شاہ زر خان + وقاص احمد

ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن



جاسوسی، سسپنس اور سیارہ ڈائجسٹ سے منتخب کردہ کہانیاں



نام : طاہر جاوید مغل والد کا نام محمد یونس پیدائش لاہور کے نواحی علاقے سلیمانکی کی
تحریری سفر کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور سے 19،74 میں آداب عرض کے عنوان سے کیا۔ طنز و مزاح میں باقاعدہ لکھنا رسالہ "چاند" سے شروع کیا، جبکہ پندرہ روزہ رسالہ دید" و "سنید میں بچوں کے لیے بھی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔
تعلیم مکمل کرنے کے بعد سیارہ ڈائجسٹ میں معاون ایڈیٹر رہے۔ اسی عرصے میں انسپکٹر نواز خان کا کردار تخلیق کیا اور جرم و سزا پر مبنی سلسلۂ کہانیاں شروع کیں جن کے اب تک 15 مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔
بعدازاں تراجم اور تاریخی موضوعات پر مبنی ناول لکھے جنہیں پذیرائی ملی۔ کراچی کے بڑے ڈائجسٹوں میں سلسلہ وار اشاعت بھی جاری رہی مثلاً ناول "تاوان" 72–02؛1920) طویل عرصہ شائع ہوا)، "دیوی" (2003–2018) اور "انگارے" 13–)8-20201) اسی نوعیت کے دیگر سلسلے "ہاتھ باقا، نور کی یلغار، قرب اشنائی، شہرِ محبت" بھی مقبول رہے۔ بعد میں بھارت کے ناشرین سے معاہدات ہوئے، پھر اپنا ادارہ مغل پبلشرز قائم کیا اور ناول پسِ" "پردہ شائع کیا۔
تخلیقی سفر آج تک اسی سلیقے، تجسّس اور مضبوط کرافٹ کے ساتھ جاری ہے۔

تو پیش خدمت ہے طاہر جاوید مغل صاحب کی منتخب کردہ 100 کہانیوں کا مجموعہ جسے ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس نے قارئین کے لیئے ترتیب دیا ہے، ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا

والسلام

شاہ زر خان **+92 317 6699066**

طاہر جاوید مغل کلیکشن

01	کارواں زیست (آپ بیتی)	11	آئس کریم
02	مختصر کہانیاں گناہ گار لڑکی	12	بلے باز
03	قدر و قیمت	13	درپردہ
04	چسکا	14	ہنگامی شادی
05	پکار	15	نگہبان
06	گمشدہ مکان	16	کامیاب مفتوح
07	عقل و ایماں	17	دو ڈائریاں
08	ہائکا	18	کرشمہ
09	اوڑھنی	19	خود اپنے دام میں
10	رائگاں مسافتیں	20	با تدبیر

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن

21	دوراہا	31	پھر یاد آئ
22	سچ کی سولی	32	جدائ
23	انگور	33	جلد باز
24	مکتوب اجل	34	شہ زوری
25	آزاد قیدی	35	ہیرو
26	دس ستارے	36	گریڈ
27	آنکھ کا تارا	37	ماسٹر پیس
28	بے خبری	38	تاخیر
29	بے خبری	39	کھلونا
30	شرارت	40	درد عافیت

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن

41	انوکھا انتقام	51	تاخیر
42	ٹارگٹ	52	محبت اور اٹیچی
43	میری بات تو سنو	53	نخل امید
44	انا	54	مسبب الاسباب
45	حوصلے	55	مقروض چڑیا
46	شب گزیدہ	56	جبر ناگہانی
47	بہروپ	57	بدلہ
48	کایا پلٹ	58	فیصلہ
49	رازداں	59	تلاش
50	انوکھی	60	پیر کامل

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن

61	چیونٹی	71	یہ اداس صبحیں
62	آزادی		یہ اداس شامیں
63	روک ٹوک		**تراجم**
64	نام بے نام	72	ڈیڈ ڈاک
65	بھوکی پیاسی مامتا	73	آدم خور جزیرہ اول
66	خیر خواہ		آدم خور جزیرہ دوم
67	اپنی امانت واپس لو		**سلسلے وار ناولز**
68	محبت اور فاصلے	74	بیجنگ آمد اول
69	مکے باز		بیجنگ آمد دوم
70	خنجر		

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن

75	باغ سے باغ تک اول	80	سنگین مزاق اول
	باغ سے باغ تک دوم		سنگین مزاق دوم
76	غرق محبت اول	81	رات کا مسافر اول
	غرق محبت دوم		رات کا مسافر دوم
77	آتش کدہ اول		رات کا مسافر سوم
	آتش کدہ دوم	82	شہر محبت اول
78	زہریلا تریاق اول		شہر محبت دوم
	زہریلا تریاق دوم		شہر محبت سوم
79	شکست کی فتح اول	83	قاتل مسیحا اول
	شکست کی فتح دوم		قاتل مسیحا دوم

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن

	قاتل مسیحا سوم		آخری شام سے پہلے چہارم
84	پس پردہ حصہ اول		آخری شام سے پہلے پنجم
	پس پردہ حصہ دوم		آخری شام سے پہلے ششم
	پس پردہ حصہ سوم		طاہر جاوید مغل کا تخلیق کردہ کردار
	پس پردہ حصہ چہارم		انسپکٹر نواز خان
	پس پردہ حصہ پنجم	86	معصوم لڑکی
	پس پردہ حصہ ششم	87	عزت کا رکھوالا
85	آخری شام سے پہلے اول	88	بھگوڑا
	آخری شام سے پہلے دوم	89	پیار باپ اور پیٹ
	آخری شام سے پہلے سوم	90	محبوب محبوب اور شوہر

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

طاہر جاوید مغل کلیکشن

91	اوروہ مرگئ		
92	لڑکا لڑکی اور لوگ		
93	برقعہ اور جرم		
94	لاڈو		
95	دولت		
96	بانو کے عشق میں		
97	پھانسی کا پھندا		
98	قاتل کہاں ہے ؟		
99	بستی اور درندہ اول		
100	بستی اور درندہ دوم		

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

ڈائمنڈ اردو بکس

DiamondUrduBooks.com

اردو ادب، علم اور ثقافت کا بہترین آن لائن ڈیجیٹل ذخیرہ

✦ ویب سائٹ کا جامع تعارف

ڈائمنڈ اردو بکس ڈاٹ کام (DiamondUrduBooks.com) اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے قائم کردہ ایک ممتاز اور بین الاقوامی آن لائن ڈیجیٹل لائبریری ہے۔ ہمارا بنیادی مقصد دنیا بھر میں موجود اردو دان طبقے، بالخصوص قارئین، محققین، اور طلبہ کو اعلیٰ معیار کی کتب بالخصوص تاریخی، مذہبی، اصلاحی، جاسوسی اور ادبی شاہکار پی ڈی ایف (PDF) فارمیٹ میں بالکل مفت اور آسان رسائی کے ساتھ فراہم کرنا ہے۔

✦ ڈائمنڈ اردو بکس کی نمایاں خصوصیات

📚 وسیع ڈیجیٹل لائبریری

ہزاروں کی تعداد میں تاریخی، اسلامی، رومانی اور جاسوسی ناولز کا اعلیٰ ذخیرہ۔

⚡ ایچ ڈی (HD) کوالٹی

تمام کتب انتہائی صاف ستھرے اور ایچ ڈی پی ڈی ایف فارمیٹ میں دستیاب ہیں۔

📱 آسان اور تیز رسائی

موبائل اور کمپیوٹر پر بغیر کسی دشواری کے آن لائن مطالعہ اور ڈاؤن لوڈنگ۔

💎 مفت مطالعہ سروس

قارئین کے لیے تمام مواد مکمل طور پر مفت دستیاب ہے تاکہ علم ہر جگہ پہنچے۔

💡 ہمارا بنیادی عزم و مقصد

اردو زبان کی بقا اور کتاب سے دوستی کے کلچر کو عام کرنا ہمارا اولین مقصد ہے۔ ہم جدید ترین ڈیجیٹل ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اردو ادب کو ہر جگہ پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

دستیاب کتب و تحاریر کی اقسام

DiamondUrduBooks.com

✦ دستیاب کتب کے اہم شعبہ جات

شعبہ / کیٹیگری	موضوعات	قارئین کی پسندیدگی
تاریخی ناولز	اسلامی تاریخ، فاتحین کے کارنامے اور عظیم سلطنتیں	★★★★★ (بہت اعلیٰ)
سلسلہ وار کتب	اسلم راہی ایم اے، عنایت اللہ التمش وغیرہ	★★★★★ (ممتاز)
شاعری و ادب	کلاسک اور جدید شعراء کے منتخب مجموعے	★★★★☆ (بہترین)
مذہبی و اصلاحی	تربیتی کتب، سیرت النبی ﷺ اور سوانح حیات	★★★★★ (مقبول)

مصنفین، شعراء اور اہل قلم کو دعوت!

کیا آپ ایک مصنف، ناول نگار، شاعر یا کالم نگار ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر یا کتاب دنیا بھر کے لاکھوں اردو قارئین تک پہنچے؟

ڈائمنڈ اردو بکس ڈاٹ کام (DiamondUrduBooks.com) تمام نئے اور تجربہ کار لکھاریوں کو یہ سنہری موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو ہماری معتبر ویب سائٹ اور پلیٹ فارم کے ذریعے قارئین تک پہنچائیں۔

ہم درج ذیل شعبہ جات میں تحاریر کا خیر مقدم کرتے ہیں:

اردو ناولز (تاریخی و معاشرتی) | شاعری و غزلیں | افسانے و کہانیاں | مذہبی و اصلاحی مضامین | تحقیقی مقالے

ہمارے پلیٹ فارم کے ساتھ جڑیں

DiamondUrduBooks.com

✦ مصنفین کے لیے خصوصی سہولیات

🌐 عالمی سطح پر رسائی
آپ کی تحریر پاکستان سمیت پوری دنیا کے اردو قارئین تک فوری پہنچے گی۔

🛡️ محفوظ پی ڈی ایف پیشکش
آپ کے نام، تعارف اور حقوق کے مکمل احترام کے ساتھ کتاب کی پیشکش۔

📈 مفت شائعات اور تشہیر
ویب سائٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر آپ کی تحریر کی مفت تشہیر۔

🤝 مستقل تعاون
نئے اور ابھرتے ہوئے قلمکاروں کی مکمل حوصلہ افزائی اور رہنمائی۔

رابطہ کریں اور اپنی تحریر پہنچائیں

اپنی کتاب، مقالہ، شاعری یا تحریر بھیجنے کے لیے ہماری ایڈمن ٹیم سے واٹس ایپ پر براہ راست رابطہ کریں۔

👇 واٹس ایپ پر آٹو پیغام بھیجنے کے لیے نیچے کلک کریں 👇

واٹس ایپ نمبر: 03176699066

✓ بٹن پر کلک کرنے پر آٹو پیغام کے ساتھ واٹس ایپ چیٹ اوپن ہو جائے گی۔

💎 ڈائمنڈ اردو بکس 💎

آفیشل سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، واٹس ایپ گروپس ڈائریکٹری

🌐 مرکزی پورٹل و آفیشل چینل

آفیشل ویب سائٹ
آن لائن پی ڈی ایف کتب کا وسیع ذخیرہ

ویب سائٹ وزٹ کریں 🔗

آفیشل واٹس ایپ چینل
اہم ترین اپڈیٹس اور خبریں

چینل فالو کریں 📢

💬 آفیشل واٹس ایپ گروپس

ڈائمنڈ اردو بکس 1️⃣
مرکزی کتابی بحث و شیئرنگ

گروپ جوائن کریں 👥

ڈائمنڈ اردو بکس 2️⃣
ثانوی کتابی اپڈیٹس گروپ

گروپ جوائن کریں 👥

ڈائمنڈ بکس کمیونٹی
مرکزی کمیونٹی حب

کمیونٹی جوائن کریں 🌐

اردو تحاریر کا گلدستہ
منتخب ادبی تحاریر

گروپ جوائن کریں ✍️

کاروان شعر و ادب
شاعری اور شاہکار ادب

گروپ جوائن کریں 📜

کتابوں پر تبصرے
ادبی ریویوز اور تبصرے

گروپ جوائن کریں 📚

ڈی یو بی میڈیا
جنرل پوسٹنگ گروپ

گروپ جوائن کریں 🎬

ڈائمنڈ لنکس ورلڈ
مختلف مفید لنکس کا مجموعہ

گروپ جوائن کریں 🔗

حمد و نعت آفیشل

اسلامی حمد، نعت و کلام

گروپ جوائن کریں 🕌

بچوں کا کارواں

بچوں کا ادب اور کہانیاں

گروپ جوائن کریں 🎈

📱 دیگر سوشل میڈیا اکاؤنٹس

ٹیلی گرام چینل

ڈائریکٹ پی ڈی ایف ڈاؤن لوڈز

ٹیلی گرام چینل 🚀

ٹیلی گرام گروپ

ڈسکشن اور گفتگو گروپ

ٹیلی گرام گروپ 💬

فیس بک پیج

آفیشل فیس بک اپڈیٹس

فیس بک پیج 👍

فیس بک گروپ

کمیونٹی فیس بک گروپ

فیس بک گروپ 👨‍👩‍👧‍👦

انسٹاگرام

بصری اقتباسات اور پوسٹرز

انسٹاگرام فالو کریں 📸

ٹک ٹاک

مختصر ویڈیو اپڈیٹس

ٹک ٹاک فالو کریں 🎵

⚠️ کسی بھی لنک کے کام نہ کرنے یا ری سیٹ ہونے کی صورت میں فوری رابطہ کریں:

رابطہ منتظم: شاہ زر خان | +92 317 6699066

© 2026 ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس — تمام حقوق محفوظ ہیں۔

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

کہانی کہاں سے شروع کی جائے؟ موسم بہار کی اس چمکیلی صبح سے جب میں ایک ٹرین میں بیٹھا کہیں دور سے لاہور آرہا تھا اور.... معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آرہا ہوں اور کہاں جارہا ہوں؟ یا پھر سردیوں کی اس شام سے جب میں اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں کے ساتھ ایک کچے پکے صحن میں ڈگمگاتا ہوا بھاگتا تھا اور کوئی مجھے اپنی مہربان بانہوں میں لینے کے لیے میرے عقب میں رہتا تھا یا پھر اس چاندنی رات سے جب ایک ''جھکا بیل'' کے پاس کھڑی ننھی منی ہستی کا معصوم سا چہرہ میری نگاہوں میں چمکا تھا اور میرے کئی ماہ و سال اس کے اردگرد گھومتے رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ حقیقتیں خشک بھی ہوں پھر بھی رنگا رنگ افسانوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں لیکن جو حقیقتیں، یادوں کی صورت ذہن پر یلغار کررہی ہیں وہ تو ایسی خشک بھی نہیں ہیں تو پھر کیوں نا دلچسپ ہوں گی۔

سو اس کہانی کو کہیں سے بھی شروع کیا جاسکتا ہے اور ابتداء سے شروع کیا جائے تو بہتر ہے..... ٹرین سے شروع کرتے ہیں۔

ہم لاہور میں رہتے تھے مگر پیدائش نانا نانی کے گھر ہوئی جو اس وقت لاہور سے کوئی 170 کلو میٹر دور ہیڈ سلیمانکی میں رہائش پذیر تھے۔ نانا محکمہ انہار میں ملازم تھے اور انہیں ایک صاف ستھری چھوٹی سی رہائش گاہ بھی ملی ہوئی تھی۔ میرے والد محمد یونس اپنے تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ دونوں بھائیوں کی چونکہ کوئی اولاد نہ تھی، لہٰذا میری پیدائش کی خوشی سب کے لیے غیر معمولی تھی۔

والدہ بتاتی ہیں کہ ہیڈ سلیمانکی میں، میں بمشکل ڈیڑھ دو ماہ کا تھا تو مجھے نمونیے کا شدید اٹیک ہوا اور بچنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ والدہ نے دعا مانگی (اور معلوم نہیں کہ انہیں مانگنی چاہیے تھی یا نہیں) انہوں نے کہا۔ ''اے خدا میرے بچے کو بچالے، بے شک بعد میں کوئی زیادہ خوبصورت بچہ دے کر واپس لے لینا۔'' یہ دعا قبول ہوئی اور مکمل قبول ہوئی (اس کا ذکر آگے آئے گا)

تو میں بات کررہا تھا ان دنوں کی جب میں نانا نانی کے گھر تھا اور لاہور میں میرے دونوں تایا اور دیگر اہلِ خانہ بے قراری سے میری آمد کے منتظر تھے۔

میری والدہ، نانی اور والد مجھے ٹرین میں لے کر

ہیڈ سلیمانکی سے لاہور روانہ ہوئے۔ عمر غالباً ڈھائی تین ماہ ہوگی۔ میں ٹرین میں تھا اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کون ہوں؟ کہاں سے آرہا ہوں اور کہاں جارہا ہوں؟

میں شہروں کے شہر لاہور جارہا تھا۔ جہاں زندگی اپنے ہزار ہا رنگوں، خوشبوؤں غموں اور ہنگاموں کے ساتھ میری منتظر تھی۔ مگر مجھے خود پتا نہیں تھا کہ میں کس انقلاب کی سمت بڑھ رہا ہوں۔

یہ وہ دور تھا جب زندگی بہت سادہ تھی۔ خانگی جھگڑوں اور مسائل میں آج ایسی شدت اور حدت نہیں تھی۔ میرے والد اپنے دونوں بڑے بھائیوں کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور کچھ ایسی ہی کیفیت ان کی بیویوں کی بھی تھی۔ میرے بڑے تایا کی بیوی مریم میری سگی خالہ تھیں، منجھلی تائی فاطمہ بھی قریبی عزیزہ تھیں وہ بے حد مشفق خاتون تھیں۔ یہ سب لوگ میری آمد کے لیے ایک ایک پل گن کر گزار رہے تھے۔ میری نانی صرف یہ دیکھنے کے لیے ہمارے ساتھ لاہور چلی آئی تھیں کہ جب بچوں کی چہکاروں کے لیے ترسا ہوا یہ گھرانا مجھے دیکھے گا تو ان کی کیفیت کیا ہوگی۔

اور یقیناً یہ کیفیت دیکھنے والی ہی رہی ہوگی۔ اس ''کیفیت'' کو دیکھ کر ہی میری نانی جان نے اپنی بیٹی یعنی میری والدہ سے کہا تھا کہ اگر تمہاری بڑی بہن خواہش کرے تو یہ بچہ اسے گود دے دینا۔ اللہ تجھے بہت نوازے گا اور والدہ نے ایسا ہی کیا تھا..... میرے چھوٹے بھائی کی پیدائش کے چار پانچ ماہ بعد ہی والدہ رقیہ بیگم نے مجھے باقاعدہ طور پر اپنی بڑی بہن مریم بی بی کی گود میں ڈال دیا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مریم بی بی اور تائی فاطمہ کی گود میں ڈال دیا۔

سوچتا ہوں ایک ماں کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہے کہ اپنے پہلوٹی کے بچے کو دوسرے کے حوالے کردے۔ تاہم والدہ کے لیے یہ جدائی برداشت کرنا اس لیے نسبتاً کم دشوار ثابت ہوا کہ تینوں بھائی ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میں ماں سے جدا ہونے کے باوجود ان کی نگاہوں کے سامنے ہی تھا۔

لاہور، نواں کوٹ کے علاقے میں ہمارا گھر قریباً دس مرلے پر مشتمل تھا۔ ان دس مرلوں میں سے قریباً سات مرلوں کا تو صحن ہی ہوگا۔ یہ وہی کچا پکا صحن تھا جس میں میرے بچپن کی بے شمار سنہری یادیں وجود میں آنے والی تھیں۔ صحن سے آگے برآمدہ تھا جس کی چھت لکڑی کی تھی۔ اس سے آگے تین کمرے تھے۔ صحن میں ایک ہینڈ پمپ تھا، اس سے آگے نلکا در تھا اور صحن کے آخری سرے پر دو درخت تھے، ایک نیم کا اور دوسرا دھریک (بکائن) کا۔

ہاں یہ وہی دن تھے جب میں اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں کے ساتھ کچے پکے صحن میں بھاگتا پھرتا تھا اور خالہ مریم اور تائی فاطمہ مجھے گرنے سے بچانے کے لیے اپنی مہربان بانہیں پھیلائے میرے عقب میں ہوا کرتی تھیں۔

بچپن کے دنوں میں نانی کا پیار میری زندگی کی سنہری یادوں کا آغاز تھا۔ نانا ذرا خاموش طبع تھے مگر نانی اتنی ہی خوش گفتار اور نثار جانے والی خاتون تھیں۔ ان کے والد کا خطے میں بہت نام تھا۔ یہ تذکرہ بھی آگے چل کر آئے گا۔ میں نے نانی کا نام کھیر والی نانی رکھ چھوڑا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ بچپن میں، کھیر مجھے پسند تھی اور میں جب بھی ان کے پاس ہیڈ سلیمانکی جاتا وہ اکثر کھیر کی دیگچی چولہے پر چڑھائے رکھتیں۔ بچپن میں میں بایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا۔ نانی سخت خلاف تھیں۔ مجھے یاد نہیں مگر والدہ بتاتی تھیں کہ نانی اکثر میرا بایاں ہاتھ کسی کپڑے میں لپیٹ کر باندھ دیتی تھیں تاکہ میں دایاں ہاتھ استعمال کروں..... اور وہ اس مشن میں کامیاب رہیں۔

بچہ ننھیال ہوتا ہے۔ والدہ میری ننھیال کا ایک واقعہ ہنس ہنس کر سناتی تھیں۔ لاہور میں ہمارے گھر میں ہینڈ پمپ تو تھا مگر ایک بابا مشکی بھی گھڑے وغیرہ بھرنے کے لیے آتا تھا۔ جب وہ دروازے پر دستک دیتا تو والدہ، خالہ اور میری تائی اپنے دوپٹے وغیرہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھتیں۔ ایسے میں، میں بھی پریشان ہوتا اور پکارتا۔ ''میلا بٹا کہاں ہے؟'' (میرا دوپٹا کہاں ہے؟)

اپنی اور اپنے چھوٹے بھائی ساجد کی جو پہلی شرارت مجھے یاد ہے وہ کافی سنگین بھی تھی۔ میں اور میرا بھائی بمشکل چھ اور چار سال کے ہوں گے جیسا کہ میں نے بتایا ہے برآمدے کی طویل چھت لکڑی کی تھی۔ اس میں چیڑ کی شہتیر اور باریک پٹے تھے۔ یہاں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ایک دن میں نے اور بھائی نے دیکھا کہ گھونسلا جو چڑیوں سے خالی ہے کافی نیچے لٹکا ہوا ہے۔ ہم نے چولہے میں سے جلتی ہوئی ایک لمبی لکڑی اٹھائی اور اس کے ذریعے گھونسلے کو آگ دکھادی۔ یہ نہ سوچا کہ گھونسلے کے ساتھ ساتھ ہمارا اپنا ''گھونسلا'' بھی جل اٹھے گا۔ چیڑ کی

لکڑی میں تیل ہوتا ہے۔ گھونسلے کے ساتھ ہی چھت نے آگ پکڑ لی۔ خواتین خانہ نے دیکھا تو آگ بجھانے کے لیے صحن کی طرف دوڑیں۔ وہ ڈونگوں میں پانی بھر بھر کر چھت پر پھینکتی رہیں کہ آگ زیادہ نہ پھیلے۔ ڈونگے بھرنے کے لیے گھڑوں سے پانی لیا گیا جو پہلے ہی تقریباً خالی تھے۔ بدحواسی میں ہینڈ پمپ کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔

ہم سب خوش قسمت رہے کہ آگ چھت کا تھوڑا سا حصہ جلا کر بجھ گئی۔ ہمیں سخت ڈانٹ پڑی اور ساتھ ہی دھمکی بھی ملی کہ ابا جی کو آنے دو۔

''ابا جی کو آلینے دو۔'' یہ ایک ایسا فقرہ تھا جس نے ہم دونوں بھائیوں کی شرارتوں کو بریک لگائے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمارے بچپن کے کافی سارے اچھے بھلے دن برباد بھی کیے۔ ابا جی بہت پیار کرنے والے تھے مگر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سخت بھی تھے۔ وہ ایل ایس او میں سرکاری ملازم تھے۔ صبح کے گئے شام پانچ بجے کے قریب لوٹتے تھے۔ جب خالہ اور چھوٹی تائی ہم دونوں بھائیوں کی کسی شرارت پر بہت زچ ہو جاتی تھیں تو فرماتی تھیں۔ ''اچھا یونس (ابا جی) کو آلینے دو شام کو..... سب کچھ بتاتے ہیں انہیں۔''

اس دھمکی کے بعد ہم دونوں کا باقی سارا دن خراب ہوتا تھا۔ شرارتیں وغیرہ ذہن سے محو ہو جاتی تھیں بس ایک ہی خواہش ہوتی تھی کہ کسی طرح ترلے منت کر کے والدہ، خالہ اور تائی کو شکایت لگانے سے روک دیا جائے۔ وہ بھی مزہ لیتی رہتی تھیں..... اور اکثر شام سے کچھ دیر پہلے مان بھی جاتی تھیں مگر اکثر ایک اور کام بھی ہو جاتا تھا۔ خالہ مریم جنہوں نے مجھے گود لے رکھا تھا شام کے وقت اپنے ارادے پر نظر ثانی کر لیتی تھیں۔ ظاہر تھا کہ یہ ہم دونوں بھائیوں اور خاص طور سے میری تربیت کے لیے ہی کرتی تھیں۔ ابا جی دفتر سے آتے ہی ہمیں پڑھانے کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے میں اگر خالہ مریم ہمارے قریب آ کر بیٹھ جاتیں تو ہم سمجھ جاتے کہ برا وقت آیا چاہتا ہے۔ وہ یوں آغاز کرتیں۔ ''یونس، میں نے بتانا تو نہیں تھا مگر ان دونوں نے اتنا ستایا کہ میں نے قسم کھائی تھی.....''

اس کے بعد ظاہر ہے کہ ہم پر فرد جرم عائد ہو جاتی اور چشم زدن میں فیصلہ بھی ہو جاتا۔ والد صاحب کے چہرے پر سرخ رنگ کی کم یا زیادہ آمیزش سے ہی ہم تجربہ کاروں کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ کتنی کھچائی ہو گی، کتنے طمانچے پڑیں گے اور ان کی شدت کیا ہو گی۔ اب طرفہ تماشا یہ ہوتا تھا کہ جب طمانچے پڑ رہے ہوتے تھے تو ہمیں بچانے والوں میں بھی سب سے آگے خالہ اور تائی ہی ہوتی تھیں..... والدہ بس منہ پھیرے اپنے کام میں لگی رہتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ خالہ اور تائی فاطمہ کی کتنی چوڑیاں ہمیں بچاتے ہوئے ٹوٹیں۔

ابا جی کا غصہ جلد ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ ہمیں پاس بیٹھاتے، پیار سے سمجھاتے..... اور اکثر اشک شوئی کے طور پر ہمیں نظام دین کی دکان پر لے جاتے۔ نظام دین ہمارے علاقے کا دودھ فروش تھا۔ مین ملتان روڈ پر اس کی دکان تھی۔ باریش، مذہبی آدمی اور انتہا کا صاف ستھرا۔ اس کے دودھ دہی اور برفی کی علاقے میں دھوم تھی۔ اس کے بڑے پیالے کے اندر، ملائی والے دہی میں شکر ملا کر کھانا ایک ایسا لذیذ تجربہ تھا جسے شاید لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے۔ کچھ یہی صورت حال اس کی بنائی ہوئی نرم نرم تازہ برفی کی ہوتی تھی۔ ابا جی محبت سے برفی کھلاتے جاتے اور ہمیں طمانچوں اور ڈانٹ ڈپٹ کی ساری کلفت بھولتی چلی جاتی۔

آپ بیتیاں بڑے لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میں ایک عام سا قلم کار ہوں۔ اس کے باوجود گزرے شب و روز کی بے شمار باتیں ایسی یاد آ رہی ہیں جن میں عام قارئین کے لیے خاصی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ انہی دنوں کی بات ہے جب میں نے اپنی ایک زبان ایجاد کی۔ یہ زبان میں بڑی فصاحت اور روانی سے بولتا تھا اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کا ایک لفظ بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کا نام میں نے دیسی بولی رکھا ہوا تھا۔ انگلش، اردو اور عربی کے کیے الفاظ اس بولی میں گڈمڈ تھے جو حقیقت میں ان زبانوں کے الفاظ تھے ہی نہیں۔ ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔ تم تے تم، ہل تے ہل، ڈومبا ڈومبا ڈینگا، واچو بالے فولے، ہری ڈوبا شی باشی.....

اہل خانہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے تھے۔ کوئی مہمان آتا تو اسے یہ بولی سنائی جاتی۔ دھیرے دھیرے میری یہ خود ساختہ بولی خاندان بھر میں مشہور ہو گئی۔ میرے بڑے پھوپا سعید خاص طور سے اسے سنتے اور سر دھنتے۔

انہوں نے میرے والد سے کہا۔ ''یونس، تم مذہبی ذہن کے ہو اور یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم نے دونوں بچوں کو مدرسے میں داخل کرایا اور انہوں نے اس چھوٹی سی عمر میں ناظرہ قرآن پاک پڑھ لیا۔ اب انہیں کسی اچھے اسکول میں داخل کراؤ۔ خاص طور سے طاہر کا ذہن تخلیقی اور پڑھنے

والا ہے۔

دونوں تایا بھی اس بات کے حامی تھے لیکن ابا جان کچھ تذبذب میں تھے۔ میں نے ناظرہ قرآن پاک صرف تین چار ماہ کے اندر ہی ختم کرلیا تھا۔ اب میرا ذہن اس طرف جارہا تھا جس طرف میرے ذہن نے جانا تھا۔ میں کہانیوں کی کتابیں پڑھنا چاہتا تھا..... نہ صرف پڑھنا بلکہ لکھنا بھی چاہتا تھا اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اگر ابا جی کو معلوم ہوگیا تو..... تو بت نظام دین کی برفی تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا میں نے چوری چھپے ایک کاپی خریدی۔ فاؤنٹین پین خریدا اور بڑے تایا جان کے ٹمبر اسٹور پر چلا گیا۔ یہ قدیمی اسٹور گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ملتان روڈ پر واقع تھا۔ یہاں بڑی بڑی شہتیر..... اور لکڑی کے بلاک ڈھیروں کی شکل میں پڑے رہتے تھے۔ میں نے ایسے ہی ایک ڈھیر کے اندر ایک کھوہ تلاش کرلی..... ایسی ہی کھوہیں اور غار بعد ازاں قارئین کو میری کہانیوں تاوان اور دیوی وغیرہ میں بھی ملے۔ میں نے اپنا فاؤنٹین پین اور کاپی وہاں چھپادی۔ جب بھی فرصت ملتی اس کھوہ میں گھس کر کہانی لکھتا۔ اس کہانی کا نام میں نے ''چار غلام'' رکھا۔ بہرحال ایک دن فرصت کے وقت اس کھوہ میں گیا تو نہ قلم تھا نہ کاپی اور نہ چار غلاموں والی کہانی بلکہ کھوہ بھی نہیں تھی۔ اب وہاں کچھ اور طرح کی لکڑیاں کچھ اور انداز میں رکھی ہوئی تھیں۔

میں دل مسوس کر رہ گیا مگر کہانیوں کا چسکا کسی پل چین نہیں لینے دیتا تھا۔ والدین سے چوری چھپے بچوں کا رسالے پڑھنا تو ایک ایسی مشق ہے جو بے شمار لوگوں نے کی ہے۔ البتہ میں اس سے تھوڑا آگے بڑھا۔ میں نے اوٹ پٹانگ کہانیاں گھڑنا بھی شروع کردیں اور یہ کہانیاں سنانے کے لیے اہلِ خانہ کے اندر سے ہی دو تین شکار بھی ڈھونڈ لیے۔ دو شکار باہر کے تھے۔ ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میرے چھوٹے سے دل پر بے حد اثر کیا۔ ہمارے پڑوس میں کچھ اردو اسپیکنگ لوگ رہتے تھے جو انڈیا سے ہجرت کرکے یہاں آئے تھے۔ وہ کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔ ان کی ایک بیٹی بینا تھی جو قریباً سات برس کی تھی یعنی مجھ سے ایک دو سال چھوٹی۔ ہم اکٹھے کھیلتے تھے، محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ بھی دھما چوکڑی جاری رہتی تھی۔ دو چار روز گزر گئے بینا نظر نہیں آئی۔ میں نے تائی فاطمہ سے پوچھا۔ وہ تھیں تو تائی لیکن ہم انہیں پھوپی کہتے تھے۔ میں نے قدرے توتلی زبان میں کہا۔ ''پھوپی جی بینا کہاں ہے؟''

پھوپی نے کہا۔ ''وہ اپنے ماموں کے پاس حیدرآباد گئی ہے۔ دو چار دن میں آجائے گی۔''

لیکن وہ دو چار دن میں نہیں آئی۔ آٹھ دس روز میں بھی نہیں آئی..... ان دنوں اہلِ خانہ مجھے اور چھوٹے بھائی ساجد کو بھی گھر سے بہت کم باہر نکلنے دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

ایک دن پھر میں نے پھوپی (تائی) اور خالہ سے پوچھا۔ ''بینا کب واپس آئے گی؟''

پھوپی نے غمناک لہجے میں کہا۔ ''وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی..... وہ بہت دور چلی گئی ہے۔ اللہ میاں کے پاس۔''

''اللہ میاں کے پاس؟ اللہ میاں حیدرآباد میں رہتے ہیں۔'' (اللہ میاں حیدرآباد میں رہتے ہیں) میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں طاہر، اللہ میاں آسمانوں پر رہتے ہیں۔ وہ کچھ لوگوں کو اپنے پاس وہاں بلا لیتے ہیں۔''

یہ عقدہ بڑی مشکل سے مجھ پر کھلا کہ وہ مرچکی ہے اور دو دن پہلے اسے ایک قریبی قبرستان میں دفنا دیا گیا ہے۔ صرف وہی نہیں کالونی کے ایک دو اور بچے بھی دنیا سے چلے گئے تھے۔ دراصل ان دنوں چیچک پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ مقامی زبان میں اسے ماتا اور ماتاں بھی کہا جاتا تھا..... یہ وبا پھیلی تھی۔ بینا بھی اس کا شکار ہوئی تھی۔ مجھے کچھ نہیں بتایا گیا تھا، یہاں تک کہ وہ دنیا سے چلی گئی تھی۔ زندگی دکھ اور خوشی کے ایسے ہی نشیب و فراز کا نام ہے۔

کپڑا بننے والے پڑوسیوں کی بات یاد آئی ہے تو یہ بھی یاد آیا ہے کہ وہاں کپڑا بننے والوں کی پوری بستی تھی۔ یہ بڑے محنتی اور ملنسار جولاہے تھے۔ سارا دن ان کی دستی کھڈیاں چلتی رہتی تھیں اور ان کی آبادی کی نالیوں میں رنگ برنگا پانی نظر آتا تھا۔ یہ مختلف رنگ خوش نما پانی ان رنگوں کا ہوتا تھا جو وہ لوگ اپنے سوت کو دیتے تھے۔ وہ رنگ برنگی نالیاں آج بھی نگاہوں میں گھومتی ہیں۔

تو میں بات کررہا تھا اپنے ایسے دو شکاروں کی جنہیں میں اپنی کہانیاں سنانے کے لیے گھیرتا تھا۔ ان میں محلے کا ہی ایک دراز قد لڑکا شوکت تھا۔ عمر میں مجھ سے پانچ چھ سال بڑا ہی ہوگا۔ شاید میٹرک میں پڑھتا تھا۔ شروع میں، میں نے

اسے گاجر والے حلوے کا لالچ دے کر اپنی گھڑی ہوئی کہانی سننے پر مجبور کیا۔ یہ گاجر والا حلوا پھوپی جان فاطمہ اپنے میکے سے بنوا کر لائی تھیں، مگر اس میں ذرا جلنے کی بو شامل ہوگئی تھی اس لیے زیادہ رغبت سے کھایا نہیں گیا تھا۔ میں روزانہ دیگچے میں سے تھوڑا سا حلوا نکال کر کاغذ پر رکھ لیتا اور لپیٹ کر گھر سے باہر آجاتا۔ دراز قد شوکت پہلے ہی میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ میں اسے حلوا دیتا۔ وہ میرے ساتھ ہی گلی میں ایک چھوٹی سی تھڑی پر بیٹھ جاتا۔ حلوا کھاتا اور ساتھ ساتھ میری کہانی سنتا۔ مجھے یاد نہیں مگر وہ بڑے وسیع کینوس کی کہانی ہوتی تھی۔ اس میں ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ بڑے بڑے بحری جہاز، جہازوں پر حملہ آور ہونے والے سمندری اژدہے.....اور پھر ساحل سے آگے ایک تپتے صحرا کے جملہ مسائل اور وہاں کے ناقابلِ بیان مصائب شامل ہوتے تھے۔

کہانی لمبی تھی، کچھ دنوں بعد حلوا ختم ہوگیا مگر میں نے محسوس کیا کہ شوکت بغیر حلوے کے بھی کہانی سننے پر آمادہ تھا۔ وہ سہ پہر ڈھائی تین بجے باقاعدگی کے ساتھ تھڑی پر آکر بیٹھ جاتا اور کہانی سنتا۔ اس سے میرے اعتماد میں اضافہ ہوا کہ حلوے کے بغیر بھی کہانی سنی اور سنائی جاسکتی ہے۔

میرا دوسرا شکار مجھ سے کافی بڑی عمر کی میری ایک پھوپی زاد تھیں۔ وہ خواب سننے اور سنانے کی شوقین تھی۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ میں نے انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے خواب سنانا شروع کردیے۔ یہ وہ خواب تھے جو میں نے کبھی دیکھے ہی نہیں تھے۔ یہ دراصل چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ایک دن بیڈ پر ان کے ساتھ لیٹ کر میں نے جو ایک خواب شروع کیا تو وہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔ اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپی سے سنتی چلی گئیں یہاں تک کہ لنچ کا وقت گزر گیا اور ظہر کی نماز بھی قضا ہوگئی۔ تب خالہ جان نے آکر انہیں بتایا کہ یہ خواب نہیں، یہ تو تمہیں کہانی سنا رہا ہے.....اگر تم اسی طرح لیٹی رہو گی تو یہ رات تک ختم نہیں ہوگی۔"

"اور وہ جو پچھلے خواب تھے؟" بڑی عمر کی کزن نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بھی اس کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہی تھیں۔" خالہ جان نے انکشاف کیا۔

مجھے یاد ہے میری پھوپیوں کے کوٹھی نما گھر میں کراچی کے موٹے موٹے ڈائجسٹ بکھرے رہتے تھے۔ عموماً انہیں میرے پھوپی زاد ہی پڑھتے تھے۔ میں ان کی ورق گردانی کرتا تھا اور کبھی یہ سوچا نہ تھا کہ کسی وقت میں بھی ان رسائل و جرائد میں لکھوں گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ان دو چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر کروں جن میں مجھے جھوٹ بولنا پڑا اور نتیجے میں جھوٹ پکڑا بھی گیا۔ آج کل بچے اور بڑے رات کو سوتے سوتے اکثر بارہ بجا دیتے ہیں اور کچھ تو اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ شام کے بعد جب ابا جی مجھے پڑھا رہے تھے مجھے ہمیشہ کی طرح نو کے پہاڑے نے الجھا دیا۔ ابا جی سٹپٹا گئے۔ انہوں نے ساجد کو تو چھٹی دے دی اور مجھ سے کہا کہ اب میں عشاء پڑھنے جا رہا ہوں۔ عشاء پڑھ کر واپس آؤں گا تو پہاڑا سنا کر سونا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ مجھے بہت بڑی سزا محسوس ہوئی تھی اور میں نے رونا شروع کردیا تھا۔ حالانکہ سردیوں کا موسم تھا، اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ساڑھے آٹھ تک ابا جی مسجد سے واپس آجاتے تھے۔ ہم صبح سویرے اٹھ کر بہت سے کام نمٹاتے تھے۔ ان میں ایک کام عموماً میرے ذمے یہ ہوتا تھا کہ میں اپنے چھوٹے، شیر خوار بھائی کا دودھ لے کر آؤں۔ یہ دودھ میں ابا جی کے ایک دوست کے گھر سے لاتا تھا جو ڈاک خانے میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ دودھ بھی فروخت کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ان کا فاصلہ کوئی سو گز ہوگا۔

حسبِ معمول انہوں نے پیتل کی ایک گڑوی نما برتن میں مجھے دودھ دے دیا۔ میں جن پری والی کسی کہانی کے تانے بانے بنتا لہراتا چلا آرہا تھا کہ گول مٹول گڑوی میرے ہاتھ سے نکلی اور دور تک لڑھک گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ گڑوی کو اٹھا کر دیکھا۔ اس میں آدھے سے بھی کم دودھ بچا تھا۔ فوراً ابا جی کی ناراضگی کے خیال نے آدبوچا۔ کچھ اور تو نہ سوجھا۔ قریب ہی کالونی کا ہینڈ پمپ تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے دودھ پورا کیا اور امی جی کو دے دیا۔

سارا دن خیریت سے گزر گیا۔ تاہم مغرب کی نماز کے وقت ابا جی کے دودھ فروش دوست نے ابا جی سے پوچھ لیا۔ "کل طاہر نے راستے میں گڑوی گرا دی تھی، کچھ دودھ بچا بھی کہ نہیں؟"

پول کھل گیا، ابا جی سے خوب ڈانٹ پڑی۔ امی

بولیں۔ ''میں بھی کہوں آج سارا دن کا کا روتا ہی رہا ہے۔'' کا کا یعنی میرا چھوٹا بھائی۔

ظاہر ہے بے چارہ بھوک کی وجہ سے روتا رہا تھا۔ دوسرا جھوٹ کچھ عرصہ بعد بولنا پڑا۔ اباجی پتنگ بازی کے بے حد خلاف تھے۔ (شاید انہیں پینتالیس پچاس سال پہلے ہی پتا چل گیا تھا کیمیکل ڈور آنے والی ہے) اباجی یا بڑے تایا جی کے آنے کا پتا چلتا تھا تو ہم گڈی اتارنے کے بجائے اسے ہاتھوں سے توڑ دینا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔

ایک شام جب اباجی گھر میں تھے، میں گھر کے سامنے والے کھلے میدان میں کھیل رہا تھا۔ ایک پتنگ کٹی تو اس کی ڈور ہم پر آن گری۔ اس ڈور کو ہم بچے پیٹا کہتے تھے اور اسے لوٹنا پتنگ بازی کے قوانین کے عین مطابق تھا۔ بچے اس ڈور پر جھپٹ پڑے۔ میں نے بھی ڈور پکڑلی مگر کٹی پتنگ کی ڈور پکڑنے کا صحیح ڈھنگ مجھے نہیں آتا تھا۔ میں نے ڈور ایسے ہی پکڑی جیسے ہاتھ میں قلفی پکڑتے ہیں۔ ڈور کا دوسرا حصہ ایک تجربہ کار لڑکے کی گرفت میں تھا۔ اس نے مجھے وارننگ دی۔ ''طاہرے! ڈور چھوڑ دے، ورنہ میں چیرا دے دوں گا۔'' میں اس دھمکی کی گہرائی اور سنگینی تک نہ پہنچ سکا۔ اس نے زور سے کھینچا مارا اور چھوٹی انگلی کی طرف سے میری ہتھیلی کوئی آدھ انچ گہرائی تک کٹ گئی۔ خون ہل ہل نکلنے لگا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے زخمی ہاتھ دبایا اور گھر کی طرف بھاگا مگر گھر میں اباجی تھے۔

انہیں کیا بتاتا۔ عین ممکن تھا کہ ڈور کاسن کر وہ غم و غصے میں ایک دو طمانچے جڑ دیتے۔ گھبرائے ہوئے ذہن کو کوئی معقول بہانہ نہ سوجھ سکا۔ ڈور کا ذکر کرنے کے بجائے میں نے اینٹ کا ذکر کردیا۔ میدان میں اینٹوں کے دو تین ''چکے'' لگے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''ہاتھ زمین پر رکھا ہوا تھا اوپر سے اینٹ گر گئی ہے؟''

''اینٹ گر گئی ہے؟'' خالہ حیرت سے چلائیں۔ ''یہ کس طرح کی اینٹ تھی جس نے ہاتھ ہی کاٹ دیا ہے۔''

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''کنارہ لگا ہے، بڑا تیز کنارہ تھا۔''

پھوپی نے کہا۔ ''ہائے ہائے۔ اینٹ نے ہاتھ کاٹ کر رکھ دیا۔''

خیر گزری کہ ہاتھ لہولہان تھا۔ کسی کو بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ زخم کو وضاحت سے دیکھ سکے۔ ہمارے علاقے کے ڈاکٹر سرفراز ہر دل عزیز اور پسندیدہ ڈاکٹر تھے۔ مرہم پٹی کے لیے ان کے پاس لے جایا گیا۔ ان کا کمپاؤنڈر بھی اینٹ کی اس جداگانہ قسم کی چوٹ پر حیران نظر آیا۔ میں اپنے مؤقف پر مضبوطی سے قائم تھا۔

اگلے روز بھی گھر میں سارا دن یہی گفتگو ہوتی رہی۔ ''اینٹ نے معصوم کا ہاتھ کاٹ کر رکھ دیا۔ شکر ہے اللہ پاک کا سر پر نہیں لگی۔''

صرف پھوپی فاطمہ تھیں جو کبھی کبھی شک کی نظروں سے مجھے دیکھتی تھیں مگر کہا انہوں نے بھی کچھ نہیں۔ جو بھی خبر لینے آتا اسے یہی بتایا جاتا کہ اینٹ کے کنارے نے ہتھیلی کاٹ دی۔ شکر ہے ہڈی بچ گئی۔

میں اگلی شام مطمئن بیٹھا تھا کہ اپنی برق رفتار ''ذہانت'' کے سبب ڈور لوٹنے والے الزام سے صاف بچ گیا۔ اباجی مجھے ساجد اور ہماری چھوٹی بہن کو لیے چارپائی پر بیٹھے پڑھا رہے تھے۔ اتنے میں ہماری پڑوسن، ہینڈ پمپ سے پانی لینے ہمارے گھر آئی۔ اباجی کو دیکھ کر بڑی روانی سے بولی۔ ''بھائی جی! طاہر کا اب کیا حال ہے؟''

خالہ جی نے کہا۔ ''بہن اینٹ کی چوٹ ہے، ٹھیک ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا؟''

''ہائے اللہ..... اینٹ بھی لگ گئی اسے؟'' پڑوسن آنٹی پکاریں۔

''اینٹ ہی تو لگی ہے۔'' خالہ نے کہا۔

''نہیں آپا، کل تو ڈور سے ہاتھ کٹا تھا نا اس کا..... تو اینٹ کب لگی؟''

دو ہی منٹ میں سارا پول کھل گیا۔ دراصل کل شام پڑوسن آنٹی اپنی چھت پر سے وہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

اباجی کا چہرہ سرخ ہونا شروع ہوا اور میرا زرد ہونا۔ پھر اباجی کی نگاہ میرے زخمی ہاتھ پر پڑی اور ان کے چہرے کی سرخی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ بہرحال ڈانٹ ڈپٹ خوب ہوئی۔ جھوٹ بولنے پر معافی بھی مانگنا پڑی۔ اگلے دو روز گھر میں اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ ''ہائے ہائے ہم بھی کہیں، اینٹ کا کنارہ کتنا بھی تیز ہو ایسے تو نہیں کاٹتا نا۔''

بہت سے صحافی اور ادیب یہ کہتے ہیں کہ جب ان کے ادارے کی طرف سے ان پر جلدی اور فوراً لکھنے کا دباؤ ہوتا ہے تو عموماً کوئی اچھی چیز نہیں سوجھتی بعض اوقات تو اوٹ پٹانگ لکھ دیا جاتا ہے۔ اینٹ والا بہانہ یاد کرتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ اباجی کے خوف کی وجہ سے مجھے بھی فوراً کوئی اچھا خیال نہ سوجھا اور میں نے اینٹ کی دہائی ڈال

دی۔

اب میں اس واقعے کا ذکر کرتا ہوں جو میرے روز و شب کے لیے بہت اہم رہا اور میرے گھر والوں کے لیے بھی۔

سائیکل چلانا میرا اور میرے بھائی کا شوق تھا مگر ان دنوں بچوں کا اپنے سائز کی سائیکل حاصل کرنا خاصہ مشکل ہوتا تھا۔ ہم ابا جی کی نئی نویلی سائیکل پر مشق کرتے تھے۔ محلے کے دوسرے بچوں کا بھی یہی احوال تھا۔ بڑے سائز کی سائیکل پر بچوں کی سائیکلنگ کے چار پانچ درجے ہوتے تھے۔ پیڈل والے بچے، آدھی قینچی والے..... پوری قینچی والے اور ڈنڈے والے بچے۔ آخر میں گدی والے بچے فل کوالیفائڈ سمجھے جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ تھوڑی بڑی عمر کے بھی ہوتے تھے۔ پیڈل سائیکلنگ یہ ہوتی تھی کہ ایک پاؤں پیڈل پر رکھ کر دوسرے پاؤں سے سائیکل کو حرکت دی جاتی تھی۔ آدھی قینچی چلانے والے بچے سائیکل کی ایک جانب کسی بندر کی طرح لٹکے ہوتے تھے۔ سائیکل کی گدی ان کی بغل تلے ہوتی تھی اور ایک ہاتھ ہینڈل پر ہوتا تھا۔ وہ پیڈل پورا نہیں گھماتے تھے۔ تھوڑا سا گھما کر چھوڑ دیتے تھے۔ چند بار گرنے اور چوٹیں کھانے کے بعد وہ پوری قینچی چلانے والی کیٹیگری میں شامل ہو جاتے تھے۔ یعنی پورا پیڈل گھماتے تھے۔ اس کے بعد ڈنڈے کی باری آتی تھی۔ یعنی گدی تک رسائی نہ ہونے کے سبب ڈنڈے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے ہینڈل پکڑ کر اندھا دھند پیڈل چلائے جاتے تھے اور لوگوں کو ٹکریں ماری جاتی تھیں۔ ڈنڈے کی کیٹیگری والے جو بچے زمین بوس ہوتے تھے انہیں اکثر بڑی سخت قسم کی چوٹیں نازک مقامات پر لگتی تھیں مگر لب پر یہ ترانہ رہتا تھا۔ کرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔

آخر میں گدی کی باری آتی تھی اور چھوٹے یا کم تجربہ رکھنے والے لڑکے ''گدی والوں'' کو بڑے رشک سے دیکھتے تھے حالانکہ پاؤں ان کے بھی پوری طرح پیڈلز تک نہیں لگ پاتے تھے اور وہ اکثر گدی پر رقص کرتے دکھائی دیتے تھے۔ گدی والے بچے سائیکل سے اترنے کے لیے اکثر کسی دیوار یا کھمبے وغیرہ کا سہارا لیتے تھے اور اگر ارد گرد کوئی ایسی سہولت حاصل نہ ہو اور اترنا بھی ضروری ہو تو ان کی شکل دیدنی ہوتی تھی۔

انہیں پتا ہوتا تھا کہ اب وہ اتریں گے نہیں بلکہ گریں گے۔ جسم کے جن حصوں پر متوقع چوٹیں لگنا ہوتی تھیں وہ پیشگی سسکنا شروع کر دیتے تھے۔

جس اہم واقعہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ رمضان کی دو تاریخ کو پیش آیا۔ میری عمر بمشکل نو سال ہوگی۔ یہ سردیوں کا رمضان تھا۔ ابا جی اور دونوں تایا جان تراویح پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ خالہ مریم، پھوپی فاطمہ (تائی) اور امی سحری کے لیے چاول وغیرہ چن رہی تھیں۔ بڑا بابرکت نورانی ماحول تھا۔ شیطان بند ہو چکے تھے لیکن ایک آدھ شاید ابھی مفرور تھا۔ ابا جان کی نئی سائیکل طویل برآمدے میں دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان دنوں میں گدی نشین بچوں کی کیٹیگری میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کھڑی سائیکل پر چڑھ کر پیڈل گھمانے کی پریکٹس کرنے لگا۔ سائیکل گر گئی اور میرا بازو تین جگہ سے بری طرح مجروح ہو گیا۔ کہنی کے جوڑ کی دونوں ہڈیاں بالکل ٹوٹ چکی تھیں۔ کندھا اور کلائی دونوں اتر چکے تھے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ایک طرح سے خالہ مریم اور فاطمہ پھوپی (تائی) دونوں نے ہی مجھے گود لے رکھا تھا۔ اپنے لیے ان کے پیار کو بیان کرنا چاہوں تو شاید مجھے الفاظ نہ مل سکیں۔ میرا بازو ٹوٹ کر توری کی طرح لٹک رہا تھا اور میری والدہ سمیت ان دونوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

چوٹ گرم تھی۔ کم سن ہونے کے باوجود میں ان دونوں کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ''خالہ، کچھ نہیں ہوا..... پھوپی جی کچھ نہیں ہوا۔''

پھوپی روتے ہوئے بولیں۔ ''کیسے کہتا ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کہنی کس طرح لڈو بنتی جا رہی ہے۔''

آج کا دور ہوتا تو شاید مجھے سیدھا اسپتال لے جایا جاتا اور بعد ازاں بازو کے جو معاملات بگڑے اور سنگین ہوئے وہ نہ ہوتے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ دادا جی کے مشورے پر محلے میں ہی رہنے والے ایک پہلوان جی کو بلایا گیا۔ یہ جانے بغیر کہ کہنی کا جوڑ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے انہوں نے حسبِ رواج میرے بازو پر بہیمانہ قسم کی تیل مالش کی اور لکڑیاں رکھنے کے بعد کس کر پٹی باندھ دی۔ میں ساری رات درد سے روتا چلاتا رہا۔ صبح تک ہاتھ پھول کر کپا ہو چکا تھا۔

اگلے چار پانچ ماہ میری زندگی کی تلخ اور نہایت تکلیف دہ یادوں کا حصہ ہیں۔ دادا جان کسی صورت بازو کا آپریشن کرانے کو تیار نہیں تھے۔ منجھلے تایا بھی کسی حد تک اس بات کے حامی تھے۔ بے ہوشی اور آپریشن کے خوف نے

قریباً سارے اہلِ خانہ کو گھیرا ہوا تھا۔ میرے بازو کو دیسی علاج کے ذریعے ٹھیک کرنے کی کوشش کی گئی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

جب مجھے کسی نئے پہلوان کے پاس لے جایا جاتا۔ وہ بتاتا کہ کہنی کی ہڈی غلط جڑ گئی ہے، نہ جانے کس بیوقوف سے آپ کا پالا پڑا رہا ہے۔ پہلے ہڈی کو کچا کرنا پڑے گا۔ وہ غلط جوڑ کو کچا کرنے کے لیے پہلے الا بلا چیزوں کا لیپ کرواتا پھر جب دوبارہ بلاتا تو وہ مجھے ایک بے رحم قسائی کی طرح نظر آتا۔ بڑی کھینچا تانی کر کے پہلے غلط جوڑ کو علیحدہ کرتا پھر اسے مزید غلط طریقے سے جوڑ کر پٹیاں باندھ دیتا۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی خالہ، پھوپی اور امی نے میرا بستر تیار کر رکھا ہوتا' اور گلوکوز گھول کر سرہانے رکھا ہوتا کہ کہیں بچے کا دل ہی نہ گھٹ گیا ہو۔ بچے کا دل گھٹنا کہاں تھا بس ختم ہی ہو جاتا تھا۔ میں آنکھوں میں آنسو اور منہ سے رالیں بہاتا ہوا نیم بے ہوشی کی حالت میں لوٹتا اور بستر پر گر پڑتا۔

اس سارے پہلوانی چکر میں فقط ایک پہلوان جی ایسے تھے جنہوں نے معقول بات کی اور مناسب مشورے دیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ علاج کر سکتے تو ضرور کریں گے مگر پہلے بازو کے ایکسرے وغیرہ کرائے جائیں۔ اندرون شہر کے ان مہربان سے پہلوان جی کی دھندلائی ہوئی سی شبیہہ آج بھی میرے ذہن میں ہے۔ جن قارئین نے میری سلسلہ وار کہانی انگارے پڑھی ہے۔ انہیں شاید پہلوان حشمت راہی کا کردار یاد ہو۔ یہ کردار انہی پہلوان جی کا پرتو ہے جن سے میرا واسطہ اس ابتلا کے دور میں پڑا تھا۔

میرا بازو سوکھنا شروع ہو گیا تو ابا جی کی فکر بہت بڑھ گئی۔ انہوں نے میرے بڑے پھوپا سعید سے مشورہ کیا۔ یہ وہی پھوپا تھے جو میری ایجاد کردہ ''دیسی زبان'' کے بہت مداح تھے۔ وہ دونوں مجھے ایف سی کالج کے اسپتال لے گئے اور میرے بازو کا قرار واقعی علاج شروع ہوا۔ میں وہاں قریباً ایک ماہ ایڈمٹ رہا۔ ان دنوں وہاں امریکن ڈاکٹرز بھی تعینات تھے۔ ان میں سے دو ڈاکٹر میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور دوست بن گئے۔ مجھے آج بھی ان کے روشن چہرے یاد ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ڈاکٹر بوس اور دوسرے کا ڈاکٹر کینال تھا۔

ابا جی نے آفس سے چھٹیاں لے لی تھیں اور اسپتال میں زیادہ تر وہی میرے پاس ہوتے تھے۔ ابا جی بوجوہ صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر پائے تھے مگر اس دور کا میٹرک بھی شاید آج کل کی گریجویشن سے بڑھ کر تھا۔ ان کی انگلش بہت اچھی تھی۔ وہ ڈاکٹر بوس اور ڈاکٹر کینال سے باتیں کرتے اور انہیں بھی میری ایجاد کردہ دیسی زبان سناتے، جس کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ نہایت رواں دواں اور خوش آہنگ ہونے کے باوجود اس کا ایک لفظ بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں بازو گلے میں لٹکائے سارے اسپتال میں گھومتا پھرتا تھا۔ خالہ اور پھوپی کو آپریشن سے قبل میری کمزوری کی بے حد فکر تھی۔ وہ مٹن قیمہ، گردے کپورے اور ہلالی کلیجی وغیرہ دیسی گھی میں بھون بھون کر میرے لیے لاتیں مگر دواؤں کی گرمی کے سبب میں بہت کم کھاتا تھا۔ اس کھانے کا بیشتر حصہ چھوٹے بھائی ساجد کی ضیافت طبع کا باعث بنتا تھا۔

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ آج سوچتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ناخوشگوار مناظر بچوں کے اذہان کو کس بری طرح متاثر کرتے ہیں اور بچوں کو ان سے بچانے کے لیے احتیاط کتنی ضروری ہے۔ ایک روز ڈاکٹر بوس اور ان کی ٹیم کا تجربہ کرتے ہوئے میں غلطی سے ایک انجانے وارڈ میں داخل ہو گیا۔ وارڈ بوائے نے بھی مجھے نہ روکا، اسی وارڈ میں ''پائلز'' کے آپریشن والے کوئی دو درجن ادھیڑ عمر مریض موجود تھے۔ میں نے دیکھا وہ سب اپنے بستروں پر تھے اور اوندھے ہو کر اپنے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل تھے۔ (سجدے کی سی حالت میں) ان کے زیریں جسم پر کوئی لباس نہ تھا۔ ڈاکٹر ز نرسوں کی مدد سے ان کا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے ابکائی آتے آتے رہ گئی اور میں دوڑ کر باہر نکل آیا۔ کئی برس تک میں اس منظر کو ذہن سے نکال نہ پایا۔

میرے بازو کا آپریشن اب ہونے والا تھا مگر انتظامیہ میں کچھ گڑبڑ چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے آپریشن میں تاخیر ہو رہی تھی۔ روزانہ شام کو عملے کا کوئی فرد آتا ابا جی سے کہتا۔ ''یونس صاحب، صبح آپ کے بچے کا آپریشن ہے۔ اسے کل تک کچھ بھی کھلانا پلانا نہیں۔''

میں صبح دس گیارہ بجے تک بھوکا رہتا۔ تب اسٹاف میں سے کوئی آ کر ڈھیلے لہجے میں اطلاع دیتا۔ ''مولوی یونس صاحب آج آپریشن نہیں ہو سکے گا۔''

لیکن ایک روز جب میں اچھا بھلا ناشتا کر کے بیٹھا ہوا تھا ڈاکٹر اور نرس آ گئے، چلیں جی، بچے کو تیار کریں، آج آپریشن ہے۔''

اور اس روز واقعی آپریشن ہو بھی گیا۔ آپریشن کے بعد

کی رات میرے لیے شدید ترین جسمانی تکلیف کی رات تھی۔ ایسی ہی ناقابل برداشت جسمانی تکلیف کا تجربہ مجھے زندگی میں بس ایک بار مزید ہوا اس کا ذکر آگے شادی بیاہ والے باب میں ہوگا۔

آپریشن کے بعد اسپتال میں گزرنے والی رات غیر معمولی جسمانی اذیت سے بے طرح لتھڑی ہوئی تھی۔ غالباً چار پانچ گھنٹے بعد ایک جھلاتی ہوئی سی نرس میری پشت پر درد کش انجکشن گھونپتی تھی۔ میں ایک آدھ گھنٹا سکون سے رہتا تھا اور پھر چلانا شروع کر دیتا تھا۔

☆☆☆

آپریشن کے بعد میرا بازو تو بے فیصد ٹھیک ہو گیا لیکن سائیکل میرے لیے شجر ممنوعہ قرار دے دی گئی۔

ازو ٹھیک ہوتے ہی مجھے اور چھوٹے بھائی ساجد کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جیسے ڈائریکٹ حوالدار بھرتی ہوتا ہے اس طرح میں بھی ڈائریکٹ چھٹی کلاس میں داخل ہو گیا کیونکہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ مجھے چوتھی پانچویں میں داخل کرنا بیکار ہوگا۔ میری عمر اس وقت تقریباً دس سال تھی۔

اپنی پسندیدہ چیز سے جدائی مجھے ہمیشہ ڈپریشن میں مبتلا کرتی تھی۔ سائیکل سے جدائی نے بھی مجھے اداس کر دیا۔ اسی اداسی کے عالم میں مجھ سے ایک اور عجیب و غریب حرکت سرزد ہوئی اور مجھے پھر اسپتال میں رخ کرنا پڑا۔

میں چنے چبا رہا تھا۔ پتا نہیں بے خیالی میں کیا بے ہودگی سوجھی کہ میں نے ایک چنا ایک ناک میں گھسایا اور بعد میں انگلی کی دھکیل سے اسے کچھ آگے بھی کر دیا۔ اس کے بعد ابا جی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں لے گئے۔ دھیان کسی اور طرف چلا گیا اور میں بھول گیا کہ چنے کو کہاں گھسایا تھا۔

کہتے ہیں جس کی لکھائی بچپن میں خراب ہو، وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بن سکتا ہے شاید اسی طرح جو بچپن میں غائب دماغ اور بدحواس ہو اس کے آگے جا کر لکھاری یا تخلیق کار بننے کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی تھا۔ میری ان نالائقیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے خالہ مریم دوسروں سے کہا کرتی تھیں۔ ''آپریشن میں کلوروفارم سونگھایا تھا نا، ابھی تک اثر نہیں گیا ہے۔''

تو بات ہو رہی تھی نہایت نامعقول جگہ پر چنا گھسانے کی۔ تین چار روز اسی طرح گزر گئے۔ ظاہر ہے ناک کے اندرونی حصے میں نمی ہوتی ہے۔ چنا پھول گیا۔ ناک سرخ ہو گئی۔ آنکھوں سے بھی پانی بہنے لگا۔ خالہ اور پھوپی نے یہی سمجھا کہ طاہر کو شدید قسم کا زکام ہو گیا ہے۔ وقت کے رواج کے مطابق جوشاندے وغیرہ پلائے گئے۔ نمکین پانی کے غرارے کرائے گئے۔ گلے کی تیل مالش ہو گئی... مگر چنا تو ناک میں تھا کچھ افاقہ نہ ہوا۔

تیسری یا چوتھی شام کو ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ میں نے تو جمعہ کے روز ناک میں چنا پھنسایا تھا..... یہ زکام وغیرہ اسی کا مرہون منت ہے۔ اب بڑوں کو حقیقت بتاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا... کیونکہ بات ابا جی تک پہنچانا لازمی تھی اور میں فی الحال نظام دین کی بری کھانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ اگلے دس پندرہ گھنٹے بھی اسی کشمکش میں گزر گئے۔ کسی اکیلے کمرے میں جا کر بار بار اپنی چھوٹی انگلی ناک میں گھساتا اور چنے کی موجودگی محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ پھر چھینکنے والے انداز میں سانس کو زور زور سے ناک کے راستے نکالتا..... سب بے سود۔

بھی میں اپنے متاثرہ بازو کو پوری طرح حرکت نہیں دے سکتا تھا لہٰذا پھوپی فاطمہ یا خالہ مریم ہی میرا منہ وغیرہ دھلاتی تھیں۔ پھوپی ہینڈ پمپ پر منہ دھلانے لگیں تو ان کا ہاتھ ذرا زور سے ناک پر لگا۔ میرے منہ سے بے ساختہ ''ہائے اللہ'' نکلا۔

''ہائے میرے بچے کیا ہوا؟''

''درد ہو رہا ہے پھوپی جی۔''

''پر کیوں؟''

''ناک میں دانا جو پھنسا ہوا ہے، میں نے بڑی روانی سے اپنا راز کھول دیا۔ چند منٹ کے اندر اندر اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ مجھے لٹا دیا گیا اور ناک کے اندر تاکا جھانکی شروع ہوئی۔ ہر کوئی قدرت کے اس کرشمے پر مختلف زاویے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خالہ مریم اور پھوپی نے اپنی ''ہیئر پنیں'' نکالیں اور بڑی احتیاط سے پھنسے ہوئے چنے کو ناک سے نکالنے کی کوشش کرنے لگیں باقی عورتوں نے میرے سر کو جکڑ رکھا تھا۔ یہ کوششیں ناکام ہوئیں اور دانا کچھ اور اندر چلا گیا۔ فوراً نمبر اسٹور پر پیغام بھجوایا گیا کہ گھر آئیں، طاہر نے ناک میں چنا پھنسا لیا ہے۔ منجھلے تایا اپنے ایک سرکاری ملازم دوست کے ساتھ مجھے میو اسپتال لے گئے۔ ایمرجنسی میں بیٹھا دیا گیا کیونکہ سرجن ڈاکٹر مصروف تھا۔ معروضیت ملاحظہ کیجیے کہ قریباً میرا ہی ایک ہم عمر مجھ سے زیادہ ہنگامی صورت

جال میں یہاں موجود تھا۔ اس نے خیر سے گلے میں آڑ دکی گھنٹلی پھنسائی ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے گھنٹلی نکلی اور میری باری آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ماتھے پر ٹارچ لگائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ٹارچ سمیت میری ناک میں گھسنے کی کوشش کی۔ سٹپٹائے ہوئے تھے بولے۔ ''ایک تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بچے ایسی چیزیں اپنے ناک گلے وغیرہ میں گھسا کیسے لیتے ہیں۔''

میں نے رونا شروع کر دیا۔ ذرا نرمی سے فرمانے لگے۔ ''چلو تمہیں کچھ نہیں کہوں گا مجھے صرف یہ بتا دو، یہ چنا تم نے اتنے اندر تک گھسایا کیسے؟''

پھر تایا جی یعقوب سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''ناکوں چنے چبانے کا محاورہ تو کئی بار سنا تھا، دیکھ پہلی بار رہا ہوں۔''

خیر چنا بغیر کسی سرجری وغیرہ کے نکل گیا اور ہم گھر واپس آ گئے۔

☆☆☆

مجھے اور چھوٹے بھائی ساجد کو اسکول میں داخل کرایا جا چکا تھا۔ یہ سمن آباد کے قریب تھا اور معیار بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ابا جان کسی اچھے اور مناسب اسکول کی تلاش میں تھے۔ مجھے ستمبر کا وہ چمکیلا دن بڑی اچھی طرح یاد ہے جب کلاس روم میں بیٹھے ہم سب ہچکولی بری طرح چونک گئے۔ ایک تیز گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اسی دوران میں مجھے اپنے دادا جان کی آواز سنائی دی۔ وہ اسکول کے برآمدے میں کھڑے گھبراہٹ کے عالم میں مجھے پکار رہے تھے۔ ''طار..... طار۔'' وہ طاہر کی بجائے مجھے طار کہتے تھے۔ ان کے یوں پکارنے کی وجہ سے بعد ازاں اسکول میں ''طار'' میری چڑ پڑ گئی۔

میں باہر نکلا تو ساجد پہلے ہی دادا جی کے بازو سے لگا کھڑا تھا۔ ''کیا ہوا ابا جی؟'' میں نے پوچھا۔

''لڑائی لگ گئی ہے۔'' انہوں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

فوراً ہماری سمجھ میں یہی آیا کہ شاید محلے میں کسی کی کسی سے لڑائی ہو گئی ہے لیکن ہمیں کیوں بلایا جا رہا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ہندوستان پاکستان کی لڑائی لگ گئی ہے۔ دیگر بچوں کے والدین بھی بچوں کو لینے اسکول آ رہے تھے۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولے گا جب لاہور کے نیلے آسمان پر دو پاکستانی لڑاکا طیارے، شاہینوں کی طرح فضا کو چیرتے ہوئے گزرے اور سڑک پر جاتے ہوئے ایک ریڑھا بان نے ریڑھے پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا۔ ''پاکستان زندہ باد۔''

یہ صبح قریباً نو دس بجے کا وقت تھا اور دن تھا چھ ستمبر کا۔ ہم گھر پہنچے، گلی محلے اور گھر میں ہر چہرے پر ایک پُرجوش جذباتی کیفیت نظر آئی۔ ہر طرف جنگ کی بات ہو رہی تھی۔ بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ ہندوستانی فوج نے آج منہ اندھیرے لاہور پر حملہ کر دیا ہے اور پاکستانی فوج ان کو منہ توڑ جواب دے رہی ہے۔ اس خبر کی تصدیق طیاروں کی پروازیں اور توپوں کی گھن گرج بھی کر رہی تھی۔ لاہور شہر سے واہگہ بارڈر کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں ہے لہٰذا گولا باری کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔

ہماری عمر بہت چھوٹی تھی۔ میں صرف دس سال کا تھا لیکن جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا وہ حیران کن اور بے حد ولولہ انگیز تھا۔ جنگ ستمبر کے موضوع پر بہت کچھ لکھا اور پڑھا گیا ہے۔ آج کی نسل کے لیے یہ ماضی کی ایک شجاعت بھری پُرجوش داستان ہے مگر ہم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے۔ ایک بے مثال جذبے نے چند گھنٹوں کے اندر جیسے پوری ملت کو فرد واحد بنا دیا تھا اور پھر دوپہر کے وقت صدر ایوب کی پُرحرارت آواز فضاؤں میں گونجی۔ ''میرے عزیز، ہم وطنو! السلام علیکم۔ دس کروڑ پاکستانیوں کے امتحان کا وقت آن پہنچا ہے۔ آج صبح سویرے بھارتی فوج نے پاکستانی علاقے پر لاہور کی جانب سے حملہ کیا ہے.....''

رات کو بلیک آؤٹ کا ہونا ہم بچوں کے لیے ایک بے حد انوکھی چیز تھی۔ رات بھر جنگی طیاروں کی چنگھاڑیں اور توپوں کی گھن گرج سنائی دیتی رہی۔ اگلے روز پوری آبادی کے لوگوں کی طرح ہم بھی فضائی حملے سے بچاؤ والے مورچے کھود رہے تھے۔ یہ مورچے انگریزی حروف وی اور ایل وغیرہ کی شکل میں ہوتے تھے۔ مورچوں کی کھدائی کے دوران ہی گاہے بگاہے فضائی حملے کا سائرن بجنے لگتا تھا اور خالہ پھوپی اور امی ہم بچوں کو لے کر کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتی تھیں۔ اب ہم دو بھائیوں کے علاوہ ایک بہن بھی دنیا میں آ چکی تھی۔ طیاروں کی چنگھاڑیں اسے سہما کر رکھ دیتیں اور اس ننھی سی جان کو دیکھ کر ہمارے اپنے دل بھی ڈرنے لگتے۔

رضا کاروں کی ٹیمیں گھر گھر گھوم رہی تھیں اور لوگوں کو فضائی حملے کے وقت مورچوں میں گھسنے کی تربیت دے رہی تھیں۔ دو تین رضا کار ہمارے گھر بھی آئے۔ انہوں

نے کافی ٹائم صرف کر کے سب کو سمجھایا کہ حملے کے وقت مورچے میں کس طرح گھسنا ہے۔ کس انداز میں بیٹھنا ہے اور کانوں اور گردن کے پچھلے حصے کو کس طرح ہاتھوں سے ڈھانپنا ہے۔ اڑوس پڑوس کی چند عورتوں نے بھی ہمارے صحن میں یہ لیکچر بے حد توجہ سے سنا اور ایک ایک نکتہ ازبر کرلیا۔ مگر چند ہی منٹ بعد جب انڈیا کا غالباً ایک روسی مگ نہایت نیچی پرواز کرتا اور خوفناک آواز نکالتا ہمارے سروں کے اوپر سے گزرا اور چند دھماکے سنائی دیے تو ساری خواتین مورچے میں گھسنے کی بجائے چلاتی ہوئی کمروں میں گھس گئیں اور جب خطرہ گزر گیا تو لیکچر کی ہدایات کے عین مطابق مورچے میں بیٹھ گئیں۔ بعدازاں سب اس بدحواسی پر بہت ہنسے بھی، مگر ایسا صرف ایک ہی دفعہ ہوا۔ سب لوگوں نے بڑی تیزی سے شہری دفاع کے سارے اصول سیکھنا اور عمل میں لانا شروع کردیے تھے۔ خبروں کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا یا پھر صبح کے وقت اخبارات تھے۔ خبروں کے وقت ریڈیو کے گرد جمگھٹے لگ جاتے تھے۔ پھر نیوز کاسٹر شکیل احمد کی بھاری آواز فضاؤں میں گونجتی تھی۔ ''یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ اب آپ خبریں سنیے!''

دلوں کی دھڑکن تیز ہوجاتی تھی۔ آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ کسی اچھی خبر پر باقاعدہ نعرے لگائے جاتے تھے..... اور اللہ کی مہربانی و بہادر افواج کی جاں فشانی کے سبب زیادہ خبریں اچھی ہی تھیں۔ لاہور پر تین اطراف سے ہونے والا حملہ پسپا کردیا گیا تھا۔ سیالکوٹ، چونڈہ کے میدان میں ٹینکوں کی تاریخی لڑائی شروع ہوچکی تھی۔ تازہ بتازہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ دشمن کے اتنے ٹینک تباہ ہوئے، اتنی توپیں خاموش ہوئیں۔ گرائے جانے والے جنگی طیاروں اور پکڑے جانے والے پائلٹوں کی تعداد اتنی ہوگئی۔

ایک طرف یہ خبریں تھیں اور دوسری طرف فضاؤں میں ولولہ انگیز جنگی ترانے گونج رہے تھے۔ شوکت علی اور مسعود رانا اعلان کررہے تھے۔ جاگ اٹھا ہے سارا وطن..... ساتھیو، مجاہدو۔ نور جہاں جنگی طیاروں کی گھن گرج کی پرواہ کیے بغیر پکار رہی تھیں..... میرا ڈھول سپاہیا، تینوں رب دیاں رکھاں..... اور پھر..... اے وطن کے سجیلے جوانو..... عظیم گلوکار مہدی حسن کی آواز ہدیۂ عقیدت پیش کررہی تھی اور دس کروڑ عوام کے دلوں کی صدا بن رہی تھی۔ اپنی جان نذر کروں، اپنی وفا پیش کروں.....

غالباً میرے پاس وہ الفاظ نہیں اور نہ ہی قلم میں اتنی طاقت ہے کہ میں ان سترہ دنوں کی جنگ میں قوم کے اتحاد، جوش اور جذبۂ ایثار کا نقشہ کھینچ سکوں۔ مجھے ایک واقعہ آج بھی یاد ہے میرے منجھلے تایا یعقوب اور ایک پھوپا بشیر عموماً کچھ کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ تایا یعقوب اور پھوپا بشیر اپنے اپنے گھروں سے نکلے۔ تایا یعقوب نے پھوپا بشیر کو دیکھ کر دور ہی سے نعرہ لگایا، بھا بشیر..... چار طیارے اور گرادیے۔''

اس کے ساتھ ہی دونوں گلی کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کے بغلگیر ہوگئے..... اور ایسا بار بار ہوا۔ اگلے روز پھر میں نے ایسا ہی منظر دیکھا، جب کھیم کرن فتح ہونے کی خبر ملی۔ لوگوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود اسلحہ لے کر بارڈر پر پہنچ جائیں۔ لاہوریوں کو یہ ''ایڈونچر'' تھا کہ بارڈر صرف سترہ اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ لڑنے والے مجاہدوں سے اظہارِ محبت کے لیے وہ دیگیں پکواتے، اشیا ضروریہ کے انبار لگاتے اور بارڈر پر پہنچ جاتے۔ اس تاریخی منظر میں تو میں خود بھی شامل رہا ہوں جب ہزاروں شہری ملتان روڈ کے دو رویہ کھڑے ہوجاتے تھے اور گزرنے والے فوجی کانوائے کی کھلی جیپوں میں بسکٹس، چاکلیٹس اور سگریٹ کے پیکٹس وغیرہ پھینکتے تھے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن میں نے بھی کوئی کھانے والی چیز ایک جیپ میں پھینکی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ٹافی ہی ہو، مگر اس ٹافی کے پیچھے محبت اور عقیدت کا جو جذبہ تھا وہ بس اوپر والا ہی دیکھ رہا تھا۔

اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ ہم سارا دن کالونی کے میدان میں رضاکاروں کی پریڈ دیکھتے..... ریڈیو کی خبریں اِدھر سے اُدھر پہنچاتے۔ خطرے کے سائرن کے وقت مورچوں میں کودتے۔ رات کو ریڈیو پر نور جہاں اور دیگر گلوکاروں کے تازہ ترانے سنتے۔ بلیک آؤٹ کے افسانوی سے ماحول میں گھر کی چھت پر چلے جاتے۔ خاموشی کے سبب واہگہ بارڈر پر توپوں کی آوازیں صاف سنائی دیتیں اور لوگوں کی چمک بھی نظر آتی۔ یقیناً ان میں مشہور زمانہ توپوں ''رانی'' اور ''شیرنی'' کی چمک بھی ہوتی ہوگی۔ انہی دنوں ایک روز اپنے سے ملتان روڈ کی طرف جاتے ہوئے سہ پہر کے وقت لاہور کے آسمان پر انڈین اور پاکستانی طیاروں کی وہ تاریخی فائٹ دیکھی جو جنگی واقعات میں ایک مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ چند سیکنڈوں میں ہمارے

دشمن اپنے کئی طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

جنگ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن لوگوں کا جوش و جذبہ روز افزوں تھا۔ ایک روز رات کو میں پھوپی فاطمہ کے ساتھ توپوں کی چمک دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھا۔ سیاہ آسمان پر تارے زیادہ چمکدار دکھائی دیتے تھے..... چاندنی بھی اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ ہمارے گھر کے عقبی جانب ایک گھر خالی پڑا ہوا تھا لیکن آج وہاں کچھ مکینوں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ پتا چلا کہ یہ لوگ نارووال کی طرف سے آئے ہیں جہاں لڑائی کا زور اور خطرہ زیادہ ہے۔ یہ مکان ان لوگوں نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ خاتون خانہ کا نام آمنہ تھا۔ ان کے دراز قد شوہر کا نام فاضل احمد تھا اور وہ نارووال میں لوہے کی کھڑکیاں دروازے وغیرہ بنانے کا کام کرتے تھے۔ پھوپی فاطمہ نے وہیں چھت پر کھڑے کھڑے ان کے کائی کوائف معلوم کر لیے۔ ان کے دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا آصف آٹھویں کلاس میں تھا۔ بیٹی نادیہ تقریباً میری ہی ہم عمر تھی یعنی ساڑھے نو دس سال کی۔ نادیہ شہد رنگ بالوں، گول چہرے اور چھوٹی سی ناک والی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت ساون کی بارش اور چودھویں کی چاندنی ہی کی طرح برستی تھی، اور میں نے پہلی بار اسے اس چاندنی رات میں دیکھا تھا جب دور مشرقی افق پر بارود کے جھماکے سے ہو رہے تھے اور وہ جھکا بیل کے سرخ پھولوں کے پاس کھڑی تھی۔

اس کی امی آمنہ نے میری طرف دیکھا اور نادیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بھائی کو بھی سلام کرو نادو۔''

''سلام بھیا۔'' وہ بڑی روانی سے بولی۔

میری اپنی بہن ابھی بہت چھوٹی تھی اور بے حد دبلی پتلی بھی۔ نادو کو دیکھ کر اس وقت مجھے یہی لگا کہ کھیلنے کے لیے مجھے ایک پلی پلائی بہن مل گئی ہے۔

ہاں کہانی کہیں سے بھی شروع کی جا سکتی تھی۔

جنگ ہندوستان کی واضح شکست کے بعد ختم ہو گئی لیکن اپنے پیچھے قومی یک جہتی، شجاعت اور دفاع وطن کا ایک ایسا رواں دواں جذبہ چھوڑ گئی جو کئی برسوں تک قوم کی رگوں میں موجزن رہا۔ آج بھی جب پرانی تحریریں اور تصاویر نگاہوں کے سامنے آتی ہیں یا جنگ ستمبر کے ترانے کانوں میں گونجتے ہیں تو وہ جذبہ پھر تازہ ہوتا ہے۔ وہ شادمانی کے شب و روز تھے۔ فتح کا سرور تھا۔ ہم بچے گلیوں میں گاتے پھرتے تھے۔ جیوڈھولا..... شاستری دا ڈھول..... اور نہرو بیٹھا پھٹے تے، اس سے آگے کے الفاظ خاصے نامعقول تھے۔ یہ گیت بھی زبان زد عام تھا۔ جھوٹ بولنی ایں جھوٹے آکاش وانی، شاستری کا ڈھڈ یعنی پیٹ تو شاید اتنا پولا نہ ہو مگر اس کا دل کافی پولا (نرم) نکلا۔ جنگ بندی کے بعد تاشقند میں ایوب خان کے ساتھ ملاقات کے دوران میں ہی شاستری جی کو دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ جانبر نہ ہو سکے تھے۔

جنگ کے بعد بے شمار لوگ مفتوحہ کھیم کرن اور دیگر علاقے دیکھنے گئے۔ ان دنوں ابھی ہمارے پاس گاڑی نہیں تھی۔ بڑے تایا غلام رسول نے مجھے اور خالہ مریم کو ساتھ لیا۔ لاہور سے ایک رکشا ہائر کیا اور واہگہ بارڈر دیکھنے گئے۔ جنگ ختم ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے۔ ہم نے سیکڑوں مکانات گولیوں سے یوں چھلنی دیکھے کہ کوئی سلامت جگہ نظر نہ آتی تھی۔ بی آر بی نہر کے کنارے تک پہنچے، وہ جگہ بھی دیکھی جہاں پل توڑا گیا تھا اور نازک ترین لمحوں میں بھارتی ٹینکوں کی پیش قدمی روکی گئی تھی۔ یہاں ایک بلند درخت کی بلند ترین شاخوں پر کسی پاکستان فوجی کی بیلٹ بھی اٹکی ہوئی نظر آئی۔ عین ممکن تھا کہ نوم کا یہ سپوت کسی توپ یا ٹینک کے گولے سے جام شہادت نوش کر چکا ہو اور اس سرفروش کے جسم کے ٹکڑوں کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کے ٹکڑے بھی فضا میں بکھر گئے ہوں۔ اس خاکی بیلٹ کا منظر آج تقریباً 56 سال بعد بھی میرے پردۂ تصور پر چمکتا ہے۔

انہی دنوں یہ خبر بھی پھیلی کہ مفتوحہ قصبے کھیم کرن سے انڈین فلم مغل اعظم کا پرنٹ بھی ملا ہے اور یہ فلم لاہور میں دکھائی جائے گی۔ منجھلے تایا یعقوب اچھی فلمیں دیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ بلکہ بڑے تایا کے لیے بھی فلم شجر ممنوعہ نہیں تھی مگر ابا جی ایسی تفریحات کے سخت خلاف تھے۔ لہٰذا بعد ازاں جب مغل اعظم کے حوالے سے پھیلنے والی افواہ نے دم توڑا تو یقیناً سب سے زیادہ خوشی ابا جی کو اور سب سے زیادہ دکھ منجھلے تایا یعقوب کو ہوا۔ کسی حد تک میں بھی اس دکھ میں شامل تھا۔ جنگ ستمبر کے جہاں اجتماعی طور پر ہماری قوم کو بہت فائدے ہوئے وہاں ہمیں یعنی ہمارے گھر کو انفرادی طور پر بھی ایک فائدہ ہوا۔ ابا جی کی وجہ سے فلم تو ری دور کی بات، ریڈیو بھی ہمارے لیے شجر ممنوعہ تھا مگر بڑے تایا نے خبریں وغیرہ سننے کے جواز کے ساتھ تین بینڈ کا ریڈیو خرید لیا جس پر بعد ازاں ہم نے جنگی ترانوں کے علاوہ رومانی ترانے بھی ذوق شوق سے سنے۔

ابا جی بدستور ملازمت کررہے تھے۔ ہماری تعلیم وتربیت کے خیال سے انہوں نے خود کو کافی سخت رکھا ہوا تھا۔ بڑے تایا اور چھوٹے تایا یعقوب لکڑی کے کاروبار میں تھے۔ کاروبار کی زیادہ ذمے داری بڑے تایا جی غلام رسول نے اٹھا رکھی تھی۔ لہٰذا چھوٹے تایا یعقوب کو ہم بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کا وقت مل جاتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ کچھ یہی کیفیت ان کی بیوی یعنی میری پھوپی فاطمہ کی تھی۔ میں سوتا بھی ان کے کمرے میں ہی تھا۔ تایا یعقوب مجھے مغل اعظم نہ دکھا سکے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں اس سے بہت مایوس ہوا ہوں۔ اس کا ازالہ انہوں نے یہ کیا کہ ایک روز ڈیوڑھی سے گزرتے گزرتے میرے کان میں سرگوشی کر گئے کہ ہم فلم دیکھنے چلیں گے۔ سرگوشی اس لیے کی کہ تب ابا جی یونس قریب ہی ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھے وضو کررہے تھے۔

تایا جی یعقوب نے مجھے فلم دکھانے کا وعدہ کیا مگر ستم یہ کیا کہ یہ خوشخبری مجھے وقت سے کوئی دو ہفتے پہلے ہی سنا ڈالی۔ دراصل ایک فلم عید مبارک آرہی تھی جس کے بارے میں انہوں نے سنا تھا کہ بہت اچھی ہے لیکن اس کے ریلیز ہونے میں ابھی دس بارہ روز باقی تھے۔ یہ دن میں نے جس عذاب میں کاٹے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ سرِشام میں تایا جی کے سرہانے بیٹھ جاتا اور سرگوشیوں میں ان کے کان کھاتا رہا۔ یہ فلم ہوتی کیا ہے؟ کس جگہ پر دیکھی جاتی ہے؟ کتنی دیر تک دیکھی جاتی ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ اس میں تصویریں حرکت کرتی ہیں۔ تو کیسے حرکت کرتی ہیں تصویریں؟

میرے آخری سوال کا جواب وہ یہ دیتے کہ تصویریں بجلی کے ذریعے حرکت کرتی ہیں۔ میرے ذہن میں پھر بھی کوئی واضح نقشہ نہ بن پاتا۔ بجلی اور حرکت تصویروں کے اشارے سے میرا محدود ذہن ایک نیون سائن چلا جاتا۔ لب سرک فائٹا سے اس نیون سائن میں روشنیاں جلتی بجھتی تھیں اور ان کے جلنے بجھنے سے ایک تصویر حرکت کرتی نظر آتی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ چودہ پندرہ دن گزرے اور میں اپنے پیارے تایا جان کے ساتھ کشاں کشاں میکلوڈ روڈ کے رتن سینما میں پہنچا۔ یہ میری فلم بینی کا آغاز تھا۔ سینما کے ٹھنڈے ماحول میں گھستے ہی مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ تصویریں حرکت کررہی تھیں۔ مجھے ایک بہت بڑی کلائی نظر آئی جس پر ایک بہت بڑی گھڑی بندھی ہوئی تھی پھر ایک بہت بڑا چہرہ نظر آیا جو غالباً اداکار حبیب یا یوسف کا ہی ہوگا۔

میں تایا جی کو مخاطب کر کے زور زور سے بولنے لگا۔ ”یہ کیا ہے؟ یہ اتنے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں..... اتنے بڑے لوگ؟“

تایا جی نے پیار سے ڈانٹا کہ خاموشی سے دیکھتے رہو۔

فلم دیکھنے کے بعد فلم کے تمام میل اور فی میل اداکاروں کے چہرے میری آنکھوں میں رچ بس گئے۔ امی، خالہ اور پھوپی کو تو پتا تھا کہ میں چھوٹے تایا کے ساتھ فلم دیکھنے گیا ہوں البتہ باقی سب سے یہ بات راز رکھی گئی تھی۔

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور دنیا کے کسی بھی کونے میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا دیہات کے لیے 2400 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرِ سالانہ 25,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

برائے رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

نارووال سے شفٹ ہو کر آنے والے پڑوسی اکثر ہمارے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان سے گھریلو مراسم پیدا ہو چکے تھے۔ نادیہ میری بہت اچھی دوست بن چکی تھی اور میں اسے اکثر باتیں بتا دیتا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت وہ ہمارے گھر آئی تو میں نے نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر اسے فلم کے بارے میں سب کچھ بتایا۔ وہ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر حیرت سے سنتی رہی۔ میں نے اسے اخبار کا ایک تراشا دکھایا جس میں عید مبارک کا اشتہار تھا تصویر تھی اور میں اسے کل سے سینے سے لگائے پھر تا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ”بھیا! میں بھی اپنے ابا جی سے کہوں گی کہ وہ مجھے اور تنویر کو فلم دکھائیں۔“

”یہ غضب نہ کرنا۔“ میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”وہ بالکل نہیں دکھائیں گے..... اور باقی رہی بات تایا کی تو وہ تمہارے ہیں نہیں۔“

اس وقت میرے ذہن میں یہی تھا کہ بے تکلفی وغیرہ صرف تایا سے ہی ہو سکتی ہے۔

فلم کا چسکا ایسا پڑا کہ میں نے تایا یعقوب کا جینا محال کر دیا۔ میں ہر وقت آتے جاتے ان کے کان میں دوسری فلم کے حوالے سے کانا پھوسی کرتا رہتا تھا۔ یہاں میں ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں۔ والد کے علاوہ اپنے بڑے اور چھوٹے تایا کو بھی ہم ابا جی ہی کہتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں کو یہی سکھایا گیا تھا۔ اپنے ابا جی کو تو ہم ابا جی کہہ لیتے تھے..... بڑے تایا کو بڑے ابا جی... مسئلہ چھوٹے تایا جی کا تھا کہ ان کو کون سے ابا جی کہا جائے۔ اس کا مسئلہ بھی میرے ہی توسط سے حل ہوا، چھوٹے تایا لکڑی کے کام کی ٹھیکیداری بھی کر لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک ٹھیکے کے سلسلے میں وہ پنجاب کے ایک قصبے للیانی گئے..... اور کئی ماہ وہاں رہے۔ بس مہینے میں ایک آدھ چکر ہی لاہور کا لگتا تھا۔ ایک دن میں نے انہیں للیانی والے ابا جی کہا۔ یہ لفظ میرے منہ سے نکلا اور دھیرے دھیرے امر ہو گیا۔ انہیں ہم بچے للیانی والے ابا جی کہنے لگے۔ آج دو تین نسلیں گزرنے کے بعد بھی یہ لفظ ہمارے خاندان میں اسی طرح مستعمل ہے۔

تو آخر کار میرے پیارے للیانی والے ابا جی کو میرے بے حد اصرار پر مجھے دوسری فلم بھی دکھانا پڑی۔ یہ فلم تھی محمد علی اور رانی کی ہزار داستان۔ اس میں اداکار ساقی نے سامری یعنی جادوگر کا کردار ادا کیا تھا اور کئی ڈراؤنے مناظر بھی ان پر فلمائے گئے تھے۔ فلم کا مزہ تو آیا مگر مار دھاڑ کے طلسمی سین دیکھنے کی وجہ سے پانچ چھ گھنٹے کے اندر اندر ہی مجھے بخار چڑھ گیا۔ اس فلم میں محمد علی کی وجیہہ شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس ہیرو کا نام کیا ہے۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں۔ اخبار کے اشتہار میں کاسٹ کے نام پڑھے اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ ان میں سے ہیرو کا نام کون سا ہے۔ آخر میں میرے دل و دماغ نے گواہی دی کہ ہیرو کا نام طالش ہوگا۔ اس غلط فہمی کے سبب میں کافی عرصے تک محمد علی کو طالش ہی سمجھتا رہا۔

اس کہانی کے بارے میں بھی میں نے نادیہ کو سب کچھ بتایا اور ہم گھر کے کسی کونے میں یا نیم کے نیچے بیٹھ کر اس پر تبصرہ کرتے رہے۔ نادیہ کے ساتھ بڑا پیارا سا تعلق تھا۔ اپنے بھائی تنویر کے ساتھ اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ شاید وہ بھائی کا پیار بھی مجھ میں ہی تلاش کرتی تھی۔ ایک دو اور کزن بھی ہمارے گھر آ جاتے تھے۔ ہم باتیں کرتے..... اکٹھے کھیلتے کودتے..... سائیکل چلاتے (اب سائیکل چلانے کی اجازت مجھے مل چکی تھی) ایک نیا مشغلہ یہ تھا کہ ہم ستمبر کی جنگ کی نسبت سے مصنوعی لڑائیاں بھی کرتے۔ چھت پر چارپائیاں جوڑ کر مورچے بناتے۔ بچوں کا مخالف گروپ بھی اسی طرح مورچے بناتا یا کھلے میدان میں پوزیشن لیتا۔ ایک دوسرے پر غلیلوں اور ہاتھوں سے بے تحاشا پتھر برسائے جاتے۔ نعرے لگائے جاتے۔ پاک بھارت کی اس جنگ میں بھارت بننا کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ لہٰذا جو ہار جاتا اسے ہی بھارت سمجھ لیا جاتا۔

یہ لڑائیاں وقفے وقفے سے کئی ماہ تک جاری رہیں۔ آخر ایک روز اوپر تلے دو سنگین واقعات ہوئے۔ مخالف پارٹی کا پھینکا ہوا ایک پتھر ہمارے ”اوپی“ اکرم کے سر پر ایسا لگا کہ فوراً ہی اس کے سر پر دو انچ اونچا روبڑا (گومڑ) نمودار ہو گیا اور اس کی والدہ ماجدہ اسے مارتی پیٹتی گھر لے گئی۔

ابھی ہم اس سانحے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ اڑتا ہوا ایک پتھر ہمارے مورچے کی چھت سے ٹکرا کر ہاؤنس ہوا اور مزید پرواز کر کے پڑوسیوں کے گھر میں لسی والی چاٹی کو جا لگا۔ چاٹی ٹوٹ گئی، کافی ہنگامہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ مصنوعی پاک بھارت جنگ بھی مستقل طور پر ختم ہو گئی۔

تو میں بات کر رہا تھا نادیہ سے اپنے معصوم تعلق کی۔ یہ بڑا جداگانہ قسم کا تعلق تھا۔ ہم دونوں کی عمر دس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اس عمر میں کسی طرح کے رومانی تعلق کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس دور میں جب زندگی

بے حد سادہ اور صاف ستھری تھی۔ یہ دوسو فیصد صرف ایک دوستانہ تعلق تھا بلکہ کسی وقت تو وہ مجھے دوست و ہمجولی کم اور بہن زیادہ لگتی تھی۔ دونوں گھرانے بہت گھل مل چکے تھے۔ کسی وقت وہ ہمارے گھر ہوتے، کبھی ہم ان کے گھر۔ پاک بھارت مصنوعی جنگیں تو کسی کی چائی ٹوٹنے کے بعد اختتام پذیر ہو چکی تھیں اب دوسرے کھیل تماشے ہوتے تھے۔ ان دنوں کے کھیل بھی اس دور کی طرح نسبتاً بہت سادہ تھے۔ آنکھ مچولی، کیڑی کاڑا، کوکلا چھپاکی، ٹپیا ٹپیا کون پٹیا، روڑا چھپائی، باندر کلا اور پتا نہیں کیا کیا۔ ان ڈور گیمز میں، کیرم بورڈ، لوڈو، پارہ ٹہنی، لیسو پنجو ہار کبوتر اور اس طرح کے کھیل تھے۔ خاص لڑکیوں کے کھیلوں میں کرکٹ ہاکی وغیرہ تو تھے ہی اس کے علاوہ پٹھو گرم، قینچی، اخروٹ وغیرہ بھی کھیلے جاتے تھے۔ قینچیوں کے کھیل کی آگے بھی کئی شاخیں تھیں جن میں پل گولی، گھ گولی اور دائرہ زیادہ مشہور تھیں۔ اس طرح گلی ڈنڈے کی بھی کئی قسمیں تھیں اور تو اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بھی دو تین طرح کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ ایک کھیل جو صرف لڑکے کھیلتے تھے اور جسے سوچ کر آج بھی ہنسی آتی ہے۔ اٹ کھڑکا تھا۔ اس سے سادہ ''اسپورٹ'' اور کیا ہو سکتی تھی کہ کہیں سے اینٹوں کے دو ٹکڑے ڈھونڈے جاتے تھے۔ کچھ فاصلے سے ایک اینٹ کو دوسری اینٹ سے نشانہ لگایا جاتا تھا۔ نشانہ مارنے والی اینٹ جتنی دور لڑھک کر جاتی تھی اتنی دور تک نشانہ مارنے والے لڑکے کو دوسرے لڑکے کی پیٹھ پر سواری ملتی تھی۔

ماضی کے دریچے کھولے ہیں تو بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ اپنی زندگی کے وہ چار دن بھی یاد آ رہے ہیں جو میرے لیے بہت تاریک اور جانکاہ تھے۔ ایک صبح تھی جب میرے چھوٹے تایا یعقوب میرے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سرمئی کمبل کے اندر لپٹی کوئی چیز تھی اور میں ہکا بکا زدہ تھا۔

پھر سردیوں کی ایک دوپہر تھی جب میں اپنے گھر کی چھت پر آیا تھا اور میں نے کچھ فاصلے پر کچھ تہ شدہ شامیانے پڑے دیکھے تھے۔ زمین و آسمان میری نگاہوں میں گھومے تھے، دھڑکن تھم گئی تھی۔

اور پھر کئی سال بعد کا وہ تیسرا دن جب مئی کی گرم سہ پہر میں، میں اور میرا بھائی ساجد، اسپتال کے باہر آبلہ پا چلتے تھے اور کسی کی صدا ہمیں اندر بلاتی تھی..... پکارتی تھی۔

''میں اندر نہیں رہنا چاہتا، میں باہر آنا چاہتا ہوں۔''

اور وہ چوتھا دن جب میں تھکا ہارا، قیلولے کے لیے صوفے پر دراز ہوا تھا اور چھوٹے بھائی عمران نے پریشان چہرے کے ساتھ آ کر کہا تھا۔ ''بھائی جان..... آپ کے لیے ایک مشکل کھڑی ہو گئی ہے۔'' اور مجھے لگا تھا کہ پتا نہیں، میں اب کبھی گھر آ سکوں گا یا نہیں۔

ہاں، وہ چار دن، چار بڑے بڑے سیاہ پتھروں کی طرح اب بھی یادوں کی شفاف ندی کی روانی کو روکتے ہیں اور دل پر گہری چوٹ لگاتے ہیں۔ زندگی ایسے ہی ناقابل یقین نشیب و فراز کا نام ہے۔ ان چار سیاہ پتھروں کا تذکرہ بھی اس روداد میں آئے گا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، زندگی میں صرف یہ سیاہ پتھر ہی نہیں تھے، خوشیوں اور شادمانیوں کے بہت سے رواں دواں ریلے بھی تھے۔ حسین لمحے، دلکش شامیں، دلنشیں قلبی واردا تیں۔ چھوٹی سی عمر میں ہی ہر موزوں اور خوبصورت چیز مجھے اچھی لگتی تھی، اور دلہن بنی ہوئی خواتین تو ہوتی ہی خوبصورت ہیں۔ جس لڑکی کی شادی کی تیاریاں آخری مراحل میں ہوتیں اس کو دیکھ کر دل میں گداز جاگتا اور اس کے ساتھ ساتھ میں بے حد اداس ہو جاتا..... شادی کے بعد یہ روتی ہوئی چلی جائے گی۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور پیارے گھر کو چھوڑ کر، پھر کبھی کبھار ہی واپس آئے گی۔ دلہن کے اہل خانہ سے کہیں زیادہ میں اداس ہو جاتا۔ کبھی چپکے چپکے روتا بھی۔ ایک دو دلہنوں کی تو باقاعدہ محبت میں گرفتار ہوا۔ وحید مراد کی پہلی اور میری تیسری فلم اولاد تھی جو تایا یعقوب یعنی للیانی والے ابا جی اپنے دو دوستوں کے ساتھ صرف اس لیے دیکھنے گئے تھے کہ فلم کے ہائف ٹائم پر پاک بھارت جنگ کے کچھ حقیقی مناظر بھی دکھائے جاتے تھے۔ ان دنوں یہ ٹرینڈ عام چلا ہوا تھا..... اخبار میں فلم کے اشتہار میں نمایاں طور پر لکھا ہوتا تھا..... ہمراہ پاک بھارت جنگ کی فلم ملاحظہ کریں۔

غالباً ہم ریگل سینما مال روڈ میں گئے تھے۔ فلم کے دوران میں جنگ کے جو مناظر دکھائے گئے وہ بمشکل دو یا تین منٹ کے تھے۔ جہازوں کی اڑانیں، بمباری، ٹینکوں کی گولا باری..... شروع ہوتے ہوتے ہی یہ جھلکیاں ختم ہو گئیں۔ تھوڑا سا دھچکا تو لگا البتہ جتنا بھی دیکھا اس کا حرہ آیا۔ فلم اچھی تھی ورنہ مایوسی میں اضافہ ہو جاتا۔ دوسرا دھچکا یہ لگا کہ ابا جی یونس کو میری فلم بینی کا علم ہو گیا۔ یہ تو خیر گزری کہ بیچ میں للیانی والے ابا جی اور پاک بھارت جنگ کی جھلکیاں آ گئیں۔ ورنہ بہت درگت بنتی اور غالب امکان تھا کہ بعد ازاں اشک شوئی کے طور پر دودھ فروش نظام دین

سے ملاقات بھی نہ کرائی جاتی۔

اس واقعے کے بعد اباجی نے نمازوں کے سلسلے میں مجھ پر اور ساجد پر بہت زیادہ سختی کردی..... حالانکہ وہ بے چارہ فلم بینی میں شامل نہیں تھا۔ ترجمے سے قرآن پاک پڑھنے کا آغاز بھی ہوگیا۔ ٹائمنگ کچھ ایسی تھی کہ اباجی ہمیں فجر کی اذان سے کچھ پہلے ہی جگا دیتے تھے۔ ظاہر ہے بچے کی نیند کا دورانیہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ ان دنوں لاہور کی سردی بھی کڑاکے کی ہوتی تھی۔ نالیوں پر برف جمی نظر آتی تھی۔ نیم تاریک گلیوں میں ہم دونوں بھائی اباجی کے پیچھے ڈولتے ڈولتے کوئی دو کلو میٹر دور قاری سلیم صاحب کی مسجد میں پہنچتے۔ فجر کی نماز میں باجماعت شرکت ہوتی اور اکثر یہ شرکت پہلی رکعت تک ہی ہوتی کیونکہ پہلے سجدے میں جانے کے بعد ہم سر بسجود ہی رہتے اور اس وقت جاگتے جب نمازی سلام پھیر چکے ہوتے۔ واپس آکر ناشتے کے فوراً بعد اسکول جانا، پھر آکر ہوم ورک..... اور اس کے بعد اکثر اباجی ہم دونوں بھائیوں کو لے کر درس کے لیے شیرانوالا گیٹ چلے جاتے تھے۔ جہاں سے رات گئے واپسی ہوتی تھی (اباجی مولانا احمد لاہوری کے عقیدت مند تھے اور ہمارے گھر میں ان کے رسالے خدام الدین کا ڈھیر لگا رہتا تھا)

بے شک میرے اور ساجد کے لیے یہ بے حد مشقت اور مجاہدے کے شب و روز تھے لیکن اب سوچتا ہوں کہ یہی مشقت اور محنت بعد ازاں ہماری عادت ثانیہ بنی..... اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمارے کام آئی۔

بچہ پھر بچہ ہی ہوتا ہے۔ اباجی باجماعت نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔ ہم اکثر جماعت میں دیر سے شریک ہوتے اور شریک ہوتے ساتھ ہی کھانسنا شروع کردیتے تاکہ اگلی صفوں میں موجود اباجی کو علم ہوجائے کہ ہم موجود ہیں۔ چند بار ایسا بھی ہوا کہ زیادہ تاخیر ہوگئی اور جب ہم بھاگم بھاگ مسجد تک پہنچے تو نمازی باہر گلی میں نکل رہے تھے۔ ایسے میں ہم بھی فوراً اپنا رخ تبدیل کرلیتے اور یوں ظاہر کرتے جیسے نماز پڑھ کر نکلے ہیں۔ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اس شعبدہ بازی کی پاداش میں ایک دو دفعہ اباجی سے مار پڑی، خالہ اور پھوپی کی چند چوڑیاں ٹوٹیں اور پھر ہم باز آگئے۔ بلکہ بعد میں نماز پڑھنا اور خاص طور سے جمعہ کی نماز پڑھنا اور خطبہ سننا بہت اچھا بھی لگنے لگا۔ خطیب نعمانی صاحب کے خطبے میں اسلامی تاریخ اور کہانیوں کا رنگ ہوتا تھا جو مجھے بہت بھاتا تھا۔

اب ہم چار بھائی تھے۔ سب سے چھوٹے کا نام حبیب اللہ تھا۔ ہم آغاز سے ہی حبیب اللہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ پیارا بھی بہت تھا۔ ہمیں اسکول اور درس سے واپس آنے کی بہت جلدی ہوتی تھی تاکہ حبیب کو پیار کرسکیں..... ہم چوم چوم کر اس کے گال سرخ کروالیتے تھے۔ وہ اب پونے دو سال کا تھا۔ سارے گھر میں بھاگا پھرتا تھا۔ اب ہمارے گھر کا صحن پختہ ہوچکا تھا، دو نئے کمرے اور واش روم بھی بن چکے تھے۔ اس کے بچپن سے ہی سب کا ارادہ تھا کہ اسے فوجی افسر بنایا جائے گا۔ پتا نہیں کیوں وہ اپنی شکل و صورت کی وجہ سے لگتا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہم اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پاکستانی جھنڈا پکڑا دیتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ ہم کہتے یہ ہمارا میجر عزیز بھٹی ہے۔

ایک دن اسکول سے چھٹی تھی، میں اور چھوٹا بھائی ساجد، تایا جی کے ٹمبر اسٹور... پر پہنچے تاکہ حبیب کے لیے لکڑی کا ایک ریڑھا (واکر) تیار کرواسکیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دنوں ہم سارا وقت اپنے گول مٹول روشن چہرہ حبیب کے بارے میں ہی سوچتے رہتے تھے۔ ملتان روڈ ان دنوں بہت تنگ سی ہوا کرتی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ سڑک کی دوسری جانب اپنی پھوپی فاطمہ پر پڑی۔ میں حیران ہوا کہ وہ برقع کے بغیر کیوں نظر آرہی ہیں۔ دور سے مجھے ان کا رنگ بھی کورے لٹھے کی طرح سفید نظر آیا۔ ہمارے چھوٹے تایا (یعنی للیانی والے اباجی) نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ دوڑ کر سڑک کے پار گئے اور پھر ان کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔

ہمیں پتا چلا کہ حبیب کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی تھی اور اسے قریبی کلینک میں لے جایا گیا ہے۔ لکڑی کی ادھوری واکر کو وہیں چھوڑ چھاڑ ہم گھر کی طرف بھاگے۔ بڑوں کے چہرے ہمیں ہراساں کررہے تھے لیکن ہمیں کچھ بتایا نہیں جارہا تھا۔ بس یہی کہا جارہا تھا کہ حبیب کلینک میں ہے۔ جس وقت ہم گھر میں داخل ہورہے تھے ایک جانب گلی میں سے چھوٹے تایا نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ خالہ، پھوپی اور دو تین دیگر افراد بھی تھے۔ چھوٹے تایا کے ہاتھوں میں سرمئی کمبل میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میری سوالیہ نظریں دیکھ کر دلدوز آواز میں بولے۔ ”یہ لو پکڑو..... یہ ہے تمہارا حبیب.....“

ان کا یہ فقرہ کسی زہریلے نیزے کی طرح میرے چھوٹے سے سینے کو چھید کر میری روح کے آر پار ہوگیا۔ یہ

کیا کہہ رہے تھے چھوٹے تایا..... کمبل میں لپٹا ہوا یہ بے حرکت جسم ہمارے جیب کا کیسے ہوسکتا تھا۔ ہم تو ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے صحن میں ہنستا کھیلتا چھوڑ کر گئے تھے۔ اسے بتا کر گئے تھے کہ ہم اس کے لیے لکڑی کا خوبصورت ریڑھا بنوانے کے لیے جارہے ہیں اور اس کی معصوم آنکھوں میں خوشی کی چمک ابھری تھی..... کیا وہ مرگیا تھا..... کیا وہ دنیا میں نہیں رہا تھا.....؟ آہ، اتنی جلدی یہ سب کیسے ہوسکتا تھا؟ ابھی تو ہم نے بہت کھیلنا تھا اس سے..... ابھی تو بہت چومنا تھا اسے ابھی تو اسے گود میں لے کر کالونی کی گلیوں میں بھاگنا تھا اور ہمجولیوں کو فخریہ انداز میں بتانا تھا..... دیکھو کتنا پیارا ہے ہمارا بھائی؟ کبھی کسی نے دیکھا ایسا پیارا بھائی اور ابھی تو اس کی سانگز ہیں ہونا تھیں۔ ابھی تو اس نے تہوار دیکھنے تھے، ابھی تو اس نے ہمارے ساتھ اسکول جانا تھا..... ابھی تو اس نے پاکستان کا پرچم تھامنا تھا، فوجی بننا تھا۔

میں اور بھائی ساجد سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ خالہ مریم نے چھوٹے تایا کے ہاتھوں سے سرمئی کمبل میں لپٹا ہوا حبیب لے لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا محلہ ہمارے گھر میں اکٹھا ہوگیا تھا۔ امی جی پر بار بار غشی طاری ہورہی تھی۔ آہ وہ پہلا تاریک ترین دن..... وہ پہلا سیاہ پتھر، پتا چلا کہ ہمارے نمبر اسٹور پر جانے کے بعد امی جان نے حبیب اور حبیب سے بڑے چار سالہ بھائی خالد کو تیار کیا۔ کپڑے وغیرہ پہنائے، وہ چند گھنٹوں کے لیے ساتھ والی آبادی میں جارہی تھیں جہاں ان کی ایک ادھیڑ عمر خالہ رہتی تھیں۔ ننھا حبیب ایک پیالی میں سے بھنے ہوئے چنے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ اس سے بڑے بھائی خالد نے اس سے چنے چھینے۔ خالد بھی تو بچہ ہی تھا، اسے کیا پتا تھا کہ یہ چند چنے چھیننے کی کیا قیمت چکانا پڑے گی۔ حبیب رونے لگا کچھ چنے اس کے منہ میں بھی تھے، وہ اس کے گلے میں پھنس گئے۔ اس کی سانس اٹک گئی۔ اسے الٹا کر کے اس کی سانس بحال کرنے کی کوشش کی گئی مگر ناکامی ہوئی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے تو خواتین خانہ اسے لے کر قریبی کلینک کی طرف بھاگیں۔ پریشانی کا یہ عالم تھا کہ پھوپی اور خالہ اپنی جوتی تک نہیں پہن سکیں۔ ڈاکٹر سرفراز کا کلینک کوئی نصف کلومیٹر دور تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہا..... ''بچہ فوت ہوچکا ہے۔'' رسمی طور پر ڈاکٹر صاحب نے ایک انجکشن بھی لگایا مگر وہ لاش کو انجکشن لگانے جیسا ہی تھا۔

گھر میں قیامت صغریٰ برپا تھی۔ ابا جی کو دفتر میں اطلاع دی جاچکی تھی۔ میں سکتہ زدہ سا تھا۔ آنسو نہیں نکل رہے تھے بس ہچکیاں ہی آرہی تھیں۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ چلا گیا ہے۔ امی اس ننھی لاش کو اٹھا کر بار بار سینے سے لگا رہی تھیں۔ اچانک ایک عورت نے محسوس کیا کہ حبیب نے پیشاب کیا ہے۔ ایک دم شور سا مچ گیا..... ابھی جان ہے..... ابھی زندہ ہے..... ڈاکٹر کو بلاؤ.....

آسیں اُمیدیں بدترین حالات میں بھی انسان کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ انہونی کی خواہش دائم موجود رہتی ہیں۔ ہمارے سینوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں آس کی ایک کرن سی نمودار ہوئی۔ دس پندرہ منٹ بعد میں نے دیکھا ڈاکٹر سرفراز ہاتھ میں اپنا میڈیکل باکس لیے قریباً بھاگتا ہوا بڑے ابا جی اور ہمارے ماموں کے ساتھ گھر کی طرف آرہا تھا۔ وہ منظر بھی میرے ذہن میں نقش ہے جب وہ اسٹیتھسکوپ سے ننھے حبیب کی دھڑکنیں ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا اور اردگرد کی ہر نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ وہ کیا کہے گا؟ وہ کیا کہے گا؟ ہر ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ ایک خاموش التجا اس طویل برآمدے میں ہر طرف گونج رہی تھی..... ڈاکٹر صاحب..... کوئی اچھی خبر دینا۔

لیکن اچھی خبر کہیں نہیں تھی۔ جانے والا جاچکا تھا..... شاید برسوں پہلے کی وہ دعا پوری ہوچکی تھی جو ہیڈ سلیمانکی میں والدہ نے مانگی تھی..... اے مالک اس کو نہ لے جا..... کوئی اور دے کر لے لینا.....

ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ کانوں سے ہٹا کر نفی میں سر ہلایا..... اور اٹھ کھڑا ہوا..... اس نے کہا۔ ''کئی دفعہ مثانے میں پیشاب جمع ہوتا ہے، جو بعد میں خارج ہوتا ہے۔''

گھر میں کس کی حالت اچھی تھی، تاہم لگتا ہے کہ والدہ کے بعد سب سے بری حالت میری ہی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں حساس بھی زیادہ تھا..... آنکھیں خشک تھیں لیکن گلا بیٹھ گیا ہے ایک دلدوز چیخ میرے سینے اور جسم کو دہلا دیتی تھی۔ کچھ عورتوں نے میرے خشک ہونٹ اور لیموں کی طرح زرد چہرہ دیکھا۔ وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گئیں۔ خالہ مریم اور پھوپی فاطمہ کو بھی وہیں بلا لیا۔ ایک عورت نے میری طرف اشارہ کرکے آبدیدہ لہجے میں کہا۔ ''ایک تو فوت ہوگیا ہے، اس دوسرے کو بھی کچھ نہ ہوجائے..... اسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دو۔''

مجھے پانی وغیرہ پلا کر کمرے کے دروازے بند

کردیے گئے اور دھیان بٹانے کے لیے میرے پاس ریڈیو لگا دیا گیا لیکن دھیان کہاں بٹنے والا تھا۔ وہ جس کے لیے میں اور ساجد بڑے چاؤ سے واکر بنوانے کے لیے ٹمبر شاپ پر گئے تھے۔ وہ بغیر کسی واکر کے ہی چل پڑا تھا۔ بہت دور جا رہا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ وہ دن تھا تو اپریل 1996ء کا۔

آج سمن آباد میانی صاحب کے قبرستان میں اس کی ننھی منی قبر موجود ہے۔ اس حادثے کو میں اگلے کئی برس تک فراموش نہ کر سکا بلکہ آج بھی کبھی کبھی اس درد کی لہریں شدت سے محسوس ہوتی ہیں۔ قریباً 36 برس بعد جب میں نے اپنا تاریخی پس منظر والا ناول ''اباقہ'' لکھا تو اس کا انتساب اپنے اسی بھائی کے نام کیا وہ چند الفاظ اس طرح ہیں۔

''اپنے مرحوم بھائی حبیب اللہ کے نام۔ آج سے 36 برس پہلے جس کی ننھی منی قبر، قبرستان میں بنی تھی اور ہمارے دلوں کے اندر بھی۔ پیارے بھائی، اللہ تجھ پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے۔''

مجھے یاد ہے یہ انتساب پڑھ کر والدہ دیر تک روتی رہیں اور یادوں میں کھوئی رہیں۔

☆☆☆

زندگی مدام رواں رہتی ہے۔ حادثے اور ان سے جنم لینے والے غم بتدریج دل و دماغ میں اپنی شدت کھونے لگتے ہیں اور یہ بھی قدرت کا ایک بہت بڑا احسان ہے۔ ننھے حبیب اللہ کی وفات نے کئی ماہ تک ادھ موا سا رکھا۔ اس کے کپڑے کھلونے اور دیگر اشیا نگاہوں سے اوجھل کر دی گئیں مگر اس کی چہکاریں پھر بھی تادیر گھر کے در و دیوار میں گونجتی رہیں جو چنے حبیب کے گلے میں پھنسے ہوئے وہ ابا جی کو دفتر کے ایک دوست نے دیے تھے۔ ابا جی نے کبھی اپنے اس دوست کو نہیں بتایا کہ حبیب والا حادثہ اس کے دیے ہوئے چنے کے سبب پیش آیا۔ چھوٹے بچوں میں ایک عجیب عادت ہوتی ہے۔ کبھی دکھ کے ساتھ روتے روتے ان کی سانس عارضی طور پر بند ہو جاتی ہے۔ پنجابی میں اس کو ''کسائی جانا'' کہتے ہیں۔ ہمارے اردگرد جب بھی کوئی بچہ کسائی جاتا تھا ہماری اپنی سانس بند ہونے لگتی تھی کہ پتا نہیں اس کو اب سانس آئے گی کہ نہیں۔ حبیب اللہ کی وفات کا مداوا اللہ نے ہمیں ایک اور بھائی دے کر کیا۔ اس کا نام بھی حبیب اللہ رکھا گیا۔ وہ جب بھی کسائی جاتا تھا مجھے اور ساجد کو ایسے لگتا تھا کہ ہم بھی آدھے مر گئے ہیں۔

ان دنوں میرے ساتھ ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی جو میرے لیے تو بے حد پریشان کن تھی لیکن قارئین کو حیران کرے گی۔ شیرانوالا کے درس میں، جمعہ کے خطبات میں اور گھر میں جنت دوزخ اور قیامت کا ذکر اس کثرت سے سنا جا رہا تھا کہ دل و دماغ میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہو گیا اور اتنی شدت سے پیدا ہوا کہ نفسیاتی مرض کی طرح ہو گیا۔ ہر وقت قیامت کا دھڑکا سا رہنے لگا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی میں چھت پر چلا جاتا اور دیکھتا رہتا کہ کہیں آج سورج مغرب سے تو طلوع نہیں ہو جائے گا..... جب وہ مشرق سے طلوع ہوتا تو اطمینان ہو جاتا کہ کم از کم آج تو قیامت نہیں آئے گی۔ مگر شام ہونے تک پھر فکر لاحق ہو جاتی کہ معمول کے مطابق تارے نکلیں گے یا نہیں۔ پہلا تارا نظر آ جاتا تو قدرے سکون ہوتا کہ نہیں ابھی نظام قدرت ٹھیک ہی جا رہا ہے۔ پھوپی فاطمہ بھی ہر وقت قیامت حشر اور جنت دوزخ کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ احادیث کے حوالے سے بتاتیں کہ قیامت جمعہ کے روز آئے گی اور عصر کا وقت ہوگا۔ جمعہ کا دن اور خاص طور سے عصر کا وقت مجھ پر بھاری گزرتا اور اگر اتفاقاً عصر کے آس پاس آندھی وغیرہ آ جاتی تو جان پر بن جاتی کہ کہیں یہ قیامت کی شروعات نہ ہو۔ دل کو بہت تسلی دیتا کہ قیامت سے پہلے کانے دجال نے اور پھر حضرت امام مہدی علیہ السلام نے بھی تو آنا ہے اور ایک بہت بڑی جنگ بھی تو ہونا ہے لیکن دل تھا کہ کسی طور ماننے میں نہیں آتا تھا۔

پھر ایک دن پھوپی فاطمہ نے بتایا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ جمعہ کے دن کے علاوہ محرم کی دس تاریخ بھی ہو گی۔

یوں دل کو تھوڑا سا قرار آیا۔ مگر پھر یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں اس بار یا اس سے اگلی بار محرم کی دس تاریخ کو جمعہ نہ ہو۔ کوئی ٹھیک سے بتانے والا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا پچاس ساٹھ فیصد پریشانی پھر عود کر آتی۔ اب اس وقت کی قابلِ رحم کیفیت کو یاد کرتا ہوں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ چھوٹے اور زیادہ حساس بچوں کے سامنے قیامت اور دوزخ کے حوالے سے بہت ڈرانے والے بیانات ذرا احتیاط سے دینے چاہئیں..... اور اگر ایسے بیانات دیے جائیں تو پھر توازن برقرار رکھا جائے اور رب کریم کی نعمتوں اور رحمتوں کا ذکر بھی اسی انداز میں کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس قیامت سی قیامت نے دہلا دیا۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلمکار کی خود بیتی کا آخری حصہ جو خود میں منفرد ہے

پولیس اسٹیشن سے واپس گھر پہنچے تو مٹھائی وغیرہ بانٹی جانے لگی لیکن میرے دل میں مسلسل کھد بد تھی۔ اگلے روز والی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ پولیس سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ میں نے نوائے وقت کے نیوز ایڈیٹر شریف کیانی صاحب کو فون کیا اور صورتحال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ "ہاتھی نکل گیا ہے پونچھ رہ گئی۔ کوئی بات نہیں۔ "کل تھانے جانے سے پہلے مجھے فون کر لینا۔"

بہرحال اگلے روز پھر پیش ہوئے۔ ان دنوں سی سی ٹی وی ابھی اتنا عام تو نہیں تھا مگر پھر بھی دونوں ملزمان ایک کیمرے میں آئے تھے۔ ان کی تصویریں پرنٹ کی گئی تھیں۔ ہم سے پوچھا گیا کہ ان لڑکوں میں سے کوئی ہمارے محلے کا تو نہیں، یا کوئی ایسا تو نہیں جس سے دشمنی چل رہی ہو۔ آخر ہماری موٹر سائیکل کا نمبر ہی کیوں استعمال ہوا ہے۔ نمبر والے سوال کا جواب مجھے کل ہی مل گیا تھا جب کرنل صاحب نے ایس ایچ او سے بات کرتے ہوئے اپنا سر کھجایا تھا اور ہولے سے کہا تھا "..... نمبر پلیٹ کے آخری فگر کا شبہ ہے..... یا تو پانچ چار تھا یا چھ چار تھا۔" یعنی نمبر کنفرم ہی نہیں ہوا تھا۔

پھر بھی اکثر پولیس اہلکار آسانی سے جان چھوڑ دینے کی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ نوائے وقت سے آنے والے فون کا کچھ اثر پڑا۔ اس کے علاوہ میری نئی کتاب "تاریخی حادثے" بھی پرنٹ ہوئی تھی۔ جس میں نائن الیون والے واقعے کی تحقیقی رپورٹ بھی تھی۔ میں نے یہ تازہ بتازہ کتاب دو متعلقہ اہلکاروں کو پیش کی۔ اہلکار بہت متاثر ہوئے اور ریشہ خطمی نظر آنے لگے۔ ایک افسر نے تو یہاں تک فرمائش کر دی کہ میں ان کے تفتیشی کارناموں کی روداد سیاہ اگست میں لکھوں آج بھی کبھی کبھی وہ خوشگوار دوپہر یاد آتی ہے جب خربوزہ کھا کر اور ٹھنڈی کی پی کر میں بڑے اطمینان سے قیلولے کے لیے تیار ہوا تھا اور بھائی نے آ کر وہ سنایا تھا کہ ہماری موٹر سائیکل ایک ڈکیتی میں استعمال ہو گئی ہے۔ اللہ ہر کسی کو ایسی بری خبروں سے بچائے۔

☆☆☆

حورین اور عاطف والا معاملہ کسی بھی کروٹ بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھی عاطف کی والدہ اور دیگر اہلِ خانہ کو حق بجانب ہی سمجھ رہا تھا۔ حورین کی ایک خامی

چال میں کے بندر کی تھی یا اس نے؟ کچھ بھی ذہن میں نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ ہم نے بات چیت چھوڑ دی۔

شروع میں خیال تھا کہ دو چار روز میں بات چیت بحال ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم دونوں روٹھے رہے۔

ایک دن پھوپی فاطمہ نے پوچھا۔ ”تم ناد و کے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں ہو؟“

میں نے کہا۔ ”وہ نہیں کھیلتی تو میں بھی نہیں کھیلتا۔“

”تم آپس میں بولتے بھی نہیں ہو؟“

”وہ نہیں بولتی تو میں بھی نہیں بولتا۔“

”وہ تمہاری بہنوں جیسی ہے۔ اتنا پیار کرتی ہے تم سب سے۔ ایسا نہیں کرتے۔“

میں بھی جانتا تھا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مگر پتا نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ شاید یہ ”ای گو“ ہی کی کوئی قسم تھی مگر ”ای گو“ تو وہاں نمودار ہوتی ہے جہاں کوئی تنازعہ ہو..... کسی سے کسی کی کوئی توقعات ہوں جو پوری نہ ہوئی ہوں یا کوئی مطالبہ ہو جو پورا نہ ہوا ہو۔ یہاں تو کچھ بھی ایسا نہیں تھا۔ ایک معصومانہ سے لوٹ تعلق تھا۔ اسے کسی کی نظر لگی تھی۔ شاید اسی تعلق کی نظر لگی تھی۔

انہی دنوں ناد و کا ہمارے گھر آنا جانا یوں اور بھی کم ہو گیا کہ وہ اور اس کا بھائی تنویر احمد مقامی اسکول میں داخل ہو گئے تھے۔ ناد و پانچویں یا چھٹی میں داخل ہوئی تھی۔ دوسری طرف چچی آمنہ نے بھی مصروفیت ڈھونڈ لی تھی۔ وہ گھر میں بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے بنانے لگی تھیں

کپڑوں کا شوق دھیرے دھیرے پھر نمودار ہونے لگا تھا۔ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ میں نے بھی گھر کے قریب ہی ایک لائبریری ڈھونڈ لی اور وہاں سے عمران سیریز اور کرنل جمیدی فریدی کے ناول لا کر پڑھنا شروع کر دیے۔ عمران سیریز مجھے زیادہ پسند تھی۔ خاص طور سے عمران کی حماقتیں اور شرارتیں۔ میں اکثر وہ باب چھوڑ دیتا تھا جن میں عمران کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ فی کل کردار جولیا پر بھی سخت غصہ آتا رہتا تھا کہ وہ عمران پر کھل کر اپنے دل کا حال بیان کیوں نہیں کرتی؟ بعد میں جب خود کہانیاں لکھنا شروع کیں تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر ہیروئین کے کردار کو بہت کھلا دلا رکھا جائے تو رومانس کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔

کتابوں کے حوالے سے میری ناک بڑی تیز تھی۔ میں سونگھ لیتا تھا کہ میرے مطلب کی کتاب کہاں پڑی ہوگی۔ ایک روز ابا جی کی الماری میں سے خدام الدین اور دیگر دینی رسائل کے نیچے سے ذوقین اسلامی تاریخی ناول بھی ڈھونڈ لیے۔ ان میں نسیم حجازی کا ناول آخری چٹان بھی تھا۔ ابا جی جب خوشگوار موڈ میں ہوتے تھے تو مجھے اور ساجد کو اپنے پاس لیٹا کر آخری چٹان کے اقتباسات سنایا کرتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اسی ناول کو پکڑا۔ ابا جی اس وقت آفس جا رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں آخری چٹان دیکھ کر ذرا ٹھٹکے پھر امی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”اگر اس نے پڑھنا ہی ہے تو پھر دھیان رکھنا۔ وہ صفیہ اور ثریا والے باب یہ نہ پڑھے۔“

”میں امی جی کے قابو کہاں آنے والا تھا۔ ابا جی کے جاتے ہی میں نے صفیہ اور ثریا والے رومانی تذکرے کو خاص طور سے پوائنٹ آؤٹ کیا اور یہ ابواب خصوصی خشوع خضوع کے ساتھ پڑھے۔

بعد ازاں برسوں بعد جب میں نے ”اباجہ“ اور ”نور کی یلغار“ وغیرہ لکھی تو اس میں محترم نسیم حجازی صاحب کی تحریروں سے ملنے والی ”انسپریشن“ بھی شامل تھی۔

ایک روز ابا جی کے آفس جانے کے بعد میں آخری چٹان کھولے بیٹھا تھا۔ امی اور خالہ میرے قریب ہی بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ امی جی نے کہا۔ ”طاہر تمہیں پتا ہے کہ آخری چٹان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”میرا تعلق؟“

”ہاں۔“ انہوں نے کہا۔ ”تمہارا نام طاہر آخری چٹان سے لیا گیا ہے۔“

”ہائیں!!“ میں نے آنکھیں پھاڑیں۔

انہوں نے بتایا کہ لاہور میں ہی رہنے والی میری پھوپی زاد کزن بلقیس بیگم نے بازار سے کوئی سودا منگوایا۔

اغلاط

گزشتہ ماہ ”کاروان ڈائجسٹ“ میں صفحہ نمبر 69 پر طاہر جاوید مغل کے چچا کے انتقال کا سن غلط چھپ گیا ہے درست سن 1966ء ہے۔ قارئین تصحیح کر لیں۔

وہ سودا جس لفافے میں آیا وہ آخری چٹان کے صفحات سے بنا ہوا تھا۔ ہماری باجی بلقیس نے وہ صفحات پڑھے اور راستے بھر سے سنا لیے سے ہی ناول کی گرویدہ ہو گئیں۔ ان کی بات گھر میں بہت مانی جاتی تھی، اور وہ لائبریری بھی تھیں۔ انہوں نے حکم صادر کیا کہ جیسے بھی ہو مجھے یہ مکمل ناول چاہیے۔ ان دنوں رسائل اور کتب تک رسائی اتنی آسان کہاں تھی؟ بہرحال بڑوں نے جیسے تیسے انہیں ناول فراہم کر دیا اور یوں میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ ناول میرے خاندان میں داخل ہو گیا۔ بیٹا سلیمانی میں میری پیدائش کے بعد جب نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو باجی بلقیس نے ہی آخری چٹان کے مرکزی کردار طاہر کا نام تجویز کیا، جو سب کو پسند آیا۔

☆☆☆

نادو سے بات چیت بالکل بند تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے پاس سے گزر گئے لیکن ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا۔ کہیں سڑک پر آتے جاتے سامنا ہوتا تو بھی ہم بیگانوں کی طرح گزر جاتے۔ دوسروں نے بھی زیادہ دھیان دینا چھوڑ دیا تھا جیسے انہوں نے تصور کر لیا تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے سے بولنا ہی نہیں۔

برسوں گزر گئے مگر یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ اس تعلق اور اس دوری میں ذرا سا بھی رومانی عنصر شامل نہیں تھا۔ بس یہ دل چاہتا تھا کہ ہم پہلے کی طرح اکٹھے کھیلیں کودیں۔ کیرم بورڈ اور لوڈو کھیلیں، ایک دوسرے سے کھانے پینے کی چیزیں شیئر کریں اور سیر کو جائیں۔ مگر پتا نہیں کہ درمیان میں کیسی برف جم گئی تھی جو پگھلنے میں نہیں آتی تھی۔

کسی وقت بالکل ایسے لگتا کہ ہم بولنا چاہ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو مخاطب کرنا چاہ رہے ہیں لیکن پھر ایک نہایت نامعقول، بچکانہ سوچ آڑے آجاتی، پہلے تم بولو پہلے تم بولو۔ اور کوئی بھی نہ بولتا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی بہت کم آتے جاتے تھے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ ایک دوسرے کے آس پاس رہتے ہوئے بھی ہم بہت دور رہے۔ اسی طرح دو برس۔ جی ہاں تقریباً دو برس گزر گئے۔ ہماری عمریں اب چودہ سال کے لگ بھگ تھیں۔ اس عمر میں تو کسی حد تک رومانی تعلق کی سمجھ آتی تھی اور روٹھنے منانے کی بھی..... لیکن گیارہ سال کی عمر میں وہ کون سی چیز آڑے آگئی تھی۔

ہمارے گھر سے ان کا گھر نظر آتا تھا۔ میں اسے سیڑھیاں اترتے چڑھتے دیکھتا، اپنے ابا جی کے ساتھ سودا سائیکل پر اسکول جاتے آتے دکھائی دیتی۔ کبھی کبھی ہم باقی بچوں کے ساتھ مل کر کوئی مشترکہ کھیل کھیلتے بھی لیکن ایک دوسرے سے مخاطب نہ ہوتے۔

راتوں کو ہمارے گھر کی آوازیں ان کے گھر تک جاتی تھیں اور ان کی آوازیں ہمارے گھر تک۔ رات کو وہ اپنے گھر میں بول رہی ہوتی تو میرا سینہ جلنا شروع ہو جاتا، دہن پر جھلاہٹ کی سوار ہو جاتی۔

بہت بعد میں، میں نے پڑھا کہ کچھ لوگوں کے درمیان اس طرح کا معاملہ چل نکلتا ہے۔ وہ بلاوجہ ہی ایک دوسرے سے بول چال بند کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو برسوں اسی طرح گزر جاتے ہیں۔

یہ بھی عجب دیوانہ پن تھا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ شاید قارئین بھی یہ پڑھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ بڑی عید کا تہوار آنے والا تھا۔ کالونی کے میدان میں بچے عید سے چھ سات روز پہلے بکرے چھترے گھمانا شروع کر دیتے تھے۔ مجھے اور ساجد کو فکر رہتی تھی کہ ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔ اسکول سے آتے ہی ہم نمبر شاپ پر ڈیرہ ڈال لیتے تھے۔ ان دنوں شہروں میں جانوروں کے راستے کی پابندی کا دور دور پتا نہیں تھا۔ ملتان روڈ پر ہماری نمبر شاپ کے سامنے سے بھی جانوروں کے ریوڑ گزر کر یتیم خانہ چوک سے چوبرجی کی طرف جاتے تھے۔ بڑے ابا جی اور للیانی والے ابا جی یعنی دونوں تایا شاپ پر ہوتے ہوئے قربانی کے جانوروں کی خریداری بھی کر لیتے تھے۔ اس خریداری میں سب سے بڑی رکاوٹ ہم دونوں بھائی ہی ہوتے تھے۔ سات آٹھ سال کی عمر تک تو ہم سودے کے وقت باقاعدہ رونا شروع کر دیتے تھے۔ زیر غور جانور ہمارے لیے لاہور کا سب سے اچھا جانور ہوتا تھا اور مناسب ترین قیمت پر مل رہا ہوتا تھا۔ ہم بس اس کی رسی پکڑ کر گھر لے جانا چاہتے تھے۔ گاہک بیوپاری بھی ایسے بچوں کو دیکھ کر فوراً جان لیتے ہیں کہ بچوں نے بڑوں کی انگلیاں بیلنے میں دے رکھی ہیں، اور یہ پیسے نکالیں ہی نکالیں گے۔ ایسے میں سودا عموماً خراب ہو جاتا تھا اور چھوٹے تایا یعنی للیانی والے ابا جی اپنی ناک سے پسینا پونچھتے ہوئے ہم پر دہاڑتے تھے۔ ”دفع ہو جاؤ گھر، اس طرح سر پر کھڑے

ہو کر روتے رہو گے تو اگلی عید تک بکرا نہیں خرید سکو گے۔"

اب ہم کچھ بڑے ہو چکے تھے، تاہم سودے کے وقت اب بھی ہماری ساری ہمدردیاں ہو پاری کے ساتھ ہی ہوتی تھیں، اور غصہ اپنے بڑوں پر آتا تھا کہ وہ جلدی سے جانور کیوں نہیں خرید لیتے۔

اس دن بھی ہم جانور کی خریداری میں ناکام ہو کر گھر آئے تھے۔ گھر پہنچے تو ہمارے کچھ پھوپی زاد کزن بھی آئے ہوئے تھے۔ ہماری تین پھوپیاں تھیں اور ان کے ماشاء اللہ کافی بچے تھے۔ تھکن اتارنے کے لیے ہم گھر کے بڑے کمرے میں کیرم بورڈ کھیلنے لگے۔ درمیانے سائز کے دو کیرم بورڈ تھے۔ ہم سات آٹھ کھلاڑی تھے نادو بھی شامل تھی مگر وہ دوسرے کیرم بورڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

کھیل جاری تھا جب دوسرے کمرے سے کسی نے آواز دی، جلدی آؤ ڈراما شروع ہونے لگا ہے۔

ٹی وی تو ان دنوں بس کسی کسی خاص گھر میں نظر آتا تھا..... یہ تاریخی قسم کا ریڈیو ڈراما تھا جو کبھی کبھار لگتا تھا۔ سب کھیل چھوڑ کر ریڈیو والے کمرے کی طرف بھاگ گئے۔ مجھے ڈرامے میں دلچسپی تھی لیکن میں وہیں بیٹھا رہا، شاید اس لیے کہ نادو بھی ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔

میں اپنے کیرم بورڈ پر اکیلا ہی کھیلتا رہا۔ دوسری طرف وہ بھی تھوڑا سا رخ پھیرے دوسرے کیرم بورڈ پر یونہی انگلیاں چلاتی رہی۔ شاید دونوں ہی چاہتے تھے کہ یہ بے ہودہ قسم کا، نامعقول اور بے وجہ ڈیڈ لاک ختم ہو مگر پہل کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ اکیلے کمرے میں ہم کتنی ہی دیر یونہی اپنا اپنا کھیل کھیلتے رہے۔ اس اثنا میں نادو کی امی یعنی آنٹی آمنہ ادھر سے گزریں، کمرے میں ہمیں دیکھ کر رک گئیں بولیں۔ "بھئی! یہ کیا تماشا ہے تم دونوں کا۔ اکٹھے بھی ہوتے ہو اور بات بھی نہیں کرتے۔" پھر ذرا ہنس کر بولیں۔ "اب دیکھو..... دونوں کیرم بورڈ کھیل رہے ہو لیکن اپنا اپنا۔ یہ کوئی بات ہے۔" تب ایک دم سمجھانے والے انداز میں بولیں۔ "تم دونوں کی عمر اور یہ تو ہر وقت لڑتے جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ تم دونوں میں کتنی دوستی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اسی طرح ہنسا بولا کرو۔" وہ میرے سر پر پیار سے ہلکا سا چپت لگاتے ہوئے آگے نکل گئیں۔

تاہم ڈھاک کے وہی تین پات رہے۔ ہم کچھ دیر ویسے ہی بیٹھے رہے پھر اپنے اپنے راستے چل دیے۔

بڑا واہیات ڈیڈ لاک تھا یہ۔ واہیات اور تکلیف دہ۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

اس معاملے سے ہٹ کر میری دیگر سرگرمیاں جاری تھیں۔ کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق پھر سے چمکا رہا تھا۔ لائبریریوں کے چکر بھی لگ رہے تھے۔ کسی وقت ہم سب کزن عزیز، شعیب، حفیظ، اقبال وغیرہ مل کر ڈراما ڈراما بھی کھیلتے۔ آج کل کے اسٹیج ڈراموں کی طرح ان گھریلو ڈراموں کا کوئی اسکرپٹ نہیں ہوتا تھا۔ بس ہم یہ مار دھاڑ سے بھرپور ڈراما شروع کر دیتے تھے۔ کہانی کو آگے بڑھانے کی زیادہ تر ذمے داری مجھ پر ہوتی تھی۔ اور میں یہ ذمے داری بخوبی نبھاتا تھا۔ ہمارے ایسے ڈراموں کو محلے کے درجنوں بچے اور کئی بڑے بھی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔

لاہور کا فلسطین یعنی شاہ نور، ایورنیو اور ہاری اسٹوڈیوز ہمارے گھر سے قریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر یتیم خانہ چوک کے دوسری جانب تھے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے خالہ پھوپی اور امی ہمیں ڈرایا کرتی تھیں کہ کبھی بھول کر بھی یتیم خانہ سے آگے نہیں جانا کیونکہ وہاں ظالموں والے لوگ ہوتے ہیں۔ جو بچہ وہاں جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔

تب ہمیں پتا نہیں تھا کہ چند سال بعد تایا جان کی نیو شاپ کی دوسری شاخ عین شاہ نور اسٹوڈیو کے سامنے کھل جائے گی اور وہاں آنا جانا اور آؤٹ ڈور شوٹنگ دیکھنا ہمارا روزمرہ کا معمول بن جائے گا۔ شوٹنگ دیکھنے کے علاوہ ہم اکثر اسٹوڈیوز کے گیٹ کے پاس کھڑے رہتے اور کبھی کسی گاڑی میں کوئی فلمی چہرہ نظر آ جاتا تو ہم خوشی سے نہال ہو جاتے۔

ایک دن میں اپنے ایک ہم عمر دوست شیراز کے ساتھ گیٹ کے قریب کھڑا تھا کہ ایک شاندار کار میں درمیانی عمر کا ایک دبلا پتلا لیکن مضبوط سا شخص پچھلی نشست پر براجمان نظر آیا۔ اس نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔

میں نے شیراز سے پوچھا۔ "یہ بھی کوئی ایکٹر ہیں؟"

ہمارے قریب ہی کھڑا ایک باریش شخص بولا۔ "اوئے نہیں۔ یہ بہت بڑے فلم ڈائریکٹر ہیں۔ ان کا نام علی سفیان ہے۔ علی سفیان آفاقی۔"

مجھے پتا نہیں تھا کہ ایک دن یہی علی سفیان میرے لیے ایک مشفق دوست کی حیثیت اختیار کر جائیں گے اور

ان کے ساتھ گھر میں مریدار نشستیں ہوا کریں گی۔

ایک دن شیراز جو کسی فلم میں چھوٹا سا چائلڈ رول بھی کر چکا تھا مجھے اور بنو اسٹوڈیو کے اندر لے گیا۔ اسٹوڈیو کو اندر سے دیکھنا ایسے ہی لگتا تھا جیسے امریکا کو دریافت کر لینا۔ جانے پہچانے فلمی چہرے کبھی اور ہی دنیا کے چہرے لگتے تھے۔ ہم ایک فلور کے مین دروازے کے سامنے پہنچے تو ایک دراز قد خوشنما شخص تھری پیس سوٹ میں نمودار ہوا۔ یہ معروف اداکار حبیب تھا۔ ان کی نہایت شائستہ مسکراہٹ قریب سے دیکھنے اور ان سے ہاتھ ملانے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد آگیا کہ اپنی پہلی فلم عید مبارک میں میں نے ان کو دیکھا تھا۔

ایک جگہ نہایت خوبرو سنتوش کمار اور کچھ دیگر افراد کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ طویل برآمدے میں چلتے ہوئے کچھ آگے گئے تو ایک کونے میں کچھ بوتلیں لڑھکی ہوئی نظر آئیں۔ شیراز نے بتایا کہ یہ شراب کی بوتلیں ہیں۔ ایک نیم تاریک کمرے میں بیٹھا کوئی ایکسٹرا اداکار اپنی گول گول آنکھوں سے ہمیں مسلسل گھور رہا تھا۔ مجھے اس کا گھورنا اچھا نہیں لگا۔ شیراز کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ اسٹوڈیو کے اندر کا ماحول زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اپنا یہ دورہ مختصر کر کے میں جلد ہی شیراز کے ساتھ اسٹوڈیو سے باہر آگیا۔ اس کے بعد ہم کزنز کا یہ شوق بس آؤٹ ڈور شوٹنگ دیکھنے تک ہی محدود رہا۔ ہم سڑک پر جہاں کہیں بھی اسٹوڈیو کے جنریٹر کو دیکھتے تھے اس کے پیچھے لگ جاتے تھے اور شوٹنگ کے مقام تک جا پہنچتے تھے۔

کبھی کبھی ہم شاہ نور اسٹوڈیو کی بیرونی دیوار کے ساتھ اخروٹ کو دیوار پر مارنے کا توڑنے کا کھیل کھیلنے لگتے تھے۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ جب ہم بچے اخروٹ کھیل رہے ہوتے، دور اسٹوڈیو کے مین گیٹ کی طرف سے کوئی خصیلا شخص نمودار ہوتا، دور ہی سے ہم پر گرجتا برستا اور دفع ہو جانے کی دھمکیاں دیتا۔ کبھی کبھی ہماری طرف دوڑ کر بھی آتا۔ ہم اخروٹ سمیٹ کر بھاگ نکلتے..... مگر دوسرے تیسرے روز ہی پھر آدھمکتے۔

ایک دن جب یہی سب کچھ ہوا اور ہم اخروٹ سمیٹ کر ہانپتے ہوئے اپنی ٹمبر شاپ پر پہنچے تو اسٹوڈیو کے ایک شخص نے جو بڑے ابا جی کا واقف بھی تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے سمجھا یا کہ جب ہمارے اخروٹ اسٹوڈیو کی دیوار کے ساتھ ٹکراتے ہیں تو ان کی آواز اندر فلور تک بھی جاتی ہے۔ وہاں شوٹنگ چل رہی ہوتی ہے اور مکالموں کی ریکارڈنگ خراب ہوتی ہے (ان دنوں غالباً ڈبنگ کا رواج ہی نہیں تھا) اس شخص کے سمجھانے کے بعد ہم باز آگئے کیونکہ ہمیں فلموں کی ''فلاح و بہبود'' بہت عزیز تھی۔

ہمارا اسکول تبدیل ہو چکا تھا۔ میں پڑھائی میں ٹھیک تھا۔ نماز وغیرہ بھی پڑھ رہا تھا۔ لہٰذا ابا جی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ساتھ ساتھ کچھ رعایتیں بھی دے رہے تھے۔ تاہم فلم بینی پر ابھی تک پابندی تھی۔ میں نے ابھی تک ٹوٹل تین فلمیں دیکھی تھیں۔ جن میں آخری اولاد تھی جو پاک بھارت جنگ کی جھلکیوں کی آڑ میں دیکھی گئی تھی۔ انہی دنوں مجھے اور ساجد کو پتا چلا کہ ابا جی جو بہت ہی کم لاہور سے باہر نکلتے تھے۔ پانچ چھ روز کے لیے اپنے آبائی گاؤں لنگیانوالی جا رہے ہیں۔

انہوں نے تین ہفتے بعد جانا تھا اور یہ تین ہفتے ہمارے لیے تین صدیوں کی طرح ہو گئے۔ ہمارا ٹارگٹ تھا کہ ان پانچ چھ دنوں میں ہم نے کم از کم چار فلمیں تو ضرور دیکھنی ہیں۔ ہر گھڑی دھڑکا تھا کہ کہیں ابا جی کا پروگرام بدل نہ جائے۔ نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جب ابا جی گاؤں جانے کے لیے بس اڈے کو روانہ ہوئے۔ وہ مشکل سے بس اڈے ہی پہنچے ہوں گے جب ہم ریجنٹ سینما کے سامنے ایک لمبی قطار میں لگے ہوئے تھے۔ فلم کا نام تھا شیراں دے پتر شیر۔ اس میں اداکار ساون کی گرج برس کمال کی تھی۔

اگلے روز ہماری دوسری فلم محمد علی اور ادیب وغیرہ کی عادل تھی۔ تلوار بازی والی یہ فلم ہم دونوں بھائیوں کو بے حد پسند آئی۔ خاص طور پر اس کا یہ گانا میرے دل کو بہت بھایا۔ ''پیاری ماں دعا کرو میں جلد بڑا ہو جاؤں۔'' سینما سے واپسی پر میں یہ گانا گھر میں گنگنا تا پھر رہا تھا کہ خالہ مریم نے عقب سے آکر ہاردو پکڑ لیا۔ ''بیٹا بڑے تو تم ہو چکے ہو..... اکیلے جا کر سینما میں فلمیں دیکھ رہے ہو۔''

پھر انہوں نے وہی تاریخی فقرہ ادا کیا جو ہماری سٹی گم کر دیا کرتا تھا۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ آ لینے دو یونس کو۔''

ظاہر ہے کہ اس فقرے کے بعد ہمارے باقی کے دن برباد ہو گئے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ رات خدا کا ڈر ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک یا دو فلموں تک ہی محدود رہتے تو شاید ہمارا محلے دار کچھ نہ کچھ ہماری مخبری نہ کرتا، مگر ہم تو کم از کم چار فلمیں

پھڑکانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

علم کا جنون اور شوق ان دنوں سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ آج کل کی تفریحی سہولیات کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ٹی وی بھی تقریباً ناپید تھا۔ ہماری کالونی کی ساتھ والی آبادی کے بس ایک دو گھروں میں ہی ٹی وی آیا تھا۔ ہم بچے ٹولیوں کی صورت میں ان گھروں کے دروازے کے باہر کھڑے رہتے۔ اندر سے ٹی وی چلنے کی سہانی آواز سنائی دے رہی ہوتی۔ ہلکی ہلکی دودھیا روشنی بھی دکھائی دیتی جو روح کو سرشار کرتی۔ ہم مسکینوں کی طرح ہولے ہولے صدا دیتے رہتے۔ ''باجی دروازہ کھول دیں..... باجی۔''

دن اچھا ہوتا تو دروازہ کھل جاتا۔ ہم بھرا مار کر اندر گھس جاتے۔ ننگے فرش پر ہی پھسکڑے مار کر بیٹھ جاتے۔ میرے کپڑے عموماً دیگر بچوں کی نسبت بہت صاف ستھرے ہوتے تھے۔ خالہ اور پھوپی مجھے سنوارے رکھتی تھیں۔ ایک دن گھر والوں کو مجھ پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے مجھے فرش سے اٹھا کر کرسی دی اور پھر اکثر کرسی پر ہی بٹھانے لگے۔

ایسا نہیں تھا کہ ہم ٹی وی خرید نہیں سکتے تھے۔ مسئلہ یہی تھا کہ دادا جان اور ابا جی پولس، ایسی چیزوں کے سخت خلاف تھے۔ ریڈیو بھی 65ء کی جنگ کی وجہ سے ہمارے گھر آیا تھا۔ اب ٹی وی بھی آنے والا تھا اور اس کی وجہ بھی ایک جنگ بننے والی تھی، 1971ء کی جنگ۔

☆☆☆

نادو کے ساتھ قطع تعلق برقرار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ تکلیف دہ صورت حال کب ختم ہوگی، اور ہوگی بھی یا نہیں؟ اسی دوران میں یہ ہوا کہ ایک تیسری دوست نے ہمارا یہ ڈیڈ لاک ختم کرنے کا بیڑا اچکے سے اٹھالیا۔ اب پتا نہیں کہ کسی بڑے نے اس سے کہا تھا، یا خود ہی اس کے دل میں یہ بات آئی تھی۔ وہ ہماری ہی ہم عمر نائلہ تھی۔ غالباً آٹھویں میں پڑھتی تھی اور ہماری ہی گلی میں چند گھر چھوڑ کر رہتی تھی وہ بھی ہمارے ساتھ کھیل کود میں شریک رہی تھی اور اب کافی عرصے سے دیکھ رہی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

ایک روز وہ مجھ سے بولی۔ ''طاہر بھائی، ہمارے اسکول میں تقریری مقابلے میں اسٹال وغیرہ بھی لگے ہیں، آپ بھی چلیں۔'' پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''نادو بھی جارہی ہے۔''

میں نے چونک کر کہا۔ ''اسے پتا ہے کہ تم مجھے بھی دعوت دینے والی ہو۔''

''ہاں، میں نے بتایا ہے اسے۔''

میں نے کچھ دیر تذبذب میں رہنے کی اداکاری کی پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔ بس خالہ جی سے پوچھ لوں۔''

کہیں بھی جانے کے لیے خالہ جی اور پھوپی جی کو بتانا ضروری ہوتا تھا ورنہ میری واپسی تک ان کی جان سولی پر لگی رہتی تھی۔ خاص طور سے خالہ تو بولائی پھرتی تھیں۔ میں محلے کے لڑکوں کی ٹیم کے ساتھ کہیں کرکٹ کھیلنے چلا جاتا تو وہ برقع اوڑھ کر گراؤنڈ تک آپہنچتیں۔

اگلے روز نائلہ، نادو اور میں۔ نائلہ کے اسکول میں تھے۔ کتنی معصومیت تھی۔ آپس میں بولنا بھی نہیں اور بول چال بحال کرنے کے لیے دونوں نے نائلہ کے ساتھ بھی چل پڑنا ہے۔ تقریری مقابلوں کے بعد ہم مختلف اسٹالز پر گھومتے رہے۔ نائلہ بے چاری گاہے بگاہے کوشش کرتی رہی کہ ہم دونوں آپس میں براہِ راست بات کریں مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بالآخر وہ جھلا کر ہم دونوں کو ٹیم کے ایک پیڑ کے نیچے بچھے پتھریلے بینچ پر لے گئی۔ مجھے یاد ہے یہ اتوار کا روز تھا خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اردگرد مختلف رنگوں کے پھول کورس کی صورت میں رقصاں تھے۔

نائلہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''چلو..... صلح کرو تم دونوں..... چلو۔''

ہم ساکت بیٹھے رہے..... بالکل روٹھے بچوں کی طرح..... اور بچے ہی تو تھے۔ نائلہ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ''چلو ہاتھ ملاؤ دونوں۔''

''میں کیوں ملاؤں؟ دوستی اس نے ختم کی تھی۔ اس سے پوچھو کیوں ختم کی تھی؟''

وہ تنک کر بولی۔ ''میں نے ختم نہیں کی تھی۔ پوچھو اس سے، میں نے کب ختم کی تھی؟''

نائلہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''یہ تو کہتی ہے بول چال تم نے بند کی تھی اور بغیر کسی وجہ کے۔''

''بغیر وجہ کے نہیں کی تھی..... پوچھو اس سے، میں نے کئی بار اسے بلایا تھا اس نے جواب نہیں دیا۔ دوسری طرف دیکھنے لگی۔''

کچھ دیر اسی طرح ''پوچھو اس سے..... پوچھو اس سے۔'' ہوئی، پھر ہم براہِ راست بات کرنے لگے۔ برسوں

سے قائم ہیریئر، ٹوٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد ہی ہماری صلح ہوگئی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔ نہ صرف ہاتھ ملایا بلکہ نائلہ کی ہدایت پر اپنی اپنی انگشتِ شہادت کو قریب لاکر ایک دوسرے میں پھنسایا اور بچوں کے مخصوص انداز میں پکی کو کچی میں بدلا۔

وہ دن مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ پر سے ایک بے وجہ کا بڑا بوجھ اتر گیا ہے مگر دل میں ایک ہلکا سا خدشہ بھی تھا کہ کہیں کسی وجہ سے نادو کے ساتھ بول چال پھر بند نہ ہو جائے..... لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بچپن کی یہ دوستی بچپن کے ہی انداز میں برقرار رہی۔ اکٹھے کھیلنا، پارک میں دوسرے بچوں کے ساتھ تفریح کے لیے جانا، باتیں کرنا اور میرا دیگر دوستوں کے ساتھ ساتھ نادو کو بھی کہانیاں سنانا۔ بس یہی کچھ تو میں چاہتا تھا، اور یہ سب کچھ ایک طویل انتظار کے بعد پلٹ آیا تھا۔ اس ساری صورتِ حال میں ایک تبدیلی دو تین سال بعد ہوئی، اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

☆☆☆

تفریح صرف فلم تھی مگر اب ٹیلی ویژن بھی کہیں کہیں نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ کہیں کسی دکان یا چائے خانے پر شام کو ٹی وی لگا ہوتا تو سڑک پر دیکھنے والوں کا مجمع بھی نظر آتا۔ پروگرام کی چوائس کوئی نہیں تھی جو کچھ بھی ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہوتا بڑے جذب اور عقیدت کے ساتھ دیکھا جاتا، حتیٰ کہ شام کو ٹی وی پروگرام شروع ہونے سے پہلے اسکرین پر پی ٹی وی کا جو "لوگو" دکھایا جاتا اور جو ٹیون سنائی جاتی اسے بھی پوری پوری توجہ اور محبت ملتی۔ ٹی وی پروگرام عموماً شام پانچ بجے کے قریب شروع ہوتے اور نو بجے کے خبرنامے کے فوراً بعد ہی پی ٹی وی والے اپنی دکان بڑھا دیتے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پیر کے روز ٹی وی کی چھٹی ہوتی تھی۔

میں نے اور ساجد نے آخری فلم عادل دیکھی تھی۔ اس کا نشہ کافی دیر تک چھایا رہا۔ میں یہ گانا اکثر گنگناتا رہتا۔ "پیاری ماں دعا کر میں جلدی بڑا ہو جاؤں۔" اس طرح فلم آئینہ کا یہ گانا ان دنوں زبان زدِ عام تھا۔ "تمہی ہو محبوب میرے میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں۔"

محمد علی میرا پسندیدہ اداکار بن چکا تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے چوڑے سینے پر خوبصورت گھنے بال تھے اور وہ تلوار بازی بہت اچھی کرتا تھا۔ اب میری یہ للہ نہی

محمد حسین آزاد

(1830ء۔1910ء)

اردو کے مشہور ادیب اور شاعر۔ اردو کے پہلے اخبار نویس مولوی محمد باقر دہلوی کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ذوق کے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کی، پھر عربی کالج میں داخل ہو گئے۔ کلام میں ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ 1757ء کے ہنگامے میں مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے پھانسی دے دی تو آزاد دہلی سے نکلے۔ کچھ عرصہ ریاست جیند اور لدھیانہ میں گزارا۔ 1861ء میں لاہور پہنچے اور 1864ء میں محکمۂ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے اور اردو و فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے۔ کرنل ہالرائڈ نے 75 روپے ماہانہ پر پنجاب میگزین کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ 1865ء میں سرکاری وفد کے ساتھ کابل اور بخارا گئے۔ دو مرتبہ ایران کا سفر کیا۔ 1869ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے عارضی اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ 1874ء میں اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہوئے، 1887ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ 1885ء میں جوان بیٹی امۃ الکبیر کی موت کے صدمے سے دماغی توازن خراب ہو گیا۔ اسی حالت میں لاہور میں انتقال ہوا۔ آزاد اردو کے صاحبِ طرز انشاء پرداز اور ماہر لسانیات تھے۔ چھوٹے چھوٹے شگفتہ جملے، حسین تشبیہات، دل کش استعارات، عبارت کی سادگی اور بے تکلفی، فارسی اور بھاشا کی ملی جلی ترکیبیں ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اردو سونیٹ شاعری کی تحریک کے بانی تھے اور غزل کے بجائے نظم نویسی کی حمایت کرتے تھے۔ تصانیف میں آبِ حیات، سخندان فارس، نیرنگ خیال، قند پارسی، قصص ہند، نصیحت کا کرن پھول، دربارِ اکبری اور نگارستان فارس مشہور ہیں۔ سپاک دلیاک اور جانورستان، زمانہ جنون کی لکھی ہوئی ہیں۔ نظم آزاد نظموں کا مجموعہ ہے۔ مدفن کربلائے شاہ لاہور میں ہے۔

(مرسلہ: ارشد فیاض، کراچی)

بھی بڑی اچھی طرح دور ہو چکی تھی کہ میرے پسندیدہ ہیرو کا نام شاید طالش ہے۔ محمد علی کو دیکھنے کی خواہش روز افزوں تھی۔ میں اپنی نئی سائیکل پر اکثر نیو شاپ سے لکشمی اور سڑک پار کر کے شاہ نور یا ایور نیو کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا رہتا۔ ہماری اسٹوڈیو میں زیادہ تر پنجابی فلموں کی نمبس بنتی ہوتی تھی لہٰذا امید نہیں تھی کہ محمد علی یا وحید مراد وغیرہ کو وہاں دیکھا جا سکے گا۔

ایک روز میں ایور نیو اسٹوڈیو کے سامنے اپنی سائیکل پر بیٹھا تھا۔ مختلف چھوٹے بڑے اداکار اپنی گاڑیوں میں آتے جاتے نظر آتے تھے۔ جب کوئی ایسا شناسا چہرہ دکھائی دیتا تو گیٹ کے سامنے کھڑے تماشائی پکارتے۔ "فلاں ہے..... فلاں ہے....."

اتنے میں ایک شاندار گاڑی نمودار ہوئی جو غالباً کیڈلک تھی۔ اگلی نشست پر ایک خوبرو، بارعب شہزادہ بیٹھا تھا۔ چہرہ سورج کی طرح چمکتا ہوا۔ یہ پاکستانی فلمی صنعت کے ماتھے کا جھومر محمد علی تھا۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر گاڑی میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگے۔ پٹھان چوکیدار نے ڈنڈا گھما گھما کر انہیں پیچھے ہٹایا۔ میں بھی سائیکل پر بیٹھا بیٹھا پیچھے ہٹا۔ پیچھے ایک چوڑے دہانے کا گٹر تھا جو پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اوپر ڈھکن وغیرہ بھی نہیں تھا۔ مگر پیچھے دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔ میری نگاہیں تو فلم ہزار داستان اور عادل کے باکمال تلوار باز پر جمی ہوئی تھیں۔ میری سائیکل کا پچھلا پہیا چوڑے دہانے والے گٹر کے اندر چلا گیا اور اگلے پہیے کا رخ تقریباً آسمان کی طرف ہو گیا۔ میں گھوڑے کی طرح الٹ ہو جانے والی سائیکل کے اوپر ہی بیٹھا رہا اور نگاہیں ایک سیکنڈ کے لیے محمد علی کے چہرے سے نہیں ہٹائیں۔ یہاں تک کہ وہ سورج چہرہ شخص ایور نیو اسٹوڈیو کے گیٹ کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میری ایک تہائی سائیکل پانی میں ڈوب چکی ہے، اور اردگرد کے دکاندار قدرے جراحیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

کئی برس بعد ایک فلمی تقریب میں علی سفیان آفاقی صاحب کے توسط سے محمد علی اور زیبا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ وہ فلمی دنیا کا ایک بے مثال جوڑا تھے۔

محمد علی کو دوسری مرتبہ میں نے چند سال بعد اس وقت دیکھا جب وہ میرے استاد پروفیسر صوفی نثار کے والد محترم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی وفات پر ان کے جنازے میں شرکت کے لیے سمن آباد آئے تھے۔ محمد علی، صوفی تبسم صاحب کے گھر کے باہر اداس کھڑے تھے اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد انسان دوست، نرم خو اور رقیق القلب شخص تھے۔

تو بات ہو رہی تھی ٹی وی اور فلموں کے ذوق شوق کی۔ فلم عادل کے بعد جان پر کھیل کر میں نے دو تین فلمیں، کزنوں کے ساتھ مل کر مزید دیکھ لی تھیں بلکہ زیادہ ہی ہوں گی، مگر جب گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور ابا جی کی طرف سے کھلائی جانے والی نظام دین کی برفی کا وعدہ ہر وقت لگا ہو تو فلموں کا اصل سواد کہاں آتا تھا۔

ایک روز میرے بھوپی زاد کزن شعیب نے مجھے پُرجوش انداز میں اطلاع دی، ظاہر اب ہمیں گھنٹی چوک اور گرمی شاہو نہیں بھاگنا پڑے گا۔ ہمارے اپنے علاقے میں سینما بن رہا ہے۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ ہم اللہ کے گناہ گار بندے، بلکہ بچے، اتنے خوش قسمت ہو سکتے ہیں۔ فوراً ہی اپنے دوسرے کزن عزیز کو ساتھ لیا اور اپنی سائیکلوں پر کشاں کشاں رحیم خانہ چوک سے آگے المناز روڈ پر پہنچے۔ اطلاع بالکل درست تھی۔ بے شک ایک سینما کی دیواریں اٹھائی جا رہی تھیں۔ ہماری باچھیں کھل گئیں۔ یہ المناز سینما تھا۔

ہم تقریباً روزانہ کام کی رفتار اور کاٹی دیکھنے کے لیے اپنی سائیکلوں پر سوار ہو کر تعمیر سینما جانے لگے۔ گھنٹوں وہاں کھڑے رہتے اور خوش ہوتے کہ اب دیواریں آدھے سے زیادہ اونچی ہو گئی ہیں۔ اب چھت پڑنے والی ہے، اب فرش ڈلنے والا ہے۔ شاید سینما کا مالک اتنا مسرور نہیں ہوگا جتنا ہم تھے۔ ہماری طرح بچے اور لڑکے بالے بھی سینما کا معائنہ کرنے اسی طرح آتے رہتے تھے۔

خدا خدا کر کے سینما مکمل ہوا۔ یہ زمانہ 1970ء کے آس پاس کا تھا یا شاید 1968ء تھا۔ یہاں پہلی فلم سید کمال اور نجمہ کی "نئی لیلیٰ نیا مجنوں" نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ وہ دن ہمارے لیے عید سعید کی طرح تھا۔ اس اضافی خوشی کی وجہ بھی اہل نظارین کی سمجھ میں آ جائے گی۔ سینما چونکہ ہمارے گھر سے صرف ایک کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ لہٰذا میرے لیے یہ سہولت موجود تھی کہ میں انٹرول کے وقت اپنی سائیکل دوڑاتا ہوا گھر پہنچ سکوں، گھر والوں کو اپنی شکل

دکھا سکوں اور پھر دوبارہ جا کر فلم جوائن کر سکوں۔ سائیکل اسٹینڈ والے کو بھی پتا ہوتا تھا کہ یہ لڑکا فلم کے انٹرول کے وقت سائیکل لے کر جائے گا۔ لہٰذا وہ اسی ٹوکن میں سائیکل دے دیتا۔ میں برق رفتاری سے گھر پہنچتا۔ ابا جی تب تک آفس سے آچکے ہوتے تھے۔ گھر پہنچتے ہی میں اپنی ساری برق رفتاری ختم کر لیتا۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں گھر میں گھومتا پھرتا۔ ابا جی کو بھی شکل دکھاتا، کوئی چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا۔ پھر بڑے ایزی موڈ میں گھر سے باہر آتا۔ سائیکل گھر سے باہر کھڑی ہوتی تھی۔ سائیکل پر بیٹھتے ہی میں طوفان میل بن جاتا۔ اندھا دھند پیڈل چلاتا المستار سینما پہنچتا اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا اپنی نشست پر جا پہنچتا۔ چھوٹے بھائی ساجد کو فلموں کا بہت زیادہ شوق نہیں تھا البتہ وہ میری اس پلاننگ کا راز دار تھا اور کبھی کبھی سہولت کار بھی بن جاتا تھا۔ کوئی پوچھتا تو وہ کہہ دیتا کہ بھائی جان ابھی یہیں تھے۔ شاید کرکٹ کھیلنے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پانچ بجے کے قریب گھر سے جانے والا ساڑھے چھ بجے کے قریب فلم دیکھ کر واپس تو نہیں آسکتا تھا۔

ناوہ کو بھی پتا چل چکا تھا کہ میں اس طرح سے فلم دیکھنے جاتا ہوں۔ وہ کسی کو نہیں بتاتی تھی بلکہ کبھی کبھی میری سہولت کار بھی بن جاتی تھی۔ وہ میری ہم عمر ہی تھی مگر وہ آٹھویں کلاس میں تھی اور میں نویں میں۔ دونوں گھرانوں کے تعلقات ایسے تھے کہ لوگ ہمیں رشتہ دار سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے کرایے کا وہ پانچ مرلہ کا گھر اب خرید لیا تھا۔

ان دنوں کہانیوں اور فلموں کے علاوہ میرا جو ایک اور شوق پروان چڑھ رہا تھا وہ کرکٹ کا تھا۔ بیٹنگ بہت اچھی نہیں تھی تاہم قد لمبا ہونے کے سبب فاسٹ باؤلنگ میں خوب کراتا تھا۔ خالہ مریم اور بہت حد تک پھوپی فاطمہ بھی مجھے ہر وقت لڑکوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھیں۔ خالہ کو بالکل پسند نہیں تھا کہ میں لڑکوں کے ساتھ دوسرے محلوں اور کالونیوں میں جا کر کرکٹ کھیلوں۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر اپنی آزمودہ دھمکی کا سہارا لیتیں۔ ''ٹھیک ہے، اب میں نے قسم کھالی ہے۔ یونس آئے گا تو بتاؤں گی۔''

اب میں اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ لاڈ پیار سے ان کی قسم تڑوانے میں بھی کامیاب ہو جاتا تھا۔ محلے کے لڑکے اکثر ہمارے دروازے کے سامنے جمع ہو جاتے۔ وہ خالہ جی سے درخواست کرتے۔ ''بھیج دیں۔ طاہر کو بھیج دیں۔ بس تین چار اوور کرا کر واپس آجائے گا۔''

وہ کبھی کبھی مان جاتیں، لیکن اگر مجھے دیر ہو جاتی تو کالا برقع اوڑھ کر گراؤنڈ پہنچ جاتیں۔

المستار سینما کیا بنا ہمارے اردگرد سینماؤں کی بہار سی آگئی۔ پہلے چوبرجی کے قریب ویلس سینما اور پھر سوڈیوال کے نزدیک لیرک سینما کھڑا ہو گیا۔ یہ خوشخبری بھی گردش کر رہی تھی کہ حرمگ چونگی کے نزدیک ڈرائیو اِن سینما بننے والے ہیں۔ وہ پاکستانی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ وحشی جٹ، پنجابی اور اردو فلمیں بن رہی تھیں اور کامیاب ہو رہی تھیں۔ سنتوش اور درپن کا دور گزر چکا تھا۔ محمد علی اور وحید مراد اردو فلموں کے سپر اسٹار تھے۔ ندیم بھی بتدریج شہرت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ پنجابی فلموں میں سدھیر اور ساون وغیرہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ تاہم ساون کی جگہ لینے کے لیے فلمی افق پر ایک اور ستارہ طلوع ہو رہا تھا اور اس کا نام تھا سلطان راہی۔

ایک روز ہم شاہ نور اسٹوڈیو کے سامنے ایک آؤٹ ڈور شوٹنگ دیکھ رہے تھے کہ قریب سے خوشبو کا جھونکا سا آیا۔ مڑ کر دیکھا تو سوٹڈ بوٹڈ سلطان راہی کھڑا تھا جو اس وقت نسبتاً دبلا پتلا بھی تھا۔ اس نے اپنی گرج دار آواز میں ہدایتکار کو مخاطب کیا اور بے تکلف انداز میں بولا۔ ''باؤجی..... باؤجی اسانوں وی شوٹنگ دکھاؤ۔'' پھر ہنسنے لگے۔

تب تک سلطان راہی نے بس ایک دو فلموں میں بڑے رول کیے تھے۔ تب کس کو پتا تھا کہ کریکٹر ایکٹر ساون کی جگہ اس طرح لینے والا ہے کہ ہر طرف دھوم مچ جائے گی۔

دھوم کی بات پر یاد آیا کہ اس وقت جس دوسرے ایکٹر کی دھوم مچی ہوئی تھی اور وہ لاکھوں فلم بینوں کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا وہ ایک ایسا ہیرو تھا جو کسی پیمانے پر بھی ہیرو کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا اور وہ تھا رنگیلا۔ جی رنگیلا، فلمساز، ہدایتکار، گلوکار، اداکار اور پتا نہیں کیا کیا ''کار'' سعید عرف رنگیلا۔

ابا جی نے ایک بیماری کی وجہ سے سروس سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور یہ بیماری تھی ذیابیطس اور راست گوئی کی۔ انہوں نے سوڈیوال کے قریب ایک صاف ستھری مارکیٹ میں شو اسٹور کھولا تھا۔ ہم بھائی بھی کبھی کبھی اس اسٹور پر جا بیٹھتے تھے۔ لیرک سینما اس شو اسٹور کے بالکل سامنے واقع تھا۔ ایک روز میں اسٹور میں

کرسی پر بیٹھا تھا۔ لیرک سینما میں رنگیلا کی نئی فلم "دل اور دنیا" لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی توڑ رش تھا۔ سڑک پر بھی لوگ جمع تھے۔ درمیانی عمر کی ایک برقع پوش صحت مند عورت میرے قریب آن بیٹھی۔ اس کے ساتھ تین چار سالہ ایک بچہ بھی تھا۔

عورت نے پوچھا۔ "یہ کس کی فلم لگی ہوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "رنگیلا کی۔"

وہ بولی۔ "کیا یہ بہت چل رہی ہے؟"

"رنگیلا کی ہر فلم ہی بہت چلتی ہے۔"

"ایک فلم سے یہ کتنا کما لیتا ہوگا؟" عورت نے پوچھا اس کے لہجے میں پٹھانی جھلک تھی۔

میں نے کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اس وقت تو ان پر دولت کی بارش ہو رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں رنگیلا کی سگی بہن ہوں۔"

میں نے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی، نہ ہی بہت اچھی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "رنگیلا صاحب، آپ سے ملتے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "بس کبھی کبھی۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ واقعی رنگیلا کی سگی بہن ہے تو انہوں نے اس کی مدد بھی کی ہوگی، مگر وہ شاید زیادہ مدد کی توقع رکھتی تھی۔ دیر تک وہاں بیٹھی رہی۔

لیرک سینما اور شو اسٹور کا ذکر آ گیا تو ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ یہ شو اسٹور کراچی پر تھا اور مشہور فلمساز فیلی کی ہلڈنگ میں تھا۔ فلمسازوں کا بہت رعب داب تھا۔ دوست محمد بڑے بھائی تھے، باقی بھائیوں پر ان کا حکم چلتا تھا۔ وہ بڑی بڑی چار پائیوں پر بڑی بڑی پگڑیوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ارد گرد کئی مین بھی نظر آتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہدایتکاری تو شروع سے تھے مگر اب درویش صفت ہو گئے تھے۔ (ہدایتکاری میں ان کے بہت سے چاہنے اور جاننے والے تھے۔ شوٹنگ پہلے دن سے ہی چلنا شروع ہو گیا تھا) فلمسازوں کے بڑے بھائی دوست محمد بھی مردم شناس تھے اور اہلِ فن کی عزت کرتے تھے۔ دوست محمد صاحب کے بیٹے محمد رفیع اور عظمت اللہ ہمارے ساتھ کھیلتے کودتے تھے۔ عظمت اللہ محمد کے بھائی ساجد کا ہم عمر تھا۔ ایک روز مجھے کسی بات پر غصہ آ گیا اور میں نے عظمت اللہ کو تھپڑ مار دیا۔ وہ روتا ہوا نارکیٹ کے کچھ لڑکے اپنی رہائش گاہ پر چلا گیا۔

ہمارے پڑوسی دکاندار نے مجھے ڈانٹا۔ "اپنی اوقات دیکھی ہے تم نے..... اور تھپڑ مار دیا ہے فلمسازوں کے بیٹے کو۔ تیری خیر نہیں ہے۔"

میں ڈرا ضرور، لیکن زیادہ نہیں۔ میں جانتا تھا کہ میں غلط نہیں ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد دوست محمد فلمساز فاتحانہ ایک گن مین کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ سرخ چہرے والا عظمت ان کے ساتھ تھا۔ وہ عظمت کی پوری بات سن چکے تھے اور نتیجہ بھی نکال چکے تھے۔ مجھے ڈانٹنے یا کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے عظمت کو ڈانٹا کہ اس نے اپنے سے بڑے کے ساتھ اس طرح بدتمیزی کیوں کی۔ میں حیران رہ گیا۔

ان لمحوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ فلمسازی برادران کو اللہ تعالیٰ نے اتنی عزت اور شان کیوں دے رکھی ہے؟ میرے خیال میں عظمت اللہ کی بھی یہ عظمت تھی کہ اس نے دو تین دن بعد ہی پھر اسی طرح مجھ سے بولنا چالنا شروع کر دیا۔ محمد رفیع تو فوت ہو چکا ہے لیکن عظمت اللہ بفضلِ خدا حیات ہے۔ آٹھ دس روز پہلے میں نے اسے ٹی وی پر دیکھا۔ وہ آل پاکستان گڈز ٹرانسپورٹ کا صدر ہے۔ اس فیلی نے سیاست میں بھی کافی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور کر رہی ہے۔

میں اپنے آس پاس کے چاہنے والوں کو چھوٹی بڑی کہانیاں سنا تو رہا تھا مگر ڈھنگ سے میں نے کبھی کوئی کہانی لکھی نہیں تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک چھوٹی سی کہانی لکھ کر کسی رسالے کو ارسال کروں۔ ناروکا خیال تھا کہ میں نوائے وقت میں بچوں کے صفحے کے لیے کہانی لکھوں، لیکن جب میں لکھنے بیٹھا تو کہانی چھوٹی نہ رہی اور بچوں والی بھی نہ رہی۔ وہ لمبی اور سنجیدہ ہوتی چلی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میری وہ پہلی کہانی درمیانی عمر کے ایک غریب پٹھان اور فلیٹ میں رہنے والی ایک جواں سالہ لڑکی کے گرد گھومتی تھی جس کا نام نیم "بے بی" تھا۔ غریب پٹھان انہی فلیٹس کے نیچے عارف ایک چائے خانے میں ملازم تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔ پھر کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔ غریب شخص کو اپنے آبائی علاقے میں واپس جانا پڑتا ہے۔ پھر وہ کبھی واپس نہیں آتا..... کچھ اس طرح کی اسٹوری لائن تھی میرے خیال میں۔ کہانی کا سارا ماحول فیلی کی ہلڈنگ اور ارد گرد جیسا ہی تھا۔

یہ پہلی کہانی تھی میرے لکھے ہوئے کوئی ساٹھ صفحات کی بن گئی تھی۔ مجھے اس کہانی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ فکر تو تب ہوتی جب مجھے پکا سا شبہ ہوتا کہ کوئی رسالہ اس کو قابل

اشاعت بھیجے گا۔ ان دنوں عمران سیریز اور اباجی کی الماری سے نکالے گئے اسلامی تاریخ ناولوں کے علاوہ میں نے آداب عرض اور اور چاند وغیرہ بھی پڑھنا شروع کر رکھے تھے۔

جب اپنی لکھی ہوئی کہانی پڑھ پڑھ کر تھک گیا تو سوچا کیوں نہ اسے آداب عرض کو بھیج دوں۔ کم از کم یہ تو ہوگا کہ میرے علاوہ آداب عرض کے دفتر میں بھی کوئی اسے پڑھے گا۔ کہانی روانہ کرنے کے بعد میں تقریباً بھول گیا۔ چار پانچ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ان دنوں فوٹو اسٹیٹ کا رواج نہیں تھا۔ ایک دن سوچا کہ کسی طرح مسودہ واپس منگواؤں۔ ابھی اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک دن تایا جی (بڑے اباجی) کی نواں کوٹ والی نمبر شاپ پر گیا۔ دیکھا تو وہاں نیا آداب عرض پڑا تھا۔ مجھے لگا کسی کسٹمر کا ہے۔ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحے پر کچھ الفاظ جانے پہچانے سے نظر آئے۔ "آپ تو بخیر سلامت تشریف لے آئی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گی اور میٹر میوں پر بہتی ہوئی آئیں گی....." کچھ اس طرح کے الفاظ تھے۔

ذہن میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا۔ یہ تو میرے لکھے ہوئے الفاظ تھے.... میرے کہانی تھی۔ لرزاں ہاتھوں سے میں نے جلدی جلدی ورق گردانی کی۔ پھر جوش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ میری ہی لکھی ہوئی کہانی تھی اور کم و بیش ایک چوتھائی رسالے پر پھیلی ہوئی تھی۔ نام بھی وہی تھا جو میں نے لکھا تھا "خلش"۔ میری حالت تقریباً وہی ہوئی جو آرشمیدس کی پانی کے ٹب میں ہوئی تھی۔ جی چاہا کہ رسالہ پکڑ کر بھاگ نکلوں اور اپنے جاننے والے ہر شخص کو اطلاع دوں کہ میری کہانی اور اتنی لمبی، رسالے میں شائع ہوئی ہے۔

اباجی کے سوا گھر کے ہر چھوٹے بڑے فرد کو کہانی دکھائی اور اس کا خلاصہ بھی سنایا۔ دو روز بعد کہانی کا نشہ تب اور بڑھ گیا جب کہانی کے حوالے سے خطوط آنے شروع ہوئے۔ آداب عرض میں لکھاریوں کے ایڈریس بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ خطوط ہمارے نمبر اسٹور کے ایڈریس پر آرہے تھے۔ بہت زیادہ تھے اور بہت حوصلہ افزا بھی۔ کہانی لوگوں کے دل میں کھب گئی تھی۔ اس تعریف و توصیف کے بعد میں نے سوچ لیا کہ اب میں لکھا کروں گا بلکہ تہیہ کر لیا۔ ہالفاظ دیگر انہی دنوں میں میرے اندر تاوان کا استاد جہانی دیوی کا رستم سیال اور فلکار کے عمران دنا بیش پنپنا شروع ہو گئے تھے۔

مگر کہتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔

خالدہ بن حامد کے تقاضے کے باوجود اگلے تقریباً دو سال تک میں آداب عرض کے لیے کچھ نہ لکھ سکا۔ ہاں مختلف مزاح کے رسالے چاند میں وقتاً فوقتاً میری مزاحیہ کہانیاں اور مضامین شائع ہوتے رہے۔ جن میں زیادہ تر اب ضائع ہو چکے ہیں۔ میری پہلی کہانی خلش کے زیادہ تر کردار حقیقی تھے۔ مرکزی کردار خان صاحب بھی میرے آس پاس کے ماحول میں ہی تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ آداب عرض صرف اور صرف سچی کہانیاں چھاپتا ہے.... اور اگر میں کوئی کہانی بھیجوں گا تو یہ کسی بددیانتی ہوگی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں پہلی ہی کہانی کی غیر معمولی پذیرائی سے تھوڑا خوفزدہ تھا اور سوچتا تھا کہ دوسری کہانی کہیں یہ تاثر خراب نہ کر دے۔ ماہنامہ چاند میں لکھی ہوئی کہانیاں اب میرے پاس نہیں اور نہ کچھ اضافے کے ساتھ ایک چھوٹی کتاب تو بن ہی سکتی تھی۔ ان کہانیوں کے حوالے سے ایک بڑے اور نہایت مقبول مزاح نگار کا تبصرہ میرے لیے بڑی قدر رکھتا ہے۔ بلکہ وہ دو تین فقرے ہی تھے۔ برسوں بعد لاہور کی ایک خوش رنگ شام میں پاک ٹی ہاؤس کے سامنے ڈاکٹر یونس بٹ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے یہ کہہ کر حیران کیا۔ "بھئی ہم نے تو چاند میں آپ کی کہانیاں بڑے ذوق شوق سے پڑھ رکھی ہیں....."

فلموں اور کہانیوں کے مسلسل تذکرے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اباجی کی تربیت اور دینی محبت بے اثر رہی تھی۔ وہ تین نمازیں ہم بہر صورت پڑھتے تھے۔ صبح کے وقت قرآن پاک بھی پڑھا جاتا تھا۔ بلکہ گھر میں محلے کی کئی لڑکیاں پھوپی جان فاطمہ سے قرآن پاک پڑھنے آتی تھیں۔ وہ سب ہمارے لیے بہنوں کی طرح تھیں۔ جمعہ کے روز میں بڑے اہتمام سے قریبی مسجد میں مولانا نعمانی مرحوم کا خطبہ سننے جاتا تھا۔ ان کی تقریر میں اسلامی تاریخ کے واقعات شامل ہوتے تھے اور ان کا لب و لہجہ سماں باندھ دیتا تھا۔

لڑکپن کے بچپنے دور میں میری صاف سادہ طبیعت اور شریف النفسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری میٹرک کی کلاس میں ایک لڑکا سعید جعفر تھا۔ بہت پیاری شکل و صورت تھی۔ کئی بڑی بہنوں کا بھائی تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے طور اطوار میں کچھ نسوانیت آ گئی تھی۔ چلنے پھرنے اور بات کرنے کا انداز بھی ویسا ہی تھا۔ لڑکے اسے بہت چھیڑتے تھے۔ جس کے ساتھ بیٹھتا وہ اسے تنگ کرتا۔ آخر میں اس نے مستقل طور پر میرے ساتھ بیٹھنا

شروع کردیا۔ گھر والے اس کی لڑکیوں کی طرح دیکھ بھال کرتے تھے اور کہیں جانے نہیں دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لیے ہمارے گھر آنے لگا اور بہت گھل مل گیا۔

ہماری پرائیویٹ اسکول سمن آباد کے وسطی علاقے میں تھا۔ ان دنوں شوبز کی کئی شخصیات سمن آباد میں رہائش پذیر تھیں لیکن ہمیں کبھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایک روز ہم اسکول کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ دور دیکھا، ایک کوٹھی کے سامنے، براؤن پینٹ کوٹ والا ایک گورا چٹا جوان دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ شاید کسی کا انتظار کررہا تھا۔ سعید جعفر نے غور سے دیکھا اور پکارا۔ "ہائے اللہ یہ تو مشہور ایکٹر قوی ہے..... قوی خان۔"

اب ہم نے بھی غور سے دیکھا۔ وہ دبلے پتلے قوی خان ہی تھے۔

ایک لڑکے نے سعید کو چھیڑا۔ "شاید اسے ہی گھور رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں کہ منڈا ہے یا کڑی ہے۔"

اس پر خوب قہقہہ پڑا۔ سینما کا دوپہر ساڑھے گیارہ بجے والا آخری شو ہم یاروں دوستوں کو بہت اپیل کرتا تھا۔ ایک دن سعید جعفر نے مجھے بتایا کہ پلازہ سینما میں فلم روپا کا آخری شو چلایا جارہا ہے۔ مجھے یاد ہے ہم دونوں اسکول سے کوئی بہانہ بنا کر سینما پہنچ گئے تھے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ شو صرف خواتین کے لیے ہے۔ ہم نے سینما کے ایک ملازم کی منت سماجت کی اور اس نے کچھ روپے لے کر ہم کو اس جگہ بٹھا دیا جہاں سے فلم چلتی تھی۔ یعنی پروجیکشن روم میں۔ ہال کالج اور اسکول کی طالبات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور پروجیکشن میں لڑکا چلا کر باہر چلا گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی کا میں نے فائدہ اٹھایا۔ شرارت کی اور ایک انگلش فلم کا ٹریلر چلا دیا۔ اس میں ایک دو نیم عریاں سین دیکھ کر لڑکیوں نے خوب شور مچایا اور سیٹیاں بجائیں۔ بعد ازاں بہت برس بعد نرم خو، نیک طبع سعید جعفر سے میو اسپتال روڈ کی ایک کافی شاپ پر ملاقات ہوئی۔ یہ اس کی شاپ تھی۔ بہت اچھے طریقے سے ملا اور پرانی یادیں تازہ کیں۔ اس کا لسانی انداز بھی کافی حد تک بدل چکا تھا۔

☆☆☆

میٹرک کا امتحان میں نے اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تھا۔ اب کالج کی تیاری تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ لاہور کی ایک خنکی لیے ہوئی شام تھی۔ میں نظام دین دودھ فروش کی دکان پر موجود تھا اور تازہ تازہ نرم برفی کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ اچانک ایک جہاز نہایت نیچی پرواز کرتا ہوا عین ہمارے سروں کے اوپر سے گزرا۔ ہم سب ٹھٹھر کر رہ گئے۔ ایک دم شور پڑ گیا۔ "جنگ لگ گئی..... جنگ لگ گئی۔"

واقعی جنگ لگ چکی تھی اور یہ 71ء کی جنگ تھی۔ شور تو کئی مہینوں سے برپا تھا۔ دونوں ملکوں میں جنگی جنون عروج پر تھا۔ ہندوستان ستمبر 65ء کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کی اداؤں کو زیر آلود کرچکا تھا..... مکتی باہنی کی تخریبی کارروائیاں عروج پر تھیں۔ اندرا گاندھی کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے۔ پاکستان میں بھی بے حد غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ سڑکوں پر ہر رکشا، ٹیکسی اور گاڑی کے عقب میں پوسٹر نظر آتے تھے جن پر "کرش انڈیا" کے الفاظ نمایاں ہوتے تھے۔

ایک بار پھر وہی چھ سال پہلے والے مناظر تھے۔ جنگی ترانے، بلیک آؤٹ، مورچوں کی کھدائی، رضا کاروں کی بھرتی، خطرے کے سائرن، جنگی طیاروں کی گھن گرج اور بے پناہ جذبہ..... لیکن نتیجہ وہ نہیں نکلنے والا تھا جو پہلے نکلا تھا۔ اپنوں کی غداری اور غیر کی مکر فریبی کے سبب ہم یہ جنگ ہارنے والے تھے۔ امریکا کے ساتویں بحری بیڑے کی آمد کا چرچا تھا جس نے ہماری مدد کرنا تھی۔ وہ کبھی نہیں آیا۔ دوسری طرف بھارت کے پشت پناہ ہر طرح اس کی مدد کرتے رہے۔ ہمنوا نے سلامتی کونسل میں قرار داد پھاڑی اور سب کو اندازہ ہوگیا کہ معاملات سنگین تر ہوتے جارہے ہیں۔ چھوٹے تایا یعنی ہمارے لیانی والے ابا جی یعقوب اس لڑائی کے حوالے سے بے حد پُرجوش اور حساس تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا ان کے چہرے کی چمک بھی کم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے 16 دسمبر کی وہ شام بھی نہیں بھولے گی جب میں نے دیکھا کہ ہمارے لیانی والے ابا جی نیر شاپ سے واپس آکر اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کررہے تھے۔ ان کا رنگ اتنا زرد تھا کہ اسے حقیقی معنوں میں لیموں سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔

"ابا جی کیا ہوا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلم کار کی خود بیتی کا تیسرا حصہ جو خود میں منفرد ہے

16 دسمبر کی شام مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ ابا جی ٹمبر شاپ سے واپس آئے تو ان کا رنگ زرد تھا۔

''ابا جی کیا ہوا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ڈھاکا پر قبضہ ہو گیا طاہر۔''

میں سکتے میں کھڑا رہ گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے ابا جان۔ آپ نے کہاں سنا ہے؟''

''ریڈیو پر۔ کہتے ہیں کہ مقامی کمانڈروں کے درمیان کوئی معاہدہ ہو گیا ہے اور.....'' ان کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ ڈھاکا ہم سے چھن گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان بھی۔

اس دن گھر میں کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ بس بار بار ریڈیو ہی سنا جا رہا تھا۔ جہاں کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ ہم سب کو اُمید تھی کہ ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے۔ مقامی کمانڈروں کے درمیان عارضی جنگ بندی کا کوئی معاہدہ ہی ہوا ہے نا۔ بہت جلد اچھی خبریں ملیں گی اور اگر مشرقی پاکستان میں کہیں کچھ پسپائی ہوئی بھی ہے تو مغربی پاکستان میں اس کا جواب دیا جائے گا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ کاتبِ تقدیر ہماری تاریخ کا ایک تاریک ترین باب لکھ کر قلم بند کر چکا ہے۔

زندگی سدا رواں رہتی ہے۔ رات اور دن کی طرح دکھ اور خوشی کے پنچھی بھی ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ ننھے منے گول مٹول حبیب اللہ کی ناگہانی موت جیسے صدمے بھی دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگتے ہیں اور بحیثیت قوم تو ہم ویسے ہی بہت بھلکڑ ہیں۔ جن حکمرانوں کے ناقابلِ برداشت ستم سہتے ہیں اور کسی طرح ان سے جان چھڑاتے ہیں، دو چار سال بعد پھر انہیں بڑے اہتمام سے مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز کر دیتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے سقوطِ ڈھاکا کے چند ہی ہفتے بعد عام لوگ بڑے ذوق شوق سے ریڈیو پر انڈین گانوں کا فرمائشی پروگرام سن رہے تھے۔ انڈین حکومت ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے عین فرمائشی گانوں کے پروگرام کے دوران چھوٹے چھوٹے وقفوں سے ہمارے جنگی قیدیوں کے انٹرویوز سناتی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں اکثر کوؤں کی کائیں کائیں سنائی دیا کرتی تھی۔

آہ یہ فرمائشی گانے وہی ہوتے تھے جن میں سے ایک

گانا بقول صدیق سالک بھارتیوں نے ایک کیمپ میں پاکستانی جنگی قیدیوں کو سنایا تھا..... مار دیا جائے، یا چھوڑ دیا جائے، بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

بے شک ہم بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ سقوط ڈھاکا اور اس کی وجوہات کو بھی بھول گئے۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے بتایا ہے ستمبر 65ء کی جنگ نے ہمارے گھر کو تین بینڈ والا ریڈیو دیا تھا۔ دسمبر 71ء کی جنگ نے بھی ایک چیز دی (لیکن بہت کچھ چھین بھی لیا) اور یہ چیز تھی بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی۔ مذہبی معاملوں میں ابا جی کی سختی سے ان کے دونوں بڑے بھائی بھی تھوڑا بہت ڈرتے تھے۔ جنگ سے پہلے ہی جنگ کا مکمل ماحول بن چکا تھا اور گھر میں چپکے چپکے ٹی وی لانے کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ بے شک ریڈیو کی طرح یہاں بھی جنگ کی آڑ موجود تھی لیکن گھریلو جنگ کا اندیشہ بھی تھا۔ ہمارے ابا جی دونوں بھائیوں کے سامنے بولتے نہیں تھے.. مگر ان کا خاموش سرخ چہرہ وہ سارا اثر ڈال دیتا تھا جو شاید بولنے سے بھی پیدا نہ ہو پاتا۔ اب پھر ان کے خاموش سرخ چہرے کا اندیشہ تھا۔

ایک دن بڑے تایا جی غلام رسول نے دل کڑا کر کے مجھے اپنے ساتھ لیا اور مال روڈ جا پہنچے۔ وہ بڑی دانائی کے ساتھ بہت جلدی اور اچھا سودا کرتے تھے۔ تب تک گاڑی ہمارے گھر میں نہیں آئی تھی۔ تایا جی نے چوڑا چکلا ٹی وی ایک ٹیکسی کی چھت پر رکھوایا اور ہم گھر روانہ ہو گئے۔ ارادہ یہی تھا کہ ٹی وی چپکے سے بالائی منزل کے کمرے میں رکھوا دیں گے..... اور کل کوئی مناسب وقت دیکھ کر انہیں بتا دیا جائے گا کہ ٹی وی صرف خبروں اور جنگی ترانوں وغیرہ کے لیے لیا گیا ہے۔

عصر کے وقت جب ہماری ٹیکسی دروازے کے عین سامنے رکی تو ابا جی نماز پڑھنے کے لیے اپنی خوشنما داڑھی سے پانی جھاڑتے باہر نکل رہے تھے۔ ٹی وی پر نظر پڑی تو اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ آہستہ آہستہ رنگ سرخ ہو گیا۔ میں نے چور نظروں سے بڑے تایا جی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی گڑبڑا گئے تھے مگر پھر ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس مسکراہٹ میں تھوڑی سی شرمندگی، تھوڑی سی معذرت اور تھوڑا سا بڑا پن بھی تھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے ہوں۔ ''بھئی کچھ بھی ہے میں اس گھر کا بڑا ہوں۔ سب کی خوشی کے لیے اپنی مرضی سے کچھ فیصلے لے سکتا ہوں۔''

آنے والی چیز آ گئی تھی۔ ایک دو روز کی خاموشی کے بعد ابا جی نے بھی سمجھوتا کر لیا۔ تاہم ہم بچوں نے کئی دن تک خبروں اور ترانوں کے سوا کوئی چیز نہیں دیکھی۔

جنگ کے بعد حالات معمول پر آنا شروع ہو گئے تھے۔ قومی زخم بھی آہستہ آہستہ اب کم ٹوہ دینے لگے تھے۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے جب پہلی بار ٹی وی پر ذوالفقار علی بھٹو کی آواز سنی تو وہ بہت باریک لگی۔ حیرانی ہوئی کہ کیا کسی ملکی سربراہ کی آواز بھی ایسی ہو سکتی ہے۔ دراصل اس سے پہلے ہم جنرل یحییٰ خان اور اس سے پہلے فیلڈ مارشل ایوب خان کی گھن گرج سنتے رہے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہ معلوم ہو گیا کہ نسبتاً باریک آواز والا یہ شخص کافی قابل بھی ہے۔ جنگی قیدی آزاد ہو رہے تھے، مقبوضہ علاقے واپس مل رہے تھے اور شملہ معاہدہ کی گونج بھی تھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے خیالات دوسری طرح کے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ مجیب الرحمان سے بگاڑ کر کے ادھر تم اور ادھر ہم کا نعرہ لگا کر اقتدار حاصل کیا گیا ہے۔

مجھے اسلامیہ کالج میں داخلہ مل گیا تھا اور میں نیلے ویسپا اسکوٹر پر آنے جانے لگا تھا۔ یہ اسکوٹر بڑے تایا ابا کا تھا لیکن وہ کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اور اپنے کاموں کا ہرج کر کے اسکوٹر مجھے دے دیتے تھے۔ بچپن میں میرا جو بازو فریکچر ہوا تھا اس کی وجہ سے اسکوٹر چلانے میں تھوڑی سی دقت تھی تاہم میں نے جلد ہی اس دقت پر قابو پا لیا۔

اب میں اس روداد کے رومانی پہلو کی طرف آتا ہوں۔ ہر عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مرد و زن کا تعلق ہماری جبلت میں شامل ہے اور اوائل عمر میں یہ تعلق کسی نہ کسی شکل میں ضرور نمو پاتا ہے۔ اس مرحلے سے کون نہیں گزرا؟ تقریباً سب ہی گزرے ہیں۔ کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا۔ اور یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ ذرا تناظر میں دیکھا جائے تو خدا کی تخلیق کردہ کسی بھی خوبصورت چیز کو سراہنا اور چاہنا عین فطرت ہے اور اس چاہنے میں صنف مخالف کی چاہت بھی شامل ہے۔ ہاں، عجیب یہ ہے کہ حدود پار کی جائیں۔ روایات، اخلاقیات اور معاشرے کو پامال کیا جائے۔

جہاں تک نادیہ یعنی نادو کی بات ہے وہ لڑکپن سے میرے ساتھ تھی.. مگر وہ صرف اور صرف دوستی تھی۔ ہاں،

جب میں کالج پہنچا تو اس میں ہلکا سا بائیں ہلکا سا ایک اور رنگ بھی شامل ہوگیا۔ تھوڑی سی جھجک پیدا ہوگئی..... حالانکہ بہت سادہ زمانہ تھا لیکن پھر بھی لگا کہ اب بہت ملنا جلنا نہیں چاہیے۔ اس کے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی اور محبت کا تعلق اب بھی قائم تھا۔ میں پڑھائی میں بھی اس کی تھوڑی بہت مدد کرتا تھا۔ امتحانات کے دنوں میں رات دیر تک بھی میں اسے پڑھاتا رہا۔ پھر ایک موقع ایسا آیا جب مجھے لگا کہ شاید آنٹی آمنہ چاہتی ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو کسی اور نظر سے بھی دیکھیں۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ جب میں کسی وجہ سے ان کے گھر میں تھا اور گھر میں نادو اور آنٹی آمنہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ہم دونوں کو چھوڑ کر کسی کام سے بازار چلی گئیں۔ جاتے جاتے ہم سے کہہ گئیں کہ گیٹ اندر سے اچھی طرح بند کرلیں۔ وہ اچھی خاتون تھیں۔ انہیں میری سادہ طبیعت اور شریف النفسی پر پختہ یقین تھا ورنہ کون اس طرح بیٹی کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ تو وہ قریباً تین گھنٹے بعد واپس آئیں۔ میں اور نادو بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے یا ٹی وی دیکھتے رہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اگر صورتِ حال یہی رہتی تو آگے چل کر میرا اور نادو کا تعلق کوئی نئی شکل اختیار کرتا یا نہیں لیکن پھر یوں ہوا کہ نادو اور اس کے اہلِ خانہ کو دوبارہ سیالکوٹ کی سائیڈ پر شفٹ ہونا پڑا۔ اس مرتبہ وہ لوگ سیالکوٹ شہر گئے تھے جہاں نادو کے والد انکل فیاض اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر لوہے کے دروازوں اور کھڑکیوں کا کام ذرا بہتر پیمانے پر شروع کررہے تھے۔ تاہم یہاں بھی ان کی دکان بدستور موجود رہی جہاں ان کا ایک قابلِ اعتماد ملازم بیٹھا رہا۔ گھر انہوں نے کرائے پر چڑھا دیا تھا تاہم ایک دو کمرے اپنے پاس رکھے تھے۔ انکل فیاض اور اہلِ خانہ دو تین ماہ بعد لاہور کا چکر لگاتے رہے۔ نادو بھی ساتھ ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ خوب گپ شپ ہوتی اور ہم سب مل کر پرانی یادیں تازہ کرتے.. پھر ایک روز پتا چلا کہ نادو کی منگنی اپنے ایک چچازاد سے ہوگئی ہے۔

ایک ہلکی سی کسک یا چبھن تو مجھے محسوس ہوئی مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ جب کوئی ایسا تعلق بنا ہی نہیں تھا تو پھر اس کے ٹوٹنے سے کیا ہونا تھا۔ اس قسم کا تعلق کہیں اور بننے والا تھا اور کافی شدت و گہرائی کے ساتھ۔ کوئی اور تھا جو دھیرے دھیرے میرے شب و روز میں سرایت کرنے والا تھا۔ میں پھر کہوں گا، زندگی کے ہر موسم کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ موسمِ بہار میں دل میں کوئی نہ کوئی پھول تو کھل کر رہتا ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو مفر ہو۔ یہ سب کچھ عین فطرت ہے۔ بلکہ کچھ لوگوں کا تو کہنا ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد ایسا نہ ہونا ایب نارمل ہونے کے زمرے میں آتا ہے۔ بات پھر وہی ہے کہ حدود سے تجاوز نہ ہو۔ میں اس حوالے سے بھی دل کی ہر واردات آپ سے کھل کر بیان کرنا چاہتا ہوں... کیونکہ اگر اس روداد میں سچائی بیان ہورہی ہے تو پھر وہ پوری ہو۔ یہاں مجھے ایک دو کرداروں کے نام بدلنا پڑیں گے اور کہیں کہیں قلم کو تھوڑا سا..... بالکل تھوڑا سا روکنا پڑے گا، اس کے لیے پیشگی معذرت۔

یہ وہ دن تھے جب میرے زیادہ تر دن تین 'ک' کے گرد گھوم رہے تھے۔ تین 'ک' سے میری مراد کالج، کرکٹ اور کہانی ہے۔ گو آدابِ عرض میں میری ایک طویل کہانی شائع ہوکر داد و تحسین سمیٹ چکی تھی مگر اگلی کہانی لکھنے کی ہمت ہی نہ ہورہی تھی۔ اس کے بجائے میں نوائے وقت کے پھول اور کلیاں، اور دیگر اخبارات کے اطفالی صفحات پر چھوٹی موٹی چیزیں لکھ رہا تھا۔ ان دنوں میں نے پھول اور کلیاں کے لیے ایک مزاحیہ تصویری کہانی بھی لکھی۔ یہ چار پانچ تصویروں والی کہانیاں تھیں۔ تصویریں میں اور میرا دوست عزیز کوڈک کیمرے سے خود کھینچتے تھے۔ میری انتہا کی خواہش تھی کہ دلچسپ کرداروں کی یہ تصویری کہانی بچوں کے اخبار میں آئے۔ پھول اور کلیاں کی اشاعت کی صبح میں منہ اندھیرے اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اتنا صبر نہیں ہوتا تھا کہ ہاکر کا انتظار کیا جائے۔ خود ہی باہر نکل جاتا۔ جہاں کہیں ہاکر نظر آتا..... جھپٹ کر نوائے وقت اٹھاتا۔ بچوں کا صفحہ دیکھتا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا۔ تصویری کہانی موجود نہ ہوتی تھی۔ کہانیاں دلچسپ تھیں مگر پتا نہیں کیا وجہ تھی، اخبار کی پالیسی یہ نہیں تھی۔ اس کہانی نے مجھے بہت انتظار کرایا اور کرب سے بھی گزرا۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ ایسے کرب اور ایسی مایوسیوں کے سبب میری ہمت کم ہونے کی بجائے بڑھی۔ میں رسائل و جرائد کی پتھریلی دیوار میں در بنانے کی کوشش کرتا رہا۔

ان دنوں فلمیں یا بھی بدستور حملہ آور تھا۔ میں، میرا ایک دور کا کزن ناصر اور ناصر کا بڑا بھائی اکبر مسلسل فلمیں دیکھ رہے تھے۔ اتوار کے روز دوپہر ساڑھے گیارہ والا اور سہ پہر تین بجے کا شو دیکھنا تو لازمی تھا۔ عام دنوں میں بھی جب اخبار میں کسی فلم کا اشتہار دیکھتے اور اس میں دوپہر

ساڑھے گیارہ بجے والے شو کا ذکر ہوتا تو طبیعت نہال ہو جاتی۔ یہ شو اس لیے بھی محبوب تھا کہ گھر والوں کو کم ہی شک پڑتا تھا کہ ہم فلم دیکھنے گئے ہیں۔

میں نے اپنے بال وحید مراد کی طرز پر بنانا شروع کر دیے تھے۔ بالوں کو آگے کی طرف گرا کر پورا ماتھا چھپانے کی کوشش کرتا تھا..... تاہم ابا جی کے سامنے جاتے ہوئے اس اسٹائل کو درہم برہم کر لیتا تھا۔ قریبی دوست ناصر کا بڑا بھائی اکبر محمد علی کا شیدائی تھا۔ تب تک محمد علی صاحب خوبصورت سی وگ لگا چکے تھے۔ ان کے ماتھے کی ایک سائیڈ کافی اوپر تک بالوں کے بغیر نظر آتی تھی۔ دوسری سائیڈ پر بال گرائے گئے تھے۔ اکبر اس اسٹائل پر اتنا عاشق ہوا کہ اس نے اپنے اچھے بھلے بال ایک جانب سے موٹر والیے۔ اس کا خوب مذاق بنا اور والدہ تو اتنے غصے میں آئیں کہ اس کی ٹنڈ کرانے کے درپے ہو گئیں۔

میرا دوست ناصر کھڑکی توڑ رش میں سے ٹکٹیں نکالنے میں ماہر تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے جو زبردست ہڑبونگ مچا کرتی تھی اس میں ہم ناصر کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لوگوں کے اوپر پھینک دیتے۔ وہ سروں کے اوپر سے ہوتا ہوا اپنا سر کھڑکی میں جا پھنساتا۔ ایسے اور بھی کئی بازی گر مصروف عمل ہوتے تھے۔ اتنا زمانہ گزر گیا۔ کبھی کبھی آج بھی دل چاہتا تھا کہ کسی تھرڈ کلاس سینما پر جا کر کوئی فضول سی فلم دیکھی جائے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے ہونے والی..... دھینگا مشتی ملاحظہ کی جائے۔ ون ایٹ والی نشستوں پر بیٹھا جائے، پھر ہاف ٹائم کے وقت باہر نکل کر گنڈیریاں چوسی جائیں، دہی بھلے چکھے جائیں۔ سینما کے برآمدے میں جا کر فلم کے مختلف پارٹس کے فوٹو گراف دیکھے جائیں اور جائزہ لیا جائے کہ کون سے پارٹ آگے ہیں اور کون سے آنے والے ہیں..... ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا۔

تو میں بات کر رہا تھا اپنے فلمیریا کی۔ ہماری نواں کوٹ والی نمبر شاپ کے عین سامنے ہیئر ڈریسنگ کی دکان تھی۔ مالک لالہ صدیق گلی محلے کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ ان کی دکان پر فلمی رسالے مصور، ممتاز وغیرہ باقاعدگی سے آتے تھے۔ وہیں پر ایک رسالے میں میں نے پہلی بار راجیش کھنہ کی تصویر دیکھی اور فلم آنند کا تذکرہ پڑھا۔ مجھے راجیش کھنہ کا چہرہ اور تذکرہ بہت اچھا لگا۔ تب تک انڈین فلمیں اور اداکار ہمارے لیے کسی اور ہی دنیا کے لوگ تھے۔

میں راجیش کھنہ کو دیکھ رہا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ جلد ہی یہ چہرہ اور ایسے بہت سے چہرے امرتسر میں قائم ہونے والے دوردرشن کے ذریعے ہم تک پہنچنے والے ہیں اور ایک دورانیہ ایسا بھی آنے والا ہے جب یہ نامعلوم راجیش کھنہ لاہوریوں کو جنون کی حد تک بھانے والا ہے۔

بہار کے دن تھے۔ میں اپنے دو منزلہ گھر کی چھت پر بیٹھا اپنے یار ناصر کو فلم آنند کی کہانی ڈرامائی انداز میں سنا رہا تھا۔ قریباً ساٹھ قدم دور میری نظر ایک دوسرے گھر کے صحن پر پڑی۔ طائرانہ نظر سے میں نے پہلے بھی کئی بار اس صحن کو دیکھا تھا مگر شب کے اور آج کے دیکھنے میں کچھ فرق تھا۔ لمبے بالوں والی ایک خوش قامت لڑکی، ایک چمکیلی لکیر سی بناتی ہوئی صحن میں سے گزری اور کمرے میں اوجھل ہو گئی۔

حقیقت یہ تھی کہ اس دن پہلی بار میں نے اس گھر کو اور اس صحن کو نوٹس کیا حالانکہ کچھ روز پہلے بھی رات کو چھت پر ٹہلتے ہوئے میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس صحن میں ڈالی تھی۔ کشادہ صحن میں بلب کی زرد روشنی تھی۔ ایک نفیس سے بزرگ چارپائی پر بیٹھے تھے اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ وہ بیمار لگتے تھے۔ شاید اسپتال سے ڈسچارج ہو کر آئے تھے۔ ان کے اردگرد اہل خانہ نے گھیرا ڈال رکھا تھا اور وہ ان سے باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ ان بزرگ کی پہلی اور آخری جھلک تھی جو میں نے اس گھر میں اور اس صحن میں دیکھی۔ اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے گھر سے قریباً ساٹھ گز کی دوری پر واقع یہ گھر اور یہ صحن میرے لیے کیا اہمیت اختیار کرنے والا ہے؟

تو میں بات کر رہا تھا اس چمکیلی لکیر کی جو صحن میں سے گزر کر اوجھل ہوئی تھی۔ میرے دوست ناصر نے بھی نوٹ کیا تھا۔ میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''یار بڑی شے لگ رہی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''ناصر، یہ ہمسائے ہیں۔ ہمسایوں کے بارے میں اچھا سوچنا چاہیے۔''

وہ تنک کر بولا۔ ''یار، ہمسائے تو ساتھ والے گھر کے ہوتے ہیں۔ تمہارے گھر کے سامنے تیس فٹ کی گلی ہے۔ گلی سے آگے کھلا میدان ہے۔ اس سے آگے وہ گھر ہے۔ یہ ہمسائے کیسے ہو گئے؟''

ناصر سے بحث کرنا فضول تھا۔ میں خاموش ہو گیا لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ جو ایک چمکیلی سی لکیر دیکھی تھی وہ

ذہن میں کہیں چمکتی رہی۔

تین چار روز بعد وہ ایک بار پھر صحن میں نظر آئی۔ کمرے سے نکل کر اس نے اپنے لمبے گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کیا تھا۔ اب کنگھی کر رہی تھی۔ بالوں کو جھلا کر اس نے دور سے ہماری چھت کی جانب دیکھا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا جب ہماری نظریں ملیں۔ وہ چھپاک سے کمرے میں اوجھل ہوگئی مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر صحن میں نظر آئی اور الگنی سے کچھ کپڑے اتار کر اندر لے گئی۔ اس مرتبہ اس نے واضح طور پر میری طرف دیکھا۔ میں چھت کی قریباً چار فٹ اونچی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ آنچل درست کرتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

اسی دوران میں میرا کزن دوست ناصر بھی فراٹے بھرتا چھت پر آگیا۔ مجھے دیکھ کر چہکا۔ ”ہاں بھئی، کیا آنکھ مٹکا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ یونہی کھڑا ہوں۔ سب کو اپنے جیسا نہ سمجھا کر۔“

”جھوٹ نہ بول۔ میں نے سیڑھیوں والی جالی سے دیکھا ہے۔ وہ صحن میں تھی اور چھت کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو روز ہی یہاں کھڑا ہوتا ہوں۔“

تبھی سیڑھیوں پر سے اباجی کی آواز آئی تھی۔ وہ چھوٹے بھائی خالد اور حبیب اللہ کو کسی بات پر ڈانٹ رہے تھے۔ حبیب اللہ میرے چوتھے بھائی کا نام تھا اور یہ ناگہانی حادثے کا شکار ہو جانے والے حبیب اللہ کے نام پر رکھا گیا تھا..... تو ابا جان کی آواز سن کر ناصر ایک دم چپ ہوگیا۔ تاہم آنکھوں میں اب شرارت ناچ رہی تھی۔

☆☆☆

ناصر کی دلچسپی پڑھائی میں نہیں تھی وہ ایک انسٹیٹیوٹ میں ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ کی ریپئرنگ کا کام سیکھ رہا تھا۔ ان دنوں ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی وغیرہ کے کاریگروں کی بڑی قدر تھی۔ ناصر کے والد وفات پا چکے تھے، وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی اکبر کے ساتھ ہماری گلی سے چند گلیاں چھوڑ کر ایک کرائے کے گھر میں رہتا تھا۔ بڑا بھائی اکبر جو ہم سے دو ڈھائی سال ہی بڑا تھا فرنیچر کی شاپ چلاتا تھا۔ ان کی مناسب گزر بسر ہو رہی تھی۔ ناصر کو ایک لڑکی نبیلہ سے محبت تھی۔ ان دونوں کے واقعات بھی اس روداد میں کہیں کہیں شامل ہوں گے..... میرے اور ناصر کے مزاجوں میں کافی فرق تھا۔ اس کے باوجود نجانے کس طرح ہماری دوستی قائم تھی، چل رہی تھی جو قدر مشترک نظر آتی ہے وہ شاید یہ تھی کہ وہ محنتی تھا اور غالباً دوسری قدر مشترک فلم بینی تھا۔

مزاج کے اعتبار سے، ناصر سے زیادہ میں اپنے ایک اور دوست عاطف کے قریب تھا۔ وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی اور نماز روزے کا پابند لڑکا تھا۔

سہ پہر کو یا رات کے وقت چھت پر جانا مجھے اب زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ گاہے بگاہے وہ روشن لکیر آنکھوں میں چمک جاتی۔ یقیناً وہ بھی مجھے نوٹس کر چکی تھی۔ وہ جیسے ہی کمرے سے نکلتی اس کی نگاہ پہلے ہماری چھت کی طرف اٹھتی..... تاہم اس نے کبھی کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے بڑے اس کے دو بھائی تھے۔ دونوں قریباً ہم عمر ہی لگتے تھے۔ دور سے دیکھنے پر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ پڑھائی میں دلچسپی رکھنے والے، سلجھے ہوئے لڑکے ہیں۔ وہ گھر میں کم کم ہی ہوتے تھے۔

ایک روز کالج سے آتے ہی میں اپنے دو منزلہ گھر کی سیڑھیاں پھلانگتا سیدھا چھت پر چلا گیا۔ صحن میں اسے دیکھ کر طبیعت نہال ہو جاتی تھی۔ بظاہر وہ سنجیدہ لڑکی نظر آتی تھی مگر کسی وقت ذرا شوخ بھی ہوتی تھی۔ اس دن بھی وہ ایک مہمان بچے کے ساتھ صحن میں اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ وہ اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور صحن میں بچھی چارپائی پھلانگ کر دوسری طرف چلی گئی۔ بچہ بدستور اس کے پیچھے تھا۔ اس نے دو تین بار اسی طرح چارپائی پھلانگی یہ منظر میرے لیے حوصلہ افزا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں منڈیر پر کہنیاں ٹکائے کھڑا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ اس کے جسم کا ہر جزو میری نگاہ میں ہے۔

کچھ دیر بعد جب بچہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے چھت پر نظر ڈالی تھی۔ نجانے مجھے کیا ہوا کہ میرا ہاتھ بے ساختہ اسے Wave کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ اس نے دیکھا اور بچے کو لے کر جلدی سے اندر چلی گئی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ شاید اس کو بہت برا لگا ہے اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اس کے گھر کی کسی کھڑکی میں سے کوئی اور بھی میری اس سے بیہودہ حرکت کو دیکھ رہا ہو۔ میں ڈر کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور چھت کی منڈیر کے روزنوں میں سے اس کے گھر کا خالی صحن دیکھتا رہا۔ کئی طرح کے اندیشے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ کلبلاتے

چلے جارہے تھے۔ شاید وہ دن اور وہ رات بہت ہی برے گزرے تھے لیکن کوئی آدھ گھنٹے بعد ہی وہ دوبارہ صحن میں آگئی۔ اس کا خوشگوار موڈ برقرار تھا اور وہ اب بھی بچے سے کھیل رہی تھی۔

میں نے سکھ کی سانس لی مگر دل کی گہرائی میں کہیں ایک الجھن سی ضرور رہی۔ اگلے روز اپنے فٹ بالر دوست عاطف سے مسجد والی گلی میں ملاقات ہوئی تو میں اسے لے کر ایک جگہ جا بیٹھا۔ ہم ایک دوسرے سے ہر بات کرلیا کرتے تھے۔ میں نے اب تک کی ساری صورت حال اس کے گوش گزار کی پھر پوچھا۔ ''یار، سچ بتاؤ۔ اگر یہ معاملہ کچھ آگے بڑھتا ہے تو یہ غلط بات تو نہیں ہوگی؟''

وہ بولا۔ ''غلط بات تو تب ہوگی جب کچھ غلط کرو گے۔ اس عمر میں کسی کا اچھا لگ جانا یا دل میں اس سے ملنے کی نیک خواہش رکھنا تو کوئی بری بات نہیں۔''

''پھر بھی یار۔ وہ پڑوسی ہیں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے..... مگر اچھے تعلقات تو کہیں بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور تو اور محلے داروں اور پڑوسیوں میں شادیاں تک ہوتی ہیں۔ ہوتی ہیں یا نہیں۔''

پھر وہ ذرا خاموش رہ کر بولا۔ ''کسی اور سے تو تیری آنکھ لڑی نہیں ہوگی، جو یہ بے وفائی کے کھاتے میں جائے گا۔ نہ ہی ابھی تیری کوئی منگنی شگنی ہے، نہ ہی کہیں بات ہوئی ہے۔''

''مگر یار۔ اس طرح چھت پر چڑھ کر.....''

''تو نہ چڑھا چھت پر۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''تم خود ہی تو بتا رہے ہو کہ اس کے دو بھائی ہیں اور اچھے ملنسار لگتے ہیں۔ ان سے علیک سلیک کرلے۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح دونوں گھرانوں میں تعلقات پیدا ہوجائیں۔''

''نہیں عاطف! یہ تو مجھ سے نہیں ہونے والا۔ ویسے بھی بھائی گھر میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ جب ہوتے ہیں تب بھی شاید کتابوں میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔''

عاطف سے ہونے والی گفتگو کے بعد میرے دل پر سے بوجھ کچھ کم ہوا۔ دوپہر اور شام کے وقت میں اکثر چھت پر چلا جاتا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے چھت کی منڈیر تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے مستطیل رخنے سے تھے۔ میں چارپائی یا کرسی پر بیٹھ کر بھی ''روشن لکیر'' والے صحن میں جھانک سکتا تھا۔ رات کو میں دوسری منزل میں اپنے کمرے میں ہوتا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں بھی اس صحن کے رخ پر ہی کھلتی ہیں۔ مجھے اس کی آمد کے اوقات کا علم ہو چکا تھا۔ اسی طرح غالباً اسے بھی میری آمد و رفت کے وقت کا پتا چل چکا تھا۔

اسی طرح کم و بیش پانچ ماہ گزر گئے۔ وہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔ مجھے اس کا نام بھی ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ بس یہی بہت بڑی خوشی تھی کہ میں اسے دیکھتا ہوں اور وہ بھی مجھے دیکھتی ہے۔ تاہم کبھی کبھی یہ بھی لگتا تھا کہ یہ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بھی کسی کو دیکھتا ہے۔

ایک دن میں گھر میں نہیں تھا۔ ناصر مجھ سے ملنے آیا۔ خالہ جی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آج کل تو وہ زیادہ وقت چھت پر ہی ہوتا ہے۔ شاید اوپر ہو۔

میں ایک کرکٹ میچ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو ناصر گھر میں ہی تھا۔ میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ راشن لے کر مجھ پر چڑھ دوڑا۔ مجھے سخت سست، بے وقوف اور نکما کہا۔ بولا۔ ''تم ان لوگوں میں سے ہو جو کڑاکے کی سردی میں ایک ابلا ہوا انڈا آدھی قیمت پر نہیں بیچ سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''اور تم ان میں ہو جو تپتی دوپہر میں گرم اوور کوٹ ڈبل قیمت پر بیچ لیتے ہیں۔''

''آج میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یار۔'' وہ سٹپٹا کر بولا۔ ''تم پانچ بجے چھت پر جایا کرتے ہو نا۔ آج کیوں نہ گئے؟''

''بس اچانک ایک میچ کی وجہ سے جانا پڑ گیا۔'' میں نے کہا۔

''اور میں نے دیکھا ہے کہ وہ بے چاری، صحن میں کس بے چینی سے چہل قدمی کر رہی تھی۔ بار بار مڑ کر چھت کی طرف دیکھتی تھی۔ میں منڈیر کے سوراخوں میں سے سب کچھ تاک رہا تھا۔''

ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی مگر میں بولا کچھ نہیں۔

ناصر نے کہا۔ ''ڈرپوک مت بن۔ اس کام کو تھوڑا سا آگے بڑھا۔ دیکھنا دوسری طرف سے بھی اچھا رزلٹ ہی ملے گا۔''

ان دنوں نیٹ، فیس بک اور پیغام رسانی کے دیگر طریقوں کا تصور تک محال تھا۔ فون بھی بس کسی کسی گھر میں ہوتا تھا۔ آجا کے خط ہی تھا جو دو دلوں کے ''حالات'' ایک دوسرے تک پہنچا سکتا تھا۔ ناصر نے بہت زور لگایا کہ میں

اپنے زورِ قلم کا فائدہ اٹھا کر کوئی خوبصورت سا خط لکھوں اور کسی طرح اس لڑکی تک پہنچاؤں جس کا نام بھی اب تک مجھے معلوم نہیں تھا۔

میرے زورِ قلم کا یقین ناصر کو اس لیے تھا کہ اس کی ایک پریم کہانی پچھلے سال، ڈیڑھ سال سے چل رہی تھی اور وہ اس سلسلے میں کبھی کبھی مجھے مجبور کر کے مجھ سے خط لکھواتا تھا۔ ناصر کی خوبیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بہت محنتی تھا اور دوسری یہ کہ وہ ہر رشتہ نبھانے میں بہت اخلاص سے بہت آگے تک جاتا تھا۔ جس گھر میں ناصر اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ رہائش پذیر تھا وہ کرائے کا تھا۔ یہ گھر جن صاحب کا تھا، وہ الیکٹرونکس کا کام کرتے تھے۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی نبیلہ اور ناصر ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ کسی حد تک نبیلہ کے گھر والوں کو بھی اس بات کا پتا چل چکا تھا۔ اس کے باوجود صاحب خانہ ناصر کو گھر کے فرد کی طرح ہی سمجھتے تھے..... ہاں نبیلہ کی والدہ، آنٹی زینب اس معاملے میں بے حد سخت تھیں۔ ناصر کو دیکھتے ہی ان کی تیوری چڑھ جایا کرتی تھی۔ وہ نبیلہ کو بھی کڑی نگرانی میں رکھتی تھیں۔

تو میں بات کر رہا تھا، ناصر کی۔ جس کا پُرزور اصرار تھا کہ میں کوئی چھوٹی موٹی تحریر لکھ کر اس لڑکی تک اپنے دل کا حال پہنچاؤں۔ مجھے یہ سب معیوب لگتا تھا اور بہت رسکی بھی۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور اسی طرح سردیوں کی سنہری دوپہروں اور گلابی شاموں میں چھت پر ٹہلتا رہا۔ اور راتوں کو اپنے کمرے کی مشرقی کھڑکی تھوڑی سی کھول کر فرسٹ ایئر کی اسٹڈی کرتا رہا۔

کتنا سادہ اور خوبصورت دور تھا۔ زندگی کی ساری خوشیاں جیسے صرف اس ایک بات میں ہی سمٹ آتی تھیں کہ میں مقررہ وقت پر اسے دیکھ لیتا ہوں اور وہ مقررہ اوقات پر صحن میں آجاتی ہے۔

میرے دوسرے دوست عاطف کو بھی اس دور دور کی محبت کا سارا ماجرا معلوم تھا۔ فٹ بالر ہونے کے ساتھ ساتھ عاطف کچھ سوشل بھی تھا۔ اس نے میری خاطر تھوڑی سی معلومات جمع کیں۔ ان معلومات سے جو سب سے بڑا انکشاف ہوا وہ یہ تھا کہ مجھے اس کا نام معلوم ہوا۔ میں اس کا نام یہاں زویا لکھوں گا۔ پچھلے برس میں نے جس نفیس سے کمزور شخص کو صحن کی دیوار سے ٹیک لگائے دیکھا۔ وہ اس کے والد تھے اور کچھ ہی روز بعد فوت ہو گئے تھے۔ زویا کے دونوں بھائی جو مجھ سے کچھ ہی بڑے ہوں گے امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والے لڑکے تھے۔ ان کے والد ایک دیانتدار سرکاری ملازم رہے تھے۔ یہ ایک نہایت شریف النفس اور باوقار فیملی تھی۔ اڑوس پڑوس والے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ سفید پوش گھرانا فی الحال جس گھر میں رہ رہا تھا وہ کرائے کا تھا۔

ایک بات عجیب تھی جو کبھی میری سمجھ میں نہ آئی۔ سر راہ آتے جاتے جب بھی دونوں بھائی میرے پاس سے گزرتے تھے۔ نہ چاہنے کے باوجود میرے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی شرمیلی مسکراہٹ آجاتی تھی۔ عموماً وہ بھی میرے پاس سے گزرتے ہوئے ہلکا سا مسکرا دیتے تھے۔

یہ وہ دن تھے جب لیجنڈ فائٹر بروس لی کی فلموں نے سینماؤں میں اودھم مچایا ہوا تھا۔ ہر موٹر سائیکل اور تقریباً ہر گاڑی پر بروس لی کے اسٹیکر نظر آتے تھے۔ اکثر گھروں میں بھی نوجوانوں نے بروس لی کے پوسٹر لگا رکھے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اور میرا کزن دوست شعیب بڑے ذوق شوق سے کراٹے سیکھنا شروع ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ میری ڈارلنگ گیم کرکٹ سے بھی میری توجہ کچھ عرصے کے لیے ہٹ گئی تھی۔ بعد ازاں میں اور شعیب براؤن بیلٹ تک پہنچے اور میں نے کچھ مقابلوں میں حصہ بھی لیا (ہمارے انسٹرکٹر قاضی شاہین صاحب تھے جو بعد میں پولیس کے محکمے میں بطور انسپکٹر بھرتی ہوئے اور غالباً ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچے)

جن دنوں جوڈو کراٹے کی ہوا زور و شور سے چل رہی تھی۔ بھٹو حکومت کا دور تھا۔ ملک میں کئی طرح کی انتظامی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے پی ٹی وی کی نشریات پیپلز پارٹی کے کوثر نیازی صاحب کی مختصر تقریر سے شروع ہوتی تھیں۔ پہلی اسلامی کانفرس کی گونج بھی ابھی باقی تھی۔ ٹی وی پر اکثر یہ ترانہ سنائی دیا کرتا تھا۔

ہم تا بہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں
ہم مصطفوی، مصطفوی، مصطفوی ہیں

پی ٹی وی نے اپنے پروگراموں میں ناظرین کی دلچسپی بڑھانے کے لیے ہفتہ وار فیچر فلم بھی دکھانا شروع کر دی تھی، گو کہ فلم کی حالت ایسی ہی ہوتی تھی جیسے پینٹ کو کاٹ کر نیکر بنا دیا گیا ہو... پھر بھی لوگ فلم دیکھنے کے لیے بڑی بے چینی سے اتوار کا انتظار کرتے تھے۔ اڑوس پڑوس کے بچے بھی فلم کے وقت ہمارے گھر آجاتے تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے بڑے تایا جی نے ابا جی کی ناراضگی کا رسک

لے کر ٹی وی خریدا تھا..... اور یہ رسک اس لیے کامیاب رہا تھا کہ 1971ء کی جنگ نے اس رسک کو تحفظ فراہم کر دیا تھا۔ تاہم ابا جی کا موقف اب بھی یہی تھا کہ خبروں اور بچوں کے پروگراموں کے علاوہ دیگر پروگراموں سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے۔ اتوار کو ٹی وی پر لگنے والی فلم ہم بہت احتیاط سے دیکھتے تھے۔ گانے کے وقت آواز مزید کم کر دی جاتی تھی تاکہ نچلی منزل پر ابا جی کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

ہماری چھوٹی پھوپی بھی ہمارے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر تھیں۔ ان کی بیٹی شہناز میرے اور ساجد کے ساتھ کھیلتے کودتے بڑی ہوئی تھی اور ہمارے لیے بہنوں کی طرح تھی۔ بے حد فرمانبردار اور سادہ دل لڑکی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے اسے سمجھایا کہ بجلی کے بٹنوں وغیرہ کو گیلا ہاتھ نہیں لگاتے۔ کچھ دن بعد روتی ہوئی والدہ یعنی ہماری پھوپی کے پاس آئی اور کانپتی آواز میں بولی۔ ''امی، میں نے تو سوچ بورڈ کو گیلا ہاتھ لگا دیا ہے۔''

پھر ایک دفعہ اپنی دھن میں سویٹر بنتے بنتے اس کے دماغ میں پتا نہیں کیا آئی کہ دونوں سلائیوں کو سنبھال کر رکھنے کے لیے بڑی احتیاط سے بجلی کی ساکٹ میں گھسا دیا۔ زور کا کرنٹ لگا اور خوب شور مچا۔ بعد میں خود بھی یہ واقعہ بیان کر کے ہنستی تھی۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جب میں اور ساجد ابھی اسکول میں داخل نہیں ہوئے تھے اور مدرسے میں جاتے تھے ہماری یہ پھوپی زاد بہن بھی ہمارے ساتھ جاتی تھی۔ ابا جی کی وجہ سے مولوی صاحب ہم تینوں بچوں کو وی آئی پی کا درجہ دیتے ہوئے اپنے بالکل پاس بٹھاتے تھے۔ ہم چالاکی یہ کرتے تھے کہ بھنے ہوئے چنے اپنی جیبوں میں ڈال کر چپکے سے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور مولوی صاحب کی نظر بچا کر تھوڑے تھوڑے پھانکتے رہتے تھے۔ شہناز یہ چنے اپنی فراک کی جھولی میں رکھتی تھی۔ ایک دن وہ سپارہ پڑھتے پڑھتے سو گئی اور میرے ساتھ اس کی ٹیک لگ گئی۔ میرے دماغ میں شرارت سمائی جب اس کی ٹیک اچھی طرح لگ گئی تو میں نے ایک دم خود کو پیچھے ہٹا لیا۔ وہ الٹ کر گری اور جھولی میں موجود سارے چنے ہوا میں اچھل گئے۔ مولوی صاحب اور درجنوں بچوں کے سامنے چنوں والا راز طشت از بام ہوا۔ بعد ازاں اس شرارت کی سزا ہمیں بھی بھگتنا پڑی۔ ہم دونوں بھائیوں سے بھی چنے برآمد ہوئے اور تینوں کو ہاتھوں پر چار چار بیدوں کی سزا ملی۔

میں بات کر رہا تھا ٹی وی پر اتوار کے روز دوپہر کو لگنے والی فلم کی۔ نو دس بجے ہی فلم دیکھنے کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ خواتین ضروری کام نمٹا لیتی تھیں۔ ٹی وی اوپر والی منزل پر تھا۔ میں بھی خالہ مریم اور بڑے تایا جی کے پاس اوپر کی منزل پر ہی ہوتا تھا۔ چھوٹے تایا یعنی للیانی والے ابا جی اور ابا جی یونس کی رہائش نچلی منزل پر تھی۔ چھوٹی تائی یعنی پھوپی فاطمہ بھی پرانی فلم شوق سے دیکھ لیتی تھیں۔ بہر حال یہ سب کچھ ابا جی یونس سے چھپ چھپ ہی ہوتا تھا۔ فلم کے روز پھوپی زاد بہن شہناز بھی بڑے اہتمام سے ہمارے ہاں آتی تھی اور فلم کا انتظار کرتی تھی۔ اس روز بھی وہ آئی ہوئی تھی۔ جب فلم لگنے لگی تو وہ ننگے پاؤں بلی کی چال چلتی نیچے گئی تاکہ پھوپی فاطمہ کو فلم لگنے کی اطلاع دے سکے۔ پھوپی فاطمہ ارد گرد نظر نہیں آئیں۔ شہناز نے یہی سمجھا کہ وہ واش روم میں ہیں۔ واش روم کے دروازے سے منہ لگا کر اس نے رازداری سے سرگوشی کی۔ ''پھوپی جی آ جاؤ۔ فلم لگ گئی ہے۔''

واش روم میں ابا جی تھے۔ ان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ فلم کا پول کھل گیا تھا۔ سب کو زبردست قسم کی یادگار جھاڑیں پڑیں۔ اگر یہ وقوعہ دو تین سال پہلے ہوا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ مجھے اور ساجد کو چند طمانچے بھی پڑ جاتے۔ شہناز اور دیگر گھس بیٹھیے، کاٹ لپیٹ، دم دبا یوں غائب ہوئے جیسے کبھی ادھر تھے ہی نہیں۔

☆☆☆

ایک روز ایک صحن میں جو روشن لکیر چمکی تھی وہ بدستور میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ ابا جی کو ابھی میری ''چھت گردی'' کی بھنک نہیں پڑی تھی۔ تاہم ایک بات واضح تھی کہ ابا جی اب کافی بدل چکے ہیں۔ ان کے مزاج میں اب کافی نرمی آ چکی تھی۔ خاص طور سے چھوٹے بھائیوں پر سختی کا وہ عالم نہیں تھا جو ہم پر تھا۔ اپنے آبائی گاؤں سے نہ صرف ابا جی کو بلکہ دونوں تایا کو بھی بہت لگاؤ تھا۔ بڑے تایا اب ''برلیما'' کار لے چکے تھے۔ میں نے میٹرک کے دوران میں ہی اس پر ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ بڑے تایا اکثر خالص دیسی گھی لینے کے لیے گاؤں جاتے تھے۔ اکثر میں ہی ڈرائیونگ کر رہا ہوتا تھا۔ یوں لاہور کا جم پل ہونے کے باوجود گاؤں سے میری شناسائی ہوئی۔ میں نے سردیوں میں کھیتوں کھلیانوں کی سنہری دھوپ دیکھی..... گرمیوں میں پیپلوں کی چھاؤں میں بیٹھا۔ تاریک

راتوں میں گاؤں کے شفاف آسمان پر تاروں کے ناقابلِ یقین جھرمٹ دیکھے۔ کبھی گنے کے رس کی کھیر کھائی۔ کبھی چائی کی مزیدار نمکین لسی پی اور کبھی رات کی باسی روٹی پر تازہ تازہ مکھن کا نرم پیڑا رکھا۔ پورا گاؤں ہمیں جانتا تھا۔ گاؤں سے باہر کے لوگ بھی ہمیں دیکھ کر جان جاتے تھے کہ شہر سے پولیس کے بچے آئے ہیں۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ گاؤں میں ہمارے رشتے کے ایک چچا اور ان کی فیملی موجود تھی۔ چچا نذیر اور چچی حلیمہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مجھے وہ منظر اچھی طرح یاد ہے جب پہلی مرتبہ ہم بس کے بجائے اپنی بریلنٹ کار پر گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو گاؤں کے پرائمری اسکول کے بے شمار بچے ہمیں دیکھ کر کھیتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے کہ ٹیکے لگانے والے آگئے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں اور ساجد تقریباً دو ماہ تک کے لیے اکیلے ہی چچا جان نذیر کے گھر رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال رہی ہوگی۔ گاؤں کے کئی ہم عمر بچے میری داستان گوئی کے شائق ہوگئے تھے۔ وہ چاندنی راتیں مجھے آج بھی یاد ہیں جب گاؤں کی کچی گلی میں کچی دیوار سے ٹیک لگا کر میں اپنے گاؤں کے دوستوں کو طویل کہانیاں سنایا کرتا تھا..... میری واپسی پر وہ بہت اداس ہوجایا کرتے تھے۔

رہٹ کے چلنے کی آواز، ڈیزل انجن کی کوکو، مویشی باڑوں کی بو باس، ریلوں کے چلنے کی مہک، تندوری روٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، گندلوں کے ساگ کا ذائقہ، حدِ نگاہ تک پھیلے سنہری کھیتوں کا طلسم اور راجباہوں میں پانی کی قلقاریاں، گاؤں کی ایسی بے شمار یادیں حافظے میں محفوظ ہوتی چلی گئیں۔ شہر کا باسی ہونے کے باوجود گاؤں سے ناتا تھا جو تب میرے کام آیا جب برسوں بعد میں نے انسپکٹر نواز خان کی کہانیاں لکھیں اور تاوان و دیوی وغیرہ کے تحقیقی سفر پر روانہ ہوا۔ جن لوگوں نے نواز خان کی کہانیاں پڑھی ہیں ان کو یہی شک ہوتا ہے کہ یہ واقعی کوئی سکہ بند دیہاتی پولیس انسپکٹر ہے۔

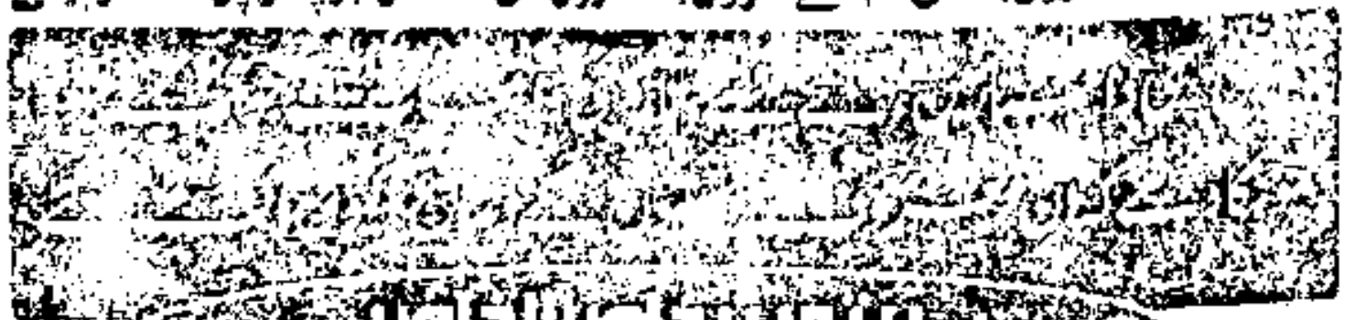
ایک مرتبہ ایسے ہی دو تین روز گاؤں رہ کر میں واپس لوٹا تو دل میں میٹھی میٹھی سی ایک کسک تھی۔ سوچتا تھا کہ میرے اچانک نظر نہ آنے سے وہ پریشان ہوئی ہوگی..... پھر کسی وقت یہ سوچ بھی ذہن میں آئی کہ کیوں پریشان ہوئی ہوگی..... اس کا اور میرا ناتہ صرف نظر کا ناتہ ہے۔ اسے

خاص الخاص ہوتے ہیں

ایک ایسا خاص نمبر
جسے آپ مجلد کرا کر
محفوظ رکھیں گے

جاسوسی ڈائجسٹ

ان مشہور فلمکاروں، اعلیٰ عہدے داروں، فنکاروں کی داستان جو باگل پن کا شکار ہوئے



ابھی سے نزدیکی بک اسٹال پر شمارہ مختص کرائیں ورنہ پچھتاوا دامن گیر رہے گا

تو میرا نام تک ابھی معلوم نہیں۔ میری آواز اس نے نہیں سنی۔ یہ جانتی نہیں کہ میں کون ہوں۔

بڑی کھلنڈری سی بچکانہ سوچیں تھیں، اس وقت میں گھر واپس تو آ گیا تھا مگر اسے جانچنے کے لیے میں چھت پر گیا اور نہ ہی کمرے کی کھڑکیوں کی طرف آیا۔ بہرحال نظریں اس کے صحن کی طرف جمائے رکھیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ گھر کے اندرونی حصے سے نکلی اور پہلے سیدھا ہماری چھت کی طرف ہی دیکھا۔ پھر اپنے کشادہ صحن میں ٹہلنے لگی۔ اس کا بار بار ہمارے گھر کی چھت اور کھڑکیوں کی طرف دیکھنا مسرور کر گیا۔ کتنی معمولی سی بات تھی مگر خوشی وہی تھی جو محبوب سے باقاعدہ وصل کی ہوتی ہے۔ اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی جو کچھ عرصہ پہلے ناصر نے کہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ مقررہ اوقات میں وہ میری غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کرتی ہے۔

تاہم ایک روز بعد زویا خود کہیں اوجھل ہو گئی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اپنے عزیزوں کے پاس کہیں مہمان گئی تھی مگر مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے منظر سے اوجھل ہوئی ہے۔ انہی دنوں مجھ سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوئی جس پر مجھے ندامت ہوئی اور میں نے خود کو بہت کوسا بھی۔ زویا اپنے صحن میں تھی۔ میں دسمبر کی نرم دھوپ میں اپنی چھت پر بیٹھا کینو کھا رہا تھا۔ نجانے دل میں کیا آئی کہ میں نے کینو پر چاقو کی مدد سے Love کے حروف کندہ کیے۔ پھر یہ کینو لے کر اس میدان کی طرف چلا گیا جو زویا کے گھر کی بیرونی دیوار سے ملتا تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر ایک عجیب لہری میرے اندر سے اٹھی، بے ساختہ میرا ہاتھ بلند ہوا اور میں نے کینو زویا کے صحن میں پھینک دیا۔ ہانپتا ہوا واپس چھت پر آیا تو زویا کا صحن خالی تھا۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کینو اس نے اٹھایا یا اہلِ خانہ میں سے کسی اور نے۔ کئی دن تک پچھتاتا رہا۔ وقت پر لگا کر اڑتا چلا جا رہا تھا اور سب کچھ جوں کا توں تھا۔

سردیاں گزر گئی تھیں اور گرمیاں آ گئی تھیں۔ زویا کے گھر والوں نے اب صحن میں سونا شروع کر دیا تھا۔ میرے اور زویا کے گھر کے درمیان جو ایک کھلا میدان تھا وہاں ایک خودرو درخت بھی تھا۔ جنتر کا یہ درخت زویا کے گھر کی بیرونی دیوار کے بالکل ساتھ تھا۔ اس نے میرے محبوب کے صحن کا کچھ حصہ جزوی طور پر ڈھانپا ہوا تھا۔ مگر زیادہ تر صحن مجھے صاف دکھائی دیتا تھا۔ صبح سویرے باقی اہلِ خانہ تو اٹھ کر اندر چلے جاتے تاہم زویا چارپائی کے اجلے بستر پر چادر اوڑھے لیٹی رہتی۔ ادھر میں رومانس کے سارے مروجہ تقاضے پورے کرتے ہوئے چھت پر بچھی چارپائی پر لیٹا رہتا اور منڈیر کے مستطیل رخنوں میں سے اسے دیکھتا رہتا۔ کچھ اسی گیت کی سی کیفیت ہوتی تھی جس میں فرصت کے رات دن کا ذکر ہے..... اور کہا گیا کہ بیٹھے رہے تصورِ جاناں کیے ہوئے۔

مجھے آج تک پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کینو، زویا نے اٹھایا تھا یا نہیں اور اگر نہیں تو وہ کس کے ہاتھ لگا تھا؟ اکثر سوچتا تھا کہ جب کبھی یہ معاملہ آگے بڑھے گا اور زویا سے کسی سہانی شام میں ملاقات ہو گی تو اس سے پہلا سوال اس کینو کے بارے میں ہی پوچھوں گا۔ وہ کینو جو نوعمری کے پُرجوش اور احمقانہ جذبات کا استعارہ بن کر میرے لرزاں ہاتھ سے نکلا تھا اور ان کے صحن میں جا گرا تھا (کینو کا یہ حوالہ تخلیقی مواد میں گھل مل کر میری ایک کہانی 'جذبہ دروں' میں بھی آیا ہے۔ بعدازاں یہ کہانی معروف ادیب ڈاکٹر عرفان خان کے پی ایچ ڈی مقالے میں بھی شامل ہوئی)

اکثر قلم کاروں کی طرح ماضی پرستی ہمیشہ میری سرشت میں شامل رہی ہے۔ جیسا کہ شروع میں میں نے بتایا ہے۔ میری پیدائش نانا نانی کے گھر ہیڈ سلیمانکی میں ہوئی تھی..... میں بچپن میں وہاں جاتا بھی رہا تھا۔ اب چونکہ عرصہ دراز سے نانا نانی اور ماموں وغیرہ لاہور شفٹ ہو چکے تھے۔ لہٰذا انیس بیس برس سے وہاں جانا نہیں ہوا تھا۔ ہیڈ سلیمانکی کی ریتیلی زمین کے نشیب و فراز، نانی کے گھر کے در و دیوار اور آس پاس کے وہ پیڑ میری نگاہوں میں گھومتے رہتے تھے جہاں میں دیگر بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ بہرحال ایک دن میں نے گھر والوں کو تیار کر لیا کہ ہم ہیڈ سلیمانکی جائیں گے۔ میں اپنی کھیر والی نانی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن چونکہ ان دنوں وہ کچھ بیمار تھیں، نہ جا سکیں۔ اب ہم بڑے ہو چکے تھے مگر پھر بھی ابا جی سے تھوڑی سی جھجک اور تھوڑا سا ڈر محسوس ہوتا تھا۔ ہم بڑے اور چھوٹے تایا کی کمپنی میں زیادہ خوش رہتے تھے۔ خاص طور سے چھوٹے تایا یعنی للیانی والے ابا جی ہم سب کے محبوب تھے۔

مجھے یاد ہے ہیڈ سلیمانکی والے اس سفر میں ابا جی ہی ہمارے ساتھ تھے، ہم کچھ ڈرے ہوئے تھے مگر یہ سفر کافی خوشگوار گزرا سوائے ایک واقعہ کے۔

اس وقت ہمارے پاس ٹویوٹا مارک ون گاڑی تھی۔ خالہ مریم اور امی جان سمیت ہم کافی اہلِ خانہ اس میں

لدے ہوئے تھے۔ ہم گنڈا سنگھ والا بارڈر کے نزدیک پہنچے تو ایک چیک پوسٹ پر ہمیں روکا گیا۔ یہ چیک پوسٹ غالباً راوی بیدیاں نہر کے پل پر واقع تھی۔ ڈرائیونگ میں کر رہا تھا۔ ابا جی ساتھ والی نشست پر تھے۔ باوردی افراد نے ہمیں رکنے کا جو اشارہ کیا تھا، وہ میں دیکھ سکا اور نہ ہی ابا جی۔ ہم فراٹے بھرتے پل پر پہنچے اور دوسری طرف نکل گئے۔ وائرلیس پر پیغام چل گیا کہ ایک گاڑی ناکہ توڑ کر آگے نکل گئی ہے۔ وہاں بارڈر ایریا میں کچھ تناؤ والی کیفیت چل رہی تھی جس کا ہمیں علم نہیں تھا۔ ہم ہنستے باتیں کرتے تھوڑا ہی آگے گئے ہوں گے کہ کچھ باوردی افراد جو غالباً رینجرز تھے ہماری گاڑی کے آگے کھڑے ہوگئے۔ وہ رائفل بدست تھے۔ انہوں نے بڑا سخت لب ولہجہ اختیار کیا اور ہمیں گاڑی سے اترنے کو کہا، ہم ان کے رویے پر حیران تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ ہم سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ آثار سے نظر آرہا تھا کہ شاید اسمگلنگ کے حوالے سے کوئی مخبری ہے۔ وہ نہ صرف گاڑی کی اچھی طرح تلاشی لینا چاہتے تھے بلکہ سیٹیں تک ادھیڑنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

بالآخر ایک آفیسر کو ہماری مسمسی صورتوں پر ترس آگیا۔ اس نے ابا جی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مولوی صاحب، آپ کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ محتاط رہیے گا۔ ایسے موقعوں پر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ گاڑی پر فائر بھی ہوسکتے تھے۔''

واقعی فائر ہوجاتے تو میں شاید اس وقت آپ کو یہ روداد سنانے کو زندہ نہ ہوتا کیونکہ گاڑی میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا اور ایسے موقعوں پر عموماً گاڑی کے ٹائرز یا پھر ڈرائیور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارا دل، آفیسر کو سیلیوٹ کرنے کو چاہ رہا تھا مگر جذبات پر قابو رکھتے ہوئے جھک کر معافی کیا۔

ابا جی مجھے مسلسل خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔ ڈرائیونگ میں کر رہا تھا۔ اصل ذمے داری تو میری ہی تھی کہ پل کے آغاز پر چیک پوسٹ والوں کا اشارہ دیکھتا اور رک جاتا۔

ابا جی کو اکثر میری غائب دماغی کا شکوہ رہتا تھا۔ کہتے تھے کہ تم ہر وقت کہانیاں سوچتے رہتے ہو۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ ایبٹ آباد نے پرسہا گایہ ہوا تھا کہ ایک اجلا سا سخن بھی ہر وقت نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ جب شام کے بعد ہمارے گھر کی بالائی منزل پر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی چل رہا ہوتا تھا اور سب ہنسی مذاق میں مصروف ہوتے تھے۔ میں کسی اداس پرندے کی طرح چھت کی چار فٹ اونچی منڈیر پر ٹکا ہوتا تھا۔ کہنیاں منڈیر کے بالائی کنارے پر، چہرہ ہاتھوں کی پیالی میں اور نگاہیں اس صحن پر جہاں بلب کی نارنجی روشنی میں ایک چاندی سی لکیر چمکتی تھی۔ چمکتی تھی اور اوجھل ہوجاتی تھی۔ اس کے چمکنے اور اوجھل ہونے کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہوتی رہتی تھیں۔ مدت گزر چکی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ مجھے تو اس کا نام معلوم ہے کیا اسے بھی میرا نام معلوم ہے۔

تو میں بات کر رہا تھا اپنی جنم بھومی ہیڈ سلیمانکی جانے کی۔ کم از کم بیس برس بعد میں ان فضاؤں میں پہنچا۔ بے شمار بچپن کی یادوں نے یلغار کی اور ذہن پر چھا گئیں۔ جن خوبصورت کوارٹرز نما رہائش گاہوں میں نانا نانی رہا کرتے تھے وہ جوں کی توں تھی۔ مجھے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ یہاں وہ دستی نلکا تھا جہاں امی مجھے نہلایا کرتی تھیں اور میں سردی کے سبب ان کی ٹانگوں سے چمٹ جایا کرتا تھا..... یہ وہ برآمدہ ہے جہاں چھوٹے بڑے بہت سے ڈرم پڑے ہوتے تھے جن میں نانی نے گندم، چنے، چاول اور دالیں وغیرہ رکھی ہوتی تھیں۔ یہاں کی دھوپ اور چھاؤں کے سارے زاویے مجھے یاد آرہے تھے۔ امی اور ابا جی میری باتیں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں جس وقت کی یادوں کو دہرا رہا ہوں اس وقت میری عمر ڈھائی تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔

ہم کوئی دو گھنٹے وہاں رہے اڑوس پڑوس والوں سے بھی ملے۔ پرانی یادوں کے تازہ ہونے سے ابا جی کا موڈ بھی اب کافی بہتر ہوچکا تھا۔ واپسی کا سفر خوشگوار رہا۔

انہی دنوں ایک ایسا شوشہ اٹھا جس نے اہل لاہور کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرلی۔ معلوم ہوا کہ انڈین شہر امرتسر سے پی ٹی وی کی نشریات شروع ہو رہی ہیں جو لاہور میں بھی دیکھی جاسکیں گی اور صرف یہی نہیں اس خبر نے بھی ہلچل مچائی کہ امرتسر ٹی وی سے ہر ہفتے تین چار انڈین فلمیں بھی ٹیلی کاسٹ ہوں گی۔ پہلی خبر پر تو ہم نے کسی نہ کسی طور یقین کرلیا مگر ہفتے میں چار یا تین فلموں والی خبر ایک لطیفے کے سوا کچھ معلوم نہ ہوئی۔ بھلا یہ بھی کوئی ماننے والی بات تھی۔ پی ٹی وی لاہور بڑے احسان کے ساتھ ہفتے یا دو ہفتے بعد ایک فیچر فلم دکھاتا تھا اور وہ بھی کاٹ چھانٹ کر پینٹ کی نیکر بنانے کے بعد۔

اطلاع ملنے کے بعد میں سیدھا اپنے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی طرف آیا۔ یہ کافی بڑا سیٹ تھا۔ لکڑی کی باڈی تھی۔ سامنے لکڑی ہی کا سلائیڈنگ دروازہ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی دروازہ سرکا کر ٹیوننگ والی ناب گھمائی۔ ایک جگہ لہروں کے ساتھ ایک پگڑی والے سردار جی کی بہت مدھم سی تصویر آرہی تھی۔ دل باغ باغ ہوا۔ اطلاع غلط نہیں تھی۔

اگلا قریباً ایک مہینا ہم سب نے شام کے وقت بڑے خشوع خضوع کے ساتھ وہ نہایت ناقص پکچر والے پروگرام دیکھے۔ یہ سن 1973ء کا تھا۔ جون جولائی کے دن تھے۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ عنقریب امرتسر سے دوردرشن کے باقاعدہ پروگرام شروع ہونے والے ہیں جو آزمائشی نشریات ہو رہی تھیں۔ وہ زیادہ تر صنعت اور زراعت وغیرہ کے حوالے سے تھیں۔ ہم ٹکٹکی لگا کر اس انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کہیں کسی انڈین فلم یا گانے کا کوئی ٹکڑا دکھایا جائے اور ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہو سکیں۔ مجھے یاد ہے نوعمری کے اس دور میں زویا کے علاوہ میری دو ہی بڑی خواہش تھیں، بلکہ انہیں حسرتیں کہنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ کراچی کا سمندر دیکھ سکوں۔ دوسری یہ کہ برصغیر کے عظیم اداکار دلیپ کمار کو اسکرین پر چلتا پھرتا دیکھ لوں۔

یہی دوسری خواہش تھی جو مجھے ہر شام دوردرشن کی نہایت بور آزمائشی نشریات کے سامنے بٹھائے رکھتی تھی۔ دلیپ کمار تو نظر نہیں آیا لیکن ایک روز ایک فلمی ٹکڑا دیکھنے کی مراد بر آئی۔ یہ کوئی دستاویزی فلم تھی جس میں فلمی صنعت کا ذکر بھی تھا۔ مجھے یاد ہے وہ ہیرو شمی کپور تھا جو اپنی ہیروئن کے پیچھے لپک لپک کر گا رہا تھا۔ "بدن پر ستارے لپیٹے ہوئے، جان تمنا کدھر جا رہی ہو۔"

اسی سال ستمبر کے دنوں میں وہ کرشمہ بھی رونما ہو گیا جس کا اہلِ لاہور کو دیر سے انتظار تھا۔ امرتسر سے دوردرشن کی باقاعدہ نشریات شروع ہوئیں اور پورا لاہور جیسے اپنی چھتوں پر چڑھ کر اینٹینے درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جب دوردرشن سے "پاکیزہ" دکھائے جانے کا اعلان ہوا تو دور دور سے فلموں کے شائقین سمٹ کر لاہور آ گئے۔ قدرتی بات ہے شروع شروع میں نئی چیز میں چارم بہت زیادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ پاکستانی فلمیں بھی ان دنوں کچھ کم نہیں تھیں بلکہ بجٹ کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو انڈین فلموں سے پاکستانی فلمیں بہت آگے تھیں۔ مگر لوگ انڈین فلموں کے دیوانے ہو گئے۔ کمال امروہوی اور مینا کماری کی پاکیزہ نے پاکستانی شائقین کو سحر زدہ کر دیا۔ مجھے یاد ہے اس روز ہمارے گھر کے بڑے کمرے میں قریبی عزیزوں کے علاوہ محلے کے پندرہ بیس بچے بھی موجود تھے۔ راج کمار کی بھاری بھرکم آواز، اس کے بولنے کا ٹھہرا ہوا انداز اور اس کا یہ مکالمہ "اپنے پاؤں زمین پر نہ اتاریے گا میلے ہو جائیں گے۔" ہر دل کو بھا گیا۔

پھر تو اوپر تلے ایسی دھانسو فلمیں آئیں کہ لاہور کی گلیاں شام کے بعد سونی ہونے لگیں۔ مغلِ اعظم لگی تو دور دراز کے شہروں کے لوگ لاہور میں سمٹ آئے۔ مجھے لگا کہ 1965ء میں جب پاک فوج نے انڈین شہر کھیم کرن پر قبضہ کیا تو اس قصبے سے ملنے والی مغلِ اعظم چلتے چلتے "اب" اسکرین تک آ پہنچی ہے۔ چلتے پھرتے دلیپ کمار کو دیکھنے کی خواہش چند دن پہلے ہی پوری ہو چکی تھی۔ اب مزید تسلی ہوئی (بہرحال مغلِ اعظم میں دلیپ کمار کی بے کار سی ڈوگ نے ہم سب کو بہت مایوس کیا تھا)

ایک دوسرا پروگرام جس نے لاہوریوں کی تمام تر توجہ کو اپنی طرف کشش کر لیا وہ گانوں کا پروگرام "چترہار" تھا۔ پی ٹی وی سے اسی نوع کا ایک پروگرام "ہر تان ہے دیپک" بھی نشر ہوا کرتا تھا۔ مگر بات پھر وہیں آ جاتی ہے شروع شروع میں ہر نئی تفریح زیادہ بھاتی ہے۔

جس دن انڈین فلم نہ ہوتی، شام کے وقت لوگ بے چینی سے چترہار کا انتظار کرتے۔ انہی دنوں لاہور کی شائقہ خواتین کے حوالے سے یہ مزاحیہ فقرہ مشہور ہوا تھا۔ "..... نی جلدی جلدی نمازاں پڑھ لو..... چترہار لگن والا اے۔" (جلدی جلدی نمازیں پڑھ لو۔ چترہار لگنے والا ہے)

ویسے یہ بات بھی درست ہے کہ آج کی فلموں اور گانوں کا موازنہ اس دور سے کیا جائے تو وہ بہت سلجھا ہوا کام تھا اور اکثر لوگ یہ چیزیں اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ لیتے تھے۔ دو تین برس پہلے مجھے ایک دوست کی کہی ہوئی بات یاد آ رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ "آج کی مادر پدر آزاد فلمی ہیروئینوں کو دیکھا جائے تو صبیحہ خانم، نیر سلطانہ اور مینا کماری وغیرہ تو بھتی عورتیں نظر آتی ہیں۔"

مجھے لاہور کی ان دنوں کی شامیں یاد ہیں۔ اکثر لوگ چھتوں پر نظر آ رہے ہوتے تھے۔ ٹی وی اینٹینے درست کیے جا رہے ہوتے تھے۔ نیچے سے آوازیں آ رہی ہوتی تھیں۔

"..... ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... تھوڑا سا اور دائیں کرو..... تھوڑا سا اور..... اوہو، زیادہ کردیا..... بالکل ہی غائب ہوگئی..... اب بائیں کرو۔"

گھر کی چھت تو ویسے بھی میری سب سے محبوب جگہ تھی۔ اکثر انٹینا درست کرنے میں ہی جاتا تھا۔ دیر تک ٹی وی کا اور اپنا انٹینا درست کرتا رہتا۔ دونوں طرف تصویر آجاتی تو دل خوش ہوجاتا۔ کتنی معصوم اور سادہ خوشیاں تھیں۔

انہی دنوں ٹی وی انٹینا کے حوالے سے لاہور میں "تھالی کلچر" بھی پروان چڑھا۔ امرتسر کے سگنل زیادہ اچھے طریقے سے موصول کرنے کے لیے یاران نکتہ داں نے "المونیم" کی پلیٹوں میں چھید کرکے انٹینا ز کے ساتھ جوڑنا شروع کردیا۔ اگر کہیں پلیٹ سے کام نہیں چلتا تھا تو بڑی پلیٹ، ٹرے یا پرات تک استعمال کرلی جاتی تھی۔ اہل لاہور کے بے شمار برتن چھید و چھید ہوگئے۔ کبھی موسم ابر آلود ہوتا اور فلم کا روز بھی ہوتا تو لوگوں کی موج ہوجاتی۔ دور درشن کے سگنل بہت واضح آتے۔

انہی دنوں ایک چہرہ ان سگنلز پر تیرتا ہوا امرتسر دور درشن سے لاہور پہنچا اور ہر طرف چھا گیا۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کی تصویر میں نے کچھ عرصہ پہلے لالہ صدیق کی دکان پر فلمی رسالے مصور میں دیکھی تھی۔ میں راجیش کھنہ کی بات کررہا ہوں۔ ہم نے اسے سب سے پہلے فلمی گیتوں کے پروگرام چترہار میں ہی دیکھا تھا۔ اس کے دانتوں کی ہموار قطار، اس کا مسکرانا اور آنکھوں کو خاص انداز میں جھپکنا، فلم بینوں کو بہت بھایا۔ کچھ عرصے کے لیے لاہور میں راجیش کھنہ کی دھوم مچی رہی تھی۔ سنا گیا کہ ممبئی میں راجیش کھنہ کو اپنی اس خصوصی پذیرائی کی خبر ملی ہے اور وہ بہت خوش محسوس کررہا ہے۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ امرتسر ٹی وی شروع ہونے کے بعد اور گھر میں مختلف ٹی وی پروگرام کا دور دورہ ہونے کے بعد ابا جی کا ردعمل کیا تھا۔ وہ شروع میں بڑے تایا سے تھوڑے سے خفا بھی تھے کہ 71ء میں خبروں اور جنگی ترانوں کے بہانے ٹی وی آیا تھا اور اب ہر طرح کے ترانے سنے جارہے ہیں۔ بہرطور ابا جی اب یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ ہم بڑے ہوچکے ہیں اور دیگر بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر ہی ٹی وی دیکھتے ہیں۔ دوسرے وہ ہم بہن بھائیوں کی تعلیم اور اخلاقیات کے حوالے سے بھی کافی حد تک مطمئن تھے.....

یوں ان کی نگرانی اور سختی کافی کم ہوچکی تھی۔ بہرطور اپنے طور پر ہم پھر بھی ڈرتے رہتے تھے کہ عین انڈین فلم کے وقت ابا جی کی آمد ہوگئی تو ہم پھرتی سے چینل بدل پائیں گے یا نہیں۔

ماہنامہ آداب عرض میں پہلی کہانی خلش لکھے مجھے کافی عرصہ بیت چکا تھا اور میں مزید کچھ نہ لکھ سکا تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ میں کہانی لکھ ہی نہیں سکتا..... قلم کاری کے حوالے سے میرا میدان اگر کوئی ہے تو وہ شاعری ہے مجھے شعر کہنے چاہئیں۔ گونوائے وقت اور چاند وغیرہ میں میری چھوٹی موٹی تحریریں چھپ رہی تھیں مگر میری توجہ شاعری کی طرف ہوگئی۔ میرے چند اشعار دیکھ کر نوائے وقت کے سب ایڈیٹر محترم بیدار سرمدی نے، جو بہت اچھے شاعر بھی ہیں، میری حوصلہ افزائی کی۔ نوائے وقت کے ادبی صفحے اور نوجوانوں کے صفحے میں میری شاعری تواتر سے شائع ہونے لگی۔ میں گاہے بگاہے اپنے اسکوٹر پر ادبی حلقوں میں بھی جانے لگا۔ لاہور کی ان گل رنگ شاموں میں اشفاق احمد، رضی مجتبیٰ، انجم رومانی، دلدار پرویز بھٹی، مظفر وارثی اور عطاء الحق قاسمی جیسے نایاب لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں حب الوطنی پر مبنی نظمیں بھی لکھ رہا تھا۔ "قائداعظم" ڈے کے موقع پر نوائے وقت نے میری ایک نظم رنگین صفحات پر بڑے اہتمام سے شائع کی۔ اس کی پہلی لائن آج تک یاد ہے..... "عظیم قائد، عظیم تر تھا، عظیم سورج اگا گیا وہ۔"

ابا جی کو نظم دکھائی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کا اثبات میں سر ہلا دینا ہی بہت بڑی شاباشی کی طرح لگتا تھا۔ وہ بہت اچھی نظم تھی مگر بہت ڈھونڈنے کے باوجود مجھے دوبارہ نہیں ملی۔

میں شاعری کررہا تھا اور میرا شاعری کی طرف متوجہ ہونا حسب حال بھی تھا۔ ایک صحن میں ایک روشن لکیر چمکتی تھی اور ایک اداس پرندہ اپنی چھت کی منڈیر پر بیٹھا رہا تھا، یا پھر تین دروں والی ایک کھڑکی میں سے چپ چاپ اپنے مطلوب کو جھانکتا تھا۔ مطلوب جو بس پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ ان دونوں کے درمیان بس ایک میدان تھا لیکن نا تو انیوں اور نارسائیوں نے اس مختصر میدان کو بیکراں کردیا تھا۔ ہر روز سورج نکلتا، ہر روز شام کے رنگ افق پر پھیلتے، ہر رات ستارے ٹمٹماتے اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ نارسائی اور دوری کا احساس کچھ اور بڑھ جاتا۔ فٹ بالر دوست عاطف نے مجھے میرے حال پر چھوڑ

دیا تھا۔ ناصر کہہ کہہ کر ہار گیا تھا۔ ''بے وقوف آگے بڑھو۔ کیوں ایک جگہ جم کر رہ گئے ہو۔ وقت نکل گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ ایک شریف لڑکی ہے، وہ اتنا ہی کر سکتی تھی جتنا کر رہی ہے۔ اس سے آگے بڑھنا تمہارا کام ہے۔''

لیکن میں کیا کرتا؟ میں ایسا تھا ہی نہیں۔ قدرت نے مجھے ایسا بنایا ہی نہیں تھا۔ میری رگوں میں ایک لاچار خون دوڑتا تھا اور میری سوچ ایک جگہ آ کر بے دست و پا ہو جاتی تھی۔ میں وہ سب کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا جو میرے اردگرد میری عمر کے لڑکے کر رہے تھے۔ وہ خط لکھتے تھے، فون نمبر ڈھونڈتے تھے، پیچھا کرتے تھے، جو بہت دلیر ہوتے تھے وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ کسی کیفے میں بھی جا بیٹھتے تھے۔ میں یہ سب کچھ کیسے کرتا، یہ میرے خون میں نہیں تھا، میری تربیت میں ہی نہیں تھا۔ وہ، ایک کمزور لمحے میں جو ایک کینو میں نے اس کے گھر میں پھینک دیا تھا، وہ بھی معلوم نہیں کیسے پھینکا تھا۔ اب مہینوں گزر چکے تھے، ایک فل اسٹاپ تھا، ایک ناروا جمود تھا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ شاید یہ شعر مجھ پر صادق آئے گا۔

پہلی بات ہی آخری تھی، اس سے آگے بڑھی نہیں
ڈری ہوئی کوئی بیل تھی جیسے پورے گھر پہ چڑھی نہیں

ناصر کی اپنی کہانی بہت تیزی سے آگے بڑھی تھی اور اب بھی بڑھ رہی تھی۔ اب اس نے مجھ سے خط وغیرہ لکھوانے چھوڑ دیئے تھے کیونکہ اب تو وہ بالمشافہ ملاقاتیں کر رہا تھا۔ یہ ملاقاتیں وہ موقع ملنے پر اپنے گھر کے کسی بھی کونے کھدرے میں کر لیتا تھا۔ میں اکثر اسے منع کرتا رہتا تھا جب اس نے الٹا مجھ پر چڑھائی کر دی۔ تڑخ کر بولا۔ ''میرا منہ نہ کھلواؤ، چپ ہی رہا کرو تو بہتر ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''تم وہ بے وقوف ہو جو ناک تک پانی میں ڈوب کر بھی پیاسا ہی رہتا ہے۔''

''یار، مجھے کوئی پانی شانی نہیں پینا۔ کسی سے دور رہ کر بھی تو اسے چاہا جا سکتا ہے۔''

''دور رہ کر بس گلا سڑا جا سکتا ہے اور تم گل سڑ رہے ہو۔ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو پھر دفع کرو یہ سب کچھ۔'' وہ بھنا کر بولا۔

''اس روز اس نے مجھے کافی لتاڑا اور مجبور کیا کہ میں اس تک اپنے دل کا حال پہنچاؤں۔ اس کو خط لکھوں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اور یہ کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے۔''

''یعنی Love لکھ کر کینو پھینکنا اچھی بات تھی؟''

''وہ پتا نہیں کیسا لمحہ تھا ناصر۔ جو کچھ ہوا مجھے خود بھی آج تک اس کی سمجھ نہیں آئی۔''

نوعمری کے دن تھے، نادانیوں سے بھرے ہوتے اور پھر ناصر جیسا دوست بھی پلے پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے دو چار سطور لکھوا کر ہی رہا، یہ ذمے داری بھی اسی نے لی کہ وہ یہ خط زویا تک پہنچائے گا۔ وہ تاک میں رہا۔ ایک دن زویا شام کے بعد حسب معمول صحن میں چہل قدمی کر رہی تھی اور بلب کی زرد روشنی میں اس کی گندمی رنگت سونا رنگی دکھائی دیتی تھی اور اس کی گلابی اوڑھنی بار بار اس کے کندھوں سے سرکتی تھی، اور نیم گرم ہوا میں موتیا پھولوں کے کھلنے کی مہلک تھی..... ناصر نے ہمارے گھر کی سیڑھیاں اتر کر شتابی سے میدان پار کیا اور کاغذ میں لپٹا ہوا محبت نامہ ان کے صحن میں پھینک دیا۔ میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا اور چھت سے دیکھ رہا تھا۔ زویا تیزی سے اندر گئی اور صحن کی لائٹ آف کر دی۔ اس نے وہ خط اٹھایا؟ اور کب اٹھایا؟ اس کے بارے میں کچھ پتا نہ چلا۔

میں اپنے دل و دماغ پر بھاری بوجھ محسوس کر رہا تھا اور خود کو بار بار کوستا تھا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خط کا مضمون کچھ خاص نہیں تھا۔ بس وہ دو چار مروجہ سی باتیں تھیں..... آپ مجھے بہت پسند ہیں۔ آپ کو بہت چاہتا ہوں۔ میں برا لڑکا نہیں ہوں۔ پتا نہیں کہ آپ مجھے چاہتی ہیں یا نہیں..... وغیرہ وغیرہ۔

نیچے ناصر نے اپنے ایک دوست کے جنرل اسٹور کا پتا لکھوا دیا تھا اور میں نے اپنا نام لکھ دیا تھا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت و ''لعنت ملامت'' کام آئے..... خیر کسی ایسی لعنت ملامت تک نوبت تو نہیں پہنچی..... ہاں یہ ضرور ہوا کہ اگلے چار پانچ روز تک زویا کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میں نے بہت ساری قضا نمازیں پڑھنا شروع کر دی تھیں اور دن رات خیریت کی دعا مانگ رہا تھا۔ دوسری طرف ناصر کا پکا خیال تھا کہ ایک دو روز تک جنرل اسٹور کے پتے پر زویا کا جواب ضرور آئے گا۔

عاطف کا خیال تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کا کہنا تھا۔ ''زویا ایک پڑھی لکھی فیملی کی شریف لڑکی ہے..... یہ

ناصر کا بچہ ہر لڑکی کو اپنی منظور نظر نبیلہ کے پیمانے سے دیکھتا ہے جس نے بہ آسانی اس کے ساتھ خط و کتابت شروع کردی تھی اور اب چوری چھپے ملاقاتیں بھی کر رہی ہے۔"

مجھے عاطف کی بات میں وزن محسوس ہوتا تھا۔ ذہن اس وزن کو محسوس کرتا تھا مگر دل اس سلسلے میں گنجائش نکال رہا تھا۔ میں سوچتا، تقریباً ڈیڑھ برس گزر چکا ہے، زدیا کو بہت اچھی طرح معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں ایک بھلا مانس لڑکا ہوں۔ تمام تحفظات کے باوجود عین ممکن ہے کہ وہ اپنا ہاتھ کاغذ قلم کی طرف بڑھالے۔

قریباً دس روز تک میں روزانہ اپنے ویسپا اسکوٹر پر جنرل اسٹور کے چکر لگاتا رہا اور ناامید ہو کر لوٹتا رہا۔ میرا "محبوب صحن" بھی قریباً ویران ہی تھا۔ آہستہ آہستہ خط کا جواب تو بھول گیا، یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں زدیا نے خفا ہو کر قطع تعلق ہی نہ کرلیا ہو؟ یا گھر والوں نے اس پر کوئی پابندی ہی نہ لگادی ہو؟

میں نے خود کو بہت لعنت ملامت کی اور چھت پر جانا بھی موقوف کردیا۔ گرمی کے باوجود میرے کمرے کی کھڑکیاں بھی تقریباً بند ہی رہتیں۔ میں نے اپنا سارا دھیان پڑھائی پر دینا شروع کردیا کیونکہ امتحانات قریب تھے۔ سب گھر والوں کو خاص طور سے خالہ جان کو مجھ سے بہت اُمیدیں وابستہ تھیں۔

امتحانات کے بعد ایک بار پھر صبح و شام کے بے کیف سلسلے شروع ہو گئے۔ شروع سردی کی وہ شامیں بہت اداس اور گھٹن والی ہوتی تھیں۔ خالہ جان اور پھوپی اکثر کن انکھیوں میں مجھے دیکھتی رہتیں۔ یقیناً کچھ نہ کچھ تو وہ جانتی ہی تھیں۔ نوائے وقت اور روزنامہ مشرق میں میری شاعری اور بھی یقیناً پھوپی جان کی نظر پڑتی ہوگی۔ بہرحال دونوں میں سے کسی نے اس سلسلے میں مجھے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ زدیا اب کم کم ہی صحن میں نظر آتی تھی۔ میں بھی کچھ کھچا کھچا سا رہتا تھا۔

اپنے اندر کی بے چینی کو کم کرنے کے لیے میں نے شاعری کے ساتھ ساتھ کچھ مزاحیہ تحریریں بھی لکھنا شروع کردیں۔ یہ مختصر مزاحیہ تحریریں ایک خاص عنوان کے تحت نوائے وقت کے ایک ایڈیشن میں ہر ہفتے شائع ہونے لگیں۔ قارئین نے انہیں پسند کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ میں یہ تحریریں اپنے نام کی بجائے زدیا کے نام سے بھیج رہا تھا۔

خط والے بے ہودہ واقعے کے بعد وہ اب کچھ نارمل ہو گئی تھی اور مقررہ اوقات میں اکثر و بیشتر صحن میں نظر آنے لگی تھی۔ ایک دن میری وہ ہفتہ وار تحریر چھپی تو میں نے دور سے اسے اخبار دکھایا اور جیسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ آج کا اخبار دیکھے۔ پتا نہیں کہ وہ سمجھ پائی یا نہیں۔ اس کا ردِعمل بہت موہوم ہوتا تھا۔ خواہش یہی تھی کہ وہ اخبار پڑھے اور اس میں اپنا پورا نام دیکھ کر اس کا دھیان میری طرف جائے۔

میرے محترم دوست بیدار سرمدی صاحب کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مزاحیہ کالم نما چیز میں لکھتا ہوں۔ معروف ادیب عطاالحق قاسمی ان دنوں غالباً ادبی ایڈیشن کے انچارج تھے۔ ایک دن انہوں نے بیدار سرمدی سے کہا۔ "یار! یہ زدیا کون ہے؟ کافی اچھا لکھ رہی ہے؟"

بیدار سرمدی نے زیرِلب مسکرا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

یہاں میں اپنی تمام تر قلبی واردات کو کھل کر بیان کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ پڑھنے والوں کو کچھ باتیں غیر ضروری اور عجیب لگیں، مگر میری آئندہ زندگی کے نشیب و فراز سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ کئی بار جی میں آیا کہ میں زدیا کے دونوں بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ علیک سلیک شروع کروں مگر اس ارادے کو کبھی عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ہاں وہ انوکھا سا سلسلہ ضرور جاری رہا کہ سرِراہ جاتے ہوئے دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ میری نظروں کا ملنا اور دونوں طرف ایک ہلکی سی مسکان چہروں پر آجاتا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ دونوں بھائیوں میں سے چھوٹے زیادہ نرم مزاج ہیں اور ان کی مسکان بھی زیادہ واضح ہوتی ہے۔ وہ ڈاکٹر بن رہے تھے۔

ان دنوں میری سوچیں عجیب عجیب رنگ اختیار کر رہی تھیں۔ آج سوچتا ہوں تو خود پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ شاید میں اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے عمل سے گزر رہا تھا اور اپنی رومانی ناکامی سے گھبرا کر کچھ بہت اعلیٰ کر دکھانے کا سوچتا تھا۔ کسی روز میں بیٹھے بیٹھے تہیہ کرلیتا کہ بہت بڑا مزاح نگار بنوں گا۔ پریم چند اور مشتاق یوسفی جیسے ناموں کی ایسی تیسی کردوں گا۔ میں ڈائری میں باقاعدہ تاریخ درج کرتا کہ آج سے باقاعدہ اس عظیم سفر کا آغاز کرتا ہے۔ میں طنز و مزاح کی کتابیں ڈھونڈتا، مزاح نگاروں کے حالات زندگی پڑھتا اور کچھ مزاحیہ تحریریں لکھتا بھی مگر پندرہ بیس روز بعد یہ شوق اچانک جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ دھیان محمد علی

کلے کی عظیم الشان کامرانیوں کی طرف چلا جاتا۔ دل کو سمجھاتا کوئی ضروری نہیں کہ تھوڑی سی لمبی ناک اور قدرے دبلے جسم کا شخص عالمی ریٹنگ کا باکسر نہیں بن سکتا۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ہینڈ بیگ اور دستانے وغیرہ خریدے جاتے۔ عاطف کے علاوہ ایک دو اور دوستوں کو بھی باکسنگ کا شوق چرایا تھا۔ وہ بھی ساتھ مل جاتے۔ دو چار ہفتے صبح سویرے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ دوڑیں لگتیں۔ ہینڈ بیگ کی دھنائی ہوتی، شیڈو باکسنگ وغیرہ کی جاتی۔ پھر درمیان میں کہیں نزلہ بخار آجاتا یا موسم کوئی رکاوٹ کھڑی کر دیتا۔ بیٹھے بٹھائے باکسنگ سے دل اچاٹ ہو جاتا..... سوچتا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں..... باکسنگ میں تو حبشی کسی کو آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ زبردست قسم کا یوٹرن لیتا اور طبع نہایت جوش و خروش کے ساتھ اداکاری کی طرف مائل ہو جاتی۔

بند کمرے میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مکالمے بولے جاتے۔ گانوں پر "لپ سنگ" کی جاتی اور کسی معروف اداکار کی چال ڈھال اپنائی جاتی۔ تمام تر توجہ فلم اور ٹی وی کے پروگرامز پر مرکوز ہو جاتی..... تاہم دس پندرہ روز بعد پھر طبیعت میں ایک ابال آتا۔ ٹی وی پر اور اخبارات میں ذوالفقار علی بھٹو یا کسی دوسرے سیاسی لیڈر کی شان و شوکت دیکھ کر خیال آتا کہ کیوں نا اپنی پسماندہ قوم کو ایک نہایت ذہین و کارگر سیاسی لیڈر کا تحفہ دیا جائے۔

ڈائری پر اس نئے عزم کی باقاعدہ تاریخ لکھی جاتی۔ کمرے کی دیواروں پر سے ایتابھ بچن اور وحید مراد وغیرہ کے پوسٹر اتار کر قائداعظم اور لیاقت علی خان کی تصویریں آویزاں کر دی جاتیں۔ پولیٹیکل سائنس کی کتاب کو سینے سے لگایا جاتا اور آناً فاناً سیاسیات میرا محبوب ترین مضمون بن جاتا۔

بے حد سیلانی دور تھا۔ کہیں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ بس یہی سوچ ذہن میں تھی کہ کچھ کر گزروں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ کہیں وہ چاندنی نکھرنے والا چہرہ کسی تاریک بادل کے پیچھے اوجھل نہ ہو جائے۔

اداکاری کے ذکر سے یاد آیا کہ کالج میں صوفی نثار ہمارے، سیاسیات کے استاد تھے۔ وہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے فرزند تھے۔ دلچسپ شخصیت تھے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی طرح ان کے بال بھی صرف سر کے عقبی حصے میں ایک سفید جھالر کی طرح موجود تھے۔ اعلیٰ ادبی ذوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ وہ پی ٹی وی پر باقاعدگی سے ڈرامے لکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی مجھے بھی ان کے ساتھ پی ٹی وی لاہور اسٹیشن کی عظیم الشان عمارت میں جانے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ میں کالج سے انہیں اپنے ویسپا اسکوٹر پر بٹھاتا اور ٹی وی اسٹیشن پہنچ جاتا۔ ان دنوں پی ٹی وی، نظم و ضبط، شائستگی اور کارکردگی کی اعلیٰ مثال تھا۔ مجھے ایک واقعہ آج بھی یاد ہے۔ صوفی نثار صاحب کے لکھے ہوئے ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ ڈرامے کا نام غالباً "ٹیڑھی کھیر" تھا اور ڈائریکٹر، پروڈیوسر تھے بارعب یادر حیات۔ سب کرسیوں پر بیٹھے مکالمے دہرا رہے تھے..... اور یادر صاحب کی ہدایت پر ایکسپریشن وغیرہ بھی دے رہے تھے۔ سونا چاندی کے جانے پہچانے اداکار حامد رانا ابھی اتنے معروف نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا مکالمہ بولتے ہوئے کہیں کوئی زیادہ "پاز" دے دیا اور شاید "جسٹر" میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کی۔ یادر حیات گرجے اور حامد رانا یوں سہم گئے جیسے چھوٹی کلاس کا بچہ استاد کی ڈانٹ پر سہمتا ہے۔ مجھے یاد ہے مقبول ٹی وی اداکارہ طاہرہ نقوی بھی اس ڈرامے کی ریہرسل میں موجود تھیں۔ ان کا رنگ بھی یادر صاحب کی گرج پر زرد پڑ گیا (طاہرہ نقوی بعد ازاں جواں عمری میں ہی بیماری کے سبب وفات پا گئی تھیں) یہ ان اداکاروں کی بھی بڑائی تھی کہ اپنے سینئرز کا احترام کرتے تھے اور ان سے سیکھنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔

ایک دن صوفی نثار صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم اداکاری کی طرف کیوں نہیں آتے؟

میرے جواب دینے سے پہلے ہی انہوں نے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ "ٹیسٹ کب ہو رہا ہے؟"

ملازم نے کوئی تاریخ بتائی، جواب میں صوفی صاحب نے تحکم سے کہا۔ "اس کا نام لکھو اور ٹائم بتاؤ۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ فطری جھجک اور شرمیلا پن آڑے آیا۔ تین چار روز سوچتا رہا کہ پتا نہیں ٹیسٹ میں کیا ہوگا تاہم یہ اندیشے غلط نکلے۔ ٹیسٹ کے روز کوئی اداکاری وغیرہ نہیں کروائی گئی۔ فقط لکھے ہوئے مکالمے بلوائے گئے اور تلفظ وغیرہ دیکھا گیا۔ کم و بیش ڈھائی سو لڑکے لڑکیاں وہاں موجود تھے۔ نتیجے میں صرف پانچ چھ امیدوار پاس ہوئے اور حیران کن طور پر ان میں ایک نام میرا بھی تھا۔

آناً فاناً پی ٹی وی اداکار کے طور پر میرا کارڈ بھی بن گیا۔ کارڈ پر میری اسٹائلش سی تصویر بھی چسپاں تھی۔ اب

ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ سب کچھ ہونے میں میری صلاحیت کو کتنا دخل تھا اور صوفی نثار صاحب کے اثر ورسوخ کو کتنا؟

جی چاہا کہ ابھی اسکوٹر بھگاتا گھر جاؤں، چھت پر چڑھوں اور دور ہی سے زویا کو یہ کارڈ دکھاؤں اور پھر چلا کر سب کے سامنے یہ اعلان کروں کہ فن کاری کے آسمان پر ایک نیا ستارہ طلوع ہو چکا ہے..... عنقریب اس ستارے کی چمک دمک کے سامنے، قوی خان، راحت کاظمی اور سلیم ناصر جیسے لوگ پانی بھرتے نظر آئیں گے۔

اگلے چند روز یہی سوچتے گزر گئے کہ کیا کردار ملے گا؟ اس میں کیسے رنگ بھروں گا۔ کیا جوہر دکھاؤں گا۔ پانچویں چھٹے روز صوفی نثار صاحب کے ساتھ اسکوٹر پر پی ٹی وی اسٹیشن پہنچا تو صورتِ حال کافی مختلف نکلی۔ ڈراما ٹیڑھی کھیر کی ہی ریہرسل چل رہی تھی۔ یاور حیات صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بڑا مؤدب سا ماحول تھا۔ صوفی نثار صاحب نے یاور صاحب کو میری طرف متوجہ کیا اور کہا کہ بچے کو کوئی کردار دیں۔ انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پیغام تھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے تھے..... بھئی شکل وصورت اچھی ہے، لیکن شروع شروع میں بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔ بالکل معمولی کردار ادا کرنا پڑتے ہیں اور اکثر تو معمولی بھی نہیں ملتے۔

انہوں نے اپنے اسسٹنٹ سے دھیمے لہجے میں کچھ کہا۔ اسسٹنٹ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''ایک ملازم لڑکے کا کردار ہے۔ مالک کو پنکھا وغیرہ بھی جھلنا پڑے گا۔ کرلو گے؟''

میں جو جاوید شیخ کے چھوٹے بھائی یا قوی خان کے بڑے بیٹے جیسے کردار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ ہر کام کے لیے قدرت کی طرف سے کچھ لوگ منتخب ہوتے ہیں، اور ہر منزل کے لیے سفر سے بہت پہلے ہی کوئی راستہ منتخب ہو جاتا ہے۔ میری منزل کے لیے کوئی اور راست تھا جو قلم وقرطاس کی طرف جاتا تھا اور آگے جا کر تاوان کے استاد جہانی اور دیوی کے رستم سیال وغیرہ سے جاملتا تھا..... لہٰذا اس روز میں پی ٹی وی کے لاہور اسٹیشن سے باہر نکلا تو پھر اداکاری کے حوالے سے کبھی وہاں نہیں گیا۔ ہاں بعد میں جب پی ٹی وی والوں نے انسپکٹر نواز خان کی کہانیوں پر مجھ سے چند ڈرامے لکھوائے تو ایک رائٹر کی حیثیت سے وہاں ضرور جانا ہوا۔

محترم صوفی نثار صاحب سے رابطہ برقرار رہا۔ ان کے حوالے سے ایک اور چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا۔ ان کی رہائش سمن آباد کے علاقے میں تھی۔ وہ وہاں اپنے والد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دن ان کے گھر گیا۔ صوفی تبسم کافی ضعیف ہو چکے تھے اور مزاج میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ بھی آ چکی تھی۔ یعنی ان کا تخلص ''تبسم'' ان سے تقریباً جدا ہو چکا تھا۔

صوفی نثار دوسرے کمرے میں تھے۔ میرے سامنے انہوں نے غصے سے آواز دی۔ ''اوئے نثار!''

نثار صاحب کی عمر بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ پروفیسر تھے۔ بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ کندھے جھک چکے تھے۔ وہ جلدی سے اندر آئے۔ ''جی ابا جی۔'' انہوں نے ادب سے کہا۔

پنجابی میں بولے۔ ''یہاں میں نے کھنڈ (چینی) رکھی تھی۔ کہاں گئی ہے وہ پیالی؟ کتنی بار کہا ہے تم سے، میری چیزیں اِدھر اُدھر نہ کیا کرو۔''

صوفی نثار صاحب نے جلدی سے ہاتھ چلایا اور ایک کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے چینی والی پیالی نکال کر والد کے سامنے رکھی۔ ''یہ لیں ابا جی۔ ادھر ہی تھی۔''

پھر وہ سر جھکا کر جلدی سے باہر نکل گئے۔ ایک بہت بوڑھے باپ نے بڑے مان سے اپنے بوڑھے بیٹے کو ڈانٹا تھا اور بیٹے نے بڑے تحمل اور ادب سے یہ ڈانٹ سنی تھی۔ فی زمانہ رشتوں کا یہ احترام مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اس واقعے کے کچھ ہی عرصہ بعد انتقال کر گئے تھے۔ یوں تو ان کی دوامی شہرت کے کئی حوالے ہیں۔ تاہم ان کی نظم ''ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی'' کئی نسلوں کے ذہنوں پر نقش ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے پوتے اور صوفی نثار کے بیٹے ڈاکٹر جاوید کے ساتھ میری گہری دوستی رہی۔ کالج کے زمانے میں ہم جاوید کو ٹونی کہتے تھے۔ اس زمانے میں آڈیو کیسٹ کا دور دورہ تھا۔ جاوید کے ساتھ مل کر میں نے دو تین دلچسپ کیسٹ کہانیاں بھی بنائیں اور مشغلے کے طور پر انہیں محدود پیمانے پر فروخت بھی کیا۔ معروف ریڈیو آرٹسٹ شوقیہ ظہیر کے علاوہ ایک دو اور فنکاروں نے بھی ریکارڈنگ میں حصہ لیا۔

ایک روز میں اور صوفی نثار صاحب اسکوٹر پر سوار اسلامیہ کالج سے نکلے..... راستے میں مجھ سے کہنے لگے۔ ''چلو طاہر، رائل پارک کی طرف چلو۔''

میں کشاں کشاں لکشمی چوک کی بھیڑ بھاڑ سے گزر کر

رائل پارک پہنچ گیا۔ صوفی صاحب کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ مجھے ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے روکا۔ شفیق لہجے میں بولے۔ ''تھوڑی دیر انتظار کرلو گے؟''

میں نے خوش دلی سے سر ہلایا اور ویسپا اسکوٹر کو بڑے اسٹینڈ پر کھڑا کر کے اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ وہ ذرا تناؤ کی سی کیفیت میں عمارت کے اندر چلے گئے۔ مگر بجب قریباً دس منٹ بعد واپس آئے تو بہت خوش تھے، چہرہ سرخی مائل تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ بس انہیں لے کر چل دیا۔ راستے میں کہنے لگے۔ ''پتا ہے کس سے ملنے گیا تھا؟''

میں نے نفی میں جواب دیا۔

بولے۔ ''اسلم ڈار کا نام تو سنا ہوگا؟ بڑا ہدایتکار ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''انہیں فلم کی کہانی سنا رکھی تھی۔ انہیں پسند آگئی ہے۔ ایگریمنٹ بھی ہوگیا ہے۔ 5 ہزار ایڈوانس دیا ہے انہوں نے، پتا ہے میں نے کیا نام رکھا ہے فلم کا؟'' پھر خود ہی جواب دیا۔ ''کل کل میرا ناں..... منور ظریف لیڈ رول کرے گا۔'' (یہ فلم بنی اور ٹھیک ٹھاک کامیاب بھی ہوئی)

صوفی نثار صاحب اپنے بھائیوں میں غالباً پہلے یا دوسرے نمبر پر تھے۔ رنگ سرخ و سپید، سفید بال سر پر بس جھالر کی صورت میں ہی باقی تھے۔ کچھ دانت جھڑ چکے تھے۔ مسکراتے کم ہی تھے مگر جب مسکراتے تھے ایک معصومیت سی چہرے پر بکھر جاتی تھی۔ مزاح بہت اچھا لکھتے تھے۔ ان دنوں آج کے معروف اداکار محمود اسلم صوفی نثار صاحب کے شاگردوں میں تھے اور صوفی صاحب کے لکھے ہوئے ایک مشہور اسٹیج ڈرامے ''شیطان'' میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے۔

کسی ہال میں اس اسٹیج ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ میں بھی وہاں صوفی صاحب کے ساتھ ہی موجود تھا۔ ایک ادلڈ کریکٹر کو پانی والا لوٹا پکڑ کر لنگڑاتے ہوئے اسٹیج پر سے گزرنا تھا۔ ہدایتکار نے بہت کوشش کی مگر اداکار کی وہ لنگڑاہٹ والی چال کسی کو پسند نہ آئی۔ بالآخر صوفی زچ ہو کر اپنی کرسی سے اٹھے۔ لوٹا پکڑا اور اداکار کو خود چل کر دکھایا۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس دن اس بات کی حقیقت سمجھ میں آئی کہ ایک فکشن رائٹر کے اندر ہی اداکار بھی چھپا ہوتا ہے اور شاید تدوین کار اور ہدایتکار بھی۔

صوفی نثار صاحب دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ عمر نے مہلت نہ دی ورنہ ان کے کریڈٹ پر اور بھی کئی سپرہٹ ڈرامے اور فلمیں ہوتیں۔ والد کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔

ٹیلی وژن کی آمد کو اباجی نے آہستہ آہستہ قبول کرلیا تھا۔ پی ٹی وی کے پروگرامز میں انہیں انگلش اور اردو خبروں میں دلچسپی ہوتی تھی۔ (اس روداد میں جہاں جہاں میں نے اباجی کا لقب استعمال کیا ہے، اس سے مراد حقیقی والد ہی ہیں) اباجی کبھی کبھی کھیلوں کے پروگرام بھی دیکھتے تھے خاص طور سے محمد علی کلے کے مقابلے کے دن تو وہ آفس سے بھی چھٹی لے لیتے تھے۔ باکسنگ کا عالمی چیمپئن محمد علی کروڑوں دلوں کی دھڑکن تھا۔ ویت نام کی جنگ میں شرکت نہ کرنے کی پاداش میں اس کے کیریئر کے بہترین چار پانچ سال پابندی کی نذر ہو چکے تھے۔ اب وہ پھر میدان میں تھا اور پاکستان میں بھی ان گنت لوگوں کی محبتیں اور دعائیں سمیٹ رہا تھا۔ مجھے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم نے بڑے اشتیاق سے ٹی وی پر محمد علی اور جوفریزر کا مقابلہ دیکھا تھا اور بالکل غیر متوقع طور پر محمد علی ہار گیا تھا۔ غالباً اس کے جبڑے میں فریکچر بھی ہوگیا تھا۔ پورے پاکستان میں سوگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ بے شمار گھروں میں چولہے ٹھنڈے رہے تھے۔ مجھے یہ صدمہ بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسا کچھ عرصہ پہلے سقوط ڈھاکا کا صدمہ تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آنے کے بعد ملک میں بہت سی تبدیلیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ سوشلزم کو بہت پروجیکشن مل رہی تھی۔ مختلف قسم کی آزادیاں بھی معاشرے میں نمو پا رہی تھی۔ طلبا کے لیے سفر قریباً مفت کر دیا گیا تھا۔ شلوار قمیص پر مشتمل عوامی سوٹ رواج پا رہا تھا۔ فلم سنسر بورڈ بھی نرمیاں برت رہا تھا۔ ٹی وی پروگرامز کے آغاز میں ہی مولانا کوثر نیازی اسکرین پر نمودار ہو جاتے تھے۔ غلام مصطفیٰ کھر، پنجاب کے گورنر بن چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد مصطفیٰ کھر کے دور میں ہی پولیس کے خلاف طلبا کے ایجی ٹیشن نے بہت زور پکڑا۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ میرا پھوپی زاد دوست شعیب ایم اے او کالج لاہور میں تھا۔ وہ روز آکر مجھے پولیس کے خلاف مظاہروں کی روداد سناتا تھا۔ کالج کے اسٹوڈنٹ چھت پر چڑھ جاتے تھے اور وہاں

پولیس کے خلاف خوب نعرہ بازی کرنے کے علاوہ خشت باری بھی کرتے تھے۔ شعیب روز مجھے دعوت دیتا تھا کہ میں بھی اس کے کالج آؤں اور اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کے علاوہ انجوائے بھی کروں۔

شاید وہ دو تین روز مزید اصرار کرتا تو میرا پروگرام بھی بن ہی جاتا۔ مگر ہوا یوں کہ اگلے روز ایم اے او کالج کے باہر موجود پولیس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ اوپر سے ہدایات آئیں اور پولیس کی بھاری جمعیت غضب ناک ہوکر کالج میں گھس گئی۔ انہوں نے کئی دنوں کی بھڑاس بڑے احسن طریقے سے طلبا پر نکالی۔ طلبا کی خوب ٹھکائی ہوئی۔ انہیں کالج کے کونوں کھدروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا گیا۔ ان کی قمیص پھاڑ دی گئی۔ پتلونوں کی زپیں (Zips) توڑ دی گئیں۔ شعیب بھی گرفتار ہوا اور کوٹ لکھپت جیل پہنچ گیا۔ اگلے روز گرفتار شدگان کو پولیس ٹرک میں بھر کر عدالت میں پیش کرنے لے جایا جارہا تھا کہ چوبرجی کے قریب ٹرک الٹ گیا۔ جس طرح الٹ جانے والی ٹریکٹر ٹرالی میں سے تربوز، خربوزے وغیرہ لڑھک کر بکھر جاتے ہیں اسی طرح لوگوں کے فوری مشورے پر گرفتار طلبا بھی تتر بتر ہوگئے۔ شعیب اور اس کی طرح کے دو تین شریف النفس پھر بھی کھڑے رہے (کہ آخر قانون پسندی بھی کوئی چیز ہوتی ہے) اردگرد کے لوگوں نے انہیں دھکے مار کر بھگایا کہ کیوں دوسروں کا غصہ بھی اپنے اوپر اتروانا چاہتے ہو، بھاگ جاؤ۔''

شعیب کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گھر آیا اور قریبی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا رہا کہ کہیں پولیس اس کے پیچھے یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ خوف سے برا حال تھا۔ آخر کسی نے اسے دیکھ لیا اور گھر لایا۔ اسے نہلا دھلا کر فوراً گلبرگ میں اس کی خالہ کے گھر شفٹ کردیا گیا۔ جہاں اس نے کئی ہفتے تک ''جلاوطنی'' جیسے شب و روز گزارے..... لڑکپن اور نوجوانی کے ایسے کھٹے میٹھے واقعات ہی ہوتے ہیں جو بعدازاں دلچسپ یادوں کی صورت اختیار کرجاتے ہیں۔

میں یہ کھٹے میٹھے واقعات اور زویا کی روداد لکھ رہا ہوں اور ساتھ ساتھ سوچ رہا ہوں کہ جب یہ سب کچھ نوجوان اور نئی پود کے وہ قاری پڑھیں گے جن کا میرے ساتھ احترام اور عزت کا رشتہ ہے تو ان کو برا تو نہیں لگے گا؟

ایسا سوچتے ہوئے ایک بزرگ کی بات یاد آجاتی ہے جو انہوں نے ٹمبر شاپ میں مجھے دیکھ کر کہی تھی۔ عام سے لہجے میں بولے تھے۔ ''دل شل بھی لگایا ہے یا نہیں کسی لڑکی سے؟''

میں بری طرح شرمایا۔ گڑبڑا کر کہا۔ ''لڑ..... لڑکی سے؟''

''تو دل لڑکی سے ہی لگاتے ہیں نا۔'' انہوں نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ''اور لگانا ہو تو اسی عمر میں لگالیتے ہیں۔ پندرہ بیس سال بعد لگاؤ گے تو مشکلات ہوں گی اور شرم بھی زیادہ آئے گی۔'' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے تھے۔ ''اخلاق کے دائرے میں رہ کر اس عمر میں کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں ہوتی۔''

انہی دنوں آداب عرض کی یادگار کہانی ''غلش'' کے ''متاثرین'' میں سے ایک متاثرہ لڑکی نے مجھے کوئٹہ سے خطوط لکھنے شروع کردیے۔ بے شک وہ اپنے مزیدار خطوط میں میرے لیے بھائی جان کا لقب استعمال کرتی تھی، مگر تحریر میں ایک دلچسپ بے تکلفی ہوتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میری طرف سے بھی کچھ اضافی بے تکلفی دکھائی جاتی یا اشاروں کنایوں میں کچھ باتیں کہی جاتیں تو یہ خط و کتابت کوئی اور رنگ اختیار کرلیتی۔ مگر میری سوچوں کا محور تو صرف اور صرف وہ محبوب صحن تھا جہاں گندمی رنگ اور لمبے بالوں والی زویا ایک روشن لکیر کی طرح چمکتی تھی اور اوجھل ہوتی تھی۔

خطوط والی اس لڑکی کا نام عندلیب تھا۔ وہ مجھے مزید کہانیاں لکھنے کا مشورہ دیتی، میرا حوصلہ بڑھاتی..... مجھے اس کی باتیں اچھی لگتیں۔ اس کے خط کا انتظار رہتا۔ خط آتا تو میں بڑے اہتمام سے اودی رنگ میں اس کا جواب لکھتا۔

ایک روز میں اپنی ٹمبر شاپ پر تھا..... کیونکہ کبھی کبھی مجھے اب کالج سے آنے کے بعد تایا جان کا ہاتھ بھی بٹانا پڑتا تھا۔ ان دنوں وہ ویسے بھی حج پر گئے ہوئے تھے۔ مجھ پر اور ایک ''دیرینہ ملازم'' پر کام کا کافی بوجھ آن پڑا تھا۔ میں پسینے میں شرابور آرا مشین کے قریب کھڑا کسٹمرز سے بات کررہا تھا جب کشادہ سڑک کی دوسری جانب میری نگاہ دو لڑکیوں پر پڑی۔ مجھے لگا کہ وہ ہمارے اسٹور کی طرف بلکہ میری ہی طرف دیکھ رہی ہیں۔ شاید میں انہیں مزید غور سے دیکھتا اور ان کی وہاں موجودگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں دو کسٹمرز نے مجھے گھیر لیا اور میرا سارا دھیان ان کی طرف چلا گیا۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلوں، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھوں
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھوں

معروف قلم کار کی خود بیتی کا چوتھا حصہ جو خود میں منفرد ہے

چند روز بعد کوئٹہ سے عندلیب کا جو خط ملا اس میں اس نے انکشاف کیا کہ جو دو لڑکیاں اس روز ملتان روڈ کے دوسرے کنارے پر کھڑی تھیں... ان میں سے ایک وہ خود تھی۔ وہ مجھے بس ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ (شاید ملنا بھی چاہتی ہو لیکن میری گونا گوں مصروفیت دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے ارادہ بدل دیا ہو۔ غالباً وہ لوگ لاہور میں اپنے کسی عزیز کے پاس آئے ہوئے تھے)

عندلیب سے خط و کتابت پھر بھی جاری رہی... پھر یوں لگا کہ آہستہ آہستہ اس کی دلچسپی کم ہوگئی ہے۔ وجہ یقیناً یہی تھی کہ میرے جواب ایک ہی طرح کے ہوتے تھے۔ ان میں کسی طرح کی رومانی پیش رفت نہیں ہوتی تھی..... ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس حوالے سے میرے دل و دماغ تو کہیں اور محصور تھے۔ دوسری طرف وہ بھی یقیناً بہت شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس نے کہیں بھی اپنی سوچ اور اپنے قلم کو پھسلنے نہ دیا۔ میں نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی لیکن خوش رنگ کاغذوں پر لکھے ہوئے خطوط ابھی تک ذہن میں چمکتے ہیں۔ یقیناً زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے آس پاس ہونے کے باوجود ہم سے کبھی ملتے نہیں لیکن ہماری یادوں کے کسی نہ کسی گوشے میں موجود رہتے ہیں۔ کوئٹہ کی وہ ''الفاظ گر'' اور خوش خط لڑکی عندلیب بھی ان میں سے ایک ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی زویا کی..... اور ''وقت'' کی جو خشک ریت کی طرح میری مٹھی سے پھسلتا جا رہا تھا۔ بس سب کچھ ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ بس ایک صحن تھا، ایک روشن لکیر تھی اور ان دونوں چیزوں سے کچھ فاصلے پر منڈیر پر لٹکا ہوا ایک اداس اور لاچار ''پرندہ'' تھا۔

ایک دن اس پرندے کے دوست نے اس کے پر بری طرح جھاڑ دیئے۔ میرا مطلب اپنے دوست ناصر سے ہے۔ اس نے میرے خوب لتے لیے۔ کم ہمتی، بزدلی اور بیوقوفی کے طعنے دیئے۔ اپنے رومانس کی دھواں دھار مثالیں پیش کیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں نے جرأت نہ دکھائی تو وہ سارے ہم عمر دوستوں میں میرا ڈھنڈورا پیٹ دے گا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے مجھے زویا کے پیچھے کالج جانے اور اس سے ہیلو ہائے کرنے پر آمادہ کر لیا۔

صبح سویرے میں نے اپنی بہترین پینٹ قمیص پہنی۔

مجھے اپنی ٹانگیں کچھ پتلی محسوس ہوا کرتی تھیں، انہیں تھوڑا سا فربہ دکھانے کے لیے پینٹ کے نیچے ایک اور پینٹ بھی پہن لی۔ بالوں کو خوب اچھی طرح سیٹ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ زویا کے گھر سے اس کا پیچھا کرتا ہوا سمن آباد موڑ کے بس اسٹاپ تک جا پہنچا۔ اس وقت ذہن سے یہ بات محو ہوگئی تھی کہ ایسی حرکتیں کبھی کبھی گلے میں بھی آجاتی ہیں۔ ناصر معاون خصوصی کے طور پر میرے ساتھ تھا مگر مجھ سے پندرہ بیس قدم دور تھا۔

زویا سفید براق لباس والی دیگر لڑکیوں کے ساتھ بس میں داخل ہوئی اور ہم دونوں بھی ہوگئے۔ بس کے اگلے حصے میں خواتین کے پارٹیشن ہوا کرتی تھی۔ جالیوں میں سے زویا کو دیکھتا اور آنکھیں سیراب کرتا رہا۔ لگا کہ ایک پنجرے میں ہوں اور وہ تماشائی ہے' لیکن شاید تماشائی کوئی نہیں تھا۔ دونوں ہی علیحدہ علیحدہ پنجروں میں تھے۔

زویا بس سے اتر کر دوسری لڑکیوں کے ساتھ گرلز کالج کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں اس سے بس چند قدم پیچھے تھا۔ ناصر بار بار مجھے غصیلے اشارے کررہا تھا کہ میں ''ہیلو ہائے'' کروں۔

ہیلو اور ہائے دونوں لفظ لکڑی کے دو گولوں کی طرح میرے حلق میں اٹک گئے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر بولوں گا تو ہیلو تو شاید نہ نکلے بس ''ہائے'' ہی نکلے گا۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی کہ زویا سے بس اتنا پوچھ لوں کہ اس نے پانچ چھ ماہ گزرنے کے باوجود ابھی تک میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟

یہ فقرہ ''آپ'' سے شروع ہوتا تھا اور ''آپ'' ہی منہ پر نہیں چڑھ رہا تھا تو باقی کے الفاظ کیا ادا ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا گیٹ آگیا اور وہ خراماں خراماں اندر چلی گئی۔

بعد ازاں ناصر نے سڑک پر ہی مجھے خوب کوسا۔ اس نے کہا۔ ''تم کبھی کچھ نہیں کرسکو گے۔ بس اسی طرح ساری زندگی اپنی چھت کی منڈیر پر لگے رہو گے۔''

''یار! نہیں ہوتا مجھ سے۔'' میں نے روہانسا ہوکر کہا۔

وہ بولا۔ ''ایک نمبر کے احمق ہو تم۔ کھوتے اوہ خود چاہ رہی تھی کہ تم کچھ بولو، کچھ کہو۔ دیکھ نہیں رہے تھے کیسے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ہر جانے کے طور پر رات کو ناصر کے ساتھ سوئٹ شاپ پر جانا پڑا۔ ہم دونوں یہاں سردیوں میں گاجر کا حلوا اور گرمیوں میں رس ملائی کھاتے تھے۔ ناصر کو رس ملائی کھلائی۔ رس ملائی کھاتے کھاتے نجانے میرے ذہن میں کیا آئی۔ میں نے کہا۔ ''یار جب بھی..... ایک ہفتے بعد، ایک مہینے بعد یا پھر ایک سال بعد، جب بھی زویا میرے خط کا جواب دے گی میں تمہیں رس ملائی کھلاؤں گا..... اور جتنی بھی کھانا چاہو گے اتنی۔''

وہ بولا۔ ''کچھوے کی چال ہے اور باتیں بھی کچھوں جیسی کرتے ہو۔ ہفتوں، مہینوں کی سوچ دماغ میں نہ لاؤ۔ دنوں کی بات کرو۔ پھر کالج میں چھٹیاں ہوجاتی ہیں۔ یہ سات آٹھ دن ہی ہیں تمہارے پاس۔ کل تو جمعہ ہے۔ پرسوں پھر چلیں گے اس کے پیچھے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے روز جمعہ تو آیا لیکن میرے لیے زیادہ مبارک ثابت نہیں ہوا۔ میں اپنے سلور کلر ویسپا اسکوٹر پر سن گلاسز لگائے ٹمبر اسٹور کے گیٹ میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ سڑک کے دوسرے کنارے سے کسی نے ہاتھ ہلا کر مجھے رکنے کا کہا۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ زویا کے بڑے بھائی تھے اور تھوڑے سے سخت بھی تھے۔ وہ سڑک پار کرکے میرے پاس آئے۔ چھوٹتے ہی بولے۔ ''یہ آج کل کیا ہورہا ہے بھئی؟''

''جی، میں سمجھا نہیں۔'' میں نے لرزتے ہاتھوں سے ہینک اتاری۔

''شکل سے آپ شریف اور بھلے مانس لگتے ہو۔''

''جج..... جی۔''

''محلے داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کوئی احترام ہوتا ہے۔ کوئی خیال ہوتا ہے۔'' انہوں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ اور یک ٹک میری طرف دیکھتے رہے۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے مگر میں نے موقع نہیں دیا۔

''ٹھیک ہے جی۔'' میں نے سر جھکا کر جواب دیا اور اسکوٹر بڑھا کر ٹمبر اسٹور میں داخل ہوگیا۔ مجھے ان کی نگاہیں اپنی پشت پر چبھتی محسوس ہورہی تھیں۔

شام سے پہلے ناصر کشاں کشاں ٹمبر اسٹور پر آیا تاکہ اگلے دن کا پروگرام بنا سکے۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں نے کہا۔ ''یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ اپنی نظروں میں ہی گر گیا ہوں۔''

''فکر نٹے منہ تیرا۔'' اس نے کہا۔ ''اتنی سی بات کا

بتنگڑ بنا رہا ہے۔

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ جس طرح میں سوچتا ہوں وہ شاید اس طرح سوچتی ہی نہیں ہے... ورنہ کیوں شکایت لگاتی؟''

''تم خود ہی یہ نتیجہ نکال کر بیٹھ گئے ہو کہ اس نے شکایت لگائی ہے۔ بہت ممکن ہے ایسا ہوا ہی نہ ہو۔ اڑوس پڑوس کی ایک دو اور لڑکیاں بھی تو کالج جاتی ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے ان کے گھر میں بات کردی ہو، اس کے علاوہ بھی امکانات ہوسکتے ہیں.....''

وہ بہت کچھ کہتا رہا مگر میرا دل اسی طرح سوتکڑوں میں بٹا رہا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ اب کم از کم چھ ماہ تک تو اس صحن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ اس دل شکنی کی ایسی سزا دوں گا زویا کو کہ تڑپ تڑپ جائے گی۔ بس اس روز سے میں نے چھت کی منڈیر کو خالی کردیا۔ کمرے کی کھڑکیاں بند کردیں اور ساری توجہ تھرڈ ایئر کی اسٹڈی اور ٹمبر شاپ کی طرف کردی۔ لیکن ایک موہوم سی آس ایسی تھی جو ٹوٹ کر بھی نہ ٹوٹتی تھی۔ کئی ماہ پہلے ناصر کے کہنے پر میں نے زویا کو جو خط لکھا تھا اس پر اپنا ایڈریس بھی لکھا تھا۔ ایک قریبی دوست کے جنرل اسٹور کا یہ ایڈریس جیسے دل پر نقش ہوکر رہ گیا تھا۔ جیسے ڈوبتا ہوا شخص تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے، ایسے ہی دو تین ہفتے بعد میں اُمید کی ایک ننھی سی کرن کے سہارے اس جنرل اسٹور تک جاتا..... مگر وہ کرن ہمیشہ ہی گھٹاٹوپ اندھیرے میں بدلی..... اور مجھے مایوس واپس آنا پڑا۔

ڈیڑھ ماہ تک میں نے زویا کی طرف سے مکمل رخ پھیرے رکھا اور اس نے میری طرف سے۔ پھر جھروکوں اور پردوں کی جھریوں سے اس صحن کی طرف دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پھر سے مخصوص اوقات میں نظر آرہی ہے اور میری تلاش میں نظر دوڑا رہی ہے۔ دن بدن اس کی بے تابی کچھ بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی فتح مندی کا کچھ احساس ہوا۔

ذہن میں یہ خیال آنے لگا..... شاید ناصر درست ہی کہتا تھا۔ کالج والے معاملے کے بعد جو کچھ ہوا شاید اس میں زویا کا دخل نہ ہو۔ میری وہ بے توقیری کسی اور وجہ سے ہوئی ہو۔ اگر اس میں زویا کا قصور ہوتا تو وہ پھر سے یہ سارے معمولات شروع کیوں کرتی؟

بے شک مجھے کامیابی کا احساس ہورہا تھا مگر اصل کامیابی تو تب ہوتی ہے کہ وہ میرے قریباً ایک سال کے انتظار کے صلے میں مجھے چند سطور لکھ دیتی۔ شاید ہی کسی کے خط کے لیے کوئی اتنا ترسا ہو جتنا ترسا ہوا میں خود کو ان دنوں محسوس کررہا تھا۔

میرے فٹ بالر دوست عاطف کی رائے ناصر کی رائے سے بالکل مختلف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زویا ایک نہایت شریف پڑھے لکھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ وہ یہ سب کچھ نہیں کرسکے گی جو ناصر کی فرینڈ نبیلہ کرتی رہی ہے اور کررہی ہے۔ میں اپنے اور زویا کے تعلق کا موازنہ ناصر اور نبیلہ والے تعلق سے نہ کروں۔

عاطف کا کہنا تھا۔ ''پچھلے دو ڈھائی سال میں زویا نے شرافت اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر اپنی طرف سے تمہیں ہر وہ اشارہ دیا ہے جو دے سکتی تھی۔ تم اسے خط والے امتحان میں کیوں ڈال رہے ہو۔ وہ نہیں لکھ سکے گی، چاہے گی بھی تو نہیں لکھ پائے گی۔ تم آگے بڑھنے کے لیے مناسب طریقہ اختیار کرو۔'' اس کے دونوں بھائی تم سے فری ڈلی ہیں، خاص طور سے چھوٹا بھائی جو میڈیکل پڑھ رہا ہے۔ تم اس سے علیک سلیک شروع کرو، یا پھر اپنی پھوپی جان کو ان کی طرف بھیجو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہاری پھوپی اور خالہ تمہارے اس دیوانے پن کے بارے میں کافی کچھ جان چکی ہیں.....''

حقیقت یہی ہے کہ عاطف کی باتیں بالکل درست تھیں۔ اس نے زویا کی وارفتگی کے دو تین مناظر میرے ساتھ ہی مشاہدہ کیے تھے۔ پچھلے ساون کی وہ گھنگھور گھٹاؤں والی دوپہر اسے ابھی بھی یاد تھی جب آسمان سے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ قریباً ساٹھ میٹر دور میدان کے اس پار زویا کا گھر تھا۔ جب اس نے دیکھا تھا کہ میں دوسری منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اسے جھانک رہا ہوں تو وہ بھی اپنے گھر کی دوسری منزل کی بالکونی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ یہ بالکونی بارش کی تند و تیز بوچھاڑوں کی زد میں تھی۔ وہ کپڑوں سمیت بھیگتی رہی تھی..... کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے میرا گلا خشک ہونے لگا تھا۔ جسم کی پکار سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ کسی کو نہیں۔ اور تب عاطف بھی مجھ سے ملنے کے لیے کمرے میں چلا آیا۔ تاہم وہ کھڑکی کے سامنے نہیں آیا۔ اس نے بھی میدان کے اس پار کسی کے بھیگنے اور مسلسل میری طرف دیکھنے کے مناظر دیکھے تھے۔ وہ خاموشی کی زبان تھی اور یہ زبان کہہ رہی تھی..... یہ چند گز کا میدان

کیوں اتنا وسیع ہوگیا ہے؟ ہم اسے کیوں پار نہیں کر سکتے؟ کیا ہم اسے کبھی پار نہ کر سکیں گے؟

تو یہی مناظر تھے، ایسی ہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے عاطف کو بھی یقین تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور میری طرف سے پیش رفت کی منتظر ہے۔ مگر میں منڈیر پر بیٹھا ہوا وہ اداس پرندہ تھا جس کے سینے میں خواہشوں کا سمندر تو تھا لیکن جس کے پر کٹے ہوئے تھے۔ اب اس اداس و لاچار پرندے کو ایک اور عارضہ لاحق ہوگیا تھا اور یہ عارضہ تھا انتظار کا۔ زویا کے تحریری جواب کا انتظار ایک ''کرانک'' زہر کی طرح میرے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔

آج اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تب سراسر میں ہی غلط تھا۔ اس غلطی کی وجہ میرے آس پاس کا ماحول اور میرے خاص دوست تھے۔ میری مراد ناصر سے ہے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ صحبت کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ ایسی بات نہیں تھی کہ ناصر برا لڑکا تھا، اس میں بے پناہ خوبیاں تھیں اور جس لڑکی سے وہ پیار کرتا تھا وہ بھی جان نثار کرنے والی تھی۔ مگر ان دونوں کے محبت بھرے تعلق کا رنگ ڈھنگ مختلف تھا۔

اپنی روداد کو آگے بڑھانے سے پہلے میں ان دونوں کی روداد کا تھوڑا سا حصہ بیان کر دوں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ناصر اور نبیلہ میں خط و کتابت ''تعلق'' کے بالکل آغاز میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ نبیلہ اپنی والدہ سے بچ بچا کر ناصر کو طویل محبت نامے لکھتی تھی اور ناصر ان کے جوابات مجھ سے لکھواتا تھا۔ شاید ان ہی دنوں میں میرے اندر یہ ناروا خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ میں جس لڑکی سے پیار کروں وہ بھی اسی انداز میں محبت بھرے خطوں کے ذریعے مجھے جواب دے۔ یہ سب کچی پکی عمر کی کچ اور سوچیں تھیں۔ بدقسمتی سے میرے اردگرد دو تین اور ہم عمر دوست ایسے تھے جن کی اپنی دوست لڑکیوں سے خط و کتابت ایسے ہی زور و شور سے چل رہی تھی۔ شاید اس صورت حال نے بھی مجھے متاثر کیا اور اپنے خط کا جواب میرے لیے انا کا مسئلہ بنتا چلا گیا۔

ناصر کا ذکر شروع ہوا ہے تو ایک اور نام بھی یاد آ گیا ہے۔ فراست۔ اس فراست نامی لڑکے نے ایک مرتبہ ناصر کو مرنے سے بال بال بچایا تھا۔ ورنہ نہ ناصر ہوتا نہ نبیلہ کے ساتھ اس کی یادگار پریم کہانی ہوتی اور نہ آج میں اس کا ذکر کر رہا ہوتا۔

فراست بھی ایک مزیدار کردار تھا۔ میرے خیال میں اس کا مختصر تذکرہ کیے بغیر آگے بڑھ جانا اس کے کردار کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ فراست لاہور سے کوئی چالیس کلومیٹر دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ ہمارے نمبر اسٹور پر وزنی لکڑی ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ درمیانہ قد، مضبوط جسم، قدرے بھاری مونچھیں جو نوجوانی کے دور میں اور بھی بھاری تھیں۔ جن دنوں میں نے تایا جی کے اصرار پر نمبر شاپ پر جانا شروع کیا، فراست کی عمر کوئی تیس سال ہوگی۔ خوش اخلاق تھا، اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی لیکن اس کی ایک آنکھ میں پیدائشی نقص تھا۔ وہ ٹیڑھی تھی۔

ایک مرتبہ میں ناصر اور عاطف تینوں دوست اچھرہ نہر پر نہانے کے لیے گئے۔ چھٹی کا دن تھا اور سخت گرمیوں کا موسم چل رہا تھا۔ اتفاقاً فراست بھی وہاں نہانے کے لیے موجود تھا۔ ہم میں سے ناصر کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ بس تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں چلا لیتا تھا۔ ہم نہانے میں مگن تھے جب ہمارے عقب میں شور بلند ہوا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو دو تین توانا افراد نے ناصر کو کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور اسے نیم بے ہوشی کی سی حالت میں کنارے کی طرف لا رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھی ہمارا فراست تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا گہرے پانی میں جانے کے سبب ناصر ڈوبنے کے قریب تھا۔ دیہات میں رہنے کے سبب فراست زبردست تیراک تھا۔ اس نے ناصر کو بچا لیا۔

کام سے کچھ فرصت ہوتی تو فراست پسینے اور برادے میں سنا ہوا اکثر میرے پاس اسٹور کے دفتر میں آ بیٹھتا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ فرش پر ہی بیٹھتا اور مجھ سے باتیں کرتا رہتا۔ کبھی موج میں ہوتا تو کوئی پنجابی لوک گیت چھیڑ دیتا۔ اس کی آواز دل کو چھوتی تھی۔ اکثر مجھ سے کہتا۔ ''باؤ طاہر! تم تو کہانیاں شہانیاں لکھتے ہو، شعر بھی کہتے ہو، کسی طرح مجھے ریڈیو اسٹیشن تک پہنچاؤ۔ سچی کہتا ہوں ایک دفعہ ریڈیو والوں نے میرا گانا سن لیا نا تو بات آگے چل نکلے گی۔''

میں نے اس سے ڈھیلا ڈھالا وعدہ کر لیا تھا۔

ہماری شاپ کے سامنے کشادہ ملتان روڈ کی دوسری جانب ایک ڈبل اسٹوری رہائشی مکان تھا۔ وہاں مجھے کبھار ایک جواں سال خاتون بیٹھی نظر آتی تھی۔ گوری رنگت، لمبے بال، غالباً ایک دو چھوٹے بچوں کی ماں تھی۔ کچھ روز بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ فراست کا اس عورت سے

آنکھ مٹکا چل رہا ہے۔ فراست رات کو بھی ٹمبر شاپ پر ہی سوتا تھا۔ دوسری طرف اس عورت کا شوہر ہفتے میں ایک آدھ بار ہی لاہور میں ہوتا تھا۔

میرا اندازہ یہی ہے کہ مکان اور شاپ کے درمیان چونکہ کافی فاصلہ تھا اس لیے اس عورت کو شروع شروع میں فراست کی آنکھ کے نقص کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ بس اس کا گول چہرہ اور مضبوط سراپا دیکھتی رہی اور یہ دیکھتی رہی کہ وہ سارا دن کس طرح لکڑی کے نہایت بھاری بھرکم بلاکس کو اپنی کمر پر لاد کر ادھر سے ادھر پھینکتا رہتا ہے۔ اس کا یہی انداز، کسرتی بدن اور میٹھے لہجے نے اس عورت کو گرویدہ بنالیا تھا، وہ عورت تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مگر انہیں احساس نہ تھا کہ وہ ایک آتش فشاں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایسے رابطے قیامت ڈھا دیتے ہیں۔

پھر ایک دو بار میں نے فراست کو اس گھر کے دروازے پر بھی دیکھا۔ غالباً اس عورت نے کوئی سودا سلف منگوایا تھا جو فراست دینے گیا تھا۔ ایسے موقعوں پر میں نے اس کی آنکھوں پر کالی عینک بھی دیکھی۔ ان دنوں وہ ویسے بھی گاہے بگاہے کالی عینک پہننے لگا تھا۔ شاید وہ کالے عینک سے آنکھوں کا عیب چھپانا چاہتا ہو۔

پھر ایک دن جب وہ دفتر کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ذرا سے ٹوکنے پر اس نے خود ہی اپنی آنکھ چوٹی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''فراست! یہ ٹھیک نہیں۔ وہ بال بچوں والی ہے۔ ارد گرد والوں کو تمہارے چکر کا پتا چل چکا ہے۔''

مگر وہ تو عشق کے بحرِ بے کراں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے توجہ نہ دی، اور یہی ایک بڑی غلطی تھی۔

تین چار ماہ یہ سلسلہ جاری رہا، پھر ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب وہ عورت کھڑکی کی جالی کے عقب میں کم ہی نظر آتی تھی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ اس رومانی مزاج کی خاتون نے ہمارے فراست علی کو عینک کے بغیر دیکھ لیا ہو، اور ویسا نہ پایا ہو جیسا دور سے نظر آتا تھا یا پھر اس کے شوہر کو بھنک مل گئی ہو کہ اس کے پیچھے کوئی گھر میں آتا ہے۔

کچھ عرصے بعد وہ لوگ اس مکان سے چلے گئے۔ اس کا یوں کہیں اور منتقل ہو جانا فراست پر کوہ گراں ثابت ہوا۔ اس کے گیتوں میں سوز کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

وہ ان پڑھ ملازم تھا لیکن ..... چونکہ بالکل نوجوانی میں ہی ہمارے بڑے ابا جی (تایا جی) کے پاس آ گیا تھا۔ لہٰذا وہ اسے اہمیت دیتے تھے۔ دوسرے ملازم تو بڑے ابا جی کے ساتھ ادب سے پیش آتے تھے مگر فراست ہر ویک اینڈ کی شام کو ان کی کرسی کے پاس زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔ اور لین دین و مزدوری کے بارے میں جھگڑا شروع کر دیتا تھا۔ ہر ویک اینڈ پر مجھے یہی لگتا تھا کہ اب یہ کام چھوڑ دے گا۔ گاؤں جائے گا تو واپس نہیں آئے گا.. مگر کبھی بھی ایسا ہوا نہیں۔ نہ صرف فراست علی کی ملازمت جاری رہی بلکہ اس کے بھائیوں اور پھر بیٹوں بھتیجوں تک نے ہماری شاپ پر اور ہمارے خاندان کے دیگر کاروباری ٹھکانوں پر ملازمتیں کیں اور یہ تعلق تین نسلوں کے بعد آج بھی کسی نہ کسی طور قائم ہے۔

فراست بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ بے حد محنتی اور اپنے کنبے کا خیال رکھنے والا شخص تھا۔ کمر پر بھاری بھرکم بوجھ لادنے میں اور زمین پر پاؤں جمائے رکھنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

غلطی کس انسان سے نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ فراست سے بھی ہوئی۔ جس پر ایک عرصہ وہ بہت شرمندہ بھی رہا۔ غلطی کرنے کے کچھ عرصہ بعد جب اس کی ضمیر پر بوجھ پڑا تو اس نے خود ہی میرے سامنے اعتراف بھی کر لیا۔

وہ لکڑی کے برادے میں اٹا ہوا دفتر میں فرش پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب ہی صوفے پر نیم دراز تھا۔ کہنے لگا۔ ''باؤ طاہر! یہ جو سردیاں ابھی گزری ہیں، ان میں مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے..... بڑی غلط ہوئی ہے۔''

''کیا کر دیا ہے؟''

''زبردستی کی ہے۔ سمجھو باؤ جی! مت ہی ماری گئی تھی۔''

جو تفصیل اس نے بتائی اس سے پتا چلا کہ دسمبر کی یخ بستہ رات میں ان کے گاؤں کے ایک قریبی گاؤں سے ایک لڑکا اپنے ساتھ لڑکی کو بھگا کر لاہور لایا۔ فراست کا ایک کزن یہاں ویلڈنگ کا کام کرتا تھا۔ وہ پناہ کے لیے اس کے پاس گئے۔ وہاں اس کزن کا ایک نہایت اوباش دوست بھی موجود تھا۔ وہ دونوں لڑکے لڑکی کو فراست کے پاس لے آئے۔ لڑکی لڑکا پہلے ہی سہمے ہوئے تھے۔ انہوں نے انہیں مزید ڈرایا کہ یہ پولیس کیس ہے، وہ پولیس کو اطلاع دینے پر مجبور ہیں۔ بلیک میلنگ کا ماحول بن جانے کے بعد انہوں نے لڑکی کو اپنے ساتھ وقت گزارنے پر آمادہ

کرلیا۔

شیطان مضبوط سے مضبوط بندے کو شکار کرنے کے لیے گھات میں رہتا ہے۔ اس نے فراست کو بھی شکار کیا۔ دونوں دوستوں نے اسے مجبور کردیا کہ لڑکی چونکہ آمادہ ہے، لہٰذا وہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ کیوں نہیں دھوتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیسی آمادگی ہے مگر وہ خود کو اس تاریک ریلے میں بہنے سے بچا نہ سکا۔

مجھے یہ جان کر بے حد کوفت ہوئی کہ میں جس جگہ بیٹھ کر یہ روداد سن رہا ہوں، اسی جگہ اس نامعلوم لڑکی کے ساتھ برا ہوا ہے۔

کئی ہفتے تک میں نے فراست سے بات نہیں کی۔ وہ بھی گم صم رہتا تھا۔ ان دنوں میں نے دیکھا کہ وہ کبھی کبھی نماز بھی پڑھنے لگا ہے۔ پھر ہمیشہ ننگے پاؤں چلنے والے ایک مقامی فقیر سے اس کو عقیدت ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نماز پڑھنے والا سلسلہ بھی دھیرے دھیرے معدوم ہوگیا۔

گلوکاری کا شوق برقرار تھا اور یہ تقاضا بھی کہ میں اسے کسی دن ریڈیو اسٹیشن لے جاؤں گا اور متعارف کراؤں گا۔ مجھے بھی اُمید تھی کہ شاید ایک دن ایسا آئے گا جب میں ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن پر جاسکوں اور فراست علی کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور واقعی ایسا ہوا بھی جب میں نے پی ٹی وی کے لیے چند ڈرامے لکھے اور میرا وہاں آنا جانا ہوا۔ علی اکبر عباس، جمیل کشکوری اور پروڈیوسر محمد عظیم جیسے لوگوں سے روابط پیدا ہوئے مگر افسوس تب تک مدھر آواز والا وہ گمنام فن کار اس دنیا میں نہیں تھا۔

گرمیوں کی طویل دوپہروں میں جب بازار میں سناٹا تھا۔ میں فراست علی اور دو دیگر ملازموں کے ساتھ بے تکلفی سے نمبر اسٹور کے عقبی احاطے میں کرکٹ کھیلتا۔ یہ کرکٹ شیڈ تلے چونکہ محدود جگہ پر ہوتی تھی اس لیے پرانے کپڑے کو سی کر اس کا گیند بنایا جاتا تھا۔ فراست کو باؤلنگ کا بے حد شوق تھا۔ کبھی کبھی بال پھینکنے کے بعد میری طرف تعریف طلب نظروں سے دیکھتا اور پوچھتا۔ ''باؤ طاہر! میری باؤلنگ گارنر سے ملتی جلتی ہے نا؟'' ان دونوں ویسٹ انڈیز کے بالرز جیول گارنر اور مائیکل ہولڈنگ کا بہت چرچا تھا۔

فراست کے معصوم سوال پر میرا جواب اثبات کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ ویک اینڈ پر بڑے ابا جی سے فراست کی ہلکی پھلکی لڑائیاں جاری رہیں اور کام بھی جاری رہا۔ اس کے کچھ گھریلو تنازعے اسے دکھی رکھتے تھے۔ شاید یہی دکھ اس کی آواز کے سوز میں بھی ڈھل جاتا تھا۔ چند بار اس نے مجھے اپنے بنائے ہوئے دو تین گیت بھی سنائے جو مجھے اچھے لگے۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ وہ کبھی کبھی چرس بھی پیتا ہے۔ میں منع کرنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

ہمارے نمبر اسٹور کے قریب ہی ایک بٹ چائے والے تھے۔ معمولی بٹ ہونے کے باوجود ان کا رنگ قدرے سانولا تھا۔ خوب اونچے لمبے تھے۔ عمر چالیس سے اوپر تھی۔ ایک بھائی کے سوا ان کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ افواہ تھی کہ کہیں پیچھے، وہ کسی قتل میں ملوث رہے ہیں۔ خیر ہمارے اسٹور کے لیے چائے بھی بٹ کی ٹی شاپ سے آتی تھی۔ فراست کا بھی ٹی شاپ پر آنا جانا تھا۔ روزانہ بٹ صاحب کا ایک بڑا دیگچہ دودھ کا لگ جاتا تھا۔ دیگچے کے پیندے میں کوئی دو ڈھائی پاؤ ملائی بچی رہتی تھی۔ بٹ یہ ملائی دیگچے سمیت فراست کے حوالے کردیتا تھا۔ اس ملائی کے عوض فراست کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ دیگچے کو ہماری شاپ پر لائے اور خوب اچھی طرح مانجھ مانجھ کر دھو دے۔ ملائی، فراست کے استعمال میں آجاتی تھی۔ وہ اسے کسی برتن میں ڈالتا، اس میں آدھ پاؤ چینی پھینکتا اور چٹ کرجاتا۔ ایک دو بار اس کے مجبور کرنے پر میں نے بھی تھوڑی سی چکھی، ظاہر ہے بہت مزیدار چیز ہوتی تھی، نظام دین کی مشہور برفی سے بھی بڑھ کر۔

کوئی دو تین ماہ تک تو فراست نے بڑے شوق سے ملائی کھائی، پھر آہستہ آہستہ وہ اکتانا شروع ہوگیا۔ ایک ہی وقعہ کھانے کے بجائے اسے دن میں دو تین بار کھاتا۔ تب اس نے ایک اور حل نکالا۔ میٹھی ملائی کھانے کے بجائے اس نے ملائی اپنی ہانڈی میں ڈالنا شروع کردی۔ اس کا ہر سالن چکنائی سے لدا پھندا ہوتا تھا۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ اگر موٹی نرم نرم ملائی جیسی چیز بھی تواتر سے استعمال کی جائے تو اس سے دل بھرنا شروع ہوجاتا ہے۔ من وسلویٰ والا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔

قصہ مختصر کہ فراست ملائی کھا رہا تھا اور یہ ملائی اس کی صحت پر مضر اثرات بھی ڈال رہی تھی۔ اس درمیانی عمر میں وہ تھوڑا سا فربہ ہوچکا تھا اور اس کے بارے میں چرس پینے کی اطلاع بھی تھی..... ایک دن فراست اچانک مرگیا۔

اس کے مرنے کا قصہ بھی عجیب ہی تھا۔ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ بڑے ابا جی لکڑی کی کھیپ لانے کے لیے

قبائلی علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی خالد شاپ پر تھے۔ کچھ دنوں سے فراست چپ چپ تھا مگر حسب عادت زور و شور سے کام بھی کر رہا تھا۔ ایک سہ پہر میں نے اسے دفتر کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ اس نے معمول کے مطابق لکڑی کا بہت بڑا بلاک جسے ہم پھاڑہ کہتے تھے، کمر پر اٹھایا ہوا تھا اور رکوع کے بل چلتا ہوا، آرا مشین کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے سے بہت زیادہ پسینا گر رہا ہے۔ میں اسے دفتر میں بلانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی سیڑھیاں چڑھ کر دفتر میں آ گیا اور حسب عادت فرش پر بچھی دری پر دوزانو بیٹھ گیا۔

میں نے اس کے لیے اے سی آن کر دیا۔ بے تکلفی سے پوچھا۔ ''کیا حال ہے فراست کچھ چپ چپ ہو؟''

اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور پھر اوپر سینے کی طرف لے گیا۔ ''باؤجی! یہاں چھاتی کی طرف کوئی ٹیس سی جاتی ہے.....''

میں نے اس سے مختلف سوالات پوچھے۔ اس کا خیال یہی تھا کہ معدے کی کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ مگر وہ چورن پھکی وغیرہ کھا کر پھر کام میں جت گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اسے دوسرے ملازموں اور چھوٹے بھائی سے ہنستے بولتے بھی دیکھ رہا تھا۔ بڑے سخت جان تھے وہ لوگ..... درحقیقت فراست اس وقت انڈر اٹیک تھا۔ اس کا دل اس کے باقی جسم کا ساتھ دینے سے انکار کر رہا تھا۔ رات کو سونے کے لیے وہ نمبر شاپ کی کشادہ چھت پر چلا گیا..... وہ صبح خیز تھا، سورج بہت اوپر آنے کے باوجود جب وہ جاگا نہیں تو پتا چلا کہ وہ جا چکا ہے۔

اس کی وفات کے تیسرے روز بڑے ابا جی اپنے سفر سے واپس پہنچے تھے۔ انہیں فراست کی موت کا گہرا دکھ ہوا تھا۔ انہیں پتا تھا کہ ہر ویک اینڈ پر ان کی کرسی کے پاس بیٹھ کر ان سے جھگڑا کرنے والا اور پھر صلح کرنے والا اب اپنے گاؤں سے کبھی نہیں لوٹے گا۔ بڑے ابا جی ہم دونوں بھائیوں پر تھوڑا ناراض بھی ہوئے کہ ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر کیوں نہیں گئے۔ ہم نے کہا۔ ''ابا جی اگر اس نے اپنی تکلیف کا تھوڑا سا اشارہ بھی دیا ہوتا تو ہم ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے، مگر وہ تو ہنستا بولتا ہی چلا گیا ہے۔'' دیگر لوگ بھی اس سے متفق تھے۔

مدت ہوئی فراست جا چکا ہے۔ ہمارا وہ نمبر اسٹور بھی اپنی جگہ بدل چکا ہے۔ ملتان روڈ کا وہ حصہ اور اردگرد کا سارا ماحول بھی اب وہ نہیں رہا جو پہلے کبھی تھا۔ مگر نمبر اسٹور کے پچھواڑے فراست کا لگایا ہوا وہ بڑا درخت آج بھی چھاؤں دے رہا ہے۔ جہاں گرمیوں کی طویل دوپہروں اور چاندنی راتوں میں بیٹھ کر وہ دلسوز گیت گاتا تھا اور ریڈیو اسٹیشن جانے کی خواہش دل میں پالتا تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے جب ملک کے طول و عرض میں ایک اور زبردست طوفان بپا ہوا۔ باریک آواز میں وزنی اور بھاری بھرکم بات کرنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے 1977ء میں الیکشن کرائے۔ ان پر دھاندلی کا الزام لگا اور ان کی پیپلز پارٹی کے خلاف ملک گیر احتجاج شروع ہو گیا۔ قومی اتحاد بنا، جس میں نو ستارے جمع ہو گئے اور گلی کوچوں میں زبردست ہلچل شروع ہوئی۔ میں سیاست سے ہمیشہ دور ہی رہا ہوں۔ کسی جانب کوئی خاص جھکاؤ نہیں اور نوجوانی کے اس دور میں تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی جھکاؤ تھا تو ہلے گلے کی طرف تھا۔ یا کوئی دلچسپی محسوس ہوتی تھی تو وہ ہڑتال کے اعلان اور چھٹیوں میں ہوتی تھی۔ اسکول کے زمانے سے ہم بچوں کو جو اخباری سرخی سب سے اچھی لگتی تھی وہ کچھ یوں ہوتی تھی..... حکومت کے اعلان کے مطابق تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی ادارے غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔

اس سرخی میں ''غیر معینہ مدت'' کے الفاظ تو اتنے پیارے لگتے تھے کہ انہیں باقاعدہ چومنے کو دل چاہتا تھا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلنے والی تحریک نظام مصطفیٰ کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بہار کے دن تھے۔ جب لاہور شہر میں خوشبوؤں کی جگہ آنسو گیس اور ٹائر جلنے کا دھواں پھیل گیا۔ گلیوں کے چنگنے کی آواز گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں دب گئی۔ آغاز اپریل کی کوئی تاریخ تھی جب لوہاری گیٹ کی مسلم مسجد کے قریب ہنگامے میں نو مظاہرین لقمۂ اجل بنے اور پولیس جوتوں سمیت مسجد میں گھسی۔ اس کے بعد تحریک نے مزید زور پکڑ لیا۔ راتوں کو لوگ چھتوں پر اذانیں دینے لگے۔ ہر روز شہادتوں اور گرفتاریوں کی خبریں آنے لگیں۔ قومی اتحاد میں بڑے قد آور لیڈر شامل تھے۔ مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، پیر پگاڑا، اصغر خان اور بہت سے دیگر۔ عجیب بات یہ تھی کہ تحریک تو نظام مصطفیٰ کی تھی مگر اس میں سوشلسٹ، کمیونسٹ، مذہبی، ہر طرح کے لوگ بھٹو کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہم دوست بھی ہلے گلے کے شوق میں ان

جلوسوں میں چلے جاتے تھے۔ ''بھٹو کو پھانسی دو'' کے نعرے کی گونج ہر طرف تھی جو کانوں کو کچھ زیادہ بھلا نہیں لگتا تھا۔ بھٹو صاحب نے دوران خطاب کہیں جوش میں کہہ دیا تھا کہ تھوڑی سی پیتا ہوں..... اس فقرے نے تحریک کو بڑھاوا دینے اور فیصلہ کن موڑ تک پہنچانے میں بہت مدد کی۔ ابا جی یونس اور دونوں تایا یعنی للیانی والے ابا جی اور بڑے ابا جی اس تحریک کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ اس حوالے سے ہماری شرارت کا ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ قومی اتحاد کی تحریک سے کافی پہلے کی بات ہے۔ بڑے ابا جی شام کو نمبر شاپ سے واپس آ کر صحن میں چارپائی پر لیٹے تھے اور ٹرانزسٹر ریڈیو پر اہتمام سے خبریں سنتے تھے۔ وہ خاص طور پر بھٹو کے ناقدین میں سے تھے۔ ایک دن میں نے اور چھوٹے بھائی ساجد نے شرارت کی۔ ریڈیو کے اسپیکر سے بجلی کا ایک لمبا تار ملایا اور اس کے آگے چھوٹا مائیک لگا دیا۔ اس ''صوتی دھاندلی'' کے سبب ہم اس قابل ہو گئے کہ بڑے ابا جی کے ریڈیو پر اپنی آواز نشر کر سکیں۔ گرمیوں کے دن تھے۔ بڑے ابا جان نہا دھو کر چارپائی پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھے اور قریب رکھا ریڈیو خبروں کے وقت آن کیا۔ بھٹو ان دنوں ایران کے سرکاری دورے پر تھے۔

چھوٹے بھائی ساجد نے آواز کو بھاری بھرکم بنا کر جو پہلی خبر سنائی وہ ابا جان کی عین مرضی کی تھی اور یوں تھی۔ ''..... ابھی ابھی تہران سے خبر آئی ہے کہ وزیراعظم بھٹو پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ ہم افسوس سے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ جانبر نہیں ہو پائے.....''

ہم ایک ستون کی اوٹ سے دیکھ رہے تھے۔ بڑے ابا جی اچھل کر بیٹھ گئے۔ ''ہائیں۔ یہ کیا ہوا؟''

انہوں نے ریڈیو اٹھا کر کان سے لگایا۔ ساجد نے ان کی سہولت کے لیے خبر دوبارہ نشر کر دی۔ ''ہاں جی، ابھی ابھی تہران سے خبر آئی ہے.....''

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اسی دوران میں بڑے ابا جی نے ٹرانزسٹر ریڈیو کے پیچھے بجلی کا تار بھی دیکھ لیا۔ بھید کھل گیا۔ بڑے ابا جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ڈانٹ پڑی لیکن انہوں نے اور خالہ وغیرہ نے کچھ کچھ انجوائے بھی کیا۔

تحریک نظام مصطفیٰ کے فائنل راؤنڈ میں ہم بھی چلے گلے کے ریلے میں بہہ گئے تھے۔ جب لاہور کے رتن سینما کو آگ لگائی گئی ہم بھی لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں پیچھے کہیں موجود تھے۔ غالباً ایک گن مین سینما کے اندر ہی جل مرا تھا۔ سینما کی چھت پر ہم نے اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رائفل بدست چکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں مجھے بس ایک لحظے کے لیے یاد آیا کہ برسوں پہلے اس سینما میں میں نے اپنی پہلی فلم ''عید مبارک'' دیکھی تھی۔

رتن سینما کے بعد مشتعل ہجوم لاہور ہوٹل کے چوک کی طرف چل پڑا۔ وہاں ایک دردناک مناظر میرے حافظے پر نقش ہونے والے تھے۔ لاہور ہوٹل کے سامنے ایک سہ منزلہ پبلی بلڈنگ پر سے ہجوم پر فائر ہوئے۔ اس کے بعد لوگوں کا غیض و غضب اس عمارت کے رخ پر ہو گیا۔ گاہے بگاہے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

ایک دراز قد جواں سال لڑکے کا چہرہ آج بھی نگاہوں میں گھومتا ہے۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی۔ اس نے سینے کو ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ چہرہ زرد تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا اور پکار رہا تھا۔ ''مجھے اسپتال لے چلو..... اسپتال لے چلو۔''

مظاہرین میں سے دو افراد نے اسے اپنے درمیان موٹر سائیکل پر بٹھایا اور تیز رفتاری سے اوجھل ہو گئے' اور بھی کئی افراد زخمی تھے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان ڈرامائی انداز میں اپنے دانتوں کے اندر چاقو یا خنجر دبائے غالباً پائپ کے ذریعے بلڈنگ پر چڑھ رہا تھا۔ ہر طرف ہیجان برپا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک اور منظر نے نگاہ کو مجروح کیا۔ پبلی بلڈنگ میں موجود ایک شخص اپنے بچاؤ کے لیے ادھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک چاقو بردار تھا جو پے در پے اس کی کمر پر وار کر رہا تھا۔ پھر وہ دونوں چھت کی طرف اوجھل ہو گئے۔ اب معلوم نہیں کہ پے در پے وار کرنے والا وہی تھا جو پائپ کے راستے اوپر چڑھا تھا یا کوئی اور..... بہرحال یہ دردناک منظر تھا..... اور غالباً اپنی کسی کہانی میں بھی میں نے اسے تخلیقی انداز میں دہرایا ہے۔

اسی دوران میں پولیس نے مظاہرین پر زبردست لاٹھی چارج شروع کر دیا..... شکر ہے کہ ان لاٹھیوں سے بال بال بچتے ہوئے میں اور ناصر بائیں جانب کی ایک گلی میں نکل گئے۔ قریبی دوست شعیب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ آنسو گیس کی زیادتی سے ہماری آنکھیں بے طرح جل رہی تھیں۔ راستے میں برف بیچنے والوں نے کئی جگہ برف توڑ کر چھینگی ہوئی تھی تاکہ لوگ اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر رکھ سکیں۔

کچھ ہی دنوں بعد جنرل ضیاء الحق مرحوم کا چہرہ ٹی وی اسکرین پر نمودار ہوا اور انہوں نے کہا۔ ''السلام علیکم! میرے ہم وطنو.....''

بے شک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر اور عوامی ریلیوں میں بہہ کر میں اور ناصر ان جلوسوں میں شریک ہوئے تھے مگر قریباً دو سال بعد جب 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی والا المیہ ہوا۔ اس کا دکھ دل و دماغ میں بہت گہرائی تک گیا اور شاید آج بھی کسی کونے کھدرے میں موجود ہے۔ اور تو اور میں نے اس دن ابا جی کو بھی بالکل گم صم بیٹھے دیکھا۔

☆☆☆

ناصر اور نبیلہ کا تعلق اب خط و کتابت سے آگے نکل چکا تھا۔ وہ چونکہ ایک ہی گھر کے دو پورشنز میں رہتے تھے اس لیے موقع محل دیکھ کر بات بھی کر لیتے تھے اور کبھی کبھی انہیں چند لمحے زبانی گفتگو کے علاوہ جسمانی گفتگو کے بھی میسر آجاتے تھے۔ ایسی کسی بھی کامیابی کی خبر ناصر سب سے پہلے مجھے آکر سناتا تھا۔ نبیلہ درمیانے قد اور موزوں جسم کی قبول صورت لڑکی تھی۔ پیشانی پر ہر وقت ایک چمک سی رہتی تھی۔ جو شرمانے کے موقع پر کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھی تھی اور اپنی دو بہنوں کو خود پڑھاتی تھی۔ بڑی ہونے کے سبب والد رشید صاحب کی خوب لاڈلی تھی۔ ناصر صرف میٹرک تک ہی پہنچ پایا تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ الیکٹرانکس اشیا کی ری پیئرنگ کا کام کرتا تھا۔ اپنے کام میں وہ ماسٹر تھا اور باتوں میں بھی۔ اوپر سے خوش شکل بھی تھا۔ وہ دونوں دن بدن قریب آرہے تھے۔ کسی خراب ریڈیو، ٹی وی یا استری وغیرہ کو دیکھنے کے لیے ناصر، نبیلہ کے گھر بھی چلا جاتا تھا اور اگر نبیلہ کی والدہ ادھر اُدھر ہوتی تھیں تو تھوڑی بہت ہاتھ چالاکی بھی کر گزرتا تھا۔ نبیلہ اس تعلق کے حوالے سے بہت سیریس تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ میل آسان نہیں ہے۔ کئی رکاوٹیں موجود تھیں، جن میں برادری، مسلک، اسٹیٹس وغیرہ کی اڑچن پیش پیش تھی۔

نبیلہ کی والدہ اس پر بہت کڑی نظر رکھنے لگی تھی اور کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ ناصر کے اہلِ خانہ بطور کرایہ دار زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ البتہ ناصر اور نبیلہ کی ماؤں میں چونکہ اعتماد کا رشتہ تھا لہٰذا یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور چل رہا تھا۔

پابندیاں سخت ہو رہی تھیں۔ محبت کی آگ نے دونوں کو بے حال کر رکھا تھا۔ ایک دن ناصر مجھ سے کہنے لگا۔ ''یار! کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ میں بہت سخت قسم کا بیمار ہو جاؤں، کوئی ایسا مرض لاحق ہو کہ جان کے لالے پڑ جائیں، پھر ہو سکتا ہے کہ نبیلہ میں جرأت پیدا ہو اور وہ اپنے اردگرد کی رکاوٹیں توڑ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے امی ابو کے دل نرم ہونے کا امکان بھی پیدا ہو جائے۔''

جدائی طویل ہوتی جا رہی تھی اب کام میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ جس ورکشاپ میں ملازم تھا وہاں کام کرتے ہوئے کوئی پرزہ الٹا جوڑ دیتا یا کوئی تار غلط لگا دیتا تھا اور نقصان کرتا۔ ایک رقیب بھی درمیان میں کود پڑا تھا۔ وہ قریب ہی رہتا تھا اور نبیلہ کا کوئی دور کا کزن تھا۔

اب میں آپ کو وہ واقعہ بتانے والا ہوں جسے سن کر آپ حیران ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ بمشکل یقین کر پائیں۔ محبوب سے ملاپ کے لیے کسی خوش منظر جگہ کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ کسی چمن کا گوشہ، کسی دریا یا سمندر کا کنارہ، کسی ریستوران کا خوشبو دار ماحول..... مگر ایک دوسرے کی چاہ میں تڑپنے والوں کے لیے یہ سب ضروری نہیں ہوتا۔ جگہ کیسی بھی ہو ان کے لیے بس ملنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے قرب میں گم ہو کر وہ اردگرد کی ہر بدصورتی اور کراہیت کو بھلا سکتے ہیں۔

ناصر اور نبیلہ مہینوں سے ایک دوسرے کے لمس کو ترس رہے تھے۔ جس گھر میں وہ رہتے تھے وہاں ابھی سیوریج کا سسٹم نہیں تھا۔ کشادہ صحن کے ایک کونے میں وہ ٹوائلٹ تھی جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصہ مالک مکان اور ایک حصہ کرائے داروں کے استعمال میں تھا۔ ناصر اور نبیلہ نے ملاقات کے لیے ٹوائلٹ کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ ذرا تصور کیا جائے وہاں گندگی موجود ہوتی تھی اور بو بھی..... مگر وہ وہاں بھی قربت کے چند لمحے چرا لیتے تھے اور اس قربت سے اتنا ہی حظ اٹھاتے تھے جتنا کہیں بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔

ناصر کی باتیں سن کر مجھے یہ خوشی تو ہوتی تھی کہ ان کے درمیانی فاصلے مٹ گئے ہیں لیکن ان پر ترس بھی آتا تھا۔ وہ مجبور ہو کر کس ماحول میں مل رہے تھے۔ یہ ہمارے سماج رد معاشرے کا ایک بدصورت عکس تھا۔ کاش شاعری میں اس قسم کی صورتِ حال کو بیان کرنے کی گنجائش ہوتی اور کوئی بہت بڑا شاعر مجبور دلوں کی ان انوکھی ملاقاتوں پر کوئی لازوال نظم لکھتا۔ کسی دانشور نے کہا تھا، جب بے قرار پانیوں کو روکو گے تو وہ کسی نہ کسی طور اپنے رستے ڈھونڈیں گے۔

کچھ عرصہ بعد جب نبیلہ کی والدہ چند ہفتوں کے لیے کہیں گئیں تو ناصر اور نبیلہ کو کسی ریستوران اور جناح باغ وغیرہ میں ملنے کا موقع بھی ملا۔ نبیلہ نوٹ کر پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ کسی طور ناصر کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ دوسری طرف ناصر کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ وہ اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا تاہم اپنی والدہ اور بیمار بڑے بھائی کا بوجھ بھی اس پر تھا۔ وقت کا پہیا چل رہا تھا۔

میں اب گریجویشن کی تیاری کر رہا تھا۔ سائیکالوجی میرا پسندیدہ مضمون بن چکا تھا۔ ان دنوں میں نے انسان کی زندگی میں تکلیف اور راحت کے توازن پر ایک آرٹیکل لکھا اور اپنے نفسیات کے پروفیسر کو دکھایا۔ یہ کاپی سائز کے آٹھ دس صفحات تھے۔ میرے استاد نے کم توجہ کے ساتھ آرٹیکل کو آخری صفحے سے پڑھنا شروع کیا، لیکن پھر جسے جسے پڑھتے، صفحے پلٹتے چلے گئے اور پہلے صفحے تک جا پہنچے۔ تب انہوں نے آرٹیکل مکمل پڑھا اور کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔ قدرت کی طرف سے دکھ سکھ کے بے مثال اور لازمی توازن کا ذکر قارئین کو میری کہانیوں میں بھی ملے گا۔

یہ وہ دن تھے جب روزنامہ نوائے وقت کے مختلف ایڈیشنز میں میری تحریریں باقاعدگی سے چھپنا شروع ہوگئی تھیں۔ لاہور کی پنجاب لائبریری میرا پسندیدہ مسکن تھا۔ میں چھ چھ گھنٹے وہاں گزار دیتا اور پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ میں نے پرانی انگلش کتابوں میں سے کچھ ایسی کتابیں ڈھونڈیں جن میں ماضی کے بڑے بڑے حادثات کا ذکر تھا۔ میں نے ان تحریروں کو ترجمہ کر کے نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن میں دینا شروع کر دیا۔ محترم شریف کیانی صاحب نے اس سلسلے کا نام ''تاریخی حادثات'' رکھا اور یہ بہت مقبول ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ضیا شاہد، غالب اور نبیدار سرمدی جیسے محنتی کارکن، ادارے کا سرمایہ تھے۔ طارق اسمٰعیل ساگر غالباً بعد میں آئے تھے۔ شریف کیانی صاحب سنڈے (یا فرائیڈے) میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے یاد ہے ایک روز میں جلدی میں ایک مسودہ لے کر گیا اور اس پر صفحات کے نمبر نہیں لکھے۔ کیانی صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''مسودے پر سب سے ضروری چیز یہ نمبرنگ ہی ہوتی ہے۔'' اس بات کو 40 سال سے اوپر ہو چکے ہیں لیکن آج بھی جب میں اپنے مسودے پر ''نمبرنگ'' کرتا ہوں مجھے کیانی صاحب کی بات ضرور یاد آتی ہے۔ کیانی صاحب کی کافی عمر ہو چکی ہے۔ سنا ہے وہ آج کل راولپنڈی میں ہوتے ہیں۔ بہت نرم گفتار اور مشفق انسان ہیں۔ اللہ پاک ان کی عمر دراز کرے۔ نوائے وقت میں تاریخی حادثات والا وہ سلسلہ بہت پسند کیا گیا۔ غالباً ٹائی ٹینک کے حادثے کے حوالے سے بھی عام لوگوں کو پہلی بار اسی سلسلے کے ذریعے تفصیلی معلومات ملیں۔ بعدازاں یہ سلسلہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ پبلشر نے مجھے بتایا کہ اس کتاب کی بہت سی کاپیاں فوج کی لائبریریز میں بھی گئی ہیں۔

طارق اسمٰعیل ساگر ان دنوں سیارہ ڈائجسٹ کو ایڈٹ کر رہے تھے۔ وہ نوائے وقت میں میرے مضمون دیکھتے رہتے تھے۔ انہوں نے فون کر کے مجھے آفس بلایا۔ انہوں نے انسپکٹر نواز خان کا نام تخلیق کیا تھا اور اس حوالے سے جرم و سزا کی چند کہانیاں لکھی بھی تھیں۔ اب چونکہ ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی اور کسی اخبار کی طرف سے بھی آفر آ رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس کردار کو سامنے رکھ کر دو چار کہانیاں لکھوں، مگر یہ سلسلہ شروع ہوا تو دو چار سے کافی آگے بڑھ گیا بلکہ پچاس اور سو سے بھی آگے بڑھ گیا۔ یہ مسلسل قریباً دس سال چلا، اس کے مجموعے شائع ہوئے، اس پر چند ٹی وی ڈرامے بھی بنے۔ یہ آج بھی مقبول ہے، اس میں میں نے بلال شاہ کے نام سے ایک ہلکا پھلکا کردار بھی متعارف کرایا جو بہت پسند کیا گیا۔ نواز خان آج بھی پڑھا جا رہا ہے۔

چار پانچ سال پہلے کی بات ہے چھوٹے بیٹے ادریس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ''ابو جی! نیٹ پر کوئی گپتا نامی انڈین ہے جو آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' گپتا سے پہلے ''چیٹ'' ہوئی پھر آڈیو کال پر رابطہ ہوا۔ گپتا نے کہا کہ وہ میرا دیرینہ فین ہے۔ پھر بولا۔ ''آپ پر ایک انکشاف کروں؟''

''ہاں جی کریں۔''

''ہمارے ہاں ایک ہائی فائی میگزین ہے'' منوہر کہانیاں۔'' اس میگزین میں آپ کا انسپکٹر نواز والا سلسلہ پچھلے پندرہ برس سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کو ہندی ٹیکسٹ میں تبدیل کر کے اہتمام سے شائع کیا جاتا ہے۔

اس نے مزید بتایا کہ اس کے پتاجی یہ کہانیاں شوق سے پڑھتے تھے اور میگزین بھی منگواتے تھے۔ یوں جواں سال گپتا کا تعارف بھی نواز خان کی کہانیوں سے ہو گیا۔ گپتا کا کہنا تھا کہ وہ مارکیٹنگ کا کام کرتا ہے اور اس کی خواہش

ہے کہ میں انڈیا میں نواز خان کی کہانیوں کے حقوق اسے دوں۔ وہ ان کہانیوں کو مقامی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا۔ (انڈیا کے طول و عرض میں بے شمار زبانیں بولی اور پڑھی جاتی ہیں) اس کے علاوہ یہ ارادہ بھی ظاہر کررہا تھا کہ جرم و سزا کی ان کہانیوں پر کوئی ٹی وی سیریز بنائی جائے۔

کچھ عرصہ گپتا نامی اس شخص سے نامہ و پیام جاری رہا پھر حسب اندیشہ دوسری طرف سے ایک دم خاموشی ہوگئی۔ ممکن ہے کہ کسی سمجھانے والے نے اسے سمجھایا کہ یہ کیا بیوقوفی کررہے ہو؟ تمہیں حقوق حاصل کرنے کے لیے ادائیگی کی کیا ضرورت ہے۔ مصنف بے چارہ ہزاروں میل دور بیٹھا ہے۔ درمیان میں سرحد ہے۔ یہاں بارڈر کی دونوں جانب سب کچھ چل رہا ہے۔

اب ان باتوں کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ گپتا کی طرف سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ وہاں سرحد کی دوسری جانب کیا ہوا ہوگا؟ کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔ عین ممکن ہے کہ گپتا اور اس کے ساتھیوں نے فقط شغل میلے کے لیے یہ نامہ و پیام کیا ہو۔ وہ اس معاملے میں کبھی بھی سنجیدہ نہ رہے ہوں۔ تاہم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نواز خان کی کہانیاں وہاں ایک یا ایک سے زیادہ مقامی زبانوں میں ترجمہ ہوکر کتابی شکل میں شائع ہوئی ہوں اور فروخت ہورہی ہوں یا پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچا جائے تو کوئی ٹی وی یا ویب سیریز بھی بن چکی ہو۔ بہرحال آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔

اب میں ایک بار پھر ناصر اور نبیلہ کے "پریم روگ" کی طرف آتا ہوں۔ انہیں وصل کی مختصر گھڑیاں تو ملتی تھیں مگر وہ ہجر کے طویل دورانیے بھی بھگت رہے تھے۔ نبیلہ اب پرائیویٹلی ایف اے کی تیاری کررہی تھی۔ ان کا گھر بھی اب پہلے سے بہتر ہوچکا تھا۔ سیوریج اور فلش سسٹم وغیرہ آچکا تھا۔ لوائیٹیٹ کے اندر لوائیلیٹ کے ماحول سے یکسر کٹ کر جو لمحے گزارے جاتے تھے وہ اب ماضی کی بات ہوچکے تھے۔

میرے تجزیے کے مطابق نبیلہ کے اندر جیسے محبت اور دلنوازی کا ایک سمندر بہتا تھا۔ وہ مالی معاملات سے ہٹ کر بھی وہ توانائی سے بھرپور لڑکی تھی۔ دونوں بہنوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کی زیادہ تر ذمے داری بھی اسی پر تھی وہ ہر وقت حرکت میں نظر آتی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ناصر صرف میٹرک تک ہی پہنچ پایا تھا۔ وہ ہنرمند ضرور تھا مگر مالی اعتبار سے نبیلہ کے گھرانے سے کافی پیچھے تھا۔ برادری اور مسلک وغیرہ کی رکاوٹیں بھی تھیں۔ اس کے باوجود نبیلہ ہر حالت میں اس کا ہاتھ تھامے رکھنا چاہتی تھی۔ کبھی ماں کی بے پناہ خدمت کرکے کبھی روٹھ کر کبھی روکر وہ ماں کو منانے کی کوشش کرتی رہتی تھی مگر ماں ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی، بلکہ اب تو نبیلہ سے بہت لاڈ کرنے والے اس کے والد بھی اپنی سوچ تبدیل کررہے تھے۔

شوہر کو ہموار بنانے کے لیے نبیلہ کی والدہ نے اس رشتہ دار لڑکے کے ساتھ نبیلہ کی بات چلا دی تھی جو اکثر ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا یہ لڑکا چونکہ نبیلہ کے ددھیال میں سے تھا۔ لہٰذا نبیلہ کے والد بھی اس رشتے کے حق میں ہوگئے تھے۔ گھر میں نبیلہ پر پابندیاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں اور یہ بھی سنا جارہا تھا کہ عنقریب ناصر کے گھرانے سے کرائے والا پورشن خالی کرایا جارہا ہے۔ ناصر کی والدہ نے بڑی مشکل سے چند ماہ کی مہلت مانگی تھی۔ ایک دوسری کالونی میں ان کا تین مرلہ کا پلاٹ موجود تھا اور وہ اس پر اپنے ایک دو کمرے تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

ان دنوں ناصر کی حالت بہت پتلی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں عشق و محبت کے نرغے میں تھا اور ایک ناقابل مزاحمت دلدل میں دھنستا چلا جارہا تھا۔ اس کے رقیب کا نام اصغر تھا۔ وہ بھی زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا۔ البتہ لبرٹی مارکیٹ کی جانب ان کی کراکری کی کافی بڑی شاپ تھی۔ ریواز گارڈن میں بارہ مرلہ کا خوبصورت گھر تھا۔ نوکس ویگن گاڑی تھی۔ یہ دونوں گھرانے ایک دوسرے کے کافی قریب آتے جارہے تھے۔ اصغر تو عموماً نبیلہ کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ نبیلہ کی والدہ کی یہ پوری کوشش تھی کہ کس طرح بیٹی کی سوچوں کا رخ اصغر کی طرف مڑ جائے... مگر وہ جانتی نہیں تھیں کہ یہ وہ سوچیں نہیں جن کا رخ کوشش سے بدلا جاسکے۔ یہ تو دل اور جسم کی پکار کا وہ ناقابل مزاحمت ریلا ہے جس میں بڑی بڑی چٹانیں بہہ جاتی ہیں۔ اس کے سامنے جتنی بڑی رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے وہ اتنی ہی شدت سے اپنا سر اس سے ٹکراتا ہے۔ رکاوٹ کو پاش پاش کرتا ہے یا پھر اپنی شکل و صورت کھو دیتا ہے..... مگر رکتا نہیں ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، دسمبر کا مہینا تھا، لاہور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں ابھی ابھی ایک کرکٹ میچ کھیل کر واپس آیا تھا اور چھت کی کمزور زرد دھوپ میں بیٹھا نوائے وقت کے لیے "تاریخی حادثات" کا نیا "اپنی سوڈ" لکھ رہا تھا کہ ناصر چلا آیا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔

کہنے لگا۔ ''یار! میں تو مرنے کی حد تک تنگ آ گیا ہوں۔ کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں نکل جاؤں۔''

''تم نہیں نکل سکو گے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ تم روز بروز مزید پھنستے جا رہے ہو۔''

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔ میں نے ذرا توقف کر کے پوچھا۔ ''.....اور یہ نبیلہ روزانہ آٹھ نو بجے رات کو کہاں سے آتی ہے تو کسی کار میں؟''

''یہی بتانے تو آیا ہوں تمہارے پاس۔'' ناصر نے آہ بھری۔ ''ریواز گارڈن والی کوٹھی میں اصغر کی والدہ آج کل بیمار رہتی ہے۔ اصغر اور اس کا والد تو صبح کو دس بجے اپنی شاپ پر چلے جاتے ہیں۔ گھر میں بیمار والدہ اور اصغر کی دو کم سن بہنوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ روز صبح اصغر کے والد گاڑی پر نبیلہ کو لینے آتے ہیں۔ وہ سارا دن اصغر کے گھر میں اس کی بیمار ماں کو دیکھتی ہے۔ شام کے بعد ان کے ساتھ گھر واپس آ جاتی ہے۔ بے چاری کو نوکرانی بنا کے رکھ دیا ہے اس کے ماں باپ نے۔''

''.....چلو بیمار کی دیکھ بھال تو اچھی بات ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن وہ اصغر بھی تو کچھ کم ''بیمار'' نہیں ہے نا۔'' ناصر جھلا کر بولا۔ ''وہ تو اس کے قریب آنے کے لیے ہر وقت موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے اور مجھے تو لگتا ہے کہ نبیلہ کو اس طرح ان کے گھر بھیجنے میں نبیلہ کی امی کی منصوبہ بندی بھی ہے۔''

''اگر نبیلہ سے پیار کرتے ہو تو پھر اس پر اعتبار بھی کرو۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ تمہیں دھوکا نہیں دے گی۔''

''..... اور اگر اس کے گھر والوں نے، اس کے خاندان والوں نے اسے مجبور کر دیا تو؟''

''مجبور ہونا اور بات ہے۔ دھوکا دینا اور بات۔''

''ان دنوں میں نبیلہ کے لیے ناصر کی تڑپ اور طلب دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ وہ سخت سردی میں رات کو دیر تک گلی کے موڑ پر اس انتظار میں کھڑا رہتا کہ وہ نو کسی کار نظر آئے جس میں نبیلہ کو ریواز گارڈن سے واپس آنا ہے۔ جب دور سے کار نظر آ جاتی تو وہ دائیں بائیں ہو جاتا کہ کسی کو شک نہ گزرے۔

پھر ایک دن ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے ششدر کر دیا اور میں ناصر سے سخت ناراض بھی ہوا۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ناصر اور خاص طور پر نبیلہ سے ایسی بے وقوفی کیوں سرزد ہوئی اور وہ تیسرا کون تھا جس نے اس حماقت میں کردار ادا کیا۔

ایک روز ناصر چہرے پر دباؤ باجوش لیے میرے گھر آیا۔ ایسا جوش اس کے چہرے پر تب نظر آیا کرتا تھا جب اپنی محبت کے آغاز میں وہ نبیلہ کا کوئی خط اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس کر مجھے پڑھانے کے لیے آیا کرتا تھا۔

لیکن آج خط نہیں تھا، اس کے پاس ایک کارڈ سائز تصویر تھی۔ اس نے بتایا کہ دو روز پہلے چونکہ نبیلہ کی والدہ اور والد کو پورے دن کے لیے ایک شادی پر جانا پڑا لہٰذا اسے نبیلہ کے ساتھ ملاقات کا موقع مل گیا۔ ان دونوں کو یہ موقع نبیلہ کی چھوٹی بہن کے تعاون سے ملا جو ایک طرح سے دونوں کی رازدار بھی تھی۔ نبیلہ کی دلیری یا بے جا دلیری تھی کہ وہ ناصر کے کہنے پر اس کے ساتھ گھر سے باہر بھی گئی۔ ایک رکشا پر وہ دونوں ادھر اُدھر گھومتے بھی رہے اور دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے۔ ان دنوں کیمرا تو بس کسی کسی کے پاس ہی ہوتا تھا۔ ان دونوں کو تصویر اتروانے کی سوجھی اور وہ ریواز گارڈن کے قریب ایک فوٹو گرافر کی دکان میں جا گھسے۔ فوٹو گرافر بھی پرلے درجے کا چالباز اور رنگ باز نکلا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ پریمی جوڑا ہے اور یادگار تصویر کے لیے یہاں پہنچا ہے۔ اس نے دونوں کی تصویریں تو شانہ بشانہ بٹھا کر اتار دیں۔ پھر وہ ناصر کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور رازداری سے بولا۔ ''ایک خاص تصویر بھی اتروالو۔ ایسی تصویر کئی جوڑے اترواتے ہیں..... اور یہ بعد میں کام بھی آتی ہے۔''

ناصر نے وضاحت چاہی تو وہ بولا۔ ''لڑکی کچی عمر کی ہے۔ یہ ثابت ہونا چاہیے کہ وہ بالغ ہے اور تم سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتی ہے۔''

اس نے ناصر کو کچھ ہدایات دیں اور کہا کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کو اس پر آمادہ کرے۔ اس میں دونوں کی بھلائی ہے۔

پتا نہیں کہ ناصر نے کس طرح نبیلہ سے بات کی اور اسے کیسے آمادہ کیا۔ میری سمجھ میں تو یہی بات آتی ہے کہ ناصر کی کسی بات کو ٹالنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر ناصر کو بات کرنے کا ڈھنگ اور منانے کا طریقہ بھی خوب آتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نبیلہ جیسی سمجھدار لڑکی کی عقل پر بھی وقتی طور پر پتھر پڑ گئے۔ اس نے ناصر کے ساتھ سونے

پر بیٹھ کر ایسی تصویر اتروالی جو نہ صرف نازیبا بلکہ اس سے بھی بدتر تھی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی اس ذکر سے کوفت ہو رہی ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے باہم پیوست تھے اور نبیلہ کے جسم کا بالائی حصہ نمایاں تر نظر آتا تھا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ ناصر اور نبیلہ کے لیے جو بھی اچھے اور لطیف جذبات تھے وہ سب دریا برد ہو گئے ہیں۔ تاہم ایک آدھ دن کے بعد میں یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوا کہ اولاد پر بے جا سختیاں اور پابندیاں، سچے و صاف شفاف جذبات کے بہاؤ کو روک تو نہیں سکتیں۔ ہاں اس بہاؤ کی شکل بدل دیتی ہیں۔ پھر بہت سے بے ڈھنگے اور کج رو واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

مجھے نبیلہ سے زیادہ غصہ ناصر پر تھا۔ وہ تو اس کی دیوانی تھی۔ کوئی بات ٹالتی نہیں تھی۔ یہ ناصر کو سوچنا چاہیے تھا کہ اس تصویر کا کوئی غلط استعمال نہ ہو جائے۔ کسی طرح کی بلیک میلنگ کا سبب نہ بن جائے۔

وہ فوٹو گرافر تو ایک آدھ مہینے بعد ہی وہاں سے منتقل ہو کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ البتہ میں کئی برس تک یہ دعا مانگتا رہا کہ اس فوٹو گراف کی وجہ سے نبیلہ اور ناصر پر کوئی زد نہ پڑے۔

☆☆☆

بسنت بہار اور بسنت کو اب لاہور اور دیگر شہروں سے بچھڑے کئی برس گزر چکے ہیں۔ آج کل کے بچوں کو تو پتنگ، ڈور، چرخی، جیسے لفظوں سے بھی نا آشنائی ہے۔ ایک اچھی بھلی تفریح اور من پسند تہوار کو ہم نے اپنی خطرناک حماقت یعنی کیمیکل ڈور کے استعمال سے تباہ کر کے رکھ دیا۔

اس دور کی بسنت آج بھی آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو نگاہوں میں رنگ سے بھر جاتے ہیں۔ بسنت کو پالا اڑنت کہا جاتا تھا اور یہ عموماً فروری کی پہلی تاریخوں میں منائی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے پتنگ اڑانے کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا، لیکن اپنے گھر کی چھت سے اور میدان پار کے اس صحن سے جو تعلق مجھے پیدا ہو چکا تھا اس کے سبب میں خصوصی اہتمام کے ساتھ بسنت مناتا تھا۔ میرے دو نہایت قریبی دوست شعیب اور ظفر اقبال بھی اس شغل میں اکثر میرے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ لاہور میں بسنت کا رنگ ڈھنگ ہی نرالا ہوتا تھا۔ یوں تو پتنگیں سارا سال ہی لاہور کے آسمان پر رقص کرتی رہتی تھیں، تاہم جوں جوں فروری کا مہینہ نزدیک آتا تھا پتنگ بازی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سڑکوں کے کناروں پر مانجھا لگانے والوں کے بے شمار اڈے نمودار ہو جاتے تھے۔ پتنگوں کی دکانوں پر خریداروں کا اژدھام نظر آتا تھا۔ بسنت سے ایک دو روز پہلے ہی پتنگوں میں دھاگے وغیرہ ڈال لیے جاتے تھے۔ ان کو عرف عام میں ''تناویں ڈالنا'' کہتے تھے۔ یہ بھی ایک دو روز پہلے ہی طے ہو جاتا تھا کہ اس خوش رنگ ''تہوار'' پر کیا کیا پکانا ہے۔ کس کس کو بلانا ہے یا کس کس کے ہاں جانا ہے۔ اکثر گھروں میں دوپہر کے وقت حلیم یا نہاری وغیرہ بنائی جاتی تھی۔ ساتھ میں گرم گرم روٹیاں یا نان ہوتے تھے۔ پتنگ باز کھاتے جاتے تھے اور مرچوں کی وجہ سے سی سی کرتے جاتے تھے لیکن عموماً۔ یہ مرچیں منہ میں نہیں انگلیوں کے ان چیروں میں لگتی تھیں جو ڈور کے سبب آتے تھے۔

گڈے، گڈیوں اور پتنگوں کی بے شمار قسمیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کے نام اب بھی یاد ہیں۔ مثلاً اکھ مار، شرلا، پری، پھاپھڑ وغیرہ۔ خوشگوار موسم، لاہور کا نیلا آسمان اور سہ پہر کے وقت فضا میں رنگوں کا میلا، چھتوں پر رنگین آنچل لہراتے تھے۔ منچلے لڑکے رقص کرتے تھے اور بوکاٹا..... وہ کاٹا کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ ان نعروں میں جب باجوں کی ''طوطو'' شامل ہو جاتی تھی تو کچھ اور ہی سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ سب مناظر مجھے بہت اچھے لگتے تھے اور اس کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ میدان کے اس پار اس محبوب صحن میں ایک چہرہ دمکتا تھا اور دو نگاہیں میرے سینے میں انبساط کے پھول کھلاتی تھیں۔

بے شک اپنے خط کے جس جواب کا مجھے انتظار تھا وہ آج تک نہیں آیا تھا۔ مگر ایک آس تو موجود تھی۔ ایک انتظار تو جوان تھا۔ ایک اُمید تو ہر روز مجھے دلاسا دیتی تھی۔ میں ہر روز یہی سوچتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کسی کو اتنی شدت اور نیک نیتی سے چاہا جائے، اتنی وفاداری اور مستقل مزاجی کے ساتھ ایک چھوٹے سے صلے کا انتظار کیا جائے، چند لفظوں کی آرزو رکھی جائے..... اور مراد پوری نہ ہو۔

عاطف کہتا تھا..... ''ایسا نہیں ہوگا طاہر۔ وہ اس ڈھنگ کی لڑکی نہیں ہے۔ وہ یہ کر ہی نہیں سکتی۔''

اور ایک دن تو اس نے یہ تک کہہ دیا۔ ''اگر وہ ایسا کرے گی تو میں سمجھوں گا کہ وہ تمہارے لائق ہی نہیں ہے۔ تم اپنے اس معاملے کو ناصر اور نبیلہ والی کہانی اور اس جیسی دوسری کہانیوں کے تناظر میں کیوں دیکھ رہے ہو۔ تم بے

دقوقی کررہے ہو۔ وقت ضائع کررہے ہو' اور کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم اپنے اس انتظار کو ختم کرنا چاہتے ہی نہیں ہو۔"

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا لیکن یہ ضرور سوچا کہ اگر عاطف نے یہ باتیں اسی شدومد کے ساتھ شروع میں کبھی ہوتیں تو شاید میرے دل میں یہ خط کے جواب والی گرہ ہی نہ پڑتی۔

بات بسنت کی ہورہی تھی۔ وہ بھی بسنت کا ایک ایسا ہی ٹھنڈی ہوا اور نرم دھوپ والا خوبصورت دن تھا۔ زویا نے بسنت کی نسبت سے بسنتی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اور صحن میں تھی۔ ان کے گھر میں پتنگ بازی نہیں ہوتی تھی مگر اس رنگ رنگیلے تہوار میں دلچسپی تو ہر فرد لیتا تھا۔

وہ نہایت خوشگوار دن اور زویا کا وہ نہایت اچھا موڈ مجھے آج تک یاد ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں چھت پر ہوں اور وہ مسلسل میری نگاہوں کی مرکز ہے۔ وہ بار بار اندر جاتی اور کوئی نیا لباس پہن کر آجاتی۔ صحن میں بیٹھی اپنی والدہ اور دادی کو گھوم گھوم کر دکھاتی۔ شاید والدہ بھی جانتی ہوں گی کہ وہ کس کو دکھا رہی ہے۔ بیس پچیس منٹ میں اس نے سات آٹھ لباس بدلے۔ ہر بار چھت کی طرف بھی دیکھتی جیسے بہ زبان خاموشی پوچھ رہی ہو کہ..... اچھی لگتی ہوں نا۔ پھر کیوں مجھ سے دور ہو۔ کیوں آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں ڈھونڈتے؟

اسی دوران میں مجھے اس کے بڑے بھائی جان کی صورت نظر آئی۔ وہ زویا کی طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ اتنے فاصلے سے یہ پتا تو ہرگز نہیں چل سکتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن یقیناً وہ اچھے موڈ میں نہیں تھے۔

زویا تیزی سے اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے انداز میں مجھے سمجھا دیا کہ اب کم از کم آج کا دن تو وہ صحن میں نہیں آئے گی۔ بسنت کا تہوار میرے لیے شروع ہوتے ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ ابھی تو دوپہر کے بارہ ہی بجے تھے۔ پتنگ اڑانے سے کس کافر کو دلچسپی تھی۔ یہ محفل تو کسی اور وجہ سے سجائی جاتی تھی۔

ابا جی پولس ہمیشہ سے پتنگ بازی کے سخت خلاف تھے۔ شاید میں نے اس سے پہلے بتایا ہے کہ بچپن میں ہماری پتنگ بازی کے وقت ابا جی اگر گھر آجاتے تھے تو ہم پتنگ اتارنے کا رسک نہیں لیتے تھے بلکہ ہاتھ سے ڈور توڑ کر پتنگ کو آزاد کردیتے تھے اور یقیناً وہ اپنے موقف کے حوالے سے بالکل درست تھے۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دور میں کیمیکل ڈور نہ ہونے کے باوجود لاہور میں ہر بسنت پر درجنوں لوگ ہلاک و زخمی ہوتے تھے۔ حادثات کا شکار ہونے والوں میں سے زیادہ تر چھتوں پر سے گرتے تھے۔ ٹریفک حادثات میں جان گنواتے تھے یا پھر ہوائی فائرنگ اور لڑائی جھگڑوں کی نذر ہوتے تھے۔

اس دن میں چونکہ جلد ہی چھت سے اتر آیا تھا اور چادر اوڑھ کر کمرے میں لیٹ گیا تھا اس لیے ابا جی یقیناً خوش ہوئے ہوں گے کہ میں نے اور ناصر نے اس شیطانی شغل کو اس مرتبہ زیادہ طول نہیں دیا مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ کسی دوسرے محبوب مشغلے کے ختم ہونے کے سبب یہ شغل ختم ہوا ہے۔

سہ پہر کے وقت بسنت اپنے عروج پر تھی لیکن چونکہ میرے اندر کا موسم بدل گیا تھا اس لیے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں اکیلا ہی اسکوٹر لے کر نکل گیا اور یہاں وہاں گھومنے لگا۔ اچانک دل میں نجانے کیا آئی کہ میں نے اسکوٹر کا رخ میو اسپتال کی طرف کردیا۔ ابا جی اکثر کہا کرتے تھے کہ بسنت والے دن اسپتالوں میں جاکر دیکھو کیا "نظارہ" ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ آج دیکھ ہی لوں۔

اور واقعی وہ مناظر آج تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ میو اسپتال ویسے بھی لاہور کے گنجان ترین علاقے میں ہے۔ وہاں ایمرجنسی کے اندر زخمی مریض یوں آرہے تھے جیسے اسپتال سے باہر کوئی خونی جنگ ہورہی ہے۔ چہرے لہولہان، ہڈیاں ٹوٹی ہوئیں، کوئی نیم بے ہوش، کوئی بے ہوش، کوئی آخری دموں پر، مائیں "سر پاؤں" لے لگی، باپ وحشت زدہ، بہن بھائی روتے کرلاتے ہوئے۔ موٹر بائیکس، گاڑیاں اور رکشے وغیرہ تیزی سے آتے۔ زخمیوں کو اتارا جاتا اور افراتفری میں ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا جاتا۔ بسنت کا یہ پہلو میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ (دوسری بات یہ پہلو میں نے قریباً 26 برس بعد پرویز مشرف کے دور حکومت میں دیکھا جب بسنت ایک بین الاقوامی فیسٹیول کی شکل اختیار کرکے پورے لاہور کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا)

☆☆☆

تین برس سے زائد بیت چکے تھے، مگر میرا اور زویا کا معاملہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ عاطف اور ناصر کے لاکھ کہنے کے باوجود میں اپنی اسی ڈگر پر چل رہا تھا۔

کمرے کی کھڑکی، چھت کی منڈیر اور وہ ایک صحن۔ مقررہ وقت پر زویا کا صحن میں آنا یا برآمدے میں موجود ہونا۔ مقررہ وقت پر میرا چھت پر آنا یا منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر کھڑے ہوجانا، اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانا، مسکرانا اور کبھی کبھی ہمت کرکے اپنی بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی انگلی سے کچھ لکھنا اور آس بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھنا۔ یعنی خاموشی کی زبان میں دور کھڑی اس نیم بستہ لڑکی سے یہ پوچھنا کہ میرے خط کا جواب کب دو گی۔ یہ اشارے کنایے میں بڑی احتیاط سے کرتا تھا، پھر بھی ارد گرد کبھی نہ کبھی کسی کی نظر تو پڑ ہی جاتی ہوگی۔

وہ جواباً کبھی کوئی اشارہ نہیں کرتی تھی مگر اس کی "بدنی زبان" یہ اعلان بھی کرتی تھی کہ وہ میرے اس خاموش کلام کی منتظر رہتی ہے اور نہیں یہ خاموش کلام ترک کردوں تو اداس ہوجاتی ہے۔

اب ایک زمانے بعد یہ ساری باتیں ہوچتا ہوں تو کچھ ہنسی بھی آتی ہے مگر زندگی کے ہر دور میں ادراک کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ اس دور کا ادراک تھا اور اس کے تناظر میں وہ سب کچھ نہایت سنجیدہ اور گہرائی لیے ہوئے تھا۔ وہ کوئی سطحی جذبہ ہرگز نہیں تھا جو کئی برس سے مجھے زندگی کی ہر دیگر رنگینی سے کوسوں دور رکھے ہوئے تھا۔

میرے بچے اور ان کے بچے اگر یہ سب کچھ پڑھیں گے تو یقیناً انہیں یہ کچھ عجیب بھی لگے گا۔ مگر میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زویا سے نظر اور دل کا رشتہ ہمیشہ اخلاقیات کے دائرے میں رہا اور اس نے کسی بھی مرحلے میں اہم معاشرتی حدود کو پار نہیں کیا۔

تو میں بتا رہا تھا کہ ہر موسم پر اثر کے موسم کا رنگ تھا اور شاید یہی زندگی کا رنگ بن کر مجھے اپنا عادی بنا رہا تھا۔ تڑپ بہت تھی مگر راستہ کوئی نہیں تھا۔ وہی لگے بندھے معمول۔ میں کالج یا شاپ پر جانے سے پہلے اپنے کمرے کے اندر سے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتا اور اسے پتا چل جاتا کہ میں جا رہا ہوں۔ گھروں کے درمیان فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی اسے میرا اسکوٹر اسٹارٹ ہونے کی مدھم آواز آجاتی تھی۔ میں سڑک پر پہنچ کر اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو وہ کبھی کبھی اپنے گھر کے دروازے پر رنگین چق کے پیچھے کھڑی نظر آتی۔ ایک بازو چق سے باہر ہوتا مگر وہ بازو الوداعی انداز میں حرکت نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ اسے حرکت دینا چاہتی ہو لیکن دے نہ سکتی ہو۔ صدیاں اس بات کی گواہ ہیں کہ مشرقی عورت کے لیے اس بازو کو حرکت دینا کبھی آسان نہیں رہا۔ ایسے میں عاطف کا مدبرانہ انداز میں کہا گیا جملہ میری سماعت میں گونجنے لگتا تھا۔ "ظاہر! وہ اتنا ہی کرسکتی تھی جتنا کر رہی ہے۔ اس سے آگے نہیں۔"

گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر آم چوسنا اور میدان کے اس پار اپنے برآمدے میں کھڑی زویا کو آفر کرنا، قیلولے کے بعد تپتی ہوئی چھت پر پہنچ جانا۔ شام ڈھلتے ہی امرتسر ٹی وی کے لیے دیر تک انٹینا درست کرنا، شام کے بعد عاطف یا ناصر کے ساتھ ٹھنڈی رس ملائی یا فرنی کھانے سوئٹ شاپ پر جانا، صبح دیر تک بستر پر پڑے رہنا اور چھت کے جھروکوں میں سے اپنے محبوب صحن کو دیکھتے رہنا۔ گرما کی وہ گرم ترین۔ طویل دوپہریں مجھے عجب انداز میں Fascinate کرتی تھیں۔ سسپنس میں شائع ہونے والی میری ایک طویل کہانی "غرقِ محبت" کی مختصر نظم انہی پرتپش دوپہروں میں بھیگی ہوئی دوپہروں کی یاد میں ہے..... تم کب تک مجھ کو بھولو گے

صحرا کی جھلسی دوپہروں میں
کچھ ان دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ ان دیکھے سے سائے ہیں
جو سنگ سنگ میرے چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں
اک گرم دوپہر کی مستی میں
اک خام خیال سی ہستی میں
کچھ ان چھوئے سے جذبے ہیں

سردیوں کی شامیں میرے لیے بڑی کرب انگیز ہوتی تھیں کیونکہ اس کے بعد زویا کا صحن میں آنا کم ہی ہوتا تھا۔ بارشوں کے موسم میں، میں اضافی طور پر اداس ہوجاتا تھا۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں، میں پھوپی جان اور للیانی والے ابا جی کے ساتھ بڑے اہتمام سے چھت پر سوتا تھا۔ سونے سے پہلے رات دس گیارہ بجے تک ٹرانزسٹر ریڈیو پر نہایت کم آواز میں فرمائشی و دیگر نغمے سننا اور آنکھوں میں ستارے چمکانا بہت بھلا لگتا تھا۔ رات کو کسی وقت آنکھ کھلتی تو پھر منڈیر پر جا کھڑا ہوتا۔ میدان کے اس پار ان کے گھر کے صحن کو اب ایک درخت ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ جنتر کی قسم کا یہ خودرو درخت میدان میں واقع تھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا

تھا کہ یہ درخت مجھے دن بہ دن زویا سے دور کر رہا ہے۔ اس میدان میں اب ایک چھوٹی سی اوپن ایئر فیکٹری قائم ہو چکی تھی جس میں غالباً سلولائیڈ کی پتریوں پر رنگ وغیرہ چڑھایا جاتا تھا اور کیمیکل کی بُو کالونی میں پھیلتی رہتی تھی۔ سانولے رنگ کا ایک جواں سال سوٹڈ بوٹڈ لڑکا فیکٹری کا کرتا دھرتا تھا۔

نازیبا تصویر اتروانے والے واقعے کے بعد سے ناصر سے تعلق کچھ کم ہو گیا تھا۔ مگر وہ اب بھی وقتاً فوقتاً گھر آ دھمکتا تھا۔ ایک دن درخت کے حوالے سے ناصر نے ایک مشورہ دیا۔ میں بھی نجانے کس موڈ میں تھا، یہ مشورہ مان لیا اور ہم نے ایک دلچسپ کام کیا۔ میں نے کویت میں موجود اپنے دوست ظفر اقبال کو ایک خط لکھا۔ اس خط کے لفافے میں ایک اور خط تھا۔ یہ خط ظفر اقبال کو کویت سے واپس پاکستان بھیجنا تھا اور یہ اسی جواں سال، سانولے لڑکے کے نام تھا۔ دو فرضی افراد احمد اور سلیم کی طرف سے جواں سال لڑکے کو لکھا گیا تھا کہ چار پانچ سال پہلے تک ہم پاکستان میں تھے۔ اس میدان میں ہم جوا وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چھاپے کے خوف سے ہم نے سونے کی پانچ چھ چوڑیاں اس درخت کی جڑوں میں گڑھا کھود کر چھپا دی تھیں۔ اب تم انہیں حاصل کر سکتے ہو ورنہ وہ مٹی میں پڑے پڑے مٹی ہو جائیں گی۔

یہ پلان کام کر گیا۔ ایک رات دس بجے کے لگ بھگ میں حسبِ معمول منڈیر پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا کہ جواں سال لڑکا اپنی ٹویوٹا کار میں فراٹے کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میدان میں اندھیرا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں جنتر کے اردگرد بغور دیکھتا رہا۔ اگلے روز دوپہر کو میں کالج سے واپس آیا تو دیکھا کہ فیکٹری کے دو ملازم لڑکے بیلچوں کی مدد سے درخت کے اردگرد کھدائی میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اپنی کھدائی جڑوں تک پہنچا دی۔ کچھ ہوتا تو ملتا۔

ان کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ مقصد ہمارا بھی مکمل طور پر پورا نہ ہوا کیونکہ درخت پوری طرح گرا نہیں کچھ ٹیڑھا ضرور ہو گیا۔ بعد ازاں اس کا تیز رفتار پھیلاؤ بھی بڑی حد تک رک گیا۔

ایک دن عجب المیہ ہوا۔ گرمیوں کی سہانی صبح تھی۔ میں نائم ٹیبل کے مطابق چھت پر پہنچا اور زویا کو دیکھنے کا منتظر ہو گیا۔ منڈیر پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا کہ ایک گرج دار آواز کانوں میں پڑی۔

یہ آواز زویا کے گھر کی بائیں جانب والے ایک کوٹھی نما گھر کے چھوٹے سے صحن سے آئی تھی۔ اس گھر کے ایک پورشن میں نئے کرایہ دار کوئی ایک ماہ پہلے پہنچے تھے۔ میاں بیوی تھے۔ ایک یا دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ بیوی کافی خوش شکل تھی مگر میری نگاہ کبھی بھی اس صحن کی طرف نہیں اٹھی تھی۔ اٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ صحن تو کیا شاید دنیا کا کوئی بھی صحن کوئی بھی چہرہ میری نظر میں نہیں سما سکتا تھا۔ میری دنیا میدان پار کے ان محبوب در و دیوار سے شروع ہو کر وہیں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اردگرد کی بہت سی رنگینیاں مجھے میسر ہو سکتی تھیں۔ مگر میری مثال فیض کے اس شعر کی تھی۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

"تو میں اس گرج کی بات کر رہا تھا جو دائیں طرف والے صحن سے اٹھی تھی۔ جواں سال بیوی کے شوہر کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ وہ میری طرف ہاتھ اٹھا کر دہاڑا..... کوئی اور کام نہیں ہے تمہیں..... سویرے سویرے چھت پر چڑھ کر کھڑے ہو جاتے ہو۔"

اپنا بے ساختہ اور کسی حد تک "خوفزدہ" جواب مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے زویا کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے زبان خاموشی کہا کہ میرا رخ اس طرف تھا۔ آپ کے گھر کی طرف نہیں تھا۔

وہ بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کمرے میں جا کر خود کو خوب کوسا۔ کیوں خود کو اس طرح تماشا بنا رہا ہوں۔ اگر آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہے، دنیا کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہے تو کیوں اوکھلی میں سر دے رہا ہوں۔ میرا یہ کردار میرے گھرانے کی نیک نامی کو داغدار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا۔

عجب دل گرفتگی کی کیفیت میں میں نے خالہ پھوپی اور ابا جان سے اجازت لی اور اپنا سفری بیگ تیار کر کے مری جا پہنچا۔ مری میں گزارے ہوئے وہ پانچ چھ روز میرے لیے بڑے کرب ناک تھے اور دل گداز بھی۔ میں نے... ناولوں اور نارسائیوں میں گھرے ہوئے ایک لاچار نوجوان کی المناک کہانی لکھی جو پچیس تیس صفحات پر مشتمل تھی مگر پھر اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا اور کشمیر پوائنٹ کی ایک گھاٹی پر کھڑے ہو کر فضا میں بکھیر دیا۔

تب ایک نئے ارادے اور حوصلے کے ساتھ میں واپس لاہور آ گیا۔ وہ میرا گھر تھا۔ وہ میری چھت تھی۔ مجھے

وہاں کھڑے ہونے سے کون روک سکتا تھا..... اور میرے پاس اس چھت، اس منڈیر اور اس کھڑکی کے سوا اور تھا بھی کیا۔ ہوسکتا تھا کہ اس غصیلے شخص کی گرج زویا کے گھر تک بھی پہنچتی ہو۔ زویا نے بھی سب سنا ہو اور اب وہ دیکھ رہی ہو کہ ایک ڈانٹتی ہوئی آواز کے بعد منڈیر خالی ہوچکی ہے۔

ایک روز بعد میں پھر معمول کے مطابق چھت پر موجود تھا۔ اندیشہ تو تھا کہ وہ شخص پھر بھنائے گا مگر ایسا ہوا نہیں۔ ہوتا بھی کیوں؟ میری نگاہ کی تمام تر آوارگی کے گرد شرافت کا ایک ہالہ تھا اور یہ ''آوارگی'' صرف اور صرف ایک صحن تک مرتکز تھی۔

ایک دن عجب تماشا ہوا۔ تین سال بعد یہ زویا کی جانب سے پہلا نمایاں ردِعمل یا اشارہ تھا۔ یہ اس دور کی معصومیت تھی کہ اس موہوم ردِعمل نے بھی اتنی خوشی دی جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ ان کے گھر کی بالائی منزل پر مالک مکان خود رہتے تھے۔ ان کی بیٹی زویا کی سہیلی تھی۔ زویا کسی وقت شام کی چائے پینے یا ٹی وی پر فلم دیکھنے کے لیے بالائی منزل پر چلی جاتی تھی۔ مگر اس دن تو فلم تھی اور نہ چائے کا ٹائم۔ وہ اپنے خوش رنگ آنچل کے ساتھ بالائی منزل پر نظر آئی اور کھڑکی کی جالی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ڈاک کا نیلا لفافہ تھا۔ بالوں کی لمبی لٹیں اس کے سفید چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ دور سے کھڑکی کے فریم میں ایک تصویر کی طرح نظر آئی۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر نیلے لفافے کو الٹا پلٹا اور پھر کھولا۔

زمین و آسماں میری نگاہوں میں رقصاں ہوگئے۔ دل نے سینے میں دھمال ڈالی۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ بالآخر اسے مجھ پر رحم آگیا ہے۔ وہ بتانا چاہتی ہے کہ مجھے خط لکھے گی۔ میں سرتاپا انتظار ہوگیا اور ایک بار پھر اس جنرل اسٹور کے چکر لگانا شروع کردیے جس کا ایڈریس میں نے اپنے نامرادِ خط میں لکھا تھا۔

کئی چکر لگے، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

درحقیقت فرطِ مسرت و سادگی میں میں نے ایک ہی رخ پر سوچنا شروع کردیا تھا۔

ایک دن تجربہ کار ناصر نے کہا۔ ''میرا خیال شروع سے یہ ہے پیارے! کہ اس نے خط کا لفافہ تمہیں اس لیے نہیں دکھایا تھا کہ تمہیں خط لکھنا چاہتی تھی۔''

''تو پھر کس لیے دکھایا تھا؟''

''شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ تم اسے دوبارہ خط لکھو۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ ان کے دروازے پر لیٹر باکس موجود ہے۔ سارا دن گھر میں کوئی بھی مرد موجود نہیں ہوتا۔ ڈاک کے ذریعے تمہارا بھیجا جانے والا خط اسے موصول ہوگا۔''

ناصر کی باتیں سننے کے بعد رات کو میں نے دل کڑا کیا اور سوچا کہ اسے پھر خط لکھوں مگر فوراً ہی زویا کے بڑے بھائی صاحب کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ کئی ماہ پہلے کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے آیا جب انہوں نے میرا اسکوٹر روک کر کہا تھا۔ ''..... شکل سے تو تم شریف اور پڑھے لکھے لگتے ہو۔''

میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم پھر بند کردیا۔

''نہیں..... اب نہیں، میں نے سوچا۔ میں ایسا عامیانہ رویہ اختیار نہیں کروں گا۔ اگر میری قسمت میں کچھ لکھا ہوگا تو وہ مجھے مل جائے گا... ورنہ یہ بھی بہت ہے جو مل رہا ہے اور نگاہوں کے راستے جسم و جاں کو سیراب کرتا رہتا ہے۔

چھت اور زویا کی بات کررہا ہوں تو ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ہر وقت خیالوں اور تصورات میں کھویا تو رہتا تھا۔ ایک دن گھر میں آم آئے تو ایک بڑا سا قلمی آم لے کر حسبِ معمول چھت پر آگیا۔ یہ ایک گرم رات تھی۔ چھت پر پانی کی ٹینکی تھی جس کا ڈھکنا لکڑی کا تھا۔ میں نے آم ٹھنڈا کرنے کے لیے ٹینکی میں ڈال دیا اور بھول گیا۔

تین چار دن گزر گئے میں جب بھی نیچے باتھ روم میں نہاتا مجھے پانی میں سے آم کی مہک آتی۔ سمجھ میں نہ آتا کہ ایسا کیوں ہے؟ ایک روز خالہ جان نے بھی اس مہک کا ذکر کیا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بھاگ کر چھت پر گیا۔ پانی میں آم کی گٹھلی اور گودے کے ریشے نظر آرہے تھے۔ گھر والوں کو بتایا۔ خوب ہنسے، لیانی والے ابا جی نے کہا۔ ''تم ضرور لکھاری بنو گے۔''

لکھاری بننے کی ابتداء تو بے شک ہوچکی تھی۔ نوائے وقت، آدابِ عرض اور چاند میں میری تحریریں باقاعدگی سے چھپ رہی تھیں۔ رومانی میدان میں اپنی نارسائی اور لاچاری کے اداس دنوں میں میں نے ایک سادہ سی غزل لکھی جو نوائے وقت کے کسی ایڈیشن میں شائع ہوئی۔

پرندے چہچہانے لگ گئے ہیں
صبح غم کے ترانے لگ گئے ہیں
بہاریں اس دفعہ بھی آئی ہیں یوں
گئے دن یاد آنے لگ گئے ہیں
وہی بستر، وہی تارے، وہی شب

پرانے غم ستانے لگ گئے ہیں
طوالت زلف کی جو کھل گئی ہے
دیے سب ٹمٹمانے لگ گئے ہیں

اور پھر ایک اور غزل جس کے شائع ہونے کی اطلاع مجھے صبح صبح پھوپی جان نے دی تھی۔ ساتھ میں میری تصویر بھی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ پہلے ڈر گئی تھیں۔ یہ غزل بھی اخبار میں تھی۔

دو غریبوں کی دوستی کیسی
میرے آنگن میں چاندنی کیسی
جنگلوں کے سفر میں تنہائی
سوچتا ہوں یہ زندگی کیسی
آشیاں سامنے ہوا بے رخ
یا الٰہی یہ بے بسی کیسی

ان سارے معاملات سے ہٹ کر ان دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جو نوعمری کے اس دور میں میرے لیے بہت شرمندگی کا باعث تو بنا مگر دلچسپ اور سبق آموز بھی ہے۔ یہ جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء کا دور تھا۔ کچھ بجا اور کچھ بے جا سختیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک سختی زبردستی روزے رکھوانے کے حوالے سے تھی۔ شدید گرمیوں کے روزے تھے۔ بازار میں پانی پی کر روزہ شکنی کرنے والوں کو آلہ واردات یعنی گلاس، جگ یا بوتل سمیت پکڑ کر ٹرکوں پر چڑھایا جاتا تھا اور تھانوں میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

رمضان گزر چکا تھا مگر گرمی شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ کسی نے مجھ سے اور میرے کزن شعیب سے کہا کہ بھنگ کی تاثیر بہت ٹھنڈی ہوتی ہے۔ شعیب بھی میری ہی طرح اکثر اپنی ٹمبر شاپ پر بیٹھتا تھا۔ اس کا ایک ملازم شاید رفیق نام کا تھا۔ وہ لاہور سے دس پندرہ میل دور چمروپور نامی قصبے میں رہتا تھا۔ بھنگ کے فوائد بیان کرنے میں وہ بھی پیش پیش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کوئی برا نشہ نہیں ہے۔ جس طرح لوگ نسوار رکھتے ہیں یا سگریٹ پیتے ہیں بس اسی طرح ہے۔

وہ سخت تپتی ہوئی دوپہر میں ہمارے ساتھ کار میں بیٹھا اور ہمیں اپنے قصبے میں ایک ملنگ کی کٹیا میں لے گیا۔ ملنگ نے ہم سے کچھ نذرانہ لیا اور کچھ بھنگ شاپر میں ڈال کر ہمیں دے دی اور گھوٹنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ واپس شعیب کے گھر آکر ہم نے ہدایات کے مطابق وہ بھنگ تیار کی اور پی کر لیٹ گئے تاکہ اس کی ٹھنڈک اور اس کے سرور کو محسوس کرسکیں۔

ہم آدھ پونا گھنٹا لیٹے رہے۔ سر کو گول گول گھماتے بھی رہے کہ شاید کچھ سرور محسوس ہو مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

اگلے اتوار ہم رفیق کے ساتھ پھر چمروپور جا پہنچے۔ سواری کروا کار ہی تھی جو ہم نے کوئی تین ماہ پہلے خریدی تھی۔ ہم نے ملنگ کو دبے لفظوں میں سخت سست کہا اور بتایا کہ نشہ تو دور کی بات ہمیں تو جماہی تک نہ آئی۔

وہ کچھ دیر اپنی لال لال آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا، پھر الماری سے بھنگ کا ایک اور شاپر نکال کر ہمیں دیا اور بولا۔ ”جاؤ باؤجی، اب پیو۔“

ہمیں معلوم نہیں تھا اور نہ ہی ہمیں بتایا گیا کہ اس بھنگ میں دھتورا بھی ملایا گیا ہے، جسے نہایت نشہ آور مضر چیز سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے حسب سابق شعیب کے گھر جاکر بند کمرے میں بھنگ کو الیکٹرک گرینڈر میں گھوٹا، برف وغیرہ ڈالی اور تین گلاس تیار کرلیے۔ اس مرتبہ ہمارا ایک اور کزن قیوم بھی ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے ٹیپ ریکارڈ آن کردیا کہ اگر نشہ ہوا اور ہم نے نشے کے عالم میں کچھ گپ شپ کی تو وہ ریکارڈ ہوجائے گی اور ہم بعد میں سن کر محظوظ ہوں گے۔

ہم نے ایک ایک گلاس چڑھالیا۔ جب کوئی سرور نہیں آیا تو شعیب نے تین گلاس اور تیار کرلیے۔ آج برسوں بعد میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو تین گلاس نسبتاً زیادہ گاڑھے مشروب کے ہم نے تیار کرکے رکھ لیے تھے وہ ہماری موت تھے..... دھتورے کی آمیزش اس بھنگ کو نہایت خطرناک بنا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم وہ تین گلاس بھی استعمال کرگزرتے اچانک مجھے ایسا لگنے لگا کہ یہ جو کچھ میرے اردگرد ہے کسی خواب کا حصہ ہے۔ بھنگ چڑھنا شروع ہوئی اور اتنی شدت سے چڑھی کہ زمین و آسمان ہماری نگاہوں میں گھوم گئے۔ کہا یہی جاتا ہے کہ بھنگ غالباً ایک بزدل نشہ ہے۔ دل میں خوف و ہراس جگاتا ہے۔ چار پانچ منٹ میں ہی ہم تینوں کی حالت اتنی پتلی ہوگئی کہ ہمیں لگا، ہم شاید زندہ نہیں بچیں گے۔ میری حالت اس لیے زیادہ خراب تھی کہ میں نے گرینڈر میں سے آخری گلاس پیا تھا جو زیادہ گاڑھا تھا۔

ہمارے دہشت زدہ ذہنوں میں ملنگ کی لال لال آنکھیں گھومنے لگیں۔ ہماری سمجھ میں آگیا کہ اس نے ہماری سخت کلامی کا بدلہ لیا ہے۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

ظاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کارِ ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلم کار کی خود بیتی کا پانچواں حصہ جو خود میں منفرد ہے

ہمارے دہشت زدہ ذہنوں میں بھنگ پلانے والے منگ کی لال لال آنکھیں گھومنے لگیں۔ ہماری سمجھ میں آگیا کہ اس نے ہماری سخت کلامی کا بدلہ لیا ہے۔

کچھ دیر تک تو ہم بند کمرے کے اندر ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ شاید دل یا کہ شاید اس طرح کچھ ہوش آئے۔ اینو فروٹ سالٹ پیا کہ ممکن ہے اس طرح مشروب جلد ہضم ہو جائے اور اس طوفانی کیفیت سے نجات ملے، مگر جب حالات بس سے باہر ہو گئے تو ہم بند کمرے میں سے نکل آئے۔ گھر والوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہماری حالت زار دیکھی اور ان کے رنگ فق ہو گئے۔ کزن شعیب کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنی گاڑی نکالی اور ہم ''اپنی مدد آپ کے تحت'' میو اسپتال کی طرف بڑھے۔ شعیب نے نہایت تحمل مندی کا ایک کام یہ کیا کہ گھر کے ہی ایک سینئر دوست کو گاڑی میں بٹھا لیا۔

بھنگ چڑھی ہوئی تھی۔ اس حالت میں ڈرائیو کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جین مندر کے چوراہے پر شعیب نے گاڑی ایک دوسری گاڑی سے ٹھوک دی۔ رک کر لڑنے جھگڑنے کا وقت ہمارے پاس کہاں تھا۔ ہم سیدھا میو اسپتال پہنچے۔ شعیب کے اس دوست کا نام غالباً ارشد تھا۔ اس نے تجھداری کا کام یہ کیا کہ اسپتال پہنچ کر ہم کو سیدھا ایمرجنسی میں نہیں لے گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ مارشل لاء کا سخت دور تھا۔ اندر جاتے تو شاید پولیس کیس بن جاتا۔ اس نے ہمیں کار میں ہی بٹھائے رکھا اور تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ٹھیک طور پر یہ سوچ رہا تھا کہ ہماری حالت بہتر ہو جائے تو ہمیں واپس لے جائے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ ہمیں گھر واپس لے آیا۔ لیکن ایک عقلمندی اور کی کہ شعیب کے گھر لے جانے کے بجائے ہمیں اپنے گھر لے گیا تاکہ ہماری حالت مزید بہتر ہو سکے۔

صبح تک یہ خبر قریباً پورے خاندان میں پھیل چکی تھی کہ ہم نے بھنگ پی کر تماشے لگائے ہیں۔ ابا جی نے کئی دنوں تک بات نہیں کی۔ بڑے تایا یعنی بڑے ابا جی بھی سخت سست قرار دیتے رہے۔ ہاں چھوٹے تایا یعنی للیانی والے ابا جی کی طرف سے ہم بہن بھائیوں کو ہمیشہ ٹھنڈی ہوا ہی آتی تھی۔ وہ بچپن سے ہماری خامیوں کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے اور ہمارے سامنے ڈھال بنتے آئے تھے۔ اس

وقوعہ پر بھی انہوں نے ہمدردانہ کردار ہی ادا کیا۔

بعدازاں شعیب کا ملازم رفیق اس ملنگ تک پہنچا اور اسے بہت کھری کھری سنائیں۔ پولیس کی دھمکی تک دے دی۔ وہ بھی شرمندہ تھا کہ "ہاتھ" کچھ زیادہ ہی بھاری پڑ گیا ہے۔

اس طرح کے واقعات کے اثرات کچے ذہنوں پر کس طرح مرتب ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگلے ویک اینڈ پر یہی بھنگ والا "اپی سوڈ" فیملی میں ہی ایک اور جگہ ہوگیا۔ میرے ایک چھوٹے بھائی اور اس کے ہم عمر ایک کزن نے بھی بھنگ سے شناسائی کو عین اپنا حق سمجھا۔ بھنگ میں بادام وغیرہ ڈال کر گھوٹا تیار کیا اور پیا۔ نتیجے میں کئی گھنٹے مدہوش پڑے رہے۔ ان کی بھی گوشمالی ہوئی۔ ان کا جرم اس لحاظ سے زیادہ سنگین تھا کہ انہوں نے ہماری حالت زار سے سبق نہیں سیکھا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد زندگی میں کبھی اس طرح کی نوبت نہیں آئی۔ ہماری بھنگ نوشی کے دو تین روز بعد فیملی کے ہی ایک ممبر نے مجھے بتایا تھا کہ جب تم بھنگ کے شدید اثر میں تھے تم اپنی خالہ کا نام لیتے رہے تھے اور ان سے شرمندگی کا اظہار کرتے رہے تھے۔ پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ "تم کسی زویا کا نام بھی لیتے رہے تھے؟"

زویا کے ذکر پر میں کانپ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ میری اس دیرینہ قلبی واردات کا علم فیملی میں کئی لوگوں کو ہو چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں میری شاعری اور افسانہ نگاری کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی ہو۔ بہرحال وہ لڑکپن اور نوجوانی کا دور تھا جس میں اس طرح کی لغزشیں روا سمجھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ سے اس سلسلے میں کبھی کسی نے بات نہ کی۔

بہرحال یہ بھنگ والا واقعہ ایسا تھا جس پر مجھے تادیر شرمندگی محسوس ہوتی رہی۔ میں نے خود احتسابی کا عمل شروع کیا۔ اپنی اسٹڈی اور دکان کی مصروفیت پر بھرپور توجہ دینا شروع کردی۔ ورزش بچپن سے ہی میرا معمول رہا تھا۔ قلم کاری کے بعد کرکٹ اور مارشل آرٹ اولین شوق تھے۔ ویسپا اسکوٹر پر سے بروس لی کی تصویر تو دیر ہوئی اتر چکی تھی مگر دل کے فریم میں لگی ہوئی تھی۔ اس شوق میں پھوپی زاد شعیب بھی میرے ساتھ تھا۔ قاضی شاہین کے علاوہ ہم نے معروف مارشل آرٹسٹ اشرف طائی صاحب کی شاگردی بھی کچھ عرصہ اختیار کی۔ ایک دو مقابلے جیتے بھی، لیکن سچی بات یہی ہے کہ مار دھاڑ والا مزاج رکھنا اور بات ہے۔ جبکہ براؤن بیلٹ یا بلیک بیلٹ وغیرہ ہونا اور بات۔ مارشل آرٹ کی ٹریننگ کے باوجود میں اور شعیب لڑائی بھڑائی سے اتنا ہی دور تھے جتنا قطب جنوبی سے قطب شمالی۔ ہم دونوں باقاعدہ کراٹے پلیئر بننے سے دو تین قدم ہی دور تھے جب ایک سہ پہر میں اور شعیب ایک دوراہے پر کھڑے ہوگئے۔ دائیں طرف ہمارا کلب تھا جہاں سخت مشقت ہماری منتظر تھی جب کہ بائیں طرف لکشمی چوک تھا جہاں فلم "اف یہ بیویاں" کی نمائش زور و شور سے جاری تھی اور سینما بھی فل ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ فلم اور کراٹے کلب کے درمیان گمسان کا رن پڑا۔ یہ ایک طرح سے مستقل مزاجی اور ہڈحرامی کے درمیان رن تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر آج ہم "اف یہ بیویاں" چلے گئے تو پھر دوبارہ کلب نہ جاسکیں گے۔ اور ہم واقعی پھر کلب نہیں گئے۔ ہڈحرامی جیت گئی تھی۔

سچ ہے کہ محنت مکمل طور پر رائیگاں نہیں جاتی۔ کسی نہ کسی شکل میں صلہ ضرور ملتا ہے۔ مارشل آرٹ کے شوق میں جو بھی تھوڑا بہت سیکھا وہ سلسلہ وار کہانیوں میں میرے کافی کام آیا.... میں اس سے مزید کام بھی لے سکتا تھا مگر اپنی معلومات کو غیر ضروری طور پر قارئین پر تھوپنا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ یہ معلومات، مارشل آرٹ، اسلحہ، جہاں گردی یا کسی بھی حوالے سے ہوں میں اختصار سے ہی کام لینے کی کوشش کرتا ہوں۔

تو بات ہو رہی تھی ملنگ کی ستم ظریفی کے سبب پیش آنے والے اس ناپسندیدہ واقعہ کی۔ اس کے بعد میں نے اپنی روزمرہ مصروفیات میں کئی تبدیلیاں کیں۔ ان میں ورزش پیش پیش تھی۔ کرکٹ کے شوق کو بھی پھر سے تازہ کیا۔ میری سہ پہریں ایم اے او کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ میں گزرنے لگیں جہاں کئی کلبوں کے میٹ لگتے تھے اور مستقبل کے کئی نامور کھلاڑی اپنی ابتدائی کرکٹ کھیلنے کے لیے آتے تھے۔ عمران خان کے مبینہ استاد سعود خان، معروف وکٹ کیپر اشرف علی، کسی حد تک وسیم اکرم اور ایسے کئی نامور کھلاڑیوں کا تعلق اس گراؤنڈ سے رہا ہے۔

میری کئی مختصر کہانیوں کے علاوہ ناول "ضدی" میں بھی کرکٹ کے کھیل کو گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہاں میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو اپنی کالونی کے ایک ایسے کردار سے ملواؤں جس کے اثرات میری کہانیوں پر اور میری اپنی زندگی پر گہرے پڑے۔ میں اس کا نام یہاں سلیم لکھوں گا۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اور ان کے والد

ہوٹل چلاتے تھے۔ سلیم کا نمبر اپنے چار بھائیوں میں شاید دوسرا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا۔ یہ پوری فیملی بڑی جی دار اور کسی حد تک لڑاکا مشہور تھی۔ مگر سلیم کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اگر کہا جائے کہ وہ لڑکپن سے ہی بنا بنایا ہیرو تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ دراز قد، دبلا پتلا جسم لیکن نہایت چوڑے شانے، گھنے اور بالکل سیدھے بال۔ ناک زیادہ کھڑی نہیں تھی۔ آنکھوں میں ہر وقت چھپتے جیسی چمک رہتی تھی۔ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ ہر وقت دھینگا مشتی اور پلٹ جھپٹ جاری رکھتا تھا۔ اس نے گھر میں ایک مینڈھا پال رکھا تھا جو زبردست ٹکریں رسید کرتا تھا۔ سلیم اس مینڈھے کے ساتھ ٹکریں کھیلتا تھا اور اس شغل نے دھیرے دھیرے اس کا اپنا سر بھی فولاد کی طرح سخت کر دیا تھا۔

کسی کی ناروا بات برداشت کر لینا سلیم کے بس میں نہیں تھا۔ وہ لڑ پڑتا تھا اور مار مار کر مخالف کا بھرکس نکال دیتا تھا۔ گلی میں جب بھی لڑائی جھگڑے کا شور اٹھتا تھا۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ سلیم کی کسی سے لڑائی ہوگئی ہے۔ باہر نکلتے تھے تو اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوتا تھا۔ وہ لڑنے اور اپنے مخالف پر غالب آنے کی خداداد صلاحیت رکھتا تھا۔ لڑائی میں اس کا اہم ترین ہتھیار اس کے سر کی ضرب ہی ہوتی تھی۔

سردیوں کے موسم میں ایک رات میں اور ناصر، سوئیٹ شاپ سے گاجر کا حلوا کھانے نکلے تو سلیم کے گھر کے پاس دو لمبے تڑنگے نوجوانوں کو دیکھا۔ وہ غالباً گجر برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک نے غلطی یہ کی تھی کہ سلیم کے گھر کی بیرونی دیوار کے پاس، اندھیرا دیکھ کر وہاں پیشاب کر دیا تھا۔ اب سلیم نے چونکہ انہیں دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا وہ ان سے بحث کر رہا تھا۔ وہ غلطی مان لیتے تو شاید بات نہ بڑھتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اچانک سلیم نے جھپٹ کر ان دونوں کے گریبان پکڑ لیے۔ اگلے ایک دو منٹ میں جو کچھ ہوا وہ ششدر کر دینے والا تھا۔ ذرا بڑی عمر کے ان لمبے تڑنگے نوجوانوں کو چھریرے جسم کے سلیم نے اس بری طرح مارا کہ لمحوں میں ان کی پھنے خانی ہوا ہوگئی۔ پے در پے ٹکروں کے سبب ان کے چہرے بری طرح لہولہان ہو چکے تھے۔ میں نے اور ناصر نے بمشکل ان دونوں کو چھڑایا۔

اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں تھا۔ ایسے واقعات ان دنوں ہماری کالونی میں آئے روز پیش آتے تھے۔ مرکزی کردار سلیم ہی ہوتا تھا۔ اور وہ بلاوجہ نہیں جھگڑتا تھا۔ عموماً اپنے کسی محلے دار کی مدد کر رہا ہوتا تھا یا علاقے کے کسی بگڑے تگڑے کو ٹھیک کر رہا ہوتا تھا۔ اس کی جی داری اور آن بان دل میں گھر کر جانے والی تھی۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے ایک مرتبہ علاقے کی ایک طاقتور فیملی کے لڑکوں سے ٹکر لے لی اور اکیلے ہی مار مار کر چار پانچ لڑکوں کا بھرکس نکال دیا۔ ہم نے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا۔ یہ بالکل فلمی سین جیسا تھا۔ یہ لڑائی بھی سلیم نے اپنی گلی محلے کی ناک اونچی رکھنے کے لیے لڑی تھی۔ کوئی ذاتی رنجش نہیں تھی اس کی۔ سلیم کے کردار کی کافی جھلکیاں میرے ناول ''آندھی'' میں موجود ہیں۔ یہ ناول نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس ناول میں بھی میں نے اس جی دار، شعلہ صفت نوجوان کو سلیم کے نام سے ہی لکھا ہے۔

وہ اپنی کالونی کے ہر فرد کی ہر قسم کی مدد کے لیے پوری طرح تیار رہتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی ہمدردی اور معاونت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھ کر وہ بے دریغ کود پڑتا تھا۔ میری کہانی سلسلہ وار تاوان میں استاد جہانی نے جس طرح کی لڑائی بھڑائی کی اس میں بھی سلیم کے کردار کی جھلکیاں موجود ہیں۔ سر کی طوفانی ضرب سے اپنے حریف کو چند ساعتوں میں تباہ حال کر دینا استاد جہانی کا بھی خاصہ تھا۔

صنف نازک کو سلیم میں بے حد کشش محسوس ہوتی تھی۔ لڑکیاں جیسے اس پر مکھیوں کی طرح گرتی تھیں۔ مجھے اس کے رومانی معاملات کا بہت زیادہ علم نہیں لیکن وقتاً فوقتاً مجھے کچھ جھلکیاں ان معاملات کی نظر آتی رہیں۔ ساتھ والی کالونی کے ایک بدزبان تند خو لڑکے سے سلیم کی زبردست مار ماری ہوئی تھی۔ وہ بھی کافی سخت جان تھا۔ بلا مبالغہ وہ دونوں کوئی آدھ گھنٹا ایک دوسرے سے لڑتے رہے تھے۔ لہولہان ہو گئے تھے۔ آخر اسی لڑکے کو ہار ماننا پڑی تھی۔ اس لڑائی کے دو تین ماہ بعد میں یہ دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ اس لڑکے کی قریبی رشتے دار لڑکی ہماری کالونی کی ایک اندرونی گلی سے گزر کر ایک اور گلی میں اوجھل ہو رہی تھی۔ سلیم اس کے ساتھ تھا۔

اس کے ہم عمر نوجوان کہتے تھے کہ اس کے پاس کوئی گیدڑ سنگی ہے کہ اس کے دشمنوں کی خواتین بھی اسے دشمن نہیں سمجھتیں۔ یہ گیدڑ سنگی غالباً اس کی غیر معمولی دلیری اور دوسروں کی آگ میں دیوانہ وار کود پڑنے کی عادت تھی۔

جن دنوں اس کے مالی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے

اس نے رکشا بھی چلایا۔ اس کا رکشا چلانا بھی اپنے اندر ایک ایڈونچر کی سی خصوصیات رکھتا تھا۔ جہاں کہیں کسی نے ٹریفک کے اصولوں کی چھوٹی بڑی خلاف ورزی کرتے ہوئے سلیم کی دم پر پاؤں رکھا وہ سرتاپا شعلہ بن گیا۔ ہم نے کئی جگہ سڑک کے بیچوں بیچ اور لب سڑک اس کی لڑائی کے سنسنی خیز مناظر دیکھے۔ کسی سے ٹکر لیتے ہوئے وہ اس کا اسٹیٹس کہاں دیکھتا تھا۔ سائیکل سوار سے لے کر ہنڈا اکارڈ کے مالک تک کوئی بھی اس کے غضب کی لپیٹ میں آسکتا تھا۔ چند مرتبہ اسے تھانے کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ مگر لگتا یہی تھا کہ پولیس والے بھی اس کی جی داری سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ فرینڈلی ہو جاتے ہیں۔

اردگرد کی کئی منہ زور پارٹیوں سے اس کی دشمنی چل نکلی تھی۔ اس کے بڑوں نے اچھا کیا کہ کچھ عرصے کے لیے اسے مڈل ایسٹ بھیج دیا۔ اور یہ واقعی اچھا ہی ہوا۔ غالباً انہی دنوں میں غیاث عرف غیاثا والے معاملے نے جنوبی لاہور میں زور پکڑا۔ غیاث نے چاندرات کو کئی افراد کو قتل اور زخمی کر دیا تھا۔ زخمی ہونے والوں میں سلیم کا ایک چھوٹا بھائی بھی شامل تھا جس کو غیاث نے اس کی دکان میں گولیاں ماریں۔ اس مشہور واردات کے وقت میری معلومات کے مطابق سلیم مڈل ایسٹ میں تھا ورنہ معاملات مزید بگڑ جاتے۔ غیاث کو بعدازاں پھانسی ہوئی تھی۔

سلیم میں کئی خوبیاں تھیں لیکن خواتین کے حوالے سے اس کے کردار کو قابل تعریف نہیں کہا جاسکتا۔ یقیناً اس میں قصور ان خواتین کا بھی ہوگا جو اس کی بانکی اداؤں پر مرمٹتی تھیں۔

بچپن اور لڑکپن میں میں نے سلیم کی لڑائی بھڑائی کے جو سنسنی خیز مناظر دیکھے تھے انہوں نے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑے۔ یہ اثرات بعدازاں میری کہانیوں میں بھی ظاہر ہوئے۔ اسٹریٹ فائٹنگ کے ان مناظر میں سے ایک منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ کالونی میں ہی کسی جواں سال لڑکے سے سلیم کی لڑائی ہوئی۔ سلیم نے حسب معمول ٹکریں مار مار کر اس کے چہرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ جوان لڑکا تقریباً روتا ہوا رفو چکر ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد لڑکے کا باپ جو اردو اسپیکنگ تھا ایک تیز دھار چھرا لے کر منہ سے شعلے نکالتا۔ سلیم کی طرف آیا۔ سلیم اس وقت بازار میں ایک ہیئر ڈریسر کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے بس چند فٹ کی دوری سے یہ منظر دیکھا۔ لڑکے کا باپ جس طرح آرہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ آتے ساتھ ہی چھرا سلیم کے پیٹ میں گھونپ دے گا۔ مگر سلیم سینہ تانے بالکل ساکت کھڑا تھا۔ کوئی اضطراب نہیں کوئی حرکت نہیں۔ جیسے یقین ہو کہ یہ شخص میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس ادھیڑ عمر شخص نے سلیم کو گریبان سے پکڑا اور چھرے والا ہاتھ پیچھے کیا۔ لگا کہ وہ ابھی سلیم کا پیٹ چاک کر دے گا۔ مگر پھر وہ رک گیا۔ سلیم نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑایا اور دم بدم سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولا۔ ''جا چاچا میرے کسی جوڑ کو بھیج۔''

پھر ایک طرف ہو کر سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کا سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر زور سے کش لینے کا اپنا ہی ایک انداز تھا۔ اسے دیکھ کر میں اور شعیب اکثر سوچتے تھے کہ اگر ایسے نیچرل فائٹر کو آغاز میں ہی کوئی استاد مارشل آرٹ کی طرف لاتا تو شاید وہ قومی بلکہ انٹرنیشنل سطح کا کھلاڑی بن سکتا۔ بعدازاں اس نے تھوڑا بہت پاؤں مقامی سیاست میں بھی رکھا۔ کونسلر وغیرہ بنا اور پھر اس سے کچھ آگے بھی گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایک مقامی الیکشن کے موقع پر اس کا جھگڑا ہاکی کے معروف کھلاڑی اختر رسول سے بھی ہوا جو ان دنوں سیاست میں سرگرم تھے۔ بعد میں صلح صفائی ہوئی۔ سلیم کی اہم ترین خوبی یہی تھی کہ وہ اپنے محلے اور محلے داروں کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ غالباً کوکا کولا کا ایک ٹرک مقامی دکانوں کے لیے سپلائی لے کر آیا۔ اردو اسپیکنگ آبادی کے کچھ چھوٹے لڑکوں نے ہوشیاری دکھائی اور ٹرک کے عقب سے کچھ بوتلیں کھینچ لیں۔ ٹرک والوں کو پتا چل گیا۔ جھگڑا ہو گیا۔ سلیم بھی آگیا۔ لڑکوں کو دو دو تھپڑ جڑے اور ان سے غالباً اوائیگی بھی کروائی۔ اس دوران میں ٹرک والا جو کافی غصیلا سا شخص تھا بول اٹھا۔ ''یہ محلہ ہی ایسا ہے۔''

ٹرک والے کی اس بات نے سلیم کا میٹر گھما دیا۔ اس کو خوب لتاڑا۔ پھر لڑکوں سے کہا۔ ''اٹھالو دو دو چار چار بوتلیں اس کی۔ اگر محلہ ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔''

کل مندرجہ بالا سطور لکھنے کے بعد میں رک گیا تھا۔ آج سفر کر کے اپنے پرانے رہائشی علاقے سمن آباد پہنچا۔ دراصل پچھلے تین چار سال سے مجھے سلیم کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اب کہاں اور کس حال میں ہے۔ دل میں کھٹکا تھا کہ پتا نہیں کہ وہ ہے بھی یا نہیں؟ میں قارئین کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ

حیات ہے..... لیکن صاحب فراموش ہے۔ اسے فالج کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا مگر اب وہ صحت مند ہے۔ کشائش سے زندگی گزار رہا ہے۔ کچھ دکانیں ہیں جن کا کرایہ اسے آتا ہے۔ بیٹا بھی کماتا ہے۔

گزرا ہوا زمانہ واپس تو نہیں مل سکتا، لیکن سلیم کا زمانہ پوری طرح گزرا بھی نہیں ہے۔ قریباً ستر سال کی عمر میں چھریرے جسم والے سلیم کا بانکپن اب بھی کسی حد تک برقرار ہے۔ سلیم میں خوبیاں تھیں تو بہت سی خامیاں بھی تھیں لیکن اسے یاد رکھنے اور اس کے بارے میں لکھنے کی ایک ہی وجہ ہے کہ وہ ایک نہایت نڈر شخص تھا اور جس کو حق پر سمجھتا تھا اس کے لیے دیوانہ وار کھڑا ہو جاتا تھا۔

اسے آج بھی معلوم نہیں اور شاید کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میرے ناول ''آندھی'' کے ابتدائی حصے میں اس کا کردار جگہ جگہ جھلک دکھاتا ہے۔ بعدازاں یہ ضرب میری کئی اور تحریروں میں بھی داخل ہوئی۔

ناول آندھی کا ایک اقتباس دیکھیں۔ ''توبہ باجی! وہ کوئی لڑکا ہے۔ مجھے تو طوفان لگتا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے دونوں یہ اتنے بڑے بڑے ڈشکرے تھے۔ پہلے تو میں سمجھی آج سلیم کی خیر نہیں لیکن جب ان میں سے ایک نے سلیم کو مکا مارا تو اس نے اپنی بغل اتار کر ایک طرف پھینکی اور دونوں کے گریبان پکڑ لیے۔ پھر بڑی تسلی سے انہیں ایک طرف لے گیا اور وہاں وہاں ٹکریں مارنے لگا۔ قسم خدا کی دونوں بچوں کی طرح رونے لگے.....''

☆☆☆

ایک بار پھر ناصر اور نبیلہ کی روداد کا رخ کرتے ہیں۔ نازیبا تصویر والے واقعے کے بعد سے میرا ناصر سے ملنا جلنا کافی کم ہو گیا تھا۔ ناصر کے بجائے اب اپنے کزن شعیب سے میل ملاقات زیادہ رہنے لگی تھی۔ میرے اور شعیب کے مزاج میں کافی ہم آہنگی تھی۔ جوڈو کراٹے، پڑھائی، فلم بینی سب کچھ اکٹھے ہی ہوتا تھا..... تاہم ناصر سے رابطہ مکمل طور پر ٹوٹا نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز میں اور شعیب فلم بائل دیکھ کر سینما سے باہر نکلے تھے (سلطان راہی کی یہ فلم بائل ہی تھی جس نے سلطان راہی کو پے در پے ناکامیوں کے بعد پھر سے نیا اسٹارٹ دیا تھا۔ یہ بلیک اینڈ وائٹ فلم کافی پسند کی گئی تھی۔ اس میں سلطان راہی منہ میں کوئی چیز چبانے کے بعد بار بار اسے تھوکتا ہے۔ یہ انداز بہت مقبول ہوا)

مجھے یاد ہے کہ لڑکپن میں میں اور شعیب جو فلم بھی دیکھ کر باہر نکلتے تھے، کچھ دیر کے لیے خود کو اسی فلم کے ہیرو کی طرح محسوس کرتے تھے۔ وحید مراد کی فلم ہے تو ایک دو گھنٹوں کے لیے سارے انداز وحید مراد کی طرح ہو جاتے تھے۔ محمد علی کی فلم ہوتی تو خود میں محمد علی کی روح بسی ہوئی محسوس ہوتی۔ ممکن ہے کہ کچی پکی عمر کے کچھ اور فلم بینوں پر بھی اس قسم کی کیفیت عارضی طور پر طاری ہوتی ہو۔

اس روز چونکہ ہم نے سلطان راہی کی فلم دیکھی تھی اس لیے خوب اونچی آواز میں باتیں کرتے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر میں ناصر کو دیکھ کر میں ذرا ٹھٹکا..... اس کے ساتھ ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ وہ کسی گمبھیر مسئلے کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ میں نے اشارے سے شعیب کو چلتا کیا اور خود گم صم ناصر کے پاس آن بیٹھا۔

چھوٹتے ہی بولا۔ ''کچھ شرم کرو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے تم نے۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ شرم تمہیں بھی تو کرنی چاہیے تھی نا۔''

وہ مزید بھڑکا۔ ''اچھا اب پھر وہی تصویر والا پھڈا لے کر بیٹھ جاؤ۔ یار چھوڑ دو اب اس بات کی جان۔ ایک غلطی تھی سو ہو گئی۔ اب وہ سب پیچھے رہ گیا ہے۔ اب اور طرح کے مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں اور یہ کافی بڑے مسئلے ہیں۔''

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دیکھ کر میرا دل پسیجا..... میں نے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں اس سے صورت احوال پوچھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ گھر والوں کی طرف سے نبیلہ پر پابندیاں بہت سخت ہو گئی ہیں۔ اندرون خانہ اس کی شادی کی تیاری بھی شروع ہو چکی ہے۔ نبیلہ کے گھر میں اصغر اور اس کی بہنوں کا آنا جانا بھی بہت بڑھ چکا ہے۔ غالباً زبانی کلامی منگنی بھی ہو چکی ہے۔

ناصر نے مزید بتایا کہ نبیلہ کی والدہ نے دبے لفظوں میں ہم سے کہہ دیا ہے کہ دو مہینے کے اندر اندر ہم اپنے لیے کوئی اور گھر ڈھونڈ لیں۔

جو سب سے اہم بات ناصر نے بتائی وہ یہ تھی کہ دو تین روز پہلے نبیلہ کا سیبنہ سگیسٹر اصغر اس سے ملا اور اسے اپنے ساتھ گھر سے باہر لے گیا۔ اس نے ناصر سے کھل کر بات کی۔ اسے صاف صاف لفظوں میں بتایا کہ جو کچھ بھی ماضی میں ہوا وہ ہو گیا۔ اب اس کا سایہ بھی نبیلہ پر نہیں پڑنا چاہیے

کیونکہ وہ اس کی بیوی بننے جارہی ہے۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں ناصر کو دھمکی بھی دے ڈالی تھی کہ اب اگر ناصر کی طرف سے مزید کچھ ہوا اس کے نتیجے اچھے نہیں نکلیں گے۔

مجبوراً ناصر نے بھی اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی تھا اب ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کی زندگی کے راستے بدل چکے ہیں اور ویسے بھی وہ تین چار ماہ کے اندر اپنے روزگار کے سلسلے میں دبئی جانے والا ہے۔

اس کا پروگرام واقعی دبئی جانے کا بن رہا تھا۔ تاہم دبئی جانے اور اپنی مالی حالت بہتر کرنے کے لیے اس نے جتنی بھی جدوجہد کی تھی اس کے پیچھے نبیلہ کی محبت ہی کارفرما تھی۔ حالات کا ستم یہی ہوتا ہے کہ کچھ کامیابیاں حاصل ہو تو جاتی ہیں مگر وقت پر نہیں ہوتیں۔ اب ناصر کے بطور ایکٹریشن دبئی جانے کی اُمید تو پیدا ہو چکی تھی مگر جس منزل کو پانے کے لیے وہ پردیس جانا چاہتا تھا وہ اس سے دور ہو گئی تھی۔

اس نے آنکھوں میں نمی لے کر کہا۔ ''اب ڈیڑھ دو سال بعد لاکھوں کما بھی لوں گا تو وہ کس کام کے؟''

ناصر کے لیے وہ شب و روز بڑے درد بھرے تھے۔ ایک طرف تو وہ اور اس کا بڑا بھائی کرائے کا نیا مکان ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ گھر چھوڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہی وہ گھر تھا جہاں چار پانچ سال پہلے ناصر اور نبیلہ کا تعلق شروع ہوا تھا۔ بے شک اس تعلق میں کئی ناپسندیدہ شیب و فراز بھی آئے تھے، مگر ایک دوسرے کے لیے ان کی چاہت اور جسمانی پکار میں غیر معمولی شدت تھی۔ انہی در و دیوار میں ان کی نگاہوں نے آنکھ مچولی کھیلی تھی اور کونے کھدروں میں ان کی نوخیز دھڑکنوں کی صدا گونجی تھی۔

ناصر سے میرا ملنا اب کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ عاطف اور شعیب کی طرف میرا رجحان زیادہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک شام میں نے اور شعیب نے لاہور کے خیام (شبستان) سینما میں ایک پنجابی فلم دیکھی۔ دیکھنا تو ہم اردو فلم چاہتے تھے مگر ٹکٹ نہ ملنے کے سبب ''پنجابی'' میں گھس گئے۔ اتفاقاً یہ فلم بھی سلطان راہی کی تھی۔ فلم میں زیادہ مار دھاڑ نہیں تھی۔ گانے بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ تین سے چھ والا شو دیکھ کر ہم باہر نکلے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سینما کے بارونق احاطے میں کچھ دیہاتی رنگ ڈھنگ والے نوجوان دو تانگوں پر موجود تھے۔ وہ بھی فلم دیکھ کر نکلے تھے۔ یہ اس فلم کا پہلا شو تھا اور پہلا شو دیکھ کر نکلنے والے فلم بینوں کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ تانگوں پر بیٹھے نوجوان نے ''ڈبا ڈبا'' شور ڈال دیا۔ فلم کے بارے میں یہ منفی تبصرہ سننے کے بعد ٹکٹ گھر کے سامنے قطاروں میں کھڑے بہت سے لوگ تتر بتر ہو گئے۔

میں نے شعیب سے کہا۔ ''یار! مجھے تو فلم کوئی ایسی بری نہیں لگی۔ بلکہ اچھی ہی لگی ہے۔ عام پنجابی فلموں سے کچھ مختلف ہے۔''

شعیب نے بھی بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ وہ فلم شہرۂ آفاق ''مولا جٹ'' تھی۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ کئی سپرہٹ فلموں کی پہلی رپورٹ کچھ زیادہ اچھی نہیں ہوتیں۔ اور بعض کو تو سینماؤں میں سے اتارنے کا سوچا جارہا ہوتا ہے مگر پھر وہ رش پکڑنا شروع کر دیتی ہیں اور ان کی دھوم مچ جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں تھوڑے بجٹ سے بننے والی فلم چکوری بھی اس کی ایک مثال ہے۔

تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہم مولا جٹ دیکھ کر نکلے تو راستہ بھر ناصر ہی کی باتیں کرتے رہے۔ بے شک اس سے کچھ دوری ہو چکی تھی مگر اس کے رنج و غم کا احساس تو گاہے بگاہے ہوتا رہا تھا۔ ہمیں نبیلہ کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے نامہربان حالات کے نرغے میں کیا سوچ رہی ہے۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ ناصر سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے اور یہ سب کچھ برداشت کر لینا اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا۔

ہمیں پتا نہیں تھا کہ حالات کے پردے میں سے کچھ ایسا ظہور میں آنے والا ہے جس کی توقع ہم میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔

☆☆☆

افسانہ اور چیز ہے مگر زندگی کی حقیقتیں بڑی ناہموار اور آبڑکھابڑ ہوتی ہیں۔ بندہ سوچ کچھ رہا ہوتا ہے، ہوتا کچھ ہے۔ ناصر اور نبیلہ کی محبت ظاہری و باطنی تمام شدتوں کے ساتھ موجود تھی مگر اس محبت کے اندر کچھ ایسا ظہور میں آیا جس کی اُمید نہیں تھی۔ اور یہ تھا شک۔ ایک دن بیٹھے بیٹھائے اچانک ناصر کو محسوس ہوا کہ نبیلہ کی زندگی میں اس کے علاوہ بھی کوئی ہے؟ اور یہ اس کا کزن منگیتر نہیں کوئی تیسرا ہے۔ جس گلی میں نبیلہ اور ناصر رہتے تھے اسی میں چند گھر چھوڑ کر ایک چھریرے جسم کا لمبا سا لڑکا بھی کرائے کے گھر میں شفٹ ہوا تھا۔ عام سی شکل و صورت تھی اور ناصر کے

مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ غالباً تھرڈ ائیر میں تھا اور تھوڑا بہت ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اس کا نام وحید سمجھ لیں۔

ناصر نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ''یار طاہر، لگتا ہے یہ جولیو وحید ہے نا..... یہ بھی نبیلہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لڑکے خوبصورت لڑکیوں میں دلچسپی لیا ہی کرتے ہیں۔ تمہیں پریشانی کی کیا بات ہے۔ وہ تو اس میں دلچسپی نہیں لے رہی نا؟''

وہ چند لمحے خاموش رہ کر افسردگی سے بولا۔ ''یہی تو مسئلہ ہے، مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک دلچسپی لے رہی ہے۔''

میں نے اس معاملے کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیا..... اور ناصر کے اس شک کو اسی شدید محبت اور طلب کا نتیجہ سمجھا جو وہ نبیلہ کے حوالے سے رکھتا تھا۔

ناصر نے اپنے شک کو تقویت دینے والے دو چار چھوٹے موٹے واقعات بھی بتائے مگر وہ بھی کچھ زیادہ اہم نہیں تھے۔ میں عرصے سے نبیلہ اور ناصر کا رازدار تھا اور جو کچھ میں نے اب تک محسوس کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ناصر کی چاہ میں سرتاپا ڈوبی ہوئی نبیلہ کوئی اس قسم کا کام کر سکتی ہے۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ پندرہ بیس روز گزر گئے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ناصر سے میرا ملنا جلنا کافی کم ہو چکا تھا اور اس کی وجہ وہی تصویر والا واقعہ تھا کہ فوٹو گرافر کی باتوں میں آکر ناصر اور نبیلہ جیسی سمجھ دار لڑکی سے ایک نہایت احمقانہ اور بے ہودہ حرکت ہوگئی۔ وہ ہم آغوش کے انداز والی تصویر تھی اور اس میں نبیلہ کے بالائی جسم کا ایک حصہ، بالکل عریاں تھا۔ جیسے ثبوت پیش کیا گیا ہو کہ اپنے محبوب کی بانہوں میں موجود یہ لڑکی بچی نہیں پوری طرح بالغ ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے لمحے تھے جن میں ناصر کے ساتھ ساتھ نبیلہ کی مت بھی ماری گئی تھی۔

بات ہو رہی تھی ناصر کے شک کی۔ آٹھ دس دن مزید گزرے تو ایک شام ناصر نے مجھ سے کہا۔ ''آج رات ہم دونوں نے نبیلہ کے گھر میں گزارنی ہے۔''

''ہائیں۔ وہ کیوں؟''

''یار! نبیلہ اور اس کے گھر والے مری گئے ہیں دو دن کے لیے۔ گھر خالی ہے، اس لیے رکھوالی کے لیے مجھے وہاں سونے کا کہہ گئے ہیں۔ دونوں ہوں گے تو ذرا گپ شپ ہوتی رہے گی۔''

رات کو ہم دونوں ان کے گھر میں سوئے۔ یہ تین چار کمرے تھے۔ گھر کی سجاوٹ میں نبیلہ کی سوجھ بوجھ بھی نظر آتی تھی۔ نبیلہ کی چھوٹی بہن آنکھوں سے تقریباً معذور تھی۔ منجھلی ہر وقت پڑھائی میں غرق رہتی تھی۔ گھر کی دیکھ بھال کی زیادہ تر ذمے داری نبیلہ کی ہی ہوتی تھی۔

ناصر کا شک نبیلہ کے حوالے سے پختہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ رات دس گیارہ بجے تک تو ہم گپ شپ کرتے رہے۔ پھر ناصر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ نبیلہ کے گھر کی خاص طور سے نبیلہ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔ ناصر کا ذہن ملٹینیکل تھا اور اس رات مجھے پتا چلا کہ وہ کس قدر باریک بین اور معاملہ فہم ہے۔ نبیلہ کے خلاف کسی ثبوت کی تلاش میں اس نے سارا گھر چھان مارا۔ بغیر چابی کے ایک دو الماریوں کے تالے کھولے اور پھر احتیاط سے انہیں اسی طرح بند بھی کر دیا۔ تب میرا دماغ بھک سے اڑ گیا جب وہ ایک اٹیچی کیس کے اندر سے کچھ خطوط ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ چھ سات رنگ برنگے خطوط نبیلہ کے ایک اٹیچی کیس کے پیندے میں ایک اوڑھے ہوئے غلاف کے اندر بڑی احتیاط سے چھپائے گئے تھے۔ یہ وحید کے خطوط یعنی نامے تھے۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ نبیلہ کے حوالے سے عشق میں ڈوبی ہوئی لڑکی کا جو تصور میرے ذہن میں تھا کرچی کرچی ہوگیا تھا۔ کچھ لوگ سچ کہتے ہیں کہ عورت ایک معما ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

خط دیکھ کر ناصر کا رنگ زرد ہوگیا تھا اور ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ ان خطوں میں کافی شعر و شاعری بھی کی گئی تھی۔ اچھے اچھے خوبصورت فقرے جوڑ کر نبیلہ کو لبھایا گیا تھا۔ خطوں کی تحریر سے صاف پتا چلتا تھا کہ نبیلہ ان خطوں کے جواب بھی دیتی رہی ہے۔

ناصر کو بجا طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی تین چار سالہ محبت کا تاج محل جو پہلے ہی حالات کے دھچکوں سے لرز رہا تھا۔ دھڑام سے نیچے آگرا ہے۔ اس کی آنکھیں بے اختیار رسنے لگی تھیں۔ اس نے بھی کچھ دوبارہ اسی طرح واپس رکھ دیا۔ ایک الماری میں سے کچھ نقدی اور زیورات بھی ملے وہ بھی اس نے احتیاط سے اس کی جگہ پر رکھ دیے۔ اس نے صرف ایک چیز چرائی اور وہ وحید کے خطوں میں سے ایک خط تھا۔ ناصر کے لیے وہ بے پناہ دکھ اور حیرت کی رات تھی۔ میرے احساسات بھی اسی طرح کے تھے۔

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ

ایسا ہوگا۔ اب تو دل چاہتا ہے کہ دبئی جانے سے پہلے ہی لاہور سے کہیں نکل جاؤں۔"

میں اسے تسلی تشفی دیتا رہا۔ میں نے کہا۔ "ناصر! ہوسکتا ہے کہ یہ تعلق اتنا آگے نہ گیا ہو جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ نبیلہ تھوڑا بہت شعر و شاعری کا شوق رکھتی ہے۔ یہ لڑکا وحید لفظوں کی پھول پتیاں بنانا جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بس وحید کے لفظوں سے ہی متاثر ہوئی ہو اور خط و کتابت شروع کردی ہو....."

"نہیں یار!" ناصر نے شدومد سے سر نفی میں ہلایا۔ "اس ثبوت کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہی۔ سب کچھ تباہ ہوگیا ہے میرے لیے۔"

ناصر سے میرا تعلق پہلے والا تو نہیں رہا تھا پھر بھی وقتاً فوقتاً ملاقات ہوجاتی تھی۔ اب وہ دہرے دکھ کا شکار تھا۔ حالات کی ستم ظریفی کہ نبیلہ کی شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں لیکن جو دوسری ستم ظریفی تھی یہ اس سے بھی بڑی تھی۔ وہ بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی۔

ایک دن ہمارے مشترکہ دوست عاطف فٹ بالر نے مجھے بتایا۔ "یار، سنا ہے نبیلہ، ناصر سے بہت معافیاں تلافیاں کررہی ہے اور رو رو کر اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہی ہے۔"

"سوال تو یہ ہے کہ ان خطوں کے بارے میں کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید، وہ تمہارے والی بات ہی صحیح ہے۔ کہتی ہے کہ وحید کے ساتھ بات بس شعر و شاعری اور خط و کتابت تک ہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔"

"لیکن عاطف اس بات کا نبیلہ کے پاس کیا جواب ہے کہ وحید اس کے لیے جان جاناں..... جان من..... اور میری پیاری جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا اور ممکن ہے کہ وہ بھی اسے ایسے ہی القابات سے نوازتی ہو۔"

عاطف نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ کچھ عورتیں جلیبی کی طرح ہوتی ہیں۔ کہاں سے شروع ہوکر کہاں ختم ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"شکر کرو کہ تم کسی ایسی جلیبی سے محفوظ ہو۔" میں نے کہا۔

شاید وہ بات کا رخ میرے معاملات کی طرف موڑ دیتا مگر اسی دوران میں دور سے میرے والد صاحب آتے دکھائی دیے اور ہم نے فوراً موضوع بدل کر آنے والے رمضان شریف کے حوالے سے گفتگو شروع کردی۔

رمضان اور عید کے فوراً بعد ہی نبیلہ کی شادی تھی۔ گھر والوں کی طرف سے اس پر کافی سخت پابندیاں لگ چکی تھیں۔ نبیلہ کا ہونے والا شوہر بھی بلا جھجک ان کے گھر آتا جاتا تھا اور کسی وقت تو لگتا تھا کہ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ مجھے اپنے دو منزلہ گھر کی چھت پر سے ان کے محلے کی گلی نظر آتی تھی۔ ایک دو بار میں نے نبیلہ کو دیکھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ کملایا ہوا اور زرد تھا۔ ایک بار وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ بھی نظر آئی جس کی بینائی معذوری کی حد تک کمزور تھی۔ دونوں بہنوں کے ساتھ نبیلہ کا منگیتر اصغر بھی تھا۔ وہ تینوں فوکس ویگن کار میں بیٹھ کر کہیں گئے۔ غالباً شادی کی شاپنگ وغیرہ کا ہی معاملہ تھا۔

جس دراز قد لڑکے وحید سے نبیلہ کی خط و کتابت شروع ہوئی تھی وہ ایک ارائیں فیملی سے تھا۔ وہ لوگ کرائے کے گھر میں تھے اب چھوڑ کر جاچکے تھے۔ مگر ان کا پانچ چھ ماہ کا یہ مختصر قیام ہی نبیلہ اور ناصر کی کہانی میں ایک اور تکلیف دہ موڑ کا اضافہ کرگیا تھا۔

ناصر جیسے پتھر کا ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ روتا نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ آنسو اس کے اندر ہی اندر گرتے رہتے ہیں۔ نبیلہ کے گھرانے کی خوش حالی اور اپنی غربت کا احساس اسے ہمیشہ سے رہا تھا۔ نبیلہ کی خاطر اپنی مالی حالت بہتر کرنے کے لیے وہ سر توڑ کوششیں کرتا رہا تھا۔ اب جاکر ان کوششوں کے بارآور ہونے کے امکانات پیدا ہوئے تھے مگر اب وہ اس سے بہت دور جاچکی تھی۔ وہ تو اب اس کی جھلک تک دیکھ نہیں سکتا تھا۔

ایک روز مٹھائی کی اسی دکان پر مجھ سے ملا جہاں ہم سردیوں میں گاجر کا حلوا اور گرمیوں میں رس ملائی وغیرہ کھایا کرتے تھے۔ یہ سردیوں ہی کے دن تھے۔ بہت بڑے تھال میں گاجر کا حلوا مہک رہا تھا۔ اس پر ابلے ہوئے انڈوں کے قتلوں اور کھوئے کی سجاوٹ تھی۔ مگر آج یہ حلوا ناصر کے گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ میری کیفیت بھی اس سے ملتی جلتی ہی تھی۔

اس نے حلوے کی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "یار طاہر..... جو امیدیں خواہشیں ہمارے دل کے اندر پلتی ہیں جب انہیں پورا ہی نہیں ہونا ہوتا تو کیوں پلتی ہیں؟"

"کوئی اور خط وغیرہ نہیں لکھا اس نے؟"

''نہیں اب تو بالکل خاموشی ہے۔ خط لکھنا تو دور کی بات ہے، اب تو مجھے لگتا ہے کہ وہ مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی..... اور اگر وہ خط لکھ بھی دے تو فائدہ کیا؟ وہی رو دھو کر خود کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اپنی مجبوریاں بتائے گی۔ بس اب ٹھیک ہے، جیسے بھی ہے۔''

ناصر یہ بات کہہ تو رہا تھا مگر مجھے لگتا تھا کہ اس کے دل کے کسی گہرے گوشے میں یہ خواہش اب بھی موجود ہے کہ وہ شادی سے پہلے ایک آخری بار اس سے ملے۔ دو چار منٹ کے لیے ہی سہی۔ وہ اسے دیکھ لے..... اسے چھو لے۔

آہ بھر کر کہنے لگا۔ ''یار، کسی وقت تو میرا دل چاہتا ہے کہ بہت زیادہ بیمار ہو جاؤں، اتنا بیمار کہ بہت زیادہ تکلیف ہو اور اس تکلیف میں یہ دوسری تکلیف بالکل بھول جاؤں۔''

''اچھا ایویں یوتھیاں نہ مار۔'' میں نے کہا۔ ''بس وہ پہلے والی بات ہی ٹھیک ہے۔ کوشش کر کہ اس کی شادی سے پہلے پہلے تیرا دبئی کا ٹکٹ کٹ جائے۔ وہاں جا کر یہ سب بھولنا آسان ہو جائے گا۔''

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''طاہر، تیری کہانی جیسی پھسپھسی اور بے کار کہانی نہیں تھی میری۔ اس میں بڑی اُمیدیں اور خواہشیں پالی گئی تھیں۔ بڑے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ ایسا برا انجام ہوگا سوچا بھی نہ تھا۔''

پھر ایک دن بالکل غیر متوقع طور پر مجھے نبیلہ کا ایک پیغام موصول ہوا۔ میں ایم اے او کالج کی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل کر واپس آیا تھا اور نہانا چاہ رہا تھا جب میری نگاہ نبیلہ کی ایک سہیلی کنول پر پڑی۔ وہ میری خالہ جان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ خالہ جان ہانڈی دیکھنے کے لیے کچن میں گئیں تو وہ جلدی سے میرے پاس آئی اور بولی۔ ''طاہر بھائی، نبیلہ کہتی ہے کہ آپ اس کی مدد کریں۔ ناصر نے کہیں کہ وہ اسے معاف کر دے۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ صرف اور صرف ناصر سے محبت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ناصر کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اپنے والدین کی مرضی سے اس کی شادی طے ہو جانا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس نے جو دوسرا دکھ اس غریب کو دیا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا۔''

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی، بولی۔ ''وہ کہتی ہے وہ سب ویسا نہیں تھا جیسا ناصر سمجھ رہا ہے۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ میں اپنے پیار کا پورا پورا ثبوت دوں گی ناصر کو۔ وہ دیکھ لے گا۔''

''کیا گولیاں شولیاں کھانے کا ارادہ ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ایسا تو وہ نہیں کرے گی مگر..... کچھ ایسا نہ ہو جائے جو خطرناک ہو۔ آپ ناصر کو سمجھائیں کہ وہ کم از کم خطوں والی بات اپنے دل سے نکال دے۔''

میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''میں پیا میر بننا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی ناصر سے میرا ملنا جلنا اب بہت کم ہو چکا ہے۔ وہ خود بات کیوں نہیں کرتی؟''

''شاید کرے گی۔ مگر آپ ناصر کو زم تو کر سکتے ہیں۔''

میں نے گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا میں اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ شاید کوئی ذی شعور بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ جو کچھ بھی ہوا تھا..... وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ایسے واقعات کے مضمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا نتیجہ جلد یا بدیر کسی نہ کسی صورت میں تو بھگتنا ہی پڑتا ہے اور کچھ دیوانے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو کہتے ہیں ٹھیک ہے بھگت لیں گے۔

وہ سردیوں کی ایک مختصر اور ٹھٹھری ہوئی شام تھی۔ نبیلہ کی شادی میں قریباً پندرہ دن اور ناصر کی دبئی روانگی میں تین دن باقی تھے۔ وہ ہمارے گھر آیا اور سیدھا میرے کمرے میں آن پہنچا۔ میں نوائے وقت کے ہفتہ وار میگزین کے لیے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا۔

میں نے کہا۔ ''ابھی پرسوں جانا ہے اور رخصت ابھی ہو رہے ہو؟''

بولا۔ ''سمجھو ابھی ہو رہا ہوں۔ ہر چیز سے رخصت ہو رہا ہوں۔ بہت بھاگ دوڑ ہے۔ کئی کام ہیں۔ ابھی درہم وغیرہ کا انتظام بھی کرنا ہے۔''

وہ گلے مل کر پیچھے ہٹا۔ اس کے تاثرات میں مصروفیت کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن آنکھوں میں ایک نشہ سا تیرتا محسوس ہوا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا بنا پھر؟ نبیلہ کی جھلک دیکھی یا نہیں؟''

''دیکھی..... بلکہ ملاقات ہوئی..... سب بتاؤں گا تمہیں۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔''

پچھلی گلی میں اس کے دوست کی موٹر بائیک کا ہارن بار بار بج رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر غیر متوقع طور پر مجھے گلے سے لگایا اور بولا۔ ''ابھی جلدی میں ہوں۔ کل کسی وقت ملوں گا تم سے۔''

مجھے ذرا حیران اور کچھ پریشان چھوڑ کر وہ لپکتا ہوا چلا گیا۔

پھر یوں ہوا کہ سفر کی گوناگوں مصروفیت میں وہ اگلے روز بھی وقت نہ نکال سکا۔ علی الصباح اس کی فلائٹ تھی۔ مجھے بھی صبح سویرے نمبر شاپ پر کام تھا۔ ٹرک پر لکڑی آرہی تھی جسے ان لوڈ کرانا تھا۔ مجبوراً اسے گھر سے ہی خدا حافظ کہا۔ گلے ملتے ہوئے میں اس کے کان میں بولا۔ ''تم نے بتایا ہی کچھ نہیں؟''

''چلو، عاطف سے پوچھ لینا۔ سب بتایا ہے اسے۔''

وہ چلا گیا۔

اس روز شام کو کرکٹ گراؤنڈ سے واپس آتے ہی میں نے عاطف کو جا دبوچا۔ عاطف سے جو کچھ معلوم ہوا وہ میرے لیے حیران کن تھا۔ تعجب خیز تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نہایت الجھن آمیز اور تکلیف دہ تھا۔ میری زندگی کی کتاب سے ناصر سے تعلق کا صفحہ اس روز پھٹ کر ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گیا تھا۔

شادی سے پہلے نبیلہ پر زبردست پہرے تھے..... مگر ناصر اس کا محبوب تھا۔ اور کہتے ہیں کہ جب کوئی عورت اپنے محبوب سے ملنا چاہے تو اس کے لیے راستے ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ ناصر پر اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ اس کا تن من صرف اس کے لیے تھا۔ نبیلہ نے ناصر سے ملنے کی راہ ڈھونڈی۔ اس کے لیے نبیلہ کی اسی فرینڈ کنول کا گھر استعمال ہوا۔ نبیلہ اور ناصر کی یہ ملاقات طویل ہوئی اور ان ساری حدوں سے گزر گئی جن سے اسے نہیں گزرنا چاہیے تھا۔ میں اس کی تفصیل میں جاؤں گا تو یہ ایک سنگینی کو رنگینی دینے کے مترادف ہوگا۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ اس ملاقات میں وہ لڑکی نجانے کس انوکھی، ہیجانی کیفیت میں تھی۔ اس نے کلی طور سے ناصر پر یہ ثابت کیا کہ اس سے پہلے کسی مرد نے اسے چھوا تک نہیں ہے..... اور یہ اجازت بھی دی کہ وہ کلی طور پر اسے چھو لے۔

یہ کیا تھا؟ محبت تھی؟ کسی کی طلب کی شدت کا احساس تھا؟ کسی کو جو ناروا دکھ دیا گیا تھا اس کی تلافی تھی؟..... یا پھر کسی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کا اپنا ایک انداز؟ (جو معاشرے کے لیے کسی بھی صورت قابل قبول نہیں)

بس اتنا کہوں گا کہ ان واقعات کو اب قریباً 45 برس گزر چکے ہیں۔ ناصر نے معمول کے مطابق اپنی زندگی جی ہے۔ دبئی سے واپسی کے بعد اس کی شادی ہوئی دو بچے بھی ہوئے۔ اس کی مالی حالت اوسط درجے کی رہی۔ اب وہ بڑھاپے کی کئی بیماریوں کا شکار ہے۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی ہے۔ اب کسی شادی غمی پر اس سے رسمی سی ملاقات ہو جاتی ہے۔ گفتگو دو چار فقروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ نبیلہ کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں۔ اس کی شادی اپنے اسی کزن سے ہوئی تھی۔ لگتا یہی ہے کہ اس شخص نے نبیلہ کو اس کی ساری ظاہری و خفیہ خامیوں، کوتاہیوں سمیت قبول کر لیا تھا۔

اب بھی کبھی کبھی مجھے ان خطوں کا خیال آتا ہے جو اس رات ناصر نے اور میں نے ایک اٹیچی کیس کے اندر سے برآمد کیے تھے۔ وہ سب کیا تھا؟ کیا وہ صرف ایک تحریری تعلق تھا جو فقط شعر و شاعری کے حوالے سے پروان چڑھا تھا یا اس نے آگے چل کر کوئی اور شکل بھی اختیار کر لینا تھی؟ زندگی میں بہت سے سوال بس ''سوال'' ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اور نبیلہ؟ نبیلہ بھی ایک سوال ہی تھی۔

☆☆☆

اب پھر آتے ہیں زویا کی طرف۔ ایک صحن اور ایک چھت کی طرف۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ دوپہر کی سنہری دھوپ، مختصر شامیں اور طویل راتیں..... ہاں دوری اور نارسائی کی طویل راتیں۔ میں اسلامیہ کالج جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے ابا جان کا ہاتھ بٹانے کے لیے نمبر شاپ پر بھی کافی وقت دے رہا تھا۔ محلے کے ایک سرخ سپید رنگت والے سفید ریش بزرگ تھے۔ ان کا مختصر ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں بڑے خوش اخلاق تھے۔ ان کو سب چھوٹے بڑے میاں جی یا میاں جاذب کہہ کر بلاتے تھے۔ ایک روز میں کریانہ اسٹور کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر اپنے پاس لکڑی کے اسٹول پر بٹھا لیا۔ بولے۔ ''کیا ہر وقت چھت کی منڈیر پر ٹنگے رہتے ہو۔ بات کچھ آگے چلی یا نہیں؟''

میں کچھ شرمایا تو کہنے لگے۔ ''جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ اور جو خواہ مخواہ شرماتا ہے وہ پچھتاتا ہے۔ شرم میں شرم نہیں ہوتی۔ لڑکا لڑکی تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں پسند کر سکتے ہیں۔''

پھر ذرا توقف کر کے بولے۔ ''جس کے لیے مرے جا رہے ہو، وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے یا نہیں؟''

''تقریباً۔'' میں نے بمشکل کہا۔

انہوں نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ''ڈیڑھ

دو سال بعد بھی بس تقریباً محبت میں تقریباً کچھ نہیں ہوتا سیدھی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں تم گھامڑ ہی لگتے ہو۔ ایک بے جان، بے کار سی کہانی کو جنم دو گے اور ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔"

پھر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس عمر میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اس میں شرمانے کی بات نہیں۔ اگر میں کنفرم ہوں کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے تو پھر میں مہذب، شریفانہ طریقے سے اس بات کو اپنے بڑوں کے ذریعے آگے بڑھاؤں؟ اور اگر میں چاہوں تو وہ خود بھی اس سلسلے میں میری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتے ہیں۔

میں میاں جی کی باتیں توجہ سے سن کر چلا آیا۔ انہوں نے کنفرمیشن کی بات کی تھی۔ مسئلہ تو یہی تھا کہ ابھی تک کچھ بھی کنفرم نہیں تھا۔ بس ایک اندھیرے اجالے کی سی کیفیت تھی۔ اور پھر میرے خط کا جواب نہ دیئے جانے کی گرہ سی بھی تھی جو دل میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں کبھی کبھی خود کو ملامت بھی کرتا تھا کہ یہ گرہ کیوں لگ گئی ہے۔ کون سی ایسی خاص خوبی ہے مجھ میں جو میرے جاہل نفس نے مجھے انا کے بانس پر چڑھا دیا ہے۔

اور پھر یہی سوچیں تھیں جن کے سبب میں نے اپنی بے کار اکڑفوں کے سر پر دو چار دھولیں جمائیں اور ایک بار پھر زویا سے رابطے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ دسمبر کی 19 تاریخ اور جمعہ کا دن تھا۔ زویا کے کالج میں کوئی سہ ماہی یا شش ماہی ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ اس نے دوپہر کے بعد کالج جانا تھا۔ میں آج اس سے بات کرنا چاہتا تھا، تاہم اپنی "قادر الکلامی" کا بھی بڑی اچھی طرح پتا تھا۔ لہٰذا ایک خط لکھ کر بھی پاس رکھ لیا۔ خیال یہی تھا کہ اگر گفتگو بے اثر رہی تو شاید قلم کاری ہی کچھ بھلا کر دے۔ اپنے بہترین کپڑے پہن کر بال شال سر پر جما کر میں بس اسٹاپ پہنچا اور زویا کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ سمن آباد گرلز کالج کی اسٹوڈنٹ تھی۔ کالج سے ایک اسٹاپ پہلے ہی وہ بس سے اتر گئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہ بوکھلاہٹ میں ایسا ہوا ہے مگر پھر اندازہ ہوا کہ اس نے مجھے راستے میں بات کرنے کا ایک موقع دیا ہے۔ میں سڑک کے کنارے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں السلام علیکم کہنا چاہتا تھا لیکن یہ السلام علیکم ایک آہنی گولے کی طرح میرے گلے میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ایسا ہی ہوا تھا۔ آخر بہت مشکل سے یہ گولا اپنے گلے سے نکالا۔ "السلام علیکم

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہِ آزادی کے دلفریب رنگ

اگست کے جاسوسی کے مختلف آہنگ

اولین سوغات

نیکی اور بدی، خیر و شر کا ازلی تصادم.....

پُل صراط پر چلنے والوں کی سنسنی خیز داستان

اسما قادری کے کہنہ مشق قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی

دردناک داستانِ حیات.....

روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

دہر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے

والے ایک دلیر نوجوان کی کوہ پیمائی

حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

جنگ جیتنے کے لیے ہر حربہ آزمایا جاتا ہے.....

سنسنی خیز لمحات سے مزین سرورق

دوسرا رنگ

دوڑتی بھاگتی زندگی میں ڈوبے کرداروں کا

حسین امتزاج..... سرورق کی تیکھی کہانی

چٹکی بجاتے چٹکی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...

شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

زویا۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ کتابیں سینے سے لگائے، سر جھکائے بدستور چلتی رہی۔ آنچل کے نیچے سے نکل کر بالوں کی ایک لٹ رخسار پر جھول رہی تھی۔ دسمبر کا سورج اس کے گندمی رنگ میں دلکش سرخی کی آمیزش کر رہا تھا۔

میں نے اس کے قریباً پہلو میں چلتے چلتے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس موقع پر جو کچھ اس نے کہا اور اپنی "بے بہا عقل سمجھ" کے مطابق جو شاندار جواب میں نے دیے۔ انہیں ہو بہو یہاں نقل کرنے میں، میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔

"آپ کیوں تنگ کرتے ہیں مجھے؟" اس نے نارمل لہجے میں کہا۔

اگر میں کہانی لکھ رہا ہوتا تو مناسب جواب کچھ اس طرح ہونا چاہیے تھا۔ "آپ کو تنگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کے پریشان ہونے کا خیال ہی ہے جس کی وجہ سے کبھی دل کی بات زبان پر نہیں لایا۔"

لیکن اس کے بجائے میں نے ایک بے تکا سا جواب دے ڈالا۔ "کبھی تنگ کیا ہے آپ کو؟"

"تو جائیے، پریشان نہ کیجیے۔"

میں نے اپنے سرپٹ بھاگتے دل کو بمشکل سنبھالا اور کہا۔ "میں نے آپ سے جواب مانگا تھا؟"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جواب آپ کو دے تو دیا تھا بھائی نے۔"

اشارہ کچھ عرصہ پہلے کی اسی مہذب وارننگ کی طرف تھا جو زویا کے بڑے بھائی نے مجھے سرراہ دی تھی۔

اب زویا کی اس بات کا جواب تو کچھ ایسا ہونا چاہیے تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری حرکت کی وجہ سے انہیں مجھ سے اس لہجے میں بات کرنا پڑی۔"

اس کے بجائے میں نے پھنر ایک ٹھس سا جواب دیا۔ "زویا! مجھے آپ کے بھائی کا نہیں آپ کا جواب چاہیے۔"

وہ بولی۔ "آپ نے جو کہنا ہے بھائی سے کہہ دیجیے۔ میں سن لوں گی۔"

یہ ایک کافی بڑی رعایت تھی، جسے نیم رضامندی بھی کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس وقت عالم بدحواسی میں یہ بات بھی میرے سر کے اوپر سے ہی گزری۔

حالانکہ اگر میرے ہاتھ میں قلم ہوتا اور میں کہانی لکھ رہا ہوتا تو اس بات کے جواب میں کہتا۔ "ٹھیک ہے زویا، بھائی جان سے بھی بات کر لیتا ہوں لیکن آپ کی خاموشی مجھے الجھن میں مبتلا رکھتی ہے۔ پلیز مجھے بتا دیجیے کہ میں اچھے کی امید رکھ سکتا ہوں۔"

ممکن ہے اس سوال کے جواب میں، اس سڑک کے کنارے، اس خوبصورت سہ پہر کی سنہری دھوپ میں وہ کوئی ایسی بات کہتی کہ روح سرشار ہوتی اور دل کی ہر گرہ آپوں آپ کھل جاتی، مگر جب اس نے کہا کہ بھائی سے بات کر لیجیے تو میرے سارے الفاظ اسی جگہ جامد ہو گئے۔ میں فوراً ہی پلان بی پر آ گیا۔ میں نے مٹھی میں دبا ہوا خط اسے دے دیا اور بس اتنا کہا۔ "اچھا..... تو یہ خط رکھ لیجیے۔"

خط دینے سے مراد یہ نہیں کہ اس کے ہاتھ میں تھمایا، بلکہ جو کتابیں اس نے سینے سے لگا رکھی تھیں ان کے اوپر رکھ دیا۔ پھر اپنی رفتار سست کر دی تاکہ وہ آگے نکل جائے۔ تاہم سڑک کے موڑ تک اسے دیکھتا رہا کہ اس نے خط پھینک تو نہیں دیا۔ دل سرپٹ گھوڑے کی طرح بھاگ رہا تھا۔ جیسے میں نے بہت بڑا تیر مار لیا ہو۔ درحقیقت اپنی کم ہمتی اور کوتاہ اندیشی کے سبب میں نے ایک بار پھر خط کا ٹینٹا کھڑا کر دیا تھا۔ جیسے پنجابی میں کہتے ہیں..... کھوتا کھوہ میں ڈال دیا تھا۔

دو تین روز بعد گلی کی نکڑ پر بیٹھے میاں جی نے مجھ سے میرے رومانی معاملے کے بارے میں ٹوہ لینے کی کوشش کی، مگر میں بات گول مول کر گیا۔ دراصل اب ایک بار پھر مجھے خط کے جواب کا انتظار لاحق ہو گیا تھا۔ مجھے کسی حد تک یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں زویا کے بڑے بھائی مجھے ایک بار پھر سرراہ روک نہ لیں، مگر تین چار دن گزرنے کے باوجود جب ایسا کچھ نہیں ہوا تو تھوڑی تسلی ہو گئی۔ لگتا یہی تھا کہ زویا نے اس بار کوئی شکایت نہیں کی۔ اس بار میں نے جواب کے لیے جو ایڈریس لکھا تھا وہ عاطف کے ایک کزن کے مہر جنرل اسٹور کا تھا۔ ایک بار پھر روزانہ اسکوٹر پر مہر جنرل اسٹور کے پھیرے شروع ہو گئے۔ میں شام سے پہلے جاتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو سورج ڈوب رہا ہوتا تھا اور اس کے ساتھ میرا دل بھی۔ خط کا جواب پھر کہیں نہیں تھا۔ خط کے مضمون کے بارے میں تفصیل میں جانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ بس وہ ایک مختصر اور گھائل دل کا دکھی محبت نامہ ہی تھا۔

راستے میں آتے جاتے، گلی کے موڑ پر بیٹھے نورانی چہرے والے میاں جی اکثر مجھے کھوجنے والی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جیسے میرے اندر کی اتھل پتھل سے بخوبی آگاہ ہوں۔ ان کی خاموش نگاہیں یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی

تھیں..... بے وقوف لڑکے کیوں خود کو خوامخواہ رول رہے ہو اور تکلیف میں مبتلا کر رہے ہو۔ اگر چاہو تو میں تمہارے بڑوں سے بات کر سکتا ہوں؟

مگر میں ان کے سوال پر غور کیوں کرتا؟ میرے اندر تو پھر وہی دکھ بھری انا کا سانپ پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ انتظار کی کہنہ لت نے پھر دل و دماغ کو جکڑ بند لگا دیئے تھے۔

اور بات صرف میاں جی کی ہی نہیں تھی۔ گھر میں پھوپی اور خالہ جان بھی اپنی روز روز بڑھتی بے چینی کو محسوس کر چکی تھیں۔ ایک دن پھوپی جان نے بھی کچھ اس قسم کی بات کی تھی جیسے اندازہ لگانا چاہتی ہوں کہ میں اس معاملے میں کس حد تک سنجیدہ ہوں اور آئندہ کیا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں بھی کچھ نہ بتایا تھا اور بات ٹال دی تھی۔ میری ساری سوچوں، امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تو وہ خط تھا، جو ایک سہانی شام کو مجھے ملنا تھا اور جس نے میری ساری محرومیوں کے داغ دھو کر میرے لمحوں کو زخموں میں مندمل کر دینا تھا۔ وہ خط جیسے خط نہیں رہا تھا، وصل کی ساری راحتوں کا اشعارہ بن گیا تھا اور جو انتظار کی تکلیف میں جھیل رہا تھا، یہ شاید وہی تھی جو انسان کے اندر قوت تخلیق کی آبیاری کرتی ہے اور اسے لفظوں، رنگوں اور موسیقی وغیرہ سے پیار ہوتا ہے۔ مجھے لفظوں سے پیار ہو رہا تھا۔ ان دنوں نوائے وقت اور مشرق کے ہفتہ وار ایڈیشنوں میں نثر کے علاوہ میری شاعری بھی تواتر سے شائع ہو رہی تھی۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

جو ہونٹوں پر آتی ہے، کیسے کہوں گا
میں صدیوں کا چپ ہوں، میں چپ ہی رہوں گا
محبت بھرا خط لکھوں گا میں اک دن
پھر اپنے پتے پر روانہ کروں گا

جس روز میں بس میں زویا کے ساتھ اس کے کالج تک گیا تھا۔ اس روز دو ڈھائی سال بعد میں نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اور یہ چھونا بھی قصداً نہیں اتفاقاً ہی تھا۔ سراسر اتفاقاً..... بس سے اترتے وقت اس کا ہاتھ بس کے راڈ پر تھا۔ میں نے بھی راڈ کو تھاما اور یوں ہاتھ چھو گیا۔ اب ایسی باتیں سوچ کر ہنسی آتی ہے اور رونا بھی۔ اس وقت یہ لمحاتی لمس بھی بے حد قیمتی اور خاص تھا میرے لیے۔ ان دنوں میں ذاتی ڈائری بھی لکھتا تھا۔ اس واقعے کی نسبت سے ڈائری کا ایک ورق، ہو بہو یہاں نقل کر رہا ہوں۔ شاید پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔

19 دسمبر بروز جمعہ: رات 10 بجے

آج بہت اہم دن تھا۔ صبح صبح جب چھت پر ہینڈ بیگ سے پریکٹس کر رہا تھا۔ صحن میں "Z" کو دیکھا۔ وہ صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ (ڈائری میں "Z" یعنی زویا کو میں مذکر کے صیغے میں لکھا کرتا) نو بجے کے قریب دیکھا، وہ کالج نہیں گیا تھا۔ غالباً ایک بجے کے بعد وہ سیکنڈ ٹائم پیپر کے لیے گھر سے نکلا۔ میں پیچھے گیا اور بس میں سوار ہو گیا اس کے ساتھ ہی..... وہ ایک اسٹاپ پہلے ہی اتر گیا۔ اترتے وقت ہاتھ سے ہاتھ چھو گیا۔ راستے میں میں نے فرسٹ ٹائم براہِ راست بات کی۔ اس نے قدرے ترشی سے جواب دیئے۔ بہرحال خط لے لیا۔ میں واپس آ کر شاپ پر بیٹھا رہا۔ وہاں سے پونے چار بجے کے قریب Z گھر جانے کے لیے گزرا۔ انداز میں تیزی تھی۔ گھر آ کر میں چھت پر لیٹا رہا۔ پھر نیچے جھرنے سے جھانک کی (یعنی منڈیر کے جھرنے سے نیچے دیکھا) شام کے بعد Z صحن میں واک کر رہا تھا۔ موڈ نارمل معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے کچھ تسلی ملی اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال میں اس کو اپنے سے برتر جانتا ہوں۔

باقی آج کے فعال دن کی وجہ سے کمر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ ٹمپریچر بھی کچھ ہائی ہے۔ کرانے کی روزانہ ورزش ملتوی کر کے سونے جا رہا ہوں۔

23 دسمبر بروز منگل۔ شام

کالج سے دو جنوری تک چھٹی ہے۔ صحت کچھ ڈاؤن محسوس ہوتی ہے۔ کل اور پرسوں سر میں درد ہوتا رہا ہے۔ آج کل شام کے بعد جلد سو جاتا ہوں اور اسٹڈی بھی صبح کو ہوتی ہے۔

Z کو لیٹر (خط) دیئے چار دن ہو چکے ہیں۔ گھر والوں کو Z نے لاعلم رکھا ہے۔ لیکن رویہ بہرحال کھچاؤ کا ہے۔ Z کے الفاظ "جائیے پھر..... مجھے تنگ نہ کیجیے۔" دل میں اٹک کر رہ گئے ہیں۔

2 جنوری بروز جمعہ

Z (زویا) کو لیٹر دیئے پورے پندرہ روز ہو چکے ہیں۔ آج موسم سرما کی تعطیلات کے بعد میں پہلی بار کالج گیا تھا۔ آج سارا دن بادل چھائے رہے ہیں؟ اور موسم یخ بستہ رہا ہے۔ نمبر شاپ پر آج کل کچھ کم جا رہا ہوں۔ اسٹڈی کرتا ہوں یا رودن سے کہانی مکمل کر رہا ہوں (اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ ڈائری میں یہ کس کہانی کا ذکر ہے۔ بالکل ابتدائی کہانیاں ہی ہوں گی)

Z بھی کالج جانے لگا ہے شاید فرسٹ جنوری سے

ہی.....اس کا ردعمل ابھی تک مبہم سا ہے۔ اب تو کبھی کبھی مجھے اس پر غصہ بھی آتا ہے۔

☆☆☆

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ دل میں عجیب سی بے کلی رہتی تھی۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ میں اپنا غصہ اپنے اوپر ہی اتارنے لگ جاتا ہوں۔ کبھی کرکٹ میں اتنی سنسنی کہ جان ہلکان ہو جائے۔ کبھی جوڈو کراٹے کے حوالے سے ہینڈ بیگ پر اتنی پریکٹس کہ انگلیوں کی پوروں سے خون رستا محسوس ہو۔ یہ تمام مزاجی اور اندر کی بے قراری ہی تھی جس کے سبب میں نے تھرڈ ایئر کے آخر میں کئی مضامین بدلے، بزعم خود کبھی بہت بڑا سیاستدان بنا، کبھی معیشت دان اور کبھی سائیکالوجسٹ۔ تاہم سائیکالوجی ایسا مضمون تھا جو تسلسل کے ساتھ میری ''گڈ بکس'' میں رہتا تھا۔ اس مضمون میں مجھے ایک خاص قسم کی آگاہی کا احساس ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ آئندہ یہی آگاہی میری کہانیوں اور خاص طور سے مختصر کہانیوں میں شامل ہونے والی تھی۔ مرحوم علی سفیان آفاقی صاحب میری مختصر کہانیوں میں نفسیات کے عمل دخل کو سراہتے تھے۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے ایک عجیب خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اپنی عقل کو کوسا کہ میں کیوں ایک بار پھر خط کے لامتناہی و لاحاصل انتظار میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مجھے وہ بات یاد آئی جو عاطف میرا دوست کئی بار کہہ چکا تھا۔

''.....وہ جس ٹائپ کی لڑکی ہے تمہیں خط نہیں لکھے گی۔ تم اپنے معاملے کو ناصر اور نبیلہ والے معاملے کی طرز پر نہ دیکھو۔''

شاید وہ ٹھیک ہی کہا کرتا تھا۔ نبیلہ نے ناصر کے خطوں کے جواب دیئے اور مختلف جگہوں پر اس سے اکیلے میں ملاقات بھی کی۔ پھر ان کے تعلق نے کیا رنگ اختیار کیا اور کس انداز میں ختم ہوا۔ جو کچھ بھی سمجھا جائے مگر آخر میں نبیلہ کا کردار وہ نہ رہا جو میں سمجھتا تھا اور جو ناصر سمجھتا تھا۔ اس کے اپنی کیس سے اس وحید نامی لڑکے کے خطوط بھی ملے۔

میں نے سوچا کیا مستقبل میں کبھی میں زویا کے حوالے سے اس قسم کی صورت حال برداشت کر سکوں گا۔ میں نے تو ان دنوں زویا کو اپنی کل کائنات سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی کبھی یہ سوچنا بھی محال محسوس ہوتا تھا کہ زویا کے بغیر بھی زندگی ہو سکتی ہے۔

یکایک ہی یہ عجیب کیتھارسس ہوا تھا میرے دل و دماغ کا۔ مجھے یہ بات سمجھ میں آنا شروع ہو گئی کہ مجھے خط کے جواب والے اس معاملے کو زویا کی محبت کی کسوٹی نہیں بنا لینا چاہیے۔ یہ شاید محبت نہیں ضد تھی۔ میں نے اس ضد سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ اب اس معاملے کو نسبتاً کسی بہتر و مناسب طریقے سے آگے بڑھاتا ہوں۔

زویا کا یہ فقرہ بار بار ذہن میں گونجنے لگا۔ ''آپ نے جو کہنا ہے بھائی سے کہہ دیجیے، میں سن لوں گی۔''

یقیناً اس میں اور بھائی میں کوئی انڈر اسٹینڈنگ تھی تا جو وہ یہ بات کہہ رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک راستہ دیا تھا اور میں اپنی کوتاہ بینی کے سبب ایک بار پھر مہینوں کے لیے خط کے جواب والے چکر میں پڑ گیا تھا۔ یعنی کھوتا کھوہ میں۔

سچی بات یہی ہے کہ لکھنے لکھانے کے چکر میں کچھ باتیں مجھے دیر کے بعد سوجھتی تھیں۔ زویا کے گھرانے کے حوالے سے ہی ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آیا۔ زویا کی والدہ نے سیاہ برقعہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ پلاسٹک کی اپنی نیلی ٹوکری لے کر وہ اکثر کالونی کے بازار میں سودا سلف لینے نکلتی تھیں۔ بڑی خاموش طبع اور نیک صورت خاتون تھیں۔ میں نے ان کے صحن میں اکثر ان کے ہاتھ میں زیب النساء یا اس قسم کا کوئی رسالہ دیکھا تھا۔ وہ بازار سے سودا لے کر آ رہی تھیں۔ میں بھی وہیں سے گزر رہا تھا۔ اچانک ان کی پنجابی چپل ٹوٹ گئی۔ وہ ٹھٹک کر رکیں۔ کچھ دیر تک چپل کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اسے ہاتھ میں پکڑے پکڑے سڑک پر آگے بڑھیں اور گھر میں داخل ہو گئیں۔

بعد ازاں میں نے اپنے آپ کو خوب کوسا، اپنی غائب دماغی کو صلواتیں سنائیں۔ اگر ان لمحوں میں دماغ کام کرتا اور میں اپنی جھجک پر غالب آ جاتا تو میں آگے بڑھتا۔ اپنی چپل کا ایک پاؤں ان کو بہ اصرار پیش کرتا اور ان کو ایک ننگے پاؤں کے ساتھ گھر نہ جانا پڑتا۔

کیا پتا کہ اتنی سی بات ہی کسی بڑی پیش رفت کا پیش خیمہ بن جاتی۔ وہ گھر کے دروازے تک پہنچ کر میرا شکریہ ادا کرتیں۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں اور کہتیں..... اس سامنے والے اونچے گھر میں رہتے ہو نا تم؟ میری آنکھوں میں نمی آ جاتی اور میں سر کو اثبات میں ہلا کر جھکا لیتا۔ ''میرے بیٹے سے ملو گے؟'' وہ کہتیں اور پھر اسے آواز دیتیں.....

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا تھا۔ بعد میں کئی دن بلکہ کئی مہینوں تک میں نے اپنی کوتاہ فہمی اور کم ہمتی کے لتے لیے تھے۔

تو میں بات کر رہا تھا اس اچانک تبدیلی کی جو میرے اندر رونما ہوئی تھی اور میں نے خطوط والی لاحاصل ضد چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ ساتھ زویا پر بھی ترس آنے لگتا تھا۔ مجھ پر کوئی پابندیاں نہیں تھیں۔ گھر میں میری تقریباً ہر بات مان لی جاتی تھی۔ درحقیقت میں نے خود کو اپنا ہی قیدی بنا رکھا تھا۔ منڈیر پر ٹنگا ہوا ایک منتظر اداس پرندہ۔

اب اس پرندے نے زمین پر اترنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی بھی پیش قدمی سے پہلے میں سات آٹھ روز کے لیے لکڑی کی خرید کے لیے بنوں، ٹل اور پارہ چنار کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو ایک کالا پتھر میرا منتظر تھا۔

جی ہاں کالا پتھر۔ یہ ان چار کالے پتھروں میں سے ہی ایک تھا جس کا ذکر میں نے اس روداد کے آغاز میں کیا ہے۔ زندگی کی روانی اور سانسوں کے تسلسل کو درہم برہم کرنے والے وہی چار پتھر جن کی کربناک یادیں دل پر نقش ہیں۔ پہلے سیاہ پتھر کا تعلق چھوٹے بھائی حبیب اللہ کی المناک موت سے تھا۔ اس دوسرے پتھر کا تعلق موت سے تو نہیں تھا مگر اثرات موت جیسے ہی تھے۔

صبح کے دس بج چکے تھے۔ میں سفر کی تکان کے سبب سویا پڑا تھا۔ خالہ جی کی آواز آئی۔ ”طاہر! باہر کوئی دوست آیا ہے تمہارا۔“

میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ دوست کے ذکر پر دھیان ناصر کی طرف ہی جایا کرتا تھا مگر اب ناصر پاکستان میں تھا اور نہ اس کی دوستی باقی رہی تھی۔

سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا تو دروازے پر عاطف موجود تھا۔ اس کی شکل ہی بتا رہی تھی کہ میرے لیے کوئی نہایت پریشان کن خبر ہے۔

میں اسے اوپر برآمدے میں لے آیا۔ ”کیا بات ہے عاطف؟“

”کچھ پتا نہیں تمہیں؟“ عاطف نے کہا۔

”میں تو آج ہی آیا ہوں۔ کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا۔“

”یار! زویا کے گھر میں کچھ ہو رہا ہے۔“ وہ روہانسا ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے کھینچ کر میرے کمرے میں لے گیا۔ اس نے کھڑکیاں کھولیں۔ سامنے ہی میدان کے پار زویا کے گھر کا صحن نظر آرہا تھا۔ اور وہاں جو کچھ نظر آرہا تھا اس نے میرے دل کو بے طرح دھڑکایا اور نگاہیں دھندلا دیں۔ وہاں بہت سے تہ شدہ شامیانے پڑے تھے، کچھ بانس اور خالی دیگیں وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

”یہ کیا ہے عاطف؟“

”وہی جو نظر آرہا ہے۔“ عاطف پژمردہ آواز میں بولا۔ ”ان کے دروازے کے سامنے اور ساز و سامان بھی اتر رہا ہے۔ میں نے ہمسائے سے پوچھا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ظہیر صاحب کی بہن کی شادی ہے۔“

زویا کے بھائی کا نام تو کچھ اور تھا لیکن میں یہاں ظہیر ہی لکھوں گا۔ کائنات کی گردش جیسے تھم گئی اور اس کے ساتھ ہی رگوں میں لہو کی گردش بھی رک گئی۔ کہیں میں جاگتی آنکھوں سے کوئی برا خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ اتنی جلدی؟ میں سات آٹھ روز ہی تو باہر رہا تھا۔ اس مختصر وقت میں یہ کیسا سیاہ انقلاب آیا تھا۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا تھا۔ ابھی تو بہت ہاتھ پاؤں مارنے تھے۔ ابھی تو ہمت نہیں ہارنا تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ پچھلے ایک سال سے جو اندیشہ گاہے بگاہے میری راتوں کی نیند کو اور دن کے قرار کو ڈستا تھا وہ ایک المناک حقیقت بن کر ناگہانی موت کی طرح میرے سامنے آگیا ہے۔ شامیانوں کو کھولا جارہا تھا۔ بانسوں پر غلاف چڑھائے جارہے تھے۔ دیگوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کھڑکھڑاہٹ نے اور شامیانوں کے سرخ اور پیلے رنگ نے میرے دل و دماغ میں قیامت برپا کردی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ عاطف کب وہاں سے گیا اور کب میں دروازہ بند کرکے اوندھے منہ بستر پر جا گرا.....

آنکھوں سے گرم سیال ضبط کے بند توڑ کر بہہ نکلا۔ اتنی بے قراری تھی کہ میں نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنا گریبان چاک کردیا۔ بٹن ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئے۔

ان دنوں ابھی شادی ہالوں کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ تقریبات گھروں میں ہی ہوتی تھیں۔ زویا کے گھر کا صحن کافی بڑا تھا۔ یہ تیاریاں وہیں پر ہو رہی تھیں۔ مجھے یقین سا لگا کہ یہ کسی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ مجھے کسی اور کی زبانی بھی پتا چلا کہ ظہیر صاحب کے گھر برات ہے۔ ان کی بہن کی شادی ہے۔ کچھ ایسی ناقابل بیان اذیت اور ایسی ہیجانی کیفیت چھائی میرے اوپر کہ میں نے خالہ جی سے کچھ رقم لے کر جیب میں ٹھونسی..... ٹوٹے بٹنوں والی شرٹ بدلی اور چکراپا

ہوا سا گھر سے نکل گیا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کدھر جانا ہے۔ ابتلا اور تکلیف میں مری ہمیشہ سے میری پناہ گاہ رہی ہے..... مگر اس مرتبہ تو میں لاہور سے دور بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میں لاہور سے باہر جانے والی بس پر بیٹھ گیا۔ سب کچھ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں کہ کتنی دیر بس میں بیٹھا اور کہاں کہاں گیا۔ پھر کسی نامعلوم جگہ پر بس سے بھی اتر گیا۔ کچھ معلوم نہیں کہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ نگاہوں میں سب کچھ دھندلایا ہوا سا تھا۔ شب و روز کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بڑا کالا پتھر ہے جس نے زندگی کی روانی روک دی ہے اور میری رگوں میں خون کی گردش بھی۔ اس دورانیے میں ایک المناک کہانی بھی لکھی جو بعد ازاں آداب عرض میں ہی شائع ہوئی تھی۔ مگر کب اور کس شمارے میں ٹھیک سے یاد نہیں لیکن صرف کہانی لکھ لینے سے سینوں کے بوجھ مکمل طور پر تو ہلکے نہیں ہوتے۔

جی چاہتا تھا کہ کسی ہمدرد کا کندھا ہو اور اس پر سر رکھ کر اپنی ناتوانیوں اور نارسائی پر کھل کر آنسو بہاؤں، لیکن یہاں کس کا کندھا حاصل ہو سکتا تھا۔ کچھ یاد نہیں کہ جی ٹی روڈ پر کون سا قصبہ تھا وہاں ایک سینما نظر آ رہا تھا۔ ٹکٹ لے کر اس میں گھس گیا۔ سینما کی تاریکی میں جہاں اور بہت کچھ ہوتا ہے وہاں آنسو بھی بہائے جا سکتے ہیں۔

مری یا نتھیا گلی وغیرہ نہیں گیا۔ پہلے ہی بھٹک بھٹکا کر واپس آ گیا..... یہاں حیران کن طور پر ایک اور خبر میری منتظر تھی۔ یہ خبر عاطف کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچی۔ وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ ''طاہر، شادی نہیں ہوئی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''یار اس کی شادی نہیں تھی..... اس کی نہیں تھی۔''

اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گھمایا اور جھنجوڑا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''یہ کوئی اور لڑکی تھی۔ رشتے میں بہن لگتی تھی ظہیر اور تنویر کی۔ مجھے بھی سہ پہر کے بعد اس بات کا پتا چلا۔ تم تب تک جا چکے تھے.....''

مجھے محسوس ہوا کہ میری جاگتی آنکھیں پھر کوئی خواب ہی دیکھ رہی ہیں۔ کائنات کی ہر شے جو زرد ہو گئی تھی۔ پھر اپنے اصل رنگوں پر آ رہی تھی۔ نہیں ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ نہیں ابھی امکانات باقی ہیں۔ ابھی وقت کی اٹل رفتار مجھے کچھ اور مہلت دے رہی ہے..... غیر مرئی صدائیں میری سماعت میں گونج رہی تھیں۔

اگلی صبح کا وہ منظر میرے لیے بڑا دلکش تھا جب میں نے زویا کو پھر روشن لکیر کی طرح صحن میں چمکتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑے خوبصورت لباس میں تھی۔ لمبے گھنے بال کمر پر لہرا رہے تھے۔ وہ میری جانب دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں بھی کھلی تھیں۔ درمیانی میدان میں جو ورکشاپ قائم ہو چکی تھی وہ آج بند تھی۔ میدان میں سناٹا تھا۔ جب زویا کے کمرے میں بلند آواز میں ایک نغمہ گونجا تو اس کی آواز مجھ تک صاف پہنچی۔

آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے

نگاہ کے لیے یہ بڑا دلفریب نظارہ تھا۔ وہ ٹیپ ریکارڈ کے قریب کھڑی اپنے دل کی آواز اس خوبصورت گیت کے ذریعے مجھ تک پہنچا رہی تھی۔ اس کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ ایسا نغمہ بھیرنے والا۔

میں اس ساری صورتِ حال پر از حد حیران تھا اور میرے ساتھ ساتھ عاطف اور شعیب وغیرہ بھی۔ جو ساری سچوئیشن بنی تھی وہ زویا کی شادی والی ہی تھی، مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ شاید قدرت کی طرف سے ایک زوردار دھچکا ملا تھا میرے دل و دماغ کو..... ایک وارننگ..... کہ جاگ سکتے ہو تو جاگ جاؤ۔

اگلے روز عاطف پھر مجھ سے ملا۔ ''یار طاہر، قدرت نے تمہیں ایک اور موقع دیا ہے۔ اب کچھ کر گزرو یار..... سیدھے سیدھے اس کے چھوٹے بھائی سے ملو۔ وہ بہت فرینڈلی ہے۔ خاص طور سے تمہیں دیکھ کر اکثر اس کے چہرے پر Smile آتی ہے۔ اس سے ہیلو ہائے کرو گے تو بات چل نکلے گی۔''

میں نے کہا۔ ''یار، تمہیں پتا ہی ہے کسی سے بندے سے ہیلو ہائے کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔ ''ہیلو'' گلے میں ہی پھنس جاتی ہے بس ہائے ہی نکلتی ہے..... اور عاطف ایک بات میں تمہیں اور بتا دوں۔ اگر تم میری اس رومانی کہانی میں کسی رنگ موڑ کی توقع رکھتے ہو تو پلیز یہ خیال دل سے نکال دو۔ اس میں انوکھا کچھ نہیں ہونے والا۔ اگر تھوڑا بہت کچھ ہو بھی گیا تو آخر میں اختتام المیہ ہی ہونا ہے۔ گی الدین نواب کی کہانی پڑھتے ہو نا تم۔ بس ان کہانیوں کے اینڈ سے ملتا جلتا اینڈ ذہن میں رکھ لو۔''

مگر مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو ، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

سرورق کا کارٹونسٹ کی کاپشا حصہ جو خود میں منفرد ہے

عاطف بڑا ہی مزیدار اور مخلص دوست تھا۔ درمیانہ قد، روشن چہرہ، ذرا گھونگریالے لیکن بہت چمکیلے بال۔ چند سال پہلے ایک لڑکی سے اسے پیار ہوا تھا مگر یہ محبت ناکام ہوئی۔ لڑکی والدین کے ساتھ ملائیشیا چلی گئی اور بعد میں وہیں پر اس کی شادی ہوگئی۔

عاطف نے کچھ عرصہ صدمے میں رہنے کے بعد خود کو بڑے اچھے طریقے سے بحال کرلیا۔ کبھی کبھی وہ بڑے جذب سے کہا کرتا تھا اب اس کے لیے عورت میں کوئی کشش نہیں رہ گئی۔ میں معروف مصنفین شوکت صدیقی، توقیر جبار اور ممتاز مفتی وغیرہ کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے اسے سمجھاتا تھا کہ ان تمام بزرگان کا یہی کہنا ہے کہ مرد کو جب اپنے پہلے پیار میں ناکامی ہوتی ہے تو پھر اس ناکامی کا درد کم کرنے کے لیے جلد یا بدیر ایک دوسری عورت اس کی زندگی میں آتی ہے، اس کے راستے کے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چنتی ہے۔

جواب میں وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا تھا۔

''اپنے کانٹے میں نے خود ہی چن لیے ہیں یار۔''

اس کے لہجے میں بہت قطعیت ہوتی تھی۔ مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ اس کا خیال غلط ثابت ہونے والا ہے۔

عاطف کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر ہنستے ہوئے بہت ہی چھوٹی ہوجاتی تھیں۔ دل کا صاف اور ارادے کا مضبوط بندہ تھا۔ ان دنوں اس نے فٹ بال کو ہی اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا۔

عاطف کے حوالے سے مجھے دو چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات یاد آگئے۔ لیاقت والے اباجی کے جن سرکاری ملازم دوست سعید انکل کا ذکر میں نے کیا ہے، ان کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ ایک دن اباجی نے مجھے ان کے ساتھ سائیکل پر انارکلی سے کچھ خریدنے کے لیے بھیجا۔ میری عمر اس وقت بمشکل آٹھ نو سال ہوگی۔ ان انکل نے مجھے سائیکل پر آگے بٹھایا اور چل دیئے۔ وہ سائیکل چلا رہے تھے۔ تھوڑے سے ہانپے ہوئے تھے اور کھلنڈرے انداز میں مسلسل ایک گانا بھی

دھیمی آواز میں گنگناتے چلے جارہے تھے۔ ''میری زلفیں نہ چھیڑو لوگ کیا کہیں گے۔''

راستے بھر وہ اپنی دھن میں یہی بول گنگناتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ یہ زلفیں کیا ہوتی ہیں، جن کو کوئی لڑکا چھیڑ رہا تھا اور لڑکی احتجاج کررہی تھی۔ میں نے زلفوں کے حوالے سے اپنا ہی ایک تصور قائم کرلیا جو خاصے ہوہ بھی تھا۔ سائیکل چلاتے ہوئے انکل جتنی بار زلفوں کو چھیڑنے والی بات کہتے تھے میرے اندر ایک گدگدی سی جاگتی تھی اور کچھ شرم بھی محسوس ہوتی تھی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ انکل سے پوچھ ہی لوں کہ یہ زلفیں جن کو اتنے اشتیاق سے چھیڑا جاتا ہے کیا ہوتی ہیں؟ لیکن میں یہ بھی محسوس کررہا تھا کہ اس کا جواب اس قدر غلط اور بے ہودہ ہوگا کہ انکل ہرگز نہیں دیں گے، الٹا مجھے ڈانٹ دیں گے۔ وہ بول گنگناتے رہے اور میں زلفوں کے خالصتاً ذاتی تصورات میں کھویا رہا۔

اگلے چار پانچ روز اسی معمے کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرے تھے، آخر ایک دن عاطف سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا۔ وہ بھی تو نو دس سال کا ہی تھا۔ اسے بھی زلفوں کے بارے میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ چار پانچ سال بعد پتا چلا کہ جو کچھ ہم سوچتے رہے وہ غلط تھا۔ زلفیں عورتوں کے لمبے بالوں کو کہا جاتا ہے۔

عاطف کی نسبت ایک واقعہ کالج کے آغاز کے دور کا ہے۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کا دورانیہ تھا۔ کالج میں این سی سی کی ٹریننگ والے نوجوانوں کو بھی بارڈرز کے پچھلے مورچوں کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ یہ نوجوان اپنے اسلحے کے ساتھ باقاعدہ فوجیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ عاطف اور اس کا ایک کلاس فیلو یاسر بھی گنڈا سنگھ والا بارڈر پر تعینات کردیے گئے تھے۔ سقوط ڈھاکا ہوچکا تھا۔ مغربی پاکستان میں خون کے آنسو بہائے جاچکے تھے تاہم فوجیں ابھی تک بارڈرز پر کھڑی تھیں۔ میں اور ناصر موٹر سائیکل پر سوار عاطف سے ملنے گنڈا سنگھ بارڈر پر پہنچے تھے۔ عاطف تو بالکل حوصلے میں تھا تاہم اس کا دوست یاسر بہت مایوس اور تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دینے لگی، بولا۔ ''چھوٹے موٹے حملے ہوتے رہتے ہیں، سکھ فوجیوں نے شراب پی رکھی ہوتی ہے، للکارے مارتے اور بدزبانی کرتے ہیں۔''

عاطف نے کئی اور باتیں بتائیں۔ اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''جنگ میں جیت بھی ہوتی ہے اور ہار بھی..... لیکن ہم نے اپنے حوصلے کو ہارنے نہیں دیا۔ اب بھی انڈین جہاز آتے ہیں تو میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں۔ الٹے لیٹ کر فائر نہیں کرنا، سیدھے لیٹ کر کرو، اگر گھر میں لاش جائے تو گولی سینے پر لگی ہوئی ہو۔''

ہم کھانے پینے کی کچھ اشیاء لے کر گئے تھے۔ ابھی لنچ کررہے تھے کہ توپوں کے فائر ہونے لگے۔ لنچ ختم ہوتے ہی عاطف اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں فوراً وہاں سے نکال دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ دوپہر کے بعد عموماً گولا باری شروع ہوجاتی ہے۔ ہم گولوں کی خوفناک گونج میں اپنی موٹر سائیکل تک پہنچے اور وہاں سے نکلے۔

انہی دنوں ایک ایسا سفر کرنا پڑا جو کافی عرصہ یاد رہا۔ نمبر اسٹور کے لیے لکڑی خریدنے کے لیے بڑے ابا جان نے اکثر پشاور، درگئی اور آزاد قبائلی علاقوں کی طرف روانہ کرتے رہتے تھے۔ ایسے موقعوں پر میں عاطف یا اپنے دوسرے دوست ظفر اقبال کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اس سفر میں عاطف میرے ساتھ تھا۔ سردیوں میں بس کا طویل اور تھکا دینے والا سفر کرکے ہم کوہاٹ پہنچے تو شام ہونے والی تھی۔ ہمیں قریباً 370 کلومیٹر آگے ٹل نامی قصبے میں پہنچنا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا جب ہمیں ٹل لے جانے والی بس ویران پہاڑوں میں پہنچی تو لکڑی کے ایک گیٹ نے سڑک بند کررکھی تھی۔

مسلح چوکیدار نے گھڑی دیکھ کر بس ڈرائیور کو بتایا کہ مقررہ وقت سے تیس منٹ اوپر ہوچکے ہیں۔ اب یہ گیٹ کل صبح ہی کھلے گا۔

بس میں علاقے کا ایک معزز شخص بھی موجود تھا۔ اس نے بس سے اتر کر چوکیدار سے پشتو میں کچھ بات چیت کی اور اس نے گیٹ کھول دیا۔ چاندنی رات میں ویران پہاڑوں پر بس کا ہچکولے دار سفر شروع ہوا۔ بس میں بیشتر مسافر پٹھان بھائی ہی تھے۔ وہ کچھ چپ چاپ نظر آرہے تھے۔

میں نے قریب بیٹھے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے دبی دبی پریشانی کا اظہار کیا اور بتایا کہ علاقے میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ کارروائیاں کررہا ہے لہٰذا سفر میں بہت احتیاط کی جارہی ہے۔ بچپن میں سدھیر کی فلم ملنگی دیکھ کر اکثر ذہن میں یہ خیال آیا کرتا تھا کہ محمد علی اور سدھیر جیسے اچھے

ڈاکوؤں کی زندگی بھی تو کوئی ایسی بری نہیں ہوتی۔ گن گن کر ظالموں سے بدلے لیتے ہیں اور مظلوموں کی خاص طور سے خوبصورت مظلوم عورتوں کی داد رسی کرتے ہیں۔ سوچتا تھا کہ اگر پڑھائی میں زیادہ آگے نہ جاسکا تو پھر اس فیلڈ میں آنے کے بارے میں بھی سوچوں گا۔

اب اتنے برسوں بعد جب ڈاکو حضرات سے بالمشافہ ملاقات ہونے کا موقع مل رہا تھا تو دیگر مسافروں کی طرح میرا دل بھی بیٹھا جارہا تھا۔ یکسر سنسان کالے پہاڑوں کے درمیان چاندنی رات کا وہ سفر بڑا پریشان کن تھا۔ ہر موڑ پر یہی لگتا تھا کہ آگے مسلح ڈاکو کھڑے ہوں گے، اور پھر ایک موڑ پر اہل بس کے دل بالکل "بے بس" ہوگئے۔ ایک ویران گھاٹی کے اندر سے نجانے کیسے شلوار قمیص والوں کا ایک جتھا نکل آیا۔ ان میں سے کئی مسلح بھی تھے۔ انہوں نے اپنے اردگرد لمبی خشک گھاس کو آگ لگا رکھی تھی۔ شعلوں میں ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ ناقابل فہم نعرے لگا رہے تھے۔ کئی مسافر کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ بس کے ڈرائیور نے بڑی تیزی سے بس کو آگے بڑھایا یقین یہی تھا کہ اگر بس ذرا سست ہوئی تو راستہ روک لیا جائے گا۔

رات کا دوسرا پہر بخیریت ٹل گیا۔ وہاں بھی پورے قصبے میں ہو کا عالم تھا۔ ہمیں لکڑی منڈی کے ایک بڑے تاجر کے ڈیرے پر جانا تھا۔ تاجر کے کارندوں نے ایک بہت بلند و بالا چوبی پھاٹک سے گزار کر ہمیں ڈیرے پہ پہنچایا..... اور وہاں میں نے پہلی بار اپنی سلسلہ وار کہانی دیوی کے ہیرو رستم سیال کو دیکھا۔ جی ہاں بالکل ویسا ہی شخص جو رستم سیال کے روپ میں نظر آتا ہے۔ وہ تاجر کا جواں سال بیٹا تھا۔ کھڑی ناک، بڑی آنکھیں، نہایت سنجیدہ صورت۔ کندھوں پر سیاہ شال ڈالے آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس شخص کی آنکھوں میں دیکھ کر ہی میرے دل نے گواہی دے دی کہ یہ عشق کا مارا ہے، اپنے سینے میں کوئی بہت بڑا درد سمیٹے ہوئے ہے۔

میں نے اس کی بڑی بڑی نیم سرخ اداس آنکھوں میں دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ "مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تمہارے سینے میں محبت کی کوئی دردناک کہانی پوشیدہ ہے" تب ہی تو اس یخ بستہ شب میں، اس ویران کمرے میں آتش دان اور دل کے اندر الاؤ بھڑکائے بیٹھے ہو اور یہ دردناک گیت سن رہے ہو۔ بے شک میں کل صبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تمہاری کہانی کبھی نہ جان سکوں گا لیکن وعدہ ہے کہ تمہیں یاد رکھوں گا اور کسی وقت کوئی دل گداز کہانی لکھ کر تمہارے خدوخال اور تمہارے سراپے کو اس کہانی کا حصہ بناؤں گا۔ کہانی کوئی بھی ہوسکتی ہے مگر ہوگی محبت کی۔۔ اور محبت کی کہانی تو صدیوں سے ایک ہی ہے۔

تو وہ رات بس سوتے جاگتے ہی گزری۔ کوئی کتا یا بلی قسم کی چیز رات بھر ہمارے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ اور اندیشوں کی دھند میں لپٹ کر "ڈاکوؤں کے گروہ" ڈیرے میں داخل ہوتے رہے، گولیاں چلتی رہیں، گھوڑے دوڑتے رہے اور لاشوں کو روندتے رہے۔ ہر طرف خون ہی خون، انسانی گوشت کے چیتھڑے ہی چیتھڑے۔ ڈیرہ لمبی لمبی خشک گھاس کی طرح جلتا رہا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ ڈیرا جوں کا توں تھا۔ وہ دراز قد مضبوط شخص کہیں نظر نہیں آیا جسے کئی سال بعد کالے پہاڑوں میں گھومنے والی ایک طویل کہانی کا مرکزی کردار بننا تھا۔

ہم پارہ چنار سے ہوتے ہوئے افغان بارڈر کے نہایت قریبی گاؤں خرلاچی پہنچے۔ انتہا کی سردی تھی۔ برف نے ہر شے کو ڈھکا ہوا تھا۔ ہمارا میزبان انور خان نامی شخص تھا جو ابا جان کا گہرا دوست بھی تھا۔ سید انور کو علاقے میں بہت عزت کریم دی جاتی تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ مرشد کا درجہ دیا جاتا تھا۔ آزاد ایجنسیوں کے عام باشندوں کی طرح اس کے کندھے سے بھی ہر وقت آٹومیٹک رائفل جھولتی رہتی تھی۔ آج کل کا تو پتا نہیں مگر اس دور میں قبائلی علاقوں میں رائفل اتنی ہی ضروری تھی جتنا گھر سے باہر نکلتے وقت لباس ضروری ہوتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے پاس چھوٹی، بڑے بچوں کے پاس اس سے بڑی اور بالغان کے پاس اس سے بڑی رائفلیں ہوتی تھیں۔ ٹرک آرٹ تو آج مشہور ہوا ہے ان رائفلوں کو ٹرک آرٹ سے کہیں بڑھ کر سجایا سنوارا جاتا تھا۔ بازار سے گزرتے وقت اپنے گرد سینکڑوں رائفلیں نظر آتی تھیں۔

انور خان ایک خوبصورت، اُنس کھ اور ہر دلعزیز بندہ تھا۔ اس کے ڈیرے پر ہر طرف موٹے موٹے ڈائجسٹ بکھرے نظر آتے تھے۔ اکثر میرا دل چاہتا تھا کہ اس سے اس کی زندگی کی کہانی معلوم کروں مگر موقع ہی نہ ملا۔ مجھے اس کی شادیوں کی ٹھیک تعداد معلوم نہیں مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ لیڈی کلر ہے۔ بالکل ہمارے محلے کے جی دار لڑکے سلیم کی طرح۔ فرق صرف یہ تھا کہ سلیم ایک اسٹریٹ فائٹر تھا

اور اس کے سر کی طوفانی ضرب مردوں کے چہرے اور خواتین کے دل زخمی کرتی تھی جبکہ انور علی خان اپنے رعب اور دلکش مسکراہٹ سے لوگوں کو مطیع کرتا تھا۔ مجموعی طور پر انور علی خان ایک نہایت با اخلاق، ہنس مکھ اور ہر دلعزیز شخص تھا۔

قبائلی علاقے کا میرا وہ سارا دورہ ہی خوف اور اندیشوں کے سائے میں رہا۔ خرلاچی میں ڈاکوؤں کے سرگرم گروہ کا چرچا تو نہیں تھا مگر وہاں دو بڑے تجارتی گروہوں میں سخت کشیدگی چل رہی تھی۔ میں اور عاطف دو تین روز وہاں رہے۔ انور علی خان کے مسلح کارندے سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہتے تھے۔

انور علی خان کا ایک کزن ظفر علی خان بھی تھا۔ وہ بھی ابا جان کے پرانے بیوپاریوں اور بہی خواہوں میں شامل تھا۔ انور علی کی طرح اچھی اردو بولتا تھا اور میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ ظفر علی کی اولاد نہیں تھی۔ اس نے اپنے کسی عزیز کا بچہ پالا ہوا تھا۔ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس بچے کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ غالباً سات آٹھ سال عمر رہی ہوگی۔ وہ دیگر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ لکڑیوں کا چھوٹا سا الاؤ بھڑکا کر بچے اس پر سے پھلانگتے تھے۔ ظفر علی کا بچہ پھلانگا تو معصوم کے جسم کے نازک حصے کو حرارت نے کچھ زیادہ متاثر کر دیا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا مگر جانبر نہ ہو سکا۔

میرے اس سفر میں ایک اور چیز یادگار رہی۔ اب تو کافی عرصہ گزر گیا ان علاقوں میں گئے ہوئے۔ ان دنوں خیبر پختون خواہ کے اندرونی حصوں میں غربت اپنے جوبن پر تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ اسی ملک کا ایک صوبہ ہے جس میں پنجاب بھی ہے۔ ہماری بس بیخ بستہ ٹھنڈ میں بنجر پہاڑوں، ٹوٹی سڑکوں اور اجاڑ کھیتوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں سے گزر رہی تھی۔ ہم واپس آ رہے تھے۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں، وہ غالباً پارہ چنار اور کرم کا کوئی درمیانی علاقہ تھا۔ تیز برفانی ہوا چل رہی تھی۔ لوکل بس ایک دو مسافروں کو اتارنے کے لیے رکی تو سڑک کے کنارے مجھے ایک ایسا شخص نظر آیا جسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ پھٹے پرانے کمبل کی بکل مارے، ہاتھ میں چند نیم خشک گنے پکڑے شہرۂ آفاق فلم ایکٹر گریگری پیک وہاں کھڑا تھا۔ ہو بہو وہی نقش، چہرے پر وہی سلوٹیں، ویسے ہی لہریے دار بال، وہی قد کاٹھ، میں مبہوت رہ گیا۔

کہتے ہیں کہ قدرت دنیا میں ایک ہی شکل کے سات آدمی پیدا کرتی ہے۔ اب پتا نہیں یہ بات درست ہے نہیں مگر اس ٹھٹھری ہوئی دوپہر میں مجھے یہ یقین تو ہو گیا کہ کم از کم دو آدمی تو ایک جیسے ضرور ہوتے ہیں۔

میں نے عاطف کو ٹہوکا دیا۔ ”وہ دیکھو۔“

وہ بھی ششدر ہوا۔ ”یار، یہ تو انگلش فلموں کا اداکار لگتا ہے، گریگری پیک نام ہے نا، سونے کی تلاش، والے ہیرو کا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یار، ایسے بندے سے تو ملنا چاہیے تھا۔ عاطف بولا۔

میرا دل بھی چاہ رہا تھا کہ بس سے اتروں اور اسے مزید قریب سے دیکھوں۔

اس دوران میں وہ مخالف سمت سے آنے والی ایک کھٹارا سی مسافر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہماری بس بھی ایک ہچکولے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

میں سوچتا رہا اگر ہماری بس نے دو تین منٹ وہاں رکنا ہوتا تو میں ضرور نیچے اترتا۔ ممکن تھا کہ وہ تھوڑی بہت اردو جانتا ہو۔ میں اس سے کہتا۔ ”یہاں اپنے علاقے کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی طرح بھوک اور افلاس کی چکی میں پسنے والے انسان، تو جانتا ہے تیری شکل میں کیا خاص بات ہے؟ تیری شکل ایک ایسے انسان سے ملتی ہے جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے، جس کی ایک مسکراہٹ اور ایک ادا کی قیمت لاکھوں ڈالر ہے۔“

تو اے بے خبر انسان پھینک ان چند سوکھے سڑے بے رس گنوں کو۔ آ میرے ساتھ، میں تجھے لاہور لے جاؤں، وہاں کسی نگار خانے میں تجھے کسی بڑے آدمی سے ملواؤں، اسے بتاؤں کہ میں نے سونے کی تلاش اور گھر آف نیوارون جیسی لافانی فلموں کے ہیروں کا ہو بہو، ہم شکل، ڈھونڈ لیا ہے۔ اب گریگری پیک کے اس ڈپلی کیٹ کو بالی وڈ ٹکٹکاؤ تا کہ اس کی زندگی بدلے، مگر بس آگے بڑھ چکی تھی پٹھان گریگری پیک اپنے پھٹے پرانے کمبل اور نیم خشک گنوں کے ساتھ اپنی غربت کے دھندلکے میں گم ہو چکا تھا۔

بس آگے بڑھ گئی۔ آگے بڑھتے ہوئے ایک ایسے واقعہ کا ذکر ہو جائے جس نے ہمارے گھرانے بلکہ پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس واقعہ میں ایک سبق بھی پوشیدہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ میری دونوں پھوپیاں چوبرجی پارک کے ایک خوبصورت گھر میں رہتی تھیں۔ اس گھر میں ایک گیلری تھی (بلکہ اب بھی ہے) اس میں ایک باتھ روم اور ٹیرس بھی تھا۔ پھوپی کی گلی میں یہ مشہور تھا کہ اس گیلری میں سایہ ہے۔ کبھی کبھی رات کے وقت وہاں کسی جوان عورت کا ہیولا دکھائی دیتا تھا۔ گلی ہی کے ایک بزرگ کا کہنا تھا کہ یہ درق برق لباس والی عورت سامنے ہی چوبرجی کے چار میناروں میں سے کسی ایک مینار میں رہتی ہے۔۔۔ اور کبھی کبھی یہاں ٹیرس میں آبیٹھتی ہے۔ ہم جب بچے تھے تو اس گیلری میں اکیلا جانے سے ڈرتے تھے۔ بلکہ بڑے ہو کر بھی ایسا ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ کسی وقت میں سوچتا تھا کیا پتا کہ یہ انگریزوں کے دور عروج کی کوئی مصیبت زدہ مغل شہزادی ہو، اور کسمپرسی کی حالت میں ماری گئی ہو وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال میں نے بنفس نفیس کبھی کسی عورت یا شہزادی کو ٹیرس میں ہوا خوری کرتے یا چہل قدمی فرماتے نہیں دیکھا۔

میں ان واقعات کا محض شاہد تو نہیں ہوں لیکن اہل خانہ کہتے تھے کہ کبھی کبھی رات کو گھر کے دروازے زور زور سے بجتے تھے یا چھت پر قدموں کی چاپ آتی تھی۔ خیر یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ ہمارے گھروں، حویلیوں اور نئی پرانی عمارتوں میں اکثر اس طرح کے واہمے پرورش پاجاتے ہیں۔ ہماری دونوں پھوپیوں کا وہ گھر بھی بالکل بے عیب اور پاک صاف تھا۔ جو واقعہ وہاں ہوا اس کی کئی جہتیں ہوسکتی ہیں اور میں تو اسی جہت کو ترجیح دوں گا جس کا تعلق Logic اور حقیقت سے ہے۔

ہمارے پھوپی زاد بھائی جان ہارون کی شادی تھی۔ وہ بھی عمارتی لکڑی کے کام سے منسلک تھے۔ نہایت سادہ طبیعت پائی تھی۔ خوش باش اور ملنسار تھے۔ ان کی شادی اپنی بڑی خالہ کی بیٹی سے ہورہی تھی۔ وہ ہماری باجی تھیں اور بہت با اخلاق اور نیک خو۔ شادی بڑوں کی مرضی سے ہورہی تھی تاہم دونوں میں بہت انڈر اسٹینڈنگ پائی جاتی تھی۔ ان دنوں شادیوں کی تقریبات گھروں میں ہی ہوتی تھیں۔ اس کوٹھی کے سامنے بھی وسیع لان تھا۔ شامیانوں کا لگنا، کرسیوں کا رکھا جانا، آرائش روشنیوں کا آویزاں ہونا یہ سب مناظر دل کو بھاتے تھے۔ شادی کی تقریبات بخیر وخوبی انجام پائیں۔ دلہن گھر بار سے رخصت ہو کر چوبرجی پارک کی اس جگمگاتی کوٹھی میں آگئیں۔ ہر طرف خوشی کی لہر تھی۔ دولہا بھائی بھی ہنستے مسکراتے پھر رہے تھے۔ ہم سب لڑکے اور نوجوان بھی دس گیارہ بجے تک یہیں ہانکتے رہے، پھر سونے کے لیے لیٹ گئے کیونکہ اگلے روز ولیمہ تھا اور اس کی تیاری بھی کرنا تھی۔

صبح میں اٹھا تو گھر میں کچھ سراسیمگی کی سی کیفیت تھی۔ چہ میگوئیاں سی ہورہی تھیں۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ دولہا یعنی ہارون بھائی گھر سے غائب ہیں۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے مجلہ عروسی میں بھی نہیں گئے۔ انہیں آخری بار رات گیارہ بجے کے لگ بھگ صحن میں چکراتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ان کے بال منتشر تھے۔ پھر وہ مین گیٹ کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ کسی نے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ''پان لینے جارہا ہوں۔'' پھر وہ باہر نکلتے چلے گئے (جیسے کوئی نادیدہ ڈور انہیں کھینچ رہی ہو)

کسی ایک نے یہ بھی کہا کہ وہ واپس آگئے تھے اور ان کے آنے کے کچھ دیر بعد گھر کے بیرونی دروازے حسب معمول بند کردیے گئے تھے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

ہارون بھائی میرے قریبی دوست شعیب کے بڑے بھائی تھے۔ شعیب نے بتایا باجی (یعنی دلہن) سمیت سارے گھر والے رات بھر ان کے منتظر رہے ہیں کہ وہ ابھی آجاتے ہیں لیکن وہ نہیں لوٹے۔''

''کہیں کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں۔ رات دس بجے تک میں نے ان کو دیکھا ہے۔ بالکل خوش باش تھے۔ ولیمے کی تیاری کے سلسلے میں ابا جان سے باتیں بھی کررہے تھے۔''

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا، تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ دوپہر ایک بجے تک اُمید پر مایوسی غالب آنا شروع ہوگئی۔ ہارون بھائی اسی پینٹ کوٹ میں تھے جو انہوں نے برات کے موقع پر پہنا تھا۔ ان کی والدہ یعنی ہماری پھوپی جان کا رو رو کر برا حال تھا۔ دلہن نے ابھی تک اپنا عروسی لباس بھی نہیں بدلا تھا۔

سہ پہر کے وقت ولیمے کی تقریبات منسوخ کردی گئیں۔ ہر کوئی ششدر تھا۔ نو بیاہتا جوڑے کے لیے سرت اور انڈر اسٹینڈنگ والی شادی تھی۔ دونوں گھرانوں میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ گھر سے باہر بھی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہایت نیک اور معتبر گھرانا تھا۔ جیسا کہ میں

نے شروع میں بتایا ہے معروف عالم دین مولانا عبدالحئی میری والدہ کے نانا تھے۔ جن دونوں کی شادی ہوئی تھی وہ مولانا عبدالحئی کے پوتا پوتی تھی۔

رات ہوئی اور پھر اگلا دن طلوع ہوگیا۔ اسرار کی دھند گہری ہوتی چلی جارہی تھی۔ اب مایوس ہونے کے بعد ہارون بھائی کی تلاش کا کام شروع ہوا۔ جہاں جہاں ان کا کوئی دوست یا ملنے والا رہتا تھا وہاں وہاں تک گاڑیاں دوڑائی گئیں..... تھانے، اسپتال اور ساری جگہیں دیکھی گئیں جہاں کسی گمشدہ کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا۔ اللہ والوں، فقیروں اور عاملوں سے بھی رجوع کیا گیا، مگر کہیں کامیابی نہ ہوئی۔

دلہن ابھی اپنے عروسی لباس میں تھی اور رنج و غم کی تصویر تھی۔ ہارون بھائی کی والدہ نے مستقل طور پر جائے نماز پکڑ لیا تھا۔ انہوں نے منت مان لی تھی کہ ہارون مل جائے تو وہ زندگی بھر ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھیں گی۔

ایک درویش صف فقیر نے یہ بتایا کہ گمشدہ دولہا کے ساتھ جو کچھ ہوا گھر کے اندر ہی ہوا ہے اور اس پر پُراسرار گمشدگی کا علاج بھی گھر کے در و دیوار کے اندر ہی ہے جس پر توجہ نہیں دی گئی۔ ایک عامل نے بتایا کہ ہارون ابھی تک زمین کے اوپر ہے لیکن اگر دیر کی گئی تو وہ زمین کے نیچے بھی جاسکتا ہے۔ ہمارے یہ پھوپا جان نماز روزے کے سخت پابند تھے اور روحانی علاج پر بھی یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے سب اہل خانہ کو کئی طرح کے وظیفے بتائے جو ہارون کی سلامتی اور واپسی کے حوالے سے مفید ثابت ہوسکتے تھے۔ ہر گزرنے والا دن پریشانی کو شدید تر کر رہا تھا۔

خاندان والوں نے مختلف ڈیوٹیاں آپس میں تقسیم کرلی تھیں۔ میرے اور شعیب کے ذمے ڈیوٹی لگی کہ ہم اسلام آباد، مری اور نتھیا گلی وغیرہ کے ہوٹلوں میں جائیں اور وہاں کے بکنگ رجسٹر میں ہارون بھائی کا نام تلاش کریں۔

صدمہ تو شدید تھا لیکن دھیرے دھیرے کم بھی ہوتا جارہا تھا۔ ہم دونوں نے خود کو سونپی گئی ڈیوٹی پوری تو کی مگر کہیں کہیں کھیلا بھی ہوا۔ توجہ رجسٹر بینی سے زیادہ فلم بینی، تفریح اور سیر سپاٹے کی طرف ہوگئی۔ کئی دفعہ یوں لگا کہ ہم بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے کی کوشش کررہے ہیں۔

ہارون بھائی کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات بھی شائع ہوگئے تھے۔ میں پھوپی جان کے گھر جاتا تو میری نگاہ بے ساختہ اس گیلری کی طرف اٹھ جاتی جو ہمیں بچپن سے خوف میں مبتلا کرتی رہی تھی۔ اس گیلری سے چوبرجی کے قدیم میناروں یعنی برجیوں کا فاصلہ آدھ کلومیٹر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اب تو چوبرجی کے چاروں مینار موجود ہیں البتہ ان دنوں صرف تین تھے۔ اور ان تینوں میں سے ہی ایک مینار وہ تھا جس کے بارے میں ہم نے سنا تھا کہ عورت وہاں سے آتی ہے اور گیلری کے ٹیرس میں آکھڑی ہوتی ہے۔ کسی وقت یونہی خیال آتا کیا وہ واقعی کوئی مغل شہزادی تھی جو عین شب عروسی میں ہمارے ہارون بھائی کو اٹھا کرلے گئی ہے۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے میں اپنے اس خیال کو رد کردیتا۔ میں ایسی باتوں پر یقین کیسے کرتا۔ یہ میرے مزاج میں ہی شامل نہیں تھا۔

خاندان میں ایک اور صاحب بھی تھے جو روحانی علاج اور عملیات وغیرہ پر بہت یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں خصوصی بھاگ دوڑ کی۔ جہاں جہاں کسی بابے یا عامل کا پتا چلتا تھا وہاں پہنچ جاتے تھے۔ پنجاب بلکہ پنجاب سے باہر بھی یہ تگ و دو جاری رہی۔

دو ماہ سے زائد وقت گزر گیا۔ اور پھر ایک دن کہیں سے ایک پُراسرار خط موصول ہوا۔ یہ خط ہارون بھائی کے ایک تنویر نامی دوست کو موصول ہوا تھا۔ یہ دوست بھی چوبرجی پارک میں ہی رہتا تھا۔ اس خط کے موصول ہوتے ہی ایک زبردست ہلچل سی محسوس ہوئی۔ کانوں میں کچھ سرگوشیاں سی کی جانے لگیں، بزرگوں اور بڑوں کے لیے ظاہر ہے ہم بچے ہی تھے۔ ہمیں اس صورت حال کی تفصیل سے بے خبر رکھا جارہا تھا۔ بڑی تیزی اور رازداری سے کچھ کام کیے جارہے تھے۔ ہمارے ایک ماموں اور پھوپا کار میں بیٹھ کر افراتفری کے عالم میں کسی آفس کی طرف چلے گئے تھے۔ سہ پہر کے وقت میں نے دیکھا کہ میری خالہ جان ہارون بھائی کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھی سلائی مشین چلا رہی تھیں۔ وہ ایک بنیان کو کپڑے کی جیب لگا رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھنے کی کوشش کی مگر انہوں نے گول مول بات کرکے مجھے ٹال دیا۔

اب جو بات میں لکھنے جارہا ہوں وہ حیران کن ہے، مگر کئی دفعہ حقائق افسانوی ہی کی طرح سنسنی خیز اور ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ چوبرجی کے مینار پر رہنے والی کسی گمنام

شہزادی کا تصور تو میرے ذہن میں اور ہمارے اردگرد موجود تھا ہی، میں کئی مرتبہ نہ چاہنے کے باوجود اس بارے میں سوچنا شروع کر دیتا تھا۔ جدید علوم سے کئی حوالے بھی خوامخواہ یاد آنے لگتے تھے کہ ارواح ہمارے آس پاس موجود ہوتی ہیں۔ پھر میری تخلیقی سوچ مجھے داستانی ماحول میں لے جاتی جہاں قالین اڑتے ہیں۔ شہزادیوں کے جسم میں سوئیاں چبھوئی جاتی ہیں۔ سنسان شہر ہوتے ہیں جہاں کسی دیو کی آمد کا اندیشہ ہوتا ہے اور ایک بھٹکا ہوا مسافر صبح دیرے کسی شہر پناہ کے دروازے میں داخل ہو کر بادشاہ بن جاتا ہے۔

جب قبیلی کے ایک خاص الخاص شخص کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ ہارون بھائی کا پتا چل گیا ہے، وہ لاہور میں نہیں ہیں، نہ ہی پاکستان میں ہیں، بلکہ وہ پریوں اور پری زادوں کے داستانی شہر بغداد میں ہیں، تو دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کہاں لاہور کا چوبرجی پارک اور کہاں بغداد۔ شروع میں یقین نہیں آیا کہ یہ سچ ہے۔ یہ تو کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ خط کے آتے ہی یکایک، جو سرکاری دفاتر کے چکر لگے تھے وہ فوری پاسپورٹ کے حصول اور ویزے کے لیے تھے..... اور میں نے جس بنیان کو کپڑے کی جیب لگتے دیکھی تھی تو وہ ہارون بھائی کے بڑے بھائی اسلم بھائی کی تھی۔ اسلم بھائی جان فی الحال کی مینوفیکچرنگ کا کام کرتے تھے۔ عبداللہ سنز کے نام سے ان کی فی ٹرالیاں پورے پاکستان میں فروخت ہوتی تھیں۔ فوری انتظام کے تحت بنیان کی وہ جیب ان کے سفری کاغذات کے لیے لگائی گئی تھی۔ اب ہم پر یہ انکشاف بھی ہو چکا تھا کہ بغداد سے جو خط موصول ہوا وہ خود ہارون بھائی کا لکھا ہوا تھا۔

بغداد کی روداد جو بعد میں اسلم بھائی جان نے بیان کی ان الفاظ میں تھی۔

''خط سے معلوم ہوا تھا کہ ہارون پچھلے دو ماہ سے روضہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ میں موجود ہے۔ میں بغداد پہنچا تو ایک مقامی عراقی رحمت کا فرشتہ بن کر آیا اور اس نے ہارون تک پہنچنے میں میری مدد کی۔ روضے کے احاطے میں پہنچ کر ہم نے ایک مقامی سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے یہاں کسی پاکستانی کو دیکھا ہے؟'' ہم نے ہارون کا حلیہ بھی بتایا۔

پہلے تو اس نے انکار کیا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک دم پلٹا اور بولا۔ ''ہاں ایک نوجوان ہے، بہت کم بولتا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستانی ہی ہو۔''

تب ایک اور شخص بھی آ گیا۔ اس نے تصدیق کی کہ ایک مفلوک الحال پاکستانی یہاں موجود ہے۔ اس نے بتایا۔ ''ہم اسے یہاں پو یا بو کہتے ہیں۔ شروع میں وہ یہاں قبروں کے درمیان سویا ہوا پایا گیا تھا۔ تب اس کا لباس کچھ اچھا تھا مگر اب تو چیتھڑوں میں بدل چکا ہے۔ ہر وقت گم سم بیٹھا اپنے سامنے کسی نہ نظر آنے والی شے کو گھورتا رہتا ہے۔''

دوسرے شخص نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی عشا کے وقت میں نے اسے وہاں وضو خانے کے سامنے والے احاطے میں دیکھا تھا۔ ''نماز پڑھ رہا تھا۔''

میں اور میرا مقامی مددگار اس وسیع احاطے میں پہنچے تو وہاں فرش پر لیٹے بہت سے لوگوں کے درمیان ایک لاغر نما نوجوان لیٹا نظر آیا۔ شیو بڑھی ہوئی، لباس خستہ اور جسم بہت کمزور، یہی ہمارا ہارون تھا۔

مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھے دیکھے اور بھاگ کھڑا ہو۔ میں عین اس کے اوپر پہنچ گیا۔ اپنی دونوں ٹانگیں اس کی دائیں بائیں جانب رکھیں اور اسے جگایا۔ پہلے تو وہ بہت دیر بس خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اس کے سینے سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ہم ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔''

ہارون بھائی جب واپس پاکستان آئے اور ایئرپورٹ سے اپنے گھر چوبرجی پارک پہنچے تو وہ منظر دیدنی تھا۔ ان کی والدہ، بہنیں، بھائی سب زار و قطار رو رہے تھے اور انہیں گلے سے لگا لگا کر بے حال ہو رہے تھے۔ وہ بھی سب سے معافیاں مانگ رہے تھے اور خاص طور پر اپنی اس شریک حیات سے جسے تقریباً ڈھائی ماہ پہلے مین شادی کے موقع پر وہ بے پناہ دکھ دے کر اوجھل ہو گئے تھے۔

خوشیوں والے گھر اچانک سوگ میں کیسے ڈوبتے ہیں اس کا سچ اور اک ہمیں اس واقعہ کے دوران ہوا تھا۔

سب سے اہم ترین سوال یہ تھا کہ ایک بالکل تندرست، صحیح الدماغ شخص اپنے عروسی لباس میں اچانک رات کے وقت کہاں اور کیوں غائب ہو گیا۔ چند روز تو اس بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی گئی۔ پھر ہارون بھائی کے حوالے سے دو تین باتیں سامنے آئیں۔

ایک بیان کے مطابق انہوں نے کہا کہ مہمانوں میں سے ہی کسی ایک نے انہیں کھانے کے لیے ایک لڈو پیش کیا۔ اس لڈو کے کھانے کے کچھ ہی دیر بعد انہیں اپنا گلا

خشک محسوس ہوا، دماغ چکرانے لگا اور جیسے کسی غیبی آواز نے ان سے مسلسل کہنا شروع کر دیا۔ ''ہارون یہاں سے چلا جا..... بہت دور چلا جا ورنہ کچھ بہت برا ہو جائے گا۔'' اور پھر جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ انہیں اپنے ساتھ کھینچتا ہوا لے گیا۔

ایک بیان یہ سامنے آیا کہ لڈو کھانے سے پہلے ہی ان کے اندر کچھ گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ دل گھبرا رہا تھا۔ وہ پان یا سگریٹ لینے کے لیے بازار گئے اور پھر آگے ہی نکلتے چلے گئے۔

اس بیان کی صحت یوں مشکوک ہو جاتی ہے کہ وہ جاتے ہوئے اپنا پاسپورٹ اور سلامیوں کی صورت میں اکٹھی ہونے والی بہت سی نقدی بھی ساتھ لے گئے تھے۔

یہ راز کبھی بھی مکمل طور پر نہ کھل سکا کہ ان کے اچانک گھر سے نکل جانے کی وجہ کیا تھی اور اس سے بھی اہم سوال یہ کہ وہ گھر سے نکلے تو کہیں آس پاس کیوں نہ رکے اور ہزاروں میل دور بغداد کیسے جا پہنچے؟

تیس پینتیس سال تک ان کا بغداد پہنچنا ایک الجھا ہوا سوال اور راز رہا۔ کئی طرح کی من گھڑت باتیں بھی پھیلیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ بغداد والی بات سراسر جھوٹ ہے ہارون یہیں کہیں موجود تھا..... کچھ اسے سراسر ماورائی رنگ دیتے تھے اور شاید کچھ ایسے بھی تھے جو اسے گھر کی گیلری اور پھر چوبرجی مینار میں بسیرا کرنے والی عورت سے جوڑتے تھے۔ کئی طرح کے مفروضے تھے۔ مگر مجھ سمیت فیملی کے کچھ قریبی لوگوں کو پتا تھا کہ بغداد والی بات سو فیصد درست ہے۔

یہ غالباً 2005ء کے بعد کی بات ہے۔ ایک اندھیری سرد رات میں ہنڈا گاڑی پر میرا چھوٹا بھائی ساجد، ایک کزن، میں اور ہارون بھائی عمارتی لکڑی کے لیے خیبر ایجنسی جا رہے تھے۔ ہارون بھائی بڑی اچھی اور معرفت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ہم اکثر ''کمپنی'' کے لیے انہیں ساتھ لے لیتے تھے۔ طویل سفر تھا۔ گاڑی کے اندر مدھم آواز میں میوزک آن تھا۔

میں نے یا شاید ساجد نے کہا۔ ''ہارون بھائی جان! عمر میں گزر گئیں۔ آپ نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے۔ ماشاء اللہ آپ کے بچے ہیں بلکہ ان کے بھی بچے ہیں اب تو کچھ بتا دیں اپنے بغداد کے سفر کے بارے میں؟''

''چھوڑ دیار۔'' وہ ٹال مٹول کرنے لگے۔

مگر جب ہم اصرار کرتے رہے تو وہ دلکش انداز میں مسکرائے اور ماضی میں کھو گئے۔ ان کی اس طویل گفتگو سے پتا چلا کہ عجب کیفیت میں گھر سے نکل جانے کے بعد وہ براستہ سڑک پہلے کوئٹہ پہنچے۔ وہاں مختصر قیام کیا جو آٹھ دس دن پر مشتمل تھا۔ وہ بس آگے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ ایک مہربان شخص کے تعاون سے ایران کا ویزا لگوا کر تفتان کے راستے زاہدان اور پھر تہران پہنچے۔ تہران میں انہیں جو چند واقعات پیش آئے وہ بھی حیران کن تھے۔ تہران سے براستہ سڑک وہ عراق میں داخل ہوئے اور غوث عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر جا پہنچے۔ وہاں چند ہفتے رہنے کے بعد انہوں نے تارکین وطن کے ایک گروپ کے ساتھ بذریعہ لانچ کویت جانے کی کوشش کی جو سنگین طور پر ناکام ہوئی۔ تاریک رات میں چلتی گاڑی کے اندر یہ طویل گفتگو اتنی دلچسپ تھی کہ پتا ہی نہ چلا کب سپیدہ سحر نمودار ہو گئی ہے۔ بہرحال اس سب کے باوجود وہ راز ایک بار پھر بھی راز ہی رہ گیا۔ اس سوال کا شافی و تسلی بخش جواب وہ پھر بھی نہ دے سکے کہ وہ کیا کیفیت تھی جس نے نصف شب کے وقت انہیں اپنے آشیانے سے نکالا اور دو ماہ تک ویرانوں اور بستیوں میں گھمایا۔

بعد ازاں ہارون بھائی نے اپنے سفر کی ساری تفصیل ایک ڈائری میں درج کر کے مجھے سونپ دی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اسے روداد کے انداز میں لکھوں۔ اسی روداد کو ایک تخلیقی ٹریک کے ساتھ ملا کر میں نے ایک طویل کہانی لکھی تھی جو غالباً سسپنس میں شائع ہوئی تھی۔ ''رات کا مسافر'' نامی یہ کہانی کتابی شکل میں موجود ہے۔ ہارون بھائی تقریباً تین سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے۔

☆☆☆

نوائے وقت کے مختلف ایڈیشنوں میں میری نظم اور نثر باقاعدگی سے شائع ہو رہی تھی۔ ریٹائرڈ انسپکٹر نواز خان کی کہانیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان کے معروف صحافی و کالم نگار جناب رفیق ڈوگر صاحب کی نگاہ سے میری کچھ تحریریں گزریں۔ ان دنوں وہ ''دیدہ شنید'' کے نام سے اپنا پندرہ روزہ رسالہ نکال رہے تھے۔ اس رسالے میں سیاسیات کے علاوہ ایک بڑا پورشن فکشن اور دیگر دلچسپ موضوعات کے لیے بھی تھا۔ رفیق صاحب نے مجھے بلایا اور دیدہ شنید میں کام کرنے کی آفر کی۔ رفیق ڈوگر صاحب جیسے بلند پایہ صحافی کے ساتھ کام کرنا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں تھا۔ میری حیثیت سب ایڈیٹر کی تھی۔ میں

نے وہاں دیگر دفتری امور کے علاوہ شہرۂ آفاق انگلش ناول "شی" کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ پرانا کنواں کے نام سے بچوں کے لیے ایک قسط وار کہانی کا آغاز کردیا۔

دیدشنید کا دفتر لکشمی چوک کے قریب بیڈن روڈ کی طرف واقع تھا۔ رفیق صاحب بہت نفیس آدمی تھے۔ صبح سویرے ان کی میز پر گلاب کے پھولوں کی ایک ڈھیری لگی ہوتی تھی۔ سیاسیات کے علاوہ انہیں انگلش، اردو پر بھی عبور حاصل تھا۔ عالمی رہنماؤں بشمول اندرا گاندھی کے سامنے بیٹھ کر پرمغز انٹرویو کرچکے تھے۔ دیدشنید کے دفتر میں ان سے ملنے کے لیے علم وادب کی جانی پہچانی شخصیات آتی رہتی تھیں جن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

دفتر کے سامنے کچھ ہی فاصلے پر بٹ سوئٹس کی ایک بڑی دکان تھی۔ دوپہر کے وقت وہاں کے گرما گرم خستہ سموسوں پر ان کی اپنی ہی بنائی ہوئی سرخ چٹنی ڈال کر کھانا ایک ایسا لذیذ تجربہ تھا جو آج تک فراموش نہیں ہوا۔ سموسے بڑے اور چٹنی وافر ہوتی تھی۔ پلیٹ میں فورک کے ذریعے انہیں مکمل طور پر توڑ لیا جاتا تھا۔ دو یا تین سموسوں کے ساتھ یہ ایک نہایت سستا لیکن چٹخارے دار لنچ بن جاتا تھا۔ الحمدللہ بعدازاں اٹلی، فرانس اور جرمنی کے اچھے ریستورانوں اور ہوٹلوں میں کھانے کا اتفاق ہوا مگر سرما کی سنہری دوپہروں میں جو مزہ اس دس پندرہ روپے کے لنچ میں آتا تھا وہ پھر کبھی نہیں آیا۔

رفیق ڈوگر صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ ایک روز انہوں نے امجد اسلام امجد کو دفتر بلایا اور مجھے ان سے انٹرویو کرنے کو کہا۔ ایسا تجربہ نہیں تھا میرا، پھر بھی میں نے امجد صاحب کے لیے اچھے سوالات ترتیب دیے۔ ان دنوں امجد صاحب کے تحریر کردہ اردو ڈرامے وارث کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شام کو ڈرامے کے وقت سڑکیں خالی ہوجاتی تھیں۔ چودھری حشمت (محبوب عالم مرحوم) کی آواز در و دیوار میں یوں گونجتی تھی کہ سماں بندھ جاتا تھا۔

انٹرویو کے دوران میں میرے ایک سوال کے جواب میں امجد صاحب نے کہا۔ "پی ٹی وی اور دیگر اداروں میں اہم عہدوں پر کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے ہیں جن کے چہروں پر "حماقت" جلی حروف میں درج ہے اور ان کی شخصیت گواہ ہوتی ہے کہ وہ اس کرسی کے قابل نہیں ہیں۔"

میں بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ حالانکہ کسی چھوٹے بڑے عہدے پر نہیں تھا۔ پھر بھی تھوڑا سا بوکھلایا کہ کہیں اشارہ میری طرف تو نہیں ہے۔

انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ "وارث ڈرامے کی وجہ سے لوگ آج کل یہی سمجھتے ہیں کہ میں پکا پینڈو ہوں اور عمر عزیز کا زیادہ حصہ حویلیوں اور کھیتوں کھلیانوں میں گزارا ہے، حالانکہ میں دیہی علاقوں میں نہ ہونے کے برابر گیا ہوں۔"

امجد اسلام امجد بہت بڑے قد کے ادیب و شاعر تھے۔ تاہم بڑی سے بڑی شخصیات کے ساتھ بھی کچھ تناؤ سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ جب ملک کے گلی کوچوں میں وارث ڈرامے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ایک احتجاجی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز بلند پایہ و معروف ناول نگار جناب شوکت صدیقی کی تھی۔ انہوں نے ایک دعا کا خیر انکشاف کیا، بقول ان کے وارث ڈرامے کا مرکزی خیال ان کے ناول جانگلوس سے لیا گیا تھا۔ جانگلوس کی اشاعت غالباً ان دنوں ڈائجسٹ میں جاری تھی۔

نوائے وقت کے دفتر میں میرا آنا جانا رہتا تھا۔ اپنی کم آمیزی کے سبب میں بیدار سرمدی صاحب کے پاس ایک گوشے میں خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا۔ وہاں ہونے والی گفتگو سے پتا چلا کہ شوکت صدیقی صاحب نے معروف جرنلسٹ اسرار زیدی صاحب سے باقاعدہ فیتوں کے ساتھ رابطہ کیا ہے کہ وارث کے حوالے سے پی ٹی وی پر ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہورہی ہے۔ اسرار زیدی صاحب کو اپنے ادارے اور دیگر ذرائع سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیے۔

شوکت صدیقی صاحب کا مؤقف یہ تھا کہ ڈرامے کے پلاٹ کے علاوہ کرداروں کے نام تک ناول جانگلوس سے لیے گئے ہیں۔

یہ قضیہ بہت آگے تک گیا۔ بیدار سرمدی صاحب نے بھی اپنی ہمت طاقت اور صوابدید کے مطابق جناب شوکت صدیقی، اسرار زیدی اور ہم خیالوں کا ساتھ دیا۔ نوائے وقت کے رنگین ایڈیشن کا وہ اوّلین صفحہ مجھے آج بھی یاد ہے جس کو بیدار سرمدی صاحب کے آرٹیکل نے پوری طرح گھیرا ہوا تھا۔ آرٹیکل کا عنوان تھا "جانگلوس اور مقبول ڈرامے وارث کا تقابلی جائزہ؟"

تب مجھے ایسے معاملات کی زیادہ سمجھ نہیں تھی اور نہ ہی میں نے اپنے اندر کسی کی طرفداری محسوس کی۔ میں تو شوکت صاحب کی طرح امجد اسلام صاحب کے قلم کا بھی گرویدہ تھا

اور آج تک ہوں۔

کہاں آکے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا، اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا
وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں
دل بے خبر، میری بات سن اسے بھول جا اسے بھول جا

بہر حال مدتوں بعد ایک احساس ضرور ہوا کہ اگر کسی تخلیق کار کو درست یا غلط شبہ ہو کہ اس کی تحریر کو کسی مقبول و معروف ڈرامے یا فلم وغیرہ کی شکل میں بدل دیا گیا ہے تو اس کے دل پر بہت کٹھن گزرتی ہے۔ اس حوالے سے نسبتاً کم شدت کا اپنا ایک تجربہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

میری متلون مزاجی، کم آمیزی اور زود رنجی نے مجھے زیادہ عرصہ دید شنید میں رہنے نہیں دیا۔ ایک اور صاحب جن کا نام مجھے معلوم نہیں دید شنید کے دفتر میں آکر بیٹھنے لگے۔ مجھے یہ لگا کہ شاید وہ میری جگہ لینے کے لیے آئے ہیں۔ ویسے بھی دفتری اوقات کی پابندی میرے لیے سوہان روح تھی۔ لہٰذا ایک دن میں نے چپکے سے اپنی اٹکش ڈکشنری اور نوٹ بک اٹھائی اور دید شنید کے دفتر کو خیر آباد کہہ دیا۔

بعد میں افسوس بھی ہوا کہ رفیق ڈوگر صاحب جیسے مشفق اور نہایت قابل انسان کی رفاقت سے محرومی اٹھانا پڑی۔ بعد میں کافی عرصہ تک رفیق ڈوگر صاحب بڑی شفقت اور کسی قدر افسوس کے ساتھ پوچھتے بھی رہے کہ مجھے ہوا کیا تھا کہ میں بغیر بتائے دفتر سے نکل گیا۔

میرے پاس اس کا کوئی ٹھوس جواب تھا ہی نہیں۔ وہ زیرک انسان تھے جلد ہی سمجھ گئے کہ میں ان غائب دماغ اور خیال پرست لوگوں میں سے ہوں جو دنیا میں کوئی بھی ٹھوس اور سنجیدہ کام نہیں کر سکتے۔ اگر ان سے کوئی توقع رکھی جا سکتی ہے تو وہ برے بھلے تخلیقی کام کی ہے۔

دید شنید چھوڑنے کے باوجود رفیق ڈوگر صاحب سے میرے نہایت اچھے روابط رہے۔ مجھے فخر ہے کہ کئی بار انہوں نے میری لکھی ہوئی کہانیاں بھی پڑھیں اور تعریف کی۔ اس کے علاوہ جب بھی انہیں عمارتی لکڑی یا فرنیچر وغیرہ کے حوالے سے کوئی ضرورت یا الجھن پیش آئی، انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ اب رفیق ڈوگر صاحب سیرت رسول پاک سمیت ان گفت گراں قدر کتب لکھنے کے بعد جہان فانی سے جا چکے ہیں۔

انہی دنوں کے آس پاس کی بات ہے، لکھنے لکھانے سے تھوڑی فرصت ملی تو میں عاطف سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔ درمیانے موسم کی شامیں، بڑی دلفریب ہوتی ہیں۔ ویسے بھی لاہور ان دنوں ابھی اتنا گنجان نہیں ہوا تھا۔ کشادہ سڑکوں پر تانگوں اور ریڑھوں کے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دیا کرتی تھی۔ ویگنیں غالباً نئی نئی چلنا شروع ہوئی تھیں۔ موٹر سائیکلوں کے علاوہ ویسپا اسکوٹر بھی فراٹے بھرتے نظر آتے تھے مگر آج کی نسبت بہت ہی کم تعداد میں۔ ابھی فضائی پلوشن کا دور دورہ نہیں تھا۔ شام بہت شفاف اور شفق رنگ ہوتی تھی۔ سیاہ کشادہ سڑکوں پر درختوں کے طویل ہوتے سائے بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ ایسی ہی شام تھی جب میں عاطف کے گھر پہنچا۔ گھر میں عاطف کی دادی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

میں عاطف کے کمرے کے سامنے پہنچا تو اسے سرپرائز دینے کے لیے کھڑکی کے ایک ادھ کھلے پٹ سے اندر جھانکا۔ اندر کے منظر نے مجھے ششدر کر دیا۔ عاطف ایک سنجیدہ اور باعمل بندہ تھا، کردار بھی مضبوط تھا۔ فٹ بال کے کھیل میں اس کا نام بن رہا تھا۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔

کھڑکی کے پٹ میں کوئی دو انچ کی درز تھی۔ میں نے اندر جھانکا تو حیران ہوا۔ شاید پڑھنے والوں کو کچھ عجیب بھی لگے تاہم میں حرف بحرف وہی لکھ رہا ہوں جو دیکھا۔ یہ سردی کے دن تھے۔ کمرے میں سوئی گیس کا ہیٹر تھا۔ عاطف نے کسی پرانی طرز سے تالے کی چابی ایک پلاس کے ذریعے پکڑی ہوئی تھی اور اسے ہیٹر پر تپا رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دل کڑا کرنے والے انداز میں اپنا جبڑا بھینچا اور تپی ہوئی انگارہ چابی اپنے بائیں کلائی پر لگا دی۔ دوسرے لمحوں میں خود کو چابی سے داغ دیا۔ چہرے پر شدید کرب کے آثار ابھرے۔

میں بوکھلا کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ ”عاطف، یہ کیا کر رہے ہو؟“

اس نے ٹھٹک کر میری جانب دیکھا۔ چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔ آنکھیں کچھ ورم زدہ تھیں۔

سامنے میز پر ایک کاغذ پڑا تھا۔ اس پر موٹے حروف میں ایک فقرہ تین چار بار لکھا گیا۔ وہ میری بہن ہے..... وہ

میری بہن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے اندازہ ہوا کہ جس لمحے اس نے چابی سے اپنی کلائی کو داغا تھا اس وقت بھی شاید زیرلب کچھ اسی طرح کا فقرہ کہا تھا۔

''یہ کیا معاملہ ہے یار..... تمہاری رمافی صحت تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

وہ کچھ شرمندہ سا نظر آرہا تھا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔

''صحت ٹھیک ٹھاک تھی لیکن شاید اب نہیں رہی۔''

''اب اگر میں تم سے پوچھوں کسی لڑکی کا چکر تو نہیں تو تم خفا ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے بقول تم یہ صفحہ ہی پھاڑ چکے ہو۔''

''صفحہ پھاڑ چکا ہوں اسی لیے تو اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔'' عاطف نے جیسے کراہ کر کہا۔

آج وہ ایسی کیفیت میں پکڑا گیا تھا کہ میری بات کو مکمل طور پر جھٹلا نہیں پایا۔ وہ بڑی ہی بے تکلفی اور سچائی کے ساتھ مجھ سے ہر بات شیئر کر لیتا تھا۔ اس کی گفتگو سے مجھے ابتدائی طور پر یہ اندازہ ہوا کہ اپنی پہلی محبت کی ناکامی کے برسوں بعد ایک اور ایسا چہرہ اس کے سامنے آیا تھا جو اس کے دل و دماغ میں تلاطم برپا کیے ہوئے تھا۔ اسے ایسی ایسی پٹخنیاں دے رہا تھا کہ اس کا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ چہرہ ایک ایسی لڑکی کا تھا جو شادی شدہ تھی۔ نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کی ماں بھی۔

وہ میری بہن ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ ایک ایسا جملہ تھا جو عاطف کی بے پناہ اندرونی اتھل پتھل کی نشاندہی کر رہا تھا۔

میں اسے جناب شوکت صدیقی اور ممتاز مفتی وغیرہ کی تحریروں سے جو حوالے دیا کرتا تھا، وہ بالآخر درست ثابت ہو گئے تھے یا ہونے والے تھے۔ مرد کی پہلی محبت جب دکھ دیتی ہے اور زندگی کے افق کو ویران اور تاریک کر دیتی ہے تو پھر جلد یا بدیر اس ویران افق پر ایک اور عورت نمودار ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کا جواز مہیا کرتی ہے۔ محبت کے سوکھے ہوئے چشموں کو پھر سے رواں کرتی ہے۔ اکثر و بیشتر یہ چشمے کسی نہ کسی حد تک رواں ہو جاتے ہیں۔ مجھے لگا کہ بالآخر عاطف کے لیے وہ عورت آ گئی ہے۔

پانچ چھ ماہ پہلے عاطف کے گھر کے قریب ہی ایک نئی کوٹھی ایک کسٹمر نے خریدی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس بندے کا نام جمشید تھا۔ ذرا خاموش طبع تھا۔ فیروز پور روڈ پر اس کا ایک بڑا شوروم تھا جہاں سینٹری کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ یہ جمشید نامی نوجوان موسیقی سے بھی کچھ شغف رکھتا تھا۔ دو تین بار کسی ٹی وی شو میں بھی گا چکا تھا۔ ایک سینٹری اسٹور چلانا اور گانا دو متضاد کام تھے لیکن جمشید کرتا تھا۔ چونکہ عاطف کی آواز بھی اچھی تھی لہٰذا دونوں میں راہ و رسم پیدا ہوئی۔ یہ راہ و رسم بڑھی اور بڑھ گئی کہ جمشید کا پانچ سالہ بچہ نومی فٹ بال کا شیدائی تھا۔ وہ ہر وقت عاطف کے ساتھ چمٹا رہتا تھا۔ جمشید کی بیوی کا فرضی نام میں یہاں حورین لکھتا ہوں۔ حورین کی پہلی جھلک میں نے کوئی چار پانچ روز بعد ان کے گھر کے دروازے پر ہی دیکھی۔ وہ دو چھوٹے بچوں کو بریانی والی پلیٹیں دے کر آس پاس کے گھروں میں بھیج رہی تھی۔ عمر یہی کوئی تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ لگتا تھا کہ چھوٹی عمر میں شادی ہوئی ہے۔ شگفتگی اور نرمی نظر آئی مجھے اس کے چہرے پر، اور شاید ایک طرح کا وقار بھی۔ انتہائی مناسب نقوش نے چہرے کو ایک خاص طرح کی دلکشی دے رکھی تھی۔ یہی وہ دلکشی تھی جو عجب انداز سے عاطف جیسے نہایت سنجیدہ اور عورت بیزار بندے کے دل پر حاوی ہو رہی تھی۔

ایک دن عاطف نے مجھ سے روہانسا ہو کر کہا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں اسے ایک بہن کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ رات دن خود کو سمجھاتا ہوں کہ اس رشتے کو کوئی اور رنگ اختیار نہیں کرنا چاہیے لیکن وہ دن بدن میرے دل و دماغ پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ جو گھرانا مجھ پر اتنا بھروسا کرتا ہے بلکہ مجھے گھر کے فرد کی حیثیت دیتا ہے میں ان کے اعتماد کو اس طرح ٹھیس پہنچاؤں گا۔''

''تو دور ہو جاؤ ان لوگوں سے بس اپنے کھیل پر توجہ دو۔''

''یہ بھی نہیں ہو پا رہا۔ تم سمجھو گے کہ اس کی خوبصورتی نے میری آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ ٹھیک ہے وہ خوبصورت ہے لیکن سچ کہتا ہوں اس کی خوبصورتی سے زیادہ اس کا حسن اخلاق متاثر کرتا ہے۔ کچھ ہے اس کے اندر جو نظر نہیں آتا لیکن مجھے اپنے حصار میں لے رہا ہے۔''

مجھے معلوم ہوا کہ حورین کسی طرح عاطف کی پہلی ناکام محبت سے آگاہ ہو چکی ہے۔ شاید یہی آگاہی تھی جس نے اس کے دل میں عاطف کے لیے کچھ اور طرح کی ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ یہ ہمدردی غیر محسوس طور پر کسی اور

قالب میں ڈھل رہی تھی۔

مجھے پتا چلا تھا، بلکہ عاطف کی زبانی ہی چلا تھا کہ محلے میں حورین کی حیثیت ہر دلعزیز کی سی ہے۔ اس کی کئی فرینڈز بن چکی ہیں۔ وہ تحفے تحائف دینے کی بہت شوقین ہے۔ گھر میں کھانے کی کوئی اچھی چیز بنتی تھی تو وہ آدھے محلے میں تقسیم کروالیتی تھی۔

ایک روز میں عاطف کے گھر گیا تو اس کی والدہ ایک چھوٹا سا خوبصورت لفن کھول رہی تھیں۔ ''بڑا پیارا لفن ہے آنٹی راحیلہ۔'' میں نے کہا۔

''اس میں جو چیز ہے وہ لفن سے بھی پیاری ہے۔ خوشبو نہیں آئی تمہیں؟''

''ہاں خوشبو تو آئی ہے۔''

''یہ ہے کھوئے والا زعفرانی زردہ۔ حورین کے ہاں سے آیا ہے۔ بڑے کمال کا بناتی ہے۔ جب بھی بناتی ہے ضرور بھیجتی ہے ہمارے گھر۔ عاطف کی بہت عزت کرتی ہے۔ کہتی ہے سفارش وغیرہ کا دور نہ ہوتا تو عاطف اس وقت لاہور کی بجائے کراچی میں ہوتا اور پاکستانی فٹ بال ٹیم میں کھیل رہا ہوتا۔''

اسی دوران میں عاطف تولیے سے اپنا سر رگڑتا ہوا باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''کھوئے والا زعفرانی زردہ آیا ہے بھئی، تمہارے لیے۔''

عاطف کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

ایک شام میری طبیعت کچھ بحال ہوئی تو عاطف کے گھر گیا۔ اس نے کھانے کے لیے روک لیا۔ ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ فٹ بال کے علاوہ موسیقی کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں اپنی دکان پر کام کرنے والے ملازم فراست کی یاد آگئی۔ میں نے عاطف کو بتایا کہ فراست کی آواز میں کتنا سوز تھا اور اس کی کتنی تمنا تھی کہ صرف ایک بار اسے ریڈیو پر گانے کا موقع مل جائے۔ وہ اپنی آرزو سمیت اب منوں مٹی کے نیچے تھا۔ ہم دونوں نے سوچا، اگر آج وہ زندہ ہوتا تو شاید ہم جمشید کے ذریعے اسے کسی طور ریڈیو یا ٹی وی تک لے جانے میں کامیاب ہو جاتے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ پی ٹی سی ایل فون تھا۔ عاطف نے گھڑی دیکھی اور اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''میرے خیال میں حورین کا فون ہے۔''

اس کا اندازہ درست تھا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ بے تکلفی کے انداز میں میں نے بھی اپنا کان ریسیور کے ایئر پیس سے لگا دیا۔ وہ عاطف سے مخاطب ہو کر شکایتی سی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''کل آپ شادی پر کیوں نہیں آئے؟ میں دیکھتی ہی رہی آپ کو، نوی بھی آپ کا پوچھ رہا تھا۔''

''دراصل ایک میچ تھا لاہور ڈویژن کا۔ واپسی میں دیر ہو گئی اور..... جمشید بھائی کہاں ہیں؟''

وہ تو کل صبح سویرے کراچی چلے گئے۔ کچھ مال خریدنا تھا شاپ کے لیے..... اور ارے ہاں پرسوں میں نے آپ کا وہ لوک گیت سنا جس کی کمپوزنگ انہوں نے پچھلے ہفتے کی تھی۔'' (انہوں نے حورین کی مراد اس کا شوہر جمشید تھا۔ وہ اس کو نام سے نہیں بلاتی تھی)

''بھئی بڑا سوز ہے آپ کی آواز میں اور اس سوز کی وجہ بھی میں جانتی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ گلوکاری کو زیادہ سنجیدہ لیں۔ بڑے کامیاب رہیں گے۔ کچھ تو پتا چلے اسے جس نے اتنا دکھ دیا بلکہ ٹھکرایا آپ کو۔''

وہ اسی لڑکی ''کومل'' کا ذکر کر رہی تھی جو ایک عرصے تک عاطف کے دل کا داغ بنی رہی تھی اور کسی حد تک اب بھی تھی۔

''پرانی باتیں نہ ہی چھیڑی جائیں تو اچھا ہے۔'' عاطف نے اسپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ سے سچی کہتی ہوں، کبھی کبھی مجھے بڑا غصہ آتا ہے اس (کومل) پر، آخر کیوں کیا اس نے ایسا۔ اس بے وقوف نے ملائیشیا کو آپ پر ترجیح دی۔ آپ کو اپنے ساتھ ملائیشیا نہ لے جا سکی تو اکیلی چلی گئی۔ راہیں بدل لیں۔ شادی کر لی۔''

اس کے لہجے کی ہمدردی میں ایک بے ساختہ لگاوٹ صاف محسوس ہوئی تھی۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا یہ وہی تقدیس آمیز چہرے والی نیک خو حورین ہے جو کل شام مجھے سن آباد کی مارکیٹ میں نظر آئی تھی۔ چہرہ چادر کے آدھے نقاب میں تھا۔ اب سڑک پر ایک عمر رسیدہ فقیر کے پاس اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑی محبت سے اس کا کندھا دبا رہی تھی۔ پھر اس نے چپکے سے اس کی مٹھی میں کچھ رقم تھما دی تھی۔ بات کرتی ہوئی یہ حورین اپنے لب و لہجے میں ایک لگاوٹ آمیز ہمدردی چھپائے ہوئے تھی۔ میں سوچنے لگا..... کیا یہی وہ دوسری عورت ہے جسے ایک عمر کے مارے مرد کی

زندگی میں آنا ہوتا ہے اور وہ جلد یا بدیر کسی صورت میں آجاتی ہے۔

اب پھر صحن اور صحن میں چہکنے والی سنہری لکیر کی طرف آتے ہیں۔ لمبے بالوں اور گندمی رنگت والی لکیر، میں اکثر سمجھتا تھا کہ میں کاروبار کے لیے موزوں نہیں ہوں۔ بس گزارا کر رہا تھا۔ دوسری طرف قلم کاری سے بھی کچھ خاص حاصل وصول نہیں ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے تایا جان جنہوں نے میری پرورش کی تھی مجھ سے کچھ خفا رہنے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنا بڑا بزنس ہے اور میں ہر وقت قلم گھسائی میں لگا رہتا ہوں (یاد رہے کہ چند برس پہلے بڑے تایا جان (بڑے ابا جی) نے دوسری شادی بھی کی تھی۔ تاہم اولاد کی نعمت اللہ کی دین ہے کسی کو ملتی ہے کسی کو نہیں۔ تایا جی کی دوسری شادی کے حوالے سے تائی یعنی میری سگی خالہ مریم کو کچھ تحفظات بھی تھے تاہم دھیرے دھیرے ان کے اہل خانہ کے سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ میری سوتیلی خالہ میں دور تک سوتیلا پن نظر نہ آیا۔ اولاد سے محرومی کا مداوا انہوں نے بھی میرے ساتھ برادرانہ شفقت سے کیا۔ بلکہ میرے دیگر بہن بھائی اسی گھر میں رہتے تھے لہٰذا وہ بھی ان کی شفقت اور توجہ سے محروم نہ ہوئے۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ بزنس میں میری عدم توجہی کے سبب جہاں کاروبار مندا ہو رہا تھا وہاں تایا جی بھی مجھ سے تھوڑے خفا رہنے لگے تھے۔ دوسری طرف میرے سر پر یہ بھوت سوار تھا کہ قلم کے ریلے کچھ کما کر بھی دکھانا ہے۔

وہ میرے لیے تھوڑے تنگدستی کے دن تھے۔ نوائے وقت مجھے میرے آرٹیکلز کا دوسروں سے اچھا معاوضہ دے رہا تھا پھر بھی وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہی ہوتا تھا۔ اسکوٹر کی حالت خراب رہتی تھی۔ کبھی پیٹرول کے پیسے ہوتے تھے، کبھی نہیں۔

زویا کے حوالے سے محلے کے ہر دلعزیز بزرگ میاں جلاب نے بھی مجھے مشورہ دیا کہ ادھر اُدھر کی چھوڑ کر میں زویا کے چھوٹے بھائی صاحب سے بات کروں۔ میں ابھی اپنے ارادے کو مضبوط ہی کر رہا تھا کہ بھائی صاحب کہیں اوجھل ہو گئے۔ کئی دن انتظار کے باوجود وہ کہیں دکھائی نہ دیے۔ پھر کسی سے پتا چلا کہ وہ ملتان میں ہیں، شاید نشتر میڈیکل کالج میں۔

کچھ پریشانی تو ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری کم ہمتی کو ایک بہانہ بھی مل گیا۔ میں اپنے اندر کی بے کلی کو شاعری اور چھوٹی موٹی کہانیوں میں منتقل کر رہا تھا۔ لاہور کی خوبصورت سرمئی شاموں میں اداس پرندہ پھر چھت کی چار فٹ اونچی منڈیر پر تنگ کر یہ جاتا تھا۔ یہ پچاس گز کا کیسا میدان تھا جو پار ہی نہ ہو پا رہا تھا۔

دوسری طرف سے ایک اُمید بھری صدا نغمے کی صورت ابھرتی تھی۔ ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے۔''

لیکن وہ کیسے آئے؟

وہ منڈیر پر ٹنگا ہوا ایک اداس پرندہ تھا۔ اس کے پر اس کے اندیشوں اور اس کی ناتوانیوں نے کاٹ رکھے تھے۔

انہی دنوں یوسف خان اور ممتاز کی خوبصورت فلم سوہنی مہینوال دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے ماحول اور گیتوں نے بہت متاثر کیا۔ شاید اس کی وجہ بھی اس لوک داستان میں چھپا ہوا، فاصلے اور نارسائی کا دکھ تھا۔ درمیان میں ایک چناب تھا۔ پچاس گز کے ایک میدان جیسا۔

یہ گیت جیسے دل میں کھب کر رہ گیا۔ تانگ سانوں دلداروی گھڑیا..... اور دوسری کلی (جھونپڑی) یار دی گھڑیا (میں دریا کے پار جانا چاہتی ہوں کہ وہاں یار کا ٹھکانا نظر آرہا ہے) ایک نیم گرم خوشگوار رات کو اس نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں۔ یہ کھڑکیاں مغرب کی طرف کھلتی تھیں۔ وہ نماز پڑھنے لگی۔ میں منڈیر پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ مجھے یہی لگا کہ وہ مجھے بھی نماز پڑھنے کا کہہ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو مگر مجھے یہی لگا..... میں نے بھی روزانہ ایک دو نمازیں پڑھنا شروع کر دیں۔

اب وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بہت عجیب لگتا ہے۔ ہر عمر کی اپنی عقل سمجھ اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ میں جیب خرچ میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر جمع کرتا تھا اور پھر انہیں اپنی ''آس اُمید'' کے نام پر خیرات کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ بی بی ریلیف فنڈ کے لیے بہت سے ٹکٹ خرید لیے۔ یہ بھی صدقہ خیرات ہی تھا۔ ان ٹکٹوں پر انعامات بھی نکلا کرتے تھے۔ سوچا کہ اگر کوئی انعام نکلا تو وہ بھی خیرات کر دوں گا۔ ایک چھوٹے سے انعام کے علاوہ کوئی انعام تو نہ نکلا مگر دل کو یہ اطمینان تو ہوا کہ کسی کے نام پر رفاہ عامہ کا کوئی کام کیا ہے۔

کسی وقت زویا کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے لگتا کہ یہ زویا نہیں بینا ہے۔ گندمی رنگ اور سیدھے بالوں والی وہی

خوش باش بینا جس کے ساتھ میں بچپن میں کھیلتا تھا..... اور جو ایک روز مجھے بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کہے سنے، خاموشی سے ہاتھ چھڑا کر چلی گئی تھی، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ میں مہینوں تک اسے اپنی کھیلنے والی جگہوں پر تلاش کرتا رہا تھا۔ پھر ایک رات جب میں چھت پر پھوپی جان کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور اپنی ننھی منی باہیں ان کے گلے میں ڈال کر پوچھا تھا۔ ''پھوپی جی! بینا اللہ میاں کے پاس کہاں ہوتی ہے؟''

تو انہوں نے دور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''طاہر! جو لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں، وہ اوپر جا کر ستارہ بن جاتے ہیں۔''

میں نے ہزاروں لاکھوں ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''پھوپی جی۔ ان میں سے بینا کون سا ہے؟''

انہوں نے بات بدل دی تھی اور پھر مجھے مقبول رسالے ''بچوں کی دنیا'' سے پڑھی ہوئی ایک کہانی سنانے میں مصروف ہوگئی تھیں۔ میرا دھیان بٹانے کے لیے۔

تاہم بات میرے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ میں اکثر رات کو ستاروں کے جھرمٹوں میں اور کہکشاں میں بینا والا ستارہ تلاش کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ستارہ اچانک اپنے پیچھے ایک لمبی لکیر چھوڑتا، زمین کی طرف آتا محسوس ہوتا اور میں سوچتا کہ شاید..... شاید کسی دن بینا بھی اسی طرح زمین کی طرف آجائے۔

ان بچگانہ معصوم خیالات کو برسوں گزر گئے تھے مگر اب بھی جب زویا کو ایک روشن لکیر کی طرح دیکھتا تھا تو سوچتا تھا کہ کہیں یہ وہی ستارہ تو نہیں جو بینا سے منسوب تھا۔

پچاس گز کا میدان، چناب کی صورت میرے سامنے آجاتا اور آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔

رات ہنیری، گھمسن گھیری، بنگی دے لشکارے
ترکے جانا، مر کے جانا، جانا اوس کنارے
رات اے قول رازدی گھڑیا

☆☆☆

زویا کے چھوٹے بھائی تنویر صاحب سے مجھے بات کرنا تھی اور وہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ میرے نماز شروع کرنے پر وہ خوش نظر آتی تھی اور اس کی ''بدن بولی'' سے اس کا واضح اظہار بھی ہوتا تھا۔ مگر اصل بات تو وہیں پر اٹکی ہوئی تھی۔ کسی وقت میں مٹھائی والی اس شاپ کے سامنے سے گزرتا جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے ناصر سے وعدہ کیا تھا کہ جس روز زویا کا خط ملے گا میں اسے جی بھر کر رس ملائی کھلاؤں گا۔ دل اداس ہو جاتا۔ رس ملائی تو روز ہی یہاں موجود ہوتی تھی۔ جیب میں تھوڑے بہت پیسے بھی ہوتے تھے، لیکن خط والی آس تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ناصر کی دوستی بھی۔ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔

گھبراہٹ ہوتی تھی تو کہیں نکل جانے کو جی چاہتا تھا انہی دنوں عمارتی لکڑی کی دکان پر مارشل لاء کے حکام کی نظر پڑ گئی۔ حکم صادر ہوا کہ آتش زدگی کے اندیشے کی وجہ سے ان سب دکانوں کو شہر سے باہر منتقل کیا جائے اور فی الفور کیا جائے۔ ماضی میں اس حوالے سے تاجروں کو کچھ پلاٹ بھی دیے گئے تھے مگر لاہور کی تین چار نمبر مارکیٹس میں سے کوئی بھی ان دور افتادہ پلاٹس پر جانے کو تیار نہیں تھا۔ بعض نے یہ پلاٹ فروخت بھی کر دیے تھے۔ میرے چھوٹے پھوپا عبداللہ جان (جن کا ذکر ہارون بھائی کی گمشدگی والے واقعہ میں بھی ہے) ملتان روڈ نمبر مارکیٹ کے صدر تھے۔

ان دنوں جنرل سوار خان پنجاب صوبے کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کے سگے بھائی، پھوپا جان اور ایک دوسرے ممبر کے جاننے والے تھے۔ وہ چکوال میں رہتے تھے۔ ان سے مداخلت کی درخواست کرنے کا پروگرام بنا۔ سفر کے لیے ہماری گاڑی استعمال ہوئی۔ غالباً دو کمیٹیوں کے صدر اور ایک معزز ہمنوا روانہ ہوئے۔ انہیں لے جانے کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوئی۔ میٹرک کی عمر سے ہی میں بڑے تایا جی کے ساتھ ''لونگ ڈرائیوز'' میں طاق ہو چکا تھا۔

بہرحال وہ سفر میرے لیے بڑا تناؤ والا رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی والا سانحہ تازہ تازہ ہوا تھا۔ ہر محفل میں یہی موضوع زیر بحث ہوتا تھا۔ گاڑی میں سوار تینوں چاروں افراد چونکہ ''پرو ضیاء الحق'' تھے، پھانسی کو قانونی قرار دے رہے تھے اور اس پھانسی پر مٹھائیاں تقسیم کرنے والے کو بھی سراہ رہے تھے لہٰذا میرا دل کٹ کٹ جا رہا تھا۔

بے شک قومی اتحاد کے جلوسوں میں ہم نے بھی زور و شور سے شرکت کی تھی مگر بھٹو کی پھانسی ایک ایسا واقعہ تھا جس نے ایک طبقے کے علاوہ ہر کسی کو کسی نہ کسی درجے میں دکھی ضرور کیا۔ خاص طور پر حساس لوگ جو بھٹو کی ذاتی خامیوں کے نقاد بھی تھے اس الم ناک موت پر اندر سے غمزدہ ضرور ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ پھانسی کے چند روز بعد سیاست کی گرما گرمی میں انہوں نے بھی اپنے اندر کی آواز کو تھپک کر

سلادیا۔

سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ پیپلز پارٹی کی خامیاں کوتاہیوں بھی طشت از بام تھیں، پھر بھی بھٹو کی پھانسی نے ضرور دکھ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب چکوال کے سفر کے دوران میں میرے بزرگ ہمسفروں میں سے ایک نے سارا واقعہ چٹخارے لے لے کر بیان کیا تو دل بوجھل ہوگیا۔ بھٹو کا پل پل موت کی طرف بڑھنا۔ اپیل سننے والے ججوں میں ردوبدل ہونا، پھانسی کی کوٹھری میں بھٹو کے آخری دن جہاں ایک ہی مختصر سی جگہ پر کھانے اور واش روم کا انتظام تھا..... پھر دنیا بھر کے رہنماؤں کی طرف سے رحم کی اپیلیں۔ مبینہ طور پر ایک جنرل کی طرف سے بھٹو کے ساتھ مار پیٹ۔ آخر میں بھٹو صاحب کی شریک حیات اور بیٹی بے نظیر کی بھٹو صاحب سے آخری ملاقات..... اور پھر رات کا وہ بے رحم لمحہ جب بقول کوثر نیازی..... اور لائن کٹ گئی۔

یہ ساری باتیں جب گاڑی میں مزے لے لے کر سنائی گئیں اور میرے ساتھ بیٹھے معزز شخص نے تو بٹی جاری کرتے ہوئے کہا۔ ''مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار صرف اور صرف یہی بھٹو تھا۔ اس کی سزا کو زیادہ عبرت ناک ہونا چاہیے تھا۔''

میں چپ نہ رہ سکا۔ دبے دبے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اس سے عبرت ناک اب کیا ہوگا جی..... ویسے بھی بنگلہ دیش جیسے عظیم سانحے کی ذمہ داری تنہا کسی ایک بندے پر نہیں ڈالی جاسکتی۔''

میرا اتنا کہنا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ چاروں بزرگان الفاظ کی کوڑیں سونت کر مجھ پر پل پڑے۔ بھٹو کی پھانسی سے شروع ہونے والی بات، نوجوان نسل کی بے حیائی، ڈسکو ازم، لچر کتابوں اور پھر وی سی آر جیسی ایک نہایت شرمناک اور ناپاک ایجاد کی آمد تک جا پہنچی۔ مجھے لگا کہ معاشرے میں ان ساری قباحتوں کا ذمہ دار صرف میں ہی ہوں اور یہ میں ہی ہوں جس نے بھٹو کو ادھر تم ادھر ہم والا نعرہ لگانے کا مشورہ دیا اور مشرقی پاکستان کو علیحدہ کردیا۔

میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ تیز رفتار کار کو سامنے چناب کے پل پر چڑھانے کے بجائے بائیں طرف دریا میں گرادوں۔ ان سارے سیاسی بزرگوں سمیت پانی میں غرق ہو کر مچھلیوں کی خوراک بن جاؤں۔ ویسے بھی چناب آج کل ذہن پر سوار رہتا تھا۔ کیا پتا تھا کہ پانی کے اندر کہیں جھاڑ جھنکاڑ میں اٹکے ہوئے ایک کے گھڑے کے ٹکڑے ہی نظر آجاتے۔ وہ کچا گھڑا جو اس مٹکے کی ہر سوہنی کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔

چکوال میں ہمارا قیام وہاں ایک سینئر پولیس آفیسر کے گھر پر تھا۔ مجھے ان کا ریک ٹھیک سے یاد نہیں۔ وہ بے حد لمبے تڑنگے تھے۔ بالوں کی روانگی کی وجہ سے ماتھا آدھے سر سے تجاوز کر رہا تھا۔ آواز ڈینگ تھی اور بے حد کرخت مزاج تھے۔ بہرحال انہوں نے ہمیں اچھا کھانا کھلایا۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہر پانچ منٹ بعد ان کا فون بجنے لگتا تھا۔ گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی۔ ''مار مار کر چمڑی ادھیڑ دو حرامزادے کی۔ ساری عشق معشوق ناک کے راستے نکالو۔'' آخر میں زیادہ طیش میں آکر وہ ناک کے علاوہ بھی کچھ راستوں کا ذکر کرنے لگے۔

پھر ایک کال آئی۔ ''کون بول رہا ہے۔'' وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولے۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بس سمیت تھانے میں بند کرو پائے خاں کو۔ بڑا ٹرانسپورٹروں کا لیڈر بنتا ہے۔ اس کی تو ماں کو.....''

میں دوسرے کمرے میں چلا گیا اور تو بچے ہی دبک کر لیٹ گیا۔ مگر نیند کہاں آنا تھی۔ ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا رہا کہ بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے میرے دل میں جو نرم گوشہ موجود ہے اس کی بھنک اس خوفناک آفیسر کو نہ پڑ جائے۔ تصور میں قید و بند کی صعوبتیں آدھمکیں اور کوڑے لہرانے لگے۔

پھر یہ سوچ کر کچھ تسلی ہوئی کہ میں کوئی ''پیپلیا'' تو نہیں ہوں۔ قومی اتحاد کے جلسوں میں بھی شرکت کرتا رہا ہوں۔ سیاسی لحاظ سے قریباً نیوٹرل ہوں۔ پھر اس ''بیت خان'' کا مہمان بھی ہوں۔ نام تو آفیسر کا کچھ اور تھا مگر مجھے بیت خان ہی مناسب لگ رہا تھا۔

رات سوتے جاگتے میں ہی گزری۔ صبح کسی قریبی گاؤں سے بیت خان کے لیے ''پرستار'' آئے۔ دیسی گھی کا ٹین، چاولوں کی بوری، اور اس طرح کی دیگر اشیائے خوردونی بطور نذرانہ پیش کیں۔

اسی طرح کے ایک اور زہریلے ایس ایچ او کو دو تین سال بعد لاہور کے ایک تھانے میں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں میں اپنے ایک بھائی کی گمشدہ موٹر سائیکل کا رپورٹ درج کرنے گیا تھا۔ شاید ایسے ہی پولیس اہلکاروں کو دیکھنے کے بعد

میرے تصور میں ایک نہایت کرخت پولیس افسر کا ہیولا بننا شروع ہوا تھا۔ ہیولا بننے کا یہ عمل چند برس بعد تب مکمل ہوا جب سلسلہ وار کہانی دیوی کا نہایت سخت گیر کردار ڈپٹی ریاض وجود میں آیا۔

ہم جنرل سوار خاں صاحب کے گاؤں میں پہنچے وہاں سے ان کے بارعب بھائی کو اپنے ساتھ لیا اور پھر ان کو اپنے ساتھ ہی لاہور لائے۔ مسلسل ڈرائیونگ اور دبنگ افراد کی موجودگی میں میرا یہ سارا سفر تناؤ بھرا ہی رہا۔ بہت سی باتیں اب ذہن سے محو ہو چکی ہیں کہ 42 برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ ہاں ایک بات اچھی طرح یاد ہے کہ اس سارے سفر میں میرے لیے خوشی کا ایک مختصر دورانیہ بھی آیا تھا۔ ایک جگہ ہم نے کسی بک شاپ پر گاڑی روکی، تو مجھے نوائے وقت نظر آیا۔ نوائے وقت کے کسی ایڈیشن میں میری ایک نہایت پسندیدہ اور جذباتی کہانی شائع ہوئی تھی۔ کہیں غلط بیان نہ ہو جائے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس مختصر کہانی میں کسی انگلش کہانی کی تھوڑی بہت انسپیریشن بھی شامل تھی یا یہ سراسر میری تخلیق تھی۔ میں جن جذباتی شب و روز سے گزر رہا تھا ان کا عکس بھی اس کہانی میں جھلکتا تھا۔

کہانی کا پلاٹ مختصر ایوں تھا..... ایک شہزادی کو اپنے طوطے سے بے حد پیار ہوتا ہے۔ طوطا بھی ایک پل اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شہزادی کی شادی ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے دولہا کے ساتھ اب کسی دوسرے دیس میں جانا ہے۔ ان کا قافلہ ایک جنگل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ شہزادی کے شوہر کو طوطا ایک آنکھ نہیں بھا رہا۔ اس کی مسلسل باتوں اور ٹیں ٹیں کے سبب وہ کئی روز سے پریشان ہے۔ آخر اپنے شہزادے شوہر کی خوشی کی خاطر شہزادی، طوطے کو آزاد کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کی ہدایت پر ملازم طوطے کا پنجرہ ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیتے ہیں اور پنجرے کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

شہزادی کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے مگر پنجرہ کھلا ہونے کے باوجود طوطا اڑتا نہیں وہ بے حد اداس اور دکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دور دیس چلی جانے والی شہزادی کو جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ وہ اسے یاد کرے گی اور عین ممکن ہے کہ وہ واپس پلٹے.....

وہ انتظار کرتا رہتا ہے، مگر وہ واپس نہیں آتی۔ وہ بھی محبت کا مارا بغیر کچھ کھائے پیئے اس پنجرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن جاتا ہے..... پنجرے کھلے بھی ہوں تو دراصل بند ہی ہوتے ہیں۔ ایک روز ایک مصور اس جنگل سے گزرتا ہے۔ غریب مصور محبوبہ اس سے بچھڑنے والی ہے۔ وہ لاچاری کے عالم میں بھٹک رہا ہے۔ نہایت کمزور طوطا، مصور سے کہتا ہے کہ وہ اس درخت کی اور اس کھلے دروازے والے پنجرے کی تصویر بنائے۔ مصور ایک شاندار تصویر بناتا ہے۔ قریب المرگ طوطا اس سے کہتا ہے کہ وہ یہ تصویر فلاں دیس کی فلاں شہزادی کو دکھائے، وہ شہزادی اسے اس تصویر کے منہ مانگی قیمت دے گی.....

کچھ ہی دیر بعد بھوکا پیاسا طوطا مر جاتا ہے۔ مصور کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ بہرحال وہ تصویر لے کر طویل سفر کے بعد شہزادی کے پاس پہنچتا ہے۔ تصویر میں پنجرے کے اندر طوطے کا مردہ ڈھانچا دیکھ کر پوری بات شہزادی کی سمجھ میں آتی ہے وہ تصویر کو سینے سے لگاتی ہے اور دھاڑیں مار مار کر روتی ہے۔

لاحاصل انتظار کے گرد گھومتی ہوئی یہ کہانی قارئین کو بہت پسند آئی تھی۔ بعدازاں جب میں نے سسپنس ڈائجسٹ میں لکھنا شروع کیا تو اپنی اسی پسندیدہ کہانی کو ایک نئے قالب میں ڈھالا۔ اس نئی کہانی میں طوطا جو محبت، وفا اور انتظار کی علامت تھا۔ ایک شہزادی کے غلام کے روپ میں سامنے آیا۔ وہ اپنی محبوبہ شہزادی سے جدائی کے رنج کا اظہار جداگانہ انداز میں کرتا ہے اور انتظار کی سولی پر لٹک کر جان دے دیتا ہے۔ سسپنس میں شائع ہونے والی اس نئی کہانی کا عنوان میں نے غالباً "آزاد غلام" رکھا تھا۔ بہت برس گزر چکے ہیں لیکن اب بھی اس کہانی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی تعریفی کلمہ مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔

بہرحال سوار خاں صاحب کے بھائی کے ذریعے متعلقہ حکام سے رابطہ ہو گیا۔ بعد کے واقعات کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال لمبر شاپس کی شہر سے باہر منتقلی والا معاملہ رک گیا، اور پھر رکا ہی رہا۔ قانون کو چکما دینے کا ہنر پاکستانیوں سے بہتر کون جانتا ہے۔

اب میں پھر اس موضوع کی طرف آتا ہوں جو پچھلے کئی سال سے چل رہا تھا۔ یہ تذکرے کا وہ حصہ ہے جسے لکھتے ہوئے دل کانپ رہا ہے اور قلم رکنے لگتا ہے حقیقتیں تلخ بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی لیکن انہیں عموماً ہمارے اندازوں، قیافوں وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو ، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

آپ بیتی معروف قلم کار کی خود بیتی کا سنسنا تو اں حصہ جو خود میں منفرد ہے

وہی ایک صحن اور چھت کی کہانی..... اور درمیان والے ایک میدان کی کہانی۔ میدان جو دریائے چناب سے پاٹ جیسی دوری پیدا کر رہا تھا۔ کچھ دنوں کا آغاز ہی بڑے ناخوشگوار طریقے سے ہوتا ہے۔ سردیوں کا وہ دن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اوپر تلے تین تکلیف دہ واقعات ہوئے جو اب تک یاد ہیں۔ میرے پاس سفید رنگ کے دو بڑے پیارے خرگوش تھے۔ انہیں بڑے ہی لاڈ سے پالا ہوا تھا۔ میں صبح اپنے گھر کے صحن میں آیا تو ایک خرگوش کو بڑی مصیبت کی حالت میں دیکھا۔ شاید اس سے بڑی مصیبت کوئی ہو بھی نہ سکتی تھی۔ وہ سفید رنگ کی ایک موٹی تازی بلی کے منہ میں تھا۔ وہ دیواریں پھلانگتی تیزی سے جا رہی تھی۔ میں چند قدم بھاگ کر ان کی طرف گیا مگر کچھ بھی نہ کر سکا۔ میری نگاہ شاید دو چار لمحوں کے لیے اپنے لاڈلے خرگوش کی نگاہ سے ملی۔ وہ بے چارگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا پھر اوجھل ہو گیا۔ اس جانور کی نگاہ میں عرصے تک فراموش نہ کر سکا۔ کمزور لوگوں سے اسی طرح طاقتور اور حیوان صفت لوگ ان کی عزیز متاع چھین لیتے ہیں۔

دوسرا واقعہ اسی روز دوپہر سے ایک گھنٹا پہلے پیش آیا۔ ہماری نمبر شاپ کی شاہ نور والی برانچ پر ایک حادثہ پیش آ گیا۔ وہاں پر چھوٹے تایا (للیانی والے اباجی) ہوتے تھے۔ دکان پر رات کے وقت بڑی بڑی مونچھوں والا ایک پٹھان چوکیدار ہوتا تھا۔ قبائلی علاقے سے اس کا ایک بھتیجا بھی لاہور کی سیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ رات کو چوکیدار، بھتیجے کو اسٹوڈیو میں شوٹنگ دکھانے کے لیے گیا۔ واپس آ کر وہ سو گئے اور پھر کبھی نہ اٹھ سکے۔ سردی بہت تھی انہوں نے انگیٹھی میں لکڑی جلائی اور کمرے میں گیس بھر گئی۔ میں بھی موقع پر پہنچا ایک ادھ کھلی کھڑکی سے دونوں لاشوں کا منظر دیکھا اور دل متلی کرنے لگا۔ گیس بھرنے کے بعد نوجوان بھتیجا تو چارپائی پر سویا رہ گیا تھا۔ مگر پٹھان چوکیدار نے اندھیرے میں اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ اندھیرے کے سبب اس کا ہاتھ چٹخنی تک نہ پہنچ سکا اور وہ الٹ کر دہکتی انگیٹھی کے اوپر ہی گرا۔ اس کی کمر کا سارا گوشت جل گیا تھا اور پٹھے کچ جانے کے سبب بے چارے کا سر اور گردن پیچھے کی جانب اکڑ گئے تھے۔ چند گھنٹوں میں یہ دوسری موت تھی۔ اسی روز سہ پہر کے وقت میں گھر پہنچا اور چھت پر گیا تو زویا کے صحن میں کچھ افراتفری نظر آئی۔ کچھ

آزادیٔ مذہب

آزادیٔ مذہب کسی بھی انسان کا وہ حق ہے جو اس سے چھینا نہیں جاسکتا۔ دنیا بھر کے دساتیر میں ہر شخص کو انفرادی طور پر کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے اور اسے چھوڑ کر دوسرا مذہب اپنانے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ اسلام بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ آئین پاکستان کی دفعہ 12 میں حق مذہب کے تحت کہا گیا ہے کہ ''قانون امن عامہ اور اخلاقی حدود کے اندر ہر شخص کو کسی بھی مذہب پر کاربند ہونے اور اس کی ترویج کا حق حاصل ہوگا۔'' اسی طرح ہر مذہبی فرقے کو اپنی عبادت گاہیں بنانے اور اس کی حفاظت کا حق حاصل ہوگا۔ آرٹیکل 13 میں کہا گیا ہے کہ کسی فرد سے ایسے مذہب کے لیے ٹیکس نہیں لیا جائے گا جو اسے ناپسند ہو اور نہ ہی ایسا ٹیکس نافذ کیا جائے گا، جس کی آمدنی سے ایسے مذہب کی تبلیغ مقصود ہو جو اس کا اپنا مذہب نہ ہو۔ آرٹیکل چودہ میں کہا گیا ہے کہ کسی فرد کو بھی تعلیمی اداروں میں ایسے مذاہب کی تعلیم کے حصول کے لیے یا عبادت کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا جو اس کا اپنا مذہب نہ ہو۔ مذہبی اداروں پر ٹیکس کے نفاذ کے ضمن میں کسی طبقے سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر مذہبی گروہ کا اپنے طلبا کے لیے مذہبی تعلیم کا انتظام اس کا بنیادی حق ہے۔ اسی طرح شہریوں پر تعلیمی اداروں میں نسل، مذہب، سکونت اور ذات پات کی بنا پر داخلے کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی، بشرطیکہ وہ ادارہ حکومت کے سرمائے سے چل رہا ہو۔ لیکن یہ آرٹیکل سرکاری احکام کے ان اقدامات پر اثر انداز نہیں ہوگا جو پسماندہ علاقوں کے لیے اٹھائے جائیں۔ اسی طرح آئین کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ اقلیتوں کے لیے اس امر کی مناسب گنجائش پیدا کی جائے گی کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے مذہب کی پیروی کرسکیں، مذہبی فرائض پر عمل درآمد کرسکیں اور اپنی ثقافت کی نشوونما کرسکیں۔

اقتباس: مرسلہ: شکیلہ پروین، سرگودھا

مہمان تھے مگر روتے ہوئے چہروں کے ساتھ۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی مرگ ہوگئی ہے۔ ایک دم دل سینے میں برف کا گولا بن گیا۔ کیا ہوا ہے، کس کے ساتھ ہوا ہے؟ چند لمحوں کے لیے تو وہی بچپن کی معصوم رجنا ذہن میں آگئی جو ایک کسی انجانے اندھیرے سے گم ہوگئی تھی مگر پھر زویا کو صحن سے گزر کر کمرے میں جاتے دیکھا تو شدید واہمے کا اندھیرا بکھر گیا۔ رگوں میں لہو کی گردش بحال ہوئی۔ میں اصل صورتِ حال جاننے کے لیے نیچے آگیا۔ گلی سے گزر رہا تھا کہ میاں جاذب اسٹور کے سامنے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے نظر آئے۔ سنجیدہ تھے بولے۔ ''ظہیر کے گھر میں فوتگی ہوئی ہے۔ شاید ان کی دادی ہیں۔ عصر کے وقت جنازہ ہوگا۔''

میری نگاہوں کے سامنے بالکل سفید چاندی جیسے بالوں والی وہ نیک صورت، ضعیف خاتون آگئیں جن کو میں اکثر زویا کے گھر میں دیکھتا تھا۔ ابا جان کا مقولہ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ خوشی میں بندہ پیچھے رہ جائے لیکن غمی میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

پھوپی جان کافی حد تک میرے حالات سے آگاہ ہوچکی تھیں مگر اس بارے میں ان سے کبھی کھل کر بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''پھوپی جان! وہ سامنے والے گھر میں مرگ ہوگئی ہے، آپ ہو آئیے۔''

وہ تھوڑا سا گھبرائیں لیکن چلی گئیں۔ میں بھی ساتھ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے گھر کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ اس بیرونی دروازے کو اور ان در و دیوار کو قریب سے دیکھا جو شب و روز نگاہ میں سمائے رہتے تھے۔

زویا کے چھوٹے بھائی تنویر سے بات کرنا تھی اور وہ دکھائی بھی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ سوگ والا گھر تھا۔ دس بارہ روز تک تو اس قسم کی کوئی بات کی ہی نہیں جاسکتی تھی اس لیے سوچا کہ ایک دو دن بعد ان سے ملوں گا مگر دو دن بعد تنویر صاحب پھر نجانے کہاں اوجھل ہوگئے۔ لگتا تھا کہ قدرت کا ہاتھ ہے جو کسی کام کو ہونے سے روک رہا ہے۔

ایک روز مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے میاں جاذب نے مجھے دیکھ لیا۔ اپنی ہموار نیم سفید داڑھی کو سہلاتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو، میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ تم نے اپنے لیے ایک بڑا مشکل راستہ چنا ہے۔ ایسے راستوں پر چلنے کے لیے بہت ہوشیاری بہت ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تم خیر سے ان دونوں صفتوں سے مبرا ہو۔ مجھے لگتا ہے تمہارا کچھ نہیں ہوسکے گا؟''

''آپ تو ایسا نہ کہیں۔''

''یہ جو مسلک کی رکاوٹ ہوتی ہے نا، بہت بڑی ہوتی ہے۔ ایسی بات نہیں کہ ایسی رکاوٹیں دور نہیں ہوتیں مگر ان کے لیے بہت کوشش کرنا پڑتی ہے جو تمہارے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ تم پیدائشی طور پر ہی سستی اور کاہلی کے اوج کمال پر ہو۔ میں تمہیں کچھ زیادہ نہیں بتا سکتا مگر میرا اندازہ یہی ہے کہ کھیل تمہارے ہاتھ سے نکلنے والا ہے۔ کسی بڑے کو درمیان میں لاؤ اور اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔''

''کیا کچھ پتا چلا ہے آپ کو؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''بس یہی سمجھ لو۔'' انہوں نے قدرے بے اعتنائی سے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

دو دن میں نے سیخ پا گزارے..... دو دن پہلے اوپر تلے جو واقعات ہوئے تھے ان کی وجہ سے بھی دل بجھا بجھا تھا۔ تب ایک روز پھر سر راہ زویا سے ملا۔ وہ اپنے گھر سے بہت دور نہیں تھی مگر سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اب اس دور کی باتیں یاد کرتے ہوئے حیرانی ہوتی ہے کہ کیسی خام خیالیاں اور نادانیاں پرورش پاتی ہیں دل و دماغ میں؟ چھوٹی چھوٹی، غیر اہم باتوں پر شادی مرگ طاری ہو جانا یا دکھ کے سمندر میں ڈوب جانا۔

میں نے اس کے پیچھے چلتے چلتے دھیمی آواز میں کہا۔

''زویا! شاید اب زیادہ وقت نہیں بچا۔ شاید آج کے بعد میں کبھی آپ کے پیچھے نہ آؤں۔ اور شاید اب کبھی بات بھی نہ ہو.....'' میں بولتا چلا گیا۔

پتا نہیں کہ کتنے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے..... اور پہنچے بھی یا نہیں۔ بس وہ دوپٹا درست کرتی سر جھکائے چلتی رہی..... اور چلتی رہی۔

''تم ایک پتھر ہو زویا، جس کے ساتھ میں مسلسل سر ٹکراتا رہا ہوں۔'' میں نے آخری میں گلوگیر آواز میں کہا۔

سرما کی اس سنہری دوپہر کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ نارسائی کی لہر اردگرد کے مناظر کو دھندلا رہی تھی۔ قدم بے جان ہوتے جا رہے تھے۔ اب تو اس کا گھر سامنے نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس سے آگے میں کیا جاتا۔ میں رک گیا۔

جس طرح کوئی قدیم مرض بار بار عود کر آتا ہے۔ مجھے بھی خط کے جواب والا عارضہ بار بار لاحق ہو جاتا تھا۔ آخری یک طرفہ گفتگو کے بعد پھر لاحق ہو گیا۔ اس کے لاحق

اسیرِ جنوں

ایک شعلہ جو الھڑ نوجوان کی جنوں خیزیں

دو بہنوں کی آپسی رسہ کشی جس کا

سیدھا اثر کئی خاندانوں پر پڑا

بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیوں کی داستان

ایک ایسی طویل سرگزشت جو عرصہ دراز تک ذہنوں پر چھائی رہے گی

ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں کچھ مثبت اشارے محسوس کر رہا تھا۔ خام خیالیوں اور خوش فہمیوں کا بھلا کیا علاج ہوسکتا ہے؟ چچا غالب کا وہ مصرعہ میری حالت زار پر صادق آتا تھا۔ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔'' •

غالباً زویا بھی دیکھ رہی تھی کہ حالات اب ہاتھ سے نکلتے جارہے ہیں۔ میں پچاس گز کے چناب کے پار سے دیکھتا تھا تو زویا کے چہرے پر شدید الجھن اور عجب پژمردگی نظر آتی تھی۔ محلے کے تقریباً ہر گھر کے حالات سے باخبر میاں جاذب نے اگر کچھ محسوس کیا تھا تو ٹھیک ہی کیا تھا۔ زویا کی شادی کے حوالے سے کچھ چل رہا تھا۔

انہی دنوں زویا کے لیے میں نے اپنا آخری خط لکھا۔ اس آخری خط میں اپنا سارا زور قلم بھر دیا۔ شاید سوچا تھا کہ دل میں یہ حسرت بھی نہ رہ جائے کہ فلکار کی کا ہنر پوری طرح نہ آزمایا۔

جس قسم کے حالات ہوگئے تھے خط پوسٹ کرنے کا رسک تو ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ سوچا کہ یہ آخری خط دستی دوں گا۔ ان دنوں کی ڈائری کا ایک ورق نقل ہے۔

8 جون بروز منگل۔ ''گرمی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ مگر شاپ پر کام ٹھنڈا جارہا ہے۔ دو دن پہلے زیڈ (Z) کے چھوٹے بھائی تنویر نظر آئے۔ اب تو ان کے چہرے پر بھی وہ مسکراہٹ نظر نہ آئی جو ہمیشہ آتی تھی۔ شاید وہ بھی اب سمجھنے لگے ہیں کہ میں بس وقت گزاری کر رہا ہوں۔

خط تیار ہے۔ Z کسی کسی دن سہ پہر تین اور پانچ بجے کے درمیان اکیلا یا اپنی فرینڈ کے ساتھ گھر سے نکل کر مین روڈ کے اسٹاپ پر آتا ہے۔ شاید اس نے کہیں جانا ہوتا ہے۔ اسٹاپ ہماری شاپ کے دفتر کی کھڑکی سے بھی نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ تین اور پانچ بجے کے درمیان نظر رکھوں گا۔''

دکان پر کسٹمر کم آرہے تھے۔ سہ پہر کے وقت تو خاص طور پر فرصت ہی ہوتی تھی۔ دفتر کی چھت نیچی تھی اور ہم صرف پنکھا چلا رہے تھے۔ نہایت گرم سہ پہر میں، میں کھڑکی کے سامنے صوفے پر بیٹھا رہتا تھا۔ خط کبھی جیب میں اور کبھی مٹھی میں ہوتا تھا۔ اب وہ دن رات یاد کرتا ہوں تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہ تھا بس تلخ ترین صورتِ حال سے فرار تھا۔ دفتر کی کھڑکی سے بس اسٹاپ تقریباً پورا ہی نظر آتا تھا۔ تقریباً نصف فرلانگ کی دوری سے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل بس اسٹاپ کی طرف دیکھتا رہتا۔

اب سوچتا ہوں تو رونا آتا ہے اور ہنسی بھی۔ ہر لحظہ سوچتا تھا کہ وہ بس اسٹاپ پر نمودار ہوجائے گی۔ حالانکہ عین ممکن تھا کہ وہ گھر سے ہی نہ چلی ہو۔ یا گھر سے ہی رکشا وغیرہ میں بیٹھ کر چلی گئی ہو۔ یا اتنی سخت گرمی میں اپنے کمرے میں سو رہی ہو۔ یا آزردہ دل کے ساتھ اپنی منگنی اور شادی کی تیاری میں مصروف ہو۔ مگر میری نگاہیں صرف اور صرف بس اسٹاپ پر جمی ہوتی تھیں۔

اور پھر ایک دن جب جون کی طویل گرم سہ پہر نے لاہور کے در و دیوار کو، سڑکوں کو انگارہ بنا رکھا تھا۔ پیاسے پرندے ہانپ رہے تھے۔ ٹریفک کے ہلکے سے شور کے سوا مکمل سکوت تھا۔ اور سینوں میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور بس اسٹاپ پر گندمی رنگت، لمبے بالوں اور سبک بدن والی وہ لڑکی کہیں نہیں تھی۔ ایک بم میرے سینے میں کچھ بجھ گیا۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ دل و دماغ میں آس امید اور انتظار کے جتنے بھی در کھلے تھے یکایک ہی بند ہوگئے۔

میں نے مٹھی میں دبے ہوئے اس آخری خط کی طرف دیکھا۔ وہ خط جس میں میں نے اپنا سارا زور قلم بھرا تھا جس میں گرمیوں کی طویل دوپہروں اور چاندنی راتوں کا ہجر شامل تھا۔ ساون کی بارشوں اور سردیوں کی بے قرار شاموں کا کرب مذکور تھا۔ خالی اداس تہواروں اور نامراد روز و شب کی بے کلی تحریر تھی۔ میں نے اس خط کے چھوٹے چھوٹے پرزے کرکے ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ بالکل جیسے چند سال پہلے مری میں ایک دلگداز کہانی لکھ کر اس کے پرزے کشمیر پوائنٹ کی نشیبی وادی کی تیز ہوا میں اڑا دیے تھے۔

یہی لمحے تھے جب میرے ناتواں دل نے پکار کر کہا۔ ''چناب'' پھر پار نہیں ہوسکا۔ اب تم کبھی نہ جان پاؤ گے کہ مارچ کی ایک چمکیلی دوپہر کو تم نے جس کینو پر Love لکھ کر پھینکا تھا وہ زویا کو ملا تھا یا نہیں؟ نہ ہی تم یہ جان پاؤ گے کہ تمہارا پہلا خط کن سے زویا نے اٹھایا تھا یا کسی اور نے؟ نہ ہی کبھی تمہیں یہ معلوم ہو پائے گا کہ ایک سہ پہر جب اس نے اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھ کر تمہیں دیکھا تھا۔ مسکرائی تھی اور ایک ڈاک لفافہ تمہیں دکھایا تھا تو اس کا مطلب کیا؟ اور وہ سارے کے سارے سوال جو تمہارے ذہن میں اٹھتے رہے ہیں اور جن کے جواب تم نے زویا سے اپنی پہلی خوبصورت ملاقات میں لینا تھے اب وہ ہمیشہ جواب طلب ہی رہیں گے۔ اور ان سب سوالوں کے ساتھ..... ہاں ان سب سوالوں کے ساتھ..... وہ ''رس ملائی'' بھی کبھی نہ کھائی

جائے گی جس کا وعدہ تم نے کبھی ناصر سے اور اپنے آپ سے کیا تھا۔

یہ تیسرا کالا پتھر تھا جو میری زندگی میں آیا تھا۔ میں نے اسی جگہ وہیں دفتر میں بیٹھے بیٹھے اپنی ہر آس امید کو کند چھری سے ذبح کر ڈالا۔

وہ بڑے کرب کے دن تھے۔ ان دنوں کی سادہ سی شاعری کا مختصر نمونہ۔

اپنی چھت پر آکر اس نے
میری چھت پر دیکھا ہوگا
سوکھے پتے اڑتے ہوں گے
سب کچھ اجڑا اجڑا ہوگا
کچھ دن چھت پر آیا ہوگا
پھر وہ مجھ کو بھولا ہوگا
چھت کی ویراں برساتی پر
ایک کبوتر بیٹھا ہوگا
یوں تو پنکھ بریدہ ہوگا
اس کی چونچ میں نامہ ہوگا

اور پھر یہ غزل.....

چلو رستے جدا کرلیں
بہاروں کو وداع کرلیں
پلٹ جائیں خزاؤں کو
محبت کو سزا کرلیں
جفا کے بت تراشیں ہم
انا کو پھر خدا کرلیں
بچھڑ جائیں جولائی میں
یہ حتمی فیصلہ کرلیں

بقول سیماں جاذب اس کی شادی ابھی کئی ماہ دور تھی۔ مگر شادی کے دور یا نزدیک ہونے سے اب کیا فرق پڑتا تھا۔ میرے اندر تاریکی چھا گئی تھی اور شاید ادھر بھی کچھ زیادہ روشنی باقی نہ رہی ہو۔ قلم کاغذ اور نمبر شاپ دونوں مجھے زہر لگ رہے تھے۔ میں نے کبھی سگریٹ نوشی نہیں کی لیکن کرنے لگا تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ یہ صرف سگریٹ نوشی تھی ورنہ ایسے موقعوں پر یار لوگ کئی طرح کی ''نوشیاں'' شروع کردیتے ہیں۔ سگریٹ کے علاوہ کسی وقت میں سکون آور گولیاں بھی کھالیتا تھا اس کے علاوہ کھانسی، نزلے اور الرجی وغیرہ کے شربت بھی بالضرورت اور بلاضرورت پی جاتا تھا کہ کچھ بے خبری و غنودگی سی محسوس ہوتی تھی۔ صورتِ حال وہی تھی، بقول محمود شام۔ ''کتنی شدت سے تمہیں چاہا تھا۔ کتنی عقیدت سے ہار مانی ہے۔''

ایسی ہی ایک کیفیت میں تھا جب خالہ جان نے بڑے لاڈ سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''تمہاری پھوپی جان کی بڑی خواہش ہے کہ ہم رشتے کی بات چلائیں۔ تم کیا چاہتے ہو؟''

خاندان برادری میں ایک دو گھرانے اور بھی اس حوالے سے خواہش مند تھے مگر بڑے تایا جی چونکہ اپنی سب سے بڑی بہن سے بہت قریب تھے لہٰذا ان کی خواہش یہی تھی کہ بڑی بہن کی سب سے چھوٹی بیٹی گھر میں آئے۔

اس دن خالہ جان نے جو سوال مجھ سے پوچھا تھا۔ پہلے بھی ایک دو بار پوچھ چکی تھیں۔ اس بار میں خاموش رہا تھا اور یہ وہی خاموشی تھی جسے نیم رضامندی بھی کہا جاتا ہے۔

زویا والی روداد میں آٹھ نو برس بعد آنے والا ایک موڑ ابھی باقی ہے۔ مگر فی الحال اس داستانِ الم کو طول دینے سے بہتر ہے کہ کچھ دیگر موضوعات کی طرف آجائیں۔ اس ٹریجک اینڈ سے میرے اندر پیدا ہونے والی کیفیات کو سردست پس منظر میں رکھ رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کیفیات موجود ہی نہیں تھیں۔

زندگی کی روانی بڑی اٹل شے ہے۔ کالے پتھروں کی وجہ سے رکتی نہیں۔ انہیں پھلانگ جاتی ہے۔ نہ پھلانگ سکے تو راستے بدل لیتی ہے۔ اس روانی کو روکنے والی بس ایک ہی شے ہے، موت۔

☆☆☆

یہ وہ دن تھے جب ایک ''آفت جاں ایجاد'' ملک عزیز کے گلی کوچوں میں جھلک دکھانے لگی تھی۔ اور یہ تھی وی سی آر۔ اس سے ایک دو برس پہلے میں نے مال روڈ کی ایک دکان پر پہلا وی سی آر دیکھا تھا۔ سمجھیں کہ یہ ''وی سی آر'' کے آباؤ اجداد میں سے ایک بزرگ تھا۔

بلا مبالغہ اس کا سائز ایک واشنگ مشین کے برابر تھا۔ لوہے اور پلاسٹک کی بڑی بڑی گراریاں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔

زویا والے معاملے کو گہری تاریکی میں ڈوبے اب قریباً ایک برس سے زائد ہوگیا تھا۔ میں بہ زبان خاموشی یہ دعا کرتا رہتا تھا کہ قدرت مجھے وہ الم ناک دن نہ دکھائے جب زویا کے صحن میں پھر تہ شدہ شامیانوں کا انبار نظر

آئے.....اور یہ شامیانے واقعی اس کی شادی کے ہوں۔ یہ دعائیں قبول ہوئی کہ ہم اقبال ٹاؤن کے اندر اپنے نئے تعمیر شدہ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ وہ گلی، وہ در و بام، وہ لوگ، سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کبھی اچانک مجھے وہ وقت یاد آجاتا تھا جب زویا کے صحن میں شامیانے اور شادی کی تقریب کا دیگر سامان دیکھ کر گلی محلے میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ کشمیر صاحب کی بہن کی شادی ہو رہی ہے۔ اور میں دکھ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر لاہور سے دور چلا گیا تھا لیکن پھر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی، مگر اس کے بعد کے ایک ڈیڑھ سال میں بھی تو کچھ نہ ہو سکا۔

مجھے کسی وقت لگتا کہ میں کرکٹ کے ایسے کھلاڑی کی طرح ہوں، جو آؤٹ ہو کر دکھی دل کے ساتھ سر جھکائے گراؤنڈ سے باہر جا رہا تھا کہ ایمپائر نے اسے ناٹ آؤٹ قرار دے کر واپس بلا لیا۔ اسے ایک اور موقع ملا۔ وہ اس نئی زندگی پر خوشی سے نہال ہوا۔ لیکن صد حیف وہ پھر، اپنے اسکور میں کوئی اضافہ کیے بغیر آؤٹ ہو گیا۔

☆☆☆

میرے فرینڈ سرکل میں ایک دو بار دبی سی آرزو دیکھا جا چکا تھا۔ مگر میں جس طرح کی کیفیت سے گزر رہا تھا اس نئی ایجاد کے دیدار سے محفوظ رہا۔ میری شادی پھوپی زاد کے ساتھ طے ہو چکی تھی۔ ابتدائی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ یہ ہمارے گھرانے میں پہلی شادی تھی اور بڑے تایا جی کی منشا کے عین مطابق ہو رہی تھی۔ لہٰذا پورے خاندان میں جوش و خروش پایا جاتا تھا (یاد رہے کہ تایا جان کی پیاری بہن اس شادی سے قبل ہی وفات پا چکی تھیں) تایا جان، خالہ جان اور چھوٹی تائی جان کی خوشی تو دیدنی تھی ہی، تایا جان کی دوسری بیوی یعنی ہماری چھوٹی خالہ بھی دل و جان سے اس آنے والی خوشی میں شریک تھیں۔

ان دنوں یہ ہوا کہ میں جو بہت کم بیمار ہوتا تھا، بستر سے آلگا۔ میرے خیال میں وجہ میری بے اعتدالیاں ہی تھیں۔ سگریٹ، سکون بخش گولیاں، نزلہ زکام، الرجی، ہر قسم کی ادویات سے استفادہ۔ ایک شام میرے پہلو میں شدید ٹیس اٹھی۔ پتا چلا کہ یہ گردے کا درد ہے۔ گردے کے پاس اس درد نے ایسا زور پکڑا کہ دن میں تارے دکھا دیئے۔ درد شروع ہونے کے قریباً 36 گھنٹے بعد ایک المناک ترین رات آئی۔ میں اس رات کو اس درد بھری رات سے تشبیہ دوں گا جب میں بچپن میں بازو تڑوا کر اسپتال پہنچا تھا اور آپریشن کے بعد ایک کرخت نرس ہر چار گھنٹے بعد میری پیٹھ میں انجکشن گھونپتی تھی۔

پہلو کا درد بڑھتا گیا۔ قے پر قے ہو رہی تھی۔ میں اسپتال جانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر میں سب کچھ بس سے باہر ہو گیا تو گھر والوں سے کہا۔ "ٹھیک ہے لے جاؤ اسپتال۔"

عموماً گردے کا درد چار پانچ روز بعد جسمانی ریاضت ختم کر دیتا ہے لیکن قدرت نے میری بے اعتدالیوں کے سبب معلوم نہیں کون سی سخت دفعہ لگا رکھی تھی۔ یہ درد طول پکڑتا جا رہا تھا۔ چند دن میں ڈاکٹر پر ڈاکٹر بدلے گئے مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات رہا۔ ایک آدھ دن کے لیے کچھ افاقہ ہو جاتا لیکن پھر وہی درد۔ دوسری طرف شادی کی تیاری بھی ہو رہی تھی۔ شادی کی تاریخ رکھنے والا کام بھی ہونا تھا۔ بڑوں نے سوچا کہ چلو ذرا لمبی تاریخ رکھ دیتے ہیں اس دوران میں طاہر کو آرام بھی آجائے گا۔ لہٰذا قریباً ڈیڑھ پونے دو ماہ کی تاریخ رکھ دی گئی۔ مگر میرا درد ہر پلانگ کو فیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ سخت پریشانی تھی۔ ایک روز کسی سیانے نے لاہور کے معروف کڈنی اسپیشلسٹ کا پتا بتایا۔ وہ سرجن ڈاکٹر کینٹ ایریا میں ہی رہائش پذیر تھا۔ نام ذہن سے نکل گیا۔ تایا جی، ابا جی اور بھائی ساجد وغیرہ مجھے کار میں ڈال کر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ ان ڈاکٹر صاحب کو اگر "ڈاکٹر" کہوں تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔ وہ ٹرٹر بھی بہت کرتے تھے۔ ان کو جب پتا چلا کہ لڑکے کی شادی ہونے والی ہے اور گھر والے سخت پریشان ہیں تو انہوں نے آؤ تاؤ دیکھے بغیر فیصلہ صادر کر دیا کہ بچے کا گردہ فیل ہونے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لہٰذا فوراً سرجری ہونی چاہیے۔ مزید سہولت دیتے ہوئے انہوں نے تایا جی سے فرمایا۔ "آپ دیر بالکل نہ کریں۔ پرسوں اسی قسم کا ایک اور سیریس آپریشن بھی ہونا ہے۔ اگر اس آپریشن کے ساتھ ہی آپ کے بچے کا آپریشن بھی ہو جائے تو فلاں فلاں شق میں بچت ہو جائے گی۔"

تایا جی اور ابا جی کو بچت کی زیادہ پروا نہیں تھی مگر بس یہی تھی کہ پرسوں تک گردے فیل ہونے سے بچا رہے۔

چند ہزار روپے ڈاکٹر صاحب کو فوراً ایڈوانس دے دیئے گئے۔ انہوں نے اپنے کسی مہربان کی لیبارٹری سے چند ٹیسٹ کروانے کا بھی کہا۔ ان میں ایک ٹیسٹ کو غالباً آئی وی پی کہا جاتا تھا جس میں نسوں کے اندر رنگین محلول انجیکٹ کیا جاتا ہے۔

اس ٹیسٹ کے لیے پیٹ کا صاف شفاف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹیسٹ سے پہلے بچے کو گرم دودھ میں کیسٹر آئل وغیرہ ملا کر پلانا ہے تاکہ پیٹ صاف ستھرا ہوجائے۔ شاید انہیں معلوم نہیں تھا کہ بچے کا پیٹ صاف ستھرا ہوگیا تو اس نے آپریشن کے لیے آنا ہی نہیں ہے۔ ایک طرح سے انہوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماردی تھی۔

قدرت جب شفا دینے پر آتی ہے تو کوئی بھی وجہ بن جاتی ہے۔

مجھے لگا کہ میری طبیعت ٹھیک ہورہی ہے۔ اپنی کیفیت کے بارے میں خود مریض سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔ رات تک میں ڈٹ گیا کہ میں نے آپریشن نہیں کرانا، میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ گھر والے خود بھی کافی پریشان تھے کہ گردے کی چیر پھاڑ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اور جن دنوں کا یہ واقعہ ہے، یہ اور بھی مشکل کام تھا۔ اکثر مریض روگی ہوکر رہ جاتے تھے۔ ہمارے خاندان میں اسی آپریشن کے نتیجے میں شدید بیماری کے بعد ایک ڈیتھ بھی ہوچکی تھی۔

میری ضد کام کرگئی۔ آپریشن سے آٹھ دس گھنٹے قبل میں خود کو بہت بہتر محسوس کرنے لگا۔ یقیناً بڑوں کی دعائیں کام کرگئی تھیں۔ مجھے اپنے علاقے کے ہر دلعزیز ڈاکٹر سرفراز صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے کچھ دوائیں اور بہت ساری تسلی دی۔

حیرانی کی بات ہے کہ اس واقعے کو اب پورے 42 سال گزر چکے ہیں۔ میرے جس ''قریب المرگ'' گردے کو سرجن صاحب دو تین دن کی مہلت بھی نہ دے رہے تھے۔ ''الحمدللہ'' وہ آج تک بالکل ٹھیک ہے۔ ان 42 برسوں میں ایک دو بار گردے کی تکلیف ضرور ہوئی مگر دوسرے گردے میں۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے خاندان میں جوش اور خوشی کی لہر بلند ہورہی تھی۔ یہ دراصل ''ڈبل شادی'' تھی۔ میری ہونے والی شریک حیات کے بھائی صاحب کی شادی بھی فیملی میں ہی ہورہی تھی۔ شادی کی تقریب کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آیا۔

ان دنوں شادی ہالز کا رواج نہیں تھا۔ شادی کی تقریب نئے گھر میں ہونا تھی۔ گھر کے عقب میں ایک بڑا پلاٹ خالی پڑا تھا۔ ہم نے ولیمے کے لیے وہیں شامیانے لگانے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر ڈر بھی رہے تھے کہ کہیں

آسٹروٹرف

گھاس کا ایسا مصنوعی میدان جس پر موسم اثرانداز نہیں ہوتا اور جسے لگاتار برسوں تک استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ آسٹروٹرف کا سب سے پہلا استعمال آسٹریلیا کے مقام پرتھ میں ہوا۔ اس کی موٹائی 15 ملی میٹر رکھی گئی تھی اور اس کے نچلے حصے میں 18 ملی میٹر موٹائی کا آبزرور پیڈ بھی لگایا گیا تھا۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے اس پر پانی چھڑک دیا جاتا ہے تاکہ اس کے ریشے نرم ہوجائیں پاکستان میں پہلا آسٹروٹرف کراچی میں ایک کروڑ روپے کی لاگت سے بچھایا گیا۔ بعدازاں دیگر سینٹروں میں بھی آسٹروٹرف بچھائے گئے۔ 11 جنوری 1980ء کو کراچی میں آسٹروٹرف پر کھیلا جانے والا پہلا بین الاقوامی میچ دوسری پی آئی اے چیمپئنز ہاکی ٹرافی تھا۔ اس میچ میں پاکستان نے کامیابی حاصل کی، مغربی جرمنی دوسرے اور آسٹریلیا تیسرے نمبر پر آیا۔

مرسلہ: نازش انصاری، حیدرآباد

ہمارے پروگرام سے پہلے ہی وہاں تعمیر شروع نہ ہوجائے کیونکہ اردگرد گھر تیزی سے تعمیر ہورہے تھے۔

مزے کی بات یہ کہ ولیمے تک وہاں تعمیر شروع نہ ہوئی۔ ولیمہ وہیں پر ہوا بلکہ اس کے بعد بھی تقریباً 25 سال تک وہ پلاٹ خالی پڑا رہا اور جب میرے بڑے بیٹے نوید کی شادی ہوئی تو بھی ہم نے سوچا کہ کیوں نا مہندی وغیرہ کی تقریب اسی پلاٹ میں کرلی جائے۔

میری شریکِ حیات شفیقہ کا تعلق اسی معروف عالم دین کے گھر سے تھا جن کا ذکر میں کرچکا ہوں۔ مولانا عبدالحئی۔ یہ ان کی پوتی تھیں۔ میری والدہ ان کی نواسی تھیں۔ ایک مختصر باب میں ان کا ذکر کروں گا جو یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔

علی سفیان آفاقی صاحب جب اچھے موڈ میں ہوتے تھے تو ایک فقرہ کہتے تھے۔ ''میری بیوی بہت اچھی بہت ہی نیک خو ہے۔ کبھی تو دل چاہتا ہے کہ اس جیسی ایک اور ہو۔''

میں اس فقرے کے بس پہلے حصے تک محدود رہنا چاہتا

ہوں۔ میں الجھن، گھٹن اور شکست و ریخت کے جس دوراہے سے گزر رہا تھا اس میں سے مجھے نکالنے میں شریکِ حیات شفیقہ نے بہت کردار ادا کیا۔

شادی کے اگلے روز ہی مجھ سے نادانستہ ایک کام ہوگیا۔ ناشتے کے فوراً بعد میں اپنی ایک ادھوری کہانی لے کر اپنے پرانے گھر نواں کوٹ چلا گیا۔ میرے حقیقی والد اور بھائی ابھی اسی گھر میں مقیم تھے۔ وہاں جاکر کہانی میں بری طرح مگن ہوگیا۔ پتا تب چلا جب خیالات کی آمد کے ساتھ ساتھ لسّیانی والے تایا جی کی آمد بھی ہوگئی۔ وہ سخت غصہ ہوئے کہ میں گھر میں بتائے بغیر یہاں قلم کاری فرما رہا ہوں۔

دراصل میری شریکِ حیات ہماری اسی یا جی کی چھوٹی بہن تھیں جو دلہن بنی بیٹھی رہی تھیں اور دولہا بھائی بغداد شریف جا نکلے تھے۔ میرے یوں اچانک چلے جانے سے گھر والوں کے دیرینہ اندیشے منہ پھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔ بعدازاں میں اس صورتِ حال پر بہت شرمندہ ہوا۔

گردے کا درد اب ٹھیک ہوچکا تھا لیکن کئی ہفتے گزرنے کے باوجود خوف اب تک طاری تھا۔ جہاں کوئی اپنے پیٹ یا گردے وغیرہ میں درد کا ذکر کرتا تھا۔ میں حفظ ماتقدم کے طور پر فوراً دو گلاس پانی پی لیتا تھا۔ یا کچر کچر مولی کھانا شروع کردیتا تھا، کیونکہ میرے اندازے کے مطابق مولی مجھے فائدہ دیتی تھی۔

ایک دن پھوپی جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شادی کے بعد تو لوگ اچھا کھاتے پیتے ہیں، تم کیا ہر وقت مولی گاجر کھیرے کے چکر میں پڑے رہتے ہو۔''

شادی کے بعد ہم سیر کے لیے مری بھی گئے۔ وہاں بھی میں ہوٹلوں میں ٹینڈے، کدو اور توریاں وغیرہ ہی ڈھونڈتا رہا۔

مری میں ہی ایک قدرے سنگین واقعہ بھی پیش آیا۔ حسبِ رواج و دستور ہم ایوبیہ بھی گئے۔ بے شک علاقے کے لوگ مہذب و مہمان نواز ہیں، مگر کچھ کالی بھیڑیں ایسی بھی ہیں جو ملک کے دیگر حصوں سے آنے والوں کو تنگ کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔ وہ نومبر کے دن تھے۔ ویسے بھی مری ایوبیہ وغیرہ میں سناٹا چل رہا تھا۔ سناٹے کے موقع پر کچھ مقامی بہت کرخت ہوجاتے ہیں۔ ایک دس بارہ سالہ بچے نے زبردستی اپنی ٹیلی اسکوپ میرے ہاتھ میں تھمادی اور ارد گرد کے نظارے دیکھنے کو کہا۔

میں نے بمشکل دس سیکنڈ کے لیے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگا کر اسے واپس کردی۔ ''بابو صیب۔ اس کا پیسا دو۔'' وہ جھگڑا کرنے لگا۔

میں نے بہت ٹالا لیکن وہ باز نہیں آیا۔ آخر منہ میں بک بک کرتا ہوا چلا گیا اور کچھ دور کھڑے ہوکر ہمیں گھورنے لگا۔

نئی نویلی بیوی کے سامنے مجھے یہ بے عزتی بہت گراں گزری۔ حالانکہ میں لڑائی جھگڑا سے حتی الامکان دور رہتا ہوں مگر لڑکے کے انداز نے تاؤ دلا دیا کچھ ''گربہ کشتن روز اول'' والا محاورہ بھی ذہن میں آگیا۔ میں بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بدتمیز لڑکے کو زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

اس کے کئی والی وارث دائیں بائیں سے نکلے اور ایک دم اکٹھے ہوگئے خوب تو تو میں میں ہوئی۔ شکر کا مقام تھا کہ بیچ میں دو چار اچھے بندے بیچ بچاؤ کرانے والے بھی تھے۔ ہم فٹافٹ چیئر لفٹ میں بیٹھے اور آغاز کے مقام پر واپس پہنچ گئے (مگر ابھی ہم ایوبیہ میں ہی تھے)

ایک مقامی شخص نے کہا۔ ''آپ نے تھپڑ مار کر اچھا نہیں کیا۔ یہ پورا گروہ ہے۔ بڑے غصیلے لوگ ہیں۔ آج کل بے روزگاری کی وجہ سے اور زہریلے ہورہے ہیں۔ آپ بس فٹافٹ مری کی طرف نکل جائیں۔

پھر ذرا رک کر پوچھنے لگا۔ ''آپ گاڑی پر ہیں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

بولا۔ ''کہاں کھڑی کی ہے گاڑی؟''

میں نے نیچے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ کہنے لگا۔ ''یہ لوگ کئی دفعہ گاڑی کے آگے پیچھے کیل وغیرہ پھینک دیتے ہیں تاکہ گاڑی پنکچر ہوجائے۔ آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوسکتا ہے۔ آپ جلدی کریں۔''

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ایک کرخت صورت شخص مسلسل ہمارے آس پاس تھا اور کڑی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ طمانچہ ان لوگوں کو ہضم نہیں ہو پارہا۔ بہرطور ہم بخیر و عافیت وہاں سے نکل آئے۔

راستے میں ایک گاڑی پر مجھے خوامخواہ شک ہوتا رہا کہ وہ ہمارا پیچھا کررہی ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میری جگہ ہمارے پرانے محلے کا شیر دل سلیم ہوتا تو وہ پیچھے آنے والوں کا راستہ خود روک کر کھڑا ہوجاتا اور ان سے پوچھتا کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ اور اگر وہ کہتے کہ تکلیف ہے تو وہ اپنے فولادی سر کی خداداد ضربی صلاحیت سے ان کے چلے

خراب کرڈالتا۔

مری سے واپسی کے چند ہی روز بعد فیملی میں غلغلہ بچا کہ سب نے اجتماعی طور پر ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرنا ہے۔ یعنی وی سی آر دیکھنا ہے۔ اس جرم عظیم کے سرغنہ ہمارے بڑے پھوپی زاد بھائی اسلم تھے۔ دو کزن ''سہولت کاروں'' کا کردار ادا کررہے تھے۔ موقع واردات چوبرجی والا گھر ہی منتخب ہوا تھا۔ یہ مارشل لاء کا دور تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا دبدبہ اپنے جوبن پر تھا۔ ملک عزیز پر اوپر تلے اسلامائزیشن کی قسطیں اتر رہی تھیں (بہرحال کئی حوالوں سے یہ سخی بجا بھی تھی) اس گھٹن اور پابندیوں کے دور میں یہ وی سی آر نجانے کہاں سے نمودار ہوگیا تھا۔ لاہور کی گلیوں میں اکثر صبح سویرے اِکا دُکا پُراسرار بندے نظر آتے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ اور بال منتشر ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے کوئی نامعلوم شے کسی گٹھڑی کی صورت یا پھر بیگ وغیرہ میں ڈال کر اٹھائی ہوتی تھی۔ چوکنی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے چلے جارہے ہوتے تھے۔

ایسے مناظر دیکھ کر مجھے تو یہی لگتا تھا کہ شاید یہ شراب یا ناجائز اسلحے کے سپلائر ہیں۔ کئی دنوں بعد یہ پتا چلا کہ یہ چیز جوان لوگوں کے پاس ہوتی ہے دراصل وی سی آر ہے۔ یہ لوگ وی سی آر پر رات بھر فلم بینی کا ارتکاب کرنے کے بعد اسے صبح سویرے واپس کرنے جارہے ہوتے ہیں۔

تو اسی فعل کا ارتکاب اب ہم کرنے جارہے تھے۔ موقعہ واردات چوبرجی والی کوٹھی ہی تھی۔ جس رات ہم نے یہ ''فعل'' کرنا تھا۔ اسلم بھائی کے ایک ملازم کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر واقع پل پر سہولت کار کے فرائض انجام دینا تھے۔ بالفاظ دیگر اسے نگرانی کے فرائض انجام دینا تھے۔ جونہی اسے مین روڈ پر کوئی مشکوک سرگرمی نظر آتی۔ مطلب پولیس کی گاڑی شاڑی دکھائی دیتی۔ اس نے فوراً ایک چھوٹے لڑکے کو کوٹھی کی طرف بھگانا تھا۔ اس کے فوراً بعد پلان بی پر عمل ہونا تھا۔ سب کی مرضی سے یہ طے ہوا تھا کہ پلان بی کے مطابق، وی سی آر کو فلموں سمیت اٹھا کر کھڑکی سے باہر پچھواڑے کے خالی پلاٹ میں پھینک دیا جائے گا۔ وی سی آر اور فلموں کے گراں قدر ہونے کی مطلق پرواہ نہ کی جائے گی۔

اور یہ کوئی مبالغہ نہیں۔ ان دنوں وی سی آر اور انڈین فلمیں پکڑے جانے کی دہشت کچھ ایسی ہی تھی۔ بعدازاں دھیرے دھیرے اس میں نرمی آتی چلی گئی۔

آدھا خاندان اس گیلری نما کمرے میں موجود تھا۔ جہاں وی سی آر لگایا گیا تھا۔ رنگین ٹیلی ویژن ہمارا استعمال ہورہا تھا اور مجھے ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ شاید یہ آلہ واردات کے طور پر ضبط ہوجائے گا۔ البتہ ہماری پُرسوز دعاؤں کی وجہ سے خیریت رہی۔

مجھے یاد ہے اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہم نے قریباً سات فلمیں دیکھیں۔ ان میں سلسلہ، قربانی، کبھی کبھی اور لاوارث وغیرہ شامل تھیں۔ مسلسل جاگنے اور کم خوراکی کے سبب دماغ ماؤف ہوچکے تھے اور آنکھیں سوج چکی تھیں۔ سب فلموں کی کہانیاں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ ہر فلم کے ہیرو ہیروئین ایک دوسرے سے بے وفائی کرتے محسوس ہوتے تھے کیونکہ ان کے عہدوپیماں بھی غلط ملط ہوگئے تھے۔ یعنی ایک فلم سے دوسری فلم میں سفر کرگئے تھے۔

میں ایک بات بتانا بھول گیا۔ وی سی آر والی یہ ''غیر قانونی'' محفل اسی گیلری میں جمی تھی جس میں آسیب وغیرہ کا ذکر پچھلے ابواب میں ہوچکا ہے۔ چونکہ اوپر تلے فلمیں دیکھ دیکھ کر ہم خود سرخ آنکھوں والے بھوت بنے ہوئے تھے لہٰذا چوبرجی کے مینار والی پُراسرار عورت آئی بھی ہوگی تو اپنے بھائی بندوں کا مجمع دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔

وی سی آر کی چاٹ بہت بری تھی۔ اس کامیاب واردات کے ڈیڑھ دو ہفتے بعد ہم نے اگلی واردات ڈال دی۔ اس دفعہ ہمارے نئے گھر کا ڈرائنگ روم استعمال ہوا۔ آٹھ دس کزن اور دیگر عزیز اکٹھے ہوگئے۔ سرگوشیوں میں پروگرام بنا اور رازداری سے وی سی آر آگیا۔ یہ دن کا وقت تھا۔ امیتابھ بچن اور ریکھا وغیرہ کی فلم سلسلہ بھی دوبارہ دیکھی گئی۔ اس کہانی میں شادی شدہ ریکھا ایک اور مرد یعنی امیتابھ میں 'انوالو' ہوجاتی ہے۔ میرے ذہن میں اپنے سنجیدہ صورت دوست عاطف اور حورین کے حالات آگئے۔ عاطف بھی آج کل ایک عجیب دور سے گزر رہا تھا۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ عاطف جیسا عورت بیزار شخص اور حورین جیسی بظاہر راست باز اور باوقار لڑکی ایک دوسرے میں انوالو ہوجائیں گے۔ میں عاطف کی طرف سے فکرمند تھا۔

بات ہورہی تھی وی سی آر فلم بینی کی۔ اس مرتبہ چھاپا پڑا اور ٹھیک ٹھاک پڑا لیکن یہ پولیس وغیرہ کی طرف سے نہیں تھا۔ ابا جان کی طرف سے تھا۔ درحقیقت بڑے تایا جان نے صبح ہی ہمارے ارادے بھانپ لیے تھے۔ دوپہر کو

انہوں نے ابا جان کو ٹیسٹر شاپ پر بلایا اور اس محفل رنگ و طرب سے آگاہ کردیا جو ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں بپا تھی۔ ہم سب فلم میں مست تھے جب اچانک ہمارے سروں پر بجلی سی چمک گئی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ابا جان کا سرخ چہرہ نظر آیا۔ بچپن میں سوکھی ہوئی نظام دین کی برفی کی خوشبو نے دماغ پر دھاوا بول دیا۔ یہی لگا کہ نئی نئی بہو کی پرواہ کیے بغیر ابا جان کوئی سخت کارروائی کر گزریں گے۔ تاہم خیریت گزری۔ انہوں نے سخت ڈانٹ ڈپٹ پر اکتفا کیا۔ ہم اتنے سکتہ زدہ تھے کہ وی سی آر بند کرنا بھی بھول گئے۔ ایک پھرتیلے کزن نے جلدی سے دیکھا اور ٹی وی کو آف کیا اور دم دبا کر نکل گیا۔ باقی لوگ بھی دوسرے دروازے سے نکل کر یوں تتر بتر ہوئے جیسے قانون نافذ کرنے والے ادارے کی طرف سے شدید لاٹھی چارج ہوا ہو۔ ایک بھائی جو اسپیشل طور پر ''سلسلہ'' فلم لے کر آیا تھا۔ فوراً دوسرے کمرے میں پہنچا اور نماز کی نیت باندھ لی۔

ڈانٹ ڈپٹ سہنے کے لیے میں، میری اہلیہ اور ایک دو مست الوجود مہمان ہی رہ گئے۔

قریباً تیس سال بعد جو فقرہ ایم این اے خواجہ آصف نے قومی اسمبلی میں بولا تھا وہ شاید ابا جان کے فقرے سے ہی اخذ کیا گیا تھا۔ ''کچھ شرم ہوتی ہے، کچھ حیا ہوتی ہے۔''

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا۔ غالباً ہماری وہ پھوپی زاد بہن بھی اس غیر قانونی اجتماع میں موجود تھی جس نے چند سال پہلے باتھ روم کے دروازے سے منہ لگا کر ابا جان کو سرگوشی میں یہ خوش خبری سنائی تھی۔ ''چچی کرو، فلم لگ گئی ہے۔'' (جلدی کریں ٹی وی پر فلم لگ گئی ہے) بے چاری نے سمجھا تھا کہ باتھ روم میں ہماری پھوپی جان ہیں۔

بعد میں ہمیں احساس ہوا کہ وی سی آر کے حوالے سے ہم کچھ زیادہ ہی اوور ہو گئے ہیں۔ یہ مذاق نہیں حقیقت تھی کہ اس سلسلے میں گرفتاریاں بھی ہو رہی تھیں۔

انہی دنوں ایک واقعے نے پورے ملک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک معصوم بچے پپو کو اغوا کیا گیا اور زیادتی کے بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ اس خوش حال گھرانے کے ملازمین ہی کا کام تھا۔ اس دلخراش واقعے میں چار ملزم مجرم ثابت ہوئے۔ فوجی حکومت نے اسے ٹیسٹ کیس بنانے اور مجرموں کو سرعام پھانسی دینے کا فیصلہ کیا۔

مجھے یاد ہے اس پبلک ہینگنگ کے لیے کیمپ جیل لاہور سے باہر فیروز پور روڈ کی طرف ایک عارضی پھانسی گھاٹ تعمیر کیا گیا۔ پھانسی کی سہ پہر لوگ مجرموں کا انجام دیکھنے کے لیے امڈ پڑے۔ میں اور میرا کزن شعیب بھی وہاں موجود تھے۔ جب چاروں سفاک قاتلوں کو پھانسی گھاٹ کے چبوترے پر چڑھایا گیا تو ہم نے فقط چند گز کے فاصلے سے انہیں دیکھا۔ ان کے رنگ یکسر ہلدی ہو رہے تھے۔ وہ چندھیائی ہوئی خالی خالی نظروں سے ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔

مغرب کی طرف جھکتا ہوا سورج، سنہری دھوپ، سڑکوں پر اور عمارتوں کی چھتوں پر تماشائیوں کا اژدہام۔ ایک آدھ منٹ میں ان چاروں نے بہت کچھ دیکھا ہوگا اور شاید سوچا بھی ہو کہ کاش وہ یہاں نہ ہوتے۔ دوسری طرف ہوتے۔ جہاں لاہور کے در و دیوار پر ایک شفق رنگ شام اترنے والی ہے۔ گھروں میں پکوانوں کی خوشبو پھیلنے والی ہے۔ بستیاں روشن ہونے والی ہیں اور رات اپنے ان گنت رنگوں کے ساتھ آزاد لوگوں کی آزاد سانسوں میں سمانے والی ہے۔

پھر وہ ایک آدھ منٹ گزر گیا۔ ان کے چہروں پر سیاہ نقاب چڑھا دیے گئے۔ جب تختہ دار ان کے پاؤں تلے سے نکلا تو جھٹکے کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ اضطراب کے عالم میں ہجوم کے اندر ایک بلند لہر سی پیدا ہوئی۔ کسی جانب سے جنگلے ٹوٹ گئے۔ پولیس اہلکار لوگوں پر لاٹھیاں برسانے لگے۔

زندگی میں پہلا موقع تھا اور اللہ کرے کہ آخری بھی ہو کہ ہم نے کسی زندہ شخص کو پھانسی پاتے دیکھا تھا۔ اگر کسی کا خیال تھا کہ وہ تڑپیں پھڑکیں گے تو ایسا نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ ان کے بھیانک گناہ کا بوجھ انہیں مرنے سے پہلے ہی مار چکا ہے۔

مجرموں کو سرعام سزائیں دینا، ایک ایسا موضوع ہے جس کی مخالفت اور حق میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ ایک مثبت پہلو تو مجھ جیسے عام شخص کی سمجھ میں بھی آتا ہے کہ جب ایک مجرم کی جان جانی ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس کی موت کو ان لوگوں کے لیے عبرت کا مقام بنایا جائے جو مستقبل میں ایسے جرائم کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسی سزائیں جب باقاعدگی سے سرعام دی جاتی ہیں تو دیکھنے والوں کے لیے بتدریج اہمیت کھو دیتی ہیں۔

مجھے اس حوالے سے ایک چھوٹا سا آنکھوں دیکھا

واقعہ یاد آگیا ہے۔ 1981ء میں ہونے والی اس سرعام پھانسی کے چند روز بعد کی بات ہے میں کزن شعیب کی شاپ پر گیا تو وہاں قریب ہی چند مکینک ٹائپ لڑکے سر جوڑے زمین پر بیٹھے کچھ کر رہے تھے۔ میں نے آگے جا کر دیکھا وہ ایک زندہ چوہے کے گلے میں باریک رسی ڈال کر اسے باقاعدہ پھانسی دے رہے تھے۔ میرے پہنچتے پہنچتے انہوں نے اسے مار دیا۔ چوہے کے پاؤں کے ساتھ انہوں نے وزن باندھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا کیا تم نے؟''

ایک لڑکا بولا۔ ''ہم نے پپو کے قاتل کو پھانسی دی ہے۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔

یہ پھانسی کافی عرصے تک ہر جگہ موضوع بحث رہی۔ آج کے دور میں بھی جب کسی طبقے کی طرف سے سرعام سزائے موت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو 1981ء کے اس کیس کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے عارضی پھانسی گھاٹ جیل سے باہر سڑک کے کنارے بنایا گیا تھا۔ جو پھانسی کے بعد بھی کافی عرصے تک وہیں پر رہا۔ عام لوگ خاص طور پر سے خواتین اور بچے اس گھاٹ کو خوفزدہ انداز میں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے گزرتے تھے۔ کچھ لوگ خیال کرتے تھے کہ چاروں سفاک مجرموں کی آخری ہچکیاں اب بھی اس سیاہی مائل پھانسی گھاٹ کے اندر سنائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ''میتھ'' ہی تھی۔

ایک روز میں اپنی چھوٹی سسٹر کو اپنے سسرال واقع گلبرگ سے گاڑی میں لے کر آ رہا تھا۔ پتا نہیں میرے دل میں کیا سمائی، میں نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے گاڑی کو عین پھانسی گھاٹ میں جا کر روک دیا۔

سسٹر نے سیاہی مائل گھاٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ پہچانو نا۔ ذہن پر زور دو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''یہ وہ پھانسی گھاٹ ہے جہاں چار قاتلوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔''

اس نے چلا کر میرا کندھا جکڑ لیا۔ ''خدا کے لیے نکلیں یہاں سے۔''

میں نے گاڑی کو خوف اور عبرت کی اس ''علامت'' میں سے نکالا اور فیروز پور روڈ پر آ گیا۔

☆☆☆

عاطف اور حورین کی روداد عجیب رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے میں اپنے علمی سفر کے بارے میں تھوڑا سا بتا دوں۔

طارق اسماعیل ساگر کے بعد علی سفیان آفاقی صاحب بطور ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ میں آ چکے تھے۔ میں وہاں انسپکٹر نواز خاں کی تفتیشی کہانیاں لکھ رہا تھا۔ ایک روز مجھے فون آیا کہ آفاقی صاحب مجھے آفس میں بلا رہے ہیں۔ تھوڑا ٹھٹکا کہ ان کے بارے میں سنا تھا، ذرا سخت مزاج ہیں، تاہم دفتر پہنچ کر انہیں دیکھا اور باتیں کیں تو تقریباً سب اندیشے باطل ثابت ہوئے۔

انہوں نے کہا۔ ''طاہر، آپ نواز خاں کی کہانیاں اچھی لکھ رہے ہیں اور اس میں آپ نے مخبر بلال شاہ کا جو مزاحیہ کردار ڈالا ہے وہ بھی خوب ہے۔ مگر پچھلی کہانی میں ایک غلطی ہوئی ہے۔''

''جی، پلاٹ میں کوئی غلطی ہے؟''

وہ مسکرائے۔ ''نہیں رشتے میں غلطی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہیں کہ ہندوؤں میں پھوپی زاد، چچازاد اور دیگر قریبی کزنوں میں شادیاں نہیں ہوتیں۔ آپ نے ایک شادی کرا دی ہے۔''

مجھے واقعی ٹھیک سے پتا نہیں تھا۔ ان کا یہ اصلاحی نکتہ میں نے فوراً ذہن میں محفوظ کر لیا۔

چند روز بعد مجھ سے کہا گیا کہ اولین صفحات کے لیے میں کچھ کہانیاں تاریخی پس منظر والی لکھوں۔ شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوگا کہ ناول 'اباقہ' کی داغ بیل اتفاقیہ طور پر پڑ گئی تھی۔ میں نے پہلی تاریخی کہانی، ڈائجسٹ کے غالباً پندرہ بیس صفحات کی لکھ کر دی۔ دفتر میں وہ بہت پسند کی گئی۔ یقیناً اس پسندیدگی میں آفاقی صاحب بھی شامل تھے۔ مجھے پھر دفتر بلایا گیا..... اور مجھے کہا گیا کہ میں اس پاور فل کردار اباقہ کو قسط وار کہانی کا حصہ بنا دوں۔

میں نے وہیں دفتر میں بیٹھ کر کہانی کی آخری سطور کو تبدیل کر دیا اور اباقہ جو ایک کہانی کے پندرہ بیس صفحات میں گم ہونے والا تھا کئی سو صفحات پر پھیل گیا..... ان دنوں ...امجد رؤف خاں سیارہ ڈائجسٹ کے کرتا دھرتا تھے۔ ایک باکمال آرٹسٹ انیس یعقوب اسکیچ وغیرہ بناتے تھے۔ انہوں نے اباقہ کے شاندار اسکیچز بنائے جن سے میری تحریر کو بھی نمایاں تحریک ملی۔ ڈائجسٹوں کے لیے وہ اچھا دور تھا۔ اب

وہ صورتِ حال کہاں؟

انہی دنوں میں نے نوائے وقت کے جمعہ میگزین کے لیے ڈیوڈ بسکوف کے سنسنی خیز ناول ''وارگیمز'' کا قسط وار ترجمہ کیا۔ یہ کافی مقبول ہوا۔ ایک کمپیوٹر جینیئس نوعمر لڑکا، اپنے کمپیوٹر کے ذریعے امریکا کے ڈیفنس سسٹم میں گھس جاتا ہے اور دنیا کو ایٹمی جنگ کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بعد میں نے ناول Wave کا ترجمہ اور تلخیص کی۔ یہ تحریر بھی جمعہ میگزین میں قسط وار شائع ہوئی۔ ایک روز میں شاہراہ قائداعظم پر فیروز سنز کے بک اسٹور پر پہنچا تو وہاں نئی آنے والی کتب میں اصل انگلش ناول Wave کی بہت ساری کاپیاں پڑی تھیں۔ یقیناً نوائے وقت میگزین میں قسط وار ترجمے کی وجہ سے ناول کی مقامی مقبولیت میں اضافہ ہوا تھا۔

اس قسم کی مسلسل تشہیر عوام الناس کو کسی نہ کسی طور ضرور متاثر کرتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب نوائے وقت میں ہی میرا طبع زاد ناول آندھی قسط وار آرہا تھا تو آندھی ہی کے نام سے ندیم اور شبنم کی ایک فلم بھی آگئی تھی۔ یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا تاہم ساٹھ ستر فیصد امکان یہی ہے کہ فلم کے نام کو ناول آندھی کے نام سے تحریک ملی ہو۔

اسی طرح کا ایک واقعہ کچھ عرصہ پہلے پیش آیا۔ ٹی وی رائٹر طارق ساحلی جو معروف رائٹر سعید ساحلی کے چھوٹے بھائی ہیں میرے پاس بیٹھے تھے۔ میری پسندیدہ کہانی پرستش کا ذکر چھیڑ گیا۔ یہ کہانی سسپنس کے اوّلین یا آخری صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ میں نے طارق کو کہانی کا خلاصہ سنایا تو تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے مجھے روک دیا۔ کہنے لگے۔

''اس سے آگے کی کہانی مجھے معلوم ہے۔''

''آپ نے پڑھی ہے؟''

جناب مسکرائے۔ ذرا توقف سے بولے۔ ''پڑھی نہیں سنی ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو یہ کہانی فلم ڈائریکٹر مرحوم اسلم ڈار کو بہت پسند آئی تھی۔ ان سے یہ کہانی میرے بڑے بھائی سعید ساحلی صاحب کے پاس پہنچی... اور وہاں سے میرے پاس آگئی۔ فلم اسٹار شاہد کو بھی یہ کہانی بھائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں یہ کہانی ان کے لیے سنبھال رکھوں۔ اس کے بعد شاہد بیرونِ ملک چلے گئے اور معاملہ حسبِ دستور مؤخر ہوگیا۔

مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ میں نے طارق ساحلی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بس اتنا کہا۔ ''مجھے صرف ایک بات بتائیں۔ اگر واقعی آپ لوگوں میں سے کوئی ایک اس کہانی پر فلم بنا دیتا..... پھر ایک دن میں اپنے کسی دوست کے ساتھ لکشمی چوک کے کسی سینما میں جاتا اور وہاں اپنی کہانی پر بنی ہوئی فلم دیکھتا تو مجھ پر کیا گزرتی؟ تب تو تخلیق اور شوبز وغیرہ کی دنیا میں مجھے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔''

وہ بھی بس مسکرا کر رہ گئے۔ میرے سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ (اس کے بعد فلم اسٹار شاہد نے کچھ ٹی وی سیریل وغیرہ بھی بنائے تھے۔ کیا خبر ان میں سے ہی کسی سیریل میں اس کہانی کی ''انسپریشن'' بھی شامل ہو۔ یہ سب کچھ تو ملک عزیز میں چلتا ہی ہے)

تو میں ان دنوں کی بات کر رہا تھا جب نوائے وقت، سیارہ ڈائجسٹ، اور اردو ڈائجسٹ وغیرہ میں میری تحریریں مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔ کاروباری حالات خراب تھے۔ بڑے تایا جی (بڑے ابا جی) بھی کچھ ناراض رہتے تھے، قلم کی آمدنی سے گھر کہاں چلتے ہیں۔ پہلے بیٹے نوید کی پیدائش ہو چکی تھی۔ اخراجات بڑھ چکے تھے۔ ایک روز میں نے سفر وسیلہ ظفر والے مقولے پر عمل کیا اور کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا۔

سچی بات یہ ہے کہ میرے خیال کے مطابق جے ڈی پی کے پرچوں میں لکھنا میری اوقات سے باہر تھا۔ میرا پروگرام یہی تھا کہ بیگ پرچوں کے مدیران سے رابطہ کروں گا۔ بذریعہ ٹرین کراچی پہنچا۔ اپنی شائع شدہ تحریروں کے نمونے میرے پاس تھے۔ کراچی میں کوئی جان پہچان والا نہیں تھا۔ ایک سستے ہوٹل میں ٹھہرا۔ تین چار روز مختلف ڈائجسٹوں کے دفاتر میں گیا۔ بعدازاں دو تین بار جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے دفتر کے سامنے سے گزرا لیکن اندر نہیں گیا۔

چوتھی بار ہمت کی۔ سمجھیں کہ ہمت کی ایک لہر سی تھی (ویسی ہی لہر جو برسوں پہلے بہار کی ایک چمکیلی دوپہر کو زیبا کے گھر میں Love کے حروف والا کیو پھینکتے ہوئے اٹھی تھی) میں اندر چلا گیا۔ ایک کمرے میں گہرے رنگ کے ایک توانا سے صاحب دو تین ساتھیوں کے ساتھ لنچ کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے ان کا نام معلوم نہیں۔ معلوم ہوتا بھی تو شاید نہ لکھتا۔ میں نے ان سے اپنا مختصر تعارف کرایا، تحریروں کے نمونے دکھائے..... انہوں نے مجھے وہیں کھڑے کھڑے اپنے پانچ چھ لفظوں میں ہی فارغ کر دیا۔

پیسے قریباً ختم ہونے والے تھے۔ میں مایوسی کی لہر

میں بہتا ہوا اسٹیشن پہنچا اور بذریعہ ٹرین لاہور واپس روانہ ہوگیا۔

بیٹا نوید غالباً پانچ چھ ماہ کا ہوگا۔ وہ بہت زیادہ بیمار رہتا تھا۔ ہمارے کمرے کی الماری دواؤں سے بھری رہتی تھی۔ ہم میاں بیوی یہ سوچ کر حیران ہوتے تھے کہ کیا بچے پالنا اتنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میرے پاس کاواساکی موٹر سائیکل تھی۔ وہ بھی اکثر بیمار رہتی تھی۔ چونکہ میں شاپ پر پورا وقت نہ دے پاتا تھا لہٰذا بڑے تایا جی نے ہیلپ کے لیے میرے چھوٹے بھائی ساجد کو شاپ پر بلا لیا تھا۔

انہی دنوں ایک اور معاشی جھٹکا لگا۔ ہماری کرولا کار جو تایا جان نے پٹھان بیوپاریوں سے لین دین میں لی تھی ایکسیڈنٹ کا شکار ہوگئی۔ ہمارے چھوٹے پھوپا جان کو کسی ضروری کام سے گوجرانوالا جانا تھا۔ ان کی اپنی گاڑی شاید کہیں گئی ہوئی تھی وہ ہماری گاڑی لے گئے۔

رات تک وہ واپس نہ آئے تو ہم پریشان ہوئے۔ چوہدری ان کی کوٹھی پر فون کیے گئے مگر کچھ پتا نہ چلا۔ آخر رات گئے پتا چلا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہوئی ہے اور مال روڈ کی ایک قدیمی ورکشاپ پر کھڑی ہے۔ اگلے روز میں اور تایا جی ورکشاپ پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ نئی گاڑی کا قریباً کچومر نکلا ہوا تھا۔ صد شکر اور صد حیرانی کا مقام تھا کہ پھوپا جان بالکل محفوظ رہے تھے۔ خراش تک نہ آئی تھی۔

جو بھی گاڑی کی حالت دیکھتا تھا دنگ رہ جاتا تھا۔ یہ ہمارے وہی پھوپا جان تھے جو روحانیات اور وظیفے وظائف پر گہرا یقین رکھتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دعا کے خواستگاروں کو ان سے فیض بھی پہنچا تھا..... کچھ دیکھنے والے تو گاڑی کی حالت دیکھ کر بلاتردد کہتے تھے کہ یہ ہوائی چیزوں کا کام ہے جنہوں نے گاڑی کا تو کچھ نہ چھوڑا مگر سوار کو خراش تک نہ آنے دی۔

میں ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا مگر معلوم نہیں کیوں ایسی گفتگو سن کر میرا دھیان آپوں آپ، زرق برق لباس والی اس عورت کی طرف چلا جاتا جو سینہ طور پر چوہدری کے ایک قدیم یعنی برسوں سے نکلتی تھی اور رات کے اندھیرے میں گیلری میں دکھائی دیتی تھی۔ کوئی گمنام مغل شہزادی.....؟

گاڑی ٹھیک کرانے میں دو ماہ لگ گئے۔ پھر وہ اونے پونے بیچ دی گئی۔ میرے لیے تایا جان کے لہجے میں کچھ تلخی آگئی تھی۔ ہمیشہ سے لاڈ کرنے والی خالہ اور پھوپی میرے لیے بہت پریشان تھیں۔ اس مشکل صورت حال میں اہلیہ شفیقہ نے ایک سچی شریک حیات ہونے کا ثبوت دیا۔ ہر مشکل مرحلے میں میری ڈھارس بندھائی۔ یہ ان دنوں کی بات ہی ہے جب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے پوتے ڈاکٹر جاوید ٹونی کے ساتھ مل کر کیسٹ کہانی لکھنے، ریکارڈ اور فروخت کرنے کی پلاننگ کی۔ یہ کام بھی کچھ زیادہ حوصلہ افزا ہندسا۔

میں نمبر شاپ کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔ ایک روز تایا جان نے میری بہتری کے لیے ہی کوئی سخت بات کہہ دی۔

میں ان کے سامنے بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا غم و غصے کے عالم میں گھر سے نکل گیا۔ جاتے جاتے ایک رنج بھرا خط بھی چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ مری گیا تو فوراً میری کھرا دبا لیا جائے گا.. کیونکہ راہ فرار کے لیے ہمیشہ سے مری ہی میری پسندیدہ جگہ تھی۔

میں ایبٹ آباد چلا گیا اور شہر کے ایک اندرونی حصے میں ایک چھوٹے ہوٹل میں قیام پذیر ہوا۔ کپڑوں کے نام پر صرف ایک فالتو جوڑا ہی میرے پاس تھا تاہم اتنے پیسے موجود تھے کہ میں چار چھ ہفتے کفایت شعاری کے ساتھ گزار سکتا تھا اور مستقبل کی منصوبہ بندی بھی کر سکتا تھا۔

یہ شعر انہی دنوں کا ہے

دیر ہوئی گھر چھوٹا، عادت مگر چھوٹی نہیں
شام ہوئی تیز قدموں سے میں گھر کو چل دیا

اس دوران ہی میں ہی غالباً نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن میں میری ایک غزل اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔

حیات ہی گزر گئی کتاب پر جھکے جھکے
ورق تھا میری زندگی کا حرف تھے بجھے بجھے
سنا ہے شہر اہل زر میں امن ہے سکون ہے
کہاں سے آرہے ہیں پھر یہ قافلے لٹے لٹے
محبتوں کی راہ میں کہاں یہ شام ہوگئی
ابھی تو شوق تیز تھا قدم بھی تھے اٹھے اٹھے

غزل کی اشاعت کے بعد میں نے ایبٹ آباد سے ہی بیدار سرمدی صاحب کو خط لکھا۔ اس میں اپنا موجودہ ایڈریس بھی دیا تھا۔

لاہور میں میری تلاش جاری تھی اور یہ تلاش پتا نہیں کس طرح بیدار صاحب تک بھی پہنچ چکی تھی۔ میرا ایڈریس ملتے ہی بیدار صاحب نے میرے گھر میں آگاہ کر دیا۔

ایک روز میں ایبٹ آباد میں ہوٹل کے اس چھوٹے سے کمرے میں، ماش کی دال کے ساتھ تندور کی گرم گرم چپاتی

کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور چھوٹے بھائی ساجد کی شکل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ بڑے تایا جان اور ابا جان پولیس بھی ساتھ ہی آئے تھے اور نیچے سڑک پر ہماری موجودہ چھوٹی گاڑی ایف ایکس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بہرحال مجھے منا کر لاہور واپس لایا گیا۔ بڑے تایا خاص طور سے پریشان رہے تھے۔ پھوپی زاد سے میری شادی بڑے تایا کی مرضی اور خواہش کے عین مطابق ہوئی تھی اور وہ ہم میاں بیوی کو پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ننھے نوید سے بھی انہیں بہت محبت تھی۔

دوسری طرف مجھے بھی تنہائی میں بہت کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ ٹمبر شاپ اور قلم کاری کو اس طرح Manage کروں گا کہ دونوں کام احسن طریقے سے ہوں اور زندگی کی گاڑی چلتی رہے۔ آخر تایا جان جو کہتے تھے ہماری بھلائی کے لیے ہی کہتے تھے۔

یہ وہ دن تھے جب میں سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ میں چھوٹی بڑی کہانیاں شوق سے پڑھ رہا تھا۔ محترم احمد اقبال کی شکاری بھی زیرِ مطالعہ رہتی تھی۔ نت نئے خیالات ذہن میں جنم لے رہے تھے۔

ایک دن گھر میں بستر پر لیٹے لیٹے ایک مختصر کہانی کا بڑا اچھا آئیڈیا ذہن میں آیا۔ مختصر کہانی کا عموماً ایک نکتہ ہی ہوتا ہے جو کہانی کار کے ذہن میں ابھرتا ہے اور کبھی کبھی دھیان ہٹ جانے کے سبب یہ پھسل بھی جاتا ہے۔ عموماً یہی نکتہ کہانی کی فنچ لائن میں بھی جھلک دکھاتا ہے۔ میں نے وہیں بستر سے اہلیہ کو پکارا ''بھئی جلدی سے میرا قلم لانا..... جلدی کرنا۔''

وہ لپکتی آئی کہ شاید میں فون کال پر ہوں اور کوئی فون نمبر لکھنا ہے۔ میں نے ایک ڈیڑھ لائن میں وہ نکتہ لکھ لیا۔ غالباً اگلے روز میں نے چند صفحے کی وہ مختصر کہانی لکھی اور اسے ''انجان'' کا نام دیا۔ ایک برفانی شب میں ایک سیاسی گروپ کو آگ کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے پاس ایک ماچس ہے اور اس میں فقط دو تین دیا سلائیاں ہیں۔ وہ خوفزدہ ہیں کہ آگ جلانے کی کوشش میں دیا سلائیاں ضائع ہوگئیں تو کیا ہوگا؟

میں خود تو کراچی میں کوئی مفید رابطہ نہیں کر پایا تھا۔ میں نے اس مختصر کہانی کو راہبلے کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہانی ایک مختصر خط کے ساتھ معراج رسول صاحب کو بھیج دی۔ خط میں میں نے لکھا۔ ''میرا عاجزانہ دعویٰ ہے جناب کہ میں سسپنس اور جاسوسی کے لیے کچھ بہت اچھی چیزیں دے سکتا ہوں۔''

''عاجزانہ دعوے'' کے الفاظ مجھے بڑے اچھے لگے اور اس ترکیب پر میں خود بھی خوش ہوا۔

حالانکہ میں نوائے وقت کے علاوہ لاہور کے ڈائجسٹوں میں مسلسل چھپ رہا تھا۔ مگر سسپنس وغیرہ میں چھپنے کا اپنا ہی کریز تھا۔ مجھے المناز سینما کے سامنے والی سڑک آج بھی یاد ہے جہاں سے موٹر سائیکل پر گزرتے گزرتے اچانک مجھے خیال آیا کہ سسپنس کا تازہ شمارہ آگیا ہوگا۔ دیکھوں تو سہی کہ کوئی انہونی ہوئی ہے یا نہیں۔ سامنے ہی ایک بک اسٹال پر سسپنس کسی حسینہ کے دھنگ رنگ آنچل کی طرح آہنی چٹکی میں جھول رہا تھا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ ابتدائی صفحات میں ہی ''انجان'' موجود تھی۔

غالباً اس مختصر کہانی یا اگلی مختصر کہانی کے بعد معراج رسول کا نامہ موصول ہوا جس میں انہوں نے میرے کام کی کھلے دل سے تعریف کی اور مجھے باقاعدگی کے ساتھ لکھنے کا کہا۔ یہ خط میں نے سنبھال کر رکھا اور شاید آج بھی کہیں کاغذوں میں موجود ہوگا۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے، بے شمار دل والوں کی طرح محبت میں چوٹ کھایا ہوا عاطف ایک انوکھی صورتِ حال کا شکار تھا۔ حورین جیسی راست باز با اخلاق اور سمجھ دار لڑکی جو ایک بچے کی ماں بھی تھی عاطف کے لیے عجیب الجھنوں کا باعث بن رہی تھی۔ میں صرف نام اور کچھ مقامات بدل رہا ہوں ورنہ اس روداد کا ایک ایک الفاظ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ کوئی مار دھاڑ والی سنسنی خیز کہانی نہیں ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں مگر ان واقعات کے پیچھے ایک عورت کا جو انوکھا جذبہ رواں دواں تھا انہوں نے اسے خاص بنایا۔

■ ایک روز میں نے پھر حورین کو دیکھا۔ ہمارے گھر کی بالائی منزل سے عاطف کے گھر کے لان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ درمیانی فاصلہ تین چار گھروں کا تھا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسی لان میں عاطف، جمشید کے پانچ چھ سالہ بیٹے نومی کو فٹ بال کھیلا رہا تھا۔ آج حورین بھی وہاں نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹا کس کر کمر سے باندھا ہوا تھا۔ سیاہ بال شانوں پر تھے۔ گیند اس کی طرف آتی تھی تو وہ بھی ایک آدھ ٹھوکر لگا دیتی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ عاطف اور

حورین کی بے تکلفی روز افزوں ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آج عاطف کی دادی کے علاوہ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔

کھیل کے دوران میں ننھے نومی کی کہنی عاطف کی آنکھ میں لگ گئی تو حورین لپک کر آگے آئی اور عاطف کی آنکھ کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر تینوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

یہ معاملہ تیزی سے آگے بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ شام کے بعد بلکہ رات کو میں عاطف سے اسی معاملے پر بات کرنے کے لیے اس کے گھر اس کے کمرے میں گیا تو وہ پہلے سے حورین کے ساتھ بات کرنے میں مصروف تھا۔ یہ بات لینڈ لائن فون کے ذریعے ہی ہو رہی تھی۔

میرے اور عاطف کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا۔ بند کمرے میں صوفے پر عاطف کے پہلو میں بیٹھ کر میں نے بھی کان ریسیور سے لگا دیا۔

عاطف پہلے تو تھوڑا سا جھجکا پھر اس نے بات جاری رکھی۔ جس طرح گفتگو ہو رہی تھی اس نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ دراصل میں شاپ کے لیے لکڑی لینے ایک بار پھر کرم ایجنسی کی طرف گیا ہوا تھا اور پچھلے قریباً ڈیڑھ مہینے سے حورین اور جمشید والے معاملے میں عاطف سے میری کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی۔ اب یہاں بے تکلف گفتگو کا لیول دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔

''پرسوں ہمارے فون سیٹ میں کوئی خرابی تھی۔ میں اور جمشید دونوں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ ٹھیک ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ میں تو سٹپٹا گئی تھی۔''

''یہاں میں بھی ساڑھے دس گیارہ بجے تک انتظار کرتا رہا۔''

''ان کے (جمشید کے) فون کا..... یا میرے فون کا؟'' وہ ہنسی۔

''دونوں کا۔''

تھوڑے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''دیکھیں..... کبھی کبھی ایسا نہیں لگتا کہ..... ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جا رہی ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' عاطف نے کہا۔ پھر چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد بولا۔ ''جمشید بھائی کہاں ہے؟''

''تھوڑی سی گرمی ہے۔ وہ آج بھی چھت پر ہی سوئے ہیں۔ نومی بھی اوپر ہی ہے۔''

''اور تم؟''

''میں وہیں۔ نیچے سامنے والے کمرے میں گدے پر۔'' وہ دبے دبے انداز میں ہنسی۔

''مجھے فون کرنے کے لیے نا؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اور آپ؟''

''میں کھڑکی والے صوفے پر۔''

''بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں؟''

''کچھ نیم دراز ہوں۔''

''پاؤں کس طرف ہیں؟''

''دادی والے کمرے کی طرف۔''

وہ ہنسی۔ ''دراصل مجھے یہ جاننا اچھا لگتا ہے کہ آپ کہاں ہیں، کس طرح ہیں۔ میرے لیے آپ کا تصور کرنا آسان ہوتا ہے۔''

''میری طرف بھی کچھ یہی کیفیت ہے۔''

''پتا ہے کسی وقت مجھے کیا لگتا ہے۔'' وہ ذرا شرماتے انداز میں بولی۔ ''جیسے ہم قریب قریب ہی بیٹھے یا لیٹے ہیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ کتنے عجیب ہیں ہم۔''

''یہ تو ہے۔'' عاطف نے بوجھل سانسوں کے ساتھ کہا۔

مجھے لگا کہ ان لمحوں میں ان نرم گرم گفتگو میں وہ اتنا مگن ہے کہ میری موجودگی کو بھی جزوی طور پر بھول گیا ہے۔ اس کی یہ کایا کلپ میرے لیے حیران کن تھی۔

''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔'' حورین کی کھنکتی آواز ابھری۔ ''مجھے وہی پاکستانی گیت سنائیں جو پچھلے ہفتے سنایا تھا..... تجھے اپنے دل سے، میں کیسے بھلا دوں..... تیری یاد ہی تو میری زندگی ہے۔''

''نہیں حورین، آج موڈ نہیں ہے..... چلو..... آج تم کچھ سنا دو۔''

''نہیں۔ میں تو آپ کے شاگردوں کی طرح ہوں۔''

''تو پھر بات مان لو نا۔''

''ہو دوں..... وہی سنا دوں جس کی کوریکشن آپ نے پچھلی دفعہ کی تھی۔ لتا منگیشکر والا۔''

''چلو وہی سنا دو۔''

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا..... چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس کی آواز ریسیور پر ابھری تو میں ایک بار پھر حیران ہوا۔ وہ آواز کو گلے میں دبا کر بڑے اچھے سُر میں گا رہی تھی۔

چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لیے
یہ مناسب نہیں آدمی کے لیے

کیا پتا کہ اس گانے میں عاطف کے لیے اور عاطف جیسے تمام ''تشنہ کاموں'' کے لیے ایک مشورہ بھی پوشیدہ ہو۔ اس گانے میں معنی خیز الفاظ کے ذریعے عاطف سے کہا گیا ہو کہ جب ''پہلی محبت'' کسی مرد کا دل کرچی کرچی کرتی ہے تو ان کرچیوں کو چننے اور پھر جوڑنے کے لیے اکثر و بیشتر ایک دوسری عورت آیا کرتی ہے۔ کسی نہ کسی روپ میں جلد یا بدیر وہ آتی ضرور ہے۔ عاطف وہ عورت میں ہوں۔ اور میں آ گئی ہوں۔ یہ مت سوچو کہ مجھے اس انداز میں آنا چاہیے تھا یا نہیں۔ بس یہ دیکھو کہ میں ہوں..... میں ہوں۔''

میں گھر آیا تو اہلیہ اور نوید سو چکے تھے۔ میں بستر پر نیم دراز ہو کر دیر تک ''عشق ممنوع'' کی اس پروان چڑھتی کہانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی وجوہات کو کھوجتا رہا۔

مجھے دبکی ہوئی چابی کا وہ نشان یاد تھا جو عاطف کی بائیں کلائی پر تھا۔ اور اس کا وہ اضطرابی فقرہ بھی بھولا نہیں تھا۔

''وہ میری بہن ہے..... وہ میری بہن ہے۔''

لیکن اب یہ فقرہ بتدریج اپنے معنی کھو چکا تھا۔ یہاں ... میں ایک بات بتانا بھول گیا۔ جمشید یوں تو قبول صورت اور کافی حد تک شائستہ بھی تھا البتہ اس میں ایک معمولی سا جسمانی نقص موجود تھا جو پہلی ایک دو ملاقاتوں میں مجھے بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک پاؤں کچھ دبا کر چلتا تھا..... اور جب وہ کسی کام میں مگن ہو کر ادھر ادھر چل پھر رہا ہوتا تھا تو یہ نقص اور نمایاں ہو جاتا تھا۔

دوسری طرف حورین ہر لحاظ سے ایک تن درست لڑکی تھی۔ اچھے جاذب نقوش تھے۔ اس کی شفاف دودھیا رنگت ایک دم چہرے کی طرف متوجہ کرتی تھی۔ وہ عمر میں جمشید سے قریباً آٹھ برس چھوٹی بھی تھی۔ اس کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا جبکہ جمشید اپنے سینیٹری کے کام کی وجہ سے خاصہ خوش حال تھا۔ اپنے میوزک لیوزنگ والے شوق سے بھی وہ کچھ نہ کچھ کماتا تھا۔ لہٰذا حورین اس کے گھر میں آن بسی تھی۔ جمشید کی ٹانگ کی چوٹ کے بارے میں مجھے عاطف سے ہی پتا چلا تھا کہ وہ اسکول کے دور میں موٹر بائیک سے گرا تھا اور ٹانگ فریکچر ہوئی تھی۔

کئی دفعہ اپنے ساتھ ہونے والی کسی ناانصافی کا احساس انسان کے اندر لاشعور میں جا براجمان ہوتا ہے، اور پھر کسی نئی اور غیر متوقع شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ حورین کے اندر بھی ناانصافی کا احساس ہو جس نے اس کے خیالات کو ایک انجان ڈگر پر ڈال دیا ہو۔

حورین کے اس موجودہ رویے کے پیچھے عاطف کے لیے اس کی ''ہمدردی'' بھی بہ آسانی تلاش کی جا سکتی تھی۔ وہ کافی سخت چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ جس کو اس نے دل و جان سے چاہا تھا وہ ایک معمولی سی بات پر اپنا دامن چھڑا کر ملائیشیا جا بسی تھی اور اب شادی شدہ تھی۔ اس بریک اپ کو اب چھ سات سال گزر چکے تھے اور وجیہہ عاطف کی عمر اب ستائیس سال سے زائد ہو چکی تھی۔ گھر والوں کے مجبور کرنے پر وہ پچھلے سال منگنی تو کرا چکا تھا مگر اس منگنی اور منگیتر سے وہ زیادہ خوش نہیں تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں خاموشی کے ساتھ عاطف اور حورین کا معاملہ آگے بڑھ رہا تھا۔

ایک قلم کار کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ تخلیقی عمل کے دوران میں قلم کار جو بھی لکھتا ہے اس کی بنیاد میں کہیں نہ کہیں اس کے ذاتی تجربات اور مشاہدات ضرور شامل ہوتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر تو پھر مستقبل کی ٹائم لائن والی کوئی سائنس فکشن ہی ہو سکتی ہے۔ سسپنس میں شائع ہونے والا میرا ناول ''پرواز'' کئی طبقوں میں خاص طور سے دیہی علاقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ جنہوں نے یہ ناول پڑھا ہے انہیں بلقیس بیگم کا کردار ضرور یاد ہوگا..... وہ شاید خاور کی منظور نظر تھی۔ یہ کردار دراصل اس حقیقی کردار کا عکس تھا۔ نوجوان چودھرائی بلقیس بیگم کی باوقار شخصیت، اس کی چال ڈھال، اس کی ناک کا چمکیلا کوکا، اس کا بھوکاٹ (ٹیلی فون) سب اسی حقیقی کردار حورین سے مستعار لیے گئے تھے۔

ناول پرواز کی کچھ سطور یوں ہیں، یہ سطور اصل حالات کی عکاس ہیں۔

میں نے جواب میں کہا۔ ''مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ بلقیس صاحبہ کے سامنے گا سکوں۔'' وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی سانسوں کی آواز ریسیور پر سنائی دیتی رہی۔ شاید میری سانسوں کی آواز بھی جاتی ہوگی۔ کئی سیکنڈ کے بعد میں نے کہا۔ ''آپ کی باتوں کی طرح آپ کی خاموشی بھی اچھی لگتی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ بند کر دیتی ہوں۔''

''نہیں دور ہونے والی خاموشی نہیں۔ پاس رہنے والی خاموشی۔'' میں نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

''اچھا چلو، کچھ دیر خاموش ہو جاتے ہیں۔'' وہ بولیں۔

ہم خاموش ہو گئے۔ ایک دوسرے کی قربت کو محسوس کرتے رہے۔ ایکا ایکی میرے اندر کچھ ہونے لگا۔ کوئی لہر سی

چلنے لگی۔ کوئی نظام حرکت میں آ گیا۔ میں بولا تو میری آواز جذبات کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ایسا نہیں لگتا کہ ہم ایک دوسرے کے پاس ہیں۔ ایک ہی بند کمرے میں..... ایک ہی جگہ؟''

''ہوووں...'' انہوں نے کہا۔

''آپ کس کروٹ لیٹی ہیں؟''

''بائیں پر۔''

''اور میں دائیں پر..... یعنی ایک دوسرے کے سامنے۔ ایک دوسرے کی سانسیں سن رہے ہیں۔ بالکل ایسا ہی لگتا ہے نا؟'' انہوں نے ایک بار پھر طویل ''ہوووں'' میں جواب دیا۔ اس ''ہوووں'' میں کچھ ایسی بات تھی کہ میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ دوڑنے لگی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آپ کا منہ میرے منہ کے بالکل پاس ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسیں اور ایک بار پھر ''ہوووں'' کہا۔

یہ بھی بڑی حوصلہ افزا ہوووں تھی۔ میں نے چند سیکنڈ تک حوصلہ جمع کیا اور پھر ماؤتھ پیس سے ہونٹ لگا کہ چومنے کی آواز پیدا کی۔ دوسری طرف گمبھیر خاموشی تھی۔ خاموشی طویل ہوئی تو میں نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

''آواز..... آئی؟''

ناول پرواز کی یہ سطور ہو بہو اس مکالمے کی کاپی ہیں جو دو تین ہفتے بعد عاطف اور حورین کے درمیان فون پر ہوا تھا۔ اس مکالمے سے آپ ان دونوں کے آگے بڑھتے ہوئے تعلق اور اس کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ ناول کا ہیرو شاہ خاور، بلقیس بیگم کو 'آپ' کہہ کر بلاتا ہے جبکہ اصل کہانی میں عاطف، حورین کو 'تم' کہہ کر مخاطب کرتا تھا، کیونکہ عمر میں اس سے بڑا بھی تھا۔ ایک دھیمی دھیمی دو طرفہ آگ برابر سلگ رہی تھی۔ میں یقین ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ عاطف جیسے سنجیدہ اور مضبوط کردار کے بندے کو ایک 'تعلق' اس طرح سے جکڑ لے گا۔

پرواز ناول کا کینوس کافی وسیع ہے۔ اس میں کئی ٹریک ہیں۔ بہت سا تخلیقی مواد شامل ہے۔ تاہم ناول کی ہیروئین، حورین سے قریب تر ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دن جاسوسی ڈائجسٹ کے دفتر سے مجھے فون آیا کسی نے بتایا کہ معراج صاحب آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سہ پہر کے وقت فون کریں گے۔ ملازم کا یہ فون سننے کے بعد میں فکرمند ہو گیا۔ دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔ میری بھیجی ہوئی کسی کہانی میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا پھر وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی (چھوٹی بڑی کہانیوں پر معراج صاحب کی گہری نظر رہتی تھی)

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ عاطف چلا آیا۔ عاطف اور حورین کے معاملے میں جو کچھ ہو رہا تھا حیران کن تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دونوں ہی مضبوط کریکٹر کے ہیں۔ دونوں ہی اچھے برے کی غیر معمولی تمیز رکھتے ہیں... مگر مرد و زن کا رومانی تعلق اپنے اندر ایک ایسا خاص تیز بہاؤ رکھتا ہے جو کبھی کبھی بے دست و پا کر ڈالتا ہے۔ نوجوانی کے قریباً چھ برس بالکل الگ تھلگ اور صاف ستھری زندگی گزارنے والا عاطف امین بھی اس تیز بہاؤ کی زد میں آیا تھا اور کیا سے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

اب وہ فون پر Kiss وغیرہ کرنے کے مرحلے سے کچھ آگے آ گیا تھا مگر اس دن اس نے مجھے مزید حیران کیا۔ کہنے لگا۔ ''یار، میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا کہ جو معاملہ ہمارے درمیان شروع ہوا ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟''

''کیوں اب کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جو نہیں ہونا چاہیے۔'' اس کی آواز میں پژمردگی تھی اور چہرے پر نادم سی مسکراہٹ بھی۔ وہ مجھے ایک بدلا ہوا عاطف نظر آ رہا تھا۔

میں نے وضاحت چاہی تو اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ان کی ٹیلی فونک گفتگو بہت آگے چلی گئی ہے..... حدود کی حد سے آگے تک۔

مطلب یہ تھا کہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی وہ صرف آواز کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آ جاتے تھے۔ اور جتنا قریب اس نے بتا دیا وہ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔

ظاہر ہے کہ جب رات کی خاموش تنہائی میں مرد عورت پانچ پانچ گھنٹے نرم گرم باتیں کریں گے تو پھر کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔

''جمشید آج کل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کسی پارٹی کے ساتھ مل کر کوئی کمپوزنگ وغیرہ کر رہا ہے۔ رات گئے آتا ہے اور کبھی کبھی آتا ہی نہیں۔''

''بڑا خطرناک کام کر رہے ہو عاطف..... یہ آگ سے کھیلنے والی بات ہے۔''

''میں آگ سے نہیں کھیل رہا، آگ مجھ سے کھیل رہی ہے۔''

میں حیرت کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ یہ وہی عاطف

ہے، جو مجھے اور دیگر دوستوں کو نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ جس نے نٹ بال صرف اس لیے شروع کیا تھا کہ صحت مند تفریح اپنائے..... اپنا غم بھلائے اور ہمیشہ کی طرح جوانی کی غلط کاریوں سے دور رہے..... اور جو گنڈا سنگھ کے بارڈر پر اپنے ''این سی سی'' کے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ انڈین طیاروں کی آمد کے وقت وہ پشت کے بل لیٹ کر فائر کریں تاکہ گولی لگتی ہو تو سینے پر لگے۔ وہ اس ''دوسری عورت'' کے ناقابل مزاحمت عشق میں ڈوب چکا تھا جس نے ایک دن آنا ہوتا ہے۔

عاطف کے آجانے سے معراج صاحب کا فون آنا ہے، یہ بات بھول گیا تھا۔ شاید وہ بھی کسی کام میں محو ہو گئے تھے۔ مگر اگلے روز آیا، کہنے لگے۔ ''میں نے تمہاری دس بارہ صفحے والی کہانی روکی ہوئی ہے... مگر ناپسندیدگی کی وجہ سے نہیں پسندیدگی کی وجہ سے؟''

وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''وہ 22 دسمبر یعنی سردیوں کی طویل ترین رات کی کہانی ہے اور ساری کی ساری سردی میں لپٹی ہوئی ہے۔ اسے سردیوں میں پڑھنے کا زیادہ مزہ آئے گا (اس کہانی کا نام ہمسفر تھا۔ ایک گھوڑے اور اس کے مالک کی کہانی..... پشاور ٹی وی سے اس سے ماخوذ ایک ڈراما بھی بنا)

معراج صاحب کے فون کا ذکر اس لیے کیا ہے تاکہ ہم جان سکیں کہ وہ چھپنے والی کہانیوں اور ان کے موضوعات پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔

ان کے کئی فون بڑی اہم نوعیت کے ہوتے تھے۔ چھ سات برس بعد کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ کہیں بھول ہی نہ جاؤں۔ ابھی بیان کر دیتا ہوں۔ 1992ء کا سال تھا۔ سرگزشت ڈائجسٹ کا آغاز ہوئے غالباً دو برس ہو چکے تھے۔ سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ میں میری طویل اور مختصر کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی تھیں۔ باوصف قلم کار جناب علیم الحق حقی میری مختصر کہانیوں کو پسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں مکالمے بہت کم لکھتا ہوں اور ایک ایسی کہانی جو تیس چالیس صفحات تک بہ آسانی جا سکتی ہے اسے چھ سات صفحات میں لپیٹ دیتا ہوں۔ انہوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ میں ابھی کچھ مختصر کہانیوں کو پھیلا کر دوبارہ لکھوں۔ افسوس کہ میں دیگر کہانیوں میں الجھ کر اس صائب مشورے پر عمل نہ کر پایا۔

میں بات کر رہا تھا معراج صاحب کے فون کی۔ حسب معمول یہ فون بھی شام سے کچھ پہلے آیا۔

انہوں نے کہا۔ ''طاہر، یہاں لاہور میں ایک علی سفیان آفاقی رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! انہیں کون نہیں جانتا۔ میں سیارہ ڈائجسٹ میں بھی لکھتا ہوں۔ وہ وہاں ایڈیٹر ہیں۔''

''دراصل میں ان سے کچھ لکھوانا چاہتا ہوں۔ ان کا رابطہ نمبر مہیا کرو۔''

یوں جناب معراج رسول اور محترم آفاقی صاحب کا رابطہ ہوا۔ مقبول عام سلسلے طلسم الف لیلہ کی داغ بیل پڑی اور دیگر سلسلے شروع ہوئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کے تعلقات میں بہت گہرائی آ گئی۔ گفتگو کی نشستوں میں وہ دونوں گھنٹوں مشترکہ دلچسپی کے موضوعات پر بولتے رہتے تھے اور میں بس ہوں ہاں کرتا رہتا تھا۔

معراج صاحب کے فن شناسی اور معاملہ فہم ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ پرچوں کی بہتری کے لیے وہ ''اچھے قلم'' اور اچھے ذہن ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اسی طرح ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''ریاض الرحمن ساغر سے کچھ لکھوانا ہے۔ وہ غالباً لاہور میں ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ نوائے وقت میں ہی کام کر رہے ہیں۔''

''ان کی کوئی مختصر کتاب ہے۔ وہ سرگزشت میں قسط وار شائع ہو سکتی ہے۔''

معراج صاحب نے مجھے کتاب کا نام بھی بتایا جواب ذہن سے نکل گیا ہے۔ میں نے ساغر صاحب کا نمبر ڈھونڈ کر ان سے رابطہ کیا۔ ساغر صاحب کی گہری سنجیدگی کا سنا ہوا تھا، لیکن اس دن وہ شاید زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔

''انہوں نے روکھے سوکھے جواب دیئے اور سب سے پہلا سوال یہی پوچھا کہ کتاب کا معاوضہ کون دے گا۔ کتنا دے گا..... اور کیسے دے گا؟''

وہ اس مختصر کتاب کے لیے کافی زیادہ توقع ظاہر کر رہے تھے۔ میں نے یہ ساری معلومات معراج صاحب تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا..... بہرحال ریاض الرحمن ساغر صاحب کی تحریر سرگزشت میں میری نظر سے نہیں گزری۔ باقی ان کی متبولیت ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ ہزاروں فلمی اور غیر فلمی گیتوں کے خالق، ایک جانے پہچانے قلم کار، ٹی وی ترانے بھی ان کی ایک شناخت تھے۔ وہ 2013ء میں بچھڑ گئے۔ بس یادیں رہ گئیں جیسے عاطف اور حورین کی یاد جس نے مجھے دہلا دیا تھا۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو ، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

یہ صرف ایک کہانی کی نہیں بلکہ کاروانِ حیات کے ہر انسان کی کہانی ہے جو حوادثِ زمانہ سے گزرتا ہے

میں قلم کاری کے ساتھ ساتھ اب کاروبار پر بھی کچھ توجہ دے رہا تھا۔ لہٰذا تنگدستی والے حالات بتدریج بدلنا شروع ہو گئے تھے۔ چھوٹے بھائی ساجد کے شامل ہونے سے بھی بہتری آئی تھی۔ میری موٹر سائیکل کا واسا کی اکثر بیمار رہتی تھی۔ لہٰذا میں نے اسے بدل دیا۔ جان دار تو کیا بے جان چیزوں سے بچھڑنا بھی مجھے کبھی اچھا نہیں لگا، موٹر بائیک نے بھی اداس کیا۔ بیچتے وقت میں نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا۔ میری کچھ یہی کیفیت اپنے پرانے گھر کے حوالے سے بھی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہاں اب میرے والد اور دیگر بھائی رہتے ہیں۔ میں جب بھی وہاں جاتا تو در و دیوار پر ہاتھ پھیرتا، ان کی خوشبو سونگھتا اور پھر وہ چھت بھی تو تھی وہاں، وہ چارفٹ اونچی منڈیر بھی جہاں ایک اداس خاموش پرندہ شب و روز ٹنگا رہتا تھا اور وہ صحن جہاں ایک چکیلی لکیر لپکتی تھی۔

میں پرانے گھر میں جاتا تو میری اہلیہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتی اور معنی خیز انداز میں مسکراتی۔ میں نے اس سے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا۔ وہ بڑے دل اور ظرف والی، مجھے سنبھالنے اور سمیٹنے کے سفر میں بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ تصنیف و تالیف کے لیے بھی اس نے میرے لیے بڑا سوافق اور سازگار ماحول مہیا کیا ہوا تھا۔

اب میں پھر اس تذکرے کی طرف آتا ہوں جو ایک خود رو بیل کی طرح تیزی لیکن خاموشی سے پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ عاطف والا معاملہ میرے لیے بڑا ہی حیران کن تھا۔ وہ قریباً اٹھائیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس سے پیشتر اس نے کسی لڑکی کو چھوا تک نہیں تھا۔ بے شک ملائیشیا چلی جانے والی کومل سے اس نے تین چار سال تک عشق نما محبت کی تھی مگر ہمیشہ ایک فاصلے پر رہ کر، مگر اب جو کچھ ہو رہا تھا، مجھ سے بالاتر تھا اور صرف عاطف ہی نہیں نہایت سمجھ دار اور گھر گرہستی والی حورین بھی اس تعلق کے روز افزوں حصار میں تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جو عاطف ہر وقت مجھے سمجھایا کرتا تھا۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں۔ میرے تو دو چار دوست اور بھی تھے لیکن عاطف اپنے دل کی ہر بات صرف اور صرف مجھ سے کرتا تھا۔

میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ کھوئے والے زردے، چھوٹے موٹے تحفے تحائف اور پھر ٹیلیفونک قربت تک پہنچنے والا تعلق اب حقیقی جسمانی لمس کی طرف بڑھنے والا ہے۔

حورین کا شوہر جمشید اپنے گھر میں کچھ لکڑی اور آرائش وغیرہ کا کام کروا رہا تھا۔ گھر میں ایک دن تین چار کاریگر بھی

لگے ہوئے تھے۔ لہٰذا حورین نے جمشید سے کہا اور وہ حورین کو بچے سمیت عاطف کے گھر چھوڑ گیا۔

حورین سارا دن عاطف کے گھر ہی رہی۔ اس کی والدہ اور دادی سے گھل مل کر باتیں کرتی رہی۔ وہ پہلے ہی اس کے اخلاق کے گرویدہ تھے۔ شام سے کچھ پہلے عاطف اپنی مہران گاڑی پر حورین کو اس کے گھر چھوڑنے روانہ ہوا۔ گھر زیادہ دور تو نہیں تھا مگر وہ ایک گلی سے گزر کر ایک اندرونی منی مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ ٹیلی فون پر ہونے والی بلکہ کئی ہفتوں سے ہونے والی رنگین و سنگین گفتگو کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ یوں تنہائی میں مل رہے تھے۔

جہاں گاڑی کھڑی تھی وہ ایک بازار نما جگہ ہی تھی۔ پچھ نومی بھی گاڑی کی پچھلی نشست پر موجود تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے کے ہاتھ کے لمس سے آشنا ہوئے۔ دونوں کا ایک ایک ہاتھ ایک دوسرے سے الجھا رہا۔ انگلیاں بے ساختہ ایک دوسرے سے کھیلتی رہیں۔ اردگرد کی نگاہوں سے بچنے کے لیے عاطف نے ایک پرانا اخبار ان دونوں ہاتھ کے اوپر ڈال دیا۔ وہ باتیں کرتے رہے۔

جب اپنے گھر کے سامنے حورین گاڑی سے اتری تو اس نے وہ اخبار تہ کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو کہ یہ اخبار نشانی کے طور پر ہمیشہ میرے پاس رہے گا لیکن اگر وہ سمجھ رہی تھی یا ان دونوں میں سے کوئی ایک سمجھ رہا تھا کہ یہ معاملہ اور آگے نہیں بڑھے گا تو وہ ایک سو دس فیصد غلطی پر تھا۔ مرد و زن کا بے مہار تعلق جو کسی قانون قاعدے کو نہیں مانتا شدت کے ساتھ حرکت میں آ چکا تھا۔

راتوں کو ٹیلی فون پر دونوں کی طویل گفتگو بھی جاری تھی۔ حورین کے کہنے پر عاطف فون پر ہی اپنی آواز کا جادو جگاتا تھا۔ کسی وقت وہ بھی گاتی تھی۔ ابھی تک یہ بات کھل نہیں تھی کہ جمشید اس تعلق کے بارے میں کس حد تک جانتا ہے، جانتا بھی ہے یا نہیں۔ ویسے جمشید کے ساتھ بھی عاطف کے تعلقات بحال تھے۔ وہ راتوں کو کئی دفعہ دیر تک بیٹھتے۔ جمشید کوئی دھن کمپوز کرتا اور عاطف اس دھن کو اپنی دلکش آواز کا لباس پہناتا۔

وہ ستمبر کی آخری تاریخوں کا قدرے خنک موسم تھا۔ جب فون پر ایک لمبی گفتگو کے بعد عاطف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔

اس نے کہا۔ "حورین! میں تمہارے گھر آنا چاہ رہا ہوں۔ جمشید کہاں ہے؟"

"وہ سو رہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم گیٹ کا چھوٹا دروازہ اَن لاک کر دو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

معمولی پس و پیش کے بعد حورین نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"

عاطف وہاں پہنچا تو غیر متوقع پر حورین کے علاوہ جمشید بھی جاگ رہا تھا۔ دونوں گھر کی چھت پر تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔ چھوٹا دروازہ بھی لاک تھا۔ حورین چھوٹا دروازہ کھولنے کے بہانے نیچے آئی۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عورت جب اپنے محبوب کے لیے کچھ کرنا چاہے تو سب کچھ کر سکتی ہے کیونکہ گھر میں کام ہو رہا تھا لہٰذا کمروں میں کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے سے گزرتے ہوئے عاطف نے حورین کا بازو پکڑ کر رخ اپنی طرف موڑ لیا اور پہلی بار اسے چوما اس سے بغلگیر ہوا۔ فی الوقت ان باتوں کے تذکرے سے یہی لگتا ہے کہ حورین مضبوط کریکٹر کی نہیں تھی۔ وہ شوہر کو اپنے جوڑ کا نہیں سمجھتی تھی۔ لہٰذا ردِعمل کے طور پر اس کی ناک کے عین نیچے اس سے بے وفائی کر رہی تھی۔ ایسا ہی تھا۔ البتہ بعد میں اس معاملے کی جو چند گرہیں کھلیں ان سے حورین کے کردار کے یہ منفی پہلو کچھ دھندلائے ہوئے نظر آنے لگے۔

اگلے روز عاطف مجھ سے ملا۔ کلائی پر جہاں چابی سے وائے جانے کا نشان تھا وہاں تھوڑا سا نیچے اس نے اپنی جلد پر کچھ گہری خراشیں ڈالی ہوئی تھیں۔ یہ خراشیں کسی بڑے سائز کی سوئے کی مدد سے ڈالی تھی۔

"یہ کیا ہے بھئی؟" میں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"پڑھو نا۔"

میں نے غور کیا یہ 23 لکھا ہوا تھا۔

عاطف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کل نومبر کی 23 تاریخ تھی۔ یہ 23 مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان برس بھرے ہونٹوں کو میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔"

ان دونوں کے آس پاس ہی مجھ پر انڈیا جانے کا بھوت سوار ہوا۔ میرا پھوپی زاد دوست شعیب بھی ساتھ تھا۔ 1983ء میں پاکستانی کرکٹ ٹیم غالباً تین ٹیسٹ میچ کھیلنے انڈیا جا رہی تھی۔ لاہوریوں کے لیے ویزے کا حصول بہت آسان تھا۔ قذافی اسٹیڈیم سے ہی چند روز کا ویزا لگ رہا تھا۔ کرکٹ ہمارا کریز تھا۔ بہت سے دوسرے شائقین کی طرح ہم بھی واہگہ بارڈر کے راستے خراماں خراماں انڈیا پہنچ گئے۔ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات

قدرے بہتر تھے۔ اسے کرکٹ ڈپلومیسی بھی کہا جاتا ہے۔

ہمارا قیام جالندھر کے ایک کالج ہاسٹل میں تھا جو ان دنوں خالی پڑا تھا۔ مہمان نوازی بھی بس ٹھیک ہی تھی۔ خاص طور سے سردار بھائیوں کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں جرنیل سنگھ بھنڈراں کی قیادت میں خالصتان کی تحریک زوروں پر تھی۔ اندرا گاندھی کی حکومت کو پسوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

میچ کے دوران میں دوپہر کا کھانا پاکستانی مہمانوں کے لیے انتظامیہ کی طرف سے تھا۔ ایک دن جالندھر کرکٹ اسٹیڈیم میں ہم نے دیکھا کہ ایک احاطے میں بکرے وغیرہ ذبح کیے جارہے ہیں۔ پتا چلا کہ یہ ہمارے لنچ کا انتظام ہورہا ہے اور بکرے ہمارے انکلوژر کے سامنے اس لیے ذبح کیے جارہے ہیں تاکہ ہمیں جھٹکے والے گوشت کا شبہ نہ ہو۔

پرانی فلموں کرتار سنگھ اور ملنگی وغیرہ دیکھ کر ہم یہی سمجھتے تھے کہ سارے سکھ اتنے لمبے چوڑے ہوتے ہیں کہ اڈی مار کر دھرتی ہلا دیتے ہیں۔ جالندھر شہر میں جب نوجوان سکھوں میں ایک کثیر تعداد کوتاہ قد دبلے پتلے جسم والوں کی دیکھی تو حیرانی ہوئی۔ لگتا تھا کسی نے علی پور کا ایلی جیسے ناول کی تلخیص بس پندرہ بیس صفحوں میں کر ڈالی ہو۔

بعدازاں قدرت کی اس مختصر نویسی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ باقی علاقے تو ہم نے دیکھے نہیں تھے جالندھر میں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی اور ظاہر ہے جہاں شراب پی جاتی ہوگی وہاں سب کچھ ہوتا ہوگا۔ یقیناً ان ہی خرافات کے اثرات نئی پود کو متاثر کررہے تھے۔ بہرحال اچھے ڈیل ڈول کے لوگ بھی جگہ جگہ نظر آتے تھے۔

لاہور والوں کو بجا طور پر زندہ دلان کہا جاتا ہے تاہم ان میں سے کچھ لوگ کھانے پینے کے معاملے میں "درمدہ دلان" بھی ہوجاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر تب نظر آیا جب پاکستانی شائقین کو بسوں پر بیٹھا کر صوبائی دارالحکومت چندی گڑھ لے جایا گیا۔ سیر تو اچھی ہوئی اور وہاں انڈین پنجاب کے چیف منسٹر کا مہمان بننے کا موقع بھی ملا مگر ضیافت کے موقع پر کچھ ناعاقبت اندیشوں نے ان بے صبروں کی یاد تازہ کردی جو برسات میں اچھی بوٹی ڈھونڈنے کی کوشش میں دیگ کے اندر ہی گر جاتے ہیں۔

آئس کریم پر بھی حملہ آور ہوئے اور چمچ کے بجائے انگلیوں سے آئس کریم کھانے کا مایوس کن و تکلیف دہ مظاہرہ کیا۔ البتہ مجموعی طور پر چندی گڑھ کا ٹور اچھا رہا۔

سیر و سیاحت کے شوق نے میرے پاؤں میں ہمیشہ ہی بگولے باندھ رکھے ہیں ان بگولوں کے سبب کچھ عجیب و غریب جگہوں اور لوگوں کو دیکھنے کا موقع بھی ملا۔

جالندھر میں ایک سائیکل رکشا والا ہمارا دوست بن گیا تھا۔ غالباً امرت سنگھ یا امر سنگھ نام تھا۔ وہ ہمیں جالندھر کے مضافات دکھانے لے گیا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس نے ہماری ملاقات ایک عجیب عورت سے کرائی وہ ایک فقیرنی تھی۔ گاؤں میں ہی کسی کے عطیہ کردہ چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ فقیرنی سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بوڑھی تھی۔ اس کی عمر بمشکل 30 سال ہوگی۔ وہ اتراکھنڈ کے کسی علاقے کی لگتی تھی۔ رنگ گندمی اور نقوش بھی اچھے تھے۔ تاہم وہ بولتی نہیں تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس نے دس سال کے لیے، اور کچھ کا کہنا تھا کہ عمر بھر کے لیے اس نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ اسے مقامی لوگ بھرت دیوی کے نام سے پکارتے تھے۔

بھرت دیوی کے مذہب کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ بس یہ کہا جاتا تھا کہ اس کی پراتھنا قبول ہوتی ہے۔ خاص طور پر لوگ بچیوں کے اچھے نصیب کے لیے اس سے دعا یا پراتھنا کراتے تھے۔ جب ہم پہنچے تب بھی درجنوں لوگ اپنی نومولود اور کم عمر بچیوں کے ساتھ وہاں نظر آئے۔

رکشا والے امر سنگھ نے بتایا۔ "اس کے ساتھ اس کا ایک ادھیڑ عمر مرید بھی تھا۔ جو اب کافی عرصے سے نظر نہیں آتا۔ اس نے بتایا تھا کہ بھرت دیوی ایک ایسے علاقے کی رہنے والی ہے، ہاں ایک بہت برا رواج پرانے وقتوں سے ہے۔ اس کو ساتی کہتے ہیں۔"

"برے رواج سے کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا جھجک کر بولا۔ "کسی ناری کا ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ رہنا۔"

"وہ کس طرح؟"

"بس وہ گنوار لوگ اس کو پاپ نہیں سمجھتے۔ مثلاً کسی گھر میں چار بھائی رہتے ہوں اور ان میں سے کسی ایک کا بیاہ ہوجائے تو سمجھ لیں کہ....." وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہوگیا۔

ہم ہکا بکا رہ گئے۔ امر سنگھ نے کافی تفصیل بتائی۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہبی کتابوں کے مطابق کورو سو بھائی تھے۔ ان کے پانچ سوتیلے بھائی پانڈو بھی تھے۔ کورو اور پانڈو کے درمیان "مہابھارت" ہوئی تھی۔ پانڈو کے پانچ بھائی کی ایک ہی پتنی تھی دروپدی۔ اتراکھنڈ میں ایسے قبیلے ہیں جو خود کو پانڈو کی نسل

بتاتے ہیں۔ ان میں یہ رسم جائز ہے کہ سب سے بڑا بھائی شادی کرتا ہے۔ باقی بھائی بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا بھائی شادی کرلے تو بھی وہ بیوی سب کے لیے جائز ہوگی۔ بچے صرف بڑے بھائی کے کہلائیں گے۔ ولدیت میں بڑے بھائی کا نام ہوتا ہے۔ انگریزوں نے مردہ شوہر کے ساتھ چتا کی آگ میں جل مرنے کی رسم ''ستی'' کی طرح اس رسم کو بھی ختم کرنے کا قانون بنایا لیکن کامیابی نہیں ملی، آج بھی پہاڑوں میں بسی یہ قوم اس رسم پر چل رہی ہے۔

''تو یہ بھرت دیوی یہاں کیسے پہنچی؟''

''واہگرو کہتے ہیں ناجی کہ برے سے برے لوگوں میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناری بھرت دیوی بھی ان میں سے ایک تھی۔ اس میں پاپ اور پن کی پرکھ بھی تھی۔ اس نے اپنے ہونے والے پتی کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ صرف اسی کی پتنی ہوگی۔ وہ مان گیا لیکن یہ ایک دھوکا تھا۔ پرکھوں سے جو روگ ان لوگوں کو لگا ہوا تھا وہ اتنی جلدی دور کیسے ہوتا۔ دور دراز کے سسرالی گاؤں میں اس کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو اس قبیلے برادری کی عورتوں سے ہوتا تھا۔ پتی کے دو بھائیوں نے بھی اس کی عزت سے کھیلنا شروع کردیا پھر ایک دن جب اس کے ''یک چشم'' سسر نے بھی نشے میں دھت ہوکر اسے اپنے کمرے میں گھسیٹنے کی کوشش کی تو سب کچھ بھرت دیوی کے بس سے باہر ہوگیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ آئی۔

''اور ان لوگوں نے بھاگنے دیا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''ٹھیک جانکاری تو کسی کو نہیں لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ اس نے ایک چھری سے سسر اور پتی کی ہتھیا کردی تھی اور پھر وہاں سے سیکڑوں میل دور ہمارے پنجاب کے اس دیہہ میں آکر رہنے لگی۔''

بھرت دیوی کے اس ٹھکانے پر کئی رگوں کے جھنڈے غالباً اس کے عقیدت مندوں نے ہی گاڑ دیئے تھے۔ بھرت دیوی سر پر موٹی اوڑھنی لیے مٹی کی ایک ٹھڑی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد رنگ برنگے کپڑوں کی بے شمار دھجیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جیسے درزیوں کے پاس ہوتی ہیں۔ شاید ان کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہو۔ وہ اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔

انڈیا بے شمار کہنہ رسموں، رواجوں، عقیدوں میں جکڑا ہوا ایک ایسا خطۂ ارض ہے کہ جس کے بارے میں جتنا جانو اتنا ہی الجھاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہاں کی حکومتیں دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ بہت سی قبیح رسوم کو ختم کرچکے ہیں مگر وقتاً فوقتاً روح کو لرزا دینے والی اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ انڈیا کی فلاں دور دراز ریاست کے فلاں دور افتادہ و پسماندہ گوشے میں عورت کو ستی کردیا گیا۔

اپنے ویزے کی رو سے ہم امرتسر نہیں جاسکتے تھے۔ تاہم گروپ کے کچھ دوسرے لوگوں کی طرح ہم نے بھی یہ رسک لے لیا۔ امرتسر میں ہم خوب گھومے پھرے۔ یہ سکھوں کا مذہبی شہر ہے۔ لہٰذا شیو کرانے کے لیے ہم حجام ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہوگئے۔ لمبی بھاجی کھانا پڑی سکھ بھائیوں نے ہمیں گوشت کے لیے بھی ترسا دیا تھا۔ ہم ٹھہرے پکے مسلمان..... اور کوتاہیاں ہو بھی جائیں لیکن گوشت سے تو دیر تک منہ نہیں موڑ سکتے۔

بصد کوشش ایک ہوٹل میں گوشت ملا۔ ہم نے رغبت سے اور عقیدت سے کھایا۔

ہم نے مقامی انداز میں پوچھا۔ ''سردار جی، یہ کس کا ماس ہے؟''

انہوں نے کسی ایک جانور کا نام لینے کے بجائے دو تین جانوروں کا نام لیا۔ شاید وہ ایک آدھ نام اور بھی لے لیتے..... لیکن ہمیں خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کوئی ایسا نام نہ لے لیں جس کے بعد کھایا پیا باہر ہو۔ لہٰذا ہم نے انہیں روک دیا۔ ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوا تھا کہ ان ہوٹلوں میں مختلف جانوروں مرغی، بکری، بھیڑ وغیرہ کا مکس گوشت بھی پکایا جاتا ہے۔

ہم امرتسر آئے تھے تو دربار صاحب یعنی گولڈن ٹیمپل کیوں نہ جاتے۔ دربار صاحب کی وسعت، صفائی ستھرائی اور وہاں کی مذہبی فضا دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب سکھوں کی علیحدگی کی تحریک ہر گھڑی زور پکڑ رہی تھی۔ جوش و خروش میں ڈوبی ہوئی مذہبی فضا صرف دربار صاحب کے اندر ہی نہیں تھی پورا امرتسر اس کے حصار میں تھا..... ہم گلیوں کے اندر سے گزرتے تھے تو گھروں کے اندر سے گرنتھ صاحب کے پاٹ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور کہیں کہیں ست سری اکال کے نعرے بھی گونجتے تھے۔

سکھ مزاحمت کاروں کے جمتے کندھوں پر رائفلیں رکھے گولڈن ٹیمپل کے اندر اور باہر پریڈ کرتے نظر آتے تھے۔ مرکزی کردار سکھ لیڈر جرنیل سنگھ بھنڈراں والا تھا جو اندرا گاندھی کی حکومت کو برابر کی ٹکر دے رہا تھا۔

گولڈن ٹیمپل کے اندر ہمیں جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چھریرا جسم، عمر قریباً پینتیس چھتیس سال، سر پر نیلی پگڑی۔ اس نے خاکستری رنگ کی

چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اپنے مسلح ساتھیوں سے کچھ بات کررہا تھا۔

میں نے ایک سکھ بزرگ سے پوچھا۔ ”یہی بھنڈراں والا ہیں؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”یہ ہماری آشاؤں کا تارا ہے۔ ہم سب کے حق کے لیے اپنے پران اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔“

بھنڈراں والا اب ساتھیوں سمیت دربار صاحب کے اندرونی حصے کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔

شعیب نے سکھ بزرگ سے پوچھا۔ ”یہ اس عبادت گاہ کے اندر کیوں موجود ہیں؟“

”پتر جی، اندرا کی گورنمنٹ اس کے خون کی پیاسی ہورہی ہے۔ ہم نے خود انہیں یہاں بلایا ہے..... تاکہ یہ واہگرو کی پناہ میں رہیں۔“

اگر میں ایک معروف انگلش فلم کے اس کردار کی طرح ہوتا جس کے پردہ تصور پر مستقبل کے حقیقی مناظر چمک جاتے تھے تو شاید میں اس خوبصورت ”دربار صاحب“ کا ایک منظر بھی دیکھ لیتا۔ وہ منظر جو صرف 32 ہفتے بعد یہاں وجود میں آنا تھا۔ انڈین ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ، توپوں کی گھن گرج، راکٹ لانچرز کے شعلے اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ۔ میں ان راہداریوں، تالابوں اور برجیوں کے اردگرد ان بے شمار شہریوں اور مزاحمت کاروں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھ سکتا۔ جن میں سے کئی ایک نے ہاتھ اٹھا کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش بھی کیا لیکن گولیوں سے بھون دیے گئے۔ یہ سارے خونی واقعات 1984ء میں 3 جون اور 6 جون کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انڈین فوج کے حملے کے وقت کم و بیش دس ہزار شہری اور بھنڈراں والا کے ساتھی دربار صاحب کے اندر موجود تھے۔ المیہ یہ کہ عام شہریوں کو صرف ایک دن پہلے انڈین فوج نے خود اجازت دی تھی کہ وہ اپنی کسی مذہبی تقریب کے لیے دربار صاحب کے اندر چلے جائیں، لیکن جب وہ جوق در جوق چلے گئے تو سخت ترین کرفیو نافذ کرکے انہیں اندر ہی محصور کردیا گیا۔

اگر میں بتیس ہفتے قبل میں یہ سارے مناظر دیکھ سکتا تو کسی چالیس پچاس گز دور کھڑے جرنیل سنگھ بھنڈراں والے کے پاس پہنچتا۔ اس سے کہتا۔ ”اے جرنیل سنگھ، تو نے اپنے مقصد کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے مگر تیرا دشمن تیری توقع سے زیادہ جابر و قاہر ہے۔ اس کے اندر ایک آتش طوفان پل رہا ہے۔ یہ کیفیت بے پناہ ریاستی جبر کی شکل اختیار کرنے والی ہے اور ایک خونی آپریشن کا نام بلیو اسٹار رکھا جانے والا ہے۔ بے شک تیرا اور تیرے ساتھیوں کا عزم بہت بلند ہے مگر تمہاری یہ ہلکی پھلکی بندوقیں اور برچھیاں وغیرہ یہاں کچھ نہ کرسکیں گی، کیونکہ یہاں ٹینک دندنانے والے ہیں اور توپیں آگ برسانے والی ہیں۔ جرنیل سنگھ جہاں تو کھڑا ہے وہاں کچھ ہفتے بعد 6 جون کے تپتے دہکتے دن میں اکالی تخت کے آس پاس تیری اور تیرے ساتھیوں کی لاشیں بکھری ہوں گی..... کیا سیاستدانوں کی طرح تیرے پاس بھی کوئی پلان بی ہے یا نہیں؟“

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے معلوم ہی کچھ نہ تھا۔ میں بھی دربار صاحب میں آنے والے سیکڑوں سیاحوں کی طرح وہاں کی خوشنمائی اور عقیدت مندوں کی مصروفیات دیکھنے میں مصروف رہا۔

اگلے روز ہم نے امرتسر میں کچھ اور تاریخی جگہیں بھی دیکھیں جن میں جلیانوالا باغ بھی شامل تھا۔ وہ تاریخی کنواں جو ہر مذہب کے ہندوستانیوں کی لاشوں سے پٹ گیا اور وہ دیوار جس پر انگریزوں کی چلائی ہوئی گولیوں کے نشان ہمیشہ کے لیے برٹش گورنمنٹ کے ماتھے کا داغ بن گئے۔ ریاستی جبر کی ایک اور مثال۔

انڈیا سے واپسی پر ایک سنگین لیکن دلچسپ واقعہ ہوا۔ چند دن پہلے جب ہم خشکی کے راستے انڈیا میں داخل ہوئے تھے تو انڈین بی ایس ایف یا آرمی کے ایک سکھ آفیسر نے سب پاکستانیوں کو ایک ایک پیپر بھی دیا تھا اور بڑی تاکید سے کہا تھا کہ یہ پولیس رپورٹ ہے، چاہے آپ سب کچھ گم کردیں مگر اس رپورٹ کو گم نہیں کرنا۔ ہم دونوں نے اس نصیحت کو پلے سے باندھ لیا، مگر ملہوم الٹ دیا۔ کچھ بھی گم نہ کیا لیکن رپورٹ گم کردی۔

شکر کا مقام تھا کہ اس گمشدگی کا علم ہمیں عین اس موقع پر ہوا جب واپسی کے وقت انڈین اہل کاروں نے ہم سے رپورٹ طلب کی۔ ہم نے پہلے اپنی جیبیں دو دو تین تین بار ٹٹولیں، پھر سفری بیگز اور اٹیچی کیس وغیرہ کی باری آئی اندر کوئی مشتبہ یا الا بچیاں وغیرہ تو تھی نہیں جو ہم احتیاط کرتے۔ زیادہ تر ان دھلے کپڑوں اور روزمرہ استعمال کی چیزیں تھیں۔ ہم نے سب کچھ اہل کاروں کے سامنے ہی زمین پر ڈھیر کردیا۔

ہماری حقیقی بوکھلاہٹ دیکھ کر ہمیں گھورتے ہوئے اہل کاروں کو اتنا وشواس تو یقیناً ہوگیا کہ ہم کوئی ڈراما نہیں

کررہے۔

وہی تنومند باوردی سکھ آفیسر جس نے آمد کے وقت ہمیں کاغذ سنبھال کر رکھنے کی تاکید کی تھی، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر مسکراتا ہوا ہمارے پاس آیا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، کوئی بات نہیں، سات آٹھ تسلیں پہلے تم بھی تو سکھ ہی تھے۔

اس نے ماتحتوں کو حکم دیا کہ اندراج کے رجسٹر میں دونوں مہمانوں کے نام دیکھو اور ان کو ڈیلی گیٹ رپورٹس بنادو۔ اب یہاں ایک اور مشکل بلکہ سنگین مشکل کھڑی ہوگئی۔ اندراج کے موٹے رجسٹر کی خوب ورق گردانی کی گئی میرا نام تو مل گیا، مگر میرے کزن شعیب کا نام نہیں ملا۔

اس کے بعد وہ سکھ آفیسر جو غالباً میجر تھا اور کافی فرینڈلی بھی تھا ایک دم بہت سنجیدہ اور چوکنا ہوا نظر آنے لگا۔ ہمارے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس وقت کو کوس رہے تھے جب ظہیر عباس اور وسیم راجا وغیرہ کی شاندار بیٹنگ دیکھنے کے شوق میں اس دشمن ملک آدھمکے تھے۔ اتنے میں ایک اور آفیسر بھی وہاں آگیا۔ اس نے ساری صورت حال جاننے کے بعد خشک لہجے میں کہا۔ ”گوبند! مجبوری ہے، جس بندے کا نام ہے اس کی ڈیلی گیٹ بنادو۔ دوسرے کو روک لو۔“

الفاظ ہم دونوں پر بجلی بن کر گرے۔ شعیب کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا۔ یقیناً اس کی نگاہوں کے سامنے جنت کی حسینائیں ناچنے لگی تھیں۔

میں نے بڑی التجا کے ساتھ رجسٹر والے باوردی اہلکار سے کہا۔ ”بھرا جی! ہم دونوں اکٹھے ہی پاکستان سے انڈیا میں داخل ہوئے تھے، جب میرا نام رجسٹر میں ہے تو میرے بھائی کا کیوں نہ ہوگا۔ آپ کو واہگہ کا راستہ ایک بار صرف ایک بار مزید اس رجسٹر کو دیکھ لیں۔“ وہ ہندو تھا لیکن بوکھلاہٹ میں میرے منہ سے واہگہ کا راستہ ہی نکلا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ عنقریب ہمیں جرنیل سنگھ بھنڈراں والے کا سہولت کار قرار دیا جانے والا ہے اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ خالصتان کا آئیڈیا لانچ کرنے کا سہرا بھی ہمارے سر ہی باندھ دیا جاتا۔

صد شکر کہ رجسٹر کی آخری ورق گردانی میں شعیب کا نام فہرست کے بالکل آخر میں ایک دو ناموں میں نکل آیا۔ دراصل ہوتا یہی تھا کہ جب اہلکار ورق گردانی کرتا تھا تو فہرست کے بالکل آخر میں پہنچ کر طائرانہ سی نظر ڈال کر نفی میں سر ہلا دیتا تھا۔

اب میرا اور شعیب کا نام علیحدہ علیحدہ کیسے درج ہوگئے اس کا پتا نہ چل سکا۔

جب سب کچھ ٹھیک ہوگیا اور ہم نے سکھ کی سانس لی تو ایک سکھ سنتری بڑی ہمدردی کے ساتھ ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ بولا۔ ”آپ سوچ نہیں سکتے کہ واہگرو نے کتنی بڑی کرپا کی ہے آپ کے اوپر۔ جس بندے کو روکا جاتا ہے اس پر جاسوسی وغیرہ کا شبہ ڈالا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اوپر والا کسی کو نہ دکھائے، کئی کئی برس تو یہ جانکاری بھی نہیں ملتی کہ وہ کس علاقے کے کس کی جیل میں ہے۔“

ہماری آنکھوں میں نمی آگئی۔ ہم نے اسی وقت شکرانے کے طور پر اپنے اپنے سامان میں سے ایک ایک ناریل نکال کر اسے پیش کیا مگر اس نے شکریے کے ساتھ انکار کیا کہ ناریل وہاں بہت تھے۔ (یاد رہے کہ کچھ عرصے بعد جرنیل سنگھ بھنڈراں والا اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا خمیازہ صرف پانچ ماہ بعد وزیراعظم گاندھی کو بھگتنا پڑا۔ اس کے دو سکھ گارڈز نے اسے جان سے مار ڈالا)

یہ غالباً انہی دنوں کی بات ہے جب الطاف حسین قریشی صاحب سے پہلی پہلی ملاقاتیں ہوئیں۔ اردو ڈائجسٹ کا دفتر سمن آباد لاہور میں تھا۔ یہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کا دور تھا۔ پیپلز پارٹی بھٹو کی پھانسی کے بعد ملک گیر تحریکیں چلا رہی تھی۔ فروری 1981ء میں بائیں بازو کی جماعتوں کا اتحاد ایم آر ڈی کے نام سے ہو چکا تھا۔ غالباً بے نظیر بھٹو اس کی سربراہ تھیں۔ مولانا بالکل الرحمٰن بھی شامل تھے۔

الطاف حسین قریشی موجودہ گورننس کو وقت کی ضرورت سمجھتے تھے اور اس کے حق میں لکھتے تھے۔ اردو ڈائجسٹ میں ان کا رواں دواں اداریہ تحریک مخالف حلقوں میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

الطاف صاحب کے لکھنے کا خاص انداز تھا۔ دفتر میں بند ہو کر خیالات میں گم ہو جاتے تھے اور ان کی انگلیاں بے ساختہ میز پر تھاپ دیتی رہتی تھیں۔ میں نے وہاں ایک دو انگلش ناولوں کی تلخیص کی۔ ان میں سے ایک ”آئی لینڈ“ تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ الطاف صاحب بے تکلفی سے مجھے پاس بیٹھا کر میرے کچھ فقروں کی اصلاح بھی کر دیتے تھے۔ مثلاً انہوں نے سمجھایا کہ کوئی بھی نیا فقرہ ”لیکن“ یا اس کی طرح کے دیگر الفاظ ”پھر“ ”جبکہ“ وغیرہ سے شروع کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ وہ اردو گرائمر کو بہت باریک بینی سے دیکھتے تھے۔ مثلاً میں نے ایک فقرہ لکھا۔ ”وہ اسے مارنے کے لیے ہی باہر نکلا

تھا۔"

الطاف صاحب نے کہا۔ "لفظ" ہی کو فعل کے قریب تر ہونا چاہیے۔ یہ فقرہ یوں زیادہ مناسب ہے..... وہ اسے مارنے ہی کے لیے باہر نکلا تھا۔"

ایک روز دفتر میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ دھوئیں کے چند مرغولے سے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی قدرے بھاری جثے کے ایک صاحب تیزی سے اندر آئے۔ دھواں ان کے سگریٹ کا تھا اور شاید کثرت سگریٹ نوشی کے سبب ہی ان کا رنگ کچھ سانولا بھی نظر آتا تھا۔ انہوں نے ایک بھاری بھرکم مسودہ الطاف صاحب کے سامنے میز پر رکھا اور عینک درست کرتے ہوئے بولے۔ "لیں جی، مکمل ہوگیا....."

پھر وہ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے سگریٹ پیتے ہوئے باہر نکل گئے۔ الطاف صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "جانتے ہو انہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

بولے۔ "حیرت ہے بھئی یہ ستار طاہر تھے۔"

میں ان کی تحریروں کا مداح تھا۔ دنیا کی سو عظیم کتابیں جیسی تحریر لکھ کر انہوں نے اپنے نام کو زندہ جاوید کیا۔

اتفاق ہے کہ بعد ازاں میں انہیں دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ چند سال بعد 53 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ تاہم ان دنوں محسن فارانی اور تنویر قیصر شاہد جیسے محنتی کارکن ادارے کو میسر تھے۔ ان سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ محسن فارانی بڑے منکسر المزاج اور حلیم الطبع ثابت ہوئے۔ ان کا مسکراتا چہرہ آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

مختلف رسائل و جرائد میں اب میری تحریریں شوق سے پڑھی جارہی تھیں۔ ایک روز ایک رسالے کے پبلشر نے مجھے دفتر بلایا۔ میں یہاں ان کا نام لکھنا نہیں چاہتا۔ بڑی مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ مجھ سے کافی بے تکلف بھی ہو چکے تھے۔ کہنے لگے۔ "یار طاہر! ایک لڑکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لڑکیاں تو بہت سی ہیں، آپ ایک کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟"

بولے۔ "تم نے جو ایک کردار لکھا ہے وہ اس پر مرمٹی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ زندہ کردار ہے اور یہاں ہمارے دفتر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ ہر صورت اس سے ملنا چاہتی ہے۔"

"تو پھر آپ نے کیا سوچا؟"

"یار! مجھے پتا ہے کہ تم تو اس سے ملو گے نہیں۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ کردار میں ہی ہوں اور میں نے ہی وہ کہانی لکھی ہے....."

"تو اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"حکم تو کوئی نہیں۔ بس تمہیں بتانا تھا اور تم سے پوچھنا تھا کہ اگر تم کہو تو میں بطور "تم" اس سے مل لوں؟"

میں اپنے پبلشر کی "ایمانداری" پر حیران ہوا اور دل ہی دل میں مسکرایا بھی۔ یہ بھی بہت تھا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ نہ بھی پوچھتے تو مجھے کیا پتا چلنا تھا۔ ہاں ایک دھوسہ رہتا کہ پتا نہیں وہ بطور طاہر جاوید مغل اس سے مل رہے ہیں..... اور اگر ایسا ہی ہے تو کسی دن ان کی رنگین طبع کے سبب میرے سر پر کوئی بم نہ پھٹ جائے۔ تاہم اس معاملے پر پھر ان سے کبھی کوئی بات نہ ہوئی۔

☆☆☆

حورین نے عاطف کو فون کرنے بند کر دیے تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کھوئے والا زردہ اور چپلی کباب وغیرہ حورین کے گھر میں بنتے تو شاید ہوں گے مگر وہ اب عاطف کے گھر تک نہ پہنچتے تھے لیکن عجیب صورت حال یہ بھی کہ عاطف اور حورین کے شوہر جمشید کا آپس میں ملنا جلنا برقرار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب ان کی ملاقاتیں گھر کے بجائے شاہ نور کے قریب ایک "ساؤنڈ اسٹوڈیو" میں ہوتی تھیں جہاں وہ دونوں رات گئے تک ساز و آواز کی تزئین و آرائش میں مصروف رہتے تھے۔ عاطف کا ایک صوفیانہ پنجابی گانا کیسٹ پر ریلیز ہو کر کافی ہٹ بھی ہو چکا تھا۔

ایک دن عاطف نے ہی مجھ سے کہا۔ "یار! پرسوں شاہ نور اسٹوڈیو کے سامنے ہوٹل میں میری ملاقات فلم رائٹر رشید ساجد سے ہوئی۔ میرے ہاتھ میں وہ ڈائجسٹ تھا جس میں تمہاری کہانی "لباس" ہے۔ رشید ساجد نے مسکرا کر میں بھی تمہاری کہانیاں پڑھی ہوئی ہیں، کہہ رہے تھے کہ تمہیں فلموں کے لیے لکھنا چاہیے۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "نہیں بابا! یہ میرے بس کا روگ نہیں اور نہ ہی میں اس کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ بڑوں کو پتا چل گیا تو کھال کھینچ لیں گے۔"

میں سمجھا بات ختم ہوگئی مگر دو روز بعد ہی عاطف نے رشید ساجد سے باقاعدہ ملاقات کرادی۔ انہوں نے میری کافی حوصلہ افزائی کی اور سمجھایا کہ فلم لائن اتنی بری نہیں جتنی لوگ سمجھتے ہیں اور یہ کہ اچھے لوگوں کو فلم لائن میں آنا چاہیے تاکہ وہاں کے ماحول میں مزید بہتری آئے وغیرہ وغیرہ۔

کہا جاتا ہے کہ فلم والوں کی طرف سے آفر بڑی ظالم چیز

ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اصول پسند لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کئی شریف گھرانوں کی شریف ترین دختران بھی ایسی پیشکشوں کو ٹھکرا نا پائیں اور عزت آبرو کو ٹھکرا دیا۔ مجھے تو خیر صرف کچھ لکھنے کی آفر ہو رہی تھی۔ رشید ساجد نے کہا۔ ''ایک فلم کا اسکرپٹ تیار کر رہا ہوں۔ تم اس میں میری معاونت کرنا۔ میں جلد ہی تمہارا ہاتھ سیدھا کر دوں گا۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے خود اپنے آپ کو ورغلانا شروع کر دیا۔ جیسا کہ حضرت اقبال نے کہا۔ ''عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے.....''

میں نے سوچا کہ اگر میں کسی طور فلم لائن میں آ بھی گیا تو اعلیٰ ترین اوصاف حمیدہ شائستہ مزاجی کی مثال قائم کروں گا..... اور اپنی پاک دامنی کو تو کسی بھی صورت ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ مزید یہ کہ نہایت اصلاحی، سبق آموز اور تاریخی اسلامی فلموں تک محدود رہوں گا۔

رشید ساجد نے کافی پھرتی دکھائی۔ دو تین روز بعد ہی فلم رائٹر ایسوسی ایشن کی طرف سے میرا کارڈ بن کر آ گیا۔ جس پر میری تصویر چسپاں تھی۔ رشید ساجد نے کہا کہ میں بے شک کل سے ہی اسٹوڈیو آنا شروع کر دوں۔

اگلے روز میں کشاں کشاں لاہور نیو اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ ان اسٹوڈیوز میں شوٹنگ کے لیے جو سیٹ وغیرہ لگتے تھے ان کی لکڑی عموماً ہماری نمبر شاپ سے ہی جاتی تھی۔ لہٰذا کبھی کبھار اسٹوڈیو کے اندر چلا جاتا تھا۔ تاہم اس دن میرا جانا ایک فلم رائٹر کے طور پر تھا۔ اس دن یہ ہوا کہ میں دو چار منٹ کے لیے گیا۔ کسی آرٹ ڈائریکٹر سے بقایا جات وغیرہ لیے اور واپس آ گیا۔ اس روز میں نے قریباً دو تین گھنٹے اطمینان سے اسٹوڈیو میں گزارے۔ یہ اسٹوڈیو کا اندرونی حصہ تھا۔ رشید ساجد صاحب سے دس پندرہ منٹ کی ملاقات ہی ہوئی پھر انہیں کسی کام سے کسی سیٹ پر جانا پڑ گیا۔ میں وہیں رائٹرز ایسوسی ایشن کے آفس کے سامنے بیٹھا رہا اور دیدے گھما گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ اکتا گیا تو چہل قدمی کے لیے ایک برآمدے میں چلا گیا۔ یہاں فلم اسٹوڈیو کا اصل رنگ نظر آیا۔ ایک دو خالی کمروں میں وہسکی کی خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی نظر آئیں۔ ایک بند دروازے کے پیچھے دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی پھر یکایک دروازہ کھلا اور ٹیکنی کلر لباس میں ایک ایکسٹرا گرل شرارت آمیز انداز میں بھاگتی ہوئی ایک راہداری میں گم ہو گئی۔ کسی قریبی کمرے میں چند افراد ننگی گالیوں کا مقابلہ کرنے میں مصروف تھے ان میں مجھے ایک ایسا فلم اسٹار بھی نظر آیا جو پردہ اسکرین پر مجسم شرافت بن کر نمودار ہوتا تھا۔

میں واپس ایسوسی ایشن کے آفس میں آن بیٹھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک اور آفس میں مجھے ایک نہایت حسین خاتون بیٹھی نظر آئی۔ غور کیا تو وہ صابرہ سلطانہ تھیں۔ ماضی میں انہوں نے کئی فلموں میں کسی حسین شہزادی یا ملکہ وغیرہ کے کردار ادا کیے تھے۔ بڑی عمر کے سبب اب وہ فلموں سے تقریباً آؤٹ ہو چکی تھیں مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ اب بھی دلکش تھیں۔ اس حوالے سے میں نے قریب بیٹھے ایک شخص سے بات کی تو اس نے کہا۔ ''کیمرے کا کلوز اپ بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ چہرے کے اندر گھس کر بڑھاپے کی خامیاں نکال لیتا ہے۔''

جس طرح صابرہ سلطانہ کچھ فاصلے پر ایک دفتر میں تنہا بیٹھی شاید پرانے وقتوں کو یاد کر رہی تھیں اسی طرح میں بھی دفتر میں یکسر اکیلا بیٹھا نئے وقتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اتنے میں الجھے بالوں والا ایک بھاری بھرکم شخص کرسی گھسیٹ کر میرے قریب آن بیٹھا۔ خوش باش لہجے میں بولا۔ ''ہاں بھئی! بڑی دیر سے یہاں بیٹھے ہو۔ کیا فلم شلم لکھنے کا ارادہ ہے؟''

''جی، سوچ رہا ہوں اس بارے میں۔''

''سوچ رہے ہو تو بس سوچ تک ہی رہنا۔ لکھنے کی طرف نہیں آنا۔ کچھ نہیں پڑا اس کام میں۔ 70 کی دہائی گزر گئی یہ 80 کی دہائی ہے۔ اب فلمیں دماغ سے نہیں ڈولوں سے لکھی جاتی ہیں۔''

''ڈولوں سے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اپنا توانا بازو موڑ کر مسلسل نٹولے پھر اپنی بھاری بھرکم رانوں کو شلوار کے اوپر سے تھپتھپایا اور بولے۔ ''اب فلموں میں وہی چلتا ہے جو ڈنڈیں پیلیں مگڑا ہوتا ہے۔''

انہوں نے قدرے ترس آمیز نظروں سے میرے دبلے پتلے جسم کو دیکھا اور دوبارہ گویا ہوئے۔ ''اب کہانیاں شہانیاں کم ہی لکھی جاتی ہیں۔ بس منشی گیری ہوتی ہے۔ اصل کہانی اسی کی شوٹ ہوتی ہے جس کے کھیسے (جیب) میں پیسے ہوتے ہیں یعنی فلمساز۔''

وہ کافی دیر مجھے پند و نصائح کرنے کے بعد چلے گئے۔ ایک سانولے رنگ کے ایکسٹرا نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''پتا ہے یہ کون تھے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا وہ بولا۔ ''یہ بالا پینڈو تھے۔''

بالا پینڈو کا نام مجھے کچھ جانا ہوا سا لگا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ پنجابی فلموں میں ڈانگ سوٹا کرنے والے کسی پرانے ایکسٹرا کا نام ہے۔

اس سانولے شخص نے مجھے یہ بات بتا کر حیران کر دیا کہ یہ پنجابی فلموں کے جانے پہچانے کیمرا مین کا نام ہے۔ کئی کامیاب فلموں کی عکاسی کر چکے ہیں۔ کیمرا مین، فلم کا ایک اہم ترین شعبہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ہالی ووڈ کے راجر ڈیکنز اور رابرٹ رچرڈسن جیسے دو تین نام تھے۔ بالا پینڈو سے مل کر سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

اسی دوران اندرونی حصے سے مار دھاڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ وہی گروپ تھا جو ایک کمرے میں بیٹھا تازہ ایجاد شدہ گالیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اب ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی۔

یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی کہ علی سفیان آفاقی، نذر الاسلام، فیصل بخاری اور جرار رضوی جیسے اہل لوگ اس انڈسٹری کو خدا حافظ کیوں کہہ گئے تھے۔ اب اس کا بس خدا ہی حافظ تھا۔ آنے والے ماہ و سال میں یہ بات درست ثابت ہوئی۔ میں نے دور کسی پروڈکشن کے دفتر میں اداس اور تنہا بیٹھی صابرہ سلطانہ کو دیکھا اور نہایت سبق آموز و اصلاحی فلموں کے سارے منصوبوں پر دو حرف بھیجتا ہوا فلم نگری سے باہر نکل آیا۔

اگلے روز جاسوسی پبلی کیشن کے آفس میں کسی سے فون پر میری بات ہوئی اب نام یاد نہیں رہا۔ انہوں نے کہا۔ ”تم سگریٹ پیتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔“

”چائے پیتے ہو؟“

”بالکل نہیں۔“

”پان کھاتے ہو؟“

”وہ بھی نہیں۔“

”یار! تم تو ڈائجسٹ رائٹر بھی نہیں لگتے۔ فلم رائٹر تو دور کی بات ہے۔ کچھ اسی طرح کی بات چند سال بعد انور فراز نے کہی۔ میں کراچی گیا ہوا تھا۔ غالباً محترم اکلیم ظلیم صاحب کی کسی عزیزہ کی شادی تھی۔ انور فراز نے کہا۔ ”چائے سگریٹ پان اور اس کے ”علاوہ“ بھی کچھ نہیں۔ یار تم نے تو رائٹروں کا نام ہی ڈبو دیا ہے۔“ مجھے یاد ہے شادی کی اس اولین اثر تقریب میں جناب معراج رسول، شکیل عادل زادہ اور جمال احسانی جیسے قد آور شخصیات موجود تھے۔ ہر دلعزیز، انقلابی شاعر حبیب جالب کی خرابی صحت کا ذکر چھڑ گیا۔ کسی نے بتایا کہ جالب صاحب کے پھیپھڑے بہت خراب ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے غالباً پھیپھڑے بدلنے کا مشورہ دیا ہے۔

معروف شاعر جمال احسانی فقرہ چست کرنے میں جواب نہیں رکھتے تھے فوراً بولے۔ ”جناب جالب صاحب کے پھیپھڑے بدلنے کے بجائے ان کے فلاں خدمتگار کو بدل دیا جائے۔“ انہوں نے ایک نوجوان صحافی کا نام بھی لیا۔

مجھے کافی دنوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نوجوان صحافی کا نام کیوں لیا گیا ہے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ سیدھے طریقے پر ہی مناقب جالب صاحب کو الکحل وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔

جمال احسانی بہت شگفتہ مزاج اور خوش گفتار شاعر تھے۔ میں ان سے بس دو تین بار ہی مل سکا۔ وہ خوش خوراکی میں بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ جب میں کراچی میں پہلی مرتبہ ان سے ملا تو کھانوں کے تذکرے کے دوران میں انہوں نے کوفتے پر ایسی سیر حاصل گفتگو کی کہ میں حیران رہ گیا۔ کوفتے کے ایسے ایسے خصائل و فضائل انہوں نے اتنے لذیذ الفاظ میں بیان کیے کہ تھوڑی ہی دیر پہلے لنچ کرنے کے باوجود میری بھوک پھر سے چمک اٹھی۔ مجھے یوں لگنے لگا کہ اگر کوئی شخص دنیا میں آ کر بھی کسی کوفتے کی لذت سے محروم ہے تو اس کا جینا مرنا ایک برابر ہے۔

بات دوسری طرف نکل گئی۔ میں ذکر کر رہا تھا اپنے دوست عاطف کے کہنے پر فلم اسٹوڈیو میں بطور رائٹر جانے کا۔ عاطف کی کہانی بڑے انوکھے رخ پر جا رہی تھی۔ میں نے محبت کی بہت سی کہانیاں دیکھی ہیں۔ سنی ہیں اور لکھی بھی ہیں مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی روداد سب سے جدا تھی۔ اس روداد نے بعد ازاں میرے فلم پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ میں یہاں ان دونوں کرداروں کے اچھا یا برا ہونے پر کوئی تبصرہ نہیں کر رہا۔ بس جو کچھ ہو رہا تھا اسے بلا کم و کاست بیان کر رہا ہوں اور یہ وہ جذبہ ہے جس پر معاشرتی طور پر شدید تنقید بھی کی جاتی ہے اور اس کے بارے میں بہت ذوق شوق سے پڑھا سنا بھی جاتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، رات گئے حورین نے عاطف کو اپنے گھر بلایا اور گھر کے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا رکھا مگر جب عاطف وہاں پہنچا تو حورین کے علاوہ اس کا شوہر بھی جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد حورین اور عاطف کا تعلق طشت از بام ہوا اور ان کے روز افزوں میل ملاپ کا سلسلہ یکدم ختم ہو گیا۔

مگر اب تقریباً تین ماہ کے وقفے کے بعد فون پر دلوں کی بات چیت پھر دھیرے دھیرے بحال ہو گئی تھی۔ پہلے یہ ملاقات ہفتے بعد ہوتی تھی اور مختصر بھی مگر پھر ہفتے میں دو تین بار ہونے لگی اور اس میں بتدریج وہی رنگ ڈھنگ آ گیا جو پہلے تھا۔ عاطف کے لیے جیسے ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ وہ حورین سے اپنی گفتگو کو کسی مقرر کردہ دائرے میں رکھ سکے۔ دوسری طرف حورین بھی جیسے نہ چاہنے کے باوجود اس بہاؤ میں بہنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ میں یہ

دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ وہ خدا ترسی والے کاموں میں پیش پیش دکھائی دیتی تھی۔ نماز پڑھتی تھی اور کسی حد تک روحانیت پر بھی یقین رکھتی تھی۔ اپنے بچے کے لیے ماں کا کردار بھی وہ بہت احسن طریقے سے نبھا رہی تھی، اس کے باوجود عاطف سے اس کا تعلق بھی موجود تھا۔

میرے خیال میں یہ ایسا تعلق تھا جس میں رومانی اور جسمانی دونوں پہلو پوری شدت سے موجود تھے۔ ان دنوں آڈیو کیسٹ کا رواج تھا۔ ایک روز عاطف بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس نے مجھے ایک کیسٹ پر اپنی اور حورین کی ٹیلیفونک گفتگو کا ایک حصہ سنایا۔ یہ گفتگو اس نے حورین کی اجازت کے بغیر ریکارڈ کی تھی اور اس پر تھوڑا شرمندہ بھی تھا۔ گفتگو کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں دنگ ہوا۔ عجب دیوانگی سی شدت تھی اس میں۔

میں حیران پریشان بیٹھا تھا۔ یہ کوئی فلم ڈراما نہیں تھا۔ جیتی جاگتی زندگی تھی اور وہ کوئی ٹین ایج نہیں تھے۔ عاطف کی عمر اب 30 سے تجاوز کر چکی تھی۔ حورین 26 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ کسی مادر پدر آزاد سوسائٹی کا حصہ بھی نہیں تھے پھر بھی ایک ممنوع راستے پر تیزی سے قدم بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔

ریکارڈنگ مجھے سنانے کے بعد عاطف نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسے ضائع (صاف) کر دیا۔

اب چونکہ فون پر گفتگو پھر شروع ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پھر براہِ راست ملنے کی طرف بھی آ جائیں گے اور پھر چند دن بعد یہی ہوا۔

عاطف میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے نومی کے لیے سیالکوٹ سے اسپیشل فٹ بال منگوایا ہے۔ وہ آج اسے دینے کے لیے ان کے گھر جائے گا۔ اتفاقاً جمشید بھی آج لاہور سے باہر گیا ہوا ہے۔ امید ہے کہ آج شام حورین سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

"تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"یار تمہیں بتایا تو تھا آنٹی جان چوبیس گھنٹے گھر میں ہی ہوتی ہیں اور انہیں ہمارے بارے میں تھوڑا بہت شک بھی پڑ چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں ذرا باتوں میں لگانا اور....."

(آنٹی جان سے مراد حورین کی ساس تھیں)

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیزاری سے کہا۔ "مجھے اس سلسلے میں بالکل معاف کرو۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ یہ تم وہی عاطف ہو جو کبھی زویا کے معاملے میں مجھے چند نصائح کیا کرتے تھے۔"

وہ روہانسا سا ہو گیا جیسے اس کے اپنے بس میں کچھ بھی نہ ہو۔ اس شام کئی ماہ بعد وہ نہ صرف حورین کے گھر گیا بلکہ اس سے ملا بھی۔ وہ فالودہ لے کر گیا تھا۔ جو غالباً حورین کی ساس شوق سے کھاتی تھیں۔ وہ بہت زیادہ فربہ تھیں، دو چار قدم چلنا بھی ان کے لیے دشوار ہوتا تھا۔ جنہوں نے ملنا ہو وہ رستے ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ جمشید نے کوئی نئی قسم کا ڈی وی انٹینا لگوایا ہوا تھا۔ اسی انٹینا کو دیکھنے کے بہانے عاطف، حورین کے ساتھ چھت پر گیا اور واپسی پر ایک برآمدے کی دیوار کے ساتھ لگ کر وہ دونوں دو تین منٹ کے لیے ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے۔ اگر یہ دو تین منٹ..... آٹھ دس منٹ تک پھیل جاتے تو نہ جانے وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ حورین کی ساس نیچے آوازیں دے رہی تھیں۔ حورین خود کو چھڑا کر نیچے چلی گئی۔

یہ شاید دوسرے یا تیسرے روز کی بات ہے۔ رمضان شریف شروع ہو چکا تھا۔ گرمیوں کے روزے تھے۔ میں سہ پہر کے بعد فروٹ لینے کے لیے موٹر بائیک پر مارکیٹ کی طرف گیا۔ مارکیٹ پہنچنے کے لیے جمشید اور حورین کے گھر کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا۔ میں فروٹ خرید رہا تھا کہ میری نگاہ حورین کے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں دس پندرہ غریب صورت مرد و زن موجود تھے۔ وہ ان میں راشن تقسیم کر رہی تھی۔ شربت کی بوتلیں، گھی اور چاول چینی کے پیکٹ وغیرہ۔ اس کی آنکھیں کچھ درماندہ سی لگتی تھیں۔

یقیناً وہ خود بھی روزے سے ہو گی۔ میک اپ سے بالکل عاری چہرے پر ہلکی سی زردی تھی۔ ململ کی سادہ اوڑھنی کی اوٹ سے ناک کا کوکا چمک دکھاتا تھا۔ میں ایک کار کی اوٹ میں تھا وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے سوچا اگر مجھے عاطف سے اس کے تعلق کا معلوم نہ ہوتا اور پرسوں شام والی رومانی ملاقات سے میں لاعلم ہوتا تو سادگی و دلکشی میں لپٹی ہوئی یہ عورت مجھے کچھ انگ ہی دکھائی دیتی۔ انسان ایک پیچیدہ چیز ہے اور اس کی نفسیات پیچیدہ تر۔

کچھ ہی دیر میں حورین دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ ایک دو منٹ بعد اس کا شوہر جمشید باہر نکلا، جو دو چار لوگ اب بھی دروازے پر موجود تھے۔ انہیں جمشید نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگایا پھر حسبِ معمول وہ ذرا لنگڑاتا ہوا سا اپنی سوزوکی کار کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کچھ فربہ بھی ہو رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کی لنگڑاہٹ قدرے نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ سچی بات تو یہی ہے کہ وہ کسی طرح بھی حورین کا "میچ" نہیں تھا۔

حورین اور عاطف کے انوکھے تعلق کو میں نے بہت

قریب سے دیکھا ہے بلکہ تعلق کے اس انوکھے پن میں حورین کے شوہر جمشید کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس تعلق کے اثرات میری دو کہانیوں پر بہت زیادہ ہیں۔ دونوں کہانیاں سسپنس میں شائع ہوئیں۔ پہلی کہانی اداس نسلیں اور اداس شامیں اور دوسری قسط وار پرواز۔ دونوں بہت پسند کی گئیں۔ اداس نسلیں شامیں کا ایک پیرا اس طرح ہے۔

چہرے اور گردن کا لمس، ہونٹوں اور رخساروں کا لمس۔ اس سے آگے حامد کو سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ بے حرکت بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی نرمی سے حامد کی پشت پر رینگ رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی بچہ ہو اور وہ اسے سلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اچھا، اب جانے دو۔" وہ کافی دیر بعد منمنائی۔

وہ اسے ہٹا کر یہ کہتی اٹھی اور باہر نکل گئی۔

اگلے روز یہ دیکھ کر حامد کی حیرت از سر نو تازہ ہوگئی کہ فرخندہ برقع پہن کر مزار پر جانے کے لیے تیار نظر آرہی تھی۔ یہ سوال ابھی تک حامد کے لیے پریشان کن تھا کہ اس سے ملنے کے فوراً بعد وہ مزار جانا کیوں ضروری سمجھتی ہے؟

اس کہانی میں حورین کا کردار جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

مارکیٹ سے افطاری کا سامان لے کر میں بائیک پر گھر واپس روانہ ہوا تو کوئی ایک فرلانگ آگے جمشید کی گاڑی گلی کی نکڑ پر کھڑی نظر آئی۔ وہ گاڑی کے قریب کھڑا بے تکلفی سے عاطف کے ساتھ باتیں کرتا نظر آرہا تھا۔ غالباً یہ گفتگو میوزک کے حوالے سے ہی ہو رہی ہوگی۔ نجانے کیوں کسی کسی وقت مجھے محسوس ہونے لگتا تھا کہ جیسے جمشید اپنی بیوی کے ساتھ عاطف والے معاملے سے بے خبر نہیں..... اور شاید..... شاید انہیں کچھ ڈھیل دے رہا ہے۔

مجھے یاد ہے ہمارے محلے میں ہی شادی کی ایک بڑی تقریب تھی۔ ہم میاں بیوی اور ہمارے دونوں بچے بھی شریک تھے۔ عاطف کے گھر سے بھی وہ افراد آرہے تھے۔ اسی طرح حورین جمشید اور جمشید کی والدہ بھی مدعو تھے۔ حورین کو میں نے ہمیشہ سادہ حالت میں ہی دیکھا تھا لیکن اس روز چونکہ وہ تقریب کی وجہ سے کچھ بنی سنوری بھی تھی میں دیکھتا رہ گیا۔ عاطف جیسا حورت بیزار شخص اگر اس پر مرمٹا تھا تو بات سمجھ میں آتی تھی۔ وہ تو شاید کسی پتھر کی بھی حوصلہ افزائی کرتی تو وہ اپنی جگہ سے سرکنے لگتا۔

تقریب جاری تھی۔ عاطف کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اسے کسی نجی تقریب میں اپنی آواز کا جادو جگانا تھا۔ وہاں اسے کچھ دیر ہوگئی تھی (یاد رہے کہ عاطف کا گایا ہوا صوفیانہ کلام بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ان دنوں زیادہ تر پی ٹی وی ہی دیکھا جاتا تھا اور عاطف کی گائی ہوئی ایک کافی ہر جمعرات پی ٹی وی پر پری ٹیلی کاسٹ ہوچکی تھی۔ اس کا ایک کیسٹ بھی تیاری کے مراحل میں تھا)

اس روز میں نے خود اپنی آنکھوں سے عاطف کے لیے حورین کی بے قراری دیکھی بھری پری تقریب میں وہ بار بار کسی کو ڈھونڈنے لگتی تھی، اور میں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ کچھ دیر بعد وہ نوی کو انگلی سے لگائے لگائے میری طرف چلی آئی۔ میرا حال چال پوچھا۔ وائف سے بھی ایک دو باتیں کیں پھر عام سے انداز میں بولی۔ "آپ کے دوست آج کہیں نظر نہیں آرہے۔"

"اس نے آنا تو تھا..... لیکن شاید کہیں کام پڑ گیا ہوگا۔"

ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ عاطف تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ حورین نے بھی دیکھ لیا اور اس کے دودھیا چہرے پر رنگ سا بکھر گیا۔ وہ اپنی ساڑی کا پلو، سنبھالتی ہوئی عورتوں والی نشستوں کی طرف چلی گئی۔ وہ کمر بالکل سیدھی رکھ کر چلتی تھی اور اس کا یوں چلنا اس کی چال میں ایک شاہانہ سا رنگ بھرتا تھا۔

پیار کرنے والوں کے سوچنے کا انداز عام لوگوں سے بہت مختلف ہوجاتا ہے۔ کئی دفعہ چھوٹی چھوٹی بے معنی باتیں بھی ان کے لیے بہت اہم ہوجاتی ہیں۔ شادی سے پہلے چونکہ میں بھی ایسے دور سے گزر چکا تھا لہٰذا تھوڑا بہت ادراک رکھتا تھا۔ تقریب میں عاطف اور میں ایک ہی میز پر کھا رہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر حورین دوسری میز پر اپنی ساس اور ایک گھلے ملے خاتون کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اپنی ساس کی موجودگی میں بہت محتاط رہتی تھی پھر بھی گاہے بگاہے چنتی سی نظر عاطف پر ڈال لیتی تھی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کی یہ اچٹتی ہوئی نظر بھی اس کی ساس صاحبہ کو بہت کھل رہی ہے۔ ان کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔

عاطف بولا۔ "طاہرہ دیکھنا، حورین کوک کی جو بوتل پی رہی ہے پوری نہیں پیے گی۔ اس میں تھوڑی سی بچی رہنے دے گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میرے پینے کے لیے۔" وہ عجیب جذبہ سے بولا۔

بظاہر کتنی معمولی خیر سی بات لگتی ہے۔ وہ عاطف جو اعلیٰ درجے کا نفیس طبع تھا۔ کسی کی جوٹھی چیز کھانا پینا جس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا اس انتظار میں تھا کہ حورین بوتل کے پیندے میں کچھ

مشروب اس کے لیے چھوڑ جائے گی۔ دراصل ٹیلیفون پر ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا۔ بہرحال ایسا ہوا نہیں۔ ہم دیکھتے رہے، حورین نے ساری بوتل آخری قطرے تک ختم کی، بلکہ بعد میں بوتل کو اس طرح گھمایا بھی، جیسے عاطف کو دکھانا چاہتی ہو کہ اب اس میں کچھ بھی نہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دودھیا چہرے پر ایک شوخی آمیز شرارت تھی۔ عاطف سٹپٹا کر رہ گیا۔

بظاہر یہ معمولی سا واقعہ محبت کے اس جنون آمیز جذبے کی عکاسی کرتا ہے جو ان دونوں کے درمیان تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ میں اس لیے بھی زیادہ فکرمند تھا کہ عاطف کے گھر والے اب اس پر شادی کے لیے زور ڈالنے لگے تھے۔ گھر میں حالات عاطف کے لیے کشیدہ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

پھر ایک دن عاطف مجھے عجیب سی حالت اور عجیب سے موڈ میں ملا۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوا لیکن اس سے پہلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کردوں جو غالباً اسی دن یا اس سے ایک دن پہلے پیش آیا۔ ہماری نواں کوٹ والی نمبر شاپ پر ہمارے ایک دور کے عزیز بشیر احمد بطور ہیڈ مستری کام کرنے لگے تھے۔ میں صبح شاپ پر گیا تو کہنے لگے۔

"طاہر، وہ تمہارے پرانے محلے کا سلیم تو بہت پہنچی ہوئی شے ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا (یاد رہے کہ یہ سلیم وہی ہے جس کی دھواں دار ٹکر اور فائٹنگ اسپرٹ نے علاقے کے بگڑے تگڑے نوجوانوں میں کھلبلی مچادی تھی)

میرے سوال کے جواب میں بھائی بشیر نے بتایا کہ کل رات وہ مقامی لیرک سینما میں اپنے ایک دوست کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تھے۔ وہاں پانچ چھ جھگڑالو ٹائپ لڑکوں کا ایک ٹولا تھا۔ وہ جھگڑا کرنے لگا۔ بات بڑھ گئی تو پچھلی نشستوں سے اٹھ کر سلیم آگیا۔ اس نے کہا۔ "یہ محلے دار ہیں اپنے۔ کسی نے ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔"

اس نے ایک لڑکے کو گریبان سے پکڑا اور گھما کر سیٹوں پر پھینک دیا۔

بھائی بشیر نے بتایا۔ "میں نے سلیم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے ..اس سے کہا۔ یار تم نے ہر وقت میرے ساتھ تو لگے نہیں رہنا۔ ان غنڈوں سے دشمنی چل پڑی تو یہ کسی بھی جگہ پکڑ کر میری ایسی تیسی کردیں گے۔ بڑی مشکل سے اسے روکا۔"

بعد میں کہنے لگے۔ "ویسے یہ سلیم ہے بڑی چالو طبیعت کا۔"

"چالو طبیعت"

مسکرا کر بولے۔ "کچھ دن پہلے میں اپنے ایک دوست سے ملنے شاہدرہ گیا تھا وہاں ایک گلی میں ایویں اس پر نظر پڑ گئی۔ کسی سیل گگڑ کی طرح سینہ پھلا کر ایک رنگ رنگیلی لڑکی کے ساتھ پیدل جا رہا تھا۔ لڑکی ایک دروازے کے اندر چلی گئی اور یہ واپس آگیا۔ مجھے دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سلیم شہزادے، یہ کون تھی تیرے ساتھ؟"

وہ بھی مسکرا لیا، بولا۔ "بھائی جان۔ ایسی باتیں زیادہ نہیں پوچھا کرتے۔" عجب کردار تھا وہ۔ یہ مصرعہ جیسے اسی کے لیے کہا گیا تھا۔ جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے..... یاد رہے کہ یہ جس گلی کا ذکر ہے وہ ایک جھگڑالو برادری کے بڑے ڈھاڈے لوگوں کا محلہ تھا۔ پھر بھی سلیم وہاں کمند پھینک رہا تھا۔ واقعی عورت کا چکر برا ہوتا ہے۔ عاطف کی روداد سے بھی یہی ظاہر تھا کہ عاطف کی دگرگوں حالت کی۔ میں وائف اور دونوں بچوں کے ساتھ آٹھ دس روز مری رہ کر آیا تھا۔ عاطف کے حالات کی زیادہ خبر نہیں تھی لہٰذا جب اسے بڑھی شیو، الجھے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ دیکھا تو تھوڑی فکرمندی ہوئی۔ پتا چلا کہ وہ آج کل حورین سے بہت خفا ہے۔ خفگی کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ حورین سے جو اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی اسے قریباً چار ماہ گزر چکے تھے (یہ وہی ملاقات تھی جس میں وہ اٹینا دیکھنے چھت پر گیا تھا) اب وہ اس سے پھر ملنے کا آرزومند تھا مگر حورین بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ اس تعلق کا انجام کیا ہوگا..... وہ اب رک جانا چاہتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اب وہ عاطف کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بابر سے شادی کرلے۔

عاطف کوئی صنف نازک کے لیے ترسا ہوا شخص نہیں تھا۔ کئی لڑکیاں اس کی مداح تھیں۔ ان میں سے کچھ ماضی میں فٹ بال کے حوالے سے تھیں اور کچھ حال میں گلوکاری کے حوالے سے۔ وہ کسی کی تھوڑی سی بھی حوصلہ افزائی کرتا تو اس تعلق کو دوستی اور پھر قربت میں بدل لیتا لیکن وہ جو کہا جاتا ہے نا کہ عشق و محبت کا معاملہ اکثر وہیں پر ہوتا ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جذبہ اکثر اپنے لیے مشکل ترین راستے چنتا ہے۔

باتیں کرتے کرتے یونہی عاطف کی آستین ذرا اوپر ہوئی تو میں چونکا۔ وہاں کلائی پر کسی گرم چیز سے داغے جانے کا ایک اور نشان نظر آرہا تھا۔ اس سے پہلے چابی سے داغے جانے کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔

میں نے دکھی دل کے ساتھ عاطف کی طرف دیکھا۔

"ایسا کیوں کر رہے ہو یار؟ تم تو دوسروں کو سمجھاتے تھے اب خود کو کیوں نہیں سنبھال پا رہے؟"

وہ مسکرایا۔ "اس طرح خود کو سنبھالنے ہی کی کوشش تو کرتا ہوں۔ خود کو تکلیف دے کر دل کو اس دیوانے پن سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

تب یکا یک اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ "بس سوچ لیا ہے طاہر۔ اب اور اپنے آپ کو نہیں گراؤں گا۔ شاید وہ بھی یہی سوچتی ہے کہ تم روٹھے..... ہم چھوٹے۔" میں اس کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ اپنے دل کو کس بے رحم مٹھی میں محسوس کر رہا ہے۔

مگر صرف دو گھنٹے بعد اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اسے حورین کا فون آیا ہے۔ وہ کل شام اس سے ملے گی۔ عاطف کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ فون پر بھی اسے منانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ سوری وغیرہ بھی بولا ہے۔ معافی مانگی ہے۔

"کہاں ملو گے.....؟"

"گھر پر تو نہیں۔ کہیں باہر ہی پروگرام بنے گا۔"

اگلے روز حورین چادر میں لپٹی لپٹائی ایک مقررہ جگہ پہنچ گئی۔ وہاں سے عاطف نے اسے اپنی سوزوکی کار میں بٹھایا۔ سردی کی مختصر شام، اندھیرا اوڑھ چکی تھی۔ وہ دونوں کالونی سے کوئی تین چار میل دور ایک بے آباد ہاؤسنگ سوسائٹی کی سڑک پر جا رکے۔ آدھ پون گھنٹا انہوں نے گاڑی کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہی گزارا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس ملاقات کے عوض حورین نے جو حاصل کیا، وہ یہ تھا کہ عاطف سے بابرہ کے ساتھ شادی کا وعدہ لے لیا۔ وہ اس ملاقات کو اپنی اور عاطف کی آخری ملاقات بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے اس ملاقات میں عاطف کی چھوٹی موٹی بیش قدمیوں کو راستہ بھی دے رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر وہی الفاظ "بغیر گنگنائے" عاطف سے کہے۔ "چھوڑ دے ساری دنیا، کسی کے لیے..... یہ مناسب نہیں آدمی کے لیے۔"

یقیناً یہ حورین وہی دوسری عورت تھی جو پہلی محبت میں لٹے پٹے مرد کی زندگی میں اکثر و بیشتر آتی ہے۔ محبت اور جیون کے سوکھے چشموں کو رواں کرنے کی کوشش کرتی ہے اور عموماً وہ ہو بھی جاتے ہیں۔ اب یہ عورت کس معاشرتی اسلوب کے ساتھ آتی ہے اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ملاقات کے آخر میں عاطف نے ہلکی چاندنی میں دور تک جاتی ہوئی خالی سڑک کے کنارے کو دیکھا اور بولا۔ "اگر واقعی یہ ہماری آخری ملاقات ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس سڑک اور اس جگہ کو یاد رکھوں..... اور پھر ایک وقت ایسا آئے جب میں یہاں ایک یادگار بنوا دوں۔"

وہ زیرِ لب سے بولی۔ "اور پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے؟"

"کیا؟"

"آپ یہ جگہ بھول جائیں۔ ہم پر بیتا ہی دے چلے کہ کہاں یادگار بنانی ہے؟" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

دونوں اس کو آخری ملاقات کہہ رہے تھے۔ تاہم شاید دونوں کے دلوں کی گہرائی میں کہیں یہ بات بھی موجود تھی کہ شاید یہ آخری ملاقات نہ ہو اور حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ یہ بات آگے چلنے والی تھی..... اور پھر ایک دن اسی ایریا میں لگی ہی ایک قریبی خالی سڑک پر، ویسی ہی سرد شب میں ایک سنسنی خیز واقعہ رونما ہونے والا تھا۔

قریباً ایک ماہ بعد عاطف کی شادی بابرہ سے ہو گئی۔ اس شادی کی تیاری میں حورین نے بھرپور حصہ لیا۔ عاطف کی ایک شادی شدہ بہن بھی تھی۔ میں نے حورین کو اس کے ساتھ کئی بار شادی کی شاپنگ کے لیے جاتے دیکھا۔ اکثر وہ شادی کے حوالے سے کوئی مشورہ دینے لینے کے لیے چھوٹے نومی کے ساتھ عاطف کے گھر بھی چلی جاتی تھی۔ شادی کی تقریبات تیل مہندی وغیرہ میں بھی اس نے نمایاں حصہ لیا۔ وہ میک اپ نہ ہونے کے برابر کرتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے دودھیا چہرے پر ایک طرح کی چمک ہوتی تھی۔ میں بلا لفظ استعمال نہ کر جاؤں ایک طرح کی تقدیس دکھائی دیتی تھی چہرے پر۔ شاید عجیب سا لگے کہ میں ایک ایسی عورت کے چہرے پر تقدیس کا کہہ رہا ہوں جو شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود بے وفائی اور گناہ کی مرتکب ہو رہی تھی۔ میں نے شروع میں بھی کہا ہے کہ میں عاطف اور حورین کے کرداروں کا بیان قطعی غیر جانبداری سے کر رہا ہوں۔ کچھ کے نزدیک یہ کردار بہت برے ہو سکتے ہیں اور کچھ کے نزدیک اس کے برعکس بھی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ حورین کا جو کردار بھی سامنے آ رہا تھا اس میں شوہر جمشید کی کچھ شدید کج رویوں کا عمل دخل بھی تھا۔ ان میں نے کچھ کج رویوں کی نسبت ازدواجی تعلقات اور بیڈ روم کے معاملات سے بھی تھی۔

☆☆☆

پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے میں ایک بار تو میں ضرور چلا جاتا تھا۔ وہاں غزلیں اور نظمیں بھی تنقید کے لیے پیش کرتا تھا۔ بڑی خوبصورت شامیں دیکھیں وہاں۔ کئی ادبی سفر کے بھی ملاحظہ

کیے۔ ہر نشست میں ایک دو اہل قلم ایسے ہوتے تھے کہ تنقید برائے تنقید فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ادھر کسی نے کوئی جملہ بولا ادھر انہوں نے اس کے لتے لینے شروع کردیے۔ جیسے ہر دلعزیز سیاستداں مرحوم نصراللہ خان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پیدائشی طور پر حزب اختلاف میں شامل تھے۔ بالفرض، وہ اگر کسی انجان جزیرے پر پہنچتے تو سب سے پہلے یہ پوچھتے کہ یہاں کوئی حکومت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ملتا تو وہ فوراً اعلان کرتے..... میں اپوزیشن میں ہوں، اس حکومت کو اپوز کروں گا۔

پاک ٹی ہاؤس کی تنقیدی نشستوں میں حصہ لینے والے ایک صاحب سے جان پہچان ہوئی عمر 60 سال سے اوپر تھی۔ اچھے شعر کہتے تھے۔ شکل صورت بھی اچھی تھی۔ مضافاتی علاقے سے تعلق رکھنے والی اپنی ایک مداح لڑکی کو منہ لگا بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایک شعلہ جوالا تھی جلد ہی محبت کی کئی منزلیں طے ہوئیں اور ایک موقع پر لڑکی کی رضامندی سے اچانک بات "خلوت کے تعلق" تک جا پہنچی۔ وہ شاید اس کی توقع نہیں کررہے تھے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دو چار ایسی ملاقاتوں میں وہ کچھ طاقت بخش دوائیں لے کر سرخرو ہوئے۔ پھر ایک دن اچانک برین ہیمرج ہوا اور ان کا ایک پاسا مارا گیا، کچھ عرصہ ان کی علالت کی خبر ملتی رہی، پھر کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں گئے۔

ایک دن فون پر ہی معراج صاحب کی ٹھہری ہوئی دلکش آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "طاہر، ہم تم سے کچھ طویل لکھوانا چاہتے ہیں۔ لکھ لوگے نا؟"

"کیوں نہیں جناب، اگر آپ پوچھ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ میں لکھ سکتا ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے دو چار دن میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

میں سمجھتا تھا کہ وہ دو چار دن محاورتاً کہہ رہے ہیں، مگر واقعی چوتھے روز کوئی میرے پاس لاہور پہنچ گیا۔ یہ انور فراز تھے جو ان دنوں سرگزشت ڈائجسٹ کو دیکھ رہے تھے۔ سرگزشت ان دنوں نیا نیا منظر عام پر آیا تھا۔ سرگزشت کا مزاج اور انداز ہر کسی کو بھا رہا تھا۔ معراج صاحب کی ہدایت پر انور فراز کتابوں کا ایک پلندہ بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ دراصل جبار توقیر کی قسط وار کہانی گمراہ کے مجموعے تھے۔

انور فراز ان دنوں بہت فعال اور سوشل تھے۔ شدید قسم کے پان بڑی شدت کے ساتھ کھاتے تھے۔ جس طرح عثمان پیسوکر ہوتے ہیں وہ "عثمان پیدل ٹی فر" تھے۔ انہوں نے میرے گھر میں ہی قیام کیا۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ "طاہر، ہم چاہتے ہیں کہ تم پنجاب کے پس منظر والی اس کہانی "گمراہ" کو آگے بڑھاؤ۔ میں مجموعے بھی ساتھ لایا ہوں، انہیں پڑھ لو تاکہ سمجھ میں آجائے کہ کہانی کس طرح آگے بڑھانی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ پنڈی کے جبار توقیر یہ کہانی لکھ رہے تھے، مگر ان کی وفات ہوگئی، پھر یہ کہانی کراچی کے دسی بداہیونی کو سونپ دی گئی مگر وہ بھی زیادہ دن نہ جی سکے۔ اب مجھے کہا جارہا تھا کہ گمراہ لکھوں۔

میں نے کن انکھیوں سے انور فراز کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا..... کام تو آپ خطرناک ہی لے کر آئے ہیں..... لیکن چلیں، اگر ارباب بست وکشاد کی یہی مرضی ہے تو۔

میں نے دو تین ہفتوں میں ہی گمراہ کے سارے مجموعے پڑھ ڈالے اور کہانی بڑھانے کے لیے خاکہ بھی تیار کرلیا۔ اس دوران میں معراج صاحب سے بھی فون پر رابطہ ہوتا رہا۔ بالآخر میں نے بڑے جذب کے ساتھ گمراہ کی پہلی قسط لکھی۔ اس قسط کا زیادہ تر حصہ میں نے پنجاب پبلک لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ پنجاب پبلک لائبریری ہی کیوں؟ اس کا جواب بھی دلچسپ ہے، آگے چل کر دیتا ہوں۔

میں نے پہلی قسط کراچی بھیج دی۔ معراج صاحب اور انور فراز دونوں کو قسط بہت پسند آئی۔ تین چار روز بعد ہی معراج صاحب کا فون آگیا۔

پُرسوچ لہجے میں بولے۔ "طاہر، ہم نے سوچا ہے کہ کیوں نا گمراہ کو ایک طرف رکھ دیا جائے۔ یہ قسط جو تم نے لکھی ہے اسے "تاوان" کا نام دیا جائے اور تاوان کے نام سے ہی یہ سلسلہ آگے بڑھایا جائے۔"

"لیکن جناب، میری قسط میں تو گمراہ کے کرداروں کے نام آئے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ ہیرو بھی غلام جیلانی ہی ہے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ ہم ٹھیک کرلیں گے۔ تم بس تاوان کے نام سے ہی کہانی آگے بڑھاؤ۔ کرداروں کے نئے نام بھی خود ہی سوچ لو۔"

ان کی دور رس نگاہ اور ان کی آواز قلم کار کے اندر نئی روح پھونک دیتی تھی۔ یہ روح میرے اندر بھی پھونکی گئی۔

کال ختم ہوئی تو میں نے سوچا..... جان بچی سو لاکھوں پائے۔ گمراہ سے جان چھوٹ گئی ہے۔ اُمید ہے اب کچھ دن اور جی لوں گا۔

بعد میں یہ بات میں نے انور فراز کو بتائی، وہ خوب ہنسے۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو ، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف فنکار کی خود بیتی کا نواں حصہ جو خود میں منفرد ہے

تاوان کا آغاز ہوا تو قلم کی روانی بڑھتی چلی گئی۔ پنجاب کے سارے کھیت کھلیان، دریا، باغات اپنے سارے موسموں سمیت مجھے اپنے قلم میں اترتے محسوس ہوئے، اور اس کے ساتھ ہی گرما کی سنسان دوپہروں اور سرما کی طویل سیاہ راتوں میں دیہاتی علاقوں میں نمو پانے والی ان گنت، کتھائیں پردہ تصور پر ابھر آئیں۔ اس سے پہلے زیادہ تر قسط وار کہانیاں شہری اور دیہی سندھ کے ماحول میں ہوئی تھیں..... بہت سے قارئین کو یہ تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔

میرے اپنے خاندان میں دیوتا، موت کے سوداگر اور شکاری وغیرہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی تھی۔ اب تاوان کو بھی ویسی ہی توجہ اور پذیرائی ملی تو میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ فیملی میں ایک بھائی صاحب تو ایسے تھے جو قسط شائع ہونے سے قبل ہی مسودے کی فوٹو اسٹیٹ مجھ سے لے جاتے تھے۔ آفاقی صاحب اور طارق اسمٰعیل ساگر جیسے قلم کاروں کے ہاں بھی کہانی دلچسپی سے پڑھی جانے لگی۔ اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ان کے فون آتے تو ایک نیا ولولہ پیدا ہو جاتا۔

یہی دورانیہ تھا جب معراج صاحب کی دعوت پر میں نے کراچی کا رخ کیا۔ ان دنوں فضائی کرائے آج کل کی طرح ہوشربا نہیں تھے۔ میں نے کراچی کا یک طرفہ ٹکٹ لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ واپسی پر بذریعہ ٹرین شہر شہر دیکھتا ہوا آؤں گا۔

یہ غائبانہ معراج صاحب سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ ان کی شخصیت مسحور کن تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دانش آمیز ٹھہراؤ، ہمدردی اور محبت کا ایک ہالہ سا ان کے گرد موجود ہے۔ چائے پلانے کے بعد انہوں نے مجھے انور فراز کے حوالے کر دیا۔ میں ان کے آفس سے باہر نکلنے لگا تو بولے۔

''طاہر! یہ جو تمہاری مختصر کہانیاں ہیں، ان کا ریکارڈ بھی رکھتے ہو یا نہیں؟''

''جی مکمل ریکارڈ تو نہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

وہ بولے۔ ''انہیں سنبھال کر رکھو۔ یہ کتابی شکل میں شائع ہو سکتی ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ معیار کے لحاظ سے غیر ملکی کہانیوں کے قریب قریب ہیں۔''

معراج صاحب کے یہ الفاظ میرے لیے کسی چمکتے دمکتے تمغے سے کم نہیں تھے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔

انور فراز نے دوپہر کے کھانے کا انتظام وہیں دفتر

کے ایک کمرے میں کیا۔ جمال احسانی بھی وہیں موجود تھے۔ بار بار میرے سراپے کو دیکھتے تھے جیسے یقین نہ کر پا رہے ہوں کہ تاوان اور سسپنس کے آخری صفحات کی کہانیاں میں ہی لکھ رہا ہوں۔ ایک لطیفہ بھی ہوا۔ کھانے میں دو تین سالن تھے۔ ایک سالن اروی کی سبزی جیسا بھی تھا بہت مزیدار تھا۔ میں نے شوق سے کھایا۔ کھانے کے بعد انور فراز نے پوچھا۔ ''طاہر! کبھی جھینگا وغیرہ بھی کھایا۔''

جھینگے کے نام سے مجھے ذرا کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے برا سا منہ بنا کر نفی میں سر ہلایا۔

وہ تڑنت بولے۔ ''تو یار! ابھی کیا کھایا ہے تم نے؟ یہ جھینگا ہی تو تھا۔'' وہ اروی کے سالن جیسی چیز کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

میں سوچتا رہ گیا کہ اگر یہ جھینگا ہی تھا تو کچھ ایسا برا بھی نہیں تھا۔

جمال احسانی کا غالباً ارادہ تھا کہ رات کو اپنی طرف سے میری دعوت کی جائے مگر میرا اندازہ ہے کہ آدھ پون گھنٹے کی نشست کے بعد انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دس بارہ فقروں کے جواب میں، میں ایک آدھ فقرہ ہی بولتا ہوں۔ ایسے کم گو، کم آمیز اور زاہد خشک نما، کی موجودگی میں کیا محفل آرائی ہو سکتی تھی۔

رات کو قیام معراج صاحب کے شاندار گھر واقع ڈیفنس میں تھا۔ ہم دفتر سے گھر جانے کے لیے نکلے۔ دروازے پر ایک لمبی سے چمکتی دمکتی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ معراج صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے شتابی سے عقبی نشست والا دروازہ کھولا۔ بیٹھنا ہی چاہ رہا تھا کہ انہوں نے روکا۔ ''نہیں طاہر! آگے بیٹھو۔''

میں ششدر ہوا۔ اتنی عزت افزائی کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی میں اس کا متحمل تھا۔ میں نے کہا۔ ''سس..... سر آپ بیٹھیں۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں بھئی۔ بیٹھو آپ۔''

تب میری نظر عقب میں گئی اور مسز معراج، محترمہ عذرا رسول نظر آئیں۔ اب میری ناقص سمجھ میں آیا کہ عقبی نشست پر معراج صاحب کے ہمراہ انہیں بیٹھنا ہے۔

گھر میں ہر آرام آسائش موجود تھی۔ بالائی منزل کا ایک کشادہ کمرا میرے تصرف میں آیا۔ معراج صاحب کا حسن اخلاق اور مشفقانہ رویہ کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ سونے سے قبل دو تین بار خود آ کر پوچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میں شرمندگی سے زمین میں گڑا جاتا تھا۔

بیڈ روم کی کھڑکیوں میں سے عمارتوں کی روشنیاں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ اس وقت مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ نامور ناول نگار شوکت صدیقی بھی اس عمارت کے بالکل سامنے رہائش رکھتے ہیں یا رکھنے والے ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو کھڑکیاں کھول کر ضرور دیکھتا اور پھر عین ممکن تھا کہ سامنے والی کوٹھی کی کسی روشن کھڑکی میں مجھے خدا کی بستی اور جانگلوس جیسے لازوال ناولوں کا تخلیق کار، بیٹھا نظر آ جاتا۔ اپنا بے مثال قلم انگلیوں میں دبائے کسی سوچ میں مگن (یاد رہے کہ ناول ''خدا کی بستی'' کا ترجمہ بہت سی غیر ملکی زبانوں میں ہو چکا ہے اور شوکت صدیقی صاحب کے لکھے الفاظ پوری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں) یہ عظیم فنکار 2006ء میں 83 سال کی عمر میں ہم سے جدا ہوا۔

کراچی کے غالباً اسی وزٹ میں پیپلز پارٹی کی مرکزی رہنما شہلا رضا سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں وہ ایک دبلی پتلی لڑکی تھیں۔ اپنے شوہر نامدار غلام قادر صاحب کے ساتھ گنجان آبادی کے ایک گھر کے بالائی پورشن میں رہائش پذیر تھیں۔ ابھی بس ڈائجسٹوں وغیرہ میں ہی لکھ رہی تھیں۔ میرے ساتھ انور فراز بھی تھے۔ ہماری تواضع چائے اور تلے ہوئے نمکین مٹر دانوں سے کی گئی۔ ان کا ذائقہ آج تک یاد ہے۔ وہ بہت خوش و خرم جوڑا تھا جس کے ساتھ ہم نے کچھ وقت گزارا۔

بعد ازاں کچھ عرصے بعد اس جوڑے کو ایک ناگہانی سانحے کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کے دو کم سن بچے انہیں داغ مفارقت دے گئے۔ اس بہت بڑے صدمے سے سنبھلنا..... اور پھر سندھ اسمبلی کے اسپیکر کے عہدے تک پہنچنا ایک مضبوط اور باحوصلہ عورت کا ہی کام تھا۔

وزٹ کے اگلے روز انور فراز اور جمال احسانی کے ساتھ میں نے ایک تقریب میں شرکت کی۔ یاد نہیں وہ کسی شادی کی تقریب تھی یا کوئی گیٹ ٹو گیدر تھا۔ تقریب کے دوران ہی میں ہوا خوری کے لیے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ راستہ بھولنے کے سبب واپسی میں کچھ تاخیر ہوئی۔ انور فراز کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کیونکہ معراج رسول صاحب نے مجھ نو وارد کو ان کے سپرد ہی کیا تھا۔

وہ تیز تیز پان چباتے، ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

''بھئی، میں تو باقاعدہ پولیس کو اطلاع دینے کا سوچ رہا تھا۔ آج کل یہاں اغوا کی وارداتیں زوروں پر ہیں۔ اغوا کار تو عام لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتے، تم تو پھر مصنف ہو۔ ڈائجسٹوں میں اچھے مصنفوں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ آیندہ احتیاط کرنا۔''

کراچی کے حالات ان دنوں واقعی دگرگوں تھے۔ بوری بند لاشوں کی بازگشت بھی تھی۔ مجھے یاد ہے، میں کچھ خریدنے کے لیے باہر بازار میں نکلا۔ ایک مقامی بزرگ نے مجھے روک لیا۔ بولے۔ ''پنجاب وغیرہ سے آئے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

کہنے لگے۔ ''میرا بھی یہی خیال تھا۔ کراچی میں آج کل لوگ سڑک کے کنارے اس طرح چلتے ہیں کہ آنے والی ٹریفک انہیں سامنے سے نظر آرہی ہو، تاکہ اگر کوئی گڑبڑ کرنے لگے تو پتا چل جائے۔ تم برعکس جارہے ہو، کوئی نقصان نہ ہوجائے۔''

کراچی میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا مگر معراج صاحب کی ہدایت پر ایک بار پھر مجھے سارے شہر کی یاترا کرائی گئی۔ اگلے روز ٹرین کا ٹکٹ بک تھا اور علی الصباح روانگی تھی۔

اندھیرا ابھی چھٹا نہیں تھا۔ کوٹھی میں ہو کا عالم طاری تھا۔ معراج صاحب نے عین وقت پر مجھے جگا دیا۔ بے شمار دیگر خوبیوں کی طرح دوسروں کی آسانیوں کا خیال رکھنا بھی ان کی خوبی میں شامل تھا۔ علی الصباح، منہ اندھیرے کسی ملازم کو جگانے کے بجائے وہ کچن میں چلے گئے۔ میں ششدر رہ گیا جب وہ خود بریڈ، مکھن اور جیم وغیرہ لے کر ڈائننگ ٹیبل پر آگئے اور اپنے ہاتھوں سے میرے لیے سلائس تیار کرنے لگے۔ میں شرم اور احسان مندی کے جذبے سے زمین میں گڑا جارہا تھا۔

اور یہ سلوک کوئی میرے ساتھ ہی خاص نہیں تھا۔ ان کی میزبانی ایسی ہی مہربانیوں سے عبارت ہوتی تھی، میں تو دو تین بار ہی ان کا مہمان بنا، علی سفیان آفاقی صاحب کراچی جاتے تو اکثر ان کے ہاں ہی ٹھہرتے۔ اپنے مصنفین اور دیگر کارکنوں سے ان کا حسن سلوک زبان زد عام رہتا تھا۔ ناشتے کے بعد مجھے اہتمام سے الوداع کہا اور اپنے ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں روانہ کیا۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ یہی کراچی تھا جہاں میں چند سال پہلے اپنی کہانیوں کے نمونے لے کر سڑکیں ناپ رہا تھا اور ''جے ڈی پی'' سے مناسب رابطہ کیے بغیر مایوسی کے عالم میں لاہور واپس چلا گیا تھا۔

ان دنوں لاہور میں اسٹیج ڈرامے عوامی مقبولیت حاصل کرنا شروع ہوگئے تھے۔ لاہور میں سب سے پہلا اسٹیج ڈراما میں نے کالج کے دور میں دیکھا تھا۔ الفلاح سینما کے آس پاس ایک چھوٹے سے یخ بستہ ہال میں یہ معاشرتی پلے اسٹیج ہوتے تھے۔ عموماً سنجیدہ کہانیاں ہوتی تھیں جن میں مسعود اختر، قوی خان اور عطیہ شرف جیسے آرٹسٹ پرفارم کرتے تھے۔ پھر بتدریج اسٹیج ڈرامے میں مزاح کا رنگ شامل ہوا اور اس نے عوامی طبقوں میں راہ پالی۔ بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوگا کہ ان پر مزاح اسٹیج ڈراموں کے اوّلین اداکار البیلا، خالد عباس ڈار، اشرف راہی، عابد خاں وغیرہ تھے۔ ان میں سے کچھ ڈرامے باغ جناح کے اوپن ایئر تھیٹر میں بھی اسٹیج ہوتے تھے۔ عموماً یہ صاف ستھرے ڈرامے ہوتے تھے۔ فیملیاں بھی بلاجھجک چلی جاتی تھیں۔ ایسا ہی ایک ڈراما میں نے اوپن ایئر تھیٹر میں اپنی سسٹر اور اہلیہ کے ساتھ دیکھا۔ اس ڈرامے میں مجھے ایک سوکھا سڑا، دبلا پتلا سادہ نوجوان پہلی بار نظر آیا جو آگے چل کر اسٹیج کا بے تاج بادشاہ کہلانے والا تھا۔ جی ہاں میری مراد امان اللہ ہی سے ہے۔ اس کے چہرے پر بے انتہا سنجیدگی اور لہجے میں بلا کی کاٹ تھی جیسے کوئی آگ تھی اس کے اندر جو اردگرد کی ہر شے کو لپک لینا چاہتی تھی۔ امان اللہ نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حریف اداکاروں کو اسٹیج کے معرکوں میں دفاعی پوزیشن پر کھڑا کردیا۔ اسٹیج کے جگت مقابلوں میں چند ماہ کے اندر ہی اس کی فتح یقینی سمجھی جانے لگی تھی۔

شاید بہت سے قارئین نہ جانتے ہوں کہ مزاحیہ اسٹیج ڈراموں میں اداکاری ایک نہایت ہی مشکل کام ہے۔ خاص طور سے اس نوع کے ڈرامے جو پاکستان میں اسٹیج کیے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں کی کہانی کا بنیادی عنصر جگت ہوتی ہے۔ بلکہ آج کل تو کہانی سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ بس ایک موہوم سے خاکے پر ایک آدھ ریہرسل کے بعد کھیل شروع کردیا جاتا ہے۔ ڈراموں کا پچانوے فیصد حصہ ڈانس اور جگتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ آج کل جس طرح کے ڈانس اور جگت مقابلے پیش کیے جارہے ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر بھی کیا جائے..... تاہم ایک حقیقت سے انکار ناممکن ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جگت ایک فی البدیہہ چیز کا نام ہے اور جگت بازی کے مقابلے نورا کشتی

نہیں بلکہ اصل کشتی کے زمرے میں آتے ہیں۔ اداکاروں کو ہر شام ایک اصل دنگل میں اترنا پڑتا ہے۔ اپنی عزت بچانا ہوتی ہے اور حریف کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فقرہ بازی اور جگت کے یہ مقابلے پانچ چھ سال کے اندر ہی اداکار کو کھا جاتے ہیں۔ اس کا سانس پھولنا اور دم خم ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ نئے تازہ دم جگت باز اس کی جگہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔

میں نے اور میرے کزن شعیب نے اچھے بھلے دنوں میں اسٹیج ڈرامے دیکھنا شروع کیے تھے۔ لنڈا بازار، شرطیہ مٹھے، بڑا مزہ آئے گا اور ''نعیقا ان امریکا'' وغیرہ انہی دنوں کے یادگار ڈرامے ہیں۔ اس کے بعد اسٹیج ڈراما بتدریج پستی میں گرتا چلا گیا اور ہم اس سے دور ہوتے چلے گئے۔

سرگزشت میں تاوان زور و شور سے جاری تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے تاوان کی کئی ابتدائی اقساط میں نے پنجاب پبلک لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھ کر لکھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ریفرنس بک آسانی سے مل جاتی تھی۔ دوسری وجہ دلچسپ تھی۔ دراصل میں گھر سے ملازمت پر جانے کے لیے نکلتا تھا اور آبیٹھتا تھا پنجاب پبلک لائبریری میں۔ مجھے پتا تھا کہ اگر میں ملازمت کا بہانہ نہ کروں گا تو گھر والے مجھے چھ سات گھنٹے تک گھر اور دکان سے اوجھل رہنے کا وقت کبھی نہ دیں گے۔

ایک روز میں اسی طرح لائبریری میں بیٹھا تاوان لکھنے میں گم تھا کہ میرے چھوٹے ماموں ایوب فاطمی جو خود بھی شعر و ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اتفاقاً پنجاب لائبریری آدھمکے۔ انہوں نے مجھے وہاں دیکھ لیا۔ اگلے روز وہ ہمارے گھر واقع اقبال ٹاؤن پہنچ گئے۔ میں حسبِ معمول ''جاب'' پر گیا ہوا تھا۔ ماموں نے خالہ مریم سے پوچھا۔

''طاہر کہاں ہے؟''

وہ بولیں۔ ''جاب شروع کی ہوئی ہے نا اس نے۔''

''جاب تو اس نے چھوڑ دی تھی کافی عرصہ پہلے۔''

(دیدشنید والی جاب)

خالہ بولیں۔ ''کوئی اور جاب ہے۔ بڑی محنت کر رہا ہے۔ صبح سویرے تیار ہو کر بہت جلدی میں نکل جاتا ہے۔''

ماموں مسکرائے۔ ''جاب شاب کوئی نہیں کر رہا وہ، وہاں لائبریری میں جا کر بیٹھا رہتا ہے۔ کہانی وغیرہ لکھتا ہے۔ دراصل شہر شاپ مل پر اڑتے برادے اور گرد وغیرہ سے بچنا چاہتا ہوگا۔''

خالہ جی کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''چلو مجھے تو بتا دیا ہے اب اس کے ابا جی کو نہ بتانا۔ بہت ناراض ہوں گے۔''

بہرحال بات ابا جی تک تو نہ پہنچی مگر باقی سب گھر والوں کو میری اہلیہ سمیت، معلوم ہو گئی۔ تھوڑی سی شرمندگی تو ہوئی کہ مجھے غلط بیانی کرنا پڑی تاہم میں نوائے وقت اور جے ڈی پی وغیرہ سے اتنا تو کما ہی رہا تھا جتنا کسی چھوٹے موٹے جاب سے کما سکتا۔

لکھنے لکھانے کے لیے میں کبھی کبھی امریکن سینٹر کی لائبریری میں بھی چلا جاتا تھا۔ ان دنوں آج کل جیسی سیکیورٹی پابندیوں کا دور دور پتا نہیں تھا۔ یار لوگ امریکن سینٹر اور برٹش کونسل وغیرہ میں بھی دندناتے ہوئے یوں... جا گھستے تھے جیسے اپنے گھر کا صحن ہو۔ امریکن سینٹر میں زبردست سہولتیں موجود تھیں۔ لاہور کی تپتی ہوئی دوپہروں میں اندر کا موسم اتنا خنک کہ ہم باہر آ کر دھوپ سینکتے اور موٹنگ پھلی ٹھکورنے کو دل چاہتا۔ اندر ہی بہترین کینٹین بھی موجود تھی۔ جہاں مناسب داموں اچھا لنچ ہو جاتا تھا۔ ریڈنگ روم کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا تھا اور میں اس ہجوم کے بیچوں بیچ بیٹھا تاوان یا سسپنس کے آخری صفحات کی کہانی لکھنے میں مصروف ہوتا تھا۔ استقبالیہ پر اجلے چہرے والی ایک دلکش لڑکی بیٹھی ہوتی تھی۔ وہ وہیں بیٹھی بیٹھی لائبریری کے مختلف امور بھی انجام دیتی تھی۔ مجھے عموماً اس کے آس پاس ہی میز ملتی تھی۔ تاوان لکھتے ہوئے میں اکثر کہانی کی بھول بھلیوں میں یوں گم ہوتا کہ اردگرد کی کچھ خبر نہ رہتی۔ میں ایسے میں بالکل نادانستہ طور پر اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا۔ مجھے پتا ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ عمل کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم۔ میں وہاں موجود ہی کب ہوتا تھا۔ میں تو کہانی کے کرداروں استاد جہانی اور غزالہ وغیرہ کے ساتھ کسی اور ہی دنیا میں پایا جاتا تھا۔ کسی وقت میں اپنے ٹرانس سے باہر آتا تو مجھے پتا چلتا کہ میں نے قلم دانتوں میں دبا رکھا ہے یا انگلیوں میں گھما رہا ہوں اور مکمل بے دھیانی میں میری نگاہیں اس کی خوبصورت آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں۔ میں گڑبڑا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔

ایک دن تو مجھے بالکل یہی لگا کہ وہ چمکیلے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر تیزی سے قدم اٹھاتی میری طرف آئے گی اور پوچھے گی۔ ''جناب کا کیا مسئلہ ہے کیوں ٹکٹکی لگائی ہوئی ہے میری طرف؟''

ایسا کچھ نہیں ہوا، بہرطور میں نے خود احتسابی کی اور اس بے ساختہ عمل کو روک لیا۔ یہ خود احتسابی چند دن تو برقرار رہی تب ایک بار پھر بے دھیانی میں یہی عمل شروع ہوگیا۔ وہ اللہ کی نیک بندی بھی سمجھ گئی کہ میں کچھ لکھ لکھا رہا ہوں اور جب سوچ بچار کے دوران میں اردگرد دیکھ رہا ہوتا ہوں تو دراصل وہاں موجود ہی نہیں ہوتا۔ یقیناً کئی اور لکھنے والوں کے ساتھ بھی اس طرح کی صورتِ حال پیش آتی ہوگی۔

چند گھنٹے امریکن سینٹر میں گزار کر جب میں باہر نکلا کرتا تھا تو اردگرد کے لوگ اپنی عادات واطوار سمیت مقامی اور دیسی قسم کے محسوس ہوتے تھے۔ البتہ آدھ پون گھنٹے میں ہی افاقہ محسوس ہونے لگتا تھا۔ جب نمبر شاپ پر پہنچتا جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہوتی تھیں اور ہوا میں لکڑی کا برادہ اڑ رہا ہوتا تھا تو مکمل یقین آجاتا تھا کہ میں پاکستانی ہی ہوں۔

امریکن سینٹر میں نظر آنے والی ایک اور لڑکی یاد آگئی ہے۔ نین نقش اچھے، قد لمبا اور جسم دبلا پتلا تھا۔ ''لیکن جہاں جہاں دبلا پن برا لگتا ہے وہاں ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنے لمبے بال لہراتی، خوشبو بکھیرتی ذرا سہمی سہمائی سی ریڈنگ روم میں داخل ہوتی تو سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ حتیٰ کہ مذہبی شکل وصورت رکھنے والے ایک صاحب بھی اس پر یوں نظر ڈالتے کہ بس ڈالتے ہی چلے جاتے۔ غالباً وہ اسی مشہور کلیے کے قائل تھے کہ کسی مہ جبیں پر پہلی نظر پڑ جائے تو پھر اسے پڑی رہنے دو کہ پہلی نظر کے لیے رعایت ہے۔

اچھی بھلی لڑکی تھی مگر گھبرائی سہمی سی نظر آتی تھی۔ ہاتھوں میں لرزش، اٹھتے بیٹھتے کوئی چیز گرا دیتی۔ کبھی ہاتھوں سے کتابیں گر جاتیں، پھر جھک کر انہیں سمیٹنے کی کوشش میں کچھ اور بھی بکھر جاتا یا بگڑ جاتا۔ مجھے وہ جنگل میں کسی ایسی سہمی بدکی ہرنی کی طرح نظر آتی جسے شکار کرنے کے لیے کسی بھی دو پاؤں والے جانور کا دل مچل سکتا تھا۔ جیسے وہ بہ زبانِ خاموش خود کہہ رہی ہو کہ میں دستیاب ہوں، بڑی آسانی سے تمہارے جال میں پھنس سکتی ہوں۔ ایک دو بار مجھ سے بھی اس نے دو تین مختصر جملوں کا تبادلہ کیا۔ آواز اچھی تھی لیکن اس میں بھی عجب طرح کی ناتوانی اور کپکپاہٹ تھی۔ دل چاہا کہ اسے کہہ دوں کہ وہ گھر بیٹھا کرے۔

اسے دیکھ کر مجھے کرکٹ کے کمنٹیٹرز کا وہ جملہ یاد آجاتا تھا جب وہ ماٹھی گیند پر اکثر بولتے ہیں۔ ''..... بہت کمزور گیند تھی۔ خود بلے باز سے ڈیمانڈ کررہی تھی کہ اسے باؤنڈری سے باہر بھیج دیا جائے۔''

کبھی وہ روزانہ امریکن سینٹر آتی، کبھی ایک دو روز کا وقفہ ڈالنے لگتی۔ صاف نظر آتا تھا کہ سینٹر میں نظر آنے والے کچھ لڑکوں کی رالیں ٹپک رہی ہیں اور وہ اس کے اردگرد منڈلاتے ہیں۔ وہ نت نئے لباس پہنتی اور بالوں کا اسٹائل بھی بدلتا رہتا۔

پھر وہ کچھ دنوں کے لیے غائب ہوگئی۔ انہی دنوں میں نے بھی ریفرنس وغیرہ کے لیے پنجاب پبلک لائبریری جانا شروع کردیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد دوبارہ امریکن سینٹر جانا شروع کیا تو وہ دوبارہ کہیں نظر نہیں آئی۔ سوچا، پتا نہیں کیا انجام ہوا ہوگا، اس کے لیے دعائے خیر نکلی۔

غالباً دو تین ماہ بعد کی بات ہے۔ میرا مری جانا ہوا۔ جی پی او کے سامنے سے ایک کھردری سڑک نیچے پرانی مری کی طرف جاتی ہے۔ میں اس سڑک پر جارہا تھا کہ میری نظر اچانک اسی لڑکی پر پڑی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ چمکیلے لباس میں تھی۔ لگتا تھا نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ ہوئی بھی یا نہیں۔ ساتھ میں ذرا فربہ جسم کا ایک نوجوان تھا۔ اس نے بھی نئی شادی جیسا پینٹ کوٹ زیبِ تن کررکھا تھا۔ یہ ایک بالکل تنگ سی ڈھلوان سڑک ہے۔ ایک سوزوکی لوڈر تیزی سے اوپر آرہی تھی۔ اس سے بچنے کی کوشش میں لڑکی لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی۔ ذرا سخت نقوش والے نوجوان نے اسے ڈانٹا۔ ''کیا کرتی ہو۔ ابھی گرنے لگی تھی۔'' جواب میں وہ جلدی سے دوبارہ سوری بولی۔

اگر وہ دونوں واقعی شادی شدہ تھے تو پھر نئی نئی شادی میں شوہر کا بیوی کو اس طرح سے ڈانٹنا ظاہر کرتا تھا کہ ان کی آئندہ زندگی کس طرح کی گزرنے والی ہے۔ مجھے اس دراز قد خوبصورت لیکن اول جلول سی لڑکی پر ترس آیا لیکن زیادہ دیر ترس بھی نہیں آسکا کہ وہ دونوں ہجوم میں گم ہوگئے۔ اس کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا۔

☆☆☆

عاطف کی شادی ہوچکی تھی۔ بظاہر میاں بیوی خوش تھے لیکن عاطف اور حورین کے درمیان وہ جو ایک معاملہ شروع ہوچکا تھا بدستور اپنی جگہ موجود تھا۔ اب ملاقاتیں تو ختم ہوچکی تھیں مگر ٹیلیفون پر رابطہ گاہے بگاہے ہوتا رہتا تھا۔ اس خفیہ رابطے کا علم کم از کم عاطف کی بیوی بابرہ کو تو ہرگز نہیں تھا۔ حورین کے شوہر جنید کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے بھی عاطف کی طرف سے کچھ لگتا تھا کہ وہ اس

تعلق سے مکمل طور پر بے خبر نہیں ہے اور جان بوجھ کر ڈھیل بھی دے رہا ہے۔

گلوکاری کے حوالے سے عاطف کی کئی پرستار لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک روز میں نے اسے ایک چلبلی سی لڑکی کے ساتھ کار میں جاتے دیکھا۔ اس کا رخ اسی پرانی طرز کے ساؤنڈ اسٹوڈیو کی طرف تھا جہاں وہ اور جمشید رات گئے تک بیٹھ کر میوزک کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ محرم کی چھٹیوں کی وجہ سے اسٹوڈیو بند تھا۔ میں ابھی تھوڑی دیر قبل اس کے بند شٹر دیکھ کر آیا تھا۔

شام کو عاطف سے ملاقات ہوئی تو میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''آج کس کو بٹھا رکھا تھا ساتھ؟ کیا کوئی نیا چکر شروع ہو رہا ہے؟''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں پرانے چکر کے ہوتے ہوئے کوئی نیا چکر شروع کر سکتا ہوں۔'' اس کا اشارہ اپنے اور حورین کے عشق ممنوع کی طرف تھا۔

''تو پھر وہ لڑکی؟''

''ایک فین تھی میری۔ گلوکاری سیکھنا چاہتی ہے۔ اسی حوالے سے اسے جمشید کے حوالے کرنے گیا تھا۔''

میں نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا یہ حوالگی صرف میوزک کے سلسلے میں تھی؟''

میرے چبھتے لہجے نے اسے تھوڑا چونکا دیا۔ کچھ دیر تک اپنے خوبصورت گھونگریالے بالوں میں انگلیاں چلانے کے بعد بولا۔ ''یار طاہر! یہ جمشید ہے نا بہت الجھا ہوا بندہ ہے۔ کسی وقت اس پر تھوڑا ترس بھی آتا ہے۔ اگر یہ کہوں کہ کسی حد تک نفسیاتی مریض بن چکا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یوں لگتا ہے کہ اپنی جسمانی کمی یعنی ٹانگ کے نقص کو اس نے بتدریج اپنا احساس کمتری بنالیا ہے۔ ایک طرف تو حورین کو اپنی منکوحہ بیوی سمجھتا ہے اور کسی طور اپنی ملکیت کھونا نہیں چاہتا، دوسری طرف اور عورتوں سے دوستی بھی رکھنا چاہتا ہے۔''

''تو یہ لڑکی بطور دوست اس کی طرف گئی ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔ اس کا نام ثمینہ ہے۔ جمشید نے اسے دو تین بار میرے ساتھ دیکھا۔ اب یہ اسے میوزک سکھانے کے ساتھ ساتھ اس کے ہمراہ گھومے پھرے گا بھی۔ لڑکی بھی اس سچوئیشن پر خوش ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یار! یہ تم کس کام میں پڑ گئے ہو۔ تم کیوں چھوڑنے گئے اسے جمشید کے پاس؟''

''میں چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ جاتی ہوئی راستے میں مل گئی تھی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

کچھ عجیب سا تعلق پنپ گیا تھا عاطف اور جمشید کے درمیان۔ اس میں دوستی بھی تھی۔ رقابت بھی اور ہمرازی و ہمکاری بھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت بدل گیا تھا عاطف۔ شاید دل کے ہاتھوں بے طرح مجبور ہونے کے بعد وہ بھی یہی سمجھنے لگا تھا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔

حورین کے سوا اسے کسی سے محبت نہیں تھی۔ شاید اپنی بیوی بابرہ سے بھی نہیں۔ ہاں والدہ سے انسیت اور خدمت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔

میں جانتا تھا اسے بہت لڑکیوں کے فون آتے ہیں۔ اس کے فرینڈ سرکل میں سگریٹ اور شراب وغیرہ بھی چلتی تھی۔ ایک بڑی عمر کے گلوکار تو ہر وقت ٹن رہتے تھے مگر جمشید ان ساری خرافات سے کوسوں دور تھا..... ایک زاہد خشک کی طرح۔ اس خشکی کو اگر کوئی تر کرتا تھا تو وہ صرف اور صرف حورین تھی جو ایک بچے کی ماں بھی تھی۔

میں نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ بظاہر بہت اچھے اور صاف کردار کی مالک حورین کے شوہر جمشید میں کچھ کج رویاں تھیں۔ ان کج رویوں کا تعلق ازدواجی تعلقات سے بھی تھا۔ یہ وہی دور تھا جب وی سی آر کے بعد موبائل فون بھی کسی حد تک ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ دیکھنے اور سننے کے لیے غیر اخلاقی مواد تک ہر کسی کو رسائی مل چکی تھی۔ یہ صورتِ حال لاڈلا ماڈ ذہنوں پر اثر ڈالتی ہے۔ کہیں یہ اثرات کم شدت کے ہوتے ہیں کہیں زیادہ شدت کے۔ حورین کا خاوند جمشید بھی زیادہ شدید اثرات والے لوگوں میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اب راز نہیں تھی کہ وہ کبھی کبھی ڈرنک بھی کرتا ہے۔ تفصیل تو لمبی ہے اور غیر شائستہ بھی۔

ان میں سے کچھ ثانوی نوعیت کی باتیں خود حورین نے ڈھکے چھپے الفاظ میں عاطف کو بتائیں۔ کچھ ''مستی'' کے عالم میں خود جمشید نے عاطف تک پہنچا دیں۔

اب جمشید کی یہ علت سامنے آ رہی تھی کہ وہ عاطف کے گرد منڈلانے والی دو تین لڑکیوں سے دوستیاں کرنا چاہ رہا تھا۔ دل کے ہاتھوں بری طرح مجبور عاطف نے بھی اس معاملے میں مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ بھی عاطف کے بس میں نہیں رہا ہے۔ شعیب ہمارا

مشترکہ دوست تھا۔ ہم دونوں عاطف کی حالت پر کڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

☆☆☆

والد صاحب میری ہی طرح دبلے پتلے تھے۔ خوش خوراکی اور تمباکو نوشی سے بھی کوسوں دور تھے۔ زیادہ وقت مسجد میں گزرتا۔ اکثر روزے سے ہوتے تھے۔ عمر بھی فقط 58 سال کے لگ بھگ تھی۔ پتا نہیں کس طرح دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ دو تین دفعہ شدید گھبراہٹ ہوئی۔ ہمارے اصرار کے باوجود طبی معائنہ نہیں کروایا۔ تکلیف اندر ہی اندر بڑھ گئی۔ وہ ابھی تک میرے دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ نواں کوٹ والے گھر میں ہی رہائش پذیر تھے۔ ایک روز مجھے پتا چلا کہ وہ سینے میں شدید گھٹن محسوس کر رہے ہیں۔ وہ غالباً 22 اپریل کی ایک تپتی ہوئی گرم سہ پہر تھی۔ ہم انہیں گاڑی میں لے کر شیخ زید اسپتال پہنچے۔ یہ نئی پرائیویٹ اسپتال نیا نیا بنا تھا اور انتظام بہت اعلیٰ تھا۔ ابا جی اپنے پاؤں پر چل کر اسپتال میں داخل ہوئے۔ معلوم نہیں تھا کہ اب وہ پاؤں پر چل کر نہیں آسکیں گے۔

منی ہارٹ اٹیک کے بعد اگلے روز انہیں اسپتال میں ہی شدید دوسرا اٹیک ہوا۔ وہ سی سی یو میں پہنچ گئے۔ شیشے کا ایک کیبن جہاں مشینیں تھیں، پلاسٹک کی نالیاں تھیں اور دواؤں کی بو باس تھی۔ ابا جی کی بیماری نے ہمیں بری طرح متاثر کیا۔ ہنستے مسکراتے، روز مرہ کے امور انجام دیتے، ابا جی بستر سے آ لگے تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ تینوں بھائیوں میں چھوٹے تھے اور بڑے دونوں بھائی بھی بالکل صحت مند تھے۔

اسپتال کی لابی میں بیٹھ کر میں اور چھوٹا بھائی ساجد دیر تک سوچتے رہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ابا جی سنبھل کر گھر پہنچ جاتے ہیں تو ان کی عمومی صحت اور دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دیں گے۔ ہم نے ان کی خوراک کا پلان تیار کیا اور ان کے اضافی آرام کے لیے مختلف تدابیر سوچیں۔ ان دنوں صحیح معنوں میں مجھے اس محبت کا اندازہ ہوا جو میں اپنے حقیقی والد سے رکھتا تھا۔ میری اور ساجد کی آنکھیں بار بار نم ہوتی تھیں اور ہم بچپن کے وہ دن یاد کرتے تھے جب ہمیں اپنی کسی غلطی پر ان سے مار پڑتی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس کا مداوا ابا جی کی محبت بھری باتوں اور دودھ فروش نظام دین کی برفی سے ہوتا تھا۔

ابا جی کی حالت سنبھل رہی تھی۔ تاہم وقفے وقفے سے انہیں ایک بچکی سی لگ جاتی تھی۔ سخت تکلیف کی حالت میں بھی انہوں نے نماز قضا نہیں کی اور قرآنی آیات کا ورد کرتے رہے۔ اب وہ کسی وقت اپنے شیشے کے کیبن میں ہی اٹھ کر بیٹھ بھی جاتے تھے۔ ایک سینئر ڈاکٹر جب راؤنڈ پر آتے تو اپنے معاون ڈاکٹروں سے انگلش میں گفتگو کرتے۔ مقصد غالباً یہی ہوتا تھا کہ مریض کے سامنے بھی اس کی بیماری کے بارے میں ہر طرح کا تبصرہ کیا جا سکے۔ ابا جی کے سامنے بھی ایسا ہی ہوتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ مذہبی رنگ ڈھنگ والا یہ بظاہر عام سا شخص انگلش پر عبور رکھتا ہے۔

ایک دن میں ان کے کیبن میں پہنچا تو کچھ خاموش سے تھے۔ میرے بار بار پوچھنے پر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اٹیک کے سبب ہارٹ کا کچھ حصہ Damage ہوا ہے۔ اس صورت حال میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، جن میں فالج کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔''

یہ پریشان کن گفتگو ڈاکٹر صاحبان نے ابا جی کے سامنے ہی کی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ جو بچکی سی آپ کو آتی ہے اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''ہاں اس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ دوا کھاتے وقت میں نے کوئی گولی ایسی نگلی ہے جو معدے کے بجائے سانس والی نالی میں چلی گئی ہے۔ یہ بچکی غالباً اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔''

پھر کہنے لگے۔ ''طاہر! خربوزہ کھانے کو بہت دل چاہتا ہے۔ دوپہر کو لیتے ہوئے آنا..... اور چکھ لینا کہ میٹھا ہو۔''

میں زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ یہ رمضان کا مہینا تھا اور ہم سب روزے سے تھے۔ غالباً اس بات کا خیال انہیں بعد میں آیا ہوگا۔ جب دوپہر کو میں خربوزے لے کر آیا تو بولے۔ ''مجھے غلطی لگی، میں نے تمہیں روزے کی حالت میں خربوزہ چکھنے کو کہہ دیا۔'' اس معمولی سی بات پر بھی نادم نظر آتے تھے۔

وہ میری لکھی ہوئی چیزیں کم ہی پڑھتے تھے۔ تاہم تاریخی ناول اباتہ کی تحریر انہوں نے کہیں کہیں سے پڑھی تھی۔ ایک روز میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے۔ ''طاہر! قلم میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اللہ نے تمہیں لکھنے کا وصف دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسلامی تاریخی پس منظر والا

ناول بھی لکھو۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں نے اگلے ہی روز ''نور کی یلغار'' کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس ناول کا زمانہ محمد بن قاسم کا ہے۔

ابا جی کے لیے گھر میں اور گھر سے باہر بہت دعائیں کی جا رہی تھیں۔ ان کی طبیعت بتدریج سنبھل رہی تھی لگتا تھا کہ اب انہیں وارڈ یا کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا مگر پھر ایک روز ان کو آنے والی ہچکی میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ سانس بھی بوجھل ہونے لگی۔

ایک روز ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ ان کے دل کا بیشتر حصہ کام نہیں کر رہا۔ اب انہیں اسپتال میں ایڈمٹ ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ وہ رات دن شیشے کے اس چھوٹے سے کیبن میں بند تھے۔ وہ یہاں شدید ترین گھٹن محسوس کرنے لگے تھے۔ گاہے بگاہے انہیں آکسیجن ماسک بھی لگایا جا رہا تھا۔

ایک روز انہوں نے مجھے اور ساجد کو بلایا۔ کہنے لگے۔ ''دل کی تکلیف سے زیادہ مجھے یہ گھٹن مار رہی ہے جو میں شیشے کے اس کیبن میں محسوس کر رہا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم لوگ مجھے یہاں سے لے جاؤ تو میں بہت بہتر ہو جاؤں گا۔ تم ڈاکٹرز سے بات کرو کہ ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔''

ہم نے ابا جی کی بات سن تو لی مگر فوری طور پر اس پر عمل کرنا مشکل تھا۔ ہارٹ مانیٹر، آکسیجن، گلوکوز کی ڈرپس، کتنا کچھ ان کے جسم سے منسلک تھا..... اگلے روز طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ سینئر کارڈیالوجسٹ جن کا نام غالباً شوکت احمد تھا۔ ابا جی پر بڑی توجہ دے رہے تھے۔ میرے کانوں میں کہیں سے یہ بات پڑی کہ ابا جی کے دل کی حالت ٹھیک نہیں۔ اس کا واحد حل ہارٹ پلانٹیشن ہی ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے ڈاکٹر صاحب جلدی جلدی گاڑی میں بیٹھ کر اسپتال سے واپس گھر جا رہے تھے۔ میں نے انہیں روک لیا۔ ''ڈاکٹر صاحب جیسے بھی ہو ہمارے ابا جی کو بچائیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا حل ہارٹ پلانٹیشن ہی ہے تو اس کے بارے میں بتائیں۔ ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔''

میری آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نمی کی پروا کیے بغیر ڈاکٹر صاحب نے مجھے ڈانٹا۔ ''بات وہ کرنی چاہیے جس پر عمل کرنا ممکن ہو۔ لگتا ہے ہارٹ پلانٹیشن کا بس نام ہی سنا ہوا ہے تم نے۔''

پھر میری صورت دیکھ کر ذرا نرمی سے بولے۔ ''جو کچھ بہترین ہو سکتا ہے، ہم کر رہے ہیں۔ معجزاتی طور پر کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ بس دعا کرو۔''

اگلے روز طبیعت کچھ سنبھلی مگر پھر بگڑتی گئی۔ سانس بوجھل تر ہو گئی وہ صبح سویرے بیدار ہونے والے، کھلی ہواؤں میں سانس لینے والے، پہاڑوں دریاؤں اور سبزہ زاروں سے بے حد پیار کرنے والے، شیشے کے ایک تابوت نما کیبن میں بند تھے۔ چھت کو گھورتی ہوئی ان کی نگاہیں بتاتی تھیں کہ وہ اس کیبن سے نکلنا چاہتے ہیں۔ کم از کم ایک بار..... ایک بار نیلا آسمان، برگ و گل اور کھلی فضا دیکھنا چاہتے ہیں۔

بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح ابا جی کو بھی ہمارے علاقے کے ڈاکٹر سید سرفراز پر بہت یقین تھا۔ وہ بار بار مجھ سے اور ساجد سے کہہ رہے تھے۔ ''اگر تم مجھے گھر لے جاؤ اور ڈاکٹر سرفراز کو دکھاؤ تو مجھے پوری اُمید ہے کہ میری حالت سنبھل جائے گی۔''

ہاں یہی وہ دن تھا جس کا ذکر میں نے اس خودنوشت کے شروع میں کیا ہے۔ وہ تیسرا کالا پتھر جو میری زندگی کی روانی میں آیا اور مجھے ناقابلِ بیان اذیت دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے گراں بوجھ سمیت دل و دماغ پر منقش ہو گیا۔

دوپہر سے ذرا قبل ابا جی نے مجھے سی سی یو والے کیبن میں بلایا۔ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا..... بولے۔ ''ظاہرا زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر مجھے یقین ہے کہ میں یہاں سے نکل گیا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس گھٹن میں میری سانس رکتی ہے۔ تم مجھے یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ ڈاکٹر سے بات کرو۔''

''ٹھیک ہے ابا جی۔ میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے بھرائی آواز میں کہا۔

وہ ابھی سانسوں میں بولے۔ ''تم اور ساجد پرسوں سے یہی کہہ رہے ہو۔ ابھی ڈاکٹر سے بات کرو..... اور..... مجھے آ کر بتاؤ۔''

ان کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں تڑپ گیا۔ اجازت لے کر باہر آ گیا۔ باہر مئی کی چمکیلی دھوپ تھی اور چبھتی ہوئی گرم ہوا کا لمس تھا۔ میں نے گلوگیر آواز میں ساجد سے کہا۔ ''ابا جان! یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ وہ کیبن ان کا دم روک رہا ہے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

سینئر ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔ ہم ایک دو

ڈاکٹروں سے ملے۔ ان سے دعا بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''آپ کے پیشنٹ کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ انہیں گھر شفٹ کیا جائے۔ بلکہ کہیں بھی شفٹ کرنا خطرناک ہے۔''

ہاں یہی وہ کلیجا چیر دینے والا دن تھا۔ جب مئی کی اس گرم سہ پہر میں، میرا بھائی ساجد اور میں، اسپتال سے باہر آبلہ پا چلتے تھے اور کسی کی خاموش صدا ہمیں اندر بلاتی تھی، پکارتی تھی۔ میرا صدمہ دوسروں سے سوا تھا کہ میں نے ہی اباجی سے وعدہ کیا تھا کہ ابھی آپ کو ڈسچارج کروانے کی بات ڈاکٹر صاحبان سے کر کے واپس آتا ہوں۔

میں جانتا تھا کہ وہ ابھی ہوکی سانسوں کے ساتھ اُمید بھری بے چین نظروں سے کیبن کے دروازے کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ ہر پل میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں انہیں کیسے اپنی شکل دکھاتا۔ کیسے انہیں بتاتا کہ جو وہ چاہ رہے ہیں وہ ممکن نہیں ہے۔ نیلا آسمان، برگ وگل، چہکتے پرندے، بہتی ہوا یہ سب کچھ ان کے قریب ہونے کے باوجود فی الحال ان سے بہت دور ہے۔

کوئی عزیز ان سے ملنے کے لیے سی سی یو کے کیبن میں گیا تو اس سے بھی انہوں نے پوچھا۔ ''طاہر کہاں ہے..... اسے بلاؤ۔'' وہ اس گھٹن زدہ کیبن سے نکلنے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔

میں نے چھوٹے بھائی ساجد اور خالہ سے کہا۔ ''مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں کسی طرح انہیں یہاں سے نکال لیں۔''

وہ دونوں بھی شدید تذبذب میں تھے۔ آخر معاملہ بڑے تایا جی تک پہنچا۔ رو رو کر ان کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں مگر کچھ بھی تھا۔ وہ ایک پریکٹیکل آدمی تھے۔ اندرونی طور پر مضبوط تھے اور جذبات کے ریلے میں بہنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''اس حالت میں یونس کو کیسے لے کر جاؤ گے گھر؟ یہاں ڈاکٹر ہیں۔ جان بچانے کے آلات ہیں، ہر سہولت ہے.....''

ان کی دکھ بھری ڈانٹ سے ہمیں برا تو لگا مگر کچھ حوصلہ بھی ہوا۔ بعد ازاں بڑے تایا جی خود ہی اندر جا کر اباجی سے ملے اور انہیں سمجھایا۔

رات کو میں ڈرتے ڈرتے اباجی کے پاس گیا تو وہ ایک دم پُرسکون نظر آئے۔ جیسے انہوں نے اپنا دل ٹھکانے پر کر لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ بڑے بھائی نے جو کہا وہ درست ہے۔ اگلے روز ان کی ہچکی بھی بڑی حد تک کم ہوگئی۔ شام سے کچھ پہلے ڈاکٹرز نے انہیں وارڈ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سب کے لیے خوش آئند صورتِ حال تھی، مگر پتا نہیں میری چھٹی حس کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔

یہ تو بعد میں پتا چلا کہ جو سینئر ڈاکٹرز دیکھ رہے تھے وہ ہم نہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اباجی کو دس بارہ روز انتہائی نگہداشت یونٹ میں رکھا تھا..... اور اب انہیں اس لیے وارڈ میں منتقل کیا جا رہا تھا کہ ان کی صحت بہتر تھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ان کی صحت میں بہتری کی توقع قریباً ختم کر دی تھی۔ سی سی یو سے باہر آنے کے تقریباً 48 گھنٹے بعد اباجی دنیا سے چلے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ 4 مئی کا دن تھا۔ رمضان کی ستائیسویں رات تھی اور جمعۃ المبارک کا روز تھا۔ سحری کھانے کے بعد میں اسپتال چلا گیا تھا اور آخری وقت میں ان کے پاس ہی تھا۔ وہ بالکل پُرسکون ہو چکے تھے۔ جیسے اب کوئی فکر، تکلیف باقی نہ ہو۔ ہچکی بھی ختم ہو چکی تھی۔ تاہم پچھلے 48 گھنٹوں میں دو تین بار غشی نما غنودگی طاری ہوئی تھی۔ آخری وقت تک انہیں اپنے جسم اور لباس کی صفائی، پاکیزگی کا پورا پورا دھیان تھا۔ انہیں گرمی محسوس ہوتی تھی اور پنکھے کی ضرورت تھی، مگر ساتھ والے بیڈ کے مریض کو سردی لگتی تھی۔ اباجی نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ میں پنکھا نہ لگاؤں۔

صبح ساڑھے چار بجے کے لگ بھگ انہوں نے لیٹے لیٹے آخری نماز پڑھی دونوں ہاتھ باندھ کر دیر تک دعا مانگی۔ سیاہ اور سفید داڑھی میں دو تین موٹی بھی نظر آئے اور انہوں نے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اگلے روز جمعہ کے بعد جب ان کا جنازہ گرم سہ پہر میں قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ اجلے چہرے والے ایک راہگیر بزرگ نے آگے بڑھ کر جنازے کو کندھا دیا۔ میں نے انہیں یہ کہتے سنا۔ ''یہ ایک جنتی کا جنازہ ہے۔'' اللہ پاک مغفرت کرے۔

کم و بیش 33 سال گزر چکے ہیں۔ میں آج بھی یہ سوچتا ہوں کہ اگر اباجی شیشے کے اسی گھٹن زدہ کیبن میں وفات پا جاتے تو ان کی جدائی کا صدمہ میرے لیے کس قدر بڑھ جاتا۔ کم از کم اتنا تو ہوا..... ہاں اتنا تو ہوا کہ وہ رخصت ہونے سے دو دن پہلے وہاں سے نکل آئے۔ وہ جس وارڈ میں منتقل ہوئے وہ بہت صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ ایک جانب بڑی بڑی دیوار گیر کھڑکیاں تھیں۔ جن کے جہازی سائز کے شیشوں میں سے نیلا آسمان نظر آتا تھا، چمکیلی دھوپ

بھی، خوبصورت سبزہ اور چلتے پھرتے لوگ بھی..... اور پھر انہی کھڑکیوں میں سے ابا جی نے اپنے کم سن پوتے پوتیوں کو بھی دیکھا، جنہیں دیکھنے کے لیے ان کی نگاہیں ترس رہی تھیں۔ (ابا جی کی جدائی کا صدمہ سہنے میں کئی ماہ لگے)

☆☆☆

کچھ عرصہ بعد کی بات ہے، میں پاکستان سے باہر جا رہا تھا۔ میں اور میرا کزن شعیب پی آئی اے کے جہاز پر سوار تھے۔ رخ تھا تھائی لینڈ کی طرف۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں قسط وار تاوان کے لیے مواد اکٹھا کرنے کے واسطے تھائی لینڈ جا رہا تھا تو یہ غلط ہوگا، لیکن ہاں..... ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس ضرور موجود تھا کہ تھائی لینڈ اور سنگاپور کا ''وزٹ'' مجھے تاوان لکھنے میں بھی مدد دے گا۔

اس سے پہلے میں کئی فضائی سفر کر چکا تھا مگر پاکستان سے مشرق کی جانب یہ پہلی یاترا ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جہاز نے ٹیک آف کیا۔ میں نے شعیب کے ساتھ بمشکل دو یا تین جملوں کا تبادلہ کیا ہوگا، کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ غالباً جاننا چاہتا تھا کہ لاہور کے خدوخال ابھی نظر آ رہے ہیں یا نہیں مگر دنگ رہ گیا۔ نیچے برف پوش چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہائیں..... یہ واہگہ بارڈر کے آس پاس برف پوش چوٹیاں؟

دراصل تیز رفتار بوئنگ نے دیکھتے ہی دیکھتے ہائٹ پکڑی تھی، لاہور سے سیالکوٹ کے نواحی علاقوں کا فاصلہ کچھ بہت زیادہ بھی نہیں ہے اور وہاں تو پہاڑ موجود ہیں اور سردیوں میں برف بھی 25 ہزار فٹ کی بلندی سے بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

وقت رخصت علی سفیان آفاقی صاحب نے بنکاک کے ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کی بہت تعریف کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ بنکاک میں اپنی جیب اور اپنے دل پر ڈاکا ڈالنے والوں سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ''دل'' پر ڈاکے کی بات تو انہوں نے محاورتاً ہی کہہ ڈالی تھی ورنہ وہاں تو حسینائیں دل کے بجائے براہِ راست جسم پر ڈاکا ڈالتی ہیں اور اکثر و بیشتر کامیاب ہوتی ہیں۔ ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کی تعریف آفاقی صاحب اس لیے بھی کر رہے تھے کہ فلموں کی شوٹنگ وغیرہ کے سلسلے میں وہ دو تین بار وہاں ٹھہر چکے تھے۔ ہوٹل کا ماحول اچھا تھا اور انہوں نے ہوٹل کو نسبتاً کم خرچ بھی پایا تھا۔ ظاہر ہے کہ ماحول اچھا تھا تو پھر کم خرچ بھی ہوگا۔

بنکاک سے ہماری پہچان صرف فلم بنکاک کے شعلوں تک تھی یا شاید ایک دو بار ابن صفی یا مظہر کلیم صاحب کی عمران سیریز میں اس شہر کا ذکر پڑھا ہوگا۔ اب جہاز سے اتر کر سرِ شام اس شہر رنگ و بو کو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ رنگوں روشنیوں اور دلکش مناظر کا ایک مرقع تھا۔ راستے میں بہت بہکانے والے مرد و زن ملے مگر ہم نے سیدھا ہوٹل نیوٹرو کیڈرو میں پہنچ کر دم لیا۔

دوسری منزل پر ہمارا کمرا سڑک کی جانب تھا اور کھڑکیوں سے بارونق منظر نظر آتا تھا۔ بنکاک کی سیر سے پہلے جو آخری پاکستانی کام ہم نے کیا وہ یہ تھا کہ اہلِ خانہ کی مگر زور تاکید کے مطابق نماز ادا کی، قبلہ رخ ہو کر خلوص دل سے دعا کی کہ یا اللہ ہم شادی شدگان کو صبر جمیل عطا فرما اور ہماری نگاہیں اور دل و دماغ یہاں کے ہوشربا نظاروں سے حتی الامکان محفوظ رہیں۔

غالباً دعا میں تھوڑی سی کمی رہ گئی تھی۔ ہم نے نظاروں سے پناہ تو مانگی تھی مگر آوازوں سے نہیں۔ رات کا کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ یوں لگا ہوٹل کی ساری دیواریں تھرتھرانا شروع ہو گئی ہیں اور کوئی لمحہ جاتا ہے کہ کمرے کی چھت ہم دونوں ابن بطوطہ ان کی سروں پر آن گرے گی۔ پتا چلا کہ یہ ہفتے کی شام ہے اور نیچے ہوٹل کے ہال میں رقص و سرود کی محفل کا آغاز ہوا ہے۔ یہ کوئی ساڑھے نو بجے کا وقت ہوگا۔ کان پھاڑ دینے والا شور تھا۔ ڈرم بج رہے تھے، گٹار گونج رہے تھے۔ لگتا تھا کہ آٹھ دس مائیکل جیکسن، سات آٹھ میڈونا ز کو لے کر ایک ساتھ ہی ہوٹل میں گھس آئے ہیں۔

برائی کو ہاتھ سے روکنا چاہیے، یا پھر زبان سے ورنہ کم از کم دل میں تو برا سمجھنا ہی چاہیے۔ ہم نے یہ کم از کم والا آپشن اختیار کیا۔ بہرحال یہ دیکھنا بھی ضروری تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ میں اور شعیب نیچے ہال میں پہنچے۔ پچیس کے قریب امیر زادیاں اور امیر زادے یہاں پائے جاتے تھے اور ان کی تعداد میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی گاڑیاں ہوٹل کے مین دروازے کے سامنے رکتی تھیں اور ان میں سے بدمست مرد و زن نکل کر ہال کمرے کے ہنگامہ ہائے ہو میں شامل ہو جاتے تھے۔ تمباکو کا دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جام اور جسم گردش میں تھے۔ آرکسٹرا کا شور اتنا زیادہ تھا کہ رقاص جوڑے ایک دوسرے کے کان میں گھس کر بھی سرگوشی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا جو بات انہوں نے سرگوشی میں کرنا ہوتی تھی وہ اشاروں میں کر گزرتے تھے اور یہ معنی خیز اشارے ماحول کو مزید پراگندہ کرتے تھے۔

کچھ دیر وہاں رک کر میں اور شعیب ہوا خوری کے

لیے باہر سڑک پر نکل آئے۔ یہ 93ء کا دور تھا۔ لذت کام و دہن کے لیے پیزے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ کم از کم ہم نے ابھی تک نہیں کھایا تھا۔ ایک ہوٹل میں ہم نے بغیر جانے پہچانے اتفاقاً پیزا آرڈر کر دیا۔ جب کھانے کے لیے پیزے کا ایک تکونی ٹکڑا پہنچا اور اس میں سے پنیر کے تار کھنچتے چلے گئے تو ہمارا دل ڈوب گیا۔ یہی لگا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں سے لیس دار مادہ نکل رہا ہے۔ اب واپس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سوجی سوجی آنکھوں والا ویٹر ویسے بھی بروس لی کا بڑا بھائی لگتا تھا۔ خاموشی سے ادائیگی کی اور باہر نکل آئے۔ یہ تو دس پندرہ برس بعد پتا چلا کہ وہ جو کچھ بھی تھا ہمیں کھا لینا چاہیے تھا۔

واپس ہوٹل میں پہنچے تو رات بارہ ایک بجے کا عالم تھا۔ ہال کمرے کی رنگین نگین محفل عروج کی طرف گامزن تھی۔ بوسے طویل اور لباس خواتین مختصر تو ہو چکے تھے۔ عالم کیف و مستی میں ایک دوسرے کو کیے جانے والے اشارے بھی حدود قیود کو پار کر رہے تھے۔

شعیب نے مجھ سے کہا۔ ”یارا تمہارے آفاقی صاحب تو کہتے تھے کہ بہت صاف ستھرا اچھے ماحول والا ہوٹل ہے۔“

اس وقت تو مجھ سے کوئی مناسب جواب بن نہ پڑا لیکن دو تین روز بعد جب بنکاک کے اصل گن ہم پر کھلے تو ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کا ماحول واقعی صاف ستھرا بلکہ پاکیزہ محسوس ہونے لگا۔

درحقیقت ہم جو پروگرام لاہور سے لے کر چلے تھے اس کے مطابق اس ”شہر خرابی“ میں ہمارا قیام بالکل مختصر تھا۔ ایک یا ڈیڑھ روز کا۔ ہمارا اصل پروگرام سنگاپور کی سیاحت کا تھا مگر فضائی ٹکٹوں کی بکنگ کا کچھ ایسا ہیر پھیر ہوا کہ ڈیڑھ دو دن کے قیام والا پروگرام سنگاپور منتقل ہو گیا اور پانچ چھ روز کا قیام بنکاک کے حصے میں آ گیا۔

اگلے روز میں اور شعیب بنکاک میں کوئی اچھا پاکستانی ہوٹل ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ حلال کھانے کی تلاش میں حلال ہو گئے۔ جب تھکے ہارے واپس اپنے ہوٹل پہنچے اور کمرے کی کھڑکی کے پار دیکھا تو دل نے کہا، دو ہتھڑ مار اپنے سر پر کیونکہ سڑک کے پار عین ہمارے سامنے پاکستانی ہوٹل کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ نا تھا محبت ہوٹل۔ گو چھوٹی سی جگہ تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ اگلے پانچ روز ہم نے وہیں سے کھانا کھایا۔

محترم علی سفیان آفاقی صاحب نے وقت رخصت خاص طور سے تاکید کی تھی کہ فلوٹنگ مارکیٹ ضرور دیکھنا۔ ہم نے پوچھا تھا کہ آپ کے لیے کیا لائیں تو انہوں نے ذرا تردد کے بعد ایک کافی کا نام لیا تھا اور کہا تھا کہ مل جائے تو لے آنا۔ یہ تو بنکاک آ کر پتا چلا کہ انہوں نے یہ خاص برانڈ کی کافی اس لیے منگوائی تھی کہ ہم بنکاک کو بہت اچھی طرح دیکھ سکیں۔ کافی کی تلاش میں ہم بہت تسلی بخش طور پر بنکاک میں گھوم لیے۔ بہرحال کافی ڈھونڈ کر ہی چھوڑی۔

عطاء الحق قاسمی صاحب نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ بنکاک میں جنس ایک روز افزوں کاروبار ہے۔ اس کاروبار میں اتنی تیزی ہے کہ ائرپورٹ پر اترتے ہی فضا میں ایک طرح کی جنسی بو محسوس ہونے لگتی ہے۔

حقیقت بھی ایسی ہی ہے۔ سیاح کو ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی سیکس ایجنٹ کھڑا نظر آ جاتا ہے۔ ہمارا واسطہ بھی مسلسل ایسے لوگوں سے پڑتا رہا۔ ان کے ہاتھ میں ایک البم ہوتا تھا جس میں ہر عمر اور نسل کے برائے فروخت مال کی تصاویر ہوتی تھیں۔ ”بیوٹی فل گرل۔ ویری چیپ پرائس“ کے الفاظ مسلسل کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ ہوٹل کے قریب کھمبے کے نیچے کھڑا ایک ایجنٹ اکثر ہمارا راستہ روک لیتا تھا۔ ایک دن میں نے جھلا کر اس سے کہہ دیا۔ ”یارا ہمیں غلط مت لو۔ ہم غلطی سے تمہارے اس شہر میں موجود ہیں۔ ہم سنگاپور جا رہے تھے۔“

البتہ ان معاملات سے قطع نظر بنکاک ایک خوبصورت شہر ہے۔ کئی مقامات دیکھنے لائق ہیں۔ کروکوڈائل آئی لینڈ۔ تیرتی ہوئی مارکیٹ۔ پٹایا کا ساحل۔

کھمبے کے نیچے کھڑے داغی گناہ سے بچنے کے لیے ایک شام ہم نے فیصلہ کیا کہ ذرا کلاوا کاٹ کر ہوٹل پہنچیں گے۔ اس کلاوا کے نتیجے میں ایک ایسے شخص سے ہماری ملاقات ہو گئی جس کی وجہ سے ہمارے باقی دنوں کا قیام قدرے دلچسپ اور خوشگوار ہو گیا۔ ان صاحب کا نام ضامن ریاض تھا۔ لاہور کے ہی رہنے والے تھے۔ ہم سے کوئی تین چار سال بڑے ہی تھے یعنی چالیس کے لیکن، چالیس ان کے سامنے ذرا چھوٹا لگتا تھا کہ ”فارغ البال“ تھے اور ہلکی سی توند بھی نکلی ہوئی تھی۔ پنجابی ہونے کے باوجود بڑی پکی میٹھی اردو بولنے کی کوشش فرماتے تھے۔ مشرق اور امروز میں ان کی کچھ تحریریں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ بقول ان کے، چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر گارمنٹس کا کام شام کرتے ہیں۔ البتہ ان

کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ کام چھوٹا بھائی ہی کرتا ہوگا یہ صرف شام کرتے تھے۔ ضامن صاحب سے سر راہ ہی ملاقات ہوگئی تھی مگر وہ اس دیار غیر میں ہم سے اتنی گرمجوشی سے ملے جیسے بچپن میں کسی میلے میں ہم سے بچھڑے ہوں، اور جب انہیں پتا چلا کہ ہمارا تعلق بھی لاہور سے ہے تو اس کے سوا چارہ ہی نہ رہا کہ ہم کسی ٹی شاپ میں جا بیٹھیں۔

وہ دو دفعہ پہلے بھی بنکاک میں وارد ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سچا پاکستانی اور لاہوری ہونے کے ناتے ہمیں اخلاقیات پر لمبا چوڑا لیکچر دیا۔ یہاں کے تشیب و فراز سمجھائے اور سمجھایا کہ یہاں اپنی نگاہ کی خصوصی حفاظت کرنی چاہیے۔

شعیب جھٹ بولا۔ ''اور باقی چیزوں کی؟''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ بٹوا، سامان اور سفری کاغذات وغیرہ۔'' شعیب نے بات بنائی۔

وہ بولے۔ ''بالکل۔ یہاں ہر طرح کے جرائم ہو رہے ہیں۔ روزگار کا معاملہ نہ ہوتو میں کبھی یہاں نہ آؤں۔''

انہوں نے بتایا کہ یہاں کی بوبے مارکیٹ بچوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کا مرکز ہے۔ پاکستان کے علاوہ اردگرد کے ملکوں سے بھی لوگ یہاں کپڑے لینے کے لیے آتے ہیں۔

وہ بڑے پکے منہ کے ساتھ روزگار والی بات تو کر رہے تھے مگر دوران گفتگو انہوں نے جس طرح بے ساختہ ایک راہ جاتی سفید فام حسینہ کو گھورا مجھے اور شعیب کو شک ہوا کہ بات صرف اور صرف روزگار کی نہیں اور نہ ہی وہ ایسے زاہد خشک ہیں کہ بنکاک کو قید خانہ سمجھ رہے ہوں۔

ٹی شاپ میں بیٹھے تو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ہی ہم ایسے شیر و شکر ہوئے کہ ضامن صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ ہمارے والے ہوٹل میں ہی شفٹ ہو جاتے ہیں اور باقی کے دن ہمارے ساتھ گزاریں گے۔

اگلے روز وہ واقعی آپدھمکے..... ہمارے والے کوریڈور میں ہی ایک ڈبل بیڈ کمرا انہیں مل گیا۔ ہم سارا دن اکٹھے ہی بنکاک کے طول و عرض میں گھومتے رہے۔ خاص برانڈ کی کافی کی تلاش بھی جاری رہی۔ ضامن صاحب اور میرے اندر تحریری لحاظ سے بڑی ہم آہنگی تھی۔ نہ انہوں نے میری کوئی کہانی پڑھی تھی نہ میں نے ان کا کوئی مبینہ کالم پڑھا تھا۔ ہاں آفاقی صاحب کو وہ بڑی اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی قلم سزا کی بہت تعریفیں کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ صحافت کے میدان میں جھنڈا گاڑنے کے بعد وہ ایک نہ ایک دن فلم لائن کی طرف بھی ضرور آئیں گے۔ فلمی ہیروئنز کے لباس اور ہیروز کا قبلہ درست کرنے کا وہ پورا پورا ارادہ رکھتے تھے۔

ان کی گفتگو کا انداز بڑا دلچسپ تھا۔ جب ہم کچھ گارمنٹس خریدنے مشہور بوبے مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ہم نے ایک انگریزی اخبار لیا۔ واقعی قتل و غارت کی خبریں نمایاں نظر آتی تھیں۔ ایک خبر تو اجی جنگلات میں ایک آدم خور شیر کی بھی تھی۔ آدم خور شیر کی بات سن کر فرمانے لگے۔ ''یہ شیر آدم خور ہی کیوں ہوتے ہیں۔ حوا خور کیوں نہیں ہوتے۔ میرا مطلب ہے کہ خواتین کو کیوں نہیں کھاتے؟'' پھر خود ہی بولے۔ ''یہ دراصل ہماری اردو زبان کی کمزوریاں ہیں۔ اب یہ مردم شماری بھی کیا بات ہوئی۔ اس میں عورتم شماری کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے نفس شماری جیسا کوئی جامع لفظ ہونا چاہیے تھا۔''

ایک تھائی نازنین چھوٹی سی نیکر پہنے ٹانگیں لہراتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ دیکھیے ضامن صاحب! شیر اس لیے نہیں کھاتے خواتین کو۔''

شعیب نے لقمہ دیا۔ ''ہاں جی میں نے بھی سنا ہے۔ شیر خواتین کے معاملے میں بڑے رقیق القلب ہوتے ہیں۔''

وہ بگڑے۔ ''تم اس بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔ میں یہ بانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ اردو زبان کو اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے۔''

ان دنوں قتالۂ عالم میڈونا کی کتاب ''سیکس'' نئی نئی شائع ہوئی تھی۔ راستے میں اس کا ذکر چھڑ گیا۔ بڑا پکا سا منہ بنا کر فرمانے لگے۔ ''کیا خیال ہے طاہر! اس کا اردو ترجمہ بھی آئے گا؟''

میں نے کہا۔ ''ضامن صاحب! ابھی تو کتاب ہی نئی نئی آئی ہے ترجمہ وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ویسے آپ کے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اسے پڑھنا چاہتے ہیں۔''

وہ ذرا سنبھل کر بولے۔ ''تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اسے پڑھوں گا تو بطور صحافی اس پر تنقید کر سکوں گا نا۔''

ہم دونوں نے شد و مد سے اثبات میں سر ہلایا۔

بوبے مارکیٹ میں خریداری خیر ان کن طور پر آسان رہی۔ نہ کوئی بھاؤ تاؤ، نہ کوالٹی کا کوئی جھگڑا۔ سب کچھ لکھت پڑھت میں موجود تھا اور صاف شفاف تھا۔ ضامن صاحب نے تو خیر کافی سامان لیا، ہم بھی عالم جوش میں کچھ زیادہ ہی

لے گئے۔ ان دنوں روپیا، تھائی لینڈ کی کرنسی بھات کے برابر تھا یا شاید کچھ تگڑا ہی تھا۔ اپنی فضول خرچی کا پتا ہمیں اس وقت چلا جب چند روز بعد ہم سنگاپور پہنچے اور کرنسی کے ہاتھوں چاروں شانے چت ہوئے۔ اس زمانے میں بھی ایک سنگاپوری ڈالر کے لیے سولہ سترہ روپے ادا کرنا پڑتے تھے۔

رات کو ہوٹل میں ضامن صاحب نے پوری پوری کوشش کی کہ میں ڈائجسٹ اور تاوان شاوان چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کا کام کروں۔ ان کے نزدیک میرے لیے سب سے ڈھنگ کا کام یہی تھا کہ میں چونکہ مغل ہوں لہٰذا مغلیہ دور کے بعد کے حالات پر تحقیق کروں اور ان مغل شہزادے شہزادیوں کا سراغ لگاؤں جو اب بھی پاکستان کے کونے کھدروں میں موجود ہیں اور اپنی بحالی کے لیے کسی مسیحا کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں نے دل میں سوچا کہ ایک مغل شہزادی کا سراغ تو چوبرجی کے ایک مینار پر لگ گیا ہے۔ اسی کو بھگت لیں تو بہت ہے۔

اگلے روز ہمیں بہت صبح سویرے اٹھنا پڑا کہ ''فلوٹنگ مارکیٹ'' کا دیدار اسی وقت ہو سکتا تھا۔ ضامن صاحب کو کوئی ذاتی کام تھا۔ ہم دونوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور جھیل نما نہر تک جا پہنچے۔ ٹیکسی ڈرائیور کافی ہٹا کٹا اور غصیلا سا آدمی تھا۔ اس کا تھوبڑا کچھ کچھ معروف انو کی پہلوان کی طرح تھا۔ کنارے پر سے ہم موٹر بوٹ کے ذریعے آگے روانہ ہوئے۔ موٹر بوٹ والے سے معاملہ بھی اس انو کی نما ڈرائیور نے ہی طے کیا تھا۔ عین پانی کے بیچوں بیچ جب موٹر بوٹ فراٹے بھرتی ہوئی فلوٹنگ مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہمارے اور انو کی نما ٹیکسی ڈرائیور کے درمیان طے شدہ معاوضے کے بارے میں تنازعہ ہو گیا۔ تنازعہ اتنا بڑھا کہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ وہ کسی حد تک نشے میں بھی تھا۔ مجھے اس کی دھاری دار شرٹ کے نیچے ایک چاقو کا دستہ صاف نظر آیا۔

اگر وہ دونوں بٹے کٹے تھائی لینڈر ہمیں زخمی کر کے یا مار کر اس ویران پانی میں پھینک دیتے تو کسی کو کیا پتا چلنا تھا؟ دھکم دھکا تک بات پہنچی۔ اس جھگڑے کی وجہ سے موٹر بوٹ بری طرح ڈول رہی تھی۔ بالآخر موٹر بوٹ والے نے مصالحتی کردار ادا کیا اور معاملہ بڑی حد تک طے ہو گیا۔

ہم قریباً روزانہ ہی گھر میں فون کر کے اپنی خیر خیریت کی اطلاع دیتے تھے۔ میں نے سوچا اگر اس خونخوار ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے ہم واقعی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ جاتے تو کیا ہوتا۔ شاید ایک دو ہفتوں بعد ہمارے سفارت خانے کے کسی اہل کار کا فون ہمارے گھر آتا اور گھر والوں کے علاوہ ہماری منتظر بیویوں کو بھی بتایا جاتا کہ..... وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

میں تو کسی دن ناغہ کر جاتا تھا البتہ شعیب روزانہ ہی اہلیہ کو فون کر کے اسے یقین دلاتا تھا کہ وہ بقید حیات اور شریکِ حیات ہے۔ موٹر بوٹ میں ہم سے لڑنے والا وہ ٹیکسی ڈرائیور ہم سے پیسے تو تھوڑے سے زیادہ لے گیا لیکن جاتے جاتے ایک چیز بھی دے گیا۔ وہ مجھے ایک بھرپور کردار دے گیا جو بعد ازاں میرے ناول کرب آشنائی میں شامل ہو گیا۔ کرب آشنائی کا ایک اور اہم کردار سون تھی۔ وہ بھی اسی سفر میں مجھ سے ملی۔ تھوڑے وقت کے لیے ملی لیکن ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔

فلوٹ کرنے والی مارکیٹ کا نظارہ دلکش تھا۔ شفاف پانی میں تیرتی ہوئی کشتیاں جو خورد و نوش کی اشیاء سے لدی ہوئی تھیں۔ یہ دراصل تیرتی ہوئی دکانیں تھیں۔ خریدار بھی کشتیوں پر ہی تھے۔ اوپر نیلا آسمان، پانی پر چھوٹی چھوٹی لہریں بناتی ہوئی مدھر ہوا۔ پھولوں، پھلوں اور سبزیوں کی خوشبو۔ ارد گرد تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھر بھی تھے۔ ان کے بالکل چھوٹے چھوٹے آنگنوں میں بچے کھیلتے اور بڑے روزمرہ کاموں میں مصروف نظر آتے تھے۔ یہ ایک بالکل نئی طرز کی آبی دنیا ہے۔ غصیلے ٹیکسی ڈرائیور سے جو منہ ماری ہوئی تھی اس کی ساری کلفت دور ہو گئی۔

ہم ہوٹل واپس پہنچے تو مجھے پتا چلا کہ پاکستان سے میرے لیے ایک فون آیا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اہلیہ کی طرف سے ہو گا اور تسلی چاہی ہو گی کہ میں خیر خیریت سے بقید حیات اور بقیہ شریکِ حیات ہوں یا نہیں مگر پھر ہوٹل کے ملازم نے شکستہ انگلش میں بتایا کہ یہ کال کسی مسٹر عاطف کی طرف سے تھی۔

عاطف والا معاملہ بھی مسلسل الجھا ہوا تھا۔ بلکہ مزید الجھتا جا رہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ دوسروں کو نصیحتیں کرنے والا اور عورت سے دور بھاگنے والا عاطف امین سرتاپا حورین کی محبت میں ڈوب چکا ہے۔ دوسری طرف اس کی نئی نئی شادی کی کشتی بھی بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ شادی کو فقط آٹھ ماہ ہوئے تھے لیکن تنازعات آٹھ برسوں والے رونما ہو گئے تھے۔ ممکن ہے کہ اس صورتِ حال میں حورین والے

معاملے کا بھی تھوڑا بہت دخل ہو لیکن اور بھی کئی وجوہات تھیں۔ عاطف کی بیوی بابرہ کیمپر ڈرائیو کرنے والی لڑکی بالکل نہیں تھی۔ اسے عاطف کا گلوکاری والا "پیشن" بھی کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ کچھ اور مسائل بھی تھے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ بابرہ کے ساتھ عاطف کا کوئی تازہ جھگڑا ہوا ہے اور وہ حسب عادت مجھے اسی کی تفصیلات بتانا چاہتا ہے۔ اس وقت تو میں تھکا ہوا تھا۔ عصمت ہوٹل کی بریانی، دال ماش اور گرما گرم تندوری روٹی کا ڈنر کر کے ہم سو گئے۔ صبح اٹھ کر میں نے لینڈ لائن پر عاطف کو فون کیا۔ واقعی بابرہ سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اور صرف جھگڑا ہی نہیں ہوا تھا "طلاق" بھی ہو گئی تھی۔ میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز ہم پیدل ہی بنکاک کے طول و عرض میں گھومتے رہے۔ اس بادہ پیمائی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ آفاقی صاحب کی مطلوبہ کافی بھی مجھے مل گئی۔ میرا ذہن مسلسل عاطف کے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ کل اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ طلاق والے سنگین واقعے کے بعد حورین اس سے بری طرح ناراض ہو گئی ہے۔ غالباً زندگی بھر کے قطع تعلق والی بات بھی ہوئی ہے۔

چلتے چلتے ہم تینوں تھک گئے تھے۔ لب سڑک پھولوں کی کیاریوں کے پاس ایک آہنی بینچ پر بیٹھ گئے۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ بنکاک روشنیوں سے جگمگا رہا تھا مگر اندر سے یقیناً تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں ضامن صاحب کی نگاہ سڑک کے پار مین ہمارے سامنے نائٹ کلب کے نیون سائن پر پڑی۔ بولے "بیٹھنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ لوگ سمجھیں گے کہ ہم اندر گھسنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم پر تو شاید کوئی شک کر لے لیکن آپ پر نہیں کر سکتا۔ یقین کریں آپ کے چہرے پر تو اتنی پاکیزگی ہے کہ آپ کہیں بیٹھ کر کوک شاستر بھی پڑھ رہے ہوں گے تو یہی لگے گا کہ نسیم حجازی کا تاریخی ناول پڑھ رہے ہیں۔"

شعیب نے لقمہ دیا۔ "اور اگر خدانخواستہ "وڈکا" پی رہے ہوں تو لگے گا کہ یقیناً سیون اپ سے شغل کر رہے ہیں۔"

وہ بولے۔ "مجھے تو لوگوں کے مذاق سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی تمہارے ذوق سے ہوتی ہے۔ اپنے اردو جملوں میں ہم انگلش کے الفاظ کیوں ٹھونستے ہیں۔ کیا کبھی ان لوگوں نے بھی اپنی انگلش میں اردو کے ٹکڑے گھسائے ہیں۔ ابھی تم نے جو دو فقرے بولے ہیں ان میں ناول، وڈکا، سیون اپ سب انگلش کے لفظ ہیں۔"

بات شروع ہوئی تو اردو زبان کے محاسن اور علمی تشریحات تک جا پہنچی۔ بولے۔ "ہم لوگ اردو گرائمر پر بالکل توجہ نہیں دیتے۔ اسم صفت دراصل تین قسم کا ہوتا ہے۔"

"کون کون سی قسم کا؟" شعیب نے پوچھا۔

وہ سر کھجا کر بے دھیانی سے بولے۔ "پہلی قسم کا..... دوسری قسم کا..... اور تیسری قسم کا۔" انہوں نے گول مول جواب دے کر بات بدل دی۔ غالباً وہ اقسام بھول گئے تھے۔

یہاں پر میں ضامن صاحب پر اعتراض داغ سکتا تھا کہ ابھی انہوں نے بھی اردو "گرائمر" کا ملاوٹی لفظ استعمال کیا ہے۔

بعد ازاں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے شعیب نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا۔ "ضامن جی اسم صفت کی اقسام اس لیے بھولے تھے کہ عین وقت پر دو تھائی دو شیزائیں سڑک پار کر رہی تھیں اور ان کے فراک ہوا میں اڑ رہے تھے۔"

اسی روز ہم نے "پاپا بیچ" بھی دیکھا تھا جس نے کھلے آسمان کے نیچے حسن و عشق کی تمام رنگینیاں سمیٹ رکھی تھیں۔ تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی تھی لہٰذا بہت تھکے ہوئے تھے۔ میں آتے ہی سو گیا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ آنکھ کھلی، تازہ ہوا کھانے کے لیے لابی کی کھڑکی کے پاس آ بیٹھا..... اور تب ہی مجھے اس بنکاک یاترا کا سب سے دلچسپ اور دلکش کردار ملا۔

ہمارے ہوٹل کے اندر ہی ایک علیحدہ پورشن میں ایک بڑا مساج گھر بھی تھا۔ سبھی جانتے ہیں کہ مساج کا تو بس نام ہی ہوتا ہے ورنہ یہ عشرت کدے ہی ہوتے ہیں پھر یہ تو ویسے بھی بنکاک تھا۔ اچانک ایک دروازے کے عقب سے ایک دبلی پتلی اسمارٹ سی تھائی لڑکی برآمد ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق عمر میں بائیس سال رہی ہوگی مگر وہ اس سے بھی کم کی نظر آتی تھی۔ اس کی لپ اسٹک پھیلی ہوئی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی نمی تھی اور وہ تھوڑی سی ہانپتی ہوئی تھی۔ لابی میں میری موجودگی کو نوٹس کیے بغیر اس نے ٹشو پیپر سے اپنی پھیلی ہوئی لپ اسٹک درست کی اور اپنی سانسیں بحال کرنے لگی۔ اس کی موجودہ حالت بتا رہی تھی کہ وہ ابھی ابھی کسی بدمست مرد

کے ساتھ بستر کے معاملات نمٹا کر نکلی ہے۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ بلاشبہ وہ ایک "سیکس ورکر" تھی۔ دوسرے لفظوں میں فاحشہ۔ لیکن اس کے چہرے مہرے پر دور دور تک کوئی ایسی علامت نظر نہ آتی تھی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک عجب اجلا پن سا نظر آتا تھا۔ اس کے نقوش پر..... اس نے دستی آئینہ اور ٹشو پیپر وغیرہ اپنے پرس میں رکھے اور پھر منہ ہاتھ دھونے کے لیے ایک قریبی واش بیسن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹی تو میں دیکھتا رہ گیا۔ اپنے اردگرد کی گندگی کے باوجود وہ اوس میں دھلا ہوا سفید گلاب نظر آئی۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے تراشیدہ بال سنوارنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تو آستینیں پھسل کر کندھوں کی طرف چلی گئیں۔ مجھے اس کے ایک دودھیا بازو پر چوٹوں کے کچھ پرانے نشان دکھائی دیئے۔ جیسے کبھی اس کے ساتھ سخت مار پیٹ ہوتی رہی ہو۔ میرے اندر کہانی کی تلاش کی حس جاگ اٹھی۔ میں نے اس سے تھوڑی سی راہ رسم پیدا کی۔ اس کے لیے بٹر اور اپنے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور کہانیاں وغیرہ لکھتا ہوں۔ ہم دونوں بری بھلی انگلش میں باتیں کرتے رہے۔ وہ "لامیانگ" کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی تھی اور نوعمری میں ہی اسے اس پیشے سے منسلک ہونا پڑ گیا تھا۔ دراصل اس کا چالاک شوہر جوا سے گاؤں سے بیاہ کر بنکاک لایا تھا۔ عورتوں کا دلال ثابت ہوا تھا۔ اس پر ہر طرح کا جسمانی و جنسی تشدد روا رکھا گیا تھا اور اب بھی رکھا جا رہا تھا۔ اس گھناؤنی صورتِ حال میں چار پانچ برس گزارنے کے باوجود اگر وہ آج بھی ایک معصوم الہڑ دوشیزہ کی طرح نظر آتی تھی تو یہ شاید اس کے اندر کی روح کی دوشیزگی تھی۔

اگلے روز لابی میں ہی میں نے پھر اس سے ملاقات کی۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ قریباً 36 گھنٹے بعد ہمیں بنکاک سے پرواز کر جانا تھا..... مجھے قلق ہونے لگا کہ سون نامی اس لڑکی سے شروع میں ہی ملاقات کیوں نہ ہوئی..... یا یہ کیوں نہ ہوا کہ ہم نے آٹھ دس روز مزید یہاں ٹھہرنا ہوتا۔ میں اس سے ڈھیروں باتیں کرتا، اس کی زندگی کے مزید خفیہ گوشوں سے نقاب اٹھتا۔ میں اور شعیب اس سے ملتے تھے تو کسی طرح کے سفلی خیالات کا گزر تک ہمارے ذہنوں سے نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عجب سی شخصیت تھی اس کی۔ کسی بچے سے مشابہہ۔ پتا نہیں وہ کون لوگ تھے جو اسے بیڈ رومز میں بھنبھوڑنے اور تاراج کرنے کی ہمت کرتے تھے..... سون کا تفصیلی تذکرہ سسپنس کی طویل کہانی "کربِ آشنائی" میں مذکور ہے۔

اور ٹھیک دو دن بعد ہم شہروں کے شہر سنگاپور میں موجود تھے۔ سنگاپور بہت صاف ستھرا بہت خوبصورت و جدید شہر ہے۔ قصہ مختصر لوگ یورپ اور امریکا تک سے اس کی دلکشی دیکھنے کے لیے بھاگے چلے آتے ہیں۔ میں یہاں سنگاپور کے صرف دو دلچسپ واقعات کا ذکر کروں گا۔ سنگاپور کی مہنگائی دیکھ کر ہماری آنکھیں کھلی اور جیبیں بند رہ گئی تھیں۔ ایک دو مرتبہ تو ہم نے ڈبل روٹی کے سلائس کوک وغیرہ کے ساتھ کھا کر گزارا کیا۔ ضامن صاحب نے بھی اس گرانی پر خوب ناک بھوں چڑھائی۔ ہماری رہائش ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں تھی وہاں لابی میں ایک چھوٹا سا بچن تھا۔ وہاں شراب کی ایک بچی کھچی بوتل پڑی تھی۔ میں نے دیکھا بوتل کے اندر بے شمار زندہ و مردہ چونٹیاں تھیں۔ غالباً یہ شراب کی وہ قسم تھی جسے شیری کہا جاتا ہے۔ جب رات کو ہم سنگاپور کی ڈبل ڈیکر بسوں پر گھوم پھر کر واپس آئے تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ درمیانی عمر کا ایک انڈین شرابی وہی چونٹیوں والی شراب بڑی رغبت سے چڑھا رہا ہے۔ مجھے متلی ہونے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں اس میں چیونٹیاں ہیں۔"

اس نے ذرا چونک کر اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے بوتل کی طرف دیکھا۔ اسے پہلی بار پتا چلا کہ بوتل میں زرد اور سفید رنگ کی بے شمار زندہ مردہ چونٹیاں موجود ہیں۔ یقیناً اس کا دل بھی متلایا ہوگا مگر وہ ٹن ہو رہا تھا۔ اس نے صرف تھوکنے اور بیزاری میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور ڈگمگاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

میں اور ضامن سوچتے رہ گئے کہ یہ شراب، خانہ خراب بندے کو کن پستیوں میں گرا دیتی ہے۔

دوسرا واقعہ سنگاپور کے ایک رہائشی کی انسان دوستی کا ہے۔ ضامن صاحب اپنے کمرے میں استراحت فرما رہے تھے۔ میں اور شعیب پیدل ہی سیر کے لیے نکل گئے..... ان دنوں سنگاپور میں الیکٹرونکس کے پرزہ جات کا کام زوروں پر تھا۔ یار لوگ وہاں سے پرزے خرید کر پاکستان میں مہنگے داموں بیچتے تھے۔ یقیناً اب بھی یہ پریکٹس جاری و ساری ہوگی۔ شعیب اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ معلومات تو کچھ نہ کچھ حاصل ہو گئیں مگر ہم ہوٹل کا راستہ بھول

بیٹھے۔ ایک ''عقلمندی'' ہم سے یہ بھی ہوئی تھی کہ ہوٹل کا کارڈ جیب میں نہیں رکھ پائے تھے۔ میں نے شعیب سے کہا بھی تھا لیکن وہ بھول گیا۔ انتہا درجے کی تھکن ہو چکی تھی۔ ہوٹل اور علاقے کا درست نام تک معلوم نہیں تھا۔ بلند و بالا عمارتوں کی شکل دیکھ کر قیافوں سے کام چلا رہے تھے۔ جتنا ڈھونڈ رہے تھے اتنا ہی بھٹک رہے تھے۔ شام گہری ہو رہی تھی۔

شعیب نے کہا۔ ''پتا ہے کل صبح سویرے واپسی کی فلائٹ ہے۔ فلائٹ مس ہوگئی تو یہاں قید ہو کر رہ جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''یار! فلائٹ ہی مس ہونی تھی تو بنکاک میں ہو جاتی۔ ہمیں سون کی زندگی کے کچھ اور گوشوں سے آگاہی ملتی۔''

وہ ہانپ کر سرِراہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ ہم ہونقوں کی طرح اپنے اردگرد فلک بوس عمارتوں کے جنگل کو دیکھتے رہے اور اپنی عقل کو کوستے رہے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے تو اپنے ایک دوست عثمان کے والد صاحب کا سفرِ حج یاد آگیا ہے۔''

''حج یاد آنے کا یہ کون سا موقع ہے؟'' شعیب نے تھکن سے کراہتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔

میں نے کہا۔ ''جب حجاج کرام حج کر لیتے ہیں اور واپس منیٰ لوٹتے ہیں تو بے حد تھکے ہوتے ہیں۔ آخری مرحلہ ہوتا ہے شیطان کو کنکریاں مارنے کا، اور احرام وغیرہ اتارنے کا۔ یہ مرحلہ تھکاوٹ کے سبب بہت کٹھن لگتا ہے۔ عثمان کے والد صاحب نے جوش و خروش سے کنکریاں ماریں اور پھر گروپ سمیت اپنے خیموں کا راستہ بھول گئے۔ دو گھنٹے پیادہ بھٹکتے رہے۔ ایک ساتھی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا جب شیطان کو اتنے جوش سے کنکریاں مارو گے تو وہ بھی تو کچھ نہ کچھ کرے گا نا۔''

''تو ہم نے کون سے شیطان کو کنکریاں ماری ہیں جو یہاں راستہ بھولے بیٹھے ہیں۔'' شعیب نے کہا۔

''یار کنکریاں مارنا تو ایک علامت ہے۔ ہم نے بھی ان شہروں میں شیطان کو کوسوں دور تو بھگائے ہی رکھا ہے۔''

''تو پھر اس کا اچھا صلہ ملنا چاہیے تھا نا۔'' وہ مایوسی کے عالم میں بولا۔

اس کے ساتھ ہی ہماری نظر کچھ دور ایک جرمن ایئر لائن کے آفس پر پڑ گئی۔ ہم ڈگمگاتے ہوئے سے ائرلائن کے دفتر میں داخل ہوئے۔ چمکیلے چہرے والے ایک اسمارٹ سے آفیسر نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم نے اسے اپنی بپتا سنائی جو اس نے بڑے دھیان سے سنی۔ وہ روانی سے انگلش بولتا تھا۔ ہم نے اسے اس علاقے کی کچھ نشانیاں بتائیں جہاں ہمارا ہوٹل واقع تھا۔

آفیسر نے اپنا سب کام چھوڑ کر ایک مقامی اہل کار کو بلایا۔ اس کے ساتھ لمبی ڈسکشن کی اور پھر نشانیوں کی بنیاد پر ہمیں اس اہل کار کے ساتھ دو تین ایریاز میں بھیجا۔ یہاں شعیب کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس کے دماغ نے کام کیا اور ایک جگہ اس نے ایک ایسی بلند عمارت کو پہچان لیا جس کے عقب میں ہمارا ہوٹل اور ہوٹل میں ضامن صاحب واقع تھے۔ یوں خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

میں نے شعیب کو شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ''آج تم نے انڈیا والا احسان اتار دیا ہے۔''

''کون سا احسان؟'' اس نے بھنویں اچکائیں۔

''بھلکڑ ہونے کا ایک اور ثبوت دے رہے ہو۔ جب تم نے جالندھر سے واپسی پر پولیس رپورٹ گھما دی تھی اور پھر تمہارا نام بھی اندراج کے رجسٹر میں نہیں مل رہا تھا۔ میں نے ہی اہل کاروں کی منت ترلا کر کے انہیں بار بار رجسٹر دیکھنے پر مجبور کیا تھا اور یوں تمہارا نام ملا تھا۔''

وہ خاموش رہا۔ مطلب یہ تھا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔

اس اجلے چہرے والے غیر ملکی کا چہرہ آج بھی نگاہوں میں گھومتا ہے جس نے ائرلائن کے دفتر سے اٹھ کر ہم تھکے ماندوں کا ہاتھ تھاما تھا اور منزل تک پہنچنے میں ہماری مدد کی تھی۔ مجموعی طور پر سنگاپور ہمیں بنکاک کی نسبت بہت صاف ستھرا، نفیس اور کم عیش پرست لگا۔ بنکاک کو تو اگر ایک بہت بڑا ''جنسی کارخانہ'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مے خانے، جوا خانے، قحبہ خانے اور پتا نہیں کیا کیا خانے وہاں پائے جاتے ہیں۔ ان دنوں ہمیں بھی مرد و زن سے متعلق واہیات مناظر عوامی جگہوں پر دیکھنے کو ملتے تھے۔ ایسے سیکس شوز وہاں اس زمانے میں بھی عام تھے جہاں سب کچھ لائیو دکھایا جاتا تھا اور صرف انسان ہی نہیں مختلف جانوروں قسم سانپ، بندر وغیرہ بھی ان شوز کا حصہ ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد ہمیں علی سفیان آفاقی صاحب کی اس بات پر یقین آ گیا تھا کہ ہوٹل نیو کیڈرون بہت صاف ستھرا ہے۔ مگر کیا کریں کہ اگلے ہی دن.....

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلم کار کی خود بیتی کا دسواں حصہ جو خود میں منفرد ہے

ہم بنکاک کی سیر سے پاکستان واپس پہنچے۔ دل و دماغ پر عاطف اور بابرہ کی طلاق والا بوجھ موجود تھا۔ عاطف کی پریشان صورت بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گو معاملہ کافی بگڑا ہوا ہے لیکن ابھی رجوع کی گنجائش موجود ہے کیونکہ صرف ایک طلاق ہوئی ہے۔

بابرہ بحیثیت مجموعی طور پر اچھی لڑکی تھی۔ مجھے بہت دکھ تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔ اس معاملے کی تفصیل شاید پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلچسپ نہ ہو بہرطور اگلے ایک دو ماہ میں ہم سب نے بہت کوشش کی اور عاطف کا گھر لوٹنے سے بچ گیا۔

ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ تھائی لینڈ کے سفر کے دوران میں شاہ عالمی لاہور کے رہائشی ضامن صاحب سے ہماری دوستی ہوگئی تھی۔ لاہور پہنچنے کے بعد بھی کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے۔ کاروبار کا زیادہ تر بوجھ چھوٹے بھائی حماد نے ہی اٹھا رکھا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تین چار ملاقاتوں سے ضامن صاحب کچھ چپ چپ ہیں۔

وہ مارچ کی ایک خوشگوار صبح تھی جب ہماری نمبر شاپ پر ان کا فون آیا، ان کی آواز کسی بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ بھرائے لہجے میں بولے۔ ”طاہر! تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ تمہاری شاپ پر آ رہا ہوں۔“

میں بھی پریشان ہوا۔ آدھ گھنٹے میں وہ اپنی ایف ایکس کار پر نمبر شاپ پہنچ گئے۔ ان کا قدرے گول چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ وہ خوش باشی جو ہم نے تھائی لینڈ اور سنگاپور میں دیکھی تھی دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ ہم ایک علیحدہ کمرے میں جا بیٹھے۔

وہ بڑی دیر تک سنسنی خیز سی تمہید باندھتے رہے۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ بالآخر وہ کراہتی ہوئی سی آواز میں بولے۔ ”طاہر! مجھے لگتا ہے کہ..... مجھے ایڈز ہوگئی ہے۔“

میرا دماغ چیخ کر رہ گیا۔ ان کا لہجہ ہرگز ایسا نہیں تھا کہ اسے مذاق سمجھا جاتا۔

”یار! ضامن بھائی یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ کس نے کہا ہے آپ کو؟“

”کوئی کیا کہے گا۔ میں خود جانتا ہوں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔“

میں ہکا بکا تھا۔ ان دنوں ایڈز یعنی "HIV" کا نام نیا

نیا منظر عام پر آیا تھا اور اس کا بہت زیادہ چرچا بھی تھا۔ ذرائع ابلاغ پر گاہے بگاہے آگاہی مہم بھی چلائی جاتی تھی۔ احتیاطی تدابیر کا شور تھا۔

میں نے کہا۔ ''ضامن بھائی! ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ کیا کوئی علامت وغیرہ ظاہر ہوئی ہے آپ میں؟''

انہوں نے غم آگیں نظروں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر لرزاں ہاتھوں کے ساتھ اپنے پیٹ سے قمیص اٹھائی۔ میں چونکا۔ ان کے جسم پر چھوٹے چھوٹے دانے اور سرخی مائل داغ نظر آرہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ضامن نے پژمردہ لہجے میں مزید بتایا۔ ''کچھ اور علامتیں بھی ہیں ظاہر۔ چھینکیں مسلسل آتی ہیں۔ ناک کی اندرونی جھلی بہت حساس ہوگئی ہے۔ کسی وقت ٹمپریچر بھی ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ضامن بھائی! ضروری نہیں کہ خدانخواستہ یہ ایڈز ہی ہو، کسی اور تکلیف کی علامتیں بھی تو ہوسکتی ہیں اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اس بیماری کی بنیادی وجہ غیر ازدواجی جنسی تعلقات ہیں۔''

''ظاہر! ایسے تعلقات کوئی اکلوتی شرط نہیں ہے۔ انتقال خون، اور مشکوک سرنجیں وغیرہ بھی وجہ بن سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پسینا اور لعاب دہن بھی بیماری منتقل ہونے کا سبب بن جاتے ہیں۔''

میں نے ذرا جھلا کر کہا۔ ''آپ نے تو ماضی قریب میں کوئی انتقال خون نہیں کرایا اور نہ کہیں کوئی ایسا لعاب دہن چکھا ہوگا۔''

واقعی وہ اس قماش کے بندے تو نہیں تھے، مگر میرے جملے کے آخری حصے نے انہیں کچھ اور بھی گم صم کر دیا۔

پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس نے کہا کہ شاید ماضی میں ان سے کوئی اس طرح کی غلطی ہوچکی ہے۔ ہماری یہ نہایت پریشان کن گفتگو جاری رہی اور آخر میں انہوں نے یہ عقدہ بھی کھول دیا۔ کوئی چار ماہ پہلے بھی انہوں نے بنکاک کا ایک ٹور کیا تھا۔ اس ٹور میں فیصل آباد کے تین چار اوباش بندے بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک تو ضامن صاحب کی طرح گارمنٹس کی خرید کے لیے ہی گیا تھا۔ باقیوں کا مقصد صرف اور صرف عیاشی اور رنگ رلیاں تھی۔ وہ پیتے پلاتے بھی تھے۔ ایک رات وہ چاروں ضامن ریاض کو بھی کھینچ کر ایک کلب میں لے گئے۔ وہاں کسی مشروب میں انہیں تھوڑی تھوڑی وہسکی ملا کر پلاتے رہے۔ یہ مدہوش ہوگئے تو دو تھائی لڑکیاں ان کے ساتھ خرمستی کرنے لگیں۔ ان کی مدہوشی کچھ کم ہوگئی اور یہ ہلکی پھلکی مزاحمت کر کے ان کے حصار سے نکل گئے۔

اب اس واقعے کے نتیجے کو ضامن صاحب کا واہمہ بھی قرار دیا جاسکتا تھا مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں تھا کہ اس درجے کے تعلقات بھی کثرت سے HIV کا سبب بن رہے تھے۔ اگلے روز میں نے شعیب کو بھی اس سارے واقعے کے بارے میں بتادیا۔ ہم دونوں نے بہت کوشش کی کہ ضامن صاحب کو ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر قائل کریں تاکہ ان کا ضروری ٹیسٹ ہوسکے مگر وہ کسی طور اس طرف نہیں آتے تھے اور کسی حد تک وہ درست بھی تھے۔ خدانخواستہ رپورٹ پازیٹو ہوجاتی تو کیا ہوتا۔ ایسے مریضوں کو فوراً خطرناک اچھوت قرار دے کر الگ تھلگ کر دیا جاتا تھا۔ اہل خانہ اور خاندان برادری میں جو بدترین ذلت اٹھانا پڑتی تھی وہ علیحدہ تھی۔

یہ بڑے روح فرسا دن تھے۔ ایک دن تو ضامن صاحب شام پر میرے پاس آئے اور علیحدہ کمرے میں باقاعدہ رونے لگے۔ عجیب ڈرامائی لہجے میں بولے۔ ''ظاہر! میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ پاکستان سے باہر چلا جاتا ہوں۔ جو کچھ ہوگا، پھر وہیں پر ہوگا۔''

میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اٹل تھے۔ انہوں نے رقت آمیز لہجے میں مجھ سے درخواست کی کہ میں انگلینڈ جانے میں ان کی مدد کروں۔ میں ان کے سامنے معراج رسول صاحب کی بہت تعریفیں کرتا رہتا تھا۔ ضامن ریاض کو یہ بھی معلوم تھا کہ معراج صاحب لندن میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

انہوں نے کہا۔ ''ظاہر! میں بس ایک ہفتے کے اندر نکل جانا چاہتا ہوں۔ تم آج ہی معراج صاحب سے فون پر رابطہ کرو ہلکہ ہوسکے تو ابھی کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہم دونوں انگلینڈ کا فوری ویزا لگوانا چاہتے ہیں۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ ''آپ 'ہم دونوں' کی بات کیوں کر رہے ہیں؟''

وہ حتمی لہجے میں بولے۔ ''ظاہر! تم بھی میرے ساتھ چلو۔ بے شک ایک دو ہفتے وہاں گزار کر واپس آجانا۔ تمہارے سفر کا خرچا بھی میرے ذمے۔''

وہ یوں بات کر رہے تھے جیسے انگلینڈ کا ویزا ہمارے

سامنے ہی دھرا ہوا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان کی غیر معمولی بے چینی اور ہراسیت پر ترس آرہا تھا۔ ان کی خوف زدہ عجلت نے مجھے بھی متاثر کرنا شروع کردیا تھا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو سہ پہر کے وقت لینڈ لائن پر میں نے کراچی میں معراج صاحب کو فون کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے بولے۔ معراج صاحب کو بھی پتا تھا مجھے گھومنے پھرنے کا شوق ہے۔ انگلینڈ کے وزٹ کے بارے میں بھی ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔ کچھ تمہید باندھنے کے بعد میں نے معراج صاحب سے کہا۔ ”میں اور میرا ایک دوست انگلینڈ جانا چاہ رہے ہیں جناب۔ آپ اس سلسلے میں کچھ ہیلپ کیجیے۔“

”کیوں نہیں۔“ وہ اپنے مخصوص بھاری مگر ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ”ہوسکتا ہے کہ دو تین ہفتوں تک لندن جاؤں۔ وہاں ایک دوست کے ہاں شادی کی تقریب بھی ہونے والی ہے۔ میں تمہیں دعوتی کارڈ ارسال کروں گا اور کچھ پوائنٹس بھی بتاؤں گا۔ بہت اُمید ہے ویزا لگ جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کی بات ٹھیک ہے جی۔ لیکن میں اور میرا دوست فوری جانا چاہتے ہیں۔ سات آٹھ دن کے اندر۔“

یقیناً مجھے اس طرح کی ہنگامی گزارش نہیں کرنا چاہیے تھی۔ مگر ضامن صاحب نے اس طرح کا ماحول پیدا کردیا تھا کہ میں بھی اس کے ”ٹرانس“ میں آگیا تھا۔

معراج صاحب ذرا سا چونکے، پھر تھوڑا ہنس کر بولے۔ ”خیریت ہے بھئی! کوئی مسئلہ ہے، جو اتنی جلد نکلنا چاہ رہے ہو؟“

میں سٹپٹا گیا۔ ان دنوں ملک کے حالات خراب تھے سندھ اور دیگر علاقوں میں بہت پکڑ دھکڑ ہورہی تھی۔ میرے حوالے سے تو معراج صاحب یقیناً مطمئن ہی ہوں گے لیکن ”نامعلوم دوست“ کے بارے میں وہ کیا جانتے تھے۔

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک جذباتی شخص اپنے تمام تر خوف اور واہموں کے ساتھ میرے سر پر کھڑا ہے اور یہ فون کروا رہا ہے۔

انہوں نے نرم الفاظ میں مجھے سمجھایا کہ حالات مشکل ہیں۔ اتنی جلدی ویزا لگنا دشوار ہے اور ہم نے سیر کے لیے ہی تو جانا ہے اس کے لیے جون جولائی کا موسم زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

معراج صاحب کو کال کرنے کے بعد مجھے ضامن ریاض پر بھی جھلاہٹ محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے اپنے غیر معمولی خوف و ہراس کی وجہ سے مجھے بھی ایک بے عقل فون کال پر آمادہ کردیا تھا۔

اس قصے کا اختتام یوں ہوا کہ ضامن جی کا اگلا ایک مہینا بھی سخت عذاب میں گزرا۔ چپکے چپکے مختلف دوائیں بھی اپنے جسم کے دانوں اور داغوں پر لگاتے رہے پھر اچانک یوں ہوا کہ انہیں افاقہ ہونا شروع ہوگیا۔ ایلرز کی ”مہینہ“ ساری علامتیں ایک ایک کرکے غائب ہونے لگیں۔ وہ توبہ استغفار میں مشغول ہوئے۔ ایک دن انہوں نے میرے اور شعیب کے سامنے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے کہ اب تھائی لینڈ وغیرہ کا رخ نہیں کریں گے۔ کہنے لگے۔ ”لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھنے سے بھی کوئی نہ کوئی چنگاری کپڑوں پر پڑ ہی جاتی ہے۔“

ایک ڈیڑھ ماہ بعد ان کی خوش مزاجی اور اردو دانی بھی لوٹ آئی۔ وہ فون کرنے لگے اور اس طرح کے فقرے پھر سننے کو ملنے لگے۔ ”یار! یہ قضائے الٰہی سے فوت ہونے والا اعلان بالکل غلط ہے، بھلا کوئی قضا کے بغیر بھی فوت ہوتا ہے۔“

کبھی کہتے، یہ صنف مخالف کا اشتعال انگیز لفظ کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میاں بیوی کے جھگڑوں کی بنیاد ہی ایسے الفاظ ہیں۔

ایک دن ہنستے ہوئے فرمانے لگے۔ ”میری شادی کے حوالے سے میرے والد اور والدہ میں مکمل اتفاق تھا۔ دونوں یہ کہتے تھے کہ یہ شادی ہماری لاشوں سے گزر کر ہوسکتی ہے۔“

غالباً جون جولائی میں معراج صاحب لندن پہنچے۔ انہوں نے وہاں سے مجھے فون کیا۔ ”ہاں بھئی! شادی قریب آرہی ہے۔ تمہارے اور تمہارے دوست کے لیے دعوتی کارڈ بھیجوں؟“

میں نے کہا۔ ”جناب! دوست کا پروگرام تو اب نہیں رہا۔“

”تو تمہارے لیے بھیج دیتا ہوں۔“ انہوں نے کہا اور پھر واقعی کارڈ بھیج بھی دیا۔

کوشش کرتا تو ویزا لگ بھی جاتا لیکن کچھ رکاوٹیں آڑے آئیں۔ بجٹ درہم برہم ہورہا تھا۔ سب سے چھوٹے بیٹے اورلین کی پیدائش بھی چند روز پہلے ہوئی تھی۔ یوں یہ

اسکوپ ضائع ہوگیا۔ تاہم معراج صاحب سے ملاقات یوں ہوگئی کہ لندن سے واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ لاہور تشریف لے آئے۔ سن اور مہینا ٹھیک سے یاد نہیں۔ انہیں ایئرپورٹ سے لانے کی ذمے داری میری تھی۔ میں نے انہیں ریسیو کیا۔ وہ پہلی بار مجھے کچھ اپ سیٹ سے نظر آئے۔ پیشانی پر الجھن کی شکن تھی۔ انہوں نے ہوٹل انٹر کانٹینٹل میں ٹھہرنا تھا لیکن مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ ''گھر چلو۔''

میں انہیں گاڑی پر گھر لے آیا۔ مجھے پتا چلا کہ معراج صاحب کے کسی دوست کا غالباً ہوٹل کے معاملات میں عمل دخل تھا۔ اس نے بہ اصرار معراج صاحب سے کہا تھا کہ وہ برائے نام یا بغیر رینٹ کے اعزازی طور پر ہوٹل میں قیام کریں۔ تاہم اب معراج صاحب کو پتا چلا تھا کہ بکنگ مکمل نہیں ہے۔ وہ متبادل انتظام کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ فون معراج صاحب کے لیے تھا اس میں کسی کی طرف سے کوآرڈینیشن کی گئی تھی اور یہ کوئی ایک فون کال نہیں تھی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے فون کی گھنٹی بجتی چلی گئی اور کالز آتی چلی گئیں۔ میں ٹھیک سے سن نہیں سکا لیکن شاید ہوٹل مینجمنٹ کی طرف سے بھی معذرت کا کوئی فون آیا۔ روم کی بکنگ میں غلطی درست ہوگئی۔ معراج صاحب میرے ساتھ انٹر کانٹینٹل میں چلے گئے۔

لاہور میں معراج صاحب کو کئی لوگوں سے ملنا بھی تھا۔ ایک دن میرے حصے میں بھی آیا کہ میں انہیں لاہور میں تھوڑا گھما پھرا دوں۔ میں نے گاڑی پر انہیں ان کی پسندیدہ جگہیں دکھائیں۔ ہمارے شہروں میں ہمیشہ سے فقیروں محتاجوں کی بہتات رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا۔ ''معراج رسول صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ ضرورت مند ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں..... اور وہ انہیں دینے میں بخل بھی ہرگز نہیں کرتے تھے۔ بزرگ کہتے ہیں۔ ''اگر تم سے کوئی مانگتا ہے تو شکر کرو کہ تم اس قابل نظر آتے ہو۔''

ہم ماڈل ٹاؤن پارک میں کہیں تھے۔ ایک جگہ گاڑی پارک کرکے ہم باغ کی سمت جانے لگے تو معراج صاحب نے فرمایا۔ ''گاڑی اچھی طرح لاک کردی؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ذرا مسکرا کر بولے۔ ''بے شک تمہاری گاڑی کی بھی قیمت ہے لیکن اس کی ڈکی میں، میں نے اپنے مصنفین کے جو مسودے رکھے ہوئے ہیں وہ زیادہ قیمتی ہیں۔'' (یہ ایک کافی بڑا پلندہ تھا)

ان کی ازراہ مذاق کہی ہوئی اس بات سے پتا چلا تھا کہ اپنے پرچوں میں شائع ہونے والی کہانیوں کی ان کے نزدیک کیا قدر و قیمت تھی اور وہ انہیں خود پڑھنے میں کتنی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ پنجاب کا رخ کرتے تو اکثر مری سے آگے بھوربن کے پی سی ہوٹل کی طرف نکل جاتے۔ وہاں بھی مسودے ان کے ساتھ ہوتے۔ یہ کام عموماً لندن میں بھی جاری رہتا۔

ہم آگے بڑھے تو قندھاری انار کا جوس فروخت کرنے والا ایک صاف ستھرا اسٹال نظر آیا۔ میرے نزدیک قندھاری انار کا ترش جوس نزلے زکام کو دعوت دینے والی چیز تھی مگر جب معراج صاحب نے جوس کا ایک کنگ سائز گلاس بڑی رغبت سے پیا تو مجھے بھی کچھ حوصلہ ہوا اور میں نے اپنے چھوٹے گلاس میں سے چند گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف چھپا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کل تک معراج صاحب نزلے کھانسی کا شکار ہو چکے ہوں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس بات کا علم مجھے کئی برس بعد ہوا کہ انار کا جوس شریانوں کی صفائی اور دل کی طاقت کے حوالے سے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے اور اگر ایسی ترش چیزیں تواتر سے استعمال کی جائیں تو ان کے منفی اثرات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔

جب ہم گاڑی پر ہوٹل کی طرف واپس آرہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے تمہارے پاؤں میں بگولے بنے رہتے ہیں۔ اگلی گرمیوں میں کوشش کرکے لندن آؤ۔ بہت اچھا موسم ہوگا۔'' پھر ذرا رک کر مسکرائے اور بولے۔ ''کراچی میں تم نے ٹھاٹ باٹ دیکھے ہیں لیکن وہاں لندن میں اگر معراج رسول تمہیں اپنی گاڑی خود دھوتا اور شاپنگ کرتا نظر آئے تو حیران مت ہونا۔ وہاں کا رہن سہن ایسا ہی ہے۔''

ان کی شخصیت دلآویز تھی۔ مبہم باتیں اور گفتگو میں بے جا پردہ داری وہ نہیں کرتے تھے۔ بے تکلفی کا یہ انداز ان کے اردگرد کے لوگوں کو ان کے بہت قریب کردیتا تھا۔

غالباً اسی دوران میں معراج صاحب نے از خود ہی قسط وار ناولوں کے معاوضے میں کچھ اضافہ کردیا۔ ایک دن میں معراج صاحب اور آفاقی صاحب کے ساتھ پی سی کی لابی میں بیٹھا تھا۔ آفاقی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''طاہر! تمہیں پتا ہے کسی سے Ransom لینا کتنا بڑا جرم ہے؟''

''جی؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

وہ بولے۔ ''تم ہر مہینے بڑے دھڑلے سے جے ڈی

پی سے Ransom (تاوان) لیتے ہو۔ لیتے ہو یا نہیں؟"

میں ان کی بات سمجھ کر مسکرایا۔ مگر جواب کوئی نہیں دیا۔ حالانکہ جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ آپ بھی تو تاوان لیتے ہیں لیکن اس کا نام آپ نے فلمی الف لیلیٰ رکھا ہوا ہے۔ معراج صاحب ہماری باتوں سے لطف لیتے رہے اور بے تکلفی سے ہنستے رہے۔

☆☆☆

اب پھر وہی صحن اور وہی روشن لکیر..... اسی یادگار نارسائی اور دوری کا مختصر سا احوال۔ پچھلے آٹھ دس سال سے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ زویا اور اس کے اہلِ خانہ کہاں ہیں۔ وہ پرانا گھر چھوڑ کر بہت پہلے جا چکے تھے۔ میں نے بھی کبھی جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ کہاں کس حال میں ہیں۔ بس کبھی کبھی میں اپنے پرانے گھر واقع نواں کوٹ جاتا جہاں بہن بھائی تو موجود تھے مگر والد صاحب کی وفات کے بعد بہت اداسی محسوس ہونے لگی تھی۔ کبھی وقت اوپر چھت پر چلا جاتا، جہاں چار فٹ اونچی منڈیر تھی۔ ایک سنسان صحن تھا اور درمیان میں ایک میدان تھا جو کبھی پار نہ کیا جا سکا تھا۔ اس گھر میں معلوم نہیں اب کون لوگ بستے تھے..... اجنبی چہرے، اجنبی آوازیں۔ میدان میں کچھ تعمیرات بھی ہو چکی تھیں جن کے سبب صحن کا ایک بڑا حصہ چھپ چکا تھا۔ وہی صحن جس میں برسوں پہلے مارچ کی ایک سنہری دوپہر کو ایک کینو پھینکا گیا تھا اور پھر کبھی پتا نہ چل سکا تھا کہ "محبت" کے لفظ والا وہ کینو کس نے اٹھایا تھا؟ اور صرف یہی سوال نہیں لڑکپن کے ترنگ آمیز دور کے کئی اور سوال بھی ہمیشہ کے لیے سینے میں دبے رہ گئے تھے۔

یہ تو میری شریکِ حیات کی بے پایاں محبت اور توجہ تھی جس نے مجھے سنبھالا اور مجھے بتدریج محرومیوں کے اذیت ناک احساس سے دور کر دیا۔ اس نے قدم قدم پر ثابت کیا کہ وہ بہت کھلے دل دماغ اور بڑے ظرف کی مالک ہے۔ بے شک ایک نامور عالم دین کی پوتی ہونا بھی ایک وصف تھا لیکن اس کے اپنے ظاہری و باطنی اوصاف بھی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ہماری زندگیوں پر خوشگوار اثرات ڈال رہے تھے۔

یہ وہ حالات تھے جن میں میری زندگی کے پُرسکون پانی میں پھر ایک متلاطم لہر پیدا ہوئی۔ ہمارے پرانے محلے میں میرا ایک بچپن کا دوست امتیاز بھی تھا۔ سرکاری ملازمت کر رہا تھا۔ کبھی کبھار ملنا ملانا بھی ہو جاتا تھا۔ اسے بھی میری اور زویا کی وہ درد بھری کہانی معلوم تھی جو ان در و دیوار میں، ان گلیوں میں کونپل کی طرح پھوٹی کئی برس پروان چڑھی اور پھر خاموشی سے مر گئی۔

ایک روز بے تکلفانہ موڈ میں میرے پاس آیا، کہنے لگا۔ "تمہارے لیے ایک جانکاری لے کر آیا ہوں۔ تمہیں پتا ہے کہ زویا جس کے تم دیوانے تھے اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "اب مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔"

"لیکن کبھی کبھار سوچتے تو ہو گے نا اس کے بارے میں۔"

"یہ سب کیوں کہہ رہے ہو تم؟"

اس نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ کچھ روز پہلے اسے اپنے نکاح نامے کی نقل کی ضرورت پڑی۔ وہ متعلقہ نکاح خواں صاحب سے ملا۔ ان سے کچھ دوستی بھی ہو گئی۔ وہیں پر کسی اندراج میں اسے زویا کے نکاح نامے کی تفصیل بھی نظر آئی۔ امتیاز کا نکاح بھی انہی تاریخوں میں چند روز کے فرق سے ہوا تھا۔ اس نے اپنے نکاح نامے کے ساتھ زویا کے نکاح نامے کی کاپی بھی نکلوائی۔

اس نے کاپی مجھے دکھائی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں پہلی بار زویا کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ دیکھ رہا تھا۔ بہت حسرت رہی تھی کوئی ایسا لفظ دیکھنے کی۔ لیکن یہ اس کے دستخط تھے جو اس نے نکاح نامے پر کیے تھے اور ہمیشہ کے لیے کسی کی ہو گئی تھی۔ کئی پرانے زخم کھرچ گئے۔ امتیاز تو مجھے وہ نقل دے کر چلا گیا مگر مجھے ماضی کی بھولی بسری یادوں کے حوالے کر گیا۔ نکاح نامے پر دیگر تفصیلات کے علاوہ دولہا کا مکمل ایڈریس بھی ہوتا ہے۔ یہ ایڈریس ٹاؤن شپ کے علاقے کا تھا۔

پتا نہیں کہ وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جب میرے دل میں یہ خواہش جاگی کہ زندگی میں کم از کم ایک بار پھر زویا کو دیکھا جائے۔ کم و بیش دس سال بعد وہ کیسی لگتی ہے کیا کرتی ہے۔

ایک عجیب سا جذباتی بہاؤ تھا۔ چار پانچ روز بعد کی بات ہے میں نے گاڑی پکڑی اور ایڈریس والے ایریا میں جا پہنچا۔ پوش علاقہ تھا، اچھی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں مطلوبہ کوٹھی کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مزید کی ہمت نہیں ہوئی واپس آ گیا۔

ذہن میں سخت اتھل پتھل تھی۔ یہ سب کچھ بڑا ہی "آک ورڈ" لگ رہا تھا۔ دماغ کچھ اور کہتا تھا لیکن دل کہتا تھا کہ..... تم نے اس کی زندگی میں مداخلت تھوڑا ہی کرنی ہے

بس گھر میں آتے جاتے یا کسی قریبی بازار میں اسے دور سے دیکھنا اور واپس چلے آنا۔ کشمکش جاری تھی۔ تین چار روز بعد مجھے اتفاقاً علی الصباح کلمہ چوک کی طرف جانا پڑ گیا۔ وہاں سے ٹاؤن شپ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی مہران کار کا رخ ٹاؤن شپ کی طرف موڑ دیا۔ ایڈریس پر پہنچا تو یہ دیکھ کر دل سینے میں اچھل گیا کہ وہ گھر سے باہر ہی موجود تھی۔ میں نے مہران کار ایک گلی کی اوٹ میں روک دی اور اسے دیکھنے لگا۔ مشرقی افق سے سورج طلوع ہوتا تھا اور اس کی سنہری دھوپ پھول پتوں اور در و دیوار کو روشن کرتی تھی۔ تقریباً سات آٹھ سال کا ایک بچہ اسکول یونیفارم میں ہاتھوں میں کرکٹ بیٹ پکڑے کھڑا تھا۔ وہ اسے بال پھینک رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میں گرد و پیش سے یکسر بے خبر ہو گیا۔ پھر سڑک پر لڑھکتا ہوا بال پکڑنے کے لیے اس نے رخ پھیرا تو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ درمیان میں چالیس پچاس قدم کا فاصلہ تھا۔ اسی میدان جیسا اور اسی خواب جیسا جو کبھی پار نہ ہوا تھا۔

وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی، جیسے آنکھیں سکوڑ کر اپنی حسیات کو آنکھوں میں جمع کر رہی ہو، پھر اس نے جلدی سے بچے کو بازو سے پکڑا اور گھبرائی ہوئی سی گھر میں اوجھل ہو گئی۔ میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ایک ہٹا کٹا ادھیڑ عمر شخص مجھے گھورتا اور جاگنگ کرتا ہوا پاس سے گزرا۔ مجھے وہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں لگا۔ واپس چل دیا۔

مجھے یوں لگنے لگا کہ دس سال سے رکی ہوئی ایک گھڑی اچانک پھر چل پڑی ہے۔ دماغ کہتا تھا کہ اسے چلنا نہیں چاہیے۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ موسموں نے بہت سے رنگ بدل لیے ہیں اور آنگنوں میں بہت سے پھول کھل چکے ہیں۔

دل کہتا تھا وہ آج بھی خوبصورت ہے۔ اس کی آواز میں آج بھی جلترنگ ہوگا۔ تم بس ایک بار اس سے مل لو، اس کی آواز سن لو، کوئی بھی بہانہ بنا لینا۔ کوئی بھی عذر تراش لینا۔

ایک سحر بہاؤ تھا جو اپنے اندر بہاتا چلا جا رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور پھر ایک روز عجیب سی لہر میرے اندر اٹھی۔ میں نے سب اندیشے بالائے طاق رکھے اور اس کے دروازے پر جا پہنچا۔ مجھے اس آشوب میں دھکیلنے والا کھلنڈرا امتیاز بھی میرے ساتھ ہو لیا تھا۔ زویا کے شریک حیات کا نام ہمیں معلوم تھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور یقینی بات تھی کہ صاحب خانہ اپنے کام پر ہوں گے۔

امتیاز نے کال بیل دی۔ اندر سے وہی بچہ بولا۔ ''کون؟''

امتیاز نے فرضی نام بتایا اور پوچھا۔ ''اعجاز صاحب سے ملنا ہے۔''

حسب توقع جواب آیا۔ ''وہ تو گھر پر نہیں ہیں؟''

''اچھا۔ ہو سکے تو فون نمبر دے دیجیے ضروری بات کرنی ہے۔'' امتیاز نے کہا۔

تھوڑے تذبذب کے بعد بچے نے وہیں کھڑے کھڑے نمبر لکھوا دیا۔

ان دنوں موبائل فون کا رواج ایسا عام نہیں تھا۔ فون نمبر سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اسی گھر کا نمبر ہے۔ مقصد حاصل ہو گیا تھا ہم واپس آ گئے۔

ایک خود فراموشی کی سی کیفیت تھی۔ گھر آ کر میں جیسے کچھ ہوش میں آ گیا۔ یہ کیا کر رہا تھا میں؟ شادی کے دس سال بعد اور گھر گرہستی والی زندگی کے بعد کیا یہ سب کچھ مجھے زیب دیتا تھا؟ پھر میں سوچنے لگا، چند روز پہلے اس نے مجھے دیکھا تھا اور اس کے چہرے پر کچھ عجیب تاثرات ابھرے تھے اور اب ایک ناسمجھ بچے نے مجھے گھر کا فون نمبر دے دیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ چوکی بھی ہو اور اس نے بعد میں بچے کو سرزنش کی ہو کہ اس نے کسی اجنبی کو نمبر کیوں لکھوا دیا۔

کشمکش عروج پر تھی۔ ایک بار تو دل چاہا نمبر ضائع کر دوں۔ پھر دل نے ورغلایا۔ صرف ایک بار بات کر لینے میں آواز سن لینے میں کیا حرج ہے۔ میں بالائی منزل پر دکان کے آفس میں بیٹھا تھا۔ نمبر میرے سامنے ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ کسی ایسے رابطے کے لیے میں کتنا ترسا کرتا تھا۔ ایک خط کے انتظار (یا بے جا انتظار) نے مجھے کتنا ہلکان رکھا تھا اور اب میں چند نمبر پریس کر کے اس سے بات کر سکتا تھا۔

دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میرا ہاتھ بے ساختہ فون کی طرف بڑھ گیا۔ کہیں دور ٹاؤن شپ کے اس خوبصورت گھر میں بیل ہوئی۔ پھر اسی کی ترنم آواز ابھری۔

''ہیلو..... ہیلو کون؟'' میں خاموش رہا۔

''ہیلو کون ہے؟'' دوبارہ پوچھا گیا۔

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس کی آواز سننے کا ''ایپیکٹ'' اتنا زیادہ تھا کہ میں ذرا وقفہ لینا چاہتا تھا۔ خود کو سنبھالنا چاہتا تھا۔ میں اپنی کیفیت بلاکم و کاست بیان کر رہا ہوں۔ چند منٹ بعد میں دوبارہ فون

کی طرف متوجہ ہوا..... لیکن یہی لمحے تھے جب وہ دوسری عورت میرے سامنے آن کھڑی ہوئی جو پہلی عورت اور پہلی محبت کے زخم مندمل کرنے کے لیے اکثر و بیشتر مرد کی زندگی میں آتی ہے۔ مجھے یہی لگا کہ میری شریکِ حیات اپنے دونوں بازو پھیلا کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔ چہرے پر اجالا، آنکھوں میں مہر و وفا اور مستحکم ارادہ..... نہیں، میں آپ کو آگے نہیں جانے دوں گی۔ آگے کچھ نہیں ہے۔ بس اندھیرا ہے، گہرے، مہلک گڑھے ہیں۔ آپ کو میرے لیے، ہم سب کے لیے رکنا ہوگا۔

ایک دوراہا میرے سامنے تھا اور جہاں سے دوراہے کا دوشاخہ پھوٹتا تھا وہاں وہ کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر۔ ایک محبت بھرے غیر معمولی اعتماد کے ساتھ۔ میرا ہاتھ فون کے ریسیور پر دھرا رہا مگر میں اسے حرکت نہ دے سکا۔ وہ فیصلہ کن لمحے تھے اور فیصلہ یہی ہوا کہ..... جس افسانے کو انجام تک لانا نہ ممکن..... میں نے فون سے ہاتھ اٹھا لیا اور فون نمبر والے کاغذ کے پرزے کر دیے۔

☆☆☆

عاطف اور خورد حورین کا عشق ممنوع ایک سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا تھا اور اس کہانی میں ایک نیا کردار داخل ہوا تھا جس کا نام ایاز تھا۔ وہ عاطف کا چھوٹا بھائی تھا اور اپنے ایک چچا کے پاس تائیوان میں تھا، وہیں پر اسٹڈی بھی کر رہا تھا۔ آج کل وہ پاکستان آیا ہوا تھا۔ اس سنگین و رنگین تذکرے کو آگے بڑھانے سے پہلے ان چند چھوٹے چھوٹے شگونوں کا ذکر کروں جو بچوں کی وساطت سے ہر آنگن میں پھوٹتے ہیں اور زندگی کی تلخیوں کو مدھم کرتے ہیں۔

میرا چھوٹا بیٹا اویس بمشکل دو سال کا تھا۔ اسے مٹی کھانے کی عادت پڑ گئی۔ کونے کھدروں اور کیاریوں وغیرہ سے مٹی ڈھونڈ ہی لیتا تھا۔ بہت دھیان رکھنے کے باوجود اس کا داؤ چل جاتا تھا۔ ایک روز میری اہلیہ شفیقہ اس کے لیے ایسے جوتے لے آئی جن کی ایڑی میں لائٹ اور "بیپ" کی آواز بھی ہوتی ہے۔ ننھا اویس اس بندوبست سے بے خبر تھا۔ اب وہ جب چوری چوری مٹی کھانے کے لیے اندرونی حصے سے نکلتا تو بیپ بیپ کی آواز اس کی مخبری کر دیتی تھی۔ اس کی دادی (خالہ مریم) چلاتیں "دیکھو دیکھو..... پکڑو..... چور مٹی کھانے جا رہا ہے۔"

بچے کو سختی سے منع کیا جائے پھر بھی وہ من مرضی کرنے کے لیے کوئی راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ ایک دن میں نے

جہانِ گانزوانگ

چین کے ممتاز ناول انعام یافتہ ادیب۔ وہ گنزو (Ganzhoo) صوبہ جیانگ میں ایک آفیسر کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدہ اداکارہ تھیں۔ 1962ء میں بیجنگ یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کی ڈگری لی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بھی رکن تھے، تاہم 1969 میں مستعفی ہو گئے۔ 1981ء سے 1987ء تک مختلف ادبی رسالوں میں مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ڈراما نگاری کی جانب بھی توجہ دی اور 1986 میں "The Other Shore" کے عنوان سے ان کا ڈراما اسٹیج پر دکھایا گیا۔ اس ڈرامے میں انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ لہٰذا حکومت نے ڈرامے پر پابندی لگا دی۔

چونکہ وہ پابندی کے ماحول میں لکھنے لکھانے سے قاصر تھے، لہٰذا 1987ء میں ہجرت کر کے پیرس کو اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے مصور بھی ہیں اور ان کے فن پاروں کی نمائشیں دنیا بھر میں منعقد کی جا چکی ہیں۔ 12 اکتوبر 2000ء کو سویڈش اکیڈمی نے ان کے لیے ادب کے نوبل انعام کا اعلان کیا۔

مرسلہ: عرش، شیخوپورہ

برساتی کے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔ کم سن اویس چھت پر تھا۔ ایک کنکر سا تھا جس کو چھت پر لڑھکاتا تھا، پھر منہ میں ڈالتا تھا۔ پھر دوبارہ لڑھکاتا تھا۔ مجھ پر عقدہ کھلا کہ چھت کی ٹائیلوں پر تھوڑی سی گرد ہے۔ وہ کنکر کو منہ میں گیلا کر کے چھت پر لڑھکاتا ہے، اسے مٹی لگ جاتی ہے، اسے منہ میں ڈال کر چوستا ہے۔ پھر دوبارہ لڑھکا دیتا ہے۔ میں اس کی معصومانہ چالبازی پر اش اش کر اٹھا۔

کچھ عرصہ بعد کی بات ہے، تھوڑا سمجھدار بھی ہو چکا تھا، ایک دن اچانک گم ہو گیا۔ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئے۔ مسجد میں اعلان کرانے تک نوبت آ گئی۔ بڑے بیٹے نوید نے گھبرا کر ایک ہزار نفل کی منت مان لی۔ کچھ دیر بعد اویس گھر کے ہی ایک واش روم میں چھپا ہوا مل گیا۔ خوشی سے سب کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے کوئی شرارت کی تھی۔ والدہ

نے ڈانٹا تھا کہ ابو کو آ لینے دو۔ اتفاقاً اسی وقت میں بھی شاپ سے آ گیا تھا۔ وہ واش روم میں جا گھسا تھا۔

اب نوید کو ایک ہزار نفل پہاڑ نظر آنے لگے۔ اس کے امتحان بھی سر پر تھے۔ میں نے کہا۔ ”یار! تم نے بھی ہاتھ کچھ ہولا رکھنا تھا نا۔“

بہرحال اس کا سوکھا منہ دیکھ کر سب نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ چالیس چالیس، پچاس پچاس نفل بانٹ لیے۔

ہر آنگن میں بچوں کی ایسی ہی معصومیت زندگی کو گوارا کرتی ہے..... آرزوؤں تک نارسائی کے دکھ بھلاتی ہے۔

ایک دفعہ ہم چڑیا گھر گئے۔ منجھلا بیٹا چند تین ساڑھے تین سال کا ہوگا۔ اسے مختلف جانوروں ہاتھی گھوڑے، اونٹ وغیرہ پر سواری کرائی۔ جب ببر شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچے تو وہ اسے خصوصی طور پر پسند آیا۔ اس نے ضد شروع کر دی کہ اب اس کے اوپر بھی بیٹھوں گا۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ شیر پر بیٹھنا تو ممکن ہو جاتا ہے لیکن پھر اترا نہیں جاتا۔

ایک ہزار نفلوں سے ایک اور بات یاد آ گئی۔ اس سے ملتی جلتی صورتِ حال پیچھے بیان کیے گئے ہارون بھائی کے واقعہ میں بھی پیش آئی تھی۔ شادی کی رات جب وہ گم ہوئے اور دو تین دن تک کچھ اتا پتا نہ چلا تو ان کی والدہ نے منت مان لی کہ ساری عمر ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھوں گی۔ ہارون بھائی کے ملنے کے بعد ٹھنڈے دل سے سوچا۔ صحت کے ایشوز بھی تھے۔ لہٰذا مفتی صاحبان کے مشورے سے کفارہ وغیرہ ادا کیا گیا۔ وقفے وقفے سے کچھ روزے بھی رکھے گئے۔

بچوں ہی کے حوالے سے ایک چھوٹا سا واقعہ انہی دنوں اور پیش آیا۔ ایک اتوار کی صبح میں اور چھوٹا بھائی ساجد اہل خانہ کے ساتھ قریبی گلشن اقبال گئے۔ کھیل کود کے دوران ساجد کی چھ سات سالہ بچی کو چوٹ لگ گئی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ تفریح بھول بھال گئی۔ ہم سب افراتفری میں پارک سے باہر آئے۔ میرے پاس سفید مہران گاڑی تھی۔ دیگر بچوں سمیت مضروب بچی کو بھی میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ سب بچوں نے اپنے جوتے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے جو گاڑی کے فرش پر ڈال دیے گئے۔

میں نے جلدی سے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ چابی بھی گھوم گئی مگر اچانک مجھے لگا کہ یہ میری والی گاڑی نہیں ہے۔ میں نے اسٹیئرنگ اور ڈیش بورڈ کو دھیان سے دیکھا۔

”ہم غلط گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں۔“ میں نے گھبرا کر اہلیہ سے کہا۔

دراصل ہماری مہران گاڑی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ ہم جلدی سے نکلے اور اپنی گاڑی میں بیٹھے۔ درد سے بچی کا برا حال تھا۔ فوراً اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ کافی دیر بعد پتا چلا کہ بچوں کے جوتے اس دوسری گاڑی میں ہی رہ گئے ہیں۔ اب واپس پلٹنے کا وقت نہیں تھا۔ اسپتال کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

بچی کے فریکچر کے لیے بہت زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ کلائی پلاسٹر سے ہی ٹھیک ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی آج بھی ذہن میں آتا ہے کہ ان دوسرے گاڑی سواروں نے جب اپنی گاڑی کے دروازے ان لاک دیکھے ہوں گے اور فرش پر بچوں کے نصف درجن جوتے اور کچھ پھول پڑے پائے ہوں گے تو ششدر ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ضعیف العقیدہ لوگ ہوں اور اس صورتِ حال کو ننھے منے بھتنوں کی کارستانی سمجھے ہوں۔

عاطف ایک عجب شکنجے میں تھا۔ وہ حورین کے سحر سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ دوسری طرف حورین بھی دیکھ رہی تھی کہ عاطف اب شادی شدہ ہے، مگر بار بار کے قطع تعلق کے باوجود خود کو روک نہ پائی تھی۔ درمیان میں دو چار ماہ کا وقفہ آتا تھا مگر پھر کسی نہ کسی بہانے فون پر بات چیت شروع ہو جاتی تھی۔ ایسے تعلق کو معاشرہ قبول نہیں کرتا اور مشرقی معاشرہ تو بالکل بھی نہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا غلط تھا۔ تاہم کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ حورین کے شوہر جمشید کا اس صورتِ حال میں بنیادی کردار ہے۔ غالباً اس نے اپنے معمولی جسمانی نقص کو اپنا احساس کمتری اور دیگر نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنایا۔ اپنی ازدواجی زندگی اور خلوت کے معاملات میں کئی شکوے گلے اور بد اخلاقیاں روا رکھیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ”ہم کار“ وجیہہ عاطف کو خود اپنی بیوی کے دل و دماغ میں راہ دی۔ اب وہ دونوں ایک الجھے تعلق میں بندھ گئے تھے اور جمشید کسی وقت بہت سٹپٹا بھی رہا تھا۔ اس کے باوجود عاطف اور جمشید ساؤنڈ اسٹوڈیو میں روزانہ ملتے بھی تھے اور گھنٹوں ساتھ بھی ہوتے تھے۔

اقبال ٹاؤن کے قریب سبزہ زار کا علاقہ اس وقت قریباً ویران پڑا تھا۔ بس کہیں کہیں کوئی گھر نظر آتا تھا۔ وہ سخت

سردیوں کے دن تھے۔ فون پر کئی راتوں سے عاطف اور حورین کے درمیان طویل گفتگو چل رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی گفتگو قربت کی خواہش کو ابھارتی رہتی ہے۔ ایک دھند آلود شام میں عاطف، حورین کو لے کر سبزہ زار کے کم آباد ایریا میں چلا گیا۔ دونوں گاڑی کے اندر ہی راز و نیاز اور لب و رخسار کے معاملات میں مصروف رہے۔

اس ملاقات کے اگلے روز وہ مجھ سے ملا۔ بولا۔ ''یار! مجھے لگتا ہے کہ خالص محبت صرف کہانیوں اور افسانوں میں ملتی ہے۔ ہم جو محبتیں کرتے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ ملاوٹ ضرور ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''عاطف! مجھے تو لگتا ہے کہ جس کو تم اب محبت کہنے لگے ہو وہ محبت ہے بھی کہ نہیں۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''قیامت کی نشانیاں ہیں۔ جس کو کبھی ہم سمجھا کرتے تھے وہ ہمیں سمجھا رہا ہے۔'' پھر اس نے اپنی کہی ہوئی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کسی وقت اسے لگتا ہے کہ حورین اس کے چھوٹے بھائی میں دلچسپی رکھتی ہے۔

میں نے سخت حیران ہو کر کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے ایاز؟''

وہ پھر مسکرایا۔ ''نہیں..... وہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ حورین کی ایک چھوٹی بہن ہے عدا۔ حورین کی طرح خوبصورت تو نہیں لیکن بس ٹھیک ہی ہے۔ بی سی ایس کر رہی ہے کچھ عرصہ پہلے تک حورین اسے لے کر ہمارے گھر بھی آتی رہی ہے۔ امی اور دادی سے ملواتی رہی ہے۔ حورین یہ بھی جانتی ہے کہ گھر کا بڑا ہونے کے سبب کوئی بھی میری بات ٹالتا نہیں۔ حورین کے دل میں ہے کہ کسی طرح ایاز اور عدا کا رشتہ ہو جائے۔ دبے لفظوں میں اس نے ایک دو بار مجھ سے بات بھی کی ہے۔''

''تو پھر کرا دو رشتہ۔ تمہارے لیے بھی راستہ کچھ اور کھل جائے گا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''سچ کہتے ہیں کہ عورت ایک گورکھ دھندا ہے۔'' عاطف نے طویل سانس لی۔ ''ایسی بات ہرگز نہیں کہ حورین مجھے استعمال کر رہی ہے۔ وہ تڑپتی ہے میرے لیے جیسے میں تڑپتا ہوں۔ ملاقات کے راستے تلاش کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اب اس نے یہ خواہش بھی پال لی ہے۔''

میں نے پچھلے ابواب میں ذکر کیا ہے کہ سبزہ زار کی ہی ایک تاریک سڑک پر عاطف اور حورین نے ایک جذباتی رومانی ملاقات کار کے اندر کی تھی۔ عاطف کی شادی سے پہلے یہ آخری ملاقات تھی اور وہ دونوں بھی کسی حد تک اسے آخری ہی سمجھ رہے تھے لیکن یہ آخری نہیں تھی۔ اب جو واقعہ ہوا وہ من و عن بیان کر رہا ہوں۔

مذکورہ بالا گفتگو کے چار پانچ روز بعد عاطف میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ ''یار! تمہارے وہ دوست ہیں نا شریف کیانی صاحب، ان کا ایڈریس مجھے دے دو۔''

شریف کیانی صاحب نوائے وقت میں میگزین انچارج تھے۔ بہت تیس آدمی تھے۔ ہم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''ان کا ایڈریس کیا کرو گے؟''

بولا۔ ''وہ بھی تو سبزہ زار میں ہی رہتے ہیں نا۔ ان کا ایڈریس لکھ کر گاڑی میں رکھ لیتا ہوں۔ اگر کہیں کوئی پوچھ تاچھ کر لے تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ کیانی صاحب کا گھر ڈھونڈ رہا تھا۔''

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ دسمبر کی ان ٹھٹھری ہوئی تاریکیوں میں رات آٹھ اور نو دس بجے کے درمیان عاطف، حورین کی گاڑی میں لے کر سبزہ زار کی کسی ویران سڑک پر جا رکتا تھا اور دونوں گاڑی میں بیٹھے ایک دوجے کی باہنوں میں محصور رہتے تھے۔ میں پہلے تو انکار کرتا رہا مگر جب اس نے بتایا کہ حورین پرسوں ہی بچے سمیت اپنے چچا کے پاس کراچی جا رہی ہے اور اس نے چار پانچ ماہ وہیں رہنا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ وہیں پر شفٹ ہو جائیں تو میں نرم پڑ گیا۔ عاطف اپنے کسی دور دراز اندیشے کے تحت حفظ ماتقدم کے طور پر ایڈریس مانگ رہا تھا۔ میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اسے کیانی صاحب کا ایڈریس لکھ کر دے دیا۔

مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ عاطف کی چھٹی حس نے بالکل ٹھیک کام کیا ہے اور آج ہی کی ملاقات میں اسے اس ایڈریس کی ضرورت پڑنے والی ہے۔

عاطف میرے ان تین دوستوں میں سے تھا جو اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ باقی دو کے نام شعیب اور عابد ہیں۔ مجھ سمیت شعیب اور عابد بھی بتدریج چھوٹی موٹی خرافات سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔ قلم بنی کم ہو گئی تھی۔ کبھی فلاحی کاموں کی طرف بھی توجہ کر لیتے تھے۔ عابد نماز بھی باقاعدگی سے پڑھتا تھا..... البتہ عاطف دوسری سمت چل نکلا تھا۔ اس کو ناصر والی سمت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک سحر تھا جس میں وہ جکڑا جا چکا تھا۔

جو واقعہ ہوا وہ عاطف کی زبانی کچھ اس طرح ہے۔ وہ 22 دسمبر کی ٹھٹھری کہر آلود شب تھی۔ رات نو بجے کا عالم تھا۔ سبزہ زار کی نسبتاً سنسان سڑک پر عاطف کی 'سوفٹ' کار کھڑی تھی۔ وہ حورین کے سحر کار حسن کی خوشہ چینی میں مصروف تھا۔ حورین اسے جلد از جلد واپس چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اچانک حورین کو کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کی نیلی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی خطرے کی علامت تھی کیونکہ پولیس موبائلز کی چھت پر عموماً یہی روشنی ہوتی ہے۔ ''عاطف وہ دور کیا ہے؟'' حورین نے کہا۔

وہ اتنا مگن تھا کہ اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ دونوں اس وقت بری طرح چونکے جب اہل کاروں سے بھری ہوئی ایک پولیس موبائل تیزی سے ان کے پاس آرکی۔ رائفل بردار اہل کار چھلانگیں لگا کر اترے اور کار کو گھیر لیا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' ایک اہل کار نے تند لہجے میں پوچھا۔

''گاڑی خراب ہوئی ہے۔'' عاطف نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور ساتھ ہی چابی دکھائی اور ''سلیف'' مار کر دکھایا۔ درحقیقت وہ گاڑی کا چور سوئچ پہلے ہی لگا چکا تھا۔

کایاں اے ایس آئی نے کہا۔ ''چلو کر لیتے ہیں گاڑی بھی اسٹارٹ۔ ویسے آپ جناب آئے کہاں سے ہیں؟''

عاطف نے اقبال ٹاؤن کا نام لیا اور چٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے دوست ہیں۔ ان کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں۔ کاغذ کی چٹ پر شریف کیانی صاحب میگزین ایڈیٹر نوائے وقت کے آگے ایڈریس لکھا ہوا تھا۔'' یقیناً اس چٹ نے اہل کاروں پر تھوڑا سا رعب ڈالا اور ان کے لہجے میں تندی تھوڑی سی کم ہوئی۔ مگر ان کے نزدیک عاطف اور حورین اب بھی پوری طرح مشکوک تھے۔ وہ خشمگیں نظروں سے دونوں کو گھور رہے تھے۔

اے ایس آئی نے حورین سے کہا۔ ''بی بی! آپ ذرا نیچے اتریں۔''

وہ چادر سنبھالتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ اے ایس آئی نے عاطف کو بھی نیچے اتارا اور کار کو مخاطب کر کے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اوئے کیا خرابی وڑ گئی ہے تجھ میں اس اندھیری سڑک پر۔'' وہ یقیناً یہی سمجھتے تھے کہ گاڑی کو چور سوئچ لگایا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے عاطف کی کار کے چور سوئچ کی ناب ٹوٹ گئی تھی صرف کیل سی باقی تھی۔ اہل کار ڈیش بورڈ کے نیچے دیر تک باپ ڈھونڈتا رہا وہ نہیں ملی۔ حورین کی شخصیت اور کس حد تک بارعب خاموشی بھی اہل کاروں کو کچھ نہ کچھ متاثر کر رہی تھی۔ عاطف نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں آپ لوگ کیا سمجھ رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں یہاں۔''

اہل کار بولا۔ ''گاڑی میں ایس ایچ او صاحب بیٹھے ہیں ان سے بات کرو۔ ویسے ہمیں پتا ہے گاڑیاں ایسی ہی اندھیری سڑکوں پر خراب ہوتی ہیں۔''

عاطف ایس ایچ او کے پاس پہنچا۔ غالباً اسے چٹ بھی دکھائی اور بتایا کہ وہ یہ ایڈریس ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایس ایچ او بھی شاید کسی لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا ہوگا۔ اس نے اہل کاروں سے کہا کہ دھکا لگا کر گاڑی اسٹارٹ کراؤ۔ اہل کاروں نے دھکا لگایا۔ عاطف نے چور سوئچ بند کیا، گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ جان بچی سو لاکھوں پائے والا معاملہ ہوا۔

حورین جو پہلے ہی ان ملاقاتوں میں ایک لمبا وقفہ چاہتی تھی۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور بولی۔ ''دیکھو عاطف! اب تو پولیس نے بھی وارننگ دے دی ہے۔ اب ہمیں یہ سب کچھ ختم کر دینا چاہیے۔''

''لیکن ایاز اور ندا والا معاملہ؟'' عاطف نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔ ''تم تو کہتی ہو کہ وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے ہیں۔''

''ان کی قسمت میں بھی جو لکھا ہوگا انہیں مل جائے گا لیکن اب ہمیں سات آٹھ ماہ کے لیے بالکل بھی رابطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ کبھی کبھی بہت اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔'' اس کا اشارہ شوہر جمشید کی طرف تھا۔

حورین نے جمشید کے اپ سیٹ ہونے کی جو بات کی تھی اس کا ثبوت تین چار ہفتے بعد ملا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ حورین، جمشید اور عاطف کی یہ تکون بڑی ہی عجیب تھی۔ رومانی لمحات میں حورین نے ایک سے زیادہ مرتبہ عاطف سے یہ بات کہی تھی کہ وہ جمشید سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ اس کے بچے کا باپ ہے اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتی۔

انہی دنوں میرا لکھا ہوا ایک پنجابی ڈراما، پی ٹی وی لاہور کے اسکرپٹ ایڈیٹر علی اکبر عباس کو بہت پسند آیا۔ اسکرپٹ پر میرا فون نمبر بھی تھا۔ نمبر شاپ کے فون پر کال آئی جو چھوٹے بھائی نے سنی۔ علی اکبر نے بتایا کہ ہم طاہر جاوید کا ڈراما ریکارڈ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈرامے کا نام پالیکھا (دھوکا) تھا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا تو آگے بڑھتا گیا۔ میرا لکھا ہوا ایک ڈراما ''بدلہ'' پی ٹی وی لاہور سے اسی مرتبہ ری ٹیلی کاسٹ ہوا

کرنا ناظرین کو کہانی ازبر ہوگئی۔ ٹی وی اسٹیشن پر آنا جانا ہو چکا تھا۔ جمیل گشکوری، محمد عارف اور محمد عظیم جیسے پروڈیوسروں سے جان پہچان ہوئی ایک روز میرے پنجابی ڈرامے تلاش کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ لیڈنگ رول اورنگ زیب لغاری کر رہے تھے۔ یہ انسپکٹر نواز خان کی تفتیشی کہانیوں میں سے ایک کہانی تھی۔ کہانی میں تھوڑا سا پیچ تھا جو فوری طور پر اورنگ زیب لغاری صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ذرا برہمی سے بولے۔ ”میرا تو خیال ہے کہ ریکارڈنگ پیک اپ کر دینی چاہیے۔“

جمیل گشکوری کہنہ مشق پروڈیوسر تھے وہ بھی ذرا تندی سے بولے۔ ”کیوں پیک اپ کی جائے ریکارڈنگ۔“

وہ کہانی کے الجھاؤ کو سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے وضاحت کی۔ کچھ کردار میں نے بھی ادا کیا۔ لغاری صاحب نیم مطمئن ہو گئے۔ بعد ازاں انہیں ایکٹ کرنے کا بہت مزہ آیا۔ تلاش نامی یہ ڈراما بھی بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ پی ٹی وی کے صوبائی ایوارڈ کے لیے بھی نامزد ہوا۔

میں جب بھی ٹی وی اسٹیشن آتا جاتا تھا۔ سوچتا تھا کہ وہ بھی کیا دور تھا جب یہاں مجھے پنکھا ہلانے والے ایک ملازم لڑکے کا رول آفر کیا گیا تھا اب میں محمد عظیم جیسے نامور پروڈیوسر کے ساتھ بیٹھ کر کہانیوں پر ڈسکشن کرتا تھا۔ ایسے لمحوں میں کبھی کبھی مجھے اپنی نمبر شاپ کا وہ ملازم فراست بھی یاد آ جاتا جس کے گلے میں ایک دہقانی سوز تھا اور جس کی حسرت تھی کہ میں کسی وقت اسے ریڈیو پاکستان ٹی وی اسٹیشن پر اپنے ساتھ لے جاؤں۔ ”کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ کہیں زمین تو کہیں آسمان نہیں ملتا۔“

میں ٹی وی پر اپنے کام کو آگے کیوں نہ بڑھا سکا اس کی کئی وجوہات تھیں جن میں سے ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس وقت مجھے باقاعدگی کے ساتھ ”ارننگ“ کی ضرورت تھی۔ آج کل کی طرح ڈھیروں ٹی وی چینل نہیں تھے اور پی ٹی وی سے رائٹرز کو جو آمدنی ہو رہی تھی اس میں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ مجھے اس حوالے سے ڈائجسٹ اور نوائے وقت جیسے اخبار زیادہ اپیل کر رہے تھے۔ ایک دو دفعہ عاطف بھی میرے ساتھ ٹی وی اسٹیشن گیا اور وہاں میری پذیرائی دیکھ کر خوش ہوا۔

عاطف کے معاملات سمجھ سے باہر تھے۔ اس پر تو باقاعدہ ڈراما لکھنے کو دل چاہتا تھا۔ حورین کراچی جا چکی تھی۔ وہ اس کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بمشکل ایک دو دفعہ بس فون پر

گرجدار چالیسیہ

(Roaring Forties)

وہ تند و تیز ہوائیں جو نصف کرہ جنوبی میں 140 اور 50 درجہ عرض بلد کے درمیان چلتی ہیں۔ چونکہ یہ 140 عرض بلد سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں تندی و تیزی کے علاوہ مہیب گرج بھی ہوتی ہے اس لیے ان ہواؤں کو گرجدار چالیسیہ کہتے ہیں۔ یہ ہوائیں منقلب تجارتی ہواؤں کی ایک قسم ہیں۔ شمالی نصف کرّے میں یہ ہوائیں چونکہ زمین اور پہاڑوں سے ہو کر آتی ہیں اس لیے ان کا زور رکاوٹ کے باعث کم ہو جاتا ہے اس کے برعکس جنوبی نصف کرّے میں خشکی کا وجود کم ہے اور ہر جگہ سمندر ہی سمندر ہے ان ہواؤں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں اس لیے یہ ہوائیں یہاں بڑی تیزی سے چلتی ہیں اور ان میں ایک مہیب گرج بھی ہوتی ہے۔ ان ہواؤں کا رخ اگرچہ شمال سے جنوب کی طرف ہوتا ہے، لیکن زمین کی گردش کے باعث ان کا رخ مشرق کی طرف ہو جاتا ہے۔

گردباد (Cyclone)

وہ تند و تیز ہوائیں جو مدور اور گول خطوط متساوی الحرارت کے اندر چلتی ہیں۔ ان میں ہوا کا دباؤ مرکز میں کم ہوتا ہے اور چاروں طرف بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے یہ ہوائیں شمال نصف کرّے میں اپنی دائیں جانب اور جنوبی نصف کرّے میں بائیں جانب گھوم جاتی ہیں۔ ان ہواؤں کی حرکت شمالی کرّے میں گھڑی کی سوئیوں کے مخالف اور جنوبی نصف کرّے میں ان کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں دو قسم کے گردباد شامل ہوتے ہیں۔ ایک وسطی گردباد جو منطقہ معتدلہ میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرے مداری گردباد جو منطقہ حارہ میں نمودار ہوتے ہیں۔

مرسلہ: نجمہ فصیح، لاڑکانہ

جاٹ

برعظیم پاک و ہند کا ایک قبیلہ جو پنجاب، سندھ، راجستھان اور مغربی اتر پردیش میں آباد ہے۔ غیر منقسم پنجاب میں راوی کے مغربی جانب کے اضلاع میں بہت سے جاٹ مسلمان تھے۔ لیکن وسطی پنجاب میں اکثر جاٹ سکھ اور جنوب مشرقی علاقے میں ان کی اکثریت ہندو تھی۔ تقسیم کے بعد تمام غیر مسلم جاٹ پاکستانی علاقوں سے ہندوستان چلے گئے۔ اور آج کل اتر پردیش کے شمالی اور مغربی اضلاع میں ان کی آبادی کثرت سے ہے۔ انہوں نے سلطنت مغلیہ پر زوال لانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اپنے آخری ایام میں یہ سلطنت اس قابل بھی نہ رہی کہ صدر مقام پر بھی جاٹوں کی لوٹ مار کا مقابلہ کرسکتی۔ جب محمد بن قاسم سے قبل عرب سپہ سالار بدیل بن طہفتہ البجلی نے دیبل کی بندرگاہ پر حملہ کیا تھا تو جاٹوں نے اس کا مقابلہ کرکے اسے ہلاک کردیا تھا۔ بعد میں ان کی مدد بھیجنے محمد بن قاسم سے 94ھ/712ء میں حملہ دیبل کے موقع پر ہوئی۔ مسلمانوں نے ان کو کثیر تعداد میں گرفتار کرکے حجاج بن یوسف کے پاس بھجوادیا۔ اس کے بعد سے یہ لوگ سندھ اور بیرون سندھ میں مستقل طور پر پرامن زندگی بسر کرتے رہے۔ جب محمود غزنوی کا دور حکومت آیا تو اس سے ان کی دریائے سندھ پر ایک بحری لڑائی ہوئی۔ کیونکہ ان لوگوں نے سلطان کی فوج پر عقب سے چھاپے مارے تھے اور کئی مرتبہ لشکر کا ساز و سامان لوٹا تھا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد یہ لوگ پھر شاہجہان کے عہد حکومت میں سامنے آئے۔ 1047ھ/1637ء میں انہوں نے شہنشاہ کے خلاف بغاوت کی اور متھرا کے فوجدار مرشد علی خان کو قتل کردیا۔ اورنگ زیب کو دکن کی مہم میں مصروف پاکر شمالی ہند کے جاٹوں نے اپنے سرداروں راجا رام اور رام چیرا کی سرکردگی میں پھر بغاوت کی۔ انہوں نے اکبر کے مقبرے کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ میر ابوالفضل نے جو یہاں کا فوجدار تھا ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 1097ھ/1686ء میں اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی کے لیے سردار خان جہان کو کمک کو بھیجا لیکن اس نے کئی معرکوں

اس سے بات کرسکا تھا۔ حورین اب واضح انداز میں اس سے کہتی تھی کہ اس کی بہن ندا اور ایاز ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ عاطف ان دونوں کو ملانے کی کوشش کرے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ وہ دونوں بھی کبھی کبھی ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے ورنہ تو پھر ایک دن فل اسٹاپ ہی لگ جانا ہے۔ عاطف کی طرف مسئلہ یہ تھا کہ اس کی والدہ کسی طور اس رشتے کے حق میں نہیں تھیں۔ ایاز اب پاکستان شفٹ ہو چکا تھا اور ایک اچھی فرم میں جاب شروع کردی تھی۔

حورین اور عاطف کی کہانی نے مجھے کئی طرح سے متاثر کیا۔ خاص طور سے حورین کا کردار تو ایک معما ہی تھا۔ ایک طرف تو وہ انتہائی ملنسار، خلیق اور ہمدرد تھی۔ کمر بالکل سیدھی رکھ کر ایسے باوقار انداز میں چلتی کہ کوئی شہزادی محسوس ہوتی جسم اب تھوڑا بھر گیا تھا تاہم کشیدہ قامت کی وجہ سے چھریرے بدن کی ہی لگتی تھی۔ دودھیا رنگت اور ہر کسی کے دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ۔ لیکن یہی بارعب باوقار حورین دسمبر کی دھند آلود شب میں گاڑی کے اندر عاطف کے سامنے یوں بے ترتیب بھی ہوتی تھی کہ قریب قریب بکھر کر رہ جاتی تھی۔ دوسری طرف میں عاطف کو دیکھتا تو اس سے ہزار اختلاف رکھنے کے باوجود اسے کسی صورت آوارہ یا ہوس پرست قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے اور حورین کے درمیان کم از کم فاصلہ اب بھی برقرار تھا۔ گلوکاری کے حوالے سے اس کے گرد کئی لڑکیاں موجود رہتی تھیں مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔

کئی دن بڑے پیارے ہوتے ہیں..... معمول سے زیادہ روشن اور خوش کن۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب دو دل پسند شخصیات یکے بعد دیگرے میرے گھر آئیں۔ کال بیل پر میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے سرکش، گاڈ فادر اور امر بیل جیسی کہانیوں کے خالق جناب محمود مودی صاحب کھڑے تھے۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ ہماری ملاقات کی "کوآرڈینیشن" کس طرح ہوئی تھی۔ میں نے ان سے رابطہ کیا تھا یا انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ لاہور میں تشریف رکھتے ہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اجلے چہرے اور سنجیدہ مسکراہٹ والے محمود مودی صاحب میرے سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ شفاف عینک کے پیچھے ان کی شفاف آنکھوں میں ملکی و غیر ملکی ادب اور فکشن کے گہرے مطالعے سے کشیدہ دانش موجزن تھی۔ انہوں نے قسط وار ناولوں کی تعریف کی اور کچھ "ٹپس" بھی دیں۔ ہماری گفتگو کتابوں اور کہانیوں کے

میں جاٹوں سے شکست کھائی۔ بعد میں شہنشاہ نے۔ اپنے پوتے بیدار بخت کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد۔ بھرت پور اور اس کے گردونواح کے جاٹوں نے اپنے سردار سورج مل کی قیادت میں آگرے اور دہلی کے درمیانی علاقے میں خوب لوٹ مار مچائی اور باشندوں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو اس نے ان ظالم جاٹوں کا قلع قمع کرنے کا اپنی فوج کو خاص طور پر حکم دیا۔ 1171ھ/1757ء میں اپنے چوتھے حملے کے دوران میں اس نے ایک بار پھر جاٹوں پر چڑھائی کی۔ اگرچہ وہ ان پر مکمل طور پر قابو نہ پا سکا۔ 1175ھ۔ 1761ء میں جب مرہٹوں کو ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کی تیسری لڑائی میں ایک فیصلہ کن شکست ہوئی تو اس شکست سے جاٹوں کی بھی کمر ٹوٹ گئی۔ جب احمد شاہ واپس لوٹا تو اس نے پنجاب کے جاٹوں کے ایک معمولی سردار آلا سنگھ کو اس کی فوجی خدمات کے صلے میں کئی ایک گاؤں عطا کیے جو بعد میں ریاست پٹیالہ کی بنیاد بنے۔ تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں رنجیت سنگھ جو ایک جاٹ تھا اس نے پنجاب میں ایک طاقتور سکھ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران جاٹوں نے دہلی میں عام بدنظمی اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے تو انہیں بھی مطیع ہونا پڑا۔ 1947ء میں انہوں نے الور، بھرت پور اور گردونواح کے علاقے میں دوبارہ سر اٹھایا اور تقسیم ہند کے بعد ہونے والی لوٹ مار اور قتل وغارت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ موجودہ دور میں وہ مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ پنجاب میں ان کے بہت قبیلوں نے جلال الدین حسین بخاری اور بابا فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ جاٹ کی معرب شکل زط ہے۔ جٹ اور جٹا کے الفاظ بھی ان ہی کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔

مرسلہ: یاسمین ترمذی، ملتان

کردی گھومتی رہی۔ اسی دوران میں چائے وغیرہ پی گئی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ دو زیادہ دیر رک نہیں سکتے تھے ورنہ دل چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ گفتگو جاری رہے۔

اسی روز شام کے بعد وہ محب وطن پاکستانی جاسوس میرے گھر تشریف لائے جنہوں نے بعدازاں خود اعلان کیا تھا کہ "میں ایک جاسوس تھا۔" یعنی طارق اسمٰعیل ساگر۔ وہ بھی بیدار سرمدی اور شریف کیانی صاحب کی طرح نوائے وقت میں گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ وہ ایک مکمل صحافی ہونے کے ساتھ ایک مکمل فکشن نگار بھی تھے۔ ان کے ساتھ نشست خوب رہی۔ انہوں نے اپنی ایک خوبصورت کہانی کے بارے میں بتایا جس کو وہ ایک ڈراما سیریل کی شکل دینے کا سوچ رہے تھے (بعدازاں گرفت کے نام سے یہ ڈراما سیریل دھوم دھام سے تیار بھی ہو گئی۔ یہ کراچی کے دگرگوں حالات کے موضوع پر تھی۔ طارق اسمٰعیل اور متعلقہ احباب اس کے آن ایئر جانے کے لیے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے تھے۔ میں بھی منتظر تھا مگر جس رات سیریل کو ٹیلی کاسٹ ہونا تھا اس سے صرف ایک دن پہلے نواز شریف کی حکومت چلی گئی اور جنرل پرویز مشرف نے ٹی وی پر آ کر کہا۔ اسلام علیکم میرے ہم وطنو!..... سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ نئی حکومتی ترجیحات کے تحت بہت سے ٹی وی پروگرام روک دیئے گئے۔ ان میں ڈراما گرفت بھی شامل تھا۔ یہ ٹوٹی کہاں کمند والا معاملہ تھا۔ طارق صاحب کو اس کا بے حد دکھ ہوا۔ میری معلومات کے مطابق بعد میں غالباً چند برس بعد یہ سیریل ٹیلی کاسٹ ہوئی تھی)

طارق صاحب کی ساری زندگی محنت اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ ان دنوں اپنے پبلشرز اور آجراداروں سے ان کے ایک دو معرکے جاری تھے۔ ایسے معرکے بعد میں بھی جاری رہے۔ وہ صاف سیدھی بات کرنے والے بے باک شخص تھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت "وہ مجھے کھا گئے" میں ان حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ طارق صاحب نے قریباً تین برس پہلے کورونا کی وبا کے دوران انتقال کیا۔ اللہ پاک درجات بلند کرے۔ ایک ہی دن میں محمود احمد مودی اور پھر طارق اسمٰعیل ساگر صاحب مجھے ایسے لگا جیسے ایک ہی بادام کے اندر سے میٹھی گریاں نکل آئی ہوں۔ کہتے ہیں کہ خوشی اور غم ایک دوسرے کا سایہ ہیں۔ اس خوشگوار دن کے بعد اگلا دن کچھ پریشانی کا نکل آیا۔ ہوا یوں کہ میرا بڑا بیٹا نوید اور چھوٹا جنید گھر کی چھت پر کرکٹ کھیل رہے تھے۔

دونوں کی عمریں تھوڑی ہی تھیں۔ چھوٹا جنید آٹھ نو سال کا ہوگا۔ کھیلتے کھیلتے وہ اچانک دھڑام سے گر پڑا۔ بڑے کی چلانے کی آواز سن کر اہلیہ لپکتی ہوئی اوپر گئی۔ بچے کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ بہت پوچھا گیا کہ کیا ہوا ہے لیکن دونوں بچے کچھ بھی بتا نہیں پا رہے تھے۔ بڑا بیٹا بس یہی کہہ رہا تھا کہ جنید بال پھینکتے پھینکتے پھسل کر گر گیا ہے۔

میں اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ میرے آنے سے پہلے ہی گھر والوں نے اس کے پاؤں کی بینڈیج وغیرہ قریبی کلینک سے کروالی تھی۔ اہلیہ نے بتایا۔ ''گرتے ہوئے کوئی کنکر وغیرہ بھی چبھا ہے۔ پاؤں پر اوپر کی طرف زخم بھی آیا ہے۔''

بہرحال ڈاکٹر صاحب نے تسلی دی ہے..... دو تین روز گزر گئے۔ دوبارہ ڈریسنگ بھی ہوئی۔ ڈاکٹر نے کھانے کی دوا بھی دی مگر جنید مسلسل ریں ریں کرتا رہتا تھا۔ کسی وقت درد بڑھ بھی جاتا تھا۔

ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ معاملہ کچھ ناقابل فہم سا لگ رہا تھا۔ جو چپل بچے نے واقعے کے وقت پہنی ہوئی تھی وہ بھی ایک جگہ سے تھوڑی کٹی ہوئی تھی جیسے شیشے کا ٹکڑا لگا ہو۔ بڑا بچہ بس یہی کہے جارہا تھا کہ بال پھینکتے وقت بس ایک آواز سی آئی تھی اور جنید پھسل کر گر گیا تھا۔ اہلیہ بچے کے مضروب پاؤں کو ٹکوے کی طرف سے چھوتی تھی تو وہاں ایک ناموس سا نیلگوں ابھار بھی نظر آتا تھا۔

ایک دو روز ہم نے مزید خود کو تسلی دی لیکن جب افاقہ نہیں ہوا تو ہم میاں بیوی بچے کو ایکسرے کرانے لے گئے۔ یہ اسپتال کے عین سامنے ایک پرائیویٹ لیبارٹری سے ایکسرے کرایا۔

ایکسرے کے بعد ٹیکنیشن میرے پاس آیا اور مجھے علیحدہ کمرے میں لے جاکر بولا۔ ''بچہ آپ کا کیا لگتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''بیٹا ہے۔ ساتھ میں اس کی والدہ ہے۔''

وہ سراسر تے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو پتا ہے آپ کے بیٹے کو گولی لگی ہے؟''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے ساتھ والے کمرے میں مجھے تار پر جھولتا ہوا ایکسرے دکھایا۔ کسی بڑی گن کی گولی پاؤں کی ہڈیوں میں صاف چمک رہی تھی۔

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''سوری۔ ہم اطلاع دینے کے پابند ہیں۔ یہ پولیس کیس ہے۔''

میں جرمنی یا انگلینڈ وغیرہ میں ہوتا تو کہتا..... ہاں ہاں ضرور پولیس کو بلائیے بلکہ ابھی بلائیے تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ میرے بیٹے کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ لیکن یہ پاکستان تھا۔ زیادہ تر وقوعوں پر پولیس کو بلانا، آبیل مجھے مار والی بات ہی ہوتی ہے۔

میں نے باہر آکر اہلیہ کو بتایا کہ جنید کو گولی لگی ہے۔ اس کا رنگ بھی فق ہوگیا۔ پہلا ٹینشن جو کچھ نرم دل واقع ہوا تھا۔ مجھے ایک طرف لے جاکر بولا۔ ''آپ شریف آدمی لگتے ہیں۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ حادثاتی طور پر گولی لگی ہے۔ آپ خوامخواہ مشکل میں پڑیں گے۔ بچے کو لے کر نکل جائیں۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ایکسرے کے چارجز دیئے۔ نوٹ بڑا تھا۔ اس کا ساتھی جو تھوڑا سخت مزاج تھا فوراً چینج لینے چلا گیا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ چینج تو اس کے پاس تھا وہ صرف بہانے سے باہر گیا ہے۔ اہلیہ کو بھی یہی لگ رہا تھا۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا اور بقایا دو ڈھائی سو روپیا چھوڑ کر لیبارٹری سے روانہ ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔

گھر پہنچے۔ بھائی ساجد اور خالدہ وغیرہ بھی آگئے۔ بچے کے ٹکوے کے نیچے جو ابھار نظر آرہا تھا وہ گولی ہی کا تھا۔ لگتا تھا کہ گولی اوپر سے لگی ہے اور پاؤں چیر کر ٹکوے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اب کسی واقف کار ڈاکٹر کی ضرورت تھی تاکہ وہ گولی نکال دے اور میڈیکو لیگل مسئلہ بھی نہ ہوا۔ اتوار کی وجہ سے قریبی کلینک بند تھے یا سینئر ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ میرے ذہن میں حورین کا خیال آیا۔ اس کا ایک دور کا کزن ڈاکٹر عاصم قریب ہی سمن آباد میں رہائش رکھتا تھا اور پرائیویٹ کلینک بھی چلا رہا تھا۔ وہ رازداری سے یہ کام کرسکتا تھا۔

میں نے حورین کو کراچی فون کیا۔ بچے کو گولی لگنے کا جان کر وہ بھی بے حد پریشان ہوئی۔ مگر پتا چلا کہ ڈاکٹر عاصم کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد گیا ہوا ہے اور اس سے رابطہ بھی نہیں۔

ہم سوچ ہی رہے تھے کہ حورین کا فون پھر آگیا۔ اس نے کہا۔ ''طاہر بھائی! دیر نہ کریں۔ گولی لگے تین چار دن ہوگئے ہیں۔ زہر پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔''

اس کی آواز میں وہی تشویش تھی جو کسی بھی غیر معمولی ہمدرد شخص کے دل میں کسی کی تکلیف دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلم کار کی خود نوشت کا گیارھواں حصہ جو خود میں منفرد ہے

اچانک میرے ذہن میں راجا ندیم کا خیال آیا۔ یہ ہمارے پرانے محلے کا ہر دلعزیز ڈاکٹر تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ فل ڈاکٹر ہے۔ تاہم کچھ کہتے تھے کہ اس کے پاس ڈگری نہیں البتہ ہاتھ میں شفا ہے۔ میں نے اسے فون کیا۔ وہ کلینک پر ہی تھا۔ ہم بچے کو لے کر پہنچے۔ اس نے نکوا چیر کر گولی نکال دی اور زخم کے اندر سلائی پھیر کر بہت اچھی طرح زخم کی صفائی بھی کر دی مگر بچے کو جو تکلیف ہوئی وہ بیان سے باہر تھی۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں تڑپے جا رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ راجا ندیم پاؤں کو پوری طرح سن نہیں کر پایا تھا۔

بچے کی تکلیف نے ہمیں اور زیادہ دکھی کیا۔ غم و غصہ بڑھ گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ طاقتور رائفل کی گولی آئی... کہاں سے؟

☆☆☆

ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک تین منزلہ کوٹھی کی چھت پر اکثر کچھ اوباش لڑکے چڑھے رہتے تھے۔ پتنگ بازی بھی کرتے تھے۔ شک یہی تھا کہ بچہ کو لگنے والی گولی ان کی چھت سے ہی آئی ہے۔ وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے بلکہ الٹا ہم سے لڑنے پر آمادہ تھے۔ میرے ایک چھوٹے بھائی کو ان کے رویے پر بے حد طیش آیا۔ اس نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ بچے جنید کو پاؤں سے گولی نکلواتے ہوئے جو تکلیف ہوئی تھی وہ ہمارے ذہنوں پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ میرا یہ مشتعل ہونے والا بھائی ابھی تک اسی پرانے محلے میں رہتا ہے جہاں سلیم کے نام کی دھوم تھی۔

جب پتنگ باز لڑکوں کو پتا چلا کہ ہم سلیم کے پرانے محلے دار بلکہ پڑوسی رہے ہیں تو وہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ ان کے بڑوں نے معذرت والا رویہ بھی اپنایا۔ شاید سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہر جگہ طاقت کو سلام ہوتا ہے جو انسان کے اندر خوف اور اندیشے جگاتی ہے۔ سلیم بھی ایک ایسا ہی دبنگ کردار تھا، بلکہ اب بھی ہے۔

علی سفیان آفاقی نہایت دلچسپ، پُر بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر بھی وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں اکثر ماڈل ٹاؤن میں واقع ان کی وسیع خوبصورت کوٹھی پر چلا جاتا۔ ایک جانب پرانی طرز کی رہائش گاہ تھی جیسے انگریزوں کے دور کی کوئی عمارت ہو۔ اس کے ساتھ ہی آفاقی صاحب نے ایک جدید پورشن بھی تعمیر کرلیا تھا اس پورشن کو ان کی بیگم صاحبہ نے بڑی نفاست سے

آراستہ کر رکھا تھا۔ آغا صاحب کی بس دو بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک بڑا خوش اخلاق اور نہایت مہذب گھرانا تھا۔ میں اور آغا صاحب تو اکثر ملتے ہی تھے کسی وقت میری بیگم اور آغا صاحب کی بیگم کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔

آغا صاحب کی شخصیت پر تو پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میں ان کے گھر جاتا تو وسیع صحن میں رنگا رنگ پھول بوٹوں کے درمیان ایک نفیس سی میز کے گرد دو تین کرسیاں ڈال دی جاتیں اور طویل نشست شروع ہو جاتی۔ بے شک آغا صاحب کوٹھی کے جدید پورشن میں رہائش پذیر تھے لیکن قدیم پورشن سے بھی ان کی محبت جوں کی توں تھی۔ یہاں ان کی بے شمار یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ فلمی دنیا کی بڑی بڑی قد آور شخصیت اس قدیم عمارت میں آتی جاتی تھیں۔ سنتوش، درپن، صبیحہ خانم، شمیم آرا، محمد علی، زیبا..... اور بڑے بڑے کہانی نویس، ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز ان یادگار دنوں کی صدائیں اب بھی آغا صاحب کو اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ جیسے وہ رہتے نئے پورشن میں ہوں لیکن ان کا دل پرانے پورشن میں دھڑکتا ہو۔

بڑے دلچسپ واقعات بھی تھے۔ ایک مرتبہ، کچھ فنکار یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ڈائریکٹر اور ایک دو کہانی نویس بھی تھے۔ فنکاروں میں سلطان راہی بھی شامل تھے۔ کسی کہانی پر بات ہو رہی تھی۔ نماز کا وقت ہوا تو سلطان راہی نے کہا کہ نماز پڑھ لی جائے۔ ڈرائنگ روم میں باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے آغا صاحب کو ہی بہ اصرار امامت کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔

آغا صاحب کہتے ہیں۔ ''میں کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ بہرحال اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھی۔ ذہن کو خوب حاضر کیا کہ کتنی رکعتیں ہیں اور کس طرح ادا کرنی ہیں مگر اس وقت سب گڑبڑ ہو گیا جب میں رکوع میں گیا۔ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا کہ رکوع سے اٹھنے کے لیے مجھے کیا کلمہ ادا کرنا ہے۔ اب میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی دماغ پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ میرے عقب میں سلطان راہی جیسے ''دبنگ مقتدی'' سمیت سب رکوع میں تھے۔ دال کلاک کی ٹک ٹک کانوں میں گونج رہی تھی۔ چند سیکنڈوں میں ہی جسم ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔ خود کو کوسا کہ کیوں امامت کے فریضے سے صاف انکار نہ کر دیا۔ پھر پتا نہیں کہ کون سی نیکی کام آئی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یوں لگا کہ جو کلمہ ادا کرنا ہے اس میں ہاکی کے معروف کھلاڑی سمیع اللہ کا نام بھی آتا ہے۔ یکایک دماغ کی بند کھڑکیاں کھل گئیں۔ میں نے کلمہ ادا کیا اور میرے ساتھ سب رکوع سے اٹھ گئے۔''

جن دنوں میں نوائے وقت میں ناول آندھی لکھ رہا تھا۔ انہی دنوں سیارہ ڈائجسٹ میں انسپکٹر نواز خان کی کہانیاں جاری تھیں۔ اس کے علاوہ سسپنس ڈائجسٹ کا کام بھی ہو رہا تھا۔ مصروفیت کے سبب ایک موقع پر ناول آندھی کی قسط میں نے تھوڑی چھوٹی بھیج دی اور کچھ تاخیر سے بھی بھیجی۔ زندگی میں قلم کاری کے حوالے سے کسی نے پہلی مرتبہ مجھے ڈانٹ پلائی۔ آغا صاحب کا فون فیملی میگزین کے دفتر سے آیا تو ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''کیا سمجھنے لگے ہو اپنے آپ کو؟ شیکسپیئر بن گئے ہو؟ نہیں لکھوانی میں نے کسی شیکسپیئر سے کہانی۔''

عجب بات ہے کہ بہت حساس طبع ہونے کے باوجود مجھے آغا صاحب کا ڈانٹنا برا نہیں لگا۔ مجھے پتا تھا کہ انہوں نے جو کہا ایک عارضی کیفیت کے تحت کہا۔ ایک دو روز بعد پھر ان کا فون آ گیا۔ اس مرتبہ لہجہ شفقت بھرا تھا۔ میرا رکا ہوا قلم نئی امنگ ترنگ کے ساتھ پھر چل پڑا۔

فلم انڈسٹری میں بھی آغا صاحب کا قصہ جانا پہچانا تھا۔ تاہم لوگ ان کی حلیم فطرت اور نرم خوئی کے بھی گن گاتے تھے۔ ایک فلم کار اور ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی انہیں بہت پذیرائی اور محبت ملی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اکثر ہیروئنز انہیں اپنی سہیلی کی طرح سمجھتی تھیں اور اپنے نجی معاملات اور مسائل پر بلا جھجک گفتگو کر لیتی تھیں۔ شروع کے دور میں شمیم آرا کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی اور قریبی میل جول کا ذکر بھی وہ اپنی یادداشتوں میں کرتے ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب ان دونوں کی شادی کا امکان بھی پیدا ہو گیا تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا شمیم آرا اپنی ہم عصر اداکاراؤں دیبا، رانی، زیبا وغیرہ کی طرح کسی اور ماحول سے اٹھ کر فلم انڈسٹری میں آئی تھیں جب کہ آغا صاحب کی نسبت ایک ''تعلیق'' گھرانے سے تھی۔

شمیم آرا کی بعد ازاں کئی شادیاں ہوئیں۔ بہرطور آغا صاحب اور ان کے گھرانے سے شمیم آرا بیگم کا تعلق آخر تک قائم رہا۔ غالباً آغا صاحب کی پہلی بیٹی کی شادی تھی۔ تقریب میں، میں فیملی سمیت شریک تھا۔ میری بیگم نے بائیں طرف بیٹھی ایک خوش پوش خاتون کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ شمیم آرا کی طرح نہیں لگتی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ شمیم آرا ہی ہے جس کی فلم سالگرہ تم نے تین مرتبہ دیکھی تھی۔'' عمر ڈھل چکی تھی لیکن جسم اب بھی چھریرا تھا۔ ماہ و سال کی گردش نے ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اب کتابی چہرے پر ایک باوقار سی روشنی جھلک دکھاتی تھی۔

ایک مرتبہ میں نے انور فراز سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، آغا جی صاحب نے اپنی جواں سالی کا دور فلمی دنیا کی رنگینیوں میں گزارا، وہ کبھی کسی پری چہرہ کی طرف مائل ہوئے ہوں گے؟''

انور فراز نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ جس طرح کے کم آمیز اور شرمیلے تھے، کوئی ہیروئین انہیں کھینچ کر تنہائی میں لے گئی ہو تو لے گئی ہو ورنہ ایسا ممکن نہیں تھا۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔'' میں نے کہا۔

جن دنوں وہ نوائے وقت کی بلڈنگ واقع شارع فاطمہ جناح پر فلمی میگزین کی ادارت کر رہے تھے زیادہ مصروفیت کے سبب کچھ جھنجلا سے جاتے تھے۔ ان کی جھنجلاہٹ کا ایک واقعہ سر راہ پیش آ گیا۔ شام کے وقت وہ اپنی سوزوکی کار پر دفتر سے نکل کر گھر جانے کے لیے شاہراہ قائداعظم پر آئے۔ غالباً لین کراس کرنے کی کسی معمولی سی غلطی پر ٹریفک وارڈن نے انہیں روک لیا اور تنگ کرنے لگا۔ مزید دلیر ہو کر اس نے کچھ تلخ کلامی بھی کی۔ آغا جی صاحب کا پارا جو انہوں نے کافی کوشش کے ساتھ نیچے دبا رکھا تھا ایک دم چڑھ گیا۔

بدمست وارڈن یہ بھی جانتا نہیں تھا کہ چھوٹی سی کار میں سے نکلنے والا یہ دبلا پتلا شخص درحقیقت کتنا قد آور ہے اور اگر وہ اپنی عزت نفس کے دفاع پر اتر آیا تو یہاں بیچ سڑک کے بکھیڑا کھڑا ہو جائے گا۔ سب ٹریفک اہلکار تو ایسے نہیں ہوتے مگر کچھ میں روایتی سخت مزاجی اور اکڑ ہوتی ہے۔ موقع پر موجود اہلکار بھی اسی لوح کے تھے۔ انہوں نے آغا جی صاحب کو گاڑی ایک سائیڈ لگانے کا حکم دیا تو وہ بجا طور پر ڈٹ گئے۔ تماشا لگا۔ بات اوپر تک گئی۔ بہرحال بدتمیز وارڈنز کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

آغا جی صاحب انہی لوگوں میں سے تھے جو بظاہر ناتواں نظر آنے کے باوجود اپنے درست موقف پر پورا اسٹینڈ لیتے تھے اور اپنے حق کے لیے لڑنے کی مقدور بھر کوشش کرتے تھے۔ ایسے کئی واقعات میں ان کی زبانی سن چکا ہوں اور ان کی لکھی ہوئی فلمی الف لیلیٰ میں بھی موجود ہیں جو سرگزشت ڈائجسٹ میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی رہی ہے۔

آغا جی صاحب کی خوبصورت فلم ''سزا'' میں نے اپنے لڑکپن میں اپنے ماموں ایوب فاطمی کے ساتھ سینما میں دیکھی تھی۔ اس فلم میں روزینہ جو بعد ازاں بہت فربہ ہو گئی تھی ایک خوش اندام و دلکش لڑکی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اس فلم میں غالباً ندیم کو ہیرو آنا تھا لیکن کوئی تنازعہ پیدا ہو گیا۔ ڈیٹس کا معاملہ رہا ہو گا یا کوئی اور بات یا پھر ہو سکتا ہے کہ آغا جی صاحب نے پراسٹار ندیم سے بھی کچھ ویسی ہی بات کہی ہو جو مجھ چھوٹے سے فلم کار سے کہی تھی۔ ''کیا اپنے آپ کو مارلن برانڈو سمجھنے لگے ہو؟ نہیں کراتا میں کسی مارلن برانڈو سے کام۔''

انہوں نے اپنی کہانی اور خداداد صلاحیتوں پر بھروسا کرتے ہوئے ایک بالکل نئے نوآموز لڑکے جمیل کو ہیرو لیا..... اور ''سزا'' کو ایک ''ہٹ'' فلم بنا کر دکھایا۔ جمیل بھی ایک ہیرو کے طور پر اسٹیبلش ہو گیا۔ اس نے غرناطہ سمیت کئی فلموں میں ہیرو کے طور پر کام کیا۔ معروف اداکارہ ''تبو'' جمیل کی ہی بیٹی ہے۔

ایک روز جب ہم سردیوں کی چمکیلی دھوپ میں ان کے پھولوں بھرے لان میں بیٹھے تھے، درختوں پر پرندے چہچہاتے تھے اور سائے طویل ہو رہے تھے وہ یادوں میں کھو سے گئے۔ کہنے لگے۔ ''کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ایک بار پھر گھر کے پرانے پورشن میں شفٹ ہو جاؤں۔ ان در و دیوار میں بہت سے بھولے بسرے مناظر اور آوازیں جذب ہیں۔''

''تو کب ہو رہے ہیں شفٹ؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں ابھی تو نہیں..... ویسے بھی ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ نہ ہم پہلے کچھ حاصل کر سکتے ہیں نہ بعد میں۔'' پھر ایک واقعہ سنانے لگے۔

مجھے ٹھیک سے یاد ہے شاید وہ اپنی فلم آس کی بات کر رہے تھے۔ وہ ان کی تمام فلموں کی طرح نہایت ہی صاف ستھری اصلاحی فلم تھی۔ کہنے لگے۔ ''یہ کافی مناسب بجٹ فلم ثابت ہوئی۔ ان دنوں گھر میں بھی روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ میں نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی کسی الماری میں برتنوں کے پیچھے رکھی اور بھول گیا۔ وہ بس وہیں پڑی رہی۔ غالباً کافی عرصے بعد دوسری فلم شروع کی۔ اس وقت مالی

پوزیشن ٹھیک نہیں تھی۔ اخراجات کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ کافی پریشانی تھی۔ اسی پریشانی میں الماری میں سے کچھ اور چیز تلاش کرتے کرتے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ نوٹوں کی گڈی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر سب کچھ یاد بھی آ گیا۔ ان نوٹوں نے ایک مقررہ وقت پر میرے استعمال میں آنا تھا لہٰذا وہیں پڑے رہ گئے تھے۔"

آفاقی صاحب کی بیگم بھی بڑی ملنسار اور خوش اخلاق خاتون ہیں۔ اللہ پاک انہیں صحت والی لمبی زندگی دے۔ ان دنوں وہ ہر وقت گھر کی آرائش، پودوں کی تراش خراش اور دو ننھی کلیوں کی دیکھ بھال میں معروف نظر آتی تھیں۔ مطالعے کا ذوق رکھتی تھیں۔ تاوان بھی پڑھتی تھیں اور کبھی اس پر چھوٹا موٹا تبصرہ بھی کر گزرتی تھی۔ آفاقی صاحب کے لیے ان کی محبت اور خیر اندیشی ان کی آنکھوں سے ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے آفاقی صاحب ازراہ مذاق کہا کرتے تھے۔ "ہماری بیگم بہت اچھی ہیں۔ کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ ان جیسی ایک اور ہو۔"

فلموں کی معرکتہ الآرا فیلڈ میں آفاقی صاحب کا ایک تنازعہ جاوید شیخ سے ہو گیا تھا۔ جاوید شیخ نے کچھ رقم ایڈوانس لی اور بعد ازاں مبینہ طور پر "وقت" دینے سے انکار کر دیا۔ بات عدالت تک پہنچ گئی ان دنوں آفاقی صاحب کافی پریشان نظر آئے تھے۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا حالات کی ساری سردی گرمی وہ خود ہی جھیلتے تھے اور بڑی پامردی سے۔

اپنے مہمان کو وہ بڑی محبت سے بیرونی دروازے تک الوداع کہنے جاتے۔ اپنے حوالے سے میں انہیں منع ہی کرتا رہتا لیکن وہ وسیع لان پار کر کے ڈرائیو وے تک آ جاتے۔ مجھے گاڑی میں بیٹھنا دشوار محسوس ہونے لگتا۔ اگر میری گاڑی کا "سائیڈ مرر" فولڈ ہوتا تو وہ احتیاط سے اسے کھولتے۔ میں بہت شرمساری محسوس کرتا۔ ہاتھ ہلا کر سی آف کرتے۔ سڑک پر پہنچ کر میں اطمینان کا سانس لیتا۔

ایک دن پتا چلا کہ انہوں نے گھر کے قدیمی پورشن کی تزئین و آرائش کرالی ہے اور ماڈرن پورشن سے پرانے پورشن میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اب شاید وہ نیا پورشن کرائے پر اٹھانا چاہتے تھے۔ قدیم پورشن میں اٹھ آنے میں کچھ کردار یقیناً "نوسٹیلجیا" کا بھی رہا ہوگا۔ ان خوبصورت در و دیوار اور برگ و بار میں ان کی ایک عمر گزری تھی۔ کئی موسم، کئی تہوار، ساون کی برساتیں، چاندنی راتیں، گلابی جاڑے، بچیوں کی چہکاریں، بھولے بسرے گیت، یہ سب کچھ ان کو بہت پیارا تھا لیکن یہ سب کچھ زیادہ دیر ان کے ساتھ رہنے والا نہیں تھا۔ حالات کی مجبوری غالب آنے والی تھی وہ اسے کھونے والے تھے۔

اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد یہی کچھ ہوا۔ دونوں بیٹیاں بیاہ کر اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ یقیناً وہ اپنی زندگی میں ہی ان کے حصے کی پراپرٹی انہیں دے دینا چاہتے تھے۔ دل پر بھاری پتھر رکھ کر آفاقی اور مسز آفاقی نے اپنا وہ محبوب آشیانہ فروخت کر دیا..... اور خود عسکری فلیٹس میں اٹھ آئے۔ آبائی گھر سے جدا ہونے کا دکھ میں اکثر ان کے لب و لہجے میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اب وہ کچھ بیمار بھی رہنے لگے تھے۔ ایلوپیتھک کے علاوہ ہومیو پیتھک پر بھی انہیں بھروسا تھا (میرے علم کے مطابق آنکھ کے آپریشن سے بچنے کے لیے وہ کئی برس تک ہومیو پیتھک دوا کھاتے رہے تھے لیکن بالآخر آپریشن کرانا پڑا تھا)

پتا نہیں کیا بات تھی۔ ماڈل ٹاؤن کا وہ کہانیوں، افسانوں جیسا دل آویز گھر علی سفیان آفاقی صاحب سے چھٹ گیا تو پھر ان کے عسکری والے فلیٹ میں، میں کبھی نہ جا سکا۔ ہاں میرے گھر اور نیلی میگزین کے دفتر میں گاہے بگاہے ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ آبائی گھر سے دور ہو جانے کی اداسی کافی عرصہ ان پر طاری رہی۔ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی جھلک آیا۔ فلمی الف لیلیٰ کی ایک دو اقساط میں اس گھر کے در و دیوار کا ذکر انہوں نے بڑے دلگداز انداز میں کیا۔

میں آج بھی کبھی کبھی ایک خوبصورت تصور میں کھو جاتا ہوں۔ میرا تخیل مجھے اس خوشبودار کشادہ لان میں لے جاتا ہے جہاں ایک خوش رنگ شام میں مرحوم آفاقی صاحب سفید پتلون اور ہاف سلیوٹی شرٹ پہنے کرسی پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ بچیاں ان کے اردگرد گھوم رہی ہوتی ہیں۔ بیگم آفاقی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دیتی ہیں۔ مجھے دیکھ کر آفاقی صاحب مسکراتے ہیں۔ "آؤ طاہر! بڑے وقت پر آئے۔ دیکھو ہماری بیگم نے کتنے اچھے کباب بنائے ہیں۔ اور ذرا اس چائے کی خوشبو تو سونگھو، ایسی نفیس چائے بھلا کہیں مل سکتی ہے۔"

آج وہ عظیم فن کار اور بہت بڑا انسان، اپنا بظاہر کمزور جسم لے کر منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے۔ ایک قلق ہمیشہ میرے دل میں رہے گا کہ بوجوہ میں آخری دنوں میں ان

سے نہ مل سکا اور نہ ہی ان کی آخری رسومات میں شریک ہو سکا۔ شاید دل کا یہی بوجھ ہے جو کبھی کبھی یک دم ایک تصور کی شکل میں میرے ذہن پر حملہ آور ہوتا ہے۔ میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ وہ خواب دیکھتا ہوں جس میں وہ اپنے گھر کے خوبصورت لان میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ وہ مختصر علالت کے بعد ہم سے جدا ہوئے۔ اللہ پاک انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

☆☆☆

پتنگ بازی اور بسنت پالا اڑنت کا ذکر میں نے ایک باب میں پہلے بھی کیا ہے۔ اب تو اس رنگا رنگ تہوار کی بس یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ اپنی حماقتوں سے ہم نے اس کے حسن کو خون میں نہلا دیا۔ 2002ء کے لگ بھگ یہ تہوار اپنے عروج پر تھا۔ مشرف کا دور تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پتنگ بازی کو عنقریب باکی کی جگہ قومی کھیل کا درجہ ملنے والا ہے۔ لاہور میں بسنت سے دو تین روز پہلے ہی غیر ملکیوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ سب بڑے بڑے ہوٹل اور پلازوں کی چھتیں بک ہو جاتی تھیں۔ عید کی طرح موقع کی مناسبت سے کپڑے سلائے جاتے تھے۔ پکوانوں کا مینیو بنایا جاتا تھا۔ جیسے عید کی چاند رات شروع ہو چکی ہے۔ اسی طرح بسنت نائٹ بھی ہوتی تھی۔ عاطف از راہ مذاق کہا کرتا تھا۔ "ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ صبح سویرے نوافل وغیرہ کی روایت بھی ڈال دیں..... کہ اللہ کے حضور سر بسجود ہونے کے بعد پیچ لڑانا شروع کریں گے۔"

مجھے سن دو ہزار کے آس پاس کی وہ بسنت نائٹ اچھی طرح یاد ہے جب مجھے اسپتال جانا پڑا۔ جب کہ پرانے محلے کی چھت چھوٹی تھی اور چار فٹ اونچی منڈیر تھی۔ پتنگ بازی سے میری مصنوعی دلچسپی بھی ختم ہو گئی تھی۔ چھوٹے بیٹے تھوڑا بہت شوق پورا کرتے تھے۔ بسنت نائٹ کو گھر میں کوئی چٹ پٹی ڈش بنی تھی جس کی وجہ میری چھوٹی خالہ (سوتیلی خالہ) علیل ہو گئیں۔ دس بجے کے قریب مجھے ان کو لے کر شیخ زید اسپتال جانا پڑا۔ انہیں ڈرپس وغیرہ لگیں۔ اہلیہ تو ان کے پاس رہیں میں باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے ریڈیو آن کر دیا۔ وہاں پر پتنگ بازی کے سارے اصول و قواعد بڑی تفصیل سے بیان کیے جا رہے تھے۔ جیسے سرکاری طور پر پتنگ بازوں کو بتایا جا رہا تھا کہ چرخی اور ڈور کا پتا کس طرح پکڑنا چاہیے۔ ڈھیل کیسے دینی چاہیے۔ کھینچا مارنے کے کیا ضوابط ہیں۔ پتنگ کو کنی دیتے ہوئے کن سنہری اصولوں کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ انگلیاں کٹ جائیں تو متبادل انگلیوں سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے؟ چھت سے گرتے وقت کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ کم سے کم نقصان ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

چند سال پہلے بسنت کے متاثرین کا ایک دردناک منظر میں نے میو اسپتال میں دیکھا تھا۔ دوسرا منظر یہاں بسنت نائٹ کو شیخ زید اسپتال میں دیکھا۔ مریض یوں آ رہے تھے جیسے کہیں آس پاس ہی خونی جنگ چھڑ گئی ہے۔ کوئی اسٹریچر پر، کسی کو حواس باختہ دوستوں نے گود میں اٹھایا ہوا۔ کوئی خود ہی لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بس ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ سمجھیں کہ ایمرجنسی کے سامنے قیامت صغریٰ کا منظر۔

ایک نوجوان اسٹریچر پر اس طرح اندر لایا گیا کہ وہ گردن کو معمولی سی حرکت بھی نہ دے سکتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ آنے والے ایک شخص سے پوچھا۔ "اس کو کیا ہوا ہے؟"

مری مری آواز میں بولا۔ "گلے میں مانجھا کڑاہی کی ہڈی پھنس گئی ہے۔"

میرے ساتھ کھڑا میڈیکل اسٹاف کا ایک شخص بولا۔ "جب نشے میں ٹن ہو کر کھایا جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ اب منا لو بسنت۔ مجھے لگتا ہے گردن کاٹ کر ہڈی نکالنا پڑے گی۔"

ان دنوں پتنگ بازی کا ایسا دور دورہ تھا کہ فلم، کھیل اور سیاست جیسے شعبوں کے نامی گرامی لوگ بھی بڑھ چڑھ کر اس تہوار کا حصہ بنتے تھے۔ یہاں تک کہ پرویز مشرف کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ خود بھی شوق سے پتنگ اڑاتے ہیں۔ ان دنوں لوگ مزاحیہ انداز میں کہتے تھے کہ جب پرویز مشرف پتنگ اڑائیں گے تو ظاہر ہے چرخی وزیراعظم ظفر اللہ خان جمالی کو پکڑنا پڑے گی اور بوکاٹا کا نعرہ چودھری شجاعت حسین جیسے معززین لگائیں گے۔

بسنت اور پتنگ بازی سے یاد آیا کہ ہمارے گھر میں بھی ایک شوقین موجود تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ خاتون تھیں اور مزید حیرت کی بات یہ کہ عمر رسیدہ تھیں۔ وہی پھوپی فاطمہ جنہوں نے خالہ مریم کے ساتھ مل کر مجھے بہت لاڈ سے پالا تھا۔ ان کا یہ شوق صرف پتنگ لوٹنے اور ڈور اکٹھی کرنے تک محدود تھا اور یہ دونوں کام بھی وہ میرے بچوں کے لیے کرتی تھیں۔ ہمارے اس گھر کی چھت کی منڈیریں کافی اونچی تھیں۔ بے پردگی کا کوئی سوال نہیں تھا۔

کوئی نمایاں زخم نہیں تھا۔ درحقیقت ان کے جسم میں تیزی سے اندرونی بلیڈنگ ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ان کا آخری وقت آ گیا۔ آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ بہت اصرار کے ساتھ مجھے ہنگامی وارڈ میں اپنے قریب بلایا۔ مجھے اشاروں سے کہا کہ اپنا کان ان کے ہونٹوں کے پاس لاؤں۔ ''میں جا رہی ہوں طاہر..... بچوں کا بہت خیال رکھنا۔'' پھر ایک دو ضروری ہدایات دیں۔ ایک دو منٹ بعد سانس کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ مہربان ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا جسے میں بچپن میں تھام کر سوتا تھا۔ بلکہ اس ہاتھ کو تھامے بغیر سو ہی نہ سکتا تھا۔

گھرانوں میں ایسی محبتیں نسل در نسل چلتی ہیں۔ وہ چلی گئی تھیں کیونکہ اب میں ان کا ہاتھ پکڑے بغیر سو جاتا تھا مگر اب میری ننھی صبا میرا ہاتھ پکڑ کر سو لی تھی۔

ابھی ہم پھوپی جان کا جسد خاکی گھر لائے ہی تھے کہ پولیس بھی پہنچ گئی۔ وہ ایف آئی آر لکھنا چاہتے تھے۔ حسب دستور کئی بڑے بوڑھوں نے کہا کہ چھوڑیں جی۔ بس وقت آیا ہوا تھا۔ وقت کو کون ٹال سکتا ہے۔ ویگن والوں کو معاف کر دیں۔

اگر ایکسیڈنٹ میں ویگن کی جگہ کوئی اور گاڑی ہوتی تو شاید میں ایف آئی آر نہ لکھواتا لیکن یہ ویگن تھی اور ان دنوں ویگنیں اپنی تیز رفتاری اور بے قاعدگی کے سبب لاہور میں موت بانٹتی پھرتی تھیں۔ اکثر ڈرائیور بغیر لائسنس کے ہوتے تھے اور نشے باز آوارہ گرد بھی۔ میں نے خود ایک کہانی میں لکھا تھا۔ یہ لوکل ویگن لاہور کی ٹریفک میں ایسے ہے جیسے عربوں میں اسرائیل۔ حادثے کا سبب بننے والا ڈرائیور موقع سے بھاگ بھی گیا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میں نے اپنی پھوپی جان فاطمہ کی جان لینے والے ڈرائیور کو یونہی معاف کر دیا تو خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔ ایسے ہی لگے گا جیسے کوئی کسی لاوارث کو کچل کر چلا گیا ہے۔ میں نے ویگن والوں پر باقاعدہ کیس کیا۔ جن وکیل صاحب نے یہ کیس کیا ان کا نام اقبال ملک تھا۔ بعد ازاں وہ میری لکھی ہوئی انسپکٹر نواز کی کہانیوں کے پرانے ریڈر نکلے اور انہوں نے بڑی اچھی پیروی کی۔

اس حادثے کے حوالے سے ایک عجیب بات لکھنا چاہتا ہوں۔ ایکسیڈنٹ کے وقت جب ہم مسافر ویگن میں پہنچے اور پھوپی جان کو شدید زخمی حالت میں پایا تو میں نے بیٹے جنید کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



کے صفحات پر بہت جلد ایک نئے سلسلے کا آغاز

جنگل کا قانون نافذ کرنے والے انسانی تذلیل کے مرتکب درندوں سے ٹکرا جانے والوں کی خونی داستان

جنگل



ان تاثرات کی وضاحت جنید ہی کی زبانی حادثے کے دو روز بعد ہوئی۔ اس نے اشک بار انداز میں بتایا۔ ''حادثے سے دو تین دن پہلے میں سحری کھا کر لیٹا ہوا تھا۔ سوتے جاگتے کی سی کیفیت میں تھا۔ میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے میں کسی حادثے کا شکار ہوا ہوں۔ میرا ایک بازو اور ٹانگ بری طرح ٹوٹ گئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اب ایسی حالت میں زندہ رہ کر کیا کرنا۔ میں کسی اندھیری جگہ پر ہوں۔ ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر خودکشی کرنا چاہتا ہوں کہ دادی (پھوپی فاطمہ) عقب سے آکر مجھے پکڑ لیتی ہیں، کہتی ہیں۔ ''جنید، تم کیوں مرو..... میرے بچے، ابھی تمہارے مرنے کا وقت نہیں..... پھر وہ ٹیلے سے گر جاتی ہیں۔''

جنید کا کہنا تھا کہ میں نے اپنی ٹانگ اور بازو بالکل اسی طرح چکنا چور دیکھا جیسے ویگن کے اندر دادی فاطمہ کا دیکھا تھا۔ ذرہ بھر فرق نہیں تھا۔

جنید وہی بیٹا ہے جسے بچپن میں پاؤں میں گولی لگی تھی۔ اب پھوپی جان کو پیش آنے والے حادثے کے وقت اس کی عمر چودہ پندرہ سال کے قریب تھی۔ دادی فاطمہ کو اس سے بہت پیار تھا۔ یہ بات بہت دفعہ سچ ثابت ہوئی ہے کہ ناگہانی مصیبتوں اور اموات سے قبل کئی لوگوں کو کسی طرح کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔

جہاں تک کیس کی بات ہے، اس کی پیروی میں نے اور ساجد نے پوری طرح کی۔ شروع میں وہ لوگ اس کو ایزی لے رہے تھے لیکن جب قانونی شکنجہ پوری طرح کسا گیا تو بھگوڑے ڈرائیور سمیت سب منت سماجت پر اتر آئے۔ اٹھارہ بیس سالہ وہ ڈرائیور بھی اس ویگن کا مستقل ڈرائیور نہیں تھا۔ عید کی آمد کے سبب اضافی آمدن کے لیے وہ اندھا دھند پارٹ ٹائم ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ تین چار ماہ کی پیشیوں کے بعد جب لوبت اس کے جیل جانے کی آئی تو ایک پیشی پر میں نے اسے عدالت کے باہر بدحواسی کے عالم میں جیل خراب ہوتے دیکھا۔ اپنے وکیل کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے اس پر کچھ ترس تو آیا مگر غصہ بھی بہت تھا۔ میں نے اس کے منہ پر زنانے کا تھپڑ مارا۔ وہ جو چند ماہ پہلے اکڑا پھرتا تھا۔ سر جھکا کر رہ گیا۔ کچھ معززین درمیان میں پڑے۔ بالآخر ہم نے اسے معاف کر دیا کہ جیل بھی تو جرائم کے گڑھ ہی بنے ہوئے ہیں۔

مجھے ایک سین آج بھی یاد ہے۔ جس روز وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ ہمارے دروازے پر آیا اور مجھ سے پوری یقین دہانی حاصل کی کہ ہم نے خدا واسطے کے لیے اسے معاف کر دیا ہے اور کیس واپس لے لیں گے تو اس کے باپ نے مجھ سے کہا۔ ''آپ نے جو کیا اچھا کیا۔ اسے زندگی کا یادگار سبق ملا ہے..... اور صرف اسی کو نہیں اس کے سنگی ساتھی اور بھی بہت سارے ڈرائیوروں کو۔''

اس کے بعد اس نے جذباتی انداز میں اپنا جوتا اتارا اور بے دریغ بیٹے کے سر پر توڑنا شروع کر دیا۔ یہ پٹائی شدید غصے اور خوشی کا ملا جلا اظہار تھی اور یہ کیفیت اس وجہ سے تھی کہ اس کے بڑھاپے کا واحد سہارا جیل جانے سے بچ گیا تھا۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ بسنت کا ذکر ہو رہا تھا۔ بسنت کو پالا اڑنت کہا جاتا ہے، مگر وہ بسنت ایسی تھی کہ ہم اسے پالا انت کہہ رہے تھے۔ لاہور میں سردی جم کر پڑ رہی تھی۔ رات کو کہرا پڑتا اور خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوتا۔ حورین چند روز کے لیے کراچی سے لاہور آئی ہوئی تھی۔ جب سے سبزہ زار کی ویران سڑک پر رات کے وقت پولیس کی آمد والا واقعہ ہوا تھا۔ عاطف اور حورین میں براہ راست ملاقات نہ ہوئی تھی مگر اب عاطف کی بے تابیاں پھر بہت بڑھ چکی تھیں۔ دوسری طرف حورین گھر سے باہر ملنے پر ہرگز تیار نہ تھی۔ ہاں فون پر گفتگو ہو جاتی تھی۔ وہ عاطف کے گائے صوفیانہ کلام اور غزلوں کی مداح تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ کبھی ڈھکے چھپے لفظوں میں اور کبھی کھل کر عاطف سے کہتی تھی کہ اسے ایاز اور عدا کے حوالے سے کچھ کرنا چاہیے کیونکہ وہ کر سکتا ہے۔ حورین کی بہن عدا، دھیمی طبیعت کی قبول صورت لڑکی تھی۔ میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ اور عاطف کا چھوٹا بھائی ایاز ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ لگتا تھا کہ اس حوالے سے تھوڑی بہت کوشش حورین نے بھی کی ہے یا دانستہ طور پر ہو گئی ہے۔

مجھے یاد ہے بسنت سے تین چار روز پہلے کی بات ہے عاطف میرے پاس آیا۔ شیو بڑھی ہوئی، گھونگریالے بال ذرا الجھے ہوئے، آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ، بولا۔ ''یار! بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ امی جی کسی صورت نہیں مانیں گی۔ دوسری طرف ایاز اور عدا کو دیکھتا ہوں۔ وہ ایک دوسرے میں بہت انوالو ہو چکے ہیں۔''

''حورین کیا کہتی ہے؟''

''تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ تو پہلے دن سے کہہ رہی ہے کہ میں اس رشتے کے لیے کوشش کروں مگر امی جی نے ایاز

سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم ندا سے شادی کرو گے تو مجھے لگے گا جیسے میرا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہو۔"

"اور تمہیں پتا ہے وہ اس رشتے کی اتنی مخالف کیوں ہوئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرے ساتھ حورین کے تعلق نے انہیں اس رشتے کا مخالف کیا ہے ورنہ وہ بھی دیکھتی ہیں کہ ایاز، ندا کے لیے "سیریس" ہے۔

"ہوسکتا ہے کہ تمہارا اور حورین کا تعلق نہ بنا ہوتا تو یہ رشتہ بڑی آسانی سے ہوجاتا۔" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پرسوں تو حورین نے باقاعدہ رونا شروع کردیا۔ کہہ رہی تھی کہ ایاز اور ندا کا رشتہ نہ ہونے کی اصل وجہ میں ہی ہوں۔ آپ کی امی سوچتی ہوں گی کہ بڑی بہن ایسی ہے تو چھوٹی کیسی ہوگی۔"

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔" میں نے تائید کی۔

"طاہر! حورین اس حوالے سے مجھ پر بھی تھوڑا بہت شک کرتی ہے۔ سوچتی ہے کہ شاید میں بھی اس رشتے کے لیے دل سے کوشش نہیں کرتا۔"

"تو کیا واقعی تم نہیں کرتے؟"

وہ چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان دونوں کی محبت میں طاقت ہے تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ جہاں تک حورین سے میرے تعلق کی بات ہے، میرے خیال میں اس حوالے سے حورین کی طرف سے کوئی شرط تو نہیں ہونی چاہیے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ عشق ہے تو پھر اس کو صرف عشق ہی رہنا چاہیے۔"

عاطف ایک بار پھر چاہتا تھا کہ حورین گھر سے باہر اس سے کہیں ملے مگر پولیس والے واقعے کے بعد حورین اس طرح کا کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اب اس تعلق کو بس دور دور کا تعلق رکھنا چاہتی تھی مگر جب عاطف کا اصرار بہت بڑھا اور حورین کے کراچی واپس جانے کا دن بھی قریب آگیا تو چار و ناچار وہ آمادہ ہوگئی۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بھی سوچتی تھی کہ اپنی بہن ندا اور ایاز کو جدائی کے دکھ سے بچانے کے لیے وہ یہ سب کررہی ہے۔ انسان کس کس طرح خود کو دھوکا دیتا ہے۔ بقول اقبال..... عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔

حورین کا شوہر جمشید کسی سنگر دوست کی شادی میں شرکت کے لیے ملتان گیا ہوا تھا۔ اس مرتبہ حورین نے اسے اپنے گھر ہی بلا لیا۔ یہ یخ بستہ بسنت کا وہی دن ہے جس کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں۔ پورے لاہور میں باجے گاجے اور "بوکاٹا" کا شور تھا۔ آسمان پتنگوں گڈیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گھروں کی چھتوں پر ہر جانب رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ ایک طرف پکوان چل رہے تھے اور پُرلطف قہقہے گونج رہے تھے۔ دوسری طرف اس تہوار کے تاریک پہلو بھی تھے۔ یعنی لوگوں کا چھتوں سے گر کر زخمی ہونا۔ فائرنگ کے واقعات، ٹریفک کے حادثے اور لڑائی جھگڑے۔ اسی رنگین و سنگین گہما گہمی میں۔ جمشید کے گھر کے ایک کمرے میں عاطف اور حورین لب و رخسار کے معاملات میں مصروف تھے۔ گلے شکوے بھی ہو رہے تھے۔ حورین کہہ رہی تھی۔ "عاطف آپ گھر کے سربراہ ہو۔ آپ ایاز اور ندا کے لیے سب کچھ کرسکتے ہو۔"

عاطف وعدے وعید تو کررہا تھا مگر اس کی اصل توجہ تو اسی حسین، طلسماتی چہرے کی طرف تھی جو اس کے دل کا انمٹ داغ بن چکا تھا۔ حورین اس طرح کی ہر ملاقات کو آخری ملاقات کہتی تھی لیکن کوئی ملاقات..... آخری ملاقات بن کر نہیں دیتی تھی۔

اگلے روز پھر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوتا تھا۔ احساس گناہ کو کم کرنے کے لیے کوئی نیکی کا کام۔ اس مرتبہ حورین نے ہمارے گھر کا چکر لگایا اور میری والدہ کو کچھ پیسے دے گئی کہ یہ طاہر بھائی جان کو دے دیں وہ ایدھی ٹرسٹ میں صدقہ وغیرہ کردیں (میں بھی کبھی کبھی حسب توفیق ایدھی ٹرسٹ میں کچھ پیسے ڈال دیتا تھا)

اگلے روز اس سلسلے میں عاطف سے مشورہ کیا تو وہ بولا۔ "یار! کیوں نا اس مرتبہ لوگوں کو شدید سردی سے بچانے کے لیے کچھ کیا جائے۔"

دراصل ایک دو مرتبہ رات کے وقت مین مندر وغیرہ کی طرف سے گزرتے ہوئے ہم دونوں نے بڑے ترس ناک مناظر دیکھے تھے۔ لاہور کی کڑاکے کی سردی اور دھند میں کچھ بے گھر لوگ مارکیٹس کے برآمدوں یا دکانوں کے پنگھوں کے نیچے ہلکی گرم شالیں یا معمولی چادریں وغیرہ اوڑھ کر سوئے نظر آتے تھے۔ جبکہ اہل لاہور گھروں میں ہیٹر لگاتے تھے اور دہرے لحافوں کا استعمال کررہے تھے۔ ایک سروے کے مطابق ہر روز شہر لاہور میں اچھے خاصے افراد صرف بے خانمائی اور سردی کے سبب موت کے منہ میں چلے جاتے تھے (یقیناً آج کل یہ شرح کہیں زیادہ ہوگی) میں نے اور عاطف نے کچھ رقم اپنی طرف سے

ڈالی۔ تقریباً پچیس کے قریب اچھے لحاف بنوائے۔ انہیں اپنے مشترکہ دوست شعیب کی بڑی گاڑی میں ٹھونسا اور رات بارہ بجے کے لگ بھگ چوبرجی اور جین مندر، پرانی انارکلی کے علاقے میں پہنچ گیا۔ اس واقعے کے سبب ہم پر انسانی فطرت اور ترجیحات کے حوالے سے ایک عجیب انکشاف ہوا اور یہ انکشاف اس رات نہیں بلکہ اگلے روز ہوا۔ ہم نے وہ سارے لحاف سخت سردی میں سوئے پڑے لوگوں میں تقسیم کردیئے۔ یہ زیادہ تر وہ مزدور لوگ تھے جو دوسرے علاقوں سے یہاں محنت کی غرض سے آئے تھے۔ کچھ روزی روٹی کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکنے والے لاچار تھے۔ جب ہم ان سکڑے سمٹے لوگوں کو ہولے سے ہلا کر نیند سے جگاتے اور ان پر نرم گداز لحاف ڈالتے تو وہ حیران رہ جاتے۔ کچھ کی آنکھوں میں احسان مندی کے احساس سے آنسو چمک جاتے۔

ہم مسرور واپس آئے۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اگلی رات ہمارے ساتھی شعیب کے دل میں نجانے کیا آیا کہ اس نے اپنی شاپ کے ایک ملازم ماجھو کو مذکورہ علاقے میں بھیجا تاکہ وہ دیکھے کہ وہ نادار لوگ اب کس انداز میں سو رہے ہیں۔

ماجھو نے واپس آکر ہمیں جو بتایا وہ حیران کن تھا۔ زیادہ تر لوگ اسی طرح فرش پر معمولی شالیں اور چادریں وغیرہ لے کر سو رہے تھے۔ دو تین افراد ہی ہمارے پھولدار لحاف میں نظر آئے۔

ماجھو نے بتایا۔ میں نے اردگرد کے دو تین بندوں سے صورتِ حال پوچھی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آج سویرے یہاں چوبرجی چوک کے پاس لحافوں کا جمعہ بازار لگا ہوا تھا۔ زیادہ تر مزدور اپنے لحاف اونی پونی قیمت پر بیچ رہے تھے کئی ایک نے تو بہت تھوڑے پیسوں میں فروخت کردیئے۔

عقدہ یہ کھلا کہ یہ زیادہ تر مزدور سرد ترین پہاڑی علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ لاہور کی سردی جو ہمارے لیے ناقابلِ برداشت تھی ان کے لیے بہت حد تک قابلِ برداشت تھی۔ کچھ ایسے پردیسی بھی تھے جو سردی تو محسوس کرتے ہوں گے مگر وہ سارا دن معماروں کے ساتھ مزدوری کرتے تھے۔ وہ وزنی لحاف کو کہاں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ لہٰذا ان کو جو قیمت ملی انہوں نے لے لی۔

ہمارا جذبہ تو یقیناً اچھا ہی تھا اور اس کا ہمیں کچھ نہ کچھ ثواب بھی ملا ہوگا مگر لوگوں کی ضروریات پہچاننے میں ہم ناقص العقل رہے۔

یہ 1999ء کے لگ بھگ کی بات ہے جب لندن میں ہی معراج صاحب نے اپنے کچھ ٹیسٹ کرائے اور ڈاکٹروں نے خطرے کی گھنٹی بلکہ گھنٹیاں بجادیں۔ انہیں اوپن ہارٹ سرجری کا کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ اوپن ہارٹ سرجری کوئی معمولی سرجری نہیں ہوتی۔ ایسے میں لوگ حکمت اور ہومیوپیتھی وغیرہ کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ معراج صاحب بھی ہومیوپیتھی سے اس آپریشن کو ٹالنے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن بظاہر وہ ایک دلیرانہ حالات کا سامنا کرنے والے شخص تھے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب انہوں نے کئی ضروری امور نمٹانے اور جے ڈی پی کی پبلشر کی ذمے داری اپنی اہلیہ عذرا رسول صاحبہ کو سونپ دی۔ لندن میں سرجری کے انتظامات تو پہلے ہی ہو چکے تھے۔ بالآخر انہوں نے آپریشن کرالیا اور بفضلِ خدا صحت یاب ہو کر لندن سے واپس بھی آگئے۔ معراج صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری اور جو لوگ بھرپور زندگی گزارتے ہیں انہیں بھرپور مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ معراج صاحب کے عارضہ قلب کی وجہ بھی ایسی ہی مشکلات تھیں۔ اسی دوران میں انہیں اپنی ایک سالہ بچی کی وفات کا جانکاں صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔

معراج صاحب کی بیماری سے یاد آیا کہ ان دنوں میرے اپنے بڑے ابا جی (تایا جی) بھی عارضہ قلب کا شکار تھے۔ کبھی کبھی میں موازنہ کرتا تھا تو مجھے اپنے بڑے ابا جی یعنی تایا جی میں محترم معراج صاحب کی کچھ جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ وہ بھی درمیانے قد، کشادہ پیشانی اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ وہ بھی "سیلف میڈ" تھے۔ گو وہ صرف عمارتی لکڑی کے کام تک محدود تھے مگر اس کام کو انہوں نے آگے بڑھایا اور اس سے ساکھ پیدا کی۔ انہوں نے بھی دو شادیاں کی تھیں ان کی دوسری اہلیہ کا ذکر میں کرچکا ہوں۔ ایک طرح سے وہ میری سوتیلی تائی تھیں مگر سوتیلا پن دور دور تک نہیں تھا۔ وہ درد دل رکھنے والی بہت دین دار خاتون تھیں۔ انہیں بارہا خدا کے گھر کی زیارت نصیب ہوئی۔

بڑے تایا جی کو پہلا ہارٹ اٹیک 1990ء کے لگ بھگ آیا تھا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ انہوں نے تھوڑی ہی دیر پہلے سحری کھائی تھی۔ یہ ایک اتنا شدید تھا کہ وہ تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ اس موقع پر میری اہلیہ شفیقہ ان کی

زندگی کا وسیلہ بن گئی۔ میں تو محلے کے ڈاکٹر صاحب کو لینے بھاگ گیا تھا۔ اہلیہ جو اکثر شدید مصیبت کے وقت اپنے ہوش وحواس برقرار رکھتی ہے (بلکہ ایسے مواقع پر اس کے حواس زیادہ کام کرنے لگ جاتے ہیں) اس نے ٹریننگ نہ ہونے کے باوجود بڑے تایاجی کو CPR دیا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کی چھاتی کے عین درمیان وقفے وقفے سے جھٹکے دیے۔ پھر ہم ان کو فوراً شیخ زید اسپتال لے گئے۔ جہاں ان کا علاج شروع ہوا۔ وہ اس پہلے اٹیک کے بعد بھی 2000ء تک قریباً دس سال زندہ رہے۔ اس دوران میں دو مزید ہارٹ اٹیک بھی انہوں نے جھیل لیے۔ وہ 16 اکتوبر 2000ء کی شام ہم سے جدا ہوئے۔ ہماری سوسائٹی کی مسجد دوسری منزل پر تھی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ آؤ نماز کی طرف..... آؤ نماز کی طرف..... وہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مسجد کی سیڑھی کے تیسرے چوتھے زینے پر تھے کہ گرے اور پھر نہ اٹھ سکے۔ یہ بات علاقے میں بہت مشہور ہوئی کہ ایک نمازی کس طرح باجماعت نماز کے لیے تیزی سے مسجد میں داخل ہوتا ہوا سیڑھیوں میں گر گیا۔

بڑے تایاجی کے حوالے سے ایک اہم واقعہ یاد آیا۔ دل کے دو آخری دوروں کے درمیان وہ کافی بیمار بھی رہنے لگے تھے۔ ان کی واحد گود لی ہوئی اولاد میں ہی تھا۔ ان کی بیماری کے دوران میرا اکثر ڈاکٹروں کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی ساجد بھی اس بھاگ دوڑ میں حتی المقدور ساتھ دیتا تھا۔ بڑے تایاجی کی عمر 80 سال کے قریب پہنچ رہی تھی۔ ان کے دل کے والوز کا مسئلہ تھا۔ درجنوں ڈاکٹروں میں سے کسی ایک نے بھی ان کے لیے ان کی صحت کے پیش نظر آپریشن تجویز نہیں کیا تھا لیکن ایک روز ڈاکٹرز کے ناموں میں مشابہت کی وجہ سے ہم انہیں غلطی سے ایک فزیشن کے بجائے سرجن کے پاس لے گئے۔ سرجن صاحب یقیناً ان مسیحاؤں میں سے تھے جو ہاتھ آئے مریض کو کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ انہوں نے تایاجی کی رپورٹس دیکھ کر سرجری کے فضائل پر لمبا چوڑا لیکچر دیا۔ ہمارا دل چاہنے لگا کہ دو چار دن میں تایاجی کا آپریشن کرا ہی لیں۔

ڈاکٹر صاحب آخر میں بڑی مردہ دلی کے ساتھ بولے۔ ”ویسے ابھی تو آپ فزیشن صاحب کے پاس چلے جائیں۔ وہ اوپر والے فلور میں بیٹھے ہیں۔ آپ کو انہی کی

قوانین ہانیے بے جا دیکھتا ہوں

یہ دنیا بہت عجیب ہے۔ آپ ذرا دنیا کا ایک چکر تو لگا کر دیکھیں۔ ایسے ایسے مناظر اور واقعات دکھائی دیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ کیا نہیں ہے اس دنیا میں۔ کتنے ممالک ہیں اور ان ممالک کے قوانین ہیں۔ قوانین کیوں بنائے جاتے ہیں۔ نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے۔ مجرموں کو سزا دینے کے لیے۔ لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسے بھی قوانین ہیں جن کے بارے میں جان کر آپ کو حیرت ہوگی۔ آپ سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ ہم نے ایسے ہی کچھ قوانین کا جائزہ لیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

☆ لوگ اپنے کتوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں لیکن آپ نے یہ کہیں نہیں سنا ہوگا کہ کتوں کی عزت نفس کو اگر ٹھیس پہنچائی جائے تو یہ جرم ہے۔ اوکلاہاما میں اگر آپ اپنے کتے کو منہ چڑائیں تو آپ کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ آپ کتے کے سامنے الٹی سیدھی شکلیں بھی نہیں بنا سکتے۔ کیوں کہ ان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔

☆ اڈاہو کی ایک کاؤنٹی ہے جسے سالٹ لیک کاؤنٹی کا نام دیا گیا ہے۔ وہاں آپ اپنے دانتوں کو کاغذ میں لپیٹ کر جیل نہیں بھیج سکتے۔ یہ وہاں جرم تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہوشیار رہیں اگر آپ کے پاس دانتوں ہے تو یوں ہی کھلے لے جائیں۔

☆ سان فرانسسکو میں آپ اپنے گھوڑے کے چارے کے ڈھیر کو چوتھ سے اونچا نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کر لیا تو آپ کا گھوڑا حکومت ضبط کر لے گی۔

☆ ڈیون (ٹیکساس کا ایک شہر) وہاں ایک عجیب و غریب قانون ہے۔ وہاں اگر کوئی بڑھئی یہ چاہے کہ اپنے گھر میں یا کسی بھی جگہ کپڑے اتار کر فرنیچر بنائے تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

☆ مونٹانا۔ یہاں کوئی شخص اپنے گھر کے پچھلے صحن میں شام کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا (ہاں البتہ مکان کے اگلے حصے میں بیٹھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے)۔

☆ کیلیفورنیا میں کوئی گاڑی اگر ساٹھ میل کی رفتار سے بغیر ڈرائیور کے چل رہی ہو تو یہ جرم ہے۔ (سوال یہ ہے کہ خدا کے بندو۔ گاڑی بغیر ڈرائیور کے کیسے چلے گی۔ فرض کرو کسی طرح چل بھی رہی ہو تو کیا ضروری ہے کہ جب وہ ساٹھ میل رفتار کی حد تجاوز کر جائے تب ہی جرم ہے چلو اگر ایسا ہی ہے تو کس کو پکڑو گے۔ ڈرائیور تو ہے نہیں۔ اسی کو کہا جاتا ہے۔ ”ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے“)۔

☆ فلوریڈا میں کوئی شخص اگر گاؤن پہنے گھوم رہا ہو اور اس نے گاؤن کے فیتے نہ باندھے ہوں تو اس پر جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔

مرسلہ: انیس گردیزی۔ ملتان

طرف ریفر کیا گیا ہے لیکن آخر میں آپ کو کرانی سرجری ہی پڑے گی۔" (اپنا کارڈ وغیرہ تھما دیا)

بعدازاں ایک سینئر موسٹ ڈاکٹر نے بھی ان کی رائے کو کلی طور پر رد کیا۔

طب کے شعبے میں بڑے اچھے اچھے لوگ موجود ہیں مگر "ابن الوقت مسیحاؤں" کی بھی کمی نہیں۔ ایک کا ذکر تو میں پچھلے ابواب میں کر چکا ہوں۔ جب شادی سے ذرا پہلے میرا کٹوارہ گردہ ایک قصاب صفت سرجن کی ہوس سے بال بال بچا تھا۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ شادی کے چھ سات سال بعد پیش آیا تھا۔ میری دائیں جانب کی بالائی پسلیوں میں گہرا سانس لیتے ہوئے کچھ درد ہوتا تھا اور کافی عرصے سے ہو رہا تھا۔ سرگزشت کے انور فراز ہومیوپیتھی کے باقاعدہ معالج ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ وہ محترم معراج رسول صاحب اور جے ڈی پی کے دیگر خواتین و حضرات کو بھی طبی مشورے دیتے رہتے تھے۔ میں نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے مجھے کراچی سے ایک ہومیو پیتھک دوا بھجوا دی۔ میں حسب ہدایت بڑے خشوع و خضوع سے استعمال کرنے لگا۔ دو تین شیشیاں چڑھا گیا۔ ایک روز جب وہ لاہور آئے ہوئے تھے شومئی قسمت ان سے پوچھ بیٹھا کہ یہ جو دوا میں پی رہا ہوں کیسے بنتی ہوگی۔ پہلے تو وہ شرارت سے زیر لب مسکراتے رہے پھر پان کی پیک گٹک کر بولے۔ "حقیقت یہ ہے کہ جو مریض لی وی کے سبب وفات پا جاتے ہیں۔ ان کے گلے سڑے پھیپھڑے کو نچوڑ کر عرق نکالا جاتا ہے جس سے یہ دوا تیار ہوتی ہے۔" ہم دونوں دودھ پتی پی رہے تھے۔ ابھی میں نے دو تین چسکیاں ہی لی تھیں۔ زیادہ پی ہوتی تو وہ یقیناً باہر آ جاتی۔

میں حیران تھا کہ خدانخواستہ مجھے تو کوئی اس طرح کی بیماری نہیں تھی پھر فراز صاحب نے میرے لیے ایسا کریہہ علاج منتخب کیوں کیا۔ وہ علاج بالمثل پر مکمل تبصرہ کر چکے تو میں پچھلے دو ماہ کے قضا غرارے اور گولیاں وغیرہ کرنے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ فراز صاحب کا یہ واقعہ تو یونہی برسبیل تذکرہ آ گیا۔ اصل بات کا تعلق ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر صاحب سے ہے۔ سردیوں میں پسلیوں کا یہ اندرونی درد زیادہ ہو گیا تو میں کسی کے کہنے پر ڈیفنس کے ایک معروف ماہر امراض سینہ کے پاس جا پہنچا۔ یہ سرجن بھی تھے۔

انہوں نے میری اس تکلیف کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ مجھے اب تک اپنے تا حیات ہونے پر حیرت ہونے لگی۔ بس یہی لگنے لگا کہ اب سارے کام نمٹانے کی اور اہلیہ کو صبر شکر کے ساتھ باقی زندگی گزارنے کی وصیت کرنے کی گھڑی آ گئی ہے۔ سلسلہ وار کہانی تا دمِ تحریر کی بھی فکر تھی۔ شاہ جہاں، غزالہ اور زریں گل وغیرہ کو میں نے ایسی جگہ پھنسا رکھا تھا کہ مجھ سے خود بھی نکالا نہیں جا رہا تھا، اور کون نکال پاتا۔ ان کرداروں کی بے بسی پر دل رنجیدہ ہو گیا۔ خاص طور پر غزالہ کی فکر لاحق ہوئی۔ میری رحلت کے بعد کسی نوجوان مصنف نے اس کے ساتھ کچھ برا بھلا کر دیا تو کیا ہوگا؟

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ پسلیوں اور پھیپھڑوں کی درمیانی جھلی کا معاملہ ہے۔ انہوں نے ایک نہایت مہنگی لیبارٹری سے کرائے جانے والے قریباً دو درجن ٹیسٹ مجھے تھما دیے اور یہ مژدہ بھی سنایا کہ آپریٹ کرنے کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ ان کا ایک فقرہ قریباً 35 سال گزرنے کے بعد آج بھی مجھے یاد ہے۔ کہنے لگے۔ "تمہارے چہرے پر تذبذب دیکھ رہا ہوں۔ دیر کرو گے تو بہت سیریس ہو کر میرے پاس آؤ گے۔"

میں نے دیر کی اور کافی دیر کی قریباً 35 سال گزار دیے۔ وہ درد ایک دو ماہ بعد نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور پھر ختم ہو گیا۔ اللہ پاک ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اپنے جسم کے اندرونی نظام کے بارے میں ہم سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کئی دفعہ کوئی چھوٹی سی تکلیف درحقیقت بہت بڑی ہوتی ہے اور کبھی کوئی بہت بڑی تکلیف معمولی اور عارضی ثابت ہوتی ہے۔

بہرحال انور فراز صاحب کی ستارہ شناسی اور ہومیوپیتھی ہر شعبے سے بالاتر رہی ہے۔ کسی وقت معراج رسول بھی ان سے مشورہ کر لیتے تھے۔ ان کا حافظہ کمال کا رہا ہے تاہم اب عمر کے ساتھ یادداشت اور بذلہ سنجی کی دھار تھوڑی کند ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر اور ڈاکٹری کے حوالے سے ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتا چلوں۔ یہ میرے ساتھ ہی پیش آیا۔ ایک مختصر کہانی لکھنے سے فارغ ہو کر سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو ایک جانب سے مہین سی آواز آئی جیسے کوئی باریک سی چیز ٹوٹی ہو۔ کسی بچے نے بیڈ شیٹ پر سوئی اڑس دی تھی جو لیٹتے وقت کہنی کے قریب میرے بازو میں چلی گئی۔ اہلیہ نے باریک بینی سے سوئی کو دیکھا اور بولی۔ "سوئی صرف چبھی ہی نہیں، آپ کے بازو میں ٹوٹ بھی گئی ہے۔"

"کوئی اچھی خبر نہ دیا کرو۔" میں نے کہا۔

"یہ اچھی خبر ہے بھی نہیں۔" اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ سوئی کا جسم کے اندر رہ جانا ٹھیک نہیں۔ یہ خون کی روانی کے ساتھ چل بھی پڑتی ہے۔ خدانخواستہ..... خدانخواستہ دل کی شریانوں تک پہنچ جائے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے بھلی مانس کو بہت سمجھایا کہ خون کی ایسی شدید روانی اور بہتات بھی مجھ میں نہیں ہے کہ سوئی فوراً چل پڑے، صبح دیکھ لیں گے مگر اس نے دسمبر کی یخ بستہ شب میں مجھے ڈاکٹر کی طرف روانہ کر کے دم لیا۔ میں گاڑی پر ریواز گارڈن کے قریب ایک کلینک میں چلا گیا۔ وہاں بھی ایک کاہل سے اور غالباً مشکوک ڈگری والے ڈاکٹر صاحب بیٹھے تھے۔ انہوں نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "بہتر ہے کہ میں میو اسپتال چلا جاؤں کہ وہاں سارا انتظام ہوتا ہے اور وہ زیادہ دور بھی نہیں۔"

کچھ اہلیہ نے ہراساں کیا تھا رہی سہی کسر ان ڈاکٹر صاحب نے نکال دی۔ مجھے خوامخواہ دل کے آس پاس خطرناک کٹ کٹاریاں سی محسوس ہونے لگیں۔ نہ چاہنے کے باوجود میں نے میو اسپتال کا رخ کیا۔ رات کا قریباً ایک بج چکا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے میرا احوال سن کر ایک پرچی لکھ دی اور بولا۔ "جا کر ایکسرے کرا لو۔"

میں سنسان ایکسرے روم میں پہنچا۔ وہاں میلی کچیلی شلوار قمیص پہنے ایک لڑکا ایکسرے والے بیڈ کے اوپر ہی سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگا کر جگایا اور پرچی دکھائی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مجھ پر خشمگیں سی نظر ڈال کر سینے کے ایکسرے کے لیے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا۔ "بھئی آپ چپ رہیں مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ اپنی ٹھوڑی اس اسٹینڈ پر رکھیں اور دونوں ... بازو پیچھے موڑ لیں۔"

وہ کسی تھانیدار کی طرح حکم دے رہا تھا۔ میں بھی کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ ان لمحوں میں سوچا، شاید سوئی بھیجنے کے بعد یہی طریقہ کار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل کا ہی ایکسرے کیا جاتا ہے کہ کہیں سوئی برق رفتاری کا مظاہرہ کرتی ہوئی دل تک تو نہیں پہنچ گئی۔ اس نے جمائیاں لیتے ہوئے کھٹاک سے میرے سینے کا ایکسرے کیا اور باہر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے پھر جملہ مقررہ پیش کیا۔ "یار! سوئی میرے بازو میں چبھی ہے اور....." اس نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی اور دھکا دے کر باہر بھیج دیا۔

دو تین منٹ بعد ہی گلا ایکسرے تھامے ڈیوٹی ڈاکٹر کے سامنے تھا۔ اس نے ایکسرے دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ پھر ایکسرے کو دیکھا۔ تب نہایت ہی برا سا منہ بنا کر کہا۔ "بہت اُلو کا پٹھا ہے۔ آپ نے اس سے کہا نہیں تھا کہ بازو میں سوئی چبھی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس نے تو مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بس یہی کہتا رہا۔ جو پرچی پر لکھا ہے۔"

ڈاکٹر دانت پیستا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا۔ ایکسرے روم میں جا کر اس لاڈلے ہونے لڑکے کو خوب ڈانٹ پلائی اور اپنے سامنے میرے بازو کا ایکسرے کرایا۔ سوئی کا ایک انچ لمبا ٹکڑا ایکسرے میں صاف چمک رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "گھبرانے کی بات نہیں سوئیاں اتنی آسانی سے کہیں چل پڑتیں۔ یہ ویسے بھی ہڈی میں پھنسی ہے۔ منگل اور بدھ کو آپریشن ڈے ہوتا ہے، نکال دیں گے۔"

میں شکریہ ادا کر کے واپس جانے لگا تو بولے۔ "ویسے آپ پڑھے لکھے لگتے ہیں آپ کو روکنا چاہیے تھا اس کو سینے کا ایکسرے کرنے سے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سچ پوچھیں تو اس نے مجھ پر اتنا پریشر ڈال دیا تھا کہ وہ سینے کے ایکسرے کے بجائے، کسی سرجن کے ساتھ مل کر سینے کا آپریشن بھی کر ڈالتا تو میں کرا لیتا۔"

ڈاکٹر نے منگل، بدھ کا کہا تھا۔ تب تک انتظار کون کرتا۔ اہلیہ کا خیال تھا کہ میری ہڈی اتنی سخت نہیں کہ سوئی کو زیادہ دیر جکڑے رکھ سکے۔ لہٰذا جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ اگلے ہی روز میں اپنے واقف کار معروف آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر سید اویس کے سامنے ان کے آپریشن تھیٹر میں بیٹھا تھا۔ یہ میو اسپتال کا ہی آپریشن تھیٹر تھا۔ انہوں نے اسکریننگ کے ذریعے دو منٹ میں سوئی ڈھونڈ کر باہر کھینچ لی۔ بولے۔ "لو جی، جاؤ، موج کرو..... لکھو اب کہانی شہانی۔"

میں نے برآمد ہونے والی سوئی کا خون آلود ٹکڑا روئی میں لپیٹ کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تاکہ اہلیہ سمیت قریبی عزیزوں کو ثبوت پیش کیا جا سکے۔ چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ سیدھے گھر ہی پہنچے۔ دو دن کی ٹینشن کے بعد خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ دل چاہ رہا تھا کہ گھر میں ہی تھوڑی سی مٹھائی بھی تقسیم کر دی جائے۔ مگر اف یہ خواتین کی ہار پک بنی، اہلیہ نے سوئی کے خون آلود ٹکڑے کو گھما پھرا کر غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم چونکی۔

"ہاؤ ہائے۔ اس کی تو TIP ہی نہیں ہے۔"

اس نے سوئی کا نکلوا مجھے دکھایا۔ واقعی آگے والی باریک TIP نہیں تھی۔ وہ خیر سے ہڈی کے اندر ہی رہ گئی تھی۔

"یہ تو بالکل ٹھیک نہیں ہے۔" اہلیہ کے علاوہ خالہ مریم اور للیانی والے ابا جی بھی یہی بات کہنے لگے۔

ساری خوشی غارت ہوگئی۔ جو روپے مٹھائی کے لیے نکالے تھے وہ میں نے دوبارہ جیب میں ٹھونسے۔ چھوٹے بھائی کو پھر ساتھ لیا۔ راستے میں ایک جگہ سے پھر بازو کا ایکسرے کرالیا جس میں سوئی کا اگلا بارک سرا اب بھی چکارے مارتا نظر آرہا تھا۔ میو اسپتال جا کر پھر ڈاکٹر اویس سے رابطہ کیا۔ انہوں نے مجھے آپریشن تھیٹر سے ملحقہ کمرے میں ہی بلالیا۔ یہاں ہڈیوں کے دو تین مریضوں کی بڑی بڑی سرجریاں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر اویس کے دستانے وغیرہ لہولہان تھے۔ مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی کہ سوئی کے چھوٹے سے ٹکڑے کے مزید چھوٹے ٹکڑے کی معمولی سی شکایت لے کر یہاں آگیا تھا۔ بہرطور ڈاکٹر صاحب نے تحمل سے میری گزارش سنی اور یقین دلایا کہ سوئی کی یہ معمولی سی چوچ میرا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ ورنہ اس کی ایسی تیسی کردیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی غلطی بھی تسلیم کی، گو یہ برائے نام غلطی تھی۔ یہ آرتھو کے بے حد نفیس قابل ڈاکٹر ہیں..... اللہ نے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے۔ اب تو بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ڈاکٹر حضرات وخواتین پر کسی طرح کی تنقید کر رہا ہوں۔ ماشاءاللہ پاکستان میں بڑے بڑے قابل اور انسان دوست ڈاکٹر موجود ہیں۔ دنیا انہیں مانتی ہے۔ کسی اچھے ڈاکٹر کے مشورے کو اپنی کم علمی، سہل پسندی یا کسی تعصب کی وجہ سے رد کرنا اکثر خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ایسی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اس ضمن میں، میں اپنے صرف دو ذاتی مشاہدات کا ذکر کروں گا۔ یہ 1987ء کے مارچ کی بات ہے۔ ایک سہ پہر عاطف بھاگا بھاگا میرے پاس آیا وہ ان دنوں فٹ بال کھیلتا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا تھا۔

"یار وہاں شہر میں دھماکا ہوا ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر زخمی ہوگئے ہیں۔ ان کی عیادت کو جانا چاہیے۔ (وہ جذبہ ایمانی سے سرشار مقررین کو سننے کا بہت شوقین تھا اور محترم علامہ کا شمار بھی نہایت مقبول مقررین میں ہوتا تھا) ہم میو اسپتال میں پہنچے۔ علامہ کے بہت سے چاہنے والے ان کے زخمی ہونے کی خبر سن کر اسپتال پہنچ چکے تھے۔ میں اور عاطف کسی نہ کسی طرح اس جگہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں انہیں طبی امداد دی جارہی تھی۔ دھماکے میں ان کی ٹانگ زخمی تھی۔ ویسے وہ مکمل ہوش وحواس میں نظر آتے تھے۔ ہمارے سامنے ہی انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں دو تین مریدین کو ڈانٹا۔ "میں ٹھیک ہوں بالکل۔ خوامخواہ مسئلہ نہ بناؤ۔ اٹھنے دو مجھے۔ میں وضو کر کے نماز پڑھوں گا۔" مریدین غالباً تیمم کا کہہ رہے تھے۔

ہمارے سامنے ہی انہوں نے پانی منگوایا اور مغرب کی نماز کے لیے وضو کیا۔

دیکھنے والوں کو تسلی ہوئی کہ وہ ٹھیک ہیں..... لیکن وہ ٹھیک نہیں تھے۔ چند ہی دن بعد انہیں داعی اجل کو لبیک کہہ جانا تھا۔

ماہر ڈاکٹرز نے دو تین دن بعد ہی کہہ دیا تھا کہ ٹانگ کاٹنا پڑے گی کیونکہ زہر پھیل رہا ہے۔ جواں سالہ علامہ احسان الٰہی فوری طور پر آمادہ نہ ہوسکے۔ فیصلہ کرنے میں جو تاخیر ہوئی اس کے سبب زہر جسم میں سرایت کر گیا۔ حالت بگڑی تو سعودی حکومت نے پیشکش کی کہ علامہ کو فوراً سعودی عرب لایا جائے۔ یہاں ان کا علاج کیا جائے گا مگر ان کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ اکثر اوقات مریض کے لواحقین کسی متاثرہ عضو کو کاٹنے کی اجازت دینے میں جتنا تامل کرتے ہیں اس سے جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اسی نوع کا ایک دوسرا واقعہ ہماری ممبر شپ کے ایک ملازم کے ساتھ پیش آیا۔ اس کا نام فرید سمجھ لیجیے۔ فرید کی والدہ کو چھاتی میں چھوٹی سی گلٹی ہوئی۔ لاہور کے غالباً گنگارام اسپتال میں دکھایا۔ انہوں نے کہا یہ کینسر کی گلٹی ہے۔ آپریشن سے نکال دیتے ہیں۔ آپریشن کا پورا انتظام ہوگیا لیکن صرف ایک دن پہلے ان کے آبائی گاؤں سے آئے ہوئے کسی ان پڑھ دانشور نے بی بی کو مشورہ دیا کہ کینسر کو نشتر لگوانے کی حماقت ہرگز نہ کرنا۔ یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گا۔

راتوں رات فرید اور اس کے بھائی نے والدہ کو اسپتال سے نکالا اور گاؤں لے گئے..... گاؤں جا کر وہی کچھ ہوا جو ہوتا ہے۔ اتائیوں کا علاج شروع ہوا۔ جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈا کرنے والوں سے استفادہ کیا گیا۔

پانچ چھ ماہ میں حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ متاثرہ حصے میں کیڑے چلنے لگے۔ ماں ہاتھوں سے نکالی جارہی تھی لیکن مکمل پر اب بھی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ فرید کئی دن سے ٹیسٹر شاپ پر نہیں آیا تھا۔ ایک روز آیا تو بڑا پُرجوش دکھائی دیا، بولا۔ ''بھائی جان! بھیں اللہ نے سن لی ہماری۔ آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ مجھے دو ہزار روپیا چاہیے۔ اگلے ماہ کی تنخواہ سے بے شک کاٹ لیجیے گا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن بات تو بتاؤ۔''

بولا۔ ''امی جان کو حافظ آباد کے ایک حکیم صاحب کو دکھایا تھا۔ بڑی شفا دی ہے رب نے ان کے ہتھ میں۔ پہلے تو وہ امی کے علاج پر راضی ہی نہیں تھے۔ بہت کہنے سننے پر بولے۔ ایک شرط پر علاج کروں گا۔ یہ ایک دوا لے جاؤ اس کو ماں کے زخم پر لگاؤ۔ اگر 24 گھنٹے کے اندر زخم نیلا ہوگیا تو علاج کروں گا۔ ورنہ آنے کی ضرورت نہیں..... اور بھائی جان..... آج دوپہر کے وقت زخم نیلا ہوگیا ہے۔'' فرید کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔

میں اسے کیا سمجھاتا، پہلے بھی کئی بار سمجھا چکا تھا۔ اسے دو ہزار روپے دے دیے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ تیسرے چوتھے روز اس کی والدہ فوت ہوگئی۔

ایک بالکل چھوٹی سی رسولی سے شروع ہونے والی کہانی ایک سڑے ہوئے گھاؤ میں بدلی اور بے رحم ''معالجوں'' کی شعبدہ بازیوں کے سبب 40 سال کی عمر میں قبر کی تاریکی میں اتر گئی۔

☆☆☆

کافی دنوں سے سری لنکا مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ خوبصورت ساحلوں پر جھومنے والے پام درختوں کی سرزمین۔ گھنے جنگلوں میں مسلسل برسنے والی بارشوں کا خطہ۔ قدرتی حسن کے سبب سیاحوں کی جنت کہلوانے والا جزیرہ۔ سری لنکا کی سیاحت کا شوق جناب ابے حمید کے مضامین نے بھی بھڑکایا تھا۔ نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں وہ ''سماوار چائے اور خوشبو'' کے عنوان سے سری لنکا کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کرتے رہے ہیں۔

پھوپی جان کو پیش آنے والے حادثے کے بعد دل کافی اداس رہا تھا۔ اب اس سارے سحالے کو نمٹتے ہوئے بھی کافی وقت گزر چکا تھا۔ جی چاہا کہ کچھ تازہ ہوا لی جائے۔ کچھ نئے مناظر، نئے خیالات، تحریروں کے لیے اپنے اندر جذب کیے جائیں۔ انہی دنوں خبر ملی کہ جس پرانے گھر میں ہم رہتے تھے وہاں ایک شاندار جامع مسجد تعمیر ہورہی ہے (میرے بابا، بھائی بھی اب اس کالونی سے شفٹ ہوکر اعوان ٹاؤن میں رہائش پذیر ہوچکے تھے) سوچا سری لنکا جانے سے پہلے ایک آخری مرتبہ اس پرانے گھر کو دیکھ لوں جہاں بے شمار یادیں تھیں۔ ایک کھڑکی تھی، ایک چھت تھی اور ایک چار فٹ اونچی سنڈیر تھی۔ کسی وقت میں سوچتا تھا، کیا وہ بھی کبھی اپنے پرانے گھر میں آئی ہوگی۔ ایک اچٹتی سی نظر اس چھت اور اس منڈیر پر ڈالتی ہوگی۔

میں موقع پر پہنچا تو مسماری کا عمل شروع ہوچکا تھا بلکہ آدھے سے زیادہ گھر ڈھے چکا تھا۔ میں نے آخری بار ان در و بام کو دیکھا۔ ایک دیوار پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہا۔ وہ ڈھیر ہوتا گھر جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ اب کے ہم بچھڑے تو شاید خوابوں میں ملیں۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی ہوئی کہ ہماری یادوں کا یہ مرکز ایک پاکیزہ محبت کی طرح ایک پاکیزہ اور مقدس قالب میں ڈھل گیا ہے۔ اب یہ مسجد ہے اور انشاء اللہ تا ابد مسجد ہی رہے گی۔ میں جس جگہ للیانی والے اباجی کا بستر ہوتا تھا اور جہاں گرمیوں کی طویل دوپہروں میں، میں سویا کرتا تھا، وہاں محراب بن رہی تھی۔ جہاں اباجی یوگس کا کرتا تھا وہاں دیدہ زیب وضو خانہ بنے جارہا تھا اور بڑے تایا جی کے کمرے کی جگہ دوسری منزل کی کھڑکیاں تھیں۔

میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہونے لگا۔ میں نے سوچا، چلو اب یہ تو نہ ہوگا کہ میں یہاں آیا کروں گا اور میری اہلیہ شرارتی نظروں سے میری جانب دیکھا کرے گی اور یہ بھی نہ ہوگا کہ جب میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت کا رخ کروں گا تو سڑکن آنکھوں سے مجھے دیکھا کرے گی اور مسکرا کر کہا کرے گی۔ ''کہاں جارہے ہیں بھائی جان۔''

پرانے محلے کے بہت سے لوگ گرمجوشی سے ملے۔ پرانی یادیں تازہ کیں۔ یہ اردو اسپیکنگ لوگ بہت محبت کرنے والے تھے اور اب بھی ہیں۔ بہرحال اس پرانی کالونی میں آنے کے بعد کئی زخم ہرے سے ہوگئے تھے۔ پتا نہیں کیوں دل چاہنے لگا کہ کم از کم ایک بار ٹاؤن شپ جاکر زویا کے شوہر کو دیکھوں۔ دور ہی سے سہی مگر اس کو دیکھوں پھر خاموشی کی زبان میں اس سے کہوں۔

تو نے دیکھی ہے، وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پر اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں

تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے

کالونی کے چاہنے والوں سے کچھ فرصت ملی تو میں گہری ہوتی شام میں اکیلا ہی اس بازار کی طرف نکل گیا جہاں کبھی ایک دکان سے میں نے خوش رنگ کیوٹ خریدے تھے اور ان میں سے ایک کیوٹ پر Love لکھ کر زویا کے گفٹ میں بھیج دیا تھا۔ اب کبھی مجھے پتا نہ چلتا تھا کہ وہ کیوٹ اس نے اٹھایا تھا یا نہیں اور یہ کوئی ایک سوال تو نہ تھا ایسے ان گنت سوال ہمیشہ کے لیے جواب طلب ہو چکے تھے۔ اور پھر وہ دکان بھی تو یہیں تھی جہاں سے میں ناصر اور شعیب گرما گرم جلیبیاں کاغذ کے لفافے میں لیتے تھے۔ چلتے جاتے تھے۔ کھاتے جاتے تھے اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے جاتے تھے اور ہاں وہ رس ملائی..... وہ بھی تو یہیں بنتی تھی جو کبھی کھائی نہ گئی اور ضائع کھائی جاتی تھی۔

میں واپس گھر پہنچا تو اہلیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"طاہر! کیا واقعی وہاں پر مسجد بن رہی ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک ہمدردانہ لیکن اطمینان آمیز مسکراہٹ ابھری۔ وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ آج اس نے قیمے میں شملہ مرچ ڈالی تھی۔ کھانے کی مہک پورے گھر میں پھیلی تھی۔ اس مہک میں رس ملائی کی خوشبو مدغم ہوتی محسوس ہوئی۔ ہاں خوشبوئیں ایسے ہی مدغم ہوتی ہیں۔

سری لنکا کے سفر میں شعیب میرے ساتھ شریک تھا۔ وہ جلد اکتا جاتا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ میں نے اس سے تحریری حلف لیا کہ وہ تین ہفتے سے پہلے واپسی کا نام تک نہیں لے گا۔ ہمارے تیسرے ساتھی ضامن صاحب تھے۔ پچھلے ابواب میں ان کا تعارف ہو چکا ہے۔ اردو دانی کا دعویٰ تھا۔ صد درجہ واہمی تھے اور ماشاء اللہ اب بھی ہیں۔ تھائی لینڈ سے واپسی پر تو انہوں نے خود کو تقریباً تقریباً ایڈز کرا ہی لی تھی۔ یہ تو ڈاکٹروں اور لیبارٹریز کی نااہلی تھی کہ وہ ان کے اندر سے مطلوبہ جراثیم ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

ہماری پوری تیاری تھی مگر پانچ چھ روز پہلے ضامن صاحب واک آؤٹ کر گئے۔ وجہ یہ تھی کہ آج کل وہ پھر ایک واہمے میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ واہمہ بیماری کا نہیں تھا۔ کاروبار کے حوالے سے ان کا دل میں بیٹھ گیا تھا کہ چھوٹا بھائی ان کی غیر موجودگی میں حساب میں گڑبڑ کر رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جنوری کا مہینا تھا جب میں اور شعیب ہائی ایئر کراچی پدھارے۔ میں نے معراج صاحب کو بتا دیا تھا اور وہ خوش بھی ہوئے تھے کہ چلو اتنے عرصے بعد سہی میں نے کراچی کا رخ تو کیا۔ ہم صبح سویرے دفتر پہنچ گئے۔ انور فراز، اقلیم طیم اور دیگر احباب سے ملاقات ہوئی لیکن معراج صاحب ابھی دفتر تشریف نہیں لائے تھے۔ ہم دونوں نے کچھ انتظار کے بعد موقع غنیمت جانا اور دو چار چیزیں خریدنے کے لیے بازار چلے گئے۔ بعد ازاں مجھے فکر لاحق ہوئی کہ کہیں معراج صاحب دفتر پہنچ کر ہمارا انتظار ہی نہ کر رہے ہوں۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے جاتے ساتھ ہی معذرت کی۔ وہ بڑی خوش خلقی سے ملے۔ چائے سموسے اور بسکٹس سے تواضع ہوئی۔ تاوان کے بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے زور دیا کہ مختصر کہانیاں بھی لکھتا رہوں۔ پھر کہنے لگے۔

"بھئی اگر سیر کے لیے ہی جانا تھا تو یورپ وغیرہ کی طرف نکلتے۔ میں نے تو تمہیں شادی کارڈ بھی اسی لیے بھیجا تھا۔ سری لنکا میں کچھ خاص نہیں رکھا۔"

میں نے کہا۔ "جناب! اے حمید صاحب نے سری لنکا کے گھنے جنگلوں میں موسلا دھار بارش کے دوران میں جو ٹرین چلائی ہے اس کی وجہ سے دماغ میں کیڑا کلبلایا ہے۔"

دلکش انداز میں مسکرا کر چپ ہو گئے۔ سامنے شیلف میں کتابوں کے درمیان مجھے اپنا ناول اباقہ بھی نظر آیا دل خوش ہوا۔ معراج صاحب کے آفس سے نکلے تو ادارے کے کئی کارکن اور دیگر احباب تاوان اور اباقہ وغیرہ کے مصنف کو دیکھنے کے لیے چلے آئے..... بڑی محبت سے ملے۔ مختلف سوالات کیے۔ ایک مقامی مصنفہ بے ساختہ حیرت سے بولی۔ "ارے مصنف ایسے بھی ہوتے ہیں۔"

اب پتا نہیں اس کا کیا مطلب تھا۔

رات ہم نے سید انور فراز کے گھر گزارنا تھی۔ شام کو شعیب اور میں اکیلے ہی سیر گشت کے لیے نکل گئے۔ واپسی کا راستہ یاد رکھتے گئے تاکہ دشواری نہ ہو۔ سورج غروب ہوتے ہی فراز صاحب کے گھر کی طرف پلٹ پڑے لیکن یہ دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے کہ کوئی بھی نشانی راستے کی باقی نہیں تھی۔ ہمارے گمان میں ہی نہیں تھا کہ کراچی میں بازار سرِ شام بند ہو جاتے ہیں۔ بند شٹروں کے ساتھ سب دکانیں ایک جیسی ہی لگ رہی تھیں۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں شادی کی ایک تقریب میں گم ہو چکا تھا۔ دوبارہ گم ہو کر انور فراز کے شرارتی جملوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہر طور تھوڑا پریشان ہونے کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ انور فراز نے

چپاتی، سالن وغیرہ پر مشتمل اچھا ڈنر کرایا۔ صبح منہ اندھیرے ان کا بیٹا، مہران کار پر ہمیں ایئرپورٹ چھوڑ آیا۔ سری لنکا کا ویزا ان دنوں موقع پر ہی لگ جاتا تھا۔ امیگریشن کے موقع پر شعیب کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اہل کاروں نے ہمیں کلیئر کرنے میں کچھ پس و پیش سے کام لیا تو میں نے اپنے سفری بیگ میں سے اپنی دو تین ایسی کتابیں نکال کر دکھائیں جن کے سرورق پر میری تصویر بھی موجود تھی۔ اہل کاروں کو یہ ماننے ہی بنی کہ میرا تھوڑا بہت تعلق، ابن بطوطہ، ابن انشا اور مستنصر حسن کے قبیلے سے بھی ہے۔ ہمیں معذرت کے ساتھ کلیئر کر دیا۔

سارے انڈیا کے اوپر سے پرواز کر کے سری لنکا کے قریب پہنچے۔ فضا سے یہ نظارہ یادگار تھا۔ انڈیا ختم ہو رہا تھا۔ درمیان میں تھوڑا سا نیلا سمندر تھا۔ آگے سری لنکا کا جزیرہ نظر آ رہا تھا جسے انڈیا کا آنسو بھی کہا جاتا ہے۔ میں جہاز کی کھڑکی میں سے بلند پام درختوں اور دلفریب ساحلوں والی اس سرزمین کو دیکھ رہا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں بہت سی نئی چیزوں کے علاوہ ایک ایسے پرکی جوڑے سے میری ملاقات ہونے والی ہے جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

کولمبو ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو حیرانی ہوئی۔ پاکستان میں کڑاکے کی سردی تھی مگر یہاں دوپہر کافی گرم تھی۔ مجھے اور شعیب کو یوں محسوس ہوا جیسے کراچی سے کولمبو تک کا سفر جنوری سے جولائی تک کا سفر تھا۔ شہر پہنچنے کے لیے رکشا ٹیکسی والوں سے کرایہ پوچھا تو بہت زیادہ محسوس ہوا۔ آخر ایک رکشا والے سے 600 سری لنکن روپوں میں معاملہ طے ہو گیا۔ اب جو رکشا والے نے چلنا شروع کیا تو بس چلتا ہی چلا گیا۔ اب ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ کرایہ اتنا زیادہ کیوں ہے۔ کولمبو شہر ایئرپورٹ سے کم از کم 35 کلومیٹر دور تھا اور یہ سارا سفر ہمیں تیز رفتار اچھلتے کودتے رکشا میں طے کرنا تھا۔ انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ کولمبو شہر میں داخل ہوئے تو بلند و بالا عمارتیں اور بڑی بڑی لگژری کاریں نظر آنے لگیں۔ یہ تاثر غلط ثابت ہوا کہ سری لنکا ایک کمزور معیشت والا ملک ہے۔ ان دنوں پاکستان میں بسنت والا اژدحام کی طرح ابھی شرم و حیا پوری طرح اژدحام نہیں ہوئی تھی۔ خواتین کے سروں پر دوپٹا نظر آتا تھا مگر یہاں تو دوپٹے کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہر عمر کی خواتین ٹانگیں کسے سینے تانے گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ بہت سی جینز میں بھی دکھائی دیں۔ موٹر سائیکل پر دونوں طرف ٹانگیں کر کے بیٹھی تھیں۔ یہ 2003ء کے واقعات ہیں۔ یعنی آج سے تقریباً 20 سال پہلے بھی سری لنکا میں ہیلمٹ پہننا لازم تھا۔ موٹر سائیکل پر جتنے نفوس اتنے ہی ہیلمٹ۔ ایک ڈیڑھ برس کا ایک بچہ ماں کی گود میں بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے بھی ننھا سا ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔

ہم کولمبو کی معروف گال فیس روڈ پر رکشے سے اترے۔ شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر ہم یکا یک ایک دل کش منظر میں آ گئے تھے۔ دائیں طرف حد نگاہ تک نیلا سمندر تھا۔ پام کے بلند درخت ہلکی ہوا میں جھومتے تھے۔ بائیں طرف صاف شفاف سڑکوں کے کنارے بلند و بالا عمارتیں چمکتی تھیں۔ فضا گرد سے بالکل صاف تھی اس لیے ہر شے اپنے اصل رنگ میں دمکتی نظر آتی تھی۔ یہ پوش علاقہ تھا۔ ہمارے بالکل سامنے "ہالیڈے ان" اور دیگر فائیو اسٹار ہوٹل تھے۔ وہاں سے کرائے کا پتا کیا تو کانوں سے دھواں نکل گیا۔ ایک سنہالی ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری مدد کی اور مناسب کرایہ لے کر ہمیں متوسط درجے کے ہوٹل تک لے آیا۔ یہاں ہمارا قیام "لیجون" نامی ہوٹل میں قرار پایا۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے کا کرایہ 2800 سری لنکن روپے جبکہ عام کمرا 1600 میں دستیاب تھا۔ 2800 روپے کافی زیادہ محسوس ہوئے مگر چونکہ یہاں پہنچتے ہی گرمی نے ہمیں چاروں شانے چت کر دیا تھا، لہٰذا ایک دن کے لیے 2800 روپے والا کڑوا گھونٹ بھر لیا اور سوچا کہ اگلے روز صورت حال دیکھ کر کمرا بدل لیں گے۔

یہ فیصلہ درست ثابت ہوا کیونکہ اگلے روز ہمیں معلوم ہو گیا کہ چاروں شانے چت کرنے والی گرمی صرف دوپہر میں ڈھائی تین گھنٹے پڑتی تھی اس کے بعد قابل برداشت ہو جاتی تھی۔ میں اپنی پسندیدہ کتاب محترم اے حمید کی "لنکا سری لنکا" اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ خواہش تھی کہ انہوں نے اس کتاب میں جن جن جگہوں کا ذکر کیا ہے انہیں خصوصی طور پر دیکھوں گا مگر المیہ یہ ہوا کہ ائرپورٹ پر امیگریشن کے دوران میں ہی یہ کتاب کہیں گم ہو گئی۔ مجھے شک تھا کہ میرے ساتھی شعیب نے ہی میری نظر بچا کر یہ کتاب کہیں دائیں بائیں کر دی تھی تاکہ میں سیر کے دوران اس کتاب میں ہی گم نہ رہوں۔ آگے جا کر ایک موقع پر میں نے بھی شعیب سے اس گمشدگی کا بدلہ لیا۔

دوسرے روز تازہ دم ہو کر ہم گال فیس روڈ کے ساحل پر سیر کے لیے نکلے ریت پر ایک جگہ مجھے دو خوش نما چھتریاں نظر آئیں۔ یہ بڑی بڑی چھتریاں ریت پر ہی رکھی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے سے چار ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ دو مردانہ ٹانگیں اور دو زنانہ۔ یقیناً یہ جوڑے تھے جو ہلکے پھلکے رومانس میں مصروف تھے۔ ذرا آگے گئے تو شعیب نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی دیکھو۔''

یہاں بھی پانچ چھ ایسی خوبصورت چھتریاں اور ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہماری نگاہیں آگے تک دوڑتی چلی گئیں اور ہم ہکا بکا رہ گئے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ جہاں تک نگاہ جاتی تھیں ایسی ہی رنگین چھتریاں دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ ریت پر تھیں، کچھ پتھریلے بینچوں کے اوپر تنی ہوئی تھیں۔ ان سب کے نیچے جواں سال جوڑے تھے۔ کچھ خوش گپیوں میں مصروف، کچھ ڈرنکس لیتے ہوئے۔ کچھ ایک دوجے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اور کچھ حد نگاہ تک پھیلے سمندر پر اڑتے پرندوں کے نظارے میں مصروف۔ جب کسی جوڑے کو جذبات سے مجبور ہو کر آپس میں چونچ لڑانا ہوتی تھی تو وہ چھتری کو اپنے سامنے کر لیتے تھے۔

میں اور شعیب پہلی بار ایسا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ ایک مقامی شخص سے پوچھا تو اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جواب دیا۔ ''اس کو ''امبریلا لو'' کہا جاتا ہے۔ قانونی طور پر اس کی اجازت ہے۔ ایک طرح سے یہ امبریلا لو فائدہ مند بھی ہے۔ یہ جوشیلے نوجوانوں کو مکمل تنہائی میں ہونے والے نقصانات سے بچاتی ہے۔'' وہ آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے مسکرایا۔

میں نے کہا۔ ''اور یہ جو لڑکیاں یہاں کھلے عام امبریلا لو کر رہی ہیں ان کا کوئی باپ یا بھائی یہاں آجائے اور یہ سب دیکھ لے تو۔''

وہ پھر بے باکی سے مسکرایا۔ ''جناب! جن لوگوں کو کوئی ایسا منظر دکھائی دینے کا خطرہ ہوتا ہے وہ اس طرف آتے ہی نہیں اور آتے بھی ہوں گے تو زیادہ تاکا جھانکی نہیں کرتے ہوں گے۔''

ہم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر نیکر شرٹ والے ایک مقامی لڑکے نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی سانولی سلونی گرل فرینڈ کو بانہوں میں لیا تو لڑکی نے جلدی سے چھتری اپنے اور لڑکے کے چہروں کے سامنے کر لی۔ یہ ایک شرم آمیز بے ہودگی یا بے ہودگی آمیز شرم تھی۔

میرے ناول سچ کی سولی میں ''گال فیس'' کے اس منظر کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

''یہ ایک بچکانہ سی شرماہٹ تھی۔ یہ شرماہٹ اس ساحلی تفریح گاہ پر کب تک برقرار رہے گی؟ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید مزید دس پندرہ سال یا پھر چالیس پچاس سال..... اس چھتری کو ایک دن بہرحال وقت کی ہوا میں اڑ جانا تھا۔ یا سر کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ شرم اور مکمل بے حجابی کا ایک درمیانی فاصلہ ہے..... یہ چھتری جو فی الحال ایک جھجک کی علامت تھی۔ دو انتہاؤں کے درمیان اس ساحلی ریت پر تنی ہوئی تھی۔''

ناول میں مجھ ناچیز کا یہ قیافہ تقریباً تقریباً درست تھا۔ مغربی ممالک میں یہ چھتری بہت پہلے اڑ گئی تھی۔ اب سری لنکا وغیرہ میں بھی بتدریج ختم ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے خطے میں تو اس کا رواج شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہونے والا ہے شاید۔

اگلے روز ایک دھماکا خیز خبر ملی۔ لاہور سے عاطف کا فون موصول ہوا اس نے بتایا کہ چھوٹے بھائی ایاز نے مایوسی کے عالم میں زیادہ مقدار میں کوئی ٹرنکولائزر استعمال کر لی تھی جس کے سبب وہ نیم بے ہوش ہو گیا اور دو روز اسپتال میں رہا ہے۔ یہ دیرینہ عمری کی محبت والا معاملہ تھا جو ایاز اور ندا کے درمیان چل رہا تھا۔ عاطف اور ایاز کی والدہ کسی صورت اس تعلق کے حق میں نہیں تھیں اور اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر ایاز اور ندا کو اس راستے پر ڈالنے میں حورین نے بھی تھوڑا بہت کردار ادا کیا تھا تو پھر زیادہ قصور حورین کا ہی بنتا تھا اور اگر ایسا نہیں تھا تو بھی حورین مکمل طور پر بری الذمہ نہیں تھی۔ اپنی بے شمار خوبیوں کے باوجود اور شادی شدہ ہونے کے باوجود اس نے عاطف سے تعلق بنایا اور یہ مذہب، معاشرے اور روایات کے لیے کسی طور پر قابل قبول نہیں تھا۔

میں نے عاطف سے کہا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ یہ رشتہ نہیں ہو سکے گا۔ کم از کم گھر والوں کی مرضی سے تو کسی صورت نہیں ہو سکے گا۔ جو کچھ تمہارے اور حورین کے درمیان چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے وہ اس رشتے کے لیے ایک ناقابل عبور رکاوٹ ہے۔

بات کچھ کچھ عاطف کی سمجھ میں آرہی تھی۔

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار بائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

اگر میں سفرنامہ لکھ رہا ہوتا تو سری لنکا میں پیش آنے والے کئی دلچسپ واقعات لکھے جاسکتے تھے۔ یہاں میں دو تین اہم واقعات کا ہی ذکر کروں گا۔ ایک روز میں اور شعیب کولمبو سے نکل کر بذریعہ بس نزدیکی ساحل ماؤنٹ لیونیا کی طرف روانہ ہوئے کولمبو میں اکثر سڑکوں پر ایک قسم کے پھل ڈھیر کے ڈھیر پڑے نظر آتے تھے۔ شروع میں تو ہم اس زرد رنگ کے پھل کو پپیتا سمجھے لیکن پھر پتا چلا کہ یہ اناناس ہے۔

اناناس کا جوس ہم نے یہاں اتنی کثرت سے پیا کہ بقول شعیب عمر بھر کا کوٹا مکمل کرلیا۔ آم، کیلا، اناناس، پپیتا اور ناریل، سری لنکا کی خاص سوغاتیں ہیں۔ تاہم یہاں کے آم کو ہم نے خاص نہیں عام پایا بلکہ عام سے بھی بہت کم۔ خوشبودار ناریل اور اس کے پانی کا جواب نہیں تھا۔ جب ہم ریستوران کے سامنے سے گزرتے تو ناریل کے تیل میں پکے ہوئے کھانوں کی مہک صاف محسوس ہوتی۔

ہم سری لنکا آنے کے بعد دوسری مرتبہ بس میں بیٹھے تھے۔ عموماً یہاں کی بسیں کھچا کھچ بھری ہوتی تھیں۔ مرد و زن ایک دوسرے میں گھسے اور گھسے ہوتے تھے۔ صنف نازک کے لیے کوئی اضافی سہولت نہیں تھی۔ صرف اتنا کیا جاتا تھا کہ ایک دوسرے کی طرف پشت کرلی جاتی تھی۔ اکثر جوان لڑکیوں کے بالوں میں سفید پھولوں کے گجرے اور ناک میں سرخ نگینے دکھائی دیئے۔ وہ رنگ دار ساڑی یا لنگی کو بہت کس کر باندھتی تھیں۔ بے شک وہ کھچا کھچ بھری بس میں مردوں کی پشت کی طرف اپنی پیٹھ کرلیتی تھیں لیکن یہ قرب بھی دل میں کچھ نہ کچھ گدگدی تو جگاتا ہی ہوگا۔ مجھے اور شعیب کو چونکہ دونوں دفعہ بس میں نشست مل گئی تھی لہٰذا ہم اس مقامی طرز کی قربت سے محروم و محفوظ رہے۔

بس کا یہ سفر غیر متوقع طور پر کافی طویل رہا۔ ہم کولمبو کی حدود سے کم و بیش پچیس کلومیٹر آگے آنے کے بعد ماؤنٹ لیونیا نامی ساحل تک پہنچ پائے۔ بس سے اترنے کے بعد بھی ہمیں سمندر تک پہنچنے کے لیے کافی چلنا پڑا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سمندر تک پہنچنے کے لیے ہم ایک نہایت پُرسکون اور خاموش رہائشی علاقے سے گزر رہے تھے۔ یہاں دونوں اطراف چھوٹی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ کسی کسی کوٹھی کے سامنے کوئی عمر رسیدہ شخص کرسی یا آرام کرسی پر بیٹھا نیلے آسمان اور ہولے ہولے جھومتے پام

درختوں کو تکتا تھا۔ جیسے عمر رفتہ کو آواز دے رہا ہو۔ کہیں کسی کوٹھی کے اندر سے کسی دھیمی طرز کے سنہالی گیت کی آواز ابھرتی اور 'ماضی پرستی' والا ماحول بنا دیتی۔

ان پرانی طرز کی کوٹھیوں کی بناوٹ اور یہاں کا ماحول دیکھ کر مجھے بالکل یہی لگا جیسے میں کسی بلیک اینڈ وائٹ پاکستانی فیچر فلم کے منظر کا حصہ بن گیا ہوں۔ جیسے کندھے پر شال لیے جو عورت سامنے رسّی گندھا کے پودے پر جھکی ہوئی ہے۔ وہ صبیحہ خانم یا شمیم آرا کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اندر کوٹھی کے وسیع احاطے سے آگے کسی قدیم طرز کے سنگ روم میں کوئی سنتوش کمار، پرویز اسلم یا محمد علی پرانے گراموفون پر سہگل کے گیت سن رہا ہوگا اور پائپ کے کش لے رہا ہوگا۔ ہمیں لگا کہ غالباً کولمبو کے عمر رسیدہ لیکن قدرے خوش حال لوگ زندگی کے باقی ایام گزارنے کے لیے یہاں آجاتے ہیں۔ اپنی کوٹھی کے سامنے ایک بلند و بالا درخت کے نیچے ایزی چیئر پر بیٹھے ایک معمر شخص کو ہم نے سلام کیا۔ اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ مجھے اس میں کسی عمر رسیدہ طالش کی جھلک نظر آئی۔ عمر رسیدہ اور بیمار۔ اس کی تھکی تھکی آنکھوں میں آخری دنوں کا کرب منجمد تھا۔ وہ تھک چکا تھا۔ اب جانا چاہتا تھا۔ ماؤنٹ لیویناکا یہ خوبصورت ماحول بھی غالباً اب اس کے لیے بے لطف ہو چکا تھا۔ میرے دل سے اس شخص کے لیے آسانی کی دعا نکلی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ لیکن ہم آدم کی اولاد تھے۔ ہمارے درمیان خون کا رشتہ تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ ساحتوں میں ایسے ہی ملن اور ایسی ہی جدائیاں ہوتی ہیں۔

☆☆☆

کولمبو کی سیر ہو چکی تھی۔ اب ہمارا رخ سری لنکا کے دوسرے بڑے شہر 'کینڈی' کی طرف تھا۔ ایک روز صبح سویرے کولمبو کے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ مرحوم ابن انشا نے اپنے سفرنامے میں کولمبو کے اس فورٹ ریلوے اسٹیشن کو دھول اڑاتا ایک معمولی اسٹیشن قرار دیا تھا۔ شاید پچھلے تیس پینتیس برس میں یہاں کافی بہتری آئی تھی۔ عام ٹرینیں تو یہاں خستہ حال ہی دکھائی دیں، تاہم کینڈی کے پہاڑی مقام کی جانب جانے والی ٹرین کافی اچھی حالت میں تھی۔ ہم نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ صرف 200 روپے میں لیا۔ ڈبے میں غیر ملکی سیاح بھی کثرت سے نظر آتے تھے۔ زیادہ تر خواتین اسکرٹ میں تھیں۔ ننگی پنڈلیاں، کھلے گریبان، مخمور ادائیں۔ اگر ضامن صاحب بھی ہمارے ساتھ ہوتے تو یقیناً مستقل توبہ استغفار بھی کرتے رہتے اور تاڑتے بھی رہتے۔

کولمبو اور کینڈی کا درمیانی فاصلہ لگ بھگ 120 کلومیٹر تھا اور یہ سارا راستہ چڑھائی کا تھا۔ سرسبز چوٹیاں، جھیلیں، آبشاریں، دل موہ لینے والے نظارے، ہم ٹرین کی جہازی سائز کی کھڑکیوں کے سامنے بیٹھ کر سری لنکا کی بہترین چائے پیتے رہے اور اے حمید کو یاد کرتے رہے۔ انہوں نے جنگل، تاریک رات، موسلا دھار بارش اور ٹرین کے طویل سفر کا ذکر کیا تھا۔ یقیناً اس کا اپنا مزہ ہوگا۔ لیکن اس روشن دن کا مزہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

مخروطی چھتوں والے خوش رنگ شہر کینڈی میں پہنچ کر جو پہلی خوشی ہوئی وہ اس بات کی تھی کہ کولمبو کی گرمی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ ہمیں ایک ایسی خوبصورت مصنوعی جھیل کے کنارے ہوٹل ملا جس کی چاروں جانب درخت تھے اور حیرت کی بات ہے کہ ان پر پھل بھی تھے اور وہ بھی پکے ہوئے۔ ہمارے علاقوں میں تو بچہ لوگ اخروٹ کے سائز کے کچے لوز ائیدہ امرود بھی درختوں سے کھینچ کر لے جاتے ہیں (یاد رہے کہ سری لنکا میں تعلیم کی شرح 92 فیصد کے لگ بھگ ہے)

جھیل کی دوسری جانب ایک ٹیلے کے سنہری کلس نظر آئے تھے۔ اسے بدھا کے دانت کا مندر کہا جاتا ہے۔

اگلے روز دیکھنے ہم بھی گئے مگر تماشا نہ ہوا۔ رش اتنا تھا کہ دانت تو کیا شیشے کا وہ مقدس بکس بھی مشکل سے نظر آیا جس میں دانت تھا۔ تین روز تک کینڈی کی خوب سیر کی، انواع و اقسام کے پھل کھائے۔ کچھ رسیلے پھل، ہمیں زبردستی کھلانے کی کوشش کی گئی لیکن ہم نے نہیں کھائے کیونکہ ہم شادی شدہ تھے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ گناہ صغیرہ و کبیرہ کی دعوت دینے والے حضرات ہوٹل کے کمروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہر قسم کے رسیلے، پتہ و نیم پتہ پھلوں کی فہرست و تصویریں ان کے پاس ہوتی ہیں۔ جب بکنے کے لیے بے شمار آسانیاں موجود ہوں تو نہ بکنے والوں کے کراماً کاتبین یقیناً نیکی کے کھاتے پر تیز تیز قلم چلاتے ہوں گے۔

ہمارے کمرے کے عین سامنے ایک کمرے میں تین مقامی لڑکے اور لڑکیاں ایک بڑے کمرے میں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ لگتے تھے

لیکن یقینی بات ہے کہ رات بھر امتحان کی تیاری نہیں کرتے تھے۔ صبح سویرے یہ تینوں جوڑے ہم سے نظریں ملائے بغیر سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتے تھے۔ ان کے نکل جانے سے اندازا آج تک یاد ہیں۔

ہم نے یہاں ایک بہت بڑا ہاتھی گھر بھی دیکھا۔ مختلف رنگ نسل اور سائز کے درجنوں ہی ہاتھی موجود تھے۔ بہت انجوائے کیا۔ اتفاقاً ہاتھی کا ایک جوڑا فزائش نسل والے عمل میں مصروف ہوگیا۔ شعیب کے چہرے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے اس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگئی ہے۔ اس نے کیمرے سے کھٹا کٹ دو تین تصویریں اتار لیں۔ اب لنچ کے لیے جانا تھا۔ ریستوران تک جانے کے لیے پیدل چلنے کے بجائے ٹک ٹک یعنی رکشا پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ اس ترجیح کا ذمے دار شعیب ہی تھا۔ اس کو جوگرز پہننا پسند نہیں ہے۔ کچے بوٹوں کی وجہ سے وہ اکثر ہمت ہار جاتا تھا۔ رکشا پر بیٹھنا ہمیں مہنگا پڑا۔ اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ ریستوران میں پہنچ کر ہم نے لنچ منگوایا۔ سری لنکا کے اکثر ہوٹلوں کا مینو صرف چاولوں پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ موٹے چاول، لمبے چاول، پتلے چاول، فلاں چاول اور ان کی مختلف ڈشیں گندم کے دانے کو ہم ابن آدم ترس کر رہ گئے۔ لنچ کے بعد ہم ٹک ٹک یعنی اچھلتے کودتے موٹر رکشا پر بیٹھے اور ہوٹل پہنچ گئے۔ شعیب نے ہاتھی گھر سے نکلتے ہی کیمرے میں نیا فلم رول ڈال لیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے جھیل اور جھیل جیسی آنکھوں والوں کی چند تصویریں اتارنے کے بعد اسے پہلے فلم رول کا خیال آیا جو رکشا پر بیٹھنے سے قبل اس نے پینٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ جیب ٹٹولی تو رول غائب تھا۔ بہت تلاش کیا نہیں ملا۔ اس میں ہماری کینڈی کی سیاحت کی بہت زبردست تصویریں موجود تھیں۔

میں نے کہا۔ ”تم پیدل چلنے کے بجائے اس چھلانگیں لگاتے رکشے میں بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے کہ فلم رول تمہاری پینٹ کی سائیڈ پاکٹ سے پھسل کر رکشے میں ہی گر گیا ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا، چلو رکشا اسٹینڈ پر چلتے ہیں۔“ وہ پریشان لہجے میں بولا۔

اب وہ اپنے پاؤں کی تھکاوٹ بھول گیا تھا۔ ہم تقریباً ایک کلومیٹر بھاگم بھاگ طے کر کے رکشا اسٹینڈ پر پہنچے۔ یہاں درجنوں رکشے موجود تھے۔ ہم نے ایک رکشا والے کو اپنا مسئلہ بتایا۔ اس نے مقامی زبان میں دوسرے کو بتایا۔ دوسرے نے تیسرے کو۔ دس پندرہ منٹ میں غالباً کینڈی کے آدھے رکشے والوں کو معلوم ہوگیا کہ دو پاکستانی نوجوانوں کا فلم رول گم ہوگیا ہے۔ بے چاروں نے بڑی ہمدردی سے کوشش کی اور اگلے روز تک کرتے رہے لیکن رول نہیں ملنا تھا نہ ملا۔

میں نے کہا۔ ”شعیب پتا ہے، ہمارا وہ یادگار تصویروں والا فلم رول کیوں گم ہوا؟“ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”یہ یقیناً اس آنٹی کی بددعا ہے جس کے نجی معاملات میں تم نے دخل اندازی کی اور تصویریں کھینچیں۔“

وہ منہ بنا کر رہ گیا۔

دنیا میں سات عجوبے ہیں تاہم سری لنکا میں ایک آٹھواں بھی ہے۔ یہ ”سائے گیریا“ نامی چٹان ہے۔ چٹان کیا ہے ایک بلند و بالا پہاڑ ہے۔ بالکل چوکور، مکعب کی شکل کا۔ اسے دیکھ کر انسان ورطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ ہمیں ایک بس پر مل دار پہاڑی راستوں پر کئی گھنٹے سفر کرنا پڑا۔ پہاڑی راستوں پر چلنے والی بسوں میں بہت سے شاپر لٹکا دیے جاتے ہیں۔ جن مسافروں کو متلی ہوتی ہے وہ پلاسٹک کے یہ شاپر استعمال کرتے ہیں۔

شعیب کا دل بھی بری طرح متلانے لگا۔ البتہ اس نے حوصلہ رکھا اور شاپر کے استعمال تک نوبت نہ آئی۔ کھچا کھچ بھری بس میں وہ بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ اگر میں نے گارنٹی کے طور پر اس سے تحریر نہ لکھوائی ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ اس پہاڑی سفر کے اختتام پر وہ میرے سینے پر سوار ہو جاتا اور دو تین دن کے اندر مجھے واپس لاہور پہنچا کر دم لیتا۔ اپنے بال بچے کی یاد بھی اسے بری طرح ستانے لگی تھی۔

سائے گیریا کی عجیب وضع چٹان کے حوالے سے سری لنکا مسلسل مطالبہ کر رہا ہے کہ اسے دنیا کے آٹھویں عجوبے میں شامل کیا جائے۔ چٹان کو دیکھا تو یہ مطالبہ کچھ ایسا بے جا محسوس نہ ہوا۔ چٹان کے بالائی سرے پر جانے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ نیچے سے دیکھا تو ان سیڑھیوں کی بلندیوں پر سیاح، چیونٹیوں کی طرح رینگتے نظر آئے۔ ہم بھی ٹکٹ لے کر چیونٹیوں کی ان طویل قطاروں میں شامل ہوگئے۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود تھے مگر یورپین سیاح زیادہ نظر آتے تھے۔ چڑھائی کی مشقت کے سبب سفید فام حسیناؤں کے گال شہابی ہو رہے تھے۔ صراحی دار گردنوں پر پسینے کی نمی تھی۔ ہم سے آگے جاتی کچھ انگریز خواتین کو دیکھ کر شعیب نے کہا۔ ”وہ دیکھو گرمی کی وجہ سے انہوں نے اپنے

فالتو کپڑے اتار دیے ہیں۔"

پھر ذرا توقف کر کے کہنے لگا۔ "ویسے اتنے فالتو تو وہ پہلے بھی نہیں تھے۔"

ہمارے عقب میں ایک پگڑی پوش سردار صاحب آرہے تھے۔ شاید ان کے کان ہماری جانب ہمہ تن گوش تھے۔ مسکرا کر بولے۔ "بادشاہو، اگر اس حساب سے کپڑے اترتے رہے تو چوٹی تک پہنچتے پہنچتے بس واہگرو کا نام رہ جائے گا۔"

دنیا کا یہ آٹھواں عجوبہ اور اس کا جنت نظیر گرد و پیش دیکھنے کے بعد ہم نے ایک مہربان سنہالی کی کار میں لفٹ لی اور ڈمبولا نامی بڑے قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں بدھا کا ایک مجسمہ ہے۔ جس مندر میں وہ مجسمہ ہے اسے راک ٹمپل کہتے ہیں جو بہت مشہور ہے۔

خوش اخلاق سنہالی نوجوان ہندی بھی جانتا تھا۔ پاکستانی فلمی ستاروں محمد علی، ندیم، شبنم وغیرہ کے ناموں سے بخوبی واقف تھا۔ کھلاڑیوں میں عمران خان اور جہانگیر خان سے اس کی شناسائی تھی۔ اس نے ہماری تواضع کے لیے انڈین گانوں کی ایک کیسٹ لگا کر سفر کو مزید سہانا کر دیا۔ کچھ دیر جب یہ معروف نغمہ گاڑی میں گونجا۔ "چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لیے..... یہ مناسب نہیں آدمی کے لیے۔" تو میرے ذہن میں عاطف اور حورین کی انوکھی کہانی سے تمام خدوخال پھر سے ابھر آئے۔ یہ عجیب سنسنی خیز تعلق تھا اور اب اس میں ایاز اور عدا والا معاملہ بھی آگھسا تھا۔ جس کا ذکر آگے کروں گا۔ ابھی تو ہم ڈمبولا کی جانب بڑھ رہے۔

یہ تقریباً 70 کلومیٹر کا سفر تھا۔ ڈمبولا میں دیکھنے والی اہم ترین چیز تو سنہری رنگ کا بدھا ہی تھا۔ بہت بلندی پر بدھا کا فلک بوس مجسمہ، جس پر سونے کا بہت سا کام تھا۔ اس مجسمے کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ بدھا کے صرف پاؤں تک پہنچنے کے لیے ان گنت زینے طے کرنا پڑتے تھے۔ راک ٹمپل کی سیر بھی ... خوب رہی۔

یہاں میں ایک دلچسپ بات بتانا بھول گیا۔ جب ہم اپنے سنہالی دوست کی کار میں بیٹھ کر ڈمبولا کی طرف آرہے تھے۔ کینڈی سے سات آٹھ کلومیٹر دور ایک قصبے میں رکے تھے۔ شعیب فروٹ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا (اور اہلیہ کے بغیر بھی..... یا کہہ لیں کہ بال بچوں کے بغیر بھی) ہم نے یہاں رک کے فروٹ اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں لیں۔ ایک چیز دیکھ کر حیران ہوئے کہ اکثر دکانوں پر سری لنکن کرکٹر مرلی دھرن کی تصاویر آویزاں تھی۔

ایک اناس فروش سے پوچھا اس نے شستہ انگلش میں بڑے فخر سے بتایا۔ "مرلی دھرن اسی قصبے میں پیدا ہوئے۔ یہاں انہیں مہاتما کا درجہ دیا جاتا ہے۔" اس وقت مجھے خیال آیا کہ ایک ہم ہیں۔ ہمارے ہیٹھڑ کو پوچھتے بھی نہیں۔

اس قصبے کا نام KUNDASALE تھا۔ بالکل پاس ہی وہ گاؤں تھا جسے اس عظیم لیکن متنازعہ اسپنر کی جائے پیدائش بتایا گیا۔ متنازعہ اس لحاظ سے کہ اس کی جادوئی آف اسپن بالنگ کو غیر قانونی قرار دینے کے لیے انگلش اور دیگر غیر ملکی ایمپائرز ہمیشہ سرگرم رہے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ کہا جاتا تھا کہ مرلی شیشے کی بیچ پر بھی بال کو اسپن کر سکتا تھا۔

پندرہ بیس ہزار نفوس پر مشتمل اس پہاڑی قصبے کو دیکھ کر ہمیں یوں لگا جیسے یہاں کا ہر بڑا چھوٹا مرلی دھرن کا پرستار ہے۔

ان دنوں مرلی دھرن ویسے بھی اپنے عروج پر تھا۔ اکثر نامور اور کامیاب لوگوں کی طرح مرلی دھرن کی ابتدائی زندگی بھی سنگین مشکلات کا شکار رہی۔ وہ بھائیوں میں بڑا تھا اور صرف پانچ سال کا تھا کہ اس کے والد کو نامعلوم مخالف گروہ نے قتل کر دیا تھا۔ ان کی سگریٹ فیکٹری بھی جلا کر راکھ کر دی گئی تھی۔ اور راکھ..... ساری کی ساری تو راکھ نہیں ہوتی..... اس میں چنگاریاں دبی ہوتی ہیں۔

ڈمبولا میں راک ٹمپل اور سنہری مجسمے کے علاوہ بھی دیکھنے والی کئی جگہیں تھیں۔ میں نے چونکہ ایک سفری کہانی لکھنی تھی اور اپنی اس سیاحت کو "ناولائز" میں استعمال کرنے کا ارادہ بھی تھا۔ میں اہم جگہیں دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا جبکہ میرے ہمسفر شعیب کی دلچسپی واجبی تھی۔ میں جی بھر کر ڈمبولا شہر میں گھوما جبکہ شعیب ایک ریستوران میں میری واپسی کا انتظار کر کے سٹپٹاتا رہا۔ شاید اس طرح میں نے لاشعوری طور پر اے حمید کی کتاب "لنکا سری لنکا" کی گمشدگی کا بدلہ اس سے لیا تھا۔ حالانکہ وہ بے چارہ آخر تک کتاب کی گمشدگی میں ملوث ہونے سے انکاری رہا۔

کینڈی اور گرد و نواح کی سیر کے بعد ہم سیاحوں کی ایشیائی جنت کولمبو میں واپس پہنچے۔ ایک بار پھر مجون ہوٹل میں قیام رہا۔ گال فیس روڈ اور ساحل کے دلکش نظارے ایک بار پھر ہمیں دعوت نظارہ دینے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ امبریلا لو بھی دلچسپی کا سامان بڑھانے لگی اور پھر ہمیں

پر وہ واقعہ پیش آیا جس نے میرے ناول ''سچ کی سولی'' کے لیے بنیاد فراہم کی۔

تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ایک روز میں اور شعیب ساحل پر تھے، چمکیلی دھوپ اور نہایت خوشگوار تیز ہوا میں ہمارے چاروں طرف رومانس ہی رومانس تھا۔ چھتریوں کے نیچے اور چھتریوں سے باہر ان گنت جوڑے خوش گپیوں اور راز و نیاز میں مصروف تھے۔

اسی گہما گہمی کے درمیان ہم نے ایک مقامی جوڑے کو دیکھا۔ ہم دور تھے اس کے باوجود صاف محسوس کر رہے تھے کہ وہ شاید الوداعی ملاقات کر رہے ہیں۔ لڑکے کے چہرے پر دکھ کی گہری چھاپ تھی۔ وہ ریتیلی ڈھلوان پر بیٹھا تھا۔ دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے لمبے بال اور اس کا لبادہ تیز ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ جا رہی تھی۔ وہ اسے رکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے انکار کر رہی تھی (اسے دیکھ کر مجھے لاہور کے امریکن سینٹر میں نظر آنے والی وہی دبلی پتلی، کالج صفت لڑکی یاد آ گئی جو بعد ازاں غالباً ایک چھریلے شوہر کے ہتھے چڑھ گئی تھی) ایک آدھ منٹ تک ریت پر بیٹھے لڑکے اور ہوا میں اڑتے لبادے والی دھان پان لڑکی کے درمیان مکالمہ ہوا۔ وہ گاہے بگاہے انکار میں سر ہلاتی رہی..... اور پھر وہ چلی گئی..... میں گیلی ریت پر اس کے نازک پاؤں کے نشانات دیکھتا رہا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ چند سطور میرے ذہن میں آئیں جو سسپنس میں شائع ہونے والے ناول ''سچ کی سولی'' میں متعدد بار دہرائی گئی ہیں۔ سمندر کہہ رہا ہے۔

''میں گواہ ہوں گئے زمانوں کا۔ میں نے اپنے کناروں پر ان گنت کہانیاں پروان چڑھتے دیکھی ہیں۔ بے شمار لوگ میرے سامنے ملے ہیں اور بچھڑے ہیں۔ لاتعداد مسکراہٹیں اور آنسو میری ریت میں جذب ہیں۔ تم بھی پل بھر کے لیے میرے روبرو ٹھہرے ہو۔ تم چلے جاؤ گے۔ اپنی اپنی دنیاؤں میں گم ہو جاؤ گے لیکن میری ریت پر تمہارے قدموں کے نشان رہ جائیں گے۔''

لڑکی تو چلی گئی مگر وہ سری لنکن لڑکا قریباً روز ہی ساحل پر آتا رہا۔ گہری اداسی کے عالم میں ڈھلوان پر بیٹھ جاتا یا ادھر اُدھر گھومتا رہتا۔ ایک دو بار میں نے اس سے بات بھی کی۔ وہ کالج میں چوتھے سال کا اسٹوڈنٹ تھا اور کولمبو میں ہی رہتا تھا۔ اس کا نام فریڈو تھا۔ لڑکی کا نام اینکا تصور کر لیں۔ اینکا، سری لنکا کے شمالی شہر انورادھاپورہ سے تین ماہ پہلے کولمبو آئی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور آفس جاب کرتی تھی۔ اس کے والدین چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ہو وہ اپنے منگیتر جیوا کو تلاش کر کے لائے جو اس سے روٹھ کر دو برس سے کہیں گم تھا۔ اینکا دو ماہ سے کولمبو اور گردونواح میں جیوا کا کھوج لگاتی پھری تھی۔ ایک اتفاق کے تحت فریڈو بھی اس تلاش میں اینکا کے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ دو ڈھائی ماہ کی اس شراکت کے نتیجے میں جیوا تو نہیں ملا مگر فریڈو اور اینکا کے درمیان محبت کا تعلق پروان چڑھ گیا تھا اور جب یہ تعلق پوری طرح پروان چڑھ گیا تو وہ ہوا جو اب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ گالے کے علاقے سے جیوا کا کھوج کرشماتی طور پر لگ گیا۔ اینکا نے جیوا کو کبھی بھی دل سے پسند نہیں کیا تھا صرف بڑوں کی مرضی سے منگنی ہوئی اور بڑوں کے حکم پر وہ اسے ڈھونڈنے بھی رہی تھی۔ اب چونکہ وہ مل گیا تھا اس لیے اینکا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فریڈو یعنی اپنے محبوب کو خیرآباد کہہ دے۔

پیار کی وہی ازلی کہانی جس کے آخر میں اکثر آنسو اور آنسوؤں کے آخر میں خشک بنجر آنکھیں ہی رہ جاتی ہیں۔

کوئی نہ کوئی ریشماں ہر دور میں یہی پکارتی رہی ہے..... چار دناں دا پیار اوربا۔ بڑی لمبی جدائی.....

پیار کرنے والے سب کچھ جانتے بوجھتے دھوکا کھاتے ہیں اور شاید ابد تک کھاتے رہیں گے۔ یہ صرف اینکا و فریڈو کا قصہ نہیں، ہر پیار کرنے والے کی کہانی ہے۔ فریڈو کے ناکام عشق پر مجھے عاطف یاد آ گیا تھا۔ لاہور سے دو مرتبہ عاطف سے فون پر بات ہو چکی تھی۔ وہ چھوٹے بھائی کے علاوہ حورین کے سلسلے میں بھی سخت پریشان تھا۔ حورین جس کو میں طلسماتی کشش والی عورت کہوں گا۔ عاطف تو حورین کے لیے بیوی بابرہ کو بھی طلاق دینے پر آمادہ ہو سکتا تھا (دونوں میں بوجوہ بن ہی نہیں پا رہی تھی) مگر حورین نے ایک طرف بچے اور شوہر کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ دوسری طرف عاطف کو۔ وہ مکمل طور پر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ پھر ایک روز کولمبو کے ہوٹل میپون میں ہی عاطف کا تیسرا فون آیا۔ وہ روہانسا ہو کر بولا۔ ''طاہر، مجھے لگتا ہے حورین دنیا کی پیچیدہ ترین عورت ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

میں نے کہا۔ ''دنیا کی اکثر عورتیں پیچیدہ ہی ہوتی ہیں لیکن تم کس پیچیدگی کی بات کر رہے ہو؟''

''طاہر: مجھے لگتا ہے یہاں ایک بڑا طوفان کھڑا ہونے والا ہے۔ یہ نہ ہو سب کچھ ختم ہو جائے۔''

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔
''تم بتاؤ کب آرہے ہو؟''
''پرسوں شام کی فلائٹ ہے، لیکن.....''
''لیکن کچھ نہیں۔ تم آؤ تو جاؤ پھر بتاؤں گا۔'' اس نے ٹوٹے لہجے میں کہہ کر فون بند کردیا تھا۔

اب سری لنکا سے واپسی کی تیاری تھی۔ شہروں کے علاوہ سری لنکا کے مضافات بھی ہمیں بہت پسند آئے تھے۔ اس حوالے سے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتا چلوں۔ جب ہم پہاڑی شہر کینڈی سے بذریعہ ٹرین واپس آرہے تھے۔ میری رگ تجسس پھڑکی تھی اور میں ٹرین کے اندر ہی اندر چلتا، انجن والے حصے میں پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک کیبن میں ٹرین ڈرائیور اور اس کا اسسٹنٹ موجود تھے۔ میں نے بطور لکھاری ان سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مجھے اپنے پاس ہی بیٹھا لیا۔ ٹرین ڈرائیور ایک درمیانی عمر کا خوش باش شخص تھا۔ اس نے قہوہ پلایا اور ٹرین کو آپریٹ کرنے کے اسرار و رموز مجھے بتائے۔ بلکہ عملی طور پر بھی تھوڑا سا تجربہ کرایا۔ ٹرین برق رفتاری سے مضافاتی علاقے میں اڑی چلی جارہی تھی۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ مسافروں سے بھری ہوئی ٹرین کو چلانا کتنی ذمے داری کا کام ہوتا ہے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ دریا، درخت، ٹیلے، پہاڑ تیزی سے پیچھے جارہے تھے اور ٹرین آگے بڑھ رہی تھی۔ دور کئی کلومیٹر کے فاصلے پر سبز پہاڑ کے دامن میں ایک قصبہ نظر آیا۔ ٹرین ڈرائیور نے شستہ انگلش میں اس قصبے کا نام بتایا اور داستانی انداز میں بولا۔ ''مسٹر طاہر جید..... یہاں ایک بہت بہادر شخص رہتا تھا۔ علاقے کے لوگ اسے اپنا ہیرو مانتے تھے..... اور وہ تھا بھی اپنے اس علاقے کا ہیرو۔ وہ آخری سانس تک اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے مخالفین سے لڑتا رہا۔ ہمارے قصے کہانیوں میں اس کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔''

ڈرائیور نے اس شخص کا نام بھی بتایا جو ذہن سے نکل گیا ہے۔ یہ باتیں سن کر نجانے کیوں مجھے اپنے علاقے کا بے باک اور منہ پھٹ، سلیم یاد آگیا۔ اپنے اردگرد کے لوگوں کے لیے سینہ تان کر سب کے سامنے کھڑا ہوجانے والا (اور لڑائی بھڑائی میں اپنے سر کی طوفانی ضرب سے بدقماشوں کا پتا پانی کردینے والا) مجھے لگا کہ ہر ملک کے ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا سلیم موجود ہوتا ہے جو مزاحمتی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اپنی خوبیوں خامیوں سمیت لوگوں کو پسند ہوتا ہے۔

کولمبو چھوڑنے سے پہلے میں نے اور شعیب نے اپنے پسندیدہ مقام گال فیس کے ساحل کو آخری مرتبہ دیکھا۔ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا رہا۔ رومانس اور تفریحات کی گہما گہمی میں مجھے وہ اداس نوجوان کہیں نظر نہیں آیا۔ جس کا اپنی محبوبہ سے بچھڑنے کا منظر ہم نے کچھ دن پہلے دیکھا تھا (اور جس کو میرے سفری ناول ''سچ کی سولی'' کا مرکزی کردار بننا تھا) ہوسکتا ہے کہ وہ اسی ساحل کے کسی اداس گوشے میں کہیں بیٹھا ہو مگر میں اسے دیکھ نہ سکا۔ یوں بھی واپسی کی تیاری مکمل ہوچکی تھی۔ ٹکٹ کی کنفرمیشن آچکی تھی۔

☆☆☆

ہم پاکستان واپس پہنچے۔ عاطف سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع اسی رات مل گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مجھے سنانے کے لیے اس کے پاس کوئی نہایت پریشان کن خبر موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے عاطف کے چھوٹے بھائی ایاز نے حورین کی چھوٹی بہن ندا سے اپنی محبت ناکام ہوتے دیکھ کر کوئی نشہ آور چیز بھی کھائی تھی جس کے نتیجے میں اسے اسپتال ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عاطف مجھے جو کچھ بتانے والا ہے اس کا تعلق ایاز والے واقعے سے ہوگا۔ مگر بات مختلف نکلی۔

عاطف نے مجھے بتایا کہ حورین اور اس کے شوہر کے درمیان سخت جھگڑا ہوا ہے۔ جمشید نے حورین سے صاف صاف کہا ہے کہ وہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ رہی ہے۔ وہ دوسری کشتی سے اپنا پاؤں فوراً نکال لے ورنہ وہ اسے طلاق دیتے جارہا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ جمشید نے اس موضوع پر اتنی غیر معمولی سختی سے بات کی تھی۔ حورین نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ جمشید اپنے ساتھ کچھ کرنہ گزرے۔ اسے ہر گھڑی خدشہ تھا کہ جمشید اسے طلاق کے کاغذ تھما سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''عاطف! دیکھو یہی اندیشے تھے جن کے بارے میں ہم دونوں میں بار بار بات ہوتی رہی ہے۔ جو کچھ بھی ہے جمشید، حورین کے بچے کا باپ ہے اور وہ حورین پر بھی اپنی ملکیت کھونا نہیں چاہتا۔ دوسری طرف حورین بھی اپنی ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو دو کشتیوں میں پاؤں والی

بات تو ٹھیک ہے۔"

"لیکن ظاہر! یہ بھی تو دیکھو جمشید نے خود کشتی کشتیوں میں پاؤں رکھا ہوا ہے۔ کیا اس نے حورین کو کبھی وہ محبت دی جس کی وہ حقدار ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بڑا لمبا موضوع ہے۔ اب بتاؤ آگے کیا صورتِ حال ہے؟"

اس نے کہا۔ "حورین نے بتایا ہے کہ اس نے جمشید کے سامنے کوئی بہت بڑی قسم اٹھائی ہے اور کہا ہے کہ وہ اب کبھی میری شکل تک نہیں دیکھے گی اور یقیناً وہ یہ سب کچھ دل سے کہہ رہی ہے۔ مگر ایک پیچ، ایک رکاوٹ اب بھی موجود ہے۔ جسے وہ بھی بری طرح محسوس کرتی ہے وہ مجھ سے التجا کرتی ہے کہ ایاز اور عدا والا جو معاملہ شروع ہو چکا ہے میں اسے کسی مثبت انجام تک پہنچا دوں۔

"تو کیا تم پہنچا سکو گے؟ تمہاری امی کسی صورت..... کسی صورت نہیں مانیں گی۔"

"لیکن مجھے کوشش کرنی ہے..... اور میں ضرور کروں گا۔" عاطف نے غمناک لہجے میں کہا۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ جیسے جمشید، اپنی ملکیت حورین پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اسی طرح عاطف بھی حورین سے مکمل اور حتمی جدائی کا تصور قبول نہیں کر پا رہا۔ یہ ایک ایسی الجھن بن گئی تھی جو پتھر کے نقش کی طرح انمٹ ہو گئی تھی۔ عاطف نے مجھے یہ بتا کر بھی حیران کیا کہ ایک روز ساؤنڈ اسٹوڈیو میں جمشید نے ڈرنک کر کے کچھ توڑ پھوڑ کی، اور عاطف کا گلا دبانے کی ادھوری سی کوشش بھی کی لیکن بعد میں عاطف سے معذرت کر لی کہ وہ نشے میں تھا۔ دونوں کی باہمی دوستی میں بھی بتدریج کھنچاؤ پیدا ہو چکا تھا۔

حورین نے رو دھو کر اپنی شادی بمشکل بچائی تھی لیکن سمندر کی خاموش سطح کے نیچے شدید مدوجزر اب بھی موجود تھا۔ میں ذاتی طور پر محسوس کر رہا تھا کہ بے شک ایاز اور عدا ابھی گرفتارِ محبت ہیں اور ایک دوسرے کو پانا چاہتے ہیں مگر جو الجھن شدتِ حورین اور عاطف کے تعلق میں تھی وہ ان دونوں میں نہیں تھی۔

مصنف و بدایتکار اقبال رضوی کا نام کئی قارئین کے لیے جانا پہچانا ہوگا۔ ایک مرتبہ انہوں نے شاہ نور اسٹوڈیوز کے قریب ہی اداکاری اور اسکرپٹ رائٹنگ وغیرہ سکھانے کے لیے ایک اکیڈمی کھولی تھی۔ ایک معروف خاتون اس

رابندر ناتھ ٹیگور 1861ء۔ 1941ء

میری پیدائش قدیم کلکتہ میں ہوئی۔ ان دنوں شہر میں چھکڑے چھڑ چھڑ کرتے گرد و غبار اڑاتے دوڑا کرتے اور رسی والے چابک گھوڑوں کی پیٹھ پر تابڑ توڑ پڑا کرتے۔ نہ ٹرام تھی اور نہ موٹر گاڑی۔ بابو لوگ تمباکو کا کش لگا کر پان چباتے چباتے دفتر جاتے۔ کوئی پالکی اور کوئی گاڑی میں۔ جو لوگ صاحب توفیق تھے ان کی گاڑیوں پر تمغے لگے ہوتے۔ چپڑے کے آدھے گھونگٹ والے کوچ بکس پر کوچوان بیٹھا کرتا جس کے سر پر باکی پگڑی لہراتی رہتی۔ پیچھے کی طرف دو دو سائیس کھڑے رہتے جن کی کمر میں چنور جھولتے ہوتے۔ عورتوں کا باہر آنا جانا بند دروازے کی پالکی میں دم گھونٹنے والے اندھیرے میں ہوتا۔ گاڑی پر چڑھنا شرم کی بات تھی۔ دھوپ اور بارش میں ان کے سر پر چھاتا نہیں لگ سکتا تھا کسی کے بدن پر قمیص اور پاؤں میں جوتا نظر آ گیا تو اسے میم صاحبی فیشن کہا جاتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ اس نے شرم و حیا گھول کر پی لی ہے۔ کوئی عورت اگر اچانک غیر مرد کے سامنے آ جاتی تو اس کا گھونگٹ فوراً ناک کے نچلے حصے تک ڈھلک جاتا اور وہ اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر پیٹھ پھیر لیتی۔ گھر میں جس طرح ان کا دروازہ بند رہتا ویسے ہی باہر نکلتے وقت ان کی پالکی بھی بند ہوتی۔ بڑے بڑے آدمیوں کی بہو بیٹیوں کی پالکی پر ایک موٹا گھنا توپ سا پردہ پڑا رہتا۔ جو دیکھنے میں چلتی پھرتی خانقاہ معلوم ہوتا۔ ساتھ ساتھ فیتل کے دستے والی لاٹھی لیے دربان بھی چلا کرتے۔ ان کا کام تھا دروازے پر بیٹھ کر گھر کی نگہبانی کرنا۔ گل مونچھ سہلانا، بینک میں روپے اور رشتہ داری میں عورتوں کو پہنچانا اور تیج تیوہار کے دن بند پالکی کے ہمراہ جا کر بالکن کو گنگا میں ڈبکی لگوانا۔ دروازے پر پھیری والے اپنا صندوقچہ سجا کر آیا کرتے جس میں شوہندن کا بھی حصہ ہوا کرتا اور پھر کرائے کی گاڑی کا گاڑی بان تھا جو بانٹ بٹرے کے معاملے میں ناراض ہوتا تو ڈیوڑھی کے سامنے جھگڑا کھڑا کر دیتا تھا۔ گاتا ہے ہمارا پہلوان جمعہ ادشو بھارام کسرت کرتا، وزنی مگدر گھماتا، بیٹھا بیٹھا بھنگ گھوٹتا اور کبھی کبھی نہایت آرام سے ہتھوں سمیت مولی چباتا۔

اکیڈمی کی سرپرست تھیں۔ ایک روز میں بھی اقبال رضوی صاحب سے ملنے وہاں جا پہنچا۔ اسکرپٹ رائٹنگ کے حوالے سے ان سے بات ہوتی رہی۔ وہاں آنا جانا شروع ہوا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق بھی فنکاری سے کافی گہرا ہے اور ٹی وی ڈرامے وغیرہ بھی لکھ چکا ہوں تو مجھے خصوصی اہمیت دینے لگے۔

میں کبھی کبھی ان کے ساتھ اداکاری کی کلاس میں بھی بیٹھ جاتا۔ درحقیقت ایک مصنف اور فکشن رائٹر کے اندر تھوڑا تھوڑا ہدایتکار، منظرنامہ نگار، اداکار وغیرہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔

ایک روز اقبال رضوی صاحب نے اپنی ساری کلاس کو ایک سچویشن دی اور کہا کہ اس پر اداکاری کرو۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ بچپن میں اسٹیج کیے جانے والے ڈراموں کا اداکار میرے اندر جاگ اٹھا۔ میں نے بھی اس سچویشن پر چند مکالمے بولے۔ اقبال رضوی صاحب سمیت پوری کلاس تالیوں سے گونج اٹھی۔

میرا یہ یقین اور پختہ ہوا کہ ایک فکشن رائٹر کے اندر تمثیل نگار ضرور موجود ہوتا ہے۔ اگلے روز رضوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اداکاری کی کلاس اٹینڈ کیا کروں۔

میں نے کہا۔ ''اگر آپ آٹھ دس سال پہلے مجھ سے ملے ہوتے تو شاید میں غور کرتا لیکن اب تو مجھے کوئی گرا پڑا ثانوی کردار ہی ملے گا..... اور کیا پتا کہ ہیرو کے بڑے بھائی کا کردار مل جائے جس نے فلم کے درمیان میں کہیں اپنی بیوی اور بچوں سمیت نہایت ہی برے طریقے سے مرنا ہوتا ہے۔ ''بھائی کی جو موت ہے وہ ہیرو کی حیات ہے۔'' والا معاملہ ہوتا ہے اور ہیرو جس کے سارے اعضا ہیروئین کے پیچھے بھاگ بھاگ کر کچھ ٹھنڈے پڑ گئے ہوتے ہیں ایک دم سراپا آتش ہو جاتا ہے۔''

میری بات پر رضوی صاحب مسکرانے لگے۔ بولے۔ ''کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔''

مجھے یاد آ گیا جن صاحبہ کی سرپرستی میں یہ اکیڈمی چل رہی تھی ان کا نام نگینہ خانم تھا۔ پندرہ بیس لڑکے لڑکیاں اکیڈمی میں آتے تھے۔ ٹی وی فلم کے معروف اداکاراؤں کو بھی وزٹ کرایا جاتا تھا۔ ایک روز بڑی عید کی قربانی کا گوشت دینے کے لیے میں اقبال رضوی صاحب سے ملنے گیا۔ وحید مراد کی کئی ہٹ فلموں کا مصنف اور ہدایتکار اقبال رضوی کچھ خاموش نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ اکیڈمی کے مستقبل سے زیادہ پُرامید نہ ہو۔ میں نے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ نگینہ خانم صاحبہ کی شاگرد پیشہ چنچل لڑکیاں اور کچھ لڑکے میوزک پر رقص کی ٹریننگ کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ عین رہائشی آبادی کے درمیان یہ ہلا گلا یہاں کے مکین پسند نہیں کریں گی۔ اس بات کا بھی قوی امکان موجود تھا کہ یہاں کوئی چھاپہ وغیرہ مروا دیا جاتا اور الزام لگتا کہ یہاں ''فنون لطیفہ'' نہیں بلکہ ''فنون کثیفہ'' سکھائے جا رہے تھے۔

میں نے تہیہ کیا کہ رضوی صاحب سے میل جول تو رکھوں گا مگر مخدوش ماحول والی اکیڈمی کا رخ کبھی نہیں کروں گا۔ دو دن بعد ادھر سے گزرا تو دیکھا کہ اکیڈمی ہی کے تین چار لڑکے افراتفری میں اکیڈمی کا کافی بڑا پبلسٹی بورڈ اکھاڑ رہے تھے۔ اکیڈمی بند ہو چکی تھی۔

ایک روز پرانے محلے کے میرے دوست امتیاز نے مجھے بتایا کہ اس نے زویا کو دیکھا تھا۔ وہ ایک دو اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے اس پرانے گھر میں آئی تھی۔

جب کوئی اس طرح کی اطلاع ملتی تھی۔ میں کئی گھنٹوں کے لیے اپ سیٹ رہتا تھا۔ مگر پھر بچوں کی چہکاریں، اور روزمرہ کی تلخ شیریں مصروفیات میری سوچوں کو اپنے ریلے میں بہا لے جاتی تھیں۔ اس دن بھی میں دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ شاید وہ بھی پرانے در و دیوار کو دیکھنے کے لیے یہاں آئی ہوگی۔ صحن میں آ کر جنتر کے پودے کے اوپر سے اس نے شاید میرے گھر کی طرف بھی نگاہ اٹھائی ہو۔ لیکن اب تو وہاں اسے چار فٹ اونچی منڈیر اور کھڑکیوں کی جگہ مسجد کے خدوخال ہی نظر آئے ہوں گے۔ سوچا شاید اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی ہو۔ پتا نہیں کیا بات تھی کبھی کبھی اس کے شوہر کو دیکھنے کی خواہش میرے اندر شدت سے جاگتی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کیسا ہوگا۔ اس کے ساتھ چلتا پھرتا، ہنستا بولتا کیسا لگتا ہوگا میں نے سوچا اگر وہ کہیں مل جائے تو اس شخص سے شاعرانہ انداز میں پوچھوں۔

تو نے دیکھی ہے، وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

چند ماہ بعد کی بات ہے ایک بار پھر اتفاقاً ہی زویا مجھے نظر آ گئی۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنی خبیر کار میں کسی کام سے ٹاؤن شپ کے علاقے میں گیا تھا۔ سال میں ایک آدھ بار ادھر آنا جانا ہو ہی جاتا تھا۔ سامنے سے ایک کار آتی نظر

آئی جو اشارے پر رک گئی۔ یونہی کار کی طرف نظر اٹھی۔ وہ عقبی نشست کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بال جوڑے کی صورت میں تھے۔ پیشانی تھوڑی سی کشادہ نظر آتی تھی۔ چہرے پر گہری سنجیدگی، کسی سوچ میں گم تھی۔ ان لمحوں میں مجھے یہ دیکھنے کا ہوش نہیں رہا کہ گاڑی میں اور کون کون سوار تھا۔ میں تو بس اسی کی جانب دیکھتا جا رہا تھا کہ جو رکی ہوئی کار میں مجھ سے بس پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔

میں ترچھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔ دل خوش فہم نے یونہی ہانکی..... کیا پتا ان لمحوں میں وہ انہی کھڑکیوں اور اسی منڈیر کے بارے میں سوچ رہی ہو لیکن پھر دماغ نے فوراً ہی اس احمقانہ خیال کی پشت پر لات مار کر اسے دور پھینک دیا۔ سگنل کسی بھی وقت گرین ہو سکتا تھا۔ جی چاہا دروازہ کھول کر تیزی سے اس کے پاس جاؤں۔ اس سے پوچھوں۔ "زویا..... تمہارے گھر میں میگزین وغیرہ تو آتے ہی تھے۔ کیا تمہیں معلوم ہے اب میں لکھتا ہوں، اور میری..... تحریروں میں اکثر تم بھی جھلک دکھاتی ہو۔ تمہارے دکھ بھی منعکس ہوتے ہیں۔ کیا تم نے تاوان، دیوی وغیرہ پڑھی ہیں..... اور ہاں یاد آیا۔ بس ایک سوال کا جواب اور دے دینا..... بس ایک سوال..... وہ..... وہ دسمبر کی اس چمکیلی دوپہر کو..... وہ جو کیو..... میں نے پھینکا تھا..... وہ؟"

اشارہ کھل گیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن آگے چل پڑی تھی۔ اور میرے دل نے کہا کہ اب شاید وہ کبھی نظر نہ آئے گی۔ پھر ڈائری پر لکھا ہوا یہ سوال اور دو تین مزید سوال بس سوال ہی رہ جائیں گے۔

☆☆☆

ہر کہانی کا اور کہانی کے کرداروں کا ایک منطقی انجام ہوتا ہے۔ تاوان کو لکھتے ہوئے کم و بیش گیارہ سال ہو چکے تھے۔ کہانی دلچسپی سے پڑھی جا رہی تھی۔ تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ تاوان کے کرداروں شاہ جہاں، غزالہ اور شکر وغیرہ کو برتتے ہوئے مجھے کچھ دشواری ہو رہی ہے تو اسے اختتام کی طرف لے آیا۔ تاوان کے بعد میں نے کسینس میں کچھ آخری صفحات کی اور کچھ مختصر کہانیاں لکھیں۔ اسی دوران میں ایک دو دفعہ پھر لاہور میں معراج رسول صاحب سے ملاقات ہوئی۔ معراج صاحب کی صحت اب بہت زیادہ اچھی نہ رہتی تھی۔ اس ملاقات میں معراج صاحب نے وہ فقرہ کہا جو میرے لیے بہت حوصلہ افزا رہا۔ اور تادیر مجھے یاد بھی رہا۔ میرے لیے یہ فقرہ ایک اعزاز کی طرح بھی تھا۔ خوشگوار موڈ میں تھے کہنے لگے۔ "ظاہرا تاوان کی طرح بس ایک اور قسط وار لکھ دو، پھر کام چل جائے گا۔"

فقرے کا آخری حصہ..... پھر کام چل جائے گا، معنی خیز تھا۔ ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہو چکی تھی۔ شاید یہ ان کی گرتی ہوئی صحت کی طرف بھی اشارہ تھا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے اردگرد کے معاملات کو طویل مدتی پس منظر کے بجائے قلیل مدتی تناظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہو۔ میں نے کہا۔ "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔"

دیوی شروع ہوئی۔ اس کے دو اہم ترین کرداروں میں سے ایک شانی کا تھا۔ وہ پوری کہانی میں ہیرو رستم ہی کی طرح فعال و سرگرم نظر آتی ہے۔ دیوی شروع ہونے سے تھوڑا پہلے غالباً جاسوسی یا سسپنس میں کوئی اور سلسلہ وار آئی تھی جس میں مرکزی کردار لڑکی کا تھا اور وہ لڑکی چھ اقساط کے بعد ہی حقیقی زندگی سے بہت دور چلی گئی تھی۔ بجلی کا پنکھا اور مشین گنز وغیرہ چلاتی نظر آئی تھی۔ ادارے میں سے ہی کسی کو یہ وسوسہ ہوا کہ شاید دیوی کی شانی بھی اسی طرح چھ اقساط کے بعد "آؤٹ آف کنٹرول" ہو جائے گی۔ میں نے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ فی میل کردار کہانی کے آخری تک حقیقت کے قریب رہے گا اور ہمارے اردگرد کا کردار ہی نظر آئے گا۔

مجھے یاد ہے وہ بقر عید کے دن تھے۔ دیوی کی پہلی قسط جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہو چکی تھی۔ کراچی سے مجھے غالباً اقلیم علیم صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ "دو تین خطوط ایسے آئے ہیں جن میں اس کہانی کو رابندر ناتھ ٹیگور کی معروف کہانی نجوگ کا چربہ کہا گیا ہے....."

میں نے کہا۔ "اقلیم صاحب! میں اس سے کلی طور پر انکار نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ غیر شعوری طور پر اس میں مذکورہ کہانی کی مماثلت آ گئی ہو لیکن یہ کوئی ایک قسط کی کہانی تو ہے نہیں۔ اس نے انشاء اللہ کئی برس تک چلنا ہے۔ دو تین اقساط کے بعد آپ معترض افراد سے پوچھیے گا کہ اب اس میں کہیں نجوگ کا شائبہ نظر آ رہا ہے یا نہیں؟"

اقلیم صاحب میرے اس جواب سے مکمل مطمئن ہوئے۔

دیوی کی تخلیق کے دنوں ہی کی بات ہے۔ ذہن پر ہر وقت لمبے بالوں اور متین صورت والا رستم سیال سوار رہتا تھا۔ ابتدائی اقساط کے بعد میں کہانی کا تانا بانا بن رہا تھا۔ ایک روز ایسے ہی اپنے لکھنے والے کمرے میں صوفے پر لیٹا

ہوا تھا۔ اہلیہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ کہنے لگی۔ ''آج کل آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کہہ کر کمرے میں آتے ہیں کہ کام کرنے لگا ہوں۔ یہاں میں دیکھتی ہوں تو صوفے پر پڑے ہوتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اہلیہ صاحبہ! اصل کام تو یہی ہے جو میں صوفے پر لیٹ کر کر رہا ہوں یعنی سوچ بچار اور بہت کاری۔ بعد میں تو صرف لکھنا ہی رہ جاتا ہے۔''

اور اس حوالے سے دوسرے لکھنے والے بھی یقیناً اتفاق کریں گے۔ کہانی کا تانا بانا اور کرداروں کے خدوخال ابھارنا ہی زیادہ اہم کار ہوتا ہے۔ جو اکثر لیٹ کر یا چہل قدمی کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ جب خدوخال اچھی طرح ابھر آتے ہیں تو کہانی کار میں ایک توانائی پیدا ہوتی ہے اور اس کا ہاتھ بے ساختہ قلم اور کاغذ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ اس کے بعد تخلیق نہیں ہوتی۔ اچھے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہوئے بھی نئے خیالات تاریک گوشوں سے نکل کر قلم کار پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی کردار ہی اتنا طاقتور نکل آتا ہے کہ کہانی کو اپنی من چاہی سمت میں موڑ لے جاتا ہے۔

اس سے ملتی جلتی بات اکثر علی سفیان آفاقی صاحب کہا کرتے تھے۔ ''میں جب فلم کی کہانی اور ڈائیلاگ وغیرہ تیار کر لیتا تھا تو ایک دم ''ایزی'' ہو جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اب فلم بندی کا باقی کام چنداں مشکل نہیں رہا۔''

جیسا کہ میں نے پچھلے ابواب میں بتایا ہے، اہلیہ شفیقہ کا خونی رشتہ ایک معروف قلم دین سے تھا۔ ان کا نام مولانا عبدالحئی ہے۔ اہلیہ ان کی پوتی ہیں۔ مولانا عبدالحئی کی کہانی بھی بڑی پُراثر ہے۔ اکثر کتب میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ نوائے وقت میں کالم ''سرراہ'' لکھنے والے محترم وقار انبالوی بھی کالم میں ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ نوائے وقت میں ایک آرٹیکل ''پہلی اذان'' کے نام سے چھپا تھا۔ پُرتاثیر واقعہ تھا۔ مولوی عبدالحئی جو میری والدہ کے نانا بھی ہیں۔ ان کا تعلق ضلع سیالکوٹ کے قصبے، کلاس والا، سے تھا۔ ان کے گاؤں میں نام نہاد پیر آتا تھا جو گاؤں والوں سے بطور نذرانہ اناج، تحائف اور نقدی اکٹھی کرتا تھا۔ مولانا لڑکپن کی عمر میں تھے۔ پیر ان کے گھر نذرانہ وصول کرنے کے لیے آیا تو مولانا نے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں آپ کے پاس کم و بیش سو مائی اناج اکٹھا ہو چکا ہے، آپ پھر بھی ہم جیسے محنت کشوں سے مانگنے چلے جا رہے ہیں۔''

پیر صاحب بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ مولانا کی والدہ ان سے ناراض ہوئیں۔ مولانا کے دل میں ترنگ جاگی کہ وہ دین کی صحیح اور سچی روشنی حاصل کریں گے۔ وہ وزیرآباد کے ایک عالم دین حافظ عبدالسبحان کے شاگرد ہو گئے۔ ساتھ ہی اسٹیشن پر محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے رہے (جبکہ مروجہ طریقے کے مطابق گھروں سے بطور نذرانہ کھانا آتا تھا وہ چاہے تو کھا سکتے تھے مگر وہ ان کھانوں کو کھانا بالکل پسند نہ کرتے تھے)

جب وہ اکتساب فیض کر چکے تو مولانا کے استاد محترم نے کہا۔ تم ایک ایسے تاریک علاقے میں چلے جاؤ جہاں روشنی کی بہت ضرورت ہے۔

استاد محترم کا اشارہ قصبہ ''کلاس والا'' کی طرف تھا۔ جہاں اکثریت سکھوں کی تھی۔ مسلمان گھرانے چند ایک ہی تھے۔

اشارہ پاتے ہی وہ اس گاؤں کی جانب چل پڑے۔ قصبے کی اکلوتی مسجد عرصے سے ویران پڑی تھی۔ رات گئے وہ دور کا مسافر اس خالی اداس مسجد میں اترا۔ اسے دھویا، صاف کیا..... اور پھر جب رات کا گہرا اندھیرا صبح کے اجالے میں ڈھلنے والا تھا۔ اس مسجد میں سے ایک آواز بلند ہوئی۔ ''اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔''

اور یہ تھی وہ پہلی اذان جو آنے والے ماہ و سال میں کلاس والا سے در و دیوار میں ہی نہیں گونجی، اردگرد کے علاقوں میں بھی دور دور تک سرایت کر گئی۔ کلاس والا کے مولانا عبدالحئی کا تذکرہ ایک طویل و مفصل تحریر کا متقاضی ہے۔ بشرط صحت و زندگی میں یہ واقعات ضرور قلم بند کروں گا۔ مختصر یہ کہ جہالت کے عالم میں مولانا نے اس تاریک ماحول میں جو شمع جلائی تھی۔ اس نے بہت کم عرصے میں بے شمار سینوں کو منور کر دیا۔ علاقے کی تاریخ گواہ ہے کہ مولانا کی جادو اثر شخصیت نے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ان گنت سکھوں کو بھی متاثر کیا۔ سیکڑوں کی تعداد ہو گی ہی جنہوں نے اسلام قبول کیا اور لاتعداد ایسے تھے جو غیر مسلم ہونے کے باوجود مولانا سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ایک سکھ چودھری نے مولانا کو قصبے میں ہی ایک بڑا رقبہ عطیہ کیا جس پر مدرسہ وغیرہ بنائے گئے تھے۔

مولانا لکڑی کا بہت اچھا کام کرتے تھے۔ انہوں نے روزگار کے لیے ایک خراس بھی لگا رکھا تھا۔ اس دور میں مولانا نے پیدل حج بھی کیا۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ نکلے تھے۔ عراق میں پہنچے تو ان کا دوست سخت بیمار ہو گیا۔ دونوں

کچھ عرصے تک حضرت عبدالقادر جیلانی کے روضے میں مقیم رہے۔ مولانا کے اوزار ان کے پاس ہی تھے۔ وہ لکڑی کا کام کر کے اپنا اور اپنے دوست کا خرچا نکالا کرتے رہے۔ دوست کو جب اندازہ ہوا کہ وہ بچ نہیں سکے گا تو اس نے مولانا کی منت کی کہ وہ چلے جائیں ورنہ ان کا حج بھی رہ جائے گا۔ مولانا غالباً ایک ڈیڑھ سال بعد ہی واپس آئے تھے۔ یہ بہت دلچسپ اور سبق آموز واقعات ہیں۔

دینی علوم پر مولانا کی کئی کتب اور مخطوطے بھی تھے۔ حضرت احمد لاہوری کے شاگردوں میں سے کچھ حضرات یہ ذخیرہ لے گئے تھے۔ یہ میرے اندازے کے مطابق 1975ء کے آس پاس کا واقعہ ہوگا۔ یہ ذخیرہ یقیناً کہیں نہ کہیں محفوظ ہوگا۔ میں ایک دو بار اس کی تلاش میں شیرانوالا گیٹ بھی گیا ہوں لیکن ابھی کوئی کھوج نہیں ملا۔

کچھ اتفاقات عجیب ہوتے ہیں۔ پچھلے ابواب میں بھائی ہارون کی پُراسرار گمشدگی اور بازیابی کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ بھی ہزاروں میل دور حضرت عبدالقادرؒ کے مزار پر پہنچے۔ انہوں نے بھی کچھ عرصہ تک جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے وہاں محنت مزدوری کی۔ مولانا عبدالحئی، میری اہلیہ کی طرح بھائی ہارون کے بھی دادا تھے۔

بھائی ہارون کا ذکر ہوتا ہے تو چوبرجی میں پھوپی جان کے گھر کی وہ گیلری بھی ذہن میں آجاتی ہے جو آج بھی اپنے اندر اسرار بیت کی پرچھائیاں رکھتی ہے۔ مولانا کے چھوٹے بیٹے حاجی عبداللہ جان بھی اسی گھر میں قیام پذیر رہے، وہ بھی روحانیت کی طرف گہرا رجحان رکھتے تھے۔ وہ اکثر بڑے وثوق سے کہا کرتے تھے۔ اس گیلری اور کچھ فاصلے پر نظر آنے والے چوبرجی کے ایک مینار میں گہرا ربط ہے۔ کوئی خاتون ہے جو رات کے سنسان لمحات میں اس مینار سے آتی ہے اور گیلری کے ٹیرس میں گھومتی ہے۔ اس نسبت سے اور کئی واقعات بھی ہم بچپن سے سنتے رہے ہیں۔

اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ میں ایسے واقعات پر زیادہ یقین نہیں رکھتا۔ تاہم بات تو طے ہے کہ ہماری "سائنس" ابھی سفر میں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے معروف قلم کار وصوفی جناب بابا یحییٰ خان کی ایک تحریر پڑھنے کا موقع ملا۔ اپنے مخصوص روحانی انداز میں انہوں نے ایک جگہ کچھ اس طرح کی بات لکھی ہے کہ لاہور کے کئی آثار قدیمہ ہوائی چیزوں کا مرکز ہیں۔ الفاظ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، انہوں نے چوبرجی کا ذکر بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ اس عمارت کے نیچے جنات کی ایک دنیا آباد ہے (اللہ پاک بہتر جاننے والا ہے)

تھائی لینڈ والے سفر میں میں نے ضامن صاحب کا ذکر کیا تھا۔ سفر سے واپسی پر انہیں یہ شدید واہمہ لاحق ہوگیا تھا کہ انہیں ایڈز ہو چکا ہے۔ نتیجے میں مجھے ان کی راہ فرار کے لیے (پاکستان سے بھاگنے کے لیے) محترم معراج صاحب کو فون کرنا پڑ گیا تھا۔ بیماریوں کے خدشات ضامن صاحب کو یوں چمٹتے تھے جیسے مقناطیس کو لوہا چون چمٹتا ہے (اب بھی خیر سے یہی صورتِ حال ہے کہ عمر کافی ہو چکی ہے) ان ہی دنوں ناف کے قریب انہیں ایک ابھار سا پیدا ہوتا محسوس ہوا۔ ابھار تو صرف ایک تھا لیکن انہیں بیس پچیس مہلک بیماریوں کی علامات اس ابھار پر فٹ بیٹھی محسوس ہوتی تھیں۔ جن دنوں جس بیماری کا واہمہ شدید ہوتا تھا اس کی ساری دیگر علامات بھی ان میں ظہور پذیر ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اس معمولی تکلیف کے ڈانڈے بھی جا تھائی لینڈ سے ملاتے تھے۔ ضامن بھائی کھانے پینے کے اب بھی بہت رسیا ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ جو بیماریوں کے واہمے عذاب الٰہی کی طرح ان پر نازل ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ ان میں بسیار خوری کا احساس جرم بھی ہے۔

ضامن صاحب کے کردار سے ہی متاثر ہو کر میں نے اپنے ضخیم ناول پرواز میں رونق علی کا کردار تخلیق کیا جو کافی پسند کیا گیا۔ یہ کردار کسی بھی طرح کی بدپرہیزی یا لڑائی جھگڑے سے پہلے ہنگامی طور پر اپنا بلڈ پریشر اور شوگر لیول وغیرہ چیک کرواتا ہے۔ میں خوش خوراکی سے ہمیشہ دور رہا ہوں مگر اس حوالے سے لاہور شہر کے وہ قدیم ٹھکانے ضرور یاد آرہے ہیں جو لذت کام و دہن میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ سن 2000 سے پہلے بڑی ہارونق جگہیں ہوتی تھیں۔ لاہور کی معروف میکلوڈ روڈ پر ریجنٹ سینما سے پہلے سڑک کنارے چینی کے معروف شربت کا ٹھکانا ہوتا تھا۔ موسم گرم میں درختوں کے نیچے چند ملازم برف کے بڑے بڑے بلاکوں کو سوئے کی مدد سے چھیدتے رہتے تھے۔ یہ چھدی ہوئی برف خالص چینی کے شربت میں ڈال کر..... لیموں اور تخم ملنگاں وغیرہ ملا کر گاہکوں کو ایک مزیدار مشروب پیش کیا جاتا تھا۔ قیمت مناسب اور رش اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ ٹریفک بلاک ہونے لگتی تھی۔ اب یہ اڈا ختم ہو چکا۔ اسی اڈے کے بالمقابل 70ء کی دہائی میں ایک دہی بھلے والا ہوا کرتا تھا۔ وہاں بھی اتنا رش ہوتا تھا کہ لگتا تھا مفت بانٹا جا رہا ہے۔ قریب

سے گزرتے ہوئے دہی بھلے کے مسالہ جات کی اتنی مزیدار خوشبو آتی کہ قدم رکنے لگتے۔ لیکن ہم لوگ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ کثرت کار کی وجہ سے دہی بھلے والے کے ہاتھوں کو کسی طرح کی الرجی یا بیماری لاحق ہو چکی ہے۔ وہ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے رکھتا تھا۔ نہایت اشتعال انگیز خوشبو کے باوجود ہم کبھی اس شخص کے دہی بھلوں سے لذت یاب نہ ہو سکے۔ اسی طرح ایبٹ روڈ کے نغمہ سینما کے قریب ایک مرغ چنے والے کی خصوصی شہرت تھی۔ ہم ایبٹ آباد روڈ پر قلم کہیں بھی دیکھتے مگر کوشش کرتے کہ مرغ چنے نغمہ سینما والے کے کھائیں۔ منفرد لذت اس کے مرغ چنے میں ہی نہیں، گرم نان میں بھی ہوتی تھی۔ پلازا سینما کا نان نگی والا بھی شاید میری عمر کے بہت سے قلم بینوں کو بھولا نہیں ہوگا۔ لاہور کا شاید کوئی ہی سینما ہوگا جس میں ہم نے نان حلیم یا نان نگی نہ کھائی ہو مگر پلازا سینما والے 'فن کار' کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ساتھ میں پودینے کی تھوڑی سی چٹنی اور شاید پیاز یا مولی وغیرہ ہوتی تھی۔ پلازا سینما میں لگنے والی فلمیں تو کبھی کبھی فلاپ ہو جاتی ہوں گی لیکن وہ نگی ہمیشہ ہٹ ہی رہی۔ قریباً چالیس پینتالیس برس گزر گئے۔ اب بھی کبھی جی چاہتا ہے کہ پلازا سینما جا کر اس نان نگی والے کا سراغ لگاؤں۔

پکوانوں کا ذکر ہوا ہے تو کالج کے دور کی دو دکانیں یاد آ گئی ہیں۔ یہ دو منزلہ دکانیں پہلو بہ پہلو اور اس چوک میں واقع تھیں جو مال روڈ والے چوک سے آگے آتا ہے اور جہاں سے انارکلی کا اصل بازار شروع ہوتا ہے۔ ان دکانوں میں مچھلی کے کباب فروخت ہوتے تھے۔ قیمت نہایت ارزاں اور سواد بے مثال۔ ساتھ میں نہایت فراخدلی سے اچار اور چٹنی وغیرہ فراہم کی جاتی تھی۔ لوگ اور خاص طور سے اسٹوڈنٹ ان دونوں فوڈ پوائنٹس پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ نہایت تھوڑے پیسوں میں ایسا چٹخارے دار لنچ ہوتا تھا کہ مرد و زن انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔ نجانے ان پوائنٹس کو کیوں ختم کر دیا گیا۔ اب عرصہ دراز سے وہاں مچھلے اور "بے لذت" ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانیں ہیں۔ خورد و نوش کا ذکر ہوا ہے تو ہمارے علاقے کے نظام دین کی برفی کا ذکر کیوں نہ ہو..... آہ نظام دین کی نرم اور خوشبودار برفی۔ اس برفی سے ہمارے بچپن کی بہت سی یادیں جڑی ہیں۔ ابا جی کی ڈانٹ ڈپٹ اور ہلکی پھلکی مار کے بعد وہ برفی ہمیں بہترین نعم البدل محسوس ہوا کرتی تھی۔ اب وہ پیار بھری سختیاں ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئیں اور وہ برفی بھی.....

ہاں نظام دین کی نرم گرم برفی جو پوری طرح ٹھنڈی ہونے سے پہلے ہی لوگ لے اڑتے تھے۔

برفی کے تذکرے پر یاد آیا کہ عاطف حورین کو کبھی کبھی برفی کے نام سے یاد کرتا۔

☆☆☆

حورین اور عاطف کا تعلق ایک ایسا گورکھ دھندا تھا جو کسی طور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شاید عاطف امین نے سری لنکا میں مجھے فون کرتے ہوئے ٹھیک ہی کہا تھا۔ حورین ایک الجھی ہوئی گتھی ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ خود بھی تو ایک الجھی گتھی ہی تھا۔ بارہ اس کی بیوی تھی۔ وہ بے حسی کے ساتھ برملا اسے دھوکا دے رہا تھا۔ دوسری طرف حورین بھی دھوکا دے رہی تھی۔ جمشید جیسا بھی تھا قانونی طور پر اس کا شوہر تھا اور وہ اس سے بے وفائی کر رہی تھی۔ دوسرا پہلو دیکھا جاتا تو وہ خدا ترسی اور نیکی کے کاموں میں بھی پیش پیش تھی۔ اپنے بچے نومی سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ ایک مرتبہ سامنے سڑک پر فٹ بال کھیلتے ہوئے نومی کو چھوٹی سی چوٹ لگی تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

اب وہ شوہر کے سامنے کوئی بڑی قسم کھا چکی تھی کہ عاطف سے کوئی معمولی سا رابطہ بھی نہیں رکھے گی، ایاز اور ندا کا جو بھی ہونا ہو وہ اللہ کی طرف سے ہو جائے گا۔ کیا پہلے ارادوں اور قسموں کی طرح اس کی یہ قسم بھی ٹوٹنے والی تھی.....؟ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال اب تو ان دونوں کے درمیان ہجر کا طویل موسم تھا۔ عاطف شادی شدہ زندگی کے باوجود بالکل تنہا تھا اور دوسری طرف شاید وہ بھی بالکل تنہا تھی۔ جمشید جیسے کج ادا شخص کے ساتھ مجبوراً بستر شیئر کرنے سے تنہائی ختم تو نہیں ہو جاتی۔

میں کافی عرصے سے ملک سے باہر نہیں گیا تھا۔ کبھی کبھی میں اور "دل گرفتہ عاطف" بیٹھتے اور سوچتے۔ ایک دن میں نے کہا۔ "ابن انشا نے سفرنامہ لکھا تھا "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" کبھی وقت دل چاہتا ہے کہ میں ناچیز بھی ایک سفرنامہ لکھوں۔ "ابن انشا کے تعاقب میں۔"

"ابن انشا یورپ گئے تھے؟"

"کوئی ایسے ویسے۔ کچھ پڑھو تو تمہیں کچھ پتا چلے۔" میں نے کہا اور اگلی دو دہائیوں کے تصوراتی مناظر میں کھو گیا جو اپنے تاریخی پس منظر کے سبب ہمیشہ سے مجھے کشش کرتے تھے۔

(جاری ہے)

کاروانِ زندگی

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ اُن کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں: ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلم کار کی خود بیتی کا تیرہواں حصہ جو خود میں منفرد ہے

حورین دوبارہ لاہور آ چکی تھی۔ تاہم عاطف اور حورین کے درمیان ہجر کا ایک اور طویل موسم حائل ہو چکا تھا۔ عاطف کی والدہ یعنی آنٹی راحیلہ کسی طور حورین کی چھوٹی بہن ندا کو بہو بنانے پر تیار نہیں تھیں۔ وہ تیار ہوتیں بھی کیسے؟ وہ دیکھ چکی تھیں کہ حورین نے کس طرح عاطف کو عشق ممنوع کے جال میں جکڑا تھا اور اب یہ جال تہہ در تہہ اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ دونوں اس میں بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔ ایک طرف سے عاطف و حورین کی ازدواجی زندگی خطرے میں تھی۔ عاطف تو خیر ابھی تک بے اولاد تھا لیکن حورین تو بچے کی ماں بھی تھی۔

عاطف کی شیو بڑھی رہتی تھی۔ لباس بے ترتیب ہوتا تھا۔ اس کی رسیلی آواز میں درد گھلا اور بڑھ گیا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی اب وہ فٹ بال کی طرح میدان سے بھی دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ایک روز میں نے اسے زبردستی گھر سے نکالا۔ میرے ہی کہنے پر اس نے شیو وغیرہ بنائی اور لباس بدلا۔ ہم دونوں لاہور میں گھومنے پھرنے کے لیے نکل گئے۔ لوکیشن کی یادیں تازہ کرنے کے لیے کئی پرانی جگہوں پر گھومتے رہے۔ میں دیکھتا تھا کہ بارونق جگہوں پر عاطف کی اداسی کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ ایسے سوچتا ہو کہ..... اگر وہ اداس ہے تو لوگ خوش کیوں ہیں۔ حورین کی دید اور اس کے لمس سے محروم عاطف کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ یہی وہ عاطف ہے جس کو میں ایک مرتبہ دیکھی ہوئی چابی سے اپنی کلائی واشنگ ہوئے دیکھ تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کہہ رہا تھا۔ "حورین میری بہن ہے بہن کے سوا اور کچھ نہیں۔" انسان قدرت کا عجب گورکھ دھ ہے۔

مجھے یاد ہے لاہور میں گھومتے پھرتے ہم دونوں قذافی اسٹیڈیم کی طرف اپل سی سی اے کی گراؤنڈ کی جانب نکل آئے۔ اس گراؤنڈ میں کرکٹ کے بڑے بڑے میچ ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ ننھے منے کھلاڑیوں کی تربیت بھی معروف کھلاڑیوں کی زیرِ نگرانی ہوتی ہے۔ ہم دونوں اپنی پتلونوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گراؤنڈ میں گھوم رہے تھے کہ چونک گئے۔ سامنے سے اسپن باؤلنگ کے جادوگر عبدالقادر آ رہا تھا۔ وہ صرف آ رہا تھا بلکہ اس نے ہمیں "اوئے" سے ہمیں سلام بھی کیا تھا۔ ہم نے سلام کا جواب

دیا۔

اب پتا نہیں کہ عبدالقادر ہمیں کیا سمجھ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اسے ہم پر کرکٹ بورڈ کے چھوٹے موٹے عہدیداروں کا دھوکا ہوا ہو۔

عبدالقادر سے پُرتپاک مصافحہ ہوا۔ "اور کیا حال ہے سر؟" آسمان کے عالمی جادوگر نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھیک..... آپ سنائیں۔"

"الحمدللہ..... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جی۔ میرے لائق کوئی خدمت۔" سرخ و سپید چہرے والے عبدالقادر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور تھوڑا سا جھک کر کہا۔

جی تو چاہا کہ کہہ دوں..... مہربانی، ایک آٹوگراف ہی عنایت فرما دیجیے..... لیکن اس طرح سے پول کھل جانا تھا۔ اور ممکن تھا کہ اس غیر متوقع عزت و تکریم میں بھی خاصی کمی واقع ہو جاتی۔ لہٰذا صرف مسکرانے اور "تھینک یو" کہنے پر اتفاق کیا۔ پرتپاک مصافحے کے بعد عبدالقادر صاحب گراؤنڈ کی طرف نکل گئے اور ہم پارکنگ کی طرف۔

انہی دنوں بڑے تایا جان اور چھوٹی خالہ (تایا جان کی دوسری بیوی) دوسری مرتبہ حج کے لیے گئے۔ واپسی پر دونوں ہی بیمار تھے لیکن جلد ہی صحت یاب بھی ہو گئے۔ ایک روز میں نے دیکھا۔ چھوٹی خالہ جا نماز پر گم صم بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگیں۔ "خانہ کعبہ کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔"

میرے اصرار پر انہوں نے بتایا۔ "ایک روز ہم باب علی میں بیٹھے تھے۔ دو پاکستانی عورتیں قریب ہی بیٹھی تھیں۔ ان کی ایک ساتھی جس کی عمر پچاس کے قریب ہو گی بڑے خشوع خضوع کے ساتھ تیز قدموں سے کعبہ کا طواف کر رہی تھی۔ میرے قریب بیٹھی دونوں عورتیں بہت غمزدہ تھیں۔ ان میں سے ایک جواں سال تھی۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ وہ طواف کرنے والی کی بیٹی ہے۔ پھر اس نے اشک بار لہجے میں انکشاف کیا کہ سیالکوٹ میں پھوپو کا بیٹا (یا بیٹی، ٹھیک سے یاد نہیں) حادثے میں جاں بحق ہو چکا ہے۔ لیکن ہم نے ابھی انہیں بتانا مناسب نہیں سمجھا ہے۔ میں نے طواف کرتی اور دعائیں مانگتی اس خوش باش عورت کو دیکھا اور میرا اپنا دل بھی رونا شروع ہو گیا۔"

چھوٹی خالہ نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں خود بھی دیر تک غمزدہ رہا۔ قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں اور وہ اپنے کاموں کی رمزیں خود ہی سمجھتی ہے۔ دعائیں، عبادتیں اور ریاضتیں رائیگاں تو ہرگز ہرگز نہیں جاتیں مگر ان کا صلہ کب اور کس شکل میں ملتا ہے یہ وہ اوپر والا ہی جانتا ہے۔

زندگی اور موت کا بھی وقت مقرر ہے۔ کبھی انسان ایک بڑی تکلیف کے ساتھ اسپتال کا رخ کرتا ہے اور چند ہی گھنٹوں میں صحت یاب ہو کر گھر واپس آ جاتا ہے۔ کبھی ایک ہلکی سی تکلیف کے ساتھ اسپتال پہنچتا ہے ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ اسے تو فوری بائی پاس کی ضرورت ہے۔ مجھے ابا جی کی وفات کے مناظر اکثر یاد آ جاتے تھے۔ وہ نارمل انداز میں اپنے پاؤں پر چل کر اسپتال میں داخل ہوئے تھے لیکن چل کر واپس نہ آ سکے۔ اسپتال میں چھوٹا بھائی ساجد اور میں آنے والے ماہ و سال میں ابا جی کی صحت، خصوصی دیکھ بھال اور خوراک وغیرہ کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرتے رہے اور اندر ڈاکٹر صاحبان دھیمی آواز میں ایک دوسرے کو بتاتے رہے کہ ایک دو دن کی بات ہے۔

جن دنوں میں بڑے بیٹے کے پاس جرمنی جانے کی سوچ بچار کر رہا تھا۔ معراج صاحب بیمار تھے پھر وہ آخری بار لاہور تشریف لائے۔ ان کی صحت کافی خراب ہو چکی تھی۔ یادداشت کے معاملات بھی تھے۔ انہیں دیکھ کر میں اور آفاقی صاحب بہت ملول ہوئے۔ مجھے بالکل یہی لگا جیسے خراب صحت کے باوجود وہ صرف اس لیے سفر پر نکلے ہیں کہ خوشگوار یادوں والی ان جگہوں کو ایک بار پھر دیکھ لیں۔

حساس دل معراج صاحب روایات اور ماضی سے بہت جڑے ہوئے شخص تھے۔ ایک مرتبہ میں نے سسپنس میں ایک کہانی گمشدہ مکان لکھی جس میں ایک شخص لوسٹلجیا کا انوکھا مظاہرہ کرتا ہے۔ صاحب ثروت ہونے کے بعد وہ اپنے ناپید ہو جانے والے چھوٹے سے آبائی گھر کو پھر سے دوبارہ اسی شکل میں تعمیر کراتا ہے۔ معراج صاحب کو کہانی پسند آئی۔ مسکرا کر کہنے لگے..... "ایک مرتبہ میرے دل میں بھی ایسی ہی خواہش مچلی تھی۔" تو میں بات کر رہا تھا ان کے آخری دورہ لاہور کی۔ محترمہ عذرا رسول بھی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ حسب معمول لاہور کے پی سی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ انہوں نے احباب سے ملاقاتیں کیں۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ معراج صاحب ہمارے گھر آ پائیں گے۔ تاہم ایک روز عذرا رسول صاحبہ نے مجھے بتا کر حیران کیا کہ وہ دوپہر کو ہماری طرف آئیں گے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ کسی دوسری گاڑی میں آئے تھے یا میں خود ہی انہیں لے کر آیا تھا۔ میری اہلیہ نے ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ایک طرف سے

بیگم عذرا رسول نے اور دوسری طرف سے میں نے انہیں سہارا دیا اور وہ بمشکل چل کر ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ وہ خاموش بیٹھے کھوئی کھوئی نظروں سے در و دیوار کو دیکھتے رہے۔ جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں آچکے ہیں۔ ان کے دیکھنے کے انداز سے دل ملول ہوا۔ وہ ہر چیز پر الوداعی سی نظر ڈالتے تھے۔ بیگم عذرا رسول ہر پل ان کے ساتھ تھیں۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی عذرا رسول صاحبہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ مجھے سن ٹھیک سے یاد نہیں لیکن وہ پھر دوبارہ کبھی لاہور نہ آسکے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد بہت برسوں تک محترمہ عذرا رسول بڑی لگن اور جانفشانی کے ساتھ معراج صاحب کی دیکھ بھال اور علاج کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتی رہیں۔ انہوں نے ایک زبردست مثال قائم کی۔

☆☆☆

بیٹا تو بیاہ جرمن میں سوفٹ ویئر انجینئر کے طور پر جاب کر رہا تھا۔ وہ کافی عرصے سے اصرار کر رہا تھا کہ میں اور اس کی امی جرمنی آئیں۔ میں کافی گھوم پھر چکا تھا مگر یورپ کا رخ ابھی تک نہیں کیا تھا۔ یہ 2008ء کا زمانہ تھا۔ ویزے کے سلسلے میں کافی سختی تھی۔ مجھے فکر تھی کہ پورے خاندان میں مشہوری تو ہو جاتی ہے کہ ہم جرمنی جا رہے ہیں..... لیکن اگر ویزا نہ لگا تو بڑی پشیمانی ہوگی۔

اہلیہ نے کہا۔ "آپ ہر وقت خاندان کا ہی سوچتے رہتے ہیں۔ کہانیاں لکھتے ہوئے بھی خاندان کی فکر لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

اور یہ بات کسی حد تک حقیقت بھی تھی۔ لکھتے وقت مجھے یہ فکر رہتی تھی کہ کوئی متنی تاثر دلانا واقعہ اتنا میرے اردگرد کے واقعات سے مشابہت اختیار نہ کر جائے۔ ایک حرفے کی بات یہ بھی ہے کہ میں اپنی کہانیوں میں بے شمار خوبصورت میل، فی میل ناموں سے اپنی اسی جھجک کی وجہ سے محروم ہوا۔ حتیٰ ہی نہیں ثبت کرداروں میں بھی میں وہ نام استعمال نہ کر سکا جو عزیز و اقارب میں موجود تھے۔ تو بات ہو رہی تھی جرمنی جانے کی۔ ہم میاں بیوی کا SCHENGEN ویزا لگ کر گھر آگیا تو ایک اور فکر لاحق ہوگئی۔ بیٹے کا کہنا تھا کہ آپ کو یورپ کے سارے اہم ممالک گھماؤں گا۔ مجھے تشویش یہ تھی کہ جگہ جگہ ایئرپورٹس پر ہمارا پالا کتوں اور خاکیوں وغیرہ کے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ لہٰذا میں نے بیٹے سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میں ٹھیک حالت میں جرمنی میں داخل ہو گیا تو وہاں جم کر بیٹھ جاؤں گا۔ فیرواپسی کے بارے میں بعد میں کچھ کرنے کی کوشش کی۔ میں سکون سے لکھنا چاہتا ہوں۔ بیٹے نے مسکرا کر ہامی بھر لی لیکن امدون خانے اس کا پروگرام ہمیں حیران کرنے کا تھا۔

یورپ میں داخل ہوتے وقت اکثر یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ امیگریشن کے مرحلے میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو جائے۔ پاسپورٹ پر اسٹیمپ لگانے والے آفیسر کی اسٹیمپ جب تک پاسپورٹ پر رضامندی کا بوسہ ثبت کرنے کے لیے حرکت میں نہیں آتی سانس سینے میں اٹکی رہتی ہے۔ فرینکفرٹ کے ائرپورٹ پر جو غیر ملکی لوگ اسٹیمپ لگوانے کے لیے ہم سے آگے کھڑی تھی۔ اس کی سانس بھی اٹکی ہوئی تھی۔ لہٰذا جب آفیسر نے اسٹیمپ لگائی تو اس نے خوش ہو کر واہیاتا چلانا شروع کر دیا۔ لباس بھی ایسا تھا جو اس کے ناچ کو مزید سنسنی خیز بنا رہا تھا۔ وہ خوش اتنی تھی کہ لگتا تھا کہ اپنے قریب ترین شخص کو گلے لگا لے گی..... اور قریب ترین میں ہی تھا۔ لہٰذا اہلیہ نے آہستگی سے میرا بازو کھینچ کر مجھے تھوڑا سا پیچھے کر لیا۔

بیٹا ہمیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ جلد ہی فرینکفرٹ اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہمارے روبرو تھا۔ نہایت شفاف فضا، تروتازہ اجلے چہرے، توانائی سے بھرے ہوئے متحرک لوگ۔ اگلے دو تین روز میں جرمن لوگوں کی شائستگی، شریف النفسی اور کام کی لگن نے دل میں گھر کر لیا۔ آخر الذکر صفت تو جوان جرمن خواتین میں زیادہ نظر آتی تھی۔ اور "کام" بھی وہ جس کے لیے اپنے ریاض الرحمٰن ساغر کہہ گئے ہیں..... ہو سکے تو میرا ایک کام کرو..... شام کا اک پہر میرے نام کرو۔ یہاں تو شام کی بھی کوئی اسکی تخصیص نہ تھی۔ جہاں بھی تھوڑا سا موقع ملتا تھا یہ خواتین اپنے ساتھی مردوں سے چونچ لڑانے لگتی تھیں۔ ڈھٹائی کا یہ چلن اتنا زیادہ تھا کہ اگر کوئی جوڑا اس طرح کی حرکات نہیں کرتا تھا تو یہی لگتا تھا کہ شاید طلاق وغیرہ لینے کے لیے عدالت جا رہے ہیں۔

جرمنی میں پیش آنے والے دلچسپ واقعات تو بہت سے ہیں۔ یہاں میں چند ایک ہی کا ذکر کروں گا۔ تیسرے چوتھے روز میں اکیلا ہی فرینکفرٹ کا اندرونی حصہ دیکھنے کے لیے نکل گیا۔ اہلیہ کو یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی کیونکہ اس نے جو کچھ سن رکھا تھا اس سے کچھ ایسا ہی تاثر پیدا ہوتا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں سرِ راہ تفریح ختم ہو چکے

ہیں اور نظری تقاضوں سے مجبور خواتین شکاریوں کی طرح ہر وقت گھات لگا کر اکیلے دکیلے مردوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ (بیٹے نے اپنی خیر و عافیت کی مثالیں دے کر بہت سمجھایا تھا۔ اہلیہ کا شک بیٹے کی کوشش اور میرے سابقہ ریکارڈ کے سبب کافی حد تک کم ہو چکا تھا لیکن بالکل ختم نہیں ہوا تھا) بہرحال شہر کی اندرونی گلیوں سے گزرتے ہوئے کسی نے گھات لگا کر مجھ پر حملہ نہیں کیا، البتہ ایک خوشگوار واقعہ ضرور ہوا۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ پاکستان سے ہزاروں میل دور اس شہر کی ایک تنگ سی سڑک پر ایک چھوٹی سی شاپ پر مجھے ناول دیوی کے رشتہ اور شائق کا ایک چاہنے والا مل جائے گا۔ اس کا ذکر شاید میں نے پہلے بھی کیا ہے۔ یہ صاحب غالباً دہلی پنجاب کے رہائشی تھے اور جاسوسی ڈائجسٹ پر دیوی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نام ذہن سے نکل گیا ہے۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ جس "دیوی" کا وہ مطالعہ کر رہے ہیں وہ پاکستان کے شہر لاہور میں بیٹھ کر میں ہی لکھ رہا ہوں تو وہ از حد حیران اور خوش ہوئے.....

جرمنی میں شہری، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ٹریفک کا نظام زبردست ہے۔ ایک ہفتے کی چھٹی کے بعد جب نوید تو آفس جانے لگا اور ہم میاں بیوی بذریعہ ٹرین ٹریفکفرٹ کے طول و عرض کو ناپنے لگے۔ ایک روز میں گروسری کے لیے اکیلا ہی ایک اسٹور پر گیا۔ تیس پینتیس برس کی ایک جرمن حسینہ دلنواز بڑی خوش دلی سے پیش آئی۔ اس نے اپنے اسٹور کے فروزن چکن کی بہت تعریفیں دیوار پر لگے اشتہار پر لکھ رکھی تھی۔ کچھ تو جرمن خاتون کی خندہ پیشانی اور کچھ مجھے چکن کی قیمت بھی نسبتاً کافی کم محسوس ہوئی۔ میں چکن لے کر خراماں خراماں رہائش گاہ پر پہنچا۔ اہلیہ شفیقہ چکن پکانے کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ بیٹا آدھمکا۔ اس نے چکن کی پیکنگ دیکھتے ہی روک دیا۔ پوچھا۔ "ابو جی، یہ کیوں لائے؟"

میں نے خندہ پیشانی کا ذکر تو نہیں کیا بس یہ بتایا کہ قیمت کم ہے۔

وہ بولا۔ "لیکن ابو یہ حرام ہے۔"

عقدہ کھلا یہ ترک اسٹور والا حلال چکن نہیں تھا لیکن یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ حرام سستا اور حلال مہنگا کیوں؟ بہرحال نوید نے وہ چکن "فرنچ پڈی" کو تھما دیا۔

دوسرے تیسرے روز اس اسٹور پر جانا ہو جاتا تھا۔ خوش نما خاتون کا نام ایلس تھا۔ رنگ ایسا تھا کہ لگتا تھا ذرا کھل کر دھوپ کی تو رخسار سے قطرہ ہائے انار جیسا سرخ رنگ بہہ نکلے گا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایک رائٹر ہوں اور میری اتنی کتب شائع ہو چکی ہیں تو وہ بہت متاثر اور بہت ہی زیادہ حیران ہوئی۔

"تو پھر آپ ان لیٹس میں کیوں رہ رہے ہیں؟" اس نے بہ زبان انگلش پوچھا۔

اس کے سوال سے لگ رہا تھا جیسے وہ کہنا چاہ رہی ہے کہ اگر آپ نے اتنی زیادہ کتابیں لکھ رکھی ہیں تو آپ کو کسی فائیو یا سیون اسٹار ہوٹل میں ہونا چاہیے تھا اور اپنے ذاتی جیٹ پر جرمنی آنا چاہیے تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ ملک عزیز میں قلم کاروں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ کتابیں چھاپنے والے اکثر پبلشر چند ہزار روپے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کتابوں پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے "دائم" کا لفظ ایجاد کر رکھا ہے دائمی حقوق..... یعنی جب تک اسرافیل صور نہیں پھونکیں گے اور قیامت برپا نہیں ہوگی یہ کتاب ان ہی کی رہے گی۔ یعنی حقوق کی منتقلی کے لیے قیامت ضروری ہے۔

میں دو تین بار مزید گروسری اسٹور پر گیا تو لگنے لگا کہ جرمن عورتوں کی گھات لگانے والی بات یکسر غلط بھی نہیں ہے۔ خاتون کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بس معمولی سی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اگر میں مسلمان ہونے کے باوجود "حرام" مرغی کھا سکتا ہوں تو اور بھی کافی گنجائش نکل آئیں گے۔ آخر میں نے اسے بتا دیا کہ وہ مرغی میں غلطی سے لے گیا تھا اور وہ ہم نے ایک غیر مسلم پڑوسی کو دے دی تھی۔ اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

اس کے بعد میں ایک طویل چکر کاٹ کر دوسرے گروسری اسٹور پر جانے لگا۔ تاہم ایک دن پھر ایک پارک میں اس سے ملاقات ہو گئی۔ ایک دوسری ہم عمر جرمن خاتون بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ تو کہیں دائیں بائیں ہو گئی اور ایلس میرے ساتھ ایک پتھریلے بنچ پر آن بیٹھی۔

اس نے کہا۔ "میں بھی ادب میں دلچسپی رکھتی ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے پوری ہیری پوٹر پڑھی ہے۔"

میں نے سوچا اگر ہیری پوٹر تحقیق ادب ہے تو پھر میں بھی بڑا ادیب ہوں۔

بولی۔ "میں کسی رائٹر کو اپنی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ اس کہانی پر زبردست سوشل فلم بن سکتی ہے۔"

وہ سوشل کہہ رہی تھی لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی

کہانی پر کسی "ور طرح" کی فلم بن جائے گی۔ پچھلے ایک سال میں وہ چار پانچ بندوں کے ساتھ ڈیٹنگ کر چکی تھی۔ اب بھی اس کی نیلگوں آنکھوں میں غور سے دیکھا جاتا تو بیئر کی بوتل اور ایک بستر بچھا ہوا نظر آتا تھا۔

گپ شپ کرنے کے بعد میں اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد ہم کئی روز کے لیے ارد گرد کے ممالک کی طوفانی یاترا کے لیے نکل گئے۔ یوں ایلس نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ "میں نے تہیہ کیا تھا کہ میں جرمنی سے باہر ہی نہیں نکلوں گا تاکہ یورپ کے مختلف ایئرپورٹس پر خجل نہ ہونا پڑے۔ تاہم یہاں آ کر پتا چلا کہ یہاں تو سرحدیں اتنی نرم ہو چکی ہیں کہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔ یورپ کی "یورریل" (ٹرین) پر بیٹھ کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک ہی مملکت خداداد کے مختلف شہروں میں جانا۔

ہمارے پاس چار ملکوں کا یورریل ٹکٹ تھے اور ہم یوں سرحدیں پار کر رہے تھے جیسے یہاں کے مرد و زن اپنی رومانی حدیں پار کرتے ہیں۔ نہایت آرام دہ ٹرینوں پر سفر کرتے ہوئے پتا ہی نہیں چلا کہ کہاں جرمنی کے کھیت اور میدان ختم ہوئے اور کہاں سوئٹزرلینڈ کے شروع ہو گئے۔ کم از کم ہمیں تو کہیں بھی چیکنگ وغیرہ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہم شام کے وقت سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورخ پہنچے تھے۔ کچھ دیر بعد ہوٹل کے سامنے پہنچے تو مسکراتے لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے بعد ہمارے عین سامنے سڑک پر آتش بازی شروع ہو گئی۔ ہم حیران ہوئے۔ میں نے اہلیہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جرمنی میں ناول ونڈی کے پرستار تک تو بات ہضم ہوتی تھی لیکن یہاں میری آمد پر اس طرح سے آتش بازی شروع ہو جائے کی یقین نہیں آ رہا۔"

اہلیہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔ "کہیں قذافی اسٹیڈیم میں کرکٹر عبدالقادر کی طرح ان بھولے بھالے لوگوں کو بھی تو کوئی غلط فہمی نہیں ہو گئی۔"

اب سامنے سڑک پر ہی نہیں ارد گرد ہر طرف آتش بازی ہونے لگی تھی۔ پورا شہر رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ بیٹے نوید کو بھی اس صورت حال کا بالکل علم نہیں تھا۔ اس نے ایک ناچتے گاتے جوڑے کو روک کر اس سے صورت حال دریافت کی تو پتا چلا کہ آج اگست کی پہلی تاریخ ہے۔ یہ سوئٹزرلینڈ کا قومی دن ہے۔ لوگ دور دور سے یہ شاندار فائر ورک دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ یہ ایک خوبصورت اتفاق ہی تھا کہ ہم عین اس بے مثال فائر ورک کے موقع پر یہاں پہنچے تھے۔

آتش بازی اتنی زیادہ تھی کہ پورا زیورخ دھوئیں کی لپیٹ میں نظر آتا تھا۔

زیورخ دھوئیں کی لپیٹ میں تھا اور زیورخ والے مستی و خود فراموشی کی لپیٹ میں۔ خاص طور پر نوجوان جوڑے تو اس قومی دن پر آزادی کا سو فیصد حق استعمال کر رہے تھے۔ میں نے بائیں جانب دیکھا، ایک جوڑا موجود تھا۔ لڑکے اور لڑکی کا درمیانی فاصلہ 40 فٹ کے قریب تھا۔ 4 سیکنڈ سے بھی کم وقت میں یہ فاصلہ 10 فٹ رہ گیا اور اگلے دو سیکنڈ میں زیرو ہو گیا۔ ہونٹوں کے درمیانی فاصلے بھی دیکھتے ہی دیکھتے زیرو پر آ گئے اور پھر منظر سے چلے گئے۔

میں نے منہ پھیر لیا اور پھر ترچھی نظروں سے اہلیہ اور بیٹے کی طرف دیکھا کہ کہیں انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔

زیورخ کے دو مناظر ہمیشہ یاد رہیں گے۔ رنگ و نور کے سیلاب اور آتش بازی کے دوران میں ایک نہایت خوبصورت "ٹرینگ وارڈن لڑکی" جو پوری یونیفارم میں سر پر کیپ جمائے ایک پول سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ کسی سوچ میں گم تھوڑی سی خوش تھوڑی سی اداس پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔ اور پھر اگلے روز کا وہ نہایت دلکش منظر جب مصروف جھیل زیورخ کے قریب سڑک کنارے چھوٹے چھوٹے سیبوں سے لدے ہوئے درخت ہلکی بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ایک نہایت خوبصورت درخت کو ہاتھ لگا کر میں نے دل ہی دل میں کہا تھا..... کتنے دلکش ہو تم..... کتنی بھینی خوشبو اٹھ رہی ہے تمہارے سراپا سے۔ میں اس گھڑی اس حسین موسم میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ کل میں یہاں سے آگے نکل جاؤں گا۔ پھر تمہیں کبھی نہ چھو سکوں گا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ اٹلی تھا۔ سیر و سیاحت اور تاریخی مقامات کی دید کے لیے روم سے بہتر کوئی جگہ تصور نہیں کی جاتی۔ یہ تمام تر تاریخی مقامات اتنے قریب قریب ہیں کہ انہیں دیکھنے کے لیے سواری کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ چل چل کر پیاروں کا حال برا ہو جاتا ہے۔ میرے سمدھی میں بلا کا درد تھا اور چل چل کر پاؤں جواب دے چکے تھے۔ پھر بھی خواہش تھی کہ کوئی قابل دید

مقام رہ نہ جائے .... کہ پتا نہیں پھر کبھی یہاں آنا ہوگا کہ نہیں۔ ابن انشاء نے اپنے سفرناموں میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے۔ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش بھی ہوتی رہی۔ کبھی کامیاب ہوئی کبھی ناکام۔

روم جیسا قابل دید شہر ہے۔ لڑکپن میں روم سے ہمارا تعارف بس اتنا ہی تھا کہ یہاں پر معروف فلم "فال آف دی رومن ایمپائر" بنی ہے۔ لاہور میں جگہ جگہ اس فلم کے پوسٹر آویزاں ہوتے تھے مگر ان دنوں فلم دیکھنا ہمارے لیے شجر ممنوعہ سے بھی آگے کی چیز تھی۔ میں بس پوسٹر دیکھتا رہتا تھا اور "فال آف دی رومن ایمپائر" کی خیالی کہانیاں ذہن میں بناتا رہتا تھا۔ ان دنوں میرا خیال یہ تھا کہ قتالہ عالم قلوپطرہ کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی وجہ سے رومن ایمپائر کا دھڑن تختہ ہوا۔ یہ بہت بعد میں پتا چلا کہ قلوپطرہ کا تعلق تو یونان سے تھا۔ اس نے دھڑن تختہ تو کیا تھا مگر یونان کا۔

ان دنوں اس انگریزی فلم کو دیکھنے کی "تڑپ" جیسی ایک اور تڑپ بھی میرے دل ناداں میں تھی اور وہ تھی عزیز اثری کا لکھا ہوا بچوں کا مشہور ناول "عالی پر کیا گزری" پڑھنے کی۔ اس ناول میں عالی پر تو جو گزری ہوگی۔ وہ گزر رہی ہوگی مجھ پر بہت کٹھن گزری۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب دل کو سمجھا لیا کہ جب کچھ بڑا ہو جاؤں گا۔ پر پرزے نکل آئیں گے اور لائبریری کی طرف سے کچھ رعایتیں بھی مل جائیں گی تو یہ دونوں کام ضرور کروں گا۔ عجب بات ہے کہ کبھی کبھی دیرینہ خواہشیں وقت کے ساتھ اپنی غیر معمولی کشش کھو دیتی ہیں۔ اب سب کچھ دسترس میں ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ فلم اور یہ ناول میں آج تک ملاحظہ نہیں کر سکا۔

اہلیہ اور بیٹے کے ساتھ روم میں گھومتے پھرتے مجھے جو چیز سب سے زیادہ یاد آئی وہ 1953ء کی شہرۂ آفاق فلم "رومن ہالیڈے" تھی۔ گریگری پیک اور آڈرے ہیپ برن کی یہ نیم مزاحیہ رومانی فلم دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک شہزادی محلاتی پابندیوں سے اکتا کر ایک عام لڑکی کے روپ میں سیر کے لیے نکلتی ہے اور ایک عام ہینڈسم نوجوان گریگری پیک کا ساتھ اس کو مل جاتا ہے۔ ایک دلچسپ کہانی شروع ہو جاتی ہے۔

اٹلی میں سے شمار قابل دید جگہیں ہیں۔ جن میں فلورنس، پیسا کا جھکا ہوا مینار اور صحراؤں کا شہر وینس بھی ہیں۔ ایک ارادہ ہمارا ارادہ دو روزہ قیام کا تھا۔ اٹلی کے پانچ چھ روز ہمیں بارس میں گزارنا تھے۔ مگر یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا جیسا بنکاک اور سنگاپور کے درمیان ہوا تھا۔ بنکاک میں ہیرا اور شمیم کا قیام مختصر اور سنگاپور میں زیادہ تھا مگر چونکہ قدرت کی طرف سے کرب آشنائی ناول کا لکھا جانا اور سون سے ملنا طے ہو چکا تھا لہٰذا ٹکٹوں کے سسٹم کی وجہ سے ترتیب الٹ گئی۔ یہاں وینس میں ترتیب الٹنے کا سبب بیٹے نوید کو لگنے والی ایک چوٹ تھی۔ وینس میں ہمارا ارادہ ہوٹل کے بجائے کیمپنگ سائٹ پر جانے کا تھا۔ کیمپ بھی ہمارے پاس موجود تھا۔ اس کے علاوہ تین سفری بیگ بھی تھے۔ نوید نے اوپر لٹکے دو سفری بیگ اپنی کمر پر لاد لیے تھے۔ ایک بیگ سامنے کی طرف لٹکایا تھا۔ میں نے اور اہلیہ نے اسے بہت منع کیا مگر وہ ہمیں زیادہ سے زیادہ سہولت دینے پر آمادہ تھا۔ کیمپ سائٹ کے قریب جب ہم بس سے اترے تو نوید کا پاؤں الٹا پڑا اور وہ کراہ کر سڑک پر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ شام ہو چکی تھی اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ہلکی دودھیا روشنی کا یہ حصہ کافی سنسان نظر آ رہا تھا۔ ہمیں یہی لگا کہ "ٹخنا" فریکچر ہو گیا ہے۔ سڑک پر ٹریفک بے انتہا تیز تھی۔ بمشکل سڑک پار کر کے میں دوسری جانب ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچا۔ فون پر مدد طلب کی۔ چند منٹ میں ہی پہلے پولیس کی کار متوقع پر پہنچی پھر ایک "آراستہ و پیراستہ" ایمبولینس آ گئی۔ ہمارے پاسپورٹ وغیرہ دیکھے گئے پھر نوید کو ایمبولینس میں سوار کر لیا گیا۔ ہم سے معذرت کی گئی کہ قانون قاعدے کے مطابق ہمیں اپنے طور پر اسپتال پہنچنا ہوگا۔ قریباً چار ہزار پاکستانی روپے کے مساوی کرایہ خرچ کر کے ہم متعلقہ اسپتال پہنچے۔ کچھ تاخیر ہوئی تاہم اٹالین ڈاکٹرز نے تفصیلی معائنہ کیا۔ فریکچر نہیں تھا لیکن سخت قسم کی موچ تھی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پانچ روز کے لیے وینس کے مہمان ہو گئے۔ نوید چونکہ کیمپ کے اندر "بیڈ ریسٹ" پر تھا لہٰذا مکمل ذمے داری مجھ پر آ گئی۔ اضافی توانائی پیدا ہوئی اور انگلش بھی رواں ہو گئی۔ وینس بہت خوب رہا۔ یہیں پر ناول "بن زندہ" کی داغ بیل بھی پڑی جو سسپنس ڈائجسٹ میں چھ اقساط کی شکل میں شائع ہوا۔

بارس کا پروگرام ہم نے ایک دو ہفتوں کے لیے مؤخر کر دیا۔ نوید چلنے کے قابل ہوا تو ہم واپس فرینکفرٹ (جرمنی) کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ہماری شاندار ٹرین آسٹریا سے بھی گزری۔ ہمیں آسٹریا میں رکنا نہیں تھا۔ ٹرین نے ایک جگہ ذرا سا اسٹاپ کیا تو میرا دل آسٹریا کی سرزمین پر پاؤں رکھنے کے لیے مچل گیا۔ میں نے ایک پاؤں

عالم فرین میں ہی رکھا۔ دوسرا پاؤں زمین پر رکھ کر کیمرے سے تصویر اتار لی۔ اب میں بڑے وقار سے سینٹ فرائیڈ سے کہہ سکتا ہوں کہ..... آپ کی نفسیاتی دماغی سے پوری طرح متفق نہ ہونے کے باوجود میں نے آپ کی جنم بھومی پر قدم رنجہ فرمایا تھا (ہمارے ایک پروفیسر فرائیڈ کو سپنوں کا سوداگر کہا کرتے تھے) برق رفتار ٹرینوں کے ایک طویل سفر کے بعد ہم واپس اپنے ہی کیمپ یعنی فرینکفرٹ میں پہنچ گئے۔ فرینکفرٹ جہاں ایک حرام موت خریدنے والی لغزش کے سبب ایک جرمن عیفہ کو ہمارے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

فرینکفرٹ میں ایک روز پھر ایلس سے ملاقات اسی چلڈرن پارک میں ہو گئی۔ اس مرتبہ اہلیہ بھی ساتھ تھی۔ لہٰذا مجھے وہی تحفظ محسوس ہوا جو موٹر سائیکل سوار کو ہیلمٹ پہننے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ ویسے بھی شاید اس نے پھر کہیں ڈیٹ پر جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ڈنک تیز نظر نہیں آتا تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ تاہم وہ گرم جوشی سے ملی اور ایک چوبی بینچ پر بیٹھ کر ہم سے دیر تک باتیں کرتی رہی۔

کہنے لگی۔ ''حیرت ہوتی ہے کہ ایک کنگ کی غلطی کی وجہ سے انگریزوں نے آپ کے ملک پر دو سو سال حکومت کی''

''وہی کنگ جوہان گیر۔''

''جوہان گیر؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

کافی دیر بعد سمجھ میں آیا کہ وہ جہانگیر کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''غلطیاں تو اس نے بے شک کی تھیں لیکن آپ کون سی غلطی کا ذکر کر رہی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''رائٹر ہو کر آپ کو معلوم نہیں۔ کنگ جوہان گیر کی بیٹی بیمار تھی۔ شاید..... شاید..... وہ چھوٹی عمر میں پریگننٹ ہو گئی تھی۔ مقامی جادوگروں نے اسے مزید بیمار کر دیا۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے اس کی بیٹی کو ٹھیک کیا۔ کنگ جوہان گیر نے خوش ہو کر کہا کیا مانگتے ہو۔ اس نے کہا۔ میرے ملک کے لوگوں کو تجارت میں مشکل ہے۔ آپ یہاں سے اپنے ملک میں ہمیں کچھ گودام اور کوٹھیاں بنانے کی اجازت دیں۔ کنگ نے اجازت دی۔ اس اجازت کی وجہ سے آہستہ آہستہ سارا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''تاریخ کے صفحات پر یہ واقعہ موجود ہے لیکن یہ جو آپ نے پریگننٹ ہونے والی بات کی ہے۔ ایسا آپ کے ملک میں ہی زیادہ تر ہوتا ہے۔ اس واقعے کے مطابق شہنشاہ جہانگیر کی وہ نصفی سی بیٹی اپنی سالگرہ کے موقع پر ایک خوش رنگ فراک پہن کر اٹھلاتی پھرتی تھی۔ ایک شعلہ ان سے فراک کو آگ لگی اور وہ جھلس گئی اور اس کا علاج جادوگروں نے نہیں مستند مقامی معالجوں نے کیا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آپ اپنی غلطیاں درست کریں۔''

''سوری..... سوری۔'' اس نے کئی بار کہا اور شرمندہ نظر آئی۔

کچھ دیر بعد ایلس کا کوئی ملنے والا آ گیا اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ جینا بھی آئس سے آ گیا تھا۔ اہلیہ اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔ اگست کی خوشگوار دھوپ میں نرم گھاس پر لیٹ کر میں گہرے نیلے آسمان کو تکنے لگا۔ یونہی میرا ذہن مجھے کئی سو سال پیچھے دور جہانگیری میں لے گیا۔ میں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک جملے کے لیے 12 ماہنامہ رسالے (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 30,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

0333-5498777
0301-2454188
0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

موحدین

وہ لوگ جو بت پرستی چھوڑ کر خدا پر ایمان لائے تھے اور اپنی سمجھ و فہم کے مطابق عبادت خدا کرتے تھے۔ ان میں سے مشہور اشخاص یہ ہیں۔ قیس بن ساعدہ، واقد بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، اور زید بن عمر بن نفیل، موحد کا اطلاق ایسے مسلمان پر بھی ہوتا ہے جو توحید کا قائل ہو اور سوائے اللہ کے، اپنی حاجت کے لیے کسی اور سے رجوع نہ کرتا ہو۔

مرسلہ: ثنا بتول، کراچی

سوچنے لگا..... واقعی کبھی کبھی تاریخ کو بدل دینے والے بڑے بڑے واقعات کی ابتدا ایک چھوٹے سے واقعے سے ہوتی ہے۔ اگر شہنشاہ کی کسی ننھی سی عزیزہ کے لبادے کو آگ لگنے والا واقعہ درست تھا تو وہ کیا لمحے ہوں گے جب کنیزوں اور عزیزوں کے جھرمٹ میں وہ چنچل بچی خوشی میں جھومتی ہوئی سی شمعدان کی طرف جا رہی ہوگی۔ کوئی بڑا اسے جھپٹ کر پیچھے ہٹا دیتا، یا آواز دے کر روک لیتا..... "ٹھہر جاؤ..... آگے مت جاؤ۔"

ہاں آگے مت جاؤ..... تمہارے آگے جانے سے ایک طویل اور دردناک کہانی شروع ہو جائے گی۔

☆☆☆

پیرس میں دو تین دن گزار کر ہم واپس پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اب پھر ہم تھے اور ہمارا پیارا راج دلارا لاہور تھا۔ یورپ و دیگر ترقی یافتہ ممالک سے واپس آنے والے جب اپنے ملک عزیز میں پہنچتے ہیں تو انہیں اکثر سب کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آتا ہے۔ گرد آلود اور کھڑکھڑاہٹ کی آواز دیتا ہوا۔ جہاں جہاں پہیا حرکت میں ہوتا ہے، ڈچکوں ڈچکوں کی صدائیں بھی آتی ہیں۔ لیکن یہ بدد ماغی صرف ایک آدھ دن ہی رہتی ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ٹھیک اور عین درست لگنے لگتا ہے۔

پھر ایک مسئلہ نیند کا بھی ہوتا ہے جو وقت پر نہیں آتی اسے "جیٹ لیپ" کہا جاتا ہے۔ نیند کا وقت بیرونی گھڑیوں کے مطابق سیٹ ہو چکا ہوتا ہے۔ اسے مقامی اوقات میں آتے آتے کچھ دیر لگتی ہے۔

ایک روز صبح گیارہ بجے تک سونے کے بعد میں جاگا تو عاطف آ گیا۔ بال الجھے ہوئے۔ آنکھیں سرخ، لباس بے ترتیب۔ وہ ایک بار پھر طویل ہجر کی زد میں تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ اس عمر میں ہی دل کا مریض بن جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "دل کے مرض کا تو مجھے پتا نہیں لیکن تمہاری دماغی صحت بھی کچھ اچھی نہیں لگتی۔ یار سنبھالو اپنے آپ کو۔ جو کام ہو نہیں سکتا، اس کے لیے خود کو ہلکان کرنے سے کیا حاصل؟ نہ تم اپنی بیوی بابرہ کو چھوڑ سکتے ہو نہ وہ اپنے شوہر جمشید کو چھوڑے گی۔"

اس نے صوفے پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ دکھی آواز میں گنگنانے لگا۔

"خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں..... تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں رہتی ہے سینے میں۔"

میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "یار کتنی اچھی آواز ہے تمہاری۔ جیسے فٹ بال کو خیر آباد کہا۔ اب گلوکاری کو بھی کہہ رہے ہو۔ تمہارا صوفیانہ کلام اور غزلیں آہستہ آہستہ پسند کی جانے لگی تھیں۔ لوگ تو اپنے روحانی صدموں کو اپنے فن میں سمو کر اسے نکھار دیتے ہیں۔ تم فن سے بھی دور ہو رہے ہو۔"

"میں نہیں بچ سکتا اس کے دکھوں کو۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

"مجھے لگتا ہے تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

وہ بولا۔ "کبھی کبھی تو دل کرتا ہے، جب این سی سی میں تھا تو گنڈا سنگھ والے بارڈر پر ہی کہیں جنگ میں جان دے دی ہوتی۔" وہ اٹھ کر چلا گیا۔

حورین اب لاہور میں ہی تھی۔ میں کبھی کبھی بازار میں اسے آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہی ملگوتی چہرہ، لمبی، بھاری پلکیں، وہ چادر یا شال میں ہوتی، کمر بالکل سیدھی رکھ کر بڑے باوقار، بھرانگیز انداز میں چلتی۔

حورین اور عاطف کے درمیان تین چار مہینے اسی نہج تعلق میں گزر گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید حورین بھی اب پوری تندہی سے اپنا ٹوٹا گھر بچانے میں لگ گئی ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ وہ شوہر کے سامنے کوئی سخت نوعیت کی قسم بھی کھا چکی تھی۔ مگر پھر بھی کسی وقت مجھے نجانے کیوں لگتا تھا کہ بھی یہ کہانی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ ہجر کے پہلے دو تین طویل موسموں کی طرح یہ موسم بھی کوئی نہ کوئی کروٹ لے گا۔

حورین کی چھوٹی بہن ندا اور عاطف کے چھوٹے بھائی

ایاز والے معاملے کا مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا۔ تاہم میرا خیال یہی تھا کہ ان کا تعلق یکسر ختم نہیں ہوا ہے۔ کم از کم کبھی کبھار کا ٹیلیفونک رابطہ تو ہے۔

اکتوبر کے خوشگوار دن شروع ہو چکے تھے۔ عاطف شمالی علاقوں میں نجانے کہاں کہاں گھوم پھر کر دو روز پہلے ہی واپس آیا تھا۔ ایک دن اپنے گھر کی چھت پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اشارہ کیا اور میں اس کے گھر چلا گیا۔ اس کی بیوی بارہ بیکے گئی ہوئی تھی۔ ہم چھت پر دیر تک باتیں کرتے رہے اس کی ایک بات نے مجھے حیران کر دیا۔ بولا۔ "ایاز (چھوٹے بھائی) نے کل ایک بات بتائی ہے۔ اسے یہ بات ندا سے معلوم ہوئی ہے۔ ندا نے بھی شاید اپنے گھر میں چوری چھپے یہ گفتگو سنی ہے۔ حورین آج کل جمشید سے مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ اس سے دوبارہ نکاح کرے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں عاطف کا منہ تکنے لگا۔

"بس کچھ ایسا ہی ہے۔ جو کچھ ندا نے سنا اس کے مطابق تو جمشید اس کی بات کو ہلکا لے رہا ہے مگر وہ اصرار کر رہی ہے۔"

"دوبارہ نکاح والی بات مجھ میں تو نہیں آئی..... لیکن وہ کہتی کیا ہے؟"

"بس یہ کہ کسی سے بات کرتے ہوئے میرے منہ سے بے ساختہ کوئی کفریہ بات نکل گئی ہے..... اور کہتے ہیں کہ اس سے نکاح ختم یا مشکوک ہو جاتا ہے....."

اب بات میری سمجھ میں آ رہی تھی اور شاید کسی حد تک عاطف کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ وہ جمشید کے سامنے ڈھکی چھپی بات کر رہی تھی۔ جمشید کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ عاطف کے ساتھ حورین کے ڈھکے چھپے مراسم ہیں لیکن یہ کس درجے پر پہنچے ہوتے ہیں اس کا اسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا..... مگر حورین کو تو معلوم تھا (وہ دونوں اپنی ملاقاتوں میں گھنٹوں تک لب و رخسار کے معاملات میں مصروف رہتے تھے) اور یقیناً یہی بات اب حورین کے دل و دماغ کا بوجھ بن رہی تھی۔ یہ بات اب واضح تھی کہ وہ دو حصوں میں بٹی ہوئی عورت ہے۔ ایک طرف خوف خدا دوسری طرف ایک سخت غیر اخلاقی تعلق۔ اب یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو بات کہہ رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کی خلش دور کرنا چاہتی ہے۔

یہ بات معلوم ہونے کے بعد مجھے یوں لگا کہ میرے ذہن میں جو خیال تھا کہ شاید ایک بار پھر حورین ٹوٹ جائے گی اور عاطف سے رابطہ کرے گی، غلط تھا۔

کیا کہیں..... انسان ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ جن قارئین نے سسپنس میں شائع ہونے والا ناول پرواز پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ناول کی ہیروئین بار بار کس طرح بھٹکتی اور سنبھلتی رہی ہے۔ کبھی کوئی مجبوری، کبھی کوئی مصلحت، کبھی کوئی جواز اس کی واپسی کی وجہ بن جاتے تھے۔

☆☆☆

سردیاں گزر چکی تھیں۔ اپریل مئی کے نیم گرم خوشگوار دن تھے۔ میں نے بھائی ساجد اور ایک کزن کے ساتھ مل کر مری میں ایک فلیٹ خرید رکھا تھا۔ خوبصورت گروپ پیش تھا۔ سسپنس اور جاسوسی کی کئی کہانیاں میں نے اسی فلیٹ کی کھڑکی میں بیٹھ کر لکھیں۔ ایک طرف سرسبز وادی، دوسری طرف مری کی آبادی کی رنگین مخروطی چھتیں۔ سامنے ہی وہ ڈھلوانیں تھیں جن پر ماضی کی اکثر فلموں کی شوٹنگ ہوتی رہی تھیں۔ کسی وقت تصور میں وحید مراد، شمیم آرا، زیبا، محمد علی وغیرہ کو چیڑ کے بلند درختوں میں جھومتے گاتے دیکھتا..... اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم..... اور پھر..... موسم حسین ہے لیکن تم ساتھ نہیں ہے۔

اس فلیٹ کو ہم نے بڑے اچھے طریقے سے استعمال کیا۔ کیونکہ استعمال کرنے والے تین فیملیاں تھیں۔ ورنہ تو ایسے فلیٹ سال میں آٹھ نو مہینے خالی پڑے رہتے ہیں (مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ایک مرتبہ سے ڈی پی سے تعلق رکھنے والے احباب بھی اس فلیٹ میں ایک دو روز ٹھہرے تھے)

میں مری میں تھا۔ عاطف کی حالت پتلی تھی۔ میں نے اسے بھی چند روز کے لیے مری بلا لیا تھا۔ میں اسے مسلسل سنبھالنے بچانے میں لگا رہتا تھا۔ ایک روز وہ فلیٹ کی بالکونی میں گم صم بیٹھا تھا۔ اچانک میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ اس کی نگاہ اپنے موبائل کی اسکرین پر تھی۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ آج تقریباً تقریباً دس ماہ کے بعد پھر حورین کا فون آیا ہے۔ میں عاطف کے پاس جا بیٹھا۔ اس کے کان سے اپنا کان لگا دیا۔ فون پر وہ رو رہی تھی۔ عاطف بھی آبدیدہ تھا۔ حورین کی روہانسی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "عاطف! مجھے لگتا ہے کہ ایک دم سب کچھ ختم ہو جانا ہے۔ نہ ہم اپنے لیے کچھ کر سکے..... نہ ایاز اور ندا کے لیے کچھ کر سکیں گے۔"

کچھ دیر تک ان کے درمیان جذباتی مکالمہ ہوا۔ ایک

موقع پر عاطف نے کہا۔ ''حورین! بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں، جو کچھ کر سکتا تھا کر تا رہا ہوں اور..... اب بھی کر رہا ہوں۔''

وہ بوجھل غمناک لہجے میں کہنے لگی۔ ''نہیں عاطف! شاید آپ ایسا نہیں کر سکے اور اس میں ایسا غلط بھی کیا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے بڑی بہن ایسی ہے تو چھوٹی بھی ایسی ہی ہوگی۔'' پھر وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ ''عاطف میں نہیں تھی ایسی..... مجھے آپ نے ایسا کر دیا..... اور شاید..... کچھ حالات نے کر دیا۔''

حالات سے حورین کی مراد غالباً جمشید کے حالات سے ہی تھی۔ جس نے اپنی کم شکلی اور اپنے چھوٹے سے جسمانی نقص کو اپنا نفسیاتی مسئلہ بنایا تھا اور کج رویاں اختیار کی تھیں۔ یہ بہت لمبا موضوع تھا۔

رات کو پھر دونوں تادیر، فون پر گفتگو میں مصروف رہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔ ''محفل سوز بھیں بنا لیتی ہے۔'' یہاں بھی بظاہر حورین نے عاطف سے دوبارہ رابطے کے لیے ایاز اور ندا کو ہی جواز بنایا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ سب ختم ہو جائے انہیں ان دونوں کے لیے ایک کوشش اور کر لینی چاہیے۔ اب یہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے کہ حورین کی اس بات کے پیچھے اس کی اپنی طلب بھی شامل تھی یا نہیں۔ ہاں یہ بات وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ ''عاطف میں نے اپنے لیے تو رابطہ نہیں کیا۔ میں ایاز اور ندا کا دکھ نہیں دیکھ سکتی۔''

خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا تھا۔ نامہ و پیام پھر شروع ہو گیا تھا۔ تاہم وہ مسلسل کہہ رہی تھی۔ ''عاطف..... اب ہم دوبارہ اس راستے کی طرف نہیں جائیں گے جسے چھوڑ چکے ہیں۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دیا۔''

ہم بدستور مری میں تھے۔ حورین کا کہنا تھا کہ وہ اور جمشید بھی فیملی کے ساتھ مری آ رہے ہیں۔ وہ ندا کو بھی لائے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں پر رازداری سے ندا اور ایاز کی ایک تفصیلی ملاقات کرائی جائے تاکہ وہ دل کے پھپھولے پھوڑ سکیں اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حورین، عاطف سے بھی کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی والدہ کو کسی بھی طرح رام کرنے کی کوشش کرے۔

میں سمجھتا ہوں عاطف اس حوالے سے ڈبل مائنڈڈ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان دونوں کی تائید کر سکتا ہے۔ ان دونوں کو سہولت فراہم کر سکتا ہے، باقی جو کرنا ہے ندا اور ایاز نے خود کرنا ہے۔ اگر ان کی محبت میں طاقت ہے تو اپنا آپ منوا لے گی۔ اسی تناظر میں چند روز بعد مری کے ہی ایک فیملی ریسٹورنٹ میں عاطف نے اپنے بھائی ایاز اور ندا میں ایک طویل ملاقات کرائی۔ کچھ دیر کے لیے اس ملاقات میں حورین خود بھی شریک ہوئی تھی۔

اس ملاقات کے بعد کم از کم میں نے تو یہ نتیجہ نکالا کہ ایاز اب کسی حد تک سنبھل چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ ماں کو سخت دکھ دیے بغیر وہ ندا کو نہیں اپنا سکتا۔ اور یہی بات ہے کہ دوسری طرف ندا کی محبت میں بھی کوئی غیر معمولی شدت نظر نہیں آئی تھی۔ شاید وہ جدائی اور ملاپ دونوں کے لیے کسی حد تک تیار ہوتی جا رہی تھی۔ عاطف نے لاہور واپس جا کر حورین کی خاطر ایک دو بار اپنی والدہ (آنٹی راحیلہ) کو منانے کی کوشش کی مگر حسب سابق کامیاب نہ ہوا۔ اس کوشش کے دوران حورین اور عاطف کے ٹیلیفونک رابطے بحال ہو چکے تھے۔

حورین بھی سلسلہ وار کہانی کو بڑی شوق سے پڑھتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ اکثر عاطف سے کہتی تھی۔ ''طاہر بھائی سے کہیے گا، آخر میں رستم اور شانی کو جدا نہ کریں۔''

عاطف نے کہا۔ ''طاہر کی مرضی ہے اور کہانی کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ ہاں میں نے ایک دن اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر کسی کو پھانسی دینی ہو یا قربان کرنا ہو تو پہلے اسے تھوڑا سا پیار تو پلا ہی دیتے ہیں۔''

ایک طرح سے عاطف اس بات کے پردے میں اپنی ہی بات کر رہا تھا۔ حورین اب تعلق ختم کرنے پر مصر تھی جب کہ عاطف کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہی ہے تو ایک آخری بار وہ اس سے مل لے..... بس آخری بار۔

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ آخری بار شاید نہیں آئے گی..... البتہ کسی وقت لگتا تھا کہ ہو سکتا ہے آ بھی جائے۔

میں نے ایک دن عاطف سے پوچھا۔ ''وہ پھر سے نکاح کرنے والی بات کیا تھی؟ کبھی پوچھا ہے حورین سے اس بارے میں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں..... میں یہ بات چھیڑ کر کسی نئی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے اندر بہت کچھ ہے لیکن اندازہ یہی ہوتا ہے کہ یہ نکاح کی تجویز دل کی بات فی الحال سرد خانے میں ہی ہے۔''

انہی دنوں کی بات ہے، ہماری عمارتی لکڑی کی دکان واقع شاہ نور پر اوپر تلے دو اہم واقعات پیش آئے۔ دکان کے اوپر میں نے لکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا دفتر بنا رکھا تھا

سلسلہ سر گزشت

سہ پہر کے وقت وہاں بیٹھا تھا کہ شور بلند ہوا۔ نیچے دیکھا تو دکان کا گیٹ بند ہو چکا تھا اور سلاخ دار گیٹ کے باہر بیسیوں افراد جمع تھے۔ پتا چلا کہ ایک خطرناک دیوانہ کتا کچھ لوگوں کو کاٹتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ اور اب ہماری دکان میں گھس کر کافی اندر گودام کی طرف چلا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ گیٹ اس لیے بند کیا گیا تھا کہ کتا باہر نہ نکل پائے۔

دیکھتے ہی دیکھتے گیٹ سے باہر بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ یہاں سڑک پر اکثر ظلموں کی شوٹنگ وغیرہ ہوتی رہتی تھی۔ دو چار دن پہلے ہی ہدایتکار حسن عسکری ملتان روڈ پر دھواں دھار قسم کی شوٹنگ کرتے نظر آئے تھے۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید پھر کوئی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

میرے چھوٹے بھائی حمید اللہ نے چھت کے روشن دان میں سے گودام کے اندر کتے پر کافی نزدیک سے کئی فائر کیے۔ مجال ہے کہ کسی فائر نے اسے چھوا تک بھی ہو۔ اسی اثنا میں ایک پولیس موبائل وہاں پہنچی۔ اہلکاروں نے سمجھا شاید کوئی واردات ہے۔ رائفلیں سنبھالتے ہوئے نیچے اترے مگر جب انہیں بتایا گیا کہ ایک خطرناک کتا اندر گھسا ہوا ہے تو اہلکاروں کے تنے ہوئے سینے، ڈھیلے پڑ گئے اور وہ دم دبا کر نکل گئے۔ سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ دکان کا اگلا احاطہ چھت کے بغیر تھا۔ سب لوگ لکڑی کے پھاٹکوں کے پیچھے اور کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ کتا اب گودام کی نیم تاریکی سے نکل کر دکان میں یہاں وہاں چکرا رہا تھا۔ ایک سادہ سا دیہاتی ترکھان جسے ہم نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ بڑی دلیری کے ساتھ جسیم کتے کے مدمقابل آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لمبا لکڑی تھی اور ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ نظریں سرخ آنکھوں والے کتے پر مرکوز تھیں۔ بڑی دلیری اور حاضر دماغی کے ساتھ اس نے کتے کے سر پر دو طوفانی ضربیں لگا کر اسے ڈھیر کر دیا۔ بعد میں ایک گولی داغ کر اسے ختم کیا گیا۔ اس سادہ سے دیہاتی نوجوان کی وہ دلیری آج تک ذہن پر نقش ہے۔

دوسرا واقعہ اسی جگہ پر کچھ عرصہ بعد کا ہے۔ دکان پر کام کرنے والے تین چار ملازمین میں سے ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا ایک بیوہ عورت کا تھا۔ اچھا بھلا رندا مشین پر کام کر رہا تھا۔ قضا اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ اسے کرنٹ لگا اور موقع پر ہی نیم جان ہو گیا۔ فوری طور پر اسے شاہ نور سے ریواز گارڈن کے اسپتال میں پہنچایا گیا۔ وہاں پہنچنے کے فوراً بعد وہ دم توڑ گیا۔ میں اپنی کسی تحریر کے لیے ریفرنس وغیرہ اکٹھے کرنے کے لیے پنجاب پبلک لائبریری گیا ہوا تھا۔ میں کبھی کبھار نفلی روزہ رکھ لیتا تھا..... اس دن بھی روزے سے ہی تھا۔ سہ پہر کے وقت واپس آیا تو بڑے ابا جی (تایا جی) نے بتایا کہ شاہ نور والی دکان پر یہ سنگین حادثہ ہو گیا ہے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ "لاش اسپتال میں ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ ابھی تک کوئی وہاں گیا نہیں۔ تم پتا کرو جا کر۔"

میں چوبرجی سے گزر کر اسپتال پہنچا۔ دل غم سے بوجھل تھا۔ لڑکے کی ڈھکی ہوئی لاش اسٹریچر پر پڑی تھی۔ تاہم وہاں کا ماحول مجھے کچھ عجیب لگا۔ موقع پر موجود لوگ اور اسپتال کا عملہ وغیرہ سب مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وجہ وہی تاخیر تھی جو ہمارے یہاں پہنچنے میں ہوئی تھی۔ "تمہارا ملازم تھا؟" ایک ڈاکٹر نے نہایت کڑوے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں..... ہماری ہی دکان پر کام کرتا تھا۔"

"تو مار کر بھیج دیا یہاں۔ تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ کسی نے یہاں آ کر خبر تک نہیں لی بدنصیب کی۔"

میں نے کہا۔ "میں موقع پر موجود نہیں تھا۔ کہیں باہر سے آیا ہوں....."

میرے گرد مشتعل لوگوں نے گھیرا سا ڈال لیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو یہی محسوس ہوا کہ دو چار بندے مجھ پر پل پڑیں گے۔ یکا یک ایک ڈاکٹر صاحب نے مشتعل افراد کو اپنے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا۔ "نہیں نہیں..... یہ ٹھیک نہیں۔" انہوں نے انہیں روکا۔ پھر مجھے دکان پر فون کرنے اور باقی ذمے دار افراد کو بلانے کے لیے کہا گیا۔

آج بھی سوچتا ہوں کہ مجھ پر حملہ ہونے میں بس ذرا سی کسر ہی رہ گئی تھی۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ دوپہر کے بعد روزہ دار کے چہرے پر ایک خاص قسم کی نرمی، لطافت اور انکساری نظر آنے لگتی ہے۔ شاید میرے چہرے پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیات تھیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے دل میں میرے لیے ہمدردی کے جذبات ابھارے اور انہوں نے مجھے کسی بری صورت حال سے بچایا۔

پولیس نے جائے وقوع کا معائنہ کیا۔ یہ ان کا روزمرہ کا کام ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی جھوٹ سچ کی تمیز کر لیتے ہیں۔ کرنٹ لگنا نادر ہوتا تھا۔ بہرحال اس ناگہانی موت نے ہم سب کو بے حد دکھی کر دیا تھا۔ بیوہ ماں کا اکلوتا بچہ اس حادثے

پی سی بروا نے دیوداس بنا کر پورے برصغیر میں دھوم مچادی تھی۔ سہگل کی البیلا اداکاری اور پرسوز گیتوں نے اس فلم کی مقبولیت میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ برصغیر میں ان دنوں جہاں جہاں فلمیں بنائی جاتی تھیں اور وہاں کی فلم انڈسٹری کے جتنے بڑے اور اہم لوگ تھے سب نے اس فلم کی دل کھول کر تعریف کی تھی مگر بروا کے معاون ہدایت کار اور معاون نوجوان بمل رائے اس فلم سے مطمئن نہیں ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ پی سی بروا نے شرت چندر چٹرجی کی اصل کہانی میں کئی تبدیلیاں کی تھیں اور اسے غم و اندوہ کی انتہاؤں تک لے گئے تھے۔ اسی طرح سہگل کی البیلا اداکاری اور پرسوز گیتوں نے ناظرین کے دلوں میں زندگی سے مایوسی کے جذبات پیدا کردیے تھے۔ اس فلم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور فوٹوگرافر بمل رائے نے اسی وقت یہ ارادہ کرلیا تھا کہ جب بھی انہیں آزادانہ کام کرنے کا موقع ملے گا وہ دیوداس کو ناول کی روح کے مطابق بنائیں گے۔

جب تک نیو تھیٹرز قائم رہا بمل رائے اس ادارے سے وابستہ رہے اور اس کی فلموں کے لیے بطور ہدایت کار اور عکاس کام کرتے رہے۔ جب نیو تھیٹرز بند ہوگیا تو وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں اپنا ذاتی فلمساز ادارہ بمل رائے پروڈکشنز قائم کرکے حقیقت سے قریب تر فلموں کی تخلیق شروع کردی۔ دیو کی بوس' کیدار شرما اور رشی کیش مکرجی جیسے عہد ساز تخلیق کار اس دور میں بمل رائے کے ساتھی تھے۔ جبکہ ایک پنجابی نوجوان سمپورن سنگھ گلزار نے بمل رائے کی شاگردی اختیار کرکے بنگال کے حقیقت پسندانہ انداز کی شمع فروزاں رکھی۔

1955ء میں بمل رائے نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے شرت چندر چٹرجی کے ناول "دیوداس" کو اس ناول کی روح کے مطابق فلم کا روپ دیا اور اس کے مرکزی کردار میں دلیپ کمار' وجنتی مالا' موتی لال اور سوتی لال کو پیش کیا۔ مکالمے ساحر لدھیانوی اور گلزار سے لکھوائے۔ گیت ساحر لدھیانوی سے اور موسیقی کے لیے سچن دیو برمن کی خدمات حاصل کیں۔ "دیوداس" سے پہلے وہ "ماں" (1952ء) دو بیگھہ زمین (1953ء) پری نیتا (1953ء) برج بہو (1954ء) بنا چکے تھے۔ بمل رائے کی "دیوداس" کا موازنہ اصل ناول اور اس پر بنی دیگر فلموں سے کیا جائے تو یہ بروا اور بھنسالی کی فلموں سے

نے نکالا تھا۔ متوفی کے ورثا کو ہم پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے کوئی قانونی مشکل پیدا نہ کی۔ ہم نے بھی جو بن پڑا بیوہ کے لیے کیا۔ جانے والوں کو کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ نہ جان کی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ بہرحال یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہوگیا۔ قدرتی حادثے زندگی کا حصہ ہیں۔ اس خاتون نے بعد ازاں زندگی کا سہارا تلاش کرتے ہوئے شادی بھی کرلی تھی۔

زندگی کو پریشانیوں، حادثوں اور ناگہانی آفات سے دور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ کافی عرصہ پہلے کا ایک واقعہ ضرور بیان کرنا چاہتا ہوں جس نے دل و دماغ پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا۔ عاطف اور حورین کے الوکھے تعلق نے مجھے بھی بری طرح ڈسٹرب کررکھا تھا۔ اس خدا کے بندے نے جیسے قسم کھارکھی تھی کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اور پریشانی بھی مجھ سے شیئر ضرور کرے گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ایک موقع پر حورین کے شوہر جمشید نے باہر ہوکر ساؤتھ اسٹوڈیو میں توڑ پھوڑ کی تھی بلکہ ہیجانی کیفیت میں عاطف کا گلا دبانے کی ادھوری سی کوشش بھی کرڈالی تھی۔ اب بھی وہ بچ پائی نظر آتا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ ڈرنک وغیرہ بھی کرلیتا تھا۔ مجھے اندیشہ رہتا تھا کہ وہ پھر کہیں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرے۔ خیر اس حوالے سے تو خیریت ہی گزری تاہم ایک روز میں نے اسے باغوار سے گزرتے دیکھا۔ وہ ہلکی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ اپنی سوزوکی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً اندیشہ جاگا کہ کہیں وہ پھر عاطف کے ساتھ تو نہیں لڑ پڑا۔ میں نے فوراً عاطف کو فون کیا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

عاطف نے کہا۔ "اس نے خود ہی ہاتھ زخمی کیا ہے۔ حورین نے بتایا ہے مجھے۔"

"کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... تمہیں پتا ہی ہے، کسی بھی وقت باہر ہوجاتا ہے۔ رات کو اس نے حورین کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ دیا۔ اس کی سانس بند ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے جان چھوڑی۔ بعد میں خود ہی بہت شرمندہ ہوا۔ چاقو کے تالے سے چوٹیں لگا کر اپنا ہاتھ زخمی کرلیا۔" (وہ حورین کے لیے تشدد والی عمل کو کبھی کبھی اسی طرح تکلیف دہ اور ناخوشگوار بنا دیتا تھا)

حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ شروع شروع میں اس نے خود ہی عاطف اور حورین کے میل جول کو راہ دی تھی اور

پدر جہا بہتر ہے۔ بروا کی دیوداس سے ناظرین کے دلوں میں زندگی سے مایوسی کے جذبات پیدا ہوتے تھے جبکہ بمل رائے نے فلم کا اصلاحی پہلو کامیابی سے ابھارا۔ ناظرین کے دلوں میں دیوداس' پارو اور چندر مکھی کے کرداروں سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے کہ کاش دیوداس پارو کو اپنانے میں جرأت کا مظاہرہ کرتا۔ کاش وہ چندر مکھی ہی کو اپنا لیتا اور وہ طوائف کی کھوکھلی زندگی سے نجات حاصل کر لیتی۔ کاش دیوداس شراب سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لیتا۔ بمل رائے کی دیوداس کا شمار برصغیر کی کلاسیکی فلموں میں ہوتا ہے۔ اس فلم کے لیے ریکارڈ کیے گئے دو بہترین نغمات "وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ ہم بلائیں" (مبارک بیگم) اور "کس کو خبر تھی کس کو یقین تھا' ایسے بھی دن آئیں گے" (طلعت محمود) بمل رائے نے جانے کیوں فلم میں شامل نہیں کیے۔ اگرچہ ایس ڈی برمن انہیں ریکارڈ کر چکے تھے اور ان کے گراموفون ریکارڈ بھی فلم کی ریلیز سے پہلے بازار میں آ چکے تھے۔

☆☆☆

1223ء میں "موحدین" کے بعد اندلس پوری طرح زوال کا شکار ہو گیا۔ حکومت قشتالہ اب اور زیادہ طاقتور ہو چکی تھی۔ مسلمان طاؤس و رباب میں الجھ کر رہ گئے اور وہ عیسائی سیلاب کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے گئے۔ اشبیلیہ' مالورقہ' بلینسیہ وغیرہ اس بے حیائی کے سیلاب کی نذر ہو گئے۔ اب صرف قرطبہ اور غرناطہ رہ گئے تھے' جو ابھی تک نصرانیوں کے سامنے چٹان بن کر کھڑے تھے۔

عیسائی قوم اس راز کو پا چکی تھی کہ کسی بھی قوم کو نیست و نابود کرنا مقصود ہو تو اس کے سربراہوں' سرداروں' نمالاروں اور پیشواؤں میں حکمرانی کی ہوس پیدا کر دو' وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے پر تل جائیں گے۔ عیسائی سپلنوں نے سرعت سے مسلمان علاقوں میں عیسائی مدرسے کھولے اور خوبصورت عیسائی لڑکیوں نے مسلمان نوجوانوں کو شراب' رباب اور لباس کی فاخرہ میں ایسا الجھایا کہ وہ اپنے آباء کی تہذیب کا مذاق اڑانے لگے اور عیسائی اپنے مشن میں کامیاب ہوتے چلے گئے۔

اقتباس: 8 صدیاں از محمد شفیع بلوچ

کہیں کہیں چشم پوشی بھی کی تھی۔ اس چشم پوشی کے عوض اس کی خواہش ہوتی تھی کہ عاطف کی دو تین فین لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھائے..... اور اس نے بڑھائی بھی تھی۔ اب وہ یہ ساری رعایتیں واپس لیتے ہوئے کسی وقت غیرت مند شوہر بھی بن جاتا تھا..... ایک نہایت الجھا ہوا شخص ثابت ہو رہا تھا وہ۔

غالباً مارچ اپریل کے ہی دن تھے۔ گرمی آنکھیں دکھانے لگی تھی۔ لنچ کے بعد تھوڑا قیلولہ ہمیشہ میرا معمول رہا ہے۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ خربوزہ کھا کر اور تھوڑی سی لسی پی کر لیٹ گیا۔ فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے گھبرائی آواز میں کہا۔ "بھائی جان ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔"

میرا دھیان سیدھا عاطف اور جمشید والے معاملے کی طرف ہی گیا۔ لیکن بھائی نے کہا۔ "نہیں، کوئی اور بات ہے۔ آ کر آپ کو بتاتا ہوں۔"

اس کی آواز کی لرزش نے مزید پریشان کیا۔ چند منٹ میں ہی وہ نمبر اسٹور سے گھر آ گیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "بھائی جان! دکان پر دو پولیس والے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری موٹر سائیکل ڈکیتی میں استعمال ہوئی ہے۔ ایس پی صاحب نے شمالی چھاؤنی تھانے میں طلب کیا ہے۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ آج تک کبھی اس طرح کی صورتِ حال سے پالا نہیں پڑا تھا۔ اور پڑا بھی تھا تو سیدھا سیدھا ڈکیتی کی صورتِ حال سے پڑ گیا تھا۔ کپڑے بدلے اور اسی وقت اپنی سوفٹ گاڑی نکالی۔ گاڑی گھر سے نکالتے ہوئے پتا نہیں دل میں کیا آیا۔ ایک حسرت ناک سی نظر گھر پر ڈالی۔ پتا نہیں کہ کس چکر میں پڑنے والا تھا اور اس گھر میں دوبارہ واپسی کب ممکن ہو نا ہو گی۔

راستے میں بھائی نے بتایا۔ "کہہ رہے ہیں کہ چھاؤنی کے علاقے میں کوئی فوجی افسر غالباً کرنل صاحب بینک سے کیش لے کر نکلے تو دو موٹر سائیکل سوار لڑکوں نے ان سے رقم چھین لی۔ کرنل صاحب نے رفو چکر ہونے والی موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کیا ہے۔ پولیس والے کہتے ہیں کہ یہ نمبر اس موٹر سائیکل کا ہے جو آپ کے نام سے رجسٹرڈ ہے۔ دونوں اہلکار ایکسائز کے دفتر سے تصدیق کر کے اور مکمل ایڈریس لے کر آئے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ معاملہ چونکہ فوجی آفیسر کا ہے لہٰذا پولیس اضافی تیزی دکھا رہی ہے۔ میں دکان پر پہنچا۔ ایک اے ایس آئی اور اس کا ساتھی غصے میں بھرے بیٹھے تھے کہ مجھے بلاتے

سے پہلے میرے دونوں بھائیوں نے انہیں ٹالنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ بحث طویل ہونے کے بعد پولیس والوں نے مجھ سے چھوٹے بھائی خالد کو باقاعدہ دھمکی بھی دے ڈالی تھی کہ تم تو کیا تمہارے بڑے بھی تھانے پہنچیں گے۔

بے گناہی انسان کی توانائی بن جاتی ہے۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اہلکاروں سے بات کی۔ وہ کچھ ٹھنڈے ہو گئے۔ اہلکاروں میں سے ایک میرے ساتھ ہی کار میں بیٹھ گیا۔ دو پڑوسی دکاندار بھی اظہار یکجہتی کے طور پر میری گاڑی میں سوار ہو گئے۔ درحقیقت زندگی میں پہلی بار ایسی خطرناک سچویشن سے پالا پڑا تھا۔ سڑکوں پر آتے جاتے لوگ کسی اور ہی دنیا کے بے فکرے اور آزاد باشندے محسوس ہوتے تھے۔ ہم طویل فاصلہ طے کر کے تھانے میں پہنچے۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب ابھی راؤنڈ پر ہیں۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ ایسے انتظار بے حد صبر آزما ہوتے ہیں۔ عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم تھانے سے ملحقہ مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ اس دوران میں بھی دو مسلح افراد مسجد کے دروازے پر موجود رہے۔ بالکل چوکس ہو کر۔

بھائی نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ ”حالات مخدوش ہیں۔ کسی کو فون کیجیے۔“

تاہم اس سے پہلے ہی میرے چھوٹے بھائی حبیب کا فون آ گیا۔ وہ لاہور سیکرٹریٹ میں ایک اچھی جاب کر رہا تھا۔ اس نے تسلی دی کہ ہمارے ایک بڑے افسر نے ایس ایچ او سے بات کی ہے آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔

خدا خدا کر کے جواں سال ایس پی صاحب جیپ پر تشریف لے آئے انہوں نے کھڑے کھڑے مجھ سے سوال کیے۔ میں نے کہا۔ ”میں تو موٹر سائیکل بہت کم چلاتا ہوں۔ وہ بیٹے کے پاس ہوتی ہے۔“

”کہاں پڑھتا ہے بیٹا؟“ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”فاسٹ یونیورسٹی میں۔“ میں نے جواب دیا۔

جواں سال ایس پی صاحب نے تلخی انداز میں سر ہلایا۔ جیسے فرما رہے ہوں۔ کڑیاں سے کڑیاں مل رہی ہیں۔ بچ نہیں پاؤ گے۔

معلوم ہوا کہ جہاں واردات ہوئی وہ جگہ فاسٹ سے قریب ہی تھی۔ ایس پی صاحب کا رویہ جو پہلے کچھ نرم تھا ایک دم سخت ہو گیا۔ میری طرف اشارہ کر کے اہلکاروں سے بولے۔ ”باپ کو ساتھ لے کر جاؤ۔ بیٹے کو بھی۔ دونوں بیٹوں کو بھی موٹر سائیکل ساتھ لے کر آؤ۔ ساتھ جو دو تین بندے آئے ہیں انہیں یہیں تھانے میں بٹھاؤ۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ دس برس تک انسپکٹر نوبہار خان کی کہانیاں لکھنے کے بعد اور سیکڑوں مجرموں کو گرفتار کرنے کے بعد ظاہر جاوید مغل ایک جواں سال ناتجربہ کار پولیس افسر کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اس کی ذرا قدر نہیں کر رہا تھا۔ جو دو پڑوسی دکاندار ہمدردی کے جذبے سے ہمارے ساتھ آئے تھے، ان کے منہ بھی سوکھ سے گئے تھے۔

میں نے پھر دونوں اہلکاروں کو گاڑی میں بٹھایا اور ”ملوث“ بیٹوں اور موٹر سائیکل کو برآمد کرانے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں باتیں ہوتی رہیں۔ گھاگ اہلکاروں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ قلم کار ہے۔ کہانیوں میں تو شاید اس نے ڈاکے وغیرہ مارے ہوں لیکن حقیقی زندگی میں اس پر ڈاکا پڑ تو سکتا ہے یہ خود یا اس کے بیٹے ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔ رہی سہی کسر دونوں بیٹوں سے ملنے کے بعد پوری ہو گئی۔ مگر کچھ بھی تھا اہلکار مروجہ کارروائی پر مجبور تھے۔ اصل فیصلہ تو کرنل صاحب نے ملزمان کی شناخت ہونے یا نہ ہونے کے بعد کرنا تھا۔

جس موٹر سائیکل پر شک کیا گیا تھا وہ تین روز سے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ بیٹا بذریعہ بس فاسٹ یونیورسٹی جا رہا تھا۔ میں نے گھر کے صحن میں کھڑی موٹر سائیکل کو اس کی جگہ سے ہلایا۔ نیچے فرش کی گرد پر اسٹینڈ اور پہیوں کے نشان نظر آنے لگے۔ میں نے انسپکٹر نوبہار خان کے انداز میں کہا۔ ”یہ دیکھو اے ایس آئی صاحب یہ نشان بتا رہے ہیں کہ یہ موٹر سائیکل کم از کم پچھلے ..... دو روز میں تو کہیں نہیں گئی۔“

قصہ مختصر موٹر سائیکل اور دونوں بچے تھانے پہنچ گئے۔ اب کرنل صاحب کی آمد آمد تھی۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ اگر وہ کسی بچے پر ہلکا سا شک بھی ظاہر کر دیتے تو بات بہت دور چلے جانا تھی۔ آخر کار کرنل صاحب کی آمد ہوئی۔ انہوں نے دونوں بچوں کو کڑی نظروں سے دیکھا جو معصوم صورتیں لیے اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بالآخر وہ خوش کن لمحہ آیا جب کرنل صاحب ہولے سے مسکرائے اور انہوں نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ بچے کلیئر ہو چکے تھے۔ ہم خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ تشکر سے آنکھوں میں نمی آ گئی۔ مگر جب ہم واپس جا رہے تھے۔ ایس ایچ او صاحب نے سارہ مزہ کرکرا کر دیا۔ مجھے واپس بلا کر ہولے سے بولے۔ ”ابھی خود کو مکمل کلیئر نہ سمجھا جائے۔ کل پھر آپ کے بچوں سے آنا ہے۔ کچھ کارروائی باقی ہے۔“

(جاری ہے)

کاروانِ زیست

طاہر جاوید مغل

الفاظ سے کھیلنا آسان نہیں، ایک کار ہائے دشوار ہے مگر کچھ لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے قارئین کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل بھی الفاظ کے باکمال کھلاڑی ہیں۔ ان کی کہانیاں پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قلم کار قارئین کے اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔ انہی کی زبانی ان کی روداد سنتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

معروف قلم کار کی خود بیتی کا آخری حصہ جو خود میں منفرد ہے

پولیس اسٹیشن سے واپس گھر پہنچے تو مٹھائی وغیرہ بانٹی جانے لگی لیکن میرے دل میں مسلسل کھد بد تھی۔ اگلے روز والی تکوار سر پر لٹک رہی تھی۔ پولیس سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ میں نے نوائے وقت کے نیوز ایڈیٹر شریف کیانی صاحب کو فون کیا اور صورتحال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ "ہاتھی نکل گیا ہے پونچھ رہ گئی۔ کوئی بات نہیں۔ "کل تھانے جانے سے پہلے مجھے فون کر لینا۔"

بہرحال اگلے روز پھر پیش ہوئے۔ ان دنوں سی سی ٹی وی ابھی اتنا عام تو نہیں تھا مگر پھر بھی دونوں ملزمان ایک کیمرے میں آئے تھے۔ ان کی تصویریں پرنٹ کی گئی تھیں۔ ہم سے پوچھا گیا کہ ان لڑکوں میں سے کوئی ہمارے گلے کا تو نہیں، یا کوئی ایسا تو نہیں جس سے دشمنی چل رہی ہو۔ آخر ہماری موٹر سائیکل کا نمبر ہی کیوں استعمال ہوا ہے۔ نمبر والے سوال کا جواب مجھے کل ہی مل گیا تھا جب کرنل صاحب نے ایس ایچ او سے بات کرتے ہوئے اپنا سر کھجایا تھا اور ہولے سے کہا تھا۔ "..... نمبر پلیٹ کے آخری گلر کا شبہ ہے..... یا تو پانچ چار تھا یا چھ چار تھا۔" یعنی نمبر کنفرم ہی نہیں ہوا تھا۔

پھر بھی اکثر پولیس اہلکار آسانی سے جان چھوڑ دینے کی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ نوائے وقت سے آنے والے فون کا کچھ اثر پڑا۔ اس کے علاوہ میری نئی کتاب "تاریخی حادثے" بھی پرنٹ ہوئی تھی۔ جس میں نائن الیون والے واقعے کی تحقیقی رپورٹ بھی تھی۔ میں نے یہ تازہ بتازہ کتاب دو متعلقہ اہلکاروں کو پیش کی۔ اہلکار بہت متاثر ہوئے اور ریشہ خطمی نظر آنے لگے۔ ایک افسر نے تو یہاں تک فرمائش کر دی کہ میں ان کے تفتیشی کارناموں کی روداد سیارہ ڈائجسٹ میں لکھوں آج بھی کبھی کبھی وہ خوشگوار دوپہر یاد آتی ہے جب خربوزہ کھا کر اور ٹھنڈی کی پی کر میں بڑے اطمینان سے قیلولے کے لیے تیار ہوا تھا اور بھائی نے آمژدہ سنایا تھا کہ ہماری موٹر سائیکل ایک ڈکیتی میں استعمال ہو گئی ہے۔ اللہ ہر کسی کو ایسی بری خبروں سے بچائے۔

☆☆☆

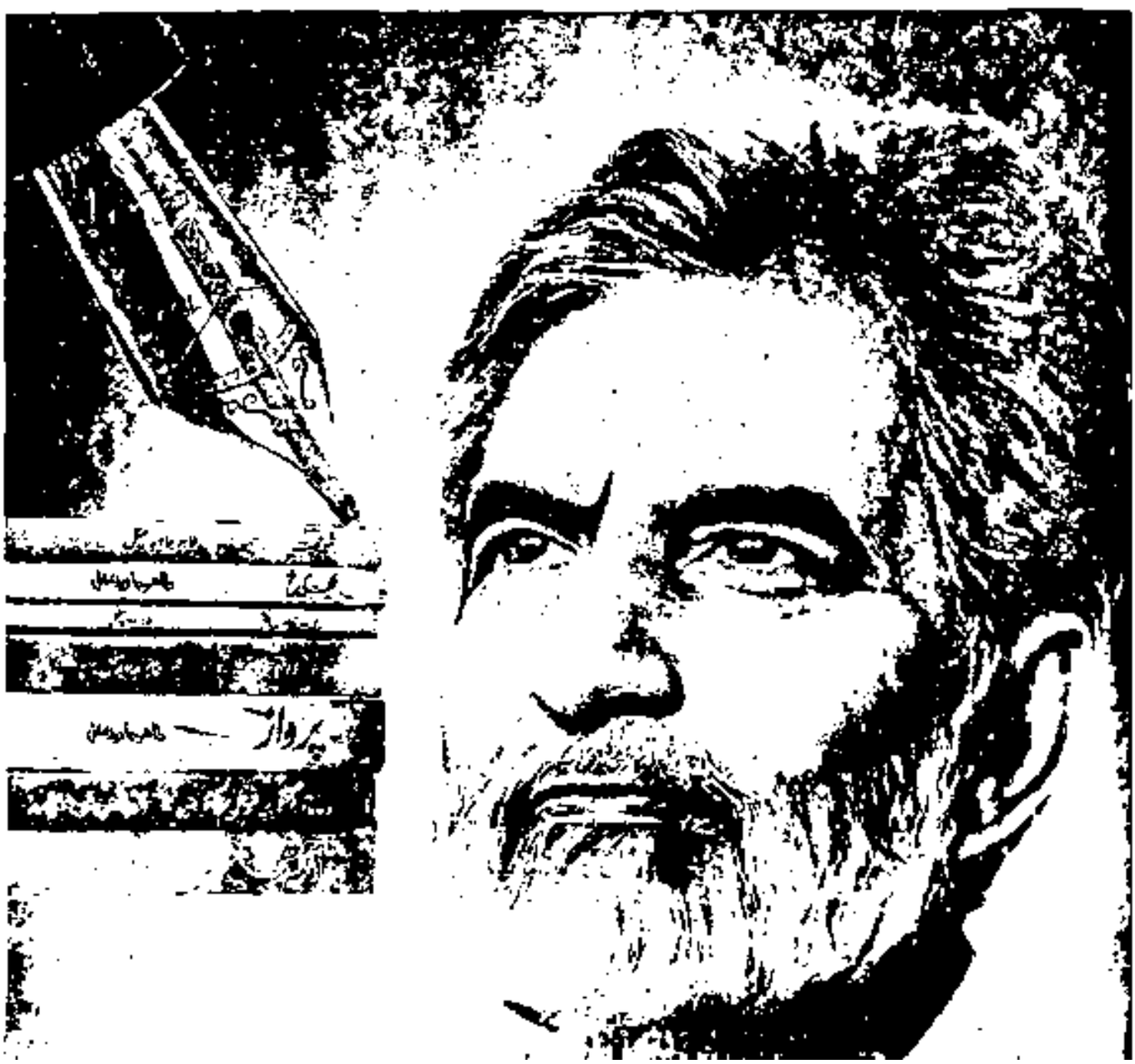
حورین اور عاطف والا معاملہ کسی بھی کروٹ بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھی عاطف کی والدہ اور دیگر اہلِ خانہ کو حق بجانب ہی سمجھ رہا تھا۔ حورین کی ایک خامی

اس کی ساری خوبیوں پر حاوی ہو چکی تھی اور خامی بھی کوئی چھوٹی تو نہ تھی۔ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہوتے ہوئے وہ عاطف کے ساتھ ایک ناروا تعلق میں بندھی تھی۔ کئی نشیب و فراز آنے کے باوجود وہ خود کو اس تعلق سے جدا نہیں کر سکی تھی۔ اب اس کی چھوٹی بہن کو عاطف کی والدہ کیسے اپنی بہو بنا لیتیں۔

اب شاید وہ خود بھی سمجھنے لگی تھی کہ خدا اور ایاز والی بیل منڈھے نہ چڑھ سکے گی۔ دوسری طرف اس کا شوہر جمشید مستقل طور پر دبئی شفٹ ہونے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ وہاں ایک پاکستانی شوفین کے ساتھ مل کر اس کا منصوبہ ساؤنڈ اسٹوڈیو بنانے کا ہی تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ عاطف اور حورین کی دوریاں اب مستقل صورت اختیار کرنے والی ہیں۔ جب مری میں حورین کا فون آیا تھا اس کے بعد دونوں میں ٹیلیفونک گفتگو تو شروع ہو گئی تھی، کچھ تحائف کا تبادلہ بھی ہوا تھا لیکن ویسے وہ دونوں کہیں بھی ملے نہیں تھے۔ حورین ملاقات والی صورتِ حال سے بچنا چاہتی تھی۔ مگر پھر ایک ایسا موڑ آیا جب وہ ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔ اس کے دبئی جانے سے کوئی ایک ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے، اس کے گھر میں ہی اس کی اور عاطف کی ملاقات ہوئی۔ اس کی ساس اور شوہر دونوں کو کسی ایمرجنسی میں فیصل آباد جانا پڑا تھا۔ رات کو حورین اور عاطف میں دیر تک فون پر گفتگو ہوئی اور پھر ملاقات والی سچوئیشن بن گئی۔ حورین نے بالکل اچانک ہی عاطف کو اپنے گھر بلایا..... ان کے درمیان جو کچھ ہوا اس سے قطعی متنفق نہ ہونے کے باوجود میں بلا کم و کاست بیان کر رہا ہوں۔

حورین نے ڈھکے چھپے طریقے سے خود کو عاطف کی بے پناہ طلب کے آگے سرنڈر کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک خواہش بھی تھی جو شرمہ کی طرح حورین نے اپنی زبان



سے تو نہیں کہی تھی..... مگر وہ موجود تھی۔ عاطف بھی سمجھتا تھا کہ اس آمادگی میں وہ شرط بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ ایسے ہی موڑ ہوتے ہیں جہاں پر کچھ عورتیں ایک پہیلی بن کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں عاطف سے کہہ رہی تھی..... عاطف..... میں تمہارے ساتھ آخری حد تک جانے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے بعد تمہیں خدا اور ایاز کی کشتی کو کنارے پر لگانا ہوگا۔ تم اس گھر کے بڑے ہو۔ دل سے چاہو گے تو سب کچھ کرلو گے۔

یکا یک ہو جانے والی یہ ملاقات دونوں کے لیے بڑی نازک تھی۔ ایک طرف طلب کی شدت اور لمس کی پکار تھی۔ دوسری طرف احساس گناہ کے تھپیڑے تھے۔

اس کو میں عاطف کی بلند کرداری تو نہیں کہہ سکتا، نہ ہی یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ان ہوش ربا و برق رفتار لمحات میں اصول پسندی کو سینے سے لگائے ہوئے تھا، مگر ایک بات تھی وہ حورین کو یہ سنگین دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ذمے داری جس کا بار وہ پوری طرح اٹھا ہی نہ سکے۔ ایک ایسا ''فرض'' جو اس ملاپ کے بعد اس پر لاگو ہو جاتے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔ ان کے چہروں پر آنسوؤں کی نمی تھی اور دھڑکتیں جسم و جان کو توڑ رہی تھیں۔ عاطف آخری حد تک جانا چاہتا تو اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا کہتے ہیں کہ آس ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹی۔ ٹوٹ بھی جائے تو کچھ نہ کچھ باقی ہی رہتی ہے۔ مستقل قریب یا بعید میں کسی موہوم سی اُمید کے ساتھ وہ سنبھل گئے اور پھر ایک دوسرے سے دور ہو گئے (ایسی اُمید جس کے کوئی خدوخال بھی نہیں تھے، شاید ہو ہی نہیں سکتے تھے)

میں کئی مرتبہ بڑی گہرائی سے اس واقعے پر غور کرتا ہوں اور اس کی تہہ میں جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ حورین کے ساتھ ایک سراسر غلط رومانی تعلق کے ماہ و سال گزارنے کے باوجود عاطف کے اندر گہرائی میں کہیں نہ کہیں اخلاقی اقدار موجود رہی تھیں۔ یہی بچی کھچی اقدار آڑے آئیں۔ تاہم میں اس بچاؤ کا کریڈٹ صرف ان بچی کھچی اقدار کو ہی نہیں دیتا۔ شاید میرا تجزیہ غلط ہو لیکن اس کے علاوہ ایک وہ اور بھی تھی۔ عاطف ان افراد میں سے نہیں تھا جو قربت کے تعلقات کے لیے ایک حیوانی قسم کی توانائی رکھتے ہیں۔ ادھر ایک بٹن دبایا۔ ادھر جبلی تقاضے متحرک ہو گئے۔ ایسے لوگ ان معاملات کے لیے یک خاص ماحول، بہت سکون اور قبل از قربت ایک طویل ذہنی تیاری کے متقاضی ہوتے ہیں عاطف کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ بارہ سے شادی کے بعد دونوں قریباً ایک ماہ تک حقیقی میاں بیوی بنے ہی نہیں تھے۔ قصہ مختصر اس ملاقات میں اگر کم از کم حدود پار نہ ہوئیں تو اس میں دونوں عوامل موجود تھے۔ یہ اخلاقی تقاضا کہ عاطف اس سے ایسا دھوکہ نہ کر سکتا تھا جو پورا نہ کر سکے اور دوسرے کسی حد تک یہ جبلی مجبوری بھی کہ وہ آناً فاناً کسی بدترین سرگرمی کی طرف نہ جا سکتا تھا۔

☆☆☆

میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق کے عمل میں جہاں تخلیق کار کے اندر کی کیفیات اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہاں باہر کا ماحول اور دیگر عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں ایک لکھاری ہونے کی حیثیت سے اپنی مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے اپنی لکھی ہوئی کہانیوں کا مختصر جائزہ لیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جو کہانیاں میں نے گرم موسم میں لکھیں ان میں غیر ارادی طور پر گرمی کے موسم والے سارے لوازمات آ گئے۔ کولڈ ڈرنکس، پنکھے، ہلکے پھلکے رنگ اور لباس، چھاؤں اور ہوا کی طلب وغیرہ۔ سرد موسم میں اس کے برعکس ہوا۔ اگر کوئی کہانی میں نے گرم موسم میں شروع کی اور اس کے مکمل ہوتے ہوتے گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ تو کہانی میں گرمی کا موسم بحال رکھنے کے لیے خصوصی کوشش کرنا پڑی..... اسی طرح جو کہانیاں میں نے بند کمرے میں لکھی تھیں ان کی ''آب و ہوا'' ان کہانیوں سے بہت مختلف تھی جو کسی سبزہ زار میں یا مری کے فلیٹ والی خوشنما کھڑکی میں بیٹھ کر لکھیں تھیں۔ قلمکار کا اچھا یا برا موڈ بھی اکثر کہانی پر اور خاص طور سے اس کے اختتام پر اثر ڈال دیتا ہے۔

اپنی لکھی کہانیوں کے بارے میں میرے کچھ اندازے غلط بھی ثابت ہوتے رہے۔ ابتدائی دور میں میں نے چار پانچ صفحات کی ایک کہانی سائنس فکشن والی طرز کی لکھی۔ بڑی انوکھی شارٹ اسٹوری تھی۔ بفضل خدا میری وہ واحد..... جی ہاں واحد کہانی تھی جو سسپنس میں یا شاید جاسوسی میں شائع ہونے سے رہ گئی۔ اور میرے اپنے خیال میں وہ آج بھی میری دو چار بہترین کہانیوں میں سے ہے۔

اسی طرح دو کہانیاں ایسی تھیں جنہیں میں نے لکھ تو لیا تھا مگر کئی ماہ تک چھپنے کو ارسال نہیں کیں۔ مجھے شک تھا کہ یہ ذرا سست ٹپوکی ہیں اور شاید زیادہ پسند نہ کی جائیں۔ ..... باخبر قارئین کو یہ جان کر حیرانی ہو کہ ان میں سے ایک

معروف کہانی ''کرب آشنائی'' اور دوسری ''اداس بسمیں اداس شامیں'' تھی۔ دونوں نہ صرف قارئین بلکہ ادارے کی طرف سے بھی بے حد پسند کی گئیں۔ میرے کیریئر کی پہلی کتاب ''پرستش'' تھی۔ یہ کہانی اس میں شامل تھی۔ میرے ہوشیار پبلشر نے پرستش میں ہی کچھ اور کہانیاں شامل کر کے اس کتاب کا نام اداس بسمیں اداس شامیں رکھ دیا۔ اکثر پبلشر حضرات جو کچھ قلم کاروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ بہت کم ..... معاوضے دے کر تخلیقات پر دائمی قبضہ جمانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تلخ حقیقت کو بھی مدنظر نہیں رکھا جاتا کہ جب ساری عمر صفحہ قرطاس پر جھکا رہنے والا قلم کار مزید نہیں لکھ سکتا تو اس کی شائع شدہ کتب ہی اس کا سہارا ہوتی ہیں۔ اسے کوئی فنڈ ملتا ہوتا ہے، نہ کوئی پنشن، نہ طبی سہولت، انہی تلخ حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ملکی قانون میں کچھ تحفظ دیا گیا ہے۔ میرے پبلشر جیسے کچھ پبلشر اسے واضح تحفظ کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے دائمی، فارایور اور ''ابدالابد'' جیسے الفاظ گھڑ رکھے ہیں۔

کتابوں کے ہی حوالے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ قریباً ایک سو بیس تفتیشی کہانیوں پر مشتمل سلسلہ انسپکٹر نواز خان میں نے لکھ تو دیا تھا تاہم اس کی پسندیدگی اور مقبولیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ہماری فیملی کی ہی ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ لڑکی نے مجھ سے نواز خان کی ایک کتاب مانگی۔ میرا خیال تھا کہ یہ ذہین فطین بچی اس میں دلچسپی نہ لے پائے گی۔ حیرانی ہوگی جب اگلے ایک دو ماہ میں وہ انسپکٹر نواز کی کہانیوں کے سارے مجموعے چاٹ گئی۔

ایک مرتبہ میں شادی کی ایک تقریب میں بیٹھا تھا۔ سیارہ ڈائجسٹ کے منتظم اعلیٰ امجد رؤف ایک سیاہ عینک والے صاحب کو میری نشست پر لے آئے۔ جب انہوں نے تعارف کرایا تو میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ معروف صحافی جناب عبدالقادر حسن تھے۔ جن کا سیاسی پرچا ''سیاسی لوگ'' بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

عبدالقادر حسن صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''طاہر! میں سیارہ ڈائجسٹ میں آپ کی شائع ہونے والی انسپکٹر نواز خان کی کہانیاں اپنے میگزین میں ری پرنٹ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اجازت درکار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔''

وہیں کھڑے کھڑے امجد رؤف نے مجھے بتایا۔ ''یار! تمہاری سلسلہ وار کہانی اپاہج بھی خوب پسند کی جا رہی ہے..... بلکہ شائع ہونے سے پہلے ہی ایک قاری پڑھ بھی لیتے ہیں۔''

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا وہ نامور مصنف و اسکالر ڈاکٹر عبدالعزیز خالد ہیں۔ ان کا فون آ جاتا ہے کہ اگر کہانی کی اگلی قسط آ گئی ہے تو اس کے مسودے کی فوٹو اسٹیٹ مجھے بھیج دیں۔ ساتھ ہی ہنس کر امجد رؤف نے مجھ سے کہا۔ ''یار! اب کہیں جوش میں آ کر معاوضہ بڑھانے کی بات نہ کر دینا۔''

ایک روز میرے چھوٹے بیٹے ادریس نے مجھ سے کہا۔ ''ابو جی۔ نیٹ پر ایک گپتا نام کے انڈین نے رابطہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ عرصے سے آپ سے بات کرنے کی کوشش میں ہے۔''

بہرحال ایک دن اسکائپ پر ہی گپتا نام کے اس بندے سے گفتگو ہوئی۔ اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے انسپکٹر نواز کی جو تفتیشی کہانیاں لکھی ہیں وہ عرصہ پندرہ سال سے ہندی فکشن میں تبدیل ہو کر یہاں کے ایک ہائی فائی میگزین میں شائع ہو رہی ہیں اور ہمارے گھر میں بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس نے میگزین کا نام شاید ''منوہر کہانیاں'' بتایا تھا۔ بعد میں گپتا نے نامہ و پیام شروع کیا کہ وہ ان کہانیوں کے حقوق حاصل کر کے انہیں مختلف مقامی زبانوں میں شائع کرنے کا پروگرام ترتیب دے رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے ہم کاروں کے ساتھ مل کر اس پر کوئی ٹی وی سیریز بھی بنائے وغیرہ وغیرہ۔ بعد میں گپتا کی طرف سے یکدم خاموش چھا گئی۔ شاید کسی سیانے نے اسے سمجھایا ہوگا کہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ اگر کچھ کرنا ہے تو کرلو، یہاں کون پوچھتا ہے، ہم تو پورا کشمیر اور خالصتان غصب کیے بیٹھے ہیں۔ ان چھوٹی موٹی کہانیوں کی کیا حقیقت ہے۔

☆☆☆

ملکہ کہسار مری کے ساتھ ہمیشہ سے گہری وابستگی رہی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ وابستگی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھی۔ بے شک مری اب بہت گنجان ہو چکا ہے۔ اکثر جگہوں پر صفائی ستھرائی کا احوال بھی ابتر ہے۔ اس کے باوجود مری کے بیرونی حدود میں اب بھی کئی ایسے مقامات ہیں جن کا ماحول ایوبیہ، خانس پور، کاغان وغیرہ کی طرح

پرسکون ہے۔ مری میں میرا پہلا ٹور تب ہوا جب میری عمر بمشکل تین چار سال تھی۔

کالج میں فرسٹ ایئر کا دور یاد آرہا ہے۔ دسمبر کے دنوں میں ہم دو تین کزن اور ایک دو دوست پہلی مرتبہ لائیو برف باری دیکھنے کے لیے مری گئے۔ پانچ چھ روز تک برف باری کی آس لگا کر بیٹھے رہے مگر برف کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ آخر ہار مان لی۔ جب خرچ ختم ہو رہا تھا، واپسی کی سوچی۔ ہوٹل سے سامان وغیرہ لے کر نکل آئے... کیونکہ دوپہر بارہ بجے کے بعد اگلے روز کا کرایہ شروع ہو جاتا تھا۔ بس کی روانگی میں ابھی دو تین گھنٹے باقی تھے۔ لہٰذا جی پی او سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گراؤنڈ میں بیٹھ گئے۔ ٹیپ ریکارڈ پر گانے وغیرہ سننے لگے۔

سہ پہر تین بجے کے قریب دھوپ تھوڑی سی دھندلی پڑ چکی تھی۔ مری کے ایک سفید ریش بزرگوار ہمارے پاس سے گزرے۔ رک کر پوچھنے لگے۔ ''لاہور سے آئے ہو شاید برف باری دیکھنے کے لیے؟''

''جی ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔'' میں نے اداسی سے کہا۔ ''اب واپس جا رہے ہیں۔''

بزرگوار نے اپنے جھریوں بھرے چہرے کو آسمان کی طرف اٹھایا۔ فضاؤں میں جیسے کچھ سونگھا۔ پھر اپنے لہجے میں مادو سال کا تجربہ سمیٹ کر بولے۔ ''اگر برف باری کے لیے آئے ہو تو پھر آج مت جاؤ۔ آج ہوگی برف باری۔''

وہ یہ کہہ کر چلے گئے اور ہم صاف شفاف آسمان کو دیکھتے ہوئے حیران ہوئے کہ یہاں تو دور دور تک بادل بھی نہیں اور مری کے یہ عمر رسیدہ بابا جی برف باری کا کہہ رہے ہیں۔ میرے دل میں نجانے کیا آئی۔ میں نے ساتھیوں سے ایک دو گھنٹے مزید رک جانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں دھوپ مزید مدھم ہو گئی۔ شام ہوتے ہوتے ٹھنڈ بڑھ گئی اس سے پہلے ہم میں سے کسی نے برف گرتے ہوئے نہ دیکھی تھی۔ لہٰذا جب ہماری سیاہ جیکٹوں پر سفید سفید سی دھول نظر آئی تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہی لگا جیسے آٹا چکی سے باریک آٹا اڑ کر ہمارے کپڑوں پر گر رہا ہے۔ پورے مری میں جیسے ایک پُرجوش ہلچل سی نظر آنے لگی تھی۔ مقامی لوگ خاص طور سے بے حد خوش تھے۔ اسی خوشی کے عالم میں ایک ہوٹل والے نے برائے نام کرایے پر ہمیں ایک کشادہ کمرا دے دیا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اب ہمیں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سردی بھی انتہا کو چھونے لگی تھی۔ ہم نے صرف جوتے اتارنے کی زحمت کی تھی اور پورے لباس، ٹوپی دستانے سمیت لحافوں میں گھس گئے۔

صبح اٹھے تو دنگ رہ گئے۔ کھڑکی سے دیکھا۔ پورے مری کو برف کی ایک دبیز تہ نے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ یہ وہ جگہ ہی نہیں لگتی تھی جہاں ہم سوئے تھے۔ کئی فٹ برف پڑ چکی تھی۔ برف بھی بہتے پانیوں کی طرح انسان کو شوخ چنچل و مست کر دیتی ہے۔ ہم پر بھی یہی کیفیات طاری ہوئیں۔ برف پر خوب خوب اودھم مچایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برف ہمارے دستانوں اور جرابوں وغیرہ میں گھس گئی۔ دو تین گھنٹے کے اندر سردی ناقابلِ برداشت ہو گئی اور ہم وہاں سے بھاگ لیے۔ کئی روز تک میں مری کے اس عمر رسیدہ باشندے کے بارے میں سوچتا اور حیران ہوتا رہا..... کسی وقت آج بھی سوچتا ہوں۔

مری کا ایک اور ٹور بھی اب تک یاد ہے۔ دو تین کزنز اپنی فیملیز سمیت اس ٹور میں شامل تھے۔ بہت خوشی اور شادمانی کا ماحول تھا۔ کہا یہی جاتا ہے کہ زیادہ خوشی اور سرمستی بھی کبھی کبھی راس نہیں آتی۔ بھائی کی چونکہ سرکاری جاب تھی لہٰذا مری کے قریب ہل اسٹیشن خانس پور میں بھی ایک ریسٹ ہاؤس میں مناسب کرایے پر ایک دو روز قیام کیا۔ یہاں ایک پلے گراؤنڈ بھی تھا خوب کھیل کود بھی ہوئی۔ تفریحی ماحول اپنے عروج پر تھا۔ خاص طور سے میرے پھوپی زاد عزیر صاحب غیر معمولی طور پر انجوائے کر رہے تھے۔ اگلے روز علی الصباح وہ پانی کی ٹینکی میں پانی چیک کرنے کے لیے چھت پر گئے۔ جب وہ ٹینکی میں جھانک رہے تھے ایک خستہ حال واٹر پائپ ٹوٹ گیا اور وہ تیس چالیس فٹ نیچے ایک کھٹ نما گڑھے میں جا گرے۔ کافی چوٹیں آئیں، ایک کندھا فریکچر ہو چکا تھا۔ چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ ہمارا آٹھ دس روزہ پروگرام سمٹ کر تیسرے چوتھے روز ہی ختم ہو گیا۔ پہلے خانس پور کے اسپتال میں ہی ان کے کندھے کی بینڈیج ہوئی پھر ہم انہیں لے کر مری کے فوجی اسپتال میں پہنچے۔ یہاں سول مریضوں کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ عزیر صاحب کا بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا گردن سے جھول رہا تھا۔ میں اور میرا بھائی ساجد بھی عزیر کے ساتھ تھے۔ عزیر صاحب بھی لمبے قد کے ہیں۔ تکلیف اور سوزش کی وجہ سے چہرہ بھی بارعب نظر آرہا تھا۔ ہم جب تیز تیز قدم اٹھاتے اسپتال کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے، کچھ لوگوں نے یہی سمجھا کہ یہ شخص (عزیر صاحب) کوئی کیپٹن

میجر وغیرہ ہیں اور کسی بارڈر سے زخمی ہو کر آئے ہیں۔ ان دنوں کنٹرول لائن پر جھڑپیں وغیرہ بھی چل رہی تھیں۔ دو تین بندوں نے بڑی عقیدت سے سیلیوٹ یا سلام بھی کیا۔ عزیر صاحب نے کچھ اور بھی تن کر چلنا شروع کر دیا۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ وطن کی خاطر جسمانی تکلیف اٹھانے والوں کے لیے عوام الناس میں کتنی محبت پائی جاتی ہے۔

میں ملکہ کہسار مری کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہاں سبزے اور سردی کی انتہا تھی۔ کبھی کبھی جون جولائی میں بھی "بعد از بارش" شام کے وقت اوور کوٹ پہننے پڑ جاتے تھے۔ اب تو موسم اتنا بدل چکا ہے کہ مری پر پنکھوں اور ریفریجریٹرز وغیرہ کی تہمت لگ رہی ہے۔ بے شک پاکستان میں مری سے کہیں زیادہ حسین و دلکش مقامات موجود ہیں لیکن وہ پوری طرح پنپ نہیں سکے۔ میرے خیال میں مری ایک ایسے برگد کی طرح ہے جس کے نیچے چھوٹے ہل اسٹیشن چھوٹے پودوں کی طرح ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں۔

پاکستان میں محترم معراج صاحب کو بھی مری کے نواحی مقام بھوربن سے بہت لگاؤ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مری میں فلیٹ خریدنے کا جو خیال پیدا ہوا اس میں معراج صاحب والی دلچسپی کی انسپریشن بھی موجود ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے فلیٹ یا زمین خریدنے کے نظریے سے ہم دو تین کرنز گھومتے پھرتے خانس پور بھی پہنچے۔ ہم لب سڑک ایک پراپرٹی ڈیلر سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک نیک صورت ادھیڑ عمر شخص نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا، وہ کریانے کی دکان پر بیٹھا تھا۔ مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "لگتا ہے لاہور وغیرہ سے آئے ہو یہاں پر جگہ خریدنے۔"

میں نے اس کی بات کا جواب اثبات میں دیا۔

میری بات سن کر وہ بولا۔ "بابو جی، آپ کو سونے چاندی سے زیادہ قیمتی مشورہ دوں؟"

میں نے کہا۔ "دیجیے چاچا جی۔"

وہ بولا۔ "یہاں شوق سے آؤ۔ دو چار روز موج میلا کرو، لیکن جگہ نہ خریدو۔ ہم نے بے شمار لوگوں کو دیکھا ہے بہت چاؤ سے یہاں گھر بناتے ہیں۔ پھر بڑے ارمانوں سے یہاں رہنے کے لیے آتے ہیں لیکن چند روز بعد ہی ان کے بچے رونا شروع کر دیتے ہیں۔"

"رونا شروع کر دیتے ہیں؟ وہ کیوں؟"

چاچا جی بولے۔ "وہ کہتے ہیں ہم اداس ہو گئے ہیں۔ ہم نے مری جانا ہے۔"

میں نے گہرائی میں جا کر سوچا۔ چاچا جی کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ان سارے ہل اسٹیشنز میں ایک بازار ہوتا ہے اور دو تین تفریحی جگہیں ہوتی ہیں۔ بڑی عمر کے سکون طلب لوگوں کی تو اور بات ہے مگر نوجوان اور بچے چند روز میں ہی اکتا جاتے ہیں۔ مری اور ایبٹ آباد وغیرہ تمام شہری سہولتوں اور تفریحات سے مزین ہیں۔ یہ بات چھوٹے ہل اسٹیشنز میں نہیں۔ سخت ضرورت ہے کہ ہم اپنے تمام خوبصورت پہاڑی مقامات کو پوری طرح ڈیولپ کریں۔

☆☆☆

سلسلہ وار "دیوی" بڑے شوق سے پڑھی جاتی رہی۔ اس کہانی کا نام "دیوی" ادارے نے ہی رکھا تھا اور ایک لحاظ سے یہ درست نام تھا۔ کیونکہ شعلہ فشاں ہیرو رستم کے مقابلے میں شانی کا دھیما، شبنمی کردار ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ وہ بدترین حالات میں بھی تحمل اور برداشت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ اپنی جنگ اپنے انداز میں لڑتی تھی چاہے جیت ہو یا ہار۔ آخر میں اس کا بدترین دشمن ڈپٹی ریاض بھی اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بہت سے قارئین نے اظہار کیا کہ دیوی میں کئی مقامات پر جذبات و احساسات کی شدت دل کو چھوتی ہے۔ نمونے کی چند سطور اس طرح ہیں۔ یہ سطور مجھے اکثر یاد آ جاتی ہیں۔

"رستم زخموں سے چور تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنون تھا لیکن اس جنون میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا جیسے مہیب سمندر اوپر سے پرسکون ہوتے ہیں۔ اس نے عجیب ڈرامائی لہجے میں نہایت مدھم سرگوشی کی۔ "بی بی! بس ایک بار میرا..... ہاتھ پکڑ لیں۔ بس ایک بار..... پھر میں رکوں گا نہیں۔ ان سارے وحشیوں کو چیر کر نکل جاؤں گا۔"

اس نے اپنا خون آلود ہاتھ شانی کی طرف بڑھایا۔ ہواؤں میں اس فقرے کی گونج تھی۔ "پھر میں رکوں گا نہیں..... پھر میں رکوں گا نہیں۔" شانی ششدر تھی۔ وہ جانتی تھی کیا ہونے والا ہے۔ اگلے چند سیکنڈ میں ان دونوں کے ٹکڑے ہو جانا تھا۔ وہ عقل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور ٹھیک دیکھ رہی تھی لیکن کوئی دوسرا عشق کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے طور پر ٹھیک دیکھ رہا تھا۔"

بہرطور کہانی کے نام "دیوی" میں مجھے ایک چھوٹی سی

شناسی محسوس ہوتی رہی۔ میرے خیال میں کئی لوگ اسے ہندی ماحول کی کوئی دیومالائی کہانی سمجھتے ہوں گے۔

ہمارے محبوب رائٹر کاشف زبیر اور ان کی اہلیہ بھی دیوی پڑھتے رہے اور کہانی کے پیچ وخم پر تبصرے بھی ہوتے رہے۔ افسوس کہ کاشف زبیر سے کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ ہاں فون پر ایک دو دفعہ کاشف زبیر سے گفتگو رائٹنگ کے حوالے سے طویل گفتگو ہوئی۔ وہ اپنے اندر تخلیق کی بے پناہ توانائی رکھنے والا قلم کار تھا۔ مجھے یاد ہے کاشف کا بھیجا ہوا ناول کفارہ میں نے ایک یادداشتوں میں پڑھ ڈالا تھا۔ کاشف کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہی سوگئے داستاں کہتے کہتے

کراچی سے لاہور آنے کے بعد ایم اے راحت صاحب بھی ہمارے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر رہے۔ ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ ہم اکٹھے ہی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ آخری دنوں میں وہ کافی بیمار رہنے لگے تھے۔ کسی وقت تو انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ایک مسافر اپنے سفر کا سامان سمیٹے کسی پلیٹ فارم پر بیٹھا ہو۔ گاڑی کا منتظر ہو۔ سخت بیماری میں بھی قلم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آخر ان کے بچوں کو کہنا پڑا..... ابا جان آپ کام کر کے جتنا کماتے ہیں اس سے زیادہ آپ کی بڑھتی ہوئی تکلیف پر لگ جاتا ہے۔ اب آپ آرام کریں۔

ایک روز ان کے دل میں نجانے کیا آئی، گھر میں ایک بہت پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ شعر وادب سے تعلق رکھنے والے کئی نامور لوگ موجود تھے۔ پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی سی بجی۔ یوں لگا جیسے بیماری کے شدید دورانیے میں داخل ہونے سے پہلے وہ الوداعی دعوت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ زیادہ دن نہیں جیئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، جنت میں اعلیٰ مقام دے۔

محترم محی الدین نواب سے آخری ملاقات لاہور میں شادی کی ایک تقریب میں ہوئی، میری بیٹی کی شادی تھی۔ کئی لوگ ان سے ملنے کے شائق تھے۔ میرے ایک عزیز نواب صاحب سے ملنے کو کچھ زیادہ ہی بے تاب تھے۔ میں انہیں ساتھ لے کر اس جگہ پہنچا جہاں نواب صاحب دو تین دیگر افراد کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے سے عزیز کو بتایا۔ ”یہ ہیں نواب صاحب۔“

”کدھر ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بھائی یہ سامنے، گول میز کے ساتھ۔“

اس نے دو مرتبہ مزید پوچھا کہ کدھر ہیں۔ میں نے ایک یا دو مرتبہ مزید بتایا کہ یہ ہیں۔ آخر پرستار اور قلم کار کی ملاقات پُرجوش طریقے سے ہوئی۔ یہ عزیز دیوتا کے پرستار تھے اور اسی نسبت سے انہوں نے نواب صاحب کی جو تصویر ذہن میں بنا رکھی تھی وہ بہت لحیم شحیم اور دبنگ قسم کی تھی۔ بہرحال انہیں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ عام قد کاٹھ کے اندر بھی ایک بلند وبالا اور غیر معمولی شخصیت چھپی ہوسکتی ہے۔

نواب صاحب کی ہر معاشرتی کہانی کا اینڈ المیہ ہوتا تھا۔ یعنی بہرصورت ایک طے شدہ اختتامیہ۔ اس کے باوجود اگر ہزاروں لاکھوں لوگ انہیں دیوانہ وار پڑھتے۔ پڑھتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا کہ ان کے اس جملے پر تو پوری ایک کہانی تعمیر ہوسکتی تھی۔

محترم علیم الحق حقی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔ ”طاہر تم اپنی مختصر تحریروں میں ایک بڑی کہانی کا گلا گھونٹ دیتے ہو۔ ان کو دوبارہ پھیلا کر لکھو۔“

میرا دل چاہا حقی صاحب سے کہوں کہ آپ کے مطابق میں ایک بڑی کہانی کو چھوٹی کہانی میں بند کر دیتا ہوں۔ آپ کہانیوں کے نواب سے کیوں نہیں پوچھتے جو ایک بڑی کہانی کو فقرے میں بند کر دیتے ہیں۔ چند لفظوں میں کہانی چھپاتے ہیں۔

میں ہمیشہ سے حقی صاحب اور احمد اقبال صاحب کی تحریروں کا مداح رہا ہوں۔ حقی صاحب اپنی پہلی کتاب کے سلسلے میں لاہور آئے تو خاص طور سے مجھ سے ملاقات کی۔ میری ایک کہانی کی تعریف کرتے ہوئے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”بھئی! میں تو کہانی کو ایک ڈیڑھ صفحے کی رعایت دیتا ہوں۔ اگر کہانی مجھے پکڑ لے تو پھر آگے بڑھتا ہوں۔ شروع شروع میں جب حقی صاحب نے اپنے ناولوں عشق کا عین اور اماوس کا دیا وغیرہ کے دیباچے مجھ سے لکھوائے تو جہاں بہت خوشی ہوئی وہاں اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔

احمد اقبال صاحب کی یادگار کہانی شکاری ہی وہ تحریر تھی جس نے حقیقی معنوں میں مجھے قسط وار لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ شکاری کو جناب نے جزئیات نگاری اور مزاح کی چاشنی سے ایک یادگار کہانی بنایا ہے۔ احمد اقبال صاحب سے فون پر تو گفتگو ہوتی رہی لیکن اتفاق ہے کہ ویسے ملاقات

نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے اور عمر دراز کرے۔ اگر کچھ لوگوں نے ڈائجسٹ اور ادب میں ایک نارواں لکیر نہ کھینچ دی ہوتی تو یقیناً احمد اقبال صاحب کا نام اعلیٰ پائے کے ادیبوں میں ہوتا۔

پاپولر فکشن وہ صنف ہے جس نے اس ڈیجیٹل دور میں بھی مطالعے کے شوق کو مکمل طور پر دفن نہیں ہونے دیا۔ مشکل ترین حالات میں بھی یہ زندہ ہے اور ان فکشن رائٹرز کی کاوشوں سے ہی زندہ رہے گا۔ پرانے لکھنے والوں میں سے پاپولر فکشن کے ان زندہ جاوید ناموں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ دیوتا کے محی الدین نواب، موت کے سوداگر کے اقیم علیم، یادگار تاریخی داستانوں کے قلم کار الیاس سیتاپوری، گمراہ کے جبار توقیر، سرکش کے محمود احمد مودی، لازوال علمی تحریروں کے خالق ڈاکٹر ساجد امجد، مقبول عام ایچ اقبال، کشتہ سیاست کے غلام قادر، تفتیشی اور عدالتی کہانیوں کی پہچان حسام بٹ اور بہت سے ایسے نام ہیں جو فی الحال ذہن میں نہیں آرہے۔ ستر اور اسی کی دہائی میں کراچی سے نکلنے والے دیگر ڈائجسٹوں میں بھی فکشن رائٹرز نے یادگار کہانیاں لکھیں اور عوام الناس میں مطالعے کا شوق جگایا۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں "دیوی" کا ذکر ہو رہا تھا سلسلہ وار دیوی کا اختتام بڑے اچھے طریقے سے ہو چکا تھا۔ رستم اور شانی کے ملاپ نے قارئین کو خوش کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان خوش ہونے والوں میں حورین بھی شامل ہو۔ البتہ اس کی اپنی کہانی کا اختتام تو جدائی پر ہی ہوا تھا۔ ایک کمزور لمحے کی گرفت میں آنے کے بعد اب وہ پوری طرح سنبھل چکی تھی۔ نہ صرف سنبھل چکی تھی بلکہ شوہر نامدار کے ساتھ پاکستان سے شفٹ بھی کر چکی تھی۔ پہلے ان کا پروگرام دبئی جانے کا تھا لیکن پھر نجانے کس طرح رخ بدلا تھا اور اب وہ اسپین کے شہر زارا گوزا میں سیٹل ہوئے تھے۔ ندا اور ایاز کی شادی بھی جلدی ہو گئی لیکن یہ شادی آپس میں نہیں ہوئی تھی۔ ندا کو ایک دبئی پلٹ نوجوان بیاہ کر لے گیا تھا اور ایاز نے اپنی والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے خاندان ہی کی ایک عالمہ لڑکی سے شادی کی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ ان واقعات کو کہانی کی شکل میں پیش کروں جو پچھلے تین چار سال میں عاطف اور حورین کو پیش آئے تھے۔ یہ ایک منفرد روداد تھی۔ بظاہر با کردار اور



مئی کے شمارے کے

جھلملاتے ستارے

اولین صفحات

یکسانی، بے سروسامانی انسان کو وقت سے پہلے نڈھال کر دیتی ہے۔ زندگی کی سہل اور دشواری کا مقابلہ کرنے والوں کی داستاں

جنگل

جنگل کا قانون انسانی معاشرے میں در آئے تو پھر تہذیب مر جاتی ہے۔ انسان اور انسانیت کی تذلیل سے ٹکرا جانے والے نوجوان کی داستانِ شجاعت

دبر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی

حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

محبت کی سنہری پٹی آنکھوں سے سب کچھ اوجھل کر دیتی ہے۔ جھوٹ و فریب کے جال میں الجھا سنسنی خیز سرورق

دوسرا رنگ

زندگی ایک ہو اور طلب گار ایک سے زیادہ۔ زندگی کو کھیل سمجھ کر کھیلنے والے اُمیدوار کا آخری داؤ سرورق کا تیسرا رنگ

چٹی ٹکٹہ چٹی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

بے حد باوقار حورین کس طرح اور کیوں ٹوٹی۔ اس کے پیچھے کوئی ایک وجہ تھی یا زیادہ وجوہات تھیں۔ مثلاً اپنے شوہر کی کج رویاں، عاطف کی محبت، اور اپنی چھوٹی بہن کے لیے ایک بہت اچھے رشتے کی خواہش وغیرہ.....؟

میرے ذہن میں ناول پردا کا خاکہ تیار ہونے لگا۔ مگر پھر نجانے کیوں مجھے لگا کہ اتنی جلدی اس کہانی کو نہ لکھا جائے۔ حالات کی گرد کو کچھ بیٹھنے دیا جائے اور یوں پرواز کی جگہ سلسلہ وار للکار شروع ہوگئی۔ للکار کی داغ بیل مری میں ہی پڑی جب میں اپنے پھوپی زاد و قریبی دوست شعیب کے ساتھ مری میں موجود تھا۔ مری کے جس فلیٹ کا ذکر ہے اس میں شعیب بھی شراکت دار تھا۔ ایک دن فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھے بیٹھے اور انڈین اداکار راجیش کھنہ کی مشہور فلم "باورچی" دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک للکار کے کردار عمران دانش کے خدوخال ابھرنا شروع ہوگئے اور پھر ابھرتے اور سنورتے چلے گئے۔

حورین اور عاطف کا افیئر ہماری معاشرتی ناہمواریوں اور بے جوڑ شادیوں جیسے رواجوں کا شاخسانہ تھا۔ بہرطور ایسے تعلق کا دفاع کسی بھی صورت نہیں کیا جاسکتا۔ حورین کے ساتھ تو پھر بھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ وہ ایک دوبار پاکستان آئی بھی لیکن جیسے خاموشی سی آئی ویسے چلی گئی تھی۔ رہا عاطف تو اس کو اس تعلق کی نسبت سے خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک سزا تو یہی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہوگئے۔ عاطف پر یہ جدائی کڑی گزری۔ حورین نے اسے کیسے جھیلا اس کا پتا نہیں۔ حورین کے بیرون ملک شفٹ ہونے کے بعد ڈیڑھ دو سال بعد ہی عاطف موٹر بائیک کے ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا۔ اس کی کمر پر شدید چوٹ لگی۔ وہ قریباً دو برس تک مسلسل بستر پر پڑا رہا۔ اتنا شدید تکلیف تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پانچ چھ ماہ کے وقفے سے اس کے دو آپریشن ہوئے۔ وہ لگاتار اوندھا لیٹے رہنے پر مجبور تھا۔ اس کے شب و روز اسی پوزیشن میں گزرتے تھے۔ پھر شاید قدرت کو اس کی حالت پر رحم آگیا۔ وہ بتدریج بہتر ہونے لگا۔ اس طویل بیماری نے جہاں اسے بہت دکھ دیے وہاں ایک مثبت نتیجہ بھی نکلا۔ بابرہ اور عاطف کے ازدواجی تعلق میں بہتری آگئی..... عاطف دھیرے دھیرے نماز روزے کی طرف بھی راغب ہوگیا۔ موسیقی کی طرف رجحان کم رہ گیا۔ کاروبار میں اسے کامیابی ہوئی۔ بہرحال ایک بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اس کے دل کے نہاں خانوں سے حورین کا خیال کبھی نہیں نکلا اور نہ شاید نکلے گا۔

☆☆☆

میں یہ سطور قلم بند کررہا تھا کہ الیکٹرونک میڈیا پر بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ سپریم کورٹ نے ذوالفقار علی بھٹو کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ بلکہ متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ مرحوم بھٹو کو شفاف ٹرائل نہ دیا گیا..... اگلے روز اسمبلی میں یہ فیصلہ بھی ہوگیا کہ بھٹو کو شہید کا درجہ دیا جائے اور ان کے نام سے ایوارڈ وغیرہ کا اجرا کیا جائے۔ میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ ماضی کے دھندلکوں میں گم رہا۔ کسی نے ہمارے نظام عدل پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ یہاں پھانسی پاکر دفن ہوجانے والوں کو بری کیا جاتا ہے اور کچھ دفن ہوجانے والوں کو بعد از مرگ پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے اور اپیلیں رد کی جاتی ہیں۔

نگاہوں میں ستر کی دہائی کے آخری برسوں کے مناظر گھومنے لگے۔ بڑا کڑا مارشل لاء تھا۔ گرفتاریاں، جلوسوں پر سیدھی فائرنگ، کوڑے، پھانسیاں سب کچھ چل رہا تھا اور اس کے ساتھ بھٹو کا ٹرائل بھی جاری تھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ قبر ایک ہے اور جسم دو ہیں۔ ایک کو قبر میں اترنا ہی پڑے گا۔ بہرحال یہ یقین کسی کو نہیں تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو واقعی پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ چھوٹی بڑی عدالتوں سے اپیلیں پے در پے رد ہوتی چلی گئیں۔ سپریم کورٹ میں تین جج ایک طرف چار جج ایک طرف، ایک جج رخصت پر اور پھانسی برقرار۔ آخر بات جنرل ضیاء الحق پر جا ٹھہری۔ تاہم انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر اعلیٰ عدالت نے سزا برقرار رکھی تو وہ بھی رحم کی اپیل رد کردیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دنیا بھر سے رحم کی اپیلیں کی جاتی رہیں اور 4 اپریل 1979ء کو ایٹمی پروگرام کا آغاز کرنے والے شخص کو شاید اسی پروگرام کی پاداش میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

بھٹو میں بہت سی شخصی خامیاں ہوں گی، ان کے سیاسی فیصلوں پر بھی اختلافات کی بہت گنجائش ہے، تاہم جس طرح انہیں پھانسی پر چڑھایا گیا، وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک دلدوز باب بن گیا۔ میرے والد بھی قومی اتحاد کے حامی اور پیپلز پارٹی کے سخت مخالف تھے۔ مگر 4 اپریل 1979ء کے اس گرد آلود سے دن میں ہم نے انہیں بھی افسردہ اور ملول پایا۔ میری عمر اس وقت قریباً 23 سال تھی مجھے اور میرے دوستوں کو بھٹو سے کسی طرے کا انس نہیں تھا، بلکہ جیسا میں نے کہیں پہلے ذکر کیا ہے، بلے گلے کے لیے

میں بھی کبھی کبھی قومی اتحاد کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ تاہم جس روز بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا گیا دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اندر کا موسم جیسے کچھ بدل سا گیا۔ ہمارے پورے خاندان میں صرف میں اور میرا ایک کزن، وہ دو افراد تھے جو بھٹو کی پھانسی کو غلط کہتے تھے۔ اس حوالے سے مجھے اور میرے کزن کو اکثر تند و تیز مناظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ والد صاحب نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا۔ تاہم وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں خدانخواستہ کوئی "پیپلیا" نہیں ہوں۔ صرف حساس دل ہوں جس کے سب بھٹو کی پھانسی سے آزردہ ہوں (ان دنوں پیپلیا کا خطاب ایک گالی کے قریب قریب سمجھا جاتا تھا)

ضیاء الحق میں بہت سی شخصی خوبیاں تھیں۔ انہیں مرد مومن و مرد آہن کہا جاتا تھا۔ پاکستانی معاشرے کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کی بہت سی پُرخلوص کوششیں بھی انہوں نے کیں اور وقتی طور پر ان کے اثرات بھی واضح نظر آئے۔ تاہم بہت سی کوششیں ایسی بھی تھیں جنہیں اسلامائزیشن کی قسط وار کہانی قرار دیا گیا۔ بھٹو کی "ادھر تم ادھر ہم" جیسی پالیسیوں کی طرح اس قسط وار اسلامائزیشن کو بھی وسیع پیمانے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دنوں کے مناظر یاد آتے ہیں۔ صبح اخبارات میں پورے پورے کالم خالی نظر آتے تھے۔ یہ سخت سینسر شپ کے مرہون منت تھے۔ ٹی وی پر نیوز کاسٹر سجی رہتی تھیں کہ کہیں دوپٹے کے نیچے سے سر کا کوئی بال دکھائی نہ دے جائے۔ ٹی وی ڈراموں میں ماں بیٹے کا رول ادا کرنے والے اداکاروں کو بھی اجازت نہ تھی کہ ایک دوسرے کو چھو سکیں۔ اخبارات میں شائع ہونے والے فلمی اشتہارات میں ہیرو ہیروئین کے درمیان ایک سفید موٹی لکیر کھینچ دی جاتی تھی۔ یار لوگ زور تخیل سے لمحوں میں اس لکیر کو غائب کر دیتے تھے۔

ان دنوں ماہ رمضان میں روزے کا احترام واقعی مثالی تھا مگر کہیں کہیں احترام پر عمل درآمد کرنے والا عملہ حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔ ایک روز میں موٹر سائیکل پر ملتان روڈ سے گزر رہا تھا کہ ایک سرکاری ٹرک کو دیکھ کر رک گیا۔ ٹرک پر سخت گرمی میں پسینے سے بھیگے ہوئے کوئی دو درجن افراد سوار تھے۔ کسی کے ہاتھ میں گلاس، کسی کے ہاتھ میں جگ اور کسی کے ہاتھ میں پلاسٹک کی بوتل تھی۔

میں نے قریب کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولا۔ "پولیس والے روزہ خوروں کو پکڑ رہے ہیں؟"

"لیکن ان کے ہاتھوں میں.....؟"

وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "ان کے ہاتھوں میں آلۂ واردات ہے۔ یہ ان برتنوں کے ذریعے پانی پی رہے تھے۔

یاد رہے کہ یہ جون جولائی کے سخت ترین روزے تھے۔ یہ جان کر قدرے افسوس ہوا کہ ان پکڑے جانے والوں میں سے بیشتر افراد سامنے والی زیر تعمیر عمارت میں مزدوری کر رہے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے چلچلاتی دوپہر میں ایک روز میں اسپورٹس سائیکل پر سمن آباد کی ایک بالکل سنسان سڑک پر جا رہا تھا۔ میرے آگے آگے درمیانی عمر کا ایک اور سائیکل سوار تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ روزے کے "احترام" میں بڑی رازداری کے ساتھ سگریٹ کے کش لے رہا ہے۔ میں نے بڑی خاموشی سے عین اس کے پیچھے جا کر زور سے کھنکھارا۔ اس آواز سے وہ یوں بری طرح بدکا کہ سائیکل گرتے گرتے بچی۔

سخت گرمی سے بے حال ہو کر ایک روز میں اور کزن شفیب نے روزہ چھوڑا۔ سوچا کہ اتوار کا روز ہے۔ کسی ٹھنڈے ٹھار سینما ہال میں کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے۔ سینماؤں کے مرکز لکشمی چوک میں پہنچے لیکن کسی بھی اچھی فلم کا ٹکٹ نہ مل سکا۔ سورج سوا نیزے پر تھا۔ پیاس اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ آٹھ دس کلومیٹر طے کر کے واپس گھر پہنچنا بھی محال تھا۔ لیٹر یا شاید ڈیڑھ لیٹر کی ایک ٹھنڈی ٹھار کوک تو لے لی..... لیکن اسے پئیں کیسے؟ گلا سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ روزہ دار سے زیادہ روزہ خور تکلیف میں ہوتا ہے۔ کوئی گزشتہ عافیت نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہمارے پاس کوک کی نہیں، مشروب مغرب، کی بوتل ہے اور گلا تر کرنے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

بے بس ہو کر ایک ایسے سینما ہال میں گھس گئے جہاں سال کی بور ترین پنجابی فلم زیر نمائش تھی۔ عام حالات میں کوئی پلے سے بھی پیسے دیتا تو یہ فلم نہ دیکھتے۔ چوکنے ہو کر، گھور اندھیرے میں گھونٹ گھونٹ کوک پیتے رہے۔ ہر لحظہ یہی دھڑکا رہا کہ کوئی عقب سے ہاتھ بڑھا کر گدی دبوچ لے گا۔

قسط وار اسلامائزیشن کے حوالے سے ایک قسط ایسی آئی جس میں ملک بھر کی مساجد میں نمازیوں کے لیے

خصوصی انتظامات کیے گئے۔ فیصلہ ہوا کہ تمام سرکاری و غیر سرکاری دفاتر و اداروں میں ظہر کے وقت خصوصی وقفہ دیا جایا کرے گا۔ بہت احسن اقدام تھا اور اچھی نیت سے ہی کیا گیا تھا مگر جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہتا ہے۔ ضیاء الحق دور کے دیگر اقدام کی طرح اس فیصلے کے مثبت اثرات بھی چند ماہ تک ہی رہے پھر نماز کے لیے یہ خصوصی وقفہ جات دیگر مصروفیات کے لیے استعمال ہونا شروع ہو گئے۔

میں اس حوالے سے کچھ زیادہ نہیں جانتا، تاہم اس دور کے باخبر سیاسی لوگ یقیناً جانتے ہوں گے۔ ان دنوں بھٹو کی پھانسی کے بعد سندھ میں زور شور سے احتجاجی تحریک چل رہی تھی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اس تحریک کو لیڈ کر رہے تھے۔ اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو تحریک جب زوروں پر تھی کچھ مواقع ایسے بھی آئے جب ایک ہی روز میں تیس پینتیس کے قریب افراد جلوسوں میں فائرنگ کا نشانہ بنے۔ اتنی زیادہ ہلاکتوں کی خبر اگلے روز اخبار کے کسی اندرونی یا عقبی صفحے پر دکھائی پڑتی تھی۔ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات اگر آج کے ڈیجیٹل دور میں ہوتے تو کیا کیا طوفان کھڑے ہو جاتے۔

ہمارے ایک بھائی صاحب بھٹو صاحب کے نجی مشاغل اور غلط سیاسی فیصلوں کے سخت ترین ناقد تھے۔ مرنے مارنے پر اتر آتے تھے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے وہ میرے پاس آئے۔ ٹی وی پر بھٹو کی برسی کی خبر سن کر آئے تھے۔ آنکھوں میں نمی سی جھلک رہی تھی۔ بولے۔ ”یار! ویسے بھٹو بندہ تو اچھا ہی تھا..... اسلامی کانفرنس کرائی..... ایٹمی پروگرام شروع کیا..... نوے ہزار جنگی قیدی.....“ وہ بولتے چلے گئے۔ میں سوچتا رہا..... بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

بہرحال اب ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق دونوں دنیاوی عدالتوں کی حدود سے باہر جا چکے ہیں۔ اپنی ذات کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے ساتھ اللہ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

ایک نہایت دلچسپ کردار یاد آ رہا ہے۔ اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں..... میری نسبت سے اس کردار کا ذکر اکثر انور فراز بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی سرگزشت ڈائجسٹ کے ”شہر خیال“ میں بھی اس کا تذکرہ آ جاتا تھا۔ یہ سن 2001ء کے بعد کے دو تین برسوں کا ماجرا ہے۔ اس کردار کا نام مانی تھا اور محترم معراج رسول صاحب بھی کسی حد تک اس سے واقف تھے۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ یہ کوئی انسان نہیں تھا۔ ایک بہت ہی پیارا سا پالتو بلا۔ ہلکے براؤن رنگ کے اس بلے کی اسٹوری یوں ہے کہ سردیوں کی ایک یخ بستہ شام میں میرے چھوٹے بیٹے ادریس نے اس زخمی بلونگڑے کو ایک کیاری سے اٹھایا۔ ادریس کی عمر اس وقت سات آٹھ سال جبکہ بلونگڑے کی عمر بمشکل بیس پچیس روز ہوگی۔

بلی کے اس زخمی بچے کی حالت بہت پتلی تھی لیکن ادریس کے ساتھ ساتھ ہم سب کی توجہ کے سبب اس کی جان بچ گئی۔ گھر کے ہر فرد کو اس کے ساتھ ایک لاڈ سا ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے ہی گھر میں دھیرے دھیرے پروان چڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہم سب کے دلوں میں اس کی محبت بھی جگہ بناتی چلی گئی۔ اس کا نام ہم نے مانی رکھ دیا۔ وہ شکل و صورت کا ہی نہیں عادت کا بھی خوبصورت و نفیس تھا۔ ادریس اور اس کی بہن خصوصی طور پر اس کی نگہداشت کرتے۔ اسے نہلاتے، کنگھی کرتے، اس کی خوراک کا خیال رکھتے۔ وہ گھر کا ایک فرد..... بنتا چلا گیا۔ میں لکھ رہا ہوتا تو وہ چپکے سے آتا اور میرے گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ کسی وقت میرے ہاتھ کا انگوٹھا ہولے سے منہ میں دبائے رکھتا اور محبت سے میری طرف دیکھتا رہتا۔ باہر سے میری گاڑی یا موٹر سائیکل کا ہارن سنائی دیتا تو بھاگا ہوا آتا جیسے از خود دروازہ کھولنا چاہتا ہو۔ شام کے وقت اسے گیند وغیرہ سے کھیلتے ہوئے دیکھنا ادریس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ موڈ میں ہوتا تو گھر کے ہر فرد کی گود میں بے تکلفی سے چڑھ بیٹھتا۔ منع کرنے پر ایسا معصوم شکل بناتا کہ ترس آئے بغیر نہ رہتا۔

وہ ہمارے گھر میں بہت اچھا وقت گزار رہا تھا۔ جب ایک بلائے ناگہانی نازل ہو گئی۔ یہ سفید رنگ کا ایک نہایت جسیم اور کریہہ صورت بلا تھا۔ اس کے نہایت غصیلا اور جنگجو ہونے کی کئی نشانیاں پرانے زخموں کی صورت اس کے چہرے پر موجود تھیں۔ پتا نہیں کہاں سے آوارد ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ محلے میں ایک دبنگ کی طرح دندنانا شروع ہو گیا۔ اردگرد کی سب بلیاں اس کی دسترس میں آ گئیں۔ اس کی جارحیت اور غنڈا گردی کا سب سے زیادہ اثر ہمارے شریف النفس نرم خو بلے مانی پر پڑا۔ اس کے چلنے پھرنے کا دلکش اسٹائل دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ دم دبائے، کونے

کمروں میں سجا سجا سا پھرتا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق سفید بلے کی آمد کے بعد کوئی بلی ہمارے بلے کی طرف نگاہ التفات ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کرتی تھی۔

کسی وقت سب اہل خانہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے کہ ایک دم شور محشر برپا ہوتا۔ ہمیں پتا چلتا کہ فرعون صفت بلے نے ہمارے شریف الطبع، امن پسند بلے پر ہلا بول دیا ہے۔ جس کے ہاتھ میں جو چیز آتی وہ لے کر میدان جنگ کی طرف بھاگتا۔ یہ جنگ عموماً یک طرفہ ہی ہوتی تھی۔ ہمارا نازونعم میں پلا بلا نیچے اور بدمعاش بلا اوپر ہوتا۔ ہمارے بلے کے چلانے کی آواز پوری اسٹریٹ میں گونج رہی ہوتی۔ ہم بمشکل، بلکی پھلکی چوٹیں لگا کر اور شور مچا کر بدمعاش بلے کو بھگاتے اور اپنے بلے مانی کی چوٹیں سہلاتے۔ اسے "در گذر" کرنے کا مشورہ دیتے۔

ایسے ہی واقعات کے بعد اڑوس پڑوس کے سب لوگ ہمارے بلے کو فلمی ہیرو ندیم اور سفید بلے کو ولن ہمایوں ٹرٹپ سے تشبیہ دینے لگے۔ سفید بلے کے ایک ایسے ہی دھاوے میں مانی کی گردن پر ایک گہرا زخم آیا جس کا علاج کئی ماہ تک گھریلو ٹوٹکوں کے ذریعے توجہ سے کیا گیا۔ ستم یہ تھا کہ اس دوران میں بھی سفید بلے کے حملے ہمارے بلے پر جاری رہے۔ جواں سال بلیاں تو اب ہمارے بلے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھیں۔ سفید بلا ہمارے ایریا کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے سبب ہمارا مانی اب بدمعاش بلے کی جارحیت کا تھوڑا بہت مقابلہ تو کرتا تھا مگر جلد ہی ہار جاتا اور اس وحشی کے ہاتھوں پٹنا شروع ہو جاتا۔ کسی وقت تو زوردار معرکے میں بے چارے کا پیشاب بھی خطا ہوتا۔ ایک باوقار بلے کی اس درگت پر ہمارے دل کٹ کر رہ جاتے۔

میں نے سوچا کہ سفید بلے کو پکڑا جائے اور غیر اعلانیہ جنگ جاری رکھنے والے اس جارح دشمن سے مخلوق خدا خصوصاً مانی کی جان چھڑائی جائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اکثر قابضین کی طرح یہ سفید بلا بھی انتہا کا عیار اور چوکنا تھا۔ کئی پھندے لگائے، حربے آزمائے مگر اس نے پکڑ کر نہیں دیا۔ بالآخر میں ایک بڑا جستی ٹب خصوصی طور پر اس امن دشمن کے لیے خرید کر لایا۔ ٹب کو اوندھا کر کے اس کے نیچے چھڑی لگا کر اور بوٹی لگا کر ایک پھندا تیار کیا (جیسے چڑیوں کو پکڑا جاتا ہے) یہ پھندا بھی ایک دو روز تو ناکام ہی رہا مگر پھر بہت سے بلے بلیوں کی دعائیں رنگ لائیں۔ ویسے بھی وہ رمضان کا مہینا تھا۔ سحری کے وقت بڑا بیٹا نوید بالائی منزل سے نیچے آیا اور اس نے بتایا کہ جستی ٹب کے نیچے کوئی چیز موجود ہے جو وزنی جستی ٹب کو پورے صحن کے فرش پر گھسیٹتی پھرتی ہے۔ دل سے الحمدللہ کی صدا بلند ہوئی۔ اتنا طاقتور "سفید بدمعاش" کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ ایک جشن کا سماں تھا..... اڑوس پڑوس کے بچے، بڑے سبھی خوش تھے۔ اب اس دشمن امن آمان کو ٹب کے نیچے سے نکال کر بورے میں بند کرنے اور پھر ایک پنجرے میں ڈالنے کا مرحلہ تھا جو کافی مشکل اور خطرناک ثابت ہوا۔ بہرطور وہ پنجرے میں بند ہو گیا۔

اہلیہ نے کہا۔ "دیکھیں۔ لگتا ہے کوئی بدروح ہے اس کے اندر۔ اب بھی کیسے پھنکار رہا ہے اور پنجرے کی جالی نوچ رہا ہے۔"

ایک بچے نے میری طرف تعریفی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "انکل! اس کے پنجرے پر لکھ دیں بدمعاش بلا۔"

میں نے مارکر سے پنجرے پر لکھ دیا۔ "بدمعاش بلا ہماری جان چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہے۔"

میں نے اور بیٹے نے اسے کار میں ڈالا۔ سنا یہی تھا کہ بلے بلیاں اپنے پرانے ٹھکانے پر واپس آ جاتے ہیں لہٰذا ہم اسے دور سے دور چھوڑنا چاہتے تھے۔ "ہراس" کا یہ عالم تھا کہ کوئی دور بھی ہمیں دور نہیں لگ رہا تھا۔ چلتے چلتے اقبال ٹاؤن سے گڑھی شاہو پہنچے۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی، گڑھی شاہو میں بھی گاڑی کو پر پیچ گلیوں میں گھماتے رہے۔ جب یقین ہو گیا کہ ہم بھی اب راستہ پوچھے بغیر واپس نہ لوٹ سکیں گے تو ایک جگہ گاڑی روکی اور پنجرہ کھول کر مشتعل بلے کو نکال دیا۔ وہ حیران کن رفتار سے بھاگا..... سڑک پار کی..... یہ اس کے کرتوتوں کی ہلکی سی سزا تھی کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار سائیکل سوار کے نیچے آ گیا۔ لیکن ڈھیٹ ہڈی تھی۔ دو تین پلٹیاں کھا کر پھر اٹھا اور بھاگ نکلا۔ کوئی نیکی سائیکل سوار کے کام بھی آئی تھی کہ وہ حادثے سے محفوظ رہا۔

فرعون کے دریا برد ہونے کے بعد خلق خدا نے وہی راحت محسوس کی ہوگی جو اس غیر معمولی جسیم بلے کے بعد ہم نے محسوس کی۔ ہمارا مانی دھیرے دھیرے پھر بحال ہو گیا۔ اب وہ خوف و ہراس کی فضا سے نکل کر آزادانہ گھومتا پھرتا تھا۔ وہ گھر کے فرد جیسا تھا لیکن کچھ بھی تھا وہ ایک بلا تھا۔ دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ وہ دو چار گھنٹوں کے لیے گھر سے باہر رہنے لگا۔ پھر یہ دو چار گھنٹے ایک دو دنوں میں بدل

گئے۔ ہم اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے اسے ایک نہایت یخ بستہ شام کے بچوں سے زخمی حالت میں چھڑایا تھا۔ پورا پورا بڑا کیا تھا..... لیکن وہ اپنی جبلت سے مجبور تھا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ وہ کئی ہفتوں کے لیے غائب ہوگیا۔ ہم سب اداس ہوگئے۔ راہ چلتے بلوں میں اس کی جھلک نظر آنے لگی۔ پھر ایک روز میں گھر آیا کہ تو اہلیہ نے سرپرائز دینے والے انداز میں کہا۔ "طاہر! کوئی آیا ہے۔"

اس نے دروازہ کھولا۔ وہ کمرے میں تھا۔ میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ بچوں نے خوب خاطر مدارات کی۔ تصویریں وغیرہ اتاریں۔ اس کے ٹھکانے کو پھر سے آراستہ کیا۔ مگر دو روز ہمارے ساتھ رہ کر وہ پھر چلا گیا۔ اس کے بعد ایسے ہی دو چار ہفتوں کے بعد وہ گھر کا چکر لگانے لگا۔ وہ جیسے ہمیں نئی صورتِ حال کے لیے تیار کر رہا تھا یا پھر یہ بھی اس کی جبلت کا ہی اظہار تھا۔ پھر ایک مرتبہ وہ قریباً چار مہینے کے بعد واپس آیا۔ دیر تک ہمارے قدموں میں لوٹتا رہا۔ میری گود میں سر رکھتا رہا۔ بچوں نے اس کی خاطر مدارات کی۔ وہ اب بھرپور جوان تھا۔ جوان اور دلکش وہ جیسے آنکھوں میں ہمیں بتا رہا تھا..... مجھے اب جینے کے سارے ڈھنگ آچکے ہیں۔

پھر وہ چل دیا۔ میں اور دونوں بیٹے نوید اور اویس اسے چھت پر سے دیکھ رہے تھے۔ گھر کے عقب میں جو خالی پلاٹ تھا وہ اس میں سے گزرا۔ دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا۔ میں نے نوید سے کہا۔ "لگتا ہے..... یہ اب نہیں آئے گا" میری آواز بھرا گئی تھی۔

اس نے ایک دو بار رک کر اور مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور سڑک کے موڑ پر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا۔

☆☆☆

میری زندگی کی بہت سی تلخ و شیریں یادیں مری سے ہی وابستہ ہیں۔ وجہ وہی ہے جو بیان کی ہے کہ مری میں زیادہ آنا جانا۔ ایک یادگار کالج کے دور کی ہے۔ یہ 1972ء کے آس پاس کی بات ہے۔ میں اور میرے دوست مری کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں سے شرقی سائیڈ والی وادی دور تک دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے ہوٹل سے نیچے ڈھلوان پر بھی موٹلز وغیرہ تھے۔ ان میں سے ایک ہوٹل کی بالکونی میں ایک جوان سال بندہ اکثر کھڑا نظر آتا تھا۔ گورا چٹا، چست شرٹ میں ملبوس، بال الجھے ہوئے سے، وہ اکثر دور نیچے ڈھلوان کی طرف دیکھتا اور سگریٹ پھونکتا رہتا۔ وہاں ایک گھر تھا جس کے برآمدے میں خوش رنگ کپڑوں والی ایک لڑکی کبھی کبھی دکھائی دیتی۔

ان دنوں شراب پر پابندی نہیں تھی۔ یہ شخص ڈرنک کرتا تھا۔ اس کا ثبوت وہ ایک دو خالی بوتلیں تھیں جو اس ڈھلوان پر پھینکی تھیں اور جھاڑیوں میں اٹکی نظر آتی تھیں۔

پھر ایک روز ہوٹل کے ایک لاہوری ویٹر نما ملازم نے ہمیں بتایا کہ یہ جوان شخص ڈھلوان پر رہنے والی اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس نے پچھلے سال اور اس سے پچھلے سال بھی ڈیڑھ دو ماہ اسی ہوٹل میں گزارے تھے۔ اب پتا نہیں کہ ملازم جو کچھ بتا رہا تھا اس میں کتنی حقیقت تھی اور کتنا افسانہ..... بہرحال یہ ہماری نوعمری کا دور تھا۔ ہم آتے جاتے دور جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی شراب کی ان خالی بوتلوں کو تجسس اور ناگواری کی ملی جلی کیفیت سے دیکھتے تھے..... اپنے طور پر اس لڑکی اور اس شراب نوش شخص کے حوالے سے کئی الٹی سیدھی کہانیاں بھی سوچتے تھے۔ اگلے سال میں مری گیا تو پھر اسی ہوٹل کے آس پاس ٹھہرا۔ اس مرتبہ خوش رنگ لباس والی لڑکی اور لڑکی کا گھر تو دور نیچے ڈھلوان پر نظر آئے۔ تاہم ہوٹل کی بالکونی میں دھوئیں کے سرغولے چھوڑتا جواں سال شخص کہیں دکھائی نہیں دیا۔ پتا نہیں کہ اس کہانی کا کیا انجام ہوا۔ اور یہ بھی خبر نہیں کہ کہانی کس حد تک درست تھی۔

مری کی ہی ایک اور مختصر روداد یاد آرہی ہے، شادی کے بعد کا ایک واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ اہلِ خانہ کے ساتھ مری گیا۔ چھوٹا بھائی ساجد اور اس کے بیوی بچے بھی ساتھ تھے۔ ہم مہران ہوٹل کے قریب ٹھہرے۔ میری گاڑی کو تو پارکنگ میں جگہ مل گئی تاہم ساجد کو اپنی گاڑی ہوٹل کے سامنے سڑک کے موڑ پر پارک کرنا پڑی۔ ساجد علی الصباح نماز کے لیے اٹھ کر مسجد گیا۔ واپس آیا تو اسے نیم اجالے میں اپنی گاڑی کے نیچے موبل آئل پھیلا ہوا نظر آیا۔ ذرا دھیان سے دیکھا تو گاڑی کا فرنٹ بھی ایک جانب سے بے طرح پچکا ہوا تھا۔ ہوٹل والوں کو جگایا گیا۔ ہم بھی پریشان ہوگئے۔ ہوٹل کے ایک سینئر ملازم نے بڑی افسردگی سے کہا۔ "جناب! گاڑی چونکہ موڑ پر پارک تھی اس لیے یہ حادثہ ہوا ہے۔ رات تیسرے پہر ایک فوجی جیپ تیزی سے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سے ٹکرائی ہے..... جیپ کا بھی تھوڑا بہت نقصان ہوا

ہے۔"

صبر کے گھونٹ بھرنے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا لیکن آدھ گھنٹے بعد صورتِ حال پوری طرح تبدیل ہوگئی۔ ساتھ والے ہوٹل کے ایک ملازم نے ہمیں اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ہم گئے تو ہمیں ایک اوٹ میں لے جاکر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "بادشاہو! کوئی جیپ ویپ نہیں ٹکرائی آپ کی گاڑی کو۔ یہ ان کے ملازموں کی اپنی حرامزدگی ہے۔"

"کیا مطلب؟" ساجد نے حیران ہوکر پوچھا۔

جواب میں اس نے انکشاف کیا کہ ہماری گاڑی کو یہاں موقع پر کچھ نہیں ہوا بلکہ اسے کشمیر پوائنٹ کی طرف حادثہ پیش آیا۔ رات تیسرے پہر ہوٹل کے ایک ملازم لڑکے نے ہی گاڑی کو ان لاک اور اسٹارٹ کیا..... اور ڈرائیونگ کا شوق پورا کرنے کے لیے جھیکا گلی کی طرف نکل گیا۔ وہاں اس نے گاڑی کسی بڑے پتھر سے دے ماری۔

اس اطلاع کنندہ کی بات بالکل دل کو لگ رہی تھی۔ گاڑی کی صورتِ حال دیکھتے ہوئے ہمارا اپنا ذہن بھی یہی مان رہا تھا کہ اس سے جیپ ٹکرائی ہے۔ بہرحال صبح دس بجے تک مکمل تصدیق ہوگئی کہ یہ حادثہ ہوٹل کے اپنے ملازم کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ گاڑی چوری کرکے لے جارہا تھا یا صرف ڈرائیونگ کے شوق میں یہاں سے نکلا تھا۔ یہ ایک بہت سیریس معاملہ بن گیا تھا اور بڑی حد تک پولیس کیس بھی۔ گاڑی کا خاصہ نقصان ہوچکا تھا۔ نیچے سے انجن کی باڈی میں بھی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ یہ اچھی حالت کی ٹویوٹا تھی۔

پڑوسی ہوٹل کے ایک ملازم نے ہمیں رازداری سے بتایا۔ "جناب! مری آنے والوں کو پتا نہیں لیکن یہاں اکثر ایسے کام ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت گاڑیوں کی حفاظت کرنے والے ملازم ہی گاڑیوں کو کھولتے ہیں اور لے کر نکل جاتے ہیں..... کبھی کبھی تو گاڑی چوری بھی ہوجاتی ہے۔"

ہوٹل کے ملازم اب بھی گول مول باتیں ہی کررہے تھے لیکن حقیقت حال پوری طرح کھل چکی تھی۔ دس گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوٹل کے مالک صاحب بھی پہنچ گئے۔ یہ ایک باریش مقامی تھے۔ ان کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ البتہ یہ اپنے ملازموں کے برعکس کافی معاملہ فہم نظر آئے۔ ہوٹل کی ریپوٹیشن کا معاملہ بھی تھا۔ انہوں نے جلدی سے معاملہ سیٹ کیا۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ اس وقت کے لحاظ سے پینتیس چالیس ہزار کا نقصان تھا۔ انہوں نے بحث وتمحیص کے بغیر یہ بات مان لی۔ گاڑی کو نیچے کلدنہ لے جایا گیا۔ ہمارے دو تین دن گاڑی کی بحالی میں لگ گئے۔ سیر وسیاحت میں اکثر ایسی چھوٹی بڑی پریشانیاں جنم لیتی ہیں۔

اسی طرح پریشانی والا ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔ تاہم اس واقعے کو ہم نے بعد ازاں ایڈونچر کے طور پر انجوائے کیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم مری میں اپنا چھوٹا سا فلیٹ خرید چکے تھے۔ یہ فلیٹ پوری طرح فرنشڈ ملا تھا۔ چھت بھی پوری طرح ڈیکوریٹ تھی۔ تاہم ابھی چھت کے اوپر ٹین کی مخروطی چھت تھی اور لینٹر پڑنا ابھی باقی تھا۔ کم از کم مجھے یہ معلوم نہیں تھا اور میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بڑے چاؤ سے فلیٹ میں موجود تھا۔ اوپر پانی کی جہازی سائز ٹینکی تھی جس میں بارش کا پانی بھی جمع ہوتا تھا۔ چوکیدار کی غلطی کے سبب رات کو پانی کی یہ ٹینکی تیز بارش کی وجہ سے اوور فلو ہوگئی اور پانی ہمارے فلیٹ کی عارضی چھت پر جمع ہونا شروع ہوگیا۔ ہم نئے نویلے فلیٹ کی خوبصورتی وسجاوٹ کے گن گاتے سوگئے تھے۔ رات کسی پہر پلاسٹر آف پیرس کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع ہوگئی۔ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ باہر طوفانی بارش تھی۔ جہاں جہاں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے برتن رکھنے شروع کیے۔ میری ڈائری سے ایک اقتباس اس طرح ہے۔

"دیکھتے ہی دیکھتے چھت کا سارا حصہ ٹپکنے لگا۔ ہم نے گرنے والے ہر قطرے کے نیچے ایک برتن رکھنا شروع کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فلیٹ کے سارے برتن ختم ہوگئے۔ دوڑ کر نیچے گئے اور نصراللہ والے فلیٹ سے بھی سارے برتن اٹھا کر لے آئے۔ چھوٹے چھوٹے کپ اور چمچیاں تک رکھ دیں..... مگر خوش نما قالین پھر بھی گیلا ہوتا جارہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ پوری چھت سے پانی دھاروں کی صورت بہنے لگا۔ ہم بھاگ کر بٹ صاحب (بلڈنگ کے مالک) کے پاس گئے اور انہیں اطلاع دی کہ طوفانِ نوح آگیا ہے۔ بٹ صاحب نے دھوتی اور بنیان پہن رکھی تھی۔ آنکھیں نیند کے خمار سے سرخ تھیں۔ انہوں نے ٹارچ ڈھونڈی اور سخت گھبرائے ہوئے میرے ساتھ فلیٹ کی چھت پر پہنچے۔ پہلے ٹینکی کا اوور فلو درست کیا، پھر مجھ سے

فرمانے لگے کہ بخروٹی چھت کے نیچے گھس کر دیکھو کہ آرائشی چھت پر کیا صورتِ حال ہے۔ بندہ خدا نے یہ بھی نہیں بتایا کہ چھت چوتے کی ہے اور مجھ جیسے ہلکے پھلکے بندے کا وزن بھی نہیں جھیلے گی۔ نیچے سب گھر والے پہلے ہی بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ چھت کسی بھی وقت ان پر آگرے گی۔ لہٰذا جب بٹ صاحب کی ہدایت پر میں نے تاریکی میں چوتے کی چھت پر قدم رنجہ فرمایا تو اس کا ایک بڑا حصہ دائمی دھڑام سے فلیٹ میں جا گرا۔ نیچے والوں نے یہی سمجھا کہ آخری وقت آگیا ہے۔"

شکر کا مقام تھا کہ میں کسی طرح نیچے گرنے سے بچ گیا ورنہ کاری ضربیں لگتیں اور ممکن تھا کہ دیوی کے ہیرو رستم سیال کو لنگڑا کرنے کی پاداش میں مجھے بھی کسی طویل مدتی لنگڑاہٹ کا سامنا کرنا پڑ جاتا (ان دنوں سلسلہ وار دیوی ہی زیرِ قلم تھی) اس حادثے کے بعد نئے نویلے فلیٹ کی حالت یوں ہوگئی جیسے یہاں مشتعل ہاتھی برسرِ پیکار رہے ہوں۔ پورے فلیٹ میں پانی تھا اور چونے کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اپنے ٹور کے اگلے آٹھ دس روز ہم نے فلیٹ کی تیمارداری اور سرہم پٹی میں ہی گزارے۔ چھت کو مضبوط اور محفوظ بنایا گیا اور اس طرح کے دیگر کام ہوئے۔ بٹ صاحب نے چوکیدار کو برخاست کر دیا۔

انہیں دنوں ایک ایسا کردار ہمارے گھر میں داخل ہوا جس نے مجھے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ یہ ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی تھی جو ہمارے گھر کام کرنے والی دیرینہ ملازمہ کی سوتیلی بہن تھی۔ وہ کہیں سے بھاگ کر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشانات تھے۔ ایک ادھیڑ عمر جابر شوہر کسی آسیب کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ اس لڑکی کا نام آپ زرینہ تصور کرلیں۔ سوتیلی بہن کا نام راحت سمجھ لیں۔ راحت نے پتا نہیں کس مجبوری یا کس وجہ سے صرف دس سالہ زرینہ کا نکاح اپنے خاندان کے ہی ایک چالیس بیالیس سالہ رنڈوے سے کر دیا تھا۔ پھر جب وہ تیرہ سال کے لگ بھگ ہوئی تو اسے رنڈوے قدیر کے ساتھ رخصت بھی کر دیا۔ قدیر سخت مزاج اور نشے باز بھی تھا۔ زرینہ کو مارتا پیٹتا تھا۔ زرینہ میکے آکر اپنی سوتیلی بہن اور اس کے خاوند وغیرہ کو بتاتی تھی۔

ایک روز کمسن زرینہ کا شوہر اسے لے کر کہیں غائب ہوگیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ اسے سرگودھا لے گیا تھا۔ وہاں وہ سبزی کی ریڑھی لگانے لگا۔ زرینہ کے ساتھ بدسلوکی بھی اس نے آزادانہ طور پر جاری رکھی ہوئی تھی۔ جب انتہا ہوگئی تو وہ کسی طرح اس کے شکنجے سے بھاگ نکلی اور لاہور پہنچ گئی۔ گرمیوں کی اس دوپہر میں جب میں نے پہلی بار اس ڈری سہمی بچی کو دیکھا تو اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اسے اور گھر والوں کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ تند مزاج شوہر اس کے پیچھے یہاں پہنچ جائے گا۔ میں نے اسے پوری تسلی دی کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی اسے یہاں سے کہیں لے جا سکتا۔ میری اہلیہ نے دہشت زدہ زرینہ کو اپنے بھائی کے پاس لاہور کی ہی ایک ہاؤسنگ سوسائٹی میں بھیج دیا۔

قدیر اس کے پیچھے آیا اور اس نے کافی زور بھی مارا لیکن اس کی چلنے نہیں دی گئی۔ قدیر سے پیچھا چھڑانے اور خلع حاصل کرنے میں اس کی مدد کی گئی اور یوں وہ آزاد ہوگئی۔ چند ماہ بعد اس کا نکاح فیاض نام کے ایک نوجوان کارپینٹر سے ہوگیا۔ ہم نے سوچا یہ کہانی ختم ہوگئی ہے لیکن نہیں ہوئی تھی۔ قریباً پانچ سال بعد میں نے ایک بار پھر زرینہ کو اپنے گھر کے صحن میں اہلیہ کے پاس بیٹھے دیکھا۔ وہ اب ایک جوان سال عورت تھی۔ نقوش کے اعتبار سے قبول صورت محسوس ہوتی تھی۔

اس نے ہمیں یہ بتا کر حیران کیا کہ دوسرے شوہر فیاض سے بھی اس کی طلاق ہوچکی ہے۔ اب زرینہ کے ساتھ تین بچے بھی تھے۔

میں نے پوچھا۔ "یہ فیاض کے ہیں؟"

وہ بولی۔ "نہیں انکل جی۔ یہ بچہ بچی فیاض سے ہیں۔ یہ تیسرا بچہ فیصل سے ہے۔ فیصل اس کے تیسرے شوہر کا نام تھا۔ بعد ازاں میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ دبلا پتلا خوش شکل تھا۔ عمر میں زرینہ سے ڈیڑھ دو سال چھوٹا ہی ہوگا۔ وہ اسٹیل ورک کا بڑا اچھا کاریگر تھا۔ شادی سے پہلے وہ کنوارا ہی تھا۔ اس نے بڑی چاہت سے زرینہ کو اپنایا اور اس کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھ رہا تھا۔ در حقیقت زرینہ کا دوسرا شوہر بھی پہلے شوہر سے ملتا جلتا ہی نکلا تھا۔ زرینہ نے اس کے ساتھ بھی کافی، بلکہ کافی سے زیادہ مصیبتیں جھیلی تھیں۔ گاؤں کی سخت ترین زندگی میں بھی اس کا ساتھ نبھانے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئی۔

میرا خیال تھا کہ شاید تیسرے شوہر نوجوان فیصل سے بھی زرینہ کی نبھ نہ پائے۔ تاہم اہلیہ نے جو اندازے لگائے وہ اُمید افزا تھے۔ اہلیہ کے اندازے درست ثابت ہوئے۔

نادم تحریر یہ جوڑا ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔ چودہ پندرہ سال کی رفاقت نے ان کی ازدواجی زندگی کو اعتماد بخشا ہے۔ اس یتیم بچی نے نوعمری سے لے کر جو کٹھن مصائب جھیلے تھے ان کا صلہ قدرت نے اسے دیا ہے۔ بعد از موت تو جو کچھ ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ اس دنیا میں بھی وہ اوپر والا تکلیفوں اور قربانیوں کا صلہ دیتا ہے۔ یہ تھر پارکیر ہے۔

یہاں تک میں نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ ان کا دورانیہ 1955ء سے لے کر تقریباً 2010ء تک ہے۔ اسٹاپ واچ پر ہند سے بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہیں..... اور دیکھا جائے تو زندگی کی رفتار بھی یہی ہے۔ لمحے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے مہینوں اور سالوں میں بدلتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا عرصہ حیات کم ہوتا چلا جاتا ہے.....

☆☆☆

کچھ ہی عرصہ پہلے خانہ کعبہ کی حاضری نصیب ہوئی۔ غار حرا میں پہنچا تو خیالات کا ریلا اڑا کر کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں کوئی بہت بڑا تخلیق کار تو نہیں ہوں مگر تخلیق کی کوشش تو کرتا ہوں اور تخلیق کاروں کو تصور کے پر لگا کر ماضی میں جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی غار حرا کو دیکھ کر ماضی میں چلا گیا۔ ایک نعت لکھی جو معروف نعت خواں عبدالرؤف صاحب نے پڑھی۔ بعد میں یہ پکچرائز بھی ہوئی اور بہت مرتبہ چینلز پر ٹیلی کاسٹ بھی ہوئی۔

میں طیبہ کے گلی کوچوں کا اک ذرہ ہوا کرتا
پھر اک پل بھی ترے قدموں سے خود کو نہ جدا کرتا
کوئی کنکر ہی ہوتا میں حرا کا، اور میرے آقا
وضو ترے کا اک قطرہ کبھی مجھ پر گرا کرتا
دیا ہوتا میں ترے حجرے کا یہ قسمت کہاں میری
دیا ہوتا میں مکہ کے کسی گھر میں جلا کرتا
کوئی تنہا شجر ہوتا، میں تیری پاک راہوں کا
تجھے آتے تجھے جاتے بصد چاہت تکا کرتا

ہاں تصور و تخیل کے پر لگا کر اڑنا اور ماضی میں جا پہنچا۔ مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے یہ پر مجھے بھی کبھی کبھی اڑا کر جوانی، نوجوانی اور بچپن تک بھی لے جاتے ہیں۔ میں بہت سے لوگوں کی طرح بچپن کے گلی گلیاروں میں گھومتا ہوں۔ ساون کے کالے سیاہ بادلوں تلے چمکنے والی چاندی سی بوندوں کو اپنے جسم اور روح پر محسوس کرتا ہوں۔ ست رنگی بسنت کی ہواؤں کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوں۔ سرما کی سنہری دھوپوں میں بچپن کے ساتھیوں کے درمیان بے تکان کھیلتا ہوں۔ کھیلتا چلا جاتا ہوں۔ پھر مجھے وہ اپنی ہم عمر ننھی بینا بھی یاد آتی ہے جو ایک روز چپکے سے کہیں چل دی تھی۔ اس کے کھلونے، جوتے اور کپڑے اس کے گھر میں اداس پڑے رہ گئے تھے... پھر ایک دن میری پیاری پھوپی جان نے دور آسمان کے ستاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا..... دنیا سے چلے جانے والے بچے ستاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کئی سوچیں ذہن میں جنم لیتی ہیں۔ کاش، آج جو کچھ میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں، یہ سب جاگتی آنکھوں کا خواب ہو، ابھی بینا کہیں نہ گئی ہو، ابھی مجھے بہت دنوں تک اس سے کھیلنا اور باتیں کرنا ہو..... اور ابھی، وہ بھتیجے ہوئے چچے بھی ہمارے گھر میں نہ آئے ہوں جنہوں نے معصوم بھائی حبیب کے گلے کا پھندا بن جانا تھا۔ اور ابھی ایک صحن میں چہکنے والی وہ روشن لکیر بھی پوری طرح بجھی نہ ہو جو لڑکپن کی خوبصورت نادانیوں اور خام خیالیوں کا استعارہ تھی۔ یعنی ابھی زویا کا صحن میں آنا باقی ہو، مسکرانا باقی ہو۔ ابھی وہ سارے تہوار گزرے نہ ہوں جن میں آس اُمید کے خوش رنگ دیے جلتے تھے۔ ہاں ابھی ایک یخ گرم شام میں دوست ناصر کو رس ملائی کھلائے جانے کا امکان باقی ہو۔ ابھی چھتوں پر ٹی وی اینٹینے درست کرنے اور سیناؤں میں قطاریں لگانے کا دور گزرا نہ ہو۔ ابھی ناصر اور نبیلہ نے اپنی خوش رنگ محبت کو سفلی ملاپ کے گھاٹ نہ اتارا ہو..... اور ہاں ابھی پیاری پھوپی جان نے وہ سڑک پار نہ کی ہو جس پر ایک تیز رفتار ویگن دست قضا کے سینے میں درد کا آغاز بھی نہ ہوا ہو..... اے گردش ایام لوٹ آ..... تیرا کیا بگڑ جائے گا جو لوٹ آئے۔ کیا اچھا ہو، مری کے فلیٹ میں گزرے سنہری دن تمام نہ ہوئے ہوں۔ تاوان اور دیوی وغیرہ لکھنے والے خوش رنگ شب و روز ابھی تک چل رہے ہوں۔ علی سفیان آفاقی، ایم اے راحت اور محی الدین نواب جیسی شخصیات سے محفل آرائی ابھی جاری ہو۔ ابھی گاہے بگاہے کراچی سے ایک جہاز لاہور ائرپورٹ پر اترتا ہو اور معراج رسول صاحب کی دلکش مسکراہٹ جلوہ دکھاتی ہو، کیا ہی اچھا ہو.....

اے گردش ایام، تو کیوں نہیں سنتی ہم جیسوں کی آواز؟

+++

نادم تحریر یہ جوڑا ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔ چودہ پندرہ سال کی رفاقت نے ان کی ازدواجی زندگی کو اعتماد بخشا ہے۔ اس یتیم بچی نے نوعمری سے لے کر جو کٹھن مصائب جھیلے تھے ان کا صلہ قدرت نے اسے دیا ہے۔ بعد از موت تو جو کچھ ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ اس دنیا میں بھی وہ اوپر والا تکلیفوں اور قربانیوں کا صلہ دیتا ہے۔ یہ تھر پارکیر ہے۔

یہاں تک میں نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ ان کا دورانیہ 1955ء سے لے کر تقریباً 2010ء تک ہے۔ اسٹاپ واچ پر ہند سے بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہیں..... اور دیکھا جائے تو زندگی کی رفتار بھی یہی ہے۔ لمحے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے مہینوں اور سالوں میں بدلتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا عرصہ حیات کم ہوتا چلا جاتا ہے.....

☆☆☆

کچھ ہی عرصہ پہلے خانہ کعبہ کی حاضری نصیب ہوئی۔ غار حرا میں پہنچا تو خیالات کا ریلا اڑا کر کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں کوئی بہت بڑا تخلیق کار تو نہیں ہوں مگر تخلیق کی کوشش تو کرتا ہوں اور تخلیق کاروں کو تصور کے پر لگا کر ماضی میں جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی غار حرا کو دیکھ کر ماضی میں چلا گیا۔ ایک نعت لکھی جو معروف نعت خواں عبدالرؤف صاحب نے پڑھی۔ بعد میں یہ پکچرائز بھی ہوئی اور بہت مرتبہ چینلز پر ٹیلی کاسٹ بھی ہوئی۔

میں طیبہ کے گلی کوچوں کا اک ذرہ ہوا کرتا
پھر اک پل بھی ترے قدموں سے خود کو نہ جدا کرتا
کوئی کنکر ہی ہوتا میں حرا کا، اور میرے آقا
وضو ترے کا اک قطرہ کبھی مجھ پر گرا کرتا
دیا ہوتا میں ترے حجرے کا یہ قسمت کہاں میری
دیا ہوتا میں مکہ کے کسی گھر میں جلا کرتا
کوئی تنہا شجر ہوتا، میں تیری پاک راہوں کا
تجھے آتے تجھے جاتے بصد چاہت تکا کرتا

ہاں تصور و تخیل کے پر لگا کر اڑنا اور ماضی میں جا پہنچا۔ مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے یہ پر مجھے بھی کبھی کبھی اڑا کر جوانی، نوجوانی اور بچپن تک بھی لے جاتے ہیں۔ میں بہت سے لوگوں کی طرح بچپن کے گلی گلیاروں میں گھومتا ہوں۔ ساون کے کالے سیاہ بادلوں تلے چمکنے والی چاندی سی بوندوں کو اپنے جسم اور روح پر محسوس کرتا ہوں۔ ست رنگی بسنت کی ہواؤں کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوں۔ سرما کی سنہری دھوپوں میں بچپن کے ساتھیوں کے درمیان بے تکان کھیلتا ہوں۔ کھیلتا چلا جاتا ہوں۔ پھر مجھے وہ اپنی ہم عمر ننھی بینا بھی یاد آتی ہے جو ایک روز چپکے سے کہیں چل دی تھی۔ اس کے کھلونے، جوتے اور کپڑے اس کے گھر میں اداس پڑے رہ گئے تھے... پھر ایک دن میری پیاری پھوپی جان نے دور آسمان کے ستاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا..... دنیا سے چلے جانے والے بچے ستاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کئی سوچیں ذہن میں جنم لیتی ہیں۔ کاش، آج جو کچھ میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں، یہ سب جاگتی آنکھوں کا خواب ہو، ابھی بینا کہیں نہ گئی ہو، ابھی مجھے بہت دنوں تک اس سے کھیلنا اور باتیں کرنا ہو..... اور ابھی، وہ بھتیجے ہوئے چچے بھی ہمارے گھر میں نہ آئے ہوں جنہوں نے معصوم بھائی حبیب کے گلے کا پھندا بن جانا تھا۔ اور ابھی ایک صحن میں چہکنے والی وہ روشن لکیر بھی پوری طرح بجھی نہ ہو جو لڑکپن کی خوبصورت نادانیوں اور خام خیالیوں کا استعارہ تھی۔ یعنی ابھی زویا کا صحن میں آنا باقی ہو، مسکرانا باقی ہو۔ ابھی وہ سارے تہوار گزرے نہ ہوں جن میں آس اُمید کے خوش رنگ دیے جلتے تھے۔ ہاں ابھی ایک یخ گرم شام میں دوست ناصر کو رس ملائی کھلائے جانے کا امکان باقی ہو۔ ابھی چھتوں پر ٹی وی اینٹینے درست کرنے اور سیناؤں میں قطاریں لگانے کا دور گزرا نہ ہو۔ ابھی ناصر اور نبیلہ نے اپنی خوش رنگ محبت کو سفلی ملاپ کے گھاٹ نہ اتارا ہو..... اور ہاں ابھی پیاری پھوپی جان نے وہ سڑک پار نہ کی ہو جس پر ایک تیز رفتار ویگن دست قضا کے سینے میں درد کا آغاز بھی نہ ہوا ہو..... اے گردش ایام لوٹ آ..... تیرا کیا بگڑ جائے گا جو لوٹ آئے۔ کیا اچھا ہو، مری کے فلیٹ میں گزرے سنہری دن تمام نہ ہوئے ہوں۔ تاوان اور دیوی وغیرہ لکھنے والے خوش رنگ شب و روز ابھی تک چل رہے ہوں۔ علی سفیان آفاقی، ایم اے راحت اور محی الدین نواب جیسی شخصیات سے محفل آرائی ابھی جاری ہو۔ ابھی گاہے بگاہے کراچی سے ایک جہاز لاہور ائرپورٹ پر اترتا ہو اور معراج رسول صاحب کی دلکش مسکراہٹ جلوہ دکھاتی ہو، کیا ہی اچھا ہو.....

اے گردش ایام، تو کیوں نہیں سنتی ہم جیسوں کی آواز؟

+++

چاندی کے پنجرے میں قید ایک سونے کی چڑیا کا احوالِ بے بسی

سلور جوبلی نمبر کی زیبائش میں اضافہ کرتی ایک خوش رنگ تحریر

گناہ گار لڑکی

طاہر جاوید مغل

کسی کی زندگی میں ہلچل کا باعث بن جانے والے کردار کی ناآگہی کا پُرماجرا احوال

ایک مشرقی لڑکی کا فسانہ۔ جبر کی آگ اس پیکرِ جمال کا بدن ہی نہیں، جذبہ و احساس بھی پھونکے دے رہی تھی۔ خوابوں سے کھیلنا اور پیہم اذیت سہنا اس پاک دل و خوش نظر کا مقدر تھا۔ لذتِ گناہ کو خود پر حرام کر لینے کی کڑی مشقت کے دوران آسودگی کا ایک امکان جب اُس کے سامنے آیا تو وہ بھی اس کے احساسِ درد پر بار ہو گیا۔

اس کا نام نجمہ پروین تھا لیکن سب اسے پروین کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ وہ کافی خوب صورت لڑکی تھی۔ باپ کے سوا دنیا میں اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کی ساری محبتیں ساری چاہتیں صرف ایک اسی ہستی سے منسوب ہو گئی تھیں۔ پروین بھی عبدالغنی کے لیے جینے کا سہارا تھی۔ عبدالغنی نے ساری زندگی ریلوے کی ملازمت کی تھی۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان اس کے روزگار کا ذریعہ تھی۔ بڑے دونوں بیٹوں کی شادیاں والدہ کی موجودگی میں ہی ہو چکی تھیں اور وہ دیارِ غیر میں جا بسے تھے۔ اب صرف پروین کے ہاتھ پیلے ہونے تھے اور چونکہ پروین کی والدہ اور عبدالغنی کی شریکِ حیات اس دنیا میں نہیں تھی لہٰذا بیٹی کا تمام تر بوجھ عبدالغنی کے سر پر تھا اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بوجھ بھی عجیب طرح کا تھا۔ اسے اپنے سینے پر محسوس کر کے عبدالغنی کا دم گھٹتا لیکن بوجھ اتارنے کا خیال بھی اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ یہ سوچ کر لرز جاتا کہ جب اس کے آنگن میں پروین کی چاپ بھی نہ رہے گی تو زندگی کتنی کٹھن اور بے معنی ہو جائے گی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں اور انہیں گھر میں رکھنا بادشاہوں کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا۔

محلے کی ایک دو بزرگ اور جہاندیدہ خواتین سے عبدالغنی نے پروین کے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا اور وہ کسی اچھے اور معقول رشتے کی تلاش میں تھیں۔ آخر ایک روز یہ تلاش رنگ لے آئی۔ بیگم کرامت نے عبدالغنی کو ایک خوبرو لڑکے کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا "ناصر نام ہے اس کا۔ بی اے کر رکھا ہے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بالکل جیسے تم چاہتے ہو۔ ہماری پروین انہیں پسند آ جائے تو تین کپڑوں میں لے جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لالچی تو نام کو نہیں ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے اور میرے خیال میں وہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ لڑکا سنگاپور میں رہتا ہے۔ وہاں بڑی اچھی ملازمت ہے اس کی.... پروین کو بھی اس کے پاس سنگاپور پڑے گا۔"

سنگاپور کا نام سن کر عبدالغنی کے چہرے پر رنگ سا گزر لیکن بہت جلد اس نے خود پر قابو پایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں "ان لوگوں میں سے کسی نے پروین کو دیکھا ہے؟"

"ہاں۔ بھائی حیات محمد اور ان کی بیگم نے دیکھا ہے۔ میر بیٹے کی شادی پر آئے ہوئے تھے۔ پروین بھی وہاں تھی۔ بھا حیات محمد نے خود مجھ سے پروین کے بارے میں پوچھا تھا۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، پروین چلمن سے لگی کھ تھی اور اس کا دل انوکھے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

.... بعد کے تمام معاملات آناً فاناً ہی طے ہو گئے تھے۔ پروی یوں لگا جیسے کوئی الجھا سلجھا خواب دیکھ رہی ہو۔ پہلے حیات محمد ان کی بیگم پروین کو دیکھنے آئے، پھر ایک روز پروین کے والد ایک دور کے بھائی کے ساتھ حیات محمد کے گھر گئے۔ دو تی ملاقاتوں میں پروین اور ناصر کا رشتہ طے ہو گیا اور پندرہ روز بعد ان کے نکاح کی تاریخ قرار پائی۔ یہ نکاح ٹیلی فون پر ہونا تھا۔

.... نکاح سے ایک دن پہلے پروین اپنے بستر پر سر تک لحاف اوڑھے گم صم لیٹی تھی۔ اس کے سینے پر ایک کتاب دھری تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں دیکھا جا سکتا لیکن بند آنکھوں کے ساتھ انسان ہزاروں لاکھوں میل دور تک دیکھتا ہے اور حال ہی نہیں، ماضی اور مستقبل بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ پروین بھی بہت دور تک اور بہت پیچھے تک دیکھ رہی تھی۔ اس کے سینے پر جو کتاب دھری تھی وہ شاعری کی تھی اور شاعر کا نام شیراز احمد تھا۔ شیراز احمد کی شاعری سے پروین کی دلچسپی لڑکپن سے تھی۔ شروع شروع میں وہ شیراز

احمر کو صرف پسند کرتی تھی پھر وہ اس کی پرستار بن گئی۔ تر و تازہ لہجے والے اس نوجوان شاعر کی ہر تخلیق پروین کو اپنے دل کی آواز محسوس ہونے لگی۔ جس کو چاہا اور سراہا جاتا ہے اسے دیکھنے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ پروین بھی شیراز احمر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ایک لوئر مڈل کلاس کی لڑکی تھی۔ اس کی پرواز اتنی اونچی نہیں تھی کہ وہ جہاں چاہتی 'پہنچ سکتی اور جس سے چاہے مل سکتی۔ وہ گھر کی چار دیواری اور کالج کی چار دیواری تک محدود تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا محبوب شاعر اسی شہر میں رہتا ہے۔ انہی گلی کوچوں میں گھومتا ہے لیکن وہ اسے ڈھونڈ نہیں سکتی تھی اور شاید ڈھونڈنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ وہ ان ہزاروں لاکھوں لڑکیوں میں سے تھی جو صرف خوابوں میں محبت کرتی ہیں اور تصورات میں زندہ رہتی ہیں۔ حقیقت کی دنیا چونکہ بہت مشقت طلب اور حوصلہ آزما ہوتی ہے لہٰذا وہ حتی الامکان اس سے نظریں چراتی رہتی ہیں۔ پروین بھی شاید اپنے محبوب شاعر کو کبھی قریب سے نہ دیکھ پاتی لیکن ایک اتفاق نے اسے یہ موقع فراہم کردیا۔ ایک روز اخبار دیکھتے دیکھتے اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر پر پڑی۔ "یوم پاکستان کے موقع پر گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ' مشہور شعرا شرکت کریں گے" شاعروں کی فہرست میں شیراز احمر کا نام بھی شامل تھا۔ پروین کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ جس گورنمنٹ کالج میں یہ مشاعرہ ہو رہا تھا وہاں پروین کی ایک قریبی سہیلی بھی پڑھتی تھی۔ اس کی مدد سے پروین اس مشاعرے میں شریک ہو سکتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک سوچ بچار میں مصروف رہی پھر اس نے اپنی سہیلی رابعہ سے کہہ ہی دیا کہ وہ مشاعرے پر جانا چاہتی ہے۔ رابعہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اگلے روز پروین کو اپنے ساتھ کالج لے گئی۔ پروین کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا جیسے وہ کوئی چوری کرنے جا رہی ہو۔ یہ کیفیت اس وقت تک برقرار رہی جب تک وہ مشاعرہ گاہ میں پہنچ نہیں گئی اور اس نے شیراز احمر کو دیکھ نہیں لیا۔ وہ رابعہ کے ساتھ دوسری قطار میں بیٹھی تھی۔ یہاں سے اسٹیج کا فاصلہ پندرہ



بیس فٹ سے زائد نہیں تھا۔ صرف پندرہ بیس فٹ دور وہ شخص موجود تھا جو پروین کے دل و دماغ کو تسخیر کر چکا تھا اور شب و روز اس کی سوچوں پر حاوی رہتا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی میں وہ یوں بیٹھا تھا جیسے برات میں دلہا۔ سرخ و سپید رنگت' جاذبِ نظر نقوش' پیشانی پر جھولتی بالوں کی لٹیں اور سب سے بڑھ کر اس کا باوقار انداز۔ جو غزلیں اور نظمیں پروین پچھلے چار سال سے پڑھتی رہی تھی وہ کسی ایسے ہی شاعر کی ہونی چاہئے تھیں۔ پروین اسے پروانہ وار دیکھتی رہی' یہاں تک کہ مشاعرہ ختم ہو گیا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

جو دھیمی دھیمی چنگاری اس کے سینے میں ایک مدت سے روشن تھی وہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ شیراز احمد کی شاعری پڑھ پڑھ کر اس کے ذہن میں جو ایک خوبصورت شبیہہ بنی تھی وہ شیراز احمد کو دیکھنے کے بعد مکمل ہو گئی تھی۔ اب یہ شبیہہ ہر وقت اس کے تصور پر چھائی رہتی۔ شیراز کی شاعری اب اسے پہلے سے کہیں زیادہ لطف دینے لگی تھی.... پھر ایک روز نجانے کیا ہوا کہ اس نے شیراز احمد کو خط لکھنے کی ٹھانی۔ شیراز احمد کا ایڈریس اسے چند ہی روز پہلے ایک ادبی رسالے میں سے ملا تھا۔ یہ ایڈریس اس نے بڑی احتیاط اور محبت سے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

شیراز احمد کے نام پروین کا پہلا خط شاعری کے حوالے سے تھا۔ تاہم اس میں اپنی والہانہ پسندیدگی کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔ اگلے خطوں میں پروین نے شاعری کے ساتھ ساتھ شیراز احمد کی ذات پر بھی تبصرے کیے اور اپنی اس وابستگی کا اظہار کیا جو وہ پچھلے کئی برسوں سے شیراز احمد کی شخصیت سے رکھتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے ان خوبصورت احساسات سے پردے سرکانے لگی جو وہ شیراز احمد کے بارے میں رکھتی تھی۔ وہ خوشبودار سوچیں' وہ بنفشی رنگ خواب' وہ ریشمی جذبے جو ہمہ وقت اسے گھیرے رکھتے تھے۔ وہ ہر مرتبہ اپنا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیتی تھی لیکن اس خط و کتابت میں ایک خاص بات تھی.... یہ ساری کارروائی یک طرفہ تھی۔ دو طرفہ ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ پروین نے خطوط میں کبھی اپنا ایڈریس نہیں لکھا۔ نہ ہی کبھی دوبارہ شیراز احمد کی اس سے ملاقات ہوئی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ وہ بہت سے خطوط اپنے محبوب شاعر کو لکھ چکی تھی اور یقیناً وہ خطوط اسے ملتے بھی تھے۔ ان خطوط کے ذریعے وہ پروین کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ پروین کون ہے؟ اس نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے گھر کا ماحول کیسا ہے۔ وہ کتنے بہن بھائی ہیں۔ وہ شکل و صورت اور قد کاٹھ کی کیسی ہے۔ اس کی پسند و ناپسند کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ شیراز احمد سے کتنی گہری اور کتنی بے لوث محبت کرتی ہے؟ لیکن اس کے برعکس وہ شیراز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ پروین کے خطوط پڑھ کر اس کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟ ممکن ہے وہ انہیں پڑھے بغیر پھینک دیتا ہے۔ ممکن ہے پڑھتا ہو اور پڑھ کر ہنس دیتا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان خطوط میں پنہاں تڑپ اور محبت کو محسوس کرتا ہو اور پروین سے ملنا چاہتا ہو' اسے جاننا چاہتا ہو....

انہی دنوں شیراز احمد کی پہلی کتاب بازار میں آئی۔ یہ اس کی شاعری کا پہلا مجموعہ "چاند رات" تھا۔ کتاب کی پشت پر شیراز احمد کی ایک خوبصورت تصویر بھی تھی۔ اس کتاب نے خواص و عوام میں مقبولیت حاصل کی اور دو ماہ بعد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا۔ یہ کتاب صبح و شام پروین کے سینے سے لگی رہتی تھی۔ کتاب سینے پر رکھے رکھے وہ سو جاتی تو کتاب کی تصویر زندہ ہو کر اسے اپنے حصار میں لے لیتی۔ گہری سیاہ سوچتی ہوئی آنکھیں' گھونگھریالے بال' گداز ہونٹ اور کشادہ سینہ۔ وہ جیسے ساری رات اس کتاب اور کتاب کی تصویر کے ساتھ بسر کر دیتی۔ اسی کتاب میں ایک نظم "گمنام صدا" پروین کو بہت زیادہ پسند تھی۔ نجانے کیوں پروین کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ نظم اسی کے لیے لکھی گئی ہے۔ شاعر نے ایک ایسی گمنام صدا کا ذکر کیا تھا جو رنگوں' جذبوں اور زندگی کی گداز حرارتوں سے معمور تھی۔ شاعر جب کبھی اداس ہوتا تھا' یہ صدا اس کے کانوں میں گونجتی تھی اور ہزاروں جلترنگ اس کی روح میں بج اٹھتے تھے لیکن اس آواز کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کب ابھرے گی۔ کب سنائی دے گی اور کب خاموش ہو جائے گی۔

ممکن تھا شیراز احمد نے یہ نظم کسی اور جذبے کے تحت لکھی ہو' کوئی اور محرک ہو اس تخلیق کا لیکن پروین جب بھی نظم پڑھتی تھی اسے اپنی طرف منسوب کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی.... کئی موسم تصوراتی محبت کی اسی دھوپ چھاؤں میں گزر گئے۔ پروین اب فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بہار کا موسم تھا۔ پورے شہر میں گلاب کھلے ہوئے تھے۔ فضاؤں میں عجیب سی مستی تھی اور صبح و شام رنگین ہو رہے تھے۔ پروین کو رابعہ کی زبانی پتا چلا کہ موسمِ بہار کو خوش آمدید کہنے کے لیے الحمرا آرٹس کونسل میں کل پاکستان مشاعرہ ہو رہا ہے۔ شاعروں کی فہرست میں جواں نسل کے مقبول شاعر شیراز احمد کا نام بھی شامل تھا۔ مشاعرے کی شام پروین بھی کھنچی ہوئی سی الحمرا میں پہنچ گئی۔ مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ پروین کے شاعر نے بھی خوب خوب داد سمیٹی۔ مشاعرے کے آخر میں کچھ سامعین شعرائے کرام سے آٹوگراف لینے لگے۔ پروین اور رابعہ نے بھی شیراز احمد سے آٹوگراف لیا۔ آٹوگراف بک واپس لیتے ہوئے پروین کا ہاتھ شیراز احمد کے ہاتھ سے مس ہو گیا۔ وہ جیسے ہزاروں وولٹ کے ننگے تار سے چھو گئی تھی۔ اس کے پورے بدن میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اس رات وہ صبح تک جاگتی رہی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ شاہراہِ زندگی پر محبت کی یک طرفہ "ٹریفک" ختم کر دے۔ کم از کم ایک بار تو یہ جاننے کی کوشش کرے کہ فریقِ ثانی کے خیالات اور جذبات اس کے بارے میں کیا ہیں۔ وہ کیوں

ایک بے در گنبد میں قید ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کیوں اس نے اپنی طرف آنے والے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔ ایک عجیب آگ سی اس کے بدن میں پھیل رہی تھی۔ شاعری اور شاعر کی محبتیں یکجا ہو کر ایک منہ زور جذبے کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ شعر ہونٹ بن گئے تھے' آنکھیں بن گئے تھے' بانہیں بن گئے تھے اور شیراز احمد مجسم شاعری بن کر اسے اپنے منہ زور دھارے میں بہائے لیے جا رہا تھا۔ سہ پہر کو کالج سے واپس آتے ہوئے جیسے اس کے قدم خود بخود فیروز پور روڈ کی طرف اٹھ گئے تھے۔ فیروز پور روڈ جہاں شاہ جمال کالونی میں شیراز احمد کے ذاتی رسالے کا دفتر تھا۔ وہ خود بھی کبھی کبھار نظمیں لکھتی تھی' اپنی ٹوٹی پھوٹی تحریریں چھپوانے کی آڑ میں وہ شیراز احمد سے مل سکتی تھی۔ اس سے راہ و رسم بڑھا سکتی تھی اور اسے یہ بھی بتا سکتی تھی کہ پچھلے پانچ سال سے اسے جو چاہت بھرے خطوط مل رہے ہیں ان کی لکھنے والی وہی ہے۔

وہ جیسے خواب میں چلتی ہوئی شیراز احمد کے دفتر تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن عین وقت پر وہ رک گئی۔ نجانے کیا ہوا تھا۔ شاید وہ شرم و حیا سامنے آئی تھی جو مشرقی عورت کا زیور کہلاتی ہے۔ شاید خاندانی شرافت نے اس کا راستہ روکا تھا۔ یا پھر فطرت نے اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں جو پروگرام "فیڈ" کیا تھا اس میں یہ "ٹکشن" شامل ہی نہیں تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے "محبوب" کے دروازے پر دستک دے گی۔ وہ واپس لوٹ آئی تھی۔ یہ اس کی "دلیرانہ کوششوں" کی انتہا تھی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی' لہٰذا اپنی جگہ اپنے مقام پر خاموش بیٹھ گئی' اس موہوم امید کے سہارے کہ شاید کبھی کوئی انہونی ہو جائے اور جس دروازے پر وہ دستک نہیں دے سکی تھی وہ خود بخود کھل جائے۔ کچھ اور مشرقی لڑکی کے بس میں نہ ہو لیکن خواب تو اس کے بس میں ہوتے ہیں اور پروین بھی پھر خواب دیکھنے لگی تھی.... خواب جو کبھی پورے نہیں ہوتے۔

تھوڑے ہی عرصے میں پروین کے احساسات اور جذبات میں ٹھہراؤ سا آگیا۔ پھر اس کی والدہ فوت ہو گئیں اور وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں تنہا رہ گئی۔ بوڑھے باپ کی کمزوری اور ناتوانی دیکھ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا۔ وہ سوچتی تھی جب وہ بھی اس گھر میں نہ رہے گی تو ابا کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ امی کے انتقال کے بعد ابا بھی بیمار بیمار سے رہنے لگے تھے' وہ ہر وقت ان کی دیکھ بھال اور خدمت میں مصروف رہتی۔ یوں جہاں اسے روحانی سکون ملتا وہاں لایعنی خیالات سے بھی اس کی جان چھوٹی رہتی۔ شیراز احمد کی تصویر اس کے تصور سے اوجھل تو نہیں ہوئی تھی لیکن اب اس میں پہلے والی چمک دمک باقی نہیں رہی تھی.... شیراز احمد کی محبت جو ایک منہ زور طوفانی ریلے کی شکل اختیار کر گئی تھی' اب ایک ہموار پُرسکون ندی کی طرح اس کی ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں بہتی تھی اور اس ندی کی موجودگی سے صرف وہی باخبر تھی۔

○☆○

اور اب پروین کی شادی ہو رہی تھی۔ کل اس کا نکاح تھا اور پھر ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اسے ہزاروں میل دور اپنے پیا کے دیس سدھارنا تھا۔ پروین کی خاموش محبت کی کہانی وہی تھی جو ہزاروں سال سے دہرائی جا رہی ہے اور اس کا انجام بھی قریباً قریباً وہی تھا۔

○☆○

اگلے روز فون پر نجمہ پروین دختر عبدالغنی کا نکاح ناصرالدین ولد حیات محمد سے ہو گیا۔ پروین کا شوہر خود پاکستان نہیں آسکتا تھا لہٰذا پروین کو اس کے پاس جانا تھا۔ آٹھ دس روز وہ اپنے سسرال میں رہی پھر اس کے سفری کاغذات مکمل ہو گئے۔ ٹکٹ آگیا اور وہ پیا دیس سدھارنے کے لیے تیار ہو گئی۔ پروین کے سسر کو اس کے ساتھ جانا تھا۔ لیکن عین وقت پر قریبی رشتے داروں میں ایک موت ہو گئی اور پروین کو اکیلے رخصت ہونا پڑا۔ وہ لاہور ائرپورٹ سے یوں رخصت ہوئی جیسے دلہن اپنے گھر کی دہلیز سے رخصت ہوتی ہے۔ عجیب رخصتی تھی یہ' نہ برات' نہ بینڈ باجا' نہ تنہائی کی گونج نہ سہیلیوں کے جھرمٹ۔ وہ اپنے باپ اور سسر سے گلے ملی' اپنی ساس کا پیار لیا اور کاغذات دکھا کر ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہو گئی۔ اسے سفر کے بارے میں سب کچھ سمجھایا جا چکا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا شوہر سنگاپور کے ائرپورٹ پر اسے لینے کے لیے موجود ہو گا۔ دیگر تمام ہدایات بھی اسے ازبر تھیں لیکن پھر بھی اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا اور وہ کسی ایسی بچی کی طرح قدم اٹھا رہی تھی جس نے نیا نیا چلنا سیکھا ہو۔

سفر بخیر و خوبی گزرا۔ ائرپورٹ پر ناصر اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ وہ ناصر کی کئی تصویریں دیکھ چکی تھی۔ ناصر اپنی تصویروں سے قدرے مختلف نظر آیا تاہم پروین کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ ناصر نے بھی پروین کو بہ آسانی پہچان لیا۔ شاید ناصر نے اس کی تصاویر نہ بھی دیکھی ہوتیں تو پہچان لیتا۔ خوبصورت' سمٹی سمٹائی' حیا کے رنگوں سے چہرہ گلنار کیے ہوئے لڑکی اس کی دلہن کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ وہ پروین کو دیکھ کر جلدی سے اس کے قریب آگیا "السلام علیکم" اس کی مردانہ آواز پروین کے کانوں میں گونجی۔

"وعلیکم السلام" وہ پلکیں اٹھا کر بمشکل کہہ سکی۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ سرتاپا لرز رہی ہے۔ جیسے وہ حجلۂ عروسی میں پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہے اور اس کا دلہا گھونگھٹ اٹھا رہا تھا۔ یہ کیسا انوکھا ملاپ تھا۔ وہ ہزاروں میل سے چل کر اپنے دلہا کے پاس آئی تھی' اور وہ پہلی بار ائرپورٹ پر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"چلو پروین" ناصر نے اپنائیت سے کہا۔
اس کے لہجے اور انداز نے پروین کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا' ورنہ تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ پتھر کے بُت کی طرح اپنی جگہ کھڑی رہ جائے گی اور لوگ اسے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگیں گے۔ ائرپورٹ کی عمارت سے نکل کر وہ ایک کار میں آبیٹھے۔ یہ ناصر کی ذاتی کار تھی۔ اس وقت رات ہو رہی تھی۔ سنگاپور کی سڑکیں رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پروین کو یہ سب خواب کا سماں لگ رہا تھا۔ ناصر کا فلیٹ خوبصورت تھا اور ایک صاف ستھرے علاقے میں واقع تھا۔ اس فلیٹ میں ناصر اور پروین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ناصر نے پروین کی خاطر تواضع کے لیے تین دن کا کھانا پہلے ہی پکوا کر فریج میں رکھا ہوا تھا۔ صرف کھانا گرم کرنے کے لیے انہیں چولہا جلانا پڑتا تھا۔ ایک دن تو مکمل آرام میں گزرا پھر اگلی شام ناصر نو بیاہتا بیوی کو لے کر سیرو تفریح کے لیے نکلا "سنگاپور دیکھنے چلو گی؟" اس نے پوچھا تھا۔
"جیسے آپ کی مرضی" وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی تھی۔ ناصر کی قربت اس کے دل کو بے طرح دھڑکا رہی تھی۔ وہ رات گئے تک سنگاپور کے ہنگاموں میں بہتے رہے۔ وہ رات پروین کی سہاگ رات بھی تھی۔ خوشبوؤں' رنگوں اور سرگوشیوں میں ڈوبی ہوئی رات جو پروین پر زندگی کے نئے مطالب و معانی کھول گئی۔ وہ شخص جو دو روز پہلے تک اس کے لیے اجنبی تھا اب رگِ جان سے بھی قریب آچکا تھا۔ پروین کو یوں لگا جیسے زندگی کا سفر اس کے لیے آسان ہو گیا ہے۔ ناصر کی اپنائیت' محبت اور خوش سلوکی نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔
قریباً ایک ماہ تک وہ دونوں جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتے رہے۔ ان کی مصروفیات کھانے پینے اور سیرو تفریح تک محدود تھیں.... آخر ناصر کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ پھر سے دفتر جانے لگا۔ پروین نے کچن تو پہلے ہی سنبھال لیا تھا اب اس نے فارغ وقت میں مصروف رہنے کے لیے گھر کا دیگر کام کاج بھی شروع کر دیا۔ ناصر کے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے گھریلو ملازمہ کو چھٹی دے دی تھی۔ وہ ناصر کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی اور اس کی خدمت کر کے اسے دلی سکون محسوس ہوتا تھا۔ خاص طور پر وہ ناصر کے لیے جو وقت کچن میں گزارتی تھی وہ بہت اچھا گزرتا تھا۔ ناصر کو نت نئے کھانے کھلانا اور اسے کھاتے دیکھ کر خوش ہونا پروین کی "ہابی" بن گئی تھی۔ ایک مشرقی بیوی کی تمام خوبیاں پروین میں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور اس کی ان خوبیوں نے ناصر کو اس کے حلقۂ احباب میں قابلِ رشک بنا دیا تھا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ دھیرے دھیرے پروین کو ناصر کے رویّے میں تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ پروین سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا۔ کبھی کبھی وہ "ان کہی" کے ان مشکل الفاظ کو زبان پر لانے کے لیے بالکل تیار نظر آتا لیکن پھر ان کہی.... ان کہی ہی رہتی اور ناصر پہلے سے زیادہ بیزار اور جھلایا ہوا نظر آیا۔ پروین یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ ناصر کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتا ہے اور اس کے دوستوں میں بھی نئے نئے چہرے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ چہرے پروین کو ناپسند تھے اور وہ دبی زبان میں ناصر سے ان کا ذکر بھی کر چکی تھی۔ پروین نہیں چاہتی تھی کہ نشے میں غرق رہنے والے اور آزادانہ گفتگو کرنے والے دوست ناصر کے ساتھ فلیٹ میں آئیں اور رات گئے تک براجمان رہیں۔ ان ناپسندیدہ دوستوں کی وجہ سے پروین اور ناصر کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ خود بھی روزانہ ڈرنک کرنے لگا تھا اور سگریٹ تو ہر وقت اس کی انگلیوں میں دبی رہتی تھی۔ نجانے یہ تبدیلی کیوں آئی تھی؟ یا پھر ناصر شروع ہی سے ایسا تھا۔ صرف پروین کی خاطر اس نے دو ڈھائی ماہ اپنا روپ بدلے رکھا تھا۔ ناصر کا بدلا ہوا رویّہ دیکھ کر پروین کے دل میں بہت سے خوابیدہ خدشے بیدار ہونے لگے تھے۔ پاکستان سے والد کے خطوط اکثر اسے ملتے رہتے تھے۔ وہ انہیں خیر خیریت سے آگاہ کرتی تھی۔ اپنی زندگی میں آنے والی بے چینی کی لہر سے اس نے سب کو بے خبر رکھا تھا۔
ایک روز انتہا ہو گئی۔ ناصر اکثر دوستوں کی محفل میں پروین کو بھی بلا لیتا تھا۔ کبھی چائے وغیرہ لانے کے بہانے' کبھی کوئی دلچسپ لطیفہ سنانے کے لیے اور کبھی ویسے ہی کسی سے تعارف کرانے کے لیے۔ شروع شروع میں پروین کا خیال تھا کہ ناصر فطری طور پر روشن خیال ہے اور آزادانہ سوچ رکھتا ہے' وہ نہیں چاہتا کہ پروین اس کے حلقۂ احباب سے کٹی رہے اور اس کے دوستوں سے گھونگھٹ نکال کر ایک طرف بیٹھی رہے۔ وہ اسے اپنے ماحول میں رچانا بسانا چاہتا ہے لیکن بہت جلد پروین کو اپنا یہ خیال باطل محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ ناصر کی بیوی نہیں کوئی نمائشی چیز ہے جسے ناصر اپنے دوستوں کو دکھاتا ہے اور ان کی نگاہوں میں حرص و ہوس کی چنگاریاں دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے.... ایک روز ڈرائنگ روم میں تاش کا کھیل ہو رہا تھا۔ سامنے ٹیبل پر وہسکی کی دو بوتلیں بھی موجود تھیں۔ پورا کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ پروین دو دفعہ چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں بھجوا چکی تھی' اب مچھلی فرائی کر رہی تھی۔ وہ ہفتے کی رات تھی اس لیے محفل کچھ زیادہ ہی رنگ پر آئی ہوئی تھی۔ رات دس بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ کال ناصر کے ایک دوست کے لیے تھی۔ کال سن کر وہ واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ناصر کچن میں آگیا۔ کہنے لگا "چلو پروین! ذرا ہمارا ساتھ دو۔"
"کس بات میں؟" پروین نے پوچھا۔
"بھئی کھیل میں اور کس میں۔ آصف کے جانے سے ایک پارٹنر کم ہو گیا ہے۔ دس منٹ کی بات ہے' ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"
"ناصر! آپ کیا کہہ رہے ہیں" پروین نے تورا چڑھا کر دلی

آواز میں کہا "میں وہاں ان لوگوں میں بیٹھ کر تاش کھیلوں گی؟"

"بھئی وہ کوئی بیگانے تو نہیں۔ گھر کے افراد کی طرح ہیں اور ان میں سے کوئی آدم خور بھی نہیں جو تمہیں کھا جائے گا" ناصر نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"پلیز ناصر! یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ مجھ سے ایسے کام مت کروایا کریں۔"

"او کم آن یار" ناصر نے بے تکلفی سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ اٹھنے کی کوشش میں کرسی سے ٹکرا گئی۔ اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی اور ایک دو چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی "بالکل نفس ہو تم" ناصر نے تلخ سرگوشی کی اور تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔

اس رات پروین نے کھانا بھی نہیں کھایا اور بستر پر پڑی دیر تک سسکتی رہی۔ رات ایک بجے کے لگ بھگ دوستوں کی محفل برخاست ہوئی اور ناصر سونے کے لیے کمرے میں آیا۔ پروین گم صم لیٹی رہی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہننے کے بعد لائٹ آف کی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ پروین اب تک اس سے صرف دوبار روٹھی تھی اور دونوں دفعہ اس نے بڑی آسانی سے منالیا تھا۔ وہ منانے کا فن جانتا تھا' پروین اس کی باتوں سے موم کی طرح پگھل جاتی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ اس موم سے جو چاہے بنا لیتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ پروین چند منٹ سے زائد اپنی ناراضگی برقرار نہ رکھ سکی اور ناصر کی گرم جوش محبت میں بہتی چلی گئی۔ بیڈ روم کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں فقط ان کے سانسوں کی گونج تھی۔ اسی دوران ناصر اپنے سگریٹ وغیرہ رکھنے کے لیے الماری تک گیا اور واپس آگیا۔ وہ ایک بار پھر ایک دوسرے میں گم ہونے لگے اور تاریکی انہیں اپنے اندر گم کرنے لگی۔ یکایک ..... پروین کو ایک عجیب احساس ہوا۔ ایک ایسا احساس جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ لفظوں میں بیان کرنا تو دور کی بات ہے اسے ذہن میں لانا بھی ممکن نہیں تھا۔ پروین کا ذہن کسی انتہائی برق رفتار کل پرزے کی طرح ایک سیکنڈ میں ہزارہا دفعہ گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ ناصر کی کلائیوں پر تھے۔ اسے یوں لگا..... جیسے یہ ناصر کی کلائیاں نہیں۔ بے حد تیزی سے اس کا ہاتھ ناصر کے شانوں' گردن اور چہرے پر دوڑ گیا۔ اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کے لرزاں ہاتھ "کچھ" دیکھ چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے پروین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ پھر اس کے رگ و پے میں ایک حیوانی قوت دوڑی اور اس نے وحشیانہ جھٹکے سے "ناصر" کو دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلاتی سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی۔ لیکن اسی لمحے پیچھے ہٹ جانے والے تاریک سائے نے اسے پھر دبوچ لیا۔

"کون ہو تم..... کون ہو تم؟" پروین پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخی۔

تاریک سائے کے حلق سے دبی دبی غراہٹ نکلی۔ یہ آواز ناصر کی ہرگز نہیں تھی۔ یکایک پروین کے ذہن میں پھلجھڑیاں سی پھوٹ گئیں۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

○☆○

دوبارہ اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ فلیٹ کے ہی ایک اندرونی کمرے میں تھی۔ اب اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی سے پتا چلتا تھا کہ اس خوفناک رات کی صبح ہو چکی ہے جو کسی باؤلی چمگادڑ کی طرح اس کے ذہن سے چمٹی ہوئی ہے۔ ناصر اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ گئی رات کے واقعات برقی کوندے کی طرح اس کے ذہن میں تازہ ہوئے اور پروین کے تن بدن میں انگارے ہی انگارے بھر گئے۔ اسے یاد آیا ناصر سگریٹ رکھنے کے لیے الماری کی طرف گیا تھا اور جو واپس آیا تھا وہ ناصر نہیں تھا۔ وہ سرتاپا جل اٹھی۔ اس میں ہمت ہوتی تو تڑپ کر ناصر پر جا پڑتی اور اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ یوں نوچتی کہ کوئی اسے پہچان نہ سکتا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ شاید وہی کمپیوٹر اور ذہن والی بات تھی۔ فطرت نے اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں یہ پروگرام "فیڈ" ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی بدترین رات کی صبح اپنے بے غیرت شوہر پر حملہ کرے گی اور اس کا منہ نوچ کر ناقابلِ شناخت بنا دے گی..... ہاں' نہیں تھی یہ بات اس کے بس میں۔

اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ یہ فلیٹ عمارت کی آخری منزل پر واقع تھا اور دیگر بھی الگ تھلگ تھا۔ ناصر کو خدشہ نہیں تھا کہ پروین کی چیخ پکار باہر سنی جائے گی لہٰذا وہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔

"یہ تم نے کیا کیا میرے ساتھ ناصر..... یہ تم نے کیا کیا" روتے روتے فریاد کناں لہجے میں بولی۔ اپنی آواز اسے اپنے کانوں میں اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ ناصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے جواب دینے یا نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اپنی بدبختی پروین کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی' وہ ایک بے غیرت شخص کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ اور یہ بے غیرت شخص اب اسے اپنے دوستوں کی ہوس کا چارا بنانا چاہتا تھا..... پچھلے دو تین ہفتے سے ان کے بیڈ روم میں گہری تاریکی رہتی تھی۔ پروین کا خیال تھا کہ شاید ناصر تاریکی میں سونا پسند کرتا ہے۔ اب اسے خبر ہو رہی تھی کہ وہ تاریکی ایک بھیانک سازش کے تانے بانے کا حصہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ کل رات گزرنے والا سانحہ پروین کے لیے "پہلا" نہ ہو۔ اس سے پہلے بھی وہ اس روح فرسا سانحے سے دوچار ہو چکی

ہو۔ یہ پرایا دیس' یہ اجنبی در و دیوار اور ان در و دیوار کی اندھی تاریکی۔ اس تاریکی میں کسی بھی وقت "چہرہ" بدل سکتا تھا۔ کسی بھی وقت اس کے شوہر کی جگہ کوئی دوسرا لے سکتا تھا۔ جب انسان برائی پر اتر آئے اور اس برائی کے نتائج و عواقب سے نمٹنے کی تیاری بھی کرلے تو پھر وہ ہر انتہا تک جاسکتا ہے۔ پروین رو رہی تھی اور سوچ سوچ کر اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کے شوہر کی جگہ کوئی اور ہو اور وہ محسوس نہ کرسکے۔ وہ کتنی بھی نو آموز' کتنی بھی سیدھی سادی سہی لیکن ایسا بھیانک دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ یقیناً کل رات گزرنے والا سانحہ پہلا سانحہ تھا..... لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ پہلا سانحہ تھا' دوسرا تھا' یا چوتھا' وہ ذلت اور غلاظت کے عمیق گڑھے میں گر چکی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت خودکشی کرلے۔ دوڑ کر جائے اور چھٹی منزل سے نیچے چھلانگ لگادے یا ناصر کا پستول تلاش کرکے ایک گولی اپنے سر میں اتار لے..... لیکن شاید وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ دستِ فطرت نے خودکشی کا "پروگرام" بھی اس کے ذہن میں فیڈ نہیں کیا تھا۔ وہ روتی رہی اور لگاتار روتی رہی۔ دل میں آتش فشانی کا عمل جاری رہا اور پگھلا ہوا لاوا اس کی آنکھوں سے بہتا رہا۔ ناصر کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا' پھر کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر باہر نکل گیا۔

دوپہر تک پروین کی آنکھیں برستی رہیں پھر وہ نڈھال سی ہو کر سو گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو وال کلاک شام پانچ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ اس نے دیکھا سائیڈ ٹیبل پر ایش ٹرے کے نیچے ایک نیلا کاغذ دبا ہوا ہے۔ کاغذ پر ناصر کی تحریر اس نے دور ہی سے پہچان لی۔ اس نے یہ تحریر پڑھنا شروع کی۔ لکھا تھا۔

"ڈیئر پروین! میں اپنے آپ کو دنیا کا بدترین انسان تصور کر رہا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تم سے آنکھیں ملا سکوں۔ تمہارے جیسی لڑکی کو دکھ دے کر میں اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے خودکشی کرلوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ میری... خودکشی سے تمہاری مصیبتیں کم تو نہیں ہو جائیں گی۔ وہ مزید بڑھ جائیں گی۔ پروین اب جو بات میں کہنے لگا ہوں اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا اور اس امر پر پختہ یقین رکھنا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ پروین! در حقیقت میں بہت بری طرح کچھ خطرناک لوگوں میں پھنس چکا ہوں۔ وہ ہر جگہ اور ہر وقت میری نگرانی کرتے ہیں۔ میرے دوستوں میں بھی ان کے مخبر شامل ہیں۔ یہ لوگ پرلے درجے کے سفاک ہیں۔ میری اور تمہاری جان لینا ان کے لیے دو نئی مسلنے کے برابر ہے۔ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں' یا ان کے کہنے پر بے چون و چرا عمل کریں یا تکلیفیں جھیل کر جان دے دیں۔ شاید تم سوچو کہ میں بدترین ذلتیں جھیلنے کے بجائے سنگاپور کی پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتا جو اپنی گرفت کی وجہ سے بہت طاقتور بھی ہے' یا میں یہاں سے فرار کیوں نہیں ہو جاتا۔ تم یہ باتیں سوچ سکتی ہو' کیونکہ تمہیں ابھی کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میں نہیں سوچ سکتا۔ میں نے ہر جتن کرکے دیکھ لیا ہے۔ ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ناممکن ہے۔ فیصلہ بے حد تکلیف دہ ہے لیکن اب تمہیں ہی کرنا ہے۔ تم اپنی اور اپنے بے بس شوہر کی جان بچانا چاہتی ہو اور کسی اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہتی ہو یا موت کو گلے لگانا چاہتی ہو۔ میں ہر دو صورتوں میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

فقط تمہارا بدنصیب شوہر

خط کے الفاظ پروین کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ ہر طرف نیلی پیلی نارنجی چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور ناصر کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے احتیاط سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور آہستگی سے بولا "کھانا کھالو پروین۔"

کتنی ملائمت اور اداسی تھی اس لہجے میں لیکن اس ملائمت اور اداسی میں بناوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بناوٹ ایک تیز دھار نکیلے خنجر کی طرح پروین کے سینے میں پیوست ہو رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ کھانے کی ٹرے کی طرف متوجہ تھا۔ کتنا معصوم اور مظلوم نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا وہ۔ اسے دودھ پیتی بچی سمجھتا تھا کہ من گھڑت قصوں سے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پروین کو سو فیصد یقین تھا کہ ناصر کا خط الف سے ے تک جھوٹ ہے۔

بے اختیار اس کا ہاتھ کھانے کی ٹرے کی طرف بڑھا اور اس نے ٹرے کو دھکیل کر فرش پر پھینک دیا۔ پھر وہ بستر سے اٹھی اور روتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔ ناصر نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ چلائی "چھوڑ دو مجھے' ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں کہتی ہوں چھوڑو۔ میں ایک پل یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

وہ بولا "کیا کرتی ہو پروین۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو؟ کہاں جاؤ گی اس وقت؟ پلیز پروین...."

"کہیں بھی جاؤں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی" وہ چلا کر بولی۔

پتا نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ وہ تو ہر ستم چپ چاپ سہہ جانے والی چھوئی موئی سی لڑکی تھی۔ اس نے زور لگا کر خود کو ناصر کی گرفت سے چھڑانا چاہا تو ایک دم اس کے تیور بدل گئے..... اور صرف تیور ہی نہیں لہجہ بھی بدل گیا "ہوش کرو" وہ ایک اجنبی سے لہجے میں بولا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ایک دم سخت ہو گئی اور اس نے پروین کو دھکا دے کر بستر پر پھینک دیا۔ بستر پر گرتے ہی وہ اٹھی اور پھر دروازے کی طرف لپکی۔ اس مرتبہ ناصر نے اس کے بال پکڑے اور رخسار پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔ وہی رخسار جن کی تعریفیں کرتے وہ تھکتا نہیں تھا' وہی بال جن کو وہ خوشبودار ریشم کہتا تھا۔ تھپڑ کھا کر پروین کی آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ دوسرا تھپڑ پروین کے چہرے کے عین سامنے ناک اور ہونٹوں پر لگا۔ وہ پھر تیورا کر بستر پر جا گری۔ اس کے بعد تو جیسے

اس پر قیامت ٹوٹ گئی۔ ناصر نے گھونسوں اور لاتوں سے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ وہ اٹھ رہی تھی گر رہی تھی' پھر اٹھ رہی تھی۔ کبھی دیواروں سے ٹکراتی تھی کبھی فرنیچر سے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ناصر کا چہرہ کسی خونخوار درندے کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں دہاڑا "حرامزادی' خون پی جاؤں گا تیرا۔ ہڈیاں توڑ دوں گا۔ تیری یہ جرأت کہ ہاتھا پائی کرے مجھ سے۔"

وہ پروین کو بے دردی سے مارتا رہا' کوئی اسے چھڑانے نہیں آیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے' وہ لہولہان ہوگئی اور ایک بار پھر ہوش و حواس کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔

○☆○

ہوش میں آنے کے بعد پروین نے ناصر کا ایک نیا ہی روپ دیکھا۔ وہ ایک ایسے سفاک اور جابر شخص کے روپ میں اس کے سامنے آیا جو قانونی طور پر اس کا شوہر بھی تھا۔ اس نے پروین کو واضح الفاظ میں بتادیا کہ اسے اس کے اشاروں پر چلنا ہوگا ورنہ وہ بہت برے حالات کا شکار ہو کر مرے گی۔ اس اجنبی ملک میں اجنبی لوگوں کے درمیان کون تھا جو اس کی مدد کرتا۔ ناصر ہر طرح اس پر حاوی تھا۔ وہ اسے سنگاپور سے تھائی لینڈ لے آیا۔ بدنام زمانہ شہر بنکاک میں ناصر کے ایک تھائی دوست کی کوٹھی پروین کا نیا مسکن ٹھہری۔ وہ خوبصورت تھی' جوان تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سحر انگیز جسمانی کشش کی مالک تھی۔ ناصر اس کی مدد سے لاکھوں کمانا چاہتا تھا۔ یوں وہ پروین پر بے حد مہربان تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ اسے ہر طریقے سے خوش اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی کرنے لگتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ اپنے اس فیصلے پر اٹل تھا کہ پروین کو گاہے گاہے اس کی مذموم خواہشات پوری کرنا ہوں گی۔ اس کے نزدیک یہ زندگی عیش و آرام سے جینے کے لیے تھی اور عیش و آرام کے حصول کے لیے کوئی سا بھی راستہ اختیار کرنا جائز تھا۔

پروین نے اس جال سے نکلنے کی بہت کوشش کی۔ آخر وہ ہار گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خودکشی کر سکتی اور اس "بزدلی" کی سزا اسے یہ ملی کہ ایک رات اسے ایک امیر کبیر انڈین تاجر کے بستر کی زینت بننا پڑا۔

یہ تاجر کار منسٹن کا کام کرتا تھا اور اس سلسلے میں بنکاک آیا ہوا تھا۔ ناصر اسے گھیر گھار کر کوٹھی میں لے آیا۔ پھر پروین کو ہدایت کی کہ وہ اس کے پاس کمرے میں چلی جائے۔ حالات بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ پروین تو پھر ایک ناتواں بے سہارا لڑکی تھی' بڑے بڑے فولادی انسان بتدریج حالات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔ جن جان سے پیارے لوگوں کی جدائی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا وہ بستر علالت پر لیٹے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان کی زندگی اور موت میں کوئی خاص فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔ پروین کی "پاکیزگی" بھی بستر علالت پر لیٹی تھی اور چند ہفتوں میں جاں بلب ہوگئی تھی۔ اب اس سے جدائی کا وقت آیا تھا تو پروین کو کوئی خاص قلق ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ نہ اس پر کوئی قیامت ٹوٹی تھی نہ وہ پاگل ہوئی تھی' نہ روئی چلائی تھی۔ اپنی بدقسمتی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس نے خود کو ایک بے جان لاشے کی طرح ایک عیاش خریدار کے سامنے پھینک دیا تھا۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ ناصر کی آنکھوں سے حجاب کا ہر پردہ اٹھ گیا۔ وہ بڑی شرمناک ڈھٹائی کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے روز کسی "مہمان" کو گھر لانے لگا۔ ناصر کے اشارے پر پروین کو کسی کٹھ پتلی کی طرح حرکت کرنا پڑتی۔ اگر کسی وقت وہ احتجاج کا سوچتی تو اسے وہ مار یاد آتی جو ناصر نے اسے سنگاپور کے فلیٹ میں ماری تھی اور جس کے بعد وہ کئی دن بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کا رواں رواں لرز جاتا اور وہ ڈر سہم کر اپنے آپ میں سمٹ جاتی۔ انسانوں کے جنگل میں ایک تنہا اور بے آسرا لڑکی کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس پر ناصر اور اس کا تھائی دوست ہر وقت کڑا پہرا رکھتے تھے۔ اگر اسے کہیں جانا بھی ہوتا تھا تو ان دونوں میں سے ایک اس کے ساتھ ہوتا تھا اور پروین کو ہمہ وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ گن پوائنٹ پر چل پھر رہی ہے۔ پروین کئی ماہ اپنے باپ سے ملنے کے لیے تڑپتی رہی' پھر ایک روز اس کی یہ تڑپن ختم ہوگئی۔ سچ کہتے ہیں کہ غم کا حد سے گزر جانا دوا ہو جاتا ہے۔ اپنے بچھڑے باپ کا غم بھی آخر پروین کے لیے دوا بن گیا تھا۔ ناصر نے پروین کو پاکستان سے آنے والا ایک خط لا کر دیا۔ یہ خط سنگاپور کے پتے پر آیا تھا اور پروین کے ایک دور دراز کے چچا نے لکھا تھا۔ اس خط میں پروین کے باپ کی موت کی اطلاع تھی۔ چند روز پروین ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح روئی پھر دھیرے دھیرے اسے صبر آگیا۔ اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں یہی پروگرام فیڈ تھا کہ جب دیار غیر میں اسے اپنے باپ کے مرنے کی روح فرسا اطلاع ملے گی تو وہ دو تین ہفتے رونے رلانے کے بعد قرار پا جائے گی۔ اس واقعے کے بعد وہ کچھ اور بے حس ہوگئی' کچھ اور خاموش ہوگئی۔ اس نے جیسے بڑی لاتعلقی سے خود کو زندگی کے دھارے میں پھینک دیا تھا۔ وہ اسے جہاں جی چاہے لے جاتا۔

کبھی کبھار پروین آئینہ دیکھتی تو اسے عجیب سا لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے چہرے پر گناہ کی کالک کا چھوٹا سا داغ بھی نہیں ہے۔ اسے اپنے چہرے پر وہی معصومیت اور شادابی نظر آتی جو گناہ کی دلدل میں گرنے سے پہلے تھی۔ وہ سوچتی اس طرح کی زندگی گزارنے والوں کے چہرے ایسے تو نہیں ہوتے۔ شاید یہ اس کی خوش نظری تھی' یا پھر یہ بات تھی کہ وہ گناہ کی دلدل میں گر کر

بھی اور غلاظت میں لتھڑ کر بھی اندر سے پاک صاف تھی۔ اس کا جسم مجبور کردیا گیا تھا لیکن اس کی روح اب تک شبنم' دھوپ' چاندنی اور بادِ صبا کی طرح شفاف تھی۔

قریباً ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ دھیرے دھیرے ناصر اس پر پابندیاں نرم کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ اسے کسی قابلِ اعتماد گاہک کے ساتھ باہر بھی بھیج دیتا تھا۔ ایک دوبار وہ اکیلی بازار بھی گئی۔ درحقیقت اب ناصر کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ کہیں نہیں جائے گی۔ وہ اس کی پہنچ اور طاقت کا اندازہ لگا چکی تھی اور جان چکی تھی کہ اس جال کو توڑنا اس کے بس میں نہیں ہے.... اور ناصر کی یہ سوچ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ چھوئی موئی سی پروین اتنا کچھ بیت جانے پر بھی چھوئی موئی ہی تھی۔ اس میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ وہ کوئی بڑا فیصلہ کرسکتی۔ بڑا فیصلہ تو کجا ناصر کی قوتِ تسخیر کا ہدف بننے کے بعد وہ چھوٹا فیصلہ کرنے میں بھی دشواری محسوس کرتی تھی۔ ناصر کے ساتھ اس کا رویہ ابھی تک وہی تھا جو ایک سخت گیر شوہر کے سامنے لاچار بیوی کا ہوتا ہے۔ شاید لاشعوری طور پر وہ ناصر کو ابھی تک اپنا شوہر ہی سمجھتی تھی۔ جس گھر میں وہ ناصر کے زیرِ سایہ رہتی تھی وہ اس کی پناہ گاہ تھا۔ یہ پناہ گاہ کیسی بھی تھی۔ پناہ گاہ تو تھی۔ اسے اس چار دیواری سے باہر ہر طرف بھیڑیے نظر آتے تھے۔ چیر پھاڑ کرنے اور خون پینے والے بھیڑیے۔ پروین کا رابطہ اپنے ماضی سے بالکل کٹ چکا تھا۔ اس نے کئی بار ان لوگوں کو یاد کیا تھا جنہوں نے اس کا رشتہ طے کرایا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے سسرالی رشتے داروں کو یاد کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی اس کے حال میں جھانکنے نہیں آیا تھا۔ ایک بار ناصر نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اپنے والدین سے قطع تعلق کرچکا ہے۔

ایک روز ناصر شام کے بعد ایک خوش پوش مہمان لے کر آیا۔ مہمان کو دیکھ کر پروین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں.... وہ شیراز احمد تھا۔ پینٹ قمیص پہنے ہوئے' ٹائی لگائے ہوئے اور چمکدار بوٹ پہنے ہوئے۔ اس نے آستینیں کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں اور اس کے بازوؤں کے سیاہ بال بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اسے اپنی نگاہ پر یقین نہیں آیا۔ شاید وہ کوئی بھولا بسرا خواب دیکھ رہی تھی۔ کہاں لاہور اور کہاں یہ شہرِ خرابی بنکاک۔ شیراز احمد نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی شربتی آنکھوں میں ہلکا ہلکا نشہ تھا۔ گداز ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ سگریٹ کا کش لے کر اس نے بغور پروین کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک نظر آنے لگی۔ تاہم اس جھلک میں ہلکی سی حیرانی بھی شامل تھی۔ غالباً وہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ خوبصورت ساری میں لپٹی ہوئی یہ نرم و نازک لڑکی اندر آتے آتے رک کیوں گئی ہے' اور اب آنکھیں پٹ پٹا کر اس کی طرف کیا دیکھ رہی ہے۔

"اندر آجاؤ" اس نے مردانہ کشش سے بھرپور آواز میں کہا۔

پروین میکانکی انداز میں چل کر اندر داخل ہوگئی۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

پروین بیٹھ گئی۔ سامنے تپائی پر وہسکی اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ کمرا ائر فریشنر کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی آمیزش تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوتا تھا' لیکن آج کچھ اور طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا محبوب اس کے سامنے تھا۔ وہی کشادہ سینہ' بھرے بھرے بازو' روشن پیشانی کے نیچے دو سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اور حاصلِ غزل شعر جیسے دو گداز ہونٹ۔ پروین نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس کا محبوب اس کی زندگی میں اس وقت آئے گا جب وہ شادی شدہ ہوگی اور اس کا شوہر خود اسے اپنے رقیب کی خلوت میں بھیجے گا۔ وقت کی بساط پر حالات نے یہ کیسی کروٹ بدلی تھی؟ آج کی رات وہ چہرہ اس کے سامنے تھا جو اس کے دل کا داغ تھا اور "اس چہرے" اور پروین کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی۔

"تم انڈین ہو؟" شیراز احمد کی آواز نے اسے چونکایا۔

"نہیں پاکستانی۔"

"کیا نام ہے؟"

"گل" پروین نے وہی نام بتایا جو وہ ایسے موقعوں پر بتایا کرتی تھی۔

"ایک جام بناؤ گی؟" شائستگی سے پوچھا گیا۔

پروین نے بوتل اور پیمانے کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے بھی جام بنا کر اپنے "شریکِ شب" کو دیا کرتی تھی لیکن آج اسے اس کام سے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں ایسا کیوں تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہاتھ بوتل کی طرف بڑھائے اور جام بنا دیا۔ شیراز احمد کا ہاتھ اس کے شانے پر تھا۔ وہ اس لمس کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے خودی کے زیرِ اثر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اسے لگا جیسے وہ تین چار برس پیچھے چلی گئی ہے' وہی الہڑ دوشیزہ بن گئی ہے جو اپنے محبوب کی کتاب سینے پر رکھ کر سوتی تھی۔ اسے محبت بھرے گمنام خط لکھتی تھی اور پہروں اس کی یاد میں کھوئی رہتی تھی۔ اس کا سر آپوں آپ شیراز احمد کے شانے سے چھونے لگا.... لیکن پھر نجانے یکدم اسے کیا ہوا کہ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ شیراز احمد چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پروین اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ معلوم نہیں اچانک کیا ہوگیا تھا اسے؟ ناصر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے پروین کو یوں بھاگ کر کمرے سے نکلتے دیکھا تو اس کے پاس آگیا "کیا بات ہے پروین؟" ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں نہیں جاؤں گی" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"کچھ کہہ دیا اس نے؟" وہ نئے اندیشے کے تحت بولا۔

"نہیں اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس میں نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن کیوں... اس نے پیسے دیے ہیں۔ وہ بھلا مانس آدمی ہے۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے تو... میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔"

"میں نے کہہ دیا نا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں نہیں جاؤں گی" وہ بلند آواز میں بولی۔ ایک برس کے بعد پہلی بار اس کے لہجے میں ہلکی سی خود سری داخل ہوئی تھی۔

ناصر نے گھور کر اسے دیکھا پھر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا "میرا خیال ہے تیرے دماغ میں پھر کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" پروین نے عذر تراشا۔

"دس منٹ میں تیری طبیعت کو کیا ہوگیا" وہ غرایا۔

"میں نے کہہ دیا نا... مجھے اکیلا چھوڑ دو" وہ بولی۔

ناصر نے سختی سے اس کی کلائی تھام لی "چل پروین اس کے پاس جا۔ خوامخواہ میرا دماغ گھمانے کی کوشش نہ کر۔"

پروین نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو ناصر نے زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ ناصر نے اس کے بال کھینچے اور تین چار مزید تھپڑ رسید کیے۔ پھر زور سے دھکا دے کر قالین پر گرا دیا۔ وہ جہاں گری تھی وہیں پڑی روتی رہی۔ ناصر نے دروازہ کھول کر زور سے بند کیا اور پاؤں پٹختا ہوا اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں شیراز احمد بیٹھا تھا۔

دو تین روز ناصر اور پروین میں بول چال بالکل بند رہی۔ ناصر کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہتا یا وہسکی پیتا رہتا۔ پروین گھر کے کام کاج میں لگی رہتی یا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی۔ تیسرے روز شام کو ناصر کے تھائی دوست نے ان دونوں کی صلح کرادی۔ بعد میں ناصر پروین کو گھمانے کے لیے باہر بھی لے کر گیا۔ ایک پاکستانی ریستوران سے کھانا کھا کر وہ رات نو بجے کے قریب واپس آئے۔ جب پروین سنگار میز کے سامنے بیٹھ کر اپنے بُندے اتارنے لگی، ناصر جلدی سے بولا "رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"کوئی آرہا ہے۔"

پروین ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر سنگار میز کے سامنے سے اٹھ گئی۔ وہ ناصر کا اشارہ سمجھ رہی تھی۔ آج شب پھر اسے کسی "مہمان" کو خوش آمدید کہنا تھا۔

"یہ نہیں پوچھو گی کون آرہا ہے؟" ناصر نے دریافت کیا۔

"کون آرہا ہے؟"

"وہی تین دن پہلے والا مہمان۔"

ایک دم پروین کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ جھلا کر بولی "ناصر! میں نے تم سے کہہ دیا ہے، میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی... مجھے... نہیں اچھا لگتا ہے وہ۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا؟" ناصر کے لہجے میں ضد اور خود سری عود کر آئی۔

"بس نہیں لگتا۔ تم اس کی رقم واپس کردو۔ میں معذرت کرتی ہوں تمہاری۔"

"تم ضد کر رہی ہو پروین۔"

"ضد تم کر رہے ہو۔"

"چلو اچھا، ضد ہی سہی۔ کیا تم میری یہ ضد پوری نہیں کرو گی۔"

"نہیں ناصر" وہ کراہی۔

"کیوں نہیں؟"

"بس میرا دل نہیں چاہتا۔"

"کیوں نہیں... کیوں نہیں؟" اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جنونی انداز میں جھنجھوڑا پھر بے دریغ پیٹنے لگا۔ چند تھپڑ مار کر اس پر وہی وحشت سوار ہوگئی جو سنگاپور کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ اس نے پروین پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کردی۔ وہ اسے اٹھا کر دیواروں سے مار رہا تھا، فرش پر پٹخ رہا تھا۔ اور غلیظ ترین گالیاں دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی پوچھ رہا تھا "جائے گی کہ نہیں... جائے گی کہ نہیں؟"

آخر پروین نیم بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئی۔ ناصر نے اپنی جیکٹ کے اندر سے چمکدار پسٹل نکالا اور اس کی سرد نال پروین کی خون آلود پیشانی سے لگا کر بولا "تو جائے گی اور سر کے بل جائے گی۔"

پروین کے بازوؤں اور ٹانگوں پر چوٹیں آئی تھیں تاہم کوئی زخم وغیرہ نہیں لگا تھا۔ زخم صرف سر پر لگا تھا اور سر سے بہنے والا خون اس کے تین چوتھائی چہرے کو بھگو رہا تھا۔ ایک پاؤں سے بھی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ناصر نے اسے گریبان سے کھینچ کر اٹھایا اور دھکیل کر باتھ روم میں لے گیا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ ناصر نے ٹھنڈے پانی کا نل کھول کر اس کا سر نیچے رکھ دیا۔ خون بند ہوا تو اس نے "اسپرے" کرنے کے بعد چھوٹی سی بینڈیج کردی۔ پسٹل اس نے ابھی تک جیکٹ میں واپس نہیں رکھا تھا۔ وہ سامنے تپائی پر پڑا تھا اور بہ زبانِ خاموشی پروین کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ناصر نے اسے لباس تبدیل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ اپنا حلیہ درست کرے۔ خود وہ پسٹل لے کر سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ پروین جانتی تھی کہ وہ بظاہر پُرسکون ہے لیکن اندر سے آتش فشاں کی طرح بھڑک رہا ہے اور اس نے مزاحمت کا ذرا سا اشارہ بھی دیا تو وہ پھر دیوانوں کی طرح اس پر پل پڑے گا۔ وہ چُور چُور جسم کے ساتھ لنگڑاتی ہوئی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد "مہمان" بھی آن وارد ہوا۔ حسبِ توقع وہ شیراز احمد ہی تھا۔ پروین کے سر پر پٹی اور زرد رنگت دیکھ کر وہ چونکا۔ ناصر نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا "معذرت چاہتا

ہوں' دراصل مس گل آج شام سیڑھیوں سے پھسل گئی تھیں۔ میں نے کہا آرام کرلیں۔ کہنے لگیں نہیں۔ مسٹر شیراز کو اس روز بھی بدمزگی کا سامنا ہوا تھا۔ آج ضرور جاؤں گی۔"

پروین کو شیراز احمد کے پاس چھوڑ کر ناصر باہر چلا گیا۔ شیراز احمد نے آج اپنے لیے خود ہی پیگ بنایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے پروین کو پیش آنے والے حادثے پر اظہارِ افسوس بھی کیا اور یہ کہا کہ وہ آج آرام کرے' وہ پھر کسی دن آئے گا۔

پروین نے اسے جانے سے روک لیا۔ یہ بھی ناصر ہی کا حکم تھا۔ اس نے پروین کو بے حد سختی سے ہدایت کی تھی کہ "مہمان" کو آج مایوس نہیں لوٹنا چاہیے۔۔۔

شیراز احمد پروین کے اصرار پر حیران تھا۔ اس نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "اگر تم بضد ہو تو ہم کہیں باہر گھومنے چلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے پورٹ کی طرف۔ میں تمہارے گارجین سے اجازت لے لیتا ہوں۔"

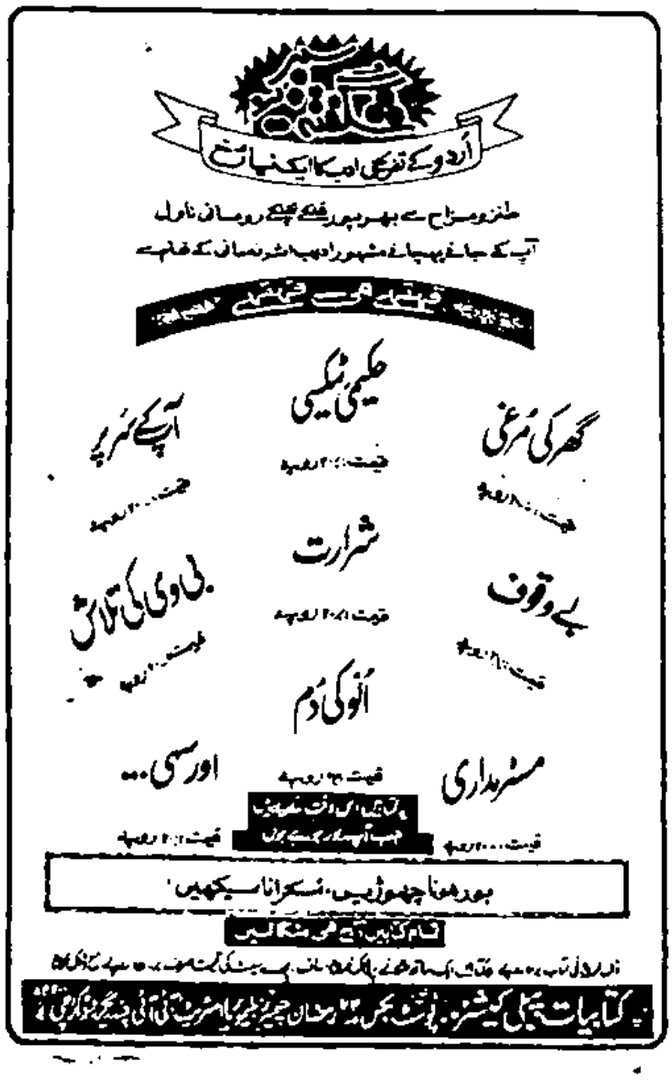
"لیکن میرا پاؤں ٹھیک نہیں" پروین نے عذر پیش کیا۔

"بھئی ہمیں کون سا پیدل چلنا ہے۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے' گاڑی پر جائیں گے گاڑی پر آجائیں گے۔"

پروین کی خاموشی کو نیم رضامندی جان کر شیراز احمد نے ناصر سے بات کی اور اس سے اجازت لے کر پروین کو باہر اپنی گاڑی میں لے آیا۔ وہ شہر کی نیم سنسان سڑکوں پر چکراتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھنے لگے۔ شیراز احمد دلنشیں لہجے میں اس سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتا جارہا تھا۔ وہی گفتگو وہی لہجہ جس کے لیے کبھی اس کے کان ترسا کرتے تھے۔۔۔ شیراز احمد کو اس بات میں شبہ تھا کہ آج وہ اچانک سیڑھیوں سے کیسے گر گئی ہے اور یہ کہ اس دن وہ طبیعت خراب ہونے کے باعث کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ حقیقت جاننا چاہتا تھا۔ پروین اسے حقیقت کیسے بتاتی۔ کیسے کہتی کہ وہ گناہ کی دلدل میں دھنس کر بھی گناہ سے بہت دور تھی' کیونکہ وہ جو کچھ کرتی تھی مجبوری کے تحت کرتی تھی لیکن اب شیراز سے ملتے ہوئے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی مجبوری میں کسی نہ کسی درجے کی مرضی بھی شامل ہو رہی ہے اور یہی اس کے نزدیک گناہ تھا۔ وہ اس گناہ سے دور بھاگنا چاہ رہی تھی لیکن ناصر کسی عفریت کی طرح اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ یہ سب کچھ شیراز احمد کو نہیں بتا سکتی تھی اس لیے اس نے بہت سی وضاحتوں اور ڈھیر ساری دروغ گوئی کے ذریعے شیراز احمد کو مطمئن کردیا۔ معلوم نہیں وہ پوری طرح مطمئن ہوا یا نہیں تاہم اس نے اس حوالے سے مزید کوئی بات نہیں کی۔۔۔

گفتگو کا رخ بتدریج اپنی طرف لے گیا پروین جانتی تھی شیراز احمد صاف کو شاعری نہیں' صاف کو انسان بھی ہے۔ پروین کی توقعات کے عین مطابق شیراز نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے بہت صاف گوئی سے کام لیا۔ وہ اسے اپنے مشاغل اپنی مصروفیات اور اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ کہیں بھی مبالغے سے کام نہیں لے رہا تھا۔ بحیثیت شاعر بھی اس نے اپنا رتبہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا اس میں سے بہت سی باتیں پروین پہلے سے جانتی تھی۔ بہرحال کچھ باتیں نئی بھی تھیں۔ شیراز احمد نے بتایا کہ ایک سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے تین چار ماہ بعد ہی میاں بیوی کے تعلقات بگڑ گئے اور اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ زندگی بہت گھٹن کا شکار تھی۔ وہ شب و روز کی تلخیاں شراب میں گھول کر پینے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی کبھی دھوپ کے مسلسل سفر سے تھک کر کسی کی زلفوں کی گھنی چھاؤں تلاش کرنے لگتا تھا۔ وہ یہاں تھائی لینڈ میں کسی ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔۔۔ اور سیمینار کے بعد بھی ڈیڑھ دو ماہ اسے یہیں قیام کرنا تھا۔ یہاں وہ گارمنٹس کے کاروبار میں کسی سرداری کا پارٹنر تھا۔

آؤٹنگ کے بعد شیراز احمد پروین کو واپس ناصر کے پاس چھوڑ گیا۔ پروین اپنے دل میں ہلکی سی کسک لے کر واپس آئی تھی۔ پروین اور شیراز احمد کی اگلی ملاقات چار پانچ روز بعد ہوئی۔ وہ ہفتے کی رات تھی۔ ہفتے کی رات کو ناصر اور اس کا تھائی دوست خوب پیتے تھے اور ان کی آنکھیں رات گئے تک سرخ انگارا رہتی تھیں۔ اس رات بھی ناصر جھومتا پھر رہا تھا۔ شیراز احمد آیا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک موٹی رقم ملنے کی توقع جو پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے پروین کو کامدار بنارسی ساری پہننے کا حکم دیا اور جب وہ تیار ہو گئی تو شیراز احمد کے پاس بھیج دیا۔ شیراز احمد کی طرف



جاتے ہوئے پروین کا دل انوکھے انداز میں دھڑک رہا تھا....

پروین نے ایسی بہت سی گناہ آلود راتیں گزاری تھیں لیکن ایسی ہر گناہ آلود رات کی صبح وہ یوں شفاف نظر آتی تھی جیسے یہ رات اس پر نہیں کسی اور پر گزری ہے.... آج پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہے۔ کوئی قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہے۔ صبح کی نماز بچپن سے پروین کی عادت میں شامل تھی۔ وہ کیسے کیسے حالات اور کیسی کیسی کیفیات سے گزری تھی لیکن یہ عادت کبھی چھوٹی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ پچھلے ایک برس کی گناہ آلود زندگی میں بھی اس نے میکانکی طور پر یہ عمل جاری رکھا تھا لیکن آج پہلی بار وہ بلا عذر دن چڑھے تک بستر پر پڑی رہی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو "شریکِ شب" رخصت ہو چکا تھا اور ناصر یا اس کے تھائی دوست نے اندر آکر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیے تھے۔

وال کلاک صبح دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ وہ یونہی پہلو کے بل لیٹی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ وہ آج خود کو ایک بدلی ہوئی عورت محسوس کر رہی تھی۔ کوئی نیا پن تھا جو اس کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ شاید یہ نیا پن اس گناہ کی دین تھا جو آج اس سے سرزد ہوا تھا۔

○☆○

ناصر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ پروین ایسی جرأت کر سکتی ہے۔ وہ تو اس کی اجازت کے بغیر کھڑکی سے باہر نہیں جھانکتی تھی۔ کہاں یہ کہ بازار جاتی اور واپس نہ آتی۔ وہ آج دوپہر ناصر سے اجازت لے کر ملازمہ فینگ کے ساتھ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ فینگ کو کچھ سامان دے کر اس نے ٹیکسی کی طرف بھیجا۔ جب فینگ ٹیکسی میں سامان رکھ کر واپس آئی تو پروین غائب تھی۔ فینگ نے بہت تلاش کیا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اس نے ناصر کو ٹیلی فون کر دیا۔ ناصر بھی موقع پر جا کر بہت دیر جھک مارتا رہا۔ آخر بھنایا ہوا گھر لوٹ آیا۔ وہ اگلے اقدام سے پہلے اپنے تھائی دوست شاؤ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو ان دونوں کا خیال تھا کہ پروین کو کسی نے اغوا کر لیا ہے لیکن جب انہوں نے پروین کے سامان کی تلاشی لی تو زیورات اور نقدی غائب پائے۔ ناصر اور اس کا دوست سناٹے میں رہ گئے۔ اب اس بات میں شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ پروین اپنی مرضی سے اور پروگرام کے تحت گئی ہے۔ ناصر حیران تھا۔ ایک دم اتنی جرأت کہاں سے آگئی اس نازک اندام' بے زبان لڑکی میں؟

سوچ بچار کے بعد ناصر اس نتیجے پر پہنچا کہ ضرور پروین اور شیراز احمد میں کوئی گٹھ جوڑ پیدا ہوا ہے۔ ناصر کو یاد آنے لگا کہ شیراز احمد سے آخری دو تین ملاقاتوں میں پروین کافی بے تکلف نظر آتی تھی اور شیراز احمد کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک بے نام آسودگی ابھر آتی تھی۔ اس نے شیراز احمد پر دانت پیسے اور وہسکی کا آدھا گلاس ہونٹوں سے لگا کر خالی کر گیا۔ وہ پکی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اپنے کسٹمرز کے بارے میں اسے اکثر بنیادی معلومات حاصل رہتی تھیں۔ خاص طور سے وہ جس کسٹمر کے ساتھ پروین آؤٹنگ پر بھیج دیتا تھا اس کا تمام "ڈاٹا" اس کو معلوم ہوتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شیراز احمد گلاب سنگھ نامی شخص کا بھانجا ہے اور گلاب سنگھ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کرتا ہے۔ گلاب سنگھ کی ایک دکان ڈیلکس مارکیٹ میں تھی۔

ناصر نے بہت جلد شیراز احمد کا سراغ لگا لیا۔ لیکن گلاب سنگھ اپنے کسی کام سے انڈیا گیا ہوا تھا۔ جونہی وہ انڈیا سے واپس آیا ناصر نے شیراز احمد کا کھرا دبا لیا۔ وہ پچھلے تین چار ہفتے سے بنکاک کے ایک نواحی قصبے "سونگی وان" میں مقیم تھا۔ سونگی وان ایک خوبصورت قصبہ تھا اور سیاح قدرتی مناظر اور پُرسکون ماحول کے لیے اس قصبے کا رخ کرتے تھے۔ ناصر اور اس کے تھائی دوست نے شیراز احمد کو ایک چھوٹی سی بنگلا نما کوٹھی میں جا لیا۔ یہ کوٹھی گلاب سنگھ کے کسی رشتے دار کی تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ شیراز احمد کوٹھی کے اکلوتے بیڈ روم میں محوِ خواب تھا۔ ان دونوں نے اسے سوتا رہنے دیا اور کوٹھی کے دیگر حصوں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ پروین کہیں نہیں تھی۔ ہاں چند ایسے آثار ضرور نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ کوئی لڑکی ایک دو روز پہلے تک یہاں موجود تھی۔

ناصر نے ایک زوردار ٹھوکر کے ذریعے شیراز احمد کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا۔ وہ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ناصر نے اسے بتایا کہ وہ دیوار پھلانگ کر آئے ہیں اور پوچھا کہ گل کہاں ہے؟

شیراز احمد نے پہلے تو لاعلمی کا اظہار کیا لیکن جب ناصر نے اس کا گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا اور لال پیلی آنکھیں دکھائیں تو وہ سمجھ گیا کہ شدید قسم کی "بے عزتی" اس کے دروازے پر دستک دینے والی ہے۔ سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے ناصر اور شاؤ سے نرم لہجہ اختیار کیا اور ساری بات کھول کر بتا دی۔

اس نے کہا "پچھلے مہینے گل نے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ شہر کے ماحول سے بہت اکتا گئی ہے اور چند دن کسی پُرسکون جگہ پر گزارنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا 'میں حاضر ہوں' تم اپنے گارجین سے اجازت لے لو۔ وہ بولی 'اجازت لینا یا نہ لینا میرا مسئلہ ہے' تم میرے ساتھ وقت طے کر لو۔ میں مقررہ وقت پر تمہیں وہیں ملوں گی پھر ہم چند دن کے لیے کہیں دور نکل جائیں گے میں نے اس سے دو روز بعد کا وقت اور مقام طے کر لیا۔ وہ مجھ سے مقررہ وقت پر ملی اور ہم خاموشی سے اس کوٹھی میں آگئے۔ اس کوٹھی میں' میں نے گل کے ساتھ ایک مہینہ گزارا ہے۔ وہ بے حد عجیب اور سیلانی لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے شادی کر لوں" ایک لمحہ توقف کر کے شیراز احمد نے سگریٹ سلگایا اور شاعرانہ انداز میں کش لیتے ہوئے بولا "میں نے آپ دونوں سے وعدہ کیا ہے کہ سب کچھ کھول کر بتا دوں گا اور کچھ

چھپاؤں گا نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں خود بھی اس لڑکی کے سحر میں جکڑا جا چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سے نکاح کروں گا اور جیسے بھی ہو سکا اسے گناہ کے ماحول سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ وہ خود ہی اپنے موقف پر قائم نہ رہی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ہماری خواہشوں کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔ میں ایک گناہ گار عورت ہوں۔ میں اپنی بدکاری کی سیاہی سے آپ کا اجلا دامن میلا کرنا نہیں چاہتی۔ میرا مقدر اب یہی ہے کہ میں بنکاک کے اندھیروں میں بھٹکتی رہوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ جیسے کسی خول میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ دو روز پہلے جب میں صبح اٹھا تو سائیڈ ٹیبل پر تازہ پھولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں" شیراز نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" ناصر چونک گیا۔

"وہ سامنے ایک کوٹھی کی سرخ چھت دیکھ رہے ہو تم" شیراز احمد نے کھڑکی میں سے دور اشارہ کیا۔ ناصر نے شیراز احمد کی نظروں کا تعاقب کیا تو کوئی فرلانگ بھر دور سرخ چھت نظر آئی۔ شیراز احمد بولا "وہ اسی کوٹھی میں ہے۔ کسی یورپین کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ کل شام اتفاقاً میری نظر پڑ گئی۔ وہ مین گیٹ کے سامنے ایک ہنڈا کار میں سے نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا' تیزی سے آگے بڑھا تو وہ گیٹ سے گزر کر اندر چلی گئی۔ میں بہت دیر گیٹ کے سامنے ٹہلتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیسے رابطہ کروں۔ آج صبح میں پھر اس کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتا رہا پھر کال بیل پر انگلی رکھنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ وہ باہر نکل آئی۔ کہنے لگی' شاید آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی' لیکن پہلے میری ایک بات سن لیجئے۔ میں نے آپ کے ساتھ کچھ بہت اچھے دن گزارے ہیں۔ میں چاہتی ہوں یہ دن جیسے گزرے ہیں ویسے ہی مجھے ہمیشہ یاد رہیں۔ پلیز میری یہ خواہش پوری کردیجئے.... آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے.... اس کے لہجے اور انداز نے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی' میں خاموشی سے واپس آگیا۔"

شیراز احمد نے بات ختم کی تو ناصر اور اس کا دوست حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

○☆○

ناصر اور اس کا دوست' شیراز احمد کے پاس سے اٹھے تو سیدھے اس سرخ چھت والی کوٹھی پر پہنچے۔ ناصر کا چہرہ غم و غصے سے بگڑا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ پروین اس حد تک جاسکتی ہے۔ وہ اس کے لیے سونے کی چڑیا تھی۔ یہ چڑیا یوں ایک دم اڑ جائے گی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ ایک ملازم لڑکے نے چھوٹا گیٹ کھولا۔ ناصر کو پروین سامنے ہی نظر آگئی۔ وہ سرسبز لان پر ایک دیدہ زیب کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ پروین کو دیکھ کر ناصر کو اپنے غصے پر قابو نہ رہا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہو رہا ہے.... جیسے کوئی اپنے مسروقہ مال کو پہچان کر اس کی طرف جھپٹتا ہے وہ بھی پروین کی طرف جھپٹا۔ ناصر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے پروین کی رنگت متغیر ہوئی اور یوں لگا کہ وہ چیخ پڑے گی لیکن پھر وہ ایک دم تن کر کھڑی ہو گئی "کیا بات ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"چلو گھر" ناصر دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ پروین کی کلائی کی طرف بڑھا۔

پروین نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور چیخ کر بولی "تم ہوش میں تو ہو۔"

ناصر ٹھٹک گیا۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس کی گرج سن کر سرسوں کی طرح زرد ہو جاتی تھی؟ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں حیرت کو غصے کا سہارا دیا اور ایک بار پھر پروین پر جھپٹا۔ اس مرتبہ اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بج گئیں۔ پروین کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا تھا۔ پھر وہ بھوکی بلی کی طرح اس پر چڑھ دوڑی۔

گھونسے' تھپڑ' ٹھوکریں' اس نے ناصر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کی جیکٹ میں بھرا ہوا پسٹل ہے اور وہ اسے کم از کم ڈراوے کے لیے تو استعمال کرہی سکتا ہے۔ مین گیٹ تک پسپا ہوتے ہوتے وہ دو تین دفعہ گرا۔ اس کا تھائی دوست حالات کی "نامہربانی" دیکھ کر پہلے ہی گاڑی کی طرف کھسک چکا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر ناصر نے دیکھا کہ ایک بارعب یورپین اپنے مسلح گارڈ کے ساتھ لان کی طرف آرہا ہے۔ ناصر سمجھ گیا کہ اب یہاں ٹھہرنے میں مزید ذلت پوشیدہ ہے۔ وہ قریباً دوڑتا ہوا گاڑی میں آبیٹھا۔ اس کا تھائی دوست انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ بڑی چستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے گیئر لگایا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف کے ساتھ حیرت بھی منجمد تھی۔ یقیناً وہ پروین کے رویے کے بارے میں سوچ کر حیران ہو رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس سے پہلے ان کا واسطہ ایک مجبور لڑکی سے پڑتا رہا تھا جب کہ آج ان کا واسطہ ایک گناہ گار لڑکی سے پڑا ہے۔

جس وقت ناصر اور اس کا تھائی دوست افراتفری میں مین گیٹ سے نکلے اور اپنی گاڑی میں بیٹھے' شیراز احمد بھی اپنی رہائش گاہ کی چھت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل بے خبر تھا کہ خاموش محبت کی اس کہانی میں اس کا کردار کیا رہا ہے اور کتنا اہم رہا ہے....

قارون

طاہر جاوید مغل

ایک شخص کی بڑی بڑی آرزوں کا کفن ایک ادنیٰ شخص نے چاک کیا

محمد دوست کام سے فارغ ہو کر باہر صحن میں آ بیٹھا۔ دو روپے کا وہ نوٹ اُس کی مٹھی میں تھا جو اُسے حاجی قربان علی کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے لالچ دوست محمد عرصہ تیس سال سے حاجی صاحب کے پاس ملازم تھا۔ حاجی قربان، ممبر سرچنٹ تھے اور اُن کا عمارتی لکڑی کا وسیع کاروبار پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ جہاں پچھلے تیس سال میں یہ کاروبار ہزاروں اور لاکھوں سے ہوتا ہوا کروڑوں روپے تک پہنچ گیا تھا وہاں دوست محمد کی تنخواہ بھی پانچ سو سے ساڑھے نو سو ہو گئی تھی۔ خاصا اضافہ تھا لیکن اس کے باوجود دوست محمد کی دال روٹی نہیں چلتی تھی۔ شاید اس لیے کہ تنخواہ اگر دوگنا ہوئی تھی تو اخراجات دس گنا ہو چکے تھے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں جھاڑو پونچھ کرنے والے اور چائے پلانے والے ملازم کو کیا حق پہنچتا تھا شادی کرنے کا، اور پھر بچے پیدا کرنے کا، اور بیمار ہونے کا اور دوسروں کی غمی خوشی میں شریک ہونے کا؟ کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ اسی لیے دوست محمد تنگدست تھا۔ لیکن اس تنگدستی میں بھی اُس نے اپنا وقار اور ایمان نہیں کھویا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر مٹھی کھول کر دو روپے کے مڑے تڑے نوٹ کی طرف دیکھا۔ آج صبح جب وہ حاجی صاحب کے دفتر میں برش سے قالین کی صفائی کر رہا تھا یہ نوٹ ردی کی ٹوکری کے قریب پڑا تھا۔ اُس نے اٹھا لیا۔ اس سے پہلے جو بھی چیز اُسے ردی کی ٹوکری سے باہر ملا کرتی تھی، وہ اُسے اچھی طرح دیکھا کرتا تھا پھر اگر اُسے شک ہوتا کہ یہ چیز کام کی ہے تو وہ منشی عبدالغنی کو دکھا دیا کرتا تھا۔ اگر کوئی روپیہ پیسہ ہوتا تو وہ خود ہی میز کے ایک کونے پر رکھ دیتا رہتا۔ بارہا ایسے موقعے آئے تھے کہ اُس نے فرش پر گری ہوئی یا ادھر اُدھر پڑی ہوئی قیمتی اشیا مالکوں تک پہنچائی تھیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے ایک بار بھی اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے پورے پانچ سو روپے حاجی صاحب کو لوٹائے تھے۔ یہ کسی بدحواس گاہک کا بٹوا تھا جو صوفے کی دو گدیوں کے درمیان اٹکا رہ گیا تھا... نہ جانے آج کیوں سو روپے کا نوٹ ابھی تک اُس کی مٹھی میں تھا۔ اُس نے اسے حاجی صاحب کی میز پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھنے کا سوچا بھی تھا لیکن پھر یہ بات اُسے مضحکہ خیز محسوس ہوئی تھی۔ حاجی صاحب کے لیے دو روپے کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔ ان کے لیے یہ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس کا کوئی مصرف اُن کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ ٹکڑا اُن کی ادنیٰ ترین ضرورت پر بھی پورا نہیں اتر سکتا تھا لیکن یہی بے کار ٹکڑا اُس کی ایک اہم ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ اُسے آج بجلی کا بل دینا تھا..... جس میں دو روپے کم تھے اور آج آخری تاریخ تھی ——

اُس نے چور نظروں سے نوٹ کی طرف دیکھا، لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کے اندر کا دوست محمد اُس پر غالب آ گیا۔ اُس نے مسکرا کر سوچا۔ دوست محمد، جب ایسے کڑے امتحان سے گزر گئے ہو تو دو روپے کے لیے کیوں ایمان خراب کرتے ہو۔ ٹھیک ہے کسی کے لیے اس نوٹ کی کوئی اہمیت نہیں لیکن تمھارے لیے یہ نوٹ بہت اہم ہے کیوں کہ اس سے تمھارے ایمان کی سلامتی وابستہ ہے۔"

دوست محمد اپنی جگہ سے اُٹھا اور حاجی صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ساگوان کی بھاری کا دروازہ بند تھا۔ چپراسی بھی موجود نہیں تھا۔ دوست محمد کچھ دیر سوچتا رہا پھر اُس نے ایک انگلی سے آہستگی کے ساتھ دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھلا۔ منیجر علیم الدین کا چہرہ نظر آیا۔ دوست محمد کو دیکھتے ہی اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ غصیلی سرگوشی میں بولے: "کیا ہر وقت منہ اٹھائے چلے آتے ہو۔ اندر ضروری میٹنگ ہو رہی ہے۔" اس کے ساتھ ہی انھوں نے دروازہ تیزی سے بند کر دیا۔

دوست محمد پشیمان سا ہو کر منشی عبدالغنی کے کمرے کی طرف چل دیا۔



دو روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ دو روپے عبدالغنی کو دے کر وہ سُرخرو ہو سکتا تھا مگر وہ بھی اپنی میز پر موجود نہیں تھا۔ پتا چلا کہ وہ حاجی صاحب کے دفتر میں ہونے والی میٹنگ میں شریک ہے۔

دوست محمد کو پریشانی سی لاحق ہو گئی۔ درحقیقت وہ بڑا دہی تھا۔ سوچنے لگا، اُسے ابھی حاجی صاحب کا لنچ لینے کے لیے گھر جانا ہے، اگر جاتے ہوئے راستے میں کہیں اُسے حادثہ پیش آ گیا اور وہ مر گیا تو دو روپے کا یہ بوجھ اُس کی ہمیشہ ہمیشہ کی مسافت کا ساتھی ہو جائے گا۔ اس خیال سے وہ کانپ کر رہ گیا۔ اُس کا رُخ خود بخود بابو سلیم کے کمرے کی طرف ہو گیا۔ بابو سلیم، حاجی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ اُنتیس تیس سال عمر رہی ہو گی۔ کالج کے بعد فرم کے ہیڈ آفس آ جاتے تھے، کاروبار میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے اس لیے دوست محمد کو امید تھی کہ وہ میٹنگ میں شریک نہیں ہوں گے اور دوستوں سے گپیں لڑا رہے ہوں گے یا میز کی دراز میں کسی خوب صورت لڑکی کی تصویریں رکھ کر دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ اُس پر جال کیسے پھینکا جائے، مگر جب وہ بابو سلیم کے پاس پہنچا تو صورتِ حال مختلف نکلی۔ وہ بال بکھرائے سخت پریشانی کے عالم میں فائلیں اِدھر سے اُدھر کر رہے تھے۔ ایک ملازم بھی کاغذوں کی اس الٹ پلٹ میں اُن کی مدد کر رہا تھا۔ پتا چلا کہ حاجی صاحب کی میز پر پڑی رہنے والی چھوٹی نوٹ بک کہیں گم ہو گئی ہے، اس نوٹ بک میں کچھ اہم ٹیلیفون نمبرز بھی درج تھے۔

دوست محمد دو کا نوٹ مٹھی میں دبائے چپکے سے باہر آ گیا جہاں اتنے اہم مسائل درپیش تھے وہاں وہ دو روپے کی بات چھیڑ کر صرف ڈانٹ ہی کھا سکتا تھا۔ وہ باہر نکلا اور گودام کے وسیع احاطے میں چلتا ہوا بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ احاطے میں جگہ جگہ دیار، کیل، پُرتل اور چیڑ کے سلیپرز اور پھاڑوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک ایسے ہی ڈھیر کے پاس اُسے "پانڈی" عنایت نظر آیا۔ کہنے کو تو وہ بوجھ اٹھانے والا پانڈی تھا، لیکن اُسے اندرونِ خانہ معاملات کی بہت خبر ہوتی تھی — مینیجمنٹ میں وہ دوست محمد سے بھی آگے تھا۔ دوست محمد اُس سے باتیں کرنے لگا، جلد ہی اُسے پتا چل گیا کہ آج یہ پُراسرار افراتفری کیوں نظر آ رہی ہے۔ عنایت نے بتایا کہ چھوٹے حاجی صاحب یعنی حاجی صاحب کے بڑے صاحبزادے پرسوں سے پشاور گئے ہوئے ہیں، وہاں سے انھوں نے کوئی چالیس پچاس لاکھ روپے کی پُرتل خریدنا ہے، پشاور کے کسی ہوٹل میں آج سہ پہر دو بجے تک یہ سودا طے پانا ہے لیکن آج صبح حاجی صاحب کو مل شہر سے یہ اطلاع ملی ہے کہ افغان علاقے میں جنگلات کی ملکیت کا جو جھگڑا چل رہا تھا وہ ختم ہو گیا ہے اور جلد ہی سیوک منڈی میں کثرت سے مال آنے والا ہے۔ اس کا مطلب ہے پُرتل کا ریٹ ایک دم نیچے گرنے والا ہے اگر آج یہ سودا طے ہو گیا تو فرم کو پندرہ بیس لاکھ کا نقصان ہو جائے گا۔"

دوست محمد نے کہا۔

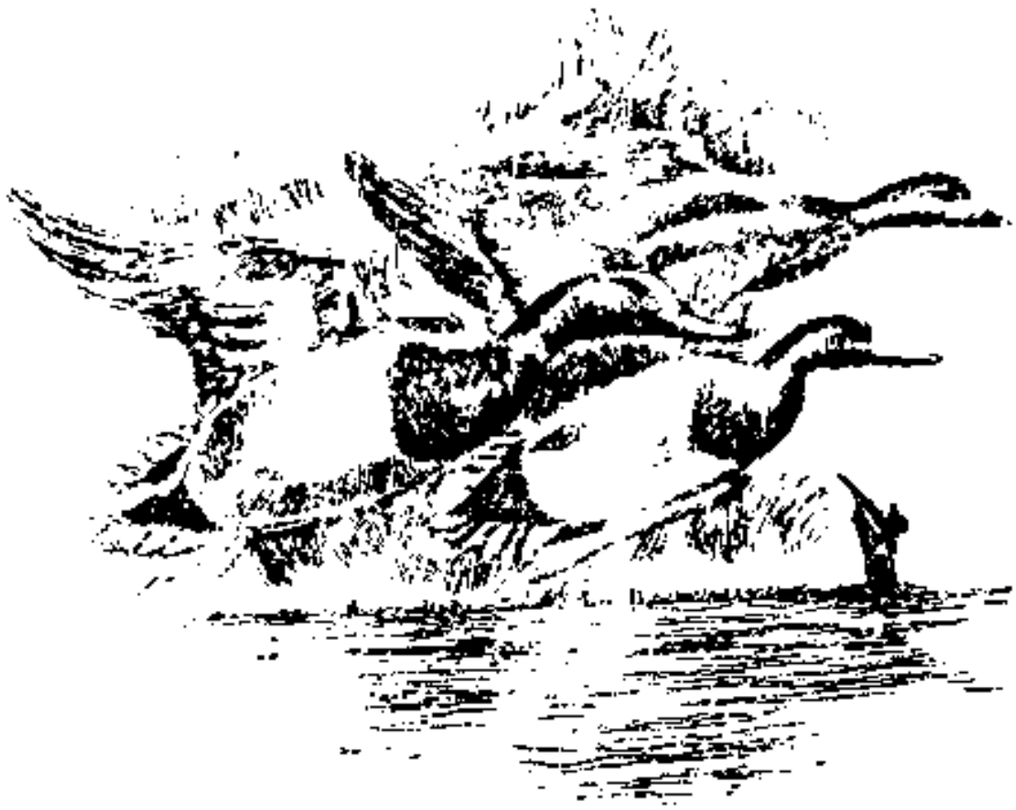
"مگر حاجی صاحب، چھوٹے حاجی صاحب کو سودے سے منع کیوں نہیں کر دیتے؟" پھر جیسے خود ہی اُسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اس تمام سے وقت میں پشاور پہنچنا اور چھوٹے حاجی صاحب کو ڈھونڈنا ناممکن تھا۔ حاجی صاحب کے پاس چھوٹے حاجی صاحب سے رابطے کا واحد ذریعہ وہ فون نمبر تھا جو نوٹ بک کے ساتھ ہی گم ہو گیا تھا اور جسے ڈھونڈنے کی کوشش میں بابو سلیم اور دوسرے لوگ ہلکان ہو رہے تھے۔ اب اسے صورتِ حال کی اصل سنگینی کا اندازہ ہوا۔ ۲۰ لاکھ روپے کا نقصان کچھ کم نہیں تھا۔ درحقیقت ایک فون نمبر پر فرم کا مستقبل داؤ پر لگ گیا تھا۔ اگر ایک آدھ گھنٹے تک یہ نمبر نہ ملتا تو کیا سے کیا ہو جاتا۔

عنایت نے بتایا "کل میرے سامنے ہی چھوٹے حاجی صاحب کا فون آیا تھا۔ بڑے حاجی صاحب موجود نہیں تھے، بابو سلیم نے اُن سے بڑے حاجی صاحب کے کمرے میں بات کی تھی۔ چھوٹے حاجی صاحب نے انھیں اسمر ہوٹل میں اپنا کمرا نمبر اور فون نمبر بتایا تھا جہاں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بابو سلیم نے یہ سب کچھ لکھ لیا تھا مگر اب وہ "ڈائری" ہی نہیں مل رہی..."

دفعتاً عنایت بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ حاجی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ تین چار آدمیوں کے ساتھ تیز قدموں سے باہر نکلے تھے۔ پریشانی اور بدحواسی اُن کے چہرے سے عیاں تھی۔ باقی آدمیوں کے چہرے بھی یہی کیفیت بیان کر رہے تھے۔ اپنی ٹویوٹا تک پہنچنے کے لیے جونہی حاجی صاحب، دوست محمد اور عنایت کے قریب سے گزرے، دوست محمد کو اپنی مٹھی میں جکڑے دو روپے کا خیال آیا۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ دو روپے منشی عبدالغنی کے ہاتھ میں دے دیے۔ "حاجی صاحب کے کمرے سے ملے تھے۔" اُس نے اسکی سے کہا۔

منشی نے بے پروائی سے وہ نوٹ واسکٹ کی جیب میں ڈالنا چاہا پھر ایک دم وہ چونک گیا۔ اُس نے نوٹ اپنے سامنے کیا اور اُس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ قریباً چیخ کر بولا "حاجی جی! یہ رہا وہ نوٹ۔" حاجی صاحب تیزی سے گھومے۔ انھوں نے منشی کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹا اور غور سے دیکھنے لگے۔ پھر وہ ماتحتوں کو ہدایات دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف لپکے۔ اُن کی آواز جذبات سے لرز رہی تھی۔

دوسری طرف منشی عبدالغنی، دوست محمد کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا "یہ بڑا ضروری فون نمبر تھا۔ "ڈائری" پر چڑھانے سے پہلے بابو سلیم نے اسے اس نوٹ پر لکھا تھا۔ آج صبح سے وہ کہہ رہا تھا "ڈائری" نہیں مل رہی تھی، نہ ہی یہ نوٹ مل رہا تھا۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے دوست محمد! بہت بڑا!"



جسکا

شائستہ نصیر

کسی بھی چیز کا چسکا پڑ جائے تو آدمی دُنیا کے سارے
کام چھوڑ کر اُسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے سوا
کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ کوئی کام اس کے بے اس سے
زیادہ اہم نہیں رہتا۔

یہ ایک شخص کا قول ہے مرغابیوں کے شکار کا چسکا پڑ گیا تھا۔

یہ شمالی مرغابیوں کا سیزن ہے۔
اپریل اور مئی میں پیرس سے پیراکی کے شوقین لوگوں کے غول کے غول آتے ہیں۔ مگر ان سے پہلے آپ کو سمندر کے کنارے کچھ بوڑھے شکاری نظر آئیں گے، جو اپنے شکاری لباس کے سلسلے میں خاصا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ ہوٹل والوں میں چار پانچ دن قیام کرتے ہیں۔ پھر چلے جاتے ہیں۔ تین ہفتے بعد وہ دوبارہ آتے ہیں۔ چند روز قیام کرتے ہیں اور اس کے بعد جاتے ہیں تو ان کی شکلیں آئندہ سال ہی دکھائی دیتی ہیں۔

وہ شمالی مرغابیوں کے شوقین شکاریوں کی یادگار ہیں۔ بہت پہلے، تیس چالیس سال پہلے اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی،

مگر اب تو یہ چند دیوانے ہی رہ گئے ہیں، جو اپنے معمولات پر اس طرح عمل کرتے ہیں، جیسے وہ کوئی مقدس مذہبی فریضہ ہو۔

شمالی مرغابی مہاجر پرند ہے۔ اس کی عادتیں عجیب اور تجسس انگیز ہیں۔ تقریباً پورا سال یہ پرندے نیوفاؤنڈ لینڈ میں رہتے ہیں، مگر جب انڈے دینے اور سینے کا سیزن آتا ہے تو ان مہاجروں کا گروہ بحر اوقیانوس عبور کرتا ہے۔ وہ ہر سال اپریل کے قریب ایک مخصوص چٹان پر بسیرا کرتے ہیں، جس کا نام ان پرندوں کی وجہ سے شمالی مرغابیوں والی چٹان پڑ گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ وہیں آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہر سال شکار ہوتے ہیں، مگر وہ بھی اپنی عادت نہیں چھوڑتے۔ وہ ہمیشہ آتے رہیں گے۔

جیسے ہی ان کے بچے بڑے ہوتے ہیں، وہ دوبارہ نیوفاؤنڈ لینڈ کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔ اپنی نئی نسل سمیت۔

یہ بات اکثر سوچی جاتی ہے کہ وہ کہیں اور کیوں نہیں چلے جاتے۔ اس طویل ساحلی پٹی پر ایسے بہت سے مقامات ہیں، جو ان کے لیے موزوں ہیں، مگر کوئی ناقابل مزاحمت جبلت ہے، جو انہیں کشاں کشاں شمالی مرغابیوں والی چٹان تک لے آتی ہے۔ شاید یہ نسل در نسل چلنے والی اور ہر نئی نسل میں زیادہ شدت سے ابھرنے والی عادت کی وجہ سے ہے۔ پتا نہیں، کس طوفان نے بنیادی جبلت ہجرت نے ان کی پہلی نسل کو اس چٹان سے کس طرح متعارف کرایا ہوگا کہ اس چٹان سے محبت اور اسے گھر سمجھنے کا احساس ان کی ہر نسل کو ورثے میں ملتا ہے۔

ان مرغابیوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ سو کے لگ بھگ ہوں گی۔ ایسا لگتا ہے کہ زیارت کی یہ خو صرف ایک جھنڈ نے اپنائی ہے۔ وہی ہیں، جو ہر سال زائرین کی طرح اپنے اس آبائی بسیرے کا رخ کرتے ہیں۔

ہر موسم بہار میں ان کے چٹان پر بسیرے کے بعد جانے پہچانے شکاری نمودار ہوتے ہیں۔ مقامی لوگوں نے انہیں جوان بھی دیکھا ہے۔ مگر اب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ تیس چالیس برس سے وہ بھی شکار کی اس روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور شاید جب تک جان میں جان رہے گی، قائم رکھیں گے۔

چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اس مخصوص سیزن میں شکار کے لیے ضرور آئیں گے۔

چند سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اپریل کی ایک شام تھی۔ شمالی مرغابیوں کے شکاریوں میں سے تین کچھ ہی دیر پہلے وارد ہوئے تھے۔ چوتھے شکاری موسیو آرنیلس تھے اور وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔

انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا تھا اور نہ ہی ان کی کوئی خبر موصول ہوئی تھی۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ کیوں کہ دوسری صورت میں ان کے ساتھی بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ تینوں شکاریوں نے خاصی دیر ان کا انتظار کیا اور بالآخر تھک ہار کر کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

وہ کھانے سے فارغ ہونے ہی والے تھے کہ ہوٹل کے احاطے میں ایک بگھی آکر رکی۔ چند ہی لمحے بعد موسیو آرنیلس اندر آئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے اور انھوں نے بڑی طبیعت سے کھانا کھایا۔ ان کے ساتھیوں نے انھیں عام سے فراک کوٹ میں دیکھ کر حیرت ظاہر کی۔

"ہاں، دراصل مجھے لباس تبدیل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" موسیو آرنیلس نے جواب دیا۔

وہ چاروں کھانے کی میز سے اٹھتے ہی سونے کے لیے چلے گئے۔ وہ صبح بہت سویرے شمالی مرغابیوں کو حیران کرنے کے موڈ میں تھے۔

صبح کی اس قسم کی مصروفیات بے حد خوش گوار ہوتی ہیں۔ اس خوش گواری کا موازنہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔

صبح تین بجے کے قریب ملاحوں نے ان کی کھڑکیوں پر کنکر مارے تاکہ وہ بیدار ہو جائیں۔ چند ہی منٹ بعد وہ تیار ہو کر نیچے آئے اور ساحل کی طرف چل دیے۔ ابھی تک سویرے کے آثار نہیں تھے۔ تاہم ستارے ماند پڑنے لگے تھے۔ سمندر ساحلی ریت سے سر ٹکرا رہا تھا۔ ہوا اس قدر سرد تھی کہ گرم لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود ان کے جسموں میں تھرتھری دوڑ گئی۔

ملاحوں نے دو کشتیاں دھکیل کر پانی میں اتاریں اور سفر شروع ہو گیا۔ بھیگے بادبان لہرانے لگے۔

کچھ دیر بعد آسمان کی رنگت ہلکی ہونے لگی۔ یا یوں لگا جیسے تاریکی آہستہ آہستہ پگھل رہی ہو۔ دھندلکے میں لپٹے ہوئے ساحل کے آثار نظر آنے لگے۔ ساحل کی سمت ایک بلند و بالا سفید سی دیوار کھڑی تھی۔

جلد ہی وہ شمالی مرغابیوں کی چٹان تک پہنچ گئے۔

چٹان ایک چبوترے کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک —— مرغابیوں کے سر ابھرے۔ وہ کشتیوں کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ ساکت و صامت انتظار کرتی رہیں۔ ان کی اڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ چند ایک کندھے پر چلی آئیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا، جیسے وہ اپنی دُم کے زور پر بیٹھی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ٹانگیں بہت چھوٹی ہیں۔ وہ چلتی ہیں تو لگتا ہے، ان کے پیروں کی جگہ پہیے لگے ہیں۔ اڑنے کے لیے انھیں خاصی دور تک دوڑنا پڑتا ہے۔ ایسے میں وہ زیادہ رفتار سے نہیں دوڑ سکتیں۔ انھیں

اپنی اس کمزوری اور اس کے نتیجے میں لاحق ہونے والے خطرات کا ادراک بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ اُڑا جائے یا نہیں۔

شکاریوں نے چیخ پکار اور شور مچانا شروع کر دیا۔

اس کیفیت میں شمالی مُرغابیاں بوکھلا کر اڑتی ہیں، ساحل کے کنارے گرتی ہیں، پھر بھاگتی ہیں اور فضا میں بلند ہوتی ہیں۔ کچھ بچ نکلتی ہیں اور کچھ شکاریوں کی گولیوں کا نشانہ بنتی ہیں۔

بعض اوقات صرف شور مچانے سے کام نہیں چلتا۔ شکاریوں کو بے سود فائر بھی کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی مادہ مُرغابیاں انڈے دینے میں اتنی منہمک ہوتی ہیں کہ کسی بھی قیمت پر اڑنا نہیں چاہتیں۔ ایسے میں وہ اندھا دھند چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں آجاتی ہیں۔ ان کے سفید بے داغ پروں پر سُرخ دھبے نمودار ہوتے ہیں اور وہ انڈوں پر بیٹھے بیٹھے ہی جان دے دیتی ہیں۔

پہلے دن موسیو آرنیلس کا جوش و خروش معمول کے مطابق تھا۔ مگر دس بجے کے قریب شکار سے واپس ہوتے وقت وہ فکرمند نظر آرہے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ حالاں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔

جیسے ہی وہ ہوٹل پہنچے اُن کے ملازم نے آکر سرگوشی میں اُن سے کچھ کہا۔ ملازم سیاہ لباس میں تھا۔

موسیو آرنیلس کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے "نہیں ..... کل۔"

اگلی صبح پھر شکار ہوا۔ مگر اس روز موسیو آرنیلس یقیناً پریشان تھے۔ ان کے کئی ایسے نشانے بھی خطا ہوئے، جو کسی بچے سے بھی نہیں چوک سکتے تھے۔ ان کے ساتھی اُن سے مذاق کرتے رہے۔

"کسی سے محبت ہوگئی ہے کیا؟" ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی پریشانی لاحق ہے تمھیں؟" دوسرے نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"ہاں... یہی بات ہے۔" موسیو آرنیلس نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ "بات یہ ہے کہ مجھے فوری طور پر واپس جانا ہوگا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ غصہ آرہا ہے رہ رہ کر۔"

"کیا... تم واپس جارہے ہو؟ مگر کیوں؟"

"بہت ضروری کام ہے۔ اب مزید رُکنا میرے لیے ممکن نہیں۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سیاہ پوش ملازم پھر نمودار ہوا۔ موسیو آرنیلس نے اسے بگھی میں گھوڑے جوتنے کی ہدایت دی۔ وہ جانے ہی والا تھا کہ موسیو آرنیلس کے ایک شکاری دوست نے مداخلت کی۔ وہ ان سے مزید قیام کی التجا کرنے لگا۔

"دیکھو دوست۔" دوسرے شکاری نے کہا۔ "تمھارا یہ کام بہت زیادہ ضروری تو نہیں ہوسکتا۔ دیکھو نا، دو دن تو تم پہلے ہی انتظار کر چکے ہو۔"

موسیو آرنیلس سوچتے رہے۔ اُن کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے، جیسے وہ فرض اور مسرت کے درمیان معلق ہوں۔ اس کشمکش نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا۔ بہت دیر غور سے الجھنے کے بعد وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "بات یہ ہے..... بات یہ ہے کہ میں یہاں اکیلا نہیں آیا ہوں۔ میرے ساتھ..... میرا داماد بھی ہے۔"

"تمھارا داماد!" شکاریوں کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کہاں ہے وہ؟"

موسیو آرنیلس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ پریشان نظر آنے لگے۔ "کیا؟ تمھیں نہیں معلوم؟ وہ..... وہ..... وہ اصطبل میں ہے۔ وہ مر چکا ہے۔"

کمرۂ طعام پر اذیت آمیز خاموشی طاری ہوگئی۔

موسیو آرنیلس کی پریشانی میں اب شرمندگی بھی شامل ہوگئی۔ "میری بدقسمتی کہ وہ راستے ہی میں زندگی ہار بیٹھا۔ میں اس کی لاش لے کر گھر جارہا تھا۔ اچانک شکار کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا، شکار سے یکسر کیوں محروم رہوں۔ چنانچہ دو دن کے لیے یہاں آگیا۔ تم لوگ سمجھ رہے ہو نا؟ اب میں مزید ایک دن بھی نہیں رُک سکتا۔"

تمام شکاری سوچ میں پڑ گئے۔ مگر اُن میں ایک بہت منہ پھٹ تھا۔ "اب جب کہ وہ مر ہی چکا ہے۔" اس نے کہا۔ "تو میرا خیال ہے، مزید ایک دن کی تاخیر سے اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

دوسرے دونوں شکاریوں کی ہچکچاہٹ بھی دور ہوگئی۔ انھوں نے جلدی سے اپنے ساتھی کی تائید کی۔ "یہ درست ہے۔" انھوں نے بیک آواز کہا۔

ایسا لگا، جیسے موسیو آرنیلس کے دل و دماغ پر سے بوجھ ہٹ گیا ہو۔ "تو تمھارے خیال میں مزید ایک دن رُکنے میں کوئی ہرج نہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

وہ تینوں بیک آواز بولے۔ "بیمار ہوتا تو اور بات تھی۔ اب تم تین دن اور رُک جاؤ تو اسے کیا فرق پڑے گا۔"

موسیو آرنیلس نے سکون کا سانس لیا اور اپنے ملازم سے مخاطب ہوگئے۔ "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ ایسا ہے... کہ کل چلیں گے۔"

GUILLEMORT ROCK
Guye De Maupassant.



پکار

طاہر جاوید مغل

دل کی گہرائی سے کی جانے والی محبت چین سے جینے نہیں دیتی... تڑپاتی ہے... گرماتی ہے اور جھلسا دیتی ہے... محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں دن و رات گزارنے والے شخص کا فسانہ... اچانک ہی اس کی چھاؤں آگ اور سورج کی تیز تپش میں بدلتی چلی گئی...

مجسم محبت سے مجسم حسرت و یاس میں ڈھل جانے والی زندگی کا پُرسوز ماجرا

ملازمت کے سلسلے میں بندے کو شہر شہر بھاگنا پڑ جاتا ہے۔ سرکاری اسکول میں میری ٹیچنگ کی جاب تھی۔ میں اپنی بیوی آصفہ اور دو بچوں کے ساتھ حال ہی میں راولپنڈی سے لاہور کی اس کالونی میں کرائے کے گھر میں رہائش پذیر ہوا تھا۔ متوسط درجے کی آبادی تھی۔ ہمیں یہاں شفٹ ہوئے... پانچواں چھٹا روز تھا جب رات کے سناٹے میں، میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔ آصفہ اور دونوں بچے سو چکے تھے۔ میں بھی غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ کسی قریبی گلی سے ایک عجیب سی آواز

اُبھری۔ ''میں آؤں..... میں آؤں.....؟''

تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ آواز مسلسل اُبھر رہی تھی۔ ''میں آؤں..... میں آؤں۔''

کوئی بڑی عمر کا شخص تھا۔ آواز میں عجیب سی گھٹن اور ایک پُراسراری بے تابی تھی۔ نجانے کیوں یہ آواز سماعت سے ٹکرانے کے بعد مجھے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئی۔ یہ شخص کس کو اپنے آنے کا بتا رہا تھا اور کیوں بتا رہا تھا؟

دو تین روز بعد ایک بار پھر یہ آواز اُبھری۔ تاہم اس وقت رات نہیں تھی۔ شام کے بعد کا وقت تھا۔ میں اور آصفہ بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہی ڈراموں میں محبت، منگنی، رقابت، شادی اور طلاق کے جھگڑے، جب آواز ابھری تو میں نے ٹی وی کی آواز آہستہ کر دی اور آصفہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولی۔ ''کوئی فقیر لگتا ہے۔ کل رات بارہ بجے کے قریب میں پانی پینے کے لیے اٹھی تو تب بھی یہ آواز آ رہی تھی۔''

''مگر یار! فقیر تو اور طرح کی صدائیں لگاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو لگتا ہے کہ کسی کو اپنے آنے کا بتا رہا ہے..... آنے کی اجازت مانگ رہا ہے۔''

آواز پھر کالونی کی دیواروں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''میں آؤں..... میں آجاؤں؟''

اگلے ویک اینڈ پر مجھے والد صاحب سے ملنے کے لیے راولپنڈی جانا پڑ گیا۔ وہاں چار پانچ روز لگ گئے۔ جس روز واپسی ہوئی اسی روز رات کو گیارہ بجے کے لگ بھگ پھر وہی درد بھری آواز کسی دور کی گلی سے سنائی دی اور قریب آتی چلی گئی۔ میں ابھی سویا نہیں تھا، سلیپر گھسیٹ کر مختصر سا صحن پار کیا اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ گیا۔ گلی کے نکڑ پر ایک بیکری اور ایک پان شاپ ابھی تک کھلی تھیں۔ میں نے اسٹریٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں دیکھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چہرے پر اپنے لمبے بالوں کو بکھیرے دیتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ عمر 40 سال سے کم نہیں ہوگی۔ جسم بہت دبلا پتلا اور قدم لمبا تھا۔ سردی کے باوجود اس نے ایک پھٹی پرانی خستہ حال سی جرسی اور گھسی پٹی پتلون پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر ایک میلی کچیلی شال تھی۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر میرے بالکل قریب سے گزرا۔ اس کے مدقوق چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک فاتر العقل شخص ہے۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کے ڈیرے تھے اور ان آنکھوں کو دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کثرت سے آنسو بہانے والا شخص ہے۔ مجھ سے آٹھ دس قدم آگے جانے کے بعد اس نے عجب انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور پھر وہی پُرسوز آواز لگائی۔ ''میں آؤں؟ میں آجاؤں؟''

قریب سے ہی گلی کا ایک اور شخص گزر رہا تھا۔ اُس نے خستہ حال شخص اور اس کی آواز پر مطلق توجہ نہیں دی۔ لگتا تھا کہ مقامی لوگ اس بندے کو بہت مدت سے اسی طرح دیکھ رہے ہیں اور اب وہ یا اس کی درد بھری آواز ان کے لیے کوئی انوکھی شے نہیں رہی۔

محلے میں میری تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی تھی۔ بیکری والے حاجی الیاس صاحب سے بھی بات چیت ہو جاتی تھی۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ ''حاجی صاحب، یہ جو بندہ آواز لگاتا ہوا نکلا ہے، کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

حاجی الیاس کی آنکھوں میں عجب تاثر ابھرا۔ افسردگی سے بولے۔ ''بس قسمت کا مارا ہوا بندہ ہے۔ چودہ پندرہ سال پہلے بیوی سے طلاق ہو گئی۔ خود اس کے اپنے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ حادثے کے بعد اپنے ہوش حواس میں ہی نہ رہا۔ تین چار مرلے کا اس کا اپنا ذاتی گھر ہے جو کئی سال سے بے آباد پڑا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی ولید کے ساتھ رہتا ہے، وہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔''

''یہ جو آواز لگاتا ہے۔ میں آؤں..... میں آجاؤں..... یہ کیا ہے؟''

حاجی صاحب کے لہجے کی افسردگی بڑھ گئی، بولے۔ ''سمجھو بس کسی اپنے کو پکارتا ہے۔ اس کی آواز سننا چاہتا ہے۔''

''لیکن حاجی صاحب! یہ تو لگتا ہے کہ کسی سے اپنے آنے کی اجازت مانگ رہا ہے، اور.....''

ایک دم حاجی صاحب نے مجھے ٹوک دیا۔ ''اچھا وہ دیکھو..... وہ جا رہا ہے، اس کا چھوٹا بھائی ولید۔ وہ تمہیں ساری بات بڑی تفصیل سے بتا سکتا ہے۔'' پھر وہ میرے جواب دینے سے پہلے ہی اسے پکارنے لگے۔ ''ولید..... او ولید..... ادھر آؤ بھئی!''

ولید کی عمر پینتیس چھتیس سال رہی ہوگی۔ وہ بھی دُبلا پتلا تھا البتہ چاق چوبند اور صحت مند نظر آتا تھا۔ وہ شاید چہل قدمی کے لیے ہی باہر نکلا تھا۔ حاجی صاحب کے بلانے پر ہمارے پاس آ گیا۔ حاجی صاحب نے ایک کرسی اس کے لیے بھی گھسیٹ لی اور لوہے کی انگیٹھی میں دو تین لکڑیاں اور گھسیڑ دیں تاکہ سردی کی شدت کم ہو۔ ولید کے تعارف سے پتا چلا کہ دونوں بھائی آٹھ مرلے کے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔

درمیان میں دیوار ہے۔ ولید کے مفلوک الحال بڑے بھائی کا نام فرید احمد تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ نارمل زندگی گزار رہا تھا اور اے جی آفس میں کلرک تھا۔ تاہم بیوی سے طلاق کے بعد فرید احمد کا نہ صرف گھر ویران پڑا تھا بلکہ اے جی آفس میں اس کی ملازمت بھی عرصہ دراز سے ختم ہو چکی تھی۔

ولید مجھے ایک خوش اخلاق بندہ لگا۔ اس کی کنپٹیوں کے کچھ بال سفید تھے۔ میرے منہ سے اپنے بڑے بھائی فرید کا نام سن کر اس کی آنکھوں سے بھی ایک طرح کی لاچاری اور افسردگی جھانکنے لگی۔ ولید کو گھر میں ویدو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ویدو سے طویل گفتگو ہوئی اس نے بڑے بھائی کی جو کہانی سنائی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

نوجوانی میں فرید کو شکیلہ نامی ایک لڑکی سے پیار ہوا۔ جلد ہی دونوں محبت کے اٹوٹ رشتے میں بندھ گئے۔ فرید کی طرح شکیلہ کا تعلق بھی لوئر مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود شکیلہ ڈٹ گئی اور یوں فرید اور شکیلہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ دونوں کی ازدواجی زندگی کا آغاز بہت ہی خوشگوار اور خوشیوں بھرا تھا۔ شکیلہ نے اپنے گھر والوں پر بھی ثابت کر دیا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں تھا اور وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی کی داغ بیل ڈال چکی ہے۔

گھر کی آمدنی بڑھانے کے لیے شکیلہ گھر کے اندر ہی چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی تھی۔ ایک طرح سے چھوٹی سی اکیڈمی کھول لی تھی۔ حالانکہ ابھی ان کے آنگن میں کوئی پھول نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ڈیڑھ دو سال تک مثالی ازدواجی زندگی گزاری۔ بہرحال کاتب تقدیر نے کچھ اور لکھ رکھا تھا۔ انہی دنوں فرید کی والدہ بیمار ہوئیں، اور کئی مہینے زیر علاج رہنے کے بعد چل بسیں۔ والدہ کی دیکھ بھال اور علاج پر دونوں بھائیوں نے مل کر ہی خرچہ کیا تھا۔ تاہم فرید کو بڑے بھائی کی حیثیت سے کچھ زیادہ خرچ کرنا پڑا تھا۔ اس کی مالی حالت دگرگوں ہو گئی۔ مزید یہ کہ شکیلہ بھی امید سے ہو چکی تھی اور یوں اضافی اخراجات شروع ہو چکے تھے۔ گھریلو زندگی میں تنگدستی اور تنازعات ساتھ ساتھ ہی جنم لیتے ہیں۔ شکیلہ اور فرید کے درمیان بھی چھوٹے موٹے اختلافات پیدا ہونے لگے۔

پھر ایک روز شکیلہ اور ویدو کی بیوی عائزہ کے درمیان باقاعدہ جنگ ہو گئی۔ اختلافات کی بنیاد تو والدہ کے علاج کے دوران ہی پڑ چکی تھی۔ اب عائزہ کو شکیلہ کی اکیڈمی سے چڑ ہو گئی تھی۔ عائزہ کا کہنا تھا کہ ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کا شور، گھر کا سکون برباد کر رہا ہے۔ اگر جیٹھانی کو اکیڈمی کا اتنا ہی شوق ہے تو کرائے پر علیحدہ گھر لے لے۔ یہ تنازعہ بڑھتا چلا گیا۔ شکیلہ بھی ڈٹ گئی کہ وہ ٹیوشن پڑھانا نہیں چھوڑ سکتی۔ ظاہر ہے کہ مستقبل قریب کے اضافی خرچے بھی اس کی نظر میں تھے۔ شکیلہ اور فرید کے درمیان آپس میں بھی کئی جھگڑے ہوئے۔ آخر شکیلہ کے اصرار پر دونوں بھائیوں کو گھر میں دیوار کھڑی کرنا پڑی۔ اس دیوار کی اونچائی سات آٹھ فٹ رہی ہو گی مگر اس کے ساتھ ذہنوں میں جو دیوار اٹھ گئی تھی، وہ سات آٹھ فٹ سے بہت آگے چلی گئی..... بلند تر ہوتی گئی۔

اسی اثنا میں فرید اور شکیلہ کے گھر میں ایک ننھی منی سی پری آ گئی۔ اس کا نام مقدس رکھا گیا۔ مقدس کے آنے سے تین چار ماہ تک تو فرید اور شکیلہ کے حالات نارمل رہے، مگر اس کے بعد پھر میاں بیوی کی باہمی تلخیاں نمایاں ہونے لگیں۔ سفید پوش لوگوں کے لیے فی زمانہ ایک بچہ پالنا بھی کارِ دشوار ثابت ہوتا ہے۔

ہیڈ کلرک کے طور پر فرید ایک ایسی سیٹ پر بیٹھا تھا جہاں اس کی جیب کافی گرم ہو سکتی تھی۔ کسمپرسی میں ایک اسٹیج ایسی آئی کہ شکیلہ دبے لفظوں میں فرید سے تقاضا کرنے لگی کہ وہ کسی بھی طرح اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ وہ جس طرح کے اضافے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ کسی طرح فرید کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ فرید میں ایک چڑچڑا پن سا پیدا ہو گیا اور یہ چڑچڑا پن اس کے آفس کے معاملات کو بھی بگاڑ رہا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے وہ اپنے ایک کولیگ سے لڑ پڑا۔ وہ بھی کوئی سر پھرا تھا۔ اس نے ایک آہنی راڈ سے فرید پر حملہ کیا اور فرید نے وہی راڈ اس سے چھین کر اسے بری طرح زخمی کر ڈالا۔ بات تھانے کچہری تک چلی گئی۔ دوسری طرف گھر میں بھی تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس میں کچھ کردار ویدو کی بیوی عائزہ نے بھی ادا کیا۔ چند ہی ماہ میں اختلافات اس نہج پر پہنچ گئے کہ علیحدگی کے آثار نظر آنے لگے۔ محبت کی وہ ریشمی ڈوری جس نے تین ساڑھے تین سال پہلے انہیں شادی کے بندھن میں باندھا تھا، ایک دم خستہ اور کھردری ہو کر جگہ جگہ سے تڑخنے لگی۔

فرید کو پانچ چھ ماہ کی مقدس سے بے پناہ اُنس تھا۔ یہ کہا جائے کہ اس ننھی سی پری میں اس کی جان تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ یہ خیال اس کے لیے سوہانِ روح تھا کہ اگر اسے شکیلہ کو کھونا پڑا تو شاید مقدس بھی اس سے بچھڑ جائے گی۔ اس نے اپنی طرف سے اس رشتے کو بچانے کی بھرپور کوشش کی مگر ہونی ہو کر رہی۔ ایک روز ان دونوں کے

سامنے پھر ایک کاغذ تھا۔ تاہم اس مرتبہ یہ کاغذ ملاپ کا نہیں جدائی یعنی طلاق کا تھا۔ شکیلہ بالکل ہی بدل چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ وہ عورت ہی نہیں جس کے ساتھ فرید نے کبھی عہد و پیمان کا دور گزارا تھا۔ تنازعات ایسے ہی محبتوں کو نگلتے ہیں۔ اس گھر کے ٹوٹنے میں شکیلہ کے گھر والوں نے بھی بھرپور کردار ادا کیا کہ یہ شادی ان کی مرضی کے بغیر ہوئی تھی۔

قدرت نے فرید پر صرف ایک مہربانی کی تھی اور یہ مہربانی بھی شکیلہ کے والدین کی ہوشیاری کے طفیل ہوئی تھی۔ وہ فرید کو نتھی مقدس کی کسٹڈی دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس بات کا پتا تو بعد ازاں چلا کہ وہ مستقبل قریب میں شکیلہ کی دوسری شادی کا ارادہ رکھتے تھے اور شکیلہ کے ساتھ بچی کی موجودگی کو اس ارادے کے لیے رکاوٹ سمجھتے تھے۔ مقدس کی ولادت کے بعد میاں بیوی کے باہمی اختلافات نے اتنی شدت اختیار کی تھی کہ شکیلہ کے اندر مقدس کے لیے وہ محبت پیدا نہ ہو سکی جو ہونا چاہیے تھی۔

طلاق کے بعد فرید کے لیے ایک نئی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ اس اداس تاریک زندگی میں مقدس اس شمع کی طرح تھی جو اس کائنات میں فرید کے لیے روشنی کا واحد ذریعہ تھی۔

سرد رات میں آگ کے سامنے بیٹھ کر بڑے بھائی کی کہانی سناتے ہوئے وید و نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ”بھائی نے اس سات آٹھ ماہ کی بچی کو اتنی محبت اور لگن سے پالا کہ کسی ماں نے بھی کیا پالا ہوگا۔ انہوں نے ان دنوں اپنی ملازمت سے طویل رخصت لے لی تھی۔ وہ ننھی بچی مقدس کو اپنے ہاتھ سے نہلاتے، کپڑے پہناتے، اس کی پیمپرنگ کرتے۔ وہ بیمار ہوتی تو آدھی آدھی رات کو اسے لیے لیے پھرتے۔ وہ بے چاری بیمار ہوتی بھی زیادہ تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے نہ ماں کا دودھ ملا تھا نہ اس کی گود، نہ پیار۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی، بھائی جان کی الفت اس میں بڑھتی گئی۔ وہ بھی پل بھر کے لیے خود کو ان سے جدا نہ کرتی تھی۔“

”لیکن فرید تو جاب بھی کرتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”مقدس کے لیے بھائی نے جاب بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ گھر میں ہی رہ کر ٹیوشن اکیڈمی کو پھر سے چلانے لگے تھے۔“

”اور شکیلہ؟ اس نے شادی کی؟“

”فوری طور پر تو نہیں کی جی..... مگر کچھ عورتیں پہیلی کی طرح ہی ہوتی ہیں نا۔ یوں لگتا تھا کہ بھائی کے لیے اس کی تمام محبت شدید نفرت میں بدل چکی ہے۔ بھائی کو اکیلا کر دینے کے باوجود وہ اس کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اب باپ بیٹی کو بھی جدا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے اپنے سابق شوہر سے اس کا آخری سہارا بھی چھیننے کی کوشش کی تو وہ ہر طرح سے مزاحمت کرے گا۔ کیا پتا کہ مرنے مارنے پر ہی آمادہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں وہ اب بھائی فرید سے ڈرتی بھی تھی۔ مالی طور پر بھی ان لوگوں کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ مقدمے بازی میں پڑ سکیں اسی لیے شکیلہ کے ذہن میں ایک سازش پروان چڑھنے لگی تھی۔“

میں سوالیہ نظروں سے ولید عرف ویدو کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”شکیلہ خوب صورت تو تھی ہی، اس نے دوسری شادی کے لیے ایک ایسا بندہ ڈھونڈا جو نہ صرف فرید سے ٹکر لے بلکہ اسے یادگار سبق بھی سکھا سکے۔ وہ پولیس کے محکمے سے بھاگا ہوا ایک سابق اے ایس آئی تھا۔ اب پراپرٹی کا چھوٹا موٹا کام کرتا تھا اور لڑائی جھگڑوں میں بھی ملوث رہتا تھا۔ شکیلہ کے والد کی کریانے کی دکان تھی۔ عامر نامی سابق پولیس والا دکان پر آتا جاتا رہتا تھا۔ شکیلہ نے عامر سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ وہ اکثر اپنی گاڑی پر ان کے گھر بھی آنے جانے لگا۔ عامر کی بھی اپنی بیوی سے طلاق ہو چکی تھی۔ بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اقبال ٹاؤن میں اس کی دس بارہ مرلے کی تین منزلہ کوٹھی تھی پھر ایک دن ایسا آیا کہ شکیلہ اپنے چھوٹے سے گھر سے نکل کر اقبال ٹاؤن کی کوٹھی میں دلہن کی حیثیت سے پہنچ گئی۔“

ویدو نے ذرا توقف کر کے خیالات کو مجتمع کیا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں اس شادی نے بھائی فرید کو بے حد دکھی کیا تھا مگر ان کے سارے دکھوں کا مداوا مقدس تو ان کے پاس تھی۔ مقدس کی عمر اب پانچ سال کے قریب تھی۔ وہ اسکول جانا شروع ہو گئی تھی اور توتلی زبان میں بڑی پیاری باتیں کرتی تھی۔ وہ باپ کے ساتھ چمٹ کر سوتی، ان کے ساتھ کھیلتی، ان کے ساتھ اسکول جاتی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ اسکول میں ہوتی اور بھائی فرید اسکول کے صحن میں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرتے۔ اسکول ٹائم کے دوران میں بھی وہ ایک دو بار باہر نکل کر باپ کو جھپی ڈال جاتی۔ وہ پانچ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کی چوتھی سالگرہ تھی۔ بھائی فرید نے دو ہفتے پہلے سے ہی سالگرہ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، سالگرہ سے دو روز پہلے کی بات ہے، شام کے وقت وہ ضد کر کے بھائی کے ساتھ قریبی پارک میں گئی۔ اکثر چھوٹے بچوں کی طرح برف پانی اور آنکھ مچولی طرح کے کھیل مقدس کے پسندیدہ تھے۔ وہ میرے بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی۔ دونوں گھروں میں جو نا چاقی ہو چکی تھی، اس کے

سبب بچے آپس میں گھل مل نہ سکے تھے۔ مقدس کی ساری سیر و تفریح اور کھیل کود بھائی فرید تک ہی محدود تھی۔ وہ پارک میں بھائی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے درختوں میں چھپی اور پھر بھائی فرید..... اُسے کبھی نہ دیکھ سکے۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے دیدو کی آواز بھرا گئی۔

میں نے بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے دیدو سے پوچھا۔ "اسے شکیلہ نے اغوا کیا؟"

دیدو نے اثبات میں سر ہلایا پھر آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن شروع میں ہمیں گمان تک نہیں ہوا کہ ایسا ہوا ہے۔ میں بھی اپنے بچوں کے ساتھ اُس وقت پارک میں ہی تھا۔ میں نے بھی شروع میں بھائی کو آوازیں دیتے ہوئے سنا تھا۔ وہ ایک دیوار کی طرف منہ کیے کھڑے تھے اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے پکار رہے تھے..... میں آؤں..... میں آجاؤں..... پھر دو تین منٹ بعد ہم نے انہیں درختوں میں دیکھا۔ وہ بلند آواز میں کہہ رہے تھے..... مقدس کہاں ہو..... مقدس ایسے مت ستاؤ..... چلو باہر آؤ۔" وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے ہر طرف چکرا رہے تھے۔ میں اور میرے دونوں بچے بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ جوں جوں ٹائم گزرتا جا رہا تھا، بھائی فرید کی حالت پتلی ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا غش کھا کر گر پڑیں گے۔ پہلے مسجدوں میں اعلان کرائے گئے..... پھر پولیس میں رپورٹ ہوئی..... اُسی رات شکیلہ اور اس کے سابق پولیس اہلکار خاوند کے گھر پر بھی پولیس پہنچی مگر پتا چلا کہ میاں بیوی شام سے ہی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ ایک پڑوسی سے پتا چلا کہ وہ کچھ دنوں سے کراچی جانے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے۔ دونوں کے موبائل فون بھی بند تھے۔ سات آٹھ روز اسی بھاگ دوڑ میں گزر گئے۔ فرید بھائی کسی وقت آدھی رات کو پارک میں چلے جاتے اور مقدس کو آوازیں دیتے پھرتے، گٹروں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر ان کے اندر جھانکتے، مقدس کو پکارتے، اردگرد کی زیرِ تعمیر عمارتوں میں دیوانوں کی طرح بھٹکتے اور پھر ایک دن وہ واقعہ ہوا جس نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔" دیدو کا گلا پھر رُندھ گیا۔

"وہ حادثہ جس نے فرید کے ہوش و حواس متاثر کیے؟" میں نے پوچھا۔

دیدو نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک سڑک پار کرتے ہوئے وہ ایک تیز رفتار رکشے سے ٹکرائے اور بے ہوش ہو کر کئی دن ایک اسپتال میں پڑے رہے۔ جب ہوش میں آئے تو ان کے حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔ کبھی شکیلہ اور اس کے خاوند پر چلاتے..... کبھی میری بیوی پر شک کرتے اور اسے بُرا بھلا کہتے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جون 2024ء
کی جھلکیاں

عشق نہیں آسان
ماضی قسط وار کی دلچسپ روداد عشق

سینما کی کہانی
فلم سازی کی مختصر تاریخ کہ
سینما کی شروعات کیسے ہوئی

کار سیکل گانگ
اس گلوکار کا تذکرہ جو عالمی پیمانے پر مشہور
ہے مگر پاکستان میں بہت کم لوگ پہچانتے ہیں

بُرائی قسمت
ایک انوکھے انداز کی سچ بیانی
جو حیرت کے در کھول دے گی

اس کے علاوہ
لہو گرم کر دینے والی ایک نوجوان کی دلچسپ سرگزشت
"اسیر جنوں" انگریز ماں کے بیٹے کی پاکستان سے
محبت کا عجیب قصہ "حب وطن" اور بھی بہت سارے
سچے قصے، دلچسپ واقعات اور سچ بیانیاں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ مخصوص
کرالیں تاکہ ختم ہو گیا جیسا مکالمہ نہ سننا پڑے
مطلوبات کے شائقین کے لیے خوشخبری ہے پرچہ

کہ اس نے مقدس کو کہیں غائب کیا ہے..... کبھی ذہن بالکل اور ہی انداز میں سوچنے لگتا..... ہر ایک کو شک سے آزاد کر دیتے۔ کھلے مین ہولز کے اندر منہ ڈال کر مقدس کو آوازیں دیتے..... یا پھر اس پارک میں چلے جاتے جہاں وہ گم ہوئی تھی۔ درختوں میں جھانک کر اسے پکارتے..... مقدس..... مقدس..... میں آجاؤں..... میں آجاؤں۔ اُن کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔"

"اور مقدس، شکیلہ کے پاس تھی..... شاید کراچی میں؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں..... لیکن وہ بھی سخت بیمار تھی۔ سینے کا انفیکشن تو اسے پہلے بھی کبھی کبھی ہو جاتا تھا مگر، اس ننھی سی جان کی اصل تکلیف اپنے باپ سے جدائی تھی۔ وہ باپ جس نے اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ چھ سات ماہ کی عمر سے لے کر اب تک وہی پیار اس کا سب کچھ تھا۔ ماں تو اس کے لیے ایک بالکل اجنبی عورت تھی جو اس پر زبردستی اپنا پیار اور اپنا حق ٹھونسنے کی کوشش کرتی تھی۔"

میں نے دیدو سے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں نے بچی کی حوالگی کے لیے قانونی چارہ جوئی کی؟"

"جیسا کہ میں نے بتایا ہے، بھائی تو اپنے حواس تقریباً کھو بیٹھے تھے، وکیل نے ہی بتایا کہ باپ کی موجودہ حالت میں بچی کی حوالگی کا کیس بہت کمزور ہو چکا ہے۔ ویسے بھی کراچی میں مقدس کی حالت ایک دم بہت خراب ہو رہی تھی۔"

میں نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ "اس موقع پر بھی ترس نہیں آیا، شکیلہ کو؟"

"تھوڑا بہت آیا جی، ان لوگوں نے مجھے کراچی بلوایا۔ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر بچی کا وزن بہت کم ہو چکا تھا۔ اس کی اندر دھنسی آنکھوں میں ویرانی جیسے ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ وہ چلڈرن اسپتال میں تھی۔ اب شکیلہ اور اس کا شوہر دونوں ہی پریشان نظر آتے تھے۔ شکیلہ نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے باپ کو لے کر آؤں۔ اگلے ہی روز میں بذریعہ ٹرین کراچی سے لاہور روانہ ہو گیا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ بھائی فرید کبھی کبھی گھر سے نکل جاتے تھے اور دو تین روز نجانے کہاں کہاں خجل ہو کر واپس آتے تھے۔ ان کی قسمت میں ہی نہیں تھا کہ اپنی لاڈلی کا آخری دیدار کر سکیں۔ اگلے ہی روز رات کو وہ معصوم بچی کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کر گئی۔ اس کی طبیعت اچانک ہی بگڑی تھی اور سنبھل نہ سکی تھی۔"

دیدو خاموش ہو گیا۔ میں بھی بوجھل دل کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ انگیٹھی کی آگ دھیرے دھیرے بجھنے لگی تھی۔ بیکری بند ہونے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے دیدو سے پوچھا۔ "فرید کو مقدس کے چلے جانے کا بتایا گیا؟"

"ہاں جی..... چند روز بعد میں نے ہی بتایا تھا لیکن میری بات سن کر بھائی مجھے مارنے کے لیے دوڑے۔ اتنی زور سے دھکا دیا کہ گر کر میرا بازو زخمی ہو گیا۔ پھر ڈاکٹر نے بھی یہی بات کہی کہ تمہارا بھائی جس ٹراما میں ہے، اسے اسی میں رہنے دو۔ نئی صورتِ حال اس کے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

میں انگیٹھی کے بجھتے انگاروں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ ہمارے معاشرے میں گھر گرہستی کی وفا بھی تو اسی طرح بجھتی ختم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ازدواجی جھگڑے بڑھ رہے ہیں، گھر ٹوٹ رہے ہیں..... اور گھر توڑنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو ننھے پھول اُن کے آنگن میں کھلے ہیں، وہ وقت کی دھوپ میں اور بے مہری کی تپش میں کس بُری طرح جھلسیں گے۔

میں نے دیدو سے پوچھا۔ "شکیلہ اب کس حال میں ہے؟"

"جس حال میں اسے ہونا چاہیے تھا۔" دیدو نے تُرت جواب دیا۔ "اس نے فرید بھائی کو تکلیف میں مبتلا کرنے کی خاطر مقدس کو ان سے چھینا اور اس کے لیے اس نے عامر جیسے مشکوک کردار کے سخت گیر بندے سے بیاہ رچایا۔ فرید سے تو جو انتقام شکیلہ نے لیا، وہ لیا وہ خود بھی مکافات کا شکار ہوئی۔ اگلے دو تین سال تک عامر نے اسے جیسے کانٹوں کے بستر پر لٹائے رکھا۔ گالی گلوچ، مار پیٹ سب کچھ اس کے ساتھ ہوا اور جب انتہا ہو گئی تو شکیلہ نے اس سے نجات پانے میں ہی عافیت سمجھی، اور یہ نجات حاصل کرتے کرتے اس کے باپ کی کریانے کی دکان تک بک گئی۔ اب ادھیڑ عمر ہو کر اپنے کسی بھائی کے گھر میں ہی پڑی ہے۔"

انگیٹھی بجھ گئی تھی۔ کہانی ختم ہو گئی تھی۔ حاجی صاحب نے بیکری کا شٹر بھی ڈاؤن کر دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر واپس پہنچا۔ سوئی ہوئی آصفہ کے چہرے سے بالوں کی لٹ ہٹائی۔ اپنے دونوں بچوں کی پیشانیاں چومیں اور بہت بھاری دل کے ساتھ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر کسی قریبی گلی سے وہی درد بھری آواز ہوا کی لہروں پر اُبھری۔

وہ بڑے کرب کے ساتھ بڑے لاڈ بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ "میں آؤں..... میں آجاؤں؟ میں آجاؤں....." یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

اس کی لاڈلی جواب نہیں دیتی تھی..... وہ نہیں دیتی تھی جواب..... وہ آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے کہیں بہت دور جا چھپی تھی۔

❖❖❖



مکان

طاہر جاوید مغل

ایک محبت شناس کے رومانی خوابوں کی کہانی۔ جاگتی اور سوئی آنکھوں سے دیکھے جانے والے، برسوں پر محیط ان خوابوں کو وہ شخص تعبیر دینا چاہتا تھا۔ اپنے ماضی سے تعلق رکھنے والی ہر چیز... ہر مہ و سال کو وہ اصل صورت میں لوٹانا چاہتا تھا لیکن یہ حقیقت نظر انداز کر بیٹھا کہ حال کو ہر صورت ماضی پر مقدم رکھنا چاہیے۔

اک تعلق تھا وقت سے جو اسے ماضی کے ساتھ وہ پھر سے تعلق بنانا چاہتا تھا

شہزاد رضوی صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ پھر منہ سے سگار نکال کر انگلیوں میں دبایا... اور بھاری بھرکم آواز میں بولے "ہیلو امتیاز! میں رضوی بول رہا ہوں... ہاں' ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے تمہیں۔ رستم کالونی کے سب سے اچھے پرائیویٹ ڈیلر کا پتا کرو اور اسے لے کر میرے پاس پہنچ جاؤ... ہاں... ہاں' ایک ضروری کام ہے۔ گیارہ بجے تک تمہیں آجانا چاہیے... اوکے... خدا حافظ۔"

امتیاز نامی یہ شخص شہزاد رضوی صاحب کا پرسنل سیکریٹری تھا۔ ذہین اور ہوشیار نوجوان تھا۔ رضوی صاحب کو امید تھی کہ وہ ٹھیک وقت پر ڈیلر کو لے کر پہنچ جائے گا۔ ریسیور رکھ کر وہ کچھ دیر صوفے پر خاموش بیٹھے رہے' ان کی نگاہیں ڈرائنگ روم کے در و دیوار پر تھیں۔ ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے وہ۔ جیسے کسی اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن پہچان نہ پا رہے ہوں۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ تاثرات سے ظاہر تھا کہ انہیں یہاں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ انہوں نے غیر ارادی طور پر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور اٹھ کر دبیز قالین پر ٹہلنے لگے۔ ساتھ والے کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ ان کی نوجوان بیٹی شہلا اور چودہ سالہ بیٹا عمران رضوی کسی بات پر نوک جھونک کر رہے تھے۔ تکرار

اُن کی عادت ثانیہ بن چکی تھی نہ کسی ایک بات پر متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے وہ۔ شاید یہ بھی باہمی الفت کا ایک رخ تھا۔

خلافِ معمول آج ان دونوں کی نوک جھونک بھی رضوی صاحب کے کانوں کو نہیں بھائی۔ سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے وہ زینے کی طرف بڑھے۔ سامنے گھریلو ملازم مؤدب کھڑا تھا۔ رضوی صاحب نے کہا "میں چھت پر ہوں' ابھی امتیاز صاحب آئیں تو مجھے نیچے بلا لینا۔"

ملازم نے احترام سے سر جھکایا۔ وہ دھیمے قدموں سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے چھت پر آ گئے۔

یہ مکان کوئی پندرہ مرلے پر مشتمل تھا۔ ماضی میں اس کا صحن وسیع تھا۔ صحن کے ساتھ چھوٹا سا برآمدہ تھا اور برآمدے کے عقب میں کچن سمیت تین کمرے تھے۔ گیراج کے اوپر ایک گیلری بنا دی گئی تھی۔ گیلری میں بڑی خوب صورت بالکونی تھی۔ بالکونی کا رخ صحن اور صحن کے آگے پھیلے ہوئے کھلے میدان کی طرف تھا۔ بالکونی کے جنگلے سے لپٹی ہوئی کنول بیل ہر وقت سرخ پھولوں سے لدی رہتی تھی۔ کالج کے زمانے میں وہی سجی ہوئی گیلری رضوی صاحب کا مسکن ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس گیلری کا حسن تادیر برقرار نہیں رہ سکا تھا۔ رضوی صاحب کے تین بڑے بھائی تھے اور ان کی شادیاں سر پر تھیں۔ بڑھتی ہوئی رہائشی ضروریات کے پیشِ نظر رضوی صاحب کے والد خدا بخش رضوی نے مکان میں توسیع کی تھی۔ ایک پرانا کمرا گرا دیا گیا تھا اور صحن میں تین کمروں کے علاوہ ایک کشادہ گیراج تعمیر کر دیا گیا تھا۔ سابقہ گیراج اسٹور کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ گیلری بھی چونکہ پچھواڑے میں پڑ گئی تھی لہٰذا اس کا کوئی خاص مصرف نہیں رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں تعمیرِ نو نے مکان کا پورا نقشہ بدل دیا تھا۔

ان واقعات کو تقریباً بائیس برس گزر چکے تھے۔ ان برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔ رضوی صاحب کے تینوں بڑے بھائی اپنے علیحدہ مکان بنوا چکے تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ والدین داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ رضوی صاحب اب خود جوان اولاد کے باپ تھے۔ لیکن اگر کوئی چیز نہیں بدلی تھی تو وہ اس پھولوں بھری بالکونی سے رضوی صاحب کی محبت تھی جہاں انہوں نے اپنے لڑکپن اور نوجوانی کا یادگار دور گزارا تھا۔۔۔ اور یہ محبت صرف اس بالکونی تک محدود نہیں تھی' اس محبت کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس دائرے میں پھولوں بھری بالکونی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ آتا تھا۔ بالکونی تو اُن لافانی یادوں کا ایک جزو محض تھی جو ایک عظیم الشان دفینے کی طرح رضوی صاحب کے سینے میں محفوظ تھیں اور ہر گھڑی ہر لحظہ دمکتی رہتی تھیں۔

چھت پر آ کر اور اردگرد کے ماحول کو دیکھ کر انہیں کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا۔ ان کی نگاہیں کچھ فاصلے پر ایک مکان کی برساتی پر جم گئیں اور وہ ایک آرام کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ تقریباً نصف فرلانگ دور نظر آنے والی اس برساتی اور ان کے مکان کی بالکونی میں ایک گہرا تعلق تھا۔ یہ تعلق آج سے چوبیس پچیس برس پہلے سرما کی ایک شفق رنگ شام کو پیدا ہوا تھا۔ اس وقت ان دونوں مکانوں کے درمیان کوئی تیسرا مکان نہیں تھا۔ بس ایک خوب صورت سا سبزہ زار تھا۔ شہزاد رضوی صاحب نے گیلری کی بالکونی سے پہلی دفعہ نائلہ کو دیکھا تھا۔ وہ کالج کے یونیفارم میں تھی' سفید شلوار قمیص پر سرخ جرسی۔ وہ ایک دم جھماکے سے اُن کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ یقیناً وہ لڑکی پہلی مرتبہ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس سے قبل بھی رضوی صاحب کی نظر پڑتی رہی ہو گی لیکن شاید "محبت" کی نمو کے لیے ایک لمحہ قدرت کی طرف سے متعین ہوتا ہے۔ اُس لمحے میں نگاہوں کا مفہوم' سوچ کے زاویے' الفاظ کے معنی' سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور شہزاد اور نائلہ پر وہ لمحہ وارد ہو گیا تھا۔ اسی لمحے وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے اور اس کے بعد آنے والے ماہ و سال میں جتنے بھی لمحے آئے وہ انہیں محبت کی راہ پر آگے بڑھاتے چلے گئے۔

نوجوان شہزاد رضوی ایک آرٹسٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد کا شمار ملک کے معروف فوٹو گرافرز میں ہوتا تھا۔ لاہور کے ایک نہایت متمول علاقے میں ان کا بہت بڑا اسٹوڈیو تھا۔ اس اسٹوڈیو کی دیواروں پر ملک کی ممتاز شخصیات کی تصاویر آویزاں نظر آتی تھیں۔ بعض اوقات اہم تقریبات کی کوریج کے لیے انہیں سرکاری طور پر بھی مدعو کیا جاتا تھا۔۔۔ دوسری طرف نائلہ اکبر بھی ایک خوش حال اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد سول سروس میں تھے اور دو بڑے بھائی ڈاکٹری کر رہے تھے۔ یہ لوگ حال ہی میں یہاں آئے تھے۔ جلد ہی دونوں گھرانوں میں راہ و رسم ہو گئی اور خواتین اکثر ایک دوسرے کے ہاں آنے لگیں۔ نائلہ چونکہ رضوی کی بڑی بہن سے "پڑھائی" میں مدد لیتی تھی لہٰذا وہ کچھ زیادہ ہی آتی تھی۔ اس آمد و رفت اور میل ملاپ میں "محبت" کا پودا بھی پروان چڑھتا رہا۔ سرگوشیاں کانوں میں رس گھولتی رہیں' کھڑکیوں اور چمنوں کی اوٹ سے شوق مسکراتا رہا' مہربان لمحوں میں بے تاب ہونٹ اپنی منزل پاتے رہے اور پیاسی باہیں ایک دوسرے کو چھوتی رہیں۔۔۔ لیکن پھر اچانک وہ قاتل لمحہ آ دھمکا جو محبت پر شب خون مارتا ہے اور محبت کرنے والوں کو عمر بھر کے آنسو دے جاتا ہے۔ ایک روز قطعی غیر متوقع طور پر نائلہ کی منگنی ہو گئی۔ اُس کی ایک پھوپی' بہن سے اسے اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں اور اپنے بھائی سے نائلہ کے رشتے کے لیے اصرار کرتی رہتی تھیں۔ ایک رات پہلے وہ بھائی سے مل کر گھر واپس گئیں تو اچانک انہیں دل کا دورہ پڑا۔ حالت دگرگوں ہو گئی تاہم بعد میں اسپتال جا کر سنبھل گئی۔ حالت کے اس بگڑنے اور سنبھلنے کے دوران ہی بھائی بہن میں ملاقات ہوئی اور نائلہ جو بڑی خاموشی سے شہزاد رضوی کی دنیا بن چکی تھی' کسی اور کے ساتھ منسوب کر دی گئی۔ اب شہزاد رضوی اس دنیا میں

"دنیا" کے بغیر تھا۔

چند ماہ کے اندر اس پر وہ ساری قیامتیں ٹوٹیں جو ایک سچے لیکن بدنصیب عاشق کا مقدر ہوتی ہیں۔ وہ ہزار بار صدمات کے خونی جبڑوں میں ریزہ ریزہ ہوا اور پھر سٹ کر ایک جسم بن گیا۔ اس نے شرافت کے دائرے میں رہتے ہوئے حالات کا رخ اپنے حق میں موڑنے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن قسمت ہی ہار ہو چکی تھی۔ اس کی کوئی سعی کارگر نہیں ہوئی۔ نائلہ کی پھوپی اپنے سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ اور وہ موت کی دہلیز پر تھیں۔ وہ لوگ ان کی زندگی کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے۔ تین چار ماہ بعد نائلہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور پھر... وہ آخری ملاقات... جو آج تک رضوی صاحب کے دل پر نقش تھی۔ جیسے پھانسی پانے والا آخری بار اپنے پیاروں کے چہرے دیکھتا ہے۔ آنکھیں روتی ہیں اور دل سینے میں کٹ کٹ کر گرتا ہے۔ آخر "واچ مین" کی آواز گونجتی ہے "وقت ختم ہوگیا" رونے والے الٹے قدموں چلتے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں' ہمیشہ کے لیے... وہ ملاقات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ریواز گارڈن میں ایک مشترکہ دوست کے گھر' رضوی اور نائلہ آخری بار ایک دوسرے سے ملے تھے... ہاں وہ آخری باتیں تھیں۔ اس کے بعد پھر کبھی بات نہیں ہونا تھی۔ وہ آخری "لمس" تھے' اس کے بعد تمام عمر بدن کو بے حس رہنا تھا' وہ آخری نظارے تھے' پھر آنکھوں کو بے نور ہو جانا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی "مجھے دیکھ لو' میرے محبوب! آج کے بعد یہ صورت تمہارے لیے پرائی ہوگی... میرے ہاتھوں کو چھو لو جاناں! پھر ہم دو ستاروں کی طرح ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر رہیں گے۔"

شاید وہ کمرا بھی پھانسی کی کوٹھری جیسا تھا۔ وہاں بھی آنسوؤں کے شور میں وقت کا شور ابھر ابھر کر سنائی دے رہا تھا۔ واچ مین نہیں تھا لیکن "واچ" تو تھی۔ گھڑی کی سوئیاں بہ زبانِ خاموشی چلا رہی تھیں "وقت ختم ہوا... مہلت پوری ہوئی۔ اب اٹھ جاؤ ورنہ اٹھا دیے جاؤ گے" اور پھر وہ اٹھ گئے۔ آخری بار گلے مل کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ چند روز بعد نائلہ کی شادی ہو گئی۔

رضوی کئی ہفتے یا شاید کئی مہینے اپنی گیلری کی کھڑکی سے لگا رہا تھا اور اس ویران سبزہ زار کو تکتا رہا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک راستہ سا بنا ہوا تھا اور جس پر قدم قدم چلتی' نائلہ چھپاک سے اس کے آنگن میں آجایا کرتی تھی۔ اسے اپنے گھر کے بام و در سے کسی کی خوشبو آتی تھی اور کونے کھدروں سے کسی کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ جانے والی اپنے گھر سے نہیں اس گھر سے رخصت ہو کر گئی ہے۔ انہی دنوں رضوی کو احساس ہوا تھا جیسے وہ اپنے گھر کے سنگ و خشت سے پیار کرنے لگا ہے۔ چند ماہ بعد جب اس کے والد نے رہائشی ضروریات کے تحت مکان کو گرا کر بنانے کا فیصلہ کیا تھا تو رضوی کو شدید دھچکا لگا تھا۔

یوں لگا تھا جیسے اسے دوسری بار نائلہ سے جدا کیا جا رہا ہے۔ وہ والد کو اس توڑ پھوڑ سے روک دینا چاہتا تھا لیکن یہ درخواست کرنے کے لیے نہ اس کے پاس ہمت تھی اور نہ کوئی ٹھوس جواز۔ وہ بصد حسرت سب کچھ دیکھتا رہ گیا تھا۔

وقت مرہم ہوتا ہے لیکن کچھ زخم اندر سے کچے رہ جاتے ہیں۔ جب کبھی چوٹ لگتی ہے... جب کبھی رُت بدلتی ہے' ان میں درد ہونے لگتا ہے۔ سارے بھولے بسرے منظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں' جیسے وہ ماضی کا نہیں حال کا حصہ ہوں۔ تین برس بعد رضوی کو بھی شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ "نئی آنے والی" تازہ ہوا کا جھونکا ہوگی اور اس کی وجہ سے بیٹے کی الجھی سانسیں پھر سے ہموار ہو جائیں گی لیکن ماں نہیں جانتی تھی' یہ سانسیں الجھ نہیں رہیں ٹوٹ رہی ہیں اور ان کے ٹوٹنے کی وجہ وہ گھٹن ہے جو نائلہ کے بعد اس ماحول میں رچ بس گئی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ یہ معاملہ کتنا سنگین ہے۔ یہ صرف رضوی جانتا تھا کہ وہ اس ماحول میں چند ماہ اور رہا تو دم توڑ جائے گا۔ ایک روز اس نے انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کے لیے اس کی جدائی بہت کٹھن تھی... وہ بلک پڑی۔ اس موقع پر رضوی نے ماں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا "امی جان' مجھے زندہ رہنے دیں اگر زندہ رہوں گا تو کبھی نہ کبھی مجھے دیکھ ہی لیا کریں گی۔"

اور پھر وہ اپنی لیکچرار بیوی کے ساتھ انگلینڈ چلا گیا تھا۔ باپ کی طرح وہ بھی پیدائشی آرٹسٹ تھا۔ باپ نے فوٹوگرافی میں نام کمایا تھا تو جینے کا رجحان مصوری کی طرف تھا۔ وہ بچپن سے تصورات



میں گم رہنے والا رومان پسند لڑکا تھا۔ تخلیق کار تھا۔ حقیقت پسندی اس کے لہو میں شامل تھی اور نہ ماحول میں۔ اس کے سوچنے اور عمل کرنے کا انداز عام لوگوں سے مختلف تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ خاص لوگوں سے بھی مختلف نظر آنے لگتا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں۔ اس کا انداز سب سے جدا تھا۔ یہ انداز کچھ ایسا مقبول تو نہیں تھا لیکن کچھ اساتذہ اس کے کام کو اہمیت دیتے تھے اور تعریف بھی کرتے تھے۔ اس کا کام تجریدی اور مقبول آرٹ کے بین بین کی کوئی چیز تھا۔ وہ بے جان اشیا اور خاص طور پر معمولی عمارات کو ایسے انداز سے رنگوں کی زبان دیتا تھا کہ کینوس پر ایک داستان رقم ہو جاتی تھی۔

انگلینڈ میں اس کے کام کو مزید سراہا گیا۔ نہ صرف یہ کہ اسے ایک مشہور اشتہاری فرم میں ملازمت مل گئی بلکہ مزید تعلیم کے لیے سہولیات بھی فراہم ہو گئیں۔ دھیرے دھیرے رضوی انگلینڈ میں "سیٹل" ہو گیا۔ اپنا مکان' گاڑی' بینک بیلنس اور دیگر لوازماتِ زندگی مہیا ہو گئے۔ اب اس کے دو بچے تھے۔ شہلا بڑی تھی اور عمران چھوٹا۔۔۔ جب بچے لڑکپن کی حدود کو پہنچے تو رضوی اور مسز رضوی نے انہیں پاکستان واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی مختلف وجوہ تھیں لیکن سب سے اہم وجہ وہی تھی جو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔۔۔ یعنی آزادانہ ماحول۔

بچے والدہ کے ساتھ پاکستان آ گئے اور رضوی صاحب وہیں مصروفِ کار رہے۔ کبھی کبھار وہ پاکستان آ کر بچوں سے مل جاتے' کبھی بچے چھٹیوں میں باپ کے پاس چلے جاتے۔ یونہی چھ سال بیت گئے۔ اس دوران رضوی صاحب محسوس کرنے لگے کہ اب بچوں کو ان کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح انگلینڈ سے کام سمیٹ کر پاکستان واپس آ جائیں۔ انگلینڈ میں اب ان کا کافی کچھ بکھرا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف مصوری سکھانے والا ایک پرائیویٹ انسٹی ٹیوٹ چلا رہے تھے بلکہ ایک اشتہاری کمپنی کے ڈی ایم بھی تھے' اس کے علاوہ بھی ان کی کاروباری مصروفیات تھیں۔ یہ سب کچھ سمیٹتے ہوئے انہیں دو سال مزید لگ گئے۔

وہ صرف ایک ماہ پہلے پاکستان پہنچے تھے اور آج کل گلبرگ میں اپنی نئی کوٹھی بنوانے میں مصروف تھے۔ شہلا کی شادی ایک دیرینہ رفیق کے بیٹے سے طے ہو چکی تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ شہلا کی برات ان کی نئی رہائش گاہ پر آئے۔

"پاپا! امتیاز صاحب آ گئے" شہلا کی آواز نے رضوی صاحب کو خیالوں سے چونکا دیا۔ انہوں نے بجھے ہوئے سگار کو پاؤں تلے مسلا اور زینے کی طرف بڑھے۔ جب وہ گھومے تو مکان کے بچھواڑے ایک گھر کی نکونی چھت پر انہیں ہیولا سا دکھائی دیا جو انہیں دیکھتے ہی اوجھل ہو گیا۔ کوئی لڑکی لگتی تھی مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لڑکے بھی تو لڑکیوں کی طرح بہت لمبے بال رکھ رہے ہیں۔۔۔ سیکریٹری امتیاز ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا محنتی اور ذہین نوجوان نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑی توند اور گھنی مونچھوں والا ایک خوش پوش شخص بیٹھا تھا۔ دونوں نے اٹھ کر رضوی صاحب سے مصافحہ کیا۔ امتیاز نے قریب اندام شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ نیلم اسٹیٹ ایجنسی کے مالک سردار محمد رندھاوا صاحب ہیں۔" رضوی صاحب نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڑا عجیب سا موڈ طاری تھا ان پر۔ ان کے سامنے کینوس تھا اور نہ ہاتھ میں پائیلٹ لیکن لگتا تھا کہ وہ کوئی شاہکار تصویر بنانے والے ہیں۔ وہی کھویا کھویا انداز' کہیں دور دیکھتی ہوئی آنکھیں' چہرے پر ایک دلنواز حسن۔ اس عالم میں وہ ایک بالکل مختلف شخص نظر آ رہے تھے۔ اجنبی اور ناقابلِ فہم۔

انہوں نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "سردار محمد صاحب! میرے سیکریٹری نے آپ کا انتخاب کیا ہے' اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ وہ کام کر سکیں گے جس کے لیے میں نے آپ کو یہاں بلایا ہے۔"

"جی فرمایئے" سردار محمد آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ وہ ایک دبنگ شخص نظر آتا تھا لیکن رضوی صاحب جیسی مشہور و معروف شخصیت کے سامنے خاصا مرعوب دکھائی دے رہا تھا۔

رضوی صاحب نے سگار کے روشن حصے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "سردار محمد صاحب! میرے اس گھر کے سامنے سڑک کے ساتھ ساتھ ہاڈل اسکول کی شمالی دیوار تک پانچ مکان ہیں' میرے خیال میں یہ کل کوئی چار کنال جگہ ہے۔ میں یہ جگہ خریدنا چاہتا ہوں۔"

سردار محمد نے ذرا حیرانی سے رضوی صاحب کی طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا "مطلب ہے کہ پوری لائن آپ خریدنا چاہتے ہیں۔۔۔ مکانوں سمیت؟ لیکن"

"لیکن کیا؟" رضوی صاحب نے پوچھا۔

"لیکن جناب! جہاں تک میری معلومات ہیں۔ ان میں سے شاید کوئی بھی شخص مکان بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ہمیں علاقے کے برائے فروخت اور کرائے والے مکانوں کی پوری اطلاع ہوتی ہے اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کون سے مکان کے بارے میں سودے کی بات چلائی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں تو۔"

"اپنے خیال کی بات مت کریں" رضوی صاحب نے سردار محمد کو ٹوکا "آپ کو بلانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے یہ کام کرنا ہے' کسی بھی قیمت پر۔ کسی بھی ڈھنگ سے" ایک لمحہ توقف کر کے انہوں نے سردار محمد کی آنکھوں میں جھانکا اور بولے "سردار محمد صاحب! ہر قابلِ فروخت چیز کی ایک قیمت ایسی ہوتی ہے جس پر وہ چیز کسی بھی وقت اور کسی بھی خریدار کو مل سکتی ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟"

سردار محمد نے تحسین انداز میں سر ہلایا اور اس کی چوڑی پیشانی پر پیشہ ورانہ تفکر کی سلوٹیں نمودار ہونے لگیں۔

○☆○

رضوی صاحب "ایریل" کے سامنے کھڑے اس برساتی کی تصویر بنا رہے تھے جو مکانوں کے عقب سے یوں جھانک رہی تھی جیسے کوئی شخص ہجوم میں سے اچک کر اپنے دیرینہ شناسا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ رضوی صاحب کا بیٹا عمران ان کے عقب میں کھڑا تھا۔ کینوس پر برش کو حرکت دیتے ہوئے رضوی صاحب عمران سے بھی باتیں کرتے جا رہے تھے۔

"اتنی زمین خرید ہم کیا کریں گے پاپا؟" عمران نے پوچھا۔

"بات زیادہ یا تھوڑی زمین کی نہیں ہوتی۔ اچھی زمین کی ہوتی ہے بس۔" رضوی صاحب نے کہا "تم دیکھ رہے ہو' سڑک پر نئی مارکیٹیں بن رہی ہیں۔ اس جگہ کا ریٹ ایک دو برسوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ ایسی زمین پر انویسٹ منٹ بعض اوقات کاروبار میں پیسہ لگانے سے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" عمران نے باپ کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ ساری جگہ ویسی ہی نظر آئے جیسی تمہارے دادا کے زمانے میں تھی۔ اُن دنوں یہاں کھلا میدان تھا۔ بڑا خوب صورت گراؤنڈ تھا۔ ہم تمام محلے کے لڑکے خوب کھیلا کرتے تھے۔ جی چاہتا ہے یہاں چار دیواری کرا کے ایک خوب صورت باغیچہ بنا دیا جائے۔ جب کبھی دل چاہا چلے آئے۔ سردیوں میں دھوپ' گرمیوں میں کھلی ہوا بلکہ تم چاہو تو یہاں باقاعدہ "سینٹ کی رچ" بھی بنائی جا سکتی ہے' تمہارے کرکٹ کھیلنے کے لئے۔"

عمران نے حیران ہو کر کہا "تو ہم یہ سب مکان گرا دیں گے؟" وہ غیر ارادی طور پر ابھی سے اس جگہ کو اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔

"بھئی ان مکانوں میں رکھا بھی کیا ہے۔ یہ جگہ اب کمرشل ہو رہی ہے۔ آج نہیں تو کل ان مکانوں کو گرنا ہی ہے۔ ہم اپنے سبزہ زار کے لیے گرا دیں گے تو کون سا فرق پڑے گا؟"

"ونڈر فل!" عمران نے کہا۔ کھلے میدان والا آئیڈیا اسے بھی بھایا تھا پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "باجی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ اپنے مکان کے سامنے والے کمرے بھی گرانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

برش رکھ کر رضوی صاحب نے بیٹے کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بولے "ہاں... ان کمروں نے مکان کی شکل بگاڑ کے رکھ دی ہے۔ تم دیکھتے ہی ہو' صحن میں نہ دھوپ آتی ہے نہ روشنی۔ اور ہوا کا گزر تو ہے ہی ناممکن۔ جس وقت تمہارے دادا نے یہ کمرے بنوائے' ان کی ضرورت تھی لیکن اب میرے خیال میں ان کا کوئی مصرف نہیں۔ ویسے بھی ہم نے تو گلبرگ میں رہنا ہے۔ یہاں تو کبھی کبھار ہی آنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں اس مکان کی کوئی شکل نکل آئے۔"

عمران بولا "باجی کہہ رہی تھیں' اتنی اکھاڑ پچھاڑ سے تو بہتر ہے کہ کسی کھلی آبادی میں ایک بنا بنایا مکان لے لیں... ویسے یہ کمرے وغیرہ گرانے کی بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی پاپا! بلکہ شاید کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔"

رضوی صاحب نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "انسان ماضی سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکتا۔ بہت سے لوگ تو زندہ ہی اپنے ماضی میں رہتے ہیں۔ شاید میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے عمی کہ میں اس گھر کو اور اس کے گرد و نواح کو بالکل اسی طرح دیکھنا چاہتا ہوں جس طرح یہ تمہارے دادا کے زمانے میں تھا۔ جی چاہتا ہے' اس گھر کا ہر دروازہ' ہر دیوار' ہر چھت اور منڈیر اسی طرح ہو جس طرح اس زمانے میں تھی۔ اسی طرح زمین پر دھوپ اور چھاؤں کی لکیریں بنیں اور اسی طرح چاندنی میں درختوں کے ہیولے ابھریں... وہ دیکھو' وہ جہاں بجلی کا پول ہے وہاں نیم کا ایک درخت ہوا کرتا تھا اور وہ تیسرے مکان کے سامنے جہاں پختہ تھڑے پر ڈسٹ بن رکھا ہے' مولسری کی دو جھاڑیاں تھیں۔ ہریالی کے درمیان ایک پگڈنڈی سی یہاں سے گزرتی تھی اور وہ جہاں تمہیں گٹر کا آہنی ڈھکنا نظر آ رہا ہے عین اسی جگہ ایک چھوٹے قد کا جامن تھا۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں گرا سی گراؤنڈ بن جائے تو ان جگہوں پر وہی پودے لگوا دوں۔"

داخلے کے لئے خط لکھیں

خواتین وحضرات! ہم بذریعہ ڈاک

● انگلش لینگویج ● پینٹنگ ● فلاور میکنگ
● بیوٹیشن ● فنکشنل بیوٹی
● لیڈیز ٹیلرنگ ● کوکنگ بیکنگ
● مہر سازی ● فوٹو گرافی ● کمرشل آرٹ
● ریفریجریشن ● ایئر کنڈیشننگ ● اسکول ٹیچنگ
اور ریڈیو ٹی وی پر اردو میں باتصویر لیکچر زو کتب
کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ داخلے کیلئے تفصیلات جوابی لفافے سے منگائیں۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔

اسلام آباد اکیڈمی

۲۵۱ سیکٹر آئی۔ تھری۔ ون، اسلام آباد

"آپ آئیڈیلسٹ ہیں پاپا! اور کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں شاید میں بھی آئیڈیلسٹ ہوں۔ دیکھیں ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کی باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم تھیں لیکن اب اچھی لگ رہی ہیں۔ واقعی کتنا اچھا لگے اگر ہمارے اس گھر میں سے دادا جان کے زمانے کا گھر ایک بار پھر نمودار ہو جائے۔"

"ضرور ہو گا۔۔۔ ضرور ہو گا" رضوی صاحب نے کہا "بلکہ میں تو چاہتا ہوں' ہم اس گھر کو ہو بہو وہی شکل دے دیں جو اس زمانے میں تھی۔ سب کچھ میرے حافظے میں ہے۔ پختہ فرش کہاں تک تھا۔ نیم پختہ فرش کہاں سے شروع ہوتا تھا۔ پھولوں کی کیاریاں کہاں کہاں تھیں۔ زینے کہاں سے چڑھتے تھے اور کتنے تھے؟ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا۔۔۔ کچھ بھی بھولا نہیں ہوں میں' اور پھر میرے پاس پینٹنگز بھی تو ہیں۔ یہ تصاویر میں نے لندن میں بنائی تھیں۔ اس وقت وہ مکان تازہ تازہ گم ہوا تھا ناں اس لیے حافظے میں ہر چیز خوب روشن تھی۔ مجھے یہاں تک یاد تھا کہ صحن کی بیرونی دیوار پر اینٹوں کے کتنے روڑے لگے ہوئے تھے۔۔۔ تم حیران ہو گے کہ یہ سب کچھ کیونکر یاد رہا مجھے۔۔۔ یہ سب محبت کی بات ہے بیٹی۔ اس مکان سے مجھے بہت محبت تھی اور اسے کھونے کے بعد تو یہ محبت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔۔۔"

اچانک وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ مخاطب اُن کا بیٹا تھا۔ کوئی بے تکلف دوست ہوتا تو شاید کہہ ہی دیتے کہ اس مکان سے انہوں نے یوں محبت کی ہے جیسے کوئی اپنے محبوب سے کرتا ہے' نگاہوں نگاہوں میں اس کے خط و خال کو چومتا ہے۔ اس کے جسم کی دھوپ چھاؤں' زاویے خطوط سب اسے پیارے ہوتے ہیں۔ اس مکان کا ایک ایک ذرہ انہیں پیارا تھا کیونکہ ان کی حسین ترین یادوں کا امین تھا۔

عمران بولا "ونڈر فل پاپا! ایک بالکل نیا آئیڈیا ہے یہ۔۔۔ پرانے مکانوں کو گرا کر نئے مکان تو سبھی بناتے ہیں لیکن نئے کو ڈھا کر پرانا کسی نے نہیں بنایا ہو گا۔ بالکل آر شٹک اپروچ ہے یہ اور ماضی کے سنہری دنوں کو زندگی بخشنے کا ایک انوکھا انداز' آئی ایم ایگری ود یو پاپا!"

رضوی صاحب مسکرائے "اس کا مطلب ہے کہ شہلا کو تو اب یہ آئیڈیا بالکل پسند نہیں آئے گا۔"

"وہ کیوں؟" عمران نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم دونوں کسی ایک بات پر متفق ہو ہی نہیں سکتے۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ عین اُسی وقت رضوی صاحب کی نگاہ پھر اس نکونی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ رخنہ دار منڈیر کے پیچھے انہوں نے ایک سایہ سا اوجھل ہوتے دیکھا۔ معلوم نہیں کون تھا جو چپکے سے اُدھر کھڑا رہتا تھا۔ رضوی صاحب جب بھی چھت پر ہوتے انہیں محسوس ہوتا کہ دو چمکیلی آنکھیں انہیں گھور رہی ہیں۔۔۔

رضوی صاحب یہ بھی نہیں جان سکے تھے کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ نوجوان ہے۔

○☆○

گھر کے سامنے والی زمین خریدنے کا کام اتنا آسان ثابت نہیں ہوا جتنا رضوی صاحب سمجھتے تھے۔ پانچ گھروں میں سے دو گھروں کے مالکان اڑ گئے' وہ کسی طور گھر بیچنے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن رضوی صاحب بھی تہیہ کیے ہوئے تھے۔ پراپرٹی ڈیلر کی رائے تھی کہ دھن کے علاوہ دھونس سے بھی کام لیا جائے تاہم رضوی صاحب دھونس پر اختیار رکھنے کے باوجود ڈیلر کی رائے سے متفق نہیں تھے۔ اُن کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے دھونس کا خلا بھی دھن سے پورا کیا اور اس قیمت پر مکان خرید لیے جس قیمت پر انہیں ہر صورت بک جانا تھا۔ ان مکانوں میں نائلہ والا مکان بھی شامل تھا۔ بائیس برس پہلے سرخ جوڑا پہن کر نائلہ وہ گھر چھوڑ چکی تھی۔ آٹھ دس سال بعد اس کے والدین بھی مکان بیچ کر چلے گئے تھے۔ خبر نہیں اب وہ لوگ کہاں اور کس حال میں تھے لیکن رضوی صاحب کے لیے یہ مکان اب بھی نائلہ کا مکان تھا۔ کچھ جگہیں ایسے ہی ہمیشہ کے لیے گمشدہ ناموں سے منسوب ہو جاتی ہیں۔

اُس روز رضوی صاحب بے حد مسرور تھے۔ اُن کا خواب پورا ہونے والا تھا۔ یہ ایک مثالیت پسند شخص کا رومانوی خواب تھا۔ جاگتی اور سوئی آنکھوں سے انہوں نے برسوں یہ خواب دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر میں' گیلری کی پھولوں بھری بالکونی میں کھڑے ہو کر اپنے سامنے دور نائلہ کے مکان تک دیکھنا چاہتے تھے۔۔۔ اور ایسا ہونے والا تھا۔ عنقریب وہ وقت آنے والا تھا جب اس بالکونی اور نائلہ کے مکان کے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہنا تھی۔ ہر منظر اسی حالت میں لوٹ آنا تھا جس حالت میں کھو گیا تھا۔ وہی در و دیوار' دھوپ چھاؤں کے وہی زاویے' وہی دریچے' وہی گوشے' وہی محبت کی پناہ گاہیں۔ وقت کسی کے لیے نہیں لوٹتا' لیکن ایک تخلیق کار کے ذہن رسا نے گزرے ہوئے وقت کے کچھ مناظر اپنے لیے پھر سے تخلیق کر لیے تھے۔ یہ تخلیق ایک تصویر تھی لیکن اس کا تعلق کینوس اور رنگوں سے نہیں زمین اور سنگ و خشت سے تھا۔

کاغذی کارروائی مکمل ہوتے ہی کام شروع ہو گیا۔ رضوی صاحب کے مکان کے سامنے چاروں مکان گرا دیے گئے۔ بلڈوزروں کی مدد سے ان کا ملبہ ہٹایا جانے لگا۔ لوگ اس کارروائی پر حیران تھے۔ اچھے بھلے مکانوں کو ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ لیکن کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہ رفتار کا زمانہ ہے۔ وقت کی رفتار اتنی تیز ہے کہ عمارتیں بے چاری مشکل میں ہیں۔ وہ بار بار گرائی جاتی ہیں' انہیں بلند کیا جاتا ہے لیکن چند ہی سال بعد وہ پھر کوتاہ قامت نظر آنے لگتی ہیں۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہاں بھی کوئی ملٹی اسٹوری شاپنگ سینٹر تعمیر ہو گا۔ یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی

نہ تھا کہ یہاں وہ سبزہ زار بنایا جائے گا جو بیس برس پہلے بو دیا گیا تھا اور وہ پودے لگائے جائیں گے جو ریت اور بجری کے ڈھیروں تلے دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔

مکان کے سامنے میدان صاف ہو گیا اور رضوی صاحب کو اپنے زیریں کمرے کی کھڑکی سے نائلہ کا گھر صاف نظر آنے لگا تو اُن کے سینے سے جیسے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ اُن کی گھٹن ختم ہو رہی تھی۔ اب اصل مرحلہ شروع ہوا۔ رضوی صاحب کو اپنے مکان میں سے سابقہ مکان کا ہیولا ابھارنا تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ لوگ اس عمل پر ہنستے لیکن رضوی صاحب کو اس کی کچھ پروا نہیں تھی۔ وہ ایک فن پارہ تخلیق کر رہے تھے اور یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ اس فن پارے کی باریکیاں ہر کسی کی سمجھ میں آجائیں۔ انہوں نے کام شروع کرا دیا۔ سب سے پہلے بالائی کمروں کو گرانے کا آغاز ہوا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے اہلِ خانہ کلبرگ والے مکان میں شفٹ ہو چکے تھے اور ان کے شفٹ ہوتے ہی شہلا کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ رضوی صاحب ان تیاریوں میں معروف تھے ورنہ ان کی خواہش تھی کہ مکان کی تخریب و تعمیر کے دوران وہ ہمہ وقت وہاں موجود رہیں۔ پہلے روز وہ کوشش کے باوجود "سائٹ" پر نہ جا سکے۔ دوسرے روز رات نو بجے کے بعد جانا ہوا۔ وہ چھت پر چلے گئے۔ کام اُن کی ہدایات کے مطابق ہو رہا تھا لیکن رفتار بہت سست تھی۔ دونوں میں ایک چھوٹے کمرے کا نصف حصہ ہی توڑا جا سکا تھا۔ شاید اس کا ایک سبب چھت کی "سخت جانی" بھی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ تاریکی میں خنک ہوا سرسراتی ہوئی محوِ سفر تھی۔ رضوی صاحب کو طبیعت میں بھاری پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ پریشانی بھی تھی۔ ان کی پریشانی کا تعلق شہلا سے تھا۔ وہ ان سے محبت کرتی تھی اور وہ بھی اسے بہت چاہتے تھے لیکن باپ اپنی بیٹی کے کتنا بھی قریب ہو، ماں کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ جانے کیوں رضوی صاحب کو محسوس ہو رہا تھا کہ شہلا غم زدہ ہے۔ جن لڑکیوں کو بیاہ کر نئے گھر جانا ہوتا ہے وہ اکثر افسردہ اور چپ چاپ نظر آتی ہیں لیکن جو چیز شہلا میں نظر آ رہی تھی وہ افسردگی اور اداسی نہیں تھی۔ کسی وقت تو رضوی صاحب کو احساس ہونے لگتا تھا کہ وہ شہلا کی شادی کر کے کوئی غلط اور ناروا قدم اٹھانے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گم چلتے رہے۔ اُن کے ہاتھ حسبِ عادت پشت پر بندھے تھے اور گاہے گاہے سگار اُن کے ہونٹوں سے چھو جاتا تھا۔

وہ تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہو گا جب رضوی صاحب کو ہوا کے دوش پر چند دبی دبی سسکیاں سنائی دیں، وہ چھت کے شمالی منڈیر کے پاس تھے۔ سسکیوں کی آواز نیچے ایک خالی پلاٹ کی تیرگی سے ابھری تھی۔ وہ منڈیر پر جھک کر نیچے جھانکنے لگے۔ ٹھہرتے ہوئے تاروں کی مدھم روشنی میں انہیں مکان کی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا نظر آیا۔ ایک عجیب سا تجسس رضوی صاحب کے ذہن میں جاگا اور وہ زینہ طے کرتے ہوئے نیچے صحن میں آ گئے۔ بیرونی دروازہ انہوں نے خود ہی اندر سے بند کیا تھا، دروازہ کھول کر وہ باہر گلی میں پہنچے اور پھر گھوم کر مکان کے پچھواڑے خالی پلاٹ میں آ گئے... ہیولا اسی جگہ موجود تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے اس کے قریب پہنچے... انہوں نے غور سے دیکھا، یہ ایک نوجوان تھا۔ نئے فیشن کے مطابق اس کے بال لمبے تھے۔ رضوی صاحب دبے قدموں اس کے سر پر پہنچ گئے لیکن وہ بے خبر رہا، وہ رو رہا تھا۔

"کون ہو؟" رضوی صاحب نے اُس کے کندھے کو چھوتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم پلٹا، اس کی بڑی بڑی آنکھیں رضوی صاحب پر جم گئیں۔ رضوی صاحب کو یہ جاننے میں مطلق دشواری نہیں ہوئی کہ یہی وہ لڑکا ہے جو تکونی چھت والے مکان سے انہیں دیکھا کرتا تھا۔ وہ بُری طرح لرز رہا تھا اور ذہنی حالت غیر نظر آتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ خود کو رضوی صاحب سے چھڑا کر بھاگ جائے گا... لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے سر جھکا لیا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ رضوی صاحب نے اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ رضوی صاحب کو اندازہ ہوا کہ اُس کے جسم کی لرزش بخار کے سبب ہے۔ وہ سرتاپا جل رہا تھا۔ خبر نہیں اسے کیا ہو گیا تھا، کوئی سوال جواب کیے بغیر وہ روتا چلا جا رہا تھا۔

رضوی صاحب اسے سہارا دیتے ہوئے اندر لے آئے اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر صوفے پر بٹھا دیا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں انہوں نے پہلی بار غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور انہیں اندازہ ہوا کہ یہ صورت انہوں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے... کہاں اور کب؟ وہ ذہن پر زور دینے لگے اور پھر ایک جھماکے سے انہیں یاد آ گیا، ڈھائی تین برس پہلے عیدالفطر کے موقعے پر ان کی اہلیہ نے اپنی اور بچوں کی بہت سی تصویریں لندن بھیجی تھیں، ان میں ایک دو تصویریں اس لڑکے کی بھی تھیں۔ رضوی صاحب کی اہلیہ نے لڑکے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا "بڑا اچھا اور بھلا مانس لڑکا ہے۔ بالکل عمران کی طرح لگتا ہے مجھے۔ ایف ایس سی کر رہا ہے۔ اسے "میتھس" میں کچھ مشکل پیش آ رہی تھی۔ میں اس کی مدد کر دیتی ہوں۔ بدلے میں یہ ہر وقت "خادم حسین" بنا رہتا ہے۔ وہ سارے کام کر دیتا ہے جو عمران کے ہاسٹل میں ہونے سے رکے رہتے ہیں۔" فٹ میں رضوی صاحب کی اہلیہ نے لڑکے کا نام بھی لکھا تھا لیکن اب انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے لڑکے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے تم اسی محلے میں رہتے ہو؟"

جسے سابق اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بازو میں چہرہ چھپائے ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ چھریرے جسم کا اسمارٹ نوجوان تھا۔ شانے چوڑے اور مضبوط تھے۔ شکل و صورت سے بھلا مانس نظر آتا تھا لیکن اس وقت اس کی حالت

ابتر ہو رہی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی' آنکھیں متورم اور چہرہ بخار کی تپش سے انگارے کی طرح دہکا ہوا... وہ بہت بری طرح ہذیان بک رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا! کچھ تو بتاؤ' شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

چند لمحے بعد اُس نے بازو ہٹا کر رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ عجیب سا ہیجان تھا اُس کے چہرے پر... جیسے بخار نے کسی تیز اثر نشے کی طرح اس کے اعصاب کو جکڑ رکھا ہو۔ اچانک اس نے رضوی صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور زار و قطار روتے ہوئے بڑبڑاتے انداز میں بولا "بس کریں جناب! بس کریں... اب اور غم سہنے کی طاقت نہیں مجھ میں... آپ نے... آپ نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا' سب کچھ لے لیا' اب میری یادیں مجھ سے نہ چھینیں۔ یہ یادیں بھی چھن گئیں تو میں مر جاؤں گا جناب... اس مکان کو کچھ نہ کریں۔ اسے یونہی رہنے دیں۔ آپ سمجھیں کہ یہ کسی کے جینے کا سہارا ہے' اسے مت توڑیں۔ شاید میں آپ کو دیوانہ لگ رہا ہوں' ہاں میں دیوانہ ہوں۔ میری اس دیوانگی پر رحم کھالیں جناب! اس مکان کو... سلامت رہنے دیں..."

روتے روتے اچانک اُس کی ہچکی سی بندھ گئی۔ اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے اور ہونٹوں کے گرد نیلاہٹ سی چھانے لگی۔ وہ جیسے تیوہا کر صوفے پر لڑھک گیا۔ رضوی صاحب نے اسے لڑھکتے ہوئے دیکھا لیکن وہ سکتے کی حالت میں کھڑے رہے۔ "یہ کس حوالے سے بات کر رہا ہے؟ یہ کس کی بات کر رہا ہے؟" یہ سوال ایک چیخ بن کر اُن کے ذہن میں ابھرا۔ اس چیخ کا جواب بھی چیخ میں آیا۔ وہ شہلا کی بات کر رہا تھا۔ وہ ان کی بیٹی کی بات کر رہا تھا۔ وہ ایک اور محبت بھری کہانی کی بات کر رہا تھا۔ غضب کی ایک بلند لہر رضوی صاحب کے سینے سے اٹھی... لیکن پھر فوراً ہی اس لہر کو ایک نادیدہ قوت نے دبا دیا۔ رضوی صاحب نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا... انہیں محسوس ہوا جیسے صوفے پر ایک بے نام لڑکے کے بجائے ان کا اپنا جسم ہو' اس جسم پر اُجڑا بکھرا چہرہ اُن کا اپنا ہو۔ وہ ابھی ابھی نائلہ سے آخری ملاقات کر کے لوٹے ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ آخری باتیں ہوئی ہوں جن کے بعد پھر کبھی بات نہیں ہو سکتی۔ ان کے ہاتھوں نے وہ آخری لمس محسوس کیا ہو جس کے بعد عمر بھر کے لیے بدن بے حس ہو جاتا ہے۔ جیسے نائلہ کی آخری آواز ابھی ان کے کانوں میں گونج رہی ہو۔ "مجھے دیکھ لو میرے محبوب! آج کے بعد یہ صورت تمہارے لیے پرائی ہو گی۔ مجھ کو چھو لو جاناں! پھر ہم دو ستاروں کی طرح ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر رکیں گے۔"

وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ پھر ایک دم اُن کی آنکھیں زندہ ہو گئیں۔ اُن سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر لڑکے کو جھنجوڑا "اٹھو... اٹھو۔"

وہ نیم بے ہوشی میں کراہ کر رہ گیا۔ رضوی صاحب لپک کر کچن کی طرف گئے۔ ایک تنکے سے گلاس میں پانی لیا۔ واپس آ کر لڑکے کا سر گود میں رکھا اور گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اُس کے ہونٹ تر ہو گئے تو وہ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگے۔

○☆○

رات کا آخری پہر [illegible] کا ہونے پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ پٹیاں رکھنے سے بخار بھی کم ہو گیا تھا۔ رضوی صاحب نے اس کے بالائی جسم پر اپنا کوٹ پھیلا دیا تھا...

ابھی تھوڑی دیر پہلے شہلا کی ایک ہمراز دوست سے فون پر رضوی صاحب کی بات ہوئی تھی۔ یہ "دوست" رضوی صاحب کی سگی بھتیجی بھی تھی۔ اس گفتگو نے رضوی صاحب کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے خالی مکان میں گھومنے لگے... اُن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ مکان گرانے کا اب انہیں کوئی حق نہیں۔ اب اِن در و بام سے بھی کسی کی سنہری یادیں وابستہ ہو چکی تھیں۔ اب دھوپ چھاؤں کے یہ نئے زاویے اور خشت و سنگ کے یہ نئے خطوط بھی کسی کے محبوب تھے۔ وہ اب اس مکان کو گرانا چاہتے بھی تو نہیں گرا سکتے تھے۔

وہ خوابیدہ لڑکے کے سرہانے آرام کرسی پر بیٹھے بہت دیر تک سوچتے رہے یہاں تک کہ مشرقی کھڑکیوں پر اجالا دستک دینے لگا۔ وہ ایک بے حد عمیق سانس لے کر اٹھے۔ ٹیلیفون سیٹ کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنے پرسنل سیکریٹری امتیاز کے نمبر ڈائل کیے۔ پھر ماؤتھ پیس میں بولے "ہیلو امتیاز! میں رضوی بول رہا ہوں۔ آٹھ بجے کی فلائٹ میں میرے لیے ایک سیٹ اسلام آباد کے لیے بک کراؤ... ہاں ہاں... بہت ضروری ہے... میں رستم کالونی میں ہوں۔ سات بجے سے پہلے ڈرائیور کو میرے پاس بھیج دینا..."

فون بند کر کے وہ کمرے میں ٹہلنے لگے۔ اُن کا ہونے والا سمدھی ان کے بچپن کا دوست اور بے تکلف ساتھی تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے جتنا اپنے بارے میں جانتے تھے۔ رضوی صاحب اسلام آباد میں اُسی سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جو بات وہ اپنے ہم دیرینہ سے کہنے جا رہے ہیں' وہ بہت سخت ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ظرف مند اس نہایت کڑوے گھونٹ کو مسکرا کر حلق سے اتار لے گا اور کچھ اسی قسم کا بھروسا انہیں اُس لڑکے پر بھی تھا جس سے دو ماہ قبل شہلا کی منگنی کی گئی تھی... وہ اس رشتے کو ختم کرنے جا رہے تھے جو صدیوں سے محبت کے گلے پر چھری چلاتا رہا ہے... وہ اپنی بیٹی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس لینے جا رہے تھے۔

اور انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک بیتے ہوئے منظر کو دوبارہ وجود دینے کے بجائے ایک خوب صورت منظر کو برباد ہونے سے بچانا [illegible] راحت بخش کام ہے۔



عقل و ایماں

طاہر جاوید مغل

بے پناہ گمراہی کی حامل ایک مختصر تحریر۔
آزمائش میں مبتلا ایک بشر کا فسانہ، نیکی

اور پارسائی اُس کا سرمایہ تھیں۔ ایک مردِ آزار
لڑکی کا ماجرا جس کی مردم شناسی لاجواب تھی۔

صاحبِ عقل و یاں کی ایک غلط مگر عقل و ایماں سے بھرپور آزمائش کا حال

ناہید اپنے چچا سے ملنے انگلینڈ گئی تھی۔ چچا ناہید سے بے حد پیار کرتے تھے تب وہ بہت چھوٹی تھی۔ پھر ایک دن وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ انگلینڈ سدھار گئے تھے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ پچھلے دس برسوں میں وہ کئی مرتبہ خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے ناہید سے ملنے کی خواہش ظاہر کر چکے تھے۔ آخر کار انہوں نے انگلینڈ سے ناہید کا ٹکٹ ارسال کر دیا تھا۔

ناہید کے چچا کا ذکر تو یونہی اس روداد میں آگیا، اصل کہانی ناہید اور اس کی "اینگلو پاکستانی" سہیلی مہوش کے گرد گھومتی ہے۔ ناہید نے نوٹنگھم میں اپنے چچا کے ہاں تقریباً دو ماہ قیام کیا۔ مہوش کا گھر اسی لائن میں تھا۔ بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے پڑوس کا گھر بھی کہا جا سکتا تھا۔ مہوش اکثر اس کے چچا کے گھر آجاتی تھی۔ وہ چچا کی بیٹیوں سے خوب گھلی ملی ہوئی تھی لیکن اس کی جو بے تکلفی دو ماہ میں ناہید کے ساتھ پیدا ہوئی وہ کئی برسوں کی رفاقت کے باوجود چچا کی بیٹیوں سے نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ناہید اور مہوش دونوں ہم عمر تھیں۔ دونوں شوخ طبع تھیں اور انگریزی ادب دونوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھی دنیا جہان کی باتیں کرتی رہتیں۔ کبھی سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتیں۔ دونوں کو فلموں سے بھی لگاؤ تھا۔

ایک روز مہوش نے ناہید کو ایک کتاب دکھائی۔ کتاب کا عنوان تھا "تیس مردوں کے خفیہ چہرے" یہ مختصر کتاب ان دنوں نوٹنگھم کے بک اسٹالز پر خوب فروخت ہو رہی تھی۔ یہ دو انگریز دوشیزاؤں جوڈتھ اور الزبتھ کی آپ بیتی تھی۔ جوڈتھ اور الزبتھ مصنفاؤں کے اصل نام نہیں تھے اور اس بات کا اعتراف انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں بھی کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ آکسفورڈ میں پڑھتی رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں جن ۳۰ مردوں کا ذکر کیا تھا ان میں چند معروف کھلاڑی تھے۔ کچھ فلمی ستارے، کچھ اخبار نویس اس کے علاوہ دو پادری اور دو نہایت اعلیٰ نسب لندنی نوجوان بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ یہ کتاب دراصل ان تیس

مردوں کی کہانیوں پر مشتمل تھی جو بظاہر نہایت پارسا اور مضبوط کردار کے مالک تھے لیکن جب مصنف لڑکیوں نے ریشمی تنہائیوں میں ان پر اپنی خوب صورتی کا جادو چلایا تھا تو وہ کاٹھ کے اُلّو بن گئے تھے اور جذبات کی رو میں بہہ کر انہوں نے مصنف لڑکیوں کو اپنے گاؤدی پن کے ٹھوس ثبوت فراہم کئے تھے۔ دونوں مصنف لڑکیوں نے اس کتاب میں بہت سی تصویریں بھی شامل کی تھیں۔ ان تصویروں میں کمال یہ تھا کہ وہ خود تو کہیں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن ان کے نادان عشاق صاف نظر آتے تھے۔ کوئی نشے میں دھت پڑا تھا' کوئی نیم لباس تھا' کوئی ان کے پاؤں چاٹ رہا تھا' کوئی ان سے حسن کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ تصویریں غالباً کسی اسپائی کیمرے سے اتاری گئی تھیں اور کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتی تھیں۔ مصنف لڑکیوں نے مردوں کے کردار کی بعض کمزوریوں کو بڑی صراحت سے بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ خلوت اور خوب صورتی کے جال میں پھنس کر بعض حضرات کس طرح چاروں شانے چت ہو جاتے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ سارا کام بڑی چابک دستی سے کرتی رہی ہیں اور انہوں نے کہیں بھی خود کو کسی مرد کی دست درازی کا شکار نہیں ہونے دیا۔

یہ کتاب مہوش کے ساتھ ساتھ ناہید نے بھی بڑی دلچسپی سے پڑھی تھی۔ بعد میں دونوں کئی روز اس پر تبصرے کرتی رہی تھیں... دو ماہ بعد جب ناہید پاکستان لوٹی تو اس وقت بھی وہ کتاب اس کے پاس تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں کئی ہم مذاق سہیلیوں کو یہ کتاب دکھائی۔ چند روز یونیورسٹی میں بھی اس کتاب کا خوب چرچا رہا۔

○☆○

تقریباً چھ ماہ بعد ناہید اور مہوش میں پھر ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ناہید کے گھر پر ہوئی۔ دراصل مہوش ناہید ہی سے ملنے پاکستان آئی تھی۔ وہ بہت عرصے سے پاکستان آنا چاہ رہی تھی۔ اس ملک کو دیکھنا چاہتی تھی جس کی نسبت اس کے مرحوم باپ سے تھی اور اس زمین پر چلنا پھرنا چاہتی تھی جس کی باتیں وہ اکثر اپنے گھر میں سنا کرتی تھی۔ وہ ایک بے حد ایڈونچس اور من موجی لڑکی تھی۔ گھومنا پھرنا اور "انجوائے" کرنا اسے ویسے بھی اچھا لگتا تھا۔

میزبان یعنی ناہید کے والد ایک خوش حال صنعت کار تھے۔ گھر میں آرام و آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ پورچ میں نئے ماڈل کی دو گاڑیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ایک اسپورٹس ماڈل شیراڈ ناہید کے استعمال میں تھی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی اور اپنی فرینڈز کے ساتھ اکثر کراچی کی کشادہ سڑکوں پر گھومتی نظر آتی تھی۔ اب اس گروپ میں مہوش بھی شامل ہو گئی تھی۔ بے فکر چنچل لڑکیوں والے تمام مشاغل اس گروپ نے اپنا رکھے تھے۔ شب و روز ہلا گلا جاری رہتا تھا...

ناہید کی رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک نہایت شاندار مسجد تھی۔ مسجد کے پیش امام مولانا خدا بخش ایک عمر رسیدہ شخص تھے۔ جمعے کے روز ان کی اثر انگیز خطابت کی کشش دور و نزدیک کے نمازیوں کو اس مسجد میں کھینچ لاتی تھی۔ مولانا کے تین صاحب زادے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا کہیں ملازمت کرتا تھا' منجھلا فوج میں تھا اور چھوٹا کسی کالج میں پڑھاتا تھا۔ تینوں شادی شدہ اور بال بچے دار تھے۔ چھوٹے بیٹے کا نام مولوی محمد اسحاق تھا۔ اس کے تین بچے تھے اور وہ اپنے والد کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ مولوی محمد اسحاق سرخ و سپید رنگت' چھوٹی چھوٹی داڑھی اور یادامی آنکھوں والا ایک خوبرو شخص تھا۔ اپنے پرائے اس کی شرافت اور دین داری کے قائل تھے۔ نظر جھکا کر چلنا' مختصر بات کرنا اور اپنے کام سے کام رکھنا مولوی محمد اسحاق کے خصوصی اوصاف تھے۔ ناہید نے اکثر مولوی محمد اسحاق کو گھر کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ کبھی پیدل' کبھی دو لیسپا اسکوٹر پر۔ ایک مرتبہ اسلامیہ کالج کے احاطے میں بھی مولوی محمد اسحاق پر اس کی نظر پڑی۔ وہ سیاہ گاؤن پہنے اپنے شاگردوں میں گھرا ہوا تھا اور بڑی متانت سے کسی مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ ناہید کے ذہن میں عرصے سے چپکے چپکے ایک منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ جب مہوش بھی پاکستان آ گئی اور اس سے خوب خوب بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی تو ایک روز ناہید کے دل کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ اس نے مہوش سے کہا "مہوش! ان مولانا صاحب کو دیکھا ہے جو ابھی اسکوٹر پر ہمارے گیٹ کے سامنے سے گزرے ہیں؟"

مہوش نے اثبات میں جواب دیا اور حسب عادت تبصرہ بھی کر دیا "ہینڈسم بندہ ہے۔ لیکن حلیہ کچھ مذہبی سا بنا رکھا ہے۔ اگر کلین شیو ہو' کوٹ پتلون پہن رکھا ہو تو اچھا خاصا لگے۔"

ناہید بولی "بڑا بھلا مانس اور نیکو کار بنتا ہے۔ ایک بار کسی عورت کے چہرے پر نگاہ پڑ جائے تو پڑ جائے' دوسری بار نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یوں آنکھیں زمین پر گاڑ لیتا ہے جیسے پہلی رات کی دلہن ہو۔ سچ.... کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس بندے کو پٹایا جائے۔ دیکھا تو جائے کہ اندر سے بھی اتنا ہی بھلا مانس ہے یا پھر الزبتھ اور جوڈتھ کی کتاب والا معاملہ ہے۔ یعنی ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور' کھانے کے اور۔"

"میں سمجھی نہیں" مہوش نے اس معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس وقت لان کی سرسبز گھاس پر بیٹھی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ناہید اس کے قریب ہو بیٹھی اور آلتی پالتی مار کر بولی "کیوں نہ ہم الزبتھ اور جوڈتھ کی کتاب سے استفادہ کریں۔ میرا مطلب ہے جس طرح الزبتھ اور جوڈتھ پارسا نظر آنے والے مردوں کو اُلّو بناتی رہی ہیں' ان مولانا صاحب کو ہم اُلّو بنائیں۔"

مہوش نے آنکھیں نچائیں "ہاں.... کام تو دلچسپ ہے لیکن یار... یہ پاکستان ہے انگلینڈ نہیں ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ

ہو جائے۔"

ناہید بولی "نہیں یار! کوئی بھی کام منصوبہ بندی سے کیا جائے تو ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ اور پاکستان کی کوئی قید نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم کوشش کرو تو اس مولانا کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتی ہو۔"

"میں؟" موش نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

"ہاں تم" ناہید بولی "بائی گاڈ۔ اتنے زبردست ہتھیاروں سے لیس ہو تم کہ شاید تمہیں خود بھی پتا نہیں۔ یہ حسن، یہ ناز و انداز، یہ بے پناہ معصومیت اور اس معصومیت کے اندر چھپی ہوئی قاتل ذہانت۔ میں لڑکی ہونے کے باوجود تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی کوئی "شے" ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم اپنے ان ہتھیاروں کے ساتھ بڑے سے بڑا قلعہ فتح کر سکتی ہو۔"

دونوں ہنسنے لگیں۔ موش کا صبیح چہرہ چڑھتے سورج کی دھوپ میں تازہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔

موش فوٹی پھونی اردو بولتی تھی اور ایسے میں اتنی پیاری لگتی تھی کہ جی چاہتا تھا سنتے جائیں۔ اور پھر گفتگو کے دوران وہ اپنے نازک ہاتھوں کے بے ساختہ اشاروں اور خوب صورت آنکھوں کی حرکات سے جس طرح اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتی تھی، وہ ایک قاتل دید نظارہ ہوتا تھا۔ ناہید کی ایک سہیلی ہاجرہ بڑی بے تکلفی سے کہتی تھی "موش! سچ کہتی ہوں میں تو عاشق ہو گئی ہوں تمہاری لنگڑی اردو پر۔"

اس روز ناہید اور موش بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ ان کی گفتگو میں دھیرے دھیرے ایک منصوبے کے خدوخال ابھرنے لگے۔ یہ منصوبہ مولوی محمد اسحاق کے بارے میں تھا۔ وہ مولوی محمد اسحاق جو نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ تین بچوں کا باپ بھی۔

○☆○

ناقابلِ تسخیر کو تسخیر کرنے کی خواہش ہمیشہ سے انسان کے دل میں موجود رہی ہے۔ ہدف جتنا مشکل ہوتا ہے، اس کے حصول کی خواہش بھی اتنی شدید ہو جاتی ہے۔ موش کے سامنے بھی ناہید اور اس کی دوستوں نے ایک نہایت مشکل ہدف رکھ دیا تھا۔ اور یہ ہدف تھا مولوی محمد اسحاق کی پارسائی و نیک نامی کی اینٹ سے اینٹ بجانا۔ ناہید کو پورا پورا یقین تھا کہ اگر موش کوشش کرے تو وہ کسی پجاری کی طرح اس کے حسن کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا۔

ایک خوب صورت لڑکی جب کسی مرد کو بہکانے کا تہیہ کر لے تو اس کے راستے میں زیادہ رکاوٹیں نہیں آتیں۔ موش کو بھی اپنی مہم کا آغاز کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ناہید نے اسے ایک مقامی ہفت روزہ کا پریس کارڈ بنوا دیا تھا۔ اس کارڈ میں موش کا نام رپورٹر کی حیثیت سے درج تھا۔ ایک روز موش مولوی محمد اسحاق سے انٹرویو کرنے اس کے کالج کے اسٹاف روم میں جا پہنچی۔ انٹرویو کا موضوع تھا "مرد و زن کے تعلقات میں مذہب کا عمل

وجہ

ریستوران کی ایک خوب صورت ویٹرس نے اپنی دوست سے کہا "میرا حسن ماند پڑنے لگا ہے" سہیلی نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "ریستوران کے گاہک اب واپس ملنے والی ریزگاری بھی گننے لگے ہیں۔"

دخل۔"

اس موضوع میں اس بات کی کافی گنجائش تھی کہ مولوی محمد اسحاق سے ایک طویل اور بے تکلف گفتگو کی جائے۔ گفتگو کے دوران کئی نازک معاملات زیرِ بحث آئے بلکہ موش نے جان بوجھ کر انہیں بحث میں گھسیٹا۔ گفتگو طویل ہو گئی تھی اس لیے دوسری نشست کی نوبت آ گئی۔ یہ نشست چند روز بعد ایک کیفے ٹیریا کے پُرسکون ماحول میں ہوئی۔ یہ کیفے ٹیریا کالج کے قریب ہی مین روڈ پر واقع تھا۔ موش بات سے بات نکالنے اور تعلقات کو تیزی سے فروغ دینے کا فن جانتی تھی۔ وہ انٹرویو جو دو گھنٹے میں ختم ہو سکتا تھا، دو دو گھنٹے کی چار نشستوں کے بعد بھی نامکمل رہا۔ بلکہ اب اگر وہ مکمل بھی ہو جاتا تو کوئی خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ موش نے مولوی محمد اسحاق کی پارسائی کی بلند و بالا فصیل میں چھوٹا سا شگاف ڈال دیا تھا اور اب گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ شگاف وسیع ہو رہا تھا۔۔۔ وہ محسوس کر چکی تھی کہ مولوی محمد اسحاق اب اس کا منتظر رہتا ہے۔ اس کو دیکھ کر اور اس سے بات کر کے وہ خوش ہوتا ہے۔ اس کی بادامی آنکھوں میں ایک روشنی سی نمودار ہو جاتی تھی۔ اس کی لنگڑی اردو کی ادائیں اب اس کو بھانے لگی تھیں۔ حالات ساز گار دیکھ کر موش نے ایک پانسا پھینکا۔ اس نے انٹرویو کو ایک طویل تر انٹرویو میں بدل دیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھے گی۔ مولوی محمد اسحاق کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں طویل اور جلد جلد ہونے لگیں۔ مولوی محمد اسحاق ایک جوان اور صحت مند شخص کا نام تھا۔ ایسا شخص جو نہ تو زاہد خشک تھا اور نہ تارک الدنیا۔ اس کے سینے میں ایک "عام انسانی" دل دھڑکتا تھا جو خوب صورتی سے متاثر ہوتا ہے اور صنفِ مخالف کی طرف بلا ارادہ کھنچتا ہے۔ مولوی محمد اسحاق کی بیوی دو ڈھائی سال سے بیمار تھی۔ اسے جوڑوں کا درد لاحق تھا۔ کبھی ایک دو ماہ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا، اس کے بعد وہ پھر بستر سے لگ جاتی تھی۔ مولوی محمد اسحاق کو ملازمت کے علاوہ اپنے تین بچوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ بے شک گھر میں دادا دادی موجود تھے لیکن ذمے داری تو بہرحال مولوی محمد اسحاق پر تھی۔۔۔ کئی اطراف سے پریشانیوں میں گھرے ہوئے اس شخص کو جب تپتے صحرا میں موش کی صورت میں ایک ٹھنڈا میٹھا چشمہ نظر آیا تو وہ

بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔

دوسری طرف لڑکیوں کی وہ چنڈال چوکڑی بڑے انہماک اور دلچسپی سے اس کھیل کو دیکھ رہی تھی۔ ہر روز شام کو وہ سب موش کا گھیراؤ کرلیتیں اور دن بھر کی رپورٹ سنتیں۔ موش بھی بڑی تفصیل سے اور مرچ مسالہ لگا کر سب کچھ بیان کرتی۔ لڑکیاں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتیں اور ساتھ ساتھ موش کو مختلف مشورے بھی دیتیں۔ اس ٹولی میں اگر کسی لڑکی کی رائے مختلف تھی تو وہ ہاجرہ تھی۔ اسے یہ کھیل پسند نہیں تھا۔ شروع میں اس کا خیال تھا کہ یہ کھیل شروع ہی نہیں ہوسکے گا' بہرحال کھیل شروع ہوگیا تھا۔ اب اس کا مؤقف تھا کہ مولوی محمد اسحاق اس حد تک نہیں جائے گا جس کے بعد اس کی نیک نامی پر حرف آجائے۔ وہ شادی شدہ اور بال بچے دار ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ موش جیسی لڑکی کے فریب میں آجائے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ صرف کتاب کے سلسلے میں موش سے مل رہا ہے۔ جب یہ کام ختم ہوجائے گا' وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھے گا۔

ناہید کا خیال برعکس تھا۔ وہ مردانہ انداز میں ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر پورے یقین سے کہتی تھی "دیکھ لینا ہاجرہ! اب چند دن میں مولوی صاحب اپنے گھر میں "عقد ثانی" 'نان ونفقہ اور شرعی اجازت" جیسے الفاظ استعمال کرتے سنے جائیں گے۔ بس سمجھو تین چار ہفتوں کے اندر اندر وہ موش کو اپنی "منکوحہ" ہونے کا شرف "بخشنے" والے ہیں۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں بیوی سے بات کی جائے گی۔ اہل خانہ کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے گا۔ دل ہی دل میں شادی پر اٹھنے والے اخراجات کا حساب کتاب بھی جوڑ لیا جائے گا... ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس کلاس اور ٹائپ کے مرد ہوتے ہی اس طرح کے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں شادی سے کم انہیں کوئی بات سوجھتی ہی نہیں میری جان!"

ناہید کی سہیلیاں اس کی ہم خیال تھیں اور زور وشور سے ناہید کی تائید کرتی تھیں۔ ہاجرہ ان میں گھر کر سٹپٹا جاتی لیکن دل چھوڑنے والی وہ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹی ہوئی تھی اور اس کا مؤقف یہ تھا کہ وہ ان کی بری توقعات پر پورا نہیں اترے گا۔ وہ کوئی ایسا موقع فراہم نہیں کرے گا جس کے نتیجے میں اس چنڈال چوکڑی کو تالیاں بجانے کا موقع ملے۔

یہ سنسنی خیز کھیل کوئی چار ہفتے جاری رہا۔ مولوی محمد اسحاق اور موش میں نشستیں ہوتی رہیں' دوسری طرف ناہید اینڈ کمپنی اور ہاجرہ میں بھی زوروں کی ٹھنی رہی۔ ہاجرہ کا خیال تھا کہ اب یہ کھیل ختم ہونے والا ہے جبکہ ناہید کہتی تھی "نا رہ! یہ کھیل شروع ہی اب ہوا ہے۔ تم دیکھنا آج کل میں مولوی محمد اسحاق چار دن شانے چت ہوجائیں گے۔ وہ عنقریب موش سے عقد کی درخواست کرنے والے ہیں۔"

○☆○

پھر ایک روز اس طویل کشمکش کا نتیجہ سامنے آگیا۔ وہ ایک صاف شفاف چمکیلی شام تھی۔ ناہید اس شام سے لطف اندوز ہونے کے لیے چھت پر چلی آئی تھی۔ آرام کرسی پر بیٹھی وہ "نیویارکر" کا تازہ شمارہ دیکھ رہی تھی جب اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی سہیلیاں نبیلہ' نازو اور نیلا چلی آرہی تھیں۔ ان کے چہرے دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ کوئی چٹ پٹی خبر لے کر آئی ہیں۔ موش آج صبح سے کہیں نکلی ہوئی تھی اور ناہید کی اطلاعات کے مطابق چھٹی کا دن ہونے کے باوجود مولوی محمد اسحاق بھی گھر میں نہیں تھا۔ یقیناً یہ دن ان دونوں نے کہیں اکٹھے گزارا تھا... ناہید کے قریب پہنچتے ہی تینوں لڑکیوں نے فلک شگاف قہقہہ بلند کیا اور دھڑدھڑ ناہید کے قریب بیٹھ گئیں۔ انہوں نے جوشِ مسرت سے لرزتے کانپتے لہجے میں ناہید کو اطلاع دی کہ ان کا پلان کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے اور مولوی محمد اسحاق کو شکست فاش نصیب ہوئی ہے۔

وہ ابھی ابھی کلفٹن کے ایک ریستوران میں موش سے مل کر آرہی تھیں۔ وہاں موش کے ساتھ مولوی محمد اسحاق بھی موجود تھا۔ دونوں گوشے کی ایک میز پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ شوخ وشنگ لڑکیوں کو اپنے گرد دیکھ کر مولوی محمد اسحاق گھبرا گیا تھا اور ایک فون کرنے کا بہانہ کرکے ریستوران کے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا تھا۔ تینوں لڑکیاں موش کے ساتھ ہی براجمان ہوگئی تھیں۔ انہوں نے مولوی محمد اسحاق کے کھانے میں خوب کھایا پیا تھا اور موش سے راز ونیاز کرتی رہی تھیں۔ اس راز ونیاز کے دوران ہی موش نے بتایا تھا کہ مولوی محمد اسحاق کے دل کی بات اس کی زبان پر آگئی ہے اور اس نے موش سے شادی کا ارادہ ظاہر کردیا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے والدین سے اس سلسلے میں بات کرلی تھی بلکہ پہلی بیوی کو بھی منا لیا تھا۔ اب وہ عقد ثانی کا زردہ کھانے کے لیے موچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

ناہید نے یہ اطلاعات ایک فاتحانہ خوشی کے عالم میں سنیں۔ لڑکیوں نے دیر تک اس خبر کو انجوائے کیا اور مولوی صاحب کی حالتِ زار کا تصور کرکر کے لوٹ پوٹ ہوتی رہیں۔ ہاجرہ کے لیے شکر کا مقام تھا کہ وہ وہاں موجود نہیں تھی ورنہ اسے خوب زچ کیا جاتا۔

اب لڑکیوں کو موش کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ مولوی صاحب سے فارغ ہوکر آئے اور مرچ مسالہ لگا کر پوری تفصیل کے ساتھ انہیں رپورٹ دے۔ موش نے آنے میں کافی تاخیر کی۔ اس تاخیر کی وجہ سے چاروں لڑکیوں کو دلچسپ اور شریر اندازے لگانے کا موقع ملا۔ کسی نے کہا "مولوی صاحب موش کو اسکوٹر پر بٹھا کر لمبی ڈرائیو پر لے گئے ہوں گے۔" کوئی بولی "موش پی سی کے سومنگ پول میں مولانا کو تیراکی سکھا رہی ہوگی۔" کسی نے کہا "ریستوران سے اٹھتے ہوئے مولوی صاحب کی داڑھی کے بال موش کی قمیص کے بٹنوں میں الجھ گئے ہوں گے اور چھڑائے نہیں

چھوٹ رہے ہوں گے۔"

موش کی واپسی قریباً آٹھ بجے ہوئی۔ حسبِ عادت وہ اپنے لمبے ریشمی بالوں کو جوڑے کی صورت میں گردن پر باندھتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ ہلکے پھلکے رنگین لباس میں بڑی چارمنگ لگ رہی تھی لیکن جب ناہید نے اس کا چہرہ دیکھا تو اس پر ایک اجنبی سی سنجیدگی اور متانت نظر آئی۔ اس سے پہلے اس سنجیدگی سے کبھی ناہید کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ سہیلیوں کی مسکراہٹوں کا جواب موش نے ایک شکستہ مسکراہٹ سے دیا اور گم صم سی ان کے درمیان بیٹھ گئی۔

نازو نے شریر لہجے میں کہا "یہ اڑی اڑی سے رنگت' یہ کھلے کھلے سے گیسو۔ لیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔"

موش کے چہرے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا یا شاید شعر اس کے سر پر سے گزر گیا تھا۔ کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر ناہید کی چمک نے اس خاموشی کو توڑا "ہاں یار! آج پھر میدان مار لیا تم نے؟"

موش نے کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا لیا' ناہید بولی "کیا بات ہے؟ یہ کیا ایکٹنگ ہو رہی ہے بھئی؟ فاتح سپاہی کے چہرے پر ایسی مایوسی تو نہیں جھلکا کرتی۔"

موش نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میرا مطلب ہے احتاق صاحب نے مجھے جو "پروپوزل" دیا ہے اس کے بارے میں؟"

ناہید بولی "ہاں بھئی! ہو گیا ہے معلوم۔ ہمارے چہروں پر یہ جو موسلا دھار خوشی برس رہی ہے اس کی وجہ تمہاری کامیابی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔"

موش نے کہا "میں ایک بات اور تمہارے علم میں لانا چاہتی ہوں اور میرا خیال ہے' یہ بات بھی تمہارے لیے خوشی کا باعث ہوگی کہ میں نے احتاق صاحب کا پروپوزل قبول کر لیا ہے۔۔۔ میں واقعی ان سے شادی کر رہی ہوں۔"

چاروں لڑکیوں کے درمیان جیسے کسی نے اعصاب شکن کرنے والا بم پھینک دیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں موش کی طرف دیکھتی چلی گئیں۔ موش بے حد سنجیدہ تھی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم لوگوں کی حیرانی بجا ہے۔ تم نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ میں کوئی ایسا فیصلہ کروں گی۔ چند ہفتے پہلے تک خود میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مذاق ہی مذاق میں شروع ہونے والی بات اتنی دور چلی جائے گی۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے موزوں الفاظ کا انتخاب کیا اور بولی "اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ مولوی احتاق صاحب اس آزمائش میں پورے نہیں اترے جس میں ہم نے انہیں ڈالا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اتنے مضبوط کردار کے آدمی ثابت نہیں ہوئے کہ مجھے ٹھکرا سکتے اور اپنا وہ "امیج" برقرار رکھ سکتے جو لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ ہماری توقعات کے عین مطابق وہ ہمارے جال میں الجھتے گئے اور آخر کار انہوں نے وہی کیا جو انہیں کرنا تھا۔ یعنی بال بچے دار ہونے کے باوجود انہوں نے مجھ میں دلچسپی لی اور مجھ سے شادی کا ارادہ ظاہر کر دیا مگر جو بات میرے سوچنے کی ہے وہ کچھ اور ہے۔۔۔"

دوبارہ تھوڑا سا توقف کر کے موش نے اپنی دوستوں کے چہرے دیکھے پھر ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی جما کر اپنی پلکیں جھکائیں اور عجیب سے لہجے میں بولی "میں مختصر بات کروں گی لہٰذا میرے تھوڑے کہے کو بھی زیادہ سمجھنا۔ پچھلے آٹھ دس دنوں میں میں نے احتاق صاحب کو ورغلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم دو تین مرتبہ ایسی جگہوں پر بھی ملے ہیں جہاں ہم دونوں کے درمیان مکمل تنہائی اور فراغت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بائی گاڈ' پتھر کا آدمی بھی ہوتا تو پگھل کر پانی ہو جاتا لیکن یہ بندہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ میں اسے سمجھنے سے بالکل قاصر رہی ہوں۔ اس نے نازک ترین لمحوں میں بھی اپنے عقیدے اور اصولوں کی حفاظت کی ہے۔ بس اس کی یہی ایک بات ہے جو اس کی تمام کمزوریوں اور خامیوں پر حاوی ہو گئی ہے۔"

ناہید نے بے پناہ حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "یہ تم کیا کہہ رہی ہو موش' تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم۔۔ مولوی احتاق سے شادی کرو گی؟"

"بالکل کروں گی" موش نے کہا "اور اپنی طرف سے سر توڑ کوشش کروں گی کہ یہ شادی کامیاب بھی ہو۔"

ثنا کچھ دیر موش کو گھورتی رہی پھر بولی "خدا کی قسم' تم مذاق کر رہی ہو اور اگر مذاق نہیں کر رہی ہو تو پھر تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوگا تمہارے ساتھ۔۔۔ تم پانچ سو سال پیچھے کے زمانے میں چلی جاؤ گی۔۔۔ او گاڈ۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں' کچھ معلوم نہیں تمہیں۔"

"مجھے سب معلوم ہے" موش نے کہا۔ "بلکہ تم لوگوں سے کچھ زیادہ ہی جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو تم زیادہ؟" ناہید نے تڑخ کر کہا۔

وہ دھیرج سے مسکرائی "یہ میں تمہیں اکیلے میں بتاؤں گی اور تم تسلیم کرو گی کہ میرا تجربہ کئی معاملوں میں تم سے زیادہ ہے۔"

اس روز رات کو موش نے ناہید پر ایک سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔ اس نے "تیس مردوں کے خفیہ چہرے" نامی اس کتاب کا ذکر کیا تھا جو ان دنوں نوشکھم اور گردونواح میں خوب بک رہی تھی۔ پھر اس نے ناہید کو بتایا تھا کہ اس کتاب کی دو مصنفاؤں میں سے ایک وہ خود ہے۔ اپنے اسی تجربے کی بنا پر وہ کہہ رہی ہے کہ مولوی محمد احتاق ایک جدا اور منفرد شخص کا نام ہے۔۔۔

ناہید سناٹے میں رہ گئی تھی۔



یہ فسانۂ حیات اُن دستانہ بندوں کے لیے ایک تازیانہ ہے جو زندگی
بھر دوسروں کی آنکھوں پر چمل ڈالتے رہے ہیں۔ وہ سردوں کی آنکھ ہتھوڑے
کی ضرب سے شہتیر سے غافل رہتے ہیں اور یہی
ماحول کی زوال آمادگی کا مظہر ہے۔ یہ کہانی کسی ایک علاقہ ایک
زمانے تک محدود نہیں بلکہ انسانی معاشرے کی بھول
کی عکاسی کرتی ہے

طاہر جاوید مغل

ہاتھ

میاں احمد شریف کا تعلق بہاولپور سے تھا۔ پینسٹھ برس کی عمر میں بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ اب بھی گھڑ سواری کرتے تھے اور شکار ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یوں تو انھوں نے مختلف ادوار زندگی میں ہر طرح کے شکار سے دل بہلایا تھا مگر گھوڑے پر سوار ہو کر نیزے سے سؤر گننی میں جو لطف پایا تھا وہ کسی اور مہم جوئی میں نہیں آیا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ریاستہائے علاقے میں اس طرح کے شکار کا عام رواج تھا۔ اس وقت احمد شریف کی عمر بائیس تیئس برس تھی۔ مختلف نواب زادوں اور نوجوان زمینداروں کے ساتھ وہ جیسلمیر



اور جودھ پور کے نواح میں گھوڑے بھگاتے پھرتے تھے اور نیزے کے جوہر دکھاتے تھے۔

ان واقعات کو اب ایک مدت گزر چکی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی جب شریف صاحب رحیم یار خاں سے آگے خان گڑھ کے قریب اپنے آبائی ریسٹ ہاؤس میں شکار کے لیے جاتے تو ان کے اندر کا جوان شکاری مچل مچل اٹھتا اور ان کا جی چاہتا کہ رائفل ایک طرف پھینک کر پرانا نیزہ برآمد کریں اور عربی گھوڑے پر بیٹھ کر سوروں کے تعاقب میں نکل جائیں۔ کئی بار تو وہ اس ارادے سے تیار بھی ہو گئے تھے مگر ایسے موقعوں پر شمسہ آڑے آجاتی تھی اور انھیں روک لیتی تھی۔ شمسہ ان کی آخری اولاد تھی اور انھیں دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ جب کہ تمام اولاد گھر بار والی ہو کر انھیں چھوڑ چکی تھی، شمسہ ان کے ساتھ تھی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد دُہرایا کرتی تھی۔ تاہم احمد شریف جانتے تھے کہ وہ تادیر اس عہد کو نباہ نہیں سکے گی۔ وہ بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایم اے کر لیتی۔ اس کے بعد اسے اپنا گھر بسانا ہی تھا۔

احمد شریف صاحب کا آبائی ریسٹ ہاؤس درحقیقت کسی چھوٹے موٹے محل سے کم نہیں تھا۔ اس محل کو وہ شکار کے لیے بیس کیمپ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ سال میں کم از کم دو مرتبہ انھیں شکار کا دورہ ضرور پڑتا تھا اور ان دنوں محل کی سوئی ہوئی رونقیں انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی تھیں۔ ان دنوں بھی موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی احمد شریف اس محل میں فروکش ہو گئے تھے۔ شمسہ کے امتحان بھی چونکہ مسلسل ملتوی ہو رہے تھے لہٰذا وہ بھی 'پاپا جانی' کے ساتھ ہی چلی آئی تھی۔ سورا دی ہیش لکھ رہا تھا۔ آٹھ دس قابل قدر مہمان ہر وقت ان کے ہاں مقیم رہتے اور شکار کے پُرلطف پروگرام بنتے۔

اس روز شریف صاحب بہت خوش تھے۔ آج وہ اپنی لاڈلی کی دیرینہ آرزو پوری کر رہے تھے۔ بڑے لوگوں کی خواہشیں بھی بڑی ہی ہوتی ہیں۔ شمسہ پچھلے ایک برس سے تقاضا کر رہی تھی کہ اسے ایک ہاتھی درکار ہے۔ بچہ ہو بوڑھا ہو یا جوان لیکن اسے ہاتھی چاہیے۔ اصل میں اس نے پچھلے برس بابے خیرو سوئنگی کے ہاتھی پر سواری کی تھی اور بہت انجوائے کیا تھا۔ بابا سوئنگی ان کے ریسٹ ہاؤس سے کوئی ایک سو کلومیٹر کی دُوری پر رہتا تھا۔ ایک بیوی اور ایک ہاتھی کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کچا پکا مکان بنا رکھا تھا۔ قریب ہی گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا ایک بیلا سا تھا جہاں نوعمر ہاتھی 'لاڈلا' آزادانہ گھومتا رہتا تھا۔ بیلے کی ایک جانب ایک طویل جوہڑ تھا جہاں وہ کبھی کبھار نہانے کے لیے بھی اتر جاتا تھا۔

بابے سوئنگی کے پاس لاڈلے کا موجود ہونا بھی ایک دلچسپ اتفاق تھا کوئی چار برس پہلے کی بات ہے بابا سوئنگی ایک رات چوری چھپے بارڈر کے قریب گھاس کاٹنے گیا۔ اس نے لاڈلے کو جو اس وقت ایک بچہ تھا جنگل میں گھومتے پایا۔ پہلے تو وہ اسے چھوٹی موٹی بھینس سمجھا مگر نکلتی ہوئی سونڈ دیکھ کر ڈر گیا۔ قریب گیا تو پتا چلا کہ ہاتھی کا بچہ ہے۔ وہ بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ سوئنگی نے اپنی پگڑی اس کے گلے میں ڈالی اور گھر لے آیا۔ دراصل ایک روز پہلے علاقے میں سخت طوفان آیا تھا۔ غالباً یہ ہاتھی کا بچہ سرحد پار سے بھٹکتا ہوا ادھر آنکلا تھا۔

سوئنگی نے اس بچے کا نام لاڈلا رکھا اور بڑے چاؤ سے اس کی پرورش کرنے لگا۔ وقت گزرتا رہا اور لاڈلا بچے سے جوان ہاتھی بن گیا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ جلد چکیلی اور جسم چھریرا تھا گو وہ ایک مکمل ہاتھی نہیں تھا مگر نہایت طرار تھا۔ احمد شریف سمیت کئی شکاری بابے سوئنگی سے ہاتھی بچے کو کہہ چکے تھے مگر وہ صاف انکار کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ ایک سرکس کا مالک نوٹوں کی گڈی لے کر ایک ہفتہ سوئنگی کے پیچھے گھومتا رہا تھا مگر بابے نے اپنا ارادہ بدلنے سے انکار کر دیا تھا۔

پچھلے برس تعطیلات پر جب احمد شریف صاحب اور شمسہ یہاں موجود تھے شمسہ نے کئی بار لاڈلے کی سواری کی تھی اور اسی وقت سے وہ بضد تھی کہ اسے بھی ایک ہاتھی چاہیے۔ شریف صاحب جانتے تھے بابے سوئنگی سے کہنا سننا فضول ہے۔ انھوں نے سوچا وہ کسی اور ذریعے سے ہاتھی کے حصول کی کوشش کریں گے۔ لاہور انیمل ہسبنڈری میں ایک اعلیٰ افسر اُن کا لنگوٹیا تھا۔ انھوں نے اس کے توسط سے کوششیں کیں اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ منہ مانگے داموں انھوں نے ایک خوب صورت ہتھنی خرید لی... اور اب یہ ہتھنی کسی بھی وقت خان گڑھ پہنچنے والی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کے آراستہ و پیراستہ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے احمد شریف صاحب نے گھڑی دیکھی۔ سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ انھوں نے ایک لوڈر کا انتظام کر رکھا تھا جس کے ذریعے ہتھنی کو احمد پور شرقیہ کے اسٹیشن سے بذریعہ سڑک خان گڑھ پہنچنا تھا۔ اور وہاں سے جنگل کے راستے پیدل ریسٹ ہاؤس آنا تھا۔ ان کے اندازے کے مطابق اسے

دو بجے پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن سفر طویل تھا۔ دو تین گھنٹے کی کمی بیشی ہو سکتی تھی... سوچتے سوچتے اچانک شریف صاحب کو چونکنا پڑا۔ شمسہ اپنے مخصوص انداز میں چھپاک سے کمرے کے اندر آگئی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی سرخ قمیص اور چست بلیو پتلون کے نیچے اس نے شکاری بوٹ پہن رکھے تھے۔ خوب صورت بال ایک جوڑے کی صورت میں کس کر باندھ دیے گئے تھے۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار نظر آتی تھی۔

"کہاں کا ارادہ ہے بیٹی؟" انھوں نے پوچھا۔

وہ لاڈ سے گردن ٹیڑھی کر کے بولی۔ "ارادہ تو تب ہوگا جب آپ اجازت دیں گے۔"

"اجازت تو دینا ہی پڑے گی۔" انھوں نے اس کی تیاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "پاپا صرف خان گڑھ تک جانا ہے۔ میری بڑی پیاری سہیلی ہے... کنول۔ آج اس کی سالگرہ ہے۔ کمبخت کو کبھی اپنی سالگرہ یاد نہیں رہتی۔ آج میں اچانک پہنچ کر اسے حیران کرنا چاہتی ہوں۔ کل دوپہر تک آجاؤں گی۔"

شریف صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن ساتھ کون جائے گا؟"

"ساتھ کی کیا ضرورت ہے؟" شمسہ نے مردانہ وار بازو کا مسل دکھاتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی ہنس دی۔ "اچھا شفیع کو ساتھ لے جاتی ہوں۔ وہ فارغ ہے۔"

شفیع اصطبل کے نگران کا بیٹا تھا۔ خود بھی اچھا گھڑ سوار اور شکاری تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں آنے والے شریف صاحب کے اناڑی مہمانوں کو گھڑ سواری کے گر سکھاتا تھا۔ شریف صاحب نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ اس سے کہنا اپنی ڈبل رائفل ضرور ساتھ لے لے اور کل جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ اور راستہ خراب ہے ساتھ ایک گھوڑا فالتو لے لینا..."

"ٹھیک ہے پاپا، آپ فکر نہ کریں۔" شمسہ نے الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا اور باہر نکل گئی۔ شریف صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انھوں نے سوچا چلو اچھا ہی ہوا۔ اس طرح وہ شمسہ کو ایک زبردست سرپرائز دے سکیں گے۔ کل جب وہ واپسی پر اپنا گھوڑا باندھنے اصطبل پہنچے گی تو سامنے ہتھنی بندھی ہوئی پائے گی۔

ہتھنی کوئی چار بجے ریسٹ ہاؤس پہنچی۔ اس وقت شمسہ جا چکی تھی۔ یہ ایک خوب صورت چنگھاڑ ہتھنی تھی۔ بالکل نوخیز اور چال میں عجب لوچ پایا جاتا تھا۔ اسے اصطبل میں پہنچا دیا گیا۔ ارد گرد کے مقامی لوگ شام تک اسے دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ ہتھنی کے ساتھ اس کا مہاوت بھی آیا تھا۔ وہ چونکہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لیے آنے کے فوراً بعد چارہ پانی ڈال کر سو گیا۔

رات سونے سے پہلے شریف صاحب ایک بار پھر ہتھنی کو دیکھنے گئے۔ اس کا پاؤں لوہے کی ایک موٹی زنجیر سے باندھ کر مرگد کے تناور تنے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ وہ بڑی نزاکت سے اپنے سامنے پڑے کماد پر سونڈ گھما رہی تھی۔ شریف صاحب نے اس کی زنجیر کو ٹٹول کر دیکھا تو خاصی مضبوط تھی۔ اصطبل کا بیرونی پھاٹک بند تھا اور اندر مہاوت کے علاوہ دو رکھوالے بھی موجود تھے۔ وہ مطمئن ہو کر رہائشی حصے میں واپس چلے گئے۔ اپنے معمول کے مطابق رات پورے نو بجے وہ خواب گاہ میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گئے۔

نہ جانے کس وقت ان کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی ساڑھے بارہ یا ایک کا عمل تھا۔ انھیں دور سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ اس آواز کو وہ سیکڑوں آوازوں میں پہچان سکتے تھے۔ یہ ہابے سوئنگ کے لاڈلے کی آواز تھی... پچھلے تین چار برسوں میں انھوں نے رات کے وقت بارہا یہ آواز


قد بڑھایئے
پُروقار
شخصیت
اپنایئے!
ہائٹول (کیپ)
ہی ہے۔ میری اس
خوبصورت شخصیت
کا راز ہائٹول ہر پستہ
مرد و خواتین کا قد
بڑھاتی ہے۔ ایک خط لکھ
کر وی پی پارسل سے
طلب فرمائیں۔
کے بی ہوم
پوسٹ بکس 2535
18 اپسٹ کلب
کراچی۔ 74600

سنی تھی... لیکن آج یہ آواز کسی اور ہی آہنگ میں سنائی دے رہی تھی۔ احمد شریف صاحب ایک تجربہ کار شکاری تھے' وہ اس آواز کے زیر و بم کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ لاڈلا مستی میں تھا۔ نیم شب کی ہوائیں جوان ہتھنی کی خوشبو تیرتی ہوئی اس کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور وہ بے قرار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انھیں ہتھنی کی چنگھاڑ بھی سنائی دی۔ ان کا خیال درست تھا۔ جانوروں کی مخصوص عادت کے مطابق وہ ایک دوسرے کو اپنی موجودگی سے آگاہ کر رہے تھے۔

شریف صاحب نیم غنودگی کے عالم میں کافی دیر تک ان آوازوں کو سنتے رہے پھر بتدریج نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

دوبارہ ان کی آنکھ ایک نامانوس شور سے کھلی۔ خوابگاہ میں پچھلی رات کی خنکی رچی ہوئی تھی۔ انھوں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ اصطبل کی طرف سے عجیب طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید کوئی چور گھس آیا تھا پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور وہ اچھل کر مسہری سے نیچے آ گئے۔ فائرنگ کے ساتھ ہی ان کے کانوں میں لاڈلے کے چنگھاڑیں گونجی تھیں اور اس کے ساتھ ہی انھیں وہ آوازیں یاد آئی تھیں جو چند گھنٹے پہلے انھوں نے سنی تھیں۔ اچانک سب کچھ ان کی سمجھ میں آ گیا۔ غصے اور نفرت کی ایک تیز لہر ان کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ انھوں نے دیوار سے طاقت ور رائفل اتاری اور سلیپر پہن کر بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ صحن سے گزر کر اصطبل میں پہنچے تو ایک طرف کی کچی دیوار گری ہوئی تھی۔ ایک رکھوالا زخمی حالت میں زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ قریب ہی اس کی چارپائی ٹوٹی پڑی تھی۔ چند سپیرے دار بھاگتے ہوئے جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ ہتھنی اپنی جگہ موجود تھی لیکن سخت مضطرب تھی۔ اس کی دزدانی زنجیر بار بار کھنکتی تھی اور تواناور درخت ماسلٹے کے پودے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

ایک ہانپتا ہوا ملازم' شریف صاحب کے سامنے پہنچا اور بولا۔

"سرکار... سرکار... یہ سارا سونگی کے لاڈلے کا کام ہے... وہ تو... وہ تو ہم جاگ گئے ورنہ وہ ہتھنی کا کاسٹیا ناس کر ڈالتا۔ ایسا مست ہوا تھا کہ اندھا ہو رہا تھا۔ بخشو بے چارے کو ایسی سونڈ ماری ہے کہ پتا نہیں بچتا بھی ہے کہ نہیں۔"

شریف صاحب چنگھاڑے۔ "حرامزادو! یہ سب تمہارا قصور ہے۔ اس طرح سوتے ہو کہ حشر ہو جائے تمھیں خبر نہیں ہوتی۔ ایک ایک کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

کچھ دیر وہ درختوں کی طرف دیکھتے رہے جہاں سے ہتھنی کی چنگھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ تب انھوں نے کوئی فیصلہ کیا اور تیز قدموں سے واپس خواب گاہ کی طرف بڑھے۔ خوابگاہ میں پہنچ کر انھوں نے جلدی جلدی شکاری لباس پہنا' دراز سے مخصوص قسم کے کارتوس نکال کر پیٹی میں لگائے' ریوالور چیک کر کے ہولسٹر باندھا اور رائفل لے کر باہر آ گئے....

اصطبل میں ابھی تک مساوت ہتھنی کو رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زخمی رکھوالے کو موقع سے ہٹایا جا چکا تھا۔ دوسرے ملازم سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ شریف صاحب نے اپنا گھوڑا سنبھالا اور چار مسلح آدمیوں کے ساتھ جنگل کی طرف بڑھے' راستے میں وہ اپنے آدمیوں سے مسلسل سوالات بھی کرتے جا رہے تھے۔ انھیں بتایا گیا کہ ہاتھی پر صرف ایک فائر کیا گیا تھا جو غالباً اسے لگا نہیں۔ پہلے دو فائر ہوائی تھے کیونکہ ہاتھی ہتھنی کے بہت قریب تھا اور سیدھی فائرنگ میں ہتھنی کے زخمی ہونے کا خدشہ تھا۔ یہ باتیں سن سن کر شریف صاحب کا پارہ مزید چڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا ہاتھ بے خیالی میں بار بار رائفل کی لبلبی کو چھو رہا تھا۔

جلد ہی انھیں اپنے کچھ گھڑ سوار بھی مل گئے۔ انھوں نے بتایا کہ لاڈلا خشک نالے میں سے گزر کر بیلے کی طرف نکل گیا ہے۔ شریف صاحب نے اپنے ماہر ساتھیوں کے ساتھ نالا پار کیا اور ٹارچوں کی روشنی میں جلد ہی لاڈلے کا کھرا اٹھا لیا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ عیار جانور متعاقب افراد کو چکما دینے کے لیے بھول بھلیاں بناتا ہوا گیا ہے۔ تاہم بہت جلد اشارہ مل گیا کہ وہ چکر کاٹ کر ٹیلے کے عقب میں واقع بیلے میں پہنچا ہے۔ یہ وہی بیلا تھا جس کے ایک سرے پر ٹیلے کے اوپر سونگی کا نیم پختہ جھونپڑا تھا اور دوسری جانب ایک جوہڑ۔

اس وقت صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ شب بیدار جانوروں کی آوازیں خاموش ہو گئی تھیں اور ان کی جگہ پرندوں کی چہچہاہٹ نے لے لی تھی۔ احمد شریف نے سب سے پہلے بابے سونگی کے گھر کا رخ کیا۔ سونگی انھیں ٹیلے کے دامن ہی میں مل گیا۔ وہ خاصا مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ احمد شریف اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ کر وہ مزید گھبرا گیا۔

احمد شریف نے کڑک کر پوچھا۔ "سونگی! لاڈلا کدھر ہے؟"

سولنگی گڑگڑایا۔ "سرکار، میں تو خود اس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ نماز پڑھ کر باہر نکلا تو اسے غائب پایا۔"

احمد شریف نے اس کا بیان یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ تیلے کے پچھواڑے اچھی طرح دیکھو۔ دو آدمی گھوڑے بھگاتے گئے اور چند ہی لمحے بعد آکر اطلاع دی کہ لاڈلا اپنی مقررہ جگہ پر موجود نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بان کی وہ رسی بھی ٹوٹی ہوئی ہے جس سے اُسے باندھا جاتا تھا۔

سولنگی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "سرکار سائیں! کیا قصور ہوگیا ہے میرے لاڈلے سے؟ میری بیوی کہہ رہی تھی تہجد کے وقت بنگلے سے دو تین فائر ہوئے تھے۔"

"فائر تو ابھی ہونے ہیں سولنگی۔" احمد شریف خوف ناک لہجے میں بولے۔ "تیرے اس لاڈلے نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔ آج اس کی لاش نہ بچھاوی تو احمد شریف نام نہیں۔"

احمد شریف کے لہجے نے سولنگی کو سرسوں کی طرح زرد کر دیا۔ وہ ہکلایا۔ "سائیں! اس کا گناہ کیا ہے؟"

احمد شریف گرجے۔ "اس کا کوئی ایک گناہ نہیں جو تمھیں بتاؤں۔ میں تم سے بار بار کہتا تھا اسے قابو میں رکھو لیکن تم تو موج دلبا چاہتے تھے ہمارے سینوں پر۔ کھلا چھوڑ دیتے تھے اُسے کہ جاؤ جو جی میں آئے کرو۔ آج سارا نقصان ایک ہی دفعہ پورا کروں گا میں۔"

سولنگی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ پریشانی میں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ احمد شریف نے کڑک کر اپنے کارندے سے کہا۔

"جاؤ سلطاناں، ہاتھی کے لیے آدمی بلا کر لاؤ۔ وہ خونی اسی بیلے میں گھسا ہے۔"

سلطاناں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "سرکار! میں نے آپ کے حکم سے پہلے ہی بندہ روانہ کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر میں وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"

احمد شریف نے مسلح آدمیوں کو حکم دیا۔ "تم فوراً بیلے کو گھیر لو۔ وہ خبیث کہیں نکل نہ جائے۔"

مسلح آدمی جو تعداد میں پچیس سے زیادہ تھے فوراً گھوڑے بھگاتے ہوئے بیلے کے اطراف میں پھیل گئے۔

سولنگی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "سر... سرکار آپ ہاتھی کو مریں گے؟"

احمد شریف غرائے۔ "تو اور کیا وہ خود گولی کھانے کے لیے باہر نکلے گا۔"

"نہیں سرکار نہیں۔" سولنگی تڑپ کر بولا۔ "میں آپ کو یہ ہاتھی نہیں کرنے دوں گا۔ ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔"

سولنگی کی بیوی بھی اب گھر سے نکل آئی تھی اور فاصلے پر کھڑی کلیجا تھامے یہ گفتگو سن رہی تھی۔

"ہاتھی ہوگا اور ضرور ہوگا۔" احمد شریف نے اپنی چار سو پچاس ڈبل رائفل ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں درختوں کی طرف سے مدھم آوازیں آنے لگیں۔ قریبی بستی سے ہانکا کرنے والے ڈھول باجے اکنٹر بیلے پہنچ گئے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سامنے سے برآمد ہوئے اور مسلح آدمیوں کی مدد سے پرتعیش بندوبست کرنے لگے۔ بیلے کے ایک جانب طویل جوہڑ تھا اگر ہاتھی اس جانب سے نکلتا تو فوراً پتا چل جاتا لہٰذا صرف دو اطراف سے ہانکے کی ضرورت تھی تیسری جانب یعنی تیلے کی طرف رائفل برداروں کو کھڑے ہونا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ بیلے میں ہانکا کیا جا چکا تھا لہٰذا ہانکے والوں کو اپنا کام سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ انھوں نے فوراً خود کو دو قطاروں میں تقسیم کر لیا۔ ایک قطار سبتا چھوئی تھی۔ اس قطار کو بڑی قطار کے پہلو بہ پہلو چلنا تھا تاکہ ہاتھی بغلی رخ سے فرار نہ ہو جائے۔

سولنگی پھٹی ہوئی نظروں سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس نے آگے بڑھ کر احمد شریف کے پاؤں پکڑ لیے۔ "نہیں سرکار... خدا کے لیے... آپ ایسا نہیں کریں۔" احمد شریف کے کندے اُسے گھسیٹتے ہوئے پیچھے لے جانے لگے۔ سولنگی گھگیایا۔ "سرکار صرف ایک بار... ایک بار میری عرض سن لیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں ساری بات..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ایک کارندے نے بندوق کا بٹ اتنی زور سے اس کے سر پر مارا تھا کہ وہ ہوش میں نہ رہ سکا۔ وہ زمین پر گرتے دیکھ کر اس کی بیوی روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

احمد شریف نے اپنے رائفل برداروں کے ساتھ تیلے کے دامن میں پوزیشن سنبھال لی۔ وہ تعداد میں کل چھ تھے۔ دبلا پتلا سکواڈ کی طرح ہاتھوں میں رائفلیں تھامے، اصیل گھوڑوں پر سوار وہ ساکت کھڑے تھے۔ چڑھتے سورج کی دھوپ میں ان کے چہرے غصے سے تمتما رہے تھے۔ دوسری جانب ہانکا شروع ہوا۔ باجے بجے، ڈھول دھم دھمائے، تاشے کھنکے۔ ہاڑھو کی آوازوں سے دریا تیوں نے اس شور کو قیامت انگیز بنا دیا تھا۔ ہانکا کرنے والی دونوں قطاروں کے ساتھ ساتھ دو دو رائفل بردار بھی

تھے تاکہ اگر جانور واپس مڑ کر حملہ کردے تو اس کا سدباب ہو سکے۔ رائفلوں کے علاوہ کچھ دیسی ساخت برچھیوں اور چھریوں سے بھی مسلح تھے حالانکہ ایک ہاتھی کا ان سے کچھ بگڑنے والا نہیں تھا۔

ہاتھی کو ہلاک کرنے والے "۵۰ ایم ڈبل" کے غار انگاف کارتوس احمد شریف نے چیمبر میں ڈال لیے تھے ہاتھ مضبوطی سے رائفل پر جمے تھے اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں ایک بے وقعت ہاتھی نے ان کی لاکھوں کی متعنی سے جوڑا بنانے کی کوشش کی تھی یہ جرم کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔

بے شک وہ جانور تھا لیکن یہ پرآگندگی ناقابل معافی تھی۔ ہانکے کی آوازوں سے احمد شریف کو اندازہ ہو چکا تھا کہ نصف بیلہ طے ہو چکا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ بیلے میں ایسی جگہیں ہیں جہاں ایک ہاتھی تو کیا ہاتھیوں کا پورا غول روپوش ہو سکتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں یہی مفرور مجرم اپنے بال بچوں سمیت کئی ہفتے اس بیلے میں پڑے رہے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ تاہم اس وقت جس انداز سے ہانکا ہو رہا تھا لاڈلے کا بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ شرط صرف ایک ہی تھی کہ وہ بدبخت یہاں موجود ہو اور احمد شریف کو اسی فیصد یقین تھا کہ لاڈلا اسی بیلے میں موجود ہے۔ باقی بیس فیصد یقین کی کمی سونگی کی گرسوزاری سے پوری ہو گئی تھی۔ یقیناً بڈھا بندی سے اسے بیلے میں گھستا دیکھ چکا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا سامنے آنے والا تھا۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ ہانکے کی آوازیں بہت قریب پہنچ گئی تھیں۔ ان آوازوں کے ارتعاش سے احمد شریف کی تجربہ کار سماعت کو اندازہ ہو رہا تھا کہ کامیابی کی امید ہے۔ جب جانور ہانکے کے آگے آگے بھاگتا ہے تو جھاڑیوں اور گھاس میں ہونے والی مخصوص جنبش ہانکا کرنے والوں کو بہت کچھ سمجھا دیتی ہے۔ احمد شریف نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ سب رائفلیں سیدھی کر کے چوکنا ہو گئے۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ شور سے اب کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور پھر احمد شریف کو بلند و بالا سرکنڈوں میں بچھل کے آثار نظر آئے۔ چھٹی حس پکاری... شکار سامنے آنے والا ہے۔ احمد شریف نے سانس روک لی.....

تب دفعتاً انھوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ شاید احمد شریف کے سامنے بے ہوش پڑا سونگی ہوا میں تحلیل ہو جاتا یا ان کا گھوڑا انسانی زبان بولنے لگتا تو بھی انھیں اتنی حیرانی نہ ہوتی جتنی اس شکار کو دیکھ کر ہوئی جو درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوا تھا... یہ شفیع تھا۔ اصطبل کے نگران کا بیٹا... ماہر نشانچی اور گھڑسوار رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے بگڑا ہوا تھا۔ اس نے دہشت زدہ انداز میں احمد شریف کو دیکھا اور بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح ایک جانب بھاگ نکلا۔ "ٹھہرو... ٹھہرو" احمد شریف چلائے۔ انھیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شفیع کے پیچھے پیچھے دو خالی گھوڑے بھی بھاگتے ہوئے ایک طرف نکل گئے تھے۔ تب احمد شریف کی نگاہ اپنے دوسرے شکار کی طرف اٹھی۔ سرکنڈوں سے شہ بالا برآمد ہو رہی تھی۔ بال پریشاں، جوان جسم پسینے میں شرابور، سانس پھولا ہوا۔ وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی بے زبان خاموشی بلند آواز سے چیخ کر ایک اعلان کر رہی تھی۔ احمد شریف کے کان یہ اعلان سن رہے تھے لیکن ذہن سمجھنے سے انکاری تھا۔ ان کی آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ لاڈلے کے بجائے ان کی لاڈلی سامنے ہے۔ ایکا ایکی ان کے حلق سے ایک خوفناک چنگھاڑ نکل بھاگنے سے بے قابو ہو کر انھوں نے اپنی ۵۰ رائفل سیدھی کی اور بیٹی کے سینے کا نشانہ لے لیا۔ انگلی ٹریگر پر تھی لیکن دماغ کی میٹر کی یہ حرکت لامتناہی فاصلوں پر محیط ہو گئی۔ چند لمحوں میں احمد شریف جہنم کی ہزار تہوں سے گزر گئے۔ کوئی چیخ کر کہہ رہا تھا "احمد شریف گولی کیوں نہیں چلاتے۔ مجرم بدل گیا تو کیا، جرم تو وہی ہے۔ جو سزا حیوان کو دے رہے ہیں تھے کم از کم وہ تو انسان کو دے دو" لیکن احمد شریف میں یہ پکار سننے کی تاب نہیں تھی۔ ان کے ہاتھ میں پکڑی رائفل دم بہ دم وزنی ہوتی چلی گئی اور آخر ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے جھک گئی۔ ہانکا کرنے والے خاموش تھے، رائفل بردار خاموش تھے، جنگل بھی خاموش تھا اور یہ ساری خاموشی احمد شریف کی پیشانی کو عرق ندامت سے تر کر رہی تھی۔

عین اس وقت قریب جنگل سے ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی... احمد شریف سیکڑوں میں پہچان سکتے تھے، یہ لاڈلے کی آواز تھی مگر اب اس آواز پر رائفل اٹھانا ان کے بس سے باہر تھا۔

وہ گھوڑے سے اترے اور شرمساری کے گراں بوجھ تلے جھک کر چلتے سونگی کے بے سدھ جسم کے پاس پہنچے۔ سونگی کے سفید بالوں میں خولہ کا پھول کھلا ہوا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا "ہانکا نہیں کرنا سرکار... ہانکا نہیں کرنا..."

Faisal Ahmed

عارف نے اپنی بوالیس سال بیوی ثروت کی اوڑھنی کو غور سے دیکھا۔ یہ اوڑھنی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ بوسیدہ تر ہو رہی تھی۔ رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ کپڑا ہر دھلائی کے بعد پتلا اور کمزور ہو رہا تھا۔ ایک دو روز پہلے ثروت نے کنارے کی طرف ایک چھوٹی سی سلائی بھی لگائی تھی۔ یہ "ہم رنگ" دھاگے سے لگائی گئی تھی مگر عارف کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

اور عارف کی نظروں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ثروت جو صرف چار سال پہلے شادی کے نئے نویلے کپڑوں میں کسی نعمت رنگ پھول کی طرح خوش نما اور تر و تازہ نظر آتی تھی اب مرجھائی جا رہی تھی۔ اس کے رخساروں کی چمک اور آنکھوں کی کشش دن بہ دن ماند پڑ رہی تھی۔ غربت کی چڑھتی اور پھیلتی ہوئی دھوپ میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

چار سال پہلے عارف کچھ ایسا مفلس نہیں تھا۔ بے شک مکان کرائے کا تھا اور اس پر تھوڑا بہت قرضہ بھی تھا مگر وہ محنت سے کام کر رہا تھا۔ دن کو کلرکی کے علاوہ وہ رات کو ایک اکیڈمی میں پڑھانے بھی جاتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی اپنے

ایک اُنو کے قسمت خریدار کی خوش قسمتی کا قصہ۔ وہ اوڑھنی خریدنے نکلا تھا مگر زندگی خرید لایا!

مفلسی، وجود کے رگ و ریشے میں سرایت کرنے سے پہلے ... بہت پہلے لباس میں اترتی ہے، کپڑے کے ریشوں میں جگہ بنا کر انہیں بھدا اور بودا کرتی... لیکن بوسیدگی اور کہنگی سے قطع نظر، زندگی سے ان کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے ایسی ہی زندگی بخش مضبوطی کی ایک کہانی!

اوڑھنی

ظہر جاوید مغل



Faisal Ahmed

حالات سدھارنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر پھر یوں ہوا کہ عارف کی والدہ بیمار ہوئیں اور قریباً ایک سال کے اندر عارف ان کا علاج کراتے کراتے پائی پائی کو محتاج ہو گیا۔ دوسرا المیہ یہ ہوا کہ فرم بند ہونے سے عارف کی نوکری بھی چلی گئی اور اس کا سارا دارومدار اکیڈمی کی پارٹ ٹائم والی نوکری پر رہ گیا۔ ان نہایت نامساعد حالات میں عارف کی شریک حیات نے توقع سے بڑھ کر عارف کا ساتھ دیا۔ وہ نہ صرف گھر کو سنبھالتی رہی، بچوں کو پالتی رہی۔ ساس کی تیمارداری کرتی رہی بلکہ سلائی وغیرہ کر کے عارف کا ہاتھ بٹانے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ دو وقت کی روٹی تو کسی نہ کسی طور چل رہی تھی، مگر مکان کا کرایہ ہر ماہ بڑی مشکل سے ادا ہوتا تھا اور اس سے بھی بڑا مسئلہ قرض کا تھا۔ والدہ کی بیماری کے دوران میں عارف کے قرض میں اضافہ ہوا تھا اور اب قرض خواہ ہمہ وقت ان کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔ ان حالات میں عارف اور ثروت کو اگر کہیں امید کی کوئی کرن نظر آتی تھی تو وہ ایک ہی تھی۔ پانچ چھ برس پہلے عارف کے مرحوم والد نے اپنی جمع پونجی ایک شخص کو کاروبار میں لگانے کے لیے دی تھی۔ یہ کوئی تین لاکھ روپیہ تھا۔ جس شخص کو رقم دی گئی وہ دور کا رشتے دار بھی تھا اور پرنٹنگ مشینوں میں استعمال ہونے والا کوئی پرزہ بناتا تھا۔ اب یہ شخص بھی کاروبار میں سخت خسارے کا رونا روتا رہتا تھا۔ پچھلے پانچ چھ سال میں اس نے منافع کے نام پر صرف دو تین مرتبہ عارف کو دس دس ہزار روپیہ دیا تھا، اور اب یہ سلسلہ بھی ختم تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ رقم ڈوب گئی ہے۔ مگر وہ کسی نہ کسی طور ان کو اصل رقم ضرور لوٹا دے گا۔ عارف اور ثروت جانتے تھے کہ یہ سب ڈراما ہے۔ اس شخص نے ایک دوسرا کام شروع کر دیا تھا اور معقول کمائی بھی کر رہا تھا... مگر وہ عارف اور ثروت کی دگرگوں حالت پر ترس کھانے کو تیار نہیں تھا۔ عارف میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی طرح کی چارہ جوئی کر سکتا۔ اب تو جو کچھ تھا، اس مختار نامی شخص کے رحم و کرم پر تھا اور وہ وعدے پر وعدہ کرتا رہتا تھا۔

اپنی شریک حیات کی قابل رحم اوڑھنی کو دیکھتے دیکھتے خیالات کہاں سے کہاں بھٹک گئے تھے۔ یہ ہر دم استعمال ہونے والی اوڑھنی اب زبانِ حال سے فریاد کر رہی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طور بدل دیا جائے۔ تین مہینے پہلے ہی عارف نے اسے بدلنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے بالکل اسی طرح کی لیس دار اوڑھنی لانے کے لیے چار سو روپیہ پس انداز بھی کر لیا تھا مگر پھر اسے محسوس ہوا کہ ثروت کو اس لیس دار اوڑھنی سے زیادہ ایک جوڑا کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اس نے تین سو روپے میں ثروت کو شلوار قمیص لا دی۔ باقی ایک سو روپیہ ناگہانی ضرورت کے زمرے میں ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گیا۔ چھوٹے بچے کو ہیضے کی شکایت ہو گئی تھی۔ ان دنوں پورے ایک ہفتے تک عارف کے گھر میں چولہا بھی نہیں جل سکا تھا۔

اب پھر عارف نے اکیڈمی تک پیدل جا کر اور روزانہ کے چار سگریٹ کم پی کر چار پانچ سو روپیہ جمع کر لیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس رقم سے ایک ایسی ہی خوبصورت اوڑھنی لانے اور ثروت کے سر پر رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

زندگی بڑی عجیب شے ہے۔ مفلسی، بیماری اور مصیبتوں کے نہایت مہلک ریگستانی سفر میں بھی خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے نخلستان ملتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کال کوٹھڑی میں پھانسی کی یقینی سزا کا انتظار کرنے والا قیدی بھی شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں کبھی کبھی کسی نہ کسی طور راحت اور آسودگی محسوس کر لیتا ہے۔ اس روز عارف بھی اکیڈمی جاتے ہوئے ایک طرح کی مسرت اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن فٹ پاتھ پر پیدل چلا جا رہا تھا۔

اپنی تمام تر پریشانیوں کو ایک طرف ہٹا کر وہ آج شام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، آٹھ بجے اکیڈمی سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے پرانی انارکلی کی طرف سے ہو کر نکلے گا۔ ایک دکان پر وہ مطلوبہ اوڑھنی آٹھ دس روز پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ دکاندار سے بھاؤ تاؤ بھی کر چکا تھا۔ بس ساٹھ ستر روپے کا فرق رہ گیا تھا۔ یہ ایسا فرق نہیں تھا کہ نہ نکل سکتا۔ عارف کا ارادہ تھا کہ ثروت کو اوڑھنی دکھانے سے پہلے وہ اسے تھوڑا سا حیران بھی کرے گا۔ وہ بند کمرے میں اس کے سر سے پرانی اوڑھنی کھینچے گا... اوڑھنی پر ناک بھوں چڑھائے گا اور اسے پھاڑ کر پھینک دے گا۔ ثروت ششدر رہ جائے گی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔ وہ کہے گی ''عارف! یہ کیا کیا آپ نے۔ اب میں کیا کروں گی؟''

وہ اوڑھنی کے ٹکڑے سمیٹے گی اور انہیں حسرت سے دیکھے گی۔

وہ کہے گا ''یہ اوڑھنی ہے؟ ایسی اوڑھنی سے تو تم ننگے سر اچھی ہو۔''

''آپ ہوش میں تو ہیں عارف!'' وہ کہے گی اور سکتہ زدہ سی نظر آنے لگے گی۔ تب وہ تکیے کے نیچے سے اوڑھنی والا

Faisal Ahmed

لفافہ نکالے گا۔ نئی چمکدار اور خنی کو اپنے ہاتھوں پر پھیلائے گا اور بڑے پیار سے ثروت کے سر پر پھیلا دے گا۔ وہ اور خنی کی نئی نویلی لیس کو اپنی انگلیوں سے چھوئے گی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر تعجب سے اس کی طرف دیکھے گی۔ اس کے مرجھائے ہوئے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑے گی اور وہ بھاگ کر اس سے لپٹ جائے گی۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن چلا جا رہا تھا، ابھی وہ اکیڈمی کی عمارت سے آدھ فرلانگ دور ہی تھا کہ اس نے اکیڈمی کے چوکیدار نعیم کو دیکھا۔ نعیم ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ پانچ افراد پر مشتمل کنبے کا واحد سہارا تھا۔ غربت اس پر بھی ساون کی بارش کی طرح ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ ابھی چند ماہ پہلے اس نے اپنی چچازاد سے نکاح کیا تھا۔ عارف کو دیکھ کر نعیم کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کے مدقوق جسم کے ساتھ ساتھ اس کی بیساکھی بھی کانپنے لگی۔ ''سر جی! میں آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔'' وہ گھگیایا۔

''کوئی میری بات نہیں سن رہا، کوئی میری مدد نہیں کر رہا۔''

''کیا ہوا نعیم؟'' عارف نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''سر جی! میری گھر والی اسپتال میں ہے۔ اس کو بچہ ہونے والا ہے۔ اس کی حالت رات سے خراب ہے۔ رات بھی ڈاکٹروں نے آٹھ سو روپے کی دوائیاں منگوائی ہیں۔ اب پھر سات آٹھ سو کی دوائیاں مانگ رہے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے پرنسپل جی نے بس دو سو روپیہ دیا ہے۔ دو سو روپے سے کچھ ہونے والا نہیں ہے سر جی! وہ مر جائے گی... خدا رسول کے واسطے میری مدد کریں جی، مجھے پانچ چھ سو روپے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے پیسے لوٹا دوں گا جی۔ میں... ایک پیسا نہیں رکھوں گا...'' وہ بولتا چلا گیا۔

عارف نے نعیم کی پوری بات سنی اور پھر خود کو جیسے ایک

یونیورسل ہوم سروس آپ بھی منگوا سکتے ہیں

صحت

1۔ حب مرچلی + شہد + لیلیانی

مقوی دماغ۔ مقوی معدہ۔ مقوی اعصاب۔ مقوی گردہ۔ عادات بد سے پیدا ہونے والی تمام کمزوریوں کو دور کر کے چہرے کی رونق کو بحال کرتی ہے۔ ہر عمر کے مردوں میں اعضاء کی کمزوری دور کر کے ازدواجی زندگی میں نئے سرے سے اعتماد پیدا کرتی ہے۔ قیمت مکمل کورس (ایک ماہ) بمع سروس چارجز ڈاک خرچ -/760 روپے

کورس نمبر (2) حب مرچلی + قوت کپسول

عام جسمانی کمزوری۔ مثانہ کی گرمی۔ اور قوت خاص کے لئے۔ یہ کورس خاص طور پر ان نوجوانوں کے لئے مفید ہے جو کسی بھی وجہ سے اپنی توانائی ضائع کر چکے ہوں
قیمت مکمل کورس ایک ماہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ -/1100

کورس نمبر (3) جگرین + جوارش زرشک + ملٹی کپسول + دوا الکبد

معدہ اور جگر کی اصلاح کر کے چہرے کی رنگت کو سرخ کرتی ہے۔ جسم کو طاقت ور بناتی ہے۔ ہیپاٹائٹس اے۔ بی اور سی میں مفید اور موثر ہے
قیمت مکمل کورس بمع سروس چارجز ڈاک خرچ -/900 روپے

کتب

1۔ نسائی امراض کی بہترین طاقت
ڈاکٹر جوزف مرنی امراض مخصوصہ مع قیمت سروس چارجز ڈاک خرچ 450 روپے

2۔ آپ بھی ماہر نباض بن سکتے ہیں۔
ایم آر۔ کیمپ میسرز ڈاکٹر اقبال کاردار قیمت سروس چارجز ڈاک خرچ 390 روپے

3۔ لاعلاج بیماریوں کی شفا راہیں
پراسن ٹریسی الملک اشفاق قیمت سروس چارجز ڈاک خرچ 350 روپے

4۔ امراض خاص (بلا علاج غور کیجیے)
پروفیسر ڈاکٹر شہزاد وائی اے بٹ قیمت سروس چارجز ڈاک خرچ 200 روپے

وظائف

نقل بر لیلیٰ سیفی الوداد
یہ عمل بچوں میں چوری۔ نشہ۔ بری عادات۔ کام چوری۔ نافرمانی اور بے روزگاری کیلئے بہت ہی خاص ہے
ہدیہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ 560 روپے

عمل تعلیم
یہ خیال ان بچوں کے لئے ہے جو محنت کے باوجود کامیاب نہ ہوتے ہوں یا خواہش کے مطابق داخلہ لینا چاہتے ہوں ہدیہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ 495 روپے

حل المشکلات
جب بہت سارے کام اور مشکلات درپیش ہوں اور کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس وظیفہ کو 11 دن سے 40 دن تک پڑھنے سے تمام کام بفضل پاک کی رحمت سے آسان ہو جاتے ہیں اور مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوتا ہے ہدیہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ 650 روپے

کشائش رزق کے لئے
یہ وظیفہ رزق میں اضافہ اور برکت کے لئے پڑھی جاتی ہے 11 دن سے پہلے پہلے اللہ پاک کے فضل سے رزق میں فراوانی کے آثار شروع ہو سکتے ہیں ہدیہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ 450 روپے

نصیب کشائی
جن بچوں بچیوں کے رشتے نہ ہوتے ہوں یا جو والدین اپنے بچوں کے رشتوں کے لئے پریشان ہوں صرف 4 دن یہ وظیفہ کریں اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہوگی اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہدیہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ 450 روپے

نجات مشکلات
یہ دعا اللہ پاک کی رحمت سے بڑی سے بڑی مشکل کو حل کر دیتی ہے لیکن یہ دعا اس وقت پڑھی جاتی ہے جب کوئی خاص ضرورت یا مشکل درپیش ہو عام چھوٹی موٹی ضرورت کے لئے یہ دعا نہ پڑھیں
ہدیہ بمع سروس چارجز ڈاک خرچ 788 روپے

اسٹاکسٹ ولید احمد 0321-9420799
فون نمبر 0300-6507997
پوسٹ بکس نمبر 3006 لاہور 042-7013754
ای میل Waleedjan11@yahoo.com

نوٹ: منی آرڈر نام ولید احمد اور V.P بھی منگوا سکتے ہیں۔

Faisal Ahmed

دم ایک دوراہے پر محسوس کیا۔ اس کی جیب میں پانچ سو روپے موجود تھے، لیکن... اس کے سینے میں ایک حسرت بھی موجود تھی۔ آج شام اپنی بیوی کے سر پر ''لیلن'' کی نئی نویلی چادر پھیلانے کی حسرت۔ وہ جانتا تھا کہ نعیم کو واقعی رقم کی اشد ضرورت ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کئی ماہ سے ایک چھوٹی سی خوشی کے لیے ترس رہا ہے۔ آج تو وہ ثروت سے یہ بھی کہہ آیا تھا کہ وہ واپسی پر اسے تھوڑا سا حیران کرے گا...

دفعتاً لب سڑک، نعیم کے سامنے کھڑے کھڑے وہ ایک جاں گسل کشمکش کے کئی مرحلوں سے گزر گیا۔ ایک طرف اپنی ایک شدید ترین ضرورت تھی، دوسری طرف اپنے ہی جیسے ایک مفلوک الحال کی دنیا اندھیر ہو جانے کا خدشہ تھا۔ وہ جانتا تھا، نعیم اپنی نوبیاہتا سے بہت محبت کرتا ہے۔ کشمکش جاری رہی لیکن آخر کار فیصلہ ایک اوڑھنی کے بجائے ایک زندگی کے حق میں ہوا۔ عارف نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے کرتے کی بغلی جیب میں ڈالا اور بوسیدہ بٹوے کے اندر تہ کر کے رکھا ہوا پانچ سو کا نوٹ نعیم کے حوالے کر دیا۔ نعیم کا چہرہ وفورِ تشکر سے متغیر ہو گیا۔ وہ ''اظہارِ تشکر'' بھی کرنا چاہتا تھا مگر کچھ بول نہ سکا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھنے کے لیے اپنی خستہ حال قمیص کا دامن اٹھایا تو وہ کھنچ گیا اور چرر کی آواز سے کئی انچ تک پھٹ گیا۔ ''مفلسی، ایسے ہی بہ زبان حال'' گاہے بگاہے اپنی موجودگی کا اعلان کیا کرتی ہے۔ وجود اور روح کے رگ و ریشے میں اترنے سے بہت پہلے یہ مفلسی لباس میں اترتی ہے۔ کپڑے کے ریشوں میں جگہ بناتی ہے۔ انہیں بے رنگ، بھدا اور کمزور کرتی ہے۔ بالکل ثروت کی اوڑھنی کی طرح۔

اکیڈمی سے فارغ ہونے کے بعد عارف سیدھا گھر واپس آ گیا۔ اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ثروت سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ثروت نے کئی بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر بولی۔ ''آپ جانے سے پہلے کسی ''حیرانی'' کی بات کر رہے تھے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی اور جھلنگا چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بس یہی حیرانی ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ نو دس بجے تک آؤں گا لیکن روزانہ کی طرح آٹھ بجے ہی آ گیا ہوں۔''

وہ زبردستی مسکرائی۔ عارف کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ایسی چوٹیں دل کی دھڑکن کی طرح اس کی سانس کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

شاید بات کچھ اور آگے چلتی تاہم اسی دوران میں دروازے پر دستک ہو گئی... ایک اور چوٹ... عارف ڈرا ڈرا باہر گیا۔ حسبِ اندیشہ دروازے پر ایک قرض خواہ موجود تھا۔ اس کی تلخ ترش سن کر اور اپنی منت سماجت سنا کر وہ پندرہ بیس منٹ بعد اندر آیا تو چھوٹے کمرے میں سے والدہ کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ ثروت نے بتایا کہ سہ پہر سے ان کی طبیعت پھر بگڑ سنبھل رہی ہے۔ عارف نے جا کر دیکھا انہیں تیز بخار ہو چکا تھا۔ چار و ناچار انہیں محلے کے کلینک پر لے جانا پڑا۔ یہ مہینے کے آخری دن تھے۔ ثروت کے پاس دو کلو آٹے اور تین دن کی دال ترکاری کے لیے جو ستر اسی روپے رکھے تھے وہ ماں کی دوا پر اٹھ گئے۔ اس کے باوجود صبح تک ان کی طبیعت پوری طرح سنبھل نہیں سکی۔

گھر میں آج پھر پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ دن ناشتے کے بغیر شروع ہوا۔ حسبِ توقع دس گیارہ بجے تک چھوٹے بچے نے دودھ کے لیے بلکنا شروع کر دیا۔ دوپہر تک بڑا بچہ بھی اس معصوم احتجاج میں شریک ہو گیا۔ ڈھائی تین سالہ بچہ آخر کہاں تک اپنے ماں باپ کی مجبوری سمجھ سکتا ہے۔ عارف اور ثروت اس احتجاجی صورتحال کے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن کچھ بھی تھا، پتھر تو نہیں تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کے اپنے دل بھی رونے لگتے تھے اور خاص طور پر ماں کا دل تو ایسے موقعوں پر واقعی خون ہونے لگتا ہے۔ بچے کی بھوک اور ماں کے دل کے درمیان ایک ایسا جبلی ناتا ہے جس کی مضبوطی اور طاقت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اس نے بڑے بچے کو جھنجوڑا اور روتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا کروں۔ یہ لو مچھری... اور میری بوٹیاں کاٹ کر کھا لو۔''

عارف جانتا تھا، وہ بڑے صبر والی ہے۔ لیکن موسموں کی پیہم سختیاں تو پہاڑوں کو بھی مسمار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

ایسے موقعوں پر وہ کان لپیٹ کر باہر نکل جاتا تھا۔ اس دن بھی نکل گیا۔ اکیڈمی کا وقت شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ وہ آدھ پون گھنٹا ایک پارک میں گھومتا رہا۔ پھر سستے ہوئے قدموں سے اکیڈمی کی طرف چل دیا۔ راستے وہی ہوتے ہیں، مسافر بھی وہی لیکن دلوں کی کیفیتیں بدل جاتی ہیں۔ کل وہ اسی راستے پر چلتے ہوئے کتنا خوش تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوش رنگ اوڑھنی سمائی ہوئی تھی لیکن آج صورتِ حال بہت مختلف تھی۔ وہ پرنسپل سے (جو اکیڈمی کا مالک بھی تھا) ایڈوانس مانگنے کا سوچ رہا تھا، حالانکہ ایک مہینے کی تنخواہ پہلے ہی اس پر چڑھی ہوئی تھی۔

اکیڈمی پہنچنے کے بعد اسے تھوڑی سی راحت نصیب

Faisal Ahmed

ہوئی۔ اسے پتا چلا کہ چوکیدار نعیم ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے اور اس کی بیوی کی حالت بھی اب بہتر ہے۔

وہ سر جھکا کر درس و تدریس کے کام میں لگا رہا اور ساتھ ساتھ پرنسپل سے ایڈوانس مانگنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈتا رہا۔ سات بجے کے لگ بھگ اس کے ایک محلے دار نے اکیڈمی میں فون کیا اور اسے بتایا کہ اس کے گھر کے سامنے جھگڑا ہو رہا ہے۔ قرض خواہ..... نے ہنگامہ مچایا ہوا ہے اور گھر کی چیزیں اٹھالے جانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

عارف کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے اسی وقت چھٹی لی اور ایک ساتھی ٹیچر سے پچاس روپے ادھار پکڑ کر بذریعہ وین گھر پہنچا۔ عجلت کے باوجود گھر پہنچتے پہنچتے اسے تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ اس وقت تک ہنگامہ سرد ہو چکا تھا۔ گلی میں اس کے گھر کے سامنے بس دو چار پڑوسی ہی موجود تھے۔ انہوں نے عارف کو تسلی دی اور بتایا کہ انہوں نے کہہ سن کر قرض خواہ اور اس کے ساتھیوں کو واپس بھیج دیا ہے۔

عارف کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ثروت کی حالتِ زار کا ''تصور'' اسے خون کے آنسو رلانے لگا۔ چند منٹ پڑوسیوں کے پاس ٹھہر کر وہ گھر کی طرف بڑھا۔ ابھی دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ اسے اپنی والدہ کے چلانے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ وہ کمرے کا اندرونی دروازہ پیٹ رہی ہیں۔ عارف دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا جو کچھ اس نے دیکھا وہ اسے پتھر کرنے کے لیے کافی تھا۔ والدہ کمرے کا آہنی دروازہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ دہائی دے رہی تھیں۔ ''ثروت... ثروت... دروازہ کھول۔'' دونوں بچے دروازے کے عین سامنے رو رہے تھے۔ عارف کو دیکھ کر والدہ نے اپنی چھاتی پیٹی اور پکار کر بولیں۔ ''عارف... دیکھ اس نے کچھ کرلیا ہے، دیکھ اس کو۔''

عارف بھی دروازے پر جھپٹا اور اس کی آہنی چادر کو زور زور سے بجانے لگا۔ پھر اس نے چوکھٹ اور پینل کے درمیان ایک باریک درز سے آنکھ لگائی۔ اس کی رگوں میں خون منجمد ہوگیا۔ بلب کی زرد روشنی میں اس نے ثروت کو دیکھا، وہ پنکھے کے ساتھ جھول رہی تھی۔ اس کے گلے میں وہی لیس دار اوڑھنی تھی۔ اس کا پورا جسم جاں کنی کے عالم میں جھٹکے کھا رہا تھا۔

''ثروت... ثروت۔'' عارف دیوانہ وار چلایا اور پوری طاقت سے دروازے کو دھکیلنے اور توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ آہنی چادر کے دروازے کو اندر سے دو آہنی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے صحن سے ایک اینٹ پکڑی اور اس کنڈی والی جگہ پر اندھا دھند ضربیں لگانے لگا۔

اسی دوران میں کئی ''پڑوسی مرد و زن'' بھی صحن میں پہنچ گئے۔ چھوٹی سی چار دیواری میں کہرام مچ گیا۔ ''بڑی ہتھوڑی لاؤ'' کوئی شخص پکار کر بولا۔

''مل کر دھکا دو۔'' ایک اور شخص چلایا۔

عارف کی آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ اسے لگا وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ اس نے ایک دیوار کا سہارا لیا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ مغربی افق پر ہلکی سی سرخی تھی۔ عارف کی والدہ سو رہی تھیں۔ عارف اپنے ہاتھ سے بڑے بچے کو چاول کھلا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ تھوڑے سے چاول انگلیوں میں مسل کر چھوٹے بچے کے منہ میں بھی ڈال دیتا تھا۔ اسی دوران میں ثروت اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں دودھ سے بھری ہوئی بوتل تھی۔ یہ بوتل اس نے چھوٹے بچے کے منہ سے لگا دی، اور عارف کے قریب بیٹھ کر بڑے بچے کا منہ چومنے لگی۔ اب وہ دونوں خوش تھے۔ دو تین روز پہلے مقامی ناظم اور پریس والوں کی مداخلت سے عارف کو اپنی ڈوبی ہوئی چار لاکھ کی رقم بھی یکمشت مل چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت کچھ بدل گیا تھا ان کے اردگرد۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے اس شام ثروت کی زندگی کیسے بچی؟ ثروت کی زندگی اسی بوسیدہ اوڑھنی کی وجہ سے بچی جس کے ہر ہر تار میں ''غربت'' سمائی ہوئی تھی۔ ہاں انسانی جسم کے رگ و ریشے میں اترنے سے پہلے یہ ''غربت'' لباس میں اترتی ہے۔ کپڑے کے ریشوں میں جگہ بناتی ہے۔ انہیں بے رنگ، بھدا اور کمزور کرتی ہے اور کمزوری و ناتوانی ہمیشہ تو نقصان دہ نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی یہ بے حد مفید بھی ثابت ہوتی ہے۔ جیسے ہر بری چیز کے اندر کوئی پہلو اچھائی کا بھی چھپا رہتا ہے۔ بقول شاعر مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں...

ثروت کی اوڑھنی اس کے تڑپتے بدن کا وزن سہار نہیں سکی تھی۔ کھچ کر پھٹ گئی تھی... اور ثروت دروازہ ٹوٹنے سے بہت پہلے فرش پر گر گئی تھی۔

شاید ہم تھوڑی سی رعایت کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں... اس روز عارف نے سرِ راہ پانچ سو روپے قربان کر کے چوکیدار کی بیوی کی نہیں، اپنی بیوی کی جان بچائی تھی۔



رائیگاں مسافتیں

طاہر جاوید مغل

ایک بار دیکھنے کے بعد وہ اسے کبھی نہیں بھولا، دل کے نہاں خانے میں اس کی تصویر سجائے اسے ڈھونڈتا ہی رہا اور بالآخر اس تک پہنچ گیا مگر ۔۔۔ یہ وہ بھی ہوتا ہے کبھی دور سے آنے والا ۔۔۔ پاس آتے ہوئے دور چلا جاتا ہے۔ مسافتیں رائیگاں ہی جاتی ہیں

اس مسافر کی کہانی جس نے نیک نامی کے لیے استعفیٰ دیا تھا

پرویز عرف جی آج بہت خوش تھا۔ بات تھی بھی خوش ہونے کی۔ انہوں نے ٹھیک ٹھاک ہاتھ مارا تھا۔ وڈیو سینٹر سے ایک وڈیو کیمرا، دو ٹیپ ریکارڈر اور تین وی سی آر ہاتھ لگے تھے۔ سچ کچھ نہیں تو یہ پچاس پچپن ہزار کا مال ضرور تھا۔ مال کو ٹھکانے کے تہہ خانے میں ٹھکانے لگانے کے بعد جی اور اس کے دونوں دوست مراد اور شکور ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ وہ کچھ دیر آج کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ پھر آئندہ کی منصوبہ بندی کرنے کے بعد لیٹ گئے۔ شکورے اور مراد کو جلد ہی نیند آگئی لیکن جی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایسے موقعوں پر اکثر اس کا ذہن انتشار کا شکار رہتا تھا۔ چوری چھوٹی ہو یا بڑی کم از کم دو راتوں کے لئے جی کی نیند اڑ جاتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ اکتا کر نیچے تہہ خانے میں گیا اور ایک مسروقہ وی سی آر اوپر اٹھا لایا۔ ۲۴ انچ کے رنگین ٹیلیویژن میں لیڈ لگانے کے بعد سوئچ آن کر کے اس نے ایک انڈین فلم کی کیسٹ وڈیو میں داخل کرنا چاہی تو پتا چلا کہ اس میں پہلے سے ہی ایک کیسٹ موجود ہے۔ یونہی کیسٹ چیک

کرنے کے لئے اس نے بلے کا بٹن دبادیا اور صوفے پر بیٹھ کر اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ جلدی تصویر نمودار ہوئی۔ یہ کسی شادی کی فلم تھی۔ ایٹن کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ کسی امیر گھرانے کے لوگ لگتے تھے۔ رنگ برنگے لباس پہنے' خوبصورت لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ کچھ لوگ گھر چکتی پھر رہی تھیں۔ ہر طرف حسن' خوشبو اور رنگوں کی بہار تھی۔ یوں ہی دل بہلاوے کے لئے جگی فلم دیکھنے لگا۔ ایٹن کے بعد مہندی کی رسم ادا ہوئی اور پھر شادی کا سین آگیا۔ ان تمام تقریبات میں۔۔۔ دراز قد اور لمبے بالوں والی ایک لڑکی بار بار نظر آرہی تھی۔ شربتی آنکھیں۔ ترشے ہوئے ہونٹ' صراحی دار گردن اور سراپا دلکش۔ ہر لباس دلنشیں۔ جب بھی اس کا چہرہ اسکرین پر دکھائی دیتا جگی کے دل سے ایک ہوک سی اٹھ جاتی کیونکہ نامعلوم لڑکی ان تقریبات کی "جانِ محفل" تھی۔ ہر کام میں آگے آگے' ہر موقع پر پیش پیش۔ کبھی دلہن سے سرگوشیاں کر رہی ہے' کبھی گیت گا رہی ہے' کبھی مہمانوں کو مشروبات پیش کر رہی ہے اور کبھی بڑی بوڑھیوں کے ساتھ اہم مشوروں میں مصروف ہے۔ شادی کے روز' نکاح کے بعد اور رخصتی سے پہلے فلم اچانک ختم ہوگئی۔ جگی کو اس بات پر حیرانی ہوئی۔ بات تھی بھی حیرانی کی۔ ابھی تو کئی رسومات باقی تھیں اور پھر اگلے روز ولیمے کی تقریب بھی ہونا تھی۔ جگی نے مزید فلم چلا کر دیکھی لیکن اس کے بعد کوئی منظر اسکرین پر نہیں آیا۔ آخر وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید فلم کو کسی دوسری کیسٹ سے اس کیسٹ پر منتقل کیا جارہا تھا اور ابھی منتقلی کا یہ کام ادھورا تھا کہ وہ وی سی آر چرا کر یہاں لے آیا۔ اس فلم میں مذکورہ لڑکی کے کردار نے جگی کے دل پر بے پناہ اثر کیا۔ وہ دیر تک اس نامعلوم لڑکی کے حسین تصور میں کھویا رہا۔ اس رات صبح ہونے تک جگی نے وہ فلم کم از کم تین بار دیکھی۔ اور یہ صرف شروعات تھیں' اس ندیدے پن کی جس کا اظہار آئندہ دنوں میں جگی کی طرف سے ہوا۔

ایک ہفتے کے اندر پرویز عرف جگی کو اس فلم کا ایک ایک سین ازبر ہوگیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس پورے خاندان اور اس کے ایک ایک فرد کی عادات کو جاننے اور سمجھنے لگا ہے۔ اور اس عجیب و غریب' غائبانہ تعلق کی واحد وجہ وہ حسینہ دلنواز ہی تھی جو پہلے روز جگی کے ہوش و حواس پر بجلی گرا گئی تھی۔ جگی کوئی ایسا مقفل کمپ بھی نہیں تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور رنگ رنگ کے لوگ دیکھے تھے۔ عورت اس کے لئے پہیلی تھی اور نہ حسن ہی کوئی معما۔ گو اس کی عمر بائیس سال تھی مگر وہ سیکڑوں بار ان چیدہ دقیم سے گزر کر ان گتھیوں کو سلجھا چکا تھا۔

وہ شہر کے مضافات میں ایک پکی' گندی اور نشیبی بستی کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ نے ساری عمر "تخت" پر گزاری تھی۔ گرمیوں میں وہ اس تخت پر برف رکھ کر بیچتا تھا اور سردیوں میں پھل لگا لیتا تھا۔ جگی اس بستی کا سب سے لائق بچہ تھا۔ اس نے نہ صرف دس جماعتیں پاس کی تھیں بلکہ سال ڈیڑھ سال کالج کی ہوا بھی کھائی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی "لیاقت" اس کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔ اس کا غصیلا باپ ایک خریدار کے پیٹ میں برف توڑنے والا سوا گھونپنے کے جرم میں دو سال کے لئے جیل جاتے وقت جگی کو تخت نشین کر گیا تھا تاکہ وہ برف بیچ کر اپنا اور بہن بھائیوں کا پیٹ پال سکے۔ برف بھی بھلا کسی کو زندگی دے سکتی ہے؟ وہ تو ویرانی اور موت کی علامت ہے۔ جگی کو اس کا احساس تھوڑے ہی دنوں میں ہوگیا تھا۔ ان کے قریب ہی سائیسوں کی جھونپڑیاں تھیں۔۔۔ سائیسوں کے لڑکے اکثر اس کے پاس اٹھتے بیٹھتے تھے۔ انہی میں ایک کا نام مرلو اور ایک کا شکورا تھا۔ وہ دونوں خاندانی چور تھے اور بڑے فخر سے اپنے پیشے کے بارے میں اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کی آمد و رفت کے دوران نہ جانے کس گھڑی جگی کے دل میں ایک چور دروازہ چپکے سے کھل گیا۔ ان کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں بھی ایک بڑا اور قابل چور بننے کی امنگ پیدا ہوگئی۔۔۔ اور پھر خربوزوں کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا چلا گیا۔

اب وہ ایک تجربہ کار چور تھا۔ اس کے ساتھی اس کی تجربہ کاری اور ہوشیاری کا اعتراف کرتے تھے۔۔۔ مگر پچھلے کئی روز سے وہ بھی الجھن کا شکار تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جگی یہ کیا پاگل پن کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے' لڑکی خوبصورت اور دل موہ لینے والی تھی مگر یوں اس کا گرویدہ ہو کر آٹھوں پہر آہیں بھرنا کہاں کی عقلمندی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی؟ کس شہر کی رہنے والی تھی' شادی شدہ تھی کہ غیر شادی شدہ؟ اور اگر وہ اسے مل بھی جاتی اور اس کے تمام حالات جگی کے موافق بھی ہوتے تو۔۔۔ پھر بھی کیا ہوتا تھا۔ کیا وہ جگی کی دسترس میں آجاتی؟ اسے دیوانے کا خواب ہی کہا جاسکتا تھا۔ کہاں وہ نیچ ذات کا چور' کہاں وہ اعلیٰ خاندان کی شریف زادی۔ حرام خوری' حرام خور کے چہرے پر لکھی جاتی ہے۔ وہ کتنے بھی نقاب ڈال لے' پہچاننے والی آنکھ پہچان جاتی ہے۔ لب و لہجہ' چال ڈھال' اطوار و انداز' ہر بات چغلی کھاتی ہے کہ کون کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ وہ شریف زادی تو شاید جگی پر دوسری نظر بھی ڈالنا پسند نہ کرتی۔۔۔ اور یہ عاشق نامراد تھا کہ ہر وقت ٹانگیں پسارے وی سی آر میں اس کی کیسٹ لگائے بیٹھا رہتا تھا اور شاید خیالِ یار میں گم رہنے ہی کو حاصلِ زندگی سمجھ رہا تھا۔

آخر ایک دن وہی ہوا جس کا شکورے اور مرلو کو خطرہ تھا۔

جی نے ان دونوں کو بلایا اور سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا "یارو! اس لڑکی کو ڈھونڈنا ہے۔"

شکورے نے ٹھنڈی سانس بھری "استاد رحم کر۔ اپنے اوپر بھی اور ہمارے اوپر بھی۔ کیوں دکھری لائن پکڑلی ہے تو نے؟ ہم جیسوں کو ایسے دھندوں میں کچھ ملنے والا نہیں ہوتا۔"

حالانکہ شکورا اور مراد سینئر چور تھے مگر وہ اب جی کو استاد کہتے تھے اور واقعی اس نے خود کو استاد ثابت کرکے دکھایا تھا۔ جی نے ان دونوں کو کھاجانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"دیکھو' میں تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ جب تک میرے دل کو سکون نہیں آئے گا' میں کوئی کام نہ کرسکوں گا۔ اگر کروں گا تو غلط کروں گا اور اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی چھتر کھلاؤں گا۔ تم نے سنا ہی ہوگا' جان ہے تو جہان ہے... اور میری جان اس وقت سخت شکنجے میں ہے۔"

مراد نے مسکین لہجے میں کہا "استاد جی! لگے ہاتھ ذرا یہ بات بھی کھول دو کہ تمہاری جان کو سکون ملے گا کیسے؟ صرف اس لڑکی کو دیکھ کر یا میل ملاقات کرکے... یا پھر شادی ولدی اور بچوں وچوں کا ارلوہ ہے... میرا مطلب ہے' کچھ تو پتا چلے کہ کتنا بخار ہے؟"

جی نے مراد کو ایک شاندار گالی دی۔ پھر اچانک اس کی پسلیوں میں ٹانگ جو ماری تو وہ اچھل کر مسہری سے نیچے جا گرا۔ جی کی دوسری ٹانگ اس کے بھدے چہرے پر پڑتی لیکن اس نے چوکسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ٹانگ بازوؤں میں جکڑلی۔ جی دوسری ٹانگ سے اس کے ہاتھوں کو رگید کر پنڈلی چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر مراد نے ٹانگ چھوڑ کر اپنی عافیت کو خطرے میں نہیں ڈالا۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان یہ دلچسپ کشمکش جاری رہی پھر مراد اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ کمرے میں موجود ہنسی مذاق کی فضا ختم ہوگئی تو جی نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے' میں تم لوگوں کے لئے پریشانیاں پیدا کررہا ہوں۔ مگر سچ پوچھو تو مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ شاید میں تم لوگوں کے کسی کام کا نہیں رہا۔"

شکورے نے اسے سنجیدہ ہوتے دیکھا تو چہک کر بولا۔ "استاد! اتنی مایوس شکل تو نہ بناؤ۔ کون سا کسی کی آنکھ سے کاجل چرانا ہے' ایک لڑکی ہی ڈھونڈنی ہے نا شہر میں... ڈھونڈ لیں گے۔ کہاں جائے گی ہم شکروں سے بچ کر؟"

مراد نے کہا "ہم دولت کے چور... وہ دل کی چور۔ ہیں تو دونوں چور ہی پہچان لیں گے اس چورنی مورنی کو..."

لیکن اگلے دو ہفتوں میں شکورے اور مراد کے تمام دعوے غلط ثابت ہوئے۔ وہ نامعلوم لڑکی کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ جی ان دونوں کو موردِ الزام کیا ٹھہراتا' وہ خود بھی سر توڑ کوشش کے باوجود کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا۔ ان تینوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہاتھ پیر چھپا کر کام کرنا چاہتے تھے۔ صرف چند روز پیشتر انہوں نے ایک زبردست

ماہنامہ صبا نو کراچی

رنگا رنگ سالنامہ ۱۹۹۱ء شائع ہوگیا ہے

اس شمارے میں

- دلچسپ تصویری فیچر مع ۲ لڑکیاں کراچی عجائب گھر میں بت بن گئیں۔
- میں اب ٹی وی پر کام نہیں کروں گی رانی کا تفصیلی انٹرویو۔
- خواجہ خورشید انور سے متعلق ہے عظیم الحق کی دلچسپ باتیں
- رقص کے بہتے گھنگروؤں کی کہانی۔ آرٹ اور بزنس کا فرق جاننے کیلئے شیما کرمانی، نائلہ صدیقی اور نگہت چودھری کے مفصل انٹرویو پڑھیے۔
- فائزہ حسن کی شادی کا مسئلہ۔
- ۹۱ء پاکستانی اور انڈین فنکاروں کیلئے کیا لے کر آئے گا کیا لے جائے گا؟
- انیتا ایوب اور عنبر ایوب کے نئے روپ سروپ۔
- ۹۰ء کے تمام اسکینڈلز کی رپورٹ۔
- شگفتہ اعجاز کی نئی سج دھج۔
- امیتابھ نئی کلیوں کے نئے مہک ہے۔

اس کے علاوہ

تمام جیلانی، امتیاز شیخ، سفال الدائم، جمیل شیخ، اظہار قاضی۔ امجد رانا، افراز گردیزی، شگفتہ بخاری کے انٹرویوز اور مضامین پاکستانی ہندوستانی خبروں کا اچھا بازار، ہندوستان کی ڈائری نئی معلومات ویڈیو راما۔ نئی فلموں کی تازہ رپورٹ اور ریکھا کا نیا انٹرویو۔ اس شمارے میں شامل ہے۔

ایک اور فائدہ

ہر مہینے ہزاروں پڑھے کے نعمانات دلچسپ انعامی سلسلوں میں حصہ لیکر نہایت آسانی سے حاصل کرسکتے ہیں یقیناً یہ سب جاننے کے بعد آپ بھی رابطہ کرنا چاہیں گے۔ فون نمبر ۴۲۱۷۷۸

رابطہ: ماہنامہ صبا نو ۲/۱۱/۲ گلشن اقبال بلاک ۱۳ گلشن اقبال روڈ کراچی

ہاتھ مارا تھا اور سنتاہی تھانے کی پولیس ابھی تک جلے پاؤں کی بلی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی کا سراغ انہیں اس وڈیو سینٹر سے مل سکتا تھا جہاں سے انہوں نے فلم چرائی تھی۔ ظاہر ہے سینٹر والے شادی بیاہ کی فلم بندی بھی کرتے تھے۔ اور یہ فلم اسی سلسلے میں وہاں پڑی ہوئی تھی۔ شاید ڈبنگ وغیرہ کا کام ہو رہا تھا۔ یقیناً وڈیو سینٹر والا بتا سکتا تھا کہ اس نے یہ فلم کہاں جا کر بنائی تھی۔ ایک دفعہ شادی والے گھر کا پتا معلوم ہو جاتا تو پھر کسی طرح اس ماہ جبیں کا سراغ بھی لگایا جا سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وڈیو سینٹر کا مالک اور اس کا کاریگر دونوں حوالات میں تھے۔ مال مسروقہ کے مالکان میں سے کسی نے ان پر الزام لگا دیا تھا کہ لوگوں کی اشیاء ہضم کرنے کے لئے انہوں نے خود ہی چوری کا ڈھونگ رچایا ہے۔ مستقبل قریب میں ان دونوں کے چھوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وڈیو سینٹر کو پولیس نے مقفل کر رکھا تھا اور وہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ مطلوبہ لڑکی کا کھوج لگانے کے لئے ان تینوں میں سے کوئی حوالات میں جا کر حوالاتیوں سے ملاقات کرے اور ان سے پوچھے کے بتاؤ صاحبان 'کہاں جا کر تم نے اس فتنہ سامان کی فلم بنائی تھی۔ اب لے دے کے ایک ہی کام رہ جاتا تھا کہ دونوں حوالاتیوں کی ضمانتیں ہونے کا انتظار کیا جائے۔

اس دوران شکورے اور مراد نے ایک اور مشغلہ ڈھونڈ لیا۔ ۔ شادی کی فلم کے شروع میں اس کا ٹائیٹل بھی تھا جس پر شادی کی تاریخ اور دُلہا دُلہن کے نام بھی دیئے ہوئے تھے۔ دُلہا کا نام آفتاب قریشی اور دُلہن کا فوزیہ قریشی تھا۔

اس سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ قریشیوں کی کوئی شادی تھی۔ جو تقریباً تین ہفتے پہلے بعد از شام انجام پائی تھی۔ اسی علاقے میں کہیں دُلہن یا پھر دُلہا کا گھر موجود تھا۔ عام طور پر ویڈیو فلم دُلہا والے بنواتے ہیں 'اس لئے زیادہ امکان یہی تھا کہ اس علاقے میں دُلہا کا گھر ہو گا۔ یہ نتائج اخذ کرنے کے بعد مراد اور شکورے نے کسی ایسی قریشی فیملی کا کھوج لگانا شروع کر دیا جن کے ہاں پچھلے دنوں شادی کی تقریب ہوئی ہو۔ لیکن یہ کوشش بھی دوسری کوششوں کی طرح لاحاصل اور رائیگاں ثابت ہوئی۔ پھر اسی دوران انہیں ایک دوسری حوصلہ شکن اطلاع ملی۔ وڈیو سینٹر کے مالک اور اس کے کاریگر کی ضمانتیں نہیں ہو سکی تھیں۔ کیونکہ دورانِ تفتیش وہ قتل کے ایک پرانے کیس میں ملوث ہو گئے تھے اور اب ان کا جلد باہر آنا بعید از قیاس تھا۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر پرویز مجی نے ایک عاشق نامراد کی طرح طویل اور سرد آہ بھری اور پھر وہی کیا جو ایسے موقعوں پر بعض نامراد عاشق کیا کرتے ہیں۔ یعنی وہ دو تین روز تک نشے میں مدہوش سگریٹ پھونکتا رہا اور ایک چمکیلے چہرے کو شعور کے آتش کدے سے تحت الشعور کے سرد خانے میں دھکیلتا رہا۔ پتا نہیں 'وہ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں لیکن چوتھے روز جب اس نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور دوستوں کے ساتھ ایک نئی پنجابی فلم دیکھی تو کافی بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔

☆○☆

قریباً ایک سال بعد کی بات ہے 'ان دنوں مجی اور اس کے دوسرے ساتھی راولپنڈی میں مصروفِ کار تھے۔ وہ دسمبر کی ایک نہایت سرد اور تاریک رات تھی۔ انہوں نے ایک کوٹھی میں کامیاب واردات کی۔ نقدی 'زیورات اور چند ہلکی پھلکی قیمتی اشیاء کی صورت میں پچاس ساٹھ ہزار کا مال ہاتھ آیا۔ مراد کوٹھی سے کچھ فاصلے پر پک اپ لئے تیار کھڑا تھا۔ شکور اور مجی کوٹھی کی عقبی چار دیواری پھلانگ کر بھاگتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہوئے اور پھر اپنی پک اپ تک پہنچ گئے۔ وہ ہانپتے ہوئے اندر گھسے اور مراد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چند لمحے انہیں سانس درست کرنے میں لگے۔ مجی محسوس کر رہا تھا کہ شکورے کا سانس کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوا تھا۔ شاید اس کی کسی سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ مجی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

"استاد! آج تو کمال ہی ہو گیا۔"

"کیا ہوا؟"

شکورے نے سخت سردی میں ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

"تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جس کی کیسٹ تم دو ہفتے تک مسلسل دیکھتے رہے تھے ...؟"

"ہاں" مجی نے چونک کر بے ساختہ کہا۔

شکورے نے کہا "وہ ادھر کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر سوئی ہوئی تھی۔"

مجی کچھ دیر حیرت سے شکورے کی طرف دیکھتا رہا۔

پک اپ کی اندرونی 'مدھم روشنی میں اس کی آنکھوں میں جیسے چراغ سے جلنے لگے تھے لیکن ان چراغوں کی روشنی پر بے یقینی کی دھند بھی منڈلا رہی تھی "تم ... تم نے اچھی طرح دیکھا تھا؟"

شکورے نے کہا "کیا بات کرتے ہو استاد! چور کی آنکھ ہے ... کوئی پولیس والا نہیں ہوں میں۔ کمرے میں نیلا بلب جل رہا تھا۔ مسہری کے برابر کی ٹیبل سے دو جھپکے اٹھائے ہیں میں نے۔ ... لڑکی مجھ سے ایک فٹ کی دوری پر مدہوش پڑی تھی۔ ایک ممکن صورت ہے کہ میرا تو دل "ایماندار" ہونے لگا۔ جھپکے بھول کر میں اسی کو دیکھتا چلا گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے 'عورت ذات مرد کو راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔"

مجی نے اپنی اندرونی مسرت چھپاتے ہوئے شکورے کو غصیلی نظروں سے گھورا۔ پھر لوہر تلے سگریٹ کے کئی کش لے کر اس سے واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگا۔

بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ پرانے درد پھر جاگ گئے تھے۔ بھولی بسری سب چوٹیں یاد آنے لگی تھیں۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی جگی نے صندوق میں سے پھر وہی کیسٹ نکال لئے ہر وقت وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس وی سی آر نہیں تھا لہٰذا یوں ہی کیسٹ کو ہاتھوں میں پکڑ کر عجیب سے انداز میں دیکھتا رہا۔ اس کی ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹوٹوں کا انبار لگ چکا تھا۔ شام کو وہ نئے کپڑے پہن کر موتع واردات کی طرف چلا گیا اور رات گئے تک اس کوٹھی کے ارد گرد منڈلاتا رہا۔ اس کی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ کوئی نو بجے شب ایک سفید سوزوکی کار کوٹھی کے کیٹ میں داخل ہوتی نظر آئی۔ جگی اس سفید کار کی کھڑکی میں اس چہرے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہا جس نے اسے اب تک ہزار رنگ سے ستایا اور تڑپایا تھا... جس نے اسے خیالوں میں پریشان کیا تھا اور خوابوں میں آبلہ پا دوڑایا تھا۔

ٹھیک دو روز بعد رات کے ایک بجے جگی بغل میں ایک گٹھری دبائے کوچۂ جاناں کے پھیرے لگا رہا تھا۔ اس گٹھری میں وہ تمام سامان موجود تھا جو اس نے اپنی محبوبہ کے گھر سے چرایا تھا۔ خاصی کوشش کے بعد وہ کوٹھی کے عقب میں پہنچ سکا۔ پھر کچھ فاصلے سے اس نے باؤلنگ کرائے کے انداز میں گٹھری گھما کر کوٹھی کے صحن میں پھینک دی۔ گٹھری گرنے کی تدھم آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی۔ اس آواز کے بعد ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔ کوٹھی کے اندر یا باہر کسی قسم کی کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ جگی کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ خود بھی دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ معمولی کوشش کے بعد اسے صحن میں گٹھری نظر آگئی۔ گٹھری دوبارہ اٹھانے کے بعد وہ کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا اور بے انتہا مہارت اور چالاکی کے ساتھ دو جالی دار دروازے کھولتا ہوا رہائشی حصے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اسے ایک بند دروازے کے تالے سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس نے جیب سے ایک مڑا تڑا تار نکالا اور پانچ منٹ کی کوشش کے بعد یہ دروازہ بھی کھول لیا۔ ایک تاریک راہداری میں چند قدم چلنے کے بعد اس نے خود کو نیلگوں نائٹ بلب والی خوابگاہ میں پایا۔ اس کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں اور دل وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ وہ سانس روکے دیکھتا چلا گیا۔ اس کے خوابوں کی شہزادی چند قدم کے فاصلے پر بے خبر سو رہی تھی۔ ململی لحاف کا کنارا اس کے سینے سے سرک کر گداز پیٹ کے نشیب میں آ ٹھہرا تھا۔ بالوں کی دو پریشان لٹیں اس کے رخساروں اور ہونٹوں کو چوم رہی تھیں۔ کتنی پاکیزگی اور معصومیت تھی اس کے چہرے پر۔ ڈبل بیڈ پر ایک دوسرا جسم بھی موجود تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اور شاید لڑکی کی ماں تھی۔ اس کی سو دانوں والی تسبیح ابھی تک ایک کلائی میں لپٹی ہوئی تھی۔ دو تین گز کے فاصلے پر ایک اور شخص سو رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا یہ ایک بزرگ سورت شخص تھا۔ بزرگ گہری نیند سو رہا تھا جس کا اندازہ اس کے مدھم خراٹوں سے ہوتا تھا۔ اس کے تکیے کا ابھار دیکھتے ہی جگی سمجھ گیا کہ اس کے نیچے بھرا ہوا ریوالور موجود ہے۔ یقینی بات تھی کہ ان احتیاطی تدابیر کا سبب وہ واردات ہی ہے جو چند روز پہلے جگی اور اس کے ساتھیوں نے کی تھی۔

جگی کچھ دیر دروازے میں گم صم کھڑا اہل خانہ کے خوابیدہ چہرے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا داہنا ہاتھ جیسے خود بخود اپنی چرمی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھ گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک نیلا رومال نکالا۔ اس نیلے رومال کے اندر کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ بڑی احتیاط سے اس نے رومال کو کھولا۔ مدھم روشنی میں ایک چھوٹی سی شیشی چمکنے لگی۔ قریباً ساٹھ ملی لیٹر کی اس شیشی میں کوئی محلول ہلکورے لے رہا تھا۔ جگی نے بڑے دھیان کے ساتھ یہ محلول رومال پر چھڑکا۔ پھر آگے بڑھ کر رومال خوابیدہ شخص کی ناک پر رکھ دیا۔ خوابیدہ شخص ذرا سا کسمسایا۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کے خراٹوں کا آہنگ بدل گیا۔ اب اس کی آواز دھیمی اور پست ہو گئی تھی۔ جگی نے ایک دو بار اسے ہلا کر دیکھا پھر مطمئن ہو کر عورت کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اسے بھی کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر چکا تھا۔ بوتل کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر کے اس نے کلوروفارم جیب میں رکھ لیا۔ یہ کلوروفارم اسے ایک واردات میں ہی ملا تھا۔ وہ اس محلول کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا لہٰذا خاص خاص موقعوں پر ہی اسے استعمال کرتا تھا۔ مرد و عورت کو بے ہوش کرنے کے بعد اس نے کوٹھی کے مختلف کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ حسب سابق گھر میں ان تینوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ مطمئن ہو کر وہ خوابگاہ میں واپس چلا آیا۔ اس نے مسروقہ سامان والی گٹھری اٹھا کر لڑکی کے پیروں میں رکھ دی۔ پھر سرہانے کھڑا ہو کر بڑی محویت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اسی محویت کے عالم میں گھٹنے ٹیک کر وہ لڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور شدت کی لرزاں انگلی سے اس کی زلفوں کو رخساروں اور ہونٹوں سے پیچھے ہٹانے لگا۔ اس کی انگلی کو جیسے ان زلفوں سے بھی رقابت محسوس ہو رہی تھی۔ زلفیں اپنے مقام پر پہنچ گئیں تو اس کی بے قرار انگلی لڑکی کے عارض پر گردش کرنے لگی۔ اسی وقت لڑکی نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ چند انچ کے فاصلے پر ایک اجنبی مرد کا چہرہ دیکھ کر اس کی پتلیاں پھیل گئیں پھر میکانکی انداز میں اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ منہ کھول کر پوری قوت

سے چیخ "جی کا مضبوط ہاتھ اس کے ہونٹوں کو ڈھانپ چکا تھا۔ لڑکی کی چیخ ایک سنسناہٹ کی صورت جی کی ہتھیلی میں ڈوب کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ کرنے میں جی کو بالکل دقت پیش نہیں آئی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ لڑکی کے اس ردعمل کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ لڑکی پر ہسٹیریا کا پہلا شدید حملہ گزر گیا تو وہ اردگرد کے حالات کو سمجھنے لگی۔ جی نے اپنے پُرخلوص لہجے میں اسے باور کرادیا کہ وہ اسے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور اگر وہ اس کی چند باتیں سن لے تو وہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا۔ لڑکی اس کی توقع سے زیادہ سمجھدار اور باہمت نکلی۔ اس نے سر کی جنبش سے جی کو بتایا کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق شور نہیں کرے گی۔ مطمئن ہونے کے بعد جی نے آہستگی سے ہاتھ اس کے ہونٹوں سے ہٹالیا۔ جی نے صاف گوئی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ وہی چور ہے جس نے چند روز پہلے انہیں نقدی و زیورات سے محروم کیا تھا۔ پھر اس نے پائنتی میں رکھی گٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں آپ کا مال لوٹانے آیا ہوں۔ میں یہ گٹھڑی صحن میں ہی پھینک کر چلا جانا چاہتا تھا... مگر پھر خیال آیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ لہٰذا بہتر سمجھا کہ آپ کا مال آپ کے سپرد کر کے جاؤں۔"

لڑکی کی آنکھوں میں ابھی تک حیرت آمیز خوف کی بہتات تھی۔ وہ کبھی گٹھڑی کو اور کبھی جی کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اس بات پر بھی حیران ہو رہی تھی کہ وہ اتنی بلند آواز میں بول رہا ہے اور اس کے باوجود اس کے والدین میں سے کوئی نہیں جاگا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد جی نے لڑکی سے درخواست کی کہ وہ دوسرے کمرے میں چل کر اس کی چند باتیں سن لے۔ اس مرحلے پر لڑکی کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر اندیشوں کی دھند چھا گئی۔ شاید وہ جی کو بے ضرر سمجھنے کے باوجود اس کمرے سے باہر جانا نہیں چاہتی تھی۔ جی نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے اسے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ اس کے والدین خواب آور دوا کے زیر اثر ہیں اور اگر خدانخواستہ اس کی نیت خراب ہو تو وہ اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے لہٰذا کمرا بدلنے سے کسی طرح کا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ والدین کی بے ہوشی کا سن کر لڑکی اپنی خوبصورت اور لرزاں آواز میں سخت تشویش کا اظہار کرنے لگی۔ جی نے بمشکل اسے یقین دلایا کہ یہ بے ہوشی عارضی اور قطعی بے ضرر ہے اور وہ دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔

☆○☆

گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے صبح کے اُجالے کی طرف سرک رہی تھیں۔ اُجالا جو مجرموں کے لئے "انتظام کار" کا نقیب ہوتا ہے۔ جو انہیں اندیشوں کی ڈور سے واپس پناہ گاہ کی طرف کھینچتا ہے۔ پرویز عرف جی کو بھی ایک ایسی ہی ڈور کھینچ رہی تھی۔ لیکن وہ واپس جانے سے پہلے اپنے رودی دل کا ہر گوشہ اپنے مسیحا کے سامنے عیاں کر دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک سمجھ دار مریض کی طرح اپنے چارہ گر سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے شروع سے لے کر آخر تک کی ساری کہانی ارجمند کو سنادی۔ اس کا نام ارجمند ہی تھا۔ اس نے ارجمند کو اپنے بے قرار شب و روز کے ہر ہر کرب سے آگاہ کیا' ہر ہر زخم کی کیفیت بتائی۔ اور جب سب کچھ بتا چکا تو ایک عاجز مریض کی طرح پُر امید نگاہوں سے مسیحا کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جی کی روداد کے دوران ارجمند کے حسین چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے اور اب ان سب رنگوں پر الجھن اور کشمکش کا رنگ غالب آچکا تھا۔ وہ کچھ دیر نظریں جھکائے خاموش بیٹھی اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتی رہی۔ پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"دیکھئے پرویز صاحب۔"

جی نے اسے ٹوکا "میں آپ کو بار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے پرویز صاحب نہیں صرف پرویز کہیے۔"

ارجمند نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ پتا نہیں وہ آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی یا شرمندگی۔ آخر چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولی تو اس کی آواز میں اعتماد تھا۔

"پرویز! میرا اور تمہارا راستہ الگ الگ ہے۔ اس قدر الگ کہ اگر تم ٹھنڈے دل سے غور کرو تو تمہیں خود بھی مایوسی ہوگی۔ میں بھلا اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

ارجمند کے جواب سے جی کو کچھ ہمدردی سی محسوس ہوئی اپنے ان دو جملوں سے اگر ارجمند نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی تو حوصلہ شکنی بھی نہیں کی تھی۔ اس کی رگ رگ میں مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ دل چاہا کہ بے قرار ہو کر ارجمند کے دونوں ہاتھ تھام لے مگر وہ اس سے دور رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارجمند! میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں جو تمہیں ناپسند ہے اور وہ سب کچھ اپنا سکتا ہوں جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔ بولو مجھے کیا کرنا ہے؟ مجھے حکم دو کہ کون سا راستہ اپنانا ہے؟"

ارجمند اس کی وارفتگی پر دھیرے سے مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اتنی مدھم تھی کہ جی کی عقابی نگاہیں بھی بمشکل دیکھ سکیں۔ اگلے ہی لمحے یہ مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

"فی الحال تو میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ... میرا مطلب

ہے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں... میں خود ہی کسی طرح تم سے رابطہ قائم کروں گی۔"

ارجمند بہت جلدی میں لگتی تھی اور بجی اس جلدی سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا "دیکھو ارجمند! میں اب تاریکی میں اور ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتا۔ میں بغیر کسی آس امید کے تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ اب کوئی ایسا وعدہ کرو کہ مجھے اپنے انتظار کی طوالت کا علم ہو جائے..."

ارجمند منمنا کر رہ گئی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد بجی نے اسے شیشے میں اتار لیا۔ اس نے ٹھیک تین روز بعد بجی سے ایک ریستوران میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔

ارجمند کو خدا حافظ کہہ کر اور اس کے والدین کے بارے میں اسے تسلی دے کر بجی عقبی دیوار پھاند کر کوٹھی سے باہر آگیا اور پھر مختلف راستوں سے ہوتا ہوا اپنی پک اپ تک پہنچ گیا۔

اگلے تین روز اس نے جس طرح گزارے، کچھ اسی کو معلوم تھا۔ اسکول اور کالج میں وہ فراق اور وصال کے جن شعروں کا مطلب نہیں سمجھ پاتا تھا، اب ان سے اچھے شعر خود اس پر وارد ہو رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی بھی آگئی جب بجی اور ارجمند کی ملاقات ہوئی۔ وہ ریستوران کے ایک پُرسکون کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ارجمند نے خود کو ایک موٹی، سفید چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اجلے چہرے پر شرقی آنکھوں میں رنگ ہی رنگ بھرے ہوئے تھے۔ وہ بجی کی توقعات سے زیادہ باہمت ثابت ہو رہی تھی۔ شاید اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ اس رات صورتحال پر پوری طرح غالب ہونے کے باوجود بجی نے اپنی فطری شرافت کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے کسی بھی مشکل سے دوچار نہیں کیا تھا۔

اس ملاقات میں ارجمند نے بجی سے کھل کر باتیں کیں۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ کہیں منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دو جگہ بات چل رہی ہے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ صرف ایک بھائی ہے جو کسی کام سے کراچی گیا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس سے پہلے وہ لاہور میں رہتے تھے اور وہاں وہ اپنی سہیلی فوزیہ قریشی کی شادی میں گئی تھی۔ عورت نے جب کچھ بتانا ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طور بتا ہی دیتی ہے۔ ارجمند نے بھی اپنی تمام تر محاذ گوئی کے باوجود پرویز بجی کو بتا دیا کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتی اور اگر وہ اپنے کردار اور ماحول میں کچھ تبدیلیاں لے آئے تو ان کے راستے جو بظاہر بہت الگ الگ نظر آتے ہیں، قریب آسکتے ہیں اور ہو سکتا ہے، کسی وقت یہ دونوں راستے مل کر ایک راستہ بن جائیں۔ ارجمند وہی کچھ چاہتی تھی جس کا بجی نے شروع میں قیاس کیا تھا۔ وہ بجی کے رہن سہن اور طور اطوار میں مکمل تبدیلی چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی لاعوری تعلیم کی طرف توجہ دے اور کچھ نہیں تو انٹر تو کر ہی لے۔ بجی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جس میں مذہب کو کافی عمل دخل ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر نہ صرف ظاہری طور پر شریف نظر آئے بلکہ باطنی طور پر بھی اچھے اخلاق کا مالک ہو۔

پرویز بجی نے ارجمند کے یہ سارے اشارے اپنے پلے سے باندھ لئے اور وہیں بیٹھے بیٹھے خود سے یہ عہد کر لیا کہ وہ ارجمند کو وہی کچھ بن کر دکھائے گا جو وہ چاہتی ہے۔ جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ان کے درمیان ایک نیم خاموش معاہدہ طے پا چکا تھا اور اس معاہدے کے تحت پانچ چھ ماہ کے اندر بجی کو نہ صرف ایک باعزت روزگار تلاش کرنا تھا بلکہ خود کو ہر طرح ایک شریف آدمی کے روپ میں ڈھالنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی تعلیم بھی جاری رکھنا تھی۔

ارجمند نے بجی سے وعدہ کیا کہ وہ ان چھ مہینوں میں اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ تاہم اس نے بجی کو اس بات کی ضمانت دی کہ اس دوران اس کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوگا اور اس حوالے سے حالات جوں کے توں رہیں گے۔

○☆○

اگلے چار پانچ ماہ بجی کے لئے انقلاب آفریں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کایا پلٹ گئی۔ چوری سے توبہ تو اس نے اسی وقت کر لی تھی جب ارجمند کو پہلی بار سوزوکی کار کی کھڑکی سے برلو راست دیکھا تھا۔ اب اس نے صدقِ دل سے روزگار کی تلاش شروع کی اور اس تلاش میں کامیاب رہا۔ معلوم نہیں اس کامیابی میں اس کی قسمت کو زیادہ دخل تھا یا اس توانا جذبے کو جو اسے ارجمند کے لئے آسمان سے تارے توڑنے پر اکسا رہا تھا۔ اس نے ایک فروٹ جوس کارنر کھولا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک چھوٹے سے خوبصورت ریستوران میں تبدیل کر دیا۔ اس دوران اس کے رہن سہن میں بھی نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے پتلون قمیص کا شوق پیدا ہوا۔ خود رو داڑھی کی جگہ فرنچ شیو نے لے لی۔ سر کے لمبے اور بے ڈھنگے بال ایک سنجیدہ اسٹائل میں ڈھل گئے۔ اس نے پان کھانا چھوڑ دیا۔ دندان ساز کو چار پانچ سو روپے دے کر اپنے دانت صاف کرائے اور انہیں باقاعدگی سے چمکانے لگا۔ اپنی چال ڈھال اور بول چال کو تبدیل کرنے کی اس نے شعوری کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہا۔ اب اس نے کسی حد تک مذہبی معاملات میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ جس روز اس نے ایف اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ابھی اسے ارجمند سے جدائی کا

چلہ کاٹتے پانچ ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک ماہ کی دوری ابھی باقی تھی مگر پھر غیر متوقع طور پر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ جس روز انٹر کا رزلٹ نکلا اس سے اگلے روز ارجمند اس سے ملنے پہنچ گئی۔ ... یوں لگتا تھا' وہ اس کے پل پل کی مصروفیت سے آگاہ رہی تھی۔ اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ جب وہ کار سے اتر کر ریستوران میں داخل ہوئی تو کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے ہوئے بجی پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ شادیٔ مرگ کی کیفیت میں اپنی جانِ جاں کو دیکھتا رہ گیا۔ شاید اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ دیدہ و دل فرشِ راہ کرے یا خود ہی اس کے قدموں میں نچھاور ہو جائے۔ ارجمند کی نگاہوں میں اس کے لئے ستائش اور محبت تھی۔ پرویز بجی نے آگے بڑھ کر دونوں سہیلیوں کا استقبال کیا۔ پھر ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ ارجمند سرخ رنگ کے لباس میں پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ بجی کے کچھ بتانے سے پہلے ہی ارجمند نے اسے کاروباری اور تعلیمی کامیابیوں پر مبارکباد دی پھر اسے بتایا کہ وہ اس کی پیش رفت سے پوری طرح مطمئن ہے۔ اور اسے آج ہی اپنے ابّو سے ملانا چاہتی ہے۔ اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔ بجی اسی وقت تیار ہو گیا۔ اس کی رہائش بھی ریستوران میں ہی تھی۔ اندر جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنا بہترین لباس پہن کر باہر آگیا۔ اچھی تراش کے لائٹ سوٹ میں وہ خوب جچ رہا تھا۔ ارجمند کے تاثرات سے صاف محسوس ہوا کہ اس نے اپنی توصیفی مسکراہٹ بمشکل روکی ہے۔ تینوں باہر کھڑی سوزوکی کار میں آبیٹھے۔ ارجمند ڈرائیونگ کرنے لگی۔ اس کا رُخ اپنے گھر کی طرف تھا۔

وہ جب گھر پہنچے تو ارجمند کے امی ابّو پڑوسیوں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں ایک ملازم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ارجمند نے اپنی سہیلی کو راستے ہی میں ڈراپ کر دیا تھا۔ اب بجی اور ارجمند ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے تھے۔ ارجمند بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا ہر انداز محبوبانہ تھا اور اس کی حسین آنکھوں کی ہر جنبش بجی کی دھڑکنوں کو تیز تر کر دیتی تھی۔ ارجمند کا رویہ اس کی توقعات سے زیادہ حوصلہ افزاء تھا۔

اس دوران صحن میں کچھ آہٹیں ہوئیں اور ارجمند کے والدین ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ارجمند نے شرماتے ہوئے ان سے بجی کا تعارف کرایا۔ اس کے والد نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر گرمجوشی سے بجی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ... ارجمند کی والدہ نے بھی خوش اخلاقی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"اچھا تو یہ ہیں پرویز صاحب' جن کا تم اکثر ذکر کرتی ہو" ارجمند کے والد نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ جواب میں ارجمند نے مسکراتے ہوئے "جی ابّو" کہا۔

"بھئی بہت تعریفیں سنی ہیں تمہاری" اس دفعہ صاحب خانہ نے بجی کو مخاطب کیا۔ بجی صرف شرما کر رہ گیا۔ اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کہا جاتا ہے۔ اور کچھ کہنا بھی چاہئے یا نہیں۔

"بیٹھو بیٹا" مستقبل کی ساس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا "تم دونوں آرام سے باتیں کرو' میں تمہارے لئے چائے بھجواتی ہوں۔"

بجی کپکپاتی ٹانگوں کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ارجمند نے مسکرا کر کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر قیامت کی چال چلتی باہر نکل گئی۔

ارجمند کے والد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے "ہاں بھئی' تمہارا غائبانہ تعارف تو ہے لیکن کچھ ادھورا سا ہے۔ کچھ اپنی زبان سے بتانا پسند کرو گے؟"

بجی نے اس راستے پر پورے خلوص سے قدم رکھا تھا لہٰذا اس نے ارجمند کے والد سے کچھ بھی نہیں چھپایا اور اب تک جو جو حالات پیش آئے تھے' سب ان کے گوش گزار کر دیئے۔ وہ پوری توجہ سے سنتے رہے اور اپنی ننھی سی تسبیح تواتر کے ساتھ انگلیوں میں گھماتے رہے۔ لگتا تھا' تسبیح گھمانا ان کی عادت بن چکی ہے۔ بجی کی روداد ختم ہوئی اور وہ اپنا تفصیلی تعارف کرا چکا تو ارجمند کے والدِ بزرگوار نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس وقت کمرے میں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ دروازے بند تھے اور کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"تم سمجھدار نوجوان ہو اور اپنے پیشے میں مہارت بھی رکھتے ہو۔ میرا خیال ہے تم اب تک صورتِ حال کو سمجھ ہی چکے ہو گے۔ بے بی چاہتی ہے کہ تم اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔ فی الحال میں تجرباتی طور پر پرسوں اسے تمہارے ساتھ بھیجتا ہوں۔ ایک طرح پرسوں کا دن تمہاری قابلیت کا امتحان بھی ہو گا۔"

بجی کو بات کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ "انکل ... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا..."

انکل نے مسکرا کر کہا "میں نے کوئی ایسی پیچیدہ بات تو نہیں کہی۔ میرا خیال ہے' بے بی نے تھوڑا بہت تمہیں بتایا ہی ہو گا۔ پرویز میاں! بات یہ ہے کہ یہ چھوٹے موٹے کام ہم سے نہیں ہوتے اور نہ ہی ہم نے کبھی کیے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ چھ چھ مہینے خالی بھی گزر جاتے ہیں لیکن جب بھی ہاتھ پیر ہلائے اس کی قیمت وصول کی ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے' آجکل اسپیشلائزیشن کا زمانہ ہے۔ جس طرح ڈاکٹر مختلف امراض کے اسپیشلسٹ ہوتے ہیں' اسی طرح اپنے پیشے میں ہم بھی شادیوں کے اسپیشلسٹ ہیں۔ طریقہ واردات کا کچھ تو

تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا' باقی ..... بے بی خود ہی سمجھ لے گی۔ ..ویسے بھی تمہیں کسی بڑی مشکل سے نہیں گزرنا پڑے گا۔ صرف دو اہم کام تمہارے ذمے ہیں۔ نمبر ایک۔ مقررہ وقت پر شادی والے گھر کی برقی رو کاٹنا۔ نمبر دو۔ بے بی کو لے کر وہاں سے نکل آنا..."

ارجمند کے والد بہت کچھ کہہ رہے تھے لیکن بجی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کے کانوں میں جیسے نشتر سے چبھنے لگے تھے۔ اس کی سماعت سے ٹکرانے والی گفتگو ایک خوفناک سمت میں اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے تصور میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو آج سے قریباً پانچ ماہ پہلے اسی ڈرائنگ روم میں ارجمند نے اس سے کہے تھے۔ آخر شب کی نیم تیرگی میں کہے گئے وہ الفاظ آج اپنا اصل مفہوم کھول رہے تھے...

ارجمند نے کہا تھا "پرویز' میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے۔ بہت الگ" اب بجی کی ناقص سمجھ میں آرہا تھا کہ راستے سے اس شنکر کی مراد طریقِ واردات تھا... آہ! کس قدر اذیت ناک انکشاف تھا یہ۔ وہ پری چہرہ جو اس کے لئے شرافت' پاکیزگی اور دلربائی کا پیکر تھی' اسی کی طرح کی ایک چور نکلی تھی۔ خاندانی شرافت اور تہذیب کے نام پر جو کچھ اس کے ساتھ وابستہ تھا' سب جھوٹ اور فریب تھا۔ اور صرف جھوٹ اور فریب ہی نہیں تھا بلکہ ایک جرائم پیشہ فیملی کا مضبوط جال بھی تھا۔ اب بجی کی سمجھ میں آرہا تھا کہ ارجمند اسے ایک نیک' شریف اور برسرروزگار آدمی کے روپ میں کیوں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ اس نے خود بھی ایک نیک' پارسا لڑکی کا روپ دھار رکھا تھا۔ اسی روپ کو ڈھال بنا کر یہ لوگ سنگین وارداتیں کر رہے تھے... واقعی بجی کا راستہ ان سے بہت مختلف تھا۔ وہ ایک چور تھا اور چور لگتا بھی تھا لیکن وہ لوگ چور تھے اور خطرناک تھے۔

بہت سے سوال بجی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن وہ ان کے جواب پوچھ کر ارجمند کے باپ کو شک میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ حالات اسے اس موڑ پر لے آئے ہیں' جہاں اسے سب کچھ خود بخود ہی معلوم ہو جائے گا۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں اسے ارجمند اور اس کے گھرانے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ ارجمند کے والدین اس کے اصلی والدین نہیں۔ اس کا بھائی بھی صرف نام کا بھائی تھا۔ درحقیقت یہ سب لوگ ایک چھوٹے سے جرائم پیشہ گروہ کے ارکان تھے۔ اور ایک شریف و تعلیم یافتہ فیملی کے روپ میں اپنی رہائش بدلتے رہتے تھے۔ چوری کی واردات کے لئے ان کی منصوبہ بندی بڑی دور رس ہوتی تھی۔ یہ لوگ کسی ایسے ثروت مند گھرانے کا انتخاب کرتے تھے جس میں عنقریب لڑکی کی شادی ہونے والی ہو۔ پھر اسی علاقے میں یہ کوئی فلیٹ یا کوٹھی کرائے پر لے لیتے تھے۔ ارجمند ایک نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز لڑکی تھی۔ اسے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں تناآناتا پروان چڑھانے کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے شادی والے گھر میں کسی عورت کو ماں' بہن یا سہیلی بنا لیتی تھی۔ شادی کی معروفیات اور رسومات میں اس کا کردار نہایت نمایاں ہوتا تھا۔ انہی دنوں میں وہ اندازہ لگا لیتی تھی کہ گھر کی قیمتی اشیاء کہاں کہاں ہیں اور کس کی تحویل میں ہیں۔ اس کا اصل ہدف دلہن کے زیورات ہوتے تھے۔ ان زیورات پر وہ شادی کی رات ہاتھ صاف کرتی تھی۔

جس وقت دلہن کو تیار کیا جاتا تھا' وہ اس کے اردگرد ہی موجود ہوتی تھی۔ پھر جب زیورات کے ڈبے نکالے جاتے تھے اور دلہن کو "پیلا" کرنے کے عمل کا آغاز ہونے لگتا تھا تو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ارجمند کا بھائی' جو اسی گھر کے مردانے میں موجود ہوتا تھا' مین سوئچ سے برقی رو بند کر دیتا تھا۔ زیورات کے ڈبے دلہن کے سامنے پہنچنے اور برقی رو بند ہونے میں اتنی درست ٹائمنگ کیسے ہوتی تھی' یہ بجی کے لئے بھی ایک معما تھا۔ لیکن یہ معما بھی آگے چل کر حل ہو گیا۔ برقی رو بند ہوتے ہی عورتیں حواس باختہ ہو جاتی تھیں۔ ارجمند جیولری کے ڈبے بغل میں دباتی تھی اور بہ آسانی کوٹھی سے باہر نکل آتی تھی۔ یہاں اس کا بھائی گاڑی لئے تیار موجود ہوتا تھا۔ اور یوں یہ واردات بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچتی تھی۔

ان تمام حالات سے آگاہ ہونے کے بعد بجی کی نگاہوں میں وہ فلم گھومنے لگی جو وہ ارجمند سے عاشقی کے دور میں بیسیوں بار دیکھ چکا تھا۔ اس فلم میں ارجمند کا ایک ایک انداز اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اب اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ نکاح کے بعد فلم اچانک اختتام پذیر کیوں ہو گئی تھی۔ یقیناً اس کے بعد کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی ہو گی اور دلہن والوں کی بدقسمتی کا آغاز ہو گیا ہو گا۔ جوں جوں بجی ماضی کی راکھ کرید رہا تھا' اس کے ذہن میں چنگاریاں سی بھرتی جا رہی تھیں۔ وہ ارجمند جس سے وہ پیار کرتا تھا' کہیں ہواؤں میں تحلیل ہو چکی تھی اور اب اس کے سامنے ایک بالکل مختلف کردار کی لڑکی کھڑی اپنی مکاریوں کی داد طلب کر رہی تھی۔ بڑی بے باکی اور ڈھٹائی سے اپنا طریقِ واردات سمجھا رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ اس واردات میں اس کا کردار کیا ہے اور بجی کا کردار کیا!

○☆○

وہ جون کی ایک نیلگوں خوشگوار شام تھی۔ مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ارجمند کے گھر کی بالائی منزل پر

پرویز بھی ایک کھڑکی کھولے آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ آج اسے ارجمند کے ساتھ بطور کزن شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے جانا تھا۔ دعوت نامہ تو سارے اہل خانہ کے نام تھا مگر ارجمند کے فرضی والدین نے بیماری کا عذر کر رکھا تھا جبکہ ارجمند کا بھائی ویسے ہی یہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی کلی کمائی کے ساتھ کراچی میں کوئی کاروبار شروع کر رہا تھا۔ ایک طرح سے اس کی غلط پوسٹ پر بھی کو "بطور کزن" بھرتی کیا گیا تھا۔ اس کو بھی کا تمام ضروری سامان دو روز پہلے ہی نہایت رازداری سے کسی دوسرے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ ارجمند کے "والدین" تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہو رہے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ رفو چکر ہو رہے تھے۔ ارجمند اور بھی کو واردات کے بعد سیدھا ان کے پاس پہنچ جانا تھا۔ کہاں؟ اس کے بارے میں بھی کو کچھ معلوم نہیں تھا تاہم اس کا خیال تھا کہ یہ نیا ٹھکانہ کسی دوسرے شہر میں کہیں ہوگا۔ اور کسی ایسے محلے میں ہوگا جہاں چند ہفتے بعد کسی امیر کبیر گھرانے میں کسی لڑکی کی شادی انجام پانے والی ہوگی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب کمرے سے باہر اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر ارجمند سرخ کامدار ساری میں ملبوس، بناؤ سنگھار کئے قدم قدم پر بجلیاں گراتی اندر آگئی۔ اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی مست خوشبوؤں نے بھی کے سینے میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اس کی مسکراہٹ بھی کی نگاہوں کو چکاچوند کرنے لگی ٹکرا گلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کر دیا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا کہ کاش اس کے پہلو میں ارجمند کے بجائے وہ بے نام لڑکی ہوتی جو کبھی اس کے خیالوں میں بستی تھی۔ جسم سے اٹھنے والی مہک، ہوش اڑانے والا گداز، یہ شباب و الفت اس معصوم لڑکی کا ہوتا جو اس وڈیو فلم میں بہار کے رنگین جھونکے کی طرح اترتی پھرتی تھی۔ لیکن نہیں، یہ سب کچھ اس ارجمند کا تھا جس نے اسی کی طرح گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا اور جو... اس کی ہم پیشہ تھی۔

ارجمند اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "تیار ہو؟"

بھی نے بے خیالی میں ٹائی کی گرہ کو چھوا اور اثبات میں جواب دیا۔

ارجمند نے کہا "اچھا اب ایک بار پھر پوری تفصیل دہرا لیتے ہیں... ہم دونوں پیدل شادی والے گھر میں پہنچیں گے۔ تم اپنا تعارف شاہ صاحب کے بھانجے یعنی میرے کزن کے طور پر کراؤ گے۔ مجھے شادی والے گھر میں چھوڑ کر اور کچھ دیر مہمانوں میں بیٹھ کر تم واپس آؤ گے اور سفید سوزوکی کار لے جاؤ گے۔ یہ کار تم کوٹھی کے بائیں گیٹ کے پاس شہتوت کے درخت کے عین نیچے کھڑی کرو گے۔ یہ درخت تم کل اچھی طرح دیکھ چکے ہو۔ گاڑی کا رخ شمال کی طرف ہونا چاہئے۔ بفرض محال شہتوت کے نیچے کوئی اور گاڑی کھڑی ہو تو تم اپنی گاڑی اسی لائن میں آگے جا کر کھڑی کر سکتے ہو لیکن اس بات کی احتیاط تمہیں آخر وقت تک رکھنی ہوگی کہ ہمارے نکلنے کا راستہ مسدود نہ ہو۔" یہ کہتے ہوئے ارجمند نے اپنا نیلی ہینڈ بیگ کھولا۔ میک اپ کے سامان، نشو پیپر اور نقدی وغیرہ کے درمیان ایک چھوٹا سا دائی ٹاکی سیٹ پڑا تھا۔ ارجمند نے سیٹ کا ایک پیس اسے تھمایا اور پھر بڑے انہماک سے اس کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگی۔ خالص مشرقی لباس میں اور گھریلو لڑکی کے لب و لہجے میں وائی ٹاکی کے بارے میں باتیں کرتی ہوئی وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس نے بھی کو بتایا کہ ان کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوگی۔

"بارات تقریباً نو بجے پہنچے گی اور نکاح کے بعد اس کی طرف سے دو سگنل موصول ہوں گے۔ پہلا سگنل تیار رہنے کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد چند منٹ کے اندر اندر دوسرا سگنل ہوگا اور اس سگنل پر کوٹھی کی برقی رو کاٹ دینی ہوگی۔ اس نے بھی کو سمجھاتے ہوئے کہا "میں اچھی طرح دیکھ چکی ہوں، کوٹھی میں جنریٹر نہیں ہے اور نہ ہی اس کا انتظام کیا گیا ہے۔ برقی رو کاٹنے کے بعد تم پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہو۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، کوٹھی کا مین سوئچ گیراج میں ہے۔ بائیں دیوار پر پلائی وڈ کا چھوٹا سا بکس ہے۔ اس میں کوئی تالا والا نہیں ہوتا۔ تم کسی بھی بہانے ٹہلتے ہوئے وہاں تک پہنچ سکتے ہو۔ ایک بار پھر میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ تمہیں مین سوئچ آف نہیں کرنا بلکہ گرپ نکالنے ہیں اور انہیں جیب میں ڈال لینا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر تم بہ آسانی دس سیکنڈ میں کار تک پہنچ سکتے ہو۔ میرے خیال میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم گاڑی اسٹارٹ رکھو گے اور پچھلا دروازہ کھلا ہوا ہوگا۔ اگر تم چاہو تو اندر جنسی لائٹ بھی آن کر سکتے ہو تاکہ مجھے گاڑی پہچاننے میں دشواری نہ ہو..."

پرویز بھی پورے دھیان سے ارجمند کی باتیں سنتا رہا۔ جب اس کی ہدایات اختتام کو پہنچیں تو دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

○☆○

دعا کے بعد مبارک سلامت کا شور بلند ہوا اور چاق و چوبند بیرے مہمانوں میں مٹھائی کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تقسیم کرنے لگے۔ شادی کی یہ تقریب ایک وسیع و عریض لان میں ہو رہی تھی۔ ہر طرف رنگ و نور کی بہار تھی۔ درختوں اور دیواروں پر کی جانے والی دیدہ زیب لائٹنگ نے ماحول کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ پرویز بھی اپنا مٹھائی کا پیکٹ

کھولنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کی جیب میں رکھے والی ٹاکی نے پہلا سگنل نشر کیا۔ جگی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ فیصلہ کن مرحلہ قریب آگیا تھا۔ وہ سگنل کی آواز اپنی گونجدار کھانسی میں چھپاتا ہوا اٹھا اور دھیمے قدموں سے گیراج کی طرف چل دیا۔ اس سے پہلے وہ گیراج کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ وہاں ایک نئے ماڈل کی ہنڈا گاڑی کھڑی تھی اور وہ اسے دیکھنے کے بہانے چار پانچ منٹ بہ آسانی گیراج میں گزار سکتا تھا۔

مین سوئچ والا بکس کھلا ہوا تھا اور نظر بچا کر اس میں سے "دو گرپ" کھینچ لینا جگی کے لئے چنداں مشکل نہیں تھا۔ وہ گیراج میں پہنچا اور گاڑی کے گرد آہستہ آہستہ گھوم کر تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے خطرہ صرف ایک ہی تھا۔ کہ کہیں کوئی دوسرا شوقین بھی اس کی دلچسپی دیکھ کر اظہارِ شوق کے لئے نہ پہنچ جائے۔ بہرحال ایسا نہیں ہوا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے سرکتی رہیں۔ نہایت اضطراب کے عالم میں جگی نے کوئی سات منٹ گزارے۔ اس کے کان ہر لحظہ سگنل پر لگے ہوئے تھے... اور پھر اس کی جیب میں پڑی ہوئی ننھی منی خاموش مشین بول اٹھی۔ تین دفعہ "بپ ... بپ" کی مخصوص آواز آئی۔ جگی نے یہ آواز سنتے ہی گرپ نکالنے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر مین سوئچ آف کر دیا۔ تھری فیس.....

کنکشن منقطع ہوا تو یکلخت پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اس کے ساتھ ہی بالائی منزل سے عورتوں اور بچوں کی "ہاہو" سنائی دینے لگی۔ جگی تیز قدموں سے باہر نکلا اور سوزوکی کار کی طرف بڑھا۔ اسے بالائی منزل کی کھڑکیوں سے کچھ دبی دبی نسوانی چیخیں بھی سنائی دیں لیکن وہ ان چیخوں کو نظر انداز کرتا ہوا گاڑی میں آبیٹھا۔ اس نے ارجمند کی ہدایات کے مطابق انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کا رخ شمال کی طرف کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے گیٹ سے نکل کر ایک ہیولا تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جگی کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگی۔ وہ ارجمند ہی تھی۔ وہ جب کچھ اور قریب آئی تو اس کے ہاتھوں میں زیورات کے ڈبے صاف دکھائی دینے لگے۔ وہ لپکتی ہوئی گاڑی تک آئی اور پھر ایک ہاتھ سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی... لیکن جگی نے اس کی آخری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ یعنی پچھلا دروازہ نہیں کھولا تھا۔ بلکہ اس وقت گاڑی کا کوئی بھی دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب پوری کوٹھی ایک بار پھر جھٹ نور بن گئی۔ مین سوئچ پھر آن ہو چکا تھا۔ ارجمند کے حلق سے ایک مدھم سی چیخ نکل گئی۔ اس نے سخت اضطراب میں دروازے کا شیشہ کھٹکھٹایا اور غرائی "پرویز! دروازہ کھولو... جلدی کرو دروازہ کھولو!"

پرویز اطمینان سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ ارجمند نے بچگانہ انداز میں دروازے کا ہینڈل کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ

کتے کا ٹکٹ

ایک صاحب کتے کی زنجیر تھامے ریلوے کے ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچے اور کھڑکی کے اندر جھانک کر پوچھا "کیا مجھے کتے کا ٹکٹ لینا پڑے گا؟"

کاؤنٹر کلرک نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "نہیں جناب! ایسی بھی کیا بات ہے۔ آپ انسانوں کے ٹکٹ پر ہی سفر کر سکتے ہیں۔"

اب لرزاں آواز میں پکار رہی تھی "پرویز... پرویز... میں کہتی ہوں دروازہ کھولو... پاگل ہوئے ہو کیا؟" پرویز نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ کوٹھی کے گیٹ سے لوگ بھاگتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ ان میں عورتوں کے زرق برق لباس بھی چمک رہے تھے۔ اور ان سب کا رخ انہی کی طرف تھا۔ یکایک ارجمند نے دروازے کا ہینڈل چھوڑا اور مخالف سمت میں بھاگی... اس کی ساری کاکلدار پلو مضحکہ خیز انداز میں لہرا رہا تھا۔ عقب سے شور بلند ہوا "پکڑو... پکڑو... یہی ہے" ارجمند گاڑیوں کے درمیان راستہ بناتی پختہ سڑک تک آئی اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں پوری رفتار سے بھاگنے لگی لیکن دس بیس گز آگے جاکر اس کی اونچی ایڑی نے دھوکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گری۔ جیولری کے ڈبے دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ اندر سے قیمتی جیولری نکل کر سڑک پر بکھر گئی۔ شاید اسی طرح جگی کے دل کے ٹکڑے اس کے سینے میں بکھرے ہوئے تھے۔

جگی نے گیئر لگا کر اطمینان سے اسٹیئرنگ گھمایا اور ایک بغلی سڑک پر سیدھا نکلتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور گلا جیسے نمکین آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ دس منٹ تک سیدھا چلنے کے بعد وہ ایک دوراہے پر آکر رک گیا۔ یہاں سے ایک سڑک اس مسجد کی طرف جاتی تھی جہاں وہ روزانہ فجر اور عشاء کی نماز پڑھا کرتا تھا۔ دوسری سڑک "پیرودھائی" اڈے کی طرف جاتی تھی۔ اس اڈے کے پاس وہ دو کمروں کا مکان تھا جہاں اس کے یارانِ ہم نوالہ و ہم پیالہ شکورا اور مرلو مقیم تھے۔ وہ بہت دیر تک اس جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ عشاء کی نماز پڑھ لے۔ کبھی سوچتا کہ شکورے اور مراد کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں ایکسلریٹر دباتا جا رہا تھا لیکن دوسرا پاؤں کلچ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ گاڑی دوراہے پر کھڑی غرا رہی تھی۔ فیصلہ بظاہر معمولی تھا لیکن بہت اہم بھی تھا۔ گاڑی غراتی رہی... دہاڑتی رہی۔ پھر اچانک اس کے ٹائر چرچرائے اور وہ پیرودھائی کی طرف مڑ گئی... پیرودھائی جہاں شکورا اور مرلو اپنے بچھڑے یار کا انتظار کر رہے تھے۔

آئس کریم

طاہر جاوید مغل

زندگی کے ہموار راستوں پر چلتے چلتے اچانک ہی قدم لڑکھڑا جاتے ہیں... ڈگمگا جاتے ہیں... اور انسان اس طرح گرتا ہے کہ پھر سنبھلنا مشکل تر ہو جاتا ہے... معمولی سی بے احتیاطی ایک بڑے حادثے کا پیش خیمہ بن جاتی ہے... پرسکون سائبان تلے رہنے والے خاندان کو پیش آنے والے دردناک سانحے کی روداد... ایک ہی رات میں ان سب کی زندگی تہ و بالا ہو گئی تھی...

محبت کی چنگاری جو انتقام کی آگ میں بدل چکی تھی

لڑکی خوب صورت تھی۔ سرخ و سپید رنگت جس میں ہلکے سے گندمی رنگ کا امتزاج بھی تھا۔ بالکل سیاہ آنکھیں اور آنکھوں کے "ہم رنگ" لمبے ریشمی بال جو اس کے ایک گلابی کان کو تقریباً ڈھانپ رہے تھے۔ اس کی ستواں ناک میں ایک ننھی سی چمک دار "کوکی" تھی۔ وہ گرمیوں کے ہلکے پھلکے پھول دار لباس میں تھی۔ جدید تراش کی لمبی قمیص اس کی جسمانی موزونیت کو نمایاں کرتی تھی۔ اس کے کانوں میں بالیاں اور کلائیوں میں زرد رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ وہ سادگی



اور کشش کا ایک دلکش نمونہ نظر آتی تھی۔ اسی مہینے اس کی شادی تھی۔ وہ اپنے الھڑ ارمانوں کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے والی تھی۔ کوئی بھی سفر شروع کرنے کے لیے انسان کا زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے..... اور وہ زندہ نہیں تھی۔ اسے مرے ہوئے تین گھنٹے سے زائد وقت ہو چکا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ کمرے کے فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ چند ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اس کے سر کی طرف بکھری ہوئی تھیں۔ پرنٹڈ لان کی قمیص سامنے سے چاک تھی اور اس کے زیریں لباس کی بے ترتیبی کو بھی ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے دودھیا جسم پر گہری چوٹوں اور خراشوں کے تازہ نشان موجود تھے۔ بہرحال موت کا سبب سر پر لگنے والی گہری چوٹ تھی بلکہ یہ ایک نہیں دو چوٹیں تھیں جو کسی کند آلے سے لگائی گئی تھیں۔ مکمل تفصیل تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہی سامنے آتی۔ تاہم بادی النظر میں یہ مجرمانہ حملے اور قتل کا کیس لگتا تھا۔

متوسط آبادی کا یہ ایک ''دو منزلہ'' گھر تھا۔ ہم دوسری منزل پر موجود تھے۔ اس کمرے سے باہر گھر کے دیگر حصوں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مقتولہ کی والدہ اور دیگر عزیزوں کی آہ و بکا سے در و دیوار گونج رہے تھے۔ یہ رات قریباً ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مجھے لڑکی کا نام کشف معلوم ہوا تھا۔ اس کے والد جمیل صاحب ایک پرائیویٹ فرم میں بطور اکاؤنٹنٹ جاب کرتے تھے۔

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ میرے کندھے سے لگ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''انسپکٹر صاحب! میں برباد ہو گیا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میری کشف لال جوڑا پہننے سے پہلے لال رنگ میں نہا گئی۔ دیکھیں اس معصوم کو کس بُری طرح نوچا کھسوٹا گیا ہے۔ ہائے..... میں نے تو اسے کبھی کانٹا چبھنے کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی۔ دیکھیں کتنی تکلیف سے جان دی ہے میری کشف نے۔ یا اللہ مجھے بھی موت دے دے..... مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا..... یا اللہ..... یا اللہ۔'' وہ بلکتے ہوئے اور اپنی رانیں پیٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔

میں نے سفید چادر دوبارہ مقتولہ کے جسم پر ڈال دی اور ایک بار پھر اپنے اے ایس آئی کے ساتھ موقع واردات کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بات واضح ہو گئی کہ مقتولہ کے سر پر کسی کند آلے سے دو شدید ضربیں لگائی گئیں۔ ان ضربوں کی وجہ سے کھوپڑی کی درمیان والی ہڈی ٹوٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں کشف کی موت واقع ہو گئی۔ یہ کند آلہ ممکنہ طور پر کوئی ہتھوڑا یا ہتھوڑی ہو سکتی تھی۔ مقتولہ کے بالائی اور زیریں جسم پر ایسے واضح نشانات موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مکمل طور پر بے لباس کرنے اور زیادتی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اسے شدید ضربات لگا کر موقع پر ہی قتل کر دیا گیا ہے۔

مقتولہ کے ادھیڑ عمر والد جمیل صاحب شلوار قمیص میں ملبوس میرے سامنے بیٹھے تھے اور میں ان سے سوال جواب کر رہا تھا۔ میں مقتولہ کی والدہ شمیم بیگم سے بھی بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ اکلوتی بچی کے دردناک قتل کے شدید صدمے کے زیر اثر اسپتال پہنچ چکی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''جمیل صاحب جیسا کہ آپ کے بیان سے پتا چلا ہے کہ واردات کے وقت آپ کی بیٹی کشف گھر میں اکیلی تھی۔ فقط اس کا تین سالہ بھائی فرحان گھر میں تھا۔ اور وہ بھی دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ آپ میاں بیوی افطاری میں شرکت کے لیے کشف کے ہونے والے سسرال گئے ہوئے تھے۔''

''دراصل ہمیں لڑکے کو عیدی وغیرہ دینے جانا تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم افطاری بھی ان کے ساتھ کر لیں۔ عید سے سترہ اٹھارہ روز بعد شادی تھی۔ رواج کے مطابق کشف تو ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ مجبوراً ہم چھوٹے فرحان کو اس کے پاس چھوڑ گئے اور اس بدنصیب کو تسلی دے گئے کہ ہم جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے جمیل صاحب کی آواز پھر بھرا گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں آپ شام چھ بجے کے قریب اپنی آلٹو کار پر اقبال ٹاؤن سے روانہ ہوئے، اپنے سمدھیوں کے گھر واپڈا ٹاؤن پہنچنے کے لیے۔ آپ کی واپسی دس بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ان چار گھنٹوں کے دوران میں آپ نے دو دفعہ بیٹی کو فون کیا۔ ایک مرتبہ افطاری کے بعد قریباً ساڑھے سات بجے، دوسری مرتبہ قریباً آٹھ بجے۔ دونوں مرتبہ کشف خیریت سے تھی۔ دوسری مرتبہ اس نے آپ کو یہ بھی بتایا کہ چھوٹے فرحان کو پھر بخار محسوس ہو رہا ہے، اس نے اسے دوا کھلا کر سلا دیا ہے۔''

جمیل صاحب نے اثبات میں سر ہلا کر میری بات کی تصدیق کی۔

''آٹھ بجے کے بعد آپ نے اور آپ کی بیگم نے... کم از کم چار دفعہ کشف کو کال کی جو ریسیو نہیں ہو سکی۔ آپ نے

بھی سمجھا کہ وہ بھی سو گئی ہے۔ بہرحال آپ میاں بیوی مزید تاخیر کیے بغیر واپس روانہ ہو گئے؟''

''جی ہاں۔'' جمیل صاحب نے رُندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

''مطلب یہ کہ آٹھ اور دس بجے کے درمیان کوئی آپ کے گھر میں داخل ہوا اور اس کے نتیجے میں کشف کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ موقع واردات سے جو شہادتیں ملی ہیں، ان سے ہم اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے۔ آپ ابھی تک کسی پر اپنے شک کا اظہار بھی نہیں کر سکے ہیں۔ نہ ہی کشف کی فرینڈ دریاب کوئی خاص بات بتا سکی ہے۔'' جمیل صاحب نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

دریاب، کشف کی کالج کی دوست تھی اور اس نے وقوعہ کے بعد خود بتایا تھا کہ وہ آٹھ بجے کے قریب کشف سے ملنے ان کے گھر آئی۔ یہ ایک سرپرائز وزٹ تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کشف کے امی ابو گھر میں نہیں ہیں۔ وہ اس کے لیے آرٹی فیشل جیولری کا ایک سیٹ اور آئس کریم لے کر آئی تھی۔ وہ آدھ پون گھنٹا کشف کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی مگر پھر اسی دوران میں اس کے گھر سے فون آ گیا کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے۔ ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی اور دریاب چونکہ گاڑی پر ہی آئی تھی اس لیے فوراً واپس چلی گئی۔ اس کی گاڑی گرے رنگ کی مہران تھی۔

پرسوں واردات کے چار پانچ گھنٹے بعد دریاب نے جو طویل بیان دیا تھا، اس کے مطابق۔ وہ صرف آٹھ دس منٹ ہی کشف کے پاس رک پائی تھی۔ افطاری کے فوراً بعد اس کی والدہ کو معدے کا شدید درد شروع ہو گیا تھا اور انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا۔ دریاب کے بیان کے مطابق جب وہ آئی تو کال بیل پر خود کشف نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اسے دیکھ کر ازحد حیران اور خوش ہوئی۔ تب تک فرحان سو چکا تھا۔ ان دونوں نے عید اور شادی کی آمد کا ذکر کیا۔ کشف کے رویے سے ہرگز کسی طرح کی پریشانی یا دکھ کی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

میں اور میرا اے ایس آئی اردگرد کے لوگوں کے بیان بھی قلم بند کر چکے تھے۔ آٹھ اور دس بجے کے درمیان کسی نے بھی جمیل صاحب کے گھر میں کسی کی آمد و رفت نہیں دیکھی تھی۔ فقط ایک شخص نے اتنی بات بتائی تھی کہ افطاری کے آدھ پون گھنٹے بعد اس نے جمیل صاحب کے گھر کے سامنے ایک گرے رنگ کی مہران کار کھڑی دیکھی تھی، جو کچھ

اکتوبر 2019ء کا شمارہ ایک نظر میں



پس پردہ

دو مختلف معاشروں کے ملاپ اور پیش آنے والے مسائل کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی..... آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے ایک طویل کہانی

مسیحا

گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر..... ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کا جادو

رنگِ آسماں

محبت کے دلگداز لمحات اور دشمنوں کے شر انگیز واقعات کے مابین دلچسپ معرکہ آرائی۔ **ایے آر راجپوت** کے خیالات کی روانی

وقت

وقت کی بے وقت راگنی اور کبھی بروقت کارروائی کے درمیان زندگی کے نشیب و فراز کی دلچسپ داستان **حسام بٹ** کے قلم سے

مزید

خطوط کی محفل

اور

ملک بھر سے دلچسپ تحریروں کی تفصیل

ناہید سلطانہ اختر۔ تنویر ریاض، شاہ زین، رضوان، نادیہ نور، علی اختر اور اعتزاز سلیم وصلی کی خوب صورت تحریریں

ہی دیر بعد وہاں سے چلی گئی تھی۔ یہ شخص ایک جنرل اسٹور چلاتا تھا۔ جنرل اسٹور، جمیل صاحب کے گھر کے سامنے ہی واقع تھا اور گھر سے اس کا فاصلہ پینتیس چالیس میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ جمیل صاحب کا گھر چونکہ ایک بند گلی (سڑک) کے آخری سرے کے قریب تھا۔ لہٰذا یہاں غیر متعلقہ لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو یہاں آتا تھا اسی راستے سے واپس بھی جاتا تھا۔ لہٰذا جب گرے مہران واپس گئی تو جنرل اسٹور کے مالک شیخ ایاز نے اسے دیکھا تھا۔

جمیل صاحب سے سوال جواب کرنے کے بعد جب میں اُن کے گھر سے واپس لوٹ رہا تھا تو میں نے جنرل اسٹور سے تھوڑا آگے جا کر ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا۔ میری نگاہ ایک کوٹھی نما گھر کی بالکونی کی طرف گئی تھی۔ وہاں مجھے ایک سی سی ٹی وی کیمرے کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ کوٹھی نما گھر جمیل صاحب کے دو منزلہ گھر سے پندرہ بیس گھر چھوڑ کر واقع تھا اور یہاں سی سی ٹی وی کیمرا موجود تھا۔ اگر یہ کیمرا ورک کر رہا تھا تو ایک اچھی پیش رفت ہو چکی تھی۔

☆☆☆

مڈل اور اپر کلاس کی رہائش آبادیوں میں سی سی ٹی وی کیمرے تو کہیں کہیں موجود ہوتے ہیں، تاہم کسی واردات کے موقع پر ان کیمروں کے مالکان پولیس سے تعاون کرنے سے کئی کتراتے ہیں۔ بہرحال ہم تھوڑی سی کوشش کے بعد مذکورہ کیمرے کی سہولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے..... اور یہ کامیابی خاصی کارآمد ثابت ہوئی۔

ہم پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ چار پانچ گھنٹوں میں ہم نے کیمرے کی مطلوبہ ریکارڈنگ کو بڑی اچھی طرح دیکھ اور پرکھ لیا۔ اس ریکارڈنگ کے مطابق مقتولہ کی دوست دریاب کے بیان کی بھی مکمل تصدیق ہوتی تھی۔ دریاب کی گاڑی آٹھ بجنے سے تین چار منٹ پہلے کیمرے کے سامنے سے گزری اور پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد قدرے تیز رفتاری سے واپس چلی گئی۔ اس گاڑی کے جانے کے تقریباً دس منٹ بعد ایک اور ایسی ''انٹری'' ہوئی جس نے پہلے جمیل صاحب کو بُری طرح چونکایا، پھر ہمیں بھی۔ یہ انٹری موٹر بائیک پر سوار ایک نوجوان لڑکے کی تھی۔ جمیل صاحب کے اشارے پر ڈرائیور کو وہاں روک دیا گیا۔ وہ زرد چہرے اور ہانپتے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''یہ..... ثاقب ہے..... میرا بھتیجا..... لل..... لیکن..... یہ کیوں آیا.....؟ یہ وہی ہے۔''

ہم نے ریکارڈنگ کے اس حصے کو دو تین بار دیکھا۔ جمیل صاحب نے لرزاں آواز میں یقین سے کہا کہ یہ ثاقب ہی ہے۔

کم و بیش ایک گھنٹے میں میرے اہلکار ثاقب کو اس کے گھر سے اٹھا کر تھانے لے آئے۔ ثاقب کے والد اور بھائی وغیرہ بھی ساتھ آئے تھے، تاہم انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر باہر بٹھا دیا گیا۔ جمیل صاحب بھی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ہم نے اکیلے میں ثاقب سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس کی عمر چوبیس کے لگ بھگ تھی۔ کلین شیوڈ تھا۔ تاہم شلوار قمیص اور گول ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ تراویح کی نماز پڑھ رہا تھا۔ پولیس والے اسے زبردستی اٹھا لائے ہیں۔ وہ ایک قبول صورت پڑھا لکھا لڑکا نظر آتا تھا لیکن فی الوقت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی آمد سے پہلے ہی جمیل صاحب دبے لفظوں میں بتا چکے تھے کہ سال ڈیڑھ سال پہلے ثاقب کے گھر والوں نے کشف کے لیے ثاقب کا رشتہ ڈالا تھا۔ ثاقب شاید کشف کو پسند بھی کرتا تھا مگر اس کی والدہ چونکہ سخت مزاج تھی اور ثاقب خود بھی برسرِ روزگار نہیں تھا لہٰذا یہ بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ جمیل صاحب کی باتوں سے یہ اشارہ ملا تھا کہ شاید ماضی میں کشف نے بھی ثاقب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہو لیکن پھر اس نے خود کو بدل لیا تھا اور دونوں گھرانوں کا میل جول بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنی بدلی ہوئی زندگی سے مطمئن تھی بلکہ خوش تھی۔ اس نے والدین کی مرضی کو مقدم جانا تھا۔

اشارے واضح طور پر ثاقب کی طرف جا رہے تھے۔ مزید، وہ جس طرح حواس باختہ نظر آتا تھا، ہمارے شک کو ہوا دے رہی تھی۔ میں نے مجبوراً پولیس والوں کا مخصوص لب و لہجہ اختیار کیا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ بہت ذلیل و خوار ہو کر بتانا ہے، وہ سیدھی طرح بتا دو گے تو بہتر رہے گا۔ تم نے کیا کیا ہے اپنی اس بدقسمت کزن کے ساتھ؟''

وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا جی، آپ کیوں مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ کشف تو دور کی بات ہے، مجھے تو تایا جمیل سے ملے بھی چار پانچ ماہ ہو چکے تھے۔''

''تم تایا کے گھر آخری بار کب گئے؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید وہ کرائے والے گھر میں رہتے تھے جین مندر کی طرف..... اس وقت گیا تھا۔''

میں نے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ کرسی سمیت الٹ گیا۔ اہلکاروں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہیں ہفتے کی رات آٹھ بج کر بیس منٹ پر جب تم تایا جمیل والی گلی میں داخل ہوئے تو ایک سی سی ٹی وی کیمرے نے تمہاری منحوس آمد کو دیکھ لیا تھا اور پھر قریباً بیس منٹ اس گھر میں رکنے کے بعد اور اپنی درندگی کے ثبوت دینے کے بعد جب تم وہاں سے نکلے تو بھی کیمرے نے تمہیں رجسٹر کر لیا تھا۔''

میرے اے ایس آئی نے ریکارڈنگ چلا کر اسے دکھائی۔ اس کے پاس اب کوئی ''ایکسکیوز'' باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کا حال اب یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب..... م..... میں تایا کے گھر گیا ضرور تھا..... لیکن.....'' وہ اس سے آگے کچھ بول نہ سکا۔ اس کے ہونٹ بے ساختہ تھرا کر رہ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے اس ''لیکن'' کے بعد جھوٹ ہی جھوٹ ہے اسی لیے تمہاری قوتِ گویائی جواب دے رہی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہیں میں بتا دیتا ہوں۔'' ذرا توقف کے بعد میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''یہ کوئی ایسی پیچیدہ گتھی نہیں ہے۔ تم اپنی کزن کشف پر نظر رکھتے تھے..... اور یہ بُری نظر ہی تھی۔ ماں باپ کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے جب کشف نے تم سے مکمل طور پر منہ پھیر لیا تو تمہارے اندر غم و غصہ پیدا ہوا۔ تم اسے دوبارہ اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر ایسا ہو نہیں سکا۔ اب تمہاری تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں کیونکہ چند دن بعد کشف کی شادی ہونے والی تھی، ہفتے کے روز تمہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ کشف کے گھر والے اس کے ہونے والے سسرال جا رہے ہیں اور وہ گھر میں اکیلی ہو گی۔ تم اپنی ہوس کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے گھر پہنچے۔ اسے ورغلانے کی کوشش کی..... اور جب ناکام ہوئے تو وحشت کے عالم میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا.....''

''نہیں سر، بالکل نہیں..... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ م..... میں یہ مانتا ہوں کہ اس سے محبت کرتا تھا اور شاید..... آج بھی کرتا ہوں۔ میں ایک آخری بار اس سے ملنے ضرور گیا تھا مگر میں نے کیا کچھ نہیں.....'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

''اچھا..... تو پھر ہماری معلومات میں اضافہ فرماؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا؟''

''میں سچ کہتا ہوں جی۔ میں اس سے مل ہی نہیں پایا..... م..... میں نے تین چار منٹ تک ڈور بیل بجائی۔ ایک دو بار دستک بھی دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ میں ٹہلتا ہوا سامنے والی اسٹور کر شاپ پر چلا گیا۔ لڑکے کھیل رہے تھے، میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا تب دوبارہ دروازے پر پہنچا۔ کچھ دیر تک بیل دیتا رہا پھر واپس چلا آیا۔ مجھے یہی لگا کہ شاید کسی کھڑکی میں سے کشف نے مجھے دیکھ لیا ہے اور دروازے تک نہیں آئی۔ ابھی واپس گھر پہنچا ہی تھا کہ اس کی موت کی دل ہلا دینے والی خبر پہنچ گئی۔''

میں نے ثاقب کو اپنے ایک سخت گیر حوالدار کے حوالے کر دیا۔ یہ کراہت نامی حوالدار پولیس کے روایتی ہتھکنڈوں سے پوری طرح واقف تھا بلکہ دس سالہ تجربہ بھی رکھتا تھا۔ اس نے اپنے طریقے سے ''پوچھ گچھ'' کی اور قریباً ایک گھنٹے بعد ثاقب نے اعتراف کر لیا کہ یہ بھیانک غلطی اسی سے ہوئی ہے۔ وہ کشف سے صرف ملنے کے لیے آیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ بالکل اکیلی ہے، چھوٹا بھائی بھی دوسرے کمرے میں سو رہا ہے تو اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا۔ اپنی مطلب براری میں ناکام ہو کر اس نے کشف کے سر پر لوہے کے ہاون دستے سے ضربات لگائیں اور اسے بے ہوش چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

پڑھنے والے سمجھیں گے کہ شاید یہ کیس حل ہو گیا لیکن ہم پولیس والے جانتے ہیں کہ مار پیٹ کے نتیجے میں ملزمان اس طرح کے جو بیانات دیتے ہیں، ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ اپنے وکیل کی ہدایت کے مطابق ملزم عدالت میں پیش ہوتے ہی اپنے بیان سے مکر جاتا ہے۔ وہاں بات ٹھوس زمینی شہادتوں اور مضبوط گواہوں پر آ کر ٹھہرتی ہے۔

میں ملزم ثاقب کے اعترافی بیان کو مکمل طور پر رد کر رہا تھا اور نہ ہی قبول کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سی سی ٹی وی کی ایک اور ''شہادت'' بھی تھی۔ اس دوسری شہادت نے بھی مقتولہ کے والد جمیل صاحب کو متاثر کیا تھا اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی۔

یہ شہادت سی سی ٹی وی ریکارڈنگ پر آٹھ بج کر پچپن منٹ پر نمودار ہوئی تھی اور یہ ایک سکندر نامی شخص کی صورت میں تھی، سکندر کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک خوش پوش شخص تھا۔ وہ کریم کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس لمبے ڈگ بھرتا ہوا، ریکارڈنگ میں نمودار ہوا تو جمیل صاحب ایک بار پھر

بے طرح چونکے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ پانچ چھ ماہ قبل وہ جین مندر کے جس علاقے میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے، سکندر اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ وہ اسی محلے میں پراپرٹی کا کام کرتا تھا بلکہ وہاں جمیل صاحب کو کرائے کا مکان بھی اسی سکندر کے توسط سے ملا تھا۔ جمیل صاحب کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ سکندر کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی حد تک "بدمعاشی" میں بھی قدم رکھتا تھا۔ جمیل صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک کرائے دار کی حیثیت سے انہوں نے کبھی بھی اپنے مالک مکان کو پریشان نہیں کیا، مگر یہ سکندر حیلے بہانوں سے بار بار ان کے دروازے پر دستک دیتا تھا۔ ایک دو بار کشف نے بھی شکایت کی کہ وہ اسے گھورتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا تھا جب ایک موقع پر جمیل صاحب نے سکندر کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی۔ بہرحال جمیل صاحب کا خیال تھا کہ وہ جب تک اس گھر میں رہے، اس سکندر کی طرف سے انہیں اور ان کے اہلِ خانہ کو پریشانی ہی رہی۔

اگلے ہی روز صبح سویرے میری بھیجی ہوئی پارٹی لیے چوڑے سکندر کو پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے آئی۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ نشہ بھی کرتا ہے..... غالباً چاروں معروف شرعی عیب اس میں موجود تھے۔ اندر سے شاید وہ ڈرا ہوا ہو مگر باہر سے پُرسکون اور بے خوف نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ کشف کے قتل والے واقعے سے آگاہ تھا اور بہت حیرانی ظاہر کررہا تھا کہ اسے اس سلسلے میں طلب کیوں کیا گیا ہے؟

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جناب سکندر صاحب! آپ کو طلب اس لیے کیا گیا ہے کہ جمیل صاحب آج کل جس گلی میں رہتے ہیں، وہاں ایک گھر میں کلوزسرکٹ کیمرا نصب ہے اور واردات کی رات اتفاق سے وہ کیمرا کام بھی کررہا تھا۔"

سکندر کے گندمی چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس نے اپنے چمکیلے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں گھمائیں اور بولا۔ "اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے..... پھر بھی..... مجھے لگ یہی رہا ہے کہ میاں جمیل نے میرے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بول دیا ہے..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہفتے کی رات میں اس سڑک پر گیا ضرور تھا مگر کسی بھی طرح کسی بُری نیت سے نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں تصدیق کرسکتے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں اور میاں جمیل صاحب کو بھی معلوم نہیں کہ رمضان شریف سے پہلے ان کے محلے میں جو نئے محلے دار، پروڈیوسر چوہدری الیاس صاحب آئے ہیں وہ میرے پرانے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ ایک لمبے عرصے سے جان پہچان ہے۔ میں ان سے ہی ملنے گیا تھا۔ مجھے تو اس بات کا پتا بھی واردات کے بعد ہی چلا کہ میاں جمیل بھی اسی اسٹریٹ میں رہتے ہیں۔"

"تم نے تھانے آتے ہوئے راستے میں اے ایس آئی ارحم سے جھوٹ کیوں بولا کہ ہفتے کی رات تم لاہور میں ہی نہیں تھے؟"

سکندر کے چہرے پر پھر رنگ سا آکر گزر گیا۔ غیر مستحکم لہجے میں وہ بولا۔ "سچی بات یہی ہے جی کہ اپنے بلاوے پر میں ڈر گیا تھا۔ مجھے سمجھ آرہی تھی کہ کسی وجہ سے مجھے اس قتل کے معاملے میں ملوث کیا جارہا ہے..... م..... مجھے کیسرے والی بات کا پتا نہیں تھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ شاید میاں جمیل یا اُن کے گھر والوں میں سے کسی نے مجھے اس اسٹریٹ میں دیکھا ہے اور میاں جمیل نے پرانی رنجش کی وجہ سے میرا نام لے لیا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے اندر ہی اس پروڈیوسر چوہدری الیاس کو بلا لیا گیا۔ سکندر نے انکشاف کیا تھا کہ وہ فلم پروڈیوسر ہے۔ تاہم ملاقات کے بعد وقوعہ پر پروڈیوسر لگا چوہدری لگا اور نہ ہی کسی کام کا لگا۔ ہمارے خیال کے برعکس اس کی عمر بھی اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی، پکا سا رنگ اور بھدے نقوش۔ چار پانچ منٹ کی گفتگو میں ہی یہ بات کھل گئی کہ چوہدری الیاس ان لوگوں میں سے ہے جو فلم بنانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے وقت کو رنگین بنانے کے لیے پروڈیوسرز کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کے پاس روپیا ہوتا ہے، یہ لاہور کے کسی فلم اسٹوڈیو میں ایک دفتر کرائے پر لے کر ایک آدھ ملازم رکھ لیتے ہیں اور اسٹوڈیو کی راہداریوں اور باغیچوں میں اُڑتی پھرتی تتلیوں کو دبوچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ (الیاس نے بھی کچھ عرصہ پہلے ایک چھوٹا پلازا بیچا تھا اور جیبوں میں نوٹ ٹھونسے پھرتا تھا)

اس الیاس نامی شخص نے اپنے دوست سکندر کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ ہفتے کی رات وہ نو بجے سے قریباً دس بجے تک اس کے نئے گھر میں رہا اور وہ دونوں باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتے رہے۔ میری چند سخت جھاڑیں کھانے کے بعد بھی وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ بہرحال اسی دوران میں ایک ایسا ثبوت ہمارے ہاتھ لگ گیا جس سے یہ کیس تقریباً تقریباً حل ہوگیا۔

شومئی قسمت اس برائے نام پروڈیوسر کا موبائل فون

اس کی جیب میں ہی تھا۔ میرے پڑھے لکھے نوجوان اسے ایس آئی ارحم نے اس موبائل کا ''پوسٹ مارٹم'' کیا تو اسے پتا چلا کہ فون میں ''کال ریکارڈنگ'' کی ایپلی کیشن بھی لگی ہوئی ہے۔ ریکارڈ شدہ کالز میں سات آٹھ روز پہلے کی ایک کال بڑی دھانسو ثابت ہوئی۔ الیاس کی بھول تھی یا پھر حماقت تھی کہ وہ ابھی تک اس کال کو ''ڈیلیٹ'' نہیں کر پایا تھا۔ جمعرات کی شب الیاس نے یہ کال اپنے ہم نوالہ و پیالہ سکندر کو کی تھی۔ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔

''یار! ڈر ہی لگ رہا ہے پنگے سے..... اتھری رن (عورت) ہے۔ آسانی سے کنٹرول نہیں ہوگی۔''

الیاس نے کہا۔ ''اوئے چیتے، ڈرے گا تو کیا کرے گا؟ تو نے سنا نہیں کہ ڈر کے آگے جیت ہوتی ہے۔''

''اور جیت کے آگے پنگا بھی تو ہو سکتا ہے بلکہ جیت کے دوران میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے گھر والوں میں سے کوئی ٹپک پڑا تو پھر؟''

''نہیں ٹپکے گا۔ یہ میرا دل کہہ رہا ہے..... میرا پُرزور مشورہ تو یہی ہے چیتے، نکال لے اپنے دل کی حسرت۔ بڑی ریشمی چیز ہے اور پھسل رہی ہے تیرے ہاتھ سے..... یہ موقع پھر نہیں ملنے والا۔''

''تو پھر تو بھی کچھ ساتھ دے میرا۔''

''تیری مت ماری گئی ہے۔ کل تیری بھابی اپنی ماں کے گھر سے آنی ہے۔ عید تک تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑنے والی۔''

''تو پھر عید کے بعد کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا۔''

''زیادہ میٹھا تو پھر کڑوا۔''

اسی دوران میں کسی عورت کے بولنے کی آواز آئی۔ غالباً یہ الیاس کی بیوی تھی۔ اس نے کال ختم کر دی۔

میں کوئی روایتی تھانیدار نہیں تھا پر اس کال کے بعد میرے لیے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ممکن نہیں رہا۔ دونوں دوست ابھی تک جرم سے انکار کر رہے تھے۔ ان کی حیثیت اور مرتبے کی پروا کیے بغیر میں نے حوالدار کرامت سے کہا کہ وہ اپنی کرامت دکھائے۔ وہ دونوں دھمکیوں پر اتر آئے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ایک بڑا وکیل ان کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ ایڈووکیٹ آفتاب کی مجھ سے بھی کچھ جان پہچان تھی۔ اس نے علیحدگی میں دونوں دوستوں سے طویل گفتگو کی پھر میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر شاہ جہاں! جرم کی صرف پلاننگ پر تو سزا نہیں ہو سکتی ناں؟''

''تم کیسی بات کر رہے ہو؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''یہاں پلاننگ ہی نہیں، جرم بھی ہوا ہے۔''

''نہیں صرف پلاننگ ہوئی ہے اور اگر یہ آڈیو ریکارڈنگ عدالت تک پہنچتی ہے تو وہاں ہم بڑی آسانی سے اس ریکارڈنگ کو بھی ''فیک'' ثابت کر سکتے ہیں۔''

''یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ تم اس پلاننگ کو صرف پلاننگ کیوں کہہ رہے ہو؟''

جواب میں ایڈووکیٹ آفتاب نے ''آف دی ریکارڈ'' رازداری کے لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا..... ریکارڈ ہونے والی گفتگو کشف کے بارے میں نہیں تھی۔ یہ سونیا نامی ایک اور خاتون تھی۔ لاہور میں ہی رہتی تھی۔ اس کا شوہر دو سال سے ملائیشیا میں تھا۔ سکندر کے ساتھ سونیا کا معاشقہ ڈیڑھ دو سال سے چل رہا تھا۔ وہ اس کی محبت کے جال میں پھنسی ہوئی تھی مگر شادی شدہ تھی اس لیے ایک حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسری طرف سکندر جیسے لوگ اپنے رویوں میں مادر پدر آزاد ہوتے ہیں۔ سکندر کو معلوم تھا کہ دو ڈھائی ماہ تک سونیا اپنے خاوند کے پاس ملائیشیا جا رہی ہے۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ سونیا کے اُڑن چھو ہونے سے قبل کسی طرح اس سے اپنے تعلق کا خراج وصول کر لے۔ تاہم اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں عین موقع پر وہ پھر انکار نہ کر دے۔ فوری طور پر سکندر کا یہ مذموم ارادہ یوں پورا نہ ہو سکا تھا کہ عید سے چند دن پہلے ہی سونیا اپنے ننھیال کوئٹہ چلی گئی تھی اور اسے پندرہ بیس روز بعد واپس آنا تھا۔

☆☆☆

عیدالفطر کی تین چار چھٹیوں میں بھی میرا ذہن اس کیس میں اُلجھا رہا۔ فرش پر بے سدھ پڑی نرم و نازک کشف کا سراپا میری نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اس کے والدین اس کے دودھ کی ''عیدی'' لے کر گئے ہوئے تھے اور وہ دل میں سیکڑوں ارمان لیے راہی عدم ہو چکی تھی۔ جاتے جاتے وہ اپنے مجرم کو ڈھونڈنے کا سارا بوجھ قانون کے کندھوں پر ڈال گئی تھی۔

میں نے اور میرے عملے نے دو تین اور سمتوں میں بھی تفتیش کی تھی مگر تفتیش کا اصل رخ ابھی تک دو افراد کی طرف ہی تھا۔ ایک غنڈا صفت سکندر اور دوسرا کشف کا چچازاد ثاقب۔ ثاقب ابھی تک جسمانی ریمانڈ پر تھا اور غالباً توقع وہ عدالت میں اپنے اعترافی بیان سے انکاری ہو گیا تھا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ وہ کشف سے ملنے ضرور گیا تھا

مگر اس کی آمد پر کشف نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔

دوسری طرف سکندر بھی زیرِ تفتیش تھا مگر اسے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ ندامت کے عالم میں اس کا کہنا بھی یہی تھا کہ جو ریکارڈڈ گفتگو پکڑی گئی ہے، وہ کشف کے بارے میں نہیں سونیا کے بارے میں تھی۔ میں اپنے طور پر سونیا کے معاملات کی تصدیق تو کر چکا تھا لیکن یہ بات وثوق سے کیسے کہی جا سکتی تھی کہ وہ ریکارڈڈ گفتگو سونیا کے متعلق ہی تھی۔

ویسے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی اور جرم کا سراغ لگا رہے ہوتے ہیں اور کسی ایسے جرم کا یا جرم کی پلاننگ کا کھوج مل جاتا ہے جس کی توقع بھی نہیں کی ہوتی۔

عید کے بعد پہلے روز کی ڈیوٹی پر ہی مجھے یہ پتا چلا کہ مقتولہ کشف کی قریبی سہیلی دریاب لاہور میں نہیں ہے۔ دراصل میں نے اس سے ثاقب اور کشف کے تعلقات کے بارے میں مزید جاننے کے لیے فون کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت ڈی جی خان چلی گئی ہے (جب تفتیش جاری ہو تو کیس سے تعلق رکھنے والے کسی قریبی فرد کا اچانک اوجھل ہو جانا، اسے مشکوک بنا دیتا ہے۔ دریاب بھی بغیر اطلاع دیے اوجھل ہو گئی تھی) دریاب کے حوالے سے ایک اور بات بھی، کسی وقت مجھے الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ ایک تفتیشی افسر کی حیثیت سے میں نے جب بھی اس سے سوال جواب کیے وہ بے حد گم صم نظر آئی، میرے دس فقروں کے جواب میں بس ایک آدھ فقرہ ہی بولا۔ اس کی آنکھوں کے اندر جیسے مسلسل کوئی دکھ کروٹیں لیتا تھا۔ اس کی اس کیفیت کو قریبی فرینڈ کی المناک جدائی پر بھی محمول کیا جا سکتا تھا..... مگر کسی وقت یہ کیفیت کچھ جدا بھی لگتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ شک بھی ہوتا تھا کہ وہ کوئی سکون بخش دوا کھاتی ہے یا کسی طرح کا ہلکا پھلکا نشہ کرتی ہے۔

کوشش کر کے میں نے دریاب کا فون نمبر حاصل کیا اور فون پر ہی اس سے ثاقب اور کشف کے بارے میں کچھ ضروری باتیں پوچھیں۔

..... وقت گزر رہا تھا اور کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک مضبوط کیس کے بغیر چالان پیش کرنا بیکار تھا۔ اب مقتولہ کا چچازاد ثاقب ضمانت پر تھا مگر اہم پیش رفت ہونے پر کسی بھی وقت اس کی ضمانت منسوخ ہو سکتی تھی۔ دوسرا مشتبہ شخص سکندر بھی ابھی تک یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب تھا کہ اس کی جو آڈیو ریکارڈنگ پکڑی گئی ہے، وہ اس دوسری خاتون کے حوالے سے تھی اور وہ صرف زبانی کلامی باتیں تھیں۔ مزید یہ کہ واردات کی شام وہ اپنے دوست ''چوہدری الیاس'' کے گھر تک محدود رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ کسی وقت تو یوں لگنے لگتا تھا کہ شاید یہ کیس سرد خانے میں ہی چلا جائے۔ ہم تینوں مشتبہ افراد یعنی ثاقب، دریاب اور سکندر کے بیانات میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔ لواحقین کی بے احتیاطی کی وجہ سے موقع واردات سے فنگر پرنٹس یا کوئی اور اہم شہادت حاصل نہیں ہو پائی تھی۔ مجھے مایوسی محسوس ہوتی تو نگاہوں کے سامنے، فرش پر آڑی ترچھی پڑی کشف کی لاش آ جاتی۔ وہ مجھ سے بہ زبان خاموشی پوچھتی..... کیا یہ میرے مرنے کی عمر تھی؟

کشف کی سہیلی دریاب ڈی جی خان سے واپس آ چکی تھی۔ ایک روز میں نے پھر اس سے سوال جواب کیے۔ اس پوچھ گچھ کے لیے میں نے اس کے گھر واقع ''لاہور صدر'' جانا مناسب سمجھا۔ میں سادہ لباس میں گیا تھا۔ دریاب کی والدہ کی موجودگی میں، میں نے دریاب سے اس شام کی ساری تفصیلات پوچھیں جب وہ اپنی سہیلی کو سرپرائز دینے کے لیے اس کے گھر پہنچی تھی۔ دریاب نے بتایا کہ وہ کتنے بجے نکلی، کہاں رکی اور کب پہنچی وغیرہ وغیرہ۔

اچانک..... بالکل اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دریاب نے ایک مقام پر جھوٹ بولا ہے..... غلط بیانی کی ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟

دریاب کے گھر سے واپس آ کر بھی یہی بات میرے ذہن میں گردش کرتی رہی۔ میرے اندر ایک وجدان سا پیدا ہو رہا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے میں نے اپنے اے ایس آئی ارجم کو تین اہلکاروں کے ساتھ بھیجا اور وہ دریاب کو پولیس اسٹیشن لے آئے۔ دریاب کی والدہ اور ایک ماموں بھی ساتھ آئے تھے۔ وہ اسی گاڑی پر تھے جس پر دریاب چند دن پہلے سوار ہو کر کشف سے ملنے گئی تھی۔ اس چھوٹی گاڑی کے معائنے پر میرے اس اندازے کی تصدیق ہوئی کہ اس میں ''اے سی'' وغیرہ نہیں ہے۔ میرے اس اچانک بلاوے پر دریاب کے ماموں اور والدہ سخت جز بز تھے۔ میرا رویہ دیکھ کر اس کے ماموں نے میری پٹی اتروانے کی ''ہر دلعزیز'' دھمکی بھی دے ڈالی۔ لیکن میں رسک لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے ہیڈ آفس سے دو کہنہ مشق لیڈی اہلکاروں کو بھی بلا لیا تھا۔ میں نے پہلے دریاب سے زبانی پوچھ گچھ کی پھر اسے لیڈی اہلکاروں کے حوالے کر دیا۔

دریاب زیادہ سخت جان ثابت نہیں ہوئی۔ غالباً چند طمانچے کھانے کے بعد ہی اس کا خول ٹوٹ گیا اور اس نے

کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جن کے بعد اس کے پاس واپسی کا راستہ نہ رہا۔ بے شک وہ ایک مضبوط لڑکی تھی۔ ایتھلیٹ اور باکی کی کھلاڑی بھی رہی تھی مگر تھی تو ایک لڑکی ہی۔ اس نے اعتراف کرلیا کہ چوبیسویں رمضان کی شام کشف کے گھر میں داخل ہونے والی اور اُسے موت کے گھاٹ اتارنے والی وہ خود ہی تھی۔ (دریاب کا یہ اعتراف، ثاقب والے اعتراف سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں سچائی جھلک رہی تھی۔ وہ سچائی جو بے حد تلخ تھی اور حیرت انگیز بھی)

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ بظاہر ہوا میں معلق یہ کیس صرف ایک نکتے کی وجہ سے اتنی جلدی اختتام کو پہنچ جائے گا۔ وہ نکتہ جو واردات کی شام، دریاب کی اقبال ٹاؤن آمد کے حوالے سے سامنے آیا تھا۔ اگلے دس بارہ گھنٹوں میں بھی کچھ واضح ہوگیا، کسی بھی قتل کیس میں سب سے اہم بات وجۂ قتل ہوتی ہے۔ دریاب نے کشف کو مارا تو کیوں مارا؟ اس کا جواب تھا رقابت۔ طویل پوچھ گچھ کے دوران میں یہ انکشاف ہوا کہ مقتولہ کشف کی شادی جس شاہ رخ نامی لڑکے سے ہورہی تھی، وہ اسکول کالج کے دور سے ہی دریاب کا محبوب تھا پھر ان دونوں میں دوری پیدا ہوئی۔ دریاب اپنے رویّوں کے اعتبار سے بڑی حد تک پُراسرار اور انتہا پسند تھی۔ بے شک وہ کشف کی دوست تھی مگر دل ہی دل میں اسے اپنی بدترین دشمن اور رقیب کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ یہی رقابت ایک دن جنون کی شکل اختیار کرگئی اور کشف کی جان لے گئی۔

وقوعہ کی شام وہ ''آئس'' کے نشے کے زیر اثر کشف کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے بڑے شولڈر بیگ میں ایک ہتھوڑا نما ہتھوڑی تھی جو اس نے خاص اسی کام کے لیے خریدی تھی۔ گھر میں داخل ہونے کے چار پانچ منٹ بعد ہی اس نے کشف کی جان لے لی۔ بعدازاں واردات کو دوسرا رنگ دینے کے لیے اس نے مقتولہ کے کپڑے پھاڑے اور اس کے جسم پر نوچ کھسوٹ کے نشان ڈالے۔

ثاقب بالکل بے گناہ ثابت ہوا۔ اس کا قصور بس اتنا تھا کہ وہ کشف سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت تقریباً یک طرفہ ہی تھی۔ وہ دُلہن بننے والی تھی اور وہ اسے آخری بار دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے اُن کے گھر گیا۔ (وہ جانتا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے) وہ مسلسل ڈور بیل بجاتا رہا اور دستک دیتا رہا۔ مگر کشف نے دروازہ نہیں کھولا۔ کھولتی بھی کیسے؟ وہ اپنے ہاتھوں میں خون کی مہندی لگا چکی تھی۔

سکندر بھی اس کیس میں بے گناہ ثابت ہوا مگر دوسرے معاملے میں اُسے بے گناہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ایک خاتون کو پامال کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ معاملہ خاتون کا تھا ورنہ میں خود مدعی بن کر اس کے خلاف پرچہ درج کرلیتا۔ بہرحال اپنے دو اعلیٰ افسران کے ساتھ مل کر میں نے اس پر اور اس کے وکیل پر دباؤ ڈالا اور وہ طویل عرصے کے لیے دبئی کی طرف نکل گیا۔

آخر میں، میں اس چھوٹے سے نکتے کی طرف آتا ہوں جس کی وجہ سے دریاب میری نظروں میں مشکوک ٹھہری تھی اور میں نے اس کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا تھا۔

جب میں نے دریاب سے قتل کی شام والی مصروفیات کی تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ شام سوا چھ بجے کے لگ بھگ اپنے والد کی گرے کار ڈرائیو کرتے ہوئے گھر سے نکلی تھی اور افطاری کے بعد آٹھ بجے کے قریب کشف کے گھر پہنچی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ راستے میں کہیں رکی تھی جو اتنی دیر لگی؟ وہ جلدی سے بولی کہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے ریگل چوک کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں رکی تھی، آئس کریم وغیرہ لینے کے لیے.....

یہ آئس کریم والی بات میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئی تھی..... یہ بالکل ''کامن سینس'' کی بات ہے کہ جب ہم کسی کے گھر مہمان جاتے ہیں اور میزبان کو پیش کرنے کے لیے آئس کریم لیتے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آئس کریم، میزبان کے گھر کے قریب ہی سے لی جائے تاکہ نرم نہ ہو۔ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو موسم گرما میں، میزبان کے گھر پہنچنے سے ایک گھنٹا قبل آئس کریم خرید کر رکھ لے مگر یہاں دریاب کی زبان سے بے ساختہ پھسل گیا تھا کہ اس نے آئس کریم ریگل چوک کے قریب سے لی۔ ریگل چوک سے اقبال ٹاؤن کا فاصلہ کم از کم..... کم از کم پون گھنٹے کا تھا جبکہ ہر طرح کی آئس کریم بہ آسانی اقبال ٹاؤن کی کسی بھی شاپ سے مل سکتی تھی (یاد رہے کہ دریاب والی گاڑی میں اے سی وغیرہ بھی نہیں تھا) یہی نکتہ دریاب کی گرفتاری کا سبب بنا..... اس کا یہ چھوٹا سا جھوٹ بڑے جھوٹ کا سراغ دے گیا۔

درحقیقت دریاب نے آئس کریم تو کشف کے گھر کے پاس ہی سے خریدی تھی، ریگل چوک کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے اس نے وہ ہتھوڑی لی تھی جو بعدازاں آلۂ قتل ثابت ہوئی اور دریاب سے برآمد بھی ہوئی..... دریاب اب جیل میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے۔

❖ ❖ ❖

خوب صورت اسٹروکس کھیلنے والے بیٹ باز کیلئے بولڈ ہونے کا صدمہ

زندگی کا کوئی شعبہ ہو، رقابت کم و بیش ہر جگہ پائی جاتی ہے اور کھیل کے میدان میں تو رقابت اور مسابقت دیگر شعبوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی کارفرما نظر آتی ہے۔ ایسی ہی حریصانہ چپقلش کا ماجرا جو پلے بازوں کے درمیان جاری تھی۔ کامیابیاں دونوں کے حصے میں آرہی تھیں مگر ایک نے غیر معمولی اور غیر متوقع کامیابی حاصل کرکے اپنا کیریئر داؤ پر لگا دیا۔

طاہر جاوید مغل

پلے باز

کرکٹ کے میدان میں کئی برسوں سے دو خاندانوں کو اہم مقام حاصل تھا۔ خان فیملی اور راجا فیملی۔ خان فیملی کے سربراہ عبدالواحد خان صاحب تھے اور راجا فیملی کے کرتا دھرتا ظہور راجا تھے۔ ان دونوں حضرات نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز پچیس تیس برس پہلے کیا تھا اور دونوں نے خوب نام کمایا تھا۔ ان دونوں حضرات کے بعد ان کے بھائی اور پھر بیٹے بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم میں شامل ہوئے اور نمایاں کارنامے انجام دیے۔

بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ ان دونوں فیملیز کے باہمی تعلقات کچھ اتنے زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اپنے اپنے لڑکوں کو قومی ٹیم میں شامل کرانے کے لیے ہمیشہ ان کے درمیان ایک سرد جنگ جاری رہتی تھی۔ بظاہر یہ لوگ آپس میں دوست بھی تھے لیکن اندرونِ خانہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ان دنوں خاص طور سے دونوں فیملیز میں کھینچا تانی کی کیفیت موجود تھی۔

واحد خان کا سب سے چھوٹا بیٹا اویس خان قومی ٹیم میں بطور پلے باز شامل تھا اور تیسرے نمبر پر بیٹنگ کرتا تھا۔ دوسری طرف ظہور راجا کا سب سے چھوٹا بیٹا شہزاد راجا بھی قومی ٹیم میں شامل تھا۔ وہ بھی مڈل آرڈر بیٹسمین تھا اور تیسرے یا چوتھے نمبر پر کھیلتا تھا۔ دونوں اچھا کھیل رہے تھے مگر یہ سب جانتے تھے کہ جلد یا بدیر ان دونوں میں سے ایک کو ٹیم سے باہر ہونا ہے۔ درحقیقت ٹیم میں نیا خون شامل کرنے کی اشد ضرورت تھی اور کم از کم تین شاندار



ٹیل آرڈر نشستیں بڑی شدت سے قومی ٹیم کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ انہیں زیادہ دیر ٹیسٹ کیپ سے محروم نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

نہ جانے کیوں خان فیملی کے سربراہ واحد خان صاحب کو یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ ٹیم کے ٹیل آرڈر میں جب بھی تبدیلی ہوگی ان کے حق میں اچھی نہیں ہوگی۔ انہیں یہ وہم سا ہوگیا تھا کہ شہزاد راجا کے بجائے اویس خان کو ڈراپ کردیا جائے گا اور نہ صرف ڈراپ کیا جائے گا بلکہ آہستہ آہستہ اس کا ٹیسٹ کیریئر بھی ختم ہوجائے گا۔ اس وہم کی کئی وجوہات ہوسکتی تھیں لیکن جو وجہ واحد خان صاحب کی سمجھ میں آتی تھی وہ یہ تھی کہ اویس خان' شہزاد راجا کی نسبت زیادہ بے پروا اور شوخ تھا۔ صنفِ مخالف میں اس کی دلچسپی بھی شہزاد راجا سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک دو خوبرو لڑکیوں کے ساتھ اس کے اسکینڈلز بنے تھے اور ان اسکینڈلز کی حقیقت سے واحد خان صاحب بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔

کرکٹ اور جسمانی "فٹ نس" کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور موجودہ دور کی تیز کرکٹ میں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا ہے۔ جسمانی فٹ نس کے بارے میں واحد خان صاحب کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کھلاڑی اس وقت تک فٹ رہتا ہے جب تک وہ غیر شادی شدہ ہوتا ہے۔ شادی شدہ کھلاڑی کتنا بھی محتاط اور سیانہ رویوں نہ ہو' اس کی ذہنی اور جسمانی چستی بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی ٹیم کا "بابا" کہلانے لگتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ واحد خان صاحب اویس کی شادی کے سخت خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ابھی کم از کم پانچ برس تک وہ شادی کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ والدہ کے اختلاف کے باوجود اویس بھی باپ کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا لیکن اس کے دل کی بات کا علم کسی کو نہیں تھا... یہی وجہ تھی کہ جب ایک دن واحد خان صاحب نے اویس کی شادی کی خبر سنی تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے اس انگریزی اخبار کو گھورتے رہے جس میں یہ خبر چھپی تھی۔ پھر انہوں نے اخبار ایک طرف پھینکا اور ٹیلی فون کی طرف لپکے۔

اویس خان ان دنوں انگلینڈ میں کاؤنٹی کھیل رہا تھا۔ اخبار کی خبر کے مطابق اس نے انگلینڈ میں ہی مقیم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ اخبار نے دلہا دلہن کی تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ واحد خان صاحب کو حیرت ہورہی تھی کہ یہ تصویر دیکھ کر ابھی تک انہیں دل کا دورہ کیوں نہیں پڑا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیے' وہ انگلینڈ میں اویس خان سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔ دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے باوجود وہ اپنے ارادے میں ناکام رہے۔ یوں لگ رہا تھا کہ اویس جان بوجھ کر ان سے بات نہیں کررہا۔ صرف اویس کے ایک دوست سے بات ہوسکی۔ اس نے اس خبر کی تصدیق تو نہیں کی لیکن اس کی باتوں سے یہی اندازہ ہوا کہ دال میں کالا بلکہ "کالا سیاہ" موجود ہے۔

واحد خان صاحب ایک بہت بڑی اشتہاری فرم میں "پی آر او" کے طور پر کام کرتے تھے۔ دفتر سے گھر پہنچتے ہی انہوں نے اخبار اپنی بیگم کے سامنے پھینکا اور دہاڑے "دیکھ لے اپنے بیٹے کے کرتوت۔ اس نے وہی کیا جس سے اسے دس کروڑ بار منع کیا تھا۔ بدبخت نے شادی کرلی ہے وہاں۔"

بیگم واحد خان نے بڑے اطمینان سے یہ خبر سنی۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس خبر سے آگاہ ہیں۔ انگریزی تو وہ جانتی نہیں تھیں تاہم انہوں نے اخبار اٹھا کر بیٹے اور بہو کی تصویر دیکھی اور مسکرانے لگیں۔

واحد خان صاحب گرجے "بہت اچھا موقع ہے مسکرانے کا۔ میرے خیال میں تو شیرینی بانٹو۔ سب کو لڈو کھلاؤ اس بات پر کہ تمہارا بیٹا عنقریب ذلیل ہوکر قومی ٹیم سے باہر ہونے والا ہے۔"

"ابھی ذلیل ہوں اس کے دشمن" بیگم واحد خان نے کہا۔ "شادی ہی کی ہے' گناہ تو نہیں کیا۔ جب آپ چھبیس سال کے تھے تو تین بچوں کے باپ تھے۔"

"کاش نہ ہوتا میں باپ ایسے بچوں کا" واحد خان صاحب نے تلملا کر کہا "دیکھو بدبخت کی بے غیرتی۔ ہمیں اطلاع تک نہیں اور وہ شادی کرچکا ہے۔"

"یہ تو نہ کہیں جی!" بیگم واحد نے کلے میں پان دباتے ہوئے کہا۔ "اطلاع تو اس نے دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے فون پر بات کی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا ہے۔ بات ہی کچھ ایسی بن گئی تھی۔ لڑکی کی والدہ دل کی مریضہ تھیں' انہیں دورہ پڑا۔ انہوں نے کہا کہ میری سانسوں کا کوئی بھروسا نہیں' چاہتی ہوں کہ اپنے سامنے بیٹی کو رخصت کردوں۔ بس اسپتال کے ایک کمرے میں ہی نکاح ہوگیا..."

"کمرے میں ہی نکاح ہوگیا" واحد خان صاحب نے بیگم کی نقل اتاری' پھر غصے میں پھنکارے "میں پاگل نہیں ہوں جو اس فلمی کہانی پر یقین کرلوں گا۔ اس سؤر کے بچے نے سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"چلیں بلا سوچے سمجھے تو نہیں کیا ناں" بیگم نے ہاتھ نچائے اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

○☆○

کاؤنٹی سیزن ختم ہوا تو اویس خان اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان آگیا۔ اس وقت تک عبدالواحد خان صاحب کا غصہ کافی حد تک کم ہوچکا تھا مگر اتنا بھی کم نہیں ہوا تھا کہ وہ بہو اور بیٹے کو گلے لگا لیتے۔ انہوں نے تخلیے میں اویس خان کے خوب خوب لتے لیے اور اسے شادی کے سبب آنے والی آفات سے ڈرایا۔ وہ بولے "بیٹا! یہ بال تیرے باپ نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میں جو کچھ کرکٹ کے بارے میں جانتا ہوں' تمہارا باپ... میرا مطلب ہے' کسی کا باپ

بھی نہیں جان سکتا۔ اب وہ دور نہیں رہا جب انتخاب عالم اشتاق اور احتشام الدین جیسے کھلاڑی قومی ٹیم میں جگہ بنالیا کرتے تھے۔ یہ تو جسمانی فٹ نس اور انتہا درجے کی تیزی طراری کا دور ہے۔ اب تو سلیکٹر حضرات شادی شدہ کھلاڑی سے ایسے ہی ڈرتے ہیں جیسے کوا غلیل سے ڈرتا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ شادی کرکے تم نے اپنے کیریئر کا گلا گھونٹ لیا ہے۔ کم از کم پانچ برس صاف نکل گئے ہیں تمہارے کیریئر میں سے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ تمہیں میری اس بات پر یقین کرنا ہی ہوگا۔"

واحد خان صاحب کی باریک بین نظروں نے بہت جلد وہ تبدیلی محسوس کرلی جس کا اندیشہ رات دن انہیں پریشان رکھتا تھا۔ اویس دیر سے سوتا اور دیر سے اٹھتا تھا۔ وہ کھانے پینے میں بھی احتیاط نہیں کررہا تھا۔ معمولیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ پریکٹس کے لیے بھی کم وقت نکلتا تھا۔ ایک روز انہوں نے اویس کو قذافی اسٹیڈیم میں نیٹ پریکٹس کرتے دیکھا اور واضح طور پر نوٹ کیا کہ اس کی بلے بازی میں اب پہلے جیسا "دم" نہیں رہا۔ بلا ہر وہ فارم میں تھا لیکن کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس سے پہلے نہیں تھی۔

گزرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ اویس کے کھیل میں رونما ہونے والی تبدیلی دیکھ کر دوسرے ماہرین نے بھی نوٹ کیا۔ اب اس میں چستی کا وہ پہلے جیسا معیار برقرار نہیں رہا تھا۔ اس کا وزن بڑھ رہا تھا اور اپنے اسٹروکس کھیلنے میں وہ غیر محسوس طور پر سستی کا مظاہرہ کرجاتا تھا۔

اویس کے کھیل میں زوال کی کیفیت کو محسوس کرنے کے بعد واحد صاحب کا صبر قرار لٹ گیا۔ وہ تصور کی نظروں سے وہ منظر دیکھ رہے تھے جب ان کے بیٹے کو ٹیم سے نکلنا تھا اور انہیں اپنے سب سے بڑے حریف ظہور راجا کے سامنے سرنگوں ہونا تھا۔ درحقیقت اویس کا ٹیم سے نکلنا بھی اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا جتنا اہم یہ تھا کہ ظہور راجا کے سامنے ان کی ناک نیچی ہونے والی تھی۔ یہ واحد خان صاحب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ ظہور راجا کا بیٹا شہزاد راجا تو ٹیم میں موجود رہتا لیکن اویس خان آؤٹ ہوجاتا۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے واحد خان کے دور اندیش ذہن نے وقت سے پہلے ہی منصوبہ بندی شروع کردی۔ اب وہ یہ تو کر نہیں سکتے تھے کہ بیٹے کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے اور پھر سے غیر شادی شدہ کرکٹر کی حیثیت سے پہچانا جانے لگے.... ہاں وہ ایک اور کام کرسکتے تھے۔ وہ یہ کرسکتے تھے کہ اپنے مدِمقابل کے بیٹے کو بھی شادی کے جنجال میں پھنسا دیتے۔ اور یوں، قومی ٹیم میں شامل ان دونوں کھلاڑیوں کے لیے ایک جیسے مواقع اور ایک جیسے حالات پیدا ہوجاتے۔۔۔ یہ بڑے پتے کی بات واحد خان صاحب کے ذہن میں آئی تھی۔ انہوں نے تنہائی میں اسے آپ کو خود ہی شاباش دی لیکن پھر فوراً ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ظہور راجا کے بیٹے کو شادی کی دلدل میں پھنسایا کس طرح جائے۔ وہ خرانٹ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ واحد خان صاحب اس کی رگ رگ سے واقف تھے۔ وہ دل ہی دل میں یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ ظہور راجا کا بیٹا ان کے بیٹے کی نسبت مضبوط کردار کا مالک ہے اور صنفِ مخالف کے لیے اس کے دل میں وہ بے تابیاں بھی نہیں جو ان کے بیٹے میں موجود ہیں اور جن کے نتیجے میں وہ ایک شادی شدہ کرکٹر کہلا رہا ہے۔ انہوں نے کئی بار بڑے غور سے شہزاد کو دیکھا تھا، اس کی آنکھوں میں انہیں ہمیشہ مضبوط ارادوں کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ ایک ایسے کھلاڑی کی آنکھیں تھیں جو اپنی پرستار لڑکیوں پر رال ٹپکانے کے بجائے اپنے کھیل پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔

بہرحال جب واحد خان صاحب نے ایک بار ارادہ کرلیا تو پھر یہ ارادہ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے چپکے چپکے مختلف پلان بنانے شروع کردیے۔ ایسے پلان جن میں وہ براہِ راست ملوث نہ ہوں لیکن جن کا حتمی نتیجہ شہزاد راجا کے سر پر سہرے کی صورت میں نکلے۔ اپنے نظریات کی سچائی پر واحد خان صاحب کو پورا بھروسا تھا اور انہیں یقین تھا کہ شادی شدہ شہزاد ان کے بیٹے کے لیے غیر شادی شدہ شہزاد سے کہیں کم خطرناک ہوگا۔ ان دنوں واحد صاحب کی ذہنی کیفیت اس مصرعے کی آئینہ تھی۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

انہی دنوں اویس خان چند ماہ پاکستان میں گزارنے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ واپس انگلینڈ چلا گیا۔ اس کی رہائش گاہ لندن کے مضافات میں تھی۔ وہاں وہ شہزاد راجا کا پڑوسی تھا بلکہ دونوں کرکٹرز ایک ہی مکان کے دو پورشنز میں رہتے تھے اور زیادہ وقت اکٹھے ہی گزارتے تھے۔ (لیکن اس مشترکہ رہن سہن کے سبب اس منافقت اور رقابت کو خدانخواستہ کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا جو ان دونوں کرکٹرز کے دلوں میں موجود تھی اور پچھلی نسل سے پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ بظاہر اچھے دوست اور اچھے ٹیم ممبر تھے لیکن چپکے چپکے بڑی شدت سے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی بددعاؤں میں یاد رکھنا ہرگز نہیں بھولتے تھے) اویس خان کی انگلینڈ روانگی کے بعد واحد خان صاحب کو سوچ بچار کے لیے زیادہ وقت ملا۔ چند ہی دن میں ایک شاندار منصوبہ ان کے ذہن میں تیار ہوگیا اور اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے ایک



موزوں ترین لڑکی بھی مل گئی۔ اس لڑکی کا نام ارم تھا۔ وہ اسی اشتہاری فرم میں کام کرتی تھی جس میں واحد خان صاحب پی آر او تھے۔ ارم نے خود بھی چند اشتہاری فلموں میں کام کیا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت اور مقناطیسی کشش کی مالک تھی۔ "جوہر شناس" پورے یقین سے دعوے کر رہے تھے کہ یہ لڑکی مستقل مزاجی سے کام کرتی رہی تو شوبز میں دھوم مچادے گی۔ واحد خان صاحب نے اسے چند ہفتے پیشتر ہی دیکھا تھا۔ وہ ہر دیکھنے والی آنکھ کو مبہوت کردیتی تھی اور پھر یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا تھا۔ اس سے ملنا' اس سے بات کرنا' اس کو جاننا' یہ سارے بڑے دلفریب اور سحر انگیز تجربات ہوتے تھے۔ اسے دیکھنے کے بعد واحد صاحب کو یقین آگیا کہ یہ لڑکی شہزاد کو ذانواں ڈول کرے گی اور نہ صرف ذانواں ڈول کرے گی بلکہ چاروں شانے چت بھی کرے گی۔ فرم کے آفس میں واحد خان صاحب سینئر ترین فرد شمار ہوتے تھے۔ ویسے بھی وہ ایک "پبلک فگر" تھے۔ دوست احباب اور ملنے جلنے والے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان عزت کرنے والوں میں ارم بھی شامل تھی۔ وہ کسی یورپی ملک میں جاکر ڈریس ڈیزائننگ کا کورس کرنا چاہ رہی تھی۔ واحد خان صاحب نے اس سلسلے میں اس کی "مدد" کی اور اسے لندن کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلوادیا۔ نہ صرف داخلہ دلوادیا بلکہ وہاں اس کی رہائش کا بھی "بے حد معقول" انتظام کردیا۔ ارم کو لندن کے مضافات میں اویس اور اس کی بیوی کے ساتھ رہنا تھا۔ ارم کو ان دونوں کے ساتھ رکھنے میں واحد خان صاحب کی حکمت پوشیدہ تھی۔ وہ جانتے تھے' وہاں شہزاد راجا بھی ہے اور وہ سب وہاں اکٹھے ہی وقت گزارتے ہیں۔ عبدالواحد خان صاحب کو یقین تھا کہ جب ارم اس گھر میں رہے گی تو یہ بات ناممکنات میں سے ہوگی کہ وہ شہزاد کو متاثر نہ کرے اور شہزاد اس کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ انہیں ارم کی بے پناہ صلاحیتوں پر پورا پورا بھروسا تھا۔ ضرورت تو نہیں تھی تاہم انہوں نے ارم کو تھوڑی بہت تیاری بھی کروادی۔ روانگی سے ایک روز پہلے وہ اسے ایک اچھے ریستوران میں لے گئے۔ کھانا وغیرہ کھلایا اور شہزاد راجا کا ذکر چھیڑ دیا۔ ارم سے شہزاد کا غائبانہ تعارف تو وہ پہلے ہی تفصیل سے کرا چکے تھے۔ آج انہوں نے کچھ نئے زاویوں سے بات کی۔ انہوں نے بڑی صفائی سے یہ بات ارم کے ذہن میں ڈال دی کہ شہزاد ایک دولت مند اور مشہور کرکٹر ہی نہیں ایک بہترین شوہر بھی ثابت ہوسکتا ہے اور اگر وہ لندن میں اپنے قیام کے دوران شہزاد سے انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرلے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ ارم ایک ظریف لڑکی تھی یعنی حسین ہونے کے باوجود وہ ذہین اور زود فہم بھی تھی۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے وہ بات سمجھ گئی جو واحد خان اسے سمجھانا چاہ رہے تھے۔ اگلے ہی روز ارم لاہور سے عازم لندن ہوگئی۔

○☆○

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ گوروں کے دیس میں ارم کا دل خوب لگا۔ ڈریس ڈیزائننگ کے کورس کے بعد وہ ماڈلنگ کا ایک کورس کرنے بیٹھ گئی۔ کبھی کبھار اس کا کوئی خط بھی مل جاتا تھا۔ وہ اس گھر میں رہ رہی تھی جس کے ایک پورشن میں اویس خان اور دوسرے میں شہزاد راجا رہائش پذیر تھے۔ وہ ان لوگوں سے بہت خوش تھی اور لندن میں اپنے قیام سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بہت جلد گھل مل جانے والی لڑکی تھی۔ ایسے لوگ کہیں بھی ہوں اجنبی نہیں رہتے۔ ماسٹر مائنڈ واحد خان صاحب کو یقین تھا کہ ان کا منصوبہ کامیاب رہے گا۔ شہزاد راجا عنقریب شادی شدہ کہلائے گا اور بالفرض محال شادی شدہ نہ بھی کہلایا تو "کام" شادی شدہ لوگوں جیسے ہی کرے گا۔ ہاں' واحد خان صاحب کو یقین تھا کہ اب عورت شہزاد کی زندگی میں اور خاص طور پر اس کی "راتوں" میں داخل ہو کر رہے گی اور یہ عورت ہوگی ارم۔۔۔ ناقابلِ مزاحمت اور حواس پر چھا جانے والی نوخیز ارم۔

جو کھیل لندن میں کھیلا جا رہا تھا اس کی "رپورٹنگ" کے لیے واحد خان صاحب نے چھوٹا سا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ ان کا ایک لنگوٹیا یار شریف کپاڈیا لندن میں ہی مقیم تھا اور گاہے گاہے واحد خان کے بیٹے اویس خان سے ملتا رہتا تھا۔ واحد خان صاحب نے ایک خط کے ذریعے شریف کپاڈیا کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً انہیں رپورٹ دیتا رہے۔

شریف کپاڈیا کی رپورٹ یہ تھی کہ حالات اسی رخ پر جا رہے ہیں جس رخ پر واحد صاحب انہیں لے جانا چاہ رہے ہیں۔ ارم اس گھر میں بڑے بے تکلف ماحول میں رہ رہی ہے۔ شہزاد سے بھی اس کا ہنسی مذاق جاری رہتا ہے۔ ایک روز کپاڈیا نے ارم کو شہزاد کی گاڑی میں سوار ہوتے بھی دیکھا تھا۔ کپاڈیا نے بتایا کہ ارم اس کو بے تکلفی سے چاچو کہتی ہے اور ایک دوبار اس کے گھر بھی آئی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ بہت اچھی اور گھل مل جانے والی لڑکی ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا اور واحد خان صاحب اس فصل کی تیاری کا انتظار کرتے رہے جس کا بیج انہوں نے لندن میں بویا تھا۔ کپاڈیا سے خط اور فون کے ذریعے رابطہ قائم تھا۔ وہ دسمبر کی ایک گلابی شام تھی جب واحد خان صاحب کو کپاڈیا کی طرف سے ایک دل پسند خبر ملی۔ ان کا دل چاہا کہ وہ نگاہوں سے کپاڈیا کے خط کو چوم لیں۔ کپاڈیا صاحب نے اپنے اس خط میں ایک جگہ لکھا تھا "۔۔۔ بھتیجی ارم اکثر مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ لیا کرتی ہے۔ آج اس نے مجھے اشاروں کنایوں میں بتایا ہے کہ وہ شادی کرنے کا سوچ رہی ہے اور ممکن ہے کہ کسی دن اچانک مجھے اس کی شادی کی خبر مل جائے۔ میں نے اسے مزید ٹٹولا تو اس نے اعتراف کیا کہ وہ جس شخص کو شریکِ حیات بنانے کا سوچ رہی ہے وہ ایک کرکٹر ہے۔ میں نے اس کے سامنے شہزاد کا نام نہیں لیا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ کل میں نے شہزاد' ارم اور اویس کو پکاڈلی میں بھی دیکھا تھا۔ وہاں وہ شاپنگ کرنے میں

مصروف تھے۔ ممکن ہے یہ شادی کی ہی شاپنگ ہو۔ شہزاد اور ارم خوب ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑی نکھری نکھری نظر آرہی تھی ارم۔ لگتا ہے کہ "کرکٹر صاحب" نے اسے شادی سے پہلے ہی تھوڑا بہت چمکانا شروع کر دیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہے یہ بات اب قرینِ قیاس ہے کہ تمہارا لگایا ہوا تانکا لگ گیا ہے' مبارک ہو۔"

○☆○

عیدالاضحیٰ کی آمد آمد تھی۔ عید اہلِ خانہ کے ساتھ منانے کے لیے اویس پاکستان آیا ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنی بیوی کو نہیں لایا تھا۔ شہزاد راجا بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا مگر ابھی شہزاد سے واحد خان صاحب کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ واحد خان صاحب کی تجربہ کار نگاہوں نے بڑے غور سے بیٹے کا جائزہ لیا تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ متحمل نظر آرہا تھا۔ کچھ "اوور ویٹ" بھی ہو گیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں وہ چستی نہیں تھی جسے واحد صاحب کی باریک بیں نگاہ کسی کھلاڑی میں دور ہی سے بھانپ لیا کرتی تھی۔ وہ واضح طور پر ایک "شادی شدہ اور بال بچے دار" کرکٹر نظر آنے لگا تھا۔ واحد خان صاحب نے اپنے بیٹے سے ارم اور شہزاد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خواہ مخواہ اسے کسی شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کپاڈیا بھی پاکستان آیا ہوا ہے اور ایک آدھ دن میں بہرصورت اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اس سے بربات تفصیل کے ساتھ پوچھ سکتے تھے۔ بہرحال انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اویس جب سے آیا ہے ان سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ شاید وہ اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں ہی کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا۔

واحد خان صاحب کی توقع کے عین مطابق اگلے روز کپاڈیا سے ملاقات ہو گئی۔ وہ صبح سویرے ہی آدھمکا تھا۔ واحد خان صاحب اس کی صورت دیکھ کر چونک گئے۔ وہ کچھ خاموش سا نظر آرہا تھا جیسے اس کے پاس واحد صاحب کے لیے کوئی اچھی خبر نہ ہو۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد وہ دونوں علیحدہ کمرے میں جا بیٹھے۔ کھڑکیاں دروازے بند کرنے کے بعد واحد خان صاحب نے کپاڈیا سے پوچھا "ہاں بھئی! اب آؤ اصل موضوع کی طرف۔ کیا صورتِ حال ہے لندن میں؟"

کپاڈیا نے بے دلی سے چائے کی چسکی لے کر کپ میز پر رکھ دیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "صورتِ حال یہ ہے دوست! کہ شہزاد راجا اس دفعہ بھی ٹاپ پر جا رہا ہے۔ اس مہینے کے آخری دو میچ کھیلنے کے بعد وہ کاؤنٹی کا ٹاپ اسکورر بن چکا ہے۔ آخری دونوں میچوں میں اس نے سنچریاں اسکور کی ہیں۔ سیزن میں اس کی وکٹوں کی تعداد بھی چالیس سے بڑھ کر پاون ہو گئی ہے۔ قومی ٹیم میں اس کی پوزیشن اور مضبوط ہو رہی ہے۔"

واحد صاحب جھنجلائے "بھئی! وہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ اچھا جا رہا ہے۔ میں تم سے ارم والے معاملے کا پوچھ رہا ہوں۔"

کپاڈیا نے ایک گہری سانس کھینچی اور بولا "اس حوالے سے تم ناکام ہو گئے ہو واحدی' یکسر ناکام۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب؟" واحد صاحب صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"ناکامی کا مطلب ناکامی ہی ہوتا ہے۔ جو تم نے چاہا تھا وہ نہیں ہو سکا۔"

"تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔ کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔ کیا ارم اور شہزاد کی بات آگے نہیں بڑھی؟"

"نہیں" کپاڈیا نے کہا۔

"لیکن کیوں؟ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟" واحد صاحب خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائے "تم نے کپاڈیا۔۔۔ تم نے خود بھی دیکھی ہے وہ لڑکی۔۔۔ تم بتاؤ۔۔۔ کیا وہ ایسے معاملے میں ناکام رہ سکتی ہے؟"

"وہ ناکام نہیں ہوئی واحد صاحب! اس نے تو اپنا کام کر دکھایا ہے۔"

"کام کیا کر دکھایا ہے" واحد صاحب غرائے "جب بات ہی آگے نہیں بڑھی۔ شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔"

"شادی بھی ہوئی ہے۔" کپاڈیا نے کہا۔

"یعنی۔۔۔ یعنی شادی ہو گئی؟" واحد صاحب اچھلے۔

"بالکل" کپاڈیا اطمینان سے بولا "تم نے ارم کو ایک دولت مند اور مشہور کرکٹر سے شادی کرنے کو بھیجا تھا ناں۔۔۔ اور اس نے یہ شادی کر لی۔۔۔ لیکن میرے بھیا! یہ شادی شہزاد راجا سے نہیں' تمہارے بیٹے اویس سے ہوئی ہے۔ ہمارا فرزندِ ارجمند اب خیر سے دو بیویوں کا شوہر ہے۔"

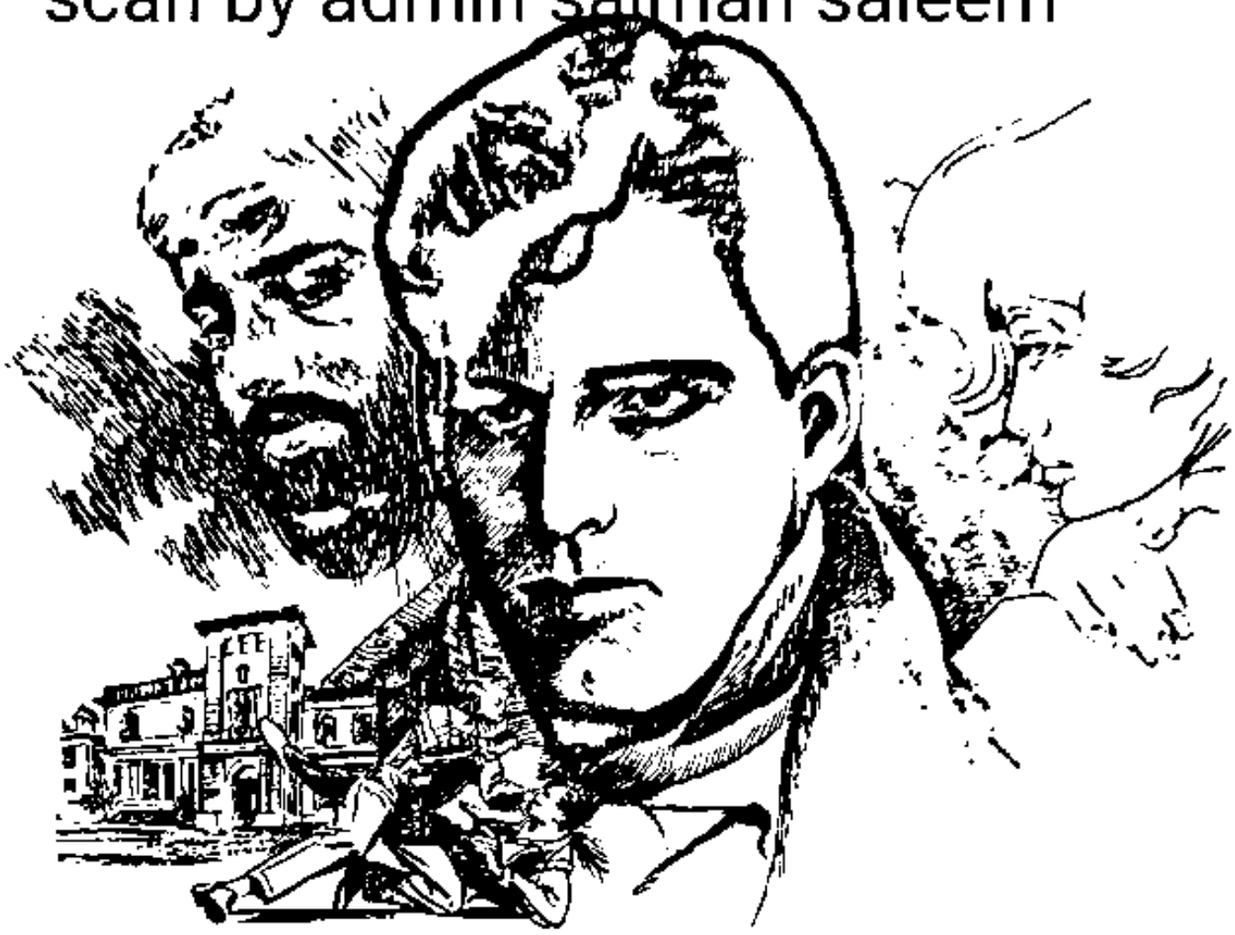
عبدالواحد خان صاحب سناٹے میں رہ گئے۔ ان کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ انہوں نے رنگ دار شیشے سے باہر کوٹھی کے سرسبز لان میں دیکھا۔ اویس خان ایک آرام کرسی پر تھکا تھکا سا بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا اور اس کی شہادت کی انگلی بار بار اس کے بائیں کان میں کھس رہی تھی۔ واحد خان صاحب اپنے بیٹے کا یہ انداز پہچانتے تھے۔ جب اس کے پاس اپنے والدین کے لیے کوئی بہت ناخوش گوار اطلاع ہوتی تھی' وہ ایسے ہی اپنی انگشتِ شہادت بائیں کان میں گھسایا کرتا تھا۔ واحد خان صاحب کی آنکھیں شعلہ فشاں ہو گئیں۔

کپاڈیا بولا "تم اپنے جال میں خود پھنسے ہو واحدی! تمہیں کس گھامڑ نے کہا تھا کہ اتنی خوب صورت لڑکی کو "شوہر" پھانسنے کے لیے اتنا اچھا اور اتنا طویل موقع فراہم کرو۔ بولو کس نے کہا تھا؟"

واحد خان صاحب کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر اپنے بیٹے کو دیکھتے رہے اور دانت کچکچاتے رہے۔

□□□
□□□

scan by admin salman saleem



دریچہ کی کہانیاں

سکین بائے ایڈمن سلمان سلیم
03067163117

طاہر جاوید مغل

شائقین اپنی پسند کے کرداروں کو اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں... انہیں اپنی دھڑکنوں میں بسا لیتے ہیں... کیونکہ ان میں انہیں اپنی خواہشات اور خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے... کرداروں کی یہ پرچھائیاں سانس لینے لگتی ہیں... ایسے ہی دلوں میں زندہ رہنے والے کرداروں کی بھرپور جھلک جو آپ کو ماضی کے خوب صورت در و دیوار میں قید کر دیتی ہے...

کہانی: عمران جو نیئر اور اس کی ذات میں بسی پُراسراریت

میں گھر میں اپنے کمرے میں تھا اور صرف ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا۔ ائرکنڈیشنر 16 کے ہندسے پر تھا اور پورے کمرے میں بھرپور ٹھنڈک تھی۔ اب جو بات میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں، وہ یقیناً کافی حیران کن ہو گی۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور پورے لاہور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، جی ہاں، یہ میرا وہی رہن سہن تھا جو میں نے پچھلے اٹھارہ بیس برس سے اپنایا ہوا تھا۔ سخت گرمی، سردی کو جھیلنا، اپنے جسم کو غیر معمولی مشقت سے توڑنا اور

اپنی قوتِ برداشت کو بڑھانے کی کوشش جاری رکھنا۔ اب یہ سب کچھ میرے جسم کی ضرورت بن چکا تھا۔ یہ تکلیفیں مجھے راحت دیتی تھیں اگر یہ نہیں ہوتی تھیں تو ایک مہیب خلا محسوس ہوتا تھا۔

ٹی وی آن تھا۔ پنجاب کے ایک علاقے میں غیر متوقع بارش نے تباہی مچادی تھی۔ اس کی فوٹیج وغیرہ چل رہی تھی۔ ایک تنومند صوبائی وزیر صاحب بڑے طنطنے سے موقع پر موجود تھے اور مصیبت زدگان کی امداد فرما رہے تھے۔ آٹے کی بوریاں اور گھی کے ڈبے تقسیم ہو رہے تھے۔ وزیر موصوف کو امدادی کارروائی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ ان کی تصویر سج دھج اور سج دھج ایکسپریشن کے ساتھ آئے۔ ایک بزرگ نے ان کے ''دستِ مبارک'' سے آٹے کا ''توڑا'' لے کر اپنے سر پر رکھا۔ وزیر صاحب نے بہتر پوز کے لیے تین چار تصویریں اتروائیں۔ تب تک بزرگ کی دبلی پتلی گردن آٹے کے توڑے کے بوجھ سے کانپنے لگی تھی۔ پتا نہیں کہ خود نمائی کا یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں امداد و خیرات کے نام پر غربت کو تماشا بنایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دین میں حکم ہے..... مستحق کی مدد اس طرح کرو کہ ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ دوسرے کو پتا نہ چلے۔

دروازے پر مدھم دستک ہوئی، میں نے کندھوں پر تولیا ڈالا اور دروازہ کھولا۔ سامنے ہماری پرانی ملازمہ کرن کھڑی تھی۔ اپنے نام کے برعکس وہ خاصی موٹی تازی تھی۔ عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی اور ایک دھان پان شوہر کی ''مالکہ'' بھی تھی۔ اس نے کہا۔ ''صاحب جی! ایک لڑکی ملنے آئی ہے۔ اپنا نام ماہین بتا رہی ہے۔''

میں ٹھٹک گیا۔ گھڑی دیکھی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ سہ پہر کے چار بج گئے تھے۔ کل فون پر ماہین سے بات ہوئی تھی۔ اس نے آنے کا کہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ حسبِ توقع جین اور جرسی میں دکھائی دے رہی تھی۔ بال ٹائٹ جوڑے کی شکل میں بندھے تھے۔ ''گڈ آفٹر نون انکل۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔

''ویلکم ماہین! سوری..... تمہیں چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔''

وہ عجیب انداز میں مسکرائی۔ ''آج یہ سوری والا لفظ آپ میرے کہنے کے لیے رہنے دیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے صوفے پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اُڑس کر بولی۔ ''انکل! میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ اس واقعے کو دو ہفتے گزر گئے ہیں مگر سب کچھ اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

وہ اس واقعے کا ذکر کر رہی تھی جب میں اور عمران جونیئر، شاہین سے ملنے کے لیے اس کی کوٹھی پہنچے تھے اور ماہین نے بالکل غیر متوقع طور پر ہمارے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس نے عمران کو مارا تھا۔ بلکہ شاید یوں کہنا چاہیے کہ عمران نے اس سے مار کھائی تھی پھر گھر میں گھس بیٹھے آ گئے تھے اور ماہین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ سب کچھ بڑا ڈرامائی تھا۔

میں نے کہا۔ ''ماہین! وہ جو کچھ ہوا، اس کو دہرانے سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سب کچھ غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ میرا دل تمہارے لیے بالکل صاف ہے۔''

''تھینک یو انکل۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔ پھر ذرا توقف کر کے مسکرائی۔ ''اور انکل! آپ کا وہ بھتیجا؟''

''اسے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

''ویسے وہ کچھ عجیب سا ہے۔ لگتا ہے کہ اوپر سے کچھ، اندر سے کچھ اور ہے۔ میری طرف سے اسے بھی سوری کہہ دیجیے گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر اپنی انگلیوں سے کھیلتی رہی پھر ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ویسے انکل نابش! آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ دراصل میں یہی درخواست کرنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

میں نے دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ''تمہاری درخواست سے پہلے ہی میں جان گیا ہوں کہ کیا کہنا چاہتی ہو۔'' اس نے چونک کر مجھ پر نگاہ ڈالی۔ میں نے کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ ہم فی الحال تمہاری آپی شاہین سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ یہی بات ہے نا؟''

وہ حیران نظر آئی۔ ''آپ تو واقعی پولیس والوں کی طرح ہیں۔ بڑی گہری نظر ہے آپ کی۔''

''شکریہ، کچھ اور؟''

''بس انکل! آپ نے میری ایک بڑی پریشانی دور کر دی ہے۔ آپ کا بھتیجا آپ کے دوست عمران دانش سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ مجھے خوف آنے لگا ہے۔ اسے دیکھ کر آپی کے سارے پرانے زخم ہرے ہو جائیں گے۔''

بات کرتے ہوئے ماہین کی پیشانی چمکنے لگی تھی اور

خوب صورت آنکھوں میں ایک روشنی سی نمودار ہو جاتی تھی۔ عمران کا خیال تھا کہ اس کی آنکھوں میں مقناطیس چھپے ہوئے ہیں جو اردگرد کی ہر شے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ آج کل رات دن اس کی غائبانہ تعریفوں میں مصروف تھا۔

اتنے میں ماہین کے فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ چہرے پر رنگ سا گزرا اور اس نے کال ریجیکٹ کر دی۔

''کون تھا؟'' میں نے بے تکلف انداز میں پوچھا۔

''کک..... کوئی نہیں۔''

''جو کوئی نہیں ہوتا..... وہ کبھی کبھی کافی کچھ ہوتا ہے۔'' میں زیرلب مسکرایا۔

وہ چند سیکنڈ کے لیے سنجیدہ نظر آئی پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے نوخیز چہرے پر حیا کا ہلکا سا رنگ بکھر گیا۔ پھر اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ''آپ تو بہت دور، دور کی کوڑی لے آتے ہیں۔''

''بوائے فرینڈ ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس نے پلکیں جھکا لیں تاہم لہجے میں بے باکی برقرار رہی۔ ''آپ فنٹی پرسینٹ کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

مجھے فوراً عمران جونیئر کا خیال آیا۔ ''وہ تو مارا گیا مفت میں۔'' میں بڑبڑایا۔

''جی کیا کہا آپ نے؟''

''کچھ نہیں..... سوچ رہا ہوں، وقت کتنا بدل گیا ہے۔ اب لڑکیاں بیکار میں شرماتیں نہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے ٹھک سے کہہ دیتی ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں شوخی ابھری۔ ''ملنا چاہیں گے اس سے؟ میرا مطلب ہے یہاں سے اس کا آفس زیادہ دور نہیں ہے۔ ابھی دس منٹ میں پہنچ جائے گا۔''

''کیا کرتا ہے؟''

''فرم ہے امپورٹ ایکسپورٹ کی۔ والد سرکاری افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔''

''چلو بلا لو بھئی، دیکھیں کہ تمہاری پسند کیسی ہے؟''

اس نے بلا تردد فون پر نمبر پریس کیا پھر بات کرتے ہوئے کوریڈور کی طرف چلی گئی۔ واقعی آٹھ دس منٹ بعد میری کوٹھی کے گیٹ پر اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔ میں نے سی سی ٹی وی کی اسکرین پر دیکھا۔ دو تین سال پہلے والے ماڈل کی اسپورٹس کار تھی۔ اس میں سے درمیانے قد اور چوکور چہرے والا ایک نوجوان باہر نکلا۔ دو منٹ بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اس کا لباس قیمتی تھا۔ بال اسپائکس کے اسٹائل میں بنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں مہنگا موبائل تھا۔ سلام کر کے وہ بے تکلفی سے ماہین والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ قبول صورت نوجوان تھا۔ گفتگو بھی اچھی کر لیتا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میرا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے تو تھوڑا سا ''ریزرو'' نظر آیا، تاہم میرے رویے نے اسے جلد ہی نارمل کر دیا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ اس درمیانی عمر میں بھی میں اس قدر فٹ ہوں اور بھرپور طریقے سے مارشل آرٹ کے ساتھ جڑا ہوا ہوں۔ کہنے لگا۔ ''انکل! آپ عام پولیس والوں سے بہت مختلف لگتے ہیں۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ میرے کان کھڑے ہوئے۔ مجھے عمران کی پھٹیچر موٹر بائیک کی مدھم پھٹ پھٹ سنائی دی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ چوکیدار یا گارڈ اسے نہیں روکے گا اور ایسا ہی ہوا۔ دو تین منٹ بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آ دھمکا۔ لباس ہمیشہ کی طرح بے ڈھنگا ہی تھا۔ وہاں میرے پاس ماہین کو بیٹھے دیکھ کر وہ پہلے تو ٹھٹکا پھر حسب عادت بتیسی نکال دی اور چہکا۔ ''واہ جی واہ، یہاں تو بڑی اہم شخصیات آئی بیٹھی ہیں۔ السلام علیکم جی سب کو۔''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے اور حشام نے کہا۔

(حشام، ماہین کے بوائے فرینڈ کا نام تھا)

میرے اشارے پر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں حشام کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''یہ..... آپ کے بھائی ہیں؟'' اس نے ماہین سے پوچھا۔

''نہیں، بھائی جان!'' وہ فوراً چہک کر بولی۔

میں زیرلب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ عمران نے کہا۔ ''اوہ سوری، آپ دونوں کی شکلیں کچھ کچھ ملتی ہیں اس لیے مجھے شک ہوا۔''

حشام نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''جو لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، آہستہ آہستہ ان کی شکلیں بھی آپس میں ملنے لگتی ہیں۔''

عمران نے ہونٹ سکیڑے۔ مجھے لگا، اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا ہے۔ میں نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''عمران! یہ حشام ہے، ماہین کا سابقہ کلاس فیلو اور دوست..... اور حشام یہ عمران ہے۔ میرے بہت گہرے دوست کا بیٹا۔ میرے لیے بیٹوں کی طرح ہی ہے۔''

''یہ کیا کرتے ہیں؟'' حشام نے پوچھا۔

ماہین بولی۔ ''جو کچھ نہیں کرتے، وہ بھی کمال کرتے ہیں۔ ویسے آج کل یہ جاب ڈھونڈ رہے ہیں۔''

حشام مسکرایا اور اس کی ناک تھوڑی سی پھیلی ہوئی نظر آنے لگی۔ ''جاب ڈھونڈنا بھی تو ایک کام ہی ہوتا ہے نا جی..... میرا خیال ہے ابھی جس موٹر بائیک کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ عمران صاحب ہی کی تھی۔''

عمران نے فخریہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں..... لگتا ہے کہ آپ کے کان کافی تیز ہیں۔''

ماہین طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''اور لگتا ہے کہ آپ کی نظر زیادہ تیز نہیں ہے..... آپ کے جوگر کا تسمہ کھلا ہوا ہے، باندھ لیجیے۔''

''اوہ۔'' عمران نے چونکنے کی اداکاری کی اور جھک کر تسمہ باندھنے لگا اور اسی طرح جھکے جھکے بولا۔ ''ویسے یہ تسمہ بھی آزار بند کی طرح ہی ہوتا ہے۔ کھل جائے تو سب انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں۔ میں جب پریشان ہوتا ہوں تو عموماً یہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے تسمہ۔'' اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

''خیریت ہے؟ تمہیں کیا پریشانی لاحق ہوگئی؟'' میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''ہاں چاچو جی، اب تو خیریت ہی ہے۔ دراصل دو تین دن کافی پریشانی رہی شادی کے سلسلے میں۔ اللہ کا شکر ہے، اب انتظام ہوگیا ہے۔''

وہ اپنے محلے کی اس لڑکی کی شادی کی بات کر رہا تھا جسے اس نے بہن بنایا تھا۔ وہ لوگ بہت ہی دست تھے۔ عمران شادی کے سلسلے میں ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ قریباً پانچ چھ لاکھ کا خرچ تھا۔ محلے کے دو تین خوش حال افراد نے بھی کچھ مدد کی تھی۔ میں نے بھی حصہ ڈالا تھا۔

''باقی پیسوں کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''شکر ہے اللہ کا۔ حاجی فراز صاحب عمرے سے واپس آگئے۔ کل شام انہوں نے پورے پانچ لاکھ روپے کیش بھجوا دیا۔ اللہ ان کو صحت اور لمبی عمر عطا کرے، بڑے دل والے ہیں۔''

''یہ شادی کا کیا معاملہ ہے جی؟'' ماہین نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ عمران جس محلے میں رہتا ہے وہاں ایک بہت ضرورت مند گھرانا ہے۔ وہ لوگ بچی کو عزت سے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔

''اب تو کوئی مسئلہ نہیں؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''چھوٹا سا مسئلہ ہے اسی لیے آیا ہوں۔''

''فرمائو۔''

''تھوڑے سے جہیز کی ڈیمانڈ بھی تھی، اس کے علاوہ سونا اتنا مہنگا ہے کہ کافی ساری رقم دو انگوٹھیوں اور دو جھمکوں پر نکل گئی ہے۔ لڑکی کے گھر والے چاہ رہے ہیں کہ شادی ہال ڈھونڈنے کے بجائے محلے کے گراؤنڈ میں ہی ٹینٹ وغیرہ لگا لیے جائیں۔ مگر مقامی نائب ناظم روڑا اٹکا رہا ہے۔ میرے خیال میں آپ اسے ایک فون کر دیں تو بات بن جائے گی۔''

میں نے اسی وقت اس سے نمبر لے کر فون کیا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ بندہ مان گیا اور عمران خوش نظر آنے لگا۔

''یہ لیجیے عمران صاحب، اس سلسلے میں یہ چھوٹا سا نذرانہ میری جانب سے بھی رکھیے۔'' ماہین کے پہلو میں بیٹھے حشام نے دو نوٹ نکال کر عمران کی طرف بڑھائے۔ یہ پانچ پانچ ہزار کے تھے۔

عمران نے پہلے تو انکار کیا پھر میرے کہنے پر رکھ لیے۔ تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ حشام یہ جو حصہ ڈال رہا ہے اس میں خدا ترسی سے زیادہ تفاخر اور امارت کا اظہار ہے۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنا اسٹیٹس بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب امکان تھا کہ وہ ماہین کو بھی امپریس کرنا چاہتا ہے۔

عمران چلا گیا۔ اس کی بائیک کی پھٹ پھٹ معدوم ہوگئی تو ماہین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مائنڈ نہ کیجیے گا انکل! یہ واقعی شادی ہو رہی ہے یا.....''

''نہیں ماہین.....'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہ ایسا نہیں ہے۔ بہت مخلص ہے عام لوگوں سے۔ بے شک کچی پکی آبادی میں رہتا ہے۔ فی الحال ذرائع آمدن بھی نہیں ہیں، لیکن دل بڑا ہے، ملاقاتی اسے ہیرو بھائی کے نام سے پکارتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے اس کے والد بھی.....''

''ہاں پتا ہے انکل..... خیر چھوڑیں اس بات کو، پھر گفتگو لمبی ہو جائے گی..... آپ یہ بتائیں کہ ہمارے گھر کب آ رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اگر جوڈو کراٹے نہیں کرو گی تو ''ویک اینڈ'' پر چکر لگا دوں گا۔''

''سوری انکل..... ایک بار پھر ویری ویری سوری۔''

وہ خجل ہو کر بولی۔ پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ''اور انکل، ان غنڈوں کا کیا بنا جو اس روز گھر میں گھسے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہیں۔ ان کی طرف سے بے فکر رہو۔ اب وہ تمہارے پاس سے بھی نہیں گزریں گے، انشاء اللہ۔''

☆☆☆

حاجی فراز ایک ثروت مند شخص تھے۔ بقول عمران خدا ترس اور مخیر بھی تھے۔ میں نے کئی بار اس سے کہا کہ ان سے ملواؤ مگر وہ آئیں بائیں شائیں کر گیا۔ ایک دن میں نے اپنے خاص مخبر نوشا سے کہا کہ وہ حاجی فراز کا پتا چلائے۔

دو روز بعد شام کے وقت نوشا کا فون آ گیا۔ ''جی سر! تھوڑا بہت پتا چلا ہے حاجی صاحب کے بارے میں۔''

''ہاں کہو۔''

''نیک آدمی ہیں۔ علاقے کے ضرورت مندوں کی خبر رکھتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ میں دو تین یتیم لڑکیوں کی شادیاں کرا چکے ہیں۔ کئی مستحق بچوں کی تعلیم کا خرچہ ادا کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک فری ڈسپنسری بھی علاقے میں بنائی ہے۔ پچھلے سال دسمبر میں علاقے کے بزرگ پوسٹ مین کی ہارٹ سرجری انہوں نے اپنے خرچے پر کروائی تھی۔ اس کے علاوہ.....''

''یار، یہ سب کچھ مجھے پتا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے تمہیں یہ ہسٹری نکالنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ حاجی صاحب پائے کہاں جاتے ہیں؟''

''وہ اس سلسلے میں بہت محتاط ہیں جی۔ شاید ہی دو چار بار لوگوں کے سامنے آئے ہوں۔ وہ یہ سب کچھ در پردہ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ آپ کے کہنے پر میں بہشت کالونی بھی گیا تھا مگر ابھی تک تو اس کالونی میں مجھے ان کا کھوج نہیں ملا۔''

''تو پھر اب تک تم نے جھک ہی ماری ہے۔ تم سے ''گزارش'' کی تھی کہ وہ اس کالونی میں ہی کہیں رہتے ہیں۔ ان کا اتا پتا معلوم کرو۔'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں فون بند کر دیا۔

نوشا میری جھنجلاہٹ کا خاصا اثر لیتا تھا، میں جانتا تھا کہ اب وہ کوئی نہ کوئی سراغ ڈھونڈ کر ہی مجھے فون کرے گا۔ پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے بھی عمران پر کچھ شک سا ہونے لگتا تھا۔ اس شک کو بُرا تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ پریشان کن

میڈیکل غزل

چلو آؤ اب موسم کا مزہ چکھیں
تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں
تم سے ملنے کی اب کیا جستجو کریں
طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کریں
ہماری چاہت کا کچھ تو خیال کریں
سیرپ کو اچھی طرح ہلا کر استعمال کریں
دل میرا ٹوٹ گیا اکثر جب اس کی ڈولی
صبح دوپہر شام، ایک ایک گولی
دل میرا عشق کرنے پر رضامند رہے گا
جمعہ کے دن کلینک بند رہے گا

کوٹڑئی سے تعمیر اقبال کی حکیمانہ شاعری

ضرور تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا کوئی روزگار نہیں۔ جو پیسے وہ انڈیا سے لے کر آیا تھا، وہ ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ کہاں سے پیسے لے رہا تھا؟ اس نے حاجی فراز کا نام لیا تھا لیکن فی الحال حاجی فراز سے بھی ''ملاقات'' نہیں ہو پا رہی تھی۔ انڈیا میں اپنی فیملی کے بارے میں بھی عمران نے ابھی تک تفصیلی معلومات نہیں دی تھیں۔ ایک بات اور تھی، کسی وقت وہ بہت کنجوسی کا مظاہرہ بھی کر جاتا تھا۔ کسی کی کہی ہوئی بات بار بار ذہن میں آ رہی تھی۔ اچھوں سے بُرے اور بُروں سے اچھے پیدا ہوتے ہیں۔ باپ اچھا ہو تو ضروری نہیں کہ بیٹا بھی نقشِ قدم پر چل رہا ہو۔ ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ کسی کا فون آیا تھا اور عمران نے میرے سامنے فوراً ہی ''ڈس کنکیٹ'' کر دیا تھا یا بات کرنے کے لیے علیحدہ کمرے میں چلا گیا تھا۔ ایک ایسی ہی گفتگو میں، میں نے اسے ہندی کے الفاظ استعمال کرتے بھی سنا تھا۔

یہ چوتھے، پانچویں روز کی بات ہے، میں حسبِ معمول صبح سویرے اپنے جم میں مصروف تھا جب میرے انفارمر نوشا کی کال آ گئی۔ ''ایک بڑی اہم نیوز ہے جی آپ

کے لیے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ لہجے میں دبا، دبا جوش تھا۔

''آگے بولو۔''

''جناب، میں پچھلے دو روز سے آپ کے عمران صاحب کو واچ کر رہا ہوں۔ یہ بہت کائیاں شخص ہے جی۔ اس کا پیچھا کرنے میں مجھے واقعی دانتوں پسینا آ گیا ہے۔ ایک بار تو ایسے ہی لگا کہ پکڑا جاؤں گا۔''

''تمہید باندھ چکے ہو، اب اصل بات بتاؤ۔''

''ہو سکتا ہے کہ میرا کہا غلط ہو..... لیکن یہ بندہ کچھ مشکوک ہے جی۔ کل رات تقریباً گیارہ بجے یہ گھر سے نکلا۔ پہلے گلی میں اپنی موٹر سائیکل کو لاتیں لگاتا رہا۔ وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی تو پیدل چل کر بس اسٹاپ تک پہنچا۔ ایک بس میں سوار ہوا اور گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں اتر گیا۔ بر شت کالونی بھی پاس ہی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حاجی فراز سے ملنے آیا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔''

دو لمحے توقف کرنے کے بعد نوشا نے بات جاری رکھی۔ ''آپ کو یہ سن کر تھوڑی سی حیرانی ہوگی کہ عمران عرف ہیرو بھائی جس شخص سے ملا ہے، وہ ایک سکھ ہے۔ گارمنٹس کی فیکٹری چلاتا ہے اور اس کا بنایا ہوا مال انگلینڈ اور آئرلینڈ وغیرہ میں بھی سپلائی ہوتا ہے۔ گارڈن ٹاؤن میں ڈیڑھ دو کینال کی کوٹھی میں ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اس کی فرم کا نام جگو اینڈ کمپنی ہے۔''

جگو اینڈ کمپنی ذرا مختلف نام تھا اور یہ نام میں نے بھی کہیں سنا ہوا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مالک کوئی سکھ ہے۔ ویسے بھی لاہور، پاکستان کے ان شہروں میں سے ہے جہاں سکھ کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ البتہ حسن ابدال اور ننکانہ صاحب وغیرہ میں سردار صاحبان عام دیکھے جاتے ہیں۔

چند ہفتے پہلے عمران مجھے اسٹیشل سموسے کھلانے اور تندوری چائے پلانے کے لیے گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں لے گیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ذکر نہیں کیا تھا کہ یہاں اس کا کوئی سکھ دوست رہتا ہے۔

میں نے نوشا سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے؟ عمران کا اس بندے سے کیا ناتا ہو سکتا ہے؟''

''اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور جناب! سچ بات تو یہ ہے کہ مزید کھوج لگانے سے مجھے ڈر بھی آ رہا ہے۔ یہ عمران عرف ہیرو ضرورت سے زیادہ چوکنا شخص ہے۔''

''یہ تو شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' پھر میں نے ذرا توقف سے پوچھا۔ ''جگو اینڈ کمپنی کے بارے میں کچھ اور معلوم ہوا؟''

''کمپنی کے مالک کو جگو سیٹھ کہتے ہیں۔ یہ داڑھی مونچھوں والا ہے، یعنی سونا سکھ نہیں ہے مگر پگڑی نہیں باندھتا۔ علاقے میں اس کا کچھ زیادہ میل جول بھی نہیں۔ ہر پانچ چھ ماہ بعد گاڑی کا ماڈل بدلتا ہے۔ گارڈ شارڈ بھی رکھے ہوئے ہیں..... اس کے علاوہ ایک اور عجیب بات بھی معلوم ہوئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ درست ہے یا نہیں لیکن جگو اینڈ کمپنی کے ایک پرانے ملازم نے رازداری کی شرط پر بتائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جگو سیٹھ دکھری ٹائپ کے کام کرتا رہتا ہے..... کوئی تین ماہ پہلے وہ ترکی سے دو عورتیں باقاعدہ خرید کر لایا ہے۔ عورتیں کیا، وہ لڑکیاں ہی ہوں گی۔ اس نے انہیں گھر میں رکھا ہوا ہے۔''

''شادی شدہ نہیں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''شادی شدہ تو ہے جی، لیکن ایسے لوگوں کو ایسی باتوں کی کیا فکر ہوتی ہے۔ عورتوں کو بھی نئے ماڈل کی گاڑیوں کی طرح ہی سمجھتے ہیں۔'' نوشا کی معلومات قابلِ غور تھیں اور اس سلسلے میں میری دلچسپی اور فکرمندی دونوں بڑھ رہی تھیں۔

اگلے روز سہ پہر کو میں عمران جونیئر سے ملنے اس کے گھر جا پہنچا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔ اس کے دو بے فکرے دوست کچن میں گھسے نہاری بنا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پارک میں گیا ہے۔ ایسی گنجان آبادیوں میں چھوٹے موٹے پارک کا ہونا بھی ایک نعمت ہی ہوتا ہے۔ یہ چلڈرن پارک بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں دو تین پُر پیچ گلیوں سے گزر کر وہاں جا پہنچا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران وہاں بچوں کی ایک سائڈ کے ایک ٹوٹے ہوئے حصے کو پلاستر کر رہا تھا۔ کئی بچے اس کے اردگرد جمع تھے۔ دو چار بڑے بھی اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے آستین سے پسینا پونچھا اور بقایا کام اپنے ایک ساتھی کو سونپ کر میرے پاس لکڑی کی ایک بینچ پر آ بیٹھا۔ ''یہ کیا کر رہے تھے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بس ٹائم پاس کر رہا تھا۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''آج کل دل بہت اداس ہے چاچو۔ سوچتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ کرتا رہوں۔ کل لڑکوں کے ساتھ مل کر وہ سامنے کرکٹ کی پچ مرمت کی تھی۔ آج اس سلائڈ کو ٹھیک کر رہا

تھا۔"

"خیر سے یہ اداسی کس سلسلے میں ہے؟"

"ایسے بے خبر نہیں ہو تم۔ سب جانتے ہو، میری دنیا کیسے اندھیر ہوئی ہے آہ..... مابین، مجھے کیا پتا تھا کہ تم میرے دل پر اتنا بڑا گھاؤ لگاؤ گی۔ کاش میرے سینے میں دل نہ ہوتا اور اگر دل تھا تو پھر غربت نہ ہوتی۔" اس نے گردن اٹکالی اور آنکھوں میں نمی لے آیا۔ باپ ہی کی طرح زبردست ایکٹر تھا مگر کسی وقت پُراسرار بھی لگتا تھا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "تو اس میں واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مہوش حیات کے ہوتے ہوئے تمہیں بھلا کون سی کمی ہے؟"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تم نہیں سمجھو گے چاچو جانی! میرے سینے میں ایک نہیں کئی دل دھڑکتے ہیں اور ہر ایک دل کے علیحدہ مسئلے مسائل ہیں۔ مہوش حیات والا دل مطمئن ہے۔ مہوش تو گھڑے کی مچھلی ہے، جب چاہو بھون کر کھا سکتا ہوں۔ یہ مابین دریائی مچھلی تھی۔ اس کا کانٹا سیدھا دل نمبر دو میں لگا ہے۔"

اسی دوران میں اس کے فون پر کوئی کال آئی۔ اس نے اسکرین دیکھی اور جلدی سے کال ریجیکٹ کردی۔

"کون تھا؟"

"وہی مہوش..... ایک فلم کی شوٹنگ چھوڑے بیٹھی ہے۔ کہتی ہے گوجرانوالا جا کر تمہارے ساتھ چڑے کھاؤں گی۔ وہ بے چارہ پروڈیوسر علیحدہ میرے ترلے ڈال رہا ہے کہ بھوی سے کہو شوٹنگ نہ چھوڑے..... ہائے ری قسمت..... اب تم خود ہی بتاؤ چاچو، خوب صورت ہونا کوئی جرم ہے..... پتا نہیں کس بات کی سزا مل رہی ہے مجھے۔ انڈسٹری کی آدھی ہیروئنز کو پتا چل گیا ہے کہ میں پاکستان میں ہوں اور جس کو پتا چلنا چاہیے تھا، اس کی آنکھوں میں موتیا آگیا ہے۔"

"وہ کون؟"

"بیکا مابین..... چاچو! تم نے دیکھا نہیں تھا کتنی بیدردی سے اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا تعارف کرایا مجھ سے۔"

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم اصل بات گول کررہے ہو۔ یہ فون کس کا تھا؟" اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا..... پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "چاچو! میرا خیال ہے کہ تم شک کررہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ مہوش نہیں کوئی انڈین ہیروئن ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جس دیس کا کھاتا ہوں، اسی کا گاتا ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رہوں تو پاکستان میں اور محبت کی پینگیں بڑھاؤں کترینہ کیف اور دیپا پالن وغیرہ سے۔ ناٹ ایٹ آل۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے ایک بات صاف صاف بتاؤ..... اگر تم نے....."

میری بات ادھوری رہ گئی۔ عمران ایک دم سامنے کھیلتے ہوئے ایک بچے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ میں نے بھی اس نوعمر بچے کو دیکھا۔ اس کے ساتھ دو خواتین تھیں۔ ایک ذرا بڑی عمر کی، دوسری نوجوان۔ دونوں لمبی چادروں میں تھیں۔ چہرے آدھے نقاب میں تھے۔ نوجوان عورت کو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی صوفیہ تھی جس کے لیے کراچی کے کمانڈو باکسر اور لاہور کے امیرزادے واجد کے درمیان چکر چلا تھا۔ واجد احمد اتفاقیہ فائرنگ کے نتیجے میں جاں بحق ہوچکا تھا۔ (اس کے وارث تلملائے پھرتے تھے) کمانڈو باکسر کہیں علاقہ غیر میں تھا۔ یہ محبت کی ایک عجیب..... اور ادھوری کہانی تھی۔ ایک شریف زادی اور ایک بدنام غنڈے کے درمیان ایک بے نام تعلق۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس کہانی کا انجام ہونا باقی ہے۔

عمران نے کہا۔ "دیکھا چاچو! وہی پچھلا اپنی سوڈ پھر جھلک دکھا رہا ہے۔ یہ صوفیہ ہی ہے۔ حالانکہ اسے اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اس میں خطرہ ہوسکتا ہے۔"

"تو یہ تمہارے محلے دار ہیں۔ صوفیہ یا اس کے والد کو سمجھاؤ۔ واجد کے وارث ان کے لیے خطرہ پیدا کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے چاچو! نیک کام میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔" وہ مجھے وہیں بیٹھا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور نپے تلے قدموں سے چلتا دونوں خواتین کے پاس پہنچ گیا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ اہم موضوعات پر بات کرتے ہوئے مجھے چکما دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اب بڑے جوش و خروش کے ساتھ دونوں خواتین سے گفتگو کررہا تھا اور وہ بھی ایسا رسپانس دے رہی تھیں جیسے عمران ان کا محلے دار نہیں، ان کے گھر کا فرد ہے۔

کچھ دیر بعد وہ میرے پاس واپس آگیا۔ سلائڈ کی مرمت مکمل ہوچکی تھی، وہ میرے ساتھ گھر چلا آیا۔ میں نے اس لڑکی کی شادی کے بارے میں پوچھا جس کے لیے وہ رقم کا انتظام کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ بروز ہفتہ آٹھ تاریخ طے ہوگئی ہے۔ تقریب پارک میں ہی ہوگی۔

عمران جونیئر کے ساتھ اپنی اس ملاقات میں، میں نے اسے ٹٹولنے کی کافی کوشش کی۔ وہ حاجی فراز کے بارے میں کوئی ٹھوس بات بتا سکا اور نہ اس نے اپنے مالدار سکھ دوست کا ذکر کیا۔ نجانے کیوں مجھے شک ہونے لگا تھا کہ شاید یہی وہ جگو نامی سکھ ہے جو اسے مالی مدد فراہم کرتا ہے۔ اس مالی مدد کے لیے عمران نے کسی حاجی فراز کا نام لے لیا تھا۔ سوال یہ بھی تھا کہ وہ شخص اس کی مدد کیوں کرتا ہے۔ کہیں اس کے پیچھے کوئی مقصد تو نہیں تھا؟

☆☆☆

گھر میں ایک نجی ٹی وی چینل کے نمائندے آئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری نجی زندگی کے بارے میں ایک تفصیلی انٹرویو کیا تھا۔ خوبرو اینکر اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ادا سے بولی۔ ''ایک آخری سوال سر! آپ کی عمر 42 سال سے اوپر ہے۔ اس عمر میں آپ کی اس زبردست فٹ نس کا راز کیا ہے؟''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دیوار پر آویزاں ثروت کی تصویر کو دیکھا اور کہا۔ ''میرے خیال میں میری اس کامیابی میں تین افراد کا ہاتھ ہے۔ ایک تو وہی عمران دانش جس نے ایک نہایت بُرے وقت میں مجھے سہارا دیا..... بلکہ موت کے منہ سے کھینچا۔ دوسرے میری مرحومہ شریکِ حیات جس نے مجھے گھریلو پریشانیوں سے آزاد زندگی دی اور مجھے میرے ''پیشن'' کے ساتھ جینے کے وافر مواقع فراہم کیے اور تیسرا وہ شخص جس نے مجھے زندگی کا فلسفہ سمجھایا۔''

''شاید آپ اپنے استاد باروندا جنکی کی بات کر رہے ہیں؟'' ایک نمائندے نے کہا۔

''آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ باروندا جنکی ہی تھا جس نے مجھے بتایا کہ جب ہم جسمانی تکلیف سہنا سیکھ جاتے ہیں اور اپنی قوتِ برداشت کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور اٹل یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں اس مشقت کا صلہ مل کر رہے گا تو مارشل آرٹ سے متعلق حیران کن کامیابیاں ہماری جھولی میں آن گرتی ہیں۔''

''اور سر..... بالفرض..... اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر؟'' خوبرو اینکر پرسن نے پوچھا۔

''تو بھی وہ محنت اور مشقت رائگاں نہیں جاتی۔ اس کا صلہ ہمیں اپنی زندگی میں کسی نہ کسی صورت مل کر رہتا ہے اور یہی اٹل یقین تھا جس نے مجھے بدترین حالات میں بھی مارشل آرٹس سے جوڑے رکھا۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ انٹرویو والے بھی سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے مقررہ وقت سے کہیں زیادہ لے لیا ہے۔ وہ اٹھنے کے لیے تیار نظر آئے۔ اینکر پرسن تلخی لہجے میں بولی۔ ''آپ ہمارے لیے چیتے جاگتے لیجنڈ ہیں سر۔ آخر میں بس ایک درخواست کرنی تھی آپ سے۔''

میں سمجھ گیا کہ اچھا بھلا انٹرویو کرنے کے بعد، وہ آخر میں کوئی احمقانہ فرمائش کرنے والی ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے اکثر میرا پالا پڑتا رہتا تھا۔ اینکر پرسن نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے بیگ میں سے قریباً پانچ مربع انچ کی دو ڈھائی فٹ لمبی لکڑی نکال لی۔ یہ نیم خشک شیشم کی تھی، وہ بولی۔ ''سر آپ کا منفرد ریکارڈ ہے کہ آپ اس سائز کی لکڑی کو کہنی کی ایک ضرب سے توڑ لیتے ہیں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو.....''

غصے کی ایک لہر میرے اندر اٹھی لیکن میں آخر میں ان لوگوں کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''ویری سوری..... فی الحال یہ ممکن نہیں۔ میرے کندھے میں کچھ کھچاؤ ہے، پھر کبھی سہی.....''

میرا موڈ دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ابھی وہ رخصت ہوئے ہی تھے کہ میرے فون پر مایا کی کال آ گئی۔ ''ہیلو انکل، کہاں ہیں آپ؟''

''میں گھر میں ہی ہوں اور تم؟''

''میں ذرا باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک خاص چیز نظر آئی ہے جس کی وجہ سے آپ کو فون کیا ہے۔'' وہ چہکی۔ اداؤں کی طرح اس کی آواز میں بھی شوخی تھی۔

''کیا چیز؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک شیطانی چرخہ۔ جسے بعض لوگ موٹر بائیک کا نام دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ پھٹ پھٹی جسے آپ کے بھتیجے صاحب چلاتے ہیں۔ وہ گارڈن ٹاؤن کی ایک سڑک پر خراب کھڑی ہے..... بلکہ شاید مردہ کھڑی ہے اور آپ کے بھتیجے عمران اسے زندہ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔''

''تم نے کب دیکھا؟''

''ابھی دو منٹ پہلے.....'' وہ بے باکی سے بولی۔ ''دراصل میں حشام کے ساتھ گاڑی پر وہاں سے گزری ہوں۔ اتفاقاً نظر پڑ گئی اس بجوبے پر۔ غلط مطلب نہ لیجیے گا۔ بجوبے سے میری مراد موٹر بائیک ہی ہے۔'' اس کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔

''پچھلی ملاقات میں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے

سوری بولنا چاہتی ہو۔ یہ سوری بولے بغیر ازالہ کرنے کا اچھا موقع تھا۔ تم لوگ اس کی ہیلپ کر سکتے تھے۔''

''میں نے دو سیکنڈ کے لیے سوچا تھا لیکن انکل کافی دیر ہوگئی ہے مجھے۔ گھر میں خالہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ اُسے فون کر لیں۔'' اس نے ذرا توقف کیا پھر اسی شوخ آہنگ لہجے میں بولی۔ ''ویسے میرا مشورہ ہے انکل تابش اپنے بھتیجے سے کہیے کہ اس برگزیدہ موٹر سائیکل کی خطائیں اب معاف کر دے۔ اسے بیچ کر اس میں تھوڑے اور پیسے ڈالے اور اچھی حالت کی بائیسکل لے لے۔''

ماہین نے تو یہ اطلاع دے کر اور گڈ نائٹ کہہ کر کال ختم کر دی لیکن میرے اندر ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ عمران اس وقت گارڈن ٹاؤن کے دوسرے چوراہے سے آگے ایک ذیلی سڑک پر تھا اور یہ وہی سڑک تھی جو سیدھی جگو سیٹھ کی کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ ماہین نے جو پوزیشن بتائی تھی، اس کے مطابق موٹر بائیک کا رخ چوراہے کی مخالف سمت میں تھا۔ اس سے بہ آسانی یہ مطلب لیا جا سکتا تھا کہ عمران، جگو سیٹھ سے ملنے جا رہا ہے۔ عمران اور جگو سیٹھ کے حوالے سے میرے ذہن میں کئی سوالات ابھر رہے تھے۔ ایکا ایکی ذہن میں ایک خیال آیا اور میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

رات سرد تھی۔ کچھ دھند بھی تھی۔ ٹریفک کم تھا۔ میں اپنی گرے کلٹس پر بیس پچیس منٹ میں گارڈن ٹاؤن پہنچ گیا۔ جگو سیٹھ کی کوٹھی ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اچھی عمارت بنی ہوئی تھی۔ میں سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ گیٹ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ پورچ کی روشنی میں مجھے کالے رنگ کی ہیوی بائیک کی جھلک نظر آ گئی۔ کنفرم ہو گیا کہ عمران اندر ہی موجود ہے۔ میں واپس آیا اور ایک بار پھر کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ گارڈ کی موجودگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں کوٹھی کی عقبی سڑک پر گیا تو ایک موافق صورت حال نظر آئی۔ کوٹھی کے عقب میں پلاٹ خالی تھا۔ غالباً تعمیر شروع ہونے والی تھی۔ دو جگہ اینٹوں کا اسٹاک دکھائی دے رہا تھا۔ میں بڑے اچھے اور ''ایڈونچرس'' موڈ میں تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ڈائریکٹ ایکشن لے کر کچھ کھوج لگایا جائے۔ ایسے موقعوں پر عموماً میرا جگری، میرا ہمدم عمران دانش میرے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہمارے جسموں میں جوش کی ایک ہی جیسی لہر دوڑا کرتی تھی..... اب وہ نہیں تھا، اور تغیرِ زمانہ یہ تھا کہ یہاں اسی عمران دانش کا بیٹا تھا، میں جس کا کھوج لگانا چاہ رہا تھا، جاننا چاہ رہا تھا کہ کہیں اس کے حوالے سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔

میں نے گاڑی خالی پلاٹ کے قریب کھڑی کی پھر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی ہلچل نہیں تھا، ارد گرد کوئی سی سی ٹی وی کیمرا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پلاٹ میں تاریکی تھی۔ میں ٹہلنے والے انداز میں پلاٹ کے اندر چلا گیا پھر ترتیب سے رکھی ہوئی اینٹوں کے اوپر چڑھا ... چار دیواری اینٹوں سے بس چار پانچ فٹ ہی اونچی تھی۔ میں نے اندر جھانکا۔ وسیع کوٹھی میں بس کہیں کہیں روشنی تھی۔ کوئی آہٹ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے تیزی سے دیوار پھاندی اور اندر کود گیا۔ ربر سول والے جوتوں کی وجہ سے آواز پیدا نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر تک سن گن لینے کے بعد میں نے دو عقبی دروازوں کو چیک کیا۔ وہ اندر سے بند تھے۔ ایک جالی دار دروازے میں سے جھانکا۔ قالین پوش راہداری تھی۔ ایک دیوار پر گرونانک دیو کی دو پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سامنے والے کسی کمرے سے ٹی وی چلنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دبے پاؤں چل کر کوٹھی کے بغلی کوریڈور کی طرف آ گیا۔ یہ کوریڈور یعنی بغلی گلی کوٹھی کے اوپن ایریا کا حصہ تھی۔ گلی کے دو تہائی حصے کو فاسیر کے ایک نیم گول شیڈ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ اچانک کچھ مدھم آوازوں نے میرے قدم جکڑ لیے۔ یہ آوازیں گلی کے گول شیڈ والے حصے کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔ میں جھک کر چلتا ہوا ایک کھڑکی کے قریب پہنچا۔ آوازیں کچھ اور واضح ہو گئیں۔ تھوڑی سی کوشش کے ساتھ میں اس کھڑکی میں ایک درز ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر ویلوٹ کا سرخ پردہ سرکا ہوا تھا۔ مجھے ایک تندرومند شخص کی پشت نظر آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا تھا، اس کا لباس قیمتی تھا، مجھے صرف نیلی شرٹ نظر آ رہی تھی۔ ایک نہایت قیمتی موبائل فون اس کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھا تھا۔ اس کے سامنے جو شخص سنگل صوفے پر براجمان تھا، وہ کوئی اور نہیں عمران تھا۔ مجھے اس کا سائڈ پوز دکھائی دیا۔ وہ اپنے بے ڈھنگے لباس میں تھا۔ ''شکریہ گاڈ فادری۔'' عمران کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

فربہ اندام شخص نے گلاس سے ایک چسکی لی۔ یقیناً یہ وہسکی وغیرہ ہی تھی۔ وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''شکریہ کس بات کا پترجی، یہ آپ ہی کا پیسا ہے۔ آپاں تو نوکر ہیں تمہارے۔'' پھر اس نے قمیص کی بغلی جیب سے اپنا پرس نکالا اور کوئی کاغذ نکال کر عمران کی طرف بڑھایا۔ ''یہ Remittance کل آئی ہے آپ کی ماتا کی طرف

سے۔ میرا خیال ہے قریباً چھ ہزار پاؤنڈز ہیں۔"

عمران نے کاغذ دیکھ کر بے پروائی سے ایک طرف رکھ دیا۔ "یہ ذرا مشکل کام ہے گاڈ فادری! پہلے رقم انڈیا سے لندن جاتی ہے، تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے، پھر یہاں پہنچتی ہے۔"

"بادشاہ زادے، تمہیں کیا پریشانی ہے۔ آپاں نے کون سا کسی خچر پر نوٹ لاد کر یہاں لانے ہوتے ہیں۔ تم پن (ثواب) کا کام کر رہے ہو، اس میں تھوڑا بہت حصہ آپاں کا بھی پڑ جاندا ہے۔"

عمران نے موبائل فون کے کیلکولیٹر پر کچھ حساب جوڑتے ہوئے کہا۔ "گاڈ فادری، بدھ کے روز جو پچاس ہزار تم نے بھیجے تھے وہ..... اور پرسوں جو پانچ لاکھ تم سے لیے تھے وہ بھی اس میں سے کاٹ لینا....."

"چلو کاٹ لیں گے پتر جی، پر یہ پنج لاکھ دیا کس کو ہے؟"

"وہی رفیق صاحب جس کا ذکر کیا تھا میں نے تم سے۔ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ سخت ضرورت مند لوگ ہیں۔"

"چنگی بات ہے۔ واہگرو تمہاری ان کوششوں کو قبول کرے..... جب میں تمہارے یہ کام دیکھتا ہوں، مجھے وشواس ہو جاندا ہے کہ تمہارا کاروبار اور ترقی کرے گا۔"

میں سناٹے کی کیفیت میں یہ باتیں سن رہا تھا..... مجھ پر انکشاف ہو رہا تھا کہ عمران دانش کا یہ بے روزگار بیٹا، جو چند ماہ پہلے پاکستان میں وارد ہوا ہے اور جو "تنگ دستی" کے عالم میں لاہور کی ایک متوسط آبادی میں رہ رہا ہے..... (اور بمعہ پجیرو موٹر سائیکل پر گھوم رہا ہے) حقیقت میں ایک امیر کبیر نوجوان ہے۔

جس فربہ اندام شخص کی مجھے صرف پشت نظر آ رہی تھی، یقیناً یہی جگو سیٹھ تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر الکحل کا ایک اور گھونٹ لیا اور بھاری آواز میں بولا۔ "پتر جی! اور آلے دوالے کا کیا حال چال ہے؟ وہاں جھانسی میں تمہاری غیر موجودگی میں کاروبار کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہو رہا؟"

"نہیں گاڈ فادری۔" عمران نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "تم کو بتایا تھا نا کہ اللہ پاک نے مجھے جو منیجر دیا ہے، سمجھو کہ فرشتہ ہی بھیجا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کبھی کبھی ماں جی بھی وقت نکال کر چکر لگا لیتی ہیں۔"

عمران نے آگے کچھ اور بھی کہا تھا لیکن میں سن نہیں سکا، اچانک ہی میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میرے سر کے عقبی حصے پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ میں سر پکڑ کر بروقت کے بل جھک گیا۔ یہ میری اضافی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے اتنا نیم بسمل ہونے سے بچا لیا تھا۔ ضرب کے ساتھ ہی کسی نے مجھے عقب سے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں ایک ساعت ضائع کیے بغیر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور حملہ آور کو پوری شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرا دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ حملہ آور میرے جسم پر اپنی گرفت برقرار نہیں رکھ سکے گا لیکن یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ اس نے شدید چوٹ کے باوجود اپنی گرفت نرم نہیں ہونے دی۔ مجھے عجیب سا شک ہوا۔ یوں لگا جیسے عقب سے میرے ساتھ لپٹا ہوا حملہ آور مرد نہیں، کوئی عورت ہے۔ اس کے جسم کی ساری ساخت مجھ پر واضح ہو رہی تھی مگر کیا ایک عورت اتنی سخت جان ہو سکتی تھی؟

اگلے ہی لمحے صورتِ حال مزید واضح ہو گئی۔ دوسرے حملہ آور نے مجھ پر سامنے سے یلغار کی۔ یہ بھی ایک عورت ہی تھی لیکن کوئی عام عورت نہیں تھی۔ چوڑے چکلے جسم کی جوان اور نہایت مضبوط عورت۔ وہ یونیفارم طرز کے لباس میں تھی۔ شلوار قمیص اور چوڑی بیلٹ جو کمر کے گرد کسی ہوئی تھی۔ چوڑے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور جبڑا نہایت مضبوط۔ مجھے اس کی بیلٹ کے ساتھ پستول لٹکا ہوا نظر آیا، وہ اپنا ہاتھ اس پستول کی جانب ہی بڑھا رہی تھی۔ یہ سارا منظر میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں دیکھا۔ غضب ناک عورت نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور پستول نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی میری دونوں ٹانگوں کی بھرپور ٹھوکر اس کے سینے پر لگی اور وہ کراہتی ہوئی دور جا گری۔ وہ گرتے ہوئے کسی ڈیوائس سے ٹکرائی تھی، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ یو پی ایس کا یونٹ تھا۔ دھماکے کے ساتھ شارٹ سرکٹ کی آواز آئی اور پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب گئی۔

عقب سے لپٹی ہوئی جنگجو عورت نے مجھے جکڑ تو رکھا تھا لیکن میرے بازو آزاد تھے۔ میں نے اپنی کہنی کی یادگار ضرب اس کی پسلیوں میں لگائی۔ پسلی چٹخنے کی آواز واضح سنائی دی۔ عورت کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ میں تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ تب تک سامنے والی حملہ آور پھر مجھ پر جھپٹ چکی تھی، وہ مجھ پر آتشیں گالیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ اس نے میرے سینے پر اپنے فولادی سر کی ضرب لگائی پھر کوئی تیز دھار چیز میری کلائی کو چیر گئی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر یقیناً یہ کوئی خنجر وغیرہ تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ فرش بوس ہونے کے بعد

پستول اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

تیز دھار آلے کا دوسرا وار میرے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے اس کا دایاں بازو دبوچ لیا اور طاقت سے مروڑ کر تیز دھار آلہ اس کی گرفت سے چھڑا دیا۔ دوسری حملہ آور اپنی پسلی پر نہایت سنگین ضرب کھانے کے باوجود پسپا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ وہ غضب ناک انداز میں چنگھاڑتی ہوئی جھپٹی۔ میں نے اس کی ساتھی کو گھما کر اس پر دے مارا۔

ایسی خطرناک، کڑک عورتوں سے میرا واسطہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ جو زبان بول رہی تھیں وہ میرے اندازے کے مطابق ترکی تھی۔ ان کے خدوخال بھی ترک تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جن ترک عورتوں کے بارے میں میرا اور میرے مخبر نوشا کا خیال تھا کہ وہ شاید موج میلے کے لیے یہاں لائی گئی ہیں، وہ موج میلے کے لیے نہیں لائی گئی تھیں، وہ یہی آفت زادیاں تھیں۔ وہ میرے ساتھ یوں برسرپیکار تھیں جیسے پرانی دشمن ہوں اور اسی جگہ مجھے لاش میں تبدیل کردینا چاہتی ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ان کے اس مہلک حملے سے جانبر نہ ہوسکتا۔ میں پانچ دس سیکنڈ کے اندر اندر سنبھل گیا اور پھر ان دونوں پر کاری وار کیے۔ ''معذوب پسلی والی'' ایک دروازے کا شیشہ چکنا چور کرتی ہوئی ایک برآمدہ نما جگہ پر جا گری اور دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ دوسری کا پیش قبض نما خنجر اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور میں نے اس کے ہیولے کو اپنے گھٹنے کے نیچے دبا لیا تھا۔ یہ سارے کا سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر ہی وقوع پذیر ہوگیا تھا۔ یکایک مجھے لگا کہ تاریکی میں کسی نے عقب سے آکر میری گردن میں لوہے کا شکنجہ ڈال دیا ہے۔ بہت سخت گرفت تھی۔ میرے دل نے پکار کر کہا..... یہ میرے یار عمران دانش کے بیٹے کی گرفت ہے۔ میں اس گرفت کو اور اس کی لڑائی کے سارے داؤ پیچ کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ (وہ جوش و خروش کی انتہا کا دور تھا، وہ دیوانگی کا زمانہ تھا۔ کبھی کبھی میں اور عمران دانش بے وجہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔ مار مار کر ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے تھے۔ چوٹیں راحت پہنچاتی تھیں، تکلیفیں جسم میں مزید امنگ ترنگ جگاتی تھیں، خطرے لہو کی گردش تیز کرتے تھے اور موت ہمیں دیکھ کر دائیں بائیں سرک جاتی تھی) ہاں، یہ اسی عمران دانش کا بیٹا تھا۔ میں اسے کوئی جوابی چوٹ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ گہری تاریکی تھی اور یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس پر عقاب کی طرح جھپٹا ہے، وہ کوئی اور نہیں اس کا ''چاچو یار'' ہے۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا لیکن میری گردن پر اس کے بازو کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں نے بولنا چاہا تو گلے سے آواز نہیں نکل پائی۔ کاش لائٹ آجائے..... میں نے سوچا۔

کمک پہنچنے کے بعد ترک گارڈ پھر شیر ہوگئی۔ وہ چلاتی ہوئی مجھ پر جھپٹی لیکن پھر ٹانگ کھا کر لڑکھڑا گئی۔ اسی دوران میں عمران جونیئر نے مجھے پوری طاقت سے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ میرا سر دیوار سے ٹکراتا تو چیخ کر رہ جاتا۔ میں نے اس کا توڑا اپنے ہاتھ کو چہرے کے سامنے لا کر کیا اور سر کی شدید چوٹ سے بچ گیا۔ ''عمران یہ میں ہوں۔'' میں نے اسے تاریکی میں پھر پکارنا چاہا لیکن ظالم نے گردن کو یوں جکڑ رکھا تھا کہ آواز ناقابل شناخت ہو کر رہ گئی تھی۔ اب مزید بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ بھی گارڈز وغیرہ ہی تھے۔ مجبوراً میں نے اپنے دائیں آزاد ہاتھ سے عمران کی پسلیوں پر کہنی کی بچی کھچی ضرب لگائی جسے اس نے کافی حد تک بچا لیا۔ تاہم اس دوران میں اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے میرے سر کی جانب سے ہٹ گئی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر سر کے عقبی حصے سے چوٹ لگائی۔ میرے گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو میں نے ''پہلی فرصت'' میں وہ کام کیا جو کرنا چاہتا تھا۔ ''عمران، یہ میں ہوں۔'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

ایک دو سیکنڈ کے لیے عمران جیسے سن ہوگیا۔ میں اس کی گرفت سے نکل آیا۔ یہی وقت تھا جب دو تین موبائل فون ٹارچز کی روشنی نے تاریکی کو دور کردیا۔ عمران ہکا بکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر پھر سے جھپٹنے والی ''ترک فائٹر'' بھی ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کا تھوبڑا خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ہانپتے کانپتے جوزف سیٹھ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ رائفل بدست موقع پر آن موجود ہوا تھا۔

عمران نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روکا۔ پھر ترک جنگجو اور دوسرے گارڈز کو بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ تب جھپٹ کر اس نے ترک جنگجو عورت کے ہاتھ سے خنجر بھی نکال لے۔ (جو اس نے روشنی ہونے کے بعد دوبارہ اٹھا لیا تھا)

''چاچو جی! تم یہاں؟'' وہ ششدر تھا۔

پھر اس کی نگاہ میری زخمی کلائی پر پڑی، جہاں گہرا کٹ تھا اور خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ''اوہ گاڈ، چاچو جی، تم تو زخمی ہو۔'' اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ وہ مجھے لیتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔

''کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''لیکن خون تو بند کرنا ہے نا۔'' وہ بولا۔

چکنا چور شیشے کے قریب دوسرے ترک جنگجو نیم بے ہوش پڑی تھی۔ ''فاروی! پلیز، تم اس کو دیکھو۔'' عمران نے جگو سیٹھ سے مخاطب ہو کر بے سدھ عورت کی طرف اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد میں اور عمران اسی کمرے میں تھے جہاں میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اور جگو سیٹھ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اسی دوران میں کوٹھی کی برقی رو بحال ہو گئی۔ روشنی ہوئی تو میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کو دھیان سے دیکھا جہاں میرے سر کی ضرب لگی تھی وہاں عمران کے رخسار پر نیلگوں ابھار نمودار ہو چکا تھا۔

وہ میری کلائی پر ایک رومال باندھتے ہوئے ششدر لہجے میں بولا۔ ''یہ سب کیا ہے چاچو؟''

''میں بھی یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟''

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ''تو اس کا مطلب ہے، میرا چاچو میری جاسوسی کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے.....''

''جب بھتیجا کچھ زیادہ ہی ''غریب'' اور لاچار ہو تو اس کی خبر تو رکھنی پڑتی ہے نا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

عمران نے ہونٹ سکیڑے اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''اس کا مطلب ہے چاچو! کہ تم نے میری اور چاچا جگت سنگھ کی باتیں بھی سنی ہیں۔''

''کون جگت سنگھ؟''

یہی وقت تھا جب جگو سیٹھ اندر داخل ہوا۔ اس کے لمبے کرتے کے نیچے درمیانے سائز کی توند بھی ابھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے سامنے سے جگو سیٹھ کو دیکھا تھا۔ دماغ میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ یہ شکل کچھ جانی پہچانی تھی پھر نگاہوں کے سامنے دھما کا سا ہوا۔ برسوں پہلے کا وہ نڈر جگت سنگھ یاد آ گیا جو میرے اور عمران دانش کے ساتھ ہی انڈیا کی بارڈر فورس کو چھکا کر پاکستان پہنچا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی محبوبہ اور اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا..... جگت سنگھ نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں لاہور میں میری موجودگی سے پہلے ہی باخبر تھا۔ شاید اس نے مجھ سے جان بوجھ کر رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ ''بھرا جی'' کہتا ہوا مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اس کوٹھی میں میری موجودگی عمران کی طرح جگت سنگھ کو بھی حیرت زدہ کر رہی تھی۔ جگت سنگھ کبھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا اور کبھی عمران کی طرف۔ ''یہ سب کیا ہے بادشاہ زادو۔ آپاں کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا؟''

عمران نے کہا۔ ''فاروی، یہ سب لمبی کہانی ہے۔ ڈھیروں سوال ہیں اور ڈھیروں جواب بھی ہیں۔ میرے خیال میں زیادہ سوال تو چاچو تابش کے ذہن میں ہوں گے۔ آرام سے بیٹھ کر یہ سوال جواب کریں گے۔ فی الحال تو تمہاری دونوں گارڈز زخمی ہیں ان کو دیکھو اور باقی ملازموں کو بھی مطمئن کرو۔ میں چاچو کی چوٹ کی ڈریسنگ کرواتا ہوں۔''

جگت سنگھ جذباتی نگاہوں سے میری جانب دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ عمران نے کلائی کے کٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہڈی تک چلا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پیٹ میں گھس کر ریڑھ کی ہڈی تک بھی جا سکتا تھا..... سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خوفناک عورتیں کیوں پال رکھی ہیں تم لوگوں نے..... اور انہوں نے اتنی بے رحمی سے مجھ پر حملہ کیوں کیا؟''

''چاچو جی! تم نے بھی تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دونوں زخمی ہیں، ایک تو بے ہوش ہے اور اسپتال روانہ ہو گئی ہے..... دراصل ہوا یوں ہے کہ یہ کسی اور کے لیے ''بے رحم'' ہو رہی تھیں۔ اتفاقاً ان کے ریڈار پر تم آ گئے۔''

''کیا مطلب؟ کس پر بے رحم ہو رہی تھیں؟''

جواب میں عمران نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ کوٹھی میں پچھلے دو مہینوں کے دوران میں دو بار چوری اور ایک بار ڈکیتی ہو چکی ہے۔ جگت سنگھ نے (جسے عمران پیار سے گاڈ فاروی کہتا تھا) دو گارڈز کا انتظام تو کر رکھا تھا لیکن زنانے حصے میں سیکیورٹی کے لیے اس نے ترکی سے یہ دو انتہائی زنانہ گارڈز منگوائی تھیں۔ انہیں پیش آمدہ خطرے کے حوالے سے پوری طرح ہوشیار اور چارج کیا گیا تھا۔ یہی ''چارج شدہ'' گارڈز مجھے ''گھس بیٹھیا'' جان کر مجھ پر پل پڑی تھیں اور دمادم مست قلندر کر دیا تھا۔

☆☆☆

رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ میں اور عمران جگت

سنگھ والی کوٹھی میں ہی موجود تھے۔ میں جگت سنگھ کے بارے میں کافی کچھ جاننا چاہتا تھا مگر عمران کا خیال تھا کہ جگت سنگھ یہ سب کچھ اپنی زبانی ہی بتائے گا تو زیادہ اچھا ہوگا۔ جگت سنگھ فی الوقت اپنی ترک گارڈ کی دیکھ بھال کے لیے اسپتال میں ہی تھا۔ ترک گارڈ کا ایک ایمرجنسی آپریشن ہوا تھا..... ابھی اس کی حالت کے بارے میں کوئی تسلی بخش خبر نہیں تھی۔ اس کی پسلی دو ٹکڑے ہوگئی تھی۔

عمران کے استفسار پر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ کسی طرح ماہین نے سرِراہ گزرتے ہوئے اس کی خراب موٹر بائیک کو دیکھا اور کس طرح مجھ شک ہوا کہ وہ یہاں جگو سیٹھ کی کوٹھی میں موجود ہے۔ میں اسے صاف لفظوں میں یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں نے اپنے ایک انفارمر سے اس کی تھوڑی سی نگرانی بھی کرائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی (عمران کی) بھلائی کے لیے ہی میں اس کے ذرائع آمدنی جاننا چاہ رہا تھا۔

اسی دوران میں پرائیویٹ اسپتال سے وہ خبر آگئی جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ جگت سنگھ نے فون پر بتایا کہ ترک گارڈ اب ہوش میں آگئی ہے، اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

اس اطمینان بخش اطلاع کے بعد عمران نے گرین ٹی اور کچھ لوازمات منگوائے۔ جگت سنگھ کی بیوی اپنے مقامی عزیزوں کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ چائے وغیرہ ملازمین نے ہی پیش کی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں دھیان سے عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اب اداس بکرے کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس سے تیکھے سوال کرنے والا ہوں۔ آخر خود ہی بول اٹھا۔ ”چاچو، جو پوچھنا ہے، پوچھ لو۔ خواہ مخواہ میرا پیشاب خشک مت کرو۔“

”پیشاب نہیں ”خون“ خشک ہوتا ہے۔“ میں نے تصحیح کی۔

”جب ڈر زیادہ ہو تو محاورے آگے پیچھے ہو ہی جاتے ہیں۔“ اس نے رونی صورت بنائی۔

میں نے کہا۔ ”زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ اس طرح کے پاکھنڈ تم کیوں کرتے ہو؟“

”کس طرح کے پاکھنڈ؟“ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔

”عمران میں سیریس ہوں۔“ میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم مجھ سے بھی جھوٹ بولتے رہے ہو۔ ایک طرف مجھے ”چاچو، چاچو“ کہتے تمہاری زبان سوکھتی ہے اور دوسری طرف مجھے بے وقوف بھی بناتے رہے ہو۔ تم..... ایک..... مال دار شخص ہو۔“

وہ بھی سنجیدہ نظر آنے لگا، بولا۔ ”چاچو جی! غلط نہیں کہہ رہا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد میں تمہیں بھی سب کچھ سچ سچ بتا دیتا لیکن فی الحال حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اپنے اردگرد جو خول سا میں نے بنایا ہوا ہے، اس میں کوئی ترید (دراڑ) نہ پڑ جائے۔“

”خول چڑھانے کو اور بہروپ بھرنے کو ہی تو ڈراما بازی کہتے ہیں۔“

وہ چند لمحے تک عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”چاچو جانی! چلیں، یہ ڈرامے بازی ہی سہی..... لیکن پلیز..... مجھے اس ڈرامے بازی کے ساتھ رہنے دو۔ اس حوالے سے مجھ پر کسی طرح کا زور نہ ڈالنا۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اپنے خوب

مجبوری

ایک شرابی ریلوے بکنگ آفس پر ایک شخص کو اپنے کندھے پر سوار کیے پہنچا اور ٹکٹ بیچنے والے سے کہا۔ ”مجھے روہڑی کا ایک ٹکٹ دے دو۔“

ٹکٹ بیچنے والے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ اور بولا۔ ”اس شخص کا ٹکٹ نہیں لوگے جو تمہارے کندھوں پر سوار ہے؟“

”یہ شخص۔“ شرابی نے جواب دیا۔ ”یہ تو میرا بچہ ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں ہوئی ہے۔“

”چھ سال سے کم عمر کا بچہ ہے؟“ ٹکٹ بیچنے والے نے کہا۔ ”کیوں بے وقوف بناتے ہو یہ شخص چھ فٹ لمبا ہے، اس کا وزن کم سے کم ستر کلو ہوگا اور اس کی داڑھی کسی حال میں بھی تین انچ سے کم نہیں ہے پھر بھی تم اسے بچہ کہہ رہے ہو؟“

شرابی نے کندھے پر سوار شخص کو زمین پر دے پٹکا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ ”گدھے میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا اپنی داڑھی منڈوا دو۔ اب مجبوراً مجھے تمہارا بھی ٹکٹ لینا پڑے گا۔“

مرسلہ: عبدالغفار کوثر، اورنگی کراچی

صورت بالوں میں انگلیاں چلا کر اسی کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''چاچو! میں ان لوگوں جیسا بن کر ان لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا ہوں، ان کے دکھ سکھ کو ان کی کمی خوشی کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دور رہ کر ان مسائل کو جان ہی نہیں سکتا جو ان تنگ گلی کوچوں میں پھلتے پھولتے ہیں، نہ ان بیماریوں اور تکلیفوں کو جان سکتا ہوں جو ان تاریک بوسیدہ کمروں میں جنم لیتی ہیں..... اور نہ ان سسکیوں سے باخبر ہو سکتا ہوں جو صرف کان لگا کر سنی جا سکتی ہیں..... مجھے یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے دو چاچو جی! مجھے وہ ذمے داری نبھانی ہے جو آپ کے دوست اور میرے پاپا نے مجھ پر ڈالی ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ بات تو وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ اور یہ بات بہت ظرف مندی والی بھی تھی۔ وہ بغیر سامنے آئے، بغیر کسی نمود و نمائش کے اپنی ہمت طاقت کے مطابق اپنے اردگرد کے دکھی لوگوں کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کے لیے اس نے کسی حاجی فراز کا نام گھڑ لیا تھا اور اپنی ساری کوششوں کو بڑی خاموشی کے ساتھ اس کے کھاتے میں ڈال رہا تھا..... ان لمحوں میں نجانے کیوں میری نگاہوں کے سامنے چند دن پہلے، ٹی وی اسکرین پر دیکھے ہوئے کچھ مناظر آ گئے۔ وہی فربہ اندام سیاست داں جو آٹے کا تھیلا، مفلوک الحال لوگوں کے سروں پر رکھتا تھا اور مسکرا مسکرا کر تصویریں اتروا تا تھا۔ آفت اور مصیبت کے دنوں میں ایسے مناظر اس وطنِ عزیز میں نجانے کتنی جگہ بکھر جاتے ہیں، کتنی جگہ غربت کو تماشا بنایا جاتا ہے۔

ماحول بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک ایک فون کال نے صورتِ حال تبدیل کر دی۔ رات کے ڈیڑھ بجے آنے والی یہ کال ماہین کی طرف سے تھی۔ ''ہیلو انکل..... ماہی بول رہی ہوں۔ کہیں آپ سو تو نہیں گئے تھے؟''

''بس سمجھو سونے ہی والا تھا۔''

''سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔ وہ دراصل آپ کے بھتیجے کے بارے میں پوچھنا تھا۔ کیا بنا اس کا؟''

''ہاں ٹھیک ہو گئی تھی اس کی بائیک، واپس گھر آ گیا تھا۔''

''چلیں..... میں نے سوچا اتنی سردی میں، کہیں وہیں اٹکا نہ پڑا ہو۔ ترس آ رہا تھا اس پر..... او کے گڈ بائے، گڈ نائٹ۔'' اس نے تھکتی آواز میں کہا۔

''گڈ نائٹ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

عمران سمجھ گیا کہ ماہین کا فون تھا۔ ''اس کو کیا فکر لاحق ہو گئی؟'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں..... یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

ایک دم عمران کا سنجیدہ موڈ ہوا ہو گیا۔ وہ اپنی اسی چلبلی ڈگر پر واپس آ گیا جو ہر گام پر کئی کئی بل کھاتی تھی، بولا۔ ''چاچو جانی! اب دیکھ لو تم خود مجھے راہ دکھا رہے ہو، وہ کیا کہتے ہیں پنجابی میں، اشکل دے رہے ہو۔ تم نے میری امید کے بجھے چراغوں میں پھر تیل ڈال دیا ہے۔''

''میں نے کیا، کیا ہے؟''

''تم مسکرائے ہو چاچو، حالانکہ تم ماہین کے ذکر پر نیم کے پتے چبانے لگتے ہو جو ہر وقت کڑوے پتے چبائے، وہ ذرا سا مسکرا بھی دے تو یہ بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔''

''کوئی خبر شبر نہیں ہے۔ اس کو بس ترس آیا ہے تم پر۔''

''اب تم جو مرضی کہہ لو چاچو جی، لیکن یہ جو تم مسکرائے ہو نا، یہ مسکراہٹ اب تم واپس نہیں لے سکتے۔ تم نے جو آس میرے اندر جگائی ہے چاچو، اب وہ بڑھتی جائے گی، بڑھتی ہی جائے گی..... اور پھر ایک دن.....''

''تم اس سے باقاعدہ جوتے کھا لو گے۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

''چاچو مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو تم۔ مجھے آج تک کوئی جوتا نہیں مار سکا۔ اگر کسی نے مارا ہے تو میں نے لگنے نہیں دیا۔ اگر لگا بھی ہے تو بس اچٹتا سا۔ جیسے بوسہ دے کر گزر گیا ہو۔'' وہ فخریہ انداز میں مسکرایا۔

''اچھے ایکٹر ہو۔ کامیڈی فلموں میں چانس بن سکتا ہے تمہارا۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

یہی وقت تھا جب قریبی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کی کھڑکھڑاہٹ گونجی اور پھر اعلان ہونے لگا۔ ''حضرات! ضروری اعلان سماعت فرمائیں۔ حاجی فراز صاحب کی فری ڈسپنسری میں بچوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر تشریف فرما ہیں۔ وہ آج اور کل رات آٹھ بجے تک بچوں کا مفت معائنہ کریں گے۔ ادویات بھی دی جائیں گی۔ اہالیانِ علاقہ سے گزارش ہے کہ.....''

اعلان جاری رہا۔ میں عمران کی طرف دیکھتا رہا جو اب اپنے خستہ حال موبائل فون کے اندر ماچس کی تیلی پھنسا کر اسے چارج کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

❖❖❖

ہنگامی شادی



نگہبان

طاہر جاوید مغل

قدرت نے انسان کی بہ ظاہر دو آنکھیں بنائی ہیں مگر... محبت... محبت کا تو وجود ہی نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی عکس... اس کے باوجود اس نادیدہ جذبے میں اتنی طاقت رکھ دی ہے کہ جس دل میں گھر کرلے وہاں الہام اترنے لگتے ہیں... ان کے درمیان تو دنیا کا حسین ترین تعلق تھا... ایک ایسا رشتہ جس کا نام بھی تھا اور حق بھی لیکن... حسد ایک ایسی آگ ہے جس میں نہ کوئی رشتہ بچتا ہے اور نہ ہی احساس...

پچھتاوے کی آگ میں جل جل کر جینے والی ایک عورت کی روداد.....

بشارت بیگم کی بہن جتنی صورت تھی اور جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی تند مزاج اور بدتمیز بھی تھی۔ اس کی یہ صلاحیتیں آہستہ آہستہ ہی بشارت پر کھلی تھیں۔ ان صلاحیتوں سے پوری طرح آشکار ہونے میں کم و بیش چھ سال لگ گئے تھے۔ اس وقت تک وہ اور اسد تین بچوں کے والدین بن چکے تھے۔ بڑی بیٹی دعا تھی، دو بیٹے اسامہ اور عاطس تھے۔ تینوں بچے بڑے پیارے اور دادی کی جان تھے مگر بشارت بیگم کے دل میں ہر وقت کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کامیاب مفتوح

طاہر حسن اویس معتصل

عورت کی رضا اور ساتھ کے بغیر جنگیں تو جیتی جاسکتی ہیں مگر... دل نہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ماجرا تھا جب ایک انار اور دو بیمار کے مصداق ایک ہی چہرہ ان دونوں کی آنکھوں میں خواب بن کر اتر گیا تھا لیکن... کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ اس خواب کی تعبیر کس کے حق میں مبدہ ہی اور کس کے لیے الٹی ثابت ہونے والی تھی۔

سسپنس کی صورت الجھا دینے والی ایک
دوشیزہ کا قصہ

یہ ایک ہوائی اڈے پر ان ہونی تھی۔ یہ ایک ہونے سانحہ کا تذکرہ تھا۔ زمین رنگیلی اور بام گرم تھی۔ چاروں طرف گھنا بھاڑ جھنکاڑ تھا۔ اس بھاڑ جھنکاڑ میں سے کہیں کہیں سمندر کے نیلگوں پانی کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔

بھی اور جاب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ دونوں کے بالائی جسم عریاں تھے۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں دونوں کے بازوؤں کی مچھلیاں چمک رہی تھیں اور وہ



ایک دوسرے پر جھپٹنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

جدید طرز کے زرد رنگ میں ملبوس ہوٹل بابرہ نے..... بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے۔ اس نے منرل واٹر کی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا اور اپنی آنکھوں سے الڑتی ہوئی بے چینی کو چھپانے کے لیے گہرے رنگ کے سن گلاسز لگا لیے۔ وہ تیئس چوبیس سال کی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ اس نے ایک لمبی کڑھائی دار قمیص اور جینز پہنی ہوئی تھی۔ جمی اور ناب دو بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ دونوں نے بازو پھیلا رکھے تھے اور اپنے پاؤں کو بڑے محتاط انداز میں حرکت دے رہے تھے۔ پھر یکایک لڑائی شروع ہوگئی۔ پہلا وار جمی نے کیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے جھکا اور اس نے ناب کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے پشت کے بل ریت پر گرانا چاہا مگر ناب نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور زور لگا کر خود کو گرنے سے بچا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھٹنے کا بھرپور وار جمی کی پسلیوں پر کیا اور پھر اس کے منہ پر جو گرفت کی ٹھوکر رسید کر کے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ جمی لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ آدھ سیکنڈ کے اندر اس کی ناک سے خون رسنا شروع ہوگیا۔ پہلے وار کی کامیابی کے بعد ناب نے پھرتی سے دوسرا وار کیا اور جمی کے منہ پر ٹانگ مارنا چاہی۔ اس مرتبہ جمی نے خود کو بچایا اور پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ اپنے حریف سے لپٹ گیا۔ اس نے ناب کی توانا گردن اپنے مضبوط بازو میں دبوچ لی تھی، دوسری طرف ناب نے اپنے بازوؤں کو شکنجے کی طرح جمی کی کمر کے گرد کس دیا۔ دونوں پوری طاقت سے ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے، بالکل جیسے دو سانڈوں نے ایک دوسرے میں سینگ پھنسا لیے ہوں اور اب جسم وجاں کی پوری توانائی سے ایک دوسرے کو دھکیل کر کسی گہری کھائی میں گرانا چاہتے ہوں۔ بابرہ اب بے چینی کے عالم میں کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے کون یہ خونی مقابلہ جیتے گا اور اس نتیجے میں اس کا "دلہا" بنے گا..... اس کے جسم وجاں کا مالک۔

شاید یہ ہی منظر تھا جو دو سو زمین پر دو اول سے بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ چند پرکھ سے لے کر اشرف المخلوقات تک سب ہی نفس اس منظر کا حصہ رہے ہیں۔ اگر واضح الفاظ میں یہ بات کہی جائے تو شاید یوں ہوگی..... ایک مادہ کے لیے دو نروں کا ٹکراؤ..... جو ہمیشہ سے جاری ہے۔

ادقانوس کے اس ویران جزیرے پر ایک تماشے کے سامنے دلکش بابرہ کے روپ روپ بکھر رہا تھا، اس کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں تین چار ماہ پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ کہانی جولائی کی اس حسین شام کو شروع ہوئی تھی جب جمی ٹیچر، جمیل اور نبیل عرف ناب آئس کریم کھانے کے لیے ایک آئس کریم پارلر میں گئے تھے۔ یہ دونوں نوجوان دوست ہونا کے ہی رہائشی تھے۔ دونوں کے آباء کا تعلق پاکستان سے تھا اور دونوں کی فیملیز قریباً ساٹھ برس سے گیانا میں رہائش پذیر تھیں۔ دونوں کا تعلق یہاں کے خوش حال کاروباری گھرانوں سے تھا۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے اور تقریباً یکساں تعلیم یافتہ بھی تھے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی۔ ہاں جمیل کے خدوخال میں سختی اور مردانہ پن نسبتاً زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک پرانے زخم کا قوس نما نشان بھی تھا، تاہم یہ نشان اس کے چہرے کی دلکشی کو کسی طور متاثر نہیں کرتا تھا۔ جمیل کے چہرے کے نقوش نسبتاً تیکھے تھے۔ دونوں دراز قد اور نہایت ورزشی جسم کے مالک تھے اور یہ بھی اتفاق تھا کہ دونوں نے کالج کے زمانے میں ایک ہی انٹینی ٹیوٹ سے مارشل آرٹ کی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی..... گلی کوچوں اور کلبوں وغیرہ میں ہونے والی لڑائیوں یا مرکتائیوں کے لیے تربیت حاصل کرنا اکثر نوجوانوں کا شوق تھا۔ جمیل اور نبیل بھی ایسی ماردھاڑ میں کافی طاق تھے۔ کئی مواقع پر وہ مقامی اور غیر مقامی پھنے باز دوں کے ساتھ نہایت کامیابی سے نمٹ چکے تھے۔

جولائی کی اس خوشگوار شام کو جب وہ دونوں آئس کریم پارلر میں داخل ہوئے تو انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہاں بھی ایک پھنڈا ان کا منتظر ہے۔ بہرحال اس پھڈے کا تعلق لڑائی مارکٹائی سے نہیں، حسن وعشق سے تھا۔ جمی اور ناب نے پارلر کی ایک میز پر ایک حسین لڑکی کو اپنے کسی اور فی میل دوستوں کے ساتھ بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھا۔ وہ جب ہنستی تو ہر طرف پھول سے بکھرنے لگتے محسوس ہوتے تھے اور جب باتیں کرتے کرتے اپنے سیاہ ریشمی بالوں کو ادا سے ہاتھ سے چہرے پر سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے چاند بادلوں کے پیچھے سے جھانکتا جھانکتا بالآخر نمودار ہوگیا ہو۔ اس کی ہر ادا اژدھے کی طرح ڈسنے والے (حضرات) کے دل پر لگتی اور غم گھائل کر دیتی تھی۔ جمی اور ناب بھی اس شام ایک ساتھ ہی گھائل ہوئے تھے اور دونوں نے اپنے اپنے حصے میں اس لڑکی کے لیے ایک آگ سی بھڑکتی محسوس کی تھی۔ سچی بات تھی کہ وہ

پاکستانی پاکستانی ہے۔ بے شک وہ ایک جیکٹ آئس کریم پارلر میں بیٹھی تھی تاہم اس کے لباس اور اس کے دوستوں وغیرہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی وہ خوش پوش لوگ، جنہوں نے ابھی خوش حالی اور لبرل سوچ کی سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھے ہوتے۔

"کیا کیا جائے؟" جمی نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"کرنا کیا ہے بچو کر..... شادی کر لیتے ہیں۔" ٹام نے کہا۔

"شادی تو صرف ایک سے ہو سکتی ہے۔"

"تو بھی میں ہوں نا، اس نیک کام کے لیے۔" ٹام نے ترت جواب دیا۔

جمی نے سوچا تھا۔ "خیر ورنہ اس قسم کے گندے ناپاک خیال ذہن میں نہ لاتا..... اب یہ لڑکی تمہارے لیے عزت کی جگہ پر ہے کیونکہ تمہارا عزیز ترین دوست اسے اپنے لیے پسند کر چکا ہے۔"

"جمی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور بالکل آخری لفظوں میں۔" ٹام نے کہا اور جمی پر جذباتی وار کرنے کے لیے اپنی ترکش کا آخری تیر نکالا۔

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ انسانی مزاج کی یہ صورت حال کتنی جلد تبدیل ہونے والی ہے۔ یہ لڑکی اس طرح دونوں کے اعصاب پر سوار ہونے والی ہے کہ وہ بچپن کے دوستوں سے بدترین دشمنوں میں بدل جائیں گے۔

وہاں آئس کریم پارلر میں بیٹھے بیٹھے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کے کوائف معلوم کیے جائیں اور دیکھا جائے کہ وہ کس باغ کی مولی ہے اور اس مولی کو کس طرح اکھاڑا اور اپنی دسترس میں لایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک آزاد اور آزاد معاشرہ تھا۔ مرد و زن کا تعلق سماجی پابندیوں سے تقریباً آزاد تھا۔ جنہوں نے شادی کے بغیر اکٹھے رہنے کی بات تو اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ مغربی معاشرے میں تو اب معاملات اس سے بھی آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ماحول کا اثر بیچارے ان غیر ملکیوں پر بھی پڑتا ہے جو مغرب کے بجائے مشرق سے تعلق رکھتے ہیں اور مغربی ممالک میں آباد ہو جاتے ہیں۔ جمی اور ٹام بھی ایسی تاریکیوں دشمن میں شامل تھے اور فلپائنی لڑکی بھی جو بظاہر اس پیچیدہ ہوئے، چوہیزیں چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

اگلے آٹھ دس روز جمی اور ٹام نے لڑکی کا سراغ حاصل کرنے میں صرف کر دیا۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ایک تیسرے دوست کی خدمات حاصل کی تھیں جو ایسے کاموں میں خاصا ماہر تھا۔ لڑکی کا نام بابرہ معلوم ہوا۔ وہ ان کے اندازوں کے عین مطابق پاکستانی تھی..... یعنی اس کے "بڑے" پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ لڑکی کے والدین ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر چکے تھے۔ اس کی صرف ایک بہن تھی جو اپنے "مذہبی" خاوند کے ساتھ امریکا میں رہتی تھی۔ بابرہ یہاں ہوا میں اپنی دو بھارتی فرینڈز کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور ایک انٹرنیشنل فرم میں جاب کرتی تھی۔ اس کا تھوڑا بہت بینک بیلنس بھی تھا۔ ذاتی بینک تھی جس پر وہ آسانی سے آ جا سکتی تھی۔ ایک حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس کی کہیں منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی تھی، نہ ہی اس کے کسی سنجیدہ بوائے فرینڈ کا کھوج لگا۔ وہ جمی اور ٹام کے لیے ہر لحاظ سے ایک موزوں کینڈی تھی۔ وہ دونوں ہی اس کامل لمحے کا اپنی تخصیص اور اپنی مالی حیثیت کے مل ہونے پر بابرہ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے سکتے تھے اور یہیں سے جمی اور ٹام کے درمیان ایک خاموش چپقلش شروع ہو گئی۔ دھیرے دھیرے یہ چپقلش ایک سرد جنگ میں بدل گئی۔ ان دونوں میں سے کوئی ابھی تک بابرہ سے براہ راست مخاطب نہیں ہوا تھا لیکن وہ دونوں جان چکے تھے کہ وہ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ جو بھی اس کی طرف قدم بڑھاتا، وہ تھوڑی سی کوشش سے اس خوبصورت لڑکی کو اپنے تصرف میں لے آتا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی طرف قدم بڑھائے گا کون؟ جمی یا ٹام؟

ایک صبح پریمیل حرف جمی نے بابرہ کا نام پتا نشانہ بابرہ سے فون پر تھوڑی سی بات چیت کی۔ اس بات کا پتا کہ یہ کیل یعنی ٹام کو چل گیا۔ دونوں میں تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا کیونکہ دونوں میں یہ طے ہوا تھا کہ وہ بابرہ کے سلسلے میں جو کچھ بھی کریں گے باہمی مشورے سے کریں گے۔ پھر ایک دن جمی کو پتا چلا کہ ٹام نے بے وجہ بابرہ کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بار پھر دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ اس تلخ کلامی کے اندر دونوں کو اپنے اپنے کچھ پرانے زخم بھی پھوٹتے نظر آئے۔ یہ وہ زمرہ زندگی میں سامنے آنے والے چھوٹے چھوٹے اختلافات تھے جو اس نئے اختلاف کی وجہ سے اب بڑے اور سنگین دکھائی دینے لگے تھے۔ جمی نے اپنی جاب اسپورٹ کار ٹام کو پہلے کئی ماہ سے چلانے کے لیے دے رکھی تھی (اور جسے وہ بیچنے کی حالت میں قطعاً بھی نہیں تھا) اس سے وہ کار مانگ لی۔ دوسری طرف ٹام نے اپنے ایک ہائی کلب کلب میں سے جمی کا ممبر یہ کہہ کر نکال دیا کہ کلب کا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہے۔ ایک تقریب میں ڈرنک کرتے ہوئے ٹام نے جمی کی ایک جرمن دوست

لڑکی سے بدتمیزی کی۔ جمی بھی نشے کی حالت میں تھا۔ اس نے ناب سے کہا۔ "بچہ کی ناک والے اپنے ہاتھوں کو اس لڑکی سے دور رکھے۔"

دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے لیکن دوستوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ بہرحال یہ سلسلہ رکا نہیں۔ دن بدن آگے بڑھتا رہا اور اس کی بنیادی وجہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم تھی۔ اس کوشش پر پتا بھی نہیں تھا کہ اس کے ارد گرد کیا اور کیا ہے اور وہ امیر زادے فنکاریوں کا روپ دھار کر اس پر جھپٹنے کی تیاری کررہے ہیں۔

دونوں کے مشترکہ دوست حیران تھے کہ دونوں کو دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوگیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں رہے تھے بلکہ کسی وقت لڑنا تھا جیسے ان کے حوالے سے کوئی سنگین واقعہ رونما ہوجائے گا۔ دونوں کے قریبی دوست نیڈی کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یہ کہانی نیڈی ہی تھا جس نے کچھ عرصہ قبل ان دونوں کے لیے بابرہ کے کوائف اکٹھے کیے تھے اور پھر ایک دن یہ ساری تفاصیل اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ ناب نشے کا عادی تھا اور جمی کے آفس میں داخل ہوا اور اس سے کہا کہ وہ اکیلے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ جمی نے اپنے دو ملازموں کو آفس سے نکال دیا۔ ناب نے جمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "فیصلہ کرلو۔"

"کیا فیصلہ؟"

"راستے سے ہٹ جاؤ..... یا مجھے بتادو۔"

جمی چند لمحے تک اسے گھورنے والے انداز میں دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "کرنا چاہتے ہو؟"

"تو سیدھی طرح اگر کوئی طریقہ ہے تو مجھے بتادو۔" ناب نے جوابی سوال کیا۔ اس کی آواز میں شدید رقصاں تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں جیسے پھڑک رہی تھیں۔

اس روز اس کمرے میں ان دونوں کے درمیان کچھ طے ہوگیا۔ یہ بہت اونچا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، بہت سنجیدگی سے کیا اور سنا گیا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں ایک طریقہ "اوکل" لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایسی طریقہ کار تھا جو دو افراد اپنے ناقابل حل مسئلے کے حل کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں، جو جیت جاتا ہے، وہ منزل مراد پا لیتا ہے، جو ہار جاتا ہے وہ موت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ اس دن جمی اور ناب کے درمیان سب کچھ فائنل ہوگیا اور وہ طریقہ بھی طے ہوگیا جس پر عمل کرکے انہوں نے بابرہ سے رابطہ کرنا تھا اور اسے مقابلے کی جگہ پر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

وہ ایک ساتھ ہی اس سے ملے تھے اور اسے اپنے ساتھ ایک گاڑی اسٹار ہوٹل میں شفٹ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ تینوں جب گاڑی میں ہوٹل کی طرف جارہے تھے، جمیل نے پروگرام کے مطابق اچانک ہی بابرہ کے چہرے کے سامنے بے ہوشی والا اسپرے کردیا تھا۔ وہ بھک کر لڑھک پر گری اور چند سیکنڈ میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

اور اب وہ تینوں ہوا سے قریباً سو کلومیٹر دور اس چھوٹے سے گمنام تجربہ گاہ پر موجود تھے۔ یہ بالکل ... بڑا تجربہ گاہ تھا۔ یہاں دور دور تک خشک ٹھنڈے کی چھوٹی بڑی چٹانوں کے کھنڈروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید ہی کبھی دو چار ماہ بعد کوئی مہم جو اس طرف آتا ہو۔ بہرحال جمی اور ناب یہاں کسی دوست نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے اور رہنے سہنے کا وافر سامان لے کر آئے تھے جس میں ایک لگژری کیمپر بھی شامل تھا۔ اپنی موٹر بوٹ انہوں نے ساحل کے کچھ درختوں میں چھپا دی تھی۔ جسمانی طاقت کی اس جنگ میں دونوں میں سے جس نے بھی جیتا تھا، اس نے یہاں بابرہ کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منانا تھا۔ یہاں اتنا سامان موجود تھا کہ وہ کم از کم دو ماہ تک یہاں وافر جیتی رہ سکتا تھا۔ اب یہ دو جیتی کون رہے گا، اس کا فیصلہ اس قرعہ اندازی کے بعد ہونا تھا۔ بابرہ نے اس سارے سامنے میں خود کو بالکل بے دخل ظاہر کردیا تھا۔ وہ یہ خونی قرعہ اندازی نہیں جاننا چاہتی تھی لیکن یہاں تک بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہورہا تھا۔ ایک طویل بحث کے بعد اس نے اس بات پر آمادگی ظاہر کردی تھی کہ ان دونوں میں سے جو بھی جیت کر آئے گا، وہ یہاں اس کے ساتھ رہنا قبول کرلے گی۔

اب ہم ایک بار پھر کیمپ کے سامنے کے منظر کی طرف آتے ہیں۔ جمی نے ناب کی تولیا گردن اپنے بازو میں جکڑ رکھی تھی، ناب اس کے نیچے رکوع کے عمل میں جھکا ہوا تھا تاہم اس طرح جھکے ہونے کے باوجود جمی اس کی کمر کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا شکنجہ کسے ہوا تھا۔ اگر جمی اس کی گردن پر دباؤ بڑھا کر اسے بے بس کرنے کی کوشش کرتا تو وہ نیچے سے اس کی کمر کو اس بری طرح جکڑ دیتا کہ وہ گردن پر گرفت نرم کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ دونوں پسینے میں نہائے تھے اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ بابرہ بیچ میں سے بے قابو ہوکر نکل چکی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔ اس وقت کیمپ میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جسے وہ کسی بھی طرح کسی پر حملہ کرنے کے لیے یا پھر اپنا دفاع کرنے کے لیے استعمال کرسکتی۔ وہ دونوں جو ساز و سامان بھی اپنے ساتھ لائے تھے، اس وقت

سوراخ میں پڑا تھا جو یہاں سے کافی فاصلے پر تھی۔ سوراخ پر فرار ہونے کا امکان بھی بعید از قیاس تھا۔ وہ سوراخ کی الف سب سے آپ واقف تھی۔ درحقیقت وہ یہاں عمل طور پر ان دونوں کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ دونوں میں سے کسی کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ دونوں جو کچھ کر رہے تھے، برا کر رہے تھے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ یہ عمل جلد از جلد ختم ہو جائے۔

اچانک باپ کا داؤ چل گیا۔ اس نے یکا یک بچی کی کمر پر اتنا شدید وار کیا کہ اس کی گردن پر بچی کی گرفت ڈھیلی ہونے کے برابر رہ گئی۔ باپ نے زور مارا اور کسی بھیڑیے کی طرح بچی کو نکالتا ہوا پیچھے سے گرایا۔ بچی زمین پر گر گئی۔ بامشکل خود کو پیچھے سے اٹھائی ہوئی باہر نکلی اور دور جا کھڑی ہوئی۔ اب بھی باپ کے بیچ تھا اور وہ اپنے گھٹنوں سے اس کے سینے کا بھرتا بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بھی نے تیزی سے پیچھے ہٹا اور باپ کی گرفت سے نکل گیا۔ دونوں ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہرے خون سے لتھڑ گئے تھے۔ بچی کی ناک پر زیادہ چوٹ آئی تھی، دو بم کی ضرب کی وجہ سے باپ کی ناک بھی سوجنا شروع ہو گئی تھی اور معمول سے زیادہ سرخی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا چہرہ قدرے چوڑا تھا اور اس کے نتھنوں کی سختی کو نمایاں کرتا تھا۔ یہ چہرہ ابھی تھوڑی کے پاس سے زخمی ہو گیا تھا۔

دونوں نے ایک بار پھر اپنے بازو پھیلائے اور ایک دوسرے کے گرد ہم دائرے کی شکل میں گھومنے لگے۔ دونوں ہوا کے گلی کوچوں سے جانے پہچانے داؤ تھے۔ کوئی بھی بار ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ ان دونوں نے تقریباً پانچ منٹ مزید قائم کی جس نے انہیں کچھ مزید زخمی اور نڈھال کیا۔ یہاں تو کوئی ریفری بھی نہیں تھا جو اس لڑائی میں وقفہ دینا یا اسے ختم ہونے کا اعلان کرتا۔

انہوں نے اپنی حد آپ کے قریب ہی ایک دوسرے کو پکڑ لیا اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوئی زمین پر گر کر اپنے پنجے گاڑنے لگے۔ بالکل جیسے دو چوپائے اپنی مادہ کے لیے جنگ کرتے کرتے بالکل نڈھال ہو جائیں اور ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو کر ہانپنے لگیں۔

بچی کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ خالی ہاتھوں سے ہی باپ کا پیٹ پھاڑ ڈالتی اور اس کی انتڑیاں نکال کر باہر پھینک دیتی۔ لڑائی کے اصولوں کے مطابق دونوں کوئی ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہتھیار ان دونوں کے پاس موجود نہیں تھے۔ وہ اپنے سامان میں بھی کسی طرح کا ہتھیار لے کر نہیں آئے

سنہری باتیں

☆ گناہ سے ہر وقت بچو، مگر تنہائی میں گناہ سے خاص طور پر بچو کیونکہ اس گناہ کا گواہ صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔

☆ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت آزماؤ جسے تمہیں بولنا سکھایا۔

☆ لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر بولنے سے پہلے۔ بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو، دنیا تم میں نہ ہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے تیرتی رہتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آجاتا ہے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔

☆ اگر کوئی محبت کرنے والا انسان آپ پر غصہ کرے، چلائے تو سمجھ لو کہ آپ اس کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

☆ اگر لوگ تم سے متاثر ہوتے ہیں تو فکر نہ کرو، شکر ادا کرو اپنے رب کا جس نے تمہارے عیب چھپا کر تمہیں لوگوں میں معزز بنا رکھا ہے۔

☆ ہم بھی کتنے نادان ہوتے ہیں کہ ہم کسی سے ناراضگی کی نسبت زیادہ وقت کسی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے لوگوں سے کیوں بیزار کرنے لگتے ہیں، ہم ان کی موجودگی میں خوش اور ان کی غیر حاضری میں اداس کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاید کچھ سوچنے والے صاحب قلب نہیں ہوتے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، ڈھوک بھٹہ، بھلم

آپ کا نام کیا رکھیں؟

باتوں رکھوں تو بکھر جاؤ گے، دل کہوں تو ٹوٹ جاؤ گے، جان کہوں تو نکل جاؤ گے، یار تمہارا ہم اور کیا نام رکھیں، جاؤ گے تو کہنے والے خود ہی دل والے آؤ گے۔

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورگی ناڑان کرک

تھے۔ یہ غزالی انہوں نے UFO کے تخیل کی طرح خیال ہی خیال میں گھڑ لی تھی۔ آخر میں دونوں میں سے کسی ایک کو مکمل ناک آؤٹ ہو جانا تھا یا پھر کسی ظالم اک داؤں کھیلنے کے بعد اس بات کا اشارہ دیتا تھا کہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے ہتھیار ڈال کرنا چاہتا ہے۔ یہ اشارہ ہاتھ وغیرہ ہلا کر یا پھر بول کر دیا جا سکتا تھا۔ ہارنے والے کو خاموشی کے ساتھ یہ جگہ چھوڑ جانا تھی اور پھر پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھنا تھا۔ جیتنے والے کو یہاں بابرہ کے ساتھ بقیہ وقت آرام سے ہنسی خوشی گزارنا تھے۔

سوچتے سوچتے ہی نے گرے ہوئے تکیے کی طرف دیکھا۔ وہاں بابرہ دوزانو بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے چہرے کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بول رہی تھی۔ ہی نے سوچا وہ کیا دعا مانگ رہی ہوگی۔ شاید یہ مانگ رہی ہوگی کہ لڑتے لڑتے وہ دونوں ہی مر جائیں یا ہم جان ہو جائیں اور وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے یا شاید وہ اس لڑائی میں خود اس کے جیتنے کی دعا مانگ رہی ہو۔ بہرحال وہ اور ناب ہر لحاظ سے بالکل ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی وہ ہم پلہ ہی تھے۔ بہرحال ہی کے تخیل تھوڑے سے چکرا گئے تھے۔ ناب کے تخیل قد سے ہوئے اور سخت تھے اور ان میں مرد انگی کی جھلک نسبتاً زیادہ تھی۔ ممکن تھا کہ اس حوالے سے بابرہ اسے ناب پر تھوڑی سی ترجیح دیتی اور ناب کے بجائے اس کے ساتھ رہنا پسند کرتی۔

دوسری طرف ناب بھی دیکھ رہا تھا کہ بابرہ نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور وہ کسی انداز میں بڑبڑا رہی ہے۔ وہ کیا دعا مانگ رہی تھی؟ شاید یہ کہ ان دونوں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں اور وہ اس خون خرابے سے رک جائیں یا شاید وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے کامیابی کی دعا مانگ رہی تھی۔ گاڑی میں جب انہوں نے بابرہ کو بے ہوش کیا تھا تو باہر سے کانپ بھی سنے تھے کہ بابرہ کے منہ پر ہاتھ تھا۔ یعنی بات تھی کہ بابرہ کو یہ دعا یاد ہوگا۔ یہ واقعہ اس کے لیے ناب کے انتخاب کا تھوڑا سا جواز پیدا کر سکتا تھا۔ بہرحال وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بابرہ دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی یہاں رہنے کے لیے تیار ہے۔

چند منٹ بعد ہی اپنی جگہ سے اٹھا تو ناب نے بھی اور اٹھ جانا مناسب سمجھا۔ اگر وہ بیٹھا رہتا تو ہی کو بھی تاثر ملتا کہ وہ ابھی تھکا ہوا ہے۔ ہی نے کھڑے ہونے کے بعد بڑی نفرت سے زمین پر تھوکا اور پھر اپنی دائیں ہتھیلی کو آسمان کی طرف اٹھا کر انگلیوں سے اشارے سے ناب کو اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔ یہ تاثر دلانے والا انداز تھا اور دوبدو مقابلے کی دعوت تھی۔

ناب بھی اب گھسے تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہی کی طرف آیا۔ ناب کو معلوم تھا کہ اسے ہی کو کہاں ضرب لگانی چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک پرانی تربیتی میں ہی کے دائیں گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی اور اب بھی اس ٹانگ کا بھرپور استعمال نہیں کر پا رہا۔ اگر وہ اس کے گھٹنے کو مزید نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا تو لڑائی کا نتیجہ اس کے حق میں نکل سکتا تھا۔ دوسری طرف ہی بھی چاہتا تھا کہ اس نے ہر صورت ناب کے دائیں گھٹنے سے بچنا ہے۔ یوں تو دونوں ہی شکل آؤٹ کی شدید ضرب رکھتے تھے، بہرحال ناب کو خاص طور سے پاکستان سے واپسی تھی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے خوفناک گھونسے سے بابرہ کے کئی فلموں کو خاک چٹوا دی تھی..... ایک بار پھر دونوں میں زور آزمائی شروع ہو گئی۔

دو تین منٹ بعد ہی ہی نے اچانک اڑنا لگا کر ناب کو چشمے کے قریب پر گرا لیا اور اس کو دبوچ لیا۔ ناب کے چہرے پر بے تحاشا گھونسے برساتے ہوئے وہ بولا۔ "یا مرد! ایک لاکھ لوگوں میں تمہیں بلاتا ہوں۔ مجھے بس یہی نظر آ رہی ہے۔ یہی نظر آ رہی۔"

ناب نے اس زہریلی بات کا جواب عمل طور پر دیا۔ اس نے اچانک ہی خود کو چھڑا لیا اور پھر زور لگا کر خود کو ہی کے نیچے سے نکال لیا۔ ایک چھلانگ کے ساتھ اس نے ہی کی ناف میں ٹانگ ماری اور پھر اسے وہ موقع بھی مل گیا جسے وہ دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ ناف پر ضرب کھا کر ہی بھی آگے جھکا اور اپنے چہرے کا دفاع کھول گیا۔ ناب کا نہایت خطرناک دایاں گھونسا اس کے منہ پر پڑا اور اس کی آنکھوں میں رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ وہ سہارے کے لیے ہاتھ بائیں چلاتا ہوا گرم ریت پر گرا۔ اس کے کانوں میں ٹوٹتی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ تکلیل تکلیل ناب جب کرنے والے انداز میں اس کی طرف آیا اور ایک اور گھونسا اس کے چہرے پر مارا۔ اس گھونسے نے ہی کی رہی سہی مدافعت بھی ختم کر دی۔ وہ بے ہوش ہو گیا لیکن ناب نے یکے پر بس نہیں کیا۔ وہ مسلسل اس کے منہ پر اپنے گھونسوں کے تھوڑے برساتا رہا..... اور اپنی پوری تسلی کی کہ اب وہ کسی طرح پر مزاحمت کے قابل نہیں ہے۔

ہی کا چہرہ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا۔ بے شک اس نے زبردست مقابلہ کیا تھا لیکن بالآخر ہی تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے ہی جیتنا تھا اور یہ جیت

کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تھے۔ وہ اب بھر لبی تھیں اور چیز میں نظر آرہی تھی۔ وہ بھی پر تلی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی اور ناک پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ بھی کے ہوش کافی سوج چکے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بھی کوئی نیلی نظر آرہی تھی۔ وہ خاموش لیٹا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟ مجھے کیوں باندھا ہے تم نے؟ آپ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟" ناب چلایا۔

بابرہ اور بھی نے اس کی طرف متوجہ نہیں دیا۔ بھی کی پیشانی پر پٹی باندھنے کے بعد بابرہ نے اسے تھوڑا سا پانی پلایا اور پھر اس کی پنڈلیوں سے اٹھا کر پیچھے تک گھسیٹ دیا۔

ناب نے اپنی بندھوں سے ہوا زبانی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو سکی۔ اسے بڑی مہارت اور مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔

بھی سے فارغ ہونے کے بعد بابرہ ناب کی طرف آئی اور اس کے قریب ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ناب نے دیکھا بابرہ کے ہاتھ میں وہی چھوٹی سی چھڑی تھی جو بچے کی ٹھکائی وغیرہ کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یقیناً بابرہ نے اسی چھڑی کی مدد سے ناب کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی تھی۔ ایسا کیوں کیا اس نے...؟ یہ سوال ایک پرہول گونج کی طرح اس کی سماعت میں بجا رہا تھا۔ پھر یہ سوال اس کی زبان پر بھی آگیا۔ اس نے بابرہ سے پوچھا۔

"تم نے تو کہا تھا۔ تم نے کہا تھا تم میری جیت چاہتی تھیں، تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی۔"

وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔ "میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے تمہاری جیت کی ہی دعا مانگی تھی۔"

"تو پھر بھی آزاد کیوں ہے اور اس کی جگہ میں یہاں کیوں بندھا ہوا ہوں؟"

"اس لیے کہ تم جیت گئے ہو۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا۔"

"کیا نہیں سمجھے؟"

ناب نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ "جب کسی عورت کے لیے دو مردوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے تو جیتنے والا ہی عورت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ پہلے سے ایسا ہوتا آیا ہے۔"

"پہلے سے ایسا ہوتا آیا ہوگا لیکن اب وقت بدل چکا ہے... اور وقت کے ساتھ ساتھ عورت بھی بدل چکی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے مسٹر ناب۔" بابرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

ناب نے ایک بار پھر ہاتھوں سے آزاد ہونے کے لیے زور لگایا اور ناکام ہونے کے بعد چیخا۔ "تم پاگل ہو گئی ہو بابرہ۔ صاف صاف بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں اکیسویں صدی کی عورت ہوں۔ میں اس "سوچ" کو یکسر مسترد کرنے والے کو اپنا آپ نہیں سونپوں گی... اور یہ فیصلہ میں نے تم دونوں کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میں گائے بکری نہیں ہوں۔ میں خود کو جیتنے کا حق کیوں بانٹوں؟ کیوں نہ میں بھی کسی کو لڑاؤں اور میں اس لڑائی میں جیتنے والے کو تو جیتنے نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نے تو پہلے ہی فائر کر کے میرے پاس آنا تھا۔ میں ہارنے والے کو جیت سکتی تھی اور ہارنے والا بھی تھا۔ وہ تمہارے سامنے بے بس پڑا ہوا تھا اور میں نے دعا کیا مانگی تھی؟ میں نے تو تمہارے حق میں دعا مانگی تھی۔ اب جو کچھ ہوگا اس میں کم از کم میرا بھی ایک کردار ہوگا۔ میری بھی مرضی شامل ہوگی۔"

ناب کی آنکھوں میں حیرت کا دریا پھیلنے لگا... وہ کچھ دیر گہری سوچ میں رہنے کے بعد دھیرے سے بولا۔ "تو... اس کا مطلب ہے، تم نے میرے لیے جیت کی دعا اس لیے کی..... کیونکہ تم ... بھی کے ساتھ ہمدردی نہیں؟"

"نہیں، یہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں تھا۔ میں نے اب تک صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اب بھی صاف گوئی سے کام لوں گی۔ میرے لیے تم دونوں ایک جیسے ہی تھے۔ تب کسی کے ساتھ بھی رو رعایت نہیں تھی۔ اس لیے بھی تم سے تھوڑا سا کم کراہیت نظر آیا، اس لیے میں نے تمہاری جیت کے حق میں دعا مانگی۔"

ناب ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اکیسویں صدی کی یہ قابل فہم عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہارنے والے کو ذبح بنایا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت بھی اور بابرہ بری سے رخصت ہو رہے تھے۔ زیادہ خون بہہ جانے سے بھی بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ بابرہ نے اسے رائفل کی نال کی طرف سے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ سامنے سڑک کی طرف بڑھے تو بابرہ نے چند لمحے رک کر ناب کی طرف دیکھا۔ وہ بندھے ہوئے قدم قدم چل کر واپس ناب کی طرف آئی اور سرگوشی میں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹوں میں تم اپنی رسیاں کھولنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ قریبا دو میل کا راستہ ہے تمہارے پاس۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں کوئی نہ کوئی سواری اس طرف آنکلے اور تمہیں یہاں سے نکال لے۔ ہم دونوں کے پاس سے جا رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ تم ہمیں ڈھونڈنے میں وقت برباد نہیں کرو گے... خدا حافظ۔"

مجھے پتا چلا تھا کہ پروفیسر اشفاق عثمانی صاحب کچھ ڈائریاں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیکڑوں لوگوں کی ڈائریوں میں سے یہ بیس ڈائریاں انہوں نے منتخب کی تھیں۔ یہ ذاتی ڈائریاں تھیں لیکن لکھنے والوں کی رضامندی سے شائع ہو رہی تھیں۔ ممکن ہے کہ ان کے مندرجات میں سے کچھ حصے حذف بھی کیے جا رہے ہوں۔ یہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگی کا احوال تھا۔ ان کے شب و روز کی کہانی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ڈائریوں میں زندگی کے سارے رنگ تھے۔ بچوں کی معصومیت اور شوخی، بڑوں کی محبت اور نفرت، جوان دلوں کی دھڑکنیں، ملنا بچھڑنا اور بچھڑ کر ملنا، دشمنیاں، بھائی چارے، زن، زر، زمین کے مسائل اور ان کے حل۔ غرض سب کچھ ان ڈائریوں میں موجود تھا۔ میری اطلاع کے مطابق پروفیسر اشفاق نے ان میں سے دو ڈائریاں "بہترین" کے طور پر منتخب کی تھیں۔ ایک سب سے



دو ڈائریاں

طاہر جاوید مغل

انسان اس دنیا میں ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی بار موت کی آغوش میں جاتا ہے لیکن... وہ کیسا بدنصیب تھا جو روز جیتا اور روز مرتا تھا... عجب امتحان تھا... ایک شخص کے دن رات دو انداز میں کیسے گزر سکتے ہیں مگر وہ گزار رہا تھا۔ اسے ڈائری لکھنے کا شوق تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی ان بے جان صفحات میں زندگی بھی دوڑ جائے گی... پوری دلکشی اور توانائی سے بھرپور ایک مکمل زندگی، جیسے وہ کسی کا خواب ہو یا... جیسے ماں کی کوئی خاص دعا ہو۔

ایک ماں اور بچے کے شعور اور لاشعور کی دل گرفتہ منظر کشی

سب سے اچھا اور خوش کن ڈائری۔ دوسری سب سے اداس۔ چوتھی ڈائری۔

پروفیسر اشفاق کافی سے میری پرانی واقفیت تھی۔ وہ کئی دن پہلے ان ڈائریوں کے حوالے سے علی ثمینہ پر جاری تحقیق بات چیت کرنے آئے تھے۔ آج میں پروفیسر اشفاق کی مختلف ڈائریوں کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر پہنچا تھا۔

چائے کے گھونٹ پیتے ہوئے انہوں نے میرا استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ آٹھ سال پہلے ان کی بیوی کی وفات ہوئی تھی اور وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ دیکھنے میں بھی وہ پروفیسری نظر آتے تھے۔ چہرہ بڑا، سفید لیکن گھنے بال، چھوٹی سی داڑھی اور عینک۔ جب ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے ایک مرد اور عورت ڈرائنگ روم میں سے نکلے۔ وہ پروفیسر صاحب کے کوئی ملنے والے تھے۔ دونوں ادھیڑ عمر میاں بیوی تھے۔ انہوں نے اشفاق صاحب سے جانے کی اجازت چاہی۔ اشفاق صاحب نے اصرار کیا کہ وہ کھانا کھا کر جائیں لیکن انہوں نے کہا کہ اب آپ کے مہمان آ گئے ہیں، اس لیے اجازت دیجیے پھر ملاقات ہوگی۔ مرد جاتے جاتے اشفاق کا ہاتھ اور خوش باش لگتا تھا۔ میری نظر صرف ایک دو لمحے کے لیے عورت کے چہرے پر پڑی اور یہ چہرہ، جیسے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ یہ ایک درمیانی عمر کی عورت کا عام سا چہرہ تھا۔ اسے قابل صورت کہا جا سکتا تھا۔ وہ بچے خاندان کی طرح پروفیسر اشفاق سے مسکرا کر باتیں کر رہی تھی اور جانے کی اجازت چاہ رہی تھی لیکن جس چیز کی وجہ سے میں چونکا وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ آنکھیں اس کے بے تاثر مسکراتے چہرے سے بالکل جدا نظر آتی تھیں۔ ایک دم متضاد، جیسے وہ اس چہرے کی نہیں کسی اور چہرے کی آنکھیں ہوں۔ ان آنکھوں کے اندر غم اور یاس کی کیفیت ایک بہت بڑی جھیل کی طرح ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک بے حد گہری لیکن خاموش جھیل۔ اس کے جانے کے بعد میں کئی دیر تک اس کی آنکھوں کے کرب کو محسوس کرتا رہا۔

"یہ کون لوگ تھے؟" میں نے پروفیسر اشفاق سے پوچھا۔

"بس ان ڈائریوں کے کرداروں میں سے دو کردار تھے۔ ایک ڈائری میں سے کچھ حصے نکال کر بنانا چاہتے تھے۔" اشفاق صاحب نے مختصر جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا، اشفاق صاحب کا فون آ گیا، وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں ایک طرف الماری میں رکھی ان ڈائریوں کو دیکھنے لگا جو مختلف حجم کی تھیں۔ کچھ بڑی تھیں، کچھ چھوٹی۔ کچھ بالکل نئی تھیں، کچھ پرانی۔ کچھ کی جلدیں بہت خوبصورت تھیں۔ کچھ کی حالت بہت خستہ تھی۔ اشفاق صاحب نے ڈائریوں کے اندر کہیں کہیں کاغذ کی پرچیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں صرف ڈائریوں کے علاوہ بھی درجنوں ڈائریاں ایک دوسری الماری میں موجود تھیں۔

اشفاق صاحب مجھے وہ ڈائریاں دکھانا چاہتے تھے جو ان کے انتخاب کے مطابق سب سے خوش کن اور سب سے دردناک ڈائریاں کہلائی جا سکتی تھیں۔ یہ فروری کی ایک سرد سہ پہر شام تھی۔ کھڑکیوں سے باہر شفق کے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا، "کہو ظاہر! پہلے کون سی ڈائری دیکھنا چاہو گے۔ پہلی، یا پھر آخری؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"چلو، میں تمہیں بتا تو نہیں رہا ہوں کہ یہ پہلی اینڈ والی ہے یا آخری اینڈ والی۔ تم دیکھو اور خود ہی اندازہ لگاؤ۔ تمہاری تجسس کی پرکھ درست ہے گی، ان میں سے ایک ڈائری کسی ہے دوسری نسبتاً مختصر۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

انہوں نے بائیں جانب والی ایک موٹی ڈائری اٹھائی۔ اسے آہستہ سے کھولا۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا [illegible] کالج، [illegible] ہاؤس، گریسٹ ہاؤس، چکوال، ملتان روڈ، لاہور۔

اشفاق صاحب نے پہلے آٹھ دس صفحے الٹ پلٹ دیے۔ پھر ایک صفحے پر رک گئے۔ اس صفحے پر 18 مارچ 2007ء کی تاریخ درج تھی۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

"آج اچھا دن گزرا۔ کبھی کبھی اسکول کی کتابیں دیکھ لیتا ہوں۔ آج بھی دوپہر کو میں کلاس کی کتاب پڑھتا رہا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ مجھے فی الحال اپنی ساری توجہ قرآن پاک کے حفظ کی طرف رکھنی چاہیے۔ حفظ کے بعد دوبارہ اسکول کی پڑھائی شروع کروں گے۔ آج مدرسے میں چھٹی تھی۔ دوپہر کو میں نے تھوڑی دیر بیٹ بال کی پریکٹس کی۔ پھر حفظ کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ کھیل کے بعد کرکٹ کھیلنا مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ آج محلے کے لڑکوں کے ساتھ جانا ہوا تھا۔ میں نے بیٹنگ بھی کی۔ آؤٹ ہونے کے بعد کافی دیر تک میں بولنگ کرتا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج کل جسم میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ امی کہتی

تھی، میں اپنی توجہ اس کی طرف موڑ دیتی۔ وہ مجھے زبردستی دودھ اور کیلا کھلانے کی کوشش بھی کرتی رہتی تھی۔"

پروفیسر اشفاق نے چند صفحے پلٹے پھر 8 مئی 2007ء کی تاریخ کی ڈائری پڑھنی شروع کی۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"گرمیوں شروع ہو گئی ہیں۔ باہر کی تھکن کو تو بہت کم ہو گئی ہے۔ ہاں کپڑے گیلے وغیرہ تھکن لیتے ہیں یا پھر کبھی کوئی کارٹون فلم دیکھ لیتے ہیں۔ ظلم مجھ سے چھوٹا ہے لیکن گیم کھیلنے میں کبھی کبھی مجھے ہرا بھی دیتا ہے۔ چھوٹی امن خاموشی سے انہیں کھیلتے دیکھتی رہتی ہے۔ فیڈر ہر وقت اس کے منہ میں رہتا ہے۔ کل ابو کہہ رہے تھے کہ چھٹیوں میں سردی کا پروگرام بنائیں گے۔ آٹھ دس روز رہیں گے۔ ابو کو پہاڑوں سے بہت محبت ہے۔ وہ ہائیکنگ کرتے ہیں اور دوستوں کے ساتھ ہر سفر پر نکل جاتے ہیں۔ مجھے بھی گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن میں بھی ابو کی طرح کے ٹور اور ہائیکنگ پر بہت کے ہاسٹلوں پر جاؤں۔ مجھے باہر کی دنیا دیکھنے کا بھی بڑا شوق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میرے پاس ایک ہوائی جہاز ہو جس میں ہم سب گھر والے دنیا میں اور پھر دنیا میں چکر لگا کریں۔ جہاں جی چاہا اتر گئے، جب جی چاہا چل پڑے۔ پچھلے دنوں مجھے بخار ہو گیا تھا۔ کئی دن دوا کھانا پڑی ہے۔ دراصل چند سال پہلے میرا ایکسیڈنٹ (حادثہ) آپریشن ہوا تھا۔ جب سے کبھی کبھی انفیکشن ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب ٹھیک ہوں۔ اور دل ہی دل میں سردی کا گھر اسم بنا رہا ہوں۔ آپی اور گھر کی بہت خوش ہیں۔ آپی بھی کبھی مجھ سے ناراض ہو جاتی ہیں لیکن وہ دل کی بہت زیادہ اچھی ہیں..... نکل گئی ہے۔ آپی انہیں بلا رہا ہے اور میں ڈائری لکھ رہا ہوں۔"

تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد کی تاریخ میں انہوں نے لکھا تھا۔

"آج کل سردی میں ہیں۔ بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ ریمن کی شرارتیں سارا دن ہمیں ہنساتی رہتی ہیں۔ بہت تیز ہو گئی ہے۔ ہر وقت میری گود میں چڑھی رہتی ہے۔ مجھے بھی اس سے بہت پیار ہے۔ کل میں نے بال روڈ سے کرکٹ کا بیٹ اور گیند خریدا ہے، لیکن یہاں سردی میں کھیلنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ ابو کہتے ہیں کہ مجھے تفریح کے ساتھ ساتھ ہفتہ جاپانیوں کی دیکھ بھال بھی کرتے رہنا چاہیے۔ ان کی شدید خواہش ہے کہ میں جلد از جلد قرآن پاک حفظ کر لوں۔ میں بھی دل و جان سے کوشش کر رہا ہوں کہ پیارے ابو کی خواہش پوری ہو سکے۔ پتا نہیں کیا بات ہے، تھوڑی دیر پڑھتا ہوں تو طبیعت گھبرانے لگتی ہے، ایسے لگتا ہے سر پھٹ رہا ہے۔ کل ابو سے تھوڑی سی ڈانٹ بھی پڑی ہے۔ آج دو بجے تک دو جرابیں کی ہے۔ شکر ہے آج طبیعت ٹھیک رہی ہے۔ ہاں پرسوں رات تو پھر سے بخار ہو گیا تھا لیکن دوا کے بعد ہی آرام آ گیا۔ پتا نہیں کبھی کبھی یہ بخار کیوں ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے کئی اچھی چیزیں کھانے نہیں دی جاتیں جو میں شوق سے کھاتا ہوتا ہوں۔ مثلاً ان کو چھوڑ دو بڑے آلو ہے۔ آئس کریم وغیرہ وغیرہ۔ تھرابو اس کی کسر دوسری طرح پوری کر دیتے ہیں۔ جو چیزیں میں کھا سکتا ہوں وہ میرے لیے چپکے سے علیحدہ لے آتے ہیں۔ ابو امی کو میری صحت کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے۔"

بیس پچیس دن بعد انہوں نے اس طرح ڈائری لکھی تھی۔"..... نجانے زکام کی دوا میں کیا کھا کر میرا برا حال ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو میں امی سے روٹی کھانے کے لیے جھگڑ پڑتا ہوں۔ بعد میں افسوس بھی ہوتا ہے کہ اتنی پیاری امی کو ہراساں کیا۔ سردی سے بچنے اور کینڈے کرنے آئے تھے وہ اسی طرح چل رہے ہیں۔ آج کل کھیلنے کو بھی بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ کچھ پڑھائی کرتا ہوں تو کبھی سر میں درد ہونے لگتا ہے اور آنکھوں میں بھی۔ ابو کہہ رہے تھے کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ابو کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں، ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔ بہت تھکے ہوئے گھر آتے ہیں۔ روز کہتے ہیں کہ آج ڈاکٹر کے پاس جائیں گے آج جائیں گے۔ مدرسے میں بھی آج کل بالکل دل نہیں لگ رہا۔ بڑے حافظ جی نے ابو سے شکایت کی ہے کہ میں پڑھنے کی طرف زیادہ دھیان نہیں دے رہا۔ جتنی دیر میں اس نے پڑھے ہوئے پارے سے حفظ کیے ہیں، اسے بیسویں یا تیسویں پارے پر ہونا چاہیے تھا۔ آج بھی مدرسے جانے کو میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ امی مجھے دیکھ کر مجھ سے سر کھپا رہی ہیں۔ اب باورچی خانے میں میرے لیے پراٹھوں والا حلوا تیار کر رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے دماغی طاقت کی ضرورت ہے۔ دماغی طاقت تو تب آئے گی جب میں حلوا کھاؤں گا۔ مجھے پتا ہے پہلے کی طرح یہ حلوا بھی آپی اور ظلم کے کام آئے گا۔"

دو ہفتے بعد کی تاریخ میں درج تھا۔"..... آج کا دن بہت برا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ابو نے مجھے مارا۔ میں مدرسے جانے سے انکار کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے پیار سے سمجھاتے رہے لیکن جب میں نہیں مانا تو انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے مجھے تھپڑ مارے۔ میں رونا ہوا اوپر کمرے میں چلا گیا اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ آپی، امی وغیرہ

مجھے اندازہ لگانے کے لیے کہتی رہیں لیکن میں نے نہیں کہا۔ پھر ابو بھی آ گئے۔ وہ سب سے پریشان تھے کہ میں دروازہ نہیں کھول رہا ہوں۔ آخر کافی دیر بعد میں نے دروازہ کھولا۔ امی مجھے اپنے ساتھ لگا کر رونے لگیں۔ انہوں نے ابو سے کہا۔ "یہ پہلے ایسا کب تھا۔ اب بیمار ہے اس لیے ضد کر رہا ہے۔"

ابو نے کہا۔ "اور کچھ نہیں ہے۔ بس عادت زیادہ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ ابھی اسے کہہ کر چھت پر پتنگ اڑانے بھیجو، آ جائے گا۔"

"بہرحال رات تک ابو کا غصہ اتر چکا تھا۔ دفتر سے آئے تو بہت دیر تک مجھے بہلاتے رہے۔ میرا سر گود میں لے کر دباتے رہے۔ پھر میرے پاؤں دبانے لگے۔ میں پھر رونے لگا۔ آج تک سے دل سے سوچ رہا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے میرے بھلے کے لیے ہی کہتے تھے۔ وہ میرے اسکول کی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے سے پہلے مجھے حافظ قرآن دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی بہت بڑی خواہش تھی اور... میں یہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے ابو امی کو بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے سوچا ہے چند دن آرام کے بعد پھر مدرسے جانا شروع کر دوں گا اور جان مار کر پڑھوں گا۔ کل رات ابو مجھے بڑے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی لے کر گئے تھے۔ میرے ایک دو ٹیسٹوں کی رپورٹیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیں دی ہیں۔ آہ... پھر وہی کڑوی، بدمزہ دوائیں، دل ان سے بھاگتا رہتا ہے۔ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ بھئی کو سارے بچے اور ان کے بچے پتنگ پر لگے تھے۔ سارے کزن کھا پی رہے تھے اور کھیل کود بھی رہے تھے لیکن میں ایک طرف بیٹھا رہا۔ ان کے بار بار کہنے کے باوجود کھیل میں شامل نہیں ہوا۔ تایا ابو نے کہا۔ "انیس بیٹا تم تو کرکٹ کے دیوانے تھے اور پتنگ بھی بہت اچھا لیتے تھے۔ اب کیا ہو گیا؟"

امی نے کہا۔ "عمری سے بڑے شوق سے گیند بیٹ لے کر آیا تھا۔ میں کہہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کھیلو۔"

"تایا ابو مجھے سمجھانے لگے کہ اس طرح الگ تھلگ نہیں رہتے۔"

اشفاق صاحب نے اخبار کے کئی صفحے پلٹ دیے اور پھر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ تاریخ تھی 18 ستمبر 2007ء ... اس تاریخ کے نیچے انیس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ "موسم کافی بدل گیا ہے۔ ہوا میں خنکی آ گئی ہے۔ مدرسے جاتے ہوئے کافی ٹھنڈ ہوتی ہے۔ ساتھیوں کو بھاری دل کے ساتھ الوداع کہا۔ ابو نے کہا ہے کہ تبدیلی مارچ میں ہو گی۔ بہرحال میں چاہوں گا اور محنت کروں گا۔ اس کے بعد باقی قرآن پاک کے حفظ کی طرف آ جاؤں گا۔ آج کل ہوم ورک وغیرہ دوا شروع کی ہوئی ہے۔ سر کا درد کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن ہفتے دو ہفتے میں ایک بار بخار ضرور ہو جاتا ہے۔ اسکول کی کتابیں پھر سے نکل آئی ہیں۔ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابو نے ظہر کے اسکول میں داخلہ دلوایا ہے۔ وہ خود اسکول چھوڑ کر آتے تھے۔ جب سے ڈاکٹری دوا چھوڑی ہے، کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ امی نے ڈیک بیڈ پر چائنیز کھانے کا دعوت کیا ہوا ہے۔ آلو چائنیز... ایگ چکن برگر... اور ساتھ میں تھی ایکن کچھ ہوٹو آئٹم کا خرد آ جاتا ہے۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔"

12 اکتوبر 2007ء کو کل چائنیز کھانے گئے تھے۔ کھانے سے پہلے ہی طبیعت کچھ خراب تھی ٹھیک سے کھایا بھی نہیں گیا۔ کھانے کے کچھ دیر بعد الٹیاں آنا شروع ہو گئیں۔ تیز بخار بھی ہو گیا۔ رات ایک بجے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس نے انجکشن لگایا اور دوائیں۔ بخار اترا نہیں لیکن کچھ کم ہو گیا ہے۔ سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ امی ابو بہت پریشان ہیں۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا کیا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے اپنے خود مجھے اس میں نہیں آتی۔ سوچا تھا کہ اسکول پھر شروع کروں گا تو مجھے اچھا لگے گا اور طبیعت بھی شاید کچھ ٹھیک ہو جائے لیکن اب طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔ بخار تو کبھی نہیں اترتا، تاہم بخار اور ہاتھوں پھر جاتے ہوتے تھے۔ ابو کو مشورہ دے رہے تھے کہ کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ تایا کہہ رہے تھے کہ انیس کا منہ سوجا ہوا لگ رہا ہے۔ رنگ بھی پیلا ہے۔ پیٹ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ بھی کھایا نہیں جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کھانے کی چیزوں سے دور رکھتا ہوں۔ امی بھی اسے یہی کہتی ہیں کہ بھائی کے ساتھ زیادہ وقت گزارو۔ سارے کزن جارحہ، بلال، احمد علی، ریحان وغیرہ باہر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بچے کے بچے بھی ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں۔ پتا نہیں میں کب ٹھیک ہوں گا اور ان کے ساتھ کھیل سکوں گا؟"

اس سے چند دن بعد انیس نے 22 اکتوبر کی تاریخ میں لکھا تھا۔ "ابو نے ڈاکٹر عارف کے کہنے پر میرے کچھ ٹیسٹ کرائے تھے۔ پرسوں ان کی رپورٹ آئی تھی۔

گئیں۔ ابو اور امی مجھے لے کر ڈاکٹر طارق کے پاس گئے اور رپورٹس دکھائیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ چپ سے ہو گئے۔ انہوں نے کہا رپورٹس ٹھیک نہیں۔ آپ کل چیک اپ میں ڈاکٹر عطاالرحمن سے رابطہ کریں اور رپورٹس دکھائیں۔ کل ابو اور تایا جان مجھے لے کر ڈاکٹر عطا کے پاس پہنچے۔ انہوں نے رپورٹس دیکھیں۔ پھر میرا چیک اپ کیا۔ اس کے بعد مجھے تھوڑی دیر باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ کیبن میں ابو اور تایا سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد ابو اور تایا باہر آئے تو ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ دونوں بالکل گم سم تھے۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ خراب ہے۔ انہوں نے مجھے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔ بس اتنا کہا کہ ایک اور جگہ چیک کرانا ہے۔ ہم گاڑی پر روانہ ہوئے۔ جب گاڑی حکومت عالم اسپتال کی طرف مڑی تو میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ مجھے پتا تو نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کینسر کا اسپتال ہے۔ اسپتال میں ہم نے کوئی دو گھنٹے گزارے۔ دو تین ڈاکٹروں نے میری رپورٹس دیکھیں۔ پھر ایک کیبن میں ابو سے بات کی۔ میں اور تایا جان باہر بیٹھے رہے۔ مجھے تیز بخار لگ رہا تھا۔ بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ ابو باہر آئے۔ وہ اور تایا جان آپس میں سرگوشیوں میں کچھ بات کرتے رہے۔ ایک دو فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ تایا کہہ رہے تھے..... ہر تکلیف کا علاج ہے۔ اللہ شفا دینے والا ہے۔ ان دونوں کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ شوکت عالم والوں نے مجھے داخل نہیں کیا۔ شاید ان کے پاس میری تکلیف کا علاج نہیں ہے۔ یا پھر کوئی دوا، انجکشن وغیرہ مہنگی چاہیے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کل سے گھر کا ماحول بڑا پریشان کن ہے۔ امی کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔ بار بار ابو سے پوچھ رہی ہیں کہ ڈاکٹروں نے کیا بتایا ہے۔ ابو انہیں اس گول مول سا جواب دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ابو اور تایا ابو کے درمیان طے ہوا ہے کہ ابھی گھر میں کچھ نہ بتایا جائے۔ ابو کا چہرہ بالکل اترا ہوا ہے۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے انہیں زندگی میں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا..... سوچتا ہوں کہ کہیں مجھے کینسر ہی تو نہیں ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ بہت بری بیماری ہے۔ آسانی سے جان نہیں چھوڑتی۔ اگر واقعی یہ کینسر ہے تو پھر کس مجھے گا ہے۔ مجھے تو صرف بخار لگتا ہے یا سر میں درد ہوتا ہے۔ اللہ کرے یہ کوئی اور تکلیف ہو۔ اللہ کرے میرے ابو کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔ بخار کے انجکشن کے بعد اس وقت طبیعت کچھ بہتر ہے۔ میں کمرے میں ڈائری لکھ رہا ہوں۔ ساتھ والے کمرے میں امی ابو سے

سوال جواب کر رہی ہیں شاید۔"

آٹھ دس دن بعد کی تاریخ میں انہوں نے لکھا تھا۔

"میرے سامنے کوئی نہیں رہتا لیکن اپنی اور امی کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ آج کل بہت روتی ہیں۔ سارے تایا جان اور ان کی فیملی بھی بے حد افسردہ ہیں۔ کوئی مجھ سے کھل کر بات نہیں کرتا۔ آج کل میں کینسر روڈ کے اوور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل ہوں۔ بہت خرچہ ہے۔ زیادہ تر امی میرے پاس رہتی ہیں۔ کل ابو جان میرے پاس تھے۔ عشا کی نماز کے بعد وہ بہت دیر تک دعا مانگتے رہے۔ پھر انہوں نے میرا سر گود میں لیا اور بہت پیار سے سہلانے لگے۔ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے بہت ہی نرم آواز میں کہا۔ "انس! خوشی کی، صحت بیماری، سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دوا مرض بھی پیدا کرتا ہے پہلے اس کا علاج پیدا کرتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ "ابو! کیا مجھے..... کینسر ہے؟"

ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولے۔ "لیکن انس..... اب یہ کوئی لاعلاج بیماری نہیں ہے۔ اس کا مکمل علاج ہے۔ بہت جلد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس شرط یہ ہے کہ دوا کھانی ہے اور ڈاکٹروں نے جو پرہیز بتایا ہے وہ کرنا ہے۔ صرف تازہ پھل، صرف پکے ہوئے پھل اور بیکری کی کوئی چیز نہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ابو! مجھے تو برگر اور سینڈوچ بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"اس کچھ دیر کے لیے انس! پھر تم سب کچھ کھاؤ گے۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ تم کھیلو گے، اسکول بھی جاؤ گے، دوستوں کے ساتھ گھومو پھرو گے بھی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اسکول کے دوست بہت یاد آتے ہیں ابو! اور مدرسے کے بھی۔ میں چاہتا ہے کہ پھر مدرسے میں پڑھانا شروع کر دوں۔"

ابو بولے۔ "ضرور..... تم مدرسے بھی جاؤ گے۔ باقی کا قرآن پاک حفظ کرنا ہے اور ضرور کرنا ہے۔ میٹرک کا امتحان دے کر سب سے پہلے یہی کام کرنا ہے۔"

"میں بہت سوچتا رہا کہ ابو سے اپنی بیماری کے بارے میں پوچھوں۔ لاسٹ سے پوچھوں کہ اگر مجھے کینسر ہے تو کس طرح کا کینسر ہے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ یہاں کی ڈاکٹر فرینڈ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔ امی سے دوستوں کی طرح بات کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ انس مجھے اپنے بچوں کی طرح لگتا ہے۔ وہ

شاید ابو سے کوئی کمپیوٹر پروگرام بھی بنوانا چاہتی ہیں اپنے کلینک کے لیے۔"

آٹھ دن بعد کی ڈائری کچھ اس طرح تھی۔"! پتا نہیں میں آج چودہ پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ آج کا دن میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ لگ رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ دکھ لگ رہا ہے۔ ایمن میرے پاس آنے کے لیے مچل رہی تھی۔ امی نے اسے میری گود میں بٹھا دیا۔ وہ بڑے پیار سے میرے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنے لگی۔ میں چکن چاول کھا رہا تھا۔ ایمن نے میرے پلیٹ سے تھوڑے سے چاول لے کر اپنے منہ میں ڈالنا چاہے۔ پاس ہی نانا بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر ایمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹ کر بولے "کیا کرتی ہو پتا نہیں چلتا تمہیں؟"

"انہوں نے اسے چاول منہ میں نہیں ڈالنے دیے۔

"مجھے بہت دکھ ہوا۔ کیا میری بیماری اتنی بری ہے کہ کوئی میری چھوٹی چیز نہیں کھا سکتا۔ میں نے سوچا ہے اب بھی ایمن یا عظمہ کو اپنی چھوٹی چیز نہیں دوں گا۔ مجھے ان سے بہت پیار ہے، بہت زیادہ۔ میں انہیں اپنے زیادہ پاس بھی نہیں آنے دیا کروں گا۔ بس دور سے دیکھا کروں گا اور باتیں کیا کروں گا۔

"تائی جان نے ایمن کو دوسری پلیٹ میں چاول ڈال کر دے دیے۔ میں نے ابو کو نانا ابو سے کہتے سنا۔ جھوٹ کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر اور میں نے جو سے ماموں کی آواز سنی۔ وہ موبائل فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید کسی کو میری تکلیف کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کا ایک فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔ اس فقرے نے مجھے سر سے پیر تک ہلا دیا ہے۔ یہ فقرہ اس طرح تھا۔"ہاں جی۔ یہ خون میں ہے بہت تیز علاج ہو رہا ہے۔ جی..... جی ہاں..... بہت تیز دوائیاں ہیں....."

"تو کیا میرے خون میں بیماری ہے؟ خون میں کینسر ہے؟ یعنی بلڈ کینسر.... جہاں تک مجھے پتا ہے بلڈ کینسر تو بہت بری چیز ہوتی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم نانا کے گھر گئے ہوئے تھے، ہم نے ٹی وی پر ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک بندے کو بلڈ کینسر تھا۔ وہ بہت برا دکھانے والی اور رلانے والی فلم تھی۔ کیا..... واقعی میں بھی اسی بیماری کا شکار ہوں۔ کیا کچھ عرصے بعد مجھے بھی مر جانا ہے؟ میں آج شام بہت دیر تک چپ کر کے لیٹا رہا ہوں اور سوچتا رہا ہوں..... مر کر لوگ کہاں جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے..... یہ دوسری دنیا کیا ہوتی ہے؟ میرا دل امی کے بارے میں سوچ کر بہت زیادہ روتا ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا، تو امی کیا کریں گی، ابو کیا کریں گے؟ وہ تو میرے ہی ساتھ ساتھ سانس لیتے ہیں..... اور میری بھولی سی گڑیا ایمن۔ میری ایمن کیا میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔؟

مجھے یہ سوچ کر رونا آنے لگا۔ میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور چہرہ چھپا کر دیر تک روتا رہا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ امی اس وقت باورچی خانے میں تھیں۔ ان کے واپس آنے سے پہلے پہلے میں نے آنکھیں اچھی طرح صاف کر لیں۔ میں امی کو پتا نہیں چلنے دینا چاہتا کہ میں رویا ہوں۔ وہ تو پہلے ہی میرے لیے بہت پریشان تھیں۔ بالکل آدھی رہ گئی ہیں۔ مجھے پتا ہے وہ بھی روتی ہیں۔ شاید اسی طرح چھپ کر جس طرح آج میں رویا ہوں۔ ابو نے مجھے کہا ہے کہ میں بیماری سے لڑنے کے لیے بہادر بنوں۔ میں بہادر بنوں گا۔ اب کبھی نہیں روؤں گا۔ امی کی خاطر بھی نہیں روؤں گا۔"

"آج 20 دسمبر 2008ء ہے۔" آج پھر کئی دنوں بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ دوبارہ ہسپتال میں داخل ہوا تھا لیکن اب گھر آ چکا ہوں۔ آج کل گرمی پڑ رہی ہے۔ امی نے بڑے کمرے سے اے سی اتروا کر میرے کمرے میں لگا دیا ہے۔ وہ مجھ پر بے حد پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ ان دنوں پرائیویٹ ہسپتال میں میری کیموتھراپی ہو رہی ہے۔ ہر بار تقریباً پندرہ ہزار کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ہسپتال میں ہر پھر مہینے سے پھوٹے کام کے بھاری چارجز ہیں۔ اس کے علاوہ جب Germs بڑھ جاتے ہیں اور تھراپی ذرا سخت ہوتی ہے تو پیسے بھی زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹرز بھی موجود ہوتے ہیں۔ جب وہ موجود نہیں ہوتے تو چھوٹے ڈاکٹر اپنی سمجھ کے مطابق تھراپی کی دوا گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ ابو یہ بات بہت جلب کرتے ہیں۔ مگر وہ بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن وہ بڑے حساب سے چل رہے ہیں۔ پرسوں میں نے امی اور ابو کو ساتھ والے کمرے میں بات کرتے سنا۔ امی رو رہی تھیں کہہ رہی تھیں۔ جیسے بھی ہو ارمان کا علاج کروائیں گے۔ چاہے اس کے لیے گھر ہی کیوں نہ بیچنا پڑے۔ اللہ نے دے رکھا ہے کو گھر اللہ نے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب میں ہسپتال میں تھا اور ٹیسٹ کا بہت برا پڑ گیا تھا تو بہنوں اور بھائیوں نے بھی ہر طرح کا تعاون کیا۔ سب کی ایک ہی خواہش ہے، میں جلد سے جلد ٹھیک ہو جاؤں۔

کیموتھراپی کافی سخت ہوتی ہے۔ دو تین دن نڈھال پڑا رہتا ہوں۔ ابو دفتر میں ہوتے ہیں۔ کیموتھراپی کے لیے عام طور پر جنید بھائی یا ضیا بھائی لے کر جاتے ہیں۔ امی بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ جنید بڑے تایا کے اور ضیا چھوٹے تایا کے بیٹے ہیں۔ جب ہم کیموتھراپی کے لیے جاتے ہیں، ایمن کو بڑے تایا کے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ ایمن کی سالگرہ آنے والی ہے۔ میں اس دفعہ اس کے لیے کوئی بہت اچھا تحفہ خریدنا چاہتا ہوں۔ مجھے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ اس سے پیار ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز خریدنے کے لیے میں گھنٹوں بھی بازار میں پھرتا رہوں تو مجھے کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ میں تحفے کے لیے پیسے جمع کر رہا ہوں۔ پتا نہیں دل کبھی کبھی بہت اداس ہوجاتا ہے۔ ہر چیز غیر لگنے لگتی ہے۔ دل میں عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔ پھر میں اپنے ایک دوست کے کزن شیروانی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ شیروانی میری ہی عمر کا ہے اور میرے ہی جیسی بیماری کا شکار ہے۔ شیروانی کینیڈا میں پیدا ہوا تھا وہیں پلا بڑھا ہے، اس کے والدین بہت عرصے سے وہیں رہتے ہیں۔ اوٹاوا کے ایک اسپتال میں دو سال سے شیروانی کا علاج ہو رہا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے، بیماری لاعلاج نہیں ہے، میں بھی ٹھیک ہوسکتا ہوں اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔ آج کل ہم نانا کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ امی اور آپی بازار گئی ہیں۔ میں چھت پر بیٹھ کر ڈائری لکھ رہا ہوں۔ میں ڈائری کو بہت چھپا کر رکھتا ہوں۔ بس امی کو پتا ہے کہ میں کبھی کبھی ڈائری میں کچھ لکھتا ہوں۔"

شام اب رات میں بدل چکی تھی۔ اشفاق صاحب کے گھر کے ملازم نے مزید چائے لاکر رکھ دی۔ اشفاق صاحب نے اگلے پندرہ بیس صفحے ایسے ہی پلٹ دیے۔ غالباً ان میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹی چھوٹی تکلیفیں۔ کبھی طبیعت کا خراب ہوجانا، کبھی بحال ہوجانا۔ خاندان میں ہونے والی شادیوں کا ذکر، عیدوں کا ذکر اور سالگرہوں کا تذکرہ۔ پھر انہوں نے ایک صفحہ کھولا اور بہ غور دیکھنے لگے۔ ایک گہری سانس لے کر پڑھنا شروع کیا۔ تاریخ تھی 18 مئی 2009ء۔ لکھا تھا۔ "آج کل ہم مری میں ہیں۔ تایا اور چچا کی فیملیاں بھی ساتھ ہیں۔ بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ میری طبیعت بہت اچھی رہتی ہے۔ وزن بھی بڑھ گیا ہے۔ کھانے پینے کو دل چاہتا ہے۔ سر کے بال جو بہت ہلکے ہوگئے تھے، اب بہتر ہوگئے ہیں۔ کل چھوٹے تایا کہہ رہے تھے۔ ماشاءاللہ اب تو جوان ہوگئے ہو۔

"مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ میں ایک بار پھر اپنے بہن بھائیوں اور کزنوں کے ساتھ کھیل کود سکتا ہوں۔ ہر طرح کی تفریح کرسکتا ہوں۔ ہم یہاں فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ آج فلیٹ کے سامنے ہی ہم نے کرکٹ بھی کھیلی ہے۔ تایا، چچا، ابو سب کھیل میں شامل تھے۔ بہت مزہ آیا۔ اگلے سنڈے کو لاہور واپسی ہوگی کیونکہ پیر کو کیموتھراپی ہونی ہے۔ تھراپی کے ساتھ ساتھ ٹیسٹ بھی ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی خون بھی لگانا پڑتا ہے۔ ضیا بھائی اور دیگر کزن خون کا انتظام کر دیتے ہیں۔ علاج شروع ہوئے اب تقریباً ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔ وہ شعبے کی انچارج ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ فروری میں جب مجھے خون لگانا پڑا تھا اور میں اسپتال میں داخل ہوا تھا تو وہ ہر روز میرے پاس آتی تھیں۔ مجھ سے اور امی سے دیر تک باتیں کرتی تھیں۔ ایک دو بار گھر سے میرے لیے کھانا پکا کر بھی لائیں۔ چند مہینے پہلے جب میری طبیعت خراب تھی تو ابو بھی سوچتے تھے کہ شاید کسی باہر کے ملک میں میرا علاج زیادہ اچھا ہوسکے۔ ابو کا خیال تھا کہ اگر مجھے باہر لے جانے کی ضرورت پڑی تو شاید ڈاکٹر ثمینہ اس سلسلے میں مدد کرسکیں۔ ان کے دو تین ڈاکٹر عزیز کینیڈا میں ہیں۔ بہرحال اب طبیعت بحال ہے اور دن بدن بہتر ہو رہی ہے۔"

21 مئی 2009ء "ابھی ہم مری میں ہی ہیں۔ پتا نہیں، میرے ساتھ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب میں خوش ہوتا ہوں تو کچھ نہ کچھ اس طرح کا ہوجاتا ہے جو بہت دکھی کر دیتا ہے۔ کل ہم سب لوڈو کھیلتے رہے۔ بہت ہی مذاق ہوا، بہت مزہ آیا۔ مغرب کے وقت جب میں واش روم میں وضو کر رہا تھا۔ مجھے چھینک آئی اور اس کے ساتھ ہی ناک سے خون نکلنا شروع ہوگیا۔ میں بہت گھبرایا لیکن میں نے کسی کو بتایا نہیں ہے۔ سب بہت خوش ہیں۔ میں ان کی خوشی کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔ ڈرتا ہوں کہ دوبارہ کہیں ایسا نہ ہوجائے۔ کل ہی سے سر بھی کچھ بھاری بھاری ہے۔ امی کچھ چونکی ہوئی سی ہیں۔ بار بار پوچھ رہی ہیں، کیا بات ہے میں نے ان کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ اپنی کسی پریشانی یا تکلیف کو چھپانا اور چہرے پر مسکراہٹ رکھنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے اس کا پتا آج چلا ہے۔"

25 مئی 2009ء بروز پیر "آج مشکل دن تھا.... بہت ہی زیادہ مشکل۔ یوں لگتا ہے کہ جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ امی ابو آپی، سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ تین روز

پہلے ہم سری سے واپس آگئے تھے۔ پرسوں ہی کو کیمو تھراپی ہوئی تھی۔ ہم کیمو تھراپی کے لیے گئے۔ ڈاکٹر پر موجود ڈاکٹر نے بلڈ کی رپورٹ دیکھ کر کہا کہ آج تھراپی نہیں ہوگی۔ رپورٹ ٹھیک نہیں ہے۔ مزید تفصیل بڑے ڈاکٹر صاحب بتائیں گے۔ امی ڈاکٹر ثمینہ کو فون کرتی رہیں لیکن ان سے رابطہ نہیں ہوا۔ وہ رات بڑی بے چینی سے گزری۔ اگلے روز خیال تھا کہ ڈاکٹر ثمینہ سے ملاقات ہوگی۔ لیکن ان سے پہلے ایک دوسرے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی۔ یہ بھی سینئر ڈاکٹر تھے۔ غالباً رند صاحب نام ہے، اپنے کمرے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے باہر جانے کو کہا اور ابو اور تایا سے بات کرنے لگے۔ میں باہر تو بھیجا گیا تھا لیکن دروازے کے پاس ہی تھا۔ وہ آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں جنہوں نے مجھے سر سے پیروں تک ہلا دیا۔ ڈاکٹر غالباً ابو اور تایا کو بتا رہے تھے کہ کینسر خون سے ہڈیوں تک پھیل گیا ہے۔ رپورٹ بہت خراب آئی ہے۔ ڈاکٹر غالباً اور تایا جان کی باتوں سے یہ اندازہ بھی لگا رہا تھا کہ شاید دو تین کے بلڈ ٹیسٹ میں بگاڑ ہوئی ہے جس کی وجہ سے دیر سے پتا چلا ہے۔ ابو اور تایا مزید کچھ اور کچھ تفصیل بھی بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر غالباً کہہ رہے تھے کہ اگر پہلے بھی پتا چل جاتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔ جو مرض نکل آیا ہے وہ اس نکل آیا ہے۔ وہ ابو کو کہہ رہے تھے "کینسر میرو ٹرانسپلانٹیشن" کا بتا رہے تھے۔ یعنی ہڈیوں کے گودے کی تبدیلی۔

تھوڑی دیر بعد ابو اور تایا باہر آئے تو ان کے چہروں پر پسینے کی چمک تھی ... بہت افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ گھر میں سوگ کی سی کیفیت ہے۔ تایا اور چچا بھی آئے ہوئے ہیں۔ سب چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بڑے بوجھل دل کے ساتھ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟"

چار پانچ روز بعد 28 مئی بروز جمعہ کی تاریخ میں انہوں نے لکھا تھا۔ "اتوار کے روز میرا دوست سفیان اور اس کے ابو میری عیادت کرنے آئے ہوئے تھے۔ سفیان وہی دوست ہے جس کا کزن شیر دل کینیڈا میں رہتا ہے۔ شیر دل میری اسی طرح بیمار تھا۔ لیکن اب وہ کافی حد تک ٹھیک ہو چکا ہے۔ پچھلے دنوں وہ اپنے ابو کی اور بہنوں کے ساتھ امی کی عیادت کو گیا ہوا تھا۔ سفیان کے ابو باہر کے ملکوں میں علاج معالجے کی سہولتوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میرے اندازے کے مطابق، ابو اور تایا وغیرہ بھی آج کل اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال بھی یہی ہے کہ میں کسی اسپتال میں ہوں۔ اس علاج کا وہ سہارا نہیں، جو ہونا چاہیے تھا۔ مجھے کسی اور اسپتال لے جانے یا باہر کے ملک لے جانے کے بارے میں بھی سوچا جا رہا ہے۔ ابو کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ شاید اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکیں۔ ان کے عزیزوں میں سے کئی ڈاکٹرز ہیں جو کینیڈا میں ہیں۔ امی کو بھی ایک امید سی ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ کچھ کریں گی۔ وہ مجھے اپنے گھر کے فرد کی طرح سمجھنے لگی ہیں۔ کل ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ بھی افسردہ تھیں۔ انہوں نے ابو کو بتایا ہے کہ ہڈیوں کے گودے کی تبدیلی کے لیے میرے بہن بھائیوں میں سے کسی کو گودے کا عطیہ دینا پڑے گا۔ اس آپریشن کے لیے پاکستان میں بھی کم از کم 30 لاکھ روپے چاہیے ہوں گے اور میرے کیس میں اس کے بعد بھی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اللہ جانے یہ علاج کتنے فیصد کامیاب ہوتا ہے، لیکن ایک بہتر کی امید ہے جو ہم سب پر آئی ہے۔ مجھ سے امی اور ابو کے چہرے نہیں دیکھے جا رہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ہر رات کے بعد سویرا ہوتا ہے۔ پتا نہیں کہ میری رات کا سویرا کہاں ہے۔ اس وقت بھی ساتھ والے کمرے میں ابو، تایا اور ماموں وغیرہ سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور علاج مشورہ کر رہے ہیں۔ ابو بیچارے تھک چکے ہیں۔ ٹوٹ چکے ہیں۔ ان سے میری تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ کبھی وقت تو ان کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے اپنے بازوؤں میں لیں ... اور کہیں دور لے جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کی بیماری یا تکلیف کے خوفناک پنجے مجھ تک نہ پہنچ سکیں ... یہ بہت بڑے دکھ ہیں ... بہت ہی بڑے۔ کل ہم نے پھر ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جانا ہے۔ اللہ کرے کوئی راستہ نظر آ جائے۔ آج تو ڈائری لکھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا لیکن اپنا دھیان بٹانے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ کسی کمرے میں شاید فون بج رہا ہے۔ گیت کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے دل سے نہ بھلانا چاہے وقت کے زمانے۔ مجھے ایسے گیت اچھے لگتے ہیں۔"

3 جون 2008ء کی تاریخ میں تحریر تھا۔ "ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے گئے۔ وہ بہت مصروف تھیں مگر ہمارے آنے کا سن کر انہوں نے ہمیں فوراً بلا لیا۔ ان کے علاوہ امی بھی میرے ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر ثمینہ بہت فکرمند دکھائی دیتی تھیں مگر میرے سامنے انہوں نے کوئی مایوسی والی بات نہیں کی۔ انہوں نے اس بات پر بہت لفظوں میں افسوس کا اظہار کیا کہ بیماری کی "گرفت" جاننے کے لیے میرا جو ٹیسٹ ہوتا

تھا اس میں دو ڈھائی ماہ کی تاخیر ہوئی..... جس کی وجہ سے مزید مشکل پیدا ہوئی۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے وہ ساتھ والے چھوٹے کمرے میں گئیں اور انہوں نے کئی جگہ فون کیا۔ غالباً کینیڈا میں اپنے کسی عزیز سے بھی بات کی۔ آدھ پون گھنٹے بعد وہ باہر آئیں تو ان کے چہرے پر کچھ اطمینان سا تھا۔ انہوں نے میرا ماتھا چوما اور مجھے تھوڑی دیر باہر بیٹھنے کو کہا۔ ابو امی اور ڈاکٹر ثمینہ کوئی ایک گھنٹا گفتگو کرتے رہے۔ ڈاکٹر ثمینہ نے لیبارٹری سے میری کچھ رپورٹیں بھی منگوا لیں۔ ہم تین بجے کے قریب اسپتال سے روانہ ہوئے۔ ابو اور امی کے چہرے پر امید کی روشنی سی تھی۔ میرے پوچھنے پر ابو نے بتایا۔ ''ہم کل اسلام آباد جا رہے ہیں۔''

''کس لیے ابو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں کے ایک اسپتال میں ڈاکٹر ثمینہ نے تمہارا ایڈمیشن کرا دیا ہے۔ کہتے ہیں بہت اچھا اسپتال ہے۔ انشاءاللہ وہاں مکمل ٹریٹمنٹ ہوگی اور تم صحت یاب ہو کر آؤ گے۔''

'' آج سارا دن سفر کی تیاری ہوتی رہی ہے۔ اس وقت بھی امی پیکنگ میں مصروف ہیں۔ ابو فون پر اسلام آباد بات کر رہے ہیں۔ وہاں ہمارے ایک دور کے چچا رہتے ہیں۔ ابو، امی، فی الحال ان کے پاس ہی ٹھہریں گے۔ ایمن کو بڑے تایا جان کے گھر اور آپی کو نانا کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔''

13 جون 2009ء .....'' اسلام آباد کی پرفضا پہاڑیوں میں یہ ''دی گرین ہوپ اسپتال'' ہے۔ کافی کشادہ اور صاف ستھری عمارت ہے۔ یہاں جدید مشینیں اور ساری ضروری سہولتیں موجود ہیں۔ یہ اسپتال چند خوش حال افراد مل کر چلا رہے ہیں۔ اس کے کرتا دھرتا، کوئی مبشر صاحب ہیں۔ ابو بتا رہے تھے۔ مبشر صاحب نے لاہور اور راولپنڈی وغیرہ میں کئی رہائشی کالونیاں آباد کی ہیں۔ بہت امیر آدمی ہیں اور اتنے ہی نیک دل بھی ہیں۔ میں دس بارہ روز سے اس اسپتال میں ہوں۔ بس ایک بار ان کی تھوڑی سی جھلک دیکھی ہے۔ عمر ساٹھ پینسٹھ کے قریب ہے۔ بال بالکل سفید ہیں۔ کپڑے بھی سفید ہی پہنے ہوئے تھے۔ کھلتا ہوا رنگ، نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی دل میں ''کچھ اچھے'' کی امید سی جاگنے لگتی ہے۔ انہوں نے میرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھا اور مختصر سی بات کی۔ ڈاکٹروں کا ایک گروپ ان کے ساتھ تھا۔

''کل ڈاکٹروں نے میری فائنل رپورٹس دیکھی ہیں۔ رائے یہی ہے کہ میرا بون میرو ٹرانسپلانٹ ہوگا۔ اسپتال میں جدید ترین سہولتوں کے باوجود خرچہ کافی کم بتایا جا رہا ہے۔ کل شام لاہور سے ڈاکٹر ثمینہ کا فون بھی آیا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ میرے آپریشن کو مزید سہل اور کم خرچ بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اور انہیں امید ہے کہ ایسا ہو بھی جائے گا۔ ابو جیسے ارینج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں..... لگتا ہے کہ انہوں نے کافی حد تک انتظام کر بھی لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بون میرو کون دے گا۔ ڈاکٹروں کے مطابق بون میرو یعنی ہڈی کا گودا سب سے زیادہ بہن بھائیوں کا میچ کرتا ہے۔ والدین کی میچنگ ہونے کے بھی بہت چانسز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت قریبی عزیزوں کا گودا بھی میچ کر جاتا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ بتا رہی تھیں کہ باہر کے ملکوں میں ایسے ادارے بنے ہوئے ہیں جہاں سے بون میرو کا عطیہ مل سکتا ہے ان اداروں کو ''بون میرو رجسٹریز'' کہا جاتا ہے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی اس طرح کے کاموں کا رواج ہو جائے۔ اس گرین ہوپ اسپتال کا عملہ بہت تربیت یافتہ اور خوش اخلاق ہے۔ ہر طرح کا تعاون کرتا ہے اور مریضوں کی حوصلہ افزائی میں مصروف رہتا ہے۔ مجھے لاہور کا وہ اسپتال نہیں بھولتا، جہاں قریباً پونے دو سال میرا علاج ہوتا رہا ہے۔ وہاں کا ایک ڈاکٹر اور ایک دو نرسیں، امی ابو سے جس طرح کی باتیں کرتی رہی ہیں ان کی بھنک میرے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ وہ سب مایوس کرنے والی باتیں تھیں، ہمت ختم کر دینے والی۔ ایک نرس نے تو ابو کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس اسپتال میں پچھلے ایک برس میں اس قسم کے کینسر کا ایک مریض بھی زندہ نہیں بچا۔ یہ بات سننے کے بعد میں کئی روز تک سخت ترین ڈپریشن میں رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں بار بار کینیڈا کے شیروانی کا خیال آیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ شیروانی بچ سکتا ہے اور اس جیسے ہزاروں بچ سکتے ہیں تو میں بھی بچ جاؤں گا۔ یہاں گرین ہوپ اسپتال میں آنے کے بعد میری ساری امیدیں پھر سے تازہ ہونے لگی ہیں۔''

اشفاق صاحب نے سیاہ جلد والی ڈائری کے چند صفحے پلٹ دیے۔ پھر ایک صفحے پر رک گئے۔ انہوں نے دھیمی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ ''12 جولائی 2009ء بروز اتوار اللہ کا بہت شکر ہے، میں ایک بہت بڑے مرحلے سے سرخرو ہو کر نکلا ہوں، یہ ایک بہت بڑا اور مشکل کام تھا لیکن اللہ کی مدد اور گرین ہوپ اسپتال کے تعاون سے یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ میرے بون میرو کے کینسر زدہ Cells کو نئے Cells سے بدل دیا گیا ہے۔ اس کے لیے میرے پیارے ابو جان کا ''بون میرو'' استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی جیسے اپنے جسم سے نچوڑ کر

میرے جسم میں بھر رہی ہے۔ آٹھ دس دن وہ بھی بستر پر رہے ہیں اور ان کی ڈریسنگ بھی ہوتی رہی ہے لیکن اب وہ ٹھیک ہیں۔ میرے جسم کی بچھی ہوئی نالی میں بھی کسی نے باہر سے نمک ڈال دیا ہے۔ اب تازہ پیپ میرے میرے جسم میں سے خون کی مقدار کم کرنا شروع کر دی ہے۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ اسپتال کے ایم ڈی سٹر رحیم صاحب نے اس سلسلے میں خاص تعاون کیا ہے۔ ابو بھی ہے تھے کہ یہ صدقہ پر دیجیر کسی دوسرے اسپتال میں ہوتا تو کم از کم تین گنا خرچہ آتا اور پھر یہاں جو جو ٹیسٹ ہوئے ہیں ان کا تصور وہ اسپتالوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال کے ایک سینئر ڈاکٹر یہاں کمرے میں ہو کے بھی موجود تھے۔ انہیں بتا رہے تھے کہ راشد بہت اچھے ہیں۔ بیماری کے "سر" مکمل کنٹرول میں ہیں۔

"لاہور سے تمام قریبی عزیز یہاں آن موجود ہوئے ہیں۔ سب خوش نظر آتے ہیں۔ آپریشن کی کامیابی پر سب کا دعا دے رہے ہیں۔ تایا ابو کہہ رہے تھے، انیس ٹھیک ہوتا ہے تو سب کو پہاڑی علاقوں کی کسی سیر پر لے چلیں گے۔ ڈیڑھ دو ہفتے وہیں پر گزاریں گے۔ میں نے کہا "میں تو ابو کے ساتھ گھر کے لوگ میں کیمپ کی طرف جاؤں گا۔ ابو ایک لیبر کور کی ٹیم کے ساتھ گھر کے لوگ میں کیمپ تک بلکہ اس سے آگے بھی جا چکے ہیں۔ انہوں نے تھیلی سیف اسٹوک سے آگے بلکہ پر ہونے سر کرنے والی ٹیم میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہاں اس ٹیم کے کپتان تھے۔ میں بھی وہ سب جگہیں، سب تھیلیں اور سارے منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں ایک بہت آرام دہ کمرے میں ہوں۔ شام کا وقت ہے کھڑکیوں سے باہر ہریالی کی خوب صورت پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں اور ان سے آگے سرمئی اور نیلاہٹ لیے دور کی چوٹیاں۔ یہ پہاڑیاں مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں، یہ کھلی فضا مجھے پکار رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے — میں پھر سے زندہ ہو رہا ہوں۔ اسپتال کے بلوں کی طرح میرے اندر بھی پھول سے کھل رہے ہیں۔

"سوہاگن کی بیل ہو رہی ہے۔ شاید لاہور سے ڈاکٹر آنٹی ثمینہ کا فون ہے۔ وہ مسلسل میرے حال سے باخبر رہتی تھیں۔ لیں — اب واپس اسے دیری گڈ ڈے۔ آج کی ڈائری ختم کرتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے اور پروفیسر اشفاق نے ڈائری کے بقیہ نیس ہر ایک نظروں سے دیکھے۔ ان صفحوں میں گاہے بگاہے لکھی گئی تحریروں کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ — تقریباً تین ماہ بعد انیس ہری گرین ہوسپٹل سے اسپتال ڈسچارج ہوا۔ لاہور پہنچ کر اس نے وہ کام مکمل کرنے کا فیصلہ کیا جو شدید بیماری کی وجہ سے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے قرآن پاک کے حفظ کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا اور مدرسے میں داخل ہو گیا۔ ساتھ ہی میٹرک کی پرائیویٹ بھی تیاری کر دی۔ موسم گرما کی چھٹیوں میں وہ سب لوگ بالاکوٹ، کاغان اور ناران کے علاقوں کی طرف نکل گئے۔ واپسی پر انیس نے اپنی ایک دیرینہ خواہش پوری کی۔ پنڈی سے لاہور تک ٹرین کی اپر کلاس برتھ کا ٹکٹ لیا۔ انیس نے اپنا پرانا شوق بھی وہیں سے شروع کر دیا تھا۔ شام کے وقت وہ اور طلحہ کرکٹ کھیلنے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہاکی کا شوق بھی پورا ہوتا تھا۔ کرکٹ میں انیس کی بالنگ بہت اچھی ہو گئی تھی۔ چھٹی کے روز جو بچے ہوتے تھے ان میں انیس کے ساتھی اس کی فیلڈنگ کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ انیس کا علاج جاری تھا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی ٹیسٹ کی ہوتا رہتا تھا۔

ڈائری پر 6 نومبر 2010ء کی تاریخ پر آ کر اشفاق صاحب رک گئے۔ یہاں انیس نے لکھا تھا "آج کا دن میرے لیے بہت زیادہ اہم اور خوشی والا ہے۔ میں نے قرآن پاک کا حفظ مکمل کر لیا ہے۔ یوں میرے ابو اور دادا مرحوم کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ سب گھر والے بہت خوش ہیں۔ ابو نے ایک پکنک رکھی ہے۔ سب کی دعوت کی ہے۔ مدرسے اور محلے میں بھی مٹھائی بانٹی گئی ہے۔ امی پھر پھر اماتا چومتی ہیں اور سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں۔ لیکن اب تقریباً چار سال کی ہو گئی ہے۔ ہر بات میں امی کی نقل اتارتی ہے۔ وہ امی کے انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور ماتھا چومنے کی کوشش کرتی ہے۔ امی نے میرے تمام استادوں کے لیے کپڑے سلوائے ہیں۔ خوشی کے اس موقع پر آپی نے مجھے کتابوں کا سیٹ تحفے میں دیا ہے۔

"رات کو میرے اور ابو کے درمیان دیر تک بات ہوتی رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں عالم بننے کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی حاصل کروں۔ میں عالم بننا چاہتا ہوں۔ ابو نے میری اس خواہش کی تائید کی ہے، تاہم کہا ہے کہ مجھے دونوں کام ساتھ ساتھ جاری رکھنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی۔ میں محنت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ نے مجھے صحت دی ہے۔ میں اس صحت اور تندرستی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ مہربان ڈاکٹر ثمینہ سے بھی گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ میری صحت کے سلسلے میں باخبر رہتی ہیں۔"

چند صفحات کے بعد 28 جنوری 2011ء کی تاریخ میں لکھا تھا۔ "ڈائری لکھنے میں کبھی کبھی لمبا وقفہ آ جاتا ہے۔

وہ بھی تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد گھر جا رہا ہوں۔ اس کی وجہ بڑی ہوئی مصروفیت ہے۔ مدرسے کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ دوسری پڑھائی کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ میٹرک کے بعد اب آئی سی ایس کے لیے شام کی کلاسز میں داخلہ لے رکھا ہے۔ گھر میں کمپیوٹر کی تعلیم کا ماحول پہلے سے موجود ہے۔ دو کمپیوٹر پر دکن مصروف ہیں۔ آپی بھی بی ایس کر رہی ہیں۔ مجھے بہت آسانی ہے۔

"ساری مصروفیت کے باوجود میں اور مظہر کرکٹ کے لیے تھوڑا بہت وقت نکال لیتے ہیں۔ کل سرکاری چھٹی تھی۔ ہم نے یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں خوب کھیلا اور نہایا۔ انہی کارکردگی کی وجہ سے میں ایک بڑا کپ بھی گھر لے کر آیا۔ امی نے یہ کپ بھی میری دوسری ٹرافیوں کے ساتھ الماری میں سجا دیا ہے۔ میری کامیابی پر امی ابو کے چہرے پر جو خوشی نمودار ہوتی ہے وہ اس سارے دکھ درد کا "مداوا" بن جاتی ہے جو ڈیڑھ دو سال پہلے انہیں میری وجہ سے اٹھانا پڑا ہے۔"

آگے کل کر جولائی 2012ء کے حوالے سے ڈائری میں یہ تحریر موجود تھی۔ "ابو نے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب میں آئی سی ایس کا امتحان پاس کروں گا تو وہ مجھے میری من پسند گفٹ دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھانا چاہوں گا یا پھر سیر و تفریح کی۔ لیکن رزلٹ آنے کے بعد میں نے ان کی توقع سے بڑھ کر چھانگا مانگا۔ میں نے کہا کہ میں اپنا ایک دن پیدائشی کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے ساتھ کے تو کے میں کیمپ تک جانا چاہتا ہوں۔ ابو ہماری کوئی بات ٹالتے نہیں ہیں چاہے اس کے لیے انہیں کوئی دشواری اٹھانی پڑے۔ ویسے بھی انہیں میری طرف سے بڑی خوشی ملی تھی۔ ایک تو آئی سی ایس کا رزلٹ، دوسرا حافظ کورس کے دوسرے سال میں کامیابی۔ ابو بہت خوش ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پرانے دوستوں سے رابطے کیے۔ کوہ پیمائی کا سارا سامان جہاز پر لیجے کر صاف کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب میں اس وقت سطح سمندر سے تقریباً 3800 میٹر کی بلندی پر کے تو کے میں کیمپ میں موجود ہوں۔ ہماری چاروں جانب برف ہے۔ تیز یخ بستہ ہوائیں چل رہی ہیں اور میں خیموں میں ہمارے گرم کپڑے بھی ٹھٹھر رہے ہیں۔ میں ابو کے ساتھ اس عظیم الشان چوٹی کے دامن میں موجود ہوں جس کی کہانیاں ہم ابو کی زبانی بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ نیلگوں آسمان کو چھوتی ہوئی "کے ٹو" ہمارے سامنے ہے۔ اس منظر کی دلکشی کا لفظوں

لطائف

سکھ کمرا داخل کرنے لگا تو کلینر نے پوچھا کہ بڑھئی کیا ہے؟

ایک لمحہ سوچنے کے بعد مجھری چلاتے ہوئے جواب دیا۔ "مستری برتھ ڈے بوائے ہے۔"

***

لڑکی آئس کریم کھاتے ہوئے برابر والے فرینڈ سے بولی۔ "مجھے کچھ ایسا کہو کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جائے۔"

لڑکا۔ "میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

***

دنیا میں دو نیٹ ورک سب سے فاسٹ ہیں۔

Female_2 _Email_1

ایک عدد سم اور ایک عدد سمر کی نمبر۔

***

ایک لڑکا دوسرے لڑکے کو کسی سے باندھ کر لے جا رہا تھا۔

یہ دیکھ کے ایک سردار جس کی لوٹ پوٹ ہو گیا اور کہنے لگا۔

"ایک رسی کو لے جانے کے لیے دو دو لڑکے۔"

***

لڑکا بس اسٹاپ پہ کھڑی لڑکی سے بولا۔ "ایکسکیوزمی آپ کے گھر اسٹاپ کر دوں اگر آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہو تو؟"

لڑکی۔ "نو پرابلم۔"

لڑکا۔ "جانا کہاں ہے؟"

لڑکی۔ "کہیں نہیں جانا ہے۔"

لڑکا۔ "پاگل میرے خیال سے ہاسپٹل سے بھاگی ہو لڑکی کو اتنا بھی نہیں دینی چاہیے اور مجھے نماز پڑھنے بھی جانا ہے۔"

مرسلہ: رضوان خوشی کرج دی اور گل ہاؤس کراچی

میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آج میری ایک بہت بڑی خواہش پوری ہوئی ہے۔"

22 دسمبر 2013ء "آج کل بالکل صحت یاب ہوں۔ آخری قسط لکھی کوئی ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی۔ اب تو کسی طرح کی دوا بھی نہیں کھا رہا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی چیک اپ کے لیے اسلام آباد میں گرین ہوسپٹل جاتا ہوں۔ اس اسپتال سے بہت سی اچھی یادیں وابستہ ہیں۔ ان یادوں میں سب سے نمایاں یاد اسپتال کے ایم ڈی ڈاکٹر رحیم صاحب کا مہربان چہرہ ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے ایک سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب ان کے سب سے بڑے بیٹے فہد صاحب خوش اسلوبی سے اسپتال کو چلا رہے ہیں۔

"آج کل میرے بی ایس سی کے سمسٹر چل رہے ہیں۔ دوسری طرف عالم کورس کا بھی چوتھا سال ہے۔ ابو میری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ ابو کے آفس میں ہی انٹرن شپ کا پروگرام بن گیا ہے۔ امید ہے کہ اس پر انگلی جاب بھی آفر ہو جائے گی۔ امی آج کل دوسری بچی کو سوچ رہی ہیں اور کبھی کبھی چڑیں سالہ لڑکوں کی مائیں مجھے ہیں۔ وہ کہتی ہیں اب میں بہت تھک گئی ہوں۔ مجھے ایک بہو کی ضرورت ہے۔ جو میرا دکھ سکھ سنے، میرا ہاتھ بٹائے۔ میں نے کہا۔ "امی دکھ سکھ سننے اور ہاتھ بٹانے کے لیے آپی جو موجود ہے۔"

وہ کہنے لگیں۔ "یہ کہیں اور دکھ سکھ سننے اور ہاتھ بٹانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اسی سال اس کی شادی ہو جائی ہے، پھر میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"امی سنجیدگی سے میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ وہ بالکل جسٹیفکیشن بڑی بیٹی سمسٹر کی بات کرتی ہیں۔ بالکل جسٹیفکیشن سگے بیٹے تو نہیں ہیں لیکن رشتے میں بھانجی لگتے ہیں۔ جب سے امی گھر میں سمسٹر کی بات کرنے لگی ہیں، میں بھی اسے ذرا غور سے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ مجھے اپنی امی کی پسند پر ہمیشہ یقین رہا ہے۔ انہوں نے جب بھی میرے لیے کوئی چیز چنی ہے، وہ بہترین ہی نکلی ہے شاید..... امی وجہ سے..... یہ لمبے بالوں اور جھیل آنکھوں والی سمسٹر مجھے پسند آ رہی ہے۔ بہت ہنس مکھ لڑکی ہے۔ جب بھی ہمارے گھر آتی ہے قہقہے سے بکھرنے لگتے ہیں۔ آپی کی طرح اسے بھی موبائل فون پر آنے والے "جوکس" سننے اور سنانے کا شوق ہے..... امی کو بتا بتا کر لوٹ پوٹ کرتی رہتی ہے۔"

کچھ صفحے پلٹنے کے بعد اشفاق صاحب ایسے صفحے پر آ گئے جہاں ڈائری پر 28 فروری کی تاریخ لکھی تھی۔ تحریر اس طرح تھی۔ "آج ایک اور خوشی سے بھرپور دن ہے۔ بلکہ یہ صبح ہی خوشی سے بھرپور رہا ہے۔ یہ دن میرے اپنے آپی کی شادی خوش اسلوبی سے انجام پائی ہے۔ صبح فجر کے ساتھ میری سنگی ہو گئی ہے۔ ایک چھوٹی سی تقریب تھی لیکن بہت خوشگوار اور پر وقار۔ فی الحال بس آپی کی رخصتی ہوئی ہے۔ ولیمہ بھائی بھی اس تقریب میں بڑے جوش سے شریک ہوئے۔ سمسٹر بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ آپ اپنے منہ میاں مٹھو کہا کریں، دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں بھی خوب صورت لگ رہا ہوں۔ میرا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم ہے۔ سمسٹر میرے کان میں آ کر کہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "تمہارا قد کان میں سرگوشی کرنے کے لیے بڑا مناسب ہے۔"

وہ بولی۔ "صرف آپ کا سننے کے لیے۔"

"امی ابو ہم دونوں کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھے۔ میں نے امی کی بڑی بہنوں کو بھی ولیمے میں مدعو کیا تھا۔ آج کل ابو کی آفس میں "انٹرن شپ" چل رہی ہے۔ ابو کے آفس میں جاب تو آسانی سے مل سکتی ہے لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا راستہ خود بناؤں۔ جیسے ابو نے اپنے راستے خود بنائے اور کامیابیاں حاصل کیں۔ میں اپنے کل ہونے پر ابو اور امی کو بہت اچھا سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔

"رابعہ کے گریڈ بہت اچھے آئے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ڈائری لکھ رہا ہوں۔ ایکزیمز اب تیسری کلاس میں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بجلی گئی تھی۔ میری کمر پر چھوٹی رانی سوئی ہوئی تھی..... بھیا آپ کھانے لگے ہیں، مجھے نیا ڈریس لے کر دیں۔ اب شاید وہ سونے کے لیے چلی گئی ہے۔ امی امی میرے پاس دودھ کا گلاس رکھ کر گئی ہیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "تمہارا کوئی فون نہیں..... کوئی میسج نہیں۔ کوئی رابطہ نہیں۔ لگتا ہے ہمارا میرا ہاتھ آخرت اور صرف آخرت... میں بہت جلد تمہاری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔"

"میرے عالم کورس کے پانچ سال مکمل ہو چکے ہیں۔ وین کے فلم نے میرے اندر ایک روشنی سی بھر دی ہے۔ ایک ایسا انتظار اور یقین جگا ہے مجھے جس کا کوئی فہم ماضی میں نہیں مل سکا۔ آج کل میں نے چھوٹی چھوٹی ڈائری بھی لکھی ہوئی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ ڈائری مجھ پر بہت سجتی ہے۔ سکیچ کی تصویریں بھی بہت خوب صورت آتی ہیں۔ امی ہر ایک کو دکھاتی پھرتی ہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں بی ایس سی کے ساتھ عالم کورس کا فائنل بھی اٹھاؤں۔ میرا ارادہ ہے کہ کبھی جاب لگ جائے گی تو تھوڑا سا وقت کسی مدرسے میں بچوں کے لیے دیا کروں گا۔ ارادہ ہے کہ یہ بچے بلکہ کسی سادہ سے گھر کی

گا۔ ابو میرے اس ارادے سے اتنے خوش ہیں کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔"

کافی سارے صفحات پلٹنے کے بعد اشفاق صاحب ایک اہم صفحے پر آگئے یہاں تاریخ درج تھی 14 نومبر بروز پیر۔ اس تاریخ کی ڈائری کچھ اس طرح تھی۔ "کیا زندگی اتنی خوب صورت بھی ہوسکتی ہے۔ کیا وقت اتنا مہربان بھی ہوسکتا ہے؟ کل اور پرسوں کے دن میری زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے۔ پرسوں سنبل کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے اور وہ سنبل جمشید سے سنبل انیس بن گئی ہے۔ ایک بہار کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئی ہے اور چھا گئی ہے۔ ہمیشہ کی طرح میری امی کی پسند میرے لیے لاجواب ہے۔ کل ہمارا ولیمہ تھا۔ خوشیوں، رنگوں اور روشنیوں سے بھرپور، ایک یادگار تقریب۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس ساری تقریب میں اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ میں کل ہی سنبل کے ساتھ اس کے گھر یعنی اپنے سسرال آگیا تھا۔ آج بھی وہیں ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے امی کا فون آیا تھا۔ "انیس! بہت اداس ہوگئی ہوں۔ تم دور ہوتے ہو تو ایک دم اندر سے خالی ہوجاتی ہوں۔ کب لینے آئیں تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "ابھی آجائیں، لیکن آپ کی بہو شاید ابھی ایک دن اور رہنا چاہتی ہے۔"

سنبل نے میرے مقتب سے گردن نکال کر ماؤتھ پیس میں کہا۔ "نہیں امی جان! یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں بلکہ اگر یہ نہیں آتے تو میں اکیلی آجاتی ہوں۔ دس منٹ کا تو رستہ ہے۔"

"بہت شوخ ہے اور امی کے ساتھ اور شوخ ہوجاتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں اور سنبل ہنی مون کا پروگرام بناتے رہے ہیں۔ ابو کی طرح مجھے بھی پہاڑوں سے عشق ہے۔ جیسا کہ میں نے پیچھے لکھا ہے، میں کے ٹو کے کیمپ نمبر تین گیا ہوں اور کاب ٹائم کے ساتھ ملکہ پربت بھی دو بار سر کی ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابیاں ہیں اور مجھے ان پر فخر ہے۔ میں نے سنبل سے کہا ہے، ہم ہنی مون "کے ٹو" کے بیس کیمپ پر منائیں گے۔ وہ بولی۔ "آپ کے ٹو کے اوپر ہی کیوں نہیں منا لیتے۔ گینز بک میں آپ کا نام آجائے گا۔"

"ہم دیر تک ہنستے رہے۔"

آگے چل کر انیس نے قریباً ایک سال بعد 3 دسمبر کی تاریخ میں لکھا تھا۔ "زندگی میں غم اور خوشی، دھوپ اور چھاؤں کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن آج کل خوشیوں کی سنہری دھوپ میں ناخوشی کی پرچھائیاں سکڑ سمٹ کر رہ گئی ہیں۔

Mob: 0300-2219514,0344-2619828

معقول فیس میں ہنرمند بنیں

بذریعہ ڈاک

موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھئے

صبح 9 بجے تا شام 5 بجے

ہنر سیکھئے روزگار لیجئے

Registered with CBR
Govt. of Pakistan

بیسک ٹیلیفون	ہاؤسکیپنگ	کشیدہ کاری	لیڈیز ٹیلرنگ	حکمت	ڈسپنسر	ایکو پنکچر	جنرل میڈیسن	میٹرس ٹیلرنگ	میڈیکل اسسٹنٹ	ای سی جی ٹیکنیشن	U.P.S ٹیکنیشن
علاج بنوکی	ایس ڈریسر	سکریٹریل	مڈوائفری	معالج حیوانات	بنیادی سائنس	کیمیکل	آئیل پینٹنگ	عینک سازی	نرسری ٹیکنیشن	ریفریجریشن ٹیکنیشن	الیکٹریشن
یوگا	انٹیریر ڈیکوریشن	بیوٹی پارلر	ایروبک	بیوٹی پارلر	آئرن کلینگ	مہر سازی	کوکنگ کلاسز	سائیکلو اسٹائل	سروئیر	کمپیوٹر	کمپیوٹر ہارڈ ویئر
مینٹل ورکر	ابتدائی طبی امداد	ہیومن سائیکالوجی	ہیومن سائیکالوجی	ہیومن سائیکالوجی	ہیومن سائیکالوجی	آٹو الیکٹریشن	شارٹ ہینڈ	ڈریسنگ بنگلہ	بیکنگ کورسز	جنریٹر ٹیکنیشن	الیکٹرک وائرنگ
فارمیسی	ہومیوپیتھک	ہومیوپیتھک	لیبر ٹیکنیشن	انگلش لینگویج	ٹیکسٹائل ڈیزائننگ	فلاور میکنگ	ویلڈنگ	انٹراساؤنڈ	فن مصوری	میک اپ	
بیسک ٹیلیفون	فزیوتھراپی	ڈائنگ پینٹنگ	آٹو سروسنگ	کار لیس بیٹری	بیوٹری میکنگ	بلڈنگ پینٹر	فرش فارمنگ	کوریا لینگویج	ایپ فشنگ	ٹائر ری موڈلنگ	فائر فائٹنگ
باڈی بلڈنگ	خزاد کا ہنر	اسٹیچ فکسنگ	ہینڈ ایمبرائڈری	باغبانی	بیٹ ڈیزائنر	نیٹ ورکنگ	موٹر سائیکل مکینک	موٹر سائیکل ریپئرنگ	چائلڈ فکسچر کورس	ٹیلی کمیونیکیشن	بیوٹیشن ایڈوانس کورس

دی انسٹی ٹیوٹ

پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

زندگی میں جیسے ہر طرف سارا گل ہے سب کچھ اچھا جا رہا ہے۔ کنول کہ پودوں کا شوق ہے۔ اس نے چھت پر درجنوں گملوں میں طرح طرح کے پودے لگا رکھے ہیں۔ دوسری طرف مجھے پھولوں کا شوق ہے۔ خاص طور سے ایسے پھول جو پہاڑوں پر اگتے ہیں۔ میں اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوں اور پانچ میں لگا رہا ہوں۔ میں اور کنول دونوں ایک دوسرے کے شوق سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پرندے بھی کو بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ چند دن پہلے میں دو بہت خوب صورت پھول لگائے ہیں۔ جی ہاں — دو جڑواں پھول — ایک ساتھ۔ ایک کی کلی پہلے اور ایک کچھ بعد میں۔ یہ دونوں پیلے ایک آسمانی رنگ کی طرح ہمارے گھر میں بکھر رہے ہیں، اور ہر طرف نور سا بکھر گیا ہے۔ بیٹی کو ای میل کی پائی ہے اور بیٹے کو بیوی سے۔ دونوں کے نام ای نے رکھے ہیں۔ عنیزہ اور ثمینہ۔ بڑی نسبت والے ہیں یہ بچے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی میری بیوی سوئٹن بھی ہوئی ہے۔ امید ہے تین چار مہینے بعد مجھے اپنے کام کے سلسلے میں آسٹریا بھی بھیجا جائے گا۔ یعنی Schengen ویزا۔ اس ایک ویزے پر پورا یورپ دیکھا جا سکے گا۔ شاید جاتی آنکھوں کا ایک اور خواب پورا ہونے والا ہے۔"

ڈائری اب ختم ہو رہی تھی۔ کم از کم ہاتھوں اور دماغ کو پائیدان نظر سے دیکھتے ہوئے ہم ایک ایسے نکتے پر پہنچ گئے جس پر صرف ایک ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی ... 28 جنوری۔ انھوں نے لکھا تھا۔ "پورے ساتھ ماہ یورپ میں گزارنے کے بعد ہم واپس پاکستان واپس آ گئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، پورے یورپ میں بہت گھوما پھرا ہوں۔ امریکا اور کینیڈا کا بھی ایک تیز رفتار دورہ کیا ہے۔ گھومنے پھرنے کی خواہش بڑی اچھی طرح پوری ہوئی ہے۔ اس سارے وقت میں ایک حسرت ہی رہی ہے تو یہ کہ ای ایک میرے ساتھ نہیں تھے اور نہ ثمینہ اور باقی گھر والے۔ کاش اور کوئی نہیں تو ایمن ہی میرے ساتھ ہوتی۔ مجھے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ میں نے سب کو بہت بہت "مس" کیا ہے۔ کبھی کبھی بہت پریشان بھی رہا ہوں۔ اس ساری پریشانی کا مداوا یہاں آتے ہی مکمل ہو گیا ہے۔ اس نے میرے باغیچے میں ایک اور پھول کا اضافہ کر دیا ہے۔ گول مٹول ستارہ آنکھوں والا گوکرنا ایمان۔ اس نے پھول سے ہمارے آنگن کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ میری آمد کی خوشی میں ابو نے گھر پر ایک گیٹ ٹوگیدر پارٹی رکھی تھی۔ یہ پارٹی ہمارے بڑے سے گھر میں ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ مدعو تھے۔ ابو اور احباب کے ساتھ ڈاکٹر آنٹی ثمینہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ گزرے ہوئے ماہ و سال نے انھیں تبدیل تو کیا ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ وہ اب بھی اپنے گھر کے فرد کی طرح ہی لگتی ہیں۔ جب بھی گرین ویو اسپتال کا تصور ذہن میں آتا ہے تو آنٹی ثمینہ کا تصور بھی ذہن میں آ جاتا ہے۔ یہ آنٹی ہی تو تھیں جنھوں نے ہمارے بہت برے وقت کی طرح محسوس کیا اور ہمیں گرین ویو اسپتال کا راستہ دکھایا۔ آج میں اور میرے اہل خانہ زندگی کی جن خوشیوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں، ان کا حصول اللہ کی مدد اور گرین ویو اسپتال کی کوششوں سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔"

اشفاق صاحب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ڈائری بند کر دی۔

چائے آ گئی تھی۔ ہم دونوں چائے کے گھونٹ لیتے رہے اور اس ڈائری کے سحر میں کھوئے رہے۔ ایک نوجوان کی زندگی کے بہت سے حسین لمحات ایک فلم کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے تھے۔

چائے ختم کرنے کے بعد میں نے اشفاق صاحب سے کہا۔ "جی جناب! بہت اچھی ڈائری منتخب کی ہے آپ نے۔ یقیناً پڑھنے والوں کو محظوظ کرے گی۔ ویسے یہ ہوتی ڈائری ہے فیصلہ پر خوش کن اختتام ایسے والی ڈائری کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔" اشفاق صاحب نے تائید کی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہر ڈائری ایسی ایسے والی نہیں ہے جو زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ آپ نے بھی کہا تھا کہ ایک ڈائری ادھوری چھوڑی ہے۔"

"ہاں، ہے تو ایسا ہی۔" انھوں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ ڈائری کہاں ہے جناب؟"

انھوں نے پھر ایک گہری سانس لی اور چشمے کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے۔ "ظہیر ... وہ ڈائری گم ہے۔"

"گم ہے؟... کیا مطلب... اشفاق صاحب؟"

انھوں نے آنکھوں پر چشمہ جمائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "بس ایک ہی ڈائری ہے ... کچی پکی ایسے والی ہے ... کچی والی۔"

میں واقعی حیران تھا۔ "میں کچھ ... کچھ نہیں پایا اشفاق صاحب؟"

وہ عجیب انداز سے مسکرائے۔ ان کی آنکھوں میں

"وہ انیس کی والدہ اور والد تھے ... تم نے اس عورت کو پہچان سے دیکھا تھا؟"

ایک دم میرے ذہن میں دو نہایت غمزدہ آنکھیں آگئیں۔ وہی آنکھیں جو محبت کے بجائے بے پناہ غم ہی غم نظر آتی تھیں۔ دن میں ایک خاموش گم خاموش کی صورت کی طرح جلا تھا۔ میں ابھی تک ان آنکھوں کی کیفیت کو بھول نہیں پایا تھا۔

اشفاق صاحب نے کہا۔ "وہ بہت دکھی عورت ہے۔ ستر سالہ بیٹے کو اپنا دکھ اور سفید لباس پہنا کر چتا پر سے کی چارپائی پر لٹا کر اور ہمیشہ کے لیے گھر سے رخصت کرنا کوئی آسان کام ہوتا ہے بھلا؟ اس عورت کو چند سال پہلے یہ کام کرنا پڑا تھا اور اس کے شوہر کو بھی کرنا پڑا تھا۔ وہ مرد ہے اور بہت حوصلہ مند ہے، وہ سنبھل گیا ہے۔ لیکن یہ عورت ہے، ابھی تک اس بے پناہ دکھ کے حصار سے نکل نہیں سکی۔ بدلنے والے موسم، آنے والے تہوار اور خوشی کے سارے موقعے اسے اس کے جواں مرگ کی یاد دلاتے ہیں اور شاید آخری دم تک رلاتے رہیں گے۔"

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اشفاق صاحب! آپ ڈائری کی بات کر رہے تھے۔ 29 سال کے بھتیجے ڈائری وائری نے نہیں لکھی تھی کسی نے لکھی؟"

"اس کی ماں نے۔ اس عورت نے جسے تم نے دو تین گھنٹے پہلے دیکھا ہے۔ ہاں طاہر... انیس کی ڈائری اس کی ماں نے مکمل کی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی زندگی کو تصور کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے۔ وہ حقیقت کی زندگی میں تو اس کے ساتھ نہ رہ سکی لیکن اس ڈائری میں اس نے محبت پروان چڑھایا ہے، جو اس نے کیا ہے، اس کی تعلیم مکمل کی ہے، اس کے سر پر سہرا سجایا ہے، اس کے بچوں کی تکرار یاں سنی ہیں اور ان کے منہ چومے ہیں۔"

"اوہ گاڈ۔" میں اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ کتنی دیر بے یقینی کی کیفیت میں اشفاق صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہانی سنا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے، یہ ایک فل ڈائری ہے اور یہی سب سے غمگسار، اور یہی سب سے درد ناک ڈائری بھی ہے۔ جو میں سمجھ رہا تھا، اس کے علاوہ تو شاید یہ بات ٹھیک ہی تھی۔

میں نے ڈائری کا وہ صفحہ پڑھنا شروع کیا جو پر قول اشفاق صاحب انیس کا لکھا ہوا آخری روزنامچہ تھا۔ اس روزنامچے کے آخر میں انیس نے لکھا تھا۔ "ابو سے میری تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ کسی وقت تو ان کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے اپنی بانہوں میں لے لیں... اور کہیں دور لے جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کسی بیماری کے خوف کے بغیر بھوک سے نہ تڑپتی ہوں۔ یہ بہت برے دن ہیں۔ بھوک ہی برے۔ کل ہم نے پھر ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جانا ہے۔ اللہ کرے کوئی راستہ نظر آجائے۔ آج تو ڈائری لکھنے کو کسی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اپنے حواس بحال رکھنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ کسی کمرے میں شاید ریڈیو بج رہا ہے۔ گیت کی آواز آرہی ہے۔ کیسے دل سے بھلا دوں... چاہے جدھر کے بہانے..."

میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "انیس نے لکھا ہے کہ کل وہ پھر ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جا رہے ہیں۔ تو کیا وہ اگلے دن ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے گئے؟"

"ہاں گئے۔" اشفاق صاحب نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"یہ اس ڈائری میں نہیں لکھا... اور جو حقیقت میں موجود ہے اور جسے پڑھ کر ہے طاہر! حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ کڑوی کسیلی اور کبھی کبھی بے رحم بھی۔ جن میں ایک حسین ہوتی۔ خوبصورتیوں کے لیے کشادہ راستے نہیں ہوتے تصور حقیقت کے روپ نہیں ہوتے۔ یہ اکثر بے حس اور سفاک ہوتی ہیں۔ کسی کی طلاق کے تحفظ کی طرح، موت کے لیلی گرہم کی طرح، تیزابی کے بلیک ویڈو کی طرح اور کینسر کی ریپ ورسک کی طرح..." وہ گلاس چھ پانی اور اس کے بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "اگلے روز انیس اور اس کے والدین اسپتال پہنچے تھے۔ ڈاکٹر ثمینہ سے ملے تھے۔ اس نے سر کے پیچھے اور گلے پر سے انہیں جواب دیے... بس علی صاحب، جو کچھ ہوا ہے کسی کے بس میں تو نہیں تھا۔ بیماری وہ نہیں تھی۔ اب آپ کو "پروبیبلز" تلاش کرنا ہے اور وہ بتا رہی ہے کہ جانا میرے تبدیل ہو۔ ہمارے امتحان میں اس کے اسٹے اسٹے اور "یہ" ٹھیک ہوں گے۔ بہرحال آپ کہیں اور سے بھی رائے کر لیں... وغیرہ وغیرہ۔"

"وہ بالکل پروفیشنل اور لاتعلق سی نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے عملے کی کسی بھی کولیگ کے بارے میں بات کرنا بے کار تھا۔ اس کے بعد انیس کے علاج معالجہ کی بھاگ دوڑ کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا جو کئی ہفتے دن جاری رہا۔ جواب ایک ہی تھا۔ بس میرو کی تہہ بڑھتی اور اسے لاکھ روپے کا انجکشن... اور پھر بھی امید کی کرنیں موجود۔ انیس کے والدین اور اس کے قریبی عزیزوں سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بیماری بڑی خاموشی سے اسے دن بدن

دبوچتی چلی جارہی تھی۔ وہ ان کے سامنے تھا اور ان کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔ مصائب اور ابتلا کے ان تاریک ترین دنوں میں انیس نے عمرے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ اپنے بچے کی بے شمار دیگر خواہشوں کی طرح والد نے اس کی یہ خواہش بھی فوراً پوری کی۔ والد، والدہ، انیس اور انیس کے ایک تایا عمرے کے لیے گئے۔ خدا کے حضور سر جھکایا اور دعائیں کیں۔ یہ دعائیں اس طرح تو پوری نہ ہوئیں جس طرح یہ لوگ چاہتے تھے لیکن انہوں نے انیس کا باقی کا سفر آسان ضرور بنا دیا۔ اس کے ساتھ اللہ نے ان سب لوگوں کو یہ بہت بڑی آزمائش جھیلنے کا حوصلہ بھی فراہم کیا۔ انیس کا باقی کا سفر کافی مختصر ثابت ہوا۔ وہ بہ ظاہر چل پھر رہا تھا لیکن اندر سے بیماری کے جملے اسے سمار کرتے چلے جارہے تھے۔ انہی دنوں انیس نے یہ ارادہ بھی باندھا کہ وہ باقی کا قرآن پاک حفظ کرے گا اور عالم کا کورس بھی کرے گا لیکن اسے اپنے یہ ارادے پورے کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ بیماری سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکا تھا اور پھر ایک دن وہ زخموں سے چور تھک کر گر پڑا۔ وہ کینسر سے اپنی طویل جنگ ہار گیا تھا۔ اسے برین ہیمرج ہو گیا۔ ناک سے خون رسنے لگا۔ بدحال والد نے اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا۔ وہ بے ہوش تھا..... اور آٹھ دن بے ہوش ہی رہا۔ کبھی ہوش میں نہ آسکا۔ اسپتال میں کئی دن اس کو مصنوعی تنفس دیا جاتا رہا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے حواس میں تو نہیں ہے لیکن شاید سن سب کچھ سکتا ہے۔ اب امید کی ہر کرن ڈوب چکی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ ایک دن غمزدہ والد آنسوؤں سے تر ڈاڑھی کے ساتھ اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اس کے کان میں بولے۔ ''انیس! جارہے ہو.....؟ اچھا یار جاؤ۔ تم نے جانا ہی ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''وہاں پہنچو تو سب سے ہمارا سلام کہنا۔ ان سب سے جو ہم سے پہلے چلے گئے اور ہمیں بھی ایک دن جن کے پاس پہنچنا ہے.....''

دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ انیس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو نمودار ہوئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا..... میں نے آپ کی بات سن لی میرے ابو۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ تاریخ تھی 8 اگست 2009، اور وہ ہفتے کی دردناک سہ پہر تھی۔

اشفاق صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر درد کی سلوٹیں تھیں۔ میں بھی گم صم بیٹھا رہا۔ اس انوکھی ڈائری میں چھپی کہانی پر غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''تو کیا وہ سب کچھ تصوراتی تھا اشفاق صاحب؟ میرا مطلب ہے ڈاکٹر ثمینہ کی مہربانیاں، وہ گرین ہوپ اسپتال، ایم ڈی مبشر رحیم، بون میرو کی تبدیلی.....؟''

''ہاں طاہر..... وہ سب تصوراتی تھا۔ لیکن وہ ہو بھی سکتا تھا..... ہاں ہو نہ سکا۔ وہ سب کچھ انیس کے ساتھ ہی چلا گیا۔'' وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بات جاری رکھتے ہوئے جذباتی انداز میں بولے۔ ''وہ سب کچھ انیس کے ساتھ ہی مر گیا۔ وہ شاندار اسپتال، خدا ترس مبشر رحیم۔ اس کے اسپتال کا دردمند، مہربان عملہ..... اور طاہر، اس کے ساتھ وہ سارے موسم اور تہوار بھی مر گئے جو انیس کی زندگی میں آئے تھے اور وہ سارے خوب صورت سفر جو اس نے کرنے تھے، اور وہ سالگرہیں جو اس نے منانی تھیں..... ہاں وہ سارے خوشی کے موقعے..... وہ ٹرافیاں، وہ کپ، وہ کامیابیاں، ڈگریاں، وہ سہرے کے پھول، وہ سب کا سب چلا گیا۔ ایک فرد جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا سارا مستقبل بھی چلا جاتا ہے..... ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے، انیس کے ساتھ نایاب پھولوں کی وہ کلیاں بھی مر گئیں جو اس کے گھر کے باغیچے میں کھلنا تھیں اور وہ پرندے بھی مر گئے جو اس نے اور سنبل نے پالنے تھے اور سنبل کی وہ ہنسی بھی جو ان کے آنگن میں گونجنا تھی..... اور اس کے ساتھ علیزا اور فیضان بھی اور ستارہ آنکھوں والا گول مٹول ذیشان بھی..... سب کا سب چلا گیا۔ کیا کیا خوب صورت امکانات تھے جو انیس اپنے ساتھ لے کر قبر میں جا لیٹا۔''

کتنی ہی دیر ہم دونوں گم صم بیٹھے رہے۔ اس بے پناہ درد کو محسوس کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے جو سترہ سالہ انیس کے والدین اور بہن بھائیوں نے اس کے لیے جھیلا۔ ذہن میں آیا، اس وطن عزیز میں جانے اب بھی کتنے انیس درد کے اس دریا سے گزر رہے ہیں۔ تشخیص اور علاج کی ناکافی سہولتوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ بدحال اسپتالوں میں دھکے کھا رہے ہیں اور اپنی بیماری کو پال رہے ہیں۔ وہ کینیڈا کے ''شیروانی'' کی طرح صحت یاب کیوں نہیں؟ کہاں ہے ہمارا وی گرین ہوپ اسپتال..... کہاں ہے؟

انیس چلا گیا ہے لیکن وہ جاتے جاتے ہم سب کے لیے ایک سوال چھوڑ گیا ہے اور وہ سوال یہی ہے۔ کہاں ہے وہ وی گرین ہوپ اسپتال..... وہ کہاں ہے اور اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ ہم سب کو انیس کے سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے۔

✖

کرشمہ

طاہر حسن وید نسل

دولت ہو یا اولاد... دنیا میں بہت بڑا امتحان ہے۔ جس کو مل جائے وہ بھی بے چین اور جسے نہ ملے وہ بھی بے سکون۔ جسے جو مل جائے اسے بھی قناعت نہیں اور جسے جتنا مل جائے اسے بھی صبر نہیں... عجیب منطق اور قدرت کی اپنی تقسیم ہے لیکن... ہر صورت میں آزمائش صرف اور صرف انسان کی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا لیکن... جسے سمجھ آجائے اسے اللہ کی رضا میں راضی ہو جانے کا سلیقہ آجاتا ہے۔



بے شمار محبتوں کی بھیڑ میں تنہا رہ جانے والوں کا قصہ

وہ اکتوبر کی ایک خنک صبح تھی۔ موسم آج نسبتاً سرد تھا۔ میں اپنے نرم گرم بستر میں بیٹھی کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ رات ہونے والی طوفانی بارش تھم چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے درخت کی شاخیں آج اپنے پھلوں اور پتوں سے محروم ہو چکی تھیں۔

میں سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور سب سے چھوٹی بھی۔ اس لیے سب نے بڑے ناز و نخروں سے پالا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ امی کسی بات پر مجھے ڈانٹ دیتیں۔

میں تنگ کر کہتی۔ "آپ تو مجھ سے پیار ہی نہیں کرتیں۔"

"ہاں ہاں، پیار نہیں کرتی۔ جتنی دعاؤں سے تجھے حاصل کیا ہے، ساری زندگی کسی چیز کے لیے نہیں کہیں۔"

ابو جان بھی اکثر مسکراتے ہوئے اپنے دوستوں اور عزیزوں میں کہتے۔ "بھئی ماشاء اللہ سات بیٹوں کی اس خوب صورت محفل میں ہمارا پیارا سا کنول کا پھول کھل ہی گیا آخر۔"

بیٹا ہو یا بیٹی، دونوں کی اپنی اپنی اہمیت اور رونق ہوتی ہے۔ امی مجھے بتایا کرتی تھیں کہ ان سے زیادہ ابو جان کو بیٹی کا شوق تھا۔ سب سے بڑے بھائی فیصل کے بعد فہد، عامر اور ذیشان پیدا ہوئے۔ عرفان، صالح اور ارقم کی مرتبہ امی ابو کی شدید خواہش تھی کہ اب اللہ پاک ایک بیٹی دے دے۔

اللہ پاک بندے کو آزماتے ہیں کہ یہ مجھ پر بھروسا کرنے اور مجھ سے مانگنے میں کہاں تک جاتا ہے اور اللہ پاک آزماتے اسے ہی ہیں جن پر ان کی نظرِ خاص ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ نے انسان کی تقدیر میں لکھ دیا ہو۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے رب کو پکارے اور وہ اس کی پکار نہ سنے۔ یہ بڑی عجیب حقیقت ہے کہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تقدیر اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری دعا بھی قبول کر لیتے ہیں۔

میری پیدائش پر امی ابو اور بھائیوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ اس وقت کی پرانی تصویریں ہمارے البم میں موجود تھیں اور ان تصویروں کو دیکھ کر اس خوب صورت دن کی بے مثال مسرتوں کا احساس ہوتا تھا۔

امی اور ابو کی طرف کے تقریباً سارے رشتے دار دوسرے شہروں میں رہتے تھے اور سال میں ایک آدھ دفعہ ہی ملنا ہوتا تھا۔ شائستہ آنٹی یہاں لاہور میں ہی رہتی تھیں، وہ امی کی بچپن کی دوست تھیں۔ بہت گہری اور شاندار دوستی تھی ان کی۔ دونوں کا اکثر ایک دوسرے کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ اس وجہ سے ان کے میاں بھی ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے لگے تھے اور ان کے درمیان بھی ایک اچھی اور..... بے تکلفی والی دوستی پروان چڑھ گئی تھی۔ میری پیدائش پر شائستہ آنٹی نے ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا اور اس دعوت کی تصویریں بھی ہمارے فیملی البم میں موجود تھیں۔ شائستہ آنٹی ایک مقامی اسپتال میں نرسنگ کے شعبے میں انچارج کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ بچپن میں ہم انہیں آنٹی شائستہ کہتے تھے لیکن بعد میں خالہ شائستہ کہنے لگے۔

وقت گزرتا گیا اور بہت اچھا گزرا۔ میں اب یونیورسٹی میں تھی اور بی ایس ہی میتھ میٹکس کر رہی تھی۔ بڑے چار بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور باقی پڑھ رہے تھے یا جاب کر رہے تھے۔ ابو اب کافی بوڑھے ہو چکے تھے، اس لیے بڑے بھائی کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ہمارا فرنیچر کا کام تھا۔ زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی کہ ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے ہم سب کو بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ امی ابو عید کے تیسرے دن فیصل آباد میں مقیم چچا جان سے ملنے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا۔ میرے پیارے ابو تو موقع پر ہی ختم ہو گئے۔ امی جان دو دن ایک مقامی اسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں رہیں پھر وہ بھی ہم سے جدا ہو گئیں۔ اس حادثے نے ہم سب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ خاص طور سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری روح تک زخمی ہو گئی ہے۔

امی ابو کے بعد پانچ چھ ماہ تک میں ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ رہی۔ بڑے بھائی شادی شدہ تھے، چھوٹے پڑھ رہے تھے۔ اس لیے وہ کوشش کے باوجود بھی مجھے بہت کم وقت دے پاتے تھے۔ اس موقع پر خالہ شائستہ نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا۔ وہ ہفتے میں دو تین دفعہ ہمارے گھر کا چکر ضرور لگاتیں۔ کبھی مجھے شاپنگ کے لیے لے جاتیں۔ کبھی ہم اکٹھے بیٹھ کر کوئی "سوپی" دیکھ لیتے۔ رفتہ رفتہ میرا ڈپریشن کم ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں خالہ شائستہ کے ساتھ انسیت کا رشتہ بھی اور گہرا محسوس کرنے لگی۔ وہ تھیں ہی اس قابل۔

ہاں تو میں بات کر رہی تھی کہ اس رات کافی بارش ہوئی تھی اور اب میں اپنے کمرے میں بیٹھی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ اسی دوران میں باہر مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے دوسری کھڑکی کی طرف آئی اور نیچے جھانکا۔ ہمارے پورچ میں سفید سوزوکی ہیران پارک ہو رہی تھی۔ میں جان گئی کہ خالہ شائستہ آئی ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنے کمرے کی حالت درست کی اور باہر لاؤنج میں آ گئی۔ خالہ بھابی سے مل رہی تھیں۔ خالہ شائستہ نے چھ سات سال پہلے اسپتال والی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اب وہ شوقیہ طور پر اپنے میاں کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ ان کے میاں کو ہم انکل ظہیر کہتے تھے۔ وہ ایک پندرہ روزہ میگزین نکالتے تھے۔ اس میگزین میں خواتین والے پورشن کو خالہ شائستہ ہینڈل کرتی تھیں۔ آج کل وہ خود لکھتی بھی تھیں اور [illegible]

پڑھے جاتے تھے۔ پچھلے دنوں خالہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ویسی فیملیز کے بارے میں ایک سیریل لکھ رہی ہیں جن میں بچے یا پھر بچی کی شدید خواہش ہوتی ہے اور عرصہ دراز کے بعد قدرت ان کی یہ خواہش پوری کر دیتی ہے۔ انہوں نے ہماری اپنی فیملی کی مثال بھی دی تھی اور بتایا تھا کہ سات بھائیوں کے بعد میرے پیدا ہونے پر میری فیملی کے جذبات اور احساسات کیا تھے۔

آج خالہ آئیں تو رسمی گفتگو کے بعد پھر یہی موضوع چھڑ گیا۔ خالہ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے چند ایسے والدین سے رابطے کیے ہیں جن کو کئی بیٹوں کے بعد بیٹی یا پھر کئی بیٹیوں کے بعد بیٹا نصیب ہوا۔

میں نے پوچھا۔ ”خالہ! کیا آپ ایسی فیملیز سے انٹرویو کریں گی؟“

وہ بولیں۔ ”بیٹا جی! کروں گی نہیں..... شروع کر چکی ہوں۔ ایک فیملی سے پرسوں ملی تھی۔ ایک فیملی سے ملنے کے لیے ہفتے کو لاہور سے باہر جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”فیصل آباد..... یہ خاتون ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہیں۔ تیس سال پہلے، اللہ نے انہیں آٹھ بیٹیوں کے بعد بیٹا عطا کیا۔ ٹیلی فون پر ان خاتون سے میری بات ہوئی ہے۔ اب آمنے سامنے بیٹھ کر ان سے تفصیلی انٹرویو کروں گی۔“ پھر ایکدم انہوں نے جیسے چونک کر کہا۔ ”اور اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو تم بھی آ جاؤ۔ کمپنی رہے گی۔“

”میں؟“

”ہاں بھئی، کئی دفعہ تم نے کہا ہے کہ فیصل آباد سائڈ پر کبھی نہیں گئی ہو اور فارغ بھی تو ہو آج کل۔“

میں تین دن پہلے ہی فائنل پیپرز سے فارغ ہوئی تھی اور میرا دل بھی بہت چاہ رہا تھا ان دنوں کہیں آؤٹنگ کرنے کا..... تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد میں نے خالہ شائستہ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

ہفتے کے روز تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہم فیصل آباد کی گلستان کالونی میں تھے۔ ہمیں مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ تقریباً ایک کنال میں بنا ہوا سادہ سا گھر تھا لیکن اس کی تعمیر سے نفاست جھلکتی تھی۔ گیٹ پر احمد خان کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ خالہ نے دروازہ بیل بجائی تو فوراً ہی ایک ادھیڑ عمر خاتون نے چھوٹا گیٹ کھول دیا۔ یہی [illegible]

ایک کہانی ان گنت بیٹیوں ایک بیٹوں کیلئے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ نومبر 2015 کی جھلکیاں

انقلابی

اس شخص کی حکایت جنوں جس نے روس کی کمیونسٹ حکومت کو ختم دیا

چار شادیاں

عرب کو ٹکڑوں میں بانٹ کر عراق، شام، اردن جیسے ملک پیدا کرنے میں کردار ادا کرنے والی کی داستان

[illegible] کی [illegible]

ماہ نومبر سے بڑی شخصیات کا مختصر مختصر سا تعارف

داستان کرب

ماضی میں بادشاہان ملزموں کو کس طرح اذیت دے کر ہلاک کرتے تھے

[illegible]

ایک انوکھی ڈکیتی سے شروع ہونے والی انتہائی دلچسپ سچ بیتی

[illegible] کی جوانی

اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، تاریخی واقعات، سچے قصے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ ..... ہر شمارہ خاص شمارہ ..... ہر شمارہ خاص شمارہ

انتظار کر رہی تھیں۔

خالہ شائستہ سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ ان کے انداز میں بے حد گرمجوشی تھی۔ اچانک مجھے اپنے کاندھے پر نمی محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹی۔

"ارے آنٹی! یہ کیا..... آپ کی آنکھوں میں آنسو؟"

"کچھ نہیں بیٹی! بس ایسے ہی یہ سوچ کر آنکھیں بھیگ گئیں کہ بیٹا ہو یا بیٹی، والدین کو دونوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کسی ایک سے بھی محرومی..... بہرحال محرومی ہی ہوتی ہے۔"

وہ شوہیر سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی ہمیں اندر لے آئیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ "اصل میں شائستہ نے فون پر تمہاری آمد کی اطلاع بھی دی تھی اور بتایا تھا کہ آپ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہو اور سب کی لاڈلی بھی۔" پھر وہ خالہ شائستہ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "شائستہ! آپ کیسی ہیں؟ بہت تجسس تھا آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا۔"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ سنائیں آج کل کیا مصروفیت ہے؟" خالہ نے بے تکلفی سے کہا۔

"بس آج کل ایک پرائیویٹ اسکول میں دو تین گھنٹے کے لیے ٹیچنگ کر رہی ہوں۔ بالکل فارغ بھی تو نہیں بیٹھا جاتا نا۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ ان کی مسکراہٹ میں خلوص اور خوش خلقی کی جھلک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہر ملنے والے کو اپنے دل میں جگہ دیتی ہیں۔

وہ باتیں کرتے ہوئے وقفے وقفے سے مجھے دیکھ لیتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے دیکھا تو میں بھی انہی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جھینپ گئیں۔

"ماشاء اللہ بہت ہی پیاری بچی ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا پھر ملازمہ کو آواز دی اور اسے مشروب لانے اور کھانا لگانے کے بارے میں ہدایات دیں۔

ہمارے کافی منع کرنے کے باوجود انہوں نے ہمارے لیے دوپہر کا کھانا لگوا دیا۔ "کھانا" کہنا تو ناانصافی ہوگی، یہ ان کی طرف سے ایک پُرتکلف دعوت ہی ہوگئی تھی۔ کھانے کی میز پر انہوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا ایان یونیورسٹی گیا ہوا ہے اور شام تک واپس آئے گا۔ ان کے شوہر احمد خان کو فوت ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے۔ وفات سے پہلے وہ اپنی تمام بیٹیوں کی ذمے داری سے سبکدوش ہو چکے تھے۔

پُرتکلف کھانے کے بعد ہم واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ خالہ شائستہ نے اپنی فوت شدہ ساس اور آنٹی کے خیالات قلم بند کرنے لگیں کہ جب آٹھ بیٹیوں کے بعد اللہ پاک نے ان کو بیٹا دیا تو ان کے احساسات کیا تھے۔ اس وقت مسز احمد یعنی آنٹی صفیہ کا ایک جملہ مجھے بہت اچھا لگا۔ انہوں نے کہا۔ "خوشی تو بے انتہا ہوئی شائستہ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اگر ایان کی جگہ پھر بیٹی ہی ہوتی تو آج مجھے اس سے بھی اتنا ہی پیار ہوتا جتنا اپنے دوسرے بچوں سے ہے۔"

ان کی اس بات میں یہ عالمگیر سچائی جھلک دکھا رہی تھی کہ اولاد "من چاہی" ہو یا نہ ہو لیکن اس کے اندر قدرت نے وہ کشش اور مقناطیسیت رکھی ہوتی ہے کہ وہ والدین کے دلوں میں جگہ بنا کر رہتی ہے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ ہم شام چار بجے تک فیصل آباد سے واپس چل پڑیں گے اور نو دس بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے۔ آنٹی صفیہ سے بڑی مزے مزے کی باتیں ہوئیں اور ہماری اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ شام کی چائے سے فارغ ہوئے تو چھ بج چکے تھے۔ آنٹی صفیہ نے کہا۔ "بھئی اب تو رات ہونے والی ہے۔ اس وقت اتنا لمبا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ لوگ صبح روانہ ہو جانا۔"

"ارے نہیں صفیہ باجی! ایسے تو اچھا نہیں لگتا نا۔ ایسے تو ہم رحمت کے بجائے زحمت بن جائیں گے۔" خالہ نے کہا۔

"نہیں بھئی! ایسی بات تو نہ کریں۔ آپ دونوں کی کمپنی میں تو اتنا مزہ آیا ہے کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا..... اور پھر پرانی یادیں بھی تازہ ہو گئیں میری۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے آنٹی کہ اتنی پُرتکلف چائے اصل میں آپ کی سازش تھی، ہمیں لیٹ کر دینے کے لیے۔"

خالہ اور آنٹی صفیہ دونوں ہنسنے لگیں۔

مجھے کچھ الگ سا محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہاں کوئی بات مجھ سے چھپائی جا رہی ہے۔ کسی وقت صفیہ آنٹی اور خالہ آپس میں کچھ کھسر پھسر بھی کرنے لگتی تھیں۔

خالہ شائستہ نے ظہیر انکل کو فون کیا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ یہ بھی کہا کہ وہ میرے گھر فون کر کے بھی اطلاع دے دیں۔ آج کی رات ہم یہاں فیصل آباد میں صفیہ آنٹی کے ہاں ہی ٹھہر رہے تھے۔

آنٹی کا بیٹا ایان آٹھ بجے کے قریب گھر آ گیا۔

کے سرد گرم نے ان کا دل بہت ہلکا کر چھوڑا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ کل تم نے دیکھا ہی تھا۔ تم سے ملیں اور تمہیں دیکھتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور رات کو جب ان کے مرحوم شوہر کا ذکر آیا تھا تو بھی ان کی آواز فوراً بھرا گئی تھی۔"

آنٹی شائستہ نے اپنی طرف سے وضاحت کر دی تھی لیکن پتا نہیں کیوں میں مطمئن نہیں ہوئی۔ میرے دل و دماغ میں یہ سوال بدستور اصرار تھا کہ کل رات والا واقعہ کیوں ہوا۔

☆☆☆

صبح ناشتا کرتے کے ساتھ ہی ہم لوگ نکل پڑے۔ ہمیں الوداع کرتے وقت بھی آنٹی کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ پہلے وہ خالہ شائستہ سے ملیں۔ "بہت بہت شکریہ شائستہ آپ یہاں آئیں۔ میری پرانی یادیں تازہ کیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ بہت بہت شکریہ۔"

پھر آبدیدہ نگاہوں سے انہوں نے مجھے دیکھا اور گلے لگایا۔ "ماشاء اللہ بڑے خوش نصیب تھے تمہارے والدین، جنہیں اتنی پیاری اور سمجھدار بیٹی ملی۔"

"خدا حافظ آنٹی۔ کبھی آپ بھی ہم سے ملنے لاہور آئیں۔" میں نے کہا۔

وہ کھانستے ہوئے بولیں۔ "طبیعت خراب رہتی ہے بیٹی۔ لمبے سفر سے دل بہت گھبراتا ہے۔ پھر بھی، اگر دانہ پانی ہوا تو ضرور آؤں گی۔"

ہم لاہور واپس آ گئے۔ خالہ شائستہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ میں چھٹیوں کے بعد پھر یونیورسٹی جانے لگی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن پتا نہیں کیوں فیصل آباد والا ٹور ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ خاص طور سے آنٹی صفیہ کا عجیب و غریب رویہ۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پے در پے پیش آنے والے مشکل حالات انسان کو جذباتیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے غموں اور خوشیوں کا ادراک بہت بڑے پیمانے پر کرنے لگتا ہے۔ ذرا سی بات پر رو دینا یا خوشی سے نہال ہو جانا، ایسے لوگ کبھی کبھی دور دراز کے رشتے ناتوں میں بھی بڑی اپنائیت اور چاہت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شاید صفیہ آنٹی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

آٹھ دس روز بعد ایک دن خالہ شائستہ ہمارے گھر آئیں تو شام کے فوراً بعد ہی تیز طوفانی بارش شروع ہو گئی اور وہ بیچاری کو گھر واپس نہ جا سکیں۔ باقی اہلِ خانہ کے سونے کے بعد بھی میں اور خالہ جاگتے رہے اور کھڑکیوں پر بارش کی بوچھاڑیں دیکھتے رہے۔ جلد ہی میری زبان پر وہ سوال آ گیا جو پچھلے کئی روز سے دل و دماغ کو الجھا الجھا کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "خالہ! آپ نے بھی کوئی بات مجھ سے چھپائی نہیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اب لگتا ہے کہ فیصل آباد میں آپ نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپایا ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آنٹی صفیہ کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ کیا وہ مجھے پہلے سے جانتی تھیں یا میرے بارے میں ... انہیں کوئی خاص بات معلوم تھی؟"

خالہ شائستہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ شدید تذبذب میں نظر آئیں۔ جیسے مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہوں اور یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ کچھ چھپایا نہ جائے، جو کچھ ہے بتا دیا جائے۔ میرے مسلسل اصرار نے انہیں شدید کشمکش سے دوچار کر دیا۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے سونے کی پشت سے ٹیک لگائی اور لمبی سانس لے کر بولیں۔ "کنول! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میں جو تمہیں بتاؤں گی، وہ ہمیشہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں خالہ۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں بتاؤں، تم اسے اپنی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دو گی۔"

"آپ جیسا کہیں گی، میں ویسا ہی کروں گی۔ میں آپ کی تمام شرائط سنے بغیر انہیں قبول کرتی ہوں۔"

خالہ نے کھڑکیوں سے باہر موسلا دھار بارش کی بوچھاڑیں دیکھیں اور کہا۔ "وہ بھی ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ میں اسپتال کے گائنی وارڈ میں نائٹ ڈیوٹی پر تھی۔ اس وقت لیبر روم میں دو عورتیں ایسی تھیں جنہیں میں اچھی طرح جانتی تھی۔ دونوں اس وقت کسی بھی وقت ایک نئی زندگی کو وجود دے سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو تمہاری ماں یعنی میری گہری سہیلی تھی ... اور دوسری یہی صفیہ نامی عورت تھی جس سے تم پچھلے ہفتے فیصل آباد میں مل کر آئی ہو۔ دونوں عورتیں شدید خدشات میں مبتلا تھیں۔ میری سہیلی سات بیٹوں کے بعد پھر بچے کو جنم دینا نہیں چاہتی تھی اور صفیہ آٹھ بیٹوں کے بعد پھر ایک اور بیٹی نہیں چاہتی تھی ... تو اس رات ہم تینوں نے باہمی رضامندی کے ساتھ ایک اہم فیصلہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ تم بات کو کچھ کچھ سمجھ گئی ہو۔ وہ فیصلہ یہی تھا کہ اگر بچے کی ولادت دونوں

عورتوں کی شدید خواہش کے برعکس ہوئی تو ہم بچوں کو بدل دیں گے۔ آٹھ بہنوں کو بھائی دے دیں گے اور سات بھائیوں کو بہن دے دیں گے۔ یہ بڑا انوکھا فیصلہ تھا اور یاد رہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے زچگی سے پہلے بچے کی جنس معلوم کرنے کی سہولت نہیں تھی۔ وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں سال گزرنے کے بعد مجھے آج بھی اس کا ایک ایک پل یاد ہے۔ رات کے آخری حصے میں وہی کچھ ہوا تھا جس کے خدشات تھے۔ تمہاری ماں نے آٹھویں بیٹے کو جنم دے دیا اور صفیہ نے تیسری بیٹی کو۔ یہ دونوں گھرانوں کے لیے نہایت مایوس کن اور تلخ رات ثابت ہو سکتی تھی لیکن ہم نے اسے خوشیوں اور قہقہوں سے بھرپور رات میں بدل دیا۔ اس رات اسپتال کے گائنی وارڈ میں اتنی مٹھائی تقسیم ہوئی تھی کہ کھانے والوں کی ہمت جواب دے گئی تھی۔"

خالہ شائستہ بول رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ جیسے ماضی کی اس برساتی رات کو اپنے تصور میں زندہ دیکھ رہی تھیں۔

میں سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ خالہ رک رک کر اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں بچوں کے باپوں اور دیگر عزیزوں کو اس حقیقت سے بے خبر رکھا گیا تھا اور اس صورتِ حال کے مطابق یہی درست تھا۔ بہرحال اللہ غلطیاں معاف کرنے والا ہے۔

آخر میں خالہ نے کہا۔ "اب تمہارے امی ابو اس دنیا میں نہیں۔ صفیہ کے شوہر بھی فوت ہو چکے ہیں۔ صرف صفیہ حیات ہے۔ وہ بھی اب بیمار رہتی ہے۔ وہ بڑے عرصے سے میری منت کر رہی تھی کہ اس کی زندگی کا کچھ پتا نہیں، وہ ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ میں کوشش کے باوجود اس کی بات نہ ٹال سکی۔ مجھے معاف کرنا کنول بیٹی! میں نے تم سے انٹرویو اور آرٹیکل لکھنے والا جھوٹ بولا ..... بہرحال یہ جھوٹ اس لیے بھی قابلِ معافی ہے کہ اس کی وجہ سے ایک ماں کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی ہے۔ اس نے تمہیں جی بھر کر دیکھ لیا ہے، پیار کر لیا ہے....."

میں حیرت زدہ بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر کسی سنسنی خیز فلم کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔

باہر بادل دہاڑ رہے تھے اور پانی برس رہا تھا۔

اس رات کا منظر بھی واقعی بہت پراسرار اور عجیب تھا۔

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(رجسٹرڈ یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

خود اپنے دام میں

طاہر جاوید مغل

گھر کو قید خانہ سمجھنے والے جب کھلی فضا کی تمنا کرتے ہیں تو راستے میں جنگل، صحرا، بستی، سب ملتا ہے مگر... گھر نہیں ملتا... جو اپنا ہوتا ہے اور جہاں اپنے ہوتے ہیں... وہ بھی آوارہ گردی کرتے نکلے تھے اور جب پلٹ کر دیکھا تو اپنا نشان بھی کھو چکے تھے۔

دام میں پھانسنے والوں کی بے دم سازشوں کا قصہ

موٹر سائیکل چرانے کے لیے نادر اور وسیم کا طریقہ کار اچھوتا اور انوکھا تھا۔ انہوں نے جو موٹر سائیکل چرانا ہوتی تھی، بالکل اسی جیسی ایک اور موٹر سائیکل لاکر اس کے بالکل قریب کھڑی کر دیتے تھے، اگر موٹر سائیکل کو وائر لاک لگا ہوتا تھا تو وہ بھی اپنی موٹر سائیکل کو ویسا ہی وائر لاک لگاتے تھے۔ نادر تالا کھولنے میں ماسٹر تھا۔ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ موقعے پر پہنچتا اور اپنی موٹر سائیکل کے بجائے دوسری موٹر سائیکل کا تالا کھولنے میں مصروف

ہوجاتا تھا۔ چند سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر وہ موٹر سائیکل لے اڑتا تھا، کچھ دیر بعد وسیم موقع پر پہنچتا اور وہ اپنی والی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے لے جاتا تھا۔

پچھلے چھ مہینے میں انہوں نے کئی درجن موٹر سائیکلیں اسی طرح اڑائی تھیں۔ ان چھ مہینوں میں فقط سات آٹھ دفعہ ایسا ہوا تھا کہ موٹر سائیکل کا تالا کھولنے کے دوران میں موٹر سائیکل کے مالک یا اس کے کسی ساتھی نے نادر کو دیکھ لیا تھا۔ ایسے موقعوں پر کچھ اس طرح کا مکالمہ ہوتا تھا۔

موٹر سائیکل کا مالک بھاگا ہوا آیا تھا۔ ''ارے، یہ کیا کر رہے ہو بھئی؟''

نادر نے چونک کر موٹر سائیکل کو دیکھا..... تھوڑا سا غور کیا..... اور پھر ماتھے پر ہاتھ مارتا ہوا کہتا۔ ''اوہ مائی گاڈ..... ویری ویری سوری بھائی صاحب! میری موٹر سائیکل تو یہ کھڑی ہے۔ میں آپ کی موٹر سائیکل میں چابی لگا رہا ہوں۔''

برابر میں واقعی نادر کی اپنی موٹر سائیکل کھڑی ہوتی تھی جو کم و بیش اسی طرح کی ہوتی تھی۔ بات موٹر سائیکل کے مالک کی سمجھ میں آجاتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے کچھ اس قسم کی بات کہتا تھا۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ویری سوری۔ معافی چاہتا ہوں۔'' نادر دوبارہ معذرت کرنے لگتا تھا۔

''کوئی بات نہیں یار۔ ایسا ہوجاتا ہے۔'' موٹر سائیکل کا مالک خوش خلقی کا مظاہرہ کرتا۔ بات ختم ہوجاتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نادر اور وسیم کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنا ''کاروبار'' بڑھانے کا خیال بھی ان کے ذہن میں جگہ بنانے لگا۔ مسروقہ گاڑیاں خریدنے والوں کے ساتھ بھی ان کے اچھے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اب انہوں نے دھیرے دھیرے موٹر سائیکلوں کے ساتھ ساتھ کاروں پر بھی توجہ دینا شروع کردی تھی۔ آغاز میں اس کام میں تھوڑی سی دشواری تو پیش آئی لیکن پھر وہ اپنے کام میں ماہر ہوتے چلے گئے۔ شروع میں انہوں نے کرائے کی کاریں استعمال کیں لیکن پھر ایک ساتھ اپنی دو ذاتی گاڑیاں خرید لیں۔ ایک سفید مہران اور دوسری سلور ہنڈا سٹی۔ دونوں نئے ماڈل کی تھیں اور سڑکوں پر عام نظر آتی تھیں۔

نادر اور وسیم کا طریقہ کار وہی پرانا اور آزمودہ تھا۔ اس میں رسک تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سفید مہران اور سلور سٹی ہی چوری کر رہے تھے۔ انہوں نے جس گاڑی کو چرانا ہوتا تھا عموماً پہلے اس پر اچھی طرح ہوم ورک کر لیتے تھے۔ ایک یا دو دن پہلے قریب سے اس کا جائزہ لیتے تھے۔ اس کے سیٹ کور، اسٹیئرنگ کور اور الارم وغیرہ دیکھتے تھے۔ پھر اپنی ذاتی گاڑی کو بھی اس سے ملتی جلتی شکل دینے کی کوشش کر لیتے تھے۔ بعدازاں موقع دیکھ کر وہ اپنی گاڑی کو چوری کی جانے والی گاڑی کے برابر یا بالکل پاس کھڑا کر دیتے تھے، صورتِ حال پرکھنے کے بعد نادر موقع پر پہنچتا اور اپنی گاڑی کے بجائے بڑے بے پروا انداز میں دوسری گاڑی کے دروازے کھولنے میں مصروف ہوجاتا تھا۔ دروازوں کے بعد وہ چند سیکنڈ میں اگنیشن میں بھی چابی لگا لیتا اور گاڑی لے کر تو دو گیارہ ہوجاتا۔ دوسری گاڑی تو ظاہر ہے ان کی اپنی ہی ہوتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت بلا روک ٹوک اسے وہاں سے لے جاسکتے تھے۔ چوری کے دوران میں اگر کبھی کہیں کوئی بدمزگی ہوتی بھی تھی تو وہی رٹا رٹایا مکالمہ سننے میں آتا تھا۔

مالک پکارتا تھا۔ ''ارے بھئی! یہ کیا ہو رہا ہے..... کون ہو تم؟''

نادر تعجب سے گاڑی کو دیکھتا اس پر گہری نظر دوڑاتا پھر برابر میں کھڑی اپنی گاڑی کو دیکھتا اور ماتھے پر ہاتھ مارنے لگتا تھا۔ ''اوہ مائی گاڈ.....''

کام بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی۔ اب نادر اور وسیم کے پاس کافی رقم جمع ہوچکی تھی۔ دونوں ہی غیر شادی شدہ تھے مگر دونوں کے دلوں میں ارمان بھی مچلتے تھے۔ کچھ خواب انہوں نے بھی دیکھنے شروع کردیے تھے۔ نادر کے والدین تو اس کے بچپن میں ہی فوت ہوچکے تھے..... دور کی ایک خالہ تھیں جنہوں نے اسے پالا مگر..... کچھ حالات کی سختیاں اور کچھ مقدر کی کارفرمائیاں کہ اسے اس گھر میں بھی نہ تو پیٹ بھر کر روٹی ملی اور نہ ہی اچھے مستقبل کو سنوارنے کے لیے کوئی مناسب تعلیم ہی دلوائی گئی..... خالی ذہن تو ویسے بھی شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے..... لمبی جمپ مارنے کی خواہش میں در در بھٹکتے ہوئے وسیم سے آن ملا..... جس کا ذہن بھی اس کی طرح باغیانہ خیالات کا مالک تھا..... اسے بھی اپنے ماحول سے فرار چاہیے تھا۔ والدین کی پیار بھری روک ٹوک کو سختیوں کا نام دے کر اس نے گھر چھوڑ دیا..... پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ والدین اس کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے..... ایک بہن تھی اس سے بھی اس

کی نہیں تھی..... لہٰذا جب کوئی اپنے گھر کی قدر نہیں کرتا تو عمر سفر میں ہی تمام کر دیتا ہے... بس جب اس کی ملاقات نادر سے ہوئی تو بھی بھائی سلام دعا آہستہ آہستہ گہری دوستی میں بدلتی چلی گئی۔ ایک دن ایک ہوٹل میں ڈنر کرتے ہوئے وسیم نے نادر سے کہا۔ "یار! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہ بزنس لپیٹ دینا چاہئیں۔"

"کیا مطلب؟" نادر نے چونک کر کہا۔

"یار! کافی کچھ حاصل ہو گیا ہے، اگر کہیں پکڑے گئے تو سب کچھ بھاڑ میں چلا جائے گا۔ پھر اتنا خیال ہے کہ دبئی چلے جائیں۔ وہاں کوئی چھوٹا موٹا دھندا کا کام کریں گے۔ سنا ہے کہ گاڑیوں کی درآمد کا بھی اسکوپ ہے۔" اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

"ہاں یار! کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔ چلو ایسا کرتے ہیں، بس اس سیزن کے آخر تک ایک دو لڑکیاں اور مار لیتے ہیں پھر دبئی والے پلان کے متعلق سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"یار! دیکھ لیں، میں تو کہتا ہوں اتنا ہی کافی ہے۔" وسیم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دنوں سے وسیم واقعی پریشان تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر جلد ہی انہوں نے اس کام سے ہاتھ نہ اٹھایا تو ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلط ہو جائے گا۔ ویسے بھی آج کل اسے اپنے سامنے والے گھر میں رہنے والی کلثوم اچھی لگنے لگی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کا پورا گھرانا انتہائی شریف اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا اور کلثوم بھی آج کل انٹر میں تھی..... جبکہ وہ خود میٹرک فیل تھا پھر بھی نگاہوں پر تو کوئی پہرا لگتا نہیں ہوتا..... ویسے بھی اس کے پاس اتنی دولت اکٹھی ہو چکی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ خوش رہ سکتی تھی..... اس کا دل اسے بار بار اکسا رہا تھا کہ بس ہو گیا سو ہو گیا..... اب جو ہے اس دلدل میں دھنسنے سے پہلے پہلے باقی پاؤں دھو کر صاف کر لیے چاہئیں تاکہ آگے کی زندگی بغیر کسی خوف اور بے سکونی سے بسر کی جا سکے۔ اس لیے وہ گاہے بگاہے نادر کو سمجھا آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

اس دن بھی یہی سمجھا کر بولا۔ "یار! اب تو ایک دم کل اسٹاپ پلانے کی کوشش نہ کر۔ جہاں اتنے عرصے سے سب اچھا جا رہا ہے، ایک دو دفعہ کے اور ہاتھ پھیر سے تو اتنا مال تو ہو جائے گا۔ ویسے بھی عید آنے والی ہے۔ عید کے بعد دیکھتے ہیں۔"

مختصر... مختصر

تحریر: محمد اسلم

سوال: تحمل کی زندگی اور شادی شدہ زندگی میں کیا فرق ہے؟

جواب: تحمل کی زندگی میں تحمل کا مطلب کورا دولت ہے اور شادی شدہ زندگی میں جوتا۔

سوال: مرسلہ: ریاض بھٹی۔ حسن ابدال

پڑوسی نے ملک صاحب کو اپنے بچوں میں گھن پا کر ان سے پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ اپنے بکرے کو کیا کھلاتے ہیں؟"

ملک صاحب بولے۔ "کون سا والا بکرا۔ سفید یا کالا؟"

پڑوسی نے کہا۔ "سفید والے کو۔"

ملک صاحب۔ "پیڑا کھلاتا ہوں۔"

پڑوسی نے پوچھا۔ "اور کالے والے کو؟"

ملک صاحب۔ "اسے بھی پیڑا کھلاتا ہوں۔"

پڑوسی نے پوچھا۔ "آپ اپنے بکرے کو کس سے ہلاتے ہیں؟"

ملک صاحب۔ "کون سے والے بکرے کو۔ سفید والا یا کالا والا؟"

پڑوسی بولا۔ "سفید والے کو۔"

ملک صاحب۔ "پالی سے۔"

پڑوسی نے پوچھا۔ "اور کالے والے کو؟"

ملک صاحب۔ "اس کو بھی پالی سے۔"

پڑوسی کو بڑا غصہ آیا۔ جھلاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اپنے بکرے کو کہاں باندھتے ہیں؟"

ملک صاحب۔ "کون سے والے بکرے کو۔ سفید والے کو یا کالے والے کو؟"

پڑوسی شدید غصے کے عالم میں بولا۔ "اب جب سارے سوالوں کے ایک ہی جواب دے رہے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہو کہ سفید والے کو یا کالے والے کو؟"

ملک صاحب نے کہا۔ "وہ دراصل سفید والا بکرا میرا ہے۔"

پڑوسی نے پوچھا۔ "اور کالا والا.....؟"

ملک صاحب۔ "وہ بھی میرا ہے۔"

مرسلہ: اختر حسین، کراچی

وسیم خاموش ہو گیا۔ باور طبیعت کا حلیم تھا۔ اکثر وہ اپنے موقف پر اڑ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں وسیم کو ہی جھکنا پڑتا تھا۔

ایک دن وسیم دوپہر کا کھانا کھا کر صوفے پر ٹانگیں پسارے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک باور آدھمکا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش بتا رہا تھا کہ وہ کوئی "خوشخبری" لے کر آیا ہے۔

"چل یار جلدی سے ڈنڈیل کھول۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وسیم نے گہری سانس لے کر سائڈ ٹیبل سے ڈنڈیل بک اور قلم اٹھایا۔ "کون سی ہے؟" وسیم نے پوچھا۔

"ہنڈا سٹی۔" باور نے چہکتے ہوئے کہا اور تفصیل لکھوانی شروع کر دی۔ "سیٹ کور بلیک ---- اسٹیئرنگ کور بلیک اور لیدر سیٹ کور بلیک ---- پچھلا ونڈ اسکرین پر روزوال کا نشان بنوانا ہے۔ اور ہم نمبر لیں گے ---- پچھلا ونڈ اسکرین پر ہنڈا کا بیج لگانا ہے۔"

وسیم ساتھ ساتھ لکھتا جا رہا تھا۔

ایکسٹرا پارٹس کے حوالے سے وہ دونوں آپس میں مشورہ اس پر مکمل کر چکے تھے۔ یہ کاروبار باور ہی کرتا تھا۔ گاہک کو مطلوبہ گاڑی کے پاس لے جا کر کھڑا کرنا اور کچھ دیر بعد واپس آ کر اپنی کے بجائے "مطلوبہ" گاڑی پر چابی آزمانا اور اگر اتفاق سے گاڑی کا مالک پکڑا جائے تو اس کے سامنے خفیف ہو جانے ---- کی اداکاری اور مظلومیت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کاموں میں باور ماہر ہو چکا تھا۔

باور نے وسیم کو گاڑی کے متعلق جو حلیہ تفصیل بتائی وہ کچھ اس طرح تھی ---- شکار کی جانے والی گاڑی اقبال ٹاؤن کے ایک مشہور پارک کے سامنے سڑک پر روزانہ صبح دس بجے سے شام ساڑھے چار بجے تک پارک رہتی تھی اور کسی رانا صاحب کی ملکیت تھی۔ آج منگل تھا۔ آج سے دو دن بعد یعنی جمعرات کو کار روانی کی جانی تھی۔ ان دو دنوں میں وسیم نے اپنی ایجوٹی انجام دینا تھی یعنی اپنی مدل سلور ہنڈا سٹی کو شکار کی جانے والی ہنڈا سٹی کے عین مطابق کر دینا تھا۔ جمعرات کو فیک ٹو فائی بجے باور نے اپنی گاڑی لے کر موقع پر پہنچنا تھا اور اسے شکار کی جانے والی گاڑی کے قریب پارک کر دینا تھا۔ اس نے پلازا ... میں جانا تھا اور پانچ دس منٹ بعد واپس آ کر دوسری گاڑی کو کھولنا اور لے اڑنا تھا۔ اس دوران میں کوئی اپ سیٹ ہوتا تو وہی رسمی سے جملے ادا کاری۔

اگلے دو دن وسیم نے اپنی "ایجوٹی" انجام دی۔ اس نے ایک بار خود بھی موقع پر جا کر گاڑی دیکھی۔ پھر اپنی گاڑی کو تیار کیا۔ تیاری کی زیادہ تر اضافی سامان سے متعلق تھی۔ اس کے دل کے اندر سے آواز آنے لگی کہ ابھی بھی وقت ہے وسیم کی بات مان لینی چاہیے اور دھن کا رخ کرنا چاہیے۔ یہاں ایک آرام دہ اپارٹمنٹ ہو۔ ایک خوب صورت لڑکی کا ساتھ ہو۔ جسے شریک حیات بھی بنایا جا سکے۔ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ ریلیکس گزارہ ہو ---- اور وہ گلی میں سے گزرنے لگے۔ بے فکر جو کام وہ اور وسیم کر رہے تھے بڑا سہل تھا۔ پکڑے جانا تو دور کی بات ہے وہ آج تک کسی شک شبہ میں گرفتار بھی نہیں ہوئے تھے پھر بھی ہو گیا تھا ---- آخر تھا تو لیبر چور ہی۔

☆☆☆

منصوبہ پلاننگ اور ابھی تیاری کے ساتھ اگلے پیچھے کے لگ بھگ باور اپنی گاڑی کو "مطلوبہ گاڑی" کے بالکل میں پارک کرنے کے لیے اقبال ٹاؤن کے معروف پلازا ... کی طرف روانہ ہو گیا ---- لیکن آج طبیعت میں وہ خوشی نہ تھی جو ہر بار وہ سے جوش اور ولولے کے ساتھ یہ کام انجام تک پہنچاتا تھا۔ جب دل کی بے کلی اور گھبراہٹ سے نظر چراتے ہوئے وہ اپنی منزل تک پہنچا تو وہاں مطلوبہ گاڑی تو موجود تھی مگر اس کے آس پاس پارکنگ کے لیے کوئی جگہ موجود نہیں تھی مگر باور تھیلے کی مکمل تیاری کر چکا تھا ---- باور کو اب تھوڑا انتظار کرنا تھا۔ لہٰذا وہ ایک جگہ رک کر مناسب جگہ خالی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ بے کلی بڑھنے کے ساتھ ساتھ انتظار لمبا ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک ایسا کچھ ہوا جس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی ---- پلازا کی طرف سے ایک عورت مضطرب انداز میں ---- تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف آئی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے یونیفارم

جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بال جدید انداز سے ترشے ہوئے تھے۔ اس نے نادر کی گاڑی کو بہ غائر دیکھ بھال کے بعد ایک نظر دیکھا اور بڑے اعتماد سے اس کا بچھلا دروازہ کھول دیا۔ عورت کے ہاتھ میں ایک وزنی بیگ تھا۔ اس نے یہ بیگ گاڑی کی نشست پر رکھا اور لرزاں آواز میں بولی۔

"میں اب جلدی سے نکل جاؤں یہاں سے....."

"کک — کیا مطلب؟" اس اچانک افتاد پر نادر ہکلایا۔

"مطلب وہی ہے جو بابا صاحب نے تمہیں بتایا ہے۔ اسے بچا کر لے جانا ہے.... خطرہ ہے، میں کہہ رہی ہوں، چلو نکلو یہاں سے۔" اس عورت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"آپ کون ہیں؟"

"یہ تعارف بعد میں ہوتے رہیں گے۔" وہ چیخ کر بولی اور دروازہ زور سے بند کر کے گاڑی سے نکل اور بڑی سڑک کی طرف تیزی سے نکل گئی۔

ابھی وہ بیس پچیس قدم ہی دور گئی ہوگی کہ ایک پولیس کار طوفانی رفتار سے موڑ کاٹ کر رکی۔ نادر نے دیکھا وہ عورت ایک دم بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

ایک پولیس والے نے اس دوڑتی ہوئی عورت سے کچھ کہا کر کچھ کہا۔ شاید اسے رکنے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہیں رکی۔ اسے دور جاتا دیکھتے ہوئے پولیس کار سے تڑتڑ کی خوف ناک آواز آئی۔ گویا عورت پر فائرنگ کی گئی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے سڑک پر گری اور کئی فٹ تک پھسل گئی اور اس کا خون پھیلتا چلا گیا۔

نادر کی رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس عورت کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا جو اس نے پھینکنے سے پہلے ہی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب رکھے ہوئے بیگ کی زپ کھولی۔ اندر جھانکا تو نظر آیا اس نے رسیے سے اوپر تک بھی خلا کر دیے۔ بیگ میں کئی فائل کے کچھ پھٹے اوراق تھے، جنہیں پھاڑ کر لیا گیا تھا۔ کوئی خاص چیز یا پیغام ہے، یہ کیا علم ہے.... انہیں تو صرف گاڑیاں چرانے کا کہا تھا.... وہ جرم کی دنیا میں اتنے آگے تک جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ نادر کے ذہن میں کھل بلی کو مچ گئی۔ اس کا ذہن اسے بتا رہا تھا کہ وہ کسی خطرناک ترین چکر میں پھنس گیا ہے اور اس چکر میں پھنسنے کی وجہ وہ تھی تھی رقم "وجہ" سے وہ اور دیگر ہمیشہ ایک کامیاب واردات کیا کرتے تھے۔ یعنی گاڑیوں کا بالکل ایک جیسا ہونا۔ کیا خبر تھی کہ خطرے سے بچنے کے لیے یہ ایک بھلی کی کارروائی انہیں اس کی منزل پر پہنچا دے گی جہاں سے زندگی بھر کے لیے ان کا پیچھا کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ عورت چند سیکنڈ پہلے ماری گئی تھی جبکہ نادر کی گاڑی کو دوسری گاڑی سمجھی گئی۔ جس کی مشابہت کے دھوکے میں وہ اس کی گاڑی کا دروازہ بے دھڑک کھول کر بیٹھی اور اسے ایک بہت بڑے اتفاق سے دوچار کر گئی۔

یہ بابا صاحب کون تھا آپ کس کی فائل تھی، یہ کون لوگ تھے، یہ کیا کرنا چاہ رہے تھے؟ اس سے نادر کو کچھ غرض نہیں تھی، وہ تو اب صرف اپنی جان بچانا چاہتا تھا اور جان بچتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ایک اور پولیس موبائل شور مچاتی آئی.... اس کے برابر چھ چھ سات سات موٹر سائیکل سوار بھی آن کھڑے ہوئے۔ دو اہلکار آتے ہی لاش کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ ایک اہلکار نے نادر کی کار کے بند شیشے پر دستک دی۔ نادر نے شیشہ نیچے کر دیا۔ اسے باہر آنے کا حکم دیا گیا اور وہ فائل بیگ سمیت لے لیا گیا۔

جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی سمجھ سے بالا تھا اور اس چیز نے نادر کو انتہائی خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ تو ایک معمولی چور تھا۔ اب اسے پھانسی کا پھندا اپنے سامنے نظر آ رہا تھا۔ جب پولیس اہلکار اسے پکڑ کر موبائل پر سوار کر رہے تھے اچانک اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور خود کو چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ عورت کی لاش کے پاس سے گزرا اور ایک گلی کی طرف لپکا۔

"رک جاؤ.... گولی مار دیں گے.... رک جاؤ۔" اس کے عقب سے آوازیں بلند ہوئیں۔

مگر وہ رکا نہیں۔ شاید اسے رکنا آتا ہی نہیں تھا۔ اگر رکنا آتا ہوتا تو سلیم کے کہنے پر چند دن پہلے ہی رک جاتا۔ ابھی وہ گلی میں بمشکل پندرہ قدم ہی دوڑا تھا کہ ایک بار پھر آتو بیگ والی لڑکی تڑتڑ کی آواز سنائی دی۔ اس کی کمر شرٹ میں گھسے ہوئے انگارے اترے اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ درد.... درد کا آسمان وہ اپنا وجود، اپنا شعور، اپنا سب کچھ ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ گرا اور اسی حالت میں دوسری سانسیں اس سے بھاگ رہی تھیں.... اور ایسا کیوں ہوا تھا؟ ایسا اس لیے ہوا تھا کہ اس کی گاڑی کسی دوسری گاڑی سے بالکل ملتی جلتی تھی....







باتدبیر

طاہر جاوید مغل

ازل سے ہوتا چلا آیا ہے کسی ایک کا تجربہ، کسی دوسرے کے لیے عبرت کا سبب بن جاتا ہے مگر افسوس... ایسا صرف چند لمحات کے لیے اور احساس کی حد تک ہوتا ہے اور پھر ہم دنیا کے جھمیلوں میں گم ہوجاتے مگر... یہ وقت کہیں گم نہیں ہوتا ہمیشہ روپ بدل کر پھر سے پرانے تجربات دہرانے آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا... دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے جب خود منہ کے بل گرتے ہیں تو دوسروں کے لیے ایسے ہی عبرت کا سبب بن جاتے ہیں جیسے ان کے لیے ان سے پہلے کے تجربات لیکن... صرف چند لمحات کے لیے۔

چاندنی راتوں میں ایک غیر متوقع انجام اور.....

عبرت کی روداد

''چاندنی رات کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے، اس سے... اٹھاؤ۔ اس کو رومانس کی طرف لاؤ۔'' ذیشان نے شہلا کا مجھاڑتے ہوئے کہا تھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ وہ بالکل مٹی کا بت بن گیا ہے۔'' شہلا نے موٹی شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''اور مٹی کا بت چونکہ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے، چلتا پھرتا ہے نہ کوئی مشکل کام کرتا ہے اس لیے اس کے ٹوٹنے کا



برجستہ اور بروقت فیصلے کرنا ایک ایسا
کمال ہے جس پر ہر ایک کی دسترس ممکن
نہیں... اور جسے یہ ہنر آتا ہو، وہ واقعی
باکمال ہوتا ہے مگر... یہاں جس دوراہے پر یہ
کردار کھڑے تھے وہاں سے کہانی کو ایک ایسا
موڑ لینا تھا، جس کے بعد کسی کی زندگی
پچھتاوؤں کا مظہر ٹھہرتی اور کوئی
پرچھائیوں کے پیچھے بھاگتا اور ان دونوں
صورتوں میں ایک کسک ہمیشہ تعاقب
میں رہتی، لیکن ان تمام کرداروں کے
درمیان کوئی ایک تو ایسا بھی تھا
جس کے من کی مراد بر آتی۔

طاہر جاوید مغل

دوراہا

پچھتاوے جذبوں اور نہ کیے گئے لمحات کی اداسی داستان

والد وسیع جائداد چھوڑ گئے تھے۔ ایک چھوٹی بہن ارسہ کے سوا دنیا میں میرا اور کوئی نہیں تھا اور اگر دو چار رشتے دار تھے بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ لہٰذا جونہی ارسہ کی شادی ہوئی میں سب کچھ چھوڑ کر یورپ کی سیر کو نکل گیا۔ شروع میں یہ پروگرام پانچ چھ ماہ کا تھا لیکن آزاد، بے فکر اور تنہا زندگی کا کچھ ایسا مزہ آیا کہ میں اگلے قریباً ڈیڑھ برس تک پاکستان سے بالکل لاتعلق بنا۔ یورپ اور امریکا کے دور دراز علاقوں میں گھومتا رہا۔ میرے پاس جو موبائل فون تھا اس کا نمبر صرف اور صرف میرے منیجر سلطان بخاری کے پاس تھا۔ میری ہدایت کے مطابق ان ڈیڑھ برسوں میں بخاری

صاحب نے مجھ سے بہت کم رابطہ کیا اور یہ رابطہ بھی اشد ضرورت کے وقت ہی ہوتا تھا۔

یہ بہار کا موسم تھا۔ میں ان دنوں اٹلی کے شہر روم میں تھا۔ جب ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے، بیئر پینے کے دوران میں ایک تازہ بیسٹ سیلر انگلش ناول پڑھتے پڑھتے اچانک دل میں کچھ پرانی یادوں نے چٹکی بھری اور دماغ میں سوچ ابھری کہ اب واپس پلٹنا چاہیے۔ اکیلے پن کا مزہ بہت لے لیا۔ اب دوبارہ شناسا چہرے دیکھنے چاہئیں۔ میرے اندر بیدار ہونے والی اس کیفیت کی ایک وجہ یقیناً ماہا عبیر بھی تھی۔ ماہا عبیر جو میری کلاس فیلو تھی، ہم مزاج تھی، دوست.....اور یقیناً..... کچھ اور بھی تھی۔

ٹھیک پانچ روز بعد میں اپنے اطالوی دوست فریزر، اس کی گرل فرینڈ اور گرل فرینڈ کی دوست کرسٹی کو الوداع کہہ کر پاکستان کے لیے واپس روانہ ہو رہا تھا۔

میں ڈیڑھ سال پہلے جس طرح خاموشی سے روانہ ہوا تھا، اسی طرح میری واپسی بھی مکمل خاموشی سے ہوئی۔ ایک ہفتے تک منیجر بخاری صاحب کے علاوہ کسی کو پتا نہیں چلا کہ میں واپس آچکا ہوں اور اب لاہور کے ڈی ایچ اے میں اپنی تین کینال کی کوٹھی میں موجود ہوں۔ آٹھویں دن میں نے اپنے دو قریبی دوستوں عدنان اور مشہود سے رابطے کیے اور انہیں آگاہ کیا کہ خیر سے بدھو گھر کو لوٹ آیا ہے اور اب اپنی واپسی کا جشن منانا چاہتا ہے۔

عدنان اور مشہود کو زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ میں انہیں لاہور کے مضافات میں اپنے ملتان روڈ والے فارم ہاؤس میں مدعو کر رہا ہوں۔ ڈیڑھ سال پہلے تک یہی فارم ہاؤس ہم پانچ چھ کلاس فیلوز کی مستیوں خرمستیوں اور تفریحات کا مرکز ہوا کرتا تھا۔

وہ مارچ کی ایک خوشگوار دوپہر تھی، ہفتے کا روز تھا۔ ہم تین دوست فارم ہاؤس میں اکٹھے ہو گئے۔ دیر تک ایک دوجے سے گلے ملتے اور شکوے شکایات کرتے رہے۔ یہ فارم تقریباً تین ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ وسط میں دس بارہ مرلے جگہ پر میں نے ایک خوبصورت و آرام دہ کاٹیج بنوایا تھا۔ میں لاہور سے دو ملازم ساتھ لایا تھا، وہ کاٹیج کو کھول کر اس کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گئے۔ ہم تینوں دوست فرش فارم کے پاس دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور یادیں تازہ کرتے رہے۔ مشہود کی شادی ہو چکی تھی۔ مشہود اور عدنان نے میرے ساتھ ہی ایم بی اے کیا تھا۔ اب وہ اچھی ملازمتیں کر رہے تھے۔

حسب توقع ہماری گفتگو شروع ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی ماہا عبیر کا ذکر چھڑ گیا۔ ماہا عبیر کو ہم ماہا عجیب بھی کہا کرتے تھے۔ ایسا اس کی افتادِ طبع اور سیلانی پن کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنی ہی طرز کی لڑکی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بہتے بلکہ ان کا ایک اپنا طرزِ فکر اور اپنا رستہ ہوتا ہے۔ یوں وہ بہت خوش اخلاق اور سوشل بھی تھی۔ ماہا اور ایمن ہمارے ان کلاس فیلوز میں شامل تھیں جو یہاں فارم ہاؤس میں آتے تھے۔ ہم لڑکے تو کئی بار رات بھی یہیں گزارتے تھے لیکن یہ لڑکیاں شام تک لاہور واپس لوٹ جاتی تھیں۔ ان میں سے ایمن کی شادی تو مشہود کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ماہا سے میری طرح میرے دوستوں کا رابطہ بھی منقطع تھا۔ ماہا ہی کی طرح ایک دو دوست اور بھی تھے جو کسی کے رابطے میں نہیں تھے۔

مشہود نے مجھ سے کہا۔ ''یار آصف، ایک بار تو سب کو اکٹھا ہونا چاہیے پھر مزہ آئے گا۔''

عدنان بولا۔ ''ٹھیک ہے، اگلے ویک اینڈ کا رکھ لو۔ کوشش کرو کہ سب سے رابطہ ہو جائے۔''

مشہود بولا۔ ''ایک کی شرکت تو یقینی ہے۔ یعنی ایمی (ایمن) کی۔''

''بیوی کے علاوہ بھی کسی پر زور چلاؤ نا بھئی۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''ماہا پر تو تمہارا ہی چل سکتا تھا لیکن تم نے کبھی چلایا ہی نہیں۔ اب پتا نہیں چل بھی سکے گا یا نہیں۔''

''اگر شادی نہ ہو گئی ہوگی تو ضرور چلے گا۔'' عدنان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یار اتم میں سے کسی کے پاس اس کا کوئی اتا پتا تو ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے شٹپٹا کر کہا۔

مشہود بولا۔ ''اچھا ایک منٹ ٹھہرو، میں ایمی کو فون کرتا ہوں۔ اس کی ایک فرینڈ ہے کراچی میں۔ اس نے ایک مرتبہ ایمی کو بتایا تھا کہ اس نے ماہا صاحبہ کو کراچی کے کسی شاپنگ مال میں دیکھا تھا۔''

مشہود نے اپنی بیوی ایمی کو فون کیا۔ مجھ سے بھی علیک سلیک کرائی۔ پھر اس سے ماہا کے بارے میں بات کی۔ ایمی نے کہا۔ ''وہ کراچی والی فرینڈ تو دبئی چلی گئی ہے۔ ہاں اس کی ایک چھوٹی بہن ہے اس سے کن لیتی ہوں۔ اگر اس سے رابطہ ہوا تو میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کروں گی۔''

ایمی نے تھوڑی دیر کا کہا تھا۔ اس کی کال قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد آئی۔ وہ اپنے شوہر مشہود سے مخاطب ہو کر ہانپتی آواز

میں بولی۔ ”ڈارلنگ تم نے بھگا بھگا کر آدھا کردیا ہے۔“

”بھگا بھگا کر؟“

”اور کیا۔ فون پر بھاگی ہوں۔ کوئی دس جگہ رابطہ کیا ہے اور نتیجہ پتا ہے کیا نکلا ہے۔۔۔؟ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ محترمہ ماہا صاحبہ یہیں لاہور میں موجود ہیں اور پچھلے چھ ہفتے سے موجود ہیں لیکن ایسی کمینی ہیں محترمہ کہ کسی سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ اس کا نمبر لکھوا رہی ہوں، خود بات کرو۔“

ایمی نے ایک نمبر لکھوایا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ماہا کی جانی پہچانی، جلترنگ بجاتی آواز ابھری۔ ”بڑی جلدی یاد آگئی میری؟“

”یاد تو اس کی آتی ہے جو بھولا ہوا ہو۔“

”کوئی اس سے زیادہ گھسا پٹا فقرہ نہیں سوجھا تمہیں؟“

”وہ بھی ہے لیکن بالمشافہ سناؤں گا۔ کب آرہی ہو؟“

”آج تو مشکل ہے۔“

”تمہیں پتا ہے، ہم ہر مشکل کو آسان کرتے رہے ہیں۔“

تقریباً دو گھنٹے بعد ایمی اور ماہا دونوں ہمارے ساتھ موجود تھیں۔ اب بھی ایک دو دوستوں کی کمی تھی پھر بھی ایک زبردست کمپنی بن چکی تھی۔ اب سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ تھوڑی سی خنکی بھی بڑھ گئی تھی، ہم کاٹیج کے اندر آگئے۔ دوسری منزل سے دور تک ہریالی اور درخت دکھائی دیتے تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو فوراً ہی ایک اور موضوع زیر بحث آگیا۔ سب سے پہلے مشہود نے ہی ذکر چھیڑا۔

”ہاں بھئی، کسی کو آرزو صاحب کی بھی کوئی خبر ہے یا نہیں؟ جناب جیتے ہیں، مرتے ہیں یا ان دونوں حالتوں میں نہیں ہیں۔“

”واقعی یار، ہم نے تو پلٹ کر ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اپنی مرضی سے کھیل شروع کیا اور اپنی مرضی سے ہی ایک دم ختم بھی کردیا۔۔۔ پتا نہیں اس تو، تو، نو، والی تاریخ کا کیا ہوا ہوگا؟“

مشہود بولا۔ ”ہوا کیا ہوگا۔ بے چارہ بھٹکتا رہا ہوگا گلشن اقبال کے مین گیٹ پر۔ پھر ایک دردناک قسم کی غزل لکھی ہوگی۔ تکیے کے نیچے رکھی ہوگی اور اس پر سر رکھ کر سو گیا ہوگا۔“

”ویسے یار، ہم سے ہوئی زیادتی تھی۔ ہمیں اس معاملے کو اتنا آگے نہیں لے جانا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔

ایک دم مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھہرو ٹھہرو، میں ایک چیز دیکھتا ہوں۔“ میں اٹھ کر نچلی منزل پر آیا۔ ایک چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر ایک الماری کھولی اور ایک گرد آلود موبائل سیٹ لے کر اوپر آگیا۔

”او دے یہ کیا ہے؟“ عدنان نے پوچھا۔

”وہی موبائل جس پر تم لوگ آرزو کو ”ماموں“ بناتے رہے ہو۔“

ایمی کے پاس ایک باریک پن والا چارجر موجود تھا۔ ہم نے اس کے ذریعے موبائل سیٹ کو چارج کیا اور چند منٹ کے اندر وہ زندہ ہوگیا۔ اس کے زندہ ہوتے ہی قریباً دو برس پہلے کے سارے روز و شب زندہ ہوگئے۔ میں نے میسج میں جا کر ان باکس کھولا اور نیچے کی طرف گیا۔ ان گنت میسج تھے اور سب تقریباً ایک ہی نمبر سے تھے۔ 21 فروری 2009ء کی تاریخ میں پہلا میسج اس سم میں موجود تھا۔ جو کچھ یوں تھا۔

”آپ کون ہیں محترمہ، میں آپ کو نہیں جانتا۔“

”او گاڈ۔ آپ کون ہیں محترمہ، میں آپ کو نہیں جانتا۔“ میں نے زیر لب دہرایا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ قریباً دو برس پرانے مناظر نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔

وہ فروری کے آخری دن تھے۔ وہی موسم جب طبیعتوں میں شوخی جاگتی ہے۔ جوان دلوں میں لہریں لینے والی امنگ ترنگ بڑھ جاتی ہے۔ ان دنوں ہماری چنڈال چوکڑی نئی نئی شرارتیں کر رہی تھی۔ ایمی ان دنوں پڑھائی سے فارغ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔ یہاں ایک شاعر نما دبلا پتلا نوجوان بھی جونیئر کلرک کی جاب کر رہا تھا۔ اس کا نام مسلم آرزو تھا، مسلم آرزو کے ایک بازو میں کسی پرانی چوٹ کی وجہ سے تھوڑا سا نقص تھا جس کے سبب اسے لکھنے اور موٹر سائیکل وغیرہ چلانے میں کچھ دقت پیش آتی تھی۔ اس کی چند تخلیقات ادبی پرچوں میں چھپی تھیں اور وہ آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر یہاں ہر شعبے میں ایسے بڑے بڑے مگرمچھ موجود ہیں جو چھوٹی موٹی مچھلیوں کو لمحوں میں ناپید کردیتے ہیں، اگر کوئی آگے بڑھنا چاہے تو اسے ان کا پیٹ پھاڑ کر نکلنا پڑتا ہے۔

آرزو کو دیکھ کر ایمی کی رگ شرارت پھڑک چکی تھی۔ اسے آرزو کا موبائل نمبر بھی مل گیا تھا۔ ایک دن اس نے یہ نمبر مجھے اور مشہود کو دکھایا۔ میرے پاس ایک نئی سم رکھی تھی۔ میں نے اسے ایک خالی موبائل سیٹ میں ڈالا اور ایک میسج آرزو کو لکھ مارا۔ ”اخبار و رسائل میں آپ کی نظمیں پڑھتی ہوں۔ آپ اتنا اچھا کس طرح لکھ لیتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی سے محبت کی تھی۔۔۔؟ نوشابہ!“

یہ میسج اس کہانی کا نکتۂ آغاز ثابت ہوا جس نے اگلے

پانچ چھ ماہ میں کئی مرحلے طے کیے اور کئی موقعوں پر ہم سب دوستوں کے لیے زبردست تفریح کا باعث بھی بنی۔

ہم سب اور خاص طور سے عدنان اور مشہود گاہے بہ گاہے آرزو کو میسج کرتے رہے اور اسے بے وقوف بناتے رہے۔ وہ نوشابہ میں انوالو ہوتا چلا گیا۔ پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان پیغامات سے ہی پتا چلا کہ آرزو کا تعلق ایک کم آمدنی والے گھرانے سے ہے۔ باپ فوت ہو چکا ہے، وہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور گھر کا کفیل بھی ہے، کچھ عرصہ پہلے اس کا دل ٹوٹا تھا۔ اکثر شاعروں کی طرح وہ بھی بے حد جذباتی اور حساس تھا۔ ہم اس کی اس جذباتیت کو استعمال کر رہے تھے۔ وہ نوشابہ سے ملنا چاہتا تھا۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو ہم نے اسے اتنی سی رعایت دی کہ اسے نوشابہ کی آواز سنا دی۔ یہ آواز دراصل ماہا ہی کی تھی، ماہا اس سے نوشابہ کے طور پر بات کرتی رہی۔ ہم نے آرزو کے حوالے سے نئے نئے تماشے لگائے۔

ماہا نے نوشابہ کی حیثیت سے آرزو کو باور کرایا تھا کہ وہ اسے تقریباً ہر روز دیکھتی ہے لیکن ابھی خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ سامنے آسکے۔ کبھی ماہا اور ایمی اسے کوئی خاص قسم کے کپڑے پہننے پر مجبور کر دیتیں۔ کبھی وہ ان کے کہنے پر کوئی خاص قسم کا ہیئر اسٹائل اپناتا۔ ایک بار ہم سب نے اسے گلشن اقبال میں بلایا اور اس کے اردگرد رہ کر اس کی بے چینی اور انتظار کی کیفیت کا لطف اٹھایا۔

دن گزرتے رہے۔ وہ نوشابہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن نوشابہ کہیں نہیں تھی۔ دوسری طرف ہم بھی اس کھیل سے اب بور ہونے لگے تھے۔ ایک روز مشہود نے آرزو سے جان چھڑانے کے لیے اسے نو نو نو والا میسج بھیج دیا۔ یعنی اس نے آرزو سے کہا کہ وہ اس خوبصورت تاریخ یعنی 9-9-2009 کو اس سے ملے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اب اس تاریخ تک وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔

ہم تو یہ وعدہ کر کے دوسری مصروفیات میں کھو گئے لیکن آرزو کچھ نہیں بھولا۔ نہ ہی وہ نو نو نو کی تہ تک پہنچا جس میں انکار کے سوا اور کچھ نہیں تھا یعنی نہیں نہیں نہیں۔

اس نے اپنے آخری میسج میں لکھا تھا۔ ''نوشابہ! انجانی، ان دیکھی محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ ان دیکھے شخص سے بھی اتنی ہی شدت سے محبت کی جاسکتی ہے جتنی کسی جانے پہچانے شخص سے۔ میرے دل کی گواہی ہے کہ تم ویسی ہی ہوگی جیسا میں نے سوچ رکھا ہے۔ تم سے ملاقات ہونے میں ابھی چار مہینے باقی ہیں۔ میں نے ان چار مہینوں کے گھنٹے، گھڑیاں اور پل ابھی سے گننا شروع کر دیے ہیں۔ یہ بڑا لمبا سفر ہے لیکن تمہاری محبت کے وجدان کے سہارے میں اسے ضرور طے کرلوں گا۔ تو ٹھیک ہے میں نو ستمبر کی اس نیم گرم شام کا اور اس شام میں موجود سارے خوبصورت امکانات کا راستہ دیکھوں گا۔ اس شام تک کے لیے خدا حافظ۔''

اس کے بعد موبائل میں آرزو کا کوئی میسج موجود نہیں تھا۔ ہاں اس کے بعد اس نے نو نو نو کے حوالے سے ایک طویل نظم ضرور لکھی تھی۔ یہ نظم ایک مؤقر اخبار کے ادبی ایڈیشن میں آرزو کی تصویر کے ساتھ شائع بھی ہوئی تھی۔ اس نظم میں ان دیکھے محبوب کی چاہ اور اس چاہ کے دکھ درد بیان کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ انتظار کے جاں گسل مرحلوں کا ذکر تھا۔

ہم نے ان باکس میں موجود بیسیوں پرانے میسج پڑھے اور وہ ساری کہانی ذہنوں میں تازہ ہوگئی۔

میں نے موبائل بند کر کے ایک طرف رکھا اور لمبی سانس لے کر مشہود اور عدنان سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی..... میں تو یہاں تھا نہیں۔ پر تم سب لوگ تو یہاں تھے، تمہیں آرزو کا خیال نہیں آیا؟''

''مجھے آیا تھا تھوڑا سا۔'' ایمی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''میں نے مشہود سے کہا تھا کہ نو نو نو کو گلشن اقبال جائیں گے اور دیکھیں گے کہ آرزو وہاں آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو کیا کرتا ہے؟''

''پھر.....؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر کیا؟ یہ ایک جگہ لگتے تھوڑی ہی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے ان کا تبادلہ کوئٹہ ہوگیا۔ آناً فاناً مجھے بھی لیا اور کوئٹہ پہنچ گئے۔''

''یار، کہیں اس نے خودکشی وغیرہ ہی نہ کر لی ہو۔ یہ شاعر حضرات ہوتے تو جذباتی ہیں۔'' عدنان نے کہا۔

''خیر ایسی بات بھی نہیں۔'' مشہود بولا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو اخبار میں دو تین کالمی خبر ضرور چھپتی جس کا کیپشن کچھ اس طرح کا ہوتا۔ ایک اور چراغ بجھا..... کچھ اور کم ہوئی روشنی، وغیرہ وغیرہ۔''

''ویسے یار اس سے ہوئی زیادتی ہے۔ وہ دکھی تو بہت ہوا ہوگا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ماہا بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''نو ستمبر کو میں دیکھنے گئی تھی!''

اسے..... اور شاید آپ سب کو یہ جان کر بہت حیرانی ہو کہ نومبر کی اس شام کو آرزو گلشن اقبال سے مایوس نہیں گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" مشہود اور عدنان نے تقریباً ایک ساتھ پوچھا۔

وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "نوشابہ اسے ملی تھی۔ مجھے بھی ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایسا ہوگا لیکن ہوا۔ وہ اندھیرا گہرا ہونے تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔ مایوسی اور دکھ کی تصویر نظر آتا تھا۔ بار بار فون کرتا تھا لیکن دوسری طرف سے جواب نہیں آتا تھا اور پھر جب وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ بالکل آخری لمحوں میں..... نوشابہ آ گئی۔"

"یار! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ایمی نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا۔ "نوشابہ تھی ہی نہیں تو اسے ملتی کیسے؟"

ہم دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ماہا کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو لڑھکے اور اس کے رخساروں پر لکیریں بناتے چلے گئے۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "نوشابہ تھی..... ہم سب نے نوشابہ کو وجود دے دیا تھا..... اور میں نوشابہ کو سب سے زیادہ جانتی ہوں، وہ بہت حساس تھی..... بہت دردمند۔ وہ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آرزو کا بھی نہیں..... وہ آرزو سے ملے بغیر نہیں رہ سکی۔"

اچانک میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ ماہا کیا کہہ رہی ہے۔ شاید باقی بھی سمجھ گئے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ غم کی کیفیت میں اس کا ملیح چہرہ کچھ اور بھی دلکش نظر آ رہا تھا۔ کانوں کے رد پہلی جھمکے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "ماہا! کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم نوشابہ کے طور پر آرزو سے ملی تھیں؟"

"ہاں آصف..... میں ملی تھی اور نہ صرف ملی تھی بلکہ ملتی رہی تھی۔ ہم دونوں بہت قریب آ گئے تھے....." وہ پلکیں اٹھائے بغیر بولتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ جیسے بخار میں تپ رہا تھا۔

ماہا کی نہایت سنجیدہ صورت دیکھنے کے باوجود ہمیں..... اور خاص طور پر مجھے..... اس کی بات کا بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں لگ رہا تھا، شاید وہ ابھی بلند آواز میں ہنس پڑے گی اور ہم سب سے اپنی اداکاری کی داد چاہے گی لیکن ایسا نہیں تھا..... جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے تو ہم نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ حواس باختہ سی ہو گئی لیکن پھر دھیرے دھیرے سنبھل گئی۔ اس نے ہمارے ہر سوال کا جواب مدلل انداز میں تسلی سے دیا۔ اس کا لہجہ نہایت گمبھیر لیکن بہت پُراعتماد تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ میں اسے سن رہا تھا اور میرے سینے میں کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا..... مجھے زخمی کر رہا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ماہا نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

"اس کے دل میں آرزو کے لیے ترس اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ جوں جوں نو نومبر کی تاریخ قریب آئی یہ جذبہ اور قوی ہوتا گیا۔ اس اداس شام کو وہ گلشن اقبال کی جھیل کے اس کنارے پر موجود تھی جہاں آرزو کو اپنی آس امید کی ڈور تھام کر آنا تھا، اس نے آرزو کو دیکھا اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک ایسے فیصلے پر پہنچ گئی جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ نوشابہ کے طور پر آرزو سے ملی۔ وہ، جو مایوس اور دل شکستگی کی انتہا کو چھو رہا تھا، اس سے مل کر جھوم اٹھا۔ اگلے دو تین ہفتوں میں ان کی ملاقاتیں تواتر سے ہوئیں۔ نوشابہ نے بتایا کہ اس کا اصل نام ماہا ہے۔ اس نے اپنی نجی زندگی کے بارے میں آرزو کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے بھی کچھ نہیں چھپایا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب

برجستگی

ایک اندھا پولیس میں بھرتی ہونے آیا تو پولیس آفیسر نے پوچھا۔ "تمہیں کس لیے رکھیں؟"

اندھے نے جواب دیا۔ "اندھا دھند فائرنگ کے لیے۔"

☆☆☆

ایک لڑکا بس اسٹاپ پہ لڑکی کو دیکھ کر بولا۔ "تو تو میری جان ہے تو میرا ایمان ہے۔" لڑکی نے جوتی اتاری تو لڑکا بولا۔

"میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے۔"

☆☆☆

آپریشن سے پہلے ڈاکٹر نے پھولوں کا ہار منگوایا۔

مریض۔ "یہ کس لیے ہیں؟"

ڈاکٹر۔ "میرا یہ فرسٹ آپریشن ہے اگر کامیاب ہوا تو میرے لیے ورنہ تمہارے لیے۔"

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل ملی پور، ضلع مظفر گڑھ

آتے چلے گئے۔"

میرے دل کی دھڑکنیں بری طرح زیروزبر ہو رہی تھیں۔ ہم سب اور خاص طور سے میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اب موجودہ صورت حال کیا ہے؟ ماہا اور آرزو کے تعلقات کس مرحلے میں ہیں؟ آرزو کہاں ہے؟ اور اس کے حوالے سے ماہا کے ارادے کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ؟

ان سارے سوالوں کا ماہا نے ایک ہی جواب دیا اور یہ ایسا جواب تھا جس نے مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے مسمار کر کے رکھ دیا اور اس جواب کے بعد ماہا زیادہ دیر وہاں ٹھہری بھی نہیں۔ ایک اجنبی سی خاموشی کی چادر اوڑھ کر فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی اور وہ بے رحم جواب یہ تھا۔ "میں آپ لوگوں سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی، میں آرزو سے شادی کر چکی ہوں، ہم پچھلے ایک برس سے میاں بیوی ہیں۔"

➡➡➡

میں اپنی وسیع کوٹھی کے وسیع بیڈروم میں سب روشنیاں بجھائے لیٹا تھا۔ غم ایک آرے کی طرح دل کو کاٹ رہا تھا۔ پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ کچھ چیزوں کی اصل قدر و قیمت کا پتا انہیں کھونے کے بعد چلتا ہے۔ مجھے بھی یہ پتا چل رہا تھا کہ میں ماہا سے بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ میں ماہا سے جدائی کا یہ دکھ برداشت ہی نہیں کر سکوں گا۔ سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دوں گا۔ کبھی لگتا تھا کہ شاید وقت کے ساتھ یہ سب کچھ جھیل لوں گا..... میں ماہا کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا کوئی اقرار نہیں تھا، کوئی وعدہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ خاموشی سے "یورپ یاترا" کے لیے روانہ ہوتے وقت بھی میں نے اس کے ساتھ اس معاملے پر کھل کر بات نہیں کی تھی۔ بس دو طرفہ خاموش انڈر اسٹینڈنگ ضرور تھی لیکن خاموش جذبوں کو جب تک زبان نہ دی جائے وہ وجود اور عدم وجود کے درمیان ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔

کئی دن تک میں اپنے اردگرد سے کٹا رہا اور ماہا کے غم سے لڑتا رہا۔ کبھی کبھی دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف حرکت کرنے لگیں۔ پھر ڈیڑھ سال پہلے کا وقت آ جائے، میں کسی خوبصورت شام میں کسی خوبصورت باغ کے کسی تنہا گوشے میں ماہا کے سرخ و سپید ہاتھ تھاموں اور اس سے کہوں، میں تم سے پیار کرتا ہوں..... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وقت کسی کے لیے ٹھہرتا نہیں، پلٹنا تو بہت دور کی بات ہے۔

کسی وقت لگتا کہ ماہا مکمل طور پر بے قصور بھی نہیں ہے، وہ میرے اور اپنے خاموش تعلق کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ پھر اس نے یہ بے حسی کیوں دکھائی؟ ایک ایسے شخص کے لیے مجھے دکھ کے دریا میں دھکیلا جو کسی طرح بھی اس کے لائق نہیں تھا۔ کیا ماہا نے مجھ سے میری بے پروائی اور خاموشی کا بدلہ لیا ہے۔ جب خیال آتا تو میرے اندر میرا تیموری خون جوش مارنے لگتا۔ جی چاہتا الماری سے اپنا بریٹا پستول نکالوں اور اسے اپنے لباس میں رکھ کر براستہ سڑک لاہور سے کراچی روانہ ہو جاؤں۔ ماہا اور آرزو کو ڈھونڈوں۔ اس ٹیڑھے بازو والے خبیث شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور ان دونوں کا جینا حرام کر دوں۔ ایک موقع تو ایسا آیا جب میں واقعی تیار ہو گیا۔ میں نے مشہود کو مجبور کیا کہ وہ ایمی کے ذریعے کراچی میں ماہا کا اتا پتا معلوم کرے اور مجھے بتائے۔

انہی دنوں اٹلی سے میرا دوست فریزر، اس کی گرل فرینڈ مارتھا اور اس کی کیلی کرسٹی لاہور آ گئے۔ جس طرح ان لوگوں نے بڑی محبت سے مجھے پورا اٹلی گھمایا تھا، اب میری بھی ذمے داری پاکستان گھمانے کی تھی۔ وہ لوگ پاکستان کے شمالی علاقہ جات دیکھنے کے شدید خواہش مند تھے۔ مجھے ان کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ تین چار مقامی دوست بھی اس سیاحتی ٹور میں شریک ہو گئے، مشہود اور ایمی بھی ان میں شامل تھے۔ اگلے چھ سات ہفتے تک ہم شمالی علاقوں کے دور دراز ہل اسٹیشنز پر گھومتے رہے۔ اس ٹور نے مجھے میرے غم سے سنبھلنے میں کافی مدد دی۔ اس میں کچھ کردار سنہرے بالوں اور بلکی نیلی آنکھوں والی کرسٹی کا بھی تھا۔ وہ ہر موضوع پر گھنٹوں تک مجھ سے باتیں کرتی۔ وہ ہمارے گروپ کے خوش اخلاق اور ملنسار ممبرز میں سے تھی۔ اس ٹور کے دوران میں بھی میرے کہنے پر ایمی بذریعہ فون، ماہا کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکامی ہوئی۔ ماہا نے جو موبائل فون نمبر ایمی کو دیا تھا، وہ بھی مستقل طور پر خاموش تھا۔

اس ٹور کے بعد میرے تینوں اطالوی دوست تھائی لینڈ اور ملائیشیا کی میر کو جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے بے حد اصرار کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے ڈھائی تین ماہ تک سیاحت اور ماہا کا غم ساتھ ساتھ چلتے رہے..... پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ غم کی دھار کچھ کند ہونے لگی تھی۔

➡➡➡

ان واقعات کو اب ایک سال سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ میں آج کل اٹلی میں ہوں، یہاں میلان میں، میں نے ایک چھوٹا لیکن آرام دہ اپارٹمنٹ خریدا ہوا ہے۔ کرسٹی میری زندگی میں داخل ہو چکی ہے اور میں اس سے شادی کر چکا

ہوں۔ زندگی جو کچھ عرصہ پہلے تک پہاڑی ندی کی طرح تھی، اب ہموار میدانوں میں داخل ہورہی ہے اور اس نے اب لگی بندھی رفتار سے بہنا شروع کردیا ہے لیکن جس طرح ہموار پہنے والی ندیوں میں بھی کسی وجہ سے اچانک ہلچل پیدا ہوجاتی ہے..... میرے شب و روز میں بھی پانچ چھ دن پہلے ایک شدید ہلچل پیدا ہوئی ہے۔ کافی عرصے بعد پاکستان سے مشہود نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ انٹرنیٹ کی وڈیو کال کے ذریعے ہم نے کوئی ایک گھنٹا بات چیت کی ہے۔

اس انکشاف انگیز بات چیت کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ عورت کو پہیلی کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں اس کے دل کی گہرائی ناپنے میں دنیا کے دانش مند ترین مرد بھی ناکام رہے ہیں۔ اپنی اس وڈیو کال میں مشہود نے مجھ پر انکشاف کیا ہے کہ ایک سال پہلے جب ہم لاہور کے مضافاتی فارم ہاؤس میں ملے تھے اور ماہا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آرزو سے شادی کرچکی ہے..... تو اس نے جھوٹ بولا تھا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ میرا سارا جسم لرزنے لگا تھا۔

''ہاں آصف۔'' مشہود ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''تب آرزو سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، آرزو سے اس کی شادی اب ہوئی ہے، صرف دو ماہ پہلے۔''

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو مشہود۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''شروع میں میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا آصف..... لیکن اب آہستہ آہستہ آنا شروع ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کچھ ایمی نے بھی میری مدد کی ہے۔ ایمی بھی ایک عورت ہے اور عورت کے دل و دماغ کو ہم سے بہتر سمجھتی ہے..... میں نے اور ایمی نے بہت گہرائی میں جاکر تجزیہ کیا ہے آصف..... اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ماہا کو تم نے دو بار کھویا ہے۔ ایک بار، جب تم اس سے اظہار محبت کیے بغیر یورپ چلے گئے..... اور دوسری بار، جب تم نے آرزو کے ساتھ اس کی شادی کی خبر سنی اور اس کو سہہ لیا۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مشہود! میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ تم مجھے الجھا رہے ہو۔''

مشہود نے جواب میں جو کچھ بتایا، اسے میں اختصار کے ساتھ بیان کردیتا ہوں اور اب میں بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ جو کچھ مشہود نے بتایا..... وہی صحیح ہے، سو فیصد درست ہے۔

''ماہا عبیر وہ جسے ہم ماہا عجیب بھی کہتے تھے، محبت کرنے اور محبت کرنے کے بارے میں بھی عجیب ہی رہی۔ وہ دل میں میری چاہ رکھتی تھی۔ میری بدقسمتی کہ میں دل میں اس کی چاہ رکھنے کے باوجود اس کے بارے میں جلد ہی سنجیدہ نہ ہوسکا۔ اسی دوران میں مسلم آرزو والا چکر چل گیا۔ ہم دوستوں نے مسلم آرزو کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا اور اپنی اپنی مصروفیتوں میں کھو گئے لیکن حساس ماہا اسے مکمل نظر انداز نہ کرسکی۔ تو تو تو کی شام وہ گلشن اقبال میں اس سے ملی۔ شروع میں ان دونوں کے درمیان دوستی کا ناتا بنا لیکن ماہا تادیر مسلم آرزو کو دوستی کی حد میں نہ رکھ سکی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا اور ماہا کے بغیر اس کے لیے زندگی کا تصور کرنا بھی محال ہوگیا۔ دوسری طرف ماہا بھی جو پہلے پہل آرزو کے لیے صرف ہمدردی رکھتی تھی اب اس کے لیے کچھ اور بھی محسوس کرنے لگی۔ اس کو ''ہمدردی جمع محبت'' کہا جاسکتا تھا۔ اس موقعے پر ماہا دو حصوں میں بٹی ہوئی لڑکی بن گئی۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں میرے لیے نرم گوشے موجود رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ تعلق ایک دھند جیسا ہے۔ نظر آتا ہے اور نہیں بھی آتا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پارہی تھی۔ ایک طرف وہ دکھی آرزو کو مزید دکھوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی، دوسری طرف اس کی چھٹی حس اسے ایک خطرے سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اسے میرا خیال بھی تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اگر اس نے آرزو سے شادی کرلی تو میرا ردعمل کیا ہوگا۔ میں اس صدمے کو کتنی شدت سے لوں گا؟ میں سنبھل پاؤں گا یا بکھر جاؤں گا؟ وہ ایک دوراہے پر تھی۔ اس کی شدید حساسیت اسے کسی طرف بھی جانے نہیں دیتی تھی..... اور پھر میں پاکستان واپس آگیا۔ لاہور کے فارم ہاؤس میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ ماہا نے میرے جذبات کو پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ مسلم آرزو سے شادی کرچکی ہے۔ یہ ایک طرح سے میرے ردعمل کا امتحان بھی تھا۔ اگلے کئی ماہ تک اس نے مجھ سے دور رہ کر بھی میرے ردعمل پر نظر رکھی۔ اگر میرا ردعمل واقعی شدید تر ہوتا..... یعنی میرے ضبط کا پانی کناروں سے چھلک جاتا تو پھر یقیناً ماہا کے فیصلے کچھ اور طرح کے ہوتے لیکن میں سہہ گیا اور میرے اس ''سہہ جانے'' نے ماہا کے لیے اگلے فیصلے آسان کردیے۔ وہ دوراہے سے حرکت میں آئی اور اس راستے پر مڑ گئی جو مسلم آرزو کی طرف جاتا تھا۔ مسلم آرزو، جو سراپا شوق اور انتظار اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کرسٹی سے میری شادی کے تقریباً دو ماہ بعد ماہا نے آرزو سے شادی کرلی..... کیونکہ وہ ماہا عجیب ہی تھی۔

Suspense Digest March 1990.pdf

کافی دیر چھت پر دھوپ سینکنے کے بعد حمنت نیچے کچن میں آگئی اور دوپہر کا کھانا پکانے پر جت گئی۔ بلی کے اسکول سے لوٹنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے اور وہ اس دوران چھوٹے موٹے ضروری کام نبٹا لینا چاہتی تھی۔ چند برتن دھو کر اس نے اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹیں۔ پھر سلائیاں سنبھال کر چولہے کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گئی اور بُنائی شروع کر دی۔ ہلکی آواز میں ریڈیو بھی ساتھ ساتھ بج رہا تھا۔ "میرا گھر میری جنت۔۔۔" ایک پرانے گانے کے بول

سچ کی گولی

طاہر جاوید مغل

کسی آنکھوں سے سچ کو تسلیم کرنے والوں کے لیے

ایک گھرانے پر گزرنے والی بھیانک روداد، اُنہیں ایک سچ کا سامنا درپیش تھا جو اپنے آپ سے بھی بولتے ہوئے ڈر لگا۔ انہوں نے جھوٹ کے مخمل پر سچ کی سُولی کو ترجیح دی۔



دھیمے سُروں میں اُبھر رہے تھے۔ اچانک اُسے برآمدے میں آہٹ سنائی دی۔

"کون؟" اس کی سُریلی آواز کچن میں گونجی۔ جواب میں کھڑکی زوردار دھماکے سے کھلی اور ایک شخص کود کر اندر آ گیا۔ وہ بے حد پھرتیلا تھا۔ اس سے پہلے کہ عصمت کے ہونٹوں سے چیخ نکلتی اس نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ پسینے اور میل کچیل کی تیز بو عصمت کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی اور حملہ آور سمیت کرسی سے نیچے گر گئی۔ قریب رکھا دودھ کا برتن اُلٹ گیا اور دودھ سارے فرش پر پھیل گیا۔ ایک سلائی عصمت کو اپنی بائیں ہتھیلی میں گھستی محسوس ہوئی لیکن اس کی تکلیف نہ ہونے کے برابر تھی۔ کانوں میں ریڈیو کی کھڑکھڑاہٹ گونج رہی تھی۔ شاید وہ بھی عصمت کا ہاتھ لگنے سے نیچے گر گیا تھا۔

... ٹھیک پندرہ منٹ بعد عصمت ایک ریوالور کی سیاہ نال کو گھور رہی تھی۔ یہ ریوالور حملہ آور کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنے بھدے انسانی کرخت لہجے میں بولا۔

"دیکھو مسز عبید! جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ۔ واویلا کرو گی تو بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہاں ایک وعدہ میں تم سے کرتا ہوں، یہ ایک غنڈے کا وعدہ ہے اس لیے تم اس پر اعتبار کر سکتی ہو۔ میں پھر کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا... ہاں اگر قانون کو بیچ میں لاؤ گی تو پھر بات دور تک چلے گی۔ میں تو جلد یا دیر سے چھوٹ ہی جاؤں گا مگر تمہاری ساری زندگی حرام کر دوں گا۔ یہ بھی ایک غنڈے کا وعدہ ہے۔ گڈ بائے۔" دراز قد حملہ آور نہایت سے مسکرایا۔ اپنے ریوالور کو چرمی جیکٹ میں اڑسا اور دروازہ کھول کر کچن سے نکل گیا۔ عصمت بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ وہ جیسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ایسی خبریں اس نے اخباروں میں پڑھی تھیں اور لوگوں سے سنی تھیں لیکن ایک روز... اس کے ساتھ... واقعتاً اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آئے گا، اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ ابھی جاگی ہی نہیں، اپنے محبوب شوہر کے پہلو میں سکون کی نیند سو رہی ہے اور حسبِ معمول شب کے آخری پہر اسے ایک ڈراؤنے خواب نے جکڑ لیا ہے۔ وہ خواب دیکھتی بھی تو بہت تھی، مگر نہیں.... یہ سب کچھ حقیقت تھا۔ آج روزِ حشر تھا اور اس پر قیامت گزر چکی تھی۔ اُسے معلوم نہیں کب ہچکی کی وجہ آئی، کب اس نے اسکول بیگ کھلا اور کب اس سے لپٹ کر کھانے کی مد کہنے لگی۔ تاہم جلد ہی عصمت کی کیفیت نے پانچ سالہ بچی کو بھوک سے بے نیاز کر دیا اور وہ سہم کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ عصمت یہی چاہتی تھی کہ وہ سو جائے۔ وہ تنہائی میں پوری یکسوئی کے ساتھ خود پر گزرنے والی قیامت کا تجزیہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ عبید کے دفتر سے لوٹنے میں ابھی ڈھائی گھنٹے باقی تھے اور اسی عرصے میں اسے زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے گزرنا تھا۔ آنسو اس کے رخساروں سے لگاتار گر رہے تھے اور ہچکی رہ رہ کر سینے کو دبا جاتی تھی۔

وہ نفسیات کی طالبہ رہی تھی۔ اسے اپنے منتشر ذہن کو مجتمع کرنا آتا تھا لیکن آج یہ کام ہمیشہ سے زیادہ دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی۔ اسے کیا کرنا ہے؟ جو ہونا تھا وہ اس کی تمام تر کوشش اور جدوجہد کے باوجود ہوا تھا اور روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ اتنی کہ وہ خود کو ہلاک نہیں کر سکی تھی۔ شاید وحشت کی گھڑیوں میں وہ یہ بھی کر گزرتی لیکن حملہ آور اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اور اس نے اسے ہر طرح سے بس کر دیا تھا... لہٰذا اپنے ضمیر کی عدالت میں وہ سرخرو تھی۔ ملکی قانون اور خدا کا قانون بھی اسے ہرگز اس سے بری الذمہ قرار دیتا تھا مگر وہ جانتی تھی... وہ بے گناہ نہیں، وہ معاشرے کی مجرم ہے، وہ بولنے والی ہزاروں زبانوں اور دیکھنے والی ہزاروں آنکھوں کی مجرم ہے، وہ سرِ راہ اٹھنے والی ہزاروں انگلیوں کی گناہ گار ہے، وہ ایک آبرو باختہ عورت ہے سیکڑوں شرمناک قصے اور ہزاروں افسانے عدم سے وجود میں آنے کے لیے بے قرار ہیں اور صرف ایک لمحے کا انتظار کر رہے ہیں، اس ایک لمحے کا جب اس کی زبان سے حرفِ فریاد بلند ہو گا اور بات اس کے ہونٹوں سے نکل کر پرائی ہو جائے گی... تو کیا وہ خاموش رہے؟ اس تیرے کی بات کا اعتبار کر کے اور یہ سوچ کر کسی کو کچھ نہ بتائے کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ جو ہو چکا اس پر رو دھو کر چپ ہو رہے اور اپنی زندگی کی کشتی کو گرداب سے بچا لے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کیا... عبید اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن وہ ایک مشرقی شوہر تھے۔ اس حادثے کا ان پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ پھر یہ تنہا ان کی ذات کا معاملہ نہیں تھا۔ ان کا اپنا ماحول تھا گو زیادہ وسیع نہیں تھا مگر ایک حلقۂ احباب تھا۔ ان کی اپنی عزت تھی۔ وہ کس کس سے نظریں چرائیں گے، کس کس سے احوال بیان کریں گے۔ زندگی بھر وہ نظر بھر کر بیوی کی طرف نہیں دیکھ سکیں گے اور شاید وہ خود بھی ان کی طرف نہ دیکھ سکے۔ ان کی ازدواجی زندگی کا کیا انجام ہو گا۔ اپنے شریف النفس اور خاموش طبع شوہر کا ڈبلا پتلا چہرہ عصمت کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ اسے اس چہرے پر بے پناہ ترس آیا اور آنکھوں میں آنسو دوگنا ہو گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ سادہ دل عبید اس طوفان کا کیسے مقابلہ کر سکیں گے۔ کیسے پورے اتریں گے اس امتحان پر

وہ تو پہلے ہی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے جان ہلکان کر رہے تھے۔ ایک پرائیویٹ ادارے میں چھ سات ہزار کی تنخواہ کیسا تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔ نہ تو ان کے پاس وافر پیسہ تھا اور نہ ہی اعلیٰ پُرزے۔ وہ اس صورتِ حال کے تقاضوں کو کیونکر پورا کریں گے؟ بے چارے! آزمائش کی اس چکی میں اناج کی طرح پس جائیں گے۔

پھر یہ تنہا اس کے شوہر کا معاملہ نہیں تھا۔ اس کے والدین، عزیز و اقارب، خاندان بلکہ پوری برادری، ہر جگہ اور ہر مقام پر اس کی بدنامی کے جھنڈے لگیں گے۔ بل سر جھکیں گے اور کتنی پیشانیاں عرقِ آلود ہوں گی... اور یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کیا وہ انصاف پا سکے گی؟ یہ سوال ایک آسیب کے مانند اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ باوردی پولیس کے چاق و چوبند دستے جیسے سلامی دیتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ توانا سینے، مضبوط بازو، چمکدار آنکھیں۔ لیکن ہر جسم کے اندر اسے ایک اور جسم نظر آیا۔ ہر وردی میں ایک روایتی تھانے دار چھپا ہوا تھا۔ سخت گیر، غصیلا، تلخ کلامی کرنے والا اور... اپنی تنخواہ سے غیر مطمئن۔ یہ ایک شخص نہیں تھا۔ اس جیسے کئی اشخاص عصمت اور عدالت کے کٹہرے کے درمیان کھڑے تھے۔ پھر عصمت کو وہ اخباری خبریں یاد آئیں جن میں زیادتی کا شکار ہونے والی عورتوں کو عدالت کے کٹہرے کے کوٹ کیا جاتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ اس حوالے سے اس نے کیسے کیسے خوف ناک فقرے پڑھے تھے۔ کیسی کیسی گالیاں تھیں، جو وکلائے صفائی نے ان بدقسمت عورتوں سے اگلوائی تھیں۔ وہ کانپ اٹھی تو کیا یہ سب کچھ اُسے بھی زبان پر لانا پڑے گا۔ اسے بھی اپنے زخم کھول کھول کر دکھانے پڑیں گے؟ اور اگر وہ ایسا کر بھی گزری، اس نے یہ سارے عذاب جھیل بھی لیے تو کیا انصاف اس کے پارہ پارہ جسم پر مرہم رکھ سکے گا اور اگر یہ مرہم مل بھی گیا تو بعد ازاں اس پارہ پارہ جوئی کا خمیازہ کیا ہوگا؟ اس کے کانوں میں لیٹرے کے الفاظ گونجے۔ "میں تو جلد یا بدیر چھوٹ ہی جاؤں گا مگر تمہاری ساری زندگی حرام کر دوں گا۔" اس نے بے اختیار ہو کر ہاتھ بڑھایا اور میز پر رکھی شوہر کی تصویر کو پکڑ کر سینے سے بھینچ لیا۔ یقیناً اس متلک شخص نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کا منحوس سایا عصمت کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ غالباً وہ اسی علاقے کا تھا۔ شاید عصمت نے اس سے پہلے اسے دیکھا بھی تھا۔ کہاں؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ کسی وڈیو سینٹر کے باہر، کسی دکان کے تھڑے پر، کسی گرلز اسکول کے سامنے، یا پھر سڑک پر موٹر سائیکل لہراتے ہوئے۔ وہ اسی بستی کا فرد تھا۔ مگر غم و اندوہ کی حالت میں عصمت کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ دل نے پکارا۔ "عصمت! ایک خطرناک شخص سے اپنی دشمنی مول نہ لو۔ تمہارے پاس گنوانے کو اب بھی بہت کچھ ہے

ایک وکیل، خاتون گواہ پر بڑی سخت جرح کر رہا تھا مگر خاتون بڑی ہوشیاری سے وکیل کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی اور کسی طرح وکیل کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر اس نے وکیل کو لاجواب کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا: "وکیل صاحب! میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں آخر سچ سے میری شادی ہوتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" وکیل سنجیدگی سے بولا۔ "مگر یہ بتائیں کہ آپ بیوہ کب ہوئیں؟"

لیکن اس لوفر کے پاس شاید کچھ بھی نہیں۔

ایک طویل آہ بھر کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ مگر پھر فوراً ہی تصویر کا دوسرا رُخ اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے سوچا... عصمت تو نے اب تک کوئی جرم نہیں کیا لیکن اب ایک مجرم کی پردہ پوشی کر کے تو یقیناً جرم کا ارتکاب کرے گی۔ تیری خاموشی ایک لٹیرے کے حوصلے کو بڑھائے گی۔ اگر وہ گیدڑ ہے تو اب شیر ہو جائے گا، شیر ہے تو لگام بن جائے گا پھر وہ اس جرم کو زیادہ بے باکی اور زیادہ قدرت سے دہرائے گا۔ شکار تو نہیں ہو گی تو کیا ہوا، شکاری کے ہاتھ کو قوت تو تیری بخشی ہوئی ہو گی اور اس طرح ہر خون ناحق میں تو غائبانہ قاتل کی حمایت کرے گی! اس کا دل ہولنے لگا۔ اندر کی آواز نے پکار کر کہا: یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ آئندہ کے لیے تجھے معاف ہی کر ڈالے۔ شیر کے منہ کو خون لگتا ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ پاگل پن اس سے کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ایک وعدے کی تو اہمیت ہی کچھ نہیں! اپنے شفیق اور مہربان باپ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی: بیٹی! سچائی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ سچے لوگوں کی نصرت کے لیے آسمان سے فرشتے اترتے ہیں۔

وہ اس فقرے پر دیر تک غور کرتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے اندر حوصلہ پیدا ہونے لگا۔ خوف کی جگہ ایک طرح کا طیش دل میں جگہ بنانے لگا۔ وہ مختلف انداز سے سوچنے لگی۔ مگر پھر اس کی نگاہ دال کلاک پر پڑی۔ اس نے گھڑی کی سرکتی سوئیوں کو دیکھا۔ ساڑھے چار بجنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ پون گھنٹے بعد کار کا ہارن سنائی دے گا۔ جید ہنستا مسکراتا چہرہ لیے اندر داخل ہوں گے۔ ان کے بریف کیس میں اسٹیج ڈرامے کے دو ٹکٹ ہوں گے! ہیلو۔ ڈیئر! وہ پورچ سے پکار کر کہیں گے۔ جلدی سے ایک کپ کافی اور پھر تھوڑا سا ریسٹ۔ شام کو ڈراما دیکھنے چلیں گے۔

کتنے خوش ہوں گے وہ۔ آہ کتنے خوش ہوں گے"۔ "عبید! ۔۔ عبید!" عصمت نے سسک کر کہا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ کافی دیر زار و قطار رونے کے بعد اس کا دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے حتمی فیصلہ کر لیا کہ اپنی آفت کو اپنے تک ہی محدود رکھے گی۔ اپنے پیاروں کو کچھ نہیں بتائے گی۔ اپنے ہونٹ سی لے گی۔

وہ جلدی سے اٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ لباس بدلا۔ زخمی ہاتھ پر پٹی باندھی پھر کچن میں پہنچ کر فرش سے دودھ صاف کیا۔ چیزوں کو سلیقے سے رکھا۔ حملہ آور کے گلے سے ایک چھوٹا سا لاکٹ ٹوٹ کر کچن میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ عصمت نے اسے اسٹور کے کاٹھ کباڑ میں چھپا دیا۔ کچن سے فارغ ہو کر وہ عبید کی شلوار قمیص استری کرنے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اسے سوزوکی کار کا ہارن سنائی دیا۔ عبید حسب معمول ہلکے پھلکے موڈ میں تھے۔ وہ عصمت کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور گاڑی اندر لے آئے۔

اس رات عصمت، عبید اور بچی نے الحمرا میں ایک کامیڈی ڈراما دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار عصمت کو احساس ہوا کہ اشکبار دل کے ساتھ ہنسنا کتنا مشکل ہے اور مردہ بھوک کے ساتھ چائنیز ڈشز کیا معنی رکھتا ہے۔ سب کچھ بدلا بدلا تھا۔ یوں لگتا تھا کائنات ہی اپنے مرکز سے ہٹ گئی ہے۔ عبید نے اس سے کئی بار پوچھا کہ وہ کچھ چپ چپ نظر آتی ہے مگر عصمت نے ہر بار بے نیازی سے ٹال دیا۔ انھوں نے اس کے زخمی ہاتھ کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ جواب میں عصمت نے بتایا کہ چھری سے کٹ گیا ہے۔ گھر آ کر دونوں کچھ کھوئے کھوئے سے لیٹ گئے۔ عبید تو جلدی سو گئے مگر نیند عصمت کی قسمت میں کہاں تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ عبید کا رومال بھگو کر اس نے آنکھوں پر رکھ لیا پھر اس بھیگے رومال کو پشیمانی اور خفت کے آنسوؤں سے مزید بھگونے لگی۔ نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ جاگی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ عبید بستر کے بجائے کمرے میں پریشان پھر رہے تھے۔ شاید ان کی آہٹ ہی سے عصمت جاگی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی کراچی سے ضروری کال آئی ہے، انھیں فوری طور پر واپس جانا ہے۔ شاید چار پانچ روز یا اس سے بھی زیادہ لگ جائیں۔ پریشانی میں عبید کچھ زیادہ بتاتے نہیں تھے لہٰذا عصمت نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے وہ دل میں کچھ خوش بھی ہوئی۔ اپنی موجودہ حالت میں اسے عبید کا سامنا کرتے ہوئے بے انتہا اذیت ہو رہی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ چار پانچ روز تک وہ کچھ نہ کچھ خود پر قابو پا لے گی۔ وہ جلدی جلدی شوہر کا سامان پیک کرنے لگی۔ صبح ناشتے سے قبل ہی وہ کراچی رخصت ہو گئے۔

یوں شدید ذہنی و جذباتی کشمکش کی یہ گھڑیاں گزر گئیں... شوہر کی روانگی سے عصمت کو محسوس ہوا جیسے وہ دوزخ سے برزخ میں آ گئی ہے۔ عبید کو کراچی میں پورا ایک ہفتہ لگ گیا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر عصمت نے خود کو بڑی حد تک سنبھالا۔ اس نے ایک چوبیس گھنٹے کی مستقل گھریلو ملازمہ بھی رکھ لی تھی۔ عبید کراچی سے لوٹے تو عصمت نے ان کے سامنے حتی الامکان نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ اس نے ان سے کہہ کر گھر کی بیرونی چار دیواری مزید اونچی کروا دی اور اس پر لوہے کی بڑی بڑی نوک دار سلاخیں بھی لگوا دیں۔ اس کے علاوہ گھر کی کئی کھڑکیوں پر گرل لگوائی اور بیرونی گیٹ میں ایک اضافی قفل کا اضافہ کروایا۔ عصمت کی ان تمام احتیاطی تدابیر نے گھر کو چھوٹی موٹی جیل بنا دیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھی۔ ایک دو دفعہ عبید نے بھی حیرانی کا اظہار کیا کہ وہ اتنی خوفزدہ کیوں ہے؟ عصمت نے انھیں یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا احتیاطی تدابیر کی مد میں اٹھنے والے اخراجات کو سرمایہ کاری ہی سمجھنا چاہیے۔

دن گزرتے رہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ عصمت کے خدشات کم سے کم ہوتے رہے۔ ایک طرح کی بے قراری جو ہر لمحہ اس کی جان کھاتی تھی، ماند پڑنے لگی۔ یہ کہا جائے کہ وہ نارمل ہو رہی تھی تو غلط تھا۔ اس کی زندگی میں ایک اٹل تبدیلی رونما ہو چکی تھی، وہ اب ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔ گھونی گھونی سی، سوئی سوئی سی۔ دن، ہفتے اور مہینے اس کے سر سے ہوا کے جھونکوں کے مانند گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ازدواجی زندگی کی گرمجوشی، ترنگ، امنگ سب خواب کی باتیں ہو چکی تھیں۔ کبھی تنہا بیٹھی وہ بری طرح چونک پڑتی اور گھبرا کر ارد گرد دیکھنے لگتی۔ ۔۔ نہ جانے اس خواب ناک انداز میں زندگی گزارتے کتنا عرصہ بیت گیا۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک چمکیلی سہ پہر کا ذکر ہے۔ اس نے آئینہ دیکھا تو چہرے پر ہلکی سی سلوٹیں نظر آئیں۔ وہ اب ایک خاتون کے روپ میں ڈھل رہی تھی۔ اچانک آئینے میں ایک اور چہرہ نظر آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، سامنے بچی کھڑی تھی۔ وہ ابھی ابھی ٹیوشن سے لوٹی تھی۔ اس کی عمر اب کوئی چودہ برس تھی۔ سفید شلوار قمیص اور دوپٹے میں وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ قد اس سے بھی کچھ نکلتا ہوا تھا اور چہرے پر بھولپن تو ایسا تھا کہ جو دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔ بچی نے کتابیں بستر پر پھینکیں اور بھاگ کر ماں کے گلے میں ڈال دیں۔

"امی جان! آج کیا تاریخ ہے؟"

"بائیس" عصمت نے حساب لگا کر کہا۔

"تو پھر" پنکی آنکھیں جھپکا کر بولی۔

عصمت نے ذہن پر زور دیا۔ "اچھا۔ تو پرسوں تمہاری چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں"

"جی ہاں" پنکی نے رعب سے کہا۔ "اور اس دفعہ ہم ہوٹل میں مری جائیں گے اور جا کر رہیں گے"

عصمت نے پیار سے اس کا گال تھپتھپا دیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں آج تمہارے ڈیڈی سے بات کروں گی"

پنکی کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ وہیں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور 'ٹور' کی تفصیلات طے کرنے لگی۔

... چھ بجے یا پانچویں روز وہ سامان گاڑی پر لادے لاہور سے مری کا رخ کر رہے تھے۔ سہ پہر کے وقت مری پہنچے۔ ویک اینڈ تھا چنانچہ پنڈی اسلام آباد سے بھی بے شمار لوگ ایک دن کے لیے مری پہنچے ہوئے تھے۔ ہر طرف ازدحام تھا کمرے بہت مشکل سے مل رہے تھے۔ عبید صاحب نے فیصلہ کیا کہ فی الحال کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں رہ لیتے ہیں۔ پرسوں رش کم ہوگا تو مناسب کمرا ڈھونڈ لیں گے۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر خیبر میں ایک کمرا انہیں مل گیا۔ بس گزارے کے لائق تھا۔ باتھ روم تو عصمت کو بالکل پسند نہیں آیا۔ سیل بنچ باتھ روم تھا لیکن دو کمروں سے اٹیچ تھا۔ تاہم ہوٹل کے ملازم نے بتایا کہ اب یہ صرف آپ والے کمرے سے اٹیچ ہے۔ دوسرا دروازہ سختی سے ٹھونک کر مستقل بند کیا جا چکا ہے... عبید اینڈ فیملی کو کیا معلوم تھا کہ اس دروازے کے سبب ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ ایک خوفناک حادثہ چپکے چپکے سر کتا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ دوسرے روز کا واقعہ ہے۔ شام کا وقت تھا۔ عصمت اور عبید کمرے کے سامنے کھلی جگہ کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ پنکی کمرے میں تھی۔ وہ سیر پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں گئی۔ کچھ دیر واپس نہیں آئی تو عصمت نے اسے پکار کر آواز دی۔ اچانک اندر سے کھٹکھٹاہٹ کی آواز آئی۔ عصمت کو شک گزرا شاید پنکی پھسل گئی ہے۔ اس نے کمرے میں جا کر باتھ روم کا دروازہ دھکیلا تو وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ایک دو آوازیں دیں اور جواب نہ پا کر پریشان ہو گئی۔ عبید بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے دروازے پر دو تین بار دستک دی۔ جواب میں اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے پنکی کسی سے دست و گریباں ہے۔ عصمت چلانے لگی۔ عبید نے دروازے کو زوردار دھکے دیے پھر ٹانگ کی پے در پے ضربوں سے کنڈی توڑ دی۔ دروازہ کھلا تو لرزہ خیز منظر ان کے سامنے تھا۔ پنکی فرش پر بے ہوش پڑی تھی اور کوئی شخص دوسرے دروازے کے ٹوٹے تختے میں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ عصمت نے ایک نظر اپنی بے ہوش بچی پر ڈالی اور غصے سے پاگل ہو گئی۔ اس نے جھپٹ کر حملہ آور کو عقب سے پکڑ لیا۔ عبید نے بھی عصمت کا ساتھ دیا اور اسے کمرے کھینچ کر تختہ دروازے کے سوراخ سے نکال لیا۔ یکایک حملہ آور پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں چمکدار پھل کا خنجر تھا... ایک جھٹکے سے اس نے خنجر عبید کے پیٹ میں اتار دیا۔ جب دوسرے وار کے لیے اس کا ہاتھ حرکت کرا تھا عصمت کی پھٹی ہوئی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ یکے بعد دیگرے دو دلدوز چیخیں اس کے ہونٹوں سے نکلیں۔ اس کے سامنے نو برس پہلے کا ایئر کموڈر کھڑا تھا۔ وہ ان چمکدار آنکھوں کو کیسے بھول سکتی تھی؟ بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لمبے بال تھوڑے سے گرے ہو گئے تھے اور مونچھوں کی بائیں قدرے کم ہو گئی تھی مگر چہرے کی خباثت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے عصمت کو پہچانا نہیں۔ پلک جھپکتے میں اس نے عبید پر دوسرا وار کیا۔ عصمت نے وار اپنے ہاتھ پر روکا۔ خنجر اس کی نازک انگلیوں کو چیرتا ہوا ایک بار پھر عبید کے جسم میں گھس گیا۔ عصمت اب جھپٹوں کی پوری قوت



- کیا آپ کی عمر 19 یا 20 سال تک ہے اور آپ کا قد چھوٹا ہے؟
- کیا چھوٹے قد کی وجہ سے آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں؟
- کیا آپ کے بچے کی نشوونما عمر کے مطابق کم ہے اور اس کا قد چھوٹا ہے؟

ایڈریس لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ عمر اور موجودہ قد لکھ کر تفصیلات منگوالیں

اپنے خط پر بھی اپنا مکمل ایڈریس ضرور تحریر کریں۔

پوسٹ بکس 18100 کراچی 33

سے چلا رہی تھی۔ حملہ آور نے قہر ناک نظروں سے اسے دیکھا پھر بھرپور قوت سے ایک ٹانگ اس کے منہ پر جمائی۔ عصمت چیخ اڑتی ہوئی باتھ روم سے باہر جا پڑی۔ ہوٹل کے ملازمین اب بھاگتے ہوئے کمرے میں پہنچ چکے تھے مگر وہ جب تک عصمت کو سنبھالتے یا صورتِ حال سمجھ سکتے ان کا 'سفاک کسٹمر' اپنے کمرے کے راستے فرار ہو چکا تھا۔ عصمت چلاتی ہوئی اٹھی اور شوہر سے لپٹ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عبید نے آخری ہچکی لی اور عصمت کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ عصمت پاگلوں کی طرح گریہ وزاری کرنے لگی پھر دفعتاً اس کا دھیان بچی کی طرف گیا۔ وہ شوہر کی لاش سے اٹھی اور بے بیٹی کے جسم سے لپٹ گئی۔ اس کے جسم میں زندگی کی حرارت باقی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ سو رہی ہے۔ اس کے چہرے کے پاس ہی ایک رومال پڑا تھا۔ اس رومال سے کلوروفارم کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ "میری بیٹی کو بچاؤ..." عصمت چیخی۔ لوگوں نے بچی کو اٹھایا اور بھاگتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر کچھ لوگوں نے عبید کو بھی باہر کھڑی کار میں ڈالا اور اسپتال کی طرف لپکے۔ حالانکہ عبید کو اتنی عجلت میں لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی جان بیٹی پر قربان کر چکے تھے۔ عصمت کو لگ رہا تھا جیسے وہ جاگ نہیں رہی، سو رہی ہے۔ اسے اپنی نگاہ کا ہر منظر دھندلا دھندلا خون آلود نظر آ رہا تھا۔ وہ ننگے سر ان لوگوں کے پیچھے بھاگی جو اس کے پیاروں کو اسپتال کی طرف لے کر گئے تھے۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور مری کی بھری برفیلی سڑکوں پر بھاگی جا رہی تھی۔ آخر ایک کار والے نے اسے لفٹ دی اور لے کر اسپتال پہنچا۔

بچی کی حالت نازک تھی۔ اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا وہ لٹیرے کے ہاتھوں تو محفوظ رہی تھی مگر کلوروفارم کی زیادتی نے اسے جاں بلب کر دیا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹر اسے بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ وہ رات ایک پہاڑ جیسی رات تھی۔ پہاڑ ہی کی طرح اٹل اور سخت۔ اسپرٹ اور دواؤں کی بو والے برآمدے میں عصمت بے قرار پیروں سے ٹہل رہی تھی اور اس کا نوحہ رہ رہ کر اسپتال کی دیواروں کو لرزا جاتا تھا۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب عصمت کا بھائی اور اس کے ڈیڈی لاہور سے مری پہنچے۔ عصمت ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی! مجھے اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔ عبید کی جان میرے گناہوں نے لی ہے۔ میں گناہ گار ہوں ڈیڈی۔ میں نے آپ کی نصیحت بھلا دی۔ میں نے سچ کا دامن چھوڑ دیا۔ میں نے دنیا کا سب سے سنگین جھوٹ بولا ڈیڈی!"

مسٹر شاہ زیب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بیٹی کی پشت تھپکتے رہے اور اسے تسلی دیتے رہے۔ انھوں نے چمکار کر کہا۔ "میری جان! بچی کو تمہارے آنسوؤں سے زیادہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ دعا کرو۔ ہم سب دعا کرتے ہیں۔ یہ دعاؤں کا وقت ہے۔"

انھوں نے اسے بمشکل خود سے جدا کیا۔ ہچکیاں لیتی ہوئی عصمت نے وضو کیا اور اسپتال کے شفاف برآمدے میں چادر بچھا کر نوافل پڑھنے لگی۔ ہر دو نفلوں کے بعد اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے اور لبوں سے سسکیاں برآمد ہوتیں۔

"اے میرے مولا! مجھ پر رحم فرما میری خطاؤں کو بخش دے۔ اب بھر میں اور غم سہنے کی ہمت نہیں۔ اے رحیم و رحیم! میری بچی کو بچا لے۔ میری پھول سی بچی کو بچا لے۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ تیرے دربار میں کسی شے کی کمی نہیں... اے میرے پروردگار! اب میری برباد زندگی میں اس بچی کے سوا کوئی روشنی نہیں۔ اس روشنی کو سلامت رکھ یا مجھے بھی ان اندھیروں سے دور لے جا..."

وہ سسکتی رہی اور نوافل ادا کرتی رہی۔ شیشے کے دروازے کے اس پار سفید لبادوں والے ڈاکٹر بیری سے آتے اور جاتے رہے۔ آخر ایک ڈاکٹر ہاتھ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔

"مس عمیرہ کے ساتھ آپ ہیں؟" اس نے عصمت کے ڈیڈی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" عصمت کے ڈیڈی نے لرزاں ہاتھوں سے چشمہ درست کیا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر وہی یاس انگیز تاثر ابھرا جو صدیوں سے غمزدہ لواحقین کا دل خون کرتا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "ہم نے بہت کوشش کی سر! لیکن... خدا کی مرضی یہی تھی۔"

ڈاکٹر کے الفاظ بم کی طرح عصمت کی سماعت سے ٹکرائے یہ دو جملے نہیں تھے بم کے دو جلتے ہوئے ٹکڑے تھے جو اس کے کانوں میں گھس گئے تھے۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چیخی...

"نہیں... نہیں۔"

... اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی چیخ سن کر عبید بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ وال کلاک ساڑھے چار کا وقت بتا رہا تھا۔ عصمت نے محسوس کیا، بھیگا ہوا جو رومال اس نے آنکھوں پر رکھا تھا ابھی تک اس کے رخسار پر ہے۔ بیڈ کے دائیں کنارے ایک بستر پر ننھی پنکی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی فرشتوں جیسا چہرہ لیے نہ جانے کن خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ لرزاں ترساں عصمت کھلی کے ٹل اٹھ کر بیک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اب اس کی کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا جسے معمول رات کے آخری پہر اس نے ایک طویل ڈراؤنا خواب دیکھا تھا... زندگی ابھی اتنی بھیانک نہیں

Suspense Digest March 1990.pdf

ہوئی تھی۔ چارپائی پر سویا ہوا فرشتہ ابھی مری کی اس منحوس قتل گاہ سے بہت دور تھا۔ اس کے محبوب شوہر کے ہاتھ ابھی اپنے ہی خون سے رنگین نہیں ہوئے تھے۔ ابھی خلقِ خدا نے اسے برہنہ سر سڑکوں پر چیختے چلاتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اس زندگی ابھی اتنی بھیانک نہیں ہوئی تھی۔ یکایک آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ وہ سسک کر بڑھی اور خوابیدہ پنکی کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ ذرا ہی دیر میں خواب گاہ اس کی دلدوز دہاڑوں سے گونجنے لگی۔ عبید حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ گلوگیر آواز میں پکار رہی تھی۔

"میری بچی! میں سب کچھ بتا دوں گی، سب کچھ بتا دوں گی۔۔۔ میری جان! میں تیری خاطر کچھ نہیں چھپاؤں گی۔۔۔"

اس روز چھٹی تھی۔ پنکی کو اس کی خالہ کے گھر بھیجنے کے بعد، عصمت نے شوہر سے اصرار کیا کہ وہ آج کہیں نہیں جائیں گے، اسے آج ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ عبید نے ایک دو جگہ ٹیلیفون کر کے اپنی مصروفیات منسوخ کر دیں تو عصمت ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کچھ دیر حوصلہ جمع کرتی رہی۔ پھر پیش آنے والا سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔۔۔ ردِعمل عصمت کی توقع کے خلاف نہیں تھا۔ عبید کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا، جسم کانپنے لگا اور آنکھیں غم و غصے سے بھر گئیں۔ میاں بیوی تادیر گم صم بیٹھے رہے۔ انتہائی تلخ حقائق کی ناقابلِ برداشت کڑواہٹ جرعہ جرعہ حلق میں انڈیلتے رہے۔ اچانک عصمت کو عبید سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔۔۔ عبید پورے بارہ گھنٹے کمرے میں بند رہے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے۔۔۔ دروازے کو دیکھ کر عصمت کو محسوس ہوتا رہا جیسے دوسری طرف اس کی زندگی کے لیے کوئی مہیب طوفان پل رہا ہے۔ آخر رات کو بیچے عبید کمرے سے نکلے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور کتنی ہی دیر خاموش کھڑے اس کی سسکیاں سنتے رہے پھر دھیمے لہجے میں بولے۔

"تم بہت بلند حوصلہ عورت ہو۔ میں تمھاری قدر کرتا ہوں۔"

عصمت نے روتے ہوئے پوچھا: "اب کیا ہوگا عبید؟"

عبید نے کہا: "سب اچھا ہوگا عصمت! تم نے ایک عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ کام کسی جہاد سے کم نہیں۔ ہم دونوں مل کر یہ جہاد کریں گے۔" جذبات سے ان کی آواز رُندھ گئی۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ رسوائی، بدنامی، خوف۔ ہر مشکل میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

عصمت نے ٹیرے کا ٹکٹ اسٹور سے لا کر شوہر کے ہاتھ میں تھما دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کہاں کن کن چیزوں پر اس کے فنگر پرنٹس مل سکتے ہیں۔۔۔ عبید سب کچھ سنتے رہے پھر ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھے اور کہیں ٹیلیفون کرنے لگے۔

اگلے ایک برس میں عصمت اور عبید نے بے حد مصائب جھیلے۔ انھیں اور ان کے قریبی عزیزوں کو خرمندگی اور پشیمانی کے بے شمار مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ غرض وہ سب کچھ ہوا جو ایسے حادثے کا شکار ہونے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس باہمت جوڑے نے بڑے حوصلے سے جھیلا اور تماشائی نگاہوں کے سامنے سر اٹھا کر اور قدم جما کر قانون کے راستے پر آگے بڑھتے رہے۔ آخر قانون نے اپنی منزل پہچانی۔ مجرم پکڑا گیا۔ وہ اسی علاقے کا ایک بدقماش شخص تھا۔ تفتیش کی جنگ میں پس کر اس نے عصمت دری اور اغوا کی کئی ایک وارداتوں کا اعتراف کیا۔ ایک اغوا کے دوران اس سے قتل بھی سرزد ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسے ۳۰۲ کا سامنا کرنا پڑا اور آخر ایک طویل عدالتی کارروائی کے بعد پھانسی کے پھندے سے اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔

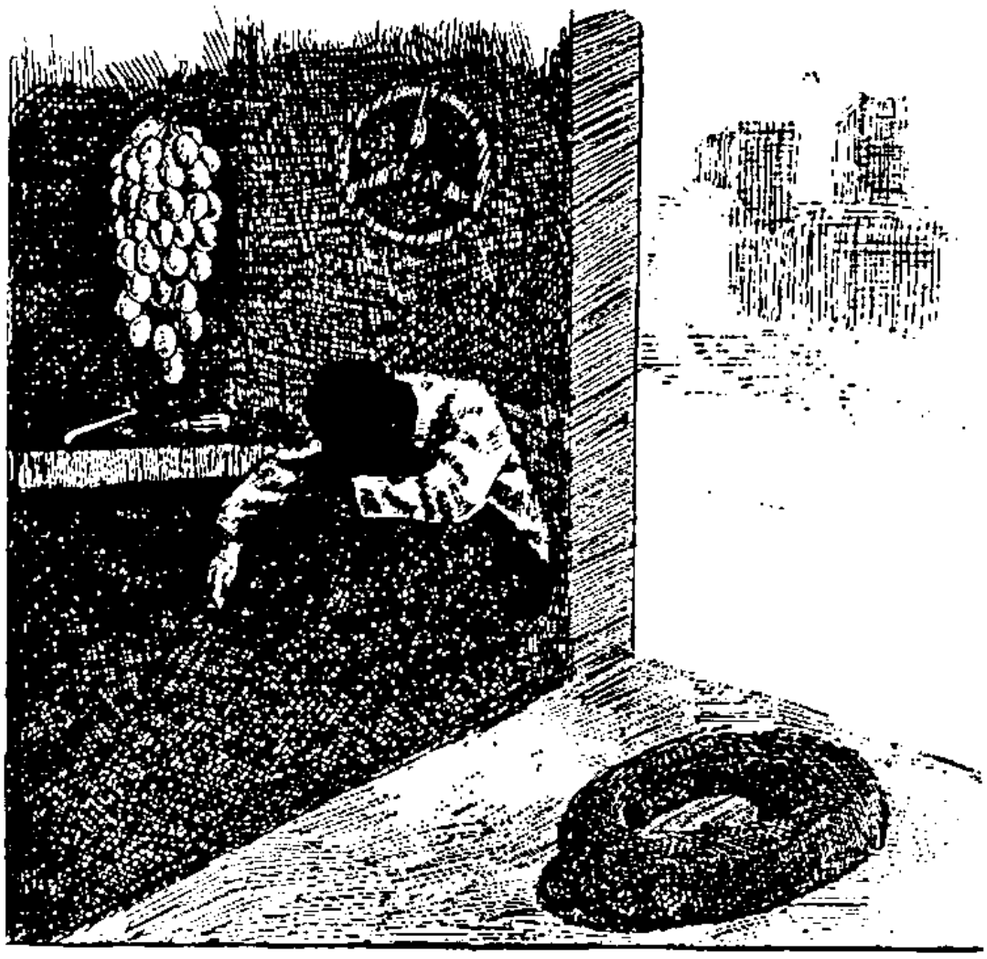
جس روز مسٹر عبید نے خوش خبری دینے کو اطلاع دے کر گھر میں داخل ہوئے اس روز ان کے پاس دو پاسپورٹ بھی تھے۔ انھوں نے سعودی عرب میں ایک اچھی ملازمت ڈھونڈ لی تھی اور اب یہ گھرانا وہاں شفٹ ہو رہا تھا۔۔۔ وہ سچ کی سولی چڑھ چکے تھے مگر سچ بولنے والے کے لیے ابھی ہماری سوسائٹی میں زیادہ گنجائش نہیں۔۔۔ کیوں نہیں؟ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔۔۔ اور ہم سب دے سکتے ہیں۔

لاعلاج

نگہت مرزا۔ لاہور

ایک بہت ہی موٹا شخص ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ جب وہ سوتا ہے تو اس کا منہ کھلا رہتا ہے۔ کیا اس کا کوئی علاج ممکن ہے۔

ڈاکٹر نے ایک نظر مریض پر ڈالی اور بولا: "آپ کے مرض کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔ آپ کی کھال اتنی کھنچ چکی ہے کہ جب آپ کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو آپ کا منہ خود بخود کھل جاتا ہے۔"



انگوروں سے بھلا کون واقف نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اُن کا ٹھنڈا اور میٹھا رس حلق میں تراوٹ اور دماغ میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ اس پھل کو پیارا جانتے ہوئے شاعر نے بیشتر محاوروں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً انگور کھٹے ہیں والا محاورہ تو زبان زدِ خاص و عام ہے مگر یقین کیجیے کہ اس کہانی میں انگور کا جو گچھا آپ کو نظر آئے گا اُس کا محاورے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس مختصر اور چٹاخ پٹاخ سی کہانی کا تانا بانا اتنی خوبصورتی اور چابکدستی سے بُنا گیا ہے کہ آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی وہ بات نہ آئے گی جو اس کہانی کے انجام میں مضمر ہے جبکہ یہ بہ ظاہر ایک کالج کے دو اُستادوں کا معمولی سا جھگڑا ہے۔ پڑھنے والوں کی پوری توجہ حاصل کرنے والی اس سے کہانی کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔

انگور

طاہر جاوید مُغل

Scanned By Faisal Ahmed

احمد رضا نے آنکھیں کھولیں۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ بلندی پر واقع روشندان سے خاصی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس نے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اس کے سونے سے پہلے تھا۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج چکے تھے۔ وہ قریباً ڈھائی گھنٹے سویا تھا۔ سویا بھی کہاں تھا' غالباً نڈھال ہو کر نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کی پشت دیوار سے ٹکی ہوئی تھی اور ٹانگیں دی کی شکل میں سامنے گیراج کے فرش پر پھیلی تھیں۔ وہ کراہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

کیسا منحوس منظر تھا جو پچھلے سولہ گھنٹوں سے مسلسل اس کی نگاہوں کا امتحان لے رہا تھا۔ چار دیواریں' ایک چھت اور ایک فرش۔ بمشکل چار مربع جگہ ہو گی۔ یہ ایک گیراج تھا۔ ایک نئے ماڈل کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ کار کے دو اگلے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اندرونی بتی روشن تھی۔ گیراج میں بھی ایک بتی جل رہی تھی۔ یہ زیرو کا بلب تھا۔ بلب کے سامنے والی دیوار پر ایک ٹیوب لائٹ تھی۔ تاہم یہ بجھی ہوئی تھی۔ گیراج کے دو دروازے تھے۔ ایک تو مین دروازہ تھا جس پر آہنی شٹر تھا۔ دوسرا دروازہ گیراج کی اگلی نکڑ میں تھا۔ یہ لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ تھا اور مکان کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ دونوں دروازے بند تھے۔

گاڑی سفید رنگ کی تھی۔ اس کی نشستوں پر ہلکے براؤن کپڑے کے کور چڑھے ہوئے تھے۔ گاڑی کی طرح یہ کور بھی بالکل نئے اور بے داغ تھے۔ ڈیش بورڈ پر ایئر ریفریشر کی بوتل فکس تھی۔ چھت پر ٹشو پیپرز کا خوبصورت ہولڈر لگا ہوا تھا۔ عقب نما آئینے کے پاس آرائشی انگوروں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔ ڈیش بورڈ پر سب سے نمایاں چیز ایک گھڑی تھی۔ اس جدید اسٹائل کی گھڑی نے ڈیش

بورڈ کی زینت میں خاطر خواہ اضافہ کردیا تھا۔

اس گیراج میں بند ہوئے احمد رضا کو سولہ گھنٹے ہوئے تھے۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سولہ برس سے اس گیراج میں بند ہے۔ اور وہاں موجود اشیا کو دیکھ رہا ہے۔ اب وہ آنکھیں بند کرلیتا تو بھی گیراج کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ وہ ٹانگوں پر زور دے کر بمشکل اٹھا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو پسینے میں شرابور تھا۔ حبس اور گرمی نے تو اسے رات بھر تنگ کیا تھا لیکن رات گزرنے اور سورج طلوع ہونے کے بعد یہ گرمی کچھ اور ہی رنگ اختیار کر رہی تھی۔ اس نے آنے والی گھڑیوں کا سوچا اور کانپ کر رہ گیا۔

اوائل جولائی کا طویل' پہاڑ جیسا دن سر پر تھا۔ آگ برساتا سورج دھیرے دھیرے بلند ہو رہا تھا اور احمد رضا جانتا تھا کہ اگلے چند گھنٹوں میں یہ سورج اس نیچی چھت والے گیراج کو تندور بنا دے گا۔ کیا اس تندور میں وہ کباب ہونے سے بچ سکے گا؟ یہ سوال کسی جہنمی عفریت کی طرح منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بازوؤں کا پسینہ دھاروں کی صورت سفر کرتا کلائیوں تک پہنچا تو ہاتھوں کی پشت پر مرچیں سی لگ گئیں۔ احمد رضا نے ہاتھ اٹھا کر دیکھے۔ کل نصف شب تک وہ مسلسل آہنی شٹر پر مکے برساتا اور چیختا رہا تھا۔ اس ایکسرسائز نے اس کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ گلے کو بھی چھیل ڈالا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو احمد رضا زخمی ہاتھوں کی مرہم پٹی کرا کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بستر پر نیم دراز پڑا ہوتا اور اس کی خوبصورت بیوی اپنے ہاتھ سے اسے ناشتا کرا رہی ہوتی۔ مگر اب تو یہ خیال کی باتیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان ہی زخمی ہاتھوں کے ساتھ ابھی اسے آہنی گیٹ پر اور بہت سے مکے برسانے ہیں اور اس زخمی گلے کے ساتھ ابھی اور بہت چیخنا ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور لڑکھڑاتا ہوا گیٹ تک پہنچ گیا۔ باہر کی سن گن لینے کے لئے اس نے شٹر سے کان لگایا تو سسکاری لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ ابھی دن کا آغاز تھا لیکن دھوپ نے آہنی گیٹ کو بری طرح تپا دیا تھا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور شٹر کے نیچے موجود درز کو کانوں سے قریب تر کر دیا۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو قبرستان میں ہوتی ہے۔ یا اس صحرا میں جہاں گمشدہ قافلوں کی باقیات پائی جاتی ہیں۔

اس گیراج سے باہر ویرانی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کسی کتے کی صدا' نہ کسی پرندے کی چہچہاہٹ۔ شاید پتوں میں سُر سرانے والی مدھم ہوا بھی گرمی کے تیور دیکھ کر آج گھر سے نہیں نکلی تھی۔ مکمل سکوت نے جیسے بند گیراج کی گھٹن میں اور اضافہ کر دیا۔ احمد رضا بے چین ہو کر کھڑا ہوگیا اور مٹھیاں بھینچ کر زور زور سے آہنی شٹر پر مارنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا۔ "دروازہ کھول! سعیدی! کتے کے بچے' دروازہ کھول دے' میں کہتا ہوں دروازہ کھول دے۔ کوئی ہے؟... کوئی ہے؟..... دروازہ کھولو۔ خدا کے لئے دروازہ کھولو۔"

وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ مسلسل یہ پکار کرتا رہا۔ آخر بے دم ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر ہانپنے کے بعد وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلی نشست کی پشت پر سر ٹکا کر نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر دانت کچکچا کر اٹھا اور گاڑی کو ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ اس کے وزنی بوٹوں نے گاڑی کی چادر میں ڈینٹ ڈالنے شروع کردئے۔ وہ چیخنے لگا۔ "سعیدی! کتے! حرامزادے' میں تجھے جیل میں سڑا دوں گا۔ تجھے قتل کرادوں گا۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھول دے....." تھکنے میں ٹیسیں اٹھنے لگیں تو اس نے ٹھوکروں کا سلسلہ ختم کر دیا۔ ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے نشست پر بیٹھ گیا اور مراقبے میں چلا گیا۔ اس دفعہ یہ مراقبہ کافی طویل ثابت ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھانا شروع کیا....

دیکھو احمد رضا! اپنے ذہن کو قابو میں رکھو۔ اگر تمہارا ذہن تمہارے بس میں نہ رہا تو پھر اذیت ناک موت تمہارا مقدر ہوگی۔ تمہارے پاس وقت تھوڑا ہے۔ گزرنے والی ہر ساعت کے ساتھ تمہاری ذہنی اور جسمانی طاقت زائل ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم گرمی اور پیاس سے نڈھال ہو کر خود ہی اس قبر میں لیٹ جاؤ۔ تمہیں ٹھنڈے دل و دماغ سے اس صورت حال کے بارے میں سوچنا چاہئے اور رہائی کی سبیل کرنی چاہئے۔ سب سے پہلے تو یہ ذہن نشین کرلو کہ وہ سعیدی' کتے کا بچہ محرم کی چھٹیاں گزارنے کے لئے یہاں سے جاچکا ہے۔ اور اس کے دونوں ملازم بھی چھٹی کر چکے ہیں۔ چھٹیوں کی وجہ سے کوئی اخبار والا' دودھ والا یا ڈاکیہ ادھر نہیں آئے گا۔ نہ ہی سعیدی کے دوست احباب میں سے کوئی اسے ملنے یہاں پہنچے گا۔ لہٰذا اگر اس پنجرے کو توڑنا ہے تو تمہیں خود ہی توڑنا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ نشست سے اٹھا اور بڑی بردباری سے گیراج کا جائزہ لینے لگا۔ لکڑی کے چھوٹے دروازے پر اس نے رات بہت کوشش کی تھی اور اس آخری نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسے توڑنا یا کھولنا ممکن نہیں۔ روشندان تک رسائی بھی کم از کم اس کے لئے ناممکن تھی۔ گو اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ تیس برس کے شخص کو جواں سال ہی کہا جاتا ہے اور اس میں خاطر خواہ پھرتی بھی ہوتی ہے لیکن وہ فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس فربہی کے سبب عرصۂ دراز..... سے اس نے کوئی کود پھاند کا کام نہیں کیا تھا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح روشندان تک پہنچ بھی جاتا تو اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ وہ وہاں لگی گرل کو اکھاڑ کر باہر نکل سکے گا۔ آجا کے وہ آہنی شٹر رہ جاتا تھا۔ یہ ہر پورچ کی طرف کھلتا تھا اور جس کو اوپر اٹھانے سے نیچے قریباً چار انچ کی درز پیدا ہو جاتی تھی۔ اس شٹر پر باہر کی طرف تالے لگے ہوئے تھے اور یہ مضبوط چادر کا بنا ہوا تھا۔ اگر وہ اسے توڑنا چاہتا تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ

گاڑی میں بیٹھ جاتا' انجن اسٹارٹ کرتا' اسے ریورس گیئر لگاتا اور پورے زور کے ساتھ شٹر سے ٹکرا دیتا۔ پھر گاڑی کو آگے لے جاتا' چار پانچ فٹ کا اسٹارٹ لیتا اور دوبارہ شٹر کو ٹکر مارتا۔ ممکن تھا ایسی بیس پچیس ٹکروں کے بعد شٹر کی ثابت قدمی میں کوئی فرق پڑ جاتا۔ لیکن اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو بنیادی چیز اسے درکار تھی وہ اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ یعنی گاڑی کی چابی۔ چابی کے بغیر انجن کیسے اسٹارٹ ہوتا؟

وہ ایک گہرا سانس لے کر شٹر کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ نیچے کی درز سے روشنی اور گرمی کی لہریں اندر آ رہی تھیں۔ اس نے بغور فرش کو دیکھا۔ بہت پرانا فرش تھا۔ شاید چالیس پچاس سال پہلے کا۔ کہیں کہیں ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی اور نیچے سے کنکریٹ جھانک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا فرش کی ڈھائی تین انچ موٹائی کے نیچے اینٹوں کی روڑی ہو گی اور اس روڑی کے نیچے کچی زمین۔ اگر وہ کسی طرح فرش توڑ کر زمین کھود لیتا تو بند شٹر کے نیچے سے باہر نکلا جا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کار کی ڈکی میں چند اوزار پڑے ہیں۔ ان کے ذریعے فرش توڑنے اور زمین کھودنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ ڈکی سے یہ اوزار نکال لایا اور شٹر کے قریب آ بیٹھا۔ فرش کے گڑھوں کو وسیع کرنے کے لئے پانے اور چھوٹے اسکریو ڈرائیور کا استعمال مناسب دکھائی دیتا تھا۔ زمین میں گڑھا کھودنے کے لئے وہ جیک کے اسکریو کو گھمانے والا لمبا راڈ استعمال کر سکتا تھا۔

کسی کام کے سہل یا مشکل ہونے کا پتا اسی وقت چلتا ہے جب اسے کیا جاتا ہے۔ دو گھنٹے کی سر توڑ کوشش میں احمد رضا نے دو اسکریو ڈرائیور بیکار کئے' تین انگلیاں لہولہان کیں اور اپنی باقی ماندہ توانائی کا بیشتر حصہ برباد کر لیا۔ اس کے عوض اس نے فرش کو جو نقصان پہنچایا وہ ناقابل ذکر تھا۔ وہ بمشکل آٹھ انچ قطر کا دو انچ گہرا گڑھا کھود سکا۔ آخر اس نے اوزار پھینکے اور مُردہ چھپکلی کی طرح نیم گرم فرش پر گر گیا۔ سورج نصف النہار پر تھا اور گیراج کی دیواریں اس کی تمازت روکنے میں قطعی ناکام ہو چکی تھیں۔ متان کا درجۂ حرارت شاید آج کوئی ریکارڈ قائم کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔

احمد رضا نے محسوس کیا کہ وہ ایک تاریک جہنم کدے میں ہے۔ اب اسے پسینہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اپنے مساموں کو چوس کر ہی اپنی اکڑی ہوئی زبان کو تراوٹ پہنچاتا۔ اب تک اس نے صرف پیاس کا نام سنا تھا۔ آج اسے ان چار حرفوں کی حقیقت معلوم ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا بھٹی میں تپی ہوئی ایک تلوار اس کے حلق سے لے کر ناف تک اتری ہوئی ہے۔ کبھی جب وہ تھوک نگلنے کی کوشش کرتا تو اسے شدید کھانسی اٹھتی۔ محسوس ہوتا حلق کی نالیاں اندر سے جڑنے لگی ہیں۔ آہ' کتنا خوبصورت لفظ تھا "پانی۔"

اس نے اٹھ کر ایک بار پھر کار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ شاید



COLLABORATION WITH PROFESSIONAL AMERICAN UNIVERSITIES

پاکستان کا پہلا اور واحد ادارہ جو دُنیا بھر میں آسان اور عام فہم اُردو اور انگلش میں خط و کتابت کے ذریعہ کمپیوٹر ایئر ٹکٹنگ و دیگر پروفیشنل کورسز کرا رہا ہے۔

کمپیوٹر کورسز

ایم ٹی او ڈی ٹیسٹ کی تیاری کے ساتھ
BASIC, dBASE III+, WS, DOS, EDP

ایئر ٹکٹنگ اینڈ ٹیرف

ٹریول ایجنسی کھولئے یا شاندار اور باوقار ملازمت کیجئے۔ IATA کے سلیبس کے مطابق

پرائیویٹ سراغرساں بنیے

سراغرساں کا مکمل کورس جس کو مکمل کر کے آپ وطن عزیز کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے شوق کی تکمیل بھی کر سکتے ہیں

فوٹوگرافی اور ریڈیو الیکٹرونکس

ایک ایسا مشغلہ جو نہ صرف آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے بلکہ آپکو بہترین مستقبل کی ضمانت بھی دیتا ہے

شمسی توانائی (SOLAR ENERGY)

جس کے ذریعے آپ دھوپ سے برف جما سکتے ہیں۔ کار اور ٹی وی چلا سکتے ہیں۔

انگلش لینگویج پروگرام

بین الاقوامی زبان جس کا سیکھنا نہایت ضروری ہے اوّل تا آخر ہماری رہنمائی آپکے ساتھ ساتھ۔

ایکسپورٹ، امپورٹ اینڈ مارکیٹنگ

ایک ایسا کورس جو انٹرنیشنل بزنس میں آپکے حال کو شاندار اور مستقبل کو عظیم ترین بناتا ہے۔

مکمل تفصیلات کے لئے پانچ روپے کا پوسٹل آرڈر یا ڈاک ٹکٹ یا مساوی رقم کا بینک ڈرافٹ بنام نیوٹیس اکیڈمی P.E.C.H.S کراچی ارسال کریں۔
جس کورس میں داخلہ لینا ہو اس کا حوالہ ضرور دیجئے
کمپیوٹر، ایئر ٹکٹنگ، انگلش لینگویج اور ایکسپورٹ امپورٹ کے کورسز ریگولر بھی کرائے جاتے ہیں۔

marksman

کہیں کوئی تھرماس ہو۔ کوئی بوتل ہو' یا کوئی ایسی چیز جو اس کے حلق کو تر کر سکے۔ یہ تلاش ایسے ہی تھی جیسے کوئی الماری کی درازوں میں گمشدہ بچے کو تلاش کرتا پھرے۔ وہ اس مقصد سے درجنوں مرتبہ گاڑی کا جائزہ لے چکا تھا۔ گھوم پھر کر اس کی نظروں میں وہی چند مناظر آتے تھے۔ نشستوں کے خاکی کور' جنہیں دیکھ کر کسی لق و دق ویرانے کی خاک کا خیال آتا تھا۔ ایئر ریفریشر کی بلوری بوتل میں جھلکتا ہوا سرخی مائل پرفیوم جس پر کسی ٹھنڈے مشروب کا گمان کیا جاسکتا تھا۔ ونڈ اسکرین کے سامنے جھولتے ہوئے زرد انگور جنہیں دیکھتے ہی اصلی انگوروں کا تصور ذہن میں آتا تھا اور پیاس کی شدت کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ ان مناظر کے علاوہ ایک منظر اور بھی تھا جس پر اس کی نگاہ بار بار ٹک جاتی تھی۔ گاڑی کے پہلو میں دیوار کے پاس فرش میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ اس ایک انچ گہرے گڑھے میں تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ شاید گاڑی کے ٹائر دھوتے ہوئے یا فرش صاف کرتے ہوئے یہ پانی یہاں جمع رہ گیا تھا۔ یہ پانی احمد رضا کے سوکھے حلق کو تر کر سکتا تھا۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو گاڑی سے نکل کر اس پانی کے قریب آبیٹھا اور جھک کر غور سے دیکھنے لگا۔ رات اسے ٹھیک طرح دکھائی نہیں دیا تھا مگر اب وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی باریک نگاہ خوردبین کی طرح پانی کا جائزہ لینے لگی۔ اس میں مٹی کے ذرّے تھے۔ موبل آئل کے لہریے تھے اور کسی زرد مادّے کی آلائش تھی۔ بہت ممکن تھا کہ یہ زرد مادّہ گوبر ہی ہو۔ اسے ابکائی سی آگئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اپنی حالت پر آج اسے خود ہی ترس آرہا تھا۔ وہ جو اپنے حلقۂ احباب میں نفیس طبع اور صفائی پسند مشہور تھا' آج کتنے مختلف انداز سے سوچ رہا تھا۔

اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے پہلی بار پروفیسر خالد سعید سے اختلاف کرکے ایک سرد جنگ کا آغاز کیا تھا۔ یہ کوئی ایک برس پرانی بات تھی۔ نفسیات کا اسسٹنٹ پروفیسر خالد سعید بہاولپور سے ٹرانسفر ہو کر ملتان آیا تھا۔ احمد رضا بھی اسی کالج میں فزکس کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اپنے فرائض کے سلسلے میں دونوں کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ گو خالد سعید اور احمد رضا ہم عمر تھے لیکن دونوں کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ خالد سعید جسے یار لوگ ڈاکٹر سعیدی کہتے تھے' اُجڑے بکھرے بالوں اور بے ترتیب لباس والا ایک سنکی شخص تھا' جبکہ احمد رضا کالج کا سب سے خوش لباس اور جاذبِ نظر استاد سمجھا جاتا تھا۔

ایک دن اساتذہ کے ایک گروپ کے ساتھ دونوں کا بہاولپور جانا ہوا۔ وہاں انہوں نے سائیکل رکشا چلتے دیکھے۔ احمد رضا کے لئے یہ منظر بالکل نیا تھا۔ اس نے ایک رکشے میں دو سیٹھ نما افراد کو بیٹھے اور ایک مدقوق شخص کو سائیکل کھینچتے دیکھا تو بہت عجیب محسوس کیا۔ اس نے ڈاکٹر سعیدی سے کہا "یار' ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ کتنی بے حسی کی بات ہے یہ؟"

سعیدی نے مسکرا کر کہا "بے حسی کی بات یہ تمہارے لئے ہے' کیونکہ تم پہلی بار دیکھ رہے ہو۔ جب کوئی چیز روٹین میں آجاتی ہے تو معمولی بن جاتی ہے۔ چار دن تم یہاں رہو گے تو اسی طرح ٹھاٹ سے رکشا میں بیٹھے نظر آؤ گے۔"

احمد رضا نے بیزاری سے کہا "چھوڑو یار! تم تو ہر مسئلے کو کھینچ کر نفسیات کی دلدل میں لے جاتے ہو۔ اگر تمہاری روٹین والی بات تسلیم کرلی جائے تو پھر ہر برائی کا جواز نکل سکتا ہے۔ بات صرف حساس ہونے اور بے حس ہونے کی ہے۔ مرنا بھی تو روٹین میں ہے' پھر تمہیں مرنے سے خوف کیوں آتا ہے! اس لئے کہ مرنا تمہارے فائدے میں نہیں؟"

سعیدی نے کہا "مرنا بھی روٹین میں آجاتا ہے۔ میدان جنگ میں جب کشتوں کے پشتے لگ رہے ہوں' موت بے معنی چیز ہو جاتی ہے۔ اپنی جگہ تم بھی صحیح ہو لیکن تم مسئلے کا اخلاقی پہلو بیان کر رہے ہو جبکہ میں نفسیاتی...."

"چھوڑو یار۔" احمد رضا نے بھنّا کر اس کی بات کاٹی۔ "بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتے ہو۔"

ڈاکٹر سعیدی نے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہی تو احمد رضا مزید بھڑک اٹھا۔ نتیجتاً دونوں میں اچھی خاصی جھڑپ ہوگئی۔

یہ جھڑپ ایک مستقل اور روز افزوں کشیدگی کا باعث بن گئی' حالانکہ یہ ایک خالص علمی تنازعہ تھا' مگر چند دھواں دھار بحثوں کے بعد ذاتی دشمنی کا رنگ اختیار کر گیا۔ کالج کے جریدے میں احمد رضا نے چند مضامین بھی لکھے۔ ان مضامین کا مقصد ڈاکٹر سعیدی کی مخالفت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ احمد رضا نے لکھا کہ ہمارے خود ساختہ نفسیات دانوں کا یہ استدلال بالکل غلط ہے کہ انسانی آنکھ بصارت سے نہیں بلکہ روز مرّہ تجربات کی روشنی میں دیکھتی ہے' اور یوں بعض سماجی ناہمواریاں نمایاں ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ اپنے موقف کے حق میں احمد رضا نے بھاری بھر کم لفظ استعمال کئے۔ تند و تیز دلائل دیئے اور پروفیسر پر رکیک حملوں سے بھی باز نہیں رہا۔

احمد رضا کا آخری مخالفانہ مضمون چند ہفتے پہلے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے جواب میں ڈاکٹر سعیدی نے بھی ایک مضمون لکھ مارا۔ یہ اس کا پہلا مضمون تھا جس میں اس نے نام لے کر احمد رضا پر تنقید کی اور اس کی تحریروں کو گمراہ کن قرار دیا۔ یہی مضمون پڑھنے کے بعد احمد رضا آگ بگولا ہوا تھا اور ڈاکٹر سعیدی سے "دو باتیں" کرنے یہاں اس کی کوٹھی پر آگیا تھا۔

یہ کوٹھی ملتان شہر کے مضافات میں واقع تھی۔ چاروں طرف جھاڑیاں اور درخت تھے۔ قریب ہی چھوٹی نہر بہتی تھی۔ تنہا اور پرسکون جگہ تھی۔ غالباً اسے پچاس ساٹھ برس پہلے کسی نواب ٹائپ کے سکون پسند شخص نے تعمیر کرایا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر سعیدی خود بھی تخلیقی ذہن رکھنے والا تنہائی پسند شخص تھا۔ لہٰذا اسے

رہائش کے لئے یہ جگہ پسند آگئی تھی۔ اس نے کوٹھی کرائے پر لے کر اسے ضرورت کے مطابق فرنیش کرلیا تھا۔ آج کل وہ اپنے دو ملازموں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔

گزشتہ شام احمد رضا غصے میں بھرا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ آج سعیدی کی فرنچ کٹ داڑھی نوچ لے گا۔ مگر حسبِ سابق سعیدی نے اس کے جوش و خروش کا جواب تحمل سے دیا اور بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے اس کا غصہ کافور کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کی گفتار میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو احمد رضا کو بے قابو ہونے سے روک لیا کرتی تھی۔ جب وہ کچھ ٹھنڈا ہوگیا تو سعیدی نے اسے چائے پلوائی اور پھر اپنی نئی گاڑی دکھانے کے لئے گیراج میں لے آیا۔ وہ گیراج میں اندرونی دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ اندر تاریکی تھی۔ سعیدی نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر زیرو کا بلب روشن کردیا مگر جب ٹیوب لائٹ روشن کرنا چاہی تو اسے ناکامی ہوئی۔ احمد رضا کے فرشتوں کو خبر نہ تھی کہ اس خرابی کا اہتمام پہلے سے کیا گیا تھا۔ سعیدی کچھ دیر بٹن کو آن آف کرتا رہا' پھر اس انداز سے باہر نکلا جیسے ٹیوب لائٹ کو چھیڑنے کے لئے کوئی لمبی لکڑی یا چھڑی وغیرہ لینے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ باہر سے بند ہوگیا اور احمد رضا اس تہہ نما گیراج میں قید ہو کر رہ گیا۔

اب ان واقعات کو قریباً اٹھارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ شدید پیاس کے باعث احمد رضا کی جان لبوں پر تھی۔ معلوم نہیں گرمی اور حبس کے سبب آکسیجن ناپید ہوچکی تھی یا اس کے دل نے درست طور پر دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ آہنی شٹر کے نیچے سے جھلسا دینے والی گرمی کی لہریں اندر گھس رہی تھیں۔ قریب ہی وہ اوزار پڑے تھے جنہیں اٹھانے کی ہمت اب اس میں نہیں تھی۔ گھوم پھر کر اس کی نظریں ناصاف پانی کے اس چھوٹے سے گڑھے پر جم گئیں۔ یہ پانی بتدریج ختم ہو رہا تھا۔

احمد رضا نے اندازہ لگایا کہ ایک دو گھنٹے تک وہاں بس تھوڑی سی نمی رہ جائے گی۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھا اور رینگنے والے جانور کی طرح اوندھے منہ فرش پر لیٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ گڑھے کو ڈھانپ چکا تھا۔ ایک زندگی بخش تراوٹ نے اس کے حلق کو چھولیا۔ مگر فرحت کا یہ احساس بہت عارضی تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کی زبان پھر خشک ہو کر چٹخنے لگی۔ یہی لمحے تھے جب اسے گیراج کے اندرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ لکڑی کے پٹ وا ہوئے اور ڈاکٹر سعیدی کے دونوں ملازم اندر آگئے۔ انہیں دیکھ کر احمد رضا کے جسم کو جھٹکا لگا۔ بے پناہ غصے سے اس نے ان پر جھپٹنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر رہ گیا۔ ناکام ہو کر وہ چیخا تو آواز حلق میں پھنس گئی۔ اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ تنومند ملازمین اسے سہارا دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں پنکھا چل رہا تھا۔ ملازمین نے

گاہک

جان نڑی ولین اپنے گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک دلال نے اسے گھیر لیا اور پوچھا "کیا تم ایک عریاں فلم دیکھنی پسند کرو گے؟"

"بالکل۔ لیکن تم! اس کے لئے مجھے رقم کیا دو گے؟" جان نے دریافت کیا۔

"تم غلط سمجھے ہو" دلال نے کہا "فلم دیکھنے کے لئے تو رقم تمہیں ادا کرنی ہوگی۔"

"نہیں" جان نے کہا "میں سمجھ گیا ہوں' تم نہیں سمجھے۔ رقم تو تم کو ہی دینی ہوگی۔"

"وہ کیسے؟" دلال نے دریافت کیا۔

"میں برٹش بورڈ آف فلم سنسر کا چیف ہوں" جان نڑی ولین نے اطمینان سے کہا۔

اسے بستر پر نیم دراز کردیا۔ ٹھنڈا پانی گھونٹ گھونٹ اسے پلایا گیا۔

کچھ جان میں جان آئی تو احمد رضا چلانے لگا "کہاں ہے وہ کتے کی اولاد؟ اسے میرے سامنے لاؤ کہاں ہے تمہارا مالک؟"

ایک نوکر نے کانپتے ہوئے کہا "جناب! وہ تو چھٹیاں گزارنے اسلام آباد جا چکے ہیں۔ جاتے جاتے وہ یہ لفافہ آپ کے لئے چھوڑ گئے تھے۔" ملازم نے ڈرتے ڈرتے ایک لفافہ احمد رضا کے ہاتھ میں تھمادیا۔

اس نے وحشیانہ انداز میں لفافہ پھاڑا۔ اندر ایک خط تھا۔ ڈاکٹر سعیدی نے اپنے ہلکے پھلکے انداز میں لکھا تھا۔

"احمد رضا' ملازموں سے گرم سرد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں.... معذرت چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں کچھ تکلیف ہوئی۔ بچوں کو سمجھانے بجھانے کے لئے بعض اوقات ان پر تھوڑی سی سختی بھی کرنا پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں میرا مؤقف اچھی طرح سمجھ میں آجانا چاہئے۔ یعنی انسان کی آنکھ بصارت سے زیادہ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی سے دیکھتی ہے۔ انسان جب کسی منظر سے خوگر ہوجاتا ہے تو پھر وہ منظر اس کی آنکھ سے اوجھل بھی ہوسکتا ہے۔ چاہے وہ سائیکل رکشا ہو' سڑک کا کھلا ہوا مین ہول ہو' قصائی کی دکان پر جھولتی ہوئی بکرے کی اوجھڑی ہو' یا وہ انگور ہوں جو میری گاڑی کی چھت سے لٹکے ہوئے ہیں.....

"ہاں' میں ان ہی انگوروں کی بات کر رہا ہوں جو کل سے تمہاری دسترس میں تھے۔ رس بھرے انگوروں کا وہ گچھا اصلی تھا۔ تم چاہو تو جا کر دیکھ سکتے ہو۔ میں تم سے میلوں دور بیٹھا ہوں لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ جاں بلب ہونے کے باوجود تم نے ان انگوروں کو چھوا تک نہیں۔ کچھ سمجھ میں آئی ہے میری بات....."



مکتوبِ ایل

طاہر جاوید مغل

آگہی کے عذاب میں مبتلا ایک باپ کی روداد۔ بیٹے کے بچپن کے بارے میں اس کا اندازہ درست ثابت ہوا

اپنے چہیتے بیٹے کی عذاب ناک یادوں میں گرفتار ایک شخص کا احوالِ غم زندگی کے سوا ہر چین اُس کے بیٹے نے اسی جیسی پائی تھی۔ ہنری باتیں، تمام گھماتیں اور ہر ہر دیوانگی! وہ اپنے نقش قدم دیکھ جانتا تھا جیسے خود کو... اس کے باوجود منہ جانے کیسے وہ بہت اہم بات نظر انداز کر گیا۔

میرا نام منصور باری ہے۔ عمر قریباً ۶۵ سال ہے۔ پچھلے چالیس سال سے انگلینڈ میں مقیم ہوں۔ لندن کے مضافات میں میرا ذاتی مکان ہے۔ اس مکان کی بالائی منزل پر ایک خوبصورت چوکور کمرا ہے۔ رات کے وقت اس کمرے کی کھڑکیوں سے آس پاس کا علاقہ یوں نظر آتا ہے جیسے کسی دوشیزہ کے سیاہ آنچل پر ہزارہا ستارے چمک رہے ہوں۔ اپنے گھر کا یہ کمرا مجھے بہت پسند ہے۔ یہ میرے عدنان کا کمرا ہے۔ میرے بیٹے کا۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر وہ شاعری کرتا تھا، گیت لکھتا تھا، تصویریں بناتا تھا اور مطالعہ کرتا تھا۔ اس کمرے کی ہر شے میں عدنان کی مہک رچی بسی ہے۔ دیواروں میں اس کے قہقہے جذب ہیں، فرش میں اس کے قدموں کی چاپ ہے اور کھڑکیوں دروازوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس چمک رہا ہے۔

اسے اس کمرے سے جدا ہوئے قریباً بیس برس گزر چکے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ ابھی یہیں تھا۔ شاید کسی کام سے باہر نکل گیا ہے۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوں اور اسی کرسی پر ہوں جس پر عدنان بیٹھا کرتا تھا۔ عدنان ہی کے انداز میں مَیں نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھی ہوئی ہیں اور سگریٹ پی رہا ہوں۔ میرا ذہن ماہ و سال کے فاصلے پھلانگ کر ماضی کے سمندر میں یادوں کے دھندلے جزیروں میں بھٹکنے لگا ہے۔

وہ سب کچھ نگاہوں کے سامنے آ رہا ہے جو مجھ پر بیت چکا ہے اور جس کی بخشی ہوئی جلن قبر تک میرے ساتھ جائے گی۔

تفصیل سے بیان کرنے لگوں تو شاید یہ ایک طویل کہانی بن جائے۔ میں مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جتنی دیر ان عذاب

ناک یادوں کے نرغے میں رہوں گا' بے حال رہوں گا۔

میرا بیٹا عدنان چھ سات برس کا ہو گا جب مجھے یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ وہ شکل و صورت کے علاوہ عادات اور خصائل کے اعتبار سے بھی مجھ سے ملتا جلتا ہے۔ وہ تمام فطری دلچسپیاں جو چھ سات سال کی عمر میں میرے مزاج کا حصہ تھیں' میرے بیٹے میں بھی موجود تھیں۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنے تمام نفسیاتی رویوں میں میری فوٹو کاپی تھا۔

مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے کے بعد میں نے گہری نظروں سے اس کے طور طریقوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میری ہی طرح اسے بچپن' شاعری' کرکٹ اور ڈاک ٹکٹوں سے دلچسپی تھی۔ رات کو دیر سے سونا اور صبح دیر سے اٹھنا اس کا معمول تھا۔ میری ہی طرح وہ اعصابی طور پر بہت زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ فرطِ طیش اور فرطِ مسرت میں ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا۔ میری ہی طرح حساسیت اس میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عاشق مزاج بھی تھا اور ہر عاشق کی طرح انا پرستی کے جراثیم بھی اس میں موجود تھے۔ یہ تو خیر عمومی رویوں کی بات ہے لیکن وہ چھوٹی چھوٹی عادات میں بھی میری پیروی کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے چبانا' لقمہ نگلنا' پہلے بائیں پاؤں میں جوتا پہننا۔ بائیں کروٹ پر ہونا۔ ہاتھ دھونے کے بعد انہیں زور زور سے جھٹکنا۔ تنہائی میں باریک آواز سے گنگنانا۔ غرض اس کی بہت سی عادات ایسی تھیں جو ہو بہو مجھ سے ملتی تھیں اور اس کی تصدیق کئی بار میری والدہ صاحبہ نے بھی کی تھی۔ اپنے بیٹے کے بارے میں میں جب اچھی طرح جاننے لگا تو اس کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیش گوئیاں بھی کرنے لگا۔ میری یہ پیش گوئیاں اکثر درست ہوتی تھیں اور میری بیوی کے علاوہ گھر کا باقی خانہ بھی حیران رہ جاتے تھے۔

میں کوئی مستقبل بین نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اس کا دعویٰ ہے۔ میری مستقبل بینی صرف اپنے بیٹے عدنان کی حد تک تھی اور اس کی وجہ وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔ عدنان کی نفسیات اور میری نفسیات میں کوئی فرق نہیں تھا اور اسی مماثلت کو بنیاد بنا کر میں اس کے آئندہ رویے کے بارے میں درست اندازہ قائم کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر میں نے ایک روز اپنی بیوی سے کہا کہ عدنان ایک دو دن میں پھر سے صبح کی سیر اور ورزش شروع کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ عدنان نے اگلے دن سے پھر میرے ساتھ جاگنگ پر جانا شروع کر دیا۔ یہ معمول اس نے تین چار ماہ پہلے بلاوجہ چھوڑ دیا تھا اور میرے اصرار کے باوجود دوبارہ شروع نہیں کیا تھا۔

میری اس "درست پیش گوئی" کا پس منظر یہ تھا کہ ایک روز پہلے گلی میں عدنان کا ایک انگریز لڑکے سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس زبانی کلامی جھگڑے میں انگریز لڑکا عدنان پر حاوی رہا تھا اور عدنان کو شرمندگی کے ساتھ پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ اپنے کمرے میں سے سن لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس شرمندگی کے ردِعمل کے طور پر عدنان اپنی صحت پر توجہ دینا شروع کر دے گا۔ بظاہر یہ بے ربط بات نظر آتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ خود میرے ساتھ بارہا ایسا ہو چکا تھا۔ مجھے کہیں ہزیمت اٹھانا پڑتی تو میں اس ہزیمت کا جواز اپنی جسمانی کمزوری یا ناقص صحت میں ڈھونڈنے لگتا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے رینگتا رہا۔ عدنان اسکول سے فارغ ہو کر کالج پہنچ گیا۔ پڑھائی میں وہ میری ہی طرح اوسط سے بہتر طالب علم تھا۔ وہ کالج کی کرکٹ ٹیم میں کھیلتا تھا' ٹکٹ جمع کرتا تھا' میوزک سنتا تھا۔ غرض وہ سب کچھ کرتا تھا جو اس عمر میں میں کیا کرتا تھا۔ عدنان کے علاوہ ہماری صرف ایک بیٹی تھی۔ وہ عمر میں عدنان سے بڑی تھی اور اس کی شادی ہم پاکستان میں کر چکے تھے۔ اب ہماری تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز عدنان تھا۔ اسے اچھا شہری بنانا اور کسی نمایاں مقام تک پہنچانا ہم میاں بیوی کا نصب العین تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب عدنان کی رومانی زندگی شروع ہونے والی ہے۔ ان معاملات میں وہ میری ہی طرح شرمیلا اور کم گو واقع ہوا تھا لیکن شرمیلے نوجوان اکثر چھپے رستم بھی ثابت ہوتے ہیں' اور پھر جو شخص شاعر اور مصور بھی ہو' اس کے علاوہ خوبصورت ہو اور حد درجہ حساس بھی تو اس کی رومانی زندگی یقیناً خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ میری اپنی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے خالص مشرقی انداز میں ایک انگریز لڑکی سے ٹوٹ کر پیار کیا تھا' اور ان تمام جاں گسل و روح افزا مراحل سے گزرا تھا جن کے ذکر سے مشرقی شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ بڑی افلاطونی محبت تھی یہ لیکن ناپائیدار نہیں تھی۔ میں نے پورے تین سال اس لڑکی کو چاہا تھا پھر اس لڑکی کی شادی ہو گئی تھی۔ جس روز اس لڑکی کی شادی ہوئی اسی روز میری بھی ہو گئی۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ جی ہاں... میں نے اپنی محبت کو ہی اپنی شریکِ حیات بنایا تھا۔ اور یہاں آ کر میرا راستہ شعرائے کرام اور نامور عشاق کے راستے سے کچھ جدا ہو گیا تھا۔

اپنے ماضی کی روشنی میں میں بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ عنقریب عدنان بھی کسی افلاطونی عشق کا شکار ہونے والا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے عدنان کی کتابوں میں ایک دو محبت نامے دیکھے۔ وہ اپنے کالج میں زیرِ تعلیم کسی جولیا نامی لڑکی سے محبت کر رہا تھا۔ عدنان کے محبت نامے پڑھنے کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں جولیا نام کی اس لڑکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانوں۔ نجانے کیوں محبت نامے پڑھتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے عدنان اب اسی لڑکی کو دلہن بنائے گا اور یہی ہماری بہو بنے گی۔ میں نے چند دن انتظار کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید عدنان خود ہی جولیا کا تعارف ہم سے کرائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ غالباً اس کی فطری شرم و حیا آڑے آ رہی تھی پھر میں نے سوچا کہ خود ہی عدنان سے جولیا کا ذکر کروں اور اس سے کہوں کہ وہ ہمیں جولیا سے ملائے مگر اس سے پہلے کہ میں عدنان سے

بات کرتا' ایک روز اتفاقاً جولیا ہی میرے سامنے آگئی۔ اسے دیکھنے کے بعد میں دنگ رہ گیا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں سے عدنان کے ساتھ نکل رہی تھی۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنا کسی مشرقی یا مغربی شاعر کا شہ پارہ ہو سکتا ہے۔ حسن اور کشش کے ہر بہترین معیار پر وہ پوری اترتی تھی۔ عمر بمشکل اٹھارہ سال ہوگی۔ اس کا چہرہ کسی معصوم دیوی کا چہرہ تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرے دنگ رہنے کی وجہ اس کی خوبصورتی نہیں تھی بلکہ یہ احساس تھا کہ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں اور یہ احساس اتنا ناخوشگوار تھا کہ مجھے اپنے سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ میں اس تتلی جیسی لڑکی کو اپنے رنگین مزاج باس کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ یہ دو ڈھائی ماہ پہلے کی بات تھی۔ انکم ٹیکس کے گوشوارے جمع کرانے کی تاریخیں تھیں اور میں چونکہ انکم ٹیکس کے کیس لڑنے والی ایک لیگل فرم میں کام کرتا تھا لہٰذا رات کو مجھے دیر تک دفتر میں بیٹھنا پڑا۔ رات نو بجے کے قریب ہمارے باس صاحب نشے میں دھت فرم کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کا ایک بھاری بھرکم بازو اسی تتلی سی لڑکی کے شانے پر تھا۔ میری موجودگی کی پروا کئے بغیر وہ لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اپنے آفس میں گھس گئے اور ڈیڑھ گھنٹے سے پیشتر باہر نہیں نکلے۔ آج میں اسی لڑکی کو اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کھول اٹھا۔ جی چاہا ابھی آگے بڑھوں اور اپنے بیٹے کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ سے چھڑا دوں لیکن میں اس خیال کو فوری طور پر عملی جامہ پہنا کر کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

اس روز میں ساری رات جاگتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے ان محبت ناموں کے حروف ناچ رہے تھے جو میرے بیٹے نے جولیا نامی اس لڑکی کو لکھے تھے۔ یہ حروف مجھے سیلاب کے تند ریلوں کی طرح محسوس ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں ان ریلوں کے سامنے جو بھی بند باندھوں گا وہ ریت کی دیوار کی طرح بہہ جائے گا۔ پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟ کیا مجھے بند باندھنا چاہیے یا کسی حکمت عملی کے ساتھ اس پانی کا رخ موڑ دینا چاہیے۔ میں بہت دیر سوچتا رہا اور جتنا سوچتا رہا' اتنا الجھتا رہا۔

جولیا اور عدنان کی محبت تیزی سے پروان چڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ بھی جاری رہی۔ میں نے اپنی بیوی کو بھی جولیا اور عدنان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور ہم دونوں نے عدنان کے توسط سے جولیا سے ملاقات بھی کر لی تھی' لیکن حالات اپنے من چاہے رخ پر سرپٹ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ میں نے ایک دو بار دبے لفظوں میں عدنان کو یہ سمجھایا بھی کہ جولیا ہمیں اچھی لڑکی نظر نہیں آتی اور وہ اس سے تعلقات استوار کرنے میں احتیاط سے کام لے لیکن اس نصیحت کا وہی حال ہوا جو عاشقوں کو کی جانے والی نصیحتوں کا ہوتا ہے۔

عدنان اور جولیا بدستور آپس میں ملتے رہے اور ان کے تعلقات پروان چڑھتے رہے۔ دوسری طرف میں اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور میرے دل و دماغ میں اس لڑکی کے خلاف نفرت بڑھ پکڑتی رہی جو بظاہر معصوم لیکن درحقیقت انتہا درجے کی عیار تھی اور میرے بیٹے کو اپنے جال میں جکڑے ہوئے تھی۔ میں حیران تھا کہ عدنان کی آنکھوں پر کیسی پٹی بندھ گئی ہے۔ وہ اتنا نادان نہیں تھا کہ جولیا کا کردار اس کی نگاہ سے اوجھل رہتا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اچھی لڑکی نہیں پھر بھی وہ اس کے سحر میں گرفتار تھا۔ وہ تیز مزاج تھا پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ میں تو کبھی بھی ایک بے راہرو لڑکی کی چاہ میں یوں غرق نہ ہوتا۔ شاید وہ اپنی سدھ بدھ کھو گیا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ آگے چل کر جولیا اپنے آپ کو بدل لے گی۔ یا پھر کسی مصلحت کے تحت اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

میں نے جولیا کے بارے میں کافی معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ وہ ایک ماڈل گرل کی بیٹی تھی۔ بے حد آزاد خیال اور ماڈرن... اس نے بہت سی دوستیاں پال رکھی تھیں۔ ان میں مردوں کی دوستیاں بھی شامل تھیں اور ان میں ایک دو مرد ایسے بھی تھے جن کا نام خاص معنوں میں اس کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ مزاج کے حوالے سے وہ بے حد حاضر جواب اور تیز و طرار مشہور تھی۔ مخاطب کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔ کسی مرد کے لیے آسان نہیں تھا کہ اسے سنجیدگی

صرف خواتین کے لیے

آپ بھی ننھے منے بچے کی ماں بن سکتی ہیں

بالکل مفت معلوماتی رہنمائے حسن و صحت حاصل کیجئے



اس کا تھوڑا سا مطالعہ ہر ہری خواتین کیلئے ضروری ہے اور خاص کر ان کے لیے جو کسی بھی وجہ سے بروقت اولاد جیسی نعمت سے محروم و پریشان ہیں یا پھر کسی شکایت میں مبتلا ہوں ان کیلئے بچوں کی تدبیروں اور احتیاطوں کا جاننا بھی ضروری ہے ہزارہا خواتین اس رہنمائے حسن و صحت کو منگوا کر فائدہ حاصل کر کے خوشیوں سے بھری زندگی گذار رہی ہیں آپ بھی اپنے دل کی بات جوابی لفافے کے ہمراہ لکھ کر روانہ کر دیں پتہ لکھتے وقت لفافے پر شعبہ خواتین ضرور لکھیں۔

خانم ایجوکیشنل ہوم پوسٹ بکس 2535 کراچی پورٹ کوڈ 74600

پر مائل کر سکے۔ یہ پہاڑ صرف عدنان نے ہی سر کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدہ ہوئی تھی اور برملا اپنی شکست کا اعتراف بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ عدنان اس کا آئیڈیل مرد ہے اور اگر وہ مستقبل میں کسی کی بیوی بنے گی تو وہ عدنان ہوگا۔

انہی دنوں میں نے عدنان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیا۔ وہ کمپیوٹر پروگرامنگ میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یہ ڈگری امریکا سے حاصل کرے۔ میرے اس مشورے کے پیچھے یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ وہ جولیا سے دور چلا جائے اور اس آگ سے بچ جائے جو ایک گمراہ لڑکی کی صورت میں اسے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ عدنان امریکا چلا گیا لیکن حالات میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی' بلکہ میں نے اندازہ لگایا کہ فاصلے نے عدنان کے جذبوں میں شدت پیدا کر دی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ ہر دوسرے تیسرے روز جولیا کو خط لکھتا تھا اور طویل ٹیلیفون بھی کرتا تھا۔ عدنان کی غیر موجودگی میں بھی جولیا کبھی کبھار ہم سے ملنے آجاتی تھی' کبھی میں اس کے فلیٹ میں چلا جاتا تھا۔ آج کل وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ علیحدہ فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ چونکہ یہ فلیٹ میرے دفتر کے راستے میں واقع تھا لہٰذا میرے لیے آسان تھا کہ گاہے گاہے جولیا سے مل سکوں۔ میں جولیا کو زیادہ اچھی طرح جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر ایک دفعہ اس کی "سائیکی" میری سمجھ میں آجاتی تو میرے لیے آسان ہو جاتا کہ اسے اپنے بیٹے عدنان سے دور کر سکوں لیکن وہ بڑی گہری اور پیچیدہ لڑکی تھی۔ پھر ایک روز ایسا واقعہ ہوا کہ جولیا کے لیے میری نفرت انتہا کو پہنچ گئی اور میں اس کے سلسلے میں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

وہ جمعہ کی شام تھی۔ اگلے دو روز چھٹی تھی۔ میں خود کو بہت بشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ جولیا کے فلیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے کار کا رخ فلیٹ کی طرف موڑ دیا۔ فلیٹ پر پہنچ کر کال بیل بجائی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ مقفل نہیں تھا۔ جولیا کو آوازیں دیتا ہوا میں اس کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔ وہ اپنے بستر پر نشے میں مدہوش پڑی تھی اور ایسی حالت میں تھی کہ کوئی بھی شخص اپنی ہونے والی بہو کو اس حالت میں دیکھنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں بھی آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کوئی دو تھوڑی دیر پہلے تک اس کے ساتھ موجود تھا۔ کمرے میں بکھری ہوئی بہت سی اشیا ان رنگین و سنگین لمحات کی کہانی سنا رہی تھیں جو اس کمرے میں گزارے جا چکے تھے۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ آیا۔ جولیا کے فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں اس لڑکی کو قتل کر دوں گا۔

جولیا کے قتل کا منصوبہ میں پہلے سے تیار کر چکا تھا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے میں تاخیر میرے تذبذب کے سبب ہو رہی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا' اس انتہائی اقدام سے پہلے تذبذب کا شکار ضرور ہوتا۔ میرے ذہن میں بھی بارہا یہ خیال آیا تھا کہ شاید میں کسی اور طریقے سے جولیا کو عدنان کی زندگی سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں یا پھر جولیا ہی میں کوئی ایسی تبدیلی آجائے کہ میرا ذہن اسے بطور بہو قبول کر لے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا اور اب میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور تھا۔

یہ منصوبہ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد بنایا تھا۔ میرے منصوبے کی بنیاد تین برس پہلے کی ایک اخباری خبر تھی۔ اس خبر میں ایک جنونی قاتل کا ذکر تھا۔ اس جنونی نے بے گناہ لوگوں کو بے وجہ قتل کیا تھا۔ اس واقعے میں خاص بات قاتل کا طریقۂ واردات تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے وارپول میں کرسمس سے چند روز پہلے چھ سات افراد پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے اور چند ایک کو نازک حالت میں اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ مقامی پولیس نے واقعات کے اس سلسلے کی کڑیاں آپس میں ملائیں تو معلوم ہوا کہ ہلاک اور بیمار ہونے والے افراد میں سے پانچ چھ افراد کے پاس ڈاک کا لفافہ پڑا ہوا پایا گیا۔ یہ لفافے مختلف نوعیت کے تھے۔ تین میں کرسمس کارڈ تھے۔ ایک میں گھریلو خط اور ایک میں کاروباری رقعہ۔ مزید تفتیش کے بعد اسکاٹ لینڈ کی مشہور زمانہ پولیس نے سراغ لگا لیا کہ تمام اموات سائنائیڈ زہر کی ایک خالص ترین قسم کی وجہ سے ہوئیں۔ حسبِ توقع یہ زہر ان ڈاک ٹکٹوں کی گم میں موجود تھا جو ڈاک کے لفافے پر موجود تھیں یا مقتولین اور متاثرین کے آس پاس پائی گئی تھیں۔ زہر سے متاثر ہونے والے افراد ڈاک کے لفافے پوسٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے ڈاک کے ٹکٹ لفافوں پر چسپاں کرنے کے لیے جب زبان سے گیلے کیے تو انتہائی زود اثر زہر کے سبب ان کی موت واقع ہو گئی یا وہ شدید بیماری کی حالت میں اسپتال پہنچ گئے۔ پولیس نے قصبے کے ڈاک خانے میں موجود تمام ڈاک ٹکٹ قبضے میں لے لیے اور ایک ملازم کو گرفتار کر لیا۔ اس ملازم نے بعد ازاں اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور بتایا کہ اس نے دماغی فتور میں مبتلا ہو کر یہ خطرناک حرکت کی ہے۔ پولیس کی بروقت تفتیش اور کارروائی سے مزید درجنوں جانیں ضائع ہونے سے بچ گئی تھیں۔ زہر آلود ٹکٹ بہت زیادہ تعداد میں فروخت نہیں ہوئے تھے پھر بھی مقامی انتظامیہ نے علاقے کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ریڈیو اور ٹی وی پر اشتہارات دیے تھے اور اخباروں کے ذریعے لوگوں کو مطلع کیا تھا۔ یہ تمام واقعات قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔

دس پنس کا جو ٹکٹ سات افراد کی موت کا سبب بنا وہ محکمۂ سیاحت کی طرف سے تھا۔ اس پر مادام تساؤ کے میوزیم سمیت لندن کے چند تفریحی مقامات کی تصویریں تھیں۔ ان ٹکٹوں کی موجودگی ہی میرے منصوبے کی بنیاد بنی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جولیا کو ان ٹکٹوں کے ذریعے ہلاک کروں گا۔ سائنائیڈ زہر حاصل

کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ آج کے دور میں رقم خرچ کرکے کچھ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں نے یہ زہر جنوبی لندن کی ایک کیمکل شاپ سے حاصل کیا اور بڑے سائنٹیفک طریقے سے اسے ڈاک کے ٹکٹوں کی پشت پر پیسٹ کردیا۔ اب منصوبے کے آخری حصے پر عملدرآمد کرنا باقی رہ گیا۔

وہ اپریل کی ایک خوشگوار شام تھی۔ میں جولیا کے فلیٹ پر پہنچا۔ جولیا کی سہیلی ان دنوں کہیں گئی ہوئی تھی۔ جولیا فلیٹ میں اکیلی تھی۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ باتوں کے دوران وہ کافی بنانے کچن میں گئی تو میں اس کے اسٹڈی روم میں داخل ہوگیا اور زہر آلود ٹکٹ اس کی میز پر رکھ دیے۔ یہ ٹکٹ میں نے پہلے سے موجود ٹکٹوں کے اندر رکھے تھے اور اگر جولیا بہت زیادہ باریک بینی کا مظاہرہ نہ کرتی تو اس کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ یہ ٹکٹ خود خرید کر لائی ہے یا کوئی یہاں رکھ گیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ جولیا ہر دوسرے روز عدنان کو خط لکھ رہی ہے اس کا مطلب تھا کہ اس ہفتے کے دوران وہ یہ ٹکٹ استعمال کرکے رہے گی۔ زہر خورانی کے سبب ہونے والی اس موت کا الزام کسی صورت بھی میرے سر نہیں آسکتا تھا۔ میں تصور کی نگاہ سے اس خبر کی سرخی دیکھ سکتا تھا جو جولیا کی موت کے بعد شائع ہونا تھی۔

"ڈاک کے قاتل ٹکٹوں نے تین سال بعد ایک اور جان لے لی۔ ماضی کی مشہور ماڈل گرل کیتھرائن کی نوجوان بیٹی جولیا اپنے اسٹڈی روم میں مردہ پائی گئی۔"

... اور پھر وہی کچھ ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ صرف دو روز بعد علی الصباح مجھے جولیا کی "ناگہانی" موت کی خبر مل گئی۔ اسے رات دس بجے کے لگ بھگ اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ایک گھنٹا موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ دم توڑ گئی۔ تفصیلات کے مطابق اس کی موت زہر آلود ٹکٹوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ اس نے اپنی ملازمہ کو ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے دیا تھا۔ ملازمہ خط پوسٹ کرنے کے بعد واپس آئی تو جولیا کی حالت خراب تھی۔ وہ مسلسل قے کررہی تھی اور اسے سینے میں درد کی شدید شکایت تھی۔ پہلے اسے فلیٹ پر ہی طبی امداد دی گئی پھر اسپتال پہنچادیا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ ختم ہوگئی۔ اس کے معدے سے برآمد ہونے والے مواد میں سائنائیڈ زہر پایا گیا۔ پولیس نے فوری طور پر تفتیش شروع کردی۔ جس وقت متوفیہ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی وہ اسٹڈی روم میں تھی۔ اسٹڈی روم کی میز پر مشکوک ڈاک ٹکٹ پائے گئے۔ ڈاک ٹکٹ ملنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر پولیس کے سراغرساں اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ متوفیہ کی موت زہر آلود ٹکٹوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

میں نے جولیا کے قتل کا منصوبہ محنت سے تیار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں "تفتیش" کی زد میں نہیں آؤں گا۔ زہر آلود ٹکٹوں کے سبب جولیا کے ہلاک ہوجانے میں ایک ڈرامائی کیفیت تو تھی، لیکن ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ اکثر لوگ غیر استعمال شدہ ٹکٹ لوگوں کے پاس پڑے رہ جاتے ہیں۔ بعد ازاں ضرورت پڑنے پر انہیں استعمال کرلیا جاتا ہے۔ تین سال پہلے وارپول کے ڈاک خانے سے جو ٹکٹ فروخت ہوئے تھے ان میں سے بہت سے لاپتا تھے۔ جولیا کی موت کا سبب بننے والے ٹکٹوں کو انہی گمشدہ ٹکٹوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔

اسی روز میں نے نیویارک فون کرکے عدنان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شام کو اسی طرح کی ایک دوسری کوشش بھی ناکام ہوئی۔ عدنان کے ایک دوست کا ٹیلکس نمبر میرے پاس تھا۔ یہ دوست نیویارک سٹی کے مضافات میں رہتا تھا تاہم مجھے امید تھی کہ وہ عدنان تک میرا پیغام پہنچادے گا۔ میں نے اپنے ٹیلکس میں عدنان کو یہ اطلاع دی کہ جولیا ایک ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہے اور اس کا فوراً لندن پہنچنا ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کل شام تک لندن واپس پہنچ سکے اور جولیا کی آخری رسومات میں شریک ہوسکے لیکن وہ پہنچ نہیں پایا۔ جولیا کی تدفین اس کے بغیر ہی عمل میں آئی۔

تدفین کے اگلے روز بھی عدنان کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ میں نے پھر اسے ٹیلیفون کیا۔ اس مرتبہ عدنان کے ایک ہم جماعت سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ عدنان ہوسٹل میں موجود نہیں۔ اس کا کمرا دو روز سے خالی پڑا ہے۔ میری پریشانی ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ میں نے عدنان کے ہم جماعت سے کہا کہ وہ فوراً عدنان کے بارے میں معلوم کرے۔ میں ایک دو گھنٹے بعد اسے پھر فون کرتا ہوں۔ لیکن میرے فون کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ صرف تو گھنٹے بعد مجھے ٹیلیفون پر نیویارک سے ایک ایسی اطلاع ملی جس نے میری دنیا اندھیر کردی اور مجھے یوں لگا کہ میرا جسم ہزارہا ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر فضائے بسیط میں بکھر گیا ہے۔ مجھے میرے جوان بیٹے کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔

○☆○

عدنان درحقیقت چوبیس گھنٹے پہلے ہفتے کی شام کو ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ کھلے سمندر میں دیر تک اس کی لاش کی تلاش جاری رہی تھی لیکن کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی۔ صرف اس کشتی کی چند باقیات مل سکی تھیں جس پر عدنان سوار تھا۔ اس دلدوز واقعے کی تفصیلات کچھ اس طرح تھیں۔ عدنان ہر ویک اینڈ پر کشتی رانی کے لیے کھلے سمندر میں جاتا تھا۔ ساحل سے دور کسی پُرسکون مقام پر وہ اپنی کشتی کے اندر ہی بیٹھ کر میوزک سنتا تھا، شعر لکھتا تھا اور دھوپ سینکتا تھا۔ ایک بار اس نے خود ہی اپنے خط میں لکھا تھا۔ "کھلے سمندر میں تنہا کشتی میں آسمان کی طرف منہ کرکے لیٹنا مجھے بہت بھلا لگتا ہے۔ شعر جیسے خود بخود مجھ پر اترنے لگتے ہیں۔ خاص طور سے اس ماحول میں جولیا کے خطوط پڑھنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے آس پاس ہی کہیں موجود

تک پہنچا۔ ایک لمحہ پہلے اس نے خود کو کیسینو کے جھلملاتے فرش پر لڑکھڑاتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ واش روم میں سنک پر جھکا ہوا تھا اور سنک قے سے بھر چکا تھا۔ گندگی صاف کرنے کے لیے اس نے پانی بہایا پھر اپنے منہ پر بھی پانی کے چھپکے مارے۔

ذرا سیدھا ہو کر اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کی جلد چونے کی طرح سفید دکھائی دے رہی تھی اور منہ غیر ارادی طور پر کھلا ہوا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا پھر غیر ارادی طور پر ہی وہ بائیں طرف کو جھکتا چلا گیا۔ دوسرے سنک کو پکڑ کر اس نے بہ مشکل خود کو گرنے سے باز رکھا۔

'اوہ۔۔۔ خدایا۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا' مجھے تو اپنے آپ پر ذرا بھی اختیار نہیں رہا۔ کیا اس طرح زندگی کا اختتام میرے مقدر میں لکھا ہے کہ میں نشے میں دھت کسی شرابی کی طرح واش روم کے فرش پر پڑا پایا جاؤں؟ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'

وہ اپنی بچی کھچی توانائی اور قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے گرتا پڑتا واش روم سے نکلا۔ سامنے ہی اسے استقبالیہ کاؤنٹر نظر آیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اس تک جا پہنچا۔ کلرک نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ہیری کو اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے چپس بہت وزنی محسوس ہو رہے تھے اور وہ گویا اس کا توازن خراب کر رہے تھے۔

"تمہارے پاس موٹا۔۔۔ دبیز۔۔۔ کئی تہوں والا لفافہ اور بہت سے ڈاک ٹکٹ ہوں گے؟" ہیری نے ڈوبتی سی آواز میں پوچھا۔

کلرک نے لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے اندر کسی چیز کی موٹی سی حفاظتی تہ موجود تھی۔ اس نے اسے ٹکٹ بھی دے دیے۔ ادائیگی کے لیے ہیری نے ایک چیک نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اس کی مالیت بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

پھر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "پین ہو گا۔۔۔؟"

کلرک نے اسے پین بھی دے دیا۔ ہیری نے چپس لفافے میں بھر دیے اور اس کے گوند والے حصے پر اپنی خشک زبان پھیر کر اسے بہ مشکل اس قابل بنایا کہ وہ چپک سکے اور لفافے کا منہ بند ہو سکے پھر اس نے اپنے کانپتے ہاتھ پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس پر ریٹا کا نام اور پتا لکھا۔ تب اسے خیال آیا کہ اسے کوئی پیغام بھی لکھ کر اندر رکھنا چاہیے تھا۔ اب لفافے کو کھولنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے لفافے کے اوپر ہی لکھنا شروع کیا "یہ۔۔۔" اسے یاد نہیں آسکا کہ ریٹا کی بچی کا نام کیا تھا۔

آخر اس نے جملہ اس طرح مکمل کیا "یہ رقم اپنی بچی پر خرچ کرنا۔"

پین کلرک کو واپس کر کے وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ اسے راستے میں چھوٹے چھوٹے سنہرے بالوں والا نوجوان اور مونچھوں والا ذرا بڑی عمر کا بدمعاش دکھائی دیا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں اس کے بارے میں ہدایات مل چکی تھیں اور وہ اس کے تعاقب میں آنے والے تھے۔

اسے یہ تو یاد تھا کہ لیٹر باکس قمار خانے کے آس پاس ہی کہیں تھا لیکن کہاں تھا؟ یہ صحیح طور پر یاد نہیں آرہا تھا۔ ذہن تھا کہ شل ہوا جا رہا تھا۔ شائیں شائیں کرتی آندھیاں سی ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ وہ گرتا پڑتا دروازے سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ لیٹر باکس تو سامنے ہی موجود تھا۔ اس نے لفافہ جیب سے نکال کر جلدی سے اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور اس کوشش کے دوران میں وہ گرتے گرتے بچا۔

وہ اپنے ذہن پر غلبہ پاتے ہوئے اندھیرے سے لڑنے اور اپنے پیروں پر کھڑا رہنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ آخر کار وہ کام کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ وہ چند قدم آگے تک جانے میں کامیاب ہو گیا پھر اسے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں بدمعاش اس کے تعاقب میں چلے آرہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت اس کی مسکراہٹ کافی ڈراؤنی لگ رہی ہو گی۔

اس سے پہلے کہ بدمعاش اس تک پہنچتے' اندھیرے نے اس کے حواس کو شکست دے دی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ گر رہا تھا مگر پھر جب اسے ذرا سا ہوش آیا تو اس نے خود کو قالین پر پڑے ہوئے پایا۔ وہ قالین پر کیسے پہنچ گیا تھا؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ فٹ پاتھ پر تو قالین نہیں ہوتے۔ اسے کوئی جواب نہ ملا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔" کوئی کہہ رہا تھا پھر یک دم ہیری کو اپنے اندر سردی کی زبردست لہر پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس کے اندر ہی اندر شاید کچھ پھٹ پڑا تھا۔ اندر ہی اندر خون بہہ رہا تھا پھر سرمئی دھند کی ایک موج سی آئی اور اسے اپنے دوش پر اٹھا کر کہیں دور لے جانے لگی۔ بہت دور سے اس نے ایک مدھم سی آواز سنی "بس موسیو۔۔۔! آپ اب مزید نہیں کھیل سکتے۔" پھر اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی!

(انگریزی سے ترجمہ)

کہانی کبھی نئی یا پرانی نہیں ہوتی، کہانی بس کہانی ہوتی ہے اور پھر کہانی بھی تو ایک ہی ہے وہی صدیوں پرانی۔۔۔ جو مختلف وقتوں میں، مختلف لہجوں اور پیرایوں میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ اس میں محبت کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کہانی کا تعلق اس دور سے ہے جب "تاریخ" نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ جب انسان کو دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ جب دھرتی کے سینے میں تہذیب کی جڑیں بہت گہری نہیں اتری تھیں۔ جب ایک بادشاہ ہوتا تھا اور ایک رعایا ہوتی تھی۔ جب گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر ملک فتح کیے جاتے تھے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو بیچا اور خریدا جاتا تھا۔

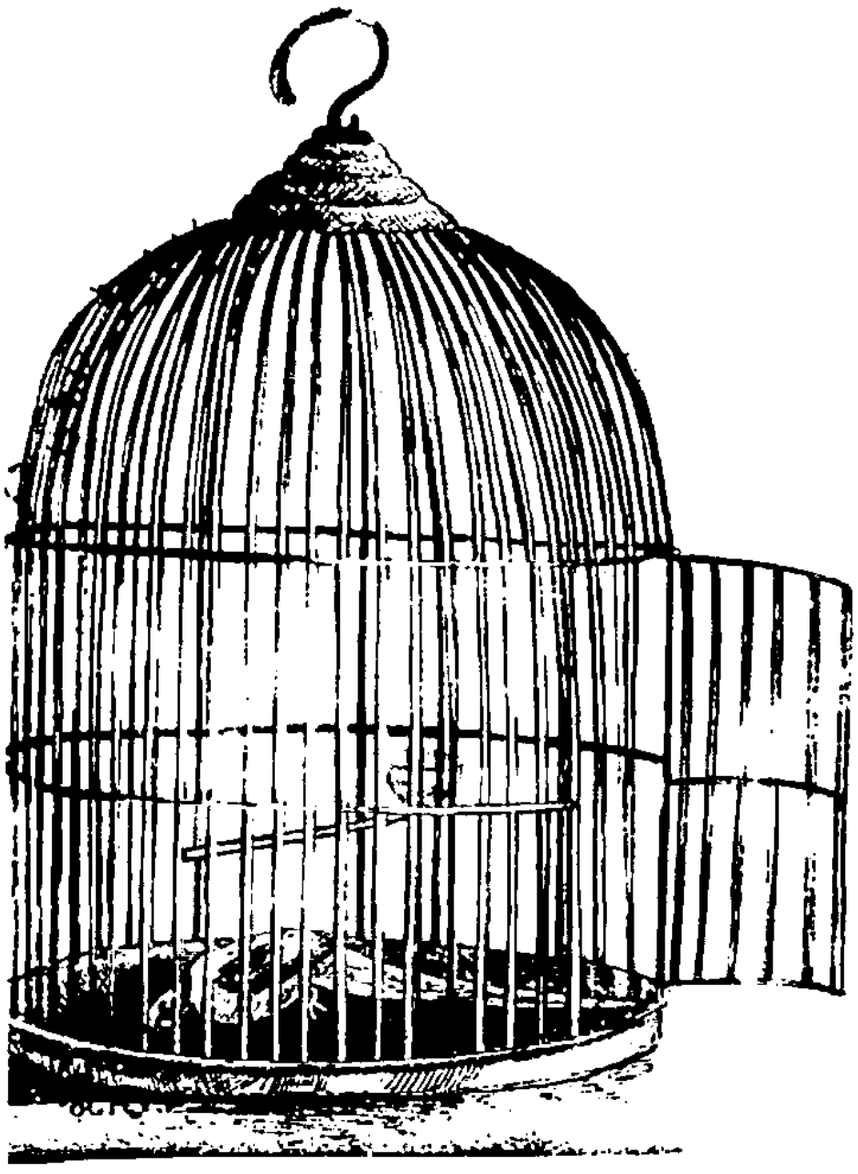
ایک ایسے ہی ملک میں ایک غریب نوجوان سکندر رہتا

مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

یک عاشقِ زار کا فسانۂ بے چارگی۔ وہ اپنی محبت ہارنے کے خطرے سے دوچار تھا۔ اچانک اُس کی مُلاقات ایک ایسے اسیرِ محبت سے ہوگئی جس کے لیے زندگی بھر کی آزادی، غلامی کے ایک لمحے کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ اُس نے اپنے ہم پیشہ کی خوب غم خواری کی۔

آزاد قیدی

طاہر جاوید مُغل



تھا۔ سکندرِ اعظم کے ہاتھ تو موت کے وقت خالی ہوئے تھے اس نوجوان کے ہاتھ شروع سے ہی خالی تھے۔ وہ منہ میں کسی چمچ کے بجائے بھوک لے کر پیدا ہوا تھا۔ لڑکپن سے ہی اس نے محنت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ قالینوں کے ایک تاجر کے ہاں ملازم تھا۔ فارغ وقت میں وہ مصوری کرتا تھا اور سنگ تراشی سیکھتا تھا۔ اس کے یہ مشاغل بھی اس کے لیے تھوڑی بہت آمدنی کا وسیلہ بن جاتے تھے۔ بہرحال یہ ساری آمدن مل کر بھی اتنی نہیں تھی کہ اس کی بیوہ ماں اور چار بہن بھائیوں کی کفالت کر سکتی۔ ان کی گزر بسر مشکل سے ہو رہی تھی۔ ایسے غریب نوجوان کو کیا حق پہنچتا تھا کسی دوشیزہ کو دیکھنے کا۔ اس کی محبت دل میں بسانے کا اور دن رات اس کی طلب میں تڑپنے کا لیکن یہ سب کچھ ہوا تھا کیونکہ ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا اور سردی گرمی و خزاں کی طرح بہار بھی اٹل ہوتی ہے۔ چمکیلی صبحوں کی ڈولی میں بیٹھ کر گلابوں کے موسم کو آنا ہوتا ہے اور وہ آکر رہتا ہے۔ سکندر کو جس دوشیزہ سے پیار ہوا تھا اس کا نام ماہ رو تھا۔ ماہ رو یعنی چاند چہرے والی۔ وہ چاند کی طرح خوب صورت تو تھی لیکن چاند ہی کی طرح سکندر سے دور بھی تھی۔ کبھی کبھی تو سکندر کو لگتا تھا کہ وہ چکور کی طرح چاند کی طرف اڑ اڑ کر ہانپ جائے گا اور کسی رات پٹ سے زمین پر گر کر ختم ہو جائے گا۔ ماہ رو اس کی دور کی رشتے دار تھی۔ اس کا باپ ایک رئیس کے اصطبل کا پہریدار تھا۔ ماہ رو ... اور سکندر کی نسبت بھی طے ہو چکی تھی لیکن اب کچھ عرصے سے حالات کچھ ایسے ہوئے تھے کہ یہ نسبت خطرے میں پڑتی محسوس ہوتی تھی اور کسی وقت تو سکندر کو لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی ماہ رو کو کھو دے گا۔ وہ سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے جو اس کی آنکھوں نے گئے موسموں میں دیکھے ہیں۔ دراصل ماہ رو کا باپ اس رئیس کا قرض دار تھا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اب ادھیڑ عمر رئیس اس قرض کے بدلے میں ماہ رو کے باپ سے ماہ رو کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔ ہاں ... وہی صدیوں پرانی روداد ... ماہ رو کے باپ نے اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی تھی لیکن اب بتدریج وہ رئیس کے سامنے بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ چند روز پیشتر ایک مذہبی تہوار کے موقع پر جب سکندر کی ملاقات ماہ رو سے ہوئی تھی تو ماہ رو نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ کچھ کر سکتا ہے تو کر لے۔ اس نے کہا "سکندر! میرے بابا کو رئیس نے آخری موقع دیا ہے۔ اگر دو ماہ کے اندر ہم نے رئیس کو پانچ ہزار اشرفیاں نہیں دیں تو وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے جائے گا۔ قاضی نے بھی فیصلہ دے دیا ہے۔ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں میرے والد کو کڑی سزا بھگتنا پڑے گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرا کمزور باپ قید خانے کی ذلت برداشت کرے اور میں اپنی محبت بچانے کے لیے اس کی بوڑھی کھال کو کوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔"

... دو ماہ کی مدت تھی اور اس میں سے چار پانچ روز گزر چکے تھے۔ سکندر اس مدت میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید وہ خود کو بیچ بھی دیتا تو یہ رقم حاصل نہ کر سکتا۔ ایک روز وہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکلا اور یونہی گلیوں گلیوں چلتا شہر سے دور نکل آیا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ بس وہ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹھہر گیا تو دم بدم بڑھتی گھٹن کے سبب اس کا دل بھی ٹھہر جائے گا۔ وہ ویرانے میں چلا گیا۔ بہت آگے ایک خشک ندی کے کنارے لمبی جنگلی گھاس تھی اور گھنے درخت تھے۔ وہ ایک سایہ دار جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

اسے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کچھ آگے بڑھ کر سرکنڈوں میں دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ایک آہنی پنجرے کے اندر ایک حبشی غلام بیٹھا تھا۔ اس کے کھانسنے کی آواز ہی سکندر کے کانوں تک پہنچی تھی۔ غلام کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ اس کی غلامی کی نشانی ایک طوق نما چرمی پٹی تھی جو اس کی گردن میں نظر آ رہی تھی۔ اس پٹی پر غلام کے نام کی مخصوص مہر تھی۔ غلام جوان تھا۔ اس کا رنگ بہت سیاہ نہیں تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور شکل و صورت میں جاذبیت تھی۔ وہ کسرتی جسم کا مالک رہا ہوگا لیکن اب اس کے رگ پٹھے کمزور نظر آ رہے تھے۔ چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ سکندر کا خیال تھا کہ نوجوان حبشی پنجرے میں بند ہے لیکن جب اس نے غور کیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ پنجرے کا دروازہ کھلا ہے۔

نوجوان حبشی غلام اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں عجیب سی بے تعلقی پائی جاتی تھی۔ سکندر نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے۔ غلام نے تھوڑے تذبذب کے ساتھ جواب دیا کہ اس کا نام قابوس ہے اور وہ شاہی غلام ہے۔

سکندر نے پوچھا "شاہی غلام ہو تو یہاں کیا کر رہے ہو؟"

نوجوان حبشی نے ایک گہری سانس لی اور بولا "یہ ایک لمبی کہانی ہے دوست۔"

سکندر نے کہا "تمہاری یہاں موجودگی حیران کن ہے۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہوں گا۔"

دونوں نوجوان کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی۔ بہت جلد انہیں محسوس

ہونے لگا کہ وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔ سکندر کو اندازہ ہوا کہ قابوس ایک بالکل سیدھا سادہ نوجوان ہے۔ وہ تھوڑا سا اٹک کر بولتا تھا۔ اس نے بہت کم بات کی تاہم جو لفظ بھی اس کی زبان سے ادا ہوا وہ غم و اندوہ کی "دل گداز تصویر" محسوس ہوا۔ سکندر خود بھی ایک دل فگار شخص تھا لہٰذا اسے قابوس کی صحبت پسند آئی۔ قابوس نے سکندر سے کہا "پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ پھر میں بتاؤں گا۔"

سکندر نے پہلے اپنا تعارف کرایا۔ اپنا مکمل پتا ٹھکانا بتایا پھر اپنی روداد غم مختصر الفاظ میں قابوس کے گوش گزار کردی۔ وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ سکندر اور ماہ رو کا غم محسوس کرکے قابوس کی آنکھوں میں یاس کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ یہ جان کر اسے یقیناً بہت دکھ ہوا تھا کہ سکندر اور ماہ رو کے درمیان چاندی کی دیوار حائل ہو رہی ہے اور وہ عنقریب ایک دوسرے سے بچھڑنے والے ہیں۔ ایک شکستہ دل ہی دوسرے شکستہ دل کا درد سمجھ سکتا ہے۔

سکندر کے بعد حبشی قابوس نے اپنی روداد سنائی۔ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ بتایا وہ کچھ یوں تھا۔

قابوس شاہی غلام کی حیثیت سے محل میں رہتا تھا۔ بادشاہ ارژنگ کی ایک بہت پیاری بیٹی شہرانو تھی۔ بے حد ذہین، خدا ترس اور محبت بھرا دل رکھنے والی۔ شہزادی شہرانو کی نگاہ میں قابوس کو اہم مقام حاصل تھا۔ وہ اس کی وفاداری اور جان نثاری پر بھروسا کرتی تھی۔ لڑکپن سے ہی وہ قابوس کو پیار سے طوطو کہا کرتی تھی۔ قابوس کو دیکھتے ہی شہزادی کے چہرے پر رونق آجاتی تھی۔ قابوس کو بات کرنے کا ڈھنگ تو نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی وہ دلچسپ آدمی تھا۔ وہ مضحکہ خیز شکلیں بنا کر اور آوازوں کی نقل کرکے ہنسانے کا فن جانتا تھا۔ وہ پرندوں اور جانوروں کی آواز اتنی خوب صورتی سے نکالتا تھا کہ سننے والا ششدر رہ جاتا تھا۔ خاص طور سے طوطے کے لہجے میں وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔ شاید اسی لیے شہزادی نے اس کا نام طوطو رکھ دیا تھا۔ وہ جب ہرا لباس پہن کر گلے میں سرخ پٹکا باندھ کر شہزادی کے سامنے آتا تو وہ خوب محظوظ ہوتی۔

قابوس کو شہزادی کے دل کا حال معلوم نہیں تھا لیکن اپنے دل کا حال وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ گزرے ماہ و سال نے اس کے دل پر خوبرو شہزادی کے نقش بہت گہرے کردیے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا تھا۔ یہ خاموش محبت تھی۔ عمیق سمندروں سے زیادہ گہری اور تاریک ترین غاروں سے زیادہ پراسرار۔ اسے محبت اور عشق وغیرہ کے معانی معلوم نہیں تھے۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ ہر دم شہزادی کے قریب رہنا چاہتا ہے۔ اس فضا میں سانس لینا چاہتا ہے جس میں شہزادی کے سانسوں کی مہک ہو اور ان راستوں کو آنکھوں سے چومنا چاہتا ہے جن پر شہزادی کے قدم پڑتے ہیں۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تو قابوس عام غلاموں کی طرح پابہ زنجیر رہتا تھا اور سخت مشقت کے کام کرتا تھا لیکن پھر رکھنے والی آنکھوں نے اس کی صلاحیت اور وفاداری کو پرکھ لیا۔ سب سے پہلے شہزادی شہرانو نے ہی والد کو بتایا کہ طوطو نامی غلام آوازوں کی نقلیں اتار لیتا ہے اور الٹی سیدھی حرکات کرکے لوگوں کو بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کردیتا ہے۔ بعد ازاں بادشاہ اور ملکہ نے بنفس نفیس قابوس عرف طوطو کی ان صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا تھا اور اس کے لیے کچھ رعایتیں فراہم کردی گئی تھیں۔ اب اسے کم مشقت والا کام سونپا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کام کے اوقات میں اسے زنجیر و طوق وغیرہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی قابوس کو محل کے اندر بھی بلالیا جاتا تھا اور اس کی "فن کاری" دیکھی جاتی تھی۔ قابوس حاضرین کو خوب ہنساتا تھا۔ خصوصاً جب شہزادی شہرانو سامنے ہوتی تھی تو اس کی صلاحیتوں کو چار چاند لگ جاتے تھے۔

شہزادی قابوس کی ہم عمر تھی یا شاید تھوڑی سی بڑی ہی تھی۔ ویسے بھی وہ آقا تھی اور قابوس غلام۔ قابوس کو مخاطب کرتے ہوئے شہزادی کے لہجے میں کسی وقت شفقت سی جھلکنے لگتی تھی۔ وہ بڑے پیار سے کہتی "طوطو! ہمارا گھوڑا لاؤ۔"

قابوس گھوڑا لاتا پھر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل جھک جاتا۔ وہ اس کی پشت پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہوجاتی۔ قابوس کے لرزتی جسم کے لیے شہزادی کا وزن پھول سے بھی کم ہوتا۔ وہ گھوڑے کی لگام تھام لیتا اور شہزادی کو محل کے پچھواڑے باغ میں لے جاتا۔ شہزادی اس کی پشت پر پاؤں رکھ کر اترتی۔ مصنوعی جھیل کے کنارے وہ دونوں پھولوں، تتلیوں اور جھرنوں کے درمیان گھومنے لگتے۔ وہ ادب سے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے اس کے پیچھے چلتا۔ وہ اس کی باتوں پر ہنستی تو ہر طرف کلیاں کھل اٹھتیں۔ کبھی قابوس کی کسی بات پر ہنستے ہوئے وہ عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی۔ اس نگاہ کی عمر صرف ایک "لمحہ" ہوتی تھی مگر اس کی تاثیر ماہ و سال پر محیط ہوتی تھی۔ اس ایک لمحے میں قابوس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہزادی ۔۔۔ شہزادی نہیں ہے اور وہ غلام نہیں ہے۔ وہ دونوں صرف انسان ہیں اور ان دونوں کے دل بے پناہ قوت سے ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے

ہیں۔ کوئی انجانی کشش ہے جو انہیں ایک نقطے پر اکٹھا کرنا چاہ رہی ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ "لمحہ" گزر جاتا۔ شہزادی پھر سے شہزادی بن جاتی اور اس سے ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر چلی جاتی۔ کبھی کبھی رونما ہونے والے 'اس "لمحے" کے بارے میں قابوس نے سیکڑوں مرتبہ سوچا تھا۔ کیا یہ لمحہ ہمیشہ ایک لمحہ ہی رہے گا۔ اس کے ذہن میں ہر بار یہ سوال ابھرا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ محل میں خاص قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ زنان خانوں میں نت نئی پوشاکیں سرسرانے لگیں اور کشیدہ کار عورتیں ریشم 'اطلس و کمخواب پر چاند ستارے اتارنے لگیں۔ محل کے ایوانوں میں نئے نئے چہرے نظر آنے لگے اور گیتوں کے پس منظر میں سارا دن خواتین کے قہقہے گونجنے لگے۔ ایک روز حبشی قابوس پر یہ انکشاف ہوا کہ شہزادی شہربانو کی شادی ہو رہی ہے اور وہ عنقریب پیا کے دیس سدھار رہی ہے۔ یہ خبر قابوس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی پھر بھی اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ اس رات وہ صبح تک کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ شہزادی کی شادی کی اطلاع نے اسے غم زدہ کیوں کیا ہے؟ اسے کیا حق پہنچتا ہے ایسی اطلاع پر غم زدہ ہونے کا؟ وہ غلام زادہ ہے۔ اس کا منصب یہ ہے کہ اپنے آقا کی خوشی پر خوش ہو اور اس کے غم کو اپنا غم سمجھے۔ اس رات۔۔۔ اور اس رات کے بعد کئی راتوں تک وہ اپنے دل کو سمجھاتا رہا تھا۔ وہ صرف ایک غلام تھا اور اسے غلام بن کر ہی رہنا تھا۔ وہ ایک لمحہ اس نے اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا جو کبھی کبھی شہزادی کی آنکھوں میں چمکا کرتا تھا اور ایک روشن شعاع کی طرح قابوس کے دل میں اتر جایا کرتا تھا۔

پھر ایک روز قریبی ملک کا سجیلا بانکا شہزادہ برات لے کر آیا اور شہزادی شہربانو اس کی بیوی بن گئی۔ غلام زادے نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے سینے پر جھیلا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق دلہا شہزادہ سات روز تک سسرال میں ہی مقیم رہا۔ اس کی خوب خاطر مدارات ہوئیں۔ حسین و جمیل شہزادی اور اس کے اہلِ خانہ شہزادے کی راہوں میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔ شہزادی نے قابوس کو بھی اپنے شوہرِ نامدار سے ملایا۔ وہ تعارف کرانے والے انداز میں بولی "یہ طوطو ہے۔ ہمارا ذاتی غلام۔ بہت ہنس مکھ، بہت دلچسپ اور وفاداری میں تو یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا خاندان کئی پشتوں سے محل کا خدمت گزار ہے۔"

پھر شہزادی نے حسبِ عادت قابوس کو حکم دیا کہ وہ دلہا شہزادے کو اپنی دلچسپ حرکات اور گفتار سے محظوظ کرے۔ اس روز قابوس نے کمال کر دیا تھا۔ ہنس ہنس کر سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ قابوس کا خیال تھا کہ شہزادہ بھی اس کی تعریف کرے گا لیکن یہ مراد بر نہیں آئی۔ تعریف کے موقع پر شہزادے نے کافی کنجوسی کا مظاہرہ کیا۔ اگلے ایک دو روز میں قابوس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ شہزادے نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اپنے اردگرد قابوس کی موجودگی محسوس کر کے شہزادے کی پیشانی پر بیزاری کی شکن نمودار ہو جاتی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ شاید قابوس کو دیکھ کر شہزادی شہربانو کے چہرے پر جو مسکراہٹ کھل اٹھتی تھی وہ شہزادے کو پسند نہیں آئی تھی۔۔۔ بہرطور شہزادے کی ناگواری محسوس کر کے اگلے چند روز تک قابوس 'شہزادے کی نگاہ سے دور دور رہا۔۔۔

شہزادی جب ساتویں روز اپنی سسرال روانہ ہوئی تو اس کے ساتھ بہت سے ساز و سامان کے علاوہ قابوس بھی تھا۔ وہ ذاتی غلام کی حیثیت سے شہزادی کے جہیز میں جا رہا تھا۔ مقامی دستور کے مطابق غلاموں کو دورانِ سفر میں زنجیریں پہنا دی جاتی تھیں یا پنجرے وغیرہ میں بند کر دیا جاتا تھا۔ قابوس اور تین دیگر غلاموں کو بھی خوب صورت پنجرے میں بند کیا گیا تھا اور گھوڑا گاڑی میں لاد دیا گیا تھا۔

یہاں تک اپنی روداد سنانے کے بعد حبشی قابوس خاموش ہو گیا۔ اس کی سفید آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ دل جیسے غم سے لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا مدتوں چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کوشش کافی طویل ثابت ہوئی۔ رہ رہ کر ایک سرد آہ حبشی غلام کے ہونٹوں سے نکلتی تھی اور فضا کو سوگوار کر جاتی تھی۔

آخر اس نے سر اٹھایا اور گلوگیر آواز میں بولا "اب تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"لیکن تمہاری روداد نامکمل ہے۔ تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور شہزادی اب کہاں ہے؟"

"شہزادی وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا اور میں وہیں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے تھا۔" وہ حسبِ عادت اٹک اٹک کر بولا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" سکندر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں کچھ سمجھا بھی نہیں سکتا۔ میں غلام زادہ ہوں اور میرے لیے شکوہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔" قابوس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندرونی کرب کے سبب سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے سکندر کی طرف سے رخ پھیرا اور

ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا "تم مصور ہو نا؟"

"ہاں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میں اچھی تصویر بنالیتا ہوں۔"

"تو پھر میری ایک بات مانو۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"ممکن ہے کہ میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں۔۔۔ لیکن۔۔۔ اگر میں نہ آیا تو ٹھیک دو ہفتے بعد تم دوبارہ اس جگہ آنا۔ یہاں پہنچ کر تم اپنے اردگرد دیکھنا۔ جو منظر تمہیں سب سے عجیب لگے اس کی ایک تصویر بنالینا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بس جو میں کہہ رہا ہوں اس کو دماغ میں رکھو۔"

"اچھا۔۔۔ تصویر بنانے کے بعد کیا کروں؟"

"تم یہ تصویر لے کر شہزادی شہربانو کے ملک چلے جانا۔ اس کی سسرال ڈھونڈنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے شاہی محل ہی اس کی سسرال ہوگی۔ تم اپنی وہ تصویر شہزادی شہربانو کو دکھانا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تصویر شہزادی کو ضرور پسند آئے گی۔۔۔ شہزادی وہ تصویر تم سے لے لے گی۔ شاہی محلوں میں رہنے والے جب کسی سے کوئی چیز لیتے ہیں تو بدلے میں انعام واکرام ضرور دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ شہزادی تمہیں فراخ دلی سے نوازے گی۔ اس انعام واکرام سے تم وہ قرض بہ آسانی اتار سکو گے جو تمہیں تمہاری ماہ رو سے دور کر رہا ہے۔"

سکندر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے قابوس کو ٹٹولنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ وہ جیسے ایک دم اپنے خول میں بند ہوگیا تھا اور سکندر سے کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتا تھا۔ ایک عجیب سی یاسیت طاری تھی اس پر۔

اپنے ذہن میں کئی سوال لیے سکندر اس ویرانے سے واپس آگیا۔ گھر آکر وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ قابوس نے آخر کس منظر کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیا چیز ہے جس کی تصویر اسے بنانا تھی اور شہزادی شہربانو کے پاس لے کر جانا تھی۔ وہ دو ہفتے والی شرط بھی بار بار اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ قابوس نے یہ کیوں کہا کہ وہ دو ہفتے سے پہلے دوبارہ یہاں نہ آئے۔ وہ دن سکندر نے بڑی مشکل سے کاٹے۔ چودہ دن گزر گئے۔ پندرھویں روز اس نے مصوری کا مختصر سامان اٹھایا اور اپنے تجسس کی انگلی تھام کر خراماں خراماں اس ویرانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ طویل مسافت پاپیادہ طے کرکے وہ دوپہر کے وقت اس سنسان جنگل میں پہنچ سکا۔ مقررہ جگہ پر پہنچ کر وہ دنگ رہ گیا۔ اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ آہنی پنجرہ اپنی جگہ موجود تھا اور اس کے اندر حبشی قابوس بھی موجود تھا۔۔۔ لیکن زندہ حالت میں نہیں۔۔۔ وہ مرچکا تھا۔ پرندے اور جانور اس کے جسم کا گوشت نوچ کر کھا چکے تھے اور اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آرہا تھا۔ یہ ڈھانچا پنجرے کی سلاخوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ جیسے مرنے والا کچھ سوچتے سوچتے یا کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سوگیا ہو۔ مرنے والے کی گردن میں اب بھی مُہروالی چرمی پٹی موجود تھی لیکن اس کی روح ہر بندھن سے آزاد ہوچکی تھی۔

اس اندوہناک منظر نے سکندر کے دل ودماغ پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ وہ دیر تک آہنی پنجرے اور انسانی ڈھانچے کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر نڈھال سا زمین پر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس کام کرنے لگے۔ اسے یاد آیا کہ قابوس نے اس سے کیا کہا تھا۔ اسے یہاں نظر آنے والے سب سے انوکھے منظر کی تصویر بنانا تھی۔ اس سے انوکھا منظر بھلا اور کیا ہوسکتا تھا۔ ایک شخص آہنی پنجرے میں موجود تھا۔ پنجرے کا دروازہ کھلا تھا لیکن قیدی پنجرے سے نکلا نہیں تھا۔ وہ بھوکا پیاسا اپنے قفس میں بند رہا اور جان دے دی تھی۔

سکندر نے اپنے آنسو پونچھے۔ کینوس کو ہموار کیا۔۔۔ اپنے رنگ سنبھالے اور بڑی وارفتگی سے منظر کشی میں مصروف ہوگیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک یادگار تصویر بنانے جارہا ہے۔

○☆○

شہزادی شہربانو اپنے محل میں موجود تھی۔ خوب صورت پائیں باغ میں وہ ایک فوارے کے قریب گم صم بیٹھی تھی۔ شاہی مغنیہ کا گیت فضا میں گونج رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف سے بے خبر تھی۔ قوسِ قزح کے رنگوں والے پھول، شاخوں پر چہکتے ہوئے پرندے، کچھ بھی تو اس کے دل کو نہیں بھا رہا تھا۔ آج کئی دن بعد وہ پھر بے وجہ اداس ہوگئی تھی۔ ایک خواجہ سرا اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ تعظیم پیش کرنے کے بعد اس نے شہزادی سے کہا "شہزادی حضور! ایک نوجوان شرفِ باریابی چاہتا ہے۔ وہ مصور ہے اور آپ کی خدمت میں کوئی تصویر پیش کرنے کا خواہش مند ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"کہیں بہت دور سے آیا ہے۔ چہرے پر طویل مسافت کے آثار ہیں۔ وہ اپنی تصویر کے بارے میں بہت پُرامید ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے اندر لاؤ۔" شہزادی شہربانو نے کہا۔
چند لمحے بعد خستہ حال سکندر اپنی تصویر کے ساتھ بائیں باغ میں داخل ہوا۔ تین بار فرشی سلام کرنے کے بعد وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔
شہزادی نے اسے تصویر دکھانے کا حکم دیا۔ سکندر نے تصویر کا غلاف ہٹایا اور بڑے سلیقے سے اسے شہزادی کے ملاحظے کے لیے رکھ دیا۔
شہزادی نے پہلے تو تصویر کو عام سے انداز میں دیکھا پھر ایک دم وہ چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں بتدریج ہیجانی کیفیت نمودار ہونے لگی۔ چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ تصویر کا فریم دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی گئی۔ کتنی ہی دیر بعد اس نے سکندر کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کی حسین آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "کہاں دیکھا تھا تم نے یہ سب کچھ؟"
سکندر نے مؤدب لہجے میں شہزادی کو اس سنسان جنگل کے بارے میں بتایا جو ایک خشک ندی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا اور جہاں ایک روز سکندر اتفاقاً جا نکلا تھا۔ اس نے شہزادی کو فاقہ زدہ غلام اور آہنی پنجرے کا احوال سنایا۔
نجانے اچانک شہزادی کو کیا ہوا۔ اس نے تصویر اٹھائی اور بھاگتی ہوئی محل سرا کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ یقیناً وہ زار و قطار رو رہی تھی۔
مفلوک الحال سکندر کو شہزادی شہربانو کی شکل پورے دو روز بعد نظر آئی تھی۔ شہزادی نے ایک خادمہ کے ذریعے اسے محل سرا میں طلب کیا تھا۔ وہ اس پھول جیسی نظر آ رہی تھی جو موسم سرما کی ایک طویل رات میں صبح تک شبنم سے نہاتا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوج چکی تھیں اور چہرہ اندوہ کی تصویر تھا۔ اس مرتبہ شہزادی شہربانو نے سکندر سے ساری بات تفصیلاً پوچھی۔ سکندر نے بھی کچھ چھپا کر نہیں رکھا۔ الف سے ے تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ شہزادی سنتی رہی اور اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے کرید کرید کر سکندر سے پوچھا کہ آخری ملاقات میں طوطو (قابوس) سے اس کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔ طوطو نے کس لہجے میں کیا کیا کہا تھا۔ شاید وہ چاہ رہی تھی کہ سکندر لفظوں کی مدد سے اس پوری ملاقات کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ ڈالے۔ اور جب سکندر یہ نقشہ کھینچ رہا تھا، وہ بے اختیار ہچکیوں سے رونے لگی۔
بہت دیر بعد اس کے آنسو تھمے اور اس نے سکندر سے کہا "مصور! ہم تمہاری یہ تصویر منہ مانگی قیمت پر خریدنا

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات
ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ
وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے
قیمت ... روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ
جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو زندگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱ روپے

کالی کہانیاں
جرائم، جادو، شیطان، ازم، ارواح، طنز و مزاح، اسرار و خوف، سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور نک ویلوٹ جو بیش قیمت چیزیں گرال قدر معاوضے پر چراتا ہے۔
قیمت جلد اول، دوم ۴۰ روپے
ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۲۳ سید مینشن بھوپال شریف ٹی ٹی چنیوٹ روڈ سرگودھا

چاہتے ہیں۔"

سکندر بولا "شہزادی حضور! میں ایسی جسارت نہیں کرسکتا۔ میری طرف سے یہ تصویر ایک حقیر تحفہ سمجھ کر قبول فرمالیجئے۔"

شہزادی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے ایک منہ بند تھیلی سکندر کی گود میں ڈال دی "یہ تمہاری تصویر کی قیمت نہیں ہے مصور۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی "اس دردناک تصویر کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی ہے۔"

رخصت ہونے سے پہلے سکندر نے کہا "شہزادی حضور! ایک بات پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں؟"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "شہزادی حضور! حبشی غلام کی روداد میں ایک کڑی غائب تھی۔ وہ آہنی پنجرہ تو آپ کی برات کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ وہ وہاں کیوں پڑا رہ گیا تھا؟"

سکندر کو ایک پل کے لیے یوں محسوس ہوا کہ شہزادی اس مداخلت پر خفا ہوجائے گی لیکن پھر ایک دم وہ پُرسکون ہوگئی۔ شاید وہ خود بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ کسی ایسے شخص کے سامنے اپنا دکھ بیان کردینا چاہتی تھی جس کا تعلق اس کے وطن سے تھا۔ اس کی مٹی سے تھا اور ان فضاؤں سے تھا جہاں وہ برسوں سانس لیتی رہی تھی۔ وہ بولی "طوطو کو ہمارے محترم شوہر نے آزاد کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک غلام کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ساتھ یہاں آئے۔ وہ ہماری شادی کی خوشی میں اسے آزاد کردینا چاہتے تھے۔ سفر کے دوران میں انہوں نے اس کا آہنی پنجرہ گھوڑا گاڑی سے اتروا کر جنگل میں رکھ دیا تھا لیکن جب اسے پنجرے سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ اس کی سلاخوں سے چمٹ گیا۔ وہ دہائی دینے لگا کہ اسے موت قبول ہے لیکن رہائی نہیں۔ شاید... شاید وہ سچ مچ طوطا ہی تھا جو پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھتا ہے اور کھلی فضاؤں میں اڑنے سے انکار کردیتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے، ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے لیکن ہم مجبور تھے۔ اپنے سرتاج کی خوشنودی ہمیں ہر حالت میں عزیز تھی۔ ہم نے طوطو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے کہا تھا "تمہارے پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ ایک نئے ڈھنگ سے اپنی زندگی شروع کرسکتے ہو۔"

وہ اٹک اٹک کر بولا تھا "غلام زادہ آزاد نہیں ہے شہزادی... اس کے پاؤں میں اب بھی زنجیر ہے۔"

اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں ہمیں بتا رہی تھیں کہ وہ ہمارا انتظار کریں گی۔ آخری وقت تک... زندگی کی آخری رمق تک۔ وہ اس امید میں کھلی رہیں گی کہ ہم پلٹ کر آئیں گے..."

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے سوگوار شہزادی پھر سسکنے لگی "ہمیں کیا پتا تھا طوطو... تو ضد کا اتنا پکا نکلے گا۔ پتا ہوتا تو... پتا ہوتا تو..."

الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر سسکیوں میں ڈوب گئے۔ وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔ شاید آج قابوس نے اس سے اپنے سارے تبصرے واپس لے لیے تھے۔ اس لمحے سکندر کو محسوس ہوا کہ یقیناً قابوس نے سچ ہی کہا تھا۔ شہزادی کی آنکھوں میں کبھی کبھی وہ لمحہ ضرور چمکتا ہوگا، جب شہزادی... شہزادی نہ رہتی ہوگی صرف ایک دوشیزہ بن جاتی ہوگی اور قابوس... قابوس نہ رہتا ہوگا صرف ایک نوجوان بن جاتا ہوگا۔ اس لمحے وہ دونوں صرف ایک مرد اور عورت کی حیثیت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں وہ برق چمکتی ہوگی جو آدم اور حوا کی آنکھوں میں ایک دوجے کو دیکھ کر چمکی تھی... ہاں ایسا ضرور ہوا ہوگا۔

○☆○

باقی کی کہانی زیادہ طویل نہیں ہے۔ سکندر انعام کی تھیلی لے کر اپنے ملک واپس آگیا۔ رئیس کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں صرف دو تین دن باقی تھے۔ آخری دو تین دن جو سکندر اور ماہ رو کی ابدی جدائی کے درمیان حائل تھے۔ سکندر نے رئیس کی واجب الادا رقم اس کے سامنے پھینکی اور... بڑی سج دھج سے اپنی ماہ رو کو اپنالیا۔ محبت کی ایک ادھوری کہانی نے محبت کی ایک مکمل کہانی کو جنم دے دیا تھا۔ قابوس اور شہزادی کی محبت کا ادھ کھلا پھول بکھر گیا تھا لیکن اس کی پتیوں نے زمین میں سرایت کرکے نئے لالہ و گل کو نمو دی تھی... جس سہانی رات سکندر نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا اور اس کے سرخ لبوں کو بوسہ دیا نجانے کیوں ایک دم اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ شاید... شاید اس کے تصور میں وہ سنسان جنگل آگیا تھا جہاں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک آہنی پنجرہ رکھا تھا اور پنجرے کے قریب ایک طوطو کی قبر تھی... ایک "ہنسانے والے" طوطو کی قبر۔ یہ قبر سکندر نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی اور اس پر اپنے آنسوؤں سے چھڑکاؤ کیا تھا۔

★★★

بورڈ کی زینت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔

اس گیراج میں بند ہوئے احمد رضا کو سولہ گھنٹے ہوئے تھے۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سولہ برس سے اس گیراج میں بند ہے۔ اور وہاں موجود اشیا کو دیکھ رہا ہے۔ اب وہ آنکھیں بند کر لیتا تو بھی گیراج کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ وہ ٹانگوں پر زور دے کر بمشکل اٹھا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو پسینے میں شرابور تھا۔ حبس اور گرمی نے تو اسے رات بھر تنگ کیا تھا لیکن رات گزرنے اور سورج طلوع ہونے کے بعد یہ گرمی کچھ اور ہی رنگ اختیار کر رہی تھی۔ اس نے آنے والی گھڑیوں کا سوچا اور کانپ کر رہ گیا۔

اوائل جولائی کا طویل' پہاڑ جیسا دن سر پر تھا۔ آگ برساتا سورج دھیرے دھیرے بلند ہو رہا تھا اور احمد رضا جانتا تھا کہ اگلے چند گھنٹوں میں یہ سورج اس نیچی چھت والے گیراج کو تندور بنا دے گا۔ کیا اس تندور میں وہ کباب ہونے سے بچ سکے گا؟ یہ سوال کسی جہنمی عفریت کی طرح منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بازوؤں کا پسینہ دھاروں کی صورت سفر کرتا کلائیوں تک پہنچا تو ہاتھوں کی پشت پر مرچیں سی لگ گئیں۔ احمد رضا نے ہاتھ اٹھا کر دیکھے۔ کل نصف شب تک وہ مسلسل آہنی شٹر پر مکے برساتا اور چیختا رہا تھا۔ اس ایکسرسائز نے اس کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ گلے کو بھی چھیل ڈالا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو احمد رضا زخمی ہاتھوں کی مرہم پٹی کرا کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بستر پر نیم دراز پڑا ہوتا اور اس کی خوبصورت بیوی اپنے ہاتھ سے اسے ناشتا کرا رہی ہوتی۔ مگر اب تو یہ خیال کی باتیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان ہی زخمی ہاتھوں کے ساتھ ابھی اسے آہنی گیٹ پر اور بہت سے مکے برسانے ہیں اور اس زخمی گلے کے ساتھ ابھی اور بہت چیخنا ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور لڑکھڑاتا ہوا گیٹ تک پہنچ گیا۔ باہر کی سن گن لینے کے لئے اس نے شٹر سے کان لگایا تو سسکاری لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ ابھی دن کا آغاز تھا لیکن دھوپ نے آہنی گیٹ کو بری طرح تپا دیا تھا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور شٹر کے نیچے موجود درز کو کانوں سے قریب تر کر دیا۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو قبرستان میں ہوتی ہے۔ یا اس صحرا میں جہاں گمشدہ قافلوں کی باقیات پائی جاتی ہیں۔

اس گیراج سے باہر ویرانی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کسی کتے کی صدا' نہ کسی پرندے کی چہچہاہٹ۔ شاید پتوں میں سر سرانے والی مدھم ہوا بھی گرمی کے تیور دیکھ کر آج گھر سے نہیں نکلی تھی۔ مکمل سکوت نے جیسے بند گیراج کی گھٹن میں اور اضافہ کر دیا۔ احمد رضا بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا اور مٹھیاں بھینچ کر زور زور سے آہنی شٹر پر مارنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا۔ "دروازہ کھول! سعیدی! کتے کے بچے' دروازہ کھول دے' میں کہتا ہوں دروازہ کھول دے۔ کوئی ہے؟... کوئی ہے؟..... دروازہ کھولو۔ خدا کے لئے دروازہ کھولو۔"

وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ مسلسل یہ پکار کرتا رہا۔ آخر بے دم ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر ہانپنے کے بعد وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلی نشست کی پشت پر سر ٹکا کر نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر دانت کچکچا کر اٹھا اور گاڑی کو ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ اس کے وزنی بوٹوں نے گاڑی کی چادر میں ڈینٹ ڈالنے شروع کر دئے۔ وہ چیخنے لگا۔ "سعیدی! کتے! حرامزادے' میں تجھے جیل میں سڑا دوں گا۔ تجھے قتل کرا دوں گا۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھول دے....." ٹخنے میں ٹیسیں اٹھنے لگیں تو اس نے ٹھوکروں کا سلسلہ ختم کر دیا۔ ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے نشست پر بیٹھ گیا اور مراقبے میں چلا گیا۔ اس دفعہ یہ مراقبہ کافی طویل ثابت ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھانا شروع کیا....

دیکھو احمد رضا! اپنے ذہن کو قابو میں رکھو۔ اگر تمہارا ذہن تمہارے بس میں نہ رہا تو پھر ازیت ناک موت تمہارا مقدر ہو گی۔ تمہارے پاس وقت تھوڑا ہے۔ گزرنے والی ہر ساعت کے ساتھ تمہاری ذہنی اور جسمانی طاقت زائل ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم گرمی اور پیاس سے نڈھال ہو کر خود ہی اس قبر میں لیٹ جاؤ۔ تمہیں ٹھنڈے دل و دماغ سے اس صورت حال کے بارے میں سوچنا چاہئے اور رہائی کی سبیل کرنی چاہئے۔ سب سے پہلے تو یہ ذہن نشین کر لو کہ وہ سعیدی' کتے کا بچہ محرم کی چھٹیاں گزارنے کے لئے یہاں سے جا چکا ہے۔ اور اس کے دونوں ملازم بھی چھٹی کر چکے ہیں۔ چھٹیوں کی وجہ سے کوئی اخبار والا' دودھ والا یا ڈاکیہ ادھر نہیں آئے گا۔ نہ ہی سعیدی کے دوست احباب میں سے کوئی اسے ملنے یہاں پہنچے گا۔ لہٰذا اگر اس پنجرے کو توڑنا ہے تو تمہیں خود ہی توڑنا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ نشست سے اٹھا اور بڑی بردباری سے گیراج کا جائزہ لینے لگا۔ لکڑی کے چھوٹے دروازے پر اس نے رات بہت کوشش کی تھی اور اس آخری نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسے توڑنا یا کھولنا ممکن نہیں۔ روشندان تک رسائی بھی کم از کم اس کے لئے ناممکن تھی۔ گو اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ تیس برس کے شخص کو جواں سال ہی کہا جاتا ہے اور اس میں خاطر خواہ پھرتی بھی ہوتی ہے لیکن وہ فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس فربہی کے سبب عرصۂ دراز..... سے اس نے کوئی کود پھاند کا کام نہیں کیا تھا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح روشندان تک پہنچ بھی جاتا تو اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ وہ وہاں لگی گرل کو اکھاڑ کر باہر نکل سکے گا۔ آجا کے وہ آہنی شٹر رہ جاتا تھا۔ یہ ہر پورچ کی طرف کھلتا تھا اور جس کو اوپر اٹھانے سے نیچے قریباً چار انچ کی درز پیدا ہو جاتی تھی۔ اس شٹر پر باہر کی طرف تالے لگے ہوئے تھے اور یہ مضبوط چادر کا بنا ہوا تھا۔ اگر وہ اسے توڑنا چاہتا تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ

گاڑی میں بیٹھ جاتا' انجن اسٹارٹ کرتا' اسے ریورس گیئر لگاتا اور پورے زور کے ساتھ شٹر سے ٹکرا دیتا۔ پھر گاڑی کو آگے لے جاتا' چار پانچ فٹ کا اسٹارٹ لیتا اور دوبارہ شٹر کو ٹکر مارتا۔ ممکن تھا ایسی بیس پچیس ٹکروں کے بعد شٹر کی ثابت قدمی میں کوئی فرق پڑ جاتا۔ لیکن اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو بنیادی چیز اسے درکار تھی وہ اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ یعنی گاڑی کی چابی۔ چابی کے بغیر انجن کیسے اسٹارٹ ہوتا؟

وہ ایک گہرا سانس لے کر شٹر کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ نیچے کی درز سے روشنی اور گرمی کی لہریں اندر آ رہی تھیں۔ اس نے بغور فرش کو دیکھا۔ بہت پرانا فرش تھا۔ شاید چالیس پچاس سال پہلے کا۔ کہیں کہیں ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی اور نیچے سے کنکریٹ جھانک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا فرش کی ڈھائی تین انچ موٹی تہ کے نیچے اینٹوں کی روڑی ہو گی اور اس روڑی کے نیچے کچی زمین۔ اگر وہ کسی طرح فرش توڑ کر زمین کھود لیتا تو بند شٹر کے نیچے سے باہر نکلا جا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کار کی ڈکی میں چند اوزار پڑے ہیں۔ ان کے ذریعے فرش توڑنے اور زمین کھودنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ ڈکی سے یہ اوزار نکال لایا اور شٹر کے قریب آ بیٹھا۔ فرش کے گڑھوں کو وسیع کرنے کے لئے پانے اور چھوٹے اسکریو ڈرائیور کا استعمال مناسب دکھائی دیتا تھا۔ زمین میں گڑھا کھودنے کے لئے وہ جیک کے اسکریو کو گھمانے والا لمبا راڈ استعمال کر سکتا تھا۔

کسی کام کے سہل یا مشکل ہونے کا پتا اسی وقت چلتا ہے جب اسے کیا جاتا ہے۔ دو گھنٹے کی سر توڑ کوشش میں احمد رضا نے دو اسکریو ڈرائیور بیکار کئے' تین انگلیاں لہولہان کیں اور اپنی باقی ماندہ توانائی کا بیشتر حصہ برباد کر لیا۔ اس کے عوض اس نے فرش کو جو نقصان پہنچایا وہ ناقابل ذکر تھا۔ وہ بمشکل آٹھ انچ قطر کا دو انچ گہرا گڑھا کھود سکا۔ آخر اس نے اوزار پھینکے اور مُردہ چھپکلی کی طرح نیم گرم فرش پر گر گیا۔ سورج نصف النہار پر تھا اور گیراج کی دیواریں اس کی تمازت روکنے میں قطعی ناکام ہو چکی تھیں۔ ملتان کا درجۂ حرارت شاید آج کوئی ریکارڈ قائم کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔

احمد رضا نے محسوس کیا کہ وہ ایک تاریک جہنم کدے میں ہے۔ اب اسے پسینہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اپنے مساموں کو چوس کر ہی اپنی اکڑی ہوئی زبان کو تراوٹ پہنچاتا۔ اب تک اس نے صرف پیاس کا نام سنا تھا۔ آج اسے ان چار حرفوں کی حقیقت معلوم ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا بھٹی میں تپی ہوئی ایک تلوار اس کے حلق سے لے کر ناف تک اتری ہوئی ہے۔ کبھی جب وہ تھوک نگلنے کی کوشش کرتا تو اسے شدید کھانسی اٹھتی۔ محسوس ہوتا حلق کی نالیاں اندر سے جڑنے لگی ہیں۔ آہ' کتنا خوبصورت لفظ تھا "پانی۔"

اس نے اٹھ کر ایک بار پھر کار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ شاید

NEWTECH ACADEMY

COLLABORATION WITH PROFESSIONAL AMERICAN UNIVERSITIES

پاکستان کا پہلا اور واحد ادارہ جو دُنیا بھر میں آسان اور عام فہم اُردو اور انگلش میں خط و کتابت کے ذریعہ کمپیوٹر ایئر ٹکٹنگ و دیگر پروفیشنل کورسز کرا رہا ہے۔

کمپیوٹر کورسز

ایپٹی ٹیوڈ ٹیسٹ کی تیاری کے ساتھ
BASIC, dBASE III+, WS, DOS, EDP

ایئر ٹکٹنگ اینڈ ٹیرف

ٹریول ایجنسی کھولئے یا شاندار اور باوقار ملازمت کیجئے۔
IATA کے سلیبس کے مطابق

پراٹیوبیٹ سٹرانرسان بنیے

سراغرساں کا مکمل کورس جس کو مکمل کر کے آپ وطن عزیز کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے شوق کی تکمیل بھی کر سکتے ہیں

فوٹوگرافی اور ریڈیو الیکٹرونکس

ایک ایسا شغل جو نہ صرف آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے بلکہ آپکو بہترین مستقبل کی ضمانت بھی دیتا ہے

شمسی توانائی (SOLAR ENERGY)

جس کے ذریعے آپ دُھوپ سے برف جما سکتے ہیں۔
کار اور ٹی وی چلا سکتے ہیں۔

انگلش لینگویج پروگرام

بین الاقوامی زبان جس کا سیکھنا نہایت ضروری ہے
اوّل تا آخر ہماری رہنمائی آپکے ساتھ ساتھ۔

ایکسپورٹ، امپورٹ اینڈ مارکیٹنگ

ایک ایسا کورس جو انٹرنیشنل بزنس میں آپکے حال کو شاندار اور مستقبل کو عظیم ترین بناتا ہے۔

مکمل تفصیلات کے لئے پانچ روپے کا پوسٹل آرڈر یا ڈاک ٹکٹ یا مساوی رقم کا بینک ڈرافٹ بنام نیوٹیک اکیڈمی P.E.C.H.S کراچی ارسال کریں۔
جس کورس میں داخلہ لینا ہو اس کا حوالہ ضرور دیجئے
کمپیوٹر، ایئر ٹکٹنگ، انگلش لینگویج اور ایکسپورٹ امپورٹ کے کورسز ریگولر بھی کرائے جاتے ہیں۔

marksman

کہیں کوئی تھرماس ہو۔ کوئی بوتل ہو' یا کوئی ایسی چیز جو اس کے حلق کو تر کر سکے۔ یہ تلاش ایسے ہی تھی جیسے کوئی الماری کی درازوں میں گمشدہ بچے کو تلاش کرتا پھرے۔ وہ اس مقصد سے درجنوں مرتبہ گاڑی کا جائزہ لے چکا تھا۔ گھوم پھر کر اس کی نظروں میں وہی چند مناظر آتے تھے۔ نشستوں کے خاکی کور' جنہیں دیکھ کر کسی لق و دق ویرانے کی خاک کا خیال آتا تھا۔ ایئر ریفریشر کی بلوری بوتل میں جھلکتا ہوا سرخی مائل پرفیوم جس پر کسی ٹھنڈے مشروب کا گمان کیا جاسکتا تھا۔ ونڈ اسکرین کے سامنے جھولتے ہوئے زرد انگور جنہیں دیکھتے ہی اصلی انگوروں کا تصور ذہن میں آتا تھا اور پیاس کی شدت کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ ان مناظر کے علاوہ ایک منظر اور بھی تھا جس پر اس کی نگاہ بار بار ٹک جاتی تھی۔ گاڑی کے پہلو میں دیوار کے پاس فرش میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ اس ایک انچ گہرے گڑھے میں تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ شاید گاڑی کے ٹائر دھوتے ہوئے یا فرش صاف کرتے ہوئے یہ پانی یہاں جمع رہ گیا تھا۔ یہ پانی احمد رضا کے سوکھے حلق کو تر کر سکتا تھا۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو گاڑی سے نکل کر اس پانی کے قریب آبیٹھا اور جھک کر غور سے دیکھنے لگا۔ رات اسے ٹھیک طرح دکھائی نہیں دیا تھا مگر اب وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی باریک نگاہ خوردبین کی طرح پانی کا جائزہ لینے لگی۔ اس میں مٹی کے ذرّے تھے۔ موبل آئل کے لہریے تھے اور کسی زرد مادے کی آلائش تھی۔ بہت ممکن تھا کہ یہ زرد مادہ گوبر ہی ہو۔ اسے ابکائی سی آگئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اپنی حالت پر آج اسے خود ہی ترس آرہا تھا۔ وہ جو اپنے حلقۂ احباب میں نفیس طبع اور صفائی پسند مشہور تھا' آج کتنے مختلف انداز سے سوچ رہا تھا۔

اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے پہلی بار پروفیسر خالد سعید سے اختلاف کرکے ایک سرد جنگ کا آغاز کیا تھا۔ یہ کوئی ایک برس پرانی بات تھی۔ نفسیات کا اسسٹنٹ پروفیسر خالد سعید بہاولپور سے ٹرانسفر ہو کر ملتان آیا تھا۔ احمد رضا بھی اسی کالج میں فزکس کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اپنے فرائض کے سلسلے میں دونوں کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ گو خالد سعید اور احمد رضا ہم عمر تھے لیکن دونوں کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ خالد سعید جسے یار لوگ ڈاکٹر سعیدی کہتے تھے' اُجڑے بکھرے بالوں اور بے ترتیب لباس والا ایک سنکی شخص تھا' جبکہ احمد رضا کالج کا سب سے خوش لباس اور جاذبِ نظر استاد سمجھا جاتا تھا۔

ایک دن اساتذہ کے ایک گروپ کے ساتھ دونوں کا بہاولپور جانا ہوا۔ وہاں انہوں نے سائیکل رکشا چلتے دیکھے۔ احمد رضا کے لئے یہ منظر بالکل نیا تھا۔ اس نے ایک رکشے میں دو سیٹھ نما افراد کو بیٹھے اور ایک مدقوق شخص کو سائیکل کھینچتے دیکھا تو بہت عجیب محسوس کیا۔ اس نے ڈاکٹر سعیدی سے کہا "یار' ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ کتنی بے حسی کی بات ہے یہ؟"

سعیدی نے مسکرا کر کہا "بے حسی کی بات یہ تمہارے لئے ہے' کیونکہ تم پہلی بار دیکھ رہے ہو۔ جب کوئی چیز روٹین میں آجاتی ہے تو معمولی بن جاتی ہے۔ چار دن تم یہاں رہو گے تو اسی طرح ٹھاٹ سے رکشا میں بیٹھے نظر آؤ گے۔"

احمد رضا نے بیزاری سے کہا "چھوڑو یار! تم تو ہر مسئلے کو کھینچ کر نفسیات کی دلدل میں لے جاتے ہو۔ اگر تمہاری روٹین والی بات تسلیم کرلی جائے تو پھر ہر برائی کا جواز نکل سکتا ہے۔ بات صرف حساس ہونے اور بے حس ہونے کی ہے۔ مرنا بھی تو روٹین میں ہے' پھر تمہیں مرنے سے خوف کیوں آتا ہے! اس لئے کہ مرنا تمہارے فائدے میں نہیں؟"

سعیدی نے کہا "مرنا بھی روٹین میں آجاتا ہے۔ میدان جنگ میں جب کشتوں کے پشتے لگ رہے ہوں' موت بے معنی چیز ہوجاتی ہے۔ اپنی جگہ تم بھی صحیح ہو لیکن تم مسئلے کا اخلاقی پہلو بیان کر رہے ہو جبکہ میں نفسیاتی...."

"چھوڑو یار۔" احمد رضا نے بھنّا کر اس کی بات کاٹی۔ "بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتے ہو۔"

ڈاکٹر سعیدی نے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہی تو احمد رضا مزید بھڑک اٹھا۔ نتیجتاً دونوں میں اچھی خاصی جھڑپ ہوگئی۔

یہ جھڑپ ایک مستقل اور روز افزوں کشیدگی کا باعث بن گئی' حالانکہ یہ ایک خالص علمی تنازعہ تھا' مگر چند دھواں دھار بحثوں کے بعد ذاتی دشمنی کا رنگ اختیار کرگیا۔ کالج کے جریدے میں احمد رضا نے چند مضامین بھی لکھے۔ ان مضامین کا مقصد ڈاکٹر سعیدی کی مخالفت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ احمد رضا نے لکھا کہ ہمارے خود ساختہ نفسیات دانوں کا یہ استدلال بالکل غلط ہے کہ انسانی آنکھ بصارت سے نہیں بلکہ روز مرّہ تجربات کی روشنی میں دیکھتی ہے' اور یوں بعض سماجی ناہمواریاں نمایاں ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ اپنے موقف کے حق میں احمد رضا نے بھاری بھر کم لفظ استعمال کئے۔ تند و تیز دلائل دیئے اور پروفیسر پر رکیک حملوں سے بھی باز نہیں رہا۔

احمد رضا کا آخری مخالفانہ مضمون چند ہفتے پہلے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے جواب میں ڈاکٹر سعیدی نے بھی ایک مضمون لکھ مارا۔ یہ اس کا پہلا مضمون تھا جس میں اس نے نام لے کر احمد رضا پر تنقید کی اور اس کی تحریروں کو گمراہ کن قرار دیا۔ یہی مضمون پڑھنے کے بعد احمد رضا آگ بگولا ہوا تھا اور ڈاکٹر سعیدی سے "دو باتیں" کرنے یہاں اس کی کوٹھی پر آگیا تھا۔

یہ کوٹھی ملتان شہر کے مضافات میں واقع تھی۔ چاروں طرف جھاڑیاں اور درخت تھے۔ قریب ہی چھوٹی نہر بہتی تھی۔ تنہا اور پرسکون جگہ تھی۔ غالباً اسے پچاس ساٹھ برس پہلے کسی نواب ٹائپ کے سکون پسند شخص نے تعمیر کرایا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر سعیدی خود بھی تخلیقی ذہن رکھنے والا تنہائی پسند شخص تھا۔ لہٰذا اسے

رہائش کے لئے یہ جگہ پسند آگئی تھی۔ اس نے کوٹھی کرائے پر لے کر اسے ضرورت کے مطابق فرنیش کرلیا تھا۔ آج کل وہ اپنے دو ملازموں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔

گزشتہ شام احمد رضا غصے میں بھرا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ آج سعیدی کی فرنچ کٹ داڑھی نوچ لے گا۔ مگر حسبِ سابق سعیدی نے اس کے جوش و خروش کا جواب تحمل سے دیا اور بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے اس کا غصہ کافور کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کی گفتار میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو احمد رضا کو بے قابو ہونے سے روک لیا کرتی تھی۔ جب وہ کچھ ٹھنڈا ہوگیا تو سعیدی نے اسے چائے پلوائی اور پھر اپنی نئی گاڑی دکھانے کے لئے گیراج میں لے آیا۔ وہ گیراج میں اندرونی دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ اندر تاریکی تھی۔ سعیدی نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر زیرو کا بلب روشن کردیا مگر جب ٹیوب لائٹ روشن کرنا چاہی تو اسے ناکامی ہوئی۔ احمد رضا کے فرشتوں کو خبر نہ تھی کہ اس خرابی کا اہتمام پہلے سے کیا گیا تھا۔ سعیدی کچھ دیر بٹن کو آن آف کرتا رہا' پھر اس انداز سے باہر نکلا جیسے ٹیوب لائٹ کو چھیڑنے کے لئے کوئی لمبی لکڑی یا چھڑی وغیرہ لینے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ باہر سے بند ہوگیا اور احمد رضا اس قبر نما گیراج میں قید ہو کر رہ گیا۔

اب ان واقعات کو قریباً اٹھارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ شدید پیاس کے باعث احمد رضا کی جان لبوں پر تھی۔ معلوم نہیں گرمی اور حبس کے سبب آکسیجن ناپید ہوچکی تھی یا اس کے دل نے درست طور پر دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ آہنی شٹر کے نیچے سے جھلسا دینے والی گرمی کی لہریں اندر گھس رہی تھیں۔ قریب ہی وہ اوزار پڑے تھے جنہیں اٹھانے کی ہمت اب اس میں نہیں تھی۔ گھوم پھر کر اس کی نظریں ناصاف پانی کے اس چھوٹے سے گڑھے پر جم گئیں۔ یہ پانی بتدریج ختم ہو رہا تھا۔

احمد رضا نے اندازہ لگایا کہ ایک دو گھنٹے تک وہاں بس تھوڑی سی نمی رہ جائے گی۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھا اور رینگنے والے جانور کی طرح اوندھے منہ فرش پر لیٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ گڑھے کو ڈھانپ چکا تھا۔ ایک زندگی بخش تراوٹ نے اس کے حلق کو چھولیا۔ مگر فرحت کا یہ احساس بہت عارضی تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کی زبان پھر خشک ہو کر چٹخنے لگی۔ یہی لمحے تھے جب اسے گیراج کے اندرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ لکڑی کے پٹ وا ہوئے اور ڈاکٹر سعیدی کے دونوں ملازم اندر آگئے۔ انہیں دیکھ کر احمد رضا کے جسم کو جھٹکا لگا۔ بے پناہ غصے سے اس نے ان پر جھپٹنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر رہ گیا۔ ناکام ہو کر وہ چیخا تو آواز حلق میں پھنس گئی۔ اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ تنومند ملازمین اسے سہارا دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں پنکھا چل رہا تھا۔ ملازمین نے

گاہک

جان ٹری ویلین اپنے گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک دلال نے اسے گھیر لیا اور پوچھا "کیا تم ایک عریاں فلم دیکھنی پسند کرو گے؟"

"بالکل۔ لیکن تم اس کے لئے مجھے رقم کیا دو گے؟" جان نے دریافت کیا۔

"تم غلط سمجھے ہو" دلال نے کہا "فلم دیکھنے کے لئے تو رقم تمہیں ادا کرنی ہوگی۔"

"نہیں" جان نے کہا "میں سمجھ گیا ہوں' تم نہیں سمجھے۔ رقم تو تم کو ہی دینی ہوگی۔"

"وہ کیسے؟" دلال نے دریافت کیا۔

"میں برٹش بورڈ آف فلم سنسر کا چیف ہوں" جان ٹری ویلین نے اطمینان سے کہا۔

اسے بستر پر نیم دراز کردیا۔ ٹھنڈا پانی گھونٹ گھونٹ اسے پلایا گیا۔

کچھ جان میں جان آئی تو احمد رضا چلانے لگا "کہاں ہے وہ کتے کی اولاد؟ اسے میرے سامنے لاؤ کہاں ہے تمہارا مالک؟"

ایک نوکر نے کانپتے ہوئے کہا "جناب! وہ تو چھٹیاں گزارنے اسلام آباد جا چکے ہیں۔ جاتے جاتے وہ یہ لفافہ آپ کے لئے چھوڑ گئے تھے۔" ملازم نے ڈرتے ڈرتے ایک لفافہ احمد رضا کے ہاتھ میں تھمادیا۔

اس نے وحشیانہ انداز میں لفافہ پھاڑا۔ اندر ایک خط تھا۔ ڈاکٹر سعیدی نے اپنے ہلکے پھلکے انداز میں لکھا تھا۔

"احمد رضا' ملازموں سے گرم سرد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں.... معذرت چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں کچھ تکلیف ہوئی۔ بچوں کو سمجھانے بجھانے کے لئے بعض اوقات ان پر تھوڑی سی سختی بھی کرنا پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں میرا مؤقف اچھی طرح سمجھ میں آجانا چاہئے۔ یعنی انسان کی آنکھ بصارت سے زیادہ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی سے دیکھتی ہے۔ انسان جب کسی منظر سے خوگر ہوجاتا ہے تو پھر وہ منظر اس کی آنکھ سے اوجھل بھی ہوسکتا ہے۔ چاہے وہ سائیکل رکشا ہو' سڑک کا کھلا ہوا مین ہول ہو' قصائی کی دکان پر جھولتی ہوئی بکرے کی اوجھڑی ہو' یا وہ انگور ہوں جو میری گاڑی کی چھت سے لٹکے ہوئے ہیں....

"ہاں' میں ان ہی انگوروں کی بات کر رہا ہوں جو کل سے تمہاری دسترس میں تھے۔ رس بھرے انگوروں کا وہ گچھا اصلی تھا۔ تم چاہو تو جا کر دیکھ سکتے ہو۔ میں تم سے میلوں دور بیٹھا ہوں لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ جاں بلب ہونے کے باوجود تم نے ان انگوروں کو چھوا تک نہیں۔ کچھ سمجھ میں آئی ہے میری بات....."

دس ستارے

شاہد جاوید مغل

ستاروں کا مقام آسمان کی بے کراں وسعتیں ہیں جہاں سے وہ دنیا میں جاری ہنگامہ خیزیوں کا نظارہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی ستارے اگر کبھی زمین پر اتر آئیں تو یہاں کسی دلفریب بیان شاید انہیں اس قدر خوبصورت نہ پائیں جتنا انہیں اپنی جگہ سے پسند آتی ہیں۔

[illegible] پاکستان کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک منفرد کہانی [illegible]

وہ اپریل کی ایک بڑی سہانی اور چمکیلی شام تھی۔ ایسی شاموں میں خوامخواہ دل میں ترنگ سی پیدا ہوتی ہے۔ میں کھڑکیاں کھول کر بیٹھا ہوں، ٹی وی دیکھتا ہوں، بیوی سے کسی اچھے سے کھانے کی فرمائش کرتا ہوں اور اس فرمائش کے بدلے میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اور بچوں کو کہیں گھمانے اور آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا۔

میں جس شام کا ذکر کر رہا ہوں اس میں دونوں بچے تو گھر میں نہیں تھے۔ امتحانات کے بعد وہ تین ہفتوں کے لیے ماموں کے گھر گئے ہوئے تھے۔ بس میں اور شکیلہ تھے۔ سنہری شام شکیلہ کو گنگنانے پر مجبور کر رہی تھی۔ گلدان میں نرگس کے پھول سجاتے وہ گا رہی تھی اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑس لیتی تھی۔ اس کا موڈ بحال تھا۔ آج ہمیں ایک شاندار ڈنر پارٹی میں بھی جانا تھا۔ یہ پارٹی ایک معروف سیاسی فیملی کے سربراہ ملک حشمت دے رہے تھے۔ شکیلہ اس پارٹی کے لیے صبح سے تیاری کر رہی تھی۔

اچانک بیرونی دروازے پر کال بیل کی آواز سنائی دی لیکن ٹھہریے..... اس کال بیل سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں تھوڑا سا بتا دوں۔ میرا نام انور خیال ہے۔ میں پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس ہوں۔ فارغ وقت میں شاعری اور دیگر تخلیقی کام بھی کر گزرتا ہوں۔ مطالعہ میرا شوق ہے۔ اچھی کتاب مل جائے تو میرے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ اور میری بیگم شکیلہ کے چہرے پر مردنی چھا جاتی ہے کیونکہ میرے فارغ وقت کے لیے شکیلہ اور "اچھی کتاب" میں کھینچا تانی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

میرے ذاتی مکان کے گیراج میں میری چھوٹی سی ذاتی سوزوکی کار موجود رہتی ہے تاہم دفتر کی طرف سے مجھے دفتری امور کے لیے ایک اسٹیشن ویگن بھی ملی ہوئی ہے۔ ان دونوں گاڑیوں کے ساتھ ساتھ میری زندگی کی گاڑی بھی ٹھیک چل رہی ہے۔

ہاں تو میں اپریل کی اس سہانی شام میں دروازے پر ہونے والی دستک یعنی کال بیل کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ململ کے کرتے کا گریبان درست کیا اور چپل پہنتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ مغربی افق پر شفق کی سرخی ابھی موجود تھی۔

"کون ہے؟" میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

"میرا نام طفیل ہے۔ آپ ذرا دروازہ کھولنا پسند کریں گے۔" نہایت شائستہ لہجے میں کہا گیا۔

میں نے [illegible] دروازہ کھولا۔ باہر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ سامنے ایک فرد نہیں تھا۔ زیادہ تھے۔ پہلی نظر میں وہ مجھے دس بارہ کے قریب لگے۔ ان کے عقب میں مغربی افق پر پھیلی ہوئی سرخی تھی۔ اس سرخی کے پیش منظر میں وہ ایک لمحے کے لیے مجھے کسی تصویر کی طرح نظر آئے۔ وہ سب کے سب جواں سال تھے۔ ان کے چہروں پر اُجالا اور آنکھوں میں روشنی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی..... چند لمحوں کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے لگا کہ میں زمین و آسماں کے درمیان معلق ہو گیا ہوں۔ میں نے سوچا کہیں میں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا..... اپنے گرد و پیش کا ادراک حاصل کرنے کے لیے میں نے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ چھوٹے سے صحن سے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے شکیلہ موجود تھی اور بڑے انہماک سے ایک گملے میں پانی لگا رہی تھی۔ میں نے پھر سامنے دیکھا۔ وہ اہل حقیقت کی طرح اپنی جگہ موجود تھے اور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ اگر وہ ایک



یاد ہوتے تو شاید مجھے پہچاننے میں تاخیر ہوتی یا شاید میں سرے سے پہچان ہی نہ سکتا لیکن وہ سارے اکٹھے آ گئے تھے۔ شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے۔ میں انہیں کیسے نہ پہچانتا۔ وہ میری زمین کا سنگھار تھے۔ وہ میرے وطن کے ماتھے کا جھومر تھے۔ اس فضا میں رہنے والے ہر شخص کی ہر سانس پر ان کا احسان تھا۔ ہاں میں نے پہچان لیا۔ وہ نشانِ حیدر تھے اور جب میں نے پہچان لیا کہ وہ نشانِ حیدر ہیں تو پھر گنے بغیر ہی مجھے ان کی تعداد کا علم بھی ہوگیا۔ وہ دس تھے..... اور وہ اپریل کی اس خوش رنگ شام میں مجھ ناچیز کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میرے ہونٹ خشک ہوگئے۔ آواز سینے میں اٹک گئی۔ میں بمشکل بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''آپ..... یہاں!''

یہ جان کر کہ میں نے انہیں پہچان لیا ہے ان کے چہروں کا تبسم دل آویز ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق ان میں سب سے آگے میجر طفیل کھڑے تھے اور وہی عمر میں سب سے بڑے بھی نظر آتے تھے۔ تینتالیس چوالیس سال عمر ہوگی۔

انہوں نے عجیب مہربان لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اندر آنے کا نہ کہیے گا؟''

میں جیسے ایک دم ہوش میں آیا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ دو قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ''آیئے ناں..... آیئے ناں سر۔''

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بڑے باوقار قدموں سے میرے گھر میں داخل ہوگئے۔ چوڑے شانے، چٹان جیسے سینے، دیودار کے درختوں کی طرح اُونچے لمبے لیکن حرکات و سکنات میں ایک موہ لینے والی نرمی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ان کے سامنے بچھ جاتا۔ ان کے قدموں کے نیچے اپنی ہتھیلیاں رکھ دیتا۔ ان کے سامنے اپنا گھر اور اپنا آپ مجھے بالکل ناچیز محسوس ہوا۔ میں انہیں نشست گاہ میں لے آیا۔ وہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ وہ در و دیوار کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خوبصورت گھونگھریالے بالوں اور نشیلی آنکھوں والے راجا عزیز بھٹی نے کہا۔ ''ہم نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

میں نے سر تا پا کانپتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیسی بات کر رہے ہیں سر، میں..... خود کو اس شہر لاہور کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں سر۔ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ مجھے اپنے حواس پر، اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ کیا واقعی ایسا ہے سر کہ آپ..... میرے سامنے موجود ہیں؟''

''ہاں، ہم موجود ہیں۔'' میجر اکرم نے کہا۔ ''آپ بیٹھ جایئے۔ ہم آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''مم..... میں آپ کے لیے۔ مم..... میرا مطلب ہے، آپ کیا لینا پسند کریں گے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں کچھ نہیں۔ بس ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، باتیں کرنا چاہتے ہیں اور اگر آپ پسند کریں گے تو آپ کے ساتھ تھوڑا سا گھوم پھر لیں گے۔''

''آ..... آپ جو کہیں گے، سر وہی ہوگا لیکن پہلے.....'' فقرہ راستے میں ہی رہ گیا۔

اندر سے بیگم کی تیز تیکھی آواز آئی۔ ''انور! ذرا سنیے۔''

مہمانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے ان سے معذرت کی اور تیزی سے اندر کچن کی طرف آیا۔

بیگم حیران پریشان کھڑی تھی۔ ''یہ کون لوگ ہیں انور؟''

میں سٹپٹا گیا۔ فیصلہ نہیں کر سکا کہ بیگم کو بتاؤں یا نہیں۔ وہ بالکل اور مزاج کی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اپنے بے مثال مہمانوں کو دیکھنے کے باوجود وہ انہیں پہچان نہیں سکی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرتی یا پھر مجھے مخبوط الحواس سمجھنے لگتی یا سمجھتی کہ میں اس کے ساتھ کوئی مذاق کر رہا ہوں۔

''تم بولتے کیوں نہیں انور! کون لوگ ہیں یہ؟ تم گھبرائے ہوئے ہو۔''

''یہ..... یہ میرے شناسا ہیں۔'' میں نے اٹک اٹک کر کہا۔

وہ خالی نظروں سے مجھے گھورتی رہی..... کچھ دیر بعد ایک دم سٹپٹا کر بولی۔ ''اچھا نہیں ان کا پروگرام چائے شائے کا تو نہیں۔ دیکھو صاف کہہ دیتی ہوں، اس وقت میں کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ زیادہ بات ہے تو فریج سے کولڈ ڈرنکس لے لو..... لیکن یہ تو پورا گینگ کا گینگ ہے۔ اتنے کولڈ ڈرنکس بھی نہیں ہوں گے۔ کتنے بندے ہیں؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''دس!'' میں نے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ تمہیں ان کو پہچان جانا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ انڈین ڈراموں اور فلموں کے سارے چھوٹے بڑے ''اداکار'' تو تم پہچانتی ہو۔ ان لوگوں کو نہیں پہچانتیں۔'' میرے لہجے میں تپش داخل ہوگئی۔

وہ چونک سی گئی۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے نشست گاہ میں جھانکا۔ چہرے پر اُلجھن بڑھ گئی۔ میرا شانہ نوچ کر بولی۔ ''تم بتاتے کیوں نہیں، کون ہیں یہ؟ کیا کرنے آئے ہیں؟''

''بہت افسوس کی بات ہے۔'' میں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''اگر ہم ان کو نہیں پہچانتے تو اس کا مطلب ہے خود کو نہیں پہچانتے۔''

وہ کچھ گڑبڑا سی گئی تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی تھی کبھی نشست گاہ میں جھانکتی تھی۔ آخر روہانسی ہو کر بولی۔ ''مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہارٹ اٹیک کرانا ہے مجھے؟''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں آج کی رات ہم دونوں اس شہر اور اس ملک کے معزز ترین لوگ ہیں۔ ہمارے گھر..... ایسے لوگ آئے ہیں جو صرف خیالوں اور سپنوں میں آسکتے ہیں.....'' میں نے چند لمحے توقف کیا اور شکیلہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے گھر ''نشانِ حیدر'' آئے ہیں۔''

''نن..... نشانِ حیدر۔ تمہارا مطلب ہے جنہوں نے نشانِ حیدر پایا؟''

میری آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' شکیلہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے نشست گاہ کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی تو اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔ ''مم..... مجھے ذرا سا شبہ تو ہو رہا تھا لیکن..... جو کچھ تم بتا رہے ہو یہ تو..... عقل سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کہیں ہم دونوں کے دماغ تو نہیں اُلٹ گئے؟''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

اس نے پھر آنکھیں پھاڑ کر نشست گاہ میں جھانکا۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ''میں تو بس دو تین کو تھوڑا تھوڑا..... پہچان سکی ہوں۔ ایک تو راجا عزیز بھٹی..... دوسرے داڑھی والے صاحب، وہ شاید کارگل والے کیپٹن شیر خان ہیں..... اور تیسرے وہ بالکل نوجوان سے راشد منہاس۔''

''مجھے اب بھی افسوس ہے کہ تم صرف تین کو پہچان رہی ہو۔ ان میں سے ہر ایک چہرے ہمارے دل و دماغ پر نقش ہونا چاہیے شکیلہ!''

وہ سکتہ زدہ کھڑی تھی اور میں بھی سکتہ زدہ تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے نشست گاہ سے نکلے چار پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ میں نے شکیلہ سے کہا۔ ''جلدی چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں ان کے پاس بیٹھتا ہوں۔ جلدی کرو شاباش۔''

اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا اور کچن کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ میں واپس نشست گاہ میں آگیا۔

اصل وجہ

ایک اداکارہ نے اپنے نئے پروڈیوسر کو بتایا "میری ایکٹنگ کا آپ کیا پوچھتے ہیں جی..... میں نے ایک فلم میں مرنے کا سین کیا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا شوہر بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔"

پروڈیوسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ضرور رویا ہوگا..... اس بے چارے کو تو معلوم تھا نا کہ تم سچ مچ نہیں مری ہو۔"

کیپٹن محمد سرور اخبار کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ میجر طفیل کے بعد وہی زیادہ عمر کے نظر آتے تھے۔ انہوں نے اخبار پر خواتین کی رنگین و سنگین تصویروں کو دیکھ کر بیزاری کا اظہار کیا اور بولے۔ ''آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اس طرح کے اخبار کا تصور بھی محال تھا۔'' انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

میں دل ہی دل میں دُعا کرنے لگا کہ اب وہ انگریزی اخبار کا مڈویک ایڈیشن نہ اٹھالیں۔ اس کی حالت اس سے بھی بری تھی۔

خیریت گزری کہ انہوں نے ایڈیشن نہیں اٹھایا۔ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''انور صاحب! ہم آج شب آپ کے مہمان ہیں لیکن ہم یہ وقت گھر پر بیٹھ کر گزارنا نہیں چاہتے۔ ہم گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔''

''ہم آپ کا لاہور دیکھیں گے۔'' راجا عزیز بھٹی نے کہا۔

میں نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ میرا کہاں آپ کا لاہور ہے جی۔ آپ کی قربانیوں کے صلے میں یہ آج آباد اور روشن ہے۔''

میجر محمد اکرم نے کہا۔ ''بس زیادہ نہیں، ایک دو اچھی جگہیں دکھا دیجیے جہاں پانچ چھ گھنٹے سکون سے گزارے جاسکیں۔''

''آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔'' لالک جان نے پشتو کے لہجے میں اُردو بولتے ہوئے کہا۔

''وہ ٹھیک ہے جناب لیکن پہلے آپ کو چائے پینا ہوگی پھر کھانا کھانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم نکلیں گے۔''

''نہیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ نے چائے کا کہہ دیا ہے تو صرف وہ پی لیں گے اور اس میں بھی تکلف نہیں ہونا چاہیے۔'' میجر شبیر شریف نے کہا۔

''آپ ٹی وی دیکھنا پسند فرمائیں گے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، آن کر دیجیے۔'' میجر شبیر بولے۔

میں ایک دم سٹپٹا گیا۔ ٹی وی آن کرنے کی بات میں نے خوامخواہ ہی کر ڈالی تھی۔ سوچنے لگا، اب کون سا چینل ٹیون کروں۔ یہاں تو ہر طرف ناچ گانا اور انڈین فلموں کی مار دھاڑ تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک نیوز چینل لگایا۔ بھارت سے آنے والے ایک ثقافتی طائفے کا استقبال ڈھول ڈھمکے سے ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ مہمان پوری طرح ہاسکرین پر نگاہیں مرکوز کر پاتے میں نے چینل بدل دیا۔ یہاں چار عدد سیاستدان ''ہاٹ ٹاک'' میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ کشمیر کے تھرڈ اور فورتھ آپشن پر دُھواں دھار دلائل دیے جا رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے چینل بدل دیا۔ یہ پھرتی مہنگی پڑی..... اگلے چینل پر ایک پاکستانی اداکارہ برائے نام لباس پہنے ایک انڈین ہیرو سے بوس و کنار کر رہی تھی۔ دو تین اکٹھی جستیں لگا کر میں ایک بوسیدہ سے سوگوار چینل پر آ گیا۔ اس چینل پر ایک سال خوردہ بینکار اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ اور منڈیوں کے بھاؤ پر بورترین گفتگو فرما رہا تھا۔

کیپٹن شیر خان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس یہیں رہنے دیجیے۔''

بالفاظ دیگر وہ کہہ رہے تھے۔ ''یہیں رہنے دیجیے۔ یہیں پر عافیت ہے۔''

میجر اکرم نے کہا۔ ''ساٹھ ستر کی دہائی میں ایسے ٹی وی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔''

لالک جان بولے۔ ''سر! آپ تو پرانی بات کہہ رہے ہیں۔ سات آٹھ سال پہلے تک بھی ایسا تصور کرنا محال تھا۔''

کچھ دیر باتیں ہوئیں پھر اندر سے بیگم کی مدھم آواز سنائی دی۔ ''سنیے انور!''

میں اجازت لے کر کچن میں پہنچا۔ ٹی ٹرالی تیار تھی۔ بیگم نے ٹھیک اہتمام کیا تھا۔

''آؤ تم بھی ملو۔'' میں نے بیگم سے کہا۔

وہ ذرا سا ہچکچائی پھر سر پر آنچل دُرست کر کے میرے ساتھ نشست گاہ میں آ گئی۔

شائستگی کی انتہا تھی۔ وہ سب کھڑے ہو گئے اور السلام علیکم کہا۔ ہم دونوں شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ خود کو بالکل ناچیز محسوس کر رہے تھے۔ چائے پینے کے دوران میں ان کی نورانی نگاہیں جھکی رہیں۔ اگر انہوں نے شکیلہ سے بات بھی کی تو اس کی طرف دیکھے بغیر کی۔

چائے ختم ہوئی تو میں شکیلہ کے ساتھ باہر آ گیا۔ کچن میں پہنچ کر میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''شکیلہ! وہ کہہ رہے ہیں ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں کہاں لے جاؤں؟''

''میں کیا بتاؤں۔ مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں۔''

''سوچو بھئی..... سوچو۔ انہوں نے یہ ذمے داری مجھ پر ڈالی ہے۔''

''مینارِ پاکستان؟'' شکیلہ نے کہا۔

''نہیں نہیں، وہاں تو آج اپوزیشن کا جلسہ ہے۔ زبردست ہلڑ بازی ہے۔''

''شالامار باغ؟''

''وہاں گورنر صاحب غیر ملکیوں کو عشائیہ دے رہے ہیں۔''

''تو پھر کہاں جاؤ گے؟ جناح گارڈن چلے جاؤ۔''

''نا بابا نا۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''پرسوں گیا تھا رضوی اور کرمانی صاحب کے ساتھ۔ رات کو لگتا ہے سارا باغ لوا سپاٹ بن جاتا ہے۔ کونے کھدروں میں لڑکے لڑکیاں گھس کر ریسرچ کرتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ ریس کورس پارک میں بھی یہی حال ہوتا ہے..... یا پھر ایک اور کام کرو۔'' شکیلہ کے ذہن میں نیا آئیڈیا آیا۔

''کیا؟''

''انہیں نہر کے ساتھ ساتھ لمبی ڈرائیو پر لے جاؤ۔ راستے میں اُتر کر مختلف جگہیں بھی دیکھ لینا۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''آج خیر سے ہفتہ ہے اور ہفتے کو اب نہر کا وہی حال ہونے لگا ہے جو بھاٹی گیٹ یا موچی گیٹ کا ہوتا ہے۔ گاڑیوں کی تین تین میل لمبی لائن لگ جاتی ہے۔''

''ارے ہاں، یہ موچی گیٹ کہاں ہے۔ سنا ہے وہ بھی تاریخی جگہ ہے۔ بڑے تاریخی جلسے ہوتے تھے وہاں۔'' بیگم نے کہا۔

''کبھی اخبار پڑھو تو تمہیں پتا چلے شکیلہ بیگم، اس تاریخی جلسہ گاہ میں اب ایک بڑا پارکنگ لاٹ بن چکا ہے اور ویسے بھی موچی گیٹ کی گراؤنڈ کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔''

''تو پھر میں کیا بتاؤں؟'' بیگم سٹپٹا کر بولی۔

ہم کچھ دیر سر جوڑے بیٹھے رہے۔ نشست گاہ میں سے باتیں کرنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ بیگم نے سر جھکا کر کہا۔ ''اب آجا کے دریائے راوی رہ جاتا ہے۔ چاندنی رات ہوگی۔ دریائے راوی پر لے چلو۔ ذرا کشتی رانی کرلو۔ کامران کی بارہ دری بھی دیکھ لینا۔''

میں نے ایک بار پھر بیگم کو عصیلی نظروں سے دیکھا۔ ''تم صرف انڈیا اور پاکستان کے ٹی وی ڈراموں اور نئے ڈیزائن کے کپڑوں پر ہی رائے دے سکتی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''کشتی رانی کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے پاس صرف دریا ہے، پانی نہیں۔''

''پانی کہاں ہے؟''

''پانی انڈیا کے پاس ہے اور جس کو تم بارہ دری کہتی ہو اس کو یار لوگ کباڑہ دری کہتے ہیں۔ اب کچھ نہیں وہاں دیکھنے کو۔ یہی حال باقی آثارِ قدیمہ کا ہے۔''

بیگم اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''ہاں ایک کام ہوسکتا ہے۔'' اس مرتبہ آئیڈیا میرے ذہن میں آیا۔

''کیا؟''

''مقصد تو یہی ہے کہ اپنے معزز مہمانوں کو کہیں گھمایا پھرایا جائے۔ ان کو تفریح کرائی جائے تو کیوں نہ ہم انہیں اپنے ساتھ لے چلیں، گلزار حویلی میں ملک صاحب کے ہاں۔ وہاں اچھا خاصا فنکشن ہے۔ کافی بڑی تعداد میں مہمان آئے ہوں گے اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہوں گے۔ رنگا رنگ پروگرام ہے۔''

''تمہاری بات تو دل کو لگتی ہے لیکن گلزار حویلی کا دعوت نامہ تو بس ہم دونوں کے نام ہے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں بھئی۔ ایک اور دعوت نامہ بھی ہے میرے پاس۔ یہ دفتر کے دوست احباب کے لیے ہے۔ یہ دوست احباب گروپ بنا کر میرسپاٹے کے لیے ایوبیہ جا چکے ہیں۔ ہم وہ دعوت نامہ اپنے معزز مہمانوں کے لیے استعمال کرلیتے ہیں اور میرے خیال میں ان معزز مہمانوں کو کسی دعوت نامے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ملک صاحب تو رہے ایک طرف، یہ پاکستان کے کسی بڑے سے بڑے وی آئی پی کے گھر بھی چلے جائیں تو انہیں دل و جان سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ میرے خیال میں تو یہ ملک صاحب پر ہمارا بہت بڑا احسان ہوگا۔ ان کی شادی کی سالگرہ کی تقریب ایک یادگار تقریب بن جائے گی بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک تاریخی حیثیت اختیار کر جائے گی۔'' اندرونی جوش سے میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اپنے ان قومی ہیروز کو گلزار حویلی میں سیکڑوں مہمانوں کے درمیان دیکھا۔

دراصل گلزار حویلی میں ہونے والی تقریب ملک حشمت کی دوسری شادی کی سلور جوبلی تقریب تھی۔ انہوں نے اپنی یہ سالگرہ منفرد انداز میں منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ حویلی میں تقریباً ایک ہزار مہمان آرہے تھے۔ یہ سب کے سب ''کپلو'' تھے یا پھر بڑی عمر کے لوگ۔ ان میں ملک صاحب کے درجنوں لنگوٹیے بھی شامل رہے ہوں گے۔ ملک صاحب مرنجا مرنج شخصیت تھے۔ موسم اور تہواروں کی نسبت سے گلزار حویلی میں آئے دن تقریبات ہوتی رہی تھیں اور مختلف ثقافتی پروگرام بنتے تھے۔ آج اس تقریب میں بھی ایک ورائٹی شو شامل تھا۔ چند بڑے فنکار لائیو میوزک بھی پیش کررہے تھے۔ میں نے اور شکیلہ نے اس حوالے سے تیزی سے سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ معزز مہمانوں کو اپنے ساتھ گلزار حویلی لے جانا چاہیے۔ نہ صرف ان کا وقت اچھا گزرے گا بلکہ وہ اندرون شہر کی ایک قدیم حویلی اور اس کا جدید رہن سہن بھی دیکھ سکیں گے۔ بہرحال فیصلے سے پہلے معزز مہمانوں سے مشورہ ضروری تھا۔ میں اس مشورے کے لیے واپس نشست گاہ میں آگیا۔

دس اُجلے چہرے اپنی دل آویز نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

معزز مہمانوں کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میجر طفیل عمر میں سب سے بڑے تھے۔ انہوں نے باقیوں کی نمایندگی کرتے ہوئے فرمایا۔ ''انور صاحب! ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ جہاں لے جائیں گے ہم چل پڑیں گے لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

میں سراپا سوال بن کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میجر اکرم بولے۔ ''دراصل..... ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی سے بھی ہمارا تعارف نہ کرائیں۔ ہاں اگر کوئی خود سے پہچان لے تو اور بات ہے۔''

''ہاں انور خیال صاحب! آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ کسی کو ہمارے بارے میں بتائیں گے نہیں۔ اشارتاً بھی

نہیں۔'' راجا عزیز بھٹی نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جج..... جیسے آپ کا حکم جناب! میں آپ کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لل..... لیکن۔''

''ہاں..... ہاں کہیے۔'' راجا عزیز نے کہا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے میزبان ملک حشمت کو بتادوں؟''

''آپ کا کیا خیال ہے ملک حشمت ہمیں خود سے نہ پہچان پائیں گے؟''

میں لاجواب ہوگیا۔ ''جی ہاں..... جی نہیں..... میرا مطلب تھا کہ شاید۔ نہیں نہیں آپ دُرست کہہ رہے ہیں۔ وہ تو آپ کو خود ہی پہچان لیں گے۔''

''تو یہ طے ہے کہ آپ ہمارے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔'' میجر طفیل نے کہا۔

''او کے سر! جیسے آپ کا حکم۔'' میں نے ادب سے سر جھکایا۔

☆☆☆

ہماری اسٹیشن وین آٹھ بجے کے قریب گلبرگ سے نکلی اور اندرون شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ بیگم کو میں نے اپنی چھوٹی سوزوکی میں روانہ کردیا تھا۔ وہ خود ڈرائیو کرسکتی تھی۔

گھر سے نکلتے ہی میرے لیے مشکل پیدا ہوگئی۔ اگر میں جیل روڈ کی طرف سے جاتا تو وہاں بے حد واہیات قسم کے ہورڈنگ آویزاں تھے (وہی ہورڈنگز جن کو دیکھتے دیکھتے کالجوں کے نوجوان بجلی کے کھمبوں میں موٹر سائیکلیں ٹھونک دیتے ہیں اور اسپتال پہنچتے ہیں (اگر میں متبادل راستہ اختیار کرکے کینال پارک کی طرف سے نکلتا تو بے حد خستہ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کا سامنا تھا۔ دونوں طرف شرمندگی تھی۔ میں نے دوسری شرمندگی کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کو خستہ حال سڑک پر ڈال دیا..... میری گاڑی میں میرے ملک کے دس معزز ترین افراد سوار تھے اور میں صوبائی دارالحکومت لاہور کی ایک ایسی سڑک پر رواں تھا جس پر چاند کی سطح پر شبہ ہوتا تھا۔ اگر لاہور کا یہ حال تھا تو چھوٹے شہروں کی کیا حالت ہوگی۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی اور ساتھ ہی گاڑی کی بھی۔ راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ گٹر ٹوٹی پھوٹی سڑک کے اوپر بہہ رہے تھے۔ مجبوراً میں نے جیل روڈ کی طرف آنے کا فیصلہ کیا۔ جیل روڈ پر پہنچتے ہی جو پہلا دیوہیکل ہورڈنگ نظر آیا اس میں تمام تر متوقع واہیاتی موجود تھی۔ ایک لڑکا لڑکی موبائل سیٹ کے حصول کے لیے سرِعام ایک دوسرے سے ریسلنگ کررہے تھے۔

قومی ہیروز کی آنکھوں میں تاسف آمیز حیرت عود کر آئی۔ میں نے اپنی پیشانی پر عرقِ ندامت محسوس کیا۔ مجھے اس پشیمانی سے بچانے کے لیے وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ان کی مدھم نورانی آوازیں مجھے کسی بھنبھناہٹ کی طرح دور سے آتی محسوس ہوئیں۔ مجھے خود پر غصہ بھی آرہا تھا۔ میرے ساتھ دُہرا معاملہ ہوا تھا۔ خستہ سڑک کی شرمندگی بھی حصے میں آئی تھیں اور عریاں ہورڈنگز کی پشیمانی بھی۔ یہ تو صرف ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ گلبرگ سے لوئر مال اور لوئر مال سے داتا دربار اور بھاٹی گیٹ تک پہنچتے پہنچتے میں کئی بار عرقِ ندامت میں ڈوبا۔ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن میرے لیے بے حد تکلیف دہ بن گئی تھیں۔ بے ہنگم ترین ٹریفک، تجاوزات، عریاں فلمی بورڈ، بورڈوں پر پھینکی گئی سیاہی، گاڑیوں میں گونجتے ہوئے بھارتی گانے اور جگہ جگہ بھارتی کرکٹرز اور فلمی ہیروز کی تصویریں.....

بالآخر ہم گلزار حویلی پہنچے۔ اندرون شہر واقع یہ شاندار سہ منزلہ حویلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ گاڑیوں کے لیے پارکنگ کا مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ ملک صاحب کی فیملی میں اس وقت ایک وفاقی وزیر اور دو ایم این اے پائے جاتے تھے۔ اُمید تھی کہ ملک صاحب خود بھی عنقریب سینٹ کے ممبر بن جائیں گے۔ حویلی کا رُعب اور دبدبہ دیدنی تھا۔ باوردی سارجنٹ اور پولیس اہلکار ٹریفک کی روانی کے لیے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ پولیس کی دو تین چوکس گاڑیاں بھی اطراف میں ڈیوٹی دے رہی تھیں۔

میں اپنے معزز مہمانوں کو لے کر گاڑی سے اتر آیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم احاطے کے وسیع و عریض پنڈال میں پہنچے۔ یہاں احاطے اور ٹیرس پر گول میزوں کے گرد قریباً ایک ہزار نشستیں موجود تھیں۔ ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب سا تھا۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ آنچل لہرا رہے تھے۔ ایک سرمستی تھی جس نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وسیع اسٹیج پر ایک معروف گلوکار سارنگی اور بانسری کی سنگت میں ایک لوک گیت گانے میں مصروف تھا۔

میں اپنے مہمانوں کے ساتھ چلتا ہوا اپنی مخصوص نشستوں کی طرف بڑھتا گیا۔ ایک باوردی ملازم ہماری رہنمائی کررہا تھا۔ ہم دو رویہ میزوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ہم جن لوگوں کے نزدیک سے گزرتے تھے وہ میرے باوقار مہمانوں کو ذرا تعجب سے دیکھتے تھے تاہم بہت سے ایسے بھی تھے جو بس ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اپنی

مصروفیات میں مگن ہو جاتے تھے لیکن کسی نے بھی میرے مہمانوں کو ان کی اصل حیثیت میں شناخت نہیں کیا۔ میرے لیے یہ صورتِ حال ایک دھچکے سے کم نہیں تھی۔ ہم کم و بیش پانچ سو افراد کے قریب سے گزرے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے ان عظیم مہربانوں کو نہیں پہچانا۔ میں ششدر رہ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ معزز مہمان صرف مجھے اور میری بیگم کو ہی نظر آئے ہوں لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ یہ غلط تھا۔ وہ دیکھے جا رہے تھے..... لیکن پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ میرے اندازے غلط ثابت ہونے لگے۔ میرا خیال تھا کہ جونہی ہم پنڈال میں داخل ہوں گے، زیادہ نہیں تو سو پچاس لوگ ضرور بڑے دھیان سے اس عظیم گروپ کو دیکھیں گے۔ ان کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہوں سے کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے کو بتائیں گے۔ پورے پنڈال میں سرگوشیاں لپکیں گی پھر سناٹا چھا جائے گا۔ ہر جاندار بے جان شے جامد ہو جائے گی۔ تب ایک نئی طرح کی لہر جاگے گی۔ حاضرین اپنی ساری مصروفیات بھول کر میرے معزز مہمانوں کے گرد جمع ہونے لگیں گے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوشی ہوگی اور نمی ہوگی۔ اس سارے پنڈال کو ایک جادوئی ہالہ اپنے حصار میں لے لے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ سب اپنے حال میں مست تھے۔ مشروب چل رہے تھے۔ اٹکھیلیاں ہو رہی تھیں۔ سریلے قہقہے گونج رہے تھے۔ میں اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ اپنے لیے مخصوص نشستوں پر جا بیٹھا۔ دیگر مہمانوں کی طرح ہماری خاطر تواضع بھی شروع ہوگئی۔

میں نے دیکھا میرے معزز مہمان کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ شاید انہیں بھی یہاں آ کر توقع پیدا ہوگئی تھی کہ انہیں پہچانا جائے گا، ان سے ملا جائے گا، باتیں کی جائیں گی..... اسی دوران میں ملک حشمت صاحب ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ مہنگی کرنڈی کی شلوار قمیص، کریم کلر واسکٹ، ڈائی کی ہوئی اور اُوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی تازہ دم نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حشمت صاحب کو آتے دیکھا تو میں چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میزبان تھے۔ کم از کم انہیں تو اپنے مہمانوں کو ضرور پہچان لینا چاہیے تھا اور مجھے اُمید تھی کہ وہ پہچان بھی لیں گے۔ میں انہیں اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ میری نگاہیں ان کے چہرے پر رہیں لیکن وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔

میں نے ایک دم کھڑے ہو کر کہا۔ ''ملک صاحب!''

وہ جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے رُکے..... مڑے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے اپنے مہمانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ملک صاحب نے اپنی پسوڑی میں جلدی جلدی میرے مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور اس فلم ایکٹریس کے استقبال کے لیے لپک گئے جو ابھی ابھی داخلی راستے سے اندر آئی تھی۔ ملک صاحب نے لش پش کرتی ایکٹریس کو بڑی دل جمعی سے خوش آمدید کہا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک دو سرگوشیاں بھی کیں..... پھر وہ آگے نکل گئے۔ کچھ دیگر مرد و زن نے میک اپ زدہ فلم ایکٹریس کو گھیر لیا۔ کچھ چنچل لڑکیاں لڑکے ایکٹریس سے آٹوگراف لینے لگے۔

میں پہلے ہی دل گرفتہ تھا۔ ایک ویٹر کی سرگوشی نے مجھے مزید دل گرفتہ کر دیا۔ اس نے میرے کندھے پر جھک کر ہولے سے کہا۔ ''سر! آپ سوفٹ ڈرنکس ہی لیں گے یا..... میرا مطلب ہے کہ علیحدہ انتظام بھی موجود ہے۔''

مجھے یہ بات گالی محسوس ہوئی۔ میں نے ڈر کر اپنے ہیروز کی طرف دیکھا۔ یقینی بات تھی کہ ان میں سے جو نزدیک تھے انہوں نے ویٹر کی بکواس سنی تھی..... لیکن مجال ہے کہ انہوں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر ہونے دیا ہو۔ وہ میری شرمندگی کی وجوہات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور خود بھی شرمندہ ہو رہے تھے لیکن اپنے احساس اور اظہار کے درمیان انہوں نے ایک پردہ سا رکھا ہوا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ میں بھی تو عام لوگوں جیسا ہی ہوں اور شاید یہاں موجود کئی افراد مرتبے میں مجھ سے کہیں بلند ہیں۔ کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں مجھ میں۔ تحریک پاکستان کے قائدین کی چند تصویریں گھر میں لگا لینے اور کچھ کتابیں پڑھ لینے سے تو میں دوسروں سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا پھر یہ دس سرفروش مجھے کیوں نظر آئے تھے۔ اس سوال کا جواب میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اس لیے مجھے نظر آئے ہیں کہ میرے مہمان ہیں۔

اسی دوران میں اسٹیج پر کیک کاٹنے کا پروگرام شروع ہوگیا..... نو بیاہتا دُلہوں اور دُلہنوں کی ایک جماعت اسٹیج پر پہنچی اور انہوں نے ہم آہنگ ہو کر شادی کا ایک گیت گایا۔ اس لوک گیت میں شادی کی خوبصورت رسموں کا ذکر تھا۔ جگمگاتی روشنیوں اور لہراتے آنچلوں کا ذکر تھا..... اور اس میں ذکر تھا دُلہا کی پُرشوق نگاہوں کا اور دُلہن کی جھکی ہوئی سنہری پلکوں کا۔

میں نے دیکھا میرے ہیروز دلچسپی سے یہ لوک گیت سن رہے تھے۔ ان میں راشد منہاس اور سوار محمد حسین عمر میں سب

سے چھوٹے تھے۔ خاص طور سے راشد منہاس تو بالکل نوخیز دکھائی دیتے تھے۔ بمشکل اکیس بائیس برس کے۔

گیت سنتے ہوئے ان کی معصوم آنکھوں میں عجیب سی محویت اور دلگداز چمک دکھائی دی۔ میرے دل میں ایک ٹیس اُٹھ کر رہ گئی۔

اسی دوران میں کیک کاٹ دیا گیا۔ تالیوں سے پورا پنڈال گونج اٹھا۔ ''ہیپی اینی ورسری'' کے شور سے ہر طرف ارتعاش پیدا ہوگیا۔ منچلے نوجوان رنگ برنگے غباروں کو پھوڑنے لگے جو شامیانوں سے جھول رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف بنے ڈانسنگ فلور پر بہت سی ڈسکو لائٹس جلنے بجھنے لگیں۔ بہت سے جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے فلور پر آگئے اور رقص فرما ہوگئے۔ میوزک کی دھمادھم سے کانوں کے پردے لرزنے لگے۔ انڈیا سے آئے ہوئے کچھ مہمانانِ خصوصی ایک بڑی میز کے گرد موجود تھے۔ گلوں میں گلاب کے ہار ڈالے وہ بھنگڑا ڈالنے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا، کچھ لڑکیاں میزوں کے درمیان چکرا رہی تھیں اور تنہا بیٹھے حضرات کو اپنے ساتھ رقص کی دعوت دے رہی تھیں۔ ایک ایسی جواں سال ماڈرن لڑکی ہماری میز کی طرف چلی آئی۔ اس نے چست پتلون پہن رکھی تھی۔ پتلون اور شرٹ کے درمیان کچھ ''علاقہ'' ہیجان خیزی کے لیے خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔

شاید وہ کسی مشروب کی ترنگ میں تھی۔ ہیروز کے قریب آکر بولی۔ ''آپ جنٹلمین میں سے کوئی میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرے گا؟''

''نو تھینک یو۔'' سب سے بڑی عمر کے ہیرو نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

''کچھ کہا آپ نے؟'' لڑکی نے ان کے قریب جھکتے ہوئے پوچھا۔

''نو تھینک یو۔'' اس مرتبہ ذرا بلند آواز میں جواب دیا گیا۔

لڑکی لہرا کر گھومی۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''نو تھینک یو۔'' اس نے نقل اُتاری۔

اس کے ساتھی کچھ ''ممی ڈیڈی لڑکوں'' نے بھی نقل اُتاری۔ ''نو تھینک یو۔''

یہ شریر نوجوانوں کی ایک بڑی ٹولی تھی۔ وہ سب کے سب مزاحیہ انداز میں بولنے لگے۔ ''نو تھینک یو..... یو تھینک یو۔''

''ہیجان خیز علاقے'' والی لڑکی نے اس صورتِ حال سے لطف اٹھایا۔ وہ ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند فرمائیں گے؟''

نوجوان نے اپنا سر مضحکہ خیز انداز میں جھکایا۔ یہاں تک کہ اس کی کمر قوس کی شکل اختیار کرگئی۔ ''نو تھینک یو'' اس نے نقل اُتاری۔

زوردار قہقہہ پڑا۔ بظاہر یہ ٹولا اپنے حال میں مست تھا۔ لیکن میں جانتا تھا یہ ہیروز کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اٹھوں اور ان لوگوں پر ٹوٹ پڑوں۔ ان کے گریبان پھاڑ دوں۔ ان کے لمبے بال نوچ لوں۔ انہیں چلا چلا کر بتاؤں کہ وہ کن کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے ہی نجانے کس طرح میرے پہلو میں بیٹھے لانس نائیک محمد محفوظ نے بھانپ لیا۔ انہوں نے بڑی متانت سے میرا بازو دبایا۔ ان کے لمس نے مجھے بے جان کردیا۔ وہ ہولے سے بولے۔

''نہیں، آپ کچھ نہیں کریں گے۔''

میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا۔ میں اپنے ہیروز کو اپنے شہر کی اچھی تصویر دکھانا چاہتا تھا لیکن حقیقت اتنی تلخ اور شرمسار کن تھی کہ ہر پردے کو جلا کر سامنے آرہی تھی۔ میں زمین میں گڑا جارہا تھا۔

ورائٹی پروگرام کا ایک حصہ کھانے سے پہلے اور ایک حصہ کھانے کے بعد تھا۔ پہلا حصہ شروع ہوا۔ انڈین گانوں پر واہیات ڈانس شروع ہوگئے۔ ون مین شو کرنے والا ایک کامیڈین پاکستانی اور انڈین فلمسٹاروں کی نقلیں اُتارنے لگا پھر دیگر خرافات شروع ہوگئیں۔ اس سارے پروگرام میں میرے معزز مہمانوں کو بس ایک چھوٹا سا آئٹم اچھا لگا اور یہی آئٹم مجھے بھی اچھا لگا۔ یہ آئٹم آٹھ نو سال کی ایک بچی نے پیش کیا۔ میں اس نابینا بچی کو جانتا تھا۔ یہ میزبان ملک حشمت کی پوتی تھی۔ اپنے خوبصورت سفید گلابی فراک اور لمبی سفید جرابوں میں وہ ایک ننھی پری دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آواز سننے سے پہلے ہی اس کی معصومیت نے حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس نے اپنی دلنشین آواز میں بچوں کا ایک گیت گایا۔

سورج کا دروازہ کھلا
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی ہوا
جاگو جاگو صبح ہوئی
جاگو جاگو صبح ہوئی

اس کا گیت ختم ہوا تو میرے معزز مہمانوں کے چہروں کو پہلی بار مسکراہٹ دکھائی دی اور پہلی بار انہوں نے تالیاں

بجائیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، میرے سینے میں دُھواں بھرتا جارہا تھا کیونکہ لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے۔ کیوں وہ اپنے درمیان چمکتے ہوئے ان دس ستاروں کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ دس ''نشانِ حیدر'' ان کے درمیان تھے اور وہ اسٹیج کے بھانڈوں کے صدقے واری جارہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا، میرے ہیروز چہروں سے ظاہر نہیں ہونے دے رہے لیکن اس صورتِ حال نے انہیں بھی مایوس کیا ہے۔ وہ کچھ گم صم سے ہوگئے تھے۔

پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا یہ لوگ جلدی سے واپس چلے جائیں اسی دنیا میں جہاں سے آئے ہیں۔ ابھی انہوں نے یہاں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس شہر کی تصویر کے بہت سے بھیانک رنگ ابھی ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور یہ اس شہر لاہور کی صورتِ حال ہی نہیں تھی، یہ پورا ملک اپنی ''صورتِ حال'' کی وجہ سے اہلِ دل کی نگاہوں پر ستم ڈھا رہا تھا۔ ہر طرف نفرت، فرقہ پرستی، ہوس اور دہشت گردی کے دیو ناچ رہے تھے۔

میں سوچنے لگا کہ ہم ڈنر کے فوراً بعد یہاں سے نکل چلیں گے۔ مجھ میں مزید شرمسار ہونے کی سکت نہیں تھی۔ میں میجر طفیل سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب سے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جب اچانک..... یوں لگا کہ پورے کا پورا آسمان ٹوٹ کر ہمارے اوپر گر پڑا ہے۔ یہ ایک نہایت خوفناک دھماکا تھا۔ کچھ دیر کے لیے یوں محسوس ہوا کہ میں کچھ بھی دیکھنے، سمجھنے اور سننے کے قابل نہیں پھر میرے دماغ نے چلّا کر کہا۔ ''..... دھماکا ہوگیا ہے۔ گلزار حویلی دھماکے سے اُڑ گئی ہے۔''

ہاں، گلزار حویلی میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ لوگ بھاگ رہے تھے، چلّا رہے تھے، ایک دوسرے کو روندتے ہوئے بیرونی راستے کی طرف بڑھ رہے تھے، میزیں اُلٹ رہی تھیں، برتن ٹوٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اسٹیج کے عقب سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان شعلوں نے دوسری منزل کی چوبی بالکونیوں کو جالیا۔ میں نے اس آگ میں سے زخمیوں کو کودتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مجھ سے صرف پندرہ فٹ کے فاصلے پر پتلون شرٹ والی لڑکی شدید زخمی حالت میں پڑی تھی۔ اس کا عریاں پیٹ ایک طرف سے چاک تھا اور اندرونی عضلات جھانک رہے تھے۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اس کے ساتھی اسے روند کر گزر رہے تھے۔ اسٹیج کے سامنے ایک فربہ اندام سیاستدان کی کھوپڑی اُڑ گئی تھی اور وہ گول میز پر یوں اوندھا پڑا تھا جیسے میز سے کان لگا کر کچھ سن رہا ہو۔

میں نے اپنے معزز مہمانوں کو دیکھا۔ وہ بھی بھاگے لیکن وہ لوگوں کی مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے۔ وہ آگ اور دُھویں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ وہ موت کے کھلاڑی تھے، وہ مردانِ میدان تھے۔ ان کی زندگی ایسے ہی آتشیں طوفان سے ٹکراتے گزری تھی۔ انہیں دیکھ کر میں بھی زخمیوں کی مدد کے لیے ان کے پیچھے لپکا لیکن پھر مجھے پتلون شرٹ والی زخمی لڑکی کا خیال آیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ وہ اس شخص کی بانہوں میں تھی جس کا کچھ دیر پہلے اس نے (اور اس کے ساتھیوں نے) مذاق اُڑایا تھا۔ محترم نشانِ حیدر نے اسے اٹھایا اور اسے باہر پہنچانے کے لیے دُھویں کی دیوار کے پیچھے اوجھل ہوگئے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تیز رفتار شعلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جو چند..... صرف چند لوگ جان کو خطرے میں ڈال کر زخمیوں اور لاشوں کو آگ کی لپیٹ سے نکال رہے تھے ان میں میرے معزز مہمان پیش پیش تھے۔ ان کی حرکات و سکنات میں پیشہ ورانہ مہارت اور پھرتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں شجاعت کی بے مثال چمک تھی۔ ہاں وہ شجاع تھے، سب کے سب شجاع تھے اسی لیے نشانِ حیدر تھے۔ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ میں نے ان شہبازوں کو آگ میں جھپٹتے، پلٹتے اور پھر جھپٹتے دیکھا۔ وہ بڑے بڑے میز پوشوں کو اپنے چہروں اور ہاتھوں پر لپیٹ کر خطرناک ترین جگہوں پر چلے گئے اور زخمیوں کو کھینچ لائے۔

مجھے اپنی بیگم نظر آ گئی تھی۔ وہ بھی میرے لیے بے حد پریشان تھی۔ میں نے اسے چار دیواری سے باہر بھیج دیا۔

اچانک بالائی منزل کے ایک محرابی دریچے سے کسی بچے کے دردناک انداز میں چیخنے کی آوازیں آئیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ میں نے ملک حشمت کو دیکھا۔ وہ رانیں پیٹ پیٹ کر دُہائی دے رہا تھا اور بالکونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ''میری پوتی کو بچاؤ..... میری کرن کو بچاؤ۔''

ہاں، یہ وہی چاند چہرہ بچی تھی جس نے کچھ دیر پہلے اسٹیج پر ایک خوبصورت گیت گایا تھا۔ اب وہ گیت، اس گیت کی آواز اور آواز کی مالک..... سب خطرے میں تھے۔ شعلے بچی کو گھیر رہے تھے۔ وہ دم بدم موت کے منہ میں جارہی تھی۔ اس کی دادی بے ہوش ہوچکی تھی۔ ایک دوسری عورت آگ میں کودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوگ اسے روک رہے تھے۔ یہ بچی کی ماں تھی۔

پھر میں نے دیکھا، میرے معزز مہمانوں میں سے ایک تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ دُھویں کی دیوار کو چیرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ وہ کون تھا..... میں اسے ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ شاید یہ وہ تھا جس نے 58ء میں مشرقی پاکستان میں دادِ شجاعت دے کر ایک تاریخ رقم کی تھی یا وہ جس نے 65ء میں بی آر بی کے کنارے مسلسل چار دن تک سینہ تان کر شہر لاہور کا دفاع کیا تھا یا وہ تھا جس نے اپنا طیارہ دشمن کے ہوائی اڈے پر اُتارنے سے انکار کیا اور ایک غدار کو جہنم واصل کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا یا پھر شاید وہ شہسوار جس نے پاک فوج کی اگلی صفوں پر کمک بحال رکھنے کے لیے آگ اور دُھویں کو چیرا اور سر دھڑ کی بازی لگائی اور ہوسکتا ہے یہ وہ ہو جس نے کارگل کی جنگ میں شجاعت کا جھنڈا گاڑا۔ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا دشمن کی پوزیشنوں میں گھس گیا اور دیوانہ وار لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ہاں، یہ ان جواں مردوں میں سے کوئی بھی ہوسکتا تھا اور اس بات سے بہت فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ وہ ان میں سے کون ہے۔ وہ سب ایک ہی تھے۔ جانبازی اور سرفروشی کی ایک ہی بے مثل کہانی کا حصہ تھے۔ ان کو مشترکہ طور پر ایک ہی نام سے پکارا جاسکتا تھا..... نشانِ حیدر!

وہ چند منٹ گلزار حویلی میں موجود ہر شخص کے لیے بے حد جاں گسل تھے اور سب سے بڑھ کر اس ماں کے لیے جو اپنی بچی کے لیے دیوانہ وار آگ میں کودنا چاہتی تھی اور پھر وہ چند منٹ گزر گئے۔ میرا معزز مہمان دُھویں کی سیاہ دیوار میں سے برآمد ہوا۔ اس نے کرن کو اپنی مضبوط بانہوں میں چھپا رکھا تھا اور دوڑتا ہوا آرہا تھا لیکن ابھی وہ آگ سے محفوظ دوری پر نہیں پہنچا تھا۔ میرے باقی معزز مہمان بھی ان کی طرف لپکے اور اسے چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔ وہ اس کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تھے۔ وہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں گئی پھر وہ اپنی ماں کے پاس آگئی۔ وہ دم گھٹنے سے نڈھال تھی لیکن حالت خطرے سے باہر نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اسے لے کر ایمبولینس کی طرف دوڑ گئے۔ اس کی ماں خوشی کے آنسو ٹپکاتی ان لوگوں کے پیچھے لپکی۔

☆☆☆

ہم اپنے گھر واپس پہنچ چکے تھے۔ میری بیگم مجھ سے پہلے اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر کے آگئی تھی۔ میں اپنے محترم مہمانوں کے ساتھ اسٹیشن وین میں پہنچا تھا۔ وہ بالکل گم صم اور افسردہ تھے۔ انہوں نے ٹی وی آن کرلیا تھا۔ نیوز چینل اس دھماکے کی خبر ''بریک'' کرتے ہوئے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلّا رہے تھے۔ نیوز کاسٹرز نے اپنے اندرونی جوش و خروش کو پیشہ ورانہ افسردگی سے ڈھانپ لیا تھا لیکن ان کا ولولہ آوازوں کی لرزش سے ظاہر ہوتا تھا۔ ایک پھرتیلے چینل نے اس دھماکے کو ''سلسلہ وار دھماکوں'' کے طور پر پیش کرنے کے لیے پچھلے دو سال کے مختلف دھماکے بھی آن ایئر کردیے تھے۔ اسکرین پر آگ، خون اور انسانی اعضا کے ٹکڑے تھے۔

گلزار حویلی میں مرنے والوں کی تعداد چھ ہوگئی تھی اور نیوز کاسٹر ''بے حد دُکھ'' کے ساتھ توقع کررہے تھے کہ ابھی یہ نمبرز بڑھیں گے۔

گلزار حویلی سے ہماری یہاں تک واپسی بخیریت ہی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا کہ نہر کے پل کے پار کینال پارک کے تاریک موڑ پر ایک پولیس ناکے پر ہمیں روک لیا تھا۔ حسبِ رواج ایک سب انسپکٹر اور اس کے نصف درجن مسلح ماتحتوں نے ہمیں گھورا تھا۔ ہمارے چہروں پر ٹارچوں کی روشنی پھینکی تھی۔ ہم سے سوال جواب کیے تھے۔ میرے معزز مہمانوں کے حلیے ذرا ابتر تھے۔ دُھویں کے سبب ان کے چہرے نیم سیاہ ہورہے تھے اور کچھ کے لباس پر خون کے چھینٹے بھی تھے۔ سب انسپکٹر کی رگِ تفتیش پھڑک اٹھی اور مال بنانے والی بے شمار دفعات اس کے ذہن میں چکرانے لگیں۔ چند لمحے کے لیے لگا کہ وہ ہم سب کو وین سے نیچے اُترنے اور تلاشی دینے کا حکم جاری کرے گا۔

لیکن پھر ایک دم نجانے کیا ہوا..... وہ پیچھے ہٹ گیا اور بے حد مرعوب نظر آنے لگا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس نے میرے معزز مہمانوں کو پہچان لیا تھا (ایسا ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی) وہ بس یونہی اچانک ہیبت زدہ ہوگیا تھا۔ بہت متذبذب ہونے کے بعد اس نے اپنے تنومند اہلکاروں کو اشارہ کیا اور وہ میری مبارک گاڑی کے سامنے سے ہٹ گئے۔ ہاں میں اپنی گاڑی کو مبارک ہی کہوں گا۔ اپریل کی اس طلسماتی شب میں میری گاڑی کے اندر اس دھرتی کے مبارک ترین لوگ موجود تھے۔

..... میں اور میری بیگم ساری رات جاگتے رہے۔ اپنی بساط اور بے حد معمولی حیثیت کے مطابق ہم اپنے معزز مہمانوں کی دلجوئی میں مصروف رہے۔ ہم نے ان کی تواضع اور ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن..... وہ خوش نہیں تھے۔ وہ بجھ گئے تھے۔ وہ مجھے ان سیاحوں کی طرح لگے جو ایک لمبے سفر کے لیے گھر سے نکلے ہوں مگر پہلی ہی منزل پر ان کے حوصلے جواب دے گئے ہوں، اب وہ ٹوٹے دلوں کے ساتھ گھر واپس جانے کا سوچ رہے ہوں۔

میں خود کو کوسنے لگا۔ میں ان کو کیوں لے کر گیا گلزار

حویلی۔ کیا لاہور میں اور پاکستان میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ جاتے، خوش ہوتے اور اپنی توقعات کو پورا ہوتا دیکھتے۔

ان کے بجھنے سے میں بھی بجھ گیا۔ میرا دل اندر سے رونے لگا۔ میرا دل چاہا میں ان کے قدموں میں گر پڑوں، ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگوں۔ ان سے کہوں اس ملک میں جو کچھ اچھا ہے وہ آپ کی وجہ سے ہے، جو کچھ برا ہے اس کے لیے میں قصوروار ہوں اور ہم سب سولہ کروڑ قصوروار ہیں۔ میں ان سے یہ بھی کہوں..... اس شہر میں جن لوگوں نے آپ کو نہیں پہچانا، انہوں نے اپنی توہین کی ہے، اپنی کم مائیگی سے پردہ اٹھایا ہے۔ جو سورج کو نہیں دیکھ سکتا وہ اندھا ہوتا ہے۔ ہم سب اندھے ہیں۔ ہمارے اندھے پن سے آپ کی لازوال روشنی کا رُتبہ کم نہیں ہوسکتا۔

رات گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہوا۔ میرے محترم مہمانوں کی آنکھوں میں رات کے اندوہناک واقعات کا خیال ایک مہیب غم بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔

دوپہر سے کچھ دیر بعد ہی اولین نشانِ حیدر نے اپنی بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''مسٹر انور! اب ہم جانا چاہتے ہیں۔''

''سر! آپ کے جانے کی بات میرے دل کے ٹکڑے کرتی ہے۔''

''ہم مہمان ہیں اور مہمانوں کو جانا ہوتا ہے۔ آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا اس کے لیے شکریہ۔'' اولین نشانِ حیدر کیپٹن سرور نے کہا۔

''سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اپنی نظروں میں گر رہا ہوں۔''

راجا عزیز نے کہا۔ ''لیکن جانے سے پہلے ہم اس بچی کی خیریت جاننا چاہتے ہیں جو رات کو آگ میں گھر گئی تھی۔''

''سر! میں ابھی فون پر رابطہ کرتا ہوں۔ پتا کراتا ہوں وہ کہاں اور کیسی ہے؟''

''نہیں، ہم خود اس سے ملیں گے۔'' شیر خان نے گونج دار آواز میں کہا۔

''جیسے آپ کا حکم سر! میں آپ کو اپنے ساتھ لیے چلتا ہوں لیکن پہلے میں معلوم کرلوں کہ وہ کہاں ہے۔''

میں نے کامن روم میں جا کر گلزار حویلی فون کیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ بچی میو اسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں ہے..... اب وہ ہوش میں تھی اور بات چیت کرسکتی تھی۔

میرے معزز مہمان میرے گھر سے رُخصت ہوئے اور اسٹیشن وین کے ذریعے میو اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ ایک بار پھر میرے لیے یہ شرمندگی کا سفر تھا۔ میو اسپتال پہنچ کر ہم سیدھے اسپیشل وارڈ کی طرف چل دیے۔ بہت سے لوگ ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ مریض، تیماردار، ڈاکٹر اور نرسیں۔ کوئی یہ نہیں جان سکا کہ ان کے درمیان کون لوگ موجود ہیں۔ البرٹ وکٹر پورشن کے پورچ میں ایک دبنگ قسم کی پجارو جیپ موجود تھی۔ ایک نوجوان سیاستدان اپنے کسی عزیز کی تیمارداری کے بعد گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ اس کے گرد مسلح گارڈز کا ہجوم تھا۔ لوگ معروف سیاستدان کی جھلک دیکھنے کے لیے جیپ کے گرد اُمڈ آئے تھے۔ ہم ان کے پاس سے ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور فرسٹ فلور پر گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک صاف ستھرے کمرے میں ننھی بچی کرن کے بیڈ کے سامنے تھے۔ بچی کے قریب اس کی والدہ اور ایک ملازمہ موجود تھیں۔ باقی رشتے دار باہر بیٹھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر نابینا بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''دیکھو کرن! تم سے کون ملنے آیا ہے؟''

''کون؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ اسے بتادوں لیکن میری زبان بندی کا حکم ایک دن پہلے جاری ہوگیا تھا۔ میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''کرن! یہ وہ ہیں جنہوں نے کل آپ کو اور بہت سے دوسرے لوگوں کو آگ میں سے نکالا۔''

''اوہ!'' کرن نے کہا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں متحرک ہوئیں جیسے وہ اپنے محسنوں کو چھونا چاہتی ہو۔

وہ سب اس کے قریب آ گئے۔ محبت سے اسے دیکھنے لگے۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میجر عزیز بھٹی کا ہاتھ زیادہ قریب تھا۔ کرن کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوا۔ اس نے ہاتھ تھاما۔ عزیز بھٹی نے جھک کر کرن کا ماتھا چوما۔ وہ اپنا نازک ہاتھ جانباز مجاہد کے چہرے پر دوڑانے لگی جیسے اپنے ہاتھ کی مدد سے چہرے کو دیکھ رہی ہو۔ ایک دم اس کے تاثرات بدلے۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''آپ کون ہیں؟''

''آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''آ..... آپ.....'' وہ یکایک بستر پر ہی کھڑی ہوگئی۔

اسے ''اسپرنگ دار گدے'' سے گرنے سے بچانے کے لیے کیپٹن شیر خان اور میجر شبیر شریف نے تھام لیا۔ کرن نے بے حد بے قراری سے ان کے چہروں پر بھی ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ہیجانی کیفیت بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے

ایک ایک کے چہرے پر ہاتھ دوڑاتی چلی گئی۔ اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ چہرہ رنگ پر رنگ بدلنے لگا۔ آخر وہ بے حد ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ آ..... آپ یہاں؟ مم..... میں نے آپ کو پہچان لیا ہے، میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔'' اس کی آواز بے پناہ حیرت اور مسرت کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

میں نے اپنے معزز مہمانوں کی طرف دیکھا۔ ان کے پژمردہ چہروں پر خوشی کی چمک نمودار ہوئی جیسے گہرے تاریک بادلوں سے سورج کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ کرن اب اپنے دونوں ہاتھوں کو بڑی محبت سے میرے معزز مہمانوں کے چہروں پر پھیر رہی تھی۔ وہ ساکت و جامد کھڑے تھے۔ ایک عجیب دلنواز چمک ان کی آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔

کرن کا دایاں ہاتھ لالک جان کے چہرے پر تھا۔ ''میں کون ہوں بیٹی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آپ لالک جان ہیں۔ کارگل کے ہیرو!''

''اور میں؟'' راشد منہاس نے پوچھا۔

''آپ پائلٹ آفیسر ہیں۔ راشد منہاس!''

''اور..... آپ میجر طفیل ہیں..... اور آپ راجا عزیز بھٹی ہیں اور آپ سوار محمد حسین ہیں.....'' وہ ہاتھوں سے دیکھتی گئی اور بولتی چلی گئی۔ اس نے سب کو پہچان لیا۔ ان کے مکمل نام، ان کے محاذ، ان کی شہادت کا سن۔ میں ششدر کھڑا تھا۔ ایک نابینا بچی ہزاروں بینا ؤں پر بازی لے گئی تھی۔ اس کی والدہ بھی ششدر تھی۔ اب وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی اور بے حد تعجب اور بے پایاں عقیدت سے ان ''نشاناتِ حیدر'' کو دیکھ رہی تھی۔ ان دیوقامت انسانوں کے رُعب سے اس کا وجود خشک پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

معزز مہمانوں کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چمک گئے۔

میرے دل کے اندر سے سوال اٹھا۔ ''کیا صرف یہ بچی ہی قومی ہیروز کو پہچان سکی ہے..... یا سب بچے انہیں پہچان سکتے ہیں؟''

یہ سوال اُبھرنے کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ ابھی تک کسی بچے سے میرے معزز مہمانوں کا ٹھیک سے سامنا ہی نہ ہوسکا تھا۔ میرے گھر میں، نہ گلزار حویلی کی تقریب میں، نہ کہیں اور۔

نور آدل کے اندر سے صدا آئی..... یہ بچی ہی نہیں شاید ہر بچہ اپنے ان قومی ہیروز کو پہچان لے گا اس لیے کہ بچے دل کے سچے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر بھی سچی اور شفاف ہوتی ہے۔

البرٹ وکٹر بلڈنگ کے اس کمرے میں بڑا ہی جذباتی منظر تھا۔ کرن کھڑی تھی۔ اس کے اردگرد دس چمکتے ستارے تھے۔ وہ ایک ایک کو چھو رہی تھی، ہاتھ چوم رہی تھی، لپٹ رہی تھی اور ان سب کے چہرے خوشی سے گلنار تھے۔ کرن کی باتوں میں خوبصورت معصومیت اور تازہ ہوا کی خوشبو تھی۔ اس کے لہجے میں ایک ''تابناک مستقبل'' جھلک دکھاتا تھا۔ وہ سنتے رہے۔

میں مؤدب انداز میں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ شاید وہ عزیز بھٹی تھے، شاید میجر طفیل تھے یا پھر راشد منہاس..... یا پھر سوار محمد حسین..... اور ہوسکتا ہے کہ شیر خان ہوں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھے۔ وہ سب ایک ہی تھے۔ جانبازی اور سرفروشی کی ایک ہی بے مثل کہانی کا حصہ تھے۔ ان کو مشترکہ طور پر ایک ہی نام سے پکارا جاسکتا تھا..... نشانِ حیدر۔ کہنے والے نے بڑے جذب کے ساتھ کرن کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''آپ صرف کرن نہیں، آپ اُمید کی کرن ہیں۔ جب تک آپ جیسے بچے یہاں موجود ہیں، پُرامید رہنے کا پورا جواز موجود ہے۔ YES, THERE IS NO REASON "TO BE DISAPPOINTED

آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی YES, THERE IS NO REASON TO BE DISAPPOINTED

میں نے اپنے معزز مہمانوں سے مخاطب ہوکر بڑی عاجزی سے کہا۔ ''کیا اب آپ اجازت دے سکتے ہیں کہ میں لوگوں کو آپ کے بارے میں بتاؤں؟''

میرے اس سوال کا جواب مسکراکر نفی میں دیا گیا۔

..... قریباً تیس منٹ بعد دس نشانِ حیدر..... میرے دس معزز مہمان مجھ سے رُخصت ہو رہے تھے۔ اسپتال سے واپسی پر انہوں نے میری اسٹیشن وین نہر کے کنارے درختوں کے درمیان رُکوائی۔ مجھے مسکراتے چہروں کے ساتھ الوداع کہا اور دُور تک جاتی ہوئی خالی سڑک پر چلنے لگے۔ انہیں یوں دیکھنا ایک روح پرور تجربہ تھا۔ کندھے سے کندھا ملائے وہ چلتے چلے گئے۔ ان کے پسِ منظر میں مغربی اُفق پر شام کی سرخی تھی۔ وہ چلے گئے اور اس سرخی میں مدغم ہوتے گئے۔ میری سماعت میں بار بار سنا ہوا ایک رسیلا نغمہ گونج رہا تھا۔

اے راہِ حق کے شہیدو! وفا کی تصویرو!
وطن کی ہوائیں تمہیں سلام کہتی ہیں

نغمہ گونجتا رہا اور وہ سرخی میں اوجھل ہوگئے۔

میرا نام امیر علی ہے۔ عمر 75 سال کے اندر باہر ہے۔ میں نے دنیا کا بہت گرم سرد دیکھا ہے۔ پچھلے قریباً چالیس سال سے میں ایک ہی گھر میں گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہوں۔ میرے مالک کا نام تراب فاروقی تھا۔ وہ بہت اچھے ستار نواز تھے اور اس سے بھی اچھے انسان تھے۔ کروڑ پتی تھے لیکن مزاج میں تکلف اور بناوٹ نام کو نہیں تھی۔ گاؤں میں ان کی کافی زمین تھی۔ مسلم ٹاؤن لاہور میں دو کینال کی کوٹھی ''ترابی ہاؤس'' میں رہتے تھے۔ بیوی بیس پچیس سال پہلے فوت ہوگئی تھی۔ دو بیٹے تھے جو انگلینڈ میں رہتے تھے۔ کوئی نو سال پہلے تراب صاحب کا انتقال ہوا تو میرا دل چاہا کہ اس گھر کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلا جاؤں مگر پھر تراب صاحب کی وصیت آڑے آئی۔ انہوں نے وقتِ رخصت کہا تھا کہ میں زندگی کے باقی سال ان دیواروں کے سائے میں ہی گزاروں۔

تراب صاحب کی وفات کے چند سال بعد ان کے بڑے بیٹے ندیم نے پاکستان میں رہائش رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس پرانی کوٹھی کو RENOVATE کرنے کی پلاننگ کی ..... کہنے کو تو یہ پرانی کوٹھی کی مرمت و آرائش تھی لیکن حقیقت میں ایک تہائی کوٹھی کو گرا کر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا اور باقی عمارت میں بھی بنیادی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ اب یہ دو کینال کی کوٹھی ایک بالکل نئی اور جدید عمارت تھی۔

کوٹھی کی اس کایا پلٹ کا کام انجینئر اشفاق چودھری

عرصے کے بعد آپ کے محبوب مصنف کی مختصر جھلک

آنکھ کا تارا

طاہر جاوید مغل

بسا اوقات انسان جس کامیابی کو اپنی فراست وذھانت کا سبب قرار دیتاھے وہ اس کی نھیں بلکہ کسی اور کی رھین منت ھوتی ھے - وہ بھی ایک ماھر فن تعمیرات تھا اور اسے انسانی نفسیات کو سمجھنے کے علاوہ بھت ساری کامیابیوں کا سھرا اپنے سر باندھنے کا دعویٰ بھی تھا



نے انجام دیا تھا۔ اشفاق چودھری ایسے کاموں کا ماہر تھا۔ اس سے پہلے وہ مسلم ٹاؤن کی ایک کوٹھی کو RENOVATE کر چکا تھا۔ یہ کوٹھی تراب صاحب کے مرحوم دوست میاں عادل کی تھی۔ عادل صاحب اور تراب صاحب کی وفات میں صرف ایک برس کا فرق تھا۔ عادل صاحب ایک بڑے ٹیکسٹائل مل کے اونر تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے نے بھی حال ہی میں کوٹھی کی مرمت و آرائش کی تھی اور اسے کافی حد تک خوبصورت اور جدید بنالیا تھا۔ میں یہاں جو واقعہ بیان کرنے جا رہا ہوں اس کا تعلق درحقیقت اسی دوسری عمارت سے ہی ہے۔ اس عمارت کو عادل منزل کہا جاتا تھا۔

یہ دسمبر کی ایک خنک شام تھی۔ دھند شام سے پہلے ہی لاہور کے گلی کوچوں میں اتر آئی تھی۔ انجینئر اشفاق چودھری آج کوٹھی کے آخری معائنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ کوٹھی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ آج اشفاق چودھری نے اپنی موجودگی میں آرائشی لائٹس بھی نصب کرادی تھیں۔ امید تھی کہ آج یا پھر کل تک اس کا کام بالکل فائنل ہو جاتا۔ ماربل کے فرش پر لکڑی کا برادہ بکھرا ہوا تھا۔ در و بام میں تازہ رنگوں کی خوشبو اور وارنش کی باس تھی۔ ہم بالائی منزل پر گیس ہیٹر کے سامنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں اشفاق چودھری کے موبائل فون کی گھنٹی بجی..... وہ کچھ دیر تک فون سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''چاچا! پتا ہے یہ کس کا فون تھا؟''

''کس کا تھا؟''

''میاں عادل صاحب کے صاحبزادے حمزہ صاحب کا۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہہ رہے تھے کہ عادل منزل کی مرمت اور آرائش بڑی کامیاب رہی ہے جو ہم چاہتے تھے وہ بالآخر ہو گیا ہے۔''

میں نے پھر سوالیہ نظروں سے اشفاق چودھری کو دیکھا۔ ''اس کے ساتھ ہی میری نگاہ کھڑکیوں سے گذر کر دور عادل منزل کی روشنیوں پر پڑی جس کا نیا نام اب عادل لاج رکھ دیا گیا تھا۔ دھند میں لپٹی ہوئی یہ عمارت اپنے اردگرد کی عمارتوں سے جدا نظر آرہی تھی۔ اس کے ڈھانچے میں ایک خاص طرح کی شان و شوکت تھی۔

میں نے کہا ''میں سمجھا نہیں ''مرمت اور آرائش'' کے کامیاب ہونے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

اشفاق چودھری نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا..... اور بولا ''ہم نے عادل منزل کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ کسی طرح اماں جی۔ یہاں سے جانے پر راضی ہو جائیں اور کل وہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔ اپنے بیٹے حمزہ کی خواہش کے مطابق ڈیفنس کی بڑی کوٹھی میں شفٹ ہو گئی ہیں۔''

یہ خبر میرے لیے بھی حیران کن تھی لیکن بہت زیادہ نہیں۔ جس عمر رسیدہ خاتون کو اشفاق چودھری ''اماں جی'' کہہ رہا تھا، وہ مرحوم میاں عادل کی بیوی تھیں۔ ان کی عمر ستر سال سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ نہایت نیک اور خدا ترس عورت تھیں۔ وہ تقریباً پچاس برس پہلے بیاہ کر عادل منزل میں آئی تھیں پھر وہ اور عادل منزل بہت کم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔

میں نے اس خبر پر حیرت کا اظہار کیا تو اشفاق اور بھی خوش نظر آنے لگا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں فخریہ چمک ابھر آئی۔ سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر بولا۔ ''چاچا امیر علی! تم اماں جی کے بارے میں کیا جانتے ہو۔''

''ہم نوکر لوگ ہیں جی۔ کتنے بھی پرانے ہو جائیں لیکن رہتے تو نوکر ہی ہیں۔ بے شک ہم لوگوں کے پاس معلومات ہوتی ہیں لیکن یہ معلومات زیادہ گہری نہیں ہوتیں۔ جن کو آپ اماں جی کہہ رہے ہیں، ان کا نام زینت بیگم ہے۔ مجھے تو یہی پتا ہے جی کہ زینت بیگم اپنے شوہر میاں عادل کی وفات کے بعد عادل منزل کی وارث تھیں۔ عادل صاحب یہ گھر ان کے نام کر گئے تھے۔ اب زینت بیگم کا بیٹا اور بیٹیاں چاہتی تھیں کہ زینت بیگم ڈیفنس والے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں اور عادل منزل بیچ دی جائے مگر زینت بیگم راضی نہیں تھیں۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں یہاں عادل منزل میں ہی لینا چاہتی تھیں۔''

''تمہاری معلومات درست ہیں چاچا! لیکن اس سے آگے کی بات کا شاید تمہیں پتا نہیں۔ اماں جی یعنی زینت بیگم کو عادل منزل چھوڑنے پر آمادہ کرنا ایک بہت مشکل کام تھا..... اور یہ کام اس خاکسار کی وجہ سے ہو سکا ہے۔'' اشفاق چودھری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا اور یوں لگتا تھا کہ اپنے موڈ کی ترنگ میں مجھے بہت کچھ بتانا چاہتا ہے۔ جلد ہی میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ صوفے پر قریباً نیم دراز ہو کر اشفاق چودھری نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے جب میاں عادل کے صاحب زادے حمزہ سے میری ملاقات جیم خانہ کلب میں ہوئی تھی پھر ہمارے درمیان

تھوڑی سی دوستی بھی ہوگئی۔ حمزہ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی بیچ کر ڈیفنس میں شفٹ ہونا چاہتا ہے لیکن اس کی بوڑھی والدہ پرانی کوٹھی چھوڑنے پر ہرگز راضی نہیں۔ وہ اس مسئلے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور کئی گھرانوں میں پایا جاتا ہے..... بزرگوں نے جس چار دیواری میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا ہوتا ہے وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہاں ان کی یادیں ہوتی ہیں۔ غمی خوشی کے دھوپ ... سائے ہوتے ہیں۔ زندگی کے آخری حصے میں وہ ان درو دیوار کو کھونا نہیں چاہتے۔ یہ ایک خالص نفسیاتی قسم کا مسئلہ ہوتا ہے اور اسے سلجھانے کے لیے بھی نفسیاتی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ دوسری صورت میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ حمزہ میری باتوں سے متاثر ہوا اور مجھے اپنے گھر عادل منزل لے آیا۔ یہاں میں حمزہ کے مہمان کی حیثیت سے دس پندرہ روز رہا۔ میں نے وقتاً فوقتاً اماں جی سے بات بھی کی اور ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ لوگوں کو سمجھنے میں مجھے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔ یہ کام مجھے ''کنسٹرکشن'' اور ''انٹریرڈیکوریشن'' ہی کی طرح مزیدار لگتا ہے۔ عادل منزل میں اپنے قیام کے دوران میں نے اماں جی یعنی زینت بیگم کو قریب سے جاننے کی کوشش کی۔ ان کے بارے میں میرے پچانوے فیصد اندازے درست نکلے۔ انہیں عادل منزل سے اس لیے محبت تھی کہ یہاں ان کی اور عادل صاحب کی بے شمار یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہر بالکونی، ہر کمرا، ہر کھڑکی بلکہ پوری کی پوری عمارت یادوں کے گھیرے میں تھی اور صرف عمارت ہی نہیں۔ اس کے اردگرد کا ماحول، گلیاں، مکان، مکین، سب ان کے دل و دماغ پر نقش تھے۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد یہ نقش کچھ اور گہرے ہوئے تھے..... اور پچھلے آٹھ دس برسوں میں بالکل

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/300

جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ''ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں''۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا ''میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں'' نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/225

اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

قیصر و کسریٰ -/300

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی حالات اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/125

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

گمشدہ قافلے -/300

انگریز کی اسلام دشمنی، یہودیوں کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/200

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت -/275

اسلام دشمنی پر متی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلہء حجاز -/300

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون -/300

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی -/275

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ -/150

بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ -/225

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اُندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی -/125

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیئوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم -/225

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش -/100

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان -/275

سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی -/300

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

شاہین -/275

اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد -/125

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا -/225

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین -/225

اُندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس • لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدرآباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

انمٹ ہو گئے تھے..... میں نے حمزہ کو سمجھایا کہ اگر وہ اپنی عمر رسیدہ والدہ کو یکلخت اس عمارت سے جدا کرنا چاہے گا تو یہ بہت مشکل اور نقصان دہ ہوگا۔ ہاں وہ انہیں بڑی احتیاط کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے جدا کر سکتا ہے۔ حمزہ نے پوچھا ''کیسے اشفاق صاحب؟''

میں نے کہا۔ ''عادل منزل کو بدلتے چلے جائیں اور ڈیڑھ دو برس میں بالکل تبدیل کر دیں۔''

''بات حمزہ کی سمجھ میں آ گئی اور ہم نے کام شروع کر دیا۔''

چند لمحے توقف کر کے انجینئر اشفاق چودھری نے نیا سگریٹ سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تمہیں یاد ہی ہوگا چاچا امیر علی ! ہم نے عادل منزل کی RENOVATION بڑی سست رفتار سے کی تھی۔ کبھی کوئی بالکونی گرا دی، کبھی چند کھڑکیاں تبدیل کر دیں..... برسات کے موسم میں چھت کی لیکیج کا بہانہ کر کے ہم نے دوسری منزل کے پورے چار کمرے گرا دیے تھے اور وہاں سنگ مرمر کے فرش والا کشادہ ٹیرس بنا دیا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے لیکن مسلسل لگے رہے اور قریباً دو سال میں ہم نے عادل منزل کا نقشہ ہی بدل دیا۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلے کا نفسیاتی اور بڑا محتاط حل تھا۔ ایک دو مواقع پر اماں جی نے کچھ احتجاج بھی کیا مگر ہم نے اس احتجاج کو سنبھال لیا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اشفاق چودھری نے آنکھوں میں ذہانت کی چمک لے کر بات جاری رکھی۔ ''زینت بیگم کا اکلوتا بیٹا تو زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہا تھا۔ بیٹیاں بہت جلدی..... بیاہ کر اپنے گھر کی ہو گئیں..... زینت بیگم کی زندگی کا محور میاں عادل ہی تھے۔ ان کی موت نے دھیرے دھیرے زینت بیگم کو ماضی پرست بنا دیا تھا۔ عادل منزل کے تمام خدوخال میں انہیں اپنا شوہر اور اپنا ماضی نظر آتا تھا لیکن جب دھیرے دھیرے عادل منزل کے سارے خدوخال ہی بدل گئے تو وہ جال بھی ٹوٹ گیا جس نے انہیں اپنی پکڑ میں لے رکھا تھا..... چار چھ ماہ کی تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن نتیجہ وہی نکلا ہے جو ہمیں درکار تھا..... ابھی حمزہ نے فون پر بتایا ہے کہ اماں جی اپنی رضا مندی سے عادل منزل یعنی عادل لاج کو چھوڑ کر گئی ہیں۔''

اشفاق چودھری اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ میں نے کہا ''آپ کو انجینئر کے بجائے نفسیاتی ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔''

وہ خاموشی سے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا رہا اور کچھ فاصلے پر موجود عادل لاج کی دھند میں لپٹی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے چونتیس پینتیس سالہ چہرے پر مطمئن مسکراہٹ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی فرم کی گاڑی اسے لینے آ گئی۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس خاص موڈ میں سے نکل آیا جس میں ہوتے ہوئے اس نے مجھے یہ ساری تفصیل بتائی تھی۔ اس نے ذرا تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''نوکر کتنا بھی پرانا اور قابلِ عزت ہو جائے لیکن نوکر ہی ہوتا ہے۔ اسے زیادہ کچھ بتانا نہیں چاہیے۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب اسے ہضم ہی رکھنا۔''

ہاں نوکروں کو زیادہ کچھ بتانا نہیں چاہیے لیکن بے خبر ہوتے ہوئے بھی ہم جیسے پرانے وفادار نوکروں کو بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اشفاق چودھری جیسے خود ساختہ عالموں فاضلوں سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ظرف مند نوکر یہ سب کچھ اپنے تک محدود رکھتے ہیں۔

میں اشفاق کو رخصت کرنے کے بعد اپنی عمر رسیدہ ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا دوبارہ ہیٹر کے سامنے آن بیٹھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور بڑی اداسی کے ساتھ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اشفاق چودھری کافی کچھ جانتا تھا لیکن بہت کچھ اسے معلوم نہیں تھا۔ جیسے اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ زینت بیگم ہمیشہ میاں عادل سے ناخوش رہی تھیں۔ وہ کاروباری شخص ہفتوں اور مہینوں گھر سے باہر رہتا تھا اور جب گھر میں ہوتا تھا تب بھی اس کے دل و دماغ پر کاروبار کا قبضہ ہی ہوتا تھا۔ اشفاق چودھری کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زینت بیگم جوانی میں بہت خوبصورت تھیں اور تنہائی کا شکار بھی..... وہ گھنٹوں عادل منزل کے فرسٹ فلور پر ایک محرابی کھڑکی میں بیٹھی رہتی تھیں اور ہمارے گھر یعنی ترابی ہاؤس کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے صاحب تراب علی یہاں اس کمرے میں بیٹھ کر ستار بجایا کرتے تھے، جہاں اب میں بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ ستار بجاتے ہوئے، ان کی نگاہیں اکثر عادل منزل کی محرابی کھڑکی پر لگی رہتی تھیں اور..... اشفاق کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زینت بیگم کے یہاں سے چلے جانے کی وجہ عادل منزل کا مسمار اور تبدیل ہونا نہیں تھا..... ترابی ہاؤس کا مسمار اور تبدیل ہونا تھا۔ زینت بیگم کی آنکھوں کا تارا عادل منزل نہیں ترابی ہاؤس تھا۔

قریباً پینتیس برس تک پھیلی ہوئی اس خاموشی اور پاکیزہ محبت کی کہانی کے بارے میں اشفاق چودھری کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی اور ناخنوں پر پالش لگاتے لگاتے وہ بری طرح چونک گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک دم اس کے ذہن میں پلنے والے تمام خدشات جوان ہوگئے۔ دوسری طرف ایاز ہی تھا۔

"ہیلو عینی!" وہ گمبھیر آواز میں بولا "فون بند مت کرنا کیونکہ اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ جب تک میں اپنی بات مکمل نہیں کرلوں گا' فون کرتا رہوں گا اور تم بار بار ڈسٹرب ہوتی رہوگی۔"

"تم اپنی بات مکمل کرچکے ہو اور میں تمہیں فیصلہ کن جواب بھی دے چکی ہوں۔" عینی جھنجلا کر بولی۔

"تم پرسوں والی بات کا ذکر کررہی ہو۔ میں آج کی بات کررہا ہوں۔ آج کی بات مختلف ہے۔"

"کیا آج تمہارے اندر انسانیت بیدار ہوگئی ہے۔ تم نے ماضی کی پاداش میں مجھے بلیک میل کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے؟"

"نہیں' ایسا تو نہیں ہے لیکن میں نے ایڈجسٹمنٹ کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں اس ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ تم ایک کروڑپتی صنعت کار کی بیوی ہو۔ ۵۰ لاکھ روپیہ تمہارے لیے معمولی بات تھی۔ بہرحال تمہاری باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی میں تمہیں رعایت دینے کے لیے آمادہ ہوں۔ اگر تم واقعی چاہتی ہو کہ تمہارا ماضی تمہارے شوہر کی نظروں سے اوجھل رہے تو کل صبح گیارہ بجے تک ۳۵ لاکھ روپے کا انتظام کرلو۔ میں دہرا دیتا ہوں۔ کل صبح گیارہ بجے تک ۳۵ لاکھ روپیہ۔ اس کے ساتھ میں اپنا وعدہ بھی دہرا رہا ہوں۔ جیسے ہی میرے مالی حالات سنبھل گئے' میں تم سے لی ہوئی یہ رقم یکمشت یا قسطوں میں واپس کردوں گا۔"

عینی تلخ لہجے میں بولی "آخر تم یہ کیوں سمجھے بیٹھے ہو کہ میں تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گی۔ میں نے۔۔۔ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس کے لیے مجھے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ میرا کردار۔۔۔ میرا کردار صاف ہے۔"

"تمہاری آواز کا کھوکھلا پن خود تمہیں بھی محسوس ہورہا ہوگا عینی ڈیئر! اپنے کردار کے اچھے یا برے ہونے کے بارے میں کوئی شخص بھی خود فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اس کا فیصلہ دنیا کرتی ہے۔ یا وہ لوگ کرتے ہیں جن کی اس حوالے سے اہمیت ہوتی ہے مثلاً تمہارا شوہر اختر زمانی۔۔۔ ہاں اختر زمانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ تمہارا کردار صاف تھا یا نہیں! اور مجھے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ تمہارے لیے خوشگوار نہیں ہوگا۔

ازدواجی رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے ...اور بہت نازک بھی۔ بعض اوقات یہ معمولی ٹھیس سے چکنا چور ہوجاتا ہے لیکن اگر اس کی اساس ایثار و وفا اور باہمی اعتماد پر ہو تو بڑے سے بڑا طوفان بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا۔ ایسے ہی رشتے میں بندھے ایک جوڑے کا احوال۔ ایک فریق تحمل و درگزر کا پیکر تھا تو دوسرا سراپا نادان و ناعاقبت اندیش۔

جب گیا عشق کسی کا نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔ نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

طاہر جاوید مغل

بے خبری



جب اسے معلوم ہوگا کہ تم میرے ساتھ تفریح گاہوں میں گھومتی رہی ہو' دو دو گھنٹے میرے ساتھ ہوٹل کے فیملی کیبن میں بیٹھی رہی ہو' مجھے محبت نامے لکھتی رہی ہو اور وہ سب کچھ کرتی رہی ہو جو معاملاتِ دل میں اور ایسے حالات میں کیا جاتا ہے تو اس کا ردِعمل کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اندر سے آگ بگولا ہوجائے گا۔ پھر جونہی تم اسے نظر آؤ گی' وہ شعلہ بن کر تمہاری طرف لپکے گا اور ممکن ہے کہ تمہیں اس قدر دوڑائے کہ تم اس کی زندگی سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بڑی عمر کے شوہر جتنے مہربان ہوتے ہیں اتنے ہی سخت دل بھی ہوتے ہیں۔ انہیں شریکِ حیات کی وفاداری پر شبہ ہوجائے تو زبردست قسم کا انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔"

ایاز کی مسلسل بکواس کو آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ عینی اس وقت بری طرح جھنجلا گئی۔ تڑخ کر بولی "مجھے دھمکانے کی کوشش مت کرو ایاز۔۔۔ میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہیں دینے والی۔ تم سے جو ہوتا ہے کرلو۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرو گے تم؟ میرے چھ سات برس پہلے کے لکھے ہوئے ایک دو خط میرے شوہر کو دکھا دو گے۔۔۔؟ دکھا دو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ ہاں اور وہ خط بھی دکھا دو جس کا تم مجھے اٹھتے بیٹھتے ڈراوا دیتے ہو۔"

"اچھی طرح سوچ لو عینی! تمہارا ماضی بے نقاب ہوجائے گا۔"

"میرے ماضی میں ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ حلق کے بل چیخی۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی' پھر ایاز کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی "اوکے جان! اگر تم ایسا چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

عینی کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی اور کانپتی رہی۔ غم و غصے سے اس کی حالت پتلی ہورہی تھی۔ پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔۔۔ غصے کی تند و تیز لہر کے بعد اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ کچھ بے نام سے اندیشے اس کے دل و دماغ پر حاوی ہورہے تھے اور مستقبل قریب کی شکل اسے بگڑی بگڑی نظر آنے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگی اگر واقعی ایاز فون بند کرنے کے بعد اختر زمانی کے پاس اس کے آفس پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔ اختر زمانی اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ ایک شوہر کی محبت تھی۔ اس محبت بھرے رشتے کی بنیاد کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ہوتی ہے۔ اس ٹکڑے کو پھاڑ دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ اختر زمانی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

وہ بے قراری سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور دبیز قالین پر ٹہل رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ پھر اس نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اس نے الماری سے اپنی چیک بک نکالی اور واپس فون سیٹ کے پاس آبیٹھی۔ اس کے پاس ایاز کا نمبر موجود تھا۔ اس نے ایاز کو رنگ کیا مگر وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ ایاز کے بجائے فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔ ملازم نے بتایا کہ صاحب ابھی اپنی گاڑی پر بیٹھ کر نکلے ہیں۔

عینی کے سینے میں دل برف کا گولہ سا بن کر رہ گیا۔ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر اعلان کرنے لگی کہ ایاز گاڑی لے کر اس کے شوہر کی طرف گیا ہے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ اگر عینی کے اندیشے درست تھے تو پھر اس کی ازدواجی زندگی تباہی کے کنارے پر تھی۔ ایک دم جیسے اس کے اندر سے لہر سی اٹھی۔ اس نے چیک بک اپنے پرس میں ڈالی' پرس کے اندر سے گاڑی کی چابی نکالی اور گیراج کی طرف دوڑی۔

چند ہی لمحے بعد وہ اپنی شیراڈ کار پر تیزی سے اختر زمانی کے آفس کی طرف جارہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایاز کو اپنے شوہر تک پہنچنے سے پہلے روک لے۔ جتنی تیز رفتاری سے گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ عینی کا ذہن سوچ کی شاہراہ پر بھاگ رہا تھا۔ یہ معکوس سفر تھا۔ اس کے ذہن کا رخ ماضی کی طرف تھا۔ چار پانچ سال پہلے کے واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہورہے تھے۔ عینی اور ایاز ایک دوسرے کو کالج کے زمانے سے چاہتے تھے۔ دونوں خوش حال اور آزاد خیال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کی رفاقت میں رہتے تھے بلکہ ایک مرتبہ تو وہ حیلے بہانے سے ایک ہل اسٹیشن پر بھی اکٹھے وقت گزار چکے تھے۔ ان کے تعلقات دو تین سال تک بخوبی چلتے رہے تھے' پھر بتدریج عینی میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔۔۔ اس کی زندگی میں اختر زمانی داخل ہوگیا۔ اختر زمانی' عینی کے والد مرحوم کے ایک دوست کا بہت لائق فائق اور ذہین بیٹا تھا۔ وہ عینی سے کم از کم چودہ پندرہ سال بڑا تھا اور اس کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ عینی اس وقت اسکول گرل تھی جب اختر زمانی اپنی بیوی کے ساتھ امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔۔۔ ٹیکسٹائل کے کئی اعلیٰ کورسز کیے اور اس شعبے میں نام کمایا۔ امریکا میں قیام کے دوران میں ہی گھریلو جھگڑوں کے سبب اختر زمانی کی اپنی بیوی

سے علیحدگی ہوگئی تھی۔ بعد ازاں یہ علیحدگی طلاق میں بدل گئی۔ اختر زمانی کی صرف ایک ہی بچی تھی جو اس کی بیوی کے پاس ہی رہی۔ اختر زمانی امریکا چھوڑ کر واپس پاکستان آگیا۔ یہاں اس نے ٹیکسٹائل کا اپنا کام شروع کیا' جو بڑی تیزی سے پھلا پھولا اور دو تین سال کے اندر ہی اختر زمانی کا شمار ملک کے اہم صنعت کاروں میں ہونے لگا۔ کچھ تقریبات میں عینی کی ملاقات اختر زمانی سے ہوئی۔ وہ اب ایک ۴۵ سالہ شخص تھا' پیشانی سے بال اڑ چکے تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے عینک لگاتا تھا۔ پھر بھی اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی جو عینی کو غیر محسوس طور پر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ وہ اس کشش کو کوئی واضح نام نہیں دے سکی۔ کبھی اسے لگتا کہ اختر زمانی سے اس کا تعلق دوستی کے زمرے میں آتا ہے' کبھی وہ محسوس کرتی کہ ایاز چونکہ اب اسے پہلے والی محبت اور توجہ نہیں دیتا لہٰذا وہ بھی اس سے دور ہوتی چلی جارہی ہے' اور یہ دوری اسے اختر زمانی کے قریب لارہی ہے۔ بہرحال یہی وہ وقت تھا جب وہ قدم بہ قدم اختر زمانی کے قریب ہوتی چلی گئی اور ایاز سے اس کی چار پانچ سالہ رفاقت دھندلا کر معدوم ہوگئی۔ اختر زمانی نرم خو اور دھیمے مزاج کا شخص تھا۔ اس کی محبت ایک پُرسکون ندی جیسی تھی۔ اس کے برعکس ایاز کا پیار اسے تند و تیز کوہی نالے جیسا لگتا تھا۔ کوہی نالا جو ڈھلوانوں سے اترتا ہے تو اچھلتا کودتا اور شور مچاتا لیکن موسم بدلتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے خشک بھی ہوجاتا ہے۔ بے شک اختر زمانی عمر میں عینی سے کافی بڑا تھا' مگر اس کی یہ کمی اس کی غیر معمولی خوش حالی پوری کرتی تھی۔ وہ نہایت شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ امریکا اور یورپ کے ٹوریوں لگاتا تھا جیسے لاہور میں جنرل اسٹور چلانے والے اکبری منڈی یا شاہ عالمی جاتے ہیں۔

جلد ہی عینی اور اختر زمانی شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ شروع شروع میں عینی کو اندیشہ تھا کہ ایاز کسی شدید ردِعمل کا اظہار کرے گا مگر شادی کے بعد جوں جوں دن ہفتے اور مہینے گزرتے گئے' عینی کے اندیشے کم ہوتے گئے۔ قریباً ایک برس گزر گیا اور انہی دنوں عینی سے وہ غلطی ہوئی جو... ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ نجانے اس روز عینی کے دل کا موسم کیسا تھا کہ اس نے اپنے پرانے محبوب ایاز کو ایک طویل خط لکھ مارا۔ اس میں پرانی یادوں کو تازہ کیا گیا تھا۔ ان محبت بھرے جذبات کا ذکر تھا جو وہ اب بھی ایاز کے لیے دل میں رکھتی تھی۔ اس خط میں عینی نے بہت سے شکوے بھی کیے تھے۔ ظاہر ہے ان میں سب سے بڑا شکوہ یہی تھا کہ ایاز

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے

روشنی کے مینار

قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ

عظمت کے مینار

قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے' جن کی آپ کو تلاش ہے۔

ایمان کا سفر

قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔

کچرا گھر

قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو پاکیزگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں

آدھا چہرہ

قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

جرائم' جادو' شیطان' ازم' ارواح' طنز و مزاح' اسرار و خوف' سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں

کالی کہانیاں

قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے۔

نک ویلوٹ کی چوریاں

قیمت جلد اول، دوم جلد ۱۲۰ روپے

ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس ۲۳ سعید منزل نمبر ۱ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ۱

نے دیگر "مصروفیات" میں گم ہو کر عینی کو نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی اختر زمانی کی طرف مائل ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں اس نے ایاز کو لکھا تھا کہ اب ان دونوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیں اور ماضی کی یادوں کو ایک قیمتی اثاثے کی طرح اپنے پاس محفوظ کرلیں۔

ایاز کے نام عینی کے اس آخری خط کو اب قریباً دو سال ہو چکے تھے۔ عینی ان معاملات کو اب قریباً قریباً فراموش کر چکی تھی..... انسان حالات کو فراموش کردیتا ہے لیکن حالات اکثر انسان کو فراموش نہیں کرتے۔ عینی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اب شادی کے تین سال بعد اچانک ایاز نے عینی سے رابطہ کیا تھا اور اسے بلیک میل کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ اس نے بزنس کے سلسلے میں گاہے گاہے عینی کے شوہر اختر زمانی سے بھی ملنا شروع کردیا تھا اور کبھی کبھی ان کے گھر بھی آنے لگا تھا۔ اس نے پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں عینی کو بتایا تھا کہ وہ دبئی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس سلسلے میں اسے بطور قرض کچھ رقم درکار ہے۔ پھر وہ لگی لپٹی کے بغیر اپنا مطالبہ سامنے لے آیا تھا۔ اس نے عینی سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اس کے لیے پچاس لاکھ روپے کا انتظام کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکی تو اس کی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ عینی کے وہ تمام خطوط اختر زمانی کے حوالے کردے گا جو عینی نے اسے شادی سے پہلے لکھے تھے اور وہ خط بھی جو شادی کے بعد لکھا تھا۔

..... یہ تمام خیالات پانچ دس منٹ کے اندر عینی کے ذہن سے گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی کار بھی چیرنگ کراس سے گزر کر فاطمہ جناح روڈ پر آچکی تھی۔ اس کے شوہر اختر زمانی کا آفس اب صرف ڈیڑھ دو کلو میٹر کی مسافت پر تھا۔ عینی نے خاصی تیز ڈرائیونگ کی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ ایاز سے پہلے اختر زمانی کے آفس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی..... لیکن جونہی وہ جیل روڈ جانے کے لیے پلازا سینما والے چوراہے سے بائیں جانب مڑی' ٹریفک جام کے سبب اسے رکنا پڑا۔ کوئی چھوٹا موٹا ایکسیڈنٹ ہوا تھا لیکن ٹریفک دور تک رکی ہوئی تھی۔ عینی کی جھنجلاہٹ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ وہ ہارن پر ہارن دیتی رہی لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اس "ٹریفک جام" سے نکل سکی۔ جس وقت وہ اپنے شوہر کے آفس پہنچی' اسے گھر سے نکلے ہوئے قریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ آفس سے باہر پارکنگ میں ایاز کی سرخ سوزوکی کار دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی اور اس کا دل چاہا کہ وہ اندر جا کر ایاز پر ٹوٹ پڑے۔ اس کی جان لے لے یا اپنی جان دے دے۔ مگر یہ صرف ارادہ تھا' اسے عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں تھا۔

وہ کار سے اتری اور اپنے آپ میں کھولتی ہوئی آفس کی طرف گئی۔ ابھی وہ دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھی کہ آفس کا دروازہ کھلا اور اس نے ایاز کو دیکھا۔ وہ اختر زمانی سے رخصت ہو کر باہر نکل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی مدھم مسکراہٹ عینی کو دنیا کی کریہہ ترین مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ ایاز نے عینی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ عام سے انداز میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ پیش آنے والے لمحات کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں کھنچ گیا تھا اور یہ نقشہ اتنا بھیانک تھا کہ عینی کی پیشانی پر ابھی سے پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں.....

اختر زمانی ٹیکسٹائل کا کام کرتا تھا اور ایاز کا کام ایڈورٹائزنگ کا تھا۔ عینی جانتی تھی کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کبھی کبھار اختر زمانی سے ملتا رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خوش خیالی جنم لینے لگی کہ شاید..... شاید وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں ہی اختر زمانی سے ملنے آیا ہو۔ لیکن اس خوش خیالی کی عمر سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ تو کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنے والی بات تھی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہونا ہی تھا۔ عینی نے اپنے ڈولتے ہوئے دل و دماغ کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آفس کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اپنی وسیع و عریض میز کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک کھلی ہوئی فائل پر تھیں لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کا ذہن کہیں بہت دور ہے۔

عینی کو دیکھ کر وہ چونکا۔ کچھ دیر ساکت نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گمبھیر آواز میں بولا "عینی! تم یہاں؟"

عینی نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے شوہر کے سامنے بیٹھ گئی اور پرس اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خاموشی کے پیچھے ایک طوفان ہے' جو کسی بھی وقت بپھر کر سامنے آسکتا ہے۔ لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ اختر زمانی کی نگاہیں بیوی کے حسین چہرے پر تھیں۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ جسم کے ہر مسام سے پسینہ ابل پڑا تھا۔ اختر زمانی نے ایک بار پھر گمبھیر آواز میں اسے مخاطب کیا "عینی! کیا بات

ہے۔ تم کچھ... پریشان لگ رہی ہو۔"

اس نے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا اور بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلا "زمانی! آپ چھپانے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟ ایاز نے آپ سے کیا بات کی ہے؟"

اختر زمانی نے حیرت سے کہا "کیسی بات؟"

"وہی بات' جو ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ دونوں کے درمیان ہوئی ہے۔"

اختر زمانی کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں "بھئی! میں تمہاری بات سمجھ نہیں پارہا۔ ایاز کام کے سلسلے میں ہی میرے پاس آیا تھا۔ وہ دبئی میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے' اس بارے میں بات کررہا تھا۔ مجھ سے اسائن منٹ وغیرہ کی توقع کررہا ہے۔"

عینی کی آنکھیں شوہر کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھوں کے راستے اس کے دل تک پہنچنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو نارمل رکھے ہوئے تھی لیکن اس کے دل و دماغ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ کیا واقعی ایسا ہوچکا تھا۔ کیا واقعی ایاز نے اختر زمانی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا کہ وہ عینی کو دھمکی آمیز فون کرنے کے فوراً بعد اختر زمانی کے آفس چلا آیا تھا اور اس سے تنہائی میں ملاقات کی تھی۔ عقل یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی لیکن صورتِ حال اسی سمت میں اشارہ کررہی تھی۔

اختر زمانی نے تھرماس میں سے ٹھنڈا پانی نکالا اور گلاس عینی کے سامنے رکھا "تم بے حد اَپ سیٹ نظر آرہی ہو ڈارلنگ... کیا ایاز کے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے۔ مم... میرا مطلب ہے کہ تم دونوں تو ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں ہو۔ پھر کیا مسئلہ ہوگیا ہے تمہارے بیچ؟"

عینی نے بڑی کوشش سے خود کو سنبھالا۔ ایک گہری سانس لے کر بولی "نہیں... ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"مگر تم نے ابھی کہا ہے کہ ایاز نے مجھے کوئی خاص بات بتائی ہے اور میں اسے چھپانے کی کوشش کررہا ہوں۔"

وہ سٹپٹا گئی "پتا نہیں... میرے دماغ میں خوامخواہ کیا وہم آگیا تھا۔"

"چلو وہم ہی سہی ڈارلنگ... مگر بتاؤ تو۔"

عینی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ کراہتے ہوئے بولی "میں آپ کو بتاؤں گی زمانی... لیکن پلیز... ابھی مجھے مجبور مت کریں..."

"تم مجھے الجھن میں ڈال رہی ہو۔"

"اوہ کم آن زمانی... یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ پلیز ٹیک اٹ ایزی۔" اس نے شوہر کے ہاتھ اپنے ملائم ہاتھوں میں تھام لیے اور موضوع بدلنے کی بھرپور کوشش کرنے لگی۔

○☆○

گھر آکر عینی مسلسل یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایاز نے اس کے شوہر سے ہنگامی ملاقات کرنے کے باوجود اپنی دھمکی کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا... کیا ایاز خود بھی تذبذب کا شکار تھا۔ یا پھر کاری وار کرنے کے لیے وہ کسی بہتر موقع کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ عینی جانتی تھی کہ ایاز کے ہر کام میں زبردست پلاننگ ہوتی ہے اور وہ قدم اٹھانے سے پہلے سیکڑوں مرتبہ سوچتا ہے... اس کے علاوہ ایک اور امکان بھی ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ عینی کو دھمکی آمیز فون کرنے کے بعد ایاز غصے میں بھرا ہوا اختر زمانی کے پاس آیا ہو لیکن یہاں حسبِ معمول اختر زمانی نے کوئی ایسی کاروباری بات کہہ دی ہو جس میں ایاز کو فائدہ ہی فائدہ نظر آیا ہو۔ لہٰذا اس نے فی الوقت اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہو۔ ایسے ہی مختلف امکانات موجود تھے۔

شام کو اختر زمانی گھر آیا تو بالکل ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ عینی اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھتی رہی مگر اس کے رویّے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اختر زمانی ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتا تھا تو میوزک سنتا تھا۔ اپنی طرح اسے میوزک بھی "سوبر" قسم کا ہی پسند تھا۔ پختہ گائیکی کے بچ والے گانے' اساتذہ کی غزلیں یا پھر کبھی کبھار کلاسیکل پرانے فلمی نغمے۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا تو ایک کلاسیکل پاکستانی نغمہ بجنے لگا۔ بھولی ہوئی ہوں داستان گزرا ہوا خیال ہوں۔ ایسے نغموں سے عینی کو چڑ تھی... ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اختر زمانی کا دھیان اپنے بریف کیس کی طرف چلا گیا۔ وہ بریف کیس کھولتے ہوئے بولا "میں بھول ہی گیا۔ ہماری شادی کی سالگرہ پر ایاز یہ کارڈ دے گیا تھا ہمارے لیے۔"

عینی نے لرزتے ہاتھوں سے کارڈ تھام لیا۔ یہ ایک خوب صورت "ویڈنگ ڈے" کارڈ تھا۔ نیچے ایاز کے دستخط تھے۔ کارڈ دیکھ کر عینی کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ اس معاملے کو ایک بالکل دوسرے رنگ میں دیکھ رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس کارڈ کے ذریعے ایاز نے اسے دھمکی آمیز پیغام پہنچایا ہو۔ اس نے عینی کو بتایا ہو کہ دیکھو آج دوپہر تمہیں فون کرنے کے بعد میں تمہارے شوہر کے پاس گیا

تھا' اس سے باتیں بھی کی تھیں' لیکن وہ بات نہیں کی جو تمہاری ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ لہٰذا ابھی بھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔

اگلے روز بھی عینی کا دل انجانے خدشے کے تحت دھڑکتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ ایاز کا فون پھر آئے گا' لیکن شام تک خیریت گزری' فون نہیں آیا۔ شام کو اختر زمانی..... گھر آیا... تو خاموش خاموش تھا۔ عینی نے اس کے لیے چائے بنوائی' ہلکی پھلکی باتیں کیں اور پھر دونوں ٹہلنے کے لیے لان میں چلے گئے "تم نے مجھے کل سے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔" اختر زمانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "یا تو آدمی کو بات کرنی نہیں چاہیے یا پوری کرنی چاہیے۔"

"کیسی بات؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

"وہی بات جو کل آفس میں ہوئی تھی۔ میرا نہیں خیال کہ تم اتنی جلدی بھول گئی ہو۔" اختر زمانی کے لہجے میں خفگی تھی۔

عینی نے ایک سیکنڈ کے لیے اختر زمانی کو گہری نظروں سے دیکھا' پھر ایک دم اس کے تاثرات بدلے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس کی شوخ چلبلی ہنسی کسی فوارے کی پھوار کی طرح لان میں بکھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ اختر زمانی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ عینی نے ایک انداز دلربائی سے شوہر کا بازو تھاما اور اپنا رخسار اس کے کندھے سے لگا دیا۔

"کبھی کبھی تو آپ بھی میری طرح خبطی ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"چھوٹی سی بات تھی تو پھر تم بھاگی ہوئی میرے دفتر کیوں چلی آئی تھیں؟"

"ڈارلنگ! میں نے کہا ہے ناں کہ میں تو خبطی ہوں۔ لیکن پلیز آپ تو ایسے نہ بنیں۔"

"مگر ہوا کیا تھا؟" اختر زمانی نے سٹپٹائے لہجے میں پوچھا۔

وہ پھر دلنشیں انداز میں ہنس دی "جان! بات تو کچھ زیادہ اہم نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے آپ سے ڈر لگنے لگا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ خفا ہوں گے لہٰذا پاگلوں کی طرح بھاگی ہوئی آپ کے پاس چلی آئی۔"

"بھئی بات بھی تو بتاؤ ناں کہ کیا تھی؟"

"ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"ٹھیک ہے' نہیں ہوں گا۔"

"میں نائیلہ کے گھر گئی تھی۔"

"اچھا وہی تمہاری گلبرگ کالونی والی سہیلی۔"

"جی ہاں۔ ایاز نے مجھے اس کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی سوزوکی کار میں تھا اور کار کا رخ تھا جناب عالی! آپ کے آفس کی طرف۔ مجھے لگا کہ یہ شخص جاتے ہی آپ کو اس بارے میں بتائے گا اور آپ آگ بگولا ہو جائیں گے۔ پورے کے پورے۔ سر سے پاؤں تک۔ جیسے پچھلی دفعہ ہوئے تھے۔"

"پچھلی دفعہ کب؟"

"ہاں آپ کو کب یاد ہوگا۔ روتی تو میں رہی تھی رات بھر۔ سالگرہ تھی نائیلہ کی۔ آپ سے ڈرتے ہوئے آپ کو بتایا بھی نہیں تھا۔ صرف آدھے گھنٹے کے لیے چلی گئی تھی۔ اسی "ایاز صاحب" نے دیکھ لیا تھا اور آپ سے ذکر کر دیا تھا۔ آپ نے گرج گرج کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔"

اختر زمانی بولا "گرجنے برسنے کو تو اب بھی دل چاہ رہا ہے لیکن تم سے خفا نہ ہونے کا وعدہ کیا ہے لہٰذا چپ رہنے پر مجبور ہوں۔ باقی یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مجھے اس لڑکی سے چڑ ہے۔ اور اس جیسی جو اور دو تین تمہاری سہیلیاں کہلاتی ہیں' ان سے بھی چڑ ہے۔ اور یہ کوئی ذاتی عناد نہیں ہے' اصولی اختلاف ہے۔ عینی! عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے اور شرم و حجاب اس کا زیور ہے۔ نت نئے فیشن کر کے لور لور پھرنے والی لڑکیوں کو میں تو سر آنکھوں پر بٹھانے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ تم نائیلہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو۔ لیکن یہ انفرادیت تا دیر برقرار نہیں رہتی۔ انسان جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے ان کا رنگ اس پر چڑھتا ضرور ہے۔"

"ڈارلنگ! وہ بھی تو میرے پاس اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا رنگ ان پر چڑھ جائے۔"

"یہ عمل یک طرفہ نہیں ہوتا۔ انسان اپنے ملنے جلنے والوں سے کچھ لیتا ہے تو دیتا بھی ہے۔ اور دیتا ہے تو لیتا بھی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ ان لڑکیوں کا رنگ ڈھنگ تمہارے اندر نظر آنے لگے۔ اب تمہارے دو تین لباس ایسے بھی ہیں جو مجھے بالکل پسند نہیں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ لباس اپنانے میں تم نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی ان سہیلیوں کو FOLLOW کیا ہے۔ پلیز ناؤ اسٹاپ اٹ۔ بہت ہو چکی ہے اب۔ مجھ پر اور میری محبت پر رحم کرو۔"

آخری الفاظ اختر زمانی نے تقریباً مسکراتے ہوئے کہے تھے' لہٰذا عینی کی چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں۔ ویسے بھی وہ اندر سے تو خوش ہی تھی کہ اس کا ایک بدترین اندیشہ باطل ثابت ہو گیا تھا۔

اس کے بعد آنے والے ہر دن میں عینی کی بے چینی کم ہوتی گئی۔ اختر زمانی نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی دوسری طرف ایاز کی طرف سے بھی دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا گیا تھا۔ عینی دل ہی دل میں دعا گو رہنے لگی کہ حالات جوں کے توں رہیں اور ایاز اپنے پروگرام کے مطابق دبئی شفٹ ہوجائے۔ انگریزی کا یہ مقولہ ان دنوں عینی کو بہت اچھا لگ رہا تھا کہ کسی خبر کا نہ ہونا ایک اچھی خبر ہے۔

اور پھر ایک روز سچ مچ عینی کی سنی گئی۔ اپنی سہیلی نائیلہ ہی کی زبانی عینی کو پتا چلا تھا کہ ایاز دو ہفتے پیشتر دبئی جاچکا ہے اور وہاں ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اس اطلاع کے بعد عینی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کی یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب شاید ایاز کی پریشان کن آواز اس کے کانوں میں کبھی نہ پڑے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ اختر زمانی کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھے ہوئے عینی کو اب پانچ چھ سال ہونے کو آئے تھے' تاہم ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایک وجہ عینی کا لاابالی پن اور آزاد خیالی تھی۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی میں موو کرتی تھی جسے اختر زمانی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ' راست گو اور کسی حد تک مذہبی بھی تھا۔ وہ عورت کے چراغِ خانہ ہونے پر یقین رکھتا تھا اس کا شمعِ محفل ہونا اسے ہرگز قبول نہیں تھا۔ عینی کے خیالات برعکس تھے' بہرحال اس سلسلے میں حدود و قیود کو وہ بھی اہمیت دیتی تھی۔ میاں بیوی دونوں نے تھوڑا تھوڑا ایڈجسٹ کیا تھا اور تھوڑے تھوڑے تناؤ کی کیفیت میں ان کی ازدواجی زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طور گھسٹتی ہی جارہی تھی۔ کسی وقت جب عینی تنہا ہوتی تو اس کے پردۂ تصور پر ایاز کی شبیہہ ابھر آتی اور وہ واقعات تازہ ہوجاتے جو تین برس پہلے اس حوالے سے رونما ہوئے تھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ جاتی کہ اگر اس روز ایاز جوشِ غضب میں سچ مچ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتا تو کیا ہوتا۔ وہ اختر زمانی کو اب بہت اچھی طرح جاننے لگی تھی۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت اس کے اصولوں سے مشروط تھی۔ اگر اسے وہ سب کچھ معلوم ہوجاتا جو ایاز بتانے جارہا تھا تو اس کا ردِعمل یقیناً شدید اور نتیجہ خیز ہوتا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ میاں بیوی کے راستے جدا ہوجاتے۔ حالانکہ اس حوالے سے عینی نے اپنی پوزیشن بڑی ذہانت سے صاف کرلی تھی۔ اور اپنی طرف سے شوہر کو پوری طرح مطمئن کردیا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اختر زمانی کے دل کی گہرائی میں کہیں شک کا موہوم سایہ موجود ہے۔ ممکن تھا کہ اس شک کی وجہ..... وہ سوال ہو جو اس روز اچانک عینی کے منہ سے نکل گیا تھا جب وہ بھاگم بھاگ آفس پہنچی تھی تو اس نے ایاز کو اپنے شوہر کے آفس سے نکلتے ہوئے پایا تھا۔ عینی نے بے ساختہ شوہر سے پوچھ لیا تھا کہ ایاز اس سے کیا بات کرکے گیا ہے۔ عینی نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر اس روز یہ سوال اس کے منہ سے نہ نکلتا تو اچھا تھا۔ بے شک بعد میں عینی نے اپنے اس سوال کی بھی وضاحت کردی تھی مگر کہیں کوئی کمی ضرور رہ گئی تھی۔

..... اختر زمانی پہلے ہی عینی سے عمر میں بڑا تھا۔ کاروباری مصروفیات' ذہنی پریشانیوں اور تفریح کی کمی نے اس کے بال کچھ سفید کردیے اور میاں بیوی کی عمر میں موجود فرق زیادہ نمایاں نظر آنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اختر زمانی کی اصول پسندی میں اضافہ ہوگیا تھا جبکہ عینی نے اپنے آپ کو بدلنے کی مطلق کوشش نہیں کی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے سیلانی پن اور آزاد خیالی میں کچھ اور آگے نکل گئی ہے۔ میاں بیوی کے باہمی روابط بہت کمزور ہوچکے تھے اور کبھی کبھی تو وہ ہفتوں ناشتے کی میز پر بھی نہیں ملتے تھے۔ گھریلو فضا مکدر ہونے کی وجہ سے اختر زمانی کے مزاج میں ہلکا سا چڑچڑا پن آگیا تھا اور اس چڑچڑے پن کی وجہ سے عینی گھر اور شوہر سے کچھ اور بھی لاتعلق ہوگئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی کو متاثر کرنے میں اولاد کی کمی بھی اپنا کردار ادا کررہی تھی۔ انہوں نے کافی علاج معالجہ کرایا تھا' طبی نقطۂ نظر سے میاں بیوی ٹھیک ہی تھے پھر بھی ابھی تک اولاد کی نعمت سے سرفراز نہیں ہوسکے تھے۔ کسی ویران رات کو جب میاں بیوی ایک ہی کمرے میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوتے تو عینی ایک دم بہت اداس ہوجاتی۔ اسے لگتا جیسے وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں کسی کلاسیکل غزل کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ دھیمے سُروں میں گائی ہوئی ایک ایسی شاعری جس میں بہت کم اتار چڑھاؤ ہیں۔ ایسے میں ایاز کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کے تصور میں دمکنے لگتا۔ اس کی محبت اسے یاد آتی۔ کوہی نالے جیسی پُرشور' پُرجوش اور دل و دماغ میں تہلکہ مچاتی ہوئی..... وہ رازو نیاز' وہ نرم گرم شوخیاں' وہ جسارتیں..... اسے اندازہ ہوتا کہ ایاز کو کھو کر اس نے بہت کچھ کھویا ہے۔ امنگ ترنگ سے بھرے ہوئے ایک دریا کے کنارے سے اٹھ کر وہ ایک ٹھہرے ہوئے پانی کے پاس آبیٹھی تھی اور زندگی کے چھ سات سال گزار دیے تھے۔ یہ پانی ایک شفاف ساکن جھیل جیسا ضرور تھا مگر اب وہ یہ شفاف ساکن منظر دیکھ دیکھ کر تنگ

آچکی تھی۔ یہ منظر اب اس کی نگاہوں میں گدلا ہونے لگا تھا۔

ہر شخص میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اختر زمانی میں بھی کئی خامیاں تھیں۔ اب یہ خامیاں عینی کی نگاہ میں بری طرح کھٹکتی تھیں۔ ان میں سے ایک خامی یہ تھی کہ وہ ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کرپاتا تھا۔ اس کی مزاحمت بے شک دھیمی اور شائستہ رہتی تھی لیکن یہ مزاحمت جاری رہتی تھی۔ اب عینی کی دوستوں والا معاملہ ہی دیکھا جاتا تو اس میں اختر زمانی بدستور مزاحمت پیش کررہا تھا اور اس میں کبھی بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے اچھے یا برے اصولوں کو سینے سے لگا کر رکھنے والے شخص کے طور پر سامنے آیا تھا۔ عینی جب ایاز کے بارے میں سوچتی تو ایک بالکل مختلف صورتِ حال اس کے سامنے آتی۔ ایاز نے عینی کی خاطر ماحول سے کتنی زبردست مطابقت پیدا کی تھی اور اپنے پر جبر کرکے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ اس کے پاس عینی کو بلیک میل کرنے کے لیے کافی مواد موجود تھا۔ وہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو عینی سے خطیر رقم بٹور سکتا تھا اور نہ بٹور سکتا تو اس کی زندگی کو تہ و بالا کرسکتا تھا لیکن قدرت رکھنے کے باوجود وہ اس انتہا تک نہیں گیا تھا اور خاموشی سے پسپائی اختیار کرلی تھی۔ وہ محبت کو رسوا کرنے کے فعل سے باز رہا تھا اور عینی کو اس کے حال پر چھوڑ کر دبئی چلا گیا تھا۔

کئی ہفتوں بلکہ مہینوں کے لیے عینی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی سوچیں اپنے شوہر اور اپنے سابقہ محبوب کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے مگر مسلسل اپنے شوہر کی محبت و توجہ سے محروم ہوتی جارہی تھی یا شاید اسے لگ رہا تھا کہ وہ محروم ہوتی جارہی ہے۔ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی تھی' اتنا ہی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اور اختر زمانی کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ہے۔۔۔ ٹھہری ہوئی جھیل کے ٹھہراؤ اور گہرائی سے اسے اب کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے اچھلتا کودتا' گنگناتا پانی درکار تھا۔ اور پھر ایک موقع آیا کہ ان دونوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجائیں۔۔۔ ضروری کارروائی کے بعد ان دونوں میں طلاق ہوگئی۔ ایک مکان' اسلام آباد میں ایک پلاٹ اور تین لاکھ کی گاڑی عینی کے نام تھی۔ اس کے علاوہ زیورات وغیرہ بھی تھے۔ وہ خود کو مالی طور پر محفوظ تصور کررہی تھی۔ اختر زمانی ایک نرم مزاج۔۔۔ محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر تھا۔ اس سے جدا ہو کر عینی کو قلق تو ہوا لیکن یہ زیادہ دیرپا نہیں تھا۔ بہت جلد اس نے خود کو ایڈجسٹ کرنا شروع کردیا۔۔۔ زندگی ایک تند و تیز موڑ کاٹ کر پھر ہموار سیدھے راستے پر چلنے لگی تھی۔

○☆○

یہ طلاق سے نو دس ماہ بعد کا واقعہ ہے' ایک روز عینی دبئی ائرپورٹ پر اتری۔ عینی کو ریسیو کرنے کے لیے اس کی ایک دیرینہ سہیلی نادو ائرپورٹ پر موجود تھی۔ نادو اپنے بنگلہ دیشی بینک کار شوہر کے ساتھ دبئی میں ہی رہتی تھی۔ عینی کا یہ دورہ تفریحی نوعیت کا تھا اس کے علاوہ وہ دبئی میں کچھ شاپنگ بھی کرنا چاہتی تھی لیکن پس پردہ اس دورے کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ ایاز سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا چاہتی تھی اور یہ جاننا چاہتی تھی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اب وہ اس کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی ہوچکی ہوگی' اس کے بال بچے ہوں گے۔ وہ اس کی زندگی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس ایک جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزرنا چاہتی تھی اور اس کی خوشبو لینا چاہتی تھی۔ ایاز دبئی میں ایڈورٹائزنگ کا کام کررہا تھا' اس کا کھوج لگانا زیادہ دشوار نہیں تھا۔۔۔ دبئی پہنچنے کے بعد عینی نے اس سلسلے میں کوشش کی اور جلد ہی کامیاب ہوگئی۔ ایاز ایک مقامی شخص کے ساتھ مل کر کام کررہا تھا۔ اس نے بہت زیادہ ترقی تو نہیں کی تھی بہرحال ایک خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ عینی یہ جان کر حیران ہوئی کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔

ایاز کا دفتر ایک کم آبادی والے علاقے میں تھا۔ ایک دو روز میں عینی کو اس کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی معلوم ہوگیا۔ عینی اس سے یوں ملنا چاہتی تھی کہ یہ ملاقات سرپرائز کی شکل اختیار کرجائے۔ ایک عجیب سی امنگ ترنگ اس میں جاگی ہوئی تھی۔ وہ خود کو پھر سے ایک نوجوان لڑکی محسوس کررہی تھی۔ وہ لڑکی جو کالج جاتی تھی۔ شاعری پڑھتی تھی اور ایاز نام کے ایک خوب صورت نوجوان کو دیکھ کر جس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ اپنی اس کیفیت کو وہ خود بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پارہی تھی۔

اس نے بازار سے جدید تراش کا ایک سیاہ برقعہ لیا اور ایک دوپہر خراماں خراماں "ایاز ایڈورٹائزنگ" کے آفس پہنچ گئی۔ ایاز سے اس کی ملاقات ایک سجے سجائے دفتر میں ہوئی۔ وہ ایک کلائنٹ کی حیثیت سے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ ایاز کی کنپٹیوں پر چند سفید بال نظر آنے

لگے تھے' بہرحال وہ پہلے ہی کی طرح صحت مند اور تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مونچھیں پہلے سے گھنی ہوگئی تھیں اور آواز بھی کچھ بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے عینی نے چہرے پر سے نقاب ہٹا دیا۔ آنکھوں کی طرح اس کا پورا چہرہ ایاز پر عیاں ہوگیا۔ ایاز کا منہ کھلا رہ گیا اور چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئیں۔

"تم عینی؟" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"کیوں تمہارا کیا خیال تھا کہ میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں۔"

"نہیں... نہیں۔ لیکن میں... سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم... یوں۔"

"سوچ تو میں بھی بہت کچھ نہیں سکتی تھی لیکن وہ سب کچھ ہوا اور میرے سامنے ہوا۔"

ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بات کو کہاں سے اور کیسے شروع کریں۔ ایاز نے کافی منگوائی۔ وہ کافی کی پیالیوں پر جھک گئے اور ماضی کو کھنگالنے لگے۔ ماضی جو ان کی نظروں کے سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ماضی دو مہیب ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک ٹکڑا عینی کے پاس تھا اور دوسرا ایاز کے پاس۔ وہ ان ٹکڑوں کو جوڑنے میں مصروف ہوگئے۔

ایاز سے عینی کی دوسری ملاقات ایاز کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ رہائش گاہ اس کے آفس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ وہ ایک صاف ستھرا اور کشادہ ولا تھا۔ دبئی جیسے شہر میں ایسے مکان کا مل جانا خوش قسمتی کی بات تھی۔ ان دونوں نے سرسبز لان میں بیٹھ کر شام کی چائے پی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں صوفوں پر براجمان ہو کر مصری فلم دیکھتے رہے۔ عینی جلد لوٹنا چاہتی تھی لیکن ایاز نے بڑی خوب صورتی سے اسے باتوں میں الجھائے رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عینی رات کا کھانا کھا کر جائے۔ وہ اپنے لبنانی خانساماں کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا اور اپنی اس قصیدہ خوانی کا ثبوت بھی فراہم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فروزن ٹراؤٹ مچھلی پکانے میں اس کے خانساماں کا ثانی دور دور نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران میں عینی نے دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایاز نے کسی نہ کسی بہانے اسے روک لیا۔ وہ بات سے بات نکالنے کا فن جانتا تھا اور عینی تو ہمیشہ سے اس کی باتوں میں یوں گم ہوتی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی کھو دیتی تھی۔ دبیز قالینوں اور خوب صورت پردوں والے اس ائر کنڈیشنڈ گھر میں بیٹھ کر مسلسل گفتگو کرنے کے لیے ان کے پاس بہت سا مواد تھا۔ سات آٹھ برس کی باتیں تھیں جو ایک جگہ جمع ہو چکی تھیں۔ عینی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی اور خاص طور سے ان واقعات کے بارے میں جو پانچ برس پہلے ایاز کی دھمکی آمیز ٹیلی فون کالز سے شروع ہوئے تھے اور اچانک ختم ہوگئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے ایاز کو ان موضوعات کی طرف لا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے عینی کو دفعتاً اندازہ ہوا کہ ایاز کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ آگئی ہے۔ وہ نشے میں محسوس ہو رہا تھا۔ باتوں کے دوران میں وہ دو تین دفعہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تھا' یقیناً اس نے ڈرنکس لیے تھے۔

"تم ڈرنک کر رہے ہو؟" عینی نے پوچھا۔

"ہاں... کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ شاید یہ بھی تمہارا ہی دیا ہوا روگ ہے۔"

"کیوں۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے کیا نہیں کیا؟" وہ تشفی انداز میں مسکرایا "تم نے سب کچھ کیا ہے۔"

اس کا ہاتھ بے تکلفی سے عینی کے ہاتھ پر آگیا۔ عینی لرز کر رہ گئی۔ ایاز کی پیش قدمی کا یہ انداز عینی کے لیے تشویش ناک تھا۔ اس نے بارہا ایاز کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کے اندر جھانکا تھا۔ لیکن ان آنکھوں کی تہ میں جو کچھ آج نظر آرہا تھا وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ ان آنکھوں میں ایک بھوکے شخص کا عکس تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے منہ سے طلب کی شدت سے رال بہہ رہی تھی۔ اور جو بڑی ہی "ضرورت مند" نظروں سے اس کے آر پار دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد عینی بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایاز نے جراٴتِ رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ عینی کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر ایک تند جھٹکے سے وہ اسے اپنے قریب لے آیا۔ الکحل کا بھبکا عینی کے نتھنوں سے ٹکرایا۔

"پلیز ایاز... یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تم جانتی ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ تم سے زیادہ تو شاید میں بھی نہیں جان سکتا۔"

وہ اس پر جھکتا چلا گیا۔ عینی نے مزاحمت پیش کی لیکن وہ ایک ایسے بپھرے ہوئے مرد کی گرفت تھی جو نشے میں بھی تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج کی نیم تیرگی میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ اس نے چلّانا چاہا لیکن ایک طاقت ور ہاتھ کی سخت ہتھیلی نے اس کے ہونٹ ڈھانپ لیے۔ پھر اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ کوہی نالے کا شور اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

... اس کے حواس دوبارہ بحال ہوئے تو وہ ایک نیم

تاریک کمرے میں تھی۔ یہ کمرا اسی وسیع مکان کا حصہ تھا جہاں ایاز کے ہاتھوں اس پر قیامت ٹوٹی تھی۔ وہ دروازے کی طرف لپکی۔ حسبِ توقع وہ باہر سے بند تھا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگی۔ ایک غنڈا صورت نوجوان کھڑکی میں نظر آیا۔ یقیناً وہ ایاز کا کوئی پاکستانی دوست تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی آہنی گرل سے لگایا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ بھری ہوئی تھی۔ اپنے ہونٹ سکوڑ کر اس نے عینی کو ایک نازیبا اشارہ کیا اور گنگنانے لگا۔ عینی نے کھڑکی ایک دھماکے سے بند کردی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ اس سے اندازے کی اتنی بڑی غلطی کیونکر ہوئی۔ وہ کیوں تن تنہا آگئی ایاز کے ساتھ اس چار دیواری میں۔

اسے اپنے تئیں مردم شناسی کا دعویٰ تھا' لیکن آج یہ دعویٰ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ اس شخص کو ہی نہیں سمجھ سکی تھی جو اس کی زندگی میں سب سے اہم تھا۔ اتنی بڑی غلطی۔ اس کا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ صبح تک بھوکی پیاسی اس کمرے میں بند رہی۔ اپنے اندرونی ہیجان سے گھبرا کر وہ کئی بار بلند آواز میں چیخی لیکن یہ مکان اتنا بڑا تھا کہ اس کی چیخ پکار باہر تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔۔۔ پھر وہ یہاں آتے ہوئے کسی کو بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔ اس کی سہیلی نادو سمیت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک ناقابلِ شکست جال میں پھنس چکی ہے۔ نجانے ایاز اسے چھوڑ کر کہاں غائب ہوگیا تھا اور وہ کن لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔ دوپہر دو بجے کے لگ بھگ کھڑکی پر دستک ہوئی' اس نے کھڑکی کھولی۔ دوسری طرف پھر وہی منحوس چہرہ نظر آیا جس نے رات اسے فحش اشارے کیے تھے۔ وہ پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ بال گھونگھریالے' رنگ سانولا اور آنکھوں میں کمینگی کی جھلک تھی۔ اس نے عینی کو دیکھ کر لفنگے انداز میں آنکھ میچی اور اپنے بے ڈھنگے دانتوں کی نمائش کرنے لگا "کیوں رانی! کچھ ہوش ٹھکانے آئے یا نہیں؟" وہ بولا۔

عینی نے ایک بار پھر کھڑکی جھٹکے سے بند کرنا چاہی لیکن اس نے گرل میں ہاتھ گزار کر اسے پٹ بند کرنے سے روک دیا۔ بازاری لہجے میں بولا "شہزادی! ہمارے قبضے میں ہو اور ہمی سے چھپ رہی ہو۔ یہ مکان ہمارا ہے اور یہ کمرا بھی ہمارا ہے۔ یہ تمہیں کب تک پناہ دے سکتا ہے۔ ہم سے دور رہو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ دو تین دن تک پیٹ میں روٹی نہ گئی تو یہ چاند سا مکھڑا مرجھا کر پیپل کے پتے جیسا ہوجائے گا۔"

"وہ کتا کہاں ہے؟" عینی نے زہرناک لہجے میں پوچھا۔

"شاید تم ایاز کو یاد کررہی ہو' لیکن یاد کرنے کا یہ انداز تو بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف اتنا پیار کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے لیے یہاں چلی آئی ہو اور ایک طرف اتنی ناراضگی کہ اسے انسان کہنا بھی گوارا نہیں۔"

"ہاں ہاں وہ انسان نہیں اور تم سب بھی جانور ہو۔ میں تھوکتی ہوں تمہارے منہ پر۔"

وہ غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تاؤ دلانے والی چمک تھی۔ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا "آخر تم چیز کیا ہو رانی۔ جلیبی کے مافق تمہارے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ جب تمہیں پتا تھا کہ ایاز تمہارے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی تمہیں بلیک میل کرچکا ہے۔ تمہارے خاوند کو تمہارے پریم پتر دکھا کر اس سے لمبی رقم بٹور چکا ہے۔ تو پھر تم کیوں اس کے پیچھے یہاں بھاگی چلی آئیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی ناں کہ آبیل مجھے مار۔"

زندگی بدل دینے والی

خواتین اور مردوں کو ہمیشہ فٹ اور اسمارٹ رکھنے والی، گھریلو ورزش کی مشینیں، موٹاپا ختم کرنے والی جاگنگ سائیکل، جمنازیم مشینیں، بنچ، بار بیل، ویٹ بار، ٹیبل ٹینس۔ نیز ٹی وی پر دکھائے جانے والے تمام فٹنس آئٹم مفت ٹریننگ وڈیو اور بعد از فروخت گارنٹی کیساتھ



بلال برادرس

A-119 سندھی مسلم سوسائٹی نزد طارق روڈ۔ کراچی

فون: 4531961 - 62

BB-7-98 marksman

عینی کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ یک ٹک غنڈا صورت نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "کیا کہہ رہے ہو تم۔ کس رقم کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو تیرے عاشق شوہر نے اپنی اور تیری عزت بچانے کے لیے ایاز کے حوالے کی تھی۔ مبلغ ۳۵ لاکھ نصف جن کے ساڑھے سترہ لاکھ ہوتے ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے عینی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا "تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کچھ پتا ہی نہیں۔ تم عورتیں واقعی چلبی کی طرح چکر دار ہوتی ہو۔ تمہارے چکر کھولنے کی کوشش میں بندے کا اپنا دماغ گھن چکر بن جاتا ہے۔"

عینی کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ جیسے کسی برق رفتار ہنڈولے میں بیٹھی تھی اور گھومتی چلی جا رہی تھی۔ پانچ سالہ ماضی ایک گٹھڑی کی طرح اس کے سامنے کھلتا چلا جا رہا تھا۔ اس گٹھڑی میں سے جو چیز بھی برآمد ہو رہی تھی وہ عینی کے لیے بالکل نئی تھی۔ آج یہ حقیقت اس پر پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ پانچ سال پہلے اس دھواں دھواں دوپہر کو ایاز اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے سے باز نہیں رہا تھا۔۔۔ اپنے سابقہ شوہر اختر زمانی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ خاموش ہونٹ' بردبار پیشانی اور بہت گہری آنکھیں' جن میں سمندر ڈوب جائیں اور نشاں تک نہ ملے۔

وہ حیرت زدگی کے عالم میں یہ سوچتی رہی کہ اس شخص نے پانچ برس تک اتنا اہم راز اس سے چھپائے رکھا۔ اپنے کسی فعل سے' اپنی کسی بات سے' کسی اشارے کنائے سے عینی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ وہ اس کے حوالے سے کتنے بڑے راز کا امین ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ عینی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو' وہ اپنی نگاہوں میں گر نہ جائے۔ اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پانچ برس تک بے خبری کا لبادہ اوڑھے رکھا۔ بے شک وہ عینی کے سلسلے میں بڑی حد تک حساس تھا مگر وہ اتنا بڑا رنج اپنے سینے میں چھپا گیا۔

یک لخت عینی کو خود پر بے حد ندامت ہونے لگی۔ پچھتاوے کی آگ نے پلک جھپکتے میں اس کے تن بدن کو لپیٹ میں لے لیا۔ آہ۔۔۔ وہ اختر کی محبت کو سمجھ نہ سکی۔ اس دل کو ہمیشہ کے لیے ٹھکرا کر چلی آئی جس میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ یہ ایک ایسے "پچھتاوے" کے آنسو تھے جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔

خبر نہیں کہ اس قید خانے میں عینی کے ساتھ کیا کچھ ہو جاتا اور کب تک ہوتا رہتا لیکن قدرت نے اس کی تھوڑی سزا کو زیادہ جانا۔ رات کسی پہر مکان میں ہلچل محسوس ہوئی۔ پھر کہیں قریب سے عینی نے ایاز اور اس کے دو دوستوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں سے عینی کو اندازہ ہوا کہ شہر کا یہ علاقہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ بنگلہ دیشی' انڈین اور کورین کال گرلز یہاں عام پائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں آئے دن چھاپے وغیرہ پڑتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی کسی ایسے ہی چھاپے کی کارروائی ہو رہی تھی۔ ایاز کی منحوس آواز عینی کے کانوں میں پڑی' وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "چھوڑ یار! خوا مخواہ کی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ نکالو اس حرام زادی کو یہاں سے۔۔۔ لیکن اچھی طرح سمجھا دینا' اگر کہیں شکایت کرے گی تو دبئی میں جہاں بھی ہو گی ڈھونڈ نکالیں گے۔۔۔ اور حشر خراب کر دیں گے۔۔۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات۔"

"اوکے ڈیئر۔" ساتھی کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی کوئی تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ یقیناً یہ ایاز ہی تھا۔

○☆○

قریباً چوبیس گھنٹے پہلے وہ ایاز کے ہمراہ جس چار دیواری میں بہت خوش خوش داخل ہوئی تھی وہاں سے مٹی کا ڈھیر بن کر نکلی۔ وہ لٹی پٹی ہوئی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور جسم و جاں پر جلتی ہوئی خراشیں تھیں۔ ایک لمبی سنسان سڑک پر وہ ڈگمگاتی ہوئی چلتی رہی۔ یہ سڑک اس کی زندگی ہی کی طرح بے سمت تھی۔ کسی نامعلوم مقام سے شروع ہو کر نامعلوم مقام تک پہنچتی تھی۔ عینی کے اردگرد دبئی کی روشنیاں تھیں مگر اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے تصور میں لاہور شہر کے در و دیوار تھے۔ ایک خوب صورت علاقے کا ایک خوب صورت مکان تھا۔ اس خوب صورت مکان کا ایک سجا سجایا کمرا تھا۔ اس سجے سجائے کمرے میں بیٹھا ہوا ایک اداس صورت شخص تھا۔ اس اداس صورت شخص کے سرہانے ایک ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس ٹیپ ریکارڈر پر کوئی تنہا تنہا اداس غزل چل رہی تھی۔ شاید اختر کی وہی پسندیدہ غزل

خبر تحیرِ عشق سن' نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا' جو رہی سو بے خبری رہی



بے خبری

طاہر جاوید مغل

اکثر لوگوں کو اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کی صورت اولاد کی کامیابی و کامرانی میں نظر آتی ہے... وہ چاہتے ہیں جو کچھ ان سے نہ ہوسکا ان کے بچے کر دکھائیں اور اس چاہ میں وہ بسا اوقات بہت آگے تک بڑھ جاتے ہیں۔

منفرد موضوعات کی کہانی پاتر اشنے والے طاہر جاوید مغل کا تازہ شاہکار

موسم ابر آلود تھا۔ دوپہر میں ہی شام کا سماں محسوس ہوتا تھا۔ وہ آرام دہ کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا دیوار گیر شیشے سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا پورا نام آصف عثمان تھا۔ عمر 70 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا وہ جگہ ''پیزا اپیاس'' کہلاتی تھی۔ پیزا اپیاس کی پانچ چھ شاخیں لاہور شہر میں موجود تھیں۔ پیزا کھانے کے شوقین ''پیزا اپیاس'' کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ آصف عثمانی پیزا اپیاس کا مالک تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور سڑک کو دیکھتا رہا۔ یہاں بیٹھ کر سڑک کو دیکھنا اس کا پرانا مشغلہ تھا۔ بعض اوقات اس مشغلے کے سبب اسے دلچسپ مناظر دیکھنے کو ملتے تھے..... جیسے آج ایک دلچسپ اور قابلِ توجہ منظر اس کے سامنے تھا۔ سڑک کے پار ایک انگلش میڈیم اسکول تھا۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ بیشتر بچے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے لیکن ایک عورت ابھی تک اپنے بچے کے انتظار میں پریشان تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے اسکول کے اندر بھی گئی تھی اور زیادہ پریشان ہو کر واپس آئی تھی۔ اب وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ ایک خوش رنگ چھتری اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

موبائل پر بات کرنے کے بعد عورت ایک بار پھر تیز تیز قدم اٹھاتی اسکول میں گئی۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی۔ وہ بدستور پریشان دکھائی دی۔ موبائل فون ایک بار پھر اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ فون بند کرکے کے بعد جواں سال عورت نے اسکول کے اردگرد کی دکانوں اور اسٹالز وغیرہ میں جھانکنا شروع کردیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس کا بچہ یہاں کہیں موجود ہوگا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا عورت کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اسی دوران بارش شروع ہوگئی۔ عورت نے چھتری کھولی اور پیزا پلیس کی سیڑھیوں پر شیڈ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ کئی اور راہگیر بھی اسی طرح دکانوں کے چھجوں کے نیچے کھڑے ہوگئے تھے۔

بارش زور پکڑتی چلی گئی۔ آصف شیشے کے پار بڑی محویت سے اس پریشان حال عورت کو دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی شفقت کے ساتھ عورت کو اندر بلالایا ''یہاں بیٹھو بیٹی! بارش تیز ہوگئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیر یہ سلسلہ چلے گا۔''

''بہت شکریہ انکل۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''در.....دراصل.....میرا بیٹا.....''

آصف عثمانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرایا اور بولا ''تمہارے بتائے بغیر ہی میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کر اس شیشے سے باہر سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پُرسوچ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تمہارا بیٹا نہیں مل رہا۔ اس لیے کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں.....وہ گھر بھی نہیں گیا ہے۔ اور میرے خیال میں.....وہ کسی ایسی جگہ پر نہیں جہاں تمہارے اندازے کے مطابق اسے ہونا چاہیے۔''

''کک.....کیا مطلب انکل۔''

عثمانی نے نیا سگریٹ سلگا کر دو طویل کش لیے اور کسی ''فورکاسٹر'' کے سے پُرخیال انداز میں بولا ''کل اسکول میں PARENT'S MEETING ہے۔ سالانہ نتیجے کا اعلان بھی ہونا ہے۔ بچے کے ذہن پر نتیجے کا دباؤ تھا۔ بہت زیادہ دباؤ.....تمہاری تمام تر کوشش کے باوجود اس کی کارکردگی وہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ تم نے اس سے بہت سی توقعات لگا رکھی تھیں۔ لیکن کل جو رزلٹ آنے والا تھا وہ تمہاری توقعات کے مطابق نہیں بلکہ شاید توقعات کے الٹ تھا.....اس لیے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ خاموشی سے کسی طرف نکل گیا ہے۔''

''یہ.....آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔'' پریشان ماں کچھ اور پریشان ہوگئی۔ اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا۔

عثمانی نے بڑے دھیمے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے پھر سے بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ ''نہیں بٹی! بارش بہت تیز ہوگئی ہے۔ شاید اولے بھی پڑ رہے ہیں۔ ابھی تمہارا نکلنا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ پھر کہو گی تو میں بھی تمہارے ساتھ بچے کو ڈھونڈنے چلوں گا۔''

عورت نے نڈھال سے انداز میں شولڈر بیگ پھر میز پر رکھ دیا اور روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نومی بھاگ.....میرا مطلب ہے.....گھر سے بھاگ گیا ہے۔''

عثمانی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا ''میں یہ اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ.....یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوچکا ہے۔''

''کیا مطلب.....آپ کا بچہ بھی.....''

''نہیں میرا بچہ نہیں.....میں خود.....میں خود ایک بار بالکل ایسی ہی سچویشن میں گھر سے بھاگا تھا.....ایسا ہی اسکول تھا، وقت بھی تقریباً یہی تھا۔ ماں بھی ایسی تھی بچہ بھی ایسا ہی تھا مگر یہ آج سے تقریباً 56 سال پہلے کی بات ہے۔''

عورت حیرت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات سے عثمانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر دن میں ہی رات کا سماں نظر آنے لگا تھا۔ بارش تیز ہوتی جارہی تھی۔ عثمان نے شیشے کے پار خاموشی سے بھیگتے ہوئے اسکول کو دیکھا اور طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

''ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ بہن مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارے والد بچپن میں ہی فوت ہوگئے۔ ماں کپڑے سی کر اور کشیدہ کاری کرکے نہ صرف گھر چلا رہی تھی بلکہ ہمیں پڑھا بھی رہی تھی۔ وہ مجھے بڑا افسر دیکھنا چاہتی تھی۔ میری پڑھائی کے لیے اس بے چاری نے اپنے آپ کو ہلکان کر رکھا تھا۔ وہ خود پڑھی ہوئی نہیں تھی لیکن اس کے ذہن میں پڑھائی کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس نے مجھ سے بڑی توقعات لگالی تھیں لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں توقعات پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میں نے اپنی مرضی سے سائنس سبجیکٹ رکھے تھے لیکن میتھ اور کیمسٹری ایسے مضامین تھے جو ہزار کوشش کے باوجود میرے پلے نہیں پڑتے تھے۔ میں اپنی ناکامیوں پر اندر ہی اندر کڑھتا تھا مگر ماں کو بتاتا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے بہت سر مارا، بہت کوشش کی مگر اپنی ماں کے توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ اندر ہی اندر ایک طرح کی دیمک تھی جو مجھے کھاتی رہی۔ میری ماں جب کسی پڑوسن یا گھر آئے مہمان

سے میری تعریفیں کرتی اور بتاتی کہ میں کتنی محنت سے پڑھ رہا ہوں اور ماں کے خواب پورے کرنے کے لیے کس طرح خود کو ہلکان کر رہا ہوں تو میں شرم کے پسینے میں ڈوب ڈوب جاتا۔ کوئی ایسا پڑھا لکھا عزیز یا جان پہچان والا تھا ہی نہیں جو اسکول جاتا اور میری شاندار کارکردگی کے بارے میں جانتا۔ بس میں ہی میں تھا اور میں اپنی سادہ لوح ماں کو سب اچھا کی رپورٹ دیتا رہا۔

میں جس دن گھر سے بھاگا، اس دن بھی میرے ماں نے صبح سویرے بڑے چاؤ سے مجھے انڈے پراٹھے کا ناشتا کرایا تھا۔ پانی میں بھیگے ہوئے بادام چھیل کر کھلائے تھے۔ مجھ پر سورۃ پڑھ کر پھونکی تھی اور جب میں باہر کے دروازے سے نکلا تھا تو پکار کر کہا تھا "دعا پڑھ لینا آصفی"۔

یہاں تک کہہ کر آصف عثمانی نے چند لمحے کی خاموشی اختیار کی۔ اس کی آنکھیں جیسے نصف صدی پرانے ان مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر ہلکی ہلکی نمی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔ "میں ان دنوں نویں میں پڑھتا تھا۔ دبلا پتلا جسم ہونے کے باعث اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا تھا۔ میرے کلاس ٹیچر پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکے تھے کہ میں اپنی والدہ یا کسی دوسرے بڑے کو اپنے ساتھ اسکول لاؤں۔ میں ہر مرتبہ مختلف بہانوں سے ٹالتا رہا تھا۔ لیکن اس دن کوئی بہانہ کام نہیں آیا۔ اگلے روز رزلٹ تھا۔ اسکول ٹیچر نے صاف کہہ دیا تھا کہ کل تمہارا کوئی بڑا تمہارے ساتھ ہوگا یا پھر میں خود تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں گا۔ ہاں وہ بھی ایک اداس سہ پہر تھی۔ اسکول سے باہر آنے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا گھر میں میری ماں سالن پکا چکی ہوگی اور اس انتظار میں بیٹھی ہوگی کہ میرے گھر میں پہنچتے ہی تازہ روٹی اتار کر میرے سامنے رکھے۔ کوئی کشش مجھے ماں کی اور تازہ روٹی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن ایک خوف مجھے ماں سے دور بھی کر رہا تھا اور یہ بڑا زور آور خوف تھا اتنا زور آور کہ ماں کی کشش بھی بے اثر ہو رہی تھی۔ یہ خوف تھا ماں کی آرزوؤں اور خوش فہمیوں کا شیشہ ٹوٹنے کا..... میں ماں کے چہرے کی وہ حیرت اور تکلیف نہیں دیکھ سکتا تھا جو اسے میری حقیقت جاننے کے بعد جھیلنا تھی..... اور پھر اس سہ پہر میں گھر نہیں گیا۔ میں شہر کے ایک دوسرے گوشے میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ شام تک سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ شام کے سائے تاریکی میں بدل گئے تو ایک شخص میرے پاس آ بیٹھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا، چہرے پر عینک تھی۔ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھنا چاہا کہ میں اسکول سے چھٹی کے بعد گھر کیوں نہیں گیا اور یہاں آوارہ گردی کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے اسے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں بتائی۔ اس کے بہت پوچھنے کے باوجود میں نے اسے اپنے گھر یا کسی جان پہچان والے کا پتا بھی نہیں بتایا۔ وہ بہت سمجھدار تھا سمجھ گیا کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ اسے یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ کہیں میں اسی طرح آوارہ گردی کرتا کسی غلط سلط بندے کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ اس نے بالآخر مجھ سے پوچھا۔ "کیا میرے ساتھ میرے گھر جانا پسند کرو گے؟"

"آپ کا گھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دور ہے لیکن اتنا دور بھی نہیں۔ اگر تم چاہو تو کل صبح ہم پھر شہر آ جائیں گے۔"

میں نے رضامندی ظاہر کی اور وہ مجھے بس پر اپنے ساتھ سوار کرا کے لاہور کے ایک مضافاتی قصبے میں لے آیا۔ یہ ایک نیم پختہ مکان تھا۔ چاروں طرف کھیت اور درخت تھے۔ بارڈر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے والے شخص کا نام حیات محمد تھا۔ اتفاق وہ بھی ایک اسکول ٹیچر تھا اور قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس نیم پختہ گھر میں وہ اپنی والدہ، اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ

امریکی ادارہ صحت FDA سے، منظور شدہ
دواؤں سے ہمیشہ کیلئے نجات
نسوانی حسن کی نشوونما منٹوں جدید ویکیوم انسٹرومنٹ سے فوری حاصل کریں لائف ٹائم خوبصورت نظر آئیں پہلے ہی دن نمایاں فرق۔ لیڈی فزیوتھراپسٹ کی زیرنگرانی (100% رزلٹ)
پہلے آزمائیں پھر خریدیں
خوشگوار بھرپور ازدواجی زندگی جدید ویکیوم انسٹرومنٹ سے فوری حاصل کریں
(100% رزلٹ) — اتوار اوپن
021-4016259-4268656
0322-2138018-0300-2129247
www geocities. Com/uniqueinternationalpk

رہتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا انور میرا ہی ہم عمر تھا۔

دو تین دن میں میں ان لوگوں سے کھل مل گیا۔ حیات محمد مجھے جلد از جلد میرے گھر واپس پہنچانا چاہتا تھا مگر خوف اور شرمندگی کے سبب میں کچھ بتا کر ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ لوگ زیادہ زور ڈالتے تھے تو میں رونا شروع کر دیتا تھا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ میرے اندر کا ڈر بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے ماموں کا خیال آتا تھا جو ایسے معاملوں میں بے حد سخت تھے اور ماں کا خیال آتا تھا جس کا سامنا کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ اسے لڑکپن کی نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ جس ماں کو میں اپنے فیل ہونے کا دکھ دینا نہیں چاہتا تھا اس کو اپنے لاپتا ہونے کا سنگین ترین غم دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ شاید ایک دو روز میں میں حیات محمد کے سمجھانے بجھانے کے سبب ''واپسی'' کے بارے میں سوچنے لگتا لیکن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

میرے ہم عمر انور کو چڑیوں کے شکار کا شوق تھا۔ دیہاتی علاقوں کی یہ چڑیاں عام چڑیوں سے کچھ بڑی ہوتی ہیں۔ انہیں شوق سے پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ انور کے پاس ایئر گن تھی۔ وہ مجھے اپنی سائیکل کے عقب میں بٹھا کر شکار کے لیے نکل گیا۔ اس سے پہلے بھی ہم دو بار جنگل جا چکے تھے..... اور کپڑے کے تھیلے میں کافی سارا شکار لے کر آئے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آج ہم خود شکار ہونے جا رہے ہیں۔ اس روز ہم درختوں میں ایئر گن چلاتے چلاتے کافی آگے نکل گئے۔ پھر ایک زخمی فاختہ کا پیچھا کرتے ہمیں پتا ہی نہیں چلا ہم نے کب وہ ان دیکھی لائن عبور کر لی جسے بارڈر کہا جاتا ہے۔ تین چار بار دردی افراد نے ہمیں للکارا پھر ہمیں پکڑنے کے لیے بھاگے۔ انور تو کسی نہ کسی طرح واپس بھاگنے میں کامیاب ہو گیا مگر میں پکڑا گیا۔ مجھے کئی دن بعد پتا چل سکا کہ میں انڈیا میں ہوں۔ دراصل مجھے انڈیا کی بارڈر سیکیورٹی فورس نے اپنی حدود کے اندر سے پکڑا تھا۔''

آصف عثمانی نے توقف کر کے نیا سگریٹ سلگایا۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تواتر سے ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تنی ہوئی ہے۔ عورت کے موبائل فون کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ اس نے آصف عثمانی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے کے بعد پی ٹی سی ایل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر شاید تیز بارش کے سبب وہ بھی ڈیڈ ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر بے دم سی ہو کر بیٹھی اور آصف عثمانی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ اپنی روداد کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو گی بیٹی!'' اس سنسناتی دوپہر میں چڑیاں پکڑتے پکڑتے انڈین فورس کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد میں پورے دس سال تک..... ہاں پورے دس سال تک واپس اپنی زمین پر قدم نہیں رکھ سکا۔ یہ دس سال میں نے کہاں کہاں اور کس کس طرح گزارے یہ ایک بہت طویل کہانی ہے۔ نہ کوئی عدالت تھی، نہ مقدمہ نہ کوئی چارج شیٹ..... بس ایک قیدی تھا اور اس کے اردگرد کھڑی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ میں ان دیواروں کے پیچھے تڑپ تڑپ گیا' میں اپنے گھر کو یاد کرتا تھا، اپنے گلی کوچوں کو اور سب سے بڑھ کر اپنی ماں کو۔ ماں کی انتظار اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہر وقت میرے تصور میں رہتی تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میں بھی بلک بلک کر روتا تھا۔ میرے آنسو خشک ہو جاتے، میرا گلا بیٹھ جاتا تھا مگر کوئی میری فریاد نہیں سنتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس پنجرے کا عادی ہونے لگا جس نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ شامیں اور صبحیں گزرتی رہیں، دن اور رات ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ مجھے مشرقی پنجاب کی دو تین جیلوں میں رکھا گیا۔ کچھ عرصے کے لیے دہلی جیل میں بھی بھیجا گیا۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھ گچھ بھی کی جاتی تھی مگر میرے پاس ایک ایئر گن، ایک سائیکل اور ایک زخمی فاختہ کے سوا بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

دس سال بعد جس طرح میں اچانک پکڑا گیا تھا، اسی طرح اچانک رہا بھی ہو گیا۔ اب میں قریباً 25 سال کا ایک بھرپور جوان تھا۔ کچھ خوش پوش افراد آئے۔ انہوں نے مجھ سے چند کاغذات پر دستخط لیے اور مجھے ایک گاڑی میں سوار کرا کے بعد بارڈر پر لے آئے۔ یہاں مجھے پاکستانی حکام کے حوالے کر دیا گیا۔

میں اپنی ماں اور اپنے گلی کوچوں کے لیے ایسے ہی تڑپ رہا تھا جیسے تپتے ریگستان میں کئی دن کا پیاسا پانی سے بھرے گلاس کے لیے تڑپتا ہے۔ مجھے یاد ہے لاہور پہنچتے ہی میں سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے دس سال بعد مجھے آج چھٹی ملی ہے۔ میں کمر پر اسکول بیگ اٹھائے اپنی ماں کی طرف بھاگا جا رہا ہوں اور وہ میرے لیے تازہ روٹی اتارنے کے لیے چولہے کے سامنے تیار بیٹھی ہے۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا..... تو سارا نقشہ ہی تبدیل نظر آیا۔ کرائے کا وہ گھر مسمار ہو چکا تھا جہاں ہم ..... رہا کرتے تھے..... وہاں اب دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ مالک مکان فوت ہو چکا تھا۔ میں اس کے بھائی سے ملا۔ اسے اس کے سوا کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری ماں میرے غم میں بیمار ہو گئی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح مجھے سڑکوں پر تلاش کرتی رہتی تھی۔ پھر اس کا بھائی اسے اور

میرے چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ یہ کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات تھی۔

میں سیالکوٹ کے اس دور دراز گاؤں میں اپنے ماموں کے پاس پہنچا۔ وہ پہلے سے کہیں بوڑھے نظر آرہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اور بمشکل پہچان کر انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ ان کی زبانی مجھ پر یہ بجلی گری کہ میری ماں تقریباً پانچ سال پہلے غموں کی اس دنیا سے چھٹکارا پا گئی تھی۔ وہ تقریباً پانچ برس تک دن رات میری راہ دیکھتی رہی۔ وہ گھر کا دروازہ کبھی بند نہیں کرنے دیتی تھی۔ ہر دستک پر اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی تھی۔ جب وہ لاہور میں بیمار ہوئی تو میرے ماموں اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آئے۔ انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا۔ لیکن اس کو چین نہیں تھا۔ وہ نیم دیوانی سی ہوگئی تھی۔ ہر ایک دو ماہ بعد چپکے سے لاہور چلی جاتی تھی۔ اس کے پرس میں میری دو تین تصویریں رہتی تھیں۔ لوگوں کو میری تصویریں دکھاتی، گلی کوچوں میں مجھے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ تپتی گرم دوپہروں میں گھنٹوں میرے اسکول کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔ کئی برس گزرنے کے باوجود اسے وہم رہتا تھا کہ میں اس اسکول کے آس پاس سے کہیں ملوں گا۔ یہاں لاہور میں ایک کتب فروش حاجی عنایت نے اسے اپنی بہن بنا رکھا تھا۔ وہ حاجی عنایت کے گھر کی بیٹھک میں قیام کرتی تھی۔ میرے ماموں اسے یہیں سے واپس گاؤں لے کر جایا کرتے تھے۔ دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات کو وہ حاجی عنایت کے گھر واپس نہیں آئی، حاجی عنایت اور ان کے گھر والے رات بھر اسے ڈھونڈتے رہے۔ اگلے روز اس دکھیاری کی لاش میو اسپتال کے سرد خانے سے ملی۔ وہ سڑک کے کنارے چلتے چلتے بے ہوش ہو کر گری تھی۔ اس کے بائیں پہلو پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ راہگیروں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے وہ ختم ہوگئی۔ بتانے والوں نے بتایا کہ مرتے وقت اس کے ہونٹوں پر میرا ہی نام تھا۔''

آصف وارثی کی آنکھیں تر ہوگئیں۔ اس نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر آنسو پونچھے اور کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر خلا میں گھور کر جیسے اس نے گزرے دنوں کو یاد کیا اور بولا ''اپنے ماموں سے اپنی ماں کے مرنے کی روداد سن کر میرا دل میرے سینے کے اندر پھٹ سا گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اپنی بے کار زندگی ختم کر کے اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔ جس صورت کو دیکھنے کے لیے دس برس تک دن رات آنسو بہائے تھے، وہ منوں مٹی کے نیچے چھپ چکی تھی۔

کئی دنوں یا شاید کئی ہفتوں تک میں ہوش وحواس سے بیگانہ رہا۔ گاؤں کے قبرستان میں جا کر ماں کی قبر کے سرہانے بیٹھا رہتا اور اپنی غلطی کی معافی مانگتا رہتا۔ ایک ناقابلِ بیان پچھتاوا مجھے اندر سے مسمار کر رہا تھا۔ کاش دس سال پہلے کا وہ لمحہ لوٹ آتا جب میرے قدم گھر کی طرف اٹھتے اٹھتے مخالف سمت میں اٹھ گئے تھے۔

زندگی جیسے تیسے جینے کا رستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ کچھ عرصے بعد ماموں ممانی اور چھوٹی بہن کی کوششوں سے میں بھی زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔ دو سال پہلے ماموں نے ہی میری چھوٹی بہن کی شادی کر دی تھی اور اب وہ اپنے گھر میں خوش تھی..... ان دنوں میرے دل میں یہ شدید ترین خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنی مرحوم ماں کی خواہش پوری کروں۔ میں تعلیم حاصل کروں اور کچھ بن کر دکھاؤں۔ قریباً چھبیس برس کی عمر میں میں نے ایک بار پھر میٹرک میں داخلہ لے لیا۔ ماں کے چھوڑے ہوئے چند زیورات سے سہارا مل گیا۔ میں نے سخت محنت کی..... دن رات ایک کر دیا..... لیکن تب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آج بھی سخت محنت اور کوشش کے باوجود میری ''پروگریس'' تسلی بخش نہیں تھی..... مگر اب ایک بات تھی۔ اب میں بچہ نہیں تھا۔ اب میں اپنی خامیوں اور خوبیوں پر غور کر سکتا تھا اور میں نے خوب غور کیا۔ مجھے پتا چلا کہ میرا مسئلہ آج بھی میرے غیر موزوں مضامین ہیں۔ خاص طور سے کیمسٹری اور میتھ وغیرہ میں میری دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ میں نے اپنے اساتذہ سے اس بارے میں تفصیل سے مشورہ کیا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے سائنس کے بجائے آرٹس رکھنی چاہیے۔ آخر آرٹس بھی تو علم کی ایک معروف شاخ تھی۔ میں نے آرٹس کے مضامین رکھے۔ خوب جم کر محنت کی اور میٹرک بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد ایف اے اور پھر بی اے..... میں نے یہ امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ میرے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میں آرٹس کے مضامین میں ہی کچھ کر کے دکھاؤں گا اور دوسروں کے لیے مثال قائم کروں گا۔ ایم اے میں میں نے انگلش رکھی اور پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی نمبر حاصل کیے۔ اس کے بعد ایم اے معاشیات کیا۔ یہیں سے میری دلچسپی ''ہوٹل مینجمنٹ'' کی طرف ہوگئی۔ اس شعبے میں میں نے اوپر تلے دو اہم ڈپلومے حاصل کیے اور پھر ایک ڈپلوما کے لیے انگلینڈ بھی گیا۔ اس کے بعد میں ہوٹلنگ کے کاروبار کی طرف آگیا۔ میں نے جدید طرز کا ایک پیزا ریسٹورنٹ بنایا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا..... اب پیزا پیلس کا نام کئی شہروں میں بڑی اچھی طرح

جانا پہچانا جاتا ہے..... کئی شہروں میں اس کی شاخیں کھل چکی ہیں۔ میں ہر طرح ایک کامیاب شخص ہوں..... ہاں بیٹی! میں سائنس پڑھے بغیر بھی ایک کامیاب شخص ہوں۔ مشہور و معروف ڈاکٹر اور انجینئر ایک ماہ میں اتنا نہیں کماتے ہوں گے جتنا میں ایک دن میں کما لیتا ہوں۔ میں نے شادی کی ہے، میرے بچے ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔ لیکن ایک بچہ آج بھی میرے اندر چھپا ہوا ہے..... یہ بچہ آج بھی اس اسکول کے اردگرد رہنا چاہتا ہے۔ جیسے اسے امید ہو کہ اس کی ماں آج نہیں تو کل اسے لینے کے لیے یہاں آئے گی۔ میں اس کرسی پر اس شیشے کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ پھر بھی یہاں بیٹھنا اور چھٹی کے وقت اسکول کے گیٹ کی طرف دیکھتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔''

آصف عثمانی کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

کھڑکیوں کے باہر بھی بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ایک بار اتنے زور سے بجلی کڑکی کہ یہی لگا، کہیں آس پاس گر گئی ہے۔ پریشان ماں پوری جان سے لرز گئی۔ وہ کراہی ''ہائے میں کیا کروں؟ وہ کہاں ہوگا؟ وہ تو بجلی سے ڈرتا ہے..... ہائے اللہ میں کدھر جاؤں۔ دو دن سے بخار ہے اسے..... صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا'' وہ سسکنے لگی۔

آصف کھوئی کھوئی آبدیدہ آواز میں بولا۔ ''جن کے جانے سے اتنا تڑپنا پڑے انہیں جانے ہی نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ جب قدم اٹھ جاتے ہیں..... تو پھر بہت دور بھی نکل جایا کرتے ہیں۔

آج کل..... کے حالات آج سے پچاس سال پہلے کے حالات سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ آج تو یہ شہر انسانوں سے بھرے ہوئے خطرناک جنگل بن گئے ہیں۔''

عورت کا رنگ زرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بڑبڑانے لگتی تھی۔ غالباً دعائیں پڑھ رہی تھی۔ سامنے ہی پیزا پیلس کے ڈائننگ ہال میں ٹی وی چل رہا تھا۔ نیوز چینل سے مسلسل خبریں آ رہی تھیں۔ طوفان باد و باراں کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی تھی۔ اچانک ایک خبر نے عورت کے ساتھ ساتھ آصف کو بھی پوری طرح متوجہ کر لیا۔ یہ تازہ ترین خبر دل دہلا دینے والی تھی۔ ایک قریبی شاہراہ پر ہوا کے زور سے ایک بہت بڑا ہورڈنگ (اشتہاری بورڈ) زمین بوس ہو گیا تھا۔ اس کے نیچے آ کر دو افراد ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں اسکول کا ایک بچہ بھی تھا۔ نیوز چینل کا کیمرا تازہ ترین مناظر دکھا رہا تھا۔ چند افراد ہلاک ہونے والے لہولہان بچے کو افراتفری کے عالم میں ایمبولینس کے اندر ڈال رہے تھے۔ بچے کی ایک جھلک نظر آئی تو عورت کربناک انداز میں چلا اٹھی۔ اس کی لرزہ خیز آواز پورے پیزا پیلس میں گونجتی اور لپکتی چلی گئی۔ ''میرا بچہ..... ہائے میرا بچہ.....''

اس نے دہائی دی اور اٹھ کر دیوانہ وار باہر بھاگی۔ باہر بارش کی طوفانی بوچھاڑیں اور چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں تھیں لیکن اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ''ہائے میرا نومی'' وہ روتی کرلاتی سڑک پر پہنچی۔ آصف عثمانی اس کے پیچھے بھاگا اس سے پہلے کہ وہ عالم دیوانگی میں کسی گاڑی سے ٹکرا جاتی، آصف عثمانی نے اسے تھام لیا..... اور کھینچتا ہوا واپس اپنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا ''ہوش کرو بیٹی، یہ تمہارا بچہ نہیں ہے..... یہ نہیں ہے تمہارا بچہ.....''

وہ حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا ''تمہارا بچہ میرے پاس ہے..... آؤ میں تمہیں ملاؤں اس سے۔''

چند سیکنڈ بعد ایک اندرونی کمرے..... سے عورت کا تیرہ چودہ سالہ بیٹا اپنے اسکول بیگ سمیت برآمد ہوا اور ماں سے لپٹ گیا۔ ماں اور بچے کا ملاپ دیدنی تھا۔ ماں بچے کو دیوانہ وار چومتی اور لپٹاتی چلی جا رہی تھی۔ آصف عثمانی ایک کونے میں کھڑا دل گداز نظروں سے اس ملاپ کو دیکھتا رہا۔

دو چار منٹ بعد جب جذبات کا چڑھا ہوا دریا اترا تو آصف عثمانی نے عورت کو بتایا کہ کس طرح اس نے ''پیزا پیلس'' کے اندر سے بچے کی حرکات و سکنات دیکھیں اور اسے اندازہ ہوا کہ بچہ گھر سے بھاگنے والا ہے۔ وہ اسے سمجھا بجھا کر اندر لے آیا، اسے کمرے میں بٹھایا اور کھانا وغیرہ کھلایا۔

عورت بس سر جھکا کر ہچکیوں کے ساتھ روتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن یہ خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔ آصف عثمانی نے اس کے کندھے پر اپنا بوڑھا ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔ ''بیٹی! میری ماں تو بے چاری ان پڑھ تھی، اپنے بچے کی الجھنوں کو نہ جان سکی لیکن تم تو ان پڑھ نہیں ہو۔ دیکھو! میں تمہارے سامنے..... اور تمہاری جیسی ساری ماؤں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اپنے معصوم بچوں سے بے خبر نہ رہو..... ان سے اچھی امیدیں ضرور لگاؤ لیکن ان امیدوں کا سارا بوجھ، تنہا ان پر ہی نہ ڈال دو..... نہیں تو..... نہیں تو.....'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ رخ پھیر کر تیزی سے اندر چلا گیا۔ آج پھر اس کو اکیلے کمرے میں بیٹھ کر دیر تک رونا تھا۔

شرارت

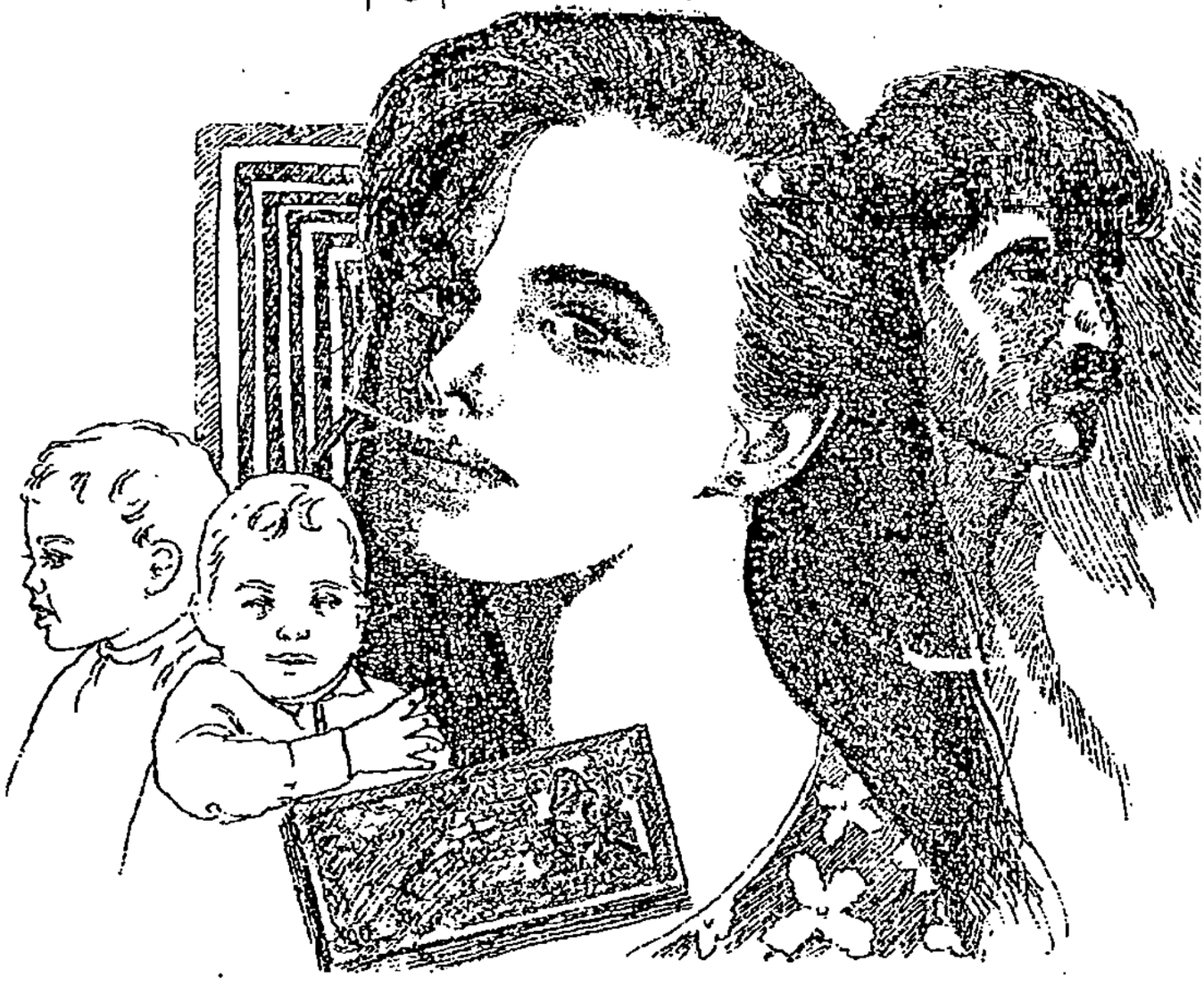
طاہر جاوید مغل

کبھی کبھی نادانیاں بھی آگہی کے در وا کر جاتی ہیں... اور بالخصوص بچوں کی معصوم شرارتوں کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے قدرت ان ننھے منے فرشتوں سے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں سرزد کراتی ہے جو بعد میں کسی نہ کسی پیغام کی نشاندہی کر رہی ہوتی ہیں۔ بچے کی ایسی ہی ایک ادا نے ماں کو جو اشارہ دیا وہ قدرت کی طرف سے اس کے صبر اور حوصلے کا بہت بڑا انعام ثابت ہوا۔ بات صرف سمجھنے کی تھی۔

دل برداشتہ لمحات میں ایک دوسرے کا حوصلہ بن جانے والے شریک سفر کا قصہ

میرا نام انجم امین ہے۔ میں لاہور کی ایک مشہور بوتیک کی مالک ہوں۔ لاہور میں میری بوتیک کی دو شاخیں ہیں۔ اب حال میں ہی میں نے سیالکوٹ میں تیسری شاخ کا افتتاح کیا ہے۔

وہ جولائی کی ایک گرم شام تھی۔ میں لاہور میں اپنی بوتیک کی مین برانچ میں تھی اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ چائے کے شوقین موسموں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ آج موسم کافی گرم



رہا تھا۔ دن کے وقت بھی مشکل سے تین چار کسٹمرز آئے تھے۔ اس وقت شاپ میں دو میاں بیوی لیڈیز کُرتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو چھوٹے بچے تھے۔ بڑے بچے کی عمر تین ساڑھے تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں دیکھ رہی تھی۔ شوہر چھوٹے بچے کو اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو اس کی جیب میں سے بال پین نیچے گر گیا۔ یہ پین بڑے بچے نے بڑی تیزی سے اٹھالیا۔ والد اور والدہ کو خبر نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں میں نے ایک کال اٹینڈ کی۔ جب دوبارہ دیکھا تو وہ بچہ فرش کی ٹائلز پر بنے ہوئے ڈیزائن پر اپنے والد کا بال پین بڑی تیزی سے چلا رہا تھا۔ تب ہی اس کے والد کی نظر بھی اس پر پڑی۔ وہ شخص موسم کے پیشِ نظر پہلے ہی ذرا تپا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بچے کو ڈانٹا اور ایک چپت بھی لگائی۔ میں نے سچویشن کو نارمل کرنے کے لیے فوراً کہا۔ ''ارے نہیں جناب! کوئی بات نہیں۔ بچے کو ماریں مت۔ بچے کے ہر کام میں معصومیت ہوتی ہے اور اکثر کوئی نہ کوئی بہتری اور فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔''

میرے اس اچانک بولے گئے جملے نے مجھے چھ سات سال پیچھے پہنچا دیا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ آج میں اور میری فیملی جس معیار کی زندگی گزار رہے ہیں..... اور یہ شاندار بوتیک کس طرح وجود میں آئی..... ہاں، یہ سب کچھ بھی ایک بچے کی معصوم سی شرارت کا ہی مرہونِ منت تھا۔

میرے شوہر امین یونس اردو کے ایک مقامی روزنامے میں سب ایڈیٹر ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ فیضان، عادل اور انعم۔ آج سے پانچ سال پہلے دوسرے بیٹے عادل کی پیدائش کے بعد اخراجات ایک دم بڑھ گئے۔ عادل کی دیکھ بھال کے لیے چھوٹی چھوٹی ضروریات کی بھرمار تھی اور انہی دنوں فیضان کا بھی اسکول میں ایڈمیشن کرایا گیا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ آمدن کے مقابلے میں اخراجات بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ دھیرے دھیرے امین کے مزاج میں تلخی آتی جا رہی ہے۔ آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھ پر بگڑنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اخراجات کے بوجھ کی وجہ سے ہی تھا۔ ہم نے بڑی کفایت شعاری سے رمضان کے روزے رکھے تھے اور اب عید قریب تھی۔ اپنی تو خیر تھی، پر بچوں کے لیے تو نئے کپڑے درکار تھے۔

ایک دن میں نے امین سے کہا۔ ''عید سر پر آگئی ہے۔ اپنی تو خیر ہے، بچوں کے لیے نئے کپڑے چاہئیں۔ آپ مجھے ان کے کپڑوں کے لیے کچھ پیسے دے دیں۔''

بس میرا یہی کہنا تھا کہ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔

''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ میں کس طرح سے ضرورتیں پوری کر رہا ہوں؟ ایک سیلاب ہے خرچوں کا۔ کہاں سے لاؤں اتنے پیسے؟ کوئی ڈاکا ڈالوں یا اپنا گردہ بیچ آؤں.....؟''

''امین! میں تو صرف.....'' میری بات ادھوری رہ گئی۔

''چپ کر جاؤ خدا کے لیے۔'' انہوں نے چلّا کر کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔

میری تو حالت ہی عجیب ہو رہی تھی۔ موجودہ صورتِ حال پہ میں سکتے کے عالم میں کافی دیر یونہی کھڑی رہی۔ شکر ہے بچے اس وقت دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ امین آج سے پہلے کبھی اس انداز میں نہیں بولے تھے۔ بحث تکرار تو چلتی رہتی تھی لیکن ایسی تلخ کلامی کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

شام کو بھی وہ وقت پر گھر نہیں آئے۔ میں بڑی پریشان تھی۔ بہرحال جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر ٹھہراؤ تھا۔ میں نے شکر کیا۔ اس رات ہم نے تسلی سے بیٹھ کر تفصیل سے بات کی اور اپنے مسائل پر غور کیا۔ ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایسے گزارہ مشکل ہے۔ روزگار کا کوئی مزید ذریعہ بھی پیدا کرنا پڑے گا۔

امین نے کہا۔ ''میری نظر میں ایک دکان ہے۔ کرائے پر مل رہی ہے۔ دل چاہتا ہے، وہاں ایک بک شاپ کھول لوں۔ آفس سے آکر وہاں وقت دوں۔''

''کس جگہ ہے دکان؟'' میں نے پوچھا۔

''مین روڈ پر مدینہ کالونی والے موڑ کے ساتھ ہی۔''

''چلیں آئیں چل کر دیکھتے ہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ہم نے اسی وقت موٹر سائیکل پر وہاں کا وزٹ کیا۔ جگہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک آئیڈیا لپک کر آیا۔ دکان کی لوکیشن ایک بوتیک کھولنے کے لیے بہت آئیڈیل تھی۔ اسی سڑک پر آگے جا کر دو بڑے شاپنگ مالز اور دو تین بوتیکس بھی تھیں۔ میں نے گریجویشن فیشن ڈیزائننگ میں کی تھی۔ اچھے کپڑے خریدنے اور سینے کا شوق مجھے ہمیشہ سے تھا۔ شادی سے پہلے میں ایک مشہور بوتیک کے لیڈیز پورشن میں ایک ڈیڑھ سال جاب بھی کرتی رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے امین کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ امین کو بھی میرا آئیڈیا اچھا لگا۔ ہم نے بڑی سنجیدگی سے

سوچنا شروع کردیا کہ کیوں نا کسی طرح ہم یہ دکان خرید لیں اور یہاں بوتیک کا کام شروع کریں۔ ایک دفعہ یہ بات ہم دونوں کے ذہن میں بیٹھ گئی تو پھر بیٹھتی چلی گئی۔ ہم نے تہیہ کرلیا کہ جس طرح بھی ہوگا، ہم یہ دکان خریدیں گے اور اپنی ذاتی جگہ پر کام شروع کریں گے۔

ہمارا کل اثاثہ وہ چار مرلے کا رہائشی پورشن تھا جو وراثت میں ہمارے حصے میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے کچھ زیورات تھے۔ ہم نے کچھ مزید سوچ بچار کی اور مکان بیچ کر دکان خریدنے کی نیت کرلی۔

اگلے ہی مہینے ہم ایک کرائے کے مختصر گھر میں منتقل ہوگئے اور مکان کو رنگ وروغن کرکے بیچنے کے لیے رکھ دیا۔ کبھی امین پریشان ہوتے تو میں ان سے کہتی۔ ''اللہ سے اچھے کی امید رکھیں امین... بے شک ہم رسک لے رہے ہیں، لیکن رسک کے بغیر تو کوئی کامیابی نہیں ملتی۔''

کبھی میں کرائے کے گھر میں غمزدہ ہوتی تو امین مجھے تسلی دیتے۔ ''پریشانی کے دن تھوڑے ہیں انجم! کاروبار ہو تو سب کچھ ہوجاتا ہے۔ مکان بھی دوبارہ بن جاتے ہیں۔''

وہ ہمارے لیے بڑی خوشی کا دن تھا جب مکان کا بیعانہ ہوا۔ ہمارا مکان اچھی قیمت پر بک رہا تھا۔ امید تھی کہ ہم نہ صرف دکان خرید سکیں گے بلکہ اگر تھوڑی سی کوشش مزید کریں گے تو کاروبار میں ڈالنے کے لیے کچھ سرمایہ بھی مہیا ہوجائے گا۔ وہ ہماری شادی کی ساتویں سالگرہ بھی تھی۔ صبح گیارہ بجے امین مکان کی بقایا رقم کی وصولی کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔ بچے اسکول جاچکے تھے۔ میں معمول کے مطابق گھر کے پاس والی مارکیٹ سے سبزی خریدنے گئی۔ وہاں قریب ہی ایک بک شاپ بھی تھی۔ میں نے وہاں سے امین کے لیے ایک خوب صورت سا بال پین خریدا۔ ویسے تو شادی کی ہر سالگرہ پر ہمارے درمیان قیمتی تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا لیکن اس دفعہ بجٹ کے پیش نظر اور اپنی موجودہ استطاعت کے مطابق میں نے امین کو تحفے میں دینے کے لیے یہ بال پین خریدا۔ آج کھانے میں بھی میں نے کچھ اسپیشل بنانے کا سوچا تھا۔ امین کی پسند کا کھانا یعنی ایگ فرائڈ رائس اور منچورین۔

میں کچن سے فارغ ہوئی تو امین گھر آگئے۔ میں نے کہا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ بارہ بجے تک آجاؤں گا اور اب ڈھائی بج رہے ہیں۔''

''ہاں، بس فہیم صاحب نے اسٹامپ پیپر کا بندوبست کرتے ہوئے دیر کردی۔'' بیڈ پر بیٹھ کر انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے خاکی کاغذ میں لپٹی ہوئی بھاری بھرکم شے مجھے تھمائی اور بولے۔ ''یہ لیں انجم میڈم! مکان کی رقم اور ہمارے خواب کی تکمیل کی طرف ہمارا پہلا قدم۔''

میں نے بسم اللہ پڑھ کر ان کے ہاتھ سے وہ لفافہ لیا۔

وہ بولے۔ ''اسے جاکر سیف کے اسی خانے میں رکھ دو، جہاں زیور پڑا ہے۔ مجھے ڈیلر کے پاس ہی دیر ہوگئی ورنہ بینک میں جمع کروا کر آتا۔''

دراصل جمعہ تھا اور بینک جلدی بند ہوگئے تھے۔ فیضان اور عادل بھی دوپہر کو ہی گھر آگئے تھے۔ فیضان کی اسکول شرٹ کہنی کے پاس سے پھٹی ہوئی تھی۔ ڈیسک کی کوئی میخ وغیرہ لگ گئی تھی۔ امین نے اسے ڈانٹا۔ حالانکہ امین کو فیضان اور عادل سے ایک جیسا پیار تھا لیکن کبھی کبھی وہ فیضان پر تھوڑی سی سختی بھی کردیتے تھے۔ شاید یہ اس کی شرارتوں کی وجہ سے تھا۔ فیضان کو پڑنے والی ڈانٹ کے سوا وہ دن اچھا ہی گزرا۔ شام کو ہم نے چائے کے ساتھ سالگرہ کا کیک کاٹا۔ دونوں بچے بھی خوش تھے۔ امین نے مجھے ایک خوب صورت سا ہیئر کلپ دیا اور میں نے انہیں برانڈڈ بال پین دیا، جو انہیں بہت پسند آیا۔ بولے۔ ''واہ! یہ تو عین حسبِ حال گفٹ ہے۔ میرا پہلا قلم اب جواب دینے لگا تھا۔''

میں نے بھی ان کے گفٹ کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا اسی دوران میں ہمارے پڑوسی بیگ صاحب اور ان کی بیگم ہم سے ملنے آگئے۔ ہم انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ بچے باہر ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہمیں ایک مرتبہ پھر سے چائے پینا پڑی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی دن بہت خوش ہوتے ہیں اور ہر اس عمل سے بچتے ہیں جو بدمزگی کا باعث بنے اور جب آپ بہت زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں تو اکثر آپ کا ڈر حقیقت کا روپ دھار ہی لیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مہمانوں سے فارغ ہوکر جب ہم واپس آئے تو دیکھا کہ فیضان کے ہاتھ میں وہی پین تھا جو میں نے امین کو گفٹ کیا تھا۔ فرش کی ٹائلز پر بنے ڈیزائن کے اوپر بڑی تیزی سے وہ پین چلا رہا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ امین نے فیضان کو ایک زوردار تھپڑ دے مارا اور ساتھ میں خوب ڈانٹ پلائی۔ صرف فیضان کو ہی نہیں مجھے بھی۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ میرے بے جا..... لاڈ پیار سے فیضان دن بہ دن بگڑتا جارہا ہے۔

میرا دل تو جیسے بجھ کر ہی رہ گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں غلط ہونے لگیں تو سب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بس اس دن بھی یہی ہوا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب تک جو ہوا، وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ آگے ایک ایسا سخت امتحان آرہا تھا جس نے ان بنیادوں کو ہی ہلا دیا جن پر ہم اپنے خواب کا محل بنا رہے تھے۔

فیضان کو تھپڑ اور ڈانٹ والے واقعے کے بعد ہم نے بس چپ چاپ رات کا کھانا کھایا۔ میں نے بچوں کو سلایا اور خود بھی سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ امین ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ رات تقریباً پونے گیارہ کا وقت تھا۔ اچانک ہماری ڈور بیل بجی۔ ''اس وقت کون آ گیا؟'' امین نے اپنی چپل پہنتے ہوئے کہا اور دروازہ کھولنے کے لیے باہر نکلے۔ میں بھی پریشان ہوگئی اور امین کے پیچھے چلتی ہوئی صحن تک آ گئی۔ ''کون ہے؟'' امین نے پوچھا۔

''ہاں جی، امین صاحب! میں مبشر ہوں۔ دروازہ کھولیے۔''

مبشر صاحب ہمارے مالکِ مکان تھے۔ یہاں پر شفٹ ہونے کے بعد بس ایک دو دفعہ ہی ملاقات ہوئی تھی ان سے۔ گھر کا کرایہ ان کا چھوٹا بیٹا وصول کرنے آتا تھا۔

امین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ تین افراد تیزی سے اندر گھس آئے۔ ان میں سے دو نے اپنے چہرے بڑے بڑے رومالوں (ڈھاٹوں) میں چھپا رکھے تھے۔ دو افراد نے تیزی سے امین کو دبوچ لیا۔ ایک میری طرف لپکا۔ میں صرف ایک بار چلا سکی۔ اس سے پہلے کہ دوسری مرتبہ چلاتی لحیم شحیم شخص نے اپنا چوڑا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور مجھے ہلنے جلنے سے قاصر کر دیا۔ یہ دیکھ کر میری دہشت انتہا کو پہنچ گئی کہ امین کو دبوچنے والے دو بندوں میں سے ایک نے سیاہ رنگ کا پستول امین کی کنپٹی سے لگا دیا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس نے اپنا چہرہ چھپا نہیں رکھا تھا۔ یہ کوئی پٹھان یا افغانی لگتا تھا۔ سر تقریباً گنجا تھا۔ نقوش کرخت تھے۔ عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ''اگر گڑبڑ کرو گے تو پھر بہت زیادہ گڑبڑ ہوگا۔ ام گولی چلانے میں بالکل دیر نہیں کرے گا۔''

اس کی آواز میں اتنی سفاکی تھی کہ میں لرز کر رہ گئی۔ امین نے بھی ایک دم مزاحمت ختم کر دی۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

یہ لوگ مجھے اور امین کو برآمدے میں لے آئے۔ نیم گنجے شخص نے ایک کھڑکی سے کمرے میں جھانکا۔ وہاں ہمارے دونوں بچے حالات کی شدید سنگینی سے بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم دونوں امارے کہنے پر چلے گا تو تمہیں اور تمہارے بچہ لوگ کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ دوسری صورت میں خون خرابا ہوگا۔'' اس نے بچہ لوگ کے لفظ پر زور دیا تھا۔

میں نے چوڑے چکلے شخص کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کو جو چاہیے یہاں سے لے جاؤ۔ لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔''

''گھر کا چابیاں کدھر ہے؟'' نیم گنجے شخص نے پٹھانی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔

امین کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ شاید اسے اپنی ساری جمع پونجی کا خیال آ گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ امین ان بے رحم لٹیروں سے کوئی اور بات کہتے، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں انہیں چابیوں کی جگہ بتا دی۔ وہ ہمارے بیڈ کے تکیے کے نیچے رکھی تھیں۔ ایک ڈھاٹا پوش اپنے ہاتھ میں چاقو لہراتا ہوا ہمارے بیڈروم کی طرف گیا اور چابیاں لے آیا۔ میں نے دیکھا امین کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میری اپنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ بہرحال ہم دونوں ہی سمجھتے تھے کہ اپنے بچوں کی سلامتی سے بڑھ کر ہم دونوں کے لیے اور کچھ نہیں۔

ان لوگوں نے بڑے سخت الفاظ میں ہم دونوں کو خاموش رہنے کی وارننگ دی۔ پھر ہمیں گھر کے چھوٹے سے اسٹور میں بند کر دیا۔ ہم وہاں سکتہ زدہ کھڑے رہے اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کے راستے، ڈاکوؤں کو اپنے گھر میں دندناتے ہوئے دیکھتے رہے۔

بے بسی جیسی بے بسی تھی۔ میں نے کہیں سن رکھا تھا کہ اس طرح کی وارداتیں مخبری پر بھی ہوتی ہیں۔ کوئی شخص جب اپنا کوئی قیمتی اثاثہ بیچتا ہے اور کیش رقم گھر لاتا ہے تو کبھی کبھی جرائم پیشہ لوگ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور رات کو واردات کر ڈالتے ہیں۔ شاید ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر ان خبیثوں نے کیش اور زیورات سمیت وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو کرنا چاہتے تھے۔

اسٹور کے اندر امین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم لٹ گئے انجم۔''

میں نے تسلی دینے والے انداز میں ان کے ہاتھ

اپنے لرزاں ہاتھوں میں تھام لیے۔

ان لوگوں نے کچن میں جاکر ہمارا فریج کھولا اور اس میں کھانے پینے کی جو بھی چیز ملی کھا گئے، ان میں ہماری سالگرہ کا بچا ہوا کیک بھی شامل تھا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کررہے تھے۔ نیم گنجا شخص اپنے ایک ساتھی کو لمبو کہہ کر بلا رہا تھا۔ اسٹور کے اندر ہم دونوں کی بس ایک ہی خواہش تھی، یہ لوگ اب جلد سے جلد ہمارے گھر سے نکل جائیں۔

آخر وہ گھڑی آگئی۔ وہ لوگ جانے کے لیے تیار نظر آنے لگے۔ کیش اور زیورات انہوں نے فیضان کے ہی خالی بستے میں رکھ لیے تھے۔ یہ بستہ نیم گنجے شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر تھے اور ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

لمبو کی آواز آئی۔ ''کل کہاں ملاقات ہوگی خاناں؟''

''کالونی والے گھر آجانا۔'' نیم گنجے سرغنہ کی آواز سنائی دی۔

''وہ تو مشکل ایڈریس ہے خاناں۔ پچھلی بار کی طرح خجل خوار ہوتا رہوں گا۔''

''اچھا روتا کیوں ہے۔ ام چھوٹے لالے کا پون نمبر (فون نمبر) دیتا ہے تمہیں۔'' نیم گنجے نے کہا۔

امین اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ تینوں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گنجے سرغنہ نے فیضان کا بستہ خالی کرنے کے لیے ساری کتابیں کاپیاں میز پر الٹ دی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کاپی اٹھائی اور اس پر فون نمبر لکھنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں وہی قیمتی بال پین تھا جو چند گھنٹے پہلے میں نے امین کو تحفے میں دیا تھا اور فیضان نے فرش پر رگڑ کر خراب کردیا تھا۔ سرغنہ جھلایا ہوا نظر آیا۔ شاید پین لکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے فونٹین پین کی طرح بال پین کو جھٹکا اور پھر لکھنا چاہا۔ دوسری تیسری کوشش میں وہ بہ مشکل کامیاب ہوا۔ اس نے کاپی کا ورق پھاڑ کر لمبو کے حوالے کیا۔ اس کے بعد وہ اسٹور روم کی طرف آگیا۔ اس نے اسٹور کا دروازہ باہر سے کھول دیا لیکن اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اگلے پانچ منٹ تک ہم نے اسٹور سے قدم باہر نکالا یا شور مچانے کی کوشش کی تو ہمارے حق میں بے حد برا ہوگا۔ وہ چلے گئے اور ہم حسرت سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ ہمارے دل سینوں میں ٹھہر سے گئے تھے۔

☆☆☆

ڈاکے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ ''آپ

ذہانت

ایک قصبے میں ایک سرمایہ دار رہتا تھا۔ وہ ہر سال نئے مزدور تلاش کرتا تھا اور انہیں سالانہ تنخواہ دیا کرتا تھا..... لیکن وہ ان کی تنخواہ کاٹنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا مگر ملّا کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ بادشاہِ وقت نے ملّا سے کہا کہ وہ تحقیقات کرے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیٰحدہ کرے۔

ملّا نے اس سرمایہ دار کے ہاں ملازمت کرلی۔ جب ایک سال مکمل ہوا تو سرمایہ دار نے ملّا کو طلب کرکے سرد مہری سے کہا۔ ''تمہیں میرے ہاں ملازمت کرتے ہوئے پورا ایک سال ہوگیا ہے۔ میں تمہیں پورے ایک سال کی تنخواہ دوں گا لیکن تمہیں پہلے میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

ملّا نے کہا۔ ''سوال کیا ہے؟''

سرمایہ دار بولا۔ ''سوال یہ ہے کہ میرے سر کا وزن کتنا ہے؟ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر تم نے غلط جواب دیا تو میں تمہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔''

ملّا نے کچھ دیر اس کے منڈے ہوئے سر کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ''ڈھائی سیر۔''

سرمایہ دار بولا۔ ''بالکل غلط ہے۔''

ملّا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جناب اگر آپ کو شک ہے، تو میں آپ کا سر کاٹ کر ترازو میں تول دیتا ہوں۔'' اور ساتھ ہی خنجر نکال لیا۔ ''اس طرح فیصلہ ہوجائے گا کہ میرا جواب صحیح ہے یا غلط۔''

سرمایہ دار گھبرا گیا اور جلدی سے بولا۔ ''نہیں..... نہیں تمہارا جواب بالکل صحیح ہے۔'' اس کے بعد اس دھوکے باز سرمایہ دار نے کسی مزدور کے پیسے نہیں کاٹے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

نے سنا ہے، نئے کرائے داروں کے گھر میں ڈاکا پڑ گیا۔'' محلے میں ہر شخص کی زبان پر یہی بات تھی۔ ہم میاں بیوی تو دو دن تک سکتے کے عالم میں ہی رہے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ بچے بھی افسردہ اور سہمے ہوئے لگتے تھے۔ ہمارے پرانے محلے سے بھی ہمارے ساتھ والی آنٹی جن سے ہماری اچھی خاصی شناسائی تھی، ہمارے گھر افسوس کے لیے آئیں اور بھی کئی لوگ پہنچے۔ غرض یہ کہ چند دن گھر میں سوگ کا سماں ہی رہا۔ اسی دوران میں لاہور کے باہر سے بھی ہم دونوں کے عزیز ہم سے ملنے آئے۔ ان میں امین کے بڑے بھائی فہیم بھائی بھی تھے۔ ان کا بڑا بیٹا جو فیصل آباد میں تھا، پولیس میں اے ایس پی تھا۔ ان کے ریفرنس سے ہم نے ایف آئی آر بھی کٹوائی۔ ہم فہیم بھائی کی کار میں ان کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن سے واپس آرہے تھے۔ امین حد درجہ افسردہ تھے۔ بولے۔ ''فہیم بھائی! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کا حق نہیں مارا۔ اپنی توفیق کے مطابق صدقہ خیرات بھی کیا ہے۔''

فہیم بھائی نے تسلی دی۔ ''کتنا بڑا شکر ہے کہ اللہ پاک نے تم لوگوں کی جانیں محفوظ رکھی ہیں۔ بہرحال جو مالی نقصان ہوا ہے، اس کا بھی اللہ پاک مداوا ضرور کرے گا۔ تم لوگوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔''

فہیم بھائی اسی دن واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے تین چار دن بعد پولیس اہل کار ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں اے ایس پی صاحب نے بھیجا ہے۔ انہوں نے واردات کے حوالے سے کچھ مزید معلومات لیں اور چلے گئے۔ میں نے امین سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ انہوں نے ہمارے کیس کو سنجیدگی سے لیا ہے، ورنہ یہ لوگ تو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔''

''ہاں دیکھو، کیا بنتا ہے۔'' امین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ویسے آج ایک دوست سے بات ہوئی تھی۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب بھول جاؤ سب کچھ۔ تھانے کچہری وغیرہ کے چکر میں رہے تو تمہاری جاب بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ ایسی وارداتوں کے کھوج کم ہی ملتے ہیں۔''

''امین! ایسی بات نہ کریں۔ آپ کو یاد ہے نا فہیم بھائی نے کہا تھا خدا کی ذات پر بھروسا رکھیں۔'' دن گزرتے رہے۔ اب واردات کو ہوئے قریباً تین ہفتے ہو چلے تھے۔ مایوسی مجھ پر بھی غالب آنا شروع ہو گئی تھی۔

ایک دن بچے اسکول سے آئے۔ میں نے انہیں کھانا وغیرہ دیا اور پھر بڑے دکھی دل کے ساتھ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ فیضان اپنا کلاس ورک دکھانے کے لیے میرے پاس آیا۔ اتنی معصوم شکل بنا رکھی تھی اس نے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کاپی دیکھنے لگی۔ اچانک میں بری طرح چونک گئی۔ پورے جسم میں جیسے ایک برق سی دوڑ گئی۔ فیضان نے کاپی پر لکھتے ہوئے ذرا دبا کر لکھا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی کاپی کے صفحات پر ترچھی پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ فیضان کی لکھائی کے مدھم نقوش نیچے والے خالی صفحے پر بھی آرہے تھے۔ کچھ پڑھا تو نہیں جا رہا تھا مگر نشانات موجود تھے۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے اس منحوس رات کا وہ منظر یاد آ گیا، جب نیم گنجا سرغنہ فیضان کی کاپی پر کوئی فون نمبر لکھ رہا تھا۔ وہ امین کے خراب بال پوائنٹ سے لکھ رہا تھا اور بہت دبا دبا کر لکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دیوانہ وار اس الماری کی طرف گئی جہاں بچوں کی کاپیاں، کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ میں نے پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر مطلوبہ کاپی ڈھونڈ لی۔ میں نے اندھا دھند صفحے پلٹے اور پھر ایک خالی صفحے پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک فون نمبر نشانات کی صورت میں موجود تھا اور پڑھا جا رہا تھا۔ میں نے کاپی کو ذرا ترچھا کیا، نمبر بالکل واضح ہو گیا۔ میں امین کو یہ اطلاع دینے کے لیے ٹیلی فون کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ انتہائی تیز رفتاری سے ہوا۔ وہ فون نمبر ایک ایسا کھوج تھا جس نے صرف دس بارہ گھنٹوں کے اندر پولیس کو مجرموں کی شہ رگ تک پہنچا دیا۔ سرغنہ سمیت چھ سات افراد گرفتار ہوئے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں انہوں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ مالِ مسروقہ بھی برآمد کروا دیا۔ جو رقم ہمارے گھر سے گئی تھی اور جو برآمد ہوئی، اس میں صرف بیس پچیس ہزار کا فرق تھا۔ میرا زیور بھی جوں کا توں مل گیا تھا۔

اوپر والے کے کام اوپر والا ہی جانتا ہے۔ قیمتی بال پوائنٹ کے ساتھ فیضان کی معصوم شرارت نے ایک موقع پر ہمیں بہت تکلیف دی تھی لیکن اس کی یہی شرارت ہمارے لیے بعد ازاں ایک بہت بڑی راحت اور خوشی کا باعث بن گئی تھی۔ میں کبھی کبھی اپنے شاندار بوتیک اور گھر کو دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ قدرت نے ہمیں یہ سب کچھ ایک معصوم شرارت اور ایک خراب بال پوائنٹ کے وسیلے سے دیا ہے۔

وہ ایک بہت تلخ رات تھی۔ ''دیکھو ثانیہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔'' ندیم کے چہرے پر ایک فیصلہ کن کیفیت تھی۔

''ندیم! خدا کے واسطے ایسا مت کہیں۔ بچوں کا کیا بنے گا؟'' ثانیہ کو اپنی آواز آنسوؤں اور کرب میں ڈوبی ہوئی اور کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ندیم مزید بپھر کر بولا۔ ''یہی تو تمہارے پاس ایک حربہ ہے۔ بچوں کی بیڑیاں میرے پاؤں میں ڈال کر میری پوری

پھر یاد آئی

طاہر جاوید مغل

وقت کا احساس بغیر کسی وجود کے بھی ہمیشہ انسانی دماغ کو اپنے شکنجے میں کسے رکھتا ہے۔ یہی اس کی طاقت ہے اور اگر ماضی اچھا ہو تو اکثر آنکھوں میں آنسو بھی لاتا ہے جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا۔ یہی وقت جب کسی پر مہربان تو تمام انسان مہربان اور جب وقت اپنی سنگدلی پر اترے تو ساری مہربانیاں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ جس کو ٹھوکر مار کر اس نے پھی گھر کے دروازے سے دور کیا تھا اسی کے قدموں میں وقت اسے پھر لے آیا مگر... اس کی نفرت کی انتہا کہ اس نے ٹھوکر میں رہنے کا بھی موقع نہ دیا... یہ وقت کی ظالم صورت نہیں تو اور کیا ہے۔

رشتوں کو قدموں تلے روندنے والے ایک فاتح کی بے بسی کا احوال



زندگی جہنم بنانا چاہ رہی ہو۔ میری آنے والی نسل کو برباد کر رہی ہو۔'' ندیم کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ وہ ایسی باتیں بھی کہہ رہا تھا جو شاید وہ فی الحال کہنا نہیں چاہ رہا تھا۔

''ثانیہ! میری اور تمہاری شادی درحقیقت شادی نہیں تھی۔ یہ صرف تمہارے ماں باپ کی سوچی سمجھی سازش تھی۔ ایک دھوکا تھا اور میری زندگی کے ساتھ ایک کھلواڑ تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی کی خاطر میری زندگی میں زہر گھول دیا۔ ایک پیدائشی بیمار کو میرے پلے باندھ دیا۔'' اس نے غصے میں اپنی وارڈ روب پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یاد رکھو، میں تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو اپنی زندگی کے ساتھ مزید کھیلنے نہیں دوں گا۔ یہ سب کچھ اب میری برداشت سے باہر ہے۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی اور بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور اس کے آنسو لگاتار اس کے چہرے پر بہہ کر اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ ندیم ایک بار پھر گرجا۔

''ہاں، یہ سب میری برداشت سے باہر ہے اور شاید اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہمارے راستے جدا ہو جانے چاہئیں اور..... تمہیں تمہارے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔''

ندیم کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ ان کی بیٹی ثمرین جو تقریباً تین سال کی تھی، وارڈ روب کے نچلے خانے سے کھلونے نکالنے میں مصروف تھی۔ بہ ظاہر اس نے خود کو کھلونوں میں مصروف کیا ہوا تھا لیکن پریشانی اور کرب کے آثار نمایاں طور پر اس کے معصوم چہرے پر نظر آ رہے تھے، جو اس بات کی دلیل تھے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے پوری طرح متاثر ہے۔ بیٹا آیان صرف دو ماہ کا تھا۔ وہ بستر پر پڑا بے چینی سے رو رہا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔ اس کے نحیف بازو اور ٹانگیں مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

ندیم ثانیہ کے پاس بیٹھا اس کو شانوں سے پکڑا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ ''اب جب تم ان بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھو گی نا... تو انہیں پتا چلے گا کہ بیٹیوں کے گھر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے آباد نہیں ہوتے۔ جھوٹ برباد کرتا ہے، صرف برباد کرتا ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں.....''

ثانیہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''خدا کے لیے ندیم ایسا مت کہیں.....''

ثانیہ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ندیم نے اسے زور سے پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''طلاق دیتا ہوں میں تمہیں۔''

ثانیہ جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کی طرح وہیں قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی ہچکیوں کی آواز اب باقاعدہ رونے میں بدل گئی۔ اس کے رونے میں کرب تھا، بے بسی تھی، دہائی تھی اور خوف تھا۔ آیان کے رونے میں بھی اب شدت آ گئی تھی۔

ندیم نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ پکڑا اور روتے ہوئے بچے کو نظر انداز کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسلسل رونے سے بچے کے گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔ ثانیہ اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کو وقتی طور پر بھول گئی۔ فوراً اٹھی اور اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ندیم پاؤں پٹختا ہوا دروازے تک جا چکا تھا۔ جاتے جاتے رک گیا۔ واپس آیا اور ثانیہ کی طرف انگلی اٹھا کر غضب ناک آواز میں گرجا۔ ''اور کان کھول کر سن لو، تمہارے پاس صرف اور صرف کل کا دن ہے جو کچھ اس گھر سے لینا ہے لے لو اور دفع ہو جاؤ۔ پرسوں میں جب یہاں آؤں تو مجھے تمہاری منحوس صورت یہاں دکھائی نہیں دینی چاہیے اور دوسری بات..... ان بچوں کو ابھی لے جاؤ مگر یہ بات اپنے کھوپڑے میں بڑی اچھی طرح بٹھا لو۔ یہ میرے بچے ہیں، صرف میرے بچے۔ وقت آنے پر میں نے ان کو لے جانا ہے.....''

اس کی آواز جیسے ایک زہریلی چنگھاڑ تھی جو پورے گھر میں گونج رہی تھی پھر وہ تند بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

اور یہ وداع کی رات تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور تیز ہوا سے کھڑکیاں دروازے تھرا رہے تھے۔ وہ ثمرین اور آیان کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھی تھی، جیسے کسی پرندے نے اپنے بچوں کو پروں میں چھپا رکھا ہو، اس نے اپنا سامان سمیٹ لیا تھا اور سامان تھا ہی کتنا؟ اپنے اور بچوں کے کپڑوں کے چند جوڑے۔ ثمرین کی دو چار کتابیں اور کاپیاں، وہ چھوٹے چھوٹے تحفے جو گزری ''برتھ ڈیز'' پر ندیم نے اسے اور ثمرین کو دیے تھے۔ ایک بڑا فوٹو البم جس میں پچھلے تین چار سال کی سنہری یادیں تھیں اور بس۔ اس نے باقی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ دل ہی دل میں کہا تھا..... ندیم! یہ تمہارا گھر ہے، یہ تمہاری چیزیں ہیں۔ میں تو ایک ''چند روزہ مہمان'' کی طرح یہاں آئی تھی اور جا رہی ہوں۔

بادل زور سے گرجا۔ ننھی ثمرین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ماما... بڑی دیر ہو گئی ہے، پاپا کب آئیں گے؟ کیا وہ آج بھی نہیں آئیں گے؟''

''ہاں شاید وہ آج بھی نہیں آئیں گے۔ وہ دور گئے

ہیں۔'' وہ اشک بار آواز میں بولی۔

''وہ کیوں دور گئے ہیں؟'' اس نے توتلی زبان میں دریافت کیا۔

''یہ تو اپنے اللہ میاں سے پوچھو نا کہ کبھی پاپا..... اور کبھی ماما... اپنے بچوں سے اتنی دور کیوں چلے جاتے ہیں؟'' ثانیہ نے سسک کر کہا اور ثمرین کو اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ ثانیہ کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کھڑکی کھل گئی۔ یادوں کے سلسلے دراز ہونے لگے..... ثانیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی پیدائش پر اس کے والدین بہت خوش تھے لیکن بہت کچھ بدلنے والا تھا اور بہت جلد بدلنے والا تھا۔ ثانیہ اپنی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد سے ہی بیمار رہنے لگی تھی۔ مختلف ڈاکٹرز سے اسے چیک کرایا گیا۔ بالآخر اس کے والد سرمد صاحب جب ایک معروف لیبارٹری سے اس کی ٹیسٹ رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے پیشہ وارانہ لہجے میں انہیں بتایا کہ ان کی بچی خون کی بیماری کا شکار ہے اور یہ تھیلیسیمیا کی ہی ایک قسم ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے ان سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور کہا کہ اگر باقاعدہ علاج ہو اور کچھ پرہیز کا خیال رکھا جائے تو کافی حد تک اور کافی دیر تک اس بیماری کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ آگے جا کر یہ بیماری مکمل طور پر ٹھیک بھی ہوسکتی ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے کی طرف سرکتا رہا۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق ثانیہ کی ٹریٹمنٹ ہوتی رہی۔ گاہے بگاہے اسے خون بھی لگتا رہا۔ ثانیہ کی والدہ شروع شروع میں تو بہت رنجیدہ رہیں لیکن پھر انہوں نے خود کو پوری طرح ثانیہ کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے لیے وقف کردیا۔ ثانیہ اپنے والدین کے گھر ان کی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد ان کی مزید کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ ثانیہ اپنے والدین کی زندگی کا مرکز و محور تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ثانیہ نے اپنے والدین کی توجہ و محبت، ڈاکٹرز کی محنت اور سب سے بڑھ کر اللہ کی مرضی اور منشا کے طفیل جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اس کی بیماری کافی حد تک کنٹرول میں تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسے دو تین ماہ تک خون کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی اور وہ جیسے بھول ہی جاتی تھی کہ وہ بیمار بھی ہے۔ ثانیہ اب سیکنڈ ایئر میں تھی۔

ایک خیال تھا، ایک سوچ تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرمد صاحب اور ان کی بیوی آسیہ کے ذہن میں جڑ پکڑ رہی تھی اور وہ سوچ تھی ثانیہ کی شادی۔ اس کی معاشی و معاشرتی ضرورت کی۔ ثانیہ کے لیے ایک ایسے ناتے کی جو ان کے جانے کے بعد ثانیہ کو سہارا دے۔ اس کے لیے سائبان بنے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ حالات نے پلٹا کھایا اور انہیں اپنی پریشانی خوشی اور امید میں بدلتی دکھائی دی۔

ایک دن شام کو سرمد صاحب بستر پر لیٹے تو ثانیہ کی والدہ آسیہ بیگم ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ ''سرمد! آج آپ سے ایک بڑی اہم بات کرنی ہے۔''

''ہاں بولو۔'' سرمد صاحب تھوڑا سا اٹھ کر تکیہ لگانے والے انداز میں نیم دراز ہوگئے۔

''آج میں اور ثانیہ سپر اسٹور گئے تھے کچھ چیزیں لینے۔ وہاں ہمیں ایک عورت ملی۔ وہ دیکھنے میں ہی بہت بھلی اور ملنسار لگتی تھیں۔''

''ہاں ہاں۔ آگے بھی بولو۔''

''انہیں ثانیہ بہت پسند آئی ہے۔ وہ رشتے کے سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں۔'' آسیہ بیگم بڑے غور سے اپنے شوہر کے تاثرات دیکھ رہی تھیں، ان کے چہرے پر پہلے امید کی کرن سی چمکی لیکن پھر چہرہ سپاٹ ہوگیا۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں آسیہ بیگم۔ اگر وہ ہمیں اور ہم انہیں پسند آ بھی جائیں تو جب انہیں ثانیہ کی تکلیف کا پتا چلے گا تو وہ پیچھے ہٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے۔''

''پتا نہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ خاتون کوئی فرشتہ ہی تھیں اور جس طرح انہوں نے اپنی چاہت کا اظہار کیا ہے، میرا دل ان کی طرف کھنچتا ہے۔''

سرمد صاحب خاموش رہے۔ آسیہ بیگم نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''چلیں، انہیں آنے تو دیتے ہیں۔ ملنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ پھر ہم نے کون سا خود انہیں مدعو کیا ہے۔ وہ اپنی چاہت سے ملنا چاہتے ہیں۔''

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن کسی شدید خواہش یا اندیشے کی زد میں یوں آتا ہے کہ اس خواہش کی تکمیل یا اس اندیشے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دھن میں وہ اخلاقیات اور اصول و ضوابط کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

ثانیہ کے والدین کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ انہیں وہ لوگ بہت بھلے محسوس ہوئے اور وہ رشتہ اپنی بیٹی کے لیے ہر لحاظ سے موزوں نظر آیا اور وہ چاہنے کے باجود ان لوگوں کو اپنی بیٹی کی بیماری کے متعلق نہ بتا پائے۔ شاید ذہن

میں یہی تھا کہ ثانیہ بتدریج ٹھیک ہورہی ہے اور کیا پتا کہ شادی کے بعد یہ روگ ویسے ہی اس کی زندگی سے جدا ہوجائے۔

رشتہ طے ہونے کے موقع پر لڑکے والوں کو کچھ بتایا نہیں گیا تھا مگر ثانیہ کے ذہن میں جیسے ایک پھانس سی چبھی ہوئی تھی..... ایک دن والدہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے ایک ریسٹورنٹ میں اپنے ہونے والے شوہر ندیم سے ملاقات کی۔ وہ اسے اپنی بیماری کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ''ہاں ثانیہ جی، اب بتائیں، وہ کیا خاص بات ہے جس کی بدولت مجھے آج آپ سے اس طرح ملنے کا شرف حاصل ہوا؟'' کھانے سے فارغ ہوکر، ندیم نے ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

ثانیہ کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور اس کے ہونٹ بار بار سوکھ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''ندیم..... دراصل..... میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے آپ میرے بارے میں سب جانتے ہوں۔''

ندیم کے چہرے پر یکدم سنجیدگی امڈ آئی۔ ''دیکھو ثانیہ، میں ذرا مختلف قسم کی سوچ رکھتا ہوں، ماضی بس ماضی ہوتا ہے۔ اسے پیچھے چھوڑ دو۔ انسان کے چہرے پر اس کی آنکھیں آگے کی جانب اس لیے ہیں تاکہ وہ آگے دیکھے۔ پچھلی باتوں اور واقعات کو ڈسکس کرنے کا میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں۔ ماضی کے متعلق نہ میں تم سے کبھی کچھ پوچھوں گا اور نہ تم پوچھوگی۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میرا حکم بھی.....'' ندیم نے آخری الفاظ مسکراتے ہوئے کہے تھے تاکہ ماحول کی سنجیدگی کم ہو۔

ثانیہ نے پھر بولنا چاہا لیکن ندیم نے باقاعدہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بات کا رخ ہی کچھ اور ہوگیا تھا۔ ثانیہ پختہ ارادہ لے کر آئی تھی کہ ندیم کو اپنی تکلیف کے نشیب و فراز کے بارے میں بتادے گی لیکن آج اس سے مل کر، اس کی باتیں سن کر اس کو جان کر نہ جانے کیوں وہ ایک دم کمزور ہوگئی۔ حالات اپنی بے پناہ کشش اور خوش آئند تصورات کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس نے بھی سب کچھ ''وقت'' پر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

دسمبر کی ایک سرد شام میں ثانیہ اور ندیم کی شادی ہوگئی اور وہ دلہن بن کر ندیم کے گھر آگئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے گھر کا کچن سنبھال لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ندیم سے جڑی ہر ذمے داری کو اپنے اوپر لے لیا۔ چند اور دن نارمل انداز میں گزر گئے..... لیکن یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں رہنے والا تھا۔ وہ وقت تیزی سے قریب آرہا تھا جب ثانیہ کی بیماری والی بات راز نہیں رہنا تھی۔ اس کی طبیعت بتدریج بوجھل ہورہی تھی۔ اگلے مہینے کی پانچ چھ تاریخ تک اسے خون لگنا ضروری تھا۔

ایک روز جب وہ خود کو بہت زیادہ مضمحل محسوس کر رہی تھی، اس نے فون پر والدہ سے بات کی اور دیر تک آنسو بہائے۔ مشورہ یہی ہوا کہ اب ندیم کو اس بارے میں بتادیا جائے۔

ندیم کو اس بارے میں بتانا ثانیہ کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح یہ سب کر گزری۔ ندیم کا ردعمل خاصا گمبھیر تھا۔ وہ دکھی بھی تھا اور ناراض بھی۔ ثانیہ نے اسے بتایا کہ وہ جب شادی سے پہلے اسے ریسٹورنٹ میں ملی تھی تو مقصد یہی تھا کہ اسے اس بارے میں آگاہ کرے لیکن وہ کسی صورت اسے کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے کمزور پڑگئی اور جب اس نے اسے ماضی کے متعلق بات کرنے سے بالکل روک دیا تو وہ رک گئی۔

ندیم کے علاوہ اس کے والدین کو بھی اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ گھر میں عجیب کشیدگی کی سی کیفیت ہوگئی۔ سب سے پہلا تاثر یہی تھا کہ ثانیہ کے گھر والوں نے اور ثانیہ نے ندیم سمیت سب کو دھوکے میں رکھا ہے۔ ثانیہ کی ساس نے کافی سخت باتیں کہیں۔ جس کے بعد ثانیہ روتی دھوتی اپنے میکے آگئی۔ اس تناؤ کے سبب اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ وقت پر خون لگنا بھی ضروری تھا۔ اسے اسپتال داخل کرادیا گیا۔ وہ قریباً دو ہفتے اسپتال میں رہی۔ اس دوران میں سسرال کی طرف سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ فقط ایک مرتبہ ندیم کا مختصر سا فون آیا۔

ثانیہ کی حالت نارمل ہوگئی اور ٹریٹمنٹ مکمل ہوگئی تو والدین اسے گھر لے آئے۔ گھر آنے کے قریباً دو ہفتے بعد ثانیہ کے سسر نے سرمد صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کافی سخت باتیں کہیں۔ سرمد صاحب نے اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی جس کو انہوں نے بالکل اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔ ''دیکھیں وقت کیا فیصلہ کرتا ہے۔''

کچھ دنوں بعد ثانیہ کو پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔ اپنے اردگرد کے اتھاہ اندھیرے میں جیسے اسے امید کی ایک کرن سی چمکتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا دھیان اپنے ناگفتہ بہ حالات

سے ہٹانے کی کوشش کی اور ایک ننھی سی جان کی خاطر خود کو زندگی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔

ثانیہ کے سسرال کی طرف سے مزید کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ وقت گزرتا گیا لیکن اب ایک حوصلہ سا تھا، امید کی ایک کرن سی تھی جو ثانیہ اور اس کے والدین کو نظر آرہی تھی..... اور پھر وہ وقت آگیا جس کا انہیں انتظار تھا۔ ثانیہ نے ایک بہت ہی پیاری بچی کو جنم دیا۔ بچی ہر لحاظ سے تندرست اور صحت مند تھی۔ بچی کا رنگ روپ ثانیہ پر تھا تاہم اس کے نین نقش میں ندیم کی نمایاں جھلک تھی۔ یہ خوب صورت پھول سرمد صاحب کے گھر میں امید کا یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ شاید اب ان کی بیٹی کا گھر پھر سے آباد ہو جائے اور اس کی زندگی پھر سے رواں دواں ہو جائے۔

ایک دن ثانیہ کی والدہ آسیہ بیگم نے بچی کو گود میں لیتے ہوئے ثانیہ سے پوچھا۔ ''بچی مہینے کی ہونے والی ہے۔ تم نے ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا۔ اتنی دیر تو ٹھیک نہیں۔''

''امی! میرا دل چاہتا ہے کہ ندیم خود اس کا نام رکھیں۔'' ثانیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ماں نے ثانیہ کا ماتھا چوما۔ ''تم پریشان نہ ہو، تم دیکھنا اب اولاد کی محبت اسے خود کھینچ کر ادھر لائے گی۔'' ان کی آواز میں امید کے دیے روشن تھے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ برف پگھلنے لگی۔ ایک دن ثانیہ کے سسر نے سرمد صاحب کو فون کیا اور پھر چند دن بعد ندیم اور دیگر گھر والے ثانیہ اور بچی کو اپنے گھر لے گئے۔ گلے شکوے دور ہوئے اور ندیم اپنی پھول سی بچی کو دیر تک سینے سے لگائے اس کا سر چومتا رہا۔

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر چل نکلی۔ اب وہ دو نہیں تین تھے اور یہ جو تیسرا تھا وہ ان کو باندھ کر رکھے ہوئے تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور راحتیں پھر سے ان کی زندگی میں داخل ہونے لگیں..... لیکن جو کچھ بھی تھا ثانیہ صاف محسوس کرتی تھی کہ اس گھر میں اس کے رتبے میں کمی واقع ہو چکی ہے اور تو اور ندیم بھی کسی وقت بیگانے سے لگنے لگتے تھے۔ وہ اکثر اس وقت کو کوستی تھی جب شادی سے پہلے وہ ندیم کو سچ بتاتے بتاتے رہ گئی تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جا رہا تھا۔ ندیم کمپیوٹر پروگرامر تھا۔ اب اسے ایک بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ وہ اپنے کام میں زیادہ مگن ہو گیا۔ گھر آکر بھی رات گئے تک لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کرتا رہتا۔ ایک دن ثانیہ نے کہا۔ ''ندیم! آپ گھر آکر بھی اکثر کام کرتے رہتے ہیں۔ آفس والے اتنا کام کیوں لیتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''لیتے نہیں ہیں کرنا پڑتا ہے۔ جب گھر کے خرچے ہوں، مستقل علاج معالجے ہوں تو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔''

ندیم کا اشارہ اس ماہانہ خرچے کی طرف تھا جو ثانیہ کی ٹریٹمنٹ پر اٹھتا تھا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔ بہرحال ایک بات ثانیہ کے لیے امید افزا تھی۔ وہ اب خود کو بتدریج بہتر محسوس کرتی تھی۔ عام حالات میں بالکل صحت مند لگتی تھی۔ تین چار ہفتوں کے بعد ''بوجھل طبیعت'' والے مختصر دورانیے آتے تھے جو ''ٹریٹمنٹ'' کے بعد اوجھل ہو جاتے تھے۔

ندیم جب بھی گھر آتا، فریش ہونے کے بعد ثمرین کو گود میں اٹھاتا اور اس سے باتیں کرتا لیکن ثانیہ نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ندیم کے تاثرات اور انداز میں ثمرین کے لیے کبھی بھی بہت زیادہ پیار اور بے تابی نہیں جھلکی۔ اسے ایک اور بچے کی خواہش تھی، ایک بیٹے کی، تندرست و توانا بیٹے کی۔

ایک روز شام کی چائے پیتے ہوئے وہ قدرے اداس لہجے میں بولا۔ ''ثانیہ! مجھے ایک بیٹا چاہیے۔ ایک وارث..... جو ہماری نسل کو آگے بڑھائے۔''

''کیوں نہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔'' ثانیہ نے شرما کر مختصر سا جواب دیا۔

ندیم بولا۔ ''ویسے میں نے ایک دو ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تھیلیسیمیا کے مریضوں کی اولاد کا زندگی پانا ایک کرشمہ ہے مگر یہ شرح بہت زیادہ نہیں۔ اگر آپ کا پہلا بچہ صحت مند ہے تو زیادہ چانسز ہیں کہ آپ کا اگلا بچہ بھی صحت مند ہو۔''

اس حوالے سے ثانیہ اور ندیم دونوں کے ذہنوں میں اندیشے موجود تھے اور وہ اس بارے میں ڈسکس کرتے رہتے تھے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ ثمرین کی پیدائش کے قریباً تین سال بعد ثانیہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ ندیم اور ثانیہ کو بہت امید تھی کہ ان کا بیٹا بھی ان کی بیٹی کی طرح صحت مند اور تندرست ہوگا مگر افسوس..... یہ ساری امیدیں اور دعائیں پوری نہیں ہوئیں۔ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی یہ انکشاف ہو گیا کہ نومولود اپنی ماں سے وہی بیماری اپنے وجود میں لے آیا ہے جس نے پہلے ہی اس گھرانے کی زندگی کو تلخ کر رکھا تھا۔ بچہ یہ بیماری تو اپنے ساتھ لایا ہی تھا وہ ویسے بھی بے حد لاغر تھا۔ دبلی پتلی ٹانگیں، سیاہی مائل زرد رنگت، مچی مچی آنکھیں۔ زندگی کے آغاز میں ہی اسے سانس کی تکلیف نے بھی گھیرا ہوا تھا۔

ندیم پر تو جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس نے کئی دن ثانیہ سے بات تک نہیں کی۔ نہ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا، نہ اس کا ماتھا چوما، نہ اس کے معصوم لمس کو محسوس کیا۔ اس کے گھر والوں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ سب کے سب جیسے اس سلسلے میں ثانیہ کو ہی قصوروار سمجھتے تھے۔

تین چار ہفتوں میں ہی حالات بہت بگڑ گئے۔ ندیم کا رویہ تلخ تر ہوتا چلا گیا..... اور پھر ایک دن وہ حشر برپا ہوگیا جس نے ثانیہ اور اس کے دونوں بچوں کی زندگی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ طلاق..... طلاق..... طلاق..... اور سب کچھ ختم ہوگیا۔ زندگی کا درخت جیسے جڑوں سے اکھڑ گیا اور خاک پر ڈھیر ہوگیا۔

.....اور آج..... آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی۔ باہر بادل ابھی تک گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے بارش کے تریڑے بھی کھڑکیوں پر دستک دینے لگتے تھے۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ننھی ثمرین اس کی گود میں سوئی ہوئی تھی اور دو ماہ کا آیان ''بے بی کارٹ'' میں سو رہا تھا۔ ہاں، صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی لیکن اس صبح میں سیاہ رات کی سی تاثیر تھی۔ یہ وداع کی صبح تھی اور جو گزری تھی وہ وداع کی رات تھی۔

☆☆☆

دن اور رات کے سیاہ اور سفید پنچھی ایک دوسرے کے پیچھے کھیلتے رہے۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کی جانب سرکتی رہیں، وقت گزرتا رہا۔ ثانیہ کو طلاق دینے کے بعد ندیم لاہور سے کوئٹہ شفٹ ہوگیا۔ اس کے والدین بھی ساتھ تھے۔ یہاں اسے بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے وہاں اپنا گھر بھی بنالیا۔ پھر اس کی زندگی میں نائلہ آگئی۔ یہ نائلہ یونیورسٹی میں اس کے ساتھ ہی پڑھتی رہی تھی۔ ان دنوں نائلہ کے ساتھ اس کی کافی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ دونوں شادی کا سوچنے لگے تھے مگر پھر نائلہ کے والدین کی وجہ سے یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اب نائلہ کے والد وفات پا چکے تھے اور صورتِ حال کافی تبدیل ہوگئی تھی۔ نائلہ بھی کوئٹہ میں ہی تھی اور ایک پرائیویٹ کالج میں انتظامی امور سرانجام دے رہی تھی۔ دونوں میں ایک بار پھر میل ملاقات شروع ہوگیا۔ دراصل ندیم کا یہی وہ ماضی تھا جسے ندیم نے شادی سے پہلے والی ملاقات میں ثانیہ سے چھپایا تھا..... اور ثانیہ سے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے ماضی کا ذکر نہ کرے۔

ایک سال بعد کوئٹہ میں ہی ندیم اور نائلہ کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد تین چار ماہ تو اچھے گزرے، پھر آہستہ آہستہ نائلہ کا اصل روپ سامنے آنا شروع ہوگیا۔ ایک ورکنگ وومن کی حیثیت سے وہ بہت حد تک حاکمانہ مزاج رکھتی تھی۔ اس نے ندیم کو بھی اپنے مطابق چلانے کی کوششیں شروع کردیں۔ وہ جس فیملی سے آئی تھی وہ معاشی اعتبار سے ندیم کی فیملی کی ہم پلہ نہیں تھی۔ نائلہ کے اندر روپے پیسے کی اضافی طلب بھی تھی۔ اسے ندیم کے گھر میں ہر طرح کی سہولت اور آسائش مہیا تھی مگر اس کی نگاہ آگے..... مزید آگے کی طرف رہتی تھی۔ ندیم کے والدین کو اس نے بالکل کھڈے لائن لگا دیا اور ندیم کو بھی ہر طرح جکڑنا شروع کردیا۔ آئے دن گھر میں جھگڑے رہنے لگے..... دو ڈھائی سال میں ہی ندیم ہائی بلڈ پریشر کا مریض بن گیا۔ اس کی جاب بھی متاثر ہونے لگی۔ کسی وقت وہ نائلہ سے لڑ جھگڑ کر لیٹا ہوتا تو اسے چار برس پہلے کے شب و روز یاد آتے..... لاہور کا گھر اور اس گھر میں مسکراتی ہوئی سی ایک صورت..... اسے ثانیہ یاد آتی، اس کی خدمت اور محبت یاد آتی اور وہ بے ساختہ اس ''جدا ہوجانے والی'' کا موازنہ اس عورت سے کرنے لگتا جو اب بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں موجود تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکل کر رہ جاتی۔ وہ سوچتا کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہوا۔

اب اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ثانیہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ جب اس نے ثانیہ کو طلاق دی تھی تو واضح طور پر کہا تھا کہ بیٹا اس کے بچے ہیں اور وہ ایک دن انہیں اپنے پاس لے آئے گا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ جہاں اور بہت کچھ بدلا تھا، یہ سوچ بھی بدل گئی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اسے اب بچوں کی کوئی خاص طلب نہیں رہی تھی۔ خاص طور سے بیٹے کی یاد تو اسے کبھی بھول کر بھی نہ آئی تھی۔ وہ جب بھی اس کے بارے میں سوچتا اس کے ذہن میں گوشت کا ایک بیمار لوتھڑا آتا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد رنگ..... دواؤں کی بو..... لیبارٹریوں کی ٹیسٹ رپورٹیں..... خون کی بوتلیں اور وہ سب کچھ جو دائمی مریضوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ بیٹی کی یاد بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ ندیم کے والد تو دو سال پہلے فوت ہوگئے تھے۔ والدہ روز روز کے گھریلو جھگڑوں کے سبب بیمار رہتی تھیں۔ شروع میں تو وہ پوتی کو یاد کرتی رہی تھیں مگر اب انہیں اپنی بیماری سے لڑائی کے سوا باقی باتیں کم ہی یاد رہتی تھیں۔

یہ زبردست ذہنی تناؤ اور انتشار کی وجہ ہی تھی کہ ایک روز آفس سے گھر آتے ہوئے ندیم اپنی مہران کار کا ایکسیڈنٹ کر بیٹھا۔ ایکسیڈنٹ شدید تھا۔ اس کی دونوں پنڈلیاں ٹوٹ گئیں اور وہ اسپتال میں جا پڑا۔ گھریلو جھگڑے اور معاشی

حالات پہلے ہی ناک میں دم کیے ہوئے تھے، اب یہ حادثہ ''مرے کو مارے شاہ مدار'' کی مثل تھا۔ خرانٹ نائلہ نے جب یہ دیکھا کہ شوہر بستر پر ہے تو اس نے مزید پر پرزے نکالے۔ ایک۔ پلاٹ تو وہ لڑ جھگڑ کر پہلے ہی اپنے نام کرا چکی تھی۔ ایک کا اس نے مختار نامہ لے لیا تاکہ اسے بیچ کر ندیم کا علاج معالجہ کرایا جاسکے۔ بعد میں پتا چلا کہ جو علاج معالجہ ہو رہا ہے، وہ گروی کے پیسوں سے ہو رہا ہے اور پلاٹ کی رقم ہڑپ ہو چکی ہے۔ نائلہ نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کسی طرح ندیم کے مکان کو گروی رکھ دیا تھا اور اس کے عوض کافی ساری رقم اکٹھی کرلی تھی۔ خود وہ ندیم کی بیمار والدہ کے ساتھ اپنے ہی گھر کے نچلے پورشن کے ایک کمرے میں بطور کرایہ دار رہائش رکھے ہوئے تھے۔

اسپتال میں جب ندیم پر یہ راز فاش ہوا تو خوب جھگڑا ہوا۔ دو تین ہفتوں میں ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ علیحدگی کی بات ہونے لگی۔ اسی دوران میں ندیم کی والدہ بھی راہی عدم ہوئیں۔ نائلہ نے بہ مشکل ڈیڑھ مہینا انتظار کیا اور پھر ندیم سے خلع لے کر اپنے بھائی کے ساتھ دبئی سدھار گئی..... ندیم کی زندگی کا ایک اور باب ختم ہوگیا۔

☆☆☆

ندیم کی ٹانگوں کے زخم بگڑ چکے تھے۔ آرتھوپیڈک مسائل بڑھتے جارہے تھے۔ وہ دو ہفتے گھر میں رہتا تو چار ہفتے اسپتال میں گزارنا پڑتے۔ پہلے وہ مکان کی گروی چھڑانا چاہتا تھا مگر اب یہ سوچ پنپ رہی تھی کہ مکان بیچ ہی ڈالے اور جو مزید رقم ملے اس سے اپنی زندگی کی گاڑی چلانے اور اپنا علاج کرانے کی کوشش کرے۔

بالآخر مکان بھی بک گیا۔ اسے قریباً تیس لاکھ روپیا ملا۔ شروع میں تو یہ معقول رقم لگتی تھی لیکن اسپتالوں میں جو لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے بھی اکثر نے بہت کند چھریاں پکڑ رکھی ہیں۔ بے رحمی سے ذبح کرڈالتے ہیں۔ ایک سال کے اندر اندر ندیم کی آدھی سے زائد رقم ٹھکانے لگ گئی۔ اس نے مکمل تباہی سے بچنے کے لیے ایک اندرونی مارکیٹ میں ایک چھوٹی دکان کرائے پر لے لی اور وہاں ''کمپیوٹر اسیسریز'' رکھ لیں۔ اس کی ٹانگوں کی حالت اب بہتر ہو رہی تھی اور وہ بیساکھی کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا مگر بلڈ پریشر کی جو تکلیف اسے نائلہ سے گھریلو جھگڑوں کے دوران میں شروع ہوئی تھی، وہ بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تکلیف اس کی آنکھوں اور گردوں پر بھی اثر کر رہی تھی۔ اسے گرمیوں میں اکثر و بیشتر گردوں کا ''پرابلم'' ہوجاتا تھا اور کسی وقت اسے ''ہاسپٹلائز'' بھی ہونا پڑتا تھا۔ زندگی کے ماہ و سال اڑتے چلے جارہے تھے۔ دور و نزدیک ندیم کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ حلقۂ احباب بھی بہت محدود تھا۔ وہ بس اپنی چھوٹی سی دکان یا پھر اسپتال تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ نائلہ اور اس کا لالچی بھائی، اپنے والدین، اپنی پہلی بیوی ثانیہ، ننھی ثمرین اور بیمار گوشت کا وہ لوتھڑا جسے اس کے دادا نے آیان کا نام دیا تھا۔ ہاں وہ سب کچھ بھول چکا تھا لیکن کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کیا وہ ثانیہ کی جھیل سی آنکھوں میں چھپی ہوئی محبت کو بھی بھول چکا ہے۔

☆☆☆

وہ اگست ستمبر کے دن تھے۔ ندیم شدید بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق گردوں کا باقاعدگی سے ڈائیلاسس ہو رہا تھا، پھر بھی اس کی طبیعت بگڑتی جارہی تھی۔ اس نے ابھی عمر کی 55 بہاریں ہی دیکھی تھیں لیکن وہ ستر برس کا لاغر بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ایک قریبی دکاندار دوست نثار نے اسے بڑی افراتفری میں اسپتال پہنچایا۔ وہ اس وقت تقریباً بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو سرکاری اسپتال کا ڈاکٹر اس کے سامنے کھڑا تھا اور ذرا سخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ''بابا جی! آپ بول سکتے ہو۔ بولنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو۔ آپ کے ساتھ کون ہے یہاں؟''

ندیم نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اردگرد دیکھا۔ کوئی نہیں تھا..... دور دور تک کوئی نہیں تھا، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بابا جی! آپ کی تکلیف بہت بڑھ چکی ہے۔ اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ آپ کو گردہ لگایا جائے۔ کیا آپ کے قریبی رشتے داروں میں کوئی ایسا ہے جو آپ کو گردہ دے سکے؟''

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی دوران میں کہیں سے اس کا دکاندار دوست نثار بھی آگیا۔ اس نے ندیم کا کمزور شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ندیم! ڈاکٹر صاحب تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔''

ندیم نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ دراز قد ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک اور ڈاکٹر ہاتھ میں فائل لیے اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے دراز قد ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر احمد! پچھلی مرتبہ بھی جب یہ ایڈمٹ ہوئے تھے تو ان کے ساتھ ان کے اس دوست کے سوا اور کوئی بھی

نہیں تھا۔ اس وقت بھی ہم نے ان کو بتایا تھا کہ ان کا معاملہ اب کڈنی ٹرانسپلانٹیشن کی طرف جارہا ہے۔''

ڈاکٹر احمد نے فائل کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پستہ قد ڈاکٹر..... سینئر ڈاکٹر احمد کو مؤدب انداز میں بریفنگ دیتا چلا جارہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک لاتعلق سی مایوسی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر احمد دیگر ڈاکٹرز کے ساتھ دوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ندیم کی موٹی تگڑی میڈیکل فائل بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نثار دکھی چہرہ لیے اپنے شدید بیمار دوست کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر احمد اس وقت گردے کے علاج میں چوٹی کا ڈاکٹر ہے۔ پچھلی مرتبہ بھی اس نے کہا تھا کہ اگر تمہارا کوئی عزیز تمہیں گردہ دے سکے تو وہ تمہیں دوبارہ سے کھڑا کردے گا۔

ندیم کراہ کر بولا۔ ''تم تو میری ہی طرح بوڑھے ہو۔ مجھے اور کون گردہ دے گا اور مجھے اب گردے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تو اب سوجانا چاہتا ہوں..... بہت لمبی نیند..... بہت دیر تک کے لیے۔''

نثار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ایسی باتیں مت کرو یار! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے.....''

ندیم کی کمر کی دونوں جانب شدید درد شروع ہوگیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زہر اس کے دماغ کو چڑھ رہا ہے۔ پھر وہ اپنے واحد سہارے (نثار) کا ہاتھ پکڑے پکڑے بے ہوش ہوگیا۔

یہ ایک طویل بے ہوشی تھی جس میں کبھی کبھی نیم بے ہوشی اور بیداری کے وقفے بھی آتے تھے۔ کسی وقت وہ اپنے نتھنوں میں تیز دواؤں کی بو محسوس کرتا، کسی وقت اسے اپنے جسم میں انجکشن لگنے کا احساس ہوتا۔ کسی وقت وہ دھندلی نظروں سے دیکھتا کہ نثار یا پھر سرخ و سپید چہرے والا ڈاکٹر احمد اس پر جھکا ہوا ہے۔ کسی وقت اسے ان کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ کسی دلدل میں دھنستا چلا جارہا تھا۔ ڈوبتا چلا جارہا تھا۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا..... اس کا اپنا کوئی نہیں تھا.....

☆☆☆

وہ ایک خوشگوار سی شام تھی۔ پتا نہیں کتنے گھنٹوں یا دنوں بعد ندیم مکمل ہوش میں آیا تھا۔ وہ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر قوسِ قزح نظر آرہی تھی۔ شاید اگست کی تیز بارش کے بعد ابھی

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

پیارے بچے تھے۔ ایک قریباً پانچ سال کا دوسرا تین سال کے لگ بھگ۔ ندیم کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا..... یہ اس کی ننھی ثمرین تھی۔ آخری مرتبہ اسی منحوس اندھیری رات میں ندیم نے اسے دیکھا تھا، جب اس نے اپنے منہ سے "طلاق" کے زہریلے بے رحم الفاظ نکالے تھے، وہ وارڈ روب کے قریب اپنے کھلونوں میں مگن رہنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مگر اس کا معصوم چہرہ بے پناہ غم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کم وبیش چھبیس ستائیس سال بعد پھر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ روتی ہوئی آگے بڑھی، ندیم نے اسے لیٹے لیٹے اپنے ساتھ لپٹا لیا..... "میری ثمر" وہ سسک اٹھا۔ "میری ثمر۔"

.....اگلے تین چار گھنٹوں میں ندیم پر کئی انکشافات ہوئے۔ ڈاکٹر آیان احمد کو ندیم کے بارے میں شک اس وقت ہوا تھا جب اس نے ندیم کی فائل تفصیل سے دیکھی تھی اور اس کی میڈیکل ہسٹری پڑھی تھی۔ اپنے دادا یعنی والد کے والد کا نام اور والد کے پیشے کے بارے میں پڑھ کر آیان احمد کی چھٹی حس نے اسے کچھ اہم سگنل دیے تھے۔ اس نے اگلے دو تین دن میں تیزی سے معلومات حاصل کی تھیں اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس سرکاری اسپتال کے کڈنی وارڈ میں جو لاغر ولاوارث بوڑھا پڑا ہے، وہ اس کا باپ ہے۔ وہی شخص جس کی یادیں اس نے، اس کی بڑی بہن نے اور ماں نے سچے موتیوں کی طرح سنبھال رکھی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہر دیکھنے سننے والے کو حیران و ششدر کر گیا۔ ایک جواں سال معروف کڈنی سرجن خود اپنا ایک کڈنی ایک مریض کو دے رہا تھا اور وہ مریض اس کا باپ تھا۔

☆☆☆

یہ چند دن بعد کی بات ہے، ندیم اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ اپنی بچھڑی ہوئی شریک حیات ثانیہ سے ملنے روانہ ہوا۔ ڈاکٹر احمد نے اپنی ہنڈا اکارڈ گاڑی قبرستان کے مین گیٹ کے سامنے روکی۔ وہ تینوں زخمی دلوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ شہر خموشاں میں داخل ہوئے۔ یہاں وہ ہستی سو رہی تھی جس نے حالات کی ستم ظریفی سے طلاق جیسا خوفناک گھاؤ اپنے سینے پر سہا۔ اپنے بچوں کو لے کر در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ اپنی بیماری سے جنگ کرتی رہی، اپنے بچے کی بیماری سے مقابلہ کیا..... اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مصیبتیں سہیں، اپنی جان کو رولا..... بے رحم وقت کا ہر وار اپنے سینے پر سہا اور والدین کی وفات کے بعد حالات کے کوہِ گراں سے تنہا ٹکراتی رہی۔

اس نے بہت اہم کام کیے اور اس کا ایک اہم ترین کام یہ تھا کہ اس نے ایک بیمار کمزور اور مدقوق بچے کو اپنے خون پسینے سے سینچ کر پالا۔ اسے تھیلیسیمیا جیسی بیماری سے ابھارا اور اسے ایک نہایت کامیاب و نیک نام انسان بنایا..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ایک ایسا بیٹا بنایا جو وقت پڑنے پر باپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

ثانیہ کی قبر پر پہنچ کر ندیم کا سارا جسم لرزنے لگا۔ وہ اس کا کتبہ دیکھنے لگا۔ وہ آج سے تقریباً تین سال پہلے منوں مٹی کے نیچے جا سوئی تھی۔ وہ واپس نہیں آسکتی تھی۔ وہ لاکھ پکارتا رہتا لیکن اب اس نے جواب نہیں دینا تھا۔ کچھ بھولی بسری آوازیں ندیم کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

"اللہ کا واسطہ ہے ندیم، ایسی باتیں مت کریں۔ بچوں کا کیا بنے گا؟"

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں....."

"خدا کے لیے ندیم! آگے مت بولیں۔"

"دفع ہو جاؤ..... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

وہ قبر پر سر ٹکا کر بیٹھ گیا..... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پتا نہیں کہ وہ کتنی دیر اسی حالت میں رہا۔ شاید ایک گھنٹا..... شاید دو گھنٹے..... یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ اسے لگا کہ اس کے جسم کا سارا پانی آنسو بن کر آنکھوں کے راستے بہہ گیا ہے۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ اسی طرح رہا..... پھر وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔

اگلے روز جب اس نے اپنے بیٹے کے گھر کے ایک کمرے میں آنکھ کھولی تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ارد گرد کافی لوگ جمع تھے۔ اس کی بیٹی ثمرین، اس کے تین بچے، اس کا بیٹا ڈاکٹر احمد اور اس کے دو بچے، اس کی نیک صورت بہو..... اگر کوئی نہیں تھا تو وہی نہیں تھی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی..... ایک دم اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ اب اسے کبھی نہ دیکھ پائے گا؟ تاہم اپنے ان سب بچوں کے درمیان چند گھنٹے گزارنے کے بعد اسے یہ لگا کہ وہ بھی یہیں موجود ہے۔ کسی بچے کے چہرے پر اس کے ہونٹ تھے، کسی کی آنکھوں میں اس کی گہری سیاہ پتلیاں تھیں، کسی کے سر پر اس کے لہریے دار بال تھے، کسی کی پیشانی میں اس کی جھلک تھی اور کسی کے گلے میں اس کی ہنسی جلترنگ بجاتی تھی۔ یہاں وہ اپنے ان سارے بچوں میں تھی اور اس کے آس پاس تھی، وہ اسے محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے ایک عجیب آسودہ کیفیت کے زیر اثر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا کہ ابھی کچھ دن اور جیا جا سکتا ہے۔

بسوں سے سری نگر کی طرف واپس آتے ہوئے مسافر بس اننت ناگ کے پر ہجوم اڈے پر تھوڑی دیر کے لیے رکی تھی۔ وقاص نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پھیری والے بس کے اردگرد آن کھڑے ہوئے تھے اور مختلف آوازیں لگا کر اپنا سودا فروخت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک چھابڑی فروش عورت کے پاس ذرا جدا قسم کا سودا تھا۔ وہ چوڑیاں فروخت کر رہی تھی۔ وقاص کی نگاہیں رنگ برنگی خوب صورت چوڑیوں پر جم کر رہ گئیں۔ اسے تابندہ کی خوب صورت، ملائم، ریشم جیسی کلائیاں یاد آگئی تھیں۔ وہ اس کی نئی نویلی بیوی کی کلائیاں تھیں مگر وہ انہیں چند بار سے زائد نہیں چھو سکا تھا۔

تابندہ کے ساتھ گزارا ہوا سنہرا وقت صرف ایک ہفتہ تک ہی میں رہ سکا تھا۔ ایک ہفتے میں تو آپس میں طرح ایک دوسرے کے مزاج کا پتا بھی نہیں چلتا لیکن پھر بھی یہ ایک ہفتہ وقاص کی زندگی کا بہترین حصہ تھا۔ پچھلے تین ماہ کے ہر ہر پل میں اس ایک ہفتے کی یادیں رچی بسی تھیں اور اس کی خوشبو وقاص کے رگ وپے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تابندہ ٹوٹ کر پیار کرنے والی بیوی ثابت ہوئی تھی اور اس ایک ہفتے میں ہی وہ اپنی تمام ظاہری و باطنی خوبیوں سمیت وقاص کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی اور کیوں نہ اترتی۔ وہ اس کی امی جی کی پسند تھی اور امی نے زندگی میں جب کبھی بھی وقاص کے لیے کچھ

آزادی کشمیر کی جنگ کرنے والے ایک مجاہد کی داستان محبت

کشمیر، سرسبز مرغزاروں، بہتے چشموں اور گنگناتے آبشاروں کی حسین وادی مگر جسے شاید دشمنوں کی بدنگاہی کے سبب خوں رنگ کردیا گیا ہے۔ اسی کشمیر کی آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی داستان، محبت اور فرض کے درمیان کش مکش کا احوال

جدائی

طاہر جاوید مغل



یا تھا وہ اس کے لیے ... ن ہی ثابت ہو ... سا۔

بس دو تین منٹ کے لیے رکی تھی۔ اس کی چھت پر بیگ اور انار وغیرہ کے کریٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ سکھ کنڈیکٹر کریٹ چڑھانے والوں کو جلدی کرنے کی ہدایت کر رہا تھا اور گا رہا گا رہا تھا بلند آواز سے بولنے لگتا تھا۔ وقاص نے بس سے اتر کر تابندہ کی خوب صورت کلائیوں کو ذہن میں بسایا اور اس کے لیے چوڑیاں منتخب کیں۔ سبز سرخ اور زرد چوڑیاں.... چوڑیاں بیچنے والی نے انہیں آپس میں "مکس" کیا تو وہ مزید خوشنما لگنے لگیں۔ چوڑیوں والا ڈبا لے کر وقاص دوبارہ بس میں آبیٹھا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو سفر کے غبار سے آلودہ تھی۔ وہ کچھ تھکاوٹ بھی محسوس کر رہا تھا مگر گھر واپس جانے اور اپنے پیاروں سے ملنے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ تھکاوٹ کا احساس کہیں دور پس منظر میں چلا گیا تھا۔

اس نے کھڑکی کی طرف رخ کر کے ایک طویل سانس لی۔ اسے اپنے گلی کوچوں اور در و دیوار کی جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی۔ جنم بھومی کی یہ خوشبو ہر شخص کے ساتھ رہتی ہے اور اس کے من کو بھاتی ہے.... وقاص کو بھی یہ خوشبو بھاتی تھی.... تاہم آج یہ خوشبو کچھ زیادہ ہی بھاری تھی۔ اس میں تابندہ کی حسین مہک بھی شامل تھی۔ وہ سات روز کی چنچل دلہن جسے تنہا چھوڑ کر وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے چلا گیا تھا۔

وقاص حریت پسند تھا۔ عرصہ پانچ سال سے وہ ان مجاہدوں کے شانہ بشانہ مصروفِ عمل تھا جو کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے.... وہ یہ سب کچھ انتہائی راز داری سے کر رہا تھا۔ اس کے انتہائی قریبی عزیزوں کے سوا اس حوالے سے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ دوست احباب اور جان پہچان والے بس یہی جانتے تھے کہ وقاص پرائیویٹ سروس کرتا ہے اور اپنے کام کے سلسلے میں اسے گاہے گاہے سری نگر سے باہر جانا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کے بارے میں شک ہو لیکن یہ ایک "موہوم شک" ہی تھا۔ وقاص کے مسلح حریت پسندوں کے ساتھ ملنے کا واقعہ بھی عجیب تھا۔ یہ کوئی پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ ان دنوں وہ بی ایس سی میں تھا۔ اسے تھوڑا بہت ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ انگلش پوئٹری وہ شوق سے پڑھتا تھا۔ اس کا ایک ہندو دوست شنکر پال اس کا ہم ذوق تھا۔ وہ اکثر اسے پبلک لائبریری سے کتابیں لا دیتا تھا۔ وہ کتابیں جن میں پھولوں، پرندوں اور موسموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ جن میں محبت کے آبشار بہتے ہیں اور جھرنوں کی موسیقی گنگناتی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہوتی ہیں جو پڑھنے والے کے لہو میں میٹھی بانسری بجاتی ہیں اور اسے زندگی سے محبت ہونے لگتی ہے.... وقاص کے لہو میں بھی میٹھی بانسری بجتی تھی اور اسے زندگی سے محبت سی۔ وہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ جینا چاہتا تھا اور زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اسے وہ لوگ کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے جو جھرنوں میں انسانی لہو ملاتے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کو بارودی دھماکوں سے مجروح کرتے تھے اور پھولوں کو آگ سے جھلساتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ فوجی تھے یا حریت پسند.... اسے ان سے بیزاری محسوس ہوتی تھی.... وہ سردیوں کی ایک تاریک رات تھی۔ وقاص اپنے دوست شنکر سے مل کر موٹر سائیکل پر گھر واپس آ رہا تھا۔ راستے میں موٹر سائیکل کا پیٹرول ختم ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل سمیت پیدل چلنے لگا۔ جی پی او سے کچھ آگے اس نے ایک فوجی جیپ دیکھی۔ جیپ درختوں کے قریب کھڑی تھی۔ تین چار فوجی تاریکی سے برآمد ہوئے اور افراتفری میں جیپ پر سوار ہو گئے۔ وقاص نے دیکھا کہ ایک فوجی کے جسم سے کوئی شے علیحدہ ہو کر گھاس پر گری ہے۔ جلدی میں وہ فوجی اس گرنے والی شے پر توجہ نہیں دے سکا۔ جیپ ٹرن لے کر تیزی سے سڑک پر آئی اور اوجھل ہو گئی۔ وقاص نے قریب جا کر دیکھا۔ جو شے گری تھی وہ ایک بیلٹ تھی۔ اس میں رائفل کی چالیس پچاس گولیاں اڑسی ہوئی تھیں۔ اس بیلٹ کو "بلٹ اسٹرپ" بھی کہا جاتا ہے۔ وقاص اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جب درختوں کی گہری تاریکی سے اسے کسی کے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا آواز کی سمت چل پڑا۔ یہ دیکھ کر وہ لرز گیا کہ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک شخص کروٹ کے بل پڑا تھا۔ وقاص کی جیب میں لائٹر موجود تھا۔ اس نے لائٹر کی روشنی میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ یہ ایک چوبیس پچیس سالہ کشمیری نوجوان تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی وقاص کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی مجاہد ہے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ سامنے والے دو تین دانت ٹوٹ چکے تھے۔ ایک آنکھ مکمل طور پر ضائع ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر پتلون کے علاوہ بس ایک خون آلود بنیان تھی۔ اس کے گورے چٹے جسم پر تشدد کے بدترین نشانات نظر آ رہے تھے۔ غالباً کچھ ہی دیر پہلے اس کے پیٹ میں تیز دھار آلے سے زخم لگایا گیا تھا۔ شاید سنگین وغیرہ گھونپی گئی تھی۔ خون بہہ بہہ کر اردگرد کی زمین کو رنگین کر رہا تھا۔ یہ نوجوان بس آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وقاص نے بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ رات کے اس پہر یہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا جو وقاص کے ساتھ مل کر زخمی کی مدد کر سکتا۔ وقاص نے بے اختیار زخمی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ بس موت سے چند ہچکیوں کی دوری پر تھا۔ لائٹر کی لرزاں روشنی اس کے زرد چہرے اور سیاہ آنکھوں پر پڑ رہی

[illegible] نے عجیب سی نظروں سے وقاص کو دیکھا جیسے کوئی شخص بہت دیر تک ناقابل برداشت اذیتیں سہنے کے بعد اپنے کسی ہمدرد کی جانب دیکھتا ہے اور خاموشی کی زبان میں اس سے اپنا دکھ بیان کرتا ہے۔ اس کے زخمی ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ دم توڑتی آواز ایک سرگوشی کی طرح تھی۔ وقاص نے بے اختیار اپنا دایاں کان اس کے ہونٹوں کے قریب کردیا۔ وہ کہہ رہا تھا "لے کے رہیں گے آزادی"۔

بہت مدھم آواز تھی لیکن اس میں مہیب طوفانوں کا شور تھا۔ ہر لفظ اپنی جگہ ایک بلند و بالا پہاڑ کی طرح تھا.... یہ پانچ لفظ نہیں تھے پانچ بلند و بالا پہاڑ تھے.... اور شاید اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ یہ لفظ اپنے معروف معنوں کے علاوہ بھی بہت کچھ بیان کررہے تھے.... چند سیکنڈ بعد اس نامعلوم نوجوان نے دم توڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور ہاتھ بھی ڈھلک گئے تھے۔ اب وقاص کا یہاں رکنا بے کار تھا اور خطرناک بھی۔ وہ نوجوان کا سر آہستہ سے زمین پر ٹکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "بلٹ اسٹریپ" اس نے ایک طرف پھینکا اور تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اگلے روز اسے ایک اخباری خبر کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ رات کو جس نوجوان نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا' وہ ایک مجاہد تھا۔

بعد کے تین چار مہینوں میں نامعلوم مجاہد کے آخری الفاظ مسلسل وقاص کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔ وہ پانچ الفاظ نہیں تھے.... واقعی پانچ پہاڑ تھے۔ وہ کسی طور وقاص کی سماعت میں سے سرک ہی نہیں رہے تھے.... "لے کے رہیں گے آزادی"۔

ان لفظوں نے اپنے اصل معنوں کے علاوہ بھی وقاص سے بہت کچھ کہا تھا.... ان لفظوں نے کہا تھا.... میری اس حالت اور اذیت کو بھول نہ جانا دوست اور نہ اس سبب کو بھولنا جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے.... میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کا سارا دکھ تمہیں سونپ کر جارہا ہوں.... تم میرے دشمنوں سے میرا انتقام لینا.... اور میرے دشمنوں سے سب سے بڑا انتقام یہی ہے کہ میرا وہ مقصد پورا ہوجائے جس کے لیے میں جان دے رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کرسکتا.... بے بس ہوں.... کیونکہ مررہا ہوں لیکن تمہارے پاس زندگی کی نعمت موجود ہے۔ میں اپنا بدلہ تم پر اور ساری انسانیت پر قرض چھوڑ کر جارہا ہوں۔

وقاص نے تنہائی میں بیٹھ کر لاتعداد مرتبہ ان پانچ الفاظ پر غور کیا تھا اور ہر بار ان میں سے نئے معنی پھوٹتے محسوس ہوئے تھے.... وقاص کو یاد تھا۔ اس رات وہ شلوار قمیص اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر وہ بیلٹ بھی تھی

[illegible] اس جاں بہ لب مجاہد نے وقاص کو بھی اپنا کوئی ساتھی ہی سمجھا تھا۔ اپنے ہی جیسا ایک مسلح حریت پسند۔ اس نے وقاص کو الوداعی نظروں سے دیکھ کر اپنی ساری بے بسی اور اذیت وقاص کو سونپی تھی اور ایک شہید کی حیثیت سے اس دنیا سے چلا گیا تھا۔ اب وقاص دن رات خود کو ایک فرض کے بہت بڑے بوجھ تلے محسوس کررہا تھا۔ اپنے شاعری بھول گئی تھی۔ پھولوں' پرندوں اور گنگناتے جھرنوں کی باتیں اسے بے معنی لگتی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں ہر وقت اس جوان رعنا کی تصویر گھومتی رہتی تھی جس کے لب پارہ' دانت ندارد اور آنکھ ضائع ہوچکی تھی۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ وہ شخص کن اذیتوں سے گزر کر درختوں کے اس ویران جھنڈ میں پہنچا ہوگا۔ اس نوجوان کی لاش دیکھنے کے قریباً چار ماہ بعد وقاص نے خود بھی حریت پسندی اور مسلح جدوجہد کے خاردار راستے پر قدم رکھ دیا تھا.... اور اب پچھلے چار پانچ سال سے وہ اسی راستے پر گامزن تھا۔

قریباً تین مہینے پہلے اگست میں وقاص کی شادی ہوئی تھی۔ یہ شادی اسے والدہ کے بے پناہ اصرار پر کرنا پڑی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے والدہ اور اپنی ہونے والی دلہن تک



مصر کے قدیم دور سے آزمایا ہوا ملکہ سبو کے عہد میں سماٹی لینڈ (افریقہ) سے لایا جانے والا یہ پتھر اور ایک خاص درخت کی گوند جسے امراء اور سلاطین اپنے خزانوں میں رکھتے تھے تاکہ اس کی برکت سے خزانے نہ صرف محفوظ رہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی ہو۔ انتہائی محدود تعداد میں دستیاب یہ نایاب تحفہ آپ آج ہی حاصل کرلیں۔ اپنے ساتھ دکان، دفتر یا مکان پر رکھنے سے انشاء اللہ ہر لحاظ سے محفوظ۔ کاروباری مشکلات دور آمدنی میں اضافہ اور برکت، گھریلو جھگڑوں اور بچوں کا سوتے میں ڈرنے سے نجات ہدیہ معہ محصول خرچ -/180 روپے گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر وی پی سے طلب فرمائیں۔

GLP پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی 74600

انوٹ انک ہے اور رہے گی۔ تابندہ اس کی والدہ کی پسند تھی۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھی لیکن شادی کے بعد صرف چند دن میں ہی وہ ان لوگوں کے ساتھ یوں گھل مل گئی تھی جیسے جڑیوں کی شناسا ہو۔ وہ بڑی ملنسار اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر کسی کو گرویدہ بنالیتی تھی۔ جب دوسروں کی یہ کیفیت تھی تو وقاص کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ وہ تو اس کا جیون ساتھی تھا۔ اس نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی شخصیت کی ساری خوبیوں کو دل وجان سے محسوس کیا تھا.... مگر شادی کے صرف سات روز بعد ہی وقاص کو اچانک سری نگر سے جانا پڑ گیا تھا۔ اپنی تنظیم کے سربراہ اعلیٰ کی طرف سے اسے فوری طور پر جموں پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ایک نئے نویلے دولہا کے لیے اس طرح اچانک اپنی دلہن کو چھوڑ کر کئی ماہ کے لیے گھر سے چلے جانا' بڑا دشوار کام تھا لیکن وقاص صرف دولہا ہی نہیں تھا' مجاہد بھی تھا بلکہ مجاہد پہلے تھا دولہا بعد میں۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنی اشک بار دلہن کو الوداع کہا تھا اور جموں پہنچ گیا تھا۔ پچھلے تین ماہ میں اس نے وہی کچھ کیا تھا جو ایک کشمیری مجاہد کرتا ہے.... اس نے ویرانوں میں بسیرا کیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے خلاف گھاتیں لگائی تھیں۔ کبھی ان کا تعاقب کیا تھا' کبھی خود کو ان کے تعاقب سے بچایا تھا.... پورے تین ماہ اسی خطرناک مصروفیت میں گزار کر اب وہ اپنے سیکٹر کمانڈر کے حکم سے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ اسے پندرہ روز کی رخصت ملی تھی۔ اسے عیدالضحیٰ بھی اپنے گھر گزارنا تھی۔ عید کے بعد تیسرے دن اسے پھر اپنے زونل آفس میں رپورٹ کرنا تھی۔ پندرہ روز کی رخصت پر وہ بہت خوش تھا۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس رخصت میں عید کا پُرمسرت تہوار بھی آرہا تھا۔

بس ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی اپنی منزل کی طرف رواں رہی اور وقاص آنکھوں میں خوب صورت خواب سجائے اپنی سوچوں میں غرق رہا۔ بے دھیانی میں اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے اس ڈبے کو سہلا رہی تھیں جن میں تابندہ کی رنگ برنگی چوڑیاں تھیں۔

○☆○

سری نگر میں وقاص اپنے دو بھائیوں اور والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اب اس گھرانے میں ایک تیسرا فرد بھی شامل ہوچکا تھا.... یعنی تابندہ.... تابندہ نے بی اے کر رکھا تھا۔ وقاص کا ایک بھائی میڈیکل اسٹور چلا رہا تھا۔ اس کا نام جمشید تھا۔ سب سے چھوٹا میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا نام حمزہ تھا۔ یہ متوسط درجے کا گھرانا تھا۔ گزر بسر آسانی سے ہورہی تھی۔ [illegible] والی تھی.... اس نے ایک اچھی حالت کی چھوٹی سی گاڑی بھی خرید رکھی تھی۔

وقاص کی اچانک واپسی نے اس چھوٹے سے گھرانے پر خوشیوں کی بارش کردی۔ والدہ بہت دیر تک اس سے لپٹ کر روتی رہیں۔ اس کا ماتھا چومتی رہیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں پھر انہوں نے اپنے لمبے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بیٹا! کیوں اس طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے مجھے.... اپنی خیر خبر تک نہیں دیتا۔ تجھے کیا پتا میری نظر ہر وقت کواڑ پر لگی رہتی ہے۔ ہر آہٹ پر یہی سمجھتی ہوں کہ تو آگیا ہے۔"

وقاص نے لاڈ سے ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا "کیوں اتنا پریشان ہوتی ہیں امی۔ آپ کے پاس دو جوان بیٹے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"لیکن بیٹے کوئی رابطہ تو ہونا چاہیے.... تجھے کیا پتا دل میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں.... اور پھر تو اکیلا نہیں ہے۔ اب تیری بیوی ہے۔ بے چاری میرے ساتھ تیرے انتظار کی گھڑیاں گنتی رہتی ہے اور پھر تو انتظار کی حد بھی تو بتا کر نہیں جاتا۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ایک ہفتے میں آئے گا یا ایک سال میں۔"

تابندہ بولی "امی جی بس آپ کا دل رکھنے کے لیے کہہ رہی ہیں ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوتے بلکہ میں تو بالکل نہیں ہوتی۔ بہت مزہ کرتے ہیں ہم لوگ۔ بارہ مولا سے چھوٹی باجی بھی آئی ہوئی تھیں اور آپ کو پتا ہی ہے وہ کتنی جولی ہیں ہنس ہنس کر جمشید اور حمزہ کے پیٹ میں تو درد ہونے لگتا تھا کیوں جمشید۔"

جمشید نے اخلاقاً اثبات میں سر ہلایا۔

تابندہ' وقاص سے مخاطب ہوکر بولی "ویسے مہمان سے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن واپس کب جارہے ہیں آپ؟"

وقاص زیر لب مسکرایا "بھئی' کہتی ہو تو شام ساڑھے سات بجے والی بس سے چلا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ چائے پی کر جایئے گا۔" تابندہ نے کہا اور اطمینان سے کچن کی طرف چلی گئی۔

حمزہ نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے' باجی چائے نہیں زعفرانی کوفتے بنانے گئی ہیں۔ بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ جس روز آپ واپس آئیں گے اس روز آپ کو زعفرانی کوفتے کھلائیں گی۔"

والدہ نے وقاص کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹا! وہ تجھ سے ناراض ہے۔ تو کہہ کر گیا تھا کہ اگر دیر سے آنا ہوا تو بھی دو ہفتے تک اپنی خیر خبر ضرور بھیجے گا لیکن تو تین مہینے بعد

اپنی سفل دکھا رہا ہے۔"

وقاص کا سر دستور ماں کی گود میں تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "امی! آپ کو پتا ہی ہے' رابطہ کرنا کتنا مشکل ہے اور پھر یہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔ بی ایس ایف والے آج کل شکاری کتوں کی طرح چوکس ہیں۔ میں ہر دکھ سہہ سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے لیے ہلکا سا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔"

جمشید نے کہا "اچھا بھائی جان! چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں۔ اب جلدی تو نہیں جانا۔"

"نہیں یار! اب عید گزار کر ہی جاؤں گا۔"

"اوہ! ونڈر فل۔" جمشید نے کہا۔

"خیر اتنا ونڈر فل بھی نہیں۔" حمزہ بولا "تین ساڑھے تین مہینے بعد آئے ہیں' کم از کم ایک مہینہ تو قیام ہونا چاہیے تھا۔ عید کے بعد تیسرے ہفتے خالو احسان کے بیٹے شکیل کی شادی بھی ہے۔"

وقاص بولا "اچھا بھئی! جب تیسرا ہفتہ آئے گا اس کو بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال آج کی بات کرو.... کاروبار کیسا ہے.... اور عید کی کیا تیاری شیاری ہے.... بکرے وغیرہ خریدے یا نہیں؟"

جمشید نے کہا "ابھی بانور منڈے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دو چار دن تک شہر میں مزید مال آجائے گا پھر ریٹ کر جائے گا۔ ویسے بھی اب آپ آگئے ہیں۔ مل کر ہی بکرا پیڑی چلیں گے۔"

پھر وقاص اور جمشید کاروبار کی باتیں کرنے لگے۔ جمشید کا میڈیکل اسٹور کافی بڑا تھا۔ اس کا شمار شہر کے بہترین اسٹورز میں ہوتا تھا۔ اسٹور میں وقاص اور جمشید کا برابر سرمایہ لگا ہوا تھا۔ منافع بھی برابر تقسیم ہوتا تھا۔ دو سیلز مینوں کی تنخواہ وقاص ادا کرتا تھا۔ اسے اسٹور پر بیٹھنا کم ہی نصیب ہوتا تھا۔ جن دنوں وہ سری نگر میں ہوتا تھا' عموماً اسٹور کے لیے سامان کی خرید پر توجہ دیتا تھا۔

رات کو تابندہ کو منانے میں وقاص کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کی چند رس بھری باتوں نے ہی تابندہ کا غصہ کافور کردیا۔ ویسے بھی تابندہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر ایک عظیم مقصد کے حصول کی جدوجہد سے وابستہ ہے۔ وہ ایک ایسا کام کررہا تھا جس کے کرنے کی تڑپ ہر کشمیری کے دل میں موجود تھی۔ وہ اپنی خونچکاں مادر وطن کو دہکی ہوئی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے اپنا سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی رگوں میں ان گنت شہیدوں کے لہو کی طاقت تھی۔ اس کے سر پر بے شمار ماؤں کی دعاؤں کا سایہ تھا۔ تابندہ اس پر جتنا بھی فخر کرتی کم تھا۔ اس فخر و انبساط کے

"[illegible] کی دن بھی بن تو [illegible] حقیقت [illegible]

وقاص کی آمد پر دکھائی تھی اور یہ صرف تابندہ ہی کی بات نہیں تھی۔ اس گھر کا ہر فرد اس ارفع مقصد کی اہمیت سے آگاہ تھا جس کے لیے وقاص اور وقاص جیسے ان گنت جوانوں نے اپنی جوانیوں کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔

وقاص کی آمد سے اس چھوٹے سے گھرانے میں خوشیوں کی پرجوش لہر دوڑ گئی۔ اتفاقاً حمزہ کی بھی کالج سے چھٹیاں تھیں۔ اگلے روز سارا دن گھر میں محفل جمی رہی۔ ڈھیروں باتیں کی گئیں' من پسند کھانا پکایا گیا۔ حمزہ نے گھر کے پچھواڑے گراسی لان میں بیڈ منٹن کا نیٹ لگا دیا۔ اس خطہ جنت نظیر میں زندگی بڑی زہریلی اور تلخ تھی۔ ایک نہایت کڑوی کسیلی گولی کی طرح لیکن جس طرح کڑوی کسیلی گولی کو نگلنے کے لیے اس کے گرد شکر لپیٹنا پڑتی ہے' زندگی کی مسلسل تلخی جھیلنے کے لیے بھی خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے ادوار ضروری ہوتے ہیں اور پھر یہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ تابندہ نئی نئی دلہن تھی۔ اس کی دل جوئی کے لیے ویران شب و روز میں تھوڑی سی ہنگامہ آرائی ضروری تھی۔

سارا دن ہنسنے کھیلنے کے بعد شام کو تابندہ اور وقاص باہر گھومنے چلے گئے۔ جمشید آج اپنی گاڑی ان کے لیے گھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جتنے دن بھائی جان گھر میں ہیں وہ گاڑی نہیں لے جائے گا.... تابندہ کو گھومنے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ تقریباً سارے شمالی ہندوستان میں گھومی تھی.... جو چند ایک شہر اس کی نگاہِ شوق میں آنے سے رہ گئے تھے' ان میں ایک سری نگر بھی تھا۔ وہ اودھم پور سے بیاہ کر آئی تھی اور سری نگر دیکھنے کا بہت شوق رکھتی تھی مگر سری نگر آنے کے بعد وہ بے چاری چار دیواری میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ تو شہر کے حالات بھی زیادہ اچھے نہیں تھے' دوسرے اس کا دولہا گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اس کے بغیر کیسے گھوم پھر سکتی تھی۔

پہلے روز ان کا پروگرام جھیل "ڈل" جانے کا بنا۔ نومبر کی وہ پہلی شام بھی کچھ زیادہ ہی خوب صورت تھی۔ ہوا میں خنکی زیادہ نہیں تھی۔ مطلع صاف تھا۔ دونوں جھیل سے کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ کی بالکونی میں بیٹھ گئے۔ جھیل کے پرسکون شفاف پانی پر خوب صورت ڈونگے اور بجرے تیر رہے تھے۔ اردگرد کے درختوں کا سبز عکس جھیل کے آئینے میں بالکل واضح دکھائی دیتا تھا۔ تابندہ کے چہرے پر بچوں کی سی مسرت تھی۔ وہ بڑی محویت سے جھیل ڈل کا حسن دیکھ رہی تھی۔ وہ "ڈل" کا حسن دیکھ رہی تھی جبکہ وقاص اسے دیکھ رہا تھا۔

"کتنی پیاری شام ہے.... ہے نا؟" اس نے وقاص کا

ے ہوئے بولا۔
"واقعی بڑی پیاری ہے۔" وقاص نے تائید کی۔ اس کی ہیں تابندہ کی خوب صورت چوڑیوں پر تھیں۔ یہ وہی چوڑیاں تھیں جو کل اس نے انت ناگ سے خریدی تھیں۔
"پتا ہے کہ یہ شام اتنی خوب صورت کیوں ہے؟" وہ بچوں کی طرح مٹھیاں بھینچ کر بولی۔
"کیوں ہے؟"
"اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ منظر میری توقع سے بڑھ کر حسین ہے۔ میں نے اس جھیل کو کئی بار اپنے تصورات میں دیکھا تھا لیکن آج وہ سارے تصورات ہیچ محسوس ہوتے ہیں۔"
"اور دوسری وجہ؟" وقاص نے پوچھا۔
"دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں گے' وہ جگہ خوب صورت ہوجائے گی۔"
"اور اگر میں نہ ہوں گا تو؟"
"پھر کچھ بھی خوب صورت نہیں ہے۔" اس نے روانی میں کہا لیکن پھر چونک کر وقاص کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی جھیل ڈل جیسی آنکھوں میں نامعلوم اندیشوں کے بھنور ابھرے اور اوجھل ہوگئے۔ اس نے سر جھکا کر اپنی حنائی انگلی سے اپنی ہفت رنگ چوڑیوں کو چھیڑا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی "وقاص آپ کو نہیں معلوم میں آپ سے کتنی محبت کرنے لگی ہوں.... شاید آپ سوچیں گے کہ یہ بات تو ہر نئی نویلی دلہن اپنے شوہر سے کہتی ہے لیکن وقاص! میں واقعی سچ کہتی ہوں۔ آپ کے بغیر تو ایک سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا ہے۔"
آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا سر کچھ اور جھک گیا اور رخساروں پر شام کا سرخی مائل رنگ پھیل گیا۔
"تم کیا سمجھتی ہو' تمہاری جدائی مجھ پر آسان گزری ہے؟" وقاص نے ہولے سے کہا۔
"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔" تابندہ جلدی سے بولی "آئیں خاموشی کے ساتھ اس سہانی شام کو اپنے اندر جذب کریں۔ یہ حسین شام ہے نا؟"
"ہاں تابندہ! اس میں حسن ہے لیکن یہ سوگوار حسن ہے۔ کاش یہ سوگواری اس حسن سے جدا ہوجائے۔"
دونوں خاموشی سے جھیل کو دیکھتے رہے۔ درمیانی عمر کا ایک انگریز جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جھیل کے کنارے چلتا ہوا' ان کے پاس سے گزرا۔ تابندہ بولی "وقاص! پتا ہے میرا کیا دل چاہتا ہے؟"
"کیا چاہتا ہے؟"
"میں اسی طرح آپ کے ساتھ ایک شفاف پانی کے کنارے چلتی جاؤں.... چلتی چلی جاؤں.... چلتے چلتے بوڑھی ہوجاؤں.... اور پھر ایک دن سب کچھ ختم ہوجائے۔"
وقاص بولا "دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ ہم برسوں تک اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلتے رہیں.... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے نیچے مسلم ہوٹل میں جس شخص کو گراہی گوشت کا آرڈر دیا ہے' وہ تو ہماری راہ دیکھتے دیکھتے فوت ہوجائے گا۔"
دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بالکونی سے لکڑی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے جھیل کے کنارے آگئے۔ رات نو دس بجے تک خوب انجوائے کرنے کے بعد وہ گھر واپس پہنچے۔
اگلے روز اتوار تھا۔ جمشید کی بھی چھٹی تھی۔ ان سب نے "فلوٹنگ گارڈنز" جانے کا پروگرام بنایا۔ وہ لوگ دن دس گیارہ بجے کے الگ بھگ کھانے پینے کا سامان لے کر نکلے اور تفریح گاہ پر پہنچ گئے۔ والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ خوش گوار اتفاق یہ تھا کہ موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ کے سبب سرد ہوا کی خنکی بھلی لگنے لگی تھی۔ وہ سب شفاف پانی کے کنارے بچوں کی طرح کھیلتے کودتے رہے۔ وہیں پر کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد جمشید اور حمزہ کو اپنے دو دوست مل گئے۔ وہ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئے۔ گھاس پر دری بچھی ہوئی تھی۔ والدہ اس پر لیٹ گئیں اور خوش گوار ہوا کی تھپکیوں نے انہیں سلادیا۔ وقاص اور تابندہ درختوں کے نیچے خوب صورت روش پر ٹہلنے لگے۔ پانی پر تیرتے ہوئے دلکش بانیچوں کا نظارہ مسحور کن تھا۔ تابندہ نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں وقاص کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا رکھی تھیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی "وقاص! کیا یہ وقت' یہ گھڑیاں ٹھہر نہیں سکتیں۔ جب آپ آس پاس ہوتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اب کچھ بھی نہ بدلے۔ زمین آسمان کی گردش تھم جائے۔"
"دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے تابندہ! لیکن تم میری مجبوریاں سمجھتی ہو اور شاید میرے وطن کی مجبوریاں بھی۔"
"جب سوچتی ہوں کہ عید کے فوراً بعد آپ چلے جائیں گے تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے.... کیا آپ کچھ دن اور نہیں ٹھہر سکتے؟"
"کیا مطلب؟"
"عید کے تیسرے ہفتے خالو احسان کے بیٹے شکیل کی شادی ہے۔ کتنا خوشی کا موقع ہوگا۔ سب ہنسیں کھیلیں گے۔ میں آپ کو یاد کرتی رہوں گی۔ پتا نہیں کیا بات ہے' جب سب لوگ مل بیٹھتے ہیں تو آپ کی کمی اور بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔"

"پاگل ہو تم۔ دور دراز کی سوچوں میں کھو کر ان خوشیوں میں کھوٹ ملا رہی ہو۔ جو آج ہمیں حاصل ہیں.... جان من! دیکھو آج میں تمہارے پاس ہوں۔ کل بھی ہوں گا' پرسوں بھی۔ پورے تیرہ دن ابھی ہمارے پاس ہیں۔ تیرہ دنوں کے کتنے گھنٹے ہوتے ہیں' کتنے منٹ۔ ہم اس سارے وقت سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم کل کلاں کے اندیشوں میں خود کو ہلکان نہ کرو۔"

تابندہ نے نمناک نظروں سے وقاص کو دیکھا "آپ ۱۴ نومبر تک رک نہیں سکتے۔ شادی میں شامل ہونے کے بعد چلے جائیں۔ چودہ پندرہ دن مزید رک جانے سے کتنا فرق پڑ جائے گا۔"

"بہت فرق پڑ جائے گا تابندہ۔ تم نہیں جانتیں۔ اس وقت ہمارا ایک ایک دن قیمتی ہے۔ کشمیر کی آزادی کی طویل جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ قریب آرہا ہے۔ اب سستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

وقاص کے جواب نے تابندہ کو خاموش کردیا۔ وہ گم صم سی ہوگئی تھی۔ وہ لوگ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا فلوٹنگ گارڈنز پر رہے۔ اس دوران میں وقاص نے دو تین بار تابندہ کا موڈ نارمل کرنے کی کوشش کی۔ موڈ قدرے بہتر تو ہوگیا لیکن تابندہ کی شوخی واپس نہیں آئی۔

رات کو بیڈ روم میں دونوں دیر تک گفتگو میں مصروف رہے.... وقاص کی خوش گفتاری دھیرے دھیرے تابندہ پر اثر کرنے لگی۔ وہ اپنی باتوں سے تابندہ کو گدگدا رہا تھا۔ وہ اپنا پروگرام تابندہ کو سمجھانے لگا۔ "دیکھو' کل صبح نماز فجر کے بعد ہم پھر سو جائیں گے۔ دیر تک سوئیں گے۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا اکٹھا کرلیں گے۔ دو بجے کے قریب شازیہ باجی (تابندہ کی بہن) بھی پہنچ جائیں گی۔ خوب ہلا گلا رہے گا۔ شام کو بیڈمنٹن کھیلیں گے۔ رات کو باہر کھانا کھائیں گے۔ پرسوں میرے کالج کے ساتھی لیاقت کامران کی طرف سے ہماری دعوت ہے لیکن اس سے پہلے سہ پہر کو ہم تھوڑی سی شاپنگ کریں گے .... دیکھا نا .... شاپنگ کے نام پر ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے.... خیر بدھ کے روز بدام باغ چلیں گے۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جگہ تمہیں بہت پسند ہے۔ جمعرات کو چنار باغ کی سیر کریں گے اور اس سے پہلے تھوڑی سی کشتی رانی بھی ہوگی۔ جمعہ کو لگتا ہے کہ شہر میں اسٹرائیک ہوجائے گی۔ ظاہر ہے کہ اسٹور بند ہوگا تو جمشید بھی گھر میں ہی ہوگا۔ صبح کے وقت جلوس میں شرکت کرنا ہوگی لیکن شام میں تو سب فارغ ہی ہوں گے۔ اس روز حمزہ نے پھوپی جان کو فیملی سمیت بلا رکھا ہے۔ اچھی خاصی رونق رہے گی.... ہاں یاد آیا بدھ کے روز تو قربانی کے جانور خریدنے بھی جانا تھا۔ چلو خیر یہ کل کے دن ہی کرلیں گے۔ قربانی سے جانور سہ پہر تک آجائیں گے تو عید سے پہلے عید کا ماحول بن جاتا ہے.... ہے نا؟"

تابندہ نے اثبات میں سرہلایا۔ وہ اب قدرے پرسکون نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اس نے سمجھ لیا تھا کہ وقاص کا پروگرام اٹل ہے۔ لہٰذا خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرنے سے کیا فائدہ۔ ویسے بھی وقاص اپنی جو مجبوریاں بیان کررہا تھا' وہ حقیقت کے قریب ترین تھیں۔ تابندہ ہر بنتِ کشمیر کی طرح ان مجبوریوں کو دل وجان سے تسلیم کرتی تھی۔ وقاص نے بڑی محبت سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا "تابندہ! انسان کی آرزوئیں تو کسی جگہ ختم نہیں ہوتیں۔ وہ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری خوشی کا متلاشی رہتا ہے۔ اگر بالفرض محال میں شکیل کی شادی تک رک بھی جاؤں تو کیا پھر میرے جانے سے تمہیں اداسی نہیں ہوگی؟ اس وقت بھی اداسی ہوگی۔ اس وقت کسی اور خوشی سے محرومی کا خیال میرے اور تمہارے دل میں ہوگا.... بتاؤ ہوگا یا نہیں؟"

"شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" تابندہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وقاص بولا "لہٰذا.... اب طے کہ جو خوشی ہمیں مل رہی ہے' اسے انجوائے کریں گے اور آنے والے کل کے اندیشوں سے خود کو دور رکھیں گے۔ زندگی کے بپھرے ہوئے سمندر میں خوشی کے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر رک کر سانس لے لینا ہی غنیمت ہے۔"

تابندہ نے وقاص کے شانے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا "پھر مجھ سے وعدہ کریں۔ جتنے دن یہاں ہیں' میرے ساتھ ہی رہیں گے کہیں اور نہیں جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"پچھلی مرتبہ آپ لیاقت کے ساتھ تنظیم کے دوستوں سے ملنے بارہ مولا چلے گئے تھے وہاں سے بانڈی پورہ جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے بھئی' وعدہ رہا۔ اس بار جتنے دن بھی ہوں' تمہارے ساتھ سری نگر میں ہی رہوں گا۔"

"ایک وعدہ اور۔" تابندہ نے کہا۔

"جی فرمایئے۔"

"عید کے دوسرے دن ہم امی کے پاس اودھم پور چلیں گے۔ رات وہیں رہیں گے۔ عید کے تیسرے دن ہم صبح سویرے واپس آجائیں گے۔ یہ آپ کی چھٹی کا آخری دن ہوگا۔ یہ سارا دن ہم اکیلے گھومتے پھرتے گزاریں گے.... ٹھیک ہے؟"

وقاص نے ذرا توقف کیا پھر بولا "ٹھیک ہے۔"

دنوں نے بوم جوی سے ہاتھ ملایا۔ تابندہ کی آنکھ ننھے بچوں جیسی خوشی ناچنے لگی۔

اگلے پروگرام حسب پروگرام دو ڈھائی بجے تابندہ کی چھوٹی باجی اپنے بچے ٹیپو سمیت پہنچ گئیں۔ ان کے آنے سے گھر کی رونق دوبالا ہوگئی۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عصر کی نماز کے بعد گھر کے پچھواڑے لان میں بیڈ منٹن کا زبردست میچ ہوا۔ تابندہ زبردست کھیلتی تھی' اس نے وقاص کو دو مرتبہ ہرایا۔ وقاص کا بدلہ ڈاکٹر حمزہ نے اپنی بھابی کو ہرا کر لیا پھر تابندہ اور چھوٹی باجی نے مل کر حمزہ اور ٹیپو کو ہرا دیا۔ فیصلہ ہوا کہ عید تک شام کو ہر روز گیم ہوا کرے گا۔

اگلا دن بھی بہت خوش گوار گزرا۔ لیاقت کامران نے پہلے صرف تابندہ اور وقاص کی دعوت کی تھی پھر اس نے حمزہ اور آٹھ سالہ ٹیپو کو بھی اس دعوت میں شامل کرلیا۔ دعوت پر جانے سے پہلے وقاص اور تابندہ نے عید کی شاپنگ بھی کی۔ رات کو وہ دعوت کھا کر دیر سے واپس آئے۔ چھت پر خنک چاندنی میں گھومتے ہوئے تابندہ نے اپنا سر وقاص کے شانے سے لگا دیا اور بولی "کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلی جاؤں۔ دن رات آپ کی خدمت کروں۔ ہر خطرے کا مقابلہ آپ کے ساتھ مل کر کروں۔"

"ایک مجاہد کی بیوی کے جذبات ایسے ہی ہونے چاہئیں۔" وقاص نے کہا "تاہم میرا خیال ہے کہ مجاہد کی بیوی گھر میں رہ کر اور گھر کی ذمے داریاں سنبھال کر بھی محاذ جنگ پر جانے کا ثواب پا سکتی ہے۔"

"لیکن آپ سے دوری بڑی تکلیف دہ ہے۔" اس نے اپنی چھوٹی سی ناک وقاص کے کشادہ شانے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔" وقاص نے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی نے کچھ کیا ہے۔" وہ بند آنکھوں کے ساتھ ادا سے بولی۔ اس کے چہرے سے محبت اور خوشی ایسے ہی پھوٹ رہی تھی جیسے چاند سے چاندنی۔

بدھ کے روز حمزہ' وقاص اور ننھے ٹیپو نے جا کر قربانی کے جانور خریدے تھے۔ شام کو تابندہ اور وقاص نے بدام باغ کی طرف جانا تھا۔ تابندہ بدام باغ جانے کے لیے بڑی بے چین تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ان چند دنوں میں سری نگر کا گوشہ گوشہ دیکھ لینا چاہتی ہے لیکن اس روز پروگرام تھوڑا سا چینج ہوگیا۔ گیارہ بجے کے قریب جب وقاص نہا دھو کر دھوپ میں بیٹھا اور تابندہ اس کے سامنے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی حلوا پوری پروس رہی تھی' دروازے پر کسی فقیر نے صدا لگائی "خدا کے نام پر سخیا.... اللہ تیری مشکلیں آسان کرے گا۔"

وقاص چونک اٹھا۔ اس نے اپنے اندرونی جذبات کو چہرے تک آنے سے بہ مشکل روکا۔ فقیر نے دوبارہ صدا دہرائی۔ وقاص اٹھ کر دروازے تک گیا اور تھوڑی سی ریزگاری فقیر کے ہاتھ پر رکھ کر واپس آگیا۔ "خدا کے نام پر سخیا.... اللہ تیری مشکلیں آسان کرے گا۔" اس کی آواز گلی میں دور جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ دراصل ایک کوڈ ورڈ تھا۔ اس کوڈ ورڈ کو وقاص کے دروازے پر "صدا" کی صورت پکارنے والا فقیر دراصل تنظیم کا کوئی رکن تھا۔

"اس کوڈ کو "ڈی کوڈ" کرتے ہوئے وقاص قریباً ایک گھنٹے بعد شاہ ہمدان مسجد کے نواح میں پہنچ گیا۔ یہاں کشمیری چائے خانے کے پیچھے ایک باغیچے میں چھوٹا سا گودام موجود تھا۔ اس گودام میں فروٹ کی خالی پیٹیوں اور ٹوکریوں وغیرہ کے انبار لگے رہتے تھے۔ اسی کاٹھ کباڑ میں وہ سیڑھیاں موجود تھیں جو ایک قریباً ۱۴ ضرب ۳۵ فٹ کے تہ خانے میں پہنچتی تھیں۔ مختلف مراحل سے گزر کر وقاص اس تہ خانے میں پہنچا تو حسب توقع اس کی ملاقات اپنے سیکٹر کمانڈر فرحت اللہ صاحب سے ہوئی۔ وہ چوڑی چھاتی چوڑی پیشانی اور چوڑی داڑھی والے ایک سادہ سے شخص تھے۔ ایک ہاتھ کی پشت پر کئی ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ گردن پر بھی زخم کا نشان تھا۔

رسمی گفتگو کے بعد فرحت اللہ صاحب نے وقاص کو ہائی کمان کا ایک حکم نامہ پڑھ کر سنایا۔ اس حکم نامے کے مطابق وقاص کو پرسوں صبح نو بجے تک یہاں اس تہ خانے میں رپورٹ کرنی تھی۔ یہاں سے اسے فرحت اللہ اور اپنے چند دیگر ساتھیوں کے ہمراہ فوراً بانڈی پورہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہاں چند روز کے اندر بھارتی فوج کے ایک کیمپ پر زبردست شب خون مارا جانے والا تھا۔ اس حملے کے لیے پچھلے ایک سال سے منصوبہ بندی ہو رہی تھی لیکن مختلف وجوہ سے یہ کارروائی ملتوی ہوتی رہی تھی۔ ہائی کمان کا خیال تھا کہ اب کارروائی کے لیے بہترین موقع دستیاب ہے۔

فرحت اللہ صاحب نے کہا "وقاص' تمہاری خواہش کے مطابق' تمہارا نام ان پانچ ساتھیوں میں شامل ہے جو اس حملے میں حصہ لیں گے۔ اس کارروائی کے بارے میں تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کارروائی میں بچ نکلنے کے امکانات بہت کم اور شہادت کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔" انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا اور آہستگی سے بولے "تمہاری شمولیت کلی طور پر رضاکارانہ ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنا نام واپس لے سکتے ہو یا اگر تم چاہو تو اس مہم میں نسبتاً کم خطرناک ذمے داری تمہیں سونپی جا سکتی ہے۔"

"مثلاً کیا؟" وقاص نے پوچھا۔

"مثلاً بھارتی گارڈز کو ڈاج کرنے کے لیے ایک ڈمی اٹیک" کیمپ کے شمال میں کیا جائے گا' تم اس میں حصہ لے سکتے ہو.... یا پھر...."

"قطع کلامی کے لیے معذرت جناب۔" وقاص نے کہا "میں اس مہم میں پہلے والی حیثیت سے ہی شامل ہونا چاہوں گا۔" اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔

فرحت اللہ صاحب نے کہا "ایک بار پھر سوچ لو.... یہ تمہارا جذباتی فیصلہ تو نہیں' میں دہرا دیتا ہوں اس کارروائی سے زندہ واپس آنے کے امکانات معدوم ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے صرف ایک لمحے کے لیے کچھ پاروں کے چہرے وقاص کی نگاہوں میں چمکے' ست رنگی چوڑیوں کی کھنک اس کے کانوں میں گونجی.... لیکن اگلے ہی لمحے سب کچھ پس منظر میں چلا گیا۔ پیش منظر میں شمیر کے خون آلود جھرنے آگئے اور دم توڑتے شہید کی آخری نگاہیں آئیں۔ ان نگاہوں نے خاموشی کی زبان میں کہا "اے دوست! میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کا سارا دکھ تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں.... تم میرے دشمنوں سے میرا انتقام لینا اور میرے دشمنوں سے سب سے بڑا انتقام یہی ہے کہ میرا وہ مقصد پورا ہو جائے جس کے لیے میں جان دے رہا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں جناب۔" وقاص نے ٹھوس لہجے میں کہا "میں بقائمی ہوش و حواس اس مہم پر جانے کا طلب گار ہوں۔ میری خواہش ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہو۔"

○☆○

سہ پہر کے وقت جونہی وقاص گھر میں داخل ہوا تابندہ نے تنک کر پوچھا "کہاں چلے گئے تھے جناب۔ آپ کی یہ پگلی دیوانوں کی طرح ڈھونڈتی پھر رہی تھی.... شاید آپ بھول گئے کہ آج آپ کو بکرا پیڑی جانا تھا۔ حمزہ دو گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ٹیپو تو باقاعدہ رونے والا ہو رہا ہے۔"

"اوہو بھئی' اتنی بھی کیا پریشانی ہے۔" وقاص نے نارمل انداز میں کہا۔

عقب سے حمزہ نے آواز لگائی "محترم بھائی جان! عید میں اب سات آٹھ دن ہی رہ گئے ہیں۔ پچھلے برس آخری دنوں میں جانوروں کا بھاؤ ایک دم آسمان کو چھو گیا تھا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اگر آپ کی طبع پر ناگوار نہ گزرے تو یہ کام آج ہی نمٹا لیا جائے۔"

"تو ٹھیک ہے بھئی' چلتے ہیں پھر بکرا یا یا دنبہ خریدنے.... بلکہ بکرے یا دنبے خریدنے۔"

تابندہ نے کہا "اور جناب نے جو بدام باغ جانے کا وعدہ فرمایا تھا؟"

"چلو وہ کل پر رکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن کل تو آپ بے چاریاں سے بے"

"بھئی کل دونوں باغات ایک ساتھ ہی دیکھ لینا بلکہ جو جو دل چاہے وہ دیکھ لینا۔"

"جو جو دل چاہے' کیا مطلب؟" تابندہ نے پوچھا۔

"ہم.... میرا مطلب ہے جی بھر کر گھوم لینا۔ سارا بہری نگر آنکھوں میں بھر لینا۔"

تابندہ نے نگاہ غلط انداز سے وقاص کو دیکھا۔ ان حسین نگاہوں میں پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

وقاص ننھے ٹیپو اور حمزہ کے ساتھ جانوروں کی خریداری کے لیے نکل گیا۔ سرد نگر دھماکوں' ہڑتالوں اور گھیراؤ جلاؤ کے واقعات سے گھنایا ہوا شہر تھا۔ بہرحال عید کی آمد کے سبب شہر کے چہرے پر تھوڑی سی رونق نظر آ رہی تھی۔ بازاروں میں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ کھیل کے میدانوں میں لڑکے بالے نظر آتے تھے۔ کھاس کے قطعات پر بکھرے پتھر' ڈنڈے وغیرہ اٹھائے کودتے نظر آتے تھے لیکن یہ سب کچھ وقاص سے بہت دور تھا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ قریباً ایک سال سے وہ جس وقت کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا' وہ آگیا تھا۔ اس وقت کے آنے کی چاپ وقاص کے لیے بہت دل پسند تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس چاپ کے پس منظر میں ست رنگی چوڑیوں کی جھنکار بھی ڈوب ابھر رہی تھی۔ وقت کی چاپ اور چوڑیوں کی جھنکار دو متضاد آوازیں تھیں۔ وقاص کبھی ایک آواز کی طرف کھنچ جاتا تھا' کبھی دوسری کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر والوں سے اور خاص طور پر تابندہ سے اپنی اچانک روانگی کا ذکر کیسے کرے گا۔ وہ جانتا تھا۔ تابندہ پر یہ سب کچھ بہت بھاری گزرے گا۔ وہ تو عید سے تیسرے دن تک کے پروگرام ترتیب دیے بیٹھی تھی.... اور پھر وقاص یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی روانگی کوئی معمولی روانگی نہیں ہے۔ وہ ایک نہایت خطرناک مشن پر جا رہا تھا۔

وہ شام تک گھومتے پھرتے رہے لیکن انہیں اپنی ڈیمانڈ کے مطابق جانور نہیں مل سکے۔ طے ہوا کہ پرسوں صبح سویرے یا کل شام پھر آیا جائے گا۔

بدام باغ جانے کا پروگرام تو پہلے ہی ملتوی ہو چکا تھا۔ تابندہ اور وقاص نے وہ شام گھر میں ہی گزاری۔ وقاص دیر تک والدہ کی ٹانگیں دباتا رہا۔ ان سے باتیں کرتا رہا۔ بعد ازاں ٹیپو کیرم بورڈ لے آیا۔ رات دس گیارہ بجے تک کیرم کھیلا جاتا رہا۔ رات کو خواب گاہ میں جب تابندہ سو گئی تو وقاص نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس نے خواب گاہ کی مدھم روشنی میں تابندہ کا ملیح چہرہ دیکھا۔ کتنا سکون و اطمینان تھا اس کے چہرے پر لگتا تھا کہ وقاص کی رفاقت کے یہ خوب

سے یہ بات سننے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کل تابندہ کو اپنے جانے کی اطلاع کیسے دے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ پھوٹ پھوٹ کر بے حال ہو جائے گی... یوں اس کا کل کا خوب صورت دن بھی غارت ہو جائے گا۔ وقاص نے سوچا' وہ اپنے جانے کی اطلاع دن کے اختتام پر دے گا۔ جب وہ خوب اچھی طرح گھوم پھر کر لوٹیں گے تو وہ مناسب طریقے سے اسے سمجھا دے گا کہ اس کا فوری طور پر جانا ضروری ہے۔ اس سے پہلے سارا دن سیر و تفریح کے دوران میں وہ اسے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش بھی کرتا رہے گا۔

تابندہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے وقاص کے دل میں رقت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بولا "تم ایک مجاہد کی بیوی ہو۔ تمہارے راستے اوروں سے جدا ہیں تابندہ۔" پھر وہ بڑی آہستگی سے آگے بڑھا۔ اس نے جھک کر نرمی سے تابندہ کی پیشانی کو چوم لیا۔ اپنے جانے کا حتمی فیصلہ کرنے کے بعد وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

○☆○

صبح وقاص نے جلدی اٹھ کر تابندہ کو بھی جگا دیا۔ آج وقاص نے والدہ کے ہاتھ کے پراٹھے کھانے کی فرمائش کی تھی جو والدہ نے بہ احسن طریق پوری کر دی۔ ساتھ میں انڈے کا آملیٹ تھا اور دہی کی لسی۔ دہی کی لسی بنانا تابندہ کو نہیں آتا تھا۔ اس خاص قسم کی لسی میں تھوڑا سا کھویا اور میٹھا ڈالا جاتا تھا۔ اب وقاص کی خاطر پچھلے تین چار روز سے تابندہ یہ لسی بنانا سیکھ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں گاڑی لے کر نکل گئے۔ "ہاں بھئی' اب بتاؤ' پہلے بدام باغ یا خپار باغ یا پھر جھیل پر چلیں۔"

"خپار باغ کل چلیں گے۔ چھوٹی باجی بھی ساتھ چلیں گی۔"

"لیکن کل تو ...." ایک دم وہ خاموش ہو گیا۔ بات ہونٹوں سے نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

"کل کیا ہے؟" تابندہ نے چونک کر پوچھا۔

"کل ہڑتال بھی تو ہو سکتی ہے۔" وقاص نے بات بدلی۔

"ہڑتال ہو گئی تو پھر گھر ہی میں رہیں گے۔ آپ کی چھوٹی جان بھی آ رہی ہیں۔ چھوٹی باجی کی طرح وہ بھی بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔ اچھی محفل جمے گی۔"

"اچھا کل کی باتیں چھوڑو' آج کی باتیں کرو۔" وقاص نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ تابندہ کے ملائم ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ پہلے جھیل پر چلتے ہیں۔ تھوڑی سی کشتی رانی۔"

وہ تقریباً دو گھنٹے جھیل پر رہے۔ تابندہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔ کشتی میں سواری کے دوران میں وقاص پر چھینٹے اڑاتے ہوئے وہ اتنا ہنسی کہ اپنے سرخ لباس کی طرح سرخ نظر آنے لگی۔ پتا نہیں کیوں اس کو یوں خوش دیکھ کر وقاص کا دل بیٹھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ تابندہ کو لے کر ایک دم جھیل سے باہر آ جائے۔ جھیل کے کنارے کسی گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر وہ تابندہ کو کل کے بارے میں سب کچھ بتا دے لیکن پھر وہی خیال اس کے ذہن پر حاوی ہو گیا جو خوشیاں آج شام تک تابندہ کو مل رہی تھیں' وہ اسے ان سے محروم کیوں کرے۔

جھیل کی سیر کے بعد وہ اپنے چند عزیزوں کو ملنے چلے گئے۔ پہلے نواب بازار گئے پھر گولف کلب کے علاقے میں.... پھر رام منشی... اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ تابندہ کی پسندیدہ جگہ یعنی بدام باغ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کار بدام باغ کی طرف جا رہی تھی۔ وقاص کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ نگاہیں سامنے سڑک پر جمی تھیں۔ تابندہ نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور بولی "کیا بات ہے وقاص! آج آپ کچھ چپ چپ سے ہیں۔"

وہ پہلے تو چونکا پھر زبردستی مسکرا کر بولا "نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

وہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی دے کر بولی "کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں مجھ سے؟"

"نہیں بھئی! تم سے کیوں چھپاؤں گا۔"

اس نے وقاص کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ "وقاص' آپ چپ ہوتے ہیں تو لگتا ہے کہ میرے اندر بھی فوراً ایک صحرا پھیل گیا ہے۔ پلیز آپ چپ نہ ہوا کریں۔"

"اور جب میں چلا جاؤں گا پھر....؟"

"دیکھیں وقاص! آپ نے خود کہا ہوا ہے کہ ہم بس موجودہ دنوں کی باتیں کریں گے آنے والے دنوں کی نہیں۔"

وقاص نے اپنی نگاہیں بدستور سامنے سڑک پر جمائے رکھیں۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ ہم زبردستی خوش ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خوشی کے موقعوں پر بھی ہم سب کے دل اندر سے روتے رہتے ہیں اور کیوں نہ روئیں۔ اسی ہزار شہیدوں کا خون بھی ابھی آزادی کی دلہن کو لال جوڑا نہیں پہنا سکا ہے۔ ہزاروں معذور جسم' ان گنت برباد عصمتیں' لاتعداد اجڑتے بستے گھروں کے کھنڈرات' یہ سب اپنی اپنی زبان میں ہم سے انصاف مانگ رہے ہیں۔ ہم ان کی فریادوں کی طرف سے کان کیسے بند رکھ

سکتے ہیں۔"

وقاص باتیں کرتا رہا۔ تابندہ سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں خود بھی بولتی رہی۔ اسی دوران میں وہ بدام باغ پہنچ گئے۔

درختوں کے نیچے خوب صورت روشوں پر ٹہلتے ہوئے وقاص نے محسوس کیا کہ اس کے دل کا بوجھ تابندہ کے دل پر منتقل ہو رہا ہے۔ وہ جو اب تک پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی اب کملائی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی اور یہ وقاص ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس دن کو تابندہ کے لیے نہایت خوش گوار اور یادگار بنا دینا چاہتا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں باتیں شروع کر دیں۔ جلد ہی تابندہ پھر سے نارمل نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں موجود خوشی پھر سے تالیاں بجانے لگی۔

وہ سارا دن ہی تابندہ اور وقاص نے گھومتے پھرتے گزارا۔ سہ پہر کی چائے انہوں نے شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک باغ میں پی اور لمبی ڈرائیو کے لیے نکل گئے۔ دن کا "اختتام" اب قریب پہنچ رہا تھا اور وہ کٹھن گھڑی بھی آنے والی تھی جس کا خیال صبح سے وقاص کے دل کو چپکے چپکے کھرچ رہا تھا۔ اسے پہلے تابندہ کو اور پھر سب گھر والوں کو اپنی روانگی کے بارے میں بتانا تھا۔

لمبی ڈرائیو کے دوران میں دو تین بار وقاص نے گفتگو کا رخ اپنے مطلوبہ موضوع کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ اسے کامیابی بھی ہوئی لیکن وہ کوشش کے باوجود اصل بات زبان پر نہیں لا سکا۔ جوں جوں تیرگی پھیل رہی تھی' اس کا دل بوجھل تر ہوتا جا رہا تھا.... رات قریباً نو بجے وہ دونوں گھر واپس پہنچ گئے۔

اپنے کمرے میں جا کر بھی وقاص نے ایک دو بار اصل موضوع کی طرف آنے کی کوشش کی لیکن تابندہ کا موڈ اتنا شگفتہ تھا کہ وہ اپنا مدعا زبان پر نہیں لا سکا۔ پڑوس کے ایک گھر میں کسی لڑکی کی مہندی کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ ڈھولک وغیرہ بج رہی تھی۔ تابندہ چھوٹی باجی اور ٹیپو کو لے کر مہندی والے گھر چلی گئی۔ اب اسے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آنا تھا۔ گھر والوں کو اپنی اچانک روانگی کے بارے میں بتانے کے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ وقاص والدہ کے کمرے میں گیا' جمشید رات کو دیر سے آتا تھا لیکن حمزہ وہیں موجود تھا۔ وقاص کچھ دیر والدہ کی ٹانگیں دباتا رہا' پھر اس نے مناسب الفاظ میں والدہ اور بھائی کو اپنی روانگی کے بارے میں بتا دیا۔ ان کا ردعمل وہی تھا جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔ اہل خانہ نے کبھی اسے اس طرح جانے سے روکا نہیں تھا بلکہ والدہ تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر لایا کرتی تھیں۔ اس کا منہ سر چوم کر اور دعائیں دے دے کر رخصت کیا کرتی تھیں لیکن اس مرتبہ "ایسے موقع پر" اور اس طرح اچانک اسے جانا پڑ رہا تھا کہ سب ہی کو شاک لگنا تھا۔ والدہ کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ حمزہ کا چہرہ بھی اتر گیا۔ وہ اپنے اندرونی تاثرات چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں صرف اتنا پوچھا "کیا آپ عید تک بھی نہیں رک سکتے۔"

"نہیں حمزہ.... اگر اب رک گیا تو پھر ایسے مواقع کے لیے پتا نہیں کب تک انتظار کرنا پڑے۔"

"کیا.... کوئی خاص موقع ہے بھائی جان۔" حمزہ نے وقاص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میری جان! بہت خاص موقع ہے۔"

حمزہ کی آنکھوں میں نمی سی لرزنے لگی۔ وقاص نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ دونوں وعدہ کریں کہ ابھی یہ بات تابندہ کو نہیں بتائیں گے۔ اگر میں نے مناسب سمجھا تو صبح سے پہلے کسی وقت خود بتا دوں گا۔"

"جانا کب ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

"صبح آٹھ بجے۔" وقاص بولا۔

والدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وقاص بے اختیار جھک کر ان کے گلے سے لگ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ اس طرح بڑی خاموشی سے اپنی ماں کے ساتھ پیوست رہا پھر سرخ آنکھوں کے ساتھ علیحدہ ہو گیا۔ تینوں ماں بیٹے اس وقت تک باتیں کرتے رہے جب تک تابندہ اور ٹیپو وغیرہ واپس نہیں آ گئے۔

○☆○

رات کو اپنے کمرے میں تابندہ خوش گوار موڈ میں

ضروری کام

پیرا سٹور میں ایک نوجوان ریٹیئرمنٹ کے طور پر ملازمت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ مالک نے اس کی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ دیکھنے کے لیے ایک شیلف سے ایک ڈبا اتارا اور نوجوان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا "اسے شیلف سے اتارنے کے بعد تم کیا کرو گے؟"

نوجوان نے ڈبے کو غور سے دیکھا اور بولا "میں سب سے پہلے اس پر سے گرد صاف کروں گا۔"

اسے سیلز مین رکھ لیا گیا۔

سا۔ بدن والے لہر میں اس نے لڑکیوں سے جو چنچل شعر سنے تھے وہ وقاص کو سنا رہی تھی پھر وہ الماری کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے وہ کپڑے نکال لائی جو اس نے عید کے روز پہننے تھے۔ یہ خوب صورت جوڑا اس کے میکے سے آیا تھا پھر وہ وقاص کو اپنا خریدا ہوا ایک جوڑا دکھانے لگی۔ "یہ میں ٹرو بکے روز پہنوں گی۔" وہ چہک کر بولی "اور یہ دیکھیں، یہ اس جوڑے کی ہم رنگ چوڑیاں ہیں۔ اچھی لگیں گی نا؟"

"مجھے کیا پتا اچھی لگیں گی یا نہیں۔" وقاص نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولی۔

"بھئی غائب کا علم تو اوپر والے کو ہے۔"

"تو میں آپ کو ابھی پہن کر دکھا دیتی ہوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

وہ اپنے اندرونی احساسات کو حتی الامکان چھپانے کی سعی کر رہا تھا اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی تھا۔ پانچ منٹ بعد تابندہ عید والا لباس پہن کر اس کے سامنے آگئی۔ کامدار گلابی جوڑے میں وہ نو دمیدہ پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ وقاص اسے محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی ادا سے گھوم کر وقاص کو اپنا آپ دکھایا۔ چوڑیاں چھنکا کر اس کی محویت کو توڑا اور پھر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ٹرو والا لباس اور اس کی ہم رنگ چوڑیاں پہن کر آگئی۔ وقاص کی تعریفی نظروں کا خراج وصول کر کے وہ ایک بار پھر باہر چلی گئی۔ اس کی غیر موجودگی میں وقاص اپنے اندر "بات" کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا رہا.... اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے جملے ترتیب دیتا رہا.... لیکن جب وہ آئی اور وقاص نے اس کا مسرور چہرہ دیکھا تو ایک بار پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ کیسے بتاتا کہ عید ابھی بہت دور ہے۔ وہ چند گھنٹے بعد اس سے رخصت ہو رہا ہے۔

تابندہ رات گئے تک اپنے شوہر کی بانہوں میں رہی۔ وہ بستر پر دراز تھے۔ وہ اس کے بال سہلاتا رہا۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہا.... وہ آج بس اس سے باتیں ہی کرنا چاہتا تھا، اس کا چہرہ ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ باتوں باتوں میں ایک بار پھر تابندہ نے کہا "کیا بات ہے وقاص! آج آپ کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔"

اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے سینے سے لگا لیا۔ "نہیں تابندہ، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یونہی سر ذرا بھاری تھا۔"

"ٹھہریے، میں آپ کا سر دباتی ہوں۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہیں تابندہ .... پلیز ایسے ہی لیٹی رہو۔ ابھی نیند آجائے گی تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

وہ لیٹے رہے .... کمرے سے باہر، شہر کی حدوں سے آگے، کشمیر کے جھرنوں، چناروں اور چناروں پر رات آہستہ آہستہ سرکتی رہی۔

○☆○

وقاص علی الصباح ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ تابندہ اس وقت فجر کی نماز پڑھنے کے بعد پھر سو چکی تھی۔ وقاص کی ہدایت کے مطابق حمزہ نے وقاص کا مختصر سامان رات کو ہی پیک کر دیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے وقاص نے ایک خط لکھ کر تابندہ کے سرہانے رکھ دیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔

"تابی! میں جا رہا ہوں۔ دراصل مجھے پرسوں ہی بلا لیا گیا تھا۔ میں پورے دو دن کوشش کرتا رہا ہوں کہ تم سے "جانے" کی بات کہہ سکوں لیکن کہہ نہ سکا۔ اس کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تابی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ایک مجاہد کی زندگی اس کے وطن کی امانت ہوتی ہے۔ میری زندگی بھی امانت ہے۔ میرا وطن یہ امانت مجھ سے کسی بھی وقت مانگ سکتا ہے۔ خود کو ذہنی طور پر اس صورتِ حال کے لیے تیار رکھو۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ میں تمہارے اس جذبے کی بے پناہ قدر کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں تمہارے ان جذبات کی بھی قدر کرتا ہوں جو مادرِ وطن کے حوالے سے تمہارے ذہن میں موجود ہیں۔ تابی! اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول اور وطن کی آزادی کے لیے جان قربان کر دینا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ کسی وقت مجھے یہ اعزاز نصیب ہوا تو تمہاری آنکھوں میں روتے ہوئے آنسو نہیں مسکراتے ہوئے آنسو ہوں گے۔ اس طرح اچانک چلے جانے پر ایک مرتبہ پھر تہ دل سے معافی چاہتا ہوں.... میں تم سے محبت کرتا ہوں.... خدا حافظ۔

میرا خدا تم پر ہمیشہ اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے۔"

یہ خط وقاص نے تابندہ کے قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا.... وہ ایک باہمت شخص تھا۔ اس خطۂ حسین کے ان گنت نشیب و فراز میں اس نے بھارتی فوجیوں کے ساتھ زندگی اور موت کا کھیل کھیلا تھا اور بدترین حوادث کا مسکراتے ہوئے سامنا کیا تھا لیکن وہ چند غم زدہ فقروں کے ساتھ تابندہ کا سامنا نہیں نہیں کر سکا تھا۔ اسے نہیں بتا سکا تھا کہ .... عین ایک تہوار کی گہما گہمی میں وہ اسے چھوڑ کر جا رہا ہے.... باقی اہل خانہ سے ملنے کے بعد اور والدہ کے آنسو

اپنے شانے میں جذب کرنے کے بعد وہ شاہ ہمدان مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ ہنستی مسکراتی گلیاں چھوڑ کر جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان گلیوں میں واپسی کا امکان بہت کم ہے۔

یاندی پورہ میں دو روز رہنے کے بعد وقاص اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں میں چلا گیا۔ ان کا اسلحہ اور ایمونیشن پتھر ڈھونے والے خچروں کے ذریعے ان کے ٹھکانے پر پہنچادیا گیا تھا.... اب انہیں حملے کے لیے مناسب ترین وقت کا انتظار تھا۔ ان کا مشن فوجی کیمپ میں داخل ہونا اور وہاں موجود نفری کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ یہ حملہ "مارو اور بھاگ جاؤ" کی تکنیک کے تحت کیا جارہا تھا۔ تاہم حملہ کرنے والے اپنی موت جانتے تھے کہ مارنے کے بعد بھاگ جانے کے چانس بہت کم ہوں گے۔ وہ جب تک اپنے "ٹارگٹ" کو کیمپ کے اندر تک نہ لے جاتے دشمن کو بھاری نقصان پہنچانا ممکن نہیں تھا.... اور کیمپ میں جانے کے بعد واپسی خاصی مشکل تھی۔ اس ٹارگٹ کا ایک دوسرا مقصد کیمپ کے عقب میں واقع ایمونیشن ڈپو تک بھی پہنچنا تھا۔ مشن کے انچارج کی طرف سے پانچوں مجاہدوں کو ہدایت تھی کہ اگر وہ ایمونیشن ڈپو کو بھی نقصان پہنچاسکیں تو یہ ایک بونس والا معاملہ ہوگا۔

جن دنوں حملے کا انتظار ہورہا تھا' وقاص اکثر اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ خاص طور سے تابندہ کی صورت بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے آنے کے بعد روئی ہوگی.... بہت آنسو بہائے ہوں گے اس نے.... شاید تین چار دن کھانا تک نہ کھایا ہو۔ پہلے چند روز میں وہ بہتا خوش ہوئی تھی' اس سے کہیں زیادہ دکھ اس نے جھیلا ہوگا اور اب بھی جھیل رہی ہوگی۔ وقاص' تابندہ کے دکھ کے بارے میں سوچتا تو اس کی رگوں میں لہو کی جگہ درد بہنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ابھی واپس چلا جائے.... لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ ایک بار واپس ہوا تو پھر "واپس" ہوتا چلا جائے گا۔ واپسی کے اس سفر کا اختتام ایک ایسی جگہ ہوگا جہاں وہ اپنے مقصد سے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر پایا جائے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تابندہ نے جتنا دکھ جھیلنا ہے' اس میں سے بہت سا وہ اب تک جھیل چکی ہے۔ اب تو شاید اسے کچھ کچھ سکون آنا شروع ہوگیا ہوگا۔ دو روز بعد عید تھی۔ ممکن تھا کہ سب اہل خانہ کے ساتھ وہ بری بھلی عید بھی منا ہی لے۔ جوں جوں دن گزریں گے' اس کی کیفیت پہلے سے بہتر ہوتی چلی جائے گی۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ اس کے کانوں میں کسی بزرگ کی کہی ہوئی بات گونجتی اور وہ خود کو قدرے پرسکون محسوس کرنے لگتا۔

عید سے ایک دن پہلے یعنی اگلے روز انہیں اچانک حرکت میں آنے کا حکم ملا۔ آخر حملے کا وقت آگیا تھا۔ پانچ سرفروش مجاہد شب کی تاریکی میں اپنی کمین گاہ سے نکلے اور سینے تان کر فوجی کیمپ کی طرف بڑھے.... اس کے بعد کے واقعات زیادہ طویل نہیں ہیں۔ کیمپ کے بیرونی گارڈز کو ڈاج دینے کے لیے شمال کی جانب گرینیڈز کے چند دھماکے کیے گئے تھے۔ کاشن ملتے ہی پانچوں مجاہد عقابوں کی طرح فوجی کیمپ کے داخلی راستے پر جھپٹے۔ خودکار رائفلوں اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی پھر دستی بموں کے خوف ناک دھماکوں نے وادی کو لرزا دیا۔ شعلے چاروں طرف لپکے' ان گنت انسانی چیخیں گونجیں اور کیمپ میں ہر طرف قیامت صغریٰ کا منظر نظر آیا۔ وقاص کی پیش قدمی میں شیر کی سی جھپٹ تھی۔ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوا وہ دشمن کے اندر تک گھستا چلا گیا۔ وقاص اور اس کے ساتھیوں کی ناقابل گماں جرأت نے ان کے مدمقابل سپاہیوں کو حواس باختہ کردیا۔ چند سیکنڈ کے اندر درجنوں لاشیں تڑپتی نظر آئیں۔ وقاص کے تین ساتھی کیمپ کے وسط تک پہنچتے پہنچتے شہید ہوگئے۔ وقاص کے دائیں کندھے پر بھی گولی لگی تھی۔ اس نے اپنے آخری ساتھی کو دیکھا' وہ فائرنگ کرتا ہوا خاردار تار کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ اپنے کمانڈر کی ہدایت پر عمل کررہا تھا اور ہدایت یہی تھی کہ دشمن کو بھاری نقصان پہنچانے کے بعد اپنی جان بچانے کی کوشش بھی کرنی ہے۔ ایک لمحے کے لیے.... صرف ایک لمحے کے لیے وقاص کے جی میں آئی کہ وہ بھی خاردار تار کی طرف جاکر خود کو بچانے کی کوشش کرے.... لیکن پھر اس کی نگاہ اس سائن بورڈ پر پڑ گئی جو ایمونیشن ڈپو کی لوکیشن بتارہا تھا۔ صرف ایک سیکنڈ کے اندر کئی خیالات وقاص کے ذہن میں لپک گئے۔ ان میں سب سے اہم خیال یہی تھا.... وقاص! تمہاری منزل تو شہادت ہے نا۔ آج نہیں تو کل.... کل نہیں تو پرسوں۔ جتنی بار تابندہ کی طرف لوٹو گے' اتنی ہی بار بچھڑنا بھی پڑے گا اور ہر بار بچھڑنے کی تکلیف پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ تم بار بار اپنے پیاروں سے بچھڑ کر بار بار انہیں رلاؤ گے۔ کیوں نہ آج ہی بچھڑ جاؤ۔ کیوں نہ آج ہی منزل کو پاجاؤ۔ اس نے دائیں جانب دو برسٹ مارے۔ چند قدم آگے بڑھا۔ پھر دانتوں سے ہینڈ گرینیڈ کی پن کھینچی اور دیوانہ وار ڈپو کی طرف دوڑا۔ اس کی آنکھوں میں "آزادی کشمیر" کی ہزارہا مشعلیں روشن تھیں۔ سینہ تنا ہوا تھا' سر اٹھا ہوا تھا.... ہاں' ایسے لوگوں کا سینہ تنا ہوتا ہے' سر اٹھا ہوتا ہے.... چند سیکنڈ بعد شہید کے جسم کے ساتھ ہی ایمونیشن ڈپو بھی ہزارہا ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔



جلدباز

طاہر جاوید مغل

مثل مشہور ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ وہ بھی بڑا جلد باز تھا۔ عجلت شاید اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس تعجیل پسندی کے باعث خود اس کی زندگی اجیرن ہوکر رہ گئی تھی۔ بات اگر اس کی ذات تک محدود رہی ہوتی تو قابل برداشت تھی اس کی جلدی نے تو خود اس کے سوا دوسروں کو بھی بہت پریشان کیا۔

ہنستی مسکراتی چھیل چھبیلی ایک کھلکھلاتی تحریر

فیصل کے اکثر کام جلدی میں ہی خراب ہوتے تھے۔ اس نے جلدی میں عشق کیا۔ جلدی میں شادی کی۔۔۔ جلدی میں گھر سے نکالا گیا۔ گوجر خان سے لاہور آنے کے لیے اس نے ٹرین بھی جلدی میں ایک ایسی پکڑلی جس سے گدھا گاڑی بھی باآسانی ریس جیت سکتی تھی اس ٹرین نے نوبیاہتا میاں بیوی کو چار گھنٹے میں گوجر خان سے فقط جہلم تک پہنچایا۔ اگر فیصل تھوڑا سا صبر کرلیتا تو ایک گھنٹے بعد پنڈی سے تیز رفتار ٹرین آنے والی تھی جو اب تک اسے لاہور کے گردونواح میں پہنچا چکی ہوتی۔

اکتوبر کے دن تھے۔ ہوا میں کافی خنکی پیدا ہو چکی تھی یہ درجہ دوم کا ڈبا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ بند کرنے کے باوجود ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ فیصل کے پہلو میں بیٹھی ہوئی کنول نے

دھیرے سے کہا "شٹر نیچے گرا دیجئے۔"

فیصل نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ چاند کی روشنی جو شیشے سے چھن چھن کر اندر داخل ہو رہی تھی اور کمپارٹمنٹ کے اس حصے کو نیم روشن کر رہی تھی' معدوم ہو گئی۔ نیم تاریکی سی محسوس ہونے لگی۔ چھت پر لگے ہوئے دونوں بلب خراب تھے۔ صرف باتھ روم کی جانب والا بلب روشن تھا لیکن وہ کافی فاصلے پر تھا۔ سامنے والی نشست پر بیٹھا ہوا معمر جوڑا اونگھ رہا تھا۔ بڑے میاں کا سر گاڑی کے ہچکولوں کے سبب مسلسل نفی میں ہل رہا تھا' جیسے وہ بہ زبانِ خاموشی فیصل کو تنبیہہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ وہ نیم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اپنی نئی نویلی دلہن سے محبت جتانے کی کوشش ہرگز نہ کرے۔ بڑے میاں کے پہلو میں بیٹھا ہوا درمیانی عمر کا شخص جاگ رہا تھا لیکن وہ کسی بہت گہری سوچ میں تھا۔ اس کی نگاہ بے دھیانی میں مسلسل ٹرین کے فرش کو گھور رہی تھی۔

موقع غنیمت تھا فیصل کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اس نے اپنا تپا ہوا ہاتھ بڑی آہستگی کے ساتھ اپنی دلہن کی گود میں سرکا دیا اور اس کے نرم ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔ یہی وقت تھا جب کمپارٹمنٹ کی چھت پر لگے ہوئے دو بے کار بلبوں میں سے ایک نے کارکردگی دکھانا شروع کر دی۔ ایک خبیث بادِ خواہ کی طرح وہ خود بخود روشن ہو گیا۔ روشنی ہوتے ہی دلہن نے اپنا ہاتھ فیصل کے ہاتھ سے چھڑا کر پیچھے دھکیل دیا۔ فیصل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس معروف قول پر اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ پاکستان ریلوے اپنے مسافر کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔۔۔ یہ بدبخت جو نجانے کتنے دنوں سے تاریک تھا' چند منٹ اور تاریک رہ جاتا تو محکمے کی حسنِ کارکردگی پر کون سا بٹا لگ جانا تھا۔

کنول سے فیصل کا نکاح ہوئے تقریباً چھتیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے لیکن وہ دلہن سے اتنا ہی دور تھا جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی۔۔۔ شاید یہ مثال غلط ہو گئی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی مقامات کافی ٹھنڈے ہیں۔۔۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک دوجے سے اتنا ہی دور تھے جتنا جیکب آباد سے میانوالی۔ اپنے نکاح کے بعد ایک رات فیصل نے اپنے دوست لطیف کے ہاں گزاری تھی۔ لطیف پہلے سے شادی شدہ تھا۔ تاہم دونوں کی دوستی گہری تھی۔ کنول سے فیصل کی شادی کو انجام تک پہنچانے میں لطیف کا بھی کافی کردار تھا۔ لطیف کے گھر فیصل اور کنول نے جو رات گزاری تھی وہ ایک طرح سے ان کی سہاگ رات تھی۔ یہ سہاگ رات بس باتوں میں ہی گزر گئی تھی۔ افسوس کا مقام یہ تھا کہ یہ باتیں دونوں نے ایک دوسرے سے نہیں کی تھیں۔ فیصل' لطیف کے پاس بیٹھا مونگ پھلی ٹونگتا رہا تھا اور کنول لطیف کی بیوی کے پاس بیٹھی کھسر پسر کرتی رہی تھی۔۔۔

درحقیقت فیصل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا بڑے طوفانی انداز میں ہوا تھا۔ یہ آج سے کوئی چار ماہ پہلے کی بات تھی جب فیصل نے پہلی بار کنول کو دیکھا۔ گوجر خان میں فیصل کے والد نواز صاحب کا لوہے کا کاروبار تھا۔ وہ اپنے کارخانے میں گھریلو استعمال کی مختلف اشیا بھی بناتے تھے۔ گوجر خان زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ نواز صاحب کی رہائشی کوٹھی شہر کی چند اچھی عمارتوں میں شمار ہوتی تھی۔ دو منزلوں میں چودہ پندرہ کمرے اور اتنے ہی باتھ روم بھی تھے۔ ٹی وی لاؤنج اور ڈرائنگ روم وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ فیصل نے بی کام کر رکھا تھا اب والد کے ساتھ فیکٹری میں ہاتھ بٹاتا تھا۔۔۔ والد نے ایک جگہ فیصل کے رشتے کی بات شروع کر دی تھی لیکن اسی دوران میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔

فیصل کے گھر کے پچھواڑے پندرہ مرلے کی ایک کوٹھی میں نئے کرایہ دار آئے۔ ان کی خوبرو لڑکی کنول پہلی نگاہ میں ہی فیصل کو بھا گئی۔ دو تین ہفتے تک آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ پھر ایک دو ملاقاتیں ہوئیں۔ عہد و پیماں ہوئے۔ فیصل نے خم ٹھونک کر کنول سے کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف اسی سے کرے گا۔ دونوں گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ ایک روز فیصل اور کنول نے چند ضروری باتوں کے لیے چھت پر ملنے کا پروگرام بنایا۔ کنول اور اس کے گھر والے چھت پر سوتے تھے (وہ گرمی کے دن تھے) کنول نے فیصل سے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے ان کی چھت پر نہ آئے کیونکہ اس کے والد صاحب جو کھانسی کے مریض تھے' دس بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ فیصل نے اس موقع پر بھی تیز رفتاری دکھائی اور دس بجے ہی محبوبہ کی چھت پر لینڈ کر گیا۔ نہ جانے یہ فیصل کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ کنول کے والد راؤ صاحب ہنوز جاگ رہے تھے۔ غالباً فیصل کی شامتِ اعمال کے نتیجے میں انہوں نے کھانسی کا کوئی اچھا سیرپ پی رکھا تھا جس کے سبب انہیں کھانسی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بستر پر لیٹے نظر آتے تھے۔ فیصل نے سمجھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ اپنی خام خیالی کا علم اسے تب ہوا جب کنول سے پہلے کنول کے والد صاحب سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کے بعد نہایت زبردست گرج چمک ہوئی اور یہ مقولہ بھی غلط ثابت ہو گیا کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ فیصل کی کمر پر تین چار بھاری دوہتڑ بھی پڑے تھے۔ کسی نے چھت کی لائٹ روشن کر دی اور گھر والوں کو علم ہو گیا کہ ان کی چھت پر

کودنے والا دراصل ان کا ہم سایہ 'ماں پیو جا پہ ہے۔

آئندہ کے تین چار دنوں میں فیصل کو سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ کارگل کی جنگ کے بعد یہ اہم ترین واقعات تھے۔ گو یہ واقعات ایک گھر کی سطح پر ہوئے تھے لیکن چھوٹے اسکیل پر بھی ان کی شدت کچھ کم نہیں تھی۔ نواز صاحب نے فیصل کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ فیصل نے بھی علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو راؤ صاحب کی بیٹی سے کرے گا۔

وہ چار پانچ روز تک گھر سے باہر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس دوران میں اپنے دوست لطیف کی مہربانی سے ایک مرتبہ فون پر کنول سے بھی اس کی بات ہوئی۔ کنول نے دکھی لہجے میں کہا۔ "جب آپ سے کہا بھی تھا کہ گیارہ بجے سے پہلے نہ آئیں تو۔۔۔"

فیصل بولا "لیکن میں تو انہیں پورا ایک گھنٹا تاکتا رہا تھا' وہ بالکل بے حرکت لیٹے ہوئے تھے۔"

وہ چیخ کر بولی "بے حرکت تو ہمارا۔۔۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ بہرحال بات فیصل کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی "بے حرکت تو ہمارا ڈبو بھی سارا دن لیٹا رہتا ہے' کیا تم کہو گے کہ وہ سو رہا ہے۔"

ڈبو ان کے پالتو بلے کا نام تھا۔ کنول نے راؤ صاحب کو پالتو بلے سے جوڑنے کی نامکمل کوشش کی تھی۔ اس سے راؤ صاحب کے بارے میں کنول کے اندرونی خیالات کا اندازہ ہوتا تھا۔ راؤ صاحب کنول کے سوتیلے باپ تھے۔ وہ بے حد خوش خوراک اور سخت اندام قسم کے جھگڑالو شخص تھے۔

تین چار روز بعد جب فیصل نے ان سے کنول کا ہاتھ مانگا تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے فیصل سے کہا "تم گھر سے نکال دیے گئے ہو۔ تم میں تو اتنی قابلیت نہیں کہ اپنا پیٹ پال سکو۔ اپنی بیوی کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے۔ جاؤ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

راؤ صاحب کے برعکس کنول کی والدہ کا رویہ نرم تھا۔ انہوں نے گفتگو میں ایسے اشارے دیے جن سے فیصل کو اندازہ ہوا کہ وہ اس رشتے کو ناپسند نہیں کریں گی۔۔۔ ان کی باتوں سے ان اختلافات کی بُو بھی آتی تھی جو میاں بیوی میں موجود تھے۔۔۔ ڈیڑھ دو مہینوں تک کھچڑی پکی۔۔۔ اس کھچڑی کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ کورٹ میں فیصل اور کنول کی شادی ہو گئی۔ اس شادی میں کنول کی والدہ کی پوشیدہ رضامندی بھی شامل تھی۔ فیصل کو تو اس کا والد پہلے ہی گھر سے نکال چکا تھا' اب کنول بھی گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ یہ گیارہ بجے کے بجائے دس بجے چھت پر کودنے کا نتیجہ تھا۔ بہرحال اب ان دونوں کے سامنے نئی زندگی کے ڈھیروں مسائل تھے اور

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں- ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں' ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں-

جیبیں تقریباً تقریباً خالی تھیں۔

فیصل اب فوراً سے پہلے لاہور جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس کا پرانا کلاس فیلو رفاقت رہتا تھا۔ رفاقت ایک بڑی فرم میں بطور کمپیوٹر پروگرامر جاب کرتا تھا۔ اس نے "حفیظ سینٹر" میں سافٹ ویئر کی ٹھیک ٹھاک دکان بھی کھول رکھی تھی۔ ماضی میں جب ڈیڈی کے ساتھ فیصل کی ان بن ہوا کرتی تھی تو رفاقت اسے بہت دلاسا دیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جب بھی لاہور آئے گا وہ اس کے لیے آسانی سے ملازمت کا بندوبست کر دے گا۔ پچھلے سال اپنے ایک دو خطوط میں اس نے فیصل سے اصرار بھی کیا تھا کہ وہ لاہور آئے۔ یہاں بی کام والوں کے لیے چند بہت اچھی ملازمتیں موجود ہیں۔

شادی کے بعد ایک رات لطیف کے گھر گزار کر جب نوبیاہتا جوڑا شہرِ پُرہنگام لاہور کی طرف روانہ ہوا تو لطیف نے زبردستی ڈیڑھ دو ہزار روپے فیصل کی جیب میں ڈال دیے۔ فیصل نے بہت کہا کہ بھئی وہاں خرچے کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ رفاقت کے ہاں رہنا ہے کھانا پینا بھی وہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس روز میں نوکری لگ جائے گی۔۔۔ بہرحال لطیف نے روپے واپس نہیں لیے تھے۔ آج سہ پہر وہ فیصل اور کنول کو خود ٹرین پر چڑھانے آیا تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" کنول نے فیصل کے کندھا چھو کر دھیرے سے کہا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ یہی سوچ رہا تھا کہ کتنے بجے لاہور پہنچیں گے؟"

"کیا وقت ہو رہا ہے۔" کنول نے کھنک دار آواز میں پوچھا۔ "گیارہ بج گئے ہیں۔ فیصل نے رسٹ واچ کو روشنی کی طرف کرتے ہوئے بتایا۔

کنول مسکرائی "پھر وہی گھپلا۔۔۔ گیارہ نہیں دس بجے ہیں۔ شاید اس دن بھی آپ نے ٹھیک سے ٹائم نہیں دیکھا تھا۔"

"کس دن؟"

"جس دن' دھم سے ہماری چھت پر کود گئے تھے' کنول نے شوخی سے کہا' لوگوں کے بارہ بجتے ہیں' پتا نہیں آپ کے دس اور گیارہ کیوں بجتے ہیں۔"

فیصل کی انگلیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ اپنی خوبصورت دلہن کو چھونا چاہتا تھا اس سے پیار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ زمانے کی کھڑی کی ہوئی ساری رکاوٹیں انہوں نے پار کرلیں تھیں لیکن اب انہیں تنہائی دستیاب نہیں تھی۔ اس عدم دستیابی نے نارسائی کا روپ دھار کر فیصل کو بل بل تڑپانا شروع کردیا تھا۔

وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچے۔ جس وقت وہ رکشا پر بیٹھ کر رفاقت کے گھر کی طرف جارہے تھے فیصل کے ذہن میں ایک نرم اور آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں وہ میاں بیوی سکون سے ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو سکیں۔۔۔

رفاقت کا گھر ڈھونڈنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ رفاقت اس وقت آفس جانے کی تیاری کررہا تھا۔ فیصل اور اس کی نوبیاہتا دلہن کو دیکھ کر وہ ایک بار تو زور سے ٹھٹکا پھر گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصل کے گلے لگ گیا۔ وہ فیصل کے ساتھ دلہن کو دیکھ دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔ یہ بات تو اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ گوجر خان میں فیصل کا کسی لڑکی سے چکر چل رہا ہے لیکن یہ بات ہرگز معلوم نہیں تھی کہ یہ بات نکاح کے بولوں تک پہنچ چکی ہے۔

فیصل اور رفاقت علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ رفاقت عمر میں فیصل سے کچھ بڑا تھا۔ گنجا ہونے کی وجہ سے اور بھی بڑا نظر آتا تھا۔ بہرحال دونوں میں احترام کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم تھا۔ فیصل نے ساری حقیقت رفاقت کے سامنے بیان کر دی۔ رفاقت خوش تو ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی نظر آیا۔ اس نے فیصل سے کہا "رہائش کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے جگر! یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے لیکن نوکری کے سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پچھلے سال ان دنوں میں ہماری کمپنی میں ہی پانچ چھ آسامیاں خالی تھیں مگر ان دنوں تو جیسے گریجویٹس نے لاہور پر حملہ کر رکھا ہے۔۔۔ کسی وقت تو۔۔۔ وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

"یار بات تو مکمل کرو۔" فیصل نے اندرونی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"کسی وقت تو مجھے اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگتی ہے۔" رفاقت نے بات مکمل کرتے ہوئے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ فیصل کو ملازمت ملنے کی امید نہیں ہے۔

"خیر اب آ ہی گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ کریں گے بھی۔"

فیصل نے بے ڈھنگی خاموشی کو توڑنے کے لیے کہا۔

رفاقت خود تو دفتر چلا گیا' اس نے بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ "دلہا دلہن" کے لیے ایک کمرا کھلوا دے۔ "کمرا کھلوانے" والا فقرہ فیصل کے کانوں کو بہت بھلا لگا تھا۔ بالکل جیسے کسی فاقہ زدہ شخص کے سامنے حلوہ پوری یا مرغ پلاؤ کی بات کی جائے۔ اپنی تمام تر پریشانیوں سے قطع نظر بس ایک ہی تصور فیصل کے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ایک پرسکون کمرا' ایک آرام دہ مسہری اور ہاتھوں میں اپنی دلہن کا ہاتھ۔

رفاقت کے کہنے پر رفاقت کی تنک مزاج بیوی نے فیصل اور کنول کے لیے ایک کمرا کھلوا تو دیا لیکن وہ اگلے چھ گھنٹے تک مسلسل ان دونوں کے سر پر اس طرح سوار رہی' جیسے اسے اندیشہ ہو کہ جونہی وہ ادھر اُدھر ہٹی مہمانان گرامی کوئی قیمتی چیز اٹھا کر یہاں سے بھاگ لیں گے' عجیب کور ذوق خاتون تھی۔ اسے کچھ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں بالکل نئے نکور شادی شدہ ہیں اور ایسے لوگوں کو خلوت کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی بیس سال قید تنہائی کاٹنے والے کو جلوت کی۔ وہ بہانے بہانے سے ان دونوں کے اردگرد ہی گھومتی رہی۔ ان دونوں کو اپنی نگاہ میں رکھنے کے حوالے سے وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ اس ستم ظریف نے کچن کا رخ بھی نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیصل اور کنول کو دوپہر کا کھانا بھی نہیں ملا۔

سرِشام ایک اور آفت نوبیاہتا جوڑے کے سر پر ٹوٹی۔ فیصل کو رفاقت کا ایک فون موصول ہوا۔ رفاقت نے اسے بتایا کہ اسے ایمرجنسی میں آفس کے ایک کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے۔ واپسی چار پانچ دن سے پہلے نہیں ہوسکتی۔ بہرحال اس نے فیصل سے کہا کہ وہ اطمینان سے گھر میں رہے اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔

تکلیف سے مراد شاید رفاقت کی مراد یہ تھی کہ ان دونوں سے کوئی مارپیٹ نہیں ہوگی' ورنہ تو باقی ہر طرح کی تکلیف وہ پچھلے چھ سات گھنٹے میں اٹھا چکے تھے۔ جس ستم ظریف کو رفاقت کی بیوی کہا جاتا تھا اس نے ان دونوں پر وہی نگاہ رکھی تھی جو پکا تھانیدار ریکے چور پر رکھتا ہے۔ وہ دوپہر کے کھانے سے محروم تھے اور ان کے کمرے کی بجلی بھی بند تھی۔ یا شاید جان بوجھ کر بند رکھی گئی تھی۔

فیصل کی دلہن اس صورتِ حال پر جزبز تھی۔ اس نے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے دوست صاحب نے بھی ہم سے پلہ ہی چھڑایا ہے۔ انہوں نے کہیں جانے کا بہانہ کرکے ہمیں اپنی فرعون صفت زوجہ کے حوالے کردیا ہے تاکہ وہ اچھے طریقے کے ساتھ ہمیں یہاں سے نو دو گیارہ کرسکے۔"

"لیکن بھئی بات یہ ہے کہ۔۔۔"

"بات کچھ نہیں۔ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ میں ایسے ماحول میں نہیں رہ سکتی ڈارلنگ' کنول نے فیصل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مگر سویٹ ہارٹ' جیسے تیسے آج کی رات تو یہاں گزار لیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔"

"یہ محاورہ گدھے کے لیے ہے لیکن ہمارا سابقہ ایک گدھی سے پڑا ہے۔" کنول نے کہا' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "نہیں ڈارلنگ' ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ آپ دیکھ لینا یہ عورت رات بھر بھوت کی طرح ہمارے سر پر سوار رہے گی۔"

"تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"وہ جو اسلامیہ پارک میں آپ کے دوست ہیں۔ کیا نام ہے ان کا... بکرم صاحب"

"بکرم نہیں مکرم صاحب۔ حکیم مکرم صاحب" فیصل نے تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔ ان کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان کی بیوی بھی بہت اچھی ہے۔ اور میرے خیال میں ان کا گھر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔"

دس پندرہ منٹ کے اندر فیصل اور کنول نے کوچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ بات فیصل کی سمجھ میں بھی اچھی طرح آگئی تھی کہ رفاقت اور اس کی زوجہ کے حوالے سے جو نیک خیالات اس نے ذہن میں پال رکھے تھے' وہ سب کے سب بے کار تھے۔ انہوں نے اپنا مختصر سامان اٹیچی میں سمیٹا اور جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ رفاقت کی بیوی نے بس رسمی انداز میں انہیں ایک دو بار رکنے کے لیے کہا پھر بری الذمہ ہو گئی۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں مہمان بہت اچھا لگتا ہے مگر اس وقت جب وہ جانے والا ہوتا ہے۔

کمرا چھوڑنے سے پہلے فیصل کو ذرا تنہائی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی دلہن کو چومنے کے لیے اسے قریب کرنا چاہا۔ لیکن وہ پتھر کی طرح اکڑ گئی۔ اس نے آنکھوں سے بائیں جانب اشارہ کیا۔ گھر کی ملازمہ برآمدے میں بیٹھی ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ جانے سے پہلے مہمانانِ گرامی' کمرے کا قالین' ٹی وی اور ریفریجریٹر وغیرہ اپنی جیبوں میں ڈال کرلے جائیں گے۔

"مجھے تو یہ لوگ نفسیاتی مریض لگتے ہیں۔ یا پھر کہیں سے انہوں نے ٹھیک ٹھاک ڈز کھائی ہوئی ہے۔" کنول نے اپنی خوبصورت ناک چڑھا کر کہا۔

رفاقت کے گھر سے باہر نکلنے کے بعد ان دونوں نے ٹیکسی لی اور مکرم علی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں متعدد بار فیصل نے اپنی دلہن کو چومنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار عقب نما آئینے میں اسے پٹھان ڈرائیور کی گھورتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں اور اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔

مکرم علی کا گھر ڈھونڈنے میں فیصل کو زیادہ دشواری پیش نہ آئی۔ مکرم علی گرمجوشی سے ملا۔ اس کا گھر کافی کشادہ تھا۔ گھر والوں کے دل بھی کشادہ ہی محسوس ہوتے تھے۔ بہرحال اس گھر میں وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو رفاقت کی کوٹھی میں تھیں۔ مکرم علی کے والد بھی حکمت کرتے تھے' ان کی وفات کے بعد مکرم نے ان کی گدی سنبھال لی تھی۔ وہ دیکھنے میں بھی حکیم ہی نظر آتا تھا کیونکہ اس کی صحت اتنی اچھی نہیں تھی وہ بہت تیز باتیں کرتا تھا اور بہت تیز ہی چلتا بھی تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ ایسی عمر میں لوگ حکیم نہیں ہوتے بلکہ "مایوسی" کی وجہ سے حکیموں کے مستقل گاہک ہوتے ہیں۔

مکرم علی نے اپنے ساتھ والا کمرا نوبیاہتا جوڑے کو رہائش کے لیے دے دیا... اور یہیں سے نوبیاہتا جوڑے کی نئی بدقسمتی شروع ہوگئی۔ پہلے تو یہ ہوا کہ آدھی رات کو میزبان اور مہمان میں باتیں ہی ہوتی رہیں۔ دونوں بے تاب پریمی ہر بات کو آخری بات سمجھ کر سہتے رہے اور صبر کے گھونٹ بھرتے رہے۔ آخر رات بارہ بجے کے لگ بھگ خدا خدا کرکے مکرم علی کی یکطرفہ گفتگو کو بریک لگے اور میاں بیوی کو تنہائی نصیب ہوئی... ڈبل بیڈ پر دونوں پاس پاس لیٹ گئے۔ ایک دوجے کا ہاتھ تھام لیا۔ آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ سانسوں کی لے چڑھنے لگی۔ سانسوں کی لے چڑھی تو خرابیٔ تقدیر کے سبب فیصل کو تھوڑی سی کھانسی آگئی۔

کھانسی کا آنا تھا کہ دروازے پر دستک ہوگئی۔ فیصل نے لحاف ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے مکرم علی صاحب کھانسی کے لیے ایک سفوف "سینہ کشا" کے ساتھ موجود تھے۔ کئی برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد یہ سفوف پچھلے ہی ہفتے ایجاد ہوا تھا اور اب فیصل کی خوش بختی تھی کہ وہ اس سفوف سے مستفید ہو رہا تھا۔ سرِشام مکرم صاحب نے جو گفتگو شروع کی تھی' اس میں سے دو تین گھنٹے انہوں نے اسی سفوف کی ظاہری و باطنی خوبیوں کو گنوانے میں صرف کئے تھے۔ مکرم علی نے نہ صرف فیصل کو سفوف کھلایا بلکہ آدھ پون گھنٹا تک مزید اس سفوف کے فوائد گنوائے۔

ان کے جانے کے بعد پھر نوبیاہتا جوڑے کو تھوڑا سا تخلیہ ملا۔ سفوف کھانے کے باوجود فیصل کو کھانسی ہو رہی تھی' لیکن اس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں کھانسی کو روکنے میں صرف کر رکھی تھیں۔ اس کوشش میں اس کا منہ بار بار سرخ ہو رہا تھا اور گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ ایک دو بار اس نے کھانسی کی بھی لیکن اس کی شدت کو حتی الامکان حد تک

کم کردیا۔ جیسے فلک شگاف قہقہے کے بجائے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا جائے۔ لیکن جب قہقہے کو زبردستی مسکراہٹ میں بدلا جاتا ہے تو کبھی کبھی ایک بے ڈھنگا سا تاثر چہرے پر پیدا ہو جاتا ہے۔ کھانسی کو روکنے کی کوشش میں فیصل کے حلق سے بھی ایک عجیب و غریب آواز نکل گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ آواز کا سننا تھا کہ مکرم علی صاحب دروازے پر آن وارد ہوئے۔ یعنی بقول شخصے' وہی ہوتا جو منظور خدا ہوتا ہے۔

اس مرتبہ وہ خاصے متفکر دکھائی دیے۔ انہوں نے انکشاف فرمایا کہ فیصل کو صرف کھانسی نہیں بلکہ کالی کھانسی ہے اور ساتھ میں تبخیر معدہ اور "سوزش جوف سینہ" قسم کی کچھ تکالیف بھی ہیں۔ اس مرتبہ ایک خمیرہ اور لعاب دار دوا بھی فیصل کو حلق میں اتارنا پڑی۔۔۔ لعاب دار دوا کافی کڑوی تھی۔ تاہم اس سے زیادہ کڑوی آدھ پون گھنٹے وہ کی حکیمانہ گفتگو تھی جو مکرم صاحب نے آفت زدہ جوڑے کے کانوں میں انڈیلی۔ لعاب دار دوا فیصل نے باتھ روم میں جا کر پی لی۔

خدا خدا کر کے وہ تشریف لے گئے۔ فیصل نے جھلائے ہوئے انداز میں اندر سے کنڈی چڑھائی اور بغیر کسی تمہید کے نفسِ مضمون کی طرف آگیا۔ اس نے کنول کو بانہوں میں لیا اور اس میں گم ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ بمشکل دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ دروازہ پھر بج اٹھا۔ فیصل نے قہرناک انداز میں دانت پیسے۔ لباس اور بال درست کیے اور کنڈی کھول دی۔ سامنے حسب توقع مکرم صاحب ہی کھڑے تھے۔ اس مرتبہ وہ فیصل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے باقاعدہ کمرے سے باہر لے گئے۔

صحن کی کڑکتی سردی میں پہنچ کر فیصل کے جذبات کافی حد تک سرد پڑ گئے۔ رہی سہی کسر مکرم علی کی گفتگو نے پوری کر دی۔ وہ ناصحانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے "میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ یہ لعاب دار دوا جو تم نے ابھی کھائی ہے اس میں تخم لہسن شامل ہے' اور تلسی کا عرق بھی ہے۔ تلسی نظام تنفس اور سوزش حلق اور افعال معدہ و جگر کے لیے بے حد مفید ہے لیکن اس کے کچھ ذیلی اثرات بھی ہیں۔ ان سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ جسم کے مختلف نظام اور افعال میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔۔۔ جو کہ ذہنی فتور کو جنم دے سکتا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

وہ بولے "تمہاری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اس موسم میں ہر روز' روز عید اور ہر شب' شب برات ہوتی ہے۔ میاں بیوی اکٹھے ہوں تو ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس دوا کی وجہ سے تمہیں آج شب دور ہی رہنا ہوگا۔ زیادہ نہیں کم از کم آخری پہر تک تو احتیاط کرنا' میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل بھائی! سو فیصد سمجھ رہا ہوں۔"

"باقی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے میں تمہیں کئی قیمتی نسخے بتاؤں گا لیکن ابھی نہیں پھر کبھی سہی۔"

فیصل نے سوچا' اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک زبردست نسخہ تو میرے پاس بھی موجود ہے لیکن افسوس میں اس پر عمل نہیں کر سکتا کیونکہ مہمان اگر میزبان کی گردن مروڑ کر اسے بے ہوش یا اناللہ کر دے تو یہ سنگین کیس ہوتا ہے۔

مکرم کے جانے بعد فیصل نے ایک بار پھر دروازہ بند کیا۔ اپنے ہاتھ رگڑ کر سردی کم کرنے کی کوشش کی اور بڑبڑایا۔۔۔ ہر روز' روز عید۔۔۔ ہر شب' شب برات۔۔۔ اونہہ۔"

کنول گھٹنوں تک لحاف کھینچے بیٹھی تھی اور مسکراتی نظروں سے فیصل کو دیکھ رہی تھی "کیا کہہ رہے تھے۔" اس نے پوچھا۔

فیصل نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے کہ پھر آپ کو سو جانا چاہیے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں کہ سو جاؤں۔"

"لیکن اس کا اندیشہ تو ہے۔ مکرم صاحب نے یہی تو کہا ہے۔"

"اندیشہ کس بات کا؟ میں نے دوا کھائی ہی نہیں تھی' باتھ روم کے واش بیسن میں بہا دی تھی۔" وہ کنول کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

"بڑے چالاک ہیں آپ" کنول نے تعریف کی۔

بمشکل پانچ دس منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ فیصل سے پھر ایک غلطی ہو گئی۔ کمرے میں مچھر تھے۔ وہ نازونعم کا پلا ہوا تھا۔ صاف ستھرے ماحول میں رہتا تھا' مچھروں سے اس کی شناسائی کم ہی تھی۔ وہ سخت بیزار ہو رہا تھا۔ ایک مچھر کو مارنے کے لیے اس نے تالی بجائی۔ یہ تالی بادشاہوں والی تالی ثابت ہوئی جس کے ذریعے خدام کو حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ تالی بجنے کے ایک منٹ بعد ہی دروازے پر دستک ہو گئی۔ اس مرتبہ حکیم صاحب کی بیوی دروازے پر موجود تھیں۔ ان کے ہاتھ میں مچھر کو دور بھگانے والا تیل تھا۔ یہ تیل بھی مکرم صاحب کا ہی ایجاد کردہ تھا۔ بھونڈی سی بوتل پر بھونڈا سا ریپر لگا ہوا تھا' جس پر ایک مچھر چاروں شانے چت پڑا تھا۔

"یہ انہوں نے بھیجا ہے۔" مسز مکرم نے کہا "یہاں مچھر کافی ہیں آپ یہ جسم کے کھلے حصوں پر لگا لیں۔"

"شکریہ۔۔۔ غالباً یہ بھی مکرم بھائی نے ہی تیار کیا ہوگا۔" فیصل از راہِ مروت پوچھ بیٹھا۔

جواباً اسے اس نایاب تیل کی کریڈ ببلٹی کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ سننا پڑا مسز مکرم نے نوبیاہتا جوڑے کو بتایا کہ یہ تیل درحقیقت اس کے والد مرحوم یعنی مکرم کے سسر نے تیار کیا تھا۔ (بہ الفاظ دیگر انسانیت پر یہ احسان عظیم انہی کے دور میں ہو چکا تھا۔) مکرم نے تو اس تیل میں صرف چند تبدیلیاں کی تھیں اور اس کی پیکنگ وغیرہ کو بہتر بنایا تھا۔

مسز مکرم کے جانے کے بعد فیصل نے دروازہ پھر بند کیا۔ مچھر تو واقعی یہاں بہت تھے۔ اب دونوں یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ مچھر کو برداشت کیا جائے یا تیل کی نہایت ناگوار بو کو۔ نئی نئی شادی تھی۔ اگر شادی کو تین چار سال گذر گئے ہوتے تو بیوی کو خود سے دور رکھنے کے لیے شاید فیصل یہ تیل استعمال کر لیتا لیکن اب تو معاملہ برعکس تھا۔

اس نے سوچ بچار کے بعد تیل ایک طرف رکھ دیا اور سٹپٹائے ہوئے انداز میں پھر لحاف میں گھس گیا۔۔۔ لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی اب عجیب سی کسلمندی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سینہ جل رہا ہے۔ وہ اٹھ کر کمرے کے اندر ہی ٹہلنے لگا۔ اسے یہ اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اپنے عین دور شباب میں وہ مکرم علی کے کسی غلط سلط نسخے کا شکار ہونے تو نہیں جا رہا۔ سخت سردی کے باوجود اس نے دو تین مرتبہ پانی بھی پیا۔ اب رات کے تین بجنے والے تھے۔۔۔ فیصل کو اپنی طبیعت مسلسل بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد وہ باہر برآمدے میں آکر چکرانے لگا۔ اس کا خدائی معالج فوراً آن حاضر ہوا۔

"کیا بات ہے فیصل بھائی؟" اس نے پوچھا۔

فیصل نے اپنی طبیعت کی گرانی کے بارے میں بتایا۔

تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ راز کھلا کہ فیصل کی چالاکی ہی اس کے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ جو لعاب دار دوا اس نے واش بیسن میں پھینک دی تھی' وہ کھانا بہت ضروری تھی۔ کیونکہ یہ دوا اس آتش اثر خمیرے کا توڑ تھی جو اس کو کھانسی روکنے کے لیے کھلایا گیا تھا۔ یعنی یہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والی بات ہوئی تھی۔

بہرحال باقی کی رات بھی مکرم علی کی تیز زبان قینچی کی طرح چلتی رہی اور بنی نوع انسان کی بیماریوں اور ان کے علاج کے حوالے سے فیصل کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا رہا۔ صبح تک فیصل کو ایک بار پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ تاہم خیریت گذری کہ اس وقت تک مکرم علی کے مطب جانے کا ٹائم ہو گیا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد گھر میں رونا دھونا مچ گیا۔ معلوم ہوا کہ مکرم علی کے سسرال میں کوئی عورت فوت ہو گئی ہے۔ اب یہ سارے لوگ فوتگی پر گجرات جا رہے تھے۔ مکرم علی بھی مطب سے واپس آگیا تھا۔ فوت ہونے والی اس کی بیوی کی بہن تھی۔ وہ لوگ دو دن سے پہلے واپس نہیں آسکتے تھے۔۔۔ فیصل رات کو ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ مکرم کے گھر میں نہیں رہے گا بلکہ دو چار دن اپنی بیوی کے ساتھ سکون سے گزارنے کے لیے درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرا کرایے پر لے لے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مکرم سے جانے کی اجازت کیسے مانگے۔ اب چونکہ مکرم خود ہی گجرات جا رہا تھا۔ فیصل کی مشکل آسان ہو گئی۔ اس نے مکرم کے سامنے بہانہ بنایا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ہاں گلبرگ جانا چاہتا ہے۔۔۔ تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد مکرم نے اجازت دے دی۔ بہرحال اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ابھی فیصل پر اپنے کئی گراں قدر نسخے آزمانا چاہتا تھا۔۔۔ ایک حسرت اس کے تاثرات سے عیاں تھی۔

گیارہ بجے کے قریب فیصل اور کنول مکرم علی کے گھر سے روانہ ہوئے اور رکشا پر سوار ہو کر میکلوڈ روڈ کی طرف چل دیے۔ فیصل جانتا تھا کہ اس علاقے میں کئی صاف ستھرے ہوٹل موجود ہیں۔ ایک پرسکون کمرے کا تصور اس کے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ایک ایسا کمرا جس کا بند دروازہ کھٹکھٹانے کے

دلچسپ ترین سلسلہ "آتش فشاں" کے
حصہ نمبر 3 اور 4 شائع ہو گئے ہیں

بڑے شہروں میں ہمارے سول ایجنٹ یہ ہیں

الکوثر نیوز ایجنسی — فریئر مارکیٹ۔ کراچی — فون: 7723601

شفیق نیوز ایجنسی — اخبار مارکیٹ۔ 1 اسپتال روڈ لاہور۔ فون: 7236688 0300-9477121

اشرف بک ایجنسی — کمیٹی چوک۔ راولپنڈی — فون: 5531610

مہران نیوز ایجنسی — اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد — فون: 780128

کتابیات پبلی کیشنز
رضوان چیمبرز، بلور پاسریٹ آئی آئی چندریگر روڈ
فون: 5802551 فیکس: 5802552-5895313
kitablat1970@yahoo.com
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

لیے کوئی مکرم علی موجود نہ ہوگا۔ اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی نئی نویلی دلہن کی طرف دیکھا اور اس کا دل جیسے انگڑائیاں لینے لگا۔ کنول بھی اس کی کیفیت محسوس کر کے زیر لب مسکرانے لگی۔ شب بیداری نے اس کے حسن کو کچھ اور بھی خمار آلود کر دیا تھا۔ فیصل نے اس کا ہاتھ آہستگی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے وعدہ کر رہا تھا۔ بس تھوڑا سا صبر میری جان کہ ابتلا کی گھڑیاں مختصر ہیں۔ بہت جلد ہم ایک ساتھ ہوں گے۔

لاہور ہوٹل سے تھوڑا آگے جا کر وہ رکشا سے اترے۔ رکشا والے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے فیصل نے جیسے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بٹوا تو جیب میں نہیں ہے۔ اس نے تیزی سے کوٹ اور پتلون کی ساری جیبیں ٹٹولیں مگر گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وہ اس کی جیب سے نکل چکا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ چکرا کر رہ گیا۔ رکشا کے اندر گھس کر اس نے نشست اور پائیدان کو اچھی طرح دیکھا لیکن بٹوا کہیں نہیں تھا۔ یہ تو فیصل کو اچھی طرح یاد تھا کہ مکرم کے گھر سے رخصت ہوتے وقت بٹوا اس کی جیب میں تھا۔ وہ راستے میں ہی نکلا تھا۔ شاید اس وقت جب وہ کنول کے ساتھ رکشا کے انتظار میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔

"یا خدا! اب کیا ہوگا؟" اس نے بڑے کرب کے عالم میں سوچا۔

کنول کے پرس میں کچھ روپے موجود تھے۔ ان روپوں میں سے فیصل نے رکشا کا کرایہ دیا اور اٹیچی کیس اٹھا کر کنول کے ساتھ ایک طرف چل دیا۔ ہوٹل کے پرسکون کمرے اور آرام دہ بستر کا خواب لمحوں میں ٹوٹ گیا تھا۔ کنول کے پرس میں کل دو سو اٹھارہ روپے تھے۔ ان سے تو ہوٹل کا ایک دن کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔۔

مکرم علی کے گھر واپس جانے کا بھی کوئی چانس نہیں تھا۔ وہ لوگ گھر کو تالا لگا کر گجرات روانہ ہو گئے تھے۔ ان کا دوسرا ممکنہ ٹھکانا رفاقت علی کا گھر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس گھر کے ساتھ ہی رفاقت کی کرخت چہرہ بیوی کا تصور بھی فیصل کے ذہن میں آگیا۔ اس کے گھر واپس جانا تو گویا تھوکے کو چاٹنے والی بات تھی۔ فیصل جانتا تھا کہ کنول تو کسی صورت رفاقت کی طرف جانے کو تیار نہیں ہوگی۔

اٹیچی کیس ہاتھوں میں لٹکا کر وہ لوگ ایک بس میں سوار ہوئے اور باغ جناح پہنچ گئے۔ درحقیقت فیصل کہیں آرام سے بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرنا چاہتا تھا۔ باغ جناح میں سرما کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں گھاس کے ایک قطعے پر جا بیٹھے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے بھٹے لے کر کھائے۔ نمک مرچ اور کھٹائی لگا کر مکئی کو مزیدار بنا دیا گیا تھا۔

"اب کیا ہوگا فیصل؟" کنول منمنائی۔

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔"

"تم ہر کام میں بہت جلدی کرتے ہو۔ تم نے ہماری چھت پر کودنے میں جلدی کی۔ تم نے شادی میں جلدی کی۔ تم نے مکرم علی کا گھر چھوڑنے میں جلدی کی اور ہوٹل جاتے ہوئے تم نے جیب سے اپنا رومال نکالنے میں جلدی کی۔۔۔ مجھے یقین ہے تم نے جلدی میں رومال نکالتے ہوئے بٹوا گرا دیا ہوگا۔"

"تم ایک نامعلوم جیب کترے کی طرفداری کر رہی ہو اور اپنے شوہر کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو۔۔۔"

دونوں خوبصورت روشوں پر گھومتے رہے۔ ہر طرف خوب صورت چہروں اور رنگین آنچلوں کی بہار تھی۔ ایک خوبصورت چہرہ فیصل کے پہلو میں بھی تھا۔ لیکن اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ بہت دور تھا۔ وہ باغ جناح کی مصنوعی پہاڑی پر چلے گئے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں جا کر فیصل نے اپنی دلہن سے تھوڑا سا پیار جتانا چاہا۔ ابھی اس نے دلہن کو گلے ہی لگایا تھا کہ نوجوان لڑکوں کی قہقہے سنائی دیے۔ وہ دونوں بدک کر پیچھے ہٹ گئے۔ اضطرابی طور پر ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید لڑکوں نے انہیں دیکھ کر قہقہہ لگایا ہے' لیکن وہ تو یونہی اپنی مستی میں ہنستے کھیلتے چلے آ رہے تھے۔ بہرحال لڑکوں کے گذر جانے کے بعد انہیں یونہی جھاڑی میں دبکے رہنا تھا۔ لڑکوں کے گذر جانے کے بعد کنول نے اٹھنے کی کوشش کی تو سسکاری لے کر رہ گئی۔ اس کا بڑا سا جھمکا ایک کانٹے دار جھاڑی میں بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس نے جھمکا چھڑانے کی کوشش کی' ناکام ہوئی تو فیصل کوشش کرنے لگا۔ جھمکا بری طرح الجھا ہوا تھا۔ فیصل پہلے ہاتھوں سے کوشش کرتا رہا پھر اس نے دانتوں سے ٹرائی کی۔ کنول نیم دراز تھی۔ فیصل کمان کی طرح دہرا ہو کر اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے دانت کنول کے چہرے کے قریب تر تھے۔ عجیب سا پوز بن گیا تھا۔ جیسے وہ خدانخواستہ آدم خور ہو اور کنول کو کچا کھانا چاہتا ہو۔

یہی وقت تھا جب جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور باغ کا ایک باوردی چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے نمودار ہوا۔ وہ چند لمحے خشمگیں نظروں سے فیصل اور کنول کو گھورتا رہا۔ پھر رعب سے چلتا آگے آگیا۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے تحکم سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی' یہ جھمکا ذرا یہاں اٹک گیا تھا۔" فیصل نے کہا۔

"جھمکا اٹکانے کے لیے تمہیں کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی۔ چوکیدار نے تیکھے لہجے میں پوچھا "کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ میری بیوی ہے بھائی' ہم سیر کرنے آئے ہیں بھائی۔"

بیویوں والے یوں چوروں کی طرح جھاڑیوں میں نہیں گھستے۔" چوکیدار نے کہا اور مخالف سمت میں چند قدم آگے جا کر اپنے کسی ساتھی فلک شیر کو آوازیں دینے لگا۔

سردی کے باوجود فیصل کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ ان لمحات میں پہلی بار اس کے ذہن میں آیا کہ اس نے اپنی محبوبہ کی چھت پر کود کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اگر وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو اس وقت بڑے آرام سے اپنے گھر میں موجود ہوتا' جہاں پہلی اور دوسری منزل کے ملا کر کل چودہ بیڈ روم تھے' چودہ عدد بستر' چودہ غسل خانے' چودہ عدد بند دروازے جو مکرم علی جیسے ہر شخص کی دستک سے محفوظ تھے۔۔۔ یہ سب کچھ موجود ہوتا تو آج اسے کنول کے ساتھ یوں جھاڑیوں میں نہ گھسنا پڑتا۔

جھمکا جو پہلے کوشش کے باوجود جھاڑی سے نہیں چھوٹ رہا تھا' اب خوف کے سبب ایک دم چھوٹ گیا۔ یہ بھی ایک طرح برا ہی ہوا کیونکہ اب فیصل اور کنول کے پاس جھمکے کے اٹک جانے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اسی دوران میں فلک شیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی ایک لمبا تڑنگا باوردی چوکیدار تھا۔

تاہم اس کی صورت دیکھ کر فیصل کے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ فلک شیر نامی یہ شخص فیصل کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس شخص کا بھائی گوجر خان میں فیصل کے والد کی فیکٹری میں کام کرتا رہا تھا۔ یہ شخص کبھی کبھی اپنے بھائی سے ملنے گوجر خان آتا تھا۔ فیصل نے ایک دو مرتبہ اس بندے سے لاہور کی معروف باداموں والی برفی بھی منگوائی تھی۔

فلک شیر نے بھی فیصل کو پہچان لیا۔ اس کی اوپر کو اٹھتی ہوئی مونچھیں ذرا ڈھیلی پڑ گئیں۔ وہ جلدی سے آگے آیا اور فیصل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "چھوٹے بابو! آپ یہاں۔۔۔؟"

فیصل نے کہا "شکر ہے تم نے پہچان لیا۔ ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ تمہارا یہ ساتھی ہماری ٹھکائی شروع کر دے گا۔"

فلک شیر نے جلدی جلدی درختوں کے پتے اور مٹی وغیرہ فیصل کے کوٹ سے جھاڑی۔۔۔ کنول کے لیے یہ کام فیصل نے کیا۔

۔۔۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں میاں بیوی فلک شیر کے گھر واقع کچی بستی "ککڑی کوٹ" میں موجود تھے۔ فلک شیر کا گھر بہت مختصر تھا۔ شاید تین مرلے کا ہوگا۔ یہ تین مرلے بھی دو بھائیوں میں بٹوارے کے بعد ڈیڑھ ڈیڑھ مرلہ رہ گئے تھے۔ اس ڈیڑھ مرلے میں ایک صحن تھا جو بڑے سائز کے کیرم بورڈ سے تھوڑا ہی بڑا ہوگا۔ اس کے علاوہ دڑبا نما چار کمرے تھے۔ یہ کمرے اینٹ گارے کے نہیں تھے۔ ان کی تعمیر میں انواع اقسام کا میٹریل استعمال ہوا تھا۔ چپ بورڈ' پلائی بورڈ' ون بورڈ' ٹین کی چادریں غرض ہر قسم کا نمونہ یہاں موجود تھا۔ فیصل اور کنول کو اپنے گھر میں لا کر فلک شیر ان کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن چھوٹے بابو اس کے گھر آئیں گے بلکہ اس کے گھر میں قیام کا ارادہ بھی ظاہر کریں گے۔ اس بے چارے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسٹر اور مسز فیصل کو کہاں بٹھائے۔ ان کے سامنے کیا پیش کرے۔ فلک شیر کی بیوی اور ان کے نصف درجن بچے بھی پروانوں کی طرح فیصل اور کنول کے گرد گھوم رہے تھے۔ چھوٹے بچے کی عمر چار پانچ سال تھی۔ کنول نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس نے بچے سے دو چار میٹھی میٹھی باتیں کیا کر دیں وہ تو اس سے چپک کر رہ گیا۔ اگلے تین چار گھنٹے میں اس نے کنول کی گود سے اترنے کا نام نہ لیا۔ وہ بار بار کنول کا منہ چوم رہا تھا اور فیصل کے احساسِ محرومی کو ہوا دے رہا تھا۔

فلک شیر نے کہا "جانی میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے جی۔ سب سے پیارا بھی یہی ہے' اور لاڈلا بھی یہی ہے۔"

رات سر پر آ گئی تھی۔ فلک شیر نے اپنے گھر کا سب سے کشادہ اور صاف ستھرا کمرا فیصل اور کنول کے لیے خالی کر دیا۔ یہ سب سے کشادہ کمرا بھی بمشکل آٹھ ضرب آٹھ فٹ کا تھا۔ زمین پر ایک موٹی دری بچھی ہوئی تھی جس پر میزبانوں نے گدا وغیرہ ڈال دیا تھا۔ کمرے کے ایک طرف کی دیوار کنستروں کے ٹین کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ کھانا فلک شیر نے ہوٹل سے منگوایا۔ وہ اس بات پر سخت افسردہ نظر آ رہا تھا کہ چھوٹے بابو کو ایسی نامعقول جگہ پر رہنا پڑ رہا ہے۔ بہرحال فیصل کے لیے یہ جگہ بھی بری نہیں تھی۔ کچھ بھی تھا یہ "جگہ" تو تھی۔ جیسے تیسے دس بجے اہل خانہ اپنے اپنے بستروں پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ فیصل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ نوبیاہتا کنول اس کے پہلو میں تھی۔ مگر پھر اچانک یوں محسوس ہوا کہ دلی ہنوز دور است۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور ننھا جانی شرماتا ہوا اندر آ گیا۔ "میں باجی کے پاس لیٹوں گا۔" اس نے بڑی ادا سے کہا۔

اس کی بڑی بہن تیزی سے آئی اور جانی کو جھپٹ کر اٹھا لیا "چلو امی کے پاس۔"

جانی نے اچانک چیخ ماری اور رونا شروع کر دیا۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ کنول نے ازراہِ مروت جانی کو اس کی بڑی بہن سے لے لیا۔ "اچھا یہیں میرے پاس رہنے دو سو جائے گا تو لے جانا۔" کنول نے کہا۔

فیصل دل ہی دل میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں جانی نے ایک بھی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے فیصل کی امید بندھتی کہ وہ آفت زادہ سو جائے گا۔ وہ توتلی زبان میں مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ توتلی زبان فیصل کو اچھی لگتی تھی مگر اس وقت زہر لگ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے جانی کو اونگھ آئی۔ فیصل نے کنول کو اشارے سے کہا کہ وہ لائٹ آف کر دے۔ کنول نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ لائٹ آف ہوئے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ بچو نگڑے نے اٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا "میں بتی جلا کر سوتا ہوں۔"

فیصل کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔ اگلے آدھ گھنٹے میں کنول نے تین بار بتی بجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ ننھے رقیب روسیاہ نے کنول کا رخ بھی اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ فیصل دانت پیس کر بولا "تمہیں بڑا شوق چڑھا ہوا تھا اسے گود میں اٹھانے کا۔"

"جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔" فیصل کو اپنے بالکل قریب سے آواز آئی۔

اس نے گھوم کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آئی تھی۔ (اگر اسے کمرا کہا جا سکے تو) چونکہ دونوں کمروں کے درمیان صرف ٹین کی چادر حائل تھی اس لیے فیصل کو بالکل یہی لگا کہ کوئی اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ہے۔ اب اس نے غور کیا تو ساتھ والے "کمرے" سے سانس لینے کی آواز بھی باقاعدہ اس "کمرے" میں پہنچ رہی تھی۔ فیصل کو شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کنول کا منہ چوما تھا۔ یقیناً یہ آواز بھی بڑی وضاحت سے ساتھ والے کمرے کے مکین یا مکینوں نے سنی ہو گی۔ "دھت تیری کی۔۔۔ اتنی پتلی دیواروں والے کمرے میں کیا خاک پیار ہو سکتا ہے۔" فیصل نے سوچا اور بیزاری سے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اندھیرا ہے۔ کوئی چیز اس کے بالوں میں رینگ رہی تھی۔ ہونے کو تو یہ کن کھجورا بھی ہو سکتا تھا کیونکہ وہ جس جگہ استراحت فرما رہے تھے وہاں ایسی مخلوق کی موجودگی بعید از امکان نہیں تھی۔ بہرحال جلد ہی فیصل کو اندازہ ہو گیا کہ کنول اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہے۔

"جانی کہاں ہے؟" فیصل نے نہایت مدھم سرگوشی میں پوچھا۔

"اسے آنٹی لے گئی ہیں۔" کنول نے بھی بہت دھیمی سرگوشی کی۔

"باقی لوگ سو گئے ہیں؟"

"جی ہاں"

فیصل نے بڑی آہستگی سے کروٹ بدلی۔ اس کی آہستگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ مکمل کروٹ بدلنے میں اس نے ایک منٹ صرف کر دیا۔ پھر بالکل سلوموشن کے انداز میں اس نے اپنا تپا ہوا ہاتھ کنول کے رخسار کی طرف بڑھایا۔ اچانک ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ بالکل یوں لگا کہ آسمان ٹوٹ کر ان کے سر پر آن گرا ہے اور زمین دھماکے سے شق ہو گئی ہے۔ اس آواز کے سبب کنول کی چیخ نکل گئی اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اسے سنبھالنے کے لیے فیصل بھی کھڑا ہوا۔ اس کی ایڑی کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ پشت کے بل پلائی وڈ کی دبلی پتلی دیوار پر گرا۔ سارے کا سارا کمرا اپنی بنیادوں سے ہلتا محسوس ہوا۔

اہل خانہ جاگ گئے۔ روشنی ہو گئی۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ سوتے میں فلک شیر کی بھاری بھرکم والدہ کا گھٹنا ٹین کے اس پارٹیشن سے ٹکرایا تھا جو فیصل والے کمرے کو دوسرے کمرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ اس قسم کے دھماکے اس کبوتر خانے میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا سونے والوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی یہ تو فیصل اور کنول ہی تھے جو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے اور شب تاریک کو روز حشر جان کر "اے خدا لبیک" پکارنے لگے تھے۔

باقی کی ساری رات فیصل اور کنول نے جاگتے گزار دی۔ کنول تو اتنی ڈر گئی تھی کہ اس نے فیصل کو لائٹ آف نہیں کرنے دی۔ اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں خوابیدہ کسی اہل خانہ کا گھٹنا بڑے زور کے ساتھ ٹین کی چادر سے ٹکرائے گا اور کانوں کے پردے پھاڑ دے گا۔

یوں لگتا تھا کہ قدرت فیصل اور کنول کے صبر کا پورا پورا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہے۔ اگلے روز دوپہر کے وقت ہی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ رات تک جاری رہا۔ فلک شیر کے گھر کے دو کمروں کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اہل خانہ کو باقی کے دو کمروں میں سونا پڑا۔ یہ کمرے پہلے ہی اوور لوڈ تھے۔ اب بالکل پیک ہو گئے۔ ایک ایک کمرے میں سات سات افراد کو ٹھونسنا پڑا۔ وہ سب ایک دوجے سے جڑے ہوئے لیٹے تھے۔ یوں فیصل اور کنول کے درمیان

قربت کی ایک شکل تو پیدا ہو گئی لیکن یہ قربت دوری سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ بالفاظ دیگر یہ قربت جذبات کی فراوانی کا نہیں حالات کے جبر کا نتیجہ تھی۔ سردیوں کی یہ بارش ساون کی جھڑی ثابت ہوئی۔ اگلی رات بھی اسی بارش کی نذر ہوئی۔

تیسرے دن فیصل اور کنول بالکل بیزار ہو گئے۔ وہ ذرا گھومنے کے لیے چوکیدار فلک شیر کے گھر سے نکلے۔ ابھی وہ بڑے سڑک تک ہی پہنچے تھے کہ ایک جگہ فیصل کو ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ اس نے سامنے سے رفاقت کو آتے دیکھا۔ وہ اپنی سفید کار میں تیزی سے چھینٹے اڑاتا چلا آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے واضح طور پر رفاقت اور فیصل کی نگاہ ملی لیکن رفاقت نے دیکھ کر بھی فیصل کو نہیں دیکھا۔ جو تھوڑا بہت شک ذہن میں تھا وہ رفع کرنے کے لیے فیصل فٹ پاتھ سے اتر کر گاڑی کے قریب سامنے ہی چلا گیا۔ لیکن رفاقت نے پھر بھی نظر نہیں ملائی۔

فیصل کا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اینٹ اٹھا کر گاڑی کی پچھلی اسکرین پر دے مارے۔ طوطا چشمی سی طوطا چشمی تھی۔ خدا کی پناہ ایسی بے اعتنائی۔ آج سے صرف چند ہفتے پہلے رفاقت اسے چھ چھ صفحوں کے خط لکھتا تھا اور ایک ایک گھنٹے کی فون کالز کرتا تھا۔ اسے بتاتا تھا کہ وہ لاہور آئے تو ہر دروازہ اپنے لیے کھلا پائے گا۔ ملازمت، مکان، گاڑی سب کچھ اسے چٹکی بجاتے ملے گا۔ بلکہ چٹکی کی زحمت بھی نہیں ہو گی بس ابرو کا اشارہ کافی ہو گا۔ مگر اب، جب اس نے دیکھا تھا کہ وہ واقعی لاہور آ گیا ہے اور آیا بھی باپ سے لڑ کر ہے تو اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں تھیں۔

کنول نے بھی دیکھ لیا تھا کہ رفاقت کس طرح آنکھ چرا کر ان کے سامنے سے گزرا ہے... یہ فیصل کے لیے اور بھی شرمندگی کی بات تھی۔ اس کا موڈ بالکل آف ہو گیا۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ ابھی رکشا پکڑ کر رفاقت کے گھر پہنچے اور اسے بے نقط سنا کر آئے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ سارے ہی کہتے تھے کہ وہ جلد بازی کرتا ہے... اس نے رفاقت کے حوالے سے اپنے آپ کو تھوڑا سا وقت دینے کا فیصلہ کیا لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اس نے فلک شیر کے گھر واپس پہنچ کر فٹافٹ تین صفحوں کا ایک طویل خط رفاقت اور اس کی بیوی کے نام گھسیٹ دیا۔ اس خط میں فیصل نے دل کی ساری بھڑاس بڑی اچھی طرح نکالی۔ رفاقت کو بدترین قسم کا طوطا چشم، مطلب پرست اور ریا کار قرار دیا۔ اس کی بددماغ بیوی کے لیے اس نے چن چن کر شایانِ شان القاب استعمال کیے۔ اس کو ایک کھڑکھڑاتے ہوئے روڈ رولر سے تشبیہہ دی جو اپنے سامنے آنے والی ہر ایک شے کو روندتا اور توڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ فیصل نے رفاقت کو لکھا "تمہیں دیکھ کر ایک کائی زدہ مینڈک کا خیال ذہن میں آتا ہے جو اس روڈ رولر کے آگے پھدکتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ ڈرتا ہے کہ رکے گا یا سستی دکھائے گا تو نیچے آ کر پچک جائے گا۔ لیکن یاد رکھنا رفاقت! یہ روڈ رولر تجھے چھوڑے گا نہیں۔ ایک دن تجھے زمین کے ساتھ یوں برابر کر دے گا کہ تیری گندی کھال بھی دکھائی نہیں دے گی کمینے!"

مندرجہ بالا فقرات اس خط میں شائستہ ترین کہے جا سکتے تھے۔ خط لکھنے کے فوراً بعد فیصل نے اسے رفاقت کے پتے پر ارجنٹ پوسٹ کر دیا۔ کنول اسے روکتی ہی رہ گئی تھی۔

یہ اس روز شام کی بات ہے۔ فیصل ایک جاب کا پتہ کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو خاصا نڈھال اور پریشان تھا۔ اپنے دڑبا نما کمرے میں پہنچ کر اس نے بوسیدہ ٹائی اتار کر ایک طرف پھینک دی اور گدے پر نیم دراز ہو گیا۔ کنول نے اس کی جرابیں اتارتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں اگر نوکری نہیں ملی۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔"

"نوکری کی بات نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے... آپ بارش کی وجہ سے پریشان تھے۔ آج تو وہ بھی تھم گئی ہے۔" وہ ذرا شوخی سے بولی۔

"بات یہ نہیں ہے۔" وہ زچ ہو کر بولا "دراصل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ بلکہ یہی سمجھ لو کہ سخت جلد بازی ہو گئی ہے۔"

"لیکن یہ بات تو اب کافی پرانی ہو چکی ہے۔"

"میں تمہاری چھت پر کودنے کی بات نہیں کر رہا۔ میں اب کی بات کر رہا ہوں... دراصل وہ خط... وہ خط مجھے نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ بہت برا ہوا۔ یہ بہت ہی برا ہوا۔" فیصل اپنے ہاتھ مایوسی سے ملتے ہوئے بولا۔

"آپ اس کل والے خط کی بات کر رہے ہیں۔" کنول نے انگلی اٹھا کر پوچھا۔ فیصل نے بڑے دکھ سے اثبات میں سر ہلایا اور بے چینی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا رنگ متغیر تھا۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" کچھ مجھے بھی بتائیں۔

فیصل نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر کہا "رفاقت کو سمجھتے میں، میں نے سخت غلطی کی۔ وہ تو ہمیں سرپرائز دینے کے چکر میں تھا۔"

"کیسا سرپرائز؟"

"زبردست قسم کا سرپرائز... اوہ خدایا، یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔"

اوہو! کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔" کنول نے زچ ہو کر کہا۔

"یہاں میرا ایک جاننے والا اور بھی ہے۔ حاجی بشارت نام ہے اس کا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ رفاقت نے میرے لیے نہ صرف نوکری کا انتظام کرلیا ہے بلکہ اپنے گھر کی انیکسی بھی میرے لیے ڈیکوریٹ کروا رہا ہے۔ اسے حاجی بشارت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہے کہ میں یہاں چوکیدار فلک شیر کے گھر میں رہ رہا ہوں۔ بس دو تین روز میں وہ مجھے اور تمہیں بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے گھر لے جانے والا تھا۔"

کنول کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر بتدریج اس کے چہرے پر بھی تاسف نظر آنے لگا "یہ تو واقعی بہت برا ہوا... میں آپ سے کہہ بھی رہی تھی کہ خط لکھنے میں جلدی نہ کریں۔ آپ نے خط بھی تو اتنا کرخت لکھ دیا ہے۔ اس کی بیوی کو روڈ رولر ڈیزل انجن اور نہ جانے کیا کیا خطاب دیے ہیں..."

فیصل نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے کہا "مجھے یہ باتیں یاد مت دلاؤ۔ کچھ سوچنے دو مجھے... کچھ سوچنے دو۔"

کنول نے کہا "خط آپ نے کس لیٹر بکس میں ڈالا تھا؟"

"لیٹر بکس میں کہاں" فیصل نے جھنجھلا کر کہا "وہ تو میں نے ارجنٹ میل کیا تھا۔ اب تک تو نہ جانے وہ کہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"ایک تو آپ کی یہ پھرتیاں بہت کام خراب کرتی ہیں۔" دونوں کچھ دیر گم صم رہے پھر کنول پُرخیال لہجے میں بولی "ڈاک والے اپنی سستی کی وجہ سے بدنام ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خط ابھی ڈاک خانے میں ہی پڑا خوار ہو رہا ہو۔"

فیصل نے سرد آہ بھری "ہمارے سلسلے میں سارے محکموں کی سستیاں... پھرتیوں میں بدل جاتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہی تھا ٹرین میں وہ کم بخت بلب بھی جل اٹھا تھا جو نہ جانے کب سے تاریک پڑا تھا۔"

"پھر بھی ڈاک خانے میں ایک کوشش کرکے دیکھ لیں۔ آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ ایک دفعہ جب آئی کام میں آپ کی کمپارٹ آگئی تھی تو ڈاکیے کو دو سو روپے دے کر آپ نے اپنا رزلٹ دستی وصول کرلیا تھا' ہو سکتا ہے اسی طرح خط بھی واپس مل جائے۔"

"وہ سستے زمانے تھے کنول بی بی۔" فیصل نے سرد آہ بھر کر کہا "بہرحال سویرے کوشش کرکے دیکھوں گا۔ شاید بات بن جائے۔"

"سنا ہے' خط وغیرہ گم بھی ہو جاتے ہیں۔" کنول نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"اس محکمے میں صرف ضروری خط گم ہوتے ہیں۔" فیصل نے کہا۔

"لیکن چانس تو ہے نا؟"

"یہ چانس ایک لاکھ میں سے شاید ایک ہو۔ مجھے تو... لگتا ہے کہ ہمارے ستارے ہی گردش میں ہیں۔ اچھا بھلا پرسکون گھر مل رہا تھا۔ نوکری مل رہی تھی۔ اف خدایا' یہ کیا ہوگیا۔"

اس رات بارش تو تھمی ہوئی تھی مگر متاثرہ دڑبوں یعنی کمروں میں کیچڑ اتنا تھا کہ انہیں پہلے کی طرح بالکل پیک ہو کر سونا پڑا۔ اگلے روز صبح سویرے چائے رس کا ناشتا کرکے فیصل ڈاک خانے کی طرف دوڑ گیا۔

ڈاک خانے سے اس کی واپسی ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ بے حد مایوس اور دل گرفتہ نظر آتا تھا۔ اس نے کنول کو بتایا کہ خط کل سہ پہر کو ہی ڈاک خانے سے نکل گیا ہے۔ راستے میں کچی آبادی کے قریب ایک چاند گاڑی سے فیصل کی ٹکر بھی ہوگئی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا آرہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی قینچی چپل اس کے ہاتھ میں تھی اور پیشانی پر چوٹ کا نیلگوں نشان بھی تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی کنول کو سامان پیک کرنے کا حکم دیا۔ مختصر سامان تھا۔ فٹافٹ اٹیچی میں پیک ہو گیا۔ دراصل گوجر خان واپس جانے کا فیصلہ فیصل نے راستے میں ہی کرلیا تھا۔ وہ جتنا ذلیل ہو چکا تھا اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مونچھ نیچی کرکے شفقتِ پدری کے سایے میں واپس چلا جائے۔ یعنی ابا جان کے پاس واپس۔

فلک شیر کا شکریہ ادا کرکے میاں بیوی اس کے گھر سے روانہ ہوئے۔ کنول نے جتنی راتیں اس مکان میں گزاری تھیں اسے یہی خدشہ لاحق رہا تھا کہ شب کے سناٹے میں فلک شیر کی والدہ کے گھٹنے کا تصادم ٹین کی چادر سے نہ ہو جائے۔ وہ تصادم ایک نفسیاتی خوف بن کر اس کے ذہن پر سوار ہوگیا تھا۔

خستہ و بدحال جوڑا ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ اس دوران میں فیصل کو مسلسل یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں رفاقت سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ پنجابی کی ایک مثال ہے کہ "موئی ڈریا موت توں تے موت اگے کھڑی۔" یہ مثال میاں بیوی پر صادق پڑ گئی۔ غالباً رفاقت نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ فیصل نے گھبراہٹ کے عالم میں رکشا والے کو ایک گلی میں مڑنے کی ہدایت کی۔ رکشا والا چند لمحے تذبذب میں رہ کر گلی میں مڑ گیا۔ رفاقت کی کار بھی ان کے پیچھے گلی میں داخل ہوگئی۔ اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ رفاقت نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ نہایت گھبراہٹ کے عالم میں فیصل نے رکشا والے کو ایک اور گلی میں موڑ دیا۔ یہ گلی آگے جا کر بند تھی۔ فیصل کا رنگ زرد ہو گیا تھا... رفاقت کی گاڑی رکشا کے

قریب رک گئی۔ اگلے چار پانچ منٹ فیصل اور کنول کے لیے خاصے حوصلہ افزا تھے۔ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ محبت نامہ ابھی تک رفاقت کو موصول نہیں ہوا۔

پھر ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ رفاقت انہیں لینے کے لیے کچی آبادی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ٹریفک سگنل پر اس کی نظر فیصل پر پڑ گئی۔ رفاقت کا سارا پروگرام وہی تھا جس کا فیصل نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ میاں بیوی کو ایک زبردست سرپرائز دینے کے موڈ میں تھا۔ وہی نوکری اور رہائش والا سرپرائز۔ اس کا ارادہ بھانپنے کے باوجود فیصل خوفزدہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج نہیں تو کل اس کا بھیجا ہوا محبت نامہ رفاقت کو موصول ہو جاتا ہے اور پھر سب کچھ اوپر نیچے ہو جاتا ہے۔ وہ گوجر خان واپس جانے پر بضد رہا۔

رفاقت نے کہا "فیصل صاحب! لطیف شہزاد تمہیں پرلے درجے کا جلد باز کہتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے اتفاق نہیں کیا۔ لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ میں غلط تھا۔ پہلے تم نے اپنے والد کے گھر سے نکلنے میں جلدی کی' اب واپس جانے میں جلدی کر رہے ہو۔ میاں! یہ موقع بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس کام کے لیے بہترین موقع کے متعلق میں تمہیں بتاؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔"

"لل لیکن۔۔۔ تمہاری وائف ذرا سخت مزاج ہے۔ اگر بعد میں کوئی خط۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی مسئلہ ہو گیا تو۔۔۔" فیصل ہکلایا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

○☆○

رفاقت اصرار کے ساتھ فیصل اور کنول کو اپنے گھر لے گیا۔ انیکسی واقعی رہنے کے قابل بنا دی گئی تھی۔۔۔ رفاقت کی بیوی کا رویہ بھی پہلے سے بہت بہتر تھا۔ اس کے باوجود اگلے چار پانچ روز فیصل اور کنول نے سخت اذیت میں گزارے۔ جونہی ڈاک آنے کا وقت ہوتا وہ شکاری جانوروں کی طرح چوکنے ہو جاتے۔ مین گیٹ پر جا کر سب سے پہلے وہی ڈاک بکس دیکھتے تھے۔ ڈاک کے لفافوں پر جو ایڈریس لکھے ہوتے تھے ان پر گلی نمبر 54 بھی لکھا ہوتا تھا۔ فیصل کے اندازے کے مطابق یہ رفاقت کے ایڈریس میں نیا اضافہ تھا۔ فیصل نے جو ایڈریس لکھا تھا اس میں گلی نمبر موجود نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ نامعقول خط رفاقت تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے فیصل کا تفکر کم ہوتا گیا۔ اس کا دل محکمہ ڈاک کی سستی پر فدا ہونے کو چاہنے لگا تھا۔۔۔ انہی دنوں بچھڑے ہوئے میاں بیوی نے اپنی سہاگ رات بھی منالی۔

۔۔۔ فیصل اور کنول نے اس انیکسی میں پورا ایک سال گزار دیا۔ نوکری بھی ٹھیک جا رہی تھی اپنے مہمانوں سے فیصل اور کنول کے تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ رفاقت کو بھائی جان کہتے کہتے کنول کی زبان سوکھتی تھی' رفاقت کی وائف کو فیصل بڑی مٹھاس سے بھابھی جی کہتا تھا۔ ایک سال بعد خدا نے ان کے آنگن میں ایک خوبصورت پھول بھی کھلا دیا۔ سب نے مل جل کر اس خوبرو بچے کا نام سرمد رکھا۔ جس روز بچہ سوا مہینے کا ہوا۔ رفاقت نے فیصل کو اپنے پاس بلایا اور بولا "اے میرے جلد باز دوست! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ جب گوجر خان واپس جانے کا بہترین موقع آئے گا' تو تمہیں بتاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ موقع آ گیا ہے۔ انکل جی کا پیارا پوتا لے کر ان کے پاس جاؤ اور سلام عرض کرو۔"

بات بڑی معقول تھی فوراً فیصل کی سمجھ میں آ گئی۔ فیصل' کنول اور ننھا سرمد رفاقت کی گاڑی میں ہی لاہور سے گوجر خان پہنچے اور ننھے سرمد کو اس کے دادا سے ملایا۔۔۔

۔۔۔ اس کے بعد کے حالات بڑی تیزی سے درست ہوئے۔ گلے' شکوے اور معافی وغیرہ کے مراحل کافی سرعت سے طے پائے۔ پندرہ بیس روز کے اندر باپ بیٹے میں صلح ہو گئی اور فیصل لاہور سے مستقل طور پر گوجر خان واپس آ گیا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک ہونے لگا۔ فیصل نے کارخانے اور آفس میں اپنی ذمہ داری سنبھال لی۔ شام کو وہ گھر پہنچتا تو کنول شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتی۔ وہی گھر جس میں چودہ بیڈ روم تھے' چودہ کے چودہ دروازے مکرم علی کی دستک نیم شب سے محفوظ تھے اور چھپن کی چھپن دیواریں فلک شیر کی والدہ کے گھٹنے سے مامون تھیں۔

رفاقت علی سے فیصل کی اب گہری دوستی ہے۔ وہ اکثر ایک دوجے سے ملتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات آج بھی ایک راز ہے کہ وہ خط رفاقت کو ملا تھا یا نہیں۔ کبھی کبھی فیصل کو شک ہوتا ہے کہ وہ خط رفاقت کو مل گیا تھا۔ بعض لوگ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ بہت کچھ بحری جہازوں اور جزیروں کی طرح ان کے اندر ڈوب جاتا ہے اور وہ سمندر کی طرح اس کا پتہ نہیں دیتے۔ فیصل کو شک تھا کہ رفاقت بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔۔۔ کچھ عرصہ بعد جب رفاقت۔۔۔ فیصل کے گھر آیا تو اس نے ایک چہکتا ہوا سا فقرہ کہا تھا۔ یہ فقرہ اکثر فیصل کی سماعت میں گونجتا رہتا ہے۔ فیصل کی بیوی کو دیکھ کر اس نے کہا تھا "یار! لڑکیاں شادی کے بعد تین چار سال تک تو بھابھی کی طرح لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ پھر ان میں سے اکثر روڈ رولر لگنے لگتی ہیں۔۔۔"

روڈ رولر کا لفظ رفاقت کی زبان سے فیصل نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

وہ سرما کی ایک ابر آلود شام تھی۔ یخ بستہ اور نیم تاریک۔ کبھی کبھی بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ ایسی ہی شامیں ہوتی ہیں جب سر پر چھت کی ضرورت کا احساس ہمیشہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ نیم گرم کمروں میں لوگ لحاف اور کمبل اوڑھ کر بیٹھتے ہیں' ٹی وی دیکھتے ہیں' گپ شپ کرتے ہیں' پڑھتے ہیں' غرض تمام مصروفیات چار دیواری میں سمٹ آتی ہیں۔ ایسی شام میں اگر کسی کو رختِ سفر باندھنا ہو تو کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنا ایک کڑی آزمائش کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔ واصف بھی اس آزمائش میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے کام کے سلسلے میں پشاور جانا تھا اور اسٹیشن سے نو بجے والی فلائنگ کوچ پکڑنی تھی۔

وہ دیگر اہلِ خانہ کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی اپنی جگہ سکون سے تھے جبکہ وہ بے سکون تھا۔ ایسی شاموں میں وہ اکثر اداس ہو جاتا تھا اور چونکہ آج اس نے لمبے سفر پر روانہ ہونا تھا لہٰذا اس کی اداسی ہمیشہ سے سوا تھی۔

واصف کے والد عرصۂ دراز سے پائپ کا فرنیچر بنانے کا کام کرتے تھے۔ ان کا کام تین چار شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اپنی گریجویشن مکمل ہونے کے بعد اب واصف بھی کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ "پے منٹس" وغیرہ لینے کے لیے اسے کبھی کبھی دوسرے شہروں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ حالانکہ سفر اسے ہمیشہ سے ناپسند تھا۔

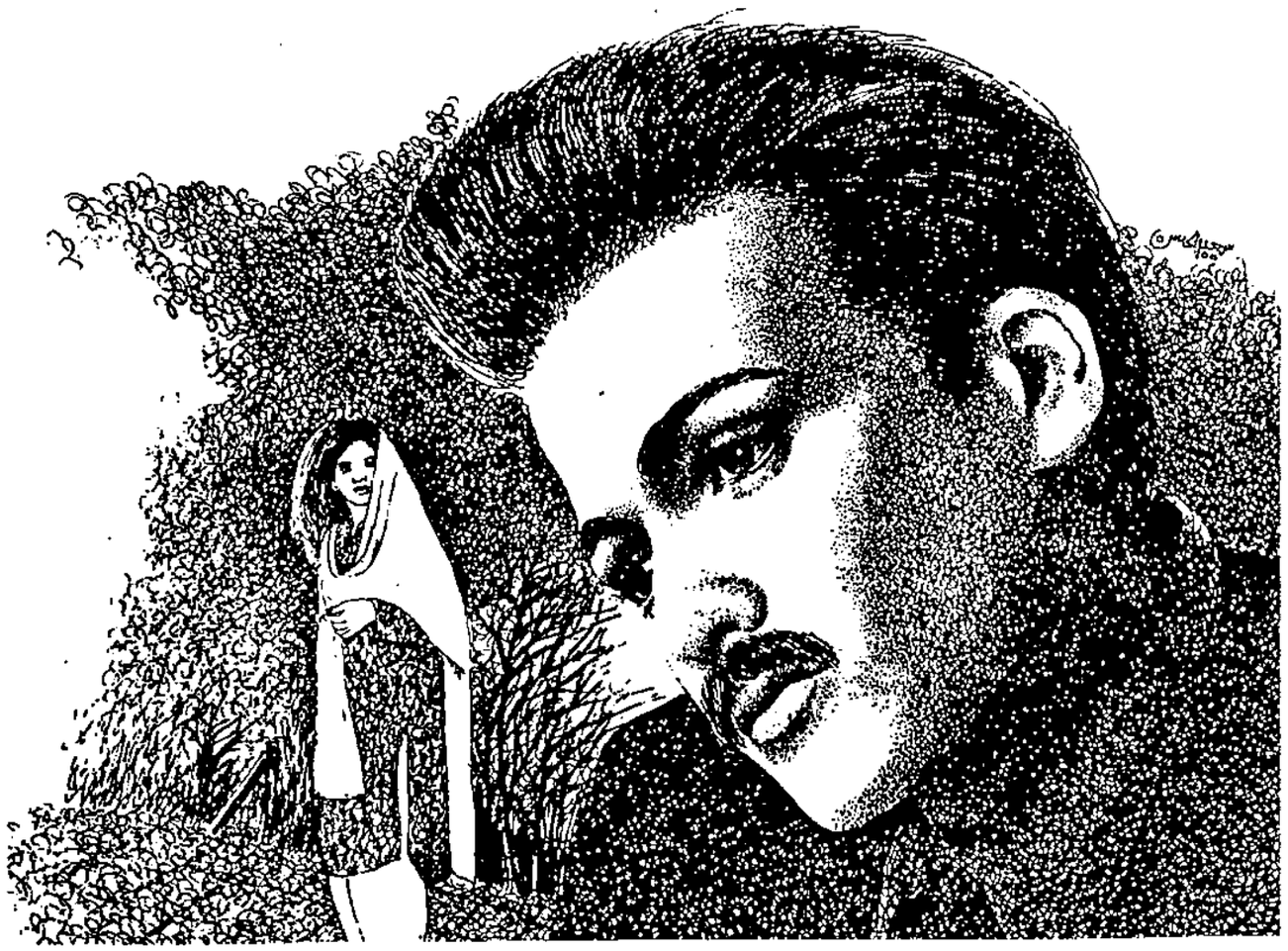
واصف کا ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن کا نام شازیہ تھا۔ وہ اور واصف جڑواں تھے۔ بھائی اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اس کا نام فہد تھا۔ شازیہ کی شادی ہو چکی تھی

شہ زوری کو بے بسی میں بدلنے والے معاملات کی کہانی

طاہر جاوید مغل

شہ زوری

بہنیں بھائیوں کی آنکھوں کی روشنی ہوتی ہیں۔ اُن کے آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑے خوشیوں کی زندگی کی علامت ہوتے ہیں.... جیسے کسی بے رنگ تصویر میں دھنک کے رنگ بھر دیے جائیں۔ ان تینوں بہن بھائیوں کی زندگی بھی ایسے ہی رنگوں اور روشنی سے عبارت تھی کہ ایک بہن نے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا۔



اور وہ اپنے میاں کے ساتھ کویت میں مقیم تھی۔ فہد ایم ایس سی فائنل ایئر میں تھا۔ بالکونی میں اداس بیٹھے بیٹھے واصف بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا۔ والدہ نے دو تین بار آکر چائے کا پوچھا تھا لیکن اس نے انکار کردیا تھا۔ نہ اس کا دل ٹی وی دیکھنے کو چاہ رہا تھا' نہ کسی سے بات کرنے کو۔ "سفر کی شام" کو وہ عموماً ایسے ہی الگ تھلگ ہوجایا کرتا تھا۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی' بجھا بجھا سا۔

بیٹھے بیٹھے خیالات کا دھارا واصف کو چار پانچ سال پیچھے لے گیا۔ ماضی کے مناظر تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں نمودار ہوگئے۔ بیتے ہوئے روز و شب کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ کتنے اچھے تھے وہ دن۔ کتنی دھما چوکڑی ہوتی تھی ان کے گھر میں۔ فہد اس سے کتنا بے تکلف تھا ان دنوں۔ واصف اس سے ایک سال بڑا تھا لیکن دونوں ہم عمر دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتے تھے اور زبانی چھیڑخانی تو ہر گھڑی کا معمول تھی۔ شازیہ بھی ان شرارتوں اور دھما چوکڑیوں میں برابر کی شریک تھی۔ وہ بڑی خودسر اور تیز طرار تھی' اوپر سے والد صاحب کی لاڈلی بھی تھی۔ اس کا حوصلہ ہمیشہ پہاڑ کی طرح بلند رہتا تھا۔ دونوں بھائیوں کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ اس کے علاوہ والدہ اور چچی کے ساتھ بھی اکثر ٹکر لے لیتی تھی۔ اس کا انداز ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب نے اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ شازیہ کو واصف اور فہد شہ زوری کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گھر میں شازیہ کا اثر و رسوخ دیکھتے ہوئے یہ نام اس پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا اور بات صرف اثر و رسوخ ہی کی نہیں تھی' وہ جسمانی طور پر بھی شہ زوری تھی۔ فہد کے ساتھ اکثر اس کی "ٹکالات" ہوجاتی تھی اور اس مکالات میں فہد کو زیر ہونا پڑتا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایسی خرمستیاں کم ہوگئی تھیں مگر ختم نہیں ہوئی تھیں۔ جب بھی زبانی تو تکار ایک حد سے بڑھ جاتی تھی "ڈائریکٹ ایکشن" شروع ہوجاتا تھا۔ اس میں وقت ماحول وغیرہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ یہ جنگ عین والد صاحب کی ناک کے نیچے بھی ہوسکتی تھی۔ اس وقت بھی چھڑ سکتی تھی جب ڈھیروں مہمان گھر میں آئے ہوئے ہوں اور کالج جاتے ہوئے گاڑی کے اندر بھی اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہوسکتی تھی۔

تنازع شروع ہونے کی موٹی موٹی وجوہات چار پانچ ہی تھیں۔ مثلاً صبح وہ تینوں ابو کے ساتھ گاڑی میں کالج جاتے تھے۔ شازیہ کہتی تھی' وہ آگے بیٹھے گی۔ دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کا خیال ہوتا تھا کہ آج اسے ابو کے ساتھ گاڑی میں آگے بیٹھنا چاہیے۔ بس اس بات پر ہنگامہ شروع ہوجاتا تھا۔ ایک اہم وجہ ایک دوسرے کے "موزوں" کا استعمال تھا۔ صبح سویرے اس گمبھیر مسئلے پر اکثر جنگ کی سی صورتِ حال پیدا ہوجاتی تھی۔

ایک دوسرے کے تولیے کا استعمال' ایک دوسرے کی الماری میں اپنی چیزیں ٹھونسنا' باتھ روم میں پہلے داخل ہونے کا مسئلہ' ٹی وی پر اپنی پسند کا چینل لگانا' یہ چیدہ چیدہ مسائل تھے جن کے سبب گھر کے آسمان پر جنگ کے بادل منڈلایا کرتے تھے۔

ہنگامی حالات میں امی اکثر بھائیوں کی حمایت کرتی تھیں جبکہ ابو کا وزن اکثر و بیشتر شازیہ کے پلڑے میں ہوتا تھا۔

یہ بات نہیں تھی کہ واصف اور فہد ابو سے دور تھے یا شازیہ اور امی میں پیار نہیں تھا۔ بس ایک طرح کی غیر اعلانیہ گروپنگ تھی جس کے سبب گھر کے ہنگامے جاندار رہتے تھے۔ فہد اس گروپنگ کو مزاحیہ انداز میں "ٹیم ورک" کہا کرتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی ایسا موقع بھی آتا تھا جب بے تکلفی کی ان لڑائیوں میں ہلکی سی تلخی بھی پیدا ہوجاتی تھی اور متحارب فریق سچ مچ منہ پھلا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر واصف کی امی اور چچی بڑی خوبی سے مصالحانہ کردار ادا کیا کرتی تھیں۔ تلخی کی صورتِ حال عموماً اس وقت پیدا ہوتی تھی جب واصف اور فہد کو اپنے دوستوں کی موجودگی میں شازیہ کی شرارت کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ فہد نے اپنے ایک دوست کی سالگرہ اپنے گھر منانے کا اہتمام کیا (اس دوست کے اہل خانہ بیرونِ ملک مقیم تھے) شازیہ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یوں کیا کہ عین سالگرہ کے موقع پر اپنی ایک سہیلی کی قریب المرگ دادی کے لیے سورۃ یٰسین پڑھوانے کا اہتمام کرلیا۔ اب ایک طرف ڈرائنگ روم میں سالگرہ ہو رہی تھی اور دوسری طرف کامن روم میں سفید چادروں پر کھجور کی گٹھلیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس واقعے کے بعد فہد اور شازیہ کے درمیان جاری سرد جنگ ایک دم گرم جنگ میں بدل گئی تھی اور کئی ہفتے دونوں کے تعلقات سخت کشیدہ رہے تھے بلکہ ایک دو موقعوں پر تو یوں لگا تھا کہ یہ گرم جنگ روایتی ہتھیاروں سے آگے بڑھ کر ایٹمی ہتھیاروں تک پہنچ جائے گی۔

کبھی کبھار تلخی کی صورتِ حال اس وقت بھی پیدا ہوتی تھی جب ابو کسی بات پر شازیہ کی کھلی حمایت کرتے تھے اور دونوں بھائیوں کا خیال ہوتا تھا کہ یہ ناجائز طرف داری ہے۔ ایک ایسے ہی موقع پر فہد نے جوشیلے انداز میں کہا تھا "ابو کا کردار اقوامِ متحدہ جیسا ہونا چاہیے۔"

امی نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا "ان کا کردار اقوام متحدہ جیسا ہی ہے۔ جیسے اقوام متحدہ صرف امریکا کی سنتی ہے، تمہارے ابو صرف اپنی لاڈلی کی سنتے ہیں۔"

واصف کو اب تک یاد تھا' وہ نومبر کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ کالج سے چھٹی تھی' کوئی خاص کام بھی نہیں تھا۔ واصف بستر پر پڑا اینڈ رہا تھا۔ فہد بھاگا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی ابھی تک سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ اس نے کمرے کی مشرقی جانب والی کھڑکی کھولی اور حیرت سے آسمان کو تکنے لگا۔

"کیا ہوا فہدی۔۔۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"برادر' دیکھ رہا ہوں کہ سورج آج بھی مشرق سے نکلا ہے یا مغرب سے نکل آیا ہے۔"

"کیوں' کیا ہوا؟"

فہد نے جست لگائی اور واصف کے عین سامنے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈرامائی انداز میں بولا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا برادر۔۔۔ ذرا میری ٹانگ پر چٹکی کاٹو تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔"

واصف نے ٹانگ پر زور سے چٹکی کاٹی۔ فہد نے اتنی بھیانک چیخ ماری کہ امی' جو باورچی خانے میں ناشتا بنا رہی تھیں' دوڑی ہوئی آئیں اور کھڑکی کے شیشے سے کمرے میں جھانکنے پر مجبور ہو گئیں۔۔۔ مگر جب واصف کو ہنستے ہوئے پایا تو بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"یار' بات کیا ہے' کیوں اتنا ڈراما کر رہے ہو؟" واصف بولا۔

فہد سرگوشی کے انداز میں بولا "برادر! آج تو کمال ہو گیا۔ رات ابو نے اپنے کچھ کپڑے میری الماری میں رکھ دیے۔۔۔ تمہیں پتا ہے میری الماری میں پہلے ہی گنجائش کم ہے۔ میں ابو سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔۔۔ میں نے سوچا چلو رسک لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ میں نے اپنے تین چار جوڑے اور دو کوٹ نکال کر شہ زوری کی الماری میں لٹکا دیے۔ مجھے نوّے فیصد یقین تھا کہ علی الصباح میرے یہ تمام لباس ہائے فاخرہ میرے کمرے کی دہلیز پر پڑے ہوں گے یا صحن میں بھٹک رہے ہوں گے۔ مگر چمتکار یہ ہوا ہے کہ وہ سارے کپڑے نہ صرف الماری میں موجود ہیں بلکہ ہماری پیاری بہنا بھی بالکل ٹھنڈے ٹھار موڈ میں ہے۔"

واصف نے غیر یقینی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس نے ابھی کپڑے دیکھے ہی نہ ہوں؟"

"نہیں برادر' اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ میرے سامنے دیکھا ہے۔ اسے پتا ہے کہ سرحدی خلاف ورزی ہوئی ہے مگر اس کی توپیں ابھی تک خاموش ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ گھمسان سے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہو؟"

"مگر وہ خاموش تھوڑی ہے۔۔۔ ابھی مجھ سے باتیں شاتیں بھی کر رہی تھی۔"

"پھر یہ کوئی حکمتِ عملی بھی ہو سکتی ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ خاموش ڈپلومیسی۔"

"نہیں برادر۔ تمہیں معلوم ہے' میں کتے کی طرح سونگھ لیتا ہوں۔ مجھے تو خطرے کی بالکل بو نہیں آرہی۔"

"ہاں' تمہاری اس صلاحیت کا تو مجھے بھی اعتراف ہے۔"

دونوں بھائی بے تکلف دوستوں کی طرح ہنسنے لگے۔

شازیہ کے ساتھ بھی وہ ایسے ہی بے تکلفی سے بات کیا کرتے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ تینوں ہی جڑواں یا "تڑواں" ہیں۔۔۔ ہاں پچھلے ڈیڑھ دو ہفتوں سے وہ کچھ کم کم بات کر رہے تھے۔ ان میں تھوڑی سی کشیدگی بھی تھی اس کے علاوہ شاید ایک وجہ یہ

ہیپاٹائٹس کیا ہے؟

ہیپاٹائٹس بی اور سی کیا ہے؟
بی اور سی وائرس انسان کو کس طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے؟
کیا ہیپاٹائٹس قابل علاج مرض ہے؟
انمول اکسیر کتابچہ کا مطالعہ آپکو
حقیقت کا آئینہ دکھائے گا
خط لکھ کر مفت حاصل کریں

حکیم محمد اعظم بٹالوی
16-A
پیپلز کالونی فیصل آباد

بھی تھی کہ واصف اور شازیہ کے ایف ایس سی کے امتحان بالکل سر پر تھے اور وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے۔

دوپہر کو واصف نے خود بھی فہد کے کپڑے شازیہ کی الماری میں ٹنگے ہوئے دیکھے اور شازیہ کا نارمل موڈ بھی دیکھا۔ اس کا دل بھی چاہا کہ چھت پر چڑھ کر دیکھے کہ سورج مشرق سے مغرب کی طرف جارہا ہے یا مغرب سے مشرق کی طرف۔۔۔ اگلی صبح شازیہ کو آزمانے کے لیے اس نے بھی ایک حرکت کی۔ وہ تینوں ابو کے ساتھ ہی گھر سے نکلا کرتے تھے۔ پہلے شازیہ کا کالج آتا تھا۔ وہ وہاں اتر جاتی تھی۔ اس کے بعد ابو واصف اور فہد کو ان کے کالج میں ڈراپ کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اصولی طور پر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ شازیہ ابو کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر نہ بیٹھتی کیونکہ اسے پہلے اترنا ہوتا تھا۔ اس کے اترنے کے بعد ابو کے ساتھ والی سیٹ خالی ہوجاتی تھی جسے پُر کرنے کے لیے فہد یا واصف میں سے ایک کو اٹھ کر آگے آنا پڑتا تھا لیکن شازیہ کو کون سمجھاتا۔ وہ اکثر و بیشتر پھرتی کا مظاہرہ کرکے اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتی تھی اور اگر بھائیوں میں سے کوئی اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرکے ابو کے ساتھ بیٹھتا تو وہ دھونس اور دھاندلی پر اتر آتی اور اگلی سیٹ خالی کرا کے رہتی۔ بچپن سے اس کی یہی عادت چلی آرہی تھی۔۔۔ اس روز واصف نے شازیہ کو آزمانے کے لیے "خصوصی پھرتی" کا مظاہرہ کیا۔ ناشتے کا آخری نوالہ منہ میں رکھتے رکھتے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسٹڈی سے اپنی فائل لی اور بھاگ کر گاڑی میں جابیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ابو، فہد اور شازیہ بھی پورچ میں پہنچ گئے۔ ملازم گاڑی کی ونڈ اسکرین صاف کررہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ کسی ہنگامے کی توقع کررہا ہے۔ بات تھی بھی ہنگامے کی خلافِ معمول آج واصف نے فرنٹ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ اب چیخم دھاڑ اور کھینچا تانی کے مناظر سامنے آنے والے تھے لیکن حیرت کی بات تھی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ شازیہ نے صرف ایک بار ٹھٹک کر واصف کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر خاموشی سے فہد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ واصف اور فہد کی آنکھیں چار ہوئیں اور ان کے چہروں پر تعجب ابھر آیا۔

دونوں بھائیوں کے لیے بہن کے رویّے میں یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ وہ تو کسی طور پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی بات دل میں رکھنے والی تھی۔ جو کچھ اس کے اندر ہوتا، فٹ سے زبان پر آجاتا۔ شام کو بھی چھت پر دونوں بھائیوں میں یہی موضوع زیرِ بحث رہا۔ واصف نے اپنے طور پر امی کو بھی کُریدنے کی کوشش کی تھی اور پوچھا تھا کہ شازیہ چپ چپ کیوں ہے۔ انہوں نے کہا تھا "چپ کہاں ہے۔ اچھی بھلی تو باتیں کررہی ہے۔ اب تم چاہتے ہو کہ گھر میں ہر وقت ہاہا کار ہی مچی رہے۔"

دونوں بھائی اس نتیجے پر پہنچے کہ شازیہ عرفِ شہ زوری عرفِ جانِ پدر کے رویّے میں بنیادی تبدیلی واقع ہورہی ہے اور وہ جو سکندرِ اعظم کی سی جنگجو طبیعت لے کر پیدا ہوئی تھی، امن و آشتی کی قائل ہورہی ہے۔ فہد نے بڑے بھائی سے کہا۔ "برادر، یہ موقع بڑا اچھا ہے، کیوں نا پلان نمبر تین پر عمل کر گزرا جائے۔ شہ زوری کی آزمائش بھی ہوجائے گی کہ واقعی اس نے خود کو تبدیل کیا ہے یا نہیں؟ اور اگر کیا ہے تو کس حد تک کیا ہے؟"

واصف نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ پلان نمبر ۳ کا نام پلان نمبر ۳ پتا نہیں کیوں پڑ گیا تھا۔ بس وہ یونہی باتوں باتوں میں اس چھوٹی سی سازش کو پلان نمبر تین کہنے لگے تھے۔ پلان نمبر ۳ ڈرائنگ روم، کامن روم اور انیکسی میں رنگ و روغن اور ڈیکوریشن کا پلان تھا۔ قریباً چھ مہینے سے ان تین کمروں میں آرائش و زیبائش کا پروگرام بن رہا تھا۔ ابو اس سلسلے میں بجٹ میں سے معقول رقم بھی مختص کرچکے تھے لیکن معاملہ "اتفاقِ رائے" کے حصول پر آکر اٹک گیا تھا۔ جب بھی اس سلسلے میں تفصیلی بات کی جاتی تھی، واصف اور فہد کی رائے شازیہ کی رائے سے ٹکرا جاتی تھی اور یہ تصادم اتنا شدید ہوتا تھا کہ اردگرد بیٹھے لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے تھے۔ سب سے پہلے تو اس بات پر اختلاف ہوجاتا تھا کہ کام کب شروع کرایا جائے پھر کس کمرے میں کون سا رنگ ہو، کس کمرے کی ڈیکوریشن کس طرح کی ہو۔ کون سے صوفے کس کمرے میں شفٹ کیے جائیں۔ غرض ہر بات پر شدید ترین تکرار ہوتی تھی اور میٹنگ روم قومی اسمبلی کا منظر پیش کرنے لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر ان سنگین اختلافات کو طے کیے بغیر کام شروع کرادیا گیا تو تھرڈ ورلڈ وار کو کوئی نہ روک سکے گا اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ لہٰذا ابو نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر بار اس معاملے کو رول بیک کردیا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات میں اگر واصف اور فہد کے ذہن میں پلان نمبر تین پر عمل کرنے کی بات آئی تھی تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔۔۔ پلان نمبر ۳ یہ تھا کہ گلبرگ میں رہائش پذیر بڑی پھوپو سے شہ زوری کو ٹیلی فون کرایا جائے اور وہ اصرار کرکے دو تین روز کے لیے شہ زوری کو اپنے ہاں بلالیں۔ اسی دوران میں رات دن ایک کرکے تینوں کمروں کی تزئینِ نو کا کام مکمل کرلیا جائے۔ (بالکل جس طرح ایمان کی حرارت والوں نے مسجدِ شب بھر بنا ڈالی تھی)

غور و خوض کے بعد واصف اور فہد کو یقین ہو گیا کہ منصوبہ قابل عمل ہے۔ حسب پروگرام انہوں نے بڑی پھوپو سے فون کرایا۔ اتفاقاً جمعے کی چھٹی بھی آرہی تھی۔ شازیہ نے ہفتے کی چھٹی ساتھ ملائی اور تین دن کے لیے پھوپو کے ہاں چلی گئی۔ اتوار کی شام کو جب وہ واپس آئی تو نصف گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ تینوں کمروں کا رنگ و روغن' آرائش و زیبائش' سب کچھ مکمل ہو چکا تھا اور ہر کام شازیہ کی مرضی کے عین "خلاف" ہوا تھا۔ فہد تو کہیں کھسک گیا تھا' واصف اپنے کمرے کی کنڈی بند کیے بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ "شہ زوری" کی برداشت سے باہر ہوگا' اس کے صبر و تحمل کی دھجیاں بکھر جائیں گی اور وہ اتنی ہی غضب ناک نظر آئے گی جتنا ہلاکو خان بغداد پر حملے کے وقت تھا۔ ہنگامی حالات میں سلامتی کونسل کا کردار ادا کرنے والے "ابو" بھی سہ روزہ کاروباری دورے پر راولپنڈی گئے ہوئے تھے لہٰذا خدشہ تھا کہ کریک ڈاؤن کی صورت میں حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔۔۔ مگر جو کچھ ہوا' وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ شازیہ نے خاموشی سے کمروں کا جائزہ لیا۔ در و دیوار پر نظر ڈالی' امی سے ایک دو باتیں کیں اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کا رویہ عجیب سے عجیب تر ہو گیا تھا۔ کھانے کی میز پر وہ واصف اور فہد سے بھی ملی۔ ان کے درمیان رسمی گفتگو ہوئی لیکن اس تبدیلی کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی جو شازیہ کی غیر موجودگی میں گھر کے اندر رونما ہوئی تھی۔۔۔ رات کو ایک بار پھر واصف اور فہد سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا واقعی شازیہ بدل گئی تھی یا وہ مصنوعی رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ واصف کے ذہن میں بار بار ایک بات آرہی تھی' عین ممکن تھا کہ ابو نے شازیہ کو ہر معاملے میں خاموش رہنے کی ہدایت کر رکھی ہو اور اس سے کہا ہو کہ جو بھی شکایت ہو وہ ان سے بیان کیا کرے۔۔۔ وہ خود واصف اور فہد وغیرہ سے نمٹ لیں گے۔ واصف نے جوں جوں اس معاملے پر غور کیا' اس کا یہ یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ یہ خاموشی بے معنی نہیں ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً ابو جان کے غصے کی شکل میں ایک طوفان ہے۔۔۔ اور یہ طوفان عنقریب ان دونوں کو زد میں لے گا۔

"فہدی پیارے' ابو سے طبیعت صاف کروانے کے لیے تیار ہو جاؤ" واصف نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا تھا۔

"یعنی دال میں کچھ کالا ہے؟" فہد نے کہا۔

"پوری دال کالی ہے' بلکہ کالی سیاہ ہے" واصف نے کہا۔ "میرے خیال میں امریکا نے اقوام متحدہ کے ہاتھوں جو کچھ عراقیوں کے ساتھ کروایا تھا' وہی ہمارے ساتھ ہونے والا ہے۔"

○☆○

ابو اگلے روز اپنے دورے سے واپس آگئے تھے۔ اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے جب واصف اور فہد کو محسوس ہوا کہ ان کے تمام اندیشے حقیقت ثابت ہونے والے ہیں۔ ابو نے ملازم سے کہہ کر ان دونوں کو اسٹڈی میں بلایا تھا۔ اسٹڈی میں بلایا جانا ہی کم نہیں تھا' اوپر سے دونوں کو اکٹھا بلایا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہایت اہم نوعیت کی بات ہوگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا' خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور امی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ ایسے موقعوں پر امی کا آس پاس رہنا ضروری ہوتا تھا۔ وہ ممتاز محل کا کردار ادا کرتے ہوئے گاہے گاہے سربراہِ خانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں اور ان کے ٹمپریچر کو خطرے کے نشان سے نیچے لے آتی تھیں مگر امی کہیں نظر نہیں آئیں۔ ملازم نے مژدہ سنایا کہ امی پہلے سے اسٹڈی میں موجود ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ معاملہ توقع سے زیادہ گمبھیر ہے۔ دونوں ڈگمگاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے اسٹڈی میں پہنچے۔ حسب توقع ابو کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ امی بھی خاموش نظر آرہی تھیں۔ ابو نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا' وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند لمحے ایک اعصاب شکن خاموشی طاری رہی پھر ابو نے بوجھل آواز میں کہا "تم دونوں اب ماشاء اللہ بالغ ہو' تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہو۔ تمہیں گھر کے مسائل اور معاملات سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تمہارا حق ہے کہ تم سے مشورہ لیا جائے اور کسی حتمی فیصلے سے پہلے تمہاری رائے دریافت کی جائے۔"

ابو کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کے برخلاف ان کا لہجہ کافی حد تک نرم تھا۔ انہوں نے میز سے نظر کی عینک اٹھا کر لگائی اور بولے "لڑکیوں کی شادی وقت پر ہو جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ شازیہ ماشاء اللہ ایف ایس سی کا امتحان دے رہی ہے۔ کچھ روز تک وہ فارغ ہو جائے گی۔ اس کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا نہایت شریف اور ملنسار ہے۔ ایم سی ایس کر رکھا ہے' کویت کی ایک فرم میں معقول جاب کر رہا ہے۔ اس کے والد سے میری جان پہچان بھی ہے۔ وہ اس رشتے پر بے حد اصرار کر رہے ہیں۔ پچھلے اتوار میں اور تمہاری امی ان کے گھر بھی گئے تھے۔ بھئی ہمیں تو وہ لوگ بے حد پسند آئے ہیں۔ لڑکا ان دنوں چھٹی پر پاکستان آیا ہوا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اگر رشتہ طے ہو جائے تو پھر ایک ماہ کے اندر اندر ہی شادی بھی کر دی جائے۔ ہماری طرح

وہ لوگ بھی رسم و رواج والے نہیں ہیں۔ نہ ہی جہیز کا کوئی مطالبہ ہے۔ سادگی سے شادی ہوجائے تو کسی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

ابو تادیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ واصف اور فہد بت بنے بیٹھے رہے۔ وہ کیا سمجھ رہے تھے اور یہ کیا بات نکلی تھی۔ ایک دم ہی انہیں یوں لگا تھا کہ کوئی ان کا کلیجا مسل رہا ہے۔ ان کی بہن' ان کی شہ زوری' ان سے لڑنے جھگڑنے والی' ان سے روٹھنے والی اور انہیں منانے والی ان سے دور جارہی تھی۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ کیا یوں بھی ایک دم کوئی جُدا ہوجاتا ہے۔ ساری پیار بھری لڑائیاں' مارے تازے بیچ میں چھوڑ کر چپ چاپ کسی طرف نکل جاتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی چچی بھی اسٹڈی میں پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی اس رشتے کی پُرزور تائید کردی تھی اور لڑکے والوں کی یہ شرط ماننے کا مشورہ بھی دیا تھا کہ شادی جلد کردی جائے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر واصف اور فہد تادیر خاموش بیٹھے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے کہ مبادا ایک دوجے کے تاثرات دیکھ کر ضبط کا بند ٹوٹ جائے اور آنسو بہہ نکلیں۔ پھر واصف خاموشی سے اٹھا اور شازیہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ واصف کو دیکھا تو سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولی "کیسے ہو واصف بھائی!" اس کی آواز میں غیر مانوس نرمی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن۔۔۔ لیکن تو یہ کیا کررہی ہے؟"

"میں کیا کررہی ہوں۔۔۔؟" وہ آنکھیں جھکا کر بولی۔

یکدم واصف نے اس کا سر پکڑ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ دلدوز آواز میں بولا "ہمیں چھوڑ کر جارہی ہے' کیوں جارہی ہے؟"

وہ بھی رودی "مجھے ایک دن تو جانا ہی تھا بھائی۔۔۔ چلو اچھا ہوا جلدی چلی جاؤں گی۔۔۔ میری الماری خالی ہوجائے گی بھائی۔۔۔ اب وہاں تم اور فہد کپڑے رکھ لیا کرنا۔ گاڑی میں ابو کے ساتھ میری سیٹ بھی خالی ہوجائے گی۔ وہاں اب فہد بیٹھ جایا کرے گا۔۔۔ باقی رہا گھر۔۔۔ تو یہ تمہارا گھر ہے بھائی! میں تو نا سمجھ تھی' یونہی سینہ زوری کرتی تھی۔ تم اس گھر کو جس طرح چاہو سجاؤ اور بناؤ۔ یہاں تم نے رہنا ہے۔۔۔ میں نے نہیں رہنا۔"

واصف نے اس کا سر سینے سے بھینچ لیا "نہ شازی! ایسی باتیں نہ کر' میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ مجھے معاف کردے' ہم دونوں کو معاف کردے۔ تو جانتی ہے یہ سب کچھ مذاق مذاق میں ہوتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے بھائی! یہ سب مذاق تھا۔۔۔ لیکن اس مذاق میں بھی تو آخر ہار میری ہی ہوئی تھی۔ میں تو ہمیشہ سے ہاری ہوئی تھی بھائی! بس مجھے پتا نہیں تھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

واصف بے قراری سے اس کا سر سہلانے لگا "نہ میری بہن' نہ رو۔ چپ کر۔"

وہ روتی چلی گئی "بھائی' مجھے تمہاری جدائی رُلا رہی ہے۔ میں نے کیا قصور کیا تھا؟ کیوں اتنی جلدی دیس نکالا دے رہے ہو مجھے؟"

اتنے میں فہد بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے شازیہ کا ہاتھ تھام لیا اور ہاتھ کی پشت پر آنکھیں رکھ کر آنسو بہانے لگا۔

اگلے پندرہ بیس روز میں ایک لمبا سفر طے ہوگیا۔ شازیہ کی بات پکی ہوئی پھر اس کا نکاح ہوگیا۔ نکاح کے ایک ہفتے بعد رخصتی تھی لیکن رخصتی سے پہلے شازیہ کے دولھا کو فرم والوں نے فوری طور پر کویت بلالیا۔ ایک بار کویت جاکر فوراً واپس آنا دولھا میاں کے لیے خاصا مشکل تھا۔ لہٰذا طے ہوا کہ رخصتی براہِ راست کویت میں ہوگی۔۔۔ شازیہ کو اپنے سسر کے ساتھ کویت جانا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر وہ اداس شام آپہنچی جو اَب تک واصف کے دل و دماغ پر نقش تھی۔ کتنے عمر رسیدہ نظر آرہے تھے ابو اس دن۔۔۔ وہ ایسی ہی سرد اور ابر آلود شام تھی۔۔۔ ہاں ایسی شاموں میں گھر سے نکلنا بڑا مشکل لگتا ہے اور سفر ایک سزا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی ہی ابر آلود شام میں شازیہ کو یہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ ائرپورٹ روانہ ہونے سے پہلے وہ اجنبیوں کی طرح کمروں میں گھومتی رہی تھی۔ ایک ایک چیز کو دیکھتی رہی تھی۔ در و دیوار پر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے چلی گئی تھی۔ جیسے کوئی بھرے پرے میلے میں سے کپڑے جھاڑ کر نکل جاتا ہے۔ اس وقت شازیہ کا پسندیدہ مصرع واصف کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ کس تمنا سے تم کو چاہا تھا۔۔۔ کس محبت سے ہار مانی ہے

اس شام بابل کے گھر میں شہ زوری کا زور ٹوٹ گیا۔ وہ لاچار اور مجبور ہوگئی' کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا۔

واصف بیٹھا ماضی کو کھنگالتا رہا۔ ہاں وہ سرما کی ایسی ہی ابر آلود اداس شام تھی۔ ایسی شامیں لمبے سفر کے لیے بڑی نامناسب ہوتی ہیں۔

لاہور میں ایک صاف ستھری فیشن ایبل آبادی کے پچھواڑے گندا نالا تھا۔ گندے نالے کے دوسرے کنارے پر وہ ایک وسیع و عریض جھونپڑ بستی تھی۔ یہاں کے مکین چھوٹے موٹے کام کرتے تھے' کچھ ردی کاغذ اکٹھے کرتے تھے' کچھ کباڑیئے تھے' کئی ایک نے سڑکوں پر پتھر ڈالنے کی مزدوری شروع کر رکھی تھی۔ بستی کی گندی گلیوں میں ہر وقت ننگ دھڑنگ بچے گھومتے رہتے تھے' آوارہ کتے بھونکتے رہتے تھے اور جھونپڑوں سے باہر بیٹھی عورتیں آپس میں چخ چخ کرتی رہتی تھیں۔ عبدل اس بستی کا مکھیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ بستی کے کچے پکے مکان میں رہتا تھا' اس نے چار پانچ گدھا ریڑھیاں بنا رکھی تھیں اور انہیں دیہاڑی پر چلواتا تھا۔ عبدل کا کچا پکا مکان بستی کے جھونپڑوں میں خاصا نمایاں نظر آتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ جھونپڑ بستی کا وائٹ ہاؤس تھا تو غلط نہ ہوگا۔

ایک روز عبدل بستی کے حجام دینوں سائیں کے پاس بیٹھا داڑھی بنوا رہا تھا کہ آئینے میں ایک منظر دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ آئینے کا زاویہ ایسا تھا کہ وہ بہ آسانی گلی میں دیکھ سکتا تھا۔ گلی میں پانچ چھ نوجوان لڑکے تاش کھیل رہے تھے۔ انہوں نے زمین پر ہی دو بوریے بچھا رکھے تھے اور ان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ یہ بستی ہی کے نوجوان تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کی صورت دیکھ کر عبدل ٹھٹکا تھا.... جونہی شیو مکمل ہوئی' عبدل نے جلدی جلدی ٹھوڑی سے صابن صاف کیا اور باہر گلی میں آگیا۔

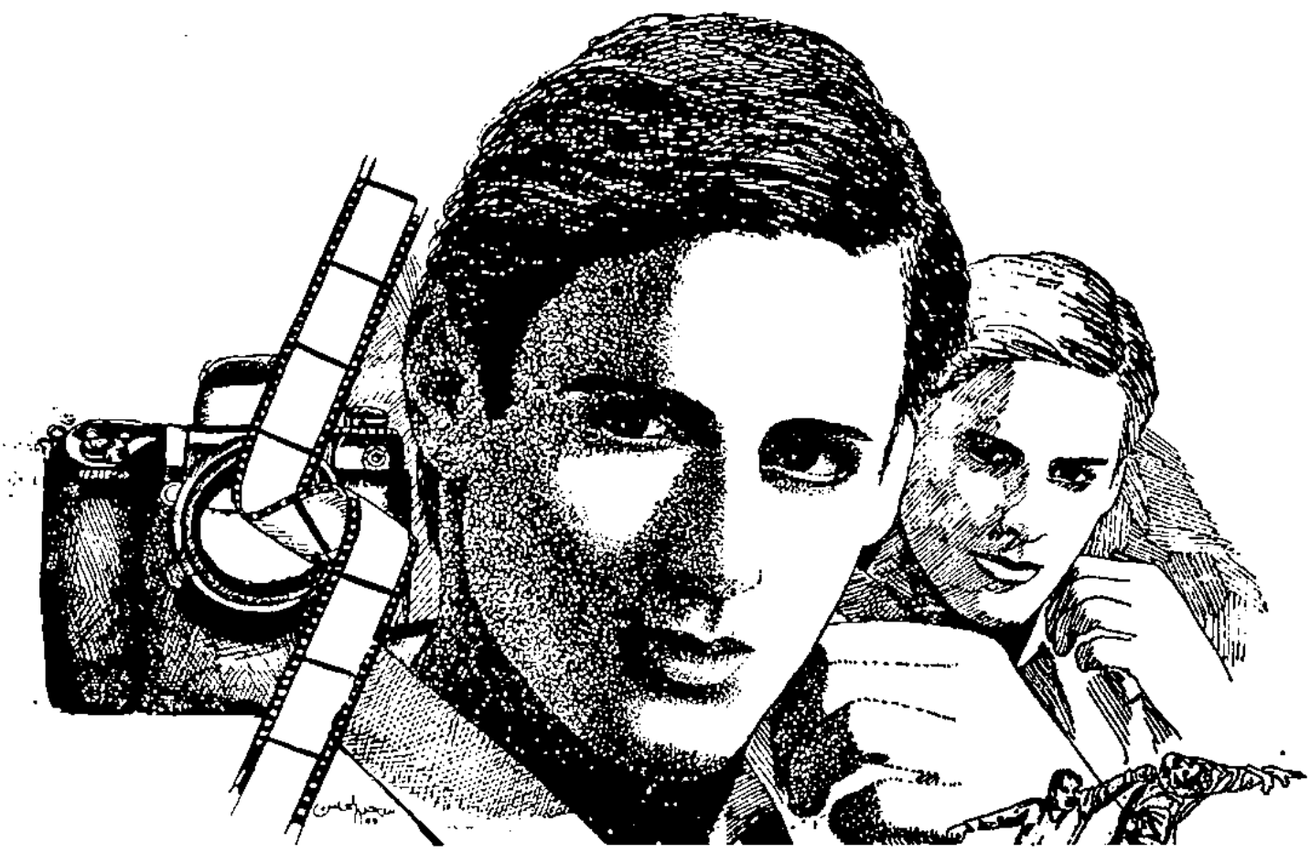
نوجوانوں نے جب مکھیا کو دیکھا تو فوراً کھڑے ہو گئے اور اسے بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ عبدل ان کے پاس ہی بوریے پر بیٹھ گیا۔ اس نے لڑکوں کو کھیل جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ لڑکے پھر سے کھیلنے لگے۔ عبدل کی نگاہ مسلسل اس نوجوان کا طواف کر رہی تھی جسے دیکھ کر وہ ایک دم بے قرار ہو کر اٹھا تھا۔ نوجوان کی عمر بیس پچیس سال کے درمیان تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی میلی کچیلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی' گلے میں تعویذ تھا' سر پر ایک رومال پنکے

اپنے معمولی فائدے کی خاطر دوسروں کو بڑا نقصان پہنچانے والوں کے لیے بطور خاص

طاہر جاوید مغل

ہیرو

فلم نگری کے آسمانِ عروج پر چمکنے والے ایک روشن ستارے کے ٹوٹنے کا احوال۔ خیرہ کن چمک کے حصول کی خاطر چند موقع پرستوں نے اُسے ابدی اندھیروں میں دھکیل دیا... مگر وہ چمک ہر چند کہ تھی مگر نہیں تھی۔



کی طرح بندھا ہوا تھا۔ نوجوان قبول صورت تھا لیکن بہت خستہ حلیے میں تھا۔ وہ کھیل میں اس قدر مگن تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ بستی کا کھیا اتنی محویت سے اسے دیکھ رہا ہے۔

عبدل کی حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان کی شکل و شباہت بہت حد تک ایک معروف فلمی اداکار سے ملتی تھی۔ اس کے چہرے کے ایک دو رخ تو ایسے تھے جن سے وہ ہو بہو فلمی اداکار قیصر کی طرح لگتا تھا۔ اگر اس کے بال ذرا سیدھے ہوتے' مونچھیں صاف ہوتیں اور دائیں کان کے قریب زخم کا نشان نہ ہوتا تو وہ تقریباً قیصر ہی کی طرح دکھائی دینے لگتا۔

عبدل زیادہ فلمیں نہیں دیکھتا تھا' نہ ہی اسے ایکٹروں ایکٹرسوں میں بہت دلچسپی تھی' سنیما تو وہ شاید ایک سال سے نہیں گیا تھا' بس کبھی کبھار بستی میں ہی وڈیو پر کوئی اچھی فلم لگتی تھی تو دیکھ لیتا تھا۔ یہ وڈیو عام طور پر دینوں حجام کی دکان کے پچھواڑے ملنگی کے چائے خانے پر لگایا جاتا تھا اور ملنگی عام فلم بینوں سے باقاعدہ ٹکٹ وصول کرتا تھا۔

تاش کھیلنے والوں میں عبدل کا سب سے چھوٹا بھائی راجو بھی شامل تھا۔ عبدل نے راجو سے مخاطب ہو کر نوجوان کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "یہ کون ہے؟"

راجو نے کھیل سے ہاتھ روک لیا اور بولا "اس کا نام سلطان ہے بھائیا جی! گوجرانوالہ سے آیا ہے محنت مزدوری کے لیے۔ لکشمی کے ایک سنیما میں گیٹ کیپری کا کام ملنے کی امید ہے۔ کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس کے پاس.... فٹ پاتھ پر سوتا تھا۔ میں نے کہا جب تک انتظام نہیں ہوتا میرے جھونپڑے میں رہ لو۔"

"کیا نام بتایا ہے تم نے اس کا؟"

"سلطان جی.... ویسے ہم سب اسے ہیرو کہنے لگے ہیں۔ اس کی شکل ہیرو قیصر سے بہت ملتی ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا؟"

عبدل نے ایک بار پھر غور سے نوجوان کا معائنہ کیا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں بھی کہہ رہا تھا کہ شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔"

ایک نوجوان بولا "بس ناک تھوڑی سی موٹی ہے بھائیا جی.... ریگ مال سے ناک رگڑ کر پتلی کردی جائے اور کان کھینچ کر تھوڑے سے بڑے کردیے جائیں تو بالکل ہی قیصر شاہ نظر آنے لگے۔"

راجو نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا "اوئے ہیرو! ذرا بھائیا جی کو ہنس کر تو دکھا۔"

نوجوان بے ساختہ مسکرا دیا۔ راجو بولا "دیکھو بھائیا جی! ہنستا بھی بالکل قیصر شاہ کی طرح ہے۔"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر عبدل اٹھ کر گھر آگیا۔ اس کا ذہن بار بار قیصر شاہ کے ہم شکل نوجوان کی طرف جا رہا تھا۔ عبدل جانتا تھا کہ ہو بہو ایک جیسی شکلیں تو فلموں ڈراموں میں ہی ہوتی ہیں' لیکن ملتی جلتی شکلیں عام زندگی میں بھی نظر آتی رہتی ہیں' کبھی کبھی ایسی شکل بھی نظر آجاتی ہے جو کسی دوسری شکل کے بہت قریب ہوتی ہے۔ سلطان نامی اس نوجوان کا معاملہ بھی کچھ اس طرح کا تھا۔ شکل کے علاوہ قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی وہ اس فلمی اداکار کے بہت قریب نظر آتا تھا۔ عبدل کا موقع شناس ذہن تیزی سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ عبدل کو معلوم تھا کہ اگر کسی شخص کی شکل و صورت کسی مشہور و معروف آدمی سے مل جائے تو وہ اپنے لیے کئی طرح کے فائدے حاصل کرسکتا ہے' کم از کم اتنا تو ضرور ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے لیے اپنی قابلیت کے مطابق کوئی اچھی ملازمت حاصل کرلے۔ عبدل یہ بھی جانتا تھا کہ فلموں میں مشہور اداکاروں کی شکل و صورت اور قد کاٹھ سے ملتے جلتے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات خطرناک مناظر کی شوٹنگ کے لیے اصل اداکاروں کے بجائے ان لوگوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بہت اہمیت ہوجاتی ہے۔

عبدل اکثر اپنے کام کاج کے سلسلے میں اسٹوڈیوز کی طرف جاتا رہتا تھا۔ اسٹوڈیوز میں کام کرنے والے چند ملازمین کے ساتھ اس کی علیک سلیک بھی ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیوں نہ اسٹوڈیو کے کسی ملازم سے سلطان نامی اس نوجوان کے بارے میں بات کرے۔ عین ممکن تھا کہ سلطان کو کوئی بہت اچھا کام مل جاتا۔ ایسا کام جس میں پیسہ بھی ہوتا اور سیر سپاٹا بھی۔ اپنی بول چال سے سلطان.... عبدل کو بالکل سیدھا سادہ اور پینڈو نظر آیا تھا۔ ویسے بھی وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں پردیسی تھا۔ عبدل کو امید تھی کہ وہ اس کا سرپرست بن کر اس سے بہت فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ عبدل کو یاد آیا کہ جب مشہور فلم اسٹار وحید مراد کا انتقال ہوا تھا تو اس کا ہم شکل ڈھونڈنے کے لیے فلم سازوں نے کیا کیا کوششیں نہیں کی تھیں۔ اخباروں میں اشتہار دیے گئے تھے' دور دور تک بندے دوڑائے گئے تھے۔ نامکمل فلموں کی وجہ سے فلم سازوں کو لاکھوں کروڑوں کا نقصان برداشت کرنا پڑے تو وہ اس نقصان سے بچنے کے لیے دس بیس ہزار بخوشی خرچ کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں۔ اس موقع پر عبدل کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ قیصر شاہ نامی وہ ہیرو اللہ کو پیارا ہوچکا ہو' اور اگر نہ ہوا ہو تو آج کل میں ہوجائے۔

رات کو وہ اپنے چھوٹے بھائی راجو کے جھونپڑے میں گیا' وہاں اس نے دیر تک سلطان سے باتیں کیں۔ اس کا یہ اندازہ سو فی صد درست ثابت ہوا کہ سلطان کو ابھی ٹھیک سے شہر کی ہوا نہیں لگی۔ اس کی باتوں میں بھولپن تھا' وہ بستی کے عام لوگوں کی طرح اسے "بھائیا جی" کہہ کر مخاطب کررہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔ "بھائیا جی! میرے لیے کوئی پکی نوکری ڈھونڈ دو۔ اگلے سے اگلے چاند کو میری دو بہنوں کی شادی ہے' مجھے پیسوں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ میں محنت مزدوری کا کوئی کام بھی کرنے کو تیار

ہوں۔"

عبدل نے اس کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اسے اطمینان دلایا کہ وہ جلد ہی اس کے لیے کوئی اچھا کام ڈھونڈ نکالے گا۔

اسٹوڈیو میں آنے جانے والے جن لوگوں کے ساتھ عبدل کی علیک سلیک تھی ان میں سے ایک فائٹر اگزینڈر بھی تھا۔ اگزینڈر ایک کالے بھجنگ لیکن چست چالاک شخص کا نام تھا' عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی' وہ جوڈو کراٹے جانتا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد یا بدیر اسے فلموں میں فائٹ انسٹرکٹر کی حیثیت سے کام ملنے لگے گا۔ فی الوقت وہ چھوٹے موٹے گرداروں پر قناعت کر رہا تھا۔

اگلے روز عبدل نے اگزینڈر سے ملاقات کی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عبدل نے اگزینڈر کو سلطان کے حوالے سے سب کچھ بتا دیا۔ اگزینڈر کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ سلطان کو دیکھے' دونوں جھونپڑ بستی پہنچے' یہاں اگزینڈر نے سلطان کو بستی کے دیگر آوارہ گرد نوجوانوں کے ساتھ اخروٹ کھیلتے دیکھا۔ دور سے سلطان کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد ہی اگزینڈر معترف ہوگیا کہ یہ لڑکا شکل و صورت اور قد کاٹھ کے اعتبار سے قیصر شاہ کے ساتھ کافی مشابہت رکھتا ہے۔

اگزینڈر عبدل کے ساتھ اس کے "وائٹ ہاؤس" میں آ بیٹھا۔ دونوں دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ آخر اگزینڈر کے زرخیز ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آگیا۔

وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا "یار! ایک کام ہو سکتا ہے۔"

"کیا؟" عبدل نے پوچھا۔

اگزینڈر نے سگریٹ کا ایک طویل ترین کش لیا اور پُرسوچ لہجے میں بولا "آج کل فلم "میدان" کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ ایک ہوٹل کا سیٹ لگا ہوا ہے' اس میں پندرہ بیس منٹ کی زبردست فائٹ ہے۔ تین چار دن سے پہلے اس سیٹ کی شوٹنگ مکمل نہیں ہوگی۔ قیصر صاحب کی یہ ساری فائٹ میرے ساتھ ہونی ہے' بڑی دھواں دھار قسم کی لڑائی ہے' تمہیں پتا ہی ہے قیصر صاحب کا جسم ذرا موٹا ہوگیا ہے' ویسے بھی وہ فائٹ سین کرانے میں کوئی اتنے زیادہ ماہر نہیں ہیں۔ آج کل ہر شاٹ مجھ سے پوچھ پوچھ کر کر رہے ہیں۔ میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔" اگزینڈر نے آخری فقرہ آنکھ میچ کر کہا۔

"کیا بات؟" عبدل کے چہرے پر لالچ آمیز تجسس نظر آنے لگا۔

اگزینڈر نے عبدل کے کان سے منہ لگایا اور پُرجوش انداز میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ان کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ پروگرام یہ بنا تھا کہ سلطان کے لیے کم از کم دس پندرہ روز کے لیے ایک منافع بخش کام کا انتظام کر دیا جائے۔ "میدان" کی شوٹنگ بالکل آخری مراحل میں تھی۔ شیڈول کے مطابق فروری کے پہلے ہفتے میں اس کا کیمرا کلوز ہو جانا تھا اور عید الاضحیٰ کو بہر صورت فلم کو نمائش کے لیے پیش ہونا تھا۔ اگر اس موقع پر فلم کے ہیرو کو "فٹ نس" کا مسئلہ لاحق ہو جاتا اور وہ شوٹنگ کے قابل نہ رہتا تو فلم ساز اور ہدایت کار کو روزِ روشن میں تارے نظر آجاتے۔ فلم کے رہے سہے شاٹ عکس بند کرنے کے لیے ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اگر ایسے موقع پر اگزینڈر اور عبدل "میدان" کے فلم ساز اور ہدایت کار کو بتاتے کہ وہ قیصر شاہ سے بالکل مشابہت رکھنے والا ایک نوجوان مہیا کر سکتے ہیں تو یقیناً ان کی بات بے پناہ توجہ سے سنی جاتی۔ ایسے میں اگزینڈر فلم ساز سے معاملہ طے کر سکتا تھا۔ قیصر شاہ کا ہم شکل مہیا کرنے کے عوض وہ اگر بیس پچیس ہزار روپیہ بھی مانگ لیتا تو فلم ساز فوراً تیار ہو جاتا۔ سودے بازی کر کے ممکن تھا کہ وہ تیس چالیس ہزار روپے تک اینٹھ لیتے۔ "میدان" کی جو شوٹنگ باقی تھی وہ کچھ اسی نوعیت کی تھی کہ اس میں "ڈپلی کیٹ" کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ زیادہ تر لڑائی کے مناظر تھے۔ لانگ شاٹس لے کر لڑائی میں قیصر شاہ کی عدم موجودگی کو چھپایا جا سکتا تھا۔

دونوں نے کافی دیر اس معاملے پر سوچ بچار کی تھی اور اپنی منصوبہ بندی سے کافی حد تک مطمئن ہوگئے تھے۔ پروگرام یہ بنا تھا کہ کل شوٹنگ کے دوران میں جب اگزینڈر اور قیصر شاہ کے درمیان فائٹنگ کے مناظر فلمائے جا رہے ہوں گے' اگزینڈر موقع دیکھ کر قیصر شاہ کو ایسی ضرب لگائے گا کہ وہ تین ہفتوں کے لیے بستر سے اٹھ نہ سکے گا۔ اگزینڈر کو یقین تھا کہ اس سوچی سمجھی ضرب کو "اتفاقیہ" ثابت کرنے میں وہ کامیاب رہے گا اور پلاننگ کا پہلا مرحلہ طے ہو جائے گا۔

واپس جانے سے پہلے اگزینڈر ایک بار پھر سلطان نامی اس لڑکے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے کہنے پر عبدل نے ایک شخص کو اپنے بھائی راجو کی طرف بھیجا اور اسے کہا کہ وہ "ہیرو" کو لے کر آئے۔ دس پندرہ منٹ بعد راجو اکیلا ہی چلا آیا۔

"وہ ہیرو کدھر ہے؟" عبدل نے پوچھا۔

"بھائی جی! وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا گیا ہے۔" راجو نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"گوجرانوالہ گیا ہے۔ کہتا تھا پرسوں آجاؤں گا' گھر والوں سے مل کر۔"

عبدل اور اگزینڈر کے چہرے پر ایک ساتھ تشویش پھیل گئی۔ چند لمحے توقف کر کے عبدل نے پوچھا "تمہیں یقین ہے کہ وہ پرسوں تک آجائے گا۔"

"ضرور آجائے گا بھائی جی۔"

"فرض کرو نہ آیا تو؟ کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس۔"

"آہو بھائیا جی! پتا بھی ہے.... گوجرانوالہ کے پاس ہی گاؤں ہے' پورا ایڈریس لکھا ہوا ہے میرے پاس۔ لیکن.... کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں خاص ہی سمجھو۔" عبدل نے کہا "جو کچھ ہم نے سوچا ہے پورا ہوگیا تو اس منڈے کی قسمت کھل جائے گی۔ ساتھ میں ہمارا بھی فائدہ ہوجائے گا۔"

راجو تفصیل جاننا چاہتا تھا لیکن عبدل نے اسے ٹال دیا۔

○☆○

عبدل بڑی بے چینی سے الگزینڈر کا انتظار کررہا تھا۔ پروگرام کے مطابق الگزینڈر کو شام کے فوراً بعد بھونپڑ بستی میں آنا تھا اور عبدل کو تازہ ترین صورتِ حال بتانا تھی۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے اور اس کالے بھجنگ فائٹر کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے انتظار میں عبدل نے مسلسل حقہ گڑگڑاتے ہوئے پورا کمرا دھوئیں سے بھر دیا تھا' نتیجے میں اس کی بیوی اپنے بچوں سمیت کھانستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ عبدل کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ گھر سے نکلا اور شاہ نور اسٹوڈیوز کی طرف روانہ ہوگیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ فلم نگری پہنچ گیا۔ یہاں رات اور دن برابر تھے۔ اسٹوڈیوز سے باہر وسیع و عریض بازار میں رات کے دس بجے بھی دوپہر کی طرح چہل پہل تھی۔ ریسٹورنٹ کھلے تھے' چائے خانوں میں ٹی وی اور وڈیو چل رہے تھے۔ وہ ایک ایسے چائے خانے میں جا بیٹھا جہاں اکثر الگزینڈر سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ اس روز الگزینڈر تو نہیں ملا ہاں اس کے قریبی دوست منا سے ملاقات ہوگئی۔

عبدل نے چھوٹتے ہی منا سے پوچھا "الگزینڈر کہاں ہے؟"

منا نے حیرت سے کہا "تجھے نہیں پتا؟"

"کیوں کیا ہوا؟" عبدل بری طرح ٹھٹکا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

منے نے چرس بھرے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ تو آج دوپہر بڑا پھڈا ہوگیا ہے۔ لڑائی میں اس کے ہاتھوں قیصر صاحب کو سخت چوٹ لگ گئی ہے۔ وہ تو اسپتال میں ہیں۔ سنا ہے آپریشن ہوا ہے ان کا.... الگزینڈر کی جان آفت میں آئی ہوئی ہے۔ قیصر صاحب کے بھائیوں اور منیجر نے اسے مارا پیٹا بھی ہے۔ سنا ہے وہ تو اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن پھر لوگوں نے سمجھایا کہ اس نے جان بوجھ کر تھوڑا کیا ہے' بس قسمت میں چوٹ تھی لگ گئی۔"

"اب الگزینڈر کہاں ہے؟"

"اسپتال میں ہی ہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں گئے ہوئے ہیں۔ قیصر صاحب ابھی تک ہوش میں نہیں ہیں۔ ناف پر الگزینڈر کا گھٹنا لگا تھا۔ پیٹ کے اندر کوئی نالی شالی پھٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کہتے

خدمتِ انسانیت ایک عظیم عبادت ہے
ارشادِ نبوی

آپ پریشان آخر کب تک؟

اگر خدانخواستہ آپ کسی بھی اندرونی بیماری اعصابی کمزوری، تبخیر معدہ یعنی گیس ٹربل شوگر یا دیگر قابلِ غور امراض کی پریشانی میں مبتلا ہیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی گناہ ہے۔ ہمارا بلند معیار۔ بااصول مستند ادارہ آپ کو سستا، آسان، اصولی، تسلی بخش مستقل اور مختصر علاج فراہم کرے گا۔

ہمارا طریقہ علاج

دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس سے بفضلِ تعالیٰ مرض جڑ سے ختم ہوجاتی ہے اور دوبارہ علاج کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

ادویات بذریعہ ڈاک منگوائی جاسکتی ہیں

اندرون و بیرون ملک حضرات اپنے تمام حالات مفصل لکھ کر مشورہ حاصل کرسکتے ہیں۔ صیغہ راز ایک امانت ہوگی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اپنی مرض کو لمبی پرانی یا لاعلاج نہ بنائیں بلکہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ اپنا اصولی، تسلی بخش اور مستقل علاج کروائیں۔ کیونکہ اگر صحت اچھی ہوگی تو تب ہی ساری خوشیاں بھی اچھی لگیں گی۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

منیجر مستند ادارہ النجم الصحت

شریف دواخانہ قائم شدہ ۱۹۴۱ء

پوسٹ بکس ۹ حافظ آباد پوسٹ کوڈ ۵۲۱۱۰ پاکستان

ہیں کہ اگر فوراً آپریشن نہ ہوتا تو جان کو خطرہ تھا۔ بہرحال اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

چائے خانے میں اکثر میزوں پر اسی واقعے کے بارے میں بات ہورہی تھی۔ عبدل اور منا بھی کچھ دیر یہی گفتگو کرتے رہے پھر عبدل بستی واپس آگیا۔

اگلے روز بھی عبدل کی ملاقات اگزینڈر سے نہیں ہوئی۔ وہ سارا دن خیریت سے گزرا تاہم شام کے بعد عبدل کو یہ اڑتی اڑتی سی خبر ملی کہ اسپتال میں ہیرو قیصر شاہ کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں اور اسے کسی دوسرے اسپتال لے جانے کے بارے میں سوچا جارہا ہے۔

صبح کے اخبارات میں بھی ہیرو قیصر شاہ کے حوالے سے خبریں موجود تھیں۔ اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا اور ڈاکٹر اس کا ایک اور آپریشن کرنے کی تیاری کررہے تھے۔ عبدل کو ہرگز امید نہیں تھی کہ یہ واقعہ اس طرح کا رنگ اختیار کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اگزینڈر لڑائی کے دوران میں قیصر شاہ کی ٹانگ وغیرہ پر ضرب لگائے گا اور وہ کچھ روز کے لیے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس دوران میں وہ فلم ساز سے بات طے کرکے گوجرانوالہ کے سلطان کو آگے لے آئیں گے اور مال پانی بنالیں گے۔ لیکن یہ تو لمبا ہی چکر چل گیا تھا۔

.... اگلے دو چار روز میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ ہیرو قیصر شاہ کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپینڈکس کا پرانا مریض تھا اور چوٹ لگنے کے وقت بھی اسے تکلیف موجود تھی، چوٹ لگنے سے اپینڈکس پھٹ گیا تھا اور ایک دو دیگر مسئلے بھی پیدا ہوگئے تھے۔

.... واقعے کے پانچویں روز قیصر شاہ کے دو مزید آپریشن ہوئے، ان آپریشنز کے بعد اس پر مسلسل بے ہوشی طاری ہوگئی اور لوگ اس کی زندگی کے بارے میں مایوسی ظاہر کرنے لگے اور پھر وہ ہوا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ شوٹنگ کے دوران میں چوٹ لگنے کے ٹھیک دو ہفتے بعد جواں سال ہیرو قیصر شاہ اسلام آباد کے ایک اسپتال میں دم توڑ گیا۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہتا ہے، کسی کے چلے جانے سے دنیا کے کام رکتے نہیں۔ ہاں کچھ عرصے کے لیے ان کاموں کی رفتار سست ضرور ہوجاتی ہے۔ سست رفتاری کا یہ دورانیہ کبھی ایک دو سال کا ہوتا ہے، کبھی ایک دو ماہ کا اور کبھی ایک دو دن کا۔ شوبز کی دنیا میں بہت تیزی ہے، یہاں چلا نہیں جاتا بلکہ بھاگا جاتا ہے۔ گرنے والوں کو رک کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ہوتی۔ قیصر شاہ کی موت کے دو تین ہفتے بعد ہی فلم "میدان" کی رہی سہی شوٹنگ کے بارے میں سوچ بچار ہونے لگی۔ ایک روز جھونپڑ بستی میں عبدل ایک جہازی سائز کی چارپائی پر بیٹھا کتوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ اسے اگزینڈر کی صورت نظر آئی۔ اسے دیکھ کر عبدل فوراً محفل سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں عبدل کے گھر پہنچے اور کمرا بند کرکے بیٹھ گئے۔ شوٹنگ والے حادثے کے بعد یہ عبدل اور اگزینڈر کی پہلی "باضابطہ" ملاقات تھی۔ اگزینڈر نے عبدل کو سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ اس نے بتایا کہ وہ قیصر شاہ کو جان سے مارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لڑائی کے دوران میں اس نے قیصر شاہ کی دائیں ران پر گھٹنے کی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہاں قیصر شاہ کو پہلے بھی ایک چوٹ لگی ہوئی تھی، اگزینڈر کو یقین تھا کہ یہاں لگنے والی اس کی "ماہرانہ" چوٹ قیصر شاہ کو ایک دو ہفتوں کے لیے لازماً بستر پر ڈال دے گی، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ٹانگ کے بجائے قیصر شاہ کی ناف نشانہ بن جائے گی اور زوردار ضرب اسے آناً فاناً اسپتال پہنچا دے گی۔

آخر میں اگزینڈر نے کہا "بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب یہ سب کچھ لپیٹا جاچکا ہے، اللہ کرے ہمیشہ ہی لپٹا رہے۔" فقرہ مکمل کرکے اس نے چند لمحے توقف کیا... پھر بولا "اب میں ایک خاص مقصد سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم کچھ نہ کچھ تو سمجھ ہی گئے ہوگے۔"

عبدل نے حقہ گڑگڑا کر کہا "شاید تم اس سلطان نامی لڑکے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"بالکل یہی بات ہے۔ وہ لڑکا کہاں ہے؟"

"وہ خبیث اب تک واپس نہیں آیا، لیکن راجو کے پاس اس کا مکمل پتا موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو میں کل ہی اسے گوجرانوالہ بھیج دیتا ہوں، وہ اسے پکڑ لائے گا۔ ویسے راجو نے پچھلے ہفتے اسے ایک خط بھی لکھ دیا تھا۔"

اگزینڈر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے عبدل! تم اس لڑکے کو بلالو۔ لیکن اب یہ معاملہ بالکل اور ہوگیا ہے۔ سمجھو وہ لڑکا سونے کا انڈا دینے والی مرغی بن گیا ہے۔ قیصر شاہ کی کم از کم گیارہ فلمیں ہیں جو نامکمل پڑی ہیں۔ ان سب کی سب فلموں میں اس لڑکے کی سخت ضرورت پڑے گی۔ فلم سازوں سے جتنے پیسے مانگے جائیں گے وہ دیں گے۔ ان کی تو راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں اور اب بات صرف نامکمل فلموں تک ہی نہیں رہے گی، اب تو اس بات کا بڑا پکا چانس ہے کہ اس لڑکے کا کیریئر بن جائے۔ مجھے نہیں یقین کہ فلم والوں کو قیصر شاہ کا اتنا زبردست ہم شکل کوئی اور مل سکے گا۔ بس اس لڑکے کو تھوڑا سا سکھانے اور چمکانے کی ضرورت ہوگی۔ اگر تم اس لڑکے کو ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوگئے تو سمجھو دھن کی بارش ہوجائے گی۔"

اگزینڈر کی باتیں سن کر عبدل کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ اگزینڈر کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں، بولا۔ "لیکن اب ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اب اس معاملے میں میرا نام بالکل نہیں آئے گا۔ میں تمہاری بات منا سے کرادوں

گا' وہ کیمرامین امانت رضوی کے ساتھ کام کررہا ہے' ہر جگہ اس کی پہنچ ہے۔اب جو کچھ کرنا ہے تم دونوں نے مل کر کرنا ہے۔ میں بیک میں رہوں گا اور تمہیں ہرہات سمجھاتا رہوں گا۔"

عبدل پُرجوش لہجے میں بولا "میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں یار.... قیصر شاہ کی موت کے بعد اب تمہارا پیچھے رہنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ کسی کو شک بھی نہیں گزرنا چاہیے۔"

انگزینڈر نے کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم کل سویرے ہی اس لڑکے کی طرف اپنے بھائی کو بھیج دو۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

عبدل نے اگلے روز اپنے بھائی راجو کو صبح سویرے گوجرانوالہ بھیج دیا اور اسے کہا کہ وہ لڑکے کو ہر صورت اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اس نے راجو کو سلطان کے لیے پانچ سو روپے بھی دیے۔

سارا دن عبدل نے بڑی بے چینی سے راجو اور سلطان کا انتظار کیا لیکن شام کو اسے کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی۔ راجو خالی ہاتھ واپس آگیا تھا۔ اس نے عبدل کی مایوسی میں "گراں قدر" اضافہ کرنے کے لیے اسے یہ اطلاع دی کہ سلطان نے جس گاؤں کا پتا دیا تھا وہ گوجرانوالہ سے چار پانچ میل کے بجائے پندرہ بیس میل دور ہے اور وہاں سلطان ولد خدا بخش نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔

شام کو انگزینڈر اور منا آئے تو انہیں بھی عبدل نے یہ مایوس کن خبر سنائی۔ تینوں دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ انہیں بالکل یہی محسوس ہورہا تھا جیسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ان کے دڑبے سے نکل کر کہیں روپوش ہوگئی ہے۔ اگلے روز وہ تینوں از خود سلطان نامی اس لڑکے کی تلاش میں نکلے۔ پورے اڑتالیس گھنٹے تک انہوں نے گوجرانوالہ اور گردو نواح میں خاک چھانی لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ وہ تھک ہار کر واپس آگئے۔

اسی طرح چار پانچ روز مزید گزر گئے۔ عبدل اور انگزینڈر کے علاوہ راجو کو بھی ہر گھڑی امید رہی کہ سلطان اچانک کسی طرف سے بستی میں وارد ہوجائے گا۔ اپنے مخصوص لب ولہجے اور اپنی خالص دیہاتی آواز میں انہیں بتائے گا کہ وہ اتنے دن تک لاہور واپس کیوں نہیں آسکا۔ لیکن یہ امید بر نہیں آئی۔ عبدل اور انگزینڈر مایوس ہونے کے باوجود ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے تھے۔ وہ لاہور میں بھی سلطان کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے زیرِ تعمیر علاقوں میں کام کرتے ہوئے مزدوروں میں ڈھونڈا تھا' بستا چارپائی والے ہوٹلوں میں ڈھونڈا تھا' سنیما گھروں کے گیٹ کیپروں میں ڈھونڈا تھا اور ہر اس جگہ تلاش کیا تھا جہاں اس کے ملنے کی معمولی سے معمولی امید بھی ہوسکتی تھی۔ پتا نہیں وہ کس طرف سے آیا تھا اور کدھر چلا گیا تھا۔ سوچ سوچ کر عبدل کا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔

آخر ایک روز اسے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا۔ وہ بستی کے حجام دینوں کی دکان پر بیٹھا شیو بنوا رہا تھا۔ آئینے کا رخ اس طرح تھا کہ وہ لکڑی کے بینچ پر پڑا ہوا اخبار دیکھ سکتا تھا۔ اخبار میں اسے ہیرو قیصر شاہ کی بڑی سی رنگین تصویر نظر آئی۔ شیو سے فارغ ہو کر اس نے اخبار اٹھالیا اور تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے دینوں سے کہا "یہ کیا لکھا ہے؟"

دینوں اس کے پاس بیٹھ گیا اور غور سے پڑھنے لگا۔ اس کی نظریں اخبار پر تھیں' وہ کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر بولا "بھائیا جی! قیصر شاہ کے بارے میں ہی لکھا ہے۔ وہ بہت محنتی اداکار تھا' بڑی لگن سے کام کرتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اپنا نام بنالیا تھا وغیرہ وغیرہ۔"

"اوئے تو پڑھ کر سنا ناں۔ تجھے اپنی طرف سے تقریر کرنے کو کس نے کہا ہے۔" عبدل نے ڈانٹا۔

دینوں شرمندہ ہو کر مچلی سطور پڑھنے لگا "قیصر شاہ مرحوم بڑا مختلف اداکار تھا۔ دوسرے اداکاروں کی طرح وہ چالو کام نہیں کرتا تھا۔ اس کی خواہش رہتی تھی کہ اسے کم سے کم مگر اچھی فلموں میں کاسٹ کیا جائے۔ وہ کردار میں ڈوب جاتا تھا' اسے اپنے اوپر طاری کرلیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کے کام کو ہر ذوق کے لوگ زبردست خراجِ تحسین پیش کررہے ہیں۔ پچھلے دنوں قیصر کو انڈسٹری کے تجربہ کار ترین ہدایت کار خواجہ شیراز نے اپنی فلم "غریب" میں کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم میں قیصر کو اپنا رول بہت پسند تھا۔ قیصر کو توقع تھی کہ یہ رول سپرہٹ ہوگا۔ ہدایت کار خواجہ شیراز نے از خود یہ بات بتائی ہے کہ اپنے رول کو بہتر طور پر ادا کرنے کے لیے قیصر سخت محنت کررہا تھا۔ اس نے گلزار کالونی کے علاقے میں ایک جھونپڑ بستی ڈھونڈ نکالی تھی اور ایک آوارہ نوجوان کے گیٹ اپ میں کئی دنوں سے وہاں جارہا تھا۔ وہ ان لوگوں کا رہن سہن' بول چال' طور اطوار سب کچھ ذہن میں اتارنے کا خواہش مند تھا۔ اگر زندگی قیصر کو مہلت دیتی تو "غریب" کا ٹائٹل رول یقیناً اس کے کیریئر کا یادگار رول ہوتا۔"

دینوں پڑھ رہا تھا' عبدل سن رہا تھا اور گردو پیش اس کی نگاہوں میں گھومتے چلے جارہے تھے۔ پتا نہیں وہ کب وہاں سے اٹھا اور کب ڈولتے قدموں کے ساتھ بستی کی گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے انگزینڈر ملا۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی۔ آج بھی انگزینڈر نے وہی سوال کیا جو وہ تقریباً روزانہ عبدل سے کرتا تھا "کچھ پتا چلا سلطان کا؟" انگزینڈر نے پوچھا۔

عبدل نے مایوسی سے سر ہلایا "نہیں انگزینڈر! سلطان اب نہیں ملے گا۔ یوں سمجھو کہ وہ بھی قیصر شاہ کے ساتھ ہی ہمارے ہاتھوں مرگیا ہے۔"

انگزینڈر حیرت سے عبدل کی طرف دیکھنے لگا۔

اسد باغ جناح کے گنگا رام والے گیٹ کی طرف سے باغ میں داخل ہوا۔ اپنی نئی ٹویوٹا کار اس نے پارکنگ میں کھڑی کی اور چابی گھماتا ہوا سرسبز روش پر ٹہلنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ گھونگھریالے بالوں والے پر پڑی۔ وہ ایک پتھریلے بینچ پر دراز تھا۔ اس کا چہرہ بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ سو رہا ہے۔

گھونگھریالے بالوں والا اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں اسد نے تین چار بار اس نوجوان کو یہاں باغ میں دیکھا تھا۔ کبھی گھاس پر خاموش بیٹھے ہوئے۔ کبھی درختوں کے نیچے یوں ٹہلتے ہوئے کہ اس کی نگاہ کہیں دور بہت دور دیکھ رہی ہوتی تھی اور کبھی کسی گوشے میں نیم دراز۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک پرانا گھاؤ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی تیز دھار آلے کا زخم ہے۔ یہ گھاؤ نما زخم اس کی پیشانی سے شروع ہو کر اس کے رخسار کو بدنما بناتا ہوا اس کی ٹھوڑی تک چلا گیا تھا۔ پیشانی پر یہ زخم زیادہ گہرا تھا جس کی وجہ سے پیشانی پچکی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ اسد نے اس نوجوان کے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید وہ یہاں نوکری ڈھونڈنے کے لیے آیا تھا' یا پھر اپنے کسی بچھڑے ہوئے کی تلاش تھی' یا پھر یونہی راستہ بھٹکا ہوا تھا۔ اس کی غم زدہ آنکھوں میں دیکھ کر پہلا خیال ذہن میں یہی آتا تھا کہ وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنی متجسس طبع سے مجبور ہو کر ایک دو بار اسد کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن پھر وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔

آج اس نے گھونگھریالے بالوں والے کو یوں لیٹے ہوئے پایا تو متجسس انداز میں اس کے قریب چلا گیا "ہیلو مسٹر

صرف ایک مسکراہٹ آگئیں اور پُرمحبت لمحے کی تلاش میں سرگرداں نوجوان کی داستان

بچپن کی انسیت بہت جلد محبت میں بدل جاتی ہے مگر اُس وقت اس کے اظہار کا مرحلہ بہت دشوار ہوتا ہے جسے اگر سر نہ کیا جائے تو آرزوئیں اور تمنائیں تشنہ کام رہ جاتی ہیں۔ اُس تشنہ کامی میں اگر احساسِ کم مائیگی بھی شامل ہو تو زندگی سراپا زہر بن جاتی ہے۔

طاہر جاوید مغل



!وقت کیا ہوا ہے؟" اسد نے یونہی اسے مخاطب کرنے کے لیے دریافت کیا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ اسد نے ذرا اور قریب جاکر قدرے بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا اس مرتبہ بھی جواب ندارد... حالانکہ اسد محسوس کرچکا تھا کہ وہ شخص سو نہیں رہا۔ اسد نے تیسری مرتبہ اسے مخاطب کیا تو اس نے جیسے مجبوراً آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔ اس کی سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں کو اپنے بازو کی رگڑ سے پونچھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے خفا نظر سے اسد کو دیکھا' پھر ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالی اور بولا "سوا پانچ۔"

"کیا بات ہے بھئی' کوئی پریشانی ہے؟" اسد اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نن... نہیں... پپ... پریشانی تو کوئی نہیں۔" اس نے کہا۔

اسد کو اندازہ ہوا کہ وہ ہکلاتا ہے۔

"میں کئی دن سے تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ تم سے بات کروں۔"

"مم... مجھ سے؟" اس کی ڈری ہوئی آنکھوں میں حیرت بھی نظر آنے لگی۔

"کیوں؟ کیا تم سے بات نہیں کی جاسکتی؟" اسد نے مسکرا کر پوچھا۔

"مم... میرا مطلب ہے۔ مم... مجھ سے آ... آ... آپ کو بھلا کیا۔ کک... کام ہوسکتا ہے؟"

"بس میرا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو۔ تم مجھے بڑے دکھی لگے ہو' اس کے علاوہ یہاں لاہور میں اجنبی بھی ہو اور شاید مصیبت زدہ بھی۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے جی۔" وہ ہر لفظ پر ہکلاتے ہوئے بولا۔

لیکن جب وہ یہ فقرہ بول رہا تھا اس کی آنکھوں میں تازہ آنسوؤں نے امڈنے کی کوشش کی تھی' جنہیں اس نے پسینہ پونچھنے کے بہانے اپنی میلی آستین میں جذب کرلیا۔

اسد نے اسے سگریٹ پیش کیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔ اسد بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں کے دوران میں اسد کو اتنا پتا تو چل ہی گیا کہ اس نوجوان کا نام شاہ زیب ہے اور وہ راولپنڈی سے یہاں آیا ہے۔ وہ بی اے تک تعلیم حاصل کرچکا تھا اور کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا' اس کا باپ راولپنڈی میں فیض آباد کے علاقے میں پودوں کی نرسری چلاتا تھا۔ شاہ زیب نے ہکلاتے ہوئے بتایا کہ وہ یہاں لاہور کی سیر کرنے کے لیے آیا ہے' تاہم اسد جانتا تھا کہ وہ اصل بات چھپا رہا ہے... وہ اسے کہہ کر سن اپنے گھر لے آیا۔

اسد کا گھر باغ جناح کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ پندرہ مرلے کی خوب صورت کوٹھی تھی۔ اسد یہاں اپنی بہت ضعیف والدہ اور دو ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشن کمپنی میں بطور پی آر او کام کرتا تھا۔ معقول تنخواہ تھی' آسانی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

اسد نے شاہ زیب کو پہلے نہانے پر مجبور کیا' پھر وارڈ روب میں سے اسے ایک مناسب سائز کی پتلون قمیص پہننے کو دی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ دونوں نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ والدہ تو سوئی ہوئی تھیں۔ گھر کے نوکر مہمان کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر شروع میں تو خوف زدہ ہوئے لیکن بتدریج ان کا خوف کم ہوگیا۔ شاہ زیب قطعی طور پر بے ضرر اور سیدھا سادہ بندہ نظر آتا تھا۔ کھانا کھانے اور اچھی سی چائے پینے کے بعد دونوں اسٹڈی میں آگئے اور باتیں کرنے لگے۔

گفتگو کے آغاز میں تو شاہ زیب کھچا کھچا رہا مگر پھر اسد کے مہربان رویے نے اسے متاثر کیا اور اس نے اسد کو بتایا کہ وہ یہاں ایک لڑکی کی تلاش میں آیا ہے۔ اسے کسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکی لاہور میں ہے اور اسی علاقے میں کہیں رہتی ہے۔

اسد نے شاہ زیب سے کہا "کیا میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

شاہ زیب نے بے خیالی میں اپنی پیشانی کے زخم کو چھوا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا "پپ... پتا نہیں... کک... کیوں... آ آ آپ بڑے اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں۔ جج... جج... جی چاہتا ہے کہ آ آ آپ سے... کک... کک... کچھ نہ چھپاؤں۔"

اسد نے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوگی شاہ زیب! اگر میں تمہارے کسی کام آسکا تو۔"

ہمدردی پاکر شاہ زیب کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک گئے۔ اس نے اپنے انداز میں ہکلا ہکلا کر غم زدہ لہجے میں اسد کو جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

"ہم شروع سے فیض آباد میں رہتے ہیں۔ میرے والد پہلے کوٹھیاں بنانے کا کام کرتے تھے پھر انہوں نے ایک نسبتاً آسان کام اپنالیا اور پودوں کی ایک نرسری بنالی جس سے معقول آمدنی ہونے لگی۔ ہم تین بہن بھائی تھے' میں سب سے چھوٹا تھا اور سب کا لاڈلا تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی شاہین رہتی تھی۔ ہم بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ لڑکپن

کی حدود میں قدم رکھا تو ہمارے درمیان ایک اور طرح کا لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ جب تک ہم دونوں دن میں ایک مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے ہمیں بے قراری رہتی۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں اور کان آواز سننے کو ترستے رہتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ کیفیت شدید ہونے لگی۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں تنہائی میں شاہین سے کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن کیا کہنا چاہتا ہوں یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی اور اسے بھی معلوم نہیں کہ کیا کہنا چاہتی ہے۔۔۔ پھر ایک روز ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک مجھے شاہین سے بہت دور کردیا۔ ان دنوں میں دسویں میں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس روز اسکول میں موسم سرما کی چھٹیاں ہوئی تھیں' میں بہت خوشی خوشی گھر آرہا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار ویگن نے مجھے ٹکر ماری۔ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹی اور چہرہ شدید زخمی ہوگیا۔ مجھے اسپتال پہنچایا گیا جہاں میں کئی روز بے ہوش پڑا رہا۔۔۔ میرا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور بازو پر پلاستر تھا۔۔۔ کئی روز بعد گھر آکر میں نے آئینہ دیکھا تو میرے سینے کے اندر جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ میں اب خوب صورت شاہ زیب نہیں رہا تھا۔ اپنا چہرہ دیکھ کر خود مجھے ہی کراہت آرہی تھی۔۔۔ اس کے بعد میرے لیے حالات بتدریج بدلتے چلے گئے۔ میں یاروں دوستوں سے دور دور رہنے لگا۔ کھیل کود سے دل اچاٹ ہوتا چلا گیا' گھر میں بھی بس کسی گوشے میں پڑا رہتا تھا یا پڑھتا رہتا تھا۔ سب کچھ ہی تو بدل گیا تھا میرے لیے' یہاں تک کہ شاہین بھی بدل گئی تھی۔ وہ مجھ سے کم کم ملنے لگی تھی۔ اب مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک نظر نہیں آتی تھی' بس ایک ہمدردی سی جھلکتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ہمدردی بھی کم ہونے لگی۔ اگر وہ مجھے کہیں اکیلے میں دیکھتی تو ڈر سی جاتی۔ حادثے کے بعد میری زبان میں بھی لکنت آگئی تھی لہٰذا میں جو فیملی میں بہت باتونی مشہور تھا بالکل ہی گم صم رہنے لگا تھا۔ میرے لیے زندگی اس قدر اور اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے زندگی کی اس نئی شکل کو قبول کرلیا۔ میرے دل و دماغ نے تسلیم کیا کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو پہلے تھا۔ میرے لیے سب کچھ بدل چکا ہے اور اس "سب کچھ" میں شاہین بھی شامل ہے۔ میرا دل وہی تھا' دل میں پیار وہی تھا' ارمان اور خواہشیں وہی تھیں لیکن چہرہ وہ نہیں تھا اور جب چہرہ وہ نہیں تھا تو پھر کچھ بھی وہ نہیں تھا' کتنی عجیب بات تھی۔

دھیرے دھیرے ماضی کا سب کچھ آنسوؤں میں بہہ گیا مگر ایک چیز بہہ کر بھی نہ بہہ سکی اور وہ شاہین کی من موہنی صورت تھی۔ وہ میری یادوں میں زندہ رہی۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ راولپنڈی سے شفٹ ہو کر لاہور آگئے۔ میرے دل کی اجڑی ہوئی دنیا کچھ اور بھی اجڑ گئی۔ میں شاہین اور اس کی دنیا سے دور اپنی زندگی کا سفر اپنے ڈھنگ سے طے کرتا رہا' میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی' اس کے بعد کچھ عرصہ بیکار رہا آخر والد صاحب مجھے اپنے ساتھ نرسری پر لے جانے لگے۔ شاید وہ خود بھی سمجھ گئے تھے کہ میں زندگی کی دوڑ میں دوسروں کی طرح شریک ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ اب میں پچھلے چار پانچ سال سے والد کے ساتھ ہی ہوں۔ والد اور والدہ کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نے ہر مرتبہ سختی سے انکار کردیا ہے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتا اور اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو آپ کے سامنے ہی ہے' یعنی میری شکل۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی معقول لڑکی اپنی رضامندی اور دلی خوشی کے ساتھ میرے ساتھ نباہ کرسکے گی۔ وہ جو کچھ کرے گی اس کے پیچھے ہمیشہ ایک مجبوری رہے گی۔ میرے انکار کی دوسری وجہ شاہین ہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوچکے ہیں لیکن ایک ادھوری خواہش ہمیشہ میرے دل سے چمٹی رہتی ہے۔ ایک دو ان کہی باتیں ہیں جو پھانس بن کر میرے سینے میں چبھی ہوئی ہیں اور کبھی چین سے نہیں رہنے دیتیں۔"

یہاں تک بتا کر شاہ زیب نے ذرا توقف کیا۔ اپنی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کو آستین سے صاف کیا اور کتنی ہی دیر کھوئی کھوئی نظروں سے فرش کو گھورتا رہا پھر اس نے ہکلاتے ہوئے بتایا "بس ایک بار۔۔۔ ایک آخری بار شاہین سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے پاس سے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں خوفناک ضرور ہوں لیکن مجھ سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میرے سینے میں آج بھی وہی دل موجود ہے جو ایک ننھی سی لڑکی سے پیار کرتا تھا اور اسے اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتا تھا۔ میں اسے بڑی نرمی سے چھونا چاہتا ہوں۔۔۔ اور اگر۔۔۔ وہ اجازت دے تو اس کی پیشانی کو چومنا چاہتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں اس کی نسبت سے کوئی شکوا کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرا دل اسے ایک کامیاب اور پر مسرت زندگی کی دعا دیتا ہے اور ہمیشہ دیتا رہے گا۔ اس کے بعد میں اسے بڑی خوشی اور بڑے سکون کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دوں گا۔"

شاہ زیب کی پوری روداد اسد نے دلچسپی اور توجہ سے

سنی۔ شاہ زیب خاموش ہوا تو اسد سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ شاہین لاہور میں ہے اور اسی علاقے میں رہائش رکھتی ہے؟"

شاہ زیب نے کہا "... میرا ایک دوست اطہر ہے' اس کی والدہ یہاں کچھ دن گنگا رام اسپتال میں داخل رہی ہے۔ وہ بھی والدہ کے ساتھ ہی چکوال سے یہاں آیا ہوا تھا اس نے شاہین کو دو تین مرتبہ اسی علاقے میں دیکھا ہے۔ اپنی سرخ واکس ویگن میں ایک مرتبہ وہ شادمان کے چوک کی طرف سے آرہی تھی۔ دو مرتبہ وہ اپنی سرخ گاڑی میں ہی جناح باغ کے اوپن تھیٹر والے گیٹ کی طرف سے نکل رہی تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا دوست تینوں مرتبہ گاڑی کا نمبر نوٹ نہ کرسکا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" اسد کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے "تت... تم اس سرخ گاڑی والی کی بات کررہے ہو جو وہاں ایڈمنسٹریشن کے آفس میں کام کرتی ہے۔"

"کس آفس میں؟" شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

اسد اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "یہ وہی لڑکی ہے ناں جس کے بال ڈیانا کٹ ہیں اور ہونٹوں کے بالکل پاس نمایاں تل بھی ہے؟"

"ہاں... ہاں یہ وہی ہوگی۔" شاہ زیب کی آنکھوں میں اور آس امید کے سیکڑوں دیے جل اٹھے "یہ وہی ہوگی۔ وہ ہمیشہ چھوٹے بال رکھتی ہے اور اس کے اوپر کے ہونٹ کے پاس تل بھی ہے۔"

"میں نے اسے دیکھا ہے۔ میں اس کی رہائش سے بھی واقف ہوں۔" اسد نے پورے وثوق سے کہا۔

شاہ زیب کے ہونٹ لرزتے چلے جارہے تھے اور چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کی "لکنت کا شکار زبان" اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اسد نے تسلی بخش انداز میں اور بڑے جوش سے اس کا کندھا دبایا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے دوست! شاہین سے ملنے کی تمہاری یہ خواہش پوری ہوسکتی ہے۔"

شاہ زیب رونے لگا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے' اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر فراموش نہیں کروں گا۔"

○:۸:○

اسد اور شاہ زیب ایک صاف ستھرے اسنیک بار میں بیٹھے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب تھوڑا سا دائیں رخ پر وہ کوٹھی واقع تھی جہاں شاہین کی رہائش تھی۔ یہ جگہ باغ جناح سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسد نے سرخ واکس ویگن کو کئی مرتبہ باغ جناح کی طرف سے آتے اور اس کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسد کو یقین تھا کہ سرخ گاڑی والی یہ لڑکی شاہین ہی ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ دونوں اس اسنیک بار میں بیٹھ کر جلد یا بدیر اس کی جھلک دیکھ سکیں گے۔ ممکن تھا کہ وہ گاڑی لے کر باہر نکلتی یا پھر ویسے ہی اپنی کوٹھی کے ٹیرس یا لان وغیرہ میں نظر آجاتی۔ شاہ زیب بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر تا تھا اور لگتا تھا کہ اپنے ال کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں مدت کی پیاس تھی۔

اچانک اسد کو چونکنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب بھی بری طرح چونک گیا۔ وہ دونوں اسنیک بار کے مین دروازے سے سڑک کے اس پار شاہین کی رہائش گاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ شاہین کو دیکھنا چاہتے تھے... اور انہوں نے اسے دیکھ لیا مگر اپنی کوٹھی میں نہیں' اسنیک بار کے اندر۔ وہ گیلری میں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہی تھیں... اچانک شاہین کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہیں شاہ زیب پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے اپنی نگاہوں پر یقین کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ چند لمحے بعد اس کے حسین چہرے پر خوف نمودار ہوا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ اس کی نوجوان ساتھی شدید الجھن کے عالم میں کبھی شاہین اور کبھی شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی۔ شاہین نے اپنی ساتھی کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اسنیک بار سے باہر لے گئی۔ دونوں باہر کھڑی ایک سفید سوزوکی میں بیٹھ گئیں۔ اسد نے شاہ زیب کو تو وہیں چھوڑا اور خود باہر آگیا۔ سفید سوزوکی پارکنگ لاٹ میں سے نکلی تو اسد کی ٹویوٹا کار بھی رینگتی ہوئی اس کے پیچھے نکل گئی۔ شاہ زیب اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہ گیا۔ اس کا رنگ ہلدی ہورہا تھا۔ اسے برسوں سے یہی اندیشہ تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ جب کبھی بھی شاہین کے سامنے جائے گا' وہ خوف زدہ ہوجائے گی۔

اسد کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے مسکرا کر قدرے تسلی بخش انداز میں شاہ زیب کا کندھا تھپتھپایا' پھر دونوں باہر گاڑی میں آبیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اسد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا "میں نے اس سے بات کی ہے۔"

"کس سے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ شاہین ہی ہے' ورنہ ایک دوسرے کو دیکھ کر تم دونوں کا اتنا برا حال کیوں ہوتا۔"

"کک... کیا بات کی ہے آپ نے؟"

"میں نے اس کا بے معنی خوف دور کرنے کی کوشش کی

ہے۔ میں نے یہاں سے تھوڑی ہی دور چوراہے میں اس کی گاڑی روک لی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ صرف دو منٹ کے لیے میری بات سن لے۔ وہ پہلے تو راضی نہیں ہوئی لیکن پھر شاید میری منت سماجت پر اسے ترس آگیا۔ اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر روک دی۔۔۔ میں نے کھڑے کھڑے دس پندرہ منٹ اس سے تبادلہ خیال کرلیا۔ میں کھڑکی پر جھکا رہا اور وہ گاڑی کے اندر بیٹھی رہی۔"

"کک۔۔۔ کیا کہا آپ نے؟"

"وہی جو میں نے محسوس کیا ہے اور جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ وہ اتنے برسوں بعد اچانک تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا یہی ردعمل ہوتا۔"

"آپ میرا دل رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔" شاہ زیب نے اٹک اٹک کر کہا "میں جانتا ہوں وہ سخت ڈر گئی ہے۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں اسے ڈھونڈتا ہوا اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آگیا ہوں اور اب اس کے لیے سخت مشکلات پیدا کرنے والا ہوں۔"

"تم کسی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو' لیکن میں نے جو دس پندرہ منٹ اس کے ساتھ بات کی ہے وہ کافی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کی جھجک کافی حد تک کم ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے شاہ زیب کہ اگر مجھے ایک آدھ مرتبہ مزید اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو اس کے سارے اندیشے دور ہوجائیں گے اور وہ خود تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے گی۔"

"نہیں' یہ کبھی نہیں ہوگا اسد صاحب۔" شاہ زیب سخت مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میری صورت کی طرح شاید میری تقدیر بھی بگڑ چکی ہے۔ میں نے جب جب جو جو کچھ سوچا ہے' ہمیشہ اس کے الٹ ہی ہوا ہے۔" اس کی آنکھوں میں بے اختیار نمی تیرنے لگی تھی۔

اسد نے گاڑی چلاتے چلاتے بڑی محبت سے اس کا شانہ تھپکا "شاہ زیب' میں نے تمہارے اندر تمہارے خوب صورت دل کو پہچان لیا ہے' شاہین بھی ضرور پہچانے گی۔ وہ تو پہلے سے تمہیں اور تمہارے دل کو جانتی ہے۔ اس کے لیے پہچاننا تو اور بھی آسان ہے۔"

گھر آکر اسد نے شاہ زیب کو وڈیو پر ایک فلم دکھائی اور دل بہلانے کے لیے اسے دیر تک باغ میں گھماتا رہا۔ شاہ زیب اس گھر میں خود کو کافی مطمئن محسوس کررہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہاں اسے دیکھنے والے اور اس کے جسمانی عیب پر آنکھوں میں کراہت آمیز حیرت بھر لینے والے بہت کم تھے۔ اسد کی والدہ تھی اور دو ملازم تھے۔ اسد کی والدہ کو ویسے ہی بہت کم نظر آتا تھا۔ ملازمین نے پہلے پہل اسے تعجب خیز نظروں سے دیکھا تھا' بہرحال اب وہ اس کے عادی ہوگئے تھے۔ ان تین افراد کے علاوہ گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ اسد نے بتایا تھا کہ اس کی شادی ہوچکی ہے لیکن کسی معمولی نوعیت کی گھریلو ناراضگی کے سبب اس کی بیوی آج کل اپنے میکے میں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں اسد کی باگیں ڈھیلی تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے گھر میں آتا تھا' مرضی سے جاتا تھا اور کبھی گھر میں بے تکلف دوستوں کی محفل بھی سجالیتا تھا۔ بہرحال شاہ زیب کی موجودگی میں ابھی تک کوئی محفل نہیں سجائی گئی تھی۔ شاید اسد کو خود بھی احساس تھا کہ شاہ زیب تنہائی پسند ہے اور اپنے گرد اجنبی افراد کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کردیتی ہے۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اسد نے شاہین سے ایک اور ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کا مکمل احوال تو اسد نے نہیں بتایا' تاہم یہ ضرور کہا کہ صورتِ حال بہتر ہوئی ہے۔ شاہین نے توجہ سے اس کی بات سنی ہے اور اس کے خدشات بھی کم ہوئے ہیں۔

ایک رات دوسرے پہر اچانک شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہورہی تھی۔ اس نے فریج سے پانی پیا۔ اچانک اسے باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا آگے جاکر ایک ادھ کھلی کھڑکی سے کان لگائے یہ اسد کی آواز تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں کسی سے فون پر بات کررہا تھا۔ شب کے سناٹے میں اس کی آواز وضاحت سے شاہ زیب کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "پلیز۔۔۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ انسان کا چہرہ بدلنے سے اس کا دل تو نہیں بدلتا۔ اس کا مزاج اس کا کردار اور اس کی خواہشات سب کچھ وہی رہتا ہے۔ اگر ہم اچانک اسے ایک اجنبی سمجھنے لگیں گے تو یہ بہت بڑی اخلاقی کراوٹ ہوگی۔۔۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اسد دھیان سے سنتا رہا' پھر بولا "تم ٹھیک کہتی ہو شاہین۔ وہ سب کچھ ماضی کا حصہ ہے لیکن وہ بھی تو کوئی مختلف بات نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ تم سے کچھ مانگ نہیں رہا۔ اپنے دل پر جبر کرکے وہ تمہارا سب کچھ تمہیں واپس لوٹا چکا ہے۔ وہ تو بس تمہاری زندگی سے چند لمحے مانگنے کے لیے آیا ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے' دو چار ان کہی باتوں کا بوجھ اپنے سر سے اتارنا چاہتا ہے شاید۔۔۔ تم سے ایک بار مل کر اور چند باتیں کرکے وہ بڑے اطمینان سے واپس چلا جائے گا اور پھر شاید کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا' جسے اسد سنتا رہا اور ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا' آخر میں بولا "وہ بڑا سادہ مزاج ہے شاہین۔۔۔ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ یہاں آیا ہے' اگر ٹوٹے دل کے ساتھ ہی لوٹ گیا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔

پلیز... میں تم سے درخواست کرتا ہوں..."

اچانک کہیں پاس سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ شاید بلی تھی۔ شاہ زیب گھبرا کر اپنے بستر پر واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اسد کی آواز آنا بھی بند ہوگئی۔ اس نے فون رکھ دیا تھا۔

شاہ زیب کے دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس کا میزبان کتنی مشکل سے دو چار ہے۔ وہ اس کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈال رہا تھا۔ اپنا قیمتی وقت ضائع کرکے شاہین سے ملاقاتیں کررہا تھا۔ اس کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی منت سماجت میں مصروف تھا... لیکن وہ شاید اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ شاہ زیب کا دل بجھ سا گیا۔ اس نے سوچا کہ کل جس وقت اسد آفس میں ہوگا وہ بڑی خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا۔ شاہین کی پیشانی پر بوسہ دینا' اسے گلے سے لگانا تو دور کی بات تھی' وہ تو اس قابل بھی نہیں تھا کہ وہ اسے توجہ سے دیکھ ہی لیتی۔ اس سے ایک آدھ بات ہی کرلیتی۔ اس نے حتمی ارادہ کرلیا کہ وہ شاہین کے دیدار کی بھیک مانگنے کے لیے یہاں بن بلایا مہمان بن کر نہیں پڑا رہے گا۔ اپنی آخری ناتمام خواہش کا دکھ بھی اپنے "درد خزانے" میں جمع کرے گا اور یہاں سے چلا جائے گا۔

مگر اس روز عجیب بات ہوگئی۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اسد کو نجانے کیسے شک پڑ گیا کہ شاہ زیب یہاں سے چپ چاپ نکل جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آفس روانہ ہونے سے پہلے اس نے حسب معمول اپنی والدہ اور شاہ زیب کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر ناشتا کیا پھر اس کی والدہ تو چلی گئیں اور ٹیبل پر اسد اور شاہ زیب بیٹھے رہ گئے۔ اسد نے صاف گوئی کے انداز میں کہا "شاہ زیب! آج میں تمہیں اپنے ساتھ ہی آفس لے جاؤں گا۔ میں تمہیں اپنا آفس دکھانا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ شک بھی ہے کہ تم کہیں خاموشی سے رفوچکر نہ ہوجاؤ۔ نہ میرے بھائی! اب کوئی ایسی حرکت نہیں چلے گی۔ میری ساری محنت برباد ہوجائے گی۔"

"لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اسد نے تیزی سے اس کی بات کاٹی پھر پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولا "تمہارے دل کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ شاہین مان گئی ہے اور سچ پوچھو تو اس کے اپنے دل میں بھی تم سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش موجود ہے لیکن وہ عورت ہے اور تمہیں پتا ہی ہے کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے بالکل وہی کچھ اس کے دل میں بھی ہو مگر اپنے جذبے کے اظہار سے پہلے اس بے چاری کو سو بار سوچنا پڑے گا۔"

"اس کی... شش... شادی ہوچکی ہے؟"

"ہاں۔ اس کا شوہر امریکا میں ملازمت کرتا ہے' اور پچھلے ایک سال سے وہیں پر ہے۔ وہ اپنے دفتر کی ایک کولیگ کے ساتھ اس کوٹھی میں رہتی ہے۔"

"کوئی بچہ ہے؟"

"نہیں۔"

"اور... شش... شاہین کے والدین؟"

"ان کے بارے میں تو معلوم نہیں۔ کل ملو گے تو خود ہی پوچھ لینا۔"

"کک... کل؟" شاہ زیب کی آنکھوں میں ڈر اور شوق یوں اکٹھے ہوئے کہ ایک ہی چیز بن گئے۔ بدنما چہرے کے باوجود وہ بے حد معصوم نظر آنے لگا۔

○☆○

اگلا دن شاہ زیب کی زندگی کا حسین ترین اور یادگار ترین دن تھا۔ وہ شاہین کے گھر ان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور شاہین صرف چند فٹ کی دوری پر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ یہ وہی سہانا خواب تھا جو وہ دس پندرہ برس سے دن رات دیکھتا چلا آرہا تھا "آپ کیسے ہیں؟" شاہین کی دل نشیں آواز شاہ زیب کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ببب بالکل... ٹھٹھ... ٹھیک... اور... آآپ؟"

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آنٹی اور انکل کیسے ہیں... اور آپ... آپ کیا کرتے ہیں آج کل؟" وہ شرما رہی تھی اور چہرے پر قوس و قزح کے رنگ لہرا رہے تھے وہ خوف اب اس کے چہرے پر کہیں نظر نہیں آرہا تھا جو اسنیک بار میں نظر آیا تھا۔ اس دیرینہ خوف کی جگہ ایک طرح کی شناسائی اور انسیت نے لے لی تھی۔ آج شاہ زیب کو شاہین کے چہرے پر دوستی اور قربت کا وہی جذبہ نظر آیا تھا جو کبھی فیض آباد میں نظر آیا کرتا تھا۔ وہ چھتیس وہ منڈیر وہ گلی کوچے اور بازار سب اسی کومل جذبے کے کومل رنگوں میں رنگے رہتے تھے۔ اسی لیے تو وہ ساری رنگین یادیں ابھی تک شاہ زیب کے دل و دماغ پر نقش تھیں۔

"آپ کہیں کھو گئے۔" وہ ہولے سے مسکرائی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو ایک ادا کے ساتھ پیشانی سے ہٹایا۔

"نن... نہیں تو... مم... میں آپ کی... ببب... بات سن رہا ہوں۔ مم... مم... میں نے پچھلے برسوں میں آ... آپ کو... ببب... بہت... یا... یا... یا... یاد کیا ہے شاہین... مم... مجھے لگتا تھا... جج... جیسے آپ مجھ سے روٹھ... گگ گئی

ہیں... اور جب مجھے ایسے لگتا تھا تو پھر... مم... میں سوچتا تھا کہ مم... میرا چہرہ بگڑا ہے... تت... تت تو یہ میری غلطی ہے۔ حالانکہ ایسا تو نہیں تھا ناں؟" اس کا گلا رندھ گیا۔

"نہیں شاہ زیب! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بس حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے کہ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔" شاہین کے لہجے میں ندامت پوشیدہ تھی۔

"مم... میں سچے دل سے کہتا ہوں۔ خدا کی قسم مم... مجھے... آ آپ سے کوئی شش... شش شکوا نہیں ہے۔ یہ مم... مم... میری قسمت تھی۔ بب... بس... ایک بار... آ آ آپ سے ملنے کو دل چاہتا تھا... آ آپ سے چند... بب... باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا۔"

"سچ پوچھیں شاہ زیب تو میں بھی اکثر پرانے دنوں کو یاد کرتی رہی ہوں۔ انکل کو' آنٹی کو۔ آپ سب کو مس کرتی رہی ہوں۔"

اتنے میں ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ شاہین فون سننے کے لیے دوسرے کمرے میں گئی۔ اسد نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "شاہ زیب! میں نے کہا تھا ناں کہ اگر تم اس کے بارے میں سوچتے رہے ہو تو وہ بھی ضرور سوچتی رہی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ اب قدرت نے تمہیں موقع دیا ہے اسے ضائع مت کرو۔ میں سگریٹ ڈھونڈنے کے بہانے تھوڑی دیر کے لیے باہر جارہا ہوں۔ تم اپنے دل کی باتیں کھل کر شاہین سے کہہ سکتے ہو۔ دلیر بنو... اگر تمہارے دل میں کوئی چور نہیں تو پھر تمہیں گھبرانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔"

شاہ زیب روکتا ہی رہ گیا لیکن اسد اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہین فون سن کر واپس آگئی۔ اس نے اسد کے بارے میں پوچھا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ سگریٹ لینے کے لیے نکلے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔ ملازمہ چائے وغیرہ بنانے چلی گئی تو شاہ زیب اور شاہین کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے لگے۔ یہ سلسلہ چلا تو دونوں جیسے گزرے دنوں کے دھندلکے میں کھو سے گئے۔ ایک ایک بات ایک ایک واقعہ یاد کیا گیا۔ جو سوال برسوں سے ذہن میں تھے ان کے جواب ملے' جو ان کہی باتیں دل و دماغ کو الجھن میں مبتلا کرتی تھیں وہ کہہ دی گئیں۔ بس چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں' عام نوعیت کے سوال و جواب تھے۔

شاہ زیب ایک صاف گو شخص کا نام تھا۔ اس نے اپنے اور شاہین کے حوالے سے کوئی بات بھی دل میں نہیں رکھی۔ صاف بتایا کہ وہ اسے کیسے کیسے یاد کرتا رہا ہے۔ کس کس موقع پر اسے کس کس طرح مس کرتا رہا ہے۔ وہ بے تکلفی سے بتاتا رہا اور وہ بے تکلفی سے سنتی رہی۔ وہ خوابیدہ لہجے میں بولا "شاہین! جن دنوں ہم بچھڑے' میں تمہیں پسند کرتا تھا۔ اس... اس... پسند کو میں کوئی نن... نام پہلے دے سکتا تھا اور نن... نہ اب دے سکتا ہوں۔ بب... بس تم مجھے پسند ہو' اور ہم... ہم... ہمیشہ رہو گی۔ جن دنوں ہم اکٹھے ہو... ہو... ہوتے تھے... مم... میں اکثر سوچا کرتا تھا' اگر ہمیں ایک دو... دوسرے سے دور ہونا پڑا... مم... میرا مطلب ہے کہ بب... بچھڑ کر زندہ رہنا پڑا... تت... تو میں تمہیں... بب... بڑے اچھے طریقے سے رخصت کروں گا' او... او... اور ہنستے چہرے کے ساتھ رخصت کروں گا۔ بب... بغیر کسی شش شکوے شکایت کے... ان دنوں ایک... گگ... گیت اکثر مم... میرے کانوں میں گونجا کرتا تھا... وہ... وہ تمہیں بھی بہت پسند تھا... یاد ہے ناں وہ نن... نن... نظم؟"

"ہاں۔" شاہین نے اثبات میں سر ہلایا "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو۔ ہمیں تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے۔"

"ہاں... یہی نن... نظم۔" شاہ زیب نے تصدیق کی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "مم... میرا دل چاہتا تھا' جب کبھی تت... تم مجھ سے جدا ہونے لگو' میں اپنے آنسوؤں کے



پیچھے سے مم۔۔۔ مسکرا کر تمہاری طرف دیکھوں۔۔۔ تت تمہاری پیشانی کو چوموں اور بب۔۔۔ بڑے خلوص کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خو۔۔۔ خو۔۔۔ خدا حافظ کہہ دوں۔"

شاہین کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔ ان آنسوؤں میں ندامت تھی اور اس کے علاوہ ایک شکوا تھا۔ یہ شکوا اکثر اس کے ذہن میں ابھرا کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ شکوا کس سے تھا؟ حالات سے؟ اپنے آپ سے؟ یا اس حادثے سے جس نے ان دونوں کو جدا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ جسم کی ثانویت اور روح کی اولیت کو سمجھتے بوجھتے بھی وہ شاہ زیب سے گریز پر مجبور ہوگئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا' لیکن ایسا ہوا تھا۔

"مم۔۔۔ میں۔۔۔ تمہیں بھولنا چاہتا ہوں شاہین۔" شاہ زیب کے ہونٹوں سے جذبات سے بوجھل آواز نکلی۔

شاہین کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ ایک کرشماتی لمحے نے اس کے چہرے پر آمادگی اور خود سپردگی کا تاثر سجا دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوجے کے سامنے کھڑے تھے۔ درمیان میں صرف دو فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ نہایت بے باکی انداز میں شاہ زیب آگے بڑھا اور اس کے ہونٹ شاہین کی پیشانی پر ثبت ہوگئے۔ اس کی پیشانی چوم کر وہ پیچھے ہٹا تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ شاہین بے اختیار اس کے گلے سے لگ گئی۔ شاہ زیب نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ روتے روتے اس نے پیچھے ہٹ کر الوداعی نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا اور ایک بار پھر اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس عمل کو کسی بھی رشتے۔۔۔ یا تعلق کے ساتھ۔۔۔ منسلک نہیں کیا جاسکتا تھا' بس یہ خالص پیار کا عمل تھا۔

دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ ایک کہنہ سال' دیرینہ بوجھ تھا جو آنسوؤں کے ساتھ ہی ان کے دل و دماغ سے دھل گیا تھا۔ شاید وہ دونوں ہی اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے تھے۔

"مم۔۔۔ میں بدنما ضرور ہوں شاہین۔۔۔ لل۔۔۔ لیکن خوفناک نہیں ہوں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

شاہین کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ شاہ زیب کی بات سے مکمل اتفاق کررہی ہے۔

○☆○

شاہ زیب واپس جارہا تھا۔ اسد اسے الوداع کہنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ وقتِ رخصت شاہ زیب نے اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور جذباتی لہجے میں بولا "مم۔۔۔ میں آپ کا یہ احسان۔۔۔ زند۔۔۔ زندگی بھر بھلا نہ سکوں گا۔ مم۔۔۔ میری دعا ہے کہ۔۔۔ جج جس طرح آپ نے مم۔۔۔ مجھے خوشی دی ہے' خو۔۔۔ خدا آپ کو بھی خوشی دے آپ کا دل اور گھر آباد ہوجائے۔"

اسد نے کہا "میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تمہاری خواہش ہے کہ میری روٹھی ہوئی بیگم گھر واپس آجائے اور میرے سائیں سائیں کرتے گھر میں پھر سے رونق ہوجائے۔"

شاہ زیب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔" اسد نے کہا "پچھلے دنوں اپنی بیگم سے میری دو چار ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے ہماری کشیدگی کافی حد تک کم ہوگئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ دو چار دن میں گھر آجائے گی۔"

"یہ۔۔۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لل۔۔۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟"

"دراصل ایک اتفاق کے تحت ہم دونوں کو اکٹھے ایک پروجیکٹ پر کام کرنا پڑ گیا تھا۔"

"پپ۔۔۔ پروجیکٹ؟"

اسد ہولے سے مسکرایا "ہاں پروجیکٹ۔ یہ ایک بہت سادہ اور بہت پیارے شخص کی دل جوئی کا پروجیکٹ تھا' اسے ایک دیرینہ بوجھ سے آزاد کرانے کا پروجیکٹ۔"

شاہ زیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی۔

اسد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں شاہ زیب! شاہین ہی میری روٹھی ہوئی بیوی ہے۔"

"آ۔۔۔ آپ نے تو۔۔۔ آ۔۔۔ آپ نے تو۔۔۔؟" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"شاہ زیب! میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ شاہین کا شوہر امریکا میں رہتا ہے۔ اس حوالے سے دیگر باتیں بھی جھوٹ ہی تھیں۔ میں نے یہ جھوٹ اپنی اور تمہاری آسانی کے لیے بولے تھے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے لیے تم مجھے معاف کردو گے۔"

"اوہ خدایا! آپ نے۔۔۔ مم میری خاطر اپنی بیوی کو۔۔۔ اپنی بیوی کو۔۔۔" وہ ایک بار پھر ہکلا کر رہ گیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے میرے دوست۔ میں نے صرف تمہارے اندر کے خوب صورت انسان کو پہچانا ہے۔ اگر تم مجھے اس کا کریڈٹ دینا چاہو تو بخوشی دے سکتے ہو۔"

شاہ زیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا' پھر وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔

ماسٹر پیس

طاہر جاوید مغل

فن کی بلندیوں کو چھونا کسی بھی فن کار کی وہ تمنا ہوتی ہے جس کی خاطر وہ اپنا آپ بھی داؤ پر لگانے کو تیار رہتا ہے۔ وہ بھی ایک اداکارہ تھی اور ایک لافانی کردار ادا کرنا چاہتی تھی مگر اسے اس کا موقع کچھ عجیب انداز میں ملا۔

جدوجہد آزادی فلسطین کے پس منظر ایک دکھیاری ماں کا قصہ



دوستی اور محبت وغیرہ کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ فریقین میں ایک جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ بعض اوقات جیون بھر ایک رشتے میں منسلک رہنے والے لوگ اپنے مزاج اور عادات کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ یہی حال باقر مشعال اور اُم ریاض کا تھا۔ دونوں پچھلے قریباً پینتیس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ تاہم ان کے نظریات اور معمولات وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔ ہر دکھ سکھ میں شریک بھی رہتے تھے لیکن اس کے باوجود کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے دور بھی تھے۔

باقر مشعال الازہر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ وہ ایک فلسطینی اخبار سے منسلک تھے اور آزادی کی تحریکوں میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے۔ وہ غزہ میں اپنے خوش نما گھر میں ام ریاض اور اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے وقاص کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے تین بیٹوں میں سے دو کی شادی ہو چکی تھی جبکہ ایک بیٹا عرصۂ دراز سے لاپتا تھا۔

اپنے خاوند کے برعکس ام ریاض زیادہ مذہبی نہیں تھی۔ وہ فیشن کے مطابق لباس پہنتی تھی۔ عربی کے بجائے اکثر انگریزی میں بات کرتی تھی۔ فنونِ لطیفہ سے اسے خصوصی لگاؤ تھا۔ شادی کے دو سال بعد ہی اپنے شوہر کی اجازت سے اس نے ٹی وی پر ایک ڈاکومینٹری فلم میں کام کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ ام ریاض کو ٹی وی پر کام ملنے لگا تھا۔ اگلے چند برسوں میں اس نے درجنوں ٹیلی فلموں اور اسٹیج ڈراموں میں کام کیا تھا اور ایک جانی پہچانی شخصیت بن گئی تھی۔ بہرحال شوبز سے وابستہ ہونے کے باوجود ام ریاض ایک باوقار اور سنجیدہ خاتون ہی نظر آتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ ام ریاض کو اپنے شوہر کے ''کاز'' سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بیشتر فلسطینیوں کی طرح وہ بھی فلسطین کی آزادی چاہتی تھی۔ اپنے انٹرویوز میں وہ اکثر اس حوالے سے بات کرتی نظر آتی تھی۔ اس نے پروڈیوسروں سے خصوصی فرمائش کر کے چند ایسے PLAYS میں بھی کام کیا تھا جن کا موضوع فلسطین کی آزادی تھا۔ بہرحال یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنے شوہر کی طرح آزادیٔ فلسطین کی سرگرم کارکن نہیں تھی۔

بچوں میں سے تیسرے نمبر کا بیٹا سو فیصد اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلا تھا بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ اس کا نام احسن طلال تھا۔ وہ ماں باپ کو پیارا بھی بہت تھا۔ احسن لڑکپن میں ہی ایک جہادی تنظیم سے وابستہ ہو گیا تھا۔ پھر مشعال اور ام ریاض کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ اسرائیلی ٹینکوں کو پتھر

مارتے مارتے ان پر گولیاں چلانے لگ گیا ہے..... وہ اپنے راستے پر بڑی تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ جلد ہی اسے روپوش ہونا پڑا تھا۔ یوں وہ اپنے گھر اور اپنے والدین سے بہت دور چلا گیا تھا۔

مشعال اور ام ریاض سے احسن کی ملاقات بس کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ یہ خفیہ ملاقات ہوتی تھی۔ ان ملاقاتوں میں تسلسل بھی نہیں تھا۔ کبھی چند دن کے وقفے سے اور پر تلے کئی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ کبھی پورا پورا سال گزر جاتا تھا اور انہیں احسن کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ احسن اب مکمل طور پر ایک ''مجاہد'' کی شخصیت میں ڈھل چکا تھا۔ اس نے مکمل عسکری تربیت حاصل کی تھی۔ گوریلا وار کے سارے داؤ پیچ اسے آتے تھے۔ اس نے اپنی تنظیم کی ہی ایک ساتھی لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ شروع شروع میں اسرائیلیوں نے مشعال اور اس کے اہل خانہ کو خاصا تنگ کیا تھا۔ وہ اکثر مشعال یا اس کے کسی بیٹے کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور ہراساں کرتے تھے۔ مشعال کے بیٹوں سے پوچھ گچھ کے دوران میں مار پیٹ بھی کی جاتی تھی۔ ان کے گھر کو بارود سے اڑانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں اور وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے جو رائج تھے لیکن پھر دھیرے دھیرے یہ سلسلہ کم ہو گیا تھا۔ فوجیوں نے بتدریج یہ باور کر لیا تھا کہ مشعال اور اس کے اہل خانہ کا احسن سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ مشعال نے آزادیٔ فلسطین کے لیے اپنا قلمی جہاد جاری رکھا۔ وہ اب پی ایچ ڈی کر چکے تھے اور انہیں ڈاکٹر مشعال بھی کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف ام ریاض بھی اپنے کام میں مگن رہی۔ وہ ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ لبنانی ٹی وی پر ایک طویل سیریل میں کام کرنے کے بعد اس کی شہرت میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ سنجیدہ اور اصلاحی رول کرتی تھی۔ غم واندوہ کے کرداروں میں تو وہ یوں ڈوب جاتی تھی کہ افسانے پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا تھا۔ شاید اس زبردست کردار نگاری میں ام ریاض کے ذاتی دکھ کا بھی عمل دخل تھا۔ احسن کی جدائی کا دکھ ام ریاض کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ کسی وقت جب وہ موڈ میں ہوتی تو اپنے شوہر سے کہتی ''مشعال' کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی ایسی کہانی میں کام کروں جو ہمارے اور احسن کے حالات کا عکس ہو..... اگر مجھے کوئی ایسا کردار مل گیا تو دیکھنا' میں اسے اپنی اداکاری سے یادگار بنا دوں گی۔''

''لیکن کردار ملے گا تو تب ہے نا..... موجودہ حالات میں اس قسم کا رسک کون لیتا ہے۔ ہر شخص آسانیاں چاہتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں بس وہی عشق ومحبت کی بنی بنائی کہانی ہے جو ہم برسوں سے ٹی وی اور سنیما وغیرہ کی اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے مشعال!'' ام ریاض فوراً شوہر کی بات کی تردید کرتی ''شوبز میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دل میں تڑپ ہے۔ وہ اپنے وسائل اور اپنی حدود میں رہتے ہوئے کوشش کرتے رہتے ہیں..... لیکن..... مسئلہ یہ ہے کہ تم ٹی وی دیکھتے ہی بہت کم ہو۔''

''چلو' ہم بھی دیکھیں گے' جب کوئی ایسا کردار کرو گی۔''

''اگر کردار نہ ملا تو میں خود ڈراما پروڈیوس کروں گی' تم دیکھ لینا'' ام ریاض غصے سے کہتی۔

لیکن بندے کی ساری خواہشیں تو پوری نہیں ہوتیں۔ وقت گزرتا رہا۔ ام ریاض کی عمر اب ڈھل رہی تھی۔ وہ کچھ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ اسے دمے کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اسٹیج پلے تو کام ہی ''آواز کے دم خم'' کا ہے۔ ام ریاض زور سے بولتی تھی تو اس کا دم اکھڑنے لگتا تھا۔ بتدریج اسٹیج پلے اس سے چھوٹ گئے۔ ٹی وی پر بھی اب وہ پہلے سی پذیرائی نہیں تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر صبح کی شام ہوتی ہے اور ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ ام ریاض بھی اب روبہ زوال تھی۔ پھر ایک وقت آیا جب اس کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی..... سردیوں کے دن تھے۔ ام ریاض کے لیے بولنا تک محال ہو گیا۔ اس کی تکلیف کو بڑھاوا دینے میں کچھ عمل دخل اردگرد کے حالات کا بھی تھا۔ تقریباً ایک برس بیت گیا تھا کہ احسن سے ان کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو خبریں ایسی بھی ملی تھیں جن سے یہ روح فرسا شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ موساد یا اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا ہے لیکن پچھلے ماہ ایک بار پھر اس کی شہادت کی تردید ہو گئی تھی۔ احسن کو ''صابرہ'' کے علاقے میں دیکھا گیا تھا۔ وہاں وہ ایک اسرائیلی فوجی کو ہلاک اور دو کو زخمی کر کے بھاگ گیا تھا۔ درحقیقت پچھلے دو ڈھائی سال سے احسن اسرائیلیوں کے لیے چھلاوا بنا ہوا تھا۔ وہ اسرائیلی انتظامیہ کو مطلوب افراد کی فہرست میں بہت اوپر آ گیا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملتی تھی' اسرائیلی پوری تیاری کے ساتھ چھاپا مارتے تھے' انہیں توقع ہوتی تھی کہ اس مرتبہ وہ ٹی وی پر اس کی لاش کی نمائش کر سکیں گے لیکن ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ وہ مختلف روپ بدلتا ہے۔ کبھی داڑھی کے ساتھ' کبھی لمبے بالوں کے ساتھ اور کبھی کسی ادھیڑ عمر شخص کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ بڑی دلیری کے ساتھ ایسے

علاقوں میں گھس جاتا تھا جہاں اس کی موجودگی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا' اطمینان سے کارروائی کرتا اور ''پکڑنے والوں'' کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جاتا۔

پچھلے نومبر میں احسن اور اس کے ساتھیوں نے گھات لگا کر ایک فوجی ٹرک پر فائرنگ کی تھی۔ اس واقعے میں ایک کیپٹن سمیت تین اسرائیلی ہلاک ہوئے تھے۔ نتیجے میں اسرائیلیوں نے شدومد کے ساتھ احسن کو ڈھونڈا تھا۔ غیظ و غضب کی لہر میں وہ احسن کے بڑے بھائی سفیان کو بھی اٹھا کر لے گئے اور کئی دن تک ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار رکھا۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ احسن کو ''رملہ'' کے قریب اِن کاؤنٹر میں شہید کردیا گیا ہے۔ اخباروں میں اس واقعے کی نمایاں خبریں آئیں لیکن دو روز بعد ہی اس خبر کی بھی تردید ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ جاں بحق ہونے والا الفتح کا ایک رکن تھا۔ اس کی صورت اور جسامت وغیرہ احسن سے ملتی جلتی تھی۔

ایک روز جب ام ریاض اپنے بیڈروم میں لیٹی مسلسل کھانس رہی تھی۔ ڈاکٹر مشعال اندر داخل ہوئے۔ ام ریاض کے قریب بیٹھ کر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی جلتی پیشانی پر رکھ دیا اور بولے ''تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ احسن نے اپنے دوست ابونصیر سے فون پر بات کی ہے۔ وہ اومان سے بول رہا تھا۔''

''سچ'' ام ریاض کی آنکھوں میں خوشی کے چراغ جل اٹھے۔

''تو کیا میں تم سے جھوٹ بولوں گا'' ڈاکٹر مشعال نے کہا۔ ''آج ابونصیر خود مجھے بتانے کے لیے آیا تھا۔''

''کیا کہا اس نے؟'' ناتواں ام ریاض اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''وہ بتا رہا ہے کہ احسن اور اس کے ساتھیوں نے ایک اچھا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ اب کچھ عرصے کے لیے اردن کے مضافاتی علاقے میں روپوش ہو رہے ہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ!'' ام ریاض نے سینے پر ہاتھ رکھا ''کاش' ایسا ہی ہو۔''

ڈاکٹر مشعال نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ''ابونصیر کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ احسن اب ڈیڑھ دو سال کے لیے مکمل خاموشی اختیار کرے گا۔ یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی تلاش کی سرگرمیاں بہت زور پکڑ گئی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اس کا کچھ دیر کے لیے منظر سے ہٹنا ہی بہتر ہے۔''

ام ریاض خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے

Book of the year 2004

Around the Vedic Sky

by Noon Meem Jyotishi

A self-learning book on Vedic Astrology. The book contains **700** pages that covers all mathematical aspects and techniques which astrologers use to casting and predicting a horoscope.

Vishnu Bhaskar Jyotishacharya principal international institute of Vedic Astrology Delhi has written the foreword.

آسان انگریزی زبان میں علم نجوم
پر شائع ہونے والی پہلی کتاب

A must for all beginners of

Astrology

Book Price: Pak Rs. 650/-
US$ 20

Plus postage:
Us-Canada-Australia Us$ 15
Other countries Us$ 12
Within Pakistan No Postage

Send your pay order or check with your name and mailing address in the name of **M/s Turning Point Publications**
Hafiz Plaza, 57-DACHS, Main Shara-e-Faisal, Karachi-75350, PAKISTAN.
(Proprietor Kamran A Bahalim)

یہ کتاب آپکو منجمین سے بے نیاز کردے گی

For information call the author
Noon Meem Jyotishi
0300-2288702

Website: www.vedicguru.com

بھیگ گئے۔ پھر ان بھیگے گوشوں سے دو موتی نمودار ہوئے اور اس کے زرد رخساروں پر لڑھک گئے۔ کھڑکیوں سے باہر ایک سرد شام دھیرے دھیرے پر پھیلا رہی تھی' ہوا میں زرد پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ ام ریاض نے تکیے سے ٹیک لگائی اور بولی ''مشعال! میں نے بہت کام کیا ہے۔ سیکڑوں کردار ادا کیے ہیں لیکن ایک کردار اب بھی مجھ پر قرض ہے۔ ایک یادگار کردار..... میں اس کردار میں ڈوب کر امر ہو جانا چاہتی ہوں۔ ایک دکھیاری فلسطینی ماں کا کردار..... میں چاہتی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد جب بھی تم اسکرین پر یہ کردار دیکھو' تمہاری آنکھوں میں آنسو آ جائیں اور تم مجھے بار بار معاف کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ میں جانتی ہوں' میں نے ساری زندگی تمہارے ''کاز'' کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اپنے حال میں مست رہی ہوں لیکن ایک یادگار کردار میں جان ڈال کر اور اسے امر بنا کر میں اپنی ساری کوتاہیوں کا مداوا کر دینا چاہتی ہوں۔''

''تمہاری حالت اب ایسی نہیں ہے ڈیئر! کہ تم کوئی ایسا بوجھ اٹھا سکو۔''

''نہیں مشعال! میں اٹھا سکتی ہوں..... اگر میں نہ اٹھا سکی تو شاید چین سے مر بھی نہ سکوں۔ پلیز' تم کسی طرح میری مدد کرو۔''

مشعال کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری ''میں کیا کروں؟''

ام ریاض کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ بولی ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح اردن پہنچ جاؤں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم اپنی حالت دیکھو۔ اردگرد کے حالات دیکھو۔''

''نہیں مشعال! ابھی نہیں..... کچھ دیر بعد..... ہم دو چار مہینے انتظار کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں احسن کی تلاش کا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ پھر تم مجھے کسی طرح چپکے سے اومان لے جانا۔''

''وہاں کیا ہوگا؟''

''وہاں میرا پرانا پروڈیوسر حسنات غزالی کام کر رہا ہے۔ میں اس سے کہوں گی کہ وہ میرے لیے جلدی سے کوئی کہانی ڈھونڈے..... بلکہ میرا خیال ہے..... میرا خیال ہے کہ اس کے پاس ایک دو کہانیاں موجود بھی ہوں گی۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ اس نے پچھلے دنوں فلسطینی پولیس کے حوالے سے ایک زبردست ٹیلی فلم پیش کی تھی..... اگر میں نے.....''

ایک دم ام ریاض کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ جب جذباتی لہجے میں بات کرتی تھی' ایسا ہی ہوتا تھا۔ مشعال نے اس کے گلے پر مساج کیا۔ اسے نیم گرم پانی پلایا اور اسے سہارا دے کر سیدھا لٹا دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر مشعال اسے سمجھانے والے انداز میں بولا ''دیکھو ڈیئر! تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم لمبی چوڑی منصوبہ بندیاں کرو اور میری بات کا برا نہ ماننا' تمہیں یہ بات مان لینی چاہئے کہ اب اسٹیج' ٹی وی وغیرہ پر تمہاری ''طلب'' ختم ہو چکی ہے۔ بے شک ایک وقت تھا کہ تم حسنات جیسے لوگوں سے اپنی من پسند کہانی میں من پسند کردار لے سکتی تھیں لیکن اب شاید ایسا نہ ہو سکے اور بالفرض محال ہو بھی جائے تو کیا تم اس قابل ہو کہ ایسے کسی کردار سے انصاف کر سکو..... پلیز ڈیئر! پلیز..... اب اپنے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں تو سمجھ رہی ہوں..... لیکن تم نہیں سمجھ رہے' میں کفارہ چاہتی ہوں اور یہ اسی طرح ادا ہو سکے گا۔ چاہے چھوٹا سا کردار ہی ہو لیکن یادگار ہو..... ایک بے مثال کردار نگاری..... ایک ماسٹر پیس' ہاں ایک ماسٹر پیس.....'' وہ وجد میں بولتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں اور ہونٹ ہل رہے تھے ''مشعال..... پلیز' پلیز..... مجھے ایسا کرنے دو۔ ممکن ہے کہ اومان میں' میں احسن کو بھی دیکھ سکوں۔ میں احسن کو دیکھ لوں گی تو میرے اندر بڑی توانائی آ جائے گی۔ میں گھنٹوں کیمرے کے سامنے کھڑی ہو سکوں گی۔ تم دیکھ لینا' میں ایسا کر گزروں گی۔ احسن میرے آس پاس ہوگا تو میرا کردار خود بخود بول اٹھے گا۔ اس میں زندگی دوڑ جائے گی۔ وہ بے مثال بن جائے گا..... یادگار..... ماسٹر پیس' ہاں مشعال! ماسٹر پیس۔''

''خواب و خیال کی باتیں مت کرو ڈیئر!'' مشعال نے ہولے سے اس کے بالوں کو سہلایا ''انسان جب انہونیوں کے پیچھے بھاگتا ہے تو خود کو اذیتوں کے سپرد کر دیتا ہے..... میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سوچنا چھوڑ دو لیکن وہ سوچو جو تمہارے دائرۂ اختیار میں آ سکے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر مشعال نے ٹھیک کہا تھا۔ اگلے دو تین ماہ میں ام ریاض کی حالت سنبھلنے کے بجائے مزید خراب ہوئی۔ اسے کثرت سے ''ان ہیلر'' استعمال کرنا پڑتا تھا اور وہ مسلسل دوائیں بھی لے رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دے رکھا تھا۔ لیکن اس کے اندر جیسے کوئی لہر بار بار اٹھتی تھی اور اس کے سکون کو اتھل پتھل کر دیتی تھی۔ اپنے اندر

امنگ ترنگ زندہ رکھنے کے لیے وہ اکثر ویڈیو پر اپنے پرانے PLAYS دیکھتی رہتی تھی' کسی وقت مشعال دیکھتا کہ وہ فون پر کسی پروڈیوسر یا فنانسر وغیرہ سے بات کررہی ہے۔ کبھی وہ اسکرپٹس کا کوئی پلندا لے کر بیٹھ جاتی..... مشعال جانتا تھا یہ سب سعیٔ لاحاصل ہے لیکن وہ اکثر خاموشی اختیار کرتا تھا۔

ان دو تین مہینوں میں بھی احسن کی تلاش زور وشور سے جاری رہی تھی۔ درحقیقت وہ اسرائیلی انتظامیہ کے لیے مستقل دردِسر بن چکا تھا۔ ہر ایک دو ہفتے بعد کوئی نہ کوئی کارروائی اس کے کھاتے میں ڈال دی جاتی تھی..... پھر مار دھاڑ ہوتی تھی' گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ شہ سرخیاں لگتی تھیں۔ لیکن فوج کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ اس دوران میں اسرائیلی فوجیوں نے غزہ کے ایک دور دراز علاقے سے ایک نامعلوم حملہ آور کو گرفتار کیا تھا۔ یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ احسن گرفتار ہوگیا ہے..... اس نوجوان کو شناخت کے لیے شہر لایا جارہا تھا کہ راستے میں ہی اس شخص نے ایک اسرائیلی کی رائفل سے خود کو گولی مار لی تھی۔ بعد ازاں پتا چلا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ شخص تھا۔ تحریکِ آزادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ اسرائیلی انتظامیہ کے پاس احسن طلال کی کوئی واضح تصویر بھی نہیں تھی۔ جو ایک دو تصویریں موجود تھیں وہ کافی پہلے کی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بھیس بدل کر بھی اسرائیلیوں کو زچ کرتا تھا۔ اسرائیلی ہمیشہ احسن کی شناخت کے حوالے سے پریشان رہے تھے اور یہی پریشانی اب بھی تھی۔

وہ بہار کے دن تھے..... لیکن یہ بہار بھی غزہ اور اس کے گردونواح پر خزاں کی طرح آئی تھی۔ روزانہ دھواں اٹھتا تھا۔ روزانہ بارود کی بو پھیلتی تھی۔ ننھے بچے ننھے ہاتھوں سے دیوہیکل ٹینکوں پر ننھے پتھر پھینکتے تھے۔ ام ریاض کی طبیعت جوں کی توں تھی۔ اردن جانے کا خیال ابھی تک اس کے ذہن سے مکمل طور پر نکلا نہیں تھا۔ اب بھی وہ فون پر ایک واقف کار سے اسی بارے میں معلومات حاصل کررہی تھی۔ گفتگو میں بار بار پروڈیوسر حسنات کا نام بھی آرہا تھا۔ اچانک ایک چیخ سنائی دی۔ گھریلو ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ ٹی وی پر بری خبر آئی ہے۔

''کیسی خبر؟'' ام ریاض نے اپنا کلیجا تھامتے ہوئے اور خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''میں کس منہ سے بتاؤں' آپ خود سن لیں'' ملازمہ نے اشکبار لہجے میں کہا اور ٹی وی آن کردیا۔

ام ریاض کے اندیشوں کے عین مطابق' یہ احسن کی شہادت کی خبر تھی۔ ابھی وہ یہ خبر پوری طرح سن بھی نہیں پائی تھی کہ دروازے پر کسی جیپ کے انجن کی کرخت آواز سنائی دی چند سیکنڈ بعد گھر کا فرش وزنی بوٹوں کی دھمک سے گونج اٹھا۔ یہ اسرائیلی فوجی تھے۔ ساتھ میں لیڈیز اہلکار بھی تھیں۔ یہ لوگ سیدھے ام ریاض کے کمرے میں پہنچ گئے۔

''مسٹر باقر مشعال کہاں ہیں؟'' ایک عینک والے افسر نے پوچھا۔

''وہ شہر سے باہر ہیں۔''

''تم مسز مشعال ہو؟''

''ہاں..... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔''

''کیوں' کس لیے؟''

''یہ ضروری ہے۔ تھوڑی دیر میں تمہیں واپس چھوڑ جائیں گے۔''

ام ریاض کے گلے میں آنسو جمع ہورہے تھے۔ وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی ''کیوں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟ مجھ سے میرے بیٹے کی..... لاش شناخت کرواؤ گے؟ اور تم کر بھی کیا سکتے ہو؟ اور تم کر بھی کیا سکتے ہو؟''

تھوڑی ہی دیر بعد ام ریاض پولیس اسٹیشن میں تھیں۔ ایک مستطیل کمرے میں اسٹریچر پر ایک جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر پر خون کے دھبے تھے۔ چند افراد اردگرد خاموش کھڑے تھے۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ اس چادر کے پیچھے

مہارت

مودی صاحب شاہ جی کو اپنی موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر روانہ ہوئے تو شاہ جی کافی گھبرا رہے تھے۔ وہ موٹر سائیکل پر سفر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ مودی صاحب نے تیز رفتاری سے شارع فیصل پر موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے گردن موڑ کر اونچی آواز میں شاہ جی کو تسلی دی ''آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں..... میں دن میں دس مرتبہ اس سڑک سے گزرتا ہوں۔ اس کا چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اس سڑک میں کہاں کہاں گڑھا ہے.....''

عین اسی وقت موٹر سائیکل ایک گڑھے سے گزری اور بری طرح اچھلی۔ شاہ جی گرتے گرتے بچے۔ مودی صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے ''.....اور یہ انہی گڑھوں میں سے ایک گڑھا تھا۔''

اس کے لختِ جگر کا چہرہ ہوسکتا تھا..... اور نہیں بھی۔ ہونے اور نہ ہونے میں چند ساعتوں کا فرق تھا۔ ہاں' یہ قیامت کی ساعتیں تھیں۔ ام ریاض کا کانپتا ہاتھ دھیرے دھیرے چادر کی طرف بڑھا۔ اسے بتادیا گیا تھا کہ لاش مسخ ہے' اس لیے وہ ہمت سے کام لے۔

ہر زمانے میں دکھیاری ماؤں سے ظالم ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں کہ وہ ہمت سے کام لیں۔

وہ ہمت سے کام لے رہی تھی۔ اگر نہ لیتی تو شاید اپنے گھر سے اسپتال تک پہنچ بھی نہ سکتی۔ ہاتھ چادر کی طرف بڑھا۔ دل دھڑک رہا تھا..... امید و بیم کے درمیان ڈوب رہا تھا' ابھر رہا تھا۔ پھر اس نے چادر سرکائی۔ آہ..... اس کام کے لیے پتھر کا جگر اور فولاد کا دل درکار تھا۔ اس کے سامنے ایک خون آلود کٹا پھٹا چہرہ تھا۔ بال لہو میں لتھڑے ہوئے۔ ایک رخسار ندارد..... گردن کے پرخچے اڑے ہوئے۔ ہاں یہ ایک شہید کا چہرہ تھا اور یہ شہید کون تھا؟

ام ریاض کے ہاتھوں نے بے تابی سے قمیص کے چیتھڑے سینے پر سے ہٹائے۔ بغل کے نیچے کچھ دیکھا پھر لپک کر پنڈلی کی طرف آئی۔ اشک بار نگاہوں کو پنڈلی پر مرکوز کیا۔ پھر ایکا یکی اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ یہ اس کا احسن تھا..... ہاں' یہ اس کا احسن تھا..... یہی تھا اس کا لختِ جگر۔ وہ جسم و جاں کی پوری قوت کے ساتھ اپنے شہید کے پارہ پارہ جسم سے لپٹ گئی۔ وہ کربناک انداز میں چیخ رہی تھی اور اپنے شہید کے جسم پر بوسے دے رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ پاؤں' سینہ اور پور پور چوم رہی تھی۔ تب اچانک وہ دیوانی سی ہوگئی۔ وہ مڑی اور زخمی شیرنی کی طرح فوجیوں پر جھپٹی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں لمبے تڑنگے عینک پوش کرنل کی گردن دبوچی ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی..... تم نے میرا احسن مارا ہے۔ تم نے میرا بیٹا چھینا ہے'' وہ ہذیانی انداز میں چیختی چلی گئی۔ اہلکاروں نے ام ریاض کو تین اطراف سے جکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کرنل سے دور لے گئے۔ ایک کیپٹن نے ام ریاض کو طمانچہ مارا اور اسے دیوار کے ساتھ لگادیا۔ وہ مسلسل نوحہ کناں تھی۔

☆☆☆

احسن کی آخری رسومات ادا ہوئے تین ہفتے ہوچکے تھے۔ ایک شدید طوفان کے بعد حالات معمول پر آنا شروع ہوگئے تھے لیکن ام ریاض کے لیے حالات معمول پر نہیں آئے تھے۔ اسپتال میں شہید کی لاش شناخت کرنے کے بعد وہ اتنے کرب سے روئی چلائی تھی کہ اس کے گلے سے خون جاری ہوگیا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ اب تین ہفتے گزرنے کے بعد وہ گھر تو واپس آ گئی تھی لیکن اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے۔

ایک شام ڈاکٹر مشعال گھر لوٹے تو ان کے چہرے پر دبی دبی خوشی تھی۔ دروازہ بند کرکے وہ ام ریاض کے پاس آ بیٹھے۔ ام ریاض ان ہیلر کے ذریعے بمشکل سانس لے رہی تھی۔ مشعال نے حسبِ معمول اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بولے ''تیرے لیے خوش خبری ہے۔ ادمان سے ابونصیر کے ہاں آج پھر احسن کا فون آیا ہے۔ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ وہ اس بات پر بہت ''خوش'' ہے کہ اسرائیلی انتظامیہ اسے مردہ تصور کررہی ہے..... میں نے خود اس سے بات کی ہے۔ وہ تیری صحت کے بارے میں فکرمند تھا اور بار بار تیرا حال پوچھ رہا تھا۔''

ام ریاض کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک گئے ''خدا اس کو اپنی امان میں رکھے' جب کبھی اس سے ملو' میری طرف سے اس کی پیشانی پر تین بوسے ضرور دینا۔''

''یہ بوسے تم خود دینا'' مشعال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں مشعال! میرا وقت اب پورا ہوچکا ہے' اب زیادہ دن نہیں جیوں گی۔''

ام ریاض نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر وہ خوابناک آواز میں بولی ''تم نے زندگی بھر میری کردار نگاری کو نہیں سراہا' کیا اب بھی نہیں سراہو گے؟ کیا اب بھی نہیں کہو گے کہ میں ایک اچھی اداکارہ ہوں؟''

مشعال کی آنکھوں سے آنسو گرے اور اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر ام ریاض نے پھر آنکھیں موندلیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سا سکون تھا۔ اس کے ہونٹوں سے پھر خواب ناک آواز نکلی ''میں برسوں سے جس یادگار کردار کی تلاش میں تھی..... وہ میں نے ادا کردیا ہے..... میں نے کردیا ہے نا مشعال!'' اس نے پھر سوالیہ نظروں سے مشعال کی طرف دیکھا۔

مشعال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں ڈیئر! تم نے کردیا ہے۔ دیٹ واز اے ماسٹر پیس..... آف کورس' دیٹ واز اے ماسٹر پیس!''

اس واقعے کے قریباً چار دن بعد ام ریاض مرگئی۔ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر عجیب سی آسودگی تھی۔

اسد اور اس کے تینوں ساتھیوں نے نقاب پہن رکھے تھے۔ ان کی کیڈلک کار کوٹھی کی عقبی دیوار کے ساتھ رکی۔ انجن بند کرنے اور ہیڈ لائٹس بجھانے کے بعد وہ چاروں گاڑی سے اترے۔ اسد نے اپنے ساتھی ملک احمد عرف ملک الموت کو اشارہ کیا۔ اس نے پھرتی سے دیوار پھلانگی اور کوٹھی میں کود گیا۔ ذرا دیر بعد رکھوالی کے دو کتوں کے بولنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی سائلنسر لگے پسٹل سے تین گولیاں چلائی گئیں، کتوں کی آواز خاموش ہوگئی۔ دو سیکنڈ بعد عقبی دروازہ کھول دیا گیا اور اسد سمیت تینوں افراد دندناتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی جب کہ باقی تینوں سائلنسر لگے پستولوں سے مسلح تھے۔

سب سے پہلے دونوں چوکیداروں کو گولی ماری گئی پھر وہ

ارادے باندھ کر توڑ دینے والے ایک تاخیر پسند کا قصہ، اس کے ارادے مضبوط ہوئے تک دنیا اجڑ چکی تھی

طاہر جاوید مغل

تاخیر

ملک الموت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگیوں سے کھیلنے والے ایک سفاک و بے مہر نوجوان کا فسانۂ عبرت۔ ایک کمزور لمحہ اسے بھی کمزور کر گیا، اتنا ناتواں کہ کسی کا دل توڑنا بھی اسے گوارا نہ رہا پھر یہ ناتوانی اس کے لیے وہ سزا بن گئی کہ ازالے کی کوئی صورت نہ تھی۔



لوگ اندرونی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوگئے۔ ایک لحیم شحیم شخص چیختا ہوا ان کے سامنے آیا اس کے ہاتھ میں خود کار رائفل تھی۔ اسد کے اشارے پر ملک الموت نے اس کی کھوپڑی میں یکے بعد دیگرے تین گولیاں ٹھونک دیں۔ یہ گھر کا سربراہ سیٹھ انوار احمد تھا۔ اس کے بعد سیٹھ کے دو بیٹے اور ان کی بیویاں سامنے آئیں۔ مردوں کے چہرے تاریک تھے اور عورتیں ہذیانی انداز میں چلاتی چلی جارہی تھیں۔ پہلے دونوں نوجوانوں کو گولی ماری گئی۔ پھر ایک خاتون کی پیشانی میں سرخ بندیا نمودار ہوگئی۔ دوسری لڑکی غالباً ٹیلی فون استعمال کرنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف دوڑی تھی۔ اسد نے اسے بھی ڈھیر کردیا۔

باقی اہلِ خانہ کو کمروں سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ وہ گڑگڑا رہے تھے' قدموں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جان بخشی کے عوض اپنا سب کچھ دینے پر آمادہ تھے' مگر اسد اور اس کے ساتھیوں پر یہ سب کچھ بالکل بے اثر تھا۔ وہ ایسے مناظر سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ ان کے دل پتھر اور ضمیر مردہ ہوچکے تھے۔ وہ خطرناک دہشت گرد تھے اور قتل و غارت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اگلے چند سیکنڈ میں انہوں نے انوار احمد کے تمام اہلِ خانہ کو قتل کر ڈالا۔ کامن روم' ڈرائنگ روم اور بالائی منزل کو جانے والی سیڑھیاں مقتولین کے لہو سے سرخ ہوگئیں۔ مرنے والوں میں دو بچے بھی شامل تھے۔

ان کا کام مکمل ہوچکا تھا۔ آج رات انہیں یہی کام سونپا گیا تھا۔ ان کے گروہ کے سرغنہ نے انوار احمد اور اس کے اہلِ خانہ کی زندگی کی قیمت وصول کی تھی اور یہ قیمت دینے والا انوار احمد کا ایک کاروباری رقیب تھا۔

"FINISH" اسد نے پسٹل کی نال میں پھونک مارتے ہوئے ملک الموت سے پوچھا۔

"یس ماسٹر فنش" ملک عرف ملک الموت نے جواب دیا۔

مگر چند ہی سیکنڈ بعد اس کا جواب غلط ثابت ہوگیا۔ اسد کے ایک ساتھی نے سیڑھیوں کے نیچے جھانکا اور ایک لڑکی کو بالوں سے گھسیٹ کر اسد کے سامنے پھینک دیا۔ لڑکی کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال اس کے کولہوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ امیرانہ خد و خال والی ایک نرم و نازک اور خوبصورت دوشیزہ تھی۔ لیکن اسد صرف اور صرف ایک قاتل تھا۔ جس طرح کمان سے نکلنے والے تیر اور پستول سے نکلنے والی گولی کی آنکھ نہیں ہوتی اسی طرح اسد بھی شاید اپنے مقتول کو دیکھتا نہیں تھا۔ وہ صرف اسے مارتا تھا' لیکن نشانہ لینے کے لیے ایک بار تو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ اسد نے بھی ایک بار لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا اس کے پسٹل کا رخ لڑکی کی پیشانی کی طرف تھا اور سفاک انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہی لمحہ تھا جب اس کی نگاہیں لرزتی کانپتی لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں۔ ڈری سہمی اور ملتجی نگاہیں جن میں موت کا خوف اور زندگی کی خواہش منجمد سی ہوگئی تھی۔ وہ ایسی سحر کار آنکھیں تھیں کہ اسد کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی انگلی جو کبھی ٹریگر پر حرکت کرنے سے چوکی نہیں تھی آج چوک رہی تھی۔ اس نے بڑے بڑے معصوم جوان اور حسین لاشے گرائے تھے لیکن آج اس کی بلا خیز سفاکی کو نجانے کیا ہوا تھا' اسے محسوس ہوا کہ وہ رحم کا مرتکب ہونے والا ہے۔ اور پھر سچ مچ ایسا ہوگیا۔ رحم..... جو اس کی لغت میں جرم تھا' اس سے سرزد ہوگیا تھا۔ اس کا پسٹل والا ہاتھ' کونے میں سمٹی ہوئی نازک لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ اس کے ساتھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

○☆○

اسی ایک کمزور نازک سی لڑکی نے اسد کی کیمسٹری بدل کر رکھ دی۔ آناً فاناً اسد کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوگیا۔ اس لڑکی کا نام عنبرین تھا۔ اس کی حسین دلکشی نے اسد کے سنگلاخ سینے میں محبت کی ایک سرسبز کونپل کھلائی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کونپل ایک تناور درخت بن کر جھومنے لگی۔ سفاک مجرم اور بے رحم قاتل اسد کے دل میں یہ عجیب امنگ جاگی کہ وہ اس آہو چشم لڑکی کے سنگ ایک نئی زندگی شروع کرے۔ ایک ایسی زندگی جس پر جرم کا سایہ تک نہ ہو۔ جو ایک نارمل زندگی ہو۔ جس میں اسد ایک شوہر ہو اور عنبرین ایک بیوی۔ وہ محنت کرکے حق حلال کی روزی کمائے' شام کو تھکا ہارا گھر آئے' عنبرین ایک دلنشیں مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرے۔ ان کے آنگن میں چہکارتے ہوئے پھول کھلیں اور ایک خوبصورت کائنات ان کی پرسکون چار دیواری میں سمٹ آئے۔

یہ خواہش ایسے تند و تیز ریلے کی طرح اسد کے دل سے ٹکرائی کہ وہ چٹان صفت ہونے کے باوجود تنکے کی طرح اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا اور وہ ایسا کچھ کر گزرا جس کا اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے تصور بھی نہیں کیا تھا..... اسد کے لئے ایک نئے روپ میں عنبرین کے سامنے آنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ جس وقت اس نے

عنبرین کے والد کی کوٹھی میں واردات کی تھی وہ نقاب میں تھا۔ پھر جب وہ لوگ عنبرین کو کوٹھی سے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لائے تھے اس وقت بھی اسد اور اس کے ساتھیوں نے نقاب نہیں اتارے تھے۔ عنبرین اب اسد کے ڈیرے پر تھی لیکن اس کی صورت سے قطعاً ناواقف تھی۔ ایک دن اسد نے اپنے ساتھی ملک احمد کو اپنا ہم راز بنایا اور وہ سب کچھ کر گزرا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دیگر دو ساتھیوں کو کسی کام سے لاہور سے باہر بھیج دیا پھر اس نے بازار سے اپنے لیے بڑے مناسب سے کپڑے خریدے۔ حجامت وغیرہ کروائی، نہایا دھویا اور اپنے ہی ڈیرے پر ایک نئے روپ میں پہنچ گیا۔ اس نے چابی لگا کر اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں عنبرین کو محبوس رکھا گیا تھا۔ خوف زدہ عنبرین اپنے سامنے پینٹ شرٹ والے ایک عام سے نوجوان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اسد نے ہیجانی لہجے میں کہا "چلو آؤ، میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ وہ ڈاکو یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ انہیں پولیس کے چھاپے کا ڈر تھا لیکن پولیس ابھی تک نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے آنے کی اطلاع غلط ہو اور وہ پھر آجائیں۔"

"لل.... لیکن۔" عنبرین ہکلائی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر دیر کرو گی تو پھر پھنس جاؤ گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔"

اسد عنبرین کو اپنی ہی حراست سے نکال کر لے آیا تھا۔ باہر آکر دونوں نے ایک ٹیکسی پکڑی تھی اور سیدھے اسٹیشن پہنچے تھے۔ اسد کسی نہ کسی طرح عنبرین کو راولپنڈی لے آیا۔

یہاں ملک احمد سارا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا۔ ایک غیر معروف علاقے میں اس نے ایک مناسب سا مکان کرایے پر لے لیا تھا اور وہاں روز مرہ ضروریات کی اشیا بھی جمع کرلی تھیں۔ اسد نے ملک احمد کا تعارف اپنے دیرینہ دوست کے طور پر کرایا۔ ایسا دوست جو اس مشکل وقت میں ان دونوں کی مدد کے لیے تیار تھا اور ہر طرح قابلِ بھروسا بھی تھا۔

چند دن وہ تینوں وہاں اکٹھے رہے۔ عنبرین اس دوران میں اسد پر خاطر خواہ بھروسا کرنے لگی۔ اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اسد اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسد نے عنبرین کو اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ اس چار دیواری سے باہر اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ان لوگوں کا خطرہ جنہوں نے اس کے والد اور پورے خاندان کو قتل کیا تھا۔ کرپٹ پولیس کی طرف سے خطرہ اور بگڑے تگڑے معاشرے کی طرف سے خطرہ۔ ویسے بھی عنبرین کا بچا کون تھا جس کی پناہ میں جانے کی اسے آرزو ہوتی، والد، بھائی، بھابیاں، چچا سب ہی تو اس منحوس رات کو جان ہار گئے تھے۔ اسے اسد کی "مہربان" ذات کی شکل میں ایک پناہ گاہ اور ایک حفاظتی حصار نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسد کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔

اسد نے عنبرین سے شادی کرلی اور ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زندگی میں ملک احمد بھی اس کا شریکِ سفر تھا۔ ایک باوفا دوست کی طرح وہ قدم قدم پر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسد نے محنت کر کے حق حلال کی کمائی سے ایک گمنام علاقے میں جنرل اسٹور کھول لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ جنرل اسٹور ایک چھوٹے پیمانے کا ڈپارٹمنٹل اسٹور بن گیا۔ عنبرین کی محبت اور دلنشیں قربت نے اسد کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی خوب صورت داڑھی بھی تھی۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ نہایت نفیس نظر آتا تھا۔ ایک خوں خوار انسان کے اندر سے ایک ایسا خوب صورت انسان برآمد ہوا تھا کہ کبھی کبھی اسد کو بھی اپنے اوپر

مرد حضرات ہی پڑھیں

آپ بھی بے پناہ قوت کے مالک بن سکتے ہیں

دیکھا گیا ہے کہ افریقی گوریلے میں اتنی بے پناہ قوت ہوتی ہے کہ وہ شیر کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیتا ہے جرمن سائنسدانوں نے اسکی قوت کے اس راز پر برسوں تحقیق کی اور کئی ناکارہ بوڑھوں کے جسم میں بندر کے غدود وں کی کامیاب پیوندکاری کر کے جوان مرد بنا دیا۔ انگریز سائنسدانوں نے گوریلے کی خوراک میں شامل قیمتی جڑی بوٹیوں کا سالہا سال اپنی لیبارٹریوں میں تجزیہ کر کے اسے کمزور نوجوان جو خاص کمزوری میں مبتلا تھے ایک ایک ہفتہ آزما کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ جوہر بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے اب ہم اس جوہر کو نسخے کی شکل میں آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں اس جوہر کو مزید جانچ پڑتال کے بعد پاکستانی آب و ہوا کے مطابق بنا دیا گیا ہے اس نسخے کے استعمال سے آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے رگ رگ میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی ہے اور رگ پٹھوں میں نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائیں گی جن سے آپ ایک مدت تک محروم رہے۔

آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

ایم۔ کے لیبارٹریز

پوسٹ بکس 2479 کراچی 74600 پاکستان

تعجب ہونے لگتا تھا۔ عنبرین بھی اسد کے ساتھ خوش تھی۔ تاہم اکثر وہ بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہوجاتی تھی۔ اسد سے اور اردگرد کے ماحول سے کہیں بہت دور چلی جاتی تھی۔ ایسے میں اس کی خوب صورت آنکھوں میں کچھ خونچکاں مناظر کا عکس نظر آنے لگتا تھا۔ والد کا خون آلود جسم' بھائیوں اور بھابیوں کے چھلنی لاشے' گولیوں کے شعلے اور نقابوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ وہ کون تھا؟ جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کے ہنستے بستے گھر پر شب خون مارا تھا اور سب کچھ ملیامیٹ کردیا تھا۔ کاش وہ اس کو بھی مار ڈالتا۔ وہ اسے موت کے بالکل قریب لے جاکر واپس لے آیا تھا۔ ساری زندگی اپنے پیاروں کی یاد میں تڑپنے کے لیے اسے زندہ درگور کرگیا تھا۔

اسد نے چند بار اس حوالے سے عنبرین سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ ذکر چھیڑتے ہی عنبرین کی حالت غیر ہونے لگتی تھی۔ اس کا جسم کانپتا تھا' ہونٹ نیلے سے ہوجاتے تھے اور حسین آنکھوں میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آتا تھا۔ ایک دن اس نے ہاتھ جوڑ کر اسد سے کہہ دیا تھا "پلیز اسد! مجھ پر ترس کھائیں۔ میرے سامنے یہ بات نہ چھیڑا کریں۔ میں آپ کی محبت کے سہارے وہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کررہی ہوں' آپ یہ ذکر چھیڑتے ہیں تو میرے زخموں سے خون نکلنے لگتا ہے۔"

کہنے کو تو وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کررہی ہے لیکن اسد جانتا تھا کہ تنہائی ملتے ہی وہ اپنے پیاروں کی تصویروں کا خیالی البم نگاہوں کے سامنے سجا کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرسکتی تھی جنہوں نے اس کے گھرانے کو خون میں نہلایا تھا۔ وہ افراد یقیناً اس کے لیے دنیا کے سب سے قابل نفرت انسان تھے۔ اس واقعے کے حوالے سے کچھ ایسی ہی کیفیت اسد کی بھی تھی۔ وہ بھی کوشش کے باوجود کچھ بھی بھول نہیں پارہا تھا۔ اس نے بڑی بے دردی سے بے شمار قتل کیے تھے لیکن یہ آخری چند قتل اس کے دل کا داغ بن گئے تھے' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مقتولوں کا تعلق اس ہستی سے تھا جو اسد کو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی' یعنی عنبرین۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اسد کے دل و دماغ پر بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ کئی بار اس کے دل میں یہ آئی کہ وہ سب کچھ عنبرین کے گوش گزار کردے۔ اس کے سامنے اپنا ہر جرم قبول لے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے' لیکن ہر بار جب اس نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہا ایک بلند و بالا دیوار اس کے سامنے آگئی۔ وہ ریزہ ریزہ ہونے کے بعد جڑا تھا' اس میں اب اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ عنبرین کی محبت سے محروم ہوکر پھر سے ریزہ ریزہ ہوجاتا۔ وہ بڑا سخت دل تھا' اس نے مشکلات کی بڑی بڑی چوٹیاں سر کی تھیں مگر اعتراف جرم کی یہ چوٹی سر کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس نے ارادہ کیا کہ پہلا بچہ پیدا ہوجائے تو پھر وہ عنبرین کو سب کچھ بتادے گا مگر پہلا بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اندر یہ ہمت پیدا نہ کرسکا پھر اس نے یہ کام دوسرے بچے کی پیدائش تک کے لیے اٹھا رکھا' دوسرا بچہ پیدا ہوا لیکن اسد اعترافِ جرم کی گھاٹی پھر بھی سر نہ کرسکا۔ دو بچوں کے بعد بھی عنبرین سے اس کی محبت روز اول کی طرح قائم تھی بلکہ شاید اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ اس کی صورت اور سیرت کا شیدائی تھا اور اس کی محبت کی شدت اسے طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اس کا کام پھل پھول رہا تھا۔ گھر میں خوش حالی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر خدا کا ایک اور احسان ہوا تھا۔ وہ اب تک پولیس کے علاوہ اپنے گروہ کی نظروں سے بھی محفوظ تھا۔ اس کا طوفانی ماضی اس کے پرسکون حال کو گزند پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔ درحقیقت اسد نے اپنی زندگی کو ایک غیر معروف علاقے کی چند غیر معروف گلیوں تک محدود رکھا تھا۔ وہ کہیں آتا جاتا نہیں تھا اور نہ اس کے بیوی بچے کہیں آتے جاتے تھے۔ ان دونوں کو آنے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عنبرین کی طرح اسد کا بھی کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہ ایک تنہا شخص تھا اور اس نے تنہا عنبرین کے ساتھ مل کر ایک ایسی دنیا آباد کی تھی کہ جو محدود ہونے کے باوجود اپنی جگہ بے حد بارونق اور مکمل تھی۔

ہاں ملک احمد کی بات مختلف تھی۔ وہ خود کو اس نئی صورت حال میں ایڈجسٹ نہیں کرپایا تھا۔ شروع میں تو اس کا خیال تھا کہ جوانی کا جوش ہے جو جلد ہی اتر جائے گا۔ اسد کا دل عنبرین سے بھر جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سال دو سال لگ جائیں گے۔ آزاد فضاؤں میں اڑنے والا عقاب' محدود زندگی کے پنجرے سے اکتا کر پھر آزاد فضاؤں میں لوٹ جائے گا.... لیکن آہستہ آہستہ ملک احمد پر اصل صورتِ حال واضح ہونے لگی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسد اپنی نئی زندگی میں گم ہوتا چلا جارہا ہے۔ عنبرین جس کی حیثیت داشتہ کی ہونی چاہیے تھی "محبوب شریکِ حیات" کی حیثیت اختیار کرچکی تھی اور محبت کا بھوت اسد کے سر سے اترنے کے بجائے اس کے جسم کے ہر ہر ریشے میں سرایت کرتا چلا جارہا تھا۔ اس

نے اپنے طور پر اسد کو سمجھانا بجھانا شروع کردیا تھا۔ وہ اسے بڑی بے تکلفی سے کنویں کا مینڈک کہنے لگا تھا اور کنویں سے نکل کر حسین و جمیل پر ہنگام زندگی کی طرف لوٹنے کے مشورے دے رہا تھا۔ ان مشوروں کے جواب میں اسد اسے شادی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا اور اس کی طرح ایک پرسکون دنیا بسانے کی تلقین کررہا تھا۔ کئی ماہ یہ کشمکش جاری رہی۔ دونوں دوست اپنے اپنے موقف پر قائم تھے۔ دھیرے دھیرے اسد کو محسوس ہونے لگا کہ ان دونوں کے راستے بدل رہے ہیں۔

پرعیش و پرہنگام ماضی ملک احمد کو اپنی طرف کشش کررہا تھا اور یہ کشش اتنی شدید تھی کہ کسی عنبرین جیسی سحرکار ساتھی کے بغیر اس کی مزاحمت ناممکن تھی اور پھر ایک روز ایک طویل بحث کے بعد اسد اور ملک احمد میں تلخ کلامی ہوئی۔ اس واقعے کے ٹھیک دو روز بعد ملک احمد نے بڑی خاموشی سے اپنا راستہ جدا کرلیا۔ اسد جب رات گئے اپنے اسٹور سے واپس آیا تو عنبرین کی زبانی اسے پتا چلا کہ ملک احمد گھر چھوڑ کر جاچکا ہے۔

اسد کی زندگی ایک بار پھر زبردست اتھل پتھل کا شکار ہوگئی۔ ملک احمد کے جانے کے بعد وہ شدید عدم تحفظ کا شکار ہوگیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ملک احمد جرم کی اسی پرانی دنیا میں لوٹا ہوگا جہاں سے ڈھائی تین سال پہلے آیا تھا۔ اس کا یوں لوٹنا کئی طرح سے اسد کے لیے خطرے کا باعث تھا۔ اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دے گا۔

اس نے جتنی تیزی سے فیصلہ کیا تھا اتنی ہی تیزی سے اس پر عمل بھی کیا۔ تین چار دن کے اندر وہ راولپنڈی کے اس محلے سے اٹھا اور ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ وہاں اندرون شہر اس نے ایک مکان کرایے پر لیا اور ساتھ ہی دکان بھی خریدلی۔ جمی جمائی زندگی کو چھوڑ کر نئی جگہ آباد ہونا جان جوکھم کا کام تھا مگر عنبرین اور بچوں کی محبت نے اسد میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا کر رکھا تھا۔ اس پہاڑ کے سامنے ہر مشکل اسے حقیر نظر آتی تھی۔ دو تین ماہ میں وہ اس نئی جگہ پر بھی سیٹ ہوگیا۔ بعض اوقات بظاہر حوصلہ پست کرنے والے واقعات انسان کے لیے غیر معمولی بہتری کا باعث بن جاتے ہیں۔ ایبٹ آباد میں گو بہت سی دشواریاں پیش آئیں لیکن جلد ہی حالات موافق ہونے لگے۔ اس نئی جگہ پر اسد کا کاروبار زیادہ تیزی سے پھلنا پھولنا شروع ہوا۔ وہ ایک ٹھیک ٹھاک ڈپارٹمنٹل اسٹور کا مالک بن گیا۔ اسی دوران میں اس کے ہاں تیسرے بچے کی ولادت بھی ہوچکی تھی۔ اسد نے عنبرین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینے کا مشکل ترین کام تیسرے بچے کی ولادت تک کے لیے اٹھا رکھا تھا لیکن جس طرح وہ دو مرتبہ پہلے ناکام ہوا تھا' تیسری مرتبہ بھی ناکام رہا۔ وہ جب بھی اس بارے میں سوچتا تھا اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ خوفناک سچ بول کر اپنا بہت کچھ گنوا دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ عنبرین کے مندمل زخموں سے بھی کھرنڈ اس طرح اتریں گے کہ وہ سرتاپا زخم بن جائے گی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ سچ بولنا چاہتا تھا لیکن یہ سچ اس سے جو بھاری قیمت طلب کررہا تھا وہ اس کے لیے ادا کرنا ممکن نہیں تھی۔ عنبرین اور بچوں کے بغیر ایک دن بھی گزارنا اس کے لیے مشکل تھا۔ درحقیقت جب سے عنبرین اس کی زندگی میں آئی تھی' دونوں ایک رات کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اب اگر اسد کسی شدید مجبوری کے تحت کہیں آنے جانے کا سوچتا بھی تو

اللہ نہ کرے

اتفاق سے آفاقی صاحب کو چھ سات ماہ بعد ہی دوبارہ انگلینڈ جانا پڑا۔ وہ سکون کی تلاش میں اس بار بھی دیہی علاقے کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے۔ انہوں نے دیکھا بورڈنگ ہاؤس کی مالکن مارگریٹ ایک بچہ گود میں اٹھائے ہوئے تھی۔

"بڑی خوشی ہوئی مارگریٹ...!" آفاقی صاحب نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا "ہم پچھلی مرتبہ آئے تھے تو ہمیں شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ تم امید سے ہو۔"

"یہ میرا نہیں... میری بیٹی ہیلن کا بچہ ہے" مارگریٹ نے ان کی غلط فہمی دور کی۔

"ارے واہ... تو تم نے ہیلن کی شادی کردی!" آفاقی صاحب نے پہلے سے زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔

"توبہ کریں مسٹر ایفاکی... اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ ہیلن کی شادی کردوں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے" مارگریٹ بولی۔

عنبرین اور بچوں کی جدائی کا تصور ایک دیوار بن کر اس کے سامنے کھڑا ہوجاتا تھا۔

اس کا بڑا بچہ حمزہ اب چار سال کا ہوچکا تھا۔ اسد نے اسے ایک بڑے اچھے اسکول میں داخل کروایا تھا' گھر میں اس کے لیے قاری کا انتظام کروایا تھا اور اس کی تربیت پر بھرپور توجہ دینے کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ کسی حد تک اسی طرح ادا کرسکتا ہے کہ اپنے بچوں کو شریف شہری اور نہایت اعلیٰ انسان بنانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگادے۔ فرصت کے لمحات میں اپنے نئے گھر کی خوب صورت بالکونی میں بیٹھ کر اسد اور عنبرین اکثر اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ یہ دس مرلے کا گھر اسد نے حال ہی میں خریدا تھا اور میاں بیوی نے بڑے ذوق و شوق سے اس کی آرائش کی تھی۔ خاص طور سے اسد تو ہروقت اس گھر کو زیادہ آرام دہ اور زیادہ خوب صورت بنانے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا لیکن ان ساری مصروفیات کے دوران بھی وہ عذاب اپنی جگہ برقرار تھا۔ "جھوٹ" ایک بہت بڑا بوجھ بن گیا تھا اور یہ بوجھ ہروقت اس کے سینے میں اس کے دل کو مسلتا رہتا تھا۔

آخر ایک روز سب کچھ اسد کے بس سے باہر ہوگیا۔ ایک طویل سوچ بچار کے بعد اس نے ایک دن اچانک فیصلہ کرلیا کہ وہ اب کچھ بھی عنبرین سے نہیں چھپائے گا۔ اس روز اپنے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ اخبار کے بیرونی صفحے پر پڑی تھی۔ وہاں سیٹھ انوار کی پانچویں برسی کا اشتہار موجود تھا۔ یہ اشتہار ہر سال ان کی کمپنی کے چند دوستوں کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ دنیا سے چلے جانے والے کو یاد رکھنے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ اس اشتہار نے اسد کو یاد دلایا کہ آج سیٹھ انوار احمد کو قتل ہوئے پانچ برس ہوگئے ہیں۔ اپنے باپ اور دیگر اہل خانہ کی برسی کا دن عنبرین کو ہمیشہ اداس تر کردیا کرتا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج جاتی تھیں۔ وہ گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کراتی تھی اور ایک ہی دن میں ہفتوں کی بیمار نظر آنے لگتی تھی۔

اسد نے مصمم ارادہ کرلیا کہ آج رات وہ عنبرین سے اپنی زندگی کی اہم ترین گفتگو کرکے رہے گا۔ وہ ایک تاریک کمرے میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لگائے گا اور پھر آنسوؤں کے درمیان وہ سب کچھ کہہ ڈالے گا جو کہنا چاہتا ہے۔

لیکن اس شام وہ گھر گیا تو سب کچھ بدلا ہوا سا نظر آیا۔ نہ عنبرین نے سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ نہ گھر میں قرآن خوانی کے لیے جمع ہونے والی عورتوں کی جھلک نظر آئی۔ نہ حمزہ' شعیب اور ننھی آمنہ کے چہرے دکھائی دیے۔ گھر بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ اندرونی دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ ایک چابی اسد کے پاس بھی موجود تھی' وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور شدید پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی نہایت بری خبر کی اطلاع دے رہی تھی اور اس کا دل جیسے اندر سے رونا شروع ہوگیا تھا۔ ایک میز پر ایک بند لفافہ اس کا منتظر تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا اور صوفے پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

لکھا تھا "تمہارے گھر اور تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جارہی ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم کبھی میری یا بچوں کی صورت نہیں دیکھ سکو گے.... اور میرے خیال میں یہ تمہاری کم سے کم سزا ہے۔ آج سے دو سال پہلے تمہارا دوست ملک احمد تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن تم نہیں گئے۔ اس نے تمہاری اس بے وفائی کا بدلہ یوں لیا کہ جاتے جاتے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا گیا۔ ہاں اسد.... پچھلے دو سال سے مجھے یہ بات معلوم ہے کہ میں ایک انسان کے ساتھ نہیں سفاک درندے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ درندہ جس نے میرے والد' میرے بھائیوں' بھابیوں اور ان کے معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا' اور اس سے پہلے بھی وہ نجانے کتنے بے گناہوں کا خون اسی طرح بہا چکا ہے۔ میں نے کہا ہے ناں اسد! کہ یہ تمہاری کم سے کم سزا ہے کہ تم زندگی بھر میری اور بچوں کی صورت کو ترستے رہو.... میں نے کوشش کی تھی کہ تمہیں قدرے بہتر سزا دے سکوں لیکن اپنی فطری کم ہمتی کی وجہ سے اس فیصلے پر عمل نہ کرسکی۔ میری الماری کی دراز میں وہ زہر ابھی تک موجود ہے' جو کتے مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میں اس زہر کو تم پر استعمال نہ کرسکی لیکن اگر کبھی تمہیں اپنے "قابل فخر" ماضی پر بے تحاشا پیار آئے تو تم اس زہر کو استعمال کرسکتے ہو۔ خط ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور.... شاید تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہوجانے کے باوجود میں نے ڈیڑھ دو سال تک کس بات کا انتظار کیا۔ میں نے دو سال تک ایک وہم کا تعاقب کیا۔ میں نے اس سچ کا انتظار کیا جسے تمہارے ہونٹوں سے نکلنا تھا اور میرے کانوں تک پہنچنا تھا۔ میں دو سال تک تمہارے ہونٹوں کی طرف دیکھتی رہی ہوں۔ تمہارے اندر سے بلند

ہونے والی کسی نیک آواز کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا اسد وہ کسی طور قابل معافی نہیں تھا۔ نہ قانون کے لیے اور نہ معاشرے کے لیے لیکن میں سچ کہتی ہوں اگر تم ایک بار... صرف ایک بار میرے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیتے اور آئندہ زندگی میں اپنے ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھنے کا وعدہ کرلیتے تو میں اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر اور اپنے سارے آنسو پی کر' اپنی حد تک تمہیں معاف کردیتی۔ اس آس پر جی لیتی کہ شاید میری اس معافی سے ایک نئی زندگی کی شروعات ہوسکے' لیکن میرا انتظار رائگاں گیا۔ دو سال کے طویل انتظار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ گئی ہوں کہ میں ایک ایسے منافق بہروپیے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں جو کسی بھی وقت اپنے فریب کی چادر اتار کر اپنے اصلی وحشی روپ میں واپس آسکتا ہے۔ لہٰذا آج میں اور میرے بچے تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہیں۔"

○☆○

اگلے پانچ برس اسد نے جس طرح گزارے وہ کچھ اسے ہی معلوم تھا۔ ان پانچ برسوں کا ایک ایک پل وہ ایک سولی پر لٹکا رہا تھا۔ اس نے عنبرین اور اپنے بچوں کو تلاش کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے اختیار میں تھا بلکہ شاید وہ بھی جو اس کے اختیار سے بڑھ کر تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ایک سابقہ مجرم ہے اور قانون کی گرفت میں آسکتا ہے۔ اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں کی خاک چھانی۔ گنجان ترین علاقوں سے لے کر غیر آباد ترین جگہوں تک کا سفر کیا۔ جہاں کہیں سے اسے عنبرین اور بچوں کے بارے میں کوئی کھوج ملنے کی توقع تھی وہ وہاں تک پہنچا اور اپنے مقصد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا' کبھی گرجا' کبھی برسا' کبھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا' لیکن وہ تو یوں گئی تھی کہ کہیں نشان تک نہیں چھوڑا تھا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ تلاش کرنے والے کے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں وہ کسی کی تلاش میں پوری دنیا کو نہیں کھنگال سکتا۔ آخر ایک روز اسد کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں اور حوصلہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ اس نے خود سے مخاطب ہو کر کہا "اسد! عنبرین کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے خود کو قانون کے حوالے کردو اور پھانسی کا پھندا چوم کر ہجر کے اس ناقابلِ برداشت عذاب سے چھٹکارا پالو۔"

لیکن پھر اسے یہ حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا قانون کے چکروں میں الجھ کر اسے کئی ماہ بلکہ شاید کئی برس تک زندہ رہنا پڑے گا اور زندگی اب اس کے لیے قطعی ناقابل قبول تھی۔ ایسے میں اسے عنبرین کا وہ آخری تحفہ یاد آیا۔ وہی زہر جو عنبرین نے اسے دینا چاہا تھا اور جو اس کی الماری میں رکھا رہ گیا تھا۔ یہ زہر ابھی تک اسد کے پاس محفوظ تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک نکھری ہوئی شام تھی۔ ایسی ہی شاموں میں وہ اور عنبرین گھر کی بالکونی میں آرام کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر دور سرسبز ڈھلوانوں کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ آج بھی بالکونی میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بید کی بنی ہوئی خوب صورت میز پر ایک فریم شدہ تصویر رکھی تھی۔ یہ اس کی محبوب بیوی اور تینوں بچوں کا گروپ فوٹو تھا۔ وہ کچھ دیر تک اشک بار نظروں سے اس تصویر کو دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں سے کراہتی ہوئی آواز نکلی "عنبرین! میں جب تمہارا "وقت جدائی" یاد کرتا ہوں تو خود کو دنیا کا بدقسمت ترین انسان سمجھنے لگتا ہوں۔ یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں تو کیا ہے کہ جس وقت میں نے تم سے سچ بولنے کا فیصلہ کیا' عین اسی وقت تم نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ میں' جس شام تمہاری آرزو کے عین مطابق' اپنا سچ لے کر تمہارے پاس آیا' اسی شام تم مجھے "سزائے موت" دے کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہوگئیں۔ کاش میں نے سچ بولنے میں یہ تاخیر نہ کی ہوتی... یا کاش تم نے سزا دینے میں تھوڑی سی اور تاخیر کی ہوتی۔ آج پانچ برسوں بعد بدقسمتی کے شدید احساس کے ساتھ میں اس دنیا سے جارہا ہوں۔"

اس نے آخری بار فریم شدہ تصویر کی طرف دیکھا' ایک سسکی لی اور زہر پھانک لیا... اگلی صبح خودکشی کی خبر کے ساتھ اس کی تصویر اخبار میں موجود تھی۔

■

بے نیازی

نیویارک میں ایک فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر سے ایک عورت نے آواز دے کر پوچھا "کیا بات ہے...؟ کون ہے؟"

"بی بی! ہم پولیس والے ہیں۔ آپ کے شوہر کی لاش لے کر آئے ہیں۔ ان کے اوپر سے سڑک کوٹنے کا انجن گزر گیا تھا۔"

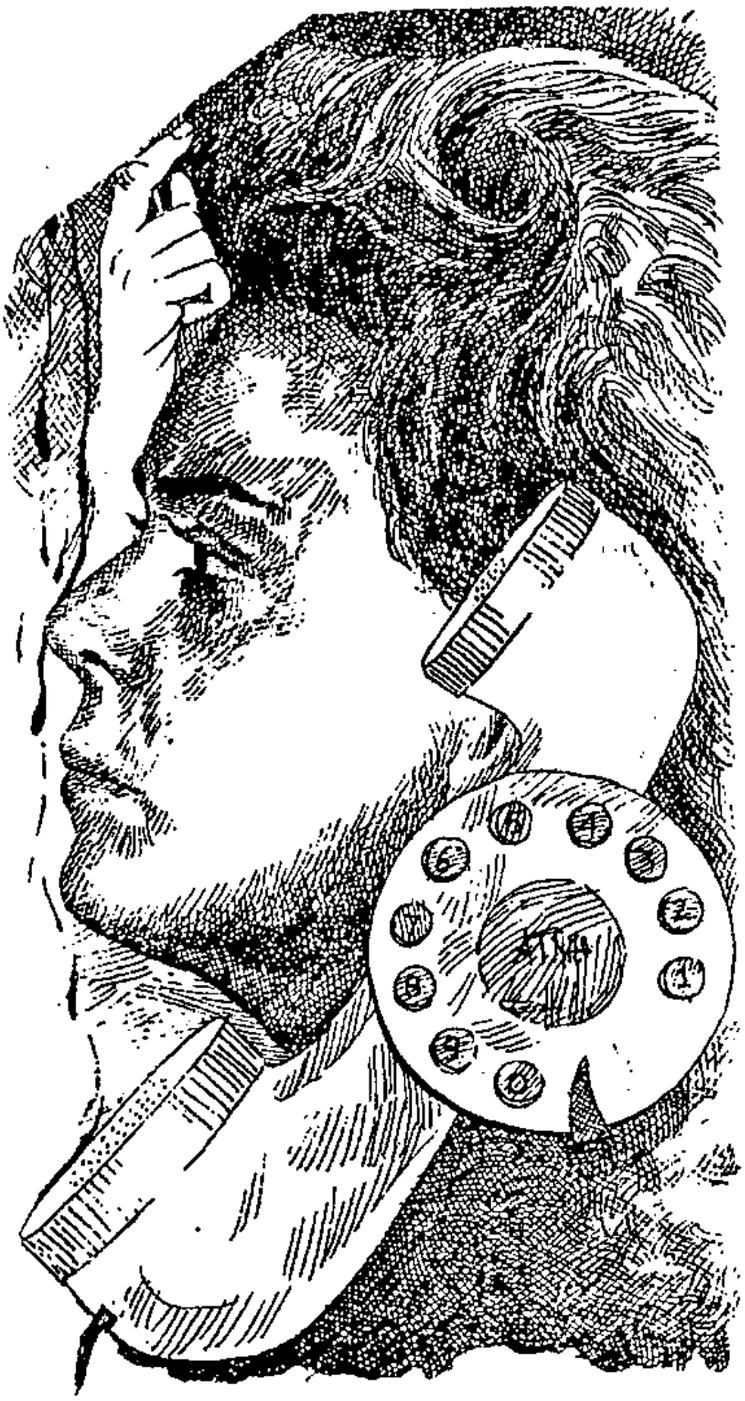
"تو پھر مجھے دروازے پر بلانا ضروری ہے کیا؟ دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دو" خاتون کی آواز آئی۔

طاہر جاوید مغل کی ایک تیکھی تحریر تارئین کے لئے بطور خاص

کھلونا

طاہر جاوید مغل

کوئی شے بری یا بھلی نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اسے برا یا اچھا بناتا ہے، اس کے پاس بھی ایک سہولت تھی جسے وہ کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتا تھا مگر یہ بھول گیا تھا کہ کبھی کوئی کھلونا اس سے بھی کھیل سکتا ہے۔



باسط کی عمر چوبیس سال کے قریب تھی۔ گھنے بال' روشن آنکھیں اور ستواں ناک .....وہ کسرتی جسم کا مالک تھا۔ ایم ایس سی کے بعد نوکری کی تلاش میں تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اچھی نوکری کی تلاش میں تھا۔ ایک دو جابز اسے آفر ہوئی تھیں۔ ایک میں تنخواہ اس کی مانگ سے کم تھی' دوسری میں اسے روزانہ لاہور سے باہر قریباً چالیس کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔

وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد صاحب کی لبرٹی مارکیٹ میں کپڑے کی دکان تھی۔ اب بڑے بھائی نے بھی اسی دکان کی ایک شاخ شادمان کالونی میں کھول لی تھی۔ بڑے بھائی اور والد کا رجحان مذہب کی طرف تھا مگر باسط کے سلسلے میں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ اس نے بال بڑھا رکھے تھے۔ جدید ترین فیشن کے کپڑے پہنتا تھا۔ پاپ میوزک سنتا تھا اور ہر ہفتے کی شام ہم خیال دوستوں کے ساتھ لاہور میں آوارہ گردی کرتا تھا۔

گھر کی بالائی منزل پر باسط کا کمرا' جو اکثر مقفل رہتا تھا' انواع واقسام کی تصویروں' رسالوں اور سی ڈیز سے بھرا ہوا تھا۔ ایک فون سیٹ بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ یہ علیحدہ فون لائن اس کے اپنے نام پر تھی۔

فون سے شغل کرنا باسط کی پسندیدہ ترین تفریح تھی۔ موبائل فون تو رہتا ہی ہر وقت اس کے ہاتھ میں تھا لیکن پی ٹی سی ایل کا فون بھی وہ کچھ کم استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو چسکا تار والے فون کے استعمال میں ہے' وہ ''بے تار والے'' فون کے استعمال میں نہیں۔ آواز کی کوالٹی' وقت کی فراوانی اور اس قسم کے دوسرے فوائد' تار والے فون سے ہی وابستہ تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ''فون'' باسط کے لیے ایک دل پسند کھلونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس کھلونے کے ان گنت استعمال جانتا تھا۔

کبھی کبھی باسط کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سرہانے رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ ایک بے جان شے نہیں ہے' یہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس میں زندگی دوڑتی ہے۔ بہ ظاہر اس ایک چھوٹی سی شے کے ذریعے وہ نہ صرف اس شہر' نہ صرف اس ملک بلکہ پوری دنیا کے ساتھ منسلک تھا۔ افریقا کی کسی بستی' امریکا کے کسی شہر کی کسی گلی یا یورپ کے کسی دور دراز گوشے سے اس کا رابطہ اس فون سیٹ کے ذریعے ہوسکتا تھا۔ اکثر وہ ایزی چیئر پر نیم دراز ہوکر اپنے کریم کلر کے فون سیٹ کو دیکھتا اور سوچتا' دنیا بھر میں اس وقت لاکھوں کروڑوں لوگ فون استعمال کررہے ہوں گے۔ اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک سے کوئی

شخص بھی سہوا اس فون سیٹ کی گھنٹی بجا سکتا ہے۔ اس طرح وہ بھی اس انٹرنیشنل لائن کے ذریعے جہاں اور جس جگہ چاہے رابطہ کر سکتا ہے۔

فرصت کے اوقات میں وہ اکثر اس فون سیٹ سے کھیلتا رہتا تھا۔ خاص طور سے رات دس اور بارہ بجے کے بعد۔ ان اوقات میں اندرون ملک کال کے ریٹس کافی کم ہو جاتے تھے اور لوکل کال تو تقریباً مفت ہی ہو جاتی تھی۔ ''رانگ نمبر'' ایک ایسی اصطلاح ہے جو لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں دخل اندازی کے ہزار ہا دروازے کھولتی ہے۔ سب کچھ فون کرنے والے کے اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ کس کو کب ڈسٹرب کرے گا' کتنی بار کرے گا اور کس انداز میں کرے گا۔ حالات ناموافق ہونے کی صورت میں فوراً اسم اعظم (سوری رانگ نمبر) کہہ کر جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ موافق حالات کی صورت میں اس رانگ نمبر کو جتنا چاہے طول دیا جا سکتا ہے۔

رات ہوتے ہی اکثر باسط کی انگلیاں بھی ڈائل پر گردش کرنے لگتی تھیں۔ وہ گھروں میں' گھروں کے بند کمروں میں اور خواب گاہوں میں داخل ہو جاتا تھا۔ مختلف آوازیں سنتا تھا۔ اونگھتی ہوئی' کسمساتی ہوئی' مسکراتی ہوئی' شعلے برساتی ہوئی' کچھ بہت بلند' کچھ دھیمی' کچھ سرگوشیوں کا انداز لیے ہوئے۔ کچھ کرخت ہوتی تھیں' کچھ نصیحت کا آہنگ لیے ہوئے' کچھ میٹھی میٹھی۔

بہر حال اس حوالے سے باسط کے کچھ اصول بھی تھے۔ وہ کسی شخص کو بار بار تنگ نہیں کرتا تھا۔ اگر کہیں سے جھاڑ پلائی جاتی تھی تو وہ خود بھی طیش میں نہیں آ جاتا تھا۔ اسے آواز سے ہی عورتوں کی عمر کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ اس کی گفتگو مختصر ہوتی تھی۔ لڑکیوں میں سے جو اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں' ان سے بات آگے بڑھاتا تھا .....لیکن یہ تعلق عموماً صرف دلچسپ گفتگو تک ہی رہتا تھا۔

پچھلے دو ڈھائی برس میں بہ مشکل دو یا تین لڑکیاں ہوں گی جن سے ''ٹیلی فونک تعلق'' کے بعد وہ بالمشافہ بھی ملا تھا۔ یہ دوستی دو تین ماہ چلی تھی اور پھر دوسری دوستیوں کے شور میں گم ہو گئی تھی۔

رانگ نمبر ظاہر ہے کہ غلط نمبر کو کہا جاتا ہے۔ مگر ایک روز اسی ''غلط نمبر'' نے باسط کو ایک ''صحیح فرد'' سے ملا دیا۔ یہ ایک لڑکی تھی' گریجویشن کر رہی تھی۔ اس کے والد ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کے مالک تھے۔ لڑکی نے اپنا نام شاہینہ بتایا۔ لڑکی کی آواز سے ہی باسط کی ''تجربے کار سماعت'' نے بہت سے اندازے لگا لیے تھے۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی' جسم چھریرا تھا' وسطی پنجاب کے لوگوں کی طرح رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔

شاہینہ کی گفتگو کے انداز اور لہجے کے لوچ نے باسط کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ جلد از جلد اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

''رانگ نمبر'' ملنے کے ٹھیک ایک ماہ بعد شاہینہ اور باسط کی ملاقات گلبرگ کے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ باسط نے شاہینہ کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

''تم بالکل دیسی ہی ہو جیسا میں نے سوچا تھا بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔''

''اب پتا نہیں تم نے کیا سوچا تھا۔'' وہ شرارت سے مسکرائی اور ساتھ ہی تھوڑا سا شرما بھی گئی۔

''یہ ایک گھسا پٹا جملہ ہے شاہینہ..... لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''پچھلے ماہ تمہاری پہلی ''ہیلو'' سن کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بہت باتونی ہو گے۔''

''پلیز شاہینہ! میری بات کو مذاق میں مت لینا۔ میں اب..... میں اب تمہارے بغیر رہ نہیں سکوں گا۔'' باسط نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

چائنیز ریسٹورنٹ میں شاہینہ اور باسط کی وہ ملاقات بعد ازاں ملاقاتوں کے ایک طویل سلسلے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ وہ دونوں ''لو برڈز'' کی طرح لاہور کی فضاؤں میں اڑتے رہے۔ تنہائی کی منڈیروں پر بیٹھتے رہے۔ قربت کے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتے رہے۔

غلط نمبر ملانے کی عادت نے باسط کو واقعی ایک نہایت درست لڑکی سے ملا دیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اس کے معیار کے مطابق تھی۔ باسط کی اولین خواہش تو یہ تھی کہ کسی طرح شاہینہ کا قرب حاصل ہو۔ وہ خاصے ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی کوئی ایسی چھوئی موئی نہیں تھی تاہم لڑکی تو تھی۔ گریز عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ شاہینہ بھی اپنی فطرت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دوسری طرف باسط نے بھی اپنی فطرت کا مظاہرہ شدّ و مد سے جاری رکھا۔ دھیرے دھیرے یہ سفر طے ہوتا گیا۔ وہ تنہائی میں ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ ایک دوسرے کو درجہ بہ درجہ دریافت کرنے لگے۔ تاہم یہ سب کچھ ایک حد میں رہتے ہوئے تھا۔

قریباً پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ بہار کا موسم ختم ہوا اور موسم گرما نے اپنے گرم پرخلق خدا پر پھیلا دیے۔ باسط نے کہیں سنا تھا کہ محبت ایک حرکت کرنے والی شے کا نام ہے۔

یہ کبھی رکتی نہیں یا غیر محسوس طور پر بڑھتی رہتی ہے یا کم ہوتی جاتی ہے۔ باسط کو بھی اپنے اندر تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں' وہ مطمئن نہیں تھا۔ شاہینہ کے ساتھ وہ قربت کے کئی درجے طے کر چکا تھا۔ مگر اب اس کے اندر کچھ اور طرح کی طلب پیدا ہو رہی تھی۔ وہ شاہینہ سے معاشی فائدہ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاہینہ کے والد اچھے خاصے کاروبار کے مالک تھے۔ باسط بھی معقول حد تک پڑھا لکھا تھا۔ اگر باسط کو فارماسیوٹیکل کمپنی میں اچھی سی نوکری مل جاتی تو وہ اپنا مستقبل سنوار سکتا تھا۔ تاہم باسط جانتا تھا کہ ابھی یہ بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اگر شاہینہ سے شادی ہو جاتی تو پھر یہ سارے مسائل خود بہ خود حل ہو جانا تھے۔

باسط نے شاہینہ یا اس کے والد سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو شاید یہ راہ' اچھی اور بری دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ اگر دو دوستوں میں سے کسی ایک کے دل میں کوئی منفی خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کا اثر دوسرے پر بھی پڑتا ہے۔ باسط نے اپنے دلی خیال کا اظہار کسی سے نہیں کیا مگر ایک دن ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے شاہینہ نے ایک عجیب بات کہی' وہ بولی ''باسط! ڈیڈی سے ملے تمہیں کتنے دن ہوئے ہیں؟''

''پندرہ بیس دن تو ہوئے ہوں گے۔ کمپنی میں انہوں نے جو افطاری کرائی تھی' اسی میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''اس وقت کوئی بات تو نہیں ہوئی تھی تم دونوں میں؟''

''نہیں' کوئی خاص بات تو نہیں۔''

وہ چند لمحے تک خاموشی سے سر جھکا کر میز کی شفاف سطح کو دیکھتی رہی پھر بولی ''ڈیڈی مجھ سے کبھی سخت لہجے میں نہیں بولے مگر کل بولے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک بات کہی ہے۔''

''بھئی پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔

شاہینہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''تمہیں پتا ہی ہے کہ ڈیڈی اپنے اصولوں کی پابندی کتنی سختی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ..... تمہیں..... میرا ہاتھ مانگنے سے پہلے' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر دکھانا پڑے گا۔''

''تو بھئی دکھا دیتے ہیں پاؤں پر کھڑے ہو کر' اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟'' باسط نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر باسط بولا ''شاہینہ! یہ دنیا کا دستور ہے کہ یہاں ایک ہاتھ دوسرے کو دھوتا ہے' ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور اسی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ اگر تمہارے ڈیڈی کی طرف سے.....''

''ہاں' ایک بات اور.....'' شاہینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''ڈیڈی ساری عمر سفارش اور رعایت وغیرہ کے سخت خلاف رہے ہیں۔ تمہارے سلسلے میں بھی ان کا کہنا یہی ہے کہ باسط نے جو کچھ کرنا ہے' اپنے بل بوتے پر کرے۔''

شاہینہ کی بات سن کر باسط کو یہی لگا کہ اس کے کرخت باپ نے ''ان دونوں کے تعلق'' کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

☆☆☆

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ شاہینہ اور باسط کے تعلقات بہ تدریج سرد مہری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ شاہینہ نے کافی کوشش کی' ہر طریقے سے باسط کو سمجھانے بجھانے اور ابھارنے کا چارہ کیا لیکن سب بے سود رہا۔ شاہینہ کو جسمانی طور پر فتح کرنے کی کچھ زیادہ خواہش باسط کے دل میں نہیں رہی تھی۔ اس کا اصل ٹارگٹ تو اپنی معاشی آسودگی تھی اور جب یہ ٹارگٹ ہی دور چلا گیا تھا تو پھر ایک گھسے پٹے راستے پر چلتے رہنے سے کیا فائدہ تھا۔

وہ خوبصورت تھا' جوان تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گفتگو کا فن جانتا تھا اور یہ ایسا ہنر تھا جو مشکل سے مشکل لڑکی کو شیشے میں اتار سکتا تھا۔ اس ہنر کو احسن طریقے سے استعمال کرنے کے لیے اس کے پاس وہ جادوئی آلہ تھا جسے لوگ عرفِ عام میں سیل فون کہتے ہیں اور اس سیل فون کے حوالے سے ایک اسمِ اعظم بھی اس کے پاس تھا..... سوری رانگ نمبر۔ شاہینہ کو نظر انداز کرنا ہی اب اس کے لیے بہتر تھا۔ وہ نئے راستوں پر چل کر نئی منزلوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ ان جہانوں کی طرف جانا چاہتا تھا جو ستاروں سے آگے ہوتے ہیں۔

جن دنوں شاہینہ کے ساتھ اس کا ''تعلق'' عروج پر تھا۔ اس نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ اب وہ کبھی ''فون'' کو ایک کھلونے کے طور پر استعمال نہیں کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ''فون'' کے ذریعے جو بہترین چیز حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اس نے کر لی ہے۔ یعنی شاہینہ تک پہنچ گیا ہے۔ اب فون سے کھیلنا ایک کارِ لاحاصل ہے۔ مگر اب بدلے ہوئے حالات میں ہر چیز بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر ایک رات ایسی آئی کہ وہ اور ''فون سیٹ'' ایک بار پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ رات کے بارہ بج

چکے تھے۔ نیا دن شروع ہو رہا تھا اور باسط کا نیا سفر بھی شروع ہو رہا تھا۔ شاہینہ کو الوداع کہنے کے بعد وہ اپنا بھولا بسرا مشغلہ پھر سے شروع کر رہا تھا۔ اہل خانہ نیچے والی منزل پر تھے۔ سب سے آخر میں بڑے بھائی سوتے تھے۔ وہ بھی نماز پڑھ کر سو چکے تھے۔

باسط نے ہزار ہا نمبروں میں سے یونہی ایک نمبر ملایا۔ یہ نمبر کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ کسی دکان کا' کسی گھر کا' کسی اونگھتی ہوئی ممی کا' کسی ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈیڈی کا' کسی استری کرتی ہوئی مہ جبین کا۔

یہ ایک غلط نمبر تھا اور اسی لیے ملایا گیا تھا کہ یہ غلط تھا..... اور کہا جاتا ہے کہ غلط نمبر کبھی اینگیج نہیں ملتا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غلط نمبر کبھی کبھی بہت ہی صحیح نمبر ثابت ہوتا ہے۔

یہ ایک موبائل نمبر تھا۔ چند سیکنڈ تک گھنٹی بجی' پھر دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز ابھری ''کون ہے؟''

''تت.....توفیق صاحب سے بات کرنی ہے۔'' باسط نے یونہی ایک نام لیا۔

''کون توفیق.....؟''

''یہ توفیق صاحب کا نمبر نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''اوہ۔ سوری رانگ نمبر۔'' باسط نے فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اگلا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا۔ دریائے راوی کے قریب ایک سنسان سڑک پر ایک کار تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ اس ہنڈا اکارڈ کا تعاقب ایک پولیس جیپ کر رہی تھی۔ یہ تند و تیز تعاقب قریباً پانچ منٹ جاری رہا۔ پھر پولیس جیپ سے کار پر یکے بعد دیگرے دو برسٹ چلائے گئے۔ کار کے پچھلے دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے اور وہ ڈگمگاتی ہوئی ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ کار میں سے دو سائے نکل کر دریا کی طرف بھاگے۔ اسی اثنا میں پولیس کی مزید گاڑیاں بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ بھاگنے والوں کو ذخیرے میں گھیر لیا گیا۔ آٹھ دس منٹ تک دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ کوئی فریق بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن آخر کار مفرور افراد کا ایمونیشن ختم ہو گیا۔ ان میں سے ایک موقع پر مارا گیا اور دوسرے کو شدید زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والا نامی گرامی مجرم اور دہشت گرد تھا۔ اس کا نام اکرام خاں تھا۔ وہ پولیس اور بہت سی خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ انٹرپول کو بھی مطلوب تھا۔ اس پر قتل' اغوا اور بم بلاسٹ وغیرہ کے لاتعداد مقدمات درج تھے۔

اکرام خاں بے حد تجربے کار اور گھاگ مجرم تھا۔ اس نے ڈھائی تین برس تک پولیس اور ایجنسیوں کو تگنی کا ناچ نچایا تھا۔ وہ بے حد صفائی اور منصوبہ بندی سے وارداتیں کرتا تھا۔ اس کی طرح اس کے ساتھی بھی کبھی منظر عام پر نہیں آ سکے تھے۔ اس کے مختلف نام تھے۔ وہ لوگوں سے ٹیلی فونک رابطے بھی کرتا تھا مگر بے حد احتیاط سے۔ وہ موبائل فون کی کوئی بھی سم ایک یا دو دن سے زیادہ استعمال نہیں کرتا تھا۔

اکرام خاں اسپتال پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد دم توڑ گیا۔ اس کی جیب سے جو موبائل فون برآمد ہوا وہ پولیس کے لیے بے حد اہم چیز تھا۔ آئندہ چند گھنٹے کے اندر ہونے والی تفتیش میں یہ فون اہم ترین کردار ادا کر سکتا تھا۔ موبائل فون پر کی جانے والی اور موصول ہونے والی کالوں کو نوٹ کیا گیا۔ یہ کل پانچ کالیں تھیں۔ آخری کال اکرام خاں کو رات بارہ بج کر ایک منٹ پر موصول ہوئی تھی۔ یہ پی ٹی سی ایل کے نمبر سے کی گئی تھی۔ کمپیوٹرائزڈ ڈائریکٹری کے مطابق اس فون لائن کے اونر کا نام تھا' باسط۔

ان واقعات سے بے خبر باسط اپنے بیڈ روم میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ سرہانے رکھے ہوئے آڈیو سسٹم پر مدھم آواز میں کسی انگلش گانے کی دھن بج رہی تھی۔ اطراف کی گلیوں میں تاریکی اور خاموشی تھی۔ اچانک اس خاموشی کو پولیس گاڑیوں کے چیختے چلاتے سائرنوں نے توڑ دیا۔ یہ ایک دو نہیں' درجن کے قریب گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں نے چاروں طرف سے ''حاجی منظور کپڑے والے'' کی کوٹھی کو گھیر لیا۔ رانگ نمبر کا کھیل بالآخر اپنی قیمت وصول کر چکا تھا۔

عبدالباسط اب جیل میں ہے۔ تفتیش کے عذاب سہتے اور مقدمے بھگتتے اب اسے دو سال ہو چکے ہیں۔ وہ کسی بڑی سزا سے بچ بھی گیا تو غالباً ابھی اسے کئی سال جیل میں گزارنا ہوں گے۔ ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے۔ بے گناہ کو اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوتی ہے' چاہے اس میں عمر گزر جائے۔

لیکن باسط کلی طور پر بے گناہ بھی تو نہیں ہے۔ اس نے ایک محبت بھرا دل توڑا ہے.....اور اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے دلوں کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

وہ غلط نمبر ڈائل کرتا تھا..... پھر غلط نمبر ڈائل کرتے کرتے اس نے ایک دن غلط ترین نمبر ڈائل کر دیا۔ شاید یہی مکافاتِ عمل ہے۔



درد عاقبت

طاہر جاوید مغل

ماضی کے بعض ڈراؤنے واقعات انسان کے لاشعور میں یوں جاگزیں ہوتے ہیں کہ مستقبل بھی ان کے زیر اثر آجاتا ہے۔ ایک ایسے ہی واقعے کی اثر آفرینی سے دوچار ڈاکٹر کا قصہ۔ اس کے مریض دردکش دوا کے انتظار میں تڑپتے ہی رہ گئے۔

انسانی نفسیات کی دشواریاں اور پیچیدگیاں نہایت سہولت سے لکھنے والے مصنف کے قلم سے

ڈاکٹر عارفہ کافی خوب صورت تھی۔ بول چال کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔ ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن وہ ہنستی ہی بہت کم تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر اگر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان نہ ہوتا تو اسے بہ آسانی حسین لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ یہ زخم ہلال نما تھا اور صرف اس وقت نظر آتا تھا جب وہ اپنا چہرہ ذرا اوپر اٹھاتی تھی۔ ٹھوڑی سے شروع ہو کر یہ زخم گردن تک چلا گیا تھا۔

ڈاکٹر عارفہ کی ڈیوٹی اکثر آرتھوپیڈک وارڈ میں لگتی تھی اور میری ڈیوٹی اکثر گائنی میں ہوتی تھی۔ یہ دونوں وارڈز پہلو بہ پہلو تھے۔ یوں اکثر ہم دونوں کو مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جن دنوں رات کی ڈیوٹی ہوتی' ڈاکٹرز روم میں ہمارے درمیان عموماً طویل گپ شپ ہوتی... یوں تو کسی کو جاننے کے لیے ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے لیکن بہرحال ان ملاقاتوں کے نتیجے میں' میں کسی نہ کسی حد تک عارفہ کو سمجھنے لگی تھی۔ وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ اور روکھی پھیکی لڑکی تھی۔ حقیقت پسندی اس کے مزاج پر یوں حاوی تھی کہ رومانیت کا دور دور سراغ نہیں ملتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی کے کچھ حسین پہلو بھی ہیں لیکن وہ زندگی کی ناہمواری اور تلخی پر زیادہ نظر رکھتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک زمانے میں انہی چیزوں کی بہتات تھی.... ساتھی ڈاکٹرز اور مریضوں وغیرہ کے ساتھ عارفہ کا رویہ بے حد سنجیدہ ہوتا تھا۔ وہ ٹو دا پوائنٹ بات کرتی تھی اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت موبائل فون پر بات کیا کرتی ہے جہاں عموماً مختصر ترین بات کی جاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا۔

پورے اسٹاف میں صرف میں تھی جس کے ساتھ عارفہ کی قدرے بے تکلفی تھی اور یہ میں ہی تھی جو کبھی کبھی عارفہ کو اس کی کسی بات پر ٹوک بھی دیتی تھی۔

ایک دن میں نے کہا "عارفہ! کبھی کبھی تم مریضوں کے ساتھ کافی بے رخی برتتی ہو۔ کل تمہارے وارڈ میں گھٹنے کے آپریشن والا وہ دیہاتی مریض کئی گھنٹے چیخ پکار کرتا رہا لیکن تم نے اسے پین کلر (SOS) نہیں دی۔ مجھے تو بڑا ترس آرہا تھا بے چارے پر۔"

"بھئی' اسے پرسوں معدے میں درد کی شکایت ہوئی تھی۔ میں پین کلر AVOID کرنا چاہ رہی تھی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "چلو اسے تو معدے کا درد تھا لیکن میں نے اکثر ایسے ہی دیکھا ہے۔ تم مریضوں کو پین کلر دینے سے کتراتی ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے...." میں کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ وہ اصرار کرنے لگی کہ میں اپنا جملہ مکمل کروں۔ میں نے کہا "برا نہ ماننا' کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تم مریضوں کو تنگ کرکے خوش ہوتی ہو۔ اس کا تماشا دیکھتی ہو۔"

یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو عارفہ اس سے لڑ پڑتی لیکن میری بات وہ کسی نہ کسی طور برداشت کرگئی۔ کچھ دیر گہری سوچ میں کھوئی رہی پھر بولی۔

"میں نے کبھی جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ بندے کو تھوڑی بہت تکلیف برداشت بھی کرنا چاہیے۔ تکلیف جھیلنا ایک فطری عمل ہے جب کہ چین کلر کھانا ایک اکتسابی فعل ہے۔"

میں نے کہا "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر عارفہ کے اندر ایک سائیکالوجسٹ گھسی بیٹھی ہے۔"

وہ کہیں کھو سی گئی پھر آہستگی سے بولی "اچھا کبھی تمہیں بتاؤں گی' اس بارے میں بھی۔"

"یعنی کوئی بات ہے اس کے پیچھے۔"

"کس کے پیچھے۔"

"تمہاری اس اذیت پسندی کے پیچھے۔"

"نہیں تم اسے اذیت پسندی تو نہ کہو۔ ہاں ایک رویہ ہے۔"

اس واقعے کے کوئی دو ہفتے بعد ایک روز جب ہم رات کی ڈیوٹی پر تھے اور دونوں وارڈز میں کوئی بھی "بے آرام" مریض نہیں تھا ہمارے درمیان پھر اسی موضوع پر بات چھڑ گئی۔ میں نے عارفہ کو یاد دلایا کہ وہ مجھے ایک واقعہ سنانے والی تھی۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ماضی کی دھند میں کھو گئی پھر اس نے کہانی سنانے والے انداز میں بولنا شروع کیا۔

"یہ آج سے قریباً چار سال پہلے کی بات ہے۔ میں ہاؤس جاب کر رہی تھی .... پروفیسر ڈاکٹر افتخار عثمانی ہمارے شعبے کے انچارج تھے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ وہ ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ سماجی خدمت کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ ان دنوں اکثر ایسے پروگرام ترتیب دیتے رہتے تھے کہ ہم میڈیکل اسٹاف کے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر دیہی علاقوں میں چلے جاتے اور عام لوگوں کا طبّی معائنہ کرتے۔ خاص طور پر بچوں پر توجہ دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی اسی طرح حفاظتی ٹیکے بھی لگانے کا پروگرام بھی ترتیب دیا جاتا تھا۔

ایک ایسے ہی موقع پر ہم چند ڈاکٹرز لاہور سے ساٹھ ستر میل دور جڑانوالہ کے علاقے میں پہنچے۔ یہ جولائی اگست کے دن تھے۔ دوسرے تیسرے روز بارش بھی ہو جاتی تھی۔ ہم بارش سے بچنے کے انتظامات سے لیس ہو کر آئے تھے۔ چھتریاں' رین کوٹ' فل بوٹ وغیرہ ہمارے پاس تھے لیکن پختہ سڑک سے کم از کم پانچ کلو میٹر دور باغ پور نامی گاؤں کے نزدیک ہمیں جس آفت نے گھیرا وہ بارش نہیں تھی... مطلع ابر آلود ضرور تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی لیکن جو کچھ ہوا' وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ہمیں کچھ دیہاتی دھان کے کھیتوں میں بھاگتے اور چیخ پکار کرتے نظر آئے پھر ایک سرپٹ بھاگتے تانگے سوار نے ہمیں بتایا کہ راوی دریا کا حفاظتی پشتہ ٹوٹ گیا ہے اور پانی کا سیلابی ریلا بڑی تیزی سے اس طرف آ رہا ہے ..... ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے کبھی ہمارا پالا نہیں پڑا تھا۔ ہمارے گروپ میں تین مرد اور دو لڑکیاں تھیں جن میں ایک میں تھی۔ میری ساتھی کا نام تابندہ تھا اور وہ خاصی نازک مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس نے باقاعدہ آنسو بہانے شروع کر دیے۔ ہم پیدل تھے۔ ہماری جیپ قریباً دو کلو میٹر پیچھے ایک زمیندار کے ڈیرے پر کھڑی تھی۔ ہم نہ آگے جا سکتے تھے' نہ پیچھے دوڑ سکتے تھے پھر ہمیں جلد ہی ایک پرہول گونج سنائی دی۔ یہ سیلابی ریلے کی گونج تھی۔ ہم قدرے نشیب میں تھے۔ سیلابی ریلا خوف ناک تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بھیانک منظر ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ سرخی مائل پانی کی لہریں تھیں جو نشیب و فراز کو ایک کرتی ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کمزور درخت پانی کی پہلی ہی ضرب سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور کھیتوں کی سبز رنگت پانی کی سرخی میں گم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک قدرے بلند جگہ کی طرف بھاگے۔ کھیتوں کے درمیان یہ ایک قدرتی ٹیلہ سا تھا لیکن ابھی ہم ٹیلے سے سو ڈیڑھ سو گز دور ہی تھے کہ پانی نے کسی عفریت کی طرح ہمیں آلیا۔ میں جانتی تھی کہ تابندہ کو بالکل تیرنا نہیں آتا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ تابندہ تو اناڑی تھی ہی' میری تیراکی بھی دھری کی دھری رہ گئی۔ سرکش پانی نے ہمیں اٹھایا اور تنکے کی طرح اپنے ساتھ بہانے لگا۔ وہ ایک ڈراؤنا خواب سا تھا۔ اس ڈراؤنے خواب میں مجھے بس ایک ہی بات یاد رہی کہ میں نے تابندہ کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اس کے ساتھ بہتی جا رہی ہوں۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے خود کو کسی گیلی سطح پر لیٹے پایا۔ میرے چاروں طرف ابھی تک پانی کا شور موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیکھا' تابندہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کے لمبے بال ایک جھاڑی میں الجھے ہوئے تھے اور نچلا دھڑ پانی میں تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ تابندہ کے بال جھاڑی سے چھڑائے اور اسے کھینچ کر پانی سے باہر نکالا۔ یہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ایک چبوترا سا تھا۔ ماہ و سال کی گردش نے اسے خستہ حال کر دیا تھا۔ یہاں دو تین قبروں کے مٹے مٹے نشانات بھی تھے۔ اس شکستہ چبوترے کو چاروں طرف سے جھاڑ جھنکاڑ نے گھیر رکھا تھا۔

میں نے تابندہ کو فوری طور پر طبّی امداد دی۔ اس کے پیٹ سے پانی نکالا اور اس کے سانس بحال کی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہونے لگی۔ یہی وقت تھا جب مجھے احساس ہوا کہ چبوترے پر ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ یہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ چبوترے پر اوندھے منہ پڑا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اپنے لباس اور حلیے سے وہ مقامی نظر آتا تھا۔ اس کے بال گھونگریالے تھے۔ ایک کان میں چاندی کی چھوٹی سی بالی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ناک چندی اینٹوں کو بھگو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بائیں کندھے سے بھی خون رس رہا تھا۔

تابندہ ہوش میں آ گئی تھی۔ میں جلدی سے اس شخص کے

پاس پہنچی۔ اسے دو تین بار پکارا تو وہ کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اب میں اس کی صورت دیکھ سکتی تھی۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کا تھا۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ سینے اور بازوؤں پر کالے سیاہ بال تھے۔ تنومند گردن اور جبڑوں کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مضبوط اعصاب کا مالک ایک سخت جان شخص ہے۔ خون اس کے سر سے بہہ رہا تھا لیکن وہ کندھے کی تکلیف کو زیادہ شدت سے محسوس کررہا تھا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے کندھے کو تھاما ہوا تھا اور اس کا رنگ فق ہورہا تھا۔

میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا "ملک امین کے ڈیرے پر کام کرتا ہوں۔"

"یہ چوٹ کیسے لگی؟" میں نے پوچھا۔

"پانی کا شور سن کر میں ملک کی گھوڑی کھولنے ڈھارے میں گیا تھا۔ ایک دم ساری چھت اوپر آن پڑی۔ لوہے کا گارڈر لگا ہے یہاں سر پر اور کندھے پر بھی۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"شکر کرو جان بچ گئی۔" میں نے کہا۔

"پتا نہیں کیسے بچا ہوں یہاں۔ اللہ ہی جانتا ہے۔"

تکلیف سے بے حال ہو کر وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ بری طرح کراہتے ہوئے بولا "اور آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "ہم دونوں ڈاکٹر ہیں۔ شہر سے یہاں آئی تھیں۔ حفاظتی ٹیکے وغیرہ لگانے کے لیے۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اللہ کرے وہ بھی خیر خیریت سے ہوں۔"

"اگر تم ڈاکٹر ہو تو میرا کچھ کرو۔ یہ کندھے کی تکلیف میری جان نکال دے گی۔"

میں نے اسے اوندھا لیٹنے کو کہا اور کندھے پر سے اس کی قمیص پھاڑ دی۔ کندھے کے پچھلے حصے میں گہری چوٹ آئی تھی اور یہ پورا حصہ نیلاہو رہا تھا۔ کٹ لگنے سے تھوڑا سا خون بھی رس رہا تھا لیکن اصل مسئلہ اندرونی چوٹ کا تھا۔ میں نے کندھے کو ہلایا۔ تو درد نے مضروب کو بے حال کردیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا اور آنکھیں زور سے میچ لی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کندھے کی پچھلی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ منسلک بالائی پسلیوں پر بھی شدید ضرب آئی تھی۔ سر پر بھی پچھلے حصے میں ہی زخم آیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ دونوں شدید چوٹیں آہنی گارڈر کی ایک ہی ضرب کا نتیجہ ہیں۔

میرے گلے میں ایک اسکارف موجود تھا۔ میں نے اس میں سے چند پٹیاں پھاڑیں۔ مضروب کے سر سے بہنے والا خون روکا اور پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد ایک پٹی کے ذریعے میں نے اس کا زخمی بازو گلے میں لٹکا دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ بازو کو کم سے کم حرکت دے... تابندہ بھی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ حیرت کی تصویر بنی کبھی میری طرف اور کبھی زخمی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں نے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے کوٹ کی ایک جیب میں چند دوائیں محفوظ رہی تھیں۔ ایک وائل کے سوا یہ سب کی سب ٹیبلٹس تھیں۔

○☆○

اگلے چوبیس گھنٹے ہم نے اس شکستہ چبوترے پر گزار دیے۔ وہ چبوترہ درحقیقت ٹھاٹیں مارتے ہوئے سیلابی پانی کے درمیان عافیت اور سلامتی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں ہم تین افراد نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی، پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اس پانی میں بس کہیں کہیں درختوں کے بالائی حصے دکھائی دیتے تھے یا کھیتوں کے درمیان واقع کسی پختہ کوٹھے کی چھت نظر آتی تھی۔ ایسا ایک تنہا کوٹھا ہم سے قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس کوٹھے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پانی کی گہرائی دس گیارہ فٹ سے کم نہیں ہے۔ جس تیسرے شخص نے ہمارے ساتھ اس شکستہ چبوترے پر پناہ لی تھی اس نے اپنا نام ریاض عرف راجو بتایا تھا۔ وہ درحقیقت ملک امین نامی زمیندار کا گن مین تھا۔ اس کے علاوہ زمیندار کے کتوں اور گھوڑوں کی رکھوالی وغیرہ بھی کرتا تھا۔ وہ باغ پور گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ باغ پور بھی یقیناً پورے کا پورا پانی میں ڈوب چکا تھا تاہم راجو کو اپنے گھربار کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس کی بیوی اپنے دو بچوں سمیت کئی ماہ سے روٹھ کر میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر میں بس بوڑھا والد تھا۔ راجو کو اس کی فکر نہ ہونے کے برابر تھی۔ فی الوقت اگر اسے کوئی فکر تھی تو وہ اپنے کندھے کی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں وہ مسلسل درد سے کراہتا رہا تھا۔ شاید پندرہ منٹ کے لیے بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس چھوٹے سے ویران "جزیرے" پر ہمیں کب تک رہنا ہے اور کیسے رہنا ہے۔ ہزارہا قسم کے اندیشے گھیرتے چلے جارہے تھے۔ خاص طور پر تابندہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ نازک مزاج اور بڑی حد تک کمزور دل لڑکی تھی۔ کل سے وہ درجنوں مرتبہ چپکے چپکے رو چکی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا تھا۔ ہمیں کچھ فاصلے پر ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اس ہیلی کاپٹر نے باغ پور گاؤں کی جانب دو تین چکر لگائے تھے پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز معدوم ہوگئی تھی۔ میری اور تابندہ کی یہ مراد بر نہیں آئی تھی کہ ہیلی کاپٹر اس چبوترے کی طرف سے بھی گزرے گا اور ہم ہاتھ وغیرہ ہلا کر پائلٹ کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں گے۔

آج دوپہر سے ذرا پہلے میں نے کچھ فاصلے پر پانی میں کوئی شے تیرتے ہوئے دیکھی تھی۔ دور سے یہ کوئی تھیلا سا نظر آتا تھا۔ یہ تھیلا پانی کے بہاؤ کے ساتھ دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ چبوترے کے نزدیک آگیا۔ اس کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دس بیس فٹ کی دوری سے گزر

جائے گا۔ یہ پولی تھین میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ تھا۔ یقیناً آج صبح سویرے یہ پیکٹ ہیلی کاپٹر سے گرائے گئے تھے اور ان میں سیلاب زدگان کے لیے کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ ریاض عرف راجو تو درد سے بے حال پڑا تھا اور مسلسل کراہ رہا تھا۔ اس سے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ میں نے تابندہ کے ساتھ مل کے ایک جھاڑی سے لمبی شاخ توڑی۔ میں تین چار فٹ تک پانی میں گئی اور شاخ کی مدد سے تھیلے کو چبوترے کے قریب کرلیا۔ اس تھیلے میں بھنے ہوئے چنے، بسکٹ اور دودھ کے پیکٹ تھے۔ یہ خوراک ہم احتیاط سے استعمال کرتے تو دو تین روز کے لیے کافی تھی۔

وہ سارا دن بھی راجو نے سخت بے چینی کے عالم میں گزارا۔ اس کے کندھے کے درد میں بالکل افاقہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی سخت جان شخص تھا اور میرے خیال میں سخت مزاج بھی تھا لیکن مسلسل درد نے اسے عاجز کرکے رکھ چھوڑا تھا۔ کسی وقت درد ذرا ہلکا ہوتا تو وہ ہم سے چند باتیں کرتا ورنہ اپنی ہی تکلیف سے لڑتا رہتا۔ نہ جانے کیوں یہ شخص مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال بتاتے تھے کہ وہ قابلِ بھروسا شخص نہیں ہے۔ اس ویران چبوترے پر طاقت کا توازن سراسر اس کے حق میں تھا۔ اگر اس کی نیت میں کسی طرح کا فتور آجاتا تو ہم دونوں لڑکیاں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں.... اور میں نے ایک دو بار اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک لپکتے ہوئے دیکھی بھی تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے اس "چبوترے کا ساتھی" نظر نہیں آیا تھا، ایک اجنبی شخص دکھائی دیا تھا۔ نہایت گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے بھنچے ہوئے سیاہی مائل ہونٹوں نے غیر ارادی طور پر ایک خاموش دھمکی دی تھی مجھے.... اب پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت میں یہ کوئی دھمکی ہی تھی۔

تابندہ کو زخمی راجو پر رہ رہ کر ترس آرہا تھا۔ میرے کوٹ کی جیب میں جو دوائیں پڑی رہ گئی تھیں، ان میں کوئی پین کلر نہیں تھی۔ تابندہ کئی بار ان ٹیبلٹس کو کھنگال چکی تھی کہ شاید کوئی ایک آدھ گولی درد کش دوا کی نکل آئے لیکن ایسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ شام کو جب راجو مسلسل کراہنے لگا تو وہ جھلا کر بولی "عارفہ! کچھ کرو اس کا.... میرا دم گھٹنے لگا ہے۔"

"تم ہی بتاؤ کیا کروں؟" میں نے کہا "اینٹی بائیوٹک گولیاں ہیں وہ دے رہے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں۔"

وہ سٹپٹا کر بولی "مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے دوسری دواؤں کے ساتھ دو لزان (پین کلر) کے دو پتے بھی لیے تھے۔ اب پتا نہیں وہ تمہارے کوٹ میں ڈالے تھے یا اپنے کوٹ میں۔"

اپنے ہی میں ڈالے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر کوٹ کی جیبیں کھنگالنے لگی۔ ایک دم چیخ سنائی دی۔ میں اور تابندہ لپک کر راجو کی طرف گئیں۔ لیٹنے کی کوشش میں اس کے کندھے کو دھچکا لگا تھا اور اس کے درد میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ہم اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ کندھے کا ورم پہلے سے کم تھا۔ جوڑ میں موومنٹ بھی موجود تھی مگر درد میں افاقہ نہیں تھا۔ دوپہر کو بسکٹ کا جو ڈبا تابندہ نے راجو کو دیا تھا وہ خالی پڑا تھا۔ اب اس کے چہرے پر پھر نقاہت نظر آرہی تھی۔ تابندہ نے اسے بھنے ہوئے چنے دیے۔ وہ چند منٹ میں چبا گیا۔ بعد ازاں دودھ کے دو پیکٹ پی کر اس کے چہرے پر تھوڑی سی رونق نمودار ہوئی۔ اگر اسے درد میں افاقہ ہوتا تو وہ یقیناً گہری نیند سو جاتا لیکن اب تو اونگھ بھی اس کی قسمت میں نہیں تھی۔

"ڈاکٹر، اتنی ساری دوائیں ہیں تیرے پاس۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اس درد کو کم کرسکے۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اگر ہوتی تو ہم تجھ سے چھپا کر رکھتے۔"

وہ بولا "یہ ساری دوائیں تھوڑی تھوڑی مجھے کھلا دو۔ ہوسکتا ہے کوئی کام کرجائے۔"

میں نے کہا "کام تو کوئی نہ کوئی ضرور کرے گی.... لیکن الٹا کام کرے گی۔ تم ہمیں صلواتیں سناؤ گے کہ جو تھوڑا بہت سکون تھا، وہ بھی غارت ہوگیا ہے۔"

"سکون کس بدبخت کو ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

وہ ساری رات بھی ہم نے کسی مدد کے انتظار میں سوتے جاگتے گزار دی۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ پانی کی سطح ذرا سی نیچی ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔ ایک دو بار پھر ہیلی کاپٹر کی دور افتادہ آواز سنائی دی تھی پھر ایک مرتبہ باغ پور گاؤں کی جانب موٹر لانچ کے انجن کا مدھم شور سنائی دیا تھا مگر یہ آوازیں ہمارے لیے کوئی "مدد" نہیں لاسکی تھیں۔ بارش سے ہمارے لباس بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے۔ راجو کے سامنے جاتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی تھی مگر کچھ بھی تھا، رہنا تو اسی مختصر سے چبوترے پر تھا۔ یہیں اٹھنا بیٹھنا تھا، یہیں لیٹنا تھا، یہیں سونا تھا۔

یہ تیسری رات کا واقعہ ہے۔ میں اپنا سفید کوٹ نیچے بچھا کر لیٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں دور تک ٹھاٹیں مارتے ہوئے پانی کی چمک نظر آتی تھی۔ جھاڑیوں کے پس منظر میں جھینگروں کا شور جیسے خاموشی ہی کا حصہ بن چکا تھا۔ تابندہ میرے قریب ہی سو رہی تھی۔ دس بارہ فٹ کی دوری پر راجو نیم دراز تھا۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی اس کے گلے سے کراہنے کی آواز "ہوں ہوں" کی صورت میں نکل رہی تھی۔

نیند سولی پر بھی آجاتی ہے لیٹے لیٹے میں بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ میں دیر تک سوئی۔ رات کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ چاند کی مدھم روشنی نظر آرہی تھی۔ تابندہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال ایک شانے پر آبشار کی طرح گر رہے تھے۔ تابندہ نے ہی میرا شانہ جھنجوڑ کر مجھے جگایا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کی جھلک تھی۔ "کیا بات ہے تابندہ۔" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کیسا جھوٹ؟"

"یہی کہ تمہارے پاس پین کلرز نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

تابندہ نے اپنی مٹھی کھولی۔ اس میں درد کش دوا دو لڑان کے دو پتے موجود تھے۔ "یہ میں نے تمہارے کوٹ کی اندر کی جیب سے نکالے ہیں۔" تابندہ نے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہی پھر چبوترے کی نیم پختہ دیوار سے ٹیک لگالی "ہاں میں مانتی ہوں کہ میں نے ان گولیوں کے بارے میں غلط بیانی کی تھی۔"

"لیکن کیوں؟ کیوں تم نے اتنی سنگ دلی کا ثبوت دیا۔ یہ شخص تین دن سے سخت درد میں مبتلا ہے۔ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم نے اس کی مدد نہیں کی۔"

میں نے کہا "تابندہ! تم بہت نرم مزاج اور سیدھی سادی لڑکی ہو لیکن یہ دنیا بہت ٹیڑھی ہے۔"

"تم کس ٹیڑھے پن کی بات کر رہی ہو۔"

"میں انسان کے اندر کے ٹیڑھے پن کی بات کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ میں نے تھوڑی بہت نفسیات بھی پڑھی ہے۔ اس رو سے میں کسی بھی اجنبی کو تم سے زیادہ جان سکتی ہوں۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟"

"نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ بعض حالات میں انسانی جبلتیں شدت سے بیدار ہوتی ہیں اور بعض حالات میں وہ نیم جان ہو کر سو جاتی ہیں۔ جیسے خوف میں غصہ نہیں آتا' نفرت میں پیار نہیں ہوتا... میں تمہیں ایک آسان اور حسب حال مثال دیتی ہوں۔ عورت کی طرف مرد کا رجحان ایک جبلت ہے لیکن شدید بھوک اور جسمانی تکلیف کی شکل میں یہ جبلت بیدار نہیں ہوتی۔ ایک بھوک سے نڈھال مرد' حسینۂ عالم کو نظر انداز کر کے روکھی سوکھی روٹی میں دلچسپی ظاہر کرے گا۔ اسی طرح جسمانی تکلیف میں مبتلا شخص کے لیے بھی جنس کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ اس کے لیے ایک بے کار چیز ہے۔ بقول کسے' جان ہے تو جہان ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات کچھ کچھ سمجھ رہی ہو.... یہ شخص ہمارے لیے اجنبی ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ اچھے کردار کا مالک نہیں۔ اس تنہا مقام پر اگر اس کی نیت میں فتور آجائے تو ہم دونوں مل کر بھی اس کی مزاحمت نہیں کر سکتیں لیکن اس کی جسمانی تکلیف نے اس کو زنجیر کر رکھا ہے۔ اس کی خواہشات درد میں دبی ہوئی ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ اپنی تکلیف کے علاوہ اس کا دھیان کسی اور طرف جاتا ہی نہیں۔"

ایک لمحے توقف کر کے میں نے کہا "میں یقین سے کہتی ہوں تابندہ کہ اگر یہ شخص تکلیف کے شکنجے میں نہ ہوتا تو اس ماحول میں اس کا ذہن اسے ضرور بھٹکا دیتا۔ یہاں ہماری فریاد سننے والا کون تھا۔ اس کا ایک بھرپور تھپڑ مجھے یا تمہیں بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھا۔"

میں نے تابندہ کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ میرے خیالات سے اتفاق کر رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی پریشانی بھی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے' تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔"

وہ بولی "اگر تمہاری باتیں درست ہیں تو پھر تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے تمہارے سونے کے بعد اسے دو لڑان کی دو گولیاں دے دی تھیں۔ وہ ڈھائی تین گھنٹے آرام سے لیٹا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ پھر دوا مانگ رہا تھا۔ میں نے دو گولیاں مزید کھلا دی ہیں۔" میں نے دو لڑان کے پتے دیکھے۔ تابندہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ایک پتے میں چار گولیاں موجود نہیں تھیں۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ راجو کی مسلسل "ہوں ہوں" سنائی



marksman

نہیں دے رہی تھی۔ مدھم چاندنی میں، میں نے غور سے دیکھا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ تیز اثر دوا نے اسے وقتی طور پر درد سے بالکل بیگانہ کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں پہلی بار راجو کو دیکھ کر مجھے اپنے جسم میں پھریری سی محسوس ہوئی۔ بہرطور میں نے اپنا خوف تابندہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تسلی تشفی کی باتیں ہی کرتی رہیں۔ میں نے تابندہ سے کہا کہ جو ہو چکا' وہ تو ہو چکا لیکن اب آئندہ ہمیں یہ غلطی نہیں دہرانی چاہیے۔ تابندہ کے چہرے پر بدستور خوف کے سائے تھے۔ وہ اپنی غلطی کو محسوس کر رہی تھی اور شاید دل ہی دل میں اپنی "نرم دلی" کو کوس بھی رہی تھی۔ موضوع سے دھیان ہٹانے کے لیے میں نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ رات کا آخری پہر ابھی باقی تھا۔ میں اور تابندہ لیٹ گئیں۔ تابندہ کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طرح کا خوف خود میرے اپنے دل میں بھی گھر کرتا چلا جا رہا تھا۔

نہ جانے میں کب تک نیم غنودگی کی کیفیت میں رہی۔ غالباً ڈیڑھ گھنٹے تو اس عالم میں گزرے ہی ہوں گے پھر ایک لرزہ خیز چیخ میرا دل دہلا دیا۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یہ چیخ تابندہ کی تھی۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ راجو کسی درندے کی طرح تابندہ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تابندہ کی مدد کے لیے بڑھی تو اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے پر رسید کیا۔ میں دور جا گری۔ یہاں درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی لٹھ نما شاخ میرے ہاتھ آ گئی۔ میں نے اس شاخ سے راجو پر حملہ کیا۔ میرا پہلا وار اس کے سینے پر لگا لیکن دوسرا اس نے بہ آسانی جھک کر بچا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے صحت مند ہاتھ سے جھٹکا دیا اور شاخ میرے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اوندھے منہ پختہ چبوترے پر گری۔ میری ٹھوڑی چبوترے کے کنارے سے ٹکرائی تھی۔ ٹھوڑی کا یہ زخم اسی بھیانک واقعے کی منحوس یادگار ہے۔ راجو نے لاٹھی نما شاخ سے مجھ پر بے دریغ حملہ کیا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس کے مہلک وار سے بچایا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ساتھ ساتھ میں تابندہ کو پکار رہی تھی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ بھی پانی میں چھلانگ لگا دے۔ ان پُرخوف لمحوں میں مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بے چاری تیر نہیں سکتی۔ میں سرد پانی میں تیرتی ہوئی چالیس پچاس گز آگے نکل آئی۔ اس وقت مجھے تابندہ کی چیخیں سنائی دیں اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ راجو کے شکنجے میں ہے۔ وہ شخص جو تین دن تک رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھا رہا تھا' اپنی تکلیف سے نجات پانے کے پانچ چھ گھنٹے بعد ہی خود "بے رحم" بن گیا تھا اور ایک بالکل مختلف روپ میں سامنے آیا تھا۔ اب تم اسے میری بزدلی کہو' بے حسی کہو یا کمزوری کہ میں واپس تابندہ کی مدد کو نہ جا سکی۔ اس کی دلدوز چیخیں پانی میں تیر کر مجھ تک پہنچتی رہیں اور میں اس تنہا کوٹھے کی طرف تیرتی رہی جس کی چھت کا کچھ حصہ پانی میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح اس چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ میرا جسم شل ہو چکا تھا اور ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون نے میرے کپڑوں کو رنگین کر دیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے ہیجانی انداز میں مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا لیکن آس پاس کوئی ہوتا تو پچھلے تین دنوں میں ہمیں نظر کیوں نہ آتا۔ وہاں خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اگر کچھ تھا تو وہ میں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک بے بس لڑکی کی چیخیں تھیں پھر دھیرے دھیرے یہ چیخیں بھی معدوم ہو گئیں۔"

روئداد سناتے سناتے عارفہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے تھوڑی دیر آنسو بہائے پھر اشکبار لہجے میں بولی "اگلے روز دوپہر کے وقت ایک موٹر بوٹ میری مدد کو پہنچی۔ اس میں فوجی سوار تھے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور اپنے مددگاروں کو بتانے لگی کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔

فوجی جوان چبوترے پر پہنچے۔ چبوترہ خالی تھا۔ تاہم قریب ہی پانی میں تابندہ کی لاش تیرتی ہوئی مل گئی۔ میں وہ منظر ساری زندگی بھول نہ سکوں گی۔ ریاض عرف راجو کو دو گھنٹے بعد ایک قریبی درخت پر سے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تیر کر فرار ہونے کی کوشش میں تھا لیکن زخمی کندھے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں جا سکا تھا.... بعد ازاں راجو پر آبروریزی اور قتل کا مقدمہ چلا۔ قریباً دو سال بعد اسے پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا۔

اپنی روئداد ختم کر کے عارفہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ کمرے میں اس کی مدھم سسکیاں گونجنے لگیں۔ میں بھی تادیر گم صم بیٹھی رہی پھر آرتھوپیڈک وارڈ میں موجود کوئی مریض درد سے کراہنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ شب کے سناٹے میں یہ آواز دور تک گونج رہی تھی "ڈاکٹر صاحبہ! مجھے درد کا انجکشن لگا دیں۔ ڈاکٹر صاحبہ خدا کے لیے۔ بہت درد ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحبہ۔"

نرس مریض کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ میری طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ڈاکٹر عارفہ اتنی جلدی مریض کی فریاد نہیں سنے گی۔ میں آنسو پونچھ کر تھکے تھکے انداز میں اٹھی اور مریض کے لیے درد کا انجکشن تیار کرنے لگی۔

▲

شاہد ملک سے میری دوستی کو صرف دس بارہ گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک خوش لباس اور خوش گفتار شخص تھا۔ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ عمر کوئی اٹھائیس برس رہی ہوگی' تاہم اس عمر میں ہی اس نے ترقی کی کئی منازل بڑی تیزی سے طے کی تھیں اور کافی بلندی پر کھڑا تھا۔ سیالکوٹ میں اس کے چار بڑے کارخانے تھے جن میں لیدر جیکٹس قسم کی اشیا بنائی جاتی تھیں اور برطانیہ امریکا وغیرہ میں سپلائی کی جاتی تھیں۔ وہ اتنا کامیاب جارہا تھا کہ اب پچھلے دو ڈھائی سال سے وہ صرف اور صرف ایکسپورٹ کوالٹی مال بنا رہا تھا۔

ہم دونوں امریکا سے براستہ فرینکفرٹ اور دبئی' لاہور آرہے تھے۔ میں وہاں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ نیویارک سے لاہور تک یہ ایک طویل سفر تھا اور اس میں ایک اچھے اور ہم مزاج ہم سفر کا ہونا ضروری تھا جو شاہد ملک کی صورت میں مجھے مل گیا تھا۔ نیویارک سے فرینکفرٹ تک ہم مسلسل گفتگو میں مصروف رہے تھے اور اب فرینکفرٹ کے شان دار ایر پورٹ پر نرم صوفوں میں دھنسے ہوئے اپنی رابطہ پرواز کا انتظار کررہے تھے جو دھند کی وجہ سے کچھ لیٹ تھی۔ کہانی کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ کوئی اچھی روداد سنتے ہوئے وقت بہت آسانی سے کٹتا ہے۔ دھیرے دھیرے میں شاہد کو بھی اپنے ڈھب پر لے آیا۔ میں نے کہا "شاہد صاحب! اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سنائیں۔"

وہ مسکرایا "میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کس طرف لے جارہے ہیں۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے ساتھ کوئی کہانی نتھی ہے۔"

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا "اتنے ہینڈسم اور مال دار نوجوان کے ساتھ کوئی کہانی وابستہ نہ ہو یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔"

"عجیب لگتا ہے لیکن ناممکن تو نہیں لگتا۔"

"ہاں ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا۔"

نفرت کی حنا طرِ محبت کرنے والی معصوم اور پاکباز لڑکی کی کتھا

طاہر جاوید مغل

انوکھا انتقام

محبت اور نفرت دو متضاد کیفیات ہیں۔ محبت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آفاقی جذبہ ہے جب کہ ذاتی انا اور خود پرستی کے جذبات کا نام نفرت ہے اور اگر ایسی نفرت سے محبت جنم لے تو گویا محب اپنے محبوب کی حنا طرا اپنی ذات کی نفی کردیتا ہے۔ اسی حقیقت کو آشکار کرتی محبت بھری نفرت کا پُراثر ماجرا۔



وہ بولا "چھوٹی موٹی کہانی تو ہر شخص کے ساتھ ہوتی ہے' میرے ساتھ بھی ہے۔ لیکن وہ خاصی مختصر اور غیر دلچسپ ہے۔"

میں نے کہا "ویسے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ضرور اپنی ہی کہانی سنائیں۔"

"یعنی آپ بیتی کے علاوہ جگ بیتی بھی چل جائے گی۔"

"بالکل چل جائے گی۔"

"تو پھر میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنا سکتا ہوں جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔"

"بسر و چشم۔" میں نے کہا۔

شاہد نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ذرا نیم دراز سا ہو گیا۔ لاؤنج کے دیوار گیر شیشے سے باہر دسمبر کی دھند آہستہ آہستہ مناظر کو دھندلاتی جا رہی تھی۔ شاہد نے کہنا شروع کیا۔

"عارفہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد ایک گورنمنٹ اسکول سے ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ بی ایڈ کر رہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی عثمان نے کمپیوٹر میں ماسٹرز کیا تھا اور ملازمت کی تلاش میں تھے۔ عارفہ اور اس کے بھائی عثمان میں کافی بے تکلفی تھی۔ اپنے بھائی کے دل کی باتیں عارفہ ایسے ہی جانتی تھی جیسے اپنے دل کی باتیں جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں' اپنی چاہت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی ان کے لیے محال ہے۔ وہ ان کے پڑوس کی ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام صنم تھا۔ خوب صورت تھی' پڑھی لکھی تھی۔ یہ لوگ کافی خوش حال تھے۔ علاقے میں ان کی کوٹھی سب سے بڑی اور شاندار تھی۔ گیراج میں دو گاڑیاں بھی کھڑی رہتی تھیں۔ صنم اور عثمان کے تعلق کا آغاز کوئی پانچ برس پیشتر ہوا تھا۔ دونوں گھروں کی چھتوں کے درمیان بس تین چار گھروں کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پھر روزانہ دیکھنے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے یہ تعلق آگے بڑھا۔ پہلے فون پر بات ہوئی پھر ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ان کا ملاپ آسان نہیں۔ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حیثیت اور مرتبے ہی کی تھی۔ صنم کے گھر والوں اور خاص طور سے اس کے والد کو اپنی حیثیت و مرتبے کا بہت احساس رہتا تھا۔ بے شک دونوں گھروں کے افراد ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے لیکن امیر اور غریب کے درمیان جو ایک فاصلہ سا ہوتا ہے وہ یہاں بھی برقرار تھا۔ ایک دوسرے کے ہاں کھانا بھیجا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت کی جاتی تھی۔ صنم کے والد چوہدری بشیر اور عثمان کے والد ماسٹر اختر صاحب اکثر گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے' مگر اس قربت میں بھی وہ ایک لکیر سی ضرور موجود رہتی تھی جو امارت کو سفید پوشی سے علیحدہ کرتی ہے۔

عارفہ' صنم کی سہیلی بن چکی تھی۔ کبھی کبھار عارفہ' صنم سے اپنے بھائی کے حوالے سے بھی بات کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صنم بھی اس کے بھائی سے بہت محبت کرتی ہے' مگر حالات اور معاشرے سے ٹکرانے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ بس موہوم سی امید تھی اس کے دل میں کہ شاید عثمان برسرِ روزگار ہو کر اپنے حالات کو بہتر بنا لے تو اس کے والدین اس رشتے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ اکثر عثمان سے کہتی رہتی تھی اور عارفہ کے ذریعے بھی پیغام بھیجتی تھی کہ عثمان جلد از جلد برسرِ روزگار ہونے کی کوشش کرے۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ چاہتی تھی کہ عثمان کا معیارِ زندگی بلند ہو اور وہ اس کے رشتے کے لیے اس کے والدین سے سر اٹھا کر بات کر سکے۔ اپنے بھائی کی رازداں ہونے کی حیثیت سے عارفہ یہ باتیں بھائی جان کے گوش گزار کر دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر عثمان بس اثبات میں سر ہلا دیتا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کروٹیں لیتا اور چہرے پر ڈرے ڈرے سائے لہرانے لگتے۔

اپنے بھائی کے چہرے پر لہراتے ہوئے یہ سائے عارفہ کو ہمیشہ بڑی اذیت پہنچاتے تھے۔ یہ اندیشوں کے سائے تھے' اور ان میں سب سے بڑا اندیشہ صنم کے کھو جانے کا تھا۔ یہ اندیشہ ہمہ وقت عثمان کو دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں وہ صنم کو کھو نہ بیٹھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گردشِ دوراں کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکے اور وقت کی رفتار صنم کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے جائے۔ عارفہ جانتی تھی کہ یہ اندیشہ کسی خونی جانور کی طرح بھائی جان کا پیچھا کیا کرتا ہے۔ اس اندیشے کی خوں خواری سے بچنے کے لیے بھائی جان اپنے ہاتھ میں اپنی ڈگریاں تھامے سارا سارا دن دفاتر کے چکر لگاتے ہیں' نوکریوں کے لیے انٹرویوز دیتے ہیں اور اخباروں میں خالی اسامیوں کے اشتہار ڈھونڈتے ہیں۔ یہ اندیشہ انہیں جلتی ہوئی دوپہروں میں تپتی ہوئی سڑکوں پر برہنہ پا بھگاتا رہتا تھا اور شاید اگر رات کو نیند آتی تھی تو وہ خواب میں بھی بھاگا ہی کرتے تھے۔ ہر صبح ان کی آنکھوں میں عارفہ کو طویل مسافتوں کی تھکن نظر آتی تھی۔

عارفہ کو بھی صنم بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ جھٹ پٹ دلہن بنا کر اسے اپنے گھر لے آتی۔ لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا بلکہ ان کے گھر میں کسی کے بس میں نہیں تھا۔ عارفہ' صنم سے چھ سات برس چھوٹی تھی پھر

بھی وہ صنم سے سہیلیوں کی طرح باتیں کرتی تھی' اور ایک بار یہ باتیں شروع ہوتیں تو گھنٹوں جاری رہتیں۔ ایک عجیب سا انس تھا اسے صنم سے۔ وہ اکثر دل کی گہرائیوں سے صنم اور بھائی جان کے لیے دعا کرتی۔

..... پھر ایک دن اسے پتا چلا کہ صنم کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ عارفہ کے دل پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک دن اس نے صنم سے تصدیق چاہی۔ صنم نے پژمردہ لہجے میں کہا "ہاں عارفہ! کچھ ایسی بات سن تو میں بھی رہی ہوں۔"

"پھر اب کیا ہوگا صنم باجی؟"

"میں کیا بتاؤں۔ میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہارے بھائی جان کے اسلام آباد والے انٹرویو کا کیا بنا؟"

عارفہ نے کہا "مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ اگر کچھ بنا ہوتا تو بتا دیتے۔"

"وہ تو اس انٹرویو سے بڑے پر امید تھے۔"

"وہ تو ہر دفعہ ہی بڑے پر امید ہوتے ہیں۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے بس امید ہی رہ جائے گی' باقی سب کچھ چلا جائے گا۔"

صنم سر جھکا کر خاموش ہوگئی تھی' عارفہ بھی چپ رہی تھی۔

عارفہ کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بھائی جان کو اس بارے میں بتائے۔ چند دن بعد صنم کے رشتے کا معاملہ بھی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ لہٰذا عارفہ نے یہ بات اپنے تک ہی رہنے دی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ بھائی جان پر ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں زیادہ زور دینے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ اگر ملازمت نہیں ملتی تو صرف انتظار کرتے رہنے کے بجائے بھائی جان کوئی ذاتی کام شروع کردیں۔ ہو سکتا ہے کہ قدرت اسی میں ہاتھ تھام لے۔

لیکن اس مصرعے کے مصداق کہ "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔" صنم اور عثمان بھی اپنی محبت کو بے رحم وقت سے نہ چھین سکے۔ کچھ عرصہ تعطل کا شکار رہنے کے بعد صنم کے رشتے کی بات پھر شروع ہوگئی اور پھر آناً فاناً یہ رشتہ طے ہوگیا۔ پہلے منگنی ہوئی اور پھر شادی کے دن مقرر ہوگئے۔ عثمان ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گیا۔ عارفہ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی لیکن وہ کمزور لڑکی کیا کر سکتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ عثمان بھائی پر جو کچھ بیت رہا ہے وہی کچھ خود اس پر بھی بیت رہا ہے۔ صنم کی منگنی کے بعد وہ ایک روز اس سے ملنے گئی لیکن صنم کے والد اس کے ساتھ بہت رکھائی سے بولے۔ ان کے رویّے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اب اس گھر میں عارفہ کا آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ عارفہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی صنم کے گھر نہیں گئی۔ دیگر گھر والوں نے بھی آنا جانا کم کردیا تھا۔ پھر یہ تعلقات بالکل ہی ختم ہوگئے۔ جس روز صنم کے گھر شہنائیاں بجیں اور اسے کہیں دور لے جانے کے لیے کار سوار دولہا وہاں آیا' عارفہ چھت پر اکیلی بیٹھ کر بہت روئی۔ اتنا روئی کہ آنسو بھی خشک ہوگئے۔

اس روز یا شاید اس سے اگلے روز عارفہ نے ایک عجیب فیصلہ کیا تھا۔ اس جیسا فیصلہ عارفہ جیسی لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ یہ ایک نوخیز لاابالی لڑکی کا فیصلہ تھا جو اس نے شدید کرب کا شکار ہونے کے بعد کیا تھا۔ عارفہ نے تہیہ کیا تھا کہ وہ اپنی بے بس غربت کا انتقام کسی کی پُرغرور امارت سے لے گی۔ جس طرح ایک اپر کلاس کی لڑکی نے اس کے غریب بھائی کو ٹھکرایا تھا' وہ بھی کسی اپر کلاس کے لڑکے کو اپنی محبت میں الجھائے گی اور پھر حقارت سے ٹھکرائے گی۔ بظاہر یہ ایک جذباتی فیصلہ تھا لیکن اس کے دل کی گہرائی میں یوں اترا تھا کہ دن بدن پختہ تر ہوتا گیا اور رگِ جاں بن گیا۔ وہ خوب صورت تھی' دلکش تھی۔ اس کا شباب چودھویں کا چاند تھا کہ جوں جوں افق سے ابھر رہا تھا روشن تر ہو رہا تھا۔

○☆○

تین برس گزر گئے اور وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ وہ یونیورسٹی کی دو تین خوب صورت ترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم شاکر ہومیو کلینک

ڈاکٹر آصف شاکر ● ڈاکٹر نرگس معصل

تعطیل بروز ـــــــــ جمعۃ المبارک

C-2/960 کمرشل ایریا، طارق روڈ بالمقابل سٹریٹ کراچی

اوقاتِ ملاقات: صبح ۱۱ تا 2 بجے

گلشن اقبال براچ

6/1 سفاری ویو بلاک 7 نزد مین گیٹ صفاری پارک گلشن اقبال کراچی

اوقاتِ ملاقات: شام ۷ تا ۹ بجے رات

شاکر ہیر آئل بھی دستیاب ہے

مزید معلومات کیلئے فون: 4966698

دراز قد' متناسب جسم' لمبے ریشمی بال اور نہایت کالی آنکھیں جن میں سچے موتیوں کی سی چمک تھی۔ عارفہ ابھی تک گلشن آباد کے اسی پانچ مرلے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس کے والد ایک سال پہلے دمے کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر چکے تھے۔ عثمان بھائی کی شادی خاندان میں ہی ایک معمولی شکل و صورت کی عام سی لڑکی سے ہوگئی تھی۔ یہ کوئی زیادہ کامیاب شادی نہیں تھی' بہرحال گزارہ ہو رہا تھا۔ عثمان اپنی ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ رہتا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ اپنی بیوی اور بچے کو بھی کوئٹہ لے گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئٹہ سے اس کا فون آتا تھا اور وہ عارفہ سے اس کا حال احوال دریافت کرلیتا تھا۔ درحقیقت بچپن سے ہی وہ اپنا ہر دکھ سکھ عارفہ کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔ عارفہ کی ایک بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی' دوسری کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ عارفہ کے والد دو دکانیں ترکے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان دکانوں کا کرایہ آتا تھا' کے علاوہ تھوڑی بہت پنشن بھی تھی۔ جیسے تیسے گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ کبھی کبھار عثمان بھی کچھ رقم بھیج دیتا تھا۔

یونیورسٹی جانے کے چند ماہ بعد سہراب نامی ایک لڑکے سے عارفہ کا افیئر شروع ہوا سہراب بلاشبہ یونیورسٹی کے گنے چنے لڑکوں میں سے تھا۔ مالی حیثیت کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا تو وہ یونیورسٹی کا امیر ترین لڑکا تھا۔ "ایس ایم انڈسٹریز" میں اس کی فیملی کے شیئرز تیس فی صد سے زائد تھے۔ یہ ماڈرن گھرانا کافی پڑھا لکھا بھی تھا۔ سہراب' عارفہ کی زلفوں کا اسیر ہوا تو جیسے باقی ہر چیز بھول گیا۔ وہ ہمہ وقت عارفہ کے اردگرد منڈلاتا نظر آتا۔ اسے خوش کرنے کا' اس سے نزدیک ہونے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔

ایک روز یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھولوں اور تتلیوں کی باتیں' موسموں اور رنگوں کی باتیں' خوب صورت فلموں اور کتابوں کی باتیں۔ سہراب نے اردگرد دیکھا پھر عارفہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "عارفہ! میں تمہیں اپنی والدہ سے ملانا چاہتا ہوں۔ وہ تم جیسی نفیس اور خوب صورت لڑکی سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

عارفہ شوخی سے مسکرائی "یہی بات اس سے پہلے کتنی لڑکیوں سے کہہ چکے ہیں۔"

سہراب کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی دوڑ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا "عارفہ! پلیز میری محبت کی توہین مت کرو۔ میں یہ تسلیم کر چکا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں کہ ماضی میں لڑکیوں سے میری دوستیاں رہی ہیں لیکن تم مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے سکتی ہو' تم سے ملنے کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اب صرف تم ہو اور تم ہی رہو گی۔"

وہ زیر لب مسکرائی "سوچ لیں' میرے اور آپ کے درمیان اسٹیٹس کی اونچی دیوار حائل ہے۔ فی الحال آپ کا رویہ جذباتی ہے' آپ کو یہ دیوار نظر نہیں آرہی' مگر دوسرے سب لوگ تو یہ دیوار دیکھ رہے ہیں۔ خاص طور سے آپ کے اہل خانہ' میری اور آپ کی مختلف حیثیتوں کو کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں۔ آپ کے والدین کسی ہم مرتبہ گھرانے کی دلہن لانا چاہتے ہوں گے' دیگر اہل خانہ کے دل میں بھی معلوم نہیں کیا کیا ارمان ہوں گے۔"

سہراب نے بے تابی سے عارفہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "عافی! ہمارے درمیان یہ باتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری حیثیتوں میں فرق ہے لیکن اگر پیار ایسے فرق نہ مٹا سکے تو پھر وہ پیار ہی کیا ہے۔ میں یہ فرق مٹا کر دکھاؤں گا اور ثابت کروں گا کہ ہم صرف دو انسان ہیں جو ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔"

اس قسم کی باتیں سہراب اکثر کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی یہ باتیں عارفہ کو اچھی بھی لگتی تھیں لیکن وہ تہیہ کر چکی تھی کہ ان باتوں کو دل میں جگہ ہرگز نہیں دے گی۔ وہ خود سے کیے گئے عہد کو کبھی نظرانداز نہیں کرے گی۔۔۔ کسی بھی حال میں ۔۔۔ کسی بھی وجہ سے۔ اور خود سے کیا ہوا عہد یہ تھا کہ جیسے ایک امیر گھرانے نے اس کے سفید پوش بھائی کی جھولی میں زندگی بھر کا دکھ ڈالا تھا۔ وہ بھی کسی امیر گھرانے کی شان کو ٹھکرائے گی اور ان کے دلوں کو کبھی ختم نہ ہونے والی کسک دے گی۔ بے شک سہراب خوب صورت اور پُرخلوص باتیں کرتا تھا لیکن ایسی باتیں تو صنم اور عثمان بھائی کے درمیان بھی بہت ہوئی ہوں گی۔ صنم نے بھی چاندی کی دیواروں کو توڑنے کی بات کی ہوگی' سماجی رکاوٹوں کو پھلانگنے کا عزم کیا ہوگا۔ لیکن ہوا کیا؟ جب فیصلہ کن مرحلہ آیا تو وہ بتدریج اپنے آپ میں سمٹتی چلی گئی۔ اس نے محبت کے کانٹوں بھرے راستے پر چلنے کے بجائے پھولوں بھرے راستے کا انتخاب کرلیا۔ مصلحتوں کو اپنی مجبوریوں کا نام دے دیا اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر کھڑی نظر آئی۔ ثروت مندی اور مفلسی کے درمیان موجود ازلی خلا کو اس نے بھی تہِ دل سے تسلیم کرلیا۔

وقت گزرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ عارفہ اور سہراب کا تعلق بھی پروان چڑھتا رہا۔ پچھلے ایک برس میں سہراب نے خود کو حیرت انگیز طور پر بدلا تھا۔ تمام بری عادات ایک ایک کرکے چھوڑ دی تھیں۔ اب کسی لڑکی کے ساتھ کبھی اس کی بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے خود کو

ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا شروع کردیا تھا جس میں عارفہ اسے دیکھنا چاہتی تھی' یا ظاہر کرتی تھی کہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے بے فکرے دوستوں سے دور رہنا شروع کردیا تھا۔ دولت کی بے جان نمود و نمائش میں بھی نمایاں کمی واقع ہوگئی تھی' اس کے علاوہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم پر بھی توجہ دیتا ہے۔ عارفہ کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس نے عارفہ کے ایک دو نجی مسائل حل کرنے میں بھی مدد کی تھی۔

عارفہ جانتی تھی کہ سہراب نے یہ سب کچھ اسی کی خاطر کیا ہے' وہ بظاہر ان تبدیلیوں کی ستائش کرتی تھی لیکن حقیقتاً اس کے دل میں اب بھی سہراب کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ ان تبدیلیوں کو کسی اور پہلو سے دیکھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سہراب کی محبت کی شدت صرف اس وجہ سے برقرار ہے کہ اسے محبت کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ جس طرح ناقابل تسخیر قلعوں کو فتح کرنے کے لیے افواج زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتی ہیں اور زیادہ قربانیاں دینے پر آمادہ ہوجاتی ہیں' اسی طرح سہراب بھی اسے تسخیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ وہ ایک دو مرتبہ عارفہ کو اپنے گھر والوں سے بھی ملا چکا تھا۔ اس کے والدین خوش اخلاق اور ملنسار تھے۔ بہن بھائی بھی تعلیم یافتہ اور نہایت شائستہ تھے لیکن عارفہ جانتی تھی کہ طبقۂ اشراف نے یہ شائستگی اور نرم روی اپنے چہروں پر نقاب کی طرح چڑھا رکھی ہوتی ہے۔ اگر وہ عام طبقے کے لوگوں سے جھک کر ملتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ خود کو بہت قد آور سمجھتے ہیں اور یوں ان کی خوش خلقی اور انکساری بھی تکبر کا ایک روپ بن جاتی ہے۔ صنم کے والدین بھی تو ان لوگوں کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اجنبی نہیں ان کے خونی رشتے دار ہیں۔ مگر ان سے قریب ہونے کے باوجود وہ ان سے بہت دور کھڑے تھے۔ بہت دور اور بہت اوپر۔۔۔ دوری مٹانا تو ناممکن نہیں ہوتا لیکن بلندی تک پہنچنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو دولت کے پر لگا کر ہوا میں معلق ہو اس تک ایک بے مایہ شخص کیونکر پہنچ سکتا ہے اور اگر کسی طرح پہنچ بھی جائے تو ہمیشہ اس کے زمین پر پٹخے جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

سہراب کی ایک بھتیجی پارو جو عارفہ سے کچھ ہی چھوٹی تھی' عارفہ کی دوست بن گئی۔ ایک عید کے موقع پر وہ عارفہ سے ملنے اس کے گھر آئی۔ وہ عید کیک لائی تھی۔ دو تین گھنٹے وہ عارفہ کے ساتھ موجود رہی۔ وہ عارفہ کے گھر والوں سے گھل مل گئی۔ باتوں باتوں میں وہ عارفہ کو چھیڑتی بھی رہی "آپ اتنی اچھی ہیں کہ اگر میں لڑکا ہوتی تو ضرور آپ پر عاشق ہوجاتی۔ پھر میرے اور چچا سہراب کے درمیان خوں ریز لڑائی ہوتی۔ جو بچ جاتا وہ آپ کو اڑا لے جاتا۔"

عارفہ مسکرائی "میرے خیال میں تو خوں ریز لڑائی کی نوبت نہیں آنی تھی۔ تمہارے چچا نے تمہارے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر خاموشی سے پسپا ہوجانا تھا۔ چند ہفتے بعد میرے جیسی تمام خوبیاں انہیں کسی اور لڑکی میں نظر آسکتی تھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں یہ مرد حضرات۔۔۔ تو نہیں اور سہی' اور نہیں اور سہی۔"

"حیرت ہے کہ اتنے لمبے ساتھ کے باوجود آپ انکل سہراب کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائیں۔ اوہ میں کیسے سمجھاؤں آپ کو۔۔۔ بائی گاڈ وہ جان دیتے ہیں آپ پر۔ ہی از رئیلی سیریس اباؤٹ یو۔ وہ آپ کے لیے آہستہ آہستہ گھر والوں کو راضی کررہے ہیں اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو گرینڈ ما تو مکمل طور پر راضی بھی ہوچکی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک دو ہفتے تک آپ کے گھر بھی آئیں۔"

کبھی کبھی سہراب اور اس کے گھر والوں کا پیار دیکھ کر عارفہ کا دل لرز جاتا تھا لیکن اس کا ارادہ اس کے دل سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ اس اداس شام کو جب پڑوس کے گھر میں شہنائیاں گونج رہی تھیں' عارفہ نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا تھا۔ گزرے ماہ و سال کے باوجود یہ عہد آج بھی روزِ اوّل کی طرح عارفہ کے سینے پر نقش تھا۔ وہ مرتو سکتی تھی مگر اس عہد کو فراموش نہیں کرسکتی تھی۔ اب قدرت نے یہ عہد بہترین طریقے سے نبھانے کا اسے ایک بہترین موقع عطا کیا تھا۔ سہراب ویسا ہی لڑکا تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ یہ ویسا ہی گھرانا تھا جیسا اس کے انتقام کے لیے ضروری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے انتقام سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔ حیثیتوں اور مرتبوں کا فرق اسی طرح برقرار رہے گا۔ ایک ہی آدم کی اولاد ہونے کے باوجود با حیثیت لوگ ہمیشہ کم حیثیت لوگ کو روندتے رہیں گے۔ کھلونا سمجھ کر ان کے دلوں سے کھیلتے رہیں گے۔ اس جیسی لڑکیاں اور عثمان بھائی جیسے لڑکے اسی طرح سماجی ناہمواریوں کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔ ٹھیک ہے کچھ نہ ہوگا' لیکن اتنا تو ہوگا کہ اس کا اپنا سینہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ اس جان لیوا تھیں کا مداوا ہوجائے گا جو اس اداس شام کو عارفہ کی انا کو لگی تھی اور چھت پر بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے تھے۔ عارفہ کے انتقام کا نشانہ بننے والی صنم نہیں تھی اور نہ اس کا بہت مغرور باپ تھا لیکن تھا تو اسی ایلیٹ کلاس کا نمائندہ جو زمین پر ہوتے ہوئے بھی خود کو آسمان پر سمجھتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جس دن وہ سہراب کو حقارت سے ٹھکرائے گی اس روز وہ اپنے

پیارے بھائی جان کو کوئٹہ کے ایڈریس پر ایک طویل خط لکھے گی اور اس خط میں سارا ماجرا بلا جھجک بیان کردے گی۔ انہیں بتائے گی کہ اس نے اپنے لیے ایک امیر گھرانے کا رشتہ اسی طرح ٹھکرایا ہے جس طرح ایک امیر لڑکی کے لیے ان کا رشتہ ٹھکرایا گیا تھا۔

وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب سہراب باقاعدہ طور پر اس سے شادی کا خواہش مند ہو اور اسے یقین تھا کہ بہت جلد ایسا ہونے والا ہے۔ سہراب اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لے کر اس کے سامنے اپنا دست سوال پھیلانے والا ہے۔ وہ اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی تاہم کبھی کبھی اس لمحے کے بارے میں سوچ کر کانپ بھی جاتی تھی۔ بے شک وہ سہراب سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن ایک قسم کا لگاؤ تو طویل رفاقت نے پیدا کر ہی دیا تھا اور اس لگاؤ سے بھی اہم عارفہ کے لیے سہراب کے اہل خانہ تھے۔ وہ عارفہ کو پسند کرتے تھے' اس سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ جس لمحے عارفہ نے سہراب کو ٹھکرانا تھا اس لمحے یقیناً ان سب لوگوں کو بھی بے حد مایوسی ہونا تھی۔ جب عارفہ اس انداز سے سوچتی اور اس کے دل میں ہلکا سا گداز پیدا ہوتا تو وہ فوراً اس بیکراں درد و کرب کو یاد کرنے لگتی جو چند سال پہلے "اپر کلاس" کی طرف سے "لوئر کلاس" کے ایک لاچار نوجوان کی جھولی میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا دل پھر سے پتھر کی طرح سخت ہو جاتا۔

کسی وقت عارفہ کو واضح طور پر محسوس ہوتا کہ وہ ایب نارمل انداز میں سوچ رہی ہے ایک گھرانے کے غلط رویے کے سبب وہ پورے ایک طبقے سے بدظن ہو رہی ہے' مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی وہ کسی طور مانتا نہیں تھا۔ وہ ایک پیار کرنے والی لڑکی تھی لیکن اپنے پیارے بھائی کی محرومی اس کے دل میں ایک ایسی نفرت بن کر اتر گئی تھی جو نکالے نہیں نکلتی تھی۔

... اور پھر وہ لمحہ آگیا جس کا عارفہ کو انتظار تھا۔ گرما کی ایک خوب صورت شام کو دریائے راوی کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے سہراب نے بڑے گمبھیر لہجے میں عارفہ سے کہا تھا "عافی! میں تمہارے دل میں تو نہیں جھانک سکتا لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ میرے لیے ناممکن ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات تو آپ نہیں کہہ رہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"یہ اس لحاظ سے نئی بات ہے کہ میں اسے عملی صورت دینا چاہ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

"اس اتوار کو میں اپنے امی ابو کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

عارفہ کتنی ہی دیر خاموشی سے کنارے کی گیلی ریت کو گھورتی رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو عافی؟" سہراب نے اپنا لرزاں ہاتھ عارفہ کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

"کیا آپ مجھے تھوڑا سا سوچنے کی مہلت دیں گے؟"

"کیا ابھی بھی کچھ سوچنا باقی ہے؟"

"نہیں۔ میں آپ کے امی ابو کے آنے کے حوالے سے بات کر رہی ہوں۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ ابھی انہیں تمہارے گھر نہیں آنا چاہیے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اگر کوئی بات ہے تو بتا دو پلیز۔" سہراب کے لہجے میں سیکڑوں اندیشے لرزاں تھے۔

"نہیں... میں تو سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہ رہی ہوں۔" عارفہ نے نگاہیں ملائے بغیر کہا تھا "میں آپ کو کل فون پر بتا دوں گی۔"

عارفہ اور سہراب کی روداد سناتے سناتے میرے دوست شاہد ملک نے ایک گہری سانس لی اور نیا سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ لاؤنج کے دیوار گیر شیشے کے باہر دھند بدستور موجود تھی۔ لاؤنج میں موجود لوگ صوفوں پر نیم دراز تھے' کچھ اونگھ رہے تھے' کچھ میگزین وغیرہ پڑھ رہے تھے' کچھ ہم دونوں کی طرح طویل گفتگو میں مگن تھے۔ رابطہ پرواز بدستور لیٹ تھی۔

شاہد نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "عارفہ نے اگلے روز سہراب کو فون نہیں کیا۔ اس سے اگلے روز بھی نہیں کیا۔ تیسرا اور چوتھا روز بھی سہراب نے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزار دیا۔ وہ اس کی زندگی کے کٹھن ترین چار دن تھے۔ پانچویں روز عارفہ کا فون آگیا۔ وہ لڑکی جس نے صرف انتقام کی خاطر ایک امیرزادے سے محبت کا کھیل شروع کیا تھا' اس کھیل کو صرف کھیل نہ رکھ سکی۔ اپنی بے پناہ خواہش کے باوجود وہ سہراب کو وہ جواب نہ دے سکی جو وہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے وہ جواب دیا جو وہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے سہراب کو آگاہ کیا کہ وہ اپنے والدین کو ان کے ہاں بھیج سکتا ہے۔ اس واقعے کے صرف ایک ماہ بعد یعنی پچھلے سال اکتوبر میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ آج کل وہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔"

کہانی کا انجام قطعی غیر متوقع تھا۔ میرے اور شاہد کے درمیان کافی دیر خاموشی رہی۔ پھر شاہد نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا "آپ کے تاثرات کیا ہیں طاہر صاحب۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا بس اپنی سوچ میں کھویا رہا۔ شاہد بولا "یقیناً آپ کو حیرانی ہوئی ہوگی کہ عارفہ نے ایسا کیوں کیا؟"

"نہیں کچھ زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ بلکہ میرا خیال تو شروع سے یہی تھا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو اس کہانی کا یہی اختتام ہوگا۔"

"اس قیافے کی کوئی وجہ؟" شاہد نے پوچھا۔

"عارفہ جیسی مڈل کلاس لڑکی کے لیے سہراب جیسے باحیثیت اور پُرخلوص لڑکے کی پیشکش رد کرنا آسان نہیں تھا۔ ٹھیک ہے کہ شروع میں وہ جذباتیت کا شکار تھی لیکن دھیرے دھیرے جب زخم مندمل ہوئے تو یہ جذباتیت کم ہوتی چلی گئی ہوگی۔ پھر عارفہ نے معروضی انداز میں سوچنا شروع کردیا ہوگا۔ قسمت نے اس پر ایک نہایت خوش حال زندگی کے دروازے کھولے تھے۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کی بہو بن کر نہ صرف اپنا مستقبل سنوار سکتی تھی بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے لیے بھی زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع پیدا کرسکتی تھی۔ بے شک وہ سہراب سے محبت نہیں کرتی تھی مگر بہتر زندگی سے تو ہر کسی کو محبت ہوتی ہے۔ اسی بہتر زندگی کی خاطر وہ اس عہد کو توڑنے پر آمادہ ہوگئی تھی جس کا تعلق سراسر ایک وقتی صدمے اور ابال سے تھا۔"

وہ مسکرایا "آپ بڑے نرم الفاظ استعمال کررہے ہیں' لیکن میں جانتا ہوں کہ عارفہ کے حوالے سے آپ کے اصل خیالات کیا ہیں اور یہ کوئی آپ ہی کی بات نہیں۔ اگر میں ایک سو افراد کے سامنے یہ روداد بیان کروں تو ان میں سے ۹۸ کے تاثرات کچھ اسی قسم کے ہوں گے۔ وہ عارفہ کو ایک نادان' جذباتی اور خواہش پرست لڑکی قرار دیں گے۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی لڑکی جس کے لیے امیر شوہر' لمبی کار اور وسیع کوٹھی ہی زندگی کی اصل اقدار ہوتی ہیں۔ اسے یہ چیزیں جب اور جہاں مل جائیں وہیں وہ اپنی کمر ہمت کھول کر ڈیرے ڈال لیتی ہے اور باقی سب کچھ بھول جاتی ہے' پھر کوئی عہد رہتا ہے' نہ قسم اور نہ کوئی نصب العین۔"

میں خاموش رہا کیونکہ شاہد کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ عارفہ کی روداد سننے کے بعد یہ خیالات ذہن میں ضرور ابھرتے تھے۔ ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ عارفہ نے منافقت آمیز مصلحت کا سہارا لیا اور خوش حال مستقبل کی خاطر ایک ایسے شخص کو اپنے جسم وجاں کا مالک بنادیا جسے دل ہی دل میں وہ دشمن کا درجہ دیتی تھی۔ اس اعتبار سے اس نے بھی وہی کچھ کیا جو چند برس پہلے صنم نے کیا تھا۔

شاہد نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "حقیقت مختلف ہے مائی ڈیر فرینڈ! عارفہ نے یہ سب کچھ دولت اور عیش و آرام کی خاطر نہیں کیا۔ اس نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ اندر سے ایک حساس اور گداز دل لڑکی تھی۔ بے رحمی کے ساتھ کسی کا دل توڑنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتی بھی تو ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ایک باحیثیت گھرانے کو ٹھکرا کر اپنی انا کو فتح یاب کرسکتی تھی لیکن اس کی نیک فطرت نے اسے ہارنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور چپ چاپ سہراب کی ہوگئی۔ مائی ڈیر فرینڈ! اب میں آپ کو وہ ثبوت دوں گا جس کے بعد آپ کو یقین ہوجائے گا کہ عارفہ کے اس فیصلے میں کسی بھی طرح موقع پرستی یا لالچ کو عمل دخل نہیں تھا۔"

"کیسا ثبوت؟" میں نے پوچھا۔

"ایک جیتا جاگتا ثبوت۔" شاہد نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

شاہد ایک طویل سانس لے کر بولا "میں نے شروع میں آپ سے کہا تھا ناں کہ میری اپنی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں اور نہ ہی دلچسپ ہے۔"

"ہاں کہا تو تھا۔"

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا "طاہر صاحب! سہراب اور عارفہ کی شادی سے چند ماہ پہلے میں بھی عارفہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا تھا۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ عارفہ کو شادی کی باقاعدہ آفر بے حد خلوص کے ساتھ کی تھی۔ مگر عارفہ نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ سہراب فیملی جس کمپنی "ایس ایم انڈسٹریز" میں تیس فی صد شیئرز کی مالک تھی وہ میری ہی کمپنی تھی۔ اس میں ساٹھ فی صد شیئرز میرے تھے۔ "ایس ایم" درحقیقت میرے ہی نام شاہد ملک کا مخفف ہے۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ شکل وصورت' حیثیت' خاندانی نجابت غرض ہر لحاظ سے میں سہراب سے بہتر تھا۔" وہ چند لمحے خاموش نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "میرے خیال میں اب آپ کے ذہن سے یہ بات صاف ہوجانی چاہیے کہ عارفہ نے صرف خوش حال مستقبل کے لیے سہراب کا ساتھ قبول کیا۔ وہ ایک اچھی فطرت کی لڑکی تھی اور اچھی فطرت کا مالک کسی سے برائی کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا' یہ اس کے بس میں ہی نہیں ہوتا۔"

ان دنوں ملک کے کئی بڑے شہروں میں دہشت گردی کے واقعات ہو رہے تھے۔ موبائل فائرنگ اور بم دھماکوں کی خبریں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر پولیس کو بھی خصوصی قسم کے انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ شہر کے حساس مقامات پر اکثر سفید پوش پولیس اہلکار موجود رہتے ہیں۔ خود کو کیمو فلاج کرنے کے لیے وہ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کہیں کوئی اہلکار چھابڑی فروش بنتا ہے، کہیں بھیک منگا اور کہیں دکان دار۔ یہ لوگ خصوصی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وحید اسپیشل پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ ان دنوں اس کی ڈیوٹی ڈبھی فیلڈ میں تھی۔ وہ سادہ پوش کی حیثیت سے لاہور اسٹیشن پر تعینات تھا۔ ایک بستر چارپائی ہوٹل میں وہ بطور مسافر قیام پذیر تھا۔ ریلوے اسٹیشن، بس اڈے اور مزارات کے گرد و نواح اکثر جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں اور وہاں سے پولیس والوں کو اکثر بڑے اہم کلیوز ملتے ہیں۔

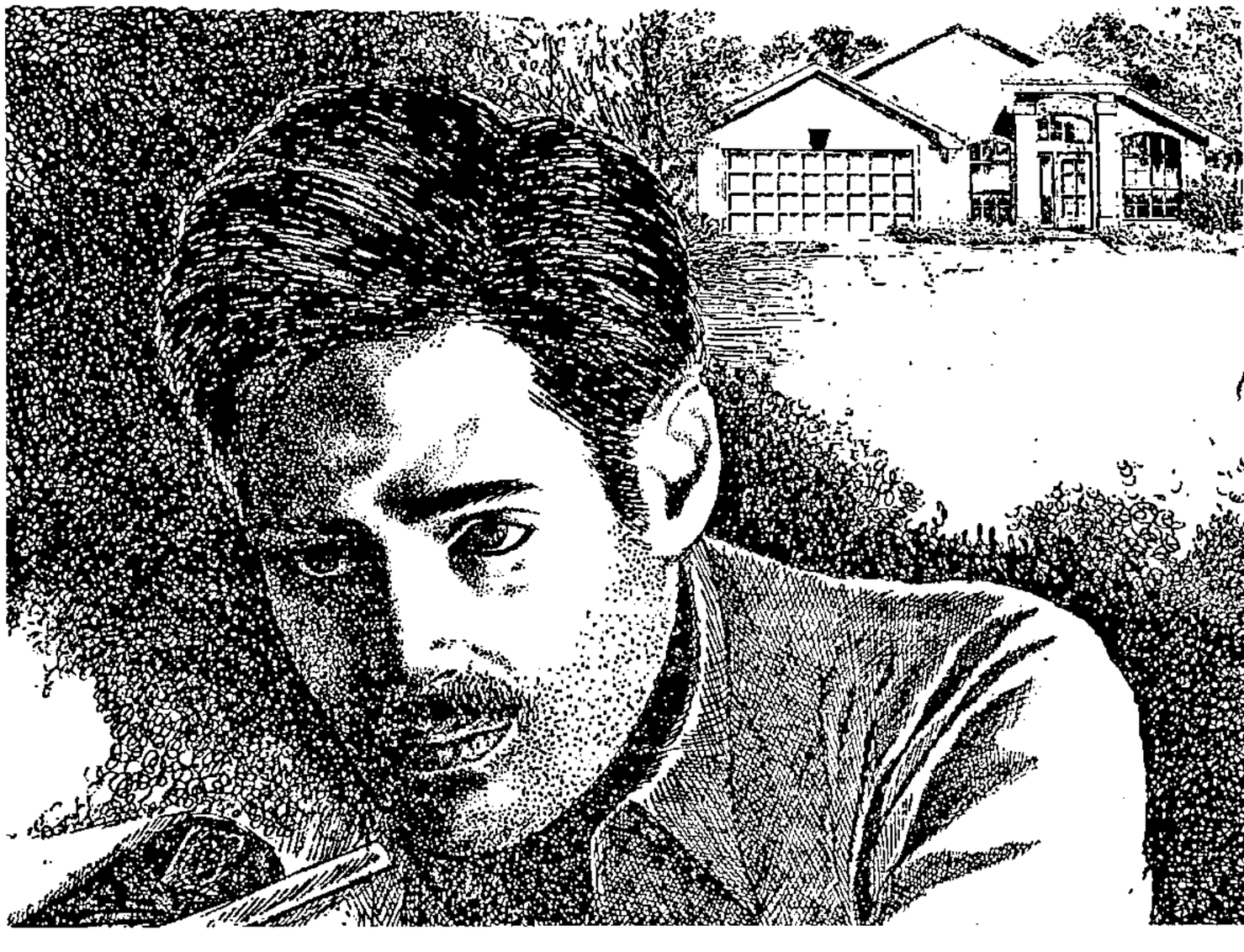
ایک روز وحید کی نگاہ بھی ایک مشتبہ شخص پر پڑی۔ وہ اپنے حلیے سے خالص دیہاتی نظر آتا تھا۔ سیالکوٹ یا گوجرانوالہ کے علاقے کا لگتا تھا۔ عمر قریباً چوبیس سال تھی۔

ایک پولیس افسر کی زندگی میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعہ کا احوال

ایک دانا و بینا اور حد درجہ عقل مند شخص کا فسانہ۔ اسے خود پر ناز تھا، مگر کبھی کبھی وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی توقع کوئی نہیں کر سکتا۔ اُس کے ساتھ بھی ایسی ہی ایک انہونی ہوئی اور پھر وقت کی ڈور اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔

ٹارگٹ

طاہر جاوید مغل



شیو بڑھی ہوئی' بال منتشر' شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں ایک میلی سی گرم چادر تھی۔ وحید نے علی الصباح پانچ بجے اسے سرائے کے سامنے والی سڑک سے گزرتے دیکھا۔ ایک بوری اس نے کمر پر لاد رکھی تھی۔ سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ وہ وحید کے بالکل قریب سے اس پر توجہ دیے بغیر گزر گیا۔ وحید کو فوراً یاد آیا کہ کل بھی قریباً اسی وقت یہ شخص بوری لے کر اسی جگہ سے گزرا تھا۔ وحید کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید یہ کوئی کاریگر ہے جس نے بوری میں اوزار وغیرہ باندھ رکھے ہیں یا پھر پھیری لگانے والا' جس نے بوری میں فروخت کا سامان رکھا ہوا ہے۔ جس چیز نے وحید کو شک میں مبتلا کیا' وہ اس شخص کا صبح سویرے نظر آنا اور گھبرایا گھبرایا ہونا تھا۔ اس سے پہلے کہ وحید اس شخص کے بارے..... میں کچھ اور سوچتا یا اسے روک کر اس سے کوئی بات کرتا وہ دور نکل چکا تھا۔ نہ جانے کیوں وحید کا دل چاہا کہ اس شخص کا پیچھا کیا جائے لیکن پھر خنکی اور سستی اس پر غالب آگئی اور وہ خستہ حال چارپائی پر کمبل لے کر لیٹ گیا۔

اس روز شام کو وحید نے اس دیہاتی کو سڑک پر سے گزرتے دیکھا تو بوری اس کے پاس نہیں تھی۔ بوری وہ کہاں چھوڑ آیا تھا؟ یہ سوال بڑی شدت سے وحید کے ذہن میں ابھرا۔ وہ دیہاتی کے پاس چلا گیا۔ "سلاماں لیکم۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

دیہاتی نے وحید کے سلام کا جواب دیا اور خالی خالی نظروں سے وحید کو تکنے لگا۔ وحید کے پوچھنے پر ارشاد نامی اس دیہاتی نے وحید کو بتایا کہ وہ گاؤں سے مزدوری کرنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ وحید نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ "تمہارے پاس شاید ایک بوری بھی تھی' وہ کہاں گئی؟"

وحید کو حیرت ہوئی جب دیہاتی بوری یا کسی تھیلے وغیرہ کے وجود سے صاف مکر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا کہ اس کے پاس کوئی بوری نہیں تھی۔

ارشاد نامی اس دیہاتی نوجوان کا جواب وحید کے شک کو پختہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے کل صبح اور پرسوں صبح خود اس شخص کو بوری سمیت سڑک پر سے گزرتے دیکھا تھا۔ وحید سے مختصر بات کر کے وہ شخص اب کافی فاصلے پر جا چکا تھا' وحید نے اسے نظر میں رکھا اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ شام اب رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر' مارکیٹوں کے برآمدوں میں اور سڑک کے کنارے گرین بیلٹس پر ایک دنیا آباد ہو چکی تھی۔ دور دراز سے آئے ہوئے مزدور' مسافر اور بے آسرا لوگ یہاں وہاں چادریں بچھا کر بیٹھ گئے تھے یا لیٹ گئے تھے۔ یہی جگہیں ان کا رین بسیرا تھیں۔ مشکوک دیہاتی اپنا ڈیرا جمانے کے لیے دیر تک یہاں وہاں کوئی مناسب جگہ ڈھونڈتا رہا۔ ایک دو افراد سے اس کی تکرار بھی ہوئی۔ آخر ایک مارکیٹ کے برآمدے میں اسے جگہ مل گئی۔ اس نے وہاں چادر بچھائی اور اپنے بازو کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔

انسپکٹر وحید کی نظر میں یہ شخص "بلیک لسٹ" ہو چکا تھا۔ رات کو وحید نے اپنے سادہ پوش ماتحت ایس آئی مشتاق باجوہ کو بھی اس شخص کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ بوری کے حوالے سے ارشاد نے جو غلط بیانی کی تھی' وہ نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ اگلے روز وحید نے از خود ارشاد کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ آج بھی وہ علی الصباح روانہ ہو گیا تھا۔ میلی سی گرم چادر جسے وہ رات بھر اوڑھ کر سویا رہا تھا' اب اس کے کندھے پر نظر آتی تھی۔ وہ اسٹیشن کے علاقے سے نکلا اور لکشمی چوک کی طرف آ گیا۔ یہاں سے وہ بس میں بیٹھا۔ وحید بھی اس کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا۔ آخر وہ گلبرگ کے فیشن ایبل علاقے میں پہنچ گئے۔ پیدل چلتا ہوا وہ گلبرگ کے رہائشی علاقے میں پہنچا اور اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس کا انداز مشکوک ہی تھا۔ وہ جیسے کوئی خاص مقام ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رک رک کر نیم پلیٹس دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ آخر وہ ایک مسجد کے اردگرد مشکوک انداز میں گھومنے لگا۔ وہ قریباً تین بار مسجد میں داخل ہوا۔ مسجد کے عین دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر آگے نکل گیا۔

دوپہر کے وقت وہ گلبرگ کی ہی ایک اور جامع مسجد کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی وہ دو تین بار مسجد میں داخل ہوا اور باہر نکلا۔ ہر بار جب وہ مسجد کے بیرونی دروازے سے نکلتا کئی بار دائیں بائیں دیکھتا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ شام تک وہ مسلسل گلبرگ کے علاقے میں گھومتا رہا۔ ایک جگہ اس نے بھنے ہوئے چنے لے کر کھائے اور ایک سرکاری نلکے سے پانی پیا۔ شام تک وہ کم از کم چار مساجد میں گیا اور وہی حرکات کیں جو پہلے کی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ واپس روانہ ہو گیا اور ساڑھے چھ بجے کے قریب اسٹیشن واپس پہنچ گیا۔

رات کو وحید اور اس کا ماتحت ایس آئی مشتاق باجوہ سرائے کے بوسیدہ کمبلوں میں دبک کر دیر تک اس شخص کے بارے میں تبصرہ کرتے رہے۔ مشتاق نے وحید کو بتایا کہ وہ آج اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی

کوشش کرتا رہا ہے مگر کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جس شخص کے قریب کل رات ارشاد سویا تھا اس سے بس یہ پتا چل سکا تھا کہ اس کا نام ارشاد عرف شادا ہے' وہ شکر گڑھ کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور ترکھان کا کام کرتا ہے۔

اگر وہ ترکھان کا کام کرتا تھا تو ممکن تھا کہ اس کی بوری میں اوزار ہی ہوں مگر جس شخص نے ارشاد کے بارے میں بیان دیا' اس نے ارشاد کے پاس بوری نہیں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کوئی شخص ارشاد اور اس کی بوری کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کرسکا تھا... انسپکٹر وحید پولیس والوں کی تعلیم یافتہ کھیپ میں سے تھا اور روایتی پولیس انسپکٹروں سے کافی حد تک مختلف بھی تھا۔ اپنے پیشے کی نسبت سے اس نے چہرہ شناسی کے بارے میں کافی کچھ پڑھ رکھا تھا' وہ کچھ عرصہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے اس شعبے سے بھی منسلک رہا تھا جہاں کمپیوٹر پر ملزمان کے خاکے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ کبل میں دبکے دبکے انسپکٹر وحید نے اپنے ماتحت باجوہ سے کہا "کل میں نے اس بندے کے چہرے کو بڑے غور سے (READ) کیا تھا۔ اس کے ناک نقشے میں وہ ساری اونچ نیچ پائی جاتی ہے جو ایک نہایت عیار اور خاط کار شخص کے چہرے پر ہوتی ہے۔ غیب کا علم تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بہرحال مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص وہ نہیں جو نظر آرہا ہے۔ اس شخص کے ہونٹ پتلے اور اندر کو دبے ہوئے ہیں جو اس کے اندر کی برداشت اور ضبط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ گردن زیادہ لمبی نہیں ہے اور صحت مند ہے جس سے اعصاب کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے۔ ناک کا پھیلاؤ اور جبڑے کی چوڑائی بھی جسمانی مضبوطی اور توانائی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی بھویں گھنی اور آنکھیں چھوٹی ہیں۔ ان سے مزاج کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پیشانی کی ساخت' ذہانت اور چالاکی کو ظاہر کرتی ہے۔"

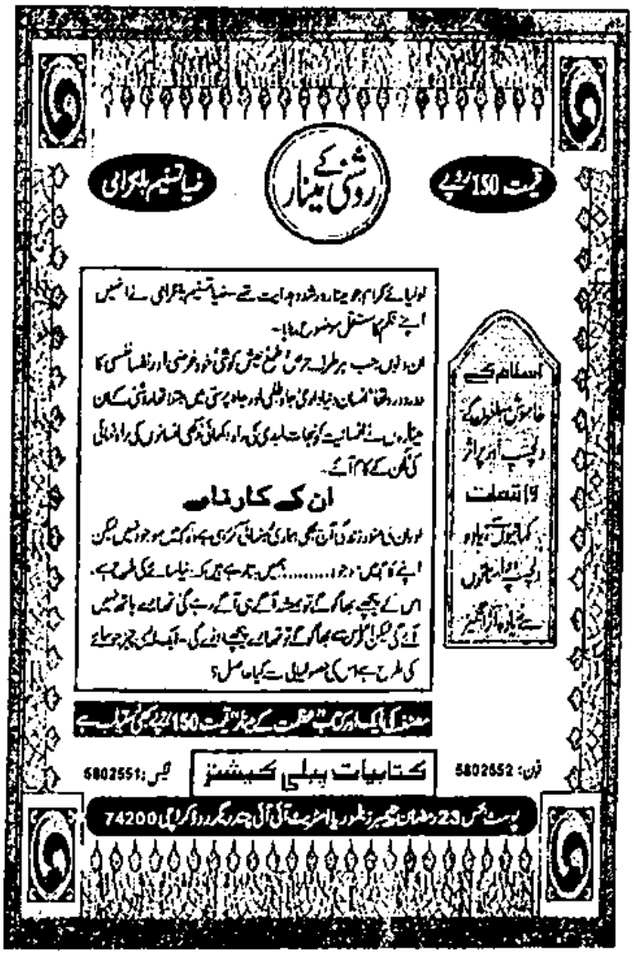
"مگر یہ شخص بول چال اور حلیے کے اعتبار سے تو پکا پکا دیہاتی نظر آتا ہے۔"

"ممکن ہے کہ اس نے بہروپ بھر رکھا ہو۔ ایک کامیاب بہروپیا خود کو مکمل طور پر ایک نئی شخصیت میں ڈھال لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے آپ کو بھی فراموش کردیتا ہے۔"

وہ دونوں رات گئے تک اس شخص کے بارے میں تبصرہ کرتے رہے۔ مساجد میں اس شخص کا گھومنا اور گلیوں میں پھرنا ہر زاویے سے مشکوک دکھائی دیتا تھا۔ اس کی بوری بھی دوبارہ اس کے کندھے پر نظر نہیں آئی تھی۔ وحید اور باجوہ کے ذہنوں میں بدترین خدشا یہ تھا کہ شاید اس تھیلا نما بوری میں کوئی بم وغیرہ تھا جو اس نے کہیں رکھ دیا تھا لیکن اگر وہ بم تھا تو ابھی تک کوئی تازہ منحوس خبر کیوں نہیں آئی تھی۔ باجوہ کا خیال تھا کہ اس شخص پر ہاتھ ڈال دیا جائے اور اس سے براہِ راست پوچھ گچھ کی جائے مگر وحید ابھی ایک آدھ دن مزید آبزرو کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز بھی وہ شخص بس پر بیٹھ کر گلبرک پہنچا اور اسی طرح سڑکوں پر گھومنے لگا۔ گاہے گاہے وہ رک کر کوٹھیوں کے اندر بھی جھانکتا تھا۔ ایک دو جگہوں پر اسے چوکیداروں نے ڈانٹا ڈپٹا بھی پھر ایک جگہ پر رکھوالی کے دو کتوں نے اس کی خبر لی اور اس کی ٹانگیں پھاڑنے کے درپے ہوگئے۔ اس نے بہ مشکل خود کو بچایا۔ آج بھی وہ دو مساجد میں گیا۔ دو تین بار دروازے میں داخل ہوا اور باہر آیا۔ دوسری مسجد میں اس نے نمازیوں میں گھس کر نماز عصر بھی ادا کی۔ وحید اور مشتاق باجوہ اسے ہر لمحہ نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس شخص کی وجہ سے کوئی المیہ رونما ہو۔ شام کو وہ شخص حسب معمول واپس اسٹیشن آگیا۔

اس روز رات کو ارشاد کی شخصیت ان کے لیے مزید پراسرار ہوگئی۔ رات کو ارشاد ریلوے اسٹیشن پر ایک اوور ہیڈ برج کے نیچے سویا تھا۔ وہاں اس کا بستر ایک ملنگ کے پاس تھا۔ ناجانا می یہ ملنگ بھی کبھی کبھار پولیس کو مشکوک



لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا تھا۔ انسپکٹر وحید نے باجوہ کو ہدایت کی اور اس نے ملنگ کو ارشاد کے سلسلے میں الرٹ کردیا۔ آدھی رات کو ملنگ اٹھ کر وحید اور باجوہ کے پاس آیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ ارشاد کو مزید ڈھیل دینا ٹھیک نہیں۔ وہ یقیناً ایک پراسرار شخص ہے۔ اس نے انگریزی اخبار کا ایک تراشا وحید کو دکھایا۔ اس تراشے کو بڑی احتیاط سے تہ کرکے ایک اور کاغذ میں لپٹا گیا تھا۔ تراشے میں لاہور کے چند پرہجوم تفریحی مقامات کی تصویریں تھیں اور ان کے بارے میں مکمل تفصیل درج تھی۔ مخبر ملنگ نے بتایا کہ یہ تراشا اس نے ارشاد کی جیب سے اڑایا ہے۔

○☆○

اس رات وحید اور باجوہ' ارشاد کو گرفتار کرکے پولیس اسٹیشن لے آئے۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کسی وقت وہ بالکل معصوم اور سادہ نظر آتا تھا۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ وہ نہایت گہرا اور چالاک شخص ہے۔ بس ایک دھوپ چھاؤں سی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک اندھیرا اجالا تھا جس میں کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بے حد چالاک اور عیار ہے یا بے تحاشا سادہ ہے۔ اس سے پوچھا گیا وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے بہ مشکل اپنے گاؤں کا نام "رکھ والی" بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ لکڑی کا کام نہیں جانتا بلکہ دیہاڑی مزدور ہے۔ وہ اپنی شادی کے لیے کچھ پیسے کمانے پہلی بار شہر آیا تھا۔ یہاں وہ روزانہ کام کی تلاش میں نکلتا ہے اور ناکام ہوکر واپس آجاتا ہے۔

وحید نے سوال کیا "تمہاری وہ بوری کہاں ہے جو دو تین روز پہلے تمہارے کندھے پر نظر آئی تھی۔"

بوری کی موجودگی سے وہ ایک بار پھر صاف مکر گیا اور اس نے کہا کہ اس کے پاس سرے سے کوئی بوری ہی نہیں تھی۔

وحید نے کہا "تم نے پہلے ایک شخص کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ تم لکڑی کا کام کرتے ہو۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ تم دیہاڑی مزدور ہو۔"

"میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔" ارشاد صاف مکر گیا۔

"اس کے سامنے گواہ پیش کیا گیا لیکن اس نے اسے بھی پہچاننے سے انکار کردیا۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

جب اسے بتایا گیا کہ اس کا تعاقب کیا جاتا رہا ہے اور اس کی ایک ایک مصروفیت نوٹ کی جاتی رہی ہے تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ تاہم اس نے بڑے بچکانہ انداز میں پولیس کی ان معلومات کو جھٹلا دیا۔ گاہے گاہے وہ بھوں بھوں کرکے رونے لگتا تھا اور اپنی زندگی سے بیزار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک نہایت پیچیدہ ملزم ثابت ہورہا تھا۔ اس کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں تھی۔

جس دوران میں ارشاد سے پوچھ گچھ ہورہی تھی ایک شخص کو ارشاد کی تصویر دے کر شکر گڑھ کے گاؤں رکھ والی کی طرف دوڑا دیا گیا تھا تاکہ ارشاد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوسکیں۔ یہ پولیس اہل کار شام کے بعد واپس لاہور پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ رکھ والی میں ارشاد ترکھان نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ ارشاد نے رکھ والی کا نام لے کر اپنے جھوٹوں میں ایک اور سفید جھوٹ کا اضافہ کرلیا تھا۔ اس تازہ انکشاف کے بعد ارشاد میں پولیس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ انوسٹی گیشن سے تعلق رکھنے والے کئی افسران اگلے چند گھنٹوں میں اس پولیس اسٹیشن پہنچ گئے جہاں ارشاد عرف شادے کو رکھا گیا تھا۔ ارشاد کی گول مول باتوں نے پولیس کو زچ کرکے رکھ دیا۔ آخر پولیس اہلکاروں نے اسے اپنے روایتی سلوک کا نشانہ بنایا۔ دو منٹ کے اندر ہی وہ نیم بے ہوش ہوگیا اور اس کے منہ سے رال بہنے لگی۔ ہوش میں آیا تو وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پولیس والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ سچ سچ بتادے گا۔"

وحید نے پچھتے ہوئے لہجے میں کہا "یہ دیہاتی لب ولہجہ چھوڑو اور انگریزی میں بات کرو۔ ہماری معلومات کے مطابق تم پڑھے لکھے ہو۔"

"میں پڑھا لکھا نہیں ہوں مائی باپ! میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں۔"

"کس ایجنسی کے لیے کام کرتے ہو؟" ایک ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا مائی باپ کیا پوچھ رہے ہیں؟"

"تمہارا ٹارگٹ کیا تھا؟" ایک اور افسر نے پوچھا۔

"مم... مجھے کچھ پتا نہیں صاحب۔"

"لاہور میں تمہارے لنکس کس کس سے ہیں؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جناب۔"

"اور تم یہ وعدہ بھی کررہے ہو کہ تم اب سچ بولو گے اور کچھ بھی نہیں چھپاؤ گے۔"

"ہاں میں سچ بولوں گا مائی باپ مگر آپ سچ سنیں تو سہی۔"

"اچھا چلو بولو سچ۔"

وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے گنجلک بال

مٹھی میں جکڑے۔ آنکھوں سے تازہ آنسوؤں کے سوتے پھوٹ نکلے۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا "میرا اصلی نام ارشاد ہی ہے صاحب جی۔ میں رکھ والی سے اٹھارہ کوس دور ایک پنڈ "غریب وال" کا رہنے والا ہوں۔ چھوٹا سا پنڈ ہے جی۔ اس میں نہ بجلی ہے' نہ سڑک اور نہ کوئی خط پتر وہاں پہنچتا ہے۔ اس پورے پنڈ میں بس دو تین ہی سیانے بندے ہیں۔ آپ پنڈ کی حالت کا اندازا اس بات سے لگالیں جی کہ پنڈ کے ان دو تین سیانے بندوں میں میرا نام بھی آتا ہے۔ پورے پنڈ میں صرف میں ہی ہوں جو اب تک وڈے شہر (لاہور) آیا ہوں۔ رابعہ میری منگ کا نام ہے جی۔ ہماری منگنی کو چھ سال ہوگئے ہیں۔ مائی باپ! میں غریبی کی وجہ سے اپنی منگ کو اپنے گھر نہیں لاسکا۔ وہ اور کتنی دیر میرا انتجار کرسکتی ہے۔ چھوٹی عید کو اس نے مجھ سے کہا "شادے! کچھ کر۔ نئیں تو میرا ابا میرا ویاہ کہیں اور کردے گا"... اس نے تھوڑے تھوڑے کرکے دو تین سو روپے جوڑے ہوئے تھے وہ اس نے مجھے دیے اور کہا کہ میں اس میں کچھ اور پیسے ڈال کر کام کے لیے اوجار خریدوں اور شہر جاکر کچھ پیسے اکٹھے کروں۔ میں نے دو سو روپے اپنی بیوہ بہن سے ادھار لیے۔ اپنی ماں کی چاندی کی دو بالیاں بیچیں اور گوجرانوالہ جاکر کام کے اوجار خرید لیے۔ آپ کو تو پتا ہے ہی جی کہ غریب مجدور کی کل جائیداد اس کے اوجار ہی ہوتے ہیں۔ میرے سارے اوجار کھڑ گئے۔"

"کھڑ گئے؟ کیا مطلب؟" ایک ساتھ دو تین آوازوں نے پوچھا۔

"گواچ گئے سرکار... گم ہوگئے۔"

اس کی میلی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھ کر اس نے سر جھکالیا۔

"کیسے گم ہوگئے؟ کیا گر گئے یا کسی نے چھین لیے؟"

"نہیں جی... بس گواچ گئے۔ مجھ سے خود ہی گواچ گئے۔" وہ معصومیت کی تصویر نظر آنے لگا۔

"کیسے گواچ گئے؟"

وہ جیسے اپنے آپ سے ہی شرمندہ تھا۔ کچھ دیر تک ہچکچانے کے بعد بولا "میں صبح سویرے اوجاروں والی بوری لے کر کام ڈھونڈنے نکلا تھا۔ نہر پار کوٹھیوں والے علاقے (گلبرگ) میں مجھے ایک جگہ ترکھاناں کام مل گیا جی... مالکوں نے چار پانچ درواجوں کی چوکھاٹیں بدلوانی تھیں۔ انہوں نے کہا کل تک ہم لکڑی لے آئیں گے۔ تم اپنے اوجار ادھر ہی رکھ جاؤ۔ سویرے آکے کام شروع کردینا۔ میں اوجار ادھر کوٹھی کے برآنڈے میں رکھ کر آگیا جی... پھر... پھر..."

"پھر کیا ہوا؟" وحید نے پوچھا۔

"میں بڑا پاگل ہوں۔ مجھ سے بڑی گلتی ہوگئی ہے جی۔ میں وہ کوٹھی ہی بھول گیا ہوں۔" وہ بے چارگی سے بولا "پچھلے پانچ دن سے میں وہاں جارہا ہوں جی۔ مجھے وہ کوٹھی ہی نہیں ملتی۔ میں نے دو تین نشانیاں رکھی تھیں۔ وہ بھی مجھے نہیں ملتیں جی۔ بڑی بھول ہوگئی ہے جی مجھ سے... میں پنڈ جاکر گھر والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ رابعہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ تو آس لگائے بیٹھی ہے کہ میں نے روپے کما کر لانے ہیں۔ یہاں کمائی کرتے کرتے اوجار بھی کھڑا دیے میں نے۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"تم مسجدوں کے اندر کیوں گھومتے رہتے تھے۔ ہم نے کئی بار تمہیں مسجد کے آس پاس دیکھا ہے۔" وحید نے پوچھا۔

"وہ جی... مسجد بھی تو ایک نشانی تھی اس کوٹھی کی۔ اس کوٹھی میں اوجار رکھنے کے بعد میں نے ایک پاس کی مسجد سے پانی پیا تھا۔ پانی پی کر باہر نکلا تو وہ ٹیالے رنگ کی کوٹھی سیدھے ہاتھ دو تین کوٹھیاں چھوڑ کر نجر آئی تھی۔ میں نے اس علاقے کی کئی مسجدیں دیکھی ہیں لیکن وہ کوٹھی نہیں ملی۔ پتا نہیں کدھر کھڑ گئی ہے وہ کوٹھی۔ میں پنڈ جاکر کیا منہ دکھاؤں گا جی۔"

"تمہاری جیب سے ایک اخباری کاغذ نکلا ہے' اس کا کیا چکر ہے۔" ایک ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"اس میں کوئی بری بات ہے مائی باپ؟" وہ کانپ کر رہ گیا

"وہ کاغذ کیسے پہنچا تمہاری جیب میں؟"

"اخبار سے پھاڑ کر رکھ لیا تھا جی۔"

"یہی تو پوچھ رہے ہیں کہ کیوں رکھ لیا تھا۔"

"بس جی' چھوٹے پپو کے لیے رکھ لیا تھا۔"

"یہ چھوٹا پپو کون ہے؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"پپو میرا بھتیجا ہے سرکار' اسکول پڑھتا ہے۔ رابعہ بھی اس سے بڑا پیار کرتی ہے۔ پپو۔ پپو کو وڈا شہر (لاہور) دیکھنے کا بڑا چاہ ہے جی۔ اس "کاگج" پر شہر کی مورتیں تھیں۔ شاہی قلعہ تھا' بادشاہی مسجد تھی' یادگار تھی۔ میں نے یہ کاگج پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ مجھ سے کوئی گلتی ہوگئی ہے جی؟" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ اس کے فاقہ زدہ ہونٹ لرزتے چلے جارہے تھے۔

انسپکٹر وحید' ایس آئی باجوہ اور ان کے اعلیٰ افسران خاموش بیٹھے اور حیرت سے اس شخص کو دیکھے چلے جارہے

تھے۔ غالباً سب سے زیادہ حیرت وحید کو ہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ اس کی چہرہ شناسی بھی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ جس سادگی کو وہ بہروپ سمجھ رہا تھا' وہ بہروپ انہیں اصلیت تھی۔ وحید کے تصور میں جو شخص کسی ملک دشمن ایجنسی کا ایجنٹ تھا اور اپنے حلیے میں اپنی بے پناہ عیاری چھپائے ہوئے اپنے ٹارگٹ کی تلاش میں تھا' دراصل کسی ٹارگٹ کی تلاش میں نہیں بلکہ اپنی بوری کی تلاش میں تھا۔ اس کے اوزاروں کی بوری جسے وہ سادہ لوح کسی بے پروا صاحب ثروت کی کوٹھی میں رکھ کر بھول گیا تھا اور اب ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

وحید کے افسران کو اپنے وقت کے ضائع ہونے کا شدید احساس تھا۔ ان میں سے کئی ایک برے برے منہ بنا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سب اٹھ کر چلے گئے اور بھیگی آنکھوں والے دیہاتی کے پاس بس وحید اور اس کے دو تین ماتحت رہ گئے۔ اس سادہ لوح نے بڑی عاجزی سے وحید کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "سرکار' میں نے آپ کو اپنے پنڈ کا نام بتادیا ہے' اب میری عجت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پنڈ میں سب مجھے بڑا سیانا سمجھتے ہیں اور وہ میری منگ تو سمجھتی ہے کہ سارے جہان کی عقل مت میرے اندر ہی بھری ہوئی ہے۔ اگر اسے پتا چلا کہ وڈے شہر میں میرے ساتھ کیا ہوا ہے تو وہ بڑی شرمندی ہوگی۔ سارے پنڈ والے بھی میرا بڑا مجاق اڑائیں گے۔ میری عجت خراب ہوجائے گی سرکار۔"

وحید کا پیشہ ایسا نہیں تھا کہ کسی پر ترس کھایا جاتا مگر نہ جانے کیوں اسے اس سادہ لوح پر بہت ترس آیا۔ وہ کچھ دیر تک یک ٹک اسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر اس نے دیہاتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دیکھو شادے!" اس نے نرم آواز میں کہا "جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا' اب سیدھے واپس پنڈ چلے جاؤ ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ شہروں کے حالات آج کل بڑے خراب ہیں۔ یہاں قدم قدم پر مصیبت کھڑی ہے۔ لوگوں کے کپڑے تک اتر جاتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ جس طرح تم یہاں منہ اٹھا کر گھومتے پھر رہے ہو' کسی بھی وقت پولیس کے ہتھے چڑھ سکتے ہو یا کسی اور بکھیڑے میں پڑ سکتے ہو۔"

وہ کافی دیر تک ارشاد عرف شادے سمجھاتا رہا۔ وہ آنسو بہاتا رہا اور سعادت مندی سے سر ہلاتا رہا۔ اس کے پاس واپسی کا کرایہ موجود تھا' وحید نے اسے گاؤں واپس بھیج دیا۔ کہنے کو تو ارشاد واپس اپنے گاؤں چلا گیا مگر وحید کے دل میں شک سا تھا۔ گاہے گاہے اس کے ذہن میں خیال آتا تھا کہ شاید شادا واپس گاؤں نہیں گیا اور ابھی یہیں شہر میں گمشدہ متاع تلاش کر رہا ہے۔ ایک دو بار اس کے دل میں آئی کہ وہ کسی کانسٹیبل کو شادے کا ایڈریس دے کر اس کے گاؤں بھیجے اور پتا کرائے کہ وہ گاؤں پہنچا یا نہیں لیکن پھر مصروفیت میں یہ خیال اس کے ذہن کی گرفت سے نکل گیا۔

چار پانچ روز بعد اسے ایک اہم کیس کی تاریخ بھگتنے کے لیے ملتان جانا پڑ گیا۔ اس کی واپسی وہاں سے قریباً دس روز بعد ہوئی۔ جس روز وہ واپس لاہور پہنچا۔ اسی روز ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ وحید کو ایک شخص کا نزاعی بیان لینے کے لیے فوراً سروسز اسپتال جانا پڑا۔ اس شخص کو گلبرگ کے علاقے میں ایک کوٹھی کے سیکیورٹی گارڈ نے گولی مار کر شدید زخمی کردیا تھا۔ اسپتال پہنچ کر وحید نے جاں بلب شخص کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ وہ ارشاد عرف شادا ہی تھا۔ اس کی جان واقعی لبوں پر پہنچ چکی تھی۔ گولی اس کے کولہے سے نکال لی گئی تھی۔ ارشاد ان دو ہفتوں میں پہلے سے بڑھ کر مصیبت زدہ اور خستہ حال نظر آنے لگا تھا۔ ایک سرکاری افسر کے گھریلو چوکیدار نے وحید کو بتایا کہ یہ شخص شام کے بعد مشکوک انداز میں ایک کوٹھی کے اندر تاک جھانک کر رہا تھا۔ گارڈ نے اسے للکارا تو یہ بھاگ کھڑا ہوا۔ گارڈ نے تاریکی میں اس کا پیچھا کیا اور نہ رکنے پر گولی چلادی' جو اس کے کولہے میں لگی۔

مضروب کی جامہ تلاشی میں بس کے کچھ پرانے ٹکٹ' دس دس کے دو نوٹ اور ڈیڑھ روپے کی ریزگاری ملی تھی۔ اس کے علاوہ ایک جیب میں بھنے ہوئے چنے اور گڑ کی چھوٹی سی ڈلی تھی۔ وحید بڑے دکھ کے ساتھ جاں بلب شادے کے اوپر جھک گیا۔ شادا بڑے دھیمے لہجے میں اٹک اٹک کر بولا "مجھے معافی دے دو صاحب ... مجھ سے بڑی گلتی ہوئی۔ میں واپس پنڈ نہیں گیا تھا۔ اپ ... اپنی بوری ... کے بغیر میں کیسے جاتا؟ اپنی ماں کو اور اس کو (رابعہ کو) کیا منہ دکھاتا ..." وہ کچھ دیر تک اپنی اکھڑی سانسوں کو درست کرنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر نے معذرت کرکے وحید کو پیچھے ہٹادیا۔

کچھ ہی دیر بعد شادا دم توڑ گیا۔ وحید کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ اس غریب شہر کو دیکھتا رہا۔ جو محنت کشی کا سادہ لوح ایجنٹ تھا۔ جس کے "خفیہ رابطے" صرف اپنی لاچاری سے تھے اور اس شہر میں جس کا پہلا اور آخری ٹارگٹ اپنے اوزاروں کی بوری ڈھونڈنا تھا۔

میری بات تو سنو!

طاہر حسادیہ معلّ

بعض اوقات کسی کمزور پر "دو تڑے اور" والی کہاوت بالکل درست بیٹھتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی منظر تھا جس کا ہر منظر انتہائی غم ناک اور دل توڑ دینے والا تھا مگر کہا گیا ہے کہ نظر کا فریب عقل مند اور دردمند دل رکھنے والوں کو بھی اتنا ہی سفاک بنا دیتا ہے جس پر انسان بعد میں چاہے جتنا بھی پشیمان ہو مگر اس گناہ کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا جس کا وہ خطاوار ہو چکا ہو۔

ایک کمزور انسان کی مظلومیت اور مگرمچھ کاروں کی سفاکی کا احوال

کالونی کے پارک میں وہ شخص آج پھر چہل قدمی کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس پچپن سال رہی ہوگی۔ اس کے کپڑے پرانے لیکن صاف ستھرے ہوتے تھے، شیو بڑھی ہوئی، بال لمبے لیکن منتشر۔ ہاتھ میں عموماً ایک سفید رنگ کا شاپر ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر بچے صغراں کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ انہوں نے بے تاب نظروں سے اپنے چار سالہ پوتے حمزہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ حمزہ پارک کی سلائڈ کے قریب دیگر بچوں کے ساتھ کھڑا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر

دیا تھا۔ بیگم صفدر نے جلدی سے اپنی چادر سر پر اوڑھی اور حمزہ کو گھر لانے کے لیے پارک کا رخ کیا۔ بیرکوں کے قریب والی اس کھڑکی سے پارک کا منظر صاف نظر آتا تھا مگر کم و بیش ایک سال سے بیگم حمزہ کا یہ معمول تھا کہ جب اس کا جی حمزہ پارک میں کھیلتے جاتا تو وہ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کو بلاتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں جیسے حمزہ کے ساتھ چپک سی جاتی تھیں۔ حمزہ کے ساتھ ان کی محبت بھی ایسی ہی تھی۔

بیگم صفدر نے جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت ان کا بیٹا ارسلان بہ مشکل دو سال کا ہوگا۔ ان کے شوہر شاہ عالی کی ایک دکان پر مل تھے۔ ایک دن وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی موٹر سائیکل پر کام پر گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ ایک بس ڈرائیور کی غفلت اور جلد بازی نے ان کی جان لے لی۔ اس حادثے کے بعد بیگم صفدر کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ زندگی کی تمام مشکلات اور محرومیاں جھیل کر انہوں نے ارسلان کو پال پوس کر جوان کیا اور تعلیم دلائی بلکہ اس کی شادی بھی کر دی۔۔۔ آج کل ارسلان فلائٹ کے سلسلے میں کویت میں مقیم تھا۔ بیگم صفدر اپنی بہو شازیہ اور پوتے حمزہ کے ساتھ اس خوب صورت فلیٹ میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کی ساری خوشیاں جیسے اپنے پوتے میں سمٹ آئی تھیں، وہ ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا اور وہ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ سب لوگ انہیں بڑی آپا کہہ کر بلاتے تھے۔

اس جمعے کو پارک میں وقت گزارنے کے بعد وہ حمزہ کو گھر لے آئیں۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ان کی بہو شازیہ نے کہا۔ "کیا ہوا امی! آپ حمزہ کو واپس لے آئیں؟"

"وہ آج پھر پارک میں ہے۔" بڑی آپا نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شازیہ کھڑکی کی طرف گئی۔ پارک میں بچوں کا ہجوم تھا۔ واپس آ کر اپنی ساس کے پاس بیٹھ گئی۔ "امی! آپ بھی نا۔۔۔ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ بچہ نہیں لگتا۔ بچوں سے پیار کرتا ہے۔ بچے بھی اس سے باتیں کرتے ہیں۔۔۔"

آپا نے تلخ کر کہا۔ "بچے اس سے باتیں کرتے ہیں تو کیا وہ ٹھیک ہو گیا؟ تم حالات کو نہیں دیکھ رہیں کہ کس طرح کے جا رہے ہیں۔ جو روز بچے اغوا ہو رہے ہیں۔ ہر روز خبریں آ رہی ہیں۔ اب تو ظالم ایسے ہیں کہ ماں باپ کے ہاتھوں سے بچے چھین کر لے جاتے ہیں۔"

شازیہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے امی! لیکن آپ کو پتا ہے کہ میڈیا بہت زیادہ غلط چیز پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی وہ سرا ایکٹو ہو تو کسی بھی ایشو کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر اسے انتہا پر پہنچا دیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اخباروں اور ٹی وی والے خبریں جھوٹی ہیں اور اس طرح کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔ میرا مطلب ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ احتیاط ضرور کریں لیکن یہ تو نہ ہو کہ بچوں کو گھروں میں بند کر دیں، ان کی پڑھائی اور تفریح کو درہم برہم کر دیں۔ پرسوں میں بھی اس بندے سے ملی تھی۔ وہ پیار باتیں بھی کی تھیں۔ دل کا برا نہیں لگتا۔ اکبرہ کی طرف کتنی رہتا ہے۔ بالکل قبول کرتے ہوئے بھر آتا ہے۔۔۔" بات کرتے کرتے شازیہ نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور ذرا چونک کر بولی۔ "وہ دیکھیں، اب بھی ان بچوں کے پاس نماز پڑھ رہا ہے۔"

آپا عینکوں پر زور دے کر انہیں اور کھڑکی سے باہر نظر دوڑانے لگیں۔ وہ شاید عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ڈوبتی کے سفید بال ڈھلتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ آپا نے ایک دو بار پہلے بھی اسے نماز پڑھتے یا تسبیح مسجد کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔ آپا نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کسی کو نماز پڑھتے دیکھ کر یہ سرٹیفکیٹ تو نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ہر طرح سے نیک پاک ہے۔ دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دوں۔ جب یہ بندہ پارک میں ہوگا، میں حمزہ کو پارک میں نہیں رہنے دوں گی۔"

شازیہ نے تلخ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے سر ہلا دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے روز جب بڑی آپا بلڈنگ کے کلینک نمبر چھ میں گئیں تو وہاں بھی یہی بات ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اور خواتین بھی بیٹھی تھیں۔ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ کل اس پارک والے شخص نے ان کی تین سالہ پوتی کو زبردستی سائیکل سے اتار کر گود میں لینے کی کوشش کی۔ بچی رونے لگی تو انہوں نے اس بندے کو جھڑک کر بھگا دیا۔

اسی دوران میں کلینک نمبر پانچ کی عورت بیگم جلدی سے باہر نکلیں۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں کسی دوا کا سرخ رنگ تھا۔ "یہ کیا ہے؟" انہوں

سے نہ تنگ عورتوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔
کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ بولیں۔ "یہ نشے کی گولیاں تھیں... اور یہ بندہ روز پارک میں بیٹھ کر کھاتا ہے۔ پرسوں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس نے پہلے گولیاں کھائیں، پھر شاپر سے پانی کی بوتل نکالی اور اکٹھی دو تین گولیاں نگل گیا۔"
"ہوسکتا ہے کہ نشے کی گولیاں نہ ہوں۔ کوئی دوا وغیرہ ہو۔" عالی نذیر صاحب کی بیوی بولی۔
"نہیں، میں نے خود پتا کیا ہے میڈیکل اسٹور والے سے۔ وہ کہتا ہے کہ نشے کی گولیاں ہیں، ہم نشے کے علاوہ نہیں دیتے بکسا کھوتو دیتے ہی نہیں۔"
خواتین بڑی دیر تک اس کی پارک پر گفتگو کرتی رہیں۔ عصر کی نماز کے وقت بڑی آپا اپنے فلیٹ میں واپس آئیں تو گولیوں والا سرخ رپورٹر ان کے پاس تھا۔ سیڑھیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ شاپر والا آج پارک میں موجود نہیں تھا (اس کا نام غیور اور دی اور غیور محسوس طور پر شاپر والا پڑ گیا تھا)
بڑی آپا نے سرخ رپورٹر کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لکھو کیا ہے؟"
شازیہ نے استفسار کیا تو بڑی آپا نے ساری تفصیل بتائی۔ شازیہ گھر جلد جلد کھانا بنانے کے لیے قرآنی اسٹور تک جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سودا سلف لے کر واپس آئی تو اس کے چہرے پر قدرے اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ "امی! یہ کوئی نایاب یا ممنوعہ گولیاں نہیں ہیں۔ یہ ہی نشے کی ہیں۔ یہ سکون آور دوا ہے۔ ہر میڈیکل اسٹور پر دستیاب ہے۔ آپ کہتی ہیں تو میں ابھی لاکر دکھا دیتی ہوں۔"
"سکون کی گولیاں بھی اکٹھی دو تین کھالی جائیں تو نشہ ہو جاتا ہے۔" بڑی آپا نے کہا۔
"امی جی! کسی نے خودکشی کرنا ہو تو پھر وہ ایسی گولیاں نہیں کھائے گا۔ کھانسی کا کوئی تیز سا سیرپ پی جائے گا۔"
اگلے روز سہ پہر کے وقت شاپر والا پھر پارک میں موجود تھا۔ یہ ایک اپڈیٹ تھا۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھا تھا اور شاپر میں سے کچھ نکال کر کھا رہا تھا۔ وہ ایک اپڈیٹ تھا۔ حمزہ پارک میں ضرور جاتا تھا۔ آج بھی اس کے ہم عمر اس کے ساتھ جانے کا اصرار کر رہے تھے۔ وہ ضد کر رہے تھے لیکن بڑی آپا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اسے پارک میں نہیں جانے دیں گی۔
حمزہ کا اصرار بڑھا تو شازیہ نے شامل ہونے کی ہامی بھر لی اور کہا۔ "امی! میں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"
بڑی آپا، بہو سے زیادہ بحث نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے غصے کی سانس لی اور خاموش ہو گئیں۔ شازیہ اور حمزہ کے باہر جانے کے کچھ دیر بعد وہ اٹھیں اور اس کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں جہاں سے پارک میں دیکھا جا سکتا تھا۔ حمزہ کھیل کود میں مصروف ہو چکا تھا۔ بڑی آپا نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ شاپر والا حمزہ پر خصوصی توجہ دیتا ہے یا شاید یہ ان کا وہم تھا۔ اب بھی وہ کھیلتے سے حمزہ کو تک رہا تھا۔ شازیہ اس کے قریب ہی بنچ پر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ شاپر والا بہت کم باتیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بہت کم بول رہا تھا۔ شازیہ نہیں تھکتے بولتی تو وہ تھا اب میں شاید ایک بولتا۔ اس دوران میں حمزہ ان دونوں کے پاس آیا تو شاپر والے نے اس سے بھی دو چار باتیں کیں اور شاپر سے ایک کیلا نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ حمزہ نے لینے سے انکار کیا تو وہ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر اٹھ گیا۔ اسی دوران میں شاپر والے نے اپنے دوسرے شاپر میں سے کوئی ڈائری نما چیز نکالی اور اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گاہے بگاہے وہ کن انکھیوں سے بچوں کی طرف اور خاص طور سے حمزہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ آپا کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ بہو اور بچہ جلدی واپس آ جائیں۔
آخر وہ آ گئے اور آپا نے سکھ کی سانس لی۔ اس نے شازیہ سے اس گفتگو کے بارے میں پوچھا جو شاپر والے سے ہوئی تھی۔ شازیہ نے کہا۔ "امی! میرے خیال میں تو وہ کوئی خاص بندہ نہیں ہے۔ وہاں اجمیر کی طرف اپنے کسی بھتیجے کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی بلڈنگ میں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ شور سے اسے بہت نفرت ہے، خصوصاً گاڑیوں کے شور سے۔ ہماری گلی کا یہ پارک پُرسکون ہے، اس لیے یہاں نکل کر یہاں چلا آتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگتا تو نہیں آیا کروں گا۔ میں نے کہا، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔"
"تم نے یہ نہیں کہا کہ سارا دن اسی پارک میں گزارا کرو۔ بلکہ ہو سکے تو ہمارے گیٹ کے سامنے ہی ڈیرا ڈال لو۔" آپا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ عام طور پر طنزیہ لہجہ اختیار نہیں کرتی تھیں لیکن اس موقع پر ان سے رہا نہیں گیا تھا۔
"امی! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔" شازیہ نے

بڑا نے تبصرہ کیا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ وہ لڑکا صفدر ہی ہے۔ اگر"

"وہ ڈائری میں کیا دیکھ رہا تھا؟" آپا نے بہو کی بات کاٹی۔

"وہ ڈائری نہیں تھی۔ دعاؤں کی کتاب تھی۔ پڑھ رہا تھا۔ یہاں پر پہنچ کر رک گیا تھا۔"

بڑی آپا چپ ہو گئیں مگر دل میں کھٹکے برستور موجود رہے۔ انہوں نے بارہا اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کسی وقت آپا کو لگتا تھا کہ یہ بندہ بہت برا ہے پھر بہت اچھا ہے۔ کالونی میں بھی اس کے متعلق دو طرح کی رائے تھی۔ کچھ لوگ اس کو بالکل بے ضرر سمجھتے تھے اور کچھ کے نزدیک وہ مشکوک تھا۔ اس کو بے ضرر سمجھنے والوں میں کالونی کا چوکیدار محمد خان بھی شامل تھا۔ اس نے کالونی کے دو چار معزز افراد کو شاپر والے کا شناختی کارڈ بھی دکھایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ آبائی طور پر شمالی آباد کا رہنے والا ہے اور اس کے کوائف بالکل درست ہیں۔ اس کا نام سعید احمد معلوم ہوا تھا۔

لیکن تھانہ دار چوکیدار کی چھان پھٹک اور ایک مقامی وڈیرے کی چھان پھٹک میں بہت فرق ہوتا ہے اور پھر وڈیرے بھی ویسے جس کا کل سرمایہ اس کا پوتا ہو۔ اسی دوران میں ایک اور اطلاع بھی آئی جس نے بڑی آپا کو مزید پریشان کر دیا۔ ارشد جنرل اسٹور والے کی بیوی فرخندہ نے کہا کہ اسے شک ہے کہ شاپر والا اپنے شاپر میں کوئی پستول قسم کی چیز بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ پارک میں گئی تھی۔ جھولے بچے کو سلائڈ دینے کے لیے وہ بڑی سلائڈ کے اوپر چڑھ گئی۔ شاپر والا پاس ہی بنچ پر بیٹھا تھا۔ بلندی سے فرخندہ کی نظر شاپر پر پڑی۔ شاپر میں تین چار کیلے، بسکٹ کا ڈبا تھا۔ اس کے علاوہ اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی سیاہ سی شے تھی جس کے بارے میں فرخندہ کا خیال تھا کہ وہ کسی پستول وغیرہ کا دستہ تھا۔ شاپر والے نے جب دیکھا کہ فرخندہ شاپر کو تاڑ رہی ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے شاپر کو جلدی سے لپیٹ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کے بعد فرخندہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ دونوں بچوں کو لے کر فوراً گھر آ گئی۔

کچھ دیر بعد آپا کی بہو شازیہ بچے کو لے کر گھر آئی تو آپا نے اسے بھی یہ خبر سنائی۔ شازیہ نے ہمیشہ کی طرح اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بولی۔ "امی جان! جب بھی ڈرا ہوا ہو تو اسے ہر کسی کی سائیکل لگنے لگتی ہے۔ اکثر واقعات ہم وہم کا کھاتے ہیں۔ جو شے نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو فرخندہ کو ارشد چچا یا چچا سے کہنا چاہیے تھا یا کم از کم اپنے شوہر کو بتاتی اور وہ جا کر دیکھتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس نے بتایا ہو۔"

"اگر بتایا تو کیا کہنے لگے؟" شازیہ نے پوچھا۔

نتیجے کا تو بڑی آپا کو پتا نہیں تھا، اس لیے وہ چپ ہو گئیں مگر چند لمحے بعد یہ بات بھی کلیئر ہو گئی۔ مغرب کی نماز پڑھنے والی آنٹی آسمان کے مغرب میں آئیں اور انہوں نے بتایا کہ جنرل اسٹور والے کی بیوی نے جا کر اپنے شوہر کو بتایا تھا۔ شوہر ارشد نے اسی وقت کالونی کے چوکیدار محمد خان کو ساتھ لیا۔ دونوں پارک میں چلے گئے اور شاپر والے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں گفتگو کرتے ہوئے ارشد نے بہانے سے شاپر والے کا سامان دیکھا۔ وہ شاپر کو ٹٹول کر بولا۔ "اس میں کیا لے کر گھوم رہے ہو؟" شاپر والے نے شاپر روک دیا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ دعاؤں کی کتاب تھی اور کچھ طرح کی سبزیاں تھیں اور اسی طرح کی دیگر چیزیں۔

سب کچھ بتا کر آخر میں آنٹی نے کہا۔ "لیکن سچ پوچھیے تو ابھی اس بھوری نسل کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ اس بندے میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔"

بڑی آپا نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ فرخندہ کے جانے کے بعد وہ ہوشیار ہو گیا ہو اور اس نے خطرہ شاپر سے نکال کر اپنے لباس میں چھپا لیا ہو۔ ان لوگوں کو اس کی تلاش لینی چاہیے تھی۔"

شازیہ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

یہ پستول والا واقعہ کل سہ پہر کو ہوا تھا۔ بڑی آپا نے دل کا کاک کی طرف نگاہ دوڑائی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں یہ پستول والی بات سننے کے بعد بڑی آپا کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ ان کا دل چاہا کہ وہ آج ہی انجیر کالونی جائیں اور پتا کریں کہ یہ شاپر والا واقعی وہاں کسی بلڈنگ میں رہتا ہے یا نہیں۔ وہ انجیر شاپنگ کے لیے جمعہ بازار جاتی رہتی تھیں اور انہوں نے کئی بلڈنگ بھی دیکھ رکھی تھیں۔

دوپہر کو چند نوالے لینے کے بعد وہ فوراً نکل کھڑی ہوئیں۔ بہو شازیہ کو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ سبزی لینے جا رہی ہیں، اپنی کچن سے متعلق۔ انہوں نے بڑی سڑک



ہے کہ کشتی بنانے اور سیر کی اجازت دینے کی ہدایت کی۔ کئی ہفتے تک جھیل بند رہی۔ اس کی وجہ سے بچوں کی آمد بھی کم ہوگئی۔ ان کے والدین کھلونے خرید کر لاتے تھے اور وہ ''ہائے ہائے'' کرتی ہوئی جارہی تھیں۔ کئی ہفتے تک بچے اداس رہے۔ بالآخر تین ہفتوں بعد جھیل کو دوبارہ کھولا گیا۔ اس بار کشتیوں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔ ان کشتیوں میں سے کسی کشتی کے بارے میں معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شاپر والے نے اپنے بچے کا نام جھیل کے کنارے لکھا تھا۔ اگلے روز کھلنے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود نہ تو عبدالحفیظ کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی یہ پتا چل سکا کہ اس جیسے کا کوئی اور شخص کہاں رہتا ہے۔ شاپر والے نے اپنی رہائش کے بارے میں سراسر جھوٹ بول رکھا تھا۔ یہاں کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اور کشتی بنانے والا تھا۔

سیر سپاٹے کے بعد جب بڑی آپا واپس لوٹیں تو بے حد پریشان تھیں۔ شاپر والا حسب معمول پارک میں موجود تھا۔ بہرحال یہ دیکھ کر انہیں تسلی ہوئی کہ شازیہ اور حمزہ پارک میں نہیں تھے۔ وہ اور قسیم مل گئے۔ انہوں نے بھوکو پکڑ نہیں لیا تھا لیکن ان کے اندر ایک خوف بٹھا دیا تھا۔ آج شام کے بعد بلڈنگ کے مکینوں کی ہنگامی میٹنگ ہونے والی تھی۔ اس میں بچوں کے بڑے مسائل ڈسکس کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہیڈ آفس صاحب بھی اس میں شریک ہوجاتے تھے۔ آپا نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس میٹنگ میں شاپر والے کا پول کھولیں گی اور پھر پولیس کی مدد سے اس پر قابو پالیا جائے گا لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ آج ہی ایک ایسا واقعہ ہونے والا ہے جو سب کچھ الٹ پلٹ کر ڈالے گا۔

حمزہ کو پارک بہت پسند تھا اس لیے اسے آج پارک میں نہیں جانا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ آج وہ اسے ہرگز نہ جانے دیتیں اگر جانتیں کہ شازیہ بھی اس کے ساتھ کہاں نہ ہوتی۔ وہ سیڑھیوں کے پاس گری ڈال کر بیٹھ گئیں اور کھڑکی میں سے پارک کا منظر دیکھنے لگیں۔ مغرب کے بعد شاپر والا چلا جاتا تھا لیکن کبھی کبھی مغرب کے بعد بھی پارک میں ہوتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی تھا۔ پارک میں گاڑیاں لائٹس روشن تھیں اور ان کی مدھم روشنی میں اندھیرا تھا اور ان کے ''بچے'' اب بھی پارک میں نظر آرہے تھے۔ شاپر والا بنچ پر خاموش بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اپنی ٹوپی اپنے سر سے اتارتا، اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتا اور ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ لیتا۔ اس کی طرف سے بڑی آپا کا دھیان ٹھوکر سے ٹھہرا ہوا تھا اور ان ٹھوکر کی نحوست کا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی ان کے دل و دماغ

میں کسی وقت نکل ہی آتا جاتی تھی اور وہ سوچنے لگتی تھیں کہ شاید وہ بچھڑے ہوؤں کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

پارک میں اب روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ بڑی آپا کی نگاہ ایک جوڑے پر پڑی۔ عورت کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ مرد جو یقیناً اس کا شوہر تھا، بیوی کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ اس نے جینز اور جرسی پہن رکھی تھی۔ عورت کی گود میں تقریباً ڈیڑھ برس کی ایک خوب صورت بچی تھی۔ یہ لوگ غالباً اس کالونی کے ہی رہائشی تھے۔ اس اسٹریٹ ہی دو، تین مرتبہ عورت کو بڑی آپا نے ایک سے زائد بار پہلے بھی کالونی کی مارکیٹ میں دیکھا تھا۔

دفعتاً آپا کی نگاہ بھٹک گئی۔ انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ شاپر والا اپنی جگہ سے اٹھا اور عورت کی طرف جھپٹا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے اس میں حیران کن پھرتی تھی۔ اس نے بچی کو عورت کی گود میں سے جھپٹے سے نوچ لیا۔ عورت چلاتی ہوئی اس پر جھپٹی اور بچی واپس چھیننے کی کوشش کی۔ مرد بھی سنبھل کر شاپر والے کی طرف آیا۔ شاپر والا الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ پکڑا جائے گا تو اس نے بچی پر رکھے شاپر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ روتی چلاتی بچی بدستور اس کی گرفت میں تھی۔ بڑی آپا نے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ شاپر والے نے شاپر سے سیاہ رنگ کا ریوالور نکالا اور اس کا رخ عورت اور مرد کی طرف کردیا۔ ساتھ ساتھ وہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا، جیسے بھاگ نکلنے کی فکر میں ہو۔

بڑی آپا کو کرنٹ لگا ہو۔ اپنے خلیت کی بالکونی میں کھڑی اور چیخنے کی پوری قوت سے چلائیں۔ "پکڑو۔۔۔ پکڑو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ اس کمینے کو....."

سڑک سے گزرتے ہوئے لوگوں نے پہلے اوپر بڑی آپا کی طرف دیکھا پھر اس طرف دیکھا جو عورت اشارے کر رہی تھی۔ کئی افراد پارک کی طرف دوڑے۔ ان میں سے جو سب سے آگے تھا، اس نے عقب سے شاپر والے کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اسی دوران میں ارشد جنرل اسٹور پر کھڑے کئی اور لوگ بھی بھاگتے ہوئے پارک میں داخل ہوگئے۔ ایک نوجوان نے گرفت میں لیے کا بڑا بھرپور وار شاپر والے کے سر پر کیا۔ وہ گارڈن چیئر کے اوپر گر گیا۔ بچی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ پھر بچی کی طرف بڑھا مگر اس مرتبہ ایک شخص نے اس کے سر پر اینٹ ماردی۔ وہ سر پکڑ کر دہرا ہوگیا۔ لوگ اس پر پل پڑے۔ اب پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لوگ اسے بے دردی سے مارنے لگے۔ وہ چلا رہا تھا۔ "میری بات تو سنو۔ میری بات تو سنو۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ اور سر بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب اس کی کوئی کوشش کامیاب ہونے والی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے نقاب الٹ چکا تھا۔ اس نے ایک معصوم بچی کو اس کے ماں باپ سے یوں چھینا تھا جیسے کوئی بے رحمی سے کسی کونپل کو شاخ سے توڑتا ہے ..... آج اس نے اپنا اصل روپ کالونی والوں پر عیاں کردیا تھا۔

وہ ہجوم میں ڈوب چکا تھا۔ لوگ اسے مار رہے تھے، گھسیٹ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، ڈنڈے تھے، اینٹیں تھیں۔ وہ غم و غصے سے دیوانے ہوئے تھے۔ وہ آج اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ وہ شاید اسی جگہ انصاف کردینا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے۔ پھر "پولیس کو اور کالونی کو" بتادیتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں، پھر سے لوگوں کا جینا حرام کرنے لگتے ہیں۔ شاپر والے کی آواز اب ڈوب چکی تھی۔ بس اس کا ایک ہاتھ کبھی کبھی ہجوم میں سے نظر آتا تھا۔ وہ جیسے اس زخمی ہاتھ کے ذریعے اب بھی اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر یہ ہاتھ بھی نظر آنا بند ہوگیا۔ ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ پارک میں اور سڑک کی کالونی میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔

آپا نے دیکھا بپھرے ہوئے ہجوم میں دو چار لوگ ایسے بھی تھے جو شاپر والے کو بچانے کی آخری کوشش کر رہے تھے لیکن غم و غصے کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔

"مر گیا ہے۔ مر گیا ہے ..... چھوڑ دو۔" ایک چلاتی ہوئی سی آواز بڑی آپا اور شازیہ کے کانوں تک پہنچی۔

لیکن لوگ مارتے رہے پھر وہ اس کے کچلے پھٹے خون آلود جسم کو گھسیٹ کر سڑک پر جلتے الاؤ کے قریب لے آئے۔ وہ بیدردی یا جنونی کا تمثیل حاصل کر رہے تھے۔ وہ اسے عذاب ناک کردینا چاہتے تھے۔ پولیس کی وہ گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔ کالونی کے محافظوں نے شریروں کو بہ مشکل الگ ہٹانے کے عمل سے روکا۔ پولیس آنے کے بعد بہت سے لوگ منتشر ہوگئے لیکن بہت سے اب بھی سڑک پر موجود تھے اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ بچی کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور نہ ہی اس کے ماں باپ۔ وہ شاید بہت خوفزدہ ہوگئے تھے۔ اغوا کنندہ کا کارندہ اٹھا کر وہ بچی سمیت

سوچ سے بوجھل ہو گئے تھے۔

گارڈن لائٹ کے نیچے ایک نامعلوم لڑکی کا نیم برہنہ جسم بے سدھ اور مردہ پڑا تھا۔ یہ شاپر والا تھا۔ کلرکیوں اور بالکونیوں میں سے آن گنت دہشت زدہ نگاہیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بڑی آپا اور شازیہ تادیر یہ منظر نہیں دیکھ سکیں اور اندر کمرے میں آ گئیں۔ بڑی آپا نے کہا۔

"دیکھ لیا نا شازیہ... میں یہی کہتی تھی نا...؟"

شازیہ نے سوئے ہوئے عزہ کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

یہ کہانی یہاں تک ہی رہتی تو شاید کچھ لوگوں کے لیے ٹھیک ہوتی لیکن یہ یہاں تک نہیں رہی اور اس نے ایک دردناک موڑ لے لیا۔ پولیس کی چھان بین ایک اور دردناکے کے بارے میں خبریں چھپیں، اگلے روز کے اخبارات میں بھی اس کی تصویریں چھپیں۔ یہ تصویر شاید اس کے شناختی کارڈ میں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر فیصل آباد سے کچھ لوگ روتے پیٹتے کالونی میں پہنچے۔ ان میں دو مرد تھے اور ایک جوان سال عورت۔ مردوں میں ایک ستائیس اٹھائیس سالہ جوان سال شخص تھا۔ اس کا نام ہارون تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ مرنے والا شخص اس کا بھائی تھا۔ وہ کوئی پریشان یا اخبار کا نمائندہ نہیں تھا۔ وہ تو آٹھ ماہ سے خود اپنی بیوی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

کسی نے اس بیان پر یقین نہیں کیا لیکن حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ جب اس واقعے کی پرتیں کھلنا شروع ہوئیں تو لوگ دنگ رہ گئے۔ بے شمار ہیبتناکیاں پہلے سے تر دکھائی دینے لگیں۔ پولیس کی تفتیش اور صحافیوں کے ذریعے جو اصل کہانی مکمل جزئیات کے ساتھ سامنے آئی وہ کچھ اس طرح تھی۔

سرمد صاحب کے تین بچے تھے مگر ایک کے سوا ابھی کوئی صاحب اولاد نہیں تھا۔ واحد ایک بیٹی فاطمہ تھی جو سرمد صاحب کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ فیصل آباد میں ان کا کپڑے کا کام تھا۔ تاہم حج کے بعد اب وہ تقریباً ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ ایک دن سرمد صاحب اور ان کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک سالہ فاطمہ کی والدہ اسے اپنے ساتھ لگتا گھر کے ایک باہر جا میں لے کر گئی اور واپس اندر آئی تو فاطمہ وہاں نہیں تھی۔ فاطمہ گم ہو چکی تھی۔ وہ شب و روز اپنے اوسان بحال کیے تھے کہ ان کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کون سا ایسا در دازہ تھا جو سرمد صاحب اور ان کے اہلِ خانہ نے نہ کھٹکھٹایا، کون سی ایسی جگہ تھی جہاں فاطمہ کو نہ ڈھونڈا گیا۔ مسجدوں میں اعلانات سے شروع ہونے والا یہ دردناک سفر پولیس تھانے اور اخبارات سے ہوتا ہوا ٹی وی چینلز اور ماہرین تک دراز ہوتا چلا گیا۔ فرض معجزہ ہی اتنا ہوتا ہے اور وہ لوگ بھی دیوانے تھے۔ خاص طور سے سرمد صاحب کے لیے تو پھر اس میں یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ وہ ایک زندہ لاش تھے اور گلی گلی، کوچے کوچے اپنی گمشدہ حیات کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ کبھی فاطمہ کے کھلونے، جوتے اور کپڑے ان کا دل قتل کر دیتے تھے۔

دعائیں دوائیں، کچھ کام نہ آئیں۔ تین چار ماہ کی سرتوڑ کوشش کے باوجود فاطمہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ہر آہٹ پر تلاش ماند پڑنے لگی۔ آنسوؤں کے دھارے خشک تو نہیں کہاں ہوتے تھے لیکن وہ تھکنے لگے..... یہ سفر انگاروں پر چلنے جیسا تھا۔ اسی طرح سات آٹھ ماہ گزر گئے۔ وہ لوگ تقریباً ناامید ہو چکے تھے جب ایک روز سرمد صاحب کے ایک بھتیجے نے انہیں لاہور سے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے فاطمہ کو لاہور کے ایک پارک میں دیکھا ہے۔ وہ ایک گورے براؤن بالوں والی عورت کی گود میں تھی۔ وہ خود "کار" میں تھا، اس لیے فوری طور پر رک نہ سکا۔ جب گاڑی کو یوٹرن دے کر واپس پارک تک پہنچا تو عورت کہیں نظر نہیں آئی۔ اسی روز سرمد صاحب اور ان کے دو بیٹے فیصل آباد سے لاہور پہنچ گئے۔ انہوں نے پارک اور اردگرد کے علاقے میں بچی کی تلاش شروع کر دی۔ متعلقہ پولیس کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ سرمد صاحب پارک میں بیٹھے رہتے تھے اور ان کے دونوں بیٹے علاقے میں فاطمہ کی نوکر سے کی کوشش میں رہتے تھے۔ بھتیجا جو کسی کام سے لاہور آیا تھا، واپس جا چکا تھا۔ پھر وہ دن بھی روز کی انتھک کوشش کے باوجود نہ تو پولیس کوئی سراغ دے سکی اور نہ وہ لوگ خود کوئی کھوج لگا سکے۔ دونوں بیٹے زیادہ دیر اپنے جاب اور کام سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ تو واپس فیصل آباد چلے گئے لیکن سرمد صاحب کسی موہوم امید کے سہارے یہیں پر لاہور میں موجود رہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ اپنا پرانا لینڈ لائن فون یہاں لاہور سے منگوا لیا تاکہ کسی برے وقت میں کام آ سکے۔ گھر والے بہت کہتے رہے کہ وہ واپس آ جائیں لیکن گھر میں اور فیصل آباد میں ان کے لیے

کیا رکھا تھا کہ وہاں جاتے۔ انہوں نے آپ آپ اس کے ساتھ اس پارک میں آنا جاری رکھا۔ لاہور میں اپنی رہائش کے اخراجات کو کم رکھنے کے لیے وہ اسٹیشن کے قریب ایک سستے سے ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔

سرمد صاحب کے دونوں بیٹوں اور بہو کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ سرمد صاحب اپنی دوسری تلاش میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس بدزبان بالوں والی لڑکی کے ساتھ اپنی پوتی فاطمہ کو دیکھ لیا تھا۔۔۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اس پر آنسو ہی بہائے جا سکتے تھے اور سوگ ہی کیا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات ذرا کم ابلاغ لوگوں کو "پیغمبر" کر دیتے ہیں۔۔۔ ویسے بھی الہام کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اندھا بہرا ہوتا ہے۔۔۔ مار پہلے دیتا ہے، نام اور جرم بعد میں پوچھتا ہے۔ بدقسمت سرمد صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مظلوم سے ظالم بنا دیے گئے۔ انہیں اپنی پوتی کو چھونے تک نہیں لگانے دیا گیا، اس کا حلیہ تک نہیں چھونے دیا گیا۔ اسے ان سے دور کر دیا گیا اور انہیں مکمہ کر کے صوفے پر ہی بٹھا دیا گیا۔

پولیس نے بہت سرگرمی دکھائی کیونکہ اکثر "حادثوں" کے بعد ہی سرگرمی دکھائی جاتی ہے اور اس بے چارے داماد کا کہنا تھا کہ اس کیس کے ساتھ ایک بے گناہ شخص کی جان بھی گئی تھی۔ پولیس نے کالونی کے قریب ہی رہنے والے بدزبان بالوں والی لڑکی اور اس کے فرضی شوہر کا کھوج لگا لیا۔ انہوں نے ایک چھوٹا گھر کرائے پر لے رکھا تھا لیکن وہ واقعے کی رات ہی بیگ سمیت اپنے گھر سے غائب ہو گئے تھے۔ پولیس تفتیش سے پتا چلا کہ وہ دونوں پیشہ ور مجرم تھے۔ بچوں اور خاص طور سے بچیوں کو اغوا کر کے اور آگے فروخت کر دینا ان کا کاروبار تھا۔

☆☆☆

بڑی آپا کھڑکی کے سامنے اسی طرح بیٹھی رہتی تھیں۔ سارے دن میں پانچ چھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں لیٹتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے چپ چپ آنسو گرتے رہتے تھے۔ وہ منظر جیسے ان کے ذہن سے محو ہی نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اس کے بڑے جسم کو اندھا دھند ضربیں لگا رہے تھے۔ وہ چلا رہا تھا۔۔۔ "میری بات تو سنو۔۔۔ میری بات تو سنو۔۔۔" اور اس کا جسم بار بار اٹھتا ہوا بازو۔۔۔ وہ اس کا دایاں بازو تھا جس کے ذریعے شاید وہ احتجاج کر رہا تھا یا شاید اپنی پوتی کو تحفظ دینا چاہتا تھا۔۔۔ اور پھر وہ مر گیا تھا۔

اس دن بھی وہ کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی، پارک میں بھاگتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہی تھیں اور آنسو بہا رہی تھیں۔ اچانک انہیں نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ہچکیاں لے کر بلند آواز میں رونے لگیں۔

"بڑی! کیا ہوا؟" ننھی حمزہ نے انہیں اپنے ننھے منے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔

شازیہ بھی باورچی خانے سے دوڑی ہوئی آئی اور انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولیں۔

"شازیہ! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ مظہر دھوکا دیتے ہیں۔۔۔ ہم اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ جو ہمیں نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے۔"

اس روز عشا کی نماز کے بعد بڑی آپا سجدے میں گر گئیں۔ دیر تک سجدے کو آنسوؤں سے تر کرتی رہیں اور گڑگڑاتی رہیں۔ "اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ اے اللہ! میری مدد کر لے۔ وہ بچی جہاں کہیں بھی ہے اسے اپنوں میں واپس پہنچا دے۔ اے اللہ! آج میں تجھ سے لے کر ہی رہوں گی۔ میں اس وقت تک سر نہیں اٹھاؤں گی جب تک تو میری دعا قبول نہ کر لے۔ اے رب! میری دعا قبول کر لے۔۔۔ یا پھر آج ہی اس بچی کی جان بھی لے لے۔ اے قادر مطلق۔۔۔ اے علیم مطلق۔۔۔" وہ ہچکیاں لیتی رہیں اور روتی رہیں۔

انہوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی کہ سر اٹھا لے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا جب انہیں ایک دم اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہوا۔ انہیں لگا کہ کچھ بدل گیا ہے۔۔۔ کچھ ہو گیا ہے۔

انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا اور تہجد کی نماز کی تیاری کرنے لگیں۔

پیر سے بدھ شام کی بات ہے جب شازیہ نے بیمار کر آپا کو ای ای او آفس میں بلایا۔ ٹی وی پر نیوز چل رہی تھی کہ بھٹی فاطمہ کو شان کے ایک علاقے سے بازیاب کر لیا گیا ہے اور اسے اس کے والدین کے پاس واپس بھیجا جا رہا ہے۔۔۔ آپا کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے لیکن اب یہ خوشی کے آنسو تھے۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑی ہو گئیں۔ پارک پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ انہیں لگا کہ شاید وہ آج پھر پتھریلی سطح پر موجود ہے۔۔۔ دعا کی چادر بچھا کر بچوں پر جھک رہا ہے اور غوث ہے۔۔۔ اس کی دایاں بازو غوث ہے۔۔۔ اپنی پوتی کے لیے اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔

اپنے ساڑھے تین سالہ بے پاک بیٹے روفی کو نرسری میں
کر اور گھر بلوٹ کر کام کاج نبٹا کر سیدھی میں آ بیٹھی۔ اس نے
الفیہ گانوں کی ایک کیسٹ لگا کر ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور مدھم آواز
میں گانے سننے لگی۔ تاہم جلد ہی اسے ٹیپ کی آواز کچھ تیز
کرنا پڑی۔

اس کے گھر کے عقب میں ایک خالی پلاٹ تھا جہاں کسی نے
آہنی جھولے نصب کر رکھے تھے۔ سارا دن بچوں کا شور سنائی دیتا رہتا تھا۔
بعض اوقات ہوا کے ساتھ باریک برادہ بھی اُن کے گھر میں آنے
لگتا تھا۔ یہ خالص رہائشی علاقہ نہیں تھا اس لیے اہلِ محلہ کے بچوں
کو ملا کر اُسے یہ شور برداشت کرنا پڑتا تھا لیکن اُنھیں اُمید تھی کہ



صفاہر جاوید مغل

دونوں نے زندگی کے سفر کچھ اس طرح طے کیا کہ ایک دوسرے
کے ساتھی و ہمدرد کے عہد و پیمان کیے تھے، زندگی کے سارے
تلخ و خوش گوار لمحے ساتھ گزارنے کے لیے ایک دوسرے کا
ہاتھ تھاما تھا لیکن ایک چھوٹی سی بات پر وہ بیچ
ہی منزل میں سب کچھ تباہ کر گئے

ایک جوڑے کی داستان جس کے درمیان انا کی دیوار حائل ہو گئی

جلد ہی اس خالی چوٹ کی تپش اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ شیطان دانا کو اسے پیچھے یا وہاں کچھ اور لانے پر مجبور ہو جانا پڑے گا۔

کیسٹ آہستہ آہستہ اپنے دو گھروں پر گھومتی رہی اور المیہ موسیقی کی لہریں درد کی طرح اس کے دل میں اترتی رہیں۔ کیسٹ ختم ہونے کے بعد وہ اٹھی اور کھولی کھڑکی ٹیلیفون سیٹ کے سامنے آ بیٹھی۔ ریسیور اٹھا کر اس نے اپنے سرخ و سپید رخسار سے لگایا ڈائل ٹون سنی پھر اس کی خالی انگلی حرکت میں آئی اور دھیرے دھیرے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فائیو سون... تھری... نائن سکس... ٹریپل... آخری ہندسے کو انگلی سے گھمانے کے بعد اس نے چھوڑا نہیں بلکہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

پچھلے تین برس سے وہ ہر روز کم از کم ایک بار یہ نمبر ڈائل ضرور کرتی تھی... لیکن آخری ہندسے کو گھمانے کے بعد چھوڑتی نہیں تھی۔ بس ڈائل میں انگلی ڈالے بیٹھی رہتی تھی۔ سوچتی رہتی تھی... آنسو بہاتی رہتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ اس ہندسے کو کبھی مکمل ڈائل نہیں کر سکے گی۔ تمام زندگی نہیں۔ اگر اسے کسی کو فون کرنا مقصود نہیں تھا تو پھر وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی تھی؟

پانچ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کالج کی ہوم اکنامکس پڑھ رہی تھی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اور سب سے خوبصورت بھی۔ کئی سہیلیاں اپنے بھائیوں کے لیے اس کے پیچھے پڑی تھیں۔ عزیز و اقارب رشتے داروں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ لڑکی خوبصورت اور دولت مند ہو تو بے شمار انکل اور آنٹیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ سب لوگ گاہے گاہے بیٹی کی عمر پوچھتے رہتے ہیں اور بیٹی کے والدین کے سامنے اپنے ہونہار بھتیجوں کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سیرا کے ساتھ بھی ہوا لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ رشتے اوپر طے ہو جاتے ہیں۔ تو سیرا اور عمران آفریدی کا سنجوگ بھی اوپر لکھا جا چکا تھا اور اوپر کا لکھا کون مٹا سکا ہے؟

سیرا کے والد کے ایک عزیز دوست پولیس میں ڈی آئی جی تھے۔ ان کا لڑکا عمران آفریدی دواؤں کی ایک بہت بڑی فرم میں سیلز منیجر تھا۔ کہا جاتا تھا کہ بہت ہونہار نوجوان ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ ڈی آئی جی صاحب نے ایک تقریب میں سیرا کو دیکھا تو فوراً اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا۔ دونوں گھرانوں کی رضامندی شامل ہوئی تو یہ معاملہ تیزی سے آگے بڑھا اور ایک ہی سال میں عمران آفریدی اور سیرا کی شادی ہو گئی۔

عمران ایک نہایت شائستہ اور تحمل مزاج نوجوان تھا۔ سیرا کو اس میں ایک آئیڈیل شوہر کی تمام خوبیاں نظر آئیں۔ دوسری طرف عمران کو بھی سیرا کی شکل میں اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ چاند اور سورج کی جوڑی تھی۔ دونوں سج دھج کر کسی تقریب میں پہنچتے تو بقول شاعر چراغوں میں روشنی نہ رہتی۔

شادی کے بعد نو بیاہتا جوڑے نے قریباً آٹھ ماہ نہایت خوش و خرم گزارے۔ پھر اچانک ان کے نصیب میں اختلاف رائے کی ایک چنگاری آن گری جو دھیرے دھیرے بھڑکنے اور کہرام مچانے لگی۔ معاملہ یہ تھا کہ سیرا ایک پریکٹیکل لڑکی تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اس کے لیے سوہان روح تھا۔ بچپن سے اس کا میلان محنت اور جدوجہد کی طرف رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر شخص کو معاشرے میں اپنا موثر ترین کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ کوئی معقول ملازمت کرنا چاہتی ہے۔ اس سے جہاں مشترکہ کے معاشی تقاضے پورے ہوں گے وہاں اسے اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع بھی ملے گا۔ عمران نے پہلے تو ہاں بھری پھر نامعلوم وجوہ کی بنا پر اسے ملازمت کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ سیرا نے سوچا کہ یہ کوئی گمبھیر مسئلہ نہیں وہ جلد ہی شوہر کو منا لے گی مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عمران کا فیصلہ اٹل ہوتا چلا گیا اور ایک خلیج سی ان دونوں کے درمیان حائل ہونے لگی۔ یہ تنازعہ جتنی خاموشی سے پیدا ہوا تھا اتنے ہی شور شرابے سے اپنے منطقی انجام کو پہنچا اور شادی کے ٹھیک چودہ ماہ بعد نوبت طلاق تک پہنچ گئی لیکن بزرگوں کے سمجھانے بجھانے سے دونوں نے انتہائی قدم نہیں اٹھایا اور مسئلے کے آخری حل یعنی طلاق کو کچھ وقت کے لیے التوا میں ڈال دیا۔

سیرا اپنے شوہر کے گھر کو غیر آباد کر کے باپ کے گھر آ بیٹھی۔ اسے ایک دو اچھی ملازمتوں کی آفر ہو چکی تھی لیکن اس نے نہ تو ملازمت کی اور نہ شوہر کے گھر واپس گئی... اور اب ان واقعات کو ساڑھے تین یا پانچ برس گزر چکے تھے۔ دونوں نے ملاقاتوں کے تمام رشتے توڑ دیے تھے۔ عمران نے نہ تو اسے طلاق دی تھی اور نہ ہی دوسری شادی کی تھی... اس کے علاوہ وہ اپنی ملازمت پر قائم رہتے ہوئے اس نے اسے منانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے آخری فیصلے پر قائم تھا۔ سیرا کے گھر چھوڑتے وقت اس نے کہا تھا۔

"سیرا! ایک بات غور سے سن لو۔ تم خود جا رہی ہو اور خود ہی آؤ گی۔"

یہ الفاظ آج تک سیرا کے کانوں میں گونج رہے تھے اور جتنی بار یہ الفاظ گونجتے اسے اتنی ہی بار ان کا جواب بھی سیرا کو سنائی دیتا تھا۔ یہ جواب سیرا نے دیا نہیں تھا لیکن اس کے دل میں اس وقت بھی موجود تھا۔ بدزبانی خاموشی اس نے کہا تھا۔ "عمران! سیرا تم سے محبت کرتی ہے اور محبت خود دار ہوتی ہے۔ تم محبت

کر بھیک مانگنے پر مجبور نہیں کر سکتے؟ دونوں اپنے اپنے موقف پر ڈٹ چکے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اُن کی ضد مستحکم ہو رہی ہے۔

سمیرا کے ڈیڈی آفس چلے جاتے تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں تنہا رہ جاتی۔ دونوں بھائی بیرونِ ملک آباد تھے۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ سمیرا سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر پل اُس کی خبر رکھتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ تھے تو دور۔ والدہ بہت کم گو تھیں۔ دن نرسری چلا جاتا تو گھر کے در و دیوار سمیرا کو کھانے کو دوڑتے۔ وہ اس محلے میں جب بسنے پہلے ہی آباد ہوئے تھے۔ اڑوس پڑوس والوں سے تعلقات ابھی زیادہ نہیں بڑھے تھے۔ یوں بھی آبادی گنجان نہیں تھی۔ تنہائی اور یکسانی سمیرا کو وحشت میں مبتلا کرتی۔ ایسے میں کسی نامعلوم جذبے کے تحت وہ ٹیلیفون سیٹ کے پاس آ بیٹھتی۔ قرآن کے آفس کا نمبر ڈائل کرتی اور آخری ہندسے کو ڈائل کرنے کے بعد واپس جانے سے روک لیتی۔ یہی سوچتی رہتی کہ عمران اور اُس کے درمیان کتنا کم فاصلہ ہے۔ کتنا مختصر سا فیصلہ ہے۔ بس چند انچ کی حرکت کے بعد وہ اُس کے کان میں سرگوشی کر سکتی ہے۔ پھر وہ تصور میں دیکھتی کہ عمیر ہے پر عمران کے دوسرے سرے پر عمران آفس میں بیٹھا ہوا ہے۔ ٹیلیفون اُس کے قریب ہی رکھا ہے۔ گھنٹی بجتی ہے تو وہ اپنا بالوں بھرا ہاتھ بڑھا کر ریسیور کان سے لگاتا ہے۔ "ہیلو!" اُس کی شیریں آواز سنائی دیتی ہے۔ اُس کے سانس کی مردانہ آہٹ سمیرا کے کانوں میں گونجنے لگتی۔ لیکن نہیں۔ وہ جانتی تھی اُس کا یہ حسین تصور کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتا۔ ٹیلیفون ڈائل کے لیے یہ چند انچ کا فاصلہ سمیرا کے لیے ایک زندگی کے سفر پر محیط تھا۔ وہ تمام عمر بستر پر پڑے پڑے بھی طے نہیں کر سکتی تھی۔ ہرگز نہیں، کسی قیمت پر نہیں۔

★

پرانے ماڈل کی نیلی سوزوکی کار ایک بغلی گلی میں رکی۔ اُس میں سے چار نوجوان نکلے۔ اُن میں سے ایک نسبتاً لیم شیم اور بڑی عمر کا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح اُس نے بھی آدھے بازو کی شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں وہ ایک سنجیدہ شخص نظر آتا تھا۔ اُس نے باہر نکل کر اطمینان سے ایک سگریٹ سلگائی، آنکھوں آنکھوں میں اپنے ساتھیوں کو کوئی اشارہ کیا، اور خود ایک ساتھی کے ساتھ ایک سفید گیٹ کی طرف بڑھا۔ یہ گیٹ ایک دو منزلہ کوٹھی کا تھا۔ بیرونی دیوار پر نرگسی کی بیل لگی ہوا تھا۔ وہ ایسے انداز میں کوٹھی کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کسی کا گھر تلاش کر رہے ہوں۔ درحقیقت اُن کی نگاہیں گلی کے دونوں ناکوں پر تھیں۔ اکا دکا راہگیر آجا رہے تھے۔ جونہی ناکوں پر کھڑے افراد نے کلیئرنس کا اشارہ دیا دونوں افراد نے پھرتی سے بیرونی دیوار پھاندی اور کوٹھی میں گھس گئے۔ بڑے محتاط قدموں سے چلتے وہ عقبی صحن میں پہنچے جہاں ایک دبلی پتلی نوعمر ملازمہ واشنگ مشین پر کپڑے دھو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ خطرے سے آگاہ ہوتی، لیم شیم شخص نے عقب سے اُسے دبوچ لیا۔ ہاتھ میں اتنی صفائی تھی کہ وہ بے چاری آواز تک نہ نکال سکی۔ اُسے باورچی خانے میں گھسیٹ کر انھوں نے اُس کی گردن پر خنجر رکھ دیا اور پھر اذاں منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور ہاتھ باندھ کر باورچی خانے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک اور عمر رسیدہ عورت کے پاس پہنچے۔ وہ اخبار چہرے پر پھیلائے گہری نیند سو رہی تھی۔ اُسے قابو کرنے میں بھی انھیں چنداں مشکل پیش نہیں آئی۔ درحقیقت وہ جاگتے ہی حملے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ ڈاکوؤں نے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور مشکیں کس کے اُسے بھی باورچی خانے میں ڈال دیا۔ دیوار پھاندنے سے اب تک کی کارروائی بمشکل تین منٹ میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں ڈاکو اندرونی کمروں کی طرف بڑھے۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر وہ ایک کشادہ کمرے کے سامنے پہنچے۔ کھڑکی سے انھوں نے جھانکا۔ ایک خوبصورت اسمارٹ عورت جسے کسی حد تک نوجوان لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا، صوفے پر بیٹھی تھی۔ اُس نے ٹیلیفون کان سے لگا رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رو رہی ہے یا رو چکی ہے۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اُس کی ایک انگلی ڈائل پر بھی ٹکی ہوئی تھی۔ جیسے کسی کو فون کرتے کرتے نمبر بھول گئی ہو۔

آپ خواہ مرد ہوں یا عورت

- پھوڑے، پھنسی، جذبات پائیے ایک سے پانچ تک قدر بڑھائیے۔
- جسم کے سیاہ اور کمزوری کی وجہ سے جذبات پائیے۔
- گرتے ہوئے بالوں کو روکیے۔ گنجے پن کو بھگائیے۔
- خواتین اپنے سراپا کی رعنائی نیز نامکمل اور ادھوری نشوونما کو مکمل کریں تمام نسوانی تکالیف سے چھٹکارا پائیں۔
- گرمیٔ جذبات اور جنسی کمزوری کو قابلِ فخر بنائیے، ذہین بنیے۔
- اولاد نرینہ سے مالا مال ہوئیے، بچوں کی کلکاریوں سے اپنے گھر کے سونے آنگن کو خوشیوں کا گہوارہ بنائیے۔
- چہرے کے کیل مہاسوں، داغوں اور ناقص بالوں سے نجات پائیے۔
- اڑدھا جیسی آنکھوں اور کتا جیسوں سے نجات پائیے۔

قابلِ فخر صحت اور جوانہ وقار حاصل کیجیے۔

جملہ امراض کا خصوصی مکمل کیفیت طلب علاج بذریعہ ڈاکٹر صاحب اور خواتین کے لیے ڈاکٹر صاحبہ ملاقات کا وقت صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک

پوسٹ بکس نمبر 2527 کراچی 18

نقیب عثمان شخص نے دروازے کو لات ماری اور اپنے ساتھی کے ساتھ تیزی سے لڑکی کی طرف پلٹا۔ اس کے انداز میں کسی خونخوار کتے کی سی تیزی تھی۔ لڑکی نے گھوم کر حملہ آوروں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے وا ہو گئیں اور منہ پورا کھل گیا لیکن اس سے پہلے کہ کھلے ہوئے منہ سے تیز چیخ نکلتی، حملہ آوروں نے اسے دبوچ لیا۔ ایک شخص نے اس کا منہ ڈھانپا اور دوسرے نے بغیر اس کی گردن پر کک دیا۔ مجبور کر ماحول میں لائے بغیر لڑکی پوری قوت سے مچلی اور تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل گئی۔ خود کو چھڑانے میں اس نے اتنی قوت صرف کی تھی کہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہ رہ سکی اور بھاگنے کی کوشش میں ٹانگوں کے الجھنے سے قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی تیز چیخ گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ حملہ آور چیلوں کی طرح اس پر جھپٹے اور اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی کوشش یہی تھی کہ لڑکی کھل کر چیخ نہ سکے لیکن مچلنے، دھکیلنے اور گھٹی گھٹی چیخوں کے درمیان لڑکی مسلسل حیدر جدوجہد کر رہی تھی۔

خود کو عمران آفریدی اپنے آفس میں بیٹھا سیکرٹری کو ہدایات دے رہا تھا۔ دفعتاً سیدھ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تین گھنٹیوں کے بعد اس نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو" ابھی وہ اپنا نام بتانے ہی جا رہا تھا کہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ دوسری طرف سے مدھم چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ نسوانی چیخیں تھیں اور ان کے ساتھ مردانہ آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ عمران سمجھ رہا تھا کہ کسی عورت پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ عمران نے تین چار بار "ہیلو" کہا پھر خبرداری کی غرض سے ماؤتھ پیس پر ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور آوازوں پر غور کرنے لگا۔ سیکرٹری حیرت سے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ حیرت سے اس نے پوچھا۔ عمران نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بچاؤ... بچاؤ" عورت کی گھٹی گھٹی آواز ریسیور پر سنائی دی۔ اس کے بعد کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ شاید کسی دروازے کو زور سے دھکیلا گیا تھا۔ یا کوئی شخص دروازے سے ٹکرایا تھا۔ پھر مردانہ اور زنانہ آوازیں مدھم ہو گئیں۔ اور آخر ٹیلیفون سے دور چلی گئیں۔ شاید تشدد کرنے والا یا والے عورت کو کسی دوسرے حصے میں لے گئے تھے۔ عمران نے چند بار پھر زور سے ہیلو کہا۔ آخر ریسیور کان سے ہٹا لیا۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی عورت نے مدد کے لیے کال کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسی دوران اسے دبوچ لیا گیا۔ ریسیور عورت کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا یا ہوا میں جھولتا رہ گیا۔ آخر الذکر میں مجرم اس پر توجہ نہیں دے سکے اور اب اس نامعلوم مقام سے تمام آوازیں عمران کے آفس تک پہنچ رہی تھیں۔

عمران کا دھیان فوراً اپنے اہل خانہ کی طرف اور پھر اپنے دوست احباب کی طرف چلا گیا۔ شاید ان میں سے کسی نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ایسا تھا تو یہ اس کے لیے زیادہ تشویش کی بات تھی۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی نے یونہی نمبر گھما دیا ہو۔ بہرحال کسی شخص کسی کو بھی مدد کے لیے پکار سکتا ہے۔ چند لمحوں کے اندر عمران کا دھیان اور دور تک گیا مگر پھر اس کی طرف ہر طرح سے مطمئن ہو گیا۔ جانتا بھی کیسے سکتا تھا۔ شاید اس کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ غیر ضروری بات یہی تھی کہ کبھی اس سے رابطہ قائم کرے۔ وہ تو اس کے لیے ایک ایسی کہانی کی طرح تھی جو پڑھنے والے کی روح کو ابدی تڑپ دے کر اس کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس کے کانوں میں کبھی کسی کی آواز آ سکتی ہے۔ وہ چھلے پر پریشانی سے پیشانی مسلتا رہا پھر سیکرٹری سے بولا۔

"ریاض، میرا خیال ہے کہیں پر کوئی گڑبڑ ہے۔ میں تمہیں ایک دو نمبر بتاتا ہوں، تم دوسرے کمرے سے فون ملا کر ان پر رابطہ کرنے کی پرتفویش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عمران نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید کسی گھر میں کوئی چور وغیرہ گھسا ہوا ہے۔"

ریاض بولا۔ "پتا نہیں کہ معلوم نہیں جناب؟"

عمران نے جھلا کر کہا۔ "پتا نہ معلوم ہوتا تو تمہیں فون ہی نہ ملاتا۔ جاؤ فوراً ان نمبروں پر رنگ کرو۔ فضول بات نہ کرنا۔ خیریت معلوم ہو جائے تو فون بند کر دینا۔ رابطہ بھی قائم ہو جائے تو فون بند کر دینا۔"

ریاض باہر گیا تو اس نے ایک بار پھر ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف ریسیور ابھی تک کریڈل پر نہیں رکھا گیا تھا۔ فرنیچر کا درہم برہم ہونا اور کچھ دیگر آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ عمران نے سامنے رکھے سبز ٹیلیفون سے اپنے گھر رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے خیریت دریافت کر کے دوسرے اور تیسرے نمبروں پر رنگ کیا اور پھر دوبارہ سیدھ والے پر کان لگا لیا۔ مدھم آہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ یہ سوچ کر اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی کہ چیخنے والی عورت اور اس کے اہل خانہ پر نجانے کیا بیت رہی ہو گی! اتنی دیر میں اس کا سیکرٹری ریاض واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ان نمبروں پر خیریت ہے۔ اس نے تھانہ اطلاع دیگر اثبات کو بھی بتا دیا تھا اور عمران کی دوسری جانب سے کئی پرتجسس نگاہیں عمران کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ عمران نے فوراً ٹانی ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔ عمران آفریدی اسپیکنگ... ڈویژنل انچارج سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے بتایا گیا کہ وہ اپنی سیٹ پر نہیں۔ عمران

نے کہا: "اچھا کسی متعلقہ آدمی کو بلاؤ۔" چند لمحے بعد ایک دوسری آواز سنائی دی: "ہیلو۔ میں فریدی بول رہا ہوں۔ رانا صاحب کا اسسٹنٹ رمضان بول رہا ہوں۔"

عمران نے کہا: "میں عمران آفریدی بول رہا ہوں۔ ڈان کہنے سے آپ سے ایک نہایت ضروری کام آن پڑا ہے۔ امید ہے آپ تعاون کریں گے۔"

"جی حکم کیجیے۔"

عمران نے کہا: "ابھی کوئی پانچ منٹ پہلے مجھے کسی نامعلوم جگہ سے کال آئی ہے۔ کوئی عورت بُری طرح چیخ رہی تھی۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ڈاکا وغیرہ پڑا ہے۔ چیخوں کے سوا عورت کوئی بات نہیں کر سکی۔ اس وقت دوسری طرف ریسیور رکھ رہا ہے اور معمولی آوازیں آ رہی ہیں۔ اب معلوم نہیں یہ حادثہ کہاں پر ہوا ہے۔" دوسری طرف عمران کی بات پوری توجہ سے سنی جا رہی تھی۔ عمران نے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ کال پیک کرنے والی مشین کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی سیریس معاملہ ہو۔"

دوسری طرف سے اسسٹنٹ کی آواز آئی: "عمران صاحب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں لیکن "ایم آر آئی" لگانے کے لیے رانا صاحب کی اجازت ضرور لی ہے اور وہ اس وقت موجود نہیں۔"

عمران نے کہا: "رمضان صاحب! یہ بڑا ایمرجنسی معاملہ ہے۔ ٹیلیفون کسی بھی وقت منقطع ہو سکتا ہے۔ ہمیں فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا۔"

رمضان کی آواز آئی: "سر! یہ اتنا آسان کام نہیں۔ اصول تو یہ ہے کہ "ایم آر آئی" لگوانے کے لیے پہلے تحریری درخواست دینا پڑتی ہے پھر اس درخواست پر فیصلہ ہوتا ہے۔ دو تین دن لگ جاتے ہیں۔۔۔ ویسے جناب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی کی شرارت ہو۔ آج کل نوجوان ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔۔۔"

اسسٹنٹ رمضان کی بے وقت کی راگنی سن کر عمران کو غصہ آ گیا۔ اس نے غصے میں اپنے والد صاحب کا حوالہ دیا تو وہ کچھ نرم پڑ کے کہنے لگا: "اچھا میں سوپر کو روم سے جگا کر بتاتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد اس نے آ کر دلی معذرت کی اور کہا کہ اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔

رابطہ منقطع کر کے عمران نے شدید پریشانی کے عالم میں سگریٹ سلگائی اور سنید ریسیور کان سے لگا لیا۔ لائن ابھی کٹی نہیں تھی۔۔۔ اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر والد صاحب کو فون کیا۔ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ایک ڈی ایس پی موجود تھا۔ عمران نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کر کے فوراً اپنے آفس بلا لیا۔ یہ تمام گفتگو کرتے ہوئے اچانک اس کا دھیان ایک اہم نقطے کی طرف چلا گیا۔ یکدم چونکتے ہوئے اس نے سنید ریسیور کان سے لگایا اور تیزی سے دھیان سے آوازیں سننے لگا۔ ٹریفک کے مدھم شور کے علاوہ ایک باریک سی مسلسل آواز بھی سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی مشین وغیرہ چل رہی ہو۔ اسے شک ہوا کہ یہ کسی آرا مشین کی آواز ہے۔ یہ مشین موقع واردات کے کہیں بالکل قریب موجود تھی۔ شاید بیس تیس گز کے فاصلے پر۔ لکڑی کے سلیپروں کی کھڑکھڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ انہی آوازوں پر غور کر رہا تھا جب دروازہ کھلا اور ڈی ایس پی راحت خان اندر داخل ہوا۔ راحت خان اس کا بچپن کا دوست بھی تھا۔ عمران نے ریسیور اسے تھمایا اور کہا:

"ذرا غور سے سنو۔ ٹریفک کے شور میں یہ مسلسل آواز کیسی آ رہی ہے؟"

راحت خان کچھ دیر دھیان سے سنتا رہا پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بولا: "کوئی مشین وغیرہ ہے۔"

"کون سی مشین ہے؟" عمران نے پوچھا۔

راحت خان ابھی تک غور کر رہا تھا۔ پھر اچانک بول اٹھا: "آرا مشین تو نہیں؟"

"شاید یہی ہے۔" عمران نے جوش سے کہا۔

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟"

عمران نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور بے قراری سے ٹہلنے

خواتین متوجہ ہوں

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ عورت کا ڈھلکا عورت ہی سمجھ سکتی ہے

ادھوری اور نامکمل جسمانی نشوونما اور سراپا کے حسن اور دلکشی میں اضافے، نیز

مثالیے بادیلے بن کو دور کر کے مکمل جسمانی فٹنس حاصل کرنے چہرے کے ناپسندیدہ اور فاضل بالوں، کیل مہاسوں، داغ دھبوں اور تمام نسوانی شکایات کے لیے ہمارے شعبہ خواتین کی انچارج لیڈی ڈاکٹر شمیم صاحبہ کی خدمات سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور مکمل کیفیت مکتوب ارسال کریں۔

ہزاروں بہنیں شفا پا چکی ہیں۔ جوابی لفافے اور اپنے خط پر اپنا مکمل ایڈریس ضرور تحریر کریں۔

ہاؤس آف بیوٹی

پوسٹ بکس 11036 کراچی 33

ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جائے واردات کے قریب کوئی آٹا مشین ہے۔ کیا ہم اس آٹا مشین کے ذریعے اس جگہ تک پہنچ سکتے ہیں؟"

راحت خاں نے کہا۔ "کم از کم شہر میں پچاس ساٹھ آٹا مشینیں تو ہوں گی۔ ان میں سے کچھ فیصد کیٹوں کے اندر ہیں اور کچھ مختلف جگہوں پر جدا جدا ——— ہم ان سب تک کیسے پہنچ سکتے ہیں علاوہ ازیں بھی تو کیا ضروری ہے کہ مطلوبہ مکان بھی مل جائے۔"

"پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

راحت خاں نے کہا۔ "میں نے یہاں آنے سے پہلے اہم راستوں کی ناکہ بندی کرا دی ہے۔ گشتی پولیس کو بھی الرٹ کرایا جا چکا ہے ایک آدھ گھنٹے میں کہیں سے کچھ پتا چل جائے۔"

عمران نے جیزلی سے سگریٹ الٹی سلگاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کے ایک آدھ گھنٹے کا مطلب ایک آدھ ہفتہ ہوتا ہے یار! کیسے لوگ ہو تم؟ کبھی تمہارے دل میں کسی کا درد نہیں جاگتا؟"

راحت خاں بولا۔ "یہ سوال تم ڈی آئی جی صاحب سے بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"ان سے بھی پوچھتا ہوں۔ پوچھتا رہتا ہوں۔" عمران نے اس کا مذاق نظر انداز کر کے جھلاہٹ سے کہا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں کوئی تدبیر آئی۔ اس نے جلدی سے وزیٹنگ کارڈ کی فائل نکالی اور کوئی کارڈ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی اسے "ساحل ایسوسی ایشن" کے صدر کا کارڈ مل گیا۔ اس نے ایسوسی ایشن کے صدر سے ٹیلی فون قائم کیا اور انھیں مختصر صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد اس نے درخواست کی کہ اسے شہر کی تمام آٹا مشینوں کے پتے درکار ہیں۔ صدر صاحب نے پورے تعاون کا مظاہرہ کیا اور خوش اخلاقی سے کہا جناب! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں ابھی دس منٹ میں آپ کو مکمل فہرست بھجوا دیتا ہوں۔"

عمران نے شکریے کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک شخص فہرست لے کر پہنچ گیا۔ عمران نے تیزی سے فہرست پر ایک نگاہ دوڑائی۔ پھر ان تمام آٹا مشینوں کے پتے کاٹ دیے جو کسی بڑی سڑک کے نزدیک نہیں تھیں۔ جو مشینیں گنجان آبادی کی مکمل گلیوں میں تھیں، ان پر دائرے کھینچ دیے۔ اب ان کے پاس کل بیس پتے رہ گئے۔ عمران نے فہرست راحت خاں کے سامنے پھینکی اور کہا۔

"ان بیس مقامات میں سے کسی ایک مقام پر وہ واردات ہوئی ہے یا ابھی ہو رہی ہے۔"

پولیس جیپ کے پہیے چرچرائے اور وہ ہوا ایک دکان کے سامنے رکی۔ یہ عمدہ کپڑے کی دکان تھی۔ آٹا مشین نمبر دو شور سے چل رہی تھی۔ جیپ سے ڈی ایس پی راحت خاں اور عمران برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک سب انسپکٹر اور چھ باوردی کانسٹیبل بھی تھے۔ راحت خاں کی ہدایت پر انھوں نے تیزی سے علاقہ سکائیت کے مکینوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کیا۔ کانسٹیبل دروازے پر دستک دیتے۔ اہل خانہ میں سے کوئی باہر نکلتا تو وہ پوچھتے "گھر میں سب ٹھیک ہے؟" گھر والا حیرت زدہ ہو کر اثبات میں جواب دیتا تو وہ شکریے کے ساتھ دوسرے دروازے کی طرف بڑھ جاتے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر انھوں نے کارروائی مکمل کی اور جیپ کے اندر آ بیٹھے جب جیپ تیزی سے اگلی ہوئی اگلے بڑھی تو لوگ یہاں وہاں کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی نے پولیس کو لوٹ کے وغیرہ کی غلط اطلاع پہنچائی ہے۔

بیس منٹ کے اندر اندر تین مختلف آٹا مشینوں کے نزدیک یہی کارروائی دہرائی گئی لیکن کسی قسم کا سراغ نہیں ملا۔ انھوں نے بقیہ تینوں پتوں پر چھتے پتے پر پہنچے۔ یہ بھی ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ کانسٹیبل جیپ سے کود کر عقبہ مکانات کی طرف بڑھے تو راحت خاں نے انھیں روک لیا۔ دراصل یہ مشین بند پڑی تھی۔ "ہمارا نظر آ رہے تھے کہ بیکار سے اس پر کام نہیں ہوا۔ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انھوں نے آٹا مشین کے مالک سے دریافت کیا تو اس نے تصدیق کی کہ مشین پر صبح سے کام نہیں ہوا۔ وہ واپس جیپ پر آ بیٹھے۔ بند مشین کو دیکھ کر عمران کے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔ اس نے جیپ کے وائرلیس سیٹ کو چھیڑتے ہوئے راحت سے پوچھا۔

"یہ کام کر رہا ہے۔" راحت نے اثبات میں جواب دیا۔ عمران نے کہا۔ "ایک کام کرو۔" راحت ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ عمران پر سوچ لہجے میں بولا۔ "تمہارے تھانے میں دوسرا سیٹ تو ہو گا؟" راحت نے پھر اقرار میں سر ہلایا۔ عمران نے کہا۔ "تھانے میں کال کرو وہ سیٹ میرے آفس پہنچوا دو۔ ہو سکتا ہے کام چکروں میں ہو جائے۔"

"وہ کیسے؟" راحت خاں نے پوچھا۔

عمران نے کسی ماہر سراغ رساں کی طرح انگلی ہوا میں لہرائی۔ "موقع واردات سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔ تمام آوازیں بذریعہ ٹیلیفون میرے آفس میں پہنچ رہی ہیں۔ ان میں مشین چلنے کی آواز بھی شامل ہے۔ اگر وہ مشین چلتی بند ہو جاتی ہے تو آواز میرے آفس میں نہیں پہنچے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

اچانک ساری بات راحت خاں کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ جوش سے بولا۔ "کہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر ہم وہ مشین بند کرا دیں اور تمہارے آفس سے بذریعہ وائرلیس اطلاع مل جائے کہ مشین بند ہو گئی ہے تو ہمیں فوراً موقع واردات کا علم ہو جائے گا؟"

عمران نے کہا۔ "ہم ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

راحت خاں چمک کر بولا۔ "ایک فالتو سیٹ تو میرے جیپ میں بھی موجود ہے۔ کیوں نہ یہی بھجوا دیا جائے۔"

عمران نے کہا۔ "تو پھر سوچ کیا رہے ہو؟"

راحت خاں نے فوراً جیپ کی پچھلی سیٹ اٹھوائی اور اس کے نیچے سے ایک وائرلیس سیٹ نکال لیا۔ پھر ایک رسکٹ کر اتھ دے کر روکا گیا اور سب انسپکٹر کو سب کچھ سمجھا کر سیٹ کے ہمراہ عمران کے آفس روانہ کر دیا گیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد آفس کے وائرلیس سیٹ سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا۔ اس وقت وہ چھٹے پتے پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں قریب قریب تین آرا مشینیں تھیں۔ راحت خاں نے سب انسپکٹر سے پوچھ کر سفید خان پر کیا پوزیشن ہے۔ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ "رابطہ قائم ہے جناب۔ مشین چلنے کی آواز بھی آ رہی ہے۔"

"گڈ۔" راحت خاں نے کہا۔ "یہاں ہمارے سامنے دو مشینیں چل رہی ہیں۔ میں انہیں بند کرا دیتا ہوں۔ دو منٹ بعد پھر تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

راحت خاں کے حکم پر کانسٹیبل مشینوں پر پہنچے اور انہیں بند کر دیا۔ راحت خاں نے دوبارہ وائرلیس پر رابطہ قائم کیا۔ انسپکٹر سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ مشین کی آواز بدستور آ رہی ہے۔

"ٹھیک ہے۔" راحت خاں نے کہا۔ "تم ہوشیار رہنا۔ ہم اب آگے جا رہے ہیں۔"

قریباً آدھ گھنٹے میں انہوں نے آٹھ مزید پتوں پر تصدیق کر لی۔ کوئی مشین نہیں ملی۔ سب انسپکٹر کو فون پر مشین کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ کبھی کبھی نزدیک سے گھٹ پٹ کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ لوگ گھر میں موجود ہیں۔ بارش تھمتی تھی کہ ابھی تک نامعلوم مقام سے یہ پُراسرار رابطہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ عمران کے دل میں مایوسی سی اترتی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا شاید یہ کالیں کسی دوسرے شہر سے کی گئی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں مغالطہ ہو رہا ہو۔ وہ آرا مشین کی آواز کا نہ ہو۔ کسی شرارت کے امکان کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عجیب صورت حال تھی۔ نہ وہ مجرم کو جانتے تھے، نہ جرم کا شکار ہونے والے کو اور نہ اس جگہ کو جہاں یہ جرم ہوا تھا۔

راحت خاں بھی اب بیزار سا نظر آ رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے ایسی الجھن کا سامنا ہوا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی اب قریباً بائیس سٹ ہو چکے تھے۔ وہ ایک آرا مشین کے سامنے پہنچے۔ جیپ میں بیٹھے بیٹھے عمران نے غور سے دیکھا۔ راحت خاں نے ہاتھ اس سے سر ہلا دیا۔ شاید اسے کوئی روشن مکان نظر نہیں آیا تھا۔ تاہم عمران کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہہ کر آرا مشین بند کروائی۔ وائرلیس سیٹ پر سب انسپکٹر سے رابطہ قائم کیا۔ سیٹ آن ہوتے ہی سب انسپکٹر چلا اٹھا۔

"یس سر، آواز بند ہو گئی ہے۔"

عمران کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ راحت کے چہرے پر بھی تازش نظر آیا۔ عمران نے مشین پھر چلوائی۔ وائرلیس سیٹ پر سب انسپکٹر کی آواز گونجی۔ "ہاں جی... ہاں جی آواز پھر آ رہی ہے۔" عمران نے مشین دوبارہ بند کرا دی۔ سب انسپکٹر نے بھی اعلان کیا کہ مشین بند ہو گئی ہے۔ اب قیاس کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ عمران اور راحت کانسٹیبلوں سمیت چھوٹی لاری میں جیپ سے نکلے اور نزدیکی مکان کی طرف بڑھے۔ یہ مشین ایک خالی پلاٹ میں تھی۔ دو اطراف میں مکان بنے ہوئے تھے۔ ایک مکان کی عقبی دیوار آرا مشین کے احاطے سے ملتی تھی۔ عمران دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اس مکان کی طرف لپکا اور راحت ایک کانسٹیبل کے ساتھ دوسرے مکان کی طرف۔ عمران نے اپنا لائسنس یافتہ ریوالور نکال لیا تھا۔ دونوں کانسٹیبلوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ مکان کا مین گیٹ ایک تنگ سی گلی میں تھا۔ دائیں قدم عمران نے دیوار دیوار کے اوپر سے اندر جھانکنے کا جائزہ لیا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ گھر کے کسی حصے میں کوئی بلب جلا ہوا تھا۔ بارش مسلسل گر رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل ہوشیاری سے دیوار پار کر گیا۔ اندر جا کر اس نے احتیاط سے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ عمران اور دوسرا کانسٹیبل اندر داخل ہو گئے۔ حالات خطرناک تھے۔ کسی کو آواز دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ تینوں دبے پاؤں چلتے عقبی صحن میں پہنچے۔ یہاں ایک دالان تھا۔ مشین کے پاس ان کے ملے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک پرانی تیل بالن کے شب میں جل رہی تھی۔ یہ منظر شدید خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ ریوالور مضبوطی سے تھامے عمران عقبی برآمدے میں پہنچا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ کسی کی دبی دبی لیکن کرخت آواز سنائی دی تھی۔

"چپ کر جا حرامزادی۔ ورنہ تیری طرح پیش آؤں گا۔"

اس کے ساتھ ہی "غوں غاں" کی مدھم آواز سنائی دی۔ جیسے کسی کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہو اور وہ چلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بائیں جانب سے ایک اور مردانہ آواز آئی۔

"جانی! یہ دھمکیوں سے نہیں پیار سے مانے گی۔ اسے کہو پانی میں بہت اچھی طرح پیش آؤں گا بڑی جنت سے۔ پھر دیکھو کیسے چیخ کر تی ہے۔"

ایک قہقہہ سنائی دیا پھر پہلے والے نے ٹھنڈی

سانس بھر کر کہا۔ "ہائے دل تو بہت کرتا ہے ایسی طرح پیش آنے کو مگر استاد پھر تو نے ہی کہا ہے سامنے پکڑو دا دیا۔"

عمران اور دونوں کانسٹیبلوں نے احتیاط سے قدم بڑھائے ایک چوڑی گلی کی اوٹ سے عمران نے دیکھا ہر آمد سے میں ایک فرنیچر کھلا پڑا تھا اور دو سٹنڈے سے فرش پر آلتی پالتی مارے تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی گھر کا بیشتر سامان بندھا پڑا تھا۔ جس میں ٹیلیویژن وی سی آر ٹیپ ریکارڈ وغیرہ شامل تھے۔

"چلو اٹھ بھی جاؤ استاد۔" برآمدے سے پھر پہلے والے شخص کی آواز سنائی دی۔ "اسکول کی چھٹی کا وقت ہونے والا ہے۔"

اس وقت عمران کی نگاہ بولنے والے پر پڑی۔ وہ ایک جالی دار دروازے کے سامنے پسار دینے والے انداز میں کھڑا تھا۔ عمران کی طرف اس کی پشت تھی لیکن اس کے ہاتھ میں سیاہ ریوالور صاف نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب آم کھانے والے افراد میں سے ایک نے عمران کی پرچھائیں دیکھ لی۔ وہ کھڑا ہو کر بولا اور لپک کر دروازے کی طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ سوچوں پر آم کا گودا لگا ہوا تھا۔ عمران نے ریوالور آہنی مکے کی طرح پورے زور سے اس کے منہ پر مارا۔ وہ اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ ریوالور والے نے پھرتی سے گھوم کر فائر کرنا چاہا مگر اپنی طرف ایک ریوالور والے کو رائفل اٹھی دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ تیسرے شخص نے ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ عمران کی پکار پر ایک کانسٹیبل رائفل سمیت اس پر جھپٹ پڑا اور گندے سے مار مار کر نیچے گرا دیا۔ اس دوران ڈی ایس پی راحت خان بھی ساتھی کانسٹیبل کے ساتھ پہنچ گیا۔ چند لمحوں میں مجرموں پر پوری طرح قابو پا لیا گیا۔ باورچی خانے کا دروازہ کھول کر عمران اندر داخل ہوا۔ تین عورتیں قریب قریب بندھی پڑی تھیں۔ ایک شاید گھریلو ملازمہ تھی جس کا چہرا ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ دوسری کوئی ادھیڑ عمر عورت تھی جبکہ ایک طرف کونے میں سکڑی سمٹی تیسری عورت کو دیکھتے ہی عمران پتھر کی طرح ساکت رہ گیا۔ اس کی تمام حسیں سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے سامنے سمیرا تھی۔ وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کا لباس ایک دوسرے سے پھٹا ہوا تھا اور چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ یکایک عمران مشینی انداز میں آگے بڑھا اور تیزی سے سمیرا کی بندشیں کھولنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے کپڑا نکال کر وہ ایک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ یکایکی اس کے اندر کا موسم تبدیل ہونے لگا تھا۔ کوئی ہری بھری چیز مچل رہی تھی۔ کوئی تودہ تھا جو سرک رہا تھا۔ پھر اچانک... بالکل اچانک ندی نالے بہہ نکلے۔ رخساروں کی بنجر زمینیں سیراب ہونے لگیں۔ ایک طوفان بپا تھا شور دماغ سے دل اور دل سے آنکھوں تک اچھلتا پگھلتا چلا گیا۔ عمران کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ "سمیرا نے تجھے آواز دی ہے۔ مصیبت میں تجھے پکارا ہے تجھے اپنا سمجھا ہے، تجھے فوقیت دی ہے۔ تیرے ساتھ تجدید محبت کی ہے۔ اس نے خدا اور تاکی آہنی دیواروں کو توڑ کر تیرے کانوں تک اپنی صدا پہنچائی ہے۔ اس نے ہار کر بھی بہت کچھ جیت لیا ہے۔"

عمران کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ایک سائنسی و تین اتفاق کے تحت ہوا ہے۔ اسے کسی نے نہیں پکارا صرف قدرت نے اسے آواز دی ہے... یہ انا اور خود داری کی دیواروں کو توڑنے کی کامیابی نہیں یہ ایک زبردست روداد ہے جو ایک حادثے کے سبب خود بخود ڈاٹل پڑ گیا تھا۔ عمران کو کچھ معلوم نہیں تھا اور وہ بھی کیسے سکتا تھا بس صرف سمیرا تھی جو اسے بتا سکتی تھی۔ اور اب... اب وہ بھی ہرگز بتانا نہیں چاہتی تھی۔ لمحوں میں یہ راز اس کی زندگی کا اہم ترین راز بن گیا تھا۔ وہ عمران کے لرزاں ہاتھوں کو اپنے خنجر کی طرف بڑھتے دیکھ چکی تھی اور اب سب کچھ بھول کر پوری جان سے اس کے بازوؤں میں سما جانا چاہتی تھی۔ ایک ہی جست میں سب فاصلے پاٹ دینا چاہتی تھی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اردگرد کھڑے لوگ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے ہیں۔ کئی نگاہیں ان کے چہروں پر ہیں مگر جذبے کی شدت اس انتہا پر تھی جہاں مصلحتوں اور رکاوٹوں کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ عمران کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مجھے معاف کر دو سمیرا۔"

یہ ایک جملہ ہزار وضاحتوں، دلیلوں اور تاویلوں پر بھاری تھا۔ تسخے والوں کے لیے یہ ایک بے محل اور مہمل جملہ ہو سکتا تھا لیکن ان دونوں کے لیے اس کی معنویت طویل مباحثوں اور مذاکرات سے بڑھ کر تھی... دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ عمران نے ہتھکڑوں کو کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور انھیں گھورتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دوسرے کمرے میں تینوں مجرم بندھے پڑے تھے۔ بیان کر بعد میں معلوم ہوا ان کا چوتھا ساتھی خطرہ دیکھ کر باہر ہی سے چمپت ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک پستول گرانے والا بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا اور آم کھانے والوں کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ ڈی ایس پی راحت خان نے اس کی کمر پر ایک لات جمائی اور عمران کو سنانے کے لیے زور سے بولا۔ "آق کے پٹھے! اتنا اچھا کام کر کے رہتا ہے۔ تیری تو ہڈی ہڈی ادھیڑ دینی چاہیے۔ چل تجھے تھانے چل تجھے رونے کا مزہ چکھاتا ہوں۔"

تیواری لال کی عمر پچاس سال کے قریب تھی لیکن صحت اچھی تھی جس کی وجہ سے وہ چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ سے ورزش کا شوقین تھا۔ بیس پچیس سال پہلے جب وہ جوان تھا اس نے باقاعدہ نشانہ بازی اور مارشل آرٹ کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ ہلکی پھلکی ورزش تو وہ کسی نہ کسی طور اب بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ تیواری لال کو کرنل سریش کے گھر کام کرتے ہوئے اب تقریباً ایک برس ہو چکا تھا۔ اس ایک برس میں اس نے خود کو ہر طرح کرنل کا وفادار خادم ثابت کیا تھا اور ایک بار بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ کرنل بھی اسے اپنے تمام دیگر ملازمین پر فوقیت دیتا تھا۔

کرنل کی رہائش گاہ بارہ مولا کے مضافات میں ایک پہاڑی ڈھلوان پر واقع تھی۔ یہ تقریباً ایک ایکڑ پر پھیلی ہوئی عمارت تھی۔ پہلے یہاں محکمۂ زراعت کے دفاتر تھے مگر اب یہ فوجی آفیسرز کی رہائش گاہوں کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ اعلیٰ رینک کے چار پانچ آفیسرز اس عمارت کے مختلف "پورشنز" میں قیام پذیر تھے۔ بڑا گمبھیر سا ماحول تھا یہاں کا۔ بلند و بالا دیوار جس کے اوپر خاردار باڑھ اور سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں۔ رات کے وقت اس باڑھ میں کرنٹ بھی چھوڑا جاتا تھا۔ بیرونی دیوار کے ساتھ مسلح پہرے دار چوبیس گھنٹے گشت کرتے تھے۔ جب سے کشمیری مجاہدین کی کارروائیوں میں اضافہ ہوا تھا' رات کے وقت نگرانی کے انتظامات مزید سخت کر دیے گئے تھے۔ اب صحیح معنوں میں اس جگہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ یہاں داخل ہونے والے ہر فرد کو کئی ایک رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کم از کم تین جگہ اپنی شناخت کرانا ہوتی تھی اور بعض اوقات تلاشی بھی دینا پڑتی تھی۔

کرنل سریش سے تیواری لال کی ملاقات بھی عجیب انداز سے ہوئی تھی۔ کرنل سریش جس راستے سے گزرنے والا تھا وہاں مجاہدین نے دو طاقتور بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ تیواری لال نے مجاہدین کی یہ کارروائی دیکھ لی تھی اور کرنل سریش کو عین اس وقت مطلع کر دیا تھا جب اس کی جیپ بارودی سرنگوں سے صرف سو ڈیڑھ سو گز دور تھی۔ تیواری لال کی اس اطلاع نے کرنل سریش

آخر میں ہے۔ شکریہ قبول کیجیے اس تحریر

ظاہر جاوید مغل

وصل

درندگی اور شقاوت آج جنت نشاں کشمیر میں اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہی ہے۔ ظالم فاشسٹ حکمرانوں کے ساتھ محو رقص ہے لیکن بہادر قوموں کے ایجاد کردہ یہ ستم بھی آزادی کے متوالوں اور مجاہدین کے حوصلوں کو ماند نہ کر سکے۔ یہ جنگ آزادی صرف مورچوں، میدانوں اور وادیوں میں نہیں لڑی جا رہی۔ اس کے نظریوں سے اوجھل کچھ محاذ ایسے بھی ہیں جہاں حریت پسندی اور سرفروشی کی جہاد کار مثالیں قائم کی جا رہی ہیں۔ یہ کہانی انہی ایسے ہی ایک محاذ کی جھلک ہے... جہاں بے سر و پیکار خاموش مجاہدین قربانیوں کی ناقابل فراموش داستان رقم کر رہے ہیں۔ یہ ہدیہ آزادی کو دل سے خراج ان مردوں کے خون اور آنسوؤں کو جو ظلم کے خلاف نبرد آزما ہیں اور ان کے بلند حوصلوں کو۔



کی زندگی بچائی تھی اس نے شاہانہ انداز میں تیواری لال سے پوچھا تھا' مانگو کیا مانگتے ہو' تیواری لال نے کسی گراں قدر انعام کے بجائے نوکری مانگ لی تھی اور اس وقت سے تیواری لال' کرنل سریش کا گھریلو ملازم تھا۔

وہ ایک اداس اداس سی شام تھی۔ اکتوبر کی پہلی تاریخیں تھیں۔ خزاں نے برگ و بار کو آبرو بچا تھا لیکن کشمیر کی اس خزاں پر بھی سو بہاریں قربان کی جاسکتی تھیں۔ ایک عجیب سی حسین سوگواری تھی جس نے ہر شے کو اپنے دامن میں رکھا تھا۔ تیواری لال ایک پتھریلی بینچ پر چنار کے چند نوزائیدہ پودوں کے پاس بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ اس آہنی گیٹ کی طرف اٹھی جو "ڈرائیو وے" کے آخری سرے پر واقع تھا۔ ایک بند جیپ اندر داخل ہوئی۔ کرنل سریش کے علاوہ اس میں تین قیدی بھی تھے۔ وہ اپنے مصیبت زدہ چہروں اور خونچکاں جسموں کے سبب دور ہی سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے دو مسلح فوجی بھی جیپ میں موجود تھے۔ تیواری لال کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھتے میں ایک آدھ بار اس قسم کے "آفت زدگان" یہاں پہنچا ہی کرتے تھے پھر عمارت کے ایک اندرونی حصے میں انسانی جسموں سے جان کشید کرنے کا عمل دہرایا جاتا تھا۔ رات کے سناٹے میں قیدیوں کی گھٹی گھٹی چیخیں اکثر سرونٹ کوارٹر تک بھی پہنچ جایا کرتی تھیں۔ اب تیواری لال ..... کافی تجربہ کار ہو چکا تھا۔ اسے ان چیخوں سے ہی اندازہ ہو جایا کرتا تھا کہ کسی مصیبت زدہ کی کتنی مصیبت باقی رہ گئی ہے اور اس کی جان قفسِ عنصری سے کب رہائی پانے والی ہے۔ اسے بدنصیب افراد کی قوتِ مزاحمت اور سخت جانی کا اندازہ بھی ان چیخوں سے ہو جاتا تھا اور یہ بھی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کس قسم کے عذاب سے گزارے جا رہے ہیں۔ یعنی الٹے لٹک رہے ہیں' زدوکوب کیے جا رہے ہیں' سگریٹوں سے داغے جا رہے ہیں یا ان کی موم بائی نکالی جا رہی ہے۔ کبھی کبھار تیواری لال کو خود اپنی آنکھوں سے یہ تماشے دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

اس روز چنار کے نوزائیدہ پودوں کے پاس بیٹھے بیٹھے تیواری لال نے جن قیدیوں کو دیکھا' ان میں ایک لڑکی بھی شامل تھی۔ عمر بہ مشکل بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ قبول صورت تھی اور کسی کالج یا یونیورسٹی کی طالبہ لگتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ پر تازہ تازہ پٹی بندھی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر تیواری لال کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ اسے کسی احتجاجی مظاہرے سے پکڑ کر لایا گیا ہے۔ لڑکی کی آنکھیں آنسو گیس کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

اس کا رنگ زرد تھا اور ہونٹ بالکل خشک۔ مسلح فوجی اسے دوسرے قیدیوں کے ہمراہ کھینچتے ہوئے اندر لے گئے۔ تیواری لال اس لڑکی کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور تیواری لال ہی کیا' کشمیر میں سیکڑوں ہزاروں لوگ اسے پہچانتے ہوں گے۔ وہ ایک اخبار میں کالم لکھتی تھی۔ کالم کے ساتھ کبھی کبھی اس کی تصویر بھی ہوتی تھی۔ اس کا نام نبیلہ احسن تھا۔ تیواری لال اخبارات کے مطالعے کا شروع سے شوقین تھا اور عالمی حالات پر گہری نظر رکھتا تھا لیکن جب سے وادیٔ کشمیر میں تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تھا۔ اور سنسنی خیز خبریں سرخیوں کا موضوع بننے لگی تھیں' اخبارات میں تیواری لال کی دلچسپی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ اخبار بھی تیواری لال کے مطالعے میں آتا تھا جس میں نبیلہ کالم لکھتی تھی۔ نبیلہ کے کالم آزادی کی امنگ ترنگ سے بھرپور ہوتے تھے۔ نرم الفاظ میں انہیں "بے باک" اور ذرا سخت الفاظ میں "باغیانہ" کالم کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے کالم کی کمان میں ہر صبح احتجاج کا ایک نیا تیر رکھ کر چلاتی تھی اور یہ تیر سیدھا ان غاصبوں کے سینے میں پیوست ہوتا تھا جو جموں و کشمیر میں آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے تھے۔ بہت سے لوگ حیران تھے کہ یہ لڑکی اب تک گرفتار کیوں نہیں ہوئی۔ آج یقیناً ان کی حیرانی دور ہو گئی تھی۔

ڈنر پر تیواری لال کی ملاقات کرنل سریش سے ہوئی۔ کھانا کھا کر کرنل نے بالشت بھر لمبا سگار لیا تھا اور صوفے پر بیٹھ کر اپنی بھاری بھرکم ٹانگیں شیشے کی نازک تپائی پر رکھ دی تھیں۔ جو بیس گھنٹے میں یکی وہ لمحات ہوتے تھے جب کرنل سریش خود کو "ریلیکس" محسوس کرتا تھا اور اس کے کرخت مزاج میں تھوڑی سی نرمی اور گفتگی داخل ہو جاتی تھی۔ اگر تیواری لال کو کرنل سے کوئی بات کرنا ہوتی تو وہ انہی لمحات کا انتظار کرتا تھا..... آج بھی وہ قالین پر کرنل سریش کے قریب ہو بیٹھا۔

"بڑے صاحب! آج تو میرا خون بالکل کھول کر رہ گیا۔" تیواری لال نے بات شروع کی "بھگوان کی سوگند' سر سے پاؤں تک شریر میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پایا ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے ہاتھوں اس لڑکی کی ہتیا ہو جائے گی۔"

"کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟" کرنل نے پوچھا۔

"وہی جسے آپ آج پکڑ کر لائے ہیں۔ ایک نمبر کی حرامجادی ہے۔ میں اخبار میں اس کا لکھا پڑھتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے کہ شبدوں کے بجائے گولیاں نکلتی ہیں اس کے قلم سے بلکہ شاید لکھتی ہی بندوق سے ہے۔ رام قسم! تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اس کی باتیں پڑھ کر۔"

"اب نہیں گولیاں چھوڑے گی قلم سے..... بالکل تیر کے مافق سیدھی ہو جائے گی۔ تم کہو گے تو تمہارے سامنے بھارت سرکار زندہ باد کے نعرے لگائے گی۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں سرکار! اب آپ کے پتے پڑھ گئی ہے تو سیدھی کیوں نہ ہوگی۔ میرے خیال میں ایسے قلم کار ان شرپسندوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں جو ہمارے سینوں پر گولیاں چلا کر

بھاگ گئے ہیں۔ جنا ان کے شبدوں پر وشواس کرتی ہے اور یہ جنا کو سمجھا کر خوش ہوتے ہیں۔ ہر روز درجنوں نردوشوں کی جانیں جاتی ہیں ایسے لکھاریوں کی وجہ سے۔ میری ناقص رائے میں تو ایسے لوگوں کو جندہ رہنے کا ہی ادھیکار نہیں۔ ان کی سجا (سزا) صرف موت ہے۔"

کرنل کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ ابھری "موت تو کوئی سزا نہیں تیواری لال! سزا تو اس حالت کو کہتے ہیں جب موت اور زندگی دونوں انسان سے روٹھ جاتی ہیں۔ اچھا تم اس بحث میں مت پڑو۔ جاؤ بوتل لے آؤ۔"

تیواری لال نے گھڑی دیکھی۔ دس بج گئے تھے۔ دس بجے کے بعد یہ بے حد ضروری تھا کہ ساغر دینا کرنل صاحب کے سامنے ہو۔

○☆○

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے' رات دس بجے کے لگ بھگ گھر پہنچتے ہی کرنل سریش نے تیواری لال کو بوتل اور سوڈا وغیرہ لانے کے لیے کہا۔ تیواری لال جان گیا کہ کرنل صاحب ڈنر کر کے آئے ہیں۔ آج کل ان کے بیوی بچے دہلی گئے ہوئے تھے لہٰذا اکثر وہ ڈنر باہر سے کر آتے تھے اور کبھی کبھی تو رات کو آتے ہی نہیں تھے۔ بوتل اور لوازمات کرنل صاحب کے سامنے میز پر سجاتے ہوئے تیواری لال خلاف توقع خاموش تھا۔ کرنل نے جلد ہی اس کی خاموشی بھانپ لی "کیا بات ہے تیواری لال۔ منہ پھلا رکھا ہے؟" کرنل نے پوچھا۔

تیواری لال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "بڑے صاحب! میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔ بھگوان جانتا ہے' یہ نوکری میں پیسے کے لیے نہیں کر رہا۔ اس لیے کر رہا ہوں کہ آپ سے ایک سمبندھ سا بن گیا ہے۔ کوئی آپ کے بارے میں الٹی سیدھی بات کرے تو میرا بھیجا کھول جاتا ہے۔"

"ہوا کیا چاچا؟" کرنل سریش نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔

تیواری لال بولا "یہ لڑکی جو آپ پکڑ کر لائے ہیں مجھے پاگل کروے گی یا پھر میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گی۔ آج میں اتفاق سے اٹیکسی کی طرف چلا گیا تھا۔ کپتان راجندر صاحب کی دستی گھڑی غسل خانے میں رہ گئی تھی۔ میں پہنچا تو غسل خانے میں لفٹین سنیل صاحب گھسے ہوئے تھے۔ میں ان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران پچھلے کمروں سے اس بدبخت کی چیخ پکار سنائی دینے لگی۔ حراجادی کا ظلم جتنا جریلا ہے' جہان اس سے دکھی جرمنی ہے۔ پہلے تو ایڈیٹن فورس اور پولیس کو کوستی رہی پھر آپ کے بارے میں بدزبانی کرنے لگی۔ میرے تو تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ من چاہا دروازا توڑ کر اندر گھس جاؤں اور کتیا کی جبان کھینچ لوں گدی میں سے۔ بڑے نیچ چھے ہلکے کی لڑکی ہے۔ ہمارے بیچ میں ہو کر ایسی

شگوفے

○ وہ صاحب اپنی مرغی کو جو فیڈ دیتے رہے اس میں لکڑی کا برادہ ملا ہوا تھا۔ اس مرغی کے انڈوں سے جو چوزے نکلے ان کے پاؤں لکڑی کے تھے۔

○ "آج ہم می پاپا کے ساتھ چڑیا گھر گئے تھے۔ اللہ۔ بڑا مزہ آیا۔ وہاں ہم نے ہاتھی دیکھا۔ وہ اپنے ویکیوم کلینر سے چنے اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔"

○ آدم خور مچھر آج کل ڈائٹنگ کر رہے ہیں۔ کھانے کے لیے بوٹے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

○ "ڈرائیور... ڈرائیور...! بس روکو۔ ایک عورت گر گئی ہے۔"

"ڈیل اے... ڈیل اے استاد! جانے دو۔ اس نے کرایہ دے دیا تھا۔"

○ کہا ایک بدروح نے دوسری بدروح سے "بھئی مجھے تو یقین نہیں کہ انسانوں کا بھی کوئی وجود ہے۔"

○ منگنی کے بعد لڑکی کو معلوم ہوا کہ اس کے منگیتر کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔ اس نے فوراً توڑ دی۔ ٹانگ نہیں' منگنی۔

○ ایک سڑک پر لگا ہوا بورڈ "جب یہ بورڈ پانی میں ڈوب جائے تو سمجھ لیجئے کہ سڑک ٹریفک کے لیے بند ہے۔"

اس ہاتھیں کرتی ہے تو آجاد ہو کر کیا کیا نہ کرے گی۔ بس جی میں تو کہتا ہوں کہ میرے لکھ اچھے تھے اور اس کے بھی جو اندر گھسنے کا راستہ نہیں تھا' ورنہ میں اس کی ہڈی پسلی توڑ دیتا اور آپ ناراج ہو کر میری ہڈی پسلی توڑ دیتے۔"

"ناراض تو ضرور ہوتے۔" کرنل مسکرایا پھر انگریزی میں بولا۔ "ایسی چیزیں ہڈی پسلی توڑنے کی نہیں ہوتیں۔"

"کیا کہا آپ نے؟" انگریزی سے نابلد تیواری لال نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" کرنل زیر لب مسکرانے لگا۔

کرنل چوتھا پیگ لے چکا تو تیواری لال اسے پرنام کر کے باہر آگیا۔ کرنل کا دستور تھا کہ تیسرے چوتھے پیگ کے بعد بیڈ روم میں چلا جاتا تھا۔

راہداری میں تیواری لال کی ملاقات اوملی اوم پرکاش سے ہو گئی۔ نوجوان اوم پرکاش کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کرنل اور تیواری

لال کی باتیں سنتا رہا ہے۔ وہ تیواری لال کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا "کیا بات ہے۔ آجکل کس چکر میں ہو۔"

"کسی چکر میں نہیں۔" تیواری لال بولا۔

دونوں باتیں کرتے سرونٹ کوارٹرز کی طرف آ گئے۔ یہ جگہ ہر قسم کی گفتگو کے لیے مناسب تھی۔ یہاں پہنچ کر تیواری لال ... نے اردلی اوم پرکاش کو ناصر کہہ کر بلانا شروع کر دیا اور ناصر' تیواری لال کو خدا بخش کہنے لگا۔ حقیقت میں یہی دونوں کے اصل نام تھے۔ دونوں مسلمان اور تحریکِ آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ اپنی ہائی کمان کے حکم پر وہ بطور مخبر کام کر رہے تھے۔ ناصر یوں تو خدا بخش سے کم عمر تھا لیکن ذہانت کے لحاظ سے وہ خدا بخش سے کافی آگے تھا۔ وہ عرصہ دو سال سے کرنل سریش کے ساتھ بطور اردلی کام کر رہا تھا۔ خدا بخش کی طرح ناصر نے بھی کسی موقع پر بی ایس ایف کے ایک اعلیٰ افسر اور اس کی بیوی کی جان بچائی تھی اور اس "خدمت" کے صلے میں اردلی کی نوکری تک پہنچا تھا۔

ناصر نے کہا "یہ کیا معاملہ ہے چاچا! کرنل سے جھوٹ کیوں بولا تم نے؟"

"ہمارے کام میں جھوٹ ہی سچ ہوتا ہے۔" خدا بخش نے مسکرا کر کہا۔

"مذاق نہیں چاچا۔" ناصر بولا "صبح جب تم کپتان راجندر کی گھڑی ڈھونڈنے انیکسی گئے تھے تو میں بھی وہیں تھا۔ تمہاری وہاں موجودگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے' نہ لڑکی نے کرنل کو گالیاں دی تھیں اور نہ تم آگ بگولا ہوئے تھے۔ اس وقت لڑکی سمیت تینوں قیدی سو رہے تھے۔"

"بس یونہی۔" خدا بخش نے جواب دیا "کشمیر کی آزادی کے پُرجوش حامیوں سے نفرت کا اظہار کرنا ہمارے لیے سود مند ہے۔ ہم جس حیثیت سے یہاں موجود ہیں' ہمیں اسی قسم کی باتیں کرنی چاہئیں۔"

ناصر بولا "مجھے پتا چلا ہے کہ پرسوں بھی تم نے کرنل کے سامنے لڑکی کے بارے میں بڑا غم و غصہ دکھایا تھا۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"کرنل نے ہی بتایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تیواری لال تو روز بروز .... دیش پریمی ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" خدا بخش نے جواب دیا "ان لوگوں کو ہمارے بارے میں اسی قسم کی باتیں سوچنی چاہئیں۔"

"بہرحال کچھ بھی ہے چاچا! مجھے لگتا ہے کہ تم اصل بات چھپا رہے ہو۔ تم لڑکی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو تو اس کی کوئی خاص وجہ ہے....."

"تم بھی ہند سرکار کی طرح میں نہ مانوں کی رٹ لگا رہے ہو۔"

کچھ دیر دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے' پھر ناصر نے خدا بخش کو خدا حافظ کہا اور سونے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ خدا بخش چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اس کے ذہن میں سوچ کے گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے بار بار لڑکی کا چہرہ آ رہا تھا..... وہ کوئی پہلی عورت نہیں تھی جو اس عقوبت خانے میں اس دردناک صورتِ حال کا شکار ہوئی تھی۔ آزادی کے اُن گنت متوالوں کی خونچکاں لاشیں اس چار دیواری میں تڑپی تھیں اور پھر مٹی کا رزق ہوئی تھیں۔ ایسے بہت سے واقعات خدا بخش نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ سیکڑوں بار خدا بخش کی رگوں میں غم کا دریا بہا تھا اور سیکڑوں بار اس کا دل سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہوا تھا لیکن نہ کوئی آہ اس کے ہونٹوں تک پہنچتی تھی اور نہ کوئی آنسو اس کی پلکوں تک آیا تھا۔ وہ ایک جاسوس تھا اور دشمن کی صفوں میں گھسنے والے جانبازوں کو پہلا سبق ہی یہ پڑھایا جاتا تھا کہ اسے اپنی شناخت ہر صورت میں پوشیدہ رکھنی ہے۔ اسی میں اس کی بھلائی ہے اور اسی طرح وہ مقصد پورا ہو سکتا ہے جس کے لیے اسے بھیجا جا رہا ہے۔ خدا بخش جانتا تھا کہ دشمن کی صفوں میں گھس کر اس کے اندر اپنی جگہ بنا لینا ایک بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس جگہ کے چھن جانے سے جہاں جاسوس کا نقصان ہوتا ہے وہاں اس "کاز" کو بھی ناقابلِ تلافی ٹھیس پہنچتی ہے جس کے لیے جاسوس کام کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے ایک سال میں خدا بخش نے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر بے شمار عذاب سہے تھے۔ یہ ایسی قیامتیں تھیں جو پتھر پر بھی گزرتیں تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ خدا بخش کو اپنی سخت جانی پر حیرت تھی کہ وہ سب کچھ دیکھ اور سن کر بھی زندہ تھا۔ یہ عقوبت خانہ ایک قتل گاہ تھا۔ اس عقوبت خانے کے سیاہ پھاٹک کو بلاشبہ "بابِ اجل" کہا جا سکتا تھا۔ جو گرفتار شدہ کشمیری اس بابِ اجل سے گزر آتا تھا اسے شاذ و نادر ہی زندہ لوٹنا نصیب ہوتا تھا۔ بے شمار شہیدوں کے خون کی سرخی ان در و بام میں جذب تھی۔ آزادی کے اُن گنت متوالوں کی آخری چیخیں اس فضا میں معلق تھیں۔ خدا بخش کو معلوم تھا کہ وہ لڑکی بھی جو چار دن پہلے یہاں لائی گئی ہے ان تمام جاں گسل مراحل سے گزرنے والی ہے جو یہاں پہنچنے والوں کا مقدر ہوتے ہیں..... وہ اس لڑکی کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ایسا کرنا اپنے فرائض سے روگردانی تھی..... مشن پر روانہ ہوتے وقت جو احکامات خدا بخش کو دیے گئے ان میں یہ بات وضاحت سے کہی گئی تھی کہ وہ اپنے ٹارگٹ پر پہنچ جانے کے بعد اپنے کسی بھی ساتھی یا شناسا کے لیے قطعی اجنبی ہو گا اور بدترین صورتِ حال میں بھی خود کو اس سے الگ تھلگ رکھے گا لیکن بالفرض اگر خدا بخش اس معصوم صورت لڑکی کے لیے کچھ کرنا چاہتا بھی تو کیا کر سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ بلند و بالا دیواروں اور انتہائی کڑی نگرانی کے انتظامات والے اس عقوبت خانے سے کسی بدنصیب قیدی کو نکالنے کی کوشش کرنا ایسے ہی تھا جیسے سوئی کے ناکے سے ہاتھی گزارنے کی

کوشش کی جاتی یا اپنے سائے سے چھٹکارا حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا۔ اس بے رحم جانبداری سے فرار کی کسی بھی کوشش کا حتمی اور طے شدہ نتیجہ دردناک موت تھا۔ کسی قسم کی سفارش' حجت' حکمتِ عملی یا چالاکی یہاں کارگر نہیں تھی۔ بالفرض خدا بخش کے ہاتھ میں کسی طرح ایک خود کار رائفل آجاتی تو وہ اس رائفل سے آٹھ دس فوجیوں کو ہلاک کر کے شہادت کا رتبہ تو پا سکتا تھا لیکن لڑکی کو یہاں سے نکال نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے انجام کی طرف محوِ سفر تھی اور اسے بہر صورت "منزل" تک پہنچنا تھا..... کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا خدا بخش اس کے لیے..... وہ جانتا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ اس کے تجربے نے اسے وقت سے آگے دیکھنا سکھا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا لڑکی سے کی جانے والی "پوچھ گچھ" مکمل ناکامی سے دوچار ہوگی۔ وہ کشمیر کی بیٹی بہت سے دوسرے مجاہدین کی طرح ہر قسم کا تشدد سہہ جائے گی لیکن کچھ بتا کر نہیں دے گی۔ یہ ناکامی کرنل سریش کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دے گی۔ وہی جھنجلاہٹ جو اسے تمام قانونی اور اخلاقی تقاضے بالائے طاق رکھنے پر اکساتی ہے اور وہ سرتاپا اس "وحشی فورس" کا کل پرزہ بن جاتا ہے جو کشمیریوں پر ظلم و زیادتی کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ وہ شراب کے نشے میں ڈوب کر لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے گا پھر اس اجڑی ہوئی لڑکی پر کرنل کے ماتحت کھیوں کی طرح بھنبھنانے لگیں گے۔ چند روز یہ انسانیت سوز شغل جاری رہے گا پھر لڑکی کی لاش اس عقوبت خانے میں دفن ہو جائے گی یا ٹکڑے کر کے کسی ندی نالے میں بہا دی جائے گی۔ عنقریب..... ہاں عنقریب یہ ہونے والا تھا۔ آٹھ دس دن کے اندر اندر۔

○☆○

رات کے نو بجے تھے۔ انٹیلی جنس کے ایک اندرونی کمرے میں قیدی لڑکی نبیلہ احسن سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ پوچھ گچھ کرنے والوں میں کرنل سریش کے علاوہ دو اور آفیسر بھی تھے۔ ایک فوجی افسر تھا اور دوسرا سویلین۔ سویلین افسر کا تعلق محکمۂ اطلاعات سے تھا۔ وہ دو روز پہلے دہلی سے آیا تھا اور تفتیشی ٹیم میں شامل ہوا تھا۔ فوجی آفیسرز کی نسبت وہ قدرے نرم مزاج تھا۔ اس کی درخواست پر لڑکی کی ہتھکڑی کھول دی گئی تھی۔ دوسرے قیدیوں کی طرح لڑکی کو بھی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر ایک اونچی کھڑکی کی سلاخوں سے منسلک تھی۔ اصطلاحاً اسے "کھڑی ہتھکڑی" کہا جاتا ہے۔ ایسی ہتھکڑی کے سبب ملزم مسلسل کھڑا رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لڑکی بھی پچھلے کئی گھنٹوں سے کھڑی تھی۔ اس کے پاؤں سوجے ہوئے تھے اور بے خوابی کی وجہ سے چہرے پر شدید تھکن اور نقاہت کے آثار تھے۔ یقیناً اس سے مار پیٹ بھی کی گئی تھی۔ ایک ہونٹ زخمی تھا اور پیشانی پر نیل کا نشان تھا۔

کرنل سریش وردی میں تھا۔ آتشدان کی سرخ روشنی میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی سرخ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ گاہے گاہے اس چھڑی کی مدد سے لڑکی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتا تھا اور چنگھاڑتا تھا "جواب دو..... میں کہتا ہوں جواب دو۔ کس سے رقم لیتی ہو تم؟ کون اپنا سرپرست ہے تمہارا۔ کون ہے؟"

لڑکی نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر رکھے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کا چٹان جیسا بے زبان حال کہہ رہا تھا "میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرو گے کہ میری جان لے لو گے۔ میری جان تو پہلے ہی میرے کشمیر کی ہے' میں اسے سہارا اپنے کشمیر پر قربان کرتی ہوں۔

خدا بخش کمرے کے ایک گوشے میں خاموش کھڑا تھا اور اس پوچھ گچھ کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھرماس تھا۔ وہ کرنل سریش کے حکم پر گرم کافی لے کر آیا تھا۔ اسے آئے ہوئے بیس پچیس منٹ ہو چلے تھے لیکن کرنل اتنا مصروف تھا کہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔ آخر خدا بخش نے مسلسل کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ کرنل ایک گہری سانس لے کر کرسی پر آ بیٹھا۔

"کافی لیجیے صاحبان!" اس نے دونوں ساتھی آفیسرز کو تھکے تھکے لہجے میں دعوت دی۔

"نو تھینکس" سول آفیسر نے فوراً کہا "میرا خیال ہے' اب چلتے ہیں۔ باقی کل دیکھیں گے۔"

"اوکے۔" کرنل خوش دلی سے بولا۔

درحقیقت وہ خود بھی لڑکی کے ساتھ دماغ کھپا کھپا کر نڈھال ہو چکا تھا۔ دونوں آفیسرز رسمی کلمات کے بعد کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب لڑکی کے علاوہ صرف خدا بخش اور کرنل کمرے میں تھے۔ کرنل بڑے تھکے تھکے انداز میں لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا یوں دیکھنا خطرے کی علامت تھا۔ خدا بخش کو اندازہ ہو گیا کہ اب ایک دو دن میں لڑکی "بدترین" مصائب کا شکار ہونے والی ہے۔

کافی پینے کے دوران کرنل ایک فائل کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ زخموں اور تھکن سے نڈھال لڑکی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور سسکتی رہی۔ خدا بخش کی نظریں لڑکی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لڑکی جو زندہ تھی لیکن جس کی قسمت میں موت لکھی جا چکی تھی۔ اسے عنقریب مرنا تھا۔ خدا بخش ایک "زندہ شہید" کو دیکھ رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا' وہ کون سی طاقت ہے جو کشمیر کے نوجوانوں کو ہنستے کھیلتے تکلیفیں سہنے اور پھر موت کو گلے لگانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ سوال جتنی بار خدا بخش کے ذہن میں ابھرا تھا اس کا ایک ہی جواب سامنے آیا تھا۔ اور یہ جواب تھا "آزادی کی خواہش" وہ خود بھی تو اسی خواہش کا اسیر تھا۔ اسے ایک برس ہو چکا تھا اپنے پیاروں کی صورتیں دیکھے۔ اس کی ضعیف ماں۔ اس کی بیوی۔ اس کے تین بچے۔ وہ لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ سب کے سب، گھر کے ایک ذاتی گاؤں میں

ایک چھوٹے سے سرسبز گھر کا منظر ہر روز سیکڑوں بار تصور میں آتا تھا لیکن وہ اس گھر تک جا نہیں سکتا تھا۔ موت کے اس ناقابلِ شکست قلعے میں وہ پورے بارہ ماہ سے محصور تھا۔ کبھی کبھی تو اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہے۔ کسی بھی لمحے کوئی معمولی سی لرزش بھی اسے اذیت ناک انجام سے دوچار کر سکتی تھی۔

کافی پینے کے بعد کرنل سریش لڑکی کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک بار پھر بید کی چھڑی سے لڑکی کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور کوئی بات کی..... شاید کوئی حرکت کی۔ خدا بخش ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ اس وقت لڑکی اور کرنل کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ تھرماس بند کر کے برتن سنبھال رہا تھا۔ ایکا ایکی لڑکی زور سے بولی "یو باسٹرڈ" اور پھر زخمی بلی کی طرح کرنل پر جھپٹی۔ اس کا طمانچہ کرنل کے منہ پر پڑا اور اس کے ہونٹوں میں دبا سگار اچھل کر دور جا گرا۔ کرنل خود بھی اچانک حملے سے لڑکھڑا کر تیاکی پر گر گیا تھا۔

پچھلے کئی روز سے خدا بخش کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ کرنل کو گرتے دیکھ کر وہ تیر کی طرح لڑکی پر جھپٹا اور پھر وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑا "حرامجادی..... ڈائن میں تیری جان لے لوں گا۔ تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔"

وہ اسے بے رحمی سے مار رہا تھا..... اور مارتا چلا جا رہا تھا۔ باہر سے تین مسلح فوجی بھاگتے ہوئے آئے اور لڑکی کو خدا بخش سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ کرنل بھی اٹھ کر اس کوشش میں شریک ہو گیا تھا لیکن اس وقت تک خدا بخش لڑکی کو چند کاری ضربیں لگا چکا تھا۔ وہ مارشل آرٹ کے اسرار و رموز سے واقف تھا۔ اس کی کہنی کی ایک بھرپور ضرب لڑکی کی نرم و نازک گردن پر پہلو کی طرف سے لگی تھی۔ یہ جان لیوا ضرب تھی۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی اور کسی بے جان شے کی طرح مسلح افراد کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ خدا بخش پھر بھی اس پر جھپٹ رہا تھا "بڑے صاحب پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔ کتیا..... میں تجھے جندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس کے منہ سے جیسے جھاگ بہہ رہے تھے۔

کرنل اور اس کے ایک ماتحت نے بڑی مشکل سے کھینچ کر خدا بخش کو لڑکی سے علیحدہ کیا..... کرنل نے لڑکی کے گال پر ہلکے ہلکے تھپڑ مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن لڑکی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہے۔ وہ بالکل بے جان نظر آ رہی تھی۔

"اسپتال لے چلو۔" کرنل تیزی سے بولا۔

اب کمرے میں سات آٹھ مسلح افراد مزید آ چکے تھے۔ لڑکی کو ہاتھوں ہاتھ باہر کھڑی جیپ تک پہنچایا گیا..... پھر جیپ نے یو ٹرن لیا۔ اس کے پہیوں نے طویل احتجاجی چیخ ماری اور لہراتی ہوئی اس گیٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی جسے خدا بخش "بابِ اجل" کہتا تھا۔

○☆○

لڑکی اسپتال کے راستے ہی میں دم توڑ گئی تھی۔ اس کی گردن

رئیس امروہوی کی بیش بہا تالیف

وما بعد نفسیات — 3 حصے
مراقبہ — 2 حصے
عجائب نفس — 2 حصے
جنات — 2 حصے
مظاہر نفس — 2 حصے
ہپناٹزم — 2 حصے
رسائنس بھی اہم ہے — 2 حصے
عالم برزخ — 2 حصے
عالم ارواح — 2 حصے
توجہات — 2 حصے
حاضرات ارواح — 2 حصے

قیمت فی کتاب 25 روپے | ڈاک خرچ فی کتاب 16 روپے

200 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

- کسی قسم کی نقد رقم لفافے میں ہرگز مت رکھیں۔
- کتاب کی قیمت منی آرڈر ارسال کریں۔ وی پی ارسال نہیں کیا جاتا۔
- بیرون ملک کتابوں کی قیمت 4 امریکی ڈالر یا مساوی رقم سمیت اخراجات ہوگی۔
- بیرون ملک رقم صرف ڈرافٹ کے ذریعے روانہ کریں۔ ڈرافٹ اس نام پر بنوائیں:

HABIB BANK LTD. A/C 688
Mansfield Street Branch Karachi

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات، پوسٹ بکس 948 رمضان چیمبرز
بلیو ایریا سٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200
فون نمبر: 2636700 2675817 2631695 لیکس

کتابوں کی قیمتیں اور ڈاک خرچ موجودہ ہیں۔ جن میں کسی بھی وقت تبدیلی ہو سکتی ہے

کہ میرے سینے میں تمہیں جاننے کی' تم سے ملنے کی اور تم سے باتیں کرنے کی آرزو مچل رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں تمہیں جان سکی تو شاید (شاید کیا' یقیناً) تم سے شدید' والہانہ محبت کرنے لگوں گی۔

"اب میں یہ خط دوسری دراز میں رکھتی ہوں اور تمہارے جواب کا انتظار کرتی ہوں۔

ہیلن۔"

ڈیوڈ نے وہ خط نہ جانے کتنی بار پڑھا۔ پہلی سطر سے آخری سطر تک۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی مگر ڈیوڈ نے کوئی توجہ نہ دی۔

رات ایک بجے ڈیوڈ نے پہلی دراز سے وہی قدیم کاغذ اور لفافے نکالے۔ ایک سادہ کاغذ پر اس نے لکھنا شروع کیا۔

"ڈیئر ہیلن!

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے سمجھاؤں۔ تمہارے لئے شاید یہ ناقابلِ یقین ہوگا' میں زندہ ہوں' موجود ہوں۔ جہاں تم رہتی ہو اس سے چند فرلانگ دور ہوں مگر میں ۱۹۹۱ء میں ہوں! ہمارے درمیان جو فاصلہ ہے وہ دراصل گزرے ہوئے برسوں کا ہے۔ بلکہ ایک صدی کا ہے!

"بات دراصل یہ ہے کہ میں اب اس میز کا مالک ہوں جس میں تم نے اپنا پہلا خط چھپایا تھا اور جو مجھے مل گیا تھا۔ میں نے اس کا جواب لکھا۔ وسٹرا سٹیشن کے قدیم پوسٹ آفس سے رات گئے میں نے یہ خط تمہارے نام پوسٹ کیا اور نہ جانے وہ کس طرح تم تک پہنچ گیا۔ شاید تمہیں یہ جھوٹ لگے' مذاق لگے مگر کیا کوئی ہیلن ایلزبتھ ورلے جیسی بے مثال لڑکی سے ایسا ظالمانہ مذاق کر سکتا ہے؟

"میں بروک لین کے علاقے میں ہی رہتا ہوں مگر تم نیویارک کے اس علاقے کو چشمِ تصور سے بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ اس شہر کی سڑکوں پر انجنوں کی مدد سے چلنے والی تیز رفتار گاڑیوں کا ازدحام ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ سے اوپر ہے۔ پتھر اور اسٹیل کی ہزاروں فٹ بلند عمارتیں جگہ جگہ استادہ ہیں۔ یہاں اب نہ کوچوان ہیں' نہ لالٹینیں اور نہ ہی دیگر قدیم اشیاء۔

"تمہیں میری باتوں پر یقین کرنا ہوگا۔ میں زندہ ہوں' موجود ہوں۔ جس وقت تم یہ خط پڑھ رہی ہوگی' اس کے ایک سو برس بعد' ۱۹۹۱ء میں' میں موجود ہوں اور تمہاری محبت کا پیغام ایک صدی کی مسافت طے کر کے میرے پاس پہنچ چکا ہے۔"

یہاں تک لکھ کر ڈیوڈ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کیا کیا لکھنا چاہتا تھا۔ لفظ اس کے سامنے آتے تھے اور پھر جیسے پیچھے چلے جاتے تھے۔ بالآخر اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ سب سے اہم بات اسے اب لکھنی تھی۔

"ہیلن' اس میز میں تین خفیہ خانے ہیں۔ پہلی دراز میں تم نے پہلا خط رکھا تھا جو مجھے مل چکا۔ اب اس دراز کے ذریعے شاید کوئی چیز وقت کی حد دو بار کر کے نہ جا سکے۔ دوسری دراز میں تم نے دوسرا خط رکھا تھا جو مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی ملا ہے۔ شاید اب یہ دراز بھی بیکار ہو چکی۔

"مگر اب تک میں نے تیسری دراز کا خفیہ خانہ نہیں کھولا ہے۔ یہ تیسری دراز ہمارے تمہارے رابطے کی آخری صورت ہے۔ اس کے ذریعے تم آخری بار کوئی پیغام' کوئی جذبہ مجھ تک پہنچا سکتی ہو۔ میں یہ خط حسبِ سابق اسی قدیم پوسٹ آفس سے پوسٹ کروں گا۔ اور پھر انتظار کروں گا۔ ایک ہفتے بعد میں تیسری دراز کھولوں گا۔

"ہیلن' یاد رکھنا کہ ایک صدی کے فاصلے پر رہنے والا ڈیوڈ نیلسن' جسے کوئی لڑکی نہیں بھاتی تھی' صرف تمہارا اسیر ہے!

تمہارا۔ ڈیوڈ نیلسن۔"

وہ ایک ہفتہ ڈیوڈ نے پاگلوں کی طرح گزارا۔

اس نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ صبح سے شام تک وہ سڑکوں پر تھا گھومتا رہتا تھا اور راتوں کو ہیلن کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

ایک ہفتے بعد رات گئے اس نے کانپتے ہاتھوں سے وہ تیسری دراز کھولی۔

دراز کے اندر اسے یقین تھا کہ کوئی طویل خط ہوگا۔ آخری رابطہ۔ آخری پیغام۔

مگر خفیہ خانے میں خط نہیں تھا۔ ایک تصویر تھی!

یہ سیاہ و سفید تصویر ایک حسین لڑکی کی تھی۔ قدیم وکٹورین طرز کے لباس میں وہ پُروقار اور خوبصورت لگتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں چمک۔

تصویر کے نچلے حصے پر ہیلن نے لکھا تھا۔ "میں ہمیشہ یاد رکھوں گی!"

ڈیوڈ ساکت بیٹھا تصویر کو گھورتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ تصویر کے ساتھ ہیلن کا پیغام کتنا بھرپور' کس قدر مکمل تھا۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ اس کے سوا بھلا کیا کہا جا سکتا تھا۔ آخری پیغام' آخری رابطہ اور بھلا کیا ہو سکتا تھا!

لیکن یہ آخری پیغام نہیں تھا۔ ڈیوڈ کو آخری پیغام کئی ہفتوں کی تلاش کے بعد بروک لین کے مضافات میں ملا۔ شام ہو چکی تھی اور نیم تاریکی پھیل رہی تھی جب اس نے درختوں کی قطاروں کے درمیان میں وہ کتبہ دیکھا۔

اس پر لکھا تھا۔

ہیلن ایلزبتھ ورلے

۱۸۷۲ء۔۱۹۳۴ء

اور اس کے نیچے درج تھا۔

"میں نے ہمیشہ یاد رکھا!"

ڈیوڈ جان گیا کہ اب اسے بھی عمر بھر کی یاد رکھنا ہے!

The Book's Hive

رخشندہ ٹی وی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ وہ غم کے ساتھ اس کا ایک باریش ہونے ہونے مل رہا تھا۔ اس کی پسندیدہ گلوکارہ اس کی پسندیدہ غزل گا رہی تھی ــــ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا۔ اچانک رخشندہ کو محسوس ہوا کہ عارف بڑے غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی اور عارف نیا نویلا دولہا۔ صرف دو ہفتے ہوئے تھے ان کی شادی کو۔ ایسے میں عارف کا اسے یوں دیکھنا انوکھی بات نہیں تھی لیکن نجانے کیوں رخشندہ کو یہ بات انوکھی محسوس ہوئی۔ شاید اس کی وجہ وہ خاص قسم کی دھندلاہٹ تھی جو عارف کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ رخشندہ نے یہ دھندلاہٹ پہلی دفعہ دیکھی تھی لہٰذا اسے کوئی خاص سمجھ نہ پا سکی۔ بس اسے

ایک خوبصورت جوڑے کا ہنسنا۔ اُن کے شب و روز خوش گوار گزر رہے تھے۔ ایک روز اچانک ناخوشگوار حالات سے دوچار ہوئے۔ خوشحال زندگی میں جبر و بیزاری کا سکن تھا۔ اذیت کدہ میں آ گیا۔

شک گزیدہ

طاہر جاوید مغل



یوں لگا جیسے عارف کی نگاہ کے شیشے میں چمک کم ہو گئی ہے۔
"بڑی اچھی غزل ہے۔" وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔
"ہاں' مجھے بہت پسند ہے۔"
"چلو تمہاری ایک اور پسند کا پتا چل گیا۔ آہستہ آہستہ ساری پسند و ناپسند معلوم ہو جائے گی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
رخشندہ کو عارف کا یہ انداز کچھ اچھا نہیں لگا۔
ان دونوں کی شادی ماں باپ کی پسند کی تھی۔ شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی اور سہاگ رات سے پہلے رخشندہ نے عارف کی صرف تصویر دیکھی تھی۔ عارف قبول صورت تھا۔ عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ رخشندہ نسبتاً کم عمر تھی۔ وہ اکیسویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ تاہم تعلیم دونوں کی برابر تھی۔ وہ دونوں ایف ایس سی تھے۔ میکے کی طرح رخشندہ کی سسرال بھی لاہور ہی میں تھی۔ عارف بجلی کی مصنوعات بنانے والی ایک چھوٹی سی فیکٹری چلاتا تھا۔ اس فیکٹری سے اتنی آمدن ضرور ہو جاتی تھی کہ پانچ افراد پر مشتمل یہ مختصر سا کنبہ سہولت کی زندگی گزار رہا تھا۔
شادی کے آغاز سے ہی رخشندہ کو اس بے پناہ محبت کا احساس ہوا تھا جو عارف کے دل میں اس کے لیے پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے بھی رخشندہ سے جدا ہونا گوارا نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا۔ "رخشی! میرا دل چاہتا ہے' اپنی جان نکال کر تمہارے جسم میں ڈال دوں اور ہم دونوں یک جان ہو جائیں۔ تم اب تک کہاں تھیں۔ خدا کی قسم' جو زندگی تمہارے بغیر گزری' رائگاں گزری ہے۔"
رخشندہ کو معلوم تھا' شادی کے اولین دنوں میں سو ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ عارف کے میٹھے رسیلے بول سن کر اس کے دل میں گدگدی تو بہت ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود کو یہ بھی یاد دلاتی رہتی تھی کہ یہ صورت حال مستقل رہنے والی نہیں۔ آج عارف نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا انہوں نے ایک دم رخشندہ کو جھنجوڑ دیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ سہانا خواب ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے جو وہ پندرہ بیس روز سے دیکھ رہی تھی۔ عارف نے کوئی بات نہیں کہی تھی' نہ ہی کوئی اشارہ دیا تھا مگر رخشندہ کے اندر بیٹھی ہوئی حساس عورت نے نجانے کیوں اسے سرخ جھنڈی دکھا دی تھی۔
اگلے آٹھ دس روز میں یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ سرخ جھنڈی وہم نہیں تھی۔ عارف کے اندر سے بتدریج ایک نیا عارف برآمد ہونے لگا تھا۔ وہ اس سے عجیب و غریب سوالات کرنے لگا تھا۔ ان سوالات کا تعلق عموماً رخشندہ کے ماضی سے ہوتا۔ مثلاً وہ کالج کیسے جاتی تھی؟ واپس کیسے آتی تھی؟ ان کے پڑوس میں کون لوگ رہتے تھے؟ اس کے کزن کون کون تھے؟ ان میں سے کون سا کزن ان کے گھر میں زیادہ آتا جاتا تھا۔ رخشندہ بچی نہیں تھی۔ وہ ان سوالات کے رخ سے بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ عارف کس نہج پر سوچ رہا ہے۔ وہ اس کا ماضی کھنگالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے سوال زیادہ واضح اور اس کی پوچھ گچھ زیادہ سخت ہوتی چلی گئی۔
ایک رات جب وہ کھانا کھا کر کالونی کی پُرسکون سڑک پر گشت کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے' عارف فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "مرکی بارہ سال کے بعد باتوں کی طرح سوچنا شروع کر دیتی ہے پھر دو تین سال کے اندر اندر اس کی سوچوں میں کوئی نہ کوئی خوابوں کا شہزادہ گھس آتا ہے۔ ایک آدھ شہزادہ تو تمہارے خوابوں میں بھی گھسا ہو گا؟"
رخشندہ اس سوال پر سن رہ گئی تھی پھر اس نے جلدی سے سنبھالا لیا اور ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ "یہی بات لڑکوں کے بارے میں بھی تو کہی جا سکتی ہے۔ وہ بھی تو تیرہ چودہ سال کے بعد باتوں کی طرح سوچنے لگتے ہیں۔"
"یعنی تم اعتراف کر رہی ہو؟"
"ہرگز نہیں۔ میں تو آپ کی بات کا جواب دے رہی ہوں۔"
"میرا بھیجہ والی بات مت کرو۔" وہ ایک دم تیز لہجے میں بولا۔ "مجھے میرے سوال کا جواب دو۔"
وہ خوفزدہ نظروں سے عارف کا غضب ناک چہرہ دیکھنے لگی۔
"عارف! کیا ہوا ہے آپ کو' کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"
اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے اندر [illegible] دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ ٹھہرے ہوئے [illegible] بولا۔ "آئی ایم سوری رخشی! پتا نہیں میرے منہ سے کیا نکل گیا۔ دراصل کسی وقت میں اچانک غصے میں بول جاتا ہوں۔"
وہ بولی۔ "کئی لوگ کہتے ہیں کہ غصے میں کہی ہوئی بات ہی دل کی بات ہوتی ہے۔"
"دراصل رخشی۔ میں بہت چاہتا ہوں تمہیں۔ ہر وقت تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ خبر نہیں تم نے کیا کر دیا ہے مجھے۔"
اس نے لاڈ سے رخشندہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور کچھ کہنے سے پہلے اس کے ہونٹوں کو بند کر دیا تھا۔
لیکن صرف ایک روز بعد وہ پھر اسی طرح تلخی سے بولا تھا۔ رخشندہ ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ عارف فیکٹری سے آیا تھا اور خاموشی سے اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا تھا۔ رخشندہ افسانہ پڑھ رہی تھی۔ یکایک عارف کی طنز بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔ "بڑی دلچسپی ہے ہماری بیگم کو رومانٹک افسانوں میں۔"
"اوہ آپ؟" وہ چونک کر بولی۔
"کیوں؟ میں نے آ کر سارا طلسم توڑ دیا؟"
"اور نہیں تو کیا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔
"تو جناب واپس چلے جاتے ہیں ہم۔ آپ کھوئی رہیں اپنے رومانی خیالات میں اور۔"

"اور کیا؟"

"اور پھلی بسری یادوں کو ٹٹولتی رہیں۔"

"عارف۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولی تھی "آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں مجھ سے۔ آپ۔ آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے؟"

"اپنی بیوی سمجھتا ہوں۔ ایک شوہر پرست بیوی۔ شوہر کی خوشی کو ہر چیز سے مقدم سمجھنے والی۔ اس کے لیے جینے مرنے والی۔ اس کی خاطر ہر غم چپ چاپ سہہ جانے والی۔" وہ بدستور طنزیہ لہجے میں بولا۔

"میں یہاں کوئی غم نہیں سہہ رہی ہوں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی تھی۔

"شوہر پرست بیویاں ایسے ہی کہا کرتی ہیں لیکن میں جانتا ہوں تم دکھ سہہ رہی ہو۔ کوئی نہ کوئی ہے جس کی یاد تم اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں یہ کیسے یقین کرلوں کہ ایک لڑکی اکیس سال کی عمر تک اپنے آس پاس سے بالکل بے خبر رہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی تمہاری زندگی میں نہ آیا ہو لیکن سوچوں میں تو ضرور آیا ہوگا۔ کسی کو تو پسند کیا ہوگا تم نے۔ کسی کے لیے آہیں بھری ہوں گی۔ بولو۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔ بولو جواب دو۔"

اس نے رخشندہ کے ریشمی بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے تھے اور جھٹکے سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

ان لمحوں میں رخشندہ نے محسوس کیا کہ فرطِ غضب سے عارف کے نتھنے پھڑکے ہوئے تھے۔ وہ اسے ایک بالکل اجنبی شخص محسوس ہوا۔ خوف کی لہر رخشندہ کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن ایک گولا سا اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ عارف کچھ دیر اسے زہریلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر دور سے جھٹک کر باہر نکل گیا۔ وہ صوفے پر گر گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسی دوران میں رخشندہ کی اکلوتی ننھ روبی نشست گاہ کی طرف چلی آئی۔ اس کی آہٹ سن کر رخشندہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ارے بھابی! کیا ہوا آپ کو؟" وہ چونک کر بولی تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی۔"

"یونہی کیا؟"

"چوٹ لگ گئی تھی۔" وہ اپنا پاؤں مسلتے ہوئے بولی۔ "صوفہ ٹھیک کر رہی تھی۔"

"چوٹ تو کہیں نظر نہیں آتی۔" روبی غور سے پاؤں دیکھ کر شوخ لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے بھائی جان سے لڑائی ہوئی ہے۔"

رخشندہ منہ پھیر کر حیرتی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

○☆○

رخشندہ کے ساتھ عارف کا رویہ بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ رخشندہ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت محبت کرتا تھا مگر جتنی محبت کرتا تھا اتنا ہی شک بھی کرتا تھا۔ وہ اب

ایمرجنسی

"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! جلدی سے آیئے۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"ہم اپنے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

"میں بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ ہی کو کچھ کرنا ہوگا ڈاکٹر! منے نے باہر کے دروازے کی چابی نگل لی ہے۔"

واشگاف الفاظ میں اس سے پوچھتا تھا کہ شادی سے پہلے اس کی نجی زندگی کیا رہی ہے۔ خاص طور سے اسے رخشندہ کے دو چچا زاد بھائیوں پر شک تھا۔ ایک کا نام انیس اور دوسرے کا شاہد تھا۔ یہ دونوں کزن لاہور میں ہی رہتے تھے اور رخشندہ کے گھر ان کا آنا جانا بھی تھا۔ عارف ان دونوں کے حوالے سے سوالات پوچھتا اور بعض اوقات اس کے سوالات رخشندہ کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوتے۔ مثلاً وہ یہ پوچھتا کہ انیس اور شاہد میں سے اس کے نزدیک زیادہ خوبصورت کون ہے۔ کس کا قد کاٹھ اچھا ہے، ہنسی مذاق کی باتیں کون زیادہ کرتا ہے۔ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ وہ تنہائی میں زیادہ مرتبہ ملی تھی۔ کبھی کبھی اور زیادہ گہرائی میں اتر جاتا۔ مثلاً ایک موقع پر رخشندہ کے منہ سے نکل گیا کہ پچھلے برس گرمیوں میں اسے انیس کے ساتھ اکیلے مری جانا پڑا تھا۔ اہلِ خانہ چند روز پہلے مری جا چکے تھے۔ وہ اپنی ایک عزیز سہیلی کی بیماری کی وجہ سے رک گئی تھی۔ بعد میں انیس اسے اپنے ساتھ کار میں لے گیا تھا۔ اس "اعتراف" کے بعد عارف کے ہاتھ ایک زبردست موضوع آگیا۔ وہ کرید کرید کر رخشندہ سے سوالات پوچھنے لگا، وہ اس کے ساتھ کس سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ کہاں کہاں رکے تھے؟ اگر کار میں ڈیک تھا تو انہوں نے کون سے گانے سنے تھے؟ اور اس قسم کے اور بہت سے سوالات۔

رخشندہ کا دوسرا کزن شاہد ڈاکٹر تھا۔ اس کی ڈاکٹری بھی عارف کے دل میں بہت کھٹکتی تھی۔ ایک روز وہ پوچھنے لگا۔ "کیا شاہد نے کبھی تمہارا علاج کیا؟"

اس سوال نے رخشندہ کو سٹپٹا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب سوالات کا پٹارا پاس کھل جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ بیمار ہوئی تھی اور شاہد روزانہ گھر آکر اسے دیکھتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے جھوٹ بولا تو عارف کسی نہ کسی طور تصدیق کرلے گا۔ لہٰذا اس نے سچ بولنے میں ہی عافیت سمجھی اور اقرار کیا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا۔ عارف ایک دم چوکنا ہو گیا اور اس کی آنکھیں دہکنے لگیں۔ بھانڈا سوالات شروع ہو گئے۔

"وہ تمہارے جسم کو چھوتا تھا؟"

"جیسے ایک ڈاکٹر چھوتا ہے ویسے ہی چھوتا تھا۔"
"اسٹیتھواسکوپ لگاتا تھا؟"
"ہاں۔"
"کہاں رکھتا تھا؟"
"جہاں رکھتے ہیں۔"
"انجکشن کہاں لگاتا تھا؟"
"کبھی بازو پر' کبھی کولہے پر۔"
"سب کے سامنے لگاتا تھا یا اکیلے میں؟"
"سب کے سامنے لگاتا تھا۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔
"تم نے کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہ دکھایا۔ کیوں ایک نوجوان کزن کے سامنے خود کو بے پردہ کیا؟"
"عارف' بس کرو۔ خدا کے لیے بس کرو۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے' تم مجھے پاگل کردو گے اور خود بھی ہو جاؤ گے۔"

وہ دانت پیستا ہوا اور اپنے آپ میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ وہ ساری رات خواب گاہ میں اکیلی سسکتی رہی تھی۔

پھر ایک روز تو قیامت ہی آگئی۔ لاہور ہی میں رخشندہ کے رشتے داروں میں ایک شادی تھی۔ ہفتے کے روز رخشندہ کو وہاں جانا تھا۔ اپنی مصروفیت کے سبب عارف نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے بمشکل رخشندہ کو اکیلے جانے کی اجازت دی۔ شرط یہ تھی کہ رات دس بجے تک وہ ہر صورت واپس آ جائے گی۔ رخشندہ اپنے چھوٹے بھائی اسد کے ساتھ چلی گئی۔ شومئی قسمت اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی کہ عارف ناراض ہو گا اور دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ تقریب جلد ختم ہو جائے۔ جب بارہ بج گئے تو رخشندہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ تقریب ادھوری چھوڑ کر اپنے بھائی اسد کے ساتھ واپس آ گئی۔ وہ ایک طوفانی رات تھی لاہور کے گلی کوچے جل تھل تھے۔ بادل گرج برس رہے تھے اور ہر گرج کے ساتھ رخشندہ کا دل سہم جاتا تھا۔ حسب توقع عارف جاگ رہا تھا اور بیٹھا تھا۔ رخشندہ نے اسے بے چینی سے نشست گاہ میں ٹہلتے دیکھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی رخشندہ سمجھ گئی کہ آج خیر نہیں۔ جب تک اسد گھر میں رہا۔ عارف نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ جونہی وہ رخصت ہوا' عارف آگ بگولا ہو گیا۔ اتفاق سے گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ عارف کو کھل کھلا کر غضب ناک ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

"اتنی دیر کہاں رہیں تم؟" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔
رخشندہ نے لرزتے کانپتے لہجے میں صفائی پیش کی۔
وہ چنگھاڑ کر بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا' تم نے وعدہ کیا تھا کہ دس بجے تک ہر صورت لوٹ آؤ گی۔ کون یار تھا تمہارا' جس کے پاس اب تک بیٹھی رہی ہو؟"
رخشندہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بے رحمی سے بولا۔ "مجھے رو کر مت دکھاؤ۔ مجھے بتاؤ' کون کون تھا وہاں؟"

اس کے غضب نے جیسے رخشندہ کو چٹانا نڑ کر رکھا تھا۔ وہ مجہول سی نظر آ رہی تھی پھر وہ ہراساں لہجے میں نام گنوانے لگی کہ کون کون وہاں موجود تھا۔ انیس کا نام سن کر عارف کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے بلند تر ہو گئے۔ وہ پھنکار کر بولا۔ "مجھی تو میں سوچتا تھا' اتنی تیاری کیوں ہو رہی ہے وہاں جانے کے لیے۔ حرامزادی' میری عزت نیلام کرنے پر تلی ہوئی ہے۔"

ایک زوردار طمانچہ رخشندہ کے گال پر پڑا اور وہ الٹ کر صوفے پر جا گری۔ فرطِ غضب سے عارف کے نقوش بگڑ گئے تھے وہ ایک دم حیوان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے رخشندہ پر گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ رخشندہ سارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے زمین پر گر پڑی۔ عارف نے اسے بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ یہاں اس بات کا کوئی شبہ نہیں تھا کہ رخشندہ کی چیخ پکار کوئی سن لے گا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ ایک بار پھر رخشندہ پر پل پڑا۔ وہ رو رہی تھی۔ دہائی دے رہی تھی' منت سماجت کر رہی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

جب وہ مار مار کر ہانپ گیا تو ایک طرف بیٹھ گیا۔ رخشندہ وہیں فرش پر پڑی اپنی چوٹیں سہلاتی رہی اور ناک سے بہنے والا لہو پونچھتی رہی۔ وہ گلاس لبالب پانی پی کر عارف کی آگ قدرے سرد پڑی۔ اس نے رخشندہ کو فرش سے اٹھا کر پلنگ پر بٹھایا۔ اسے "ٹانک" دی تاکہ وہ ناک سے بہنے والا خون بند کر سکے پھر اسے پینے کے لیے پانی دیا۔

پانچ دس منٹ میں رخشندہ کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو وہ ایک بار پھر سوال و جواب کرنے لگا۔ "چلو میں آج مان لیتا ہوں کہ انیس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بھی مان لیتا ہوں کہ شاید بھی تمہارے سگے بھائیوں کی طرح تھا لیکن یہ بات کسی صورت نہیں مانوں گا کہ تم نے آج تک کسی سے پیار نہیں کیا ہے۔ یہ بات مانی جانے والی ہے ہی نہیں۔"

رخشندہ نے دل میں سوچا۔ "اگر یہ بات تمہارے نزدیک "مانی جانے والی" نہیں تھی تو تم نے شادی ہی کیوں کی تھی۔"

لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کوئی ایسی ویسی بات زبان پر لائی تو وہ ایک بار پھر حیوان بن جائے گا اور اسے اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخنے لگے گا۔ وہ اس کے قریب سٹ آیا۔ اس کی ٹھوڑی انگلی سے اٹھا کر بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ "دیکھو رخشی! مجھ پر اور خود پر رحم کرو۔ آج مجھے اس کا نام بتا دو' جو مجھ سے پہلے تمہاری زندگی میں موجود تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم سچ سچ بتا دو گی تو میں اس معاملے کو بالکل بھول جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے۔ کبھی ذکر نہیں کروں گا تمہارے سامنے۔"

"میں کیا بتاؤں؟" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ "جو چیز تھی ہی

نہیں' اس کے وجود کا کیسے اقرار کرلوں۔۔۔ پلیز عارف' مجھے میرے عورت ہونے کی ایسی کڑی سزا مت دو۔ پلیز معاف کردو مجھے۔"

عارف کی آنکھیں ایک بار پھر شعلے اگلنے لگیں۔ وہ چند لمحے خونخوار نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر تیزی سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کا ایک چین تھا۔ یہ چین اس نے کسی کوڑے کی طرح ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کے سر پر آن کھڑا ہوا' بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دیکھ رخشی! میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ مجھے سب کچھ صاف صاف کہہ دے۔ تجھ سے بڑھ کر عزیز مجھے دنیا میں اور کوئی نہیں اور میں تیری ہی قسم کھاتا ہوں کہ اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔" یہاں تک کہہ کے اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن اگر تو نے آج بھی ہٹ دھرمی دکھائی تو پھر یہ تیری گوری چمڑی سلامت نہیں رہے گی۔ میں مار مار کر حشر کردوں گا تیرا۔ کسی کو صورت دکھانے کے قابل نہیں رہے گی تو۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ بے حد خوفناک ہوگیا تھا۔

رخشندہ سسکی اور عاجز لہجے میں بولی۔ "عارف! میں۔۔۔ کیا بتاؤں تمہیں۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے بتانے کو۔"

عارف کا داہنا ہاتھ حرکت میں آیا۔ رخشندہ نے لہراتے ہوئے آہنی چین کی ایک جھلک دیکھی پھر اس کی کمر' کندھوں کے قریب آگ سی لگ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آہنی سریا دھکا کر اس کی پسلیوں میں اتار دیا ہے۔ اس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی اور طوفانِ بادوباراں کے شور میں دب گئی۔ چین کی دوسری ضرب رخشندہ کے بازو پر لگی۔ ایک بار پھر دہکے ہوئے انگارے اس کے جسم میں اتر گئے۔ درد کی شدت سے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ گئی۔ چین کی تیسری ضرب شاید رخشندہ کے چہرے پر لگتی لیکن اس نے یہ وار اپنی دونوں کلائیوں پر روکا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا' بے رحم چین نے اس کی کلائیوں کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگلی ضرب لگانے کے لیے عارف نے ہاتھ بلند کیا لیکن ضرب لگائی نہیں۔ وہ جیسے رخشندہ کو چند لمحوں کی مہلت دینا چاہ رہا تھا' بے انتہا سرد آواز میں بولا۔ "بول بتائے گی یا نہیں۔۔۔ بول۔"

رخشندہ نے بے انتہا سہمی ہوئی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ اس کا سر اثبات میں ہلتے دیکھ کر عارف کی شعلہ فشاں نگاہوں میں فاتحانہ چمک ابھری اور اس کا چین والا ہاتھ دھیرے دھیرے نیچے آگیا۔

دوسری طرف رخشندہ ایک کڑی آزمائش سے دوچار تھی۔ جان لیوا اذیت سے بچنے کے لیے اس نے اپنا سر اثبات میں تو ہلا دیا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ حیران تھی کہ وہ عارف کو کیا بتائے۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ اس کا ماضی آئینے کی طرح شفاف تھا۔ ماں باپ کی عزت کا پاس کرنے والی ایک مشرقی لڑکی کی طرح اس نے اب تک بے داغ زندگی گزاری تھی۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا اسکینڈل وابستہ نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ بلوغت سے شادی تک اس نے خود اپنی ذات پر سیکڑوں پہرے بٹھا رکھے تھے۔ ان پہروں نے کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔۔۔ سکندر کو بھی نہیں۔ سکندر جوان کا پڑوسی تھا۔ وجیہہ' اونچا لمبا اور چوڑے شانوں والا۔ اس بے چارے کو تو چار برس میں یہ خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ رخشندہ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ رخشندہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ سکندر اس کے دل کو بھایا تھا۔ سکندر کے لیے اس کے دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگی تھیں لیکن یہ احساس ہمیشہ ایک احساس ہی رہا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اس احساس کے نتیجے میں رخشندہ گردن زدنی کیسے ہو سکتی تھی؟ یہی وجہ تھی کہ اس نے ابھی تک عارف کو سکندر کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ یہ کوئی بتانے والی بات ہی نہیں تھی۔۔۔ یہ کوئی چار سال پہلے کی بات تھی جب رخشندہ کے پڑوس میں نئے کرائے دار آئے تھے۔ خوش اخلاق و خوش لباس لوگ تھے۔ خاندان کا سربراہ "کارپینٹر" کا کام کرتا تھا۔ سکندر اس کے منجھلے بیٹے کا نام تھا۔ ایک مرتبہ رخشندہ کے بڑے بھائی رضوان کی چند دودھ فروشوں سے لڑائی ہوگئی تھی۔ ان کا ریڑھا رضوان کی موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا تھا اور وہ سب رضوان پر پل پڑے تھے۔ اسی دوران میں سکندر بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے رضوان کے ساتھ مل کر بڑی دلیری سے "دودھ فروش حضرات" کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح رخشندہ نے بھی یہ لڑائی اپنے گھر کی چھت سے دیکھی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس کے دل میں سکندر کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔۔۔ لیکن یہ نرم گوشہ آنے والے دنوں میں نہ کبھی سکڑا اور نہ وسیع ہوا۔ بس جوں کا توں موجود رہا۔ وہ چپکے چپکے سکندر کو دیکھا کرتی اور اس کے لیے دل میں جاگنے والی خوشگوار دھڑکنوں کو محسوس کیا کرتی۔

آج وہ عارف کے ہاتھوں اتنا درجہ مجبور ہو چکی تھی۔ کسی ایسے حوالاتی کی طرح جو تھانے دار کے تشدد سے مجبور ہو کر اپنے چھوٹے سے چھوٹے جرم کا بھی اقرار کرلیتا ہے۔ وہ عارف کو سکندر کے بارے میں بتانے پر آمادہ ہوگئی۔ شاید اسی بہانے اس کی جان عارف کے غضب سے چھوٹ جاتی۔ وہ وعدہ کررہا تھا کہ اگر ایک بار وہ سچ بتا دے گی تو وہ اس معاملے پر ہمیشہ کے لیے مٹی ڈال دے گا۔۔۔

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے عارف کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں آہنی چین لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولی۔ "عارف! تم جو قسم کہو میں کھانے کو تیار ہوں۔ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی نہیں آیا۔۔۔"

"پھر وہی بکواس۔" وہ اتنے زور سے چیخا کہ رخشندہ سرتاپا دہل گئی۔

وہ جلدی سے بولی۔ "صرف ایک لڑکا۔ سکندر تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی جان کا دوست تھا۔ میں تمہارے سامنے اپنے اس گناہ کا اعتراف کرتی ہوں کہ وہ۔۔۔ شروع شروع میں مجھے اچھا لگتا تھا لیکن خدا گواہ ہے' میں نے کبھی اس سے بات کی' نہ کبھی نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک دو دفعہ وہ بھائی جان کے ساتھ ہمارے گھر بھی آیا تھا لیکن میں اس کے سامنے نہیں آئی۔ اس کو آج تک یہ معلوم نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ سوچتی تھی۔۔۔ پھر جب تمہارے ساتھ میرے رشتے کی بات چل نکلی تو میرے دل سے اس کا خیال تک نکل گیا۔ اور اب۔ اب تو میں اس کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا سب کچھ اب تم ہو عارف! میرے دل و دماغ میں اب تمہارے سوا کوئی داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ میں سر سے پاؤں تک تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔" وہ جذباتی انداز میں اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر اس کے گھٹنوں سے ٹکا دیا۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ روتی رہی اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

○☆○

رخشندہ کو امید تھی کہ عارف اپنے وعدے کا پاس کرے گا اور رخشندہ کے ماضی کے بارے میں اس کا خطرناک خبط کم ہو جائے گا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ حالات ایک بالکل نیا رخ اختیار کر جائیں گے اور اس تبدیلی کے نتیجے میں اس کی زندگی تہ و بالا ہو جائے گی۔ وہ آغازِ بہار کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ عارف اپنے کام کے سلسلے میں راولپنڈی گیا ہوا تھا اور اسے دو تین روز وہاں رہنا تھا۔ باقی اہلِ خانہ کو ایک شادی میں شرکت کرنا تھی اور وہ دو ہفتے کے لیے سرگودھا چلے گئے تھے۔ رخشندہ کے بھائی اسد کی بیس دن سالگرہ آنے والی تھی۔ رخشندہ کئی ماہ سے سوچ رہی تھی کہ بھائی کو کوئی اچھا سا تحفہ دے گی۔ اس نے عارف کو ایک دو بار بازار لے جانے کو کہا تھا لیکن اس نے مصروفیت کا بہانہ بنا دیا تھا۔ اب عارف کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بازار جانے کی ٹھانی۔ باہر جاتے ہوئے وہ برقع پہنتی تھی۔ ساتھ میں اس نے اس دس بارہ سالہ لڑکی کو لے لیا جو گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ بذریعہ رکشا وہ لوگ انارکلی پہنچے اور خریداروں کے ہجوم کا حصہ بن گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد اچانک ایک آواز نے رخشندہ کو چونکا دیا۔ "اسلام علیکم جی!"

رخشندہ نے دیکھا' اس کے سامنے سکندر کھڑا تھا۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ سکندر ایک دم یوں اس کے سامنے آن کھڑا ہو گا' وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ سکندر پتلون اور پوشرٹ میں تھا۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے بھرے بھرے بازو نمایاں نظر آ رہے تھے۔ وہ صورت سے ہتھ چھٹ اور ہنگامہ پسند نظر آتا تھا لیکن اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور دھیما پن تھا۔

رخشندہ نے سکندر کے سلام کا جواب زیرِ لب بڑبڑا کر دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنائیت سے بولا "پلیز رخشندہ صاحبہ! میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف چار پانچ منٹ کا وقت دیں۔"

"کیا بات کرنی ہے آپ کو؟" رخشندہ تنکے ہوئے لہجے میں بولی

"م۔۔۔ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔"

"کہا ہے نا کہ بہت ضروری بات ہے اور اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔ وہ سامنے اسنیک بار ہے۔ آیئے دو منٹ وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ یقین کیجئے' یہ دو منٹ آپ کو بہت فائدہ پہنچائیں گے۔"

"لیکن یہ ٹھیک نہیں' آپ کو جو کہنا ہے امی سے۔"

"یہ امی والی بات نہیں ہے۔ کیا آپ دو منٹ کے لیے مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتیں۔"

رخشندہ تذبذب میں کھڑی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں انجانے خدشے جاگ اٹھے تھے۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ راہ گیر مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اسنیک بار سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ شیشے کے دروازے سے پار اکا دکا لوگ بیٹھے تھے۔ غیر ارادی طور پر رخشندہ کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ ملازمہ لڑکی بھی رخشندہ کے ساتھ تھی۔ وہ ایک گوشے میں الگ تھلگ میز پر جا بیٹھے۔ سکندر نے کچھ منگوانا چاہا لیکن رخشندہ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ صرف وہ بات جاننا چاہ رہی تھی جس کے لیے سکندر اسے یہاں لایا تھا۔ سکندر نے ملازمہ لڑکی سے کہا کہ وہ دوسری میز پر بیٹھ جائے۔ رخشندہ کی آنکھوں میں رضامندی دیکھ کر لڑکی کچھ فاصلے پر جا بیٹھی۔

چھوٹی سی تمہید کے بعد سکندر بولا "عارف صاحب آپ کے شوہر ہیں۔ کوئی بھی عورت یہ پسند نہیں کرتی کہ کوئی اجنبی اس کے شوہر کے خلاف کوئی بات کرے لیکن میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے شوہر اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

رخشندہ کے سینے میں ناگواری کی ایک لہر بلند ہوئی۔ وہ بے حد بیزار لہجے میں بولی "معاف کیجئے۔ میں نے آپ سے اپنے میاں کے بارے میں رائے طلب نہیں کی۔"

سکندر نے کہا "مجھے معلوم تھا' آپ کو ناگوار گزرے گا لیکن تفصیل جاننے کے بعد آپ اتنا غصہ نہیں کریں گی۔"

"کیسی تفصیل؟"

سکندر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا "آپ کے شوہر کو آپ کی شادی پر چھ ماہ کمل دیکھا تھا۔ پندرہ بیس دن پہلے ان سے دوسری ملاقات ہوئی ہے۔ وہ ہماری دکان پر آئے تھے۔ مجھے اپنے

ساتھ جناح گارڈن لے گئے۔ کہتے تھے' کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جو "ضروری باتیں" انہوں نے کیں وہ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو ان کی زبان سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آپ مجھ سے محبت کرتی تھیں اور چپکے چپکے میرے بارے میں سوچا کرتی تھیں۔ اس کے بعد عارف صاحب نے مجھ سے عجیب وغریب سوالات شروع کردیے۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے کہ میرے اور آپ کے تعلقات کب سے شروع ہوئے' کب تک قائم رہے اور یہ تعلقات کہاں تک گہرے تھے۔ میرے ہر انکار اور ہر صفائی کو عارف صاحب نے رد کیا اور اپنی باتوں پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے مجھے دھمکایا بھی اور کئی طرح کا لالچ بھی دیا لیکن جو کچھ میں نے کیا ہی نہیں تھا اس کا اقرار کیسے کرلیتا۔ عارف صاحب سے میری دوبارہ ملاقات دو روز بعد مال روڈ کے چائنیز ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ یہ ملاقات بھی عارف صاحب کی پُرزور خواہش پر ہی تھی۔ وہ ہر صورت میں مجھ سے اقرار کروانا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب میری بیوی اقرار کرچکی ہے تو تم کیوں اقرار نہیں کرلیتے ہو۔ انہوں نے اپنے طویل انٹرویو میں بعض ایسے شرمناک سوال بھی کیے جو کوئی بھی نارمل شخص اپنی بیوی کے حوالے سے نہیں کرسکتا۔ اس طویل انٹرویو کا ہر سوال اس بات کا گواہ ہے کہ عارف صاحب بے انتہا شکی مزاج اور ناقابلِ اعتبار شخص ہیں بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ عارف صاحب جیسا شخص ہرگز ہرگز آپ کے قابل نہیں تھا۔"

رخشندہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ کبھی تو اس کے دل میں آتا کہ اپنے سامنے کھڑے سکندر کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کردے' کبھی دل چاہتا کہ اپنی بدبختی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور روتے روتے یہیں گر کر مرجائے۔ لیکن وہ ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام بھی نہ کرسکی اور اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ ایک میکانکی حرکت کے تحت سکندر کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے ایک سفید لفافہ رخشندہ کی انگلیوں میں تھمادیا "میں نے اس میں کچھ لکھا ہے۔ یہ آپ اطمینان سے گھر جاکر پڑھ لیں" اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑگیا تھا۔

○☆○

رخشندہ اپنے بیڈ روم میں تھی۔ کھڑکیاں دروازے اندر سے بند تھے۔ اس کے سامنے وہ دو نیلگوں کاغذ تھے جن پر سکندر کی تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"رخشندہ صاحبہ! یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی ذہن میں نہ لائیے کہ میری اس تحریر کی وجہ وہ دو ملاقاتیں ہیں جو آپ کے شوہر نے مجھ سے کی ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ تحریر برسوں سے میرے دل پر لکھی ہوئی ہے۔ میں ہر روز اسے پڑھتا تھا اور ہر روز سوچتا تھا کہ کاش میں یہ الفاظ کاغذ پر بھی اتار سکتا اور آپ تک پہنچا سکتا۔ تین ہفتے پہلے جب میں نے آپ کے شوہر کی زبانی یہ سنا کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں اور میرے بارے میں سوچا کرتی ہیں تو مجھے اچانک یوں لگا جیسے میرے ان جذبات کو زبان مل گئی ہے جو برسوں سے میرے دل میں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔۔۔ آج میں پوری سچائی اور انتہائی دیانت داری کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو چاہتا ہوں۔ میری اس خاموش اور پُرخلوص چاہت کا آغاز انہی دنوں ہوگیا تھا جب ہم آپ کے محلے میں آئے تھے۔ پھر آنے والے ہر دن کے ساتھ یہ محبت پروان چڑھتی رہی۔ اس کی شاخوں پر خواہشوں اور آرزوؤں کے پھول کھلتے رہے لیکن میں نے کبھی اس محبت کو کسی پر آشکار نہیں ہونے دیا۔ آپ کے بھائی کا شمار میرے اچھے دوستوں میں ہوتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس رشتے پر کوئی حرف آئے۔ میرے دل میں بڑے بڑے طوفان اٹھتے تھے لیکن میں ان پر قابو پاتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں لاچار ہوگیا۔ کم از کم دو مرتبہ یہ واقعہ ہوا کہ میں نے آپ کے نام تفصیلی خطوط لکھے۔ میں اس موقع کی تلاش میں رہا کہ یہ خطوط آپ تک پہنچاسکوں مگر دونوں دفعہ موقع ملنے سے پیشتر ہی میری ہمت جواب دے گئی۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور تھا۔۔۔ یقیناً یہی منظور تھا جو ہوا ہے۔ اوپر والے کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ کیا کوئی تصور کرسکتا تھا کہ ایک روز میرے بجائے آپ محبت کا اظہار کریں گی۔۔۔ اور مجھے اس "اظہار" سے آگاہ کرنے والا آپ کا شوہر ہوگا۔"

خط کے آخر میں فیض کے دو شعر تھے۔ الوداعی کلمات کے طور پر لکھا تھا "میں آپ سے پُرخلوص محبت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔ خدا گواہ ہے میں آپ کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔"

رخشندہ کتنی ہی دیر خط ہاتھ میں تھامے ساکت وجامد بیٹھی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ اور کیسے ہوا تھا؟ یہ ایک انوکھا اظہارِ محبت تھا اور اس اظہارِ محبت کا اصل تخلیق کار رخشندہ کا عاقبت نااندیش شوہر تھا۔ وہی شوہر جسے دعویٰ تھا کہ وہ رخشندہ سے بے مثال محبت کرتا ہے۔ رخشندہ کو اس بے مثال شوہر پر رہ رہ کر طیش آرہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اپنی ان گت چوٹوں کے بدلے میں اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارے اور پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھے۔ اس نے رخشندہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا تھا کہ اگر رخشندہ "ماضی" کے بارے میں اعتراف کرلے گی تو وہ اس معاملے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فراموش کردے گا لیکن وہ کم ظرف چند ہی روز بعد وعدے سے پھرگیا تھا۔ رخشندہ کے منہ سے سکندر کا نام سننے کے بعد اس نے سکندر سے ملاقات کی تھی اور وہی شرمناک تفتیش شروع کردی تھی جو وہ اس سے پہلے رخشندہ سے کرتا رہا تھا۔

اگلے پانچ چھ روز رخشندہ نے سخت اذیت میں گزارے۔ اس میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر پوچھ سکتی کہ اس نے اپنے وعدے سے انحراف کیوں کیا ہے؟ اس نے کیوں ایک بے نام شک کو اپنی صداقت سے حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا' اس کا ذمے دار صرف اور صرف وہ خود تھا اور جو کچھ ہونا تھا' اس کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ رخشندہ کے اندر چھپی ہوئی حساس عورت چیخ چیخ کر خطرے کا اعلان کررہی تھی۔ یہ عورت کہہ رہی تھی کہ جو بے نام شک' حقیقت کے روپ میں ڈھلا ہے وہ کسی سنگین حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔

○☆○

آٹھ دس روز بعد رخشندہ کو سکندر کی طرف سے ایک اور خط ملا۔ یہ خط سکندر نے دن گیارہ بجے کے لگ بھگ گھر کے لیٹر بکس میں ڈالا تھا اور خط ڈالنے کے فوراً بعد رخشندہ کو فون کردیا تھا کہ وہ بکس میں سے خط نکال لے۔ اہل خانہ ابھی تک سرگودھا سے لوٹے نہیں تھے۔ گھر میں ملازمہ لڑکی اور رخشندہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا پھر بھی کسی کی نگاہ لیٹر بکس تک پہنچ سکتی تھی۔ رخشندہ نے فوراً جاکر بکس میں سے خط نکال لیا تھا۔ وہ خط کو پڑھے بغیر پھاڑ دینا چاہتی تھی مگر بعد ازاں اس نے ارادہ ترک کردیا تھا۔

اندرونی کمرے میں جاکر اس نے خط پڑھا۔ یہ خط بھی سکندر نے اپنے دلی جذبات کے حوالے سے ہی لکھا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ عارف ہرگز اس کے قابل نہیں' یہ غلطی محض اس کی زندگی کو جہنم بنا کے رکھ دے گا' ابھی رخشندہ کے پاؤں میں "بچے" کی زنجیر نہیں پڑی۔ وہ اہم اور بروقت فیصلہ کرکے اپنی زندگی کو مسلسل عذاب بن جانے سے بچاسکتی ہے۔ اس خط میں اخلاص اور محبت کی جھلک تھی لیکن نہ جانے کیوں رخشندہ اس اخلاص اور محبت کو سراہنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سکندر کو دو ٹوک جواب دے گی اور وہ پرکاٹ دے گی جو اسے پرواز پر اکسا رہے ہیں۔ وہ سکندر کو کسی صورت بھی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولے۔ خط کے ایک گوشے میں سکندر کی دکان کا فون نمبر بھی لکھا تھا۔ رخشندہ اتنی جھنجلائی ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ فوراً ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سکندر کے نمبر ڈائل کیے۔ پہلے کسی ملازم لڑکے کی آواز آئی' پھر سکندر بولا "ہیلو' میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں" وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"کون؟ رخشندہ! او گاڈ' مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی تمہارا فون آئے گا۔"

"میں نے تمہارا خط پڑھا ہے سکندر" وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولی "تم ایسی باتیں کیوں لکھ رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک شادی شدہ عورت سے تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں۔ اگر ماضی میں۔"

یکایک رخشندہ لرز اٹھی۔ ساتھ والے کمرے سے دلدوز چیخ ابھری تھی۔ ریسیور رکھ کر وہ آواز کی سمت لپکی۔ یہ آواز یقیناً ملازمہ لڑکی پروین کی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دہشت ناک منظر دیکھا۔ ایک آٹھ فٹ لمبا کوبرا سانپ بستر پر پڑا تھا۔ لڑکی اسی کو دیکھ کر چیخی تھی اور صحن میں بھاگ گئی تھی۔ رخشندہ کی بھی چیخ نکل گئی۔ عین اس وقت عارف کا قہقہہ سنائی دیا اور اس نے ایک گوشے سے برآمد ہوکر رخشندہ کو عقب سے بانہوں میں لے لیا۔

"بڑے خراب ہو تم!" رخشندہ لال بھبوکا چہرے سے بولی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ اچھا ہوں" عارف اس کے بالوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے بولا۔ "اگر اچھا ہوتا تو ربر کے سانپ کے بجائے اصلی سانپ لیتا اور تمہارے سامنے خود کو ڈسوالیتا۔"

اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ رخشندہ اس طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی "اچھا چھوڑو مجھے... لڑکی کو دیکھوں' کہیں بے چاری کا ہارٹ فیل ہی نہ ہوگیا ہو۔"

لڑکی کو تسلی تشفی دے کر رخشندہ کمرے میں واپس آگئی۔ عارف کا موڈ آج خوش گوار تھا۔ ایسا موڈ اس پر کبھی کبھار ہی طاری ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ رخشندہ سے ہنسی مذاق بھی کیا کرتا تھا۔ پچھلی دفعہ وہ ایک کھلونا پستول لے آیا تھا۔ سبز رنگ کے ایسے کھلونا پستولوں سے عموماً پانی کی دھار نکلتی ہے۔ عارف نے یہ پستول رخشندہ کے ہاتھ میں تھمادیا تھا۔ رخشندہ نے یونہی ٹریگر دبایا تھا لیکن پانی کی دھار نکلنے کے بجائے زوردار دھماکے سے فائر ہوا تھا اور رخشندہ کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ یہ بے ضرر فائر تھا لیکن رخشندہ کے اوسان تو خطا ہوگئے تھے۔ عارف کے "مذاق" ایسے ہی اوسان خطا کردینے والے ہوا کرتے تھے۔

اس نے ربر کا سانپ گود سے نکال کر بستر پر پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پتلون کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس نے رخشندہ کی آنکھوں کے سامنے کھولی۔ اس میں ایک خوب صورت طلائی انگوٹھی تھی۔ انگوٹھی پر ایک چھوٹا سا مونوگرام بنا ہوا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ عارف اور رخشندہ کے نام ہیں۔ خطاطی کے انداز میں دونوں ناموں کے حروف ایک دوسرے میں یوں گڈمڈ کردیے گئے تھے کہ یک جان دو قالب نظر آتے تھے۔ وہ بولا "شاید تم بھول گئی ہو۔ آج ہماری منگنی کی پہلی سالگرہ ہے۔"

وہ محبت کا اظہار کبھی کبھی کرتا تھا لیکن جب بھی کرتا تھا ایسا ہی شدید کرتا تھا۔ رخشندہ کو اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن نظر آرہا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جو اس پر شک اور نفرت کے شعلے برساتی ہیں اور یہ وہی نامہرباں ہاتھ ہیں جو اسے آہنی چین رسید کرتے ہیں۔ "چلو آج کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی" رخشندہ نے کہا۔

ملازمہ لڑکی کو چھٹی دینے کے بعد رخشندہ کپڑے بدلنے کے لیے اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ وہاں اسے دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ جب تیار ہوکر باہر نکلی تو سارا منظر بدل چکا تھا۔ اس نے عارف کو دیکھا۔ وہ خواب گاہ کے صوفے پر عجیب سے انداز میں بیٹھا تھا۔ اندرونی اضطراب کے سبب اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی

تھیں اور آنکھوں کا رنگ سرخ ہو چکا تھا۔ وہی سرخ رنگ جو رخشندہ کا خون پیتا تھا اور اس کے جسم سے جان کشید کرتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اس کی نگاہ اس نیلگوں کاغذ پر پڑی جو عارف کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔ یہ سکندر کا خط تھا۔ رخشندہ کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ وہ یہ خط جلدی میں تکیے کے نیچے رکھ گئی تھی۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی' کوئی دلیل' کوئی صفائی یا معافی تلافی یہاں کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

نفرت اور طیش کے سبب عارف کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ اس نے خطرناک انداز میں اٹھ کر کھڑکیاں اور دروازہ بند کیا پھر اس کے حلق سے ایک زہریلی پھنکار نکلی "حرام زادی...!"

اس کے ساتھ ہی وہ رخشندہ پر پل پڑا۔ رخشندہ کا نازک جسم جیسے اچانک وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آگیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور وہ خود بھی اڑ اڑ کر دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور بلا کی رفتار سے اس پر... گھونسوں کی بارش کر رہا تھا "بدکار' بدمعاش عورت' میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں جان لے لوں گا تیری" وہ چیخا اور اس نے الماری میں سے اپنا لائسنس یافتہ ریوالور نکال لیا۔

رخشندہ کی دھندلائی ہوئی نگاہوں میں موت ناچ رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن کو اس پگھلے ہوئے سیسے کے لیے تیار کرنے لگی جو ایک دھماکے سے اس کے جسم کے کسی حصے میں اترنے والا تھا۔ وہ زمین پر پڑی تھی اور اب شاید اسے کبھی اٹھنا نہیں تھا..... اچانک زور دار دھماکے سے دروازہ کھلا اور سکندر جست لگا کر اندر آگیا..... وہی سکندر جس کے بازوؤں کی مچھلیاں ہر وقت تڑپتی تھیں اور جو ہر آن ہنگامہ خیزی کے لیے تیار رہتا تھا۔

رخشندہ کو اس کی آنکھوں میں عقابی چمک نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ عارف صورتِ حال کا ادراک کرتا اور اس کا ریوالور کسی سمت میں متحرک ہوتا' سکندر نے جھپٹ کر اس کی کلائی تھام لی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک ان دونوں میں زبردست کشمکش ہوئی پھر رخشندہ نے سیاہ ریوالور عارف کے ہاتھ سے فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی عارف اور سکندر گتھم گتھا ہو کر بستر پر جا پڑے۔ دونوں کی آنکھوں میں حیوانی چمک تھی اور وہ ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے نظر آرہے تھے۔ رخشندہ کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا' اس نے جلدی سے ریوالور اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا..... اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ برآمدے سے صحن اور صحن سے برآمدے تک ناچ کر رہ گئی۔ چند سیکنڈ بعد جب دوبارہ کمرے میں پہنچی تو صورتِ حال نہایت بھیانک نقشہ پیش کر رہی تھی۔ عارف نے سات آٹھ انچ لمبے پھل کے چاقو سے سکندر پر حملہ کیا تھا۔ چاقو کا پھل پورے کا پورا سکندر کے کندھے میں گھسا ہوا تھا اور عارف اسے واپس کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ ربر کا وہ سانپ جو بستر پر پڑا تھا' عارف کے گلے میں تھا اور سکندر اس سانپ کی مدد سے پوری طاقت کے ساتھ عارف کا گلا بھینچ رہا تھا۔ عارف کا رنگ نیلا ہو چکا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں لیکن وہ سکندر کے کندھے سے چاقو کھینچنے کی کوشش پھر بھی ترک نہیں کر رہا تھا۔ ان میں سے جو بھی پہلے کامیاب ہوتا' اس کی زندگی بچ سکتی تھی۔ غم کی شدت سے بے قابو ہو کر رخشندہ ان دونوں کو جھنجوڑنے لگی اور چیخنے لگی "چھوڑ دو..... خدا کے لیے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔"

پھر اتفاقاً کسی ایک کی ٹانگ لگ جانے سے وہ تیورا کر گر گئی تھی۔

چند لمحے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو بستر پر عارف کی لاش پڑی تھی۔ سانپ ابھی تک اس کے گلے میں تھا۔ یہ ربر کا سانپ تھا' پھر بھی اس کی جان لے گیا تھا۔ خون آلود دستے والا چاقو ابھی تک سکندر کے کندھے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی نوک یقیناً کسی ہڈی میں پھنس گئی تھی۔ سکندر کا رنگ درد کی شدت سے ہلدی ہو رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دلیری اور حوصلے کی چمک تھی..... وہ چند لمحے تک یک ٹک رخشندہ کی سکتہ زدہ آنکھوں میں دیکھتا رہا' پھر اس نے بڑی مضبوطی سے رخشندہ کے دونوں شانے تھام لیے "آؤ رخشندہ! میرے ساتھ" وہ طلوع ہوتے سورج جیسی توانا آواز میں بولا۔

"کہاں؟" رخشندہ کے ہونٹوں سے لرزتی کانپتی مات کناں آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی آنسوؤں کی طویل لڑیاں اس کی پلکوں سے ٹوٹنے لگیں۔

"جہاں میں کہوں" وہ وجدانی انداز میں بولا تھا۔

اور پھر رخشندہ کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے اسے بازو سے تھام لیا۔ رخشندہ جیسے کسی بھیانک خواب میں تھی۔ اپنی حرکات و سکنات پر اس کا بس نہیں رہا تھا پھر بھی کمرے کی دہلیز چھوڑنے سے پہلے اس نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا' جو اس کا شوہر تھا۔ جس نے بڑی محنت سے ایک "ٹشک" کی پرورش کی تھی اور پھر اس "ٹشک" کے ہاتھوں مارا گیا تھا..... اس بات میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں تھا کہ اس نے اپنی بدنصیبی کو خود دعوت دی تھی۔

گھر سے باہر وہ سوزوکی کار کھڑی تھی جس میں سکندر یہاں پہنچا تھا۔ سکندر نے اسے کار میں بٹھایا۔ کار نے اپنی جگہ سے جنبش کی۔ پہیہ متحرک ہوا اور پھر یہ حرکت طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ وہاں سے سیدھا گجرات گیا جہاں اپنے ایک دوست کے ہاں رک کر اسی کے توسط سے اس نے زخم کی مرہم پٹی کرائی پھر اس کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا..... جہلم' راولپنڈی' پشاور' کوہاٹ..... اور پھر کرم ایجنسی۔ ایک روز نئے سورج نے انہیں آزاد قبائلی علاقے میں دیکھا۔ یہاں پہاڑ تھے اور پہاڑوں کے اسرار تھے۔ یہاں ان دونوں کے لیے ایک نئی زندگی کا نشان موجود تھا..... نئی زندگی جو انہیں ماضی کے ہر حادثے کے اثر سے نکال سکتی تھی۔

□ □

یہ بستی لاہور کی ان بستیوں میں سے ہے جو دن رات جاگتی ہیں۔ یہاں شانہ بشانہ تین فلم اسٹوڈیوز موجود ہیں جن میں شاہ نور اسٹوڈیو بھی شامل ہے۔ درحقیقت یہ مقام پاکستان کی فلمی صنعت کی تمام تر معروفیات کا مرکز ہے۔ یہاں فلمی صنعت سے وابستہ لوگ رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ایکسٹرا سپلائی کرنے والے' لباس تیار کرنے والے' ناچ گانے کی تربیت دینے والے' فلمی تکنیک کار اور ایسے بہت سے دیگر لوگ۔

شہزاد اور اکبر جب ہیڈ سلیمانکی سے محنت مزدوری کے لئے لاہور آئے تو اتفاقاً انہیں بھی رہائش کے لئے اسی بستی میں جگہ ملی۔ یہ ایک چھوٹا سا ڈیرا تھا جہاں بیس روپے مہینہ دے کر کوئی ایک درجن افراد رہتے تھے۔ شہزاد اور اکبر پڑوسی ہونے کے علاوہ بچپن کے دوست بھی تھے۔ دونوں رزق کی تلاش میں لاہور پہنچے تھے اور ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار تھے جو انہیں معقول آمدن دے سکے۔ کوشش بسیار کے بعد وہ نوکری ڈھونڈنے کی مزدوری ہی حاصل کر سکے۔ تپتی دوپہروں میں یہ ایک جاں گسل کام تھا لیکن جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے انسان کو ایسے مرحلوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

شہزاد شروع سے مذہبی ذہن کا آدمی تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور محنت کو عبادت کا درجہ دیتا تھا۔ اکبر کا مزاج ذرا مختلف تھا۔ یوں تو وہ بھی شریف النفس تھا لیکن روٹی کمانے اور لاہور میں پاؤں جمانے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ شہزاد کی طرح وہ بھی شادی شدہ تھا اور نئی نویلی بیوی کے علاوہ اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر بھی تھی۔

لاہور آنے کے دو تین ماہ بعد اکبر کی دوستی ایک فلم فائٹر سے ہو گئی اور اس کے ہمراہ وہ کبھی کبھار اسٹوڈیوز آنے جانے لگا' پھر ایک دن شہزاد کو پتا چلا کہ اکبر اس کے ساتھ مزدوری کے لئے نہیں جائے گا کیونکہ وہ اسٹوڈیو میں ایکسٹرا کا کام کرے گا۔ نہ جانے کیوں شہزاد کو اسٹوڈیوز کی ہنگامہ خیز اور مصنوعی زندگی سے چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس زندگی میں مصنوعی پن اور فریب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ نہ اس نے کبھی کوئی فلم دیکھی تھی اور نہ فلمی اداکاروں سے اسے کوئی دلچسپی تھی۔ اس نے اکبر کے اس نئے کام پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ سیدھے سادے طریقے سے

ایک روپ بہروپ کی کہانی جو بہروپ بھرنے کے عمل سے شروع ہوئی

طاہر جاوید مغل

بہروپ

رنگ و روشنی کی اندھیری گپھاؤں میں جا نکلنے والے ایک فن کار کا احوال۔ بہروپ بھرنے پر مختلف بہروپ بھرنے بھرنے کی آفاد طبع نے کروٹ لی تو یہ بہروپ حقیقی زندگی میں بھی در آئے۔ حقیقت اور بہروپ کے اس تضاد کا انجام وہی ہوا جو منطقی طور پر ہونا چاہیے تھا۔



محنت مزدوری کرے۔ خواہ مخواہ ان چکروں میں نہ پڑے۔ اکبر نے کہا کہ اچھا جب کوئی بہتر کام ملے گا تو وہ یہ کام چھوڑ دے گا۔

اکبر نے شہزاد کو صرف ٹالا تھا ورنہ وہ اسٹوڈیو اور وہاں کے شب و روز میں گہری دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔ ایکسٹرا کی حیثیت سے وہ نہ صرف شوٹنگز دیکھنے کا شوق پورا کرتا تھا بلکہ نوکری ڈھونڈنے کی نسبت اسے کم محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ عام سی شکل و صورت کا لیکن سخت جان شخص تھا۔ ایسے لوگ ایکسٹرا کے لئے بہت موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ تین چار ماہ میں ایکسٹرا کی حیثیت سے اکبر کی پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ کبھی کبھار وہ کسی پنجابی فلم میں ایک آدھ فقرہ بھی بول لیتا تھا' اپنے فائٹر دوست راجو سے اس نے "فائٹنگ" سیکھنا بھی شروع کر دی تھی۔ راجو کے ساتھ اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی اور وہ شہزاد سے علیحدہ ہو کر راجو کے کوارٹر میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ کوارٹر شاہ نور اسٹوڈیو کے سامنے والی بستی میں تھا۔

ایک روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک پنجابی فلم میں اکبر اور اس کے چھ سات ساتھیوں کو پولیس کے اہلکاروں کا کردار ادا کرنا تھا۔ اکبر کا ڈیل ڈول اچھا تھا لہٰذا اسے اے ایس آئی کی وردی پہنائی گئی تھی۔ شوٹنگ کے دوران میں لنچ کا وقفہ ہوا تو اکبر کھانا کھانے کے لئے اسٹوڈیو کے سامنے ایک ہوٹل میں پہنچ گیا۔ کھانا وغیرہ کھا کر اس نے سگریٹ خریدے اور یونہی آنکھیں کھولنے کے لئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کی یہ چہل قدمی غیر معمولی نہیں تھی۔ اکثر فلمی ایکسٹرا اور چھوٹے موٹے ایکٹر اپنے فلمی گیٹ اپ میں اسٹوڈیوز سے باہر آ جاتے تھے اور اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے۔ مقامی لوگ چونکہ ان کو دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے لہٰذا ان پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔

گھومتے گھومتے اکبر ویگن اسٹاپ کی طرف گیا تو ایک منظر دیکھ کر چونک گیا۔ پتلون قمیص والا ایک نوجوان لڑکا اور چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی ویگن اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ اکبر کو دیکھ کر وہ دونوں واضح طور پر چونکے اور ڈرے ہوئے نظر آنے لگے۔ اکبر ان کے کچھ اور قریب چلا گیا۔ لڑکا بے چینی سے پہلو بدلنے لگا اور لڑکی نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر اکبر کو شک ہونے لگا کہ وہ گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ اکبر پولیس اہلکار کی وردی میں تھا اور اس وردی کی جھلک نے ان دونوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ اکبر اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے قریب جا کر لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" لڑکا ہکلا کر بولا اور اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کہاں سے آئے ہو بھائی؟" اکبر نے رُعب دار آواز میں پوچھا۔

"جی۔۔۔ جی سے۔۔۔" لڑکے نے ایک قصبے کا نام لیا۔

لڑکے کا لب و لہجہ دیہاتی تھا اور وہ زیادہ تیز طرار بھی نظر نہیں آتا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے تمہارے ساتھ؟" اکبر نے دریافت کیا۔

"جی۔۔۔ میری۔۔۔ کزن ہے۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔

"کہاں لے جا رہے ہو اسے؟"

"اس کی پھوپی کے گھر گوجرانوالہ چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

"تم نے گوجرانوالہ جانا تھا تو راوی کے پُل پر اترتے یا بادامی باغ اڈے پر۔ یہاں کیوں اترے؟"

"وہ جی۔۔۔ وہ جی دراصل۔۔۔" لڑکے کو اکبر کے سوالات نے بُری طرح گڑبڑا دیا۔ وہ ایک دم نروس نظر آنے لگا۔

"مجھے تم پر شک ہو رہا ہے۔" اکبر نے اس کی بات کاٹی۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

لڑکا ایک دم وحشت زدہ ہو گیا۔ لڑکی بھی بے چینی سے اپنی چادر کا پلو موڑ رہی تھی۔ ان کی پریشانی نے اکبر کا حوصلہ مزید بڑھا دیا۔ اس نے تحکم سے کہا۔ "چلو آؤ میرے ساتھ" اسے خوشگوار حیرت ہوئی جب وہ دونوں خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیئے۔ اکبر دل ہی دل میں اپنی چالاکی پر اور مغرور جوڑے کی بیوقوفی پر خوش ہو رہا تھا' اس کے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اب ان دونوں کا کیا کرے۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی آیا کہ انہیں کوارٹر میں لے جائے اور دیکھے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

وہ دونوں کو کوارٹر میں لے آیا۔ دونوں کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ لڑکی کے کندھے پر ایک شولڈر بیگ بھی تھا جسے وہ اپنی چادر میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کوارٹر میں پہنچ کر اکبر پولیس والوں کے انداز میں بولا۔ "دیکھ کاکا! مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کر' سچ سچ بتا دے یہ کیا چکر ہے۔ کہاں سے بھگا کر لایا ہے اس لڑکی کو؟"

لڑکے کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھی تو لڑکی کانپتے لہجے میں بولی۔ "ہمیں۔۔۔ معاف کر دیں جی۔۔۔ ہم۔۔۔ دراصل۔۔۔ ہم شادی۔۔۔ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بہت خوب' یہ بڑا اچھا طریقہ ہے شادی کرنے کا۔" اکبر نے کہا پھر ذرا کڑک کر بولا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"ش۔۔۔ شمیم۔"

"اور تمہارا؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"جمیل۔"

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اس نے لڑکی کے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

"کپڑے ہیں جی۔" وہ ہکلائی۔ وہ کچھ اور ڈر گئی تھی۔

"دکھاؤ مجھے۔" اکبر نے کہا اور لڑکی کے ہاتھ سے شولڈر بیگ لے لیا۔

اس نے بیگ کھولا۔ اندر ایک زنانہ سوٹی جوڑا تھا۔ اس کے

علاوہ پندرہ بیس ہزار کے زیور اور تھوڑی سی نقدی تھی۔

ایک دم اکبر کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ وہ تھانے دار کی وردی میں تھا اور یہ جوڑا اس کے شکنجے میں آگیا تھا۔ ان کی پریشانی اور کم ہمتی دیکھ کر اکبر کا حوصلہ اور بڑھ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی وردی کو شاباش دی اور سوچنے لگا کہ اگر وہ کوشش کرے تو اس بیگ میں موجود سارا مال اس کا ہو سکتا ہے۔

اسی دوران میں اکبر کا ساتھی راجو بھی وہاں پہنچ گیا۔ اکبر نے لڑکے اور لڑکی کو کمرے میں بند کیا اور راجو کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ بیٹھا۔ دونوں قریباً دو گھنٹے تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ آخر انہوں نے ایک پروگرام تیار کر لیا۔

○☆○

لڑکے اور لڑکی میں اتنی سمجھ ہی نہیں تھی کہ وہ جان سکتے کہ وہ فرضی پولیس والوں کے شکنجے میں ہیں۔ وہ بس ڈرے ہوئے تھے اور بے تحاشا ڈرے ہوئے تھے۔ رات کو اکبر اور راجو نے لڑکے جمیل کو تھوڑی سی پھینٹی بھی لگائی اور اس سے سب کچھ اگلوا لیا۔ یہ لڑکی چنوکی کے ایک دور دراز گاؤں کی تھی۔ بوڑھی والدہ کے سوا اس کا کوئی اور نہیں تھا۔ جمیل بھی اسی گاؤں کا تھا اور لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ دونوں اپنی مرضی سے بھاگ کر پہلے سانبوال گئے تھے۔ وہاں ایک ہوٹل میں انہوں نے چار پانچ روز گزارے تھے پھر وہاں سے وہ لاہور آ گئے تھے۔ اکبر اور راجو نے لڑکے کو بُری طرح ڈرایا دھمکایا اور اسے یقین دلا دیا کہ "پھانسی" نہیں تو دس بارہ سال قید تو اسے ہو ہی جانی ہے اور پھر جو کچھ تفتیش کے دوران میں اس کے ساتھ اور لڑکی کے ساتھ ہونا ہے وہ علیحدہ کہانی ہے۔ لڑکا زار و قطار رونے لگا اور جان بخشی کی درخواستیں کرنے لگا یہاں تک کہ وہ لڑکی کو زیور رات سمیت چھوڑ کر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اکبر اور راجو بھی یہی چاہتے تھے۔ لڑکے کی بزدلی ان پر عیاں ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ دوبارہ اِدھر کا رخ نہیں کرے گا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ دوبارہ اپنے گاؤں چلا جاتا۔ وہ وہاں سے ہمیشہ کے لئے نکل آیا تھا۔ اب اسے کوئی تیسری جگہ ہی ڈھونڈنا تھی۔ اسے مزید خوفزدہ کرنے کے لئے اکبر اور راجو اسے رات بھر ڈراتے دھمکاتے رہے۔ صبح سویرے وہ ان کے کوارٹر سے یوں نکلا جیسے کوئی موت سے پیچھا چھڑا کر نکلتا ہے۔

لڑکی ثمینہ قبول صورت تھی۔ وہ عملی طور پر اکبر اور راجو کی دسترس میں تھی۔ رونے دھونے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اکبر نے اس کے سامنے خود کو ایک ایسے بااثر تھانیدار کے طور پر پیش کیا تھا جو بے گناہوں کو پھانسی پر چڑھا سکتا تھا اور پھانسی پانے والوں کو اپنے ایک دستخط کے ذریعے آزاد کرا سکتا تھا۔ وہ سیدھی سادی لڑکی پوری طرح ان دونوں کے رحم و کرم پر تھی۔ جیسے سانپ کو سامنے پا کر چڑیا سکتے میں چلی جاتی ہے۔ راجو چالاک پرزہ تھا۔ اس نے اکبر کو سمجھایا کہ وہ لڑکی سے شادی کر لے۔ سارا انتظام وہ خود کر دے گا۔ راجو کے برعکس اکبر کا بال بچہ یہاں نہیں تھا لہٰذا شادی میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ دو تین دن بعد راجو "نکاح خواں" دو جعلی سرپرست اور جعلی گواہ لے آیا اور یوں وہ لڑکی مستقل طور پر اکبر کی ہوس کی زد میں آ گئی۔ وہ دہرے فائدے میں رہا تھا۔ اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ لڑکی کے ساتھ ساتھ عیاشی کے لئے پیسے بھی مل گئے تھے۔ رقم میں سے اسے دو حصے راجو کو دینے پڑے تھے پھر بھی یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ ثمینہ اس کے حصے میں آئی تھی اور وہ "رکھنے" کی چیز تھی۔

شہزاد سے اکبر کا ملنا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا پھر بھی اسے ساری بات کا پتا چل چکا تھا۔ وہ اکبر سے سخت ناراض ہوا تھا۔ اس نے اکبر کو راہِ راست پر لانے کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اکبر کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی اب اس کے ساتھ رضامندی سے رہ رہی ہے۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ اکبر مستقل طور پر ایکسٹرا کا کام کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اسے کوئی چھوٹا سا رول بھی مل جاتا تھا۔ ویسا ہی غیر اہم رول جیسے ایکسٹرا اداکاروں کو ملا کرتے ہیں۔ شہزاد اور اکبر کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بتدریج وسیع ہو رہی تھی۔ شہزاد حلال کی روزی پر یقین رکھتا تھا جب کہ اکبر ہر ممکن طریقے سے پیسہ حاصل کر لیتا تھا۔ مالی حالت دونوں کی قریباً ایک جیسی ہی تھی۔ شہزاد اب کلرکی کا کام کرنے لگا تھا۔ سو روپے وہ لیتی تھی۔ اکبر کی اوسط بھی یہی تھی۔ کبھی کبھار کسی ذریعے سے اسے زیادہ پیسے مل جاتے تھے لیکن وہ انہیں عیاشی میں اڑا دیتا تھا اور ہاتھ پھر تنگ کا تنگ رہتا تھا۔ وہ لڑکی جو اکبر نے چھ سات ماہ گھر میں رکھی تھی اب نظر نہیں آتی تھی۔ اکبر کا کہنا تھا کہ وہ حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن اکبر کی بہت سی دوسری باتوں کی طرح شہزاد کو اس بات پر بھی یقین نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اکبر کس ٹائپ کا شخص بن چکا ہے۔

لڑکی سے دل بھر جانے کے بعد اس نے اسے اپنے دوستوں سے ملانا شروع کر دیا تھا پھر وہ اسے لے کر راولپنڈی چلا گیا تھا۔ شہزاد کا خیال تھا کہ وہ اس اجڑی ہوئی لڑکی کو کسی کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے اور بالفرض محال وہ کسی کے ساتھ بھاگی بھی تھی تو اکبر کے نامرد اسلوک اور بے پناہ تشدد کی وجہ سے بھاگی تھی۔

شہزاد اکثر اکبر سے کہتا تھا۔ "مجھے تم سے نہیں تمہارے کام سے نفرت ہے۔ اسی کام نے تمہیں بہروپیا بننے پر مجبور کر رکھا ہے اگر تم بہروپیے نہ ہوتے تو شاید تم سے وہ گناہ بھی سرزد نہ ہوتا جس نے ایک لڑکی کی زندگی برباد کی۔"

اکبر ڈھٹائی سے مسکراتا اور کہتا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔" شہزاد جواب دیتا۔ "نہ تم اس روز پولیس والے کی وردی میں ہوتے اور نہ اس لڑکے

لڑکی کو گھیرنے کا خیال تمہارے دل میں آتا اور نہ تمہارے منہ پر یہ کالک لگتی اور ابھی ایسی نہ جلنے لگتی کالکیں تمہارے منہ پر لگتی ہیں۔"

جواب میں اکبر زور زور سے ہنسنے لگتا۔

ایک روز شہزاد نے زور دے کر کہا۔ "اکبر! تم یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ یہ کام ہم جیسے لوگوں کا نہیں ہے اور نہ ہم اس میں ترقی کر سکتے ہیں۔ ہم سیدھے سادے ان پڑھ بندے ہیں۔ ہمیں محنت مزدوری کی طرف توجہ دینی چاہئے۔"

اکبر قہقہہ لگا کر بولا۔ "اوبا گل! تجھے کیا پتا رونق میلے میں رہنے کا کیا سوا ہوتا ہے اور پھر یہ دنیا تو ہے ہی سوپ خانہ۔ یہاں اصل روپ میں کون ہے؟"

اکبر بالکل بدلتا جا رہا تھا۔ شہزاد کے ساتھ اس کے مراسم کم سے کم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ چھوٹے موٹے رول کر کے اپنے پیٹ اور اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ گاؤں میں بھی وہ بہت کم جاتا تھا۔ ہاں جب شراب اور دیگر عیاشیوں سے چار پیسے بچ جاتے تو گاؤں منی آرڈر کر دیتا تھا۔

دوسری طرف شہزاد کو لکڑی کے کام میں کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ چچا کی قسمت میں اس نے لکڑی کے کام کی چھوٹی سی ورکشاپ کھول لی۔ دھیرے دھیرے کام چل نکلا اور وہ اپنے حال میں مگن ہو گیا۔ اب اکبر کے ساتھ اس کے تعلقات بالکل ختم ہو چکے تھے۔ اکبر کے ساتھ ساتھ وہ لاہور کو بھی بالکل فراموش کر چکا تھا۔ لاہور میں اس نے جو چار پانچ سال گزارے تھے وہ ماضی کا حصہ تھے۔ شہزاد کو ان کے ساتھ کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے اکبر کی بہت سی دوسری کارستانیوں کی طرح وہ لڑکی بھی بھول چکی تھی جو اکبر کی جعلی وردی کے جال میں پھنسی تھی اور دردناک مصیبتوں کا شکار ہوئی تھی۔

اسی طرح سات سال گزر گئے۔

وہ سردیوں کا موسم تھا۔ شہزاد اپنی ورکشاپ کو وسیع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ لکڑی کا کام کرنے والی الیکٹرک مشینیں بھی خریدنا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں ایک عرصے بعد اس کا لاہور آنا ہوا۔ وہ اکبر سے بھی ملا۔ اکبر وہیں اسٹوڈیوز کے قریب تین کمرے کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو چکا تھا۔ چہرے پر چربی کی تہہ چڑھ گئی تھی۔ پیشانی کے بال بھی اڑے ہوئے تھے۔ وہ اب بھی چھوٹے موٹے رول کرتا تھا۔ صرف ایک دو فلموں میں اسے درمیانے درجے کے رول ملے تھے اور وہ ان پر بہت اتراتا تھا۔ اس کی مالی حالت پہلے کی طرح پتلی تھی۔ کپڑے میلے ہوئے جو تا پرانا "سواری نہ ادھار"۔ بہرحال وہ اپنے اس حال سے مطمئن تھا۔

پرانے دوست سے مل کر اکبر خوش ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ شہزاد لاہور میں جتنے دن رہے اس کے ہاں رہے۔ شہزاد پہلے تو انکار کرتا رہا پھر نیم دلی سے مان گیا۔ اس نے کہا۔ "دیکھ اکبرے! میں تیرے کوارٹر میں رہ تو لوں گا لیکن کھانا وانا اپنا کھاؤں گا۔"

"میری بھلائی کو اچھا نہیں سمجھتا نا۔" اکبر نے قہقہہ لگایا۔ "بڑا نخلی ہے بھئی تو۔ چل جیسے تیری مرضی۔ تیرا سندر مکھڑا تو نظر آتا رہے گا۔"

شہزاد نے اکبر کے ہاں قیام کر لیا۔ اس کا جگری دوست راجو کسی کیس میں گرفتار ہو کر جیل بھگت رہا تھا۔ تاہم راجو ہی کے ٹائپ کے کئی افراد اب اس کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اکبر کے ہاں رہتے ہوئے شہزاد گھٹن سی محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال چار پانچ روز کی بات تھی پھر اسے گاؤں واپس چلے جانا تھا۔ اکبر کا ارادہ تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی گاؤں جائے گا اور بیوی بچوں سے مل کر آئے گا۔ دراصل شادی کے پورے چودہ سال بعد اس کی مراد بر آئی تھی اور اس کے ہاں نرینہ اولاد پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ شاید وہ اڑ کر اس تک پہنچ جاتا لیکن آج کل وہ ایک اردو فلم میں "کوبرا پلٹ سینما" کا مختصر کردار ادا کر رہا تھا۔ فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا اور اکبر اپنا کام مکمل کرانے سے پہلے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ صرف تین چار دن کی بات تھی۔ وہ جیسے تیسے یہ دن کاٹ رہا تھا۔ جونہی اسے اسٹوڈیو میں کام سے فرصت ملتی وہ بازار میں شاپنگ کے لئے نکل جاتا۔ وہ اپنی استطاعت کے مطابق نومولود کے لئے ننھی منی بہت سی چیزیں خرید رہا تھا۔ ایک شام وہ زبردستی شہزاد کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ بازار میں جب کوئی اکبر کو دیکھ کر پہچان لیتا اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتا تو اکبر کا سینہ فخر سے تن جاتا۔ وہ ایک معمولی سا اداکار تھا پھر بھی تین چار فیصد فلم بین تو اسے پہچانتے ہی تھے۔ یہی "ناقابل ذکر" شہرت اکبر کی گردن اکڑا رہی تھی۔ وہ ترنگ میں آ کر کہنے لگا۔ "شہزاد پیارے! تم کیا جانو اداکاری کے مزے۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہے۔ رونق میلے اور شور شرابے سے بھری ہوئی۔ جانِ جگر کبھی اسٹوڈیو میں آ کر دیکھ کیسے ہمارے آس پاس جل پریاں گھومتی ہیں۔ چمکتی مہکتی ہوئی جدھر سے گزرتی ہیں واہ وا ہو جاتی ہے۔"

"واہ وا ہی کرتے رہتی ہو نا۔ تمہارے ہاتھ تو کوئی نہیں آتی کیوں خواہ مخواہ اپنا ایمان خراب کرتے ہو۔"

"اوئے! ہاتھ کیوں نہیں آتیں..... ہاتھ بھی آتی ہیں۔"

"تم جل پریوں کی بات کر رہے ہو نا۔ وہی بڑی بڑی ایکٹریس جن کے فوٹو اخباروں وغیرہ میں چھپتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں ان تک صرف اونچے اونچے لوگوں کے ہاتھ ہی پہنچتے ہیں۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن یار کبھی کبھی ہمیں بھی تو پاس آنے کا موقع مل جاتا ہے۔" وہ شیطانی انداز میں مسکرا کر بولا۔

"اب اسی سین والے رول کی مثال لے لو۔ اب آج میں نے جو سین کرایا ہے اس میں میں یعنی یہ سینما فلم کی ہیروئن چاندنی پر جھپٹتا ہے۔ اپنے بیڈ روم میں اس سے کھینچا تانی کرتا ہے اور قالین پر گرا کر اس کی قمیص پھاڑ ڈالتا ہے۔ اب ذرا سوچ تمہارے جیسا

کوئی بندہ چاندنی کے قریب پھٹکنے کا بھی نہیں سوچ سکتا لیکن وہ سین فلم بند کرواتے وقت میرے اور چاندنی کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ واہ وا۔ کیا عورت ہے۔ ایک لاکھ پاور کا کرنٹ دوڑتا ہے اس کے جسم میں۔۔۔"

شہزاد نے بے زاری سے کہا۔ "یار! اب تمہاری اولاد جوان ہو رہی ہے۔ چھوڑ دو ان چکروں کو۔ بہت بھٹک چکے ہو۔ اب راہِ راست پر آجاؤ۔"

حسبِ عادت اکبر نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔"

یہ دوسرے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ اسٹوڈیو میں شوٹنگ کے دوران میں وقفہ ہوا تو اکبر کھانا کھانے کے لئے باہر آگیا۔ وہ اسی سینما والے "گیٹ اپ" میں تھا۔ اس نے اپنے پوسیدہ لباس کی جگہ نہایت قیمتی کپڑے کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں امپورٹڈ جوتے تھے۔ ایک سنہری مائل فرنچ کٹ داڑھی بھی اس کے گیٹ اپ کا حصہ تھی۔ یہ داڑھی لگانے کے بعد جب وہ نئے اسٹائل کی کمانی دار عینک پہنتا تو واقعی کوئی رنگین سینما نظر آتا تھا۔ کھانا کھا کر اکبر بڑی سڑک کی طرف چلا گیا۔ فلم کے چند سناٹر ایسے تھے جن میں اکبر کے ہاتھ میں ایک قیمتی بریف کیس بھی دکھایا جانا تھا۔ یہ بریف کیس بھی اکبر کے ہاتھ میں تھا۔ درحقیقت اس بریف کیس میں فلم کے اسکرپٹ اور ایک فالتو فرنچ کٹ داڑھی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اکبر "صابر ہوٹل" کے سامنے پہنچا تھا کہ اچانک ایک ٹویوٹا کار اس کے قریب آکر رکی۔ کار کی ایک جانب کے دونوں دروازے کھلے اور دو بچے کھچے افراد پھرتی سے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے کے ہاتھ میں خطرناک ماؤزر تھا۔

انہوں نے اسلحہ اکبر کے جسم سے لگا دیا اور اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر کار کی طرف کھینچنے لگے۔ اکبر نے مزاحمت کی۔ ماؤزر بردار نے ماؤزر کا دستہ پوری قوت سے اکبر کی کنپٹی پر رسید کیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ دوسرے شخص نے پیچھے سے اکبر کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور اسے پورے زور سے اٹھا کر سر کے بل گاڑی میں گھسیڑ دیا۔ دوسرے شخص نے اس کی ٹانگیں سمیٹ کر گاڑی میں کر دیں پھر دونوں اسلحہ بردار خود بھی پھرتی سے کار میں داخل ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے کار کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اتفاقاً شہزاد بھی ایک قریبی ہوٹل سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ جب تک بھاگ کر موقع پر پہنچا، ٹویوٹا کار پچاس ساٹھ گز دور جا چکی تھی۔ یہ ساری کارروائی بمشکل پانچ سیکنڈ میں مکمل ہوئی تھی۔ ارد گرد کے دکاندار اور راہ گیر انگشت بدنداں تھے۔ شاید ان میں سے کچھ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہے۔ کار تھوڑی ہی دور گئی ہو گی کہ ایک دم تابڑ توڑ فائرنگ کی آواز آئی۔ اس فائرنگ نے لوگوں کو مزید دہشت زدہ کر دیا۔ کچھ لوگ پاپیادہ اور کچھ مختلف سواریوں پر فائرنگ کی سمت میں دوڑے۔ اگلے چوک میں انہیں سنسنی خیز صورتِ حال نظر آئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ شہزاد بھی ہانپتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کے سامنے اکبر کی لاش پڑی تھی۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی اور گولیوں سے چھلنی۔ اس کا بھیجا اس کے چہرے پر بکھرا ہوا تھا۔ کار کا کہیں پتا نہیں تھا۔

اکبر کو قتل کرنے والے صرف دو گھنٹے بعد راوی پُل کے ناکے پر پکڑے گئے تھے۔ وہ جس کار پر سوار تھے وہ بھی چوری کی تھی۔ یہ لوگ "اغوا برائے تاوان" کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کسی شکار کی تلاش میں بھٹک رہے تھے کہ اکبر پر ان کی نگاہ پڑ گئی۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ مجرموں نے ایک کنگلے شخص کو بہت بڑا سیٹھ سمجھ کر پکڑ لیا اور اپنی مسروقہ گاڑی میں ڈال لیا۔ اغوا کی کارروائی کے دوران میں اکبر نے شدید مزاحمت کی اور گاڑی کے اندر بھی مجرموں سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس کی مزاحمت نے شدت اختیار کی تو مجرموں نے جھلا کر اسے گولیوں سے چھلنی کیا اور باہر پھینک دیا۔

شہزاد سناٹے میں تھا اور اکبر کی لاش کے سرہانے کھڑا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔۔۔ اس کے ذہن میں وہی لڑکی در آئی تھی جسے آج سے دس سال پہلے اکبر نے اغوا کیا تھا اور اس کی عزت برباد کی تھی۔ وہ لڑکی اکبر کے بہروپ کا شکار ہوئی تھی اور آج اکبر خود اپنے بہروپ کا شکار ہو گیا تھا۔ دس سال بعد تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا دیا تھا۔ اکبر کو اپنے جرم کی سزا ملی تھی اور اسی انداز میں ملی تھی جس انداز میں اس نے جرم کیا تھا۔ برسوں پہلے پولیس والے کے روپ نے اسے "فائدہ" پہنچایا تھا اور ایک لڑکی اپنے مال و متاع سمیت اس کے رحم و کرم پر آگئی تھی۔ آج سیٹھ کے روپ نے اسے "نقصان" پہنچایا تھا اور وہ کنگال ہوتے ہوئے بھی اغوا برائے تاوان کے سلسلے میں قتل ہو گیا تھا۔ اپنے تمام ارادوں اور خواہشوں سمیت۔ اپنے نومولود بچے کو دیکھنے کی حسرت دل میں لئے وہ خاک و خون میں لوٹ گیا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ آج دس سال بعد یہ دوسرا جرم بھی قریباً اسی مقام پر ہوا تھا جہاں پہلا جرم ہوا تھا۔

اکبر کے یار دوست اور شناسا اس کے سرہانے غمزدہ کھڑے تھے۔ کچھ رو رہے تھے، کچھ رونے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہزاد نے چور نظروں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا جیسے ابھی ان سب کو بھی اکبر کا وہ دس سال پرانا جرم یاد آجائے گا اور وہ سب یک زبان ہو کر کہنے لگیں گے۔ "اکبر! دیکھ لیا نا اپنے گناہ کا انجام۔ پا لی نا اپنے جرم کی سزا" لیکن نہیں۔ یہ شہزاد کا وہم تھا۔ وہ سب بے خبر تھے۔ اکبر کا وہ گناہ کسی کے علم میں نہیں تھا۔ شہزاد نے ایک طویل سانس لی اور اپنی اندرونی بے چینی چھپانے کے لئے اکبر کی لاش سے دور چلا گیا۔

● ●

ناجی کی عمر بارہ سال تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے وہ عمر سے قدرے بڑا نظر آتا تھا..... ویسے بھی وہ کسان کا بیٹا تھا۔ دودھ دہی، خالص دیسی گھی اور خالص آب وہوا، سب کچھ اسے میسر تھا۔ ذرا دیر دھوپ میں کھیلتا تھا تو گال تمتمانے لگتے تھے۔ شوکا، ناجی کو پہلے دن ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ناجی کی بہن نسیمہ کو بیاہنے کے لیے ان کے گاؤں راہوالی آیا تھا۔ ناجی نے اسے براتیوں کے ہجوم میں دیکھا تھا۔ بڑی بڑی گھنی مونچھیں، چوڑے جبڑے اور لمبا چوڑا جسم۔ اس نے سر باندھ رکھا تھا اور بڑا پھیل کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی باجی کے کہنے پر اس نے بھاشوکے کے ساتھ بیٹھ کر تصویر کھنچوائی تھی۔ بھاشوکے نے اپنا ہاتھ ناجی کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ بڑا سخت اور کھردرا سا ہاتھ تھا اس کا..... اس کے جسم سے ناجی کو ویسی ہی باس آئی تھی جیسی چچا کے مشکی گھوڑے کے جسم سے آیا کرتی تھی۔

پھر بھاشوکا اس کی باجی نسیمہ کو بیاہ کر اپنے ساتھ رتن پورہ لے گیا تھا۔ یہ گاؤں فیصل آباد کے قریب تھا اور سیالکوٹ سے کافی فاصلے پر تھا۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت اس کی باجی گھر والوں سے اور اپنی سہیلیوں سے لپٹ لپٹ کر روئی تھی۔ اس کے رونے سے سب کی آنکھوں میں پانی چھلکا دیا تھا۔ باجی کو بڑی مشکل سے کھینچ تان کر ڈولی میں بٹھایا گیا تھا۔ ڈولی سے اتر کر وہ بس میں سوار ہوئی تھی اور پھر بھاشوکے کے ساتھ چلی گئی تھی۔

کایا کلپ

طاہر جاوید مغل

بہنوں سے بھائیوں کی محبت ایک روایت ہے، بھائی اپنی بہنوں پر فدا ہونے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور بہنوں کی ذرا سی تکلیف انہیں بے کل کر دیتی ہے، وہ بھی ایک بھائی تھا اور اپنی بہن کی مصیبت کو اس سے دور کرنا چاہتا تھا۔

ایک حساس کم عمر بچے کی کتھا جسے اپنی بہن کی خوشی عزیز تھی



باجی کی واپسی تین دن بعد ہوئی تھی۔ رنگ برنگ کپڑوں میں لپٹی ہوئی، سر جھکائے جھکائے وہ بڑی خاموش سی لگ رہی تھی۔ بھاشو کے کے ساتھ تو وہ کوئی بات ہی نہیں کرتی تھی۔ جیسے اس کے ساتھ ناراضی ہو۔ بھاشو کا ان کے گھر بس ایک رات رہ کر واپس چلا گیا تھا۔ ناجی کے باپ اور چچاؤں کی طرح بھاشو کا بھی زمینداری کرتا تھا۔ گندم کی کٹائی شروع ہونے والی تھی اس لیے سارے ہی مصروف نظر آتے تھے۔ بھاشو کے کو بھی جلدی تھی۔

بھاشو کے کے جانے کے بعد اس کی باجی نسیمہ جیسے کسی قید سے آزاد ہوگئی تھی۔ اس نے سلمٰی ستارے کے کام والی بھاری اوڑھنی اتار پھینکی تھی۔ موٹے موٹے کپڑے اور گہنے بھی اتار دیے تھے۔ اس نے پھر سے اپنا ہلکا پھلکا لباس پہنا اور تتلی کی طرح اِدھر اُدھر اڑنے پھرنے لگی تھی۔ ناجی کو اپنی باجی ایسے ہی اچھی لگتی تھی۔

ناجی چھوٹا تھا۔ اس کا ذہن بھی چھوٹا تھا لیکن اس چھوٹے ذہن میں بہت سی سوچیں بھری رہتی تھیں۔ ایک اجنبی بندہ آیا تھا اور اس کی باجی کا مالک بن بیٹھا تھا۔ وہ اس کی روتی سسکتی باجی کو راہوالی سے اڑا کر نجانے کتنی دور لے گیا تھا۔ اب وہ اسے واپس تو چھوڑ گیا تھا لیکن فقط چند دنوں یا ہفتوں کے لیے۔ ماں نے ناجی کو بتایا تھا کہ تمہاری باجی نسیمہ اب دو ڈھائی مہینے ہمارے پاس رہے گی۔ اس کے بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ جب ماں بھاشو کے کے گھر کو "باجی کا اپنا گھر" کہتی تھی تو ناجی کے دل پر چوٹ سی لگتی تھی۔

ناجی کی بڑی باجی بھی تو بیاہی ہوئی تھی، اس کا شوہر بھی تو تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، بڑی باجی کے شوہر بھا اکبر کے بارے میں، ناجی نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بھا اکبر..... شوکے کی طرح اکھڑ نہیں تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں نہیں تھیں اور وہ کسی وقت ناجی کو پاس بٹھا کر باتیں بھی کرتا تھا یا شاید پھر اس کی وجہ یہ ہو کہ بڑی باجی ناہید کی شادی اس وقت ہوئی تھی جب ناجی بہت چھوٹا تھا۔ اسے اردگرد کا ہوش ہی نہیں تھا۔ بہرحال وجہ کوئی بھی ہو، یہ حقیقت تھی کہ بھاشو کا، ناجی کو پہلے دن سے اچھا نہیں لگا تھا۔

ڈیڑھ دو ماہ ٹھیک گزر گئے پھر گھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ باجی نسیمہ کے واپس اپنے سسرال جانے کے دن نزدیک آ گئے ہیں۔ گاؤں میں اکثر جگہوں پر اب بھی یہی رواج چلتا ہے۔ دلہن شادی کے بعد سسرال میں دو تین دن رہ کر واپس آتی ہے تو پھر میکے میں لمبا قیام کرتی ہے۔ کبھی کبھی یہ قیام تین چار مہینے تک طویل ہوتا ہے۔ نسیمہ قریباً ڈھائی ماہ بعد واپس جا رہی تھی۔

ایک دن ناجی اپنی تختی گھماتا ہوا اسکول سے واپس آیا تو باجی نسیمہ کی آنکھیں روئی روئی سی لگ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ ناجی اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا "امی! آپ باجی کو نہ بھیجیں۔"

"کیوں نہ بھیجوں۔" ماں ہانڈی میں چمچہ گھماتے ہوئے زیرلب مسکرائی۔

"امی، دیکھیں نا۔ باجی کتنی چپ چاپ ہیں۔ کتنی اداس ہیں۔"

"ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ گھر سے جانے کی اداسی تو ہوتی ہے لیکن جتنی اداس نظر آتی ہیں، اتنی ہوتیں نہیں۔" ماں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب امی؟" ناجی نے پوچھا۔

"بس یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں ہیں۔"

"آپ مجھے بالکل بچہ سمجھتی ہیں امی لیکن میں جانتا ہوں۔ باجی جانے میں خوش نہیں۔ پرسوں جب آپ اور ابا جی چوہدریوں کے گھر گئے ہوئے تھے، تو باجی نے مجھے گلے سے لگا کر خوب خوب پیار کیا۔ ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگیں، میرے بس میں ہو تو میں تم سب کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں....."

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن اس دوران میں ٹریکٹر کی آواز آئی۔ ناجی کے بڑے چچا جن کو وہ مجید چاچا کہتا تھا، گھر واپس آ رہے تھے۔ مجید چاچا آج کل سخت ہو گئے تھے۔ اصل میں نسیمہ کی شادی پر کافی خرچا ہو گیا تھا۔ کچھ ادھار بھی لینا پڑا تھا۔ مجید چاچا اور ابا جان پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ خاص طور سے مجید چاچا تو سویرے گئے شام کے بعد گھر آتے تھے۔ اس سے پہلے چھوٹے چاچا انور ان کا ہاتھ بٹاتے تھے مگر چار چھ مہینے پہلے کھیت میں پانی لگانے کے جھگڑے پر چاچا انور کے ہاتھوں گولی چل گئی تھی۔ پستول کی گولی سے حاجی مراد کے مزارعے کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی۔ اس کیس کی وجہ سے چاچا انور ایک سال کی جیل کاٹ رہا تھا۔

مجید چاچا نے آج آتے ساتھ ہی ماں کو اپنی طرف سے خوش خبری سنائی "اماں جی..... شوکا اور چاچا چاچی پرسوں آ رہے ہیں..... نسیمہ کا سکلاوہ لینے کے لیے۔"

ناجی نے چور نظروں سے باجی نسیمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا پھر وہ جلدی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

ماں نے کہا "پرانہوں نے تو اتوار کو آنا تھا۔"

''بس کوئی شادی ہے ان کی برادری میں اس لیے جلدی آرہے ہیں۔''

''ہائے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ ان کے کھانے شانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔'' ناجی کی امی نے پریشان ہوتے ہوئے کہا'' کپڑے لتے بھی ابھی تیار نہیں ہوئے۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں اماں جی، میں سب کچھ کرلوں گا۔''

''کتنے بندے آئیں گے؟'' ناجی کی امی نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں، بس چار پانچ ہی ہوں گے۔'' چاچا مجید نے کہا۔

☆☆☆

جس وقت بھاشو کا اور اس کے گھر والے چاچا خیرو کے تانگے پر بیٹھ کر ان کے مکان کے سامنے پہنچے' ناجی اتفاقاً گھر میں ہی تھا۔ نسیمہ کی ایک سہیلی نازو بھی گھر میں تھی۔ تانگہ دیکھ کر وہ بھاگی ہوئی اندر گئی اور نسیمہ کے کان میں کھسر پھسر کی' وہ خوش نظر آرہی تھی لیکن نسیمہ کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی پھر ناجی نے دیکھا کہ وہ پچھلے کمرے میں گھس گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

تانگہ دروازے کے سامنے آکر رکا۔ ناجی کے چچا' والد اور والدہ وغیرہ نے باہر نکل کر مہمانوں کو' جی آیاں نوں' کہا۔ شوکے نے چمکیلے کپڑے کا لمبا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کی کالی مونچھیں بھی کرتے کی طرح ہی چمک رہی تھیں' جب سارے تانگے کے گرد کھڑے باتیں کررہے تھے، ناجی کی نظر گھر کے صحن کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے نسیمہ کو دیکھا، وہ گھبرائی شرمائی ہوئی پچھواڑے والے کمرے سے نکلی۔ گھر کی پچھلی دیوار کوئی چارفٹ اونچی تھی۔ گارے مٹی کی ایسی دیواریں گھروں کے احاطوں کی حد بندی کرتی ہیں۔ ان کی موٹائی ایک فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ انہیں اکثر بھوسا ملی ہوئی مٹی سے لیپا جاتا ہے۔ ناجی نے دیکھا نسیمہ دیوار تک پہنچی اس نے اپنا رخ گھر کے صحن کی طرف کیا۔ دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائیں اور جسم کو اچھال کر دیوار پر جا بیٹھی' پھر دونوں ٹانگوں کو اٹھا کر گھمایا اور اپنا رخ گلی کی طرف کرلیا۔ اگلے ہی لمحے کود کر وہ گلی میں تھی۔ یہ سارا عمل ایک یا دو سیکنڈ کے اندر مکمل ہوا۔ دراصل اس کام کی نسیمہ اور ناجی کو بہت پریکٹس ہوچکی تھی۔ ہر روز وہ دو تین بار تو یہ مشق ضرور کرتے ہوں گے' اس مشق ہی کا نتیجہ تھا کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا تھا اور نسیمہ ہوا کی طرح گھر سے باہر نکل گئی تھی۔

اسے صرف ناجی نے دیکھا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے..... کہاں چلی گئی ہے۔

مہمان گھر کے اندر آگئے۔ ماں نسیمہ کو آوازیں دینے لگی' بھاشو کے کی تیز نظریں بھی چاروں طرف گھوم رہی تھیں یقیناً وہ بھی نسیمہ کو تلاش کررہا تھا۔ ماں نے باری باری کمروں میں جھانکا پھر مسکراتے ہوئے بولیں'' شرما کر بھاگ گئی ہے، بڑی پاگل ہے۔''

شوکے کی بھاری بھرکم والدہ خالہ شریفاں بھی مسکرانے لگیں' نسیمہ کی سہیلی نازو بولی'' اچھا میں اسے ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔''

نازو، نسیمہ کو ڈھونڈنے نکلی تو ناجی بھی اس کے ساتھ ہولیا۔'' بڑی خچر ہے..... پتا نہیں کہاں دفع ہوگئی ہے مجھے تو لگتا ہے دیوار ٹپ کر گئی ہے۔'' نازو نے خیال ظاہر کیا۔

ناجی نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ دونوں مستان شاہ کے کنوئیں کے پاس سے ہوتے ہوئے ترکھانوں والی گلی میں پہنچے' یہاں نسیمہ کی ایک دو سہیلیاں تھیں۔ ناجی اور نازو نے دو

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسہابرس سے عام و خاص طب خصوصاً بے ریشوں کے لیے جوانی ناگہانی کی پامردیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربہ شدہ نسخہ جات شائع کرتی رہی ہے کئی لوگوں نے ہمارا نسخہ استعمال کر کے بے حد کامیاب ہوئے جس نے بھی ناکامی کا اظہار کیا ہمیں کہا بہت کم دنوں میں جوان مرد بن گئے گزرے گزرے جوانوں جیسا لیک لیک بخ آنا کریہ بات کر کھلا کہ بے ہر باتی ہے بہادت کامیاب ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کررہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں بالوں کا خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر نرمی اور خوبصورتی میں خوشگوار تبدیلی ظاہر کرکے صحت کو کامل و مکمل بنا دیتا ہے اور آپکو مردانہ خوبیاں سے مالا مال کر دیتا ہے آپ ایک مدت سے محروم ہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر ہمارے ادارے کے پتہ پر روانہ کریں آپکو پیکٹ روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

تین گھروں میں دیکھا لیکن وہ وہاں نہیں آئی تھی۔ پھر انہوں نے سوچا شاید وہ اپنے کھیتوں کی طرف چلی گئی ہو۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ آموں اور مالٹوں کا باغ بھی تھا' برسات شروع ہونے والی تھی۔ آم پک کر پیلے پیلے ہو رہے تھے۔ ناجی اور نسیمہ اکثر باغ کی طرف آجاتے تھے' ٹین اور کنستر بجا بجا کر پرندوں کو بھگاتے تھے لیکن چاچا مجید کی نظر بچا کر دو چار آم توڑ بھی لیتے تھے۔ ناجی اور نازو نے سارے باغ میں دیکھا کھیتوں میں بھی دور تک گئے لیکن نسیمہ نہیں ملی۔

وہ شام سے بس تھوڑی دیر پہلے گاؤں کے آخری سرے سے ملی۔ وہاں وہ عبداللہ سنیارے کی بیٹی شاہدہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی' شاید کچھ دیر اور بھی نسیمہ کا پتا نہ چلتا لیکن عبداللہ کی بیوی نے آکر بتایا کہ نسیمہ ان کے گھر بیٹھی دال چاول کھا رہی ہے۔ نازو' ناجی اور ناجی کی امی گئے اور نسیمہ کو گھر واپس لائے۔ وہ بالکل خاموش تھی' بدکی ہوئی ہرنی کی طرح تھی اس کی آنکھیں سرخ تھیں' اس نے بس اپنے ساس سسر کو سلام کیا اور جلدی سے پچھواڑے کے کمرے میں گھس گئی۔ رات تک امی اور نسیمہ میں گاہے بگاہے کھسر پھسر ہوتی رہی' ناجی دیکھتا رہا کہ باجی نسیمہ کا سر بار بار نفی میں ہل رہا تھا' امی اسے پچکار رہی ہے' سمجھا رہی ہے' ناجی کے لیے یہ سمجھنا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ باجی سسرال جانے سے انکار کر رہی ہے اور امی اسے سمجھانے بجھانے میں لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نازو بھی باجی سے کھسر پھسر کرنے لگتی تھی۔

باجی نسیمہ بس ایک بار اپنے شوہر کے سامنے گئی اور وہ بھی بس چند سیکنڈ کے لیے' جب سب کھانا وغیرہ کھا کر چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور حقے گڑگڑا رہے تھے۔ باجی نسیمہ لمبا سا گھونگھٹ نکالے آئی' بھاشو کا برآمدے میں چاچا مجید کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا۔ نسیمہ چھپاک سے آئی اور دونوں کو چائے دے کر چھپاک سے باہر چلی گئی..... رات کو سونے سے پہلے والدہ نے ناجی سے پوچھا "تم نے باجی کے ساتھ جانا ہے؟"

"کہاں؟" ناجی چونک کر بولا۔

"تمہاری باجی کل اپنے سسرال جا رہی ہے نا۔ اگر تم نے جانا ہے تو ساتھ چلے جاؤ تمہاری سیر ہو جائے گی اور تمہاری باجی کا بھی ذرا دل لگا رہے گا۔ ابھی تمہاری پندرہ بیس چھٹیاں تو باقی ہیں نا؟"

خوشی سے ناجی کا دل اچھل گیا' وہ بولا "پندرہ وی کہاں ابھی تو پوری پچیس چھٹیاں باقی ہیں۔" اس نے جیسے ایک ایک چھٹی اپنی انگلیوں پر گن رکھی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے سویرے نہا کر تیار ہو جانا میں ابھی کپڑے تمہاری باجی کے صندوق میں رکھ دیتی ہوں۔"

فیصل آباد جانے کی خوشی میں ناجی باقی سب کچھ بھول گیا۔ باجی کا دیوار پھاند کر بھاگنا' اس کا ستا ہوا چہرہ' اس کا رونا دھونا اور بھاشو کے کی چمکتی ہوئی آنکھیں' لیکن یہ سب کچھ تا دیر اس کے ذہن سے اوجھل نہیں رہا۔ اگلی صبح باجی کی رخصتی کا منظر دیکھ کر سب کچھ پھر اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس کا دل ایک عجیب سی بے نام اداسی سے بھر گیا۔ فیصل آباد جانے کی خوشی دھندلا سی گئی۔ کالے برقع میں لپٹی' لرزتی کانپتی باجی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی' وہ کئی منٹ نازو کے گلے سے لگے رہی اور ہچکیاں لیتی رہی۔ وہ جیسے نازو کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

تانگہ دروازے پر کھڑا تھا۔ سب بالکل تیار تھے۔ چاچا مجید گھور گھور کر باجی نسیمہ کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر چاچا مجید نے نسیمہ کو کھینچ کر تانگے میں بٹھایا۔ نسیمہ کے ساتھ شوکا بیٹھ گیا۔ شوکے کے ساتھ ناجی..... ناجی کے ساتھ شوکے کی دبلی پتلی بھابی بھی پھنس پھنسا کر بیٹھ گئی۔ وہ چاروں تانگے کی پچھلی سیٹ پر تھے' ناجی بھاشو کے کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ایک بار پھر وہی باس آرہی تھی جو چاچا مجید کے مشکی گھوڑے سے آتی تھی' بھاشو کا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ باجی سمٹی ہوئی تھی جیسے کوئی ڈری ہوئی چڑیا ہو۔

ناجی کا دل ایک دکھ آمیز اداسی سے بھر گیا۔ اسے یوں لگا جیسے باجی کوئی مجرم ہے اور بھاشو کا کوئی پولیس والا ہے جو اسے باندھ کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ باجی اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی لیکن پھر بھی جانے پر مجبور ہے' ماں نے کہا تھا کہ لڑکیاں اوپر اوپر سے روتی ہیں..... لیکن باجی تو سچ مچ روتی تھی' کالے برقع کے اندر وہ اب بھی ہولے ہولے ہچکیاں لے رہی تھی۔

وہ لوگ تانگے پر پکی سڑک تک آئے وہاں سے ایک کھٹارا بس میں بیٹھ کر سیالکوٹ کے بس اڈے تک پہنچے اور پھر وہاں سے فیصل آباد کے گاؤں رتن پورہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ایک لمبا سفر تھا۔ شروع شروع میں تو باجی نسیمہ اور بھاشو کا بالکل چپ رہے' پھر ان میں تھوڑی تھوڑی بات ہونے لگی۔ یہ بات زیادہ تر بھاشو کے کی طرف سے ہی ہوتی تھی۔ وہ نسیمہ کی طرف جھک کر اس سے کچھ پوچھتا تھا۔ نسیمہ برقع کے اندر سے ہی کبھی انکار میں کبھی اقرار میں سر ہلا دیتی تھی' بھاشو کے نے راستے میں انہیں ٹھنڈی بوتلیں پلائیں' گنڈیریاں چوسائیں اور قلفی بھی کھلائی۔ نسیمہ نے صرف بوتل

ی پی اور وہ بھی آدھی۔ بھاشو نے کہا وہ باقی بوتل بھی پی لے لیکن وہ ہر بار انکار میں سر ہلاتی رہی۔ جب وہ لوگ قلفی کھا رہے تھے تو کچھ قلفی بھاشو کے کی مونچھوں پر بھی لگ گئی تھی 'ناجی کو یہ مونچھیں ویسے ہی اچھی نہیں لگتی تھیں' قلفی لگنے سے اور بھی بری لگنے لگیں۔ پھر جب بھاشو کے نے سر پر بندھے ہوئے رومال سے مونچھوں کو صاف کرنے کے بعد انہیں تاؤ دینا شروع کیا تو ناجی کو یہ منظر اور بھی برا لگا شاید اس کی باجی نسیمہ کو بھی برا لگا تھا۔ وہ منہ پھیر کر بھاشو کے کی بھرجائی سے باتیں کرنے لگی۔

وہ لوگ شام کے بعد رتن پورہ پہنچے تھے۔ یہ مکان بھی ناجی کے اپنے مکان سے ملتا جلتا تھا' نیچی چھتوں والے تین چار کچے کمرے' ایک لمبا برآمدہ' برآمدے سے آگے ایک بہت کھلا سا احاطہ..... احاطے کے گرد چار فٹ اونچی مٹی کی دیوار (دیوار کو دیکھ کر ناجی کے ذہن میں ایک بار پھر وہی کل دوپہر والا منظر تازہ ہوگیا' جونہی بھاشو کے کا تانگہ گھر کے دروازے کے سامنے رکا تھا' باجی نسیمہ دیوار پھاند کر بھاگ گئی تھی)

یہاں بھی احاطے کے ایک کونے میں دو تین چھپر پڑے تھے۔ ان چھپروں کے نیچے سات آٹھ بھینسیں اور تین چار بکریاں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف چارا کترنے والا ٹوکا تھا دوسری طرف ٹین کی ایک چھت کے نیچے بھاشو کے کا ٹریکٹر کھڑا تھا۔

اپنے سسرال پہنچنے تک نسیمہ نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ وہ اب گھر والوں سے باتیں کرنے لگی تھی' خاص طور سے بھاشو کے کی والدہ یعنی خالہ شریفاں کے ساتھ وہ بے تکلفی سے بات کررہی تھی۔ خالہ شریفاں کی کسی کسی بات پر وہ مسکرا بھی دیتی تھی۔ اس نے رات کو روٹیاں بھی پکائیں پھر وہ خالہ شریفاں اور بھاشو کے کی بہنوں سے باتیں وغیرہ کرتی رہی لیکن اندر سے وہ اب بھی "بے چین" تھی۔ آخر وہ ناجی کی بہن تھی، اس کے اندر کی بے چینی کو ناجی نہ سمجھتا تو اور کون سمجھتا..... اور ناجی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی بے چینی کی وجہ صرف اور صرف بھاشو کا ہے۔ وہ بھاشو کے سے دور رہنا چاہتی ہے۔ اس کی گھورتی آنکھوں سے بچنا چاہتی ہے..... وہ جب اس کے سامنے ہوتا ہے تو وہ اندر سے لرز اٹھتی ہے۔

رات سونے سے پہلے ناجی نے خالہ شریفاں اور نسیمہ کو باتیں کرتے سنا۔ خالہ شریفاں بڑے لاڈ سے کہہ رہی تھی "جادمی رانی! اپنے کمرے میں جاکر سو جا، کل سے تو نے شوکے سے کوئی گل بات نہیں کی..... وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔"

بنکاک کی اس لڑکی کی روداد،
جو مہم جوئی کی شوقین تھی

انتقام کی آگ نے دلوں کے لئے ایک دلچسپ داستان

سسپنس ڈائجسٹ کے آخری صفحات کی یادگار کہانی

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

کربِ آشنائی

کہانی عمل مکمل ہونے کو ہے

ایک حیران کن سلسلہ

ناکام کے بلند درخت پر بیٹھا ہے

اور رو رہا ہے

یہ سمندر زلیخان سے شروع ہوتا ہے؟

یہ ہوا کیان سے چلتی ہے؟

یہ سورج کی سرخ گیند کیان ہی جھلی ہوتی ہے؟

اس کا خیال ہے کہ جس طرح

گمشدہ سورج دوبارہ آسمان پر نمودار ہوتا ہے

اس طرح اس کا ساتھی

جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا

ایک دن واپس آجائے گا

سفید کاغذ | خوبصورت سرورق
عمدہ طباعت و کتابت | مضبوط جلد

قیمت 200/- روپے

ملنے کا پتہ
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور ۲
فون: 7668958-7231595-0300-4183997
E mail al_quraish@hotmail.com

''نہیں خالہ..... ہم..... مجھے کمرے میں نہیں سونا۔ وہاں بڑی گرمی ہے میں تیرے ساتھ چھت پر سوؤں گی۔''

''دھی رانی' وہ کمرا تو بڑا ہوادار ہے' شوکا پرسوں ہی شہر سے تیرے لیے نیا پنکھا بھی لے کر آیا ہے۔ جا میری دھی رانی ایسے نہیں کرتے۔''

''خالہ! مجھے نہیں پتا ، مجھے بس تیرے ساتھ ہی سونا ہے۔''

خالہ نے دو چار منٹ اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر تھک کر نسیمہ کو اپنے ساتھ چھت پر لے گئی۔

اگلے روز بھی ایسا ہی ہوا' نسیمہ، خالہ شریفاں کے ساتھ چھت پر سوئی' ناجی خالو اور خالہ کے چھوٹے بیٹے مختار کے ساتھ برآمدے میں سویا اور ..... بھاشو کا اپنے کمرے میں.....اس سے اگلے روز بھی ایسا ہی ہوا' یہ چوتھی رات کی بات ہے' گرمی بہت زیادہ تھی پسینے سے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ آدھی رات کے بعد تیز آندھی آئی اور اس کے ساتھ ہی گرج چمک کے ساتھ بارش ہونے لگی' بارش کی بوچھاڑ برآمدے تک پہنچ رہی تھی۔ سب اپنے کمروں میں گھس گئے' ناجی نے دیکھا خالہ شریفاں نے نسیمہ کا بستر گول کر کے بغل میں دبا رکھا ہے اور اسے بھاشو کے کمرے میں سونے کے لیے کہہ رہی ہے۔ نسیمہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی' خالہ شریفاں نے دھکیل دھکال کر اسے کمرے میں بھیج ہی دیا۔ سامنے والے کمرے میں سوئے ہوئے ناجی کا دل عجیب سی اداسی اور غصے سے بھر گیا۔ اگر باجی نسیمہ بھاشو کے سے دور رہنا چاہتی تھی تو اسے کیوں مجبور کیا جا رہا تھا۔ کیوں ہر کوئی اسے بھاشو کے کی طرف دھکیل رہا تھا۔

وہ تقریباً آدھ گھنٹا بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ باہر بارش زور سے برس رہی تھی' کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی تھی' گاؤں کی گلیوں میں مکمل خاموشی تھی آج تو کتوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں.....اچانک ناجی کو اندازہ ہوا کہ بھاشو کے کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور کوئی تیز قدموں سے باہر آ گیا ہے۔ یہ کون ہو سکتا تھا ناجی نے بے حرکت لیٹے لیٹے آنکھوں کی جھری سے بھاشو کے کے کمرے کی طرف دیکھا، ادھر کھلے دروازے سے باہر نسیمہ کھڑی تھی۔ سکڑی سمٹی ہوئی جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کمرے سے نکل کر اب کدھر جائے پھر وہ ناجی کے بستر کی طرف آئی کچھ دیر سرہانے کی طرف خاموش کھڑی رہی' پھر ہولے سے ناجی کے ساتھ ہی لیٹ گئی' ناجی نے یہی ظاہر کیا کہ وہ سو رہا ہے۔ باجی کی طرف اس کی پشت تھی۔ باجی نے اپنا ایک ہاتھ آہستہ سے ناجی کے کندھے پر رکھ دیا' تھوڑی دیر بعد ناجی نے محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کا سینہ دھل رہا تھا ۔گاہے بگاہے ہچکی کی جنبش سے چارپائی لرز جاتی تھی۔

ناجی کے دل میں غم کا دھواں سا بھر گیا۔ بھاشو کے کے لیے نفرت کی ایک لہر سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ باجی نسیمہ بھاشو کے سے دور رہنا چاہتی ہے۔ وہ اس سے خوفزدہ ہے اس کا دل چاہا اپنی باجی کو اس چار دیواری سے اڑا کر کہیں دور لے جائے۔ اس نے اپنی پشت پر باجی نسیمہ کے جسم کا لمس محسوس کیا، کتنی اچھی تھی اس کی باجی..... کتنی نرم و نازک' کتنی بھولی بھالی اور بھاشو کا کتنا سخت اور کرخت اس کا سارا جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے پاس سے چاچا مجید کے گھوڑے جیسی ہواڑ آتی تھی۔ پھر ناجی کو بھاشو کے کا بھاری بھرکم کھردرا ہاتھ یاد آیا جب شادی کے روز وہ تصویر کھنچوانے بھاشو کے کے پاس بیٹھا تھا تو اس نے اپنا ہاتھ ناجی کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ ناجی اب تک اس ہاتھ کا ناپسندیدہ بوجھ محسوس کرتا تھا شاید وہی ہاتھ اس کی باجی کو بھی دکھ دیتا ہے۔ ناجی کا دل چاہا کہ وہ اس ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے .....سوچتے سوچتے اس کی ذہنی رو کہیں سے کہیں پہنچ رہی تھی' اسے اپنے چھوٹے چاچا انور کا پستول یاد آ رہا تھا۔ چھوٹے چاچا نے اس پستول سے گولی چلا کر حاجی مراد کے مزارعے کی ٹانگ پھسل کی تھی۔ یہ پستول اب بھی گھر میں موجود تھی اور ناجی کو اچھی طرح پتا تھا کہ اسے کہاں چھپایا گیا ہے۔ ناجی کا دل چاہا کہ اس کے ہاتھ میں چھوٹے چاچا کا پستول ہو اور وہ پٹاخ سے بھاشو کے کی مونچھوں سے تھوڑا اوپر گولی مار دے۔

نجانے کب ایسی ہی سوچوں میں گھرا ہوا وہ سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو باجی نسیمہ چائے میں سے گھسن کے پیڑے نکال نکال کر ایک بڑی تھالی میں رکھ رہی تھی' باورچی خانے کی طرف سے خالہ شریفاں کی آواز آ رہی تھی۔ ''سویرے سویرے نکل گیا ہے نہ کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ سارا دن بھوکا رہے گا۔''

شوکے کی بھرجائی کی آواز آئی'' پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے چنگا بھلا تھا' خوش باش' ہنستا کھیلتا۔'' پھر وہ نسیمہ سے مخاطب ہو کر بولی'' نسیمہ تجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی؟''

''نن.....نہیں .....آپا صغراں میں نے تو کوئی بات نہیں کی۔''

''یہی تو مصیبت ہے کہ تو کوئی بات نہیں کرتی۔'' باورچی خانے سے خالہ شریفاں کے بڑبڑانے کی آواز آئی' پھر وہ خالو کو روٹی دینے بیٹھک کی طرف چلی گئیں۔

ناجی نے کن انکھیوں سے باجی نسیمہ کا چہرہ دیکھا، ان کی

پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔
ناجی سمجھ گیا کہ ابھی جو ذکر ہو رہا تھا، وہ شوکے کا تھا۔ وہ غصہ دکھا کر صبح سویرے کھیتوں کو چلا گیا ہے۔

اگلے تین چار دن بھی گھر میں خاموشی سی رہی۔ نسیمہ بدستور چھت پر خالہ کے پاس سوئی تھی' اب ناجی اور مختار ابھی وہیں سونے لگے تھے۔ ان تین چار دنوں میں ناجی نے صرف ایک بار نسیمہ کو بھاشو کے سے بات کرتے دیکھا۔ پھر ایک دن دوپہر کو پتا چلا کہ پٹواری کی بیوی جو عرصے سے بیمار تھی، چل بسی ہے۔ سارے گھر والے فوتگی والے گھر چلے گئے۔ بھاشو کا ٹریکٹر کا کوئی پرزہ لینے شہر گیا ہوا تھا۔ وہ ڈھائی تین بجے واپس آیا تو گھر میں ناجی اور نسیمہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نسیمہ نے شوکے کو کھانا دیا اور اس کے لیے دودھ کی مینھی لسی بنائی۔

کھانا کھاتے ہوئے بھاشو کے کی تیز نظریں نسیمہ کو گھورتی رہیں اور ناجی دل ہی دل میں کھولتا رہا۔ لسی پینے کے بعد بھاشو کے نے مونچھوں کو دہرا تاؤ دیا اور رنگین پایوں والی چارپائی پر چوڑا ہو کر لیٹ گیا۔ وہ ادھر سے ادھر آتی جاتی نسیمہ کو بری طرح گھور رہا تھا' پھر اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے دو نوٹ نکالتے ہوئے ناجی سے بولا" جایار! ایک سگریٹوں کی ڈبی لے آ..... اور بیچ روپے کا سوڈا واٹر پی آ..... چھیدے پرچون والے کی دکان سے....."

ایک دم ناجی بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ بھاشو کا اسے گھر سے نکالنا چاہ رہا تھا۔ چھیدے پرچون والے کی دکان پنڈ کے دوسرے سرے پر تھی' وہاں آتے جاتے ہوئے ناجی کو کافی ٹائم لگنا تھا۔ اس سے پہلے تو بھاشو کے نے کبھی اس سے اس طرح کی فرمائش نہیں کی تھی آج اس لیے کر رہا تھا کہ باجی نسیمہ گھر میں اکیلی تھی' وہ اسے پریشان کرنا چاہ رہا تھا۔" میں نہیں جاؤں گا ..... ہم..... میرے پیٹ میں درد ہے۔" ناجی نے صاف انکار کر دیا۔

"اوئے کھوتے! سوڈا واٹر پیے گا تو درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں سوڈا واٹر سے مجھے الٹی آنے لگتی ہے۔" ناجی نے بیزاری سے کہا اور اٹھ کر برآمدے میں چلا گیا۔

شوکا وہیں چارپائی پر پڑا رہا اور اسے گھورتا رہا۔

☆☆☆

ناجی جب رتن پورہ آیا تھا تو اس کا ارادہ تھا کہ پندرہ بیس دن یہاں رہے گا..... لیکن وہ سات آٹھ دن میں ہی اکتا گیا۔ یہاں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سوچتا تھا اور

خدمتِ انسانیت ایک عظیم عبادت ہے
ارشاد نبوی

آپ
پریشان
آخر کب تک؟

اگر خدانخواستہ آپ کسی بھی اندرونی بیماری
اعصابی کمزوری، تبخیر معدہ یعنی گیس ٹربل
شوگر یا دیگر قابل غور امراض
کی پریشانی میں مبتلا ہیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ
ہوں کیونکہ مایوسی گناہ ہے۔ ہمارا بلند معیار۔ بااصول
مستند ادارہ آپ کو سستا، آسان، اصولی، تسلی بخش
مستقل اور مختصر علاج فراہم کرے گا۔

ہمارا طریقہ علاج

دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس سے
بفضلہ تعالیٰ مرض جڑ سے ختم ہو جاتی ہے اور دوبارہ علاج
کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

ادویات بذریعہ ڈاک منگوائی جا سکتی ہیں

اندرون و بیرون ملک حضرات اپنے تمام حالات
مفصل لکھ کر مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ صیغہ راز ایک امانت
ہوگی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اپنی مرض کو لمبی
پرانی یا لاعلاج نہ بنائیں بلکہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ اپنا
اصولی، تسلی بخش اور مستقل علاج کروائیں۔ کیونکہ اگر صحت
اچھی ہوگی تو تب ہی ساری خوشیاں بھی اچھی لگیں گی
تندرستی ہزار نعمت ہے

مینجر مستند ادارہ النجم الصحت
شریف دواخانہ قائم شدہ ۱۹۴۱ء
پوسٹ بکس نمبر ۹ حافظ آباد پوسٹ کوڈ ۵۲۱۱۰ پاکستان

یہ سوچ اس کو سخت بے چین رکھتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ باجی یہاں خوش نہیں ہے اور بھاشو کے کے ساتھ تو بالکل بھی خوش نہیں ہے' لیکن وہ باجی کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا اگر کر نہیں سکتا تھا تو پھر یوں تماشا دیکھتے رہنے اور خود کو جلاتے رہنے سے کیا فائدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب باجی نسیمہ نے اسے بتایا کہ خالو اپنے کسی کام سے سیالکوٹ جا رہے ہیں تو ناجی فوراً بول پڑا ''میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔''

اگلے روز وہ جانے کے لیے تیار تھا' باجی نے اس کے کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھری اسے تھما دی اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔ وہ باجی کا ہاتھ تھام کر بولا ''باجی تم کب آؤ گی؟''

''ابھی پتا نہیں۔'' وہ بولی۔

''پھر بھی بتاؤ نا کب تک؟''

''اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے، وہ ہولے سے بولی ''تم مجھے یاد کرتے رہنا اور امی کو بھی کراتے رہنا پھر جب تم دونوں مجھے لینے آؤ گے تو میں آ جاؤں گی۔''

''چل پتر ناجی..... بس نکل جائے گی۔'' خالو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ باجی کو خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

راستے میں بھی اس کا چھوٹا سا ذہن باجی اور اس کے مسئلوں میں الجھا رہا۔ اسے فکر تھی کہ کہیں ان کے گھر جا کر خالو جان باجی کی کوئی شکایت نہ لگا دیں۔ یہ نہ کہہ دیں کہ وہ اپنے نئے گھر میں ٹھیک سے نہیں رہ رہی یا وہ اپنے خاوند سے بولتی نہیں ہے۔

اسے پتا نہیں تھا کہ اس طرح کی شکایت لگائی جاتی ہے یا نہیں اور اگر لگائی جاتی ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اسے ابا کی فکر نہیں تھی وہ تو بڑے نرم دل اور ٹھنڈے دماغ کے تھے لیکن چاچا مجید کو غصہ چڑھ سکتا تھا۔ وہ غصے میں رتن پورہ بھی جا سکتے تھے اور باجی نسیمہ کو ڈانٹ ڈپٹ سکتے تھے' وہ بے چاری تو پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ باجی کے دکھ کا سوچ کر ناجی کا اپنا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔

بہر حال اگلے چار پانچ دن میں ناجی کا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو گیا' وہ واپس آ کر بھی مسلسل باجی نسیمہ اور بھاشو کے کے متعلق سوچتا رہا تھا..... لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کی توجہ کتابوں کاپیوں کی طرف ہونے لگی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں سے بس دو چار ہی باقی رہ گئی تھیں' اسے چھٹیوں کا کام مکمل کرنا تھا اور یہ کافی کام تھا۔

اسکول کھلنے کے بعد ناجی کی مصروفیت بڑھ گئی۔ اس کی بڑی باجی رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس کے بچوں کی چہکم دھاڑ میں دل لگا رہتا تھا۔ موسم بھی بدل رہا تھا اب سائے ڈھلنے کے بعد کھیلنے کودنے کو دل چاہتا تھا' گاؤں کے لڑکے بالے کھیل کے میدان میں جمع ہو جاتے تھے۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ برسات بیت گئی کھیتوں میں چاول کی فصل لہلہانے لگی۔ ناجی امی سے باجی نسیمہ کے بارے میں اکثر بات کرتا رہتا تھا۔ باجی نسیمہ کے دو چار خط بھی رتن پورہ سے آئے تھے۔ ایک بار چاچا مجید اور چاچی خود بھی رتن پورہ میں نسیمہ سے مل کر آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ٹھیک ہی ہے لیکن ناجی جانتا تھا کہ اور اس کا دل جانتا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

پھر ایک روز جب ناجی گنگناتا چوستا ہوا اسکول سے گھر آیا تو دنگ رہ گیا' باجی نسیمہ صحن میں امی کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی اور امی بار بار اس کا سر چوم رہی تھیں۔ ناجی کو دیکھ کر باجی نسیمہ اس سے لپٹ گئی' اسے خوب خوب پیار کیا اور آنکھوں سے آنسو جھلکانے لگی' وہ خوش بھی تھی اور رو بھی رہی تھی جیسے بارش ہو اور دھوپ بھی نکلی ہوئی ہو۔ ناجی کے گھر والے ایسی بارش کو ''کانی بارش'' کہتے تھے۔

بھاشو کا بھی نسیمہ کے ساتھ آیا تھا لیکن اسے چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا تھا۔ اسے خالو کے ساتھ ایک تاریخ پر لاہور جانا تھا۔ ناجی نے سوچا اچھا ہی ہوا اسے شو کے کی موجودگی نہیں دیکھنا پڑیں۔

باجی نسیمہ جب رتن پورہ سے آئی تو چپ چپ تھی لیکن دس پندرہ دن میں ہی وہ پھر سے پہلے والی باجی نسیمہ بن گئی۔ باتیں کرتی' ہنستی کھیلتی وہ دونوں پھر ایک دوجے سے پیار بھری لڑائیاں کرنے لگے' باغ میں جانے لگے اور گاؤں گھومنے لگے۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر ناجی جانتا تھا کہ کہیں کچھ غلط بھی ہے' باجی باتیں کرتے کرتے اچانک کہیں کھو جاتی تھی، چپ ہو جاتی تھی۔ ناجی کو لگتا تھا کہ کوئی غم اسے اچانک آ دبوچتا ہے۔

ایک دن جب باجی ابا جان کے ساتھ بڑی باجی سے ملنے اس کے سسرال گئی ہوئی تھی' ناجی نے ماں سے پوچھا ''امی! پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ باجی نسیمہ بھاشو کے کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ بھاشو کا باجی کو اچھا نہیں لگتا۔''

''نہیں ماں صدقے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ یہ تیرا وہم ہے ابھی تو چھوٹا ہے تجھے پتا نہیں شروع شروع میں لڑکیاں اپنے خاوندوں سے ایسے ہی روٹھی روٹھی رہتی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ خوش نہیں ہوتیں جب تو بڑا ہو جائے گا

تو ہم تیرا ویاہ کریں گے' تیری وہ بھی آئے گی دیکھنا وہ بھی تجھ سے ایسے ہی لڑی لڑی رہے گی۔'' ماں کے لہجے میں شرارت تھی۔

ناجی کو کوئی جواب نہیں سوجھا اور وہ خجل خجل سا احاطے کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں کہ ماں اس کی بات کیوں نہیں سمجھتی تھی' وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا ماں نہیں کر رہی تھی بلکہ کوئی بھی نہیں کر رہا تھا یا شاید وہ کر رہے تھے لیکن انجان بنے ہوئے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ پھر ایک دن ناجی کے کانوں میں یہ بات پڑی کہ باجی نسیمہ اپنے سسرال واپس جانے والی ہے۔ رتن پورہ سے اسے شوکا لینے کے لیے آنے والا ہے۔

ناجی ایک دم اداس ہو گیا۔ باجی بھی اداس محسوس ہونے لگی تھی' گھر میں باجی کی واپسی کی تیاری شروع ہو گئی۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ امی نے باجی کے ساتھ بھیجنے کے لیے بہت سی مٹھائی بنوائی' چاچا مجید سیالکوٹ سے کپڑے لے کر آیا شوکے اور اس کے گھر والوں کے جوڑے سلوائے گئے' پتا نہیں کیوں یہ ساری تیاریاں باجی کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھیں۔

ایک دوپہر ناجی نے امی اور باجی کو بند کمرے میں باتیں کرتے سنا۔ باجی کہہ رہی تھی'' میں نے کہہ دیا ہے نا امی! مجھے نہیں جانا..... میرا دل نہیں چاہتا، میں کیا کروں؟''

ماں نے کہا'' دھی رانی'' ایسے نہیں کہتے' تیرے ابے یا چاچے نے سن لیا تو کیا کہیں گے۔''

'' آپ انہیں میری طرف سے سمجھا دیں نا۔''

'' دھی رانی! تیرے نانا جی کہا کرتے تھے' تلوار کے ایک پاسے دھار ہوتی ہے لیکن دنیا کے دونوں پاسے دھار ہوتی ہے ذرا سی بات پر کام بگڑ جاتا ہے۔''

شاید ماں بیٹی میں ابھی اور بات ہوتی لیکن اسی دوران میں چاچا مجید کے کھنکورے کی آواز سنائی دی اور دونوں ایک دم چپ ہو گئیں۔

اس رات بھی ناجی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا پتا نہیں اس کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے' شوکے کا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں گھومتا تھا اور نفرت کی ایک بلند لہر اس کے سینے میں اٹھ جاتی تھی۔ اس کا دھیان چاچے انور کے پستول کی طرف بھی جاتا تھا اس پستول کو چاچا مجید نے بھینسوں والے واڑے کے اندر گڑھا کھود کر اور موم کاغذ میں لپیٹ کر دبا دیا تھا۔ ناجی ذرا سی کوشش کرتا تو اس پستول کو نکال سکتا تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب شوکا ایک بار پھر اس کی باجی کو لینے راہوالی پہنچا۔ اس مرتبہ بس وہ اور خالہ شریفاں ہی آئے تھے جب شوکے کا تانگہ گھر کے دروازے کے سامنے رکا تو باجی نسیمہ پچھواڑے کے کمرے میں گھسی ہوئی تھی۔ شوکے کے آنے کے آدھ گھنٹے بعد وہ باہر نکلی' اس نے جھکے جھکے سر کے ساتھ شوکے اور خالہ شریفاں کو سلام کیا اور پھر پچھواڑے کے کمرے میں گھس گئی۔ رات کو سب نے برآمدے میں بیٹھ کر کھانا کھایا' دیسی گھی میں بھنے ہوئے دیسی مرغ کو دانتوں سے ادھیڑتا ہوا شوکا ناجی کو زہر لگ رہا تھا۔ حلوا کھا کر اس نے ایک لمبی ڈکار لی اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' وہ جیسے بے دھیانی میں سب کے سامنے ہی نسیمہ کو تلاش کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد چاچا مجید اور شوکا دیر تک باتیں کرتے رہے سگریٹ پھونکتے رہے اور اپلوں کی راکھ پر ہاتھ سینکتے رہے۔ دس بجے کے قریب سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ باجی امی اور چاچی اپنے دو بچوں کے ساتھ اندر سوئی ہوئی تھی' ابا جان ڈھارے میں تھے' چاچا مجید' شوکا اور ناجی برآمدے میں رضائیاں لے کر لیٹے ہوئے تھے۔ جلد ہی سارے سو گئے' چاچا مجید کے خراٹے تبھی گونجنے لگے۔ شوکا بھی چپ چاپ لیٹا تھا پتا نہیں کہ سو گیا تھا یا جاگ رہا تھا۔

اچانک ناجی کی نظر ایک سائے پر پڑی' وہ پہچان گیا یہ ذرا سہما ہوا سایہ باجی نسیمہ کا تھا' وہ بڑی خاموشی کے ساتھ برآمدے کے پرلے سرے سے نکلی اور احاطے میں پہنچ گئی۔ اس نے چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھا پھر احاطے کی چار فٹ اونچی دیوار کے قریب چلی گئی' ایک بار پھر ناجی نے ویسا ہی منظر دیکھا جیسا چند ماہ پہلے اس وقت دیکھا تھا جب شوکا باجی نسیمہ کا مکلاوہ لینے کے لیے آیا تھا۔

باجی نسیمہ نے دیوار پھاندی تھی اور گاؤں میں گم ہو گئی تھی۔ آج ایک بار پھر وہ اس دیوار کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ڈرے ہوئے انداز میں اردگرد دیکھا' دیوار کی طرف پشت کی اپنی دونوں ہتھیلیاں دیوار کے اوپر ٹکائیں اور اچھل کر دیوار پر بیٹھ گئی' پھر اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر خود کو گھمایا اور اپنا رخ گلی کی طرف کر لیا' اگلے ہی لمحے ناجی نے اسے دیوار سے کود کر گلی میں جاتے دیکھا۔ احاطے کے زرد بلب کی بہت مدھم روشنی میں باجی کی گلابی گرم چادر ایک لمحے کے لیے ناجی کی آنکھوں میں چمکی اور پھر اوجھل ہو گئی۔

تو کیا آج پھر باجی نسیمہ شوکے کے ڈر سے بھاگ گئی تھی!

لیکن آج دن کی روشنی نہیں تھی، رات کا سرد اندھیرا تھا آج معاملہ زیادہ سنجیدہ تھا۔ ناجی کا دل اس کے سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا' اچانک وہ ایک بار پھر چونک گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کی طرح شوکے نے بھی باجی کو دیوار پھاندتے دیکھ لیا ہے۔ شوکا ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا' یقیناً وہ سویا ہوا نہیں تھا کیونکہ وہ بالکل چوکس نظر آرہا تھا' اس نے اپنی جوتی پہنی اور تیزی سے باجی کے پیچھے گیا۔ احاطے میں پہنچ کر اس نے اونٹ کی طرح گردن اٹھائی اور ارد گرد دیکھا۔ پھر اس نے بھی دیوار پھاندی اور گلی میں چلا گیا۔

ناجی کے سینے میں عجیب سی آگ بھڑک اٹھی تھی' اس نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ لمبے تڑنگے شوکے نے باجی کو ایک گلی میں دبوچ لیا ہے اور مارتا گھسیٹتا ہوا گھر واپس لا رہا ہے۔

ایکا ایکی ناجی بھی اپنے بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹھنڈا اور بھاری ''لوہا'' تھا۔ یہ اس کے چاچے انور کا پستول تھا' اس میں پوری چار گولیاں موجود تھیں۔ اس کا ''گھوڑا'' (ٹریگر) بھی کافی نرم تھا۔ چاچے انور کے ساتھ مل کر ناجی نے اس پستول سے باغ کے درختوں پر کئی گولیاں چلائی تھیں' ناجی نے پستول کو اپنی شلوار کے نیفے میں خوب اچھی طرح پھنسایا اور ہوائی چپل پہنتا ہوا صحن میں آگیا۔ اس نے اسی طرح احاطے کی دیوار پھاندی جیسے چند سیکنڈ پہلے اس کی باجی نسیمہ نے پھاندی تھی' وہ تاریک گلی میں پہنچا۔ اماں برکتے کی بھٹی کے پاس آوارہ کتے شور مچا رہے تھے' گلی میں اترتے ہی ناجی نے دائیں طرف دیکھا۔ ان کے مکان کے بالکل ساتھ ہی ایک بڑا سا ڈھارا تھا اس ڈھارے میں ابا اور چاچا مجید ڈور ڈنگر باندھا کرتے تھے۔ لیکن جب سے ان کی تین بھینسیں چوری ہوئی تھیں، انہوں نے یہاں جانور باندھنے چھوڑ دیئے تھے' بس یہاں گندم کا بھوسا پڑا رہتا تھا یا پھر پرالی کے بڑے بڑے گٹھے ہوتے تھے' ناجی کو شک سا ہوا تھا کہ شوکا اس ڈھارے کی طرف گیا ہے۔

ناجی بڑی احتیاط سے ڈھارے میں داخل ہوا' چاند کی مدھم روشنی' روشندانوں سے اندر آرہی تھی' صاف تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن ہلکا ہلکا اندازہ ہوتا تھا کہ کہاں کیا رکھا ہے۔ ایک پرانی تھریشر مشین کے پاس سے گزر کر ناجی پرالی کے ڈھیر کی طرف گیا۔ دفعتاً اس کی رگوں میں خون اچھل گیا' ایک ہی لمحے میں پورے جسم پر چنگاریاں سی بکھر گئی تھیں۔ اس نے شوکے کو دیکھا' روشندان سے آنے والی روشنی میں شوکے کی نیلی قمیص صاف دکھائی دے رہی تھی' وہ باجی نسیمہ کے ساتھ گتھم گتھا تھا ناجی کو بس شوکے کی پشت ہی نظر آئی۔ ناجی کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ چاچے انور نے بتایا تھا کہ پستول کا گھوڑا سخت ہو تو پستول کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھوڑے کو دو انگلیوں سے دباتے ہیں' اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اسے معلوم نہیں تھا کہ گولی شوکے کے جسم میں کہاں تک جائے گی' اسے کس حد تک زخمی کرے گی..... وہ بس گولی چلانے کے لیے حوصلہ جمع کر رہا تھا اور حوصلہ جمع ہوتا جا رہا تھا' باجی نسیمہ شوکے کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ ناجی کی نازک کلائیوں کو پستول کا وزن بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں انگلیوں کو ٹریگر پر جما دیا' نظریں اپنے نشانے پر جمائیں مگر وہ ایک بار پھر چونک گیا نشانہ بدل گیا تھا اب اسے باجی نسیمہ کی پشت نظر آرہی تھی' شوکا نیچے تھا باجی نسیمہ کی کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سنائی دی۔

''تم بڑے ندیدے ہو۔''

''تم نے ندیدہ بنا دیا ہے۔'' شوکے نے کہا۔

''کل تک بھی انتظار نہیں کیا کوئی یہاں دیکھ لے تو کیا ہو۔''

''بھلی لوکے' ہم میاں بیوی ہیں کوئی گھر سے دوڑے ہوئے نہیں ہیں۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو کل کا پروگرام پکا ہے نا؟''

''کیا مطلب؟'' باجی نسیمہ نے پوچھا۔

''کل اپنے گھر جا رہی ہو نا؟'' شوکے کی آواز آئی۔

''ہاں..... میں نے پرسوں امی سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔''

''کیا کہہ دیا تھا؟''

باجی نسیمہ شوخ انداز میں بولی ''میں نے کہہ دیا تھا کہ باجی کا اگلا بچہ ہوگا تو پھر میں رہنے کے لیے اس کے گھر چلی جاؤں گی ایک مہینے کے بجائے دو مہینے رہ آؤں گی لیکن اس بار مجھے نہیں جانا' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''جھوٹی کہیں کی' طبیعت تو چنگی بھلی ہے تیری۔''

''تم سے ملنے کے بعد چنگی بھلی ہوئی ہے نا۔'' نسیمہ پھر شوخی سے بولی۔

ناجی آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اس کے سینے میں جلتی ہوئی نفرت اور اندیشوں کی آگ تیزی سے ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔



رازداں

ـ محمد جوبیہ مفتی

وہ عاشق نہیں بلکہ عشق کے نام پر دھوکہ تھا۔ اُس کی رگوں میں محبت کے بجائے زہر دوڑنے لگا تھا۔ اُس نے اپنی اَنا کی تسکین کے لیے ایسا راستہ ڈھونڈ جس نے اُسے مزید توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

بہتے ہوئے پانی پر مکان کی بنیادیں رکھنے والوں کے لیے

ریاض فاروقی کی عمر ۳۵ کے لگ بھگ تھی۔ گھنی مونچھیں اور جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے اپنی نیو ماڈل گرے رنگ کی اکارڈ سڑک کے کنارے کھڑی کی اور اُسے لاک کرنے کے بعد چابیوں کا گچھا پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ پیدل چلتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوا اور کچھ ہی دیر بعد وہ اس گلی کے دوسرے سرے سے نکل کر ایک کشادہ سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ سامنے ہی ایک بس اسٹاپ نظر آرہا تھا۔ مسافروں کی نگاہیں ایک ہی

جانب لگی بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ بھی اس بے قرار گروہ میں شامل ہو گیا۔ موسم معتدل تھا۔ ورنہ اسے بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

ریاض فاران کی مطلوبہ بس کوئی آدھ گھنٹے بعد پہنچی۔ یہ ایک سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر تھی اور اس کا نمبر اے ۱۵ تھا۔ ریاض آگے بڑھا اور سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آ گیا۔ بائیں طرف کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آنے لگے، جیسے وہ کوئی بھولا بسرا منظر یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ خیالات کا ریلا اسے بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا... آج سے ٹھیک تین برس پہلے وہ اسی طرح اپنی کار سے اتر کر ڈبل ڈیکر میں بیٹھا کرتا تھا مگر اس وقت وہ اکاؤنٹنٹ سے نہیں ایک پرانے ماڈل کی فوکس ویگن سے اترا کرتا تھا اور اس کا حلیہ بھی مختلف تھا۔ بکھرے بال، بڑھی ہوئی شیو اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے سیاہی مائل ہونٹ۔ وہ آخری اسٹاپ کا ٹکٹ لے کر آنکھیں موند لیا کرتا، پھر جب بس یوٹرن لے کر رک جاتی تو وہ سمجھ جاتا تھا کہ منزل آ گئی ہے۔ وہ نشست پر تھوڑا سا نیچے کو کھسک کر کھڑکی سے باہر نظریں جما دیتا۔ سفید رنگ کی ایک خوشنما کوٹھی اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ صاف و شفاف فرش اور ترشے ہوئے سرسبز لان۔ پھر ان لانوں میں اسے وہ عورت نظر آتی جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو اور اس کے دل کا سب سے گہرا داغ تھی۔ خوش رو، سرو قد، سیماب بدن اور باوقار۔ وہ نسیم تھی، نسیم حامد۔ وہ اس کی محبوبہ تھی، کالج کے زمانے میں دونوں نے [illegible] ایک ساتھ گزارا تھا لیکن پھر گردش حالات نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ایک روز شناختوں کی گونج میں نسیم پرائی ہو گئی۔ اس کی شادی شاہد عظیم سے ہو گئی۔ شاہد خوش شکل آدمی تھا اور محکمہ جنگلات میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ ریاض اپنے تمام تر رقیبانہ جذبات کے باوجود یہ سمجھتا تھا کہ شاہد ایک نفیس اور مہربان شخص ہے اور ہر طرح سے نسیم کے لائق۔

ان حالات میں ریاض کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے دل کو سنبھال کر ان دونوں کی زندگی سے نکل جاتا اور نسیم کو صرف اپنی نیک تمناؤں میں یاد رکھتا۔ مگر وہ تھا کسی اور ڈگر کا آدمی۔ شکست تسلیم کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا اور پھر ایسی تڑپا دینے والی شکست! وہ نسیم کو ہمیشہ کے لیے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرح سے نسیم کی شادی نے ریاض کے عشق کو مزید ہوا دی تھی اور وہ شب و روز کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ پھر اس نے وہی وتیرہ اختیار کیا جو کم ظرف اور شہدے عاشق اختیار کرتے ہیں۔ یعنی یہ جانتے بوجھتے بھی کہ نسیم نئی زندگی شروع کر چکی ہے، اس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور حیلے بہانوں سے اس سے ملنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت جلد نسیم کو بھی اس کے ارادوں کا علم ہو گیا اور وہ حد سے زیادہ محتاط ہو گئی۔ درحقیقت وہ ایک خاندانی اور خالص مشرقی لڑکی تھی، تعلیم نے اسے ماڈرن ضرور بنایا تھا مگر ریاض کی طرح اقدار سے بیگانہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ریاض کے تیور دیکھ کر ہر طرح اس کی دل شکنی کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ کئی بار اسے فون پر بڑی طرح لتاڑ دیا۔ ان ناکامیوں نے ریاض کی خباثت کو اور بھی ہوا دی۔ اسے ضد سی ہو گئی کہ نسیم کو شوہر پرستی کے بخار سے نجات دلا کر چھوڑے گا۔ مگر ولائے قسمت! اس کی یہ تمنا بر نہیں آئی اور وہ اس دیوار سنگ سے صدہا مرتبہ سر پھوڑنے کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ ڈبل ڈیکر میں بیٹھ کر نسیم کے گھر میں جھانکنے والی یہ تدبیر بھی ریاض کو انہی دنوں سوجھی تھی۔ ایک روز اتفاقاً اسے پتا چل گیا تھا کہ ڈبل ڈیکر کے جہاں اور بہت سے فائدے ہیں، وہاں اس سے چار دیواری کا توڑ بھی کیا جا سکتا ہے۔ نسیم کے گھر کی بیرونی دیوار بلند ہونے کے باوجود وہ ۸۰ پیسے کا ٹکٹ لے کر اس کے گھر میں رونمائی جھانک لیا کرتا تھا۔

ان واقعات کو اب تین برس بیت چکے تھے۔ اس دوران ریاض نے کئی بار جرمنی، ہانگ کانگ، برطانیہ اور امریکا کے کئی چکر لگائے تھے اور اب وہ امپورٹ ایکسپورٹ کے میدان کا کامیاب شہسوار تھا۔ اس نے حیرت انگیز سرعت سے ترقی کی تھی۔ اب کئی غیر ملکی کمپنیوں میں اس کے حصص تھے اور امریکا کی ایک ریاست میں کھیلوں کا سامان بنانے والی ایک فرم اس کی ملکیت تھی۔ وہ پونے تین سال بعد پاکستان آیا تھا۔ یہاں اسے سیالکوٹ میں کچھ کام تھا کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے ڈیڑھ دو ماہ یہاں رکنا پڑتا... لہٰذا اس نے سیالکوٹ میں قیام پر لاہور کو ترجیح دی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ امریکا میں آباد تھا، تاہم لاہور میں تھا مال اس کے عزیز رہتے تھے۔ وہ ان عزیزوں میں سے ایک ثروت مند چچا کے ہاں قیام پذیر ہو گیا۔ لاہور آمد کے دوسرے روز ہی اس کے دل میں ڈبل ڈیکر کی سواری کا شوق انگڑائیاں لینے لگا تھا اور آج علی الصباح وہ کار میں بیٹھ کر اس طرف نکل آیا تھا۔

وہ خیالوں میں گم تھا جب کنڈیکٹر نے 'مارکیٹ اسٹاپ' کی آواز لگائی۔ یہ آواز سنتے ہی ریاض نے کھڑکی سے جھانکا اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس کی منزل چند فرلانگ دور رہ گئی تھی اور پھر یہ چند فرلانگ بھی طے ہوگئے۔ بس نے یو ٹرن لیا اور رُخ پھیر کر آخری اسٹاپ پر کھڑی ہوگئی۔ سواریاں دھڑا دھڑ اُترنے لگیں۔ دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ ریاض نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور اس کا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آگیا۔ اسے لگا جیسے وہ تین سال بعد نہیں صرف تین دن یا تین گھنٹے بعد یہاں آیا ہے۔ سب کچھ اسی طرح تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا سوائے دو بچوں کے جن کی عمریں تین اور ایک سال کے لگ بھگ تھیں اور جو سبزلان میں کھیل رہے تھے۔ دونوں لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا ٹرائی سائیکل چلانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ چھوٹا گراؤنڈ میں بیٹھا بھائی کو سائیکل چلاتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ ریاض کی نگاہیں نسیم پر جم کر رہ گئیں۔ وہ پھولدار جرسی میں ملبوس لانبے بال شانوں پر بکھرائے آرام کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس کے ننگے پاؤں سبز گھاس پر دھرے تھے۔ اتنے فاصلے سے بھی یہ باتیں ریاض کی آنکھوں میں سفید شعلوں کی طرح دمک رہے تھے۔ نسیم کو دیکھ کر اس کے دل سے ایک ہُوک نکلی اور آنکھوں میں رقیبانہ جذبے اُودھم مچانے لگے۔ وہ حسبِ معمول نشست پر تھوڑا سا نیچے کو کھسک گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ بالکونی پر بند دروازے کے سامنے ایک خوبصورت کرسی اور تپائی دھری تھی۔ یہ جگہ ریاض کے رقیبِ روسیاہ شاہد کے لیے مخصوص تھی۔ وہ علی الصباح یہاں بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا۔ تب ریاض کی نگاہ گیراج کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی جس پر ریکسین کا غلاف چڑھا ہوا تھا اور غلاف پر گرد جمی تھی۔ ریاض سمجھ گیا کہ شاہد عظیم صاحب آج کل دورے پر ہیں۔ وہ جانتا تھا بڑی کار جب برقع پوش ہو کر گیراج میں کھڑی ہو اور چھوٹی سوزوکی پورچ میں ہو اور لان میں تین بال کاٹ نظر نہ آئے تو اس کا مطلب ہے رقیبِ روسیاہ دورے پر ہے۔ یہ ساری معلومات اب ریاض فارانی کو ازبر ہو چکی تھیں۔ شاہد عظیم ہر دوسرے تین ماہ بعد ملازمت کے سلسلے میں دورے پر جاتا رہتا تھا اور یہ دورہ دو ہفتے سے کم اور چھ ہفتے سے زائد نہیں ہوتا تھا۔

اچانک ریاض کو ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس نے اپنی نگاہوں کو نسیم کے مقناطیسی جسم سے جدا کر کے دیکھا بچے نے گھاس پر کھیلتے کھیلتے اپنی گردن موڑی تھی اور اب چلا چلا کر ماں کو بلا رہا تھا۔ نسیم نے اخبار پھینکا اور لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا پھر وہ اُسے بازوؤں میں جھلا جھلا کر چُپ کرانے لگی۔ بچے کا رونا تھا تو وہ اپنی ناک سے اس کے پیٹ میں گدگدی کر کے اسے ہنسانے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی بچے کی دُور افتادہ چیخیں ریاض کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ نسیم نے ایک طائرانہ نگاہ بس کی طرف ڈالی اور بچے کو پُچکارتی چمکارتی اندرونی عمارت کی طرف چل گئی۔ بڑا بچہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔

نسیم کے آنگن کی سمت ریاض فارانی کے دل پر آرے سے چلا رہی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پروان چڑھتا رہا۔ درحقیقت اس منصوبے کی شروعات کافی عرصہ پہلے ہو چکی تھی۔ امریکا میں قیام کے دوران فرصت کے لمحوں میں وہ اکثر اس سازش کی کڑیاں جوڑا کرتا تھا۔ آج وہ سارا 'ہوم ورک' اس کے سامنے تھا اور اسے عملی قدم اٹھانے پر اکسا رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر فضا بھی فوراً ہی سازگار مل گئی تھی۔ اب اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا نادانی تھی۔

اس رات گیارہ بجے ریاض فارانی اپنی شاندار خوابگاہ سے امریکا کی ریاست کیلیفورنیا ٹیلیفون کر رہا تھا: ہیلو زلفی... کیسے ہو... بس میں بھی ٹھیک ہوں... تم کیا کر رہے ہو...؟ چلو اچھا ہے... تم ایسا کرو پرسوں تین بجے کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ جاؤ۔ میں اپنا لاہور کا ایڈریس تمہیں دیتا ہوں... بہت ضروری ہے... نہیں باقی باتیں یہاں پہنچ کر ہوں گی۔ اوکے... ویسے میں لاہور ایئرپورٹ پر موجود رہوں گا... اوکے... گڈ بائی۔"

ٹھیک چوتھے روز رات دس بجے ایک خوبرو نوجوان سفری بیگ تھامے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل رہا تھا۔ سرخ و سپید رنگت، لمبا قد، چوڑے شانے، مجموعی طور پر وہ



انتہائی پرکشش و جاذب شخصیت کا مالک تھا۔ غالباً صنفِ نازک کے لیے ممکن نہیں تھا کہ ایک بار دیکھ کر اسے دوسری بار نہ دیکھے۔ یہ زلفی تھا۔ ریاض فارانی سے اس کی ملاقات ایک سال پہلے لندن میں ہوئی تھی۔ پھر کاروباری مناسبت کے سبب دونوں میں دوستی ہوگئی۔ عورت تو عورت، مرد بھی اس کی شخصیت کے سحر سے نہ نکل پاتے تھے۔ وہ نسلاً آفریدی تھا مگر عمر کا زیادہ حصہ اس نے یورپی تعلیم گاہوں میں گزارا تھا۔ جب تک وہ بات نہ کرتا یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ یورپین ہے یا پاکستانی۔ دنیا کے قریباً ہر بڑے شہر میں اس کے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ معاشقے موجود تھے۔ دوستوں نے اسے "ماسٹر آف لیڈی کلنگ" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور اب یہ ماسٹر آف لیڈی کلنگ پاکستان میں موجود تھا اور بدباطن ریاض فارانی اس سے ایک اہم کام لینا چاہتا تھا۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہ دونوں نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ شغلِ مے نوشی کے ساتھ ساتھ گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ ریاض مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"... زلفی، اس عورت کی پارسائی وہ ایٹ آؤٹ ایور سٹ ہے جسے سر کیے بغیر میں چین سے مر بھی نہ سکوں گا... کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟ یہ میں سب تم پر چھوڑتا ہوں۔ بس میں تو اس کے غرور کی کرچیاں تمہارے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے اسے شوہر سے بے وفائی پر مجبور کر دیا تو بائی گاڈ... بائی گاڈ میں تمہیں ماڈرن ایج کا جادوگر مان لوں گا۔"

زلفی کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس نے خوابناک نگاہوں سے ریاض کو دیکھا اور آہستگی سے بولا۔

"کوئی پرابلم جانی۔"

اگلے تین چار روز مصروف گزرے۔ زلفی کی ہدایت پر ریاض نے کوشش کی کہ نسیم لاج سے دائیں یا بائیں کوئی کوٹھی کرائے پر یا قیمتاً مل جائے مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ ہاں اسی لائن میں دس کوٹھیاں چھوڑ کر وہ ایک خوشنما بنگلا حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ ریاض نے منہ مانگا ایڈوانس اور کرایہ دے دیا، مارکیٹ سے زلفی کو ایک سیکنڈ ہینڈ لیکن شاندار کار خرید دی اور ضروری ہدایات دے کر سیالکوٹ چلا گیا۔

سیالکوٹ سے اس کی واپسی چھٹے روز ہوئی۔ وہ کوئی اہم خبر سننے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے آتے... ہی زلفی کو رنگ کیا۔ وہ گھر ہی میں تھا لہٰذا جلد ہی اس کے ہاں پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ نسیم لاج کے سامنے پارک میں روزانہ صبح شام ورزش کے بہانے موجود رہتا ہے۔ بس ایک روز شام کے وقت ایک نوکرانی نسیم کے چھوٹے بچے کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر پارک میں لائی تھی۔ اس نے بچے سے بے تکلف ہونے کے لیے اسے کچھ پھول توڑ کر دیے لیکن وہ ایسا کور ذوق نکلا کہ پھول پھینک کر ان پر پیشاب کرنے لگا۔

ریاض فارانی کے لیے یہ رپورٹ مایوس کن تھی لیکن وہ زلفی سے مایوس ہرگز نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا شکاریوں کا شکاری میدان لگا چکا ہے، اب کچھ مار کر ہی نیچے آئے گا اور اگلے ہی روز اس کی توقعات درست ثابت ہوئیں۔ شام کے وقت زلفی لے از خود پہنچ کر ایک نہایت حوصلہ افزا روداد سنائی۔ اس نے بتایا۔

"میں صبح دن چڑھے تک ورزش کے بعد گھر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ نسیم لاج کی نوکرانی بڑے بچے کے ساتھ جس کا نام بلال ہے کچھ سامان اٹھائے باہر نکلی۔ اس کے ساتھ ہی مین گیٹ کھلا اور نسیم اپنی چھوٹی گاڑی ریورس کرتی ہوئی سڑک پر لے آئی۔ میں نے دیکھا گاڑی کے پیچھے کچھ چیزیں مثلاً ٹوکریاں، تھرماس، لنچ کیریئر وغیرہ پڑے ہیں۔ مجھے شک ہوا کہ یہ لوگ پکنک پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نسیم اور بچوں کے لباس بھی اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔ میں درختوں سے ہوتا ہوا بھاگم بھاگ گھر پہنچا اور فوراً لباس بدل کر بالکونی میں آگیا۔ یہاں میں ٹیلی اسکوپ سے نسیم لاج کا گیٹ صاف دیکھ سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد روانگی کے آثار نظر آئے تو میں بھی نیچے آکر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی جناح باغ کی طرف روانہ ہوگئیں۔

باغ میں نسیم اپنے بچوں کے ساتھ دوپہر تک پکنک میں مصروف رہی۔ میں تمام وقت ان سے کچھ فاصلے پر موجود رہا اور شناسائی کا کوئی موقع تلاش کرتا رہا۔ دوپہر کے وقت ایک عجیب حادثہ رونما ہوا۔ کسی قریبی درخت پر شہد کی مکھیوں کا چھتا تھا۔ یہ مکھیاں مشتعل ہو کر لوگوں پر حملہ آور ہوگئیں۔ ہر طرف چیخ و پکار ہونے لگی۔ لوگ جدھر منہ اٹھا، بھاگ نکلے۔ میرے سامنے دو تین افراد کو مکھیوں نے بری طرح کاٹا۔ نسیم اور اس کے بچے بھی چیخ چلا رہے تھے۔ میں ان کی مدد کو پہنچا۔ بڑے بچے کو بانہوں میں اٹھایا اور نسیم کو ساتھ لے کر قریبی ٹی اسٹال کی طرف بھاگا۔ یہاں مشروبات کی بوتلیں سپلائی کرنے والا ایک ٹرک کھڑا تھا۔ میں نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور بچوں کے ساتھ ٹرک کے کیبن میں گھس گیا۔ نسیم اور اس کی نوکرانی بھی اندر آگئے۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے اور مکھیاں

Raaz Daan By Tahir Javed Moughal Suspense August 1989.pdf

چاروں طرف منڈلا رہی تھیں۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ خدا خدا کر کے یہ آفت ٹلی اور ہم باہر نکلے۔"

ریاض فاروقی نے مسکرا کر پوچھا "اب کیا صورتِ حال ہے؟"

زلفی نے جوابی مسکراہٹ اچھالی اور بولا "صورتِ حال یہ ہے کہ انکل زلفی کو ماسٹر بلال کی طرف سے چائے کی دعوت مل چکی ہے اور محترمہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر شکریے کا اظہار کر چکی ہیں۔ اب آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے؟"

ریاض فاروقی نے زلفی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ذوالفقار خاں صاحب، ان مکھیوں کو چھتے سے اڑایا کس نے تھا؟"

زلفی نے ایک آنکھ میچی اور دلکش انداز میں مسکرانے لگا۔

کچھ تو زلفی ویسے ہی تیز رو تھا، رہی سہی کسر ریاض کی اس تنبیہ نے پوری کر دی کہ رقیب و رسیاہ کا دورہ ختم ہونے سے پہلے پہلے قابلِ ذکر پیش رفت ہونی چاہیے۔ چنانچہ پکنک والے واقعے کے چند ہی روز بعد زلفی نے ریاض کو ایک اور اہم رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ ماسٹر بلال نرسری سے واپسی پر روزانہ دوپہر کو اس سے ملنے چلا آتا ہے اور کل تو وہ اس کے لحاف ہی میں سویا رہا۔ نسیمہ نے ایک دو بار ٹیلیفون کیا اور بعد ازاں خانم کو اسے خود ہی لینے آگئی۔ بلال اس وقت ایک ٹی وی پروگرام دیکھ رہا تھا، مجبوراً نسیمہ کو بھی کچھ دیر وہاں بیٹھنا پڑا۔ آدھ پون گھنٹا دلچسپ گفتگو رہی۔

اس سلسلے کی سب سے اہم رپورٹ زلفی نے ریاض فاروقی کو کوئی دس روز بعد دی۔ ٹیلیفون پر زلفی کی آواز سن کر ریاض نے سب سے پہلے یہی پوچھا "وہ آلو کا پٹھا شاہ عظیم تو واپس نہیں آگیا؟"

زلفی نے ہنس کر کہا "نہیں یار، کیوں مرے جا رہے ہو اس کے خوف سے؟"

ریاض فاروقی نے کہا "ہاں — رپورٹ؟"

زلفی نقاہت سے بولا "یار، رپورٹ بڑی دھانسو قسم کی ہے۔"

"تو پھر آجاؤ۔" ریاض بے تابی سے بولا۔

"نہیں یار۔" زلفی بولا "اس وقت میرے سر میں سخت درد ہے۔"

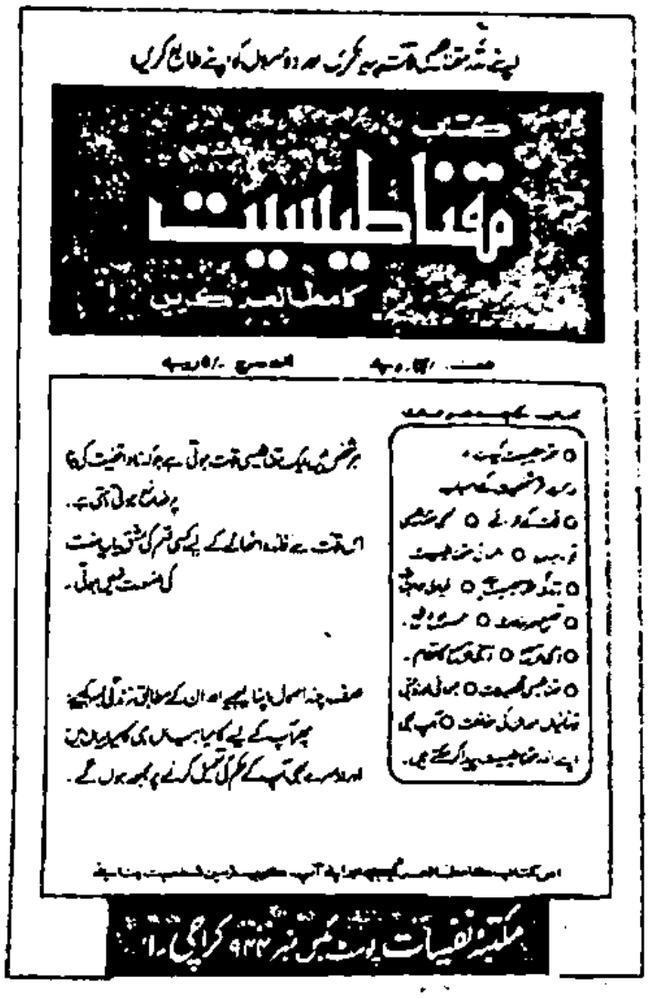
"تو وہیں سے بکو۔" ریاض نے کہا۔

زلفی نے ایک گہرا سانس لے کر کہنا شروع کیا —

"پانچ چھ روز میں بلال اور نسیمہ کو بالکل نظر نہیں آیا۔ بلال بھی آیا تو میں نے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا۔ وہ کئی بار میرا نام پکار پکار کر گیا۔ کل سہ پہر میں نے کمرے سے باہر نسیمہ کی آواز سنی۔ وہ میرے ملازم ضامن علی سے باتیں کر رہی تھی۔ ضامن علی جو کمبخت بڑا سمجھدار آدمی ہے، اسے بتا رہا تھا کہ مالک پانچ روز سے سخت بیمار ہیں۔ رات رات بھر جاگتے ہیں اور سگریٹ پھونکتے ہیں۔ کوئی دوا بھی نہیں لیتے۔ نہ جانے بیٹھے کیا لکھتے رہتے ہیں۔ بعد ازاں نسیمہ کی دستک سنائی دی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ ماسٹر بلال بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ نسیمہ تشویشناک لہجے میں میرا احوال دریافت کرنے لگی اور تب اس کی نگاہ ردی کی ٹوکری پر جا پڑی جو اوپر تک مڑے تڑے کاغذوں سے بھری ہوئی تھی اور جسے میں نے جان بوجھ کر بیڈ سے باہر کھسکا دیا تھا۔ ٹوکری دیکھ کر وہ بے اختیار بولی۔

"یہ کیا لکھتے رہے ہیں آپ؟"

پھر ایک کاغذ کھول کر پڑھنے لگی۔ اس پر انگریزی میں لکھا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں نسیمہ، مجھے معاف کر دو۔" تحریر پڑھ کر نسیمہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے جلدی سے کاغذ واپس ٹوکری میں پھینکا اور کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ بلال کی انگلی تھام کر سنگین لہجے میں بولی "چلو بلال، یہاں سے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھامی اور آزردگی



سے کہا۔

"نسیم! اگر تم سب کچھ جان ہی چکی ہو تو اتنا اور سن لو کہ میں اپنی آدھی زندگی آئیڈیل کی تلاش میں برباد کر چکا ہوں اور اب بقایا تمہاری حسرت میں برباد کر دوں گا۔"

نسیم کا چہرا غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹکا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ زلفی کی پوری بات سن کر ریاض نے کہا "ونڈرفل... ونڈرفل۔ زلفی ڈیئر! تم بہت اچھے جا رہے ہو۔ اگر تم مغرور نہ ہو جاؤ تو میں کہوں گا کہ نسیم جیسی خبیث عورت میں اتنی جان پیدا کر لینا بھی تمہارا زبردست کارنامہ ہے۔"

دوسری طرف سے زلفی کی آواز آئی "جان! آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں بہت جلد اس کہانی کو آخری موڑ دینے والا ہوں۔"

ریاض نے بے ساختہ کہا "زلفی، مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ تم اس عورت کو پٹا لو گے لیکن اگر ایسا ہو گیا تو میں زندگی بھر کے لیے تمہارا معترف ہو جاؤں گا اور ہاں، ذرا جلدی کرو۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس کا شوہر ابھی واپس نہیں آیا۔ ویسے وہ چھ ہفتے سے زیادہ باہر نہیں رہتا اور تمہیں اس چکر میں ایک ماہ ہو چکا ہے۔"

"ڈونٹ وری ڈیئر۔" دوسری طرف سے زلفی کی بھرپور مردانہ آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ریاض نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ذوالفقار غل عرف زلفی اس سے کچھ چھپا رہا ہے۔ غالباً وہ نسیم کے معاملے میں کچھ سنجیدہ ہو چلا تھا۔ وہ واقعی ایسی ہی ساحرہ تھی۔ اپنے تمام رعبِ حسن کے ساتھ آنکھ کی پتلی میں جم کر رہ جاتی تھی۔ ریاض نے سوچا، چلو اگر ایسا ہے بھی تو اس کا کیا جاتا ہے۔ اس کا تو صرف ایک ہی مقصد ہے۔ ایک شادی شدہ مشرقی عورت کی پارسائی کا جنازہ نکالنا اور حالات نے اسے زلفی جیسے سحرکار اور ناقابلِ مزاحمت مرد سے ملا کر یہ موقع پیدا کر دیا تھا۔

اس کے بعد پورے بیس روز ریاض نے انگاروں پر گزارے۔ زلفی نے اسے کہا تھا کہ وہ خود ہی اس سے رابطہ قائم کرے گا۔ بیسویں روز ریاض کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے زلفی کو رنگ کرنے کے لیے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اسی وقت گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا اور دوسری طرف زلفی کی آواز سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ وہ اُسے زبردست جھاڑ پلانے کے موڈ میں تھا لیکن زلفی نے اسے کچھ کہنے ہی ایسی اطلاع دی کہ اس کا غصہ کافور ہو گیا۔

زلفی نے کہا "جانی، تمہارا کام پچانوے فیصد ہو چکا ہے۔"

ریاض فارانی چلایا "مجھے تفصیل بتاؤ، خبیث..."

جواب میں زلفی نے جو کچھ بتایا اور ان کے درمیان جو سوال و جواب ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ اس روز جانے کے بعد نسیم پورے دس روز اسے نظر نہیں آئی۔ نہ ہی اس کے بچوں میں سے کوئی گھر سے باہر نکلا لیکن اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ پھر سڑک یا پارک میں دکھائی دینے لگی۔ ایک روز بلال بھی چوری چھپے اس سے ملنے آ گیا جسے نوکرانی واپس لے کر گئی۔ عورتوں کے بناض زلفی کے لیے یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ نسیم کے آہنی پیکر کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی ہے۔ آخر اس نے نسیم کے نام ایک خط لکھا اور اکنالجمنٹ رجسٹری کے ذریعے اس کے پتے پر ارسال کر دیا۔ اس نے لکھا۔

"نسیم! میں نہیں جانتا میرے پاگل دل کو کیا ہو گیا ہے؟ کبھی سوچتا ہوں، میں نے تم سے محبت کر کے گناہِ عظیم کیا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں یہ میری فطرت کا مثبت زور دھارا ہے، جس پر میرا کوئی بس نہیں۔ اب سب کچھ تم پر چھوڑ رہا ہوں۔ پانچ دسمبر کو میں امریکا واپس جا رہا ہوں، اس عہد کے ساتھ کہ زندگی میں پھر کبھی ہماری ملاقات نہ ہو گی... لیکن اگر تم مجھے کسی طور قابلِ معافی سمجھتی ہو تو... چار دسمبر کو شام پانچ بجے میں پرنس ریسٹورنٹ کے صدر دروازے پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

ایک پردیسی ذوالفقار آفریدی

ریاض نے فون پر زلفی کی پوری روداد سنی اور اس کی نگاہیں بے اختیار دیوار پر آویزاں کیلنڈر کی طرف اٹھ گئیں۔ یکبارگی اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ آج تین تاریخ تھی۔ اور پانچ بجے تھے۔ چوبیس گھنٹے بعد... پورے چوبیس گھنٹے بعد اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہونے والی تھی۔ افسانوں، کہانیوں اور فلموں کی پاکدامن مشرقی عورت نسیم، خاندانی شرافت کی دھجیاں بکھیر کر شوہر سے بے وفائی کا زہر پینے والی تھی لیکن اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں زلفی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "ریاض ڈیئر، تم خود دیکھ

آ کر دیکھ لینا۔ وہ آئے گی اور ضرور آئے گی... آئے گی اور ضرور آئے گی۔"

ریاض نے ریسیور رکھ دیا اور نڈھال ہو کر سوچنے لگا۔ کیا یہ واقعی ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے، نسیم اس سے ملنے آئے لیکن کسی اور رنگ میں، وہ اسے نیک چلنی کا سبق دینے کے لیے آئے یا ایک دوست کے طور پر الوداع کہنے کے لیے آئے یا پھر... وہ نسیم ہی نہ ہو۔ سیکڑوں بے معنی شبہے اس کے ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔ رات بھر وہ پاگلوں کی طرح سوچتا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی جب اس نے پرنس ریسٹورنٹ میں قدم رکھا۔ یہ ریسٹورنٹ بارونق شہر سے ہٹ کر ایک نسبتاً غیر معروف مقام پر تھا۔ شاید زلفی نے اس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اس کی محبوبہ کو آنے میں جھجک محسوس نہ ہو۔ ڈائننگ ہال کے ایک دُور افتادہ کونے میں بیٹھ کر ریاض اپنے دوست زلفی اور نسیم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ یہاں سے صدر دروازے کے مناظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ پانچ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے جب اسے زلفی نظر آیا۔ نظری پیس ایونگ سوٹ اور نیلگوں چشمے میں وہ کوئی یونانی شہزادہ لگ رہا تھا۔ اس نے ریاض کی طرف ایک معنی خیز مسکراہٹ اُچھالی اور رسٹ واچ پر نگاہ دوڑا کر صدر دروازے کے سامنے ٹہلنے لگا۔ ریاض نے بغور اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کے لاابالی چہرے پر عجیب سی سنجیدگی کا عکس تھا۔ ریاض کی کبھی جھوٹ نہ بولنے والی بہن ہی اسے بتا رہی تھی کہ زلفی نسیم کے بارے میں سیریس ہے اور اس معاملے کو دُور تک... اور شاید شادی تک پہنچا کے چھوڑے گا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم دونوں، بلکہ تینوں۔" اس نے دل میں سوچا۔ "مجھے تو اپنا مقصد چاہیے۔"

وہ بیٹھا رہا اور پل پل گنتا رہا۔ آخر وہ قیامت کی گھڑی پہنچ گئی۔ پانچ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے جب نسیم شرماتی لجاتی پھاٹک دروازے کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اس نے کھلتے رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی، گردن جھکی ہوئی تھی اور نگاہیں زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ زلفی نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور بڑی عجلت سے اس کی کمر میں بازو ڈال کر اندر لے آیا۔ ریاض نے چہرے کو چھپانے کے لیے ہاتھ میں پکڑی مینو بک کھول کر سامنے کر لی۔ وہ دونوں ویٹر قالین پر چلتے ہی کہ بالکل پاس سے گزرے۔ زلفی نے اسے سنانے کے لیے بڑے ہیجانی انداز میں کہا: "ڈارلنگ...

ڈارلنگ۔ یو کِل می۔" نسیم کے بدن سے اٹھنے والی مہک ریاض کے نتھنوں سے ٹکرائی اور دونوں ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزر گئے۔ ریاض نے گھوم کر انہیں دیکھا: ماسٹر آف ہیڈی کلنگ: کا توانا بازو نسیم کی نازک کمر کے گرد کسا ہوا تھا۔ ریاض کی آنکھوں میں فتح مندی کے آثار نظر آئے اور ہونٹ نفرت سے بھنچ گئے۔ اسے لگا یہ زلفی کا بازو نہیں اجل کا شکنجہ ہے جو مشرقی تہذیب کی گردن میں کسا ہوا ہے۔ اس نے سوچا کون کہتا ہے پارسائی نہیں بکتی، صرف قوتِ خرید کی بات ہے۔

نسیم کو لیے ہوئے زلفی ایک شیلی کیبن میں داخل ہو گیا۔ اب کچھ دیکھنے سننے کو باقی نہیں رہا تھا۔ ریاض بل چکا کر اپنی میز سے اٹھا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ وہ کامیابی کے نشے میں چور تھا اور جلد از جلد اپنے رقیب کو اپنی مسرتوں میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ایک پیگ لیا۔ پھر محکمۂ جنگلات کے ایک مقامی اہلکار کا نمبر ملایا۔ اسے معلوم تھا یہ شخص شاہد عظیم کا رابطہ آفیسر ہے اور اسے شاہد سے ملا سکتا ہے۔ تین سال پہلے بھی ایک دفعہ جب شاہد دورے پر تھا، ریاض نے اسی طرح اس کے معمولات کی ٹوہ لگائی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سلسلہ مل گیا۔

"ہیلو کون... آپ ظفر علی چیمہ صاحب ہیں؟" دوسری طرف سے اثبات میں جواب ملا۔ ریاض نے کہا: "میرا نام ریاض غازی ہے۔ مجھے شاہد صاحب سے ایک اہم سلسلے میں بات کرنا ہے۔ کیا آپ راولپنڈی میں ان سے بات کرا سکتے ہیں؟" (اسے معلوم تھا کہ شاہد جب دورے پر ہوتے ہیں تو عموماً راولپنڈی ہی میں ہوتے ہیں) دوسری طرف سے جواب آیا۔

"آپ شاہد صاحب کے کیا لگتے ہیں؟"

"بھتیجا ہوں۔" ریاض نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے کہا گیا: "لگتا ہے آپ کافی عرصے بعد ان سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔"

"ہاں... ہاں۔" ریاض ہکلایا۔

دوسری طرف ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر آواز آئی: "آئی ایم سوری سر۔ شاہد عظیم صاحب تو دو برس پیشتر ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے..." ریسیور ریاض کے ہاتھوں میں لرزنے لگا... اب اسے یہ سمجھ بھی آ رہی تھی کہ زلفی اس سے کیا چھپاتا رہا ہے۔ اپنی حماقت سے اس نے اپنی محبوبہ ایک نئے رقیب کو سونپ دی۔

دھیمے سُروں میں اُبھر رہے تھے۔ اچانک اُسے برآمدے میں آہٹ سنائی دی۔

"کون"؟ اس کی سُریلی آواز کچن میں گونجی۔ جواب میں کھڑکی زور دار دھماکے سے کھلی اور ایک شخص کود کر اندر آ گیا۔ وہ بے حد پھرتیلا تھا۔ اس سے پہلے کہ عصمت کے ہونٹوں سے چیخ نکلتی، اس نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ پسینے اور میل کچیل کی تیز بو عصمت کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی اور حملہ آور سمیت کرسی سے نیچے گر گئی۔ قریب رکھا دودھ کا برتن اُلٹ گیا اور دودھ سارے فرش پر پھیل گیا۔ ایک سلائی عصمت کو اپنی بائیں ہتھیلی میں گھستی محسوس ہوئی لیکن اس کی تکلیف نہ ہونے کے برابر تھی۔ کانوں میں ریڈیو کی کھرکھراہٹ گونج رہی تھی، شاید وہ بھی عصمت کا ہاتھ لگنے سے نیچے گر گیا تھا۔

... ٹھیک پندرہ منٹ بعد عصمت ایک ریوالور کی سیاہ نال کو گھور رہی تھی۔ یہ ریوالور حملہ آور کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنے تئیں انتہائی کرخت لہجے میں بولا۔

"دیکھو مسز عبید! جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ۔ واویلا کرو گی تو بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہاں ایک وعدہ میں تم سے کرتا ہوں، یہ ایک غنڈے کا وعدہ ہے اس لیے تم اس پر اعتبار کر سکتی ہو۔ میں پھر کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا... ہاں اگر قانون کو بیچ میں لاؤ گی تو پھر بات دور تک چلے گی۔ میں تو جلد یا دیر سے چھوٹ ہی جاؤں گا مگر تمہاری ساری زندگی حرام کر دوں گا۔ یہ بھی ایک غنڈے کا وعدہ ہے۔ گڈ بائے۔" دراز قد حملہ آور خباثت سے مسکرایا۔ اپنے ریوالور کو چرمی جیکٹ میں اڑسا اور دروازہ کھول کر کچن سے نکل گیا۔ عصمت بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ وہ جیسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ایسی خبریں اس نے اخباروں میں پڑھی تھیں اور لوگوں سے سنی تھیں لیکن ایک روز... اس کے ساتھ... خالصتاً اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آئے گا، اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ ابھی جاگی ہی نہیں، اپنے محبوب شوہر کے پہلو میں سکون کی نیند سو رہی ہے اور حسب معمول شب کے آخری پہر اسے ایک ڈراؤنے خواب نے جگا دیا ہے۔ وہ خواب دیکھتی بھی تو بہت تھی، مگر نہیں.... یہ سب کچھ حقیقت تھا۔ آج روزِ حشر تھا اور اس پر قیامت گزر چکی تھی۔ اُسے معلوم نہیں کب بچی کی ویگن آئی، کب اس نے اسکول بیگ رکھا اور کب اس سے لپٹ کر کھانے کی ضد کرنے لگی۔ تاہم جلد ہی عصمت کی کیفیت نے پانچ سالہ بچی کو بھوک سے بے نیاز کر دیا اور وہ سہم کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ عصمت یہی چاہتی تھی کہ وہ سو جائے۔ وہ تنہائی میں پوری یکسوئی کے ساتھ خود پر گزرنے والی قیامت کا تجزیہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ عبید کے دفتر سے لوٹنے میں ابھی ڈھائی گھنٹے باقی تھے اور اسی عرصے میں اسے زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے گزرنا تھا۔ آنسو اس کے رخساروں سے لگاتار گر رہے تھے اور ہچکی رہ رہ کر سینے کو دہلا جاتی تھی۔

وہ نفسیات کی طالبہ رہی تھی۔ اسے اپنے منتشر ذہن کو مجتمع کرنا آتا تھا لیکن آج یہ کام ہمیشہ سے زیادہ دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی۔ اسے کیا کرنا ہے؟ جو ہونا تھا وہ اس کی تمام تر کوشش اور جدوجہد کے باوجود ہوا تھا اور روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ اتنی کہ وہ خود کو ہلاک نہیں کر سکی تھی۔ شاید وحشت کی گھڑیوں میں وہ یہ بھی کر گزرتی لیکن حملہ آور اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اور اس نے اسے ہر طرح بے بس کر دیا تھا... لہٰذا اپنے ضمیر کی عدالت میں وہ سرخرو تھی، ملکی قانون اور خدا کا قانون بھی اسے ہر گناہ سے بری الذمہ قرار دیتا تھا مگر وہ جانتی تھی... وہ بے گناہ نہیں، وہ معاشرے کی مجرم ہے، وہ بولنے والی ہزاروں زبانوں اور دیکھنے والی ہزاروں آنکھوں کی مجرم ہے، وہ سرِ راہ اٹھنے والی ہزاروں انگلیوں کی گناہ گار ہے، وہ ایک آبرو باختہ عورت ہے سیکڑوں شرمناک قصے اور ہزاروں افسانے عدم سے وجود میں آنے کے لیے بے قرار ہیں اور صرف ایک لمحے کا انتظار کر رہے ہیں، اس ایک لمحے کا جب اس کی زبان سے حرفِ فریاد بلند ہو گا اور بات اس کے ہونٹوں سے نکل کر پرائی ہو جائے گی... تو کیا وہ خاموش رہے؟ اس لٹیرے کی بات کا اعتبار کر کے اور یہ سوچ کر کسی کو کچھ نہ بتائے کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ جو ہو چکا اس پر رو دھو کر چپ ہو رہے اور اپنی زندگی کی کشتی کو گرداب سے بچا لے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کیا... عبید اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن وہ ایک مشرقی شوہر تھے۔ اس حادثے کا ان پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ پھر یہ تنہا ان کی ذات کا معاملہ نہیں تھا۔ ان کا اپنا ماحول تھا، گو زیادہ وسیع نہیں تھا مگر ایک حلقۂ احباب تھا۔ ان کی اپنی عزت تھی۔ وہ کس کس سے نظریں چرائیں گے، کس کس سے احوال بیان کریں گے۔ زندگی بھر وہ نظر بھر کر بیوی کی طرف نہیں دیکھ سکیں گے اور شاید وہ خود بھی ان کی طرف نہ دیکھ سکے۔ ان کی ازدواجی زندگی کا کیا انجام ہو گا۔ اپنے شریف النفس اور خاموش طبع شوہر کا دبلا پتلا چہرہ عصمت کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ اسے اس چہرے پر بے پناہ ترس آیا اور آنکھوں میں آنسو دوگنا ہو گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ سادہ دل عبید اس طوفان کا کیسے مقابلہ کر سکیں گے۔ کیسے پورے اتریں گے اس امتحان پر

Such Ki Sooli by Tahir Javed Moughal Suspense March 1990.pdf

وہ تو پہلے ہی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے جان ہلکان کر رہے تھے۔ ایک پرائیویٹ ادارے میں چھ سات ہزار کی تنخواہ کیا تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔ نہ تو ان کے پاس وافر پیسہ تھا اور نہ اعلیٰ اپروچ۔ وہ اس صورتِ حال کے تقاضوں کو کیونکر پورا کریں گے؟ بے چارے! آزمائش کی اس چکی میں اناج کی طرح پس جائیں گے۔

پھر یہ تنہا اس کے شوہر کا معاملہ نہیں تھا۔ اس کے والدین، عزیز و اقارب، خاندان بلکہ پوری برادری، ہر جگہ اور ہر مقام پر اس کی بدنامی کے جھنڈے لگیں گے۔ کئی سر جھکیں گے اور کئی پیشانیاں عرق آلود ہوں گی... اور یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کیا وہ انصاف پا سکے گی؟ یہ سوال ایک آسیب کے مانند اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ باوردی پولیس کے چاق و چوبند دستے جیسے سلامی دیتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ توانا سینے، مضبوط بازو، چمک دار آنکھیں، لیکن ہر جسم کے اندر اسے ایک اور جسم نظر آیا۔ ہر وردی میں ایک روایتی تھانے دار چھپا ہوا تھا۔ سخت گیر، غصیلا، تلخ کلامی کرنے والا اور... اپنی تنخواہ سے غیر مطمئن۔ یہ ایک شخص نہیں تھا۔ اس جیسے کئی اشخاص عصمت اور عدالت کے درمیان کھڑے تھے۔ پھر عصمت کو وہ اخباری خبریں یاد آئیں جن میں زیادتی کا شکار ہونے والی عورتوں کو عدالت کے کٹہرے میں کوٹ کیا جاتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ اس حوالے سے اس نے کیسے کیسے خوف ناک فقرے پڑھے تھے۔ کیسی کیسی گالیاں تھیں جو وکلائے صفائی نے ان بدقسمت عورتوں سے اگلوائی تھیں۔ وہ کاتب اٹھی تو کیا یہ سب کچھ اسے بھی زبان پر لانا پڑے گا۔ اسے بھی اپنے زخم کھول کھول کر دکھانے پڑیں گے؟ اور اگر وہ ایسا کر بھی گزری، اس نے یہ سارے عذاب جھیل بھی لیے تو کیا انصاف اس کے پارہ پارہ جسم پر مرہم رکھ سکے گا اور اگر یہ مرہم مل بھی گیا تو بعد ازاں اس چارہ جوئی کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے کانوں میں لیٹرے کے الفاظ گونجے: "میں تو جل دیا بدیر تجھوٹ ہی جاؤں گا مگر تمھاری ساری زندگی حرام کر دوں گا۔" اس نے بے اختیار ہو کر ہاتھ بڑھایا اور میز پر رکھی شوہر کی تصویر کو پکڑ کر سینے سے بھینچ لیا۔ یقیناً اس متلک شخص نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کا منحوس سراپا عصمت کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ غالباً وہ اسی علاقے کا تھا۔ شاید عصمت نے اس سے پہلے اسے دیکھا بھی تھا۔ کہاں؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ کسی وڈیو سینٹر کے باہر، کسی دکان کے تھڑے پر، کسی گرلز اسکول کے سامنے یا پھر سڑک پر موٹر سائیکل لہراتے ہوئے۔ وہ اسی بستی کا فرد تھا، مگر غم و اندوہ کی حالت میں عصمت کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ دل نے پکارا: 'عصمت! ایک خطرناک شخص سے ابدی دشمنی مول نہ لو۔ تمھارے پاس گنوانے کو اب بھی بہت کچھ ہے

> ایک وکیل، خاتون گواہ پر بڑی سخت جرح کر رہا تھا۔ مگر خاتون بڑی ہوشیاری سے وکیل کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی اور کسی طرح وکیل کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر اس نے وکیل کو لاجواب کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا: "وکیل صاحب! میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں آخر سچ سے میری شادی ہوتی ہے۔"
>
> "وہ تو ٹھیک ہے۔" وکیل سنجیدگی سے بولا۔ "مگر یہ بتائیں کہ آپ بیوہ کب ہوئیں؟"

لیکن اس لوفر کے پاس شاید کچھ بھی نہیں۔'

ایک طویل آہ بھر کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ مگر پھر فوراً ہی تصویر کا دوسرا رُخ اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے سوچا... عصمت تو نے اب تک کوئی جرم نہیں کیا لیکن اب ایک مجرم کی پردہ پوشی کر کے تو یقیناً جرم کا ارتکاب کرے گی۔ تیری خاموشی ایک لٹیرے کے حوصلے کو پر لگا دے گی۔ اگر وہ گیدڑ ہے تو اب شیر ہو جائے گا، شیر ہے تو بلا بن جائے گا پھر وہ اس جرم کو زیادہ بے باکی اور زیادہ قدرت سے دہرائے گا۔ شکار تو نہیں ہو گی تو کیا ہوا، شکاری کے ہاتھ کو قوت تو تیری بخشی ہوئی ہو گی اور اس طرح ہر خون ناحق میں تو غائبانہ قاتل کی تائید کرے گی! اس کا دل ہولنے لگا۔ اندر کی آواز نے پکار کر کہا: یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ آئندہ کے لیے تجھے معاف ہی کر ڈالے۔ شیر کے منہ کو خون لگتا ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ پاگل پن اس سے کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ایک وعدے کی تو اہمیت ہی کچھ نہیں، اپنے شفیق اور مہربان باپ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی: بیٹی! سچائی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ سچے لوگوں کی نصرت کے لیے آسمان سے فرشتے اترتے ہیں۔'

وہ اس فقرے پر دیر تک غور کرتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے اندر حوصلہ پیدا ہونے لگا۔ خوف کی جگہ ایک طرح کا طیش دل میں جگہ بنانے لگا۔ وہ مختلف انداز سے سوچنے لگی۔ مگر پھر اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی۔ اس نے گھڑی کی سرکتی سوئیوں کو دیکھا۔ ساڑھے چار بجنے میں صرف پون گھنٹا باقی ہے۔ پون گھنٹے بعد کامران سائی لے گا۔ عبید ہنستا مسکراتا چہرہ لیے اندر داخل ہوں گے۔ ان کے بریف کیس میں اسٹیج ڈرامے کے دو ٹکٹ ہوں گے! ہیلو... دیکھو وہ پورچ سے پکار کر کہیں گے، جلدی سے ایک کپ کافی اور پھر تھوڑا سا ریسٹ۔ شام کو ڈراما دیکھنے چلیں گے۔'

میں بہت اوٹ پٹانگ لڑکی مشہور ہوں۔ کوئی میرے تعلیمی کیریئر پر ہی نظر ڈالے تو اسے میرے اوٹ پٹانگ ہونے کا پورا یقین آجائے گا۔ بچوں کی تعلیم نرسری یا پری نرسری سے شروع ہوتی ہے۔ میری فورتھ کلاس سے شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں گھر ہی میں پڑھتی رہی تھی۔ کس سے؟ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں۔ بس آپوں آپ ہی سب کچھ میری سمجھ میں آتا چلا گیا تھا اور جب اسکول میں داخل کرنے کے لیے میرا ٹیسٹ لیا گیا تو میں فورتھ کلاس کے معیار پر پوری اتری تھی۔ اس سے آگے کی کارستانیاں ملاحظہ فرمایئے۔ مڈل بورڈ کا امتحان میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا لیکن میٹرک میں فیل ہوتے ہوتے بچی تھی۔ ایف ایس سی میں میں نے سارے خاندان کو حیران کردیا تھا کیونکہ اپنے حاصل کردہ نمبروں کے بل بوتے پر میں بہ آسانی میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکتی تھی لیکن میں اپنے کرم فرماؤں کو زیادہ سے زیادہ حیران کرنا چاہتی تھی لہٰذا میں نے میڈیکل کالج کی طرف آنکھ اٹھا کر

ایک شریر لڑکی کی ہنستی مسکراتی کہانی

زندگی کو انفرادیت اور رانو کے پن سے گزارنے کا شوق بُرا نہیں... تاوقتیکہ یہ شوق دوسروں کے لیے بارِگراں ہوجائے۔ وہ پوسٹ مین بھی ایسی ہی ایک معیت سے دوچار ہوگیا تھا۔ جان چھڑانے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔



طاہر جبوری نقل

بھی نہیں دیکھا تھا اور اپلائڈ سائیکالوجی میں ایم ایس سی کی ٹھان لی تھی۔ ہے نا مزے کی بات ـــــ اسی کا نام تو انفرادیت ہے۔ اس انفرادیت میں اس وقت تو چار چاند لگ گئے جب چار سال بعد سائیکو جسٹ بننے کے بعد میں نے خٹراپ سے غوطہ لگایا تھا اور نیچے ہی نیچے تیرتی جانکلی تھی جرنلزم کی طرف۔ یوں میڈیکل کے مضامین کے ساتھ ایف ایس سی کرنے والی سائیکو جسٹ بننے کے بعد ایک مقامی روزنامے میں فیچر رائٹر بھرتی ہو گئی تھی۔ یہ چاولوں سے بھری دیگ میں سے ایک دانے کی مثال میں نے آپ کو دی ہے۔ میری تعلیمی مصروفیات کی طرح میری ہر مصروفیت اسی انفرادیت اور انوکھے پن سے عبارت ہے اور انشاء اللہ رہے گی۔ آج میں اوٹ پٹانگ لڑکی ہوں تو کل اوٹ پٹانگ عورت کہلاؤں گی اور ہو سکتا ہے دادی، نانی بننے تک بھی یہ اوٹ پٹانگ کا لاحقہ کسی نہ کسی طور مجھ سے منتسب رہے۔ آج میں اپنی اوٹ پٹانگ زندگی میں سے ایک واقعہ آپ کو سنانے والی ہوں۔ یہ منتخب واقعہ ہے اس لیے ظاہر ہے زیادہ اوٹ پٹانگ ہو گا لیکن اس کے ساتھ یہ میری زندگی کا اہم ترین واقعہ بھی ہے۔

بطور فیچر رائٹر میری ملازمت کو دو تین ماہ ہی ہوئے تھے جب میں نے ایک مفلوک الحال مصیبت زدہ پوسٹ مین کا سراغ لگایا۔ یہ پوسٹ مین لاہور کی ایک مضافاتی آبادی میں تعینات تھا اور اس کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ بات مشہور تھی۔ کوئی بہت مالدار خبطی ہاتھ دھو کر اس پوسٹ مین کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس نے پوسٹ مین کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی اور یوں بنا رکھی تھی کہ کوئی اس پر انگلی اٹھا سکتا تھا نہ موردِ الزام ٹھہرا سکتا تھا۔ بلکہ محکمۂ ڈاک بھی مجبور تھا کہ اپنے ملازم کو ناکردہ گناہ کی سزا دینے میں اُس مالدار خبطی کی مدد کرے۔ اس سزا سے بچنے کے لیے وہ پوسٹ مین پچھلے چھ ماہ میں کم و بیش تین دفعہ مختلف ڈاک خانوں میں تبادلہ کرا چکا تھا لیکن بے سود۔ اُس کے "مہربان" نے ہر بار اس کے نئے ایڈریس تک رسائی حاصل کر لی تھی اور بات پھر وہیں رہی تھی یعنی ڈھاک کے تین پات۔

میں معلوم کر چکی تھی کہ شاہد مراد نامی اس پوسٹ مین سے سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان کچی بستی کے ایک چائے خانے میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی رنگ برنگی ٹوسیٹر کار چائے خانے سے قریباً ایک فرلانگ پیچھے جامع مسجد کے سامنے برگد کے پیڑ تلے روکی اور ڈائری سنبھال کر چائے خانے کی طرف چل دی۔ تین کی چھت والا یہ چائے خانہ پوسٹ مینوں اور ڈاک خانے کے دیگر ملازمین کے ڈیرے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس وقت چونکہ ڈاک خانے میں چھٹی ہو چکی تھی لہٰذا اکثر بینچ خالی نظر آ رہے تھے۔ ان ڈور کرسیاں تو سبھی خالی پڑی تھیں۔ میں ایک کونے والی کرسی پر جا بیٹھی۔ ارد گرد موجود حضرات حسبِ عادت مجھے گھورنے لگے۔ چائے خانے کا جواں سال مالک خود بھاگا بھاگا آیا اور ادب سے جھک کر آرڈر کا طلب گار ہوا۔ میں نے پوچھا "شاہد نام کا ایک پوسٹ مین یہاں بیٹھا کرتا ہے، آج آیا ہے یا نہیں؟"

میرے منہ سے شاہد کا نام سن کر ملازم ذرا چونکا۔ پھر سنبھل کر بولا "ابھی تو نہیں آیا جی لیکن ـــــ" بات کرتے کرتے ایک دم اس کے تاثرات بدل گئے۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "بڑی لمبی عمر ہے جی ـــــ وہ دیکھیے ـــــ وہ آ رہا ہے سامنے سائیکل پر۔"

میں نے دیکھا خاکی وردی میں وہ نوجوان بڑے سُکھے سُکھے انداز میں پیڈل چلاتا چائے خانے کی طرف آ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ خوبصورت تھا۔ اسے دیکھ کر کسی چاکلیٹ فلمی ہیرو کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ اگر یہ نوجوان قیمتی لباس میں ہوتا اور مرسڈیز گاڑی دروازہ کھول کر اترتا تو یقیناً شہزادہ لگتا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے درمیان ایک لرزہ بر اندام تپائی پر چائے کی پیالیاں رکھی تھیں۔ شاہد نامی یہ پوسٹ مین اتنی بات تو جان گیا تھا کہ میں اس سے انٹرویو قسم کی چیز لینا چاہتی ہوں لیکن یہ انٹرویو کس حوالے ہو گا، اس بارے میں وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔

اصل موضوع پر آنے سے پہلے میں نے دس پندرہ منٹ اِدھر کی باتیں کیں اور شاہد کی جھجک دور کرنے میں خاصی حد تک کامیاب رہی۔ جب وہ کھل کر باتیں کرنے لگا تو میں نے اس ملازمت اور روزگار کے حوالے سے بات شروع کر دی۔ میں نے کہا۔

"شاہد صاحب! سنا ہے کوئی شخص ـــــ بلکہ یہ کہنا چاہیے کوئی خبطی شخص ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور بڑے عجیب ڈھنگ سے آپ کو پریشان کر رہا ہے۔"

شاہد نے ایک گہرا سانس لیا۔ جیسے اسے پہلے ہی پتا ہو کہ کس موضوع پر بات کروں گی۔ وہ سر جھکا کر کچھ دیر اپنے گھونگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا پھر بولا "پریشانی ایک معمولی لفظ ہے میڈم ـــــ میری تو زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ بے بائی واوے ـــــ آپ کیا جانتی ہیں میری پریشانی کے بارے میں۔"

میں نے کہا "قریباً سبھی کچھ۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں تم ڈاک خانوں میں تبادلہ کروایا ہے لیکن کہیں بھی چین سے کام نہیں کر سکے۔ شہر کے جس ڈاک خانے میں تمہارا تبادلہ ہوتا ہے اچانک ڈاک کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ یہ ڈاک بھاری بھرکم پارسل پر مشتمل ہوتی ہے اور اسی "زون" میں تقسیم کی جانا ہوتی ہے۔ تم ڈیوٹی پر ہوتے ہو۔ بعض اوقات یہ تمام پارسل ڈیڑھ دو گز ہوتے ہیں۔ پہلے پہل تم یہ سارا وزن پیٹھ پر لاد کر تقسیم کرتے تھے پھر تم نے سائیکل لے لی لیکن یہ بھی کوئی آسان کام نہیں سائیکل پر اتنا وزن لاد کر گلی گلی پھرنا اور بعض اوقات رات تک ڈاک بانٹتے رہنا بے حد کٹھن ڈیوٹی ہے۔"

شاہد مراد پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "سب کچھ ٹھ

جانتی ہیں پھر انہوں نے کس بات کا پہلے آئی ہیں۔"
میں نے کہا "بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ میں چاہتی
اس مشکل سے نکلنے میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے
ضروری ہے کہ سب کچھ میرے علم میں ہو۔"
وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے میری بات پر اسے
یقین نہ آیا ہو۔ میں نے کہا "یوں حیرت سے نہ دیکھو۔ پریس میں
بڑی طاقت ہوتی ہے۔ حکومتیں الٹ دیتا ہے۔۔۔۔ اور یہاں تو صرف
ایک الجھے ہوئے دماغ کو سیدھا کرنا ہے۔"
وہ بولا "دیکھئے میڈم میں غریب آدمی ہوں اور سات افراد کا
واحد کفیل۔ نوکری چلی گئی تو خودکشی کی نوبت آجائے گی۔"
"تمہاری مرضی کے خلاف میں کچھ نہیں کروں گی۔" میں نے
اسے تسلی دی۔ "پھر یہ ضمانت بھی دیتی ہوں کہ خدانخواستہ نوکری پر
زد پڑ گئی تو تمہیں اس سے بہتر نوکری دلواؤں گی۔"
میرا پُراعتماد لہجہ اس کے چہرے سے اندیشوں کی پرچھائیاں
سمیٹ رہا تھا اور وہ خود کو کافی "ایزی" محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھ
سے اجازت لے کر اس نے ایک سستے برانڈ کا سگریٹ بڑے
اسٹائلش انداز میں سلگایا اور چھوٹے چھوٹے کش لینے لگا۔ بولا
"میڈم! میری مصیبت کا آغاز تقریباً ایک برس پہلے ہوا تھا میں
گلبرگ نمبر دو کے ڈاک خانے میں تھا۔ یہ امیر کبیر لوگوں کا علاقہ
ہے۔ چار چار چھ چھ کنال کی کوٹھیاں عام ہیں۔ ایسی ہی ایک کوٹھی
"نور فوٹو ریز" والوں کی ہے۔ بڑا مشہور نام ہے یہ۔ آپ نے بھی
سنا ہوگا۔ بڑے ماڈرن لوگ ہیں یہ اور بہت دھڑلے والے۔ میں
اس کوٹھی میں بھی ڈاک دینے جاتا تھا۔ یہیں پر ایک لڑکی میرے
پیچھے پڑ گئی۔ آواز سے تو وہ لڑکی ہی لگتی تھی۔ میں نے کبھی اس کی
صورت نہیں دیکھی۔ وہ ہمیشہ دروازے کے پیچھے رہی اور جو بک
بک بھی کی دروازے کی اوٹ سے کی۔ یہ لوگ شرم، جھجک اور
پردے وغیرہ کے قائل تو ہوتے نہیں۔ وہ میرے سامنے بھی آجاتی تو
کوئی بات نہیں تھی لیکن وہ تو شرارت کر رہی تھی مجھ سے، اور
شرارت بھی ایسی کہ ہر روز ناک میں دم کر دیتی تھی میرا۔ مجھے روز
ان کی کوٹھی جانا پڑتا تھا کیونکہ وہ اپنے پتے پر خود ہی خط پوسٹ کرتی
تھی۔ لیٹر بکس اس نے گیٹ سے اتروا دیا تھا لہٰذا مجھے ڈاک دینے
کے لیے اندر جانا ہوتا تھا۔ عموماً وہی دروازے کے پیچھے سے ڈاک
لیتی اور پھر ان پڑھ عورتوں جیسا لہجہ بنا کر کہتی کہ میں اسے خط پڑھ
کر سناؤں۔ یہ خط وہ اپنے ایک فرضی منگیتر رب نواز کی طرف سے
لکھتی تھی۔ رب نواز اپنے خط میں اسے زینب یا زیبے کہہ کر
مخاطب کرتا تھا۔ مثلاً وہ لکھتا "زینب! آج کل میں فیصل آباد میں
ہوں۔ ایک پولٹری فارم پر مرغیوں کے نیچے سے انڈے نکالتا ہوں۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی مرغی کبھی چھوٹا اور کبھی بڑا انڈا کیوں
دیتی ہے اور وہ بھی اپنی مدد آپ کے تحت۔ پتا نہیں کیسی کیسی
خوراکیں ڈالتے ہیں مرغیوں کو۔"

کبھی وہ لکھتا۔ "دیکھیے آج کل میں امرسد ھو میں ہوں یہاں ایک گجر کے ہاں بھینسوں کا دودھ دوہتا ہوں۔ کل میں اندھیرے میں غلطی سے بالٹی لے کر ایک کتے کے نیچے جا بیٹھا۔ اس نے ٹکر مار کر میرا بھیجا ہلا دیا ہے۔ ایک کے چار چار نظر آرہے ہیں۔ رات خواب میں بھی مجھے تمہارے ایک چہرے کی جگہ چار نظر آئے۔ اس حساب سے تمہاری جدائی کا غم بھی چار گنا ہو گیا ہے۔" ایک مرتبہ اس نے خط میں ہیر وارث شاہ کے کئی صفحے نقل کر دیے۔

میں جانتا تھا یہ سب فراڈ ہے۔ نہ کوئی رب نواز ہے اور نہ زینب۔۔۔ بس ستانے کا بہانہ ہے۔ وہ یقیناً بہت پڑھی لکھی لڑکی تھی اور میرے ساتھ ڈراما کر رہی تھی۔ گھر کے نوکر چاکر بھی یہ بات سمجھتے تھے۔ میں جب دروازے کے پاس کھڑا ہو کر اوٹ پٹانگ خط پڑھنے میں مصروف ہوتا تو وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے۔ اہلِ خانہ میں سے بس ایک ادھیڑ عمر عورت ہی کبھی کبھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چہرا ٹماٹر کی طرح سرخ اور تر و تازہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بھی اس شرارت سے واقف ہے لیکن لاڈ پیار کی وجہ سے چشم پوشی کر رہی ہے اور پھر ایک روز انتہا ہو گئی۔ اس کم بخت نے مجھ سے اظہارِ محبت کر دیا۔ بولی "میرے منگیتر نے مجھے روز روز خط لکھ کر اچھا نہیں کیا۔۔۔ نہ تم روزانہ یہاں آتے اور نہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوتی۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

اُس روز میں نے سخت لہجے میں کہا تھا "میں جانتا ہوں مس صاحب! آپ مجھے تماشا بنا رہی ہیں۔ آج کے بعد میں یہاں نہیں آؤں گا۔"

اور واقعی پھر میں وہاں نہیں گیا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی پوسٹ مین فدا محمد سے درخواست کی اور وہ "تور ہاؤس" کی ڈاک خود پہنچانے لگا۔ ایک روز اُس لڑکی نے فدا محمد کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا کہ میں خود ڈاک لے کر آیا کروں ورنہ مجھے پچھتانا پڑے گا۔

میں نے اس دھمکی پر کان نہیں دھرا۔ پھر ایک روز ڈاک خانے کے پتے پر مجھے اُس لڑکی کا لمبا چوڑا ہاتھ سے لکھا خط ملا۔ کوئی پیچ ڈھیلا لگتا تھا اس کا۔ عجیب الٹی سیدھی باتیں لکھی تھیں۔ میں نے خط پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے آٹھ دس روز بعد میرے زون کے پتوں پر بھاری بھرکم پارسل موصول ہونے لگے۔ یہ پارسل "حسنات سنز" نامی کمپنی کی طرف سے ہوتے تھے اور ان لوگوں کے لیے ہوتے تھے جو اس ادارے کو جانتے تک نہیں تھے لیکن ظاہر ہے پارسل وصول کرنا کون پسند نہیں کرتا۔ پارسل عموماً وزنی لیکن سستی چیزوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ مثلاً لکڑی کے ڈیکوریشن پیس۔ بھاری بھرکم کتابیں، کپڑا، شیشے کی مصنوعات اور کبھی کبھی تو کسی پارسل میں سے صرف ایک پتھر برآمد ہوتا تھا۔ یہ پتھر بعض اوقات "پارسل کی آخری حد" یعنی دس کلو کو چھو جاتا تھا۔ ساتھ میں ایک چٹ پر تحریر ہوتا تھا "دریائے نیلم کا خوبصورت پتھر۔ آپ کے ایکوئرنگ روم کی زینت کے لیے۔" منجانب حسنات سنز۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دو تین ہفتے جیسے تیسے یہ سب برداشت کیا۔ میرا خیال تھا کہ سلسلہ بند ہو جائے گا لیکن وہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔ ڈاک خانے کا سارا عملہ حیران تھا۔ ان میں سے بیشتر حقیقت حال جانتے تھے لیکن کیا کر سکتے تھے۔ میں نے پوسٹ ماسٹر سے شکایت کی تو انہوں نے میری ایوانی ایک دوسرے زون میں کر دی۔۔۔ چند ہی دنوں بعد پارسلوں کے دھارے کا رخ اس جانب ہو گیا۔ قانونی طور پر پوسٹ ماسٹر صاحب بھی مجبور تھے۔ بے قاعدگی شرارت تھی لیکن اس "شرارت" پر باقاعدہ ٹکٹیں لگی ہوئی تھیں اور مکمل ایڈریس موجود ہوتے تھے۔ ان پارسلوں کو ڈاک خانے میں روکنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں روتا پیٹتا دو ڈھائی ماہ تک یہ بوجھ گھسیٹتا رہا۔ سخت گرمی میں پارسلوں والی بوری کمر پر لاد کر گلی گلی گھومنا ایک جان لیوا عذاب تھا۔ آخر پوسٹ ماسٹر کو مجھ پر ترس آگیا اور انہوں نے ڈاک خانے سے میرا تبادلہ میرے گھر کے قریب والے ڈاک خانے میں کروا دیا۔۔۔ یہاں صرف ایک ہفتہ سکون رہا۔ ایک روز میں خوش خوش ڈاک خانے پہنچا تو چھانٹی کی الماری کے سامنے میرے لیے پارسلوں کا انبار نظر آرہا تھا۔ قریباً چوبیس روپے پانچ کلوگرام کے حساب سے ان تین من پارسلوں پر صرف اخراجات ڈاک کی مد میں چھ سات سو روپے کی لاگت آچکی تھی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو ایک ہی بار یہ حرکت کر کے سال بھر روتا رہتا لیکن تور ہاؤس میں رہنے والی کو اس خرچے کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ شغل بغیر کسی وقفے کے کئی سال جاری رکھ سکتی ہے۔۔۔ اور میڈم صاحبہ۔۔۔ اس نے جاری رکھا ہوا ہے۔ پورے دس مہینے ہو گئے ہیں۔ کسی مہینے شاید ایک دو ناغے ہو گئے ہوں ورنہ پارسل باقاعدگی سے مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔ ڈاک خانہ بدلنے کے بعد صرف ایک ہفتہ سکون سے گزرتا ہے اور پھر وہی مصیبت گلے لگتی ہے۔ کبھی کبھی میرا کوئی ساتھی ترس کھا کر چند روز میرا ہاتھ بٹاتا ہے لیکن کب تک؟ یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔۔۔ اب تو میڈم صاحبہ! خوابوں میں بھی پارسل ہی وصول کرتا رہتا ہوں۔ عجیب عجیب خواب آتے ہیں۔ ابھی کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ حسنات سنز والوں نے کئی ہزار گز لمبے قصیلے کو ہمالیہ کی ایک چوٹی پارسل کر کے بھیج دی ہے۔ میں جنرل پوسٹ آفس کے سارے عملے کے ساتھ مل کر یہ ملک بوس پارسل اپنی سائیکل پر رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور سائیکل ہچکولے کھاتی چلی جا رہی ہے، پچکتی چلی جا رہی ہے۔"

ٹھنڈی سانس لے کر پوسٹ مین شاہد مراد چپ ہو گیا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ ترس آرہا تھا بے چارے کی صورت پر۔

میں نے پوچھا "یہ حسنات سنز کون ہیں۔ تم نے پتا کروایا؟"

شاہد کا جواب اثبات میں تھا۔ بولا "ٹاؤن شپ کے علاقے

شل ویئر کا ایک دفتر ہے۔ کوئی حسنہ نامی سوشل ورکر مالک ہے۔ وہ خود تو انگلینڈ رہتی ہوئی ہے اس کی لڑکی دفتر میں بیٹھتی ہے۔ کوئی ہے "پارسل ہم بھیجتے ہیں' بس ہماری مرضی ہے ہم بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ یہ پارسل پہنچاتے ہیں' نقصان تو نہیں کرتے۔ ہیں۔ لوگوں کو فائدہ ہی پہنچاتے ہیں' تفنن تو نہیں کرتے۔ ہو ورہاؤس والی لڑکی "آفت" کی نانی ہے۔"

میں نے کہا "بھئی! اگر تمہیں یقین ہے کہ اس شرارت کی جڑ ہو ورہاؤس والی لڑکی ہے تو اس کے بزرگوں سے ملے ہوتے تم۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ چارہ بھی کر چکا ہوں۔ اپنے ملانے کے پوسٹ ماسٹر اور کونسلر کو ساتھ لے کر گیا تھا نور فونڈریز کے ہیڈ آفس میں۔ وہاں اسسٹنٹ منیجر صاحب ملے۔ خورشید احمان ہے ان کا۔ انہوں نے ہمدردی سے ہماری بات سنی اور ہمیں ہدایات میں لے آئے۔ کہنے لگے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ جس لڑکی کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس کا نام ثوبیہ رحمان ہے۔ وہ بڑے صاحب کی لاڈلی بیٹی ہے۔ اپنی طرز کی انوکھی چیز ہے لیکن اس کے بارے میں بڑے صاحب سے شکایت کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کریں گے' چاہے وہ سچی بھی معقل ہو۔ میرا برادرانہ مشورہ ہے کہ آپ فی الحال جیسے تیسے اس مصیبت کو جھیلیں۔ امکان ہے کہ بڑے صاحب جنوری کے آخر میں امریکا چلے جائیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ صاحبزادی کو وہاں کسی تعلیمی ادارے میں بھرتی کرانے کا ارادے رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ کی جان خود بخود چھوٹ جائے گی۔"

میں نے شاہد سے پوچھا "پھر ــــ وہ گئے یا نہیں؟"

"ہاں جی۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "جنوری گزر گیا۔ اب دوسرا جنوری آنے والا ہے۔ مگر میری مصیبت آسان نہیں ہوئی۔ مشکل پتے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور وزنی پارسل تقسیم کر کر کے نڈھال ہو چکا ہوں۔ پچھلے مہینے تو کیس بنتے بنتے رہ گیا ہے مجھ پر ــــ غلطی سے میں نے کچھ پارسل چوہدری کے گندے نالے میں پھینک دیئے۔ آٹھ دس روز بعد ہی "کمپلین" آ گئی کہ فلاں فلاں کے پتے پر فلاں فلاں پارسل نہیں پہنچا۔ ساتھ میں رسیدوں کے فوٹو کاپیٹ تھے۔ وہ تو پوسٹ ماسٹر صاحب میرے درد آشنا تھے۔ انہوں نے کوشش کر کے اس معاملے کو دبایا اور انکوائری سے میری جان چھڑائی۔ خدا کی قسم بہت عاجز آ چکا ہوں میں۔ یوں لگتا ہے اس کم بخت نے "مستقل" بندے چھوڑ رکھے ہیں میرے پیچھے ــــ اگر نوکری چھوڑ کر ایک وقت کی روٹی ملنے کا امکان بھی ہوتا تو میں کب کا ادھر بھیج چکا ہوتا اس ذلت کی تنخواہ پر۔"

کچھ دیر ہم دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی حائل رہی۔ پھر میں نے پوچھا۔ "شاہد صاحب ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکی سچ مچ تم سے پیار کرتی ہو۔ تم نے کہا ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے وہ سنجیدہ ہو' تمہیں اس سے بات تو کرنی چاہیے تھی۔"

"کیسی بات کرتی ہیں میڈم! آپ کبھی بھی یہ نہ خیال کریں۔ کیا آپ سوچ سکتی ہیں کہ کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی مجھ ایف اے پاس پوسٹ مین سے شادی کرے گی؟"

"لیکن ایسی کہانیاں بھی تو اسی دنیا میں ہوتی ہیں شاہد صاحب۔ میں خود ایسی کہانیوں کی عینی شاہد ہوں۔ ہر کام ہونے کا ایک سبب ہوتا ہے۔ اس مزاج کے لوگ وجہ کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ تم کسی کے گمان میں بھی نہیں ہو گے ــــ"

"لیکن میں اس بات کو نہیں مانتا۔ کوئی شوق نہیں ہے مجھے جھوٹے کا اور انوکھلاتے کا۔"

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "دیکھو شاہد! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس لڑکی سے تمہاری ملاقات کرائے تم دونوں کی صلح کرا دوں گی۔ اس ملاقات میں یہ پتا بھی چل جائے گا کہ وہ شکل و صورت کی کیسی ہے اور یہ ایشو بھی ہو جائے گا کہ وہ تمہارے بارے میں سنجیدہ ہے یا نہیں لیکن ایک بات پر تم بھی "گیری" کرو۔ اگر وہ سنجیدہ ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتی ہے تو تم کسی طرح کا احساس کمتری اپنے قریب نہیں پھٹکنے دو گے اور اس سے شادی کر لو گے۔"

شاہد مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جیسے میری ذہنی حالت پر شک کر رہا ہو۔ مسکرا کر بولا "آپ اخبار میں کام کرتی ہیں۔ جن پریوں کی کہانیاں لکھتی ہیں۔"

میں نے کہا "کہانیاں بھی لکھتی ہوں اور اسی لیے مجھے پتا ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے انوکھے لوگ پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے انوکھے کام کر گزرتے ہیں۔ یہ لوگ فطرتاً چھڑے باز ہوتے ہیں۔ گینز بک آف ریکارڈز ایسے ہی لوگوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ میں نے کہا "بتاؤ اگر وہ تمہارے بارے میں واقعی سنجیدہ ہوئی تو شادی کر لو گے اس سے؟"

وہ مسکرا کر بولا "میڈم صاحب! اس پارسلوں والی مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے میں پھولن دیوی اور الزتھ ٹیلر سمیت کسی بھی عورت سے شادی کر سکتا ہوں۔"

"الزتھ ٹیلر" میں نے ٹیلر کی "ے" کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ "اس کے گھٹنوں میں تو سنا ہے پانی پڑ گیا ہے۔"

وہ بولا "اور میرے گھٹنے بھی جواب دینے والے ہیں ایک دو مہینے میں۔" اس کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا۔ وہ میری باتوں کو ابھی تک سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔

بہرطور یہی بہت تھا کہ اس نے اقرار کر لیا تھا ــــ میں اسے خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔

ــــ میں نے کہا تھا ناں کہ میں ایک عجیب غریب لڑکی ہوں۔ آج میں شاہد مراد کی بیوی ہوں۔ وہ "نور فونڈریز" کی نیشنل تباہ برانچ کا منیجر ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے "ثوبیہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ جواب میں میں کہتی ہوں۔ "وہ تمہارا پارسل" اور وہ مجھے پکڑنے دوڑتا ہے ــــ آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے میں کون ہوں۔" ★

انسان کی خیر کے حصار میں گردش کے لاوے میں جلتے ہوئے شخص کی تاخیر پسند لات کا افسانہ

طاہر جاوید مغل

تاخیر پسند

قارئین کے بہت اصرار پر اس ماہ آخری صفحات میں طاہر جاوید مغل کی مختصر سی تحریر پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اُس کے گمنام اور متذبذب شخص کی داستان ہے جس سے ہر معاملے میں تاخیر ہو جاتی تھی۔ لڑکپن کی عجلت پسندی اور نوجوانی کی بے چینی بھی اس پر گویا اثر انداز ہوئے بغیر ہی گزر گئیں مگر ایک لمحۂ مہیب تھا کہ جس نے اُسے اپنے حصار میں لے کر ٹھکانے نہ دیا۔ اس جاں فزا لمحے اور اپنی جاں سوز فطرت کا وہ اسیر خود سے دست و گریباں تھا اور جذبوں کے تضاد کا شکار! اپنی نیک نامی کا بوجھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور گمنامی اُسے مجبوری کی صورت لاحق تھی۔ ہر روز اس کے من میں خواہشات کے محل تعمیر ہوتے مگر تذبذب کا ایک لمحہ انہیں ٹیلوں زمیں بوس کر دیتا جیسے پہیری موج ساحل پر بنے ریت کے گھروندا کو ڈھا دیتی ہے۔ تذبذب اور خواہشوں... لہروں اور گھروندوں کا یہ کھیل جاری رہا اور وقت کا پرندہ اپنا سفر طے کرتا رہا اور وہ اُسی گلی کے چکر لگاتا رہا جو اس کے دل میں بھی آباد تھی مگر اس سے جڑا ایک ناقابلِ برداشت جرم کا احساس اُس کے دل میں جاگزیں تھا۔ اس کی سزا خود کو دینے کے لیے اپنی زمین اور اپنا آسمان چھوڑ کر بیرونی کے الاؤ میں جلنا قبول کیا مگر اچانک واقعات نے خود کو دُہرانا شروع کر دیا۔ وقت کا یہ تھپڑ اور کیفیات کی بازگشت اُسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔





محبوب احمد کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ اس نے سارہ کو سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ شاید وہ اپنے گھر کے صحن سے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ شاید وہ چھت پر کپڑے پھیلا رہی تھی۔ شاید وہ ٹیوشن سے پڑھ کر واپس آ رہی تھی۔ محبوب کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسے پہلے سارہ کی شکل سے پیار ہوا تھا یا اس کی آواز سے۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ بس یہ معلوم تھا کہ وہ ایکا ایکی اس گڑیا سی نازک اندام لڑکی سے پیار کرنے لگا ہے۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس کے نقوش میں زبردست موزونیت اور تناسب تھا۔ محبوب کو اس کے سراپا میں سب سے دلکش چیز اس کی پیشانی لگی تھی۔ بے حد باوقار اور خوب صورت پیشانی۔ جب وہ ہنستی تھی یا کسی بات پر بہت غور کرتی تھی تو اس پیشانی پر ایک رگ سی ابھر آتی تھی۔ محبوب احمد کا جی چاہتا تھا وہ اس رگ اور پیشانی کو دیکھتا چلا جائے۔ اپنے اردگرد کی ہر شے کو فراموش کر دے۔ حتیٰ کہ گزرے ہوئے وقت کو بھی۔ لیکن عملی طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ سارہ سے محبوب کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ دونوں صرف پڑوسی تھے اور پڑوسی بھی عارضی۔ مستقل گھر اسی آبادی کی ایک دوسری گلی میں واقع تھا۔ سن ۵۸ء میں جب محبوب کے والد سیالکوٹ سے لاہور آئے تھے تو انہیں اس متوسط بستی میں آٹھ دس مرلے جگہ اونے پونے داموں مل گئی تھی۔ یہاں دو تین کمرے پہلے سے تعمیر شدہ تھے۔ بارہ چودہ برس محبوب کے والدین نے انہی کمروں میں گزارہ کیا تھا لیکن اب چونکہ محبوب کے والد کا عینک سازی کا کام چل نکلا تھا اور مالی حالت بہتر ہو گئی تھی لہٰذا انہوں نے پرانی طرز کے کمرے گرا کر دو منزلہ مکان بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ محبوب کے والد وقار صاحب کا اندازہ تھا کہ مکان مکمل ہونے میں قریباً چار پانچ ماہ لگ جائیں گے۔ تعمیر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے سے کہیں بہتر تھا کہ وہ چند ماہ کے لیے علیحدہ سے کرائے کا مکان لے لیں۔ یہ مکان ڈھونڈنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی اور نومبر کی ایک سہانی صبح وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اس کرائے کے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ یہی مکان جس کے سامنے سارہ کا مکان تھا' اور جہاں زندگی کو ایک نئی راہ پر ڈالنے والے حسین واقعات محبوب کا انتظار کر رہے تھے۔

محبوب نے زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں۔ ہاں۔ وہی عمر۔ جب آنکھوں میں نشہ تیرتا ہے' جب سانسوں سے خوشبو پھوٹتی ہے' جب چال میں رقص کی سی کیفیت ہوتی ہے اور جب اپنی ہی اداؤں پر پیار آنے لگتا ہے۔

محبوب اٹھارہ سال کا تھا اور اس سن سے وابستہ ساری کیفیات اس پر بھی طاری ہوتی تھیں لیکن وہ اپنی کیفیات کا اظہار بہت کم کرپاتا تھا۔ ایک تو وہ فطرتاً کم گو اور اندرون بین تھا' دوسرے والدین کی طرف سے اس پر پابندیاں بھی بہت تھیں۔ خاص طور سے والد "سونے کے لقمے اور شیر کی آنکھ" والے محاورے کے قائل تھے۔ محبوب ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھا۔ گورنمنٹ کالج میں نظم و ضبط عام کالجوں سے کہیں زیادہ تھا۔ عموماً وہ ڈیڑھ دو بجے فارغ ہو کر گھر آتا تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر ذرا لیٹتا تھا تو سردیوں کی شام جھپٹ کر سر پر آن پہنچتی تھی۔ شام ہوتے ہی والد صاحب کے دوست پروفیسر ریاض صدیقی' محبوب اور اس کے چھوٹے بھائی عاطف کو پڑھانے آجاتے تھے۔ ریاض صدیقی صاحب جاتے تھے کہ والد صاحب تشریف لے آتے تھے۔ والد صاحب کے آنے کے بعد ممکن ہی نہیں ہوتا تھا کہ محبوب یا عاطف کہیں جاسکتے یا کسی تفریحی یا نیم تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے۔ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد جلدی بستر پر جانے کا حکم تھا اور اس حکم کی تعمیل اکثر انہیں کرنا پڑتی تھی۔

اتوار کا دن محبوب کے لیے قدرے فراغت اور مسرت کا دن ہوتا تھا۔ وہ دیر تک سوتا' چھت پر دھوپ سینکتا' کبھی اپنے لنگوٹیے دوست قدیر کے ساتھ اسکوٹر پر آؤٹنگ کے لیے نکل جاتا۔ کبھی کبھار چپکے چپکے فلم دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ وہ بھی اتوار کا ایک ایسا ہی سہانا اور چمکیلا دن تھا جب اپنے بالائی کمرے کی کھڑکی سے محبوب نے بڑے غور سے سارہ کو دیکھا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کے قریب جانے کی کوشش کرے گا۔ اس فیصلے کے بعد اس کے ذہن میں وہی خیال آیا جو اس عمر میں نوجوانوں کے ذہن میں اکثر آتا ہے۔ وہ اپنے دلی جذبات فریق ثانی تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ کسی خوب صورت شعر' کسی خوب صورت بات' یا اشارے کنائے کی شکل میں۔ بعض اوقات خط اور فون وغیرہ کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ فون تو ان دنوں اتنا عام نہیں تھا اور متوسط طبقے میں تو بالکل ہی نہیں تھا۔ اظہارِ جذبات کا بہترین ذریعہ خط ہی ہو سکتا تھا۔ اتوار کی بہت ساری سنہری دھوپ اور تازہ ہوا کا خسارہ برداشت کر کے محبوب ایک کمرے میں بند ہو گیا اور اس نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ سارہ کے نام ایک طویل خط لکھ دیا۔

اس محبت نامے میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی تحریر

تھی جو ہمیشہ سے لکھی جاتی رہی ہے اور پڑھی جارہی ہے لیکن یہ جب بھی لکھی جاتی ہے اس میں ایک نیا پن' ایک دلفریب تازگی خود بخود در آتی ہے۔ محبوب نے بڑے سلجھے ہوئے الفاظ بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کیے تھے۔ اپنی عقل سمجھ کے مطابق پوری کوشش کی تھی کہ کہیں کوئی عامیانہ پن نہ آجائے کوئی ایسا فقرہ جو "سارہ" کو برا لگے۔ خط مکمل کرنے اور اسے کئی بار پڑھنے کے باوجود اسے دس فیصد یقین بھی نہیں تھا کہ وہ یہ خط سارہ تک پہنچا سکے گا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید یہ خط اس نے صرف اپنے لیے لکھا ہے۔ جیسے کچھ مصور اور شاعر اپنی تصویریں اور نظمیں صرف اپنی تسکین کے لیے تخلیق کرتے ہیں۔ خود ہی دیکھتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ اس خط کو منزل تک پہنچانا محبوب کو اتنا دشوار نظر آرہا تھا جتنا کسی کے لئے بیساکھیوں کی مدد سے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنا' مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ اپنا اور سارہ کا درمیانی فاصلہ کم کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ خط کسی بھی صورت سارہ تک پہنچانا ہوگا۔

اس نے یہ خط ایک موہوم امید کے سارے سنبھال لیا۔ موہوم امید یہ تھی کہ شاید جو ہمت اسے درکار ہے وہ آج نہیں تو کل پیدا ہوجائے۔ اس کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ وہ کوئی کام کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کرپاتا تھا مگر وہ قطرہ قطرہ حوصلہ جمع کرتا رہتا تھا۔ خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرتا رہتا تھا اور آخر ایک مرحلہ آتا تھا کہ وہ یہ کام کر گزرتا تھا۔ بے شک ایسا کرتے ہوئے اسے تاخیر ہوجاتی تھی اور بعض اوقات وہ "کام" انجام پاکر بھی "بے انجام" ہی رہتا تھا لیکن اس مسئلے کا محبوب کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ شاید تاخیر اس کی فطرت میں شامل تھی۔ جلدی کی خواہش کے باوجود ہر کام میں دیر کرجانا اور پھر مہینوں اور سالوں اپنی ناکامی پر کڑھنا محبوب کی تقدیر تھا۔ سارہ سے اظہارِ محبت میں بھی محبوب نے بے وجہ تاخیر کی اور اس تاخیر کے سبب حسین و دلکش پیشانی والی سارہ اس سے دور چلی گئی۔

خط لکھنے کے بعد محبوب نے اپنی چرمی فائل کے اندرونی خانے میں رکھ دیا تھا۔ وہ تقریباً ہر روز اس خط کے بارے میں سوچتا اور یہ غور کرتا کہ اس خط کو سارہ تک کیسے پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ سوچ اس کی پیشانی پر پسینہ لے آتی اور اسے اپنی سانس بڑی تیزی سے چلتی محسوس ہوتی۔ ایک دو بار تو اس کے جی میں آئی کہ وہ خط پھاڑ ہی دے لیکن پھر کسی انجانی امید کے سہارے وہ اس کارروائی سے باز رہا۔ اس نے یہ محبت نامہ اپنے کالج کے ایک دوست پاشا کو بھی دکھایا۔ پاشا نے کہا۔

"یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ ایسا خط تو پکے سے پکا عاشق بھی نہیں لکھ سکتا۔ سچ بتاؤ اس سے پہلے کہاں کہاں ٹرائی ماری ہے۔"

محبوب نے کہا "اُلو کے! ایسی بات ہوتی تو تجھے ضرور بتاتا۔ خدا قسم اس سے پہلے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔"

"اور وہ جو بارہ شریف کے عشق میں گرفتار رہا ہے تو؟"

"ویسے عشق تو تُو نے بھی درجن بھر کیے ہوں گے۔ خیالی عشق اور اصلی والے عشق میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"بس یہی فرق ہوتا ہے کہ اصلی عشق میں اصلی جوتے پڑتے ہیں۔ ذرا سنبھل کے یار! یہ بڑا مشکل رستہ ہے۔ بڑوں بڑوں کا ڈھابا گول ہوجاتا ہے۔"

پھر ایک دن محبوب پر جیسے قیامت گزر گئی۔ اس نے الماری میں اپنی کتابیں ترتیب سے رکھتے ہوئے چرمی فائل دیکھی اور بھونچکا رہ گیا۔ خط' فائل میں موجود نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی ساری فائل کھنگالی۔ ایک ایک کتاب اور کاپی دیکھ ڈالی لیکن خط نہیں ملا۔ سردی کے باوجود پسینہ اس کے چہرے پر دھاروں کی صورت بہنے لگا "یا الٰہی یہ کیا ہوگیا۔ کہاں گیا وہ خط۔ کس کے ہاتھ لگا۔" والد' والدہ' باجی' عاطف' سب کی صورتیں ایک ایک کرکے اس کی نگاہوں میں گھومیں اور وہ عرقِ ندامت میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ منہ چھپا کر گھر سے نکلے اور کسی ویرانے میں جاکر بھٹک جائے۔ اس روز سارا دن وہ سہمے سہمے انداز میں اہلِ خانہ کی صورتیں تکتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا "راز" کس کے ہاتھ لگا ہے۔ بظاہر سب کچھ نارمل تھا۔ والدہ حسبِ معمول خوشگوار موڈ میں تھیں۔ باجی کے چہرے پر بھی خفگی نظر نہیں آئی۔ عاطف کی آنکھوں میں شرارت تو ہر وقت رہتی تھی لیکن کوئی خصوصی کیفیت وہاں بھی نظر نہیں آئی۔ رہی والد صاحب کی بات تو محبوب کو تسلی تھی کہ خط ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ کیونکہ ان کے ہاتھ لگتا تو پھر اب تک محبوب کے لیے زمین و آسمان ایک ہوچکے ہوتے۔ وہ "اچھے کام" میں دیر کرنے کے قائل ہرگز نہیں تھے اور اس سے اچھا کام اور کیا ہوسکتا تھا کہ پڑوس کی لڑکی کو محبت نامہ لکھنے کی پاداش میں محبوب کو کمرے میں بند کیا جاتا اور اس پر اتنا گھر جابرسا جاتا کہ کئی مہینے کے لیے اس کی طبیعت صاف ہوجاتی۔ ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا تھا' لہٰذا یہ بات سو فیصد یقینی تھی کہ وہ "مسلک خط" ابا حضور کے ہاتھ نہیں لگا۔ محبوب کے والد ایک مقامی کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر پڑھاتے تھے۔ عینک سازی کا کام انہوں نے پارٹ ٹائم کے طور پر شروع کیا

تھا جو کافی پھلا پھولا تھا۔

سارہ کے سلسلے میں محبوب کے تمام نرم گرم جذبات پر اوس پڑ گئی تھی اور وہ جو سرتاپا شعلہ بنا ہوا تھا' یک دم قلفی کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ محبوب کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا۔ سب صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور شریف النفسی کی وجہ سے انہیں گلی محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ محلے کی بچیاں محبوب کی والدہ کے پاس قرآن شریف پڑھنے آجاتی تھیں اور وہ بھی بڑی لگن اور محبت کے ساتھ گھنٹوں ان کو پڑھانے میں مصروف رہتی تھیں۔ گھر میں دو نوجوان لڑکے بھی تھے۔ اس کے باوجود لوگ اپنی نوعمر اور نوجوان لڑکیوں کو بلا جھجک ان کے ہاں بھیج دیتے تھے۔ بعض اوقات یہ لڑکیاں سارا دن ان کے ہاں رہتی تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اہلِ محلہ اس گھرانے کی شرافت پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ محبوب اس صورتِ حال سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی غلطی پر ضرورت سے زیادہ پشیمانی ہو رہی تھی۔ خط گم ہونے کے بعد پانچ چھ ہفتوں تک اسے سارہ کا خیال تک نہیں آیا۔ ہر گھڑی دل کو یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں کب گمشدہ خط کا سویا ہوا آتش فشاں ایک دم پھٹ پڑے اور ہر طرف دہکتا ہوا سرخ سرخ لاوا پھیلنے لگے۔ سوتے جاگتے "خط" اس کے تصور میں رہتا اور الفاظ شرم انگیز انداز میں اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہتے۔ اہلِ خانہ میں سے کوئی اسے آواز دیتا تو لگتا کہ "خط" پر بات شروع ہونے لگی ہے۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوتی تو وہ سوچتا کہ یہ دستک خط کے سلسلے میں ہے۔ گھر میں یا گلی محلے میں کوئی دو افراد رازداری سے بات کرتے نظر آتے تو محبوب کو یوں لگتا کہ وہ اس کے خط کے سلسلے میں بات کر رہے ہیں۔ عجیب سے واہموں میں گھر گیا تھا وہ۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر اسے تسلی ہوتی کہ اتنے روز گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کے سر پر آسمان ٹوٹ کر نہیں گرا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ خط گھر میں یا کالج میں گم نہیں ہوا بلکہ راستے میں آتے جاتے کہیں فائل میں سے گر گیا ہے۔

محبوب' قدیر سے ملنے اکثر اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قدیر اس کا لنگوٹیا یار تھا اور دونوں دن میں کم از کم ایک بار ضرور ملتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ قدیر اور سارہ ایک ہی چار دیواری میں رہتے تھے۔ وہ قدیر سے ملنے جاتا تھا تو سارہ کی ایک آدھ جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔ دراصل قدیر اور اس کے گھر والے' سارہ کے مکان میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ یہ ایک کافی کھلی جگہ تھی لیکن تعمیر تھوڑے حصے میں کی گئی تھی باقی احاطہ کھلا پڑا تھا۔ اس احاطے میں ایک جانب ایک درمیانے سائز کا کمرا اور ایک نیم پختہ کوٹھا سا تھا۔ یہ پورشن سارہ کے والد رزاق صاحب نے کرائے پر اٹھایا ہوا تھا۔ قدیر اپنی والدہ اور دو چچا زاد بھائیوں کے ساتھ اسی پورشن میں رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب محبوب کے والد کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہوتے تھے' قدیر اور اس کے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ محبوب کی خوب محفلیں جمتی تھیں۔ ان محفلوں کا ٹھکانا وہی نیم پختہ کوٹھا ہوتا تھا لیکن جب سے محبوب کا محبت نامہ گم ہوا تھا اور سارہ کی طرف سے اس کا دھیان ہٹا تھا وہ قدیر سے ملنے بھی کم ہی جاتا تھا۔ قدیر اکثر اس بات پر شاکی رہتا تھا اور ایک دو بار ناراض بھی ہوا تھا۔ ایک دن محبوب' قدیر سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہ نیم پختہ کوٹھے میں چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اس نے اپنی کمر کے نیچے تین چار تہ شدہ لحاف رکھے ہوئے تھے اور ٹانگیں بڑے اسٹائل سے اٹھا کر کوٹھے کی دیوار سے ٹکائی ہوئی تھیں۔

محبوب نے کہا "کیا بات ہے قدیری! آج بڑے موڈ میں نظر آتا ہے۔"

قدیر نے لٹک کر کہا "شہزادے! اس کو کہتے ہیں سونے پر سہاگا۔ یعنی ایک تو میں پہلے ہی خوش تھا' بلکہ خوشی سے پھٹا پڑ رہا تھا' اوپر سے تو بھی آگیا ہے۔"

"کیوں' کیا کوئی بانڈ شانڈ نکل آیا ہے تیری امی کا۔"

"امی کا تو نہیں نکلا لیکن میرا ضرور نکل آیا ہے۔ بلکہ بانڈ بھی کیا لاٹری نکلی ہے' ایسی لاٹری کہ بس کیا بتاؤں۔"

"لاٹری۔۔۔؟ کیا مطلب؟"

قدیر نے محبوب کی گردن میں بازو ڈالا اور کھینچ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر اس کی گردن کو مزید خم دے کر اپنے سینے کے پاس لے آیا۔ اب محبوب کے چہرے کے بالکل سامنے وہ چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے سارہ کے گھر کا بیرونی دروازہ اور ایک کمرے کی کھڑکی صاف نظر آرہی تھی۔

قدیر نے وہیں دبے دبے جوش میں کہا "وہ دیکھ میرے گھائل شہزادے! وہ رہی لاٹری۔"

محبوب نے غور سے دیکھا۔ کمرے کی کھڑکی میں جالی لگی ہوئی تھی۔ جالی کے بالکل ساتھ اسے گلابی قمیص کی جھلک نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ سارہ کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ اس کا سر ایک کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے چہرے پر ڈھلک آنے والی ریشمی لٹوں کو وہ گاہے گاہے پنسل سے پیچھے ہٹا رہی تھی۔

محبوب کا دل یکبارگی زور سے اچھلا پھر جیسے ساکت سا ہوگیا۔ ایک ٹھنڈی لہر اس کے پورے جسم میں پھیل گئی۔ قدیر کی آواز جیسے اس کے کانوں میں کہیں دور سے آرہی تھی۔

"بس شہزادے! بڑی زوردار چیز ہے۔ پہلے تو لگتا تھا کہ بالکل گھاس ہی نہیں ڈالے گی لیکن اب معاملہ ٹھیک ہوتا نظر آرہا ہے' کبھی کبھی دیکھ کر ہنستی ہے۔ کل تو یہاں کوٹھے میں بھی آگئی تھی۔ اپنے ہاتھ سے حلوا پکا کر لائی تھی۔ میں نے ایک شعر سنایا' شرما کر بھاگ گئی۔"

قدیر اس روز دیر تک سارہ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو اس نے پھر سارہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ شروع میں تو محبوب کو اس کی باتیں بڑی بری لگیں۔ بالکل جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز زبردستی حلق میں ٹھونسی جارہی ہو' لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنے دل کو سمجھالیا۔ بہت سے دوسرے کاموں کی طرح سارہ کے سلسلے میں بھی اس نے دیر کردی تھی۔ خیر' اب کیا ہوسکتا تھا۔ یہی شکر تھا کہ ابھی وہ سارہ کے معاملے میں بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا تھا ورنہ قدیر کے انکشافات سے اسے زبردست ٹھیس پہنچتی۔ وہ کوشش کرکے قدیر کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا اور حسب منشا اسے چھوٹے بڑے مشوروں سے بھی نوازنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے قدیر کی کامیابی اور اس کی کامیابی ایک ہی چیز ہے اور اگر کل کلاں قدیر' سارہ کے قریب جانے میں کامیاب ہوتا ہے تو جتنی خوشی قدیر کو ہوگی اتنی ہی خود اسے بھی ہوگی۔

قدیر صرف پانچ جماعتیں پاس تھا۔ لکھنا تو دور کی بات ہے ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اس کی ذہانت اور ہنرمندی میں کسی طرح کا شک نہیں تھا۔ وہ درزیوں کا کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی کا کام بھی جانتا تھا۔ صرف دو تین سال پہلے وہ ایک مشہور استاد کا شاگرد رہا تھا اور اب استاد سے بھی دو تین ہاتھ آگے نظر آتا تھا۔ کم عمری میں ہی اس کی آمدن ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ قدیر کا بڑا بھائی بھی درزی کا کام کرتا تھا لیکن اس میں قدیر جیسی ہنرمندی نہیں تھی۔ قدیر کے والد کئی سال پہلے فوت ہوچکے تھے اور والدہ بھی گھر ہی میں سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔

تین چار روز بعد قدیر محبوب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"شہزادے! آج ایک خط تو لکھ دے سارہ کے لیے۔"

معمولی تذبذب کے بعد محبوب تیار ہوگیا۔ دونوں چھت پر چلے گئے اور برساتی میں بیٹھ کر خط لکھنے لگے۔ یہ قدیر کا پہلا خط تھا۔ محبوب نے بڑی احتیاط اور سمجھ بوجھ کے ساتھ قدیر کے تندو تیز جذبات الفاظ کی صورت میں ڈھال دیے۔ خط سن کر قدیر اش اش کر اٹھا۔ اس نے بے اختیار محبوب کا رخسار چوما اور خط تعویذ کی طرح تہ کرنے کے بعد شلوار کے ہے میں اڑس لیا۔

قدیر کے جانے کے بعد محبوب کچھ دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔ اسے محسوس ہورہا تھا جیسے خط لکھتے لکھتے اس کے دل پر چھوٹا سا چرکا لگ گیا ہے۔ شاید اسے وہ خط یاد آگیا تھا جو اس نے چند ہفتے پہلے اپنی طرف سے سارہ کو لکھا تھا۔ بہرحال بہت جلد اس نے متاسفانہ خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیے اور قدیر کی خوشی میں اپنی خوشی کو شامل کردیا۔

سارہ سے قدیر کا انیشز چل رہا تھا۔ اسے خط بھی قدیر نے لکھا تھا۔ اور پہنچایا بھی قدیر نے تھا لیکن قدیر سے زیادہ جواب کا انتظار شاید محبوب کو تھا۔ وہ بے چینی سے اگلے دن کا انتظار کرتا رہا تھا۔ علی الصباح قدیر ان کے گھر آیا تھا۔ والد گھر میں موجود تھے۔ محبوب نے اشاروں کنایوں میں قدیر سے پوچھا تھا کہ جواب آیا؟

قدیر نے اشارے سے ہی بتایا کہ ابھی نہیں آیا لیکن امید ہے کہ ضرور آئے گا۔ اس روز کالج میں بھی محبوب' سارہ اور قدیر کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ سہ پہر کو وہ گھر آیا۔ سب سے پہلے اس نے والدہ سے یہی پوچھا کہ قدیر تو نہیں آیا تھا؟ والدہ کا جواب نفی میں تھا۔ قدیر کی اس روز کام سے چھٹی تھی لیکن وہ گھر پر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ محبوب رات تک بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ اسے یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں خط کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو اور قدیر جو گھر میں نظر نہیں آرہا تو اس کے پیچھے کوئی سنگین وجہ نہ ہو۔ اسی ادھیڑبن کا شکار وہ چھت پر چلا گیا۔ اس نے تین چار بلیاں پال رکھی تھیں۔ اپنے گھر میں تو ان بلیوں کے لیے زبردست انتظامات تھے لیکن اس عارضی رہائش گاہ پر بلیاں بھی جیسے تیسے گزارہ کررہی تھیں۔ ان کا "دڑبا" چھت پر رکھ دیا گیا تھا اور محبوب اکثر ان کی طرف توجہ نہیں دے پاتا تھا۔ وہ بلیوں والے دڑبے کے قریب کھڑا تھا جب اچانک اسے قدیر نظر آیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر درج تھا کہ اس کی مراد پوری ہوگئی ہے۔ اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر محبوب بھی کھل اٹھا۔ قدیر نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر قمیص اوپر اٹھائی اور نیفے میں اڑسا ہوا خط نکال کر محبوب کو تھمادیا۔

دونوں کے ہاتھ مسرت سے کانپ رہے تھے۔ برساتی میں گھس کر انہوں نے خط پڑھا۔ سارہ نے مناسب الفاظ میں

خط کا جواب دیا تھا۔ اس خط میں "ٹین ایجرز" کی مخصوص شوخی اور تیزی طراری نظر آتی تھی۔ ایک دو شعر بھی لکھے تھے۔ آخر میں قدیر سے پوچھا گیا تھا کہ اس نے یہ خط کس سے لکھوایا ہے۔

اسی وقت قدیر نے محبوب سے خط کا جواب لکھوایا۔ اس میں قدیر نے اپنے دل کا حال لکھوا دیا اور سارہ سے درخواست کی کہ وہ اسے کہیں اکیلے میں ملے۔ اس نے سارہ کو اپنی بے پناہ محبت اور وارفتگی کا یقین دلایا۔ اس کی درخواست پر محبوب نے حسبِ حال دو تین شعر بھی لکھ دیے۔ قدیر کے کہنے پر محبوب نے سارہ کو مطلع کردیا کہ یہ خط کس سے لکھوایا گیا ہے۔ اس کے بعد تواتر سے خطوط آنے اور جانے لگے۔ سارہ کے کسی کسی خط میں محبوب کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ وہ محبوب کو محبوب بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور اس کا حال چال پوچھتی تھی۔ بھائی جان کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ سارہ کی ایک چھوٹی بہن پنکی محبوب کو بھائی جان کہتی تھی۔ اس کے منہ سے یہ لفظ سب کو اتنا اچھا لگتا تھا کہ سارہ نے بھی اپنا لیا تھا۔ اب یہ عادت پختہ ہوگئی تھی اور سارہ بڑی روانی سے بھائی جان کے بجائے بھائی جان کہہ جاتی تھی۔ قدیر اور سارہ کے اس محبت بھرے کھیل میں محبوب کو جو "حیثیت" حاصل ہوئی تھی وہ اس نے صدقِ دل سے تسلیم کرلی تھی۔ اب سارہ اس کے لیے صرف اور صرف قدیر کی محبوبہ تھی اور ان دونوں کی محبت کو پھلتے پھولتے دیکھنا محبوب کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

رم جھم برستی بارش والی وہ شام محبوب کے لیے یادگار تھی جب قدیر جوش سے بھرا ہوا اس کے پاس پہنچا تھا اور اس نے محبوب کو بتایا تھا کہ کل رات سارہ اس سے ملنے کے لیے ڈھارے (نیم پختہ کمرے) میں آئی تھی اور اس نے سارہ کو گلے سے لگا کر اسے چوما بھی تھا۔

محبوب کے لیے کتنا سرور تھا اس خبر میں۔ وہ کئی دن اس خبر کے سحر میں گرفتار رہا تھا۔ پھر قدیر اور سارہ کی محبت قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ ان کے خطوط طویل اور زیادہ بے تکلف ہوتے چلے گئے۔ وہ اکثر ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہونے لگے' عہد و پیمان باندھنے لگے' لیکن ان دونوں کے درمیان محبوب بھی موجود رہا۔ اس کا ذکر ان دونوں کی گفتگو میں ہوتا رہا۔ خطوں میں اس کے بارے میں لکھا اور پڑھا جاتا رہا اور کبھی کبھی وہ ان کی ملاقاتوں میں بھی موجود رہا۔ ایک ایسی ہی ملاقات محبوب کے گھر میں بھی ہوئی تھی۔ محبوب کے سب گھر والے ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ قدیر کے ہوشیار ذہن نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سارہ کو تیار کرلیا کہ وہ سہ پہر کے وقت سہیلی سے ملنے کے بہانے گھر سے نکلے اور محبوب کے گھر سے "بیٹھک والے دروازے" سے اندر آجائے۔

تذبذب میں ہونے کے باوجود سارہ یہ سب کچھ کر گزری۔ قدیر' سارہ اور محبوب قریباً دو گھنٹے رازداری سے بیٹھک میں موجود رہے۔ سارہ آزار خیال ضرور تھی لیکن وہ بہت ذہین اور محتاط بھی تھی۔ اس نے کبھی بھی قدیر کو ایک حد سے بڑھنے نہیں دیا۔ قدیر سے اس کی وابستگی اور محبت اپنی جگہ تھی تاہم وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فاصلے میں محبت کی زندگی اور قربت میں موت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی لیکن اپنی عمر اور تعلیم سے زیادہ جانتی بوجھتی تھی۔ وہ محبوب کو بڑے خلوص سے بھائی جان کہتی تھی اور ہر معاملے میں اس کی رائے کو اہمیت دیتی تھی۔ قدیر سے بات کرتے وقت اس کا لہجہ اکثر شوخ ہوجاتا تھا مگر محبوب کے ساتھ وہ بڑی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ بات کرتی تھی۔ غالباً اس کے ذہن میں ہر وقت یہ خیال موجود رہتا تھا کہ محبوب کا تعلق ایک نہایت دین دار اور شریف گھرانے سے ہے' اور اس حوالے سے محبوب کے ساتھ اس کا رویہ محتاط اور رکھ رکھاؤ کا ہونا چاہیے۔

گھر کی بیٹھک میں ہونے والی اس ملاقات میں محبوب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ سارہ کو زیادہ قریب سے دیکھ سکے اور اس کی شخصیت کو سمجھ سکے۔ وہ "پیشانی" جو ہمیشہ سے محبوب کو دلکش لگتی تھی آج بھی سارہ کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا سبب تھی۔ وہ شفاف اجالے جیسی پیشانی جس پر "ہنستے ہوئے" ایک خوب صورت رگ شعاع کی طرح ابھر آئی تھی۔ محبوب نے اس پیشانی کو بڑے قریب سے اور بڑی دیر تک دیکھا۔

اس رات جب عشا کی نماز کے بعد محبوب اپنے لحاف میں گھس کر لیٹا تو اسے دیر تک نیند نہیں آئی' یہاں تک کہ محبوب کے گھر کی طرح گلی میں بھی سناٹا چھا گیا۔ گلی سے آنے سڑک بھی خاموشی اوڑھ کر اونگھنے لگی۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی شب نے گرد و پیش کو اپنی آغوش میں لے کر جیسے مبہوت سا کردیا۔ اپنے پلنگ پر کروٹیں لیتے لیتے اچانک محبوب پر انکشاف ہوا کہ وہ آج بھی سارہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ سارہ کو چاہتا ہے' اس کے لب و رخسار' اس کی دلنشیں آنکھیں' اس کی حسین پیشانی' یہ سب کچھ آج بھی اس کے دل میں

ہوئے ہے۔ اس کا یہ خیال خام ہے کہ سارہ اور قدیر کا معاملہ شروع ہونے سے پہلے وہ سارہ کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ اپنے خیالات کی بے باکی اور خود سری محسوس کر کے وہ ٹھٹک گیا۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہا تھا۔ سارہ اس کے پیارے دوست قدیر کی محبوبہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس نے خود ان دونوں کے ملنے کے راستے ہموار کیے تھے۔ اب وہ کیوں ایک رقیب کے سے خیالات ذہن میں لا رہا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کی اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نجانے آج کیا بات ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں قدیر اور سارہ کے سوا کچھ آ ہی نہیں رہا تھا۔ یہی کمرا تھا جس میں آج قدیر اور سارہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ محبوب کو لگا اس کمرے میں ابھی تک سارہ کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ اس کی خوب صورت ہنسی ان در و دیوار میں جذب تھی اور اس کی پیشانی ایک چراغ کی طرح اس کمرے کی محراب میں جلتی رہتی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے قدیر، سارہ کا ایک اور نامہ لے کر آیا تھا۔ حسب معمول اس خط میں محبوب کا ذکر بھی تھا۔ شروع شروع میں محبوب کے متعلق صرف ایک آدھ سطر لکھی جاتی تھی لیکن اب خط کا تقریباً ایک تہائی حصہ محبوب کے لیے وقف ہوتا تھا۔ سارہ نے لکھا تھا "محبوب بھائی جان! آپ کا بہت شکریہ کہ کل آپ میرے ساتھ موجود رہے اور آپ کے خطرناک دوست (قدیر) نے مجھے تنگ کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام کر دیا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ جب بھی بھی ہماری ملاقات ہو آپ ہمارے درمیان موجود رہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں خود کو بہت محفوظ تصور کرتی ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ کے خطرناک دوست کو میری یہ تجویز پسند نہ آئے لیکن آپ ان کی ناراضگی کی بالکل پروا نہ کریں۔ ان کا کام ہی ناراض ہونا ہے۔ اور ان سے یہ بھی کہہ دیں کہ ڈریکولا فلمیں نہ دیکھا کریں ورنہ دماغ کو نا قابل علاج ہو جائے گا۔ کل جب آپ تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چلے گئے تھے تو مجھے اس بیماری کی علامتیں نظر آئی تھیں۔"

سارہ کے تقریباً ہر خط میں اس طرح کے معنی خیز اور طنزیہ فقرے موجود ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ فقرے قدیر کے سر کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔ محبوب اسے سمجھاتا تھا اور پھر دونوں لطف اندوز ہوتے تھے۔

خط پڑھنے کے بعد محبوب نے قدیر سے کہا "یار! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ خط وغیرہ تو کسی اور سے لکھوایا کرے۔"

"تجھے کیا تکلیف ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یار! مجھے بڑی تکلیف ہے۔ تمہیں آپا جی کی سخت طبیعت کا تو پتا ہے۔ کسی دن انہیں بھنک پڑ گئی تو ایمان سے دو کانوں میں سر کر دیں گے۔ کل مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ قدیر تجھ سے کیا لکھوا رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا گاؤں میں اپنی پھوپی کو خیر خیریت کا خط لکھوا رہا تھا۔ ایک دو بار مزید انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو آفت آ جائے گی۔"

قدیر نے تیز لہجے میں کہا "بس نکل گئی دوستی کے غبارے سے ہوا؟"

"یار! یہ بات نہیں، لیکن۔۔۔"

"بس بس۔ زیادہ صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ اب میں نہیں کہوں گا تجھے ایسے خطرناک کام کے لیے۔"

وہ اٹھا اور پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔

چار پانچ روز قدیر بہت ناراض رہا۔ محبوب کو شکل تک نہیں دکھائی۔ آخر محبوب کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اس نے منت سماجت کر کے قدیر کو خط "لکھوانے" پر آمادہ کیا۔

قدیر کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دے۔ محبوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خواہش کے پیچھے سارہ کی خواہش کارفرما ہے۔ قدیر آٹھویں جماعت کی کتابیں لے آیا تھا۔ وہ فارغ وقت میں محلے کے ایک ماسٹر صاحب سے پڑھتا تھا اور کبھی کبھار محبوب کا دماغ کھانے بھی بیٹھ جاتا۔ انگلش میں اسے دقت پیش آ رہی تھی تاہم محبوب کا خیال تھا کہ وہ کوشش کرے تو اس مشکل میں سے نکل سکتا ہے لیکن پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ انہی دنوں قدیر کے ایک تایا زاد بھائی نے دبئی سے اس کے لیے ویزا بھیج دیا اور قدیر کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بہتر مستقبل کی تلاش میں دبئی جانا پڑ گیا۔ محبوب اچھی طرح جانتا تھا کہ سارہ سے جدا ہونا قدیر کے لیے کتنا مشکل ہے لیکن بہتر مستقبل کے لیے اسے یہ سب کچھ کرنا تھا۔ روانگی سے چند روز پہلے قدیر نے محبوب سے سارہ کے نام ایک طویل خط لکھوایا۔ اس خط میں اس نے عہد محبت کی تجدید کی۔ سارہ کو باور کرایا کہ وہ پردیس میں ہر "پل" اس کی یاد کے سہارے کاٹے گا اور دور رہ کر بھی ہر وقت اس کے قریب رہے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ جب وہ واپس آئے تو اس قابل ہو کہ سارہ کو اپنا سکے۔

پھر ایک روز وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے محبوب کو خدا حافظ کہہ کر ائرپورٹ کے ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اس کی اور محبوب کی دوستی کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہو گیا۔

شروع شروع میں محبوب نے قدیر کی کمی شدت سے

محسوس کی۔ یقیناً قدیر کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔ ہر تیسرے چوتھے روز دبئی سے اس کا خط آجاتا تھا۔ اس میں ایک خط علیحدہ سے سارہ کے لیے بھی ہوتا تھا۔ قدیر کا یہ خط سارہ تک پہنچانا بھی محبوب کی ذمے داری تھا۔ آغاز میں اسے بڑی جھجک محسوس ہوئی مگر پھر یہ کام یوں آسان ہوگیا کہ سارہ خود ہی موقع دیکھ کر خط وصول کرنے محبوب کے گھر آجاتی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا' قدیر کے خطوں میں وقفے بڑھنے لگے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کی دلی کیفیات ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ وہ بہت جلد اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ شاید قدیر بھی ایک ہی طرح کے خط لکھوا لکھوا کر اور جواب موصول کر کر کے اکتا گیا تھا۔ تحریر سے اس کا دل کہاں تک بہلتا۔ اسے سارہ کی ضرورت تھی اور سارہ اس سے بہت بہت دور تھی۔ محبوب محسوس کر رہا تھا کہ سارہ کے خطوط بھی اب جلدی جلدی نہیں پہنچتے تھے۔ غالباً وہ بھی ایک ہی طرح کی باتیں لکھ لکھ کر تھک گئی تھی۔ اس کی زندگی میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ایف ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد وہ گھر بیٹھ گئی تھی۔ والدین نہیں چاہتے تھے کہ وہ بسوں میں دھکے کھاتی کالج پہنچے اور راستے میں اُن گنت میلی نظروں کا سامنا کرے۔ اس کا کوئی بھائی بھی نہیں تھا جو اسے کالج پہنچانے اور واپس لانے کی ذمے داری اٹھاتا۔ وہ محبوب کو جب ملتی' خاموش اور اُداس نظر آتی۔ قدیر نے اسے ایک انگوٹھی دی تھی۔ وہ ابھی تک اس کی انگلی میں چمکتی تھی۔

محبوب کا گھر اب مکمل ہو چکا تھا۔ وہ لوگ کرائے کے مکان سے اٹھ کر اپنے نئے مکان میں آگئے تھے۔ بہرحال قدیر اور سارہ والی گلی میں محبوب کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہ اس گلی کو کیسے بھول سکتا تھا' یہ گلی تو اس کے دل میں آباد تھی۔ اس گلی کے مکان' اس کی دھوپ چھاؤں' اس کی خوشبو۔۔۔ سب کچھ محبوب کے ذہن میں رچ بس چکا تھا۔ ایک دن سارہ کی والدہ محبوب سے ملیں۔ کہنے لگیں "بیٹا جی! سارہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے پرائیویٹ بی اے کرے گی۔ تمہاری نظر میں کوئی اچھی سی ٹیوشن ہو تو بتاؤ۔"

محبوب نے کہا "ماسٹر کرامت صاحب ہیں آپ کے محلے میں۔ اچھا پڑھاتے ہیں۔ قدیر بھی ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اگر آپ۔۔۔"

"نہیں بیٹا جی۔" سارہ کی والدہ نے محبوب کی بات کاٹی "کوئی استانی وغیرہ ہو تو بتاؤ۔۔۔ لڑکی کا معاملہ ہے اور پتا نہیں کیا بات ہے' ماسٹر کرامت مجھے ویسے بھی اچھا نہیں لگتا۔"

محبوب نے کہا "اچھا خالہ جی! میں کوشش کروں گا۔"

محبوب کے کہنے کا مطلب تھا کہ میں ٹیوشن ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا لیکن سارہ کی والدہ خالہ عطیہ نے اور مطلب لیا۔ کہنے لگیں "بیٹا جی! اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تم تو گھر ہی کے بندے ہو۔ اگر تم تھوڑا سا وقت نکال سکو تو سارہ کا کام بن جائے گا۔ ویسے بھی تم اس کی عزت کرتی ہے تمہاری۔۔۔ تم پڑھاؤ گے تو پڑھے گی بھی اور دل لگا کر۔"

محبوب سٹپٹا کر رہ گیا۔ وضاحت کرنا چاہ رہا تھا لیکن ہو کی طرح تھوڑی سی تاخیر کر گیا۔ اسی دوران میں خالہ عطیہ نے سارہ کو آواز دے دی "سارہ بیٹی ادھر آجلدی سے۔ دیکھ تیرے بھائی جان آئے ہیں۔"

خالہ عطیہ اور محبوب گھر کے صحن میں کھڑے تھے۔ سارہ تیزی سے باہر نکلی۔ اس کے کندھوں پر دوپٹا نہیں تھا۔ گیلے بالوں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس منظر نے ایک لمحے کے لیے محبوب کو مبہوت کر دیا۔

"السلام علیکم محبوب بھائی جان۔" سارہ کی آواز نے محبوب کو چونکایا۔

خالہ عطیہ نے سارہ کو مخاطب کیا اور تیزی سے بولیں "لے تیرے من کی مراد پوری ہوگئی۔ محبوب نے کہا ہے وہ تجھے پڑھا دیا کرے گا۔"

"سچ۔" سارہ نے حیرت سے کہا۔

اس کی پیشانی تمتما اٹھی اور شعاع جیسی خوب صورت رگ ابھر آئی۔ ایک لمحے کے لیے محبوب کو لگا جیسے وہ خوشی سے ناچ اٹھے گی۔

محبوب نے ایک بار پھر وضاحت کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی سارہ نے بڑے خلوص سے اس کا ڈھیروں شکریہ ادا کر دیا اور محبوب کا جملۂ معترضہ ہونٹوں پر آنے سے پہلے دم توڑ گیا۔

اگلے روز سہ پہر کو محبوب' سارہ کے گھر بیٹھا اسے انگلش پوئٹری پڑھا رہا تھا۔ محبوب پہلے سے جانتا تھا کہ محبت کی قربت اس کے اندر کچھ انقلابی تبدیلیاں رونما کرے گی۔ وہ ان تبدیلیوں سے بہت خوف زدہ تھا لیکن ان تبدیلیوں میں کوئی ایسی کشش بھی تھی جو مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ تبدیلیاں اس کے لیے بیک وقت اذیت ناک بھی تھیں اور فرحت بخش بھی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سارہ اس کے

پیارے دوست کی محبت تھی لیکن وہ اس کے بارے میں کبھی کبھی عجیب سے انداز میں سوچنے لگتا تھا' اور جب وہ اس انداز سے سوچ رہا ہوتا تھا تو قدیر کا خیال اس کے ذہن سے بالکل محو ہو جاتا تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ سارہ کو پڑھانے کے دوران میں اس کی تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز رہے۔ وہ اپنے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کر لیتا' اپنی سوچوں پر پہرے بٹھاتا اور اپنی گفتگو کو صرف ضروری موضوعات تک محدود رکھتا لیکن پھر بھی کسی وقت چپکے سے اس کا دفاعی حصار ٹوٹ جاتا اور وہ محسوس کرتا کہ وہ غیر ضروری چیزوں کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ مثلاً سارہ کی اس انگلی کے بارے میں جو کتاب پر رینگ رہی ہے۔ اس آنچل کے بارے میں جو شانے کی ہوا سے بار بار اڑتا ہے اور محبوب کے پاؤں کو چھو جاتا ہے اور اس پیشانی کے بارے میں جو حدت سے تمتما رہی ہے۔ اپنی چوری پکڑ کر وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ یہ تو بالکل عامیانہ سی بات تھی۔ نوجوان لڑکا نوجوان لڑکی کو تنہائی میں پڑھانے بیٹھے اور وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنا شروع کر دے تو یہ ایک عامیانہ بات ہی ہوئی نا اور محبوب عام لڑکا نہیں تھا۔ وہ خود کو خاص سمجھتا تھا اور لوگ اسے خاص سمجھتے تھے۔ وہ وقار صاحب کا بیٹا تھا۔ دور و نزدیک اس گھرانے کی نیک نامی اور شرافت مشہور تھی پھر وہ ایسا گھٹیا پن کیوں کر رہا تھا' اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے حوالے سے جو اس کے دوست کا پیار تھی۔

یہ شرمسار کرنے والی سوچ ذہن میں آتی تو وہ چور نظروں سے سارہ کی طرف دیکھتا۔ اسے شبہ ہونے لگتا کہ ہوا کی لہروں پر سفر کر کے اس کے خیالات سارہ تک پہنچ گئے ہیں اور وہ برا مان گئی ہے لیکن سارہ کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی رہتا۔ وہ جیسے محبوب سے اور محبوب کی سوچوں سے' ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر پائی جاتی۔ اپنی کتابوں میں گم۔ معاشیات کے کسی سوال میں الجھی ہوئی یا انگریزی کے کسی شعر کی تشریح میں غلطاں۔

ایک ایسے ہی موقع پر جب وہ تفتیشی نظروں سے سارہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا' وہ کتاب پر جھکے جھکے زیر لب مسکرائی اور بولی "محبوب بھائی جان! ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔" محبوب نے چونک کر کہا۔

"برا تو نہیں مانیں گے؟"

"امید ہے کہ نہیں مانوں گا کیونکہ تم کوئی ایسی بات پوچھو گی ہی نہیں۔"

"اچھا تو نہیں پوچھتی۔"

"چلو پوچھ لو۔"

"جان بخشی کا وعدہ؟" وہ ادا سے بولی۔

"وعدہ۔" محبوب مسکرایا۔

"شہلا کا کیا معاملہ ہے؟"

محبوب ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا "کوئی خاص معاملہ نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"ایسے ہی دماغ میں بات آ گئی تھی۔" سارہ نے کہا۔ اس کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی سرخی جھلک آئی تھی۔

"یونہی تو کوئی بات دماغ میں نہیں آتی۔" محبوب نے اصرار کیا۔

"وہ دراصل۔۔۔ ایک دن باجی راحت (محبوب کی بڑی بہن) نے بتایا تھا کہ آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی بات۔۔۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" محبوب نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

سارہ نے اس لہجے کو محسوس کر لیا اور فوراً موضوع بدل دیا۔ ناپسندیدہ موضوع کو غیر محسوس طور پر بدلنے میں سارہ کو کمال حاصل تھا اور یہ اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی ایک معمولی سی مثال تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ محبوب کو بھی پتا نہیں چلا کہ کب وہ شہلا والے موضوع سے ہٹ کر اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری پر بات کرنے لگے ہیں اور پھر اسلامیات کے نوٹس لکھنے لگے ہیں۔ بہرحال شہلا والی بات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رہی اور وہ گھر آ کر دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ سارہ نے شہلا کے بارے میں بات کی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اشاروں کنایوں میں کئی بار شہلا کا ذکر کر چکی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔ شہلا سے سارہ کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا بلکہ تین چار مرتبہ سے زائد محبوب نے شہلا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ شہلا نام کی یہ لڑکی محبوب کے والد وقار صاحب کے ایک دیرینہ دوست پروفیسر ریاض کی بیٹی تھی۔ اپنے والدین کے ساتھ محبوب کے گھر بھی آتی تھی۔ ایک مرتبہ یہ لوگ محبوب کے اہل خانہ کے ساتھ تفریحی ٹور پر ایبٹ آباد گئے تھے۔ شہلا نے محبوب سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن محبوب کی فطری جھجک آڑے آئی تھی اور معاملہ ٹائیں ٹائیں فش رہا تھا۔

شہلا پرکشش لڑکی ضرور تھی لیکن ایسی بھی نہیں تھی کہ محبوب اس کے بارے میں کسی خاص زاویے سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر ایک مرتبہ گھر میں شہلا کے ساتھ محبوب کے

رشتے کی بات ہوئی تھی لیکن اس بات کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی تھی اور یہ معاملہ قریباً ختم ہو گیا تھا۔ سارہ واس معاملے کی نجانے کیسے بھنک پڑ گئی تھی اور وہ اسے غیر ضروری اہمیت دینے لگی تھی یا شاید وہ دل لگی کے لیے یہ موضوع چھیڑ رہی تھی' یعنی پرچھائی سے ہٹ کر کوئی ہلکی پھلکی بات کرنے کے لیے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ اس کی شوخ فطرت کے اظہار کا ایک انداز ہو یا پھر ایک اور بات بھی ہو سکتی تھی۔ یہ خیال بجلی کی طرح محبوب کے ذہن میں چمکا اور اس کے تن بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اب سارہ کے خیال میں تبدیلی آ رہی تھی۔ بالکل جیسے محبوب کے اپنے خیالات میں تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ قدیر کو بھولتا جا رہا تھا اور اب سارہ کی قربت اس کے دل میں ایک نئی کونپل کھلا رہی تھی۔ شاید اسی طرح سارہ بھی قدیر کو بھولتی جا رہی تھی اور اس کے دل و دماغ میں ایک نیا جذبہ پنپ رہا تھا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" محبوب نے بے حد حیرانی سے سوچا "کیا سارہ ایسی لڑکی ہے کہ اس انداز میں سوچ سکے؟"

محبوب نے سنا تھا کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار پیار کرتی ہے اور یہ اس کا پہلا پیار ہوتا ہے۔ سارہ کا پہلا پیار تو قدیر تھا پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اب وہ محبوب کے حوالے سے اپنے دل میں کسی نازک جذبے کو جگہ دے۔ نہیں یہ صرف محبوب کا وہم تھا۔ یہ اس کے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ تھی۔ دل کا شکستہ آئینہ تھا جو اسے بگڑی ہوئی شکلیں دکھا رہا تھا۔

ایک دن سارہ نے کہا "محبوب بھائی جان! آج میں نے "میری پسندیدہ شخصیت" کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔"

"دکھاؤ۔"

"پہلے آپ اندازہ لگائیں کہ یہ مضمون کس کے بارے میں ہوگا۔"

"مجھے کیا معلوم؟"

"یہ شخصیت میرے اردگرد کے ماحول میں سے ہے۔ اب GUESS کریں۔"

"تمہارے ابو ہوں گے یا پھر کوئی استاد وغیرہ۔"

"جی نہیں' یہ مضمون آپ کے بارے میں ہے۔"

محبوب کے سینے میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ اس نے کوشش کی کہ دلی تاثرات اس کے چہرے پر نہ آنے پائیں۔ معلوم نہیں وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ "اچھا' دکھاؤ تو مضمون۔" اس نے کہا۔

سارہ نے نوٹ بک اس کے سامنے کر دی۔ مضمون واقعی محبوب کے بارے میں تھا۔ سارہ نے بڑے خوب صورت پیرائے میں اپنے دلی جذبات بیان کیے تھے۔ اپنے مضمون میں اس نے پہلے محبوب کا تعارف کرایا تھا اور بتایا تھا کہ محبوب بھائی جان اس کے بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ اس کے استاد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں پھر لکھا تھا "محبوب بھائی جان عام نوجوانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ کوئی بہت برگزیدہ روح ان میں حلول کر چکی ہے۔ متانت' سنجیدگی اور بردباری ان کا شعار ہے۔ نیک اور پارسا جیسے الفاظ ان کی صاف شفاف شخصیت کا احاطہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ وہ ایک ایسے شیشے کی طرح ہیں جس کے آر پار سب کچھ صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے چہرے پر سب سے خوب صورت ان کی آنکھیں ہیں' شرمائی شرمائی' بے حد حیران اور بے حد گہری۔ کسی سمندر کی طرح عمیق اور بیکراں۔ ساری دنیا ان میں ڈوب جائے اور پتا نہ چلے۔ ان کی ذات میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ وہ جب میرے قریب ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ان کے سراپا سے پاکیزگی اور محبت کی لہریں پھوٹ رہی ہیں اور مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ کہتے ہیں' چاند اپنی روشنی سورج سے حاصل کرتا ہے۔ میں چاند تو نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ محبوب بھائی جان کی روشنی میں چمک دمک ہوں۔ یہ روشنی نہ صرف مجھ پر اپنا آپ واضح کرتی ہے بلکہ میرے اردگرد کی ہر چیز کو بھی روشن کر دیتی ہے۔"

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا تھا' جس میں محبوب کی ذاتی صفات کے علاوہ اس کے خاندانی پس منظر' اس کے حالاتِ زندگی اور اس کی کامیابیوں پر بڑی باریک بینی سے روشنی ڈالی گئی۔

یہ مضمون محبوب کی تعریفوں سے بھرا ہوا تھا لیکن نجانے کیوں یہ مضمون پڑھ کر محبوب کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے سارہ نے خود زمین پر بیٹھ کر اسے ایک بلند و بالا کرسی پر بٹھا دیا ہے۔ یہ کرسی اتنی اونچی ہے کہ وہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ بالکل تنہا اور اکیلا۔ سارہ بہت دور تھی اور اس نے اپنے دلی جذبات سارہ پر ظاہر نہیں ہونے دیے۔

"جی بھائی جان! کیسا ہے مضمون؟" اس نے پوچھا۔

"مضمون تو بہت اچھا ہے لیکن "میں" اس میں کہیں نظر نہیں آ رہا۔"

"ہر سطر میں آپ ہی نظر آ رہے ہیں جی۔"

"کہیں نظر آ رہا ہوں گا۔"

"اور میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔ ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ٹیسٹ کرائی تھی۔" پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "سچ کہتی ہوں محبوب بھائی جان! آپ بہت اچھے لگتے ہیں مجھے۔ اگر آپ۔۔۔ آپ کوئی مولانا ہوتے تو میں ضرور آپ کے ہاتھ پر۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے؟"

"بیعت۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ آپ کی مرشد بن جاتی۔"

"مرشد نہیں مرید۔"

"بالکل وہی۔"

محبوب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا مریدنی صاحب۔۔۔ اب یہ سکے لگانا چھوڑو اور کتاب کی طرف توجہ دو۔ ایک ہفتے سے تم نے "اردو" کی شکل نہیں دیکھی اور ابھی ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ اردو تمہاری کافی کمزور ہے۔"

گھر آکر بھی سارہ کا مضمون محبوب کے ذہن میں گھومتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس ندامت طاری ہو رہا تھا اس پر۔ سارہ اسے کیا سمجھ رہی تھی اور وہ کیا تھا۔ سارہ کے حوالے سے کیسی کیسی سوچیں پرورش پاتی تھیں اس کے ذہن میں۔ وہ اسے آسمان کا تارا سمجھتی تھی اور وہ نالی میں پڑے کنکر جیسا تھا اور وہ صرف سارہ کا مجرم ہی نہیں تھا' اپنے پیارے دوست قدیر کا بھی مجرم تھا۔ قدیر نے دبئی جاتے ہوئے جو الفاظ اس سے کہے تھے وہ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ قدیر نے کہا تھا "سارہ کا خیال رکھنا شہزادے! وہ کسی وقت بہت دکھی ہو جاتی ہے۔ اس سے ملتے جلتے رہنا۔"

قدیر اسے اپنی محبت کا نگہبان بنا کر گیا تھا۔ وہ کیسی نگہبانی کر رہا تھا۔ اپنی نگاہ کی نگہبانی ہی نہیں کر سکا تھا۔

انہی دنوں کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی نے ایک ڈراما اسٹیج کیا۔ اس ڈرامے کا مرکزی کردار محبوب نے لکھا تھا۔ دوستوں نے محبوب کو بھی زبردستی ایک رول پلے کرنے پر مجبور کر دیا۔ ڈرامے کا عنوان تھا "دو قبروں کی داستان" یہ دو سگے بھائیوں کی کہانی تھی۔ دونوں آپس میں بہت محبت رکھتے ہیں لیکن غلط فہمی کے سبب ایک بھائی دوسرے کی جان لے لیتا ہے۔ محبوب نے مرنے والے بھائی کا کردار ادا کیا تھا اور ایسی خوبی سے کیا تھا کہ سب اش اش کر اٹھے تھے۔ محبوب فطرتاً ایک کم آمیز اور بہت حد تک شرمیلا نوجوان تھا۔ دوسروں کی تو اور بات ہے اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ یہ رول عمدگی سے نبھا جائے گا مگر اس نے نبھایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ رول بے حد سنجیدہ تھا اور محبوب کی طبع سے مطابقت رکھتا تھا۔ اسٹیج پر پہنچ کر جب اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیلی تو یہ تاثر کردار کی ڈیمانڈ کے عین مطابق نظر آیا۔

کالج کے آڈیٹوریم میں کھیلا جانے والا یہ ڈراما سارہ نے بھی دیکھا۔ وہ محبوب کی بڑی بہن راحت کے ساتھ آئی تھی۔ ڈرامے کے آخری مناظر میں محبوب اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس کے سینے میں گولی لگتی ہے اور وہ چند جذباتی مکالمے بول کر ایک صوفے پر گرتا اور دم توڑ دیتا ہے۔ جب دل سوز مکالمے تھے۔ محبوب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ "مرا" گیا تب بھی آنسو اس کے رخساروں پر پھسلتے رہے۔ ہال میں موجود تماشائیوں پر سکتہ طاری تھا لیکن ہال میں مخالف لڑکوں کی ایک ٹولی بھی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکا چیخا "اوئے دیکھو! مردہ رو رہا ہے۔"

دوسرا بولا "اوئے مرا نہیں ہے۔ مکر کر رہا ہے۔"

تیسرے نے کہا "بھئی جوتی سونگھاؤ۔ ابھی اٹھ بیٹھے گا۔"

پہلے لڑکے نے پھر کہا "کوئی چیز مار کر دیکھو۔"

کوک کی ایک خالی بوتل اڑتی ہوئی آئی اور ایک اداکارہ لڑکی کے پاؤں میں گری۔ دوسری بوتل بے سدھ لیٹے محبوب کے سینے پر لگی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا جسم جھنجھنا اٹھا لیکن وہ اپنے کردار کا بھرم رکھنے کے لیے بے سدھ پڑا رہا۔ اسی دوران میں ہال کے اندر ہنگامہ شروع ہو گیا اور پردہ گرا دیا گیا۔ مصنوعی مونچھیں اور روگ وغیرہ اتار کر محبوب ہال میں پہنچا تو اس نے عجیب منظر دیکھا۔ سارہ نے ایک نوجوان کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ نوجوان کی قمیص تار تار ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ نوجوان کو سارہ کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بری طرح بپھری ہوئی تھی اور گرج رہی تھی "بے ہودہ' بدتمیز' بدمعاش۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔۔۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی!"

نوجوان اب کافی گھبرایا ہوا تھا اور جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکے نے لجاجت سے کہا "چلیے چھوڑیے مس۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

ایک دوسرا شخص بولا "یہ غلطی نہیں' بدمعاشی ہے۔ اچھا بھلا پٹے چل رہا تھا ستیاناس کر دیا پکڑ کر۔"

سارہ بولی "پٹے تو رہا ایک طرف اگر بوتل محبوب صاحب کے سر پر یا منہ پر لگ جاتی۔"

محبوب کے ایک دوست نے پوچھا "بھئی! محبوب۔۔۔ کہاں؟ اسے تو دیکھو۔"

محبوب نے کہا "میں یہ ہوں بھئی۔ بالکل ٹھیک ہوں۔

ہے۔ آپ لوگ چھوڑ دو اس کو۔ خواہ مخواہ بات بڑھانے سے فائدہ نہیں۔"

محبوب کی بہن راحت لپک کر اس کے پاس آئی اور فکر مندی سے اس کی خیریت دریافت کی۔ اسی دوران میں ایک دو پروفیسر صاحبان بھی موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے سارہ سے ہسٹل نوجوان کی جان چھڑائی اور معاملہ رفع دفع کیا۔

شام کو جب محبوب ٹیوشن پڑھانے سارہ کے گھر گیا تو وہ اپنی کلائی پر پٹی باندھے بیٹھی تھی۔ دھینگا مشتی کے دوران میں اس کی چوڑی ٹوٹ کر اپنی ہی کلائی میں چبھ گئی تھی۔ محبوب اس پر تھوڑا سا ناراض بھی ہوا "تمہیں کیا ضرورت تھی یہ ہنگامہ کرنے کی۔ انتظامیہ کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ خود ہی سنبھال لیتے۔"

"مجھ سے برداشت نہیں ہوا بھائی جان۔ بے ہودگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ آپ کو کوئی چوٹ نہیں آئی ورنہ اس کتے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ ہم سے اگلی والی رو میں بیٹھا تھا۔ پہلی بول پھینکنے کے بعد دوسری اٹھانے جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے ہی اس کے بال پکڑ لیے۔"

"بھئی' وہ خطرناک لوگ ہیں۔ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو پھر؟"

"اور اگر آپ کو نقصان پہنچ جاتا تو؟ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ اس کا قیمہ بنا دوں۔"

محبوب نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "سارہ! تم مجھے اتنی اہمیت مت دیا کرو۔ میں سچ کہتا ہوں میں اتنی اہمیت اور عزت کے قابل نہیں ہوں۔"

وہ رسان سے بولی "یہ میں آپ سے زیادہ جانتی ہوں کہ آپ کتنی عزت کے قابل ہیں' محبوب بھائی جان! میرے بس میں ہو تو آپ۔۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ محبوب کا دل انوکھے انداز میں دھڑک اٹھا۔ کانوں میں شادیانے سے بج اٹھے "بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟" اس نے پوچھا۔

وہ بولی "میرے بس میں ہوتا' تو آپ کے لیے اپنے ہاتھ سے دلہن لاؤں اور ایسی دلہن لاؤں۔۔۔ ایسی دلہن لاؤں کہ جو ساری عمر آپ کے گھر میں خوشیاں بکھیرتی رہے۔ آپ کی اتنی خدمت کرے' آپ کا اتنا خیال رکھے کہ آپ زندگی بھر مجھے دعائیں دیتے رہیں۔"

سارہ کے جواب نے اس شعلے پر پانی پھینک دیا جو چند لمحے پہلے بھک سے اس کے سینے میں بھڑکا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے چہرے پر مایوسی کی گہری پرچھائیاں پھیلنے والی ہیں۔ ان پرچھائیوں سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کہا "تو پھر ڈھونڈو نا کوئی۔"

"ڈھونڈنا کیا ہے۔" وہ بولی "آپ تو پہلے سے ڈھونڈ بیٹھے ہیں۔ ویسے شہلا بھی تو کوئی ایویں شیویں نہیں ہے۔ میں ایک دن آپ کے گھر ملی تھی اس سے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت خوش رکھے گی آپ کو۔ دل و جان سے چاہے گی۔"

"لیکن تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں بھی شہلا کو چاہوں گا۔"

"بنیں مت۔" وہ ادا سے بولی "ہم سب جانتے ہیں بھائی جان۔ آپ شہلا باجی سے بہت بہت پیار کرتے ہیں۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"دیکھیں جی! میں نے آپ کے معاملے پر بہت غور کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شہلا سے آپ کی محبت کے چاند کو آپ کی خاموشی اور شرمیلے پن کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ چاند نظر نہیں آ رہا لیکن چاند موجود تو ہے نا۔"

محبوب نے کہا "جسے تم چاندنی رات سمجھ رہی ہو' وہ ہو سکتا ہے اماوس کی رات ہو۔"

سارہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ اس نے گہری نظروں سے محبوب کو دیکھا لیکن پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی "آج آپ بیشہ سے زیادہ غم زدہ نظر آ رہے ہیں۔۔۔ کہیں ہماری شہلا باجی سے کوئی ان بن تو نہیں ہو گئی۔"

موضوع بدلنے میں وہ واقعی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بات کو کسی اور طرف لے کر نکل گئی اور چاندنی رات و اماوس والا معاملہ وہیں کا وہیں اٹکا رہ گیا۔

اس دن کے بعد محبوب کو عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔ یہ اپنی ہی ذات کا اور ذات میں پیدا ہونے والے ہیجان کا خوف تھا۔ چاندنی رات اور اماوس کی رات کی بات کرتے ہوئے وہ ایک دم کتنا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس سنجیدگی میں اگر کوئی الٹی سیدھی بات اس کے منہ سے نکل جاتی تو کیا ہوتا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا اس کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے ابال کی ہلکی سی آنچ بھی سارہ تک پہنچے۔ وہ اسے عزت و تکریم کے زینوں پر چلا کر رتبے کی اس بلندی تک لے گئی تھی کہ وہاں سے گرنے کا تصور بھی اس کے لیے جانکاہ تھا تو پھر وہ کیا کرے۔ وہ تمام اخلاقی اور سماجی قیود کو توڑ کر ہر وقت اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے ہر وقت اسی کا خیال محبوب کے در دل پر دستک دیتا تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ شاید یہ وہی شہرۂ آفاق جذبہ تھا جسے عشق کہا

جاتا ہے۔ گلابی شاموں میں جب آسمان پر بادلوں کی سرخ کناروں والی ٹکڑیاں تیرتیں تو محبوب کو ان میں سارہ کی شبیہہ نظر آتی۔ تاروں بھری رات سارہ کا آنچل بن جاتی اور آسمان پر چاند سارہ کی روشن پیشانی کی طرح دمکتا۔ وہ رات رات بھر تصور میں اس پیشانی کو دیکھتا اور چومتا رہتا۔ صبح کا اُجالا سارہ کے کھمبے جیسا ہوتا اور سرما کی تمازت بھری دوپہر میں سارہ کے بدن کی حرارت اور نرمی جذب ہو جاتی۔

ایک رات جب وہ نکھری ہوئی چاندنی میں چھت پر ٹہل رہا تھا' اور قریباً ایک فرلانگ دور سارہ کے گھر کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو کسی جاں نثار پروانے کی طرح دیکھ رہا تھا' ایک دم اسے جھٹکا سا لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں بالکل اچانک ہی "قدیر" کا خیال آگیا تھا۔ وہ اس نام کو یوں بھولا ہوا تھا جیسے کوئی اس آسمان کو بھول جائے جو ہر وقت سر پر سایہ فگن رہتا ہے' یا اس ہوا کو بھول جائے جس میں وہ ہر وقت سانس لیتا ہے' یا اس دھرتی کو جس پر چلتا پھرتا ہے۔ قدیر تو اس کی زندگی کا ایک اٹوٹ انگ تھا' پھر وہ اسے کیوں بھول گیا تھا۔ چند دنوں یا چند ہفتوں کے لیے ہی سہی لیکن قدیر کا نام اس کے ذہن سے کیوں نکلا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی خطا تھی۔ محبوب نے جتنا سوچا اتنا ہی عرقِ ندامت میں ڈوبتا چلا گیا۔ سارہ قدیر کی محبوبہ تھی اور وہ اس سے عشق فرما رہا تھا اور عشق بھی ایسا جس میں ایکا ایکی دنیا جہان کی شدتیں سمٹ آئی تھیں۔ وہ ایک گناہ کر رہا تھا اور اس گناہ کی سزا اسے ملنی چاہیے تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ سزا کیا ہو سکتی ہے۔ وہ اب سارہ کے گھر نہیں جائے گا۔ لیکن یہ ایک چھوٹی سزا تھی۔ وہ کبھی سارہ سے بات نہیں کرے گا' یہ بھی ایک چھوٹی سزا تھی۔ وہ کبھی سارہ کو اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ یہ سزا بھی اس کے گناہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس نکھری ہوئی رات میں چھت پر ٹہلتے ٹہلتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لاہور چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہ گریجویشن کر چکا تھا۔ راولپنڈی میں اسے ایک پرائیویٹ فرم اچھی جاب دے رہی تھی۔ محبوب کے والد نہیں چاہتے تھے کہ محبوب تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت کرے لیکن وہ ملازمت اور تعلیم کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہتا تھا۔ والد صاحب کے اعتراض کا جواب بڑے احترام سے دیتے ہوئے محبوب نے کہا تھا "ابا جان! آپ نے بھی تو ملازمت اور تعلیم کو ایک ساتھ اپنائے رکھا تھا۔" وقار صاحب نے جواب دیا تھا "بیٹا جی' میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے آگے جاؤ۔ جب بوجھ بہت زیادہ ہو جائے تو آدمی بہت دور تک نہیں جا سکتا۔"

وقار صاحب کی مدلل باتوں نے محبوب کو خاصی حد تک قائل کر لیا تھا۔ لیکن اب سارہ کے حوالے سے محبوب کے دل و دماغ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں' انہوں نے ایک بار پھر محبوب کو نیا آسمان ڈھونڈنے پر مائل کر دیا۔ اسے لاہور اور لاہور کے در و دیوار سے وحشت سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا' اس کے پَر لگ جائیں اور وہ اڑ کر یہاں سے اتنی دور جا سکے۔ صرف پانچ چھ روز بعد اس کے ارادے رنگ لے آئے۔ ایک روز علی الصباح جب ابھی لاہور اور لاہور والے باسی گہری نیند سو رہے تھے' وہ لاہور ریلوے اسٹیشن سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔

○☆○

ان دنوں کمپیوٹر نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ جن دفاتر میں کمپیوٹر کا استعمال شروع ہوا تھا وہاں کمپیوٹر آپریٹرز اور پروگرامرز کی زبردست مانگ تھی۔ محبوب کے پاس پروگرامنگ کا ڈپلوما تھا' اسی ڈپلوما کی بنیاد پر اسے یہ ملازمت ملی تھی۔ رہائش اور سواری کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ایک خانساماں بھی ملا ہوا تھا۔ چار پانچ کمروں والا ایک صاف ستھرا گھر تھا جہاں محبوب اپنے ایک ساتھی پروگرامر ارشد خاں کے ساتھ رہائش پذیر ہوا۔ ارشد خاں ایک لاابالی نوجوان تھا۔ شکل و صورت اچھی تھی' باتیں بھی خوب کرتا تھا' یہی وجہ تھی کہ صنفِ مخالف میں بھی اسے مقبولیت حاصل تھی۔ لڑکیاں اس سے ملنے کے لیے آتی رہتی تھیں۔ ارشد خاں کے پاس ایک ون ٹو فائیو موٹر سائیکل تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی کسی منظورِ نظر کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے بھی نکل جاتا تھا۔ اسے محبوب کے روکھے پھیکے روز و شب پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک دن کہنے لگا "یار! تم نے تو اپنے نام کی بھی لاج نہیں رکھی۔ محبوب ہو کر بھی کسی کے محبوب نہیں ہو تم۔ ارے یار جوانی میں آنکھ نہیں لڑاؤ گے تو کیا بڑھاپے میں لڑاؤ گے۔"

"بس یار طبیعت اس طرف نہیں آتی۔"

"طبیعت اس طرف نہیں آتی یا ویسے گھبراتے ہو۔" اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا "یار تم کوئی اسکول بوائے تو نہیں ہو۔ اچھے بھلے ملازمت پیشہ نوجوان ہو۔ اس عمر میں لڑکی پھنسانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ بس تھوڑی سی ہمت کر لے بندہ تو سارے کام آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچے دھاگے سے بندھی آتی ہے سرکار میری۔"

"اچھا کبھی فرصت ملی تو سوچیں گے اس بارے..."

میں بھی۔"

ارشد بولا "پنجابی کا محاورہ ہے سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ ویسے بھی نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آگے تمہاری مرضی ہے بھئی۔"

ارشد نے جو بات مذاق مذاق میں کہی تھی وہ بہت حد تک ٹھیک بھی تھی۔ صنفِ مخالف سے رابطہ کرنے کے حوالے میں محبوب ہمیشہ سے صفر تھا۔ وہ کم عقل نہیں تھا۔ پڑھا لکھا تھا' سمجھ دار تھا' کئی معاملات میں وہ خاصی دلیری کا مظاہرہ بھی کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ اس کے اور صنفِ مخالف کے درمیان ہمیشہ ایک دیوار حائل رہی تھی۔ شاید یہ کوئی ایسی صفت تھی جو اسے وراثت میں ملی تھی یا پھر بچپن اور لڑکپن میں اس کی تربیت ہی ایسے انداز سے ہوئی تھی۔ لاہور سے راولپنڈی پہنچنے کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال کئی بار آیا تھا کہ وہ سارہ کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کرے اور اس کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ کسی معقول لڑکی میں دلچسپی لینے لگے۔ یہاں ارشد خاں کی مصروفیات دیکھ کر اس کے ارادے کو مزید تقویت ملی تھی' لیکن اس نے جب بھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا' اس کی چھٹی حس نے ناکامی کی پیش گوئی کردی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود کسی معقول لڑکی سے راہ و رسم پیدا نہیں کرسکے گا۔ اس حوالے سے جب بھی بات بنتی نظر آئے گی' جب بھی کوئی فیصلہ کن لمحہ اس کا ہاتھ تھامنا چاہے گا' ایک فطری تذبذب اور گریز اس پر حاوی ہوجائے گا اور اس سے وہ "تھوڑی سی دیر" سرزد ہوجائے گی جو اسے ہمیشہ محرومی سے دوچار کرتی رہی ہے۔

وہ کئی ہفتے اپنے آپ سے ہی دست و گریباں رہا۔ اس دلفریب لیکن جاں گسل تصور سے لڑتا رہا جس نے راولپنڈی پہنچ کر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ یہ سارہ کا تصور تھا جو روز بہ روز بے باک اور بے لگام ہوتا جارہا تھا۔ اب صرف سارہ کی پیشانی اور رخسار اور ہونٹ ہی اس کے تصور میں نہیں چمکتے تھے' اب اس کا سیمیں بدن بھی اس کے خیالوں میں مہکتا تھا۔ اس غنچہ دہن کے نشیب و فراز اس کے وجود میں شعلے بھڑکاتے تھے۔ رات کے ریشمی اندھیرے میں کی جانے والی دلگداز سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونجتی تھیں اور اس کے لہو میں چنگاریاں بکھیر دیتی تھیں۔ وہ ساری ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔ جب بے قراری بہت بڑھ گئی تو اس نے از خود اپنا تجزیہ کرنا شروع کردیا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ نفسیاتی طور پر اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ نفسیاتی حل شاید یہی تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کو پانی کے چھینٹوں کی ضرورت تھی۔ صنفِ مخالف سے مسلسل دوری نے اس کے اندر جو آگ بھڑکائی تھی اسے ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے ایک روز وہ تن تنہا شہر کے ایک ایسے حصے میں جا پہنچا تھا جہاں حسن فروخت ہوتا تھا۔ نجانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت اس کے قدم خود بخود اٹھتے چلے گئے تھے اور جب اسے ہوش آیا تو وہ بازارِ حسن کی ایک گلی میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے صورتِ حال پر غور کیا اور خود سے یہ سوال پوچھا کہ 'کیا یہ میں ہی ہوں۔ محبوب احمد ولد وقار احمد ایک نہایت شریف النفس اور نیک نام نوجوان۔ گلی محلے میں اور عزیز و اقارب میں جس کی شرم و حیا اور پارسائی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جواب "ہاں" میں تھا اور اس جواب کی تصدیق وہ منظر کررہا تھا جو دور تک محبوب کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک طویل گلی تھی۔ دونوں طرف دو منزلہ اور سہ منزلہ مکان تھے۔ بالکونیاں' چھجے' کھڑکیاں اور دروازے۔ کہیں نزدیک سے ہی گھنگھروؤں کی چھنا چھن' طبلے کی آواز سے ہم آہنگ ہوکر فضا میں پھیل رہی تھی۔ جس جگہ محبوب کھڑا تھا وہاں سے گلی کا آغاز ہوتا تھا۔ یہاں پان سگریٹ کی دکانیں تھیں۔ تکے کباب کی خوشبو تھی' پھلوں کے ٹھیلے تھے اور گل فروشوں کے کیبن تھے۔ یہ سب پسندیدہ خوشبوئیں تھیں لیکن یہ ساری خوشبوئیں ایک سیلن زدہ ناپاک بو میں لپٹ کر بدبو بن گئی تھیں۔ وہ ایک ابر آلود دن کی گیلی گیلی سی دوپہر تھی۔ محبوب کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئی تھیں۔ یہاں کوئی اسے جاننے والا نہیں تھا' پھر بھی اسے محسوس ہورہا تھا کہ ہر نظر اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ جیسے پوری کائنات ایک آنکھ بن گئی ہے اور اس لمحے کا انتظار کررہی ہے جب وہ اس بدنام گلی میں داخل ہوگا اور کسی دروازے کے پیچھے اوجھل ہوگا۔

"کیا کروں؟ جاؤں کہ نہ جاؤں۔" وہ بار بار خود سے ہی پوچھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک باریش و بساتی نوجوان کو دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ مفلر میں چھپا رکھا تھا اور دوڑتا ہوا گلی کے ایک موڑ سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پولیس والا تھا۔ پولیس والے کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور وہ گالیاں بک رہا تھا پھر اس نے بھاگتے بھاگتے اپنا ڈنڈا وبساتی نوجوان پر کھینچ مارا تھا۔ ڈنڈا نوجوان کی ٹانگوں میں الجھا تھا اور وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ ان لمحات میں نوجوان کا مفلر کھل گیا تھا

اور محبوب کو پتا چلا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی ہے۔ نوجوان کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا ایک بغلی گلی میں غائب ہو گیا تھا۔

اس منظر نے محبوب کا حوصلہ مزید پست کر دیا تھا۔ بدنام گلی میں داخل ہونا اسے اتنا ہی مشکل نظر آنے لگا جیسے تلوار کی دھار پر ننگا پاؤں رکھنا۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ایک ٹھیلے والے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ بالکونیوں اور دروازوں میں عورتیں موجود تھیں۔ انہوں نے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپ رکھا تھا۔ کیا یہی وہ صنفِ نازک تھی جس کی تلاش میں محبوب یہاں پہنچا تھا۔ کیا وہ واقعی صنفِ نازک تھی؟ ان عورتوں کا بناؤ سنگار انہیں اور بھی بدصورت اور قابلِ رحم بنا رہا تھا۔ وہ ایسی کھنڈر عمارتوں کی مثال تھیں جن پر چراغاں کرنے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہو۔

محبوب کے قریب ہی سترہ اٹھارہ سال کا ایک اور لڑکا بھی کھڑا تھا۔ محبوب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح "معرکہ" سر کرنے کے لیے یہاں پہنچا ہے۔ وہ اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ پندرہ بیس قدم دور دروازے میں کھڑی ایک درمیانی عمر کی گنجی ہوئی عورت اسے مسلسل اشارے کر رہی تھی۔ لڑکے نے دو تین بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیری' پھر ایک جھٹکے کے ساتھ عورت کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں غڑاپ سے دروازے کے پیچھے اوجھل ہو چکے تھے۔ بمشکل دو منٹ بعد اندر سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا یہ آوازیں محبوب کے لیے ناقابلِ فہم تھیں۔ بس یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ عورت کسی بات پر غصے سے چیخ رہی ہے۔ پھر دھڑ سے دروازہ کھلا۔ لڑکے کا اولی مظفر اڑتا ہوا گلی میں آ گرا۔ گنجی ہوئی عورت کا چہرہ نظر آیا۔ وہ گرج رہی تھی "سالا' حرامی' لڑکی مانگتا ہے۔ میں تجھے بڈھی نظر آتی ہوں۔ دفعان ہو یہاں سے۔ نکل۔"

لڑکا سر جھکائے ہوئے باہر نکلا۔ اس نے جلدی سے اپنا مظفر اٹھایا اور عرقِ ندامت پونچھتا وہاں سے کھسک گیا۔ غالباً وہ یہ سمجھ کر اندر گیا تھا کہ "عورت" اس کے لیے کسی لڑکی کا بندوبست کرے گی لیکن وہ تو خود ہی بندوبست تھی۔ لڑکا سٹپٹا گیا تھا اور نتیجے میں خوار ہو کر نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

محبوب کی ہمت اب بالکل جواب دے گئی تھی۔ وہ واپس پلٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ٹھیلے والے نے اس کا ہاتھ تھام لیا "کیا بات ہے باؤ؟ گھبرا رہے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔"

محبوب نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹھیلے والے کو لے کر گلی میں داخل ہو گیا۔ محبوب کی رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ گردوپیش اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ رنگ برنگے کپڑے' سرخی پاؤڈر سے پوتے ہوئے چہرے' معنی خیز اشارے' سب کچھ اس کی نگاہوں میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ٹھیلے والا' محبوب کو گلی میں قریباً ایک فرلانگ چلانے کے بعد ایک شکستہ دروازے کے سامنے لے آیا۔ یہاں ایک جواں سال عورت موجود تھی' بلکہ شاید وہ لڑکی ہی تھی لیکن اس بستی کے زہریلے موسم میں عورت نظر آنے لگی تھی۔

"کتنے پیسے ہیں؟" عورت یا لڑکی کی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

محبوب نے کوئی جواب بھی دیا تھا لیکن اسے وہ جواب یاد نہیں۔ وہ عورت کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچا تھا لیکن اسے وہ کمرا یاد نہیں۔ کوئی چہرہ اس کے قریب آیا تھا لیکن اسے وہ چہرہ یاد نہیں۔ بس اسے اتنا یاد ہے کہ وہ ایک بیمار سا جسم تھا جو اس سے لپٹ گیا تھا۔ ایک ناگوار حرارت تھی جو اسے محسوس ہوئی تھی۔ ایک سیلن زدہ سی باس تھی جس نے اس کے ہوش و حواس کو مختل کیا تھا لیکن پھر یہ باس ایک جھونکے کی طرح آگے نکل گئی تھی' محبوب کے کھوئے ہوئے حواس اسے واپس مل گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس نے خود کو اس بدنام گلی سے دور ایک معروف چوک میں پایا تھا۔ اس نے ایک تانگے والے کو ہاتھ دیا تھا اور تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر اور اپنے گھر کا پتا بتا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سارہ کے غم کی دھار ایک دم کند ہو گئی ہے۔ اس آگ پر چھینٹے پڑ گئے ہیں جو اسے "رقصِ مرگ" پر مجبور کر رہی تھی۔ جو مقصد لے کر آج وہ اپنے گھر سے نکلا تھا' وہ پورا ہو گیا تھا۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ اس کی بیماری میں جو افاقہ ہوا تھا وہ بالکل عارضی تھا۔ دو تین دن بعد ہی سارہ کا غم ایک بار پھر پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو گیا بلکہ اس مرتبہ اس غم کی شدت پہلے سے سوا تھی۔ وہ تمتماتی پیشانی' وہ لب و رخسار ایک بار پھر اس کے پردۂ خیال سے چپک گئے تھے جن کی یاد اس کے لیے سوہانِ روح تھی۔ محبوب کا یہ خود ساختہ مفروضہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا کہ کوئی اور عورت سارہ کی جدائی کا مداوا کر سکتی ہے۔ محبوب کا خیال تھا کہ سارہ کا عشق ایک "بھوک" ہے۔ بھوک جو روٹی سے مٹائی جا سکتی ہے اور روٹی نہ ملے تو چاول سے مٹائی جا سکتی ہے۔ وہ بے خبر

تھا کہ یہ جسم کی بھوک نہیں وجود کا عشق ہے اور ایک "بیماری" ہے، جس کے لیے صرف ایک مخصوص دوا کارگر ہے۔ بدنام گلی میں رہنے والی وہ عورت نما لڑکی اس "بیماری" کا علاج بھی بیکا نہیں کر سکی تھی جس کا تعلق سارہ سے تھا۔ اس کے بعد میں محبوب کو سوائے ندامت اور پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ ایسے واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، سارہ کا غم ایک اٹل حقیقت ہے اور رہے گا۔

اس روز اس نے ایک دم پینترا بدل لیا اور وہ خوب مل مل کر نہایا اور اپنے جسم سے لپٹی ہوئی ہر غلاظت پانی اور صابن کے ملغوبے میں بہادی۔ اس روز اس نے صاف ستھرے سفید کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور جمعے کی نماز بڑے خلوص خضوع سے ادا کی۔ اس نے نماز کی پابندی شروع کردی۔ صبح اٹھ کر سیر کے لیے جانے لگا۔ کبھی کبھار سگریٹ پینے کا شوق تھا وہ بھی یکسر ختم کردیا۔ وہ اپنی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتا تھا اور ایک بدلا ہوا انسان بننا چاہتا تھا۔ زیادہ باوقار اور سلجھا ہوا ایک نوجوان۔ اس نے تنہائی میں بیٹھ کر اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر خوب غور کیا اور فیصلہ کیا کہ ان کمزوریوں کو دور کرکے رہے گا۔ اس کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری شاید یہ بھی تھی کہ اس کے پاس "فارغ وقت" ہوتا تھا۔ اس فارغ وقت میں سارہ کی یاد اس پر حملہ آور ہوتی تھی اور کسی آکٹوپس کی طرح اسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ اس فارغ وقت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے ایک کلب جوائن کرلیا۔ یہاں اسنوکر، سوئمنگ، پنگ پونگ، اسکواش وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ وہ رات گئے تک اس کلب میں مصروف رہنے لگا۔ محبوب کی ایک اور کمزوری اور شاید سب سے اہم کمزوری یہ تھی کہ وہ بے حد کم گو تھا۔ جہاں دس الفاظ بولنے کی ضرورت ہوتی تھی وہاں ایک لفظ بول کر کام چلا لیتا تھا۔ اس کے ساتھی اس بات کو بُری طرح محسوس کرتے تھے۔ محبوب نے اس خامی کو دور کرنے کی کوشش بھی شروع کردی تھی۔ حالانکہ اسے یقین تھا وہ ناکام ہوگا۔ وہ جب سے راولپنڈی آیا تھا صرف تین مرتبہ لاہور گیا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ جمعے کی شام کو لاہور پہنچا تھا اور رات گزارنے کے بعد علی الصباح چار بجے کی فلائنگ کوچ سے واپس آگیا تھا۔ اہلِ خانہ معترض تھے لیکن وہ ان کا اعتراض یہ کہہ کر دور کردیتا تھا کہ کام بہت زیادہ ہے۔ اب پچھلے دو ڈھائی مہینے سے تو اس نے لاہور کا یہ برائے نام چکر بھی نہیں لگایا تھا بس فون پر ہی اہلِ خانہ کی خیر خیریت دریافت کرلیتا تھا۔

سارہ کے حالات کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا، ہاں کبھی کبھار قدیر کا خط راولپنڈی کے ایڈریس پر آجاتا تھا۔ ان خطوں میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ قدیر ایک کمپنی میں ملازم تھا، وہاں سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ وہ خود بھی زیادہ زور نہیں لگا رہا تھا۔ ابھی تو اس نے بمشکل وہ قرضہ ہی اتارا تھا جو اس کی ماں نے اسے دبئی بھیجنے کے سلسلے میں لیا تھا۔ اب وہ کچھ رقم جمع کرنا چاہتا تھا اور رقم جمع کرنا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ موج میلہ کرنے والا شخص تھا۔ یاری دوستی بھی کافی تھی۔ روپیہ پیسہ جیسے ہاتھ میں آتا تھا ویسے ہی نکل جاتا تھا۔ کسی کسی خط میں سارہ کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ قدیر کے ساتھ سارہ کی خط و کتابت جاری تھی۔ اب قدیر کے خط سارہ کی ایک سہیلی کے ذریعے سارہ تک پہنچتے تھے۔ قدیر یہ خط کسی ہمراز سے لکھواتا تھا۔ کچھ دن پہلے قدیر نے سارہ کو ایک آڈیو کیسٹ بھر کر بھیجی تھی، جواب میں سارہ نے بھی کیسٹ ارسال کی تھی۔ اس کیسٹ میں محبوب کا ذکر بھی تھا۔ سارہ نے قدیر سے بڑے اصرار کے ساتھ پوچھا تھا کہ محبوب کے ساتھ اس کی (قدیر کی) کوئی ناراضگی تو نہیں ہوگئی اور اگر ایسا نہیں تو پھر محبوب بھائی جان اپنی صورت کیوں نہیں دکھاتے۔ کیوں بالکل اجنبی بن گئے ہیں۔ قدیر نے اپنی طرف سے اسے جواب ارسال کردیا تھا اور کہا تھا کہ وہ راولپنڈی میں بہت مصروف ہے اور خواہش کے باوجود لاہور آنے کے لیے وقت نہیں نکال پاتا۔ معلوم نہیں قدیر کے اس جواب نے سارہ کو مطمئن کیا تھا یا نہیں بہرحال اس سلسلے میں کوئی تازہ بات نہیں ہوئی تھی۔

وہ اوائل بہار کی ایک خوشبو سے لدی ہوئی رنگ دار شام تھی جب محبوب کو قدیر کا ایک چونکا دینے والا خط ملا۔ اس نے چھوٹتے ہی لکھا تھا "یار تم کیسے دوست ہو۔ یہاں راولپنڈی میں آرام سے بیٹھے ہو اور وہاں لاہور میں سارہ مصیبت میں ہے۔"

تفصیل بتاتے ہوئے قدیر نے لکھا "کوئی آوارہ قسم کا لڑکا ہے جو ہاتھ دھو کر سارہ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ٹویوٹا میں گھومتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ سارہ گھر سے نکلے اور وہ اسے پریشان کرے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ اس لڑکے کا تعلق تمہارے کالج سے ہے۔ سال ڈیڑھ سال پہلے تمہارے کالج میں کوئی ڈراما ہوا تھا اور ڈرامے کے دوران میں جھگڑا بھی ہوگیا تھا۔ سارہ کا خیال ہے کہ یہ لڑکا اسی ٹولے کا ہے جس سے جھگڑا ہوا تھا۔"

آگے جا کر قدیر نے لکھا تھا "میرے یار! تمہارے ہوتے

ہوئے مجھے کسی اور سے کہنا پڑے کہ وہ اس معاملے کو دیکھے تو بڑی شرم کی بات ہے۔ بے شک تم ملازمت اور پڑھائی میں بہت مصروف ہو اور تمہارے پاس کان کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ مگر امید کرتا ہوں کہ تم کم از کم ایک بار لاہور ضرور جاؤ گے اور بات کو سلجھانے کی کوشش کرو گے۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے اور تمہارے مشترکہ دوست جیدے کو بھی لکھا ہے۔ اس کا چچا زاد بھائی ایم این اے کا خاص بندہ ہے' وہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

خط پڑھنے کے بعد محبوب سخت پریشان ہو گیا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ جس معاملے کا ذکر قدیر نے خط میں کیا تھا اس کا براہِ راست تعلق محبوب سے تھا۔ کالج کے آڈیٹوریم میں ہونے والے ہنگامے میں محبوب ہی کی وجہ سے سارہ نے ایک لڑکے کا گریبان پکڑا تھا۔ اس واقعے کو ایک برس سے اوپر گزر چکا تھا۔ محبوب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ تنازع پھر سر اٹھائے گا۔

وہ اسی روز رات کو لاہور پہنچا۔ گھر والے اس کی غیر متوقع آمد سے حیران ہوئے اور خوش بھی۔ محبوب نے اپنی بڑی بہن راحت سے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن اسے سارہ والے معاملے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اگلے روز محبوب' سارہ کے گھر گیا۔ ایک عرصے بعد اس نے سارہ کو اور سارہ نے اسے دیکھا۔ سارہ کے چہرے پر گلے شکوے نمایاں تھے۔ ویسے بھی وہ کچھ پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ خالہ عطیہ نے بھی شکوے شکایات کی گٹھڑی کھول دی "ارے تو کیسا ہے محبوب! ایسی آنکھیں پھیریں کہ پھر ہماری خبر ہی نہیں لی۔ کیا غلطی ہو گئی تھی ہم سے۔"

محبوب شرم سے پانی پانی تھا' ہکلا کر بولا "میں آپ دونوں سے بہت شرمندہ ہوں خالہ جی۔ راولپنڈی میں کام اتنا زیادہ ہے کہ کچھ نہ پوچھیں۔ میں تو ترس گیا ہوں لاہور آنے کے لیے۔"

خالہ عطیہ نے کہا "یہ بات تو نہ کہو۔ اپنے گھر تو آتے جاتے ہی ہو نا۔ چپکے سے آتے ہو' چپکے سے چلے جاتے ہو۔ جب بھی سارہ کو پتا چلتا ہے کہ تم آئے تھے اور ملے بغیر چلے گئے ہو تو کئی دن اداس رہتی ہے۔"

سارہ ناراضگی سے بولی "چھوڑیں امی! جب ان کا دل ہی نہیں چاہتا ہم سے ملنے کو تو ہمارے کہنے سننے سے کیا فرق پڑے گا۔"

محبوب نے بمشکل تھوک نگلا اور بولا "سارہ! میں نے کہا ہے کہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ شروع کے تین چار مہینوں میں بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے میں تمہارے ہاں نہ آ سکا۔ اس کے بعد جھجک سی پیدا ہو گئی۔ سوچتا تھا کہ تمہاری ناراضگی کا سامنا کیسے کروں گا۔"

"ہم کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے آپ سے۔ ہمارا تعلق ہی کیا ہے۔" سارہ نے کہا اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔ وہ بہت خفا تھی۔

خالہ عطیہ بولیں "بیٹا! یہ بہت چاہتی ہے تمہیں۔ سچ پوچھو تو تمہارا نام لے لے کر جیتی ہے۔ جاؤ' ذرا اس کی دل جوئی کر دو۔"

محبوب اندر چلا گیا۔ وہ کمرے میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی اور چاول چن رہی تھی۔ چہرہ اترا اترا نظر آتا تھا' حتیٰ کہ وہ پیشانی بھی جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑتی تھی۔ محبوب نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کسی کو منانے کا ڈھنگ اسے کہاں آتا تھا۔ بس چند ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ یہ سارہ ہی کی مہربانی تھی کہ وہ ان بے اثر باتوں کا بھرم رکھتے ہوئے مان گئی۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر محبوب اصل موضوع پر آ گیا۔ محبوب نے قدیر کے خط کا ذکر کیا اور سارہ سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس کا نام یاسر تھا۔ وہ اسی پنڈال چوکڑی کا رکن تھا جس سے ڈرامے کے دوران میں سارہ کا جھگڑا ہوا تھا۔ سارہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لڑکا اکیلا نہیں ہوتا بلکہ گروپ کے تین چار اور مشٹنڈے بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

سارہ کی باتیں سن کر محبوب کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ بہرحال اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سارہ ڈری ڈری آواز میں بولی "محبوب بھائی جان! میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات آپ تک پہنچاؤں لیکن ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے' اس لیے مجبور ہو گئی۔ اب بھی میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ آپ ان سے کسی طرح کا جھگڑا کریں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یاسر کا بڑا بھائی مشہور صحافی ناصر احمد ہے اور ناصر احمد' وقار انکل کا شاگرد رہا ہے۔"

"اباجی کا شاگرد؟"

"ہاں جی۔ میرے خیال میں وقار انکل' ناصر احمد کو سمجھائیں تو وہ اپنے بھائی کو لگام ڈال لے گا۔"

محبوب نے کہا "ٹھیک ہے سارہ! تم بے فکر رہو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

سارہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ یہ چمک چھپانے کے لیے اس نے پلکیں جھکا لیں۔ محبوب کے سینے میں

جوالا مکھی دہک اٹھا تھا۔ اسے ایک ایسی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بے حد خاموش طبع اور بزدلی کی حد تک امن پسند شخص تھا۔ بچپن میں وہ کسی سے جھگڑا ہو تو ہو ورنہ ایسا کوئی واقعہ اسے یاد نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سوچ کر کوفت ہوتی تھی کہ وہ جھگڑے سے بچنے کے لیے بعض اوقات اپنے حق سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے لیکن کچھ بھی تھا یہ سب کچھ اس کے مزاج کا حصہ تھا اور وہ اسے تسلیم کر چکا تھا۔

مگر آج سارہ کے آنسو دیکھ کر اس نے جو کچھ محسوس کیا تھا' وہ بیان سے باہر تھا۔ یاسر کا چہرہ شیطانی مسکراہٹ لیے ہوئے بار بار اس کے تصور میں آ رہا تھا اور اس کی رگوں میں آگ بھڑکا رہا تھا۔ اسے یہ بات کچھ جچی نہیں کہ وہ اپنے والد کے پاس جائے اور ان سے کہے کہ وہ اپنے شاگرد ناصر احمد سے ملیں اور اس سے درخواست کریں کہ وہ اپنے لوفر بھائی کو سمجھائے۔ یہ تو بڑا کمزور سا ردِعمل تھا اور کیا معلوم کہ اس ردِعمل کا کوئی فائدہ بھی ہوتا تھا یا نہیں۔ محبوب' یاسر کو کسی حد تک جانتا تھا۔ وہ شروع سے ہی ایک خود سر اور جھگڑالو لڑکا تھا۔ کالج میں اکثر لڑکے اس سے نالاں رہتے تھے مگر عزت بچانے کے لیے خاموشی اختیار کرتے تھے۔ یہ بات بعید از ممکن تھی کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے سمجھانے بجھانے سے بھی باز نہ آتا۔

محبوب قریباً ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا۔ سوچ سوچ کر اس کا وجود آگ کی طرح تپنے لگا تھا۔ اسے بخار تھا۔ اگلے روز صبح سویرے اس نے چھوٹے بھائی عاطف کی موٹر سائیکل پکڑی اور اچھرہ میں یاسر احمد کے گھر جا پہنچا۔ یاسر کے گھر کا پتا اسے اپنے ایک دوست سے مل گیا تھا۔ کال بیل کے جواب میں گھر کا دروازہ کھولنے والا یاسر ہی تھا۔ وہ محبوب کو پہلے تو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا' پھر اسے پہچان کر دنگ رہ گیا۔

"ک۔۔۔ کیا بات ہے؟" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

محبوب کے چہرے پر نظر آنے والی ہیجانی کیفیت نے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اندیشے جگا دیے تھے۔

محبوب نے کہا "کیا گلی میں بات کرنا مناسب رہے گا؟"

یاسر چند لمحے کے لیے تذبذب میں رہا' پھر اس نے اندر جا کر گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

محبوب اندر داخل ہو گیا لیکن بیٹھا نہیں۔ اس کے سینے میں غم و غصے کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس طوفان کی شدت سے اس کا جسم تھان پان ہوئے ہوئے لرز رہا تھا۔

وہ یاسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "یاسر! میں تم سے لمبی چوڑی بات کرنے نہیں آیا' اور جو بات میں کرنے آیا ہوں اس کے بارے میں تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔ کیا خیال ہے؟"

محبوب کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ یاسر جو بڑے بڑے دبنگ لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا' ہونٹوں پر زبان پھیرنے پر مجبور ہو گیا' ہکلا کر بولا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

محبوب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور وہ سرتاپا لرز رہا تھا۔ عجیب سے خطرناک لہجے میں بولا "میں آج تک کسی سے جھگڑا نہیں ہوں۔ شاید اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی ہے لیکن میں ایک بات تمہیں بتا دوں' آج کے بعد تم نے یا تمہارے کسی بچے نے سارہ کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔۔۔ خدا کی قسم قتل کر دوں گا۔"

یاسر کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے محبوب کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس کے ہونٹ لرزے اور وہ بولا "یا۔۔۔ تت۔۔۔ تم کیسی بات کر رہے ہو' ہم نے ہمیشہ تمہاری عزت کی ہے' لیکن۔۔۔"

"بس۔۔۔ اور کچھ مت کہو۔" محبوب نے اس کی طرف انگلی اٹھائی "جو میں نے کہنا تھا' کہہ دیا ہے۔ اس کے سوا ایک لفظ نہیں کہوں گا اور نہ کچھ سنوں گا۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گھر واپس آ کر بھی محبوب رات تک لرزتا رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ کس جذبے نے سر اٹھایا تھا اس کے اندر' یہ کیسی طاقت ملی تھی اسے کہ اس نے یاسر جیسے غنڈے کو سہما کر رکھ دیا تھا۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ ہر جذبے کا ماخذ مرد و زن کا باہمی تعلق ہے۔ تو کیا آج کچھ دیر کے لیے جو توانائی برقِ آسمانی کی طرح اس کے جسم میں کوندی تھی وہ اسی باہمی تعلق کا نتیجہ تھی۔۔۔ یا پھر کوئی اور وجہ تھی کہ وہ زندگی میں پہلی بار اس طرح "جذباتی" ہوا تھا۔

نجانے کیوں اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ یاسر سے ہونے والی آج کی ملاقات یاسر کے لیے بے حد متاثر کن رہی ہے۔۔۔ اور اب سارہ کی جان اس مصیبت سے قریباً قریباً چھوٹ جائے گی۔

ساری رات اس کا جسم آگ کی طرح تپتا رہا۔ شاید یہ حرارت اس ہیجانی کیفیت کا نتیجہ تھی جو کل رات بھر اس پر طاری رہی تھی۔ اگلے روز نو دس بجے کے لگ بھگ وہ دوبارہ

جسے انجام تک لانا ممکن نہیں' اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑ دیا جائے۔

اس کے دل میں ارادے کی ایک بلند لہر اٹھی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پتا نہیں کیسے اس کے قدم سارہ کے گھر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ قریباً یہی وقت ہوتا تھا جب وہ اسے پڑھانے جاتا تھا لیکن آج وہ کچھ پہلے چلا آیا تھا۔ سارہ اپنے کمرے میں تھی۔ سویٹر بن رہی تھی۔ محبوب کو دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ وال کلاک دیکھ کر بولی "آج آپ کچھ جلدی نہیں آ گئے!"

"ہاں آج میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"زہے نصیب کہ آج آپ نے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

محبوب نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ دروازہ ڈور کلوزر کی وجہ سے خود ہی بند ہو گیا تھا۔ محبوب کے تاثرات دیکھ کر سارہ ذرا سی ٹھٹکی لیکن پریشان بالکل نہیں ہوئی "کوئی خاص بات لگتی ہے۔" وہ سر پر اوڑھنی درست کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں سارہ۔ بہت خاص بات۔" محبوب کی آواز لرز رہی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" سارہ کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی آ گئی۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔" محبوب نے کہا۔ اس کا دل سینے میں ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ زبان کی جگہ چمڑے کا ایک خشک ٹکڑا ہے جو ہزار کوشش کے باوجود بھی حرکت نہیں کرے گا "بات دراصل یہ ہے سارہ کہ۔۔۔" آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ ایک پھندا سا لگ گیا۔

وہ کوشش کے باوجود اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ چند لمحے سکتے کی سی حالت میں وہاں کھڑا رہا پھر اس نے بات کو مختلف انداز میں کہنے کے لیے اپنے ذہن میں الفاظ کی ترتیب بدلی۔ ایک بار پھر ہمت جمع کی اور بولنے کے لیے لبوں کو حرکت دی لیکن اسی دوران میں سارہ کی چھوٹی بہن شاہین کی آواز آ گئی "باجی سارہ! کہاں ہیں آپ؟ امی چھت پر بلا رہی ہیں۔"

سارہ ٹھٹک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ محبوب نے سر کو عجیب سے انداز میں جھٹکا اور دروازے کی طرف گھوم گیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سارہ کے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے میں ناکام رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے دیر کر دی تھی۔ یہ "دیر" اس کے شب و روز میں یوں سرایت کر چکی تھی کہ اس کی زندگی کا ہی ایک حصہ بن گئی تھی۔

اگلے روز وہ سارہ کو پڑھانے گیا۔ سارہ بار بار پوچھتی رہی "بھائی جان! کیا بات تھی جو آپ کہنا چاہ رہے تھے؟"

"پھر کسی وقت بتاؤں گا۔" وہ بار بار یہی جواب دے رہا تھا۔

"لگ۔۔۔ کہیں شہلا باجی کے بارے میں تو کوئی بات نہیں تھی۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"پھر وہی شہلا۔" وہ قدرے غصے سے بولا "تم اسے بار بار کیوں گھسیٹ لیتی ہو اپنی باتوں میں۔ کیا میری زندگی صرف شہلا کے گرد ہی گھومتی ہے۔"

"اوہ۔ آپ تو ناراض ہو گئے۔ اچھا معاف کر دیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے کتابیں کھولو۔"

"آپ کی ناراضگی دور نہیں ہوئی۔" وہ ادا سے بولی "ٹھیک ہے جناب! اب آپ سے نہیں پوچھوں گی کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ اوکے؟" اس نے ہاتھ جوڑے۔

"یس اوکے۔"

وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ دوسرے روز سارہ کا پہلا پیپر تھا۔ پیپر بھی انگلش کا تھا۔ عام طور پر محبوب شام سات آٹھ بجے واپس آ جاتا تھا لیکن اس روز وہ دیر تک پڑھاتا رہا۔ سارہ بھی بڑی توجہ سے پڑھتی رہی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ رات کے دس بج گئے۔ بے احتیاطی سے محبوب کا بخار بڑھا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے حرارت ہو جاتی تھی۔ آج دو تین دن بعد وہ پھر حرارت محسوس کر رہا تھا لیکن سارہ پر کچھ ظاہر کیے بغیر وہ اسے تیاری کرواتا رہا۔ سارہ کی بہنیں اپنے والد کے ساتھ کسی شادی میں سیالکوٹ گئی ہوئی تھیں۔ بس خالہ عطیہ گھر میں تھیں۔ سارہ کے امتحان تھے اس کے ساتھ کسی کو تو گھر میں رہنا ہی تھا۔ نو بجے کے قریب خالہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ بہرحال وقفے وقفے سے ان کی کھانسی کی آواز آ جاتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر پر جانے کے باوجود جاگ رہی ہیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے محبوب تھک سا گیا تھا۔ وہ اب گھر جانا چاہ رہا تھا لیکن سارہ کا آخری مضمون مکمل ہی نہیں ہو پا رہا تھا "کتنی دیر ہے بھئی۔"

"بس پانچ منٹ بھائی جان۔" اس نے نوٹ بک پر جھکے جھکے جواب دیا۔

اس کی ایک لٹ ڈھلک کر نوٹ بک کو چھو رہی تھی۔ لمبی گردن کا خم قابلِ دید تھا۔

محبوب کمر سیدھی کرنے کے لیے آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد سارہ نے مضمون مکمل کر لیا۔ نوٹ بک محبوب کو تھمانے کے لیے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ دونوں کے ہاتھ چھو گئے۔ سارہ نے چونک کر محبوب کا ہاتھ تھاما "آپ کو تو بخار ہے۔"

"ہاں کچھ حرارت سی ہے۔"

"حرارت نہیں جناب۔ اچھا بھلا بخار ہے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

اس نے لپک کر الماری میں سے تھرمامیٹر نکالا اور محبوب کے منہ میں دے دیا۔ بخار ۱۰۲ سے زیادہ تھا۔ وہ محبوب پر ناراض ہونے لگی کہ اتنے بخار کے باوجود اس نے بتایا کیوں نہیں۔ محبوب اٹھنا چاہ رہا تھا لیکن وہ بولی "لیٹے رہیں۔ میں آپ کا سر دبا دوں۔"

اس کے ٹھنڈے نرم ہاتھ محبوب کی تپتی پیشانی پر آئے تو بقول شاعر 'روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی۔ وہ مبہوت سا رہ گیا۔ دو تین منٹ بعد جب وہ اٹھنا ہی چاہ رہا تھا ایک دم لائٹ چلی گئی۔ کمرے میں اور کمرے سے باہر اور دور تک گھپ اندھیرا چھا گیا۔

"اوہ۔" سارہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس کے ہاتھ بدستور محبوب کی پیشانی پر حرکت کر رہے تھے۔

چند سیکنڈ بعد وہ بولی "میں موم بتی لے آؤں۔"

"نہیں رہنے دو۔" نجانے کیسے محبوب کے ہونٹوں سے نکل گیا۔

کمرے میں چند لمحے بے ڈھنگی سی خاموشی رہی پھر محبوب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "ابھی آ جاتی ہے لائٹ۔ خواہ مخواہ کہیں ٹھوکر لگے گی۔"

سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تاریکی محبوب کے لیے بڑی سازگار تھی۔ وہ جو بات کل نہیں کہہ سکا تھا وہ آج اس تاریکی میں کہہ سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے بدن میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ اس نے الفاظ منتخب کیے اور فقرے کو ترتیب دینے لگا لیکن ایک بار پھر وہی کم ہمتی اچانک اس پر طاری ہو گئی جس نے کل اسے دبوچا تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ یہ بات کبھی بھی باوقار انداز اور لب و لہجے میں سارہ تک نہیں پہنچا سکے گا اور بے وقار ہونا اسے قبول نہیں تھا۔ ایک دم ہی تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے تاریکی کو مزید گہرا کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ سارہ کے ہاتھ پیشانی پر متحرک تھے۔ کبھی کبھی کوئی چوڑی ہولے سے کھنک جاتی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں بولی "میری الماری میں ڈسپرین موجود ہے۔ آپ کہیں تو لا دوں۔"

"نہیں' رہنے دو۔" محبوب نے کہا۔

اس کا دل ایک بار پھر عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی' بدن میں کوئی شعلہ بھڑک اٹھا تھا۔ اس کی زبان کو بولنے کی سکت نہیں تھی لیکن اس کے ہاتھ کو حرکت میں آنے کی سکت تھی۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور عام سے انداز میں سارہ کے بازو سے مس ہو گیا۔ بالکل جیسے محبوب کو خود بھی خبر نہ ہو کہ اس کا ہاتھ سارہ کے بازو سے چھو رہا ہے۔ وہ اس معمولی سے لمس کی ہر تفصیل جانتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت کا چھوٹی انگلی والا حصہ سارہ کے بازو پر کہنی سے ذرا نیچے چھو رہا تھا۔ وہ نصف آستین پہنے ہوئے تھی لہٰذا بازو ننگا تھا۔ یہ ایک غیر اہم سا لمس تھا لیکن اس کی قدر و قیمت صرف اور صرف محبوب جانتا تھا۔ قریباً دو منٹ اسی طرح گزرے پھر اس ہاتھ نے دوبارہ حرکت کی اور آہستگی سے سارہ کے بازو پر رینگ گیا۔ اب ہاتھ نے کروٹ لے لی تھی اور اس کی ہتھیلی سارہ کے بازو پر تھی۔ جو بات زبان سے ادا نہیں ہو سکتی تھی اسے "ہاتھ" بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سارہ کی طرف سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تھا' کم از کم محبوب کو محسوس نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں کے درمیان تاریکی کا پردہ تھا۔ تاریکی جو صدیوں سے بھید چھپاتی آئی ہے۔

کچھ دیر بازو پر رہنے کے بعد محبوب کا ہاتھ سارہ کے شانے پر آ گیا۔ وہ خاموش تھی اور یہ خاموشی بڑی تباہ کن تھی۔ محبوب کے بدن میں ہزاروں سورج طلوع ہو گئے تھے اور ان کی حرارت اسے پگھلاتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا۔ بات ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔" سارہ کی مدھم آواز ابھری۔

محبوب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب "دینے کے بجائے" جواب "نہ دینا" اسے بہت اچھا لگا۔ اس خاموشی میں ایک طوفان' ایک ہیجان تھا۔ ہزاروں سورجوں کی حرارت خون کو لاوے کی طرح کھولا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اس کے شانے پر پڑا رہا' دھیرے دھیرے حرکت کرتا رہا' اس کی شفاف گردن سے چھونے لگا۔

لائٹ گئے قریباً پانچ چھ منٹ گزر چکے تھے۔ قریبی کمرے

سے سارہ کی والدہ کی آواز آئی "کیا بات ہے سارہ! موم بتی نہیں جلائی؟"

"اُف۔۔۔ ڈھونڈ رہی ہوں امی۔ مل نہیں رہی۔" سارہ نے کہا اور یونہی ٹیبل لیمپ کو اِدھر سے اُدھر کیا۔ محبوب کا ہاتھ بدستور اس کے شانے پر تھا۔ محبوب کی کہنی کسی گداز سے چھو رہی تھی۔ ایک دم محبوب کے لیے وہ بات کہنا آسان ہوگئی جو "ہاتھ کی حرکت" سے پہلے کہنی بے حد۔۔۔ بے حد مشکل تھی۔ اس نے اپنی تمام جسمانی اور ذہنی قوت کو ایک نقطے پر مرکوز کیا اور آنسوؤں سے بوجھل ایک ناقابلِ شناخت آواز میں بولا "آئی لو۔۔۔ یو۔۔۔ سارہ۔"

ایک دم جیسے کوئی ہزاروں لاکھوں قمقموں والا فانوس آسمان سے گرا اور سنگلاخ زمین سے ٹکرا کر زبردست چھناکے سے چکنا چور ہوگیا۔ اس چھناکے کی گونج سیکڑوں میل کے دائرے میں پھیلتی اور گونجتی محسوس ہوئی۔ ان لمحوں میں وقت بھی جیسے تھم گیا تھا۔

"یہ لو۔ یہ رہی موم بتی۔" خالہ حلیمہ کی آواز برآمدے کی طرف سے آئی۔

سارہ کے جسم میں جھرجھری سی نمودار ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ محبوب کا ہاتھ اس کے شانے پر سے پھسل گیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ چند لمحے بعد کمرے میں روشنی کی کرنیں نمودار ہوئیں۔ موم بتی کارنس پر روشن ہوگئی۔ محبوب نے اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ اس بازو کی اوٹ سے اس نے سارہ کو دیکھا۔ شمع کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔ ایسی خاموش محبوب نے اس کے چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ توقع کرتا رہا کہ وہ کچھ کہے گی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید تیز ہوا چل رہی تھی۔ شاید آندھی آگئی تھی۔ یہ لائٹ غالباً آندھی کی آمد کے سبب ہی گئی تھی۔ اچانک کمرے کی دو بند کھڑکیاں ایک دھماکے سے کھلیں اور ہوا کے تیز جھونکے سرکش گھوڑوں کی طرح کمرے میں چکرا گئے۔ موم بتی بجھ گئی۔ ایک بار پھر گہری تاریکی چھاگئی۔ محبوب کھڑکی بند کرنے کے لیے بڑھا۔ شاید اسی وقت سارہ بھی کھڑکی کی طرف بڑھی تھی۔ دونوں ٹکرا گئے۔ سارہ جھجک کر پیچھے ہٹی لیکن محبوب کے ہاتھ اس کے شانوں پر تھے۔ اس نے سارہ کو روک لیا۔ اس میں اتنی جرأت نجانے کہاں سے آگئی تھی یا پھر شاید یہ "تاریکی کی جرأت" تھی۔

"آئی لو یو سارہ۔" اس نے ایک بار پھر بے باک سرگوشی کی اور اسے گلے سے لگالیا۔ وہ بری طرح کسمسائی۔

"نہ کریں۔۔۔ چھوڑ دیں مجھے۔"

لیکن محبوب کی گرفت مضبوط تھی۔ اس گرفت میں محبت بھرا جوش لہریں لے رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ اس کے رخساروں پر رکھ دیے "چھوڑ دیں پلیز۔۔۔ پیچھے ہٹ جائیں۔" وہ کراہ رہی تھی۔

شاید وہ زیادہ بلند آواز سے بولتی۔ شاید وہ زیادہ شدید مزاحمت کرتی لیکن خالہ حلیمہ برآمدے میں تھیں۔ سارہ کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ آواز ان تک پہنچے۔ اس کی پشت دیوار سے لگ گئی تھی اور جسم محبوب کی بانہوں میں تھا۔ وہ اسے دیوانہ وار چوم رہا تھا' بھینچ رہا تھا۔ وہ رونے لگی تھی۔ اس کے گلے میں جیسے پھندا سا لگ گیا تھا۔ بولنا چاہ رہی تھی لیکن بول نہیں پا رہی تھی' محبوب کو پیچھے ہٹانا چاہ رہی تھی لیکن ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ گاہے گاہے اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلتی تھی "پلیز چھوڑ دیں۔ پلیز۔۔۔ چھوڑ دیں مجھے۔"

وہ اسے خوب چوم چکا تو اس کے بال اپنی مٹھی میں لیے اور اس کا چہرہ آہستگی سے اوپر کی طرف اٹھا دیا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا۔ اپنے دل کی کیفیت بیان کرنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ کوئی جملہ ہی نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر صرف اتنا ہی کہہ سکا "آئی لو یو" اور آہستگی سے اسے چھوڑ دیا۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ گہری تاریکی اس کا پردہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس پردے کی اوٹ میں سارہ کے گھر سے نکلا اور گلی میں آگیا۔ اس کے قدم تیزی سے اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔

○☆○

جو کچھ ہوا وہ خواب و خیال جیسا تھا۔ محبوب کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔ وہ جو کسی لڑکی سے بات کرتے ہوئے پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے یوں جارحانہ انداز میں اس لڑکی سے اظہارِ محبت کرے گا جو اس سے ایسے اقدام کا تصور تک نہیں کرسکتی۔ جس نے اسے عزت و تکریم کے بلند و بالا درجے پر فائز کر رکھا ہے اور جو محبوب کے لیے قابلِ صد احترام ہے۔

محبوب نے گھر آنے کے بعد کمرا بند کیا اور سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم شدت سے لرز رہا تھا۔

یقیناً یہ بخار کا لرزہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گلی کوچوں میں آندھی کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی محبوب کے اندر چلنے والی آندھی بھی تھم گئی۔ جونہی یہ آندھی تھمی اس پر ندامت اور پچھتاوے کا شدید ترین دورہ پڑ گیا۔ یہ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ عرق ندامت میں ڈوب ڈوب جانے لگا۔ سارہ اور خالہ عطیہ اسے کیا سمجھتی رہی تھیں اور وہ کیا نکلا تھا۔ وہ آسمان کے تارے سے نالی کا کنکر بن گیا تھا اور پھر اچانک ایک اور چہرہ اس کے تصور میں آیا۔ وہ چہرہ جو نجانے کیوں پچھلے چند روز سے اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل تھا۔ بالکل بھولا ہوا تھا۔ وہ قدیر کا چہرہ تھا۔ قدیر جو اس کا پیارا دوست تھا۔ جس نے دبئی جاتے وقت کہا تھا "شہزادے! سارہ کا خیال رکھنا۔"

یہ کیسا "خیال" رکھا تھا اس نے۔ یہ کیسی دوستی نبھائی تھی؟ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ گیا۔ نہایت کرب کے عالم میں اس نے دیوار پر مکے برسائے اور اپنے بال نوچ لیے۔ اس کا جی چاہا اپنی جان لے لے۔ وہ صوفے پر اوندھا گر گیا اور سسکنے لگا۔ گرم آنسو دھاروں کی صورت بہہ نکلے اور اس کا بازو بھگونے لگے۔ وہ کس آزمائش سے دوچار ہو گیا تھا۔ ایک طرف قدیر کی دوستی تھی اور دوسری طرف سارہ کی جان لیوا محبت۔ وہ تصور ہی تصور میں قدیر سے مخاطب ہوا۔ "مجھے کیوں یہاں بھیجا تھا تم نے؟ کیوں فرمائش کی تھی لاہور آنے کی۔ پڑا رہنے دیا ہوتا مجھے وہیں۔ کاٹنے دی ہوتی قید بامشقت۔ میں کہاں تھا اس قابل کہ پھر سارہ سے ملتا۔ یہ سب تمہارا قصور ہے۔ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔" وہ بہت دیر روتا رہا اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ پچھتاوا کم ہونے کے بجائے شدید تر ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں لیٹے لیٹے فیصلہ کیا کہ آج رات ہی لاہور سے چلا جائے گا اور یہ فیصلہ بھی کیا کہ آئندہ وہ کبھی سارہ کی اور خالہ عطیہ کی صورت نہیں دیکھے گا۔

رات کے آخری پہر اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ صرف بڑی بہن راحت کو جگا کر بتایا کہ راولپنڈی سے فون آیا ہے۔ اس کا راولپنڈی پہنچنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ وہ صبح چار بجے والی فلائنگ کوچ سے راولپنڈی جا رہا ہے۔ راولپنڈی پہنچ کر محبوب خود کو کار روز و شب میں گم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ ایک ایسی اتھل پتھل جاری تھی اس کے اندر جس کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ اس اتھل پتھل میں کئی طرح کے کرب شامل تھے۔ اہل خانہ سے دوری کا کرب، اپنی محبوب کی گلی سے دوری کا کرب، تاہم ان میں سب سے نمایاں کرب کا تعلق پچھتاوے سے تھا۔ یہ پچھتاوا ایک آسیب کی طرح ہر گھڑی محبوب سے چمٹا رہتا تھا۔ وہ قدیر کو کیا منہ دکھائے گا۔ کس طرح اس کی سوالیہ نظروں کا سامنا کرے گا۔ اس پچھتاوے نے محبوب کا دل ہر چیز سے اچاٹ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دنیا نہیں چھوڑ سکتا تو کم از کم پاکستان ضرور چھوڑ دے۔ دور چلا جائے اس ملک سے جہاں وہ کسی بھی وقت سارہ اور قدیر کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ اب اس میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ان سے مل سکتا۔ ان کی دید میں محبوب کے لیے بدترین ذلتیں پوشیدہ تھیں۔ اس نے پاسپورٹ بنوا لیا تھا اور اوورسیز جاب کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ کمپیوٹر میں اب اس کے پاس ہائی کوالیفیکیشن تھی، قریباً دو سال کا تجربہ بھی ہو چکا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ اس میں "پی آر" کی زبردست کمی تھی۔ شاید وہ تیز طرار لوگوں سے بھری ہوئی اس دنیا کا فرد ہی نہیں تھا۔ اسے ملازمت کے لیے انٹرویو دینے سے نفرت تھی اور شاید "انٹرویو" کو بھی اس سے نفرت تھی۔ اس "انٹرویو" نے کبھی بھی اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ملازمت کے لیے انٹرویو دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اپنے اندر موجود صفات اور کمالات کے بارے میں بتایا جائے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ہمیشہ ناکام ہوا تھا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کی خاموشی ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اب اس نے اپنی صفات تلاش کرنے کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا تھا اور اپنی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز کر دی تھی کہ اس کے اندر نمایاں صفات پیدا ہو جائیں۔ اتنی نمایاں کہ اس کی بے زبانی کے باوجود چھپی نہ رہ سکیں۔ غالباً وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوا تھا۔ سعودیہ میں اسے کمپیوٹر پروگرامنگ کی اچھی جاب مل گئی تھی۔ تنخواہ بھی توقع سے کم نہیں تھی۔ وہ تین مہینے بعد پہلی بار راولپنڈی سے لاہور آیا۔ وہ رات کے وقت آیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ وہ لاہور میں ہے۔ اس نے ماں باپ اور بہن سے سعودیہ جانے کی اجازت چاہی۔ اجازت لینے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ ساٹھ ستر ہزار پاکستانی روپے ماہوار مل رہے تھے۔ ترقی کے چانسز بھی تھے۔ اہل خانہ سے اجازت حاصل کر کے وہ راتوں رات ہی راولپنڈی واپس چلا گیا تھا۔ چند روز بعد اس کی سعودیہ روانگی بھی راولپنڈی سے ہی ہوئی تھی۔ وہ ہوا کے دوش پر سوار ہوا تھا اور ایک دور افتادہ منزل کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

○☆○

نیا ملک' نیا ماحول' نئے ساتھی اور توجہ طلب مصروفیات۔ کم آمیز اور تنہائی پسند ہونے کے باوجود محبوب کے شب و روز میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ نئی فضا میں پہنچ کر اسے سکون سا آگیا تھا۔ جیسے کوئی جلتے تپتے صحرا سے نکل کر درختوں کی پناہ میں آجائے' یا لو کے تھپیڑے بارش کی پوچھاڑوں میں بدل جائیں۔ اس نے ایک خاص احتیاط یہ کی تھی کہ اپنا ایڈریس کسی کو نہیں بتایا تھا۔ صرف والد' والدہ اور بڑی بہن راحت کو اس ایڈریس کا علم تھا۔ محبوب نے انہیں تاکید کردی تھی کہ وہ یہ ایڈریس صرف اپنے تک رکھیں۔

لاہور کی اس طوفانی رات کو پیش آنے والے واقعے کی یاد دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگی۔ قدیر اور سارہ کے چہرے پردۂ تصور پر کم کم نمودار ہونے لگے۔ ہاں جب کبھی فرصت ہوتی اور وہ بستر پر دراز ہوتا تو یہ ساری یادیں ایک دم اجاگر ہوجاتیں اور ایک جری لشکر کی طرح ہلہ بول کر اس پر حملہ آور ہوجاتیں۔ آنکھوں کے سامنے مناظر ابھرتے اور پھر ان مناظر سے وابستہ سوال ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگتے۔ وہ سوچتا "اس واقعے کے بعد سارہ کا ردِعمل کیا تھا۔ اس نے خالہ عطیہ کو بتایا تھا یا نہیں۔ اس نے قدیر کو آگاہ کیا تھا یا نہیں۔ اگر آگاہ کیا تھا تو قدیر کا ردِعمل کیا تھا' خالہ عطیہ کا ردِعمل کیا تھا۔ قدیر نے کیا سوچا تھا۔ اگر قدیر سے اس کی ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کیا کہتا پھر ایک اور سوچ اسے الجھن کے خار زار میں گھسیٹنے لگتی۔ اس طوفانی رات کو تاریک کمرے کا تاریک نقش اس کی آنکھوں کے سامنے آتا۔ اسے یاد آتا کہ اس نے کس طرح سارہ کو اپنی بانہوں میں لیا تھا۔ کیسے دیوانہ وار اس پر جھک گیا تھا۔ اسے سارہ کی مزاحمت یاد آتی۔ محبوب کے رویے کے مقابلے میں سارہ کی مزاحمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ منطقی طور پر یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پوری شدت سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کرتی اور نہ چھڑا سکتی تو بلند آواز میں بولتی یا پھر والدہ کو مدد کے لیے پکارتی اور اگر وہ اس کے منہ پر طمانچے بھی رسید کردیتی تو یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن وہ صرف کسمساتی رہی تھی یا دبی دبی آواز میں احتجاج کرتی رہی تھی۔ کیا وہ محبوب کو اتنی ہی عزت دیتی تھی کہ اس کی نہایت غلط سلوک کے باوجود خاموش رہی تھی اور اس بات سے ڈرتی رہی تھی کہ کہیں والدہ کو معلوم نہ ہوجائے کہ وہ کیا کررہا ہے۔ یا پھر یہ ہوسکتا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہوگئی ہو۔ اس کے حواس مختل ہوگئے ہوں لیکن یہ بات بھی کچھ دل کو لگتی نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ بول رہی تھی' احتجاج کررہی تھی لیکن یہ احتجاج لفظ تھا۔ پھر کسی وقت محبوب کو یوں محسوس ہوتا کہ سارہ پہلے سے ہی اس قسم کے سلوک کی توقع کررہی تھی۔ اس کے لاشعور کے کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ کسی وقت محبوب اس قسم کے رویے کا مظاہرہ کرسکتا ہے (ایک دن پہلے بھی تو وہ خاص بات کہنے کے لیے سارہ کے پاس پہنچا تھا لیکن کہہ نہیں سکا تھا) اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ بات بھی متوقع تھی کہ سارہ اس اتھل پتھل سے آگاہ ہو جو تقریباً دو سال سے محبوب کے دل میں مچی ہوئی تھی۔ اور وہ خود بھی کسی نہ کسی حد تک اس اتھل پتھل کا شکار ہو۔ محبوب ان معاملات میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا چلا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس نے سوچنے کی عادت پر قابو پانا شروع کردیا۔ وہ اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ جو اوراق وہ اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ چکا ہے ان پر کیوں غور کررہا ہے۔ ماضی اب مدفون تھا۔ اب وہ اس کی قبر پر بیٹھا کیوں نوحے پڑھ رہا تھا۔ اس نے بتدریج خود کو سنبھالنا شروع کردیا۔ وہ رام شہر میں مقیم تھا۔ جس کمپنی میں وہ کام کررہا تھا وہاں پاکستانی اور انڈین باشندوں نے ایک ہاکی ٹیم بنا رکھی تھی۔ ہاکی کا شوق اسے شروع سے تھا۔ وہ اس ٹیم میں شامل ہوگیا۔ یوں ملازمت سے جو وقت بچتا تھا وہ اسپورٹس میں صرف ہوجاتا تھا۔ چھٹی کے روز وہ لوگ فلم دیکھتے تھے یا سیر کے لیے چلے جاتے تھے۔ گھر سے والد' والدہ اور باجی کے جو خطوط آتے تھے ان میں کسی وقت اردگرد کے حالات کی جھلک بھی ملتی تھی۔ اس اردگرد میں سارہ' خالہ عطیہ اور قدیر وغیرہ بھی شامل تھے۔ سارہ کے بارے میں محبوب کے کچھ اندیشے ختم ہوگئے تھے۔ اگر اس نے محبوب کے "اظہارِ محبت" کا ذکر خالہ عطیہ یا کسی اور سے کیا ہوتا تو یہ بات والدین کی وساطت سے محبوب تک بھی پہنچ جاتی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سارہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس نے بی اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا ہے اور ایم اے کرنا چاہ رہی ہے لیکن خالہ عطیہ نے اس کی شادی کا پکا ارادہ کررکھا ہے۔ قدیر کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ بڑی عید کے موقع پر پاکستان آیا تھا اور قریباً ایک ماہ یہاں گزار کر گیا ہے۔ وہ پہلے سے کافی موٹا ہوچکا ہے اور ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے۔ وہ محبوب کے والدین سے بے حد اصرار کرتا رہا تھا کہ وہ محبوب کا ایڈریس دیں لیکن انہوں نے کہا تھا کہ محبوب کا ایڈریس تبدیل ہوچکا ہے اور نیا ایڈریس خود انہیں بھی معلوم نہیں ہے۔ آخر قدیر ناراض ہوگیا تھا

اور دبئی واپس جاتے ہوئے محبوب کے گھر والوں سے مل کر بھی نہیں گیا تھا۔

کبھی کبھی محبوب کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن راحت کو خط لکھے اور اس سے قدیر اور سارہ کے بارے میں پوچھے (راحت کو قدیر اور سارہ کے معاملے کی خبر نہ تھی) راحت اسے بتا سکتی تھی کہ ان دونوں کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے اور حالات نے ان دونوں کے لیے کیا رخ اختیار کیا ہے لیکن کوشش کے باوجود وہ راحت کو لکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دیر کر دینا اس کی فطرت کا وصف خاص تھی۔ اس کی پوری زندگی اسی تذبذب سے عبارت تھی۔ زندگی میں صرف اور صرف تین موقع ایسے آئے تھے جب اس نے مختلف رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک اس وقت جب اس نے اپنی اندرونی شکست و ریخت سے گھبرا کر بازارِ حسن کا رخ کیا تھا۔ دوسرے اس وقت جب اس نے سارہ کے سلسلے میں صحافی ناصر احمد کے آوارہ بھائی یاسر سے بات کی تھی اور تیسرے اس وقت جب لاہور کی اس طوفانی رات میں اس نے تاریکی کا سہارا لے کر سارہ سے اظہارِ محبت کر دیا تھا۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ روز و شب ایک دوسرے کے تعاقب میں محوِ پرواز رہے' ہوائیں چلتی رہیں' بادل گرجتے برستے رہے' سورج مشرق سے مغرب تک اپنا سفر مکمل کرتا رہا۔ اسی طرح کوئی تین برس گزر گئے۔ محبوب اب خود کو کافی حد تک "سیٹل" کر چکا تھا۔ وہ ہر ماہ پچیس تیس ہزار روپیہ گھر بھیجتا تھا۔ افسران اپنے اس کم گو لیکن بہت محنتی ماتحت سے خوش تھے اور وہ اپنے کام سے مطمئن تھا۔

محبوب کی بہن راحت کی شادی بڑے اچھے طریقے سے انجام پا چکی تھی۔ محبوب "کوشش" کے باوجود اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اب یہ بات تو وہ خود ہی جانتا تھا کہ اس نے کتنی "کوشش" کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہن کی شادی میں شریک ہونے کی شدید خواہش کے باوجود وہ خود کو پاکستان جانے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے سعودیہ سے ہی ڈھیروں روپیہ' ڈھیروں دعائیں اور ڈھیروں آنسو اپنی باجی کے نام کر دیے تھے۔ راحت اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ اب گھر میں محبوب کی شادی کی باتیں ہونے لگی تھیں لیکن وہ ابھی اس معاملے سے بہت دور رہنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل ایک زخم ہے جس پر کھرنڈ آ رہا ہے۔ اگر کسی وجہ سے کھرنڈ اتر گیا تو اس کی ہر دھڑکن کے ساتھ اس کا پورا جسم لہو میں نہاتا چلا جائے گا۔

اسی طرح چند ماہ مزید گزر گئے۔ وہ اکتوبر کی ایک خوشگوار شام تھی۔ محبوب ایک تفریحی پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ پارک میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا اور ان پھولوں کا موازنہ ان پھولوں سے کر رہا تھا جو اس کے وطن میں کھلتے تھے۔ اس کے گھر کے پچھواڑے پھلواری میں کھلنے والے پھول' کالج کے لان میں مہکنے والے پھول اور وہ پھول جو سارہ کے گھر دیوار پر اُدھ چڑھی بیل میں مسکراتے تھے۔ جب کبھی بھی سارہ کے گھر دیوار پر چڑھی ہوئی دبلی پتلی بیل اسے یاد آتی تھی' نجانے کیوں سارہ سے اسے اپنی محبت بھی یاد آ جاتی تھی۔ اس بیل اور اس محبت میں گہری مشابہت تھی۔ شاید یہ مشابہت منیر نیازی کے شعر نے پیدا کی تھی۔

پہلی بات ہی آخری تھی اس سے آگے بڑھی نہیں
ڈری ڈری سی بیل تھی جو دیوار پہ پوری چڑھی نہیں

دفعتاً کوئی پیچھے سے آیا اور بڑی شدت کے ساتھ محبوب سے لپٹ گیا۔ محبوب گرتے گرتے بچا تھا۔ لپٹنے والے کی گرفت میں انتہا درجے کی گرم جوشی تھی۔ محبوب نے بمشکل گھوم کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ جیدا تھا۔ محبوب اور قدیر کا مشترکہ دوست۔ وہ ان کا رازداں بھی تھا۔ جیدا پہلے قدیر کا پڑوسی ہوا کرتا تھا پھر وہ کہیں اور چلا گیا۔ قدیر تو پھر بھی اس سے ملتا رہا لیکن محبوب سے اس کی ملاقات نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ جیدے سے محبوب کی آخری ملاقات کوئی چار سال پیشتر ہوئی تھی اور وہ بھی بالکل سرسری سی۔ جیدا اس وقت ائر کنڈیشنر اور فریج وغیرہ کا کورس کر رہا تھا۔ آج چار سال بعد وہ بالکل غیر متوقع طور پر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ جیدے نے محبوب کو چھوڑا تو دونوں ایک بار پھر بغل گیر ہو گئے۔ پردیس میں اپنے دیس والوں کا ملنا اتنا ہی جذباتی ہوتا ہے' تاہم محبوب اور جیدے کے معاملے میں جذبات ایک جیسے نہیں تھے۔ جیدے کو دیکھ کر محبوب کو خوشی ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی کئی طرح کے اندیشے بھی منہ پھاڑ کر سامنے آ گئے تھے۔ جس ماضی سے ناتا توڑ کر وہ اس دیارِ غیر میں آ بسا تھا وہ پھر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے روبرو آ سکتا تھا' اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ قدیر کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آیا اور اسے لگا کہ یہ چہرہ ابھی اس پر تھوکنے لگے گا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کے دل میں آئی کہ نہایت بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیدے سے دور چلا جائے۔ یا کسی بازار میں اچانک اس سے ہاتھ چھڑائے اور بھیڑ میں گم

ہو جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا مزاج اور فطرت ہی ایسی نہیں تھی۔ وہ ایک بار مل کر جیدے سے جدا نہ ہو سکا۔ دونوں بڑی اپنائیت سے باتیں کرتے ایک قریبی ریستوران میں جا بیٹھے۔ عربی قہوے کی پیالی پر موضوعات کا پنڈورا باکس کھل گیا۔ محبوب نے پوچھا "کیا کر رہے ہو یہاں؟"

جیدا قہقہہ لگا کر ہنسا "یار! ہم سب میں سے پڑھا لکھا تو تو ہی نکلا۔ ہم سب تو دیہاڑی لگانے والے بن گئے۔ گلزار علی کویت میں نلکے ٹھیک کرتا ہے اور اس سالے قدیر کا تو تجھے پتا ہی ہے' دبئی میں "کارپینٹر" کا کام کرتا ہے۔ میں یہاں ائر کنڈیشنر کے پائپوں میں گھسا رہتا ہوں۔ خدا کی پناہ۔ ایسا کتا کام ہے کہ کیا بتاؤں اور اوپر سے یہاں کی گرمی۔ لگتا ہے کہ دوزخ کی چوکیداری مل گئی ہے اور تو سنا تو کیا کر رہا ہے؟ تو تو بڑی اونچی ہواؤں میں ہے۔ تیرے کپڑے لتے سے ہی پتا چل رہا ہے۔ ویسے یار! تو شروع سے ہی ساروں سے وکھرا تھا۔ بالکل اور ٹائپ کا۔ تیری عقل دوسرے ٹائپ کی تھی۔ ہم تجھے گاؤدی سمجھتے تھے لیکن یہ بات بھی مانتے تھے کہ پڑھائی میں تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایک دم ماسٹر۔"

"گاؤدی تو میں اب بھی ہوں۔"

"لیکن یار! اب تو تو جنٹلمین بن چکا ہے۔ سچ پوچھ تو ہم تو تیرے پاسکو بھی نہیں ہیں۔ بچپن میں تو بالکل اور طرح کا تھا۔ بات وات تو کسی سے کرتا نہیں تھا۔ کسی سے یاری دوستی کیسے ہوتی' آجا کے ہم ہی تین چار یار تھے تیرے۔ یاد ہے تجھے تاش کھیلنی نہیں آتی تھی۔ ایک بار چکر دے کر ہم نے تجھ سے ڈیڑھ سو روپیہ جیت لیا تھا مگر بعد میں بتا بھی رہا تھا تجھے۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔" محبوب مسکرایا۔ پھر اس نے ذرا توقف کر کے پوچھا "قدیری کا کیا حال ہے آج کل؟"

"وہ سالا تو ایک دم نوسرباز نکلا ہے۔ لڑکی تو یوں پٹاتا ہے جیسے جھوٹ بولتے ہیں۔ آج کل دبئی میں کوئی بنگلہ دیشی پھنسا رکھی ہے اس نے۔ اس کے ساتھ مزہ بھی لے رہا ہے اور اس کے پیسے بھی کھا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بنگال کا جادو ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ بنگال کا جادو ہے تو پھر تجھ پر چلنا چاہیے تھا' الٹا بنگال پر کیوں چل گیا ہے۔ کہتا ہے' یار رے! یہ اپنے اپنے "گے کس" کی بات ہوتی ہے۔"

جیدا بول رہا تھا اور محبوب حیرت میں گم سن رہا تھا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ یہ جیدا کیا کہہ رہا تھا؟ جیدے نے تھوڑا سا اوپر اٹھ کر اپنی پتلون کی عقبی پاکٹ سے پرس نکالا' پھر ریال نکالے' پھر ایک اندرونی تہ میں سے ایک تصویر نکال کر محبوب کے سامنے کر دی۔ پرجوش لہجے میں بولا "یہ ہے سالے کی نئی معشوقہ۔ دیکھو کتنے لمبے بال ہیں کم بخت کے۔ کسی پاکستانی اور انڈین ایکٹرس کے بھی کیا ہوں گے۔ واقعی بنگال میں جادو تو ہے۔"

محبوب نے لرزتے ہاتھ سے تصویر تھامی۔ ایک درمیانی شکل و صورت کی لڑکی قدیر کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی تھی۔ اس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔ بال بڑے اسٹائل میں بنائے ہوئے تھے۔ قدیر سرخ ٹی شرٹ اور جینز میں تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ پہلے سے کافی فربہ ہو گیا تھا۔ محبوب پتھرائی ہوئی نظروں سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ قدیر اس کا دوست اور رازداں رہا تھا لیکن اس کا یہ موجودہ روپ محبوب کے لیے بالکل نیا تھا۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "۔۔۔ اور وہ مالک مکان کی لڑکی سارہ۔۔۔ اس سے بھی تو زبردست چکر چل رہا تھا اس کا۔"

جیدے نے ماحول کی پروا کیے بغیر بلند قہقہہ لگایا پھر مسکراتے ہوئے بولا "اس قصے کو چھوڑ و یار! وہ تو گئی گزری بات ہے۔"

جیدے کے لہجے نے محبوب کو تھوڑا سا چونکا دیا۔ وہ بولا۔ "پھر بھی یار! کچھ تو بتاؤ۔ میں تو اتنے عرصے سے یہاں ہوں۔ کچھ خبر ہی نہیں آگے پیچھے کی۔"

جیدے نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور ولگر انداز میں بولا "بات کافی پرانی ہو گئی ہے اس لیے تجھے بتانے میں حرج نہیں یار۔۔۔ تو سچ پوچھتا ہے تو وہ لڑکی قدیری کے چکر میں تھی ہی نہیں۔ قدیری تو بس اسے چالاکی سے کھینچ لے گیا۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

جیدا مسکراتے ہوئے بولا "یار جی! وہ لڑکی دراصل تیرے چکر میں تھی۔ تجھے پتا ہے قدیری شروع سے بڑا چالاک ہے۔ بس وہ ایک دم سے بیچ میں کود پڑا۔"

"کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو جیدے! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" محبوب کا دل سینے میں جیسے برف کا گولہ بن کر رہ گیا تھا۔

جیدا بولا "یار! جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے' وہ لڑکی شروع میں تجھ پر ہی نظر رکھتی تھی۔ وہ اکثر میرے اور قدیری کے پاس ڈھارے (نیم پختہ کمرے) میں آیا کرتی تھی۔ وہ جب بھی آتی تھی' تیری ہی باتیں کرتی تھی۔ ایک روز قدیری سے

کہنے لگی "قدیری! محبوب بھائی جان تیرے بڑے پکے دوست ہیں۔ بڑے لائق فائق بھی ہیں۔ ان سے کہو مجھے تھوڑی دیر کے لیے انگریزی ہی پڑھا دیا کریں۔"

قدیری بولا "محبوب بھائی جان کے سوا کوئی اور بات بھی آتی ہے تمہیں۔ کوئی چیز ہم سے بھی سیکھ لو۔ ہمیں بھی بڑے ہنر آتے ہیں۔"

وہ بولی "چلو جب سلائی کڑھائی کا ٹائم آیا تو وہ تم سے سیکھ لوں گی۔"

"تم جانتے ہی ہو وہ ہنس مکھ لڑکی تھی اور صاف سیدھی بات کرتی تھی۔ اپنا قدیری جلیبی کی طرح ٹیڑھا تھا اور اب بھی ہے۔ باتوں باتوں میں بندے کی مت مار دیتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے سارہ کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کھٹی میٹھی باتوں سے سارہ اور اس کی ماں سے بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ اس نے سارہ کے ذہن میں یہ بات بھی ڈال دی کہ تم پہلے سے ہی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو' اس کا نام شہلا ہے اور وہ ایک بہت پڑھے لکھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو ان دنوں قدیری کی کوشش رہتی تھی کہ تم ان کے گھر نہ جاؤ بلکہ وہ تمہارے گھر چلا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری موجودگی میں سارہ بھی ڈھارے میں چلی آئے اور تمہیں ایک دوسرے سے باتیں شاتیں کرنے کا موقع ملے۔ یہ قدیری شروع سے بڑی شے تھا پیارے۔ ایک بار میں نے کہا۔ یار! تم محبوب سے دھوکا کر رہے ہو۔ کہنے لگا' دھوکا نہیں اس کا بھلا کر رہا ہوں۔ یہ کڑی اس کے لائق نہیں ہے۔ اسے کوئی اور پھنسا کر دیں گے۔ آہستہ آہستہ قدیری نے سارہ کو شیشے میں اتار لیا۔ سارہ اگر قدیری کی طرف گئی تو اس میں جہاں قدیری کی تیزی طراری کا ہاتھ تھا وہاں میرے خیال میں تمہاری بے پروائی یا سستی بھی تھی۔ بہرحال جب قدیری نے رات دن ایک کر کے سارہ کو پھنسا لیا تو اسی سے اسے خط شط بھی لکھوانے لگا۔ بڑا استاد بندہ ہے وہ۔ ہم تم اس کے پائے کے نہیں ہیں۔ ویسے ایک بات کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ سارہ قدیر کے ساتھ پھنس کر بھی تجھے خاص نظر سے دیکھتی رہی ہے۔"

محبوب سکتے کی کیفیت میں تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے دنوں کی فلم چل رہی تھی۔ وہ ماضی جو دفن ہو چکا تھا یا محبوب کا خیال تھا کہ دفن ہو چکا ہے' اپنی قبر پھاڑ کر نکل آیا تھا اور چیخ و پکار مچا رہا تھا۔ جیدا جو باتیں کہہ رہا تھا ان میں وزن تھا۔ ان میں چھپی ہوئی سچائی آپوں آپ محبوب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ایک پردہ سا محبوب کے سامنے سے اٹھتا جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ قدیر ہمیشہ اسے "شہزادے" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ کبھی کبھار محبوب کو شک گزرا کرتا تھا کہ اس لقب میں تضحیک کا عنصر بھی شامل ہے۔ جیسے قدیر' محبوب کو کم فہم یا غائب دماغ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا اور شہزادہ کہہ دیتا ہے۔ قدیر نے ایک دو بار محبوب کے منہ پر بھی کہا تھا "تم تو بادشاہ بندے ہو یار! تمہیں فلاں بات کا کیا پتا۔" آج برسوں بعد محبوب کو یقین ہونے لگا تھا کہ اس کا شک درست تھا۔ پھر اسے سارہ کی ایک بات یاد آئی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ راولپنڈی منتقل ہونے سے پہلے اسے پڑھانے جایا کرتا تھا۔ سارہ نے کہا تھا "جب آپ پڑھاتے ہوئے کوئی بات سمجھاتے ہیں تو سیدھی میرے دماغ میں اتر جاتی ہے۔ میں کوئی آپ جیسا پڑھانے والا ہی ڈھونڈ رہی تھی بلکہ شاید آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔" پھر اچانک محبوب کے ذہن میں ماضی کا ایک اور در کھل گیا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ محبوب نے کئی بار سوچا تھا کہ سارہ گاہے گاہے شہلا کا ذکر کیوں کرتی ہے' کیوں شہلا کے حوالے سے اسے ٹٹولنا چاہتی ہے۔ آج اس بات کا جواب جیدے نے اپنی باتوں میں دے دیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا تھا "شہلا" کے بارے میں سارہ کو سب سے پہلے قدیر نے ہی بتایا تھا اور اپنی باتوں سے اسے باور کرایا تھا کہ محبوب چپکے چپکے شہلا کو چاہتا ہے اور اس کی محبت میں آہیں بھرتا ہے۔

واقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی جا رہی تھیں۔ ایک زنجیر مکمل ہو رہی تھی "کہاں کھو گئے یار۔" جیدے نے کہا۔ "اتنے عرصے بعد ملے ہیں' کوئی بات کرو۔ کچھ اپنی سناؤ' کچھ ہماری سنو اور کوئی لڑکی شڑکی بھی تاڑی ہے کہ ابھی تک دوسروں کے پریم پتر ہی لکھ رہے ہو۔"

آخری فقرہ کچھ زیادہ ہی [illegible] تھا' محبوب کو ناگوار گزرا مگر وہ پرانے دوست کی نادانی سمجھ کر درگزر کر گیا۔ اس نے جیدے سے پوچھا کہ تم کب سے یہاں ہو؟ وہ بولا "کوئی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ پچھلے مہینے قدیری کا خط ملا تھا۔ اس میں تمہارا ذکر بھی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ شہزادہ تو پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کہ اس پر کسی نے تعویذ کر دیے ہیں۔ پہلے پنڈی میں غائب رہا تھا۔ اب سعودی عرب گیا ہے اور ایسا گیا ہے کہ بس چلا ہی گیا ہے۔ گھر والوں کو اس نے پتا نہیں کیا پڑھا دیا ہے۔ وہ اس کا ایڈریس تک بتانے سے انکار کرتے ہیں۔" جیدے نے ایک لمحہ توقف کر کے محبوب کی طرف دیکھا اور بولا "کیا واقعی تم

نے کسی کو اپنا ایڈریس نہیں بتایا۔"

محبوب کو برا لگا "نہیں ایسی بات نہیں یار! میں یہ کمپنی والوں کا کوئی چکر ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے پاکستانی ملازموں کے پتے ٹھکانے کا کسی کو پتا چلے۔" محبوب نے سفید جھوٹ بولا۔

جیدے نے آنکھیں گھمائیں "اسی لیے تو کہتا ہوں یار کہ تو بہت اونچا آدمی بن گیا۔ کمپنی تجھے چھپاتی پھرتی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ہم اپنی کمپنی کو چھپاتے پھرتے ہیں۔ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ کہاں کام کر رہے ہیں۔"

جیدے کی زبان بڑی تیز چل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے چار پانچ سال کی کسر وہ آج ہی نکال لینا چاہتا ہے۔ اسی دوران میں اسے یاد آگیا کہ اس نے اپنے "کام کے" پر فون بھی کرنا ہے۔ وہ محبوب سے چند منٹ کی اجازت لے کر فون کرنے چلا گیا۔ ایک بار پھر محبوب کے دل میں آئی کہ وہ یہاں سے نکل لے لیکن اب نکلنا بے سود تھا۔ وہ جیدے کو اپنی کمپنی کا نام پتا بتا چکا تھا۔ جیدے کے لیے محبوب کو ڈھونڈنا اب زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس نے سگریٹ سلگائی اور قہوے کی خالی پیالی کو گھورنے لگا۔ ماضی کی یادیں کسی فوج کے جنگجو دستوں کی طرح کلاوے کاٹ کاٹ کر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ ان یادوں سے کہیں مفر نہیں رہا تھا۔ وہ طوفانی شب ایک بار پھر محبوب کے پردۂ تصور پر نمودار ہو گئی تھی جب اس نے پہلی بار ساوہ کو چھوا تھا' اسے اپنے قریب کیا تھا اور اس کے سمے ہوئے سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی تھی۔ وہ کیسی قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ وہ سراپا حسن تھی اور وہ سراپا عشق۔ محبوب کے ذہن میں سیکڑوں بار یہ سوال ابھرا تھا کہ اس رات ساوہ نے قرار واقعی مزاحمت کیوں نہیں کی تھی۔ وہ محبوب کو کسی خاص نظر سے نہیں دیکھتی تھی تو پھر اس کی دست درازی پر وہ پھٹ کیوں نہیں پڑی تھی۔ کئی سوالوں کی طرح آج اس سوال کا جواب ڈھونڈنا بھی محبوب کے لیے مشکل نہیں رہا تھا۔ ساوہ اس سے محبت کرتی تھی بالکل جیسے محبوب اس سے محبت کرتا تھا۔ قدیر کے آنے کے بعد ساوہ کی محبت روپوش ہو گئی تھی لیکن ملی نہیں تھی۔ دل کے اندر کہیں بہت گہرائی میں یہ محبت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ جیسے کسی بہت گہرے اور تاریک کنوئیں میں ایک ستارے کا عکس جگنو کی طرح ٹمٹما رہا ہو۔ ہاں یہ محبت ایک تارے' ایک جگنو یا ایک کرن کی صورت میں موجود تھی۔

وہ دن محبوب کی زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش دن تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس پر ایسے انکشافات ہوئے تھے جس نے اس کی گزشتہ زندگی کا نقشہ بدل دیا تھا۔ ماضی کی ساری بساط الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔ مہرے تکوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر اس ریستوران میں جیدے کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس کے ارد گرد کا ہر منظر دھندلایا دھندلایا تھا پھر جیدا بہت اصرار کر کے اسے اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا۔

جیدے نے اور اس کے دوستوں نے کھانے میں بہت سی پاکستانی ڈشیں اس کے سامنے لا رکھی تھیں۔ آلو مٹر کا سالن' ماش کی دال' چکن بھونا اور تندوری رول۔ ساتھ میں زردہ بھی تھا۔ محبوب نے جیدے کے اصرار پر کھانا کھایا تھا لیکن مزہ اسے نہیں آیا تھا۔ من و سلویٰ بھی ہوتا تو شاید اسے مزہ نہ دیتا۔ اس کا دل و دماغ تو طوفان کی زد میں تھا۔ رات ایک بجے محبوب اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ آیا اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ اسی لیے ماضی کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ وہ زخم جو تین ساڑھے تین سال میں مندمل ہوئے تھے' ایک ہی بے رحم کھرونچے نے لہولہان کر دیے تھے۔ یہ کاتبِ تقدیر نے اس کی کتابِ زندگی کا کیسا ورق پلٹ دیا تھا۔ اس ورق پر درد ہی درد اور حیرتیں ہی حیرتیں لکھی تھیں۔ وہ اب تک قدیر سے منہ چھپاتا پھر رہا تھا لیکن آج اس پر انکشاف ہوا تھا کہ منہ چھپانے کی ضرورت تو شاید قدیر کو ہے۔ محبوب اپنی زندگی کی جس سب سے بڑی محرومی کا شکار ہوا تھا اس محرومی کی شروعات قدیر کی مطلب پرستی نے کی تھی۔ بلاشبہ اپنی جگہ محبوب بھی مجرم تھا لیکن قدیر... اس سے بڑا مجرم تھا۔

پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کہیں وہ نتائج اخذ کرنے میں جلدی تو نہیں کر رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جیدا اسے حالات کی صحیح تصویر نہ دکھا رہا ہو۔ مگر سوچنے کی بات یہ بھی تھی کہ جیدے کو حالات کا غلط رخ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ محبوب ساوہ کی محبت میں کس بری طرح گرفتار ہے۔ وہ تو اس سارے قصے کو ماضی کا حصہ سمجھ رہا تھا' اور پھر وہ تصویر جو ریستوران میں جیدے نے اسے دکھائی تھی' وہ تصویر جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس تصویر سے کچھ اور نہ بھی ثابت ہوتا ہو تو قدیر کی بے وفائی تو ثابت ہو جاتی تھی۔

دو تین روز محبوب نے شدید کرب کے عالم میں گزارے۔ اس نے زندگی میں بہت کم نفرت کی تھی لیکن قدیر کے خلاف اس کے ذہن میں نفرت ابھر آئی تھی۔ پتا

نہیں ایسا کیوں تھا۔ اس کے علاوہ محبوب کے اندر ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ وہ سارہ کو دیکھنا چاہتا تھا' ایک نئے زاویے سے' ایک نئی سوچ کے ساتھ۔ اس نے اب تک قدیر کی محبوبہ کو دیکھا تھا' اب وہ ایک ایسی لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس سے محبت کرتی تھی یا کبھی کرتی رہی تھی۔

محبوب ہر دوسرے تیسرے روز جیدے کے ڈیرے پر جانے لگا۔ وہ بھی فارغ وقت ملتے ہی محبوب کے پاس آجاتا تھا۔ گم شدہ ماضی اپنی تمام تر بے قراریوں اور کرناکی کے ساتھ دوبارہ محبوب کے سامنے تھا۔ نجانے کیوں۔۔۔ وہ جو پاکستان سے دور بھاگتا تھا' اب پاکستان جانا چاہتا تھا۔ کوئی شے اسے مسلسل اپنی جنم بھومی کی طرف کشش کر رہی تھی۔ انہی دنوں ایک اور ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کے ارادے کو مہمیز کیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا اور بھولے بسرے ماضی کا حصہ تھا لیکن محبوب کے لیے اس واقعے کی بھی اہمیت تھی۔

وہ ایک دن جیدے کے ڈیرے پر پہنچا۔ جیدے کا ڈیرا محبوب کی رہائش گاہ سے پانچ چھ میل دور ایک زیر تعمیر کالونی میں تھا۔ کئی افراد مل کر وہاں رہتے تھے۔ ایک سکھ تھا اور تین پاکستانی۔ اس روز چھٹی تھی۔ جیدا اور اس کے دو ساتھی گھومنے پھرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ صرف سکھ نوجوان شوبھا سنگھ وہاں موجود تھا۔ اس نے محبوب کا استقبال کیا۔ اسے چائے وغیرہ پلائی' اخبار لا کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ لوگ واپس آجائیں گے۔ محبوب وقت گزاری کے لیے اخبار دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ یہاں جیدے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں بہت سی کتابیں کاپیاں اور رسالے بھرے ہوئے تھے۔ محبوب ان کتابوں کاپیوں کو پہچانتا تھا۔ ان کا تعلق قدیر سے تھا۔ جن دنوں سارہ کی فرمائش پر قدیر نے پڑھائی شروع کرنے کی ٹھانی تھی انہی دنوں یہ کتابیں خریدی گئی تھیں' پھر کچھ عرصے بعد قدیر کا شوق تو ختم ہو گیا تھا اور یہ سارا پلندہ جیدے کے پاس چلا گیا تھا۔ اس پلندے کے ساتھ شاید قدیر کا شوق بھی جیدے میں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک ان کتابوں سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ کم از کم میٹرک تو کر کے رہے گا۔

محبوب یونہی وقت گزاری کے لیے ان کتابوں کو دیکھنے لگا۔ کئی بھولی بسری یادیں تازہ ہوئیں۔ ایک کاپی میں محبوب کے تحریر کردہ شعر موجود تھے۔ ایک کتاب پر اس نے قدیر کی آسانی کے لیے پنسل سے نشان لگا رکھے تھے۔ اس کی "چیک" کی ہوئی دو تین کاپیاں بھی اس پلندے میں موجود تھیں۔ ایک لفافے میں چند بہت پرانی تصویریں برآمد ہوئیں۔ ان تصویروں میں محبوب سمیت قدیر کے چند دوست تھے۔ وہ سیر سپاٹا کر رہے تھے۔ سیر گاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مستقبل کے حوادث سے بے خبر اپنے لڑکپن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر یادوں کے گرداب میں پھنس گیا۔ کتابیں دیکھنے کے بعد وہ بوسیدہ رسالے دیکھنے لگا۔ ایک رسالے میں سے دو تین تہ شدہ کاغذ پھسل کر فرش پر گر گئے۔ محبوب نے بے خیالی میں انہیں اٹھا کر دوبارہ رسالے میں رکھا لیکن ان میں سے ایک کاغذ کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے کاغذ کی برسوں پرانی تہیں کھولیں اور ششدر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا کاغذ تھا جو اس نے برسوں پہلے کھویا تھا اور پھر کئی ہفتے تک اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈا تھا۔ یہی وہ خط تھا جو اس نے اپنی محبت کے آغاز میں سارہ کو لکھا تھا اور اس تک پہنچانے کے لیے اپنی چرمی فائل میں چھپایا تھا۔ پھر ایک روز وہ خط یوں غائب ہوا تھا کہ ڈھونڈے نہیں ملا تھا اور اس گمشدگی نے محبوب کو خوف کے شکنجے میں جکڑ کر اس کے سارے ارادے تہس نہس کر دیے تھے۔ آج یہ خط قدیر کے کاغذوں میں سے مل گیا تھا۔

اس خط کی "برآمدگی" نے قدیر کا کردار کچھ اور واضح کر دیا تھا۔ دوست کے بھیس میں چھپا ہوا وہ بدخواہ آج محبوب کے سامنے بے نقاب تھا۔ محبوب کا دل رنج و الم سے بھر گیا۔ کچھ لوگوں میں نفرت کا جذبہ انتقام بن جاتا ہے اور کچھ لوگوں میں آنسو بن کر بہہ جاتا ہے۔ محبوب دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھا۔ اس رات بند کمرے میں اس نے دیر تک آنسو بہائے تھے۔

○☆○

ٹھیک ایک ماہ بعد محبوب پی آئی اے کے ذریعے سعودی عرب سے پاکستان پہنچا۔ اس کی فلائٹ اسلام آباد تک تھی۔ اسلام آباد سے اسے براستہ سڑک لاہور پہنچنا تھا۔ لاہور' جہاں اس کے والدین تھے' جہاں وہ گلی تھی جس میں اس کا لڑکپن گزرا تھا۔ جہاں وہ چار دیواری تھی جہاں خالہ ملا اور سارہ رہتی تھیں۔ وہ سب کچھ جو اس کی سادگی اور اس کے دوست کی تیز طراری نے بتدریج اس سے چھین لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر ان سارے مناظر کو دیکھنا چاہتا تھا' ایک نئے انداز سے' ایک نئے رخ سے۔

راولپنڈی کے نواحی قصبے فتح جنگ میں اس کی بڑی بہن راحت بھی بیاہی ہوئی تھی۔ وہی راحت جس کی شادی میں

بھی وہ شریک نہیں ہو سکا تھا۔ راولپنڈی کی مانوس فضا میں پہنچتے ہی اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اسے یہ حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ بہن سے ملے بغیر لاہور کا رخ کرلے۔ بہن کا مکمل پتا اس کے پاس موجود تھا۔ اس کا شوہر ایک وفاقی محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اسلام آباد سے ڈائریکٹ لاہور روانہ ہونے کے بجائے محبوب اپنی بہن کے گھر چلا گیا۔ برسوں بعد بہن بھائی کی ملاقات یادگار تھی۔ وہ دونوں گلے لگ کر دیر تک روئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ راحت سمیت محبوب کے آنے کی اطلاع کسی کو بھی نہیں تھی لہٰذا راحت جتنا بھی خوش ہوتی کم تھا۔ راحت ہی وہ واحد ہستی تھی جس کے ساتھ محبوب قدرے کھل کر بات کرتا تھا ورنہ عام لوگوں کی طرح اہلِ خانہ بھی یہی کہتے تھے کہ وہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے رہتا ہے۔ ایک بار راحت اور محبوب کی باتیں شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب شام ہوئی اور رات ہوگئی۔ کھانا وغیرہ کھا کر اور گاڑی میں تھوڑا سا گھومنے کے بعد وہ پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ راحت کے میاں کام کے سلسلے میں گجرات گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں مکمل آزادی سے بات چیت کررہے تھے۔ گفتگو کے ایک مرحلے میں محبوب نے سارہ کے بارے میں پوچھا۔ راحت نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی "وہ تمہارا دوست قدیر تو بالکل دھوکے باز نکلا۔ جب یہاں سے گیا تھا تو سارہ کے نام کی مالا جپتا تھا۔ وہاں جا کر اس نے کچھ اور ہی گل کھلا دیے۔ سنا ہے دو تین لڑکیوں سے اس کا ملنا جلنا رہا ہے۔ ایک بنگالن کے خط تو اس کے پیچھے لاہور بھی آتے رہے ہیں۔ سارہ کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ تو پیدائشی صابر شاکر ہے۔ اس نے قدیر سے شکوہ شکایت تک نہیں کی۔ بس خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ پچھلی دفعہ جب میں لاہور گئی تھی تو اس سے ملی تھی۔ بڑی گم صم اور سنجیدہ ہوگئی ہے۔ گرمیوں میں ڈیڑھ دو مہینے بیمار بھی رہی ہے۔ اب کہہ رہی تھی کہ ایم اے کی تیاری کررہی ہوں۔ یہ امتحان دے کر رہوں گی۔ اس کی چھوٹی بہن کی منگنی ہو چکی ہے۔ اگلے مہینے کے شروع میں شادی بھی ہے لیکن سارہ کسی صورت شادی کی طرف نہیں آرہی۔ ایک دو اچھے رشتے بھی آئے ہیں لیکن وہ مانی نہیں اور خدا لگتی بات یہی ہے محبوب! شادی تو خوشی کا نام ہے۔ دل میں ہی خوشی نہ ہو تو شادی کیسی۔ ہو سکتا ہے کسی وقت دل ٹھکانے آجائے تو مان جائے۔"

محبوب نے کہا "جب قدیر کی دغابازی ثابت ہوگئی ہے تو پھر وہ کیوں سوگ منائے بیٹھی ہے۔"

راحت کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں "میرا خیال ہے محبوب! اس کے ساتھ قدیر کی بے وفائی کا مسئلہ ہی نہیں ہے، کوئی اور بات بھی ہے جس نے اس کا من مار رکھا ہے۔"

"اور بات؟" محبوب کے سینے میں جلترنگ سے بج اٹھے۔

"ہاں کوئی اور بات ہے۔ میں ٹھیک سے نہیں جانتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ شاید کوئی اور اس کی زندگی میں آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے خاندان کا ہی کوئی لڑکا ہو۔ ان کا خاندان بھی تو بہت بڑا ہے۔ بڑے اچھے اچھے لڑکے بھرے پڑے ہیں ان میں۔ بہرحال ہمیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے تو عادت ہی نہیں خواہ مخواہ ٹوہ لگانے کی۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" محبوب نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ قدیر سے اس کا دل بالکل کھٹا ہوگیا تھا۔ دل کھٹا ہونے کے بعد ہی وہ کسی اور طرف متوجہ ہوئی ہے۔"

محبوب نے کہا "لیکن باجی! تمہاری تو وہ پکی سہیلی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"بھئی جب اس نے نہیں بتایا تو میں کیوں کریدتی پھروں۔ بس ایک مرتبہ اتنا بولی تھی کہ وہ پاگلوں کی طرح سوچتی رہتی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کسی کے بارے میں سوچتی ہو یا یونہی سوچتی ہو؟ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی، کوئی ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ میں نے پوچھا تھا، اگر کوئی ہے تو جیتا جاگتا بندہ ہے یا خوابوں کا شہزادہ۔ کہنے لگی نہ بندہ ہے نہ شہزادہ ہے۔ لیکن جو بھی ہے بہت عجیب ہے۔"

محبوب کے سینے میں ایک چراغاں سا ہوگیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ تاریکی جو برسوں سے اس کے اندر مسلط تھی، کونے کھدروں میں چھپ رہی تھی۔ محبوب کا دل گواہی دے رہا تھا کہ سارہ اس سے محبت کرتی تھی اور آج بھی کرتی ہے۔ باجی راحت نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شاید قدیر کی بے وفائی کے بعد سارہ کی زندگی میں کوئی اور لڑکا آگیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ لڑکا تو پہلے سے موجود تھا بلکہ یہ تو کہانی ہی اس لڑکے کی تھی۔ قدیر نے تو زبردستی اس کہانی میں اپنا آپ ٹھونسا تھا۔ یہ اس لڑکے اور سارہ کی کہانی تھی۔ ہاں یہ محبوب اور سارہ کی کہانی تھی۔ اب تک محبوب خود کو بانو قدسیہ کا "راجا گدھ" سمجھتا رہا تھا، لیکن راجا گدھ وہ نہیں قدیر تھا۔ محبوب کے دل میں امنگ ترنگ کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر لاہور پہنچ جائے۔

سارہ کو دیکھے اور ہر تذبذب کو بالائے طاق رکھ کر اس سے کہہ دے "سارہ! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنا بنانا چاہتا ہوں۔"

ایک میٹھا میٹھا سا درد اس کے جسم میں لہریں لینے لگا۔ ایک لرزش سی ہاتھ پاؤں میں نمودار ہوگئی۔ کیا وہ ایسا کرسکے گا۔ کیا وہ مرحلہ طے کرلے گا۔ وہ اگلے روز سہ پہر کو لاہور پہنچا۔ راحت بھی اس کے ساتھ ہی چل دی تھی۔ راستے ہی میں راحت نے بذریعہ فون گھر والوں کو محبوب کی آمد کی اطلاع دے دی۔

جب ساڑھے تین سال بعد اس نے اپنے گھر کی دہلیز پار کی تو اس کے پیاروں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئے۔ کچھ قریبی عزیز بھی پہنچ چکے تھے۔ میلے کا سماں تھا۔ اس کے سر پر مسلسل دستِ شفقت پھر رہا تھا اور پیشانی بوسوں کی زد میں تھی۔ محلے کی عورتیں بھی جمع ہوگئیں۔ بیٹھک ملنے جلنے والوں سے بھر گئی۔

"ماشاء اللہ اب تو جوان ہوگیا ہے۔" کسی عورت نے کہا۔

"اللہ سلامت رکھے' بڑا نیک بچہ ہے۔ ہم تو اس کی مثالیں دیتے ہیں۔" ایک بوڑھی بولی۔

چھوٹا بھائی عاطف اسے کھینچ کر بیٹھک میں لے گیا۔ محلے والوں نے معانقے کر کر کے اسے بے حال کردیا۔ ایک نے کہا "واہ بھئی! یہ چھوٹی چھوٹی داڑھی تو بڑی جچ رہی ہے تیرے چہرے پر۔"

اس کے پڑوسی ارشاد صاحب بولے "ماشاء اللہ کافی صحت مند ہوگئے ہو۔ پورے مرد لگتے ہو۔"

بوڑھے ماسٹر عنایت نے کہا "مرد نہیں' مردِ مجاہد کہو۔ کیسی چمک ہے پیشانی پر اور کیوں نہ ہو' اب تو اللہ کا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں یہ سعادت نصیب ہونا بڑی بات ہے۔"

کچھ دیر مردوں میں بیٹھ کر وہ پھر عورتوں میں آگیا۔ اس کی نگاہ سارہ یا خالہ عطیہ کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ بہرحال اس بے چینی نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے خالہ عطیہ نظر آئیں۔ وہ ابھی ابھی بیرونی دروازے سے داخل ہوئی تھیں۔ عورتوں کی بھیڑ اب کم ہوچکی تھی۔ خالہ عطیہ سیدھی اس کے پاس آئیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیار کیا۔ منہ سر چوما اور بلائیں لیں۔ ان کے ہاتھ کے لمس نے ماں کے ہاتھوں کی طرح محبوب کو سکون دیا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں اور باتیں کرنے لگیں "بیٹا! تُو تو ہم سب سے جیسے روٹھ ہی گیا ہے۔ کتنی رونق تھی تیرے دم قدم سے یہاں۔ ہر شام تیری صورت دیکھتے تھے اور آواز سنتے تھے۔ اب تو سب خواب ہوگیا ہے۔ بچیاں ہر وقت پوچھتی رہتی ہیں کہ محبوب بھائی جان کب آئیں گے' اور سارہ تو اتنا یاد کرتی ہے تجھے کہ بس کیا بتاؤں۔ پتا نہیں اس کا سگا بھائی بھی ہوتا تو اس طرح چاہتی یا نہیں۔ ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہی تھی "پتا نہیں پردیس میں کیا بات ہے۔ جو وہاں جاتا ہے' سب کچھ بھول جاتا ہے۔ پتا نہیں لوگ کیوں چھوڑتے ہیں گھر بار کو" میں نے کہا' محبوب کی بات کررہی ہو؟ کہنے لگی "ہاں انہی کی بات کررہی ہوں۔ کتنا اچھا ہو کہ وہ اچانک یہاں آجائیں اور کچھ نہیں تو میری شادی میں ہی شامل ہوجائیں۔"

محبوب کے بدن میں ایک یخ بستہ لہر دوڑ گئی "شش۔۔۔ شادی۔ کس کی شادی؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"سارہ کی شادی۔" خالہ عطیہ نے کہا "وہ تو مانتی ہی نہیں تھی بیٹا! دو سال سے اڑی بیٹھی تھی۔ کہتی تھی نہیں' بس پڑھوں گی اور پڑھتی چلی جاؤں گی۔ بڑی مشکل سے راضی ہوئی ہے۔ اب چھوٹی شاہین کے ساتھ اس کے بھی ہاتھ پیلے ہوجائیں گے۔ اللہ نے بڑی جلدی سبب لگا دیا ہے۔ دونوں کا فرض ایک ساتھ ہی ادا ہوجائے گا۔"

خالہ عطیہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں لیکن محبوب کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کی تمام حسیات منجمد ہوگئی تھیں۔ سینے میں ایک یخ بستگی پھیل گئی تھی اور اس برف میں اردگرد کی ہر شے منجمد ہوتی چلی جارہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ سعودی عرب سے ایک زبردست محبت نامہ اپنے دل پر لکھ کر یہاں لایا تھا لیکن ایک بار پھر اس نے یہ محبت نامہ سارہ تک پہنچانے میں دیر کردی ہے اور نامہرباں وقت نے قدیر کا روپ دھار کر یہ محبت نامہ ہمیشہ کے لیے کہیں چھپا دیا ہے۔ وہی حسرت آمیز مایوسی اس پر طاری ہورہی تھی جو اب تک قدم قدم پر اس کے ساتھ رہی تھی۔

ایک دم محلے کی اور کئی خالائیں اور آنٹیاں اندر آگئی تھیں۔ چھوٹا سا برآمدہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ یہی وقت تھا جب محبوب نے سارہ کی جھلک دیکھی۔ وہ سب سے پیچھے کھڑی تھی اور ایک عورت کے کندھے کے اوپر سے محبوب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ محبوب حیران رہ گیا۔ وہ کافی کمزور اور زرد نظر آرہی تھی۔ آنکھیں چمک سے خالی تھیں' حتیٰ کہ وہ پیشانی بھی ماند نظر آرہی تھی جس پر ہر وقت ایک دلنشیں شعاع کا

عکس جھلملاتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے صرف ایک لمحے کے لیے ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ یہ ایک لمحہ محبوب کو اَن گنت کہانیاں سنا گیا۔ سارہ نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں نے کہا "آپ نے پھر دیر کردی محبوب۔" ہاں اس نے یہ بات کہی تھی۔ یہ محبوب کا "زورِ خیال" نہیں تھا۔

محبوب کا خیال تھا کہ وہ اس کے قریب آئے گی۔ کم از کم سلام تو کرے گی لیکن اس کی پہلی جھلک ہی آخری تھی۔ محبوب اس کو عورتوں کے جمگھٹے میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔

○☆○

وہ بڑی سنسان رات تھی۔ خاموش اور کسی دائمی بیمار کی طرح بے آرام۔ گھر میں آنے والے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ کسی قریبی کمرے میں اہلِ خانہ کی چہکنے والی آوازیں بھی اب نیند کی گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کھڑکی سے جھانکنے والے زرد چاند اور کمرے میں بے چین پھرنے والے زرد رو محبوب کے سوا کچھ بھی بیدار نہیں۔

"سارہ یہ کیا کردیا تم نے۔" وہ بے حد کرب کے ساتھ سوچ رہا تھا "جہاں اتنے برس انتظار کیا تھا چند روز مزید کرلیا ہوتا۔ تم نے اس وقت رختِ سفر باندھا جب منزل تمہیں خود ڈھونڈتی ہوئی آپہنچی تھی۔"

پھر اس کے اندر سے آواز آئی "اب بھی کچھ نہیں بگڑا محبوب! تو اب بھی وقت کی طناب کھینچ سکتا ہے۔ سارہ تجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ خالہ عطیہ نے خود بتایا ہے وہ اب بھی ہر وقت تیری باتیں کرتی ہے' تیرے خیالوں میں رہتی ہے۔ وہ تیری ایک آواز پر ہر رکاوٹ کو عبور کر جائے گی۔ ہر بندھن کو توڑ دے گی۔ اس کی آنکھ سے گرنے والا ایک آنسو خالہ عطیہ کے دل کو چیر ڈالے گا اور دوسرا آنسو خالو رزاق کے سینے میں ہلچل مچا دے گا پھر سب کچھ تم دونوں کے حق میں ہو جائے گا۔ ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا ہے محبوب! ابھی سارہ کو اس کی پیشانی کی چمک اور رخساروں کے گلاب واپس مل سکتے ہیں۔ ابھی وہ اتنی دور نہیں گئی کہ تمہارے آنگن میں بہار بن کر نہ آسکے۔"

لیکن۔۔۔ وہ سارہ کو پکارنے کی ہمت کہاں سے لائے گا۔ اس کی فطرت نے اسے مزاج کے جس دائرے میں محصور کر رکھا ہے وہاں سے کیسے نکلے گا۔ کیسے پار کرے گا اپنی حدِ اختیار۔ وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس کا ہاتھ بے اختیار نیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سارہ کے گھر میں اب فون بھی تھا۔ اس کا نمبر بھی انڈکس میں لکھا تھا۔ محبوب نے لرزتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیے۔ تین چار دفعہ گھنٹی بجی پھر کسی نے ریسیور اٹھایا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی ایک کربناک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ ڈھولک کی آواز تھی۔ کسی قریبی کمرے میں ڈھولک بج رہی تھی۔ خالہ عطیہ نے بتایا تھا کہ چار روز بعد سارہ کی منگنی ہے اور ایک ماہ بعد شادی ہے۔ یہ سارہ کی منگنی کی ڈھولک تھی۔ پھر سارہ کی بہن شاہین کی آواز آئی "ہیلو کون۔۔۔ ہیلو!"

محبوب نے بولنا چاہا لیکن پھندا سا لگ گیا۔ وہی "نیک نام کمبخت" اس پر طاری ہو گئی جو اس کی جان کا روگ تھی۔ وہ کوشش کے باوجود شاہین کی بات کا جواب نہیں دے سکا اور یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ سارہ کو بلائے۔ اس نے فون بند کردیا۔

دوسرے روز گھر میں پھر مہمان آتے جاتے رہے' بچے اودھم مچاتے رہے اور عورتیں دنیا جہان کی باتیں کرتی رہیں۔ ان میں سارہ اور شاہین کی شادی کی باتیں بھی تھیں۔ سارہ کی شادی کوئٹہ کے ایک قریبی قصبے نوشکی میں ہو رہی تھی۔ اس کا متوقع دلہا عمر میں تھوڑا سا بڑا تھا اور درمیانی شکل وصورت کا تھا۔ وہ پراپرٹی ڈیلنگ کرتا تھا۔ محبوب نے اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ اس کی پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ جسم فربہ تھا اور وہ ہر طرح سے سکہ بند پراپرٹی ڈیلر نظر آتا تھا۔

اس روز نصف شب کے بعد محبوب نے ایک بار پھر سارہ کو فون کرنے کی ٹھانی۔ وہ کتنی ہی دیر عذاب ناک تذبذب کے عالم میں فون کے سامنے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اس صورتِ حال کا سامنا کیسے کرے۔ اس کی پوری زندگی میں صرف تین مواقع ایسے تھے جب اس نے اپنی ہمت اور سکت سے بڑھ کر کوئی کام کیا تھا اور ان تینوں مواقع پر کسی نہ کسی سہارے نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ سب سے پہلا موقع وہ تھا جب وہ راولپنڈی میں تھا۔ اپنے اندرونی ہیجان اور کربناک یورش پر قابو پانے کے لیے وہ بازارِ حسن چلا گیا تھا اور وہاں جا کر ایک سکتہ زدہ شخص کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ اس وقت اسے ایک ٹھیلے والے نے سہارا دیا تھا اور ہاتھ تھام کر "گندگی کے ایک ڈھیر" پر پھینکا تھا۔

دوسری مرتبہ اس نے غنڈے یاسر سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت تیز بخار نے اسے خفقان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دماغ گردش میں تھا اور اس گردش میں اس نے یاسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

تیسری مرتبہ اس کا سابقہ سارہ سے پڑا تھا۔ اس کڑی

آزمائش میں تاریکی نے اسے سہارا دیا تھا اور تاریکی کے پردے میں اس نے سارہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

مگر آج ایسا کوئی سہارا نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ تھپکنے والا' نہ بخار کی مدہوشی تھی' نہ تاریکی کی پناہ تھی۔ بس وہ تھا اور سارہ تھی۔ اسے فون کے ذریعے براہ راست سارہ سے بات کرنا تھی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیے۔ قریباً دو فرلانگ دور سارہ کے گھر میں گھنٹی بجی۔ دو بار۔۔۔ چار بار۔۔۔ دس بار۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا۔

"کون ہیلو۔۔۔ کون۔" شاہین کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

محبوب نے تھوک نگلا "میں۔۔۔ محبوب بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر شاہین کی خوشی سے لرزتی ہوئی آواز ابھری "محبوب بھابی جان آپ؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"کس بات کا؟"

"کہ آپ نے۔۔۔ آپ نے فون کیا ہے۔ اوہ مائی گاڈ۔ آپ تو پتا نہیں کن ہواؤں میں اڑ گئے ہیں۔ ہم تو ترس گئے ہیں آپ کی آواز سننے کے لیے۔"

محبوب سنجیدگی سے بولا "شاہین! ایک چھوٹا سا کام کردو۔ ذرا سارہ کو بلادو۔"

"آپ حکم دیں بھابی جان' مم۔۔۔ میں ابھی بلاتی ہوں۔ ایک سیکنڈ۔ آپ ہولڈ کریں' لیکن بند نہ کردیں۔"

پھر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی ہے۔ چند لمحے بعد پھر قدموں کی آواز آئی۔ یہ آواز پہلی آواز سے مختلف تھی۔

محبوب کے دل نے گواہی دی کہ یہ سارہ کے قدموں کی آواز ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہیں اور دل یوں دھڑک رہا ہے جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ جو بات وہ سارہ سے کہنا چاہ رہا تھا وہ بہت "بڑی" تھی۔ بات کے مقابلے میں اس کا حوصلہ بہت چھوٹا تھا۔

"ہیلو۔" سارہ کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔ اس آواز کا سحر اس کی سماعت میں جذب ہو کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ وہ ہیلو کہنا چاہ رہا تھا لیکن پھر کوئی چیز گلے میں اٹک گئی تھی۔

"ہیلو۔ میں سارہ بول رہی ہوں۔" آواز پھر اس کے کانوں تک پہنچی۔ محبوب کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"ہیلو۔" سارہ نے کہا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ التجا تھی کہ وہ کچھ بولے۔

محبوب کی پیشانی سے اب باقاعدہ پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر اس خوف ناک کشمکش میں گرفتار رہا۔ وہ شرم آلود جھجک' وہ نارسائی اور بے زبانی جو نجانے کتنی نسلوں سے اس کے خون میں سفر کر رہی تھی' ایک دم ابھر کر سامنے آگئی تھی۔۔۔ پھر یکایک اسے سکون سا آگیا۔ کوئی اچھلتا ہوا سمندر تھا اس کے اندر جو ایکا ایکی شانت ہوگیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ گہری سانس لے کر بولا "ہیلو' سارہ! میں محبوب بول رہا ہوں۔"

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اور تم؟"

"مم۔۔۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔"

"بس تمہاری خیر خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"جی؟" قدرے حیرت سے پوچھا گیا۔

"اچھا۔۔۔ معاف کرنا۔ میں نے تمہیں بے آرام کیا۔ خدا۔۔۔ حافظ۔"

دوسری طرف خاموشی تھی۔ محبوب نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر جھک کر اپنا ماتھا کریڈل پر رکھا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا' پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

○☆○

سارہ کی شادی سے ایک ہفتے قبل ہی محبوب واپس سعودیہ پہنچ گیا تھا۔۔۔ اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی کا دامن ہو اور وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہے۔ ایسے میں اسے وہ دامن یاد آگیا جو پوری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ جس شہر میں محبوب کا ٹھکانا تھا' وہاں "شہر نبیؐ" کو چھو کر آنے والی ہوا چلتی تھی۔۔۔ وہاں شب کی خنکی میں حرم کی خوشبو سرایت کر جاتی تھی۔ یہ ایسا ماحول تھا جس میں طبع رقیق ہوتی تھی اور دلوں میں گداز جاگتا تھا اور محبوب تو پہلے ہی سرتاپا رقت اور گداز تھا۔ اس کے سینے میں جیسے غم کا ایک پہاڑ سمایا ہوا تھا۔۔۔ پھر ایک شب اس نے خود کو شہر کی مرکزی جامع مسجد کے سائے میں پایا۔ وہ بلند و بالا مینار کی پرچھائیں پر گر گیا اور اس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جو ماں کو اپنے بے پناہ درد سے آگاہ کرنا چاہتا ہے اور وہ کیوں نہ روتا۔ آج سارہ کی شادی کی رات تھی۔۔۔ وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں بلکنے لگا "اے میرے خدا! تو نے مجھ کو ایسا کیوں بنایا؟ میرے سینے میں جذبات کا سمندر رکھا لیکن میری زبان کو الفاظ نہ دیے۔ میرے نطق کو وہ تاثیر نہ دی کہ میں دلوں کو متاثر کر سکوں۔ مجھے وہ سمجھ بوجھ' وہ تیزی طراری نہ دی کہ میں دیواروں میں راستے بنا سکوں اور اگر

تو نے مجھے ایسا بنایا ہی تھا یارب' تو پھر قدیر جیسے زمانہ ساز لوگوں سے میرا واسطہ نہ رکھا ہوتا اور اگر قدیر جیسے لوگوں سے میرا واسطہ رکھا تھا تو پھر میرے دل میں ایسی تمنا نہ پالی ہوتی جسے پورا نہیں ہونا تھا۔ اے میرے رب' میرا کیا قصور ہے۔ میں نے سارہ کو چاہا تھا۔ اپنی طاقت اور اپنے حوصلے کے مطابق میں نے اسے اپنانے کی پوری کوشش کی مگر میں اتنی صلاحیتیں کہاں سے لاتا کہ اس کوشش کو کامیاب بناتا۔ یہ صلاحیتیں تو تُو نے مجھے عطا ہی نہیں کی تھیں۔ اے مالک' میری چاہت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا' میری نیت میں کوئی کجی نہیں تھی۔ میں ایک سیدھے سادے راستے کا مسافر تھا' پھر مجھے کیوں مات ہوئی۔"

وہ دیر تک روتا رہا۔ اس کے دل کا غبار قدرے ہلکا ہوگیا۔ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کسی حد تک چھٹ گئی۔ وہ سسک کر بولا "میں تجھ سے کوئی شکوہ نہیں کر رہا اے میرے مالک۔ میں کہاں ہوں اس قابل۔۔۔ میں جانتا ہوں تیرے پاس میرے ہر احمقانہ سوال کا بے مثال جواب موجود ہے۔ میں تو بس یونہی رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تجھے اپنے بندوں کا عاجزی سے سسک سسک کر رونا اچھا لگتا ہے نا' میں اسی لیے رو رہا ہوں۔"

معلوم نہیں کب تک اس پر رقت اور خود ترسی کی وہ ناقابلِ فراموش ..... کیفیت طاری رہی پھر اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اس کے دل پر ایک خیال الہام کی طرح وارد ہوا۔ یہ بات آپوں آپ اس کے دماغ میں سما گئی کہ سارہ ایک خوشی تھی جو اس سے چھن گئی ہے۔ بے شک' فی الوقت اس جان لیوا محرومی کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا مگر قدرت کے خزانے لامحدود اور بیکراں ہیں۔

اسے یوں لگا جیسے اس کی سلب شدہ توانائی کا کچھ حصہ اسے واپس مل گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ایک سنسان گلی کے موڑ پر اوجھل ہوگیا۔

○☆○

کافی وقت گزر گیا۔ محبوب کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ ایک خاموشی سی اس کے اردگرد پھیل گئی تھی۔ جیسے ایک شدید طوفانی رات کے بعد ایک چمکیلی صبح کو سمندر کی سطح ہموار اور پُرسکون دکھائی دے۔ اس نے جاں گسل سوچوں کی یلغار سے بچنے کے لیے خود کو اپنے کام میں غرق کرلیا۔ وہ صبح سے رات گئے تک مصروف رہتا۔ پھر جب نیند سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں تو اپنا سر تکیے پر ٹکا دیتا۔ وہ گھر والوں کو بھی بہت کم کم خط لکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جتنے زیادہ خط لکھے گا' اتنے ہی زیادہ جواب آئیں گے اور اس بات کا خدشہ بھی اتنا ہی بڑھ جائے گا کہ ان خطوط میں اسے سارہ کا ذکر پڑھنے کو ملے۔ وہ اب سارہ کی طرف سے اپنی حسیات بالکل منجمد کرلینا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اپنے زخم زخم ماضی کی جھلک بھی اسے نظر نہ آئے۔

○☆○

۔۔۔وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ہفتے مہینوں میں بدلے اور مہینے سالوں میں' محبوب اب سعودیہ میں کافی "اسٹیبلش" ہوچکا تھا۔ کام سے اس کی غیر معمولی لگن رنگ لائی تھی اور وہ اپنی فرم میں کمپیوٹر کے شعبے کا انچارج ہوگیا تھا۔ تنخواہ بھی قریباً سہ گنا ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر سہولیات بھی حاصل تھیں۔ محبوب کا چھوٹا بھائی عاطف اب جوان ہوچکا تھا۔ وہ پاکستان میں ہی ایم بی اے کر رہا تھا۔ محبوب نے اپنے والدین کو سعودیہ بلالیا۔ اس کی خواہش تھی کہ عاطف بھی کورس مکمل کرکے سعودیہ چلا آئے۔ وطن کی محبت اپنی جگہ تھی لیکن "محبت کے گھاؤ" بھی اپنی جگہ تھے۔ محبوب کو اپنا وطن پیارا تھا لیکن وطن سے وابستہ یادیں سوہانِ روح تھیں۔ وہ ان یادوں سے بہت دور بہت دور رہنا چاہتا تھا۔

محبوب کی عمر اب قریباً بتیس سال ہوچکی تھی۔ پچھلے آٹھ دس سال سے والدین مسلسل اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ "دباؤ" والی بات پر غور کیے بغیر محبوب نے والدین کو سعودیہ بلالیا تھا۔ نتیجے کا علم اسے دو تین ہفتے کے اندر ہی ہوگیا۔ والدین اور خاص طور سے والدہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئیں۔ انہوں نے جیسے یہ سوچ لیا تھا کہ "اب یا کبھی نہیں۔" دوسری طرف ان کی معاونِ خصوصی راحت بھی پاکستان سے خط پر خط ارسال کر رہی تھی۔ وہ بار بار محبوب کو دھمکا رہی تھی' اس کے قریباً ہر خط میں یہ فقرہ موجود ہوتا تھا "محبوب! تمہاری ہٹ دھرمی سے امی کو ضرور کوئی نہ کوئی روگ لگ جائے گا۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے ہم سب کے حال پر رحم کرو۔"

۔۔۔پھر اکتوبر کی ایک خزاں رسیدہ اداس شام کو محبوب نے اپنے پیاروں کے پیہم اصرار کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ سعودیہ میں مقیم شائستہ نام کی ایک لڑکی اس کی زندگی میں آکر شائستہ محبوب بن گئی تھی۔ شائستہ ایک بڑی پیاری ہستی تھی۔ شفیق' مہربان اور ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کرنے والی۔ وہ گریجویٹ تھی۔ اس کے والد پچھلے چالیس سال سے سعودیہ میں کاروبار کر رہے تھے۔

بے شک وقت ایک مرہم ہے لیکن مرہم گہری چوٹ پر اثر نہیں کرتے۔ محبوب کے دل کی چوٹ بھی بہت گہری تھی۔ زندگی کی معصوفیت کسی "پین کلر" کی طرح محبوب کو وقتی افاقہ تو پہنچا دیتی تھی لیکن مستقل افاقہ اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا اور شاید وہ ایسا افاقہ چاہتا بھی نہیں تھا۔ یہی درد تو اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ نارسائی کا دکھ اس کی سانس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور اُن کہی باتوں کی جاں گسل کسک دھڑکنوں میں سمائی رہتی تھی۔

شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں بیٹا ہوا۔ اس کا نام اس نے نازید رکھا۔ نازید شکل و صورت کے اعتبار سے بہت حد تک محبوب پر گیا تھا۔ جب وہ پانچ چھ سال کا ہوا تو اس کی عادات بھی محبوب سے ملتی جلتی پائی گئیں۔

سارہ کے بارے میں محبوب کو کچھ علم نہیں تھا۔ ہزاروں میل کی دوری تھی اور اس دوری سے بھی بڑی رکاوٹ وہ دیوار تھی جو محبوب نے اپنے اور سارہ کے درمیان اپنی مرضی سے اٹھائی تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس دیوار کو گرانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنی والدہ کی زبانی ایک بار بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ سارہ کے والدین لاہور ہی میں ہیں۔ سارہ کے دو بیٹے ہیں۔ خاوند اسے بہت خوش رکھتا ہے۔ وہ کبھی کبھار والدین سے ملنے لاہور آجاتی ہے۔

اگلے چار پانچ سال میں محبوب کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ پہلے اس کے والد اور پھر والدہ فوت ہوگئیں۔ اس کی اہلیہ کے پیٹ میں رسولی تھی' اس کے دو آپریشن ہوئے۔ ان آپریشنز کے نتیجے میں وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہی۔ اب اکیلا نازید ہی ان کی زندگی کا محور تھا۔ وہ پڑھائی میں کافی ہوشیار تھا۔ میٹرک کا امتحان اس نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ لوگوں سے روابط پیدا کرنے اور بڑھانے میں وہ محبوب ہی کی طرح صفر تھا۔ کم گو' شرمیلا اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا۔ محبوب کو اس میں اپنا عکس نظر آتا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ بیٹے میں اپنے والی عادات دیکھ کر اسے خوشی کے بجائے دکھ ہوتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ آخر کیوں ہے وہ ایسا؟ وہ ایک دم جھلا جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر نازید کو ٹوکتا تھا' ڈانٹتا تھا۔

اس قسم کے فقرے اکثر اس کی زبان سے نازید کے لیے ادا ہوتے رہتے تھے "نیچے کیا دیکھ رہے ہو' سر اٹھا کر بات کرو۔"

"منہ میں گھنگنیاں ڈال رکھی ہیں۔"

"بے وقوف' کم عقل' یہ بھلا کوئی بات ہے عورتوں کی طرح شرمانے کی۔"

اس کی ڈانٹ نازید کو سہما کر رکھ دیتی تھی۔ بعد میں محبوب کو دکھ بھی ہوتا۔ وہ سوچتا' وہ ایسا کیوں کرتا ہے' تربیت کا یہ انداز تو نہیں ہوتا' بچے کی عادات کو آہستہ آہستہ اور بتدریج بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ خود سے عہد کرتا کہ اب نازید کو نہیں ڈانٹے گا۔ ایک دو ماہ اس عہد پر سختی سے کاربند ... رہتا' لیکن پھر آہستہ آہستہ بھولنے لگتا۔ پھر وہ سوچتا شاید نازید پر اسے جو غصہ آتا ہے وہ اس "رنجش" کا ردِعمل ہے جو اسے اپنی ذات سے ہے' وہ نازید پر غصہ کر کے درحقیقت اپنے آپ پر غصہ اتارتا ہے۔

ایک خیال رہ رہ کر اس کے ذہن میں آیا کرتا تھا۔ کیا وہ اور سارہ اب کبھی نہ مل سکیں گے۔ انہیں کبھی ایک دوسرے کی خبر نہ ہو سکے گی۔ ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے' ایک ہی زمانے میں جیتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائیں گے؟ ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ یہ زندگی کسی "فلم" کی طرح ہو جائے۔ جس میں اچانک کوئی حسین موڑ آجاتا ہے' کوئی انوکھا اتفاق ہو جاتا ہے۔ کہانی پھر وہیں سے شروع ہو جاتی ہے جہاں سے کبھی سلسلہ ٹوٹا تھا لیکن محبوب کی اس سوچ کی عمر بس ایک لمحہ ہی ہوتی تھی۔ بہت جلد وہ ہوش کی دنیا میں واپس آجاتا تھا۔ گزرے ماہ و سال میں گھڑی کی سوئیاں جو فاصلہ طے کر چکی تھیں اسے مٹایا نہیں جا سکتا تھا' نہ ہی وہ پانی واپس آسکتا تھا جو پلوں کے نیچے سے بہہ چکا تھا' یہ فلم نہیں تھی' یہ زندگی تھی۔ اٹل' ٹھوس اور سخت ناہموار۔

ایک مرتبہ نازید اصرار کر کے پاکستان چلا گیا۔ وہ اپنے والدین کی جنم بھومی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ ابو اور امی بھی اس کے ساتھ جائیں لیکن محبوب آمادہ نہیں ہوا تھا۔ نازید کے کالج میں دو مہینے کی چھٹیاں تھیں۔ یہ ساری چھٹیاں اس نے پاکستان میں ہی گزاریں۔ وہ واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ پاکستان اسے بہت اچھا لگا تھا اور وہاں کے لوگ بھی۔ اس نے وہاں کے حالات کے بارے محبوب کو اور شائستہ کو بہت کچھ بتایا۔ ایک روز وہ محبوب سے کہنے لگا۔

"ابو! یہ سارہ آنٹی کون تھیں؟"

محبوب کے سر پر جیسے بم کا دھماکا ہوا۔ وہ کتنی ہی دیر کھلی کھلی آنکھوں سے نازید کا چہرہ دیکھتا رہا پھر سنبھل کر بولا "وہ کہاں ملی تھیں تجھے؟"

"خالہ انجم کے گھر۔ وہاں میلاد میں آئی ہوئی تھیں۔ میرا نام پوچھا' پھر پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ وہ تو سب کچھ جانتی ہیں ہمارے بارے

میں۔ سب رشتے داروں' عزیزوں کے نام اور ان کے حالات وغیرہ انہیں معلوم تھے۔ وہ بتاتی تھیں کہ آپ ایک دوسرے کے ہاں اکثر آتے جاتے تھے۔ آپ کا اور امی کا حال احوال بھی پوچھ رہی تھیں۔ بڑے اصرار سے کہنے لگیں کہ میں ان کے گھر آؤں۔ اگلے روز میں ان کے گھر بھی گیا تھا۔"

"ان کے گھر؟" محبوب کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"میرا مطلب ہے' ان کے والدین کے گھر۔ خود تو شاید وہ کوئٹے میں بیاہی ہوئی ہیں۔ یہاں اپنے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخل کرانے آئی ہوئی تھیں۔ مجھے تو بڑی اچھی لگیں وہ۔ اگلے روز میں ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ چائے پلائی۔ ان کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ان کے پاس سے اٹھ کر جاؤں۔ کہنے لگیں "تم مجھے بالکل اپنے بیٹے کی طرح لگے ہو۔ جب میں آنے لگا تو انہوں نے مجھے ایک سویٹر بھی دیا۔ بولیں' یہیں میرے سامنے مجھے پہن کر دکھاؤ۔"

نازید اٹھا اور اس نے اچکی سے سویٹر نکال کر محبوب کو دکھایا۔ یہ آستینوں کے بغیر ایک خوب صورت سویٹر تھا۔ محبوب کو یاد آیا کہ اس نے یہ سویٹر پہلے بھی دیکھا ہے۔ بہت برس پہلے۔۔۔ بہت موسم پیشتر۔ یہی رنگ تھے' یہی ڈیزائن تھا' یہی سائز تھا۔۔۔ جن دنوں محبوب' قدیر کے کہنے پر راولپنڈی سے لاہور آیا تھا' شاید انہی دنوں یہ سویٹر سارہ نے سلائیوں پر چڑھا رکھا تھا۔۔۔ ہاں یہی تھا وہ سویٹر' محبوب نے غینک درست کر کے غور سے دیکھا۔ اس کے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑتی چلی گئیں۔

اس نے سویٹر کو اپنے لرزاں ہاتھوں سے چھوا۔ اس کی انگلیوں نے سارہ کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ اکیلا ہوتا تو شاید رو دیتا۔ لیکن اس کا بیٹا اس کے سامنے تھا۔ وہ بکھرنے سے پہلے سنبھل گیا۔ نازید ابھی تک سوالیہ نظروں سے محبوب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس سوال کا جواب چاہتا تھا جو شروع میں اس نے پوچھا تھا "یعنی کون تھیں یہ آنٹی؟"

محبوب اسے کیا بتاتا وہ کون تھی' کیسے اس کی زندگی میں آئی اور کیسے دور ہو گئی۔ اس نے بیٹے کو صرف اتنا بتایا کہ وہ ان کی محلے دار تھی اور وہ لوگ ایک دوسرے کے گھر میں اکثر آتے جاتے تھے۔

پھر چند ماہ بعد جنوری کی ایک خنک شام کو جب محبوب اپنے گھر کی چھت پر ٹہل رہا تھا اسے ایک دل ہلا دینے والی اطلاع ملی تھی۔ یہ اطلاع دینے والا اس کا بیٹا ہی تھا۔ وہ تیزی سے چھت پر آیا تھا' کہنے لگا "ابو جان۔۔۔ کچھ پتا چلا آپ کو؟"

"کیا ہوا؟" محبوب نے چونک کر پوچھا۔

"وہ سویٹر والی آنٹی فوت ہو گئیں۔"

ایک دم آسمان ٹوٹ کر محبوب کے سر پر آن گرا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح کتنی ہی دیر بیٹے کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ سارہ کیسے مر سکتی تھی؟ اس سے ملے بغیر' اسے ایک بار چھوئے بغیر؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا' ابھی تو زندگی میں کوئی انوکھا موڑ نہیں آیا تھا۔ ابھی تو دل کی اتھاہ گہرائی میں کسی حسین اتفاق کا انتظار چھپا ہوا تھا۔۔۔ وہ کیوں ایک دم سارے امکانات ختم کر گئی تھی۔ یہ کیسا کلائمکس تھا' یہ کیسا ڈراپ سین تھا' اتنا اچانک' اتنا بے ترتیب؟

ایک ہی لمحے میں اُن گنت خیالات محبوب کے ذہن سے گزر گئے۔ اس کی نگاہیں بیٹے کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے محبوب کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا "انہیں دل کی تکلیف تھی۔ ایک بار پہلے بھی اٹیک ہو چکا تھا۔ چند روز پہلے دوسری بار اٹیک ہوا۔ وہاں کوئٹے کے ایک اسپتال میں داخل تھیں۔ حالت زیادہ خراب ہو گئی تو بیٹے سے کہنے لگیں کہ مجھے لاہور لے چلو' میں لاہور میں مرنا چاہتی ہوں۔ بیٹوں نے بہت چاہا کہ وہ سفر نہ کریں لیکن وہ نہیں مانیں۔ لاہور آنے کے بعد چند گھنٹے بعد ہی انہیں پھر دورہ پڑا اور انتقال کر گئیں۔"

محبوب کے ہونٹ مضبوطی سے بھینچے ہوئے تھے لیکن سینے میں انا للہ وانا الیہ راجعون کی صدا گونج رہی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بند کمرے میں مصلے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔

○☆○

محبوب اب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ رہا تھا۔ وہ تھکا تھکا سا رہتا تھا۔ اس کی سوچوں میں بھی تھکاوٹ اور قنوطیت در آئی تھی۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچتا' زندگی کیا ہے۔ شاید ایک تیز رفتار گاڑی۔ جس پر ہم سب اوپر نیچے لدے ہوئے ہیں۔ اونچی نیچی راہوں پر یہ گاڑی اچھلتی کودتی سرپٹ بھاگی چلی جا رہی ہے۔ گاہے گاہے ہمارے ہم سفر شدید دھچکوں کے سبب اس گاڑی پر سے گرتے رہتے ہیں۔ ہم گاڑی روک سکتے ہیں اور نہ نیچے اتر کر انہیں تھام سکتے ہیں۔ بس حسرت سے انہیں دیکھ سکتے ہیں' لیکن تادیر کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ بہت جلد فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور بچھڑنے والوں کی صورت نظر

میں دھندلا جاتی ہے۔ پہلے بھی کئی لوگ محبوب سے بچھڑ گئے تھے۔ پہلے بہت پیاری دادی' پھر والد' پھر والدہ اور اب سارہ۔ مگر گاڑی حرکت میں تھی۔ اسے حرکت میں رہنا تھا۔

نازید اب اٹھارہ انیس سال کا ہو چکا تھا۔ محبوب کی بھرپور کوشش تھی کہ نازید کا دھیان صرف اپنی تعلیم کی طرف رہے اور وہ ان چکروں سے بچا رہے جو محبوب کو محبت کے خارزار میں لے گئے تھے اور جہاں اس کے جسم و جاں تار تار ہو گئے تھے لیکن انسانی ارادوں کی ناکامی کا نام ہی تو قدرت ہے۔ ایک روز ایکا ایکی محبوب کو اندازہ ہوا کہ نازید پر وہ وقت آگیا ہے جو ہر نوجوان پر آتا ہے۔ جب آنکھوں میں خواب جاگتے ہیں' ہونٹوں پر گلاب کھلتے ہیں اور چال میں رقص کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ہاں نازید ایک لڑکی سے پیار کر رہا تھا۔ وہ جس علاقے میں رہتے تھے وہاں زیادہ تر پاکستانیوں کے گھر تھے۔ خاص طور سے ان کی گلی تو مکمل "پاکستانی" تھی۔ دو تین گھر چھوڑ کر ایک "ایس ایم سالک" صاحب کی کوٹھی تھی۔ وہ نہایت تجربے کار اور پڑھے لکھے الیکٹریشن تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی دونوں بیاہی جا چکی تھیں' چھوٹی پڑھ رہی تھی۔ اس کا نام سنبل تھا۔ خوب صورت' ہنس مکھ اور تیز طرار لڑکی تھی۔ سعودیہ میں پیدا ہوئی تھی اور یہیں پلی بڑھی تھی۔ اپنے جیسے دیگر نوجوانوں کی طرح اسے اردو بس واجبی سی آتی تھی۔ ہاں انگریزی اور عربی روانی سے بولتی تھی۔ وہ اور نازید ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی محلے کے چند نوجوان تھے جو اس کالج میں پڑھتے تھے۔ ان سب نے ایک گروپ سا بنا رکھا تھا۔ یہ سب ماڈرن گھرانوں کے ماڈرن بچے تھے۔ ان کا اپنا رہن سہن تھا' اپنے مشاغل تھے۔ معاشرتی حوالے سے بیرون خانہ تو اتنی آزادی حاصل نہیں تھی لیکن درون خانہ ان کی تفریحی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ کسی برگر فیملی کی طرح وہ لوگ مکمل مل جاتے تھے۔ بیڈ منٹن اور ٹینس وغیرہ کے مقابلے ہوتے تھے' کارڈز کھیلے جاتے تھے' وڈیو پر فلمیں دیکھی جاتی تھیں اور ایسے ہی بہت سے مشاغل تھے۔ نازید بھی کبھی کبھار ان دلچسپیوں میں شریک ہو جاتا تھا۔ مگر فطرتاً وہ تنہائی پسند تھا۔

محبوب اور اس کی اہلیہ نے نازید سے اس کے معمولات کے بارے میں کبھی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی لیکن وہ ان معمولات پر نظر ضرور رکھتے تھے۔ خاص طور سے محبوب کی نظر تو بہت گہری تھی۔ ویسے بھی بزرگوں سے اپنے بچوں کے محسوسات چھپے تو نہیں رہ سکتے۔ وہ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ جانتے ہیں۔ محبوب بھی جانتا تھا کہ نازید کے قدم ایک نازک راستے پر پڑ چکے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس راستے پر اور کس کس کے قدم ہیں۔ نوجوان ٹولی سے کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود وہ ان کے بارے میں قریباً سبھی کچھ جانتا تھا۔ اس ٹولی میں ایک لڑکا باسط بھی سنبل میں دلچسپی لیتا تھا۔ ٹولی کے دیگر نوجوانوں کی طرح وہ بھی خاصا تیز طرار اور باتونی تھا۔ بلند قہقہے' خوب صورت جملے' حاضر جوابی' یہ سب کچھ اس کی گفتگو میں موجود رہتا تھا۔ جب محبوب کو یہ اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا اس کے بیٹے کا رقیب ہے (یا ہو سکتا ہے) تو اس کا دل بجھ سا گیا۔ نجانے کیوں اسے پھر وہ لمحہ یاد آگیا تھا جو برسوں پہلے لاہور کی ایک شاداب گلی میں سارہ' قدیر اور اس کے اپنے درمیان بنی تھی۔ اسے لگا جیسے وقت خود کو دہرا رہا ہے۔ ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں گھر کر گیا۔ کیا اس کے بیٹے کو بھی انہی عذابوں سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ گزرا۔ اس کا دل غم و اندوہ میں ڈوب گیا۔ اس بیت کے نتیجے میں اس پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ اسے نازید پر غصہ آنے لگا۔ اسے کیا ضرورت تھی ان بکھیڑوں میں پڑنے کی۔ اس کی تمام توجہ اپنی تعلیم کی طرف ہونی چاہیے تھی۔ وہ کیوں اپنی توانائیاں بے کار کے کاموں میں لگا رہا تھا۔ لیکن پھر اسے اپنے ان سوالوں کا جواب اپنے ماضی سے مل گیا۔ اس عمر میں ایسے حالات میں اس نے خود بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ جب محبوب نے اس انداز سے سوچنا شروع کیا تو اسے نازید سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ نازید کے متعلق ایک باپ کی طرح نہیں ایک دوست کی طرح سوچ رہا ہے' ایک ہمراز اور خیر خواہ دوست کی طرح۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ خواہش ابھری کہ نازید اپنی محبت کو پانے میں کامیاب ہو جائے۔ جو خوشی وہ حاصل نہیں کر سکا وہ نازید کو مل جائے۔ وہ غیر ارادی طور پر نازید اور سنبل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ان کے رویوں اور کیفیات پر نگاہ رکھنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نازید کو بھی وہی مشکلات درپیش ہیں جو اسے تھیں۔ کم آمیزی اور کم گوئی اس کے آڑے آرہی تھی۔ وہ ماحول میں گھل مل نہیں پا رہا تھا۔ ایک ویک اینڈ پر جب سارے ہم خیال نوجوان جھیلوں پر آؤٹنگ کے لیے گئے تو نازید ان میں شریک نہیں ہوا۔ سنبل اور باسط اسے لینے کے لیے گھر بھی آئے لیکن وہ سر درد کا بہانہ کر کے پڑا رہا۔ چند روز بعد رات کو باسط کے کزن مصاہر کے گھر "برتھ ڈے" پارٹی تھی۔ یہ پارٹی رات دو بجے تک چلتی رہی لیکن نازید دس گیارہ بجے ہی واپس آگیا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات تھے جن سے

محبوب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ فطری تنہائی پسندی نازید پر غالب آ رہی ہے۔

دوسری طرف باسط قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اکثر سنبل کے ساتھ نظر آتا تھا۔ ایک روز باسط' سنبل اور چند دیگر دوست نازید سے ملنے ان کے گھر آئے' اسٹڈی کے ساتھ والے کمرے میں کیرم بورڈ کی زبردست بازی جمی۔ محبوب اسٹڈی میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ کمرے سے آنے والی بیشتر آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں' وہ لوگ پارٹنر بن کر کھیل رہے تھے۔ باسط کی آواز آئی "سنبل! کس کی پارٹنر بنو گی۔ میری یا نازید کی؟"

"جو بھی بنا لے۔"

باسط تیزی سے بولا "دیکھو بھئی! بات یہ ہے کہ تم کھیلتی ہو فاؤل۔۔۔ جو فاؤل کھیلتا ہے' اس کا پارٹنر تگڑا ہونا چاہیے' تاکہ جھگڑا وغیرہ ڈال سکے۔ نازید تو چپ رہے گا' اکیلے تم کو ہی لڑنا پڑے گا۔ کیا خیال ہے؟"

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ سنبل نے تنک کر کہا "کون کہتا ہے میں فاؤل کھیلتی ہوں۔"

باسط بولا "میں کہتا ہوں تم فاؤل کھیلتی ہو۔"

"بس تم ہی کہتے ہو۔" نازید نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"اور یہ بھی میرا پلس پوائنٹ ہے۔" باسط نے تڑاخ سے جواب دیا "یہ میری پارٹنر ہوئی تو فاؤل پلے کا جھگڑا ہی کھڑا نہیں ہوگا۔"

ایک بار پھر زبردست قہقہہ پڑا۔

سنبل ہنستے ہوئے بولی "ٹھیک ہے بھئی۔ امنِ عامہ کی خاطر میں باسط کی پارٹنر ہوں۔"

معمولی سی بات تھی لیکن محبوب کئی دن اداسی کے سمندر میں غرق رہا۔ اسے لگا ایسے ہی کسی دن نازید کی خاموشی اسے سنبل سے بہت دور لے جائے گی۔ وہ چپ چاپ پسپا ہو جائے گا۔ باسط اس "کھیل" میں بھی سنبل کا پارٹنر بن جائے گا۔

چند ہی روز بعد اسے اپنے اندیشے حقیقت میں ڈھلتے محسوس ہوئے تھے۔ نازید اب پہلے سے زیادہ خاموش رہنے لگا تھا' اداس' پژمردہ۔ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتا' کتابوں سے الجھتا رہتا یا دھیمی آواز میں میوزک سنتا پھر ایک روز محبوب کا کلیجا کٹ کر رہ گیا تھا۔ رات کسی پہر محبوب کی آنکھ کھلی۔ وہ واش روم سے ہو کر باہر نکلا تو نازید کے کمرے سے اسے سسکیوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا اور کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد کھڑکی کی ایک جھری سے اندر جھانکنے لگا۔ اسے نازید دکھائی دیا۔ وہ اپنا سر میز پر ٹکائے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ کمرے میں بہت مدھم آواز میں المیہ میوزک بج رہا تھا۔

محبوب خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے وہ ساری رات سخت اضطراب میں گزاری۔ کبھی اسے نازید پر بے حد ترس آتا اور کبھی شدید غصے سے اس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ وہ سوچتا "یہ بے وقوف لڑکا کیوں پڑا ہے ایسے چکر میں۔ پہلے کسی قابل ہو جاتا' کچھ بن جاتا' نہ عقل' نہ ہمت' نہ کوئی وصف اور چلا ہے عشق بازی کرنے۔ کسی مصیبت میں پڑے گا اور ہمیں بھی ڈالے گا۔"

صبح سویرے اس نے نازید کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ پریشان حال پہنچا۔ بال الجھے ہوئے' لباس بے ترتیب اور آنکھوں میں رتجگا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" محبوب نے غصے سے پوچھا۔

"کک۔۔۔ کیا ابو جی۔" وہ سہم کر بولا۔

"جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ یہ کیا چکر چلا رہے ہو تم آج کل؟"

"مم۔۔۔ میں سمجھا نہیں ابو جی۔" وہ مزید ڈر گیا۔ سمٹ



marksman

سکڑ کر ایک بچے کی طرح نظر آنے لگا۔
"یہ سنبل کا کیا معاملہ ہے؟"
وہ پیلا پڑ گیا "کچھ بھی نہیں' ابو جی؟"
"جھوٹ بولتے ہو۔" وہ حلق کی پوری قوت سے دہاڑا۔
"جھوٹ بولتے ہو مجھ سے۔" اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا تھپڑ نازید کے رخسار پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر صوفے پر جا گرا۔ محبوب کی آنکھوں کے سامنے طیش کی سرخ چادر تن گئی تھی۔ وہ چیخنے لگا "بہت بڑے ہو گئے تم؟ بہت قابل بن گئے ہو؟ کیا ہے تمہارے پاس' نہ عقل نہ سمجھ نہ کوئی صلاحیت' دیکھو اپنے ساتھیوں کو' باسط کو' عمار کو' خالد کو۔ کیا ہو تم ان کے مقابلے میں۔ بولو کیا ہو تم۔ تمہاری تعلیم پر لاکھوں خرچ کر رہے ہیں' کیا اس لیے کہ تم کمرے میں پڑ کر روتے رہو' برباد ہوتے رہو' ذرا دیکھو جا کر' آئینے میں اپنا حلیہ۔ کیا لگتا ہے کہ تم کسی معقول خاندان کے فرد ہو۔۔۔؟"
وہ گرج رہا تھا۔ باہر اس کی بیوی شائستہ دروازہ پیٹ رہی تھی پھر وہ دوسرے دروازے سے اندر آ گئی۔ اس نے بپھرے ہوئے محبوب کو بمشکل قابو میں کیا اور آنسو بہاتے نازید کو اپنی پناہ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

○☆○

نازید کو طمانچہ مار کر محبوب جتنا پچھتایا' اتنا زندگی میں کبھی نہیں پچھتایا تھا۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا جسم غصے اور غم سے پھنک رہا تھا۔ اس نے کتنی کوشش کی تھی کہ نازید اس پُرخطر راستے پر قدم نہ رکھے جہاں خود محبوب کے پاؤں میں بے شمار کانٹے ٹوٹے تھے لیکن اس کی کوشش ناکام ہو گئی تھی' اور اب وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ کبھی اسے بیٹے پر بے تحاشا ترس آتا تھا اور کبھی شدید غصہ۔ جس ہاتھ سے اس نے جواں سال بیٹے کو مارا تھا وہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا' اس کا جی چاہتا تھا اسے کاٹ کر پھینک ڈالے۔ کیوں یہ ہاتھ اٹھا تھا نازید پر۔۔۔ شاید یہ ہاتھ اس نے نازید پر نہیں خود اپنے اوپر اٹھایا تھا۔۔۔ وہ کبھی بستر پر لیٹ جاتا کبھی قالین پر ٹہلنے لگتا۔ اسے کسی حال میں چین نہیں تھا۔
وہ ساری رات جاگتا رہا تھا' علی الصباح وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا۔ وہ خواب اور بیداری کی درمیانی حالت تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کمرا ایک مانوس خوشبو سے مہک گیا ہے۔ یہ برسوں پرانی وہی خوشبو تھی جو وہ سارہ کی قربت میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اسے پڑھاتے ہوئے' اس سے باتیں کرتے ہوئے اور اس کے آس پاس گھومتے ہوئے۔۔۔ پھر اس نے سارہ کا ہیولا دیکھا۔ یہ ہیولا روشنی میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ وہی تیس سال پہلے کی سارہ تھی۔ آہو چشم روشن جبیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ محبوب کو اپنے کانوں میں اس کی آواز گونجتی محسوس ہوئی۔ یہ آواز کہیں بہت دور سے لاکھوں کروڑوں میل کے فاصلے سے اس تک پہنچ رہی تھی۔ یہ آواز سارہ کے ہونٹوں سے نہیں نکل رہی تھی' اس کے سراپا سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی "بھائی۔۔۔ جان۔۔۔ آپ نے کیوں مارا اسے۔۔۔ آپ نے میرے بیٹے کو کیوں مارا۔۔۔ آپ نے مجھے بہت رلایا ہے۔۔۔ اب تو بس کریں۔۔۔ خدا کے لیے اب تو بس کریں اب تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا میری طرف بھیج دیں۔۔۔"
محبوب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اسے لگا جیسے سارہ واقعی ابھی یہاں موجود تھی۔ وہ ابھی ابھی اس ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل کر گئی ہے۔
اس کے دل پر چھائے ہوئے غم و غصے کے بادل ایک دم چھٹ گئے۔ اوس سے بھیگے ہوئے نخلستان میں ایک سہانی صبح کا منظر اس کے سامنے تھا۔ نازید کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے آئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل پھر اپنے بیٹے کے لیے دھڑکنے لگا ہے۔ ہاں۔۔۔ وہی دل جو بیٹے کا دوست تھا' اس کا ہمراز اور غم خوار تھا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا "مجھے معاف کر دے میرے بیٹے۔۔۔ مجھے معاف کر دے نازید۔"

○☆○

کچھ دیر گھنٹی ہوتی رہی پھر کسی نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔" زندگی سے بھرپور ایک خوب صورت آواز سنائی دی۔
"میں انکل محبوب بول رہا ہوں سنبل بیٹی!" محبوب نے کہا۔
"اوہ انکل آپ۔۔۔" وہ چہکی "آج آپ نے کیسے یاد کر لیا؟"
"بھئی! وہ تم نے کہا تھا ناں کہ میرا کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ دیکھنا چاہتی ہو۔"
"واؤ۔" وہ خوشی سے چہک کر بولی "تو آپ لے جا رہے ہیں مجھے دکھانے؟"
"بیٹے! اسی لیے تو فون کیا ہے۔ اگر کوئی اور ضروری کام نہیں تو پاپا سے پوچھ لو اور نو بجے تک چلی آؤ۔ یہاں سے اکٹھے ہی چلیں گے۔"
"اوہ سویٹ انکل۔۔۔ یو آر گریٹ۔۔۔ بس میں ابھی ناشتا

کرکے آپ کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔"
"پاپا سے پوچھ لینا۔"
"سمجھ لیں پوچھ لیا۔ بس میں آرہی ہوں ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر۔"

محبوب، سنبل کو لے کر دس گیارہ بجے کے قریب اپنے آفس پہنچا۔ سنبل کمپیوٹر سائنس پڑھ رہی تھی۔ کمپیوٹرز میں اس کی دلچسپی فطری بات تھی۔ محبوب کے ڈپارٹمنٹ میں کچھ نیا "ہارڈ ویئر" آیا تھا۔ سنبل اسے دیکھنے سمجھنے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ جینیئس لڑکی تھی اور بلا کی ...زود فہم بھی۔ محبوب اس کی ان صلاحیتوں کا معترف تھا۔ اس نے سنبل کو اپنے ڈپارٹمنٹ کا وہ حصہ دکھایا جہاں نئی مصنوعات رکھی گئی تھیں۔ دو ڈھائی گھنٹے انہوں نے دلچسپ مصروفیت میں گزارے۔

سنبل تو سارا ڈپارٹمنٹ دیکھنا چاہتی تھی لیکن محبوب نے کہہ سن کر اسے باز رکھا۔ اس نے سمجھایا "بیٹا جی! اتنا ہی کھانا چاہیے جتنا ہضم ہوسکے۔ جو کچھ آج دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے ذہن نشین کرو، پھر مزید دیکھ لینا۔"

"تو اب کیا کریں گے۔ گھر واپس چلیں گے۔"

"نہیں بھئی! آج تم ہماری مہمان ہو۔ یہاں پاس ہی شاندار مصری ریستوران ہے۔ وہاں ہم اپنی بیٹی کو زبردست لنچ کرائیں گے، پھر واپس چلیں گے۔"

سنبل کھل اٹھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد محبوب کی سیک گام مرسڈیز "الناصر ریستوران" کے سامنے رکی۔ محبوب اور سنبل گاڑی سے اترے اور ڈائننگ ہال کے ایک نہایت پرسکون نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔

سوپ کا چمچ لیتے ہوئے محبوب نے کہا "سنبل بیٹی! میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ جو بات تم سے کرنا چاہتا ہوں، وہ مجھے زیب نہیں دیتی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ کیا میں امید کروں کہ میری بیٹی مجھ سے ناراض نہیں ہوگی۔"

"انکل! آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ میں بھلا آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں۔ آپ میرے بڑے ہیں۔"

محبوب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "نازید! تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

سنبل کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ سوپ کا چمچ اس کے ہاتھ میں ڈگمگایا تھا۔

"مم۔ میں سمجھی نہیں انکل۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"میں نے پوچھا ہے کہ نازید، تمہیں کیسا لگتا ہے۔"

وہ ذرا سنبھل کر بولی "بہت اچھا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا، ذہین، خاموش طبع اینڈ ویری ویری جینٹل۔"

"لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے سنبل! تم اسے کس نظر سے دیکھتی ہو۔ کیا وہ تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

سنبل کے چہرے پر پھر رنگ لہرا گیا۔ لاکھ ماڈرن سہی لیکن تھی تو لڑکی۔ اس کا سر غیر محسوس طور پر جھک گیا۔ انگلیوں سے بالوں کو پیچھے ہٹا کر بولی "مم۔ میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں انکل۔ اور نہ ہی کبھی۔ اس نے کوئی بات کی ہے۔"

"اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی؟"

"نہیں انکل۔" وہ معصومیت سے بولی۔

پھر شاید اسے احساس ہوا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر کچھ تسلیم کر رہی ہے۔ اس کا سرخ چہرہ حیا کی وجہ سے کچھ اور سرخ ہوگیا۔

محبوب نے ایک بہت گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولا "سنبل! میں آج تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ یہ کہانی میں نے اس سے پہلے کسی کو نہیں سنائی۔ شاید تمہیں بھی نہ سناتا لیکن اب تم نے جو جواب دیا ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں یہ کہانی سناؤں۔"

ڈاک بذریعہ ہنر سیکھئے ◎ روزگار لیجئے

انگلش لینگویج کورسز	ایئر ہوسٹس فلائیٹ اسٹیوارڈ	بیوٹی پارلر کورسز
اردو، عربی لینگویج کورسز	ڈرافٹسمین ڈرائنگ	ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
بزنس ایڈمنسٹریشن	کمپیوٹر کورسز	اسکول ٹیچنگ میتھڈ
انٹیریئر ڈیکوریشن	کمرشل آرٹ	امپورٹ ایکسپورٹ
فرنکلن پبلشنگ ہاؤس	شمسی توانائی	کوکنگ بیکنگ
آئل پینٹنگ	میڈیکل ایڈ	ڈینٹل ٹیکنیشن
کمپیوٹر	فوٹوگرافی	فن آف پامسٹری

یہ تمام کورسز اردو میں سیکھنے، تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک گھر بیٹھے حاصل کریں۔ اور بذریعہ خط و کتابت امتحان کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جواباً ٹکٹ لگے لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس 1237
جی۔پی۔او اسلام آباد

سنبل حیران حیران سی محبوب کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔ محبوب اپنے سامنے خلا میں جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی بہت دور ماضی کی ایک بھولی بسری گلی میں بھٹک رہی تھیں۔ وہی گلی جس میں سارہ کا گھر تھا اور جہاں محبوب اپنے والدین کے ساتھ "عارضی مکین" کی حیثیت سے ٹھہرا تھا۔ اس نے اپنی کہانی یوں شروع کی "سنبل! اس کا نام سارہ تھا۔ وہ ہمارے سامنے والے مکان میں رہتی تھی۔ وہ بڑی اچھی لڑکی تھی۔"

جوں جوں محبوب کی کہانی آگے بڑھتی گئی سنبل اس میں کھوتی چلی گئی۔ اس کا اضطراب، جھجک، الجھن سب کچھ کہانی کے بیچ و خم میں ڈوب گیا۔ کبھی اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ جاتے، کبھی اس کی آنکھیں اداس ہوجاتیں۔ محبوب کے احساسات کو چھو کر کہانی اس کی دانائی تک پہنچی اور پھر اس کی سب زبانوں سے ہوتی ہوئی اس کی بیکراں خوبیوں تک آگئی۔ جب کئی برسوں پر محیط یہ روداد اختتام پذیر ہوئی تو شوخ سنبل کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

وہ کراہ کر بولی "انکل محبوب! میں نے خاموش محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج پتا چلا کہ خاموش محبت کیا ہوتی ہے۔ سچ انکل! مجھے آنٹی سارہ پر اور آپ پر بے تحاشا ترس آرہا ہے۔ اف یہ ڈونٹ مائنڈ پلیز۔ آئی وانٹ ٹو سے آئی ایم ویری ویری سوری۔"

"یقین تمہارے نزدیک میں قاتل رحم ہوں۔"

"جی انکل۔" اس نے آنسو چھپانے کے لیے سر جھکالیا۔

محبوب نے انگلی سے سنبل کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی "میری طرف دیکھ کر بات کرو بیٹی! کیا میں قاتل رحم ہوں؟"

سنبل نے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

محبوب نے کہا "میری طرح کا ایک "قاتل رحم" اور بھی ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ کون ہے؟" پھر خود ہی بولا "وہ میرا بیٹا ہے۔"

"جی!" سنبل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں بیٹی! وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ ویسی ہی محبت جیسی میں نے سارہ سے کی تھی۔ میری طرح وہ بھی مذبذب رہتا ہے۔ اسے بھی اظہار کا ڈھنگ نہیں آتا۔ وہ سالہا سال کوشش کرتا رہے گا تو بھی تم پر اپنے دل کا حال نہیں کھل سکے گا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا سنبل! چاہے اس کے سامنے کوئی شاطر اس کی آرزو اس سے چھین لے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ کوئی اور نہیں ہے۔ وہ میں ہی ہوں سنبل۔ سمجھو کہ میں ہی ہوں۔"

جذبات کی شدت سے محبوب کی آواز رندھ گئی۔ وہ بولا۔ "سنبل بیٹی! وہ قابل رحم ہے تو اس پر رحم کرو۔ اگر تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے تو خود اس کی طرف بڑھ جاؤ، اس کا انتظار مت کرو۔ وہ نہیں آئے گا۔ وہ نہیں بولے گا۔ ہم ایک ہی بے زبان قبیلے کے فرد ہیں، ایک جیسی نارسائیاں ہمارا مقدر ہیں۔ جو کل میرے ساتھ ہوا تھا وہ اب نازید کے ساتھ ہوگا۔ لیکن تم چاہو تو اس "ہونی" کو ٹال سکتی ہو۔ اگر تم چاہو تو۔"

دو آنسو بے اختیار محبوب کے رخساروں پر لڑھکے اور اس کی چھوٹی چھوٹی نیم سفید داڑھی میں اوجھل ہوگئے۔ سنبل یک ٹک اس کی طرف دیکھتی جارہی تھی۔

○☆○

وہ ایک خوش رنگ شام تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ محبوب نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر پوری میں جھانکا۔ سنبل، نازید کو لے کر گاڑی میں سوار ہورہی تھی۔ سنبل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے گلاب کھلے تھے۔ نازید کا چہرہ بھی مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، سنبل اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ سنبل نے کوئی چٹکلہ بات کہی۔ نازید بے اختیار مسکرانے پر مجبور ہوگیا۔ گاڑی نے حرکت کی اور ہموار فرش پر بے آواز پھسلتی باہر نکل گئی۔

محبوب کتنی ہی دیر اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ آج اس کے دل کا موسم عجیب سا ہورہا تھا۔ ایک عمر بیت گئی تھی اور آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پاکستان واپس جائے۔ اپنے گھر کو دیکھے، اپنے گلی کوچوں کو دیکھے اور اس گلی کو بھی جو دنیا میں وہ جگہ آباد تھی، ایک زمین پر ایک اس کے دل میں۔ وہ جیسے قدموں سے چلتا الماری کے پاس پہنچا۔ وہ سوئٹر جو نازید کئی ماہ پہلے لاہور سے لایا تھا، اب محبوب کے پاس تھا۔ نازید اور شائستہ دونوں کا خیال تھا کہ یہ سوئٹر محبوب کو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ محبوب نے سوئٹر الماری سے اتارا، کچھ دیر اس پر ہاتھ پھیرتا رہا، اس کی خوشبو لیتا رہا، پھر اس نے سوئٹر پہن لیا۔ کوئی لاتعداد فاصلوں پر ہونے کے باوجود ایک دم اس کے قریب آگیا، اس کی رگ رگ جاں سے لگ گیا۔ یہ سوئٹر شاید بھیجا ہی اس کے لیے گیا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے پٹ وا کرکے وہ مشرق کی طرف دیکھنے لگا۔ اپنا وطن اور اپنی "گلی" دیکھنے کی خواہش اس میں شدید تر ہوتی جارہی تھی۔



سالگرہ نمبر کے لئے طاہر جاوید مغل کا تحفہ خاص

محبت اور انٹیچی

طاہر جاوید مغل

اساتذہ کے لئے کوڑھ مغز، غبی اور بے رغبت شاگرد کوفت و الجھن کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ایسے طالب علموں کے روبرو تو بسا اوقات ذہانت بھی ناکام ہونے لگتی ہے تاہم اگر شاگرد ذہین، معاملہ فہم اور سمجھنے کے لئے آمادہ ہو تو سمجھنے سمجھانے کا عمل دلچسپ ہوجاتا ہے۔

محبت جیسے دقیع مسئلے کو آسان کرنے والی ایک مشاق استاد کا ماجرائے دلچسپ

عظمیٰ ریاض کا تعلق درس و تدریس کے شعبے سے تھا۔ وہ کالج میں سائیکالوجی کی اسسٹنٹ پروفیسر تھیں۔ یعنی اپنے طلبہ و طالبات کو نفسیات پڑھاتی تھیں۔ دو بچے تھے۔ میاں بینک آفیسر تھے۔ عظمیٰ کالج کے طلبہ کے ایک بڑے گروپ کے ساتھ مری آئی ہوئی تھیں۔ ان کی ایک بھانجی نادیہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ یہ گروپ کی واحد ممبر تھی جس کا تعلق کالج سے نہیں تھا۔ نادیہ نویں کی طالبہ تھی اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔

طالب علم لڑکے لڑکیوں کا یہ گروپ جو تقریباً 200 ممبران پر مشتمل تھا اگست کی 10 تاریخ کو مری پہنچا۔ یہ وہ دن ہوتے ہیں جب ملکہ کوہسار مری اپنی پوری سج دھج اور پورے جاہ و جلال میں نظر آتی ہے۔ جدھر دیکھو انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ ریستوران کے باہر لوگ قطاروں میں کھڑے ہوکر کھانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے سارے کمرے بک ہوجاتے ہیں بلکہ ایسے کمرے بھی بک ہوجاتے ہیں جنہیں کمرا کہتے ہوئے ہنسی آتی ہے۔ مثلاً پان سگریٹ کے خالی کھوکھے، خستہ حال اسٹور روم، مرغیوں کے دڑبے وغیرہ

سب کچھ بک ہو جاتا ہے۔ ان دنوں میں کوئی مناسب قیام گاہ مناسب داموں میں ڈھونڈنا کار دشوار ہوتا ہے اور جب کوئی بڑا گروپ قیام گاہ ڈھونڈ رہا ہو تو پھر اس کا تجمل خراب ہونا یقینی ہوتا ہے۔ کالج کے اس ''وسیع و عریض'' گروپ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا..... کئی گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد پرنسپل اکرم رندھاوا صاحب نے فیصلہ کیا کہ گروپ چھوٹے چھوٹے گروپس میں تقسیم ہو جائے اور جس کے جدھر سینگ سمائیں ادھر چلا جائے' یعنی سب لوگ آزادانہ طور پر اپنی اپنی قیام گاہ ڈھونڈ لیں لیکن اس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ ہر روز شام کو ٹھیک سات بجے سب لوگ مال روڈ کے جی پی او چوک پر جمع ہوں گے اور اپنے حال احوال سے آگاہ کریں گے یہ ٹور چھ دن کا تھا۔

رندھاوا صاحب کی ہدایت کے مطابق ہمارا گروپ ہجوم مری میں تتر بتر ہو گیا تھا۔ لڑکوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن لڑکیوں کے بہت زیادہ ذیلی گروپس نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ 80 لڑکیاں تقریباً چھ ٹکڑیوں میں تقسیم ہوئیں ہر ٹکڑی کے ساتھ ایک عدد استاد موجود تھا۔ عظمیٰ جس ٹکڑی یا گروپ میں تھی اس میں عظمیٰ کے علاوہ بارہ لڑکیاں تھیں جو عظمیٰ کی بھانجی نادیہ تھی۔ انہیں مری کے مہران ہوٹل میں تین کمرے ملے تھے۔

عظمیٰ کے گروپ میں تھرڈ ایئر کی ایک لڑکی نتاشا بھی تھی' نتاشا کالج کے ہی ایک اسٹوڈنٹ منصور میں دلچسپی لیتی تھی' منصور بی ایس سی کر رہا تھا اور فورتھ ایئر میں تھا۔ دونوں شائستہ حدود میں رہتے ہوئے رومانس کر رہے تھے اور اس رومانس کے بارے میں کالج کے اکثر طلبہ کو معلوم تھا اور یہ کوئی اکیلا رومانس نہیں تھا ایسے چار چھ افیئرز کالج میں اور بھی موجود تھے بلکہ ایک جوڑے کی تو منگنی بھی ہو چکی تھی۔ نئی زمانہ یہ سب کچھ کالج لائف کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔

ٹور شروع ہونے کے ایک دن بعد ہی نتاشا نے پریشان ہونا شروع کر دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ منصور اس سے دور ہو گیا تھا۔ وہ تو اکٹھے گھومنے پھرنے کے لیے یہاں آئے تھے مگر یہاں ازدحام کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا..... منصور اور اس کے گروپ کو مال روڈ سے بہت نیچے بس اسٹینڈ کے قریب ہوٹل ملا تھا۔ دو دن میں وہ بس دو دفعہ ہی مل سکے تھے۔ نتاشا لوگوں کے ہجوم میں سارا دن منصور کو ڈھونڈتی رہتی تھی یقیناً وہ بھی ایسا ہی کرتا ہوگا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے نتاشا کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔ منصور شام کو جی پی او چوک پر بھی نہیں آیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پرنسپل رندھاوا صاحب کی ہدایت کے مطابق سب طلبہ کو شام سات بجے اکٹھے ہونا تھا۔

درحقیقت پہلے دو روز تو اس ہدایت پر جیسے تیسے عمل ہوا تھا لیکن اب یہ حکم بھی دوسرے بہت سے احکام کی طرح ہوا میں اڑ گیا تھا۔ آزادی کی عمر تھی' آزادی کا ماحول تھا اور اگست کے حوالے سے وقت بھی آزادی کا تھا۔ رندھاوا صاحب کے احکامات اس آزاد ریلے پر کہاں تک بند باندھ سکتے تھے' کئی طلبہ شام کے اجتماع میں نہیں پہنچے تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ لڑکوں کی ایک ٹولی بغیر بتائے ایوبیہ چلی گئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک مخلوط گروپ شام سات بجے سے تھوڑی ہی دیر قبل کشمیر پوائنٹ کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔

جب شام سات بجے کے ''گیٹ ٹوگیدر'' میں بھی منصور سے ملاقات نہیں ہوئی تو نتاشا کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی۔ وہ بالکل اداس سی پوسٹ آفس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ عظمیٰ کے گروپ کی کچھ لڑکیاں اسے تنگ کرنے لگیں۔ عظمیٰ کی بھانجی نادیہ ان میں پیش پیش تھی۔ درحقیقت پہلے دن سے ہی نادیہ نے نتاشا کو تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، یوں لگتا تھا کہ اسے نتاشا سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ بات بے بات اس سے الجھ جاتی تھی کبھی اسے دیسی جیولیٹ کا خطاب دیتی' کبھی بیر کی پوتی اور کبھی کسی کی رشتے دار کہہ کر پکارتی۔ نتاشا کے لباس اور بالوں کے اسٹائل وغیرہ میں نقص نکالنا بھی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ گروپ کی ایک اور لڑکی فریال بھی نادیہ کے ساتھ شریک ہو گئی تھی اور دونوں اکثر نتاشا کے بارے میں ہی مزاحیہ کانا پھوسی کرتی رہتی تھیں۔

ان کی باتوں سے قطع نظر نتاشا ایک قبول صورت' سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ نوعمر نادیہ کی باتوں کو بڑے تحمل سے برداشت کرتی رہی تھی اور اب بھی کر رہی تھی۔ اس روز تو حد ہو گئی۔ سب لڑکیاں آئس کریم کھانے کے لیے قریبی دکان پر چلی گئیں۔ نتاشا سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی رہ گئی..... بس ایک سنجیدہ صورت لڑکی تھی جو اس کے پاس بیٹھی واک مین پر موسیقی سن رہی تھی۔ اتنے میں شوخ آنکھوں والی فریال تیزی سے واپس آئی اور نتاشا کو مخاطب کر کے بولی ''لو یار! تمہاری اداسی دور ہونے کا سامان ہو گیا۔''

نتاشا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''مذاق مت سمجھنا..... میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' فریال بولی ''تیرے منصور صاحب آ گئے ہیں۔''

فریال نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا تھا کہ نتاشا نے بے ساختہ پوچھا ''کہاں ہے؟''

''وہ نیچے ''کراچی ہوٹل'' کے پاس کھڑا برگر کھا رہا

ہے۔ آؤ دکھاؤں تمہیں۔''

نتاشا چند لمحے تذبذب میں رہی پھر کھڑی ہوگئی۔ فریال اسے لے کر اس تنگ سڑک پر آگئی جو ''جی پی او'' کے سامنے سے پرانی مری کی طرف اترتی ہے' صرف چالیس پچاس میٹر آگے جا کر فریال رک گئی ''وہ دیکھو وہ کھڑا ہے۔'' فریال نے اشارہ کیا۔

''کہاں ہے؟'' نتاشا نے چاروں طرف نگاہ گھما کر پوچھا۔

چند بلیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

پھر جیسے ساری بات ایک دم ہی اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس کے ساتھ ہی غم و غصے کی ایک شدید لہر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ ہوٹل کے پاس کچرے کا ڈرم تھا' ڈرم کے پاس ایک میلا کچیلا فربہ اندام بلّا باسی برگر پر منہ مار رہا تھا۔

نتاشا نے تیزی سے گھوم کر دیکھا فریال موقعے سے غائب تھی۔ وہ اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی واپس جی پی او کی سیڑھیوں پر آگئی۔ عظمیٰ نے اسے جاتے اور پھر اشک بار آنکھوں کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''کیا بات ہے نتاشا؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں۔''

''کچھ نہیں ٹیچر! ویسے ہی پانی نکل آیا ہے۔''

''یہ ویسے ہی نکل آنے والا پانی نہیں ہے۔'' عظمیٰ اسے اپنے ساتھ سیڑھیوں پر بٹھاتے ہوئے بولی ''مجھے بتاؤ کیا بات ہے..... میں جانتی ہوں فریال تمہیں تنگ کر رہی ہے اور نادیہ بھی۔''

نتاشا پہلے تو ٹالتی رہی لیکن جب عظمیٰ کا اصرار بڑھا تو اس کے ضبط کا بندٹوٹ گیا اور وہ ایک بار پھر رونے لگی کچھ دیر بعد بولی ''ٹیچر! نادیہ آپ کی بھانجی ہے، میں اسے چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی ہوں..... لیکن..... وہ فریال کے ساتھ مل کر مجھے بہت ستا رہی ہے۔ میں جانتی ہوں اب بھی دونوں نے مل کر شرارت کی ہے۔''

''کیا شرارت کی ہے بھئی؟ یہی تو پوچھ رہی ہوں تم سے؟''

نتاشا نے اشک بار لہجے میں ساری بات بتادی..... عظمیٰ کو سن کر واقعی دکھ ہوا۔

رات کو کھانے کے بعد انہوں نے ایک چکر مال کا لگایا۔ سردی محسوس ہو رہی تھی عظمیٰ اپنے گروپ کے ساتھ ہوٹل واپس آگئی۔ لڑکیاں ایک ہی کمرے میں جمع ہو کر لوڈو اور کارڈ وغیرہ کھیلنے لگیں۔ عظمیٰ اپنے بستر پر نیم دراز ہوگئی اور نادیہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ نادیہ کے ساتھ عظمیٰ کو بچپن سے بہت پیار تھا۔ وہ بالکل گڑیا سی تھی اور ذہین بھی بہت تھی۔ ذہین بچے اکثر شرارتی بھی ہوتے ہیں۔ نادیہ کی نس نس میں بھی شرارت بھری ہوئی تھی۔ وہ شروع سے ہی بے حد کھلنڈری تھی۔ بڑی ہوئی تو اس نے قد کاٹھ بھی اچھا نکالا لیکن اس میں لڑکیوں جیسی نزاکت اور نرمی نہیں تھی۔ دیکھنے میں لمڈھینگ لگتی تھی اور لڑکوں کی ہی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی چلتی تھی۔ قدرتی طور پر کچھ لڑکیوں میں نسوانیت جلدی جاگ جاتی ہے اور کچھ میں یہ تبدیلی دیر سے آتی ہے۔ نادیہ بھی دوسری قسم میں شمار ہوتی تھی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے برعکس نہ تو اس میں شرم و جھجک پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی صنفِ مخالف کے لیے کسی طرح کی خواہش یا دلچسپی اس میں نمودار ہوئی تھی بلکہ عظمیٰ نے محسوس کیا تھا کہ اس قسم کے جذبے اور اس نوع کے واقعات کو وہ تمسخر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ٹی وی یا فلم وغیرہ دیکھتے ہوئے کوئی رومانی منظر اسکرین پر نمودار ہوتا تھا تو نادیہ کی آنکھوں میں شرم و حجاب کے بجائے عجیب طرح کا الجھن آمیز تمسخر دکھائی دینے لگتا تھا۔ بعض اوقات وہ کوئی بے ڈھنگا سا فقرہ بھی اچھال دیتی تھی۔ مثلاً..... دیکھو اب بک بک شروع



ہونے لگی ہے یا..... لو جی اب مینڈکوں کو پھر زکام ہونے لگا ہے۔

عظمیٰ چاہتی تھی کہ وقت کے مطابق نادیہ میں تبدیلیاں رونما ہوں۔ اسے اپنی صنف اور صنف کے جذبات کا احساس ہو۔ اس حوالے سے اس کی غیر معمولی سرد مہری میں کمی واقع ہونا اب ضروری تھا۔

لڑکیاں ساتھ والے کمروں میں مسلسل لوڈو وغیرہ کھیلنے میں مصروف تھیں۔ خبر نہیں کہ انہیں کب تک جاگنا تھا۔ عظمیٰ نے نادیہ کو اپنے پاس بلالیا۔ اس سے بات کرنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ نادیہ آلتی پالتی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور تکیہ دہرا کر کے گود میں رکھ لیا ''جی خالہ! کیا بات ہے؟'' وہ اپنے مخصوص بے پروا لہجے میں بولی۔

عظمیٰ نے گہری سنجیدگی سے کہا ''نادیہ! تم ہاتھ دھو کر اس بے چاری نتاشا کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو۔ وہ آج باقاعدہ رونے لگی تھی۔''

''میں نے کیا کیا ہے خالہ؟'' وہ انجان بن کر بولی۔

''دیکھو نادیہ! مجھے یہ مان ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتی ہو۔ میرا یہ مان کبھی نہ توڑنا..... آج فریال نے نتاشا سے جو شرارت کی اس میں تم بھی شامل تھیں نا؟''

نادیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم ایسا کیوں کرتی ہو؟'' عظمیٰ نے پوچھا۔

جواب میں نادیہ یکسر خاموش رہی۔

عظمیٰ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''دیکھو نادو! میں نفسیات پڑھاتی ہوں بہت بڑی نفسیات داں تو نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت علم اس بارے میں مجھے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ تجربہ بھی ہے۔ اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ تمہیں ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ تمہارا رویہ تمہاری عمر کے مطابق نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں جس خاص سمت میں اشارہ کر رہی ہوں..... تم سمجھ رہی ہو۔ اس بارے میں ایک بار پہلے بھی ہم دونوں میں تھوڑی سی بات ہو چکی ہے۔''

وہ ذہین نظروں سے عظمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ..... لڑکوں اور لڑکیوں کے ملنے جلنے کی بات کر رہی ہیں نا؟''

''ہاں..... میں یہی بات کر رہی ہوں..... اور چاہتی ہوں کہ تم بھی آج کھل کر اس بارے میں بات کرو۔''

اس نے سر جھٹک کر اپنے بالوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور قدرے بے باکی سے بولی ''خالہ! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگتی ہے۔ بالکل اُلو لگتے ہیں۔ ایک دم نان سینس۔''

''مجھے خوشی ہے نادو کہ آج تم کھل کر بات کر رہی ہو..... ویری نائس..... میں چاہوں گی کہ اس حوالے سے جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں ہے بلا جھجک اور بے تکان مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری خالہ نہیں..... تمہاری دوست بھی ہوں..... بولو ہوں نا؟''

نادو نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے تک ایک ''معصوم بے باکی'' سے عظمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گویا ہمت کر کے بولی ''ایسا کیوں ہوتا ہے خالہ یہ لڑکیاں..... یہ لڑکے..... مم..... میرا مطلب ہے۔ یہ کیوں کرتے ہیں ایسے؟ ہم سب کیوں اس طرح نہیں رہ سکتے جیسے عام لوگ رہتے ہیں۔ دوستی بھی ہو ہنسی مذاق بھی ہو لڑائی جھگڑا بھی ہو لیکن یہ جو.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں..... ہاں کہو نادو! جو کچھ دماغ میں ہے بے جھجک بتاؤ۔''

''مجھے ان کے انداز اچھے نہیں لگتے۔ ایک دوجے کو دیکھ کر شرم سے سرخ ہوتے ہیں ایک دوجے کو دیکھتے ہیں اور نہیں بھی دیکھتے بات کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے چھپ چھپ کر ملتے ہیں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ہر وقت آہیں بھرنا ہر وقت ایک ہی چکر میں رہنا۔ مجھے یہ سب کچھ الجھا دیتا ہے۔''

عظمیٰ مسکرائی ''..... لیکن اس ''سب کچھ'' میں تو زندگی ہے اسی سے محبت کی شروعات ہوتی ہے۔ اسی سے دو اجنبی لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں پھر گھر بنتے ہیں فیملی کی شروعات ہوتی ہے۔ تم سوچو اگر ایک گھر نہ ہوتا وہاں دو محبت کرنے والے ''مرد اور عورت'' نہ ہوتے تو پھر تمہارا وجود کیا ہوتا؟ میرا وجود کیا ہوتا؟ یہ نیچر ہے مائی ڈیئر یہی زندگی ہے قدرت نے اس دنیا کا کارخانہ چلانے کے لیے یہ اٹل جذبے بنائے ہیں۔ ان جذبوں کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے لڑکوں سے بات کرنا ان سے ملنا اچھا نہیں لگتا تو میں ادھوری ہوں؟''

''نہیں..... بات نہ کرنے میں ادھورا پن نہیں بلکہ یہ تو تمہاری عمر کے لحاظ سے شاید مناسب ہی ہے ادھورا پن تمہاری سوچ میں ہے۔''

وہ مسکرائی ''خالہ! آپ تو سائیکالوجسٹ ہیں آپ کی کئی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں..... مجھے صرف یہ بتائیں کہ یہ ایموشن جسے آپ ''محبت'' کہتی ہیں..... کیوں پیدا

ہوتی ہے؟ کیوں اچھے بھلے لوگ نیم دیوانے سے لگنے لگتے ہیں۔ آپ نتاشا باجی کو دیکھ ہی رہی ہیں۔ تین دن سے کس طرح بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی ہیں! آخر یہ لوگ..... کیوں..... ایک دوسرے کو اس بری طرح مس کرنے لگتے ہیں۔ کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ یہ صحت مند نہیں بیمار لوگ ہیں۔''

اس سے پہلے کہ عظمیٰ جواب میں کچھ کہتی' دروازے پر دستک ہوئی۔ عظمیٰ نے خود اٹھ کر دروازہ کھلا، باہر ریحان تھا۔ ریحان فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ عظمیٰ ہی کے محلے میں رہتا تھا۔ کالج کا اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے وہ عظمیٰ کا شاگرد بھی تھا۔ بے حد شریف لڑکا تھا۔ اسے گروپ کے ساتھ ہی مری آنا تھا لیکن بوجوہ ... آنہیں سکا۔ اب پہلی فرصت میں وہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کا اٹیچی اس کے ہاتھ میں تھا۔ عظمیٰ نے اسے اندر آنے دیا۔ حال احوال پوچھا۔

ریحان کو بھی ساری صورتِ حال معلوم ہوئی۔ ریحان نے عظمیٰ کو بتایا کہ وہ اس گروپ میں رہنا چاہے گا جس میں اس کا دوست ٹیپو ہے۔ اب ٹیپو کہاں تھا' یہ عظمیٰ کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس نے ریحان کو پرنسپل رندھاوا صاحب کی طرف بھیج دیا اور اسے کہا کہ وہ ان سے ساری معلومات لے کر آئے۔ ریحان اپنا اٹیچی وہیں رکھ گیا۔

ریحان کے جاتے ہی باقی لڑکیاں بھی لوڈو وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرے میں پہنچ گئیں یوں عظمیٰ اور نادو کے درمیان ہونے والی بات چیت وہیں رہ گئی۔

سب تھکی ہوئی تھیں جلد ہی سو گئیں۔ نادو بھی سو گئی۔ عظمیٰ جاگتی رہی۔ اس کا ذہن نادو کے سوالوں اور جوابوں میں الجھا ہوا تھا۔ نادو مرد و زن کے باہمی ربط کی حقیقت جاننا چاہتی تھی۔ وہ آفاقی جذبۂ محبت کے بارے میں الجھنوں کا شکار تھی اور یہ خاصی پیچیدہ الجھن تھی۔

عظمیٰ جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ دفعتاً اس کی نگاہ ریحان کے اٹیچی کیس پر پڑی۔ یہ اٹیچی دیوار کے ساتھ قالین پر رکھا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر نادو کا اٹیچی بھی رکھا تھا۔ یہ دونوں اٹیچی نیلے پیراشوٹ کے بنے ہوئے تھے اور بالکل ایک جیسے تھے ان کے اندر سامان کا حجم بھی کم و بیش ایک جتنا ہی تھا۔

عظمیٰ کے ذہن میں اچانک ایک بات آئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی۔ وہ بستر سے اتر کر ریحان کے اٹیچی کے پاس پہنچی اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔

ابھی وہ واپس بستر پر نہیں پہنچی تھی کہ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ باہر ریحان اور ٹیپو تھے۔ ریحان اپنا اٹیچی کیس

اظہار ہمدردی

ریشماں کا منگیتر کافی عرصے سے دبئی گیا ہوا تھا اور اب شادی کے لیے آنے والا تھا۔ ایک روز ریشماں نے شرماتے ہوئے زرینہ کو بتایا ''وہ وہاں دبئی میں اپنے دوستوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ میں شہر کی سب سے خوب صورت لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔''

''ہائے اللہ.....! یہ تو بہت بری بات ہے.....'' زرینہ نے فوراً ہمدردانہ لہجے میں کہا ''اتنا عرصہ اس نے منگنی تمہارے ساتھ رکھی اور اب.....''

لینے آیا تھا۔ عظمیٰ نے دروازہ کھولا اور اٹیچی کیس اسے دے دیا۔ ٹیپو نے بتایا کہ وہ ڈیسنٹ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

لڑکیاں بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اگلے روز دیر تک سوتی رہیں۔ دس بجے کے قریب ریحان کا فون آیا یہ فون عظمیٰ نے ہی ریسیو کیا۔ وہ پریشان لہجے میں بولا ''ٹیچر! رات کو آپ نے مجھے غلط اٹیچی دے دیا۔ یہ تو کسی لڑکی کا ہے۔''

''واقعی؟'' عظمیٰ نے حیرانی سے کہا۔

''جی ٹیچر..... دونوں اٹیچی دیکھنے میں بالکل ایک جیسے ہیں۔ شاید اسی لیے آپ کو غلطی ہو گئی۔''

عظمیٰ نے چند لمحے توقف کیا اور کمرے پر نظر دوڑانے کے بعد بولی ''اوہو! میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں نادو والا اٹیچی دے دیا ہے۔ یہ تو..... بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کک..... کیوں ٹیچر؟''

''نادو تو ابھی ابھی ایک گروپ کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ لوگ ایوبیہ گئے ہیں۔ وہاں سے شاید کچھ آگے بھی چلے جائیں۔ اٹیچی بھی اس کے پاس ہے۔ جلدی میں اس نے بھی نہیں دیکھا کہ یہ تمہارا اٹیچی ہے یا اس کا۔''

''ان کی واپسی کب ہے ٹیچر؟''

''واپسی تو اب کل ہو گی..... اور وہ بھی اس صورت میں کہ کہیں آگے نہ نکل گئے تو۔''

''تو یہ واقعی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اٹیچی میں ہی سارا سامان تھا۔''

''گڑبڑ تو دونوں طرف ہوئی ہے۔ وہ بھی ایوبیہ پہنچ کر پریشان ہو گی۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر ریحان بولا ''کپڑوں کے بغیر گزارا تو میں کرلوں گا لیکن..... میری نظر کی عینک بھی سامان میں تھی..... اور میری سر درد کی دوا..... اور جوگر بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔''

''تو پھر تھوڑی سی ہمت کرلو۔'' عظمیٰ نے سوچتے ہوئے کہا ''بس اسٹینڈ چلے جاؤ ممکن ہے کہ وہ ابھی اسٹینڈ پر ہی ہوں۔ اگر نہ ملے تو ایوبیہ والی وین پر بیٹھ جانا۔ آج رش تو ایوبیہ میں بھی ہوگا مگر تم کوشش کرو گے تو اسے ڈھونڈ لوگے۔ سر عتیق بھی ان کے ساتھ ہیں۔''

''ٹھٹھ..... ٹھیک ہے ٹیچر! میں پھر..... ٹیپو کے ساتھ نکلتا ہوں۔''

''ہاں جلدی کرو..... اگر ایوبیہ جانا پڑا تو مجھے وہاں سے فون ضرور کرنا۔''

''او کے ٹیچر۔''

''او کے۔'' عظمیٰ نے کہا اور فون بند کردیا۔

نادو کہیں نہیں گئی تھی وہ ساتھ والے بستر پر سو رہی تھی..... وہ تقریباً گیارہ بجے اٹھی۔ دوسری لڑکیاں بھی جاگ گئیں۔ اب سب کو ناشتے کی جلدی تھی۔ واش روم جانے کے لیے نادو نے اٹیچی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ٹوتھ برش اور پیسٹ وغیرہ نکالنا چاہ رہی تھی۔ اس وقت نادو پر انکشاف ہوا کہ یہ اس کا اٹیچی کیس نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے ڈھکنا اٹھایا۔ اٹیچی مردانہ کپڑوں اور اجنبی سامان سے بھرا ہوا تھا۔

''خالہ! یہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے چیخی۔

دوسری لڑکیاں بھی جمع ہوگئیں۔ عظمیٰ نے دھیان سے اٹیچی کو دیکھا ''اوہ مائی گاڈ۔'' عظمیٰ نے کہا ''یہ تو ریحان کا اٹیچی ہے۔ وہ تمہارا اٹیچی اپنا سمجھ کر لے گیا ہے۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ نادو بدستور پریشان تھی ''کب آیا تھا وہ؟'' نادو نے بیزار لہجے میں پوچھا۔

''رات..... تمہارے سونے کے بعد' اٹیچی میں نے ہی اسے پکڑایا تھا۔ اس نے بھی غور نہیں کیا۔''

''اب کیا کریں؟''

''یہ تو بڑی فلمی سچویشن ہے۔'' فریال نے قہقہہ لگایا۔

''مذاق مت کرو بھئی۔ نادو پریشان ہے۔'' ایک دوسری لڑکی نے کہا۔

فریال سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ''پریشانی کیا ہے۔ اس بے وقوف کا پتا چلاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ فٹافٹ لے کر آؤ اٹیچی..... بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی خود ہی بھاگا چلا آئے۔''

''وہ نہیں آئے گا۔'' عظمیٰ نے کہا۔

''کیا مطلب ٹیچر؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا فون آیا تھا۔ وہ کمرے کو لاک کر کے اپنے دوست ٹیپو کے ساتھ گھومنے جارہا تھا۔ اس کا پروگرام پنڈی پوائنٹ کا تھا مجھے نہیں یقین کہ اب وہ شام سے پہلے ہوٹل واپس لوٹیں گے۔''

''یعنی اس اُلو کو ابھی تک اٹیچی کی تبدیلی کا پتا نہیں چلا۔'' نادو نے کہا۔

''نہیں چلا ہوگا۔ اسی لیے تو اس نے ذکر نہیں کیا'' عظمیٰ نے جواب دیا۔

''اب کیا کریں۔ میری تو ہری والی شرٹ بھی اٹیچی میں ہی ہے اور میری پی کیپ اور سن گلاسز ان کے بغیر تو میں نکل ہی نہیں سکتی۔''

وہ 13 اگست کا دن تھا۔ مری اپنے کلائمکس پر تھی آج اور کل کے لیے لڑکیوں نے خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ آج کے دن کے لیے نادو نے ایک شاندار ہری ٹی شرٹ سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ میں میچنگ پاجامہ تھا۔ اب مذکورہ شرٹ تھی..... نہ میچنگ پاجامہ..... اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ نہیں تھا۔ وہ سٹپٹائی ہوئی تھی۔

تھرڈ ایئر کی لڑکی شہناز نے کہا ''آج تو رش بھی انتہا کا ہوگا۔ وہ بے وقوف گدھا آسانی سے نہیں مل سکے گا۔''

''پرنسپل سے رابطہ کر کے دیکھیں۔'' فریال نے رائے دی۔

''پرنسپل صاحب کو آج کچھ پتا نہیں کہ کون کہاں ہے۔'' شہناز نے کہا۔

عظمیٰ نے کہا ''بڑی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے۔ مجھے اٹیچی دیتے ہوئے دیکھ لینا چاہئے تھا' دراصل کمرے میں نائٹ بلب تھا۔ برآمدے میں بھی ہلکی سی روشنی تھی۔

''آپ کی غلطی نہیں ٹیچر! دونوں اٹیچی ہیں ہی بالکل ایک جیسے۔'' شہناز نے عظمیٰ کی طرف سے صفائی پیش کی۔

اچانک فریال نے چونکتے ہوئے کہا ''ٹیچر! ان ہوٹل والوں کے پاس ''ڈپلی کیٹ'' چابیاں بھی تو ہوتی ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' دو تین لڑکیوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

کمرے میں فون صرف ریسیو کیا جاسکتا تھا۔ فون کرنے کے لیے ریسپشن پر جانا پڑتا تھا۔ عظمیٰ نے لڑکیوں سے کہا ''واقعی یہ ہوسکتا ہے کہ متبادل چابی ہو۔ وہ ہوٹل ڈیسنٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ وہاں فون پر

بات ہو سکے۔''

وہ فون کرنے کے لیے ریسپشنسٹ ''خان چاچا'' کی طرف چلی گئی۔ اس کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ چہرے پر مایوسی تھی ''نہیں بھئی۔'' عظمیٰ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''ناخوشگوار اتفاق یہ ہے کہ ہوٹل والوں کے پاس دو تین کمروں کی متبادل چابیاں نہیں ہیں اور ان میں سے ایک وہی کمرا ہے جہاں ریحان اور ٹیپو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے گروپ انچارج مسٹر رحمان سے بھی پتا کیا ہے۔ ریحان یا ٹیپو میں سے کسی کے پاس موبائل فون بھی نہیں ہے۔''

''اچھا خالہ! دفع کریں۔'' نادو نے جھلاتے ہوئے کہا ''میں کرلوں گی ایسے ہی گزارا۔ شام تک تو وہ لوگ ہوٹل واپس آ ہی جائیں گے۔''

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھومتے پھرتے کہیں ان سے ملاقات ہی ہو جائے۔'' فریال نے لقمہ دیا۔

سب لڑکیاں ناشتے کی تیاری کرنے لگیں۔ ناشتے کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کیے گئے۔ ہلکا پھلکا میک اپ ہوا۔ پھر پروگرام بننے لگے کہ کس نے کہاں جانا ہے..... نادو ایک بار پھر بیزار نظر آنے لگی تھی۔ اسے ہر ہر قدم پر اپنا اٹیچی یاد آ رہا تھا۔ اس کے استعمال کی کئی چیزیں تھیں جو اٹیچی کے ساتھ چلی گئیں تھیں۔ اب اسے اپنی ''چیپ اسٹک'' یاد آ گئی تھی۔ سرد ہوا کی وجہ سے اس کے ہونٹ پھٹنے لگتے تھے۔ آج کل وہ متواتر چیپ اسٹک استعمال کر رہی تھی۔ وہ بھی سامان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ پھر ایک دم اسے اپنا موبائل فون یاد آیا اور وہ تقریباً روہانسی ہو گئی۔ یہ اس کے ابو کا موبائل فون تھا۔ مری آتے ہوئے انہوں نے اسے دیا تھا۔ ابو کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے وہ کراچی سے ہی روزانہ دو تین بار نادو کو فون کرتے تھے اور اس کا حال احوال پوچھتے تھے۔ اس کے علاوہ روزانہ ایک دو بار نادو کی امی کا فون بھی آ جاتا تھا۔ آج تو وہ ابو سے ضرور بات کرنا چاہتی تھی کیونکہ ان کی سالگرہ بھی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ۔ یہ کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔'' وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی ''خالہ! میرا خیال ہے کہ میں اور باجی فریال ''پنڈی پوائنٹ'' کا چکر لگا آتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ کہیں اس گدھے کی شکل نظر آ جائے۔''

''ہاں یہ ہو بھی سکتا ہے۔'' عظمیٰ نے تائید کی۔

''اور نہیں بھی ہو سکتا۔'' شہناز بولی ''آج رش بہت زیادہ ہوگا۔'' اور جس گدھے کو آپ نے ڈھونڈنا ہے اس کا قد بھی زیادہ لمبا نہیں ہے۔''

''چلو کوشش تو کی جا سکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سے بھی چھوٹے گدھوں میں گھوم رہا ہو۔'' فریال نے کہا۔

غمزدہ سا تاشا ایک طرف خاموش بیٹھی اپنی ساتھیوں کی یہ ہلکی پھلکی گفتگو سن رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد فریال اور نادو باقی گروپ سے علیحدہ ہو کر پنڈی پوائنٹ کی طرف جا رہی تھیں۔

☆☆☆

آج مری میں واقعی ازدحام تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور انسانوں کے اس سمندر میں نادو..... ریحان کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے بادل گھر کر آئے تھے اور تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ عظمیٰ کے پاس موبائل موجود تھا۔ اس کے موبائل پر سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ نادو کی کال آئی۔ وہ آواز سے ہی تھکی ہوئی اور بیزار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ پنڈی پوائنٹ پر ہے اور چیئر لفٹ کے قریب ایک ''پی سی او'' سے بول رہی ہے۔ اس نے عظمیٰ سے پوچھا کہ ریحان کا کوئی سراغ ملا ہے؟

عظمیٰ نے نفی میں جواب دیا۔

نادو جھلائی ہوئی آواز میں بولی ''پتا نہیں کدھر دفع ہو گیا ہے چغد..... خالہ! میری تو گھوم گھوم کر ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس کا ایک دوست ملا تھا اس نے بھی یہی بتایا کہ وہ صبح سے اپنے کمرے سے نکلا ہوا ہے۔''

''فریال کہاں ہے؟'' عظمیٰ نے پوچھا۔

''وہ بھی ساتھ ہی خجل خراب ہو رہی ہے۔'' نادو بولی۔

''سردی ہو گئی ہے تم لوگوں نے کوئی سویٹر وغیرہ پہنا ہے۔'' عظمیٰ نے ناصحانہ لہجے میں پوچھا۔

''فریال باجی نے تو پہنا ہے لیکن میرا تو ہے ہی نہیں۔ اٹیچی کے ساتھ ہی چلا گیا ہے۔'' وہ سخت بیزار تھی، صاف ظاہر تھا کہ قدم قدم پر اسے اٹیچی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد عظمیٰ ہوٹل پہنچی تو کمرے کے فون پر ریحان کی کال آ گئی۔

وہ ایوبیہ سے بول رہا تھا، اس کے لہجے میں تھکاوٹ اور پریشانی تھی ''ہیلو ٹیچر۔''

''ہیلو۔ کچھ پتا چلا نادو وغیرہ کا؟''

''نہیں ٹیچر! پہلے بس اسٹینڈ پر گئے۔ وہاں ڈھونڈتے رہے پھر یہاں ایوبیہ آ گئے۔ یہاں بھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے گھوم رہے ہیں۔ کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں آتی۔''

''اوہو۔ یہ تو بہت برا ہوا۔''

''میرے تو جوگر بھی ایٹچی میں ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے جوگر کے بغیر مجھ سے زیادہ چلا نہیں جاتا۔'' اس کی آواز میں کراہ کا تاثر تھا۔

''ان لوگوں کا مجھ سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ بہر حال تم کوشش جاری رکھو۔'' عظمیٰ نے کہا۔

شام تک نادو اور ریحان دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ریحان اپنے ایٹچی کو ایوبیہ اور آس پاس کے علاقوں میں ڈھونڈ رہا تھا اور نادو اپنے ایٹچی کے لیے مری میں مجل خراب ہوتی رہی تھی۔ دونوں کو اپنی تلاش میں ناکامی ہوئی تھی اور اب دونوں سخت سٹپٹائے ہوئے تھے۔ خاص طور سے نادو۔ آج وہ سارا دن ایٹچی کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پریشان رہی تھی۔ شام کو گروپ کے اکثر اسٹوڈنٹ جی پی او کی سیڑھیوں پر جمع ہوئے۔ نتاشا بھی وہاں تھی۔ نتاشا کی پریشانی ابھی تک جوں کی توں تھی۔ منصور کا اسے کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اس سے ناراض ہے یا پھر کسی مشکل میں پھنس گیا ہے یا پھر کسی ارجنٹ کام کے سلسلے میں اسے کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ پرنسپل رندھاوا صاحب سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ اسے کسی کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا ہے لیکن وہ اسے کچھ بتا کر تو جاتا اور اگر نہیں بتا سکا تھا تو فون کال ہی کر لیتا۔ ہوٹل مہران کا نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ منصور کے دو دوستوں سے بھی بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ لاہور سے اس کی کوئی ضروری کال آئی تھی اور وہ فوراً روانہ ہو گیا تھا۔ نتاشا اس وقت چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ پتریاٹا گئی ہوئی تھی۔

نتاشا چاہتی تھی کہ لاہور میں منصور کے کنٹیکٹ نمبر پر فون کرے مگر ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ منصور نے اسے بوجوہ منع کر رکھا تھا۔ لاہور میں اپنے اور منصور کے ایک مشترکہ دوست سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی وہ کرتی رہی تھی لیکن ناکامی ہوئی تھی۔

آج بھی نتاشا اداس سی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس کا سارا ٹور غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ پرسوں انہیں واپس چلے جانا تھا۔ اپنے اردگرد کی گہما گہمی سے لاتعلق ہو کر اس نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا رکھی تھی اور خالی خالی نظروں سے مال روڈ پر انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ دیر تک روتی رہی ہے۔ اسے اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ زود رنج منصور اس کی کسی بات پر ناراض ہو کر واپس چلا گیا ہے۔

نادو اور فریال آج بھی سیڑھیوں پر موجود تھیں۔ مگر آج نتاشا کو چھیڑنے والا کوئی نہیں تھا وجہ یہی تھی کہ آج نادو خود پریشان تھی۔ بلکہ اس کی اور نتاشا کی حالت ایک جیسی نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے خاموش بیٹھی تھی اور اس کی متلاشی نظریں انسانوں کے لہریں لیتے سمندر میں ریحان کو (یعنی اپنے ایٹچی کو) تلاش کر رہی تھیں۔

باقی اسٹوڈنٹ ہنگامہ مچا رہے تھے' گپیں ہانک رہے تھے' کھا پی رہے تھے' خوشی اور ترنگ کے اس سمندر میں نادو اور نتاشا دو اداس جزیروں کی طرح تھیں۔ عظمیٰ پاپ کارن کا ایک بڑا پیکٹ تھامے آئی اور نادو کے پاس بیٹھ گئی۔

''پتا ہے آج سارے اسٹوڈنٹ کیا کہہ رہے ہیں؟'' عظمیٰ نے نادو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہ کہہ رہے ہیں کہ نادو اور نتاشا بالکل ایک جیسی لگ رہی ہیں۔ شاید نادو کے ساتھ بھی کچھ ہو گیا ہے۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ۔'' نادو منہ بنا کر بولی ''آپ جانتی ہیں کہ مجھے ایٹچی کی فکر ہے۔''

عظمیٰ گہری سانس لے کر مسکرائی اور بولی ''میں جانتی ہوں ریحان بھی بہت پریشان ہو گا۔ وہ بھی دیوانوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھرتا ہو گا۔''

''خاک تلاش کرتا پھرتا ہو گا خالہ..... اس کو تو پتا ہی نہیں کہ ایٹچی بدلا گیا ہے۔ اگر وہ گدھا مجھے تلاش کر رہا ہوتا تو سیدھا ہمارے ہوٹل آتا۔''

''وہ بے چارہ تمہیں ایوبیہ میں تلاش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم ایٹچی سمیت وہاں موجود ہو۔''

نادو حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ' آپ نے تو کہا تھا کہ اسے ایٹچی کے بدل جانے کا پتا ہی نہیں اور..... اور وہ اپنے دوست کے ساتھ سیر کے لیے پنڈی پوائنٹ کی طرف نکل گیا ہے۔''

''یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔'' عظمیٰ پھر مسکرائی ''میں نے جان بوجھ کر تم سے غلط بیانی کی۔ اس کے لیے میں تم سے معذرت چاہتی ہوں اور جب ریحان ملے گا تو اس سے بھی ایکسکیوز کروں گی۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''سائیکالوجسٹ جو ٹھہری اور تم نے خود ہی بتایا تھا کہ سائیکالوجسٹ مشکل باتیں کرتے ہیں۔''

نادو روہانسی ہو گئی ''پلیز خالہ میں الجھی ہوئی ہوں' مجھے مزید نہ الجھائیں۔ آپ نے ..... آپ نے مجھ سے کیوں کہا

کہ ریحان کو اٹیچی کی تبدیلی کا پتا نہیں اور وہ..... پنڈی پوائنٹ کی طرف گیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے تمہیں شروع سے بتانا چاہیے..... چلو آؤ سامنے کیفے میں بیٹھتے ہیں۔''

عظمیٰ حیران نادو کو لے کر سامنے اسنیک بار میں آبیٹھی کافی کا آرڈر دے کر اس نے کہنا شروع کیا ''نادو! کل شام تم نے مجھ سے ایک اہم سوال کیا تھا۔ یہ سوال مرد و عورت کے تعلق کے بارے میں تھا۔ میں تمہیں اس کا جواب یوں دینا چاہتی تھی کہ یہ جواب تمہارے ذہن میں بیٹھ جائے۔ نفسیات کہتی ہے کہ جب کوئی بات خاص طور سے سمجھانی ہو تو اس کے لیے خاص طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی کسی خاص طریقے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میری نظر ہوٹل کے کمرے میں تمہارے اور ریحان کے ''اٹیچی کیسز'' پر پڑ گئی۔ دونوں اٹیچی بالکل ایک جیسے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ اٹیچی کیس بدل دوں۔''

''اس سے کیا ہوا؟'' نادو آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

عظمیٰ نے طویل سانس لی ''اس سے یہ ہوا میری شہزادی کہ تم دونوں کا سامان بدل گیا۔ جن چیزوں کی ضرورت ریحان کو تھی وہ تمہارے پاس آ گئیں..... اور جن کی ضرورت تمہیں تھی وہ ریحان کے پاس چلی گئیں۔ تم دونوں ان چیزوں کے لیے بے چین ہو گئے۔ بے چین ہو گئے یا نہیں؟''

''ہاں وہ تو ہو گئے۔'' نادو نے کہا۔

''ان گمشدہ اشیا کی وجہ سے تم دونوں کا تعلق بن گیا۔ تم دونوں ہر شے سے بیگانہ ہو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈتے پھرے۔ دن بھر تمہاری نگاہیں ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹکتی رہیں..... اب تمہارے لیے ریحان کا ملنا بے حد اہم ہے اور ریحان کے لیے بھی تمہارا ملنا بے حد اہم ہوگا۔ تم دونوں ایک دوسرے کی اشد ضرورتیں پوری کر سکتے ہو۔ جب ریحان آئے تو تم اس سے پوچھنا' وہ کس طرح دیوانہ وار تمہیں تلاش کرتا رہا ہے۔''

نادو کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔

عظمیٰ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''نادو! قدرت نے مرد اور عورت کو بھی اسی طرح مشترکہ ضرورتوں کے بندھن میں باندھ دیا ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے اسے ایک طاقتور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے یہ طاقتور سہارا مرد کے پاس ہے۔ عورت کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اس کی خوب صورتی کی تعریف کرنے والا ہو' اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو ''سراہنے والی'' آنکھیں دی ہیں۔ مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ قدرت نے عورت کے دل میں ممتا کی تڑپ اور سلیقہ شعاری پیدا کی ہے۔ تم میری باتیں سمجھ رہی ہو نا؟''

نادو نے زبان سے کچھ نہیں کہا' مگر اثبات میں سر ہلایا۔

عظمیٰ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''اگر مختصر بات کی جائے تو یوں ہے کہ عورت کے پاس دلکشی ہے' نرمی ہے' نزاکت ہے اس کے علاوہ ممتا' سلیقہ' محبوبیت' حلیمی' ایثار' تسلیم' رضا بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو عورت کے پاس ہیں اور ان کی ضرورت مرد کو ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس طاقت' مضبوطی' جفاکشی' ہنرمندی' محبت اور برداشت جیسی صلاحیتیں ہیں جن کی ضرورت عورت کو ہے۔ اسی طرح جسمانی بناوٹ اور تقاضے ہیں جن کی وجہ سے عورت کو مرد میں کشش محسوس ہوتی ہے اور مرد کو عورت میں۔ تم یوں سمجھو کہ قدرت نے مرد کی ضروریات کا ''اٹیچی کیس'' عورت کو دے دیا ہے اور عورت کی ضروریات کا اٹیچی کیس مرد کو تھما دیا ہے۔ اور دونوں کو دنیا کے گنجان ہل اسٹیشن پر چھوڑ دیا ہے کہ ایک دوسرے کو تلاش کریں اور اپنی اپنی زندگی کو آسان بنائیں۔ شاید اس سے ملتی جلتی صورتحال ہمارے ''آدم اور حوا'' کو بھی پیش آئی ہوگی۔''

نادو خاموشی سے سن رہی تھی۔ اس کی نوخیز آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔

عظمیٰ نے کہا ''تم نتاشا اور منصور کو دیکھ کر حیران ہوتی ہو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کیوں بے قرار ہیں اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی ایک دوسرے کے لیے کیوں بے قرار ہوتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں نادو! یہ بے قراری تو قدرت نے ان کے اندر رکھی ہے۔ ان کے اٹیچی ان کے پاس نہیں دوسرے فریق کے پاس ہیں۔ ہر نتاشا کے لیے منصور کو ڈھونڈنا ضروری ہے اور ہر منصور' نتاشا کو تلاش کرنے پر مجبور ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

نادو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات اب بالکل نرم پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ عظمیٰ کے سمجھانے کا منفرد انداز بہت حد تک کارگر رہا تھا۔ عظمیٰ بولی ''نادو! ذرا غور کرو تمہیں اندازہ ہوگا کہ میرا اور تمہارا وجود بھی اسی لیے ہے کہ ''محبت'' ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان ایک اٹوٹ تعلق ہے۔ اسی تعلق کے سبب انسان کی نسل قائم ہے اس دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے.....'' خالہ اور بھانجی میں کافی دیر تک

باتیں ہوتی رہیں..... اسنیک بار کے دیوار گیر شیشوں سے باہر انسانوں کا سمندر ہلکورے لیتا رہا۔ سڑک کے پار کچھ فاصلے پر اداس نتاشا ''جی پی او'' کی پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی اور کسی کا انتظار کرتی رہی۔

کافی ختم ہو چکی تھی..... عظمیٰ کی بات بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اب اٹھنا چاہ رہی تھی مگر نادو نے کافی کے دو مگ اور منگوا لیے۔ شاید وہ عظمیٰ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ عظمیٰ تازہ گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نادو نے کہا ''خالہ! آپ کی باتیں میرے دل کو لگی ہیں۔ مجھے میرے کئی سوالوں کا جواب ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں ایک طرح کی پشیمانی پیدا ہو گئی ہے۔''

''پشیمانی! کیا مطلب؟''

''میں نتاشا باجی کے لیے پشیمانی محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے..... میں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔'' نادو کے لہجے میں عجیب سی ندامت آمیز نرمی تھی۔

''دیکھو تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہر بات کھول کر بیان کرو گی۔''

نادو نے چند لمحے توقف کیا پھر اعتراف کرنے والے انداز میں بولی ''میں سمجھتی ہوں کہ نتاشا باجی میری وجہ سے پریشان ہیں۔ دراصل یہ ساری میری ہی شرارت ہے۔''

''تمہاری شرارت؟''

''خالہ! دراصل منصور بھائی لاہور جانے سے پہلے ہمارے پاس ہوٹل آئے تھے۔ اس وقت نتاشا باجی دوسری باجیوں کے ساتھ پتریاٹا گئی ہوئی تھیں۔ منصور بھائی مجھے ہوٹل کے سامنے سڑک پر ملے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے ایک ماموں جو بہت عرصے سے ناراض تھے اچانک انگلینڈ سے آئے ہیں۔ ان کی خاطر انہیں فوری طور پر لاہور واپس جانا پڑ رہا ہے۔ منصور بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں اس بارے میں نتاشا کو بتا دوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لاہور جا کر وہ میرے موبائل فون پر نتاشا سے بات کریں گے۔

''میں نے نتاشا باجی کو کچھ نہیں بتایا..... بلکہ یہ کیا کہ منصور بھائی کی کال آئی تو ریسیو ہی نہیں کی..... یقینی بات ہے کہ منصور بھائی بہت پریشان ہوئے ہوں گے..... انہوں نے پچھلے دو تین روز میں بار بار کال کی لیکن میں فون فوراً بند کر دیتی تھی۔ منصور بھائی کے لیے دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہوٹل کے فون پر نتاشا باجی سے بات کرتے۔ اس کا حل بھی فریال باجی نے نکال لیا۔ انہوں نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے خان چاچا سے بات کی۔ انہیں بتایا کہ ایک لڑکا ہاتھ دھو کر ہماری کلاس فیلو نتاشا کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اسے اپنے چکر میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا نام منصور ہے۔ اگر لاہور سے اس کا فون آئے اور وہ نتاشا کو بلانے کے لیے کہے تو اسے ڈانٹ پلائیں۔ خان چاچا نے ایسے ہی کیا لیکن اس کے بعد بھی کل اور پرسوں منصور بھائی کا فون آیا تھا۔ خان چاچا نے ان کی بات نہیں کرائی۔ مجھے یقین ہے کہ منصور بھائی بھی بہت پریشان ہوں گے۔''

عظمیٰ ہونٹ سکوڑے ساری بات سن رہی تھی۔ اب سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اگر نتاشا نے پچھلے دو تین روز رو رو کر گزارے تھے تو اس کی وجہ نادو اور فریال کی شرارت ہی تھی۔

☆☆☆

رات نو بجے کے قریب ریحان ایوبیہ وغیرہ میں خجل خراب ہو کر واپس آ گیا۔ عظمیٰ نے اس کو ساری بات بتائی اور اس ''تجربے'' کی وجہ سے ریحان کو خوامخواہ جو پریشانی جھیلنا پڑی اس کے لیے معذرت بھی کی۔ ریحان نے یہ سب کچھ خوشدلی سے قبول کیا۔ اس کے بعد نادو اور فریال غمزدہ نتاشا کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور اپنی تکلیف دہ شرارت پر نتاشا سے معافی مانگی۔

نتاشا کو بھی ساری صورتحال جان کر قدرے ''ریلیف'' محسوس ہوا..... ریحان کے آنے کے بعد نادو کو اس کا اٹیچی واپس مل گیا تھا اور اپنا موبائل فون بھی۔ اس نے موبائل فون فوراً آن کر دیا اور نتاشا سے کہا کہ اگر منصور بھائی کی کال آئی تو وہ فوراً اسے اطلاع دے گی۔ عظمیٰ نے خان چاچا کو بھی لڑکیوں کی شرارت سے آگاہ کر دیا۔ اور خان چاچا کو ہدایت کی کہ منصور صاحب کی کال آئے تو فوراً کمرے میں ٹرانسفر کر دیں۔

رات کے بارہ بجے تھے، سب لڑکیاں سو رہی تھیں، عظمیٰ غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ نادو کے موبائل پر منصور کی کال آئی۔ کال ریسیو کرتے ہی نادو بستر سے نکلی اور دروازہ کھول کر ننگے پاؤں نتاشا کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اس نے سخت سردی میں سویٹر وغیرہ پہننے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد عظمیٰ ساتھ والے کمرے کے دروازے پر نادو کی بے تاب آواز سن رہی تھی ''نتاشا باجی..... آپ کا فون..... نتاشا باجی آپ کا فون۔''

عظمیٰ زیر لب مسکرا دی۔ نادو کی آواز کی بے تابی بتا رہی تھی کہ نفسیاتی تجربہ کامیاب رہا ہے۔

اشرف یاس صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ ناچ رہی تھی وہ بالکل نوخیز تھی، جسم انتہائی متناسب اور انداز نہایت دلکش۔ اس کے چہرے پر وہ پختہ پن نہیں تھا جو ناچنے والیوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔ وہ ناچنے والی تھی ہی نہیں۔ وہ تو ایک معصوم صورت کالج گرل تھی۔ ایک ایسی گھریلو لڑکی جو سہیلیوں کے ساتھ شادی بیاہ کے موقع پر بھی اگر ناچتی ہے تو ناچنے سے پہلے شرم سے سو سو بل کھاتی ہے.... وہ صرف اس کے لیے ناچ رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کی محبوبہ تھی۔ اس کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ مجبورِ رقص تھی اور وہ سراپا آنکھ بنا ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن رقصاں دوشیزہ کے قدموں سے ہم آہنگ ہوگئی تھی۔ قدم تیز اٹھتے تھے تو دھڑکن تیز ہو جاتی تھی، قدم آہستہ پڑتے تھے تو دھڑکن بھی رفتار کھو دیتی تھی۔ پھر اس نے اپنے رقص کا آخری اسٹیپ لیا اور دوڑ کر اشرف یاس سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ یاس کے بازوؤں میں چھپالیا تھا۔ یاس نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر کی آواز کم کی اور پھر داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے لڑکی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے گال شبابی ہو رہے تھے اور ان پر پسینے کی نمی شبنم کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں شرم کی ہلکی سی سرخی بھی تھی جو بڑی پیاری لگتی تھی۔

"ٹھیک کیا ہے؟" لڑکی نے شرما کر پوچھا۔

"ٹھیک تو ایک معمولی لفظ ہے۔" یاس نے کہا "بلکہ تعریف و توصیف کے جتنے بھی لفظ ہیں وہ مجھے معمولی لگ رہے ہیں۔ کاش میں خراجِ تحسین کے لیے کوئی مناسب پیرایہ ڈھونڈ سکتا۔"

وہ بولی "لفظوں کی تمہارے پاس کیا کمی ہے۔ بلکہ تم تو لفظ ایجاد بھی کر سکتے ہو۔"

"اس کے باوجود خود کو بے بس محسوس کر رہا ہوں۔" وہ مسکرایا اور اس نے اپنی محبوبہ کو چوم لیا۔ اس نے لجا کر یاس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

پھر ایک دم سب کچھ یاس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ نہ وہاں لڑکی تھی، نہ اس کی خوشبو، نہ وہ موسیقی جس پر لڑکی نے ہوش ربا رقص کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ ایک بوسیدہ سے کمرے میں خستہ حال چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک ایسی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی جس کا پلستر کئی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں دو جستی ٹرنک پڑے تھے، ان پر کتابوں کا ڈھیر تھا۔ کچھ بوسیدہ اوراق والی کتابیں اور رسالے وغیرہ ایک بے در کی الماری میں ٹھسے ہوئے تھے۔ اس الماری کے عین نیچے ایک میز اور لکڑی کی سادہ سی کرسی تھی۔ کرسی کے قریب ہی لکڑی کی گھڑونچی پر پانی کا مٹکا

انسانی رویوں کی پیچیدگی اور محبت کی حساس نزاکتوں کی لفظی تصویر شاق فنکار کے قلم سے

طاہر جاوید مغل

نخلِ اُمید

عجیب معجز نما جذبہ ہے محبت! ویرانوں میں پھول کھلاتا ہے اور صحراؤں کو بادِ نسیم کے نرم جھونکوں سے تھپکتا ہے، روگیوں کو بے نام سی آس میں مبتلا رکھتا ہے۔ وہ سپنوں اور تخیل کو مجسم کرتا... اور حقیقت کی کٹھنائیوں کو سہل کرتا ہے۔ اپنی محبت کو ایسی ہی معراج تک پہنچا دینے والے ایک خیال ساز اور خیال پرست کا فسانہ۔ اُس کا تخیل جتنا توانا تھا، اس سے بڑھ کر اس کی اُمید تھی۔



اور اسٹیل کا گلاس رکھا تھا۔

اشرف یاس نے اٹھ کر سگریٹ سلگایا اور کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگیا۔ کمرے کی طرح برآمدے اور چھوٹے سے صحن میں بھی ویرانی کا ڈیرہ تھا۔ نہ کوئی پھول نہ پودا' نہ کسی آنچل کی جھلک نہ بچے کی چہکار۔ یہ سب کچھ یاس کی زندگی میں تھا ہی نہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس نے یہ سب کچھ اپنی زندگی میں آنے ہی نہیں دیا تھا۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور کاغذ قلم کے سوا اس کی کسی سے رشتے داری نہیں تھی۔ وہ ملک کا مانا ہوا شاعر ہونے کے باوجود گوشہ نشینی بلکہ کسی حد تک گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔

وہ محکمہ آثار قدیمہ میں افسر تھا۔ چار پانچ سال اس نے لاہور میں ملازمت کی تھی' پھر کوشش کرکے اس نے اپنی پوسٹنگ رحیم یار خاں کے قریب خان پور میں کروالی تھی۔ لاہور کی نسبت خان پور ایک دور افتادہ اور گرم خشک مقام تھا... نہ وہاں لاہور کی رونقیں تھیں نہ لاہور جیسے رنگیلے موسم۔ گرد آلود ہوا چلتی تھی اور سرشام گلی کوچے سنسان نظر آتے تھے لیکن اس کا کیا کیجئے کہ یاس کو ایسا ہی ماحول پسند تھا۔ جیسی ویرانی اس کے دل کے اندر تھی وہ ویسی ہی اپنے اردگرد بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ سائیں سائیں کرتی دوپہریں' حبس زدہ اداس شامیں اور چاندنی راتیں جن میں خاموشی اور درد کی لہروں کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو۔ خان پور میں اس نے اپنے رہنے کے لیے ایک الگ تھلگ گھر منتخب کرلیا تھا۔ یہ گھر خان پور کی ایک مضافاتی بستی میں تھا بلکہ بستی کی کچی پکی آبادی سے بھی ذرا ہٹ کر تھا۔ دو کمرے تھے' برآمدہ' ایک کچن اور ایک نیم پختہ صحن۔ شروع شروع میں یاس نے یہاں پودے وغیرہ لگائے تھے لیکن کڑے موسم نے انہیں جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد یاس کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ کچھ اور پودوں کو اذیت ناک موت مارنے کے لیے اپنے صحن میں نصب کرے... اس نے کیاریوں کو ویران چھوڑ دیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ ویران کیاریاں ہی اسے بھلی لگنے لگی تھیں۔ پورے گھر میں بس ایک بیل تھی اور یہ اکلوتی بیل اسے بہت پیاری تھی کیونکہ اس کے ساتھ یاس کا درد کا رشتہ تھا۔ اس کے دل میں یہ یقین سا بیٹھا ہوا تھا کہ جب تک یہ بیل زندہ ہے یہ امکان بھی زندہ ہے کہ اس کی بچھڑی محبوبہ اسے دوبارہ مل جائے گی۔ خان پور آنے کے دو سال بعد ہی اپنی ایک نالائقی کے سبب یاس کی نوکری جاتی رہی تھی' اور یہ کوئی اکیلی نالائقی نہیں تھی۔ ایسی نالائقیوں سے اس کی پوری زندگی عبارت تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک ان فٹ شخص تھا۔ ایک بڑا فن کار اور صاحب علم ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو کہیں بھی "ایڈجسٹ" نہیں کرسکا تھا۔ لوگ بہت جلد اس سے اکتا جاتے تھے اور وہ لوگوں سے اکتا جاتا تھا۔ وہ جس طرح اسکول میں تنہا تھا اسی طرح کالج میں بھی تنہا رہا تھا۔ جس روز اس نے ایم اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اس سے صرف دو روز پہلے اس کی والدہ وفات پاگئیں۔ یہ عظیم ہستی اس سے جدا ہوئی تو وہ اپنے گھر میں بھی بالکل تنہا رہ گیا۔ والد صاحب اردو کے پروفیسر رہے تھے' اب وہ ملازمت کے سلسلے میں سعودیہ میں مقیم تھے۔ دو بڑے بھائی تھے لیکن ان کے مزاج یاس سے یکسر مختلف تھے۔ بھابیاں آپس میں بہنیں تھیں اور شروع میں یاس کے ساتھ ان کا رویہ بہتر تھا لیکن ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی ایک چچا زاد بہن کو یاس کی دلہن بنا کر گھر میں لانا چاہتی تھیں... یہ ایک مسئلہ تھا جو کبھی حل نہیں ہوسکتا تھا۔ شاید وہ قیامت تک بھی انتظار کرتیں تو ان کی مراد بر نہ آتی۔

یاس کی شادی تو ابیں کے غم سے ہوچکی تھی۔ اس کی شریک حیات اس کی دائمی اداسی تھی اور یہ اداسی شاید اسی روز اس کی قسمت میں لکھی گئی تھی جس روز اس نے پہلی بار شمع کو کالج کے برآمدے میں بڑی تیزی سے سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ اس کا خوب صورت بدن جھیل کے کنول کی طرح ڈول رہا تھا اور بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ملی تھیں اور پھر یہ لمحہ پورے دو سال پر محیط ہوگیا تھا۔ پیار کی ایک کہانی شروع ہوئی تھی اور اس میں وہ سارے موڑ آئے تھے جو ان کہانیوں کا خاصہ ہوتے ہیں' مسکراہٹیں' آنسو' جدائی' ملاپ' دلدوز آہیں اور حسین سرگوشیاں۔ یاس کی شاعری اس رنگ رنگیلے موسم میں جوان ہوئی تھی اور پھولوں سے لدا ہوا ایک بتاور درخت بن گئی تھی۔ لیکن پھر ایک روز اچانک اس درخت پر خزاں ٹوٹ پڑی تھی۔ وہی دست ستم آگے بڑھا تھا جو پیار کرنے والوں کو ہمیشہ سے جدا کرتا آیا ہے۔ وہ کسی سے رعایت نہیں برتتا' اس نے ایک نرم دل نازک طبع شاعر سے بھی رعایت نہیں برتی تھی اور اس کی "جانِ شاعری" کو ہمیشہ کے لیے اس سے جدا کردیا تھا۔

شمع کے والد بے حد سخت تھے اور وہ کسی طور بے خانماں شاعر کے ساتھ شمع کی شادی پر راضی نہیں ہوئے تھے۔ اب ایک طرف شمع کی محبت تھی اور دوسری طرف والدین۔ وہ والدین کو نہیں چھوڑ سکتی تھی' اس نے یاس کو الوداع کہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جدائی کی اس شام وہ دونوں ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے تھے۔ جدا ہونے سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھنے کا وعدہ کیا تھا اور رخ پھیر کر اپنے اپنے راستے پر چل دیے تھے۔ اس شام سے ٹھیک ایک ہفتے بعد ایک دوسری شام آئی تھی' آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اس شام میں شمع اپنے والدین کے ساتھ مستقل انگلینڈ شفٹ ہوگئی تھی۔

...ہاں شمع چلی گئی تھی اور نیم سوختہ پروانہ تڑپتا رہ گیا تھا۔ وہ نہ جیتا تھا نہ مرتا تھا۔ محبت کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت پر خزاں چھاگئی تھی۔ لیکن خزاں کا بھی تو اپنا حسن ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ خزاں ہی یاس کو اچھی لگنے لگی تھی۔ اس نے اس خزاں میں ایک زہریلا حسن تلاش کرلیا تھا۔ یہ حسن اس کے دل کو ایک مسلسل تڑپ دے رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہ تڑپ اس کے قلم میں سیاہی کی جگہ لہو بھرنے لگی۔ وہ ایسے شعر لکھنے لگا جو دلوں میں آگ

تھا کہ وہ اس کی شاعری کی شہرت پھیلنے اور فیصلہ پانے لگی۔ محبت بھرے ہر ان دل اس کی گرمی سے دھڑکنے لگے۔ ہر سوختہ جاں کو اس کی آواز اپنی آواز محسوس ہوتی۔ انہی دنوں وہ زیادہ تر اپنا وقت سفر کرنے لاہور سے خان پور چلا گیا تھا۔ اس کی ساتھی اس کی غزلیں تھیں۔ وہ سنسان گھر میں بھی ایک محفل سجا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ محفل کا بادشاہ تھا۔ اس کا ہر شعر اس کے..... اور محفل کا گرو تھا۔ خلوت اس پر شفق تھے کہ اس کے کلام کی سب سے اہم خوبی اس کا زیر محفل ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا اپنے سامنے بہم کرلیتا تھا۔ اس کا خیال اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جیتی جاگتی تصویر بن جاتا تھا اور وہ اس تصویر کو بذریعہ قلم کاغذ پر اتار لیتا تھا۔ یہ بھی یاس کے فن کا کرشمہ تھا کہ وہ اپنے سے آپ بھی اور ہر انجمن گھر میں بھی ایک دلچسپ محفل سجا بیٹھتا تھا۔ اس محفل کی جان اس کی محبوب ترین ہستی شمع ہوتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا تھا' اس سے باتیں کرتا تھا' اس کا لمس محسوس کرتا تھا' اور یہ سارے حالات حقیقت کے اتنے قریب اور منطقی ہوتے تھے کہ یاس کو کسی طرح کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ خود بھی سوچنے لگتا تھا کہ یہ سب کچھ کتنا منطقی اور ہوتا جاتا ہے۔ شمع کی جاں فزا قربت' اس کی پذیرائی' اس کی لطیفہ گوئی' وہ ہر چیز سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

— شمع محفل کی رخصت پر سوا دو بجے رات گئے اس کے پاس آتی تھی۔ دونوں اکٹھے کھانا کھاتے۔ کھانے کے لیے شمع کی شرط تھی کہ وہ کھانا خود لے کر آئے گی' اسے یاس کی پسند و ناپسند اچھی طرح معلوم تھی۔ اکثر و بیشتر وہ چیز پکا کر لاتی تھی جو یاس کی خواہش کے مطابق ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد وہ دونوں تھوڑی دیر چہل قدمی کرتے تھے۔ یہ چہل قدمی موسم کے لحاظ سے کبھی برآمدے میں اور کبھی صحن میں ہوتی تھی۔ چہل قدمی کے بعد یاس شمع کو اپنی تازہ ترین نظم یا غزل سناتا تھا' کبھی کبھی وہ یہ خواہش کرتا کہ شمع یہ نظم یا غزل ترنم سے پڑھے۔ شمع کا ترنم بہت اچھا تھا۔ وہ جب بھی فرمائش کرتا' شمع بھوم جاتی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کچھ دیگر شعرا بھی یاس کی "محفل تصور" میں آجاتے۔ ایک شاندار مشاعرے کا ماحول بن جاتا۔ اس محفل مشاعرہ میں شمع ہمیشہ اگلی نشستوں پر بیٹھتی۔ یاس دیگر شعرا کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا ہوتا لیکن اس کی نگاہ شمع پر ہی رہتی۔ پھر جب وہ اپنا کلام سناتا تو اس کے کان صرف شمع کی داد کے منتظر ہوتے۔ وہ بیسیوں آوازوں میں سے بھی شمع کی آواز پہچان لیتا اور اس کے جسم کے ہر مسام سے مسرت کے چشمے پھوٹ نکلتے۔

— شمع سے مل کر وہ ہمیشہ خوش ہی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دونوں کسی بات پر اداس بھی ہو جاتے۔ کبھی یاس اس سے پوچھتا کہ وہ حقیقت کا لباس پہن کر کب اس کی دنیا میں آئے گی۔ جواباً شمع

کبھی وہ دونوں کسی پرانی یاد میں کھو جاتے اور گزرے دنوں کو یاد کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شمع اسے اپنی کسی نئی پریشانی سے آگاہ کرتی اور دونوں غم زدہ ہو کر طویل محسوس کرنے لگتے۔ ہر حال جب وہ یاس کے پاس ہوتی تھی تو وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔ بہت جلد یہ اس کی زندگی کی ضرورت بن گئی اور اس کی شاعری کا مذہب بن گئی۔

ایک روز محفل کی انہی "خیالی" محفل آرائی ہو رہی تھی۔ ایک بجے کے قریب نہایت آراستہ کمرے میں دونوں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکیوں سے باہر چاند نکلا تھا اور گلاب و موتیا کے پھول تھے۔ ہوا کی ہلکی پھوار کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی اور باغ مہک اٹھے تھے۔ یاس نے مسکراتے ہوئے شمع سے پوچھا تھا "کبھی یہ رقص کیا ہے؟"

شمع۔ "نہ" شرما کر مسکرائی تھی۔

"پاگل لڑکی۔ تم نے رقص کیا ہے۔ بلکہ تم رقص کرتی ہو اور خوب کرتی ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"ایسے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دیکھا ہے۔"

"کہاں؟" اس کا خوب صورت چہرہ حیرت سے کھل اٹھا تھا۔

"تمہارے کزن احتشام کی شادی پر... تمہیں یاد ہوگا۔ احتشام میرا بھی دوست تھا۔ میں اس کی برات کے ساتھ گیا تھا۔ سردی کی رات تھی اور کمرے میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی تھی۔ احتشام مجھے پکڑ کر کوٹھی کے پائیں باغ میں لے گیا تھا۔ وہاں ہم ایک انگور روم میں گئے تھے اور اس کی لمبی کھلی کھڑکی میں سے کانچ روم کا منظر دیکھا تھا۔ لڑکیاں اسٹیج پر گیت گا رہی تھیں۔ دو لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ باقی بیٹھی تھیں اور کچھ لڑکیوں نے تمہیں کھینچ کھینچ کر رقص کے لیے کھڑا کیا۔ تم ہنستے ہوئے شرماتی رہیں' پھر جب لڑکیوں نے تمہیں بے حد اصرار کیا تو تم نے ایک گانے کے میوزک پر رقص شروع کر دیا۔ وہ خوب صورت منظر آج تک میری نگاہوں میں ہے۔"

یاس کی بات سن کر شمع پر تک شرمیلی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔ پھر ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔ یاس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی تھی "تمہارا دل چاہتا ہے' رقص دیکھو گے؟"

اس نے ہونٹ بند رکھ کر "ہوں" کیا تھا۔

یاس کی یہ ادا شمع کو بہت بھائی تھی۔ وہ والہانہ انداز میں مسکرا دی تھی اور پھر اٹھ کر مجبور رقص ہو گئی تھی۔ شرم آمیز ہوا کے رنگ میں رنگا ہوا یہ رقص یاس کی آنکھوں کو یوں سیراب کر رہا تھا کہ کئی روز اس پر نشہ طاری رہا تھا۔ پھر دنیا تو شمع اس کے بعد مجبور رقص ہونے لگی تھی۔ یوں ان کی ملاقاتیں (جو ہمیشہ محفل آرائی کرتی تھیں) کچھ اور رنگین ہونے لگی تھیں۔ اشرف یاس محظوظ الحواس نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب کچھ تخیلاتی ہے

معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ پاکستان واپس آچکی ہے' لندن میں ہے یا لندن سے بھی کہیں آگے جاچکی ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں۔ بس ایک الوہی سا خیال یاس کے دل میں جاگزیں تھا کہ وہ جہاں بھی ہے' اس کی ہے اور اس کے پاس ضرور آئے گی۔ برآمدے میں ستون سے لپٹی ہوئی انگور کی بیل ہر روز اسے یقین دلاتی تھی کہ ایسا ہوگا۔ یہ کوئی عام بیل نہیں تھی۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ "خاندانی بیل" کہا جاسکتا تھا۔ یاس کے دادا سے پہلے یہ بیل اس کے پڑدادا کے صحن میں موجود تھی۔ دادا کے صحن میں تو اس بیل کو یاس نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا تھا' پھر جب وہ لوگ راولپنڈی سے لاہور منتقل ہوئے تھے تو یاس کے والد اس بیل کی ایک قلم اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے۔ یہاں انہوں نے بڑے اہتمام سے یہ قلم لگائی تھی۔ بیس سال تک یہ بیل ان کے آنگن میں شان سے لہراتی رہی تھی۔ پھر یاس کے والد ریٹائرمنٹ کے بعد پرائیویٹ سروس کے لیے سعودیہ شفٹ ہوگئے تھے' جانے سے پہلے انہوں نے یاس کو خصوصی ہدایت کی تھی کہ وہ بیل کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ جب تک یاس اپنے والد کے گھر میں رہا تھا وہ بیل کی نگہداشت کرتا رہا تھا' پھر جب بھائیوں اور بھابیوں کے رویے کے باعث اسے گھر چھوڑنا پڑا تھا تو وہ چپکے سے اس بیل کی چند قلمیں اپنے ساتھ خان پور لے آیا تھا۔ اب پچھلے قریباً آٹھ سال سے یہ بیل یہاں موجود تھی۔ اس بیل کے ساتھ یاس کا عجیب سا ناتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ بیل چپکے چپکے اس کے ساتھ ایک وعدہ کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتی رہتی ہے کہ میں وصال کی بیل ہوں' میں نے ہر دور میں پیار کرنے والوں کو ملایا ہے۔ میں نے نسل در نسل "ٹوٹے ہوئے دلوں کو" جوڑا ہے۔ میں اس بار بھی ایسا ہی کروں گی۔ میرے سائے میں پلنے والی محبت ہمیشہ کامران ہوئی ہے' پھر تم کیوں ناکام ہوگے۔

انگور کی بیل کا یہ "وعدہ" کسی وقت تو یاس کو بہت خوش آئند محسوس ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی اس "وعدے" سمیت ہر شے پر سے یاس کا اعتماد اٹھ جاتا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ اس کے خاندان میں اگر کسی نے محبت کی تو بہت ٹوٹ کر کی اور آگ کے اس دریا کو ناکامیابی سے عبور بھی کیا۔ یاس کی معلومات کے مطابق اس خاندان میں بہت کم لوگوں نے "محبت" کی تھی۔ لیکن جب بھی کسی نے کی تھی وہ کامران ہوا تھا۔ علم و ادب سے تعلق رکھنے والی اس فیملی کو کم از کم محبت کے حوالے سے تو خوش نصیب ہی کہا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ کیا ضروری تھا کہ یہ کامرانی یاس کے حصے میں بھی... آجاتی' یہ بالکل ضروری نہیں تھا۔ اور اب تو آٹھ برس گزر چکے تھے۔ محبت اور محبت کی یادوں سمیت ہر چیز دھندلاتی چلی جارہی تھی۔ وہ جنت کی ٹھنڈک اور دوزخ کی تپش سے دور خود کو برزخ میں محسوس کرتا تھا۔

○☆○

وہ خان پور کی ایک گرم اداس دوپہر تھی۔ یاس کے گھر در و دیوار سے تنہائی لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے کمرے میں رکھا ہوا مٹکا پانی سے خالی ہوچکا تھا اور اس پر گرد کی تہہ جمی تھی۔ یاس نے مٹکا اٹھایا اور کمیٹی کے نلکے سے پانی لینے چلا گیا۔ وہاں چلچلاتی دھوپ میں اور لوگ بھی موجود تھے' ان میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ ایک دو افراد نے یاس کو سلام کیا جس کا اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ یہ لوگ یاس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ بابو لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے۔ ہر وقت کمرے میں گھسا رہتا ہے' کتابیں چاٹتا ہے یا پھر شعر وغیرہ لکھتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے گھر کے سامنے کوئی بڑی سی کار یا جیپ وغیرہ بھی کھڑی نظر آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ چند اخبار والے بھی اس دور دراز بستی میں آئے تھے اور انہوں نے بابو کے مکان کی اور آس پاس کی تصویریں کھینچی تھیں۔ بستی کے پرائمری اسکول کے ماسٹر عطا صاحب اور چند دوسرے پڑھے لکھے افراد یہ بتاتے تھے کہ بابو صاحب بہت اونچی چیز ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دور دور تک پڑھی جاتی ہیں اور بڑے بڑے افسر لوگ انہیں جھک کر سلام کرتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بستی والے یاس کو کوئی سڑی قسم کی چیز ہی سمجھتے تھے۔ وہ اگر یاس کی عزت کرتے تھے تو اس میں اپنائیت سے زیادہ خوف اور بیگانگی کو دخل ہوتا تھا۔ پانی کا گھڑا دونوں ہتھیلیوں پر اٹھائے اشرف یاس اپنے امکان کی طرف بڑھا تو پوسٹ مین رنگ الٰہی آتا دکھائی دیا۔ حسب معمول اس کے پاس اشرف کے لیے اچھی خاصی ڈاک موجود تھی۔ پندرہ بیس خط تھے' اس کے علاوہ رسائل کے بھی تین چار پارسل تھے۔ یہ سب چیزیں پوسٹ مین نے از خود ہی یاس کے کمرے میں پہنچا دیں۔ دو تین جگہ سائن لیے اور پھر ادب سے سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

یاس نے میز پر رکھے ہوئے خطوط دیکھے۔ سنبل کا خط اسے دور ہی سے نظر آگیا۔ نیلے رنگ کا خوب صورت لفافہ اور اس پر دلکش تحریر.... اس نے سنبل کے پچھلے تین خطوط بغیر پڑھے پھاڑ کر پھینک دیے تھے۔ غالباً وہ اس خط کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا لیکن لفافے کے کونے پر لکھے چار لفظ دیکھ کر چونک گیا۔ بہت باریک لکھا گیا تھا لیکن الفاظ پڑھے جاسکتے تھے۔ لکھا تھا "پلیز پڑھیے گا ضرور۔"

وہ خالی خالی نظروں سے خوب صورت لفافے کو تکتا رہا پھر زیر لب مسکرا دیا۔ وہ بے حد ذہین تھی۔ یاس سے سیکڑوں میل دور بیٹھی تھی۔ نہ اس نے یاس سے کبھی ملاقات کی تھی' نہ کبھی آواز سنی تھی' صرف چند بار یاس نے اس کے خطوط کے جواب ضرور دیے تھے۔ اس قلمی شناسائی کے باوجود اسے یاس کی مزاج آشنائی کا دعویٰ تھا۔ اور یہ دعویٰ کبھی کبھی یاس کو درست معلوم ہونے لگتا تھا۔ جیسا کہ اب ہوا تھا۔ سنبل کو کیا معلوم تھا کہ وہ اس کے خطوط پڑھے بغیر پھینک دیتا ہے' پھر بھی آج اس کے ارسال کردہ لفافے پر

یہ مختصر نوٹ تحریر کر رہا تھا "پلیز پڑھے گا ضرور۔"

وہ ایک گہری سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا اور لفافہ چاک کیا۔ اندر سے پھول دار لیٹر پیڈ کے دو تین صفحے نکلے۔ اپنے خط میں سنبل نے اسے ڈیئر یاس صاحب" کہہ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا "دو ڈھائی ماہ پہلے اخبار میں آپ کی ایک تصویر چھپی تھی آپ اپنی تصویر دینے سے پیہم انکار کرتے رہے ہیں لہٰذا میں نے وہی تصویر فریم کرا کے اپنی میز پر سجائی ہے۔ اس وقت بھی وہ تصویر میرے سامنے ہے۔ میں شام سے اس تصویر کے سامنے بیٹھی ہوں اور اس سے پوچھ رہی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ کی طرح تصویر بھی کوئی جواب نہیں دیتی.... یاس صاحب! آج سے دو سال پہلے جب میں نے آپ سے خط و کتابت شروع کی تھی تو اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ سے میری وابستگی یہ رخ اختیار کر جائے گی۔ میرے اور آپ کے درمیان ایک قلم کار اور پرستار کا رشتہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر بہت ہوا تو یہ ہوگا کہ ہم اچھے دوست بن جائیں گے لیکن یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بتدریج میں اس جذبے کی گرفت میں آجاؤں گی جس کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا اور جس کے بے شمار ناموں میں سے ایک نام محبت بھی ہے۔

اس موضوع پر ہمارے درمیان کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے لہٰذا میں دہراؤں گی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی یاس صاحب کہ اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے وہ غم جو آٹھ سال پہلے آپ پر ٹوٹا تھا آپ کے ساتھ مجھ پر بھی ٹوٹا تھا۔ شمع صاحبہ کی جدائی نے جتنے زخم آپ کے سینے پر لگائے ہیں شاید اتنے ہی میرے سینے پر بھی لگائے ہیں۔ اگر میں آپ کے زخموں پر مرہم رکھنے کا سوچتی ہوں تو دراصل اپنے زخموں پر مرہم رکھنے کا سوچتی ہوں۔ لہٰذا یاس صاحب! مجھے اپنے دل کے زخموں پر مرہم رکھنے سے مت روکیے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو مجھے ایک ناقابلِ برداشت اذیت کے حوالے کر دیں گے۔ آپ بہت سخت جان ہیں یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن میں نہیں کر سکتی۔

آپ نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک دوسرے کو بھول جائیں۔ زمانہ ہمارے ملاپ کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ آپ نے اپنی تنگ دستی اور میری خوش حالی کے درمیان فاصلے کا ذکر کیا تھا۔ پھر اس فاصلے کا ذکر کیا تھا جو آپ کی اور میری عمر میں ہے۔ آپ نے لکھا تھا کہ آپ پینتیس برس کے ہیں اور مجھ سے کم از کم بارہ سال بڑے ہیں۔ پھر آپ نے اس فاصلے کا ذکر کیا تھا جو میرے اور آپ کے مزاج میں ہے۔ آپ نے لکھا تھا کہ آپ جیسا تنہائی پسند شخص جس کے چہرے پر ہر وقت مکڑی نے جالا تن رکھا ہوتا ہے، مجھ جیسی خوش باش اور پرجوش لڑکی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کے ان تمام دلائل کو آپ [illegible]

اپنے شعری مجموعے "وہ شام" کے پیش لفظ میں لکھا ہے "محبت ہر قانون و قاعدے سے بالاتر ہوتی ہے، بلکہ محبت تو نام ہی قواعد و ضوابط کو پاش پاش کرنے کا ہے۔ محبت وہاں ہوتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے ہوتی ہے جیسے نہیں ہونی چاہیے اور تب ہوتی ہے جب نہیں ہونی چاہیے۔"

ایم آئی رائٹ؟ آئی تھنک آئی ایم رائٹ۔ یاس صاحب آخر میں یہی کہنا ہے کہ میں نے بالآخر قواعد و ضوابط کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں آپ کے پاس آرہی ہوں، ۲۶ تاریخ بروز بدھ بعد از دوپہر... وقت اور دن یاد رکھیے گا، اور یہ بھی یاد رکھیے گا کہ میں آپ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔

والسلام۔ سنبل

یاس نے خط دوبارہ پڑھنے کے بعد ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی، دونوں ہاتھ باندھ کر گردن کے پیچھے رکھے اور آنکھیں بند کر لیں۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ اس کے سوچنے کا شاعرانہ انداز تھا۔ اس نے ابھی تک سنبل کو دیکھا نہیں تھا۔ صرف اس کی تحریر دیکھی تھی اور خیالات پڑھے تھے۔ تاہم اسے یقین تھا کہ وہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اس کے الفاظ اور الفاظ کے دلکش دائرے و خطوط اشارہ دیتے تھے کہ وہ متناسب جسم کی مالک ہے اور نرم و نازک خیالات رکھتی ہے۔ اس نے اپنی عمر تیئیس سال بتائی تھی۔ اگر خواتین کے رواج کے مطابق اس نے تھوڑی بہت ڈنڈی بھی ماری تھی تو زیادہ سے زیادہ وہ پچیس چھبیس سال کی رہی ہوگی۔ یعنی پھر بھی وہ یاس سے دس برس چھوٹی تھی۔ اس کے خطوط سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک پڑھے لکھے اور کسی حد تک ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے والد دس بارہ برس پہلے فوت ہو گئے تھے۔ ایک بھائی تھا جو شادی کے بعد امریکا چلا گیا۔ سنبل نے ایم ایس سی کیا تھا اور اسے ایک بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ اسی ملازمت کے دوران میں بینک کا جواں سال منیجر اسے پسند کرنے لگا تھا اور نوبت شادی تک پہنچ گئی تھی۔ سنبل کی والدہ نے بیٹی کا نکاح کر دیا تھا لیکن پھر رخصتی سے چند ماہ قبل ہی بینک منیجر کے بارے میں کچھ ایسی باتیں سننے میں آئی تھیں کہ سنبل نے شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یوں یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی تھی اور رخصتی سے پہلے ہی سنبل نے طلاق حاصل کر لی تھی۔ اب وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتی تھی۔ والدہ کو اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا۔ وہ اس کی ہر بات بلا چوں و چرا تسلیم کرتی تھیں اور اس پر کسی بھی طرح کی قدغن نہیں لگاتی تھیں۔ پچھلے تین چار سال میں نوجوان سنبل نے بڑی تیزی سے ترقی کی تھی اور اب وہ لاہور میں بینک کی ایک بڑی برانچ میں آفیسر تھی۔ وہ اب اتنی باشعور ہو چکی تھی کہ ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ وہ شخص جس کے ساتھ اس کا رشتہ ختم ہوا تھا۔ کافی عرصہ اسے تنگ کرتا رہا تھا لیکن اب وہ کچھ عرصے سے دم سادھ کر بیٹھ گیا تھا۔ سنبل کے مستحکم

روپے اور کردار نے اردگرد کے لوگوں کی زبانیں بھی بند کردی تھیں اور اب وہ نہ صرف برسرروزگار' بلکہ نہایت پر اعتماد لڑکی تھی۔ ایک بینکر ہونے کے باوجود اسے شعروادب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ آرٹ فلموں کی دلدادہ تھی۔ ایک آرٹ فلم میں یاس کی نظم سن کر ہی وہ اس کی تحریروں کی دیوانی ہوئی تھی۔ دو سال پہلے ان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ چلا تھا جو یاس کے مسلسل گریز کے باوجود ابھی تک جاری تھا۔

یاس کبھی کبھی خود بھی محسوس کرتا تھا کہ سنبل دھیرے دھیرے اس کے دل ودماغ پر حاوی ہورہی ہے۔ وہ بڑی آہستگی کے ساتھ لیکن مسلسل اس کے اندر سرایت کرتی جارہی تھی۔ اس کی دوشیزگی' اس کی شوخ محبوبیت' اس کی شعرفہمی ... سب کچھ گوشہ نشین شاعر پر اثر انداز ہورہا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا کہ ماضی ایک دھند میں چھپ رہا ہے اور حال ٹکر کے سامنے آتا جارہا ہے۔ ماضی جو "شمع" تھا اور حال جو "سنبل" تھا۔ کسی وقت یوں بھی ہوتا کہ دونوں تصویریں یک بارگی یاس کے سامنے آجاتیں۔ کبھی ایک تصویر دھندلا جاتی کبھی دوسری۔ وہ سوچتا کیا شمع کی محبت کی سسکیاں' سنبل کی محبت کے نغمے میں ڈوب رہی ہیں؟ وہ لرز کر رہ جاتا... اور پھر کئی ہفتے تک سنبل کے خطوں کے جواب نہ دیتا' لیکن وہ بھی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اسے یاس کو منانے اور "جواب" پر مجبور کرنے کے ایک سو ایک ڈھنگ آتے تھے۔ وہ بلا جھجک لکھا کرتی تھی "میں وہ دوسری لڑکی ہوں جو دکھی شاعر کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ یہ دوسری لڑکی درحقیقت اسی وقت وجود میں آجاتی ہے جب دکھی شاعر وجود میں آتا ہے۔ اس لڑکی کے دل پر ایک بوجھ قرض کی طرح رکھا رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ کس کا اٹھایا ہوا قرض ہوتا ہے؟" پھر وہ خود ہی جواب دیتی تھی "آپ تو شاعر ہیں' آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا یہ اس خوش نصیب لڑکی کا قرض ہوتا ہے جسے شاعر نے پہلی بار چاہا ہوتا ہے۔ آپ اس کو ایک سماجی قرض بھی کہہ سکتے ہیں۔"

یاس جب سنبل کی لکھی ہوئی ایسی باتیں پڑھتا تھا تو اسے اس امر پر شک ہونے لگتا تھا کہ سنبل ایک بینک آفیسر ہے۔ اس کے اندر شاید ایک شاعرہ کا بسیرا تھا۔ یہ شاعرہ حالات کے بہاؤ میں بہہ کر روزگار کے بھنور میں پھنس گئی تھی اور شاید اپنی اصل سے بچھڑ گئی تھی۔ ایسی ہی باتیں پڑھ کر یاس کو یہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ شاید وہ اتنی جواں سال نہیں جتنا خود کو بتاتی ہے۔

یاس کے لیے سنبل کا تصور یوں تو بڑا ترنگ آمیز ہوتا تھا لیکن اس تصور کے ساتھ ایک طرح کا احساس ندامت بھی شامل ہوتا تھا۔ یاس کو لگتا تھا کہ شمع اس کے آس پاس موجود ہے اور شکوہ کناں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سنبل کے آتشیں خیال کے برعکس شمع کے خیال میں ٹھنڈک تھی' سکون تھا۔ شمع کو سوچتے ہوئے بادفا ہونے کا احساس یاس کے اندر سے پھوٹتا تھا اور اس کی پور پور کو ڈھانپ لیتا تھا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ بھی تھی کہ کوئی کب تک یادوں کے سہارے جی سکتا ہے۔ کب تک "زورِ تخیل" سے تصوراتی محفلیں سجائی جاسکتی ہیں اور سرابوں کے پیچھے بھاگا جاسکتا ہے۔ شمع کو یاس سے جدا ہوئے اب آٹھ برس ہونے کو آئے تھے۔ ہر صبح اس کی آس بندھ کر ہر شام ٹوٹتی تھی۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ وہ آئے گی۔ لیکن کب آئے گی؟

○☆○

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا اور جس کی "امید" تھی۔ ۱۴ تاریخ بروز بدھ سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ دروازے پر دستک ہوئی۔ یاس ٹیبل فین کے سامنے چارپائی پر لیٹا تھا۔ اس نے صرف پاجامہ اور بنیان پہن رکھی تھی۔ جلدی سے قمیص پہن کر وہ باہر نکلا دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں۔ سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی اور یقیناً یہی سنبل تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں یاس نے اپنی اس گمنام پرستار کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خوب صورت ہوگی اور اس کی عمر چوبیس پچیس سال سے زائد نہیں ہوگی لیکن اس کے دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ خوب صورت نہیں... بہت خوب صورت تھی اور اس کی عمر بھی یاس کی توقع سے کہیں کم نظر آتی تھی۔ وہ سرتاپا ایک رنگین غزل تھی اور اس کا "مطلع" ایک جگمگاتا چہرہ تھا۔ یاس نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ بھی یک ٹک یاس کو دیکھ رہی تھی۔ پھر پہلے اسے ہی ہوش آیا تھا۔ اس نے ہاتھ ماتھے پر لے جاکر سلام کیا۔

"وعلیکم سلام!" یاس نے کہا۔

وہ مسکرائی تو کلیوں سے دانت چمک اٹھے "اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟" دلنشیں آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

وہ لڑکھڑا کر اس کے راستے سے ہٹ گیا۔

وہ خوشبو کے جھونکے کے مانند صحن میں داخل ہوگئی۔ اس کا ویران گھر جیسے ایک دم ہزارہا رنگ برنگ پھولوں سے مہک اٹھا تھا۔ وہ ہلکی گلابی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ شیفون کے دوپٹے پر موٹی کامدار اوڑھنی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا سا قیمتی اٹیچی پکڑ رکھا تھا۔ یاس اسے اندر لے گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کہاں بیٹھنے کو کہے۔ وہ خود ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں کچھ دیر تک ایک بے ڈھنگی خاموشی طاری رہی' پھر وہ رسمی باتوں میں مصروف ہوگئے۔ یہ باتیں تو بس خاموشی کا توڑ تھیں اصل گفتگو تو ان کی نگاہیں کررہی تھیں۔ وہ نگاہوں نگاہوں میں ایک دوجے کو دریافت کررہے تھے۔

دو ڈھائی گھنٹے کے اندر ان کی اسّی فی صد جھجک ختم ہوگئی۔ اسی دوران میں ان دونوں نے کھانا بھی کھایا اور برآمدے میں بیٹھ کر چائے بھی پی۔ یاس نے سنبل کو ویسا ہی پایا تھا جیسا سوچا تھا بلکہ شکل وصورت کے اعتبار سے تو وہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس کی دلنشیں قربت یاس کے دل میں ایک ترنگ سی جگا رہی تھی۔

بات کرتے کرتے اس کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگتا تھا اور سانس ذرا پھولی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بھی گاہے گاہے لمبی سانس لیتی تھی اور کسی نامعلوم احساس کے بوجھ سے اس کی پلکیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ یاس یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ اس بن بلائے حسین و جمیل مہمان کو ٹھہرائے گا کہاں۔ وہ کسی جنگل صحرا میں نہیں رہتا تھا' یہ ایک آبادی تھی۔ یہاں رہنے والوں کی آنکھیں تھیں رائی کا پہاڑ بنا لینے والے ذہن تھے۔ اور یہاں تو پہلے ہی پہاڑ تھا' لوگ اس کا پتا نہیں کیا بنا ڈالتے۔ اس مختصر سی بستی میں یقیناً اب تک کئی افراد کو معلوم ہو چکا تھا کہ بابو صاحب کے گھر میں شہر کی ایک خوب صورت تتلی آئی ہے۔ اب اگلا مرحلہ چہ میگوئیوں اور سرگوشیوں کا تھا۔

یاس نے سنبل کو سمجھایا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ شام کے بعد اسے بستی کے امام مسجد عبدالغفور صاحب کے گھر چھوڑ آئے گا' امام صاحب کی بڑی بیٹیاں قریباً اس کی ہم عمر ہیں' ان کے ساتھ اس کا وقت اچھا گزر جائے گا۔ وہ تنک کر بولی "یاس صاحب! میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ امام صاحب کی بیٹیوں سے ملنے کی خاطر میں نے اتنا لمبا سفر نہیں کیا۔"

"لیکن بھئی! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ لوگ کیا سوچیں گے۔"

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی "انسان کی نیت درست اور جذبہ سچا ہو تو پھر لوگوں کی باتوں کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بھی آپ ہی کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہیں تو شعر بھی سنا دوں؟"

"تم اس بستی کی نثر کو میری کتاب کے شعر سے اتنی جلدی ملانے کی کوشش مت کرو۔ اس میں بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا جناب۔" وہ کمال بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی "اور اگر ہو بھی جائے تو ہمیں اس کی کیا پروا۔ ہم نے کوئی یہاں تھوڑی رہنا ہے۔"

"کیا مطلب۔ کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟"

وہ عجیب والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی "میں.... آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں یاس صاحب۔"

"کک.... کہاں؟"

"باغوں کے شہر لاہور میں۔ جہاں ہر طرف پھول ہیں' ہریالی ہے' رنگ ہیں' اور وہ سب کچھ ہے جو آپ کے شعروں میں ہوتا ہے۔"

"لیکن میں پھولوں' ہریالی اور رنگوں کے بارے میں اس وقت لکھ سکتا ہوں جب ان سے دور.... بہت دور ہوتا ہوں۔" یاس نے اپنے بے آب و گیاہ صحن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں آپ سے غزل کہلوانے کے لیے تو آپ کو لاہور نہیں لے جا رہی ہوں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"تو کس لیے لے جا رہی ہو؟"

"اپنی امی سے ملوانے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ میں آپ کو فرصت میں بتاؤں گی اور فرصت تب ہی حاصل ہوگی جب آپ مجھے امام مسجد عبدالغفور صاحب کے گھر ان کی بیٹیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔ میرا مطلب ہے کہ رات کے کھانے کے بعد آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں آپ کے لیے رات کا کھانا بھی خود ہی تیار کروں۔ میرے خیال میں کچن تو ہوگا یہاں۔"

"کچن تو ہے لیکن کچن کے اندر کچھ نہیں ہے۔ اور اگر ہوتا بھی تو میں تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہ دیتا۔"

"کیوں جی۔ کیوں نہ دیتے اجازت۔ خدا کی قسم یاس صاحب! آپ کو پتا نہیں میں آپ کے لیے کیا کیا چاہتی ہوں۔ اگر.... اگر میں بتاؤں گی تو آپ میرا مذاق اڑائیں گے۔"

"اچھا نہیں اڑاتا مذاق۔ بتاؤ کیا چاہتی ہو۔"

وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی تو جیسے قرب و جوار شفق رنگ ہو گئے۔ وہ بولی "میرا دل چاہتا ہے ابھی وہ سامنے پڑی جھاڑو اٹھاؤں اور آپ کے پورے گھر کو صاف کر کے آئینہ بنا دوں۔ پھر آپ کے کپڑے لے کر بیٹھ جاؤں اور سب کو دھو کر استری کر کے تہ در تہ الماری میں رکھوں۔ پھر کچن میں جاؤں اور آپ کے لیے کھانا پکاؤں۔ جب آپ کھانا کھا کر لیٹ جائیں تو آپ کی پائنتی بیٹھ جاؤں' آپ کے پاؤں دباؤں اور دباتے دباتے۔ دباتے دباتے مجھے اونگھ آجائے۔ اسی اونگھ میں میری جان نکل جائے اور میں بے جان ہو کر دھپ سے آپ کے پہلو میں گر جاؤں۔"

یاس چونک گیا۔ آخری الفاظ ادا کرتے کرتے سنبل کی جھیل آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا۔ اسے ایک دم سنبل کے والہانہ پن سے عجیب طرح کا خوف محسوس ہوا' لیکن یہ خالص خوف نہیں تھا۔ اس میں ایک لذت آمیز سنسناہٹ بھی تھی جو اس کے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔

یاس کے اصرار کے باوجود وہ کہیں نہیں گئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ یاس کے گھر میں ہی رہی بلکہ اس نے اپنی خواہش کے عین مطابق گھر کو آئینہ خانہ بھی بنا ڈالا۔ یہ کام اس نے اس وقت کیا جب یاس رات کا کھانا لینے کے لیے بازار گیا تھا۔ اس نے سنبل کو ہدایت کی تھی کہ وہ اندر سے کنڈی چڑھا لے۔ بستی کے تندور ہوٹل سے تو بس دال روٹی ہی مل سکتی تھی' یاس ماسٹر عطا صاحب کی سائیکل پر بیٹھ کر خان پور اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے قریباً ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کپڑے' کتابیں' سامان' ہر شے قرینے سے رکھی تھی۔ فرش پر کہیں گرد کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

اس رات یاس اور سنبل بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سنبل کے جذبے کی شدت کا اندازہ تو یاس کو پہلے سے تھا لیکن اس کی اصل شدت اور وسعت یاس پر اب عیاں ہو رہی تھی۔ اس کا

جذبہ ایک تند دھارے جیسا تھا جو یاس کو اپنے ساتھ اپنی دنیا کی طرف بہالے جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی' کھل کر بات تو نہیں کرسکتی تھی لیکن اس کی ذہانت نے اس کی بے زبانی کا مداوا کردیا تھا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی اس نے بہت کچھ کہہ دیا۔ اس نے یاس کو باور کرادیا کہ اس کا جذبہ پانی پر لکھا ہوا لفظ نہیں' پتھر پر کھی لکیر ہے۔ وہ اسے اپنانا چاہتی ہے' اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔

گفتگو کے دوران میں کچھ لمحات ایسے بھی آئے جب جذبے کی شدت اس پر حاوی ہوگئی۔ اس نے بے اختیار اپنا سر یاس کے کندھے سے لگایا اور گہرے سانس لینے لگی۔ یاس نے تسلی آمیز انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے دوسرے ہاتھ میں یاس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ قربت' یہ دل گدازی' یہ سانسوں کی کھنک' یاس کو کہیں بہت دور لیے جارہی تھی۔

اگلا دن بھی سنبل نے یاس کے پاس ہی گزارا۔ وہ مستقبل کے پلان بنا رہی تھی بڑے خلوص اور بڑے والہانہ پن سے اسے سمجھا رہی تھی کہ ان دونوں کا ساتھ ان دونوں کی زندگیوں کو شاداب کردے گا۔ مگر یاس کے لیے یہ سب کچھ کرنا سہل نہیں تھا۔ ماضی نے اسے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں سنبل کی دل ربا شخصیت کے سبب یاس پر سے ماضی کی گرفت کچھ کمزور تو ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ سارا دن یاس نے ایک دوراہے پر گزارا۔ ہزار ہا سوچیں پوری شدت سے اس کے دل و دماغ پر حملہ آور ہوتی رہیں' کبھی اس کے قدم ایک طرف اٹھتے کبھی دوسری طرف۔

سنبل کا دل غم سے چور تھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ یاس اتنی شدید مزاحمت کرے گا۔ کل شب اسے امید ہوچلی تھی کہ وہ دونوں علی الصباح لاہور کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ کچھ سامان وہ ابھی ساتھ لے جائیں گے' چند روز بعد یاس پھر یہاں آئے گا اور مالک مکان کو اطلاع دے کر اور باقی سامان سمیٹ کر لاہور شفٹ ہوجائے گا۔ وہ اتنی پر امید تھی کہ اس نے علی الصباح یاس کا کچھ سامان پیک بھی کردیا تھا۔ اس میں یاس کی ضروری کتابیں تھیں' لکھنے کا سامان تھا اور کپڑے وغیرہ تھے۔ یہ سب کچھ اس نے ایک جستی ٹرنک میں بڑی ترتیب سے رکھا تھا اور یہ ٹرنک برآمدے میں ایسی جگہ رکھ دیا تھا کہ آتے جاتے یاس کی نگاہ اس پر پڑتی رہے اور اسے یاددہانی ہوتی رہے کہ وہ سنبل کے ساتھ ایک نئے سفر پر روانہ ہورہا ہے۔

لیکن سہ پہر کی چائے کے بعد سے یاس کا رویہ پھر بدلنے لگا تھا۔ وہ ایک بار پھر واضح طور پر تذبذب میں نظر آرہا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ یہ محفل آرائی کا وقت تھا۔ شاعر کا ذہن اپنے زورِ تخیل سے وہ محفل سجانے والا تھا جہاں شمع اس کی ہم نشیں ہوتی تھی اور ہر روز اس سے وعدہ کرتی تھی کہ ایک روز وہ سچ مچ اس کے پہلو میں آئے گی۔

شام کے بعد یاس کھانا لینے کے لیے بازار بھی نہیں گیا۔ وہ صاف طور پر محسوس کررہا تھا کہ اہل بستی اسے شک کی نظروں سے گھور رہے ہیں۔ وہ کچھ بول نہیں رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں سب ہی کچھ کہہ رہی تھیں۔ سنبل اب واضح طور پر اس سے ناراض نظر آرہی تھی۔ اس ناراضگی میں غصے سے زیادہ محبت اور اپنا پن تھا۔ وہ روٹھے روٹھے سے انداز میں بستر پر لیٹ گئی تھی اور پھر شاید سسکیاں لیتے لیتے ہی سوگئی تھی۔

برآمدے میں یاس آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شیشے کی ٹوٹی ہوئی ایش ٹرے میں ٹکڑوں کا ڈھیر تھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اس کی نگاہ کمرے میں جارہی تھی۔ بوسیدہ کمرے میں سنبل چارپائی پر لیٹی یوں لگ رہی تھی جیسے کسی جھونپڑے میں سونے کا فانوس جگمگا رہا ہو۔ ٹیبل فین کی ہوا نے اس کے بال حسین چہرے پر منتشر کردیے تھے۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ کبھی اس کی نگاہ اس جستی ٹرنک پر جاتی تھی جو سنبل نے صبح سے برآمدے میں رکھ چھوڑا تھا' کبھی وہ ادھ کھلی کھڑکی کے اندر جھانکنے لگتا تھا۔ اسی طرح رات کا ایک پہر گزر گیا۔ یہ ایک پہر ایک صدی پر بھاری تھا۔ آخر یاس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک آخری فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ سنبل کے ساتھ لاہور جارہا تھا۔

○☆○

بینک کی طرف سے سنبل کو ایک رہائش گاہ ملی ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ وہیں رہتی تھی۔ سنبل کا آبائی مکان مسلم ٹاؤن کے علاقے میں تھا اور اکثر و بیشتر خالی رہتا تھا۔ سنبل نے یاسین کو وہاں "سیٹل" کردیا۔ لاہور پہنچنے کے دو ماہ بعد ہی سنبل اور ملک گیر شہرت کے حامل شاعر اشرف یاسین کی شادی ہوگئی۔ سنبل ایک دل گداز شخصیت تھی۔ اس کا قرب یاس کے لیے توقع سے زیادہ سکون بخش اور راحت افزا ثابت ہوا۔ یاسین کی ویران زندگی میں چپکے سے بہار آگئی تھی اور نہ صرف بہار آگئی تھی بلکہ ہر روز عید اور ہر رات شب برات ہوگئی تھی۔ وہ جیسے ایک حسین و جمیل ریشمی بھنور میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔ شادی کے بعد دو ماہ تو وہ مسلم ٹاؤن والے مکان میں رہا پھر سنبل کی والدہ کی پرزور خواہش پر ان کے پاس ہی شفٹ ہوگیا۔

کتابوں کی رائلٹی سے یاس کو ہر ماہ اوسطاً تین چار ہزار کی آمدن ہوجاتی تھی' پھر لاہور آنے کے بعد وہ کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ دوسری طرف سنبل بھی ملازمت کرتی تھی۔ کنبہ مختصر تھا لہٰذا بہ آسانی گزر بسر ہورہی تھی۔ یاس نے سنبل کے پیہم اصرار پر ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی لے لی۔ اپنے لباس اور وضع قطع کے بارے میں بھی وہ قدرے محتاط ہوگیا تھا کیونکہ وہ اب اکیلا نہیں تھا۔ اس کا نام کسی کے نام سے جڑا ہوا تھا۔ سنبل کو پانے کے بعد اس کی شاعری میں ایک نیا رنگ داخل ہوا تھا۔ وصال کا

ے۔ کلیوں کا رنگ جب وہ چٹک کر پھول بنتی ہیں اور بارش کا
ب جب وہ ٹوٹ کر برستی ہے' اور ان آنچلوں کا رنگ جو شب
اب میں سرِ بام لہراتے ہیں۔ یاس کے چاہنے والوں نے جس
ح اس کی درد بھری شاعری کو پسند کیا تھا' اسی طرح اس کے پر
ب شعروں کو بھی دل کھول کر سراہا۔

○☆○

سنبل کی سرور انگیز قربت نے یاس کے تلخ ماضی کو اس سے
ت دور دھکیل دیا تھا۔ شمع سے دوبارہ ملنے کی آس کبھی یاس کی
رگی کا حسین ترین خواب ہوا کرتی تھی۔ ماضی کی طرح یہ خواب
اب ایک گہری دھند میں روپوش ہوگیا تھا۔ لیکن دھند کتنی بھی
ری ہو آخر تو دھند ہی ہوتی ہے۔ جلد یا بدیر اسے چھٹنا ہوتا ہے۔
ماہ بعد یاس کو محسوس ہوا کہ اس کے ماضی کو ڈھانپنے والی دھند
ب اتنی دبیز نہیں رہی جتنی شروع میں تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟
ں ہوا تھا؟ شاید اس سوال کا جواب سنبل کی ذات میں پوشیدہ
۔ نجانے کیوں دھیرے دھیرے یاس کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ
نبل کی محبت پر خلوص ہونے کے باوجود خالص محبت نہیں ہے۔
ں میں کسی نہ کسی درجے کی ملاوٹ موجود ہے۔ یاس کو یوں لگا تھا
یسے سنبل اپنی زندگی میں ترقی کی منازل تیزی سے طے کرنے کے
لیے یاس کے نام اور شہرت کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرنا چاہتی
ہے۔

سنبل کو معلوم تھا کہ یاس کے پرستاروں میں با اثر و با اختیار
وگ شامل ہیں۔ ان میں سرکاری عہدے داروں سے لے کر سماجی
خصیات تک ہر قسم کے افراد شامل تھے۔ سنبل اکثر کسی نہ کسی
معاملے میں سفارش کی خواہش مند ہوتی تھی۔ وہ کبھی دبے لفظوں
میں اور کبھی واشگاف طریقے سے اپنی خواہش کا اظہار یاس سے
کرتی۔ ایک دو بار تو یاس نے اس کا کہا مان لیا لیکن پھر وہ کنی کترا
گیا۔ وہ اس قسم کا شخص ہی نہیں تھا۔ اس نے پوری زندگی میں
سبک سر ہو کر کسی سے کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ اب کیسے
کر سکتا تھا۔ وہ وقار اور خودی کا شاعر تھا۔ بے وقعتی اور ندامت
کے گڑھے میں گرنا اسے کیوں کر قبول ہوتا۔ سنبل چاہ رہی تھی کہ
اس کی تبدیلی بینک کی مین شاخ میں ہوجائے۔ وہاں اس بات کا
امکان موجود تھا کہ اسے پبلک ریلیشن کے شعبے میں لے لیا جائے
اور اس کے لیے ترقی کے راستے کھل جائیں۔ بینک کی انتظامیہ کے
ایک اہم عہدے دار کی رضامندی کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔
یہ اہم عہدے دار بینکر کے علاوہ شاعر بھی تھا اور اس حوالے سے
یاس کا زبردست مداح بھی۔ سنبل کو امید تھی کہ اگر یاس ایک بار
بھی چل کر اس کے پاس چلا جائے تو وہ یاس کی بات کسی طور نہیں
ٹالے گا۔ لیکن حال مست یاس کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا۔ کئی
روز تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے صاف انکار
دیا۔

شاید بات آئی گئی ہوجاتی لیکن اس واقعے کے چند ہی روز بعد
ایک اور واقعہ پیش آگیا۔ یوں یاس اور سنبل کے درمیان جو ایک
باریک سی درز پیدا ہوئی تھی وہ پھیل کر دراڑ بن گئی۔

کاشف نامی وہ شخص جس سے سنبل کا نکاح ہوا تھا' لاہور ہی
میں موجود تھا اور اکثر اس کے لیے مسائل کھڑے کرتا رہتا تھا۔
اس بار اس نے ایک نئی شرارت کی۔ اس شرارت کے لیے اس
نے یاس اور سنبل کی شادی کو بنیاد بنایا۔ ایک "زرد" قسم کے کالم
نگار سے اس کی گہری دوستی تھی۔ اس کالم نگار کے ذریعے اس نے
یہ بات پریس میں چھپوائی کہ یاس اور سنبل کے درمیان ایک
نہایت گھٹیا قسم کا رومانس دو ڈھائی سال چلتا رہا ہے۔ شاعر کو
پھانسنے کے لیے سنبل اکثر خان پور جاتی رہی ہے' اور شاعر کے
ساتھ اکیلے مکان میں راتیں گزارتی رہی ہے۔ گواہی کے طور پر
خان پور کی اس نواحی بستی کے ایک دو مکینوں کا حوالہ بھی دیا گیا
تھا۔ پھر اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کالم نگار نے یہاں تک
لکھا تھا کہ ایک سال پہلے یاس کے ساتھ ملاقاتوں کے نتیجے میں
سنبل امید سے ہوگئی تھی اور اس نے خان پور کے ہی ایک اسپتال
سے ابارشن کرایا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اور اس قسم کی دوسری
تمام باتیں بہتان تراشی کے زمرے میں ہی آتی تھیں۔ لیکن عوام
الناس کو تو اسکینڈل بنانے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ اس
بات کو خوب اچھالا گیا اور ایک دو سرے اخبار نے بھی بدنامی کے
یہ اشتہار چھاپ دیے۔

سنبل بے حد آزردہ خاطر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کاشف کو
یادگار سبق سکھایا جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ یاس اپنے
تعلقات استعمال کرے اور تہمت لگانے کے جرم میں کاشف پر
کیس کیا جائے۔ لاہور ہی کے ایک نامی گرامی وکیل صاحب نے
پبلشنگ کا ادارہ بھی کھول رکھا تھا۔ یہ صاحب یاس کی کتابیں بھی
چھاپتے تھے اور خود کو یاس کا عقیدت مند کہتے تھے۔ سنبل جانتی
تھی کہ یاس ایک بار بھی وکیل صاحب سے اس بارے میں بات
کرلے تو وہ اپنی قابلیت کی بنا پر کاشف کو دن میں تارے دکھا سکتے
ہیں۔ لیکن یاس کے خیالات مختلف تھے۔ سنبل نے جتنی بار بھی
اس حوالے سے بات کی یاس کا جواب ایک ہی تھا "سنبل! جھوٹ
کبھی پنپتا نہیں ہے' یہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ جھوٹ کی
اڑائی ہوئی گرد جتنی تیزی سے اٹھتی ہے اتنی تیزی سے بیٹھ بھی
جاتی ہے۔ ہاں اس گرد کے نتیجے میں جھوٹے کا منہ ضرور کالا ہوتا
ہے... کوئی اور نہ جانے لیکن خدا تو جانتا ہے کہ دو سال تک ہمارا
تعلق کس نوعیت کا رہا ہے۔ تم اپنے دماغ پر بالکل بوجھ نہ لو اور
یقین رکھو کہ یہ عارضی شور شرابا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

سنبل ایک بار پھر صبر کے تلخ گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔ بے
شک وہ خاموش رہی تھی اور اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا
لیکن یاس اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ یہ قدم

پر یاس کے بارے میں سنبل کی توقعات غلط ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ تصورات ایک ایک کر کے چکنا چور ہو رہے تھے جو اس نے یاس کے بارے میں بنا رکھے تھے۔

اور اسی بات سے یاس ڈرتا تھا۔ یہی خوف تھا جس نے اسے سب سے الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ذات میں بے شمار خامیاں ہیں.... اور شاید ان خامیوں ہی کے مداوے میں قدرت نے اسے سخن کی طاقت عنایت کر رکھی ہے۔ نہ اپنی خامیوں پر اس کا اختیار تھا نہ صلاحیتوں پر۔ اس نے بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا اور اسے یقین تھا کہ ان خامیوں اور خوبیوں کا نوّے فی صد حصہ اسے وراثت میں ملا ہے۔ وہ اپنے پیچھے چار پشتوں تک دیکھتا تھا تو اسے اپنے اجداد میں شعر فہمی اور شعر گوئی کا سراغ ملتا تھا۔ اس کے والد ایک اچھے شاعر تھے' اس کے پڑدادا نے تصوف کی شاعری کی تھی اور ان کی کئی کتابیں بھی موجود تھیں' یقیناً اس سے پیچھے بھی یہ سلسلہ موجود تھا۔ یہ سب گوشہ نشین قسم کے لوگ تھے۔ سماج سے کٹے ہوئے اور اپنے حال میں مست و مگن.... دنیا ان کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی لیکن وہ صرف شعر و سخن کے بارے میں سوچتے تھے۔ دنیا داری کے حوالے سے بے شک وہ زیادہ کامیاب لوگ نہیں تھے لیکن اپنی خداداد صلاحیت کا لوہا انہوں نے ضرور منوایا تھا' اور پھر ایک اور بات بھی تھی۔ ایک کامیابی ان کی تمام نامرادیوں میں روشن ستارے کی طرح چمکتی تھی.... اور وہ کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی' اور نہ صرف یہ کہ محبت کی تھی بلکہ اپنی محبت کو حاصل بھی کیا تھا۔ اس کے والد نے محبت کی شادی کی تھی اور یہ ایک نہایت کامیاب شادی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے دادا محترم کی شادی بھی محبت کی تھی' میاں بیوی میں قریباً ساٹھ برس کی بے مثال رفاقت رہی تھی۔ پڑدادا کے بارے میں اسے زیادہ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ ایک برہمن زادی ان کی خاطر کلکتہ چھوڑ کر امرتسر آگئی تھی اور مسلمان ہوگئی تھی۔ اس نے پڑدادا سے شادی کی تھی' مگر شادی کے ایک دو سال بعد وہ وفات پاگئی تھی اور پڑدادا اس کے غم میں بالکل ہی فقیر بن گئے تھے' بعد ازاں انہوں نے شاعری اور نثر میں تصوف کو موضوع بنایا تھا اور ان کی تحریروں نے قبولیت عامہ حاصل کی تھی۔

یاس اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے اجداد کی طرح اسے بھی شعر و سخن کی خوبی کے ساتھ بے شمار خامیاں ودیعت ہوئی ہیں۔ وہ ان خامیوں کو چھپانے کے لیے ہی اب تک گوشوں میں سمٹا رہا تھا' لیکن اب کوہی نالے جیسی شوریدہ سر تند و تیز سنبل اسے اپنے خوب صورت پائیوں میں بہا کر عین زندگی کے منجدھار میں لے آئی تھی اور وہ جو تیراکی کی ابجد سے بھی ناواقف تھا بے بسی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

کے حوالے سے ہر روز ایک نئی مایوسی کو گلے لگانے کے باوجود وہ اس میں خوبیاں تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کی شاموں کو اپنے آنچل کے عکس سے رنگین کرتی تھی اور اس کی راتوں کو اپنے بدن کی خوشبو سے مہکاتی تھی۔ لیکن پھر بھی ان دونوں کے درمیان مزاج کے فرق نے جو تھوڑا سا فاصلہ پیدا کر دیا تھا وہ اپنی جگہ موجود تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غیر محسوس طور پر اور بتدریج وہ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر لیکن بار بار یاس کی تن آسانی' کم آمیزی اور قناعت پسندی سنبل کی سرگرمی' تیز رفتاری اور مشکل پسندی سے ٹکرا رہی تھی اور دونوں کا تھوڑا تھوڑا نقصان ہو رہا تھا۔

یہ سلسلہ قریباً ایک سال تک چلتا رہا پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس کے بعد یاس کو اندازہ ہوا کہ یاس کے لیے سنبل کی محبت.... ناپسندیدگی بلکہ شاید نفرت میں بدل گئی ہے۔

وہ جنوری کی ایک سرد شام تھی۔ الحمرا آرٹ کونسل کے ہال میں ایک بڑا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یاس بھی بحیثیت شاعر یہاں مدعو تھا۔ سنبل اس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ ابھی وہ لوگ ہال میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ یاس واش روم میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واش روم سے نکلا تو ایک ہنگامہ نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ہجوم کے درمیان سنبل نے کسی شخص کا گریبان پکڑ رکھا ہے اور چیخ رہی ہے۔ یاس لڑکھڑاتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ جو شخص سنبل سے الجھ رہا ہے وہ کاشف ہے۔ یاس کو دیکھتے ہی سنبل چیخی "یاس! اس کتے نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ اسے پولیس کے حوالے کرو۔ اس نے.... اس نے مجھ سے بدتمیزی کی ہے۔"

وہ آگ بگولا ہو رہی تھی' لیکن اگر اسے توقع تھی کہ اسے آگ بگولا دیکھ کر یاس خود بھی آگ بگولا ہو جائے گا اور نتائج سے بے پروا ہو کر کاشف پر تھپڑوں کی بارش کر دے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لڑائی جھگڑا یاس کے مزاج میں ہی شامل نہیں تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن ہنگامہ آرائی پر اکسانے والی لہر.... یاس کی خواہش کے باوجود کبھی اس کے سینے میں نہیں اٹھ پائی تھی۔

وہ بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے سنبل اور کاشف کے درمیان آگیا۔ یاس کا نرم رویہ دیکھ کر کاشف کا ٹوٹا ہوا حوصلہ پھر جڑ گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگا اور سنبل کو سبق سکھانے کی دھمکیاں دینے لگا۔ یاس نے بڑی تحمل مزاجی سے اسے سمجھایا کہ وہ زبان درازی نہ کرے۔ وہ جب کچھ ڈھیلا پڑا تو یاس اسے دھکیل کر ایک طرف لے گیا' اور اسے سمجھایا کہ وہ یوں سب کے سامنے تماشا نہ بنائے۔ اگر کوئی نزاع کی بات ہے تو وہ بیٹھ کر تحمل سے کی جا سکتی ہے۔

یاس کا معذرت خواہانہ رویہ دیکھ کر سنبل حیران ہو رہی تھی۔

تھا کہ زیادہ نہیں تو یاس اس کا گریبان تو ضرور پکڑے گا' لیکن وہ تو کسی بدھ بھکشو کی طرح کاشف کو صبر و برداشت و عدم تشدد کا درس دینے میں مصروف تھا۔ اس واقعے کے بعد کئی ہفتے تک سنبل یاس سے کچی کچی رہی تھی۔ نہ یاس کی شاعری اسے کشش کرتی تھی اور نہ تو خود یاس۔۔۔ ہاں وہی یاس جس کے چہرے پر خواب دیکھتی آنکھیں سجی ہوئی تھیں اور سنبل کا دل ان میں ڈوب جانے کو چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی خواب گاہ میں ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے بہت دور سوتے تھے۔ پھر سنبل شام کو دیر سے گھر آنے لگی اور سویرے بہت جلد نکل جانے لگی' یوں لگتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر یاس سے دور رہنا چاہتی ہے۔ جیسے یاس کی موجودگی میں خود پر خوش خلقی طاری رکھنے کے لیے اسے خود سے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ اب یاس کو کئی بار اپنا ناشتا خود بنانا پڑتا تھا' اس کے ان دھلے کپڑے' گرد آلود کتابوں کے درمیان بکھرے رہتے تھے۔ وہ سارا دن گھر میں کسی "گمشدہ بے روزگار" کی طرح گھومتا رہتا اور سنبل کا انتظار کرتا' اس کا دل چاہتا کہ وہ اسے اپنی تازہ ترین تخلیق سنائے لیکن اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں ایسی بے زاری نظر آتی کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکتا۔ وہ صاف محسوس کر رہا تھا کہ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی وہ دونوں ایک دوسرے بہت دور چلے گئے ہیں۔ مایوسی اور ندامت کے اندھیرے میں ڈوب کر کبھی کبھی یاس کو شمع کی یاد آتی۔ وہ سوچتا کہ شاید اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ شمع کے غم سے بے وفائی کر کے اور اس کے انتظار سے جدا ہو کر اس نے جو گناہ کیا تھا شاید یہ اسی کی سزا مل رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خاموشی سے اسی تنہا مکان میں واپس چلا جائے جہاں چلچلاتی دوپہروں میں اداسی گرد آلود در و دیوار سے لپٹی تھی اور سائیں سائیں کرتی ہوا اپنے ساتھ خرابوں کی دل سوز مہک لاتی تھی۔ اس تنہائی میں شمع کو یاد کرنا اور اس کے قدموں کی چاپ کا منتظر رہنا کتنا خوش کن تھا۔

ہاں وہ سب کچھ چھوڑ دینا چاہتا تھا' لیکن اس کے تذبذب کو کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے کسی تحریک کی ضرورت تھی۔ اور پھر ایک روز یہ تحریک بھی اسے مل گئی۔ یاس ایک مشاعرہ میں جانے کے لیے اپنے کپڑے استری کر رہا تھا کہ غلطی سے اس نے گرم استری شیشم کی ایک ایسی میز پر رکھ دی جو سنبل کی والدہ اپنے جہیز میں لے کر آئی تھی اور اسے بے حد عزیز تھی۔ دیر تک استری میز پر رہنے کی وجہ سے میز کی پالش شدہ ٹاپ جل گئی۔۔۔ میز کو دیکھنے کے بعد یاس کی خوشامد بھی نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا' شام کو سنبل گھر آئی تو وہ بھی تلخ ترش بولی۔ جلی ہوئی میز تو بس ایک بہانہ تھی' سنبل کے دل میں چبھی ہوئی کئی باتیں اس کی زبان تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھیں۔ فرطِ طیش میں وہ یاس کو غیر ذمے دار۔۔۔ غائب دماغ۔۔۔ اور بے کار تک کہہ گئی۔ یہ وہی یاس تھا' ڈیڑھ سال پہلے وہ جس کے پاؤں اپنے ہاتھ سے دھونے کی تمنا کرتی تھی اور اب

زمین کو بھی آنکھوں سے چومتی تھی جہاں یاس کا سایہ پڑتا تھا۔۔۔ ایک حساس شاعر کے لیے مندرجہ بالا القابات' گالیوں سے کم نہیں تھے۔ وہ رات بھر اپنے بستر پر پڑا رہا اور ڈبڈبائی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔ وہ واضح طور پر محسوس کر چکا تھا کہ اب سنبل کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید وہ اس کے لیے شاعری کے افق پر چمکنے والا ایک خوب صورت چاند تھا' اب وہ اس چاند کو قریب سے دیکھ چکی تھی اور اسے اکتاہٹ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ یاس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مزید رسوا ہونے سے پہلے یہاں سے چلا جائے گا۔ سنبل کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے گا۔ اس نے اپنی ضروری کتابیں اور مختصر سامان ایک اٹیچی کیس میں رکھا اور صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے گھر چھوڑ گیا۔ سنبل کی ماں نے اسے دیکھ لیا لیکن ایک بار بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید ماں بیٹی ذہنی طور پر پہلے سے اس واقعے کے لیے تیار تھیں۔

ریل گاڑی میں خان پور کی سمت سفر کرتے ہوئے' اس پر یادوں کے دریچے کھل گئے۔ اپنا تنہا مکان اپنی تمام تر ویرانیوں سمیت اسے بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی شمع بھی یاد آ رہی تھی۔ چھک چھک کرتی ریل گاڑی میں یاس نے اپنا سر نشست کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں' اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے تخیل کو آواز دی' شمع کو پکارا۔ ایک بار۔۔۔ دو بار۔۔۔ تین بار لیکن وہ نہیں آئی۔۔۔ وہ کوشش کرتا رہا لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ شاید وہ اس سے روٹھ گئی تھی۔ اس نے بھی کون سا اچھا کام کیا تھا' ڈیڑھ برس تک اس کی یاد سے تقریباً غافل ہی رہا تھا' اپنی نئی دنیا کی مصروفیات میں کھویا رہا تھا۔ اپنے تخیل سے الجھتے الجھتے اس نے سارا سفر کاٹ دیا۔ اپنے تخیل کی ناکامی اس کے دل کو ٹکڑے کر رہی تھی۔

○☆○

خان پور کی نواحی بستی میں وہ مکان جوں کا توں تھا۔ مکینوں کے جانے سے بارونق مکانوں پر اثر پڑتا ہے' ویران مکانوں کی ویرانی کا کیا بگڑ سکتا ہے۔ بھائیں بھائیں کرتے در و دیوار' بے آب و گیاہ صحن' نیم تاریک کمرے میں کھڑی چارپائی' لکڑی کی کھڑونچی پر گرد آلود گھڑا اور کھڑکی کے سامنے مرجھائی مرجھائی سی انگور کی کمزور بیل۔ دو تین گھنٹے بعد مالک مکان بھی آ موجود ہوا۔ یاس کی غیر موجودگی میں اس نے دو تین ماہ کے لیے ایک غریب گھرانے کو مکان کرایے پر دے دیا تھا' ان کے جانے کے بعد سے یہ خالی تھا۔

یاس نے پھر سے وہاں ڈیرہ جما لیا۔ ایک دم بیتے ہوئے شب و روز اس کے لیے لوٹ آئے تھے' سب کچھ ویسا ہی تھا' صرف انگور کی بیل پر مرنی سی چھائی ہوئی تھی۔ یاس نے اس کے پتوں کو دھویا' کیاری میں پانی دیا اور اس کے قریب ہی آرام کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ گھر میں موجود اس اکلوتی "ہریالی" سے یاس کو بہت پیار تھا۔ اسے

امید بھی موجود ہے۔ اس بیل کے ساتھ مل کر شمع کا انتظار کرنا اسے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔

اس رات بھی وہ صبح تک شمع کے تصور کو آواز دیتا رہا۔ فریاد کرتا رہا' روتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ وہ بہت ناراض تھی شاید۔۔۔ اس کی شبیہہ یاس کے پردہ تصور پر بن بن کر مٹ رہی تھی' ہر بار جب وہ ملتی تھی تو کچھ اور بھی بے رنگ ہو جاتی تھی۔ اگلے روز بستی کے کچھ لوگ اس سے ملنے آئے۔ وہ بڑی محبت اور تپاک کا اظہار کر رہے تھے۔ کچھ بھی تھا بہرحال وہ ایک عرصے تک اس بستی کا ایک فرد رہا تھا۔ اتنی دیر تو جانور بھی ساتھ رہے تو اس سے پیار ہو جاتا ہے۔ بستی کے باقی لوگ تو کچھ دیر بعد چلے گئے لیکن ماسٹر عطا صاحب وہیں بیٹھے رہے۔ وہ یاس سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے' کچھ دیر تو جھجکتے رہے پھر بولے "یاس صاحب! چار پانچ ماہ پہلے۔۔۔ ایک۔۔۔ لڑکی ملنے آئی تھی آپ سے۔"

ایک دم زمین و آسمان یاس کی نگاہوں میں گھوم گئے "لل۔۔۔ لڑکی؟ کون تھی؟" اس کے ہونٹوں سے لڑکھڑاتی آواز نکلی۔

"اپنا نام شمع بتاتی تھی۔ شمع اعجاز!" ماسٹر صاحب نے کہا۔

یاس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم ماسٹر عطا کی طرف دیکھتا رہا' پھر اس کے ہونٹوں سے لرزتی کانپتی آواز نکلی "کہاں ہے وہ؟"

ایک دم ماسٹر عطا کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا "آپ۔۔۔ کی کیا لگتی تھی وہ۔۔۔ م میرا مطلب ہے کوئی عزیز تھی؟" ماسٹر عطا منمنایا۔

"وہ جو بھی تھی' کہاں ہے وہ؟" یاس نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

"وہ کہیں بہت دور سے آئی تھی۔ اس کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک ہینڈ بیگ تھا۔ پہلے وہ یہاں آپ کے مکان پر پہنچی' یہاں تالا لگا دیکھا تو بستی میں آ گئی۔ عورتوں سے آپ کے بارے میں پوچھتی رہی۔ اس کے پاس آپ کی ایک پرانی تصویر بھی تھی' اس کے علاوہ آپ کی ایک دو کتابیں بھی تھیں۔۔۔ عورتوں نے اسے بتایا کہ چند ماہ پہلے ایک لڑکی یہاں آئی تھی' وہ آپ کو اپنے ساتھ لاہور لے گئی ہے' وہاں آپ نے اس لڑکی سے شادی کر لی ہے۔

"یہ باتیں سن کر وہ بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ بالکل دیوانی دیوانی سی لگنے لگی تھی۔ امام صاحب نے اسے اپنے گھر ٹھہرا لیا تھا اور بچیوں سے کہا تھا کہ وہ اس کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ لڑکی نے پورے دو روز تک کچھ کھایا پیا نہیں۔ نہ کسی سے بات کرتی تھی نہ اپنے بارے میں کچھ بتاتی تھی۔"

یہاں تک کہہ کے ماسٹر عطا چپ ہو گیا۔ اس کی آواز میں لرزش آ گئی تھی' یاس کو صاف طور پر محسوس ہوا کہ وہ کوئی نہایت اہم بات کہنے جا رہا ہے۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر غم والم کی بے شمار پرچھائیاں امڈ آئی تھیں' اور اس کے ساتھ ہی یاس کا دل بھی اس کے سینے میں دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ماسٹر عطا نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تیسرے روز۔۔۔ صبح کے وقت۔۔۔ اس نے۔۔۔ کوئی زہریلی چیز کھالی۔۔۔ امام صاحب کی بیٹی رقیہ نے دیکھا تو اس کا نچلا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔۔۔ اور وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔۔۔ ہم نے اسے بھاگم بھاگ خان پور اسپتال پہنچایا۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس کے سانس پورے ہو چکے تھے جی۔۔۔ ایک گھنٹے بعد وہ مر گئی۔ مرنے سے پہلے۔۔۔ اس نے جو آخری لفظ بولا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ آپ کا نام تھا۔"

"نہیں!" یاس کے حلق سے ایک دھاڑ نکلی۔ اسے لگا جیسے اس کا جگر پھٹ گیا ہے اور دل پانی بن کر آنکھوں تک اچھل آیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ نیم غنودگی کی کیفیت ختم ہو گئی جو اب تک اس پر طاری تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا زورِ تخیل اسے جو ایک طویل روداد سنا اور دکھا رہا تھا وہ بجلی کے جھماکے کی طرح ختم ہو گئی۔ یاس جو ڈیڑھ برس تک مستقبل کے اندر چلا گیا تھا آناً فاناً لوٹ آیا۔ وہ اپنے برآمدے میں آرام

عیسائی ڈاکٹر کا حیرت انگیز کمال

پاکستان بننے سے پہلے دہلی میں ایک عیسائی ڈاکٹر نے میرے مطب کے چند کامیاب نسخوں کو اپنے مریضوں پر آزما کر انکا کامیاب علاج کیا۔ تو وہ میرا اور بھی گہرا دوست بن گیا پھر وہ ریٹائر ہو کر انگلستان چلا گیا۔ یہ دوستی پھر خط و کتابت کی صورت میں جاری رہی وہ میرے بہت سے نسخے تو اپنے ساتھ لے گیا، لیکن اپنی دواؤں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ آخر انتقال سے ایک سال قبل ڈاکٹر ولیم نے اپنا ایک مشہور نسخہ مجھے تفصیل سے لکھ کر بھیج دیا۔ جو کہ کمزور نوجوانوں کو بہت کم دنوں میں قابل فخر صحت کا مالک بنا دیتی تھیں میں نے خاص ہدایتوں کا نسخہ پاتے ہی فوراً دوائیں تیار کر کے اپنے مطب میں آنے والے بالکل گئے گذرے کمزور نوجوانوں کو استعمال کرائیں خدا نے میرے مریضوں کو مکمل شفاء عطا فرمائی اور ساتھ ہی میرے مطب کو ایسی شہرت بخشی جیسی ولیم کو اپنے ملک میں حاصل تھی، اس نسخہ کے استعمال کے فوراً بعد ہی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سدا نوجوانی کا راز پا لیا ہو۔ مایوس مریضو! یہ اشتہار نہیں بلکہ حقیقت ہے اگر خدانخواستہ آپ بھی کسی ایسی ہی شکایت میں مبتلا ہوں تو آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ روزانہ کر دیں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائیگا۔

حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

کرسی پر بیٹھا تھا... اور کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا' وہاں بستر پر سنبل سو رہی تھی' ٹیبل فین نے اس کے گھنگھریالے بال اس کے چاند چہرے پر بکھیر دیے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بوسیدہ جھونپڑی میں سونے کا جگمگاتا فانوس روشن ہو۔ صبح کے وقت سنبل نے یاس کا جو سامان پیک کیا تھا وہ اسی طرح برآمدے میں رکھا تھا...

... ہاں ابھی وہ سنبل کے درِ حسن پر جھکا نہیں تھا... ابھی مستقبل نے اس پر کاری ضرب نہیں لگائی تھی۔ نہ ابھی وہ سنبل کے ساتھ لاہور گیا تھا' نہ اس کی شادی ہوئی تھی' نہ وہ حسن و شباب کے راحت آفریں پانیوں میں بہا تھا... ہاں ابھی کچھ بھی نہیں ہوا تھا... ابھی شاعر کا پندار محفوظ تھا' ابھی شاعری رسوا نہیں ہوئی تھی' ابھی وہ سنبل کے لیے ایک دو افتادہ چمکتا دمکتا چاند ہی تھا۔ وہ دیر تک اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا اور سوچتا رہا خواب تو انسان نیند میں دیکھتا ہے لیکن اس نے جاگتی آنکھوں سے ایک طویل خواب دیکھا تھا۔ اس کے IMAGINATION نے اسے کہاں کہاں نہیں گھمایا تھا۔ اور اس کا IMAGINATION اکثر سچ ہی بولا کرتا تھا۔

وہ اٹھ کر صحن میں آگیا۔ رات کے آخری پہر ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی' آسمان پر چاند مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا اور ستاروں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ یاس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے تخیل نے اسے ڈیڑھ برس تک مستقبل کی بھول بھلیوں میں گھمایا ہے۔ اسے اپنے سوچے ہوئے ہر منظر پر حقیقت کا گماں ہو رہا تھا... ٹہلتے ٹہلتے یاس نے شمع کے تصور کو آواز دی اور وہ مجسم ہو کر مسکراتی ہوئی اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اس کے چہرے پر شکوے کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی... ایک عجیب طرح کی طمانیت یاس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ بے خیالی میں چلتا ہوا ایک عمیق ترین گڑھے میں گرنے سے بچ گیا ہے۔ وہ بالکل گڑھے کے "کنارے" پر آکر رکا تھا۔ یہ کنارہ ہی تو تھا... شام کو سنبل اسے آمادہ کرتی رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ لاہور چلے۔ اس نے اپنا سارا زورِ بیان صرف کردیا تھا اور ہر دلیل دے کر دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد وہ روٹھی روٹھی سی لیٹ گئی تھی اور روتے روتے سو گئی تھی۔ یاس نے ادھ کھلی کھڑکی کے پاس پہنچ کر ایک بار پھر اسے دیکھا اور آہستگی سے کھڑکی بند کردی۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ سنبل صبح اکیلی واپس جائے گی۔

○☆○

صبح سنبل چلی گئی۔ جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب تھرا رہے تھے۔ یاس نے اس کا اٹیچی اٹھالیا اور اسے تانگے پر بس اڈے تک چھوڑ کر آیا۔ بس میں بیٹھنے سے پہلے سنبل نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اپنے پرس میں سے ایک آٹوگراف بک نکالی اور عقیدت سے معمور لہجے میں بولی "آٹوگراف پلیز۔" اس کے ساتھ ہی دو آنسو اس کے گل رنگ رخساروں پر ڈھلک آئے۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد یاس نے بک پر آٹوگراف دیا اور ساتھ ہی لکھ دیا "زندگی صرف پانے کا نام نہیں' یہاں بہت کچھ کھویا بھی جاتا ہے۔ خوش کن بات صرف یہ ہے کہ قدرت کے پاس ہر زخم کا مرہم موجود ہے۔"

"میں آپ کو کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔" سنبل نے سسک کر کہا اور جلدی سے بس میں سوار ہوگئی۔ جب تک بس روانہ نہیں ہوگئی' یاس وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ خان پور کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر چلتا پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابھی تک اس کا ذہن "جاگتی آنکھوں کے طویل خواب" میں الجھا ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ رات کے وہ دو ڈھائی پہر اس کے لیے کتنے کایا پلٹ ثابت ہوئے ہیں۔

گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے انگور کی بیل کو دیکھا۔ وہ اپنے اردگرد کی خشک سالی سے بے نیاز ہمیشہ کی طرح ہری بھری تھی۔ اور یاس کو یقین دلا رہی تھی کہ اس کی امید کی کھیتی بھی سرسبز ہے۔ اس بیل کے سائے میں بیٹھ کر نجانے کیوں یاس کو یقین ہونے لگتا تھا کہ اس کے خاندان میں کئی نسلوں سے جو کہانی دہرائی جارہی ہے وہ اب بھی دہرائی جائے گی۔ قدرت نے بے شمار ناکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ اس کی قسمت میں ایک کامیابی بھی لکھ رکھی ہے۔ اس کی محبت اسے ملے گی اور ضرور ملے گی۔ شرط صرف یہی ہے کہ وہ "لازوال وفا" سے اپنا رشتہ استوار رکھے اور اپنے غم کے گلشن پر کبھی خزاں نہ چھانے دے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو ایک روز اس کے دروازے پر شمع کا ہاتھ دستک ضرور دے گا۔ بہار کی کسی چمکیلی صبح کو' گرما کی کسی تپتی دوپہر کو یا سرما کی کسی شفق رنگ شام کو وہ دستک ضرور ہوگی جس کا انتظار وہ اس ویران گھر میں برسوں سے کررہا ہے۔ اور اگر بالفرض محال... بالفرض محال ایسا نہ بھی ہوسکا۔ تو شمع کا تصور تو اس کے پاس ہے۔ کسی "سنبل" کے باعث وہ تصور تو اس سے روٹھا نہیں... وہ اپنے اس ویران گھر میں شام ڈھلنے کے بعد جب چاہے شمع کو بلا سکتا ہے اس کے ساتھ اپنا دکھ سکھ بانٹ سکتا ہے۔ اس کو شعر سنا سکتا ہے اور اس سے داد لے سکتا ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ ہے اور کاغذ پر اس کا قلم روانی سے چلتا ہے اور الماری میں رکھی پرانی کتابوں میں سے من پسند خوشبو اٹھتی ہے۔ اور ڈاکیا رنگ الٰہی دور دراز مقامات سے اس کے لیے ان دیکھے لوگوں کی ڈاک لاتا ہے تو پھر مایوس ہونے کی کون سی بات ہے؟ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

○

تاج دیئے کے نسترمال کمرہ غربت
جولالی کی دھوپ کی طرح
ٹوٹ کر برستی تھی۔ اس دھوپ میں جلنے والوں میں اس کے علاوہ
پانچ افراد اور بھی تھے۔ اُس کی ساری شاگرد بچی جو ایک کھٹارا دسی
سٹین پر سلاد ون محلہ داروں کے کپڑے سیتی تھی۔ ایک لڑکا جو
ٹائر ٹیوب کی پنکچر لگانے کے بعد اُس کی بیگر مقامی ڈاکٹر نے یہ طے

حالات اُس کے سخت مخالف تھے۔ وہ جو قدم اٹھاتی
منزل اُس سے دور ہو جاتی۔ دریا عبور کرتا تو پتہ چلتا شفٹ
آ کھڑا ہوتا۔ جواد سیٹھ کے ساتھ چلنا اُس کے لیے
ناممکن ہوگیا تھا مگر اُس کی مشکل اُسی وقت آسان
ہوئی جب سب کے بگڑے ہوئے کام سنورنے لگے۔

جس کا کوئی نہیں ہوتا اُن کا خدا ہوتا ہے

الاسباب

شاہد جاوید منظر



پوسٹ میں بھرتی ہوا تھا اور جس کی تنخواہ کا زیادہ تر حصہ اُس کی اپنی بیماری پر خرچ ہو جاتا تھا۔ اُسے ہیروئن کی بیماری تھی۔ اُس کا چھوٹا بھائی جو ایک تباہ حال اسکول میں میٹرک کا طالب علم تھا، اور دو لڑکیاں جو اپنے پورے قد کاٹھ کے ساتھ ہر لحظہ تاج دین کے سر پر سوار رہتی تھیں۔ یہ بھی مالی مفلوک الحالی میں بیماں ہو لتی کچھ نہیں تھیں لیکن اُن کی یہی خاموشی تاج دین کے کانوں کے پردے پھاڑتی رہتی تھی۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں اور تاج دین کو اُن کی شادی کرنا تھی۔ جیسے تیسے اُس نے محلے کے ایک سبزی فروش سے بڑی لڑکی رفیسہ کا رشتہ تو طے کر دیا مگر اب یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی تھی۔ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں جو لڑکی کو دے دلا کر اُس سے اپنی خطا معاف کرائی جاتی۔ یہاں تو ہاں و نہ نفقے کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا، شادی کا خرچا کیسے پورا ہوتا۔ کہیں بھی سادگی اپنائی جاتی کچھ نہ کچھ تو خرچ ہونا ہی تھا۔ سارا کنبہ رات دن اسی پریشانی میں رہتا۔ شادی میں زیادہ سے زیادہ ایک سال تھا اور اپنی اپنی جگہ سبھی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن یہ کوششیں سعی لاحاصل کے مذہرے میں آتی تھیں۔

بڑا بیٹا اکبر بڑی نیک نیتی سے کم سے کم ہیروئن پینے کی کوشش کرتا، تاکہ اُس کی تنخواہ سے اور کچھ نہیں تو گھر کی دال روٹی ہی چل سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کوشش میں اکثر اُسے ناکامی ہوتی تھی۔ چھوٹا بیٹا اسلم دن رات کرکٹ کھیلتا تھا شاید اُس کا خیال تھا کہ ایک برس سے پہلے پہلے وہ پاکستانی ٹیم میں پہنچ جائے گا اور میاں داد کی طرح کوئی یادگار چھکا لگا کر اپنے پکے گھر کو غوثوں سے بھر دے گا۔ اُس کا خیال خام تھا لیکن وہ اپنی کوششوں میں بے حد سنجیدہ تھا۔ روز سہ پہر کو پھٹی پرانی کٹ پہن کر جب وہ پریکٹس کے لیے نکلتا تو اُس کے چہرے پر بلا کی ذمے داری اور متانت ہوتی۔ ہر ہفتے بڑی اُمید سے کسی نہ کسی ٹرائل پر لاہور جاتا اور بجھا بجھا واپس آجاتا۔ . .

رفیسہ کی چھوٹی بہن نوزیہ نے دو سو روپے کے انعامی بانڈ خرید رکھے تھے۔ ہر قرعہ اندازی سے دو تین روز پہلے وہ ہمسائی سے دو سو روپے اُدھار لیتی اور اگلی قرعہ اندازی کے لیے بانڈ خرید لیتی۔ پھر پہلے والے بانڈ کے نتائج دیکھنے کے بعد انھیں بھنا کر ہمسائی کا قرض واپس کر دیتی۔ ہر قرعہ اندازی کا انتظار وہ بڑی بے قراری سے کرتی۔ بڑی بہن سے کہتی "باجی، کبھی اس دفعہ تو ہمارا جیکپاٹ آ گیا۔ لیکن جیکپاٹ کبھی نہیں آیا۔ ہاں ہر قرعہ اندازی نوزیہ کے لیے بے پناہ مایوسی ضرور لائی۔ نتائج دیکھ کر وہ دیر تک اخبار ہاتھ میں پکڑے گم صم بیٹھی رہتی۔ ایسے میں کوئی اُس سے بات نہیں کرتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ لڑ پڑے گی۔ تاج دین کی بیوی دن رات مشین چلانے میں مصروف رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہ کسی کے مقابلے پر مشین چلا رہی ہے۔ شاید ایک مشین وقت چلا رہا تھا۔ اور ایک اُس کے نحیف ہاتھ ـــــ تاج دین تو وہ اب کسی کا کام ہی کا نہیں تھا۔ پنجابی میں اُس کے لیے بڑی شاندار مثال تھی "جیہا کلے بنجھا۔ تیہا چوراں کھڑیا"۔ یعنی اُس کی حالت اُس پالتو جانور کی سی تھی جو کھونٹے سے بندھا رہے یا چورا لے جائیں گھر والوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔

تاج دین جانتا تھا کہ گھر کے سارے افراد اپنی اپنی جگہ مخلص ہیں اور سارے کامیاب بھی ہوں گے۔ لیکن اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ اسلم اسی لگن سے کرکٹ کھیلتا رہتا تو یقیناً کسی نہ کسی کی اچھی ٹیم میں شامل ہو جاتا۔ ممکن تھا اُسے کسی بینک میں ملازمت مل جاتی لیکن اُسے کون بتاتا کہ کامیابی چھ سات سال کا عرصہ مانگتی ہے اور اُس کی بہاری باجی کی شادی میں صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ فوزیہ کے بانڈ اسی طرح قرعہ اندازیوں میں شامل ہوتے رہتے تو بالآخر ایک نہ ایک دن اُن پر لاکھوں کا انعام نکلتا لیکن رفیسہ کی شادی تک یہ انعام نکلنے کا امکان لاکھوں میں ایک تھا۔ اُسے امداد کی شبہ گری کون سمجھاتا۔ اس تلخ حقیقت سے اُسے کون آگاہ کرتا۔ تاج دین کی بیوی مشین چلاتی تھی۔ اگر وہ آٹھ آنے فی گھنٹا کے حساب سے مشین چلاتی رہتی اور اُسے کام ملتا رہتا تو وہ چار پانچ سال میں دو ڈھائی ہزار روپے ضرور اکٹھا کر لیتی . . . مگر اس کے پاس صرف ایک سال تھا۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ . . وقت جس کی رفتار کسی کے کہنے سے گھٹتی بڑھتی نہیں۔ آخر شادی کے دن آ گئے۔ بڑے لڑکے نے بڑے احسان کے ساتھ چار سو روپے باپ کے ہاتھ میں تھمائے۔ فوزیہ نے اپنے دو سو کے بانڈ اس شادی کی نذر کیے۔ تاج دین کی بیوی حلیمہ نے باقی بچا ہوا بانڈ جو ڈھائی سو روپے کا تھا، خاوند کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ کل گیارہ سو روپے ہو گئے۔ یہ گیارہ سو روپے سنبھال کر تاج دین اپنے اکلوتے ہم عمر دوست مصطفےٰ کے پاس پہنچا۔ مصطفےٰ بھی اس کی طرح ڈاکخانے سے ریٹائر ہوا تھا لیکن اُس کے پاس دو خستہ حال دکانیں تھیں جن کے کرائے سے اُس کی معاشی حالت زیادہ نہیں تو کچھ بہتر ضرور تھی۔ تاج دین کو دروازے پر دیکھتے ہی وضع دار دوست نے اُس کی غرض پہچان لی اور بغیر کچھ کہے سنے تین سو روپے کے میلے کچیلے نوٹ اُس کی مٹھی میں تھما دیے۔ تشکر کے جذبات سے تاج دین کے آنسو اُمڈ پڑے۔ انھیں چھپاتا ہوا وہ دوست کے گھر سے چلا آیا۔ اب اُس کے پاس کل چودہ سو روپے تھے۔ جہیز کے نام پر چند معمولی معمولی چیزیں تاج دین کی بیوی نے گھر پر جوڑ رکھی

"جاپان میں اب کے ہمیں وطن عزیز بہت یاد آیا۔ ایک روز تو بہت ہی یاد آیا۔ جائے یہاں کی آزادی کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں، کوئی لوگ نے والا نہیں۔ سگریٹ کا ٹکڑا تو خیر معمولی چیز ہے آپ کبھی بھی دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، کسی بھی سنیما کے غسل خانے میں ہاتھ دھوتے ہوئے دیکھ لیں۔ پان کی پیک پھینک سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں یہ ہے کہ راستہ چلتے اگر کوئی ضروری حاجت تک کرے تو غسل خانہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ جنٹلمین کا نشان دیکھنا پڑتا ہے یہاں ذرا اک گردن جھکائی اور کسی بھی دیوار کے سامنے ہیں بیٹھ گئے۔ ناک ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے آپ اپنی ناک پر رومال رکھ لیجیے۔ پاس سے گزرنے والا اپنی ناک پر رکھے گا خواہ مخواہ لوگ ایک ذاتی مسئلے کو سماجی مسئلہ بنا لیتے ہیں دوسرے ملکوں میں۔"

ابن انشا کے سفر نامے "نگری نگری پھرا مسافر" سے اہم باب جنہیں کی خواہش

تھیں گو ان چیزوں کی مجموعی قیمت چار پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی لیکن حلیمہ کو انھیں جمع کرنے میں کئی برس لگے تھے۔

بہرحال اب سب نے مل کر چودہ سو روپے کا بجٹ بنایا۔ کچھ چیزیں مثلاً دو چارپائیاں دو چٹائیاں چند ایک کپڑے برتن اور چاول وغیرہ انھوں نے گھر سے ہی لینے کا فیصلہ کیا۔ باقی اشیاء جن میں بنا ہوتی گھی، چینی، مرچ مصالحے، ایک ٹرنک، ایک واٹر کولر اور ایک زنانہ جوتا شامل تھا۔ نزدیکی شہر ڈسکہ سے تاج دین کو لانی تھیں۔ چودہ سو روپے میں سے پانچ سو روپے حلیمہ نے تاج دین کو تھما دیے اور کہا کہ بڑی احتیاط اور کفایت شعاری سے خرچ کرنا۔ ابھی پانچ چھ روز باقی ہیں، کوئی جلدی نہ کرنا گھوم پھر کر سودا لینا۔ چینی، گھی اور زنانہ جوتا پہلے لے لینا۔ باقی چیزوں کے بارے میں بعد میں سوچنا۔ تاج دین نے گھر والوں کی تمام نصیحتیں پلوؤں کے ساتھ پلے سے باندھ لیں۔

اکبر نے کہا "ابا! مجھے بھی ملتی تو میں چلا جاتا لیکن گھبرا مت، جاچا عبدل تجھے کسی طرح کی پریشانی نہیں ہونے دے گا وہ داڑھی میں چھپا سہی ہے، بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ منڈی میں اس کے داماد کی دکان ہے، سستا سودا لے کر دے گا۔ میں نے اسے خط میں لکھ دیا ہے۔ شکل دیکھتے ہی تجھے پہچان لے گا۔"

★

تاج دین خریداری کے لیے ڈسکہ روانہ ہوا لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی قوت خرید ختم ہو گئی۔ بس کی بھیڑ میں اس کے پیسے نکل گئے اور اس جانکاہ صدمے کا علم اسے اس وقت ہوا جب بس اسے "بنگلا" نامی اسٹاپ پر اتار کر بہت دور جا چکی تھی۔ یہاں سے تاج دین کو شہر جانے کے لیے دوسری بس پکڑنا تھی مگر بس پکڑنے سے پہلے ہی اس کا دل کیلا کھانے کو چاہا۔ دو کیلے خریدنے کے لیے جونہی اس نے ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا اسے معلوم ہوا کہ وہ تو لٹ چکا ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنے لباس کا ہر حصہ ٹٹول ڈالا مگر پانچ سو روپے کہیں نہیں تھے۔ زمین و آسمان اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ کانوں میں ڈھولک کی تھاپ پڑی اور گھر والوں کے مسکراتے چہرے تصور میں آ گئے۔ . . . آہ اب کیا ہوگا؟ اس نے ڈوبتے دل سے سوچا۔ وہ کیا منہ لے کر گھر جائے گا۔ کس طرح یہ خبر سنا پائے گا۔ ٹہلنوں میں کھڑا کھڑا وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ ہزاروں اندیشوں نے اسے گھیر لیا اور دیوانہ وار اس کے گرد ناچنے لگے۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ قریب بہتی نہر میں کود کر خودکشی کر لے۔ . . . لیکن یہ حوصلے کا عمل نہیں تھا۔ جان دینے سے اس کی پیٹی کی ٹوٹل نہیں ٹوٹتی تھی۔ اس کے لیے وہ سامان درکار تھا جو بیچ لینے آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے لیے پانچ سو روپے کی ضرورت تھی۔ تاج دین نے سوچا۔ وہ چیچے تو واپس جا کر مصیبت اپنی مصیبت بیان کرے لیکن کیسے؟ اس نے تو پیسے ہی بہت بڑا جیسا حوصلہ کر کے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ کیا وہ پھر اس کے سامنے دست سوال پھیلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر وہ صفیہ کے سامنے دست سوال نہیں پھیلا سکتا تھا تو پھر اور کون رہ جاتا ہے۔ زندگی میں اس نے ان گنت مشکلیں جھیلی تھیں لیکن کبھی سوالی نہیں بنا تھا۔ ہر حالت اور ہر دور میں سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ تاج دین کے پاس بہت کچھ ہے لیکن حسرت قناعت کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو کسی سے آنکھ ملانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگانا شروع کیا کہ گھر میں اس کے ذاتی استعمال کی کون کون سی چیزیں موجود ہیں، جن کو بیچ کر وہ کیا حاصل کر سکتا ہے۔ ایک پیتل کے ہینڈے والا لوٹا، ایک گرم چادر، ایک پگڑی، دو سیر تمباکو اور لکڑی کا ایک صندوق، شاید ان سب چیزوں کو بیچ کر وہ

ڈیڑھ سو روپے بھی حاصل نہ کر سکے پھر وہی سوال منہ پھاڑے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اب وہ کیا کرے، کہاں جائے، اچانک ذہن میں آیا کہ کیوں نہ پول ڈسکہ چلا جائے اور وہاں معماروں کے پیچھے اینٹیں وغیرہ ڈھونے کی مزدوری کرے۔ مزدور کی بیگار ایک دن میں پچاس ساٹھ روپے کے لگ بھگ تھی۔ اگر کسی نہ کسی طرح وہ پانچ چھ روز لگا لیتا تو نقصان پورا ہو سکتا تھا لیکن کیا کوئی اُسے مزدوری دینے پر تیار ہو جائے گا، اُسے معلوم تھا کہ مزدوری دینے والے تو ہاڑ اور ہٹا کٹا جسم دیکھتے ہیں اور اُس کے پاس ایک ڈھانچ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پھر بھی قسمت آزمانے کے لیے وہ ایک قریبی عمارت پر چلا گیا۔ وہاں تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک ٹھیکیدار نما شخص سے کام کو سطالبہ کیا تو اُس نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا جیسے اُس کا مالی المنیر سمجھ گیا ہو اور جیب سے بچا کھچا پیسے نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیے۔ تاج دین نے ہاتھ یوں کھینچا جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھر اُس کے ہونٹوں سے صرف 'بابو' کا لفظ نکلا اور وہ اپنا غصہ ضبط کرتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

★

یہ تاج دین کی دربدری کا تیسرا دن تھا۔ وہ نہ سو سکا تھا اور نہ والپس قصبے میں۔ رات کو مسجد میں پڑ کر لیٹ رہتا اور صبح کسی مزدوری کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔ وہ جانتا تھا، اب گھر میں اُس کی واپسی کا شدت سے انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ شادی کی تیاری ہو چکی ہوگی اور حلیمہ کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا ہوگا۔

خاتوں سے نڈھال، تھکا ماندہ تاج دین انھی سوچوں میں گم پھر رہا تھا۔ قریب ہی گھوشاہ نامی ایک اللہ والے کا مزار تھا۔ تاج دین ایک دو بار پہلے بھی یہاں دُعا مانگنے آ چکا تھا۔ اُس کے دل میں آئی کہ کیوں نہ مشکل میں دادرسی کے لیے اس اللہ والے کو وسیلہ بنایا جائے۔ نیا پٹنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ وہ پیدل ہی مزار کی طرف روانہ ہو گیا۔ . . مزار پر پہنچا تو ارد گرد رونق نظر آئی۔ دکانیں لگی ہوئی تھیں اور کھیل تماشے کا سامان بھی تھا۔ اہم میلے کے اولین وقت میں سب کچھ سویا سویا سا تھا۔ تاج دین سمجھ گیا کہ عرس شروع ہونے والا ہے یا ہونے والا ہے . . . اسے اس ہنگامے سے غرض نہیں تھی، وہ صرف دعا مانگنا چاہتا تھا۔ مزار کے احاطے میں پہنچ کر اُس نے گڑگڑا کر دعا مانگی اور کافی دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

روتے روتے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ وہ باہر نکلا تو سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ بھوک اور پریشانی میں وہ رات بھی ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ طبیعت میں عجیب کسلمندی تھی۔ قریب ہی کنواں چلتا دیکھ کر اُس نے نہانے کا سوچا۔ سر کا بڑا سا صافہ اُس نے کمر کے گرد باندھ کر کپڑے اُتارے اور نہانے لگا۔ سیر ہو کر نہانے کے بعد اُس نے کپڑے پہن لیے اور گیلا صافہ دھو کر نچوڑ لیا۔ کچھ دُور جوار کے کھیتوں کے پاس دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر اُس نے صافہ دھوپ میں پھیلا دیا اور خود پاس ہی کھیت کی منڈیر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ مسحور کن ہوا خمارآلود چل رہی تھی۔ تین رات کے تھکے ماندے اور جاگے ہوئے تاج دین کو مناسب ماحول ملا تو وہ تمام اندیشوں کو بھول کر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ سچ ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

تاج دین جس پگڈنڈی پر سویا، درحقیقت وہ ایک معروف راستہ تھا۔ شمال و دیہات سے مزار کی طرف آنے والے تمام زائرین اسی راستے سے گزرتے تھے۔ جوں جوں سورج اوپر آتا گیا، اس راستے کی چہل پہل میں اضافہ ہوتا گیا۔ رنگ برنگے لباسوں میں مرد و زن، بچے بوڑھے جوان مزار کی طرف گامزن نظر آنے لگے۔ پھر کسی خدا ترس نے ایک پریشان حال بوڑھے کو صافہ پھیلائے بڑی بے چارگی سے زمین پر لیٹے دیکھا۔ بوڑھے کا ایک ہاتھ فریادی انداز میں آگے کو پھیلا ہوا تھا۔ خدا ترس راہگیر نے تھم رو کے اور جیب سے پچاس پیسے کا ایک سکہ نکال کر چادر نما رومال پر اُچھال دیا۔ یہ سکہ خشک زمین پر بارش کے پہلے قطرے جیسا تھا . . . آج عرس پورے جوبن پر تھا اور مختلف اطراف سے لوگوں کا سیلاب مزار کی طرف اُمڈا آ رہا تھا۔ سارا دن تاج دین کی جھولی بھر سکے اور کرنسی نوٹ گرتے رہے اور وہ تین راتوں کا جاگا تھکن سے نڈھال سویا رہا۔

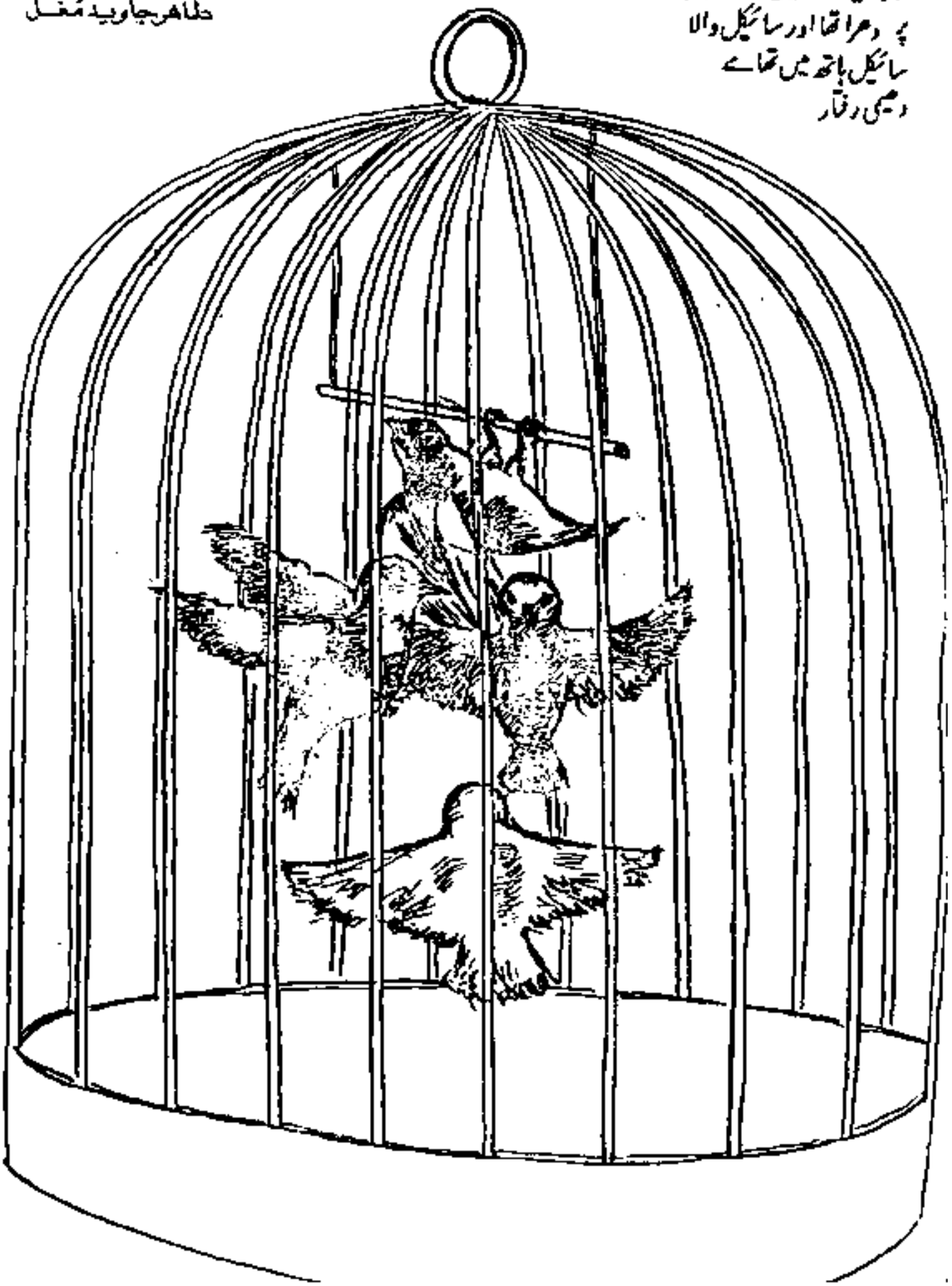
سورج ڈوب گیا اور دھوپ غائب ہونے سے فضا میں ہلکی سی خنکی رچ گئی تو تاج دین جاگ گیا۔ آنکھ کھلتے ہی خوابوں کا طلسم ٹوٹ گیا اور گم شدہ پانچ سو روپے اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ اُس کے ذہن میں در آئے۔ تب اُس کی نگاہ اپنے سامنے گئی اور وہ ششدر رہ گیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے دھندلاتے پرسکوں اور نوٹوں کا ایک چھوٹا سا انبار نظر آ رہا تھا . . . وہ کتنی ہی دیر سکتے کی کیفیت میں گم سم بیٹھا رہا۔ اُس کے سامنے سے گزرنے والا راستہ اب خالی تھا مگر تاج دین کا دامن خالی نہیں رہا تھا۔ اچانک آنسو اُس کی آنکھوں سے لگاتار گرنے لگے۔ اُس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا پھر رومال کے پلوؤں کو نے پکڑ کر باندھنے لگا۔

تجسس فطرت کے حامل ایک لڑکے کے خیالات و احساسات۔ ایک لامتناہی زنجیر کے چند حلقے اس کی مقل کمر حیران کیے دے رہے تھے۔ چند چڑیوں کی اسیری پر پریشان اس لڑکے کا دام خیال ڈلا اور وسیع ہوا تو ایک عالم اس میں سما گیا۔

مقروض چڑیاں

طاہر جاوید مغل

وہ چھوٹی سی چڑیا چھوٹے سے پنجرے میں بند تھی اور بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ پنجرا ایک سائیکل کے کیریئر پر دھرا تھا اور سائیکل والا سائیکل ہاتھ میں تھامے دھیمی رفتار



سے پیدل چلا جارہا تھا۔ چڑیا کو پنجرے میں چکراتے دیکھ کر فرقان کو نہ جانے کیوں اپنے والد یاد آگئے۔ وہ بھی تو اسپتال کے ایک چھوٹے سے کیبن نما کمرے میں اسی طرح پندرہ روز سے پھڑپھڑاتے رہے تھے۔ وہ دل کے مریض تھے۔ انہیں اچانک ایک روز دل میں درد کی شکایت بڑھ گئی تھی اور گھر والوں نے انہیں اسپتال پہنچادیا تھا۔ کارڈیالوجی وارڈ کے "آئی سی یو" میں انہوں نے اپنے آخری دن بے حد اضطراب میں گزارے تھے۔ پورے دو ہفتے انہیں نیند آئی تھی اور نہ ان کے سانس کی روانی لوٹی تھی۔ وہ سرتاپا مختلف نالیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ گلوکوز کی نالیاں' گیس کی نالیاں' دھڑکن کی رفتار بتانے والے آلے کی نالیاں۔ ایک جال سا تھا ان کے اردگرد اور یہ بھی انہیں معلوم تھا کہ وہ اب اس جال سے نکل نہیں سکیں گے۔ وہ آخری سانسیں لینے سے پہلے ایک مرتبہ نیلا آسمان دیکھنا چاہتے تھے۔ دن کی روشنی' دھوپ کی چمک' ہوا کی روانی' برگ وبار کی ہریالی اور اپنے گھر کا آنگن' ان سب چیزوں کو ان کی آنکھیں ترس رہی تھیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ اصرار کیا تھا کہ انہیں شیشے کے اس کیبن سے نکال کر ایک مرتبہ کھلی فضا میں لے جایا جائے۔ لیکن بوجوہ ایسا نہیں ہوسکا تھا۔ اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے پندرہویں روز وہ اسی نیم روشن کیبن میں دم توڑ گئے تھے۔

چودہ سالہ فرقان کو کبھی کبھی شیشے کا وہ منحوس کیبن یاد آتا تھا تو اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ آج چڑیا کو پنجرے میں مضطرب دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے لگا کہ وہ اپنے جاں بلب والد کو آئی سی یو کے کیبن میں دیکھ رہا ہے۔ اس نے سائیکل والے نوجوان کو ہاتھ دے کر روکا اور بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ چڑیا بیچو گے؟" اس نے پوچھا۔

"بیچنے کے لیے ہی تو پھر رہا ہوں" لڑکے نے جواب دیا۔

"کتنے کی ہے؟"

"پانچ روپے کا جوڑا دیتا ہوں۔ بس ایک رہ گئی ہے تم دو روپے دے دو۔"

وہ پہلے تو چڑیا کی کم قیمت پر حیران ہوا۔ پھر اس بات پر حیران ہوا کہ لوگ ان چڑیوں کو خرید کر کیا کرتے ہیں۔ اس کی یہ حرکت سوال بن کر اس کی زبان پر آگئی "لوگ یہ چڑیاں خرید کر کیا کرتے ہیں؟"

نوجوان مسکرایا "کرتے کچھ نہیں' بس چھوڑ دیتے ہیں۔ کئی لوگوں نے منت مان رکھی ہوتی ہے' کئی ویسے ہی نیکی کماتے ہیں۔"

اب بات فرقان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے جھٹ نیکر کی جیب سے دو روپے کا نوٹ نکال کر نوجوان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے کنڈی ہٹا کر پنجرے سے چڑیا نکالی اور فرقان کے ہاتھ میں تھمادی۔ چڑیا کا ننھا سا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فرقان نے اپنی انگلیوں کی گرفت نرم کی۔ وہ پھر سے نکلی اور اڑ گئی۔ فرقان اسے دور تک اڑتے دیکھتا رہا۔ ایک عجیب سی خوشی کا احساس اس کے رگ وپے میں سرایت کرگیا۔

اس کے بعد یہ قریباً روز کا معمول بن گیا "چڑیوں والا" نوجوان پنجرہ سائیکل پر رکھے فرقان کے گھر کے سامنے سے گزرتا اور مخصوص انداز میں آواز لگاتا "چڑیاں والا۔"

فرقان بھاگتا ہوا باہر نکلتا۔ امی' دادا' دادی اور دیگر اہل خانہ سے اس نے جو رقوم بٹوری ہوتیں وہ چڑی فروش کے حوالے کرتا اور کم از کم آٹھ دس چڑیاں روز چھڑا لیتا۔ وہ بہت فرحت بخش لمحات ہوتے جب وہ اپنی کانپتی چڑیوں کو ہاتھ میں لیتا اور ایک ایک کرکے انہیں فضا میں چھوڑتا۔ ایک تہوار کے موقعے پر تو اس نے پورے دو سو روپے کی چڑیاں "چڑی فروش" سے رہا کروائیں۔

روپے پیسے کی فرقان کو کمی نہیں تھی۔ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد ایک بڑے صنعت کار تھے۔ ان کی وفات کے بعد اب سارا کام اس کی والدہ نے سنبھال لیا تھا۔ وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور گھر میں اس سے لاڈ پیار بھی خوب ہوتا تھا۔ اس کے اندر سوچ بچار اور تحقیق کا مادہ شروع سے تھا۔ ہر بات کی گہرائی میں جاتا اور پہروں بیٹھا لاینحل مسئلے حل کرتا رہتا۔ جب والد کی وفات ہوئی' اس کی عمر بمشکل بارہ سال تھی۔ اس عمر کے بچے کو اپنے والدین کی بیماری کے حوالے سے تشویش تو ہوتی ہے لیکن یہ جستجو نہیں ہوتی کہ انہیں کیا بیماری ہے' کیوں لاحق ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ؟ فرقان کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف تھا۔ وہ والدہ سے ٹوہ لینے والے سوالات پوچھتا رہتا تھا اور اسے اپنے والد کی پریشانیوں کے بارے میں کافی کچھ پتا چل چکا تھا۔ اس کے والد ایک بہت بڑے کارخانے دار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے مقروض بھی تھے۔ لاکھوں روپے قرض لے رکھا تھا انہوں نے اور کاروبار میں نقصان کے سبب یہ قرض ادا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ یہی مسلسل اور روز افزوں پریشانی تھی جس نے انہیں پہلے دل کا مریض بنایا اور پھر جان لے لی۔

تمام چھوٹے بڑے مسائل اور معاملات کی طرح اس "چڑیوں والے" معاملے پر فرقان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ مخلصانہ انداز میں غور کرتا اور اسے محسوس ہونے لگتا کہ ان چڑیوں کی مصیبت کا اصل ذمے دار تو وہ خود ہے اور وہ سارے لوگ ہیں جو چڑیاں خرید کر چھڑواتے ہیں۔ اگر وہ یہ "نیکی" کمانے سے باز آجائیں تو چڑیاں پکڑنے والے خود بخود اس کاروبار کو خیرباد کہہ دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

وقت گزرتا رہا فرقان تقریباً روزانہ اپنے جیب خرچ میں سے بیس پچیس روپے خرچ کرکے چڑیاں چھڑواتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں "چڑی فروش" کے خلاف ایک طرح کی نفرت بھی پروان چڑھتی رہی۔ وہ کیوں ایسا دل دکھانے والا کام کرتا تھا۔ وہ بے زبان پرندوں کی معصومیت کا تاوان خدا ترس لوگوں سے وصول کرتا تھا اور بار بار کرتا تھا۔ فرقان کے ذہن میں یہ بات بیٹھتی چلی گئی کہ اصل نیکی چڑیاں چھڑوانا نہیں بلکہ چڑی فروش کو اس کام سے روکنا ہے۔ اس نے کئی بار چڑی فروش سے کہا کہ وہ یہ کام چھوڑ دے۔ چڑی فروش اس کی بات کو بچگانہ خیال کرکے مسکرا دیتا اور یہی چیز تھی جو فرقان کو مشتعل کردیا کرتی تھی۔ اسے سخت برا لگتا تھا کہ اسے بچہ سمجھا جائے اور کم عمر جان کر اس کی بات کو اہمیت نہ دی جائے۔ یہاں تک کہ والدہ بھی اسے کسی وقت لاڈ سے پچکار دیتی تھیں تو وہ خفا ہوجاتا تھا۔

چڑی فروش کے رویّے نے فرقان کی جلتی پر تیل کا کام کیا اور اسے چڑی فروش کی صورت سے نفرت ہوگئی۔ ایک دن فرقان نے چڑی فروش کے سلسلے میں نادر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ نادر انسی کے محلے کا ایک لڑکا تھا۔ عمر میں فرقان سے ڈیڑھ دو سال بڑا ہوگا لیکن قد کاٹھ میں چار پانچ سال بڑا لگتا تھا۔ اس کے والد سینئر پولیس سرجن تھے۔ نادر محلے کا سب سے ہٹا کٹا اور تیز و طرار لڑکا مشہور تھا۔ اس نے اردگرد کے چند شریر اور تند مزاج لڑکوں کو اکٹھا کرکے گینگ سا بنا رکھا تھا۔ ان میں سے دو تین لڑکوں کے پاس موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ وہ اکثر ایک ایک موٹر سائیکل پر تین تین سوار ہوکر کالونی کی اندرونی سڑکوں پر آوارہ گردی کے لیے نکل جاتے۔ دوڑیں لگاتے، لوگوں پر آوازے کستے، سائیکل سواروں کو تنگ کرتے اور کبھی کبھی کسی دوسرے محلے میں جاکر مارپیٹ بھی کرآتے۔ نادر ان سب کا لیڈر تھا اور وہ اسے دل و جان سے لیڈر سمجھتے بھی تھے۔ فرقان اس گروپ کا باقاعدہ ممبر تو نہیں تھا لیکن اکثر وہ ان کے ساتھ مل بیٹھتا۔ خاص طور پر جب شرط لگاکر دھواں دھار کرکٹ میچ کھیلے جاتے، وہ ضرور اس گروپ کی طرف سے حصہ لیتا۔

ایک چلچلاتی دوپہر میں جب گلیاں، بازار سنسان نظر آرہے تھے۔ فرقان، نادر کو چلڈرن پارک میں لے گیا۔ نیم کے ایک گھنے پیڑ تلے بیٹھ کر اس نے نادر سے کہا "میرا جی چاہتا ہے نادر، اتنی مار ماری جائے اس چڑی فروش کو کہ وہ اس کام سے توبہ کرلے۔"

نادر نے پتلون کا پائنچہ اٹھا کر جراب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "مارپیٹ سے کیا ہوگا۔ چند دن بعد وہ خبیث پھر پرانی ڈگر پر آجائے گا۔ میں تمہیں ایک اور طریقہ بتاتا ہوں۔"

"وہ کیا؟" فرقان نے سوال کیا۔

"دیکھو، جب میں ساتویں کلاس میں تھا تو ایک اسٹوری بک میں، میں نے شاہ جہاں کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس نے تاج محل بنایا تھا ناں۔ کہتے ہیں کہ جن کاریگروں نے تاج محل تعمیر کیا شاہ جہاں نے ان کے ہاتھ کٹوا دیے تھے۔ پتا ہے کس لیے؟ اس لیے کہ وہ تاج محل جیسی کوئی اور عمارت کھڑی نہ کرسکیں اور یہ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں اکثر حکمرانوں نے اس طرح کے کام کیے ہیں۔ کسی سنگ تراش کے بازو کٹوا دیے، کسی کاریگر کی آنکھیں نکلوا دیں۔ کسی تیر انداز کی انگلیاں کٹوا دیں۔ مطلب یہ کہ کسی کو کسی کام سے ہمیشہ کے لیے روکنا ہو تو پھر اسی طرح کا انتظام کیا جاتا ہے۔"

فرقان حیران ہوکر بولا "تو تمہارا مقصد ہے کہ ہم بھی چڑی فروش کے ہاتھ کاٹ دیں؟"

"بالکل" نادر نے سرسراتے لہجے میں کہا "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"لل... لیکن... یہ کام ہوگا کس طرح؟"

"بھئی، یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ نذیر نام ہے اس کا۔ فردوس ٹاؤن کے پچھواڑے مہاجر آباد میں رہتا ہے وہ۔ ریلوے لائن کی دوسری طرف مکان ہے اس کا۔ اس کا ایک بھائی گلستان سنیما میں خوانچہ لگاتا ہے۔ میں اسے بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

فرقان نے کہا "یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر ہم کریں گے کیا؟"

"یہ بڑا سیدھا سادا کام ہے پیارے" نادر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا "جہاں تک میں جانتا ہوں

چڑی فروش نذیر کے گھر میں اس کے چھوٹے بھائی کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔ یہ چھوٹا بھائی بھی سہ پہر کو سینما چلا جاتا ہے۔ یعنی بات ہے کہ وہاں سے اس کی واپسی رات بارہ ایک بجے ہوگی۔ ہم رات کے پہلے پہر کسی وقت چڑی فروش کے گھر میں گھس کر "آپریشن مڈنائٹ" کر سکتے ہیں۔"

فرقان نے متفکر لہجے میں کہا "لیکن یار! اگر وہ مر گیا تو؟"

"نہیں مرے گا پیارے" نادر نے بے فکری سے کہا "ہم یہ مشن بڑے سائنٹیفک طریقے سے مکمل کریں گے۔ میں پاپا کا سرجری باکس اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ہم چہروں پر نقاب ڈال کر اس کے گھر میں گھسیں گے۔ پہلے اس کی مشکیں کسیں گے پھر سن کرنے والے انجکشن لگائیں گے اور دونوں ہاتھ کلائیوں پر سے "گرچ" کر دیں گے۔ آخر میں اس کی مرہم پٹی بھی کر دیں گے۔"

وہ دیر تک اس سنسان دوپہر میں نیم کے گھنے پیڑ تلے بیٹھے اس منصوبے کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

○☆○

دس بجے کا وقت تھا۔ وہ گرمیوں کی ایک حبس زدہ رات تھی۔ فرقان اور نادر ایک موٹر سائیکل پر سوار فردوس ٹاؤن پہنچے۔ موٹر سائیکل ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے لاک کرنے کے بعد وہ پیدل ہی مہاجر آباد کی طرف چل دیئے۔ صرف دس منٹ بعد وہ اس چھوٹے سے الگ تھلگ مکان کے سامنے پہنچ چکے تھے جس کے بوسیدہ دروازے پر نذید احمد کے نام کی "بوسیدہ تر" نیم پلیٹ لگی تھی۔ انہوں نے چاروں طرف گھوم کر مکان کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ دائیں پہلو کی جانب سے اندر گھسنا آسان رہے گا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اندر گھسنے کے پروگرام پر عمل کرتے مکان کا اکلوتا مکین باہر نکل آیا۔ فرقان اور نادر نے اسے دور ہی سے پہچان لیا وہ چڑی فروش نذیر احمد ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھیلا تھا۔ وہ پیدل ہی ریلوے لائن کی طرف بڑھا اور اسے عبور کر کے جنوب کی طرف چل نکلا۔ فرقان اور نادر کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے نذیر احمد کا تعاقب شروع کر دیا۔ کھیتوں اور جھاڑیوں کے درمیان قریباً ایک کلو میٹر چلنے کے بعد نذیر احمد اینٹوں کے ایک بھٹے پر پہنچا۔ بھٹہ اور اس کا گرد و نواح تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھٹے کے پچھواڑے صرف چند مکانوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ نذیر احمد ان میں سے ایک مکان کے اندر چلا گیا۔ فرقان نے نادر کی طرف دیکھا۔ نادر کی بے خوف نگاہوں میں تجسس کی چمک تھی۔ اس نے فرقان کا ہاتھ پکڑا اور اسے لیتے ہوئے مکانوں کی سمت چلا آیا۔ یہ چھانٹی شدہ اینٹوں کے مکانات بمشکل دس فٹ بلند تھے۔ تاہم ایک مکان کافی کشادہ اور بلند نظر آتا تھا۔ اس کی دیواروں پر پلستر کیا گیا تھا اور صحن میں پودے وغیرہ بھی لگے تھے۔ اس مکان کی ایک کھڑکی میں سے بلب کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ نادر اور فرقان بڑی احتیاط کے ساتھ کھڑکی کے سامنے پہنچ گئے اور ایک کوتاہ قامت بیری کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اندر جھانکنے لگے۔ ایک بھاری بھرکم پنکھا گھڑ گھڑ کی زوردار آواز سے چل رہا تھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے انہوں نے کمرے کا منظر دیکھا۔ ایک فربہ اندام شخص صرف ایک دھوتی پہنے مسہری پر نیم دراز تھا۔ اس کا بیشتر جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میلے کچیلے کپڑوں والی ایک سانولی سلونی جواں سال عورت اس شخص کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ اتنے میں ایک چھ سات سالہ بچہ اندر داخل ہوا۔ وہ صرف لمبی سی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ وہ بڑے سہمے ہوئے انداز سے آگے بڑھا اور پانی کا گلاس مسہری پر بیٹھے ہوئے شخص کو پیش کر دیا۔ اس شخص نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا اور ہاتھ کی پشت سے مونچھیں صاف کر کے "چڑی فروش" نذیر احمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نذیر احمد مجرموں کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہاں لائے ہو رقم؟" فربہ اندام شخص نے نذیر احمد سے پوچھا۔

"جج۔ جی مالک۔ لایا تو ہوں لیکن۔۔۔ پوری نہیں ہو سکی۔"

"کتنی ہے؟"

"ایک ہزار۔"

فربہ اندام شخص نے لیٹے لیٹے ایک زوردار ٹانگ نذیر احمد کی ناف میں رسید کی۔ وہ الٹ کر دروازے کے قریب گرا۔ تھیلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس میں سے روپے روپے والے بوسیدہ نوٹوں کی چند گڈیاں نکل کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ فربہ اندام شخص کی ٹانگیں دباتی ہوئی عورت سسکیوں سے رونے لگی۔ لیکن اپنی جگہ سے اٹھنے کی جرأت اس نے نہیں کی۔ اسے روتے دیکھ کر ننگی ٹانگوں والا بچہ بھی منہ بسورنے لگا۔ فربہ اندام شخص نے نذیر احمد کو گالی دی اور چلا کر بولا "دفع ہو جا یہاں سے۔ دو مہینے بعد ایک ہزار لے کر آ گیا ہے۔ آٹھ ہزار سے کم ایک پیسہ نہیں لوں گا میں اور وہ بھی ایک ماہ کے اندر اندر۔ اس کے بعد میں کسی چیز کا ذمے دار نہیں ہوں۔ بچ دوں گا ان حرام زادوں کو اور ایسی جگہ بھیجوں گا جہاں سے تیرا باپ بھی واپس نہ لا سکے۔" آخری جملہ

ادا کرتے ہوئے فریہ اندام شخص نے عورت اور بچے کی طرف اشارہ کیا تھا' جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ عورت اور بچے کو فروخت کرنے کی بات کر رہا ہے۔

نذیر احمد اٹھا اور گھگھیا کر بولا "مالک۔۔۔ یہ ظلم نہ کرنا۔ میں۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ بس دو مہینے کی مہلت دے دو۔"

"ایک دن اور نہیں ملے گا" فریہ اندام شخص گرجا۔

فرقان اور نادر نے دیکھا کہ نذیر احمد کے ایک ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ اپنی چوٹ سے بے خبر فریہ اندام شخص کے سامنے رونے گڑگڑانے میں مصروف ہے۔ فریہ اندام شخص کی لات کھا کر گرتے ہوئے اس کا ہاتھ پیڈسٹل فین کے جنگلے میں چلا گیا تھا اور اس کی انگلیاں شدید زخمی ہو گئی تھیں۔ بلب کی روشنی میں انگلیوں سے رستا ہوا خون چمک رہا تھا۔ یہی خون بہانے کے لیے فرقان اور نادر کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے لیکن اب یہ خون دیکھ کر انہیں قلق ہو رہا تھا۔

نادر نے فرقان کا کندھا دبایا اور اسے لے کر کھڑکی سے ہٹ آیا اور یہ اس نے اچھا ہی کیا تھا۔ کھڑکی کے سامنے زیادہ دیر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ کسی بھی لمحے دیکھے جا سکتے تھے۔

○☆○

نادر ایک چلتا پرزہ تھا۔ ہر ٹیڑھا کام کرنا وہ اپنے لیے چیلنج سمجھتا تھا۔ اگلے چند ہی گھنٹے میں اس نے اپنے ایک۔۔۔ ہمراز ملازم کے ذریعے فریہ اندام شخص کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیں اور یہ بھی جان لیا کہ نذیر احمد کے ساتھ اس کے جھگڑے کی کیا نوعیت ہے۔ فریہ اندام شخص کا نام راجا خان تھا۔ وہ پہلے ٹھیکے دار تھا اور کچھ ہی عرصے پہلے اس بھٹے کا مالک بنا تھا۔ نذیر احمد کا بڑا بھائی بشیر احمد کچھ عرصہ پہلے اس شخص کے بھٹے پر "تھیرے" کا کام کرتا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کی بیوی' بچے' ماں اور والد بھی اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ایک سال پہلے ایسی ہی شدید گرمیوں میں جب سورج سوا نیزے پر آیا ہوا تھا بشیر احمد بھٹے سے پکتی اینٹیں نکالتے ہوئے چکرا کر گرا اور پھر کبھی نہ اٹھ سکا۔ وہ بھٹے کے مالک سے قرض لے کر بہت سا روپیہ کھا چکا تھا اور اس کے اہل خانہ اتنا کام نہیں کرتے تھے کہ دس میں برس میں بھی یہ قرض چکا سکتے۔ لہٰذا وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ بھٹے کے مالک نے بشیر احمد کے اہل خانہ کو "یرغمال" بنا لیا۔ ان کی حیثیت راجا خان کے زر خرید غلاموں کی سی ہو گئی۔ ایک روز پہلے فرقان اور نادر نے جس عورت کو راجا خان کی ٹانگیں دباتے دیکھا تھا وہ بشیر مرحوم کی بیوہ تھی اور وہ بچہ جو کانپتے ہاتھوں سے پانی کا گلاس لیے اندر داخل ہوا تھا اس کا منجھلا بیٹا تھا۔

چڑی فروش نذیر احمد اپنے والدین' اپنی بھابی اور اس کے بچوں کو راجا خان کی قید سے رہائی دلانا چاہتا تھا۔ اس رہائی کی قیمت راجا خان نے آٹھ ہزار روپے رکھی تھی۔ نذیر اور اس کا خوانچہ فروش بھائی دن رات کوشش کر رہے تھے لیکن ابھی تک یہ رقم اکٹھی نہیں ہو سکی تھی۔

یہ تمام تفصیلات جان کر فرقان کو لگا' جیسے بھٹے کا مالک راجا خان بھی ایک چڑی فروش ہے۔۔۔ وہ چڑی فروش ہی تو تھا۔ اس نے بشیر احمد کے اہل خانہ کو ایک پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔ ان سے بیگار لیتا تھا اور ہر طرح کا ناروا سلوک ان سے کرتا تھا۔ وہ چڑیوں کی طرح اس کی قید میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی پھڑپھڑاہٹ سے راجا خان کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اگر کسی کو ان پر بہت ترس آتا ہے تو وہ سات آٹھ ہزار روپیہ دے اور ان کو چھڑا کر لے جائے۔ یہ تو بالکل وہی نقشہ تھا' وہی صیاد' وہی قیدی' وہی پھڑپھڑاہٹ اور وہی مقررہ قیمت آزادی کی۔ چڑیا پانچ روپے کا جوڑا' انسان آٹھ ہزار کا جوڑا۔

○☆○

ایک شام فرقان اور نادر دوبارہ بھٹے کے مالک راجا خان کے ڈیرے پر پہنچے۔ لیکن اس مرتبہ ان کے ساتھ نادر کے والد پولیس سرجن شجاعت درانی صاحب بھی تھے۔ وہ وردی میں تو نہیں تھے لیکن ان کا رعب داب دیکھ کر راجا خان کا ماتھا ٹھنک گیا۔ بعد ازاں جب انہوں نے راجا خان سے اپنا تعارف کرایا اور اصل موضوع پر آئے تو راجا خان کا رنگ پھیکا پڑنا شروع ہو گیا۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں جیسے خود بخود نیچے لٹکنے لگیں۔ اس نے بے حد معذرت کا لہجہ اختیار کیا لیکن ساتھ ساتھ اپنی مجبوریاں بھی بیان کیں۔ اس نے بتایا کہ وہ کوئی کام غیر قانونی نہیں کر رہا۔ اس نے شجاعت صاحب کو کچھ رجسٹر دکھائے جن پر انگوٹھے لگے ہوئے تھے۔ بہت سی رسیدیں بھی دکھائیں۔ پھر وہ بشیر کے اہل خانہ کو بھی درانی صاحب کے سامنے لے آیا۔ ان بے چاروں کے چہروں پر ندامت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ انہیں کوئی صفائی پیش کرنا تھی اور نہ حق دعویٰ کرنا تھا۔ وہ بہ زبان حال تسلیم کر رہے تھے کہ وہ مقروض ہیں اور راجا خان ان کے ساتھ جو کر رہا ہے بجا ہے۔

درانی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو راجا خان اس کو ہائل کرلیتا لیکن انہوں نے بڑی "پکی گولیاں" کھیل رکھی تھیں۔ انہوں نے راجا خان کی سب سے نازک رگ پر ہاتھ رکھا اور دریافت کیا کہ اس نے بشیر کی جواں سال بیوہ کو کس حساب میں اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟ راجا خان بری طرح گڑبڑا گیا۔ حالانکہ بشیر کی بیوہ اس کی مرضی کے مطابق بیان دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اسے راجا خان سے کسی طرح کی شکایت نہیں لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر معاملہ تھانے کچہری میں چلا گیا تو مصیبت میں پڑ جائے گا۔ وہ جلد ہی منت سماجت پر اتر آیا۔ درانی صاحب نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بشیر کی اہلیہ اور دو نابالغ بچوں کو راجا خان کے حبس سے نکال لیا۔ بشیر کے والدین اور اس کے ایک بڑے لڑکے نے مجبوراً باتیم رضامندی سے یہ بیان دیا کہ وہ بھٹے پر کام کرنا چاہتے ہیں اور یہیں بھٹے پر رہنے میں انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس طرح "کچھ لو اور کچھ دو" کی بنیاد پر یہ معاملہ طے ہو گیا۔

اس مرحلے پر فرقان کو راجا خان بھی مظلوم نظر آنے لگا۔ وہ شجاعت صاحب کے سامنے بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا اور بار بار ہاتھ جوڑ رہا تھا "جناب! میں مجبور ہوں ورنہ یقین کریں میں بشیر کے بال بچوں میں سے کسی کو اپنے پاس نہ رکھتا" اس نے ایک فائل نما کاپی شجاعت درانی صاحب کے سامنے رکھ دی "یہ دیکھیں جناب! بھٹے کی ساری زمین اور یہاں کی ایک ایک اینٹ گروی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی بیس ایکڑ زمین بیچ کر یہ پراپرٹی خریدی تھی۔ ان دنوں یہ کام بڑا ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔ لیکن پھر ایک بہت بڑی پارٹی "نیازی اینڈ کمپنی" بیچ میں کود پڑی۔ وہ جو لوگ کہتے ہیں ناں جی کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے' یہ پارٹی بھی علاقے کے بیشتر بھٹہ مالکان کو کھا گئی۔ اب وہ سارے اپنے بھٹے نیازی اینڈ کمپنی کو بیچ رہے ہیں۔ جو میری طرح چوں چراں کر رہے ہیں اور کاروبار بچانے کے چکر میں ہیں ان کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔ ہم بھی کوئی راجے مہاراجے تو نہیں ہیں جی۔ دوڑ دھوپ کر کے زندگی کی گاڑی کھینچ رہے ہیں۔ اب ڈاکٹروں نے میری بیوی کی کمر میں کینسر کا پھوڑا بتایا ہے۔ اس کے علاج کے لیے لاکھوں درکار ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں جہاں روٹی کے لالے پڑے ہوں وہاں لاکھوں کہاں سے آئیں گے۔ مر جائے گی کسی دن۔"

راجا خان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ ان لمحوں میں فرقان کو لگا جیسے خود راجا خان بھی ایک چڑیا ہے۔

وہ اور اس جیسی کئی دوسری چڑیاں نیازی اینڈ کمپنی نے پکڑ کر پنجرے میں بند کر رکھی ہیں۔ وہ چڑیاں پھڑپھڑا رہی ہیں۔ چیخ چلا رہی ہیں۔ کبھی تھک ہار کر بیٹھ بھی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے دانے دُنکے پر بھی چونچ مار لیتی ہیں لیکن ہیں سخت مصیبت میں۔

اُس روز گھر آ کر فرقان بہت دیر تک اپنے بیڈ روم میں بند' سوچوں کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا رہا "نیازی اینڈ کمپنی۔ نیازی اینڈ کمپنی" بار بار یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ جانتا تھا' ہر کمپنی کا ایک سربراہ ہوتا ہے۔ اس کمپنی کا بھی ایک سربراہ تھا۔ وہ ایک ٹھنڈے ٹھار ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر ان بہت سے بھٹوں کو کنٹرول کر رہا تھا جہاں پسینہ پانی کے مانند بہایا جاتا ہے اور دہکتی آگ کے سامنے خون بھاپ بن کر اڑتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس سربراہ کا پتا کرواتا اور پھر کسی شب ناور کے ساتھ مل کر اس کے گھر میں گھستا اور وہ ہاتھ کاٹ ڈالتا جو دوسروں پر عرصہ حیات تنگ کرتے تھے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اتفاقاً وہ اس کمپنی کے کرتا دھرتا کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا' وہ شخص بھی اتنا "ظالم" نہیں جتنا نظر آتا ہے بلکہ اسے ظالم کہنا ہی غلط تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو خود بھی ایک چڑیا تھا۔ وہ پورے پندرہ روز ایک اسپتال کے کارڈیالوجی وارڈ میں شیشے کے چھوٹے سے کیبن میں پھڑپھڑاتا رہا تھا۔ قدرتی روشنی کی ایک کرن اور ہوا کے ایک جھونکے کو ترستا رہا تھا۔ اسے اَن دیکھے ہاتھوں نے پکڑ کر ان دیکھے پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔۔۔ اور پھر وہ مر گیا تھا۔ اب اس کی بیوہ اس کی نیم دیوالیہ کمپنی کو چلا رہی تھی۔۔۔ وہ فرقان کی ماں تھی۔ وہ اپنی ماں کے ہاتھ کیسے کاٹ سکتا تھا۔ وہ نہیں کاٹ سکتا تھا اپنی ماں کے ہاتھ۔

وہ سوچتا رہا۔ درجہ بدرجہ' آگے اور آگے بہت سے صیاد اس کے پردہ تصور پر نمودار ہوتے رہے۔ دھیرے دھیرے اسے لگنے لگا کہ یہ ملک بھی ایک چڑیا ہے۔ اس جیسی بہت سی چڑیاں ایک سفید فام صیاد نے پکڑ کر آہنی پنجرے میں بند کر رکھی ہیں اور پنجرے پر ایک پلیٹ لگا رکھی ہے' اس پلیٹ پر لکھا ہے۔ "مقروض چڑیاں" اس ظالم صیاد تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔

وہ بچہ ہونے کے باوجود بچہ نہیں تھا لیکن سمجھ دار ہونے کے باوجود اتنا سمجھ دار بھی نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب آسانی سے اس کی سمجھ میں آ جاتا لہٰذا۔۔۔ وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔

چراغ کہکشاں

ظاہر جاوید مغل

ذکیہ نصابت کی مسیحائی کو مقصد حیات بنانے والی نوجوان لڑکی کی کہانی۔ حالات کی کٹھن گھاٹیاں اور راہ کے کانٹے بھی اس کے استقامت میں جنبش نہ لا سکے۔ یہ خاردار پگڈنڈی کی کوشش میں اس کی روح تک لہولہان ہوگئی۔ جب اُس نے آسان راہ اپنائی چاہی تو مسافت اور بڑھ گئی۔

آپ کے من موہنے صفحے کی نئی سج دھج کے لیے خصوصی کاوش

ڈاکٹر حماس امریکا چلا گیا تو صباحت خود کو ایک دم تنہا محسوس کرنے لگی۔ ان دونوں کا بہت گہرا ساتھ تھا۔ میڈیکل کالج میں دونوں نے سات برس کا عرصہ جسم اور سائے کی طرح گزارا تھا۔ یہ ڈاکٹر حماس کی پُرخلوص اور دلنشیں رفاقت ہی تھی جس نے صباحت کو ڈاکٹر بننے میں مدد دی اور اس کا وہ خواب پورا کیا جو وہ کم و بیش پندرہ برس تک شب و روز دیکھتی رہی تھی۔ صباحت کے والد ایک بزنس مین تھے۔ اُن کا اوڑھنا بچھونا بزنس تھا۔ اپنے دونوں بیٹوں کی تربیت بھی انہوں نے خالص کاروباری نقطۂ نظر سے کی تھی اور اس تربیت کے بعد وہ دونوں بہت پیسہ کما رہے تھے۔ ایک امریکی شہریت حاصل کرچکا تھا اور دوسرا کینیڈا جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ صباحت کے ڈیڈی اسے بھی ایم بی اے کرانا چاہتے تھے مگر وہ شروع سے مسیحائی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ درحقیقت صباحت کا مزاج اپنے پورے گھرانے سے مختلف تھا۔ وہ زر پرستی اور نمود و نمائش سے کوسوں دور تھی۔ سادگی، قناعت، محنت اور دردمندی کے اوصاف اسے اپنی مرحومہ ماں سے ورثے میں ملے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکپن سے ہی اس کی اپنے ڈیڈی سے بن نہ سکی۔ اُس نے اپنے راستے خود چُنے اور اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے گزارنے کی پلاننگ کی۔ بعض اوقات اسے خود سر اور ضدی بھی سمجھا گیا۔ کبھی کبھار والد اور بڑے بھائیوں کی طرف سے ڈانٹ ڈپٹ کی نوبت بھی آئی مگر وہ اپنے منتخب کردہ راستے پر آگے بڑھتی رہی۔ اس کا ہاتھ حماس کے ہاتھ میں رہا۔ ڈگمگاتے قدم بار بار سنبھالتے رہے اور آخر وہ ڈاکٹر بن گئی۔ ڈاکٹر بننے کے بعد وہ بہت خوش تھی۔ اس کی آنکھیں بڑے سہانے سپنے دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہی دنوں اسے اوپر تلے دو شدید صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بڑے بھائی جو امریکا میں تھے، وہاں ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ ان کی موت کا سب سے زیادہ دکھ ڈیڈی کو ہوا۔ وہ مرحوم کو اپنا جانشین تصور کرتے تھے۔ اس حادثے کے چند روز بعد ڈیڈی کو دل کا شدید اٹیک ہوا۔ انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں انہیں اوپر تلے کئی اٹیک ہوئے اور وہ بھی صباحت کو داغِ مفارقت دے گئے۔ چھوٹا بھائی سکندر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسا چکا تھا۔ اس دنیا میں دولت تھی، ہنگامے تھے، رنگینیاں تھیں، کاروبار تھا، سیاحت تھی۔ اگر نہیں تھی تو صباحت نہیں تھی۔ برسوں ایک چھت تلے رہنے کے بعد بھی وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ درحقیقت ڈیڈی کی موت کے بعد صباحت بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ لاوارثی کے اس کربناک دور میں ڈاکٹر حماس کی ذات ہی تھی جس نے صباحت کو سہارا دیا اور اس قابل کیا کہ وہ ان عظیم صدموں کو سہہ سکے۔

اب جبکہ ڈاکٹر حماس بھی تعلیم کے سلسلے میں امریکا چلا گیا تھا، صباحت خود کو بہت اکیلا محسوس کررہی تھی۔ گھر کی چاردیواری میں اس کا دم گھٹتا تھا اور شہر کے گلی کوچے حماس کے بغیر کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے۔ پہلے تو حماس کے خط جلدی جلدی آتے تھے۔ پھر وہ کئی کئی ہفتوں کے وقفے سے آنے لگے۔ ایسے ہی ایک طویل اور بہت آزما وقفے کے دوران صباحت کے دل میں دھیرے دھیرے وہ خواہش سر اٹھانے لگی جس کی نمو بہت عرصہ پہلے ہوچکی تھی۔ تقریباً دس برس پہلے۔ اس وقت وہ دسویں میں پڑھتی تھی۔ ایک روز اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر اس نے کہا تھا "امی! میں ڈاکٹر بنوں گی... اور وہ کام کروں گی جس کا وعدہ تو سب کرتے ہیں لیکن کرتا کوئی نہیں۔"

ماں نے مسکرا کر اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا اور پوچھا تھا "کون سا کام بیٹی؟" صباحت نے کہا تھا "امی جب لڑکے ڈگریوں کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملتا ہے تو وہ کہتے ہیں، ہم ڈاکٹر بن کر گاؤں انسانیت کی خدمت کریں گے، مگر پھر وہ شہر کی ایسی سڑک پر کلینک بنا کر بیٹھ جاتے ہیں، جہاں ان سے پہلے درجنوں ڈاکٹر بیٹھے کھیاں مار رہے ہوتے ہیں۔ وہ اسی کو قوم کی خدمت سمجھ لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ دور دراز علاقوں میں ہزاروں لوگ ان کے وجود کو ترس رہے ہیں۔"

"تو تم ڈاکٹر بن کر گاؤں میں کلینک کھولو گی؟"

"انشاءاللہ" صباحت نے جواب دیا تھا "میں ڈاکٹر بن گئی تو

مرور ایام کروں گی" اب جبکہ وہ واقعی ڈاکٹر بن چکی تھی' ماں سے کی ہوئی بات بار بار اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ حماس نے جانے کے چند ماہ بعد صباحت نے چپکے چپکے اپنے پروگرام کو عملی شکل دینی شروع کر دی۔ حافظ آباد روڈ سے کچھ ہٹ کر ناگر نام کا ایک گاؤں تھا۔ صباحت کے بزرگوں کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ اب وہ دو نسلوں سے اس شہر میں آباد ہو چکے تھے لیکن اپنی زمین سے جو ایک تعلق ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی صورت اب تک برقرار تھا۔ چند برس پہلے تک صباحت کے ایک خالو اس گاؤں میں رہتے تھے۔ صباحت کئی بار خالہ سے ملنے کے بہانے گاؤں دیکھنے چلی جاتی تھی مگر اب وہ خالو بھی فیصل آباد کا رخ کر چکے تھے۔ ہاں... ان کا مکان وہاں موجود تھا۔ صباحت جانتی تھی اگر وہ خالو کو دس پندرہ ہزار روپیہ نقد بھجوا دے تو یہ مکان اس کا ہو سکتا ہے... اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک روز وہ چپکے سے فیصل آباد پہنچی اور مکان کے حقوق اپنے نام کرا کے واپس آگئی... ابھی تک اس کا بھائی ان معاملات سے بے خبر تھا۔ اب صباحت کو سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ یعنی بھائی سے رسمی اجازت لینا اور گاؤں کا رخ کرنا۔

○-----□-----○

خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب صباحت کے دیرینہ خواب کی تعبیر ملی۔ وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ لاہور سے ناگر کاؤں آ گئی۔ اس کا ملازم ریاض چند روز پہلے ہی گاؤں پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایک مقامی شخص خیر دین کے ساتھ مل کر کلینک کو ابتدائی شکل دے دی تھی۔ خیر دین ان کا ایک دور پار کا رشتے دار تھا۔ صباحت



گاؤں پہلی تو اسے قطعی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ سب لوگ اس سے جانے والے تھے۔ یہ اس کا آبائی گاؤں تھا۔ یہاں کی مٹی میں اس کے لئے محبت رچی بسی تھی۔ گاؤں کے نمبردار عظمت نے خود اس کا استقبال کیا۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے اسے گاؤں کے اندر لایا۔ نمبردار کے علاوہ گاؤں کے دیگر معززین بشمول پٹواری' امام مسجد و ماسٹر حضرات بھی اس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ سب دلی خوشی محسوس کر رہے تھے کہ ان کے گاؤں کو ایک ہمدرد ڈاکٹر اور کلینک میسر آگیا ہے۔ گاؤں پہنچ کر صباحت نے سب سے پہلے اپنا کلینک دیکھا۔ اس کے ملازم پیشہ نے اس کی ہدایت کے مطابق بہت کام کیا تھا۔ تاہم کچھ چیزوں کی ضرورت تھی۔ یہ کلینک اسی مکان میں واقع تھا جو چند ہفتے پہلے صباحت نے اپنے خالو سے خریدا تھا۔ کلینک کی دیواریں نئی سے پوتی گئی تھیں۔ فرش بھی کچا تھا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں شورے کا کمرا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑے کمرے میں مریضوں کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ شہر کے عالیشان کلینکس اور ہسپتال پیشنٹ ہاسپٹلز کے مقابلے میں یہ کچی دیواریں بہت معمولی تھیں لیکن صباحت جانتی تھی' انسانیت کی خدمت یہاں ہو سکتی ہے وہاں

اگلے ہی دن سے صباحت نے کلینک میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ آنے والے ہر دن کے ساتھ اس کے اعتماد اور اس کے مریضوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ پہلے اس سے کچھ سہمے سہمے تھے لیکن جب نئی "ڈاکٹرنی" کو انہوں نے بے حد ہمدرد پایا اور اس کے علاج میں شفا بھی نظر آئی تو وہ اس پر بھروسا کرنے لگے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ صباحت کا علاج مہنگا نہیں تھا۔ ایک ہفتے کی دوائی پر قریباً اتنے ہی پیسے خرچ ہوتے تھے جتنے گاؤں کا نیم حکیم ان سے بٹور لیتا تھا یا جھاڑ پھونک والا پیر نذرانے کے طور پر وصول کر لیتا تھا لیکن صباحت کے علاج اور ان کے علاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جلد ہی صباحت کی شہرت ناگر سے نکل کر اردگرد کے دیہات میں پھیلنے لگی۔ لوگ دور دور سے کلینک کا رخ کرنے لگے۔ صباحت کو اپنے کام کے اوقات میں اضافہ کرنا پڑا..... شروع شروع میں چند لوگوں نے صباحت کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی وہ پسپا ہو گئے۔ پسپائی اختیار کرنے والوں میں سب سے آخری شخص گاؤں کا جھاڑ پھونک کرنے والا پیر "بابا رحمے شاہ" تھا۔ ایک روز اس نے گاؤں والوں کو "جان لیوا بیماریوں" سے ڈرا سنا کر صبر تاک انجام کی پیش گوئیاں کیں اور بستی والوں کو کہے کسی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

صباحت یہاں خدمت خلق کے جذبے سے آئی تھی۔ اسے کسی سے دل لگی نہیں تھا پھر بھی وہ یہ بات سمجھتی تھی کہ اگر اسے یہیں علاقے میں کلینک چلانا ہے تو یہاں کے معتبر لوگوں سے بنا کر رکھنی ہوگی۔ اس نے پہلے روز ہی سے ایسا رویہ اپنایا تھا کہ علاقے کے معززین اس سے خوش رہیں۔ اس کی معلومات کے مطابق قریبی گاؤں "چاہ مولا" کا چوہدری اللہ رکھا ان دیہاتوں میں سب سے بارسوخ سمجھا جاتا تھا۔ کلینک شروع کرنے کے چند ہفتے بعد صباحت نے اپنے گاؤں کے نمبردار عظمت اللہ سے بات کی اور اسے کہا کہ وہ قریبی دیہات کے معززین سے ملنے کی خواہش رکھتی ہے۔ خاص طور پر "چاہ مولا" کے چوہدری اللہ رکھا سے۔

نمبردار عظمت کو صباحت کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اس نے کہا "بیٹا جی! بڑی سوہنی بات کی ہے تم نے۔ ایسا کرتے ہیں' اس جمعے حویلی میں چار پانچ چوہدریوں کی دعوت کر لیتا ہوں۔ چوہدری اللہ رکھا کو بھی بلا لیتے ہیں۔ چوہدری اللہ رکھا آئے گا تو تھانیدار ظہور علی کو بھی آنے میں اعتراض نہیں ہوگا۔ تم کو تو پتا ہی ہے ہمارے علاقے میں تھانیدار بڑی شے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ملنے میں بندے کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ تھانیدار صاحب ویسے بھی تمہیں جانتے ہیں۔ چار پانچ روز ہوئے مجھے کچہری میں ملے تھے کہنے لگے' سنا ہے شاہنواز صاحب کی بیٹی ڈاکٹر بن کر گاؤں آئی ہوئی ہے۔ میں نے کہا' ہاں جی آئی ہوئی ہے۔ کہنے لگے' بی بی سے میرا سلام کہنا۔ اگر میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔" صباحت نے نمبردار عظمت کی بات مختصر کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے چاچا جی' آپ ان لوگوں کو کھانے پر بلا لیں۔ اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔"

جمعے کے روز نمبردار عظمت کی حویلی میں بڑی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ پانچ چھ بلب روشن تھے۔ احاطے میں خوب پانی چھڑکا ہوا تھا اور چارپائیوں پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ گاؤں کا کٹ مشق نائی بڑے اہتمام سے کھانا پکا رہا تھا۔ تیتر' بٹیر' مچھلی' مرغ' چاول' تندوری روٹیاں' کھیر' سبھی کچھ کھانے میں شامل تھا۔ کھانے کے بعد نمبردار عظمت' صباحت کو مہمانوں سے ملانے مردانے میں لے آیا۔ صباحت کے سر پر دوپٹا اور کندھوں پر موٹی سفید چادر تھی جس نے اسے ٹخنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ متانت اور سنجیدگی کے سبب وہ اپنی عمر سے بڑی نظر آرہی تھی۔ وہ بڑے وقار سے چلتی ہوئی آئی اور مہمانوں کے پاس آبیٹھی۔ سب اپنی اپنی عقل اور مزاج کے مطابق صباحت کے "پروگرام" کو سراہنے لگے۔ اس امر میں کسی کو اختلاف نہیں تھا کہ طبی سہولتوں سے محروم اس علاقے میں صباحت نے کلینک قائم کر کے اور برائے نام فیس رکھ کر خدمت و خدا ترسی کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا خاص طور پر خوش نظر آرہا تھا۔ اس کی عمر ستر سال سے زائد تھی۔ چہرہ بارعب تھا اور قد کاٹھ سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی وقت وہ بڑا شاندار جوان رہا ہوگا۔ بہرحال اب وہ دمے کا مریض تھا اور سماعت بھی خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ تھانیدار ظہور علی سانولے رنگ کا ایک کرخت چہرہ شخص تھا۔ تاہم صباحت کی موجودگی میں اس نے اپنی کرختگی کو دھیمی مسکراہٹ میں چھپائے رکھا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس مسکراہٹ کے لئے تھانیدار کو خود پر بہت جبر

کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسرے مہمان جن کی تعداد تقریباً آٹھ تھی عام شکل و صورت اور شخصیت کے لوگ تھے۔ اونچی پگڑیاں' اجلے پیرہن' مسکراتے چہرے لیکن گروہوں میں تھوڑی سی اکڑ۔ انہیں دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی گاؤں کے کرتا دھرتا یا کھاتے پیتے زمیندار ہیں۔ تھانیدار کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے وہ کچھ زیادہ ہی محتاط نظر آتے تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص کچھ منفرد نظر آیا۔ اس کے سر پر بھی اونچی پگڑی تھی لیکن وہ نسبتاً جوان نظر آتا تھا۔ قریباً پینتیس برس عمر رہی ہوگی۔ شانے چوڑے' گردن موٹی اور آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا کڑھائی دار کرتا پہن رکھا تھا۔ صباحت نے محسوس کیا کہ وہ شخص اسے بڑی بے باکی سے گھور رہا ہے۔ اس کے انداز نے صباحت کو چند لمحوں کے لئے نروس کر دیا۔ اپنی توجہ ہٹانے کے لئے اس نے چوہدری اللہ رکھا سے اس کا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ چوہدری اللہ رکھا جیسے موقع ہی کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی بیماریوں کا حال سنانا شروع کر دیا۔ صباحت نے بڑے خلوص سے چوہدری کو پیش کش کی کہ وہ اس کا علاج کرے گی' بلکہ خود اُس کے گاؤں آکر اسے دیکھا کرے گی۔ چوہدری اللہ رکھا نے اس کی آخری بات نہیں مانی اور کہا کہ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ وہ خود کلینک آیا کرے گا۔

○——□——○

صباحت نے چوہدری اللہ رکھا کا علاج شروع کر دیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہ ہر تیسرے روز اپنے آرام دہ تانگے میں بیٹھ کر "چاہ مولا" سے تانگہ پہنچنے لگا۔ غلط سلط دوائیاں کھا کر اُس نے اپنا جسم کھوکھلا کر لیا تھا۔ پھیپھڑے بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ صباحت نے شہر سے اس کے کئی ٹیسٹ کرانے کے بعد مناسب دوا دینی شروع کی۔ اس دوران اسے چوہدری اللہ رکھا کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ درحقیقت چوہدری اللہ رکھا ذہنی طور پر ریٹائر ہو چکا تھا۔ اس کی چودھراہٹ اب اپنے بیٹے کے دم سے تھی۔ زمینوں اور گاؤں کے سارے معاملات اس کا لڑکا ہی دیکھتا تھا۔ اس کا نام صباحت کو عمرو راز معلوم ہوا۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس میں خود سر چوہدریوں والی ساری برائیاں موجود ہیں اور چند برس پہلے اس پر اغوا اور قتل کا ایک مقدمہ بھی چلتا رہا ہے۔

ایک دوپہر صباحت مریضوں سے فارغ ہو کر مکان کے رہائشی حصے میں پہنچی ہی تھی کہ اس کے ملازم خاص ریاض نے اطلاع دی کہ چوہدری اللہ رکھا کا بڑا بیٹا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ صباحت نے یہ اطلاع قدرے ناگواری سے سنی۔ بہرحال اب ملنا تو تھا ہی۔ اس نے ملازم کو کھانا نکالنے سے روک دیا اور دوبارہ کلینک چلی گئی۔ چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا مشورے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ صباحت اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس شخص سے تو پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ وہی سرخ کرتے والا تیز نگاہ شخص تھا جس نے نمبردار کی حویلی میں اسے بری طرح گھورا تھا۔ صباحت کی ناگواری میں اضافہ ہو گیا۔ تاہم اس نے اخلاق کا دامن تھام کر چہرے کی بشاشت برقرار رکھی اور نرمی سے بولی۔

"جی فرمایئے۔ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

اس نے ایک بار پھر تیکھی نظروں سے صباحت کو گھورنا شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں لاشعوری طور پر مونچھوں کو تاؤ دے رہی تھیں۔ وہ بے باک لہجے میں بولا "ڈاکٹرنی جی! میرا نام عمرو راز ہے۔ میں گاؤں کا بندہ ضرور ہوں لیکن آٹھ سال آپ کے شہر لاہور میں بھی گزارے ہیں۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ خیر سے آپ میرے والد صاحب کو کیا پلا رہی ہیں؟"

"کیوں جی۔ کیا بات ہوئی ہے" صباحت نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ پوچھیں کیا نہیں ہوا ہے۔ نشے والی دوائیاں دے دے کر آپ نے ان کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ کل رات پیشاب کرنے کے لئے اٹھے' چکرا کر گر گئے۔ چارپائی کے پائے سے سر ٹکرایا' لہولہان ہو گئے اور وہیں نیم بے ہوش پڑے رہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی' میں نے پچھلے پہر اٹھ کر دیکھ لیا' ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔"

صباحت کو یہ خبر سن کر دکھ ہوا۔ بہرحال اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ چوہدری صاحب کو معمولی مقدار میں "ٹرنکولائزر" دے رہی ہے اور ان کی بیماری کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہے۔



چوہدری عمرو راز نے غصے سے کہا "ڈاکٹرنی جی! آپ مجھے استانیوں کی طرح پٹی پڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ ان نشہ آور دوائیوں کے دھندے کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں میں۔ شہر والوں کا ستیاناس تو آپ ڈاکٹروں نے کیا ہی ہوا ہے اب گاؤں والوں کو بھی برباد کرنے آگئے ہیں۔ مہربانی فرما کر یہ کاروبار بند کریں آپ۔ ہمیں نہیں چاہئے ایسا علاج۔"

چوہدری عمرو راز کے کڑوے کسیلے لہجے سے صباحت کو شدید شاک پہنچا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ یہ شخص ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ اتنے میں نمبردار عظمت بھی کلینک میں چلا آیا۔ صباحت نے دیکھا کہ عمرو راز کو غصے میں دیکھ کر نمبردار عظمت کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ نمبردار عظمت نے عمرو راز کو سلام کیا۔ وہ سلام کو نظر انداز کر کے غصے میں بولا۔

"چاچا! یہ کیا ہو رہا ہے تیرے پنڈ میں؟ کیا اس دن کے لئے تو چوہدری بنا تھا؟"

نمبردار عظمت نے گھبرا کر کہا "کیا ہوا ہے چھوٹے چوہدری جی؟ کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ وڈے چوہدری تو ٹھیک ٹھاک ہیں ناں؟"

وہ طنز سے بولا "ہاں بڑے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ دیکھ لے جا کر تو بھی ساتھ اس ڈاکٹرنی کو بھی لے جا۔"

نمبردار عظمت نے محسوس کیا کہ معاملہ بہت بگڑا ہوا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی وجہ سے صباحت کی بے عزتی ہو جائے۔ اس نے عمرو راز کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور عاجزی سے بولا۔

"چوہدری جی! آؤ حویلی میں چل کر بات کرتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر چوہدری کو کلینک سے باہر لے گیا۔ صباحت شام تک افسردہ اور بے چین رہی۔ شام کے بعد نمبردار عظمت نے آکر اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے صباحت کو بتایا کہ چوہدری عمرو راز اس کے سخت خلاف ہو گیا ہے۔ دراصل جھاڑ پھونک والا سادھو "پیارے جی" چوہدری عمرو راز کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہے۔ وہ تاکر گاؤں سے نکل کر عمرو راز کے پاس جا بیٹھتا ہے اور اس سے لگائی بجھائی کرتا رہتا ہے۔

صورتِ حال تشویشناک تھی۔ صباحت نمبردار عظمت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتی تھی۔ اس نے کہا "چاچا عظمت، اب کیا کرنا چاہئے؟"

نمبردار نے کہا "بیٹی! تم اپنا کام کرتی رہو۔ میں یہ معاملہ خود سنبھال لوں گا۔ اگر وڈے چوہدری صاحب تم سے علاج کرانا چاہتے ہیں تو چوہدری عمرو راز کو بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچنا پڑے گا۔"

وقتی طور پر یہ معاملہ دب گیا۔ علاقے کے سیکڑوں مریضوں کے ساتھ ساتھ چوہدری اللہ رکھا کا علاج بھی صباحت کے کلینک میں ہوتا رہا۔ صباحت یہاں خدمت کے جذبے کے ساتھ آئی تھی اور جذبے کی اس سچائی نے اسے بہت جلد ہر دلعزیز بنا دیا۔ بڑے چھوٹے اسے "باجی" کے نام سے پکارنے اور بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وہ جدھر سے گزرتی لوگ راہ میں آنکھیں بچھاتے۔ صباحت کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے قدموں میں عقیدتوں کے ڈھیر لگے ہیں۔

وہ جس سچی خوشی کی متلاشی تھی وہ اسے مل گئی تھی۔ دکھوں کے مارے لوگ اس کی ذات سے آرام پا رہے تھے۔ صباحت نے اپنی مصروفیت کا دائرہ مزید وسیع کر دیا۔ گاؤں میں علاج معالجے کے علاوہ بھی بہت سے مسائل تھے۔ صباحت نے گرد و پیش کے حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ اس کی غمگسار آنکھوں کو بہت سی ناہمواریاں نظر آئیں۔ گاؤں میں لڑکوں کا ایک مڈل اسکول تھا۔ بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں تھا۔ قریب ترین اسپتال ضلع کا اسپتال تھا اور وہاں پہنچتے پہنچتے بہت سے مریض جاں بحق ہو جاتے تھے۔ پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ ضرورت گاؤں میں اس طرح پوری ہو رہی تھی کہ جانور اور انسان ایک ہی جوہڑ کا پانی استعمال کرتے تھے۔ صباحت نے فیصلہ کیا کہ وہ ان مسائل کے سلسلے میں جو کچھ بھی بن پڑا ضرور کرے گی۔

سب سے پہلے تو اس نے نمبردار عظمت کو مجبور کیا کہ وہ گاؤں میں کم از کم ایک ٹیوب ویل لگائے تاکہ اہلِ دیہہ کو پینے کا صاف پانی میسر آسکے۔ ٹیوب ویل کے لئے بجلی کا اضافی کنکشن لینا جوئے شیر لانا تھا۔ اس سلسلے میں صباحت نے خود بھاگ دوڑ کی اور دوہری پھنے میں یہ مسئلہ حل کر لیا۔ ٹیوب ویل لگ گیا اور لوگوں کو پینے کے لئے صاف پانی ملنے لگا تو صباحت نے گاؤں کے چیدہ چیدہ افراد کو اکٹھا کیا اور ان سے بچیوں کے اسکول کے بارے میں بات کی۔ چند ایک افراد کے سوا یہ تجویز سب لوگوں نے پسند کی۔ ایک زمیندار نے اپنے کھیت کا کچھ حصہ اسکول کے لئے وقف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ صباحت نے اسکول کی تعمیر کے لئے فنڈ جمع کرنے کا آغاز اپنی جیب سے تین ہزار روپے دے کر کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسکول کی تعمیر کا مسئلہ پورے گاؤں کا مسئلہ بن گیا اور لوگ حسبِ حیثیت اس رفاہی کام میں دلچسپی لینے لگے۔ صباحت کی مصروفیت اب پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ علاج معالجے کے علاوہ اسے دوسرے کاموں پر بھی توجہ دینی پڑتی تھی۔ صباحت لوگوں کو جتنا قریب سے دیکھ رہی تھی ان کے دکھ اتنے ہی گہرے اور تعبیر محسوس ہو رہے تھے۔ ہر شخص نے سینے میں درد کی ایک داستان چھپا رکھی تھی۔ ان کے مصائب دیکھ کر صباحت کو اپنا ہر دکھ ہیچ محسوس ہونے لگا۔ ڈاکٹر حماس کی بے رخی کے زخم مندمل ہونے لگے اور وہ خود کو فراموش کر کے لوگوں کے غم میں گھلنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ انہی مصیبت زدہ لوگوں کے لئے دنیا میں آئی تھی اور وہ نجانے کب سے اس کا انتظار کر رہے تھے..... ایسا محسوس کر کے صباحت کے سینے میں ہمدردی کے پھپھولے پھوٹ نکلتے۔ ایک عجیب سا احساس اس کے ذہن میں جاگنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا وہ پھیل کر ایک بہت بڑی چھت بن

جائے اور مصائب کی دھوپ میں جلتے ہوئے ان سارے لوگوں کو اپنے سائے تلے سمیٹ لے۔

ایک طرف یہ سب ہو رہا تھا اور دوسری طرف چوہدری عمرداز کے سینے میں پھوٹنے والی نفرت کی کونپل پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ ناگہ گاؤں میں ہونے والی تبدیلیوں پر اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ صباحت کو معلوم نہیں تھا کہ نادانستگی میں اس نے اپنے لئے کتنی بڑی مصیبت کھڑی کر لی ہے۔ چوہدری عمرداز ان چوہدریوں میں سے تھا جو اپنے اقتدار میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ اور صباحت سے یہ "جرم" مسلسل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف وہ ایک ایسا کام کر رہی تھی جس کی وجہ سے چوہدری کو اپنے گھر میں بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ چوہدری اللہ رکھا اس کا باپ تھا اور وہ اس کی منشاء کے خلاف صباحت سے علاج کرا رہا تھا۔ صباحت کے "توڑ" کے لئے عمرداز نے شہر سے ایک منگا ڈاکٹر بھی بلوایا تھا لیکن اللہ رکھا کو صباحت پر کچھ ایسا بھروسا ہو چکا تھا کہ اس نے دو ہی روز میں سنے ڈاکٹر کو بھگا دیا تھا۔

وہ شروع نومبر کی ایک خنک دوپہر تھی۔ آج کلینک میں آدھے دن کی چھٹی تھی۔ گاؤں کے ڈاکیے نثار محمد کی بیٹی رضیہ کا بیاہ تھا۔ صباحت گاؤں کی ایسی تمام تقریبات میں بڑے شوق سے شامل ہوتی تھی اور رضیہ تو ویسے بھی اسے بہت پسند تھی۔ صباحت نے اس کی شادی کا زیادہ تر انتظام اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ گاؤں کی عورتوں میں بالکل گھل مل جاتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے رضیہ کے جوڑے تانکے تھے۔ اس کی سہیلیوں کے ساتھ مل کر ڈھولک بجائی تھی اور گیت گائے تھے۔ آج اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے رضیہ کو دلہن بنائے گی۔ اس نے اپنے نوکر رمضانی کو آرائشی سامان لانے کے لئے خاص طور پر گوجرانوالہ بھیج رکھا تھا۔ کلینک سے فارغ ہوتے ہی صباحت لباس بدل کر شادی والے گھر میں پہنچ گئی اور دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر ادھر ادھر کے کام کرنے لگی۔ اتنے میں اس کی ملازمہ نوری بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے کہا۔

"بابی جی! جلدی چلئے۔ چاہ مولا سے چھوٹے چوہدری صاحب آئے ہیں۔ وڈے چوہدری صاحب کی طبیعت خراب ہے' انہوں نے آپ کو چاہ مولا بلایا ہے۔"

صباحت کے سارے چاؤ دھرے رہ گئے۔ چاہ مولا آنے جانے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ معلوم نہیں وہاں کتنی دیر ٹھہرنا پڑتا۔ شادی کی رسومات تو اس کے لئے نہیں روکی جا سکتی تھیں۔ وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ نوری کے ہمراہ چل دی۔ ایک ڈاکٹر کو ایسے ناگفتہ بہ حالات سے اکثر گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کلینک پہنچی تو چوہدری عمرداز بڑی بیقراری سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ صباحت کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ کہنے لگا۔

"جلدی چلو۔ وڈے چوہدری کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے بلایا ہے تمہیں۔"

صباحت نے نرمی سے کہا "ڈاکیے نثار محمد کی بیٹی کی برات آنے والی ہے۔ اگر طبیعت زیادہ خراب نہیں تو....."

"زیادہ خراب ہے" چوہدری نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں پاگل نہیں ہوں کہ دو میل سے کھوتے کی طرح بھاگا ہوا یہاں آگیا ہوں۔"

صباحت نے بڑے حوصلے سے عمرداز کا لہجہ برداشت کیا اور میڈیکل باکس لینے کے لئے گھر کے اندر چلی گئی۔ رمضانی شہر گیا ہوا تھا ورنہ اسے ساتھ لے لیتی۔ تنہا عمرداز کے ساتھ جاتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوئی لیکن مجبوری تھی۔ اس نے شادی پر پہنا ہوا ہلکا گلابی لباس اپنی موٹی سفید چادر کی بکل میں چھپایا اور عمرداز کے ساتھ چل دی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ عمرداز کے سینے میں کیسا آتش فشاں دہک رہا ہے اور آئندہ گھڑیوں میں کیا ہونے والا ہے۔ کلینک سے کچھ فاصلے پر عمرداز کا سجا سجایا تانگہ موجود تھا۔ تانگے کے پاس مونچھوں والا ایک کوچوان میلا سا کھیس لئے مؤدب کھڑا تھا۔ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے ایک بار پھر صباحت کے دل میں آئی کہ وہ گاؤں کے کسی مرد کو ساتھ لے لے۔ مگر قرب وجوار میں کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ وہ تانگے میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور کوچوان نے منہ سے چخ چخ کی آواز نکال کر گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

کچے دلدلی راستے پر ایک میل کا فاصلہ انہوں نے قریباً آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ ابھی وہ چاہ مولا سے ایک ڈیڑھ میل دور ہی تھے کہ کوچوان نے نجانے کیا کیا' تانگے کا گھوڑا پچھلے پیروں پر الف ہو گیا۔ تانگہ پیچھے کی طرف جھکا اور صباحت سنبھلنے کی کوشش کرتی ہوئی کچی زمین پر جا گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ عمرداز اگلی نشست سے کود کر اسے سنبھالنے آیا۔ وہ آخری لمحے تک یہی سمجھتی رہی کہ وہ اسے سنبھال رہا ہے۔ مگر وہ اسے "سنبھالنے" کے بجائے "گرانے" آیا تھا۔ صباحت نے محسوس کیا کہ وہ اسے کھیت کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری مرتبہ چیختی عمرداز کا مضبوط ہاتھ اس کے ہونٹوں کو ڈھانپ چکا تھا۔ صباحت کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا سارا خون کھنچ کر اس کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ وہ ہاتھوں کی پوری قوت سے عمرداز کی گرفت ختم کرنے کی کوشش کرنے لگی' لیکن عمرداز اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اسے گنے کے کھیت میں آگے تک کھینچ لے گیا۔ یہ کھیت بہت بلند تھا۔ صباحت کے قد سے قدرے بلند۔ صباحت کو ہر طرف تیز کٹیلے کناروں والے پتے سرسراتے نظر آئے۔ وہ عمرداز کی گرفت میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ عمرداز کی زہریلی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"تجھے کہا تھا نا چلی جا یہاں سے۔ بول کہا تھا نا تجھے۔" وہ غصے کی زیادتی سے ہانپ رہا تھا۔ "حرامزادی' تیری تو سات پشتوں میں

سے کوئی اب تاگر کا رخ نہیں کرے گا۔"

اُس نے اسے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ صباحت نے محسوس کیا کہ وہ گری ہے اور اس کے جسم تلے کئی پودے ٹوٹ گئے ہیں۔ خوف و ہراس کے شدید حملے کے فوراً بعد صباحت کے اندر کی دلیر عورت بیدار ہوگئی۔ وہ عمر دراز کے مقابلے میں کمزور تھی لیکن مزاحمت کرنا اس کا فرض تھا اور اس کی ذمے داری بھی۔ یہ وہی ذمے داری تھی جو ناتواں عورت جارح مرد کے مقابلے میں صدیوں سے پوری کرتی آئی ہے۔ وہ پوری تندہی سے یہ ذمے داری نبھانے لگی۔ گوشت خور ہاتھوں نے اسے کاٹ کاٹ کھایا۔ اس کے کومل جسم پر انگارے دھرے گئے لیکن وہ چوہدری عمر دراز سے برسرِپیکار رہی۔

"چھوڑ دے چوہدری' خدا کے لئے چھوڑ دے مجھے۔" وہ جسمانی مزاحمت کے ساتھ زبانی احتجاج بھی کر رہی تھی۔ مگر لگتا تھا کہ اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ اپنے ہونٹوں کی طرف بڑھنے والی عمر دراز کی چوڑی چکلی ہتھیلی کو جُل دے کر وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ اچانک کھیت کے باہر سے آواز آئی "کون ہے بھائی؟"

اس آواز کے ساتھ ہی عمر دراز کھڑا ہو کر کھیت سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ تاہم وہ صباحت کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ نے صباحت کے بال جکڑ رکھے تھے جبکہ دوسرا ہاتھ بار بار اس کا منہ دبوچ لیتا تھا۔ صباحت نے محسوس کیا کہ کھیت کے قریب سے گزرنے والے کچے راستے پر کسی بس کا انجن گڑگڑا رہا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سی ملی جلی آوازیں صباحت کے کانوں میں پڑیں۔ یوں لگا بہت سے لوگ کھیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چوہدری عمر دراز نے دانت کچکچا کر صباحت کو دیکھا اور پھنکار کر بولا۔

"تیری قسمت اچھی ہے ڈاکٹرنی... جا چلی جا' لیکن یاد رکھ گاؤں میں رہے گی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

اس نے صباحت کو زور سے دھکا دیا وہ دوبارہ ٹوٹے ہوئے پودوں پر جا گری۔ چوہدری عمر دراز نے جھک کر زمین سے اپنا گرا ہوا ریوالور اٹھایا اور فصل میں گم ہوگیا۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی صباحت اپنی جگہ سے اٹھی اور بے ارادہ ایک طرف بڑھنے لگی۔ وہ ان لوگوں سے بچنا چاہتی تھی جو اس کی مدد کے لئے کھیت میں گھس آئے تھے اور جن کی پیش قدمی سے کھیت کا ایک حصہ سرلائے مار رہا تھا۔ بڑی تیزی سے چلتے ہوئے صباحت نے ایک چوڑی پگڈنڈی پار کی اور دوسرے کھیت میں گھس گئی۔ یہ کھیت بھی گنے کا تھا۔ اس کھیت کو طے کرنے کے بعد صباحت کو ایک خشک نالا نظر آیا۔ نالے کے ساتھ ساتھ اور تلک لہلہاتے سرکنڈے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بلا سوچے سرکنڈوں میں گھس گئی اور کچھ آگے جا کر خاموش کھڑی ہوگئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ٹوٹے والے گلابی کرتے کا گریبان اُدھڑا ہوا تھا۔ بازوؤں اور گردن پر خراشیں تھیں۔ وہ کافی دیر دم سادھے اسی جگہ کھڑی رہی۔ چند کھیت پیچھے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دھیرے دھیرے یہ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ پانچ دس منٹ بعد صباحت نے سرکنڈوں کے اندر سے دیکھا۔ ایک لاری جس کی رنگا رنگ پھولوں کے ہار آویزاں تھے' نالے کی پلی پار کر رہی تھی۔ بس کی چھت پر بھی لوگ نظر آرہے تھے۔ ان کے اجلے لباسوں سے ظاہر تھا کہ وہ براتی ہیں۔ یقیناً یہ ڈاکیے نثار محمد کی بیٹی رضیہ کی برات تھی۔ اسی برات کی وجہ سے صباحت کی عزت بچ پائی تھی۔

****

صباحت ٹھوکریں کھاتی' چھپتی چھپاتی' رات گئے گاؤں واپس پہنچی۔ اکا دکا راہ گیروں سے نگاہیں بچا کر وہ سیدھی اپنے گھر میں گھس گئی۔ پورے چوبیس گھنٹے وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ اس کے سینے میں طوفان برپا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کی شکایت وہ کس سے کرتی۔ اس نے یہ کانٹوں بھرا راستہ اپنے لئے خود چنا تھا۔ اب پاؤں میں کانٹے ٹوٹے تھے تو قصور اس کا اپنا تھا..... اس کے سامنے اب دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ جو کچھ ہوا تھا خاموشی سے سہہ جاتی اور امید رکھتی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا یا وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ چوہدری عمر دراز کی اس حرکت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی۔ نمبردار عظمت اور چوہدری اللہ رکھا کو بتاتی اور اگر ضروری ہوتا تو تھانے میں رپورٹ کرتی۔ پھر ان باتوں کا جو بھی نتیجہ نکلتا اسے حوصلے اور مستقل مزاجی سے برداشت کرتی۔ دوسرا راستہ کٹھن ضرور تھا لیکن یہی درست راستہ تھا۔ اسی راستے پر چلنے سے انصاف کے تقاضے پورے ہوتے تھے اور مجرم کو کیفر کی سزا ملتی تھی۔ مگر اس راستے پر چلنے سے وہ مقصد فوت ہوتا تھا جس کے لئے صباحت یہاں آئی تھی اور جو مقصد اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں سے اس نے جو خاموش عہد کیا تھا وہ اسے توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہوجائے کہ اسے ان لوگوں سے دور جانا پڑے۔ اگر چوہدری عمر دراز سے اس کا کھلا تصادم ہوجاتا تو صباحت کا اس علاقے میں رہنا ناممکن تھا۔ یہ چوہدری عمر دراز کا علاقہ تھا۔ وہی یہاں کا وڈیرا تھا' وہی تھانیدار اور وہی جج۔ صباحت اچھی طرح جان چکی تھی کہ تھانیدار ظہور علی وردی ضرور پہنتا ہے لیکن تھانیداری چوہدری عمر دراز کی ہے۔ علاقے میں وہی ہوتا ہے جو عمر دراز چاہتا ہے۔

صباحت پورے چوبیس گھنٹے ان مسائل پر غور کرتی رہی۔ رو رو کر اب اس کے آنسو خشک ہوچکے تھے اور سینے میں دکھ جیسے ایک وزنی گولے کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے "آدمی جس بات سے زیادہ ڈرتا ہے عموماً وہی بات ہوجاتی ہے۔ صباحت کو بھی خدشہ

تھا کہ وہ علاقے کے کسی بارسوخ شخص کو ناراض نہ کر بیٹھے اور اس کی پوری احتیاط کے باوجود یہی کچھ ہو گیا تھا۔ بہرحال..... ایک بات اب طے تھی کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ علاقے کے سادہ لوح باسیوں کو چوہدری عمرداز جیسے مگرمچھ کے رحم و کرم پر نہیں رہنے دے گی۔ اس کی شکست یہ نہیں تھی کہ وہ ایک چوہدری کے ہاتھوں بے عزت ہو کر خاموش رہی ہے۔ اس کی شکست یہ تھی کہ اس نے گاؤں سے بھاگ کر پوہ ری کی مراد پوری کر دی ہے۔

چوبیس گھنٹے بعد وہ بند کمرے سے نکلی تو خود پر مکمل قابو پا چکی تھی۔ کسی کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس پر کیا سانحہ گزرا ہے اور کیا سانحہ گزرتے گزرتے رہ گیا ہے۔ اگلے روز وہ حسب سابق کلینک میں پہنچی اور مریضوں کو دیکھا۔ سہ پہر کو حسب معمول اسکول کی زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور گاؤں کی عورتوں سے گھل مل کر باتیں کیں۔ "باجی باجی" کہہ کر عورتوں کی زبانیں سوکھ رہی تھیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا ان کی محسن و غم خوار "باجی" پر ایک رات پہلے کیا بیتی ہے..... کو صباحت نے اپنے روز مرہ کے کام شروع کر دیے تھے مگر اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ آئندہ کیا ہو گا۔ چوہدری عمرداز اپنا اگلا وار کب اور کہاں کرے گا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے اپنے مرحوم والد کے ایک پرانے گن مین منیر خان کو گاؤں بلا لیا تھا۔ یہ گن مین گھریلو ملازم کے روپ میں کلینک میں رہنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ریاض بھی تھا۔ وقت ضرورت وہ بھی وفادار محافظ کا کردار ادا کر سکتا تھا۔

رات کے وقت صباحت کو زیادہ دھڑکا رہتا تھا۔ لیکن ایک دن چوہدری عمرداز دن دہاڑے آن دھمکا۔ وہ کلینک میں بیٹھی تھی۔ مریضوں کو باری سے بھیجنے کے لئے ریاض دروازے پر اسٹول رکھے براجمان تھا۔ چوہدری عمرداز اسے ایک طرف دھکیلتا ہوا اندر آیا۔ وہ سفید تہبند قمیص میں تھا۔ سر کے بال جن میں کنگھیوں کے دانت جلی سفیدی تھی، تیل سے چپڑے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے پر تولیا جھول رہا تھا۔

"سلام باں بیگم ڈاکٹرنی جی۔" اس نے اندر آ کر عام سے لہجے میں سلام کیا۔ اور بے تکلفی سے موڑھا گھسیٹ کر صباحت کے سامنے بیٹھ گیا۔ صباحت کے پاس جو مریض موجود تھا وہ خوف سے زرد ہو کر باہر نکل گیا۔

"کیا بات ہے؟" صباحت نے برف کے مانند سرد لہجے میں پوچھا۔

"وئی خاص بات نہیں ہے جی۔ بس کھانا کھانے کے بعد سینے میں جلن سی رہتی ہے۔ سوچا ڈاکٹرنی جی کو دکھا آؤں۔"

عمرداز کا لہجہ بالکل عام سا تھا۔ جیسے وہ چند روز پہلے کے اس واقعے کو بالکل بھول چکا تھا یا ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ صباحت کا سارا جسم غصے سے لرزنے لگا۔ پلکوں پر جیسے کسی نے منوں بوجھ رکھ دیا تھا لیکن وہ جانتی تھی اگر وہ پلکیں نہ اٹھا سکی تو یہ اپنی بے بہا کمزوری کا اعتراف ہو گا۔ اس نے جان پر سیکڑوں عذاب جھیل کر چوہدری عمرداز کی آنکھوں میں دیکھا اور بے انتہا خشک لہجے میں بولی۔

"چوہدری! کیا چاہتا ہے مجھ سے؟"

وہ بڑی بے رحمی اور بے پروائی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اسی طرح جیسے اس نے پہلی بار صباحت کو دیکھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اچانک اس کے چہرے کو گہری سنجیدگی نے ڈھانپ لیا۔ وہ ڈرامائی لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹرنی جی! اگر یہاں رہنا چاہتی ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"کیا؟" صباحت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میرے جواب سے لال پیلی تو نہیں ہو جاؤ گی؟"

"چوہدری! جو کہنا ہے صاف کہو۔" صباحت نے تلملا کر کہا۔

"میری گھر والی بن جاؤ۔" چوہدری نے کھٹاک سے جواب دیا۔

صباحت کے جسم میں زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ وہ پھنکار کر بولی "چوہدری! اپنی زبان کو لگام دو۔ اگر ہوشمندی کی بات نہیں کر سکتے تو چلے جاؤ یہاں سے۔"

چوہدری اٹھتے ہوئے بولا "چلا جاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، ابھی تم جو بھی کہو گی جوش میں کہو گی۔ بہرحال، میری ایک بات یاد رکھنا، میں نے یہ تجویز دے کر تمہارے اور اپنے لئے ایک درمیانی راستہ نکالا ہے۔ اس راستے سے منہ موڑو گی تو بہت پچھتاؤ گی اور ہو سکتا ہے ان لوگوں کو بھی پچھتانا پڑے جو تمہاری طرفداری کر رہے ہیں۔ میں چند روز بعد تمہارا جواب سننے کے لئے پھر آؤں گا۔ رب راکھا....." وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اگلے روز وہ صبح اسکول کی عمارت دیکھنے پہنچی تو معلوم ہوا وہاں کام رکا ہوا ہے۔ اس نے مستریوں سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ صبح نور محمد صاحب آئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ فی الحال کام روک دو۔ نور محمد وہی زمیندار تھا جس نے اسکول کے لئے جگہ دی تھی۔ صباحت اس خبر سے سخت پریشان ہوئی۔ اس نے اسی وقت ایک آدمی کے ہاتھ نور محمد کو بلا بھیجا۔ نور محمد تو نہیں آیا اس کی جگہ نمبردار عظمت آ گیا۔ نمبردار نے بتایا کہ وہ نور محمد کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے کام کیوں روک دیا ہے۔

صباحت نے پوچھا "تو کیا بتایا اس نے؟"

نمبردار بولا "وہ کہتا ہے کہ اپنے ایک بھائی سے اس کا جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ بھی زمین پر اپنا حق جتا رہا ہے۔ اس لئے وہ فی الحال اسکول کے لئے رقبہ نہیں دے سکتا۔ معاملہ طے ہو جائے تو پھر اس

بارے میں سوچا جائے گا۔"

اس اطلاع سے صباحت کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے آزردگی سے کہا۔ "چاچا عظمت! پہلے تو نور محمد نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

نمبردار عظمت نے سر جھاڑ کر گہری سانس لی' بولا "وہی رانی' بات دراصل یہ نہیں جو نور محمد کہہ رہا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل تھانیدار غلام علی نے نور محمد کو تھانے بلایا تھا۔ اسی نے نور محمد کو مجبور کیا ہے کہ وہ اسکول کا کام رکوادے اور میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ چوہدری عمرداز کی شہ پر ہو رہا ہے۔"

صباحت کا دماغ سنسنا اٹھا۔ ایک ہی لمحے میں وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس کا مطلب تھا چوہدری عمرداز اس پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے خواب بکھرنے لگے۔ بجھے ہوئے دل کے ساتھ وہ کلینک واپس آگئی..... کلینک میں ایک اور بری خبر اس کی منتظر تھی۔ صباحت کی ملازمہ نوری کلینک نہیں آئی تھی۔ ایک عورت کی زبانی پتا چلا کہ رات اس کے شوہر نے اسے بری طرح مارا ہے۔ اور وہ زخموں سے چور گھر میں پڑی سسک رہی ہے۔

نوری چار بچوں کی ماں تھی اور شوہر نکھٹو تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی روزگار اس کے ہاتھ آئے۔ صباحت نے اسے گھریلو کام کاج کے لئے ملازم رکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ اسے کپڑا بنائی بھی سکھا رہی تھی۔ نوری کے شوہر مختارے کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے نوری کو روکنے کی کوشش کی تھی مگر صباحت نے اسے سمجھا بجھا لیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر نوری اسے نشے پانی کے لئے دو روپے روز دیتی رہے تو وہ اسے نہیں روکے گا۔ صباحت کو توقع نہیں تھی کہ بات طے ہونے کے بعد وہ یوں بیوی کو مار پیٹ کر گھر میں ڈال لے گا۔ اسے نوری پر بے پناہ ترس آیا۔ اپنا میڈیکل باکس لے کر وہ اسی وقت نوری کی طرف روانہ ہوئی۔ دو چار گلیوں سے گزر کر نوری کے گھر پہنچی تو اس کا نہاتا کتا شوہر گھر سے باہر ہی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ صباحت کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ غرا کر بولا۔

"کیا لینے آئی ہو ڈاکٹرنی جی؟"

صباحت نے کہا "تم نے نوری کو مارا ہے؟"

وہ چھاتی ٹھونک کر بولا "ہاں مارا ہے۔ وہ زنانی ہے میری۔ اس کی کھال بھی اتار دوں تو یہ میرا حق ہے۔ آپ کون ہوتی ہیں پوچھنے والی۔"

صباحت نے کہا "وہ میرے پاس ملازم ہے۔ میں مالکن ہوں اس کی۔"

مختارے نے کہا "اور میں مالک ہوں اس کا۔ اس گاؤں کے سوا بھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ اپنی زنانیوں کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔ یہ گاؤں ہے ڈاکٹرنی جی۔ یہاں شہروں والے رواج نہیں چل سکتے۔"

صباحت کہہ سکتی تھی کہ اس وقت تمہاری غیرت کہاں چلی جاتی ہے جب تمہارے بچے مار مار کر بھوکے سو جاتے ہیں مگر یہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ مختارے کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی صورت صباحت کو نوری کے پاس نہیں جانے دے گا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس مڑی اور آنکھوں میں آنسو بھرے تیز قدموں سے کلینک کی طرف چل دی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کارروائی میں بھی چوہدری عمرداز کا ہاتھ ہے۔ نوری نے بتایا تھا کہ مختارا' چوہدری عمرداز کی مخبری چاپلوسی کرنے چاہ رہا ہے۔ اور وہاں دوسرے ملازموں کے ساتھ مل کر نشہ پانی کرتا ہے۔ یقیناً عمرداز کے ہی مشورے پر مختارے نے صباحت کو اس کے ایک مفید ساتھی سے محروم کیا تھا۔ اب صباحت کے لئے سمجھنا بھی دشوار نہیں تھا کہ ان کارروائیوں کا سلسلہ مزید دراز ہوگا۔ عمرداز قدم قدم پر صباحت کے راستے میں روڑے اٹکائے گا اور ہر وہ ہتھکنڈہ آزمائے گا جو صباحت کو مایوس اور خوفزدہ کر سکے۔ وہ کلینک پہنچی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس روز اس نے کسی مریض کو بھی نہیں دیکھا۔ بس اندیشوں کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی رہی اور سوچتی رہی۔ اس کے اندر سے کہیں آواز آتی تھی۔ صباحت اگر تم یہاں کے مظلوم' بے سہارا لوگوں سے عہد رفاقت نبھانا چاہتی ہو تو تمہیں اس کے لئے قربانی دینا ہوگی۔ تمہیں اپنا دل مار کر اس بااختیار شخص کا تعاون حاصل کرنا ہوگا جو یہاں کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ تمہیں ایک بڑی فتح کے لئے ایک چھوٹی ہار کو قبول کرنا ہوگا۔ پھر اس کی نگاہوں میں ڈاکٹر حماس کا چہرہ گھومنے لگا اور وہ خواب اس کے تصور میں چمکنے لگے جو اس نے لاہور کی سہانی شاموں میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھے تھے۔ وہ تنہا اس کے خواب نہیں تھے۔ وہ حماس کے بھی خواب تھے۔ ان خوابوں نے صباحت کو جینا سکھایا تھا۔ اسے انتظار' کسک اور آس جیسی لذتوں سے آشنا کیا تھا۔ یہ سارے خواب جو اب دھندلا چکے تھے' صباحت کی نگاہوں میں گڈمڈ ہونے لگے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔ اس کی ایک طرف حماس آکھڑا ہوا اور دوسری طرف سیکڑوں بے سہارا مصیبت زدہ لوگ۔ وہ لوگ جو اس سے محبت کرتے تھے۔ اسے نجات دہندہ سمجھتے تھے اور شاید دل ہی دل میں اسے پوجتے تھے۔ صباحت کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ ان سیکڑوں آس بھرا نگاہوں سے منہ پھیر لے۔ وہ سسک اٹھی۔ اس نے حماس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور خودکلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔

"میں کیا کروں حماس۔ تم ہمیشہ رہنمائی کرتے رہے ہو۔ آج خاموش کیوں ہو..... مجھے راستہ دکھاؤ حماس' مجھے بتاؤ کہ اب جبکہ تم بھی اپنی دنیا میں کھو چکے ہو' میں کیا کروں؟"

وہ مسلسل تین روز شدید تذبذب میں رہی۔ چوتھے روز

چوہدری عمرداز پھر آدھمکا۔ صباحت اس وقت گھر میں لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ لمبے سیاہ بال شانوں پر پریشان تھے۔ خوبصورت آنکھیں رت جگوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ صباحت کے گن مین نے جو گھریلو ملازم کے بھیس میں تھا' جاکر دروازہ کھولا۔ کچھ دیر بعد جھگڑنے کی آوازیں آئیں۔ صباحت نے جلدی سے بالوں کو جوڑے کی صورت میں لپیٹا اور چادر سینے پر پھیلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ گن مین منیر خاں' عمرداز سے الجھا ہوا تھا۔ عمرداز نے اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹایا اور نہایت سنگین لہجے میں بولا۔

"بچے! تیرے جیسے بندو قتری باز بڑے دیکھے ہیں ہم نے۔ کوئی سانپ نکالنے کا شوق ہے تو وہ ابھی نکال لے۔"

صباحت نے دیکھا منیر خاں غصے سے کانپ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر بے بسی کے آثار تھے۔ حق نمک ادا کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر عمرداز کے راستے میں آنا چاہا تو عمرداز کے تیور خطرناک ہوگئے۔ صباحت کو لگا جیسے ابھی وہ منیر خاں کو تھپڑ دے مارے گا۔ صباحت اندر سے پکار کر بولی۔

"منیر خاں! آنے دو چوہدری کو۔"

اس آواز نے منیر خاں کی مشکل آسان کردی۔ اس نے ایک نظر کھڑکی کی طرف دیکھا اور برا سا منہ بنا کر چوہدری کے راستے سے ہٹ گیا۔ چوہدری نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر خوشگوار تاثرات ابھر آئے۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ اندر آکر اس نے صباحت کا حال احوال پوچھا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرکے صباحت کے موڈ کا اندازہ کرتا رہا پھر اصل موضوع پر آگیا۔ وہ بڑی چابک دستی سے صباحت کو اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔ اس کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ صباحت کے عشق میں گرفتار ہوگیا ہے (غالباً یہ وہی عشق تھا جو شیر کو بکری اور باز کو چڑیا سے ہوتا ہے) اس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس بہت دولت اور وسائل ہیں۔ ان وسائل کو اگر علاقے کی بہتری کے لئے استعمال کیا جائے تو یہاں کے باسیوں کے سارے دلدر دور ہوسکتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب صباحت چوہدری کے ساتھ ہو اور وہ دونوں مل کر یہ کام انجام دیں۔ اس مرحلے پر چوہدری نے اپنے گھریلو حالات بھی صباحت کے گوش گزار کئے۔ اس نے بتایا کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کے دوران مرگئی تھی۔ دوسری بیوی کے تین بچے ہیں۔ تینوں اب سیانے ہیں اور ان کی پرورش کا کوئی مسئلہ نہیں۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اگر صباحت دلہن بن کر اس گھر میں آجائے تو وہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

اپنے بیوی بچوں کے متعلق چوہدری جو کچھ بتا رہا تھا وہ صباحت پہلے ہی جانتی تھی بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ جان چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ چوہدری نے دو نہیں بلکہ تین شادیاں کی تھیں۔ اس کی تیسری شادی ایک طوائف سے تھی جسے اس نے شہر میں رکھا ہوا تھا۔ معلوم نہیں بعد میں اس شادی کا کیا انجام ہوا۔ اس کے علاوہ چوہدری کی ذات سے دو نئی کہانیاں وابستہ تھیں۔ وہی کہانیاں جو کھیت میں بھوکے بن کر اگتی ہیں۔ غریب کے آنگن میں خوبصورت بیٹیاں جن کر پروان چڑھتی ہیں۔ اونچی حویلیوں کے آس پاس منڈلاتی ہیں اور پھر کسی تاریک کمرے میں مخمور قہقہوں اور دبی دبی سسکیوں کے درمیان انجام پا جاتی ہیں۔ صباحت' چوہدری عمرداز کے سارے کارناموں سے آگاہ تھی مگر وہ ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں اس کے لئے ایک ناپسندیدہ فیصلہ کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد چوہدری عمرداز سے صباحت کی شادی ہوگئی۔ نمبردار عظمت نے اپنی حویلی سے صباحت کو بیٹیوں کی طرح رخصت کیا۔ وہ سرخ جوڑا پہنے' گہنوں سے لدی پھندی اس گل پوش ڈولی کی طرف بڑھی جو چوہدری عمرداز اس کے لئے لایا تھا۔ اس ڈولی کی طرف قدم اٹھانے سے پہلے صباحت نے وہ سارے خواب ذہن سے جھٹک دیے جن میں ڈاکٹر حماس اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لاہور کی خوبصورت فضاؤں میں ٹہلتا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے دل کے فریم میں ڈاکٹر حماس کی تصویر پر ایک گہرے رنگ میں ڈوبا ہوا برش پھیر دیا۔ ڈاکٹر کا روشن چہرہ ہمیشہ کے لئے ایک گہرے سرخ رنگ کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ صباحت کی رخصتی کا



منظر دیدنی تھا۔ حالانکہ وہ اس علاقے سے نہیں صرف اس گاؤں سے جارہی تھی اور وہ بھی دو میل کی دوری پر لیکن اہلِ دیہہ کی آنکھوں نے اس کے لئے اشکوں کی برسات کر دی۔ اسے جس گرمجوشی اور اپنائیت سے رخصت کیا گیا وہ یادگار تھی۔ لوگوں کے والہانہ انداز کو محسوس کر کے غم کی وہ دشوار گھاٹی' صباحت کے حافظے سے محو ہونے لگی جسے عبور کر کے وہ چوہدری عمردراز کی ڈولی تک پہنچی تھی۔

چوہدری عمردراز کی بلند و بالا حویلی میں ڈاکٹر صباحت کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ "باجی جی" سے چوہدرانی باجی بن گئی۔ شادی سے پہلے ہی صباحت نے چوہدری سے سب کچھ طے کر لیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا کلینک ایسی جگہ ہو جہاں دونوں گاؤں سے لوگ بہ آسانی پہنچ سکیں۔ اس کے لئے چوہدری نے نہر کے پاس "ڈیرہ" نامی جگہ منتخب کی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ ناگر اور چاہ مولا سے اس کا فاصلہ قریباً ایک ایک میل تھا۔ اس کے علاوہ دو قریبی دیہات سے بھی مریض بہ آسانی یہاں پہنچ سکتے تھے۔ شادی کے دو ہی ہفتے بعد صباحت نے اس نئے کلینک میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ چوہدری سے مشورہ کر کے اس نے کلینک کے ساتھ ہی پچاس بستروں کے ایک چھوٹے سے اسپتال کی بنیاد رکھ دی۔ ناگر میں لڑکیوں کے اسکول کی تعمیر بھی پھر شروع ہو چکی تھی۔ دواخانے میں نوری واپس آچکی تھی بلکہ صباحت نے اس کے علاوہ بھی دو پڑھی لکھی لڑکیوں کو نرسنگ کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ ان ساری سماجی مصروفیات میں صباحت نے اپنے گھر کو فراموش نہیں کیا۔ اس نے اپنی خداداد ذہانت اور خوش اخلاقی کی بدولت چند ہی ہفتوں میں ساس نندوں اور بچوں کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ چوہدری عمردراز بھی اس سے بہت خوش نظر آتا تھا۔ شادی کے بعد صباحت کی تمام وفاداریاں شوہر سے وابستہ تھیں اور وہ اس کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی تھی۔ وہ بے پناہ جسمانی اور ذہنی خوبیوں کی مالک تھی۔ کوئی بھی مرد اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ چوہدری عمردراز لاکھ اکھڑ سہی مگر صباحت کی دل گداز محبت نے تھوڑے ہی دنوں میں اس کی وحشتوں کو لگام دینا شروع کر دی۔ اب اس کا غصہ چڑھنے سے پہلے ہی اتر جاتا تھا اور اگر نہ اترتا تو صباحت اپنی دلنشین مسکراہٹوں سے اسے اتار دیتی تھی۔ وہ ایک طرح سے چوہدری اور علاقے کے نئے بے آسرا لوگوں کے درمیان امان بن گئی تھی۔ اس کے وجود سے ایک خلقت کو امان مل رہی تھی۔

کم و بیش دو برس تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ اس دوران علاقے میں کئی فلاحی کام ہوئے اور لوگوں کی زندگیوں میں نمایاں تبدیلی آئی۔ "چوہدرانی باجی" اب علاقے کی محبوب و ہر دلعزیز ہستی تھی۔ بڑے بڑے اس پر جان نچھاور کرتے تھے اور اس کے حکم کا ادب کرتے تھے لیکن پھر ایسا ہوا کہ اندھیرے

اندھیرے چوہدری عمردراز کی دلچسپی صباحت میں کم ہونے لگی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اب خوبصورت نہیں رہی تھی یا اس کی خوش اخلاقی میں فرق آگیا تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ حسین اور پُرکشش تھی جیسے پوری رات کا دمکتا چاند یا ایک مکمل کھلا ہوا پھول جس کی پتیوں پر شبنم کی افشاں چنی ہو لیکن کہا جاتا ہے کہ مرد کی ذات کو قرار نہیں۔ اس کی محبت انگارے کی طرح سلگتی اور راکھ کی طرح بجھ جاتی ہے۔ چوہدری عمردراز بھی انہی مردوں میں سے تھا۔ جوں جوں صباحت سے اس کا دل بھرنے لگا اس کے رویے میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ وہ صباحت کی مصروفیات پر ناک بھوں چڑھانے لگا اور اس کی خدا ترسی کو حماقت و فضول خرچی کا نام دینے لگا۔ چند پیشتر اس کے والد چوہدری اللہ رکھا بھی فوت ہو چکے تھے۔ یوں اب ایک برائے نام رکاوٹ اس کے راستے میں تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ بے لگام گھوڑے کی طرح اپنے من چاہے راستے پر بھاگ سکتا تھا..... کچھ دن بعد یہ بات سنی گئی کہ وہ کسی لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ لڑکی چوہدری عمردراز کے دوست خان عباس کے پاس ملازم تھی۔ خان عباس علاقے کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ اس کی حیثیت عمردراز سے کم نہیں تھی۔ بلکہ وہ کارخانے دار میں بھی قدم رکھ چکا تھا۔ شکر کی ایک مل میں اس کا حصہ تھا اور اگر یہ بات سامنے رکھی جاتی تو وہ عمردراز سے بڑا چوہدری تھا۔ عمردراز کا اس کے ہاں آنا جانا تھا۔ خان عباس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔ شکر بنانے والے اس امیر آدمی کو شکری کی بیماری تھی۔ وہ تین سال بیرونِ ملک علاج کرانے کے بعد حال ہی میں واپس آیا تھا۔ واپس آتے ہوئے وہ شہر سے ایک پڑھی لکھی آیا بھی لے آیا تھا۔ کہا جارہا تھا کہ اب یہی آیا چوہدری عمردراز کی منظورِ نظر ہے۔ صباحت دو تین مرتبہ عمردراز کے ساتھ خان عباس کی حویلی میں جا چکی تھی۔ اس نے وہاں وہ لڑکی دیکھی تھی۔ کٹے بالوں والی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ اس سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں اور عورتیں عمردراز کی حویلی میں کام کرتی تھیں لیکن بات دل آنے کی ہوتی ہے۔ عمردراز کا دل اس پر آگیا تھا اور صباحت یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ کیا واقعی ایسا ہو چکا ہے۔

صباحت فطرتاً ایک سادہ دل لڑکی تھی۔ وہ اپنی طرح پوری دنیا کو سچائی اور شرافت کا علمبردار سمجھتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو اس سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ کیسے خاوند کو راہِ راست پر لایا جاتا ہے اور کیسے متوقع سوکن کے لتے لئے جاتے ہیں۔ اس بیچاری کی اصل طاقت تو نیکی اور محبت میں تھی اور ان طاقتوں نے دو ہی برس میں عمردراز پر اثر انداز ہونا چھوڑ دیا تھا "یا الٰہی میں کیا کروں" وہ رات دن سوچتی رہتی۔ بہت جھجک جھجک کر اس نے چوہدری عمردراز سے یہ بات چھیڑی تو ان میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے شروع ہو گئے۔ جلد ہی صباحت کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگی کہ علاقے کے لوگ ایک بار پھر

چوہدری عمر دراز کے ظلم کی چکی میں پسنے والے ہیں۔ جرم ضعیفی کی سزا پھر شروع ہونے والی ہے اور چوہدراہٹ کا ڈنڈا پھر پورے قہر کے ساتھ حرکت میں آنے والا ہے۔

یہی پُراندیش شب و روز تھے جب صباحت کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ ایک روز وہ حویلی میں بیٹھی ایک عورت کے خانگی مسائل سن رہی تھی کہ ڈاکیا اس کے لئے ایک خط دے گیا۔ یہ خط ضلعی اسپتال کے انچارج عزیز شاہ کی طرف سے تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ اسپتال میں نیا میڈیکل آفیسر آیا ہے۔ علاقے کے طبی مسائل پر بات کرنے کے لئے سب ڈاکٹروں کو اسپتال آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ صباحت ایسی میٹنگز میں بڑی توجہ کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ اگلے روز وہ اپنے ملازم ریاض کے ساتھ چوہدری عمر دراز کی جیپ میں سوار ہو کر ضلعی اسپتال روانہ ہو گئی۔ اسپتال سے ایک دو فرلانگ دور ہی ان کی جیپ خراب ہو گئی۔ لہٰذا صباحت کو پیدل چل کر جانا پڑا۔ اس کے پہنچنے تک میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ میٹنگ روم میں پہنچی تو ایک دراز قد خوش رُو شخص تقریر کرتا نظر آیا۔ وہ ڈاکٹر حماس تھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے ٹکرائیں اور گردشِ وقت جیسے تھم گئی۔ ایک ساعت کے اندر سیکڑوں گمشدہ یادیں برقی لہروں کی طرح ذہنوں میں کوند گئیں۔ اپنی لرزشوں کو سنبھالتی ہوئی صباحت جلدی سے نزدیکی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے حیران رہنے کے بعد ڈاکٹر حماس نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر حماس کی آواز میں لرزش تھی۔ چند ہی منٹ میں یہ اکھڑی اکھڑی تقریر ختم ہو گئی اور ڈاکٹر حماس ہانپتا ہوا سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ جونہی میٹنگ ختم ہوئی ڈاکٹر حماس صباحت کی طرف چلا آیا۔ حماس کے ایک ساتھی ڈاکٹر نے صباحت کا تعارف کرانا چاہا تو حماس نے اسے ٹوک دیا۔ کہنے لگا "میں ڈاکٹر صباحت کو اتنا ہی جانتا ہوں، جتنا خود کو۔"

دونوں نے ایک دوسرے کا احوال پوچھا اور پھر وہ اس کمرے میں جا بیٹھے جو حماس کے لئے مخصوص تھا۔

حماس نے کہا "میں نے مہمانوں کی فہرست میں تمہارا نام پڑھ لیا تھا لیکن یقین نہیں تھا کہ یہ تم ہی ہو گی۔"

"یوں؟" صباحت نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تمہارے نام کے ساتھ چوہدری لکھا تھا۔"

"اب تو یقین آ گیا۔" صباحت نے پلکیں جھکا کر کہا۔

"ہاں۔ خود کو فریب دینے کی اب کوئی گنجائش نہیں۔ شادی مبارک ہو۔"

"آپ کب آئے ہیں؟" صباحت نے مبارکباد کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"تین چار مہینے ہو گئے ہیں۔ تمہارے گھر گیا تھا۔ پتا چلا کہ تم سسرال میں مستقل قیام کر چکی ہو۔ مکان بک چکا ہے اور تم نے مناسب قیمت ملتے ہی فوراً چلا دیا ہو۔ میں نے گاؤں کا نام معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی درست اطلاع نہ دے سکا۔ بس اتنا پتا چلا کہ گوجرانوالہ سے آگے کوئی گاؤں ہے۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک ملاقات ہو جائے گی۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ بالکل اچانک ہی ان کی گفتگو کے لئے موضوع ناپید ہو گیا تھا۔ آخر ڈاکٹر حماس نے ایک گہری سانس لی پوچھا۔

"صباحت، تم نے شادی کرنے میں جلدی کی۔"

وہ بولی "میرا خیال اس کے برعکس ہے۔"

حماس نے کہا "صباحت! ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے سچ بولتے رہے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ہم آج بھی سچ بولیں۔ کیا میں سچ بول سکتا ہوں؟"

"کہیے" وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر فلسفیانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "میں نے بہت سوچا ہے کہ آخر ہم دونوں میں اتنے فاصلے کیسے پیدا ہو گئے۔ کیا وجہ تھی کہ خط و کتابت کے ذریعے ہمارا رابطہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کی کئی وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک دوسرے سے جسمانی دوری، نیا ماحول، بڑھتی ہوئی مصروفیات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے ذہن میں جو سب سے اہم وجہ آتی ہے وہ یہ ہے کہ تم نے بے جا لاڈ پیار سے مجھے بگاڑ دیا تھا۔ تمہیں عجیب لگا ہو گا کیونکہ یہ فقرہ عموماً بچوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں پیار محبت کے معاملات میں مرد عورت بعض اوقات بچوں جیسے ہی ہو جاتے ہیں۔ تم نے مجھے جو والہانہ محبت دے رکھی تھی، میں خود کو اس کا مستحق سمجھنے لگا تھا۔ گاہے گاہے تم سے بے رخی اختیار کرنا اور اپنی ناز برداریوں کا لطف اٹھانا غیر شعوری طور پر میرا مشغلہ بن چکا تھا۔ میں گم ہو جاتا تھا اور تمہیں اپنی تلاش میں دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ ہر بار تم ہی مجھے ڈھونڈو گی، تم ہی مناؤ گی لیکن آخری مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ میں غیر ارادی طور پر تمہارے مزید خطوں کا انتظار کرتا رہا اور دوسری طرف تم نے مجھے میری کج ادائیوں کی قرار واقعی سزا دیتے ہوئے شادی کر لی۔"

ڈاکٹر حماس نے سب کچھ اتنی سادگی اور سچائی سے کہہ دیا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے صباحت ششدر رہ گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی وہ دونوں اکثر ایسی ہی صاف سیدھی گفتگو کرتے رہے ہیں۔ صباحت نے بغور ڈاکٹر حماس کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر گزرے دنوں کا گہرا ملال تھا لیکن لگتا تھا وہ اس ملال سے بھی حظ اٹھا رہا ہے۔

اچانک صباحت اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ "اچھا حماس، میں چلتی ہوں۔"

"کہاں؟" حماس نے پوچھا۔

"واپس اپنے گھر۔"

"تمہارا گاؤں چاہ مولا ہے نا؟" صباحت نے اثبات میں جواب دیا۔ حماس بولا "میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ چاہ مولا

سے آگے گاؤں پیراں والی میں وہاں کا زمیندار خان عباس ہے' شاید تم نے نام سنا ہو۔"

خان عباس کا نام سن کر صباحت چونکی۔ خان عباس ہی کی ملازمہ سے اس کے شوہر کا معاشقہ چل رہا تھا۔ وہ بولی "جی.... ہم جائیں ہیں خان عباس صاحب کو۔ وہ میرے شوہر کے ملنے والے ہیں۔"

"اوہ ونڈرفل۔" ڈاکٹر حماس نے کہا "پھر تو کسی دن آپ کے شوہر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ دراصل' اب خان عباس کی طرف میرا آنا جانا رہے گا۔ ہفتے کے روز وہ یہاں اسپتال آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی رپورٹیں وغیرہ دیکھی ہیں۔ آج سے وہ میرا علاج شروع کر رہے ہیں۔ ویسے کتنی عجیب بات ہے' شکر بنانے والے کا جسم بھی شکر بنانے لگا ہے۔"

"جی" صباحت نے مختصر جواب دیا۔

حماس بولا "ہاں... تو میں کہہ رہا تھا آپ بھی ساتھ ہی چلئے۔ کس پر آئی ہیں آپ؟"

"جیپ پر آئی تھی۔" صباحت نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ جیپ خراب ہے اور اسے واپس جانے میں بہت دشواری ہوگی۔ ڈاکٹر حماس کی پیش کش قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

****

نیم پختہ راستہ' چاروں طرف کھیت تھے۔ کہیں کہیں رہٹ یا ٹیوب ویل چل رہے تھے۔ ابھی وہ ناگر سے تین چار میل دور ہی تھے کہ مطلع تیزی سے ابر آلود ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہیں شدید طوفانِ باد و باراں نے آلیا۔ بہت موٹے اولے پڑنے لگے۔ ایسے اولے صباحت نے کم ہی دیکھے تھے۔ ڈاکٹر حماس کی سوزوکی کار ٹھکا ٹھک بج اٹھی۔ اسے اولوں سے بچانے کے لئے وہ برگد کے ایک درخت تلے چلے گئے۔ ویسے خراب موسم میں سفر جاری رکھنا ویسے بھی خطرناک تھا۔ بہتر تھا کہ طوفان کا زور ٹوٹنے کا انتظار کیا جاتا۔

کار کے شیشے چڑھا کر انہوں نے سردی کی یلغار روکنے کی کوشش کی اور دھیان بٹانے کے لئے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ جلد ہی گفتگو کا رخ صباحت کے شوہر اور اس کی ازدواجی زندگی کی طرف مڑ گیا۔ صباحت کا دل دکھا ہوا تھا۔ ماضی کے ایک مخلص اور غمگسار ساتھی کو سامنے پا کر صباحت بہت سی ایسی باتیں نہ چھپا سکی جو اسے چھپانی چاہئیں تھیں۔ درحقیقت حماس اور صباحت کا تعلق عجیب طرح کا تھا۔ گو یہ تعلق بوجوہ پروان نہیں چڑھ سکا تھا لیکن انہوں نے اس تعلق کے دوران کبھی ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اگر جھوٹ بولنے کی نوبت آتی تو وہ ایک دوسرے کا سامنا ہی نہ کرتے... اس دن بھی صباحت نے اپنے بہت سے غم ڈاکٹر حماس کے سامنے آشکار کر دیئے۔ اس نے ڈاکٹر کو بتا دیا کہ یہاں دیہات میں آ کر اس نے عام شخص کی بے چارگی کیا عالم دیکھا۔ کیوں وہ چوہدری عمر دراز سے شادی پر مجبور ہوئی اور کس طرح عمر دراز نے شادی کے ڈیڑھ دو برس بعد اس سے آنکھیں بدلنی شروع کر دیں۔

ڈاکٹر حماس نے یہ سب کچھ بڑی دردمندی سے سنا۔ آخر میں چوہدری عمر دراز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں محتاط رہا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ بھی ہے' آخر وہ اس کا شوہر ہے اس کو برا ٹھہرا کر وہ کوئی دانائی کا کام نہیں کرے گا۔ اس نے وضاحت سے بس اتنا ہی کہا۔

"عمر دراز جیسے چوہدریوں کے لئے شادی عموماً ایک کھیل تماشا ہوتی ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کا انجام ایسی شادیوں سے مختلف ہو تو تمہیں اپنے اندر رکھ رکھاؤ کی بے پناہ ہمت پیدا کرنی ہوگی۔"

صباحت کے چہرے پر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ بولی "میں نے اپنی ذات پر ہر مصیبت جھیلی ہے..... اور جھیل رہی ہوں لیکن مسئلہ ان لوگوں کا ہے جن کی تمام تر امیدیں مجھ سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ وہ مجھے "چوہدرانی باجی" کہتے ہیں اور میرا نام لے لے کر جیتے ہیں۔ اگر میں ان کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی تو یہ کتنا بڑا المیہ ہوگا..... شاید آپ اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ کاش میں یہاں آئی ہی نہ ہوتی۔"

صباحت نے اپنا سر جھکایا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ حماس اسے دلاسا دینے لگا۔ وہ بڑی ذہانت سے گفتگو کا رخ دوسرے موضوعات کی طرف موڑ لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد بارش کا زور کم ہو گیا۔ وہ برگد کے سائے سے نکلے اور اپنے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔

****

حماس سے صباحت کی اگلی ملاقات تقریباً تین ہفتے بعد خان عباس کی حویلی میں ہوئی۔ وہاں ایک تقریب تھی۔ صباحت اپنے شوہر عمر دراز کے ساتھ شریک ہوئی تھی۔ ان تین ہفتوں میں صباحت اور عمر دراز کی گھریلو زندگی کچھ اور تلخ ہو چکی تھی۔ عمر دراز ناراض ہو کر چند دنوں کے لئے کلینک بھی نہیں گئی تھی۔ مگر پھر اسے اپنے مریضوں اور دوسرے لوگوں کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ تقریب میں بھی وہ بڑی بے دلی سے شریک ہوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ حماس اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اس کے بارے میں فکرمند ہے۔ دونوں میں مختصر گفتگو بھی ہوئی۔ حماس نے عمر دراز سے بھی ہاتھ ملایا اور اس کا حال احوال پوچھا۔

اس واقعے کے بعد بھی صباحت اور حماس کا دو دفعہ آمنا سامنا ہوا۔ ایک مرتبہ ضلعی اسپتال میں اور دوسری دفعہ چاہ سولا کے راستے میں۔ صباحت نے جب بھی دیکھا اسے حماس کی نگاہوں میں

اپنے لئے بہبودی اور تشکر کے احساسات دکھائی دیئے۔ ایک دن صباحت کو معلوم ہوا کہ حماس ملاقاتیوں میں کسی جگہ فری آئی کیمپ لگوانا چاہتا ہے۔ صباحت کی بہت عرصے سے خواہش تھی کہ کوئی ایسا ذریعہ اختیار کیا جائے۔ اس اطلاع پر اس نے اپنے ملازم ریاض کے ہاتھ فوراً ڈاکٹر حماس سے رابطہ قائم کیا اور اسے یہ مشورہ دیا کہ کیمپ چاہ سولا میں لگایا جائے۔ اپنے دو ساتھی ڈاکٹروں سے علیحدہ مشورے کے بعد ڈاکٹر حماس اس بات پر رضامند ہوگیا۔ تین روز بعد لوگ صباحت کے کلینک پہنچے۔ کیمپ کے لئے جگہ منتخب کی گئی اور اگلے ہی روز کام شروع ہوگیا۔ ایک کھلے میدان میں شامیانوں کا اسپتال بنا دیا گیا۔ چارپائیاں اور بستر وغیرہ قریبی دیہات سے اکٹھے کئے گئے۔ صباحت کی وجہ سے عام لوگوں نے اس نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کیمپ کی خبر بہت جلد پورے علاقے میں پھیل گئی اور مریض معائنہ کرانے پہنچنے لگے۔ پروگرام کے مطابق اس کیمپ کا افتتاح خان عباس کو کرنا تھا۔ امید تھی کہ وہ اس موقع پر ایسے مزید کیمپ لگانے کے لئے "مالی تعاون" کا اعلان بھی کرے گا۔ افتتاح کے روز ڈاکٹر حماس اور صباحت سمیت کیمپ کے دیگر منتظمین خان عباس کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہیں پہنچا۔ اس کی خیر لانے کے لئے دو افراد کو "پیراں والی" دوڑایا گیا۔ انہوں نے تین گھنٹے بعد آکر اطلاع دی کہ خان عباس کی طبیعت ناساز ہے۔ یہ سراسر غلط بیانی تھی۔ خان عباس کی طبیعت ناساز ہوتی تو سب سے پہلے حماس کو اطلاع ہوتی کیونکہ وہ اس کا معالج تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ غالب گمان یہی تھا کہ خان عباس کے نہ آنے کی وجہ چوہدری عمر دراز ہے۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ کیمپ عمر دراز کی مرضی کے بغیر لگا ہے۔ لہٰذا وہ افتتاح کرکے چوہدری سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

صباحت نے اس کیمپ کا افتتاح اپنے گاؤں کے سب سے بزرگ شخص سے کروایا اور اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کردیا۔ کیمپ سے چھوٹے سے آپریشن تھیٹر میں مسلسل آپریشن ہونے لگے۔ ڈاکٹر حماس امریکا سے آئی اسپیشلسٹ بن کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شفا بھی بہت تھی۔ اس نے روزانہ متعدد آپریشن کئے اور کامیابی سے کئے۔ سارا دن مصروف رہنے کے بعد شام کو جب کام ختم ہوتے تو قریب ہی واقع صباحت کے کلینک میں بیٹھتے۔ ایسے میں گرم بھاپ اڑاتی چائے اور ہلکی پھلکی گفتگو اعصاب کو سکون دیتی۔

ایک روز صباحت اور حماس کلینک میں تنہا بیٹھے تھے۔ مغرب کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے دور تک سبز کھیتوں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ان کھیتوں سے پرے سورج ایک سرخ تھال کے مانند کسی نامعلوم جھیل میں ڈوب رہا تھا۔ چائے کی چسکی لے کر ڈاکٹر حماس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"صباحت! میں کوئی مدد کرسکتا ہوں؟"

"کس سلسلے میں؟" صباحت نے پوچھا۔

"تمہاری اداسی دور کرنے کے سلسلے میں..... صباحت! ہم وہ نہیں رہے جو پہلے تھے لیکن اچھے دوست تو اب بھی ہیں۔ ہمارے درمیان اخلاص کا رشتہ قائم ہے۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"خوشی اب میرے نصیب میں نہیں ہے۔" صباحت نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"نصیب تو انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ایک انسان کے اندر اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی جو قوت ہوتی ہے وہی نصیب کہلاتی ہے۔" صباحت خاموش رہی۔ حماس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا "تمہارے حالات جاننے سے پہلے میں تمہاری اداسی کو سمجھ نہیں پایا تھا لیکن اب محسوس کررہا ہوں کہ تمہارا رویہ بے جواز نہیں۔ تم جو زندگی جی رہی ہو وہ جبرِ مسلسل کا دوسرا نام ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں تبدیلی کا بھی کوئی امکان نہیں۔ جہاں تک میں چوہدری عمر دراز کو سمجھ پایا ہوں وہ تمہاری خاطر اپنی فطرت تبدیل نہیں کرسکتا۔"

صباحت منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں گہرا اندھیرا خوبصورت مناظر کو ہڑپ کرتا چلا جارہا تھا۔

حماس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "صباحت! تم ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہو، میں تمہیں کوئی مشورہ دینا نہیں چاہتا اور نہ ہی مجھے دینا چاہئے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کی کوشش کرو اور اگر یہ جان جاؤ کہ ایسا نہیں کرپاؤ گی تو پھر ایک دھتکاری پھٹکاری ہوئی مفلوج زندگی گزارنے کے بجائے کوئی ایسا فیصلہ کرلو جو بے شک تلخ ہو لیکن سود مند ہو۔"

ابھی صباحت اور حماس نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ حماس کا ایک ساتھی ڈاکٹر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے بتایا کہ چوہدری عمر دراز صاحب آرہے ہیں۔ وہ بڑے غصے میں دکھائی دیتے ہیں۔ اتنے میں ایک نرس بھی آگئی۔ اس کے چہرے پر بھی یہی اطلاع درج تھی۔ صباحت اٹھ کر باہر نکلی۔ عمر دراز دندناتا ہوا اندر داخل ہورہا تھا۔ صباحت نے دیکھا اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہے۔ وہ حاضرین کی پروا کئے بغیر غرایا۔

"میں نے کہا تھا دوپہر سے پہلے تم واپس آجاؤ گی۔ اب چھ بج رہے ہیں۔"

صباحت نے کہا "میں نے ریاض کے ہاتھ اطلاع بھجوادی تھی کہ....."

عمر دراز نے تیزی سے صباحت کی بات کاٹی۔ ایک گالی ریاض کو اور دوسری اطلاع کو دے کر پھنکارا۔ "بڑا شوق چڑھا ہوا ہے تمہیں خدمتِ خلق کا۔ گھر میں خدمت کرلی تھی جو یہاں آگئی ہو؟ ساس بیمار پڑی ہے، بچے آوارہ پھر رہے ہیں اور یہاں خدمت خلق ہورہی ہے۔ میں کہتا ہوں ختم کرو یہ تماشا۔ اٹھاؤ یہاں سے

بستر لو۔ نہیں تو میں خود اٹھوا لیتا ہوں۔"

صباحت نے کہا "اچھا آپ یہاں مجمع نہ لگائیں..... چلیں آئیں۔ جو بات ہے گھر میں جا کر کر لینا۔" وہ باہر نکلنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی تو عمر دراز نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میں کہتا ہوں یہاں فیصلہ کر کے جاؤ۔ یہ کیمپ والا تماشا ختم کرتا ہے کہ نہیں۔"

ڈاکٹر حماس نے نرمی سے کہا "چوہدری! یہ نیکی کا کام ہے' آپ اسے کھیل تماشا کہہ رہے ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے پوچھیں جنہیں آنکھوں کی روشنی ملی ہے اور بخدا ہم یہ کام کسی لالچ سے نہیں کر رہے....."

"آپ چپ رہیں جی۔" عمر دراز نے زہریلے لہجے میں حماس کی بات کاٹی۔ "مجھے اپنی بیوی سے بات کرنے دیں۔" وہ اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر صباحت کی طرف مڑا اور فیصلہ کن انداز میں بولا "ہاں..... بتاؤ۔ یہ ڈنگر خانہ ختم کرتا ہے کہ نہیں۔"

صباحت نے روہانسی آواز میں کہا۔ "آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اتنی جلدی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

عمر دراز غرایا "اس کا مطلب ہے تم انکار کرتی ہو..... ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ تم کل تک فیصلہ کر لو کہ تمہیں یہ ڈاکٹری رکھنی ہے یا گھر۔"

وہ پاؤں سے زمین کوٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ صباحت اس کے پیچھے گئی۔ دروازے پر پہنچ کر آواز دی لیکن عمر دراز بگولے کی طرح آگے بڑھ چکا تھا۔

اس رات صباحت اپنے سسرال جانے کے بجائے اپنے میکے چلی گئی۔ تاثر گاؤں اس کا میکا ہی تھا۔ یہاں سے نمبردار عظمت نے اسے بیٹی کی طرح رخصت کیا تھا۔ یہاں صباحت کا اپنا مکان بھی تھا۔ تاہم وہ اپنے مکان کے بجائے نمبردار کے گھر ہی ٹھہری۔ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ شاید اب اسے دوبارہ چاہ مولا جانا نصیب نہیں ہوگا۔ اس کی آنکھیں ہی نہیں سارا جسم رو رہا تھا۔ ہر مسام سے پسینے کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کی ناؤ ڈوبتے ہوئے صاف دیکھ رہی تھی۔

نمبردار عظمت اور دوسرے معزز افراد نے میاں بیوی میں صلح کرانا چاہی لیکن ان کوششوں نے الٹا اثر دکھایا۔ حالات مزید بگڑ گئے۔ بگاڑ کا سبب چوہدری عمر دراز ہی تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صباحت کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتا۔ اگر کیمپ والا واقعہ نہ ہوتا تو بھی وہ یقیناً کوئی اور بہانہ ڈھونڈ لیتا۔ صباحت سے علیحدگی کے جہاں اور بہت سے فائدے تھے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ اس کی دوسری شادی کی راہ ہموار کرنے کے لئے جگہ خالی ہو جاتی۔

اور پھر ایک روز صبح سویرے آسمان ٹوٹ کر صباحت کے سر پر گرا۔ وہ اپنی جا۔ پھر ایسی بنی کھڑی رہ گئی۔ ڈاکیے نثار نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھمایا تھا۔ اس لفافے کو کھولنے سے پہلے صباحت سمجھ گئی تھی کہ اس میں کیا ہے۔ اس خاکی لفافے میں اس کے لئے طلاق لکھی تھی۔ طلاق کا لفظ کسی انگارے کی طرح دہکتا رہا اور لفافے کے اندر سے اس کی ہتھیلی کو جلاتا رہا۔ آخر نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گئی۔

***

صباحت اور عمر دراز کا ازدواجی رشتہ ٹوٹ گیا۔ مگر ملانے کے لوگوں سے "باجی جی" کا جو رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ نہیں ٹوٹا۔ ٹوٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ "باجی جی" اس ماحول کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ وہ ہر ایک کی کچی دیواروں' ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور کھیتوں کھلیانوں میں جذب ہو چکی تھی۔ وہ آنکھوں میں رہتی تھی' دلوں میں بستی تھی اور ہر سانس کے ساتھ چلتی تھی۔ عمر دراز سے علیحدہ ہو کر بھی اس نے کلینک جانا نہیں چھوڑا تاہم یہ کلینک پھر ناگر گاؤں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح مریضوں کو دیکھتی رہی۔ گھروں میں گھومتی رہی اور لوگوں کے دکھ سکھ بٹاتی رہی۔ تقریباً دو مہینے اسی طرح بیت گئے۔ تاثر گاؤں کے لوگ صباحت کی واپسی پر بے حد خوش تھے لیکن ان میں سے سیانے لوگ کچھ ڈرے ڈرے بھی تھے۔ نجانے کیوں وہ چوہدری عمر دراز کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔

ایک روز صباحت کو کلینک کے پتے پر ضلعی اسپتال کی طرف سے وہی خط ملا جس میں کبھی کبھار ڈاکٹروں کو میٹنگ کے لئے بلایا جاتا تھا۔ خط پر ڈاکٹر حماس کے دستخط تھے۔ دستخط دیکھ کر صباحت کو یاد آیا کہ پچھلے دو مہینے میں ایک بار بھی حماس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ خود گاؤں سے نکلی تھی اور نہ ہی حماس نے آنے کا تکلف کیا تھا۔

اگلے روز میٹنگ میں شرکت کے لئے صباحت ضلعی اسپتال پہنچی۔ یہ طویل سفر اس نے اپنے ملازم ریاض کے ساتھ تانگے اور بس پر کیا تھا۔ وہ اسپتال پہنچی تو کہیں بھی میٹنگ کے آثار نظر نہیں آئے۔ ڈاکٹر حماس اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ صباحت کو اس کے چہرے سے اندازہ ہو گیا کہ حماس نے بہانے سے اسے یہاں بلایا ہے۔ وہ فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ صباحت کے ساتھ وہ اپنے ریٹائرنگ روم میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے اور چائے پلانے کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے کہا۔

"صباحت! میرے خیال میں بہتر ہے کہ اب تم گاؤں چھوڑ دو۔"

"کیوں؟" صباحت نے پوچھا۔

ڈاکٹر حماس نے الٹا سوال کیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ عمر دراز نے تم سے علیحدگی کیوں اختیار کی ہے۔"

صباحت اس سوال کے جواب میں خاموش رہی۔ حماس نے کہا۔ "شاید تمہارا خیال ہو کہ وہ..... تم سے اکتا گیا تھا اور نئی محبوبہ کو بیوی بنانا چاہتا تھا۔ یہ بھی علیحدگی کی ایک وجہ ہے لیکن ایک وجہ اور بھی ہے جو زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ عمر دراز تمہیں اس

ہوں بلکہ اس علاقے میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ درحقیقت تم نے اس گاؤں میں جاکر عمردراز کے اثر و رسوخ کو للکارا تھا اور اس کے بے پناہ اختیارات پر روک لگائی تھی۔ وہ اول روز سے تمہیں اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہے۔ اسی دشمنی کے نتیجے میں تمہاری شادی ہوئی اور اب یہی دشمنی عمردراز کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ تمہیں اپنے علاقے سے نکال باہر کرے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

صباحت کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی لمبی پلکوں پر شبنم اٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر حماس نے کہا "کبھی کبھی انسان کو حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ بالکل جیسے لمبی چھلانگ لگانے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تمہارے لئے بھی یہ سمجھوتے کا وقت ہے۔"

صباحت نے کہا "لیکن حماس، وہ لوگ جو میرے بغیر گمشدہ بچوں کی طرح غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ جن کے لئے میں سب کچھ ہوں۔"

حماس بولا "یہی تلخیاں سمیٹنے کا نام تو سمجھوتا ہے.... یقیناً تمہیں دکھ ہوگا لیکن ہو سکتا ہے کل کلاں اسی دکھ سے سکھ کا کوئی سبب پیدا ہو جائے۔" سگریٹ سلگا کر اس نے اوپر تلے کئی کش لئے اور آگے جھک کر بولا "مجھے اپنے ایک خاص مخبر سے اطلاع ملی ہے کہ چوہدری عمردراز کے کارندے تمہیں یہاں سے بھگانے کے چکر میں ہیں۔ پرسوں تھانیدار غلام علی کو چوہدری نے حویلی بلایا ہوا تھا۔ وہاں پر یہی پروگرام بنتے رہے ہیں۔ چند ماہ پہلے تمہارے کلینک میں کسی عورت کا بچہ فوت ہو گیا تھا۔ عمردراز نے اس بچے کی ماں اور رشتے داروں کو بھڑکایا ہے کہ وہ تمہارے اوپر کیس کریں اور الزام لگائیں کہ ڈاکٹرنی مخالفین سے پیسے لے کر بچے کو زہر کا ٹیکا لگا دیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس واقعے کو آڑ بنا کر تمہارے کلینک میں توڑ پھوڑ بھی کی جائے۔"

صباحت کا چہرہ زرد نظر آنے لگا۔ اس نے غصے سے کہا "لیکن یہ جھوٹ ہے، میں ثابت کروں گی کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"کیا کیا ثابت کرو گی، ثبوت مانگ مانگ کر چوہدری عمردراز اور اس کے گماشتے تمہیں پاگل کر دیں گے۔"

وہ کتنی ہی دیر صباحت کو سمجھاتا رہا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لہجے میں خلوص اور ہمدردی تھی۔ اس کے علاوہ وہ لگاؤ تھا جو برسوں پہلے اس نے جسم اور سائے کی طرح ساتھ رکھتا تھا۔ ان کے دلوں میں پھول کھلاتا تھا اور ان کی آنکھوں کو اچھے سپنے دکھاتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹا حماس کے پاس بیٹھنے کے بعد صباحت نے اجازت چاہی۔ حماس کو جب معلوم ہوا کہ وہ بسوں پر دھکے کھاتی یہاں تک پہنچا ہے تو وہ مصر ہو گیا کہ اسے خود گاؤں چھوڑ کر آئے گا۔ صباحت نے کہا کہ یہ مناسب نہیں ہے لیکن حماس اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر صباحت اس حد تک راضی ہو گئی کہ وہ پختہ سڑک کا سفر حماس کے ساتھ کرے گی۔ باقی کا فاصلہ وہ اور ریاض تانگے پر طے کریں گے۔

سہ پہر کے وقت صباحت، حماس اور ریاض سوزوکی کار پر اسپتال سے روانہ ہوئے۔ ان کا سفر قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا۔ صباحت کے کہنے پر حماس نے اسے تانگوں کے اڈے سے ایک فرلانگ ادھر ہی اتار دیا۔ صباحت اپنے ملازم کے ساتھ پیدل چل دی۔ کچھ آگے جا کر صباحت نے مڑ کر دیکھا۔ حماس کی گاڑی ابھی تک وہیں تھی اور وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ گاڑی سے کوئی سو گز دور گئی تھی کہ اچانک کنارے کی لمبی گھاس میں سے تین چار افراد نکل کر سامنے آ گئے۔ صاف محسوس ہوا کہ یہ لوگ ان کی گھات میں بیٹھے تھے۔ لباس اور حلئے سے یہ افراد خانہ بدوش نظر آتے تھے۔ چاہ مولا کے قریب ان کی ایک چھوٹی سی خیمہ بستی کافی عرصے سے آباد تھی۔ ان کو "دین دار" کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ چوری چکاری و مار پیٹ میں بدنام تھے۔ صباحت نے دیکھا ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں پستول ہے اور باقی کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہیں۔ ان کے تیور دیکھ کر صباحت کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر ریاض کا گریبان پکڑ لیا اور دوسرے نے لاٹھی گھما کر پورے زور سے اس کی گدی پر ماری۔ وہ تیورا کر زمین پر گرا۔ چاروں افراد اسے بری طرح پیٹنے لگے۔ لگتا تھا کہ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ صباحت چیختی ہوئی اس کی جانب بڑھی لیکن حملہ آوروں نے دھکے دے کر اسے دور گرا دیا۔ اتنے میں صباحت کی نگاہ گاڑی کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا حماس بھاگتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ حماس نے قریب پہنچ کر "دین داروں" کے ہاتھ روکنے چاہے تو وہ اسے بھی بے دریغ پیٹنے لگے۔

صباحت ایک بار پھر چیختی ہوئی ان کی مدد کو بڑھی۔ اس دفعہ ایک لمبے شخص نے لاٹھی گھما کر صباحت کے کندھے پر ماری۔ اس کا پورا بازو جھنجھنا اٹھا اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لمبا آدمی چیخا "دفعہ ہو جاؤ یہاں سے ورنہ مار ڈالیں گے تجھے بھی۔"

صباحت زور زور سے مدد کے لئے چیخنے لگی۔ اسی دوران ہاتھا پائی میں حماس نے نجانے کس طرح پستول بردار شخص سے پستول چھین لیا۔ صباحت کے سامنے اس نے پستول پورے زور سے ایک شخص کے چہرے پر مارا۔ وہ چلاتا ہوا کنارے کی لمبی گھاس میں گرا۔ حماس نے اوپر تلے دو ہوائی فائر کئے اور گرج کر بولا۔

"چھوڑ دو اسے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو۔"

جن دو افراد نے ریاض کو گرایا ہوا تھا وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئے۔ حماس نے دلیری سے پستول ان کی طرف سیدھا کر لیا اور چلایا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

حملہ آوروں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مزدور بھی بھاگم بھاگ موقع واردات کی طرف آ رہے تھے۔ حملہ آوروں نے حماس کو خونی نظروں سے دیکھا اور

دھمکیاں دیتے ہوئے جھاڑیوں کے عقب میں اوجھل ہو گئے۔ صباحت لپک کر ریاض کے پاس آئی۔ اس کے رخسار پر کلہاڑی کا گہرا زخم تھا۔ لاٹھی کی ضرب سے ایک کلائی ٹوٹ کر لٹک رہی تھی۔ وہ شدید زخمی تھا۔ صباحت نے لرزاں آوازیں حماس سے کہا۔

"اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

حماس نے کہا "تم اس کا خون روکو۔ میں گاڑی لاتا ہوں۔"

صباحت نے اپنا دوپٹا اس کے زخم پر باندھا۔ اتنے میں حماس گاڑی لے آیا۔ موقع پر موجود لوگوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ریاض کو گاڑی میں ڈالا اور حتی الامکان تیزی سے واپس اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسپتال میں ریاض کے زخموں میں کئی ٹانکے لگے۔ ڈاکٹر حماس نے خود زخمی ہونے کے باوجود اسے دو بوتل خون دیا۔ دو تین گھنٹے بعد اسے ہوش آسکا۔ صباحت اور حماس سے باتیں کرتے ہوئے ریاض نے بتایا کہ وہ حملہ آوروں کو جانتا ضرور تھا لیکن ان سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس بات میں شبے کی بالکل گنجائش نہیں تھی کہ یہ کارروائی بھی چوہدری عمرداز کے ایما پر ہوئی ہے۔ چوہدری عمرداز اب صبر کا دامن چھوڑ کر مار دھاڑ پر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ صباحت کو ہر صورت اس گاؤں اور اس علاقے سے رخصت کرنا چاہتا تھا۔

اس رات صباحت اور حماس میں دیر تک اس مسئلے پر بات ہوئی۔ بہت کوشش کے بعد حماس نے صباحت کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ فی الحال گاؤں چھوڑ کر لاہور چلی جائے۔ اس فیصلے کا کڑوا گھونٹ صباحت نے بڑی دشواری کے ساتھ حلق سے نیچے اتارا۔ وہ اپنا ضروری سامان لینے کے لئے گاؤں واپس جانا چاہتی تھی لیکن حماس نے اپنے دو آدمی بھیج کر وہ سامان اسپتال میں ہی منگوا لیا۔ اگلے روز علی الصباح وہ دونوں زخمی ریاض کو لے کر بذریعہ کار لاہور روانہ ہو گئے۔

لاہور میں صباحت کا آبائی مکان فروخت ہو چکا تھا۔ وہ کسی عزیز کے ہاں بھی جانا نہیں چاہتی تھی' لہٰذا حماس نے اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور تین چار روز بھاگ دوڑ کر کے اس کے لئے کرائے کے ایک مناسب مکان کا بندوبست کر دیا۔ ریاض اب کافی بہتر تھا۔ صباحت اس کے ساتھ کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئی۔ حماس نے اپنے گھر کی ایک پرانی نوکرانی کی خدمات صباحت کے سپرد کر دیں۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے سرکنے لگا۔ چودہ پندرہ روز بعد نبیہ اور عظمت اسے گاؤں سے ملنے آیا۔ اس نے صباحت کے اس فیصلے کو سراہا کہ وہ گاؤں کی سلگتی آگ سے نکل کر یہاں آگئی ہے۔ صباحت نے نمبردار سے کہہ کر اپنا باقی سامان بھی منگوا لیا۔ ڈاکٹر حماس اس بحرانی دور میں ہر طرح اس کا تعاون کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صباحت خود کو مصروف رکھنے کے لئے کسی ادارے سے منسلک ہو جائے یا اپنا کلینک کھول لے۔ اس کے علاوہ وہ صباحت کو شادی کر لینے کا مشورہ بھی دے رہا تھا۔ یہ مشورہ بڑے شائستہ انداز سے اور ڈھکے چھپے الفاظ میں دیا جاتا تھا۔ وہ واضح طور پر یہ نہیں کہتا تھا کہ صباحت اس سے شادی کر لے لیکن اس کی آنکھیں وہ سب کچھ کہتی تھیں جو وہ نہیں کہتا تھا۔ ان آنکھوں میں گئی رُتوں کی کسک تھی اور کچھ ادھورے خواب تھے۔ یہ آنکھیں کہتی تھیں "صباحت' تمہیں کھو کر مجھے اپنی محبت کی شدت کا احساس ہوا ہے۔ تم میرے لئے اب بھی وہی پانچ برس پہلے کی صباحت ہو۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں' اپنے رگ و پے میں بسانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں' پچھتاوے ختم کرنے کا جو موقع قدرت نے ہمیں دیا ہے وہ ضائع نہ ہو جائے" کبھی باتیں کرتے کرتے وہ اتنی محویت سے صباحت کو دیکھنے لگتا کہ اسے بات ہی بھول جاتی۔ اس کی کیفیت محسوس کر کے صباحت کے جسم میں جو لہر سی دوڑ جاتی۔ ایسے میں وہ کوشش کرتی کہ اس کی نگاہوں کے جال سے دور ہٹ جائے۔

پھر ایک روز وہ صباحت سے ناراض ہو گیا۔ ناراضی کا سبب یہی تھا کہ صباحت اس کی خواہش کے مطابق کوئی اشارہ نہیں دے رہی تھی۔ حماس کی تمام ترغیبات اس پر بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ اس روز وہ صباحت کے چہرے پر بہت دیر اپنے سوال کا جواب ڈھونڈتا رہا۔ آخر جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

"صباحت' کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تمہیں میرا یہاں آنا ناگوار گزرتا ہے۔"

صباحت بولی "حماس' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اور آپ کے آنے سے ناگواری محسوس کروں گی۔"

وہ کہنے لگا "پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے۔ شاید اس لئے کہ میں خود بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا۔"

ایسی ہی چند باتیں کرنے کے بعد وہ چلا گیا۔

قریباً دو مہینے گزر گئے۔ حماس نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ غالباً وہ لاہور ہی نہیں آیا تھا۔ صباحت نے ایک دو بار اسے فون پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ پھر ایک روز لاہور کے ایک سرکاری اسپتال میں صباحت کی ملاقات خان عباس سے ہوئی۔ وہ وہاں اپنی ایک عزیزہ کو داخل کرانے آیا تھا اور اسی سلسلے میں اسے صباحت کا تعاون درکار تھا۔ صباحت نے اس سے بھی حماس کے متعلق پوچھا۔ خان عباس نے بتایا "اب میں کافی بہتر ہوں اس لئے ڈاکٹر حماس سے زیادہ ملاقات نہیں ہوتی۔ آخری دفعہ میں ایک مہینہ قبل اس سے ملا تھا" اس نے یہ بھی بتایا کہ

حماس ابھی تک ضلعی اسپتال میں تعینات ہے۔

یہ دو ڈھائی مہینے صباحت نے بے حد اضطراب میں گزارے۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ رہ رہ کر اس کے سامنے ان سیکڑوں بے زبان لوگوں کا تصور آجاتا تھا جو اس کے کچھ نہیں لگتے تھے لیکن جن سے اس کا اٹوٹ رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ ایسا رشتہ جو خونی ناتوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس رشتے نے اس پر بہت سی ذمے داریاں ڈال دی تھیں۔ ابھی اسے کتنی لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرنا تھا۔ کتنے مریضوں کو جینے کا حوصلہ دینا تھا۔ ابھی کتنے ننگ دھڑنگ بچے گلیوں میں آوارہ پھر رہے تھے۔ وہ سوچتی رہی کوئی ایسا درمیانی راستہ تلاش کرتی رہی جس میں حماس اس کا ہم سفر ہو اور وہ ہزاروں لوگ بھی اس کے ساتھ چل سکیں جن کے بغیر زندہ رہنا اب اسے محال نظر آتا تھا۔ وہ ایک ایسی منزل کی تلاش میں تھی جہاں اس کی روح اور جسم دونوں سکون پا سکیں۔ بہت دن سوچنے اور مسائل کے سمندر میں غوطہ زن رہنے کے بعد..... آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اسی فیصلے نے اسے ہوا کی طرح ہلکا پھلکا کر دیا۔ وہ اس بوجھ سے آزاد ہو گئی جو ہفتوں سے اس کے لئے عذاب بنا ہوا تھا۔ اگلے روز بہت دنوں کے بعد اس نے نہا دھو کر لباس بدلا' بال سنوارے اور باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اتفاق خان عباس کا ڈرائیور گاڑی سمیت ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے شوگر مل سے ہوتے ہوئے گاؤں واپس جانا تھا۔ صباحت نے اس سے کہا کہ وہ اسے راستے میں ضلعی اسپتال اتارتا جائے۔

وہ دوپہر کے وقت اپنی منزل مقصود پر پہنچی۔ اسپتال کے احاطے میں ڈاکٹر حماس کی نیلی سوزوکی کار موجود نہیں تھی۔ پتا چلا کہ وہ آج گھر ہی میں ہیں۔ حماس کا رہائشی کوارٹر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ صباحت پیدل ہی چلتی ہوئی قریباً پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ یہ چار کمرے کا ایک چھوٹا سا بنگلا نما گھر تھا۔ ڈاکٹر حماس کا ملازم اپنے صاحب کو اطلاع دینے اندر گیا۔ چند ہی لمحے بعد حماس ننگے پاؤں لپکتا ہوا باہر آگیا۔ اس کی شیو بڑھی تھی اور بال الجھے ہوئے تھے خاصا "ورف" نظر آرہا تھا۔ صباحت کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے روشنی پھوٹ نکلی۔ اس نے آگے بڑھ کر صباحت کا استقبال کیا اور اسے سٹنگ روم میں لے آیا۔ یہاں ہر طرف کتابیں اور کپڑے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر حماس نے انہیں سمیٹ سمٹا کر ایک جانب رکھا۔

صباحت نے کہا "حماس! آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں۔"

وہ مسکرایا "پریشان نہیں 'پریشان حال کہو۔"

وہ بالوں کو پیشانی سے جھٹک کر بولی "ہاں' میں یہی کہنا چاہتی تھی..... اور..... آپ اتنے دن آئے بھی نہیں۔"

"اب تم جو آگئی ہو۔"

صباحت مسکرانے لگی۔ حماس نے صباحت کے لئے عمدہ کافی بنوائی۔ موسم بڑا خوب صورت تھا۔ وہ باغیچے میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ گئے۔ کہیں قریب ہی ریڈیو' ٹیپ ریکارڈر سے پُرسوز لے ابھر رہی تھی۔ دل میں میٹھے میٹھے درد کے پھول کھلے۔ پھر یادوں کی ہوا چلی' پھر شام ہوئی۔ حماس کافی پیتے ہوئے بغور صباحت کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ آخر کہنے لگا "صباحت' بہت عرصہ تمہارے ساتھ رہنے کے بعد اب میں تمہارے چہرے کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔"

وہ بولی "کیا کہتا ہے میرا چہرہ؟"

حماس نے کہا "میرا خیال ہے' پچھلے دنوں میں تم نے کچھ اور نہ بھی کیا ہو..... تو کم از کم شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

صباحت کے چہرے پر لرزنے والا رنگ اس سوال کا جواب ہاں میں دے گیا۔

وہ سنبھل کر بولی "کم از کم شادی کے فیصلے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

حماس نے مسکرا کر کہا "میرا مطلب ہے شادی کا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ شریک حیات کا انتخاب معلوم نہیں ہوا ہے یا نہیں۔"

یکایک صباحت کے چہرے کو گہری افتاد سنجیدگی نے دبوچ لیا۔ وہ عجیب لہجے میں بولی "یہ فیصلہ بھی کر چکی ہوں حماس..... اگلے ماہ دس تاریخ کو خان عباس سے میری شادی ہے۔"

کافی چھلک کر حماس کی قمیص پر جا گری۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا۔ اس نے نڈھال ہو کر کپ تپائی پر رکھ دیا۔ جیسے کپ کا بوجھ اٹھانا بھی اس کے لئے محال ہو چکا ہو۔

صباحت نے بدستور کھوئی کھوئی آواز میں کہا "حماس' درحقیقت ہم دونوں کے راستے اسی روز الگ ہو گئے تھے جب چار برس پہلے سردیوں کی ایک اداس سہ پہر کو ڈاکیا میرے دروازے کے سامنے رکے بغیر آگے نکل گیا تھا..... اب تو ہم ایک دوسرے سے بہت دور نکل چکے ہیں۔ میں اس بیکراں فاصلے کو پاٹنا چاہوں تو بھی نہیں پاٹ سکتی۔ میرے ساتھ میری لاتعداد ذمے داریاں ہیں۔ میں ان سے آنکھ نہیں چرا سکتی۔ اور آپ ان ذمے داریوں میں میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔ ان ذمے داریوں میں وہی شخص ہاتھ بٹا سکتا ہے جو عمر دراز کے علاقے میں رہ کر اس سے ٹکر لے سکتا ہو جو اس سے بڑھ کر بارسوخ' زور آور اور خود سر ہو۔ میرا خیال ہے آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں۔ خان عباس ہی وہ شخص ہے جس کی بیوی بن کر میں عمر دراز کے شر سے محفوظ رہ سکتی ہوں اور آزادی کے ساتھ اپنے چنے ہوئے راستے پر آگے بڑھ سکتی ہوں۔"

اس کے لہجے میں فاتحانہ انداز کی جھلک تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "آپ میرے محسن ہیں۔ میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

حماس کے چہرے پر ایک آخری نظر ڈال کر وہ اس سے اجازت لینے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

حسن بے مثال کے روبرو دل ہارنے والے ایک جری سپاہی کی داستان، اس حسین پیکر نے اسے دنیا و مافیہا سے بے گانہ کردیا مگر اس دیوانگی میں بھی ایک فرزانگی موجود تھے۔ محبت نفرت، وفا بے وفائی و انتقام اور احسان کے تانوں بانوں سے بنی داستان محبت۔

میدان جنگ میں داد شجاعت دینے والے سپاہی کے دل ہارنے کا افسانہ

طاہر جاوید مغل

بدلہ

میں آپ کو سن انیس سو باون کا ایک واقعہ سنانا چاہ رہا ہوں۔ میرا نام ہارون انور ہے۔ صادق حسین صاحب میرے تاریخ کے استاد تھے۔ بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو اس قدر علمی اور رنگا رنگ ہوتی تھی کہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھ کر بھی اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کالج کے زمانے سے ہی وہ میرے پسندیدہ ترین استاد تھے۔ بعد ازاں ماسٹرز کرکے میں ملازمت کے سلسلے میں ملتان چلا گیا اور صادق حسین صاحب کے ساتھ پرلطف نشستوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بہرحال اب بھی جب کبھی لاہور آنا ہوتا تھا، صادق حسین صاحب سے "ملاقات" میرے پروگرام کا لازمی حصہ ہوتی تھی۔

برسات کا موسم تھا۔ چچا جان کی فیملی میں ایک تقریب تھی۔ مجھے اس تقریب کے سلسلے میں لاہور آنا پڑا۔ صرف دو روز کا قیام تھا۔ بہرحال اس مختصر وقت میں بھی میں نے صادق صاحب سے ملنے کا وقت نکال لیا۔ میں ان کی کوٹھی واقع سمن آباد میں پہنچا۔ صادق صاحب آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے کچھ ذاتی وجوہات کے سبب اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ آج کل وہ صرف صوفیت کے لیے ایک پرائیویٹ اکیڈمی میں پڑھانے جاتے تھے۔

حسب دستور صادق صاحب بڑی اپنائیت اور گرم جوشی

سے ملے۔ یہ گرم جوشی اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اس مرتبہ میں پورے چھ ماہ بعد انہیں صورت دکھا رہا تھا۔ ایک پرانا کلاس فیلو امجد بھی صادق صاحب کے پاس موجود تھا۔ ہم بیٹھ کر چائے پیتے رہے اور پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں اچانک مجھے ایک بات یاد آگئی' میں نے کہا "سر! جب میں پچھلی بار یہاں آیا تھا تو ادھر قالین پر ایک نشی بڑی بری حالت میں پڑا کھانس رہا تھا۔ شاید آپ نے آوت سنگھ نام بتایا تھا اس کا۔"

"اوت سنگھ نہیں۔۔۔ اُوت سنگھ۔ الف کے اوپر پیش ہے۔۔۔ اُوت سنگھ!" صادق صاحب نے دوبارہ بول کر بتایا۔

"جی ہاں۔۔۔ اوت سنگھ۔ اس کا کیا بنا سر؟"

صادق صاحب عجیب انداز میں مسکرائے اور اپنی سفید کھپٹی کھجا کر بولے "تمہارا کیا اندازہ ہے؟"

میں نے کہا "مجھے تو اس کی حالت اتنی اچھی نہیں لگتی تھی سر! ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں اس کے جسم پر خارش کے زخم نظر آرہے تھے۔"

صادق صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "اس کی جسمانی حالت تو اب بھی اتنی زیادہ اچھی نہیں مگر تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ وہ مفلس و بدحال شخص اس وقت شکر گڑھ میں ایک بڑی حویلی کا مالک ہے۔ ایک جیپ بھی اس کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ اس کا علاج لاہور کی ایک مہنگی علاج گاہ میں ہو رہا ہے۔"

"آپ۔۔۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے سر!" میں نے کہا۔

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے "ہارون میاں! زندگی اسی نیرنگی اور الٹ پلٹ کا نام ہے۔ حالات ایسی ایسی کروٹیں لیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اوپر والے کی قدرت پر بھی یقین کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اوت سنگھ نامی وہ بندہ کافی عرصے سے میرے پاس آرہا ہے۔ وہ جب بھی میرے پاس آیا' پہلے سے کچھ بدتر حالت میں ہی آیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے حالات یوں پلٹا کھائیں گے۔"

میں نے کہا "آپ نے غالباً بتایا تھا کہ وہ طوائفوں وغیرہ کے چکر میں پڑ کر اس طرح برباد ہوا ہے؟"

"ہم اسے "طوائفوں کے چکر" میں تو نہیں کہہ سکتے ہاں "طوائف کے چکر" میں کہہ سکتے ہیں۔ وہ دراصل ایک ہی کم ذات عورت ہے جس نے اوت سنگھ کو اس حال تک پہنچایا ہے بلکہ وہ طوائف نہیں نائیکا ہے۔ اور میرے خیال میں نائیکا' طوائف سے آگے کا درجہ ہوتا ہے۔"

"سر! کیا آپ اوت سنگھ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

صادق صاحب نے "وڈبائن" کا سگریٹ سلگایا۔ وہ ہمیں اوت سنگھ کے بارے میں بتانے پر آمادہ نظر آرہے تھے لیکن اسی دوران میں انگلینڈ سے ان کے ایک قریبی عزیز کا فون آگیا۔ وہ فون سننے کے لیے گھر کے اندر چلے گئے۔ فون سننے کے فوراً بعد صادق صاحب کو اپنے بڑے بیٹے زبیر کے ساتھ ماڈل ٹاؤن جانا پڑ گیا اور یوں ہماری بات ادھوری رہ گئی۔

○☆○

سر صادق سے میری اگلی ملاقات قریباً تین ہفتے بعد ہوئی۔ اس مرتبہ میں پانچ چھ روز کے لیے لاہور آیا تھا۔ کوئی دفتری کام تھا۔ مجھے رہنا بھی صادق صاحب کے گھر ہی تھا کیونکہ چچا جان مع اہل و عیال کراچی گئے ہوئے تھے۔ میں جس دن لاہور پہنچا' ساون کے بادل جھوم کر آئے ہوئے تھے اور زور دار بارش ہو رہی تھی۔ ان دنوں کا لاہور آج کے لاہور سے کافی مختلف تھا۔ ٹریفک بہت کم تھا۔ آبادیاں چھدری اور فاصلے پر تھیں۔ ملتان روڈ جو آج ایک بہت بڑی شاہراہ ہے' ان دنوں ایک تنگ سی سڑک تھی۔ سمن آباد ان دنوں نیا نیا بننا شروع ہوا تھا۔ اس کے نزدیک نواں کوٹ کی پرانی آبادی تھی۔ چوبرجی کا قریبی علاقہ ریفیل رینج کہلاتا تھا۔ سمن آباد آنے سے پہلے صادق صاحب ریفل رینج میں ہی رہتے تھے۔

میں صادق صاحب کے گھر پہنچا تو وہ بڑے ایزی موڈ میں بیٹھے گراموفون پر سہگل کا گانا سن رہے تھے اور بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گراموفون بہت پرانا تھا بلکہ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے یہ دنیا کا سب سے پہلا گراموفون ہو۔ صادق صاحب کے استعمال کی اکثر چیزیں ایسی ہی قدیم ہوتی تھیں۔ پرانی اشیا سے انہیں زبردست لگاؤ تھا۔ وہ انہیں اثاثے کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے اور ایسی اشیا کی پوری ہسٹری سے واقف ہوتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہسٹری کے استاد تھے اور اس حوالے سے قدیم و نایاب اشیا میں ان کی دلچسپی ایک قدرتی امر تھی۔ وہ حسب معمول گرم جوشی سے ملے۔ اگلے روز ویسے بھی تعطیل تھی۔ ہم رات کو برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور بارش سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ خالہ جان (صادق صاحب کی بیوی) ہمارے لیے گاہے گاہے چائے اور پکوڑے وغیرہ بھجواتی رہیں۔

موقع محل مناسب تھا۔ میں نے ایک بار پھر اوت سنگھ کا

ذکر چھیڑ دیا۔ صادق صاحب نے بتایا کہ وہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔ اس کی حالت میں انیس بیس کی بہتری آئی ہے۔ صادق صاحب نے طویل سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور اوت سنگھ کے ماضی میں جھانکتے ہوئے بولے۔

"اوت سنگھ شکرگڑھ کا رہنے والا تھا۔ پاکستان ..... بننے سے کافی عرصہ پہلے وہ فوج میں بھرتی ہوا۔ جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ پنجاب رجمنٹ میں لانس نائیک تھا۔ بعد میں اسی حیثیت سے اس نے جنگ میں بھی حصہ لیا۔ یہ اوت سنگھ وہ نہیں تھا جسے کچھ عرصہ پہلے تم نے یہاں ہمارے گھر میں کسی حقیر شے کی طرح پڑے دیکھا تھا۔ اس وقت اوت سنگھ ایک سرخ و سپید جوان گبھرو تھا۔ اس کی چھاتی چوڑی تھی، قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ پگڑی باندھ کر قد کچھ اور بھی اونچا نظر آنے لگتا تھا۔ جنگ میں اوت سنگھ بڑی بہادری سے لڑتا رہا۔ بعد ازاں وہ اتحادی فوج میں شامل ہو کر برما چلا گیا۔ اس نے برما کے جنگلوں میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی یادگار معرکوں میں حصہ لیا اور ہر جگہ اپنے پنجاب کی آن بان قائم رکھی۔

یہ جنگ کے عروج کا زمانہ تھا۔ کچھ فوجی یونٹوں کو ایک انگریز کرنل مسٹر وکٹر کی قیادت میں نہایت خطرناک جنگل میں گھسنا پڑا۔ راستے میں دشمن کے ساتھ ایک دو جھڑپیں ہوئیں جن میں مسٹر وکٹر کے سپاہیوں نے بڑی جانفشانی سے مقابلہ کیا اور دشمن کو پسپا کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ تیسری رات کے آخری پہر کا واقعہ ہے۔ اچانک جاپانی جہازوں نے اتحادیوں کے فوجی پڑاؤ پر شدید ترین بمباری کی۔ اس بمباری میں تین کے قریب جہازوں نے حصہ لیا اور سب کچھ تہس نہس کر ڈالا۔ اوت سنگھ کے اردگرد اس کے ساتھیوں اور ہم وطن سپاہیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اوت سنگھ خود بھی لاشوں کے درمیان اوندھے منہ پڑا تھا اور اپنی زندگی کی طرف سے ناامید ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی اس کے سانس باقی تھے۔ وہ اس بمباری میں بچ گیا۔ اوت سنگھ کا کہنا ہے کہ خوفناک بمباری کے کچھ ہی دیر بعد دشمن فوجی موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے زخمیوں کو شوٹ کر دیا اور لاشوں کو ٹھوکریں مار مار کر دیکھتے رہے کہ ان میں زندگی کی رمق باقی تو نہیں۔ ایک ٹھوکر اوت سنگھ کی پسلیوں میں بھی لگی مگر وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا رہا۔

کچھ دیر بعد دشمن فوجی وہاں سے چلے گئے۔ اوت سنگھ کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد لاشوں کے درمیان سے اٹھ بیٹھا۔ اس کی ٹانگ پر بم کا پرخچہ لگا تھا اور پنڈلی سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس کا کندھا بھی زخمی ہوا تھا۔ ابھی اوت سنگھ اپنے زخم ہی دیکھ رہا تھا کہ لاشوں کے درمیان حرکت پیدا ہوئی۔ اوت سنگھ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص لاشوں کے درمیان سے اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اوت سنگھ نے اس شخص کو لاشوں کے نیچے سے نکلنے میں مدد دی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہوا کہ یہ کرنل وکٹر تھا۔ کرنل وکٹر بری طرح زخمی تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اس بری طرح ٹوٹی تھی کہ لٹک کر رہ گئی تھی۔ اس کے پیٹ اور سینے پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بس چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ اوت سنگھ نے اپنی ٹارچ کی روشنی میں کرنل کے زخموں کا معائنہ کیا۔ اس کی ٹانگ کے زخم سے خون تیزی کے ساتھ خارج ہو رہا تھا۔ اوت سنگھ نے پٹی وغیرہ باندھ کر اس خون کا اخراج کافی حد تک روک دیا۔ کرنل کے پیٹ کا زخم کافی گہرا تھا لیکن یہ زیادہ خون نہیں اگل رہا تھا۔

اوت سنگھ نے اپنے اردگرد دیکھا۔ جلے ہوئے درختوں اور بکھری ہوئی لاشوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ قریباً پچیس افراد اس جگہ لقمۂ اجل بنے تھے۔ سارا ساز و سامان بشمول

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی

طاہر جاوید مغل

کی یادگار کہانیاں

محبت کی کہانیاں

کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہیں

قیمت 165/- روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور۔2

فون: 7668958

وائرلیس سیٹ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ اسلحہ دشمن کے سپاہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ممکن تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی اردگرد بھی موجود ہو مگر آواز یا آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اگلے دو چار منٹ میں اوت سنگھ نے اردگرد کے درختوں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ محتاط آواز میں کسی بچے کھچے ساتھی کو پکارا بھی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس ویرانے میں بس وہ اور کرنل ہی زندہ حالت میں موجود ہیں۔

کرنل دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک مدھم کراہ کے سوا کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل بند تھیں۔ اوت سنگھ کے سامنے دو راستے تھے۔ پہلا یہ کہ اپنی جان بچا کر اس جنگل سے نکلنے کی کوشش کرے۔ دوسرا یہ کہ اپنے ساتھ کرنل کو بھی لے جائے۔

پھر اس نے دوسرا راستہ ہی اپنایا۔ اس نے شدید زخمی کرنل کو اپنے کندھے پر لادا اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

اوت سنگھ کا سفر ایک طویل اور نہایت کٹھن سفر ثابت ہوا۔ اس کی اپنی ٹانگ بھی زخمی تھی۔ اکیلے چلنا بھی آسان نہیں تھا مگر وہ اپنے افسر کو کندھے پر لاد کر لے جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی دھن تھی' اسے اپنے کرنل کی جان بچانی ہے۔ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر۔ وہ نہایت دشوار راستوں پر گرتا پڑتا' زخموں سے چور چلتا ہی رہا۔ اس نے پورے دس میل کا سفر طے کیا۔ اب دن چڑھ چکا تھا۔ ربڑ' پام اور ساگ کے درختوں میں ایک دھواں دھواں اجالا پھیل گیا تھا۔ آخر اوت سنگھ کے کندھے پر پڑا نیم بے ہوش کرنل وکٹر بڑبڑانے لگا۔ "اوت سنگھ' ہمارا لائف ختم ہے۔ ہم کو چھوڑ دو۔ تم اپنا لائف بچانے کا کوشش کرو۔"

اوت سنگھ نے کہا "نہیں سر! ہم نے ایک بہادر پنجابی ماں کا دودھ پیا ہے۔ ہم آپ کو دشمن کے گھیرے میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

اوت سنگھ کے لہجے میں ایسا عزم تھا کہ اس کے افسر کو خاموش ہونا پڑا۔

اوت سنگھ اپنے افسر کو لے کر آگے بڑھتا رہا۔ اس کی اپنی ٹانگ کا زخم مسلسل خون اگل رہا تھا۔ بھوک پیاس اور تھکن نے بھی برا حال کر رکھا تھا مگر وہ رکا نہیں۔ اپنے ہیں کیمپ کی طرف اس کا سفر جاری رہا لیکن سفر طویل تھا اور کرنل وکٹر کے سانس کم تھے۔ بمباری والی جگہ سے تقریباً اٹھارہ میل آگے آنے کے بعد کرنل وکٹر کی زندگی کی ٹمٹماتی ہوئی لو ایک دم مدھم ہو گئی' اس نے بے حد نحیف آواز میں کہا "اوت سنگھ! رک جاؤ' ہم تم کو آرڈر دیتا' رک جاؤ۔"

اوت سنگھ رک گیا۔ اس نے اپنے افسر کو آہستگی کے ساتھ نیچے گھاس پر لٹا دیا۔ خون نچڑ جانے سے کرنل وکٹر کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ اس نے اٹکی ہوئی آواز میں کہا "اوت سنگھ۔ ہمارا لاسٹ ٹائم آ گیا' ہم تم کو بہت شکریہ بولتا۔ تم نے اپنی ڈیوٹی سے بڑھ کر کام کیا ہے۔" پھر اس نے اوت سنگھ کی پگڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کو کھولو۔ اوت سنگھ نے پگڑی اتار کر اپنے افسر کے سامنے رکھ دی۔

کرنل وکٹر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی چھوٹی انگلی اپنے ہی خون میں ڈبو کر پگڑی کے پلو پر کچھ الفاظ لکھے۔ انگریزی کے یہ الفاظ اس طرح تھے۔

"THE BRAVE MAN_ UOOT SINQ.HE TRIED HIS BEST TO SAVE MY LIFE COLONEL VICTOR"

(بہادر آدمی اوت سنگھ۔ اس نے میری زندگی بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔۔۔ کرنل وکٹر)

کچھ ہی دیر بعد کرنل وکٹر ختم ہو گیا۔ اوت سنگھ اس ویران جنگل میں اپنے افسر کی لاش پر کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر وہ لنگڑاتا ہوا اٹھا اور اسے دفنانے کے لیے گڑھا کھودنے لگا۔

اس واقعے کے دو تین روز بعد اپنے ہیں کیمپ میں اوت سنگھ نے اپنی پگڑی ایک انڈین کیپٹن کو دکھائی۔ اس نے اوت سنگھ سے کہا کہ یہ تحریر اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اسے محفوظ رکھے۔ دس پندرہ روز بعد ایک نیا انگریز کرنل اس محاذ پر پہنچا۔ انڈین کیپٹن نے اوت سنگھ کی ساری روداد سنانے کے بعد اسے اوت سنگھ کی پگڑی بھی دکھائی دی۔ اس واقعے اور تحریر نے انگریز افسر کو بھی بے حد متاثر کیا۔ اس نے اسی وقت ایک قینچی منگوائی اور پگڑی کا وہ ٹکڑا کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

اوت سنگھ اس واقعے کے بعد بھی نو دس مہینے برما کے محاذ پر رہا۔ زخموں سے صحت یاب ہونے کے بعد اس نے کئی سنسنی خیز معرکوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہو گئی۔ اپنے بچ جانے والے خوش قسمت ساتھیوں کی طرح اوت سنگھ بھی ہندوستان واپس آ گیا۔ چھٹی ملنے پر وہ اپنے قصبے شکرگڑھ پہنچا۔ اس کے والد فوت ہو چکے تھے۔ بن بیاہی جا چکی تھی۔ بس والدہ اور چھوٹا بھائی تھے۔ بڑے بھائی سے

اسے زیادہ لگاؤ نہیں تھا اور وہ الگ رہتا تھا۔ اوت سنگھ کو موسیقی سننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ شہر سے ٹرانسسٹر ریڈیو لے کر آیا تھا۔ اس ریڈیو کا پورے علاقے میں خوب چرچا ہوا۔ جب ریڈیو پر گانے آتے تو لوگ دم بخود ہو کر سنتے اور حیران ہوتے۔ اوت سنگھ ان لوگوں کو مزید حیران کرنے کے لیے میدان جنگ کے واقعات سناتا۔ ان مصیبتوں کا ذکر کرتا جو پچھلے چند برسوں میں اس پر آئی تھیں اور جن کا اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ لوگ اس کی باتوں میں محو ہو جاتے۔

شکر گڑھ آئے ہوئے اوت سنگھ کو ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ اسے ایک رجسٹری خط موصول ہوا۔ اسے فوری طور پر لاہور بلایا گیا تھا۔ اوت سنگھ اس سرکاری حکم کی تعمیل میں لاہور پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس پر یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ وہ چند دیگر فوجیوں کے ساتھ بذریعہ بحری جہاز لندن جا رہا ہے۔ اس انکشاف کے بعد اوت سنگھ کو فوراً اپنی پگڑی یاد آگئی اور اس پر لکھی ہوئی کرنل وکٹر کی تحریر یاد آگئی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس کی لندن روانگی کا تعلق اسی واقعے سے ہے۔

اوت سنگھ کی روداد بیان کرتے کرتے صادق صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ ملازم تازہ چائے لے آیا تھا۔ میں نے دو پیالیاں تیار کیں۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دیر بوندا باندی ہوتی رہی تھی لیکن اب پھر پانی شدت سے برسنے لگا تھا۔ صادق صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "ہارون میاں! اس کے بعد لندن کے واقعات کی پوری تفصیل تو مجھے معلوم نہیں' بس جو کچھ اوت سنگھ نے بتایا تھا' وہی میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ اوت سنگھ بذریعہ بحری جہاز ۱۹۴۶ء کے اوائل میں لندن پہنچا۔ جنگ میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے چند دیگر فوجی بھی اس کے ساتھ تھے۔ ملکہ برطانیہ نے ان لوگوں کو بہادری کے میڈل دیے۔ اس کے علاوہ بھی انعام واکرام سے نوازا گیا۔ تقریباً ایک مہینا لندن میں رہنے کے بعد وہ لوگ واپس ہندوستان آگئے۔ اوت سنگھ کو اس کی بہادری کے صلے میں گیارہ مربع نہری زمین ملی۔ اس کے علاوہ بھی کئی مراعات حاصل ہوئیں ۔۔۔ اوت سنگھ بے حد خوش تھا۔ پورے علاقے میں اس کی اور اس کے گھرانے کی عزت بن گئی تھی۔ چوہدری' نمبردار اور چھوٹے موٹے سرکاری افسر اس کے پاس بیٹھ کر فخر محسوس کرتے تھے۔

اوت سنگھ کی زخمی ٹانگ میں کبھی کبھی شدید درد شروع ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی وہ تھک سا گیا تھا۔ اس نے فوج سے ریٹائرمنٹ کی درخواست دی اور یہ درخواست منظور ہو گئی۔ ملازمت کی ذمے داریوں سے فارغ ہونے کے بعد اوت سنگھ نے اپنی زمین کی دیکھ بھال پر توجہ دی اور شکر گڑھ کے مضافات میں اپنے لیے ایک شاندار حویلی بنوائی۔ اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ آخر برادری میں ہی اس کی منگنی ہو گئی۔ لڑکی خوب صورت تھی اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا نام سرجیت کور تھا۔

انہی دنوں اوت سنگھ کا لاہور آنا ہوا۔ اوت سنگھ کا ایک شہری دوست سریش کمار اسے گانا سنانے کے لیے بازار حسن لے گیا۔ وہ دونوں جس کوٹھے پر چڑھے' اس کی مالکن ایک پارسی طوائف تھی۔ نام تو اس کا پتا نہیں کیا تھا مگر چھوٹے بڑے سب اسے بڑی بائی کہتے تھے۔ "بڑی بائی" ایک دبنگ عورت ہے۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ اس سے بھی زیادہ دبنگ اور بارعب تھی۔ وہ بڑی زمانہ ساز تھی اور اپنے کاروبار کے سارے داؤ پیچ بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ بڑی بائی کی چھوٹی بیٹی لالہ نے ان دنوں شباب کی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ وہ جتنی اچھی رقاصہ تھی' اتنا ہی اچھا گاتی بھی تھی۔ اوت سنگھ کو فطری طور پر موسیقی اور اچھی آواز سے لگاؤ تھا۔ اس نے لالہ کا گانا سنا اور یہ خوبصورت آواز کانوں کے راستے سیدھی اس کے دل پر لگی۔ شکل وصورت کے اعتبار سے بھی لالہ کسی سے کم نہیں تھی۔ اس کے مزاج میں عجیب سی سنجیدگی اور ٹھہراؤ کی کیفیت تھی۔ اس کے مزاج کا یہ رخ اسے عام طوائف زادیوں سے جدا کرتا تھا۔

اوت سنگھ لاہور سے واپس شکر گڑھ آگیا لیکن اس کے دل ودماغ میں لالہ کی آواز گونجتی رہی اور آنکھوں کے سامنے اس کی صورت پھرتی رہی۔ وہ چند روز تک تو اپنے خیالات کی مزاحمت کرتا رہا لیکن پھر اس کے قدم آپوں آپ لاہور کی طرف اٹھ گئے۔ وہ اپنے دوست سریش کے پاس پہنچا اور اسے لے کر پھر سے بڑی بائی کے کوٹھے پر جا پہنچا۔ یہ محسوس کر کے اوت سنگھ کے سینے میں جلترنگ سے بج اٹھے کہ پچھلے پندرہ بیس دنوں میں لالہ بھی اس کی منتظر رہی ہے۔ وہ بھری محفل میں نغمہ سرا ہوئی تو اوت سنگھ کو یہی لگا کہ یہ نغمہ صرف اور صرف اس کے لیے ہے۔ اس محفل رنگ وطرب میں دونوں کی نگاہیں بار بار ملتی رہیں اور اوت سنگھ کے سینے میں ایک بجلی سی تڑپتی رہی۔ وقتِ رخصت لالہ نے اوت سنگھ

سے دبے لفظوں میں پوچھا "پھر کب آئیے گا؟"

سریش کمار ہنس کر بولا "یہ یہاں سے جائے گا تو آئے گا نا۔ اس کا دل و دماغ یہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خود بھی یہیں ہے۔ اگر یہ اپنے شریر (جسم) کو لے کر چلا بھی گیا تو گھوم پھر کر دوبارہ ادھر آجائے گا۔"

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ اوت سنگھ کو محسوس ہوا کہ وہ خود تو شکر گڑھ پہنچ جاتا ہے لیکن اس کا دل و دماغ ادھر لاہور میں بڑی بائی کے کوٹھے پر ہی رہ جاتا ہے۔ لالہ کی ادائیں' اس کی باتیں' اس کا ناز و ادا' سب کچھ اوت سنگھ کی نگاہوں میں گھومتا رہتا۔ اس نے مشکل سے دس پندرہ روز نکالے اور ایک بار پھر جیب میں نوٹ ڈال کر لاہور روانہ ہو گیا۔

بڑی بائی کی گھاگ نگاہوں نے پہچان لیا تھا کہ شکار پھنس گیا ہے اور شکار بھی معمولی نہیں تھا۔ جوانی' دولت اور آزادی اسے ساتھ ساتھ ہی ملی تھی۔ باپ فوت ہو گیا تھا۔ گیارہ مربع زمین تھی' حویلی' مال مویشی' سبھی کچھ تھا۔ بڑی بائی نے بڑی ہوشیاری سے اوت سنگھ کو شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کی ہوشیار نظریں دیکھ چکی تھیں کہ اوت سنگھ ہی لالہ پر فدا نہیں' لالہ بھی اوت سنگھ کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگی ہے۔

اوت سنگھ تھا بھی اس قابل کہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ گورا چٹا کڑیل جوان۔ اس کی ذات کے ساتھ بہادری کا ایک یادگار واقعہ منسوب تھا اور انگریز سرکار کی طرف سے اسے انعام کے طور پر جائداد ملی ہوئی تھی۔

بڑی بائی بے حد احتیاط سے لالہ اور اوت سنگھ کے تعلق کو پروان چڑھانے لگی۔ وہ دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے ملاتی اور زیادہ دیر کے لیے جدا رکھتی۔ وہ بڑی چابک دستی سے اپنی بیٹی کا بھاؤ بڑھا رہی تھی۔

انہی دنوں ایک اور واقعہ ہو گیا۔ بڑی بائی کے کوٹھے پر جگ جیت پہلوان نامی ایک شخص بھی آتا تھا۔ جگ جیت سنگھ کا علاقے میں ٹیکا تھا۔ چار پانچ کن ٹٹے ہر وقت جگ جیت کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ لاہور بھاٹی گیٹ میں پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ جگ جیت بھی لالہ پر نظر رکھتا تھا پھر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا ہے۔ لالہ کے معاملے پر جگ جیت اور اوت سنگھ میں ٹھن گئی۔ جگ جیت پہلوان نے... علی الاعلان کہا کہ لالہ اس کی ہے اور لالہ کی نتھ وہی اتارے گا۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ چپقلش بڑھتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک رات جگ جیت پہلوان لالہ کو کوٹھے سے اٹھا کر لے گیا۔ اوت سنگھ بھی اس وقت لاہور میں ہی تھا۔ اسے اس واقعے کا پتا چلا تو اپنے دوستوں سریش کمار اور ابرار شاہ کے ساتھ جگ جیت کے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ اس وقت جگ جیت کو اپنے ٹھکانے پر پہنچے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے۔ ڈیرے کے اندرونی کمرے میں لالہ کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ جگ جیت نے اوت سنگھ سے کہا "تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں' اس کنجری کا خیال دل سے نکال کر یہاں سے چلے جاؤ' ورنہ قتل ہو جاؤ گے۔"

اوت سنگھ مسکرا کر بولا "اوت سنگھ اپنے بھتوں کو دشمن کے گھیرے میں چھوڑ کر نہیں جاتا۔"

ڈیرے پر فائرنگ ہوئی۔ اس فائرنگ میں ایک گولی اوت سنگھ کے ساتھی ابرار شاہ کی ٹانگ میں لگی۔ اس طرح جگ جیت پہلوان بھی زخمی ہوا۔ سریش کی چلائی ہوئی ایک گولی اس کے پیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ اوت سنگھ' لالہ کو اپنی جیپ میں بٹھا کر واپس کوٹھے پر لے آیا۔

دونوں پارٹیوں پر جھگڑے اور بلوے کا کیس بنا۔ یہ کیس اس وقت مزید سخت ہو گیا جب جگ جیت پہلوان ایک ماہ اسپتال میں رہنے کے بعد سورگ باشی ہو گیا۔ جگ جیت کے مرنے سے سریش پر ۳۰۲ کی دفعہ لگ گئی۔ کچھ عرصے بعد جب اوت سنگھ ضمانت پر رہا ہوا تو اس نے اپنے دوست سریش کمار کے مقدمے پر روپیا پانی کی طرح بہا دیا۔ اس نے اپنی چھ مربع زمین بیچ ڈالی اور پورے زور کے ساتھ سریش کا کیس لڑا۔

اس دوران میں لالہ کے کوٹھے پر بھی آنا جانا لگا رہا۔ لالہ ویسے تو اوت سنگھ سے محبت کرتی تھی لیکن وہ اپنی ماں "بڑی بائی" کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتی تھی۔ اوت سنگھ لالہ سے اور طرح کی محبت چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لالہ بھی ویسے ہی ٹوٹ کر اس سے محبت کرے جیسے وہ کرتا ہے۔ لالہ کے اندر بھی ہر رکاوٹ اور دیوار کو رستے سے ہٹا دینے کی ہمت ہو مگر لالہ کی چاہت کا رنگ ڈھنگ اور طرح کا تھا۔

لالہ کے لیے بڑی بائی نے بڑی قیمت مانگی تھی۔ مگر اوت سنگھ کے لیے یہ قیمت کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی جان تک لالہ کے قدموں میں نچھاور کر سکتا تھا۔ اس نے لالہ کی نتھ اتروائی کی رسم کے لیے اپنی تین مربع زمین مزید بیچ ڈالی۔ ماں روتی' کرلاتی رہی۔ خاندان والوں نے حقہ پانی بند کر دیا۔ ارد گرد کے لوگ جو پہلے جھک جھک کر سلام کرتے تھے' اس پر انگلیاں اٹھانے لگے۔ مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو

بس لالہ کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس روز اس نے لالہ کو حاصل کیا' اس سے دو دن بعد اوت سنگھ کی منگنی ٹوٹ گئی لیکن اوت سنگھ کو ان باتوں کی فکر ہی کہاں تھی۔ وہ تو لالہ کو پاکر یوں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے ساری کائنات اپنے حسین ترین رنگوں اور خوشبوؤں سمیت اس کی بانہوں میں آگئی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ساری خوشیاں چند روزہ ہیں۔ اس نے محبت حاصل نہیں کی تھی' سودا خریدا تھا اور مزید سودا خریدنے کے لیے مزید پیسوں کی ضرورت تھی۔ پھر مزید پیسوں کی ضرورت تھی' پھر اسی طرح یہ سلسلہ چل پڑا۔

اگلے ایک سال میں عدالت اور کوٹھے پر اوت سنگھ نے پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ اس کی بچی کچی زمین اور حویلی بھی بک گئی۔ جیپ کی جگہ اب اس کے پاس ایک پرانا سا لمبرٹا اسکوٹر تھا۔ اب وہ اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ شہر ہی میں ایک دس مرلے کی کوٹھی میں آگیا تھا۔ اس نے یہاں تھوک میں چاول بیچنے کا اسٹور کھول لیا تھا۔ جو کیس عدالت میں چل رہا تھا' اس میں سریش کمار کو عمر قید کی سزا ہوئی اور جو معاملہ کوٹھے پر چل رہا تھا' اس میں بھی سزا عمر قید ہی تھی۔ یہ عمر قید بھگتنے والا اوت سنگھ تھا۔ لالہ کی آواز اور اس کے حسن کی زنجیر نے اسے زندگی بھر کے لیے جکڑ لیا تھا۔

بازار حسن کے اپنے ہی اصول اور ضابطے تھے۔ جوں جوں اوت سنگھ کے پاس روپیا گھٹتا گیا' ترازو کے دوسرے پلڑے میں محبت بھی گھٹتی گئی۔ بڑی بائی جو آتے جاتے اوت سنگھ کی بلائیں لیتی تھی اب چپ چپ رہنے لگی۔ لالہ جو ہر وقت پروانے کی طرح اوت سنگھ کے گرد چکراتی تھی' اب ذرا سنجیدگی اختیار کرنے لگی۔ اوت سنگھ اور بڑی بائی میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ وہ لالہ کو ماہوار رقم دے گا اور لالہ ناچ گانا نہیں کرے گی۔ ماہوار تو اوت سنگھ اب بھی دے رہا تھا لیکن جو اضافی تحفے تحائف وہ بڑی بائی کی نذر کرتا تھا وہ اب نہیں آرہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی بائی اب وعدے سے انحراف کرنے لگی تھی۔ ایک دو بار اوت سنگھ کو پتا چلا کہ اس کی غیر موجودگی میں لالہ نے ناچ گانا کیا ہے' اوت سنگھ نے لالہ سے باز پرس کی' وہ صاف مکر گئی۔ دوسری بار اس نے رنگے ہاتھوں دکھا دیا۔

انہی دنوں اوت سنگھ کی ماں سخت بیمار ہوگئی۔ اوت سنگھ کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ ماں کے علاج پر بھاری رقم خرچ ہونے لگی ..... بڑی بائی چوری چھپے تو لالہ کو نچا ہی چکی تھی' اب اس نے یہ کام کھل کر شروع کردیا۔ شیخوپورہ کا ایک بہت بڑا سیٹھ باقاعدگی سے بڑی بائی کے کوٹھے پر آنے جانے لگا۔ اسی دوران میں پاکستان اور ہندوستان بن گیا۔ اوت سنگھ نے لالہ کو تجویز پیش کی کہ وہ اس کے ساتھ ہندوستان چلی جائے لیکن لالہ میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ نہ ہی اس کی محبت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی۔ اس نے اوت سنگھ سے کہا کہ جیسے بھی ہو وہ بڑی بائی کے واجبات ادا کرتا رہے۔

بڑی بائی کے واجبات ادا کرنے کے لیے اوت سنگھ نے اگلے چار چھ مہینے میں اپنا مکان اور اسٹور بھی بیچ ڈالا۔ اب وہ کرائے کے ایک مکان میں اٹھ آیا تھا۔ اسکوٹر بھی بک چکا تھا۔ ایسے سلسلہ کہاں تک چل سکتا تھا۔ بڑی بائی کے تقاضے روز بروز بڑھنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی من مانیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پریشانیوں نے چاروں طرف سے گھیرا تو اوت سنگھ افیم کا نشہ کرنے لگا۔ وہ جیسا بھی تھا لیکن اس کے دل میں کھوٹ نہیں تھا۔ وہ لالہ سے سچی محبت کرتا تھا۔ لالہ بھی ایسی بری نہیں تھی لیکن بڑی بائی کا اثر اس پر اتنا زیادہ تھا کہ وہ اس کی پہنائی ہوئی زنجیریں توڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

دھیرے دھیرے یوں ہوا کہ اوت سنگھ جو ایک چوہدری جیسی شان کے ساتھ کوٹھے پر چڑھتا تھا' اب ایک لاچار شخص کی حیثیت سے کوٹھے پر ادھر اُدھر پڑا نظر آنے لگا۔ تین سال پہلے جب دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی صبح کو اس کی ماں نے گنگا رام اسپتال میں دم توڑا تو اوت سنگھ بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس واقعے کے بعد وہ چوبیس گھنٹے افیم کے نشے میں دھت رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی حیثیت بڑی بائی کے گھریلو ملازم کی سی ہوگئی۔ وہ اسے وقت پر کھانا دیتی تھی' روز مرہ کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ سب کے سامنے نرمی سے پیش آتی تھی لیکن اکیلے میں وہ اسے گالیاں دینے سے بھی باز نہیں آتی تھی۔ نشے کی طلب سے مجبور ہو کر اوت سنگھ بڑی بائی کی گالیاں بھی سن لیتا تھا۔ اسے گالیاں دے کر وہ ذرا ٹھنڈی پڑ جاتی تو بیٹی سے کہتی "دیکھ کیسے مر رہا ہے کالی گولی کے لیے۔ جا اسے دس پندرہ روپے دے دے' الماری سے نکال کر۔"

لالہ' اوت سنگھ کی حالت پر غم زدہ تو ہوتی تھی لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی ... اور شاید اب وہ کچھ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ "ناچ گانا" کرنے لگی تھی اور شیخوپورہ کا سیٹھ بھی باقاعدگی سے آتا جاتا تھا۔ وہ ماں کی ہدایات کے مطابق چل رہی تھی اور ماں کی زندگی کا بس ایک ہی اصول تھا' پیسا کماؤ چاہے وہ کسی بھی طرح آئے۔ درحقیقت بڑی بائی ایک

بے حد لالچی اور نوٹ پرست عورت تھی۔ پیسے کے لیے وہ کسی غلیظ ترین شخص کے تلوے چاٹنے پر بھی آمادہ ہو سکتی تھی۔ اکثر لالچی لوگوں کی طرح وہ عیار بھی تھی۔ وہ اوت سنگھ کو ذلیل تو کرتی تھی لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ سراسر بغاوت پر آمادہ ہو جائے یا کوٹھا ہی چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے وہ اس کی نشے کی طلب بھی بڑی اچھی طرح پوری کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ نشہ اوت سنگھ کو روز بروز اندر سے کھا رہا ہے اور اس کا دم خم ختم کرتا جا رہا ہے۔"

اوت سنگھ کی روداد سناتے سناتے صادق صاحب نے چند لمحے توقف کیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے لیکن کسی وقت جب بڑے موڈ میں ہوتے تھے تو دو چار کش لگا بھی لیتے تھے۔ آج بھی برسات کی اس بھیگی ہوئی رات نے ان کا موڈ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے الماری سے وڈبائن کا ایک سگریٹ نکالا اور واپس میرے پاس برآمدے میں آبیٹھے۔ چاندی کے خول والے ایک پرانے سگریٹ لائٹر سے انہوں نے سگریٹ سلگایا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے "آج سے کوئی دو سال پہلے اوت سنگھ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا اور کھانسی بھی ہونے لگی۔ شروع میں اس نے توجہ نہیں دی لیکن آہستہ آہستہ تکلیف بڑھتی گئی۔ بڑی بائی سے چوری چھپے 'لالہ دوا دارو کے لیے اوت سنگھ کو چند روپے دے دیتی تھی۔ وہ کسی وقت دوا لے لیتا تھا' کسی وقت دوا کی جگہ بھی افیم ہی کھا لیتا تھا۔ افیم کے علاوہ اب وہ چرس کے کش بھی لگانے لگا تھا۔ لالہ کا قرب نصیب ہونا تو اب اوت سنگھ کے لیے خواب خیال کی بات ہو گئی تھی۔ بس اسے دیکھ لینا ہی وہ غنیمت سمجھتا تھا۔ اچھے دنوں کی امید کس کے دل میں نہیں ہوتی۔ اوت سنگھ کے دل میں بھی تھی۔ وہ سوچتا تھا شاید... قدرت کی پٹاری میں کوئی ایسا کرشمہ چھپا ہو جو اسے پھر سے چوہدری اوت سنگھ بنا دے۔ ایک بار پھر اس کوٹھے پر لالہ کی رعنائیاں اس کے لیے اپنی باہیں کھول دیں۔ لیکن خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں اور حقیقت یہ تھی کہ اوت سنگھ اب چوہدری نہیں رہا تھا۔ وہ بڑی بائی کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر پڑا ہوا ایک نشئی اوت تھا۔ صرف اوت۔!

جب اوت سنگھ کی کھانسی بڑھ گئی تو بڑی بائی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سمجھ گئی کہ اوت سنگھ کا کوٹھے پر رہنا ٹھیک نہیں۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اوت سنگھ کو کوٹھے کے نیچے واقع ایک پرانی کھولی میں منتقل کر دیا۔ وہ اوت سنگھ کا کھانا بھی وہیں بھجوا دیتی تھی۔ کسی وقت دل کڑا کر کے اس کی خبر گیری بھی کر آتی تھی۔

نشے کے بغیر اوت سنگھ کا گزارا نہیں تھا۔ پہلے تو بڑی بائی اسے خود نشہ فراہم کرتی رہی تھی لیکن اب اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اب نشے کے بغیر بھی وہ مر ہی جائے گا۔ انہی دنوں ایک روز گنگا رام اسپتال کے سبزہ زار میں اوت سنگھ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھا تمہاری خالہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک مریضہ کی عیادت کے لیے اندر گئی تھی۔ میں نے اوت سنگھ کو اپنے قریب ہی گھاس پر لیٹے دیکھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا۔ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ اوت سنگھ نے اپنی درد بھری کہانی کے کچھ حصے مجھے سنائے۔ اس کی باتوں پر یقین کرنا بڑا مشکل تھا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں سچائی کی جھلک ہے۔ میں نے اوت سنگھ کو اپنے گھر کا ایڈریس بھی دیا اور آنے کے لیے کہا۔ ایک دن اوت سنگھ سچ مچ آگیا۔ اس کی حالت بالکل بھیک منگوں کی سی ہو رہی تھی۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہی شخص ہے جس نے ملکہ الزبتھ سے میڈل حاصل کیا تھا!" وڈبائن سگریٹ کے دو آخری کش لے کر صادق صاحب نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"میں نے اوت سنگھ سے میڈل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سونے کا میڈل تو وہ ڈھائی تین سال پہلے ہی بیچ کر کھا چکا ہے۔ اس نے مجھے چند انگلش سکے اور ایک دو چھوٹے چھوٹے ڈیکوریشن پیس دکھائے جو وہ برسوں پہلے انگلینڈ سے لے کر آیا تھا۔ اوت سنگھ کی خواہش تھی کہ میں ان چیزوں کے عوض اسے کچھ روپے دے دوں۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ اوت سنگھ یہ چیزیں چند روپوں کے عوض کسی کباڑیے کو دے دے گا۔ میں نے اس سے یہ چیزیں لے لیں اور کچھ روپے دے دیے۔

پندرہ بیس دن بعد وہ پھر آگیا۔ اس مرتبہ بھی کچھ چیزیں اس کے پاس تھیں۔ ایک بہت پرانا خنجر تھا۔ ایک کی رنگ تھا جس پر جارج پنجم کی شبیہ کندہ تھی۔ ایک دو پرانے فوٹوگرافس تھے۔ ایک فوٹوگراف میں اوت سنگھ برمنگھم پیلس کے باہر کھڑا نظر آرہا تھا۔ میں نے اوت سنگھ کے اصرار پر یہ چیزیں بھی اس سے لے لیں اور کچھ رقم دے دی۔ اس کے علاوہ میں نے اسے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے نام چٹھی بھی لکھ کر دی۔ یہ ڈاکٹر صاحب گلاب دیوی اسپتال میں کام کر رہے تھے۔ میں نے اوت سنگھ سے کہا "تمہاری بیماری بڑھتی جا رہی ہے' تم جلد سے جلد کسی اسپتال میں داخل

ہو جاؤ۔"

اس نے چٹھی لے لی اور داخل ہونے کا وعدہ بھی کیا۔ مگر وہ اسپتال گیا نہیں۔ اگلے دو مہینے میں وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار میرے پاس آیا اور اسی طرح کی چھوٹی موٹی اشیا کے بدلے مجھ سے پیسے لے جاتا رہا۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو میرے لیے بے کار تھیں لیکن میں ہمدردی کے ناتے اوت سنگھ کی تھوڑی بہت مدد کرتا رہا۔ درحقیقت اب میں اوت سنگھ سے کچھ اکتا سا گیا تھا۔ وہ وقت بے وقت آتا تھا اور مجھے ڈسٹرب کر کے رکھ دیتا تھا۔ اس کی حالت بھی بڑی پتلی ہو چکی تھی۔ منہ کے آگے کپڑا رکھ کر مسلسل کھانستا رہتا تھا۔ وہ دنیا والوں کی طوطا چشمی اور سنگدلی پر بولتا اور پھر بولتا چلا جاتا۔

اوت سنگھ کا آگے پیچھے اب کوئی نہیں تھا۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی۔ وہ فوت ہو گئی تھی۔ چھوٹا بھائی شہر والے مکان میں سے اپنا حصہ لے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بڑے بھائی یعنی اوت سنگھ سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ اس کے بارے میں اوت سنگھ کو بس اتنا ہی پتا چلا تھا کہ وہ رنگون یا سیلون وغیرہ جانے کا پروگرام رکھتا تھا۔ میں اوت سنگھ کو زندگی کی اونچ نیچ سمجھانے کی اکثر کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ میری باتیں سن تو لیتا تھا لیکن ان پر عمل نہیں کرتا تھا۔ نہ ڈاکٹر کو دکھاتا تھا' نہ دوا باقاعدگی سے کھاتا تھا' نہ نشہ چھوڑتا تھا۔ وہ ایک بے کار شے کی طرح لالہ کی دہلیز پر پڑا ہوا تھا۔ بڑی بائی اسے ٹھوکریں مارتی تھی لیکن وہ اتنا بے حس ہو چکا تھا کہ ان ٹھوکروں کا اثر ہی نہیں لیتا تھا۔

وہ تیسری مرتبہ آیا تو میں نے اس سے ذرا خشک لہجے میں بات کی۔ اس نے میرے بدلے ہوئے رویے کو نوٹ کیا اور برآمدے میں بیٹھ کر جلدی سے واپس چلا گیا۔ اس واقعے کے تقریباً ایک ہفتے بعد وہ پھر میرے پاس آیا۔ یہ آج سے کوئی چھ سات مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگا تھا' اس کا لباس پھٹا ہوا تھا اور سردی سے وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک گھڑی مجھے دیتے ہوئے کہا "صاحب جی! یہ ایک آخری چیز میرے پاس رہ گئی ہے۔ بس یہ مجھ سے لے لیں اور مجھے کچھ پیسے دے دیں۔ واہگرو کی سوگند' اس کے بعد میں کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ وہ پرانی طرز کی کلائی پر باندھنے والی گھڑی تھی۔ سائز میں کچھ بڑی تھی لیکن دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔ اوت سنگھ بولا "صاحب جی! یہ بھی مجھ کو انعام ہی میں ملی تھی۔ اس کے اندر میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔"

"کہاں لکھا ہے نام؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

اس نے بتایا کہ نام کیس کے اندر کی طرف ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کوشش کر کے نچلی طرف سے گھڑی کا ڈھکن کھولا۔ گھڑی کے پرزے صاف شفاف اور بالکل چالو حالت میں تھے۔ گھڑی کے بیرونی کیس میں جو دھات استعمال کی گئی تھی وہ بھی قیمتی لگتی تھی۔ میں نے عینک لگا کر گھڑی کے ڈھکن کی اندرونی سطح دیکھی اور دنگ رہ گیا۔ صاف شفاف سطح پر انگریزی حروف میں لکھا تھا "ملکہ وکٹوریہ کے دستخط کے ساتھ" نیچے دستخط کندہ کیے گئے تھے۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں نے پرانی کتابوں میں ایک دو جگہ ملکہ وکٹوریا کے دستخط دیکھ رکھے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ وہی دستخط ہیں۔

گھڑی کے ڈھکن کے بالائی کنارے پر بڑی نفاست سے اوت سنگھ کے الفاظ کندہ کیے گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ملکہ وکٹوریا بیسویں صدی کے پہلے سال میں وفات پا گئی تھیں لیکن یہ گھڑی اوت سنگھ کو ۱۹۴۵ء کے بعد ملی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نادر گھڑی پر اوت سنگھ کا نام بعد میں کندہ کیا گیا ہے۔ میں نے محدب عدسہ لگا کر دیکھا تو اس امر کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میں نے اس گھڑی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اوت سے پوچھا "یہ گھڑی اب تک کہاں رکھی ہوئی تھی تم نے؟"

وہ بولا "میرے ٹرنک میں تھی۔ ٹرنک میں نے کھولی میں رکھا ہوا ہے.... لیکن آپ ان باتوں کو چھوڑیں صاحب جی ۔۔ مجھے کچھ روپے دے دیں۔ مجھے سخت لوڑ ہے صاحب جی ۔۔" وہ منت پر اتر آیا تھا۔

میں نے کہا "کیا کرو گے روپوں کا؟ افیم کھا لو گے اور چرس پی لو گے؟"

"نہیں صاحب جی! اب تو روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ برسوں سے ایک دانہ میرے منہ میں نہیں گیا ہے۔ جو ملازم مجھے روٹی دینے آتا تھا وہ بیمار پڑا ہوا ہے۔ بڑی بائی کسی شادی پر لائل پور گئی ہوئی ہے۔ بھوکا مر رہا ہوں میں تو۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ بڑی بائی اب اوت سنگھ کو روٹی کی مار دے رہی ہے۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ اپنی بیمار نحوست سمیٹ کر وہ یہاں سے چلا جائے۔ میں نے اوت سنگھ کو دو سو روپے دیے اور اس کا سارا پتا ٹھکانا بھی پوچھ لیا۔"

بولتے بولتے صادق صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہانی کے ایک دلچسپ موڑ

پر پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے گرما گرم چائے کی چسکی لی اور گہری سانس لے کر بولے "گھڑی دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کافی قیمتی ہے۔ گھڑی کے اندر ملکہ وکٹوریا کے دستخط تھے اور اس سے گھڑی کی شان غیر معمولی ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے اپنے دوست سینئر پروفیسر اشفاق ہمدانی صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وہ محکمہ آثار قدیمہ میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی اس گھڑی کو خصوصی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ تم جانتے ہی ہو' انگلینڈ میں میرے بہنوئی انوار شاہ ملازمت کرتے ہیں۔ ہم دونوں نے انوار شاہ سے رابطہ کیا۔ وہ بھی اس قسم کے معاملات میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم نے انہیں گھڑی کی تصویریں بھیجیں اور اس کی ساری خصوصیات سے آگاہ کیا۔ انوار شاہ نے اس بارے میں معلومات حاصل کیں اور ہمیں آگاہ کیا کہ پانچ چھ ماہ پہلے قدیم اشیا کی ایک بڑی نیلامی میں بالکل ایسی ہی ایک گھڑی ایک لاکھ پاؤنڈ میں نیلام ہوئی ہے۔ وہ اس بارے میں مزید معلومات حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اور اشفاق ہمدانی صاحب نے اپنے طور پر بھی تحقیق شروع کر دی۔ ہارون میاں! ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ایک ٹھوس فیصلے پر پہنچ گئے ہیں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ ہمیں دو تین ماہ مزید انتظار کر لینا چاہیے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں لندن میں قدیم اشیا کی وہی نیلامی دوبارہ ہونی ہے۔ ہم اوت سنگھ کی گھڑی کو اسی آکشن میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارا محتاط اندازہ یہی ہے کہ یہ گھڑی ایک لاکھ پاؤنڈ سے کم میں فروخت نہیں ہوگی۔"

صادق صاحب خاموش ہوئے تو فضا میں ایک سنسنی سی موجود تھی۔ میں اس روداد کے تحیر خیز تاثر کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے صادق صاحب سے پوچھا "اوت سنگھ کو یہ سب کچھ معلوم ہے؟"

وہ بولے "اسے معلوم ہے میاں! بلکہ یہ بات نکلتے نکلتے بڑی بائی اور لالہ وغیرہ تک بھی جا پہنچی ہے۔ حالانکہ میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ بڑی بائی ایک بہت خرانٹ عورت ہے۔ اس سے ہر برائی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اوت سنگھ آج کل بڑے مزے میں ہے۔ اس کا علاج ایک اچھے پرائیویٹ کلینک میں ہو رہا ہے' اس کی حویلی بھی اسے واپس مل گئی ہے اور وہ بینٹلے فلائنگ سپر بھی جو اس نے کافی عرصہ پہلے اونے پونے بیچ دی تھی۔"

"ہاں سر! آپ نے بتایا تھا" میں نے کہا۔

صادق صاحب بولے "تمہیں پتا ہے' یہ سب کچھ کس نے کیا ہے؟ یہ بڑی بائی نے ہی کیا ہے۔ وہ بڑی زمانہ ساز ہے۔ اس نے اپنے طور پر بھی کھوج لگایا ہے۔ وہ بھانپ چکی ہے کہ قیمتی گھڑی کی وجہ سے اوت سنگھ کے دن بدلنے والے ہیں۔ اس عورت نے خود کو بڑی ہوشیاری سے اس بدلی ہوئی صورت حال کے بارے میں تیار کیا ہے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے' اس نے اوت سنگھ سے باقاعدہ معافی مانگی ہے کہ وہ اپنی مصروفیت کے سبب پچھلے کچھ عرصے سے اس پر پورا دھیان نہیں دے سکی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے لالہ سے بھی معافی منگوائی ہے۔ دونوں ماں بیٹی ایک بار پھر اوت سنگھ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں لالہ کا حسن بھی بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ لالہ اب نوخیز لڑکی تو نہیں رہی لیکن بازار حسن میں اب بھی اس کی خوبصورتی کی باتیں ہوتی ہیں ۔۔۔ درحقیقت ہارون میاں' بڑی بائی کے نزدیک اوت سنگھ ایک احمق اور گاؤدی شخص ہے۔ بلکہ وہ تو شاید اس کی بہادری کو بھی حماقت ہی سمجھتی ہے۔ حالانکہ یہی حماقت تھی جس نے جگ جیت پہلوان جیسی بلا سے اس کی اور اس کی بیٹی کی جان چھڑائی تھی۔ اب وہ اوت سنگھ کے جذباتی پن سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر اسے چکر دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس حرافہ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا ہے۔ اوت سنگھ کو یہ باور کرایا ہے کہ وہ کافی عرصے سے چپکے چپکے اس کی شکر گڑھ والی حویلی واگزار کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صرف پانچ چھ ماہ پہلے اسے حویلی کا خیال آیا تھا۔ میں نے پتا کرایا ہے' اس خرانٹ عورت نے بینک سے باقاعدہ قرض لے کر وہ حویلی خریدی ہے اور اس کی رجسٹری اوت سنگھ کے نام کروائی ہے۔ وہ اوت کے علاج پر بھی روپیہ پانی کی طرح بہا رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جتنا لگا رہی ہے' اس سے دس گنا تھوڑے ہی عرصے میں حاصل کر لے گی۔ اسے اندازہ ہو چکا ہے کہ ٹی بی جیسے موذی مرض سے اوت سنگھ کی جان بہ آسانی چھوٹنے والی نہیں۔ وہ مر گیا یا بستر پر پڑا رہا تو بھی اس کا سارا پیسا بڑی بائی کے کام ہی آئے گا۔"

میں نے پوچھا "کیا اوت کو بڑی بائی کی عیاری کا اندازہ نہیں؟"

"ممکن ہے اندازہ ہو لیکن بڑی بائی لالہ کے ذریعے اوت سنگھ کے دل و دماغ پر پورا قبضہ رکھتی ہے۔"

میں نے کہا "سر! وہ گھڑی اب کہاں ہے؟"

"ابھی تک تو میرے پاس ہی ہے' گھر میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

صادق صاحب اٹھ کر کمرے میں گئے اور ایک چھوٹا سا

بریف کیس اٹھالائے۔ بریف کیس کھولا تو اندر قدیم سکے نظر آئے۔ اس کے علاوہ وہ چھوٹی بڑی اشیا بھی تھیں جو اوت سنگھ وقتاً فوقتاً ان کے آگے بیچتا رہا تھا۔ صادق صاحب نے یہ اشیا اوت کی امانت کے طور پر اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ ہاتھی دانت کا بنا ہوا سگریٹ کیس، خم دار خنجر، جیبی چاقو، کی رنگ۔۔۔ اور پتا نہیں کیا کچھ۔ بریف کیس کے اندرونی خانے میں ڈبیا کے اندر وہ قدیم گھڑی بھی تھی جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے صادق صاحب نے کیا تھا۔ گھڑی واقعی خاصے کی چیز تھی۔ اس کے ڈائل اور کیس کی چمک دمک ابھی تک قائم تھی۔ صادق صاحب نے چمٹی کی مدد سے گھڑی کا ڈھکن کھولا اور دھات پر کندہ تحریر مجھے دکھائی۔ بالکل وہی الفاظ تھے جو صادق صاحب نے مجھے بتائے تھے۔ صادق صاحب نے بڑی آہستگی کے ساتھ ان الفاظ کو اپنی انگلی کی پور سے چھوا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولے "ملکہ وکٹوریا۔۔۔ ایڈورڈ ڈیوک آف کینٹ کی اکلوتی اولاد۔۔۔ انیسویں صدی کی تعظیم فرمانروا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ این ٹیک کی پہچان رکھنے والا شخص اس گھڑی کی قیمت ہمارے اندازے سے زیادہ لگائے گا۔"

○☆○

مجھے اپنے کام کے سلسلے میں پانچ چھ روز لاہور میں رہنا تھا لیکن کام سمیٹتے سمیٹتے زیادہ دن لگ گئے۔ میں صادق صاحب کے ہاں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ اس قیام کے دوران میں ایک بار میری ملاقات صادق صاحب کے دوست پروفیسر اشفاق ہمدانی سے بھی ہوئی۔ وہ زبردست علمی اور سماجی شخصیت تھے۔ اوت سنگھ کی گھڑی کے بارے میں وہ بھی بڑے پُرامید نظر آتے تھے۔

میرا دل اوت سنگھ کو دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے صادق صاحب سے اپنی خواہش بیان کی۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے ہارون! شام کو چلیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں بڑی بائی سے بھی تمہاری ملاقات ہوجائے۔ وہ آج کل اوت سنگھ کا سایہ بنی ہوئی ہے۔ اس کا زیادہ وقت اوت کے پاس اسپتال میں ہی گزرتا ہے۔"

ہمارا سہ پہر کے بعد جانے کا پروگرام تھا مگر سہ پہر سے پہلے ہی شدید بارش شروع ہوگئی۔ بادل یوں ٹوٹ کر برسے کہ ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ شام تک بھی بارش کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔ شام کے وقت کال بیل بجی۔ صادق صاحب کے بیٹے زبیر نے باہر جاکر دیکھا اور ذرا ناگواری سے صادق صاحب کو بتایا کہ اوت آیا ہے۔ اس کی اطلاع پر صادق صاحب کے ساتھ ساتھ میں بھی چونک گیا۔ اوت کو پاس سے دیکھنے کا مجھے اشتیاق ہوگیا تھا۔ صادق صاحب کی ہدایت پر زبیر نے اوت کو برآمدے میں بٹھایا۔ میں نے دیکھا، اوت نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ وہ سکھ تھا مگر اس کے سر پر کیس تھا اور نہ پگڑی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ "موناسکھ" ہوچکا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی وقت وہ واقعی گبرو جوان رہا ہوگا۔ یعنی کھنڈر بتا رہے تھے کہ عمارت عظیم تھی۔ اوت سنگھ کی عمر تینتیس چونتیس برس کے قریب دکھائی دیتی تھی۔

صادق صاحب آئے تو اوت نے احترام کے طور پر اٹھنے کی کوشش کی۔ صادق صاحب نے اسے اٹھنے سے روک دیا اور پوچھا کہ وہ اسپتال (کلینک) سے کیسے آگیا؟ اوت سنگھ نے نحیف و نزار آواز میں بتایا کہ بڑی مشکل سے اجازت لے کر آیا ہوں۔

"تمہیں نہیں نکلنا چاہیے تھا اور ایسے موسم میں تو بالکل نہیں نکلنا چاہیے تھا" صادق صاحب نے کہا۔

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

اوت سنگھ نے صادق حسین صاحب سے جو باتیں کیں، ان سے پتا چلا کہ بڑی بائی اور لالہ کی مالی حالت آج کل زیادہ اچھی نہیں۔ لالہ کے آس پاس کے کوٹھوں پر نئی نویلی رقاصائیں آگئی تھیں اور لالہ کی سیڑھیوں پر کم کم تماش بین ہی نظر آتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بڑی بائی نے قرضے بھی لے رکھے تھے۔ اوت سنگھ نے صادق صاحب سے پوچھا کہ اس کی گھڑی کب تک فروخت ہوجائے گی۔ صادق صاحب نے اسے تسلی دی اور کہا کہ دیر آید درست آید۔

بارش مسلسل برس رہی تھی۔ صادق صاحب نے اوت سے کہا کہ ابھی وہ واپس نہ جائے۔ بارش تھمنے کا انتظار کرے۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ صادق صاحب نے گرم گرم دودھ اوت کو پلوایا۔ ساتھ میں ابلا ہوا انڈا بھی تھا۔ دودھ پی کر اور انڈا کھا کر اوت برآمدے میں لکڑی کی بینچ پر ہی لیٹ گیا اور سو گیا۔

سوتے میں بھی کمزوری کے سبب اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ صادق صاحب نے اسے دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولے "کئی بار اسے سمجھا چکا ہوں کہ آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا نہیں چاہیے۔ بڑی بائی مطلب پرست عورت ہے اور پہلے کی طرح وہ اب بھی مطلب پرستی ہی کر رہی ہے۔ لیکن یہ باتیں اوت کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ بس سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ لالہ

اس کے اعصاب پر بری طرح سوار ہے۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ کال بیل پھر بجی۔ اس مرتبہ دو عورتیں گھر میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ بڑی بائی اور اس کی بیٹی لالہ ہیں۔ وہ رکشے پر یہاں پہنچی تھیں۔ رکشا والا کرائے کے سلسلے میں مطمئن نہیں تھا اور جھلائے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ زبیر حسین نے باہر جاکر یہ معاملہ سلجھایا۔

میں نے لالہ اور بڑی بائی کو غور سے دیکھا۔ لالہ خوبصورت تھی مگر چہرہ کچھ کملایا ہوا سا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا جوبن ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جس کے فوراً بعد ہی وہ ڈھلنا شروع ہو جائے گا۔ بڑی بائی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا' اس کی شکل وصورت بھی ویسی ہی پائی۔ وہ چہرے مہرے سے ایک کرخت اور چالاک عورت نظر آتی تھی۔ اس کی پیشانی پر کوئی تازہ چوٹ لگی تھی اور وہاں پٹی چپکی ہوئی تھی۔ اس کی کلائی پر بھی پٹی بندھی تھی۔ بڑی بائی یقیناً اوت کو ڈھونڈتی ہوئی ہی یہاں آئی تھی۔ برآمدے میں اوت کو بینچ پر محو خواب دیکھ کر اسے تسلی ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر "محبت" سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اس لڑکے نے تو جان ہی نکال دی تھی۔ بغیر کچھ بتائے کلینک سے چلا آیا ہے" وہ صادق صاحب سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تم نے فون کرلیا ہوتا" صادق صاحب نے قدرے ناگواری سے کہا۔ یقیناً انہیں ماں بیٹی کی آمد ناگوار گزری تھی۔

"فون ہوا تو ڈیڈ پڑا تھا۔ لالہ نے ایک گھنٹے میں کوئی دس بار ڈائل کیا ہے۔"

"جی ہاں" لالہ نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔

لالہ کے انداز سے میں نے قیاف لگایا کہ وہ ماں کی موجودگی میں بہت کم بولتی ہے اور بس اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی ہے۔

صادق صاحب کے ملازم نے بڑی بائی سے پوچھا "باجی جی! یہ چوٹیں کیسے لگی ہیں؟"

جواب میں بڑی بائی نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ وہ پچھلے تیس سال سے جس کوٹھے پر دھندا کر رہی تھی' وہ مالک مکان نے خالی کروالیا ہے۔ کل اسی سلسلے میں کوئی پھڈا بھی ہوا ہے۔ مالک مکان کے کارندوں نے بڑی بائی کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔ ان چوٹوں کا تعلق بھی اسی پھڈے سے تھا۔

درحقیقت بڑی بائی کا رعب داب اب زوال پذیر تھا بلکہ وہ ہر لحاظ سے اب ایک زوال پذیر عورت تھی۔ گاہکی کم ہونے کے سبب اس کے مالی حالات بھی اتنے اچھے نہیں رہے تھے۔ اس کی ساری امیدیں اب غالباً اوت سنگھ کے ساتھ ہی وابستہ تھیں۔ وہ بھانپ چکی تھی کہ ایک انہونی کے سبب اوت کے حالات بڑی تیزی سے بدلنے والے ہیں۔

وہ جتنی دیر صادق صاحب کے پاس ٹھہری' اپنے مسائل کا رونا ہی روتی رہی۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے صادق صاحب سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ اوت سنگھ کی گھڑی کب تک فروخت ہونے والی ہے۔ صادق صاحب نے اسے گول مول جواب دیا۔ آخر میں وہ بولی "صادق صاحب! لالہ نے اس گھڑی کے بارے میں بڑا سنا ہے' وہ اسے دیکھنا چاہتی ہے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لالہ کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہی ہے۔ درحقیقت وہ خود گھڑی دیکھنا چاہتی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق صادق صاحب نے بڑی بائی کو بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ گھڑی پروفیسر اشفاق کی حفاظت میں ہے۔

اس ساری بات چیت میں لالہ نے صرف ایک بار حصہ لیا تھا۔ اس نے تحیر آمیز لہجے میں صادق صاحب سے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے جی کہ وہ گھڑی اتنی مہنگی بک جائے گی؟"

صادق صاحب نے کہا تھا "دیکھو بھئی' ہم کوشش تو کر رہے ہیں اور دعا بھی کر رہے ہیں۔"

تسلی

اس عمارت میں ایک ہی لفٹ تھی اور وہ بھی نہایت پرانی۔ ایک مرتبہ وہ دسویں اور گیارہویں فلور کے درمیان پھنس گئی۔ اندر ایک ہی تو تھی تھا۔ چوکیدار نے آکر لوہے کے جالی دار دروازے سے اسے دیکھا اور تسلی دی "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے لفٹ ٹھیک کرنے والے مستری کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔"

"جھوٹے کہیں کے۔! میں ہی لفٹ ٹھیک کرنے والا مستری ہوں" اندر پھنسا ہوا تو تھی غصے سے بولا۔

"کیا اس میں کوئی ہیرے وغیرہ لگے ہوئے ہیں؟" لالہ نے خوبصورت آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ ہیرے تو نہیں لیکن دھات قیمتی ہے۔ اس کی اصل اہمیت اس کے پرانے ہونے کی وجہ سے ہے۔"

کچھ دیر بعد بارش ذرا کم ہوگئی مگر اوت سنگھ گہری نیند سو رہا تھا۔ صادق صاحب نے بڑی بائی سے کہا کہ وہ بچی کو لے کر چلی جائے۔ وہ صبح اوت سنگھ کو خود کلینک پہنچادیں گے۔

کچھ تذبذب کے بعد بڑی بائی چلی گئی۔ بڑی بائی کے گھر سے نکلنے کے بعد صادق صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔

اوت سنگھ رات کو وہیں پر سویا رہا۔ صبح سویرے بارش نے پھر زور پکڑلیا تھا۔ میں اٹھا تو صادق صاحب کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ایک کھلی ہوئی الماری کے پاس کھڑے تھے۔ الماری کی چیزیں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں "کیا ہوا سر؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ بولے "ہارون! گھڑی کوئی لے گیا ہے۔"

"کون لے گیا ہے؟"

"مجھے شک ہو رہا ہے کہ اوت سنگھ خود ہی لے گیا ہے اور۔۔۔ یہ کام کیے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے زبیر کی موٹر سائیکل پکڑی اور تیزی سے باہر گلی میں آگیا۔ آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ سب کچھ جل تھل ہوگیا تھا۔ میں ایک فرلانگ آگے گندے نالے کی طرف آیا۔ یہ وہی نالا ہے جو فیروز پور روڈ کی طرف سے ملتان روڈ کی طرف آتا ہے۔ نالا دریا بنا ہوا تھا۔ بارش کا پانی طوفانی انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس سرخی مائل پانی میں نالے کے اصل پانی کی سیاہ دھاریاں تھیں۔ اچانک میری نگاہ اوت سنگھ پر پڑی۔ وہ نالے سے تھوڑا ہٹ کر گھاس پر بیٹھا تھا۔ اس نے کوندی کے ایک پیڑ سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ بارش اور کیچڑ نے اسے لت پت کردیا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسے کندھوں سے پکڑا اور جھنجوڑا۔ میں نے پوچھا "اوت سنگھ! الماری سے گھڑی۔۔۔ تم لائے ہو؟"

اس نے اطمینان سے کہا "آہو باؤجی! میں لایا ہوں۔"

"کدھر ہے گھڑی؟"

"میں نے اسے دے دی ہے۔"

"کسے دے دی ہے؟"

"اسے دے دی ہے" اس نے وضاحت سے تیز رفتار پانی کی طرف اشارہ کیا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ بڑے سکون سے بیٹھا تھا' کہنے لگا "آہو باؤجی! میں نے وہ گھڑی پھینک دی ہے نالے میں۔۔۔ میں نے تو مرہی جانا ہے۔ میں اپنی شے غیروں کے قبضے میں چھوڑ کر کیوں جاؤں؟" پھر ایک لمحہ توقف کرکے بولا "بڑی بائی کے نزدیک میں ایک بے وقوف بندہ ہوں باؤجی! ہاں' میں ہوں بے وقوف۔۔۔ پر اتنا بھی نہیں ہوں۔۔۔ میں اتنا بھی نہیں ہوں" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

○☆○

دراصل اوت سنگھ نے ماں بیٹی کو ایک یادگار سزا دی تھی۔ ماں کو سزا اس کی عیاری اور نائیکا پرستی کی دی تھی۔ بیٹی کو سزا اس کی کم ہمتی اور سہل پسندی کی۔ بے شک وہ اوت سنگھ سے پیار کرتی تھی لیکن اپنے پیار میں کبھی اتنی جرأت پیدا نہ کرسکی کہ اوت کے لیے کوئی قربانی دینے پر آمادہ ہوسکتی۔ اوت سنگھ نے اس کے لیے سب کچھ چھوڑا' وہ اس کے لیے ایک زنجیر نہ توڑ سکی۔

اس واقعے کے بعد اوت سنگھ فقط ڈیڑھ دو ماہ ہی زندہ رہا۔ دھواں دھار معرکوں میں زندہ بچ جانے والا دلیر لانس نائیک ایک روز اسپتال کے بستر پر خاموشی سے زندگی کی لڑائی ہار گیا۔ موت سے قبل اس نے اپنی حویلی وغیرہ اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق ایک عبادت گاہ کو چلانے والے ٹرسٹ کے نام کردی تھی۔ بڑی بائی بالکل تہی دامن رہ گئی۔ درحقیقت اوت اسے کوڑی کوڑی کو محتاج کرگیا تھا۔ اسے اور اس کی بیٹی کو آخری بار لاہور کے ایک خیراتی اسپتال میں دیکھا گیا۔ بڑی بائی وہاں کے کارڈیالوجی وارڈ میں داخل تھی۔ اس کے بعد ان دونوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔

صادق صاحب کو اوت سنگھ کی گھڑی گم ہوجانے کا ازحد افسوس تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو سیکڑوں مزدور لگوا کر نالے کا طول و عرض چھان مارتے۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے اس سلسلے میں بڑی "سنجیدگی" سے بھی سوچا تھا لیکن پھر پروفیسر اشفاق ہمدانی اور دیگر دوستوں کے سمجھانے پر یہ خیال ترک کردیا۔

ان واقعات کو اب تقریباً پچاس برس گزر چکے ہیں۔ میں لاہور ہی میں ہوں اور ملتان روڈ پر اپنے بیٹے عثمان کے ساتھ فرنیچر کا شوروم چلاتا ہوں۔ صادق حسین صاحب بہت ضعیف ہوچکے ہیں لیکن خدا کے فضل سے حیات ہیں۔ میں کبھی کبھار ان سے ملنے ان کے گھر جاتا ہوں۔ ان کے گھر جانے کے لیے نالے کا پل کراس کرنا پڑتا ہے۔ میری نظر خودبخود اس مقام کی طرف اٹھ جاتی ہے جہاں اوت سنگھ نے گھڑی پھینکی تھی۔ اوت سنگھ۔۔۔ جو اپنے بقول "بے وقوف تو تھا لیکن اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا۔"

○ ○

محبت کی بلاخیزی اور بے رحمی کی لوکل لمحات جو ہر رکاوٹ ٹھوکر کو بہا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہے

طاہر جاوید مغل

فیصلہ

محبت وہ آفاقی جذبہ ہے جو اپنے محبوب کو بیک وقت دو متضاد کیفیات سے دوچار کر دیتا ہے۔ عین اس وقت کہ جب ایک طرف یہ انہی دھیمی دھیمی سلگتی ہوئی آنچ سے پتھر دلوں کو موم کرتا ہے تو دوسری طرف کسی تند و متین اور پرشور اندازمیں بہنے والے سرکش دریا کی طرح اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کاٹتا چھانٹتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ محبت اور فطرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چرواہا سوہنی فطرت اور اس کے دلربا نظارے اسی جذبے کو مہمیز دیتے ہیں اور اپنے محبوب کو بے خود کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ہی لافانی محبت کی داستان ہے جس کا آغاز پاکستان کے فردوس منظر شمالی علاقوں میں ہوا اور پھر یہ گنگناتے جھرنوں، فلک بوس کوہساروں، خوبصورت آبشاروں کی ہمراہی میں اونچی نیچی سنگلاخ راہوں پر اپنا سفر طے کرتی رہی۔

وادی کاغان اور وادی سوات کے دل فریب نظاروں، بہتے چشموں سرسبز و شاداب مرغزاروں کی سحر انگیز فضاؤں اور برفانی ہواؤں کو اپنے جلو میں لیے یہ داستانِ محبت اُن فیصلہ کن لمحوں کی روداد ہے جب انسان اپنا اختیار خود اپنے آپ پر سے کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی محبت اسے جن پُرخار راہوں یا انتہائی خوبیلی کھائیوں میں لے جانا چاہتی ہے وہ بے خودی میں اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سیلِ محبت کا تیز بہاؤ اسے کسی جگہ ٹھہرنے سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور وہ بہتا چلا جاتا ہے۔ آپ کے محبوب مصنف طاہر جاوید مغل صاحب سسپنس کے آخری صفحات کے لیے تحفۃً حاضر۔





صبح کی سیر ہمیشہ سے میرا معمول رہا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی ہوتا ہوں تو اس معمول میں فرق نہیں آتا۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں راولپنڈی میں قیام پذیر تھا۔ یہ عارضی قیام تھا یعنی صرف دو روز کا۔ اس کے بعد مجھے شمالی علاقہ جات کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ تن تنہا اور بے سمت۔۔۔ یہ تن تنہا یعنی "سولو ٹور" میں پہلی مرتبہ لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی بھی میں شمالی علاقہ جات کا رخ کرتا تھا' دوست اور ہم مزاج ساتھی میرے ہمراہ ہوتے تھے' کبھی یہ تعداد ایک ہندسے کی ہوتی تھی' کبھی دہرے ہندسے کی اور ایک مرتبہ تو یہ تہرے ہندسے تک بھی پہنچی تھی۔ شمالی علاقہ جات سے میرا عشق کوئی نئی بات نہیں۔ یہ برسوں پرانا شوق تھا اور میرے ساتھ ہی جوان ہوا تھا۔ میں نے کالج کے زمانے میں ٹریکنگ اور ہائی کنگ شروع کی تھی۔ کالج کے ہائی کنگ کلب کا میں مصروف ترین ممبر تھا۔ بعد ازاں یہ شوق آگے بڑھا اور میں نے کلائمبنگ (کوہ پیمائی) کی طرف بھی پیش قدمی کی۔ ایک معروف کلب کی ٹیم کے ساتھ میں نے کئی چھوٹی بڑی چوٹیاں سر کر رکھی تھیں۔

۔۔۔ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا راولپنڈی میں اپنے قیام کا اور صبح کی سیر کا۔۔۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہوتا کہ بادِ صبا کا لمس پانے کے باوجود میں بستر میں پڑا رہوں۔ اس روز بھی علی الصباح میں لیاقت باغ کی طرف نکل گیا۔ میں ایک ٹریک پر جاگنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک دراز قد نوجوان سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میں تھوڑا سا چونکا اور رک گیا۔ مجھے نوجوان کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' نوجوان کی رفتار سست ہو گئی تھی اور وہ بھی گھوم کر میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو دونوں رک گئے۔ میں نوجوان کی طرف بڑھا۔ گورے چٹے چہرے پر دائیں کان سے نیچے ایک مسا نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں اس مسے کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اخلاق! تم یہاں؟"

اخلاق نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ میری طرف بڑھا "اوئے تیمور! مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔"

ہم دونوں بغلگیر ہو گئے۔ اخلاق میری ہی طرح دراز قد تھا۔ شانے چوڑے تھے لیکن جسم میں وہ سختی نہیں تھی جو جفاکشی اور محنت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک نہایت قیمتی ٹریک سوٹ میں تھا۔ کچھ دیر بغلگیر رہنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور سانسیں درست کر کے وہیں گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گئے۔

"کتنا عجیب لگ رہا ہے تم سے مل کر" اخلاق بولا "میرا خیال ہے سات آٹھ برس بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

"ہاں' تم ان دنوں ملک سے باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہم انارکلی میں بانو بازار کے قریب ملے تھے۔"

"اور جوس کی دکان پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کی تھیں۔"

"تم نے بتایا تھا کہ پڑھائی کے سلسلے میں انگلینڈ جا رہے ہو۔ تین چار سال سے پہلے نہیں لوٹو گے۔"

"میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا" اخلاق بولا "میں نے تین چار سال کا کہا تھا' تین اور چار کو ملائیں تو سات سال بنتے ہیں۔ پورے سات سال بعد لوٹا ہوں۔ ابھی دو ڈھائی مہینے ہی ہوئے ہیں۔ ایم بی اے کیا ہے بھائی' کوئی مذاق نہیں ہے۔ ایک بڑی انگلش فرم میں دو تین سالہ تجربہ بھی ہے۔ یہاں بہت سی فرمیں ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں' پُرکشش تنخواہ کی آفرز ہوئی ہیں لیکن تم جانتے ہو اپنا مزاج نوکری کا ہے ہی نہیں۔۔۔ گلبرگ لبرٹی مارکیٹ کے پاس ایک پلازا۔۔۔ میں پورا فلور کرائے پر لیا ہے۔ اپنا آفس بنا رہا ہوں۔ لاہور میں رہنے اور کام کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔"

"ویری نائس!" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"اور تم؟" اخلاق نے پوچھا۔

"ہم ہیں وہیں' ہم تھے جہاں" میں نے ہنس کر کہا "بُرے بھلے نمبروں سے ایم ایس سی کیا تھا۔ کھیلوں کا سامان بنانے والی ایک فیکٹری میں کوالٹی کنٹرولر کی ملازمت مل گئی تھی۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ تنخواہ بھی معقول ہے' بس گزر بسر ہو رہی ہے۔"

"رہائش کہاں ہے؟"

"وہیں' زمان پارک میں۔ والد صاحب جو مکان چھوڑ گئے تھے' اسی میں رہ رہا ہوں۔ آپا کی شادی ہو چکی ہے۔ بھائی جان اپنی فیملی کے ساتھ سعودیہ شفٹ ہو گئے ہیں۔"

"اوہ!" اخلاق کے ہونٹ افسوس ناک انداز میں سکڑ گئے۔

بات تھی بھی کسی حد تک افسوس کی۔ والد اور پھر والدہ کی وفات کے بعد میں اب یکسر تنہا تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ بس ڈیڈی کے وقت کا ایک ملازم دین محمد تھا اور آیا خورشید بیگم تھی۔ کبھی کبھی تو دل میں آتی تھی کہ مکان ہی فروخت کر ڈالوں۔

"آنٹی کا سن کر بہت افسوس ہوا تیمور!" اخلاق نے آزردہ لہجے میں کہا "مجھے پچھلے سال شاید جنوری میں پتا چلا

ہت دل چاہا کہ اور کچھ نہیں تو تمہیں افسوس کا خط ہی
کھ دوں لیکن میرے پاس ایڈریس نہیں تھا' بلکہ کسی کے
س بھی نہیں تھا۔ وہ تو اخبار میں نیوز نہ آتی تو شاید ہمیں
ابھی نہ چلتا۔ میں سچ کہتا ہوں تیمور' میں بہت متاثر تھا آنٹی
سے۔ وہ ایک منفرد خاتون تھیں۔ ہمارے خاندان میں انہیں'
ن کی حیثیت کے مطابق مرتبہ نہیں دیا گیا... بلکہ بڑی ناانصافی
وئی ان سے۔ میں ہمیشہ اس صورتِ حال پر کڑھتا رہا ہوں۔
اش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔" اخلاق دل گرفتہ لہجے میں بولتا
لا گیا۔

ماحول ایک دم افسردہ ہوگیا تھا۔ میری والدہ کی وفات
تقریباً ڈیڑھ برس قبل ہوئی تھی۔ زخم ابھی بھرا نہیں تھا لہٰذا
یس سی اٹھنے لگی تھی۔ بہرحال میں ماحول کو مزید گمبھیر نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں موضوع تبدیل
کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے اخلاق سے پوچھا کہ وہ یہاں
کیا کرتا پھر رہا ہے؟

اخلاق نے جواب میں جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ
وہ لوگ ایک ٹور پر نکلے ہوئے ہیں اور کل ہی لاہور سے
اسلام آباد پہنچے ہیں۔ اخلاق کے ساتھیوں میں جو نام شامل
تھے' وہ سب میرے جانے پہچانے تھے۔ یہ سب میرے بہت
قریبی رشتے دار تھے۔ میرے خونی رشتے جو مجھ سے بہت دور
ہو چکے تھے۔ میرے دونوں تایا تھے' ان کے اہلِ خانہ تھے اور
اس کے علاوہ دو تین فرسٹ کزن تھے۔ اخلاق بھی ان میں
شامل تھا۔ وہ میرا پھوپی زاد بھائی تھا۔ یہ سب لوگ ایک
تفریحی دورے پر لاہور سے روانہ ہوئے تھے۔ ایبٹ آباد سے
ہوتے ہوئے انہیں کاغان پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے ناران
اور جھیل سیف الملوک کا رخ کرنا تھا۔ واپسی پر ان کا
پروگرام شوگران جانے کا تھا۔ وہاں وہ لوگ کیمپنگ کا
ارادہ رکھتے تھے۔ اخلاق نے مجھے اس "دورے" کی تمام
تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ان کے پاس تین
کاریں اور ایک اسٹیشن ویگن ہے۔ تمام سامان اسٹیشن
ویگن میں لوڈ کیا گیا ہے۔ اس میں کیمپنگ کا سامان بھی
شامل ہے۔ گاڑیوں میں ایک ہنڈا سوک تھی' ایک مارگلہ اور
ایک مہران۔ قصہ مختصر یہ لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکلے
تھے اور بلند ارادے رکھتے تھے۔ منجھلے تایا کام کے سلسلے میں
لاہور ہی رہ گئے تھے۔ ہاں بڑے اور چھوٹے تایا ہمراہ تھے۔
چھوٹے تایا کا بڑا بیٹا سلجوق بزعمِ خود اس پارٹی کا لیڈر تھا۔
حالانکہ وہ بے چارہ خود بھی پہلی مرتبہ کاغان سے آگے جا رہا
تھا۔ میرے خیال میں اس پارٹی کا سب سے دلچسپ ممبر ندیم
تھا۔ ندیم میرا چچا زاد تھا۔ خاندان کے دیگر افراد کی طرح'
عرصہ ہوا اس سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی' بہرحال اس کی
لطیفہ گوئی' نغمہ سرائی اور رنگین مزاجی مجھے اب تک یاد
تھی۔

گفتگو کے دوران میں ہی اخلاق کی نگاہ میری پشت پر
پڑ گئی تھی۔ میں نے بھی اخلاق کی طرح ٹریک سوٹ پہن رکھا
تھا۔ سوٹ کی پشت پر ہائیکرز ایسوسی ایشن کے الفاظ درج
تھے۔ میں پچھلے چھ برس سے اس ادارے کے ساتھ منسلک
تھا اور درجنوں مرتبہ شمالی علاقوں میں دور دراز کے ٹور لگا چکا
تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اکیلا آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا
دل چاہتا تھا کہ اپنے پسندیدہ کوہ و دمن کو تنہائی میں دیکھوں۔
وہ محبوب نشیب و فراز و دل فگار نظارے جن کی یاد ہمہ وقت
میرے دل میں سمائی رہتی ہے' میری آنکھوں کے سامنے
ہوں اور ہمارے درمیان کوئی تیسرا نہ ہو۔ میں ان بلندیوں
اور ان گہرائیوں کا عاشق ہوں اور کبھی کبھی عاشق کا دل چاہتا
ہے کہ وہ محبوب کے ہمراہ اکیلا ہو... یکسر تنہا۔

یہی وجہ تھی کہ میں خاموشی سے چلا آیا تھا۔ میں نے
کسی دوست کسی شناسا کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی کہ
میں "شمال" کو جا رہا ہوں۔ مگر دعا کو اثر کے ساتھ' عمل کو
ارادے کے ساتھ اور خواہش کو نتیجے کے ساتھ ہمیشہ سے
دشمنی رہی ہے۔ یہاں بھی یہ دشمنی کارفرما ہوئی اور "دل کی
تمنا دل ہی میں رہی۔" والا معاملہ ہوگیا۔

اخلاق نے میرے ٹریک سوٹ کی پشت پر "ہائیکرز
ایسوسی ایشن" کے الفاظ دیکھے تو چونک گیا "یہ کیا معاملہ ہے
بھئی! تم تو شاید ہائی کنگ بھی کرتے ہو۔"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اس حوالے سے
میری کیا مصروفیات رہی ہیں۔ وہ بے حد حیران ہوا۔ میں نے
ملکہ پربت کا ذکر کیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ ملکہ پربت جھیل
سیف الملوک کے کنارے واقع ایک شاندار برفانی چوٹی
ہے۔ تین سال پہلے میں نے اپنے کچھ مہم جو دوستوں کے
ساتھ اسے سر کرنے کی ادھوری کوشش کی تھی۔ ناکامی کے
باوجود ہمیں اپنی اس مہم پر فخر تھا۔ ہم کافی بلندی تک گئے تھے
اور بخیر و عافیت واپس لوٹے تھے۔ اتفاقاً میری جیب میں ملکہ
پربت والی مہم کی دو تین تصویریں بھی موجود تھیں۔ میں نے
وہ تصویریں اخلاق کو دکھائیں۔

اخلاق کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں' بولا "یار! ہائی
کنگ اور کلائمبنگ وغیرہ کے سلسلے میں مجھے بھی تھوڑی
بہت معلومات حاصل ہیں۔ میں تو بہت متاثر ہوا ہوں تمہاری

ACHIEVEMENT سے۔ ہمارے ہی خاندان میں ایک ٹھیک ٹھاک مہم جو موجود ہے اور ہمیں خبر تک نہیں۔۔۔ بھئی یہ تو کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں بندے کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا چاہیے اور ہر حال میں کرنا چاہیے۔ میں تو ملک سے باہر تھا۔ اگر ملک میں ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔"

"کیسا کبھی نہ ہوتا؟"

"یہی کہ ہماری فیملی میں ایک زبردست بائیکر موجود ہو جو ملکہ پربت تک پر چڑھائی کر چکا ہو اور ہمیں علم تک نہ ہو۔ ویری سیڈ یار' ویری سیڈ" پھر ذرا توقف کر کے بولا "ابھی تم نے بتایا ہے کہ تم نانگا پربت کے بیس کیمپ تک بھی گئے تھے۔ یہ کس سن کی بات ہے؟"

"تا نفٹی فور!" میں نے جواب دیا "جاپانی ٹیم تھی' وہ لوگ تو سکہ بند کوہ پیما تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے جیسے نو آموزوں کا شامل ہو جانا بھی اعزاز کی بات تھی۔ بیس کیمپ تک کا سفر ہمارے لیے کسی بڑی مہم سے کم نہیں تھا۔"

"ونڈر فل یار۔۔۔ ایکسیلنٹ!" اخلاق نے مجھے سرتاپا گھور کر آنکھیں نچائیں "یہ اپنے مستنصر حسین تارڑ صاحب بھی تمہارے جتنے دور ہی گئے ہیں بلکہ شاید اتنی دور بھی نہیں گئے پھر بھی انہوں نے کے ٹو کہانی لکھ ماری ہے اور ایسی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ تم نے کوئی کتاب نہیں لکھی؟"

"یار! کے ٹو کہانی جیسی کتاب لکھنے کے لیے مہم جو ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب ہونا بھی اشد ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں اصل شرط ادیب ہونا ہی ہے۔"

اخلاق مجھے گھور کر بولا "یار' کتنے افسوس کی بات ہے' تمہارے جیسے تجربہ کار شخص کے ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک چغد کو لیڈر بنا کر پہاڑوں کی سیر کو جا رہے ہیں۔۔۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ اور یہ اٹل فیصلہ ہے' تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔"

"کہاں؟"

"بھئی جہاں جا رہے ہو' ہماری اور تمہاری منزل تو ایک ہی ہے۔ تمہیں بھی کاغان سے ہوتے ہوئے ناران اور سیف الملوک جانا ہے' ہمارا ٹور بھی یہی ہے۔ بس اب تو یہ فیصلہ ہو چکا۔ ہم اکٹھے سفر کریں گے اور اس ٹور کو۔۔۔ انشاء اللہ یادگار بنا دیں گے۔" اخلاق بے حد پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

اسے ان فاصلوں کی کچھ زیادہ خبر نہیں تھی جو میرے اور خاندان کے دیگر لوگوں کے درمیان حائل تھے۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک عرصہ ملک سے باہر رہا تھا۔

میں نے کہا "اخلاق صاحب' کیوں اپنے ٹور کا بیڑا غرق کرنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ سو استیاناس ہو جائے گا تمہاری ساری تفریح کا۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ باقی لوگ تمہاری وجہ سے بیزاری محسوس کریں گے' ٹور کے دوران؟"

"وہ تو دور کی بات ہے بھولے بادشاہ۔۔۔ جونہی تمہارے منہ سے یہ بات نکلی کہ تم مجھ سے ملے ہو اور تم مجھے اپنے ساتھ ٹور پر لے جانا چاہتے ہو' تمہارے سارے ہمراہیوں کا منہ پھول کر کپا ہو جائے گا۔ پھر بے شک تم معذرت بھی کر لو مگر جو بدمزگی تمہاری خواہش کی وجہ سے پیدا ہو گی' وہ آخر تک تم لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا" اخلاق اعتماد سے بولا "میری بات ماننا ہی پڑے گی انہیں۔ بھئی اب کوئی ایویں شیویں چیز نہیں ہوں میں۔۔۔ اخلاق احمد شہزاد ایم بی اے ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ بھی کئی ڈگریاں لگی ہوئی ہیں میرے ساتھ۔۔۔ اور خیر سے تمہارے بڑے تایا صاحب کا داماد بھی بننے والا ہوں' نرگس سے منگنی ہو چکی ہے میری۔۔۔" اخلاق نے بڑے انداز سے گردن اکڑا کر کہا۔

یہ واقعی ایک اہم اطلاع تھی۔ میرے استفسار پر اخلاق نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ نرگس سے اس کی منگنی کب ہوئی اور شادی کب متوقع ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ساری بات سننے کے بعد کہا "تمہاری منگنی کا سن کر خوشی ہوئی اور تمہاری یہ بات بھی درست ہے کہ تم تایا جان اور دیگر افراد پر بڑے مؤثر طریقے سے دباؤ ڈال سکتے ہو لیکن اگر میں ہی تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دوں تو پھر؟"

اس نے چھلانگ لگا کر میری گردن دبوچ لی "پھر میں تجھے اغوا کر کے لے جاؤں گا۔ اگر خود نہ کر سکا تو کرائے کے غنڈوں سے کروا لوں گا۔"

قریب سے گزرتی ہوئی دو لڑکیاں ہمارے انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اخلاق نے گھبرا کر میری گردن چھوڑ دی۔

اخلاق کے ساتھ مجھے ہمیشہ سے تھوڑا بہت اُنس رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے تمام کزنز سے مختلف تھا۔ بے شک وہ بھی میرے دیگر رشتے داروں کی طرح خاصا خوشحال و ماڈرن تھا مگر اس میں وہ خاص قسم کی نخوت و بے گانگی نہیں تھی جو ہمارے خاندان میں ہمارے گھرانے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اسکول اور پھر کالج کے زمانے میں بھی کئی بار اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کبھی کبھی

کسی شادی بیاہ یا مرگ پر بھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت خوش اخلاقی سے ملا تھا اور اکثر اس نے ان فاصلوں پر اظہارِ تاسف کیا تھا جو ہمارے گھرانے اور دیگر خاندان کے درمیان موجود تھے لیکن وہ بچپن یا لڑکپن کی باتیں تھیں' ان دنوں وہ ان فاصلوں کے بارے میں بس سوچ سکتا تھا۔ انہیں مٹانے یا کم کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس روز لیاقت باغ کے سبزہ زار میں ہم قریباً دو گھنٹے تک مصروفِ گفتگو رہے یہاں تک کہ صبح کی ڈولی رخصت ہو گئی اور سورج نے ہر طرف کرنوں کا جال بچھا دیا۔ اخلاق نے مجھ سے میرا پتا ٹھکانا دریافت کر لیا تھا اور اپنا ایڈریس بھی دے دیا تھا۔ کل مجھ سے ملنے کا پختہ عہد کر کے وہ واپس چلا گیا۔

اس نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ شام کو ہی پھر آدھمکا۔ "یار' تیرا ایڈریس ڈھونڈنے میں دانتوں پسینہ آگیا۔" وہ دانتوں کے بجائے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

میں اسے اندر لے آیا "تمہیں تو کل آنا تھا۔"

"وہ گانا نہیں سنا تم نے' بے خودی میں صنم۔ اٹھ گئے یہ قدم۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کل تک تم کہیں اِدھر اُدھر نہ کھسک جاؤ۔"

"اگر کھسک جاتا تو کیا ہوتا؟"

"میرے سارے پروگرام کا کریا کرم ہو جاتا۔ بھئی میں پکا فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ جس ٹور پر ہم جا رہے ہیں وہ تمہارے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔"

"میرا ناقص خیال ہے کہ تم نے ابھی تک اپنے ہم سفروں سے اور خصوصاً بڑے تایا جان سے بات نہیں کی۔"

"کر چکا ہوں بھئی' اس لیے تو آیا ہوں۔"

"یعنی وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ جاؤں" میں نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔

"گھامڑ! میں نے انہیں آمادہ کر لیا ہے۔"

"آمادہ کرنے اور آمادہ ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم نے ایک ہونے والے داماد کی حیثیت سے ان پر دباؤ ڈالا ہو گا۔ ان کے پاس تمہاری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہو گا۔"

"چلو ایسے ہی سہی' لیکن میں تمہیں ساتھ لیے بغیر جاؤں گا نہیں۔ اگر تم نہیں گئے تو سمجھو یہ ٹور بھی ختم ہو جائے گا۔ بھئی' میرے لیے یہ بات کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں کہ تم جیسے تجربہ کار ہائیکر ہوتے ہوئے ہم سلجوق جیسے چُغد کو پارٹی لیڈر بنائیں اور اس کی زیرِ نگرانی ٹریکنگ اور کیمپنگ وغیرہ کریں۔ اِٹ از امپوسیبل' تمہیں چلنا ہی ہو گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم صرف اپنا تفریحی دورہ برباد کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں ٹھیک سے معلوم نہیں کہ تایا صاحبان اور ان کے اہلِ خانہ مجھے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میری موجودگی میں انہیں یہی محسوس ہو گا کہ وہ کسی بڑے ڈکیت یا عالمی شہرت یافتہ قاتل کے ساتھ تفریح پر نکلے ہوئے ہیں اور اس حماقت کے نتیجے میں کسی بھی وقت ان کے جان و مال کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ' جب جان و مال و آبرو کو شدید خطرات لاحق ہوں تو تفریح کیا خاک ہو گی!"

"مگر وہ لوگ تمہیں ایسا کیوں سمجھتے ہیں جب کہ تم ایسے نہیں ہو۔"

"یہ بات تم ان سے پوچھو تو بہتر ہے۔"

"پھر بھی تمہیں کچھ اندازہ تو ہو گا۔"

"میرے خیال میں میری سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ مجھ میں منافقت نہیں ہے۔ میں سگریٹ پیتا ہوں' کبھی کبھار ڈرنک بھی کرتا ہوں۔ میرے دوستوں میں بھلے مانس بھی ہیں اور ایسے بھی ہیں جو بھلے مانس نہیں ہیں۔ آوارگی میرا شوق ہے اور میں ایسی شرافت پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں جس کی اصل بزدلی پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں اپنے حق کے لیے لڑنے کی بات ہو' میں پیچھے نہیں ہٹتا ہوں۔ اب تم میری ان خصلتوں کو برائی کہہ لو' بے راہ روی کہہ لو یا کوئی اور نام لے لو لیکن یہ میری ذات کا حصہ ہیں اور میں نے کبھی بھی انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے خاندان سے باہر ہوں اور تمہارے بڑے چھوٹے مجھے منہ نہیں لگاتے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ تمہاری زبان سے میرے بارے میں سن کر ان کا خون کھول اٹھا ہو گا۔ اب پتا نہیں انہوں نے اپنے دلی جذبات تم پر ظاہر کیے ہیں یا نہیں لیکن دل ہی دل میں وہ سب تمہیں کوس رہے ہوں گے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔"

ہمارے درمیان قریباً ایک گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اخلاق اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ وہ ٹریکنگ اور ہائی کنگ کے سلسلے میں میرے تجربے سے بہت متاثر نظر آتا تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی اس سے متاثر ہوں لہٰذا وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے وہ مجھے میرے اسباب سمیت

اسی ہوٹل میں لے گیا جہاں چھوٹے بڑے تایا کی فیملیز ٹھہری ہوئی تھیں۔ خلافِ توقع سب لوگ خوش دلی سے ملے' یہاں تک کہ بڑے تایا جان کے ماتھے پر بھی ناگواری کی بس ایک دو شکنیں ہی نظر آسکیں۔

میں قریباً پانچ سال بعد ان لوگوں سے مل رہا تھا۔ سب چہرے بدلے بدلے نظر آرہے تھے۔ بچپن اب لڑکپن میں ڈھل گیا تھا۔ جو لڑکے تھے وہ اب جوان نظر آرہے تھے' جو عمر رسیدہ تھے وہ اب مزید عمر رسیدہ ہوگئے تھے۔ مزید عمر رسیدہ ہونے والوں میں بڑے تایا احتشام اور بڑی تائی نصرت شامل تھیں۔ تاہم چھوٹی تائی اور چھوٹے تایا صحت مند نظر آتے تھے۔ دونوں کافی فربہ اندام بھی تھے۔ لگتا تھا کہ کھانے پینے کے دونوں زبردست شوقین ہیں۔ بڑے تایا کی چھوٹی بیٹی یعنی نرگس کی چھوٹی بہن عینی اب جوان ہوگئی تھی۔ تراشیدہ بالوں اور ماڈرن لباس کے ساتھ وہ خاصی دلکش نظر آرہی تھی۔ بڑے تایا کے گھرانے میں ایک بہو کا اضافہ بھی ہوچکا تھا۔ خاموش طبع اس جواں سال خاتون کا نام فریحین تھا۔ بڑے تایا کا بیٹا رضوان بھی ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹے تایا کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں بھی اس گروپ میں شامل تھیں۔ یہ ہنستے مسکراتے روشن چہرہ' تعلیم یافتہ اور ماڈرن لوگوں کا گروپ تھا۔ تعلیم یافتہ اور ہنس مکھ تو کسی حد تک میں بھی تھا لیکن شاید ان لوگوں کی طرح ماڈرن نہیں تھا یا پھر کوئی اور کمی تھی مجھ میں کہ میں خود کو ان کا ہم پلہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان لوگوں میں پہنچ کر میں نے عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی لیکن جس طرح وہ اپنی ناگواری چھپائے ہوئے تھے اسی طرح میں نے بھی اپنی بے چینی چھپائے رکھی کہ ایک اچھے سفر کے لیے یہ تھوڑی سی منافقت ضروری ہوگئی تھی۔

۲۲ جون کے روز ہم دس بجے کے قریب راولپنڈی سے کاغان کے لیے روانہ ہوئے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ قافلہ چار گاڑیوں پر مشتمل تھا اور ان میں ایک بڑی اسٹیشن ویگن بھی تھی۔ اسٹیشن ویگن میں سازوسامان کے علاوہ تین چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش بھی تھی۔ میں مہران گاڑی میں اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اخلاق نے زبردستی مجھے اپنے ساتھ مارگلہ گاڑی میں بٹھایا۔ اس گاڑی میں رضوان کے علاوہ میرا چچا زاد ندیم بھی سوار تھا۔ وہ زبردست قسم کا لطیفہ گو اور خوش نوا شخص تھا۔ اخلاق کے بعد ندیم ہی تھا جس نے اس گروپ میں میری آمد کو ٹھنڈے پیٹوں قبول کیا تھا۔ ندیم کی موجودگی کے سبب سفر اچھا کٹتا رہا۔ موسم بھی خوش گوار تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ دوپہر کا کھانا ایبٹ آباد پہنچ کر ہی کھایا جائے گا لیکن راستے میں دو تین جگہ گاڑیوں کے ٹائر پنکچر ہوئے۔ ہم قریباً ایک بجے حسن ابدال پہنچ پائے۔ حسن ابدال میں لب سڑک تین چار ہوٹل کھانے کے حوالے سے بڑے مناسب ہیں۔ میرے مشورے پر کھانا وہیں کھالیا گیا۔ اس کے بعد ہم ایبٹ آباد روانہ ہوئے۔ ابھی ہم ہری پور سے کچھ ہی آگے گئے تھے کہ عجیب واقعہ رونما ہوا۔ میرے بائیں پہلو میں درد ہونا شروع ہوگیا۔ درد کی نوعیت اور اٹھان محسوس کرکے ایک دم میرے مساموں سے پسینہ بہنا شروع ہوگیا۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ یہ گردے کا درد ہے۔ گردے کا درد مجھے دو تین بار پہلے بھی ہوچکا تھا لہٰذا مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ کس "بلا" کا نام ہے۔ پچھلے چھ سات سال سے یہ درد بالکل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ہری پور سے ایبٹ آباد کی طرف جاتے ہوئے جب یہ درد اچانک شروع ہوا تو میرے ذہن میں کسی ایسے آتش فشاں کا خیال آیا جو برسوں سے خاموش تھا اور اب اچانک انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا تھا۔ شروع میں تو میں نے خود کو فریب دینے کی کوشش کی اور دل کو سمجھایا کہ یہ کوئی اور درد ہوگا۔ گاڑی میں کولر موجود تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے تین چار گلاس پانی پیا اور جیلوسل کی کئی گولیاں حلق سے نیچے اتاریں لیکن جلد ہی بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق درد ناقابلِ برداشت ہوگیا اور اس درد سے بڑھ کر یہ احساس ناقابلِ برداشت ہوگیا کہ یہ درد اب آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ پانچ دس منٹ کے اندر میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا اور میری حالتِ زار دیکھتے ہوئے اخلاق کو گاڑی روکنی پڑی۔ جونہی ہماری گاڑی رکی' باقی بھی رک گئیں۔ جلد ہی یہ خبر پورے گروپ کو معلوم ہوگئی کہ مجھے گردے کا شدید درد ہو رہا ہے۔ درد کی اذیت کے ساتھ ساتھ اب ایک عجیب سی پشیمانی بھی دل ودماغ پر حاوی ہو رہی تھی۔ میری وجہ سے سب لوگ ڈسٹرب ہوگئے تھے۔

میں دل ہی دل میں خود کو اور اپنے نامراد گردے کو کوس رہا تھا۔ پچھلے چھ سال میں کیسے کیسے مشکل حالات میں کتنے کٹھن سفر کیے لیکن گردے نے ذرا اثر قبول نہ کیا۔ اب ایک آسان اور آرام دہ سفر کے دوران میں اس کا فیوز اڑ گیا تھا۔ میں نے بہت کہا کہ درد ایسا شدید نہیں' ہم سفر جاری رکھ سکتے ہیں لیکن اخلاق کی تیز نظر میرے اندر تک دیکھ رہی تھی۔ اس نے نادرشاہی فیصلہ جاری کردیا کہ ایبٹ آباد میں قیام کیا جائے۔ یہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ نہایت روشن مستقبل والے داماد صاحب کی بات ٹالنا بڑے تایا جان کے لیے

آسان نہیں ہے۔ اب اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد تایا جان نے اخلاق کی ہاں میں ہاں ملادی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود بڑی تائی جان کی طبیعت بھی کچھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ ان کا دل مسلسل متلا رہا تھا اور وہ بار بار سوڈی کا نمک چاٹتی نظر آتی تھیں۔ جب بڑے تایا نے اخلاق کی ہاں میں ہاں ملائی تو باقی گروپ کو بھی چار و ناچار یہ بات ماننی پڑی۔

ویسے بھی سب لوگوں کو کہیں منزل پر تو پہنچنا نہیں تھا۔ یہ سیر و سیاحت کا ٹور تھا اور ایسے ٹورز پر ہر خوبصورت مقام' منزل ہوتا ہے۔ گروپ کی لڑکیوں کو خاص طور سے "ہل ٹاپ" دیکھنے کا شوق تھا۔ بڑے تایا اور رضوان وغیرہ نے الیاسی مسجد نہیں دیکھی تھی۔ غالباً انہوں نے دل ہی دل میں سوچا ہوگا کہ گردے کے درد کا احترام بھی ہو جائے گا اور ایبٹ آباد کی سیاحت بھی ہو جائے گی۔ جلد ہی سب نے بیک زبان کہا کہ آج رات ایبٹ آباد میں قیام کیا جائے۔ قرعۂ فال ایبٹ آباد کے کشمیر ویو ہوٹل کے نام نکلا۔ رضوان وغیرہ پہلے بھی اس ہوٹل میں ٹھہر چکے تھے۔ اچھا ہوٹل تھا' بارونق علاقہ تھا۔ ایک طویل بالکونی تھی جس پر سامنے کی طرف سیمنٹ کے خوبصورت ستون بنے ہوئے تھے۔ ان تین چار فٹ اونچے ستونوں کے ساتھ ساتھ کرسیاں اور میزیں رکھی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر نیچے بازار کی رونق اور پہاڑوں کے مناظر دیکھنا بھلا معلوم ہوتا تھا لیکن میرے پہلو میں چونکہ درد کا خنجر پیوست تھا لہٰذا میں ہوٹل اور اردگرد کی خوبصورتی پر بالکل نگاہ نہیں ڈال سکا۔ چار کمرے بک کرائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈبل بیڈ کا چھوٹا کمرا تھا۔ یہ اخلاق نے میرے لیے حاصل کیا تھا۔ وہ مجھے کمرے میں لے آیا اور تندہی سے میری تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ میں نے درد کش گولیاں کھائیں' دل میں موہوم سی امید تھی کہ شاید درد میں افاقہ ہو جائے۔ لیکن جب ایک ڈیڑھ گھنٹے تک یہ امید پوری نہیں ہوئی تو اخلاق مجھے ایک نزدیکی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ دوا دی اور گلوکوز کی ڈرپ تجویز کی۔ میری کزنز میں سے بڑے تایا کی بیٹی عینی میڈیکل کر رہی تھی اور فائنل ائیر میں تھی۔ اس نے مجھے انجکشن اور ڈرپ وغیرہ لگانے کی ذمے داری قبول کر لی۔

اس رات اخلاق صبح تک میرے ساتھ جاگتا رہا۔ وہ رات مجھ پر بھاری بھی بہت تھی۔ درد کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اوپر سے قے بھی شروع ہو گئی تھی۔ عینی نے بڑی دل جمعی سے میری دیکھ بھال کی۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی اور میں سخت تکلیف کے عالم میں بھی اس کی خوبصورتی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ بازو ہلنے کی وجہ سے میری نس میں لگی ہوئی ڈرپ کی سوئی ہل گئی اور دوبارہ سوئی لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ معلوم نہیں کیوں نس نہیں مل رہی تھی۔ عینی نے بازو پر تقریباً دس جگہ کوششیں کی لیکن سوئی نہیں لگ سکی۔ ہر بار جب وہ سوئی میرے بازو میں چبھوتی تو میرے بجائے اس کے منہ سے سی نکل جاتی۔ اذیت کی حالت میں بھی اس کی یہ ادا مجھے بھلی لگ رہی تھی۔ وہ ایک خوش بودار لڑکی تھی۔ اس کا قرب اس کے نازک ہاتھوں کا لمس میری تکلیف کی شدت کو کم کر رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب اخلاق کمرے سے باہر تھا اور وہ میرے اوپر جھکی ہوئی مجھے دوا پلا رہی تھی' اس کی بھابی فرحین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر جو پہلا تاثر نظر آیا۔ وہ ناخوش گواری کا تھا۔ اس نے عینی سے کہا "عینی' رات بڑی ہو گئی ہے' چلو اب سو جاؤ۔"

عینی بولی "بس بھابی! دو بجے ایک انجکشن لگنا ہے' وہ لگا کر آجاتی ہوں۔"

"بھئی انجکشن کا کیا ہے' اخلاق لگا لے گا" فرحین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"نس کا انجکشن ہے بھابی! مجھے ہی لگانا پڑے گا۔"

فرحین لاجواب ہو کر واپس چلی گئی۔ میں نے کہا "عینی! تمہاری بھابی بڑی رعب دار ہیں۔"

"بھابی کس کی ہیں" وہ مسکرائی۔ چند لمحے محویت سے مجھے تکتی رہی پھر بولی "تیمور بھائی! مجھے ٹریکنگ اور ہائی کنگ سے بڑا لگاؤ ہے۔ میں ایسی خبریں شوق سے پڑھتی ہوں۔ ایک مرتبہ اخبار میں آپ کے بارے میں ایک نیوز پڑھی تھی میں نے... آپ شاید کسی ٹیم کے ساتھ صفائی کی مہم پر نانگا پربت کے دامن تک گئے تھے۔ گروپ لیڈر کے ساتھ آپ کی تصویر بھی آئی تھی۔"

"ہاں' یہ ۹۲ء کی بات ہے" میں نے کہا "کافی مشکل سفر تھا۔ اس جیسے اور بھی سفر کیے ہیں میں نے لیکن دیکھو' یہ گردے کا منحوس درد شروع ہوا تو کیسے آسان سفر پر ہوا۔ اب کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آئے گی۔"

وہ مسکرائی "ویسے تیمور بھائی' آپ دلچسپ آدمی ہیں اور اتنے برے بھی نہیں جتنا ہمارے خاندان میں آپ کو سمجھا جاتا ہے۔"

"تو کتنا برا ہوں؟"

"تھوڑے تھوڑے۔" اس نے ادا سے کہا "آپ

سگریٹ بہت پیتے ہیں' آپ کی مونچھیں کچھ بڑی ہیں۔ آپ لباس کے معاملے میں بڑے بے پروا نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ آپ باتوں میں بازاری قسم کے لفظ استعمال کرجاتے ہیں۔ شاید آپ کو خود بھی پتا نہیں چلتا ہے۔"

"یہ تو پھر کافی برائیاں ہوگئیں۔"

"نہیں۔۔۔ سنا تو آپ کے بارے میں بہت کچھ ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ! آخر آپ لوگ میرے بارے میں اتنے بدظن کیوں ہیں' کیا تمہاری سمجھ میں اس کی کوئی REASON آتی ہے؟"

اس نے پُرسوچ انداز میں اپنی انگلی پیشانی سے نکالی اور بولی "دل کی بات بتاؤں یا ٹالنے کی کوشش کروں؟"

"دل کی بات بتاؤ۔ اس پوری پارٹی میں اخلاق اور تم ہی مجھے کچھ اپنے اپنے سے لگے ہو۔ اس لیے تم سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ بات کررہا ہوں۔"

"تیمور۔۔۔ بھائی! میرے خیال میں اس بدظنی کی اصل وجہ آپ کی ذات کے بجائے آپ کے "پس منظر" میں پوشیدہ ہے۔ آپ کی والدہ خاندان سے باہر کی تھیں۔ پھر یہ شادی بھی چچا جان کی پسند کی تھی۔ ہمارا خاندان آپ کی والدہ کو اپنے اندر سمو نہیں سکا۔ یقیناً اس میں آپ کی والدہ سے زیادہ ہمارے خاندان کا تصور ہے۔ بہرطور آپ اپنے اور ہمارے درمیان جو فاصلہ پاتے ہیں اس کی بنیاد ماضی کے اس واقعے پر رکھی گئی ہے۔"

ہم دیر اس معاملے پر گفتگو کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے انجکشن کا وقت ہوگیا۔ عینی نے انجکشن لگایا ہی تھا کہ اس کی بھابی فرحین پھر آدھمکیں "لگالیا انجکشن؟" انہوں نے پوچھا۔

عینی نے اثبات میں سرہلایا اور مجھے الوداعی نظروں سے دیکھ کر بھابی کے ساتھ چلی گئی۔ تاہم جاتے جاتے وہ اخلاق کا پاؤں زور سے ہلا گئی۔ اخلاق میرے ساتھ والے بستر پر سویا پڑا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رات کا باقی حصہ اخلاق نے بھی میرے ساتھ جاگ کر گزارا۔

اگلے روز بھی وقفے وقفے سے شدید درد اٹھتا رہا۔ کچھ کھایا پیا نہیں جارہا تھا۔ اخلاق نے اعلان کردیا تھا کہ جب تک تیمور پوری طرح ٹھیک نہیں ہوجاتا' کوئی آگے جانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔۔۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ رہا تھا کہ جو بھی سامان خورد و نوش لاہور سے لایا گیا ہے یعنی دالیں' چاول' بیکری اور جام چٹنیاں وغیرہ وہ سب یہیں ایبٹ آباد میں رہ کر استعمال کرلیا جائے اور آٹھ دس روز یہاں قیام کرنے کے بعد واپس لاہور کا رخ کیا جائے۔ درحقیقت میری تکلیف نے اسے سخت پریشان کردیا تھا اور اس سے زیادہ پریشانی کی بات اخلاق کے لیے یہ تھی کہ میری شدید تکلیف دیکھنے کے باوجود پارٹی کے باقی ممبران جلد از جلد ناران کی طرف روانہ ہونا چاہتے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے اخلاق کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ میرے اہل خانہ کو میری بیماری کی اطلاع لاہور میں بذریعہ فون دے کر میرے فرض سے سبکدوش ہوا جائے اور پروگرام کے مطابق سفر جاری رکھا جائے۔ سلجوق یہ مشورہ اخلاق کے سامنے بارہا دہرا چکا تھا۔ اپنی حالت کے پیش نظر میں نے بھی بارہا اخلاق سے کہا تھا کہ وہ میری وجہ سے اپنا ٹور خراب نہ کرے۔

اخلاق بھی ایک ضدی تھا' وہ اس بات پر اڑ گیا تھا کہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا چاہے سارا پروگرام ہی کینسل کرنا پڑے۔ اس کے دوٹوک فیصلے نے سب کو رویہ بدلنے پر مجبور کردیا تھا۔ اب وہ دل و جان سے اس بات کے خواہش مند نظر آنے لگے تھے کہ میری تکلیف میں جلد از جلد افاقہ ہو تاکہ ناران کی طرف سفر شروع کیا جائے۔۔۔ بڑی تائی کی طبیعت اب بحال تھی۔۔۔ بڑی تائی کے پُرزور اصرار پر اخلاق سہ پہر کے وقت مجھے دوبارہ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر گلوکوز کی ڈرپ لگائی۔ اس ڈرپ نے کرشماتی اثر کیا۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں چار پانچ روز سے پہلے ٹھیک ہوسکوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اخلاق کی منتیں کرتا رہا تھا کہ وہ میری وجہ سے اپنا ٹور خراب نہ کرے لیکن اس ڈرپ کے لگنے کے بعد ہی میں نمایاں افاقہ محسوس کرنے لگا۔ طبیعت ٹھیک ہو تو کس کا دل مسکرانے کو نہیں چاہتا اور کون نہیں چاہتا کہ وہ ایک خوبصورت ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھے اور ایبٹ آباد کے سرسبز و شاداب پہاڑوں کو دیکھتا رہے اور ان کھلی ہواؤں کو سینے میں اتارتا رہے جو تھیا گلی اور مری کی یخ بستہ بلندیوں کو چھو کر آتی ہیں۔ ایک دم ہی مجھے اپنا گردوپیش حسین نظر آنے لگا تھا۔ بالکونی کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک' سامنے تندور پر مسلسل روٹیاں پکاتا ہوا نان بائی' فوٹو گرافر کی دکان پر آتے جاتے ہوئے لوگ' چوک کے فوارے سے چھوٹتا ہوا پانی اور عینی۔۔۔ وہ واقعی ایک دلکش کزن تھی اور اس کے لمس میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس کا ہاتھ بدن سے چھوتے ہی گردے کی شدید تکلیف نصف رہ جاتی تھی۔ وہ میرے پاس سے گزری تو میں نے کہا۔ "عینی! تم کمال کی اسپیشلسٹ بنتا۔"

"وہ کیوں؟"

"تمہارے اندر کوئی ایسی بات ہے کہ جب تم پاس آتی ہو تو انسانی گردے میں ایک خاص قسم کی کیمیائی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور اس کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔"

"آپ اپنی مثال کو پوری انسانیت پر لاگو کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیوں' ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کا گردہ خاص قسم کا ہو۔"

"کیا مطلب' گردوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟"

"کیوں نہیں' نرم گردے۔ سخت گردے۔ دل پھینک گردے۔"

اس روز سہ پہر تک میری طبیعت کافی سنبھل گئی۔ پروگرام بنا کہ سب لوگ بل ٹاپ چلیں گے اور میں بھی ساتھ چلوں گا۔ بل ٹاپ قابلِ دید جگہ ہے۔ ایبٹ آباد کی آبادی سے صرف ڈھائی تین کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ مسلسل چڑھائی ہے۔ تھوڑی بلندی پر جائیں تو ایبٹ آباد کی ساری آبادی نظر آنے لگتی ہے۔ ٹاپ پر موسم بھی لبتا خنک ہوتا ہے اور چیڑ کے بلند و بالا درختوں میں ہوا ایک گونج کے ساتھ سرسراتی ہوئی گزرتی ہے۔ میں ایک دو بار پہلے بھی اس پارک میں آچکا تھا لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی لطف آیا۔ قریباً ۲۴ گھنٹے کی شدید تکلیف کے بعد آرام و سکون کے یہ لمحات بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کسی دانا نے سچ کہا ہے کہ خوشی کو آرام میں نہیں تکلیف میں تلاش کرنا چاہیے۔

اگلے روز میری طبیعت میں مزید بہتری آئی۔ اخلاق کا اصرار تھا کہ میں ایک دن مزید آرام کر لوں کیونکہ ایبٹ آباد سے آگے کا سفر خاصا دشوار ہوگا۔ اس کی بات تکنیکی طور پر درست تھی۔ درد گردہ اور سفر کا چولی دامن کا ساتھ سمجھا جاتا ہے لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ میری وجہ سے سارے گروپ کا پروگرام درہم برہم ہو۔ میں نے اخلاق کو اپنی "فٹ نس" کا مکمل یقین دلایا اور اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ میں پوری طرح سفر کے قابل ہوں۔ مگر اس موقع پر گروپ کے باقی ارکان خاص طور سے نوجوان کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ دراصل ایبٹ آباد میں ان کا دل کچھ لگ گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مزید ایک روز قیام کر کے شہر کی قابلِ دید جگہیں دیکھ لی جائیں۔ مثلاً کمپنی باغ' الیاسی مسجد وغیرہ۔

ہم اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ ایبٹ آباد سے عازمِ کاغان ہوئے۔ بہتے کا روز تھا۔ موسم خوش گوار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گردے کے مریض کو پانی بکثرت پلایا جاتا ہے لہٰذا یحییٰ کی ہدایت پر اخلاق نے چھ لیٹر کا واٹر کولر لبالب بھر کر میرے پہلو میں رکھ دیا تھا اور حکم جاری کر دیا تھا کہ میں ہر آدھ گھنٹے بعد ایک گلاس بھر کر معدے میں انڈیلتا رہوں۔

میں نے کہا "حضرت اخلاق صاحب' اتنا مت چاہو کہ دم نکل جائے۔ اتنا زیادہ پانی پینے سے گردے کے درد کا چانس تو شاید ختم ہو جائے لیکن زندہ رہنے کا چانس بھی مشکوک ہو جائے گا۔"

ہنستے کھیلتے سفر جاری رہا۔ ندیم کی خوش گفتاری بہت کام آ رہی تھی۔ ہم نے مانسہرہ سے پیٹرول لیا۔ جونہی گاڑیاں شاہراہ ریشم کو چھوڑ کر کاغان کی طرف مڑیں' سڑک تنگ ہو گئی اور راستہ غیر ہموار ہو گیا۔ جگہ جگہ سڑک کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ گرد و غبار' تپش اور کچے پکے راستوں پر اچھلتی کودتی گاڑیاں' گروپ کے سارے ارکان یکدم بجھے بجھے سے نظر آنے لگے۔

اخلاق بولا "یار! شروعات تو کچھ اچھی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "شروعات اچھی ہے۔ اختتام دیکھ لو گے تو پھر شروعات پر تبصرہ کرنا۔ وہ شعر نہیں سنا تم نے 'انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ' میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے۔ تم سمجھو کہ یہ شعر جھیل سیف الملوک نے اپنے عاشقوں کے لیے کہا تھا۔"

ندیم موسیقی کا بہت شوقین تھا۔ اس کا ہاتھ بار بار گاڑی کے ڈیک کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اخلاق ڈرائیونگ کرتے کرتے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیتا تھا۔ "یار ندیم! خدا کا خوف کرو۔ اتنا برا راستہ ہے اور تمہیں گانوں کی پڑی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو تم جھیل سیف الملوک کے کناروں تک ڈیک کو آن نہیں کر سکو گے۔ بھئی یہ راستے بس اسی قسم کے ہیں۔ جوں جوں آگے بڑھیں گے یہ خراب تر ہوتے جائیں گے۔ تم راستے کی کوالٹی کو نظر انداز کر کے مناظر کی کوالٹی پر توجہ دو۔"

پندرہ بیس کلومیٹر کا سفر اسی طرح گرد و غبار میں اچھلتے کودتے گزرا۔ جہاں کہیں ہموار سڑک آتی سب چیخ اٹھتے "آگئی پکی سڑک۔"

مگر ابھی اس چیخ و پکار کی گونج بھی ختم نہ ہونے پاتی تھی کہ سڑک ناپید ہو جاتی۔ بہرحال آگے جا کر راستہ ٹھیک ہو گیا۔ جس وقت ہم بالاکوٹ کے خوبصورت قصبے کے درمیان سے گزرے' ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بالاکوٹ

کے نشیب و فراز میں گونجتے اور دھاڑتے ہوئے آبی نالوں کا نظارہ دل کش تھا۔ آبی گزرگاہوں کا ماخذ دریائے کنہار تھا جو آئندہ سفر میں ہمارا ہم سفر ٹھہرنے والا تھا۔

میں جب بھی بالاکوٹ سے گزرتا ہوں بچپن کی چند خوبصورت یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ والد صاحب ایک دفعہ ہم بہن بھائیوں کو لے کر یہاں آئے تھے۔ ہم خاص طور سے مولوی اسمٰعیل شہید کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے تھے۔ راستے میں ہم نے پودینے کی بہتات دیکھی تھی۔ خودرو گھاس کی طرح حدِ نگاہ تک پودینا بچھا تھا۔ ہمارے معصوم ذہنوں نے تصور ہی تصور میں اس پودینے کو گٹھیوں کی صورت میں جوڑا تھا اور حساب لگایا تھا کہ کتنے ہزار کا پودینا ان پہاڑوں پر اگا ہوا ہے۔ پھر والد صاحب کے ہمراہ ہمارا گزر ایک میدان سے ہوا تھا۔ میدان کی ڈھلوان پر بڑی بڑی سیاہ چٹانیں تھیں۔ والد صاحب بڑی محویت سے اس میدان کو تکتے رہے تھے۔ وہ تصور کی نگاہ سے جیسے ماضی بعید کا کوئی بھولا بسرا منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ ہمیں بتانے لگے کہ اس میدان میں اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں نے قابض انگریزوں کے خلاف یادگار جنگ لڑی تھی۔ یہی وہ دیوہیکل چٹانیں تھیں جنہوں نے سرفروشوں کی ناقابلِ فراموش مزاحمت دیکھی تھی۔ وہ ایک پتھر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے "یقیناً انہی پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ کر رائفل بردار مجاہدین نے فرنگیوں پر تابڑتوڑ فائرنگ کی ہوگی۔"

میری ایسی ہی کئی چھوٹی چھوٹی یادیں بالاکوٹ سے وابستہ ہیں۔ اسی بالاکوٹ میں کوئی ایسی مسجد ہے جس کا نام و مقام مجھے معلوم نہیں۔ اس مسجد کے اندر ایک تیز رو آب جو بہتی ہے' نمازی وہاں سے وضو کرتے ہیں۔ ہم والد صاحب کے ساتھ اس مسجد میں گئے تھے۔ والد صاحب نماز میں مصروف ہوگئے تھے۔ ہم ایک دلچسپ کھیل کھیلنے لگ گئے تھے۔ میرا ایک کزن اکبر اپنی چپل تیز رفتار آب جو میں پھینکتا تھا' دوسرے ساتھی نشیب میں کھڑے رہتے تھے۔ جب چپل تیرتی ہوئی وہاں پہنچتی تھی تو وہ اسے نکال لیتے تھے۔ یہ کھیل بمشکل چار منٹ ہی جاری رہ سکا تھا۔ تیز رفتار پانی میں چپل ہاتھ نہیں آسکی تھی اور دریائے کنہار میں پہنچ گئی تھی۔ نتیجے میں اکبر کو اپنے گال پر ابا جی کا طمانچہ سہنا پڑا تھا۔ ایسی ہی کئی یادیں بالاکوٹ کے گلی کوچوں میں گم ہیں۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں وہ مجھے پکارتی ہیں۔ شاید کسی روز مجھے ان کی پکار پر بالاکوٹ رکنا پڑے اور اس کے گلی کوچوں میں بھٹکنا پڑے۔ پھر شاید شاید مجھے وہ اپنی خوبصورت ٹینس بال بھی

ماہنامہ پاکیزہ کا نیا منفرد اور مفید ترین سلسلہ

مسیحا

مسیحا اور فراز کے نام سے

آپ کسی بھی مسئلے سے دوچار ہوں' ہمیں لکھئے۔ شادی' محبت' ازدواجی زندگی کے مسائل' جسمانی' نفسیاتی اور روحانی تکالیف و الجھنیں۔ کاروباری' مالی یا تعلیمی معاملات میں ناکامیاں۔ وقت کی گردش کے تحت مصائب اور پریشانیاں۔ الغرض کوئی بھی مسئلہ ہو' ہم علمی طور پر نہ صرف آپ کی ہر ممکن رہنمائی کریں گے بلکہ آپ کے مسئلے کے ممکنہ مادی و روحانی حل کے لئے تدابیر بھی تجویز کریں گے۔ آپ کے سوالوں کے جواب اور مسائل کا حل علم نجوم و اعداد و جفر' نفسیات و روحانیات اور طب کی روشنی میں پیش کیے جائیں گے۔ ان علوم کے بارے میں اگر آپ چاہیں تو کوئی معلوماتی سوال بھی کرسکتے ہیں۔

مکمل تفصیل کے ساتھ اپنے حالات لکھئے۔ ساتھ ہی درج ذیل کوائف سے بھی آگاہ کیجئے۔

مکمل نام مع والدہ _____

مکمل تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش _____

پیدائش کا شہر یا گاؤں _____

سوال کرنے کا وقت' مکمل تاریخ اور شہر کا نام _____

کسی جسمانی' یا روحانی بیماری کی صورت میں اب تک کیے گئے علاج کی تفصیل۔

کھانے میں میٹھی چیزیں زیادہ پسند ہیں یا نمکین؟

آنکھوں کا رنگ؟ جسمانی طور پر نارمل یا مائل بہ فربہی؟

پتہ:

"مسیحا" معرفت ماہنامہ پاکیزہ پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی

مل جائے جو میں نے ایک مسجد کے وضو خانے میں گیلے ٹاٹ کے ڈھیر تلے رکھ دی تھی اور بھول گیا تھا۔ میں سال پہلے اپنی اس بال کی گمشدگی پر میں کئی روز پریشان رہا تھا۔

بالاکوٹ سے آگے سفر بہت خوش گوار رہا۔ سوائے ایک واقعے کے' مارگلہ گاڑی ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ اس میں چھوٹے تایا کی فیملی سوار تھی۔ گاڑی چھوٹے تایا کا بیٹا سلجوق چلا رہا تھا۔ یہ گاڑی بالکل نئی لی گئی تھی۔ خطرناک ڈھلوان پر گاڑی چلاتے ہوئے سلجوق نے کاریگری دکھائی اور گاڑی کا انجن بند کردیا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ انجن بند ہوتے ہی گاڑی کا ہائیڈرولک سسٹم کام کرنا چھوڑ دے گا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیئرنگ بھی لاک ہوجائے گا۔ جونہی ایک موڑ پر سلجوق نے اسٹیئرنگ گھمایا' یہ جان کر اس کے اوسان خطا ہوگئے کہ اسٹیئرنگ لاک ہے۔ گاڑی تیز رفتاری سے سات آٹھ سو فٹ گہری کھڈ کی طرف جارہی تھی۔ اس موقع پر میں نے بھی گاڑی کو خطرناک رفتار سے موڑ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ خدا کو گاڑی سواروں کو زندہ رکھنا منظور تھا' عین موقع پر سلجوق کا دماغ کام کرگیا اور اس نے اگنیشن میں چابی گھما کر اسٹیئرنگ آزاد کرالیا۔ گاڑی سات سو فٹ گہری موت کے کنارے پر پہنچ کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔

شروع میں ہمارا ارادہ یہ تھا کہ آج ناران پہنچ کر ہی دم لیں گے مگر راستے اتنے خراب تھے کہ سارا پروگرام اپ سیٹ ہوگیا۔ سہ پہر دو بجے تک ہمیں کاغان کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ بہرحال دریائے کنہار ہمارے ساتھ ساتھ تھا اور ہمیں یقین دلا رہا تھا کہ کاغان آئے گا۔ اور ناران آئے گا۔ اور بالآخر جھیل سیف الملوک بھی آئے گی۔ کاغان سے آگے ناران صرف ۲۲ کلومیٹر ہے لیکن یہ راستہ مزید دشوار ہے۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ اپنے نڈھال جسموں اور تھکی ماندی گاڑیوں کو مزید گھسیٹنے کے بجائے بہتر ہے کہ رات کاغان میں گزار لی جائے۔

خدا خدا کرکے چار بجے کے لگ بھگ کاغان پہنچے۔ اچھلتے' کودتے اور دھاڑتے دریا کے کنارے یہ ایک نہایت خوبصورت قصبہ ہے۔ اس چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ دریائے کنہار مختلف شاخوں میں تقسیم ہوکر اس قصبے کے اندر سے گزرتا ہے اور کئی جگہ شاخ در شاخ تقسیم ہوجاتا ہے۔ یہاں کچھ ننھے آبی دھارے بھی دریا میں شامل ہوتے ہیں۔ اس پُرجوش پانی کی گونج ایک دلنواز موسیقی کی طرح پورے کاغان میں گونجتی ہے۔ کاغان میں اچھے ہوٹل ہیں' بازار بھی ہیں لیکن قصبے کا پھیلاؤ اتنا نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ کاغان کی خوبصورتی اس بات کی متقاضی ہے کہ اس قصبے میں قیام وطعام کی بہترین اور وافر سہولتیں مہیا ہوں۔

ہم نے بازار سے تھوڑا سا ہٹ کر "پلس پوائنٹ" نامی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔

ہوٹل کی تعمیر میں زیادہ تر لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ دریا کی ایک شاخ ہوٹل کی چار دیواری کو چھو کر گزرتی تھی۔ کھڑکیوں میں بیٹھ کر اس پانی کا نظارہ کرنا ایک خوش گوار تجربہ تھا۔ اتفاقاً ہمیں صرف دو کمرے مل سکے۔ ایک کمرے میں چھ بیڈ تھے' دوسرے کمرے میں سات تھے لیکن وہاں تین چار مزید بیڈ لگنے کی گنجائش موجود تھی۔ یہ کافی کشادہ ہال نما کمرا تھا۔ سات آٹھ کھڑکیاں تھیں جو آبی گزرگاہ کی طرف کھلتی تھیں۔ پورا گروپ اس کمرے میں اکٹھا ہوگیا اور یہیں سونے کا فیصلہ کیا گیا۔ سب نے خوب انجوائے کیا۔ لنچ تو سفر کی نذر ہوگیا تھا لہٰذا ڈنر سرِشام ہی کرلیا گیا۔

جب بہت سے افراد ایک گروپ کی صورت میں کسی سفر پر نکلتے ہیں اور شب و روز اکٹھے رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو دریافت کرنے کا عمل غیر شعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ عادات و خصائل' جذبات اور ترجیحات کے بارے میں نت نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ میں بھی غیر شعوری طور پر اپنے ہم سفر خواتین و حضرات کا مطالعہ کررہا تھا۔

اخلاق کی منگنی بڑے تایا کی جس بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی اس کا نام نرگس تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کو بے تحاشا پسند کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بولتی تھیں اور ان کی حرکات و سکنات علی الاعلان یہ گواہی دیتی تھیں کہ وہ ایک دوسرے میں گم ہیں۔ عینی' نرگس کی چھوٹی بہن تھی اور کافی شوخ و شنگ بھی تھی۔ گروپ کے ہر فرد کے ساتھ اس کی چھیڑ چھاڑ ہمہ وقت جاری رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ زندگی کو انجوائے کرنے والی لڑکی ہے اور کافی حد تک آزاد خیال بھی ہے۔ اس کی شوخ مزاجی ہلکہ رومان پسندی کا اندازہ مجھے رات کو ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ ایک بڑے ہال نما کمرے میں دس بارہ بستر دو قطاروں میں لگا دیے گئے تھے۔ ان بستروں پر ہم نے اپنی صاف ستھری چادریں بچھائی تھیں۔ ہوٹل کے لحاف ایک کونے میں ڈھیر کردیے گئے تھے اور اوڑھنے کے لیے اپنے کمبل نکال لیے گئے تھے۔

ہم سب بے ترتیب سے لیٹے ہوئے تھے۔ میرے دائیں

ف اخلاق تھا' بائیں طرف رضوان تھا۔ نرگس کے ساتھ
ں اور نرگس کا چھوٹا بھائی نومی تھا۔ نومی کے ساتھ عینی
ب۔ ہال نما بڑے سے کمرے کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔
رے کمرے میں صرف ایک بلب روشن تھا۔ یوں لگتا تھا
ے موم بتی جل رہی ہو۔ کھڑکیوں سے باہر پانی کا وجد طاری
نے والا رد عمل تھا۔ ہم بستروں پر لیٹے کافی دیر گپ شپ
تے رہے پھر دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔
ری آنکھ ایک عجیب سے احساس کے ساتھ کھلی تھی۔ یوں
جیسے بالوں میں کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ میرا ہاتھ سر کی
رف گیا اور کسی کی نرم و نازک انگلیوں سے ٹکرایا۔ اس
ے ساتھ ہی چوڑیوں کی مدھم کھنک کانوں میں گونجی۔ میرا
تھ جیسے ہزاروں وولٹ کے ننگے تاروں سے چھو گیا تھا' ایک
ے میں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ عینی کا ہاتھ ہے۔ اور
ہاتھ دانستہ میرے سر تک پہنچا ہے۔ بے ہوشی کی نیند میں
شر انسان ہاتھ پاؤں پھیلا کر سوتا ہے لیکن یہ ہاتھ بے ہوشی
ں نہیں' ہوش میں مجھ تک پہنچا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر
ں نے آہستگی سے کلائی تھام لی۔ ہاتھ بالکل بے حرکت
و گیا۔ شفاف چوڑیوں کا لمس میری رگوں میں خون کی گردش
و انتہا تک پہنچا رہا تھا۔

میں عینی کی جرأت کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران
و رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بولڈ اور
یز رفتار ثابت ہوگی۔ ہماری جان پہچان کو ابھی دن ہی کتنے
ہوئے تھے۔ بمشکل چار دن۔ مگر وہ ایک ایسا کام کر رہی تھی جو
ایک مشرقی لڑکی چار برسوں کی رفاقت کے بعد بھی کرتے
ہوئے جھجکتی ہے۔ اس کی انگلیاں اب میرے بالوں پر بے
حرکت دھری تھیں لیکن ان میں تڑپتی ہوئی بجلیوں کا ادراک
مجھے تھا۔

عینی کا جو تصور میرے ذہن میں قائم ہوا تھا وہ ایک دم
گمنا سا گیا۔ شرم و جھجک عورت کا لباس ہوتی ہے لیکن کمرے
کی اس گہری تاریکی میں عینی مجھے اس لباس سے بے نیاز نظر
آئی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ پھر بھی
اس نے اپنا ہاتھ کس طور... مجھ تک پہنچایا تھا۔ اگر یہ فاصلہ
نہ ہوتا تو پتا نہیں اس کی پیش قدمی کس انداز کی ہوتی۔ میں یہ
سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ میری طرف سے ایسی کون سی بات
ہوئی ہے جس نے عینی کی اس قدر حوصلہ افزائی کی ہے۔ کتنی
عجیب بات تھی' بڑے تایا اور چھوٹے تایا اپنے گھرانوں کو
پوری برادری میں شرافت کا علم بردار سمجھتے تھے۔ ان کے
طفیل میں ان کی اولادیں تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ ترین
اخلاقی اقدار کی امین تھیں اور ان کی تعریف میں بولتے
دونوں بزرگ حضرات کی زبانیں نہیں تھکتی تھیں لیکن آج
میں اس شرافت اور حسنِ اخلاق کا کھوکھلا پن دیکھ رہا تھا۔

اچانک عینی کا ہاتھ میرے بالوں پر سے ہٹ گیا۔ ایک دو
مدھم آہٹیں سنائی دیں پھر دوبارہ یہ ہاتھ میرے قریب آگیا۔
اب ہاتھ کی پشت میرے رخسار سے چھو رہی تھی۔ میں نے
محسوس کیا کہ "ہاتھ" اب زیادہ آسانی سے مجھ تک پہنچ رہا
ہے۔ شاید عینی کوشش کر کے کچھ مزید آگے کھسک آئی تھی۔
میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے پُرجوش
انداز میں انگلیاں میری انگلیوں میں پیوست کر دیں۔

نہ جانے وہ کب تک میرا ہاتھ تھامے رہتی' اچانک
آہٹ سنائی دی اور کمرے کا بلب روشن ہو گیا۔ گو یہ مدھم
روشنی تھی مگر گھپ اندھیرے میں بلب اچانک روشن ہوا تو
یوں لگا جیسے دن چڑھ گیا ہے۔ عینی کا ہاتھ بڑی سرعت سے
غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹ پٹ سنائی دی۔ میں نے
آنکھوں میں درد بنا کر دیکھا' عینی کی بھابی کمرے کے وسط میں
کھڑی تھیں اور کھوجی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی



تھیں۔ پھر ان کی نگاہیں عینی کے بستر پر جم کر رہ گئیں۔ میں نے ان کی گوری چٹی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ صاف محسوس کی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عینی کا کمبل درست کیا اور اس سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں بولیں "نومی کو پاکستی کی طرف کیوں ڈال دیا ہے؟ اپنے ساتھ لٹاؤ اسے۔"

عینی نے نیند سے بوجھل آواز بنا کر کہا "مجھے نہیں پتا... خود ہی ٹانگیں چلا کر گھوم گیا ہے ادھر۔"

پھر میں نے دیکھا کہ عینی کی بھابی نومی کو اٹھا کر عینی کے پہلو میں لٹا رہی ہے اور ساتھ ساتھ خشمگیں نظروں سے عینی کو دیکھ رہی ہے۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے عینی کے ہاتھ کی رسائی آسانی سے مجھ تک کیسے ہو گئی تھی۔ یقیناً اس نے چھوٹے بھائی کو پہلو سے اٹھا کر پائنتی کی طرف لٹا دیا تھا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ عینی کی بھابی فرحین اس پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ غالباً وہ اس بات سے بھی آگاہ ہو چکی تھی کہ عینی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس صورتِ حال نے اسے حد سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ جانے سے پہلے فرحین نے کمرے کی لائٹ تو بجھا دی لیکن برآمدے کا بلب جلا دیا۔ کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی روشنی نے کمرے کی گہری تاریکی کو نیم تاریکی میں بدل دیا۔ کھڑکیوں کے پار سے کمرے میں داخل ہونے والا پانی کا شور رات کے سناٹے میں کچھ اور بھی متاثر کن لگ رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد صبح تک مجھے نیند نہیں آ سکی۔ شاید عینی بھی جاگ رہی تھی مگر بھابی کی صورت دیکھنے کے بعد اس نے اپنی بیداری کا کوئی عملی ثبوت فراہم نہیں کیا۔

علی الصباح میں نے دیکھا کہ فرحین برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ جب کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تھی تو کمرے میں ایک نگاہ ضرور ڈال لیتی تھی۔ برآمدے میں ایک طرف مصلیٰ بھی بچھا ہوا تھا۔ شاید وہ تھوڑی دیر پہلے تک نماز پڑھتی رہی تھی۔

میں نے چور نظروں سے عینی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جاگ گئی تھی۔ اور کمبل میں سے ایک آنکھ نکالے' میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی یہ ادا خوبصورت تھی۔ لحاف میں سے نکلی ہوئی اکلوتی آنکھ میں شوخی تھی۔ اس کے علاوہ رات والی رنگین مصروفیت کا خمار بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ شرمیلے سے انداز میں مسکرانے لگی۔

ناشتے پر سب جمع تھے۔ بڑا دلنواز ماحول تھا۔ رات کی پُرسکون نیند کے بعد ہر چہرہ کھلا کھلا اور تر و تازہ نظر آتا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دریائے کنہار کا ایک دھارا 'شور مچاتا ہوا دھارا تھا۔ پس منظر میں برف کے چمکیلے تاج والی فلک بوس چوٹیاں تھیں۔ اگر کوئی اس خوبصورت ماحول کا حصہ نظر نہیں آتا تھا تو وہ عینی کی بھابی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ صرف گہری سنجیدگی تھی بلکہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے اور جلتی کڑھتی بھی رہی ہے۔

ایک دو بار فرحین کی خشمگیں نظر مجھ پر پڑی اور میں نے فوراً نگاہ جھکا لی۔ کچھ یہی کیفیت عینی کی بھی تھی۔ وہ فرحین سے نظر نہیں ملا رہی تھی اور نہ براہِ راست بات کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بچوں کے علاوہ گھرانے کے نوجوان افراد پر بھی فرحین کا کافی رعب ہے اور وہ سب اس کی خفگی سے ڈرتے ہیں اور تو اور اخلاق بھی فرحین سے محتاط لہجے میں ہی بات کرتا تھا۔

ہمیں کاغان سے روانہ ہونے کی کوئی جلدی نہیں تھی' لہٰذا گرما گرم ناشتے کے فوراً بعد سب لوگ دریا کی طرف نکل گئے۔ دریا کا پاٹ یہاں خاصا وسیع تھا۔ دیوہیکل چٹانیں پانی کا راستہ روکے کھڑی تھیں اور پانی ان چٹانوں سے لڑتا جھگڑتا چیختا چلاتا اپنے راستے پر گامزن تھا۔ لب دریا پہنچ کر سب کے سب مستی میں آ گئے' اور تو اور چھوٹی تائی اور چھوٹے تایا جان بھی شلواریں چڑھا کر پانی میں اتر گئے اور اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ اخلاق اور نرگس دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اخلاق کی زیادہ تر توجہ اپنی ہونے والی بیوی نرگس کی طرف تھی۔

عینی چیخ کر بولی "اخلاق بھائی! آپ کو باجی نرگس کے علاوہ کچھ اور بھی دکھائی دیتا ہے۔"

وہ آہستہ سے بولا "ہاں' اس کا ہرا سوٹ بھی نظر آتا ہے۔"

تنویر بولا "ہاں... ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آئے گا۔"

عینی کھلکھلا کر ہنس دی اور اس نے نرگس پر پانی کے چھینٹے اڑائے۔ نرگس اسے مارنے کے لیے دوڑی۔ دونوں پانی میں دور تک بھاگتی گئیں۔ پھر عینی کا پاؤں پھسلا اور وہ سر پانی میں گر کر شرابور ہو گئی۔ اخلاق نے کھٹا کھٹ اس کی دو تصویریں اتار لیں۔ وہ اٹھ کر بڑی ادا سے اپنے کرتے کا دامن نچوڑنے لگی۔ بھیگے ہوئے لباس نے اس کے ہیجان خیز نشیب و فراز کو نمایاں کر دیا تھا۔ اوپر سے وہ کھڑی بھی خاص انداز سے تھی۔ اس نے سب کی نظر بچا کر میری طرف دیکھا

ر مسکرادی۔ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ اس کا پاؤں
وں نہیں پھسلا اور وہ جان بوجھ کر گری تھی۔ اس کی بانکی
یعت کا کچھ کچھ اندازہ مجھے ہونے لگا تھا۔

فرحین برا سا منہ بنا کر آگے بڑھی اور ایک موٹی شال
ی کے کندھوں پر ڈال دی۔ پھر اسے ڈانٹ کر بولی "چلو باہر
واب۔۔۔ بالکل بچی بن جاتی ہو۔"

عینی ٹھنکی "نہیں آپی' تھوڑی دیر اور۔۔۔"

اس نے شال وہیں ایک پتھر پر رکھ دی اور پانی میں مزید
گے چلی گئی۔ فرحین کنارے پر کھڑی اپنے آپ میں کھولتی
ہی۔ عینی کو شال تھمانے کے چکر میں وہ میرے قریب آن
کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے آہستگی سے کہا "فرحین صاحبہ!
ں میں عینی کا قصور نہیں۔ آپ دیکھیں' سب لوگ ہی
ٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ یہ جو اچھلتا ناچتا پانی ہے ناں' یہ
رے کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اس کے سامنے کسی
بس نہیں چلتا۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی "بس کیوں نہیں چلتا۔۔۔ یہ دیکھو' یہ
نر پڑے ہیں' یہ تو ٹھکیلیاں نہیں کر رہے' ان میں وزن
ہے۔"

میں نے کہا "پتھر تو پتھر ہوتا ہے فرحین صاحبہ۔ باقی
یدیلی تو ان پتھروں میں بھی آتی ہے' جلدی نہ آئے' دیر سے
تی ہے اور اچھی نہ آئے تو بُری آجاتی ہے۔ پانی اندر ہی
ندر انہیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے' سوراخ کر دیتا ہے ان میں۔"

وہ خشک لہجے میں بولی "اور جو پانی میں بہہ جاتے ہیں ان
کا حشر کہیں زیادہ خراب ہوتا ہے۔ ریت کے ذروں کی طرح
حقیر ہو جاتے ہیں وہ۔۔۔ بہاؤ میں بہنا بہادری نہیں ہوتا' اس کا
راستہ روکنا بہادری ہوتا ہے۔"

"کیا آپ لوگ سیدھی سیدھی گفتگو نہیں کر سکتے۔ ایسی
کالمہ بازی تو ڈراموں میں سنا کرتے ہیں" یہ میرے چچا زاد
ندیم کی آواز تھی جو نہ جانے کب خاموشی سے ہمارے پیچھے
آن کھڑا ہوا تھا۔

ندیم قبول صورت نوجوان تھا۔ بچپن سے اس کی آواز
ہت اچھی تھی' سیکڑوں ہندوستانی اور پاکستانی فلمی گانے اسے
ازبر تھے اور وہ موقع محل کے لحاظ سے ان گانوں کے مکھڑے
اپنی گفتگو میں بھی استعمال کرتا رہتا تھا۔ اس موقع پر بھی اس کی
رگ موسیقی پھڑکے بغیر نہ رہ سکی' بولا "آپ کیا آپس میں
باتیں کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ بشیر احمد نے کیا خوبصورت گانا
گایا تھا فلم درشن میں۔ یہ موسم' یہ مست نظارے' پیار کرو تو
ان سے کرو' کرتے ہیں یہ تم کو اشارے پیار کرو تو ان سے

****

بلی کو جانے دو

ایک دولت مند مگر قدامت پرست خاتون نے بیماریاں لگ جانے اور عادات بگڑ جانے کے خوف سے پانچ سال تک اپنی بلی کو بھی کبھی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ خود بھی غیر شادی شدہ تھیں اور کہیں آتی جاتی نہیں تھیں۔ آخر کار وہ ایک طویل بحری سفر پر روانہ ہوئیں۔ جاتے جاتے بھی ملازم کو تاکید کر گئیں "بلی کو گھر سے بالکل نہ نکلنے دینا۔"

ایک ماہ بعد ملازم کو مالکن کا تار موصول ہوا "بہت اچھا وقت گزر رہا ہے۔ نت نئے لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے... اور وہاں.... بلی کو باہر جانے دیا کرو۔"

****

کرو۔"

فرحین نے گھور کر ندیم کو دیکھا تو وہ جو باقاعدہ ترنم سے سنانے کا ارادہ کر رہا تھا' ایک دم چپ ہو گیا۔

دن گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم کاغان سے ناران کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ ہمارے سفر کا کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ سڑک ناپید تھی۔ ایک تنگ سا پتھریلا راستہ تھا۔ سامنے سے کوئی گاڑی آتی تھی تو بالکل کنارے پر لگ کر راستہ دینا پڑتا تھا۔ اور کنارے پر لگنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے فولاد کا دل گردہ درکار تھا۔ کنارے سے سیکڑوں فٹ نیچے دھاڑتا پھنکارتا ہوا دریائے کنہار تھا۔ وہ کسی عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا اور اس کے تیور گواہی دیتے تھے کہ وہ اپنے جبڑے میں آنے والے کسی ذی روح کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

اس راستے پر ہمیں صرف جیپیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی کار یا دیگر قسم کی سواری نظر آتی تھی تو اخلاق کی ڈھارس بندھتی تھی کہ اس راہِ پُر خطر پر "کار سواری" کا رسک لینے والے ہم پہلے مہم جو نہیں ہیں۔ جونہی کوئی کار نظر آتی تھی اخلاق کا خون سیروں بڑھ جاتا تھا۔ وہ انگلی اٹھا کر پکار اٹھتا تھا' وہ دیکھو' وہ ایک اور کار آ رہی ہے۔ اگر وہ کار ناران کی طرف سے آتی تھی تو اخلاق کا سوال مزید بلند ہو جاتا تھا۔ "دیکھو بھائیو اور بہنو! اگر یہ کار بقائمی ہوش و

حواس اپنے ٹائروں پر چل کر ناران سے واپس کاغان آسکتی ہے تو ہماری کاروں کو کون سے پوشیدہ امراض لاحق ہیں کہ وہ ناران نہیں جاسکتیں۔"

اخلاق کی حد سے بڑھتی ہوئی خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے میں نے کہا "بھائی! کاریں واپس آتو رہی ہیں لیکن ان سے یہ بھی تو پوچھو کہ ناران سے آرہی ہیں یا راستے ہی سے لوٹ رہی ہیں اور اگر ناران سے ہی آرہی ہیں تو ٹھنڈے پیٹوں آرہی ہیں یا آہیں بھرتی ہوئی آرہی ہیں۔"

"یار! تم بڑے قنوطی واقع ہوئے ہو۔ ہر معاملے کا تاریک پہلو ہی دیکھتے ہو" اخلاق نے کہا۔

"جسے تم تاریک پہلو کہہ رہے ہو یہ میری "باخبری" ہے۔ جس راستے پر ہم جارہے ہیں اس پر ایک دو بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو ان مقامات کو گلیشیر کہتے ہیں۔ یہ گلیشیرز جیپوں کے سوا کسی قسم کی گاڑیوں سے دوستانہ تعلقات نہیں رکھتے۔ گاڑی کے پہیے پر نیچے سے ایسی ضرب لگاتے ہیں کہ بس ناکارہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔"

"برف کی ضرب گاڑی کا کیا بگاڑ لے گی" سلجوق نے کہا۔

"ضرب برف کی نہیں ہوتی' ان چھوٹے بڑے پتھروں کی ہوتی ہے جو برف میں چھپے رہتے ہیں۔ چوٹیں چونکہ اونچی ہوتی ہیں لہٰذا ان پتھروں سے بچی رہتی ہیں۔"

اپنی بات ثابت کرنے کے لیے مجھے جلد ہی ایک موقع مل گیا۔ سامنے سے ایک ہنڈا سوک کار آتی دکھائی دی۔ راستہ ایسا تھا کہ گاڑیوں کی رفتار دس میل فی گھنٹا سے ہرگز نہیں بڑھتی تھی' لہٰذا جب میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ہنڈا کار رک گئی۔ درمیانی عمر کے ایک نہایت تنومند صاحب ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھے۔ نہایت گھنی مونچھوں کے نیچے ان کے بھدے ہونٹ افق تا افق پھیلے ہوئے تھے۔ پہلو میں ایک نہایت خوبصورت دبلی پتلی سی لڑکی فروکش تھی۔ لڑکی کے سنگھار اور لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نوبیاہتا ہے۔ عقبی نشست پر ایک ملازمہ صورت عورت موجود تھی۔ میں نے گھنی مونچھوں والے صاحب سے پوچھا۔

"کیوں جناب' راستہ کیسا ہے؟"

"راستہ تو جیسا ہے' آپ کے سامنے ہے لیکن گلیشیر بہت تنگ کرتے ہیں۔" پاٹ دار آواز میں جواب ملا۔

"کتنے گلیشیر ہیں ناران تک؟"

"تین ہیں۔ درمیان والا زیادہ لمبا ہے اور زیادہ خطرناک بھی ہے۔ میری گاڑی کو نیچے سے کافی رگڑے لگے ہیں۔ شاید کچھ ٹوٹ بھی گیا ہے' مسلسل آواز آرہی ہے۔ اب بالاکوٹ جاکر ہی دکھاؤں گا۔"

اخلاق اور تنویر وغیرہ کے منہ لٹک گئے۔ گھنی مونچھوں والے نے ہمیں گلیشیرز پر سے گاڑی گزارنے کے سلسلے میں کچھ مفید "ٹپس" دیں اور آگے بڑھ گیا۔ اس کی گاڑی کے نچلے حصے میں سے واقعی کھٹ پٹ کی آواز آرہی تھی' سائلنسر بھی کچھ پھٹا پھٹا سا تھا۔

میں نے کہا "گاڑی کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو TIPS ہمیں دی گئی ہیں' ان پر ہمیں ہرگز عمل نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ ہماری گاڑیوں کا مستقبل تاریک تر ہوسکتا ہے۔"

اخلاق بولا "بھئی' ممکن ہے کہ یہ وہ ٹپس ہوں جن پر یہ صاحب بوجوہ عمل نہ کرسکے ہوں اور اب اپنے تجربے کا فائدہ ہمیں پہنچانا چاہتے ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہم ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دیکھیں۔"

"لیکن ہر چیز کا صرف روشن پہلو بھی تو نہیں دیکھا جاسکتا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ پہلو میں مگرمچھ بستا دریا سے کنارہو" عقب سے تنویر نے کہا۔

"ہاں... تاریک اور روشن پہلو تو ساتھ ساتھ ہوتا ہے" ندیم نے کہا "ابھی ہم نے اس کی جیتی جاگتی مثال بھی دیکھی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اخلاق نے پوچھا۔

"بھئی ہنڈا کار میں تم نے دیکھا نہیں تھا' تاریک پہلو کے پہلو میں روشن پہلو بھی تھا۔ ہائے کیا چیز تھی ظالم۔ مگر کس ظالم جن کے قبضے میں تھی۔ اگر میرے بدترین اندیشے درست ہیں تو وہ اس موٹے کی بیوی ہی تھی۔"

تنویر نے تائید کی "لنگور در پہلوئے حور تو سنا تھا لیکن ریچھ در پہلوئے حور کبھی نہیں سنا تھا۔"

ندیم نے کہا "یار! تمہیں محاوروں کی پڑی ہے' میرا دل اکلا جارہا ہے۔ کتنا ظلم ہوا ہے اس قسمت ماری کے ساتھ۔ پتا نہیں کیا مجبوریاں ہوں گی جن کا نتیجہ اتنے موٹے اور بھدے شوہر کی صورت میں نکلا ہے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور اتنا بیکراں شوہر۔ کیسے اندھے والدین تھے جنہوں نے لڑکی کو پال پوس کر رودار کے نیچے دھکا دے دیا۔"

ندیم کے چہرے پر بے پناہ اداسی نظر آرہی تھی اور لگتا تھا کہ نامعلوم لڑکی کی بدنصیبی دیکھ کر وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوگیا ہے۔ وہ مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور تاسف کا اظہار کررہا تھا۔

ایک ذرا کشادہ موڑ پر ہم نے گاڑیاں روکیں۔ یہاں دریائے کنہار کے اوپر ایک شاندار پل موجود تھا۔ ہوا میں معلق ایسے کئی پل ہمیں دریا پر نظر آچکے تھے اور آئندہ بھی آنے والے تھے لیکن اس پل کا محل وقوع ایسا شاندار تھا کہ ہم رکے بغیر نہیں رہ سکے۔ گروپ کے ہر شخص نے سب سے پہلے میرا حال احوال پوچھا۔ سب فکر مند تھے کہ دشوار سفر کی وجہ سے میری طبیعت کہیں پھر نہ بگڑ جائے۔ ظاہر ہے میرے ہم سفروں کی فکر مندی کا میری ذات سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ یہ لوگ میرا حال نہیں پوچھ رہے تھے' اپنے تفریحی پروگرام کی خیر خیریت دریافت کررہے تھے۔ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ میرے گردے میں اٹھنے والی پہلی ٹیس کے ساتھ ہی ان کے تفریحی پروگرام کا مستقبل ڈانواں ڈول ہوجائے گا۔ میری خیریت پوچھنے کے ساتھ ساتھ وہ چوری چھپے اخلاق کو بھی کڑی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ حقیقت بھی جانتے تھے کہ یہ سارا کیا دھرا اخلاق کا ہے۔ اگر وہ سارے ایک دو ٹکے کے رشتے دار کو اتنی اہمیت دینے پر مجبور ہوئے تھے تو صرف اخلاق کی وجہ سے ہوئے تھے۔ صرف عینی تھی جس کی مزاج پرسی کا انداز ذرا مختلف تھا۔ اس کی نگاہوں میں لگاوٹ اور لہجے میں شیرینی اتنی زیادہ تھی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کل رات والے "واقعے" کے حوالے سے دیوار پر اشتہار لگانے کی کوشش کررہی ہے۔

ہم سب پل پر چڑھ گئے تو وہ باقاعدہ کپکپانے لگا۔ پل پر کھڑے ہوکر دریائے کنہار کے پانی پر نظر جمائے رکھیں تو ایک دم یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دریا ساکت اور پل متحرک ہوگیا ہے۔ سب نے اس "بصری دھوکے" کا تجربہ کیا۔ یوں لگا جیسے ہم پل پر سوار ہوکر ناران کی طرف اڑے جارہے ہیں' ندیم تو باقاعدہ چلانے لگا تھا "بھائیو! ہم تو ناران پہنچ جائیں گے۔ ہماری گاڑیاں کون لائے گا۔"

پل پر کافی تصویریں بھی بنائی گئیں۔ عینی نے نرگس اور اخلاق کو کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے کے قریب کھڑا کیا۔ پھر ان سے کہا کہ وہ چہرے پر SMILE لائیں' جب وہ مسکراہٹ لے آئے تو وہ بولی "بڑا اچھا پوز ہے' اگر میرے کیمرے میں ایک بھی تصویر بچی ہوتی تو میں آپ کی تصویر ضرور کھینچتی۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ نرگس تیزی سے عینی کے پیچھے دوڑی۔ عینی قلانچیں بھرتی ہوئی گاڑی میں گھس گئی اور دروازے اندر سے لاک کرلیے۔

اس طرح ہنستے کھیلتے سفر جاری رہا۔ راستے میں ایک جگہ بورڈ لگا ہوا تھا۔ "ناران دس کلومیٹر" میرا دل چاہا کہ واپس جاؤں اور اس بورڈ پر لکھ آؤں کہ جنت کا ایک ٹکڑا زمین پر اتر آیا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ ایک خواب ناک راستہ ہے جسے دنیا کے دلکش ترین مناظر نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ فلک بوس سرسبز پہاڑ' ہزاروں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبی دھارے' مستی میں جھومتا گاتا ہوا دریائے کنہار اور وہ پُرشکوہ چٹانیں جو عجیب و غریب زاویوں سے استادہ ہیں اور سیکڑوں ہزاروں برس سے اسی انداز میں اس خوبصورت ماحول کا حصہ ہیں۔

جلدی ہی ہمارا پالا پہلے گلیشیر سے پڑ گیا۔ پہاڑ کی ڈھلوان سے پھسل کر گلیشیر سڑک پر آگیا تھا۔ کیونکہ گلیشیر تھوڑا تھوڑا کھسکتا رہتا ہے لہٰذا ہر دوسرے تیسرے روز مشینوں سے اسے کاٹا جاتا ہے تاکہ ٹریفک کے لیے راستہ صاف رہے۔ ہمارے گروپ میں سے بہت سے افراد نے گلیشیئر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اسے چھونا چاہتے تھے۔ اس پر پیدل چلنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ہر نئی چیز کے لیے انسان کا تجسس اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ دیکھا دیکھی سب گاڑیوں سے اتر گئے۔ صرف چھوٹے تایا اور چھوٹی تائی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ فربہ اندام ہونے کے سبب وہ دونوں کچھ سست الوجود تھے۔ اخلاق نے کہا "آنٹی' آپ نہیں اتریں گی؟"

"بھئی کیا کرنا ہے اتر کے۔ برف ہی تو ہے۔ دور سے بھی نظر آرہی ہے۔"

ندیم نے کہا "ہم تو یونہی احتیاطاً کہہ رہے تھے۔"

"احتیاطاً' کیا مطلب؟" چھوٹے تایا کے کان کھڑے ہوئے۔

"دراصل برف پر پہیے گھومتے ہیں اور کبھی کبھی گاڑی سلپ بھی کرجاتی ہے" ندیم نے عام سے انداز میں کہا۔

چھوٹی تائی کے چہرے پر چند لمحے کے لیے تذبذب کے آثار نظر آئے۔ پھر وہ اپنے گیند جیسے جسم کو لڑھکا کر گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ تایا نے بھی ان کی تقلید کی۔ بہرحال ہونی ہو کر رہتی ہے۔ یہ فربہ انداز جوڑا گاڑی میں بیٹھا رہتا تو یقیناً محفوظ رہتا پاپیادہ گلیشیر پار کرتے ہوئے یہ جوڑا دو بار لڑھکا اور دونوں بار انہیں بمشکل اٹھایا گیا۔ گلیشیر کی سطح سخت ناہموار تھی۔ گاڑیاں بے طرح اچھلتی ہوئی دوسرے کنارے پر پہنچیں۔

اس سے اگلا گلیشیر واقعی زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ سطح سخت ناہموار تھی۔ ایک دو جگہوں پر گہری کھائیاں بنی ہوئی تھیں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں سے گاڑی زخمی ہوئے بغیر گزر جائے گی۔ اس گلیشیر پر کچھ گاڑیاں پھنسی ہوئی نظر

آئیں۔ ان میں ایک کار تھی اور ٹویوٹا کے تین لوڈر تھے۔ کسی قریبی آبادی کے نوجوان لڑکے اور بچے وغیرہ ان گلیشیر زدگان کو مشکل سے نکالنے میں مدد دے رہے تھے۔ گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے درخت کی چھال بچھائی جاتی تھی' دھکا لگایا جاتا تھا۔ ڈرائیور کو قیمتی مشورے دیے جاتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شور مچایا جاتا تھا کہ گاڑیوں کے مالکان کو پتا چلتا رہے کہ ان کو برف سے نکالنے کے لیے کیسا "تابڑتوڑ تعاون" کیا جارہا ہے۔

اس گلیشیر سے گزرنے کے بعد سب نے سکھ کا سانس لیا۔ گاڑیوں کے کیسٹ پلیئرز جو مسافروں کے سہم جانے کی وجہ سے بند ہوگئے تھے پھر سے آن ہوگئے۔ ہماری گاڑی میں بھی احمد رشدی کی جادو بھری آواز گونجنے لگی "ہاں' اسی موڑ پر اس جگہ بیٹھ کر تم نے وعدہ کیا تھا' ساتھ دوگے زندگی بھر' چھوڑ کر تم نہ جاؤگے۔"

ہر خوبصورت موڑ پر یقیناً کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی نے بیٹھ کر کوئی نہ کوئی حسین وعدہ ضرور کیا ہوتا ہے۔ ہر چٹان' ہر چشمہ' ہر خوبصورت منظر کسی نہ کسی محبت کا گواہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ محبت کرنے والے ماضی کا حصہ ہوتے ہیں' وہ ہمیں نظر نہیں آتے' نہ ان کے وعدے سنائی دیتے ہیں' نہ ان کی آوازیں' لیکن وہ ان خوبصورت مناظر میں موجود رہتے ہیں۔ ان کی گم گشتہ محبتوں کا درد ان مناظر کو گداز بخشتا رہتا ہے' ان کی مکمل و نامکمل کہانیاں تو آس پاس کی رومانیت میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔

میں اپنے حسین پاکستان کو دیکھ رہا تھا اور اس کے حسن میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔ اپنے گردوپیش کا کچھ ہوش نہیں رہا تھا مجھے۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کب تیسرا گلیشیر آگیا ہے اور کب ہماری گاڑی سمیت تمام گاڑیاں رک گئی ہیں۔ مارگلہ ہماری کار کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس میں سلجوق کے علاوہ دیگر خواتین موجود تھیں۔ ان خواتین میں عینی کی خاموش طبع بھابی فرحین بھی موجود تھیں۔ میں نے چونک کر محسوس کیا' وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے گڑبڑا کر منہ پھیرلیا۔ چند سیکنڈ کے توقف سے میں نے دوبارہ ان کی طرف دیکھا۔ ان کی ٹکٹکی میری ہی طرف لگی ہوئی تھی۔ ان کی نگاہ میں تپش تھی اور کسی حد تک غصے کا اظہار تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھیں اگر خاندان والے تم سے دور دور رہتے ہیں تو شاید ٹھیک ہی کرتے ہیں۔ تم ہو ہی اس لائق کہ تم سے فاصلہ رکھا جائے۔

ان لمحات میں' میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ اس بے نام تعلق سے آگاہ ہوگئی ہیں جو پچھلے پانچ چھ روز میں میرے اور عینی کے درمیان پیدا ہوا ہے۔۔۔ یہ تیسرا گلیشیر جس کا میں ذکر کررہا ہوں' ناران کے بالکل قریب واقع ہے۔ بلندی سے ناران کی خوبصورت وادی اور آبادی صاف دکھائی دیتی ہے۔ دریائے کنہار یہاں خاصا شریف النفس نظر آتا ہے' بقول ندیم' ناران میں دریائے کنہار کو دیکھ کر کسی ایسے فاسٹ باؤلر کا تصور ذہن میں آتا ہے جو اپنے طوفانی رن اَپ کے لیے اسٹارٹ لے رہا ہو۔

ہم درمیانی گلیشیر سے گزر چکے تھے لہٰذا اس گلیشیر کو عبور کرنا آسان ثابت ہوا۔ اس آخری رکاوٹ کو پار کرنے کے بعد ہماری منزل ہمارے سامنے تھی۔ ناران اب کافی پھیل چکا ہے۔ چند سال پیشتر تک یہاں قیام وطعام کی ان سہولتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جو اب یہاں موجود ہیں۔ بہت سے اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ اور ہوٹل بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔ کثیرالمنزلہ عمارتیں عام نظر آنے لگی ہیں۔ مین بازار کافی طول کھینچ چکا ہے اور یہاں ضرورتِ زندگی کی قریباً ہر شے نظر آجاتی ہے۔ ہم پنڈی سے ڈھیروں انڈے لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ وہاں بہت مہنگے ہوں گے لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور معاملہ صرف انڈوں کا ہی نہیں تھا کئی اشیائے خورونوش کے حوالے سے ناران نے ہمیں مایوس کیا۔ خاص طور سے سلجوق کو اس حوالے سے پریشانی ہوئی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ناران میں ہر اس شے کے نرخ ساتویں آسمان سے چھورہے ہوں جو وہ پنڈی سے اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ اب اس کی دلی کیفیت اس فلم بین جیسی تھی جس نے سخت بھاگ دوڑ کرکے فلم کی ایڈوانس بکنگ کروائی ہو اور جب وہ مقررہ دن فلم دیکھنے جائے تو ٹکٹ باافراط و بہ آسانی مل رہے ہوں۔

ناران پہنچ کر ہم نے گاڑیاں ایک جگہ روک دیں۔ میں' اخلاق اور سلجوق ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ یہ کافی کٹھن کام تھا جس میں ہم نے قریباً دو گھنٹے صرف کیے۔ آخر ایک اچھے ہوٹل میں چار کمرے ہمیں دستیاب ہوگئے۔ کرایہ تھوڑا سا زیادہ تھا لیکن جگہ ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ پارکنگ کے لیے بڑی کشادہ جگہ تھی۔ بازار بالکل قریب تھا۔ گرم پانی کی سہولت چوبیس گھنٹے موجود تھی۔ اس ہوٹل تک پہنچنے سے پہلے ہم نے جو ہوٹل دیکھا تھا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ شاید وہی ہوٹل دیکھنے کے بعد ہمارے دل ودماغ کی یہ حالت ہوئی تھی کہ ہمیں یہ ہوٹل دنیا کا خوبصورت ترین ہوٹل لگ رہا تھا۔ وہ ہوٹل مین بازار سے تھوڑا سا ہٹ کر تھا۔ دنیا بھر کے

بڑے ہوٹلوں کی خصوصیات ناران کے اس ایک ہوٹل میں جمع ہوگئی تھیں۔ تنگ و تاریک کمرے' ٹوٹے ہوئے فرش' بدبودار غسل خانے' سیلن زدہ دیواریں۔ اخلاق کا خیال تھا کہ یہ ہوٹل' ناران کے "ہوٹل اونرز" نے جان بوجھ کر تعمیر کروایا ہے۔ ان کی خواہش ہوگی کہ اس ہوٹل کو دیکھنے کے بعد سیاحوں کو ناران کا ہر ہوٹل جنت نظیر لگنے لگے۔

جب ہم چابیاں وغیرہ لے کر واپس آئے اور گروپ سمیت ہوٹل کی طرف چلے تو اخلاق کی رگ شرارت پھڑکی۔ اس نے مجھے اور سکھوتی کو چپکے سے بتایا کہ گروپ کو سرپرائز دینا ہے' پہلے اسی ہوٹل پر چلنا ہے جو ناران کے "ہوٹل اونرز" نے سازش کے تحت بنا رکھا ہے۔

اخلاق کی گاڑی ہوٹل کے سامنے رکی تو باقی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ "کہاں ہے ہوٹل؟ کدھر ہے ہوٹل؟" کئی آوازیں ابھریں۔

اخلاق نے بڑے اطمینان سے تنگ و تاریک زینوں کی طرف اشارہ کیا۔ سب کے ماتھے ٹھنکے۔ بہرطور اخلاق کے پیچھے پیچھے چلتے سب اوپر پہنچے۔ بدبو سے سب کے دماغ پھٹنے لگے۔ ہوٹل کی اندرونی حالت دیکھ کر خواتین کی چیخیں نکل گئیں اور تو اور گروپ کے سب سے کفایت شعار بلکہ کنجوس رکن بڑے تایا بھی جز بز نظر آنے لگے.... کافی ہنگامہ ہوا۔ بہرحال جب تھوڑی دیر بعد ہم گروپ کو لے کر اصل ہوٹل پہنچے تو بڑے تایا کے سوا سب کی باچھیں کھل گئیں۔

ہوٹل میں اپنا کھانا پکانے کی اجازت نہیں تھی۔ بہرطور ہم نے ہوٹل منیجر سے خصوصی اجازت طلب کی۔ اس موقع پر ندیم کی چرب زبانی کام آئی اور ہم یہ اجازت لینے میں کامیاب ہوگئے۔ ہمارے کمرے گراؤنڈ فلور پر واقع تھے۔ کمروں کے سامنے بڑا شاندار برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ایک گوشے میں خواتین نے اپنا باورچی خانہ قائم کرلیا۔

ناران میں بجلی نہیں ہے۔ سرِشام ہی ہر شخص اپنی بجلی خود پیدا کرنے لگتا ہے۔ یعنی آپ اپنا جہاں پیدا کرلیں۔ یعنی آپ اپنا جہاں پیدا کرلیں۔ سورج غروب ہوتے ہی جنریٹرز آن ہوگئے۔ بازار' ہوٹل' گھر' ہر طرف قمقموں سے جگمگا اٹھے۔ ہمارے ہوٹل میں بجلی کی سہولت شام سے رات بارہ بجے تک مہیا تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک دیوہیکل جنریٹر ہوٹل کے عقب میں موجود تھا۔ جنریٹر چلنے سے ناران کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے۔ دھوئیں سے فضا بھی کچھ کثیف ہوجاتی ہے۔ لیکن ناران اپنے چاہنے والوں کو حسن و دلربائی کے جو نذرانے بخشتا ہے ان کے مقابلے میں یہ شور اور کثافت کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

سفر کی وجہ سے خواتین تھکی ماندی تھیں لہٰذا رات کا کھانا ہم نے ہوٹل سے ہی کھایا جو خاصا مہنگا ثابت ہوا۔ ایک مرغ کڑاہی قریباً ساڑھے تین سو روپے میں پڑی۔ رات کو دس گیارہ بجے تک گپ شپ کرنے کے بعد سب لوگ سوگئے.... نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں آخری مرتبہ قریباً تین چار سال پہلے ناران آیا تھا۔ اس ناران اور آج کے ہنگامے کے ناران میں بہت فرق نظر آرہا تھا۔ رات ٹھیک بارہ بجے ہوٹل کا دیوہیکل جنریٹر بند ہوگیا۔ گھپ تاریکی چھاگئی۔ ہوٹل سے باہر پہلے ہی تاریکی کا راج تھا۔ پوری آبادی میں شاید اب ایک جنریٹر بھی نہیں چل رہا تھا۔ اندھیرے کا ایک اپنا ہی فسوں ہوتا ہے۔ کچھ نظر نہ آتے ہوئے بھی کبھی کبھی سب کچھ نظر آتا ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے کمرے سے باہر آگیا۔ شلوار قمیص کے علاوہ میرے جسم پر صرف ایک سوئٹر تھا۔ باہر ہوا بہت خنک تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ایک ہی نگاہ میں' میں نے لاکھوں کروڑوں ستارے دیکھے۔ یہ اجرام فلکی جیسے روشن تر ہوکر زمین پر اتر آئے تھے۔ لگتا تھا کہ میں ہوٹل کی چھت پر کھڑے ہوکر انہیں چھو سکتا ہوں۔ یہ ایک یادگار منظر تھا۔ میں نے سوچا لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی تو یہی آسمان ہوتا ہے مگر ستاروں کے یہ جھرمٹ اور کہکشاؤں کی یہ دنیا کہاں ہوتی ہے۔ وہیں برآمدے میں کھڑے کھڑے میں نے مشرق کی طرف بلند و بالا پہاڑوں کے ہیولے دیکھے اور یہ سوچ کر روئنگٹے کھڑے ہوگئے کہ ان پہاڑوں میں قریباً بارہ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر یخ بستہ پانی سے بھرا ہوا وہ عظیم الشان طلسمی پیالہ موجود ہے جسے جھیل سیف الملوک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے مشرقی گوشے میں چمکتی ہوئی ایک کہکشاں بلند و بالا جھیل کے پانیوں سے پھوٹ رہی ہے۔ یہ شاعرانہ تصور تھا لیکن اس وقت حقیقت کے بالکل قریب لگ رہا تھا۔

ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عینی میرے قریب کھڑی تھی۔ اس کے شانوں پر ایک موٹی گرم شال تھی۔ "آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ بولی۔

"اندھیرا دیکھ رہا ہوں.... اور تم؟"

"میں یہ دیکھنے چلی آئی تھی کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ اگر معلوم ہوتا کہ اندھیرا دیکھ رہے ہیں تو اندھیرا تو کمرے میں بھی بہت تھا... بلکہ اتنا زیادہ تھا کہ میں اٹھ کر چلی آئی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

وہ میرے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی۔ گہری تاریکی کے باوجود مجھے اس کے مدھم خدوخال نظر آنے لگے تھے "بخار تو نہیں ہوا؟" اس نے پوچھا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے کہا "مجھے تو نہیں ہوا لیکن لگتا ہے تمہیں ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں... اور اگر ہو بھی تو فکر کی بات نہیں' میں خود ڈاکٹر ہوں۔"

"لیکن ضروری تو نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر اپنا علاج خود کرلے۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے" وہ ہولے سے مسکرائی "اکثر مستند ڈاکٹروں کو بھی اپنے علاج کے لیے دوسرے ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔"

"بلکہ میں نے تو مستند ڈاکٹروں کو اپنے جیسے ایرے غیرے حکیموں اور نیم حکیموں سے بھی رجوع کرتے دیکھا ہے۔"

"لیکن میں ایسی نہیں ہوں" پھر ذرا توقف سے بولی "لیکن آپ نے خود کو ایرے غیرے حکیموں سے کیوں ملایا ہے؟ آپ میں کون سی بات ایری غیری ہے؟"

"بھئی میں تو الف سے لے کر ے تک ایرا غیرا ہوں۔ پتا نہیں تمہیں کیا نظر آگیا ہے مجھ میں... مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھے یہاں سے پٹوا کر نکلواؤ گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں... تمہارے والد محترم کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔ ایک مرتبہ بچپن میں' میں تمہارے بھائی صاحب سلجوق کا کرکٹ بیٹ توڑنے کی پاداش میں ان کے تھپڑ... کھا چکا ہوں۔"

"کیسی بات کررہے ہیں آپ!" وہ بولی "ہم آپس میں فرسٹ کزن ہیں اور میرے زیر علاج بھی ہیں آپ... میں آپ سے پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ آپ اس وقت اتنی سردی میں یہاں کیا کررہے ہیں؟ یہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہے۔"

"ایسی ویسی بات کی شروعات تو ہے" میں نے زیرلب کہا۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ تمہاری دلیل میں بے تحاشا وزن ہے' تمہیں تو ڈاکٹر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا۔"

اچانک خواتین والے کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا "جاؤ اب... کہیں وہ تمہاری نک چڑھی بھابی صاحبہ نہ جاگ گئی ہوں۔"

عینی بھی تفتیشی نظروں سے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں... میں نے کہا "سوچتی کیا ہو' جاتیں کیوں نہیں؟"

وہ بولی "خطرے کی کوئی بات نہیں کوہ پیما صاحب! آپ تو خوامخواہ ہی ہانپ گئے ہیں۔ کمرے میں ایک ہی موم بتی تھی' وہ میں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔"

اس نے چادر کے اندر سے موم بتی نکال کر مجھے دکھائی۔ انداز میں شوخی تھی۔ چند لمحے خاموش رہی' پھر میں نے کہا "ماچس تو کمرے کے اندر ہی ہوگی۔ اگر تمہاری بھابی صاحبہ نے وہ جلا کر دیکھ لی تو؟"

وہ سہلا کر بولی "ہاں اس مرتبہ آپ کی دلیل میں بھی بے تحاشا وزن ہے۔" دو چار سیکنڈ سوچتی رہی پھر دبے قدموں کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تاہم کچھ دیر تک دروازے کے سامنے سن گن لینے کے بعد وہ واپس آگئی۔

"کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے بھابی ہی تھیں' دوبارہ لیٹ گئی ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تمہاری بھابی کیا چیز ہیں عینی! ہر وقت لیے دیے رہتی ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ اس گروپ میں شامل ہی نہیں ہیں۔"

"ہاں' وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ ان کی زندگی میں تلخی بھی تو بہت ہے اور یہ ساری تلخی کامران بھائی کی وجہ سے ہے۔ کامران بھائی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی کینیڈا چلے گئے تھے۔ وہ ایک کورس کے سلسلے میں گئے تھے' ان کا ارادہ ایک سال میں واپس آجانے کا تھا۔ وہاں جاکر وہ کچھ ایسے مگن ہوئے کہ پاکستان کا راستہ ہی بھول گئے۔ شروع میں ان کے خط آتے تھے پھر خط آنا بھی بند ہوگئے۔ اس کے بعد پتا چلا کہ وہ کینیڈا سے امریکا چلے گئے ہیں۔ قریباً دو سال بعد وہ واپس کینیڈا آگئے۔ مگر اس مرتبہ وہ اکیلے نہیں تھے' ان کے ساتھ امریکن بیوی بھی تھی۔ ابو اور امی' انہیں کو سمجھانے کے لیے کینیڈا گئے۔ بڑی مشکلوں سے ان تک پہنچے۔ ابو قسم کھا کر گئے تھے کہ کامران کو پاکستان واپس لائیں گے اور اگر وہ نہ آیا تو اس سے قطع تعلق کرلیں گے۔ کامران بھائی نہیں آئے اور ابو ناراض ہوکر واپس آگئے۔ اس واقعے کو اب قریباً پانچ برس گزر چکے ہیں۔ کامران بھائی سے ہمارا رابطہ بالکل منقطع ہے۔ خبر نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کینیڈا میں ہیں یا امریکا میں۔ ان کا آخری خط ڈیڑھ دو سال پہلے آیا تھا۔"

"تمہاری بھابی تمہارے ساتھ ہی رہتی ہیں؟"

"ہاں' وہ بڑی صابر شاکر خاتون ہیں۔ شاید آپ کو یہ سن

کر حیرانی ہو کہ جب سے ان کی شادی ہوئی ہے۔ وہ بہت کم میکے گئی ہیں۔ حالانکہ میکا بھی لاہور میں ہی ہے۔ شادی کے بعد وہ چند بار دو تین دن کے لیے اپنی امی کے پاس گئی ہوں گی۔ اب وہ جاتی ہی نہیں۔ اگر جاتی ہیں تو شام سے پہلے گھر لوٹ آتی ہیں۔ ابو امی سے انہیں اتنا پیار ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ خاص طور سے ابو کا تو کوئی کام کسی کو نہیں کرنے دیتیں۔ ابو آج کل کامران بھائی کی طرف سے بہت مایوس رہتے ہیں۔ وہ دلی طور پر چاہتے ہیں کہ فرحین بھابی کامران بھائی سے طلاق لے لیں اور کہیں شادی کرلیں۔ انہیں یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ بھابی یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کاٹیں گی۔ کوئی بچہ ہوتا تو بھی انہیں سہارا ہوتا۔ ویسے بھابی ٹھیک ٹھاک پڑھی ہوئی بھی ہیں۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ انہوں نے باقاعدہ تھیسس لکھا ہوا ہے۔ اے آئی (آرٹیفیشل انٹیلی جنس) میں ان کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے۔"

واقعی چونکا دینے والی اطلاع تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے پوچھا۔

"کبھی طلاق کے بارے میں بات بھی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اپنے آخری خط میں ابو نے کامران بھائی کو لکھا تھا کہ وہ فرحین بھابی کو طلاق دے دیں۔ کیونکہ انہوں نے کینیڈا میں اپنی نئی زندگی شروع کرلی ہے اور مستقبل میں ان کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔۔۔ اپنے جوابی خط میں کامران بھائی نے طلاق دینے پر آمادگی ظاہر کردی تھی۔ لیکن جب بھابی فرحین کو اس خط و کتابت کا پتا چلا تو انہوں نے رو رو کر برا حال کرلیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہرگز طلاق نہیں لیں گی اور اگر اس سلسلے میں ان سے زبردستی کی گئی تو وہ کچھ کر گزریں گی۔"

"کیا انہیں اب بھی امید ہے کہ کامران پاکستان واپس آئے گا۔"

"معلوم نہیں۔۔۔ بہرحال وہ اب آہستہ آہستہ حالات کی عادی ہوگئی ہیں۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی محرومیوں سے سمجھوتا کرلیا ہے۔"

ہم کچھ دیر اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر ایک کمرے سے بڑے تایا جان کے کھانسنے کی مسلسل آواز آنے لگی۔ عینی بولی "اب کچھ بھی ہوجائے بھابی، ابو جان کو کھانسی کی دوا پلانے کے لیے ضرور اٹھیں گی، لہٰذا میں چلتی ہوں۔"

اس نے میرا ہاتھ پُرجوش انداز میں دبایا۔ حوصلہ افزا نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن اسی دوران میں کمرے سے گھٹ پٹ کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے میرے حوصلے کا کوئی ثبوت مانگے بغیر جلدی سے واپس چلی گئی۔

صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ کمرے میں سب خراٹے لے رہے تھے۔ یقیناً دوسرے کمروں میں بھی گروپ کے ارکان خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ میں عینی کی بھابی کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔ زرد پھولوں والی سفید قمیص اور سفید شلوار، قمیص پر زرد دھاریوں والی جرسی تھی۔ شانوں پر پڑی ہوئی کامدار شال نے خوبصورتی اور وقار میں اضافہ کردیا تھا۔ میں نے پہلی بار غور اور باریک بینی سے اس خاتون کو دیکھا۔ عمر چوبیس اور اٹھائیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ نقوش تیکھے اور چہرے پر خاص قسم کا حزن و ملال تھا لیکن یہ کیفیت شخصیت کی مجموعی دلکشی میں کمی کے بجائے اضافہ کرتی تھی۔ ان کا تعلق میرے ددھیالی رشتے داروں سے ہی تھا۔ وہ میرے دادا کے بھائی کی پوتی تھیں۔ اپنے والد کی طرح ان کا رنگ بھی غیر معمولی طور پر سرخ و سپید تھا۔ وہ بہت سے مقامی بچوں کے درمیان کھڑی تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں شاپر تھا، وہ شاپر میں سے سیب اور کیلے وغیرہ نکال کر بچوں میں تقسیم کررہی تھیں۔ بچے اس مہربانی پر بڑے خوش تھے اور جھپٹ جھپٹ کر اپنا حصہ وصول کررہے تھے۔ پھل ختم ہوگئے لیکن بچوں کے تقاضے ختم نہیں ہوئے۔ عینی کی بھابی اندر گئیں اور دو بڑی ڈبل روٹیاں اٹھا لائیں۔ ساتھ میں جام کی شیشی تھی۔ وہ جام لگا لگا کر ڈبل روٹی کے سلائس بچوں میں تقسیم کرنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈبل روٹی اور جام بھی ختم ہوگئے۔ اب کچھ اور بچے آگئے تھے اور فرحین کے گرد پھیلے ہوئے ہاتھوں کا حصار برقرار تھا۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر باہر نکل آیا۔

فرحین کے چہرے پر بے بسی نظر آرہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرادیں۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں بچوں کے حصار سے نکالا۔ بچے ان سے چمٹے جارہے تھے۔ میں نے زیادہ بے باک بچوں کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور وہ تتر بتر ہوگئے۔ فرحین ہانپ سی گئی تھیں۔ شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی۔ میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ آپ پہلی بار اس علاقے میں آئی ہیں۔"

"یہ بات آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟" فرحین نے پوچھا۔

"آپ کو مصیبت میں دیکھ کر کہنا پڑی یہ بات۔۔۔ یہاں غربت بہت ہے۔ آپ اس طرح دریادلی کا مظاہرہ کریں گی تو درجنوں بچے یہاں جمع ہوجائیں گے اور مستقل طور پر جمع رہیں گے۔ ہمارا کمروں سے باہر نکلنا دوبھر کردیں گے۔"

بچے دور کھڑے تھے اور ابھی تک للچائی ہوئی نظروں سے فرحین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحین کے چہرے پر تاسف ابھر آیا' بات تھی بھی تاسف کی۔ یہ علاقے جو قدرتی حسن سے مالا مال ہیں۔ معاشی طور پر بُری طرح بدحال ہیں اور لاچاری کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اب تو پھر بھی صورتِ حال قدرے بہتر ہوئی ہے چند برس پہلے حالات اور بھی ترس ناک تھے۔ مجھے ۹۰ء کا ایک واقعہ آج تک یاد ہے۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ناران آیا تھا۔ ہم ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے' میرے ایک دوست نے چکن پیس کھا کر ہڈی باہر پھینکی' ہڈی کے ساتھ تھوڑا بہت گوشت لگا رہ گیا ہوگا۔ جونہی ہڈی کمرے سے باہر گری' گھات میں بیٹھے ہوئے چند بچے اس پر جھپٹے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوگئے۔ میں یہ منظر دیکھ کر اپنی بنیادوں تک ہل گیا' یہ کسی فلم یا ڈرامے کا منظر نہیں تھا۔ ہماری آنکھوں کے عین سامنے اشرف المخلوقات گوشت کے چند ریشوں کے لیے جانوروں کی طرح آپس میں لڑ رہا تھا۔ وہ معصوم بچے ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور بالکل چوپایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔"

آج فرحین کے گرد ترسے ہوئے چہروں کا جمگھٹا دیکھ کر وہ دردناک منظر پھر سے میری نگاہوں میں تازہ ہوگیا تھا "ایسا کیوں ہے؟" فرحین بولی "کیا یہ پاکستان نہیں ہے۔ کیا یہ بچے ہمارے قومی جسم کا حصہ نہیں ہیں؟"

"بالکل ایسا ہے لیکن ہماری سل پسندی کی وجہ سے ان کی حالت سنورتی نہیں۔"

"ہماری سل پسندی؟" فرحین کے لہجے میں تعجب تھا۔

"ہاں' ہماری سل پسندی۔ ہم لوگ ان علاقوں میں آتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی حالت زار دیکھتے ہیں۔ ہمارے ضمیر میں کسک جاگتی ہے' مگر ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے ہم چند سکے ان لوگوں کی طرف اچھال دیتے ہیں اور مناظر کی دلکشیوں میں کھو جاتے ہیں۔ ہم کبھی ان کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچتے' ہم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا شمار اربابِ اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ کن فیکون کی طاقت رکھتے ہیں۔ اگر چاہیں تو مہینوں میں ان علاقوں کی حالت بدل سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی سل پسندی سے کام لیتے ہیں۔ اس علاقے کی پھیلی ہوئی جھولی میں سستی نوازشات کی خیرات ڈال کر "سبحان اللہ" کا ورد کرتے واپس چلے جاتے ہیں۔ کوئی یہاں سڑک نہیں پہنچاتا' بجلی نہیں پہنچاتا' دیگر شہری سہولتیں تو خیر دور کی بات ہے۔"

فرحین بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھیں' کہنے لگیں "آپ باتیں تو مدبروں جیسی کرتے ہیں لیکن۔"

"لیکن کیا۔؟"

ایکدم ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ وہی سنجیدگی جو انہیں ایک نہایت سنجیدہ اور باوقار روپ دیتی تھی اور جس کے سبب سب بڑے چھوٹے ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"تیمور صاحب' بڑے خلوص سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

"آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ بد سے بدنام برا ہوتا ہے۔ آپ کو خیر بدنام تو کسی طور نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ خاندان کے کچھ لوگوں کی رائے آپ کے بارے میں زیادہ اچھی نہیں ہے اور جب رائے پہلے سے اچھی نہ ہو تو چھوٹی سی بات کا بھی بتنگڑ بن جاتا ہے۔ آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"آپ کو یہ تنبیہہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"اس بات کو آپ رہنے دیں" وہ سرد لہجے میں بولیں اور میری سگریٹ کو ناگواری سے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

میں جان گیا تھا کہ فرحین صاحبہ کا اشارہ کس طرف ہے۔ کاغان میں گزرنے والی رات نے میرے اور یمنی کے حوالے سے ان کے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا۔

سارا دن دھوپ سینکتے اور اٹکھیلیاں کرتے ہوئے گزرا۔ سہ پہر کو گلیشیر پر جانے کا پروگرام بنا۔ یہ وہی تیسرا اور آخری گلیشیر تھا جسے عبور کرکے ہم وادیٔ ناران میں داخل ہوئے تھے۔ آبادی سے گلیشیر کا فاصلہ بمشکل ایک کلومیٹر ہوگا۔ سفر کے دوران میں ہماری گاڑیوں کا بھی سواستیاناس ہوچکا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ گاڑیوں کو دھلوالیا جائے۔ یہ کام بھی وہیں گلیشیر کے پاس ہو سکتا تھا۔ جس جگہ گلیشیر دریائے کنہار میں گرتا تھا وہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ دریا کے ساتھ چند چھوٹے بڑے دھارے بھی بن گئے تھے۔ ان دھاروں کے درمیان خشکی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے اور یہاں کیمپ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ یہ کیمپس سیاح حضرات اپنے ساتھ لے کر آئے ہوئے تھے۔ گنگناتے کھلکھلاتے دریا کے کنارے آرام دہ خیموں میں رات گزارنا ان سیاح حضرات کے لیے یقیناً ایک خوش گوار تجربہ ہوتا ہوگا۔ اس جگہ کرائے پر بھی خیمے دستیاب تھے۔ کئی

شوقین خواتین و حضرات نے کسی ہوٹل میں رہنے کے بجائے ان خیموں میں رہنے کو ترجیح دے رکھی تھی۔ یہاں دریا کے کنارے پر ایک چائے خانہ بھی موجود تھا۔ چائے نوش فرمانے کے لیے دریا کے عین کنارے پر لکڑی کے اسٹول اور میزیں رکھی تھیں۔ بڑا دلکش ماحول تھا۔

گاڑیاں دھونے کے لیے مقامی لڑکوں کے حوالے کردی گئیں۔ پورا گروپ مختلف ٹولیوں میں بٹ گیا اور یہ ٹولیاں اِدھر اُدھر گھومنے لگیں۔ گلیشیر پر پہنچنے اور وہاں اودھم مچانے کا ہر کسی کو شوق تھا۔ کھیتوں کے درمیان سے گزر کر کرتے پڑتے ہم گلیشیر پر پہنچے۔ برف سخت اور میلی تھی' اس پر چلا تو جاسکتا تھا لیکن اودھم نہیں مچایا جاسکتا تھا۔ پھر بھی حسبِ توفیق سب نے ایک دوسرے پر برف کے گولے وغیرہ پھینکے۔ ندیم نے فلم آگ کا وہ مشہور گانا گایا۔ موسم حسیں ہے لیکن تم سا حسیں نہیں ہے' میری نظر سے پوچھو تم سا کہیں نہیں ہے۔ اگر وہ صرف گانے تک محدود رہتا تو بھی ٹھیک تھا لیکن جب اس نے محمد علی کی طرح باقاعدہ برف پر لڑھکنے اور پھسلنے کی کوشش کی تو برف میں چھپے ہوئے پتھر نے اس کی پشت پر کاری ضرب لگائی اور وہ کافی دیر گم صم رہا۔

تنویر ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ وہ ندیم کو اشاروں سے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ندیم نے ایک ہاتھ کمر پر رکھا اور لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔

عینی مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "کچھ اندازہ لگایا آپ نے' وہ کدھر گئے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ تم بتاؤ۔۔۔ تمہارا کیا اندازہ ہے؟"

"اندازہ نہیں۔۔۔ مجھے ٹھیک ٹھیک پتا ہے کہ چٹان کے پیچھے کیا ہوگا۔ ادھر اس لفنگے تنویر نے برف کا مجسمہ بنا رکھا ہوگا۔ دونوں اس مجسمے پر غیر شریفانہ تبصرے کریں گے اور شیطانی ہنسی ہنسیں گے۔ ہمیں معلوم ہے' ان لڑکوں کے یہی کام ہوتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کسی عورت کا مجسمہ ہوگا؟"

"عورت کا نہیں لڑکی کا' ایک دم خطرناک مجسمہ!" وہ منہ پھیر کر شرم آمیز شوخی سے مسکرائی۔

اخلاق اپنے کام سے لگا ہوا تھا۔ وہ دھڑا دھڑ اپنی ہونے والی بیوی کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ اور جب خود نہیں کھینچتا تھا تو کسی دوسرے سے کھنچواتا تھا۔ گلیشیر پر واپسی کا سفر خطرناک تھا۔ ڈھلوان کی وجہ سے بار بار پاؤں پھسل جاتا تھا۔ عینی نے میرے ہاتھ کا بلکہ پورے بازو کا سہارا لے لیا۔ وہ میرے بازو پر لدی گئی تھی۔ اس کے بال ہوا سے منتشر ہو کر میرے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ بڑے تایا اور تائی جان تو ہوٹل میں ہی رہ گئے تھے لیکن عینی کا بھائی رضوان تو ساتھ تھا۔ مگر وہ رضوان کی کوئی خاص پروا نہیں کر رہی تھی۔ اگر اسے تھوڑی بہت پروا تھی تو صرف بھابی صاحبہ کی تھی اور بھابی کی یہ اہمیت صرف عینی تک ہی محدود نہیں تھی' پورے گروپ کے نوجوانان جو بھی شوخی شرارت کرتے تھے' بھابی کی نظر بچا کر کرتے تھے۔ اب جبکہ ہم گلیشیر سے اتر رہے تھے' تو بھی بھابی کا تذکرہ ہی ہو رہا تھا۔ بھابی نیچے دریا کے کنارے گاڑیوں کے پاس موجود تھیں لیکن ان کی نگراں نظروں کی تپش یہاں تک محسوس کی جارہی تھی۔ بھابی دیکھ رہی ہیں۔ بھابی ناراض ہوں گی' بھابی سے شکایت کرنا ہوگی۔ اس قسم کے فقرے بار بار کانوں میں پڑ رہے تھے۔ ایک دو بار تو نرگس نے عینی اور فوزیہ کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر "بھابی" کو باقاعدہ آوازیں بھی دے ڈالی تھیں۔

میں نے دور نیچے عینی کی "بھابی صاحبہ" پر نگاہ ڈالی۔ گاڑیوں کی "سروس" ہو رہی تھی اور وہ ان کے قریب کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ ان کے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ بار بار انہیں سمیٹ کر شال کے نیچے چھپاتی تھیں۔ غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں ان کی قمیص کے زرد پھول دمک رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ یہ پھول کسی کے لباس کا حصہ نہیں' بلکہ دریا کی لہروں نے اچھال کر کنارے پر پھینک دیے ہیں۔

میں نے کہا "عینی! مجھے لگتا ہے کہ فرحین صاحبہ ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہیں۔"

"لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔"

"تو پھر چھوڑو بازو!"

"یہ بھی تو مشکل ہے" اس نے ٹھوڑی میرے کندھے سے لگا دی۔

"ارے ٹھوڑی ہٹاؤ" میں نے کہا۔

"اتنی دور سے بھابی کو ٹھوڑی' ٹھوڑی نظر آئے گی۔"

"نظر نہ آنے سے ہی تو شکوک بڑھتے ہیں اور تمہیں تو پتا ہے میں پہلے ہی بہت مشکوک ہوں۔"

"کسی کی نظر میں آپ کچھ بھی ہوں۔ میری نظر میں وہی ہیں جو میں سمجھتی ہوں۔"

"اور تم کیا سمجھتی ہو؟"

"ایک سچا کھرا انسان۔ مہم جو' بلند حوصلہ' حسین فطرت کا عاشق' اوپر سے سخت اندر سے بہت نرم اور میٹھا۔ ایک ایسا شخص جس سے دوستی کی جاسکتی ہے۔"

"دوستی بہت وسیع لفظ ہے' اپنے اندر بہت کچھ چھپالیتا ہے۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے" عینی نے کہا "ایک مرتبہ میں نے عمرانیات کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی۔"

وہ مجھے کتاب کے بارے میں بتانے لگی۔ میں بظاہر عینی کی باتیں سن رہا تھا لیکن میری تمام تر توجہ دور نیچے ان زرد پھولوں کی طرف تھی جو دریا کی لہروں نے اچھال کر چمکیلی ریت پر پھینک دیے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان ایک پھول نیم گلابی بھی تھا' یہ شاید کسی کا چہرہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فرحین صاحبہ ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہیں۔ نہ جانے اچانک میرے دل میں کیا آئی کہ برفیلی ڈھلوان پر اترتے اترتے میں جان بوجھ کر پھسلا' عینی بھی میرے ساتھ ہی پھسل گئی۔ ہم ایک دوسرے کے اوپر گرے اور اسکیٹنگ کے انداز میں بیس پچیس فٹ نیچے چلے گئے۔ عینی کے ہونٹوں سے ایک سریلی چیخ نکلی تھی اور وہ میرے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

جونہی ہم رکے' میں نے عینی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ پھسل کر اس نے انجوائے کیا تھا۔ بہرحال اس کے ذہن میں یہ شک نہیں گزرا تھا کہ یہ پھسلن "غیر اتفاقیہ" تھی۔

ہم نیچے پہنچے تو فرحین حسب توقع مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یقیناً انہوں نے گلیشیر پر میرے اور عینی کے لڑھکنے کا منظر دیکھا تھا۔ انہوں نے بڑے تحکمانہ لہجے میں عینی کو اپنی طرف بلایا اور اس سے کھسر پھسر کرنے لگیں۔ یقیناً عینی پر پند و نصائح کی بارش ہو رہی تھی اور اسے سمجھایا جا رہا تھا کہ وہ میرے خطرناک سائے سے بھی دور رہے۔

رات دو کمروں میں لوڈو کی ہنگامہ خیز بازیاں سجی ہوئی تھیں۔ بہت شور غل ہو رہا تھا۔ عینی اصرار کر رہی تھی کہ میں بھی اس تماشے میں شرکت کروں لیکن میں اسے مسلسل ٹالتا رہا۔ میں نے کہا "تمہاری بھابی صاحبہ نے پنجے نکال لیے ہیں۔ اب وہ کسی بھی وقت حلق سے غراہٹ بلند کریں گی اور مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ مجھے تو لہولہان کریں گی ہی' تمہارے بھی سارے پر جھاڑ دیں گی۔"

میں عینی کو بھابی کا ڈراوا دے رہا تھا' اصل میں میرا دل خود ہی جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی دل و دماغ کی۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار وہ زرد پھول بکھر جاتے تھے جو میں نے دریائے کنہار کے کنارے دیکھے تھے۔ ان میں ایک پھول نیم گلابی تھا اور وہ کسی کا چہرہ تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اطمینان سے لیٹوں اور بس لیٹا رہوں۔

کمرے میں میرے علاوہ اخلاق اور چھوٹے تایا بھی موجود تھے' اخلاق تو سو رہا تھا۔ چھوٹے تایا میگزین دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ جگالی بھی کرتے جا رہے تھے۔ غالباً پستہ وغیرہ کھا رہے تھے۔ میں نے کمبل سر تک اوڑھا اور آنکھیں موند لیں۔ زرد پھول آنکھوں کے سامنے بکھر گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اندر مسز فرحین کے لیے ایک خاص قسم کی دلچسپی پروان چڑھ رہی ہے۔ میں پچھلے کئی دن سے غیر ارادی طور پر ان کے متعلق سوچ رہا تھا' کوئی ایسی بات تھی ان کی شخصیت میں جو مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ خاندان والوں کی آرا سے قطع نظر یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ میں ڈھیلے ڈھالے کردار کا مالک نہیں تھا۔ اور مجھ پر "دل پھینک" یا "عاشق مزاج" ہونے کا الزام تو میرے بدترین مخالف بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ کالج کے زمانے میں میرے ایک دو معاشقے ضرور ہوئے تھے لیکن وہ کبھی اخلاق کے دائرے سے نہیں نکلے اور نہ کبھی ان میں ایسی شدت آئی جس سے بدنامی کا سامان ہوتا۔ تاہم ناران کی وادی میں اترتے ہی میرے مزاج اور میری سوچوں میں ایک انقلابی تبدیلی آئی تھی۔ خبر نہیں یہ یہاں کے جادو بھرے ماحول کا اثر تھا' یا پھر ان زرد پھولوں کا جن میں انتہا درجے کی یاسیت اور دلکشی اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ایک کو دوسری سے جدا کرنا مشکل تھا۔

اگلا دن سب نے ناران کے اندر ہی گھومتے پھرتے گزارہ۔ ان ڈور گیمز بھی ہوتے رہے۔ بہت بے تکلفی کا ماحول تھا۔ اور تو اور میں بھی گروپ کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ شاید گروپ کے ارکان نے یہ سوچا تھا کہ ایک فرد کی وجہ سے تفریح برباد کیوں کی جائے۔ میرے لیے جو نفرت ان کے دلوں میں موجود تھی۔ اسے تو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بڑے تایا اور تائی "داماد" کی مجبوری کے سبب میرے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ بڑوں نے میرے لیے گنجائش پیدا کر لی تھی تو چھوٹے بھی رعایت دینے پر آمادہ ہو گئے تھے... اگر کوئی رعایت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا تو وہ فرحین تھیں۔ وہ مجھ سے بہت کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ ان کی تیز نظر ہمہ وقت میرا تعاقب کرتی تھی' خاص طور سے اس وقت جب عینی میرے آس پاس موجود ہوتی تھی۔

میرے ہاتھ بھی ایک مشغلہ آگیا تھا۔ مجھے جونہی فرحین کی صورت نظر آتی' میں عینی کی طرف متوجہ ہو جاتا یا اس کے قریب چلا جاتا۔ وہ اس صورتِ حال پر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں اور کسی وقت تو مجھے یوں لگتا تھا کہ ان کی قوتِ

برداشت جواب دے جائے گی اور وہ دوسروں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ پر پھٹ پڑیں گی یا پھر بڑے تایا جان کو میرے بارے میں کوئی ایسی رپورٹ دیں گی کہ وہ "داماد صاحب" کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر مجھے دھکے دے کر ہوٹل سے رخصت کردیں گے۔ بہرحال ابھی تک ایسی نوبت نہیں آئی تھی اور مسز فرحین کی برداشت (جو واقعی قابلِ ذکر تھی) ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

فرحین کے طور اطوار سے خدا ترسی اور نیک دلی بہت نمایاں تھی۔ جہاں کہیں کسی فقیر یا محتاج کو دیکھتیں فوراً بٹوا کھول کر کھڑی ہوجاتیں۔ گروپ میں کسی کو کوئی تکلیف ہوتی' کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اسے اپنا دردِ سر بنالیتیں۔ ہر کسی کی ضرورت کا خیال رکھنا اور آتے جاتے چھوٹے چھوٹے مسئلے نمٹاتے رہنا ان کی عادتِ ثانیہ تھی۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو ہر قسم کے لوگوں کو اپنی عزت کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

دوسرے روز جھیل سیف الملوک جانے کا پروگرام بنا۔ ہم نے رات ہی جیپ والوں سے بات کرلی تھی۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک کھلا میدان تھا۔ وہاں جیپوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہ سب کی سب نہایت سخت جان جیپیں تھیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ جیپیں آرمی کے استعمال میں رہی تھیں۔ بعد ازاں انہیں نیلام کردیا گیا تھا۔ یہ جیپیں اب بھی بڑی اچھی حالت میں تھیں۔ دشوار گزار راستوں کو دھاڑتی چنگھاڑتی پھلانگتی چلی جاتی تھیں۔ ان علاقہ جات میں یہ جیپیں آمدورفت کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں' ہمیں ان علاقوں میں ہر جگہ ان جیپوں کی حکمرانی نظر آئی۔ وہاں اس جیپ کے لیے پہاڑوں کی شہزادی کا لقب بجا طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ راستے میں ہم نے پہاڑوں کی شہزادی کا دیدار بے تحاشا کیا تھا مگر اس شہزادی کی اصل طاقت اور صلاحیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ہماری ہم سفر بنی اور ہمیں ناران سے جھیل تک لے کر گئی۔

ان جیپوں میں عام طور پر آٹھ سے دس سواریوں کی گنجائش ہوتی ہے' بہرحال اکثر اوقات اوور لوڈنگ بھی کرلی جاتی ہے۔ ڈرائیور حضرات تین جیپوں کے لیے اٹھارہ سو روپیا مانگ رہے تھے۔ ایک بار پھر ندیم کی چرب زبانی کام آئی اور میں نے ندیم کے ساتھ مل کر یہ معاملہ چودہ سو روپے میں نمٹالیا۔ اس کے علاوہ یہ سہولت بھی حاصل کرلی کہ ہم وہاں جھیل پر چار پانچ گھنٹے قیام کریں گے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں علی الصباح نو بجے کے لگ بھگ ناران سے روانہ ہونا تھا۔ قریباً سات آٹھ کلومیٹر کا سفر تھا۔ یہ انتہائی دشوار سفر ایک گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہوتا تھا۔ تین ساڑھے تین بجے تک ہمیں جھیل پر رکنا تھا۔ اس دوران میں ڈرائیور صاحبان آزاد تھے' وہ اپنی گاڑیوں سمیت جہاں چاہے جاسکتے تھے۔

خواتین نے قیمے اور آلو کے سینڈوچ بنانے کا سامان رات کو ہی تیار کرلیا تھا۔ علی الصباح سینڈوچ تیار کیے گئے' کولڈ ڈرنکس' فروٹ اور اس قسم کی دیگر اشیا ساتھ لے لی گئیں۔ پروگرام کے مطابق ڈرائیور صاحبان ساڑھے آٹھ بجے جیپیں لے کر پہنچ گئے۔ سب سوار ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ ندیم کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر تھا۔ وہ بوکھلایا بوکھلایا سا پھر رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولا "یار! نازیہ اور زوہیب کی کیسٹ نہیں مل رہی' وہی جس میں گانا تھا' ٹالی دے تھلے بھے کے' ماہیا دے ماہیا' کریئے پیار دیاں گلاں۔"

میں نے کہا "تم اس سے پہلے جیپ پر جھیل سیف الملوک گئے ہو۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"یہ بہت خطرناک راستہ ہے' بڑے بڑے سخت دل لوگ اللہ توبہ کرنے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی خدا یاد آئے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ کوئی نعتوں وغیرہ کی کیسٹ ڈھونڈو۔ یہ نازیہ شازیہ سب تمہیں بھول جائے گا۔"

جو میں نے کہا تھا' درست ثابت ہوا۔ جوں جوں جھیل کی طرف بڑھتے جائیں راستہ خطرناک ترین صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ راستہ کیا ہے ایک پُل صراط ہے۔ پہاڑ کے ساتھ ساتھ ایک سخت ناہموار پٹی ہے۔ اس پٹی پر سے دو جیپیں بمشکل گزر پاتی ہیں۔ نیچے سیکڑوں فٹ گہرائی میں آبی گزرگاہ ہے۔ یہ وہ پانی ہے جو جھیل سیف الملوک سے ایک بڑے دھارے کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہزاروں فٹ کی بلندی سے وہ شور مچاتا جھاگ اڑاتا آتا ہے اور دریائے کنہار کا حصہ بن جاتا ہے۔ جوں جوں ہم جھیل کی طرف بڑھتے جارہے تھے' یہ سفید چمکیلا آبی دھارا گہرائی میں جارہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پتلی لکیر کی صورت میں نظر آنے لگا۔ اس پانی میں جگہ جگہ برف نے محرابیں سی بنا رکھی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ برف کے غار ہیں جن میں سے پانی فراٹے بھرتا گزر رہا ہے۔

میرے ہم سفروں کی حالت عجیب تھی۔ ان میں سے بیشتر

پہلی مرتبہ اس وادیٔ حسن میں آئے تھے اور پہلی مرتبہ پل صراط سے گزر کر طلسمی جھیل کی طرف جا رہے تھے' اخلاق میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ بولا "کہتے ہیں کہ جنت پہنچنے سے پہلے پل صراط سے گزرنا ہوگا۔ غالباً ٹھیک ہی کہتے ہیں۔"

بڑی تائی بھی اسی جیپ میں تھیں جس میں' میں بیٹھا تھا۔ ان کی حالت سب سے پتلی تھی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ گاہے گاہے ڈری نظروں سے سیکڑوں فٹ نیچے پہاڑی نالے کو دیکھتی تھیں اور جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ منہ میں تیزی کے ساتھ کچھ بڑبڑانے بھی لگتی تھیں۔ فرحین نے انہیں اپنے بازو کے حصار میں لے رکھا تھا۔ شاید فرحین بھی کچھ پڑھ رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پر تائی کی طرح خوف و ہراس کی یلغار نہیں تھی۔ ندیم بھی چپ تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ بات بناتے ہوئے بولا "مجھے تو بس وہ لڑکی نہیں بھول رہی جو راستے میں ملی تھی۔ اتنا بھدا شوہر اتنی خوبصورت بیوی' سچ مچ یہ تو بڑا ظلم ہے۔"

مینی سب سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ چہک رہی تھی اور گاہے گاہے تالی بجا اٹھتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کی خوشی میں جھوٹ کتنا تھا اور سچ کتنا..... بہرطور ایک موقع پر تو مینی کو بھی چپ لگ گئی۔ سامنے سے آنے والی جیپوں کو راستہ دینے کے لیے ہماری جیپ کے ڈرائیور کو جیپ ریورس کرنا پڑی۔ جیپ لڑھکنے کے انداز میں چلتے ہوئے راستے کے بالکل کنارے پر جا لگی۔ بلا مبالغہ جیپ کے دو ٹائر عین کنارے پر تھے۔ اور کنارے کے پتھر ایسے تھے کہ کسی بھی وقت ہمیں خدا حافظ کہہ کر ہزاروں فٹ گہرے نالے کی طرف روانہ ہو سکتے تھے۔ جیپ میں چھوٹے تایا کی پوتی بھی موجود تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی تھی۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

ندیم نے کہا "یار' کتنے خوش نصیب لوگ ہیں وہ۔"

"کون؟" اخلاق نے مری مری آواز میں پوچھا۔

ندیم نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں پیادہ جھیل کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان لڑکے لڑکیاں تھے۔ انہوں نے اشیائے خورد و نوش کی ٹوکریاں اور تھرماس وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔

"کیوں نہ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہو جائیں' میرا مطلب ہے کہ جہاں تک راستہ خطرناک ہے' جیپوں سے اتر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو سوپیاز اور سو جوتوں والی بات ہو گی... اب راستہ جھیل تک خطرناک ہی ہے۔"

ڈرائیور خوش باش شخص تھا۔ وہ دنیا کے اس خطرناک ترین راستے پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہمیں لطیفے سنا رہا تھا اور ہنسنے ہنسانے کی باتیں کر رہا تھا۔ یہاں بھی ہمیں ایک بڑے گلیشیر پر سے گزرنا پڑا۔ کچھ جدت پسند دکان داروں نے برف کھود کر چھوٹی چھوٹی خوبصورت دکانیں تراش رکھی تھیں۔ ان دکانوں پر کولڈ ڈرنکس' سگریٹ اور سوئٹس وغیرہ دستیاب تھیں۔ مینی نے ان دکانوں کو "برفانی دکانوں" کا نام دیا۔

جھیل سے قریباً ایک کلومیٹر ادھر ہی جیپیں رک جاتی ہیں۔ اس کے بعد جھیل کے عشاق کو راہِ پُرخار پر پاپیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اپنا خون خشک کرنے کے لیے گھوڑوں پر بھی سوار ہو جاتے ہیں۔ جھیل تک راستہ ایک تنگ پگڈنڈی کی شکل میں ہے۔ آپ میں اور آپ کے ہم سفر میں کتنی بھی محبت ہو مگر اس پگڈنڈی پر کچھ مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ آپ کندھے سے کندھا ملا کر نہیں چل سکتے۔ پگڈنڈی پر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے۔

پلِ صراط کو..... عبور کر کے اور حساب کتاب کے مراحل سے گزر کر جنت کو دیکھنے کی خوشی کا تو علم نہیں لیکن سیاحوں کے لیے جھیل سیف الملوک کو دیکھنے کی خوشی بھی یادگار ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے جیسے مدتوں سے اس کے اندر ایک بصری خلا تھا جو اس نیلگوں جھیل کو دیکھنے کے بعد پُر ہو گیا ہے۔

مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح کچھ چیزیں اس لیے خوبصورت نظر آنے لگتی ہیں کہ ان کی خوبصورتی کا شہرہ ہوتا ہے مگر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خوبصورتی.... جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتی ہے اور جھیل سیف الملوک ان میں سے ایک ہے۔ اس کے حسن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت اچھے طریقے سے لکھا جا چکا ہے۔ میرا قلم وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا' صرف اتنا کہوں گا کہ برف پوش پہاڑوں کے درمیان نیلے برفاب کا وہ منظر ہتانے کی نہیں صرف دیکھنے کی چیز ہے۔ "سم سم" کے غار میں داخل ہونے پر جو حالت علی بابا کی ہوئی ہوگی' وہی جھیل سیف الملوک کے روبرو پہنچنے والے کی ہوتی ہے۔ اسے اپنے اردگرد خوبصورتی کی ایسے خزانے نظر آتے ہیں کہ وہ دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ ایک ہی وقت میں بہت سے مناظر دیکھ لے' ایک ہی لمحے میں بہت سی چیزوں کو چھو لے۔

جھیل سیف الملوک سے بہت دیر والہانہ ملاقات

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے کے بعد ہم کنارے کنارے چلتے ایک کلیشیر کی طرف چلے گئے۔ جھیل ایک پیالے کی طرح ہے اور اس میں چاروں طرف سے کلیشیر گرتے ہیں۔ انہی کلیشیرز کا پانی جھیل میں جمع ہوتا ہے اور ایک خوبصورت جھالر کی شکل میں جھیل سے نکل کر کوہی نالے میں پہنچ جاتا ہے۔

کلیشیر پر پہنچ کر گروپ کے ارکان نے کچھ دیر اودھم مچایا پھر سب ٹولیوں کی شکل میں بٹنے لگے۔ جس وقت یہ چھوٹے چھوٹے گروپ بن رہے تھے' میں فوراً اس گروپ میں شامل ہوگیا' جس میں عینی تھی۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ میں عینی کے ساتھ رہوں' مقصد کچھ اور تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں عینی والے گروپ میں شامل ہوں گا تو فرحین بھی ضرور ہمارے ساتھ شامل ہوجائیں گی۔ وہ یہ کبھی گوارا نہیں کریں گی کہ عینی پر اور مجھ پر ان کی نگاہ نہ رہے۔ میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ میں' تنویر' ندیم اور عینی کے ساتھ شامل ہوا تو فرحین بھی جو رضوان اور فوزیہ وغیرہ کے ساتھ رہنا چاہ رہی تھیں' ہمارے ساتھ چلی آئیں۔ اب ہم پارٹی میں کل پانچ ارکان تھے۔ یعنی میں' عینی' ندیم' تنویر اور فرحین۔ ہم جھیل کے ساتھ ساتھ چلتے اس کنارے کی طرف بڑھے۔ جہاں عظیم الشان چوٹی ملکہ پربت سر اٹھائے کھڑی تھی اور آسمان کو بوسہ دے رہی تھی۔ جھیل کے کنارے سے ملکہ پربت کا نظارہ اتنا خوبصورت تھا کہ یہ خوبصورتی دہشت پیدا کردیتی تھی۔ ایک مفلوک الحال مقامی نوجوان مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا۔ اس کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا اور وہ کھانے کو کچھ مانگ رہا تھا۔ ہم سامان خورد و نوش پہلے کلیشیر پر ہی چھوڑ آئے تھے۔ فرحین کے پرس میں چند چاکلیٹس تھیں' انہوں نے وہی دے دیں۔ پچاس ساٹھ روپے کی ہوں گی۔ چاکلیٹس لے کر بھی نوجوان نے ہمارا تعاقب جاری رکھا۔ اب وہ تقاضا کررہا تھا کہ ہم اس سے جھیل سیف الملوک کی کہانی سنیں۔ اس کہانی کا معاوضہ وہ بیس روپے طلب کررہا تھا۔ جب اس نے کسی طرح ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تو زچ ہوکر ہم کہانی سننے پر آمادہ ہوگئے۔ تاہم اسے باور کرادیا کہ ہم اس "تفریح بالجبر" کا ہرجانہ صرف دس روپے ادا کریں گے۔

ہم جھیل کے سرد پانیوں میں پاؤں کی انگلیاں ڈبو کر بیٹھ گئے۔ (پورے پاؤں نہیں ڈبوئے کیونکہ یہ پانی اتنا سرد ہے کہ خون منجمد کرکے ہاتھ پاؤں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچادیتا ہے) نوجوان کی کہانی شروع ہوئی۔ ویسی ہی کہانی جیسی ہم بچپن میں "بچوں کی دنیا" نامی رسالے میں پڑھا کرتے تھے۔ شہزادہ' شہزادی' دیو' زنداں' طلسم' سب کچھ اس میں موجود تھا۔ کہانی سے زیادہ اہم وہ لہجہ تھا جس میں وہ مقامی نوجوان کہانی سنا رہا تھا اور وہ گردوپیش اہم تھا جس میں ہم بیٹھے بین رہے تھے۔ جھیل کی عطریز ہوا اہم تھی اور وہ چوٹی اہم تھی جسے اہل ملکہ پربت کے نام سے جانتے تھے اور جو کسی الف لیلوی داستان کے دیو ہیکل کردار کی طرح لاکھوں سال سے اس جھیل کے کنارے سینہ تانے کھڑی تھی۔

دس روپے کے عوض ایک صدیوں پرانی کہانی سننے کے بعد ہم پھر چہل قدمی کے انداز میں جھیل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوگئے۔ جلدی ہی ہم جھیل کے ایک دور افتادہ کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں دو برف پوش پہاڑوں کے درمیان رہ گزر سی بنی ہوئی تھی۔ ہوا یہاں سے سیٹی بجاتی ہوئی گزرتی تھی۔ چلنا خاصا دشوار تھا۔ کہیں کہیں جگہ تو برف اچانک پاؤں کے نیچے ٹوٹ جاتی تھی اور جسم کو شدید جھٹکا لگتا تھا۔ ایک جگہ برفاب پانی کا دھارا بہہ رہا تھا۔ اسے پار کرنے کے لیے کسی نے دو پتھر پانی میں رکھ دیے تھے۔ ان ناہموار پتھروں پر پاؤں رکھ کر گزرنا خاصا دشوار عمل تھا۔ ندیم' تنویر اور عینی تو بہ آسانی گزر گئے لیکن فرحین گزرنے لگیں تو ذرا سا ڈگمگائیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر انہیں ہاتھ پیش کیا' وہ ایک دم جھجک کر پیچھے ہٹ گئیں۔ جیسے میں نے ہاتھ کے بجائے انہیں لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ تھمانے کی کوشش کی ہو۔ میں خجل سا ہوکر آگے نکل گیا۔ وہ خود ہی سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی دھارا پار کر آئیں۔

مصیبت آتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرو تفریح اور سیاحت کا یہ خوشگوار موڈ یوں آناً فاناً برباد ہوجائے گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارے رواں دواں تفریحی دورے کو یوں اچانک فل اسٹاپ لگ جائے گا۔ جو کچھ ہوا اتنے غیر محسوس طریقے سے ہوا کہ ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب ہم پریشانی کی دلدل میں گلے گلے تک دھنس گئے ہیں۔

ہم برفیلی ڈھلوان پر بیٹھ کر دم لے رہے تھے۔ چاروں طرف برف تھی لیکن پھر بھی ہلکی تپش موجود تھی اور پیاس محسوس ہورہی تھی۔ تنویر نے سفری بیگ میں سے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں نکالیں' ہم بوتلیں پینے لگے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے پچاس ساٹھ گز نیچے کچھ نوجوان اٹکھیلیاں کررہے تھے۔ اپنے حلیے اور بول چال سے وہ اونچے خاندانوں کے چشم و چراغ لگتے تھے۔ لمبے بال' قیمتی جیکٹیں' بڑے بڑے امپورٹڈ جوگرز۔ ایک لڑکے کے پاس جدید ویڈیو کیمرا بھی تھا۔

یعنی کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل کھولنے کی کوشش کررہی تھی۔ بوتل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور پھسلتی ہوئی دور نیچے لڑکوں کے پاس چلی گئی۔ لڑکوں نے بوتل اٹھائی اور شوخی میں "تھینک یو۔ تھینک یو" کے آوازے بلند کرنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ مذاق کررہے ہیں' بوتل واپس کردیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک لڑکے نے دانتوں سے بوتل کھولی اور غٹاغٹ چڑھانے لگا۔ دوسرے اس سے چھیننے لگے۔ زبردست دھماچوکڑی شروع ہوگئی۔ ہم سب خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

لڑکوں نے بوتل پینے کے بعد خالی بوتل واپس کرنا بھی گوارا نہیں کی اور بوتل وہیں پھینک کر ایک مرتبہ پھر دھینگا مشتی شروع کردی۔ جس لڑکے کے پاس ویڈیو کیمرا تھا' وہ اس دھینگا مشتی کی فلم بندی میں مصروف ہوگیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی خیریت تھی لیکن پھر یوں ہوا کہ لڑکے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہمارے بالکل قریب آگئے۔ لمبے بالوں والا کیمرامین مسلسل وڈیو فلم بنا رہا تھا۔ ظاہر ہے ہماری فلم بھی بن رہی تھی۔ ندیم نے لڑکوں کے پاس جاکر انہیں منع کیا اور کہا کہ وہ دوسری طرف چلے جائیں۔ ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور وہ مسلسل "ہائے ہاؤ" میں مصروف رہے۔

میں نے ندیم کو واپس بلالیا' پھر عینی اور فرحین وغیرہ کو اشارہ کیا۔ ہم نے سامان سمیٹا اور آگے چل دیے۔ ویڈیو کیمرا بار بار ہمیں فوکس کررہا تھا۔ ندیم سے رہا نہیں گیا۔ اس نے کیمرا بردار لڑکے کے قریب جاکر کچھ کہا۔

شرمندہ ہونے کے بجائے وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ کیمرا دوسرے لڑکے کو تھماکر وہ ندیم سے تکرار کرنے لگا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔ ایسے ڈیڑھ پسلی کے غنڈے بہت دیکھے تھے میں نے۔ اور بہت سوں سے نمٹا بھی تھا لیکن اس موقع پر میں پیچھے ہی رہنا چاہتا تھا' میں ہرگز ہرگز کسی کو یہ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کوئی مسئلہ کھڑا ہوا ہے اور سب کی تفریح برباد ہوئی ہے۔ کیمرا بردار لڑکے اور ندیم میں تھوڑی دیر تک تکرار ہوئی پھر لڑکے نے ندیم کو باقاعدہ دھکا دے دیا۔ ندیم کا رنگ انگارے کی طرح سرخ ہوگیا لیکن معاملے کو بگڑنے سے بچانے کے لیے وہ خاموش رہا۔ اسی دوران میں' میں اور تنویر بھی موقع پر پہنچ گئے۔

ندیم غصے سے کانپ رہا تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا "لیڈیز ساتھ ہیں ورنہ تمہاری بات کا جواب میں بڑے اچھے طریقے سے دے سکتا تھا۔"

تین چار لڑکوں نے ایک ساتھ منہ سے ہوکی طویل آواز نکالی' جیسے ندیم کو اس کے اچھے ڈائیلاگ پر داد دے رہے ہوں۔

ایک لمبا تڑنگا لڑکا جو انگلش لہجے میں اردو بول رہا تھا' منہ سے پچ پچ کی آواز نکال کر بولا "جاؤ۔ جان جی۔ اتنی سرد جگہ پر اتنی گرمی اچھی نہیں ہوتی' لقوہ شقوہ ہوجاتا ہے۔"

بظاہر وہ بات مٹانے کی بات کررہا تھا لیکن انداز سخت تاؤ دلانے والا تھا۔ تنویر کا پارا بھی چڑھنے لگا۔ اسی دوران میں فرحین ہمارے نزدیک پہنچ گئیں۔ وہ ندیم اور تنویر کو واپس بلانے لگیں "چھوڑو ندیم! ہمیں نہیں جھگڑا کرنا۔ آجاؤ واپس' دفع کرو ان کو۔"

میں ندیم اور لمبے تڑنگے لڑکے کے درمیان آگیا اور ندیم کو دھکیل کر واپس لے آیا۔ تنویر بھی منہ میں بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹ آیا۔ ہمارا موڈ برباد ہوگیا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ گروپ کی طرف واپس چل دیے۔ لیکن ابھی ہم تقریباً ایک فرلانگ دور ہی گئے تھے کہ ہمیں شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ لڑکے ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ دو تین کے سوا وہ سب شرارت کے موڈ میں تھے۔ کورس کی شکل میں وہ ایک بے ہودہ گانا گارہے تھے اور تالیاں پیٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ تنویر اور ندیم غصے کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ لڑکوں کی تعداد دس کے قریب تھی۔ لڑائی کی صورت میں یقیناً ان کا پلہ بھاری رہتا۔ یہاں ارد گرد کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان لمحوں میں مجھے اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ ایسے دور دراز تفریحی مقامات پر پولیس یا گارڈز وغیرہ کا اہتمام ہونا چاہیے۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہورہا تھا۔ میں نے نگاہوں نگاہوں میں ان لوفر امیرزادوں کو تول لیا تھا۔ دو تین کے سوا ان میں سے کوئی بھی مارنے یا مار کھانے والا نہیں تھا۔ ایسے مشٹنڈوں کو طفیلی مشٹنڈے کہنا چاہیے۔ گروپ میں شامل ہوکر وہ طرم خان بن جاتے ہیں لیکن اگر کہیں پھڈے وغیرہ کا معاملہ ہوجائے تو وہ سر پر پاؤں رکھ لیتے ہیں اور ان کی دوڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اگر دوڑ نہ سکیں تو پھر ایسے مشٹنڈے فوراً محل مزاجی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور صلح صفائی کی کوشش شروع کردیتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں دو چار منٹ میں ان بدبختوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتا ہوں۔ مگر مسئلہ پھر وہی "ریپوٹیشن" کا تھا۔ برادری میں مجھے پہلے ہی آوارہ گرد' بدقماش اور ہتھ چھٹ جیسے معزز القابات سے یاد کیا جاتا تھا۔ اگر میں یہاں مار ماری شروع کردیتا تو مطلب یہ ہوتا کہ میں نے اپنے اوپر لگائے جانے والے تمام جھوٹے

سچے الزامات کا ٹھوس ثبوت فراہم کردیا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کررکھا تھا کہ اس معاملے میں سب سے پیچھے ہی رہوں گا۔

ہماری خاموشی دیکھ کر لڑکوں کا حوصلہ مزید بڑھا۔ وہ آپس میں نورا کشتی کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے اور برف کے گولے مارنے لگے۔ لڑتے جھگڑتے وہ ہمارے بالکل قریب آگئے۔ برف کا ایک گولا عینی کی پشت پر لگا۔ ایک لڑکا جس نے نیکر پہن رکھی تھی۔ تنویر سے ٹکرایا اور تنویر گرتے گرتے بچا۔ یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ ایسے لوگوں کی خصلت مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر ندیم اور تنویر تھوڑی دیر مزید خاموش رہے تو یہ مشٹنڈے دست درازی کرنے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔

ندیم کا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا تھا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ برف پر پھینکا اور نیکر والے لڑکے کا گریبان پکڑلیا۔ وہ لوگ تو جیسے شاید بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ تین چار لڑکے ایک دم ندیم اور تنویر پر پل پڑے۔۔۔ عینی اور فرحین کے چہرے برف ہی کی طرح سفید ہوگئے تھے۔ عینی چیخنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ فرحین نے لاچار نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ کچھ کرو اور کچھ نہیں تو کسی کو بلا کر ہی لاؤ۔

میں نے بڑے اطمینان سے اپنا کیمرا فرحین کو تھمادیا۔

"کیا کروگے؟" فرحین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"آپ دیکھتی رہیں" میں نے جواب دیا اور ان لڑکوں کی طرف بڑھا جو کالی بھڑوں کی طرح ندیم اور تنویر سے چمٹ گئے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو دو لڑکے مجھ پر جھپٹے۔ ان میں سے ایک وہی لمبا تڑنگا لڑکا تھا جس نے ندیم سے الجھنا چاہا تھا اور جو انگریزی لہجے میں منہ ٹیڑھا کرکے اردو بولتا تھا۔ وہ خاصا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی موٹی چین چمک رہی تھی۔ دوسرا لڑکا دبلا پتلا تھا' اس کے بال شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ لمبے تڑنگے لڑکے نے آتے ساتھ ہی مجھے مکا رسید کرنا چاہا۔ میں نے بڑے اطمینان سے یہ وار بچایا' پھر میرا ہاتھ دوسرے لڑکے کے لمبے بالوں پر آیا میں نے مضبوطی سے اس کے بال پکڑے اور پوری قوت سے گھما کر اسے لمبے تڑنگے لڑکے پر دے مارا۔ دونوں پھسلے اور برف پر دور تک لڑھک گئے۔ لمبا لڑکا بے تحاشا گالیاں بکنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ برف سے اٹھتا میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے وزنی بوٹ پہن رکھے تھے' چہرے پر لگنے والی ایک زوردار ٹھوکر نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ لمبے بالوں والا لڑکا ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ مجھ سے لپٹ جائے یا ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کوئی شے ڈھونڈے۔ اس ایک لمحے کا تذبذب اسے مہنگا پڑا۔ میں نے گریبان پکڑ کر اس کے جبڑے پر ایک دھواں دھار مکا رسید کی۔ وہ چیختا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں ایک اور لڑکا میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وزنی بکل والی بیلٹ لہرا رہی تھی۔ میں نے بیلٹ اس سے چھین لی اور پانچ دس سیکنڈ کے اندر اس کا بھرتا بنادیا۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور نیلی اسکوپ کٹ پھٹ گئی۔ تنویر اور ندیم نے جب یہ دیکھا کہ میں لڑکوں کی درگت بنا رہا ہوں تو ان کا حوصلہ بھی بلند ہوا۔ تنویر نے زمین سے چیڑ کی ایک موٹی شاخ اٹھائی اور اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ ندیم بھی ایک تنومند لڑکے کے نیچے سے نکل آیا اور اسے رگڑے دینے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر پانسا پلٹ گیا۔ وہی ہوا جس کا میں نے پیشگی اندازہ لگایا تھا۔ اس گروپ میں سے تین چار لڑکے "جنگ بندی" کے لیے دہائی دینے لگے۔ وہ چیخ رہے تھے اور مار ماری روکنے کی کوشش کررہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی اور عینک والا ایک لڑکا بار بار میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگانے لگا اور درخواست کرنے لگا کہ میں اس لڑکے کو چھوڑ دوں جس کی گردن میں' میں نے بیلٹ لپیٹ رکھی تھی اور برف پر پٹخ رہا تھا۔ اسی دوران میں دور سے مجھے اپنے گروپ کے باقی ارکان بھی دکھائی دینے لگے۔ دراصل جب لڑکوں کے ساتھ ہماری مار ماری شروع ہوئی تھی۔ عینی نے موقع سے دوڑ لگادی تھی اور تقریباً ایک فرلانگ آگے جاکر چیخ وپکار کی تھی جس کے بعد گروپ کے وہ ارکان جو سامان کے پاس موجود تھے' دوڑے چلے آئے تھے۔ ان کے ساتھ چند مقامی افراد بھی تھے۔۔۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ ان غنڈا صفت لڑکوں کو مزید پھینٹی لگائی جائے لیکن ان لڑکوں کے وہ ساتھی جو اب بیچ بچاؤ کرا رہے تھے' میرے اور ندیم کے سامنے دیوار بنے کھڑے تھے۔ دو لڑکوں نے تنویر کو بھی جپھی ڈال رکھی تھی۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر یہ معاملہ صلح صفائی پر ختم ہوگیا لیکن چہروں پر کشیدگی دونوں طرف موجود تھی۔ خاص طور سے جن تین چار لڑکوں کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں' وہ بپھرے ہوئے نظر آتے تھے اور اپنی حرکات وسکنات کے ذریعے یہ "پیغام" دے رہے تھے کہ یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوجائے گا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جس وقت ہم جیپوں میں جھیل سیف الملوک کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

الرا تلری میں بڑی تائی جان اپنی ایک قیمتی گرم شال کمرے کے دروازے پر ہی بھول گئی تھی۔ ارد گرد کئی غریب صورت مقامی بچے موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر بچے خوش ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ ہماری چادر (جس کے ساتھ پندرہ بیس روپے بھی تھے) کرسی پر پڑی رہ گئی تھی۔ تائی جان نے فوراً یہ پیسے بچوں میں بانٹ دیے اور چادر لینے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے سے پہلے ہمارے کچھ ساتھیوں کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید یہ بچے جو غربت کی انتہا کو چھو رہے ہیں اور ہمارے کمروں کے باہر اکثر اوقات روٹی کے ایک ٹکڑے کے منتظر رہتے ہیں۔ موقع ملنے پر چوری چکاری بھی کر لیتے ہوں گے۔ مگر انہوں نے ہمارا یہ خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔

اس رات اور اگلے دن بھی جھیل پر ہونے والی "بدمزگی" زیر بحث رہی۔ بڑے تایا بار بار تشکی نظروں سے میری جانب دیکھتے تھے۔ غالباً معتبر گواہیوں کے باوجود ان کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ جھیل پر ہونے والا جھگڑا میری وجہ سے بڑھا ہے۔ میرے لیے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔

اگلے روز سہ پہر کو میں اخلاق اور عینی بازار میں گئے۔ شام کے کھانے کے لیے مرغی کا گوشت لینا تھا۔ گوشت خریدتے ہوئے دکان دار سے مچھلی کی بات چل نکلی۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ ہم نے ناران میں ہونے کے باوجود ابھی تک "ٹراؤٹ" تو کھائی ہی نہیں۔ ٹراؤٹ مچھلی یہاں کی سوغات ہے اور بہت سے لوگ ناران پہنچ کر سب سے پہلے ٹراؤٹ کی تلاش میں ہی نکلتے ہیں۔ ہمیں آج یہاں چوتھا دن تھا اور ٹراؤٹ کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

جب یہ بات مرغی فروش محمد اسحاق کو معلوم ہوئی تو وہ بھی ہنسنے لگا۔ بولا "صاحب! آپ بھی عجیب لوگ ہو۔ لوگ یہاں صرف ایک رات کے لیے آتے ہیں اور ٹراؤٹ کھا کر چلے جاتے ہیں۔ آپ چار روز سے یہاں پڑے ہو اور ابھی تک ٹراؤٹ نہیں کھائی آپ نے۔"

میں نے کہا "ابھی ملنے یا نہ ملنے کی بات نہیں۔ ہمارے ذہن میں تو خیال ہی نہیں آیا۔"

"یہ تو اور بھی بُری بات ہے جی۔ بندہ ناران میں ہو اور اسے ٹراؤٹ کا خیال نہ آئے۔"

محمد اسحاق نے اسی وقت دو لڑکے بھگائے کہ وہ ٹراؤٹ کا پتا کریں۔ دس پندرہ منٹ بعد لڑکے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ آج پتے والے پکڑے گئے تھے' وہ سارے بک گئے ہیں۔ اب کل ہی امید کی جا سکتی ہے۔

محمد اسحاق نے پوچھا "ہم کتنے دن یہاں ہیں؟"

اخلاق بولا "شاید کل کا دن ہی رکیں گے۔"

"پھر تو کل آپ کو ضرور مچھلی ملنی چاہیے۔" اسحاق نے کہا۔

اس کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل مچھلی کی قیمت... طلب اور رسد کے حساب سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً دو دن پہلے دریا سے بہت کم مچھلی پکڑی گئی تھی۔ خریدار زیادہ تھے۔ یوں پون کلو کے دو ٹراؤٹ ایک ہزار روپے میں فروخت ہوئے تھے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ندیم اور رضوان بھی وہاں چلے آئے۔ بظاہر وہ نارمل نظر آ رہے تھے لیکن بغور دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی آنکھوں میں پریشانی کی جھلک ہے۔ میرے پوچھنے پر ندیم نے بتایا کہ کل جھیل پر ملنے والے لڑکے ناران میں ہی موجود ہیں۔ ابھی بازار میں ان سے ملاقات ہوئی ہے۔

"کوئی بات بھی ہوئی ہے یا صرف دیکھا ہی ہے۔"

"بس دیکھا ہی ہے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ رہے تھے بلکہ گھور رہے تھے۔"

"خیر یہ تو کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں" میں نے کہا۔ "نوجوان لڑکوں کے ایسے گروپ زیادہ دیر ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ ہو سکتا ہے کہ آج ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ اگر نہ گئے تو کل چلے جائیں گے۔"

گھر آ کر ندیم نے چپکے سے بتایا کہ لڑکوں سے صرف آنکھیں ہی چار نہیں ہوئیں۔ ان سے بات بھی ہوئی ہے۔ ان میں وہ لمبا تڑنگا لڑکا بھی موجود تھا جس سے میں نے خصوصی پھینٹی لگائی تھی۔ اس لڑکے نے بازار میں ندیم کو کھلم کھلا دھمکی دی تھی کہ یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جائے گی' بہت آگے تک جائے گی۔

میں نے ندیم کا کندھا تھپتھپایا "یار! گھبرانے کی بات نہیں۔ میں ہوں یہاں... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے کہ عینی کے سامنے یہ سب کچھ نہیں بتایا' خوا مخواہ سب کی تفریح برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رضوان کو بھی سمجھا دو کہ کسی سے بات نہ کرے۔"

اگلے دو روز تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ فٹنوں کی اس ٹولی میں سے ایک دو لڑکے ناران کے بازار میں گھومتے پھرتے نظر آئے۔

تیسرے روز ہم ناران سے واپس روانہ ہو گئے۔ واپسی کا یہ سفر بھی خاصا دلچسپ تھا۔ سب سے بڑی دلچسپی تو سفر کے

آغاز میں ہی پیش آگئی۔ جس آخری گلیشیر کو پار کرکے ہم ناران میں داخل ہوئے تھے وہ واپسی کے سفر میں پہلا گلیشیر تھا۔

ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ گلیشیر ہمیں یوں ناکوں چنے چبوائے گا۔ ہم تو درمیان والے گلیشیر سے ڈرے ہوئے تھے کہ وہ زیادہ لمبا اور دشوار گزار تھا۔ ناران سے روانہ ہونے کے بعد جونہی ہم نے گلیشیر کو پار کرنا چاہا' اس نے ہمیں اذن روانگی دینے سے صاف انکار کردیا۔ گلیشیر کی برفیلی ڈھلوان پر چڑھنے سے ہماری گاڑیاں قطعی انکاری ہوگئیں۔ ایکسی لریٹر دبایا جاتا تھا تو پہیے گھومنا شروع کردیتے تھے۔ ہم گاڑیوں کو پیچھے سے دھکا لگاتے تھے لیکن ڈھلوان پر پہنچتے ہی وہ بے بس ہوجاتی تھیں۔ قریباً ایک گھنٹا وہاں تماشا لگا رہا۔ آخر موقع پر موجود ایک صاحب نے ہمیں اپنی ماہرانہ خدمات پیش کیں۔ انہوں نے گاڑی کے اگلے پہیوں کے عین اوپر بونٹ پر دو لڑکے بٹھائے تاکہ پہیوں پر وزن رہے اور وہ گھومنے کی کوشش نہ کریں۔ ڈرائیونگ سیٹ ان صاحب نے خود سنبھال لی۔ کچھ افراد نے پیچھے سے دھکا لگایا' یوں ہماری پہلی گاڑی' لہراتی بل کھاتی آگے بڑھی اور پل صراط پار کرنے میں کامیاب رہی۔ باقی دونوں گاڑیوں کو بھی اسی طرح "رحمت کے اس فرشتے" نے پل صراط پار کرایا۔ آخر میں اسٹیشن ویگن بھی کسی نہ کسی طرح اس مرحلے سے گزر گئی۔ لیکن جب ہم اس شخص کا پُرخلوص شکریہ ادا کرکے آگے بڑھنے لگے تو معلوم ہوا کہ رحمت کا یہ فرشتہ "رحمت" اس کے پیسے وصول کرتا ہے۔ یعنی وہ شوقیہ نہیں پیشہ ور فنکار تھا۔ اس نے فی گاڑی پندرہ روپے کا تقاضا کیا جو ہم نے بخوشی اسے دے دیے اور اپنا "شکریہ" دل ہی دل میں واپس لے لیا۔

ناران سے کاغان تک واپسی کا سفر بھی حسن فطرت کی باغ و بہار وادی میں طے ہوا۔ یہ جنت نظیر مقامات دیکھ کر انسان دماغی و روحانی طور پر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میرا قلم اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہے جو اس مختصر سفر کے دوران میں اکثر مجھ پر طاری ہوا کرتی ہے۔

ہم قریباً ایک بجے کاغان پہنچے' ہماری منزل شوگران تھی۔ کاغان سے آگے کیوائی کا قصبہ ہے۔ کاغان میں ہم نے پندرہ بیس منٹ قیام کیا۔ بچوں کے لیے بسکٹ چپس وغیرہ لیے اور کیوائی کے لیے روانہ ہوگئے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم کیوائی پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔

کیوائی سے بائیں جانب شوگران جانے والی سڑک نکلتی ہے۔ مین روڈ اور شوگران روڈ کے سنگم پر ایک اچھا ریستوران موجود ہے۔ سلجوق بزعم خود پارٹی لیڈر بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اس ریستوران سے کھانا کھا لیتے ہیں۔ سب کو بھوک لگی ہے اور گاڑیاں بھی گرم ہیں۔ ہماری پیٹ پوجا ہوجائے گی اور گاڑیوں کو ذرا ریسٹ مل جائے گا۔ سلجوق نے مجھے فوراً سڑک کے کنارے پر نصب سنگ میل دکھادیا۔ سنگ میل پر لکھا تھا۔ "شوگران سات کلومیٹر" وہ بولا "بھائی صاحب! پچاس ساٹھ کلومیٹر تو آگئے ہیں' اب سات کلومیٹر رہ گیا ہے' شوگران چل کر ہی کھائیں گے۔"

میں نے کہا "یہ جو سات کلومیٹر رہ گیا ہے' یہ پچھلے ساٹھ کلومیٹر پر بھاری ہے' بہت چڑھائی ہے۔"

ایک دو آوازیں میرے حق میں آئیں لیکن زیادہ آوازوں نے سلجوق کا ساتھ دیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ سات کلومیٹر کی تو بات ہے' اب منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

عینی میری ہم خیال تھی۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ "اچھا ووٹنگ کرلیتے ہیں جس جس کو بھوک لگی ہے وہ ہاتھ کھڑا کردے۔"

ظاہر ہے کہ بھوک تو سب کو لگی تھی۔

فرحین صاحبہ نے گھور کر عینی کو دیکھا اور کہا "تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ بے شک بھوک سب کو لگی ہے لیکن سلجوق کہہ رہا ہے کہ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

فرحین کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو ٹالنے کی ہمت کس میں تھی' لہٰذا سب بڑی خاموشی سے شوگران کی طرف روانہ ہوگئے۔

شوگران کی چڑھائی اپنی مثال آپ ہے۔ اسے عمودی چڑھائی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اکثر گاڑیاں دوسرے گیئر میں بھی چڑھنے سے انکار کردیتی ہیں اور انہیں پہلے گیئر میں لانا پڑتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں اپنے پہلو میں نظر آنے والا دریائے کنہار پتلی سی سفید لکیر دکھائی دینے لگا۔ ہم برق رفتاری سے بلند تر ہوتے جارہے تھے۔ اس چڑھائی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ گاڑی کو کہیں دم لینے کا موقع نہیں ملتا۔ بس ایک سیڑھی ہے جس پر چڑھتے ہی چلے جانا ہے۔ اگر کہیں گاڑی رک جاتی ہے تو ڈھلوان اتنی زیادہ ہے کہ اسے دھکا لگائے بغیر آگے نہیں لے جایا جاسکتا۔ دو تین کلومیٹر طے کرکے ہی ہماری گاڑیاں ہانپ گئیں۔ ہماری گاڑی کی ٹمپریچر بتانے والی سوئی انتہا سے تھوڑا ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ انجنوں

کے شور سے گاڑیوں کی حالتِ زار کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ قریباً آدھا گھنٹا چلنے کے بعد گاڑیاں بے دم ہو گئیں۔ ایک موڑ پر تھوڑی سی ہموار جگہ نظر آئی۔ میرے کہنے پر ندیم نے گاڑی وہاں روک لی۔ ہماری دیکھا دیکھی باقی چاروں گاڑیاں بھی وہاں رک گئیں۔ جگہ تھوڑی تھی گاڑیاں ایک دوسرے میں گھسی ہوئی تھیں۔ ان کے پچھلے پہیوں کے نیچے پتھر رکھ دیے گئے تھے۔ سب لوگ باہر نکل آئے اور بلند و بالا درختوں میں سیٹیاں بجاتی ہوا کا ترنم سننے لگے۔ تیس چالیس منٹ کے اندر ہم ہزاروں فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ گردوپیش ویسے ہی تھے جیسے بلند ترین پہاڑی مقامات یعنی نتھیا گلی اور ٹھنڈیانی وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ اخلاق نے چاروں گاڑیوں کے بونٹ کھلوا دیے۔ مہران کا بونٹ کھولنے کے لیے ندیم گاڑی کے قریب گیا تو اندر سے سوں سوں کی تیز آواز آئی۔ دھواں بھی خارج ہو رہا تھا۔ احتیاط سے بونٹ کھولا گیا تو بھاپ ایک تیز فوارے کی طرح کئی فٹ اوپر گئی' گاڑی کا ہاؤس پائپ لیک کر چکا تھا۔ دیگر گاڑیوں کے ریڈی ایٹر بھی ابالے کھا رہے تھے۔

سلجوق جو کیو آئی میں رکے بغیر اوپر جانے کے سلسلے میں سب سے زیادہ پُرجوش تھا اب سب سے پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ آخر اس کی نئی نویلی مارگلہ گاڑی کا معاملہ تھا۔ مایوسی کی انتہا کو چھو کر وہ بولا "میرا تو خیال ہے کہ دفع کریں شوگران کو' واپس چلتے ہیں۔ کیمپنگ ہی کرنی ہے' کہیں آگے چل کر کر لیں گے' یہ چڑھائی تو گاڑیوں کی جان لے لے گی۔"

اس کی مایوسی جب پورے گروپ کو گھیر رہی تھی' میں ٹہلتا ہوا سڑک کی طرف چلا گیا۔ اگلے موڑ کے ساتھ ہی سنگِ میل موجود تھا۔ لوہے کی ایک پرانی سی زنگ آلود تختی تھی۔ تختی پڑھ کر مجھے خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں فوراً واپس آیا اور گروپ کے باقی ارکان کو بھی یہ تختی دکھائی۔ اس پر لکھا تھا "شوگران' ایک کلومیٹر" دراصل فاصلے کا احساس میرے ذہن سے بھی نکلا ہوا تھا۔ ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ شوگران کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ گروپ میں ایک بار پھر جان دوڑ گئی۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ سلجوق کی باتوں میں آکر سچ مچ واپس ہی روانہ نہیں ہو گئے ورنہ وہ ان بدنصیبوں میں شامل ہو جاتے جو منزل کے بالکل قریب پہنچ کر ہمت ہار دیتے ہیں اور پلٹ جاتے ہیں۔ قریبی چشمے سے پانی لے کر گاڑیوں کے انجن ٹھنڈے کیے گئے۔ ٹائروں پر پانی ڈالا گیا۔ پھٹے ہوئے ہاؤس پائپ کو تنویر نے ٹیپ

غیر ممالک میں رہنے والے قارئین کے لیے

ہر ماہ گھر بیٹھے رجسٹرڈ ایئر میل سے فراہمی

جاسوسی ڈائجسٹ — سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

کسی بھی پرچے کے ۱۲ شماروں کے لیے زرِ سالانہ

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لیے ۱۵۰۰ روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی امریکا کے لیے ۱۸۰۰ روپے

آج کی قیمت پر اکیسویں صدی کا سبسکرپشن

کسی اضافی زحمت کے بغیر

ایک سے زائد رسائل اور ایک سے زائد سالوں کے لیے رقم ارسال کر کے اپنے قیمتی وقت اور پیسے کی بچت کے ساتھ اپنے پسندیدہ ماہناموں سے بروقت لطف اندوز ہوتے رہیں

اپنی رقوم

JASOOSI DIGEST PUBLICATION

کے نام

63-C, PHASE II EXTENSION
DEFENCE COMMERCIAL AREA
MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500 PAKISTAN

کے پتے پر ارسال کریں۔ ڈرافٹ کی رقم کراچی میں واقع کسی بھی ملکی یا غیر ملکی بینک کی شاخ میں قابلِ ادائی ہونا ضروری ہے۔ ڈرافٹ یا چیک کی بیرونِ پاکستان کلیرنس کے لیے زرِ سالانہ کی رقم میں بینک چارجز (دس ڈالر کے مساوی) اضافہ کرنا ہوگا۔ اپنی یہ رقم ضرور بچائیں۔

Fax: (92) (21) 580.2551
E-MAIL: Jasoosi@attglobal.net

کے ذریعے مرمت کردیا۔ ہنڈا گاڑی کا انجن فین جواب دے گیا تھا۔ اسے چالو کیا گیا۔ قریباً آدھ گھنٹا ریسٹ کرنے کے بعد ہم شوگران پہنچ گئے۔

شوگران بھی دیکھنے کی جگہ ہے۔ یہ ایک ابھرتا ہوا ہل اسٹیشن ہے اور جو ایک بار یہاں آتا ہے' دوبارہ آنے کی خواہش ضرور کرتا ہے۔ اب کئی ایک نہایت عمدہ ہوٹل یہاں بن گئے ہیں جن میں سرحد کے ایک معروف سیاست داں کا فائیو اسٹار ہوٹل بھی شامل ہے۔ زندگی کی ہر سہولت یہاں میسر ہے۔ سڑکوں پر خاصی چہل پہل نظر آتی ہے۔ یہ پہاڑ مری سے ہزاروں فٹ بلند ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہاں پتھریلی چٹانوں کے بجائے سرخی مائل مٹی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں کھیت بھی ہیں جنہیں دیکھ کر بالکل یوں لگتا ہے جیسے ہم پنجاب کے کسی گاؤں میں گھوم رہے ہیں۔ اردگرد کے مناظر دلنواز ہیں۔ فلک بوس چوٹیاں سروں پر برف کے تاج پہنے استادہ نظر آتی ہیں۔ نگاہ ان مناظر میں کہیں کھو کر رہ جاتی ہے۔ مشہور مکڑا پیک یہاں سے نو دس کلومیٹر کی دوری پر ہے۔

ہمیں ایک اچھے ہوٹل میں مناسب قیمت پر چار کمرے مل گئے۔ کمروں میں سامان وغیرہ رکھنے کے فوراً بعد ہم نے پیٹ پوجا کی۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ یہ لنچ تھا اور نہ سپر' دونوں کا مجموعہ تھا۔ گھری کھائیوں کے کنارے لکڑی کے بنے ہوئے ایک سادہ سے ہوٹل میں کھایا جانے والا یہ کھانا ہمیں "فائیو اسٹار ہوٹل" کا مزہ دے گیا۔

رات کو سب تھک کر سو گئے۔ اگلا دن بھی شوگران کے خوبصورت نشیب و فراز میں گھومتے ہوئے گزرا۔ عینی بدستور میرے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کررہی تھی۔ دوسری طرف فرحین صاحبہ کی نگاہیں بھی بدستور میری اور عینی کی نگرانی کررہی تھیں۔ یہ ناراض نگاہیں جیسے ہمہ وقت مجھ سے چپکی رہتی تھیں... شوگران میں موجود سرسبز میدان اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ ایک ایسا ہی وسیع و عریض میدان مکڑا پیک کا بھی ہے۔ گروپ کے ارکان سارا دن یہاں بھاگتے دوڑتے رہے اور دھوپ سینکتے رہے۔ اتنی بلندی پر ایسا ہموار میدان شوگران کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔

شام کو میرا دل کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اتنے سارے لوگوں میں بھی میں بالکل تنہا ہوں۔ میرے ہم سفر حقیقت میں میرے ہم سفر نہیں تھے۔ وہ کسی اور دنیا کی مخلوق تھے۔ میں کسی اور سیارے کا باسی تھا۔

ایک مجبوری کے تحت وہ مجھے برداشت کررہے تھے۔ اگر آج وہ مجبوری ختم ہوجاتی تو وہ آج ہی مجھے اپنا بستر بوریا گول کرنے کا حکم دے دیتے۔ پورے گروپ میں صرف عینی' اخلاق اور ندیم تھے جو دل سے مجھے اپنا ہم سفر سمجھ رہے تھے۔ ان تینوں میں سے عینی میرے زیادہ قریب آگئی تھی۔ وہ اکثر چور نظروں سے مجھے تکتی رہتی۔ کسی وقت موقع ملتا تو میرے کانوں میں کوئی چنچل سرگوشی کرجاتی۔ کسی وقت سب کی نظر بچا کر میرا ہاتھ دبا دیتی' ایک دو موقعوں پر ایسا بھی ہوا کہ اس نے چند لمحوں کے لیے مکمل تنہائی ڈھونڈلی اور میرے قریب آنا چاہا لیکن میں نے اس حوالے سے ہر بار اس کی حوصلہ شکنی کی اور اپنی حدود میں رہا۔

اپنے طور پر میں حتی الامکان عینی سے دور رہنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بات کرنے کا ذرا سا بھی موقع ملے... مجھے اس گروپ میں اپنی ریپوٹیشن اچھی طرح معلوم تھی۔ میں کسی قیمت پر اس ریپوٹیشن کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس شام میں گروپ سے الگ ہوکر اکیلا ہی درختوں میں نکل گیا۔ ایک درخت تلے ندیم نیم دراز تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ حسب معمول مزاحیہ انداز میں بولا "مجھے تو بھائی جان' اس بے چاری لڑکی کا غم نہیں بھول رہا ہے۔ اف توبہ..." میں اس کی باتوں میں الجھے بغیر آگے بڑھ گیا... ہموار میدان کے آخری کنارے پر جہاں سے کھائی شروع ہوجاتی تھی۔ اخلاق اور نرگس ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ان سے نگاہ چراتے ہوئے میں ڈھلوان پر اتر گیا۔ کچی زمین پر چلتے ہوئے بالکل یوں لگتا تھا کہ میدانی علاقے میں چل رہا ہوں لیکن جب اپنے سامنے نگاہ اٹھتی تھی اور دنیا کی بلند ترین چوٹیاں نظر آتی تھیں تو اندازہ ہوتا تھا کہ میں فرش پر نہیں عرش پر ہوں۔ شوگران میں سیبوں کے بہت سے خودرو درخت ہیں۔ ان درختوں پر چھوٹے سائز کے کچے پکے سیب بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے ایک درخت سے کچھ نیم پختہ سیب توڑے اور دانتوں سے کچل کچل کر ان کا رس چوستا ہوا نیچے درختوں میں چلا گیا۔ ایک پتھر پر نیم دراز ہوکر آنکھیں بند کرلیں اور دلنواز پہاڑی خاموشی کو حیات بخش ہوا میں گھول گھول کر اپنے اندر اتارنے لگا۔ دفعتاً ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" یہ فرحین صاحبہ کی آواز تھی۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں؟" میں جلدی سے اٹھتے

ہوئے بولا۔

ویسے میں اس تنہائی میں فرحین کی آمد پر حیران رہ گیا تھا اور کچھ پریشان بھی ہوا تھا۔ کوئی ہمیں اس تاریکی میں اس طرح بیٹھے دیکھ لیتا تو پتا نہیں کیا سمجھتا۔

وہ آسمانی رنگ کی ساڑی میں ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور باوقار نظر آرہی تھیں۔ ایک ایسی ہستی جسے دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ اس کی عزت کی جائے... اس سے محبت کی جائے۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئیں' ان کا رنگین آنچل دھیرے دھیرے ہوا میں لہرا رہا تھا۔

وہ بولیں "میں آپ سے ایک اہم بات کہنے آئی ہوں" ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

"جی فرمائیں۔"

"میں آپ سے عینی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" ان کے الفاظ اور لہجے نے قرب وجوار کے حسن کو ایک دم گہنا دیا۔

"میں سن رہا ہوں" ایک سرد آہ بھر کر میں نے کہا۔

پُرسوچ توقف کے بعد وہ بولیں "آپ مجھے شکل سے سمجھ دار لگتے ہیں' پڑھے لکھے بھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے رویے پر غور کریں۔"

"کیوں' میرے رویے کو کیا ہوا ہے؟"

"اس سوال کا جواب آپ خود سے پوچھیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔" فرحین نے مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "عینی نوجوان ہے' شوخ طبع اور لاابالی ہے۔ اگر آپ اس کے مزاج سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے تو یہ بہت غلط ہوگا۔"

"میں حتی الامکان اس سے دور رہنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ تم اسے صاف کہہ سکتے ہو کہ وہ تم سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرے۔"

فرحین آپ سے تم پر آگئی تھی۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ اسے "تم" کہہ ڈالوں لیکن خبر نہیں کہ کیا چیز آڑے آگئی۔ میں نے کہا "میرے خیال میں آپ اپنا قیمتی وقت برباد کررہی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے سمجھانے کے بجائے اسے باندھنے کی کوشش کریں۔"

میں نے دانستہ طور پر سخت لہجہ اختیار کیا تو فرحین ذرا نرم پڑ گئیں۔ ان کا لہجہ بھی دھیما پڑ گیا۔ قریباً ایک گھنٹے تک ہم وہاں مصروف گفتگو رہے۔ فرحین صاحبہ عینی کا نفسیاتی تجزیہ کرتی رہیں۔ بتاتی رہیں کہ وہ کوئی قدم سوچ سمجھ کر نہیں اٹھاتی نہ ہی اس کے کسی فیصلے میں پائیداری ہوتی ہے۔ وہ ایک جذباتی لڑکی ہے اور اکثر نقصان بھی اٹھاتی ہے۔ فرحین صاحبہ کا تجزیہ تھا کہ میں عینی کی نادانی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا ہوں۔ جو سراسر غلط ہے اور میرے لیے بہت نقصان دہ بھی ہے کیونکہ برادری میں پہلے ہی میرا امیج زیادہ اچھا نہیں ہے۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں عینی کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کی کوشش کروں اور اس سے کنارہ

ایک بار

پارک میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب دوسرے صاحب سے متعارف ہوئے اور انہیں دعوت دی "آیئے ذرا دیر کرکٹ کھیل لیں۔"

"جی نہیں... میں کرکٹ نہیں کھیلتا۔ زندگی میں ایک بار کھیلی تھی۔ اس کے بعد دل نہیں چاہا۔" دوسرے صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا... تو آیئے تھوڑی دیر والی بال ہی کھیل لیتے ہیں۔" پہلے صاحب نے دعوت دی۔

"جی نہیں... میں والی بال بھی نہیں کھیلتا۔ ایک بار کھیلی تھی پھر کبھی دل نہیں چاہا۔" دوسرے صاحب نے یہ دعوت بھی مسترد کردی۔

"اچھا... تو آیئے تھوڑی دیر بیڈ منٹن ہی کھیل لیتے ہیں۔" پہلے صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے۔"

"میں تو بیڈ منٹن بھی نہیں کھیلتا... لیکن میرا بیٹا آپ کے ساتھ کھیل لے گا۔" دوسرے صاحب بولے۔

"ٹھیک ہے... کوئی حرج نہیں۔" پہلے صاحب نے ملازمت سے کہا "غالباً یہ صاحب زادے آپ کی اکلوتی اولاد ہوں گے؟"

○☆○

کشی اختیار کرلوں۔ نہ صرف اس ٹور کے دوران میں بلکہ بعد میں بھی عینی سے کوئی رابطہ نہ رکھوں۔

فرحین کی شخصیت میں وقار کا کوئی ایسا پہلو تھا کہ میں کوشش کے باوجود ان کی چبھتی ہوئی باتوں کے جواب چبھتے ہوئے لہجے میں نہیں دے پا رہا تھا۔ بہرحال میں نے ان سے وعدہ کیا کہ عینی سے دور رہنے کی پوری کوشش کروں گا۔

شام اب گہری ہو چکی تھی۔ شوگران میں برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ کسی ریسٹورنٹ میں بجنے والے ڈیک کی آواز ان درختوں تک پہنچ رہی تھی۔ غم ہے یا خوشی ہے تو میری زندگی ہے تو۔

فرحین نے بتایا کہ وہ بازار جانے کا بہانہ کرکے یہاں آئی تھیں۔ اب انہیں جانے کی جلدی تھی' وہ واپس چلی گئیں۔ میں دس پندرہ منٹ مزید وہاں بیٹھا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ فرحین اب تک ایک ایسے مسئلے کے لیے سر کھپاتی رہی تھیں جو سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں عینی کا خیال دل سے نکال دوں جبکہ عینی کا خیال یہاں تھا ہی نہیں۔ یہاں تو کسی اور کا خیال تھا۔ اور یہ خیال بڑی تیزی سے دل و دماغ کے قریبی اور دور افتادہ گوشوں تک پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ ایک سحر تھا جو مجھے غیر محسوس طور پر جکڑ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو شخص یہاں میرا ناصح بنا بیٹھا تھا وہی میرا محبوب تھا۔ شاعر حضرات ناصح سے کنی کتراتے ہیں کہ وہ انہیں محبوب سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہاں یہ انوکھا واقعہ ہوا تھا کہ ناصح ہی صنم بن گیا تھا۔ ایک ایسا صنم جسے اپنے گردوپیش کی مطلق خبر نہیں تھی۔

میں واپس ہوٹل پہنچا تو ماحول کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ سب سے پہلے چھوٹے تایا سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا اور قریب کھڑے تنویر سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ پھر میری نظر سکوتی پر پڑی۔ وہ ایک دم آگ بگولا نظر آرہا تھا۔ یہاں تک کہ عینی بھی مجھے گم صم نظر آئی۔ اس دوران میں بڑے تایا' پھنکارتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ میری طرف آرہے تھے۔ یقیناً مجھ سے ہی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن راستے میں ہی اخلاق نے انہیں روک لیا۔ اس نے بڑے تایا کو باقاعدہ اپنے بازوؤں میں لیا اور ان کے کان میں سرگوشیاں کرتا ہوا واپس انہیں کمرے میں لے گیا۔ ہر نگاہ مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ چند لمحے تک کمرے میں بڑے تایا چھوٹے تایا اور اخلاق کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ دونوں تایا سخت غصے میں تھے اور اخلاق غالباً انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ خیال آیا کہ کہیں نیچے درختوں میں میرا فرحین کے ساتھ بیٹھنا ہی تو اس گرما گرمی کا باعث نہیں ہے؟ لیکن یہ خیال دل کو کچھ لگا نہیں۔ میں نے قریب کھڑے ندیم سے پوچھا "آخر ہوا کیا ہے بھئی؟"

ندیم کوئی جواب دیے بغیر کمرے کی طرف چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ صورتِ حال میری توقع سے زیادہ سنگین ہے۔ اسی دوران میں اخلاق کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہوٹل سے باہر پارکنگ میں آگیا۔

"یار' آخر بات کیا ہے؟" میں نے اخلاق سے پوچھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور بولا "تم کہاں سے آرہے ہو؟"

"ذرا چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔ وہاں درختوں میں بیٹھا تھا" میں نے میدان کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کب سے وہاں بیٹھے تھے؟"

"تقریباً ایک گھنٹے سے۔ تم نے اور نرگس نے خود مجھے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہارے پاس سے تو گزر کر گیا تھا۔ لیکن... لیکن تم یوں تھانے داروں کی طرح مجھ سے سوال کیوں کر رہے ہو؟"

"یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے" اخلاق نے گہری سانس لے کر کہا "کسی نے فوزیہ کے ساتھ سخت بدتمیزی کی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میری حیرت عروج کو پہنچ گئی۔

"جہاں میں اور نرگس بیٹھے باتیں کر رہے تھے' وہاں پاس ہی فوزیہ بھی درختوں میں بیٹھی تھی۔ اندھیرے میں کوئی اس پر جھپٹا اور کھینچ کر نیچے کھائی میں لے جانے کی کوشش کی۔ اس نے فوزیہ کی چیخ و پکار روکنے کے لیے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ فوزیہ نے خود کو چھڑا کر شور مچا دیا۔ گھبرا کر اس نے فوزیہ کو دھکا دیا اور بھاگ گیا۔ یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔"

میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اخلاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اور تمہیں شبہ ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے؟"

"میں ہرگز ایسا نہیں سوچ سکتا لیکن... لیکن فوزیہ... میرا مطلب ہے کہ فوزیہ..."

"یعنی فوزیہ میرا نام لے رہی ہے؟"

اخلاق مجھ سے نظر چرا کر درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔

میرے بدن میں جوالا مکھی دہکنے لگا تھا۔ مجھے کسی ایسے

حادثے کا اندیشہ بہت پہلے سے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اخلاق کے ساتھ اس گروپ میں شامل ہونے سے انکار کررہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری موجودگی جہاں ان لوگوں کی تفریح برباد کرے گی' وہاں میرے بہت سے زخموں کو بھی تازہ کردے گی۔

میں نے اخلاق کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر کہا "مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم بھی فوزیہ کے بیان کو درست سمجھ رہے ہو۔ اگر ایسی بات ہے دوست تو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں ہی اس لائق۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے سیدھا سیدھا پولیس کے حوالے کردو یا پھر خود سارے مل کر میری ہڈی پسلیاں توڑدو۔"

اخلاق نے بے قرار ہوکر میرا ہاتھ تھام لیا "یہ کیسی باتیں کرتے ہو تیمور!"

"مجھے ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں" میں نے زور دے کر کہا۔

اتنے میں ندیم بھی گتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں آگیا۔ وہ بلا تمہید بولا "میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا اخلاق بھائی کہ فوزیہ وہاں اندھیرے میں کر کیا رہی تھی؟"

اخلاق چند لمحے خاموش رہ کر بولا "شرارت کررہی تھی اور کیا کررہی تھی۔"

"میں سمجھا نہیں" ندیم نے کہا۔

"میں اور نرگس وہاں بیٹھے باتیں کررہے تھے' وہ شرارت کے موڈ میں تھی۔ چھپتی ہوئی درختوں میں چلی گئی تاکہ ہماری باتیں سن سکے۔"

"وہاں پر گہری تاریکی ہے۔ فوزیہ نے کیسے دیکھ لیا کہ اس سے ہاتھا پائی کرنے والا کون ہے؟" ندیم نے نکتہ اٹھایا۔

"یہی بات میرے ذہن میں بھی آئی ہے۔ لیکن وہ بڑے یقین سے۔"

ایک بار پھر اخلاق نے میری دل آزاری کے خیال سے فقرہ ادھورا چھوڑدیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ خوف سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ الٹی سیدھی ہانک رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں ہوں ہی اسی قابل کہ مجھ پر اس قسم کا گھٹیا الزام لگایا جاتا" میری آنکھیں بے اختیار ڈبڈبا گئی تھیں۔

اخلاق نے میرا شانہ تھامنا چاہا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میرا یہ خیال ہے کہ مجھے اب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے" میں نے کہا اور تیزی سے ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں نے اپنا سامان پیک کیا اور پندرہ بیس منٹ کے اندر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں ہوٹل چھوڑنے کے لیے کمرے سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اخلاق اور ندیم کمرے میں آدھمکے۔ اخلاق نے میرے کندھے سے زبردستی بیگ اتارلیا اور بولا "تم کہیں نہیں جاؤگے' اگر تم جاؤگے تو پھر ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد بڑے ماموں کے ساتھ اپنے تعلقات پر مجھے نظرثانی کرنا ہوگی۔"

میں نے کہا "تم اس معاملے کو طول دینے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ مجھے ایک بار پھر اپنی اوقات کا پتا چل گیا ہے۔"

اخلاق اور ندیم اصرار کرتے رہے' میں انکار کرتا رہا۔ بات نے جب بہت طول کھینچا تو اخلاق ایک دم آزردہ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولا "ٹھیک ہے تیمور! تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ میرا کوئی زور نہیں ہے تم پر۔ لیکن اگر تم نے جانا ہی ہے تو صرف ایک دن کے لیے رک جاؤ۔ میں تمہیں یوں ملزم کی حیثیت سے نہیں جانے دوں گا۔ میں ہر صورت میں کل تک



کھوج لگاؤں گا کہ فوزیہ سے دست درازی کرنے والا کون تھا۔"

"کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا "جب لڑکی خود میرے خلاف گواہی دے رہی ہے تو پھر اور کس کی گواہی معتبر ہوگی۔"

"لڑکی کی بات چھوڑو۔ وہ تو اپنے حواس میں نہیں۔ تم بس مجھے ایک دن کی مہلت دے دو۔"

ندیم بولا "ویسے بھی موسم بے حد خراب ہو رہا ہے۔ بوندا باندی بھی شروع ہوگئی ہے' اس وقت آپ کا نکلنا کسی طور مناسب نہیں۔"

ندیم اور اخلاق نے کسی نہ کسی طرح مجھے روک لیا۔ احتیاط کے طور پر جاتے ہوئے وہ باہر سے دروازہ بھی بند کرگئے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اخلاق اور ندیم اگلے روز دوپہر تک سرگرمی سے اس کھوج میں لگے رہے تھے کہ اندھیرے میں فوزیہ سے بدسلوکی کرنے والا کون تھا؟ لیکن وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ گروپ میں تو میرے سوا سبھی شریف زادے تھے۔ ہوٹل کے ملازمین اور ویٹرز وغیرہ کو بھی شاملِ تفتیش کیا گیا مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ فوزیہ نے بدحواسی کے عالم میں میرے خلاف بیان تو داغ دیا تھا لیکن وہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دے پائی تھی۔ فوزیہ کے بقول اس نے حملہ آور کا منہ نوچا تھا اور تھپڑ وغیرہ مارے تھے۔ منہ نوچا جائے تو اکثر چہرے پر ناخنوں کے نشانات رہ جاتے ہیں۔ ایسے نشانات کسی کے چہرے پر نظر نہیں آرہے تھے۔ حتیٰ کہ میرے چہرے پر بھی نہیں تھے حالانکہ "اعلان شدہ" ملزم میں ہی تھا۔

دوپہر کو چھوٹے تایا اور تائی جان میرے پاس آئے۔ اخلاق بھی ان کے ساتھ تھا۔ چھوٹے تایا نے معذرت کا رویہ اختیار کیا' کہنے لگے "بھائی صاحب کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہیں لیکن کیا کیا جائے' بزرگ ہیں۔ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ویسے دل میں غصہ نہیں رکھتے' ابھی آگ بگولا ہوتے ہیں' ابھی نارمل ہوجاتے ہیں۔ اب صبح سے خاموش بیٹھے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تیمور پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا؟"

تائی بھی چکنی چپڑی باتیں کرنے لگیں۔ میں جانتا تھا' جو کچھ ان کی زبان پر ہے وہ دل میں نہیں ہے۔ ہونے والے داماد کی خاطر انہوں نے اپنے غیظ و غضب کو وقتی طور پر پسِ منظر میں دھکیل کر میری الٹک شوئی کی کوشش کی تھی۔

سہ پہر کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے ایک بار پھر شوگران میں ہی رکنے پر مجبور کردیا۔ میں اور اخلاق کمرے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ تنویر بھاگا بھاگا آیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا' وہ بولا "ایک بری خبر ہے اخلاق بھائی! جھیل سیف الملوک والے لڑکوں کا گروپ بھی شوگران آگیا ہے۔ میں نے ابھی ابھی انہیں نئے ہوٹل کے پاس جیپوں سے اترتے دیکھا ہے۔"

"اوہ' مائی گاڈ!" اخلاق کے منہ سے نکلا اور اس کے چہرے پر تشویش پھیل گئی "ان لوگوں نے بھی تمہیں دیکھا ہے" اخلاق نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ دیکھا ہے" تنویر نے جواب دیا۔

"اب کیا کیا جائے؟" اخلاق نے مجھ سے پوچھا۔

"اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرسکتا ہے۔"

اخلاق چاہتا تھا کہ گروپ کے باقی ارکان سے یہ اطلاع چھپا کر رکھی جائے لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں تھا۔ شوگران چھوٹا سا ہل اسٹیشن ہے۔ وہاں بیس بائیس لڑکوں کا گروپ چھپا کیسے رہ سکتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں یہ خبر ہماری پارٹی کے سبھی ارکان کو معلوم ہوچکی تھی کہ جھیل والے لڑکے یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ اب دو صورتیں ہوسکتی تھیں' ایک تو یہ لڑکے اتفاقاً یہاں پہنچے تھے' دوسرے انہوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ دونوں صورتوں میں ہمارے لیے بدمزگی کا سامان بہرحال موجود تھا۔ اخلاق وغیرہ شوگران سے آگے سری پائے نامی مقام پر جانا چاہتے تھے اور وہاں کیمپنگ کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اب سب کچھ چوپٹ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکوں نے شام تک ہمارے ٹھکانے کا کھوج بھی لگالیا۔ وہ دو تین بار ٹولیوں کی صورت میں شور شرابا کرتے ہوٹل کے سامنے سے گزرے۔ ان میں دو تین نئے چہرے بھی نظر آرہے تھے۔ شاید یہ لوگ بعد میں ان کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ یہ نئے چہرے حلیے اور صورت کے اعتبار سے چھٹے ہوئے خوش حال غنڈے نظر آتے تھے' ان میں سے ایک کے پاس موبائل فون بھی تھا۔

شام کے بعد میں اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا کہ فرحین وہاں آئیں۔ انہوں نے دوپٹا سر پر اوڑھ کر کانوں کے پیچھے سے اڑس رکھا تھا۔ دوپٹے کے اس انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے تک نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکا۔ انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا اور جلدی سے بولیں "اسے پڑھ لیجئے گا۔"

اس داستانِ محبت کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



تلاش

طاہر جاوید مغل

ایک خوش حال و خوش خصال شخص کا قصہ۔ اُسے اپنے لیے بیوی کی تلاش تھی۔ معصوم و سادہ اور گل نو دمیدہ کی طرح تازہ۔ بجوبیا گوہر کمیاب! پھر جیسے اُس نے اپنے خواب کی تعبیر پالی۔ اسی دُنیا کی ایک لڑکی اُسے مل گئی۔

ایک سادہ مگر پُرکار لڑکی کا اُس نہ دو مردوں کی سنگی طبیعت کی شناسائی تھی

مرزا کامران چونتیس پینتیس سال کا خوش پوش شخص تھا۔ گاڑی، کوٹھی، کاروبار، نوکر چاکر سب کچھ اسے میسر تھا۔ اگر کمی تھی تو بس ایک خوبصورت و خوش خصال بیوی کی۔ کامران کی پہلی شادی قریباً آٹھ برس پیشتر ہوئی تھی۔ اس وقت تک اس کے والدین حیات تھے اور یہ شادی انہی کی پسند کی تھی۔ شادی کے دو تین سال بعد میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہونا شروع ہوئے اور اگلے تین سال میں نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ کامران کی صرف ایک بچی تھی، یہ بچی اس کی بیوی اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ اب پچھلے دو سال سے وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پچھلے تین چار سال سے تنہا زندگی گزار رہا تھا کیوں کہ اپنی ازدواجی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو سال، وہ اپنی بیوی سے اتنا ہی دور رہا تھا جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی۔

بہار کا خوشگوار موسم تھا جب اس نے اپنے لیے دوسری

بیوی کی تلاش کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتا تھا۔ پہلی شادی کا تجربہ اس کے سامنے تھا۔ اس تجربے میں اس نے جو سب سے اہم بات نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اس کا نباہ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے جو بہت ہوشیار اور چالاک نہ ہو۔ کم گو ہو اور معصومیت اس کے کردار کا جوہر خاص ہو۔

ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ خاندان کے ایک دو بزرگوں کو تلاش کے کام پر لگایا۔ اس کے علاوہ رشتے کرانے والی خواتین کی خدمات بھی حاصل کرلیں۔ رشتے آنے اور جانے لگے۔ میل ملاپ شروع ہوا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک آئیڈیل مرد تھا۔ صحت مند، خوشحال، صاحب جائداد اور تن تنہا۔ واحد داغ طلاق تھا لیکن یہ داغ اس کی بہت سی خوبیوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ مختلف خاندانوں کی بہت سی لڑکیاں زیر غور آئیں لیکن جس لڑکی کی کامران کو تلاش تھی وہ کہیں دکھائی نہیں دی بلکہ اس "معیار" کے قریب قریب بھی کوئی نظر نہیں آئی۔ کبھی کبھی وہ تنہائی میں بیٹھتا اور سوچنے لگتا، کہیں وہ سراب کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہا۔ یہ دنیا ہے۔ جو اس میں رہتا ہے وہ اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ وہ کتنا بھی الگ تھلگ ہو، خواہ سات پردوں میں چھپا رہے لیکن معاشرت کی چھاپ اس پر لگ کر رہتی ہے۔ کہاں سے ملے گی اسے ایسی لڑکی جو ہر جسمانی و ذہنی آلودگی سے پاک ہو۔ جس کے کان میں کسی سہیلی کی سرگوشی نہ گونجی ہو۔ جس کی آنکھ کسی چلمن سے نہ لگی ہو۔ جس کا دل اپنے کسی چچا زاد، ماموں زاد یا پھوپی زاد کے لیے نہ دھڑکا ہو۔ جس کو پتا ہی نہ ہو کہ مرد و زن کی محبت کیا چیز ہے اور جنس کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کا دل گواہی دیتا کہ وہ کوشش کرے تو ایسا گوہر نایاب ڈھونڈ سکتا ہے۔ شہر میں نہ سہی گاؤں میں، گاؤں میں نہ سہی کسی دور دراز پہاڑی بستی میں، پہاڑی بستی میں نہ سہی کسی الگ تھلگ وادی کے تنہا مکان میں۔ کہیں نہ کہیں ایسی لڑکی ضرور ملے گی جو معصومیت و سادگی کے اس اعلیٰ معیار پر پوری اترے گی۔

اس نے اپنی تگ و دو جاری رکھی۔ ڈھونڈنے والوں کو دور دور دوڑایا جیسے جیسے موقع ملا خود بھی اس کار دشوار میں حصہ لیا۔ اور کبھی کبھی اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ جیسے منزل کے نزدیک پہنچ گیا ہے لیکن جب باریک بینی سے جائزہ لیا گیا تو کامیابی ناکامی میں بدل گئی۔ مضافاتی علاقوں میں ملنے والی تین چار لڑکیاں تو ایسی تھیں کہ جن کے والدین اس بات پر تیار نہیں ہوئے کہ "لڑکی لڑکے" کو آمنے سامنے بٹھا کر بات چیت کرنے کا موقع دیا جائے۔ کچھ لڑکیاں بظاہر بے حد معصوم قسم کی آئیں مگر کامران کے معیار پر پوری نہیں اتریں۔ ایک لڑکی ایسی تھی جو واقعی معصوم تھی لیکن "اس قدر" معصوم تھی کہ اسے دماغی علاج کی ضرورت تھی۔ (وہ ایب نارمل تھی) ایک دو لڑکیوں کے بارے میں اسے غلط اطلاعات فراہم کی گئیں۔ ان میں صرف شکل و صورت کی حد تک سادگی و معصومیت تھی۔ پھر ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ کامران کے نزدیک معصومیت اور جاہلیت میں بے حد فرق تھا۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو شریک حیات بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، جس نے مناسب تعلیم نہ پائی ہو۔ کامران کے ننھیال کا تعلق ایبٹ آباد و مری سے تھا۔ وہاں سے ایک دو ایسی خوبصورت لڑکیاں ڈھونڈی گئیں جنہوں نے خالص دیہی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ مگر وہ تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے، کامران کو بھی ایک روز گوہر مقصود ہاتھ آگیا۔ اس روز اسے لگا جیسے واقعی کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس نے انارکلی کے بالو بازار میں ایک برقع پوش لڑکی کو ایک دکاندار سے چوڑیاں خریدتے دیکھا۔ دو ادھیڑ عمر عورتیں بھی لڑکی کے ساتھ تھیں۔ اسے لڑکی کے چہرے کا صرف ایک تہائی حصہ دکھائی دیا۔ اس "حصے" میں دو آنکھیں بھی تھیں۔ یہ آنکھیں دو ایسے دریچوں جیسی تھیں جن کے راستے کامران کو ہر وہ چیز نظر آگئی جسے دیکھنے کے لیے وہ ایک عمر سے ترس رہا تھا۔ مگر ابھی یہ صرف ایک خواب تھا۔ اس خواب کو تعبیر اس وقت ملنا تھی جب کامران اُس لڑکی سے ملتا، اس سے بات کرتا اور اسے قریب سے دیکھ لیا۔

اس نے اپنی عمر و مرتبے کا لحاظ کیے بغیر کسی کالج لڑکے کی طرح لڑکی کا تعاقب کیا اور اس کا گھر دیکھ لیا۔ اگلے دو روز میں اسے بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ لڑکی کا تعلق میانوالی کے ایک نہایت شریف اور مہذب گھرانے سے تھا۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے۔ ان کے صرف تین بچے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا تھا۔ جو سعودی عرب میں کام کرتا تھا اور مستقل طور پر وہیں مقیم تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی ایک معروف عالم دین کے صاحبزادے سے انجام پا چکی تھی۔ یہ سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ اپنی بہن کی طرح اس نے بھی بی اے کے بعد تمام تعلیم گھر ہی میں حاصل کی تھی۔ لڑکی کا نام سلمیٰ معلوم ہوا۔ وہ لاہور کی سیر کے لیے آئی ہوئی تھی اور والدین کے ساتھ اپنی بہن کے گھر میں مقیم تھی۔ دو تین روز بعد یہ لوگ

سیانوالی واپس جارہے تھے۔

ان لوگوں کا اتا پتا معلوم کرنے کے بعد کامران نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ کے ذریعے بات چیت آگے بڑھائی۔ لڑکی کی کہیں منگنی وغیرہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کی عمر صرف انیس برس تھی۔ تاہم اس خاندان میں لڑکیوں کی شادیاں بہت جلد کرنے کا رواج تھا اور یہ امید کی جاسکتی تھی کہ والدین کو ایک ڈیڑھ سال کے اندر شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کامران اور سلمٰی کی عمروں میں فرق ضرور تھا لیکن کامران کی نہایت اچھی صحت کے سبب یہ فرق کم محسوس ہوتا تھا۔ لڑکی والوں کے معاشی حالات بھی کچھ دگرگوں تھے اور انہیں توقع نہیں تھی کہ مستقبل قریب میں کوئی ایسا وجیہہ' خوشحال اور بااثر داماد انہیں مل سکے گا۔ انہوں نے اِس سلسلے میں نیم رضامندی ظاہر کردی۔ جو بزرگ کامران کی طرف سے سلسلہ جنبانی کے لیے گئے تھے وہ کامران کے مزاج آشنا بھی تھے۔ انہوں نے واپس آتے ہی بڑے یقین کے ساتھ کہہ دیا۔ "کامران مرزا! اگر یہ لڑکی بھی تجھے پسند نہ آئی تو پھر کوئی نہیں آئے گی۔"

اور ان کا کہا سچ ثابت ہوا۔ قریباً ایک ماہ تک دونوں گھرانوں میں میل ملاپ جاری رہا اور پھر وہ مرحلہ آگیا جب کامران نے لڑکی کے والد سے درخواست کی کہ وہ ان کی بیٹی سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ شرعی حوالے سے یہ تقاضا معیوب نہیں تھا۔ ویسے بھی دونوں گھرانوں میں بے تکلفی پیدا ہوچلی تھی۔ لہٰذا اسے اجازت مل گئی۔ اس ملاقات میں لڑکی کی والدہ بھی شریک تھیں۔ ملاقات کے ابتدائی چار چھ منٹ میں ہی کامران کا یہ خدشہ بھاپ بن کر اڑ گیا کہ شاید وہ اس لڑکی کو بھی ریجیکٹ کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کا ظاہر جتنا معصوم تھا باطن بھی اتنا ہی سادہ اور بے عیب تھا۔ وہ رات پچھلے پہر کھلنے والی وہ شبنم آلود کلی تھی جس نے دھوپ تو کجا اجالے کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پلکیں لرزاں لبوں میں جنبش اور آواز میں شرم و حیا کا ایسا تاثر کہ سننے والا مسحور ہوجائے۔ وہ ننھی سی جان' مٹھی میں بند چڑیا کی طرح ہانپ رہی تھی۔ کامران کی ہمت نہیں ہوئی کہ اسے زیادہ دیر مضطرب رکھے اور وہ اپنی بات چیت مختصر کرکے اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج اُس نے اپنے دل کی مراد پائی ہے۔

کامران کے ہونے والے سسر کا گھر بھی اس کی بیٹی کی طرح سادگی اور شائستگی کا نمونہ تھا۔ اس گھر میں وی سی آر' ٹی وی وغیرہ یا ریڈیو نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ نہ کہیں کوئی

لندن میں ایک صاحب رہن رکھنے والی کمپنی میں اپنی کار دو مہینے کے لئے رہن رکھوانا چاہتے تھے۔ منیجر نے جب ان سے رہن کی رقم دریافت کی تو ان صاحب نے فرمایا "ایک پونڈ۔"

منیجر کو بہت تعجب ہوا اور اس نے اعتراض بھی کیا کہ یہ رقم بہت کم ہے لیکن وہ صاحب مُصر تھے کہ ایک پونڈ سے زیادہ کی رقم کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے وہ صرف ایک پونڈ ہی لیں گے۔ منیجر نے کار رکھ لی اور انہیں ایک پونڈ ادا کردیا گیا۔

دو مہینے بعد ہی وہی صاحب دوبارہ کمپنی پہنچے اور رہن کی رقم مع سود کے ادا کردی جو ایک پونڈ اور چند پنس بنتی تھی۔ منیجر نے ایک بار پھر ان سے پوچھا کہ ایک پونڈ کے عوض کار رہن رکھنے کی وجہ کیا تھی؟

وہ صاحب کچھ دیر تو ٹالتے رہے لیکن منیجر نے اصرار کیا تو بولے "دراصل مجھے دو ماہ کے لئے شہر سے باہر جانا تھا اور لندن میں کوئی بھی گیراج پندرہ پونڈ ماہوار سے کم کا نہیں تھا۔"

☆☆☆

پینٹنگ نظر آئی نہ تصویر۔ چھوٹی سی گھریلو لائبریری میں نہایت سنجیدہ اور علمی قسم کی کتب رکھی تھیں۔ کامران کے ہونے والے سسر نے بتایا کہ وہ آج تک گھر میں اخبار نہیں لائے۔ انہوں نے بچوں کی تربیت اس طرح کی تھی کہ انہیں تفریح کے ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ انہیں تفریح بھی کراتے تھے لیکن یہ تفریح کھیل کود کی صورت میں چار دیواری کے اندر ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ انہیں اچھی اور اصلاحی کتب پڑھنے کو دیتے تھے۔ پاکستان کے خوبصورت مقامات دیکھنے کا انہیں شوق تھا اور یہ شوق ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوا تھا۔ وہ بڑے اہتمام سے اپنے بچوں کو تفریحی دوروں پر لے جاتے تھے۔ سلمٰی کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے مڈل کے بعد گھر میں خاتون

اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہے اور پرائیویٹ امتحان دے کر فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا ہے۔ دو ماہ بعد کامران چند قریبی عزیزوں اور ساتھیوں کے ساتھ میانوالی گیا اور سادگی کے ساتھ سلمٰی سے نکاح کرلیا۔۔۔ دو روز بعد ایک زبردست ولیمے کا پروگرام تھا اور اس کے لیے ایک ہفتہ پہلے تیاری شروع ہوچکی تھی۔

سہاگ رات کامران کے لیے انمول خوشیوں کا پیام لے کر آئی۔ سلمٰی کے دلکشیں قرب نے اسے مسحور کردیا۔ اس کی ایک ایک معصوم ادا پر اس کا جان دینے کو دل چاہ رہا تھا۔۔۔ اگلی شب اس سے بھی زیادہ حسین تھی۔ کامران کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سلمٰی کے ساتھ اس کھڑکی میں کھڑا ہوجائے جو مشرق کے رخ پر کھلتی ہے اور جس میں درمیانی راتوں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ وہ اس سے باتیں کرتا رہے۔ شوخ شریر اور ہنستی مسکراتی باتیں۔ اس کی نگاہیں اپنی شریک حیات کے گلاب رنگ چہرے پر جمی رہیں اور یوں ہی عمر بیت جائے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ نوعمر حسینہ کہیں اجنبی سیارے سے آئی ہے۔ وہ اس کی انگلی تھام کر اسے زمین کی سیر کرا رہا ہے۔ اسے چاندنی' خوشبو' بادِ صبا اور دھوپ سے متعارف کرا رہا ہے' وہ ہر شے کو ایک دلفریب حیرانی سے دیکھ رہی ہے اور دانتوں میں انگلی دبا رہی ہے۔

رات دوسرے پہر وہ دونوں ایک ہی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ کامران نے غیر ملکی سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا "میں نے سنا ہے کہ تم اپنی تنہائی پسند فیملی میں سب سے زیادہ تنہائی پسند ہو۔ گھنٹوں' کمرے میں بند سوئی رہتی ہو۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا۔" وہ اپنی نوخیز آواز میں بولی۔

"تمہارے ابّو نے۔۔۔ جو اب رشتے میں میرے بھی ابّو ہیں۔"

وہ ہنسی تو جیسے خواب گاہ میں چھوٹی چھوٹی نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ "میں کمرے میں بند ضرور رہتی ہوں لیکن اتنا سوتی نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ فارغ وقت میں اکثر پڑھتی رہتی ہوں۔"

"مثلاً کیا؟"

"وہی جو ابّو پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ یا پھر کورس کی کتابیں۔"

"کورس کی کتابیں تو پڑھنے کی چیز ہی نہیں ہوتیں۔ باقی جو کچھ ابّو تمہیں پڑھنے کے لیے دیتے ہوں گے' وہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے گھر کی لائبریری میں میں نے کتابیں دیکھی تھیں۔ بھئی وہ بھی کوئی کتابیں ہیں پڑھنے کی۔ ایجادوں کی کہانیاں' سائنسی معجزے' حساب کے کرشمات' کلثوم کا دسترخوان' خلا میں سفر' اف تو بالکل نہ اور بور' یا پھر ان میں وہ کتابیں ہیں جن کو لوگ قبر میں لٹکانے کے بعد پڑھتے ہیں مثلاً تاریخ ایشیا' فلسفہ آزادی کی تحریکیں' انقلاب چین۔۔۔ معلوم نہیں ایسی کتابیں' پڑھنے والوں کے حلق سے کیسے اترتی ہیں۔ میں لیٹر پانی کے ساتھ ایک صفحہ بھی نہ نگل سکوں۔ مائی ڈارلنگ اب تم نے نئی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ اب کچھ اور طرح کی کتابیں پڑھا کریں گے ہم۔ ایک ایسی ہی مزیدار کتاب خاص تمہارے لیے لے کر آیا ہوں۔۔۔ تاکہ پڑھو اور دنیا آؤ۔"

اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر ایک مجلد کتاب نکال لی۔ چار رنگ کے خوبصورت سرورق پر ایک مردانہ زنانہ ہاتھ کی شبیہہ تھی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں نے مل کر گلاب کا ایک پھول تھام رکھا تھا۔ کتاب کا عنوان "منزلیں" تھا اور اس عنوان سے ظاہر تھا کہ یہ ایک رومانی ناول ہے۔ اکثر رومانی ناولوں کی طرح یہ ناول بھی کسی نامی مصنفہ نے لکھا تھا۔ ناول کا "فلیپ" ایک مشہور ادیب کا تھا۔

ناول کا سرورق دیکھ کر ہی سلمٰی کے چہرے پر سرخی پھیلنے لگی تھی۔ کامران نے ناول کو مختلف جگہوں سے پڑھنا شروع کیا۔ بہت بے باک تحریر تھی۔ جگہ جگہ شوخی' عریانی کی حد چھوتی محسوس ہوتی تھی۔ رومانی معاملات کو بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کرکے ناشر کو ضمانت فراہم کی گئی تھی کہ اس کی لگائی ہوئی رقم مع منافع چند ہفتوں میں واپس مل جائے گی۔

کامران ناول پڑھتے پڑھتے شریر انداز میں سلمٰی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں حیا آمیز شوخی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایک دو مواقع ایسے بھی آئے کہ اس نے ناول جھپٹ کر بند کرنا چاہا۔ مگر وہ ہر بار اسے طرح دے گیا۔ آخر سلمٰی کی مشکل یوں آسان ہوئی کہ بجلی چلی گئی اور کمرا گہری تیرگی میں ڈوب گیا۔

"اف خدایا" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "کتابوں میں کیسی کیسی باتیں لکھ دی جاتی ہیں۔ بھلا ایسی باتیں بھی لکھنے کی ہوتی ہیں۔"

"مائی لٹل گرل! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟" کامران کی آواز ابھری۔

"نہ جی نہ۔ میں دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ یہ تو بالکل واہیاتی ہے۔" اُس نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپالیا۔

○☆○

اگلے روز ولیمہ تھا۔ ولیمے کے انتظامات کے لیے کامران صبح ہی صبح باہر نکل گیا۔ سلمٰی نے نیا لباس پہنا اور آئینے کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی۔ وہ بظاہر پرسکون نظر آرہی تھی لیکن اس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ رات والا ناول بار بار اس کی نگاہوں میں آتا تھا اور اس کے سیاہ الفاظ اس کے تصور میں چمکنے لگتے تھے۔ وہ جلد سے جلد اس ناول کو پھر دیکھنا چاہتی تھی' تنہائی میں بیٹھ کر پوری یکسوئی سے پڑھنا چاہتی تھی۔

رات بجلی جانے کے بعد کامران نے وہ ناول دوبارہ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ دراز میں تالا لگا ہوا تھا اور چابی کامران نے الماری میں کہیں رکھی تھی۔ بال سنوارنے کے بعد وہ دھڑکتے دل سے اٹھی اور خوابگاہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ معمولی کوشش سے اس نے دراز کی چابی ڈھونڈ لی۔ دراز کھول کر کانپتے ہاتھوں سے اس نے ناول نکالا اور صوفے پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ رات کامران نے بتایا تھا کہ یہ ناول دو تین روز پہلے ہی مارکیٹ میں آیا ہے اور اپنے کھلے ڈلے انداز کی وجہ سے خوب بک رہا ہے۔ واقعی نیا نکور ناول تھا۔ لگتا تھا کہ "پریس" سے نکلتے ہی سیدھا یہاں پہنچ گیا ہے۔ سلمٰی کے حساس نتھنوں نے دور ہی سے اس "نوکھے" ناول کی خوشبو سونگھی' پھر اس کی لرزاں انگلیاں ورق گردانی کرنے لگیں۔ وہ تنہا بیٹھی تھی پھر بھی اس کا چہرہ فرطِ حجاب سے سرخ ہوتا جارہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ خود کو بہت بڑا مجرم سمجھ رہی ہے وہ۔

آخر ناول بند کرکے اس نے تکیے کے نیچے رکھا اور ٹیلی فون کے پاس آگئی۔ اس کی واحد سہیلی اس کی چچا زاد بہن سکینہ تھی لیکن اس سے بھی سلمٰی کو کبھی کبھار ہی ملنے دیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان میں نوجوان لڑکیوں کا مل بیٹھنا اور تنہائی میں سرگوشیاں کرتے رہنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سکینہ لاہور ہی میں رہتی تھی۔ سلمٰی نے اس کا نمبر ڈائل کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی آواز کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف سکینہ کے والد یعنی سلمٰی کے چچا عطاء اللہ صاحب نے فون اٹھایا۔ "کون ہے؟" ان کی کرخت آواز سلمٰی کے کان میں گونجی۔ سلمٰی نے اپنا تعارف کرایا تو آواز کی سختی معدوم ہوگئی اور چند ہی لمحے بعد سکینہ لائن پر تھی۔

"کیا بات ہے سلمٰی؟ صبح ہی صبح؟ خیریت تو ہے؟" کی آواز ابھری۔

"خیریت ہی ہے۔" سلمٰی نے جذبات سے لرزتے لہجے کو کیا۔

"تمہاری آواز سے لگتا ہے کہ کوئی خاص بات ہے؟"

سلمٰی نے جواب میں دو تین سیکنڈ کی خاموشی اختیار پھر دھماکا خیز انداز میں بولی۔ "سکینہ کی بچی' کتی' حرامزادی ناول چھپ گیا ہے....."

"کک..... کون سا؟"

"وہی' نئی منزلیں..... میرے سامنے بستر پر پڑا کامران بازار سے لے کر آئے ہیں۔"

"سچ؟" دوسری جانب سکینہ اتنے زور سے چیخی کہ سلمٰی کے کان میں برے کی طرح گھس گئی۔

"آہستہ بول کم بخت" سلمٰی نے دانت پیسے "کیوں سارے گھر کو اکٹھا کرتا ہے۔"

"اوہ میرے خدا..... سلمٰی! مجھے تو یقین نہیں آرہا۔ سکینہ نے پُرجوش سرگوشی کی "کم بخت مذاق مذاق میں بڑی مصنفہ بن گئی تو..... ویسے تو نے اچھی طرح دیکھ لیا وہی تیرا والا ناول ہے نا؟"

"دیکھا ہی نہیں پڑھا ہے میں نے" سلمٰی نے فخر کہا۔ "حرف بحرف میرا ہے۔ کہیں زیر زبر کا فرق بھی ہے۔ صرف نام میں تبدیلی کی ہے۔ میں نے قلمی نام نرگس لکھا تھا۔ انہوں نے نرگس لکھ دیا ہے۔ اس سے کیا فرق ہے۔"

سکینہ کی آواز آئی "بھئی! مجھ سے تو اب صبر نہیں ہورہا۔ میں تو جارہی ہوں بازار' اپنی بھولی بھالی بنو کا ناول دیکھنے کے لیے۔"

"اری ٹھہر" سلمٰی نے تیزی سے کہا۔ "میرا ایک کام بھی کرنا ہے تو نے۔"

"کہو میری بنو۔"

"میں" مجھے پبلشر کا فون نمبر دے دیتی ہوں۔ اس سے کہنا کہ مجھ سے رابطے کی کوشش نہ کرے۔ جب میں مناسب سمجھوں گی خود اس سے مل لوں گی۔ پاگل! تو تو جانتی ہے۔ نئی نئی شادی ہے' اور یہ مرد..... اف توبہ بڑی گندی "سائیکی" ہوتی ہے ان کی۔ ہر بات پر شک کرتے ہیں۔"

* *



انسان اپنی زندگی میں جس چیز سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ خود زندگی ہے لیکن وہ شخص موت کی تمنا کیوں نہ کرے جس کے زندہ رہنے کا حق کسی موذی مرض نے غصب کر لیا ہو۔ مہینوں سے بدتر اُس زندہ آدمی کا المیہ بھی یہی تھا۔ زندہ رہنے کے لیے اُس کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت کی فراوانی، حسین زوجہ اور محبت کرنے والی ایک دیرینہ، معصوم دوست کی طرف واپس بُلانے کے لیے کیا یہ سب کچھ کافی نہ تھا؟

ایک ہی لمحے میں آنے والے دو مختلف تاثرات کو بیان کرنے کی ایک بہترین کوشش

پیپر کامل

صلاحیت جاوید سلیمی

جاوید راہی نے کہنی اچھی طرح ٹانگوں کے گرد لپیٹا اور گھٹنے سے ٹیک لگا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ یہ دسمبر کی ایک دھند آلود صبح تھی۔ انتہائی سرد اور کالی طاری کرنے والی۔ کینسر یونٹ کے اس کمرے سے اسپتال کے باغیچے کا بس چھوٹا سا حصہ نظر آتا تھا۔ اس حصے کو وہ اتنی دفعہ اور اتنی مدت تک دیکھ چکا تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی ہر پودے اور پیڑ کا نقشہ کھینچ سکتا تھا۔ یہ کوئی ایسا برا نظارا نہیں تھا لیکن اب اسے دیکھتے ہی راہی کو متلی سی ہونے لگتی تھی اور اسی نظارے پر کیا موقوف، کمرے اور اردگرد کی

ہر شے کو دیکھ کر اُس کا جی مائل کرنے لگتا تھا۔ ان اشیا میں نرسوں اور ڈاکٹروں کے چہرے بھی تھے۔ ان کے آلات بھی' حتیٰ کہ ان کی آوازوں کو بھی ان "اشیا" میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ حقیقتاً زندگی جاوید رائی کے لئے ایک عذاب بن چکی تھی۔ وہ زندہ تھا لیکن مُردوں سے بدتر۔ کبھی کبھی جب تیز تسکین دواؤں کے زیر اثر اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہوتا اور ایک بدبودار قے اس کے گلے میں اٹکی ہوتی وہ سوچتا کیوں نہ اس پُراذیت زندگی کا خاتمہ کردیا جائے۔ مگر پھر کسی نہ کسی ڈاکٹر یا نرس کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔ مشفقی انداز میں کہے ہوئے ان کے الفاظ اسے یاد آتے۔ ہمدردی کے فقرے' ڈھارس بندھانے والے جملے "جناب حوصلہ رکھیے..... ہمت کیجئے..... آپ جلد ٹھیک ہوجائیں گے..... بس تھوڑی تکلیف اور رہ گئی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

انسان کو زندگی ہر شے سے بڑھ کر پیاری ہے اور آخری سانس تک اُس کی امید بندھی رہتی ہے۔ رائی بھی ایک انسان تھا اور اسے زندگی اور صحت کی دوسروں سے زیادہ ضرورت تھی۔ زندہ رہنے کے لئے اس کے پاس دولت بھی تھی' جوانی بھی اور..... ایک حسین خوبصورت چہرہ بھی۔ اسے زندہ رہنے کا پورا حق تھا' اور وہ ایک آرام دہ زندگی کا آغاز کرنے والا تھا جب کینسر کے موذی مرض نے اس کا حق غصب کرکے اسے اس کلستھرے ہوئے منحوس کمرے میں لا پھینکا تھا۔ بُرا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ رائی بھی آناً فاناً اس جان لیوا مرض میں گرفتار ہوا تھا۔ کم از کم اس مرض کا انکشاف آناً فاناً ہی ہوا تھا۔

کوئی دس ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ فروری کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ رائی اٹھا تو اسے کمر میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اوّل تو اس نے کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ مگر دوپہر تک تکلیف شدت اختیار کرگئی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے ابتدائی معائنے کے بعد ایک اسپیشلسٹ کی طرف ریفر کیا..... پھر چند ٹیسٹ ہوئے اس کے بعد نہایت تیزی سے طبّی امتحانات اور لیبارٹری ٹیسٹس کا ایک اور راؤنڈ ہوا..... اور تیسرے روز وہ یہ روح فرسا خبر سن رہا تھا کہ اسے کینسر ہوچکا ہے۔ عرصہ پہلے ایک بلند جگہ سے چھلانگ لگاتے ہوئے اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی بعد ازاں علاج معالجے سے چوٹ تو ٹھیک ہوگئی مگر کبھی کبھی درد ہوتا تھا۔ اور اب یہ درد کینسر کا روپ دھار گیا تھا۔ رائی علاج کے لئے اسپتال میں داخل ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے لئے کیمو تھراپی تجویز کی..... کیمو بُو والی دواؤں' پرہیزی غذاؤں اور قید تنہائی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ پانچ ماہ کے صبر آزما علاج کے بعد اسے اسپتال سے فارغ کردیا گیا..... مگر صرف چار ماہ بعد مرض پھر شدت سے عود کر آیا اور اب..... اب وہ دوبارہ آزاد دنیا سے کٹ کر اسپتال کے اسی کمرے میں پہنچ چکا تھا جہاں ایک کھڑکی سے باغیچے کا ایک چھوٹا سا حصہ نظر آتا تھا اور برائی طرز کی اونچی چھتوں کے نیچے ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایڑیوں کی ٹھک ٹھک اور سرنجوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کوئی آواز کم ہی سنائی دیتی تھی۔ اس دفعہ اسے زیادہ طاقتور دوائیں استعمال کرائی جارہی تھیں۔ ان دواؤں سے اُس کے سر کے بال جھڑنے لگے تھے' جلد خشک ہوگئی تھی اور ہر وقت متلی کی کیفیت اس پر طاری رہتی تھی۔

کھڑکی سے باہر دُھندلاہٹ کچھ چھٹنے لگی تھی۔ رائی نے سوچا اسپتال سے باہر سڑکوں پر ٹریفک کا زور بڑھنے لگا ہوگا۔ لوگ بغل میں ہاتھ دبائے دھوپ سینکنے کے لئے کھلی جگہوں پر نکل آئے ہوں گے۔ کھلے میدانوں میں لڑکے بالے دسمبر کی چھٹیوں سے لطف اٹھا رہے ہوں گے۔ شاہراہ قائد اعظم کے یونے ریسٹورنٹ کے ملازمین نے کھانے کی تیاری شروع کردی ہوگی۔ ان کے کچن میں خوشبوئیں چکرا رہی ہوں گی۔ لیکن وہ ان خوشبوؤں' ان باغوں سے اور دھوپ سے بہت دور تھا اور نہ جانے کب تک اسے دور رہنا تھا۔ یہاں سے واپس بھی جانا تھا یا نہیں؟

اچانک وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے گھڑی دیکھی یہ نرس کی آمد کا وقت نہیں تھا۔ کسی انجانے خدشے کے تحت اس نے ہاتھ بڑھایا اور وہ خشک گلدستہ اچھی طرح تکیے سے ڈھانپ دیا جو چند روز پہلے اُس کا ایک دوست لے کر آیا تھا۔ پچھلے چند مہینوں میں یہ واحد دوست تھا جس نے اس کی خبر گیری کی تھی۔ دستک دوسری بار ہوئی۔ "آجاؤ" اس نے نحیف آواز میں کہا۔ دروازہ کھلا اور ایک دراز قد شخص اندر آگیا۔ اس کی عمر کوئی پینتالیس سال رہی ہوگی۔ چوڑے جبڑے' سوجھی ہوئی آنکھیں' گھنی بھویں' ہائی نیک سوئیٹر اور پتلون۔ وہ ایک بارعب شخص تھا۔ اسے دیکھتے ہی رائی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ آنکھوں میں مسرت کی چمک لئے کسی معمول کی طرح بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

دراز قد شخص جلدی سے بولا "لیٹو۔ لیٹو۔ تم کیوں اٹھ رہے ہو؟"

اُس کی آواز بھی اس کی طرح بارعب اور قائل کرنے والی تھی۔ معانقے کے بعد اس نے رائی کو دوبارہ بستر پر بٹھادیا۔

"عظیم صاحب! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا" رائی لرزاں آواز میں بولا۔

دراز قد شخص جس کا نام عظیم بیگ تھا' مسکرایا اور بولا۔ "ڈیڑھ برس کا عرصہ کچھ بہت زیادہ تو نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے ہماری آخری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی۔"

"جی ہاں" رائی نے کہا "میں وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں۔"

عظیم نے کہا "مجھے تمہاری علالت کا پتا چلا' اس لئے چلا آیا..... سناؤ اب کیا حال ہے؟"

رائی نے مختصراً اپنے مرض اور علاج کے بارے میں بتایا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے وہ بے حد مؤدب اور مرعوب نظر آتا تھا۔ یوں

تا تھا جیسے کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے مصروف گفتگو ہو۔ قریب ہی راہی کی میڈیکل فائل رکھی تھی۔ عظیم بیگ فائل اٹھا کر دیکھنے ۔ راہی کی ٹیسٹ رپورٹیں' دواؤں کے نسخے' ڈاکٹروں کی آراء ب کچھ فائل میں موجود تھا۔ عظیم بیگ خود بھی میڈیکل کی سوجھ جھ رکھتا تھا۔ وہ ماضی میں ایک کامیاب ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی رہا ہا۔ اس نے بغور فائل کو دیکھا پھر اس کی بیماری کے متعلق والات کرنے لگا۔ راہی کو بھی دکھ سننے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ اس نے سب کچھ پوری تفصیل اور رقت کے ساتھ گوش گزار کیا۔ اس ساری گفتگو میں اس کی نگاہیں نیچی اور انداز بے حد مؤدبانہ رہا تھا۔

راہی خاموش ہوا تو عظیم بیگ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور بولا "راہی' تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

راہی نے سراپا عجز و انکسار بن کر کہا "جناب' آپ کا مشورہ ہمیشہ مجھے جان سے عزیز رہا ہے۔"

"راہی' میں نے تمہارا کیس بغور دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے تم اسپتال سے چھٹی لے لو۔ جس ماحول میں تم رہ رہے ہو' مجھے امید نہیں کہ کوئی فائدہ ہو۔"

راہی اپنی حیرانی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن بھی طلوع ہو رہی تھی۔ عظیم بیگ نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "کئی پیچیدہ امراض بعض اوقات معمولی دواؤں سے یا خود بخود بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں بشرطیکہ مریض خوش رہے اور نارمل زندگی گزارے۔۔۔ تم اگر اسپتال سے چھٹی لے لو تو میں تمہیں ایک غذائی چارٹ بنا کر بھیجوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارے لئے اس علاج سے بڑھ کر سود مند رہے گا۔"

راہی نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا "عظیم صاحب' میں خود اس زندگی سے عاجز آ چکا ہوں۔ خدا کی قسم مجھے ان دواؤں اور در و دیوار سے چھٹکارا مل جائے تو میں ہر شرط قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

عظیم بیگ نے ہمیشہ کی طرح سپاٹ آواز میں کہا "کوئی کڑی شرط نہیں ہوگی۔ صرف خوش رہنا ہوگا اور زندگی میں بھرپور حصہ لینا ہوگا۔۔۔ آرام کی جگہ مصروفیت' فاقے کی جگہ کھانا اور دواؤں کی جگہ سیر و تفریح۔ مجھے یقین ہے تمہیں فائدہ ہوگا۔"

○☆○

عظیم بیگ کی بات ٹالنا راہی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اسی روز خود کو اسپتال سے ڈسچارج کرایا اور گھر آ گیا۔ ٹھیک دو روز بعد اسے عظیم بیگ کی جانب سے غذائی چارٹ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مل گیا۔ چارٹ دیکھ کر اس کی حیرتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ کوئی خاص پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ صرف کھانوں کی ترتیب تھی۔ چند غذائی اشیاء کو دوسری غذائی اشیاء کے ساتھ ملا کر کھانے کی تاکید تھی' اور کچھ ایسی ڈشیں کھانے کی بھی

> ایک ہوٹل میں نئے شادی شدہ جوڑوں کے لئے ہدایت درج تھی۔
> "کھڑکیوں پر پردے ضرور ڈال لیجئے۔ آپ کا پیار اندھا ہو سکتا ہے مگر آپ کے پڑوسی نہیں۔"

اجازت دے دی گئی تھی جو اس سے پیشتر راہی نے کھائی ہی نہیں تھیں یا اسے توفیق نہیں ہوئی تھی۔

اس روز سے راہی نے اپنی زندگی کو ایک نئی نہج پر ڈال دیا۔ شب و روز کے معمولات بدل گئے اور وہ گویا ایکا ایکی ایک صحت مند شخص کی زندگی گزارنے لگا۔ دوائیں چھوڑنے کی وجہ سے طبیعت کی سستی دور ہو گئی اور ہر وقت کی متلی بھی جاتی رہی۔ ایک ہی ہفتے میں وہ سکون کی نیند سونے لگا اور کھانے سے لطف حاصل کرنے لگا۔ ایک ہفتہ پہلے جن خوشیوں کا دور دور پتا نہیں تھا وہ آج اس کے قدموں میں تھیں۔ وہ حیرانی سے کبھی خود کو اور کبھی اپنے ماحول کو دیکھتا تھا۔ وہ ایک بڑے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ زندگی کی تمام سہولتیں اس گھر میں موجود تھیں اگر کوئی کمی تھی تو اُس پری چہرہ کی تھی۔ ایک سال پہلے وہ یہ کمی بھی پوری کرنے والا تھا جب اچانک اس پر بیماری کا حملہ ہوا تھا اور وہ سب کچھ بھول کر زندگی بچانے کی تگ و دو میں لگ گیا تھا۔ اب فکر و پریشانی سے آزادی نصیب ہوئی' جسم میں کچھ توانائی آئی تو سوچیں رنگین ہونے لگیں۔ اس کا دھیان آپوں آپ راحیلہ کی طرف جانے لگا۔ اسے یاد آیا کہ آخری بار وہ دونوں گلشن اقبال میں ملے تھے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد دو مہینوں میں اس نے تین دفعہ راحیلہ کو ملنے کا وقت دیا لیکن نہیں ملا۔ وہ جان بوجھ کر نہیں پہنچا تھا۔ تیسری دفعہ جب وہ وقت پر نہیں پہنچا تو راحیلہ کا پُرغضب ٹیلی فون موصول ہوا تھا۔ اس نے نہایت غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

"راہی' میرا خیال ہے تمہاری مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ مجھے افسوس ہے میں اب تک تمہیں ڈسٹرب کرتی رہی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے بات ختم کر دی تھی اور تیسرے روز ایک پارسل میں اسے وہ تمام تحائف واپس مل گئے تھے جو وہ وقتاً فوقتاً راحیلہ کی نذر کرتا رہا تھا۔ راہی ان تحائف کو دیکھ کر بہت دیر گم صم بیٹھا رہا تھا اور اپنی بے بسی پر خود ہی مسکراتا رہا تھا۔

لیکن اب..... چونکہ وہ نئے سرے سے زندگی شروع کر رہا تھا اس لئے راحیلہ کی یاد بھی ایک نئی خوشبو کے ساتھ اس کے ذہن میں در آئی تھی۔ اس نے ایک شام ٹیلی فون اٹھایا اور راحیلہ کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے بولنے والا کوئی اجنبی تھا۔ راہی نے اُس سے بینک آفیسر راحیلہ قریشی کے بارے میں پوچھا۔

اس نے بتایا وہ تو یہ مکان چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ راہی نے سمجھا کہ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ اگلے روز وہ بینک جا پہنچا۔ وہاں سے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ ملازمت چھوڑ گئی ہے۔ راہی کو اب راحیلہ کے نئے ٹھکانے کی فکر ہوئی لیکن وہ کوشش کے باوجود کچھ معلوم نہ کر سکا۔ اُس کی والدہ بیمار رہتی تھیں اور بڑا بھائی کئی بار اصرار کر چکا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر کراچی چلی آئے۔ شاید وہ کراچی چلی گئی تھی مگر کراچی جیسے بڑے شہر میں راحیلہ کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا' کاش اس کے پاس راحیلہ کا سراغ ہوتا۔

دو تین روز اسی پریشانی میں گزرے۔ ایک روز فون پر عظیم بیگ سے بات ہوئی۔ انہوں نے کہا "راہی' مجھے پتا چلا تھا کہ تم اپنی کسی دوست کو تلاش کرتے پھرتے ہو..... کیا بنا؟"

راہی نے کچھ جھجکتے ہوئے وہی کچھ بتا دیا جو حقیقت تھا۔ اس گفتگو کے ٹھیک ایک ہفتے بعد اسے بذریعہ ڈاک راحیلہ کا ایڈریس مل گیا۔ وہ کراچی ہی میں تھی۔ یہ ایڈریس اسے عظیم بیگ نے بھیجا تھا۔ راہی کو اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ عظیم بیگ کے لئے ایسے کام معمولی حیثیت رکھتے تھے..... اگلے ہی روز وہ ہائی ایئر لاہور سے کراچی پہنچ گیا۔ راحیلہ اسے گھر ہی میں ملی۔ وہ اب تک روٹھی ہوئی تھی۔ تاہم اس کی والدہ گرمجوشی سے ملیں۔ وہ راہی کے بارے میں اتنا ہی جانتی تھیں کہ وہ ایک تنہا لکھ پتی کاروباری ہے۔ یہ معلومات اتنی جامع تھیں کہ اس کے بعد کچھ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ اگر راحیلہ اس کو شوہر بنانے میں کامیاب ہو جاتی تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا راحیلہ کی جہاندیدہ والدہ نے کبھی ان دونوں کے تعلقات میں رخنہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی انہوں نے راحیلہ کے ساتھ اس کی صلح کرانے میں کافی تعاون کیا۔ انہوں نے بیٹی کو چائے دے کر راہی کے پاس بھیجا۔ پھر کچھ خریداری کرنے کا کہہ کر گھر سے باہر چلی گئیں۔ ان کے علاوہ چونکہ گھر میں اور کوئی نہیں تھا اور انہیں "خریداری" بھی کافی "زیادہ" کرنی تھی لہٰذا راہی نے اپنی خوش گفتاری اور چابک دستی کا کھل کر مظاہرہ کیا اور راحیلہ کو منانے میں کامیاب رہا۔ اس نے راحیلہ کو بتایا کہ وہ یہاں صرف اسے منانے کے لئے آیا ہے تاہم لگے ہاتھوں ایک کاروباری معاملہ بھی نبٹا لے گا۔ اس سلسلے میں چند روز کراچی رہنا پڑے گا اور یوں میل ملاقات کے مواقع فراہم ہوتے رہیں گے۔ اس نے راحیلہ کو اپنے ہوٹل کا ایڈریس دیا جو اُس نے "نہ..... نہ....." کرتے ہوئے رکھ لیا۔

○☆○

اگلے چند روز راہی کے لئے یادگار تھے۔ کراچی اسے ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آ رہا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ ایک حسنِ دلنواز اس کے پہلو میں تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساحل ساحل اور چمن چمن گھومنے لگا۔ ایک روز ہاکس بے پر بیٹھے وہ چاندنی رات سرگوشیاں کر رہے تھے۔

راہی بولا "بتائے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا؟"

"ہرگز نہیں' ہرگز نہیں۔" راحیلہ نے لاڈ سے دائیں با سر ہلاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ راہی نے پتھر سے ٹیک لگائی اور گ سانس بھر کر راحیلہ کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے "راحیلہ' مجھے کینسر ہو گیا تھا۔"

"کیا؟" راحیلہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ راہی لہجے میں اسے تفصیلات بتانے لگا۔ راحیلہ فکرمندی اور غم سے سنتی رہی۔ راہی بات ختم کر چکا تو راحیلہ نے کہا۔

"راہی' تمہیں علاج..... چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔"

راہی نے کہا "راحیلہ' جس شخص نے مجھے ایسا کرنے کے کہا ہے' جانتی ہو وہ کون ہے..... وہ شخص میرے لئے دنیا کا سے قابلِ اعتبار شخص ہے۔ میں نے آج تک اس کی بات مان نقصان نہیں اٹھایا۔ میں کیا' شاید کسی نے بھی اس کی رائے اہمیت دے کر نقصان نہیں اٹھایا ہو گا۔ راحیلہ' میں عظیم صاحب اپنا دنیاوی اور روحانی پیر مانتا ہوں۔ میں آج جو کچھ ہوں اسی کے طفیل ہوں۔ میرا یقین ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہو ہے' تم مجھے دھوکا دے سکتی ہو لیکن عظیم صاحب مجھے غلط مشو نہیں دے سکتے۔"

راحیلہ نے کہا "میں خدانخواستہ غلط نیت کی بات نہیں کر رہی۔ غلط تجزیے کی بات کر رہی ہوں۔ ٹھیک ہے تمہارے عظ صاحب خود بھی معالج رہے ہیں لیکن وہ اس معاملے میں حرفِ آ نہیں۔ ان سے بڑے اور قابل ڈاکٹر جب تمہیں مکمل علاج مشورہ دے رہے ہیں تو تمہیں علاج کرانا چاہیے۔ وقتی افاقے پر جاؤ۔ ہو سکتا ہے ابھی استعمال کی ہوئی دواؤں کا اثر ہو اور چند ما بعد پھر شکایت ہو جائے۔"

راہی کو راحیلہ کا تبصرہ ناگوار گزرا۔ اپنی ناگواری پر بمشکل قابو پا کر اس نے کہا "راحیلہ! میں نے تم سے کب کہا ہے کہ عظیم صاحب بڑے ڈاکٹر یا معالج ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کے مشورے پر عمل کرنے والا کبھی گھاٹے میں نہیں رہ سکتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں بھی نہیں رہوں گا۔ ڈیئر..... یہ دل کا معاملہ دل کے ساتھ ہے۔ سمجھ لو جیسے تمہارے دل کے ساتھ ایک معاملہ ہے' ایسے ہی عظیم صاحب کے ساتھ بھی میرا ایک معاملہ ہے۔"

راہی کا رویہ دیکھ کر راحیلہ نے اس بارے میں کوئی اور بات نہیں کی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ایسا کرنے سے وہ اسے ناراض کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گی۔

قریباً دو ہفتے تک راحیلہ اور راہی بانہوں میں بانہیں ڈالے شہ کے ہر تاریک اور پُرفضا گوشے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ ایک شام کچھ ایسی مستانی تھی کہ وہ محبت کی لہروں پر بہتے بہت دور نکل گئے

جب ذرا سا چونکے تو انہوں نے خود کو بیکراں سمندر میں پایا۔ یہ بیکراں سمندر بارہ ضرب چودہ کا چھوٹا سا کمرا تھا۔ اسی ہوٹل کا کمرا جہاں راہی رکا ہوا تھا۔ جب ساتھی من پسند ہو' محبت بھی ہو اور جذبے جوان ہوں تو مختصر چار دیواری بھی سمندر ہوتی ہے جس میں ہفت اقلیم کے رنگ اور دولتیں سمٹ آتی ہیں۔ رات دس بجے جب راحیلہ اسے شوخ شرمیلی نگاہوں سے دیکھتی رخصت ہوئی اور راہی نے ایک فرحت بخش ڈکار لے کر لذیذ ڈنر کو معدے میں تھوڑا سا راستہ دیا تو وہ خود کو دنیا کا مسرور ترین انسان تصور کر رہا تھا لیکن صرف چند لمحے بعد اس نے دروازہ بند کر کے ترنگ میں بستر پر چھلانگ لگائی تو اندیشوں کے دیو پھنکارتے ہوئے ذہن میں گھس آئے۔ کر کے نچلے حصے میں پھر وہی ناقابلِ برداشت درد اٹھا تھا جس نے ایک عرصہ اسے ہلکان رکھا تھا۔ وہ جہاں کا تہاں بے حرکت پڑا رہ گیا۔

"یا خدا خیر۔" بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔ وہ اسی طرح ساکت لیٹا رہا۔ درد کی لہریں آہستہ آہستہ کم ہو گئیں اور وہ لیٹے لیٹے گہری نیند سو گیا۔

صبح طبیعت ٹھیک تھی مگر اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ ایک روز مزید قیام کے بعد وہ لاہور واپس چلا آیا۔ وقتِ رخصت راحیلہ نے ایک بار پھر دبی زبان میں کہا کہ وہ اپنا علاج کرائے۔ لاہور واپس آکر ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عظیم صاحب نے..... اسے لاعلاج سمجھ کر۔ نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے خود ہی اپنے خیال کو رد کیا۔ وہ اپنے مرض کے بارے میں کافی سے زیادہ خود جانتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ قابلِ علاج ہے۔ اس نے اپنی رپورٹیں خود پڑھی تھیں اور کئی غیر متعلق ڈاکٹروں سے بھی پڑھوائی تھیں۔ وہ ابھی شفا کے مرحلے سے گزرا نہیں تھا..... پھر بھی اپنا شبہ رفع کرنے کے لئے وہ اس روز اپنے تمام ریکارڈ کے ساتھ ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے پاس جا پہنچا۔ ڈاکٹر نے تفصیلی طبی معائنہ کیا اور اس کے خیال کی تصدیق کی' یعنی وہ قابلِ علاج تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے اس پر علاج کی اہمیت اور ضرورت بھی واضح کی۔ غرض ڈاکٹر کے پاس سے وہ مزید الجھنیں لے کر لوٹا۔

وہ لاعلاج نہیں تھا۔ اُسے علاج کی ضرورت بھی تھی۔ پھر عظیم صاحب نے اسے اپنی صوابدید پر علاج چھوڑنے کا مشورہ کیوں دیا۔ یہ تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عظیم صاحب کا مشورہ غلط ہے۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو وہ خود نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کی عقل محدود تھی اور عظیم صاحب غیر معمولی فہم رکھتے تھے۔ اگر پورے لاہور کے ڈاکٹر بھی ایک طرف ہو جاتے تو وہ عظیم صاحب کے تجربے کو اہمیت دیتا۔ اسے بارہ برس پہلے کا وہ دن یاد آیا جب اس نے اپنے چند نوجوان ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک راہ گیر کو لوٹا تھا۔ اس واردات میں انہیں کیا ملا تھا۔ اٹھائیس روپے۔ ایک کنڈم وستی گھڑی اور ایک گرم مفلر۔ اس مالِ مسروقہ کی تقسیم پر دوستوں سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ شاید تین چار روپے کا ہیر پھیر تھا۔ لیکن بات اتنی بڑھی کہ ساتھی اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ قبرستان کے ایک تاریک گوشے میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا تھا جب عظیم صاحب جو اس وقت اجی دادا کہلاتے تھے وہاں پہنچے۔ انہوں نے ریوالور دکھا کا چاقو بردار لڑکوں کو بھگا دیا اور راہی کی جان بچائی۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ اسکوٹر پر بٹھا کر ایک چائے خانے میں لے گئے۔ اُن کا ایک فقرہ راہی کو آج تک یاد تھا۔

انہوں نے کہا تھا "جرم کی دنیا میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہیں لیکن ہر دروازہ صرف باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ لہٰذا داخل ہونے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لو اور بہتر ہے کہ یہ ارادہ ترک کر دو۔"

اجی دادا اسے صرف سمجھا سکتا تھا۔ اس کی ماہانہ ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے خون میں شرافت نہیں گھول سکتا تھا۔ لہٰذا راہی اپنے راستے پر چلتا رہا۔ آخر جرم کے ایک چوراہے پر پھر اس کی ملاقات اجی دادا سے ہوئی۔ اس روز وہ ایک نمازی کی سائیکل چرانے کی کوشش میں تھانے پہنچا تھا۔ پولیس والے اسے زمین پر لٹا کر زیرِ دست "تفتیش" کر رہے تھے۔ اجی دادا نے اس کی جان چھڑائی تھی اور ضمانت دے کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"بیٹا جی! غریب نمازیوں کی سائیکلیں اور جوتے چرانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا اگر کچھ بگاڑنا ہی ہے تو بے نمازیوں کا بگاڑو۔ ان سیٹھوں کا بگاڑو جنہوں نے ایک زمانے کی خوشیاں تجوریوں میں بند کر کے تالے لگا رکھے ہیں۔"

اُس روز سے جاوید راہی کی زندگی میں ایک انقلاب نے راستہ پایا تھا..... اس نے اپنا حوصلہ بڑھا کر اپنا معیارِ جرم بلند کر لیا تھا۔ اس مرحلے میں اجی دادا نے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی۔



اس نے اسے زندہ رہنے کے گُر سکھائے۔ ہاتھ پیر بچا کر لمبے ہاتھ مارنے کے طریقے بتائے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ایک مضبوط سہارا اور "پشت پناہ" فراہم کیا۔ یہ سہارا یا پشت پناہ اجی دادا خود تھا۔ درحقیقت وہ ایک بڑے جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ تھا..... اور اس سے بڑا ایک اور سرغنہ بھی تھا جسے وہ سب "بڑے صاحب" کے نام سے جانتے تھے۔ یہ لوگ بڑے منظم طریقے سے جرم کرتے تھے اور جرائم کی دنیا میں اُن کی دھاک تھی..... قریباً آٹھ برس تک راہی نے اس گروہ میں رہ کر خوب موج اُڑائی اور پھر وہ دن آیا جب انہوں نے "بڑے صاحب" کی زیرِ نگرانی ایک زبردست واردات کی۔ اس واردات میں بے شمار دولت ہاتھ آئی لیکن ایک گڑبڑ بھی ہوئی۔ ایک نہایت اہم شخصیت ان کے ہاتھوں قتل ہوگئی۔ انتظامیہ حرکت میں آئی اور نہایت سرگرمی سے مجرموں کی تلاش شروع ہوگئی۔ بڑے صاحب نے اپنے منظم گروہ کے ساتھ زیرِ زمین چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ کراچی میں اُن کی آخری میٹنگ ہوئی جس میں ہر رکن کو کئی لاکھ روپے دیے گئے اور انہیں مختلف شہروں میں آباد ہونے کی ہدایت کی گئی۔ انہیں یہ حکم دیا گیا کہ کم از کم دو برس تک وہ جرائم کی دنیا سے مکمل طور پر الگ رہیں۔ اس دوران اپنے کسی ساتھی یا ملنے جلنے والے سے رابطہ نہ رکھیں۔ باس کا حکم ان سب کے لئے حرفِ آخر ہوتا تھا اور وہ اس سے رُوگردانی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے..... اور یوں اس گروہ کے تمام ارکان بکھر گئے اور مختلف شہروں میں خاموشی سے وقت گزارنے لگے۔

اپنے ساتھیوں کی طرح راہی کے یہ دو سال بھی عیش و آرام سے گزرتے اگر اسے یہ موذی مرض لاحق نہ ہوجاتا..... حقیقتاً اس نے اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا تھا عظیم صاحب کے تفیل کیا تھا اور جو کچھ کھویا تھا ان کی نافرمانی میں کھویا تھا یا ان کی غیر موجودگی میں حالانکہ عظیم صاحب کی نافرمانی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ مگر دانستہ یا نادانستہ کچھ موقعوں پر ضرور ایسا ہوگیا ہوگا..... جیسے کہ کی اس چوٹ کا واقعہ تھا جو بالآخر اس کے کینسر کا سبب بنا۔ چار پانچ سال پہلے جب اجی دادا، عظیم صاحب بن چکے تھے اور "کارِ جرم" کے ساتھ ساتھ شہر میں ایک بڑا ہوٹل بھی چلا رہے تھے۔ ان کے ہوٹل پر ایک مخالف پارٹی نے پولیس ریڈ کروا دیا تھا۔ قمار خانے میں بھگدڑ مچ گئی۔ راہی اور عظیم صاحب چھت پر چلے گئے۔ ایک پولیس انسپکٹر ریوالور تان کر اُن کی طرف بھاگا۔ راہی ان دنوں اشتہاری مجرم تھا۔ خبر ارادی طور پر چھت سے چھلانگ لگانے لگا۔ عظیم صاحب اسے روکتے ہی رہ گئے۔ چھت سے گر کر اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ بعد ازاں اسپتال میں اسے عظیم صاحب نے بتایا تھا کہ وہ انسپکٹر تو اپنا آدمی تھا۔ ہمیں پکڑنے نہیں بچاؤ کا راستہ بتانے آیا تھا۔ شاید ہمیشہ کی طرح اس روز بھی راہی نے عظیم صاحب کی بات مانی ہوتی تو آج وہ صحت مند ہوتا اور ساتھیوں کی طرح رنگین گوشہ نشینی کے مزے لُوٹ رہا ہوتا۔

برسوں کے تجربے نے اب اس بات پر اس کا ایمان پختہ تھا کہ "عظیم صاحب" غیر معمولی طور پر صائب الرائے شخص اور ان کے حکم کی نفی میں سو فیصد گھاٹا ہے۔ بہت سوچ بچار کے اس نے فیصلہ کیا کہ اس کے مرض کی کیفیت چاہے کچھ بھی عظیم صاحب کی ہدایات نظرانداز کرنے کا خطرہ مول نہیں لے

○☆○

ایک روز راہی نے اپنے لئے ایک ایسے کھانے کا انتظام کروایا جو بیماری کے دوران اس کے لئے شجرِ ممنوعہ تھا۔ یعنی ڈنر میں سفید چینی، میدہ، کیک پیسٹری، گوشت وغیرہ سب کچھ شامل تھا۔ کھانے کے بعد مزیدار کافی نے لطف دوبالا کردیا۔ ان اشیا کو ترک کئے ہوئے اسے مہینے گزر چکے تھے لہٰذا یہ عام خوردنی اشیا اسے ہر نعمت سے بڑھ کر محسوس ہو رہی تھیں۔ جب وہ بلیک کافی چسکیاں لے رہا تھا کال بیل بج اٹھی۔ ملازم نے دروازہ کھولا تو دیوار جیسے روشن ہوگئے۔ جگمگاتے چہرے اور سیاہ آنکھوں والی راحیلہ السلام علیکم کہتے ہوئے اندر آگئی۔ "چشم ما روشن دل شاد" راہی نے جھومتے ہوئے کہا اور ملازموں کو کھانے کی تیاری کا حکم دیا۔ راحیلہ نے اسے بتایا کہ وہ کھا کر آئی ہے۔ اس نے کہا "یہاں میری ایک ڈاکٹر سہیلی ہے اس کے پاس ٹھہری ہوں اور تمہیں اس کے پاس لے جانے آئی ہوں۔"

راہی کے چہرے پر فکرمندی پھیل گئی۔ اس نے بہت انکار تاہم جب خطرہ محسوس کیا کہ محبوبۂ دلنواز روٹھ کر چلی جائے گی تو آدھے دل کے ساتھ تیار ہوگیا۔ راحیلہ کی یہ سہیلی واقعی کینسر اسپیشلسٹ تھی۔ اس نے راہی کی رپورٹیں دیکھیں۔ اس سے احوال دریافت کیا۔ بہت دیر سوچ بچار کرتی رہی۔ آخر اس نے بھی وہی کہا جو اس سے پہلے ڈاکٹر کہتے آئے تھے۔ یعنی مرض لاعلاج نہیں۔ اس نے راہی کے دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"درست ہے کہ نارمل زندگی گزارنے سے اور خوش رہنے سے کینسر کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہوتی ہے اور متوازن غذا اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آج کل ترقی یافتہ ممالک میں اس انداز فکر کو اپنایا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو ہومیو پیتھک دوائیں استعمال کررہے ہیں ان کی افادیت سے بھی میں انکار نہیں کرتی..... مگر مرض سے مکمل چھٹکارا پانے کے لئے آپ کو اس سے کہیں زیادہ کرنا ہوگا۔ میں یہاں وہی پرانا فقرہ کہوں گی "تو پین نو گین" جن ادویات کو آپ خوفناک اور آدم کش قرار دے رہے ہیں وہ آپ کے لئے مفید ہیں۔"

راہی پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ راحیلہ کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے اتنا ضرور کہہ دیا کہ وہ اس بارے میں سوچے گا۔ راحیلہ کی آمد نے زندگی میں ایک بار پھر پھول کھلا دیے۔ چند روز

انہوں نے لاہور میں خوب داد محبت دی۔ نگاہیں' سرگوشیاں' لمس' مسکراہٹیں' سب کچھ یکجا ہوتا رہا اور بکھرتا رہا۔ چار پانچ روز بعد راحیلہ واپس چلی گئی..... اور اس کے ساتھ ہی راہی کی کہانی ختم ہوگئی..... اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایک روز اچانک اسے عظیم صاحب کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ اور مشینی تھا۔

"راہی' آج تمہیں رات دس بجے کوٹھی نمبر ۱۸ زیڈ بی ٹاؤن شپ میں پہنچنا ہے۔"

رات ٹھیک دس بجے وہ کوٹھی نمبر ۱۸ زیڈ بی ٹاؤن شپ میں موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد عظیم صاحب ڈارک بلیو سوٹ میں ملبوس اس کے سامنے آن بیٹھے۔ اُن کی آنکھیں متورم اور چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولے "میں جانتا ہوں راہی! آج کل تم بہت الجھن میں ہو۔ تمہیں مجھ پر اندھا اعتماد ہے اور تم یہ جانتے ہو کہ میں تمہیں کبھی غلط گائیڈ نہیں کروں گا۔ یہی سبب ہے کہ تم نے ہر قسم کا علاج چھوڑ رکھا ہے اور میری ہدایات پر عمل کر رہے ہو۔ دوسری طرف راحیلہ ہے جو تمہیں ڈاکٹروں کے پاس لئے پھرتی ہے اور تمہاری زندگی کی طرف سے پریشان ہے۔ اپنی جگہ وہ سچی ہے اور میں بھی جھوٹا نہیں....."

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا جناب؟" راہی نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔ اس لہجے میں کہیں بہت گہرائی میں ایک ہلکا سا احتجاج بھی چھپا ہوا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو' جناب مجھے کچھ بتایئے' کچھ تو وضاحت کیجئے۔ ایسا غیر مشروط اعتماد تو خدا بھی نہیں چاہتا۔ وہ بھی بندوں کو قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے اور ان کے لئے ایمان و یقین کی منزلیں آسان بناتا ہے۔

عظیم صاحب نے کہا "بعض اوقات انسان کسی مسئلے پر بہت سوچتا ہے۔ اس کی وجوہ اور اسباب پر غور کرتا ہے۔ بہت گہرائی میں چلا جاتا ہے لیکن مسئلے کا حل بالکل بالائی سطح پر ہوتا ہے۔ کوئی معمولی سی بات ہوتی ہے جو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ تمہاری الجھن کا حل بھی تمہاری نگاہوں کے سامنے رکھا ہے لیکن تم نے اس کی طرف نگاہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ہومیو پیتھی' ایلو پیتھی یا کسی دوسرے طریقۂ علاج کی جانچ پرکھ کا معاملہ نہیں ہے' بالکل جدا مسئلہ ہے یہ..... ذرا خود سوچو' بڑے اسپیشلسٹ اور قابل ڈاکٹرز جس مرض کو تشویشناک قرار دے چکے ہیں اور جس کے لئے علاج کی ضرورت کو نہایت شدت سے محسوس کر رہے ہیں اسے میں اتنا "ایزی" کیوں لے رہا ہوں؟ جواب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم علاج کی سختیاں جھیلو اور اپنے شب و روز کو عذاب ناک بنائے رکھو۔"

راہی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "لیکن جناب..... زندگی کے برسک پر ان سختیوں سے بچنا..... کیا مناسب رہے گا؟"

"زندگی..... ہا..... زندگی۔" عظیم صاحب نے مایوسی سے سر جھٹکا۔ نیا سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر طلائی لائٹر سے سلگایا اور طویل کش لے کر بولے۔ "تم جانتے ہی ہو راہی! بڑے صاحب کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی ہر بات حتمی ہوتی ہے۔ ان کے حکم سے روگردانی کرنا نہ کبھی کسی کے بس میں ہوا ہے نہ شاید آئندہ ہو۔ وہ کہا کرتے ہیں میری حکم عدولی کرنی ہے تو وہاں چلے جاؤ جہاں میں پہنچ نہ سکوں..... کیا تم سمجھتے ہو راہی کہ اس ملک میں یا ملک سے باہر کہیں کوئی ایسی جگہ ہے؟ مجھے یقین ہے میری طرح تمہارا جواب بھی نفی میں ہوگا۔"

"آپ..... کہنا کیا چاہتے ہیں؟" راہی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

عظیم صاحب نے برف جیسے بے لچک اور سرد لہجے میں کہا "ایک مدت بڑے صاحب کے ساتھ گزار کر میں ان کا رمز شناس ہو چکا ہوں۔ اُن کے چہرے کا اتار چڑھاؤ مجھے بہت کچھ سمجھا دیا کرتا ہے۔ میں نے چار پانچ ہفتے پہلے اندازہ کر لیا تھا کہ بڑے صاحب کو اب تمہاری ضرورت نہیں رہی اور وہ بہت جلد تمہاری موت کا حکم صادر کر دیں گے۔ "تم" سے میری مراد وہ پانچوں ارکان ہیں جو آخری واردات میں ملوث تھے' اور جن کے پیچھے پولیس پاگل ہوئی پھرتی ہے۔ اس بات کا یقین ہونے کے بعد کہ تمہاری زندگی ٹمٹماتے چراغ کی مانند ہے' میں تم سے ملنے اسپتال پہنچا اور تمہیں علاج معالجے کی تمام سختیوں سے بے نیاز کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا تمہاری زندگی کے آخری شب و روز اس قدر بے کیف اور تکلیف دہ ہوں۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو؟" راہی کا چہرہ سرسوں کی مانند زرد تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عظیم صاحب نے سپاٹ لہجے میں کہا "میرا اندازہ درست تھا۔ کل تمہاری موت کا حکم صادر ہو گیا ہے۔ بلیک وارنٹ میری جیب میں پڑا ہے۔ آئی ایم سوری' آئی ایم رئیلی ویری سوری راہی..... میں مجبور ہوں۔"

عظیم صاحب نے کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالا۔ اعشاریہ ۳۸ بور کا سیاہ ریوالور راہی کی نگاہوں میں چمکا۔ پھر دھماکوں کے ساتھ تین شعلے راہی کی طرف لپکے اور وہ وسیع ٹیبل پر اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے کینسر زدہ جسم میں تین جان لیوا سوراخ ہو چکے تھے۔ ایک سر میں' دوسرا گردن کے قریب اور تیسرا سینے میں۔ خون کے فوارے ابلے اور اسے بہاتے ہوئے نئی منزلوں کی طرف لے چلے۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ اس نے موت کے بے پناہ کرب اور لامتناہی دکھ کو محسوس کیا لیکن اس کے ساتھ ذہن میں ایک خوشگوار احساس بھی تھا۔ وہ سوچنے لگا "عظیم صاحب کا مشورہ اس دفعہ بھی سود مند تھا..... اس مشورے پر عمل کر کے میں نے اپنی قے آور زندگی سے چار یادگار ہفتے چرا لئے ہیں۔"

اُس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی ورنہ وہ ضرور کہتا۔ "عظیم صاحب! چار یادگار ہفتوں کے لئے..... بہت بہت شکریہ۔"

کریں۔"

"میں دوبارہ کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ یا میں کچھ دیر باہر انتظار کر لیتا ہوں جب آپ فارغ ہو جائیں تو مجھے طلب کر لیں۔" میں نے کہا۔ "آپ تفصیلی واقعات سنے بغیر کیس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

میری بات سن کر اس نے تیوری چڑھائی' بولا۔ "ٹھیک ہے' آپ باہر جا کر انتظار کر سکتے ہیں۔"

میں باہر نکل کر اس کے پی اے کے پاس جا بیٹھا۔ تقریباً پونے گھنٹے کے بعد ایس پی نے میری معطلی کا پروانہ جاری کر دیا اور میرے ایک نائب کو تھانے کا انچارج بنا دیا۔

○☆○

ایس پی کے پاس تفصیل سننے کا وقت نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ اسے سچ یا جھوٹ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ جاگیردار کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور چونکہ میری کارروائی جاگیردار کو پسند نہیں تھی۔ اس لیے اس نے مجھے معطل کر دیا۔

تفتیش کے دوران جو سنگین واقعات میرے علم میں آئے تھے' ان میں سے چند واقعات کی تفصیل میں ذیل کی سطور میں بیان کرتا ہوں۔

قتل کے وقت شوکت علی کی عمر بائیس تیئس سال کے لگ بھگ تھی۔ چونکہ وہ جاگیردار کا اکلوتا بیٹا تھا' اس لئے اس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی اور حویلی میں کوئی شخص اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ عیاشی کی طرف مائل ہو گیا۔ اس زمانے میں شراب و شباب کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر صاحبِ زر حسبِ توفیق ان "نعمتوں" سے فیضیاب ہو سکتا تھا۔

شوکت علی کو اپنے جیسے چند دوست بھی مل گئے۔ ان میں سے دو دوست خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک کا نام نور جمال اور دوسرے کا تنویر شاہ تھا' یہ دونوں بھی کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے تھے۔ تینوں نے قریبی شہروں کے بدنام بازاروں میں کوچہ گردی شروع کر دی۔

اکا دکا راتیں بھی کوٹھوں پر گزارنا شروع کر دیں۔ ایسی حرکتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ ایک دفعہ جاگیردار کے ایک پرانے یار بیلی نے تینوں کو ایک حجرے میں دولت لٹاتے دیکھ لیا۔ اس کا نام رئیس خان تھا اور وہ خود بھی اس کوچے کا پرانا کھلاڑی تھا۔ لیکن وہ ان ... رافضیت لوگوں میں سے تھا جنہیں دوسروں کو نصیحت کرنے کا ... شوق ہوتا ہے۔ انہیں اپنی برائی نظر نہیں آتی۔

رئیس خان نے لڑکوں کو تو کچھ نہیں کہا' لیکن چند روز کے بعد چودھری ظہور حسین کے پاس پہنچا اور کہا۔ "چودھری تیرا لڑکا ہاتھ سے گیا۔"

"کیوں' کیا ہوا؟" ظہور حسین نے پوچھا۔

"لڑکا کوٹھے پر پہنچ چکا ہے۔"

ظہور حسین نے انجان بن کر پوچھا۔ "کون سے کوٹھے؟"

رئیس خان نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "رنڈی کے کوٹھے۔"

"تم وہاں کیا کر رہے تھے؟" چودھری نے طنزیہ لہجے میں ...

"نذر نیاز دینے گئے تھے؟"

"تمہیں پتا ہی ہے کہ میں..... پرانا پاپی ہوں۔ کبھی کبھ... پشوری کرنے ادھر چلا جاتا ہوں۔ لیکن یہ منڈے کھنڈے ... کاری میں مارے جائیں گے۔"

"رئیس خان' جب ہم نے یہ شغل شروع کیا تھا تو ہم بھ... منڈے کھنڈے ہی تھے۔ اوئے' لڑکوں کو دنیا کے ہر رنگ ڈھنگ کا تجربہ ہونا چاہئے۔ جب کندھوں پر ذمے داری کا بوجھ پڑے گا تو... ہی سدھر جائیں گے۔"

یہ بات بڑے بڑے سمجھدار لوگ بھی کہہ جاتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے تجربات اور برائی میں بہت فرق ہے۔ برائی کی دلدل میں اترنے کے بعد باہر نکلنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ گناہ میں ایک لذت ہوتی ہے' جو انسان کی آتش ہوس کو ہر دم بڑھاتی رہتی ہے۔

"چودھری' ہم شغل کے ساتھ محنت بھی تو کرتے تھے۔" رئیس خان نے کہا۔ "بیٹے کو پہلے کام پر لگاؤ۔ پھر دوسری بات کرنا۔"

"میں اسے بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کر دوں گا۔" ظہور حسین نے کہا لیکن جو آدمی کسی برائی کو برائی نہ سمجھتا ہو' اس کی نصیحت بے کار ہی ثابت ہوتی ہے۔

کوٹھے کی لذتوں سے آشنا ہونے کے بعد شوکت علی کو ہر ایرا غیرا سوجھنے لگا۔ اس نے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو بھی بری نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے ایک پرچون فروش کی لڑکی کو محبت کا جھوٹا فریب دے کر لوٹ لیا۔

اس لڑکی کا نام امینہ تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور پُرکشش لڑکی تھی۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سترہ سال کے قریب تھی۔ شوکت علی نے اسے گلی میں ہی کہیں دیکھا تھا۔ چونکہ وہ بڑے باپ کا بگڑا بیٹا تھا' اس لئے اس نے امینہ کو رقعے بھیجنے شروع کر دیئے وہ نادان لڑکی یہ سمجھی کہ جاگیردار کا بیٹا اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے جواب دینا شروع کر دیا۔ یہ رقعے بازی گلی کے بچوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد شوکت نے ملاقات کے لئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ امینہ کئی ہفتوں تک انکار کرتی رہی لیکن آخر کار اس نے ہتھیار ڈال دیے اور شوکت علی کی بتائی ہوئی جگہ پر ملنے چلی گئی۔ یہ تنویر شاہ کے ایک رشتے دار کا مکان تھا' جو ان دنوں خالی پڑا تھا۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت تھا۔ اس وقت گرمی کی وجہ سے گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ امینہ اپنے گھر میں کسی کو بتائے بغیر وہاں آئی تھی۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ چند منٹ کے بعد

احمد رضا کا ماتھا اسی وقت ٹھنک گیا تھا جب تقسیم انعامات کی تقریب کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے سحرش اور اسے آفس میں بلایا تھا اور دس پندرہ منٹ دونوں سے باتیں کی تھیں۔ ڈائریکٹر آفتاب سردار نے احمد رضا کے سامنے ان کی بیٹی سحرش کی تعریف کی تھی اور اسے اپنے کالج کی ہونہار اور لائق ترین طالبہ قرار دیا تھا۔ سحرش سر جھکا کر مسکراتی رہی تھی اور اس کے ہونٹ شکریے کے انداز میں ہلتے رہے تھے۔

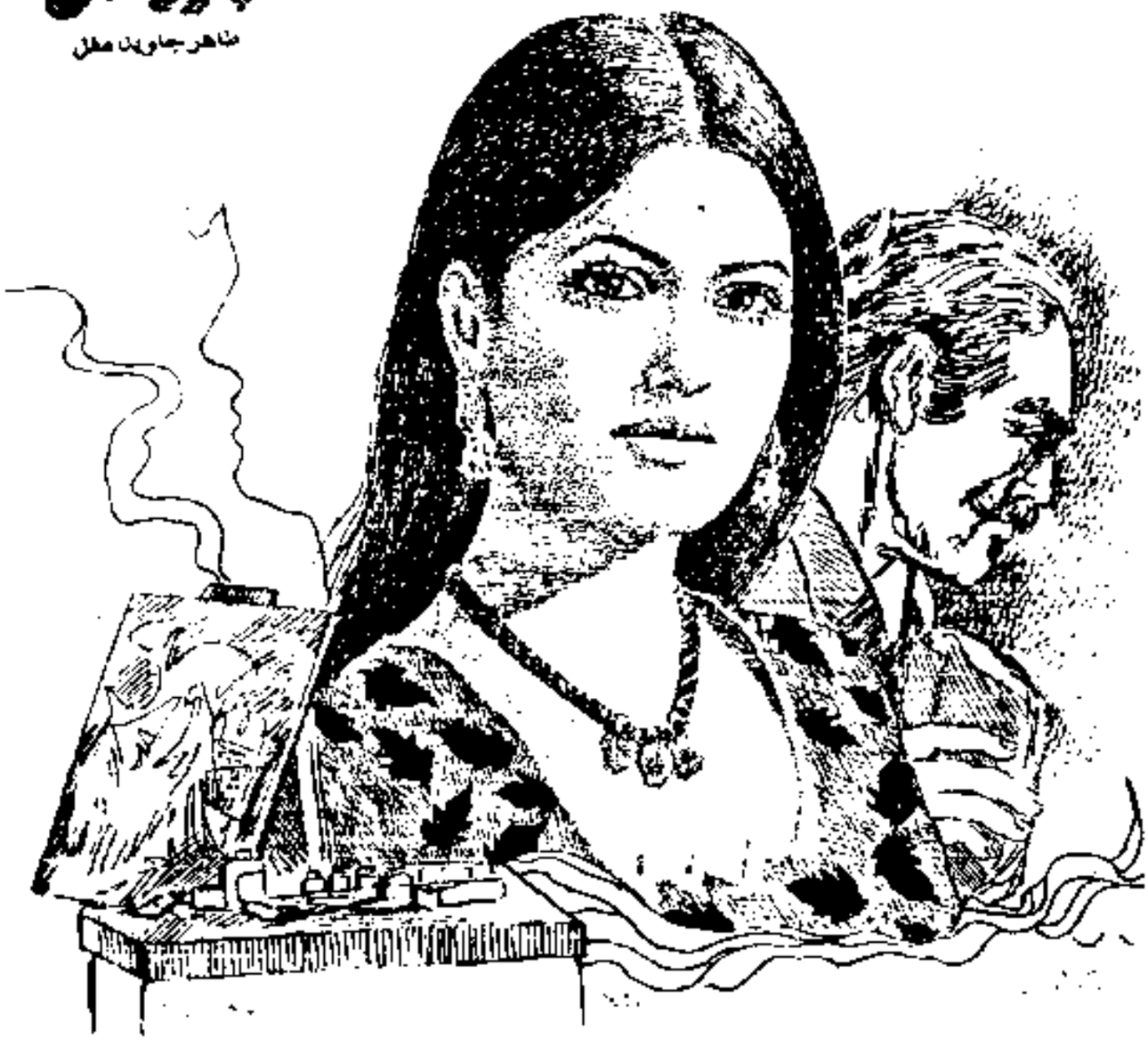
آفتاب سردار ان لوگوں میں سے تھا جن کے چوبیس گھنٹوں کا ہر ہر لمحہ شیڈول کی زنجیر میں جکڑا ہوتا ہے۔ صبح سویرے ہی ان کے معاون ملے کر دیتے ہیں کہ انہیں کن کن لوگوں سے کہاں کہاں ملنا ہے اور کس کس کام کے لیے کتنے کتنے منٹ یا لمحے صرف کرنے ہیں۔ آفتاب سردار آج کل تو ویسے بھی ہمیشہ سے زیادہ مصروف تھا۔ اس کا تعلق جس سیاسی جماعت سے تھا' وہ صوبے بھر میں بڑی واضح اکثریت سے الیکشن جیتی تھی۔ یوں آفتاب کی سیاسی اور کاروباری مصروفیات دونوں ہی کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ اس کی انگلیاں گھی میں اور سر تو پہلے ہی کڑاہی میں تھا' اب وہ جیسے پورے کا پورا کڑاہی میں چلا گیا تھا۔ اس کی دو ٹیکسٹائل ملز زیر تعمیر تھیں اور دو پوری رفتار سے کام کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک جدید ترین اسپتال بھی گروپ آف ہاسپٹلز میں تبدیل ہونے والا تھا۔ کالج کا روز افزوں کاروبار اس کے علاوہ تھا۔

آہوں' کراہوں اور سسکیوں سے معمور ایک بے بس شخص کا جگر پارہ پارہ کرتی داستان

اس کا جرم صرف اسکی کم مائیگی تھا' ایسا جرم جس کی کوئی معافی نہیں ہوتی تاہم اگر سزا صرف اسے ملتی تو شاید غنیمت ہوتا مگر اس سزا کے عذاب میں تو وہ ذات بھی آگئی تھی جو اس کے لیے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

چیونٹی

ظاہر جاوید مغل



اگلے تین چار ہفتوں میں احمد رضا کو سحرش کی زبانی گاہے گاہے ایسی اطلاعات ملتی رہیں جن سے احمد رضا کو پتا چلا کہ کالج کے مالک و کرتا دھرتا آفتاب سردار صاحب سحرش کو اپنی خصوصی عنایات کا مستحق ٹھہرا رہے ہیں۔ وہ اسے اسکالرشپ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس عندیے کا اظہار بھی کیا ہے کہ بی ایس کے فوراً بعد سحرش کو اپنے ہی کالج میں تدریسی ذمے داریاں سونپی جاسکتی ہیں۔

سحرش بہت خوش تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ معصوم تھی لیکن احمد رضا خوش نہیں تھے۔ تقسیم انعامات کے موقع پر انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کی آنکھوں میں جو رنگ دیکھا تھا' وہ ایک اندیشہ بن کر ان کے ذہن میں موجود تھا اور یہ اندیشہ روز بہ روز جڑ پکڑ رہا تھا۔ کسی وقت وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ خود کو باور کراتے کہ وہ خوامخواہ دور دراز کے وسوسوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ آفتاب سردار ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے اختیار اور اثر رسوخ کی سرحدیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی نیک نامی اور بیکراں شہرت کو سینے پر تمغے کی طرح سجا کر پھرتا ہے۔ پھر وہ کوئی جذباتی نوجوان بھی نہیں ہے۔ اس کی عمر تینتیس' چونتیس سال سے زیادہ ہے۔ وہ بال بچے دار ہے۔ وہ اس قسم کی سوچ کو ذہن میں کیسے جگہ دے سکتا ہے۔ بالفرض اگر وہ اس مزاج کا آدمی ہے بھی ... تو پھر اس کے لیے اپنے روز و شب کو رنگین بنانے کے لیے بے شمار مواقع مہیا ہوں گے۔ اس کے اردگرد درجنوں نہیں سیکڑوں ایسی خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں موجود ہوں گی جو اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر بڑی خوشی سے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں گی۔ پھر اسے کیا ضرورت پڑی ہے ایک غریب آرٹسٹ احمد رضا کی کم عمر بیٹی کے بارے میں سنجیدہ ہونے کی۔

پھر ایک روز جب احمد رضا اپنے گھر کے ایک کشادہ کمرے میں بڑی یکسوئی سے ہاہائے قوم کی ایک پورٹریٹ بنا رہے تھے' گیٹ کے سامنے ایک لمبی سیاہ کار آکر رکی۔ کار پر سبز نمبر پلیٹ تھی۔ کار کی پچھلی نشست پر سے سحرش اتری۔ ساتھ ہی گھنگھریالے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص بھی تھا۔ اس نے براؤن واسکٹ اور سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ سحرش اسے انکل کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ پھر وہ بے حد اخلاق کے ساتھ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ادھیڑ عمر شخص اور احمد رضا تعارف کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ احمد رضا کو معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر شخص کا نام حاجی الطاف رحمانی ہے۔ وہ خاصا پڑھا لکھا بندہ تھا اور آفتاب سردار کے سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کی رہائش ایک قریبی علاقے جوہر ٹاؤن میں تھی۔ آج سحرش کی دین کسی وجہ سے لیٹ تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ دین کے انتظار میں کھڑی تھی۔ حاجی الطاف اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں تک لے آئے تھے۔ اب سحرش کے بے حد اصرار پر وہ گھر کے اندر آگئے تھے۔

احمد رضا سمجھ گئے کہ یہ سارا پالیسی بیان ہے ورنہ آفتاب سردار کے سیکریٹری کو کسی نہ کسی طور پر اس ڈرائنگ روم تک پہنچنا ہی تھا۔ احمد رضا کے سینے میں دھواں سا بھر گیا۔ ان کے اندیشے' حقیقت سے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے۔

حاجی الطاف نے کہا ''سردار صاحب نے بیٹی سحرش کو پہلی بار تقسیم انعامات کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اکثر مجھ سے بس اسی کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں۔''

''وہ خود اچھے ہیں اس لیے دوسروں میں بھی اچھائی ڈھونڈ لیتے ہیں۔'' رضا صاحب نے یہ رسمی فقرہ بے دلی سے کہا۔

تاہم اس فقرے کی وجہ سے سردار صاحب کے سیکریٹری کو ان کی تعریف و توصیف بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ کہنے لگا ''دل کے بہت ہی اچھے ہیں سردار صاحب۔ روپیا اور اختیار اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لے کر آتے ہیں لیکن سردار صاحب بالکل الگ فطرت کے مالک ہیں۔ بڑی سچی' کھری زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر انسان کی طرح اندر سے وہ بھی دکھی ہیں۔ کئی محرومیاں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ گھریلو زندگی بہت زیادہ پرسکون نہیں ہے۔ پھر بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور لفظوں میں مٹھاس رہتی ہے۔''

سردار صاحب کا یہ سیکریٹری آدھ پون گھنٹا رضا صاحب کے ساتھ رہا۔ اس کی گفتگو اور تعریف کا محور سردار صاحب ہی تھے۔ سیکریٹری کے جانے کے بعد رضا صاحب کے اندیشے گمبھیر تر ہو گئے۔

چند دن بعد ایک تصویری نمائش کے افتتاح کے موقع پر سیکریٹری حاجی الطاف سے رضا صاحب کی ایک ملاقات اور ہوئی۔ اس ملاقات میں سیکریٹری صاحب مزید کھل کر سامنے آئے۔ ان کی باتوں سے بالکل واضح ہو گیا کہ محترم سردار صاحب سحرش میں کس انداز اور نوعیت کی دلچسپی لے رہے

ہیں۔ ایک نہایت بااختیار شخص نے آرٹسٹ احمد رضا کی خوش قسمتی کو گہری پڑی چیز سمجھ لیا تھا اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں سیکریٹری حاجی الطاف نے بڑے شائستہ انداز میں رضا صاحب کو ایک دو خوش آیند پیش کشیں بھی کیں۔ ان میں سے ایک پیش کش احمد رضا صاحب کو سرکاری سطح پر بہ طور مصور پروموٹ کرنے کی بھی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے احمد رضا صاحب کو سردار صاحب کی چھوٹی بہن رخشندہ کے بارے میں بتایا۔ وہ مصوری میں بے حد دلچسپی رکھتی تھی اور کسی اچھے استاد سے فن مصوری کے رموز سیکھنا چاہتی تھی۔ سیکریٹری الطاف نے رضا صاحب کو یہ اشارہ بھی دیا کہ اگر وہ اس حوالے سے کچھ وقت نکال سکیں تو بہت سے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ سب باتیں سن کر رضا صاحب کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ انہوں نے بے حد برداشت کا ثبوت دیتے ہوئے سیکریٹری الطاف سے تو کچھ نہیں کہا مگر رات گئے تک وہ اپنے اندر ہی اندر ہانڈی کی طرح ابلتے رہے۔ سردی کے باوجود ان کا سارا جسم پسینے میں نہایا رہا۔

سحرش ان کی متاعِ حیات تھی۔ سحرش کی والدہ کو فوت ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے تھے۔ سحرش سے بڑا صرف ایک بیٹا تھا۔ وہ اٹلی کے سفارت خانے میں ملازم تھا اور اپنے بیوی بچوں سمیت وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ سحرش رضا صاحب کو بچپن سے ہی بہت پیاری تھی۔ من موہنی سی' نازک سی' پھولوں کی طرح دلکش اور آئینوں کی طرح شفاف۔ اس ویران گھر میں اس کے وجود سے روشنی تھی۔ وہ جیسے چلتے پھرتے بہ زبان خاموشی' رضا صاحب سے کہا کرتی تھی..... "ابو! مجھے بہت دیکھ بھال کر خود سے جدا کرنا۔ میں اتنی کومل ہوں کہ ذرا سی گرم ہوا بھی مجھے کملا کر رکھ دے گی۔"

اور گرم ہوا آ گئی تھی۔ ہوا کیا تھی" وہ تو بادِ سموم تھی' حرص و ہوس کے صحرا سے اٹھنے والی ایک ایسی آندھی جو پتھروں کو بھی جھلسا دے..... یہ آندھی احمد رضا صاحب کے سامنے دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی تھی۔ معصوم سحرش ان سارے حالات سے بے خبر اپنے بابل کے آنگن میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔

سحرش بے شک خوبصورت تھی لیکن اس کا مزاج عام گھریلو لڑکیوں کی طرح ہی تھا۔ وہ کمپیوٹر پڑھ رہی تھی اور بی ایس کے پہلے سال میں تھی۔ رضا صاحب جب اسے دیکھتے تھے تو انہیں یوں لگتا تھا کہ وہ ایک شیشے کو دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسا شیشہ جس کے آر پار بھی کچھ نظر آتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے' سحرش کی سوچیں کس طرح کی ہیں۔ اس کے اردگرد اور آس پاس کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جسے وہ "خاص نظر" سے دیکھتی ہو لیکن اپنی عمر کی سب لڑکیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی کچھ سپنے تھے۔ وہ بھی یقیناً کسی خوبرو' من پسند ساتھی کا تصور ذہن میں بسائے ہوئے تھی۔ کوئی ویسا جیون ساتھی جو اسے سچی محبت اور خوشی دے سکے۔ ان سپنوں اور تصورات میں ایک پختہ عمر کے نیم گنجے' شادی شدہ کا تصور ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک دن سحرش کالج سے واپس آئی تو بہت گم صم اور زرد رو دکھائی دیتی تھی۔ رضا صاحب کا دل انجانے خدشوں کے زیرِ اثر شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ شام تک سحرش سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے لیکن اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ آخر میں بس اس نے اتنا کہا کہ وہ کسی دوسرے کالج میں داخل ہونا چاہتی ہے۔

اگلے روز بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ سب کچھ واضح ہو گیا۔ سردار صاحب کا سیکریٹری حاجی الطاف' رضا صاحب

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً بے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر بیحد مایوس ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربہ و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے لاکھوں بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا ہے ایسے لوگ جو کئے کرائے پر پانی پھیر چکے تھے ایک بار آزما کر یقین کر لیا کہ یہ جڑی بوٹیوں سے بنا واقعی کارگر نسخہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے چند ہی ہفتوں میں نوجوانوں جیسا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی ہاتھوں پاؤں میں چستی توانائی ظاہر کرتے محنت کو تیار ہو جاتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جاتی ہیں جسکے لیے آپ ایک مدت سے محروم ہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر ذیل پتہ کے ساتھ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

کے گھر آیا۔ وہ بہت دیر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ بالآخر وہ اصل موضوع پر آیا اور اس نے بتایا کہ سردار صاحب اپنی پہلی بیوی کی اجازت اور رضامندی سے دوسری شادی کے خواہاں ہیں اور اس حوالے سے ان کی نظرِ انتخاب محرش پر پڑی ہے۔ اگر رضا صاحب کی طرف سے مثبت اشارہ مل جائے تو اس بات چیت کو مروجہ طریقے سے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

اب یہ سب کچھ رضا صاحب کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ سیکریٹری الطاف پر پھٹ پڑنا چاہتے تھے۔ تاہم انہوں نے بہ مشکل اپنے طیش پر قابو پایا اور سیکریٹری سے کہا ''اگر سردار صاحب اپنے قیمتی وقت میں سے بیس تیس منٹ نکال سکیں تو میں اس سلسلے میں ان سے خود بات کرنا چاہوں گا۔''

اگلے روز بارہ بجے آفتاب سردار کے ساتھ احمد رضا کی ''اپائنٹ منٹ'' ہوئی۔ دھڑکتے دل اور لرزتے جسم و جاں کے ساتھ احمد رضا' سردار صاحب سے ملنے ان کے مین آفس واقع اتہال ٹاؤن میں پہنچے۔ انہیں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ملک کے فرماں روا سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ سیکورٹی کے دو تین مراحل سے گزر کر وہ انتظار گاہ میں پہنچا دیے گئے۔ معلوم ہوا کہ بڑے صاحب ایک ضروری میٹنگ میں ہیں اور میٹنگ بس ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔ پولیس' پرائیویٹ گارڈز' نگراں کیمرے' بوگیر کتے۔ غرض سردار صاحب کے اردگرد ہر وہ شے موجود تھی جس کا تعلق شان و شوکت اور دبدبے سے تھا۔

انتظار کٹھن تھا۔ بہرحال احمد رضا صاحب کو یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ میٹنگ برخاست ہوتے ہی آفتاب سردار انہیں لینے کے لیے خود انتظار گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور چند منٹ کی تاخیر پر معذرت بھی کی۔ احمد رضا اس کے ساتھ وسیع و عریض آفس میں داخل ہوئے۔ اپنی پرشکوہ میز کے عقب میں بیٹھنے کے بجائے آفتاب سردار' رضا صاحب کے قریب صوفے پر بیٹھا۔

''ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہاں کچھ کھانے پینے کے لیے نہیں آیا سردار صاحب! صرف ایک ضروری بات کرنی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کا زیادہ وقت لیے بغیر وہ بات آپ تک پہنچا دوں۔''

''جی کہیے۔'' آفتاب سردار نے اپنے دونوں موبائل فونز بند کرتے ہوئے کہا۔

احمد رضا بولے ''سردار صاحب! آپ حاکم ہیں' بااختیار ہیں۔ آپ کے ایک اشارے پر سارے شہر کی انتظامیہ حرکت میں آسکتی ہے۔ میرا آپ کا کوئی مقابلہ نہیں' نہ ہی موازنہ ہے۔ میں ایک معمولی آرٹسٹ ہوں۔ بے شک لوگ مجھے بھی جانتے ہیں۔ ایک خاص طبقے میں میری بھی شناخت ہے..... لیکن یہ شناخت اور حیثیت آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اگر میں اپنی حیثیت دیکھوں تو شاید آپ سے بات کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکوں۔ لیکن اگر میں بات کرنے کی جرأت کر رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کو ایک اچھا انسان' اچھا منصف اور حاکم سمجھ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری بات ''بڑے پن'' سے سنیں گے۔''

''جی کہیے۔'' سردار صاحب کے ماتھے پر ایک شکن ابھر کر غائب ہوگئی۔

''سردار صاحب! اس حقیقت سے یقیناً آپ کو انکار نہیں ہوگا کہ اپنی اولاد پر ہر ماں باپ کا حق ہوتا ہے۔ وہ اولاد کی اچھائی برائی کے بارے میں سوچنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔'' سردار صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ احمد رضا صاحب دوٹوک انداز میں بولے ''آپ میری بیٹی محرش کے بارے میں جس انداز سے سوچ رہے ہیں' وہ میرے لیے بالکل قابلِ قبول نہیں۔ میری بیٹی کی عمر بہت چھوٹی ہے' اس کی ساری توجہ ابھی اپنی پڑھائی لکھائی کی طرف ہے۔ میں آپ کو پوری سچائی کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ جس دن سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ میرا اور میری بیٹی کا ذہنی سکون غارت ہوکر رہ گیا ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو شاید..... ہم یہ شہر یا ملک ہی چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔''

آفتاب سردار نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''رضا صاحب! آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں۔ میں دل کی گہرائی سے آپ کی عزت کرتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ آپ اس معاملے میں جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ ٹھنڈے دل سے خوب سوچ بچار کرلیں۔ پھر آپ جو بھی کہیں گے' مجھے قبول ہوگا۔ جہاں تک بات محرش کی ہے..... اس کے موجودہ ردِعمل کو آپ حتمی نہ سمجھیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے وقتی طور پر تھوڑا سا شاک لگا ہو لیکن وہ بہت جلد صورتِ حال سے مطابقت پیدا کرلے گی اور اگر.....''

''دیکھیں سردار صاحب! اپنی بیٹی کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں' کوئی باہر کا فرد نہیں جان سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو غلطی پر ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے

کہ طاقت اور حیثیت کے لحاظ سے میرا آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ جب اور جس طرح چاہیں ہمیں روند سکتے ہیں لیکن اگر آپ حق سچ بات سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے آپ کی پیشکش کسی طور پر قبول نہیں۔ نہ آج نہ کل نہ آئندہ کبھی۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا سارا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ان کے اٹھتے ہی آفتاب سردار بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ عجیب گمبھیر انداز میں مسکرایا۔ ''آپ اس وقت جذباتی ہو رہے ہیں رضا صاحب! میرا خیال ہے کہ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔''

احمد رضا کہنے کو تو بہت کچھ کہہ آئے تھے لیکن اب اندر سے ڈر بھی رہے تھے۔ آفتاب سردار اگر باپ بیٹی کو سزا دینا چاہتا تو اس کے لیے اس کے پاس ہزاروں راستے تھے۔ احمد رضا سوچنے لگے۔ شاید پرانے وقتوں میں لوگ ٹھیک ہی کیا کرتے تھے۔ وہ علاقے کے بااختیار اور طاقتور لوگوں سے اپنی خوش شکل عورتیں چھپا کر رکھتے تھے۔ انہیں اندیشہ رہتا تھا کہ اگر کسی عیاش نے ان کی بہو بیٹی کو سرراہ دیکھ لیا تو اسے خلوت میں طلب کرلیا جائے گا۔

سحرش نے دو دن بعد ہی وہ کالج چھوڑ دیا اور گھر کے نزدیک ایک دوسرے کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ کچھ گم صم سی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی شوخی اور کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کو جیسے کسی کی نظر لگ گئی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ دو تین بار سیکریٹری الطاف سے بھی سرسری ملاقات ہوئی۔ وہ اس رویے سے خوش نہیں تھا جو رضا صاحب نے اس کے باس سے اپنایا تھا۔ الطاف نے بین السطور رضا صاحب کو سمجھایا کہ یہ صورت حال ناخوشگوار رخ اختیار کرسکتی ہے۔

بہ مشکل دو تین ماہ گزرے تھے کہ وہ ''ناخوشگواری'' ظاہر ہونے لگی جس کا ذکر ایک روز سیکریٹری الطاف نے کیا تھا۔ رضا صاحب کی زندگی بھر کی پونجی ایک آرٹ گیلری تھی۔ یہ گیلری اوقاف کی جگہ پر تھی۔ برسوں سے الطاف صاحب باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتے چلے آرہے تھے۔ اس سلسلے میں کبھی کوئی تنازع پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تنازع پیدا ہوگیا۔ رضا صاحب کو اوپر تلے کئی نوٹس موصول ہوئے۔ محکمۂ اوقاف سے کرائے دار کی حیثیت سے رضا صاحب پر کڑی شرائط عائد کی جارہی تھیں' بہ صورت دیگر انہیں جگہ چھوڑنے کے لیے کہا جارہا تھا۔

ابھی وہ اس دھچکے سے سنبھلے بھی نہیں تھے کہ ان کے انکم ٹیکس کی فائل جو تین چار سال پہلے بند ہوگئی تھی پھر سے پورے اہتمام کے ساتھ کھل گئی۔ متعلقہ آئی ٹی او اور دیگر اہلکار زور شور سے ان کے گھر اور گیلری کے چکر لگانے لگے۔ ان پریشانیوں اور الجھنوں میں دو تین ماہ گزر گئے۔ اسی دوران میں تیسرا جھٹکا لگا اور یہ شدید ترین تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کے اکلوتے بیٹے کو بدعنوانی کے الزام میں محکمانہ کارروائی کا سامنا ہے اور اسے اٹلی سے پاکستان واپس بلایا جارہا ہے۔

اس تازہ دھچکے نے جیسے رضا صاحب کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ رضا صاحب کی عمر اڑتالیس سال ہوچکی تھی لیکن وہ ابھی پوری طرح صحت مند تھے۔ ان کی دلکش شخصیت کو ان کی خوش لباسی اور خوش گفتاری سے بڑھاوا ملتا تھا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر محفل کی جان بن جاتے تھے لیکن اوپر تلے پڑنے والی ان مصیبتوں نے چند ہی ماہ میں انہیں مرجھا کر رکھ دیا۔ وہ مضمحل اور پژمردہ نظر آنے لگے۔ دوسری طرف وہ سحرش میں ایک مختلف قسم کی تبدیلی دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں رضا صاحب کو محسوس ہوتا تھا کہ چند ہی ماہ میں سحرش نے سنجیدگی اور دانائی کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں۔ وہ اب ایک چنچل کالج گرل کے بجائے بیچ عورت کی طرح سوچتی تھی۔ اکثر اوقات اس کی سوچ اتنی گہری ہوتی تھی کہ وہ قرب وجوار کو ہی فراموش کردیتی تھی۔ کچھ ہی روز پہلے وہ کالج سے آتے ہوئے اپنی وین میں بیٹھنے کے بجائے دوسری وین میں بیٹھ گئی اور دو تین اسٹاپ آگے جانے کے بعد اسے واپس آنا پڑا۔ اس کی یہ پریشان خیالی رضا صاحب کو تکلیف دیتی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے ایک عجیب فقرہ کہا۔ باپ بیٹی کے سامنے صبح کا تازہ اخبار پڑا تھا۔ اخباروں میں عموماً آفتاب سردار کی تصویریں چھپتی رہتی تھیں۔ آج بھی میگزین کے رنگین صفحے پر آفتاب سردار کی ایک بڑی تصویر آئی تھی۔ وہ لاہور کے مرکز میں ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا۔ سحرش بولی ''ابو! یہ سردار صاحب دیکھنے میں اتنے بڑے بھی نہیں لگتے۔ لگتا ہے کہ ستائیس اٹھائیس سال کے ہی ہیں۔''

رضا صاحب چونک کر سحرش کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ نظریں جھکائے بے ظاہر لاتعلق بیٹھی تھی۔ وہ اپنے باپ کو جو اشارہ دے رہی تھی' وہ باپ نے وصول کرلیا تھا لیکن وہ اس اشارے کے پیچھے دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ

وہ اس کے باپ تھے۔ ایک لمحے میں ہی احمد رضا صاحب نے جان لیا کہ محرش جو کچھ کہہ رہی ہے کہ اس کے پیچھے جبر اور ستم کا بے پناہ دباؤ ہے۔ وہ ان سارے حالات کو دیکھ رہی ہے جو باپ بیٹی کے اردگرد موجود ہیں اور ان حالات کے تناظر میں وہ اپنے اندر قربانی اور ایثار کا جذبہ ابھار رہی ہے۔ ایک ایسے شخص کو اپنی نوخیز زندگی میں داخلہ دینے کے بارے میں سوچ رہی ہے جو عمر میں اس سے قریباً دگنا ہے' جو پہلے سے شادی شدہ ہے..... اور جس کو وہ ہرگز پسند نہیں کرتی۔

جس روز اخبار کی تصویر والی بات ہوئی' اسی روز دوپہر کو ایک اہم فون کال آئی۔ آفتاب سردار کی پی اے نے رضا صاحب کو یہ سنسنی خیز اطلاع دی کہ سردار صاحب آپ سے بات کریں گے۔ اس متوسط طبقے کے گھر میں داخل ہونے والی فون لائن کے لیے یہ بہت بڑا "اعزاز" تھا کہ اس پر سردار صاحب جیسے طاقتور و بااختیار شخص کی آواز گونجنے والی تھی۔

رضا صاحب پتھر کی طرح ساکت و جامد بیٹھے رہے "ہیلو رضا صاحب! میں آفتاب سردار بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے نرم ملائم لہجے میں کہا گیا۔

"جی' میں سن رہا ہوں۔" احمد رضا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"محترم! مجھے الطاف رحمانی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آپ کو ایک دو مسئلے درپیش ہیں۔ آپ کی پریشانی کو میں نے اپنی پریشانی کی طرح محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک اور طرح کی فکرمندی بھی پیدا ہوئی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں آپ ان پریشانیوں کا ناتا کسی طور پر میرے ساتھ نہ جوڑ دیں۔ میری اور آپ کی جو آخری ملاقات ہوئی تھی' وہ میرے لیے زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ اس قسم کی صورت حال میں عموماً بدظنی پیدا ہو جاتی ہے۔"

"اب آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" احمد رضا نے اپنے اندرونی احساسات کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"الطاف نے کل انکم ٹیکس اور اوقاف کے متعلقہ اہلکاروں کو بلایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دو چار دن میں اس سارے معاملے کو ہینڈل کر لے گا۔ اگر مزید کوئی پیچیدگی پیدا ہوئی تو میں خود دیکھ لوں گا۔ انشاءاللہ' آپ کے یہ دو مسائل تو اب آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔"

"شکریہ!" رضا صاحب بہ مشکل یہی کہہ سکے۔

"اور رضا صاحب! میری طرف سے اپنا دل بالکل صاف رکھیے۔ میں آپ کے بارے میں جو کچھ سوچتا ہوں' اس میں کسی طرح کے عناد یا غرض کو دخل نہیں ہے۔ میں اپنے نجی معاملات کو اپنی سماجی ذمے داریوں سے بالکل الگ رکھتا ہوں۔"

"جی!"

دو چار مزید باتیں کرنے کے بعد آفتاب سردار نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

احمد رضا کا سارا جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ منافق کے لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے جبر اور قہر کو بڑی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ وہ ایک فن کار تھے اور ان کی حساسیت انہیں آفتاب سردار کی اندرونی خباثت سے پوری طرح آگاہ کر رہی تھی۔

فرطِ غضب سے ان کے رگ و پے میں آگ بھر گئی۔ وہ دیکھ رہے تھے' آفتاب سردار ان کی چھوٹی موٹی' خوش رنگ بیٹی کو سالم نگلنے کے لیے ایک مگرمچھ کی طرح دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور بے تابی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ آفتاب کے مقابلے میں وہ کمزور تھے۔ بے حد ناتواں تھے لیکن اگر چیونٹی کو بھی مسلا جائے تو وہ مزاحمت کا حق ادا کرتی ہے۔ وہ کیا کر سکتے ہیں؟ کیا کر سکتے ہیں؟

وہ بے حد بے قراری کے عالم میں سوچنے لگے۔ انہوں نے کبھی مکھی تک نہیں مارا تھا لیکن ان لمحوں میں وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ وہ آفتاب سردار کو گولی مار دیں۔ سارے نتائج سے بے پروا ہو کر وہ سیدھے آفتاب سردار کے آفس میں جائیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھیں اور پستول سیدھا کر کے اس کے سینے میں تین چار گولیاں اتار دیں۔ آتشیں گولیاں..... جو ہر اونچ نیچ' ہر کمزوری اور طاقت کو برابر کر دیتی ہیں۔ جو انصاف کے راستے مسدود ہونے کے بعد انصاف اور مساوات کی پیامبر بنتی ہیں۔

لیکن..... لیکن سوچنا آسان اور عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احمد رضا بھی کئی پہر اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ ایک پل جیتے اور ایک پل مرتے رہے۔ آخر بے بسی کے آنسو بہاتے' نڈھال سے ہو کر بستر پر لیٹ گئے۔ ان کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ آفتاب سردار جیسے عفریت کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ یہ ظاہر تو مزاحمت کے راستے موجود تھے۔ پولیس تھی' عدالتیں تھیں' احمد رضا کا اپنا حلقۂ احباب تھا۔ فن کی دنیا سے منسلک ہونے کے باعث انہیں ایک دو اہم فورم مہیا ہو سکتے تھے مگر نتیجہ کیا تھا؟ نتیجہ وہی تھا جو صدیوں سے نکلتا آیا ہے..... ذہنی اذیت' بدنامی' جگ ہنسائی اور اس کے ساتھ ساتھ بسا اوقات پسپائی۔

انہوں نے ابھی تک اپنے حلقۂ احباب میں سے کسی کو اس تکلیف دہ صورتِ حال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ انہیں پتا تھا کہ اگر وہ بتائیں گے تو دو چار قریبی ساتھی تو ضرور غم ٹھونک کر اٹھ کھڑے ہوں گے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک شدید تذبذب کے عالم میں فون سیٹ کے پاس بیٹھے رہے مگر کسی دوست کو فون کرنے کی ہمت انہیں نہیں ہوئی۔

سہ پہر کو سیکریٹری الطاف ان سے ملنے چلا آیا۔ الطاف کا آنا انہیں کبھی اچھا نہیں لگا تھا اور آج تو وہ اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ بہرحال اپنے گریز پر ضبط کرتے ہوئے انہوں نے سحرش سے کہا کہ وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

آج سیکریٹری الطاف نے رضا صاحب سے مختلف ڈھنگ سے بات کی۔ وہ بولا ''رضا صاحب! آپ ایک بلند پایہ فن کار ہیں تاہم اس حیثیت سے قطع نظر ہم دونوں ایک ہی کلاس کے لوگ ہیں۔ ہمارے طبقے کے مسائل تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ آپ جس کیفیت سے گزر رہے ہیں' میں اسے بڑی اچھی طرح سے سمجھ رہا ہوں اور بہ خدا میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں تہ دل سے چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نکل آئے جو آپ کے لیے قابلِ قبول ہو۔''

اس تمہید کے بعد سیکریٹری الطاف نے پہلی بار اپنے ان داتا سردار صاحب کے بارے میں مختلف انداز سے رائے زنی کی۔ اس نے بتایا کہ آفتاب سردار کا پس منظر جاگیردارانہ ہے۔ یوں ان میں انا پرستی' ضد اور تند مزاجی جیسی وہ ساری صفتیں پائی جاتی ہیں جو ایسے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ بہرحال ان میں اچھی صفتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے دوست بھی ہیں اور ایسے ہیں کہ محبت کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں الطاف نے ڈھکے چھپے انداز میں شائستہ طریقے سے رضا صاحب کو یہ بات سمجھائی کہ اگر کسی طور ان کی بیٹی سردار صاحب کے خاندان کی عزت بن جائے تو یہ بہت خیر اور بھلائی کی بات ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت خوش آیند بھی۔

رضا صاحب کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ ہر طرف سے شکنجے میں جکڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اس دن عاطی الطاف کے جانے کے بعد وہ اسٹڈی میں بند ہو کر بہت دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ شاید ان کے ماضی کی کچھ کوتاہیاں تھیں' جن کا صلہ انہیں آج اس صورت میں مل رہا تھا۔ ان کی ذہنی اذیت انہیں بہ تدریج ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ماہ و سال کو یاد کرنے لگے۔

وہ ہمیشہ سے خوبرو تھے۔ جوانی ان پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ سفید کھلتا ہوا رنگ' ہلکی براؤن آنکھیں' گھنے ریشمی بال اور لمبا قد۔ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ جن دنوں وہ فائن آرٹ کالج میں پڑھتے تھے' کئی لڑکیوں سے ان کی دوستی ہوئی۔ درحقیقت وہ جس لڑکی کو نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے' وہ ان کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔ ان دنوں کسی بھی لڑکی کو سر کرنا ان کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ بلکہ وہ چاہتے تو اکثر لڑکیوں کو جسمانی طور پر بھی فتح کر سکتے تھے لیکن ان کا مزاج ایسا نہیں تھا۔ ان کی زیادہ تر دوستیاں بس ایک حد کے اندر ہی رہیں۔ اوائل عمری کے اس دور میں بھی اخلاق اور شائستگی کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا..... شاید یہی وجہ تھی کہ ''تعلق'' ختم ہونے کے بعد بھی اکثر لڑکیاں نارمل انداز میں ان سے ملتی رہتی تھیں۔ وہ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں اور وہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

ایک صرف ایک لڑکی ایسی تھی جس کے ساتھ احمد رضا کا تعلق آگے تک گیا تھا..... ان دونوں کے جذبات میں شدت آئی تھی اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے لیکن اس لڑکی کو احمد رضا نے چھوڑا نہیں تھا۔ اسے شریکِ حیات بنایا تھا اور وہی سحرش کی مرحومہ ماں تھی۔ اس کا نام نائلہ تھا اور وہ بھی احمد رضا کی طرح فنونِ لطیفہ میں دلچسپی رکھتی تھی۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کے بیس سال گزارنے کے بعد اب وہ دوسری دنیا کی باسی تھی۔

شادی سے پہلے جب احمد رضا کالج لائف میں ایک آزاد پنچھی کی سی زندگی گزار رہے تھے' ان کے دوست ان کے لیے ایک معروف اصطلاح ''لیڈی کلر'' استعمال کیا کرتے تھے اور وہ واقعی لیڈی کلر تھے۔ صنفِ مخالف ان کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچتی تھی۔ اس دور میں کبھی کبھی تو احمد رضا کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ''رومانی تعلق'' بس ان کی توجہ کا نام ہے۔ وہ جس لڑکی یا خاتون پر بھی چند دن یا ہفتوں کے لیے اپنی توجہ مرکوز کرتے تھے۔ وہ ان کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔ بعد ازاں اپنے یقین کے پختہ ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنی اس خداداد صلاحیت کو کئی بار آزمایا بھی۔ اس کی مثال یوں تھی کہ کوئی چہرہ انہیں اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں میں بساتے تھے۔ اسے سوچتے تھے' اس کی تمنا کرتے تھے۔ اس سے ملتے جلتے' اسے باتیں کرتے' وہ اس

کی خواہش اپنے اندر ابھارتے رہتے تھے اور تین چوتھائی کیسوں میں یہ ہوتا تھا کہ وہ ''خوبرو خاتون یا لڑکی'' ان میں دلچسپی لینے لگتی تھی۔ ان دنوں احمد رضا عام ڈگر سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔ اسے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خود رو ہوتی ہے' وغیرہ وغیرہ لیکن ان دنوں احمد رضا اس حتمی نتیجے پر پہنچے تھے کہ سارے نہیں تو کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ''محبت'' کو پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس لطیف جذبے کی مینوفیکچرنگ کر سکتے ہیں۔ ایسے عاشق مزاج لوگوں کو جو چہرہ بھاتا ہے' وہ اسے اپنے ذہن میں فوکس کرتے ہیں' اس کے لیے آہیں بھرتے ہیں' بے قرار ہوتے ہیں' اس کی خواہش کو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اندر ابھارتے ہیں۔ ان کی طلب میں اتنی شدت اور ثابت قدمی ہوتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں فریق ثانی ان کی ''طلب'' کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور روما نس کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں۔

احمد رضا' ماضی کی سوچوں میں گم تھے۔ وہ تصور کے دریچوں سے بیتے ہوئے وقت کو دیکھ رہے تھے اور گزری ہوئی کیفیات کو محسوس کر رہے تھے۔ ان کے سفیدی مائل بالوں کی کچھ لٹیں ان کی کشادہ پیشانی پر لہرا رہی تھیں۔ مالیخا اوائل عمری میں انہوں نے زندگی کو اپنے ڈھنگ سے انجوائے کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بھی مواقع موجود ہونے کے باوجود انہوں نے بڑی حد تک خود کو سنبھالے رکھا تھا۔ وہ بیٹھے رہے اور اپنے ماضی کا تجزیہ کرتے رہے۔ وہ بالائی منزل پر تھے۔ ان کی نگاہیں کھڑکی سے باہر اور لان سے آگے تارکول کی سیاہ سڑک کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی لاڈلی کالج سے لوٹنے والی تھی۔ اپنی مخصوص آواز میں انہیں ''السلام علیکم ابو!'' کہنے والی تھی۔ پھر اپنے ہاتھوں سے ان کے سامنے دوپہر کا کھانا پروسنے والی تھی۔ وہ اپنے ماضی کو کھنگالنے کے ساتھ ساتھ بے خیالی میں بیٹی کی کالج وین کا راستہ بھی تکتے جا رہے تھے۔ آج وہ زیادہ شدت سے اس کے منتظر تھے کہ وہ صبح سویرے سوجی آنکھوں کے ساتھ کالج گئی تھی۔

اور پھر کالج وین سڑک کے موڑ پر نمودار ہوئی۔ اس نے حسب معمول سحرش کو موڑ پر اتارا اور آگے بڑھ گئی۔ سفید براق یونیفارم میں ملبوس سحرش چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گھر کی طرف بڑھی۔ ایک فائل اور دو چار کتابیں اس کے سینے سے لگی تھیں۔ سر پر سبز دوپٹا تھا۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ عجیب اداسی بھرے کھوئے کھوئے انداز میں وہ گھر کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ شوخی' ترنگ اور تیزی جو اس کی ذات کا حصہ تھی' کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ سب کچھ ایک طاقتور' خودسر اور بے اصول شخص کے اڑائے ہوئے گرد و غبار میں گم ہو چکا تھا۔ وہ اسی گرد و غبار میں ڈگمگاتی ہوئی سی مین گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر احمد رضا کا دل سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ سحرش اپنے آپ میں اتنی گم تھی کہ اس تیز رفتار ویگن کو نہیں دیکھ سکی جو برق رفتاری سے موڑ پر نمودار ہوئی تھی۔ احمد رضا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سحرش نے ایک تہائی سڑک پار کی تھی جب بریکوں کی خوفناک چنگھاڑ ابھری۔ ویگن نے سحرش کو اٹھایا اور ربڑ کی گڑیا کی طرح اچھال کر کئی میٹر دور پھینک دیا۔ احمد رضا کو اپنی معصوم بچی کی کتابیں ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر وہ چلاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

سحرش کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی دائیں پنڈلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ پاؤں کے علاوہ چہرے اور کندھے پر بھی زخم آئے تھے۔ اسپتال میں اس کی کنپٹی اور رخسار پر ٹیس ٹانکے لگے۔ ٹانگ میں پلیٹیں وغیرہ لگانے کے لیے ایک بڑا آپریشن کرنا پڑا۔ وہ قریباً دو ہفتے تک اسپتال میں رہی پھر گھر واپس آ گئی۔

آنے والے دنوں میں احمد رضا نے اپنی لاڈلی کے علاج معالجے پر کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انہوں نے مکان گروی رکھ دیا اور سحرش پر پیسا پانی کی طرح بہایا۔ امّی سے' بھائی نے بھی جو کچھ ہو سکا' بہن کے لیے کیا۔ وہ خود بھی برے وقت کا شکار تھا اور ملازمت کے حوالے سے اس کا مستقبل خطرے میں پڑا ہوا تھا۔ بہترین علاج معالجے سے سحرش کی پنڈلی تو ٹھیک ہو گئی لیکن پاؤں پر جو پیچیدہ چوٹ آئی تھی' اس کی وجہ سے اس کی چال میں مستقل لنگڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ چہرے کا زخم چھپانے کے لیے کراچی سے اس کی پلاسٹک سرجری کرائی گئی۔ یوں چہرے کی یہ بدنمائی کافی حد تک چھپ گئی۔

کچھ بھی تھا' وہ اب پہلے جیسی سحرش تو رہی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آفتاب سردار کی صورت میں جو آسیب باپ بیٹی کو چمٹ گیا تھا' وہ خود بخود ہی اپنے شکار کو چھوڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ جب ہدف ہی نہیں رہا تھا تو ''دشمن ہاتھ'' کمان کس لیے کھینچتے۔ چند مہینوں میں ہی بدباطن آفتاب سردار کی وجہ سے پیدا ہونے والے سارے مسئلے آپوں آپ حل ہو گئے یا پس

منظر میں چلے گئے۔

ان واقعات کے قریباً ایک سال بعد احمد رضا نے بڑی خاموشی سے بیٹی کی شادی کردی۔ اپنے شاگردوں میں سے ہی ایک درمیانی شکل صورت کا ضرورت مند لڑکا دیکھ کر انہوں نے سحرش کے ہاتھ پیلے کردیے۔ سنہری خوابوں کے وہ سارے محل مسمار ہو چکے تھے جو احمد رضا نے کبھی اپنی دلکش بیٹی کے لیے بنائے تھے۔ اب تو بس زندگی گزارنے کے لیے ایک چھت اور چار دیواری کی ضرورت تھی۔

نازک مزاج اور بے حد حساس سحرش اپنے جسمانی عیب سے کبھی مطابقت پیدا نہ کرسکی۔ ایک احساس کمتری تھا جو اسے ہمیشہ گھن کی طرح چاٹتا رہتا تھا۔ پھر ایک ستم یہ بھی ہوا کہ میاں بیوی اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو زندگی کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔ یہ خوشیاں سحرش کو بھی ملتی رہیں لیکن پھر ایک دن ایک بڑا غم اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی پنڈلی کی چوٹ جیسے پھر سے ہری ہوگئی۔ ٹیسٹوں کے بعد پتا چلا کہ اسے سرطان ہے۔ یہ ہڈی کا سرطان تھا۔ اس کے بعد کے واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ اس تیزی سے جس تیزی سے کبھی سحرش اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھتی تھی' اپنے لان میں بھاگتی تھی اور اپنے ابو کے ساتھ کھیلتی کودتی تھی۔ ٹیسٹ' اسپتال' آپریشن... پھر ٹیسٹ پھر اسپتال۔ بس دو سال کے دورانیے کا ایک جان لیوا چکر تھا۔ اس جان لیوا چکر کا اختتام اٹلی روانگی پر ہوا۔ بھائی نے جاں بہ لب بہن کے لیے آخری کوششیں کرنا چاہی تھیں اور باپ سمیت اسے اپنے پاس بلالیا تھا۔ اٹلی میں سحرش بس ایک سال اور زندہ رہی۔

☆☆☆

وقت مدام چلتا رہتا ہے۔ رات اور دن کے چولے بدلتا' نئے نئے واقعات کو وجود دیتا' پرانے واقعات کو گرد میں ڈھانپتا' یہ سدا حرکت میں رہتا ہے۔ اٹلی کے ایک مسلم قبرستان میں ایک جواں سال لڑکی کی قبر بننے کے بعد بھی وقت حرکت میں رہا۔ صبح اور شام کے رنگ آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ درختوں پر پرندے چہکتے رہے۔ جھرنوں میں پانی بہتا رہا۔ موسم آتے اور جاتے رہے۔ اسی طرح دس برس گزر گئے۔ بہت کم لوگوں کو یاد رہا کہ لاہور کے ایک پرسکون گوشے میں ایک اسٹائلش گھر تھا جہاں معروف مصور احمد رضا اپنی خوش رو بیٹی سحرش رضا کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ سفید براق یونیفارم پہن کر کالج جاتی تھی اور وہ بالائی منزل کی کھڑکی میں بیٹھ کر اس کی راہ تکتا تھا۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کی کل کائنات تھے۔ پھر ایک روز باپ کی کائنات ایک حادثے کا شکار ہوکر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

ہاں... بہت کم لوگوں کو یہ یاد رہا اور یہ بات تو دو تین افراد کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں تھی کہ احمد رضا کی کائنات اس شخص کے سبب تباہ ہوئی جس کا نام آفتاب سردار ہے۔ اسی کی پھیلائی ہوئی مایوسیوں کی زہریلی دھند میں وہ بے چاری ٹھوکر کھا کر ایک سانحے کی گود میں گری اور اٹھ نہ سکی۔ ہاں' وہی آفتاب سردار جو اخلاقی قدروں کا علمبردار اور بہت بڑا ''سماج دوست'' بن کر لاہور کی سڑکوں پر دندناتا ہے۔ جس کے اردگرد وفا کیشوں اور اطاعت گزاروں کے جمگھٹے ہوتے ہیں اور جب کسی کو یہ معلوم ہی نہیں تھا تو پھر کوئی آفتاب سردار کے حوالے سے جرم و سزا کے فلسفے پر کیسے غور کرسکتا تھا۔ کسی کے ذہن میں یہ بات کیسے آسکتی تھی کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور کمزور و ناتواں چیونٹی کو بھی مسلا جائے تو وہ مزاحمت کا حق ادا کرتی ہے۔

حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی اور حقیقت یہ تھی کہ کچھ عرصہ پہلے ایک چیونٹی کو مسلا گیا تھا... وہ چیونٹی مزاحمت اور بدلے کا حق محفوظ رکھتی تھی۔

☆☆☆

وہ بہار کی ایک خوبصورت شام تھی۔ لاہور رنگوں اور خوشبوؤں کی لپیٹ میں تھا۔ نہر کے نزدیک آفتاب سردار کی محل نما کوٹھی سبزے میں گھری ہوئی اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ایک خوشنما منظر پیش کرتی تھی لیکن یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو گھر باہر سے خوبصورت و پرسکون لگیں' وہ اندر سے بھی آرام دہ و سکون بخش ہوں۔ آفتاب سردار کی محل نما کوٹھی بھی اندر سے پرسکون نہیں تھی۔ وہاں ایک بہت بڑی اتھل پتھل رونما ہو چکی تھی۔ ایک تباہ کن طوفان آ چکا تھا۔ آفتاب سردار کی اکلوتی بہن ڈاکٹر رخشندہ سردار سوجی ہوئی سرخ آنکھوں اور تمتمائے چہرے کے ساتھ اپنی قریبی سہیلی ماہم کے ساتھ اپنے بیڈروم میں بیٹھی تھی۔ خوبرو رخشندہ سردار کی عمر اب تیس کے قریب تھی لیکن دیکھنے میں وہ پچیس چھبیس کی ہی نظر آتی تھی۔ چار پانچ برس پہلے اس کی شادی نیوی کے ایک بہت بڑے افسر سے ہوئی تھی لیکن بہ وجوہ دو تین ماہ میں ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس وقت سے رخشندہ مجرد زندگی گزار رہی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت تصویریں پینٹ کرنے یا میوزک سننے میں گزرتا تھا۔

یہ کوئی پانچ چھ مہینے پہلے کی بات ہے جب رخشندہ کی زندگی ایکا ایکی ایک انقلابی تبدیلی سے روشناس ہوئی تھی۔ شروع میں یہ ''تبدیلی'' بہ ذریعہ انٹرنیٹ رخشندہ کی زندگی

میں داخل ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رخشندہ سرتاپا اس تبدیلی کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس تبدیلی نے رخشندہ کو تو بے طرح متاثر کیا ہی تھا' اس کے گھرانے بلکہ پوری حویلی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ ایک زلزلہ تھا جو پچھلے پانچ چھ ماہ سے گاہے گاہے ان بہ ظاہر پرسکون دیواروں کے اندر تہلکہ مچاتا تھا اور ہر شے کو لرزا دیتا تھا۔ اس وقت بھی رخشندہ اپنی قریبی سہیلی کے ساتھ اسی موضوع پر بات کر رہی تھی۔

وہ روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی ''ماہم! میں سب کچھ سمجھتی ہوں' سب کچھ جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے' وہ عمر میں مجھ سے دگنا بڑے ہیں۔ میں تمہاری اس بات کو بھی رد نہیں کرتی کہ ماضی میں احمد رضا صاحب اور بھائی جان میں کسی طرح کا تنازع پیدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میرا یہ فیصلہ شاید تمہارے سمیت کسی کو پسند نہیں ہے لیکن..... لیکن مجھے یہ فیصلہ کرنا ہے..... میں بہت آگے نکل چکی ہوں ماہم! اب واپسی میرے لیے ممکن نہیں' کسی صورت ممکن نہیں۔''

''لیکن رخشی! یہ بھی تو دیکھو' اس میں جگ ہنسائی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس میں تمہارے بھائی جان کی عزت اور وقار کا سوال ہے۔''

''کوئی عزت و وقار کا سوال نہیں ہے ماہم!'' رخشندہ تیزی سے بولی ''کیا عورتیں اور لڑکیاں بڑی عمر کے مردوں سے شادی نہیں کرتیں؟ کیا میری یہ شادی روئے زمین پر پہلی ہوگی۔ اور تو اور ہمارے اپنے خاندان میں کم از کم ایسی دس شادیاں میں تمہیں گنوا سکتی ہوں۔ یہ سب ہلکی پھلکی باتیں ہیں ماہم! ذرا سا وزن نہیں ہے ان میں..... اگر وزن ہے تو اس حقیقت میں ہے کہ وہ ایک بے حد اچھے' بے حد نیس انسان ہیں اور میں انہیں دل کی گہرائیوں سے پسند کرتی ہوں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں ماہم! ان کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک دن بتانے کے لیے میں اپنی پوری زندگی قربان کر سکتی ہوں۔''

ماہم نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا ''کتنی جلد کتنا بدل گئی ہو رخشندہ۔ یقین نہیں آتا۔''

اس سے پہلے کہ رخشندہ جواب میں کچھ کہتی' اس کے موبائل کی ''وائبریشن'' نے بتایا کہ کال آئی ہے۔ رخشندہ نے نمبر دیکھا اور اس کی بھیگی آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک نمودار ہوگئی۔ چہرے پر ایک انوکھی روشنی پھیلی۔ یہ اوورسیز کال ہالینڈ سے آئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی ''ہیلو رضا صاحب! کیسے ہیں آپ..... جی..... جی..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے کل فون کیوں نہیں کیا؟''

جس وقت رخشندہ کی خواب گاہ میں یہ باتیں ہو رہی تھیں' کوٹھی کے ایک قریبی کمرے میں آفتاب سردار اپنے ہاتھ پشت پر باندھے زخمی شیر کی طرح چکرا رہا تھا۔ اس کی بہن نے پوری طاقت کے ساتھ علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ وہ بالغ تھی' تعلیم یافتہ اور میچور تھی۔ اس کا اپنا حلقۂ احباب تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ آفتاب سردار کی بہن تھی۔ آفتاب کے ماتھے پر پسینے آ رہے تھے۔ سارے جسم پر لرزا طاری تھا۔

تین دن بعد صبح کے وقت ملک بھر کے چھوٹے بڑے اخبارات ایک چٹخارے دار خبر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ایک بڑے اخبار کی سرخی یہ تھی ''آفتاب سردار کی ہمشیرہ ڈاکٹر رخشندہ سردار گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ قریبی ذرائع کے مطابق وہ ایمسٹرڈیم پہنچ چکی ہیں۔''

مختلف خبروں کے متن کا مفہوم کچھ اس طرح تھا ''باخبر ذرائع کے مطابق ملک کے جانے پہچانے مصور احمد رضا آج کل ہالینڈ میں مقیم ہیں۔ رخشندہ سردار ان کی پرانی فین تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے انٹرنیٹ پر احمد رضا اور رخشندہ سردار کا رابطہ ہوا۔ یہ رابطہ جلد ہی ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی میں ڈھل گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ دو ڈھائی ماہ پہلے ہی رخشندہ سردار نے مصور احمد رضا کو شریک حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے بعد سردار گھرانے میں اختلافات پیدا ہوئے جو بہ تدریج سنگین شکل اختیار کر گئے۔ احمد رضا اور رخشندہ سردار کی عمروں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیٹس اور خاندانی پس منظر کا تفاوت بھی نمایاں ہے۔ یاد رہے کہ چند ہفتے قبل رخشندہ سردار کو تشویش ناک حالت میں اسپتال بھی داخل کرایا گیا تھا۔ اس وقت میڈیا کی طرف سے یہ قیاس آرائی کی گئی تھی کہ شاید یہ خودکشی کی کوشش ہے۔ بہرحال خاندانی ذرائع کی طرف سے اس خبر کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی تھی۔ آج اس طویل کشمکش کا ڈراپ سین اس شکل میں ہوا ہے کہ رخشندہ سردار ہالینڈ پہنچ گئی ہیں۔ معتبر ذرائع کے مطابق آئندہ چند دنوں میں ہالینڈ میں کسی مقام پر احمد رضا اور ڈاکٹر رخشندہ' رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں۔''

شدزور آفتاب سردار اور کمزور احمد رضا کی کشاکش اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ ''مد زور پانی کی طرح'' ناانصافی اور زیادتی کا ''ردعمل'' بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی مناسب نامناسب راستہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

طاہر جاوید مغل

آزادی



سنگدل فریب کے جرم کا ارتکاب کرنے والے دو مجرموں کے احوال۔ ان کے جرائم ثابت شدہ تھے اور نا قابل معافی۔ انہیں پیش آنے والے حالات میں عجیب سے نام سی یکسانیت تھی۔ مقدر کے ان فیصلوں کا انجام بھی ایک ہی ہوا۔

معاشرت اور حالات کے دو الگ الگ مجرموں کا فسانہ

یہ دو افراد کی دو کہانیاں ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی کہانی ہے۔ یہ کہانی ان دونوں کے ساتھ قریباً قریباً ایک ہی وقت شروع ہوئی اور ایک ہی وقت پر انجام کو پہنچی۔

ان میں سے ایک کا نام قاسم تھا۔ دوسری ایک لڑکی تھی اور اس کا نام راحت تھا۔ قاسم درمیانی عمر کا حال بیچنے دار شخص تھا اور سرگودھا میں رہتا تھا۔ راحت ایک نوجوان لڑکی تھی اور خوشاب کے ایک دور دراز گاؤں باغ پور کی رہائشی تھی۔

001 (NASIR@SRUSHENBAR)167

قاسم خوانچہ فروش تھا۔ عورتوں کے بناؤ سنگھار کی سستی اشیا اور عیاری کا دیگر سامان وہ ایک ریڑھی پر رکھ کر گلی گلی بیچتا تھا۔ اس کا بیٹا اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ لاہور جا چکا تھا۔ اب سرگودھا میں قاسم کی بیوی اور بیٹی رہ گئے تھے۔ بیٹی کی عمر بمشکل چودہ پندرہ برس تھی۔ گزر اوقات کے لیے ماں بیٹی مختلف گھروں میں کام کاج کرتی تھیں۔

خوانچہ فروش قاسم کے پاس عرصے سے پچاس روپے والے چند انعامی بانڈ پڑے تھے۔ ایک روز قاسم پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ اس کے ایک بانڈ پر پندرہ ہزار روپے کا انعام نکل آیا ہے۔ جب انعام کی اچھی طرح تصدیق ہو گئی تو قاسم کو بانڈ بھنانے کی فکر لاحق ہوئی۔ اپنے بیٹے سے بڑھ کر وہ کس پر اعتبار کر سکتا تھا' وہ سیدھا لاہور آ گیا۔ بیٹا اور بہو بھی بہت خوش ہوئے۔ بیٹے نے بانڈ کیش کروا لیکن بینک میں جانے کے بجائے باہر سے رقم لے لینے کا مشورہ دیا۔ قاسم کا خیال تھا کہ وہ تین چار ہزار روپے بیٹے کو دے گا اور باقی سرگودھا لے جائے گا۔ اگر رقم محفوظ رہتی تو کل کلاں بیٹی کے بیاہ میں کام آتی لیکن جب اسے پتا چلا کہ بہو امید سے ہے تو اس کی مٹھی اور بھی "ڈھیلی" ہو گئی۔ ایک ننھے منے ہنستے ہوئے پوتے کے تصور نے اسے اتنا نہال کیا کہ اس نے خاموشی سے نصف رقم بیٹے کے ہاتھ میں تھما دی۔ لاہور سے سرگودھا واپس جاتے ہوئے اسے اپنے خوانچے کے لیے کچھ سامان بھی لینا تھا۔ سامان وغیرہ لے کر وہ تیسرے چوتھے روز لاہور سے واپس سرگودھا روانہ ہو گیا۔

وہ مارچ کی ایک بڑی سہانی شام تھی۔ ہر طرف پھول کھلے تھے۔ فضا میں خوشبو کا بسیرا تھا لیکن حالات کا ایک اپنا موسم ہوتا ہے۔ اس خوشبو بھری شام کو قاسم سے ایک "جرم" سرزد ہو گیا۔ ٹرین سرگودھا کے اسٹیشن پر پہنچی۔ قاسم اپنے سامان والے بیگ کے ساتھ نیچے اترا۔ خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے سامان والا بیگ ایک ستون کے ساتھ رکھا اور روانہ انتظار گاہ کی طرف بڑھا۔ یہاں پانی کا ایک خستہ حال کولر موجود تھا۔ قاسم نے پانی کی ٹونٹی کی طرف سر جھکایا ہی تھا کہ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔ گھبراہٹ سے پھیلتے ہوئے دھوئیں میں قاسم نے دیکھا کہ کئی لوگ فرش پر گرے پڑے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پھر قاسم کا دھیان اپنے قدموں کی طرف گیا۔ اسے ایک کٹا ہوا خون آلود انسانی ہاتھ نظر آیا۔ قاسم پاگلانہ انداز میں چلایا اور مڑ کر بھاگا۔ وہ ابھی اسٹیشن کے بیرونی برآمدے میں ہی پہنچا تھا کہ کسی نے عقب سے اسے دبوچ لیا۔ ایک باوردی پولیس اہلکار تھا۔

قریباً یہی وقت تھا جب سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن سے بہت دور خوشاب کے اس دور دراز گاؤں باغ پور میں راحت نامی لڑکی کی کہانی شروع ہوئی۔ راحت سے بھی ایک "جرم" سرزد ہوا۔ راحت ایک غریب مزارعے خادم حسین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے دو بھائی اس سے کافی چھوٹے تھے اور گاؤں کے چھوٹے سے اسکول میں پڑھتے تھے۔ راحت خوب صورت تھی' وہ ہنستی تھی تو اس کے دندانے کا رنگ نمایاں ہوتا تھا اور دانت موتیوں کی طرح دمکتے تھے۔ وہ بہار کا موسم تھا۔ بڑی سہانی شام تھی۔ فضا میں خوشبو کا ڈیرا تھا۔ گندم کے سنہری کھیت کے ساتھ ساتھ چلتی جب وہ کنوئیں کی طرف [illegible] اس کی نگاہ ماسٹر ارشاد کے بیٹے تنویر پر پڑی۔ [illegible] اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ شروع سے ہی اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی برس پہلے اپنے ماموں کے پاس کراچی چلا گیا تھا اور وہاں پڑھتا رہا تھا۔ اس کی واپسی چند روز پہلے ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں گاؤں میں بڑے بچوں کے لیے بڑا اسکول کھولنے کی باتیں کر رہا تھا۔ راحت نے تنویر کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے میں کوئی شے ایک دم پگھل گئی ہے اور اس کا دل بالکل مختلف انداز سے دھڑکنے لگا ہے۔ کئی وقت میں وہ دونوں بڑے تکلف سے ایک دوسرے کا نام لے کر بلایا کرتے تھے لیکن اب کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ ایسا ایسی کوئی تبدیلی آئی تھی۔ راحت تنگ پگڈنڈی پر اپنا بدن چرا کر تنویر کے قریب سے گزرنا چاہتی تھی لیکن نہ گزر سکی' وہ دونوں ہولے سے ٹکرا گئے اور یہ مختصر لمس ان دونوں کے لیے یادگار بن گیا۔

جس طرح کسی نامعلوم شخص نے قاسم کی بے خبری میں اس کے بیگ میں بم رکھا تھا اور وہ بے گناہ تھا اسی طرح راحت بھی بے گناہ تھی۔ اس کے سینے میں جس "جذبے" کا آتش فشاں پھٹا تھا وہ "جذبہ" اس نے خود تو اپنے دل میں نہیں چھپایا تھا' یہ دستِ قدرت کا کام تھا۔ وہی دستِ قدرت جس کی انگلیوں سے بندھی ہوئی ڈوریاں ہمیں کٹھ پتلیوں کی طرح چلاتی ہیں۔ سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن پر قاسم ناکردہ جرم کی پاداش میں پکڑا گیا۔ باغ پور کی راحت بھی ناکردہ جرم کی پاداش میں "گرفت" کی راہ پر چل پڑی۔۔۔ پگڈنڈی پر ہونے والی اس پہلی ملاقات کے تین ہی ہفتے بعد جب وہ آموں کے باغ میں تنویر سے باتیں کر رہی تھی' ایک آہٹ نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ تنویر نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا سر راحت کی آغوش سے نکالا۔ راحت نے جلدی سے سینے پر اوڑھنی پھیلائی۔ سامنے درختوں میں جنبش ہوئی اور چوہدری

SCANNED BY CAMSCANNER

تیمور زماں کا ایک کارندہ ان پر خطرناک نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ درختوں میں اوجھل ہوگیا۔

○☆○

قاسم عدالت میں پیش ہوا۔ سب کچھ اس کے خلاف تھا۔ جس بم کی وجہ سے تین افراد ہلاک اور دو خواتین زخمی ہوئے وہ قاسم کے بیگ میں تھا۔ قاسم کو موقع سے فرار ہوتے ہوئے ایک ذمے دار پولیس اہلکار نے دیکھا تھا۔ پھر قاسم کے پاس سے سات ہزار روپے کی خطیر رقم بھی برآمد ہوئی تھی۔ یہ رقم قاسم خوانچہ فروش کے پاس کہاں سے آئی۔ وکیل صفائی اس سوال کا کوئی "ایسا مؤثر" جواب نہ دے سکا جس کی قانونی حیثیت ہوتی۔ وہ بانڈ جس پر قاسم کا انعام نکلا تھا اس کے بیٹے نے بینک سے بالاہی بالا فروخت کردیا تھا۔ قاسم کے اڑوس پڑوس میں بھی کسی کو بھنک تک نہیں تھی کہ قاسم کا بانڈ نکلا ہے۔ اس حوالے سے وکیل صفائی نے جو چند کمزور دلیلیں پیش کیں' وکیل استغاثہ نے ان کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ شومئی قسمت ایک دو مزید باتیں بھی سراسر قاسم کے خلاف گئیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اس سے پہلے بھی جیل کاٹ چکا تھا۔ یہ گلی محلے میں ہونے والے ایک پرانے جھگڑے کا شاخسانہ تھا۔ اس جھگڑے کے نتیجے میں ایک بااثر شخص نے قاسم پر چوری کا پرچہ درج کرایا تھا اور جرم بے گناہی میں اسے چھ ماہ قید بھگتنا پڑی تھی۔

جس دن عدالت میں بے قصور قاسم پر جرح ہو رہی تھی' اسی دن باغ پور کی پنچائت میں بے قصور راحت بھی مجرموں کے کٹہرے میں تھی۔ جاگیردار تیمور زماں موچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور قہر آلود نظروں سے راحت کے باپ خادم حسین اور چچا مؤت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں مزارعے تھے اور ہمیشہ سر جھکا کر رکھتے تھے لیکن آج تو ان کے سر اتنے جھکے ہوئے تھے کہ ٹھوڑیاں سینے سے جا لگی تھیں اور کہیں نہ لگتیں' ان کی بیٹی سے ایک ناقابل معافی جرم ہوا تھا۔ اس نے پیار کیا تھا۔ جاگیرداروں کی "اجازت" کے بغیر پیار کیا تھا۔ اور پیار بھی اس نوجوان سے جو جاگیردار اور اس کے حواریوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ وہ یہاں نیا اسکول بنانا چاہ رہا تھا۔ ایسا اسکول جس میں گاؤں کی لڑکیاں اور لڑکے دسویں تک پڑھ سکیں۔ یہ کتنی بڑی بغاوت' کتنی بڑی سازش تھی۔ جاگیردار تیمور اور اس کے اثر و رسوخ کے خلاف؟ ان لوگوں کے بس میں ہوتا تو تنویر کو کچا چبا جاتے۔ انہوں نے اسے کچا تو نہیں چبایا تھا لیکن اتنا مارا تھا کہ وہ کئی ہفتوں تک بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب جاگیردار کو یقین تھا کہ وہ بستر سے اٹھ بھی گیا تو اپنی نظروں [illegible] سے نہیں اٹھ سکے گا۔ اور جب وہ اپنی نظروں سے نہیں اٹھ سکے گا تو اسکول کی دیواریں کیسے اٹھائے گا۔ باغ پور کی اس پنچائت میں راحت کی ماں بھی موجود تھی۔ بیٹی کی طرح اس نے بھی اپنا سراپا چادر میں چھپا رکھا تھا۔ چادر کی لرزش گواہ تھی کہ ماں بیٹی شاخ پتے کی طرح لرز رہی ہیں۔ جاگیردار چنگھاڑ رہا تھا اور اس کی آواز کمزور لوگوں کے کلیجے شق کر رہی تھی۔ کافی دیر گرجنے برسنے کے بعد اس کا لہجہ کچھ نارمل ہوا' اس نے کہا "ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ ہمارے خادم حسین کی لڑکی کے سبب پورے گاؤں کی آبرو پر حرف آیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسے دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بنایا جاتا لیکن چونکہ اس کے باپ اور چچا نے دست بستہ معافی مانگی ہے اور گاؤں والوں سے بھی شرمندہ ہوئے ہیں لہٰذا اس لڑکی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ چونکہ خادم اور مؤت نے بتایا ہے کہ فی الحال ان کی نظر میں لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ہے اس لیے پنچائت نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈا جائے اور اس کے دو بول پڑھوا دیے جائیں۔"

○☆○

سیشن کورٹ میں قاسم کو سزائے موت سنا دی گئی اور دوسری طرف باغ پور کی پنچائت نے خود راحت کو "شادی بالجبر" کی سزا سنا دی۔

قاسم کے خستہ حال والی وارثوں نے جیسے تیسے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ دوسری طرف راحت کا والد خادم حسین بھی ایک روز روتا دھوتا علاقے کے ایم این اے کی حویلی میں جا پہنچا۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں تھی اور آنسو [illegible] کی صورت جھریوں بھرے رخساروں پر بہہ

خوبی کی تلاش

ایک حسین لڑکی اہلِ محفل کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا "مجھے تو اس لڑکی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی مگر جانے کیوں لوگ اسے گھیرے کھڑے ہیں۔"

شوہر نے معصومیت سے کہا "خوبی تو مجھے بھی کوئی نظر نہیں آتی۔ قریب جا کر دیکھتا ہوں شاید نظر آجائے۔"

۔محمد حسان نصیب افضل کی جنش' پیلیانوالہ سے

رہے تھے۔ ایم این اے شہاب دارا کے سامنے پہنچ کر وہ سر تاپا لرزنے لگا۔ "مائی باپ! میری مدد کریں۔ میری بچی کو بے موت مرنے سے بچائیں۔"

"جو بات ہے کھل کر بتاؤ۔" شہاب دارا کے سیکریٹری نے کہا۔ "اگر دارا صاحب تمہاری مدد کرسکے تو گریز نہیں کریں گے۔"

خادم کی ہچکی بندھ گئی۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ "دیکھو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" شہاب دارا نے کہا۔ "اگر تمہارا رونا بہت ضروری ہے تو پہلے باہر جاکر بوجھ ہلکا کرلو۔"

خادم حسین کا رونا بند ہوگیا۔ رونا تو اس وقت آتا ہے جب حرفِ تسلی کان میں پڑے۔ جب کوئی ہمدردی سے شانہ سہلائے۔ جب رونے والے کو جھڑکا جائے تو آنسو رخساروں کے بجائے دل پر گرنا شروع ہوجاتے ہیں۔ خادم حسین خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا "دارا صاحب! میری بچی سے غلطی ضرور ہوئی تھی لیکن اس کی اتنی کڑی سزا تو نہیں ملنی چاہیے تھی۔ جاگیردار جی میری بچی کا رشتہ ایک تیس سالہ رنڈوے سے کررہے ہیں۔ وہ کسی طرح بھی میری پھول سی بچی کے قابل نہیں لیکن وہ... لیکن..."

"ہاں ہاں کہو۔"

"لیکن وہ جاگیردار جی کا خاص بندہ ہے اس لیے ہم میں دم مارنے کی جرأت نہیں۔ اگر... اگر ہم نے اشارہ بھی دیا کہ ہمیں یہ رشتہ پسند نہیں تو جاگیردار جی ہم پر بڑی سختی کریں گے۔"

"پنچائت کیا کہتی ہے؟"

"پنچائت تو وہی کہے گی مائی باپ جو جاگیردار جی کہیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ رنڈوے سے میری بیٹی کا رشتہ پنچائت کا نہیں جاگیردار جی کا فیصلہ ہے۔"

شہاب دارا نے اپنے ہاتھوں میں انگلیاں پھنسا لیں "تم نے بیٹی کے لیے خود کوئی رشتہ کیوں نہ ڈھونڈا؟"

"پنچائت نے ہی ایک ہفتے کی شرط لگائی تھی۔ اتنی جلدی رشتہ کہاں سے ملتا ہے جی؟"

"یہی تو بات ہے بے وقوف! جن لڑکیوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نکل جاتی ہیں ان کا بر ملنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر تو کسی طرح گناہ کی گٹھڑی کو سر سے اتارنا ہوتا ہے۔"

"میری بچی نے کچھ نہیں کیا مائی باپ! وہ بالکل معصوم ہے۔ بالکل پاک ہے۔ اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہیے اسے۔ آپ ہمیں بس جاگیردار جی سے تھوڑی سی مہلت لے دیں۔ ہم جاگیردار جی کا قرضہ اتار کر یہاں سے چلے جائیں گے یا پھر بچی کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ لیں گے۔ ایک دو مہینے کی مہلت مل جائے ہمیں۔"

خادم پھر بلک بلک کر رونے لگا۔ شہاب دارا کے چہرے پر ترش کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا "حوصلہ کرو بھئی! میں کچھ دن کے لیے شہر جارہا ہوں۔ واپس آکر اس معاملے کو دیکھوں گا۔ اس دوران میں تم بھی سوچنے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"ہم نے کیا سوچنا سمجھنا ہے مائی باپ! ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں۔" خادم نے شہاب دارا کے پاؤں چھوئے اور الٹے پاؤں [illegible]

[illegible] اپنی مال کو [illegible] سے خارج ہوگئی۔ عدالت نے [illegible] سزائے موت بحال رکھی تھی۔ جس روز اپیل خارج ہوئی قاسم خوب رویا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ ہونے والے پوتے کا منہ چومنا چاہتا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ چاہتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور راحتیں جن کا انتظار اس کے خون میں رچا بسا تھا لیکن اب یہ سب کچھ [illegible] تھا۔ اسے بے اختیار رونا آیا۔ اپنی رخصتی کے وقت اس کی بڑی بیٹی کس کے کندھے پر سر رکھ کے روئے گی۔ اس کا بیٹا اپنی توتلی زبان میں کس کو دادا کہے گا۔ اور پھر اس کی بیوی اس تھکی ماندی بیکار عورت کا خیال کون رکھے گا۔ کون اس کو اس کے ساتھ مل کر کھائے گا اور اس کے دکھ درد سنے گا؟

دوسری طرف ایم این اے شہاب دارا کی "عدالت" سے نوجوان مجرمہ راحت کی "اپیل" بھی خارج ہوگئی تھی۔ ایک روز شہاب دارا اپنی جیپ پر باغ پور آیا تھا۔ ایم این اے اور جاگیردار نے اکٹھے کھانا کھایا تھا۔ شکار کھیلا تھا، گھڑ سواری کی تھی اور پتا نہیں کیا کچھ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ ان مصروفیات کے دوران میں چند لمحے کے لیے خادم حسین اور اس کی بے گناہ بیٹی کے بارے میں بھی بات ہوئی ہو لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ خادم حسین کو امید تھی کہ ایم این اے کی موجودگی میں اسے بھی حویلی بلایا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ غالباً جاگیردار نے ہونے ہی نہیں دیا۔ ایم این اے دارا صاحب اسے ملے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ اسی رات جاگیردار زمان نے خادم حسین کو حویلی میں بلایا تھا۔ جاگیردار کی خون بار آنکھیں دیکھ کر خادم حسین کا خون خشک

ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر جاگیردار کی دہاڑوں نے پوری کر دی تھی۔ اس نے خادم حسین کو بری طرح لتاڑا پھٹکارا تھا۔ بس اتنی رعایت کی تھی کہ خادم کو اپنے جلاد صفت کارندوں سے پٹوایا نہیں تھا۔ شاید ایم این اے دادا صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے یہ رعایت کی گئی تھی۔

خادم حسین کی اس یادگار بے عزتی کے موقع پر اس کا ہونے والا داماد "مولی" بھی موجود تھا۔ وہی پختہ عمر اور پختہ رنگ کا شخص جس کے موٹے بھدے ہونٹوں پر لفنگی سی مسکراہٹ رہتی تھی اور جو جاگیردار کے ارد گرد "جی سرکار' جی سرکار!" کرتا پھرتا تھا۔ یہ شخص جیل خانہ جات کے محکمے میں ادنیٰ سا ملازم تھا۔

جاگیردار نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا تھا "تم لوگ ہو ہی اس قابل کہ تمہیں جوتے کی نوک پر رکھا جائے۔ تیرے لیے اگر میرے دل میں تھوڑی بہت نرمی تھی بھی تو اب وہ ختم ہو گئی ہے۔ اب تیری بیٹی کا بیاہ مولی سے ہو گا اور ضرور ہو گا۔ تو جانتا ہے کہ پنچائت کے سامنے بات پکی ہو چکی ہے۔ ایک دو ماہ کے اندر تو بیاہ کی تیاری کر لے۔ مولی کے گھر والے اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔"

○☆○

پھر ایک روز میانوالی جیل میں قاسم کو کھٹی لگ گیا تھا۔ وہی کوٹھی جس میں صرف ایک دروازہ تھا اور یہ دروازہ پھانسی گھاٹ کی طرف کھلتا تھا۔

بالکل اسی انداز میں راحت بھی "کوٹھی" لگ گئی تھی۔ بے شک اس کی کوٹھی مختلف تھی لیکن صورتِ حال تو یہی تھی۔ اسے "بابوں" بٹھا دیا گیا تھا۔ اس رسم کے مطابق راحت اب تنہا کہیں آ جا نہیں سکتی تھی۔ دو تین سہیلیاں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں بھی نگرانی کرتی تھیں۔ اگر قاسم کی کوٹھری سے باہر سرخ وردیوں والے پہرے دار تھے تو راحت کے گھر سے باہر جاگیردار کے مسلح پگڑیوں والے کارندے تھے۔ وہ راحت کی نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ کتنی مطابقت تھی دونوں کہانیوں میں۔

قیدی قاسم کے گھر والوں کی طرح قیدی راحت کے گھر والوں کو بھی رو دھو کر سکون آ گیا تھا اور بیاہ کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ لیکن جس طرح قاسم کی بے قراری بڑھتی جاری تھی اسی طرح راحت کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ سزائے موت کے قیدی کو چین آئے بھی تو کیسے؟ وہ رات کو کمرے کی دیوار سے ٹیک لگاتی اور گہناک سوچیں اسے گھیر لیتیں۔ وہ اپنے بچپن کے پیار نذیر کے بارے میں سوچتی۔ کتنے برس گزر گئے تھے جب سے وہ دونوں ایک دوسرے کے دل میں سمائے ہوئے تھے۔ ایک ایک بات' ایک ایک ملاقات اسے یاد آتی۔ بیت جانے والے سہانے موسم' گزر جانے والے رنگین تہوار' میلے ٹھیلے اور اس کے ساتھ ساتھ نہ بھولنے والی یادوں کی پرچھائیاں۔ وہ ایک ایک یاد کو سیکڑوں مرتبہ دہراتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ بچپن سے لے کر جوانی تک نذیر اور وہ ایک لمحہ بھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہے۔ جو عرصہ انھوں نے دور رہ کر گزارا ہے اس عرصے میں بھی وہ محبت کے سفر میں آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اب جو سامنے عمر کا حصہ تھا وہ اس کے لیے اجنبی بننے والا تھا اور جو اجنبی تھا وہ اپنا قریب آنے والا تھا کہ ہر فاصلہ مٹنے والا تھا۔ مولی کا چہرہ تصور میں آتے ہی اسے گھن آنے لگتی۔ راہ چلتے اور گاؤں کی گلیوں سے گزرتے اس نے کئی بار مولی کو دیکھا تھا۔ وہ کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا لیکن ہر وقت جاگیردار کی بیٹھک میں گھسا رہتا تھا۔ راحت نے کسی سے یہ بھی سنا تھا کہ وہ عیسائی سے مسلمان ہوا ہے۔ وہ جیل خانے میں ملازم تھا۔ کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ کیا کام کرتا ہے۔ ایک سہیلی نے راحت کو بتایا تھا کہ چپڑاسی وغیرہ ہے۔ راحت نے جب بھی مولی کو دیکھا تھا' اس کی آنکھوں میں شکرانے کی سی چمک نظر آئی تھی۔ ایک گرسنہ بھوکی چمک۔ راحت کو یوں لگتا تھا جیسے یہ نظر ایک تیز چونچ کی طرح اس کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اسے چیر پھاڑ دینا چاہتی ہے۔ وہ گھبرا کر خشک نظروں سے مولی کی طرف دیکھتی۔ ایسے میں اس کے بھدے ہونٹوں پر ایک غلیظ مسکراہٹ بکھر جاتی۔ جاگیردار نے جب سے راحت کو مولی سے منسوب کیا تھا' مولی کے ہونٹوں پر نظر آنے والی مسکراہٹ کچھ اور بھی مکروہ ہو گئی تھی۔ وہ کہتا کچھ نہیں تھا بس راحت کی طرف دیکھا کرتا تھا' بالکل کسی گوشت خور پرندے کی طرح۔

میانوالی جیل کی کہانی میں قاسم رات بھر جاگتا تھا۔ وہ اپنی طرف بڑھنے والی موت کی چاپ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے عزیز اسے بچانے کے لیے آخری کوششیں کر رہے تھے۔ رحم کی اپیلیں دائر کی جا رہی تھیں اور خاندان والوں سے چندے اکٹھے کر کے وکیلوں کی فیسیں گرم کی جا رہی تھیں۔

باغ پور کی کہانی میں راحت کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ تھا۔ اس کی والدہ اور چچا بدستور کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ سرگودھا کا ایک بڑا مشہور ڈاکٹر تھا۔ وہ دو تین بار جاگیردار تیمور زماں کا علاج کر چکا تھا۔ جاگیردار اسے بہت مانتا

تھا۔ ایک دو بار ڈاکٹر اس کے کہنے پر سرگودھا سے باغ پور بھی آیا تھا۔ کسی نے راحت کے چچا اور والدہ کو یہ بتایا تھا کہ یہ ڈاکٹر ان کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ اس ڈاکٹر کے پاس پہنچے تھے۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہر دلعزیز سماجی کارکن بھی تھا۔ اس نے راحت کی والدہ اور چچا کو سمجھایا تھا کہ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ جاگیرداری کے مقروض ہیں۔ اس قرض کی وجہ سے وہ جاگیر چھوڑ کر نہیں جا سکتے اور نہ ہی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں جاگیردار جی کے منشا کو ٹھکرا سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے مناسب ترین راستہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے کوشش کر کے جاگیردار جی کا قرض اتاریں۔ اس کے بعد جاگیردار جی سے رشتے کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کی جائے۔ ڈاکٹر ریاض نے انہیں یقین دلایا کہ وہ جاگیردار جی کو فیصلہ بدلنے پر رضامند کر لے گا۔

ڈاکٹر کی یقین دہانی راحت کے چچا اور والدہ کے لیے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" ثابت ہوئی۔ انہوں نے عزیز و اقارب سے رجوع کیا۔ منت سماجت کر کے جتنی رقم مل سکی' حاصل کی۔ گھر کی چیزیں بیچیں' جو دو چار گہنے تھے وہ بیچے اور کسی نہ کسی طرح مطلوبہ رقم جمع کر کے جاگیردار تیمور زمان کو پیش کر دی۔

○☆○

خواتین فروش قاسم کے لیے کی جانے والی کوششیں ناکام ہو گئیں اور اس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو گئی۔

دوسری طرف سماج کی جیل میں بے رحم رواجوں کی کوٹھری میں بند راحت کے لیے کی جانے والی تمام کوششیں بھی ناکام ہو گئیں۔ حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ اپنا قرض وصول کرنے کے باوجود جاگیردار جی کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جاگیردار کے منشی نے لمبا چوڑا بہی کھاتہ خادم حسین اور ڈاکٹر ریاض کے سامنے کھول دیا تھا۔ اس کھاتے کے مطابق اصل زر کے برابر ہی سود بھی خادم حسین پر چڑھ چکا تھا۔ یعنی قرض ادا ہونے کے بعد بھی جوں کا توں تھا۔ ڈاکٹر ریاض کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی بلکہ جاگیردار نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ یہ قرض کا معاملہ ہے ہی نہیں۔ یہ زبان کا معاملہ ہے۔ خادم حسین نے گاؤں والوں کے سامنے زبان دی ہے۔ قرض ادا ہو یا نہ ہو' خادم حسین کو بیٹی کا رشتہ مولی کو دینا ہی ہوگا۔

یہ آخری آس ٹوٹنے کی اطلاع راحت کو اس کی ایک سہیلی نے دی۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "راحتے! شاید تیرا مقدر ہی خراب ہے۔ تیری ماں اور تیرے چچا نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے لیکن وہ تیرے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ جاگیردار نے کہا ہے' تیری شادی مولی سے ہی ہوگی۔ یہ قرض کا معاملہ نہیں ہے' یہ قول ہارنے کی بات ہے۔"

راحت بڑی دیر گم صم بیٹھی رہی' پھر کراہتے ہوئے بولی۔ "ثریا! کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ کچھ کھا کر سو جاؤں۔"

"نہ میری جان' ایسا مت سوچنا" ثریا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ماں باپ کے لیے اس سے بڑا طعنہ اور کوئی نہیں ہوتا۔"

بے بسی کے آنسو راحت کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

جس دن میانوالی جیل میں قاسم کا بلیک وارنٹ جاری ہوا اسی دن شام کو راحت کی سسرال سے اس کی شادی کا کارڈ چھپ کر آیا۔ جس روز جیل کی کال کوٹھری میں قاسم کی اپنے عزیزوں سے آخری ملاقات ہوئی' اسی رات راحت نے بھی گھر کے پچھلے صحن میں چوری چھپے اپنے بچپن کے یار سے آخری ملاقات کی۔

میانوالی جیل میں قاسم رو رہا تھا اور اس کے عزیز رو رہے تھے۔

خادم حسین کے گھر کے پچھلے صحن میں راحت رو رہی تھی اور ثریا رو رہا تھا۔

یہ آخری باتیں تھیں۔۔۔ یہ آخری لمس تھا۔

یہ آخری باتیں تھیں۔۔۔ یہ آخری لمس تھا۔

"میری رانو کا خیال رکھنا۔ میرے پوتے کو میرا پیار دینا۔ میری لاش پر واویلا نہ کرنا" قاسم اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بھول جانا۔ میرے خط جلا دینا۔ شہر جا کر ایک نئی زندگی شروع کرنا" راحت اپنے محبوب سے کہہ رہی تھی۔

قاسم نے اپنے پیاروں سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔

راحت نے اپنے محبوب سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔

آخری ہچکیاں' آخری آنسو اور آخری بوسے۔۔۔ ایک دل ہلا دینے والے شور کی گونج میں آخری ملاقات ختم ہو گئی۔

میانوالی جیل کی کوٹھری میں وہ کرب کی رات تھی۔

خادم حسین کے گھر میں بھی وہ کرب کی رات تھی۔

قاسم جاگتا رہا اور اس کے اردگرد موجود لوگ جاگتے رہے۔

راحت جاگتی رہی اور اس کے اردگرد موجود لوگ جاگتے رہے۔

بہت کوشش کی گئی لیکن قاسم نے کچھ نہیں کھایا۔ دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس ایک کونے میں پڑا رہا۔

بہت کوشش کی گئی لیکن راحت نے کچھ نہیں کھایا۔ دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس ایک کونے میں پڑا رہا۔

قاسم نیم جان سا چٹائی پر لیٹا رہا اور کچھ آیات پڑھتا رہا۔

راحت بھی نڈھال سی ایک چارپائی پر پڑی رہی اور اس کے منہ سے رہ رہ کر "ہائے اللہ" کی صدا نکلتی رہی۔

اس کے بعد بھی دونوں افراد کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک ہوا۔

قاسم کو علی الصباح نہانے کے لیے نیم گرم پانی دیا گیا تھا۔

راحت نے بھی اس صبح نیم گرم پانی سے غسل کیا۔

قاسم نے سیاہ جوڑا پہنا تھا۔

راحت نے سرخ جوڑا پہنا۔

سیاہ جوڑا پہن کر قاسم یکایک بے دم سا ہو گیا۔ اس کا دل "ناتواں سینے" میں برف کا گولا بنتا جا رہا تھا۔ دہشت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

سرخ جوڑا پہن کر راحت بھی ایک دم نیم جان سی ہو گئی تھی۔ اس "نازک بدن" کو محسوس ہوا تھا کہ خون اس کی رگوں میں جمنے لگا ہے۔ دہشت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

جیل کے حکام 'وارڈن' مقدم 'سنتری' ڈاکٹر' مجسٹریٹ ایک برات کی طرح قاسم کو لینے آئے تھے۔ وہ بڑے زبردست لوگ تھے۔ وہ اسے لیے بغیر جانے والے نہیں تھے۔ یہ ویسی ہی برات تھی جیسی چند گھنٹے بعد بلوغ پور گاؤں میں خادم حسین کے گھر اترنے والی تھی۔

جیل کے حکام کوٹھری کے اندر پہنچے۔ سیاہ پوش قاسم چٹائی پر نیم دراز تھا۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد تھا اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی کے سبب اس کا چہرہ کچھ اور بھی دبلا پتلا نظر آنے لگا تھا۔ ایک آفیسر نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کا معائنہ کیا۔ دل کی دھڑکن بے حد کمزور تھی اور ہر دھڑکن کے ساتھ ایک دو غیر ضروری آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ شاید ہارٹ اٹیک کی ہی کیفیت تھی۔ سرکاری ڈاکٹر درجنوں بار ایسے مراحل سے گزر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا ان اعصاب شکن لمحات میں اکثر قیدیوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اگر "میڈیکل ٹریٹ منٹ" کیے چکروں میں پڑا جائے تو سارا شیڈول درہم برہم ہو جاتا ہے۔ تو پھر میڈیکل ٹریٹ منٹ کا فائدہ؟ جس پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہو اس پر زیادہ کش دوا کے اسپرے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا "اسٹریچر لے جانا ہوگا۔"

مجسٹریٹ نے محتاط لہجے میں کہا "دیکھ لیں فزیکل کنڈیشن کیا ہے؟"

"غیر معمولی بات نہیں۔ بے ہوشی ہے۔ میں انجکشن دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے سنبھل جائے گا۔"

اس نے موت کے مسافر کو انجکشن دیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسانے لگا۔ اسے اسٹریچر پر ڈالا گیا اور پھانسی گھاٹ پہنچا دیا گیا۔ رات کے اندھیرے میں "دن" کے اجالے کی آمیزش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ "دن" جو قاسم کو کبھی نہیں دیکھنا تھا۔ پھانسی گھاٹ کے اردگرد کچھ سائے متحرک تھے۔ ان میں جلاد مولا بخش بھی تھا۔ وہ پوری طرح تیار تھا۔

پھانسی گھاٹ پر قاسم کا ایک بار پھر معائنہ کیا گیا۔ اس کی حالت غیر تھی لیکن اسے پھیپھڑوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ جلد از جلد ڈراپ آؤٹ ہو جائے۔ سب کی جان چھوٹ جاتی ہے اور مجرم کی بھی۔ قاسم کو سہارا دے کر اٹھایا گیا۔ اسے ایک زندہ میت کا احترام دیا جا رہا تھا۔ دو توانا پہرے داروں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دیے' اس کی ٹانگیں زمین پر نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ پینتالیس سال کا تھا' چوالیس سال تک جو پاؤں اس کا بوجھ اٹھاتے رہے تھے' وہ اب بوجھ اٹھانے سے انکاری تھے۔ اگر کہا جائے کہ قاسم کو اٹھا کر تختۂ دار تک پہنچایا گیا تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں پھر ایک دم اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ سانس جھٹکے سے آنے لگی۔ جسم میں خفیف لرزش نمودار ہو گئی۔ پھندا "جلاد مولا بخش" کے ہاتھ میں تھا۔ بادردی اہلکار مجرم کو سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ان کے ہاتھوں میں توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ یکایک ڈاکٹر کو اندازہ ہوا کہ مجرم کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا ہے۔ اس نے اہلکاروں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بہ آہستگی مجرم کو تختۂ دار پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے بڑے دھیان سے مجرم کا معائنہ کیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھ کر بولا "ہی از نو مور۔"

○☆○

جلاد مولا بخش کافی عرصے سے یہ کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اسی قسم کے دو تین واقعات ہو چکے تھے۔ پھانسی پانے سے پہلے ہی مجرم بے جان ہو گیا تھا۔ لہٰذا اسے آج والے واقعے پر زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ ویسے بھی آج اس کے پاس حیران ہونے کے لیے فالتو وقت نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد گھر واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ پھانسی گھاٹ سے وہ جیلر صاحب کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دفتر پہنچا۔ وہاں ضروری کارروائی نمٹا کر وہ سات بجے کے لگ بھگ فارغ ہو گیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور آٹھ بجے والی بس پکڑ کر میانوالی سے خوشاب روانہ ہو گیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا "یہ نوکری بھی بری بلا ہے۔ نادر شاہی حکم آتا ہے اور کسی بھی وقت حاضر ہو جانا پڑتا ہے۔" آج اس کا بیاہ تھا اور آج ہی اسے سب کچھ چھوڑ کر میانوالی آنا پڑ گیا تھا۔ مولا بخش عرف مولی باغ پور کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ باغ پور کے جاگیردار تیمور زماں کا چینا کارندہ تھا۔ آج مزارعے خادم حسین کی بیٹی سے اس کا بیاہ تھا۔

میانوالی جیل کے قیدی "قاسم" اور باغ پور گاؤں کی قیدی "راحت" کی کہانی بالکل ایک جیسی تھی لیکن ان کے واقعات، مقامات اور کردار مختلف تھے۔ ہر ایک ایک کردار کے ___ اور وہ کردار جلاد مولا بخش عرف مولی کا تھا۔ مولی جو دہشت، سنگدلی اور موت کی علامت تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دو ایک جیسی کہانیوں کا ایک مشترک کردار ہے۔

خادم حسین کے گھر راحت کی برات باجے گاجے کے ساتھ آئی۔ جاگیردار کے کارندوں نے ہوائی فائرنگ کی، پٹاخے چھوڑے اور بھنگڑوں کا رقص دیکھا۔ دلمن سرخ جوڑے میں لپٹی کمرے میں بیٹھی تھی ___ لیکن بیٹھی نہیں تھی ___ وہ نیم دراز تھی۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد تھا۔ سانسیں بے ترتیب تھیں۔

"اٹھو بیٹی، اٹھو" ماں نے اس کی کمر کے نیچے ہاتھ گھسیڑا۔ "پرسوں سے بھوکی ہو۔ تھوڑا سا کھالو۔ بس دو تین لقمے۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

اس نے زہر نہیں کھایا تھا۔ اس نوخیز بچی کی میں اتنی ہمت ہی کہاں تھی کہ زہر کھاتی۔ وہ اتنے بڑے قدم کے بارے میں سوچ سکتی تھی، یہ قدم اٹھا نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ صبح سے کھینچ کھینچ کر سانسیں لے رہی تھی۔ بار بار کہہ رہی تھی "میرا دم گھٹ رہا ہے امی، میرے گلے میں کچھ پھنس رہا ہے امی ___ میں مر جاؤں گی امی!"

اور اب وہ بستر پر ڈھے گئی تھی۔ بس کبھی کبھی اس کے ہونٹوں سے مدھم کراہ نکلتی تھی۔ گاؤں کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کی پیشانی پر ہلکا سا پسینہ ہے اور اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ بالکل کسی پرندے کی طرح ___ کسی فاختہ کی طرح۔ یہ ہارٹ اٹیک کی سی کیفیت تھی لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ ذہن پر غیر معمولی دباؤ کے سبب ایسا ہو۔ اس نے راحت کی والدہ سے پوچھا "کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے تذبذب کے عالم میں راحت کو دو انجکشن لگائے اور زبان کے نیچے رکھنے والی گولی بھی دے دی۔ اسے امید تھی کہ دلمن کی حالت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ یہ شادی کا موقع تھا اور شادی بھی ایسی جسے انجام تک پہنچانے کے لیے جاگیردار صاحب سخت بے چین نظر آ رہے تھے۔ وہ اس شادی کا پروگرام درہم برہم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

نکاح کے وقت تک دلمن کی حالت کچھ سنبھل گئی لیکن اتنی بھی نہیں سنبھلی کہ وہ خود سے بیٹھ سکتی۔ اسے سہارا دے کر بٹھایا گیا۔ دو گواہوں کی موجودگی میں اس سے "مرضی" پوچھی گئی۔ وہ خاموش رہی۔ حسب رواج اس خاموشی کو رضامندی قرار دیا گیا "مبارک ___ مبارک" کی دو تین صدائیں بلند ہوئیں اور راحت پرائی ہو گئی ___ آخر رخصتی کا وقت آن پہنچا۔ اہل خانہ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ سہیلیوں نے راحت کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کسی وقت تو ناتواں جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیتی تھیں۔ فاصلہ کافی تھا۔ فیصلہ ہوا کہ ڈولی اندر لائی جائے۔ ڈولی اندر لائی گئی۔ دلمن کے چچا نے روتے روتے دلمن کو گود میں اٹھایا اور ڈولی کے اندر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز کر دیا۔ سسکیوں اور آہوں کی سرسراہٹ میں ڈولی روانہ ہو گئی ___ بالکل جیسے قاسم کا اسٹریچر روانہ ہوا تھا۔

___ رات کو مولا بخش عرف مولی نے دلمن کو بیچ پر دیکھا۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھی۔ مولی کی والدہ اور بڑی بہن نے کہا تھا کہ دلمن کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس نے سوچا، اچھی بھلی تو ہے، بیمار کوئی ایسے ہوتے ہیں۔

وہ چہرے کے بناؤ سنگھار کے نیچے موت کی زردی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ شراب کا ہلکا سا خمار اس کے دماغ کو ہوا میں اڑا رہا تھا۔ دفعتاً اسے اندازہ ہوا کہ دلمن کا سندی لگا ہاتھ عجیب سے انداز میں ایک طرف ڈھلک گیا ہے۔ اس نے دلمن کا شانہ جھنجھوڑا "راحتے ___ راحتے! آنکھیں کھول۔"

لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ مر چکی تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ شکرے کی دہشت سے فاختہ مر بھی جایا کرتی ہے ___ اس کا ننھا سا جگر پھٹ بھی جایا کرتا ہے۔

___ جس وقت ہیر کو دھاگے میں قاسم کا جنازہ اٹھ رہا تھا، اس وقت باغ پور میں راحت کی میت کے سرہانے اس کی ماں اور باپ کو تسلی کے دلاسے پڑ رہے تھے۔ دونوں "مجرم" آزاد ہو چکے تھے۔

NAYA.PAKISTAN.ONLINE



آدمی عمر کے ہر دور میں الگ الگ کیفیات اور احساسات سے دوچار ہوتا ہے۔ بچپن معصومیت اور بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے جب کہ جوانی عموماً بے پروائی اور غیر ذمے داری سے عبارت ہوتی ہے... پھر جب احساس ذمے داری اور سنجیدگی آدمی کے وجود پر غالب آتے ہیں تو پچھلی تمام باتیں گویا نقش برآب ثابت ہوتی ہیں۔

اُس ہنستے بولتے گھرانے کے تمام افراد بھی اپنی اپنی عمر کے تقاضے نبھا رہے تھے۔ ایک روز کچھ ایسا ہوا کہ وہاں کی رونق ماند پڑ گئی۔

روزنوں

طاہر جاوید مغل

ذمے داری کے احساس کی کٹھنائیوں کے سہ پراہ کو روک ٹوک کا خبط تھا

آپا نذیراں باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں گھر کے سب لوگ جمع تھے اور ہنس بول رہے تھے۔ ان کی آوازیں آپا نذیراں کے لئے ایک ایسے دل پسند نغمے کی طرح تھیں جو جب بھی بجتا ہے کانوں میں رس گھولتا ہے۔ پورے بیس برس ہو گئے تھے اسے اس گھر میں کام کرتے ہوئے۔ اب تو وہ گھر کا ایک فرد ہی بن چکی تھی۔ چھوٹے بڑے سب اسے آپا نذیراں کہتے تھے۔

یہ گھرانا کل چار افراد پر مشتمل تھا۔ عطا محمد صاحب، ان کی بیگم کلثوم اور دو بچے یاسر اور نوبیہ۔ اس گھرانے میں حال ہی میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا تھا اور یہ تھی یاسر کی دلہن سیمی۔ سیمی بھی یاسر اور نوبیہ کی طرح ایک ہنس مکھ لڑکی تھی اور وہ تینوں مل کر گھر میں رونق لگائے رکھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ تینوں غالباً کیرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ یاسر کی والدہ جنہیں آپا نذیراں باجی کہہ کر بلاتی تھی شاید بیٹھک پر دھوپ سینکنے گئی ہوئی تھیں۔ اچانک بیرونی دروازے کی طرف سے ایک بارعب آواز گونجی اور آپا نذیراں جیسے ٹھٹک کر رہ گئی۔ یہ آواز عطا محمد صاحب کی تھی۔ وہ خاصے برہم نظر آ رہے تھے۔

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی وہ بولے "یاسر، میرا تو دماغ خالی ہو گیا ہے تم لوگوں کے ساتھ بول بول کر۔ یہاں سب مزے سے بیٹھے ہیں۔ وہاں کمرے میں ٹی وی لائٹ، گیس ہیٹر سب کچھ چل رہا ہے۔ بھئی حد ہوتی ہے بے پروائی کی۔ گھر کا خرچ چلانا پڑے تو کچھ احساس ہو تم کو۔"

"اوہ سوری ابا جی! میں بھول گیا تھا۔" یاسر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یاد رہے بھی کیسے، یاد رکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے تم۔ کہتے ہو میں بکواس کر رہا ہوں۔ کرتا رہوں، کیا فرق پڑتا ہے۔"

اتنے میں یاسر کی والدہ بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئیں۔ انہوں نے شوہر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چلیں چھوڑیں بھی۔ کسی وقت بندہ بھول ہی جاتا ہے۔"

"کسی وقت؟" عطا صاحب نے طنز سے کہا "مجھے پندرہ سال ہو گئے ہیں تم لوگوں سے بک بک کرتے ہوئے۔ یہاں کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا" وہ پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

رات نو دس بجے کے قریب جب آپا نذیراں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں پہنچی تو یاسر بھی وہیں چلا آیا۔ یہ بچپن سے اس کی عادت تھی۔ جب والدین سے اور خاص طور پر باپ سے کسی بات پر ڈانٹ پڑتی تھی تو وہ "پناہ" کے لئے آپا نذیراں کے پاس چلا آیا کرتا تھا۔

"آپا! آج دل بہت پریشان ہے۔" وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔"

"ہائے میرا پتر۔ ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔" آپا نذیراں نے اسے ٹوکا۔

"یہ کوئی زندگی ہے آپا۔" یاسر نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ "گھر میں رہتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اسکول میں رہ رہے ہوں۔ ابا جی نہ ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب ہو گئے۔ ہر بات پر پابندی' ہر کام پر روک ٹوک' یہ ٹی وی کیوں چل رہا ہے۔ یہ لائٹ کیوں آن ہے۔ یہ دروازہ بند کیوں نہیں کیا۔ یہ دروازہ کھولا کیوں نہیں۔ گاڑی میں پانی کیوں نہیں ڈالا۔ موٹر سائیکل کا ٹوکن کیوں نہیں لگوایا۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹنے لگتے ہیں۔"

"پتر جی! بڑے چھوٹوں کو سمجھایا ہی کرتے ہیں۔" آپا نذیراں نے نرمی سے کہا "ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہئے۔"

"لیکن آپا' اب میں بچہ تو نہیں ہوں کہ ہر وقت روک ٹوک کی جائے۔ اب بیوی کے سامنے بے عزتی کرتے ہیں۔ کل بچے ہوں گے تو ان کے سامنے بھی یہی کچھ کریں گے۔ گھروں میں چھوٹی موٹی کوتاہیاں بے پروائیاں سب سے ہوتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی ایک کو ہر وقت توہین کا نشانہ بنایا جائے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو یاسر اور بھائی صاحب بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہیں۔" آپا نذیراں نے جواب دیا "خرچے روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔ دکان بھی زیادہ نہیں چلتی۔ لوگ اب سلے سلائے کپڑوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو بھائی صاحب نے ہیں پچیس سال سخت محنت کی ہے۔ اب وہ تھک سے گئے ہیں۔"

یاسر بولا "آپا نذیراں' میں بھی کوئی فارغ تو نہیں بیٹھا۔ جو کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔ بائیس سو روپیہ تنخواہ ہے۔ گیارہ سو روپیہ گھر میں دے دیتا ہوں۔ باقی گیارہ سو میں اپنی اور بیوی کی ضروریات پوری کرتا ہوں۔ چار سو روپیہ تو موٹر سائیکل کے پیٹرول پر ہی لگ جاتا ہے۔"

آپا نذیراں نے کہا "اسی لئے تو کہتی ہوں پتر کہ تمہیں اب زیادہ محنت اور زیادہ آمدنی کی ضرورت ہے۔ تمہارے خرچے اور بڑھنے والے ہیں۔ اس طرح کب تک گزارہ ہو گا۔ میں تو پھر کہوں گی کہ دکان سنبھالو۔ تجارت میں برکت ہے۔"

"آپا! میں نے ہزار بار کہا ہے کہ مجھ سے دکان پر بیٹھنے کی بات مت کیا کرو۔ یہ کام میرے بس کا ہے ہی نہیں۔"

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے' آپا نذیراں باورچی خانے میں مصروف تھی کہ برآمدے کی طرف سے پھر شور اٹھا۔ اس مرتبہ عطا صاحب بیٹی ثوبیہ پر بگڑ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ رات پورچ کا ٹلکا کھلا چھوڑ آئی تھی اور ساری رات پانی بہتا رہا ہے۔ ثوبیہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بتایا کہ رات کو تو بھائی جان چھت پر گئے تھے۔ "بھائی جان" کے ذکر پر عطا صاحب کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ وہ بولے "یہ لڑکا ہے ہی ناکارہ۔ نہ وقت پر سونا نہ وقت پر جاگنا۔ رات دن وی سی آر اور ٹیلی وژن۔ ایسے میں حواس خراب نہ ہوں گے تو کیا ہو گا۔"

یاسر کی والدہ نے آڑے آتے ہوئے کہا "اچھا چھوڑیں' جوان جہان ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر نہ بگڑا کریں۔"

عطا صاحب گرجے "تمہیں تو ہر بات ذرا ذرا سی لگتی ہے۔ پچھلے مہینے چار سو ساٹھ روپے بل دیا ہے پانی کا۔ آدھی آمدنی تو اس میں اڑ جاتی ہے واٹر۔ مجھ میں تو اب سکت نہیں ہے یہ فضول خرچیاں برداشت کرنے کی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کس طرح گاڑی چل رہی ہے۔"

آپا نذیراں کو سڑک کی طرف سے یاسر کے موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر عطا صاحب سے مخاطب ہوئی "بھائی صاحب' یاسر آ رہا ہے۔"

"تو میں چھپ جاؤں کہیں جا کر۔" وہ آگ بگولا ہو گئے "گستاخی کر دی ہے میں نے لاٹ صاحب کی شان میں۔"

آپا نذیراں منمنائی "ہم۔۔۔ میرا مطلب تھا۔۔۔"

"آپا نذیراں! تم زیادہ پردے نہ ڈالا کرو اس پر۔" عطا صاحب نے کہا "اسے بگاڑنے میں تمہارے لاڈ پیار اور طرفداریوں کا بڑا حصہ ہے۔"

آپا نذیراں جلدی سے باورچی خانے میں پسپا ہو گئی۔ یاسر آنے تک جھگڑا ختم ہو چکا تھا لیکن شام تک اسے پتا چل گیا کہ کیا باتیں ہوئی ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے کھانا نہیں کھایا اور رات کو دیر تک دوستوں کے ساتھ رہنے کے بعد واپس آیا۔

آپا نذیراں دیکھ رہی تھی کہ گھر میں تناؤ کی کیفیت بڑھ رہی ہے۔ عطا صاحب تپے تپے سے رہتے تھے۔ وہ کنجوس نہیں تھے لیکن بے جا اسراف کے سخت خلاف تھے۔ آمدنی اور اخراجات میں عدم مطابقت کے سبب یہ "مخالفت" اور بڑھ گئی تھی۔ اپنے بیٹے یاسر سے عطا صاحب کو خاص طور سے شکایت تھی۔ ان کی رائے تھی کہ وہ حد درجہ بے پروا' فضول خرچ اور سست پسند ہے۔ یاسر سے وہ اکثر سرزنش کے لہجے میں بات کرتے تھے۔ ایسے میں

یاسر سخ چہرے لے کر دائیں بائیں ہو جاتا تھا اور اس کی دلسن کی آنکھوں سے بے چینی ظاہر ہونے لگتی تھی۔

ایک روز آپا نذیراں اپنی اکلوتی بہن سے ملنے کے لئے لاہور سے گوجرانوالہ گئی۔ شام کو جب وہ واپس آئی تو گھر کی فضا میں عجیب سا کھنچاؤ اور سونا پن محسوس ہوا۔ ثوبیہ سوگوار سی بیٹھی تھی' باجی جی لوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں "کیا ہوا ثوبیہ بیٹے؟" آپا نذیراں نے تڑپ کر پوچھا۔

باجی جی تو آنسو بہاتی باہر چلی گئیں اور ثوبیہ نے اسے بتایا کہ بھیا اور بھابی گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ آپا نذیراں بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کسی نے اس کے کلیجے کو مسل ڈالا تھا۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ نہ اولاد تھی نہ اپنا گھر۔ اس نے اس گھر کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ یاسر کو اس نے اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا تھا اور اپنی ساری محبتیں اس کے نام کر دی تھیں۔ اس کے یوں اچانک چلے جانے کی خبر نے آپا نذیراں کو ادھ موا کر دیا تھا۔ اس نے ثوبیہ سے تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ صبح معمولی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ سبھی نے یاسر کے لئے چائے تیار کی تھی۔ وہ چولھا بند کرنا بھول گئی۔ عطا صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ غصے میں بولنے لگے اتنے میں یاسر بھی کمرے سے نکل آیا۔ دبے دبے لہجے میں ایک دو باتیں اس کے منہ سے بھی نکل گئیں۔ عطا صاحب کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ انہوں نے یاسر سے کہا کہ اگر وہ زیادہ تنگ ہے تو بے شک علیحدہ ہو جائے۔ یاسر نے کہا "آپ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ مجھے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میاں بیوی ایک دو گھنٹے کمرے میں بند رہے پھر سامان باندھنے لگے۔ یاسر کی والدہ نے بیٹے اور بہو کو بہت روکنا چاہا لیکن ان کی ایک نہیں چلی۔ ثوبیہ کا رونا دھونا بھی بیکار گیا اور یوں شادی کے صرف سات ماہ بعد یاسر باپ کے گھر سے چلا گیا۔

یاسر اور سبھی کے بعد گھر ایک دم ویران ہو گیا تھا۔ عطا صاحب دکان سے آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتے۔ ثوبیہ چپ چاپ بیٹھی رہتی یا کتابوں میں گم ہو جاتی۔ وہ ایف ایس سی کا امتحان دے رہی تھی۔ یاسر کی والدہ سارا دن روتی رہتیں۔ دو تین ہفتے گزر گئے لیکن یاسر کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ عطا صاحب بظاہر تو بے پروا بنے ہوئے تھے لیکن بیٹے اور بہو کی جدائی نے انہیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تیسرے ہفتے یاسر کے ایک دوست نے کوئٹہ سے ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ یاسر اس کے پاس ہے اور یہاں اس نے ایک دفتر میں نوکری کر لی ہے۔

یاسر کی "اطلاع" ملتے ہی اہل خانہ بے تاب ہو گئے۔ یاسر کی والدہ تو اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے شوہر سے کہا کہ وہ فوراً کوئٹہ جائیں اور بیٹے کو لے کر آئیں۔ اس مرحلے میں عطا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا "یاسر خود گیا ہے اور خود ہی آئے گا۔ میں اسے منانے نہیں جاؤں گا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

اہل خانہ نے بہت زور لگایا لیکن عطا صاحب کا آخری فیصلہ بدلا نہ جا سکا۔ مجبوراً یاسر کی والدہ اپنے ایک بھانجے سعید کو لے کر کوئٹہ روانہ ہو گئیں۔ وقت رخصت آپا نذیراں نے انہیں تاکید کی کہ وہ ہر صورت یاسر کو واپس لے کر آئیں۔ تین چار روز امید و بیم میں گزرے پھر سعید نے کوئٹہ سے فون کر کے یاسر کے ماموں اور ایک چچا کو بھی بلا لیا۔ آٹھ دس روز مصالحتی کوششیں جاری رہیں لیکن جس طرح عطا صاحب اٹل فیصلہ کر چکے تھے اسی طرح یاسر بھی کر چکا تھا کہ وہ اب کبھی باپ کے گھر واپس نہیں آئے گا۔ دو ہفتے بعد یاسر کی والدہ آنکھوں میں آنسو اور مایوسی سمیٹ کر لاہور واپس آ گئیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی ہے۔ اب وہ جب بھی یاسر کی صورت دیکھنا چاہیں گی انہیں ہی چل کر اس کے پاس جانا ہو گا۔

○☆○

— یاسر کے چلے جانے کے بعد آپا نذیراں بھی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی بہن نے اسے گوجرانوالہ بلا لیا۔ دو تین ماہ بعد وہ لوگ گوجرانوالہ سے مظفر آباد آزاد کشمیر چلے گئے۔ یہاں آپا نذیراں کے بھانجے نے ٹھیکیداری کا کام شروع کر دیا تھا۔ آپا نذیراں تقریباً پانچ سال اپنی بہن اور بھانجے کے ساتھ مظفر آباد میں رہی۔ اس دوران کبھی کبھار اسے عطا محمد اور دیگر اہل خانہ کی خبر مل جاتی تھی۔ یاسر ایک بار جو گھر سے نکلا تھا تو پھر پلٹ کر نہ آیا تھا۔ اب وہ کوئٹہ میں ایک اچھی جگہ نوکری کر رہا تھا۔ اس نے اپنا مکان بنا لیا تھا اور دفتر کی طرف سے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ پانچ سالہ خرم اور چار سالہ شہزاد۔ یاسر کی والدہ نے ایک مرتبہ ان دونوں کی تصویریں بھی بھیجی تھیں۔ بڑے پیارے بچے تھے۔ ناک نقشہ ہو بہو باپ سے ملتا تھا۔ یاسر کی طرح عطا صاحب بھی اب تک اپنی ضد پر قائم تھے۔ وہ یاسر کو منانے کوئٹہ نہیں گئے تھے۔ ہاں یاسر کی والدہ اور بہن ثوبیہ بھی کبھار کوئٹہ جا کر اس سے مل آتی تھیں۔

آپا نذیراں تقریباً پانچ سال اپنی بہن اور بھانجے کے ساتھ مظفر آباد میں رہی پھر بہن فوت ہو گئی اور بھانجا کویت چلا گیا۔ آپا نذیراں ایک بار پھر اکیلی تھی۔ لاہور سے کئی بار خطوط آ چکے تھے۔ عطا محمد اور دیگر اہل خانہ اسے بہت یاد کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے پاس واپس آ جائے۔ ان کی خواہش اور اپنی ضرورت کے پیش نظر آپا نذیراں لاہور واپس آ گئی اور ایک بار پھر عطا محمد کے گھر کا کچن سنبھال لیا۔ پرانے گھر میں واپس آتے ہی اس کے پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ یاسر کی یاد شدت سے آنے لگی تھی۔ وہ ہر گھڑی اس کی غیر موجودگی محسوس کرتی تھی۔ اس کی صورت دیکھے ہوئے بھی تو ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ آپا نذیراں کا دل چاہا کہ

کوئٹہ جا کر کم از کم ایک بار تو اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر آئے۔
اتفاق سے انہی دنوں دسمبر کی چھٹیاں تھیں۔ ثمینہ اور باجی جی (یاسر کی والدہ) کوئٹہ جا رہی تھیں۔ آپا نذیراں نے بھی ان کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ لوگ ٹرین میں بیٹھے اور ایک لمبے سفر کے بعد کوئٹہ پہنچ گئے۔ یاسر نے اتنے عرصے بعد آپا نذیراں کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ آپا نذیراں بھی اشک بار ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے یاسر کو پیار کیا۔ اس کی پیشانی چومی۔ یاسر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ یاسر کے بیوی بچوں نے بھی گرمجوشی سے آپا نذیراں کا استقبال کیا۔ یاسر اب پہلے سے کچھ فربہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر کی عینک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کنپٹیوں پر بھی چند بال سفید نظر آنے لگے تھے۔

○☆○

آپا نذیراں کو یاسر کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تیسرا روز تھا۔ رات کا وقت تھا۔ آپا نذیراں بھاری بھرکم لحاف اوڑھے کمرے میں سو رہی تھی۔ اچانک کچھ آوازیں سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ یہ یاسر کی آواز تھی۔ وہ کسی بات پر بیوی سے جھگڑ رہا تھا۔ تجسس سے مجبور ہو کر آپا نذیراں اپنی جگہ سے اٹھی اور ننگے پاؤں چلتی کوریڈور میں آ گئی۔ آواز ڈریسنگ روم میں سے آ رہی تھی۔ وہ ایک کھڑکی کے سامنے پہنچی تو سب کچھ صاف سنائی دینے لگا۔ یاسر بیوی پر بگڑ رہا تھا۔ وہ بڑے بیٹے خرم کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا "سیمی اب وہ دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ اس میں کچھ ہونی چاہئے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے میرے سامنے اس نے گرم پانی کا نلکا کھولا اور منہ ہاتھ دھو کر چلتا بنا۔ نلکا بند کرنے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے۔ بے پروائی کی حد ہے۔ ٹی وی لگا ہے تو لگا ہے۔ ٹرانسمیشن ختم ہو جاتی ہے لیکن ٹی وی چلتا رہتا ہے۔ ہیٹر آن ہے تو رات دن آن ہے۔ بتی جلائی ہے تو بجھانی یاد نہیں۔ تم بھی کسی وقت دیکھتی ہو کسی وقت دیکھ کر بھی نہیں دیکھتی ہو۔ اس طرح کب تک چلے گا؟ میرا تو بول بول کر دماغ خالی ہو گیا ہے۔"

سیمی نے کہا "یاسر! اپنی طرف سے تو بہت احتیاط کرتے ہیں کسی وقت انسان بھول بھی جاتا ہے۔"

"کسی وقت؟" یاسر نے طنز سے کہا "میں تو یہاں رات دن ایک ہی تماشا دیکھتا ہوں۔ سچ پوچھو تو تمہارے لاڈ پیار نے بالکل ستیاناس کر دیا ہے دونوں کا۔"

"یاسر! بچے ہیں۔ آہستہ آہستہ سمجھ جائیں گے۔" سیمی نے دھیرے سے کہا۔

"سمجھ جائیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے آہستہ آہستہ مزید احمق اور بے پروا ہوتے جائیں گے۔" یاسر بولا "یہ دیکھو اس مہینے کا بجٹ۔ پچھلے مہینے بلوں کی مد میں تو سوا تین روپے اٹھے تھے۔ اس مرتبہ بارہ سو

سائھ بن رہے ہیں۔ بہتری کی یہی رفتار رہی تو سات آٹھ مہینوں میں آدھی تنخواہ بلوں کی نذر ہو جایا کرے گی پھر چلا لینا خود ہی اس گھر کو۔"

"آہستہ بولیں" سیمی نے کہا "آپا نذیراں چھوٹے کمرے میں سو رہی ہے۔ سن لے گی۔" اپنا ذکر سن کر آپا نذیراں نے واپس جانا چاہا۔ نیم تاریکی میں کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور زور کا کھٹکا پیدا ہوا۔ وہ اپنی جگہ سن کھڑی رہ گئی۔ چند ہی لمحے بعد ڈریسنگ روم کا اندرونی دروازہ کھلا اور آپا نذیراں نے یاسر کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"آ۔۔۔۔ پا۔۔۔۔ نذیراں۔۔۔۔ تم یہاں؟" یاسر نے کہا۔

آپا نذیراں خاموش کھڑی رہی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں اپنی موجودگی کے لئے کوئی بہانہ نہ بنائے۔ یاسر کو صاف بتا دے کہ اس کی باتیں سن چکی ہے اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ جذبات سے بوجھل بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں بولی "یاسر! میں نے تمہاری ساری باتیں سنی ہیں اور سن کر مجھے لگا ہے کہ یہ باتیں میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہوئی ہیں۔"

"مم۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں آپا؟" یاسر نے کہا۔ اب سیمی بھی اس کے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

آپا نذیراں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ بولی "یہ باتیں تم آج کہہ رہے ہو' یہی باتیں تمہارے ابا جان کہا کرتے تھے۔ ذرا یاد کرو کچھ سال پہلے یہی باتیں ہوا کرتی تھیں نا۔ اس وقت تمہیں یہ باتیں بہت بری لگتی تھیں۔ تم کہا کرتے تھے ابا جان پر "روک ٹوک" کا خبط سوار ہو گیا ہے۔ یاد کرو یہی کہا کرتے تھے ناں تم؟"

یاسر خاموش رہا۔ ایک دم ہی اس کے چہرے پر پشیمانی کے بادل امڈ آئے۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے آپا نذیراں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آپا نذیراں نے کہا "جو باتیں تم ابھی کر رہے تھے' یہ بری نہیں ہیں۔ یہ پہلے بھی بری نہیں تھیں لیکن تم نے انہیں برا سمجھا اور لڑ جھگڑ کر گھر سے نکل آئے۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو تمہیں ایسا کرنا چاہئے تھا؟" یاسر اب بھی کچھ نہیں بولا لیکن اب آپا نذیراں کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک نمودار ہو چکی تھی۔ آپا نذیراں نے بڑی محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر آواز میں بولی "چلو پتر! گھر چلو۔ ان گزرے برسوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب تمہارے باپ نے تمہیں یاد نہ کیا ہو اور اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر تمہاری راہ نہ دیکھی ہو۔"

یاسر کتنی ہی دیر گم صم کھڑا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور آپا نذیراں سے لپٹ گیا۔

جواب دے گئی تھی۔

اس نے لطفی کو دیکھا اور پہچان لیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے لطفی سے اشاروں میں کان قریب لانے کو کہا اور جب اس نے اپنا ایک کان یزدی کے ہونٹوں سے لگایا تو سنا' یزدی کہہ رہا تھا "تیرا شکریہ کہ تو آگیا۔ میں نے تجھ پر بہت ظلم کیے۔ شرمندہ ہوں' مجھے معاف کر دینا۔"

لطفی نے یہاں بھی منافقت اور جھوٹ کے بجائے سچ سے کام لیا اور کہا "یہ مکافاتِ عمل ہے۔ جو بویا تھا اسے دنیا ہی میں کاٹنا پڑ رہا ہے۔"

فائزہ کی ماں لطفی کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور کہا "بیمار پر رحم کر۔ تو نے بھی اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔ اگر تو دنیا والوں کی طرح بنا ٹھنا سلیقے سے رہتا تو فائزہ تجھے کبھی نہ ٹھکراتی۔"

لطفی نے جواب دیا "آپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیونکہ آپ خود مجبور تھیں لیکن مجھے موردِ الزام ٹھہرا کر آپ اپنے شوہر یزدی کی طرفداری کر رہی ہیں کیونکہ اس وقت میں جو کچھ بن گیا تھا اس کے پیچھے بھی یزدی ہی کا ہاتھ کارفرما تھا۔"

زبیدہ نے دونوں کو بحث و مباحثے سے منع کیا اور اپنے بھائی کی مذمت کرتے ہوئے کہا "اس شخص کی خود غرضی اور خست نے ہم سب کو برباد کر دیا۔ میں جوانی میں ہی بوڑھی ہو گئی اور فائزہ شوہر کی موجودگی میں بیوہ جیسی ہو گئی۔ رہ گئی تو تو نے کون سا سکھ دیکھا ہے۔"

لطفی نے کتب خانے کو دیکھا اور حویلی میں رہنے لگا مگر اب اسے یہاں کی ہر شے مردہ لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے شاگردوں کو بھی یہیں بلوا لیا اور اپنا کتب خانہ بھی یہیں منتقل کر لیا۔ برتنوں کے تاجر دوست نے اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیا۔ وہ اپنے دوست کی رضا کا قائل تھا۔

کچھ عرصے بعد اسکندریہ کا یعقوب بھی لطفی سے ملنے آیا۔ اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی مرید اس کے دائیں بائیں تھے۔ کچھ پیچھے چل رہے تھے۔ ایک امیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ شاید اسی کی گاڑیاں تھیں جن پر بیٹھ کر یہ لوگ یہاں آئے تھے۔

یعقوب بے حد خوش تھا کہ لطفی نے بحیثیت ایک عالم' ایک استاد اور ایک حق گو بڑی شہرت حاصل کر لی تھی مگر اس حویلی میں لطفی کو تنہا دیکھ کر یعقوب کو افسوس ہوا۔ یعقوب وراق کی حیثیت سے یزدی کو بھی جانتا تھا۔ اس نے یزدی کی بھی عیادت کی اور کتب خانے کو دیکھنے کے بہانے لطفی کو تنہا کتب خانے میں لے گیا۔ وہاں آہستہ سے پوچھا "تو نے ابھی تک شادی نہیں کی؟"

لطفی نے جواب دیا "تو شادی کی بات کر رہا ہے۔ اگر اسلام نے خودکشی کو حرام قرار نہ دیا ہوتا تو میں کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ کیا انسان کیا' عورت' کیا دولت' کیا بادشاہ' کیا رعایا' کیا مرشد اور کیا مرید۔ ان سب نے مجھے مایوس کیا اس لئے میں ان سب سے کنارہ کش ہو گیا۔"

یعقوب نے اسے سمجھایا "تو نے بڑی غلطی کی۔ شادی تو تجھے ضرور کرنی چاہئے تھی۔ میں حیران ہوں کہ دنیا کی لذیذ ترین شے عورت کی تو نے ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔"

لطفی نے جواب دیا "ایک عورت تو کیا مجھے دنیا کی ہر شے کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی مگر جب میں نے ان سے منہ موڑ لیا تو موڑ لیا۔"

یعقوب نے پوچھا "اس وقت تیری عمر کیا ہو گی؟"

لطفی نے جواب دیا "تقریباً پچاس سال۔"

یعقوب نے اس کا مذاق اڑایا "اب بھی وقت ہے۔ یہ زندگی بار بار نہیں ملے گی اور خدا نے تجھے جو اعضا دیے ہیں ان کا کوئی مقصد ہے۔ ان سے کام نہ لینا اللہ کی عطا پر معترض ہونا ہے۔ یہ جو تجھ میں ایک قسم کا چڑچڑا پن آگیا ہے اور خشونت پیدا ہو گئی ہے وہ اسی کا ردِ عمل ہے۔"

یعقوب نے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا "لطفی! تو ایک بے غرض اور بے ضرر انسان ہے اس لئے میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ میری زندگی بڑی پُر آسائش ہے۔ یہاں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ تجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ نہیں تھا اسی لئے تو دنیا میں تنہا رہ گیا۔ اب اپنی یہ انفرادیت ختم کر اور دنیا کے مزے لے لے۔ جاتی بہاروں کے جو چند جھونکے باقی رہ گئے ہیں انہیں کسی طرح ضائع نہ جانے دے۔"

یعقوب تو چلا گیا مگر اس مخلص شخص نے لطفی کے اندر تجدد شخص کو کسی قدر جھنجھلا دیا تھا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اللہ نے اسے جو اعضا بخشے تھے کیا ان سب سے ایمانداری سے کام لیا گیا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے اپنی سابقہ زندگی پر محاسبانہ اور تنقیدی نظر ڈالنی پڑی تو معلوم ہوا کہ سب کچھ چھوڑ کے اس نے جس علم اور کتابوں کا سہارا لیا تھا ان سے بھی لطفی کو کچھ نہیں ملا۔ سوائے بہت کچھ جاننے کے زعم کے۔ یہ بھی سراب ہی نکلا۔ اسے نوجوان فائزہ یاد آئی تو اسے نادانی سے کھو دینے کا چرکا سا لگا۔ اب اسے آہستہ آہستہ کچھ اور ہی احساس ہو رہا تھا۔ بہت کچھ کھو دینے کی خجالت اور اپنی نا سمجھی کی ندامت اسے پریشان کرنے لگی اور اسے یہ احساس ستانے لگا کہ اس نے اب تک جو کچھ پایا تھا اس کی اتنی زیادہ قیمت ادا کر دی تھی کہ قیمت کے بدلے ملنے والی اشیا بہت حقیر اور کمتر لگتی تھیں۔ توکل' قناعت' پارسائی یہ ساری چیزیں فضول اور فریب لگ رہی تھیں۔ یعقوب کے بقول جو چند جھونکے جاتی بہاروں کے باقی رہ گئے تھے انہیں بھی گنوا دینا عقلمندی نہیں تھی۔

اس سوچ نے اس میں یہاں تک تبدیلی پیدا کر دی کہ اب وہ اپنے شاگردوں سے بھی یہ کہنے لگا تھا "بہت زیادہ علم حاصل کرنے

تاخیر بے تمام

طاہر جاوید مغل

ایک سراپا انتظار کا ماجرائے اُمید و بیم۔ ہر صبح سورج کی پہلی کرن اُس کے دل میں اُمید کا دیا جلاتی اور ہر شام مایوسی کے اندھیرے اُسے گل کر دیتے۔ اُسے انجانے دیس سے کسی نامعلوم خط کا انتظار تھا جو نہ جانے لکھا بھی گیا تھا یا نہیں... پھر ایک روز نامہ بر نے وہ خط اُسے پہنچا ہی دیا۔

حسین وادیوں کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دل رُبا تحریر

بالا کوٹ اور کیوائی کے درمیان دریائے کنہار کی گزرگاہ پر وہ ایک خوب صورت پہاڑی قصبہ تھا۔ حدِ نگاہ تک سبزہ، ابلتے ہوئے چشمے، پتھروں کے درمیان اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ندی نالے، دور پس منظر میں برف پوش چوٹیاں۔ نگاہ جس طرف رخ کرتی تھی اسی طرف ایک حسین نظارہ منتظر ملتا تھا۔ قصبے کی آبادی قریباً پندرہ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ سب لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا بھیڑ بکریاں اور مرغیاں وغیرہ پالتے تھے۔ حسین فضاؤں میں بسا ہوا یہ حسین لوگوں کا نظر نواز قصبہ تھا۔

پوسٹ مین اعجاز کی تبدیلی جب اس علاقے میں ہوئی تو وہ کچھ بہت زیادہ خوش نہیں تھا لیکن آٹھ دس روز کے اندر ہی اس قصبے نے اور قصبے کے لوگوں نے اسے بہلا لیا۔ وہ خود کو اس خوب صورت ماحول کا ایک حصہ محسوس کرنے لگا۔

پوسٹ آفس اس قصبے کے اندر ہی واقع تھا۔ اس آفس کے عقب میں اعجاز کو رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کوارٹر نما گھر مل گیا تھا۔ اس گھر کے پہلو سے ایک پُرشور آب جو بہتی تھی۔ کہنے کو تو یہ شور تھا لیکن اس کی موسیقیت چند ہی دن میں اعجاز کے دل و دماغ میں رچ بس گئی۔ اعجاز صبح سویرے ناشتے کے بعد پوسٹ آفس کا رخ کرتا۔ کام بہت زیادہ تو نہیں تھا لیکن بکھرا ہوا تھا۔ اسے قصبے کے علاوہ قرب و جوار کے تین دیہات اور تین چار چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ڈاک تقسیم کرنا ہوتی تھی۔ بعض اوقات صرف ایک خط کی ترسیل کے لیے اسے اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر چار چار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑ جاتا تھا۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ وہ کام سے جی چرانے والا نہیں تھا۔

کام سے فارغ ہو کر وہ سہ پہر کے وقت کوارٹر میں واپس آجاتا۔ کچھ دیر آرام کرتا۔ پھر آبشار کی طرف نکل جاتا۔ واپسی پر کھانا تیار ہوتا۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام پڑوسیوں کی طرف تھا۔ اماں فاطمہ اور چاچا گلریز خاں اس کے پڑوسی تھے۔ چند ہی روز میں وہ اسے بالکل اپنے اپنے سے لگنے لگے تھے۔

چاچا گلریز قصبے کے سربراہ ملک خداداد خاں کے کھیتوں میں مزارعے کے طور پر کام کرتا تھا اور اس کی بیوی فاطمہ ملک خداداد کی حویلی میں خدمت انجام دیتی تھی۔ دونوں ہی بڑے قناعت پسند، ہمدرد اور محبت کرنے والے تھے۔ ان سے مل کر نجانے کیوں اعجاز کے دل میں سے اکیلے پن اور تنہائی کا احساس ختم ہونے لگا تھا۔

وہ اپریل کی ایک بڑی ہی سہانی سہ پہر تھی جب اعجاز نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ قریبی بستی "چندری" میں ڈاک تقسیم کر کے قصبے کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ لڑکی اسے دور ہی سے نظر آگئی تھی، شاید اس لیے کہ وہ سامنے نظر آنے والے خوب صورت منظر سے بالکل جدا تھی۔ ایک حسین گردوپیش کے درمیان وہ ایک اُداس ہیولے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں دریا کے بہتے پانی میں تھے، آنچل ہوا میں اڑ رہا تھا اور مقامی طرز کا سیاہ لبادہ ہولے ہولے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اعجاز کو دیکھ کر وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر تک محویت سے اس کی طرف تکتی رہی، پھر چند قدم تیزی سے چل کر قریب آگئی۔ درمیانی فاصلہ اب بہت کم تھا۔ اعجاز نے غور سے دیکھا، وہ خوب صورت تھی۔ خوب صورت چہرے تو اس نے یہاں اور بھی بہت دیکھے تھے لیکن یہ خوب صورتی اس لحاظ سے جدا محسوس ہوئی کہ اس میں ایک خواب ناک سی کیفیت تھی۔ جیسے وہ جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو، افسانوں کہانیوں میں پایا جانے والا کوئی تصوراتی کردار ہو جو کسی خوب صورت کتاب میں سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگیا ہو۔ مگر جب وہ بولی تو اعجاز تصور سے حقیقت کی دنیا میں آگیا "بابو! میرے نام کا کوئی خط ہے؟" اس نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اعجاز نے پوچھا۔

آس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرایا "سنبل!"

اعجاز نے اپنے ہاتھ میں پکڑے خطوں پر ایک رسمی نگاہ ڈالی اور دامن پر زور دے کر بولا "نہیں' اس نام کا تو کوئی خط نہیں۔"

"بابا کے نام کا۔۔۔ ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے ملک خداداد کے نام کا؟"

"نہیں۔ آج تو ان کے نام کا بھی نہیں۔ پرسوں ایک چٹھی آئی تھی' وہ میں نے دے دی تھی۔"

"اس پر سنبل کا نام تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔" اعجاز نے پورے یقین سے کہا' پھر کچھ سوچ کر بولا "ملک خداداد تمہارے والد ہیں؟"

سنبل نے اُداسی سے اثبات میں سر ہلایا۔

اُداسی یقیناً اس بات کی نہیں تھی کہ ملک خداداد اس کے والد تھے بلکہ اس بات کی تھی کہ ان کے نام کا کوئی خط اعجاز کے پاس موجود نہیں تھا۔

وہ وہیں گم صم سی پتھر پر کھڑی رہی اور اعجاز آگے بڑھ گیا۔

دو روز بعد اسی مقام پر سنبل سے اس کی ملاقات ہوئی۔



وہ بھی سہ پہر کا وقت تھا۔ دور شمال کے برف پوش پہاڑوں سے سیاہی مائل بادل اٹھ کر وادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ وہیں پتھر پر بیٹھی تھی' جنوب کے رخ پر بلند و بالا پہاڑوں کو تک رہی تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اعجاز قریب آیا تو وہ حسب سابق بولی "بابو! میرے نام کا کوئی خط تو نہیں؟"

"تمہارا نام سنبل ہے نا؟" اعجاز نے یوں ہی کہہ دیا۔

سنبل کے چہرے پر اُمید کی چمک برق بن کر لہرائی "ہاں" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"سنبل کے نام کا تو کوئی خط نہیں۔" اعجاز نے کہا "اور ملک صاحب کے نام کا بھی نہیں۔"

وہ کچھ دیر اداس کھڑی رہی پھر بے دم سی ہو کر پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک غم زدہ تصویر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اعجاز کچھ دیر حوصلہ جمع کرتا رہا پھر بولا "بہت پریشان نظر آتی ہو تم؟"

"نہیں تو۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"کوئی ضروری خط آنا ہے تمہارا؟"

"ہاں۔" اس نے کہا۔

اعجاز مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن لڑکی کا انداز حوصلہ افزائی کا نہیں تھا۔ وہ کان میں پنسل درست کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اعجاز کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایبٹ آباد کا رہنے والا تھا۔ ایبٹ آباد میں ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ میاں بیوی نے چار پانچ ماہ تو بخوبی گزارے تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنے وسیع ہو گئے کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑے تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ ان دونوں کی طبیعت میل نہیں کھاتی تھی۔ بیوی کوری اَن پڑھ تھی جبکہ اعجاز نے میٹرک کیا تھا۔ (یہ ان دنوں بہت اہم بات تھی) وہ زندگی کی خوب صورتی پر یقین رکھتا تھا۔ خوب صورت گفتگو' خوب صورت مناظر' دلکش ماحول' نفاست اور شائستگی یہ سب کچھ اس کے دل کو بھاتا تھا جبکہ بیوی بالکل برعکس تھی۔ وہ قبول صورت تھی لیکن اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپیاں اچھی خوراک اور زرق برق کپڑوں تک محدود تھیں۔ پھر وہ پرلے درجے کی لالچی بھی تھی۔ یہ ان کے مزاج کا بُعد تھا کہ ان میں جو بھی چھوٹا موٹا اختلاف پیدا ہوا وہ پھیل کر تنازع بن گیا۔

اعجاز کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ اعجاز کی بیوی ان کی طرف رتی بھر توجہ نہیں دیتی تھی۔ اعجاز اور تو سب کچھ برداشت کر سکتا تھا لیکن یہ نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ دیں پر ہو اس کی والدہ بے بسی کے عالم میں پڑوسیوں کو پکارتی رہیں۔ اس نے کئی بار بیوی کو اس حوالے سے سمجھایا لیکن ان باتوں کا الٹا اثر ہوا۔ یہ تنازع اتنا بڑھا کہ آخر ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اس واقعے کے دو تین ہفتے بعد ہی اعجاز کی والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ یوں اعجاز ایک دم اکیلے پن اور تنہائی کے دشت میں کھو گیا۔ والدہ کی وفات نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایبٹ آباد کا بھرا پُرا شہر چھوڑ کر کسی دور دراز پہاڑی قصبے میں جا بسے۔ کھلی فضاؤں میں بسیرا کرے۔ قدرتی مناظر سے ہم کلام ہو اور کبھی کبھی اپنا وہ شوق بھی پورا کرے جو والدہ کی طویل علالت کے دوران میں اس کے اندر کہیں دفن ہو گیا تھا۔ اسے لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ شعر جوڑتا تھا اور اس نے چھوٹی موٹی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ پھر کارِ معاش کے سبب یہ سارے مشاغل چھوٹ گئے تھے۔

اوپر والے نے اس کی دعا سن لی تھی۔ اس کی تبدیلی ایبٹ آباد سے اس دور دراز قصبے میں ہو گئی تھی۔ شروع میں اسے یہاں اجنبیت ضرور محسوس ہوئی تھی لیکن اب وہ بہت خوش تھا۔

سنبل نامی اس اُداس لڑکی سے اس کی صرف دو ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر ان دو ملاقاتوں میں یہ لڑکی اس کے دل و دماغ کو متاثر کر گئی تھی۔ اعجاز کو یوں لگا تھا جیسے اس لڑکی کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ یہ لڑکی اپنے اندر کوئی گداز کہانی چھپائے ہوئے ہے۔ دو تین روز اعجاز اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر اس سے اعجاز کی ایک اور ملاقات ہو گئی۔

یہ ملاقات بھی قریب قریب پہلی ملاقاتوں جیسی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن شام کا سماں نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سر پر چھتری تانے اعجاز قریبی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ پگڈنڈی پگڈنڈی چلتے اچانک اسے اپنے عقب میں قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پیچھے کھڑی تھی۔ بارش سے اس کا لباس بھیگ گیا تھا اور اس کا سرکش شباب بے حجاب نظر آنے لگا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک بھرپور لڑکی تھی۔ ایک پکے ہوئے رسیلے پھل جیسی۔ وہ جس علاقے کی مکین تھی وہاں لڑکیوں کی شادیاں عموماً چودہ سے اٹھارہ سال کے درمیان ہو جاتی ہیں۔ سنبل ابھی تک غیر شادی شدہ تھی اور یہ اچنبھے کی بات تھی۔

"بابو! میرا کوئی خط تو نہیں آیا؟" سنبل نے حسب

معمول معصومیت سے پوچھا۔
اس کی آواز نے اعجاز کو چونکا دیا۔ وہ سنبل سے نظریں ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں اسے افسوس سا ہوا کہ آج بھی اس کے پاس سنبل کے لیے کوئی خوش کن جواب نہیں ہے "نہیں بھئی! تمہارے نام تو کوئی خط نہیں۔" وہ بولا۔
حسب معمول وہ بجھ سی گئی۔ اس کے چہرے اور جسم میں جلتی ہوئی کوئی لو ایک دم اندھیرے میں کھو گئی۔
"بابو جی! ذرا ٹھیک سے دیکھو تو۔"
اس کا دل رکھنے کے لیے اعجاز نے یونہی خطوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ ساتھ وہ نفی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ وہ امید و بیم میں ڈوبی اس کے سامنے تھی۔ اعجاز نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "تم نے ایڈریس کیا دیا تھا؟"
"ایڈریس بالکل ٹھیک تھا بابو جی۔"
"کیا پہلے کوئی خط آیا ہے؟"
"آیا تو نہیں۔ لیکن ایڈریس بالکل ٹھیک ہے اور۔۔۔ وہ اچھی طرح جانتا بھی ہے۔"
اعجاز نے دل میں سوچا' چلو ایک بات تو صاف ہوئی۔ وہ کوئی مرد ہے۔ اب اگلا سوال یہ ہو سکتا تھا کہ کون مرد ہے؟'
ابھی لڑکی کے ساتھ اس کی اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی کہ وہ براہِ راست یہ سوال پوچھ سکتا اور یہ پوچھ سکتا کہ وہ کہاں ہے اور کب سے اسے انتظار کروا رہا ہے۔
بارش کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ اعجاز نے چھتری تھوڑی سی ٹیڑھی کر لی۔ پھر ایک نظر بے ساختہ سنبل پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ کافی آگے جا کر اس نے ترچھی نظر سے دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس کے اردگرد سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس سبزے پر بارش نے پردہ سا تان رکھا تھا۔ ایک آبشار کے پاس کھڑی وہ سنگِ مرمر کی مورتی دکھائی دیتی تھی۔
اس واقعے کے بعد بھی وقفے وقفے سے چار پانچ دفعہ ایسا ہوا کہ سنبل نے اس سے اپنے خط کے بارے میں پوچھا۔ ہر مرتبہ اعجاز کا جواب نفی میں رہا۔ جب کوئی خط آیا ہی نہیں تھا تو وہ اثبات میں کیا جواب دیتا۔ اعجاز کے ذہن میں سنبل نامی اس لڑکی کے بارے میں شدید تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ آخر وہ کس کے خط کی راہ تک رہی تھی۔ وہ کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ وہ اتنی حسین و جمیل لڑکی کی خواہش پر کیوں اسے خط نہیں لکھتا تھا۔ کیا وہ کوئی پردیسی تھا یا اسی قصبے کا کوئی ایسا فرد تھا جو کام کاج کی غرض سے بستی سے باہر تھا یا پھر۔۔۔ یا پھر یہ کوئی عشق و محبت کا معاملہ ہی نہیں تھا۔ سنبل اپنے کسی بھائی یا کسی قریبی عزیز کے خط کا انتظار کرتی تھی؟
اعجاز جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کوئی کہانی موجود ہے۔
ایک روز چھٹی تھی۔ چاچا گلریز زمین پر کام کے لیے گیا ہوا تھا۔ اماں فاطمہ کی طبیعت ذرا ناساز تھی اس لیے وہ ملک خدادار کی حویلی نہیں گئی تھی۔ اعجاز نے اماں فاطمہ سے پوچھا۔
"اماں! یہ سنبل ملک خدادار کی بیٹی ہے؟"
"ہاں بیٹی ہے' لیکن تو کیوں پوچھتا ہے؟"
"بس یونہی۔ وہ اتنی بڑی ہو گئی ہے ناں۔ میں سوچ رہا تھا اس کا بیاہ کیوں نہیں ہوا؟"
"وہ بیمار ہے۔"
"کیا ہوا اسے؟"
"بس کبھی کبھی اسے بیماری کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔"
"مثلاً کیا ہوتا ہے؟"
"بس ٹھنڈی ٹھار ہو جاتی ہے۔ آنکھیں اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ سانس رکنے لگتی ہے۔ دیر تک ہاتھ پاؤں کی مالش کریں تو ہوش میں آتی ہے۔"
"یہ تو کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں۔ اکثر کسی صدمے یا شدید پریشانی کی وجہ سے عورتوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔"
"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ بیماری تو کوئی ایسی خطرناک نہیں۔ اور اگر ہوتی بھی تو سنبل جیسی لڑکی کی شادی میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ باپ بستی کا ملک ہے۔ اس کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ ایک پورا پہاڑ اس کی ملکیت ہے۔ وہ آسانی سے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر سکتا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ ایسا نہیں کرتا۔ سنا ہے کہ سنبل خود بھی بیاہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ اسے بیماری کا دورہ بھی اسی وقت پڑتا ہے جب اس سے بیاہ کی بات کی جاتی ہے۔ وہ ملک کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی ہے۔ ملک اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اس وجہ سے اس نے سنبل کے بیاہ کی بات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"
اعجاز بولا "اماں جی! میں نے تو سنا ہے کہ جوان بچے بچیوں میں کوئی اس طرح کی تکلیف ہو تو فوراً ان کی شادی کر دینی چاہیے۔ ویسے بھی یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس میں بہتری ہی بہتری ہے۔"
اماں فاطمہ نے کہا "ہاں بیٹا جی! ہم بھی یہی سنتے اور دیکھتے آئے ہیں۔ پر سنبل ملک خدادار کی اولاد ہے۔ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی نہیں۔ اگر ہوتی تو اب یہی ملک صاحب یہ لمبا ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے پڑے ہوتے کہ وہ

جوان جہان بیٹی کا بیاہ کیوں نہیں کرتا۔ کیوں اپنے اور سارے قصبے کے سر پر بوجھ بڑھا رہا ہے مگر اب بات ان کے اپنے گھر کی ہے اس لیے بالکل خاموش ہیں۔ کسی کو بھی یہ جرأت نہیں کہ اس بارے میں زبان کھولے۔"

اعجاز اب اماں فاطمہ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ اماں کے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا' اور اماں اس کے بارے میں کافی کچھ جان چکی تھی۔ اس نے اماں سے کہا "کہیں اس لڑکی کا کسی سے پیار محبت کا معاملہ تو نہیں تھا؟"

اماں فاطمہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا "تو کیوں خواہ مخواہ ٹوہ لے رہا ہے۔" اماں نے اسے ٹوکا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کوئی بات ہے؟"

"بیٹا! ایسی باتوں کو کریدا نہیں کرتے اور پھر اگر بات کسی اونچی پگڑی والے کی ہو تو اسے کریدنے میں اور بھی خطرہ ہوتا ہے۔"

"لیکن اماں' میں کسی اور سے تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ تیری اور میری بات کوئی دو ہے؟"

اماں نے ٹھنڈی ہوا روکنے کے لیے کھڑکی بند کی اور قہوے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بولی "سات آٹھ سال پہلے اس طرح کی ایک بات ہوئی تھی۔ پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ سڑک نکل رہی تھی۔ شہر سے آنے والے بہت سے لوگ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے نالے کے پاس ہی اپنی خیمہ بستی بنا رکھی تھی۔ ان میں ایک لڑکا تھا۔ اونچا لمبا گھبرو' پتلون قمیص پہنتا تھا' بڑا ہنس مکھ تھا۔ سودا وغیرہ لینے اکثر بستی میں آیا کرتا تھا۔ اس نے کہیں سنبل کو دیکھا اور اس کے پیچھے پڑ گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور بات بڑھ گئی۔ ایک روز اس نے سنبل کو جھاڑیوں میں روکنے کی کوشش کی۔ سنبل نے گھر آ کر باپ اور بھائیوں کو بتا دیا۔ انہوں نے لڑکے کو گھیر کر پکڑ لیا۔ پھر اسے ترائی کے درختوں میں لے جا کر خوب مارا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے اور جسم خوناں خون ہو گیا۔ بعد میں قصبے کے لوگوں نے ہی لڑکے کو اسپتال پہنچایا۔ وہاں وہ دو تین دن رہا پھر اس کے والی وارث اسے راولپنڈی لے گئے۔ وہ بچ تو گیا لیکن پھر اس نے کبھی قصبے کا رخ نہیں کیا۔ بعد میں سنا تھا کہ اس لڑکے کا بیاہ بھی ہو گیا تھا۔"

اعجاز کا اندازہ آخر درست نکلا تھا۔ کہانی موجود تھی۔ لیکن جتنی اعجاز تک پہنچی تھی وہ بہت مختصر تھی۔ اعجاز کو تفصیل چاہیے تھی۔ یہ تفصیل اسے کون بتا سکتا ہے؟ اس نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اس کا دھیان سیدھا رحیم گل کی طرف گیا۔ رحیم گل ڈاک خانے میں کلرک تھا اور اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔ پچھلے دو ڈھائی مہینے میں اعجاز کے ساتھ اس کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔

اگلے روز شام کو اعجاز نے رحیم کو گھیر لیا۔ دریا کے کنارے گھاس کے ایک قطعے پر دونوں چادر بچھا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی اعجاز اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے سنبل کے حوالے سے رحیم گل کو کریدنے کی کوشش کی۔ رحیم گل کے چہرے پر وہی تاثر پیدا ہوا جو کل اماں فاطمہ کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ اس تاثر میں خوف و ہراس کی آمیزش تھی۔ ظاہر ہے سنبل بستی کے ملک کی بیٹی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نکل جاتی اور ملک تک پہنچ جاتی تو قیامت آ جاتی۔

رحیم گل نے پہلے تو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا مگر جب اعجاز کا اصرار بڑھا تو وہ چپ کا روزہ توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے تائید کی کہ چھ سات سال پہلے ہائی وے ڈپارٹمنٹ کے ایک ملازم کا نام سنبل کے ساتھ لیا گیا تھا۔ بعد ازاں اس نوجوان کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ ملک اور اس کے دونوں بیٹوں نے نوجوان کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔

اعجاز نے پوچھا "کیا سنبل بھی اس لڑکے میں دلچسپی لیتی تھی؟"

رحیم گل کے جواب نے اعجاز کو یک دم مایوس کر دیا۔ وہ بولا "میرا خیال ہے ایسا نہیں تھا۔ اسے تم یک طرفہ کارروائی کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ کچھ دن مزید گزر جاتے تو یہ یک طرفہ نہ رہتی مگر بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی ملکوں نے ختم کر دی۔"

"لڑکا علاج معالجے سے صحیح ہو گیا تھا؟"

"ہاں اس کے دونوں بازو ٹوٹے تھے۔ آپریشن کے بعد ہڈیاں جوڑ دی گئی تھیں۔"

"اماں فاطمہ کہتی ہے کہ وہ لڑکا پھر کبھی قصبے میں نظر نہیں آیا۔"

"اس میں اتنی جرأت ہی کہاں تھی۔ وہ لڑکا کیا تھا' بزدل بھیڑ تھی۔ ایسے عاشقوں میں اتنا دم خم نہیں ہوتا کہ کسی کو گریبان سے پکڑ سکیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک مرتبہ ملک کے کچھ کارندوں نے اسے کھائی میں پکڑ لیا تھا۔ شاید وہ وہاں کسی کام کے لیے آیا تھا۔ انہوں نے اسے خوب پیٹا۔ لکیریں نکلوائیں' کورے کاغذ پر انگوٹھے لگوائے اور پھر دھمکی دی کہ اگر وہ آئندہ کھائی میں نظر آیا تو اس کی خیر نہیں۔"

اعجاز کی مایوسی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کہانی میں تو

کوئی جان نظر نہیں آتی تھی۔ رحیم گل نے اپنے مؤقف کی تائید میں مزید ثبوت دیتے ہوئے کہا "میری بڑی بہن کی اب شادی ہو چکی ہے۔ وہ سنبل کی سہیلی تھی۔ سہیلی سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ خود مجھے بتایا کرتی تھی کہ سنبل کا اس لڑکے سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں۔ وہ تو اسے لمبے بالوں والی بھینگر کہتی تھی۔"

اعجاز نے کہا "ہاں' یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اگر سنبل کا دل ڈانواں ڈول ہوتا تو وہ باپ کے سامنے اس لڑکے کی شکایت نہ کرتی۔"

"لیکن یار! تم کیوں اتنے کھوجی بنے ہوئے ہو۔" رحیم نے اعجاز کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"پیارے! مجھے لکھنے کا ٹھرک ہے۔ کوئی کہانی ڈھونڈتا رہتا ہوں۔" اعجاز نے کہا۔

"سنبل کو تم نے کہاں دیکھا تھا؟"

"یونہی راہ چلتے ایک دو بار۔" اعجاز نے کہا۔ وہ یہ بات گول کر گیا کہ سنبل آتے جاتے اس سے کسی خط کے بارے میں پوچھا کرتی ہے۔

"بس وہ سنگی سی لڑکی ہے۔" رحیم نے آہستہ سے کہا۔ "باپ نے لاڈ پیار سے سر چڑھا رکھا ہے بلکہ میرے خیال میں تو اب اسے لڑکی بھی نہیں کہنا چاہیے۔ ایک دو سال میں وہ عورت کہلانے کی مستحق ہو گی۔ بھئی' یہ تو کوئی بات نہیں کہ لڑکی نہیں مانتی تھی اس لیے اس کی شادی نہیں ہو رہی۔"

"اماں فاطمہ کہتی تھی کہ وہ بیمار ہے۔"

"کوئی بیماری شماری نہیں' بس لاڈ ہی لاڈ ہے۔" رحیم گل نے بیزاری سے کہا "یہ ملک خداداد کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ چھوٹا بچہ پیار محبت میں اکثر خراب ہو جاتا ہے۔"

"کتنے بھائی ہیں اس کے؟"

"دو بھائی ہیں۔"

"اور بہنیں؟"

"تین ہیں۔ تینوں بھلی چنگی ہیں' بال بچے دار ہیں۔ اپنے اپنے گھر ہنسی خوشی رہتی ہیں۔ سنبل کی طرح ان تینوں نے آٹھویں جماعت پاس کی ہوئی ہے۔ قصبے کی لڑکیوں کے بارے میں اکثر باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ ان تینوں کے بارے میں تو کوئی افواہ تک نہیں اڑی۔ ماں باپ نے بر ڈھونڈا' ماں باپ نے شادی کی۔ چپ چاپ ڈولی میں بیٹھیں اور رخصت ہو گئیں۔ ایک یہ لڑکی ہے کہ نئے نئے تماشے بنا رہی ہے۔ پتا نہیں چاہتی کیا ہے۔ بھئی اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ ماں باپ بچوں کی بات سننے لگے ہیں۔ ملک خداداد کتنا بھی سخت سہی لیکن اپنی لاڈلی پر تو کلہاڑا لے کر چڑھائی نہیں کرے گا۔ اگر وہ کسی کو چاہتی ہے تو بتا دے۔ کیا پتا بات بن ہی جائے اس کی۔"

اعجاز نے کہا "رحیم گل! مجھے تو یقین ہے کہ لڑکی کا کوئی چکر ہے۔ اگر کوئی پوچھنے والا ہو تو بتا دے گی اس کو۔"

رحیم نے کہا "یار! تجھے بتایا تو ہے۔ ہم ان کے پڑوسی ہیں۔ میری بہن صادقہ اس کی سہیلی تھی۔ اگر کوئی بات ہوتی تو اسے پتا نہ ہوتا۔"

"ممکن ہے یہ تمہاری بہن کی شادی سے بعد کی بات ہو۔"

"میری بہن کی شادی دو برس پہلے ہوئی تھی لیکن یہ تو چھ سال سے ایسے ہی ملنگ ہے۔"

ملنگ کا لفظ رحیم گل نے خوب استعمال کیا تھا۔ اعجاز دل ہی دل میں مسکرایا۔ واقعی سنبل کو دیکھ کر ایک خوب صورت ملنگ کا تصور ذہن میں آجاتا تھا۔ ایک پری پیکر ملنگ جس نے پتھر پر بیٹھ کر اپنے دودھیا پاؤں بہتے پانی میں ڈبو رکھے تھے۔

○☆○

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ ہاں وہ وقت ہی تھا۔ وہ ہوا کے ساتھ چیڑ کے درختوں میں سرسراتا رہا اور پانی کے ساتھ چشموں میں بہتا رہا اور بادلوں کے ساتھ... پربتوں پر اڑتا رہا۔ لمحے' دنوں' ہفتوں اور مہینوں میں بدلتے رہے۔ اعجاز اب علاقے سے اور علاقے کے مکینوں سے بہت مانوس ہو چکا تھا۔ وہ ہر شخص کو جاننے پہچاننے لگا تھا۔ ہر شخص کی عادات' خصائل اور پس منظر کے بارے میں اسے معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اگر کوئی اس کے لیے اب بھی اجنبی تھا تو یہ وہی سنبل تھی۔ وہ اسے جان سکا تھا نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ اکثر اوقات سہ پہروں میں اسے کسی پتھر پر بیٹھی ملتی۔ کسی چشمے کے کنارے اس نے اپنے پاؤں بہتے پانی میں ڈبو رکھے ہوتے یا پھر ترائی میں چیڑ کے دیو قامت درختوں تلے وہ برہنہ پا چکراتی نظر آجاتی۔ ہمیشہ اعجاز کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہو جاتی۔ ایک آس بھری چمک۔ جس سے اعجاز کو اب ڈر آنے لگا تھا۔ اسے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس لڑکی کا گناہ گار وہ شخص نہیں جو اسے خط لکھنا بھول گیا ہے بلکہ وہ خود ہے۔ جس کے تھیلے میں سے اس کے لیے کوئی خط نہیں نکلتا۔ وہ اکثر اس سے کترا کر گزر جاتا لیکن کبھی کبھی آمنا سامنا ہو ہی جاتا۔ سنبل کی آنکھوں میں موہوم امید ٹمٹماتی۔ وہ پوچھتی "ہے کوئی خط؟"

اعجاز کی خاموشی ہی اس کا جواب ہوتی تھی۔ یہ جواب دینے کے بعد وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں

کرتا تھا۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں ہوتی تھی کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا۔ کبھی کسی وقت وہ دانستہ طور پر سنبل کے سوال سے بچنے کی کوشش کرتا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھتا کہ آج بھی اس کے نام کا کوئی خط نہیں' یا پھر نفی میں سر ہلا دیتا۔ بہرحال یہ خط والا معاملہ اعجاز اور سنبل کے درمیان ایک راز کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا تھا کہ کسی نے سنبل کو اعجاز سے خط کے بارے میں دریافت کرتے دیکھا یا سنا ہو اور اگر کوئی جان بھی جاتا تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ملک خداداد کی بیٹی کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی ہانکتا۔

اکثر اعجاز کے دل سے یہ دعا نکلتی کہ وہ خط آ ہی جائے جس کا سنبل اتنی بے چینی سے انتظار کیا کرتی ہے۔ وہ پوسٹ آفس سے روزانہ درجنوں خطوط تھیلے میں بھر کر لاتا تھا۔ ان میں ہر طرح کے خطوط ہوتے تھے اور ایسے خطوط بھی جو چھپا کر لکھے جاتے ہیں اور چھپا کر پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خط ان پردیسیوں کے ہوتے تھے جو اپنے بال بچوں سے دور کسی دوسرے شہر میں کام کاج کے لیے گئے ہوتے تھے' کچھ منگیتروں کے خط ہوتے تھے' کچھ محبوباؤں کے نامے ہوتے تھے' کچھ سہیلیوں کی چٹھیاں ہوتی تھیں۔ اعجاز اکثر سوچتا تھا کہ کتنا اچھا ہو اگر ان میں ایک چٹھی سنبل کے نام کی بھی آجائے۔ پوسٹ آفس میں "سارٹنگ" کے دوران میں اکثر اس کی نگاہ سنبل کا نام تلاش کرتی رہتی۔

ایک شام چیڑ اور کیل کے گھنے درختوں سے گزرتے ہوئے اس نے سنبل کو دیکھا۔ وہ جنگلی پھولوں سے چھوٹا سا گلدستہ بنا رہی تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اعجاز شام کی سیر کو نکلا ہوا تھا اور ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ وہ پاس ہی گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گیا اور دریا کے شفاف پانی میں اپنے کیچڑ آلود جوتے دھونے لگا۔ وہ اسے محویت سے دیکھنے لگی۔

اعجاز نے کہا "ایک بات پوچھوں سنبل بی بی' بُرا تو نہیں مانو گی۔"

بولی۔ "ہاں۔۔۔ آں پوچھو۔" وہ جیسے کسی خواب سے چونک کر

"وہ کس کا خط ہے جس کا تم روز انتظار کرتی ہو؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں لیکن اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ میں اکثر اس خط کے بارے میں اور تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

وہ ایک طویل سانس لے کر بولی ... "ایک سہیلی ہے میری۔ بیاہ کر بہت دور چلی گئی ہے۔"

"کہاں؟"

"لاہور۔۔۔ شاید لاہور سے بھی آگے۔"

"تمہارے پاس اس کا ایڈریس نہیں ہے۔"

"ہوتا تو خط نہ لکھتی اسے؟"

اعجاز کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ وہ بولا "میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم غلط کہہ رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ سہیلی نہیں ہے۔"

سنبل نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ ان لمحوں میں وہ سچ مچ ملک خداداد کی بارعب بیٹی نظر آئی۔ اعجاز پہلے تو ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا "ایک مرتبہ خود تمہاری زبان سے ایک ایسا جملہ نکل گیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ کوئی لڑکی نہیں۔"

"کیسا جملہ؟"

"مجھے وہ جملہ اب تک یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم جس کے خط کا انتظار کر رہی ہو' وہ تمہارا ایڈریس اچھی طرح جانتا ہے۔"

سنبل نے گھور کر اسے دیکھا۔ اعجاز گڑبڑا گیا۔ یہ رسک ہی کم نہیں تھا کہ وہ قصبے کے بااثر ترین شخص کی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔ اب یہ دوسرا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس پر برہم ہونے والی تھی۔ بہرطور خیریت گزری۔ دور سے اسے رحیم گل اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر سنبل نے رخ پھیرا اور قصبے کی طرف چل دی۔

رحیم گل نے کہا "یہاں کیا کر رہا ہے پیارے۔"

اعجاز نے بتایا کہ جوتے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے وہ دھو رہا تھا۔

دونوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ رحیم گل نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اعجاز کو تنبیہہ کی کہ وہ ملک خداداد کی بیٹی کے آس پاس زیادہ نظر نہ آیا کرے۔ وہ بہت شکی مزاج اور غصیلے لوگ ہیں۔ ذرا سی بات پر بندے کی گردن اڑا دیتے ہیں۔

اعجاز نے کہا "یار! تم کیسی بات کر رہے ہو۔ میرے دل میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں تو بس اپنے ہی چکر میں ہوں۔"

"کیسے چکر میں؟"

"کہانی کے چکر میں۔ مجھے یقین ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی کہانی ہے۔ وہ اس کہانی کو اپنے اندر چھپائے پھرتی ہے۔ کوئی ہے۔۔۔ ہاں کوئی ہے جس کے آنے کا' جس کے خط کا وہ انتظار کیا کرتی ہے۔"

"یار! اگر ہے بھی تو تُو کیوں خواہ مخواہ اس معاملے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔"

"نہیں پیارے، میں رہ نہیں سکتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ کسی دن اسے جنگل میں گھیر لے۔ نائیلون کی رسی کے ساتھ اسے درخت سے باندھ دے اور چیڑ کا ڈنڈا لے کر اس کے سر پر کھڑا ہو جا۔ پوچھ اس سے کہ کون ہے اس کا پریمی۔ اور کیا ہے پریم کہانی۔"

"یار! تم تو غصہ کر رہے ہو۔ اچھا میری ایک بات سنو۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہاری بڑی بہن صادقہ اس اول جلول لڑکی کی گہری سہیلی رہی ہے۔ جو بات کسی کو معلوم نہیں ہوتی وہ سہیلی کو پتا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ روڈ ڈپارٹمنٹ کے ملازم شفیع کے علاوہ بھی کسی سے سنبل کا تھوڑا بہت تعلق جوڑا گیا ہو۔ عام لوگوں کو معلوم نہ ہو لیکن سنبل کے گھر والوں یا اس کی ایک دو قریبی سہیلیوں کو معلوم ہو۔"

رحیم گل گہری نظروں سے اعجاز کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کی کھوجی طبیعت پر کوئی فقرہ چست کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے گہری سانس لی اور بولا "ویسے تمہارا اندازہ درست ہے۔ میرا بھی خیال ہے کہ شفیع کے علاوہ بھی سنبل کا نام ایک نوجوان کے ساتھ آیا تھا۔ یہ بات زیادہ اہم نہیں اور نہ ہی زیادہ پھیلی تھی مگر بات تھی ضرور۔"

"کون تھا وہ؟"

"ایک مقامی نوجوان۔"

"بہن صادقہ ہمیں اس بارے میں تفصیل سے آگاہ کر سکتی ہے۔"

"اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہیں تفصیل سے آگاہ کر سکتا ہوں اور تفصیل بھی کیا ہے، بس مختصر سی بات ہے۔"

"یعنی تم اس بارے میں جانتے ہو!"

"کیوں نہ جانوں گا۔ اپنے بارے میں کون نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں ہی تو ہوں وہ۔" رحیم گل عجیب انداز میں مسکرایا۔

اعجاز چند لمحے دیدے پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ حیرت کچھ کم ہوئی تو اس نے رحیم گل سے تفصیل چاہی۔ رحیم گل کی روداد بڑی مختصر تھی۔ مختصر الفاظ نے اسے مزید مختصر کر دیا۔ جب رحیم نے روداد شروع کی تو اعجاز خاصا پُر امید تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آخر اسے وہ کہانی مل گئی ہے، جس کی

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے

روشنی کے مینار

قیمت ۳۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ

عظمت کے مینار

قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے

ایمان کا سفر

قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھ سے نہیں دل سے پڑھیں گے

کچرا گھر

قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

محی الدین نواب کا پہلا ناول معاشرتی ناول جس کو لوگوں نے ایک تجزیہ جو کہ سچائی کے بارے میں اپنا اصل چہرہ چھپا رکھتے ہیں

آدھا چہرہ

قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

جرائم پیشہ شیطان لازم ملزوم مزاح ماسٹر دوست سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں

کالی کہانیاں

قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

مشہور بینک ڈیولپمنٹ جیب قیمت چیزیں گرل فرینڈ ساتھ ہے چشمہ ہے۔

بنک ویلوٹ کی چوریاں

قیمت جلد اول ۲۰۰ جلد دوم ۲۰۰

ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس ۲۳ سید مٹھن ملیر یا سٹریٹ نمبر ۱۰ [illegible]

تلاش میں وہ سرگرداں تھا' لیکن جب یہ روداد ختم ہوئی تو اعجاز کا اولین تاثر مایوسی کا تھا۔ بالکل ویسی ہی مایوسی جیسی اسے روڈ ڈپارٹمنٹ کے شفیع کی کہانی سننے کے بعد ہوئی تھی۔ رحیم گل کی روداد کا خلاصہ یوں تھا کہ سنبل' رحیم گل کی بہن کی سہیلی تھی۔ اس ناتے وہ اکثر ان کے گھر بھی آتی تھی۔ ویسے بھی وہ پڑوسی تھے۔ سنبل جتنی خوب صورت آج نظر آتی تھی' پانچ چھ سال پہلے اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ حسن اور محبت کا دائمی ساتھ رہا ہے۔ رحیم سنبل کی طرف کھنچنے لگا۔ دو چار مرتبہ اس نے اشاروں کنایوں میں سنبل سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک مرتبہ رحیم چھت پر سے اشارے کر رہا تھا کہ رحیم کے والد نے دیکھ لیا۔ اپلوں والی کوٹھری میں بند کر کے والد نے اسے چھڑ رسید کیے اور بُری طرح ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کہا' تو ایک معمولی کلرک کا کلرک بیٹا ہے۔ وہ ملک خدادار کی بیٹی ہے۔ ان لوگوں کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تجھ سمیت پورے گھر کو آگ لگا دیں گے۔

اس واقعے کے بعد رحیم کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ رہی سہی کسر دو تین ماہ بعد پوری ہو گئی۔ شام کے وقت کھیت کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک پگڈنڈی پر کسی زہریلے کیڑے نے رحیم کے پاؤں پر کاٹ لیا۔ وہ وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ آس پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ اتفاقاً سنبل دریا کی طرف سے وہاں آ گئی۔ اس نے رحیم کے پاؤں کا نیلا انگوٹھا دیکھا تو فوراً اپنا دوپٹا اس کی پنڈلی پر باندھا اور کیڑے کا ٹوٹا ہوا ڈنک نکال دیا۔ بعد میں انگوٹھے سے زہر آلود خون نکالنے میں بھی اس نے رحیم گل کی مدد کی۔ رحیم گل نے مشکل وقت میں مدد کرنے پر سنبل کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بولی "بہنیں۔۔۔ بھائیوں کے کام آیا ہی کرتی ہیں۔ تم صادقہ کے سگے بھائی ہو تو میرے لیے بھی سگے بھائیوں کی طرح ہو۔"

اس کے بعد یہ بات بالکل ختم ہو گئی تھی۔ سنبل نے بڑے خلوص سے اسے سگے بھائی کا درجہ دے دیا تھا' اب باقی کیا رہ گیا تھا۔

رحیم گل کی کہانی سننے کے بعد اعجاز کی الجھنوں میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوا۔ یہ لڑکی اس کے لیے ایک معما بنتی جا رہی تھی۔ وہ جتنا اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا تھا' اتنا ہی اس کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ اس حسین قصبے میں رہتے ہوئے اعجاز کو اب تین سال ہونے کو آئے تھے۔ ان تین سالوں میں اگر وہ قصبے کے کسی شخص کو نہیں سمجھ سکا تھا تو وہ سنبل تھی۔ وہ تھوڑی سی کھسکی ہوئی لگتی تھی لیکن اس کا یہ انداز بھی دل کو بھاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس لڑکی میں رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ سرتاپا ایک خوب صورت خواب کے مانند تھی۔ ایسا خواب جو اپنے سحر انگیز گرد و پیش کی وجہ سے کچھ اور بھی دلکش ہو گیا تھا اور یہ حسین و جمیل لڑکی کسی کہانی کا کردار تھی' ایک ایسے خط کا انتظار کر رہی تھی جو بلند و بالا پہاڑوں کے پار سے اسے کوئی بھیجنے والا تھا۔۔۔ یا ان گھنے جنگلوں کے پار سے جو مغربی ڈھلوانوں پر نظر آتے تھے' یا ان چمکتی برفوں کے پار سے جو شمال میں حدِ نگاہ تک چلی گئی تھیں۔۔۔ ہاں کہیں نہ کہیں سے اس خط کو آنا تھا پھر اس خط کو پوسٹ آفس میں پہنچنا تھا اور اعجاز کے خاکی تھیلے میں منتقل ہونا تھا۔ مگر کب۔۔۔ کب ہونا تھا ایسا؟ شاید تب' جب انتظار کی لذت ختم ہو جاتی تھی۔ جب بالوں میں سفیدی اُتر آتی تھی۔ جب سنبل کا حسن اپنے اندر کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔۔۔ وہ سوچتا اور سوچتا ہی چلا جاتا۔ ایسے میں سنبل اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ اس کے تصور میں آ جاتی۔ وہ دلکش' ملنگ طبع حسینہ۔ اعجاز کبھی اسے چیڑ کے بلند و بالا درختوں تلے دیکھتا' کبھی وہ جنگلی پھولوں کے گلدستے بناتی نظر آتی اور کبھی پُرشور دریا کے کنارے کسی پتھر پر بیٹھی دکھائی دیتی۔ اس کے پاؤں دو گلابوں کی طرح پانی میں ڈوبتے ابھرتے اور وہ خود بھی انجانی سوچوں میں ڈوبتی ابھرتی۔

جون کی ایک بڑی سہانی صبح تھی۔ کئی دن کی بارش کے بعد آسمان نکھرا ہوا تھا اور خوشگوار دھوپ نشیب و فراز کو اپنی مہربان انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اعجاز آج بہت خوش تھا۔ ایک تو چھٹی کا دن تھا۔ دوسرے کل ہی اسے اپنی ترقی کا پروانہ ملا تھا۔ وہ پوسٹ مین سے ہیڈ پوسٹ مین بن رہا تھا۔ معمولی سا فرق تھا لیکن ایسا فرق اچھا تو لگتا ہے۔ صبح سویرے اماں فاطمہ سے چھاچھ' مکھن اور روٹی کا ناشتا کر کے وہ دریا کی طرف چلا آیا۔ دریا کے ساتھ ساتھ اکیلے گھومنا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ سنبل کے بارے میں بہت سوچتا تھا شاید اسی لیے اس پر سنبل کا رنگ چڑھتا جا رہا تھا۔ اسے بھی تو ان سرسبز نشیب و فراز میں اکیلے گھومنا اچھا لگتا تھا۔ دریا کے ساتھ ساتھ ابھی اعجاز تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ یہ میوزک کی آواز تھی۔ یقیناً تفریحی ٹور پر آئے ہوئے لڑکوں کی کوئی ٹولی شوگراں یا کاغان کی طرف جاتے ہوئے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ وہ موسیقی سے دل بہلا رہے تھے۔ ایک سریلی نسوانی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اعجاز ایک پتھر کی اوٹ میں رک گیا اور محویت سے سننے لگا۔ بول کچھ اس

طرح تھے۔

چل چلیں' اے دل کریں چل کر' کسی کا انتظار۔۔۔ جھیل کے اس پار

جو اس پار نہیں کوئی' شاید وہ اس پار ہو
جھیل کے پیچھے اک سندر سپنوں کا سنسار ہو
آئی ہو بہاروں پر بہار۔۔۔ جھیل کے اس پار

اس آواز نے اعجاز پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کردی۔ اسے یوں لگا جیسے ایک عقدہ سا اس کی آنکھوں کے سامنے کھلتا چلا جارہا ہے۔ اس عقدے کا تعلق اس خوب صورت سنبل سے تھا جسے وہ پچھلے تین سال سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ گانے کی شاعری عام فہم تھی۔ اس شاعری سے ایک خاص چیز کا اظہار ہوتا تھا۔ لڑکی جس کا انتظار کررہی تھی وہ کوئی مخصوص شخص نہیں تھا۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا تھا اور کہیں بھی پایا جاسکتا تھا۔ بس وہ تھا۔۔۔ اور وہ اس کی منتظر تھی۔ ان عقدہ کشا لمحات میں اس پُرسوز آواز کو سنتے سنتے اعجاز پر یہ راز کھلا اور اسے یقین ہوگیا کہ سنبل کے پیچھے کوئی کہانی نہیں۔ وہ ایک ایسے خط کا انتظار کررہی ہے جو کہیں سے بھی آسکتا ہے۔ جنوب کے پہاڑوں کے پار سے' شمال کی برفوں کے پار سے اور ان بلند و بالا درختوں کے پار سے جو مغرب میں حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اعجاز وہیں پتھروں میں بیٹھ گیا اور حیرت ناک نظروں سے دریا کے بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس کے علم میں اضافہ کررہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سنبل کی تحلیلِ نفسی میں مصروف ہوگیا۔ وہ ایک رومان پسند لڑکی تھی۔ رومانیت کے لیے اس کے اندر ایک وسیع و عریض خلا تھا۔ مگر یہ خلا کون پاٹتا؟ قصبے کے کس نوجوان میں ہمت تھی کہ وہ اس خلا کو پاٹنے کے لیے آگے بڑھتا؟ وہ ملک خداداد کی بیٹی تھی۔ اس کی طرف نگاہِ غلط انداز ڈالنے کا مطلب اپنی گردن سے محروم ہونا تھا۔ وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر تھی' لہٰذا ایک بلند و بالا چوٹی کی طرح تنہا ہوگئی تھی۔ وہ قصبے کی دوسری دوشیزاؤں کو دیکھتی تھی۔ ان کے امنگ ترنگ بھرے واقعات سنتی تھی' ان کے گالوں پر کھلے گلاب دیکھتی تھی اور مزید تنہا ہوجاتی تھی۔ وہ تازہ معطر ہوا چاہتی تھی جبکہ اس کے والدین اس کے لیے کفن کا اہتمام کررہے تھے۔ اس کی ضرورت محبت تھی جبکہ اسے "شادی" مہیا کی جارہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس سے شادی پر اصرار کیا جاتا تھا تو وہ شدید ذہنی انتشار کا شکار ہوجاتی تھی' اور اس پر بیماری کا حملہ ہوجاتا تھا۔

اس دن اعجاز صرف اور صرف سنبل کے بارے میں سوچتا رہا' پھر اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی سنبل ہی اس کے خیالوں پر محیط رہی۔ تیسرے روز شام کو اعجاز نے ایک اہم فیصلہ کیا۔۔۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کل کی ڈاک میں ایک خط سنبل کے نام کا ضرور ہوگا۔

○☆○

وہ اعجاز کے لیے ایک یادگار لمحہ تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا وہ تین برس سے انتظار کررہا تھا۔ آج اس کے تھیلے میں ایک خط سنبل کے نام کا موجود تھا۔ یہ اعجاز ہی کا لکھا ہوا خط تھا۔ تین برس تک وہ سنبل سے نظریں چراتا رہا تھا' آج وہ سنبل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ تین برس تک اس نے جس سوال کا جواب نفی میں دے کر سنبل کو مایوس کیا تھا' آج وہ اس کا جواب ہاں میں دینا چاہتا تھا۔

اور پھر وہ اسے نظر آگئی۔ وہ ایک میمنا گود میں اٹھائے دھیمے قدموں سے کھیت کی طرف جارہی تھی۔ اس کے لمبے بال کسی تاریک آبشار کی طرح اس کی پشت پر لہرا رہے تھے۔ اعجاز کو دیکھ کر وہ حسبِ عادت رک گئی۔ وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ پاس آیا تو صدیوں کی پیاسی آواز اس کے ہونٹوں سے سوال بن کر ابھری "ہے کوئی خط؟"

اعجاز نے ایک لمحہ توقف کیا پھر کانپتی آواز میں بولا "ہاں۔۔۔ آج ہے۔"

سنبل کا منہ کھلا رہ گیا' خوب صورت آنکھیں پھیل گئیں۔ سفید میمنا ایک جھٹکے سے اس کی بانہوں میں سے نکل گیا اور ڈھلوان پر دور تک بھاگتا چلا گیا۔

گھر بیٹھے ملک ملک کی سیر کا لطف اٹھایئے

علی سفیان آفاقی کا سفرنامہ

لنکا یاترا

کرکٹ کے عالمی چیمپئن سری لنکا کے نظارے جو ایک زمانے میں پاکستانی فلم سازوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس سفر کی روداد جس میں خان صاحب اور بٹ صاحب بھی اپنی دلچسپ باتوں اور حرکتوں کے ساتھ موجود تھے۔

ماہنامہ سرگزشت کا تازہ شمارہ آج ہی خریدیے

وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی "کوئی خط ہے میرے نام کا؟"
"ہاں سنبل! کہہ تو رہا ہوں کہ ہے۔"
وہ اپنی جگہ جامد ہو گئی تھی۔ ایک لرزش سی سر تا پا اس کے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ اعجاز نے ڈھیر ساری رجسٹریوں' پارسلوں اور خطوں میں سے ایک خط علیحدہ کیا اور سنبل کی طرف بڑھا دیا۔ ایک لمحہ ٹھٹک کر اس نے خط تھام لیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ حیرت اور خوشی یوں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا۔
اعجاز اسے وہیں کھڑے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

○☆○

اماں فاطمہ اور چاچا گلریز بہت پوچھتے رہے لیکن اعجاز نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کئی ہفتوں تک وہ کچھ نہیں کھا سکے گا۔ سرِ شام ہی وہ اپنے کوارٹر میں سونے کے لیے چلا گیا۔ جو مختصر خط اس نے سنبل کے نام لکھا تھا' اس کی نقل اس کے پاس موجود تھی۔ اس نے گھٹنوں تک لحاف کھینچا' لالٹین کی لو ذرا اونچی کی اور خط پڑھنے لگا۔
"یاد نہیں سنبل! میں نے سب سے پہلے تمہیں کب اور کہاں دیکھا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اور جہاں بھی دیکھا تھا' میں پہلی نظر میں ہی تم سے پیار کرنے لگا تھا۔ پہلے پہل اس پیار کا خود مجھے بھی علم نہیں تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پیار کا جادو میرے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ میں نے بے شمار راتیں تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے گزاری ہیں سنبل۔ میرے بے شمار دن صرف اور صرف تمہارے خیالوں سے عبارت رہے ہیں۔ میرا دل ایک پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا مگر تم جانتی ہو جب پتھر پر لکیر پڑتی ہے تو وہ بڑی پائیدار ہوتی ہے۔ سنبل! تمہارے حسن نے میرے دل پر بھی ایک بہت گہری لکیر کھینچ دی ہے۔ ایک بہت گہرا نقش بنا دیا ہے۔ میرے لفظوں کو صرف لفظ مت سمجھنا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر زندہ رہنا میرے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں' میں تمہارے مرتبے کا نہیں۔ میں ایک معمولی ملازم ہوں اور تم ملک خداداد کی بیٹی ہو۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میری اس جسارت کا نتیجہ میری موت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے' لیکن میں نے سب اندیشے بالائے طاق رکھے ہیں اور اپنے دل کی بات تم تک پہنچا دی ہے۔ اب اس کا نتیجہ جو بھی نکلے گا' مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو مجھے مایوس مت کرنا۔ میں آج دن بھر جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھتا رہا ہوں کہ رات کے اندھیرے میں تم بے حد و بحبت کی ڈور سے باندھا ہے اور اپنے آپ کو "خود" ہی کھینچ کر میری طرف لا رہی ہو۔ تمہارے ہاتھ میرے کوارٹر کے بوسیدہ دروازے پر دستک دے رہے ہیں۔ محبت کی دستک۔ جس کے لیے میرے کان برسوں سے ترس رہے ہیں۔
تمہارا مختصر
آج بھی۔ کل بھی اور زندگی کے آخری سانس تک
اعجاز احمر"
خط پڑھنے کے بعد اس نے تہ کر کے تکیے کے نیچے رکھا۔ سردی آج معمول سے زیادہ تھی۔ اس نے لحاف سینے تک کھینچا اور لالٹین کی لو مدھم کر دی۔ وہ سوچنے لگا' کہیں اس نے خط میں کسی جگہ مبالغے سے تو کام نہیں لیا۔ کیا واقعی وہ شروع ہی میں سنبل سے محبت کرنے لگا تھا۔ ایک ایسی محبت جس کا اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ وہ بظاہر سنبل کے اندر ایک کہانی تلاش کرتا رہا اور لاشعوری طور پر خود ایک کہانی کا کردار بنتا رہا؟ اس سوال کا جواب ہاں میں تھا۔ اس نے خط میں کہیں بھی مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔
لحاف کی حرارت اسے خوشگوار محسوس ہوئی۔ وہ فطرتاً ایک دلیر شخص تھا ورنہ ایسی صورتِ حال میں یوں ٹانگیں پسار کر بستر پر دراز نہ ہو جاتا۔ اس نے اپنے دل کی بات کاغذ پر منتقل کر دی تھی' اب وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ نجانے کیوں اسے یقین تھا کہ آج رات کمرے کے دروازے پر دستک ضرور ہو گی' لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ یہ دستک کس قسم کی ہو گی۔ یہ دستک دو طرح کی ہو سکتی تھی۔ بہت مدھم' نازک نازک سرگوشیاں کرتی ہوئی جن میں چوڑیوں کی چھن چھن ساز کی طرح ابھر رہی ہو۔ یا بہت بلند' کرخت اور بے رحم دستک۔
پہلی دستک کا تعلق سنبل سے تھا اور دوسری کا ملک خداداد اور اس کے بیٹوں سے۔ یقینی بات تھی کہ دونوں دستکوں کے بعد پیش آنے والے حالات بھی یکسر مختلف ہوں گے۔
وہ ان دونوں دستکوں کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے انجام کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اس کے کان معمولی سے معمولی آہٹ بھی لے رہے تھے۔ نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے اسے اونگھ سی آنے لگی۔ ذہن بس دو دستکوں کے درمیان بھٹکا ہوا تھا' چوڑیاں چھن چھن بجاتی ہوئی دستک یا گرجتی ہوئی اور غراتی ہوئی دستک۔ اس کی زندگی انہی دو دستکوں کے درمیان معلق ہو چکی تھی۔

وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ اعجاز اونگھ رہا تھا۔ اچانک اس کے قیافے درست ثابت ہوگئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا' بلکہ اچھل پڑا۔ یہ ایک بڑی زوردار دستک تھی' غراتی اور دہاڑتی ہوئی۔ کمرے کی دیواروں کو ہلاتی ہوئی۔ چند لمحے کے لیے اعجاز کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور بے جان لیکن بنے تلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے چاچا گلریز خاں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ دیکھ کیا ہوا ہے؟"

اعجاز نے حیرت سے گنگ ہو کر دیکھا۔ کوارٹر سے باہر سائبان تلے کوئی پہلو کے بل گرا ہوا تھا۔ یہ سنبل تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں' ہاتھ اینٹھے ہوئے تھے اور وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اعجاز کی سائیکل بھی گری ہوئی تھی۔

چاچا گلریز بولا "چلو' اس کو اٹھاؤ' اندر لے چلو۔"

دونوں سنبل کو سنبھال کر اندر لے آئے۔ چاچا گلریز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "یہ کیا معاملہ ہے؟"

"مم۔۔۔ میں ابھی بتاتا ہوں چاچا۔۔۔ تم۔۔۔ پانی لے کر آؤ۔"

چاچا پانی لے کر آیا اور سنبل کے چہرے پر چھینٹے دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ بول رہا تھا "غضب خدا کا۔ وہ تو سائیکل گرنے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی ورنہ یہ تو باہر ہی پڑی پڑی اکڑ جاتی۔ مگر یہ یہاں آئی کیسے؟ کہیں۔۔۔ کہیں تم نے تو کوئی چکر نہیں چلا دیا اس کے ساتھ۔"

"نہیں ایسی بات نہیں چاچا۔" پھر اس نے تیزی سے بات بدلی "تم جاؤ بازار۔۔۔ ابھی کپاؤنڈر شکر الٰہی کی دکان بند نہیں ہوئی ہوگی۔ اس سے "کورامین" لے آؤ۔ لیکن بتانا کچھ نہیں۔"

چاچا گلریز گھبرایا ہوا باہر نکل گیا۔ اعجاز نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ سنبل دھیرے دھیرے اپنے حواس میں آرہی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی پلکوں کی جنبش واضح محسوس کی جاسکتی تھی۔ اعجاز اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے آہستگی سے پکار بھی رہا تھا "سنبل۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔ سنبل۔"

پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ وہ اسے پیار کرنے لگا۔ اسے اپنی بانہوں کی گرمی پہنچانے لگا۔ وہ جاگ گئی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔ اعجاز کی سانسیں اس کے حسین چہرے سے چھو رہی تھیں۔ پھر اس کے نازک بازو حرکت میں آئے اور اعجاز کی گردن کے گرد حمائل ہوگئے۔ اعجاز کو محسوس ہوا کہ وہ اس کے سینے میں سماتی چلی جارہی ہے۔

○☆○

ملک خداداد بہت عرصہ پہلے ہی بیٹی سے ہار چکا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کبھی اس کے ہاتھ پیلے نہیں کرسکے گا۔ وہ ایک بیمار روح کی طرح ہمیشہ اس کے گھر میں بھٹکتی رہے گی۔ لہٰذا جب اسے اپنی بیوی کی زبانی معلوم ہوا کہ سنبل شادی کے لیے مان گئی ہے تو وہ خوشی سے پھٹنے لگا۔ اس کی شادمانی کا یہ عالم تھا کہ اس شادمانی میں باقی ساری الجھنیں اور پریشانیاں دب کر رہ گئیں۔ بے شک اعجاز اس سے پہلے ایک بیوی کو چھوڑ چکا تھا۔ بے شک وہ ایک معمولی ملازم تھا' بے شک وہ ان کی برادری کا نہیں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ملک خداداد نے نظرانداز کردیا۔ صرف ایک بات اس نے یاد رکھی۔ اس کی لاڈلی بیٹی اپنی جوانی بیتنے سے پہلے پہلے اپنے گھر کی ہو رہی تھی۔

پھر ایک روز اس قصبے کی گلیوں میں شہنائی کی گونج ابھری۔ یہ شہنائی سن کر چڑے کے اداس درخت جھومے' دریا کا پانی بلیوں اچھلا' جھرنے گنگنائے اور ہر منظر نشے میں ڈوب گیا۔ اس رات جب اعجاز اپنے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ پھولوں سے سجے ہوئے بستر پر خوب رو سنبل بے سدھ پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اعجاز کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اسے لگا کہ سنبل پر پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ تاہم اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی اور اس آواز پر اسے کامل یقین تھا کہ سنبل پر اب کبھی بیماری کا حملہ نہیں ہوگا اور نہ اس کی ذہنی رو بھٹکے گی۔ اس نے سنبل کی بیماری کی جڑ ڈھونڈ لی تھی اور بڑی جرأت سے اسے کاٹ ڈالا تھا۔

اس نے بڑے یقین کے ساتھ سنبل کو آواز دی "سنبل۔" وہ کسمسائی ضرور لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اعجاز نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی "سنو۔"

"ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

"آج ایک اور خط آیا ہے تمہارے نام۔"

"کہاں ہے؟" وہ مسکرائی لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

"بہت پاس ہے۔"

پھر وہ واقعی اس کے بہت پاس چلا گیا۔

امارت اور غربت کی روایتی داستان کے روایتی انجام کا عکس

بھوکی پیاسی مامتا

طاہر جاوید مغل

اُس عورت کی کتنا اچھے صفائی زندگی کی طرح عزیز تھی..... اور صفائی اس کے لیے صرف تھی۔ اس کے بعد میں سوائے مامتا کے کچھ نہ تھا



بچے بوسیدہ کمرے کی چھت اب کسی جگہ سے ٹپکنے لگی تھی۔ شہناز اور اس کے دونوں بچے کمرے کے ایک کونے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ دونوں بچے جڑواں تھے۔ ان کی عمریں ایک سال کے لگ بھگ تھیں۔ شہناز کی طرح بچے بھی خوب صورت تھے لیکن فاقہ کشی نے انہیں کملا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت بھی دونوں ربی ربی کرتے بچے ماں سے چپٹے ہوئے تھے اور وہ رزق حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو وہاں نہیں تھا۔ ۲۸ گھنٹے سے ماں کے منہ میں اناج کا دانہ اڈکر نہیں گیا تھا۔ بچوں کو دودھ کہاں سے ملتا۔ وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر ماں کے سینے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہاں ان کے ناخنوں سے تراوی خراشیں تھیں اور نیلگوں داغ تھے۔ ماں یہ ساری اذیت برداشت کر رہی تھی۔ وہ اس سے سوگنا زیادہ اذیت برداشت کرنے کو بھی تیار تھی لیکن اس اذیت کے بدلے اس کے بچوں کو تو کچھ ملتا۔ وہ ان کے خشک لب اور تر آنکھیں دیکھ دیکھ کر پچھلے دو دن میں بیسیوں مرتبہ مری تھی اور زندہ ہوئی تھی۔ آخر وہ مجبور ہو کر اٹھی اور ایک بار پھر اس کھڑکی کے سامنے آ بیٹھی جہاں سے حویلی کی پچھلی دیوار نظر آ رہی تھی۔

شہناز قریباً اڑھائی سال پہلے بیاہ کر اس خستہ حال گاؤں میں آئی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ شہناز سے بڑا ایک بھائی تھا۔ وہ چار پانچ سال پہلے گھر سے گیا تھا اور واپس نہیں لوٹا تھا۔ شہناز کی

شادی اس کے ایک بچانے کی تھی۔ شادی کیا تھی بس ایک سستے بارے نڈھال تھیں کی طرح جہاں جگہ مل گئی وہاں سر کی تھڑی اتار کر رکھ دی تھی۔ شہناز کا شوہر لیاقت چاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی کھیتی کے اندر خون پسینہ گرا کر بمشکل دو وقت کی روٹی پیدا کرتا تھا اور پچھلے سات آٹھ ماہ سے تو اس دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔ لیاقت کی ماں یہ جانتے ہوئے بھی کہ غریب کو ادھار نہیں ہونا چاہیے بلکہ براہ راست مرنا چاہیے بیمار ہوئی تھی اور مرتے مرتے لیاقت کو پانچ سو روپے کا مقروض کر گئی تھی۔ لیاقت، شہناز اور ان کے دو معصوم بچوں کے لیے یہ قرض ایک پہاڑ کی طرح تھا۔ اس پہاڑ کے بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ دن رات اپنا پیٹ کاٹتے رہتے تھے۔ یکے بعد دیگرے جن میں سات آٹھ روز پہلے سیلاب کی آفت نے اس بستی کو آلیا تھا۔ کوہاٹ سے تھوڑا آگے شمال کی طرف یہ بستی ایک چاڑی کے دامن میں واقع تھی۔ کوئی ایک سو کے قریب گھر تھے۔ یہ سب کے سب مظلوک الحال لوگ تھے۔ اگر کوئی شخص یہاں صحیح معنوں میں خوش حال تھا تو وہ بستی کا مالک تھا۔ اس کا نام خان عارف تھا۔ خان عارف کی قابل کاشت زمین ذرا بلندی پر واقع تھی اور زرخیز بھی تھی۔ اس کے برعکس بستی والوں کی زمینیں نشیب میں تھیں اور یہاں کاشت کاروں کو سخت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ سال دو سال بعد یہ نشیبی زمینیں سیلاب کی زد میں تباہ ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کاشتکاری سے مایوس ہو کر بہت سے لوگ بڑے شہروں کا رخ کر چکے تھے۔ کوئی لاہور میں پوٹ پالش کرتا تھا، کوئی راولپنڈی میں چنے بیچتا تھا، کوئی فیصل آباد میں کندھے پر تالیں اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ سب لوگ اپنوں سے دور رہنے پر مجبور تھے اور مہینوں ان کی صورت دیکھنے کو ترستے تھے۔ اس مرتبہ بستی والوں کی فصل قدرے اچھی ہوئی تھی اور وہ آنے والے دنوں سے پُرامید تھے لیکن اس مرتبہ ان کے ازلی دشمن برساتی نالے نے اچھل کر ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیرا تھا۔ ایک رات نالے کا خاکستری بند ٹوٹا تھا اور غضب ناک انداز میں اچھلتا کودتا اور پھنکارتا ہوا سیلابی پانی ان کے ملاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ کھیتیاں برباد ہو گئی تھیں اور کئی گھروں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ شہناز، لیاقت اور ان کے دونوں بچے بھی اس تخت سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ ان کے چھوٹے سے گھر کی دو بیرونی دیوار گر گئی تھی۔ جو صرف دو ماہ پہلے شہناز اور لیاقت نے بڑی محنت کے ساتھ تیار کی تھی اور جس کی تیاری کے دوران میں گرمی لگنے سے "مکول" شہناز کئی دن بیمار رہی تھی۔ دیوار گر جانے کے بعد سیلابی پانی آزادانہ ان کے گھر میں بھر گیا تھا۔ دیگر نقصانات کے علاوہ دس پندرہ دن کا وہ راشن بھی برباد ہو گیا تھا جو لیاقت نے خان عارف کی حویلی میں مزدوری کر کے جمع کیا تھا اور جس کے بدلے میں لیاقت کی ٹانگ پر سخت چوٹ بھی آئی تھی۔ یہ پچھلے مہینے کی بات تھی۔ فصل پکنے میں چونکہ ابھی کچھ دیر تھی اور لیاقت کے گھر میں راشن بالکل ختم ہو چکا تھا لہٰذا لیاقت نے سوچا تھا کہ چند دن مزدوری کر لی جائے۔ خان عارف کی حویلی میں دو نئے کمرے تعمیر کیے جا رہے تھے۔ لیاقت بھی وہاں چھڑا ہونے کا کام کرنے لگا تھا۔ اس نے پہلے کبھی ایسا کام نہیں کیا تھا لیکن وہ سخت کہ تیسرے چوتھے روز ہی اسے حادثہ پیش آ گیا تھا۔ وہ اینٹ سے بھری ہوئی ایک کڑاہی لے کر پانس کی سیڑھی پر چڑھا تھا کہ پاؤں پھسلا تھا اور وہ دھڑام سے نیچے جھریلی زمین پر جا گرا تھا۔ اس کے ٹخنے اور کولہے پر سخت چوٹ آئی تھی اور اسے چارپائی پر ڈال کر گھر پہنچایا گیا تھا۔ بستی کے حکیم نے بتایا تھا کہ ہڈی ٹوٹنے سے تو بچ گئی ہے لیکن اس میں بال آ گیا ہے اور لیاقت کو دو تین ماہ مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ چونکہ چوٹ خان عارف کے کام کے دوران میں لگی تھی لہٰذا خان عارف نے چار دن کی مزدوری کے علاوہ دوا دارو کے لیے بھی سو روپے دیے تھے۔ خان عارف جیسا بھی تھا بہرحال اپنے ملازموں اور کارندوں کا خیال ضرور رکھتا تھا۔ بستی والوں کو بھی اس سے کوئی خاص شکایت نہیں تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ اس کے ممنون بھی ہو جاتے تھے۔ وہ ان کے جھگڑے نمٹاتا تھا، کبھی کسی کی تھوڑی بہت مالی مدد بھی کر دیتا تھا۔ اگر کسی کو پولیس اور تھانے کچہری کا چکر پڑتا تھا تو اس کی رہنمائی بھی کر دیتا تھا۔ لیکن چونکہ یہ ایک مظلوک الحال بستی تھی لہٰذا یہاں کے لوگ جینے بولنے کم اور لڑنے جھگڑنے زیادہ تھے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے سے ناراض نظر آتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود سے بھی ناراض دکھائی دینے لگتے تھے۔

مزدوری اور مرہم پٹی کی رقم ملا کر کل چار سو روپے بنے تھے۔ ان میں سے دو سو روپے کا لیاقت نے قرض چکا دیا اور باقی دو سو روپے سے ایک ماہ کا راشن خرید لیا۔ اسے قوی امید تھی کہ یہ راشن ختم ہونے تک مکئی کی فصل پک جائے گی اور گھر کی گاڑی پھر سے چلنے لگے گی۔ لیکن اوپر والے کے کام اوپر والا ہی جانتا ہے۔ بدھ کی رات سیلابی پانی کے ریلے نے سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا۔ راشن برباد ہو گیا تھا اور بستی کے بیشتر گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ لیاقت کے گھر میں تو اناج کا دانہ تک نہیں بچا تھا۔ تین چار روز تو انہوں نے ادھر ادھر سے مانگ کر گزارہ کیا تھا لیکن پھر یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ بستی میں قحط کی سی کیفیت تھی اور ایسے حالات میں کوئی کب تک دوستی اور تعلق داری نبھا سکتا ہے۔ خاص طور سے اس صورت حال میں کہ لیاقت کی ٹانگ بھی زخمی تھی اور امید نہیں تھی کہ وہ اگلے تین چار ماہ میں کسی کام سے لگ سکے گا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا اور چند قدم چلنے کے بعد ہی درد سے بے تاب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر ایک شام لیاقت اور شہناز کی ناقص کٹھی مٹھنا پر بچ گئی تھی۔ بچے رو رو کر اور ماں کی منگ چھاتیاں نوچ نوچ کر نڈھال ہو گئے تھے اور ان کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھ کر لیاقت اور

شہناز کا دل ہولنے لگا تھا "میں کیا کروں لیاقت..... میں کیا کروں؟" شہناز روہانسی ہو کر بولی تھی۔

اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔ پھر یہ آنسو اس کے مرجھائے ہوئے زرد رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ لیاقت یہ آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے اپنی جیسا کبھی سنبھالی تھی اور خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ اس پوٹلی میں سے اس نے روٹی کے ٹکڑے کچھ کٹورے اور تھوڑا سا سالن نکالا تھا۔ یہ اشیاء وہ خان عارف کی حویلی سے لے کر آیا تھا۔ روٹی اور سالن کے علاوہ پوٹلی میں ذھائی تین سیر چاول بھی تھے۔ چاول دیکھ کر شہناز کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اگر احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو یہ راشن ان کے لیے دس بارہ دن تک کافی تھا۔ لیاقت بھی بہت خوش نظر آتا تھا۔ جہاں فاقوں کے سبب جان لبوں پر آئی ہوئی ہو وہاں یہ احساس بھی بہت فرحت بخش ہوتا ہے کہ اب چند دن تک بھوک کے خوف سے نجات مل گئی ہے۔ رات کو انہوں نے حویلی کی بچی کچی روٹی کھائی تھی۔ بچوں کے پیٹ میں بھی دودھ اور روٹی کی شکل میں کچھ نہ کچھ چلا گیا تھا۔ دو تین دن بعد شہناز قدرے سکون سے بستر پر لیٹی تھی۔ بھوک کا غبار حواس پر سے چھٹ جائے تو ذہن پھر سے کام کرنے لگتا ہے۔ شہناز بھی رات کو دیر تک سوچ بچار میں مصروف رہی تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ خان عارف نے اتنی فراخ دلی سے لیاقت کو چاول کیوں دے دیے ہیں؟ ان حالات میں اناج کا ایک ایک دانہ قیمتی تھا۔ شہناز کو امید نہیں تھی کہ لیاقت حویلی سے سیر بھر آٹا بھی لا سکے گا۔ کہاں یہ کہ وہ تین سیر باسمتی چاول لے آیا تھا۔ پھر اچانک ہی شہناز کے ذہن میں ایک بات آئی تھی اور اس کا سارا اطمینان سخت تشویش میں بدل گیا تھا۔ اسے دو ذھائی ماہ پہلے کی ایک بات یاد آگئی تھی۔ خان عارف کی بیوی ان دنوں امید سے تھی۔ شہناز ایک روز چھاچھ لینے کے لیے حویلی گئی تھی تو خان عارف کی بیوی خانم نے اسے پاس بٹھالیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ذرا اس کی ٹانگیں دبا دے۔ شہناز نے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اس روز اسے بالٹی بھر کر چھاچھ ملی تھی اور اس میں مکھن کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی تیر رہا تھا۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے روز شہناز حویلی جا کر خان عارف کی بیوی کی ٹانگیں بھرنے لگی تھی۔ ایک روز وہ ٹانگیں بھر کر اندر کے کمرے سے باہر نکل رہی تھی کہ ایک ہرکارے کے پیچھے سے اچانک خان عارف کا بیٹا خان خرم برآمد ہوا تھا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے شہناز کی کمر میں اتنی زور سے چٹکی بھری تھی کہ وہ کراہ کر رہ گئی تھی۔ خان خرم اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، لمبے بال اور آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ۔ دیکھتا تھا تو ایسے لگتا تھا کہ نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا۔ اب وہ خیر سے شادی شدہ تھا اور بچے کا باپ بھی بننے والا تھا لیکن... کرتوت وہی رہے تھے۔ اس دن کے بعد شہناز حویلی میں چھاچھ لینے گئی تھی اور نہ اس نے خان عارف کی بہو کی ٹانگیں دبائی تھیں۔ آج دو ذھائی ماہ بعد اس ابر آلود رات کی تاریکی میں وہ ساری باتیں پھر شہناز کے ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں۔ اسے شبہ گزر رہا تھا کہ لیاقت حویلی سے جو چاول لے کر آیا ہے وہ خان خرم نے دیے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ لیاقت کو بلا کر اپنے شبے کی تصدیق کرے لیکن لیاقت کئی راتوں کے بعد آج اطمینان کی نیند سویا تھا۔ شہناز کو ہمت نہیں ہوئی کہ اسے خواہ مخواہ بے اطمینان کرے۔

بہرحال علی الصباح وہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوال کو دبا نہیں سکی تھی۔ اس نے لیاقت سے پوچھا اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ چاول اسے چھوٹے خان یعنی خان خرم نے ہی دیے تھے اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہو سکے تو وہ کل شہناز کو تھوڑی دیر کے لیے حویلی بھیج دے۔ اس کی بیوی کو بچہ ہوا ہے اور جو عورت اس کی ٹہل سیوا کرتی تھی وہ اپنے بچے سے ملنے شہر گئی ہوئی ہے۔ یہ باتیں سن کر شہناز کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے کے اس گوشے کی طرف بڑھی تھی جہاں چاولوں والی پوٹلی رکھی تھی۔ اس نے یہ پوٹلی لیاقت کو تھمائی تھی اور کہا تھا کہ وہ فوراً سے پہلے یہ چاول واپس کر آئے۔ لیاقت نے بہت پوچھا تھا کہ بات کیا ہے لیکن شہناز نے کچھ بتا کر نہیں دیا تھا۔ بہرحال لیاقت ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم شخص تھا۔ شہناز کے کچھ "نہ بتانے" نے ہی اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بات کی تہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاک ہومیو پیتھک کلینک

ڈاکٹر آصفہ شاکر — ڈاکٹر زرگس کنول

اوقات کار، شام ۵ بجے تا ۸ بجے

تعطیل جمعرات

شکل پرسیڈی کے علاقائی علاج کیا جاتا ہے

فلاحی ہسپتال میں مفت دوائیں دیتے ہیں

9/1 سفاری ویو اپارٹمنٹ بلاک 7

گلشن اقبال۔ کراچی

نزد مین گیٹ سفاری پارک

معلومات کے لیے 4966698

تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے خاموشی سے چاروں کی پوٹلی اٹھائی تھی اور چاروں حویلی والوں کو واپس کر آیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے چہرے سے عجیب سی بے بسی اور لاچاری جھلک رہی تھی۔ وہی لاچاری جو غربت کا منظر ہے۔

وہ دن بھی پچھلے کئی دنوں کی طرح بھوک' پریشانی اور بچوں کی ریں ریں سے عبارت تھا۔ سہ پہر کے وقت لیاقت نے اپنی بیساکھی سنبھالی تھی اور کہیں جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" شہناز نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں ذرا لمبتی کا چکر کاٹوں گا" لیاقت نے مرے مرے لہجے میں کہا تھا۔

شہناز جانتی تھی وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اپنی کھیتی میں جائے گا۔ وہی کھیتی جہاں اب فصل کے بجائے امیدوں اور آرزوؤں کے لاشے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ منڈیر پر بیٹھ کر ان لاشوں کو دیکھتا رہے گا اور اپنے آپ میں گڑھتا رہے گا۔

لیاقت کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دونوں بچے' جو بڑی مشکل سے سوئے تھے' پھر جاگ اٹھے۔ کل رات کی طرح' صبح بھی تھوڑا بہت دودھ ان کے منہ میں گیا تھا لیکن اب پچھلے چھ سات گھنٹے سے وہ پھر بھوکے تھے۔ جاگنے کے بعد دھیرے دھیرے ان کے رونے میں شدت آتی گئی۔ وہ مچل رہے تھے' ٹانگیں چلا رہے تھے اور ماں سے فریاد کر رہے تھے کہ وہ ان کی ناقابل برداشت بھوک کا علاج کرے۔ شہناز انہیں بہت دیر پچکارتی رہی' پھر روہانسی ہو گئی۔ اس نے ایک بچے کو پیٹ والا اور دوسرے کو دھکیل کر دور پھینک دیا۔ وہ دونوں سہم کر ایک دم چپ ہو گئے۔ ان کی پھولی پھولی آنکھوں میں "ضد" کی جگہ خوف نے لے لی۔ شہناز کو بچوں کے رونے نے اتنا نہیں تڑپایا تھا جتنا ان کی خاموشی نے تڑپایا۔ وہ اٹھی اور لپک کر دونوں بچوں کو سینے سے چمٹا لیا۔ وہ ان کے سر چومتی جاتی تھی اور زار و قطار روتی جاتی تھی۔ باہر بادل بھی کھل کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ جس بچے کو مار پڑی تھی اس کا نام طارق تھا' وہ دلدوز ہچکیاں لے رہا تھا۔ وہ اسے گلے سے لگا کر بولی "نہ روتا رے! مجھے معاف کر دے۔ چپ کر جا۔۔۔ خدا کے لیے چپ کر جا' میرا دل پھٹ جائے گا۔"

وہ بڑی دیر اسے پچکارتی رہی۔ پھر نا چار اس نے دونوں بچوں کو ایک بار پھر چمٹا لیا۔ بچے بے قراری کے ساتھ منہ کھول کر اپنی ماں سے پیوست ہو گئے۔ بد وضع۔۔۔ ناکافی۔۔۔ اور جھنجلاہٹ کا پھر وہی مایوس کن کھیل شروع ہو گیا۔ صبح تھوڑا بہت دودھ اترا تھا' اب پھر بچے ایک خشک صحرا میں بھٹک رہے تھے۔ جب کھینچا تانی کی اذیت شہناز کی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ بچوں کو خود سے جدا کر کے اٹھی اور ایک بار پھر اسی کھڑکی کے سامنے جا بیٹھی جہاں سے خان عارف کی حویلی کی پچھلی دیوار نظر آ رہی تھی اور دیوار کے ساتھ لگا ہوا ایک بڑا سا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھی بیٹھی شہناز اپنے خیالات سے چونک گئی۔ ہاں یہی ڈھیر تھا جسے شہناز پچھلے دو دن میں کئی بار دیکھ چکی تھی۔ یہ کچرے کا ڈھیر تھا' اس ڈھیر میں بہت کچھ تھا۔ حویلی کے کچن اور برآمدوں سے جمع ہونے والا کوڑا' پھلوں کے چھلکے' کپڑے کی کترن' باسی سالن' بچا کھچا چارا' گوبر' پرال' اور بہت سی دیگر اشیا۔ کھڑکی سے اس ڈھیر کا فاصلہ بیس تیس گز سے زائد نہیں تھا۔ شہناز کو ایک ایک شے صاف نظر آ رہی تھی۔ کل سے کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ کچرے کے اس ڈھیر تک پہنچے اور وہاں سے کیلے کے ادھ کھائے گلے یا آم کی گٹھلیاں وغیرہ اٹھا لائے۔ یہ خوراک جیسی بھی تھی بہرحال اس کے جاں بلب بچوں کے جسم میں نئی زندگی دوڑا سکتی تھی۔ لیکن اس میں خطرات بھی تھے۔ سب سے پہلا خطرہ تو یہی تھا کہ کوئی اسے کچرے کے ڈھیر سے چیزیں اٹھاتے ہوئے دیکھ لے گا۔ دوسرا اور بڑا خطرہ یہ تھا کہ کچرے میں پڑی کھانے کی اشیا جراثیم زدہ تھیں۔ ان پر کہاں پھپھوند اتر جانے کیا کیا کچھ جھنجھنا رہا تھا۔ اس کے بچے بیمار ہو سکتے تھے۔ پھر بھی وہ سوچتی بچے اس طرح بھی تو مر رہے ہیں۔ بھوک سے بلبلا رہے ہیں' سسک رہے ہیں۔ ان حالات میں وہ انہیں کچرا کھانے کا خطرہ مول لے سکتی ہے۔

آہ۔۔۔ حالات نے اسے کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ یہ بے سر شب و روز کی مجبوریاں تھیں جو وہ اس انداز سے سوچ رہی تھی۔ ورنہ وہ تو اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق بھرپور کوشش کرتی تھی کہ بچوں کو بہتر اور صاف خوراک ملے۔ پانی ابال کر پلاتی تھی۔ بچوں کے استعمال کے برتن بالخصوص کئی کئی بار دھوتی تھی' کھانے پر کبھی بیٹھ جاتی تھی تو اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ بچوں کو کھلائے' بے حد صفائی پسند تھی وہ۔ اب وہی شہناز کچرے کے ڈھیر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور اس میں پڑی آم کی گٹھلیوں' کیلے کے چھلکوں اور باسی ٹکڑوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بچوں کی فریاد اس کے کانوں میں مسلسل زہر گھول رہی تھی اور کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہوئی کہ یہ بات پہلے اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ کچرے کی اشیا بچوں کو نہیں کھلا سکتی تھی لیکن خود تو کھا سکتی تھی۔ یہ اشیا کھانے کے نتیجے میں اس کے ناتواں جسم کو توانائی مل سکتی تھی' اس کی خشک چھاتیوں میں دودھ اتر سکتا تھا۔ وہ دودھ جسے قدرت نے اس کے بچوں کی زندگی کا وسیلہ بنایا تھا۔ وہ اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لیے سب کچھ کر سکتی تھی' ہر مشکل امتحان سے گزرنے کے لیے تیار تھی۔

"کچرا" کھانے کا خیال ذہن میں آتے ہی شہناز کی بجھی بجھی ویران آنکھوں میں روشنی نمودار ہو گئی۔ اس نے اپنے روتے بلکتے بچوں کو سینے سے لگایا اور انہیں پچکارتے ہوئے بولی "ماں صدقے' چپ کر جاؤ۔ میں تمہیں دودھ پلاؤں گی۔۔۔ میں تمہیں دودھ پلاؤں

گی۔۔۔ بس تھوڑی دیر صبر کرلو۔۔۔ میرے لال چپ کر جاؤ۔"

وہ انہیں لے کر آگے پیچھے جھولنے لگی اور اپنی نحیف و لاغر آواز میں بچوں کو ایک مقامی لوری سنانے لگی۔ اس لوری میں اناج سے بھرے ہوئے کھیتوں کا ذکر تھا۔ سونا اگلتی زمین کا ذکر تھا۔ اس بستی کا ذکر تھا جس میں کوئی بہت زیادہ غریب تھا اور نہ کوئی بہت زیادہ امیر۔ سب خوش حال تھے اور خوش تھے۔ شاداب چہروں والی ماؤں اناج صاف کرکے اس کے ڈھیر لگاتی تھیں اور ان کے قریب جیسے سرخ رخساروں والے بچے اٹکھیلیاں کرتے تھے۔

معلوم نہیں یہ لوری کا اثر تھا یا برابر بڑھتی ہوئی خباثت تھی کہ معصوم جانیں ماں کے شانوں سے لگی لگی اونگھنے لگیں۔ بس کسی وقت ان کے ننھے منے سینے ہچکی سے دل جاتے تھے۔ پھر یہ ہچکیاں بھی ماند پڑ گئیں۔ وہ بچہ دم کے لیے بھوک کے بادل سے نکل کر سو گئے۔ شہناز نے انہیں بڑی آہستگی سے چٹائی پر لٹا دیا۔ ان کے مدقوق چہرے اور خشک ہونٹ دیکھ کر اس کا کلیجا شق ہو رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ لیاقت بھی نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ شاید بارش کی وجہ سے کہیں رک گیا تھا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن بادلوں کی وجہ سے تاریکی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ شہناز کی خواہش تھی کہ یہ تاریکی جلد از جلد گہرے اندھیرے میں بدل جائے۔ اسے دس پندرہ منٹ مزید انتظار کرنا پڑا۔ آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر شہناز نے اپنے خوابیدہ بچوں کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑکی پوری کھولی اور اس کی چوکھٹ پر سے گزر کر دوسری طرف اتر گئی۔ رم جھم برستے مینہ نے اس کے نیم گیلے کپڑوں کو شرابور کر دیا۔ وہ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی کچرے کے ڈھیر کی طرف بڑھی۔ وہ ڈھلوان پر بڑھ رہی تھی لہٰذا کئی جگہ اسے چوپائے کی طرح ہاتھوں اور پاؤں کے بل چلنا پڑا۔ آخر وہ حویلی کی بلند دیوار کے سائے میں پہنچ گئی۔ حویلی۔۔۔ جس کے مکین بستی پر ٹوٹنے والی آفت سے لاتعلق اپنے حال میں مگن تھے۔ ان کی چمنیوں بارش سے محفوظ تھیں۔ ان کے چولہے چوبیس گھنٹے روشن رہتے اور ان کے گھر کے بچھواڑے کچرے کے ڈھیر میں صبح و شام پھلوں کے چھلکے اور سالنوں کے ٹکڑے پھینکے جاتے تھے۔ وہ کچرے کے اس ڈھیر میں ٹٹولنے لگی۔ اس کا دل منتشار تھا لیکن اسے وہ سب کچھ کرنا تھا جو کرنے کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے آم کی ایک گٹھلی اٹھائی۔ سینے سے اچھلنے والی ابکائی اس نے بمشکل روکی۔ پھر آنکھیں بند کیں اور جلدی جلدی گٹھلی کو چوسنے لگی۔ گٹھلی چوسنے کے ساتھ ساتھ وہ ابکائیاں بھی لیتی رہی تھی۔ اگلے چند منٹ میں اس نے بہت سا کچرا اپنے حلق سے اتار لیا۔ اس میں بیسیوں مارے گئے تھے، کیلے کے گلے سڑے ٹکڑے تھے۔ تربوز کے چھلکوں کے ساتھ لگا رہ جانے والا گودا تھا اور بارش سے گلی ہوئی روٹی تھی جس میں گوبر کی بُو شامل ہو چکی تھی۔

یہ سب کچھ حلق میں ٹھونس کر وہ لرزتی کانپتی اپنی جگہ سے اٹھی اور چوہوں کی طرح رائیں رائیں دیکھتی ہوئی واپس اپنے گھر میں آ گئی۔ لیاقت ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ بچے شدید خباثت کے زیر اثر گہری غنودگی میں تھے۔ شہناز نے کئی بار کلی کرنے کے بعد ایک گوشے میں منہ چھپایا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ رونے سے اس کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا لہٰذا جب تھوڑی دیر بعد لیاقت اپنے پانس کھینچتا واپس آیا تو اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ اس کے آنے سے پہلے شہناز نے کیا کیا ہے اور آزمائش کے کس مرحلے سے گزری ہے۔ لیاقت بھی بھوک اور خباثت سے نڈھال تھا۔ وہ اپنے ایک دوست مسیح خاں کی طرف گیا تھا لیکن وہ فاقہ کشی کے ڈر سے اپنے بیوی بچوں سمیت بستی چھوڑ کر جا چکا تھا۔ صرف اس کا بھائی گھر میں تھا لیکن اس کے سات بچے تھے۔ جو تھوڑا بہت راشن ان کے گھر میں تھا اس کا ایک ایک دانہ ضرورت کی زور سے بڑھا ہوا تھا۔ کوشش کے باوجود لیاقت کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھانے پینے کی کسی چیز کے لیے مسیح کے بھائی کے سامنے دست سوال پھیلاتا۔ لیاقت کی طرح مسیح کا بھائی بھی اپنی کھیتی باڑی ہو جانے سے بہت آزردہ تھا۔ بستی کے کچھ دوسرے لوگوں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ خان عارف اور اس کے بیٹوں نے اپنی ترائی والی زمین بچانے کے لیے باندھ کا حفاظتی بند توڑا ہے اور بستی کے غریب لوگوں کے کھیت غتربود کر دیے ہیں۔۔۔ بہرحال ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایسی باتیں پہلے بھی ہوتی رہی تھیں اور آئندہ بھی ہوتی رہتی تھیں۔۔۔ طاقتور کا نشانہ سر پر ہوتا ہے اور یہاں خان عارف سے طاقتور اور کون تھا۔ خان عارف جیسے لوگ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔

بارش میں بھیگنے اور دیر تک گھومنے پھرنے سے لیاقت کی خباثت عروج پر پہنچ گئی تھی۔ بہت دیر تک بھوک سے بے حال رہنے کے بعد اب تو اسے بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک بڑھ مروڑ اور نقاہت سی تھی جو جسم کے ہر ہر مسام میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بچوں کے قریب ہی لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ شہناز مسلسل جاگ رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ اس کے جسم کی توانائی اس کے بچوں کی غذا میں بدل جائے۔ اسے اپنے سینے میں اس رزق کی موجودگی کا احساس ہو جو قدرت نے اس کے بچوں کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ اضطراب کے عالم میں وہ بار بار اپنے سینے کو ٹٹولنے لگتی تھی۔ وہ قابل نفرت کچرا جو اس نے اپنی جان پر سو عذاب جھیل کر کھایا تھا، قریب صاف شفاف دودھ کی شکل میں ڈھلنے والا تھا۔ قریب وہ لمحے آنے والے تھے جب وہ اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اپنے بچوں کو جگا سکتی تھی، انہیں اپنے سینے سے لپٹا سکتی تھی۔ وہ لمحے کی زد

روشنی میں اپنے محوِ خواب بچوں کو دیکھتی رہی جو حالتِ غنودگی میں بھی شاید اپنی بھوک سے دست و گریباں تھے۔ وہ بالکل بے حرکت لیٹے تھے۔۔۔ کمزوری کے سبب ان کی آنکھیں آدھ کھلی تھیں۔ وہ بہت دھیمی سانسیں لے رہے تھے۔

شہناز اضطراب کے عالم میں اٹھ کر کمرے کے اندر ہی گھومنے لگی۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ اسے ہلکی ہلکی پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے گھڑے میں سے دو گلاس پانی پیا۔ ایک اپنی پیاس کے لیے' ایک اس دودھ کے لیے جو اس کے سینے میں اس کے بچوں کے لیے اترنے والا تھا۔ اچانک اس کو پہلو میں درد کی ٹیس محسوس ہوئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے پہلو پر پہنچ گیا۔ پھر چند لمحے بعد دوسری ٹیس اٹھی۔ یہ پہلی سے زیادہ شدید اور طویل تھی۔ شہناز کراہ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ ایک دم خشک ہو گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ درد سے تڑپنے لگی۔ اس کے معدے کو جیسے کوئی اپنے تیز نکیلے پنجوں سے کھود رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو ضبط کرتی رہی پھر اس کے ہونٹوں سے بے اختیار کراہیں نکلنے لگیں۔ اس کا شوہر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کچھ دیر تو خالی خالی نظروں سے شہناز کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ "کیا ہوا شہناز۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"بڑا سخت درد ہو رہا ہے" اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام رکھا تھا اور کیچڑ آلود فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"اوہ خدایا!" لیاقت کے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ "اب کیا کروں؟"

دس پندرہ منٹ کے اندر شہناز کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اس نے تین چار الٹیاں کیں۔ آخری الٹی میں خون کی آمیزش بھی تھی۔ بچے جاگ گئے تھے۔ وہ ماں باپ کی مصیبت سے بے خبر تھے اور ایک بار پھر پیٹ پر ہاتھ مار مار کر چیخ پکار کرنے لگے تھے۔ بچوں اور ان کی ماں کو روتا چیختا چھوڑ کر لیاقت برآمدے کی طرف لپکا۔ اپنی بیساکھی اٹھائی اور بارش میں نکل گیا۔ حکیم کے گھر تک کا فاصلہ اس نے نہ جانے کیسے طے کیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر نامرادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ حکیم صاحب خود شدید بیمار ہیں اور ان کا بیٹا شہر سے ان کے لیے ڈاکٹری دوا لینے گیا ہوا ہے۔

"یا اللہ! میں کیا کروں؟" لیاقت نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا۔

پھر اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ وہ بھی شہناز کو شہر کے بڑے اسپتال میں لے جائے۔ شاید وہاں جانے سے اس کی جان بچ جائے۔ لیکن شہناز کو لے جایا کیسے جائے؟ ایک ہی حل تھا۔ خان عارف اپنی چھوٹی کار یا ٹریکٹر ٹرالی دے دیتے۔ لیکن وہ کیا منہ لے کر حویلی جائے۔ آج صبح ہی تو وہ حویلی سے ملنے والے جواب واپس کر کے آیا ہے۔۔۔ کتنی کرختگی نظر آئی تھی خان خرم کے چہرے پر۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ کیا اب وہ اس کی بات سن لے گا۔ لیکن کچھ بھی تھا' اسے حویلی جانا تھا۔ اپنی شہناز کی جان بچانے کے لیے حویلی جانا تھا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بیساکھی کے سہارے گرتا پڑتا حویلی کے دروازے پر پہنچا۔ حویلی میں جس شخص کے ساتھ سب سے پہلے اس کا واسطہ پڑا وہ خان خرم ہی تھا۔ لیاقت کو دیکھ کر جوان سال خان خرم کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ لیاقت بے اختیار خان خرم کے پیروں میں گر گیا اور رو رو کر اپنی چاہت سنانے لگا۔ اس کا لہجہ بھیک مانگ رہا تھا اور سر خان خرم کے پاؤں پر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ خان خرم خاموشی سے سنتا رہا پھر وہ یہ آہستگی پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "نہیں بھئی نہیں۔ ہم تو پہلے ہی لٹے ہیں۔ جو کچھ بھی کریں گے' اپنا مطلب نکالنے کے لیے کریں گے۔۔۔ ہم باز آئے ایسی نیکی سے۔ تم ہمیں گناہ گار ہی رہنے دو۔"

اس کے بعد وہ بڑی لاتعلقی سے گھوما اور حویلی میں واپس چلا گیا۔ لیاقت کچھ دیر اپنی جگہ بیٹھا روتا رہا پھر اس نے بیساکھی تھامی اور واپس گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ شہناز بیمار کیسے ہو گئی ہے۔ بندے کو بدہضمی تو تب ہوتی ہے جب وہ بہت کچھ کھا لیتا ہے۔ شہناز کے پیٹ میں تو بھوک سے بل پڑے ہوئے تھے۔ پھر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ لیاقت کے ذہن میں اندیشوں کے دیو سر اٹھا رہے تھے۔ اسے گھر سے نکلے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔۔۔ معلوم نہیں اس کے بعد شہناز پر کیا بیتی تھی۔

ڈھلوان پر پھسلتا' گرتا پڑتا وہ اپنے کیچڑ زدہ گھر میں واپس پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک المناک منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔۔۔ شہناز تڑپ تڑپ کر جان دے چکی تھی۔ اس کے دونوں بچے اس کے خشک سینے پر منہ دھرے بیٹھے تھے اور ریں ریں رو رہے تھے۔ ایک بچہ بار بار "ماں" کہتا تھا اور اسے جگانے کے لیے اس کے بال کھینچنے لگتا تھا۔ مرنے سے پہلے شہناز نے ایک خونی الٹی کی تھی اور خود ہی اسے کپڑے سے صاف کرنے کے بعد کپڑا ایک طرف ڈال دیا تھا۔

لیاقت سے یہ جگر پاش منظر زیادہ دیر دیکھا نہیں گیا۔ اس نے تڑپ کر اپنے دونوں بچوں کو اٹھایا اور ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا باہر صحن میں آ گیا۔ پھر وہ حلق کی پوری قوت سے چلایا "کوئی ہے۔۔۔ کوئی ہے جو میرے بچوں کو دودھ پلائے۔ کوئی ہے جو ان کو روٹی کا ٹکڑا دے' کوئی ہے جو انہیں مرنے سے بچائے؟"

اس کی بین کرتی آواز رات کے سناٹے میں پھیلتی اور گونجتی چلی گئی۔ گلی گلی اس دردناک آواز کی بازگشت سنائی دی۔ گھروں میں لالٹینوں کی لو اونچی ہونے لگی۔ کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ دروازے وا ہونے لگے۔۔۔ پھر غم زدہ چہروں اور بھیگی آنکھوں والے لوگ لیاقت کے گرد جمع ہونے لگے۔۔۔ پوری بستی جاگ گئی۔ ہر طرف بے چینی لہریں لینے لگی۔ اگر کہیں سکوت اور سکون تھا تو خان عارف کی حویلی میں تھا۔

***



خودکشی

ظاہر جاوید نسل

یہ اس منحوس کی کہانی ہے جہاں ظلم و ستم اور عدل و انصاف کے الفاظ کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے اور ہر طاقتور کی خواہش روایت اور ہر کمزور قانون کی بنیاد بنتی ہے۔ جبر و استبداد کی اس فضا سے ایک جھونکا دینے والے انجام کی کہانی۔

ایک متعصب مگر بااثر شخص

چوہدری شیر عالم آج پھر اداس تھا۔ مختار چونکہ اس کا خادم خاص اور ذاتی محافظ تھا اس لیے اس کی رنگ بدلتی طبیعت کے بارے میں بہت کچھ جاننے لگا تھا۔ شیر عالم پر اداسی اور بیزاری کے ایسے دورے پڑتے رہتے تھے۔ عموماً چار پانچ روز اطمینان سے گزر جاتے تھے کوئی نہ کوئی لایعنی فکر لاحق ہو جاتی۔ شیر عالم نے تین شادیاں کی تھیں مگر صاحب اولاد نہ تھا۔ پہلی بیوی تو فوت ہو چکی تھی۔ دوسری اور تیسری آپس میں لڑنے جھگڑنے اور شیر عالم کی زندگی کو تلخ کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ ان کی چخ چخ سے گھبرا کر شیر عالم زیادہ وقت حویلی کے بجائے ڈیرے پر ہی گزارتا۔ ویسے بھی اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں بیوی چاہے کتنی بھی خوب صورت اور نئی ہو مرد کے جذبات خفیف ہو جاتے ہیں۔

حسب معمول پچھلے چند روز شیر عالم نے نہایت خوش و خرم گزارے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی جو امریکا میں تھا اور شادی کر کے وہیں مقیم ہو گیا تھا ایک مدت بعد اس سے ملنے پاکستان

آرہا تھا۔ شیر عالم اس بھری پُری دنیا میں اپنے بھائی کے سوا شاید ہی کسی سے دلی محبت کرتا ہو۔ دو ہفتے بھر اسے خوش آمدید کہنے کی تیاریوں میں مصروف رہا تھا مگر دو روز پہلے اس کی طرف سے اطلاع آئی تھی کہ فی الحال وہ کسی وجہ سے نہیں آسکتا اور اب کچھ عرصے بعد آئے گا۔

اس روز سے شیر عالم پھر اُداس ہو گیا۔ مختار جانتا تھا، اس کی یہ اداسی بڑھتی ہی چلی جائے گی یہاں تک کہ چوہدری کی قوتِ مدافعت جواب دے جائے گی اور وہ اپنی بیماری کی پروا کیے بغیر وحشی کی دو چار بوتلیں منگوائے گا، شہر سے کسی نوخیز طوائف کو بدعو کرے گا اور شراب و شباب میں ڈوب جائے گا۔

مختار کے اندازے درست ثابت ہوئے۔ اس روز شام تک چوہدری کی ..... اداسی گہری ہوتی چلی گئی۔ پھر اس نے مختار کو بلوایا اور شراب پیش کرنے کا حکم دیا۔ مختار نے شراب پیش کر دی۔ تب چوہدری کے ہونٹوں سے ایک ایسی بات نکلی جس نے مختار کو سرتاپا لرزا دیا۔ چوہدری نے ..... اس سے اپنے ہی گاؤں کی ایک لڑکی کی بات کی تھی۔ اس کا نام ثریا تھا۔ ثریا، مختار کے عزیز دوست ریاست کی بہن تھی۔ چوہدری نے پچھلی سردیوں میں اسے سرِ راہ دیکھا تھا اور اس پر مرمٹا تھا۔ اس کے بعد سے ہی ثریا کے گھر والے پر اس کی مہربانیاں بڑھ گئی تھیں۔ ثریا کے گھر والوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ چوہدری کی یہ مہربانیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ وہ ان دنوں چپکے چپکے اس علاقے سے نکل جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک طرح سے چوہدری کی زد سے نکل جانے کا مشورہ انہیں مختار ہی نے دیا تھا۔ وہ ریاست کا دوست تھا اور چوہدری کی فطرت سے آگاہ بھی۔ اس نے ریاست کو سمجھا دیا تھا کہ چوہدری اب اس کے گھر کو نقصان نہیں کرے گا لہٰذا بہتر ہے کہ وہ اونے پونے زمین بیچ کر یہاں سے نکل جائے۔ ریاست اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا مگر آج چوہدری نے اپنے دل کا مدعا بیان کر کے مختار کے ذہن میں خطرے کی اَن گنت گھنٹیاں بجا دیں۔

چوہدری نے اپنی گھنی بھنویں اٹھا کر جھانکتی نظروں سے مختار کو دیکھا اور بولا: "میری طرف سے لڑکی کے گھر والوں کو پیغام پہنچا دو۔ میرا خیال ہے وہ اس رشتے سے انکار نہیں کریں گے۔ میں نہر پار کی ساری زمین ثریا کے حق مہر میں لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

مختار جانتا تھا چوہدری کتنا بھی اونچا دے ثریا کے گھر والے دل سے رضامند نہیں ہوں گے۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ چوہدری کی ہوس پرستی کا شاخسانہ تھا اور وہ کیا گاؤں کا ہر فرد جانتا تھا کہ چوہدری کو شادیوں کی لت ہے ورنہ ایک مدت ہوئی شہر کے ڈاکٹر اسے بتا چکے تھے کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ بہرحال تقدیر ریاست اور اس کی بہن کو گھیر چکی تھی۔ اگر وہ اس سے پیشتر نکل جاتے تو نکل جاتے۔ مختار جانتا تھا کہ اب چوہدری انہیں نکلنے نہیں دے گا۔ اس کی نظروں میں ثریا کا معصوم اور حسین چہرہ گھوم گیا۔ برسوں سے ان دونوں کے درمیان جو ایک خاموش تعلق تھا اور جس نے گاؤں کی پگڈنڈیوں اور راستوں پر پرورش پائی تھی اور جو چاندنی راتوں اور ساون کی رُتوں میں پروان چڑھا تھا، اب ختم ہونے والا تھا۔ ہزاروں ان کہی باتیں اور ناسنگوے ساتھ لیے یہ خاموش تعلق خاموشی سے اپنی موت مرنے جا رہا تھا۔ مختار کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کے اتھاہ سمندر میں وفاداری کی لہروں کے نیچے چوہدری شیر عالم کے خلاف نفرت کا جو طوفان چپکے چپکے پل رہا ہے، ابھر کر سطحِ آب کی طرف بڑھنے لگا ہے۔

تیسرے ہی روز ادھیڑ عمر شیر عالم نے ثریا سے شادی رچا لی۔ گھی نکالنے کے لیے اسے انگلیاں زیادہ ٹیڑھی نہیں کرنی پڑی تھیں لیکن جب وہ بجلہ سرو سی میں پہنچا تو وہاں ثریا اکیلی نہیں تھی۔ اسی کمرے میں ایک قدِ آدم الماری کے پیچھے مختار بھی چھپا ہوا تھا۔ کسی کو اس کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا۔ چوہدری کو بھی اسی وقت پتا چلا جب نصف شب کے بعد گہری تاریکی میں ایک نادیدہ ہاتھ نے مضبوطی سے اس کے بال جکڑے اور ایک خنجر کی دھار اس کی گردن سے آن لگی۔ پھر اس سے پیشتر کہ اس کے حلق سے ..... دہشت زدہ چیخ بلند ہوتی اس کی شہ رگ صاف کٹ گئی۔ اب چوہدری چیخ نہیں سکتا تھا صرف خرخرا سکتا تھا اور اس کے کان تاریکی سے اُبھرتی ہوئی مختار کی آواز سن رہے تھے۔ وہ ثریا کو اپنا نام بتا کر تسلی دے رہا تھا کہ وہ چیخنے چلانے سے باز رہے۔ یہ آخری آوازیں تھیں جو اس کے کانوں نے سنیں۔

چوہدری شیر عالم کو قتل کر کے مختار نے ہانپتی کانپتی ثریا کو ساتھ لیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ عقبی کھڑکی کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ پہلے سے تمام منصوبہ بندی کر چکا تھا لیکن جب عمل کا وقت آیا تو اسے معلوم ہوا کہ حویلی سے جان بچا کر نکلنا کتنا مشکل ہے۔ بیرونی چار دیواری تک پہنچنے سے پہلے ہی چوہدری کے خونخوار کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور پھر اچانک چاروں طرف سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ لالٹینیں گردش میں آئیں اور چوہدری

کے مسلح گماشتے پوری حویلی میں پھیل گئے۔ اگر مختار نے پہلے سے مکمل انتظام نہ کیا ہوتا تو شاید وہ حویلی سے چند گز دُور بھی نہ جا سکتا مگر وہ اپنا مشکی گھوڑا بالکل تیار حالت میں حویلی کی عقبی دیوار کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اس نے پہلے ثریا کو اٹھا کر دیوار پر چڑھایا پھر خود چڑھا۔ گھوڑا دیوار کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔ وہ دونوں اس کی پشت پر بیٹھے اور زندگی بچانے کی آخری کوشش کے طور پر بھاگ نکلے۔ اب حویلی کی دیواروں سے ان پر فائر کیے جا رہے تھے اور حویلی کے دروازے سے مسلح گھڑ سواروں کا ایک دستہ برآمد ہو کر تیزی سے ان کے عقب میں آ رہا تھا۔ مختار نے ایک ہاتھ سے باگیں اور دوسرے سے ثریا کو اپنے آگے سنبھال رکھا تھا۔ ابھی وہ گاؤں سے ایک فرلانگ دُور ہی پہنچے تھے کہ سامنے اور دائیں جانب سے بھی گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ یہ ڈیرے کے لوگ تھے اور فائرنگ کی آوازوں نے انہیں بھی ہوشیار کر دیا تھا۔ مختار نے گھوڑا کھیتوں میں ڈالا اور اندھا دھند بھگا لے گیا۔

گھٹا ٹوپ ہوئی تاریکی میں زندگی اور موت کا یہ تعاقب تا دیر جاری رہا۔ بالآخر مختار کا گھوڑا ہانپ گیا۔ ایک جگہ اسے ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ دونوں مُنہ کے بل ایک ہل چلائے کھیت میں جا گرے۔ متعاقب گھڑ سوار اب کسی بھی لمحے ان کے سر پر پہنچ سکتے تھے یقیناً وہ چوہدری کی ہلاکت سے آگاہ ہو چکے تھے اور ان دونوں کی بخیہ بوٹی کرنے کو بے تاب تھے۔ کھیت میں گرتے ہی وہ اٹھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بے مقصد بھاگتے چلے گئے۔ موت کی قربت میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور انسان کی جدوجہد کا صرف ایک ہی مطلب رہ جاتا ہے۔ موت کو ٹالنا۔ وہ بھی کچھ ساعتوں کی مہلت دینے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال مختار اور ثریا کا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ علاقے کے سب سے بااثر زمیندار کا خون ان کی گردنوں پر ہے اور مقتول کے وارث انہیں چاروں طرف سے گھیر چکے ہیں۔

اس تاریک ویرانے میں وہی صدیوں پرانی کہانی پھر دُہرائی جانے والی ہے۔ زمیندار اپنے جبر کے شکنجے میں کس کر ان کے نادار جسموں کا لہو..... کھیتوں میں بچھڑنے والے ہیں لیکن وہ بھاگتے رہے، کماد کے اونچے کھیتوں میں، میڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر اور گھنے درختوں کے درمیان... بھاگتے رہے اور ہانپتے رہے۔ حویلی کے لوگ ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں اور دُور افتادہ آوازیں ہوا

خریدیے اور مکمل شخصیت کی تعمیر کیجیے

HOW TO WRITE A LETTER
خطوط نویسی کے لیے قیمت ۷/ روپے

HOW TO WRITE AN ESSAY
مضمون نگاری کے لیے قیمت ۷/ روپے

HOW TO WRITE AN APPLICATION
وضاحت و تشریح کے لیے قیمت ۷/ روپے

HOW TO LEARN CORRECT SPELLING
صحیح ہجے لکھنے کے لیے قیمت ۷/ روپے

HOW TO DEVELOP CONFIDENCE
ادراک و فہم کا اظہار کرنے کے لیے قیمت ۷/ روپے

CORRECT USAGES OF PREPOSITIONS
پریپوزیشن کے صحیح استعمال کے لیے قیمت ۷/ روپے

HOW TO ENRICH
رموز اوقاف جاننے کے لیے قیمت ۷/ روپے

10 DAYS TO ENGLISH
اُردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لیے قیمت ۷/ روپے

○ ضمنی محصول ڈاک ہر چیک یا منی آرڈر کی رقم پر ۱۰ روپے ہوگا۔ ○ کتابوں کی قیمت اور ڈاک خرچ بذریعہ وی پی بھیجنے کی درخواست کریں۔ ○ کتابوں کی قیمت کے ساتھ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتا اور کتابوں کا نام ضرور لکھیں۔ ○ کسی قسم کی تفصیلات کے لیے خط لکھیں۔ ٹکٹ نہ بھیجیں۔ ○ بیرون ملک سے منی آرڈر کی قیمت ۱۰ ڈالر، ۱۰ پاؤنڈ، ۱۰ ریال، ۱۰ درہم، ۱۰ دینار، ۱۰ ڈالر آسٹریلیا، ۱۰ ڈالر کینیڈا، ۱۰ ڈالر نیوزی لینڈ، ۱۰ ڈالر سنگاپور، ۱۰ ڈالر ہانگ کانگ، ۱۰ ڈالر ملائشیا، ۱۰ ڈالر تھائی لینڈ، ۱۰ ڈالر فلپائن، ۱۰ ڈالر انڈونیشیا، ۱۰ ڈالر جاپان، ۱۰ ڈالر فرانس، ۱۰ ڈالر جرمنی، ۱۰ ڈالر ہالینڈ، ۱۰ ڈالر بیلجیم، ۱۰ ڈالر سوئٹزرلینڈ، ۱۰ ڈالر اٹلی، ۱۰ ڈالر سپین، ۱۰ ڈالر پرتگال، ۱۰ ڈالر یونان، ۱۰ ڈالر ترکی، ۱۰ ڈالر مصر، ۱۰ ڈالر لیبیا، ۱۰ ڈالر تیونس، ۱۰ ڈالر الجیریا، ۱۰ ڈالر مراکش، ۱۰ ڈالر نائیجیریا، ۱۰ ڈالر گھانا، ۱۰ ڈالر کینیا، ۱۰ ڈالر یوگنڈا، ۱۰ ڈالر تنزانیہ، ۱۰ ڈالر زمبابوے، ۱۰ ڈالر زامبیا، ۱۰ ڈالر موزمبیق، ۱۰ ڈالر انگولا، ۱۰ ڈالر جنوبی افریقہ، ۱۰ ڈالر نامیبیا، ۱۰ ڈالر بوٹسوانا، ۱۰ ڈالر زمبابوے، ۱۰ ڈالر زامبیا، ۱۰ ڈالر موزمبیق، ۱۰ ڈالر انگولا، ۱۰ ڈالر جنوبی افریقہ، ۱۰ ڈالر نامیبیا، ۱۰ ڈالر بوٹسوانا

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L. MANSFIELD STR. BR. KARACHI

براہ راست حاصل کرنے کے لیے:

MAKTABA NAFSIAT 404 HUSSAIN CENTRE, SHAHRAHE IRAQ SADDAR KARACHI - PHONE: 526689

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

کے دل و دماغ پر تیرتی ہوئی انہیں میسمیز لگا رہی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں اتنی قریب... آجاتیں کہ انہیں اپنے جسموں پر موت رینگتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ایسے میں ثریا، مختار کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیتی اور وہ دل ہی دل میں کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگتا۔ مصیبت میں خدا یاد آنے کا محاورہ اس نے کئی بار سنا تھا لیکن آج اس کی حقیقت بھی جان رہا تھا۔

اچانک مختار نے اپنے سامنے اندھیرے میں ایک منظر دیکھا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کچے راستے سے ہٹ کر نہر کے کنارے گھنے درختوں میں ایک پرانی طرز کی عمارت نظر آرہی تھی۔ عمارت دیکھتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ لال پل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ لال پل اُن کے گاؤں سے کوئی اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ شہر کی طرف جاتے ہوئے کئی مرتبہ لال پل سے گزر چکا تھا۔ اس پل سے گزرتے ہوئے دائیں جانب دیکھنے سے راہ گیر کو کھپریل کی چھت والی یہ عمارت عموماً نظر آجاتی تھی۔ انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا یہ ریسٹ ہاؤس، جو اب محکمۂ انہار کی تحویل میں تھا، کبھی کبھار کسی ایسے سرکاری افسر کے کام آجاتا جو اس علاقے کا دورہ کرنے آیا ہوا ہوتا، ورنہ عام طور پر یہ عمارت ویران نظر آتی۔

ریسٹ ہاؤس دیکھتے ہی مختار نے اپنا رخ بدلا اور عمارت کی طرف دوڑ لگادی۔ ثریا گرتی پڑتی اس کے ساتھ بھاگی چلی آرہی تھی۔ عمارت کے اندر مکمل تاریکی تھی مگر یہ دیکھ کر مختار ٹھٹک گیا کہ دروازے کے سامنے پیپل کے درخت تلے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے ایک پہیے کو جیک لگا کر اوپر اٹھا دیا گیا تھا اور پہیہ کھلا پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی وہاں مقیم تھا۔

مختار، ثریا کو لیے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے بڑے دروازے پر پہنچا اور بے تابی سے دستک دینے لگا۔ تیسری یا چوتھی دستک پر اندر روشنی ہوئی اور کسی نے آکر دروازہ کھول دیا۔ یہ گھنی مونچھوں اور بڑی بڑی آنکھوں والا ایک صحت مند شخص تھا جو سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا اور ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ مختار نے صاف محسوس کیا کہ اس کا ایک ہاتھ گاؤن کی جیب میں ہے اور وہاں ریوالور موجود ہے۔ پہلی نظر میں مختار کو یہ ایک سخت گیر بلکہ خطرناک شخص نظر آیا۔ وہ پناہ طلب کرنے سے پہلے ایک لمحے کو ٹھٹکا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے تیزی مگر لجاجت سے کہا...

"جناب! کچھ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری جان بچائیے۔"

گھنی مونچھوں والے نے ایک نظر اُن دونوں کو گھورا پھر دروازے سے ہٹ گیا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے مختار نے قدم بڑھائے اور ثریا کو لے کر اندر داخل ہوگیا۔ اس شخص نے دروازہ اندر سے بند کرکے پردہ برابر کردیا مگر پھر اس سے پہلے کہ وہ مختار اور ثریا سے ان کی بابت کچھ پوچھتا، باہر نہر کی جانب سے گھڑ سواروں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مختار اور ثریا کی آنکھوں سے ایک ساتھ خوف جھانکنے لگا۔ گھنی مونچھوں والے نے نیم نگاہوں سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور پھر ایک بتی دروازہ کھول کر انہیں اندر جانے کی ہدایت کی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ وہ اندر آگئے تو اس نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔ مختار دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور آوازوں سے اندازہ ہوا کہ چوہدری کے مسلح کارندے گھنی مونچھوں والے سے ان دونوں کے متعلق استفسار کر رہے ہیں۔ مختار اور ثریا دم سادھے کھڑے تھے۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ چوہدری کے آدمی جھوٹی سچی بات بنا کر گھنی مونچھوں والے کو قائل کرلیتے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود زبردستی اس کمرے تک پہنچ جاتے۔ آخر وہ تنہا تھا اور وہ کسی صورت بھی پندرہ بیس سے کم نہیں تھے۔

کچھ دیر آوازیں آتی رہیں۔ پھر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں اور مختار اور ثریا کی جان میں جان آئی۔ حویلی کے لوگ واپس ہوگئے تھے۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور گھنی مونچھوں والا اندر داخل ہوا۔ مختار نے پہلی نظر میں بھانپ لیا کہ اس کا ہاتھ گاؤن کی جیب میں ابھی تک ریوالور پر ہے۔ مونچھوں والے کی صورت دیکھ کر ایکا ایکی مختار کے ذہن میں نئے خدشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا حساب تو نہیں ہونے والا تھا۔ مونچھوں والا گہری نظروں سے ثریا کو دیکھ رہا تھا۔

وہ عروسی جوڑے میں ملبوس، کسی سہمی چڑیا کی طرح مختار کے بازو سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے نازک ہاتھوں کی گرفت سے اس کی جسمانی لرزش کا اظہار ہوتا تھا۔

مونچھوں والے نے جب اپنے ہونٹوں سے پہلا فقرہ ادا کیا تو اچانک جیسے مختار اور ثریا کے اندیشے بھاپ بن کر اڑنے لگے۔ چہرے بعض اوقات کتنا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ گھنی مونچھوں اور کرخت چہرے والا شخص نہایت شائستہ اور مہربان لہجے کا مالک تھا۔ اس نے دل کش انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں کے بارے ایک طرفہ رپورٹ ملی ہیں کیا آپ خود اپنے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

مختار نے متشکر لہجے میں کہا: "ضرور جناب! آپ نے ہمارے ساتھ جو مہربانی کی ہے ہم اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے آپ سے کچھ بھی چھپانا احسان ناشناسی ہوگی۔"

وہ تینوں اس ہال کمرے میں آ بیٹھے جو ریسٹ ہاؤس کی نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چلتے ہوئے مختار واضح طور پر لنگڑا رہا تھا۔ گھوڑے سے گرتے ہوئے اس کے پاؤں میں سخت موچ آئی تھی۔ جسم ٹھنڈا ہونے پر چوٹ کافی تکلیف دینے لگی تھی۔ اس ہال کمرے میں پرانے گھروں کی بو باس بسی ہوئی تھی۔ چھت پر ایک میلا سا فانوس روشن تھا۔ قدیم طرز کے صوفوں پر بیٹھ کر انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔ مختار کے بولنے سے پہلے ہی گھنی مونچھوں والے نے کہا۔

"بہتر ہے۔ پہلے میں اپنا مختصر سا تعارف پیش کر دوں۔ میرا نام اورنگ زیب ہے۔ میں دریا پار کے ایک موضع میں جا رہا تھا کہ یہاں پہنچ کر میری جیپ خراب ہو گئی۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے پٹھان چوکیدار کو بھیجا ہے تاکہ وہ کسی موٹر مکینک کو لے آئے۔ وہ نزدیکی قصبے میں گیا ہے۔ معلوم نہیں کیا نام بتا رہا تھا قصبے کا۔ میرا خیال ہے اب صبح ہی واپس آئے گا۔"

اس مختصر تعارف کے بعد مختار نے محسوس کیا کہ اورنگ زیب نامی یہ شخص بے ضرر ہے اور اسے اپنے متعلق بتلانے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ممکن ہے وہ اس صورت حال میں انہیں کوئی بہتر مشورہ دے سکے۔ اس دوران ثریا کبھی سٹائی، گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر آزردہ ہو کر وہ چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگتی۔ اورنگ زیب نہایت تجربہ اور ہمدردی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ گاہے گاہے اس نے زمیندار شیر عالم کے رویے پر تاسف کا اظہار بھی کیا۔ مختار جب اپنی بات مکمل کر چکا تو اورنگ زیب نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کافی خطرناک ہیں اور اگر زمیندار واقعی مر چکا ہے تو وہ تمہاری تلاش میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ خون کا انتقام لینے تک یہ لوگ کسی صورت چین سے نہیں بیٹھتے۔ اس صورت حال میں بہتر یہی ہے کہ تم ایک دو روز اسی جگہ چھپے رہو۔"

مختار اس کی بات سمجھ رہا تھا، بولا: "جناب! آپ کا کہنا بجا ہے مگر آپ کے جانے کے بعد ہم یہاں کیسے رُک سکتے ہیں؟"

اورنگ زیب نے کہا: "ضروری تو نہیں کہ کل میری گاڑی

سائز

ایک آدمی کے پاؤں بہت بڑے بڑے تھے۔ اسے نظر بھی کم آتا تھا۔ ایک بار وہ اپنے نوکر کے ساتھ جوتے خریدنے گیا۔ مگر جوتے کا بڑے سے بڑا سائز بھی اس کے پیر میں فٹ نہ آتا۔ اچانک ایک جوتا اس کے پیر میں پورا آگیا۔ وہ خوشی سے چیخا۔

"یہی جوتا خرید لو۔ ہمارے بالکل ٹھیک آگیا ہے۔"

نوکر نے کہا۔ "مگر سرکار۔ آپ نے تو پاؤں میں جوتوں کے ڈبے پہن رکھے ہیں۔"

ٹھیک ہی ہو جائے اور اگر ہو بھی گئی تو میں تم لوگوں کی خاطر ایک آدھ دن مزید یہاں رُک جاؤں گا۔"

ثریا نے پہلی بار پلکیں اٹھا کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ مختار کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی احسان مندی کے جذبات تھے۔

اورنگ زیب نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا: "تم دونوں بے خوف و خطر پچھلے کمرے میں رُک سکتے ہو۔ چوکیدار ضرورت مند آدمی ہے۔ میں اسے منہ بند رکھنے کے لیے معقول رقم دے دوں گا۔"

مختار نے کن انکھیوں سے ثریا کی طرف دیکھا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے اسے نڈھال کر رکھ دیا تھا۔ خود اس کے ٹخنے کو بھی شدید ضعف پہنچا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ تکلیف کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس حالت میں وہ چوہدری کے مسلح گنوں کے آگے کہاں تک بھاگ سکتے تھے اور کہاں تک چھپ سکتے تھے۔ ان کے محسن نے نہایت مناسب بات کہی تھی۔ تلاش کی سرگرمی ماند پڑنے تک اس عمارت میں چھپے رہنا ان کے لیے بہتر تھا۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔

"جناب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ مجھ غریب کے لیے آپ کی کرم فرمائی کا بوجھ ناقابل برداشت ہے۔"

اورنگ زیب نے مسکرا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ پھر دونوں کو بغلی کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔ دونوں اٹھ کر کمرے میں چلے آئے۔ وہاں دو بستر موجود تھے۔ وہ لیٹ گئے۔ دو اجنبیوں کی طرح لیکن ایک دوسرے کی دھڑکنوں سے آگاہ

تکلیف اور پریشانی کے سبب نیند مختار کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ دن چڑھے تک جاگتا رہا۔ نو بجے کے قریب دروازہ کھلا اور اورنگ زیب ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ مختار نے لپک کر اس کے ہاتھ سے ٹرے تھام لی۔ اسے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اورنگ زیب نے کہا۔

"چوکیدار ابھی تک نہیں لوٹا۔ دھرسا درچی خانے میں ناشتے کا سامان موجود تھا۔ میں نے سوچا اپنی مدد آپ کرنی چاہیے۔"

ثریا بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اب جھکی جھکی نگاہوں سے اپنے میزبان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً بیرونی دروازہ زوردار دستکوں کی زد میں آ گیا۔ اورنگ زیب نے چونک کر گردن گھمائی، پھر دروازہ باہر سے بند کرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مختار اور ثریا دھڑکتے دلوں سے باہر کی آوازیں سننے لگے۔ وہ چوہدری کے سٹاف کے کارندوں کے لہجے صاف پہچان رہے تھے۔ وہ خاید دروازہ کھلتے ہی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ اُن کی آوازوں میں ایک ایسی آواز بھی شامل تھی جسے مختار بچپن سے جانتا تھا۔ یہ ان کے گاؤں کا ماہر کھوجی "مٹی" تھا۔ یقیناً انہیں دوبارہ اس ریسٹ ہاؤس تک لانے والا مٹی ہی تھا۔ وہ بڑے پُراعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"لالہ جی! وہ دونوں آئے ہیں تو ادھر ہی آئے ہیں اور اس سے آگے کہیں نہیں گئے۔"

اورنگ زیب کی بارعب آواز گونجی: "تو تم مجھے جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

چوہدری شیرعالم کے بالتوخنڈے لالہ سراج کی اکھڑی ہوئی آواز آئی: "صاحب بہادر! جھوٹ سچ کسی کے ماتھے پہ نہیں لکھا ہوتا۔"

اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی زوردار آواز آئی۔ مختار بے قرار ہو کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ تھپڑ سراج کے گال پر پڑا تھا اور مارنے والا ہاتھ اورنگ زیب کا تھا۔ سراج تیورا کر فرش پر گر پڑا تھا مگر مختار کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ اورنگ زیب کا غضبناک چہرہ کس انداز میں آگے بڑھتے دیکھا۔ اس کی بھرپور ٹھوکر سراج کی پسلیوں پر پڑی تھی۔ وہ بُری طرح چیخا۔ تب سراج کے دو تین ساتھیوں نے اٹھاں سونٹ گرا اورنگ زیب پر جھپٹنا چاہا مگر پھر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ کمرے کی شمالی جانب سے اورنگ زیب کی گرجدار آواز سنائی دی: "خبردار! آگے بڑھے تو گولی مار دوں گا۔"

اس کی آواز میں بے پناہ تحکم اور دبدبہ تھا۔ وہ غرایا۔

"بےشرم نابکار! مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں تمہیں جیل میں سڑا کر رکھ دوں گا۔ کس کی اجازت سے اندر آئے ہو تم؟ یہ ایک سرکاری عمارت ہے۔"

اتنے میں بیرونی دروازے سے تیز قدموں کی چاپ آئی اور بولنے والے کی آواز سے مختار کو اندازہ ہوا کہ چوہدری کا ایک سسرالی رشتے دار اندر داخل ہوا ہے۔ یہ اس کا سالا تھا۔ بگڑی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر اس نے اورنگ زیب سے نرم لہجہ اختیار کیا اور اپنے آدمیوں کو فحش گالیاں دینے کے بعد بولا۔

"جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ میں خود بات کروں گا ان سے۔"

مخالف پارٹی نرم ہوئی تو اورنگ زیب نے بھی دھیما لہجہ اختیار کیا۔ وہ چوہدری کے سالے سے بولا: "بھائی! میں ایک مسافر آدمی ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے تم لوگوں کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ پھر بھی تم اگر تسلی کرنا چاہو تو گھوم پھر کر دیکھ سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

چوہدری کا سالا بولا: "نہیں جناب! اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو ہم بھی مطمئن ہیں۔"

اورنگ زیب نے کہا: "نہیں، نہیں.... آؤ میرے ساتھ۔" پھر مختار نے مختلف دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ اورنگ زیب ان لوگوں کی تسلی کروا رہا تھا۔ پھر قدموں کی چاپ اس کمرے کے سامنے پہنچ گئی جہاں وہ دونوں دبکے کھڑے تھے۔ دونوں کے دل شدت سے دھڑکنے لگے۔ تب ہی چوہدری کے سالے کی آواز ابھری: "ہم نے پورا ریسٹ ہاؤس دیکھ لیا۔ نہیں بھائی صاحب! آپ خرخشہ نہ کریں، بس ٹھیک ہے۔ ہم جاتے ہیں۔ ہاں، آپ ذرا محتاط رہیں۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں کہیں ارد گرد موجود ہوں اور یہاں پناہ لینے کی کوشش کریں۔"

کچھ ہی دیر بعد بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ چوہدری کے کارندے رخصت ہو چکے تھے۔

اس دوران پٹھان چوکیدار نزدیکی قصبے سے ایک ٹریکٹر کلینک کو لے کر آ چکا تھا۔ دوپہر تک وہ لوگ پکارو جیپ ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر اورنگ زیب نے کلینک کو واپس بھیج دیا۔ اس نے پٹھان چوکیدار کو بھی کچھ کرایہ دے کر شہر روانہ کر دیا۔ مختار اور ثریا کو اس نے اگر بتایا کہ اس نے کلینک کو جان بوجھ کر بھیجا ہے کیونکہ گاڑی ٹھیک ہو جاتی تو اسے ریسٹ ہاؤس چھوڑنا پڑتا جو وہ نہیں چاہتا۔ اس نے مختار کو بتایا کہ چوہدری کے کارندے بظاہر تو واپس چلے گئے ہیں لیکن وہ مشکوک ہو چکے ہیں اور غالباً ریسٹ ہاؤس

پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کا یہاں سے نکلنا کسی طور ٹھیک نہیں۔

اورنگ زیب کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انہیں ہر صورت ریسٹ ہاؤس میں روکنا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر مختار کے ذہن میں خدشے سر اٹھانے لگے۔ وہ نہ صرف زخمی تھا بلکہ نہتا بھی۔ وہ خنجر جس سے اس نے چوہدری کو جہنم واصل کیا تھا، افراتفری میں اس کمبخت سروسی ہی میں رہ گیا تھا۔ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کی محافظت اس کے ذمے تھی اور یہ ایک نہایت نازک معاملہ تھا۔ سازگار حالات میں انسان کے اندر کا حیوان باہر نکلنے کے لیے اینٹھنے لگتا ہے اور کس کے اندر کا حیوان کتنا زور آور ہے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مختار نے سوچا کہ اسے ہر دم چوکس رہنا ہوگا۔

وہ تین روز مختار نے نہایت چوکسی سے گزارے۔ ان تین دنوں میں کئی مرتبہ اس کا دل چاہا کہ تریا کو یہاں سے لے کر نکل جائے مگر اورنگ زیب سے کنی کترا کر یہاں سے نکلنا ممکن تھا۔ وہ بہت باخبر رہتا تھا۔ دوسرے مختار کی نگاہوں میں رہ رہ کر شیر عالم کے خونخوار بھائیوں، بھتیجوں اور بھانجوں کی شکلیں گھوم جاتی تھیں۔ یہ عین ممکن تھا وہ ابھی تک گھوڑوں پر سوار ان کی تلاش میں ہوں۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ تیسرے روز شام کو چوکیدار شہر سے کمیک کو لے کر واپس آگیا اور اگلے روز دوپہر تک اس نے گاڑی درست کر دی۔ اسی روز نصف شب کے وقت اورنگ زیب ان دونوں کو لے کر ریسٹ ہاؤس سے نکلا اور اپنی پجارو جیپ میں لے آیا۔ ساری رات وہ نہایت دشوار گزار راستے پر سفر کرتے رہے۔ آخر علی الصباح وہ ایک پختہ سڑک پر پہنچے اور اورنگ زیب نے انہیں ایک مسافر بس میں سوار کرا دیا۔ وقت رخصت ان تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بس اپنے راستے پر گامزن ہوگئی۔ مختار کے ہاتھ میں ایک خط تھا لیکن وہ اسے نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ صبح کا اجالا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ پھر صبح ہوئی اور ہر شے صاف صاف نظر آنے لگی۔ مختار بھی اورنگ زیب کا دیا ہوا وہ خط پڑھنے کے قابل ہوگیا۔ ایک نفیس لیٹر پیڈ پر خوشخط لفظوں میں تحریر تھا،

"پیارے دوست! سدا خوش رہو۔

جس شخص کو تم قتل کر کے فرار ہوئے ہو یعنی چوہدری شیر عالم کو، میں اس کا سب سے چھوٹا بھائی ہوں۔ امریکا میں ایک مدت سے اپنے پیارے بھائی کی صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا لیکن کیا معلوم تھا اس کی جگہ اس کے قاتل سے محبت نبھانا پڑے گی۔ میں اچانک گاؤں پہنچ کر بھائی کو حیران کرنا چاہتا تھا، اس لیے خاموشی سے اپنی نئی جیپ پر روانہ ہوا مگر ایک مقام پر جیپ خراب ہوگئی اور مجھے اس ریسٹ ہاؤس میں رکنا پڑ گیا۔ وہاں تم نے مجھ سے پناہ طلب کی اور میں پناہ دینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ تم میرے بھائی کے قاتل ہو۔ میرا دل چاہتا تھا کہ تمہارے جسم کے ٹکڑے کر ڈالوں، لیکن میرے ضمیر کی آواز نے بتا دی تھی کہ تم دونوں بے گناہ ہو۔ مجرم میرا بھائی ہے اور وہ ساشو ہے جس نے تمہاری زمینوں میں زہر گھولا ہے۔ آخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ تمہاری مدد کروں۔ تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچاؤں مگر میں جانتا تھا میں جائیداد اور مقام چوہدری کے اس سیلاب کے آگے بند نہیں باندھ سکوں گا۔ میرے بھائی کے لواحقین تمہیں کسی صورت معاف نہیں کریں گے اور جو تمہارے لیے سائبان کا خواستگار ہوگا اسے بھی گردن زدنی جانا جائے گا لہٰذا میں سنسان پر ظاہر ہوئے بغیر تمہاری حفاظت کرنے کی کوشش کی اور خدا کا فضل ہے کہ مجھے کامیابی ہوئی... میں جانتا ہوں میرا تعلق جس طبقے سے ہے تمہارے دل میں اس طبقے کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے لیکن میرا خیال ہے کوئی انسان کسی کا دشمن نہیں، صرف جہالت انسان کی دشمن ہے۔ آخر میں تم سے درخواست ہے کہ اب کبھی اس علاقے کا رخ نہ کرنا۔ تمہیں دیکھ کر میرے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا ایک تکلیف دہ عمل ہوگا۔ خدا حافظ۔

تمہارا خیر خواہ ایک زمیندار"



ان کی محبت بہت پرانی تھی۔ شاید اس وقت کی جب یاسمہ چھ سات برس کی اور تابش نو دس برس کا تھا۔ وہ دونوں بھولی تھے اور پڑوسی بھی۔ بچپن کتنا معصوم اور خوش رنگ تھا جیسے ایک پھول کی انگڑائی جیسے ایک تتلی کی اڑان اور جیسے قوس قزح کی جھلک۔ اتفاق تھا کہ دونوں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ دونوں لاڈ پیار میں پلے تھے۔ یاسمہ اور تابش کے گھرانے ایک دوسرے میں یوں گھلے ملے ہوئے تھے کہ ایک ہی خاندان کے افراد لگتے تھے۔ یاسمہ کے والد عرفان صاحب ایک سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ تابش کے والد چوہدری بشیر تجارت پیشہ تھے اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی کوٹھیاں پہلو بہ پہلو واقع تھیں۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان ایک برائے نام دیوار تھی لیکن دلوں کے درمیان یہ برائے نام دیوار بھی نہیں تھی۔

یاسمہ اور تابش کا اسکول بھی ایک ہی تھا۔ یاسمہ کے والد عرفان چونکہ دفتر کے لیے جلدی نکل جاتے تھے لہٰذا وہ دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ لنچ کے وقت چوہدری بشیر انہیں گھر لے آتے تھے۔ بچپن کا ایک واقعہ ان دونوں کے لیے یادگار تھا۔ یہ واقعہ ان یادوں میں سے تھا جو ان کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش تھیں۔ عید الفطر کا موقع تھا۔ سب بچوں کی طرح یاسمہ اور تابش کی جیبیں بھی نئے نکور کڑکتے نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جب جیب میں وافر پیسے ہوں تو دبی ہوئی خواہشیں سر اٹھاتی ہیں اور من مانی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ یاسمہ ڈرائی فروٹ کی بہت شوقین تھی۔ خاص طور پر سردیوں میں اس کا شوق بہت بڑھ جاتا تھا۔ دوسری طرف تابش کو سوئٹس کا چسکا تھا۔ اس کی جیب میں جو بھی آتا تھا گولیوں اور ٹافیوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔ اپنے اس شوق کے سبب وہ کئی بار بیمار بھی پڑا تھا۔ دو دفعہ ڈانٹ سننی پڑی تھی۔ کئی بار تو ابو سے پٹائی ہوتے ہوتے رہی تھی۔ بہرحال جو منانے سے مٹ جائے وہ شوق ہی کیا۔

اس عید الفطر پر سہ پہر کے وقت یاسمہ اور تابش ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ تابش نے اپنی جمع

یہ کہانی سراسر فرضی ہے اور اس میں بیان کیے گئے تمام واقعات اور کردار بھی فرضی ہیں

طاہر جاوید مغل

اپنی امانت واپس لو

الفا، اعتماد، جدائی، وصال، امانت داری اور دکھ وغیرہ محبت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کوئی محبت ان میں سے کسی ایک سے بھی محروم ہو تو پھر پوری کیفیات کی حامل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ لڑکی بھی ان اجزائے محبت پر یقین رکھتی تھی بلکہ امانت داری کو تو اس نے طرزِ جہاں بنا رکھا تھا۔ چند خوب صورت و بیش قیمت امانتیں تھیں جن کی خاموش گواہی اس پر بار ہوئی جا رہی تھی... اس کے باوجود خیانت کا اس کے ذہن میں کبھی خیال تک نہ آیا۔ پھر ایک روز یہ امانتیں حوالے کرنے کا وقت آ گیا۔



پونجی سوئٹس کے لیے خرچ کردی۔ اس نے چار پانچ موسم کی ٹافیاں لیں اور کوٹ کی جیبیں بھرلیں۔ تابش کو دیکھ کر یاسمہ کا شوق بھی بیدار ہوا۔ اس نے تیس چالیس روپے ڈرائی فروٹ پر خرچ کرڈالے۔ تلے ہوئے بادام' اخروٹ نما مغز' پستہ اور سندرخانی کشمش' یہ سب چیزیں نفاست سے پیکٹوں میں بند کی گئی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی معصوم مسرتیں جیبوں میں بھرے خراماں خراماں واپس آرہے تھے جب اچانک ان کی جان نکل گئی۔ اپنے عقب میں انہیں کار کا ہارن سنائی دیا تھا اور یہ تابش کے ابو کی کار تھی۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ تابش کو ابو کا ناراض اور امی کا پریشان چہرہ دکھائی دیا۔ گاڑی روک کر ابو جلدی سے نکلے۔ تابش کا کان کھینچا "کہاں سیر سپاٹا ہورہا ہے صاحب زادے!" انہوں نے خفگی سے پوچھا۔

"ہم مارکیٹ تک گئے تھے۔"

"اور تمہاری ماں کا ہارٹ فیل ہوجاتا تو؟ آدھے گھنٹے سے ڈھونڈ رہے ہیں تم دونوں کو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے تابی!" امی بھی گاڑی سے نکل آئیں۔ وہ دونوں سر جھکائے کھڑے تھے۔

شاید دونوں کو مزید ڈانٹ ڈپٹ بھی سننا پڑتی اور تابش کو کھڑے کھڑے اپنے پیسوں کا حساب دینا پڑتا لیکن چونکہ یہ بازار تھا لہٰذا ابو نے اسی پر اکتفا کیا اور انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔

دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ ابو کا خراب موڈ دیکھ کر تابش نے یاسمہ کے کان میں کہا "میری ٹافیاں تم رکھ لو' میں کل تم سے لے لوں گا۔"

"لیکن میری جیبوں میں تو میری چیزیں ہیں" یاسمہ نے جوابی سرگوشی کی۔

تابش نے چند لمحے سوچا "اچھا تم ڈرائی فروٹ کے پیکٹ مجھے دے دو" وہ بولا۔

یہ مناسب تجویز تھی۔ یاسمہ کو صرف ڈرائی فروٹ کی وجہ سے ڈانٹ پڑا کرتی تھی اور تابش کو صرف سوئٹس کی وجہ سے۔

پچھلی نشست پر دیکھے دیکھے تابش نے خاموشی سے اپنی "شاپنگ" یاسمہ کی جیبوں میں منتقل کردی اور یاسمہ نے اپنی "خریداری" تابش کی جیبوں میں پہنچادی۔

عید کی وہ شام بدمزہ ہونے سے بچ گئی۔ تابش اور یاسمہ کو صرف اس بات پر معمولی ڈانٹ ڈپٹ ہوئی کہ وہ بتائے بغیر اکیلے مارکیٹ چلے گئے تھے۔

یاسمہ کا خیال تھا کہ اگلے روز کسی وقت وہ اور تابش اپنی اپنی اشیا کا تبادلہ کرلیں گے مگر "اگلا روز" تو ہمیشہ اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا عالم' دانشور یا سائنس داں اس "اگلے روز" کے بارے میں یقین کے ساتھ پیش گوئی نہیں کرسکتا۔ یہ اگلا دن مستقبل کا حصہ ہوتا ہے اور مستقبل چاہے ایک لمحے کے روپ میں ہو "نامعلوم" ہی ہوتا ہے۔ اگلے دن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے یاسمہ اور تابش کو قریباً ایک ماہ کے لیے ایک دوسرے سے دور کردیا۔ یاسمہ کے ایک تایا کوئٹہ میں رہتے تھے' انہیں فالج کے علاج کے لیے اچانک انگلینڈ جانا پڑگیا۔ یاسمہ کی تائی اپنی دو بچیوں کے ساتھ گھر میں اکیلی رہ گئیں۔ لہٰذا یاسمہ کی والدہ ان کے پاس رہنے کے لیے کوئٹہ چلی گئیں۔ یاسمہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ یاسمہ کے ساتھ وہ ساری ٹافیاں بھی گئیں جو اس کے کوٹ کی جیب میں ایک امانت کی طرح محفوظ تھیں۔ کوئٹہ میں یاسمہ ایک ماہ رہی۔ وہ ٹافیاں اس نے اپنے جہازی سائز بستے کے ایک اندرونی خانے میں رکھ چھوڑی تھیں۔ ایک روز اس کی امی نے پوچھا "یاسمہ' یہ ٹافیاں یہاں کیوں رکھی ہیں۔ انہیں کھاتی کیوں نہیں؟"

وہ بولی "امی! یہ تابش نے رکھنے کے لیے دی تھیں' یہ میری نہیں ہیں۔ میں کیوں کھاؤں؟"

امی مسکرا کر رہ گئی تھیں۔ وہ یاسمہ کی اس عادت کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا' جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے بس وہ بیٹھ گئی ہے۔ اب وہ ان ٹافیوں کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گی اور نہ کسی کو لگانے دے گی۔

اس ایک ماہ میں ڈھیر ساری رنگ برنگی ٹافیاں دیکھ کر کئی بار یاسمہ کا دل للچایا لیکن ہر بار اس نے خود پر قابو پایا۔ جو چیز اس کے پاس امانت تھی وہ بس امانت تھی اور پھر اس امانت کا تعلق تابش سے تھا۔ وہ اس میں خیانت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک ماہ بعد جب وہ کوئٹہ سے واپس آئی تو سیدھی تابش کے گھر گئی۔ چھٹی کا دن تھا' تابش کمرے میں پڑا سو رہا تھا۔ اس نے جھنجوڑ کر اسے جگایا۔ پھر کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور ساری کی ساری ٹافیاں نکال کر اس کے سامنے ڈھیر کردیں "یہ دیکھو' گن لو ایک بھی کم نہیں ہے" وہ بولی۔

تابش حیران رہ گیا "واہ! یہ تو واقعی پوری لگتی ہیں لیکن ــــ تم نے چکھی کیوں نہیں؟"

"کیوں چکھتی؟" وہ بھنک کر بولی "تم نے رکھنے کے لیے دی تھیں' چکھنے کے لیے تو نہیں دی تھیں۔"

تابش ایک دم خاموش ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ بولی۔

"لیکن میں نے تو ــــ تمہارا وہ ــــ ڈرائی فروٹ کھالیا" وہ اٹک اٹک کر بولا تھا۔

یاسمہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوئی پھر یکدم اس نے
برے پر مسکراہٹ سجالی "پھر کیا ہوا تابی' کوئی بات نہیں۔
میں اور لے لوں گی۔"
وہ افسردہ ہوگیا "لیکن یہ اچھی بات تو نہیں۔ تم نے
میری ٹافیاں ایک مہینے تک سنبھالے رکھیں' انہیں چھیڑا تک
نہیں۔۔۔ اور میں بے صبرا نکلا۔"
"افوہ۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ ذرا سی فروٹ ہی تو تھا۔"
"اور یہ بھی ٹافیاں ہی تو تھیں" تابش نے کہا۔ پھر ایک
لمحہ توقف کرکے بولا "ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ اب
میں یہ ٹافیاں نہیں لوں گا۔ یہ تمہاری ہیں کیونکہ میں نے
تمہارا ذرا سی فروٹ واپس نہیں کیا لہٰذا تم بھی مجھے یہ ٹافیاں
واپس نہ کرو۔"
"بالکل نہیں" وہ تنک کر بولی "یہ تمہاری ہیں۔۔۔ بس
تمہاری ہیں۔"
وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ دل کی
کیفیت چھپانے والی اور پریشانی پر پردہ ڈالنے کے لیے چہرے
پر فوراً مسکراہٹ سجالینے والی۔
تابش کے دل میں بھی نہ جانے کیا آئی۔ وہ بضد ہوگیا
"نہیں یاسمہ! یہ میں نہیں لوں گا۔ تم انہیں اپنے پاس رکھ
لو۔"
"نہیں تابی! یہ تمہاری ہیں۔ میرے پاس تمہاری
امانت تھیں اور امی کہتی ہیں امانت ضرور لوٹانی چاہیے۔۔۔
اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ انکل زیادہ سخت ہیں۔ مجھے تو ذرا سی
بات کے لیے اور پیسے مل جائیں گے' تمہیں شاید سوئٹس
کے لیے نہ مل سکیں۔"
دونوں میں کافی تکرار ہوئی۔ تابش ٹافیاں لینے کو ہرگز
تیار نہیں تھا۔ وہ ٹافیاں میز پر رکھتی تھی اور تابش اٹھا کر اس
کی جیبوں میں ٹھونسنے لگتا تھا۔ ایک دم یاسمہ کے دل میں نہ
جانے کیا بات آئی' وہ ٹافیاں لے کر چلی گئی۔ قریباً آدھ گھنٹے
بعد تابش کمرے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ دروازے
کے عین سامنے تابش کا اسکول بیگ پڑا ہے۔ اس بیگ کے
باہر والے خانے میں "ساری کی ساری" ٹافیاں موجود
تھیں۔
یاسمہ کی اسی حرکت نے تابش کو بے ساختہ مسکرانے پر
مجبور کردیا۔ کوئی بات جب یاسمہ کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی تو
پھر اسے نکالنا بہت مشکل ہوتا تھا۔
بچپن کے وہ دن ایسی ہی شرارتوں' حماقتوں اور محبتوں
سے عبارت تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھوٹے چھوٹے غم'
زندگی بڑی سادہ اور سہل تھی ان دنوں۔۔۔ تابش اور یاسمہ کو
کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کی ٹافیوں اور ذرا سی فروٹ کی طرح

قدرت نے بھی ایک تقسیم کر رکھی ہے' ہر یاسمہ کی رومانی
خواہشات کسی تابش میں چھپی ہوئی ہیں اور ہر تابش کی محبت
بھری آرزوئیں کسی یاسمہ میں پنہاں ہیں۔ یوں ان دونوں کو
ایک دوسرے کا مطلوب بنایا گیا ہے اور زندگی کو ایک پُرہنگام
رخ دیا گیا ہے۔۔۔ ان کے معصوم ذہن ابھی ایسی پیچیدہ سوچوں
سے دور تھے۔ وقت کا پنچھی دن اور رات کے پنکھ لگائے ماہ و
سال کے وسیع مناظر پر پرواز کرتا رہا۔ زندگی رواں دواں
رہی۔ بچپن نے اپنا آپ لڑکپن کے حوالے کیا اور لڑکپن
نے خود کو جوانی کے سپرد کردیا۔ جوانی جو زندگی کا موسم بہار
تھی۔ آنکھوں میں نشہ بننے لگا' رخساروں میں روپ جل اٹھے
اور ہونٹوں پر ان کے نغمے گونجنے لگے۔ یاسمہ اور تابش اب
جوان تھے۔ دونوں خوش شکل تھے۔ یاسمہ کالج میں تھرڈ ایئر کی
اسٹوڈنٹ تھی۔ تابش اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا۔ وہ
ایک بے پروا اور کھلنڈرا نوجوان تھا۔ پڑھائی سے اسے کچھ
خاص دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے اچھے نمبروں سے
گریجویشن کیا تھا تاہم ماسٹرز میں آکر وہ پڑھائی کی طرف سے
کچھ اور بھی غافل ہوگیا تھا۔۔۔ اور اسے ڈگریوں کی کچھ ایسی
خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ چلا چلایا کاروبار تھا۔ وہ کسی
بھی وقت والد کے ساتھ کام میں شریک ہوسکتا تھا۔ اس کے
والد خود بھی چاہتے تھے کہ وہ آوارہ گردی چھوڑ کر بزنس میں
ان کا ہاتھ بٹائے۔ مگر تابش ابھی کچھ دن آزادی کے گزارنا
چاہتا تھا۔ جب والد زیادہ مجبور کرتے تو وہ چند روز آفس جاتا
لیکن اس کے من موجی دوست اسے وہاں بھی نہیں چھوڑتے
تھے۔ اس کے پیچھے آفس پہنچ جاتے۔ پھر بیٹھے بٹھائے لمبے
چوڑے پروگرام بن جاتے۔ کبھی سیر و سیاحت' کبھی شکار' کبھی
ان ڈور تفریحات۔
وقت کے ساتھ ساتھ یاسمہ اور تابش کا پیار بھی جوان
چڑھا تھا۔ دونوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں
اور عہد و پیمان کیے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے
تھے اور جن دنوں دیکھ نہیں سکتے تھے نہ جیتے تھے نہ مرتے
تھے۔ ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دونوں
فیملیز اکٹھے آؤٹنگ پر بھی چلی جاتی تھیں۔ ابھی تابش اور
یاسمہ کے رشتے کی بات نہیں چلی تھی لیکن دونوں طرف
ذہنوں میں یہ بات موجود تھی کہ یہ رشتہ ہونا ہے۔ جو بات
برسوں سے دلوں میں موجود تھی اسے ایک نہ ایک دن تو زبان
پر آنا ہی تھا۔
بے شک تابش لاابالی ذہن کا مالک کھلنڈرا نوجوان تھا
لیکن یاسمہ کے سلسلے میں اس کی سنجیدگی اور "کمٹ منٹ"
ہر شبے سے بالاتر تھی۔ اس کی زندگی کا رومانی پہلو صرف

یاسمہ سے عبارت تھا۔ وہ اس کی آنکھوں پر شعر کہتا' ہواؤں میں اس کی زلفوں کی خوشبو سونگھتا اور خوابوں میں اس کے ہونٹوں کی نرمی و حرارت محسوس کرتا۔ وہ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا' اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ اس کا دیوانہ تھا۔ کبھی جب وہ تنہائی میں ہوتے تو وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بیٹھا رہتا۔

وہ کہتی "تابی پلیز۔۔۔ چھوڑو میرے ہاتھ۔"

وہ کہتا "یہ تمہارے نہیں' میرے ہاتھ ہیں۔"

"تو پھر میرے ہاتھ کہاں ہیں؟"

"تمہارے ہاتھ یہ ہیں جن سے میں نے ان ہاتھوں کو پکڑا ہوا ہے اور بات صرف ہاتھوں ہی کی نہیں ہے۔ یہ آنکھیں جن سے تم مجھے دیکھ رہی ہو' میری ہیں اور یہ ہونٹ جو تمہارے چہرے پر مسکرا رہے ہیں میرے ہیں اور یہ رخسار جو تمہارے چہرے پر دہک رہے ہیں' یہ بھی میرے ہیں۔۔۔ اور یہ پاؤں۔"

"بس جناب بس' اتنی لمبی چوڑی شاعری کی ضرورت نہیں۔"

"یہ شاعری نہیں' حقیقت ہے۔"

"اچھا اگر یہ حقیقت ہے اور یہ سب کچھ تمہارا ہے تو پھر میری آنکھیں' ناک' کان ہونٹ وغیرہ کہاں ہیں؟"

"وہ سب میرے پاس ہیں۔ جب تمہیں ضرورت ہوگی دے دوں گا۔"

وہ اکثر ایسے موقعوں پر گہری سانس لے کر رہ جاتی۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا "تابش تمہارے نام کا مطلب ہے گرمی اور تپش۔ میرے نام کی نسبت ایک ناتواں پھول سے ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ تمہاری تپش سے میرے پھول کی پتیاں سیاہ ہو کر بکھر جائیں۔"

"تم ایسی باتیں مت سوچا کرو یاسمہ۔۔۔ تم ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو؟"

"شاید اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں۔ جس کی قسمت میں ازل سے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ مرد اسے ایذا پہنچائے گا اور وہ ہنسی خوشی یہ اذیت سہنے پر مجبور ہوگی۔"

وقت پل پل رواں دواں تھا۔ پھر انہی دنوں اوپر تلے کچھ ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے تابش کی زندگی کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ کاروباری زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ تابش کے والد چوہدری بشیر کو بھی کچھ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کاروبار میں نقصان ہوا تو وہ کچھ چڑچڑے سے ہوگئے۔ پہلے تو وہ تابش کی آوارہ گردی اور بے پروائی سے صرفِ نظر کرتے تھے لیکن اب انہیں یہ صورتِ حال کھلنے لگی۔ انہوں نے ایک دو بار تابش کو سرزنش کی اور سختی سے کہا کہ وہ دیگر مشاغل چھوڑ کر کاروبار کی طرف توجہ دے۔ پھر ایک روز انہوں نے اسے باقاعدہ ڈانٹا ڈپٹا۔ تابش ہمیشہ سے لاڈلا تھا۔ جس کو کبھی مارا نہ گیا ہو اسے پھول بھی مارا جائے تو پتھر کی طرح لگتا ہے۔ تابش کو اس ڈانٹ ڈپٹ نے بنیادوں سے ہلا دیا۔ باپ بیٹے میں جنریشن گیپ پہلے سے موجود تھا' یہ اس واقعے سے کچھ اور وسیع ہوگیا۔ تابش کئی روز بالکل گم صم رہا۔ یاروں دوستوں کی سب محفلیں چھوٹ گئیں' اور تو اور کئی ہفتے تک وہ یاسمہ سے بھی نہیں ملا۔ پھر ایک روز وہ اس سے ملا۔ حسبِ معمول "جائے ملاقات" گھر کی چھت تھی۔ دونوں گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ درمیان میں بس چار فٹ اونچی ایک منڈیر تھی۔ وہ دونوں منڈیر کے آر پار کھڑے ہوگئے۔ چاند ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ دور تک نظر آنے والی چھتیں' گلیاں اور بالکونیاں سب کچھ محوِ خواب تھا۔ دن بھر کی تپش کا ازالہ کرنے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تابش کا لہجہ غم سے بوجھل تھا "یاسمہ' میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے طور پر کچھ کر کے دکھاؤں گا۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں یاسمہ۔ میں نے سوچا ہے یاسمہ کہ میں کینیڈا جاؤں گا۔ وہاں میرا دوست بزنس مینجمنٹ کا کام کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ مل کر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

تابش کے لب و لہجے نے ایک دم یاسمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ان کی محبت کا گلشن خزاں کی زد میں آنے والا ہے۔ اب یہ خزاں کتنی طویل ہوگی' اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا "کیا بات ہے چپ کیوں ہوگئی ہو؟" تابش نے پوچھا "ابھی سے تو اداسی نے نہیں گھیر لیا ہے!"

"اگر میں کہوں کہ ہاں ایسا ہے تو کیا تم اپنا ارادہ بدل دو گے؟"

تابش نے گہری سانس لی "یاسمہ! میرا جو بھی قدم اٹھتا ہے وہ تمہاری راہ میں اٹھتا ہے۔ میں اب جو کچھ کرنے جا رہا ہوں سمجھو یہ بھی تمہارے لیے ہے۔ میں تمہاری نظروں میں سربلند رہنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے میں اپنی نظروں میں سربلند ہو سکوں۔ میرے سینے میں بہت زیادہ گھٹن بھر گئی ہے یاسمہ! ابو جان کی باتیں سننے کے بعد میں خود کو اپنی نظر میں بونا محسوس کرنے لگا ہوں۔ اتنا بونا کہ تمہارا ہاتھ تک نہیں تھام سکتا۔ میں اپنا اعتماد بحال کرنا چاہتا ہوں

یاسمہ اور اس کے لیے تمہیں میری تھوڑی سی جدائی برداشت کرنا پڑے گی۔"

"کہتے ہیں جدائی بڑی ظالم ہوتی ہے تابی۔ یہ بندے کے دل سے آہستہ آہستہ غم کا احساس بھی مٹا دیتی ہے۔"

"کیا تمہیں اپنے اور میرے غم پر اعتبار نہیں" تابش نے کچھ ایسے والہانہ لہجے میں کہا تھا کہ یاسمہ ایک لفظ نہیں بول سکی تھی۔ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر گویا ہوا تھا "یاسمہ! تیری یہ آنکھیں' یہ ہونٹ' یہ رخسار' تیرے سانسوں کی یہ مہک' کیا یہ بھولنے والی چیزیں ہیں۔ نہیں میری جان۔۔۔ تو میرے دل و دماغ پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہے۔ میں چاہوں بھی تو یہ لکیر مٹا نہیں سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے تابی' جاؤ اپنا مستقبل سنوارو' میں وہی کروں گی جو مجھ جیسی لڑکیاں ہمیشہ سے کرتی آئی ہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ہر دن' ہر پل۔ تمہارا راستہ زندگی کی آخری سانس تک بھی دیکھنا پڑا تو دیکھوں گی۔"

تابش نے اس کے چہرے پر محبت کی بارش کردی تھی۔

اور پھر تابش چلا گیا۔ گرد و پیش یاسمہ کے لیے ویران ہوگئے تھے۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہی سڑکیں اور بازار' وہی دھوپ چھاؤں کے زاویے' وہی نیلا آسمان لیکن کچھ بھی ویسا نہیں تھا۔ ایک شخص سارے شہر کی رونق سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور تو اور یاسمہ کا دل پڑھائی سے بھی اچاٹ ہوگیا۔ حالانکہ بی اے اس نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا پھر بھی اس نے سوچ لیا کہ وہ آگے نہیں پڑھے گی۔ اسے کالج اور کالج کے راستوں سے بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ وہاں بھی تو ہر طرف تابش کی یادیں ہی بکھری ہوئی تھیں۔۔۔ اور پھر کلاس فیلوز اور سہیلیاں تھیں۔ وہ کس کس کو اپنے ہجر کی کہانی سناتی۔

وہ روز بروز اندروں میں اور اکیلی ہوتی جارہی تھی۔ اداسی کے بے کراں سمندر میں بس امید کے چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے' یہ وہ خطوط تھے جو تابش سات سمندر پار سے بھیجتا تھا۔ ان دنوں یاسمہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ بس ان خطوط کے لیے ہی جیتی ہے۔ سات دن بعد ایک خط موصول ہوتا تھا اور وہ سات دن مسلسل اسے پڑھتی رہتی تھی۔۔۔ اگر کسی وقت فون پر تابش کی آواز سن لیتی تھی تو یہ ایک ایسا بونس ہوتا تھا جس کی سرشاری کئی روز یاسمہ پر طاری رہتی تھی۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ کہانیوں کے کرداروں کی طرح کسی دیوار پر بہت سی تاریخیں لکھ ڈالے پھر گزرنے والے ہر دن کو اپنے انتظار میں سے نفی کرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے کاٹتی جائے لیکن اسے یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ اسے کتنی تاریخیں لکھنی ہیں۔ ایک سال کی دو سال کی یا دس سال کی۔ جانے والا آنے کا کوئی وعدہ بھی تو نہیں کرتا تھا کوئی آس بھی تو نہیں بندھاتا تھا۔

یاسمہ کے اہل خانہ اس کی دلی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ امی ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگی رہتیں۔ ابو سیر و تفریح کے نئے نئے پروگرام بناتے' دادی ماں دن رات صدقے پھیرتیں اور اسے پھونکیں مارتی رہتیں۔ اکلوتی پوتی تھی انہیں تو اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ کبھی انہیں وہم ہوجاتا کہ یاسمہ بیمار ہے' کبھی وسوسہ الٹھتا کہ کسی نے تعویذ دھاگا کروایا ہے۔ بس ہر وقت اپنے تخلیق کردہ مسائل کے حل میں لگی رہتیں۔ ابو اور امی کی طرح غالباً انہیں بھی معلوم تھا کہ یاسمہ کا اصل روگ کیا ہے' بس وہ خود فریبی کی مشق کرتی رہتی تھیں۔

امی نے اکیلے میں اسے بہت سمجھایا کہ وہ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرے۔ اسے پڑھائی نہیں چھوڑنی چاہیے تھی بلکہ کوشش کرنی چاہیے تھی کہ اس کی مصروفیت میں اضافہ ہو مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔ اس کی بس ایک ہی مصروفیت تھی' تنہائی میں بیٹھ کر تابش کو طویل خط لکھنا اور اس کے خطوں کو بار بار پڑھنا یا کبھی کبھی وہ تابش کی والدہ کے پاس چلی جاتی۔ ان سے ڈھیروں باتیں کرنے کا یاسمہ کو چسکا سا پڑ گیا تھا۔ وہ بھی کسی اور یاسمہ کی ان اسٹاپ باتیں نہ سنتیں تو انہیں چین نہ آتا۔

انہی دنوں تابش کو مانٹریال میں ٹریننگ کا ایک عارضہ لاحق ہوگیا۔ اس کے بازو میں دو تین فریکچر ہوئے۔ اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس کا علاج کافی طویل ثابت ہوا۔ تین چار ماہ وہ اسپتال میں ایڈمٹ رہا۔ اس دوران میں اس سے یاسمہ کا قلمی رابطہ بھی قریباً منقطع رہا۔ تابش نے اپنا علاج معالجے کے لیے پاکستان سے کچھ رقم منگوائی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ چوہدری بشیر اپنے اور بیٹے کے درمیان خلا کو ختم کرنے کے لیے اس موقع پر پیش رفت کرتے' رقم بھیج دینے کے بعد ہو سکتا تو خود بھی چلے جاتے لیکن انہوں نے اس موقع کو ضائع کیا بلکہ اپنے رویے سے "جنریشن گیپ" کو مزید وسیع کرلیا۔ انہوں نے مطلوبہ رقم سے بہت کم رقم بھیجی اور ساتھ ہی پند و نصائح سے بھرا ہوا ایک خط بھی بھیجا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ اکلوتے بیٹے پر معاشی دباؤ پڑے گا تو وہ واپس ان کی پناہ میں آنے کا سوچے گا لیکن اس کا الٹا اثر ہوا۔ تابش نے اپنی جوابی خط کے ساتھ رقم کا ڈرافٹ واپس بھیج دیا۔۔۔ تابش ا

والدہ کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ تڑپ اٹھیں۔ انہوں نے رازداری سے اپنا زیور بیچا اور جیسے تیسے رقم اکٹھی کرکے اپنے طور پر بیٹے کو ارسال کردی۔ یہ رقم بھی چند روز بعد تابش کی والدہ کو واپس مل گئی۔ تابش نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنے بازو کے زخم بھرنے کے لیے اپنی ماں کی کلائیاں نہیں کرسکتا۔

اس کے بعد اچانک تابش کے خطوط آنا بالکل بند ہوگئے۔ وہ کسی کو نہیں لکھتا تھا' نہ اہل خانہ کو' نہ یاسمہ کو نہ کسی اور یار دوست کو۔ گجرات میں اس کا ایک بہت قریبی دوست ملک نصیر تھا۔ دو تین ماہ بعد بس اسی کو ایک خط ملا تھا۔ اس خط میں تابش نے لکھا تھا کہ اس نے کینیڈا چھوڑ دیا ہے' اب وہ امریکا میں ہے اور یہاں تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک میڈیکل اسٹور میں کام کررہا ہے۔ اس خط میں تابش نے اپنا ایڈریس یا فون نمبر وغیرہ نہیں لکھا تھا۔ تابش کے اہل خانہ نے سرتوڑ کوشش کی کہ کینیڈا میں تابش کے دوست جمل یا کسی اور جاننے والے سے اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہوجائے لیکن ناکامی ہوئی۔

یاسمہ کے گلشن محبت پر چھائی ہوئی خزاں کی پرچھائیاں طویل اور گہری ہوتی چلی جارہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ تابش اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے لیکن حالات نے آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ لیا تھا اور یاسمہ سے لامتناہی فاصلوں پر لے گیا تھا۔ جدائی کی طویل سرد راتوں میں وہ پہروں بستر پر جاگتی رہتی۔ کبھی کبھی کھوئی کھوئی سی آئینے کے سامنے کھڑی ہوجاتی۔ اپنی خمار آلود آنکھوں کو دیکھتی' اپنے گداز ہونٹوں کو اپنے ریشمی رخساروں کو۔ ہاں یہی وہ چہرہ تھا جس پر تابش دیوانہ وار محبت کی بارش کردیا کرتا تھا۔ اب یہ چہرہ اس سے کتنی دور تھا۔ یہ آنکھیں' یہ ہونٹ' یہ زلفیں' یہ سانسوں کی حرارت' کچھ بھی تو اس کی دسترس میں نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی' وہ ان سب چیزوں کے بارے میں سوچتا ہوگا' تنہائیوں میں اس کے تصور کو اپناتا ہوگا۔ اس کو پانے کے لیے ترستا ہوگا۔

وہ ایسے سوچتی تو اسے اپنی "خوب روئی" سے اور اپنے آپ سے چڑ سی ہونے لگتی "جب دیکھنے والا اور سراہنے والا ہی پاس نہیں تھا تو پھر یہ سب کچھ کیوں تھا' کیوں لوگ راہ چلتے مڑ مڑ کر اس کے بالوں کو دیکھتے تھے' اس کی آنکھوں کو سراہتے تھے' اس کے خدوخال کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ یہ سب لوگ اس کی محرومی کو بڑھاوا دیتے تھے۔ اس محرومی کے حوالے سے یاسمہ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ کسی وقت وہ خلیوں کے انداز میں اپنے آپ کو کوسنے لگتی۔ وہ اپنے رخساروں کو کوستی جو اس کے محبوب کے پیاسے ہونٹوں کو سیراب نہیں کرسکتے تھے۔ وہ اپنی گھنیری زلفوں کو کوستی جو اس کے لیے چھاؤں نہیں بن سکتی تھیں اور اپنے پُرشباب جسم کو کوستی جس کے لمس کے لیے کوئی پردیسی شب و روز ترستا تھا۔

اس کی سوچوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود سے بالکل بے پروا رہنے لگی۔ ہیئر ڈریسر کے پاس تو وہ پہلے بھی زیادہ نہیں جاتی تھی۔ اب لباس کا اہتمام بھی ختم ہوگیا۔ نہ خوراک کا خیال' نہ دھوپ چھاؤں کا۔ وہ اپنے آپ سے وہی سلوک کرنے لگی جو کسی بے آباد مکان کے پھول پودوں سے کیا جاتا ہے۔ پہلی نظر میں وہ دیکھنے والے کو اجڑی بکھری اور خستہ حال نظر آتی تھی۔ اہل خانہ نے بہت سمجھایا' دادی ماں نے تو روگ سا لگالیا لیکن وہ کسی کی سنتی ہی کب تھی۔ دادی ماں کے تمام سوالوں کا جواب بس وہ یہی دیتی "دادی ماں۔ بس اب زیادہ جینے کو جی نہیں چاہتا۔"

دادی ماں اس کی کمر پر دوہتڑ مارتیں "تو میری جان ضرور لے کر چھوڑے گی۔ دیکھ جاکر ذرا آئینے میں۔ ایسے لگتا ہے ہمارے گھر کی لڑکی ہی نہیں ہے' کھلتے میں نکلتا تھا تو ایسے اٹھائے دیکھنے کو ملتے تھے۔"

وہ سر گھٹنوں میں دیے مسکراتی رہتی۔ دادی ماں بہو کو آواز دیتیں "اے بہنا' مجھے تو چھوڑ آجاکر اپنی بہن کے گھر۔ مجھ سے نہیں دیکھی جاتی اب یہ مصیبت۔ غضب خدا کا۔ میرے معصوم کانوں کو اب یہ بھی سننا تھا کہ میری پوتی میرے سامنے اپنے مرنے کی دعا کرے۔"

بہو سنی اَن سنی کردیتی تو سفید براق بالوں والی یہ پیاری سی بوڑھی عورت تیزی سے آگے پیچھے جھولنا شروع کردیتی اور تسبیح کے دانوں پر اس کی لرزاں انگلیوں کی حرکت تیز ہوجاتی۔ وہ تشویش ناک لہجے میں کہتی "یاسمہ۔ یاسمہ ضرور تیرے اوپر کسی نے تعویذ گنڈا کردیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے منہ میں بدبداتی اور یاسمہ پر پھونکنا شروع کردیتی۔ یاسمہ کے افسردہ چہرے پر تھوڑی سی شوخی ابھرتی۔ وہ دادی کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی "بس کریں دادی ماں۔ کسی دن آپ کی ساری ہوا نکل ہوجائے گی۔"

"اے ہے میں کب ڈرتی ہوں" وہ کہتیں "کل کی ہوتی آج ختم ہوجائے۔ جو چند روہیں گنے رہ گئے ہوں' وہ بھی مجھے ہی لگ جائیں۔ سو برس سے اوپر کی ہوجائے تو۔"

ایک دن آئینے کے سامنے یونہی کنگھی کرتے ہوئے یاسمہ کے دل میں عجیب سی بات آئی۔ اس نے اپنی اجڑی

اجڑی صورت دیکھی اور سوچا۔۔۔ کہ یہ وہ کیا کر رہی ہے؟ اسے لگا کہ جیسے وہ کسی کی "امانت" کی طرف سے بے پروائی برت رہی ہے۔ یہ ہونٹ' یہ رخسار' یہ آنکھیں کس کی تھیں؟ اسی کی تھیں جس نے کہا تھا کہ یہ سب کچھ میرا ہے۔ اگر یہ سب کچھ اس کا تھا تو پھر اس کی امانت تھا۔۔۔ اور امانت کو تو بڑے خیال سے' بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ وہ کیوں اس امانت کی حفاظت نہیں کر رہی تھی؟ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کی سوچ کا رخ بدل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے آپ کو ایک بالکل مختلف زاویے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ چھوئے' اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا' اپنی زلفوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔۔۔ اس کے دل نے گواہی دی' یاسمہ یہ سب کچھ تیرا کہاں ہے' یہ تو اس کا ہے جسے یہ سب کچھ درکار ہے۔ جس کے بارے میں وہ شب و روز سوچتا ہے۔

یاسمہ کے ذہن میں جو بات بیٹھتی تھی بڑی پختگی کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ اس کے چہرے کی خوب صورتی اور اس کے جسم کی موزونیت اس کی اپنی نہیں ہے' یہ تو سب اس کے محبوب کی امانتیں ہیں اور اگر یہ محبوب کی امانتیں ہیں تو پھر انہیں سنبھال کر رکھنا چاہیے' ان کی نگہداشت کرنی چاہیے۔ دھیرے دھیرے وہ اپنا خیال رکھنے لگ گئی۔ اب آئینے کے سامنے کھڑے ہونے سے اس کے دل پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ وہ خود کو سنوارتی تھی' بالوں کا اور لباس کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خاموشی اور اداسی بھی اب کم ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے تابش کا خط یا فون ضرور آئے گا۔ وہ سب سے ناراض ہو سکتا تھا لیکن اس سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ جہاں بھی ہو گا صرف اسی کا ہو گا۔

اور پھر ایک عید ایسی آئی تھی کہ عید سے پہلے ہی عید ہو گئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے ٹیلیفون کی گھنٹی اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری بن گئی تھی۔ اس نے "ہیلو" کہا تھا اور دوسری طرف سے جیسے صدیوں کا فاصلہ طے کر کے تابش کی آواز سنائی دی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ یاسمہ' کیسی ہو؟"

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔ اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ پھر اس ڈر سے کہ دو سال بعد سنائی دینے والی یہ آواز کہیں پھر معدوم نہ ہو جائے وہ اپنی پوری قوت جمع کر کے آہستگی سے بولی تھی "میں ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟"

"بس زندہ ہوں۔"

"میرا قصور بتا سکتے ہو؟"

"میں بھی تین برسوں سے یہی سوال اپنے حالات سے پوچھ رہا ہوں۔"

وہ رو پڑی تھی۔ اسے رونا بہت اچھا لگا تھا۔۔۔ اور وہ خاموشی بہت اچھی لگی تھی جو کئی سیکنڈ تک ٹیلی فون لائن پر مسلط رہی تھی پھر وہ اپنی سسکیاں روکتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ سکی تھی "میں تمہارا انتظار۔۔۔ انتظار کر رہی ہوں تابش۔۔۔ اور جب تک نہ آؤ گے' کرتی رہوں گی۔"

"میرے لیے دعا کرنا یاسمہ!"

"تم کہاں ہو' بتاؤ' خدا کے لیے اتنا تو بتا دو' کس شہر میں ہو' کس ملک میں ہو؟"

"بس یہ بتا سکتا ہوں کہ فی الحال عالمِ بالا میں نہیں ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی یاسمہ کو خدا حافظ کی آواز آئی تھی اور سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

یاسمہ کی امید بندھی تھی کہ شاید اب کبھی کبھار تابش کا فون آ جایا کرے گا لیکن یہ امید پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے دل کی گھنا ٹوپ تاریکی میں ایک جگنو چمکا کر وہ پھر نہ جانے کس دنیا میں کھو گیا تھا۔۔۔ بلکہ پانچ چھ ماہ بعد یوں ہوا کہ تابش کے گجراتی دوست ملک نصیر کو بھی تابش کے خطوط آنا بند ہو گئے۔ تین چار ماہ پہلے تابش کی والدہ بیٹے کی دید کو ترستی ہوئی راہی عدم ہو چکی تھیں۔ دل کے ایک شدید دورے نے ان کی ساری مشکلیں چند لمحوں میں آسان کر دی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد تابش کے گھر سے یاسمہ کا تعلق اور بھی کمزور ہو گیا تھا۔ وہ جو گھڑی دو گھڑی کے لیے تابش کی والدہ کے پاس جا بیٹھتی تھی اور اپنے سینے کی گھٹن دور کرنے کی کوشش کرتی تھی' اپنے اس سہارے سے بھی محروم ہو گئی۔ انہی دنوں اس نے خلائی میں بے تحاشا سوچنا شروع کر دیا اور قنوطیت اس پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔

دادی ماں کو اس سے بے انتہا پیار تھا۔ ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں یاسمہ کو دلہن بنتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یاسمہ کے ایک ماموں زاد بھائی شہزاد کو گرمیوں کی تعطیلات گزارنے کے لیے ملتان سے لاہور بلایا گیا۔

درحقیقت کئی برسوں سے شہزاد کے گھر والے دبے دبے لفظوں میں یاسمہ کا رشتہ مانگ رہے تھے۔ ان دنوں چونکہ اس خانہ کا رجحان تابش کی طرف تھا لہٰذا شہزاد اور اس کے اہل

خانہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی تھی۔ اب حالات یکسر مختلف تھے لہٰذا اس رشتے کے سلسلے میں "مخالف رائے رکھنے والے" عرفان صاحب نے بھی شہزاد کو لاہور بلانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

شہزاد لاہور آگیا۔ وہ ایک ہینڈسم وجیہہ نوجوان تھا۔ ایک بینک میں آفیسر تھا۔ ترقی کے مواقع بھی تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران میں شہزاد اپنی وجاہت اور خوش گفتاری کے سہارے یاسمہ کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگا۔ شہزاد شادی کے لیے ایک آئیڈیل نوجوان تھا۔ گھر والوں اور خاص طور سے دادی ماں کی بھی پُرزور خواہش تھی کہ یاسمہ شہزاد سے شادی کے لیے ہاں کہہ دے۔

ایک دن یاسمہ تنہائی میں دیر تک سوچتی رہی۔ تابش اس سے نامعلوم فاصلوں پر تھا۔ اس نے کب سے رابطہ نہیں کیا تھا' خط نہیں لکھا تھا۔ کیا پتا اس کے دل کا موسم اب کیا تھا۔ وہ کن ہنگاموں میں گم تھا۔ ایک بے نام آس اور بے کراں انتظار کے سہارے وہ کب تک زندگی گزار سکتی تھی۔ اگر معاملہ صرف اس کا اپنا ہوتا تو اور بات تھی لیکن اب امی ابو' دادی ماں' عزیز رشتے دار۔۔۔

اچانک ایک نئے خیال سے وہ چونک پڑی۔ شادی دو انسانوں کا ملاپ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دو جسموں کا بھی۔۔۔ لیکن جسم کے نام پر تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ یہ رخسار' یہ لب' یہ آنکھیں' یہ ہاتھ۔۔۔ کچھ بھی تو اس کا نہیں تھا۔ یہ تو سب کسی کی امانتیں تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ لیے پھرتی تھی۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔ ان میں سے کوئی چیز اس کی اپنی نہیں ہے۔ اس نے بے پناہ سنجیدگی کے ساتھ سوچا۔ ان لمحوں میں اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں پیچھے چلی گئی ہے۔ ایک بھولا بسرا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ وہ کمرے میں دروازہ بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بیڈ پر ٹافیوں کے بہت سے پیکٹ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا ہاتھ بار بار ٹافیوں کی طرف بڑھتا تھا لیکن پھر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ یہ پیکٹ کسی کی امانت تھے۔ وہ انہیں کیسے چھو سکتی تھی کیونکر استعمال کر سکتی تھی۔ وہ بچپن کی بات تھی آج برسوں بعد اس نے اپنے ماموں زاد شہزاد کے بارے میں سوچا تھا تو اسے کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ وہی امانت کی پاسداری کا غیر معمولی احساس۔۔۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہونے لگی کہ چند لمحے پہلے اسے کیا ہوگیا تھا۔ اس نے شہزاد کے بارے میں کیوں سوچا تھا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا شہزاد کو دینے کے لیے۔ جو کچھ اس کے پاس نظر آتا تھا' اس کا اپنا نہیں تھا۔۔۔ یہ تو کسی اور کی "امانتیں" تھیں۔

اس دن کے بعد وہ جب بھی آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اسے یوں لگا کہ جو کچھ بھی اسے نظر آرہا ہے' وہ اس کے اپنے جسم کا حصہ نہیں۔ اگر وہ اپنے جسم کے مختلف حصوں کی دیکھ بھال کرتی تھی' انہیں بناتی سنوارتی تھی یا ان کی تکلیف اور راحت کا خیال رکھتی تھی تو صرف اس لیے کہ یہ سب اعضا اس کے پاس تابش کی امانت تھے۔۔۔ اور یہ خیال گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یاسمہ کے ذہن میں پختہ تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ایک روز اس کے لمبے گھنے بالوں میں بڑے پیار سے کنگھی کرتے ہوئے اس کی امی نے کہا کہ اس نے شہزاد کے بارے میں کیا سوچا ہے تو وہ بڑی حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی امی!"

"جان! میں پوچھ رہی ہوں کہ تم نے شادی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"کیسی شادی امی!" وہ ماں کی طرف رخ پھیر کر بولی۔ "میں کیسے کر سکتی ہوں شادی؟ آپ جانتی ہیں میں نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتی ہو تم؟" وہ حیرانی سے بولیں۔

"بس نہیں کر سکتی۔"

وہ بیجان انداز میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی چلی جارہی تھی۔ یہی ہاتھ تھے جنہیں تابش نے اپنے ہاتھوں میں تھاما تھا جن پر اپنے جلتے لبوں سے بوسے دیے تھے۔ کیا وہ تابش کے ان "پیارے ہاتھوں" میں کسی اور کے نام کی انگوٹھی پہن سکتی تھی' ہرگز نہیں۔

"امی' آپ شہزاد کے ہاتھوں میں کس کا ہاتھ تھمانا چاہتی ہیں" وہ روتے ہوئے بولی اور اپنا سر ماں کی گود میں پھینک دیا "آپ اس ہاتھ کو میرا ہاتھ سمجھ رہی ہیں لیکن یہ میرا نہیں ہے' یہ میرا نہیں ہے۔"

ماں نے تشویش ناک نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کا سر سینے سے لگا کر بھینچ لیا "شاید تیری دادی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تجھ پر کسی نے کچھ پھونک دیا ہے۔"

اہل خانہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن یاسمہ نے شادی کے لیے "ہاں" نہیں کہی۔ نفسیاتی دباؤ کے سبب وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ کسی وقت بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی تھی۔ گھر والوں نے سوچا کہ کہیں معاملات زیادہ نہ بگڑ جائیں لہٰذا رشتے کے معاملے کو ٹھپ کر دیا گیا۔ شہزاد بھی مایوسی دل میں

چھپائے واپس ملتان چلا گیا۔

یاسمہ کی طبیعت سنبھل گئی اور ذہنی حالت بھی بہتر ہو گئی لیکن وہ بالکل کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ بس اس کی صرف ایک مصروفیت ایسی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں زندگی کی امنگ ابھی باقی ہے۔ وہ اپنے لباس' خوراک اور کسی حد تک بناؤ سنگار کا خیال رکھتی تھی' اس کی آنکھیں بے شک غم میں ڈوبی رہتی تھیں لیکن چہرہ تروتازہ نظر آتا تھا۔ بال سلیقے سے کنگھی کیے ہوتے تھے' ہاتھ پاؤں کی نگہداشت پر بھرپور توجہ دیتی تھی۔ موسم اور وقت کے مطابق لباس کا انتخاب کرتی تھی۔ اس کی عمر چھبیس سال سے اوپر ہو گئی تھی لیکن جسم میں بھدے پن کا شائبہ تک نہیں تھا یقیناً اس "اسمارٹ نیس" میں متوازن خوراک اور باقاعدہ ورزش کا عمل دخل تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اپنے ہر ہر عضو کو والہانہ پیار سے دیکھتی' اسے لگتا جیسے وہ اپنے اعضا نہیں دیکھ رہی' اپنے بچھڑے محبوب کی نشانیاں دیکھ رہی ہے۔ یہ خیال پتھر کی لکیر کی طرح اس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا کہ وہ سب کچھ جو آئینے میں نظر آتا ہے' اس کے تابش کا ہے۔ پھر کبھی کبھی وہ سوچتی' تابش کے پاس بھی تو اس کی کچھ امانتیں ہیں' وہ روشن پیشانی' وہ شریر آنکھیں' وہ گھونگھریالے بال' وہ چوڑے شانے۔ کیا اس نے بھی کبھی اس انداز میں سوچا ہوگا؟ کیا اس نے خیال کیا ہوگا کہ یہ کسی اور کی چیزیں ہیں جو اس کے پاس امانتاً موجود ہیں۔ ایسے میں پھر اس کا ذہن سترہ اٹھارہ برس پیچھے چلا جاتا۔ ایک عجیب سی اداسی اس کے دل و دماغ میں بھر جاتی۔ اسے وہی ڈرائی فروٹس اور سوئٹس والا واقعہ یاد آجاتا۔ کہیں اس بار بھی تو ایسا نہیں ہوگا۔ کہیں اس بار بھی تو تابش۔

اس سے آگے وہ کچھ بھی سوچ نہ سکتی اور اس کی سوچ پر قفل سا لگ جاتا۔

○☆○

اور پھر اسی طرح جدائی کے بارہ برس گزر گئے۔ دادی ماں یاسمہ کے جسم پر عروسی جوڑا دیکھنے کی حسرت لیے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ یاسمہ کی والدہ بھی اکثر علیل رہتی تھیں۔ یاسمہ اب قریباً بیس برس کی ہو چکی تھی۔ گزرتا ہوا وقت اس کے حسن و جمال میں سے بہت کچھ چرا کر لے گیا تھا۔ چہرے پر وہ دورِ شباب کی سی تازگی باقی نہیں رہی تھی۔ آنکھیں کی جادو اثر چمک' ہونٹوں کی شادابی' جسم کی دلکشی' تھوڑا تھوڑا سب کچھ کھویا تھا اس نے اگر کوئی چیز کم نہیں ہوئی تھی تو وہ تابش کی محبت تھی اور اس کا انتظار تھا بلکہ یہ دونوں چیزیں تو شاید پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھیں۔ سرما کی سرد شاموں میں' بہار کی چمکیلی صبحوں میں اور گرمیوں کی طویل سنسان دوپہروں میں وہ اکثر ٹکٹکی باندھے ٹیلی فون سیٹ کو دیکھتی رہتی تھی۔ آٹھ نو برس گزرے تھے جب اس ٹیلی فون پر آخری بار اسے تابش کی آواز سنائی دی تھی۔ ہاں وہ آٹھ نو برس پہلے کی عید تھی۔ اس کے بعد کئی عیدیں گزری تھیں۔ سیکڑوں روز و شب بیت گئے تھے اس نے ہر پل کسی نامعلوم مقام سے آنے والے ٹیلی فون کال کا انتظار کیا تھا۔ مگر وہ کال نہیں آئی تھی۔ اس نے لاتعداد مرتبہ بڑے دکھ سے سوچا تھا' تابش' تم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو اس ٹیلی فون سیٹ کے ذریعے مجھ سے منسلک ہو۔ تاروں میں دوڑتا ہوا کرنٹ چند لمحات میں ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ سکتا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ تم ایسا کرنا چاہو۔ تم کب ایسا کرنا چاہو گے تابی۔ کب چاہو گے؟ دیکھو اب تو میرے بالوں میں چاندی اترنے والی ہے' میری زندگی کا پھول مرجھانے لگا ہے۔

اور پھر ایک روز ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا دوسری طرف سے آواز آئی "میں تابش بول رہا ہوں یاسمہ!"

نو سال پہلے کی طرح ایک بار پھر اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے لب تھرا رہے تھے لیکن وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس شدید خوف کے تحت کہ کہیں وہ فون بند نہ کر دے' اس نے ایک لرزتی کانپتی ناقابلِ شناخت آواز میں کہا تھا "ہیلو تابش!"

"کیسی ہو یاسمہ؟"

"کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ تم تابش ہی ہو نا؟"

"ہاں میں تابش ہوں" وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا۔ "تم سے ملنا چاہتا ہوں' تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کہاں ہو تم؟" یاسمہ کا سوال جیسے بازگشت بن کر پوری کائنات میں پھیل گیا۔

"یہیں' تمہارے لاہور میں ہوں۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"تابش! کہیں میں مر نہ جاؤں' مجھ سے یہ حیرت سنبھالی نہیں جا رہی۔"

وہ دونوں قریباً پندرہ منٹ فون پر بات کرتے رہے۔ اس گفتگو سے یاسمہ کو معلوم ہوا کہ تابش ایک روز پہلے ہی نیویارک سے لاہور پہنچا ہے۔ وہ دواؤں کا کاروبار کر رہا ہے۔

وطن کی شدید کشش کے باوجود وہ اپنی مصروفیات کے سبب پاکستان آنے کا وقت نہ نکال سکا۔ اب وہ پاکستان آیا تھا لیکن بہت رازداری سے۔ عزیز و اقارب تو کجا اس کے اہلِ خانہ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے۔ اس نے یاسمہ کو تاکید کی تھی کہ اس کی موجودگی کی خبر وہ صرف اپنے تک رکھے۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے یاسمہ کو اپنا روم نمبر بھی بتایا۔

اس شام لرزتے جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ یاسمہ ہوٹل کے اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی جہاں تابش ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی دستک کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا وہ تابش سے کافی مختلف تھا لیکن تابش تھا۔ بارہ برس میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ جسم پہلے سے کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ پیشانی پر سے بال اڑے اڑے تھے۔ آنکھوں پر نظر کی عینک بھی آگئی تھی۔ بہرطور اس کے مسکرانے اور بات کرنے کا انداز وہی تھا۔ اسے دیکھ کر یاسمہ دروازہ پار کرنا ہی بھول گئی۔ اس نے بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اندر لے گیا۔

"تم اکیلی ہی آئی ہو؟" اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں" یاسمہ نے روانی میں جواب دیا۔

پھر اچانک اس سوال کی گہرائی یاسمہ پر آشکار ہوئی۔ وہ چونک کر تابش کی طرف دیکھنے لگی۔

اس نے چند لمحے تک تابش کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ پھر اس کے ہونٹوں سے نکلا "تم اکیلے نہیں ہو تابش؟"

"یہاں۔۔۔ یہاں تو اکیلا ہی ہوں۔"

"یہاں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

تابش نے قیمتی لائٹر سے سگریٹ سلگائی اور بڑے دھیمے لہجے میں بولا "میں شادی کر چکا ہوں یاسمہ۔"

یاسمہ کو دھچکا لگا لیکن یہ دھچکا اتنا شدید نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ نہ اس پر سکتہ طاری ہوا' نہ وہ تنگ ہوئی' نہ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھایا۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر وہ پہلے ہی اس دھچکے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ ماضی کی کسوٹی پر اس نے حالات کی ہر کروٹ کو پرکھ لیا تھا۔

"کتنے بچے ہیں؟"

"دو!" تابش نے جواب دیا "تین سالہ بیٹی راحت اور دو سالہ بیٹا فہد۔"

"بیوی امریکن ہے؟"

"نہیں' انگلش۔" تابش نے سر جھکائے جھکائے کہا پھر یاسمہ کی آنکھوں سے بمشکل آنکھیں ملا کر بولا "اور تم۔۔۔ میرا مطلب ہے تم نے شادی کی؟"

"شادی!" یاسمہ کے چہرے پر ہیجانی اثرات ابھرے۔ "کیسی شادی۔۔۔ میں کیسے کر سکتی تھی شادی؟"

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پانی کی دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دیوانے سے لہجے میں بولی "تم نے کہا تھا' یہ میرے ہاتھ ہیں' میں تمہارے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی کیسے لگا سکتی تھی۔ بولو۔۔۔ تم نے کہا تھا نا یہ میرے ہاتھ ہیں؟" اس نے اپنے دونوں ہاتھ تابش کے سامنے کر دیے۔

"تمہاری۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا یاسمہ!"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں" اس نے کہا۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ تابش ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

○☆○

وہ ایک خنک اور طوفانی رات تھی۔ پہلے تیز جھکڑ چلے تھے پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ تابش نے کھڑکی سے پردے ہٹا کر دیکھا۔۔۔ ہوٹل کے سامنے سے ایک معروف سڑک گزرتی تھی۔ سڑک پر درختوں کی بڑی بڑی شاخیں گری ہوئی تھیں۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں بارش کی بوچھاڑیں چمک رہی تھیں۔ وہ بارہ سال کے طویل عرصے بعد اپنے شہر کو دیکھنے آیا تھا۔ ان گلی کوچوں کو دیکھنے آیا تھا جن میں بچپن اور لڑکپن گزرے تھے اور جہاں شباب نے انگڑائی لی تھی اور سب سے بڑھ کر وہ یاسمہ کو دیکھنے آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اسے توقع تھی کہ یاسمہ اب تک شادی کر چکی ہو گی اور اس کے آنگن میں ایک دو پھول بھی کھل چکے ہوں گے۔ لیکن کل یاسمہ سے ملنے کے بعد وہ ششدر رہ گیا تھا۔ درمیانی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ ابھی غیر شادی شدہ تھی۔ اس سے ملنے کے بعد اور اس کے دکھ کو محسوس کرنے کے بعد نہ جانے کیوں تابش کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اپنا ارادہ بدل ڈالے۔ اپنے اس پروگرام پر نظرِ ثانی کر لے کہ اپنی آمد کو ہر کسی سے چھپا کر رکھے گا۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ یاسمہ کے ابو امی سے ملے۔ ان سے یاسمہ کے بارے میں تفصیل سے پوچھے اور انہیں اپنے بارے میں بتائے۔۔۔ پھر اگر ہو سکے تو وہ یاسمہ کے اہلِ خانہ کو مجبور کرے کہ وہ اس کی شادی کر دیں۔ بے شک اب وہ لڑکی نہیں عورت تھی مگر

اپنے گھر بار کی ہو سکتی تھی۔

اچانک وہ اپنے خیالات سے چونک گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور بھونچکا رہ گیا۔ سامنے یاسمہ کھڑی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی ایک نہایت خوب صورت کامدار ساڑی پہن رکھی تھی۔ بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی صورت میں باندھے گئے تھے۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس میک اپ نے اس کی آنکھوں کے گرد اور پیشانی پر نظر آنے والی ہلکی ہلکی سلوٹوں کو چھپا لیا تھا۔ مجموعی طور پر وہ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اندر آگئی۔ کمرا پرفیسی کی خوشبو سے معطر ہو گیا۔

"اس طوفانی رات میں؟" تابش نے کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ تابش نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یاسمہ کی سرخ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے' چہرے پر وہی کل جیسی بیچارگی کیفیت تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے سر جھکائے جھکائے پوچھا۔

"بہت اچھی۔"

"یہ ساڑی میرے جہیز کے کپڑوں میں سے ہے۔ ایسی کئی ایک ہیں۔ بہت سے سلے اور ان سلے کپڑے ہیں۔ پڑے پڑے بے کار ہو رہے ہیں۔ ان میں سے نکال کر پہن آئی ہوں۔"

"لیکن یاسمہ' اتنی رات گئے اور ایسے موسم میں۔ کہیں بیمار نہ پڑ جانا۔"

"بیمار تو پہلے ہی ہوں' اب اور کیا بیمار پڑوں گی۔ دراصل۔۔۔ دراصل ایک بہت بڑا بوجھ ہے میرے سر پر۔"

"کیسا بوجھ؟" تابش نے پوچھا۔

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ کوئی ایسی بات تھی اس کی آنکھوں میں کہ تابش لرز کر رہ گیا۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "تابی! تمہاری کچھ امانتیں ہیں میرے پاس۔۔۔ یہ لے لو مجھ سے' مجھے اس بوجھ سے آزاد کر دو۔"

"کیسی امانتیں یاسمہ؟ میں نے۔۔۔ میں نے تو تمہیں کچھ نہیں دیا تھا۔ اگر کچھ دیا تھا تو مجھے یاد نہیں؟"

"مجھے تو یاد ہے نا تابی!" وہ ہذیانی انداز میں بولی اور اپنے ہاتھ تابش کے سامنے کر دیے "یہ دیکھو۔۔۔ کیا یہ ہاتھ تمہارے نہیں اور یہ آنکھیں۔۔۔ اور یہ پیشانی اور یہ ہونٹ۔۔۔ یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ میں بارہ برس سے انہیں اپنے ساتھ لیے لیے پھر رہی ہوں تابی۔ ان کا بوجھ اٹھا رہی ہوں۔"

تابش کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس بات کی گہرائی تک پہنچ کر تابش کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب اسے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس طوفانی موسم میں اتنی رات گئے وہ اس کے کمرے میں بن سنور کر کیوں چلی آئی ہے۔ حیرت آمیز دکھ سے تابش کا سینہ لبریز ہو گیا' وہ ہکلا کر بولا "یہ کیا کہہ رہی ہو یاسمہ۔۔۔ میں۔۔۔ اب ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ حیرت سے بولی "کیوں ایسا نہیں سوچ سکتے تم۔۔۔ یہ تو سیدھی سادی بات ہے تابی! جو کچھ تمہارا ہے وہ تمہارے پاس رہنا چاہیے۔"

چند لمحے کے لیے تابش گنگ ہو گیا پھر ہمت کر کے بولا۔ "یاسمہ! میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم ایسی بات کہو گی۔ مجھے شرم آ رہی ہے اپنے آپ سے۔"

اس کی حیرت بڑھ گئی "تابی! یہ کیسی بات کر رہے ہو تم۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔"

اس کی ساڑی کا پلو گر گیا تھا۔ کھلے گریبان میں سے جسم نظر آ رہا تھا۔ وہ تابش کے بالکل قریب چلی آئی تھی۔۔۔ ایک عجیب سی خود سپردگی طاری تھی اس پر۔۔۔ وہ سراپا مختصر تھی کی تابش اسے بانہوں میں لے لے۔

تابش نے اپنا رخ پھیرا اور قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا "یاسمہ! تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہو۔ بہتر ہے کہ فی الحال یہاں سے چلی جاؤ۔"

یاسمہ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ساڑی کا پلو اس نے سینے پر درست کر لیا تھا۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر نظر آنے لگا تھا۔ آنسو آنکھوں سے چھلکے اور رخساروں پر بہہ نکلے۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش کھڑی رہی پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ "تابی! تمہاری امانتیں سنبھالنے میں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دو۔ میرے چہرے اور جسم میں تمہیں اب وہ پہلی سی کشش نظر نہیں آتی ہو گی۔۔۔ تم نے دیر بھی تو



مکتبہ نفسیات

بہت لگائی تابی۔ بارہ برس سے زیادہ بتا دیے۔ میں کیا کرتی' کہاں تک سنبھالتی انہیں۔ جو کچھ مجھ سے بن پڑا وہ تو کرتی رہی ہوں۔ اب یہ جیسی بھی ہیں انہیں اپنے پاس رکھ لو۔۔۔ پلیز تابی!"

"میں نے کہا ہے ناکہ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔۔۔ چلو۔۔۔ میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔"

تابش نے اس کا بازو پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی "میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ مجھ سے ایسا مت کہو تابی۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز تابی!"

تابش کبھی سختی سے اور کبھی نرمی سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "ٹھیک ہے تابی! میں چلی جاتی ہوں۔ بس ایک بات۔۔۔ مجھے اپنے گلے سے لگا لو۔" اس کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور وہ لرزے کے بخار میں نظر آتی تھی۔ تابش کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ خود ہی اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کا جسم واقعی بخار میں تپ رہا تھا۔ دل دھڑکنے کے بجائے پھڑکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تابش نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔

"یاسمہ! مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک۔۔۔"

"شی!" اس نے ہونٹوں سے آواز نکال کر اسے خاموش کر دیا "تھوڑی دیر کے لیے کچھ نہ بولو تابی۔۔۔ میری خاطر!"

وہ خاموش ہو گیا' وہ بھی خاموش ہو گئی۔ وہ تابش میں پیوست تھی اور ساکت کھڑی تھی۔۔۔ وہ چند لمحے دائمی حیثیت اختیار کر گئے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر وہ تابش سے جدا ہو گئی۔۔۔ اس کے بعد ایک لفظ کہے سنے بغیر وہ باہر نکل گئی تھی۔ اس کے انداز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔

○☆○

اگلی صبح وہ مر گئی۔ اس کی لاش ہوٹل کی راہداری میں تابش کے کمرے کے سامنے پڑی تھی۔ دستک سن کر جب تابش باہر نکلا تو لاش کے گرد بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے۔ کوئی شخص ڈاکٹر کو بھی بلا لایا تھا حالانکہ اب ڈاکٹر کی نہیں' ایمبولینس کی اور پوسٹ مارٹم کرنے والے سرجن کی ضرورت تھی۔ ہوٹل کی نچلی منزل میں ایک کلینک بھی موجود تھا جو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اسی کلینک سے آیا تھا۔ وہ قالین پر پڑی عورت کی لاش دیکھ کر ذرا سا چونکا۔۔۔ پھر رسم پوری کرنے کے لیے اس نے اپنا اسٹیتھسکوپ متوفیہ کے جسم سے لگایا۔ آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں اور مایوسی سے سر ہلا دیا "شی از ڈیڈ!" اس نے اعلان کیا۔

مرنے والی کو گلابی ساڑی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گلابی ساڑی کو ڈھانپنے کے لیے اس پر ایک بیڈ شیٹ پھیلا دی گئی۔

ڈاکٹر اپنا چشمہ اتار کر تاسف سے بولا "اس خاتون کا کوئی اتا پتا معلوم ہوا؟"

بہت سے سر نفی میں ہلے۔ ڈاکٹر نے کہا "میرے اندازے کے مطابق خاتون کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔ یہ رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب میرے پاس نیچے کلینک میں آئی تھیں۔ بارش کی وجہ سے بالکل بھیگی ہوئی تھیں۔ کہتی تھیں' میں دل کی مریضہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے دل کو کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے کہا' خاتون بہتر ہے کہ آپ اسپتال چلی جائیں۔ اسپیشلسٹ کو دکھا لیں' کہنے لگیں "نہیں میں کسی اور مقصد سے آپ کے پاس آئی ہوں۔ پھر انہوں نے ایک عجیب بات کہہ ڈالی۔ کہنے لگیں' آپ کسی طرح میرے ہاتھوں کو سن کر کے انہیں کاٹ ڈالیں۔ میں اس کے لیے آپ کو بیس ہزار روپیہ دوں گی۔۔۔ اگر آپ نے کام ٹھیک کیا تو پھر آپ کو اور کام دوں گی۔۔۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگیں' پھر میں آپ سے اپنا چہرہ سن کراؤں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے ہونٹ' رخسار اور میری آنکھیں چہرے سے علیحدہ ہو جائیں۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ مریضہ کی ذہنی حالت ابتر ہے۔ میں نے انہیں ویٹنگ روم میں بٹھا کر اسپتال فون کرنا چاہا مگر اسی دوران میں یہ کلینک سے غائب ہو گئیں۔"

حاضرین محویت سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ ان میں تابش بھی شامل تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "میرا خیال ہے کہ خاتون نے اپنے طور پر بھی کسی چاقو وغیرہ سے اپنا ہاتھ کاٹنے کی کوشش کی ہے۔"

اس نے لاش پر سے چادر ہٹائی۔ کلائیوں کو روشنی کی طرف کیا۔ ان پر واقعی تیز دھار آلے کے زخم موجود تھے۔ ایسے ہی زخم متوفیہ کے ٹخنوں پر بھی نظر آ رہے تھے۔ خون آس پاس کی جلد پر جم چکا تھا۔ ڈاکٹر کے ابتدائی تجزیے کے مطابق متوفیہ کی موت اچانک حرکت قلب بند ہونے سے ہی واقع ہوئی تھی۔۔۔ تابش ایک ٹک لاش کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے اندر خونی آنسوؤں کا ایک آبشار گر رہا تھا۔ اسے برسوں پرانا ایک واقعہ یاد آ گیا تھا۔ وہی "نائیوں" والا واقعہ۔ اسے لگ رہا تھا کہ آج پھر یاسمہ "خوشنما نائیاں" اس کے کمرے کی دہلیز پر ڈھیر کر کے چلی گئی ہے' بغیر آنکھیں کھولے ہوئے' بغیر آنکھیں چمکتے ہوئے۔

محبت اور فاصلے

طاہر جاوید مغل

عشقیہ داستان... کسی کی بھی ہو، اگر سچ پر مبنی ہو تو دل پر اثر کرتی ہے۔ اس نے بھی ایک ایسی ہی داستان سنا کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا... فقط اس معاملت پر کہ ایک محبوب کے حصول کی خاطر دونوں کی جدوجہد اور ٹارگٹ ایک مگر... نتائج مختلف... لہٰذا ایک عاشق نے دوسرے کو حسرت و مایوسی کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے اپنی قیمتی متاع بھی قربان کر دی۔

محبت کو پانے کے لیے فاصلوں کو مٹانے والی ایک عظیم

قربانی کا احوال

کبھی کبھی تو شہزاد کو لگتا تھا کہ وہ ایک میراتھن دوڑ میں حصہ لے رہا ہے۔ کسی بھی وقت اس کا دم ٹوٹ جائے گا اور وہ چکرا کر گر جائے گا، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا، شاید زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال اور اس کم عرصے میں اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں جونیئر اسسٹنٹ منیجر تھا۔ کمپنی کے باس شاد سہگل صاحب بڑے موڈی آدمی تھے اور نت نئے تجربے کرتے رہتے تھے۔ آج کل ان کے دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ پرانا



لاہور اپنی تمام تر قدیمی خوب صورتی کے ساتھ ناپید ہوتا جارہا ہے۔ اندرونِ شہر کی کلاسیکل عمارتیں گرائی جارہی ہیں اور ان کی جگہ نئی عمارتیں اور پلازے تعمیر ہورہے ہیں۔ آج کل سہگل صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا کہ اندرونِ شہر کی ایک قدیم گلی کو مسمار ہونے سے بچایا جائے اور آنے والے زمانے کے لیے محفوظ کرلیا جائے۔ اس گلی کے دس بارہ مکان تو وہ خرید چکے تھے۔ گلی کے آخری سرے پر ایک سہ منزلہ مکان ایسا تھا جس کا خبطی مالک اسے بیچنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ کمپنی کے دو تین نمائندے تو کوشش کرچکے تھے لیکن وہ مالک کو رضامند نہیں کرسکے تھے۔ اب شہزاد کا امتحان تھا۔ باس نے اسے بلا کر سرزنش کی تھی اور کہا تھا کہ ایسے اٹکے ہوئے کاموں کو وہ بخوبی کرلیا کرتا تھا لیکن پچھلے آٹھ دس ماہ سے اس کی کارکردگی بالکل صفر ہوکر رہ گئی ہے۔ لہٰذا اب وہ جائے اور مالک کو اس ڈیل کے لیے رضامند کرے۔

باس نے مزید تو کچھ نہیں کہا مگر ان کی چپ بھی بے معنی نہیں تھی۔ انہوں نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر وہ ناکام ہوا تو اس کی نوکری پر بھی سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔

اپنے اس مشن پر روانہ ہونے سے پہلے شہزاد نے اپنے ان دو ساتھیوں سے معلومات حاصل کیں جو اس سے پہلے مالکِ مکان کو قائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بہزاد نامی یہ چالیس پینتالیس سالہ شخص اس گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اسے ستار بجانے کا شوق ہے، کہیں کسی گاؤں میں تھوڑی سی زمین بھی ہے۔ اسی کی آمدن سے اس کی گزر بسر ہوجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جیتے جی یہ گھر فروخت نہیں کرے گا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت شہزاد ایک تنگ گلی میں مطلوبہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ لمبے بالوں، اونچی ناک اور چھریرے جسم والا مالکِ مکان اس کے سامنے آیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی۔

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا..... دراصل..... میں روز ہی یہاں سے گزرتا ہوں۔ گھر کے اندر سے ستار بجنے کی آواز آتی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ستار آپ بجاتے ہیں۔“

”ہاں، میں ہی بجاتا ہوں۔“ سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

”مجھے..... یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ یقین کریں میں کئی دفعہ رک کر سنتا ہوں۔ ایک دن آپ ایک پرانا ہندوستانی گیت بجارہے تھے۔ اک پیار کا نغمہ ہے، موجوں کی روانی ہے.....“

”ہاں، شاید یہ غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہوگی۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں.....؟“ خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

”کچھ بھی نہیں جی، بس تعریف کرنے اور آپ کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”چلو، اب یہ دونوں کام ہوچکے۔ اب جایئے یہاں سے۔“

”دراصل میں چاہتا تھا.....“

اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”دراصل آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پچھواڑے پر اتنی زور سے لات ماروں کہ آپ اس سامنے والی دیوار پر جا کر لگیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے جھوٹ بولتے ہوئے۔ میں اتنا بدھو نہیں ہوں، جان گیا ہوں کہ تم اس فرم سے آئے ہو جس کے دو تین مشٹنڈے پہلے بھی میرا دماغ چاٹتے رہے ہیں۔“

شہزاد سناٹے میں رہ گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”سس..... سوری سر۔ میں تو بس.....“

”جاتے ہو، یا دوں ایک۔“ وہ شخص چنگھاڑا اور شہزاد کو دھکا دیا۔ وہ ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں بجلی کے پول سے ٹکرایا۔ مالکِ مکان نے زور سے دروازہ بند کردیا۔

جانے کیوں، شہزاد کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ دروازے سے تو ہٹ گیا لیکن کچھ دور جا کر ایک نوتعمیر شدہ بلڈنگ میں واقع چائے خانے میں بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اس شخص سے مزید بات کرکے دیکھے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جو لوگ میوزک میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے دل میں کہیں نہ کہیں نرم گوشے ضرور موجود ہوتے ہیں اور یہ ادھیڑ عمر شخص تو شکل صورت سے بھی رومان پسند لگ رہا تھا۔

سہ پہر ٹھنڈی ہوتی جارہی تھی۔ سردیوں کی مختصر شام جلد ہی رات کی تاریکی میں بدلنے والی تھی اور اندرونِ شہر کے اس علاقے میں سہ منزلہ اور چہار منزلہ عمارتوں میں جلد ہی روشنیاں جگمگانے والی تھیں۔ شہزاد نے قریبی دکان سے فل اسکیپ کے چار کاغذ لیے۔ ایک اور چائے کا آرڈر دیا، سگریٹ سلگایا اور وہیں بیٹھ کر اس تند مزاج مالکِ مکان

کے نام ایک تحریر لکھنے لگا، اس نے لکھا۔

''محترم! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ کبھی آپ نے بھی کسی سے پیار کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنی روداد بیان کرنے کا حوصلہ مل رہا ہے۔ میں ایک بڑی مشکل میں ہوں محترم! میں لاہور کے نواح میں ایک چھوٹے قصبے کا مونگی کا رہنے والا ہوں۔ میں نے گریجویشن کیا ہوا ہے اور کچھ ڈپلوماز بھی لے رکھے ہیں لیکن یہ سب کچھ میری اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے جس کو پورا کرنے کے لیے میرے پاس ایک محدود وقت ہے..... میری دن رات کی کوشش بھی مجھے اپنی منزل کے قریب نہیں پہنچا پا رہی۔ دراصل میں نے ایک لڑکی سے پیار کیا اور اتنی شدت سے کیا کہ اس کے سوا میرے لیے اس دنیا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں، والدین بہن بھائی کوئی نہیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ لڑکی ہی میری کل کائنات ہے اور اگر اسے حاصل نہ کر سکا تو پھر میرے لیے زندہ رہنا یا مرنا ایک برابر ہو جائے گا۔ وہ بھی مجھے بے انتہا چاہتی ہے۔ ہمارے راستے کی اصل رکاوٹ لڑکی کے والدِ محترم ہیں۔ وہ ایک دنیادار شخص ہیں۔ ان کی مالی حیثیت مجھ سے بہت بہتر ہے۔ انہوں نے شرط رکھی ہے کہ اگر میں ان کی بیٹی شاہینہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں تو میرے پاس کم از کم دس مرلے کا ایک گھر اچھے علاقے میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ذاتی کار اور پچاس لاکھ کے لگ بھگ حق مہر کے لیے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے تین سال کا وقت دیا تھا۔ میں پچھلے ڈیڑھ برس سے لاہور میں ہوں اور ہر طرح سے جان مار رہا ہوں۔ دو جگہوں پر جاب کر رہا ہوں اور رات ایک بجے تک جاگتا ہوں۔ مجھے کم و بیش ڈیڑھ کروڑ روپیا اکٹھا کرنا ہے مگر آدھا وقت گزر چکا ہے اور میں 20 فیصد بھی جمع نہیں کر سکا..... اور آج کل تو یوں لگ رہا ہے محترم کہ میں پوری طرح لڑے بغیر ہی یہ لڑائی ہارنے والا ہوں۔ مجھے سہگل صاحب والی نوکری کے لالے پڑ رہے ہیں۔ میں ان کے لیے پرچیزنگ کا کام کرتا ہوں۔ باس مجھ سے بہت خفا ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں آپ کو مکان کی فروخت پر قائل نہ کر سکا تو شاید میری چھٹی ہو جائے اور میرے پاس صرف پارٹ ٹائم جاب ہی رہ جائے گی۔ یہ میرے لیے ایک ایسا ''سیٹ بیک'' ہوگا جس کے بعد میں شاید سنبھل ہی نہ سکوں۔

''میرے سپنے مجھ سے چھن رہے ہیں جناب! میری زندگی مجھ سے دور جا رہی ہے۔ مجھے سہارے کی ضرورت ہے جناب..... میں آپ سے التجا کرتا ہوں اگر آپ تھوڑا سا بھی دردمند دل رکھتے ہیں تو میری حالت پر رحم فرمایئے۔''

آخر میں شہزاد نے اس ڈیل کا ذکر کیا تھا جو وہ مالک مکان سے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ تمام نکتے بیان کیے جو مالک مکان کے فائدے کو ظاہر کرتے تھے۔ کمپنی مارکیٹ ریٹ سے قریباً 20 فیصد زیادہ دے رہی تھی۔ یہ تین مرلے کا گھر تھا۔ موقع کے لحاظ سے اس کی قیمت تقریباً تیس لاکھ بنتی تھی، مالکِ مکان کو چھتیس لاکھ تک کی آفر کی جا چکی تھی۔

یہ مفصل خط شہزاد نے عجیب جذباتی کیفیت میں لکھا تھا۔ خط مکمل کر کے اس نے لفافے میں ڈالا اور اس لیٹر باکس میں ڈال دیا جو مطلوبہ گھر کے مین دروازے پر موجود تھا۔

☆☆☆

تین دن تک شہزاد نے بڑی شدت سے جواب کا انتظار کیا۔ اس نے اپنا ایڈریس اور سیل فون نمبر، دونوں خط میں لکھ دیے تھے۔ چوتھے دن وہ مایوس ہو گیا لیکن جب وہ مایوس ہوا اسی روز شام کو اس کے سیل فون پر وہ کال آ گئی جس کا اسے انتظار تھا۔ مالکِ مکان بہزاد قدسی صاحب نے اسے اپنے گھر پر بلایا تھا۔

اس نے نہا دھو کر بہترین کپڑے پہنے اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اندرونِ شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا بہزاد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس سنکی شخص کا رویہ کیا ہوگا تاہم اس کے خدشات غلط نکلے۔ اسے مسٹر بہزاد نسبتاً اچھے موڈ میں ہی دکھائی دیے۔ اپنے حال میں مگن رہنے والے آرٹسٹوں کی طرح ان کے بال چہرے پر بکھرے تھے اور وہ مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے، ان کے بیڈروم کا منظر خستگی اور بے سروسامانی کا عجیب نمونہ پیش کرتا تھا۔ فرش پر گدا بچھا ہوا تھا جس کے اسپرنگ فوم کے اندر سے جھانک رہے تھے۔ ایک دقیانوسی ٹیپ ریکارڈر کے قریب درجنوں آڈیو کیسٹ رکھے تھے۔ ایک طرف بے کواڑ کی الماری میں گرد آلود کتابیں اور رسالے وغیرہ تھے۔ اگر کوئی چیز قدرے صاف ستھری نظر آتی تھی تو وہ وہی ان کا محبوب ستار تھا۔ اس کی پالش چمکیلی اور تار تنے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک مخملی گدی رکھی تھی جس پر بیٹھ کر وہ ستار نوازی کرتے تھے۔ ستار کے قریب ہی وہ ''جذباتی خط'' کھلا پڑا تھا جو چار روز پہلے شہزاد نے اس گھر کے مالک کے نام یعنی بہزاد صاحب کے نام لکھا تھا۔

بہزاد قدسی صاحب کی آنکھیں سوجی سوجی اور سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پچھلی ایک دو راتوں سے نیند پوری نہیں کر پائے اور شدید قسم کی کشمکش کا شکار رہے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر دھیمی آواز میں میوزک پلے ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ خود بہزاد صاحب کا بجایا ہوا ستار ہی تھا۔ ایک پرانا گیت گونج رہا تھا۔ تیری الفت میں صنم، ہم نے بہت درد سہے..... پر ہم چپ ہی رہے۔

بہزاد صاحب نے میوزک کا والیم کچھ اور کم کر دیا اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولے۔ ''میں نے تمہارا خط دو تین بار پڑھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے، تمہاری بات میں بھی اثر ہے۔''

جانے کیوں شہزاد کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ بولا۔ ''مجھے ایسی ہی امید تھی، بہت شکریہ.....''

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ سگریٹ کا دھواں ان کے اردگرد چکراتا رہا۔ ستار کی آواز گونجتی رہی۔ عجیب افسانوی سا ماحول بنا ہوا تھا۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔ ''اب وہ لڑکی شاہینہ کہاں ہے؟''

''اپنے والدین کے گھر..... اس کی سگائی کی بات چل رہی ہے مگر اس کے والد نے چونکہ مجھ سے مہلت کا وعدہ کیا ہوا ہے اور والدہ بھی اس مہلت کے حق میں ہیں، اس لیے ابھی یہ بات کسی نتیجے پر نہیں پہنچی۔''

''یہ سلسلہ..... میرا مطلب ہے تمہارا اور شاہینہ والا معاملہ کب شروع ہوا؟''

شہزاد نے خط میں کافی کچھ لکھ دیا تھا۔ پھر بھی اس نے ساری تفصیل سے بہزاد صاحب کو آگاہ کیا۔ اس میں کوئی بات بھی جھوٹ نہیں تھی۔ اس نے جیسے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

ان کے سامنے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ یہ چائے پڑوس سے آئی تھی۔ پڑوس کے لوگوں سے بہزاد صاحب کے تعلقات اچھے تھے۔ ان کا کھانا وہیں سے آتا تھا..... کپڑے وغیرہ بھی وہیں سے دھلتے تھے، البتہ اس کے لیے وہ ماہانہ معقول رقم دیتے تھے۔

بات کرتے کرتے بہزاد صاحب گہری سوچ میں چلے جاتے تھے۔ جیسے اردگرد کو بالکل بھول ہی جاتے ہوں۔ ایک ایسے ہی طویل وقفے کے بعد انہوں نے شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا اور بولے۔ ''میں تمہیں یہ مکان بیچنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کی ایک شرط ہے۔''

''جی فرمایئے۔'' شہزاد نے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو بہ مشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''بلکہ یہ دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں یہ مکان کسی فلانی ڈھمکانی کمپنی کو نہیں، تمہیں بیچوں گا۔ دوسری شرط یہ کہ تم اس مکان کو سنبھال کر رکھنے کے لیے نہیں خریدو گے بلکہ گرانے کے لیے خریدو گے۔''

''م..... میں سمجھا نہیں جناب۔ میرا مطلب ہے آپ کی دوسری شرط.....''

''پہلی شرط تمہارے فائدے کی ہے اور دوسری بھی تمہارے ہی فائدے کی ہے۔ اس مکان کو اس حالت میں سنبھال کر رکھنے سے تمہیں وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو اس کو گرانے سے مل سکتا ہے۔''

''میں معذرت چاہتا ہوں جناب! مگر میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔ گرانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''وہی مراد جو سب کی ہے۔ لوگ ان پرانے گھروں کو گرا کر نئے گھر بنا رہے ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کر سکتے ہو۔''

''میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ضروری ہے جناب؟''

''زیادہ سوچ بچار کرو گے تو پھر یہ سودا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس کے ساتھ ہی شاید.....''

انہوں نے فقرہ مکمل نہیں کیا لیکن ان کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقیناً وہ افسردہ انداز میں یہی کہہ رہے تھے کہ اس مکان کے ساتھ شاید شاہینہ بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔

شہزاد کو اندازہ ہوا کہ سنکی مزاج کے بہزاد صاحب سے زیادہ بحث کرنا درست نہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر اچانک اپنا ارادہ بدل دیتے اور وہی لب ولہجہ اختیار کر لیتے جو انہوں نے پچھلی ملاقات میں کیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں خود یہ مکان خریدتا ہوں تو اس کے لیے مجھے آپ کو کیا ادا کرنا ہوگا؟''

''وہی مارکیٹ ریٹ۔ 30 لاکھ کے لگ بھگ..... اور جو کچھ میں سمجھا ہوں، تم اتنی رقم تو آسانی سے دے ہی سکتے ہو۔''

وہ واقعی سنکی تھے۔ 36 کی آفر ٹھکرا کر 30 پر آمادہ ہو رہے تھے۔ شہزاد نے کہا۔ ''آپ یقیناً میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ آپ کی آفر قبول کر کے مجھے خوشی ہوگی لیکن درمیان میں کمپنی کا مسئلہ ضرور آئے گا۔ وہ لوگ کہیں گے کہ میں ان کے لیے پراپرٹی ڈیلنگ کرنے گیا اور اپنے لیے سودا کر کے آ گیا۔''

''تو پھر؟'' بہزاد صاحب نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''نن..... نہیں..... کوئی ایسی بات تو نہیں۔ میں اس کا

حل نکال لوں گا۔ میرے ایک دو بہت بااعتماد دوست ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کے نام پر رجسٹری کرالوں گا اور ساتھ ہی مختار نامہ یا دستبرداری وغیرہ لکھوالوں گا۔"

انہوں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ بھی ہے، یہ تمہارے مسائل ہیں۔ ہاں، میں اتنا یقین تمہیں ضرور دلاتا ہوں، یہ مکان تمہیں تمہاری توقع سے کہیں زیادہ فائدہ دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ پانچ چھ گنا تک۔"

شہزاد، بہزاد صاحب سے کئی سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی بھی سوال پر ہتھے سے اکھڑ سکتے ہیں اور بنی بنائی بات بگڑ سکتی ہے۔ اسی لیے اس نے کہا۔ "آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں، آپ جو کہہ رہے ہیں مجھے منظور ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم کاغذ تیار کروالو، پیمنٹ کا انتظام بھی کرلو۔ ہم اگلے جمعے کو ملیں گے۔ اس وقت میں تمہیں ایک دو اور ضروری باتیں بھی بتاؤں گا۔"

رات نو بجے کے قریب شہزاد اس ناقابلِ فہم شخص سے رخصت ہوکر اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

تقریباً سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ جمعے کے روز کاغذات پر بہزاد صاحب کے سائن انگوٹھے ہوگئے اور شہزاد نے 30 لاکھ روپے کا پے آرڈر ان کے حوالے کردیا۔ بہزاد صاحب نے اداس لہجے میں کہا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر مکان خالی کردیں گے۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ انہوں نے کوئٹہ شفٹ ہونے کا پروگرام بنایا ہے اور وہاں کسی فلیٹ کا بیعانہ بھی دے دیا ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے اپنی مرضی ومنشا سے کر رہے تھے اور اپنے معاملے میں وہ کسی کا مشورہ قبول کرنے والے شخص ہرگز نہیں تھے۔

پانچ دن بعد جب وہ لاہور سے رخصت ہو رہے تھے، ان کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ در و دیوار کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا انداز دیکھ کر شہزاد کا دل کٹ سا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بہزاد صاحب اور اس مکان کے پیچھے کوئی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے بارے میں کوئی سوال کرنے کی جرأت شہزاد کو ہرگز نہیں تھی۔ شاید کسی کو بھی نہیں تھی۔ بہزاد صاحب کا حلقۂ احباب بہت محدود تھا۔ اکثر پرانے لوگ تو یہ محلہ چھوڑ کر ہی جا چکے تھے، جو چند ایک موجود تھے وہ بھی ان کے بارے میں کسی اچھی یا بری رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

جاتے وقت بہزاد صاحب نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جب تم اس گھر کو گرانا شروع کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ ایک بندہ تمہارے پاس آئے۔ وہ تمہیں تمہارے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ تم سے یہ گھر خریدنا چاہے لیکن تم نے صاف انکار کرنا ہے۔ وہ قیمت بڑھائے گا۔ ممکن ہے کہ تمہاری خرید سے دگنی یا تگنی قیمت بھی دے لیکن تم نے لالچ میں نہیں آنا۔ وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہر قیمت پر یہ مکان خریدنا چاہے گا۔ اس بندے سے ایک ڈیڑھ کروڑ تک وصول کرلینا تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ ایسا ہی ہو جیسا میں نے سوچا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں مل رہا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کرکے ذیل میں مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

براہِ کرم اور مزید معلومات کے لیے

نصیر عباس 0301-2454188

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہے..... اور تم اپنی مراد پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے بہزاد صاحب کی آواز غم ناک اور بوجھل سی ہوگئی تھی، ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی اور آنکھوں میں گہری اداسی کی دھند نظر آتی تھی۔ شہزاد حیران تھا۔

کمپنی والوں کو پتا نہیں چل سکا کہ یہ مکان شہزاد نے خریدا ہے۔ باس کو یہی معلوم ہوا کہ شہزاد اس ''پرچیزنگ'' میں ناکام رہا ہے۔ وہ اس سے ناراض تھے۔ اس کی ترقی کا امکان ختم ہوگیا تھا اور خدشہ تھا کہ تنخواہ میں بھی بے قاعدگی آنے والی ہے۔ بہرحال پتا نہیں کیوں وہ زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ بہزاد صاحب کے کہنے پر اس نے جو کچھ کیا، اس کا کچھ نہ کچھ پھل اس کو ضرور ملے گا۔

مالکِ مکان بننے کے بعد اس نے اڑوس پڑوس والوں سے بہزاد صاحب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ فقط اتنا پتا چل سکا کہ بہزاد صاحب کے والدین کوئی پندرہ سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ بہزاد صاحب سے بڑا ایک بھائی انگلینڈ میں مقیم تھا اور اپنے بال بچوں سمیت وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ بہزاد صاحب کے حصے میں اندرونِ شہر کا یہ مکان آیا تھا اور وہ اس پر مطمئن تھے۔ بہزاد صاحب کو کالج کے زمانے سے ستار کا شوق پیدا ہوا۔ اس فن میں انہوں نے کافی نام کمایا اور ایوارڈ وغیرہ بھی حاصل کیے۔ جوانی میں ہی انہوں نے کافی شہرت اکٹھائی کی۔ اسی دوران میں انہیں کسی سے پیار بھی ہوا جو ناکامی پر ختم ہوگیا۔ اس وقت تک والدین زندہ تھے۔ انہوں نے مجبور کر کے ان کی شادی کر دی۔ بہزاد آرٹسٹک مزاج رکھتے تھے۔ بیوی بالکل اور طرح کی تھی۔ نباہ نہ ہو سکا۔ شادی کے صرف دو سال بعد ہی طلاق ہوگئی۔ بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ بہزاد صاحب تنہائی کی زد میں آئے۔ والدین یکے بعد دیگرے دنیا سے گئے تو اس گھر میں صرف بہزاد اور ان کا ستار ہی رہ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے سوشل لائف سے بالکل کٹ گئے۔ لوگ ان کے پرستار تھے۔ محفلوں میں ان سے سننا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی ریڈیو اور ٹی وی سے بھی آفر آتی تھی لیکن وہ صرف اپنے لیے بجاتے اور خود ہی سنتے تھے۔

شہزاد اپنی جمع پونجی اس کھنڈر مکان کی خرید پر صرف کر چکا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اس کا کیا کرے گا۔ یہ بات تو کچھ افسانوی سی ہی لگتی تھی کہ جب وہ اس مکان کو گرانا شروع کرے گا تو کوئی بندہ یہاں پہنچے گا اور اسے روکنے کے لیے اور مکان خریدنے کے لیے منہ مانگے دام دے گا۔ اگر کوئی ایسی بات تھی تو پھر بہزاد صاحب نے خود یہ کام کیوں نہ کرلیا؟ ایک دن فقط تجربے کے طور پر اس نے دو مزدور لگائے اور اس سہ منزلہ مکان کی چھت پر واقع ممٹی کو گرانا شروع کیا۔ ممٹی دو دن میں گر گئی۔ چھت پر چاروں طرف ملبا بکھر گیا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا بہزاد قدسی نے بتایا تھا۔ شہزاد نے ایک ہفتے تک سوچ بچار کی پھر اس کے دماغ نے مشورہ دیا کہ وہ اس ایڈونچر میں پڑ کر کہیں خود کو خوار ہی نہ کرلے یہ جگہ اس لائق ہرگز نہیں تھی کہ اسے مسمار کر کے یہاں کوئی پلازا وغیرہ بنایا جاتا۔ تین ساڑھے تین مرلے میں اور اس تنگ گلی میں بھلا کیا بن سکتا تھا۔ بہت ہوتا تو سات آٹھ لاکھ کا فائدہ ہو جاتا اور وہ بھی سخت بھاگ دوڑ اور انویسٹمنٹ کے بعد۔ یہ انویسٹمنٹ کہاں سے آتی؟ اور تعمیر کون کرواتا؟ اس طرح کے کئی سوالات تھے۔ آخر اس نے سوچا کہ خود پسِ پردہ رہتے ہوئے یہ گھر باس کو ہی فروخت کر دیا جائے مگر جب اس نے ٹوہ لگائی تو اسے پتا چلا کہ باس نے اس سلسلے میں جو بجٹ بنایا تھا، وہ ختم ہو چکا ہے اور اس نے جو آٹھ دس مکان خرید رکھے ہیں وہ انہی پر اکتفا کرنا چاہ رہا ہے۔ ویسے بھی وہ انگلینڈ روانہ ہو رہا تھا اور اپنے سیریس کام یعنی کنسٹرکشن کے سلسلے میں اسے چار پانچ ماہ وہیں پر قیام کرنا تھا۔

ایک بار پھر شہزاد کا ذہن بہزاد صاحب والی بات کی طرف منتقل ہونے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک اور بات بھی آئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کبھی کبھی پرانے مکانوں کے گرانے والوں کو کوئی غیر متوقع فائدہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔ چھت میں سے کوئی نہایت قیمتی لکڑی نکل آتی ہے۔ کہیں دبایا ہوا روپیا یا زیور وغیرہ مل جاتا ہے..... کہیں بہزاد صاحب کی مراد کوئی ایسا ہی فائدہ تو نہیں تھا؟

آخر ایک روز اس نے پھر مزدور لگا کے اور تیسری منزل کے ایک ایسے جھروکے کو گرانے کا ارادہ کیا جس کے گرانے سے باقی عمارت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ مکان میں سامنے کی طرف ایسے ہی تین جھروکے اور تھے۔ قدیم طرزِ تعمیر کے مطابق ان میں سامنے کی طرف لکڑی کی منقش محرابیں تھیں۔ جھروکے کے زیریں حصے میں سرخ پتھر کی حفاظتی جالی تھی۔ ایسے ہی جھروکے اور بالکونیاں نیچے والی دو منزلوں میں بھی تھیں۔ مکان کی دیواریں موٹی اور لکڑی کی چھتیں قریباً سولہ فٹ بلند تھیں۔ بل کھاتی ہوئی تاریک سیڑھیاں نیچے سے اوپر تک آتی تھیں۔ ان سیڑھیوں میں روشنی اور ہوا کے لیے چھوٹے چھوٹے روزن تھے۔ کبھی کبھی شہزاد کو محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کی ہر شے میں

ایک طرح کی اداسی اور موسیقیت رچی ہوئی ہے۔ وہ اداسی اور موسیقیت جس کا تعلق شہزاد صاحب سے تھا، جنہوں نے پہلے اپنے خاندان کے ساتھ اور پھر تن تنہا تقریباً چالیس پینتالیس برس اس گھر میں گزارے تھے۔

شہزاد نے جھروکا گرانے کا کام بڑی احتیاط سے شروع کروایا۔ گنجان علاقوں میں تعمیر اور مسماری کا کام کافی مشکل اور احتیاط طلب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے روز دوپہر کی بات ہے۔ شہزاد دفتر میں تھا۔ اسے سیل فون پر ایک کال آئی۔ یہ کال اسی مستری کی طرف سے تھی جو ایک مزدور کے ساتھ گھر میں جھروکا گرانے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر جی! ایک صاحب آئے ہیں۔ انہوں نے کام رکوا دیا ہے۔ کہا ہے کہ مالک کو بلاؤ.....''

ایک دم شہزاد کے سینے میں جیسے نقارہ سا بج اٹھا۔ شہزاد نے پوچھا۔ ''کون ہے؟ کسی محکمے کا بندہ ہے؟''

''نہیں جی۔ محکمے کا تو نہیں لگتا۔ بڑی عمر کا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی ہے۔ ساتھ میں ایک دوسرا بندہ بھی ہے، شاید گاڑی کا ڈرائیور ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم ان کو روکو بلکہ کمرے میں بٹھاؤ۔ میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

شہزاد نے موٹر سائیکل پکڑی اور دھڑکتے دل کے ساتھ حتی الامکان تیزی سے موقع پر پہنچ گیا۔

نیم سفید ڈاڑھی والے شخص کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے کلف لگی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی مگر وہ کچھ زیادہ رعب داب والا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا، ہاں آنکھوں میں ذہانت کی گہری چمک تھی۔ ساتھ ہی ڈرائیور ٹائپ شخص تھا۔ سلام دعا کے بعد نیم سفید ڈاڑھی والے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام فضل احمد ہے۔ تین گلیاں چھوڑ کر چوک میں جو پیلے رنگ کی حویلی ہے، میں وہاں رہتا ہوں۔''

''جسے چٹی حویلی کہتے ہیں؟'' شہزاد نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، پہلے وہ چٹی حویلی ہی کہلاتی تھی۔ اب رنگ بدل چکا ہے مگر نام وہی ہے۔'' فضل احمد نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ شہزاد یہ مکان آپ کو بیچ کر چلا گیا ہے اور آپ اسے گرا کر یہاں نئی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔'' شہزاد نے جواب دیا۔

فضل احمد نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ مستری بھی پاس ہی کھڑا اس گفتگو کو دلچسپی سے سن رہا تھا، شہزاد کے اشارے پر وہ بھی باہر نکل گیا۔

سفید ڈاڑھی والے فضل احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد صاحب! اب تم اس جگہ کے مالک ہو، جو چاہو کر سکتے ہو لیکن میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اس مکان کو جیسے کا تیسا رہنے دو۔ میرا نہیں خیال کہ آپ اسے گرا کر اور نئی تعمیر کر کے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ یہ جگہ پلازے والی تو ہے نہیں۔ ایک بے ڈھنگی سی رہائشی عمارت ہی بنے گی۔''

''آپ کے مشورے کا شکریہ۔'' شہزاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟''

فضل احمد نے پھر تھوڑا سا توقف کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''دراصل..... اس گھر سے کسی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور وہ یہی چاہتا ہے کہ یہ مکان ایسے ہی رہے۔''

''کون ہے وہ شخص؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''سمجھیں کہ میرا مالک ہے۔ میں اس کی ملازمت کرتا ہوں۔ اسی کے کہنے پر میں یہاں آیا ہوں۔''

''آپ کی باتیں کچھ الجھی ہوئی ہیں..... میں سمجھ نہیں پا رہا..... ویسے آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ مکان گرایا جا رہا ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں جس چٹی حویلی میں رہتا ہوں اس حویلی کی دوسری منزل سے مجھے تمہارا یہ گھر نظر آتا ہے۔ چند دن پہلے بھی شاید تم نے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی تھی..... لیکن اس وقت مجھے پتا نہیں چلا۔ اب جب تم نے دوبارہ کام شروع کرایا تو میں نے دیکھ لیا۔''

''تو آپ کے مالک نے آپ کو بھیجا کہ آپ یہ کام رکوائیں؟'' شہزاد نے قدرے روکھے انداز میں کہا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''آپ کی منطق کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آپ کے مالک کو اس مکان میں اتنی دلچسپی کیوں ہے اور کیا اس دلچسپی کی وجہ سے میں آپ کی مرضی کے مطابق چلنا شروع کر دوں؟''

''نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ اس میں کسی طرح کی زبردستی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر بندے کو اپنا مالی فائدہ سوچنے کا حق ہوتا ہے لیکن اس سلسلے میں، میں ایک چھوٹی سی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔'' شہزاد کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تم یہ مکان فروخت کر دو۔ تم بغیر تعمیر کے ہی اپنی

توقع سے زیادہ فائدہ حاصل کرلو گے۔''

وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا ذکر شہزاد صاحب نے کیا تھا۔ شہزاد صاحب کی کہی ہوئی ساری باتیں شہزاد کو یاد آنے لگیں۔ اس نے فضل احمد کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''چلیں، آپ بتائیں..... آپ کیا دے سکتے ہیں اس گھر کا؟''

فضل احمد نے ایک طائرانہ سی نگاہ در و دیوار پر ڈال کر کہا۔ ''مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت تیس بتیس سے اوپر ہرگز نہیں لیکن اگر تم اپنا ذہن بنالو، تو میں تمہیں اس کا چالیس لاکھ تک دلوا سکتا ہوں۔''

شہزاد کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اس نے یہ تیس لاکھ میں خریدا تھا۔ تقریباً ایک لاکھ کاغذات وغیرہ پر لگا تھا۔ دو تین ہفتوں بعد تو دس لاکھ کا منافع بہت بڑی بات تھی مگر پھر اسے فوراً شہزاد صاحب کی گفتگو یاد آئی۔ اس نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''فضل صاحب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں یہاں کچھ بنانا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے چار چھ سال میں یہ جگہ یہی کمرشل بن جائے گی۔''

''اس گلی میں یہی کمرشل؟'' فضل احمد نے استہزائیہ انداز میں سر ہلایا۔ ''تمہاری کم از کم یہ بات تو ماننے والی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ جو بھی سمجھیں لیکن میں ابھی اس جگہ کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ آئی ایم سوری۔'' شہزاد کا لہجہ خشک ہوگیا۔

چائے آگئی تھی۔ دونوں نے بوجھل سے ماحول میں چائے کے کپ ختم کیے اور پھر یہ ملاقات ٹیلی فون نمبرز کے تبادلے کے ساتھ ختم ہوگئی۔

شہزاد نے یہ پرکشش آفر ٹھکرا دی تھی لیکن اسے امید تھی کہ جلد ہی دوبارہ آفر آئے گی اور واقعی یہی ہوا۔ اگلے ہی روز شام کو شہزاد اور فضل احمد میں پھر گفتگو ہوئی۔ فضل احمد نے کال کر کے شہزاد کو بتایا کہ وہ لوگ اس گھر کے لیے اسے پورے پچاس لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔ شہزاد نے دل پر جبر کر کے یہ آفر بھی بے رخی سے ٹھکرا دی۔ بہرحال بارش اور خراب موسم کی آڑ لے کر اس نے جھرو کے کو مسمار کرنے کا کام وقتی طور پر روک دیا تھا۔

اب اس سلسلے میں اس کی دلچسپی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ فضل احمد کون تھا؟ وہ اپنے کس مالک کے لیے یہ گھر خریدنا چاہ رہا تھا اور اس مالک کو اس گھر سے ایسی کیا گہری دلچسپی تھی؟ اس نے اپنے طور پر کھوج لگایا۔ ایک ہیئر ڈریسر آفتاب عرف آفتابی سے اسے ''چٹی حویلی'' کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اسے پتا چلا کہ یہ حویلی انگریزوں کے دور سے کسی سیٹھی فیملی کے استعمال میں ہے۔

آفتابی نے کہا۔ ''شاید آپ نے ٹی وی کی مشہور اداکارہ سلیمہ سیٹھی کا نام سنا ہو۔ وہ آج کل بھی ڈراموں میں درمیانی عمر کے پارٹ کرتی ہیں۔''

شہزاد کی آنکھوں کے سامنے نہایت دلکش نقوش والی پُروقار خاتون کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں..... سلیمہ سیٹھی کو دیکھا ہوا ہے۔ کیا وہ بھی اس حویلی میں رہتی ہیں؟''

''اب نہیں رہتیں جی، دس پندرہ سال پہلے رہا کرتی تھیں۔ آج کل تو ڈیفنس میں ان کی بڑی شاندار کوٹھی ہے۔''

''اب حویلی میں کون رہتا ہے؟''

''خستہ حال حویلی ہے جی۔ سلیمہ صاحبہ کا ایک پرانا ملازم ہی اپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہ رہا ہے۔ فضل احمد نام ہے۔ اچھا بندہ ہے ویسے۔ میل جول والا ہے۔''

شہزاد کو اب اس معاملے کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔ فضل احمد کی مالکن ایک نہایت دلکش اور امیر خاتون تھی..... اور شاید یہی خاتون تھی جو اس مکان کو بکنے سے روکنا چاہتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ماضی میں اس حسین ٹی وی آرٹسٹ اور ستار نواز شہزاد صاحب میں کوئی گہرا تعلق رہا ہے۔ اس تعلق نے کچھ ایسی یادوں کو جنم دیا ہے، جو ایک مدت گزرنے کے باوجود بکھری نہیں تھیں، اپنا وجود رکھتی تھیں۔

شہزاد نے باتوں باتوں میں ہیئر ڈریسر آفتابی سے شہزاد صاحب کے بارے میں بھی پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا تھا جو شہزاد کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔ اب شہزاد بے چینی سے فضل احمد سے اگلی ملاقات..... اور اگلی آفر کا انتظار کرنے لگا۔ حسبِ توقع اس ملاقات میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔ قریب کی کشادہ گلی میں گاڑی رکنے کی آواز آئی اور پھر فضل احمد نمودار ہوا۔ شہزاد نے اسے اس مختصر گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور رسمی انداز میں چائے کا پوچھا۔

''ہاں چائے کا موڈ تو ہے۔'' فضل احمد نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

چائے کے دوران میں ہی فضل احمد اصل موضوع پر آگیا۔ وہی مکان کی خرید والا موضوع۔ شہزاد نے اپنے چہرے پر سخت بیزاری پیدا کر رکھی تھی اور یہ جتا رہا تھا کہ

جیسے وہ اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔

آخر فضل نے کہا۔ ''دیکھو شہزاد! میں نے تمہیں تین چار آفر دی ہیں۔ اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم یہ مکان بیچنے کے لیے کیا لینا چاہو گے تو پھر؟''

شہزاد کے سینے میں جیسے ایک شادیانہ سا بج اٹھا لیکن وہ ایک ماہر سودے باز تھا۔ اپنے تاثرات چھپانا بخوبی جانتا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لے کر فضل کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ''ڈیڑھ کروڑ دے سکو گے؟''

فضل سناٹے کی سی کیفیت میں اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر چند سیکنڈ کے اندر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر اس نے بغیر کچھ کہے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک چیک بک نکالی۔ ایک چیک علیحدہ کر کے شہزاد کے سامنے رکھا۔ چیک پر سائن موجود تھے۔ فضل ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''تم نے میری توقع سے بھی زیادہ بتایا ہے۔ ایک بار اس پر نظر ثانی کر لو پھر جو بھی دل چاہے اس میں بھر لینا۔''

''نظر ثانی کوئی نہیں جی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''ایک روپیہ کم نہ زیادہ۔''

فضل ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اوکے..... شناختی کارڈ کی کاپی دے دو۔ میں کل تک کاغذات تیار کروالوں گا۔''

شہزاد کو اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا لیکن جو وہ سن رہا تھا وہ حقیقت تھی اور حقیقت یہی تھی کہ ایک انہونی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہزاد نے اچھے علاقے میں دس مرلے کا ایک سنگل اسٹوری گھر خرید لیا۔ مہران کار لے لی۔ اس کے کئی سپنے پورے ہو گئے۔ مگر اپنے محسن یعنی شہزاد صاحب سے دوبارہ ملنے والا سپنا پورا نہیں ہوا۔ ان کا فون نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے سیکڑوں مرتبہ ٹرائی کی مگر وہ شاید ''سم'' ختم کر چکے تھے۔

شہزاد نے اب چھوٹے پیمانے پر کنسٹرکشن کا اپنا کام شروع کر دیا تھا..... قریباً ڈیڑھ سال بعد کی بات ہے، ایک کام کے سلسلے میں شہزاد کا ''سبی'' جانا ہوا۔ ایک روز ایک سڑک سے گزرتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک گیا۔ اسے ایک دروازے سے شہزاد صاحب نکلتے نظر آئے۔ ان کا حلیہ اور لباس کافی بدل چکا تھا۔ بال تو اسی طرح لمبے تھے مگر اب چہرے پر کھچڑی ڈاڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ ماتھے پر بلکا سا کراب تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھے۔ شہزاد نے گاڑی کو

ہنی مون

ایک شادی شدہ جوڑا ہنی مون ختم ہوتے ہی اپنے گھر پہنچ گیا اور دوسرے دن ہی دلہن نے خرچ کی تنگی کا گلہ شروع کر دیا۔ ''تم تو کہا کرتے تھے، میں بڑا کھاتا پیتا اور مالدار شخص ہوں۔''

''درست ہے۔ مگر یہ میں ہنی مون منانے سے پہلے کہا کرتا تھا۔''

عاشق

ایک عاشق نے ماہر نفسیات کو خط لکھا۔

محترم جناب.....

مجھے ایک ایسی بدصورت لڑکی سے رجسے دیکھ کر بچے ڈر جاتے ہیں۔ سچی محبت ہو گئی ہے جبکہ ایک خوب صورت لڑکی جسے دیکھ کر بیویاں ڈر جاتی ہیں، مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں میں سے کس کا انتخاب کروں۔

فقط..... پریشان حال

ماہر نفسیات نے جواباً لکھا۔

جناب پریشان حال۔

اپنی سچی محبت کا گلا نہ گھونٹیے اور پہلی والی سے شادی کر لیجیے اور دوسری لڑکی کا نام و پتا مجھے ارسال کر دیں۔

فقط..... جواب کا منتظر

دعوت نامہ

امریکی مزاحیہ اداکار باب ہوپ نے اپنے دوستوں کو ایک شاندار پارٹی دی جس میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ ایک ایسا نوجوان بھی خوب بن ٹھن کر پارٹی میں پہنچ گیا جسے دعوت نامہ نہیں دیا گیا تھا۔ جب پارٹی ختم ہوئی اور لوگ رخصت ہونے لگے تو باب ہوپ نے اس سے آ کر پوچھا۔

''کہیے جناب پارٹی کیسی رہی.....؟''

''بے حد شاندار.....'' نوجوان نے اپنی چالاکی پر پھولے نہ سماتے ہوئے کہا۔

باب ہوپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''برائے مہربانی، آپ اپنا پتا دے جائیں تاکہ آئندہ آپ کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

بریک لگائے اور پھر اتر کر ان کی طرف بھاگا۔ وہ ان سے لپٹ گیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے..... اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی۔

شہزاد نے انہیں بتایا کہ وہ کس کس طرح انہیں تلاش کرتا رہا ہے۔ شہزاد نے نیم پلیٹ پڑھی تو اسے پتا چلا کہ یہ بہزاد صاحب کا ہی گھر ہے۔ بہزاد صاحب نے اسے بتایا کہ وہ کوئٹہ سے یہاں آگئے ہیں۔ وہاں کا موسم انہیں بالکل راس نہیں آرہا تھا۔

اگر کہیں سرِراہ ان سے ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید وہ کنی کترا جاتے مگر وہ اب گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ انہیں شہزاد کو اندر لے جانا پڑا۔

لاہور کی طرح وہ یہاں بھی تنہا تھے بلکہ اب تو ستار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ شہزاد کا خیال تھا کہ وہ سب سے پہلے اس سے گھر کی فروخت کے بارے میں سوال کریں گے۔ پھر شاہینہ کے بارے میں اور اس سے شادی کے بارے میں پوچھیں گے..... لیکن وہ تو اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے، ان کی سوچ اپنی اور گفتگو کا انداز منفرد تھا۔ شہزاد کے منع کرنے کے باوجود وہ خود ہی چائے بنا کر لائے اور سامنے لکڑی کی میز پر رکھ دی۔ وہ ایک بارشی شام تھی۔ کھڑکی سے باہر بوندیں تواتر سے گر رہی تھیں۔ دسمبر کا آغاز تھا۔ دسمبر ہو، بارش ہو تو پھر آتش دان بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں آتش دان تو نہیں تھا لیکن لوہے کی چھوٹی سی انگیٹھی ضرور سلگ رہی تھی۔ بہزاد صاحب چائے کی پیالی کو گھور رہے تھے۔ اچانک ہی انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں بولنا شروع کیا۔ ''اس کا نام تو سلیمہ تھا لیکن گھر میں اسے پیار سے سلی کہا جاتا تھا۔ کھاتا پیتا امیر گھرانا تھا۔ اسے ریڈیو ٹی وی پر کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف شوق تھا، یہی شوق اسے پہلے ریڈیو اور پھر ٹی وی پر لے گیا۔ ان دنوں آج کل کی طرح چینلز کی بھرمار تو نہیں تھی۔ بڑا اعلیٰ کام ہوتا تھا.....''

بہزاد صاحب بولنا شروع ہوئے تو پھر سحر انگیز انداز میں بولتے چلے گئے۔ وہ اپنی اور سلیمہ سیٹھی کی کہانی سنا رہے تھے۔ شہزاد کا خیال تھا کہ ان سے ان کے ماضی کے بارے میں جاننے کے لیے اسے شاید بہت تگ و دو کرنا پڑے مگر اس کے دیگر خیالوں کی طرح یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اس بوندا باندی والی یخ بستہ شام میں بہزاد صاحب نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ مختصر الفاظ میں یوں تھا۔

سلیمہ اپنے کیریئر کے جوبن پر تھی۔ اسے ایک ڈراما سیریل میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ملا جو بہت اچھا ستار بجاتی تھی۔ اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سلیمہ نے باقاعدہ ستار سیکھنا چاہا۔ ان دنوں بہزاد صاحب کا بھی ستار نوازی میں نام تھا۔ ان کی عمر چھبیس سال اور سلیمہ کی تیئس چوبیس سال ہوگی۔ بہزاد صاحب کی اپنی ایک فنکارانہ آن بان تھی۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ چٹی حویلی میں جا کر سیٹھی فیملی کی لڑکی کو ستار بجانا سکھائیں تو انہوں نے کہا، پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے.....

نتیجہ یہ نکلا کہ معروف اداکارہ سلیمہ برقع اوڑھ کر اور قریباً نصف فرلانگ فاصلہ پیدل طے کر کے ستار سیکھنے، چٹی حویلی سے بہزاد صاحب کے گھر آنے لگی۔ بہزاد صاحب کی خودی اور بے نیازی سلیمہ کے دل میں گھر کر گئی اور اس سے بھی زیادہ ان کی شرافت۔ پتا نہیں وہ کون سا جادوئی لمحہ تھا جب وہ ان کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ دوسری طرف بہزاد صاحب بھی خود کو اس کی سحر انگیز شخصیت کی کشش سے نہ بچا سکے۔ جلد ہی دونوں کو یوں لگنے لگا جیسے ایک دوسرے کے بغیر جینا اب ''ناممکن'' ہے لیکن یہ معاشرہ ایسے ہی ناممکنات کو ممکن بنانے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ سلیمہ کو اس کے دادا فرمان سیٹھی نے پالا تھا۔ وہ پوتی سے بہت محبت کرتے تھے اور اتنے ہی سخت مزاج بھی تھے۔ وہ سلیمہ اور بہزاد کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار بن گئے جس کی دونوں جانب رو پیار کرنے والے تڑپ تڑپ کر رہ گئے لیکن دیوار کو توڑ نہ سکے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جب خود سلیمہ نے سب کچھ چھوڑ کر بہزاد صاحب کے ساتھ کہیں بھی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بالکل تیار ہو چکی تھی مگر بہزاد صاحب اپنی محبت کو اس طرح حاصل کرنے کے حق میں نہیں تھے..... اور پھر وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ان دونوں کی جدائی پر مہر لگ گئی تھی۔ سلیمہ سیٹھی کی شادی اس کی فیملی میں ریحان سیٹھی سے کر دی گئی اور غریب مگر خوددار اور باکردار ستار نواز بہزاد قدسی اپنے تین مرلے کے گھر میں مہینوں کے لیے بند ہو کر رہ گیا۔ ہاں، یہ وہی گھر تھا جہاں چپے چپے پر ان دونوں کی محبت کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہاں کی دیواریں، جھروکے، بالکونیاں..... سیڑھیاں..... کون سی جگہ ایسی تھی جہاں سے ان کی محبت کی خوشبو نہیں پھوٹتی تھی۔ ان دونوں کا ساتھ صرف ایک سال کا رہا تھا مگر اتنی یادیں دے گیا تھا جو سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں۔ اس ناکام محبت کی روداد علاقے کے کئی پرانے لوگ جانتے تھے۔

باقی کی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں تھی۔ سلیمہ جب کبھی کبھار اپنے میکے یعنی چٹی حویلی آتی تھی تو دور سے بہزاد صاحب کے گھر کو دیکھتی تھی۔ کبھی کبھار اسے اپنے نامراد محبوب کی کوئی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہوگی۔ وہ ایک ٹی وی آرٹسٹ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک باکردار مشرقی لڑکی بھی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے بعد اس نے کوئی معاشرتی حد پھلانگنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف..... اور صرف اتنی سی رعایت اپنے لیے حاصل کی کہ کبھی کبھی جب چٹی حویلی آتی تو آنسوؤں کی اوٹ سے بہزاد صاحب کے گھر کو دیکھا کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کا یہ معمول پختہ ہوگیا۔ مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور وہ چٹی حویلی آتی تھی۔ ہاں محبت سے وابستہ چیزیں بھی محبوب ہوجاتی ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ خاص مکانوں اور گلی کوچوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اس کا شوہر سات آٹھ سال پہلے فوت ہوچکا تھا۔ اس کے دو بیٹے قریباً سترہ اور پندرہ سال کے تھے۔ ترکے میں اس کو ایک چلی چلائی شاندار گارمنٹ فیکٹری بھی ملی تھی۔ اب وہ ہر طرح خودمختار تھی۔ اگر کبھی کبھی کسی ڈرامے یا شو میں دکھائی دیتی تھی تو وہ صرف ایک شوق ہی تھا جو ماضی سے اس کے ساتھ چلا آرہا تھا۔

بہزاد صاحب کی کہانی نے ایک عجیب سے درد میں مبتلا کردیا تھا۔ خود ان کا اپنا چہرہ بھی اندوہ کی تصویر تھا۔ کھڑکی سے باہر تاریکی پھیل گئی تھی لیکن بارش کی صدا آرہی تھی۔

ایک اداس وقفے کے بعد شہزاد نے کہا۔ ''بہزاد صاحب! گستاخی معاف۔ آپ نے سب کچھ بتایا لیکن اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جس نے آکر مجھ سے مکان کا سودا کیا اور آپ کی پیش گوئی کے عین مطابق ایک بھاری رقم ادا کی۔ اسے یقیناً آپ کے اور سلیمہ صاحبہ کے بارے میں سب معلوم ہوگا۔''

''شاید تم فضل احمد کی بات کررہے ہو؟'' شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولے۔ ''ہاں..... وہ سلیمہ کا رازدار ملازم تھا۔ دراصل وہ سیٹھی فیملی کے جدی پشتی ملازموں میں سے تھا۔ بچپن میں اس نے سلیمہ کو گود کھلایا اور جب وہ قدرے بڑی ہوئی تو اس کے دوستوں کی طرح ہوگیا۔ جو بات وہ اپنے دادا یا ماں کے ساتھ نہیں کرسکتی تھی، وہ فضل کے ساتھ کرسکتی تھی اور وہ بھی وفاداری اور پُرخلوص محبت میں اپنی مثال آپ تھا..... اور اب بھی ہے۔ خیر اس طرح کی تو اتنی باتیں ہیں کہ شروع کریں تو رات یہیں بیت جائے۔ تم بتاؤ، تم کس حال میں ہو۔ شاہینہ کو حاصل کرچکے یا نہیں.....؟''

شہزاد نے تھوڑا توقف کیا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں جناب! باقی تو سب کچھ آپ کی عنایت سے حاصل ہوگیا مگر شاہینہ ابھی تک نہیں مل سکی۔''

''یہ کیا بات کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت زدہ اور دکھی نظر آئے۔

''شاہینہ کے والد محترم کی تقریباً ساری شرطیں پوری ہوگئی ہیں لیکن وہ ابھی تک پس وپیش کررہے ہیں۔ کبھی کوئی بہانہ کبھی کوئی۔ اب یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے شاہینہ ماسٹرز مکمل کرے گی۔ بہرحال شاہینہ کی والدہ امید کی کرن کی طرح ہیں۔ وہ پوری طرح ہماری طرف داری کررہی ہیں..... آپ نے دوا تو کردی ہے جناب، اب دعا بھی کریں.....'' شہزاد نے عجیب لہجے میں کہا۔

بہزاد صاحب یک ٹک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''اچھا فقرہ کہا تم نے۔ دوا تو کردی اب دعا بھی کریں۔ اچھا کہا۔ ویل سیڈ۔''

''کریں گے دعا؟'' شہزاد نے ان کے ہاتھوں کو عقیدت سے چھوتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور دو سچے موتی محبت کا حسین اشارہ بن کر ان کی آنکھوں سے لپک گئے۔

اب پتا نہیں کہ یہ اتفاق تھا، حسنِ اتفاق تھا یا دعا کا اثر تھا (کئی دعائیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی خدا کی بارگاہ میں قبول ہوجاتی ہیں اور ایسی دعائیں بہزاد صاحب جیسے لوگوں کی ہی ہوتی ہیں) بہزاد صاحب کی آنکھوں سے آنسو گرے ہوئے بہ مشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک شہزاد کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف شاہینہ ہی تھی۔ اس کی آواز جیسے خوشی سے کانپ رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

''ہمارے لیے ایک اچھی خبر ہے شہزاد!''

''کیا؟'' شہزاد نے اپنے سرپٹ دل کو بہ مشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سن کر خوشی ہوگی..... لیکن..... لیکن..... مجھے بتاتے ہوئے شرم آئے گی..... میں تمہاری بات امی سے کروارہی ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

پھر اس کے بھاگتے چنچل قدموں کی آواز آئی۔ وہ امی کی طرف جارہی تھی۔ گویا سینے پورے ہونے کا اعلان ہورہا تھا۔ ایک گمشدہ محبت کے طفیل ایک روتی سسکتی محبت کو نئی زندگی مل رہی تھی۔



سکین بائے ایڈمن اردو بکس
محمد سلمان سلیم
03067163117

مُکّے باز

طاہر جاوید مغل

آنکھوں میں آنسو رواں ہوتے ہیں... غم کے بھی اور خوشی کے بھی... ہر شخص کے پاس آنسوؤں کا خزانہ ہوتا ہے... پوشیدہ آنسو جو پلکوں کے پیچھے اس طرح چھپے ہوتے ہیں جس طرح ڈرپوک پرندے شکاری کی آہٹ سنتے ہی روپوش ہوجاتے ہیں۔ اس کا وجود بھی یوں کھڑا تھا کہ ایک قدم جوانی کے دائرے میں اور دوسرا بُڑھاپے کے دائرے میں... وقت اور حالات نے اسے ایسے دوراہے پر کھڑا کردیا تھا جہاں صرف موت منتظر تھی... سنگین حالات کے تلاطم نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا... زیرک دشمن نے اپنی دوستی اور دشمنی کی حدوں کو چھوتے ہوئے ایک مسلسل عذاب سے دوچار کردیا تھا... ایک مُکّے باز دلیر باپ کی جرأت مندانہ جدوجہد... غم اور اذیت نے اس کے جذبات کو بھڑکادیا تھا۔

ایک باکسر کی سحر انگیز زندگی کے طلسماتی کرشمے

زندگی ایک سدا بہتی ندی کا نام ہے۔ یہ بہتی ہے اور موڑ مڑتی رہتی ہے۔ کئی موڑ اتنے حیران کن ہوتے ہیں کہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا۔ مُدام بہتا پانی مسلسل راستے بدلتا ہے اور یہ بدلتے راستے انسان کو ششدر کرڈالتے ہیں۔ عدیل بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ وہ زیادہ تر کروٹ کے بل ہی لیٹتا تھا۔ ایک طرف دیوار پر مرحومہ بیوی کی تصویر تھی۔ وہ کوئی سات برس پہلے زندگی کے سفر میں اسے تنہا چھوڑ کر ایک اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ موٹروے پر ایک ایکسیڈنٹ..... جس نے اس کی جان لے لی تھی اور عدیل کو قریباً معذور کرڈالا تھا۔ ہاں ان دونوں کی محبت کی نشانی الہام معجزانہ طور پر محفوظ رہی تھی۔ اب اس خالی گھر میں وہی تھی جس کا وجود عدیل کو جینے پر آمادہ کرتا تھا۔

ایک پہلو پر لیٹے لیٹے وہ تھک گیا تو کروٹ بدل لی۔ اب اس کی مرحومہ بیوی سنبل کی تصویر اس کے سامنے تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا اسے لگتا وہ اسے جینے کا حوصلہ دے رہی ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اب اس میں آہستہ آہستہ حوصلہ پیدا ہوتا جارہا تھا۔

وہ احتیاط سے اٹھا..... وال کلاک دوپہر کے ایک بجے کا وقت بتارہا تھا۔ ملازمہ راحت آج چھٹی پر تھی۔ تاہم وہ کل ہی کھانا پکا کر فریج میں سلیقے سے رکھ گئی تھی۔ عدیل نے بہت احتیاط سے جھک کر کھانا نکالا اور گرم کرنے

کے لیے کچن میں لے آیا۔ اسی دوران میں کال بیل نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کچھ انتظار کیا جب تیسری مرتبہ بیل ہوئی تو وہ لان پار کر کے دروازے تک پہنچا۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''جی..... ذرا دروازہ کھولیے۔'' ایک سُریلی آواز نے جواب دیا۔

پنجوں پر کھڑے ہو کر اس نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ ایک خوش رُو لڑکی شال لپیٹے کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال سرما کی سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا۔ ''جی فرمایئے۔'' وہ شائستہ لہجے میں بولا۔

''جی میرا نام تابانہ ہے۔ ہم اسی لین میں تھوڑا آگے رہتے ہیں۔ وہ کارنر والا گھر 28K جس کے گرین شیڈز ہیں۔'' اس کی آواز بھی اس کے نقوش کی طرح تیکھی اور سُبک تھی۔

اس سے پہلے کہ عدیل پھر اپنا سوال دہراتا یعنی جی فرمائیں، کہتا، وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟''

''دراصل میں.....'' وہ گڑبڑا گیا۔

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ صرف دو چار منٹ دے دیں۔ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔'' عدیل نے اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ معقول ہی نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے لڑکی کہا جا سکتا تھا۔ رعایت کے بغیر وہ بہ آسانی ''جواں سال'' کہلا سکتی تھی۔ محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھائیس تیس سال تھی۔ اس نے جس انداز سے اندر آنے کی درخواست کی تھی، عدیل کو راستہ دیتے ہی بنی۔ اس نے شال تو بے شک لے رکھی تھی۔ لیکن نیچے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی بڑی شان سے چلتی عدیل کے ساتھ برآمدے میں آ گئی۔ عدیل اسے اس سے آگے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ دسمبر کی سنہری دھوپ برآمدے میں ایک بڑی سی نکون بنا رہی تھی۔ اس نکون میں بید کی میز اور بید ہی کی تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اندر آنے کے بعد یہ جواں سال خاتون ایک دم پُرجوش نظر آنے لگی تھی۔ اس کی پیشانی تمتما گئی تھی اور خوب صورت آنکھوں میں ایک روشنی سی نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے چھریرے جسم پر اونی شال درست کی اور بولی۔ ''آپ عدیل صاحب ہیں نا۔ معروف باکسر۔ ایشیائی چیمپئن.....'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

عدیل نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ تو ایک پرانی بات ہے۔''

اس نے جیسے عدیل کا فقرہ سنا ہی نہیں۔ اسی پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اسی سوسائٹی کے اسی بلاک میں رہائش رکھتے ہوں گے۔ ہمارے گھر سے بس ساٹھ ستر میٹر کے فاصلے پر..... مجھے..... اپنی نگاہوں پر اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ میں..... آپ کی بہت بڑی فین ہوں سر۔ اور میں ہی نہیں میرے ڈیڈی بھی آپ کے فین تھے۔ بلکہ وہی تھے جن کی وجہ سے میں آپ کی فین بنی۔ ڈیڈی محمد علی کلے کے دور سے باکسنگ کے شیدائی تھے۔ ٹی وی وغیرہ پر وہ باکسنگ کا کوئی مقابلہ مس نہیں کرتے تھے۔ جب پاکستان میں باکسنگ کا REVIVAL شروع ہوا اور پھر آپ جیسے کھلاڑی فوج اور پولیس وغیرہ سے نکل کر منظرِ عام پر آئے تو ڈیڈی کی دلچسپیاں پھر تازہ ہو گئیں۔ آپ نے تو انہیں اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ اسپورٹس کے رسالے ہمارے گھر میں عام آتے تھے۔ ان میں اکثر آپ کی تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ میں اس وقت ہائی اسکول کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ایک مرتبہ ایک انٹرنیشنل میگزین میں آپ کی تصویر چھپی تو ڈیڈی خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔ بعد میں، میں نے یہ تصویر کاٹ کر فریم کرائی تھی اور ڈیڈی کو تحفے میں دی تھی۔ وہی والی جس میں آپ نے کورین باکسر کو تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کیا تھا۔'' وہ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی چلی جا رہی تھی۔

وہ ذرا سانس لینے کے لیے رکی تو عدیل کو بمشکل مداخلت کا موقع ملا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا پورا تعارف نہیں کرایا؟''

''اوہ سوری، جی میرا پورا نام تابانہ عاطف ہے۔ عاطف میرے ڈیڈی کا نام تھا۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا بزنس، اسپورٹس کا سامان فروخت کرنے کا تھا۔ شاید اسی نسبت سے مجھے بھی اسپورٹس کا شوق پیدا ہوا۔ میں مارشل آرٹ سے وابستہ ہونا چاہتی تھی..... ایک موقع پر تو میں نے باکسر بننے کا ارادہ کر لیا تھا مگر ایک تو باکسنگ لڑکیوں کا کھیل نہیں ہے۔ دوسرے باکسنگ اور کراٹے وغیرہ میں چہرے پر چوٹ لگنے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں جوڈو کی طرف راغب ہو گئی۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کر کے اپنے ذرا ناکٹ بالوں کو ہلکورا دے کر پیشانی سے ہٹایا اور

بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں موبائی سطح کے مقابلوں میں کامیابی سے حصہ لیتی رہی ہوں۔ نیشنل گیمز میں، میں نے سلور میڈل لیا تھا۔ آج کل گلبرگ کے علاقے میں، میں اپنا کلب چلا رہی ہوں۔ فی زمانہ جس قسم کے حالات ہیں، لڑکیوں میں بھی سیلف ڈیفنس کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔''

عدیل نے اُسے ایک بار پھر سرتاپا دیکھا۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کی تھی، اس کی چال ڈھال سے اندازہ ہوا تھا کہ جسم مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ لچک دار بھی ہے۔ کھلاڑیوں کے لیے ایسا ہی جسم چاہیے ہوتا ہے۔ وہ بھی بڑے اشتیاق سے عدیل کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر عدیل پر توصیف و تعریف کے ڈونگرے برسانا شروع کر دیے۔ عدیل کو محسوس ہونے لگا کہ شاید اسے اپنے بارے میں خود اتنا معلوم نہیں جتنا وہ جانتی ہے۔ عدیل کا سارا کیریئر اُسے ازبر تھا۔ اس کا مقابلہ کس سن میں، کہاں پر کس سے ہوا؟ کتنے ناک آؤٹ اور کتنے ٹیکنیکل ناٹ آؤٹ ہوئے۔ کچھ فائٹس کی ''اسکورنگ'' تک اسے یاد تھی۔

وہ تمتمائے چہرے کے ساتھ پُرجوش انداز میں بولی۔ ''اگر ڈیڈی زندہ ہوتے تو آپ سے مل کر اور اس طرح آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔'' پھر جیسے ایک دم اسے کچھ یاد آیا۔ ''سر! کہا جاتا ہے کہ ایکسیڈنٹ کے بعد آپ کی کمر پر سخت چوٹ آئی تھی، کچھ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ آپ وہیل چیئر پر آ گئے ہیں۔ لیکن آپ تو ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہیں۔''

عدیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔ میں اتنا ٹھیک بھی نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے میں مجھے بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے، مخصوص بستر پر سوتا ہوں۔''

''لیکن سر! آپ اس عمر میں بھی کافی جوان اور اسمارٹ نظر آتے ہیں۔'' وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی پھر اس کے چہرے پر سرخ رنگ سا لہرایا اور وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''سر! آج کل تو آرتھوپیڈک اور فزیوتھراپی بہت ایڈوانس ہو چکی ہے۔ آپ بیرونِ ملک..... ہم..... میرا مطلب ہے.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے عدیل نے کہا۔ ''یہ ایک کافی پیچیدہ انجری ہے۔ اس کی سرجری وغیرہ بھی آسان نہیں ہوتی۔ بس اسی میں اللہ کا شکر ہے کہ آسانی سے چل پھر لیتا ہوں۔''

اچانک تابانہ عاطف نے اپنی ناک سکیڑی۔ ''سر! کچھ جل تو نہیں رہا؟''

اب عدیل کو بھی کچن کی طرف سے جلنے کی بُو آئی۔ جب ڈور بیل ہوئی تھی، عدیل کھانا گرم کر رہا تھا۔ باتوں میں وہ بھول ہی گیا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے کچن میں پہنچا۔ چکن آلو کا سالن تباہ ہو رہا تھا۔ اس نے نیپکن پکڑ کر جلدی سے سالن چولھے سے ہٹایا..... تھوڑا سا شوربا چھلک کر اس کے ٹراؤزر اور پاؤں پر گرا۔ چپل پہنی ہوئی تھی پھر بھی بائیں پاؤں کی انگلیوں میں جلن محسوس ہوئی۔ تابانہ بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کچن میں لپک آئی تھی۔ کچن میں دھواں ہو رہا تھا۔ تابانہ نے جلدی سے ایگزاسٹ چلایا۔ پھر اس کی نگاہ عدیل کے پاؤں پر پڑی۔ ''اوہ، آپ کے پاؤں پر شوربا گرا ہے۔''

وہ جلدی سے نیچے بیٹھ گئی اور اپنی شال سے عدیل کی چپل صاف کرنے لگی۔ عدیل نے اضطراری طور پر اپنا پاؤں پیچھے ہٹا لیا۔

''اوہ سر! آپ کی تو انگلیوں پر بھی سالن گرا ہے۔''

عدیل واقعی جلن محسوس کر رہا تھا۔ عدیل کے منع کرتے کرتے اس نے عدیل کی چپل اتار دی اور سرخ ہوتی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ ''کوئی مرہم ہے آپ کے پاس..... میرا مطلب ہے ڈراماز ین وغیرہ؟''

عدیل نے کچن کیبنٹ کے ایک بالائی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ہاتھ لمبا کر کے اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کے کیبنٹ کا دروازہ کھولا اور مرہم نکال لیا۔ عدیل کچن میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ انگلیوں کا بالائی چھلکا تھوڑا، تھوڑا اترا نظر آ رہا تھا۔ عدیل نے خود مرہم لگانا چاہا مگر وہ نہیں مانی۔ ''نہیں سر! آپ کو کمر جھکانا پڑے گی۔''

وہ سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ عدیل کا پاؤں احتیاط سے اپنی گود میں رکھا اور پاؤں کے جلے ہوئے حصے پر اپنی انگلی سے مرہم کا لیپ کرنے لگی۔ عدیل کو اب تک بہت پرستار ملے تھے لیکن یہ پرستار کچھ جداسی نظر آتی تھی۔ مرہم لگتے ہی عدیل نے اپنا پاؤں اس کی گود سے اتار لیا اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

اپنی بادفا اور ''محبت سے بھرپور شریکِ حیات'' سنبل کی ابدی جدائی کے بعد عدیل کو عورت میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی اب اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ عمر ایسی دلچسپیوں کے لیے مناسب

نہیں ہے۔

''آ... آپ کے ہاں ملازمہ وغیرہ نہیں ہے؟'' اس نے ذرا حیرانی سے پوچھا۔

''ہے بھئی، لیکن آج چھٹی پر ہے۔''

''خیر ہیں، میں آپ کے لیے کھانا گرم کر دیتی ہوں۔'' اس نے چولھے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

عدیل کے منع کرتے کرتے اس نے ایپرن باندھا اور چولھا پھر سے جلا دیا۔

یہی وقت تھا..... جب گیٹ کی طرف کچھ کھٹ پٹ ہوئی۔ عدیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسے یہ سب کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا اور اب تو اور بھی زیادہ غیر مناسب لگنے لگا تھا۔ عدیل کی بیٹی الہام جو میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اپنی ''پرسنل کی'' سے بیرونی دروازہ کھولتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ کچن میں تھی۔ کچن میں اپنے پاپا کے ساتھ ایک خاتون کو مصروف کار دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کی سوالیہ نگاہیں عدیل کی طرف اُٹھیں، پھر اس کی نگاہ عدیل کے مرہم لگے پاؤں پر پڑی۔

اُس نے اپنا اسکول بیگ جلدی سے ایک طرف پھینکا۔ ''اوہ پاپا! یہ کیا ہوا؟ یہ کیسے جل گیا؟'' وہ عدیل کا پاؤں سہلاتے ہوئے بولی۔

عدیل نے مختصراً الہام کو بتایا۔ وہ پریشان نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سوالیہ نگاہیں تابانہ کی طرف بھی اٹھ رہی تھیں۔ عدیل نے کہا۔ ''یہ ہماری محلے دار ہیں بھئی، دو ڈھائی سال سے یہاں رہ رہی ہیں۔ انہیں آج ہی ہمارا پتا چلا ہے۔ ملنے آ گئی ہیں۔'' پھر وہ تابانہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابانہ! یہ میری بیٹی ہیں الہام۔''

تابانہ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے پاپا کی بہت بڑی فین ہوں ڈیئر! آج اتنے برسوں بعد ان کو دیکھ رہی ہوں تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ واقعی دیکھ رہی ہوں۔ ہم یہاں ایک ہی بلاک میں رہتے رہے اور ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔''

الہام نے اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں تابانہ کو سلام کیا پھر بولی۔ ''ویسے مجھے تھوڑا تھوڑا لگ رہا ہے کہ آپ کو آتے جاتے دو چار بار دیکھا ہے۔''

''الہام! وہی دائیں طرف کارنر والا گھر ہے ہمارا، جس کے گرین شیڈز ہیں۔ ویسے اب مجھے بھی لگ رہا ہے کہ یہ پیاری پیاری صورت میں اپنے آس پاس دیکھتی رہی ہوں۔'' اس نے الہام کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد عدیل ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا رہا تھا اور تابانہ ساتھ والے کمرے میں الہام کے ساتھ بیٹھی تیز رفتاری سے باتیں کر رہی تھی۔ الہام بھی جلد ہی ... اس کے ساتھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ اب دونوں کی باتیں رکنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

پولیس کا محکمہ کبھی بھی عدیل کو راس نہیں آیا تھا۔ وہ خود کو اپنے اردگرد کے لوگوں میں بالکل مس فٹ محسوس کرتا تھا۔ پولیس ٹریننگ کے دوران میں اس نے اپنے لیے باکسنگ کی اسپورٹس چنی تھی..... اس نے پنجاب کی سطح پر چند مقابلے بھی جیتے تھے۔ بعد ازاں جب اس کا جی پولیس کی نوکری سے اچاٹ ہوا تو اس نے ایک بار پھر اپنے گیم پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ اسے یکا یک کامیابی ملی اور پھر ایک بڑے ایونٹ میں واپڈا کے ایک باکسر کو اَپ سیٹ شکست دے کر وہ ایک دم اوپر کے ناموں میں آ گیا۔ بعد ازاں کچھ وجوہات کی بنا پر اسے محکمہ بالکل چھوڑنا پڑا اور اس نے خود کو ایک چیمپئن باکسر کے طور پر اسٹیبلش کر لیا۔ اس کی بیوی سنبل نے ہر ہر قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس کی کامیابیوں میں سنبل کا بڑا کردار تھا۔ سنبل کو کھونے کے بعد اس نے باکسنگ کو ہی نہیں کھویا تھا خود بھی کھو دیا تھا۔ اس حادثے کے وقت الہام فقط سات آٹھ سال کی تھی۔ عدیل نے اسے اپنے سینے سے چمٹا کر مزید زندہ رہنے کا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔ الہام بہت حد تک سنبل کی تصویر تھی۔ وہ نہ ہوتی تو شاید شریکِ حیات کا غم اسے مار ہی ڈالتا۔

وہ دوپہر کے قیلولے کے بعد بستر پر لیٹا انہی خیالوں میں گم تھا جب اسے چھت پر دھما دھم کی تھم تھم آوازیں سنائی دیں۔ عدیل نے ملازمہ راحت کو آوازیں دیں لیکن وہ شاید لان میں تھی۔ اس نے الہام کو پکارا۔ دوسری، تیسری آواز پر وہ سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اترتی دکھائی دی۔ اس نے ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے اور وہ ہانپی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے تابانہ بھی اترتی دکھائی دی۔ وہ جین اور جرسی میں تھی۔ وہ بھی کچھ ہانپی ہوئی تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ دونوں نے عدیل کو سلام کیا اور اس کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔

''یہ کیا ہو رہا تھا اوپر؟'' عدیل نے پوچھا۔

الہام نے شوخی سے تابانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''پاپا! ان سے ملیے..... یہ ہیں میری ٹیچر مس تابانہ عاطف۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میری نئی ٹیچر..... میں آج سے

ان کی شاگرد ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"پاپا! یہی جو دھم دھم آپ نے سنی ہے اس سلسلے میں۔ یہ مجھے جوڈو سکھائیں گی بلکہ ان کی اتنی زیادہ "کانیڈنس" ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ یہ مجھے گھر آ کر سکھایا کریں گی۔ ہفتے میں تین روز۔" وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

عدیل سٹپٹا سا گیا لیکن اُس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پچھلے آٹھ دس روز میں تابانہ کی دخل در معقولات میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ قریباً ہر دوسرے روز چلی آتی تھی۔ دو بار وہ کچھ پکا کر بھی لائی تھی۔ پھر ایک دن وہ ڈھیر سارے پرانے ٹکی اور غیر ٹکی میگزینز لے آئی تھی۔ ان میں کسی نہ کسی طور عدیل کا تذکرہ تھا یا تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ اس دن اس کی والدہ بھی ساتھ آئی تھیں۔ وہ قریباً پچپن برس کی ماڈرن لیکن مدبر سی خاتون تھیں۔ کلب چلانے میں وہ تابانہ کی معاونت بھی کرتی تھیں۔ وہ بڑے اشتیاق سے ملیں۔ دونوں نے عدیل کے ساتھ تصویریں وغیرہ بنوائیں۔ تابانہ جو پرانے رسالے اٹھا لائی تھی، یہ کام عدیل کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ عدیل اس ماضی کو زیادہ یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس تابناک ماضی کے ساتھ سنیل کی بے شمار یادیں بھی یلغار کر کے ذہن میں آ گھستی تھیں۔

"کس سوچ میں کھو گئے پاپا۔" الہام کی آواز نے عدیل کو اس کے خیال سے چونکایا۔ وہ عدیل کے کندھے پر ٹھوڑی رکھ کر شوخی سے بولی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ مس تابانہ مجھ سے کوئی فیس چارج نہیں کریں گی۔ کیوں مس، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس نے گردن گھما کر تابانہ کی طرف دیکھا جو کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"بالکل الہام۔ فیس کا کوئی سوال نہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر مجھے بہت اچھا لگے گا..... ہاں..... اگر سر اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہیں تو یہ علیحدہ بات ہے۔" آخری جملہ اس نے عدیل کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا شوخی سے ادا کیا تھا۔

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟" عدیل نے سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ بدلے میں مجھے باکسنگ کے تھوڑے سے داؤ پیچ سکھا دیں تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

تابانہ نے گو یہ بات ہلکے پھلکے انداز میں کہی تھی مگر عدیل کو ناگوار گزری۔ عدیل کے تاثرات دیکھ کر وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی..... اور موضوع بدل دیا۔ الہام کی کوئی بھی بات ٹالنا عدیل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی ہر ادا میں اسے مرحومہ بیوی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہی سنیل کی سی شفاف مسکراہٹ، وہی اندازِ گفتگو..... وہی دوسروں کا درد بانٹنے کی خُو اور ہر وقت کام میں لگے رہنے کی دُھن۔

اس نے بڑی آسانی سے عدیل سے یہ اجازت لے لی تھی کہ وہ ہفتے میں تین بار آدھ پون گھنٹا تابانہ کے ساتھ گزار لیا کرے۔ اگلے آٹھ دس روز میں تابانہ کئی بار ان کے گھر آئی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ فزیوتھراپی بھی جانتی ہے۔ جوڈو کی پریکٹس کے لیے الہام نے ایک مہنگا گدا بھی منگوا لیا تھا۔ اس گدا زگدے کے باوجود دھم دھم کی آوازیں بالائی منزل سے نیچے پہنچتی تھیں۔ تاہم ان آٹھ دس روز میں ایک بار بھی تابانہ سے عدیل کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ جان بوجھ کر اسے Avoid کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اسے تابانہ سے گریز کرنا چاہیے۔ کسی وقت عدیل سے بات کرتے ہوئے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت نمودار ہوتی تھی۔ وہ اس کیفیت کو صرف پسندیدگی نہیں کہہ سکتا تھا لیکن پسندیدگی کے علاوہ کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا پھر اسے اس دن والی بات کا بھی غصہ تھا۔ اس نے باکسنگ سیکھنے والی بیکار سی بات کر ڈالی تھی۔

ایک روز وہ ایسے وقت آ دھمکی جب الہام اسکول گئی ہوئی تھی۔ عدیل کمرے میں تھا اور فون پر جمیل سے بات کر رہا تھا۔ جمیل اس کا چھوٹا بھائی ہی نہیں غم خوار دوست بھی تھا۔ بیوی بچوں والا ہونے کے باوجود عدیل سے اس کا تعلق ایسے ہی تھا جیسے دونوں ابھی تک لڑکے بالے ہوں۔ خاص طور سے والدین کی وفات کے بعد وہ عدیل سے اور بھی قریب ہو گیا تھا پھر جب عدیل کو حادثہ پیش آیا تو جمیل نے اس کی صحت کی بحالی اور اس کا غم بانٹنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اس حادثے سے پہلے ہی دونوں بھائیوں نے پراپرٹی کی "سیل پرچیز" کا چھوٹا سا کام شروع کر دیا تھا۔ حادثے کے بعد اس کام کی تمام تر ذمے داری جمیل نے خود اٹھا لی تھی۔ اب یہ کام کافی پھل پھول چکا تھا۔ جمیل کسی خاص موقع پر ہی عدیل کو زحمت دیتا تھا ورنہ وہ کاروبار کے سارے مسائل خود ہی ہینڈل کرتا تھا۔

دونوں بھائیوں میں گفتگو کے دوران میں ہی کمرے کے بند دروازے پر تڑ تڑ دستک ہوئی۔ "کون؟" عدیل نے پوچھا۔

''میں تابانہ ہوں جی۔ اندر آسکتی ہوں۔'' ایک لمحے کے لیے عدیل سٹپٹایا پھر اس نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ ''یار سوری، ایک ملنے والا آگیا ہے۔ شام کو بات کریں گے۔'' فون بند کرکے وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''آجاؤ۔''

وہ دروازہ دھکیل کر اندر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا بھی آیا۔ آج وہ شلوار قمیص میں دکھائی دے رہی تھی۔ کندھوں پر شال تھی۔ وہ ذرا جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ اس روز ایویں میں نے منہ سے وہ بات نکال دی۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ انجری کے بعد آپ ہاکنگ وغیرہ سے بالکل دور ہو چکے ہیں اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔''

عدیل نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ ذرا آگے جھک کر بیٹھی لہجے میں بولی۔ ''آئی ایم سوری، میں آئندہ احتیاط کروں گی۔''

عدیل نے بستر پر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلو کوئی بات نہیں، اگر تمہیں احساس ہوگیا ہے تو اچھی بات ہے۔''

''اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے چائے بنا دوں۔'' عدیل نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی اثنا میں تابانہ کی نگاہ عدیل کے پاؤں پر پڑی۔ پاؤں ٹھیک ہو چکا تھا تاہم دو انگلیوں پر ابھی تک زخم موجود تھا۔ وہاں سے بینڈیج کھسکی ہوئی تھی۔ ''اوہو، آپ کی بینڈیج ٹھیک ہونے والی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں کر لیتا ہوں اسے۔'' عدیل نے بستر پر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ پاؤں کی طرف جھکا تو ہمیشہ کی طرح تیزی سے جھکا نہیں گیا۔ اس کی کیفیت محسوس کرکے وہ فوراً بولی۔ ''تھہریے میں کر دیتی ہوں۔''

عدیل کے روکتے روکتے وہ بستر پر پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور عدیل کا پاؤں پہلے کی طرح بڑی احتیاط سے گود میں رکھ لیا۔ جیسے وہ پاؤں نہ ہو کوئی چھوٹا سا بچہ ہو جسے وہ اپنی آغوش کی نرمی و گرمی دے رہی ہو۔ پاس والی تپائی سے اس نے کاٹن اور پائیوڈین اٹھائی۔ محلول سے عدیل کی انگلیاں صاف کرکے اس نے نئی بینڈیج لگا دی۔ وہ اپنے گداز ہاتھوں کو بڑی نرمی سے عدیل کے پاؤں پر گردش دے رہی تھی۔ بینڈیج مکمل ہوتے ہی عدیل نے اپنا پاؤں اس کی گود سے کھینچ لیا۔

واش بیسن پر ہاتھ دھو کر وہ پھر کرسی پر آن بیٹھی۔ اس نے اپنی سرخ جرسی کی ایک پاکٹ میں سے ایک کارڈ سائز کی تصویر نکالی۔ یہ انہی تصویروں میں سے ایک تھی جو چند روز پہلے اس نے اپنے اسمارٹ فون سے لی تھیں۔ ان تصویروں میں عدیل کے علاوہ تابانہ کی والدہ بھی موجود تھیں لیکن جو تصویر تابانہ اب عدیل کو دکھا رہی تھی اس میں صرف عدیل اور تابانہ ہی نظر آتے تھے۔ شاید اس میں عدیل اور تابانہ ہی تھے یا تصویر پرنٹ کراتے ہوئے اس نے اپنی والدہ کو فریم میں سے نکال دیا تھا۔

تصویر دیکھ کر عدیل کو سینے میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ تصویر کا انداز ایسا تھا جیسے یہ ایک ''کپل'' کی تصویر ہو۔ وہ بڑی شان سے سینہ تانے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے عدیل کے پہلو میں کھڑی تھی۔ ''کتنی صاف اور پیاری تصویر آئی ہے سر۔'' وہ عدیل کی جانب دیکھ کر بولی۔

''اچھی ہے۔'' عدیل نے کہا اور ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر تصویر سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ سرخ جرسی کے کالر سے ٹنگا ہوا قلم اتار کر بولی۔ ''پلیز، اس کے پیچھے سائن کر دیجیے۔ میرے لیے یادگار رہے گا۔''

عدیل نے بے دلی سے سائن کر دیے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''تم سے ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں۔''

''دیکھیں، اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، آپ کو کسی بھی سلسلے میں مجھ سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''تم نے ابھی تک شادی نہیں کی، کوئی خاص وجہ ہے؟''

وہ مسکرائی اور دانت لشکارے مارنے لگے۔ ''ویسے میری عمر ابھی اتنی بھی زیادہ نہیں ہوئی سر! اٹھائیس سے زیادہ اور انتیس سے کم ہوں۔'' اس نے ہنس کر اپنے تراشیدہ بالوں کو ہلکورا دیا اور بولی۔ ''ایک جگہ منگنی ہوئی تھی جی۔ لڑکا بے وقوفی کی حد تک کھلنڈرا اور رنگ رنگیلا تھا۔ میرا جی اچاٹ ہوگیا پھر ایک جگہ اور بات چلی۔ اس کا ٹھ کے الّو کی کوئی اپنی رائے ہی نہیں تھی۔ ایک دن کہتا تھا کہ اسے میرے کلب چلانے پر کوئی اعتراض نہیں، دوسرے دن انکاری ہو جاتا تھا۔ دراصل وہ اپنے ماما، پاپا کا ریموٹ کنٹرول کھلونا تھا۔ اب سچ پوچھتے ہیں تو مجھے ان لااُبالی قسم کے لااُبالی ''نونہالوں'' سے الرجی سی ہوگئی ہے۔ مجھے سنجیدہ، سنجیدہ طبیعت کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ ان کی سوچ میں پختگی ہوتی ہے۔ نونہالوں والی سطحی جذباتیت بھی نہیں ہوتی اُن میں.....'' وہ سر جھکا کر عام سے لہجے میں بولتی چلی جا رہی تھی

مگر اُس کے لہجے کی تہ میں ایک معنی خیزی بھی تھی۔ عدیل بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

☆☆☆

عدیل کو پاکستان اور پاکستان کے باہر سے بھی ڈھیروں خطوط اور پیغامات آتے تھے۔ لوگ اسے ایک ہر دلعزیز باکسر کے طور پر جانتے تھے (بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ کسی وقت باکی کا کھلاڑی بھی رہا ہے) باکسنگ میں عدیل کی پہچان تھی کہ وہ Ring میں ہمیشہ بہت پُرسکون نظر آیا کرتا تھا۔ اپنے حریفوں پر گرجتا برستا نہیں تھا۔ بڑے اطمینان سے بلکہ مسکراتے انداز میں اپنا دفاع کرتا تھا۔ اس کی جارحیت میں بھی ایک طرح کی فن کاری ہوتی تھی۔ لوگ اس کے انداز کو بہت پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی مجبوری کا احساس کیے بغیر لوگ ایک بار پھر اس کو Ring میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ اسپانسرز نے تو اسے بڑی بڑی آفرز کے ذریعے مجبور بھی کیا تھا کہ وہ پھر Ring میں آئے۔ ایسا ہی ایک شخص ظہور باوا نامی بھی تھا جو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

وہ کچھ خطوط دیکھ رہا تھا۔ جمیل اور اس کی بیوی آمنہ بھی آئے ہوئے تھے۔ جمیل نے کہا۔ ''بھائی جان! پرسوں ایک اسپورٹس چینل پر آپ کا ایک پرانا انٹرویو چلایا جا رہا تھا۔ لوگ آپ کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں، کیونکہ.....'' جمیل کی بات ادھوری رہ گئی، پرانا ملازم شرفو بابا اور الہام ہانپتے ہوئے سے اندر آئے۔ الہام نے کہا۔ ''پاپا! جلدی باہر آئیں۔ سامنے سڑک پر کچھ لوگ ٹیچر سے جھگڑا کر رہے ہیں.....''

عدیل اور جمیل کمرے سے نکلے اور لان کراس کر کے گیٹ سے باہر آئے۔ سہ پہر کی چمکیلی دھوپ میں کچھ فاصلے پر سڑک کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ الہام کی ٹیچر یعنی تابانہ کی آلٹو گاڑی ایک کنارے پر کھڑی تھی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پینٹ جیکٹ میں ملبوس تابانہ سڑک پر تھی۔ دو بچے کھچے لڑکے اور ایک فیشن ایبل لڑکی تابانہ سے جھگڑ رہے تھے۔ نوبت گالی گلوچ تک پہنچ چکی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ گتھم گتھا ہو گئے۔ تابانہ بھی کوئی عام نہیں تھی۔ جوڈو کی کھلاڑی رہی تھی اور باقاعدہ کلب چلاتی تھی۔ اس نے ایک موچھیل لڑکے کو گھما کر دیوار سے دے مارا۔ مقابل لڑکے کے بال تابانہ کی گرفت میں آ گئے۔ اس نے بال کھینچ کر اسے رکوع کے مل جھکایا اور پھر ٹانگ مار کر دور پھینک دیا مگر اس دوران میں دوسرے لڑکے نے اسے عقب سے بازوؤں کے شکنجے میں لے لیا۔ پہلے والا لڑکا بھی سنبھل کر اس سے چمٹ گیا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی اندرونی سڑک پر ہونے والا یہ دنگل اکا دکا راہ گیر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

عدیل اور جمیل تیزی سے آگے بڑھے۔ موچھیل لڑکا طیش کے عالم میں تابانہ کو زمین بوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمیل نے آگے بڑھ کر اسے چھاپ لیا۔ دوسرے لڑکے کو عدیل کا ایک زوردار گھونسا سہنا پڑا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔ تابانہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ عدیل چاہتا تو حملہ آور لڑکے کو ایک دو گھونسے مزید رسید کر کے لمبا لٹا سکتا تھا مگر اپنی معذوب کمر کی وجہ سے وہ ایسی مہم جوئی سے ہمیشہ دامن بچا لیتا تھا..... تابانہ اور جمیل نے اس لڑکے کو بھی چند کراری ضربیں لگائیں۔ اب اردگرد کے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ دونوں حملہ آور لڑکے، فیشن ایبل لڑکی سمیت دھمکیاں دیتے اور گالیاں بکتے اپنی ہنڈا گاڑی میں بیٹھے اور موقع سے کھسک گئے۔

تابانہ کا چمکیلا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کی جیکٹ ایک طرف سے پھٹ گئی تھی لیکن ویسے اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ پتا چلا کہ وہ عید کی کچھ شاپنگ کرنے کے لیے گھر سے نکلی تھی کہ ان لوگوں نے اس کا رستہ روکا اور جھگڑا شروع کر دیا۔ یہ ایک طرح سے کاروباری رقابت کا معاملہ تھا۔ تابانہ گلبرگ کے علاقے میں لڑکیوں کے لیے جوڈو کا کلب چلا رہی تھی، یہ لوگ بھی وہیں پر مارشل آرٹ اور یوگا وغیرہ کا کلب چلاتے تھے۔ دونوں میں کئی ماہ سے کشمکش چل رہی تھی جو اب سیدھا سیدھا جھگڑے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

عدیل نے تابانہ سے پوچھا۔ ''تمہاری والدہ کہاں ہیں؟''

وہ اپنی سانسیں درست کر چکی تھی۔ اپنے ڈیانا کٹ بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ ''عید کی چھٹیوں کی وجہ سے کلب بند ہے۔ وہ پنڈی میں اپنی بہن کے ساتھ عید گزارنا چاہتی تھیں اس لیے وہاں گئی ہوئی ہیں۔''

''اوہ۔'' جمیل نے ہونٹ سکیڑے۔ ''کہیں یہ لوگ آپ کو دوبارہ پریشان تو نہیں کریں گے؟''

''کریں گے تو نمٹ لوں گی اُن سے۔''

''ہمارا مطلب ہے، کوئی مرد وغیرہ ہے گھر میں؟'' عدیل نے پوچھا۔

''ہے تو نہیں سر! لیکن میں کلب سے گارڈ کو بلوا لوں

گی۔"

وہ چاند رات تھی۔ جمیل اور آمنہ اپنے گھر واقع گلشن راوی واپس جا چکے تھے۔ عدیل اپنے تخت بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ گھر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ عدیل کی نگاہیں سامنے دیوار پر سنبل کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ خوشی کے ایسے موقعوں پر ماضی کے ماہ و سال ایک فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے متحرک ہو جاتے تھے۔ وہ ایک مثالی بیوی تھی۔ عدیل کی والدہ قدسیہ بیگم ہی نہیں گھر کا ہر فرد اس پر جان چھڑکتا تھا، کوئی بھی اسے نہیں بھول سکا تھا..... تو وہ کیسے بھولتا۔ وہ تو آٹھ برس تک اس کی دھڑکنوں خلوتوں اور بیش بہا محبتوں کا ساتھی رہا تھا۔

الہام تیزی سے اندر آئی اور عدیل کو اس کے خیالوں سے چونکا دیا۔ "پاپا! میں نے ابھی مس تابانہ کو فون کیا ہے۔ وہ گھر میں اکیلی ہیں اور تھوڑا پریشان بھی ہیں۔ جھگڑے کی وجہ سے۔"

"اکیلی کیوں ہیں، وہ تو کہتی تھیں کہ کلب سے گارڈ کو بلا لیں گی؟"

"ان کا گارڈ بھی ہر صورت اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے..... ویسے پاپا..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم مس تابانہ کو دو تین دنوں کے لیے یہاں لے آئیں؟"

"کیا انہوں نے اس بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں، کہا تو نہیں۔ لیکن ان کی باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید وہ چاہتی ہیں۔ اِن فیکٹ یہاں لاہور میں ان کا کوئی رشتے دار بھی تو نہیں ہے۔"

الہام مُصر ہو گئی کہ وہ اپنی کیئر ٹیکر تابانہ کو دو تین دن کے لیے یہاں لے آئی ہے۔ عدیل کے لیے الہام کی بات کو ٹالنا ہمیشہ سے بہت دشوار تھا۔ اگر وہ ٹالتا تو وہ عید کے یہ دو تین دن خوش ہو کر نہ گزار سکتی۔ ویسے بھی موجودہ صورتِ حال میں تابانہ کا گھر میں اکیلے رہنا کچھ خیر محفوظ لگتا تھا۔ عدیل نے اجازت دی تو الہام ملازمہ راحت کے ساتھ جا کر تابانہ کو اس کے مختصر سامان سمیت لے آئی۔

وہ تینوں رات کو دیر تک بیٹھی رہیں۔ ایک دوسرے کو مہندی وغیرہ لگاتی رہیں۔ عید کا دن بھی اچھا گزرا۔ جمیل، آمنہ اور ان کے بچے بھی آ گئے۔ کل کے ناخوشگوار واقعے کو بھول کر تابانہ بھی چہک رہی تھی۔ اس نے آج چمکیلا شرقی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ تراشیدہ بالوں کے باوجود یہ لباس اسے جچ رہا تھا۔ جتنی بار اس کی نگاہ سے عدیل کی نگاہ ملی، اسے ایک سنسنی سی محسوس ہوئی۔ وہ سنسنی جسے وہ ہرگز محسوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دن تو ٹھیک گزرا لیکن شام کے بعد عدیل کو ہلکا سا بخار ہو گیا۔ چھینکیں وغیرہ بھی آئیں۔ اسے فلو کی شکایت ہو گئی تھی۔ پیناڈول وغیرہ کھا کر وہ جلدی سو گیا۔ رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو گہری غنودگی میں اسے اپنے ماتھے پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ کمرے کی ہلکی روشنی میں تابانہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔

وہ تکیے کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا اور ذرا تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "آپ بخار کی حالت میں بڑبڑا رہے تھے۔ میں آواز سن کر آ گئی۔ آپ کہہ رہے تھے..... سر درد سے پھٹا جا رہا ہے..... پلیز ذرا دبا دو۔" پھر وہ ذرا جھک کر اور رک کر بولی۔ "آپ..... اپنی مسز کا نام لے رہے تھے۔ سنبل تھا نا اُن کا نام؟"

عدیل نے تکیے سے ٹیک لگائی تاہم تابانہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رات کے دو بجے اس کے بستر پر چڑھی بیٹھی تھی۔ عدیل کو یہ سب عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ الہام یا راحت میں سے کوئی دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا۔

وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "آپ کا جسم اب بھی تپ رہا ہے۔ کوئی دوا وغیرہ لے لیں۔"

وہ بھاری آواز میں بولا۔ "یہ عام سا فلو ہے۔ میں فلو میں دوا وغیرہ نہیں لیا کرتا۔ شام کو بھی الہام نے زبردستی پیناڈول کھلا دی تھی..... بس وہ پانی والا گلاس یہاں تپائی پر رکھ دو اور جاؤ..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے شتابی سے گلاس میں تازہ پانی بھر کر عدیل کے سرہانے رکھا۔ اس کے کمبل کو ڈبل کیا اور پھر اجازت لے کر چلی گئی۔ عدیل نے جماہی لی اور ناپسندیدگی کے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ مگر ایک ہی منٹ بعد وہ پھر کمرے کے دروازے پر نمودار ہو گئی۔ کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بولی۔ "سوری سر! آپ کو پھر ڈسٹرب کرنے آ گئی۔ پلیز بُرا نہ مانیے گا۔" اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ آپ کے لیے عید کارڈ ہے۔ کل وہ جھگڑے والا واقعہ ہو گیا۔ آپ کو دے نہ سکی لیکن خیر اب بھی کون سا عید گزر گئی ہے۔ ہمارے ہاں عید کارڈ لینے اور دینے کی خوب صورت روایت کو یہ موبائل فونز کھا گئے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ یہ روایت زندہ رہے۔" اس نے جھک کر لفافہ عدیل کے سرہانے رکھ دیا۔

وہ سنک کے ڈھیلے ڈھالے نائٹ گون میں تھی پھر بھی جسم کئی جگہوں سے نمایاں ہو رہا تھا۔

عدیل نے اپنے اندر کی ناگواری کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ۔ بہرحال اس کی ضرورت نہیں تھی۔ باقی تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔ پتا نہیں کتنی دیر یہاں بیٹھ کر میرا سر دباتی رہی ہو، مجھے فلو ہو رہا ہے۔ یہ بڑی جلدی ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔''

وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔ ''آپ کا فلو مجھے ٹرانسفر ہو جائے تو یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

عدیل کی سٹپٹاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے لفافہ چاک کر کے عید کارڈ دیکھا۔ ایک سہانی شام میں دیوار کے ایک بلند و بالا درخت کے تنے کے سامنے ایک لڑکی دوزانو بیٹھی تھی اور زمین بوس شاخوں کو دیکھ رہی تھی۔ نیچے انگلش کے دو رومانی VERSES بھی پرنٹ تھے۔

عدیل نے گہری سانس لے کر کارڈ ایک طرف رکھ دیا وہ کوئی انجان لڑکا نہیں، ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ تابانہ جس رخ پر جا رہی تھی، وہ اچھی طرح عدیل کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ ایک سیلابی ریلے کی طرح بڑھتی چلی آ رہی تھی اور اس امر سے بے خبر تھی کہ یہ سب کچھ عدیل کو پسند نہیں آ رہا۔ سنگل کے بعد زندگی کا یہ باب اس کے لیے قریباً بند ہو گیا تھا۔ پھر وہ ایک جوان ہوتی بیٹی کا باپ تھا، وہ اس قسم کی خرافات میں پڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے باکسنگ کے رنگز سے آؤٹ ہوئے سات برس ہونے کو آئے تھے مگر اب بھی ملک میں اور ملک سے باہر اس کے اَن گنت فین موجود تھے۔ ان میں ہر عمر کے مرد و زن شامل تھے۔ دو چار ایسی پُرجوش فی میل پرستار بھی تھیں جنہوں نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی مگر عدیل نے ہمیشہ اپنے اور اپنے چاہنے والوں کے درمیان ایک معقول فاصلہ رکھا تھا۔ یہاں مسئلہ یہ ہوا تھا کہ یہ جوشیلی پرستار نہ صرف اس تک پہنچ چکی تھی بلکہ اس کے گھر میں بھی موجود تھی۔ وہ صرف پرستار ہوتی تو بھی کوئی بات نہیں تھی مگر اس کا ''تعلق'' تو ایک نہایت سنجیدہ قسم کا رومانی ٹچ لیے ہوئے تھا۔ اب یہ صورتِ حال عدیل کو کچھ کچھ ہراساں کرنے لگی تھی۔ وہ جس بیباکانہ انداز میں اس کے اردگرد موجود تھی، عدیل کا دفاع کمزور نہ بھی ہوتا تو لرزہ براندام ضرور ہو سکتا تھا۔ پھر پچھلے دو تین ہفتوں میں عدیل نے ایک اور بات محسوس کی تھی اور یہ بڑی ''شاکنگ'' تھی۔ اُسے یوں لگا تھا کہ وہ عدیل اور اس کی بیٹی کے درمیان ایک پردہ سا تان رہی ہے۔ الہام اب عدیل پر پہلے جیسی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کا جو وقت اسٹڈی سے بچتا تھا، وہ اپنی اس نئی ٹیچر کے اردگرد گزر جاتا تھا۔ کبھی اسے فون کر رہی ہوتی تھی۔ کبھی اس کے ساتھ ٹریننگ میں اور کبھی ٹریننگ کی دہرائی وغیرہ میں مصروف ہوتی تھی۔ اب ٹیچر صاحبہ دو روز سے ویسے ہی گھر میں موجود تھیں۔ الہام نے قریباً ساری عید اس کی معیت میں ہی گزار دی تھی۔ کسی وقت تو عدیل کو یوں بھی محسوس ہوا تھا جیسے وہ باپ بیٹی کے غیر معمولی پیار سے تھوڑا بہت حسد بھی کرتی ہے۔

اگلے روز ٹرو تھا۔ دوپہر سے ذرا پہلے الہام دندناتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ ''پاپا! آج ٹرو ہے۔ کہیں آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔ چچا جمیل کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... لیکن میری طبیعت رات سے کچھ خراب ہے۔''

''اوہ گاڈ، کیا ہوا؟'' اس نے جلدی سے عدیل کا ماتھا چھوا۔

''نہیں کچھ زیادہ نہیں ہلکا زکام اور بخار ہے۔'' اس نے الہام کو تسلی دی۔

وہ فکرمند نظر آنے لگی۔ ''کوئی دوا لی آپ نے پاپا؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ الماری سے تھرمامیٹر نکال لائی اور بخار چیک کرنے لگی۔

اسی اثنا میں تابانہ بھی ناک سے سُوں سُوں کرتی اندر آ گئی۔ اس کی ستواں ناک سرخ ہو رہی تھی اور ہاتھ میں ٹشو پیپر تھا۔

الہام بولی۔ ''اوہ مس! آپ کو بھی فلو ہو گیا؟''

''ہاں تھوڑی سی شکایت ہو گئی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''مس! کوئی دوا لی آپ نے؟''

''نہیں..... دوا لوں گی تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب؟ آپ نہیں چاہتیں کہ یہ ٹھیک ہو؟''

اُس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں..... بڑی دیر بعد ہوا ہے فلو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ کبھی کبھار یہ ہو جانا چاہیے۔''

عدیل تھرمامیٹر منہ میں دبائے خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ الہام اب عدیل کا سر دبانے لگی تھی۔ تابانہ نے فوراً اسے ٹوکا۔ ''نہیں الہام تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ کہیں بیمار نہ ہو جانا۔ مجھے تو ہو چکا ہے اس لیے میں دیکھتی ہوں ان کو۔''

الہام چار و ناچار اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے کے

پاس پہنچ کر بولی۔ ''پاپا! آپ کے لیے جوشاندہ بنا کر لاؤں؟''

اس سے پہلے کہ عدیل جواب میں کچھ کہتا، تابانہ فوراً بولی۔ ''بھئی الہام! کہا ہے نا تم سے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں بنا دوں گی جوشاندہ بھی۔''

الہام چلی گئی۔ تابانہ تھرمامیٹر دیکھنے کے بعد عدیل کا ہاتھ چھو کر بولی۔ ''بس ہلکی سی حرارت ہے۔ انشاء اللہ کل تک اچھے ہو جائیں گے۔ ویسے رات تو ٹھیک گزری نا آپ کی؟''

عدیل کو غصہ آرہا تھا، لیکن اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دو دن گھر میں مزید رہی۔ اگلے روز عدیل کی طبیعت بہتر ہو گئی تھی، بخار بھی اتر گیا تھا مگر وہ مسلسل اس کے اردگرد منڈلاتی رہی تھی۔ کسی وقت تو وہ عدیل کو کچھ تھکی ہوئی لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سے ہر وقت کچھ شعاعیں سی نکلتی رہتی تھیں اور یہ شعاعیں گاہے گاہے عدیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔

جھگڑے والا واقعہ اب کچھ ٹھنڈا ہی نظر آرہا تھا۔ مخالف پارٹی کی طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی سامنے نہیں آئی تھی جس روز تابانہ کی والدہ میڈم تنویر پنڈی سے واپس آئیں اسی روز وہ بھی گھر چلی گئی..... لیکن جاتے جاتے وہ ایک کارنامہ بھی انجام دے گئی۔

رات کو عدیل نے اپنا سلیپنگ گاؤن پہنا تو اس کی جیب میں اسے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ گلابی لیٹر پیڈ پر ایک تہ شدہ خط تھا جو تابانہ کی طرف سے تھا۔ تحریر کچھ اس طرح تھی۔

جناب! شاید آپ میرے جذبات کو میرا لاابالی پن سمجھتے ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ کوئی حالیہ ایک دو ماہ کا قصہ نہیں ہے، یہ کئی برسوں پر محیط کتھا ہے۔ ڈیڈی چلے گئے لیکن شاید وہ آپ کے لیے اپنی ساری پسندیدگی مجھ میں منتقل کر گئے۔ جب پچھلے ماہ آپ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو یوں لگا جیسے ایک برسوں پرانے سپنے کو تعبیر مل گئی ہے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا تھا اور نہ اب آرہا ہے۔ پتا نہیں کہ میرے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں آپ کی صرف پرستار نہیں ہوں..... میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ سے ملنے کے بعد اس محبت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اگر میں نے اب آپ کو کھو دیا تو شاید یہ زندگی..... زندگی ہی نہ رہے۔ یہ سب کچھ میرے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے اگر آپ مجھے اس سے روکنے کی کوشش کریں گے تو یہ بے سود ہوگی۔ آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گی..... چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لیے..... یہ مناسب نہیں آدمی کے لیے..... آپ کی..... اور صرف آپ کی.....

خط پڑھ کر عدیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس عورت یا اس لڑکی کی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اپنی اور عدیل کی عمروں کے فرق کا لحاظ کیے بغیر اور دیگر حالات کو دیکھے بغیر وہ اندھا دھند یک طرفہ ٹریفک چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ عدیل نے خط پھاڑ کر اس کے پرزے کیے اور پھر انہیں ایک چھوٹے شاپر میں لپیٹ کر باہر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ تابانہ نے آخر میں جو شعر لکھا تھا وہ یقیناً عدیل کی موجودہ زندگی اور سنبل کی جدائی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

اگلے روز بھی تابانہ کا وہ خط اور اس کے مندرجات عدیل کی نگاہوں میں گھومتے رہے۔ اس کی اندھا دھند پیش قدمی نے عدیل کو جھنجوڑ سا ڈالا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ سوچیں چکما دے کر بار بار اس کے ذہن میں گھس رہی تھیں۔ خود کو مصروف کرنے کے لیے وہ اپنے ''ہوم جم'' میں چلا گیا۔ خود کو فٹ اور اپنی کمر کو بحال رکھنے کے لیے وہ فزیو کی ہدایات کے مطابق ہلکی پھلکی ورزش کرتا رہتا تھا۔ کمر یعنی ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ وہ چلتے ہوئے بائیں رخ پر تھوڑا سا جھکا رہتا تھا۔ اگر ایک دو دن کے لیے ورزش چھوڑ دیتا تھا تو یہ جھکاؤ مزید بڑھ جاتا تھا۔

اسے لائٹ ایکسرسائز کرتے ہوئے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ جمیل حسب معمول ہلا گلا کرتے ہوئے اندر آگیا۔ بھنگی الہام سے گپ شپ کرنے کے بعد وہ عدیل کے پاس پہنچا تو اس کی شوخی قدرے ماند نظر آئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''بھائی جان! وہ لڑکی چلی گئی.....'' اس کا اشارہ تابانہ کی طرف تھا۔ عدیل نے اثبات میں جواب دیا۔

جمیل نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''بھائی! اس کی طرف سے آپ لوگوں کو شاید بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کے معاملے میں اور اس کی والدہ کے بارے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عدیل نے تولیے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

جمیل نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک لوکل

اخبار کا مڑا تڑا صفحہ نکالا۔ یہ تین روز پہلے کا اخبار تھا۔ اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی خبر تابانہ اور اس کے ہیلتھ کلب کے بارے میں تھی۔ جمیل بولا۔ ''بھائی کل اتفاقاً اس خبر پر نظر پڑ گئی۔ آپ بھی دیکھیں۔''

عدیل نے خبر پڑھی اور اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس خبر میں تابانہ کے نیو ایج کلب کی کچھ مشتبہ سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایک مخالف کلب کے اونر نے بیان دیا تھا کہ مارشل آرٹ کی آڑ میں نیو ایج کلب کے اندر فلط کاری ہو رہی ہے۔ لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر امیر زادوں سے ان کی دوستیاں کروائی جاتی ہیں اور پھر مال بنایا جاتا ہے۔ مزید تفصیل بھی موجود تھی، اس کے علاوہ ایک متاثرہ لڑکی کا حلفیہ بیان بھی موجود تھا۔

عدیل نے خبر پڑھنے کے بعد کہا۔ ''جمیل! یہ سب کچھ اس جھگڑے کا شاخسانہ بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''بھائی! آگ ہوتی ہے تو دھواں نکلتا ہے نا۔ یہ لڑکی ویسے بھی ضرورت سے زیادہ تیز طرار لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھیں نا تو ایک علیحدہ سی چمک پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔''

جمیل کو ابھی ان کارستانیوں کا پتا نہیں تھا جو وہ یہاں کر رہی تھی ورنہ اس کے بارے میں جمیل کی رائے اور بھی سخت ہو جاتی۔ عدیل کو ویسے بھی یہ ''پرستاری'' کچھ زیادہ بھائی نہیں تھی۔ اس کا تجزیہ یہی تھا کہ کسی کا فین ہونا بس ایک جذباتی عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جیسے چاند ستارے دور ہی سے اچھے لگتے ہیں۔ ایسے ہی اسٹارز اور سپر اسٹارز بھی بس ایک فاصلے سے ہی دلکش محسوس ہوتے ہیں۔ جب اُن کے دیوانے دو چار بار ان سے مل لیتے ہیں تو پھر ساری کشش و رومانیت ختم ہو جاتی ہے۔

اُس روز عدیل نے فیصلہ کر لیا کہ تابانہ اب مزید اس گھر میں نظر نہیں آئے گی اس نے سوچ لیا کہ صبح اس بارے میں الہام سے بات کرے گا اور اسے تابانہ کے ساتھ ملنے جلنے سے سختی کے ساتھ روک دے گا لیکن اس سے پہلے ہی ایک اور واقعہ ہو گیا جو زیادہ سنگین تھا۔

رات کو نو بجے کے بعد تین چار بار عدیل کے فون پر تابانہ کی کال آئی۔ عدیل نے فون سائیلنٹ پر کر دیا اور کال ریسیو نہیں کی۔ اس کی آخری کال رات بارہ بجے کے لگ بھگ آئی، جس کے بعد عدیل نے جھلا کر فون ویسے ہی بند کر دیا اور سو گیا۔

وہ صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا۔ یہ عادت کالج کے زمانے میں ہاکی کے کھیل سے شروع ہوئی تھی، پولیس کی ٹریننگ اکیڈمی میں یہ عادت مزید پختہ ہوئی اور پھر باکسنگ کے کھیل نے اسے کچھ اور راسخ کر دیا۔ آج کل بھی وہ صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب جاگ جاتا تھا اور ضروریات سے فارغ ہو کر کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کرتا تھا۔ آج بھی اس کی یہی مصروفیت تھی۔ باقی گھر میں سناٹا تھا، شرفو بابا سمیت سب سو رہے تھے۔ ڈوبرمین نے اسے حیران کیا، صبح سویرے یہ کون آ ٹپکا تھا۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ہوں سر۔'' تابانہ کی آواز نے اس کے بدن میں آتشیں لہر دوڑا دی۔

خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ اَن لاک کیا۔ باہر کے ملگجے میں وہ ٹراؤزر پر بھاری نارنجی جیکٹ پہنے کھڑی تھی۔ جیکٹ کے نیچے سفید رنگ کا ہائی نیک سویٹر تھا۔ ''اوہ جینئس گاڈ۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''آپ ٹھیک ہیں نا جی؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' اس نے خشک، سوالیہ لہجے میں جواب دیا۔

''بتاتی ہوں، بتاتی ہوں، اندر تو آنے دیجیے۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

عدیل کو شک گزرا کہ کہیں یہ وہی جھگڑے والا معاملہ نہ ہو۔ اس نے اسے اندر آنے دیا۔ وہ اس کے ساتھ چلتی کامن روم میں آ گئی۔ کچھ پانی ہوئی لگ رہی تھی۔ عدیل کڑی سوالیہ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''رات میں نے آپ کو اتنے فون کیے لیکن آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔ میرے دماغ میں پتا نہیں کیا، کیا وسوسے آنے لگے۔ پھر میں نے الہام کو کال کی کہ آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھ سکوں۔ لیکن وہاں بھی نیٹ جاتی رہی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ میں رات بھر پریشان ہی رہی۔ آپ نے بتایا تھا نا کہ زیادہ سردی میں آپ کی کمر کی تکلیف اچانک بڑھ جاتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک ایمبولینس یہاں سے گزری تو میری جان ہی نکل گئی۔ سیدھی آپ کی طرف آئی..... یہ دیکھیے..... میرا دل کتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔'' اس نے بے تکلفی سے عدیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھنے کی کوشش کی۔

جو رَدِّعمل ہوا وہ شاید اس کے وہم گمان میں نہیں تھا۔ ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا گئی اور سراسیمہ نگاہوں سے عدیل کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک ہی لمحے میں اس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا۔

عدیل دانت پیس کر بولا۔ ''کوئی شرم حیا تمہارے اندر ہے یا نہیں۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ تمہاری یہ حرکتیں ہم سب کے لیے کتنی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی ہیں۔ گیٹ لاسٹ..... آئی سے گیٹ لاسٹ۔ میں دوبارہ یہاں تمہاری شکل نہ دیکھوں۔ اور خبردار جو تم کہیں الہام کے آس پاس بھی نظر آئیں۔'' طیش کے سبب عدیل کی آواز کانپ رہی تھی اور اس نے انگلی دروازے کی طرف اٹھا رکھی تھی۔

عدیل کا خیال تھا کہ وہ جلدی سے باہر نکل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سفید چہرے اور ساکت جسم کے ساتھ کھڑی رہی۔ یوں محسوس ہوا کہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

''میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔'' عدیل نے پھنکارتی آواز میں کہا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

زوردار تھپڑ کے سبب اس کے بال اچھل کر چہرے پر آ گئے تھے۔ اس نے لرزاں ہاتھ سے انہیں پیچھے ہٹایا۔ چند ساعتوں کے لیے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یوں لگا کہ وہ کوئی جوابی فقرہ بولنا چاہ رہی ہے مگر پھر اس نے اپنی بھیگی نگاہیں پھیر لیں۔ تیزی سے مڑی اور باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

دو روز بعد کی بات ہے، الہام تیز قدموں سے عدیل کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''پاپا! کچھ پتا چلا آپ کو مس تابانہ اسپتال میں ہیں۔''

''کیا ہوا؟'' عدیل نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''کہتے ہیں کہ انہیں بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا ہے۔ ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں۔ میں نے راحت کو بھیجا ہے کہ وہ معلوم کر کے آئے۔''

نہ جانے کیوں عدیل کو محسوس ہونے لگا کہ یہ وہی پرسوں والے تھپڑ کا شاخسانہ ہے۔ اسی دوران میں ملازمہ راحت بھی آ گئی۔ ''کیا پتا چلا آنٹی؟'' الہام نے بے حد بے قراری سے پوچھا۔

''ان کے گھر تو میں نہیں جا سکی ہوں۔ وہاں تالا لگا ہوا ہے بی بی۔ پڑوس والوں سے سن گن ملی ہے کہ اس نے کوئی زہریلی دوا کھالی ہے اور بے ہوش ہو گئی ہے۔ شاید گھر میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا یا ہو سکتا ہے کہ باہر کا ہی کوئی معاملہ ہو۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ کچھ دن پہلے سڑک پر جو مار دھاڑ ہوئی تھی۔''

الہام روہانسی آواز میں بولی۔ ''پاپا! ہمیں اسپتال جانا چاہیے۔ ان کا پتا کرنا چاہیے۔''

عدیل نے ایک گہری سانس لی۔ ''الہام! اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ میں تمہارے چچا کو فون کرتا ہوں۔ وہ کوئی خیر خبر لیتے ہیں۔''

الہام کو مثل تسلی دے کر عدیل کمرے میں آ گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی معاملہ ہے۔ اس کے ذہن میں پہلے ہی تابانہ کے ردعمل کے مختلف اندیشے موجود تھے۔ وہ اسپتال جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، تاہم دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ معاملہ زیادہ سیریس نہ ہو اور وہ ہوش میں آ جائے۔

ایسا ہی ہوا، کوئی ایک گھنٹے بعد جمیل ہی کی زبانی پتا چلا کہ اس کا معدہ واش کیا گیا ہے اور وہ ہوش میں آ گئی ہے۔ یہ اطمینان بخش خبر تھی لیکن ابھی ایک اندیشہ موجود تھا۔ اقدام خودکشی کے اس معاملے میں کسی حوالے سے اس کا نام بھی آ سکتا تھا۔ بہرحال اس حوالے سے بھی خیریت ہی گزری۔ یہ اقدام خودکشی کا معاملہ بنا ہی نہیں تھا۔ ایک تو اس کی ٹریٹ منٹ پرائیویٹ کلینک میں ہوئی تھی، دوسرے تابانہ نے بیان دیا تھا کہ اس نے غلطی سے دوا کی جگہ کیڑے مار محلول پی لیا تھا۔ (غالباً محلول بھی زیادہ مقدار میں نہیں پیا گیا تھا ورنہ کام لمبا ہو سکتا تھا)

وہ گھر آ گئی تو الہام ایک بار پھر ضد کرنے لگی کہ وہ اس کو دیکھنے جائے گی۔ تب عدیل نے بیٹی کو علیحدگی میں تسلی سے سمجھایا اور بتایا کہ تابانہ اور اس کی والدہ کے بارے میں جو معلومات مل رہی ہیں ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ ان کا کردار مشکوک ہے۔ اس نے الہام کو اس اخباری خبر والی بات بھی بتائی جو اس کے چچا جمیل کے ہاتھ لگی تھی۔ الہام کو ان باتوں سے بہت شاک پہنچا..... اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ الجھن میں بھی نظر آئی جیسے ابھی تک اسے تابانہ کے متعلق باتوں پر پوری طرح یقین نہ آیا ہو، وہ اس میں شک کی گنجائش رکھ رہی ہو۔

اگلے دو تین ہفتے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ دو بار عدیل نے تابانہ کو گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھر کے سامنے والی سڑک پر سے فراٹے کے ساتھ گزر گئی تھی۔ ایک بار شاید اس نے عدیل کو اپنے گیٹ کے قریب کھڑے دیکھا بھی ہو مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے الہام سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے علاوہ عدیل کا یہ خدشہ بھی درست ثابت نہیں ہوا کہ وہ کوئی خط لکھے گی یا فون وغیرہ کرے گی۔

☆☆☆

عدیل ایک پیدائشی کھلاڑی تھا۔ شروع میں ہاکی کھیلی مگر پھر جب باکسنگ میں آیا تو باقی سب کچھ پس منظر میں چلا گیا۔ اب وہ باکسنگ کھیل تو نہیں پا رہا تھا مگر اس کھیل میں اس کی دلچسپیاں اسی طرح برقرار تھیں۔ ٹی وی اور یوٹیوب وغیرہ پر وہ باکسنگ کے مقابلے بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا۔ ہاکی اب ایک بھولی بسری محبوبہ کی طرح تھی۔ ہاں ''جمیل'' کو اب بھی ہاکی سے کچھ شغف تھا۔

ایک میٹنل ایونٹ کا فائنل ہو رہا تھا۔ جمیل ہر وقت اس کوشش میں رہتا تھا کہ بڑے بھائی کی روکھی پھیکی زندگی میں تھوڑا بہت چارم موجود رہے۔ وہ دوپہر کے وقت آیا اور اصرار کر کے عدیل کو اپنے ساتھ ہاکی اسٹیڈیم لے گیا۔ وہ فرسٹ کلاس پویلین میں بیٹھے۔ یہاں ہاکی کے نئے پرانے کھلاڑی موجود تھے لیکن ایک چیمپئن باکسر کی حیثیت سے عدیل کی شہرت تھی کہ لوگ ہاکی پلیئرز کو چھوڑ کر اس سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ ہاکی سے وابستہ کئی تلخ و شیریں یادیں عدیل کے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

دونوں بھائی سہ پہر تین بجے کے قریب گھر لوٹے۔ پرانی ملازمہ نوراں کچھ پریشان نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ''صاحب جی، الہام بیٹی ابھی تک اسکول سے نہیں آئی۔''

عدیل اور جمیل بھی پریشان ہو گئے..... قریباً ایک گھنٹا اوپر ہو چکا تھا۔ عدیل نے اسکول فون کیا۔ پتا چلا کہ آخری اسٹوڈنٹ بھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے اسکول سے نکل چکی ہے۔ عدیل نے وین ڈرائیور کو کال ملائی۔ وین ڈرائیور کی اطلاع نے اہلِ خانہ کو مزید پریشان کر دیا۔ اس نے بتایا کہ قریباً ایک گھنٹا پہلے وہ خود الہام کو گھر کے گیٹ پر اتار کر گیا ہے۔

عدیل نے نوراں سے پوچھا۔ ''تمہیں بیل کی آواز نہیں آئی؟ اور وین والا بھی تو ہارن دیتا ہے۔''

''نہیں جی..... میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔ میں سارا وقت ڈرائنگ روم میں ہی رہی ہوں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، بابا شرفو کہاں ہے؟''

''وہ تو جی مہینے کا سودا لینے گیا ہوا ہے۔ اس نے بل بھی جمع کرانے تھے۔''

عدیل دوبارہ وین ڈرائیور کو فون کرنے کا سوچ رہا تھا جب جمیل ایک اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں الہام کا اسکول بیگ تھا۔ اسکول بیگ دیکھ کر نوراں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''جھوٹ کیوں بولا ہے تم نے..... کہ الہام آئی ہی نہیں؟'' جمیل گرجا۔

''وہ..... وہ..... صاحب جی..... مجھے پتا نہیں چلا ہو گا۔ دراصل..... وہ.....''

''دراصل تم سو گئی تھیں۔'' عدیل نے غصے میں اس کی بات مکمل کی۔ ''اور تمہاری نیند بھی اینچوؤں سے کم نہیں ہوتی۔ وہ بیل دیتی رہی ہو گی اور پھر ''پرسنل کی'' سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی ہو گی۔''

اس دوران میں جمیل نے سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر الہام کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ بالائی منزل کے کسی کمرے میں ہو یا پھر دھوپ سینکنے کے لیے چھت پر چلی گئی ہو بہرحال یہ خیال بھی خام ہی نکلا وہ اوپر کہیں نہیں تھی۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اڑوس پڑوس میں کہیں گئی ہے اور ابھی آ جاتی ہے۔ ''بھائی اس کو فون کر کے دیکھیں نا۔''

الہام اسکول میں فون نہیں لے جاتی تھی مگر گھر میں استعمال کرتی تھی۔ عدیل نے اسے کال کی تو فون کی بیل اندر کامن روم سے سنائی دینے لگی۔ فون بھی یہیں تھا۔ اسی دوران میں بابا شرفو بھی سامان سے لدا پھندا آ گیا۔ سب کو پریشان دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ عدیل نے اسے صورتِ حال بتائی پھر بابا، شرفو اور نوراں سے کہا کہ وہ اڑوس پڑوس میں پتا کر کے آئیں۔ دفعتاً اسے تابانہ کا خیال بھی آ گیا۔ ممکن تھا کہ عدیل کو گھر میں نہ پا کر الہام اسی سے ملنے چلی گئی ہو۔ (حالانکہ ایسی نافرمانی وہ کرتی نہیں تھی) اس نے نوراں سے کہا۔ ''اور اس کی بچپڑ تابانہ کے گھر..... بھی دیکھ کر آؤ۔''

وہ ''اچھا صاحب جی'' کہتی ہوئی شرفو کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد سنگین تھا۔ عدیل اور جمیل پر انکشاف ہو رہا تھا کہ الہام گھر میں یا اردگرد کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ اسکول سے گھر آئی تھی۔ اس نے فریج کھول کر جوس پیا تھا اور یونیفارم بدلنے سے پہلے ہی اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی۔ عدیل کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گا اور کبھی نہ اٹھ سکے گا۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا ہوا تھا۔ جمیل اسے مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ جمیل نے بابا شرفو اور نوراں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ابھی الہام کے ''نہ ملنے کا ذکر'' کسی سے نہ کریں۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید گزرا۔ جمیل نے بے قراری سے کہا۔ ''کیا خیال ہے بھائی جان! پولیس میں اطلاع دینی چاہیے؟''

"دینی تو چاہیے لیکن....." وہ سخت تذبذب کے عالم میں خاموش ہو گیا پھر جیسے نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "چلو ایسے کرتا ہوں عرفان شیخ سے آف دی ریکارڈ بات کرتا ہوں۔"

عرفان شیخ، پولیس سروس کے وقت سے عدیل کا گہرا دوست تھا بلکہ پولیس اکیڈمی میں بھی وہ ساتھ ہی رہے تھے۔ عدیل نے مختصر لفظوں میں عرفان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ عرفان نے بھی وہی کہا جو عدیل کے ذہن میں بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "ابھی رپورٹ نہیں کرانی چاہیے۔ اللہ کرے اگلے ایک دو گھنٹوں میں اس کا پتا چل جائے۔ ویسے میں اپنے طور پر دو چار ناکوں کو الرٹ کرتا ہوں۔"

عدیل کو لگ رہا تھا کہ وہ کھلی آنکھوں سے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ خود سے کہیں گئی ہو۔ اس کی جو دو چار فرینڈز تھیں، ان سے بھی پتا کیا جا چکا تھا۔ تازہ صورتِ حال جاننے کے لیے اسکول سے بھی دو کالز آ چکی تھیں مگر عدیل اور جمیل نے یہ کالز ریسیو نہیں کی تھیں۔ ان کے دلوں سے بس ایک ہی دعا نکل رہی تھی کہ کوئی مثبت فون آ جائے یا ڈور بیل ہو اور الہام دروازہ کھول کر اندر آ جائے۔

شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح عدیل کے ذہن میں کوندا۔ اسے وہ تھپڑ یاد آیا جو چند دن پہلے اس نے تابانہ کے منہ پر مارا تھا۔ پھر اس کا سرخ ہوتا چہرہ، اور اس کا تیزی سے باہر نکل جانا یاد آیا، پھر وہ واہیات حرکت جب اس نے زہریلی دوا پی تھی۔ وہ ایک علیحدہ ٹائپ کی لڑکی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں عدیل کو ہمیشہ ایک جداقسم کی کیفیت للکارے مارتی دکھائی دی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسی نے الہام کے ساتھ کچھ کر ڈالا ہو۔ اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہیں بھائی؟" جمیل نے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں الہام کی ٹیچر تابانہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

نوراں چونک کر بولی۔ "لیکن صاحب جی! وہاں تو تالا لگا ہوا ہے۔ میں نے ساتھ والے خواجہ جی سے پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ دونوں صبح سے گھر پر نہیں ہیں۔ گھر میں کام کرنے والی بھی بیل بجا، بجا کر چلی گئی تھی۔"

عدیل کے ذہن میں پلنے والا اندیشہ ایک دم جوان ہونے لگا۔ اس نے اسی وقت تابانہ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وہ فوراً جمیل کو لے کر تابانہ کے گھر پہنچا۔ گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے وہی بات بتائی جو اس سے پہلے نوراں نے بتائی تھی۔ عدیل نے گھر واپس پہنچتے ہی جمیل کو وہ سب کچھ بتا دیا جو تابانہ کے حوالے سے پیش آ چکا تھا۔ اس کی پیش قدمیوں سے لے کر اس کے خط اور اپنے تھپڑ تک اس نے کچھ بھی چھوٹے بھائی سے نہیں چھپایا۔

جمیل بولا۔ "بھائی! میں تو وہ اخباری خبر دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ ٹھیک فیملی نہیں ہے۔ الہام کے ساتھ تابانہ کا میل جول مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ "سیدھی سادی الہام" کو اپنے ہاتھوں پر ڈال رہی تھی مگر یہ سوچنا پڑے گا کہ اتنا سنگین قدم وہ واقعی اٹھا سکتی ہے یا نہیں۔"

اسی دوران میں شرفو بابا ہانپا ہوا سا کمرے میں آیا۔ اس نے کہا۔ "عدیل بیٹا..... وہاں گیٹ کے پاس کیاری میں دو چھوٹے گملے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ذرا آپ بھی آ کر دیکھیں۔"

عدیل اور جمیل فوراً باہر لان میں پہنچے۔ گراسی لان میں گارڈن لائٹس موجود تھیں۔ بابا شرفو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مٹی کے دو گملے ٹوٹے ہوئے تھے اور کیاری میں کچھ ایسے نشان بھی تھے جیسے وہاں کسی کا پاؤں رپٹا ہو۔ گملوں کا ٹوٹنا، بلیوں وغیرہ کی کارستانی بھی ہو سکتی تھی مگر یہ پاؤں کے گھٹنے کا نشان جو کچی مٹی پر واضح نظر آ رہا تھا، کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ الہام نے عدیل کو بتایا تھا کہ وہاں جوڈو کلب میں کوئی وارثی نام کا منیجر بھی ہے، تابانہ اور اس کی والدہ دونوں اس پر بے حد اعتماد کرتی ہیں۔ کسی وقت تو تابانہ کلب کی ساری ذمے داری ہی اس پر ڈال دیتی ہے۔

عدیل نے جمیل کو ساتھ لیا اور اسی وقت دونوں تابانہ کے کلب جا پہنچے۔ سیمی کمرشل علاقے میں یہ ایک کشادہ عمارت تھی۔ چھت پر نیو ایج ہیلتھ کلب کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ منیجر وارثی لمبے بالوں اور فرنچ کٹ داڑھی والا ایک چھبیس ستائیس سالہ نوجوان تھا۔ عدیل اور جمیل نے اس کے ساتھ تند و تیز لہجہ اختیار کیا اور پوچھا کہ تابانہ اور اس کی والدہ کہاں ہیں؟

وہ ان دونوں کے انداز سے بہت گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ "شاید آپ کی بیٹی ابھی تک گھر نہیں آئی ہیں اور اس سلسلے میں آپ مس تابانہ پر کسی طرح کا شک کر رہے ہیں۔ وہ اور ان کی والدہ ایسی نہیں ہیں....."

''ہم نے تم سے اُن دونوں کی صفائی نہیں مانگی۔ بس وہ بتاؤ جو کچھ پوچھ رہے ہیں۔'' جمیل نے کڑا لہجہ اختیار کیا۔

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''اللہ جانتا ہے۔ میں آپ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ کل شام مس تابانہ نے سارا چارج میرے حوالے کر دیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں کچھ دنوں کے لیے ایمرجنسی طور پر کہیں جانا پڑ رہا ہے۔''

''کہاں جانا پڑ رہا ہے؟'' عدیل نے آتشیں انداز میں پوچھا۔

''میں نے پوچھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔ نہ ہی بتایا کہ کتنے دنوں تک واپسی ہو جائے گی۔ ویسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شہر سے باہر ہی کہیں جا رہی ہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' عدیل پھنکارا۔ ''ہماری اطلاعات یہی ہیں کہ تابانہ کے چھوٹے سے چھوٹے پروگرام اور پلان کے بارے میں بھی تمہیں پتا ہوتا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کئی روز کے لیے کہیں نکل گئی ہو اور تمہیں اپنی منزل کا نہ بتایا ہو۔''

''مم..... میں خود بھی اس پر حیران تھا سر۔ میں نے دوسری، تیسری بار پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ہو سکتا ہے کہ میڈم تنویر (تابانہ کی والدہ) نہ جا سکیں۔ اگر وہ آ گئیں تو تفصیل بتا دیں گی۔

جمیل نے اپنا ہاتھ وارثی کے گریبان تک پہنچانا چاہا لیکن عدیل نے روک دیا۔ لڑائی جھگڑے میں اس سنگین واقعے کی تشہیر تھی اور وہ تشہیر سے بچنا چاہ رہا تھا۔ وارثی گہرا بندہ لگتا تھا مگر کسی وقت یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کم از کم اس معاملے میں سچ ہی بول رہا ہے۔ عدیل اور جمیل نے وارثی کا موبائل فون بھی چیک کیا۔ کل شام تابانہ جوڈو کی کلاس کے لیے کلب آئی تھی۔ اس کی آمد سے پندرہ منٹ پہلے اس کی ایک کال وارثی کے لیے آئی تھی اور یہ آخری تھی۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ گزرنے والے ہر پل کے ساتھ عدیل کا دل جیسے ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ عدیل اور جمیل نے منیجر نما وارثی کو بڑی سختی سے ہدایت کی کہ وہ فی الحال الہام کے لاپتا ہونے کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ''سر! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ یہ نازک معاملہ ہے۔''

بندہ ٹھیک لگ رہا تھا پھر بھی کلب سے نکلتے ساتھ ہی عدیل نے دوست ایس پی عرفان کو فون کیا اور اسے وارثی اور تابانہ کا نام کرنے کے بعد کہا کہ وہ ان دونوں نمبروں اور ان کے IMEI پر ٹریکنگ لگوائے۔ اب جمیل کے لیے بھی ضروری ہو چکا تھا کہ گھر کال کر کے کم از کم آمنہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دے۔ آمنہ کو کال کرنے کے بعد عدیل اور جمیل پھر گھر واپس آ گئے۔ نوراں خود کو اس نہایت سنگین مصیبت کا ذمے دار سمجھ رہی تھی۔ رو، رو کر اس کا برا حال تھا۔ بابا شرفو بھی غم کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس نے الہام ہی کو نہیں عدیل اور جمیل کو بھی انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ (جب باکی کامیل چھوڑ کر عدیل اسلام آباد کی پولیس اکیڈمی میں چلا گیا تھا تو بابا شرفو بیمار پڑ گیا تھا) عدیل نے بابا شرفو کو گلے سے لگا کر کہا کہ وہ چاہے اور کچھ نہ کریں لیکن دعا مسلسل ضرور کرتے رہیں۔ اس نے نوراں کا رونا دھونا بھی بند کرایا اور اسے دعا کے لیے کہا۔

سردیوں کی وہ طویل رات بہت..... بوجھل تھی۔ کسی مہلک اژدھے کی طرح ان کو اپنے حصار میں جکڑتی چلی جا رہی تھی مگر پھر اس رات نے اچانک ایک کروٹ لی۔ عین اس وقت جب عدیل اور جمیل پولیس اسٹیشن میں باقاعدہ رپورٹ درج کرانے کا سوچ رہے تھے، ایس پی عرفان کی طرف سے ایک کال موصول ہو گئی۔ اس نے جذباتی انداز میں بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے صرف تیس چالیس سیکنڈ کے لیے تابانہ کا نمبر آن ہوا ہے اور اس نے وارثی والے نمبر پر بات کی ہے۔

''نمبر کی لوکیشن؟'' عدیل نے پوچھا۔

''شیخوپورہ..... میں نے وہاں کے مقامی افسران سے رابطہ کر لیا ہے۔ سروس پروائیڈرز بھی رابطے میں ہیں۔ لگتا ہے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ایگزیکٹ لوکیشن کا پتا بھی چل جائے گا۔''

عدیل کے سینے میں امید کی لہریں جاگ گئیں۔ جمیل کا چہرہ بھی سرخ نظر آنے لگا تھا۔ جمیل نے وارثی کا نمبر پریس کیا اور عام سے انداز میں اس سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی، کسی طرح کی کوئی خبر؟''

''نن..... نہیں سر جی۔ میں بھی ویٹ ہی کر رہا ہوں۔'' شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔

''کہاں ہو تم؟'' جمیل نے استفسار کیا۔

''کل کلب میں تو چھٹی ہے۔ ذرا اپنے کام سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تابانہ یا اُس کی والدہ سے کوئی رابطہ ہو تو فوراً بتاؤ، ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔''

''آ.....آپ بے فکر رہیں جی۔ آپ سے جو کمٹ منٹ کی ہے، پوری کروں گا۔''

واضح ہو چکا تھا کہ وارثی بھی دھوکا دے رہا ہے۔ اب پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ خیر گاڑی میں تو وہ موجود تھا۔

عدیل نے ایک بار پھر ایس پی عرفان سے رابطہ کیا پھر دونوں شیخوپورہ جانے کے لیے نکل پڑے..... تابانہ کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ عدیل کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اپنی واہیات حرکت پر عدیل سے تھپڑ کھانے کے بعد تابانہ کا چہرہ پہلے زرد اور پھر سرخ ہوا تھا۔ ان لمحوں میں اس کے چہرے پر جو کیفیت نظر آئی تھی، اس نے اکثر عدیل کو ''ہانٹ'' کیا تھا۔ اپنی لاڈلی کی عافیت کے لیے عدیل کے دل سے مسلسل دعائیں نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

ابھی عدیل اور جمیل شیخوپورہ سے چار پانچ کلومیٹر دور ہی تھے کہ عرفان شیخ کی کال آ گئی۔ اس نے دو اہم خبریں دیں۔ ایک یہ کہ تابانہ کا موبائل ایک بار پھر چار پانچ سیکنڈ کے لیے آن ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ وارثی کے موبائل کی لوکیشن بتا رہی ہے کہ وہ اسلام آباد کے بجائے مغربی رخ پر شیخوپورہ کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اسے شیخوپورہ کے داخلی راستے پر روک لیا جائے۔ وہاں پہلے سے ایک ناکا موجود تھا۔

وارثی کی غلط بیانیاں اب ثابت ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب چار پانچ منٹ بعد عرفان شیخ نے عدیل کو یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ناکے پر پکڑ لیا گیا ہے تو عدیل کے اندر آس امید کے دیے کچھ اور روشن ہو گئے۔ ان دونوں کے متذکرہ ناکے پر پہنچنے تک وارثی کو چیدہ چیدہ تھپڑ بھی پڑ چکے تھے۔ وہ مقامی ایس ایچ او کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں جوڑ رہا تھا۔ عدیل اور جمیل کو دیکھ کر اس کا رنگ اور زرد ہو گیا۔

عدیل اور جمیل نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ یہ پوچھ گچھ تاریکی میں کھڑی پولیس موبائل کے اندر ہی ہوئی۔ وارثی کی اپنی سوزوکی مہران سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ وارثی نے بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہوئے بتایا کہ اسے اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے مس تابانہ نے اسے ہنگامی طور پر شیخوپورہ بلایا ہے..... وہ ان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جا رہا تھا۔ مس اور میڈم نے اس سے کیا کہنا تھا، یہ اسے وہاں جا کر ہی معلوم ہونا تھا۔

وارثی کے ہاتھ آ جانے سے دو بہت اہم فائدے ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ فون ٹریسنگ کے ذریعے تابانہ کی ایگزیکٹ لوکیشن ڈھونڈنے کی محنت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ تابانہ تک پہنچنے اور اسے محفوظ طریقے سے چھاپنے میں وارثی سے مدد لی جا سکتی تھی۔ اگر واقعی الہام، تابانہ کے قبضے میں تھی۔ (اور شواہد بتا رہے تھے کہ اس کا بہت زیادہ امکان ہے) تو پھر تابانہ کو گرفت میں لانے کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اسی اثنا میں عرفان شیخ بھی پرائیویٹ کار میں پرائیویٹ حیثیت سے اس ناکے پر پہنچ گئے اور پلاننگ میں شریک ہو گئے۔

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تابانہ شیخوپورہ کی ایک نئی رہائشی کالونی کی ایک سنگل اسٹوری عمارت میں موجود تھی۔ پلاننگ کے مطابق وارثی نے کوٹھی کی ڈور بیل دی۔ اس کے ساتھ عرفان شیخ سادہ کپڑوں میں تھے۔ دروازہ خود تابانہ..... نے کھولا۔ وارثی نے عرفان شیخ کے بارے میں بتایا کہ یہ اس کے ماموں ہیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر گلی کے موڑ پر مل گئے ہیں۔ ذرا جز بز دکھائی دینے کے بعد تابانہ..... نے انہیں اندر آنے دیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وارثی کے ساتھ پولیس ہے۔

عدیل، جمیل اور عرفان کا ڈرائیور گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر گاڑی میں موجود تھے۔ عرفان شیخ کی لمبی قمیص کے نیچے بھرا ہوا سروس پسٹل موجود تھا۔ انہوں نے عدیل کو یقین دلایا تھا کہ اگر الہام اندر موجود ہے تو وہ اس کے لیے کسی طرح کا رسک نہیں لیں گے۔ عدیل کو عرفان کے تجربے پر بھروسا تھا۔

وہ چند منٹ عدیل اور جمیل کے لیے بے حد کرب ناک تھے۔ پھر گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور وارثی کی شکل نظر آئی۔ اس نے گاڑی کے پاس آ کر کہا۔ ''اندر آ جائیں جی۔ ایس پی صاحب بلا رہے ہیں۔''

اسی دوران میں عدیل کے فون پر عرفان کی کال بھی آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''عدیل پریشانی کی بات نہیں، اندر آ جاؤ۔''

عدیل اور جمیل کوٹھی کے لان سے گزر کا کامن روم میں پہنچے۔ تابانہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی۔ بال منتشر تھے۔ وہ عرفان سے تکرار کر رہی تھی۔ عدیل کو دیکھ کر دم بخود ہو گئی۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عدیل کو اپنے روبرو دیکھ رہی ہے۔

''ماں کدھر ہے تمہاری؟'' عرفان نے پولیس والوں کے کڑک لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... دوا کھا کر پچھلے کمرے میں سو رہی ہیں۔ طبیعت خراب ہے اُن کی۔''

''طبیعت تو تمہاری بھی بہت خراب ہو جائے گی اگر تم نے سچ نہ بولا تو.....''

تابانہ گھبرا کر عدیل کی طرف آئی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ یہ مجھ سے الہام کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا ہوا ہے اُسے؟''

''ان سوالوں کے جواب تو تمہارے پاس ہیں۔'' عدیل سرسراتے لہجے میں بولا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ عرفان شیخ نے کہا۔ ''ان دو چار کمروں میں تو الہام کہیں نظر نہیں آ رہی۔ میں باقی جگہوں پر دیکھتا ہوں۔''

عرفان کے باہر نکلتے ہی عدیل نے جمیل اور وارثی وغیرہ کو بھی باہر بھیج دیا۔ اس کے سینے میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ اس نے تابانہ کے منتشر بال مٹھی میں جکڑے اور پھنکارا۔ ''تابانہ! میں تیری جان لے لوں گا اور اپنی جان دے دوں گا۔ بتا میری بچی کے ساتھ کیا، کیا ہے تو نے؟ کہاں ہے وہ؟'' شدتِ اندوہ سے عدیل کا گلا رُندھ گیا۔

وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں ہے اس کا..... میں تو.....'' اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عدیل کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ پھر ایک اور..... پھر ایک الٹے ہاتھ کا۔ عدیل غم و غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ تابانہ کے ڈیانا کٹ بال بدستور اس کی مٹھی میں تھے۔

تابانہ کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی یلغار تھی۔ یہی وقت تھا جب بغلی دروازہ کھلا اور تابانہ کی قدرے فربہ اندام والدہ نائٹ گون پہنے نمودار ہوئی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر اس نے چلّانا شروع کر دیا۔ ''ہائے میری بچی، ہائے کیا ہوا اِس کو..... کیوں مار رہے ہو؟''

وہ عدیل پر جھپٹی اور اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ عدیل کا چہرہ انگارا ہو رہا تھا۔ وہ میڈم تنویر پر دہاڑا۔ ''میری بچی کہاں ہے؟''

یہی وقت تھا جب عرفان شیخ اور جمیل وغیرہ اندر آ گئے۔ اسی اثنا میں عدیل کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون نکالا اور اسکرین پر نمبر دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے فون کان سے لگایا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''کون؟''

جواب میں بھاری آواز سنائی دی۔ ''تمہارا پرانا دوست، ہمدرد، خیر خواہ.....''

''کون؟ جمشید خاں؟'' عدیل نے آواز پہچان کر کہا۔

''سو فیصد..... بلکہ آج تو سو فیصد سے بھی زیادہ۔'' بولنے والا نشے میں لگتا تھا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر بڑے اطمینان سے کہا۔ ''دو بار پہلے بھی فون کیا تھا مگر اٹینڈ ہی نہیں ہوا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بچی کی رپورٹ ہی درج نہ کرا دو تم..... درج تو نہیں کرائی نا؟''

عدیل کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا خون اس کے سر کو چڑھنے لگا ہے۔ یہ بندہ کس لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''کس بچی کی بات کر رہے ہو تم؟'' عدیل چلّایا۔

''یار! تمہاری بچی کی اور کس کی۔ اور تمہاری بچی کیا، اپنی ہی ہوئی نا۔ میرے پاس ہے اِس وقت۔ اور بڑے آرام سے ہے۔ سمجھو کہ آج اپنے باپ کے گھر میں نہیں تایا کے گھر میں سو رہی ہے۔''

غصے اور غم کی شدت سے عدیل کا سارا جسم پتے کی طرح لرزنے لگا۔

ایس پی عرفان شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کون ہے یہ؟ عدیل نے ہاتھ ہی کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کا کہا اور مخاطب سے بات کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے ہیجانی انداز میں سرگوشی کی۔ ''جمشید خاں! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے میری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے؟''

وہ ہنسا۔ ''اس کو اغوا کہہ کر تم خود کو مزید ہلکان کیوں کر رہے ہو۔ میں تو بچی کو ذرا آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے یہاں لے آیا ہوں۔ دو چار دن یہاں رہے گی۔ کھائے پیے گی تھوڑی سی اور جوان اور صحت مند ہو کر واپس آئے گی۔''

''جمشید خاں! میری بچی کو چھوڑ دو۔ میں مار دوں گا اور مر جاؤں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔'' عدیل جنونی انداز میں بولا۔

''ایزی چیمپئن ایزی..... بات کو اتنا آگے مت لے جاؤ کہ پھر واپس لانا مشکل ہو جائے۔ مسئلہ اتنا بڑا نہیں ہے لیکن اگر بڑا کرتے جاؤ گے تو پھر بڑا ہوتا جائے گا۔''

''کیا چاہتے ہو تم..... کیا چاہتے ہو؟'' عدیل اتنی زور سے دہاڑا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی۔

''تمہارے سوال پر ہنسنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔ جو میں چاہتا ہوں تم اچھی طرح جانتے ہو، بلکہ کئی ماہ سے جانتے ہو۔''

''تم..... تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ تم جانتے ہو کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ میں نہیں کر سکتا، وہ میرے بس میں نہیں ہے۔''

''بس میں ہو جائے گا..... بالکل ہو جائے گا۔ تمہاری بچی، تمہیں اس قابل بنا دے گی کہ تم یہ کر سکو۔''

آخری فقرہ اس نے ایسے دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا کہ عدیل کی رگوں میں آگ دوڑ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ انڈر ورلڈ کا یہ شیطان اس کے سامنے ہو اور وہ اپنی اور اس کی جان ایک کر دے۔ سخت سردی میں اس کا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا ہے۔ ''جمشید خاں..... جمشید خاں.....'' وہ دہاڑا مگر فون بند ہو چکا تھا۔

''کیا ہوا؟ کون تھا بھائی جان؟'' جمیل نے پوچھا۔

عدیل بے دم سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''پانی لاؤ جلدی۔'' عرفان نے ڈرائیور سے کہا۔

جمیل بھی جان گیا کہ فی الحال عدیل سے سوال جواب مناسب نہیں ہے۔

عدیل نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن میں کھلبلی سی تھی۔ جمشید خاں کا گھنی مونچھوں والا چوڑا چکلا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ جمشید خاں کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا۔ وہ اسمگلنگ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جمشید خاں ہر وہ جائز اور ناجائز کام کر گزرتا تھا جس میں اُسے پیسا نظر آتا تھا۔ کئی شعبوں میں اس کے فرنٹ مین موجود تھے۔ ایسا ہی ایک فرنٹ مین ظہور باوا کھلیوں کے شعبے میں بھی تھا۔ ظہور باوا سے عدیل کی پہلی ملاقات کوئی ڈیڑھ سال کل ہوئی تھی۔ ہاکنگ کے ایک نیشنل ایونٹ میں عدیل کو تقسیم انعامات کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ وہیں پر خوش پوش اور طرح دار ظہور سے عدیل کی گفتگو ہوئی تھی۔ بعد ازاں ظہور نے ایک طویل ٹیلی فونک گفتگو میں عدیل سے کہا تھا کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر اب بھی لاکھوں لوگ اسے پھر سے ہاکنگ کے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر زیادہ نہیں تو صرف ایک بار ہی عدیل کسی بین الاقوامی مقابلے میں نظر آ جائے تو نوٹوں کی بارش ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ظہور باوا نے عدیل کے پرانے حریف ایک تھائی ہاکسر اناڈا کا نام لیا تھا۔ اناڈا، تھائی لینڈ کا رہنے والا تھا اور اتفاقاً عدیل کی طرح اس کا تعلق بھی ماضی میں پولیس کے محکمے سے رہا تھا۔ ایک مقابلے میں عدیل نے اس کی ناک فریکچر کر دی تھی۔ اس کے بعد سے دونوں میں زبردست قسم کی نسل چل پڑی تھی۔ ماضی میں ان دونوں کے تین چار مقابلے مختلف پلیٹ فارمز پر ہوئے تھے اور یہ پُرجوش مقابلے شائقین نے غیر معمولی اشتیاق سے دیکھے تھے۔ پورے جنوبی ایشیا میں ان کا چرچا ہوا تھا۔ اناڈا ابھی تک ہاکسنگ کے کھیل سے وابستہ تھا۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میں ظہور باوا نے عدیل کو ایک خطیر رقم کی پیشکش کی اور درخواست کی کہ وہ اناڈا سے دس راؤنڈ کا ایک مقابلہ کر لے۔ ڈیڑھ سال پہلے عدیل نے ظہور کی اس آفر کو سختی سے رد کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی کمر کی حالت ایسی نہیں کہ وہ پھر سے ہاکسنگ کے رنگ میں اتر سکے۔ اگر عدیل کا خیال تھا کہ یہ بات یہیں پر ختم ہو جائے گی تو یہ غلط تھا۔ پچھلے ڈیڑھ برس میں یہ بات نہ صرف جاری تھی بلکہ مزید سنگین ہو گئی تھی۔ یہ ظہور باوا ان لوگوں سے زیادہ ڈھیٹ نکلا تھا جو عدیل کو اس طرح کی پیشکش کرتے رہتے تھے۔ خود ناکام ہونے کے بعد وہ ایک نہایت خطرناک بندے کو بیچ میں لے آیا تھا۔ یہ اس کا باس جمشید خاں تھا۔ جمشید خاں ہر ڈیڑھ دو ماہ بعد اسے فون کر دیتا تھا۔ مختلف طریقوں سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں تو اس کا لب و لہجہ شائستہ ہی ہوتا تھا مگر کبھی کبھی اس شائستگی کے اندر ایک شعلہ سا لپکتا بھی محسوس ہوتا تھا۔ جمشید خاں سے عدیل کی آخری ٹیلی فونک گفتگو تقریباً دو ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اس نے ذرا جھلائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''یار! تم ایک ہی چکر میں گھومتے چلے جا رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری کمر کی تکلیف روپے میں سے پچانوے پیسے تمہارا وہم اور خوف ہے۔ تم ایک دفعہ ہاکسنگ رنگ میں کود پڑو تو یہ سارے وہم اُڑن چھو ہو جائیں گے۔ میں پچھلے دنوں سنگاپور میں تھا۔ میں نے وہاں ایک ماہر آرتھوپیڈک سرجن سے تمہاری اس لاڈلی کمر کے بارے میں تفصیل سے بات کی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ اگر تم چاہو تو وہ یہاں پاکستان آ کر بھی تمہارا معائنہ کر سکتا ہے۔''

عدیل نے بمشکل اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''معائنے کی بات نہیں ہے جمشید صاحب! یہ صرف سرجری کا معاملہ ہے اور ریڑھ کی سرجری جتنی پیچیدہ ہوتی ہے شاید آپ کو پتا نہیں۔''

وہ عجیب لہجے میں بولا تھا۔ ''مجھے تو سرجری سے زیادہ

تم پیچیدہ لگتے ہو۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ تم نے بس ضد پکڑ لی ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ضد بازیاں اچھی نہیں ہوتیں۔"

اُس نے عدیل سے کہا تھا کہ عدیل نے ضد پکڑ لی ہے۔ حالانکہ ضد وہ پکڑے بیٹھا تھا اور آج اس کی پیڑھ برس پرانی ضد ایک نہایت سنگین واردات پر ختم ہوئی تھی۔ آنکھیں موند کر کرسی پر بیٹھے، بیٹھے عدیل پسینے میں نہا گیا۔ دفعتاً اسے تابانہ کا خیال آیا اور ان طمانچوں کا خیال آیا جو اس نے تابانہ کے منہ پر مارے تھے اور خون کی اس سرخی کا خیال آیا جو اس کے نچلے ہونٹ پر دکھائی دی تھی۔ "اوہ گاڈ۔" وہ بڑبڑایا اور تیزی سے اٹھ کر تابانہ والے کمرے میں پہنچا۔ وہ اپنے ہونٹ پر روئی رکھے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی والدہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ عدیل کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تابانہ سہم گئی۔ اس کی والدہ ڈھال کی طرح اس کے سامنے آگئی۔ "خدا کے لیے ہوش کرو۔ میری بچی کچھ نہیں جانتی تمہاری الہام کے بارے میں۔ یہ تو خود ڈر مر کر یہاں چھپی بیٹھی ہے۔" میڈم نے دہائی دی۔

عدیل چند لمحے کمرے کے وسط میں ساکت کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا پھر وہ بھیگے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "تابانہ! میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو، میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔"

تابانہ نے اشک بار نگاہوں سے ذرا چونک کر عدیل کی طرف دیکھا۔ تب اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو اُبل پڑے۔ وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔ "کچھ پتا چلا الہام کا؟"

"ابھی نہیں، لیکن کچھ کھوج مل گیا ہے..... ویسے..... وہ بالکل محفوظ ہے۔" عدیل نے سر جھکائے جھکائے کہا اور مڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

عرفان شیخ اور جمیل بے قراری سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عرفان شیخ نے عدیل کو کھوجتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "کہیں یہ وہی حرام زادہ جمشید خاں تو نہیں؟"

عدیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایس پی عرفان کا چہرہ اتر گیا۔ جمیل بھی اس تصدیق کے بعد زرد زرد نظر آنے لگا۔ وہ دونوں تھوڑا بہت اس کھینچا تانی کے بارے میں جانتے تھے جو عرصے سے عدیل اور انڈر ورلڈ کے جمشید خاں کے درمیان جاری تھی۔ لیکن یہ کھینچا تانی ایک دن ایسا رخ اختیار کر لے گی، یہ ان دونوں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ ایس پی عرفان بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جمشید جیسے روپوش مجرموں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ منظر پر موجود ہی نہیں ہوتے..... اور اُن کے جو فرنٹ مین موجود ہوتے ہیں وہ بھی اکثر اپنے سرغنہ کی WHERE ABOUT کے بارے میں نہیں جانتے۔ عرفان کے ساتھ ساتھ عدیل کو بھی یقین تھا کہ اگر جمشید کے فرنٹ مین ظہور بابا کو پکڑ بھی لیا جائے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کا الٹا اثر یہ ہو سکتا تھا کہ طیش میں آ کر جمشید خاں، الہام کو کوئی نقصان پہنچا دیتا۔ بے شک وہ الہام کو "میری بچی" کہہ رہا تھا مگر اس جیسے بدمعاش سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ جمشید خاں نے جس نمبر سے فون کیا تھا اس کو ٹریس کرنے کی کوشش حماقت تھی۔

وہ کچھ دیر آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ان تینوں کی سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ انہیں اس معاملے میں جلد بازی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

☆☆☆

اب دن طلوع ہو چکا تھا لیکن عدیل کو یہی لگ رہا تھا کہ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ اور جمیل ابھی تک شیخوپورہ کے اسی گھر میں تھے جہاں تابانہ اور اس کی والدہ موجود تھیں۔ عدیل کا دوست عرفان واپس لاہور چلا گیا تھا۔ اسے اپنے کسی آفیسر کا بلاوا آیا تھا۔ رات کو جس نمبر سے جمشید خاں نے فون کیا تھا وہ اب بند تھا۔ عدیل شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ دوبارہ اس بدبخت کا فون آئے۔ رونے کی وجہ سے تابانہ کی آنکھیں سرخ تھیں تاہم اب اس نے خود کو قدرے سنبھالا ہوا تھا۔ اس کا زخمی ہونٹ تھوڑا سا سوجا ہوا تھا اور اس کی دید عدیل کو بے چین کر دیتی تھی۔ عدیل کو اس کی والدہ میڈم تنویر کا وہ جملہ یاد آیا جو انہوں نے رات کو بولا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میری بیٹی تو خود ڈر سہم کر یہاں چھپی ہوئی ہے۔ عدیل نے تابانہ سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ اپنی سرخ ناک کو شوپیس سے رگڑتے ہوئے بولی۔ "یہ وہی کلب والا جھگڑا ہے جی۔ وہ لوگ اوچھے ہتھکنڈوں پر اترے ہوئے ہیں۔ بس وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا کلب بند ہو جائے۔ ایک دو خطرناک لفنڈے بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ماما کو لے کر خاموشی سے یہاں چلی آئی ہوں۔" اس کی سیاہ آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔

کہتے ہیں کہ جس کی چوری ہو جائے اس کے لیے ہر کوئی چور ہی ہوتا ہے۔ شاید عدیل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ الہام کی گمشدگی کے روز ہی تابانہ اور اس کی والدہ کا

اپنے گھر سے اوجھل ہو جانا ان کو عدیل اور جمیل کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہرا گیا تھا پھر کلب کے نگراں وارثی نے جو الٹی سیدھی باتیں کیں، اس کی وجہ سے عدیل اور جمیل کا شک مزید گہرا ہوا۔ مگر اب یہاں پہنچنے کے بعد بالکل مختلف صورتِ حال سامنے آئی تھی۔ ماں بیٹی اپنے کلب کے تنازعے کی وجہ سے ہی منظر سے اوجھل ہوئی تھیں۔ قم واندوہ کی بیہوشی کیفیت میں عدیل نے تابانہ سے جو سلوک کیا تھا، وہ اسے مزید شرمندہ کر رہا تھا۔ اب عدیل پر یہ بات بھی کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی کہ تابانہ کے ہیلتھ کلب کے بارے میں جو ناروا باتیں کہی گئی تھیں وہ بھی کاروباری رقابت کا ہی شاخسانہ تھیں۔

میڈم تنویر نے آزردہ لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کلب ممبرز میں سے آرائیں برادری کی دو لڑکیاں ایسی تھیں جن کے رشتے میری کوشش سے طے ہوئے اور ایسا ان لڑکیوں اور ان کے والدین کی رضامندی سے ہوا۔ آج کل کے رواج کے مطابق لڑکیوں اور لڑکوں کو ایک دو دفعہ ایک دوسرے سے ملایا بھی گیا تاکہ وہ کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ بس ہمارے مخالفوں نے اسی بات کا بتنگڑ بنایا اور بہتان باندھ دیے۔ حالانکہ ان دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ ہنسی خوشی ہیں۔''

میڈم تنویر نے تابانہ کے موبائل پر ان شادیوں کی تصاویر بھی دکھائیں۔ عدیل اور جمیل نے تابانہ اور میڈم تنویر سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ عدیل نے تابانہ سے کہا کہ وہ ایس پی عرفان سے بات کرے گا۔ مخالف کلب والوں کو قانون کے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیا جائے گا۔ اس نے میڈم تنویر سے کہا کہ وہ اس طرح چھپ کر نہ بیٹھیں۔ بہتر ہے کہ ابھی لاہور واپس چلیں۔ ماں بیٹی سمجھتی تھیں کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتیں پھر بھی وہ ابھی چند دن یہاں گزارنا چاہتی تھیں۔

دوپہر کے بعد جب میڈم تنویر کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے سو گئیں تو عدیل کو تابانہ سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے رویے پر تابانہ سے معذرت کی۔ تابانہ بھی الہام کے سلسلے میں بے حد فکرمند تھی۔ جیسے وہ صرف اس کی شاگرد نہ ہو، چھوٹی بہن یا بیٹی ہو۔ یہ فکرمندی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے صاف جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''سر! پلیز مجھے بتائیں میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔ تھین کریں سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے والا ہو گیا ہے۔''

''فی الحال تو تم دعا ہی کرو تابانہ اور اپنی امی سے بھی کہو۔ اس بندے کا فون دوبارہ آئے، تو پھر ہی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''آپ اور جمیل کسی ظہور باوا کی بات کر رہے تھے۔ یہ نام میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ جمیل شاید کہہ رہا تھا کہ یہ جمشید خاں کا فرنٹ مین ہے۔''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''سر! یہ شخص تو انڈر گراؤنڈ نہیں ہے نا۔ کیوں نا اسی پر ہاتھ ڈالا جائے۔ پولیس والے تو پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایس پی عرفان آپ کا دوست ہے۔''

''نہیں تابانہ، اس رخ پر ہم نے بھی سوچا ہے۔ اس سے ہماری اور الہام کی مشکلات میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔''

یکایک عدیل کے موبائل پر کال کے سگنل آئے۔ وہ جیسے سرتاپا ہل گیا۔ جلدی سے اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ یہ وہی منحوس نمبر تھا جسے ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عدیل کال ریسیو کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جمشید خاں کی قدرے باریک لیکن نہایت تیکھی آواز سنائی دی۔ بالکل جیسے تلوار کی دھار ہو۔ وہ بلا تمہید سرد لہجے میں بولا۔ ''چیمپ عدیل! پہلے تو میں تمہیں یہ بات بتا دوں کہ اپنے یار ایس پی شیخ یا کسی اور پولیس والے کی گندی ناک اس معاملے میں گھسیڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے تمہاری بچی کو بچی کہا ہے اور بڑے احترام اور لاڈ سے اپنے پاس رکھا ہے۔ یہ ''احترام'' اور لاڈ برقرار ہی رہے تو بہتر ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں پھر ایک آتشیں دھمکی برق کی طرح کوندی۔

''کیا چاہتے ہو؟'' عدیل نے بمشکل اپنے لہجے کی لرزش کو چھپایا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''تم نے اس کو ضد بنا لیا ہے جمشید خاں۔''

''چلو ضد ہی سہی۔ لیکن اس ضد میں جیسا بھی بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں گارنٹی دے سکتا ہوں۔ تھائی لینڈر اناڈا سے تمہارا صرف آٹھ راؤنڈ کا مقابلہ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں کم از کم ایک لاکھ یورو کا اضافہ کر دے گا۔ ہماری کرنسی کے مطابق قریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیا۔''

''مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے جمشید خاں! تم اچھی طرح جانتے ہو میری فزیکل پرابلم کیا ہے۔''

''لیکن مجھے یہ سب کچھ چاہیے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تمہاری فزیکل پوزیشن سے زیادہ تمہارے اندیشوں اور واہموں نے تمہارا ایڑا اغرق کر رکھا ہے۔ تم سارے روزمرہ کے کام کرتے ہو، ڈرائیونگ کرتے ہو، جاگنگ کرتے ہو..... اور پتا نہیں کہ کیا کچھ کرتے ہو، لیکن باکسنگ کے رِنگ میں آتے ہوئے تمہاری جان نکلتی ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ضد میں نہیں کر رہا، تم کر رہے ہو۔''

''دیکھو جمشید خاں، پچھلے مہینے بھی میری کمر اور اسپائنل کے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ کہو تو میں تمہیں رپورٹس ارسال کر دیتا ہوں۔''

''تمہاری وہ ساری رپورٹس شاید میں تم سے بھی پہلے دیکھ چکا ہوں۔ ان رپورٹس میں کہیں نہیں لکھا کہ تم صرف ایک مقابلے کے لیے باکسنگ رِنگ میں اترو گے تو جہان فانی سے کوچ کر جاؤ گے۔ تمہاری درمیانے درجے کی ''انجری'' کا ذکر ضرور ہے لیکن اس انجری کے لیے میں نے توانائی کا ایک زبردست انجکشن ڈھونڈ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے اندر بے پناہ طاقت اور حوصلہ محسوس کرو گے اور اصل چیز تو حوصلہ ہی ہوتا ہے۔''

عدیل جواب میں خاموش رہا۔

جمشید خاں کی تیکھی آواز دوبارہ عدیل کے کان میں گونجی۔ ''پوچھو گے نہیں، کون سا انجکشن ہے؟'' پھر خود ہی ہنس کر جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام ہے الہام..... تمہاری بیٹی کی دوری بھی تو تمہارے لیے ایک انجکشن کی طرح ہی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ انجکشن ضرور کام کرے گا اور سابقہ ایشین چیمپئن ایک بار پھر Ring میں نظر آ کر اپنے چاہنے والوں کو حیران کر دے گا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر اپنے لہجے کو زیادہ سنجیدہ بناتے ہوئے بولا۔ ''چیمپ عدیل! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاس پورے تین ہفتے کا ٹائم ہے۔ خود کو اچھی طرح وارم اَپ کرو..... میڈیکیشن پر پوری توجہ دو۔ میں تمہارا اور اناڈا کا باؤٹ (مقابلہ) 3 فروری کو شیڈول کر رہا ہوں۔ کراچی میں ہونے والا یہ مقابلہ بے شمار لوگوں کو حیران کر دے گا۔ میں اس فائٹ کو نیٹ پر لائیو دکھانے کا انتظام بھی کر رہا ہوں..... اور ہاں یاد آیا، یہ جو ایک لاکھ یورو معاوضہ میں تمہیں بتا رہا ہوں اس میں تمہاری ہار جیت کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ جیت کی شکل میں تمہیں اضافی رقم بھی مل سکتی ہے.....''

''دیکھو جمشید خاں۔'' عدیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے کچھ نہ دو، جو کچھ میرے پاس ہے وہ بھی سب لے لو..... میری الہام مجھے واپس کر دو۔''

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا پُرلطف قہقہہ لگایا۔ ''تمہارے پاس کچھ بہت زیادہ تو نہیں ہے چیمپ! ایک گھر کے علاوہ کوئی پانچ چھ پلاٹ ہیں جو تم دونوں بھائیوں نے پراپرٹی کے کام کو دھکا لگانے کے لیے رکھے ہوئے ہیں لیکن اگر تمہارے پاس کچھ بہت زیادہ بھی ہوتا تو یہ مقابلے والا کام تو تمہیں پھر بھی کرنا پڑتا۔ میں ایک بار اپنے چیمپ کو ہر صورت پھر سے میدان میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن جمشید.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' اس مرتبہ جمشید خاں نے نہایت سرد لہجے میں عدیل کی بات کاٹی۔ ''تمہاری بیٹی بہت پیاری اور معصوم ہے..... اور میں چاہتا ہوں کہ یہ پیاری اور معصوم ہی رہے..... میرے خیال میں مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تین ہفتے کی مہلت، تین فروری..... اور کراچی۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عدیل اپنی جگہ بُت بنا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔

☆☆☆

الہام کو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بیسمنٹ میں ہے لیکن یہ کوئی تاریک یا حبس زدہ بیسمنٹ نہیں تھا۔ یہ نہایت جدید طریقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ آسائش کی ہر شے اس کشادہ بیسمنٹ میں موجود تھی۔ درمیانی عمر کی ایک خادمہ بھی ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنا نام انیلا بتایا تھا۔ اب پتا نہیں کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا نقلی۔ پہلے دو تین روز تک تو الہام نے رونے چلّانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا تھا مگر پھر انیلا کے سمجھانے بجھانے پر وہ دو چار لقمے لینے لگی تھی۔ اس تہ خانے میں اسے انیلا کے علاوہ بس ایک صورت اور نظر آئی تھی۔ دُبلے جسم لیکن لوہے کی طرح سخت اور کرخت چہرے والا ایک دراز قد شخص۔ اس نے الہام کو رونے چلّانے سے منع کیا تھا۔ پہلے پیار سے سمجھایا تھا، پھر دھمکایا تھا اور تب دوبارہ پیار کا لہجہ اختیار کیا تھا۔ اس پینتالیس پچاس سالہ شخص کا نام جمشید خاں معلوم ہوا تھا۔ اس نے الہام سے کہا تھا کہ وہ اسے انکل کہہ کر بلا سکتی ہے۔

تاہم جب الہام نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''انکل! پلیز مجھے گھر جانے دیں۔ میرے پاپا رو رو کر خود کو ختم کر لیں گے۔'' تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پیار سا گداز پن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"یہاں تمہاری ہر بات مانی جائے گی لیکن یہاں سے باہر نکلنے والی بات نہیں۔ تمہیں چند روز یہیں پر ٹی وی اور فلمیں وغیرہ دیکھ کر گزارا کرنا پڑے گا۔"

صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کرخت چہرے والے اس دھان پان شخص کے ساتھ ایک اور چہرہ نظر آیا تھا۔ یہ انیس بیس سالہ ایک دُبلا پتلا لڑکا تھا۔ فیشن ایبل کپڑے پہن رکھے تھے سر کے بال اسپائکس کی شکل میں تھے اور ایک کان میں گولڈن چھلا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ انکل کا کوئی قریبی..... یا شاید بیٹا ہے۔ بعدازاں انیلا کی زبانی اس کی تصدیق ہوئی تھی۔ وہ جمشید خاں کا بیٹا ہی تھا، اس کو جونی کہا جاتا تھا۔ مدقوق چہرے پر اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی لگتی تھیں۔ وہ جتنی دیر بیسمنٹ میں رہا تھا ایک قریبی کمرے میں لیپ ٹاپ کے ساتھ کچھ کرتا رہا تھا۔ الہام کو لگا تھا کہ گیم کھیل رہا ہے۔ اس کی موجودگی کے دوران میں انیلا، الہام کے اردگرد ہی موجود رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ جونی، الہام سے بات کرنے یا اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے گا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دُبلا پتلا کھبے جیسا جونی جونہی بیسمنٹ میں آیا، ملازمہ انیلا کچن چھوڑ کر فوراً الہام کے پاس آ گئی۔ شاید الہام کو اٹھا کر یہاں لانے والے انکل جمشید نے ہی انیلا کو اس احتیاط کے لیے کہا ہوا تھا۔ بہرحال خیریت ہی گزری۔ جونی تین چار گھنٹے بیسمنٹ میں رہا لیکن اس کی طرف سے کسی طرح کی غلط حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی منحوس شکل ایک دوسرے کمرے میں ہی گم رکھی۔ لیکن جاتے جاتے وہ ایک عجیب و غریب حرکت کر گیا۔ الہام کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ ایسا کچھ کرے گا۔ سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے اس نے بڑے اطمینان سے ایک کاغذ الہام کی گود میں پھینک دیا۔ اس وقت انیلا بھی الہام کی کرسی کے پاس قالین پر بیٹھی تھی۔ الہام حیرت سے کبھی کاغذ کو اور کبھی انیلا کو دیکھتی رہی۔

"یہ کیا ہے آنٹی؟" الہام نے زرد ہو کر پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں، دیکھ لو۔" انیلا نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

الہام کچھ دیر لرزتی رہی، پھر اس نے تہ شدہ کاغذ کھولا۔ جیسے کسی نے ٹھک سے اس کے سر پر لاٹھی ماردی۔ سیدھا سیدھا لکھا تھا۔ "آئی لو یو۔ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ سارا سارا دن تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم کہو گی کہ میں نے تو تمہیں بس ایک دو بار دیکھا ہے، اتنی جلدی یہ پیار کیسے ہو گیا؟

میں نے تمہیں ایک دو بار نہیں سیکڑوں بار دیکھا ہے اور جی بھر کر دیکھا ہے۔ اب میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ یہاں اکثر کمروں میں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں تمہارا کمرا بھی شامل ہے۔ پریشان نہ ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ جمشید خاں کا بیٹا ہے۔ زور زبردستی کرے گا مگر مجھے نظر انداز بھی نہ کرنا۔ زیادہ برداشت نہیں ہے میرے اندر۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے اپنے تعلقات ٹھیک رکھو گی اور یہ لو لیٹر پاپا تک نہیں پہنچاؤ گی لیکن اگر پہنچا بھی دو گی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔

مرجان جونی۔"

الہام سناٹے میں رہ گئی۔ وہ یہاں فریاد کرتی تو کس سے؟ ابھی تک اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کس لیے ہوا ہے۔ وہ اس دن اسکول سے گھر آئی تھی۔ بیل دیتی رہی پھر اسے اندازہ ہوا تھا کہ شرفو بابا گھر میں نہیں ہیں اور آنٹی نوراں شاید سو گئی ہیں۔ ان کی نیند بڑی پکی تھی۔ الہام نے اسکول بیگ میں سے اپنی پرسنل چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ حسبِ اندازہ آنٹی سوئی پڑی تھیں۔ وہ انہیں جگائے بغیر بیڈ روم میں چلی گئی تاکہ یونیفارم بدل سکے۔ یہی وقت تھا جب ڈور بیل ہوئی۔ وہ بھاگ کر گئی۔ دوسری طرف کوئی عورت تھی جو التجا آمیز لہجے میں اس سے دروازہ کھولنے کا کہہ رہی تھی۔ الہام نے گیٹ کے "پیپ ہول" میں سے جھانکا اور چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ عورت اندر آئی لیکن اس کے ساتھ ہی دو ہٹے کٹے بندے بھی اندر آ گئے تھے، وہ یقیناً اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ الہام کچھ سمجھ پاتی، ایک بندے نے اسے دبوچ کر اس کے منہ پر اپنا چوڑا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک تیز تیکھی بُو سی اس کی ناک میں گھستی چلی گئی۔ آخری لمحوں میں اسے بس یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ تڑپی، مچلی ہے اور اس کا پاؤں اندرونی کیاری کے کسی گملے سے ٹکرایا ہے..... پھر اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس آراستہ بیسمنٹ میں پایا۔

اس نے جھنجھلائے ہوئے مدقوق چہرے والے انکل سے کئی بار پوچھا تھا کہ وہ اس کے پاپا سے کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں تھا، تاہم الہام کا خیال یہی تھا کہ اسے پاپا سے کوئی لمبی رقم لینے کی خاطر اغوا کیا گیا ہے۔ اسے اپنی فکر تو تھی ہی اس کو... ہر گھڑی اپنے پاپا کی فکر بھی لگی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھے۔ اس کی واپسی کے

لیے کیا، کیا جتن کر رہے تھے۔ خیالات کے ہجوم کے سبب وہ اکثر بیٹھے بیٹھے رونے لگتی تھی۔ ایک دن پہلے تک وہ اسی اسکول یونیفارم میں تھی جو واقعے کے روز پہن رکھی تھی، لیکن کل دوپہر انیلا نے اصرار کر کے اس کے کپڑے بدلوائے تھے اور اس کے اُلجھے ہوئے بالوں میں کنگھی وغیرہ کی تھی۔

محلے والے واقعے کے بعد دو دن تو طوطے جیسی ناک والا پانس نما جونی نظر نہیں آیا مگر تیسرے دن اس نے پھر اپنی شکل دکھادی۔ وہ ایک نیکی شرٹ اور واہیات کی حد تک تنگ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ وہ الہام کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ملازمہ انیلا سے کہا کہ وہ کافی بنا کر لائے۔ انیلا جز بز نظر آئی۔ پھر ہولے سے بولی۔ ''سوری چھوٹے مالک! بڑے مالک نے کہہ رکھا ہے کہ میں الہام کو اکیلا نہ چھوڑوں۔ یہ ڈر جاتی ہے۔''

جونی نے کھا جانے والی نظروں سے انیلا کو دیکھا۔ غصے کے ساتھ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ الہام کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ مختصر جواب دیتی رہی۔ ان کی باتیں ٹین ایجرز والی ہی تھیں۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ سوشل میڈیا استعمال کرتی ہے یا نہیں۔ ٹک ٹاک میں دلچسپی رکھتی ہے یا نہیں؟ کون کون سی گیم کھیلتی ہے۔ جلد ہی اس نے اپنے اور الہام کے درمیان ایک مشترکہ دلچسپی ڈھونڈ لی۔ یہ معروف کمپیوٹر گیم ورلڈ آف کرافٹ تھی۔ اس نے الہام کو مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ یہ گیم کھیلے۔ اس نے کہا۔ ''یہ مت سوچو کہ اس ہسپتال سے جلدی تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ کچھ پتا نہیں کہ تمہیں کتنی دیر یہاں رہنا پڑے۔ کوئی تفریح نہیں رکھو گی تو یہ ٹائم گزارے نہیں گزرے گا۔''

اس کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ الہام کے اردگرد رہنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ الہام کی طرف پیش قدمی کرنے کے اشارے بھی اس کی گفتگو میں واضح تھے مگر شاید اس کے باپ نے اس کے لیے کچھ حدود مقرر کر رکھی تھیں۔

اس کے بعد تقریباً روزانہ ہی جونی ہسپتال میں آنے لگا۔ یہاں کامن روم میں دو میزیں تقریباً بارہ فٹ کے فاصلے پر موجود تھیں۔ دونوں میزوں پر ایک ایک لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ الہام کی مرضی یا موڈ کی پروا کیے بغیر جونی اسے گیم کھیلنے کا کہتا تھا۔ وہ بہ امرِ مجبوری کھیلنا شروع کر دیتی تھی۔ کسی کسی وقت اسے تھوڑی بہت دلچسپی بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ البتہ جونی کی موجودگی اسے بالکل نہیں بھاتی تھی۔ خاص طور سے جب بھی اس کی حریص نگاہیں الہام کے سراپا سے ٹکراتی تھیں، وہ اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس کرتی۔ اس کے علاوہ پتا نہیں کیا بات تھی ایک طرح کی بُو سی بھی جونی کے جسم سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہ کسی نشے کی بو تھی۔ جب تک وہ ہسپتال میں موجود رہتا، انیلا بھی الہام کے قریب ہوتی۔ اس کی موجودگی سے الہام کی ڈھارس بندھی رہتی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کامن روم میں بھی ایک دو خفیہ کیمرے موجود ہیں۔

ایک روز جونی آیا تو ایک خوب صورت ڈبیا میں ایک بریسلیٹ لے آیا۔ ڈبیا الہام کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھو..... چار چھوٹے ڈائمنڈ لگے ہوئے ہیں اس پر۔ تمہارے لیے لایا ہوں۔''

الہام نے بے بسی سے خادمہ انیلا کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات سے الہام کو اندازہ ہوا کہ وہ انکار نہ کرنے کا کہہ رہی ہے۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ اس نے مجبوراً بریسلیٹ لینے کے لیے جونی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بولا۔ ''نہیں ڈیئر! خود پہناؤں گا۔''

الہام نے ایک بار پھر بے بسی کے عالم میں انیلا کی طرف دیکھا۔ تب کلائی آگے بڑھا دی۔ اس نے کہا۔ ''ڈیئر! یہ کلائی والا نہیں، بازو والا ہے۔ آستین اوپر کرو۔''

الہام جھجک رہی تھی، اس نے خود ہی اس کی آستین کندھے تک چڑھا کر بریسلیٹ اس کے بازو پر پہنا دیا۔ اس کا لمس الہام کے لیے کانٹوں بھری شاخ جیسا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی بُو... اضافی کراہت کی وجہ تھی۔

یہی وقت تھا جب زینوں پر اس کا باپ نظر آیا۔ وہ بلا تمہید بولا۔ ''جونی! یہاں کیا کر رہے ہو۔ چلو اوپر جاؤ۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے اس سے۔'' اس کا اشارہ الہام کی طرف تھا۔

ان لمحوں میں جونی باپ کا اطاعت گزار نظر آیا۔ وہ اور انیلا اوپر چلے گئے۔ انکل جمشید نے کہا۔ ''لے بیٹی! تیری خواہش پوری کر رہا ہوں۔ باپ سے بات کر لے لیکن زیادہ لمبی نہیں اور دیکھ کوئی جھوٹ بھی نہیں بولنا۔''

جمشید خاں کے دبلے پتلے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا لائٹ ویٹ ''لیپ ٹاپ'' نظر آرہا تھا۔ الہام کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر اپنے پاپا اور چچا جمیل کو دیکھ رہی تھی۔ تقریباً اس روز کے ایک ٹاک انکار کے بعد یہ ملاقات بے

عدنان باتی اور رقت آمیز تھی۔ وہ رو رہی تھی اور بات کرتے ہوئے بار، بار اپنی انگلیوں کی پوروں سے اسکرین کو چھو رہی تھی جیسے اپنے پاپا کے چہرے کو چھو رہی ہو۔

اس کے پاپا کے بال پیشانی پر منتشر تھے اور ان کی آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا مگر وہ حوصلے میں نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاپا کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''پاپا! میں ٹھیک ہوں لیکن میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ ایک منٹ بھی نہیں۔ پلیز مجھے لے جائیں یہاں سے۔''

پاپا بولے۔ ''بس تھوڑا سا انتظار تمہیں اور کرنا پڑے گا الہام۔ بس چند دن۔ میں روزانہ ہی تمہیں کال کروں گا۔''

''کتنے دن کا انتظار پاپا؟'' وہ بلک اٹھی۔

اس مرتبہ چچا جمیل نے اسے پچکارا۔ ''صرف چند دن الہام..... اور یقین رکھو، یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ انکل نے ہر طرح تمہارا دھیان رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور ہم روزانہ ہی تم سے بات بھی کریں گے۔''

''لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ میں نہیں رہنا چاہتی یہاں۔'' وہ کراہی۔

''ایک مجبوری ہے میری بچی۔ جیسے ہی یہ دور ہوتی ہے، یہ انکل خود تمہیں چھوڑ کر جائیں گے۔'' اس کے پاپا نے کہا۔

الہام کے پہلو میں کھڑے انکل جمشید نے تسلی بخش انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی طرف سے بھی ''حوصلہ'' دیا۔

الہام کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس اپنے پاپا کے سینے سے لگنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اپنے پاپا کا دکھ اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

عدیل اپنی زندگی کے مشکل ترین دوراہے پر تھا۔ ایک طرف اس کی بیٹی تھی اور دوسری طرف اس کی اپنی زندگی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جمشید خاں کی ضد جان لیوا ہے۔ اگر وہ ہاکنگ کے رینگ میں اترا تو صحیح سلامت باہر نہیں آ سکے گا۔ جان بچ بھی گئی تو اسے جسمانی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔

کمر کی یہ چوٹ کوئی معمولی چوٹ نہیں تھی۔ اس کے درمیانی مہرے بُری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ پچھلے پانچ چھ برس میں اس نے اپنے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ جمیل بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہا تھا۔ بلکہ ایک موقع پر تو جمیل نے اپنا ایک قیمتی ذاتی پلاٹ، کم قیمت پر فروخت کر دیا تھا اور عدیل کو زبردستی امریکا لے گیا تھا۔ وہاں ایک ماہر آرتھوپیڈک معالج اور اس کی ٹیم نے عدیل کا تفصیلی معائنہ اور ٹیسٹ وغیرہ کیے تھے۔ نتیجہ وہاں بھی وہی نکلا تھا جو دیگر جگہوں پر نکلتا رہا تھا۔ عدیل کو اسپائنل سرجری کی ضرورت تھی اور یہ بہت رسک والی سرجری تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ اس تکلیف کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ عدیل ایک نہایت محتاط زندگی گزارے۔ ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق ادویات کا استعمال اور مجوزہ ورزشیں جاری رکھے تاکہ چلنے پھرنے کے قابل رہ سکے۔ اس صورت میں اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ کسی وقت بغیر آپریشن کے ہی مہروں کی اس تکلیف میں افاقہ ہو جائے۔ امید و بیم کی بس اسی کیفیت میں پچھلے چھ سات برس گزر گئے تھے۔

''سنبل! تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟'' عدیل نے مرحومہ بیوی کی تصویر کے سامنے بیٹھے بیٹھے جذب کے عالم میں کہا۔ چہرے پر اندوہ کی گہری کیفیت تھی۔

تصویر کیا جواب دیتی، وہ خاموش تھی۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''تمہاری بیٹی تمہاری تصویر ہے سنبل۔ مجھے اس میں تم نظر آتی ہو۔ اور وہ بہت بڑی مصیبت میں ہے سنبل۔ میں اس کی زندگی کے لیے بڑے سے بڑا رسک لینے کو تیار ہوں۔ تم اب نہیں ہو، اگر تم زندہ ہوتیں تو تم بھی مجھے یہ رسک لینے سے نہ روکتیں..... میں یہ رسک لینے جا رہا ہوں سنبل، میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

دروازے پر ہونے والی مدھم دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آنے والی نمی کو پونچھا اور بولا۔ ''کون ہے؟''

نوراں کی آواز آئی۔ ''صاحب جی! تابانہ بی بی آئی ہیں۔''

عدیل چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وال کلاک پر نظر دوڑائی۔ چار بج چکے تھے۔ وہ تقریباً روزانہ ہی سہ پہر کے وقت آ رہی تھی اور عدیل کی کمر کا مساج وغیرہ کرتی تھی۔ وہ ایک کوالیفائڈ فزیوتھراپسٹ تھی۔ عدیل نے اور ایس پی عرفان نے تابانہ اور اس کی والدہ کو تسلی بخش دی تھی اور وہ پچھلے ہی ہفتے شیخوپورہ سے واپس لاہور، اپنے گھر آ گئی تھیں۔ آج کل تابانہ باقاعدگی کے ساتھ عدیل سے مل رہی تھی۔ دراصل عدیل فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ الہام کی سلامتی کی خاطر جمشید خاں کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ اس

کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ تین چار روز پہلے اس سلسلے میں فون پر اس کی جمشید خاں سے تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور معاملہ طے پایا تھا۔ معاملہ طے پانے کے بعد جمشید خاں نے وڈیو لنک کے ذریعے پہلی بار الہام کی بات عدیل اور جمیل سے کرائی تھی۔ اب عدیل نے تھائی باکسر اناڈا کے ساتھ آٹھ راؤنڈ کے مقابلے کے لیے ہلکی پھلکی ٹریننگ شروع کردی تھی۔ اس کے لیے اس نے اپنے کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ مشورہ کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کا جواب یہی ہونا تھا کہ وہ اپنا دشمن آپ کیوں ہو رہا ہے۔ اسے سخت نقصان اٹھانا پڑے گا..... بلکہ سخت ترین نقصان۔

تابانہ سب کچھ جانتی تھی اسی لیے وہ بے حد فکرمند بھی تھی۔ وہ کھلاڑی ہی نہیں فزیوتھراپسٹ بھی تھی۔ جانتی تھی کہ ہلکی پھلکی ٹریننگ بھی عدیل کی کمر پر کتنا اسٹریس ڈال سکتی ہے۔ اس نے بے حد اصرار کے ساتھ عدیل کو آمادہ کیا تھا کہ ٹریننگ سیشن سے پہلے اور بعد میں وہ تھوڑی سی تھراپی کرائے۔ خصوصاً ٹریننگ کے بعد اسے تھراپی کی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ اس کی کمر کا جھکاؤ بڑھ جاتا تھا اور وہ کافی دیر تک سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا تھا بستر پر چت لیٹنا بھی اس کے لیے قطعی ناممکن ہوتا تھا۔

''کیسے ہیں جی؟'' تابانہ نے اندر آتے ہوئے چست انداز میں کہا۔

''بس ٹھیک ہوں۔'' اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ''لیکن جم کے لیے دیر ہوگئی ہے آج مساج رہنے دیں؟''

''نہیں سر! وقفہ نقصان دہ ہوگا۔'' وہ پروفیشنل انداز میں بولی۔

اس نے قمیص اتارنے میں عدیل کی مدد کی۔ پھر اپنی جرسی کی آستینیں اڑسیں اور عدیل کو پہلو کے بل لٹا دیا۔ اوپو آئل لگا کر وہ بڑی نرمی اور مہارت کے ساتھ مساج کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس میں کچھ ایسی بات تھی جو بالکل جدا محسوس ہوتی تھی۔ عدیل کو لگتا تھا کہ اس کے رگ و پٹھوں میں آئل کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی محبت بھی سرایت کررہی ہے۔ تابانہ کے گال شہابی ہوجاتے، اس کی سانس مشقت کے سبب ذرا سی تیز ہوجاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ تھراپی صرف عدیل کے رگ و پٹھوں کو ریلیکس کرتی تھی، اس کی کمر کی موذی تکلیف کو اس سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔

روز کی طرح وہ آج بھی تھراپی کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''جناب اسپورٹس کے کئی ٹی وی چینلز آپ کے مقابلے والی خبر چلا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی اس کا کافی ذکر ہے۔ لگتا ہے کہ یہ جمشید خاں اور اس کا فرنٹ مین باوا کافی پیسا اکٹھا کرلیں گے۔ بس یہ لالچ ہی تھا جس نے ان لوگوں کو اتنے بڑے جرم پر اکسایا ہے۔ اس لالچ کے سبب ان لوگوں نے آپ کی صحت سلامتی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے تابانہ کے لہجے میں گہرا درد اتر آیا۔

''جو کچھ بھی ہے تابانہ، بس دعا کرو کہ الہام خیریت کے ساتھ گھر واپس آجائے۔''

''ان لوگوں کا کچھ بھروسا تو نہیں ہوتا سر، کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ آپ کے اتنے بڑے رسک کے باوجود یہ لوگ بعد میں پس وپیش کرنے لگیں۔''

''امید تو نہیں ہے۔'' عدیل نے ذرا کراہتے ہوئے کہا۔ ''سنا یہی ہے کہ یہ بُرے لوگ بُرے کام بڑی ایمان داری سے کرتے ہیں۔''

''خدا کرے سب ٹھیک ہوجائے۔ آپ بھی ٹھیک رہیں اور ہماری الہام بھی عافیت کے ساتھ گھر واپس آجائے۔'' تابانہ نے بڑے درد سے کہا اور عدیل کو محسوس ہوا کہ دو قطرے اس کے عریاں کندھے پر گرے ہیں۔ یہ آئل نہیں تھا، یہ آنسو تھے جو تابانہ کی گہری سیاہ آنکھوں سے ٹپکے تھے۔

وہ اسی طرح کروٹ کے بل لیٹے لیٹے بولا۔ ''تابانہ! تمہارے اپنے بھی مسئلے ہیں..... ان کی طرف توجہ دو۔ خود کو اس معاملے میں اتنا ہلکان مت کرو، مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

وہ عجیب آہنگ میں بولی۔ ''یہ سب میرے بس میں نہیں ہے سر! اس وقت میرے لیے آپ کے مسئلے سے بڑا مسئلہ کوئی نہیں ہے۔ میں..... اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

تابانہ بین السطور وہ سب کچھ کہہ رہی تھی جو اس نے اس سے پہلے اپنے میڈ کارڈ کے ذریعے سمجھایا تھا اور اپنے خط میں کہا تھا۔ وہ عدیل کی صرف پرستار نہیں رہی تھی، گزرے ماہ و سال نے اور پھر عدیل کی اتفاقیہ ''دید'' نے اس کی پسندیدگی کو محبت کے جذبے میں ڈھال دیا تھا۔ شاید وہی محبت جو وقت دیکھتی ہے، نہ عمر، نہ ذات پات نہ کوئی اور رکاوٹ۔ وہ بس ہوجاتی ہے اور کسی جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتی ہے۔ ''لو..... میں ہوگئی ہوں۔ اب تم سے جو بن پڑتا ہے کرلو۔ اگر مجھ میں طاقت ہے تو میں اپنا آپ منوا کر دکھا

دوں گی۔ ساری دنیا مل کر بھی مجھے ہرا نہیں سکتی کیونکہ ہار اور جیت میرے لیے ہم معنی ہیں۔ میں جیت کر تو جیتی ہی ہوں، ہار کر بھی جیت جاتی ہوں۔''

عدیل ایک سرد سانس لے کر رہ گیا۔ وہ تابانہ سے اپنے سابقہ رویّے پر بے حد شرمندہ تھا۔ اب اس میں اتنی سکت ہرگز نہیں تھی کہ وہ کوئی سخت بات کہہ کر اسے صدمہ پہنچائے۔ یہی وقت تھا جب میز پر پڑے عدیل کے فون کی بیل ہونے لگی۔ تابانہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی میز کی طرف گئی اور فون عدیل کے ہاتھ میں تھمایا۔ اسکرین دیکھ کر عدیل نے فون ایک طرف رکھ دیا۔ یہ کراچی کے معروف آرتھوپیڈک معالج تھے۔ سرجری بھی کرتے تھے۔ عدیل کچھ عرصہ ان کے زیرِ علاج بھی رہا تھا۔ عدیل سمجھ گیا کہ فروری کی 3 تاریخ کو ہونے والے باکسنگ مقابلے کی خبر ان تک بھی پہنچی ہے اور وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے عدیل کو اس حماقت کے مضمرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک دو فون عدیل کو لاہور سے بھی آچکے تھے۔ وہ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا کہ بیٹی اس کی زندگی ہے..... اگر یہ زندگی نہیں ہے تو پھر زندگی کا کیا کرنا۔

☆☆☆

عدیل فرسٹ فروری کو ہی کراچی پہنچ گیا تھا۔ جمیل اور عرفان بھی فضائی سفر کر کے اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ کراچی میں بھی عدیل نے ہلکی پھلکی ٹریننگ اور شیڈو باکسنگ جاری رکھی تھی۔ ادویات اور مخصوص ورزشوں کے سبب وہ خود کو پہلے سے کچھ بہتر محسوس کرتا تھا۔ وارم اَپ ہونے کے بعد وہ اپنی کمر کو سیدھا کرنے کے قابل بھی ہو جاتا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب عارضی ہے اور اصل صورتِ حال تو مقابلے کے وقت ہی سامنے آنی ہے۔

اور آج مقابلے کا دن 3 فروری تھا۔ ویک اینڈ کی شام آٹھ بجے منعقد ہونے والے اس مقابلے نے کافی شہرت پائی تھی۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں تسلسل سے خبریں لگ رہی تھیں۔ باکسنگ کے شائقین دو پرانے حریفوں عدیل اور اناڈا کو ایک بار پھر آمنے سامنے دیکھنے کے حوالے سے بے حد پُرجوش تھے۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ ان کا محبوب کھلاڑی کس عذاب سے گزر رہا ہے۔ آج کا سارا دن ہی تناؤ بھرا تھا۔ پہلے، دوپہر کے وقت مخصوص وڈیو لنک کے ذریعے الہام سے عدیل کی جذباتی ملاقات ہوئی۔ وہ بے چاری کچھ نہیں جانتی تھی کہ آج اس کا پیارا باپ اس کی سلامتی کے لیے کتنے بڑے امتحان سے گزر رہا ہے۔ عدیل نے اس پر کچھ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا۔ تاہم الہام سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی آواز بار بار بھرّاتی رہی۔ دل میں خیال آتا رہا کہ پتا نہیں آج وہ جس آزمائش سے گزر رہا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلنا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ بے سہارا الہام ہمیشہ کے لیے اس کی صورت دیکھنے کو ترس جائے۔

الہام سے گفتگو ختم ہونے کے دو گھنٹے بعد جمشید خاں کی کال آگئی۔ وہ اپنی قدرے باریک لیکن تلوار جیسی تیز آواز میں بولا۔ ''چیمپ عدیل! مقابلے میں اب بس چند گھنٹے باقی ہیں۔ میں ایک بار پھر تمہیں تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔ کلنچنگ یا انڈر پرفارمنگ سے مجھے ہمیشہ سخت نفرت رہی ہے۔ مجھے نظر آنا چاہیے کہ اس مقابلے میں تم اپنی ہمت، طاقت کے مطابق اپنا سو فیصد دے رہے ہو۔ یہ آٹھ راؤنڈ کا مقابلہ ہے اور تمہاری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ یہ چھ سات راؤنڈ تک تو ضرور چلے۔ مجھے تمہاری یہ کوشش اور کٹ منٹ نظر آئے گی تو ہی ہمارا معاہدہ بھی برقرار رہے گا۔''

وہ بہت کمینہ اور خرانٹ شخص تھا۔ عدیل کا دل چاہا وہ اس کے سامنے ہو اور وہ تمام اندیشے اور خطرات بالائے طاق رکھ کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ اپنی اور اس کی جان ایک کر دے مگر وہ جانتا تھا اس کی زندگی، اس کا لختِ جگر اس کی بے رحم مٹھی میں ہے۔ اسے خود پر ضبط کرنا ہے۔ اس نے جمشید خاں کی بات کا جواب اس کی مرضی کے مطابق تحمل سے دیا۔

جمشید خاں ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''تم سے ایک اور خاص بات بھی کرنی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں یہ بات زیادہ بُری نہیں لگے گی..... بلکہ پسند آئے گی لیکن ابھی نہیں ابھی تم اپنی پوری توجہ شام کے مقابلے پر فوکس رکھو۔ میری تو خواہش ہے کہ تم جیتو..... تھائی لینڈر کو دھول چٹاؤ اور صرف یہی مقابلہ نہیں اور مقابلے بھی جیتو۔''

''جمشید خاں! میرے لیے بہت بہتر ہوگا کہ تم اپنی یہ نیک تمنائیں اپنے پاس ہی رکھو۔'' عدیل کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

جمشید خاں نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ ''گھبراؤ مت۔ میرا اور تمہارا معاہدہ صرف اسی ایک مقابلے تک ہے۔ اس کے بعد تمہاری اپنی مرضی ہوگی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ''گڈ وشز'' کہا اور فون بند کر دیا۔

اور یہ منظر تھا مقابلے کا۔ سیکڑوں پُرجوش تماشائیوں کے درمیان عدیل اپنے پرانے حریف اناڈا کے سامنے رنگ میں تھا۔ اناڈا کی عمر 35 سال تھی۔ وہ عدیل سے قریباً چھ سال چھوٹا تھا۔ اس کی ''فزیک'' بھی کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ یقیناً اسے بھی معلوم تھا کہ عدیل اپنی انجری سے ''صحت یاب'' ہوکر میدان میں آیا ہے۔ انجری سے ابھر کر میدان میں آنے والوں کے لیے کامیابی کا تناسب بہت کم ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ پُراعتماد تھا۔ (اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ عدیل ابھی تک انجری کی حالت میں ہی ہے تو شاید اس کا اعتماد اور بڑھ جاتا)

مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں باکسرز نے پہلا راؤنڈ بہت سنبھل کر کھیلا اور زیادہ تر ایک دوسرے کو تولتے اور جانچتے رہے۔ دوسرے راؤنڈ میں اناڈا نے عدیل پر کچھ سخت حملے کیے اور اناڈا کے حمایتیوں اور اس پر شرط لگانے والوں نے شور بلند کیا۔ تیسرا راؤنڈ قریباً مساوی ہی رہا۔ اناڈا کی غیر معمولی خود اعتمادی میں رخنہ ڈالنے کے لیے عدیل نے بھی اس پر چند مؤثر وار کیے۔ اس لڑائی میں عدیل کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ جمشید خاں کو مطمئن کر سکے اور اس کی خواہش کے مطابق مقابلے کو کھینچ تان کر چھٹے ساتویں راؤنڈ تک لے جائے۔ جہاں تک جیتنے کی بات تھی، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کی جیت بس یہی تھی کہ وہ میدان میں آگیا تھا اور مقابلہ کر رہا تھا۔ چوتھے اور پانچویں راؤنڈ میں اناڈا نے عدیل کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ عدیل کی کمزوریاں جانچ کر شیر ہوگیا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے اسٹاک پنچ کا بھرپور استعمال کیا اور عدیل کو لوکھڑا دیا۔ عدیل کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ اناڈا کے سپورٹرز فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ پانچویں راؤنڈ کے آخر میں عدیل نے خود کو سمیٹ کر جوابی حملے کی ادنیٰ سی کوشش کی تو اس کی کمر کے پٹھوں میں ایسا زبردست کھچاؤ پیدا ہوا کہ وہ کراہ کر رہ گیا۔ پانچواں راؤنڈ اناڈا کی نہایت واضح برتری پر ختم ہوا۔ عدیل کا چہرہ لہولہو تھا۔ اس نے دیکھا تماشائیوں کی اگلی صف میں بیٹھی تابانہ رو رہی تھی، جمیل کا چہرہ بھی دھواں دھواں تھا۔ ایک بیمار باپ اپنی ''لاڈلی'' کی سلامتی اور عافیت کے لیے ہزاروں نگاہوں کے سامنے اپنی صحت اور زندگی کو داؤ پر لگائے ہوئے تھا۔ ایک ''بے رحم'' نے اس کی حالت کی پروا کیے بغیر اسے اَن گنت لوگوں کے سامنے تماشا بنا دیا تھا۔

عدیل کے بہی خواہوں کا خیال تھا کہ شاید عدیل کو ٹیکنیکل ناک آؤٹ قرار دے کر مقابلہ ختم کر دیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور چھٹا راؤنڈ عدیل کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ بپھرے ہوئے اناڈا نے اس پُرکوں کی بارش کر دی۔ وہ اسے ناک آؤٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ عدیل کی ایک ابرو سے بہنے والا خون اس کی آنکھ میں جمع ہو رہا تھا۔ اناڈا کا ایک طوفانی مُکا بچانے کی ناکام کوشش میں اس نے اپنا سر پیچھے ہٹایا تو اس کی مضروب کمر کو ایسا شدید دھچکا لگا کہ پورا جسم درد سے چیخ گیا۔ اُسے یوں لگا تھا کہ ایک لمحے میں اس کی ٹانگیں بے جان ہوگئی ہیں۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پشت کے بل گرا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سنسنی اور الہام کے چہرے گھومے اور پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

وہ مر چکا تھا یا شاید مر رہا تھا..... یا عالم ارواح میں تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی منوں وزنی پلکوں کو اٹھایا۔ اسے اپنے آس پاس کہیں اپنے بھائی جمیل کی آواز سنائی دی۔ پھر یہ آواز بھی کہیں کھوگئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اسپتال کے کمرے میں ہے اور اکیلا ہے۔ وہ کروٹ پر لیٹا ہے۔ اسے وہ سب کچھ یاد آیا جو اس کے بے ہوش ہونے سے پہلے پیش آیا تھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے ماتھے کی طرف گیا۔ یہاں ایک بھاری بینڈ تھی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں۔ وال کلاک دو بجے کا وقت بتا رہا تھا اور یقیناً یہ رات کے دو تھے کیونکہ اسپتال کے طول و عرض میں نیم تاریکی اور خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اور چونکا۔ جمیل بھی کمرے میں موجود تھا اور ایک صوفے پر سو رہا تھا۔ اس نے اسے پکارنا چاہا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے اپنے جسم کو احتیاط سے حرکت دی اور خود ہی ہاتھ لمبا کر کے تپائی پر رکھا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا اور تب ہی اس پر ایک ایسا انکشاف ہوا جس نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ وہ جہاں کا تہاں ساکت رہ گیا۔ اُسے لگا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ کیسے ہوگیا ہے؟

وہ تکیے کے سہارے تھوڑا سا گھوما۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ جمیل کو پکارے۔ اسے اتنی زور سے آواز دے کہ وہ ہڑبڑا کا اٹھ بیٹھے لیکن پھر فوراً ہی ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے، وہ غلط ہے۔ صرف ایک دھوکا ہے۔ نہیں ابھی اسے جمیل

کو نہیں بتانا چاہیے۔ کسی کو بھی نہیں بتانا چاہیے' پہلے اُسے پوری طرح تصدیق کر لینی چاہیے۔

یہی وقت تھا جب ایک نوجوان ڈیوٹی ڈاکٹر، نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ خوش دلی سے بولا۔ ''میرا اندازہ تھا کہ آپ جاگ چکے ہیں..... لیکن جناب ابھی آپ کو بے حد، بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔'' اس نے عدیل کو کندھوں سے تھام کر بہت آہستگی سے اس کی کمر کو تکیوں سے ٹکایا اور نرس کو اشارہ کیا کہ وہ اس کا بی پی وغیرہ چیک کرے۔

غالباً بے ہوشی یا غنودگی کی حالت میں عدیل کا سی ٹی اسکین کیا جا چکا تھا اور کمر کے دو تین ایکسرے بھی اتارے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر توجہ سے ایکسریز کا معائنہ کرنے لگا۔ اسی دوران میں جمیل بھی جاگ چکا تھا۔ اس نے آنکھوں میں نمی لے کر بڑی محبت سے اس کا ہاتھ چوما۔ ڈاکٹر نے اسے کسی میڈیسن کی پرچی تھمائی اور پھر اس کے ساتھ دھیمے لہجے میں بات کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

عدیل نے مزید 48 گھنٹے اسپتال میں گزارے۔ ڈاکٹرز اُسے ہلنے جلنے سے منع کر رہے تھے بلکہ سینے میں انفیکشن کی وجہ سے زیادہ بات چیت بھی کرنے نہیں دے رہے تھے۔ لیکن وہ بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ اپنے ہمراز دوست جیسے بھائی جمیل کو وہ سب کچھ بتانا چاہتا تھا جو دو دن پہلے اس پر آشکار ہوا تھا۔ وہ لمحے جو جاگتی آنکھوں کے خواب جیسے تھے اور جن پر وہ اب تک پوری طرح یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ جمیل نہانے اور لباس وغیرہ بدلنے کے لیے گھر گیا ہوا تھا۔ بابا شرفو عارضی طور پر اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھا۔ عدیل بے چینی سے جمیل کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

اسی دوران میں وہ فون کال آ گئی جس کو شاید کل ہی آ جانا چاہیے تھا۔ یہ جمشید خاں کی کال تھی۔ عدیل نے تڑپ کر فون اٹھایا۔ ''ہیلو'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

جمشید خاں کی تیکھی، برے جیسی آواز نے اس کے کان کو چھیدا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر میں تم سے پوچھوں کہ کیا حال ہے، تو یہ رسمی بات ہوگی۔ مجھے پتا ہے تمہیں ابھی دس بارہ دن مزید بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا، پھر آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ جائیں گے۔''

پھر وہ ذرا توقف کے ساتھ گویا ہوا۔ آواز میں طنز تھا۔ ''شکریہ ٹیپ! کہ تم نے میرا مان رکھا۔ برسوں بعد ہانگ رنگ میں اتر کر ہزاروں لوگوں کو انٹرٹین کیا۔ بے شک یہ اسپیڈ رٹ مین شپ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔''

''جمشید خاں! میری بچی کب واپس آ رہی ہے؟'' عدیل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر گمبھیر آواز میں کہا۔

''بہت جلد..... بالکل صحیح سلامت حالت میں..... بلکہ شاید تمہارے لیے ایک اچھی خبر بھی لا رہی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر جمشید خاں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''عدیل! مقابلے سے پہلے میں نے تم سے کچھ کہا تھا..... دراصل..... میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں یہ بات بُری نہیں لگے گی بلکہ شاید پسند آئے گی۔ تمہاری بچی سمجھو میری بچی ہے۔ اسے یہاں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی لیکن اِن تین چار ہفتوں میں یہاں حالات کچھ تبدیل ہوئے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عدیل نے ٹھٹک کر پوچھا۔

وہ بالکل سپاٹ بے لچک لہجے میں گویا ہوا۔ ''ٹیپ عدیل! یہ جو نئی نسل ہے نا اس کے رویے ہماری سوچوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، تمہیں سن کر شاک تو ضرور ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا بیٹا مرجان تمہاری الہام سے محبت کرنے لگا ہے..... اور یہ معاملہ یک طرفہ نہیں، وہ بھی اُسے پسند کرنے لگی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے سامنے اظہار نہ کرے یا بالکل مختلف رویہ اپنائے لیکن سچائی یہی ہے جو میں تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں۔ اس کا رونا بسورنا ختم ہو چکا ہے اور وہ ایک بالکل مختلف موڈ میں آ چکی ہے۔''

عدیل کے سینے میں جیسے شعلے بھڑک اٹھے۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ سمجھ گیا تھا کہ انڈر ورلڈ کا یہ بدمعاش اپنے وعدے سے پھر رہا ہے۔ وہ جو بات کہہ رہا تھا، وہ عدیل کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی الہام کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سنبل کا پرتو تھی۔ سنبل کی شرم و حیا اور پاکیزگی کی وارث تھی وہ۔ یہ بدذات کمینہ شخص اُس معصوم پر الزام لگا رہا تھا جو بات وہ کہہ رہا تھا، وہ اس عیاش کے بدبخت بیٹے کے بارے میں تو درست ہو سکتی تھی، الہام کے بارے میں نہیں۔

''جمشید خاں! اب اگر تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو..... میں کچھ کر بیٹھوں گا۔'' عدیل بھائی لہجے میں بولا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا تھا۔

''جو تم کر سکتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''لیکن میں تم سے کوئی زور زبردستی

کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں کوئی غلط بات کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں، وہ قانونی ہے اور شرع کے بھی عین مطابق ہے۔ میں تمہاری الہام کو اپنی الہام بنانا چاہتا ہوں۔ اپنے بیٹے کے نکاح میں دینا چاہتا ہوں۔ اسی میں دونوں بچوں کی خوشی ہے۔"

عدیل دانت پیس کر بولا۔ "دونوں بچوں کی نہیں تمہارے بدمعاش سپوت کی خوشی ہوگی اور تمہاری خوشی ہو گی۔ لیکن میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ شادی کے نام پر تمہارے بیٹے کے ہاتھوں اپنی بیٹی کو تاراج نہیں ہونے دوں گا۔ مرجاؤں گا یا مار دوں گا۔"

"دھیرج چیمپ دھیرج۔ زیادہ اُچھلو گے تو تمہارا بلڈ ریسٹ چند ہفتے کے بجائے مہینوں میں بدل جائے گا۔ دیکھو میں اپنے وعدے سے پھر نہیں رہا۔ یہاں میرے پاس وہ ہر طرح محفوظ رہی ہے اور میری شرط پوری ہونے کے بعد وہ تمہارے پاس اسی طرح منتقل ہو جاتی جس طرح تمہارے اکاؤنٹ میں ڈیڑھ کروڑ روپے منتقل ہوئے ہیں لیکن یہاں جو کچھ ہوا، وہ قدرت کا کھیل ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ہونا چاہتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن اس وقت بھی وہ دونوں بیٹھے کمپیوٹر پر گیم کھیل رہے ہیں..... باقی تمہارے ذہن میں جو اندیشے ہیں، وہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ شاید تمہیں ڈر ہے کہ تمہارا داماد مستقبل کا ایک جرائم پیشہ شخص ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا چیمپ عدیل! الہام سے شادی کے بعد میں مرجان کو اس کاروبار سے بالکل علیحدہ کر دوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں دونوں کو بیرونِ ملک کہیں سیٹل کر دوں۔ سڈنی میں میری کچھ صاف شفاف پراپرٹی ہے جو مجھے وراثت میں ملی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کو خاموشی سے وہاں بھیج دوں....."

جمشید خاں کھوکھلے لہجے میں جو مطمئن تسلیاں دے رہا تھا، وہ عدیل کے اندر کی آگ کو مزید بھڑکا رہی تھیں۔ وہ پھنکارا۔ "جمشید خاں! جو کچھ تم نے کہا، وہ میں نے کیا۔ اپنی جان پر کھیل کر کیا لیکن اب میں اپنی معصوم بیٹی کو کسی کی ہوس کا لقمہ نہیں بننے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔" اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے کہ تم کو عزت راس نہیں آرہی۔ ایک جائز کام کو ناجائز کہہ رہے ہو اور اس کے لیے غلط الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ بہرحال ایک بات اچھی طرح جان لو سمدھی جی، مرجان میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں نے آج تک اس کی کوئی خواہش رد نہیں کی۔ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ تم مزید سوچ لو۔" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہونے کی منحوس آواز آئی اور عدیل کو لگا جیسے اس کا دل سینے کے اندر تھم گیا ہے۔

☆☆☆

الہام اسی تہ خانے میں اسی نامعلوم مقام پر تھی۔ جونی آج پھر سرِشام ہی آدھمکا تھا۔ آج وہ کمپیوٹر گیم کھیلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا اور الہام کے لیے یہ غنیمت تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جلدی ہی اس کی جان چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں درمیانے سائز کا ایک مستطیل ڈبا نظر آرہا تھا۔ گتے کے اس ڈبے میں نہایت قیمتی بنارسی ساڑی تھی۔ وہ یہ ساڑی الہام کو دیتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لیے لایا ہوں۔"

الہام نے کچھ فاصلے پر بیٹھی انیلا کی طرف دیکھا اور پھر ساڑی لے کر تپائی پر رکھ دی۔ اس کی یہ بے اعتنائی دیکھ کر سوکھے سڑے جونی کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آئے۔ کچھ دیر تک جیسے اندر ہی اندر کھولتا رہا پھر ذرا تحکم سے بولا۔ "چلو ڈیئر! مجھے یہ پہن کر دکھاؤ۔"

وہ خاموش کھڑی رہی تو اس نے اپنا فقرہ کچھ زیادہ تحکم سے دہرایا۔ الہام ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے ملازمہ انیلا کی طرف دیکھنے لگی۔ جونی کا پارا چڑھ گیا۔ "اس کی طرف کیا دیکھنے لگتی ہو۔ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔"

"م..... میں نے کبھی نہیں پہنی..... مجھے باندھنی بھی نہیں آتی۔"

وہ پھنکارا۔ "تمہیں اور بھی "بہت کچھ" نہیں آتا ہوگا لیکن اب تمہیں کرنا پڑے گا۔ چلو جاؤ..... باندھ کر آؤ ساڑی۔"

الہام نے جھلائے ہوئے انداز میں ساڑی والا ڈبا اٹھایا اور اس کمرے میں چلی گئی جہاں کے واش روم میں وہ کپڑے بدلتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد وہ واپس آئی۔ اس نے جیسے تیسے ساڑی باندھ ہی لی تھی۔ ساڑی کی چولی بہت زیادہ مختصر تھی۔ خود کو چھپانے کے لیے الہام نے ایک شال اوڑھ لی تھی۔ شال کی موجودگی نے جونی کو پھر بدمزہ کر دیا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے بھئی، اتارو اس بدرنگ چادر کو۔" وہ بولا۔

الہام اسی طرح شال کے کناروں کو دونوں مٹھیوں میں دبائے کھڑی رہی۔ وہ ایک خوب صورت تصویر نظر آرہی تھی۔ نوخیزی کے سارے رنگ اس کے متناسب جسم پر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے خود شال نہیں ہٹائی تو جونی نے آگے بڑھ کر شال اس کے جسم سے علیحدہ کی اور انیلا کی طرف اُچھال دی۔ اب الہام کمرے کے بیچوں بیچ سر

جھکائے پشیمان کھڑی تھی۔ جونی کی تیز آنکھیں نگاہیں اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلا تو پھر وہ انگلیاں ٹیڑھی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

اُس نے دیکھا کہ الہام کے شفاف چکنے رخساروں پر آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہ استخوانی ہاتھ سے اپنی ملوطے جیسی ناک کھجا کر بولا۔ ''کیا ظلم کر دیا ہے میں نے تم پر..... جو رو نا دھونا کر رہی ہو۔ کچھ دے ہی رہا ہوں تم کو..... کچھ چھین تو نہیں رہا۔''

اُس کے لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی کو محسوس کر کے نوخیز الہام کے آنسو کچھ اور رواں ہو گئے۔ یہی وقت تھا جب اس کا باپ جمشید خاں سیڑھیاں اتر کر اندر آ گیا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے ایک لمحے میں صورت حال نوٹ کر لی۔ بیٹے کو جھڑک کر بولا۔ ''جونی کیوں تنگ کر رہا ہے میری بچی کو، چل اوپر جا..... چل نکل یہاں سے۔ ایسے ہی منہ اٹھا کر نہ گھس آیا کر۔''

جونی نے تیکھی نظروں سے الہام کو دیکھا پھر فرمانبرداری کے انداز میں سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ جمشید خاں نے انیلا کو بھی دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا پھر پیار سے الہام کو اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور اسے سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اسے باور کرا رہا تھا کہ جونی اس کی محبت میں گرفتار ہے..... وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کی خاطر خود کو ہر طرح سے تبدیل کر لے گا وغیرہ وغیرہ۔

الہام سنتی رہی اور روتی رہی۔ اس کا تقاضا بس ایک ہی تھا کہ وہ فی الحال اپنے پاپا کے پاس جانا چاہتی ہے۔ جمشید خاں نے اسے ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے۔ الہام کے جانے کے بعد جمشید خاں جہاندیدہ ملازمہ انیلا سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

''تیرا کیا خیال ہے انیلا، کیسے ڈھب پر آئے گی یہ؟''

''بڑے صاحب! لگتا ہے کہ ہمارے سمجھانے بجھانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں اس کا کوئی اپنا اس کے ساتھ بات کرے تو شاید اس کی عقل میں کچھ آ جائے۔'' انیلا نے تھوڑا توقف کیا، پھر مودب آواز میں بولی۔ ''میں نے اندازہ لگایا ہے صاحب جی کہ یہ اپنی کسی ٹیچر کی بات بھی بہت زیادہ مانتی ہے..... مس تابانہ نام لیتی ہے اُس کا۔ اگر اس طرح کا کوئی بندہ، بندی اس سے بات کرے تو شاید یہ ڈھیلی پڑ جائے۔''

''ٹیچر کا کوئی رابطہ نمبر ہے اس کے پاس؟''

''ضرور ہو گا جی، میں کوشش کر کے نمبر لیتی ہوں اس سے۔''

جس وقت جمشید خاں اور انیلا میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ الہام اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ پاپا اور چچا جمیل نے کہا تھا کہ وہ وڈیو لنک پر اس سے بات کرتے رہیں گے لیکن کئی دن ہو گئے تھے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید انکل جمشید کی ہی مرضی نہیں تھی کہ بات ہو۔ وہ پاپا کو یاد کرتی رہی۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے کے لیے وہ واش روم چلی گئی۔ جب وہ دروازہ بند کر کے واش بیسن پر جھکی، اسے کچھ بہت مدھم آوازیں سنائی دیں۔ جیسے کئی عورتیں آپس میں بات چیت کر رہی ہوں۔ کھانس رہی ہوں، ہنس رہی ہوں اور کسی وقت لڑ بھی رہی ہوں۔ یہ بھنبھناہٹ جیسی آوازیں اسے ایک دو دفعہ پہلے بھی سنائی دی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کشادہ بیسمنٹ کے کسی حصے میں اس کے اور انیلا آنٹی کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ کون ہیں یہ عورتیں۔ کبھی وہ نظر کیوں نہیں آتیں؟ کبھی انیلا نے ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

بلند چھت والے اس واش روم کی چھت کے پاس ایک چھوٹا سا گول ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ بمشکل چند انچ قطر کا ہو گا۔ الہام کچھ دیر سوچتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ واش روم میں خفیہ کیمرے بالکل نہیں ہیں۔ اس نے واش روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا پھر ہمت کر کے اس ''ٹیپ'' پر چڑھ گئی جو بالٹی بھرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ٹیپ کے پائپ پر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے اپنا چہرہ ایگزاسٹ فین تک پہنچا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوتھ برش تھا۔ اس برش کی مدد سے اس نے ایگزاسٹ فین کے باہر لگی ہوئی ''گرل'' کو تھوڑا سا اٹھایا۔ چھ فٹ کی دوری پر اسے ایک دوسرے کمرے کی کھڑکی نظر آئی۔ کھڑکی کے شیشے میں سے اسے ایک ایسا منظر نظر آیا جس نے اسے حیرت میں ڈبو دیا۔

اسے اس کمرے میں کم و بیش چھ عورتیں نظر آئیں۔ ان میں سے تین چار کو بہ آسانی لڑکیاں کہا جا سکتا تھا۔ عجب کی بات یہ تھی کہ یہ سب دُبلی پتلی کمزور تھیں۔ ان میں سے کچھ تو ہڈیوں کا ڈھانچا تھیں۔ ہر قسم کی جسمانی کشش سے محروم۔ اُن کے چہرے اگر بیمار نہیں تھے تو صحت مند بھی نہیں

تھے۔ کچھ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ ٹیبل کی صرف دُبلی پتلی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شاید کچھ پڑھ رہی تھی۔ الہام حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں انہیں دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

عدیل اب کراچی سے اپنے گھر آچکا تھا۔ وہ تمام وقت بستر پر لیٹ کر گزارنے پر مجبور تھا۔ جمیل نے ایک وہیل چیئر کا انتظام تو کر دیا تھا مگر ابھی عدیل چیئر بھی استعمال نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا بھی یہی کہنا تھا کہ ابھی دو تین ہفتے تک وہ اپنی کمر پر کسی طرح کا کوئی دباؤ نہ ڈالے۔ عدیل کے صاحبِ فراش ہو جانے کی خبریں مین اسٹریم میڈیا اور سوشل میڈیا پر بھی گردش کر رہی تھیں۔ چند مخالفین ایسے بھی تھے جو عدیل کی صورتِ حال کو لالچ کا نتیجہ قرار دے رہے تھے مگر زیادہ تر شائقین کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔

جمیل چوبیس گھنٹے بھائی کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ اس نے کھانا پینا اور آرام خود پر حرام کیا ہوا تھا۔ وہ عدیل کی زبانی اس بات سے بھی آگاہ ہو چکا تھا کہ جمشید خاں طے شدہ معاہدے سے رُوگردانی کر رہا ہے اور الہام کی واپسی کے حوالے سے اپنے کسی منحوس بیٹے کو درمیان میں لے آیا ہے۔ جمیل کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے جسم سے بم باندھ کر جمشید خاں کی کچہار میں گھس جاتا اور اسے جہنم واصل کر دیتا۔

اگر کسی وقت جمیل کو کہیں آنا جانا پڑتا تو تابانہ، عدیل کے پاس پہنچ جاتی۔ وہ اس کی ادویات اور دیگر ٹریٹ منٹ کا خیال رکھ رہی تھی اور اسے کوئی کوتاہی کرنے نہیں دیتی تھی۔ ہر روز اس کا سوال یہی ہوتا تھا کہ الہام کب واپس آرہی ہے۔ ہر روز عدیل اور جمیل اسے گول مول جواب دے دیتے تھے۔ عدیل کے لیے یہ قیامت کے شب و روز تھے۔

ایک روز تابانہ اکیلی، عدیل کے سرہانے کرسی پر بیٹھی تھی۔ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''سر! اگر میں کوئی لکھاری ہوتی نا تو آپ کے حوالے سے ایک زبردست کہانی لکھتی۔ آپ نے جس طرح ایک بے رحم شخص کا ستم سہا ہے اور اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کی ہے، وہ سنہری حروف میں درج ہونے کے قابل ہے..... اب خدا سے دعا ہے کہ ہمیں جلد سے جلد ہنستی مسکراتی الہام کی صورت نظر آجائے۔''

عدیل صرف ایک طویل ''ہوں'' کر کے رہ گیا۔

وہ چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''پتا نہیں کسی وقت کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ اور جمیل، الہام کے بارے میں..... کچھ..... چھپا بھی رہے ہیں۔''

عدیل جھنجلا گیا۔ ''تابانہ! اگر..... تمہیں اس طرح کی باتیں کرنا ہوتی ہیں تو نہ آیا کرو یہاں، اپنے گھر میں رہا کرو۔''

وہ جیسے ایک دم سہم کر چپ سی ہو گئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے تھے اور وہ انگلیاں مروڑنے لگی۔ عدیل کو اندازہ ہوا کہ وہ جھلاہٹ میں زیادہ سخت بات کہہ گیا ہے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ ہولے سے اٹھایا اور نرمی سے تابانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''سوری تابانہ! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دراصل تکلیف اور پریشانی نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا ہے۔ ایک بار پھر سوری۔''

''سوری تو مجھے کہنا چاہیے سر! اپنی الٹی سیدھی باتوں سے آپ کو مزید پریشان کرتی ہوں۔''

''حوصلہ رکھو تابانہ، دیر ہو رہی ہے لیکن اندھیر نہیں ہوگی۔ چند دن میں الہام انشاء اللہ ہمارے درمیان ہوگی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' تابانہ نے آہستہ سے عدیل کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی..... پھر اچانک نہ جانے اُسے کیا ہوا، اس نے ذرا جھک کر عدیل کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

عدیل اسی طرح لیٹا رہا۔ تابانہ کی ایسی جذباتی حرکتیں اسے اچھی تو نہیں لگتی تھیں لیکن اب وہ ان حرکتوں پر سٹپٹاتا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی کیفیت کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ بعض اوقات تو اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ یہ منہ زور کیفیت کسی لہر کی طرح اس پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔

وہ اسی طرح بستر پر لیٹا رہا۔ خیالات کی رو مختلف سمتوں میں چلتی رہی۔ قریباً 36 گھنٹے ہو چکے تھے جمشید خاں نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ شدت سے اس کی کال کا منتظر تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا دھیان چند روز پہلے کے ان ناقابلِ فراموش لمحوں کی طرف چلا گیا جو ہوش میں آنے کے بعد اسپتال کے کمرے میں اس پر وارد ہوئے تھے۔ وہ کیا لمحے تھے، وہ اکہرا انکشاف تھا۔ اس نے عدیل کو مبہوت کر ڈالا تھا۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں سنیل بھی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے دیکھ رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے۔ شروع میں عدیل کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنے ہمراز بھائی کو اس بھید میں شریک کرلے مگر پھر بوجوہ اس نے ارادہ بدل دیا تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ یہ بھید اپنے تک ہی رکھے تو بہتر

ہے۔

☆☆☆

وقت گزرتا جارہا تھا۔ امیدیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ کوئی دعا کام کررہی تھی اور نہ دوا۔ الہام ابھی تک کسی نامعلوم مقام پر اس مکروہ جالور کے پنجے میں تھی جسے جمشید خاں کا نام دیا جاتا تھا۔ وہ انڈر ورلڈ کا بندہ تھا۔ جب کبھی بھی اس کے خلاف ایکشن ہوا تھا اس کے فرنٹ مین اور دست راست تو پکڑے گئے تھے مگر کوئی اس کی ہوا کو بھی نہیں چھو سکا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی جان چکے تھے کہ جمشید خاں ان مگرمچھوں میں ہے جو لوہے کا چنا ہوتے ہیں اور جنہیں چبانے سے دانت ٹوٹنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کو ختم نہیں کیا جاسکتا، ہاں ان کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی سعی ضرور کی جاسکتی ہے۔ جمیل، عرفان اور تابانہ وغیرہ اب یہ چاہتے تھے کہ الہام کے اغوا کو اب مزید راز میں نہ رکھا جائے۔ باقاعدہ کیس درج کرایا جائے اور عدیل اعلیٰ حکام سے درخواست کرے کہ اس کی بیٹی کو بازیاب کرایا جائے۔ کھیل کے میدان میں عدیل کا ایک نام تھا۔ اعلیٰ ترین حکام میں بھی اس کے پرستار موجود تھے۔ وہ اس سنگین ترین معاملے میں اس کی خصوصی مدد کرسکتے تھے۔ لیکن عدیل اس حوالے سے ابھی تک خاموش تھا۔ وہ جانتا تھا اور باقی اہلِ خانہ بھی جانتے تھے کہ اس میں بہت بدنامی ہے..... اور بات صرف بدنامی کی نہیں تھی الہام کی جان جانے کا بھی غیر معمولی رسک تھا۔

بے شک یہ ایک دوراہا تھا اور اس نے عدیل اور جمیل کو تو ڈکر رکھ دیا تھا۔ عدیل اور جمشید خاں کے درمیان تقریباً ہر روز ہی ٹیلی فونک گفتگو ہورہی تھی۔ جمشید خاں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ عدیل کی التجائیں اس پر کچھ اثر کررہی تھیں اور نہ اُس کا غم و غصہ..... جمیل اور ایس پی عرفان اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں عرفان کا کوئی قریبی دوست تھا۔ یہ "سیاست داں دوست" رازداری کے ساتھ ان کی مدد کرسکتا تھا مگر فی الحال اس سے ملاقات نہیں ہو پارہی تھی۔ تابانہ بھی کئی دن سے دکھائی نہیں دی تھی۔ عدیل کے ذہن میں آرہا تھا شاید وہ اُس دن والی جھڑکی کے سبب ڈس ہارٹ ہوئی تھی مگر یہ بات اس کے دل کو لگ نہیں رہی تھی۔ عدیل کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرائی لیے ہوئے تھا۔ وہ یوں پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی..... اس مشکل وقت میں وہ کسی وقت اس کی ڈھارس کی ضرورت محسوس کرنے لگتا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا جب اسے جمشید خاں کی ایک تہلکہ خیز کال موصول ہوئی۔ اس کال نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ جمشید خاں خود ہی کال کرتا تھا (اس کی خاص فون لائن پر کوئی کال بھی ریسیو نہیں ہوتی تھی) وہ بغیر تمہید کے بولا۔

"چیمپ عدیل! تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

اس کے بے لچک سپاٹ لہجے نے عدیل کو چونکا دیا۔ رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

جمشید بولا۔ "الہام نے یہ ضد چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے گھر سے رخصت ہوکر میرے گھر آئے گی..... پرسوں بروز ہفتہ یہیں میری رہائش گاہ پر جونی سے اس کے دو بول پڑھائے جارہے ہیں۔ تین روز بعد آسٹریلیا کے لیے ان کے ٹکٹ بک ہے۔ وہ یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

عدیل کو لگا اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔ "جمشید! تم جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پچھلے دو ہفتے میں تم نے ایک بار بھی الہام سے میری بات نہیں کرائی۔ نہ فون پر نہ وڈیو لنک پر۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں عدیل ڈیئر! جب یہ لڑکیاں بڑی ہوجاتی ہیں نا، ان کی ساری محبتیں، چاہتیں بدل جاتی ہیں۔ ان کی نگاہیں اپنی اگلی منزلوں پر لگ جاتی ہیں۔ الہام جانتی ہے کہ تم اور تمہاری فیملی، جونی کے ساتھ اس کی شادی کو کبھی قبول نہیں کرو گے۔ لہٰذا وہ تم لوگوں سے کنی کترا رہی ہے۔ میں نے کوئی دس دفعہ اس سے کہا ہے کہ اپنے پاپا جانی سے ہی بات کرلو لیکن وہ ٹال جاتی ہے۔"

"اتنا جھوٹ مت بولو جمشید جو تمہیں خود بھی ہضم نہ ہو سکے۔ خدا کے قہر سے ڈرو۔ تم اپنے اوباش بیٹے کی خاطر ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اسے زبردستی اپنے لاڈلے کی ہوس کا کھلونا بنا رہے ہو۔ میں نے اپنی بیٹی کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ مفلوج ہوکر بستر پر آن پڑا۔ میں نے سنا تھا کہ بدمعاشوں، ڈاکوؤں اور گینگسٹروں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں ان کے اندر ضمیر موجود ہوتا ہے۔ تم اُن سے بھی گئے گزرے ہو۔"

"تم گلاس کو آدھا خالی کیوں دیکھ رہے ہو ضدی چیمپ! آدھا بھرا ہوا کیوں نہیں دیکھتے۔ مجھے بدمعاش اور گینگسٹر تو کہہ رہے ہو مگر یہ نہیں سوچ رہے کہ تمہاری بیٹی ڈیڑھ ماہ سے اس گینگسٹر کے قبضے میں ہے اور بالکل محفوظ ہے۔ میں اپنے بیٹے سے اس کا نکاح کررہا ہوں۔ اسے بیوی بنا رہا ہوں اس کی..... اور تمہیں باقاعدہ ہر بات سے

باخبر بھی رکھ رہا ہوں۔"

"تمہاری دیانت داری اور راست بازی کا یہ پیمانہ شرمناک ہے جمشید خاں، میری بیٹی تاراج ہو رہی ہے۔ تمہارے ہاتھوں نہیں ہو رہی تو تمہارے بیٹے کے ہاتھوں ہو رہی ہے..... اور تم اسے شادی کا نام دے رہے ہو؟"

وہ زہریلے انداز میں بولا۔ "اب تم جو بھی کہو چیمپ عدیل! مگر جو ہونا ہے وہ تو اب ہونا ہی ہے۔ بس کر قبول کر لو یار و کر۔ مجھے بس تمہیں اطلاع دینا تھی، دے دی ہے۔" وہ شاید فون بند کرنے جا رہا تھا۔

عدیل بے طرح تڑپ اٹھا پکار کر بولا۔ "فون بند نہ کرنا جمشید خاں! میری بات سنو..... ایک منٹ میری بات سنو۔"

"کہو..... میں سن رہا ہوں۔" وہ جیسے اس پر احسان کرتے ہوئے بولا۔

عدیل کئی سیکنڈ تک خاموش رہا۔ وہ اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمشید خاں بھی سکون سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر عدیل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "جمشید خاں! میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں پر یقین کر لوں۔ مجھے پتا ہے کہ تم ہر صورت الہام کو اپنے بیٹے کے نکاح میں دینے کا تہیہ کر چکے ہو۔ اس کے لیے الہام کی رضامندی یا انکار کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی کم عمری کا تمہیں کوئی خیال ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کا رونا دھونا بھی تم باپ بیٹے کے لیے بے معنی ہوگا..... لیکن ذرا سوچو جس "تعلق" کا آغاز ہی اس طرح کے جبر سے ہوگا وہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو کیا خوشی دے گا..... اور اس میں کیا پائیداری ہوگی؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو سمجھ گی جی؟" وہ اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں بولا۔

"عدیل نے ایک طویل سانس لی..... وہ سانس ایک سرد آہ جیسی تھی۔ "جمشید خاں! میں چاہتا ہوں کہ میری الہام پر ہونے والا یہ ظلم سراسر ظلم نہ رہے اور کچھ نہیں تو اس کی شدت ہی کم ہو جائے۔ تمہارا بیٹا اگر الہام سے نکاح کر ہی رہا ہے تو پھر اسے ایک جیتی جاگتی لڑکی ملے۔ ایک بے جان، بے روح مٹی کی مورتی نہ ملے، جو اسے کوئی خوشی دے سکے اور نہ خود اپنے دکھوں کے گھیرے سے نکل سکے۔"

"کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" جمشید اس کی بات دھیان سے سن رہا تھا۔

"تم نے میری کوئی بات نہیں مانی لیکن ایک بات مان لو..... اور میرا خیال ہے کہ یہ بات تمہارے اور تمہارے بیٹے کے فائدے میں ہی جائے گی۔"

"کہو سمجھ گی جی۔"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ "ایک بار الہام سے میری ملاقات کرا دو..... ایک تفصیلی ملاقات..... وہ میری بات ٹالتی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ پوری طرح نہ بھی سمجھے گی تو کم از کم اس کے دکھ کی اور گریز کی شدت کم ہو جائے گی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ اپنی اس نئی زندگی سے سمجھوتا بھی کر لے۔ پاکستان سے باہر جانے کے بعد اس کی سوچوں میں مزید تبدیلی آ جائے۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ "تمہارا مطلب ہے وڈیو لنک کے ذریعے.....؟"

"نہیں جمشید خاں!" عدیل نے اس کی بات قطع کی۔ "جس طرح کی بات چیت میں اس سے کرنا چاہتا ہوں وہ اس سے مل کر ہی کی جا سکتی ہے۔ اسے پاس بٹھا کر، اس کے آنسو پونچھ کر۔"

جمشید خاں نے پینترا بدلا۔ "دیکھو چیمپ عدیل! میں نہیں سمجھتا کہ الہام کو تم سے ملنے اور تم سے کچھ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے..... لیکن..... فرضِ محال..... میں تمہیں اس سے ملانا چاہوں بھی تو یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تمہارے لیے سب کچھ ممکن ہے جمشید..... جو شخص قانون کی ناک کے عین نیچے سب کچھ کرتا ہے اور ہمیشہ محفوظ رہتا ہے..... وہ کیا نہیں کر سکتا..... تم کہیں کسی بھی جگہ ایک دو گھنٹے کے لیے الہام سے میری ملاقات کرا دو۔ میں اس سارے معاملے کو اللہ کی رضا سمجھ کر اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کروں گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سمجھے گی۔"

دوسری طرف انڈر ورلڈ کا وہ بدمعاش کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ تب اس نے کہا۔ "میں اس بارے میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین گھنٹے تک میں تمہیں دوبارہ فون کروں۔"

"میری اس التجا کو ٹھکرانا مت جمشید خاں۔ اس ملاقات کا نتیجہ تمہارے لیے اچھا ہی نکلے گا۔" عدیل نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" جمشید نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

..... اگلے ڈھائی تین گھنٹے عدیل کے لیے ایک

عذاب سے کم نہیں تھے۔ وہ جس بستر پر لیٹا ہوا تھا وہ اس کے لیے کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ بار بار دیوار پر آویزاں تصویر کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے ساتھ سنبل بھی تڑپ رہی ہے۔ اپنی بیٹی پر ٹوٹنے والی آفت اُسے بھی خون کے آنسو رُلا رہی ہے، وہ بہ زبانِ خاموشی اس سے پوچھ رہی ہے۔ ''عدیل! یہ ہماری خوش رنگ چڑیا جیسی الہام کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ کن خونخوار عقابوں کے چنگل میں چلی گئی ہے؟ کیا تم میری الہام کو بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکو گے..... کچھ بھی نہیں؟''

وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کی کراہ سن کر بابا شرفو جلدی سے اندر آ گیا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اب بھی عدیل کی آواز پر لپک کر آتا تھا۔ ''عدیل بیٹا! کچھ کہنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بابا..... بس دروازہ بند کر دو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

اس کی نگاہ بار بار اپنے سیل فون کی طرف اٹھ رہی تھی۔ فون خاموش تھا۔ اگر وہ خاموش ہی رہتا..... اس پر جمشید خاں کی کال نہ آتی، رات گزر جاتی..... کل کا دن بھی گزر جاتا..... تو کیا ہوتا..... وہ شاید کبھی الہام کی شکل نہ دیکھ سکتا۔ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ چلایا..... اور ایک کارڈ سائز تصویر نکال لی۔ یہ پانچ چھ سالہ الہام کی تصویر تھی۔ وہ عدیل کی نقل میں چھوٹے چھوٹے باکسنگ گلوز پہنے ہوئے بڑی شان سے اس کے سینے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ عدیل چت لیٹا تھا اور کچھ فاصلے پر سنبل کھڑی دونوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ عدیل نے بار بار الہام کی تصویر کو چوما اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے یاد تھا جب ایکسیڈنٹ کے بعد سنبل دم توڑ رہی تھی، وہ کسی شدید کرب میں نظر نہیں آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی نے جو کچھ اسے دیا ہے، وہ اس پر راضی ہے اور اب اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے اسے کچھ زیادہ خوف محسوس نہیں ہو رہا۔ اس کی بے نور ہوتی آنکھوں میں سے بس ایک التجا جھانک رہی تھی۔ وہ بہ زبانِ خاموشی عدیل سے کہہ رہی تھی۔ میری اور اپنی الہام کو بچنے سے لگا کر رکھنا۔ اسے بھی کوئی تکلیف نہ ہونے دینا..... اور آج..... وہ خوش رنگ چڑیا..... وہ معصوم روح، بے رحم لوگوں کے حصار میں تھی۔ تکلیف کی انتہا کو چھو رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ منتظر عدیل، اُچھل کر رہ گیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ یہ جمشید خاں ہی کی کال تھی۔ وہ بلا تمہید گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میں الہام سے تمہاری ملاقات کرانے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ملاقات دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہو گی اور میری شرائط کے مطابق ہو گی۔''

''م..... مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے جمشید خاں۔'' عدیل نے جلدی سے کہا۔

''یہ ملاقات آج ہی رات ہو گی۔ اس کے لیے تمہیں میرے پاس آنا پڑے گا اور تم جس طرح آؤ گے، اس کی تفصیل میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔''

''میں سن رہا ہوں جمشید خاں۔''

''تمہارے اردگرد کوئی اور تو موجود نہیں ہے؟''

''نہیں جمشید خاں، میں کمرے میں اکیلا ہوں۔''

''کسی بھی مرحلے پر مجھ سے جھوٹ نہ بولنا عدیل..... ورنہ بہت بُرا ہو جائے گا۔'' اس کا لہجہ بھیانک تھا۔

''نہیں بولوں گا جمشید خاں! مجھے بیٹی کی سلامتی عزیز ہے۔''

وہ عدیل کو بتانے میں مصروف ہو گیا کہ وہ کیسے اور کس طرح الہام کے پاس پہنچے گا۔

☆☆☆

عدیل نے جمیل کو ساری صورتِ حال بتا دی تھی۔ رات ٹھیک نو بجے جمشید کے لوگ عدیل کو لینے پہنچ گئے۔ یہ جمشید کا فرنٹ مین باوا اور اس کے دو ساتھی تھے۔ وہ اندر چلے آئے۔ عدیل کو بڑی احتیاط سے بستر پر سے اٹھایا گیا اور وہیل چیئر پر بٹھا دیا گیا۔ جمیل بھی ساتھ جانے کے لیے تیار تھا لیکن عین موقع پر اسے ظہور باوا نے روک دیا۔

''نہیں عدیل صاحب! آپ اکیلے جائیں گے۔''

''لیکن فون پر سب کچھ طے ہوا ہے جمشید خاں سے۔''

''نہیں، یہ نیا حکم ہے۔'' باوا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو وائس میسج سنا دیتا ہوں۔''

اس نے اپنے موبائل پر جمشید خاں کا وائس میسج سنایا جس میں اس نے دوٹوک انداز میں عدیل کو بتایا کہ پلان میں تھوڑی تبدیلی آئی ہے۔ وہ کسی اور کو اپنے ساتھ نہیں لا سکے گا۔''

جمیل، باوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ بھائی جان کو ہر لمحے میری ضرورت ہوتی ہے۔ پین کی صورت میں انہیں کب کون سی دوا دینا ہے، مجھے ہی پتا ہے پھر پیشاب وغیرہ کی حاجت کی صورت میں بھی۔''

''پلیز چھوٹے بھائی۔'' باوا نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ بحث آپ لوگوں کو راس نہیں آئے گی۔ جمشید خاں صاحب کسی بھی وقت اپنا ارادہ بدل سکتے ہیں جہاں تک دوا اور دوسری ضرورتوں کا تعلق ہے..... ہم ہیں نا ان کے پاس اور یہ کوئی دو چار دن کے لیے تو نہیں جا رہے،

دو تین گھنٹوں کی بات ہے۔"

"اوور بات کی وجہ سے یہ زیادہ پانی پی رہے ہیں اور یورین بھی زیادہ پاس کر رہے ہیں اس لیے....."

"ایسی بات ہے تو یہ ڈائپر استعمال کر لیں۔" باوا نے تلخ لہجے میں بات کاٹ کر کہا۔

جمیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید وہ بھی کچھ تلخ بولتا مگر عدیل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ باوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جیسے آپ لوگ کہتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔"

باوا زیرِ لب مسکرایا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے گول چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں عدیل سے کہہ رہا ہو..... اگر یہ انڈر اسٹینڈنگ شروع میں دکھائی ہوتی اور باس کے کہنے پر ایک دفعہ ہاکنگ Ring پر اتر آئے ہوتے تو یہ نوبت تو نہ آتی۔

باوا کے ساتھ آنے والوں کی احتیاط دیدنی تھی۔ انہوں نے نہ صرف عدیل کی مکمل تلاشی لی بلکہ وہیل چیئر کے بھی ایک ایک انچ کو پرکھ ڈالا۔ پھر عدیل کو ہدایت کی کہ وہ اپنا موبائل فون اور گھڑی وغیرہ اتار کر اہلِ خانہ کے حوالے کر دے۔ عدیل نے سن رکھا تھا کہ جمشید خاں ایک نہایت ہی محتاط شخص کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک "سروائیو" کر رہا ہے۔ آج یہ سنی ہوئی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ جمشید خاں کے بے حد محتاط ہونے کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی تھی کہ ایک "ڈان" ہونے کے باوجود وہ جسمانی طور پر کوئی بہت مضبوط یا زور آور بندہ نہیں تھا۔ اس کی ساری طاقت اس کی دماغی مضبوطی اور اُس کی شیطانیت میں تھی۔ اس کے حصے کی ساری مار دھاڑ اس کے غنڈے ہی کرتے تھے۔ وہ خود شاید ہی کبھی اپنے کسی حد کے مقابل آیا ہو۔

تلاشی کے بعد وہ لوگ اس کی وہیل چیئر کو دھکیل کر باہر لان میں لائے۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ جمیل نے دھمکی انداز میں ایک شال عدیل پر ڈال دی۔ پورچ میں نفیس شیشوں والی ایک نیلی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ عدیل کو چیئر سمیت دھکیل کر ویگن میں سوار کرا دیا گیا۔ باوا اور اس کا ایک ساتھی عدیل کے ساتھ پچھلے حصے میں بیٹھے اور ویگن روانہ ہو گئی۔ لاہور کی دو تین مصروف سڑکوں سے گزرنے کے بعد ویگن نسبتاً کشادہ علاقے میں آ گئی۔ عدیل کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کتنا سفر کرنا ہے اور کتنی دیر اس ویگن میں رہنا ہے۔

"سوری عدیل صاحب۔" باوا نے کہا اور بڑی صفائی سے ایک سیاہ پٹی عدیل کی آنکھوں پر باندھ دی۔

بند آنکھوں کے ساتھ عدیل نے کم و بیش آدھ گھنٹے کا مزید سفر کیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مضافاتی علاقے میں ہے۔ اس کے ساتھی ہم سفر یکسر خاموش تھے۔ ہموار سڑک کے بعد دو تین منٹ کا ہچکولے دار سفر ہوا۔ عدیل نے گنگنانا شروع کیا تو باوا کی ہدایت پر ڈرائیور نے ویگن کی رفتار کچھ کم کر دی۔ پھر ویگن ایک جگہ رک گئی۔ یہاں بالکل سناٹا تھا۔ ویگن کے دروازے کھلے اور بند ہوئے پھر باوا نے عدیل کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ اپنی اسپورٹ جیکٹ اور نیم گنجے سر کے ساتھ وہ کوئی کوچ قسم کی شے ہی نظر آتا تھا۔ کہنے لگا۔ "عدیل صاحب! آپ کی آنکھوں سے پٹی اس لیے ہٹائی ہے کہ آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ آپ کو تھوڑی دیر یہاں اکیلے رہنا ہوگا پھر دوسرے ساتھی آئیں گے اور آپ کو جمشید صاحب تک لے جائیں گے۔"

"کتنی دیر لگے گی؟"

"میں منٹ اور سیکنڈ تو نہیں بتا سکتا جناب عالی لیکن بس تھوڑی دیر۔ آپ بالکل تسلی سے بیٹھیں۔"

اس نے کہا اور ویگن سے اتر کر دروازہ لاک کر دیا۔ اس کے بعد وہ درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھی بھی جا چکے تھے۔

ویگن میں اب تاریکی تھی۔ عدیل نے سر گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب تاریکی میں تھوڑا تھوڑا کام کرنے لگی تھیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی باغ نما جگہ پر ہے۔ یہاں کثرت سے درخت تھے۔ سناٹے میں آوارہ کتوں کی دور اقتادہ آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

وقت کی رفتار جیسے دھیمی پڑ گئی۔ عدیل وہیل چیئر پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ جمشید خاں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اپنے "مجرمانہ کیریئر" میں ایک دو واقعات کے سوا وہ ہمیشہ پولیس کی گرفت سے محفوظ رہا ہے۔ اس خبیث کی یہ احتیاط ہر قدم پر واضح ہو رہی تھی۔ باوا اس کا صرف فرنٹ مین تھا۔ یقیناً وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آج کل جمشید کا ٹھکانا کہاں ہے۔ باس کے حکم کے مطابق وہ اور اس کے ساتھی عدیل کو ایک سنسان باغ میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب کسی خاص الخاص شخص یا اشخاص نے آنا تھا اور عدیل کو یہاں سے پک کر کے جمشید خاں تک لے جانا تھا۔ عدیل کو کچھ علم نہیں تھا کہ وہ لاہور سے کتنی دور اور کس رخ پر ہے..... اور آگے اسے کس سمت جانا ہے۔ اُس کی دھڑکنیں بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا، سوچ رہا تھا کہ الہام کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس سے کس طرح بات

کرے گا اور کیا بات کرے گا۔

عدیل کو انتظار تو کرنا پڑا مگر بہت طویل نہیں۔ بیس پچیس منٹ بعد اسے اندازہ ہوا کہ وین سے باہر ہم تاریکی میں سائے موجود ہیں۔ پھر چابی کے ذریعے وین کا سلائڈنگ ڈور کھولا گیا اور وہ افراد اندر آ گئے۔ ان دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے اور مفلر وغیرہ لپیٹے ہوئے تھے۔ لباس شلوار اور جیکٹ پر مشتمل تھا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے عدیل کی وہیل چیئر کو کھینچ کر وین سے اتارا اور پکی زمین پر چلا کر پچاس ساٹھ قدم آگے جامن اور بیری کے گھنے درختوں کے نیچے لے آئے۔ ''کہاں لے جا رہے ہو؟'' عدیل نے سردی سے کپکپاتے ہوئے پوچھا۔

''وہیں جہاں آپ کو جانا ہے۔ باس کے پاس۔'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ دیہاتی ٹائپ کے لباس کے باوجود اس کا لہجہ پڑھے لکھوں جیسا تھا۔

اُن کے ہیلمٹ دیکھ کر عدیل نے سوچا تھا کہ شاید وہ موٹر بائکس وغیرہ پر آئے ہیں مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس کا دوسرا قیافہ بھی غلط ثابت ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اسے کسی اور لگژری گاڑی میں بٹھایا جائے گا۔ لگژری گاڑی کے بجائے یہاں ایک پرانا لوڈر کھڑا تھا جس کے پیچھے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ شاید یہ پھل اور فصل وغیرہ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

دونوں تنومند افراد نے عدیل کی وہیل چیئر کو اٹھا کر لوڈر کے پچھلے حصے میں رکھ دیا۔ لوڈر کے اوپر ترپال تنی ہوئی تھی۔ عدیل کی آنکھوں پر ایک بار پھر پٹی باندھی گئی۔ مستزاد یہ کہ اس مرتبہ اس کے کانوں میں بھی ائرڈاٹ ٹھونس دیے گئے۔ چند لمحے بعد لوڈر باغ کے اندر سے نکل کر نامعلوم سمت کو روانہ ہو گیا۔ عدیل اب عملی طور پر ''گم'' تھا۔ بس اسے صرف اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک ہموار سڑک پر تیزی سے سفر کر رہا ہے۔ سردی بہت تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد پھر سفر میں بریک آیا۔ منزل کے خیال سے عدیل کی دھڑکن تیز ہو گئی مگر یہ منزل نہیں تھی۔ اسے چیئر سمیت لوڈر سے اتار کر پھر ایک گاڑی پر سوار کیا گیا۔ عدیل کو محسوس یہی ہوا کہ یہ ایک ائرکنڈیشنڈ اسٹیشن ویگن یا لگژری جیپ ہے۔

اس مرتبہ سفر زیادہ تیز رفتار تھا۔ دس پندرہ منٹ تک سفر بہت ہموار بھی رہا لیکن پھر یوں لگا کہ سڑک اب زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آخر گاڑی رک گئی۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اسے وہیل چیئر سمیت لگژری گاڑی میں سے احتیاط کے ساتھ نیچے اتارا گیا۔ کسی نے عدیل کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی اور کانوں سے ڈاٹ بھی نکال دیے۔ اس نے چندھیائی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ وہ اونچے ستونوں والے ایک پورچ میں تھا۔ گراسی لان کے آگے ایک بلند چار دیواری نظر آ رہی تھی۔ اسے یہاں لانے والی گاڑی کہیں اوجھل ہو چکی تھی۔ دو گارڈ نما افراد نے عدیل کی چیئر کو دھکیلا اور عمارت کے اندر لے آئے۔ یہاں عدیل کو ہیٹرز کی حرارت کا احساس ہوا۔ عمارت کی چھتیں اونچی اور دروازے محرابی تھے۔ بھاری پردے، قالین، فرنیچر اور آسائش کی دیگر اشیا دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم یہ بھی پتا چلتا تھا کہ عمارت بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ عدیل کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مختصر لباس والی ایک ماڈل نما لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے دانتوں کی نمائش کر کے عدیل کو خوش آمدید کہا اور اس کی کسی بھی ضرورت کا پوچھا۔ عدیل نے نفی میں جواب دیا۔ لڑکی ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہی تھی تاہم اس کے خدوخال ''ملائی'' طرز کے تھے۔ ''کیا وقت ہوا ہوگا؟'' اس نے لڑکی سے پوچھا۔

اس نے موبائل دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گیارہ بج کر چالیس منٹ جناب۔''

''جمشید صاحب کب آئیں گے؟''

''آپ کو بس تھوڑے سے انتظار کی زحمت ہوگی۔ آئی تھنک او کے اے فیو منٹس۔'' قریباً دس منٹ بعد اسے یہاں لانے والے دونوں مسلح گارڈز پھر نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک بار پھر بڑی احتیاط اور باریک بینی سے عدیل کی تلاشی لی اور وہیل چیئر کو جانچا..... تب ایک گارڈ عدیل کی چیئر کو آہستہ روی سے دھکیلتا ہوا ایک قالین پوش راہداری میں لے آیا۔ عدیل کے جسم میں سنسناہٹ دوڑنے لگی تھی، اسے ایک سجے سجائے کشادہ کمرے میں پہنچایا گیا اور اس کی چیئر کو بڑے بڑے اٹالین صوفوں کے سامنے روک دیا گیا۔

''آپ صوفے پر بیٹھنا پسند کریں گے یا چیئر پر ہی رہیں گے؟'' گارڈ نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''نہیں، میں یہاں ٹھیک ہوں۔'' عدیل نے کہا۔

گارڈ چلا گیا۔ کمرے میں بس وال کلاک کی مدھم ٹک ٹک تھی۔ پھر بلند دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور درمیانی عمر کا ایک دبلا پتلا دراز قد شخص بڑی شان سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ٹیکنی کلر شرٹ اور کاٹرائے کی سلیٹی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے سنہرے بال پیچھے

کی طرف مڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پیشانی اور بھی اونچی اور ناک مزید تیکھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی دُبلی پتلی گردن میں گولڈ کی چین تھی۔ دائیں بائیں دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ دونوں کے لباس نہایت مختصر تھے۔ ان میں سے ایک وہی ملائی نقوش والی تھی جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کامن روم میں اس کا استقبال کیا تھا۔

''واؤ..... ویلکم سمبندھی جی..... جی آیاں نوں۔'' وہ اپنی نشیلی آنکھوں میں مسکراہٹ سجا کر بولا اور آگے بڑھ کر عدیل سے ہاتھ ملایا۔

عدیل نے خود پر بمشکل ضبط کر رکھا تھا۔ وہ جمشید کی طرف زیادہ دیکھ بھی نہیں رہا تھا کہ مبادا اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی نفرت مچل کر جمشید کے سامنے آجائے۔

وہ بولا۔ ''تمہارے سفر میں تھوڑا سا کچھ راستہ بھی تھا۔ تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''یہ تکلیف اُس تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، جو مجھے میری بیٹی کے حوالے سے پہنچ رہی ہے۔'' عدیل نے جیسے کراہ کر جواب دیا۔

''تم اپنے ذہن پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لے رہے ہو جیمب! یہ دیکھو، یہ میں نے کیا پلاننگ کی ہے دونوں بچوں کے لیے۔ دونوں ایک بہترین جگہ پر بہترین وقت گزارنے جا رہے ہیں۔'' اس نے قریبی دراز سے دو سبز پاسپورٹ اور فضائی ٹکٹ نکال کر عدیل کے سامنے رکھ دیے۔ ''نکاح کے فوراً بعد وہ دونوں سڈنی جا رہے ہیں۔''

''کہاں ہے الہام؟'' عدیل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اس سے ملاتا ہوں یار، پہلے اپنے ہونے والے داماد سے تو مل لو۔'' جمشید خاں نے کہا اور مختصر لباس والی لڑکیوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ وہ پنجوں کے بل گھوم کر باہر چلی گئی۔

ایک منٹ بعد ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ وہ بانس کا بانس تھا۔ قیمتی کپڑے جیسے اس کے جسم پر نہیں تھے کسی کھونٹی پر جھول رہے تھے۔ باپ کی طرح اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نشہ سا تیر رہا تھا۔ اب پتا نہیں کہ یہ کسی نشہ آور چیز کا نشہ تھا یا یہ پیدائشی کیفیت تھی۔ اس کی طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک کا بانسا روم لائٹ میں چمک رہا تھا۔

''سلام انکل۔'' اس کی باریک، تلوار کی دھار جیسی آواز نے عدیل کے کانوں کو مجروح کیا۔

عدیل نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ وہ بڑے کینے سے انداز میں عدیل کے سامنے جھک گیا تاکہ اپنے سر پر پیار لے سکے۔ مجبوراً عدیل نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور اسے پیار دیا۔ وہ ادب و احترام کا جھوٹا مظاہرہ کرتا ہوا نظریں جھکا کر عدیل کے سامنے بیٹھ گیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مرجان عرف جونی، عدیل کو بتانے لگا کہ وہ سڈنی میں ایک مختلف پلاننگ لے کر جا رہا ہے۔ وہ وہاں ایک قانونی، شریفانہ بزنس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جونی کی یہ باتیں بالکل بے حقیقت اور بے وقعت تھیں۔ عدیل جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے باپ نے ہی اسے پڑھایا ہوگا۔ ورنہ جو کچھ یہ تھا اس کی کچھ کچھ حقیقت عدیل کو بھی معلوم تھی۔ اپنے ڈان باپ کی طرح یہ لڑکا بھی شاید پیدائشی زانی اور بدمعاش تھا۔ چند ماہ پہلے ایس پی عرفان نے اسے ایک خفیہ کیس کی فائل دکھائی تھی۔ اس کے مطابق چند سال پہلے جمشید خاں کے اس سپوت نے ایک اسکول گرل کو اغوا کیا تھا اور دو ہفتے سے زائد اپنے پاس رکھا تھا۔ چونکہ وہ لڑکی ایک صوبائی منسٹر کی تھی لہٰذا میڈیا وغیرہ کو اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی گئی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے رازداری کے ساتھ معاملے کو ہینڈل کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہے تھے۔

پندرہ بیس دن بعد وہ بچی چادر میں لپٹی لپٹائی خود ہی اپنے گھر پہنچی تھی۔ اس کے پورے جسم پر تشدد کے نشانات تھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق اغوا سے پہلے ایک دو موقعوں پر لڑکی کو چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنایا گیا پھر جب وہ اپنے اسکول کے ساتھ ایک پکنک پوائنٹ پر تھی اسے ڈرامائی طور پر اٹھا لیا گیا۔

پندرہ بیس روز میں کم سن لڑکی کی عزت تو کیا باقی رہنا تھی، وہ بے چاری اپنے ساتھ کئی مسائل بھی لے آئی تھی۔ وہ کئی ماہ سخت ڈپریشن کا شکار رہی پھر اچانک اس کا وزن کم ہونا شروع ہو گیا۔ شروع میں اسے اس بدسلوکی کا نتیجہ سمجھا جو اس کے ساتھ ہوئی تھی مگر پھر ڈاکٹروں نے ایک اور نتیجہ نکالا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ گلے کے غدودوں کی ایک خاص قسم کی بیماری کا شکار ہے۔ یہ بیماری جان لیوا تو نہیں لیکن پوری زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ اس بیماری میں وزن کم ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی کوشش کے باوجود نارمل نہیں ہو پاتا دیگر پیچیدگیاں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ غدودوں کی دیگر بیماریوں کے برعکس یہ بیماری لعاب دہن وغیرہ کے ذریعے ٹرانسفر بھی ہوتی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ بے چاری یہ مرض ''اغوا کار'' سے لے کر آئی تھی۔ عدیل کی معلومات

کے مطابق اب وہ لڑکی اپنی والدہ کے ساتھ انگلینڈ شفٹ ہو چکی تھی، وہاں وہ ایک لمبے اور مشکل علاج کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ مصیبت زدہ والد بھی اپنی سیاست اور کاروبار سمیٹ کر بیرونِ ملک جانے والا تھا اور یہ تو صرف ایک واقعہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ "باپ" کی طرح بیٹے کے کردار پر بھی اس طرح کے کئی شرمناک داغ ہوں..... اور اب ایک خطرناک موروثی بیماری والا یہ بدمعاش وہوسناک لڑکا بھی ویسے ہی جیسی الہام کا شوہر بننے جا رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ عدیل کا دل اس کے سینے میں خون ہونے لگا۔

جونی اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تو لمبوترے چہرے والے جمشید خاں کے پتلے پتلے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی ہوئی نظر آئی۔ "سمدھی جی۔ کیسا لگا اپنا ہونے والا داماد؟"

عدیل نے تکلیف محسوس کرتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر لیا۔ وہ ذرا تاسف کے ساتھ عدیل کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ "مجھے پتا ہے چیمپ! تم میرے خلاف بھرے بیٹھے ہو۔ میں نے تمہیں باکسنگ رنگ میں اترنے پر مجبور کیا اور نتیجے میں تم وہیل چیئر پر آ گئے..... لیکن تم بھی جانتے ہو یہ سب عارضی ہے۔ کچھ عرصے میں تمہیں بھلے چنگے ہو جانا ہے اور اگر کوئی تھوڑی بہت پیچیدگی ہوئی بھی تو کیا مسئلہ ہے۔ تمہاری جیب نوٹوں سے فل گرم ہے۔ چھوٹی موٹی ٹریٹ منٹ کے لیے ایک اور چکر یو ایس اے کا لگا لینا..... اور اگر نہ بھی لگانا ہوا تو تمہیں کون سی کمی ہے۔ یہاں پاکستان میں بھی تمہیں غیر ملکی علاج جیسی سہولت اسٹار سہولت ملی ہوئی ہے۔"

اس کے معنی خیز لہجے پر عدیل نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ "میں تمہاری اس حسین پڑوسن کا ذکر کر رہا ہوں جو تمہاری ٹاپ فین بھی ہے۔ سنا ہے کہ وہ اکثر بڑے پولے پولے ہاتھوں سے تمہارا مساج کرتی ہے اور تمہارے اندر نئی روح پھونکتی ہے۔ بند کمرے میں دو چار ہفتے اس سے فزیوتھراپی کراؤ گے تو سارے مردہ رگ پٹھے زندہ ہو جائیں گے۔"

عدیل حیران ہوا کہ اس شخص کو تابانہ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا ہے اور وہ یہاں اس کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔ وہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر مستقبل میں تمہارے مردہ رگ پٹھے زندہ ہو جائیں تو بڑا فائدہ ہو سکتا ہے تمہارا۔ مقابلے چاہے نہ کر سکو مگر کوچنگ اور ٹریننگ سے تو پیسا کما ہی سکتے ہو۔ مجھے پتا ہے کہ بہت سے قدرداں ہیں تمہارے۔"

جمشید خاں کی یہ ساری باتیں عدیل کو زہر لگ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی برچھی جیسی کٹیلی آواز سے اس کے کان زخمی ہو رہے ہیں۔ وہ اس کی گفتگو سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "جمشید! الہام کو بلاؤ، میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور دیکھو میرے چیمپ! لیکن دیکھنا ہی نہیں، اسے سمجھانا بھی ہے۔ اچھے بُرے کا بتانا بھی ہے۔ محبت کا یہ کام محبت سے ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ میرا بیٹا تمہاری بیٹی پر فدا ہے..... اور وہ فدا ہی رہے تو ہم سب کے لیے بہتر ہو گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھیج رہا ہوں اُسے، تم دونوں اکیلے میں بات کر سکتے ہو۔"

وہ باہر چلا گیا۔ عدیل کا سینہ دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ جمشید خاں کے ساتھ ہی دونوں چوکس لڑکیاں بھی باہر چلی گئی تھیں۔ تاہم اندازہ یہی ہوتا تھا کہ وہ دروازے کے پاس موجود ہیں۔ وہ صرف ڈیکوریشن پیس نہیں تھیں، ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جمشید خاں کے گارڈز کی سی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

چند منٹ گزرے پھر بلند دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور الہام نظر آئی۔ سمٹی سمٹائی ہوئی کسی ڈری سہمی چڑیا جیسی۔ اس نے حیرت سے عدیل کو وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھا اور پھر جیسے تڑپ کر اندر آ گئی۔ "پاپا..... پاپا۔"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور اس کا بازو تھام کر اُس سے لپٹ گئی۔ "پاپا! یہ کیا ہوا آپ کو؟ آپ چیئر پر کیوں ہیں؟ آپ زخمی ہیں؟" وہ رو رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں الہامی! بس تھوڑی سی تکلیف ہوئی ہے۔" اس نے کہا پھر الہام کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی اور سر کو بار بار چوما۔ "میری بچی..... میری جان....." اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ سٹیل کی اس آخری نشانی کو ابھی اپنے سینے میں چھپا لیتا اور ان ستم گر در و دیوار سے کہیں دور نکل جاتا۔

کمرے کا بلند دروازہ ڈور کلوزر کے ذریعے بند ہو چکا تھا اور وہ اکیلے تھے۔ آنسو عدیل کی آنکھوں میں بھی امڈ کر آنا چاہتے تھے لیکن اگر وہ خود رونے لگتا تو الہام کو کیسے سنبھالتا۔ اس نے خود پر ضبط کیا۔ الہام کے گال اور بال سہلانے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکنے اور پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ (اس نے اسے سمجھایا کہ سیڑھیوں پر پھسلنے کی وجہ سے کمر پر کچھ ضرب آئی ہے)

وہ بولی۔ "پاپا! مجھے یہاں سے لے جائیں۔ اب مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جایئے گا۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ

ایک بار پھر عدیل کے بازو سے چمٹ گئی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا الہامی! بس تم حوصلہ رکھو۔"

"وہ..... انکل کا بیٹا بہت برا ہے پاپا..... بہت ہی بُرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ..... مجھ سے شادی کرے گا۔ مجھے اپنے ساتھ کسی دوسرے کنٹری لے کر جائے گا۔ پاپا! مجھے کہیں نہیں جانا..... مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔ آپ کے پاس رہنا ہے۔" وہ کسی ہراساں بچے کی طرح اپنا سر عدیل کے سینے میں گھسانے لگی۔

عدیل نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے اور الہام کی کمر تھپکنے لگا۔ وہ اسی طرح عدیل کے ساتھ لگے لگے بولی۔ "پاپا! آپ کو پتا ہے مس تابانہ بھی یہاں ہیں۔"

عدیل بُری طرح چونکا۔ اس نے الہام کو خود سے علیحدہ کر کے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں پاپا! یہ لوگ مس تابانہ کو بھی یہاں لے آئے ہیں۔ پتا نہیں کہ زبردستی لائے ہیں یا وہ خود آئی ہیں۔ یہ چاہتے تھے کہ مس تابانہ مجھے سمجھائیں۔ مجھے "انگری" کریں کہ میں..... میں....." وہ شرم کے سبب آگے نہ بول سکی۔ یقیناً وہ کہنا یہی چاہتی تھی کہ مس تابانہ کو اس لیے یہاں لایا گیا ہے کہ وہ اسے جونی سے نکاح پر آمادہ کر سکے۔

یہ سب کچھ عدیل کے لیے حیران کن تھا۔ گھر میں اسے کئی روز سے تابانہ نظر نہیں آئی تھی اور آج اس پر انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ تو لاہور میں موجود ہی نہیں تھی۔ وہ یہاں اس نامعلوم ستم گر چار دیواری کے اندر تھی۔ لائی گئی تھی یا خود آ گئی تھی، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

الہام نے اشک بار لہجے میں جو تفصیل بتائی، اس سے معلوم ہوا کہ تابانہ پانچ روز پہلے یہاں پہنچی تھی۔ اس نے الہام کو بتایا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے..... مگر اسے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہے۔ کیونکہ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا ہے اور دو بار سواری بھی تبدیل کی گئی ہے۔ تابانہ نے الہام کو بتایا تھا کہ انکل جمشید ایک بہت طاقتور شخص ہے اور وہ ہر صورت اپنے بیٹے کا نکاح اس سے کرنا چاہتا ہے۔ وہ الہام کو کسی ایسی جگہ پر لے آیا ہے جہاں پولیس پہنچ سکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا مددگار۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ انکل کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

"تابانہ اب کہاں ہے؟" عدیل نے بے تابی سے پوچھا۔

الہام اس کے بازو سے لگے لگے بولی۔ "وہ..... بُری حالت میں ہیں پاپا۔ انہیں یہاں پاس ہی ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ وہ جو دو لڑکیاں انکل جمشید کے ساتھ ہوتی ہیں، انہوں نے ایک گارڈ کے ساتھ مل کر انہیں بہت مارا بھی ہے۔ یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔"

"مارا کیوں ہے؟ اور بند کیوں کیا ہے؟" عدیل کی حیرانی بڑھ گئی۔

وہ دائیں بائیں دیکھ کر مزید دھیمی آواز میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ مس تابانہ نے یہاں سے نکلنے کا سوچا تھا..... یا وہ کم از کم..... باہر کسی کو اطلاع دینا چاہتی تھیں۔ شاید آپ کو..... یا پھر چچا جمیل وغیرہ کو....."

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں سب کچھ جانتی ہوں پاپا۔ اس جگہ پر موجود جتنے بھی لوگ ہیں، ان میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔ یہاں پر انٹرکام وغیرہ سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ فون یہاں بس انکل کے پاس ہے یا اس کے بیٹے کے پاس۔ لیکن یہ فون ایسے ہیں جن کی لوکیشن ٹریس نہیں ہوتی۔ یہ بات مجھے مس تابانہ نے ہی بتائی تھی مگر ان کا خیال تھا کہ جیسمنٹ کے بڑے کمرے میں جو دو لیپ ٹاپ رکھے ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے کیونکہ ان میں نیٹ موجود ہے۔ ان کے ذہن میں تھا کہ اگر وہ نیٹ آن کر سکیں تو اس کے ذریعے وہ یہاں سے باہر کوئی ایسی کال کر سکتی ہیں جو ٹریس ہو سکے اور پتا چل سکے کہ ہم اس وقت کس علاقے میں اور کہاں ہیں۔

"پرسوں رات کی بات ہے جب سب سو رہے تھے مس تابانہ نے رسک لیا اور اس کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں لیپ ٹاپ رکھے تھے..... وہ بڑی ذہین ہیں پاپا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک لیپ ٹاپ ایسی جگہ پر پڑا ہے جہاں وہ سی سی ٹی وی کیمرے میں نظر نہیں آ سکتا۔ وہ لیپ ٹاپ کا نیٹ آن کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جب کسی شک کی وجہ سے ایک گارڈ اندر چلا آیا اور اس نے مس کو دیکھ لیا۔ فوراً وہ دونوں لڑکیاں بھی آ گئیں جو ہر وقت انکل کے ساتھ رہتی ہیں۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مس تابانہ کا رنگ فق ہو چکا تھا اور دونوں لڑکیاں ڈانٹنے والے انداز میں مس سے کچھ پوچھ رہی تھیں پھر انکل بھی اپنے گاؤن کی ڈوری باندھتا ہوا آ گیا اور....." الہام کی آواز بھرا گئی اور وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔

عدیل نے اسے پچکارا اس کا شانہ سہلایا۔ "انہوں نے مس تابانہ کو مارا؟"

"ہاں پاپا۔" وہ سسک کر بولی۔ "یہ بڑے بُرے

لوگ ہیں۔ مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔ انکل نے مس تابانہ کے پیٹ میں لات ماری پھر وہ دونوں خبیث لڑکیاں ان پر ٹوٹ پڑیں۔ گارڈ نے بھی ان کی ہیلپ کی۔ مس تابانہ اوندھے منہ لیپ ٹاپ والی میز پر گریں اور..... ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ وہ انہیں بالوں سے گھسیٹتے ہوئے....." الہام کی آواز دکھ کی شدت سے ایک بار پھر رُندھ گئی۔

عدیل اسے پچکارتا رہا۔ اس کے بال سہلاتا رہا۔ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پاپا! پتا نہیں وہ اب کس حال میں ہیں..... وہ میرے لیے..... صرف میرے لیے یہاں آئی تھیں۔ وہ مجھے نکالنا چاہتی تھیں یہاں سے۔ لیکن اب خود زخمی ہو کر پڑی ہیں۔"

الہام اب صوفے پر بیٹھ کر اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ "تکلیفیں انسانوں پر ہی آتی ہیں الہام، اور ان کو جھیلنا بھی پڑتا ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اوپر والے کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

"پاپا! مجھے بس یہاں سے لے جائیں..... میں ایک منٹ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ آپ کو تو بڑے بڑے لوگ جانتے ہیں پاپا۔ آپ اُن سے مدد لیں۔ ان ذلیل لوگوں کو پکڑوائیں۔" وہ آنسو بہاتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ اور یاد آیا بولی۔ "پاپا! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ رات کو بہت روتی ہوں میں۔ یہ بُرے لوگ ہیں۔ یہاں بیسمنٹ کے ایک پورشن میں بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو بیمار ہیں۔ کسی وقت اچھی بھلی ہوں گی لیکن اب ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتی ہیں۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے انہیں؟"

عدیل نے اس سے پوچھا۔ "کیا وہ ان سے ملی ہے؟"

الہام نے کہا۔ "نہیں پاپا! بس دور سے دیکھا ہے چھپ کر۔"

عدیل نے کہا۔ "اچھا الہامی اب تم یہ آنسو وغیرہ پونچھ لو۔ ان لوگوں کو یہ بتلے دو کہ میں نے تمہیں سمجھا بجھا لیا ہے اور میری اس کوشش سے تم بہت حد تک نارمل ہو گئی ہو۔ میری بات فالو کر رہی ہو نا....."

"لیکن....."

"پلیز الہام۔" عدیل نے تیز سرگوشی کی۔ "میری مشکل اور مت بڑھاؤ۔ جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے کرو۔ اپنے آپ کو پُرسکون کرلو اور اپنے کمرے میں جاؤ..... کہاں ہے تمہارا کمرا؟"

"نیچے بیسمنٹ میں۔"

"بس اب تم اپنے کمرے میں رہو، ہو سکے تو دروازہ اندر سے بند کرلو۔ اب تمہیں اپنے کمرے میں ہی رہنا ہے۔"

"آ..... آپ کیا کریں گے پاپا؟"

"کچھ نہیں، بس اس انکل جمشید سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے طریقے سے سمجھانا چاہتا ہوں....."

دروازہ کھلا اور جمشید خاں کا منحوس چہرہ نظر آیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں جی، دکھ سکھ ہو گئے باپ بیٹی میں؟" اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ گفتگو کی طوالت اُسے پسند نہیں آئی۔

عدیل نے الہام کا شانہ تھپکا اور اُسے جانے کا کہا۔ وہ اٹھی اور سر جھکا کر باہر نکل گئی۔ جمشید خاں اسے تولتی ہوئی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید میر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

نظروں سے دیکھتا رہا پھر لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔

''کیا رزلٹ نکلا جیمپ؟'' اس نے صوفے پر پھیلتے ہوئے پوچھا۔

''وہی نکلے گا جو تم لوگ چاہ رہے ہو۔''

''لیکن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ کھردرا ہو گیا۔

اسی دوران میں بانس کا بانس مرجان عرف جونی بھی چغلوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آ گیا۔ عدیل نے کہا۔

''وہ بہت زیادہ اَپ سیٹ ہے جمشید خاں۔ میں نے کوشش کی ہے اور وہ کچھ کچھ بھی ہے۔ لیکن مجھے مزید بات چیت کرنا پڑے گی اُس سے۔''

''میں نے تم سے بس دو گھنٹے کا وعدہ کیا تھا۔''

''مگر میں نے دو گھنٹے تو بات نہیں کی اُس سے۔ شاید ایک گھنٹا اور دس پندرہ منٹ دی ہے وہ میرے ساتھ۔''

''تو تم دوسرا دور چاہتے ہو؟''

''ہاں جمشید خاں.....'' عدیل نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''لیکن یہ الہام کی ٹیچر والی بات میں کیا سن رہا ہوں؟ تم اسے بھی پکڑ کر یہاں لے آئے ہو؟''

اس نے قیمتی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اسے پکڑ کر کوئی نہیں لایا۔ اسے میں نے بس تجویز دی تھی۔ وہ خود یہاں آئی ہے لیکن جس مقصد کے لیے وہ یہاں آئی تھی، وہ مقصد پیچھے رہ گیا اور وہ کچھ نیا کرنے کے چکر میں پڑ گئی۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ اسی کام سے یہاں آئی تھی جس کے لیے تم آئے ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ الہام کو سمجھائے بجھائے گی۔ اس کے ذہن میں اگر کوئی اندیشے ہیں تو انہیں دور کرنے کی کوشش کرے گی مگر وہ تو اندیشوں کے بجائے اسے ہی دور کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔ حرام زادی نے دھوکا دینا چاہا، لیپ ٹاپ تک پہنچ گئی۔ اس کا نیٹ آن کرنا چاہا۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''فی الحال بند کیا ہوا ہے اس لیڈی جیمز باؤنڈ کو..... تھوڑی سی مرمت بھی کرنا پڑی ہے لیکن گھبراؤ مت۔ میں جانتا ہوں تم دونوں کا آپس میں ناتا ہے، چھوڑ دوں گا اُس کو..... بلکہ تم دونوں کو اکٹھے ہی چھوڑ دیں گے نکاح کے بعد۔''

عدیل کے جسم میں آگ بھڑک رہی تھی۔ جمشید خاں اور اس کے بچے کی صورتیں اسے زہر لگ رہی تھیں۔ اب رات کے دو بج چکے تھے۔ عمارت کا پورشن بالکل خاموش تھا۔ یہاں ان دو نیم عریاں لڑکیوں اور ایک مکمل گارڈ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یقیناً زیادہ سکیورٹی کی جمشید خاں کو ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہاں عمارت کے بیرونی حصے میں مسلح گارڈز اور سخت سکیورٹی کے آثار نظر آئے تھے۔

''اب آپ کیا چاہتے ہو ڈیڈی جان؟'' جونی نے مسخرہ کا انداز اختیار کیا۔

''میں چاہتا ہوں الہام کو کچھ دیر سوچنے کا موقع دوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس سے دوبارہ بات کرتا ہوں، لگتا ہے وہ سمجھ جائے گی۔''

''سمجھ تو وہ سب گئی ہے ڈیڈی جان، آپ کے لاڈ پیار کی وجہ سے آپ کو ایکسٹرا نخرے دکھا رہی ہو گی۔'' وہ شریر لہجے میں بولا۔

''شٹ اَپ جونی، تمیز سیکھو..... تمہارے بڑے ہیں۔'' جمشید خاں نے مصنوعی خفگی سے کہا پھر وہ عدیل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''سوری جیمپ! بچہ ہے۔ آہستہ آہستہ سیکھ جائے گا۔''

''سیکھ جائے گا اور جو لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے ہیں انہیں سکھا بھی دے گا۔'' جونی نے پھر معنی خیز انداز میں عدیل کو چڑکانا چاہا۔

جمشید نے اسے گھورا۔ ''جونی! مائنڈ یور لینگویج۔ اگر چپ نہیں بیٹھ سکتے تو باہر چلے جاؤ۔''

وہ صوفے پر اپنی لمبی ٹانگیں پھیلا کر اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جمشید خاں، عدیل سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ بیٹی کے نکاح کے بعد وہ بخیر و عافیت اپنے گھر واپس پہنچ جائے گا۔ تابانہ کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔ یہاں سے جانے کے بعد ان کے دماغوں میں اگر کوئی کیڑا رینگے تو اسے فوراً ہی مار دیا جائے۔ کیونکہ کسی طرح کی تلاش یا جوابی کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ یہ حماقت اور ہلاکت کے زمرے میں آئے گی۔

آخر میں اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''جیمپ! تمہارا یہ خاکسار، نیارشتے دار کہیں موجود نہ ہونے کے باوجود بہت سی جگہوں پر موجود ہوتا ہے۔ کافی جگہوں پر دیکھ لیتا ہوں میں..... اگر تم اسے اپنے منہ میاں مٹھو جاننا سمجھو تو کہوں گا کہ میرے بہت سے ہاتھ ہی نہیں، بہت سی آنکھیں بھی ہیں۔ یہ آنکھیں شہر کے اندر دیکھتی ہیں۔ دیواروں اور پردوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے، وہ بھانپ جاتی ہیں۔''

وہ اپنی اصلی جنس اور جانکاری کی خبریں سنا رہا تھا، اپنی دھاک بٹھا رہا تھا۔ بے شک وہ بہت ہوشیار باش

تھا..... بے شک بہت کچھ جانتا تھا..... لیکن..... وہ ایک خاص بات نہیں جانتا تھا۔ وہ ان خاص لمحوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا جو کراچی کے اسپتال میں عدیل پر وارد ہوئے تھے۔ مقابلے کے بعد اسپتال کے کمرے میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور پھر اس پر وہ انکشاف ہوا تھا جس نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہوش ربا لمحے..... وہ انکشاف انگیز گھڑیاں..... اُس نے ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ حتیٰ کہ جمیل کو بھی نہیں۔ صرف اور صرف وہ جانتا تھا کہ اس کی کمر کا مسئلہ اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ وہ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔ مجھے ایسے ہی رونما ہوتے ہیں۔ انسانی عقل کو ایسے ہی انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے..... اُس رات ہوش میں آنے کے بعد اس نے بستر پر لیٹے لیٹے تپائی کی طرف گھوم کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور اسے معلوم ہوا تھا کہ گھومتے ہوئے، درد کی جو لہر اس کی کمر میں اٹھا کرتی ہے، وہ نہیں ہے۔ اس نے تصدیق کے لیے کمر کو دوبارہ حرکت دی تھی اور نتیجہ وہی رہا تھا۔ درد اوجھل تھا۔ تب اس نے بڑی احتیاط سے خود کو بستر سے اٹھایا تھا اور یہ جان کر بھونچکا رہ گیا تھا کہ اس کی کمر میں کہیں کھچاؤ نہیں..... کہیں اینٹھن نہیں۔ وہیں بستر پر اس نے اپنی کمر کو دو تین مختلف اینگلز میں حرکت دی تھی اور پھر بے سدھ سا بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اسے یہی لگا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کمر کے مہروں کی سنگین تکالیف میں کبھی کبھی ایسے کرشمے بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرف سے سنگین قسم کی سرجری تجویز کی جا رہی ہوتی ہے اور اچانک ہی کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی علاج کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ شاید گڑے کو لات راس آ جانے والی بات بھی اسی تناظر میں کہی جاتی ہوگی۔ ان ہوش ربا لمحوں میں عدیل کو امریکن ڈاکٹر کی یہ بات بھی یاد آئی تھی کہ مہروں کی ایسی سنگین تکالیف کبھی کبھی حیرت انگیز طور پر اچانک ہی دور ہو جاتی ہیں..... کراچی اسپتال کے وہ سارے شب و روز عدیل کو یاد تھے۔ شاید اگلے روز اس کرشمے کی پوری تصدیق ہونے کے بعد وہ جمیل کو یہ خبر سنا ہی دیتا مگر پھر جمشید خاں کی وہ منحوس کال آ گئی تھی جس میں اس نے معاہدے سے انحراف کا اشارہ دے دیا تھا اور اپنے اوباش بیٹے کے "رومانس" کا بتا دیا تھا۔ تب ایک جدا خیال کے تحت عدیل نے اپنی کمر کے راز کو راز ہی رہنے دیا تھا اور آج..... پندرہ بیس روز بعد اس سنگین شب میں وہ بظاہر معروب حالت میں وہیل چیئر پر جمشید خاں کے روبرو موجود تھا۔

"ہاں انڈر ورلڈ کا یہ بدمعاش جمشید خاں بہت کچھ جانتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ جو بے بس باپ وہیل چیئر پر بے حس و حرکت بیٹھا ہے اور اپنی بیٹی کے دلدوز ڈکھڑے سن رہا ہے، وہ بے بس نہیں ہے۔ اس کے سینے میں آگ ہی نہیں، اس کے جسم میں اتنی ہمت بھی ہے کہ وہ اس تنہا پورشن میں ڈان اور "ڈان زادے" پر جھپٹ سکے۔

جمشید خاں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے لمبوترے چہرے پر ہاتھ چلایا اور بولا۔ "جیمپ! لگتا ہے کہ تم چیئر پر بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو۔ اگر چاہو تو تمہیں کچھ دیر کے لیے ساتھ والے کمرے میں لٹایا جا سکتا ہے۔"

عدیل خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے جمشید نے دور گوشے میں کھڑے گھرے سانولے گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ وہیل چیئر کے قریب آیا تاکہ اسے گھما کر قریبی دروازے کی طرف لے جا سکے۔ چیئر کی ونڈ بریک بنانے کے لیے جونہی وہ نیچے جھکا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عدیل کا دایاں زوردار مُکا اس کے تھوبڑے پر پڑا اور وہ الٹ کر شیشے کی تپائی کو چکنا چور کر گیا۔

عدیل نے وہیل چیئر چھوڑ دی۔ حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد جونی، آنکھیں نکال کر عدیل پر جھپٹا۔ اس نے جونی کا مُکا بڑی آسانی سے بچایا اور جوابی کُکے سے اسے دور تک لڑھکا دیا۔ یہ کسی عام شخص کا نہیں تجربہ کار باکسر کا مُکا تھا۔ جونی کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ جمشید خاں کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ پلٹ کر الماری کی طرف بھاگا۔ وہ الماری کی دراز میں سے کچھ نکالنے جا رہا تھا۔ پھرا ہوا عدیل اس کی جانب لپکا۔ عین اس وقت جب جمشید دراز کھول چکا تھا، عدیل نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ وہ کسی مچھلی کی طرح تڑپا مگر گرفت سے نکل نہیں سکا۔ عدیل نے دایاں ہاتھ بڑھایا اور کھلی ہوئی دراز میں سے "گلاک 17 پسٹل" نکال لیا۔

گارڈ اب سنبھل کر پھر عدیل کی طرف جھپٹنا چاہ رہا تھا۔ عدیل نے پسٹل جمشید خاں کی کنپٹی پر رکھا اور گرجا۔ "خبردار مار دوں گا اِسے۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسی وحشت تھی کہ تومند گارڈ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف دھان پان بدمعاش زادہ اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے بھی باپ کی کنپٹی پر پسٹل کی نال دیکھ لی تھی۔

جمشید خاں کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گلے سے آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا تھا

اور ناگواری بُو عدیل کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ شاید ایسی ہی بو اس کے بیٹے کے جسم سے بھی اٹھتی تھی۔

''کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا تو مار ڈالوں گا اُس کو۔'' عدیل پھر دہاڑا۔

یہی وقت تھا، جب سامنے والا دروازہ دھماکے سے کھلا اور مختصر لباس والی دراز قد لڑکی نظر آئی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور وہ پتھر کا بُت بن گئی۔

''دروازہ بند کرو..... جلدی۔'' عدیل نے سائیلنسر لگے پسٹل کی نال جمشید خاں کی کنپٹی میں کھسیڑتے ہوئے کہا۔ دباؤ کے سبب جمشید خاں کی گردن ستر کے زاویے پر مڑ گئی۔ اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کہاں تھا کہ مقابلے کے بعد کمر کو مکمل طور پر چٹکا کر بیٹھا ہوا مفلوج عدیل یوں اچانک جھپٹ پڑے گا۔

لڑکی نے خوف زدہ نظروں سے باس کی طرف دیکھا اور عدیل کے حکم پر دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔

پسٹل کی نال کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ رگڑ سے جمشید خاں کی کنپٹی سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ عدیل نے جانچ لیا تھا کہ جمشید کے لباس میں فی الحال کوئی ہتھیار نہیں ہے اور یہ بھی جانچ لیا تھا کہ بیٹے جونی کی جیکٹ میں ہتھیار ہے۔ وہ خطرناک لہجے میں بولا۔ ''حرامی باپ کے حرامی بیٹے! اپنا پستول نکال کر میری طرف پھینک دے اور اپنا موبائل بھی..... ورنہ ابھی یہاں گولی چلے گی اور بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔''

ضدی اور اڑیل جونی پس و پیش سے کام لینے لگا۔ اس کے گڑبڑ تاثرات دیکھ کر عدیل نے پسٹل کی نال جھکا کر بے دریغ جمشید خاں کی پنڈلی پر فائر کیا۔ 'ٹھک' کی مہلک آواز کے ساتھ ہی جمشید خاں بے طرح اُچھلا اور اپنے گلے سے گھٹی گھٹی آوازیں نکالنے لگا۔ ''اگلا فائر اس کے پیٹ میں جائے گا۔'' عدیل وحشت میں پھنکارا۔

عدیل کے حکم پر جونی نے اپنا سلور کلر کا قیمتی پستول نکالا اور اسے بیرل کی طرف سے پکڑ کر عدیل کی طرف اُچھال دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے موبائل کے ساتھ بھی یہی کیا۔

''الہام کی لیچر کہاں ہے؟'' عدیل نے پوچھا۔

جونی نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر نوکے جبڑے کی وجہ سے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ عدیل نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی زرد چہرے کے ساتھ گم صم کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی تابانہ کے بارے میں جانتی ہے۔ عدیل نے اپنے شکنجے میں پھنسے ہوئے جمشید خاں کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ''جمشید خاں، میرے سر پر خون چڑھا ہوا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، اس کے بعد میرے ساتھ کچھ بھی ہو جائے۔ اس اپنی رکھیل سے کہو کہ جائے اور تابانہ کو لے کر آئے۔''

جمشید خاں کے اندر کے ''ڈان'' نے ایک بار پھر جوش مارا۔ اس نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی اور پھنکار کر کچھ کہا۔ عدیل کے سر پر واقعی خون سوار تھا۔ اس نے بلا تردد گلاک پسٹل سے دوسرا فائر کیا۔ اس مرتبہ جمشید خاں کی دوسری ٹانگ نشانہ بنی۔ وہ اُچھلا اور عدیل کی گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ اس کی پہلی ٹانگ خون سے رنگین ہو چکی تھی، اب دوسری بھی ٹخنے کے پاس سے گھائل ہو گئی۔

''جمشید! اگلا فائر تجھے بہت زیادہ نقصان پہنچائے گا۔ اس لڑکی سے کہہ الہام کی لیچر کو لے کر آئے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جمشید خاں کی لمبی گردن پر سے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔

تکلیف کی شدت سے ٹوٹتی ہوئی آواز میں جمشید خاں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر ''مونا'' کہا اور ساتھ ہی اثبات میں سر ہلایا۔

مطلب یہی تھا کہ وہ ''مونا'' کو عدیل کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''کوئی چالاکی نہ دکھانا لڑکی، نہیں تو پچھتانے کا موقع نہیں دوں گا۔'' عدیل نے بلند آواز سے کہا۔

لڑکی لرزاں قدموں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھی اور پھر ایک کمرے کا دروازہ ان لاک کر کے تابانہ کو باہر لے آئی۔ تابانہ کے تراشیدہ بال اس کی پیشانی پر منتشر تھے۔ اگر عدیل کو پتا نہ ہوتا کہ وہ زخمی ہے تو شاید وہ اسے پہچان ہی نہ سکتا۔ اس کے چہرے کی ایک سائڈ اس بُری طرح سوجی ہوئی تھی کہ ایک آنکھ بند ہو گئی تھی اور نصف چہرہ نیلگوں ہو چکا تھا۔ اس کی گردن اور کندھے پر بھی زخم دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بھی ریلنگ کے پاس ہکا بکا کھڑی عدیل کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ مختصر لباس والی لڑکی مونا کے ساتھ زینے اترتی ہوئی نیچے آئی۔ ''وہیں رک جاؤ تابانہ۔'' عدیل نے حکم سے کہا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ وہ فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ پسٹل اٹھاؤ اور یہ موبائل بھی قبضے میں کرو۔''

تابانہ کو یہ سارا سنسنی خیز منظر حیرت زدہ کر رہا تھا اور یقیناً یہ بات بھی حیرت زدہ کر رہی تھی کہ بستر پر مشکل سے حرکت کرنے والا عدیل جمشید خاں کو اپنے شکنجے میں لیے کھڑا

تھا۔ جمشید کی ٹانگیں لہولہان تھیں اور اس کے تومند گارڈ کا تھوبڑا بھی خون سے رنگین تھا۔ بہرطور اس نے عدیل کی ہدایات پر تیزی سے عمل کیا۔ تب اس نے عدیل کی طرف دیکھ کر جذباتی لہجے میں پوچھا۔ ''سر! الہام ملی ہے آپ کو؟''

''ہاں، وہ نیچے بیسمنٹ میں ہے۔ تم راستہ جانتی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''تو جاؤ اور اُسے لے کر آؤ۔'' پھر وہ ذرا ٹھٹکا۔ مونا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ تمہاری دوسری ساتھی کہاں ہے؟''

''وہ یہاں اس پورشن میں نہیں ہے۔''

''نیچے بیسمنٹ میں ہے؟'' عدیل نے پوچھا۔

''نہیں..... اس کو بلڈنگ سے باہر جانا پڑا ہے۔''

عدیل دہاڑا۔ ''دیکھو، مجھ سے کوئی غلط بیانی نہ کرنا۔ میں مرد اور مار کی پوزیشن میں ہوں۔ کچھ بھی کر گزروں گا۔''

لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بار پھر اپنا بیان دہرایا۔

عدیل کی چھٹی حس بھی یہی کہہ رہی تھی کہ عمارت کے اس رہائشی پورشن میں باپ بیٹے کے علاوہ فقط یہ لڑکی مونا اور گہرے سانولے رنگ والا گارڈ ہے۔ پورشن کا دروازہ وہ اندر سے لاک کروا چکا تھا۔ اب باہر سے کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ وہ تابانہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابانہ پسٹل لوڈڈ ہے؟''

''جی سر۔''

''چلا لوگی نا؟''

''کیوں نہیں سر۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ سوجن کے سبب اس کی صورت ناقابلِ شناخت ہو رہی تھی۔

''تو جاؤ، الہام کو لے آؤ۔ اگر کوئی سامنے آئے تو ایک سیکنڈ ضائع نہ کرنا۔ اُڑا دینا اس کو۔'' وہ جانتا تھا کہ تابانہ کوئی چھوئی موئی لڑکی نہیں ہے..... وقت پڑنے پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ الہام کو بیسمنٹ میں سے نکال کر لے آئے گی..... اور ایسا ہی ہوا۔ قریباً تین منٹ بعد وہ الہام کو اپنے ساتھ لیے ہوئے بیسمنٹ کے زینوں کی طرف سے برآمد ہوئی۔ جذباتی مشقت کے سبب اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ الہام بھی ششدر نظر آ رہی تھی۔ اس دوران میں عدیل نے کمرے کے ایک ایک انچ پر عقابی نظر رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی مونا..... سانولا گارڈ اور دونوں باپ بیٹا اس کی نگاہوں کے حساس ریڈار پر تھے۔ جونی نے دوزانو بیٹھ کر اپنا سر جھکا رکھا تھا اور منہ ہاتھوں میں دبا رکھا تھا۔ گاہے گاہے اس کی کراہ گونجتی تھی اور اس شدید تکلیف کا پتا دیتی تھی جو ٹوٹے جبڑے کے سبب اسے جھیلنا پڑ رہی تھی۔ یقیناً باپ کی طرح وہ بھی ششدر تھا کہ وہیل چیئر پر بمشکل یہاں پہنچنے والا شخص ان کے لیے اتنا خطرناک و مہلک کیسے ثابت ہو گیا ہے۔

الہام نے جذباتی انداز میں عدیل کی طرف لپکنا چاہا مگر عدیل نے اسے فاصلے پر رکنے کی ہدایت کی۔ وہ زخمی جمشید خاں کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جمشید خاں کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش نہیں ہے، انڈر ورلڈ کا نہایت خطرناک اور تجربہ کار شخص ہے۔ اس کے سامنے ذرا سی چوک بھی پانسا پلٹ سکتی تھی۔

عدیل نے لڑکی مونا سے پوچھا۔ ''یہاں اور کون کون ہے؟''

''یہاں اور کوئی نہیں، جو تھے وہ آپ کے سامنے ہیں۔'' وہ منمنائی۔

''میں اس پورشن کی بات نہیں کر رہا۔ پوری عمارت کی بات کر رہا ہوں۔ باہر کتنے گارڈز اور ملازم ہیں اور دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔ میں اس وقت جھوٹ بولنے پر بھی جان لے سکتا ہوں۔''

لڑکی مونا نے رک رک کر جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ باہر چھ مسلح افراد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مالی، ایک ڈرائیور اور دو گھریلو ملازم ہیں۔ ہیڈ گارڈ کا نام ورقا خاں معلوم ہوا۔ عدیل نے تابانہ کو ہدایت کی اور وہ، تار کے بغیر والا انٹرکام عدیل کے پاس لے آئی۔ عدیل نے انٹرکام جمشید خاں کو تھمایا اور اسے حکم دیا کہ وہ ورقا خاں کو اندر بلائے۔ کچھ مزاحمت اور کچھ پس و پیش کے بعد جمشید خاں نے ورقا خاں کو بلا لیا۔ درحقیقت جمشید خاں کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ اس حقیقت کو سمجھ رہا تھا کہ اگر زیادہ دیر ہو گئی تو اسے ''وفات پانے کے لیے'' گولی وغیرہ کی حاجت نہیں رہے گی۔

دو منٹ بعد ورقا خاں اندر آ گیا۔ وہ ایک لمبا چوڑا روایتی گارڈ نظر آتا تھا۔ ایک مشین پسٹل اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ تابانہ نے سلور کلر پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کا رخ ورقا خاں کے سینے کی طرف کر لیا تھا۔ عدیل کا پسٹل جمشید خاں کی کنپٹی پر تھا۔ اور سرمئی قالین اس کی ٹانگوں سے بہنے والے خون کے سبب سرخ ہو رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ میں خونخوار صورت والے ورقا خاں نے خود کو اس پوزیشن کے سامنے بے بس محسوس کیا۔ عدیل نے دوٹوک لہجے میں اسے حکم دیا۔ ''اپنے پانچوں ساتھیوں کو یہاں اس کمرے میں بلاؤ..... فوراً۔''

بہتے خون کی وجہ سے جمشید خاں کا رنگ زرد ہوتا جا رہا

تھا۔ ویسے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں کوئی بہت زیادہ خون نہیں ہوگا۔ جمشید نے جب ورقا خاں کو پس و پیش کی کیفیت میں دیکھا تو خود ہی بول اٹھا۔ ''ورقا خاں!'' اس کی آواز تکلیف کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ورقا خاں، عدیل کی ہدایت پر عمل کرے۔ ورقا خاں نے اپنا انٹرکام استعمال کیا اور باہر موجود اپنے ساتھیوں کو بغیر ہتھیار کے اندر آنے کا حکم دے دیا۔ سب کچھ عدیل کی مرضی اور منشا کے مطابق ہو رہا تھا اور اس کی وجہ وہی نیلی آگ تھی جو اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی اور جس نے اسے ہر اندیشے اور مصلحت سے یکسر بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بس اپنی معصوم الہام کی صورت تھی اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے یہاں سے نکالنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد ورقا خاں کے پانچوں ماتحت اور تینوں ملازم اس بڑے کمرے میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک ماتحت گارڈ کسی 'اندیشے' کے تحت ایک بریٹا پسٹل اپنی جیکٹ میں رکھ کر لے آیا تھا۔ تابانہ کو اس کی پھولی ہوئی جیکٹ پر شک گزرا۔ یہ شک کارآمد ثابت ہوا اور وہ پسٹل بھی اس سے نکلوا لیا گیا۔ اب وہ سب کے سب قالین پر بیٹھے تھے اور ہراساں نظروں سے اپنے باس کی طرف دیکھ رہے تھے جو کرب اور بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔ عدیل اور تابانہ پوزیشن پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ الہام سمیت یہاں سے بحفاظت نکل جائیں گے مگر کیا واقعی ایسا ہو سکے گا؟ عدیل کو اس پر پوری طرح یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ موچھیل ورقا خاں نے عدیل کو مخاطب کر کے طیش آمیز لہجے میں کہا۔ ''باکسر! تم جو کرنا چاہتے ہو جلدی کرو۔ بڑے مالک کا خون نکل رہا ہے۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو یہاں کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔''

''ہم یہاں سے نکل رہے ہیں اور تمہارا بڑا مالک ہمارے ساتھ جائے گا۔ تمہارے بڑے مالک سے میری دشمنی میری بیٹی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ مجھے تم سب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ یہاں سے محفوظ فاصلے پر پہنچ کر میں اسے کسی بھی اسپتال یا کلینک کے سامنے چھوڑ دوں گا مگر شرط یہی ہے کہ کوئی ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

ورقا خاں اور جونی نے ایک ساتھ سوالیہ نظروں سے جمشید خاں کی طرف دیکھا۔ سرمئی قالین پر سرخ پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ جمشید خاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ عدیل کی شرائط مان رہا ہے۔

عدیل نے ورقا خاں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم سب، ہمارے یہاں سے نکلنے تک اس کمرے میں رہو گے۔ ہم دروازے کو باہر سے مقفل کر رہے ہیں۔''

''جو کرنا ہے، جلدی کرو۔'' جونی نے اپنے ٹوٹے ہوئے جبڑے کے سات بمشکل بولتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کی آنکھوں میں الہام کو دیکھ کر جو بجلیاں سی چمکتی تھیں، وہ بالکل بجھ چکی تھیں۔

یہی وقت تھا جب چند قدم کے فاصلے پر کھڑی، مختصر لباس والی مونا، بولی اور اس کے فقرے نے عدیل اور تابانہ کو بے طرح چونکا دیا۔ ''آپ لوگ یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں عدیل سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''اس کمرے کے دروازے میں اس وقت 440V کا کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ دروازے کے اوپر اندر اور باہر سینسرز لگے ہوئے ہیں۔ وہ چہرہ پہچان کر گزرنے کی اجازت دیتے ہیں۔''

عدیل اور تابانہ حیرت سے مونا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باقی بھی حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر ان کی نگاہوں میں حیرت کے علاوہ غصہ بھی تھا۔

عدیل نے دیکھا لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ وہ عدیل کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ کامیابی کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں..... کیونکہ..... میں بھی جانا چاہتی ہوں۔''

عدیل نے دیکھا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ورقا خاں کا چہرہ ٹوٹے برتن جیسا دکھائی دینے لگا تھا۔ لڑکی نے چند جملوں میں تیزی کے ساتھ جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اندر داخل ہونے سے پہلے ورقا خاں نے اسٹیل کے اس سلائڈنگ دروازے کا سیکیورٹی سسٹم آن کر دیا ہے۔ اب اپنی پہچان کرائے بغیر یہ دروازہ کسی کو باہر سے اندر اور اندر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

لڑکی مونا کی آنکھوں سے ''بغاوت'' صاف جھلک رہی تھی اور یہ بغاوت انڈرورلڈ کے اس بدمعاش جمشید خاں اور اس کے بیٹے کے لیے تھی۔ مونا نے جو کچھ کہا تھا، اس کی تصدیق بھی فوراً ہو گئی۔ عدیل کی ہدایت پر تابانہ نے لوہے کا ایک راڈ، دروازے کی طرف اچھالا تو اسپارک صاف نظر آیا۔ ورقا خاں اور جونی وغیرہ اب سخت تلملائے ہوئے تھے۔ تاہم وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ عدیل نے گن پوائنٹ پر ہی ورقا خاں سے دروازے کے سیکیورٹی سسٹم کو ''ان ڈو'' کروایا۔ جمشید خاں کسی ڈھال چھپکلی کی طرح اس کی گرفت میں تھا، وہ بڑی احتیاط سے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ پہلے اس نے الہام، تابانہ اور لڑکی مونا

کو باہر نکالا پھر خود بھی نکل آیا اور مونا کو حکم دیا کہ وہ اسٹیل کے دروازے کو باہر سے مقفل کردے۔

عمارت کے کوریڈورز اور لابی وغیرہ میں سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے مگر اب عدیل کو ان کی پروا نہیں تھی۔ ان کیمروں سے جو لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے، وہ ہال کمرے میں بند تھے۔ لڑکی مونا، ان کی رہنمائی کرتی ہوئی انہیں پورچ تک لے آئی۔ وہ مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ البتہ عدیل ابھی تک اس پر پوری طرح بھروسا نہیں کر رہا تھا۔ اس نے تابانہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس پر نظر رکھے۔ وہ پورچ میں پہنچے تو وسیع گراسی لان کی طرف سے آنے والی یخ ہوا نے ان کا استقبال کیا۔ یہ رات کے قریباً تین بجے کا عمل تھا۔ گہرے کہرے نے اردگرد کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مختصر لباس والی مونا سردی کے سبب اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔ وہ شاید عدیل اور تابانہ وغیرہ سے بھی زیادہ بے تاب تھی، جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

پورچ میں تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک سیاہ بیڈفورڈ جیپ کی چابیاں عدیل نے حاصل کر لی تھیں۔ تابانہ نے جیپ میں گھس کر اس کو اسٹارٹ کیا اور فیول وغیرہ چیک کیا۔ ''ٹھیک ہے جی۔'' وہ باہر آ کر بولی۔

''ڈرائیو کرلوگی نا؟''

''کیوں نہیں جی۔'' وہ بولی۔ سوجن کے سبب اس کا منہ بولتے ہوئے مزید بگڑ جاتا تھا۔

اب اندر سے ایسی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ بند کمرے کا سلائڈنگ ڈور توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ابھی تک سب ٹھیک جا رہا تھا..... لیکن سب ٹھیک نہیں تھا۔ الہام خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''پاپا..... پلیز جلدی کریں۔''

جمشید خاں کی دُبلی گردن بدستور عدیل کے شکنجے میں تھی۔ زخمی ٹانگوں کی وجہ سے اس کی مزاحمت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ عدیل اسے اپنے ساتھ قریباً گھسیٹتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ اس کی لہولہان ٹانگوں کے گھسٹنے کے نشان دور تک نظر آ رہے تھے۔ وہ کسی وقت دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کرتا تھا جیسے اسے اب بھی کسی جانب سے مدد کی امید ہو۔

اس کا خیال سو فیصد غلط نہیں تھا۔ ان لمحوں میں عدیل اور تابانہ مختصر لباس والی اُس دوسری لڑکی کو یکسر بھولے ہوئے تھے جو عمارت میں موجود نہیں تھی۔

پورچ کی روشنی میں عدیل نے یکایک تابانہ کا رنگ بدلتے دیکھا۔ اس نے عدیل کے عقب میں دیکھا تھا پھر یکایک وہ چلّاتی ہوئی ایک طرف جھپٹی۔ عدیل نے پلٹ کر دیکھا، وہ کسی سے لپٹی ہوئی تھی پھر وہ اور اس کا مدِمقابل لان کے گملوں کے اوپر گرے جو لڑکی تابانہ کے نیچے تھی یہ وہی مختصر لباس والی گارڈ تھی جسے عدیل نے اندر دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ایک فٹ لمبا دندانے دار خنجر چمک رہا تھا۔ تابانہ کے نیچے لیٹے لیٹے اس نے بیدردی سے خنجر تابانہ کے بائیں پہلو میں گھونپ دیا۔ الہام دہشت زدہ انداز میں چلّا کر عدیل کے پہلو سے آ لگی تھی۔ تابانہ کی مدمقابل نے بس ایک وار پر اکتفا نہیں کیا۔ بڑی وحشت کے عالم میں اس نے اوپر تلے دو وار مزید کیے۔ ایک وار تابانہ نے جزوی طور پر روکا لیکن دوسرا پھر اس کے پہلو میں گھس گیا۔ وہ درد سے چلّائی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ دونوں ابھی تک گتھم گتھا تھیں۔ یہی وقت تھا جب دھند میں لپٹے ہوئے درختوں کے اندر سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ ایک تو سیاہ جیپ کی باڈی میں لگا، دوسرے نے فی میل گارڈ مونا کو ہٹ کیا۔ وہ جیپ کے دروازے سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر گئی۔

عدیل نے تاریکی میں چمکنے والے شعلے کی وجہ سے فائر کرنے والے کی لوکیشن دیکھ لی تھی۔ اس نے سائلنسر لگا گلاک پسٹل جمشید خاں کی کنپٹی سے ہٹایا اور حملہ آور کو نشانہ بنایا۔ پہلا فائر ہی کارگر ثابت ہوا۔ عین اپنے سر میں گولی کھا کر وہ یخ بستہ گھاس پر گرتا دکھائی دیا۔

تابانہ اور حملہ آور لڑکی بدستور برسرِ پیکار تھیں۔ دو زخم..... بلکہ کاری زخم کھانے کے بعد تابانہ میں وہ توانائی تو نہیں رہی تھی تاہم اس نے خود کو مزید نقصان سے بچانے کے لیے مدِمقابل کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی جکڑ رکھی تھی اور اسے کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ دونوں اس طرح گتھم گتھا تھیں اور اوپر نیچے ہو رہی تھیں کہ عدیل حملہ آور لڑکی پر فائر بھی نہیں کر سکتا تھا اور ملائی نقوش والی وہ لڑکی بھی کوئی معمولی حریف نہیں تھی، جیسا کہ بعد ازاں پتا چلا، تابانہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے والی وہ چرمدن نامی بری لڑکی بلیک بیلٹ تھی اور نہایت خطرناک فائٹر تصور کی جاتی تھی۔ اس نے تابانہ کو اپنے سر کی ضربات سے مزید لہولہان کر دیا تھا مگر وہ کسی صورت اس کی کلائی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کے پہلو سے بہنے والا خون پورچ کے فرش پر گل کاریاں کرنے لگا تھا۔

یکایک تابانہ کا داؤ چل گیا۔ اس نے مدِمقابل کے

نیچے ہونے کے باوجود اسے ایک فرشی داؤ لگایا اور بے بس کر ڈالا۔ مدِمقابل کا بازو اس بُری طرح مڑا تھا کہ خون آلود خنجر اس کے ہاتھ میں پکے ہوئے پھل کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ دہشت زدہ الہام ہمت کر کے آگے بڑھی اور اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے خنجر اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔

بری فائٹر ان لمحوں میں بالکل اسٹل تھی اور تابانہ کے آرم لاک میں بے بس نظر آ رہی تھی۔ عدیل نے فقط تین چار فٹ کی دوری سے تاک کر اس کے سینے میں فائر مارا اور اس کی مزاحمت کا قلع قمع کر دیا۔

اندر سے دروازہ توڑے جانے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ عدیل نے تڑپ کر تابانہ کو دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بایاں پہلو دبا رکھا تھا اور خون اس کی انگلیوں کی درزوں میں سے پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ ''الہام! لیچر کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھاؤ۔'' عدیل نے پکار کر کہا۔

پھر وہ مددگار لڑکی سونا کی طرف جھکا۔ رائفل کی گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور گردن کے پچھلے حصے کو پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اسے مرنے میں شاید دو تین سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی تھی اور ادھ کھلی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ وہ جیپ دھند میں لپٹے سفیدے اور شاہ بلوط کے درختوں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ مزید آگے نہیں جا سکی لیکن کم از کم ان سنگلاخ دیواروں میں سے تو نکل آئی ہے۔ وقتِ رخصت چھوٹے بھائی جمیل نے جو شال عدیل کے جسم پر ڈالی تھی وہ اب عدیل کے کندھوں پر تھی۔ اس نے یہ شال کھول کر اس مددگار لڑکی کے نیم برہنہ جسم پر پھیلا دی اور جمشید خاں سمیت گاڑی میں آ گیا۔ گاڑی میں گھستے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ پسٹل کے آہنی دستے کی دو تین زوردار ضربیں جمشید کے سر پر لگائیں اور اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے سیٹ پر پھینک دیا۔ تب وہ اندر ہی سے دو نشستیں کراس کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا تابانہ لمبی نشست پر پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ خون کے قطرے تواتر سے لگژری جیپ کے فرش پر ٹپک رہے تھے۔

''تابانہ ہمت نہیں ہارنی۔ ہم اسپتال پہنچ رہے ہیں۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

تابانہ بند آنکھوں کے ساتھ بس اثبات میں سر ہلا سکی۔

جیپ کا طاقتور انجن گرجا اور وہ گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے عدیل نے مڑ کر اس پُرشکوہ و نیم تاریک عمارت کو دیکھا۔ گیٹ کے ستون پر میاں خدا بخش کے نام کی پلیٹ نظر آ رہی تھی۔ جلد ہی عدیل کو اندازہ ہو گیا کہ یہ عمارت ایک فارم ہاؤس کا حصہ ہے۔ رات کے اس پہر فارم ہاؤس کے داخلی راستے پر فقط رکھوالی کے دو کتے چکراتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جیپ کو دیکھ کر ہکا بکا سے کھڑے رہے۔ جیپ فراٹے کے ساتھ بڑی سڑک پر آ گئی۔ الہام کی کراہتی ہوئی آواز عقب سے ابھری۔

''لیچر..... پلیز لیچر ہوش کریں، آنکھیں کھولیں پلیز۔''

پھر وہ روتے ہوئے عدیل سے مخاطب ہوئی۔ ''پاپا! دیکھیں ان کو، کیا ہو رہا ہے انہیں۔''

عدیل کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ جیپ روکتا اور اسے دیکھتا۔ وہ پوری توجہ سامنے سڑک پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ''الہام! ان کا سر اونچا رکھو، ان کا سانس رکنے نہ پائے۔''

''پاپا! بہت خون بہہ رہا ہے..... جلدی کریں۔''

جیپ اب نسبتاً ہموار سڑک پر تھی۔ پھر کچھ فاصلے پر اسے ایسے آثار نظر آئے جن سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ موٹروے کے آس پاس ہے۔ موٹروے کی تیز رفتار روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جگہ اسے ایک سنگ میل نظر آیا جس پر لکھا ہوا تھا لاہور 30 کلومیٹر۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ ''مریدکے'' قصبے کے قرب و جوار میں کہیں موجود ہے۔ رخ کا تعین ہونے کے بعد اس نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔

☆☆☆

عدیل لاہور کے ایک بہترین پرائیویٹ اسپتال میں تھا۔ تابانہ کی حالت نازک تھی۔ اس کی کچھ انتڑیاں کٹ چکی تھیں، پیٹ کے دیگر اعضا کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اسے مکمل بے ہوشی کی حالت میں آپریشن تھیٹر کے اندر لے جایا گیا تھا۔ ایس پی عرفان اور جمیل بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔ عرفان شیخ نے سب سے پہلے تو خون آلود جیپ میں موجود اس نیم بے ہوش شخص کو اپنی تحویل میں لیا تھا جو برسوں سے دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی عرفان یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ جمشید خاں ہی ہے۔ دیگر اہلکاروں کا بھی یہی حال تھا۔ جمشید خاں کو بھی پولیس کی نگرانی میں فوراً اسپتال کے اندر پہنچایا گیا۔ ہر طرف فون کی گھنٹیاں بج گئی تھیں۔ رات کے اس آخری پہر انتظامیہ کو اس اطلاع نے ہلا ڈالا تھا کہ جمشید خاں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ لمبے ہاتھوں والا بندہ تھا۔ کسی بھی ری ایکشن سے بچنے کے لیے شہر کی پولیس کو الرٹ کر دیا گیا تھا۔ پولیس کی کئی گاڑیاں ''مریدکے'' کی طرف روانہ ہو چکی تھیں تاکہ اس فارم

ہاؤس پر ایک زوردار ریڈ کیا جاسکے جہاں سے ڈان گرفتار ہوا تھا..... اور جہاں کم از کم دو لاشیں بھی موجود تھیں۔ عرفان بھی جمشید کی کٹھڑی کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد مرید کے روانہ ہو گیا۔ عدیل نے اسے عمارت کا اندرونی نقشہ سمجھا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ بیسمنٹ میں کچھ بیمار لڑکیاں اور عورتیں موجود ہیں۔ قیاس یہی ہے کہ ان کی حیثیت قیدیوں کی سی ہے۔

الہام مسلسل رو رہی تھی۔ وہ بار بار عدیل سے پوچھتی تھی۔ ''پاپا! کیا بچ جائیں گی نا؟''

عدیل اسے حوصلہ دے رہا تھا اور دعا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ پولیس اہلکاروں نے حفاظت کے نقطۂ نظر سے اسپتال کے اس ویٹنگ روم کو گھیرا ہوا تھا جہاں الہام اور عدیل موجود تھے۔ اسی دوران میں ایک عورت روتی پیٹتی اور اہلکاروں کے درمیان سے راستہ بناتی عدیل اور الہام کے پاس پہنچ گئی۔ یہ تابانہ کی والدہ میڈم تنویر تھیں۔

''کیا ہوا میری تابانہ کو۔ کہاں ہے وہ؟'' وہ عدیل کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی! وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی، آپ دعا کریں۔''

''خدا کے لیے اُسے بچا لو۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں بچوں گی۔''

عدیل نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ الہام بھی انہیں دلاسا دینے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔ عرفان کی ہدایت کے مطابق اس کے ماتحت اہلکار تابانہ کے لیے خون کا انتظام کر رہے تھے۔ آپریشن تھیٹر میں آنے جانے والے طبی عملے کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہے۔

☆☆☆

قیامت کی رات گزر چکی تھی لیکن امید کی صبح ابھی طلوع نہیں ہوئی تھی۔ یوں دوپہر کا ایک بج چکا تھا مگر آپریشن تھیٹر سے نکلنے کے بعد تابانہ مسلسل بے ہوش تھی۔ دوسری طرف بڑی تیزی کے ساتھ کچھ اہم واقعات رونما ہوئے تھے۔ جب علی الصباح فجر کے وقت پولیس نے ''مرید کے'' کے اس نواحی فارم ہاؤس پر ریڈ کیا تو وہاں سے کوئی ملزم ہاتھ نہیں آیا۔ فقط دو لاشیں ملیں یا پھر بیسمنٹ میں بند سات عدد خواتین۔ وہ بہت خوف زدہ تھیں۔ اس کے علاوہ بیسمنٹ کے ہی ایک حصے سے منشیات کی ایک کھیپ بھی ہاتھ لگی۔ انڈر ورلڈ کا یہ خطرناک اسمگلر جمشید خاں قریباً دو برس سے اس فارم ہاؤس میں یہاں خدا بخش کے نام سے مقیم تھا اور کسی کو اس کی بھنک تک نہیں پڑی تھی۔ وہ اُسے بس ایک ''الگیٹڈ پلٹ'' فارمر کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔

عرفان نے بڑی تندہی سے مرید کے اور گوجرانوالا کے نواح میں چھاپے مارے۔ جمشید گینگ کے تین بندے گرفتار ہوئے اور ایک بھاگنے کی کوشش میں بلندی سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ سنسنی خیز بات یہ تھی کہ بلندی سے گرنے والا یہ شخص جمشید خاں کا لاڈلا سپوت مرجان عرف جونی تھا۔ وہ جو ایک مجبور و بے بس لڑکی کے لیے زبردستی کا دولہا بننے جا رہا تھا، اپنی ناپاک خواہش سمیت راہیِ عدم ہوا تھا۔

عرفان نے برآمد ہونے والی تمام عورتوں کو دارالامان پہنچا دیا تھا اور وہاں کا راؤنڈ متعین کر دیے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے عرفان ان میں سے ایک فریدہ نامی عورت کو عدیل سے ملانے اسپتال ہی لے آیا۔

فریدہ کی عمر 35 سے اوپر تھی۔ یقیناً کسی وقت وہ خوب صورت رہی ہو گی مگر اب مدقوق چہرے اور دھان پان سپاٹ جسم کے ساتھ قابلِ رحم نظر آتی تھی۔ اسے اگر بیمار نہیں کہا جا سکتا تھا تو صحت مند بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

پوچھ گچھ کے دوران میں اس نے ایک دو حیرت انگیز انکشاف کیے۔ اس نے بتایا کہ بیسمنٹ میں رہائش رکھنے والی ان تمام عورتوں اور لڑکیوں کی حیثیت ماضی میں جمشید خاں کی رکھیلوں جیسی تھی۔ جمشید خاں کے ساتھ ان میں سے کچھ کا تعلق سات آٹھ سال پہلے قائم ہوا تھا۔ کچھ کا چار پانچ سال پہلے اور کچھ اس کے بعد اس کے ساتھ رہی تھیں جس وقت جمشید خاں نے ان سے تعلق قائم کیا تب وہ ایسی نہیں تھیں جیسی اب نظر آ رہی تھیں۔ جمشید خاں کی بیمار صحبت نے انہیں اس حال تک پہنچایا تھا۔ یہ تھائی رائیڈز کی مخصوص بیماری والا وہی معاملہ تھا جو اس سے پہلے بھی سننے اور دیکھنے میں آ چکا تھا۔ جمشید خاں سے قربت کا تعلق رکھنے والی ہر عورت جلد یا بدیر اس بیماری سے متاثر ہو جاتی تھی۔ بظاہر وہ مریض نظر نہیں آتی تھی، تھوڑا بہت کھاتی پیتی بھی تھی مگر اس کا وزن بتدریج کم ہوتا چلا جاتا تھا۔ کچھ مریضوں میں ہر طرح کی خواہشات ختم ہونے لگتی تھیں۔

عدیل نے پوچھا۔ ''تو جمشید خاں نے تمہیں وہاں کیوں رکھا ہوا تھا؟''

''وہ ہمیں آزاد کر کے اپنے لیے کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔'' وہ دکھی آواز میں بولی۔

''ویسے کسی وقت خیال آتا ہے کہ وہ ہمیں جان سے بھی مار سکتا تھا مگر شاید اپنے تئیں وہ ہمارے ساتھ مہربانی والا

سلوک کر رہا تھا۔ یعنی ہمیں زندہ رکھا ہوا تھا اور ہماری تمام تر ضروریات پوری کر رہا تھا۔"

عرفان نے پوچھا۔ "مونا نام کی جو لڑکی فارم ہاؤس میں ماری گئی، اس کا کیا ماجرا ہے؟"

فریدہ نے گہری سانس لی۔ "جہاں تک میں جانتی ہوں وہ جمشید خاں کے بیٹے جونی سے خوف زدہ تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"جمشید خاں اپنے ساتھ اکثر دو تین فی میل گارڈز بھی رکھتا تھا مگر اس نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ان گارڈز کے ساتھ کسی قسم کا جسمانی تعلق قائم نہیں کرتا تھا۔ وجہ یقیناً یہی ہوگی کہ وہ انہیں صحت مند دیکھنا چاہتا تھا۔ مونا اور بری لڑکی چوئن کے معاملے میں بھی یہی بات تھی مگر جمشید کا بیٹا جونی..... مونا پر بُری نظر رکھے ہوئے تھا۔ باپ کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کے درپے تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اُس کے ڈر سے وہ ماری گئی۔"

"بالکل ایسا ہی ہے جی..... کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی..... جب مونا نے دیکھا کہ اسے اس چنگل سے نکلنے کے لیے راستہ مل رہا ہے تو وہ آپ لوگوں کی مدد پر آمادہ ہوگئی لیکن....." فریدہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں نمی آگئی۔

عدیل کی نگاہوں میں بھی وہ منظر گھوم گیا جب رائفل کی طاقتور بلٹ لگنے کے بعد وہ پورچ کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی اور دھند میں لپٹے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مزاحمت اور پھر آزادی کا سفر کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی ختم ہوا تھا۔

☆☆☆

تابانہ کے آپریشن کو 72 گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ مسلسل آئی سی یو میں تھی۔ کسی وقت وہ ہوش میں بھی آجاتی تھی مگر اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔ اس کی والدہ اور جمیل مستقل طور پر اسپتال میں اس کے ساتھ تھے۔ اس کے ایک ماموں جو فزیوتھراپسٹ تھے، وہ بھی آجا رہے تھے۔ شام کو الہام اور عدیل پھر اسپتال پہنچے۔ جمیل نے بتایا کہ وہ اس وقت ہوش میں ہے۔ الہام اسے دیکھنے کے لیے تین روز سے بے تاب تھی۔ اس روز جمیل نے کوشش کر کے اسے ملا دیا۔

کوئی دس منٹ بعد الہام آنسو بہاتی ہوئی واپس آئی..... اس نے عدیل کو بتایا کہ انہیں آکسیجن لگی ہوئی ہے۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ عدیل کی طرف دیکھ کر بولی۔ "پاپا! وہ بہت اچھی ہیں۔ دیکھیں اس حالت میں بھی انہیں آپ کا خیال ہے۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں..... مجھے بہت افسوس ہے پاپا کہ ہم نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔"

عدیل اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔

وہ کہنے لگی۔ "پاپا! وہ صرف میری خاطر، اپنی رضامندی سے اس منحوس فارم ہاؤس میں پہنچی تھیں۔ وہاں..... ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری خاطر انہوں نے ان لوگوں کی اتنی سخت مار پیٹ برداشت کی..... اور پاپا، میری اور آپ ہی کی خاطر وہ اس وقت ایسی حالت میں پڑی ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے نشو سے اپنی سرخ ناک پونچھی اور بولی۔ "وہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب ہم نکل کر پورچ میں پہنچے، وہ حملہ آور لڑکی آپ کو بہت نقصان پہنچا سکتی تھی اگر لیچر کو اس کے سامنے آنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی ہو جاتی تو وہ کامیاب ہو جاتی۔ آج اگر آپ میری نظروں کے سامنے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اللہ کے بعد لیچر کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

عدیل، الہام کو اپنے ساتھ لگا کر چپکنے لگا۔

"پاپا۔" اس نے عجیب آہنگ میں کہا۔ "وہ..... آپ کو پسند کرتی ہیں پاپا۔ بہت زیادہ۔ کوئی کسی کے لیے اپنی جان اس طرح خطرے میں کب ڈالتا ہے..... آپ کو انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھیں مگر مکمل کر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔" پھر اس نے عدیل کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے کہا۔ "پاپا! یہ حادثہ ہونے سے پہلے بھی میرے خیالوں میں آتی تھیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا، وہ بالکل میرے ساتھ کھڑی ہیں۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں میرا اور دوسرے میں لیچر کا ہاتھ تھام رکھا ہوتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح لیچر کو چاہتی ہیں۔ ہم..... مجھے اور لیچر کو..... ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہیں۔" عدیل بس اس کا سر سہلاتا رہا۔

یہ اس سے تیسرے روز کی بات ہے۔ تابانہ کی والدہ اسپتال کے برآمدے میں جائے نماز بچھائے سر بسجود تھیں۔ عدیل لابی میں تھا۔ کالج کے دو لڑکے اسے بحیثیت باکسر پہچان کر اس کے قریب آن بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ چیمپئن باکسر بالکل فٹ نظر آتا ہے اور وہ شاید اسے پھر سے باکسنگ کے رنگ میں دیکھ سکیں اور یہ خواہش صرف ان لوگوں کی ہی نہیں تھی بے شمار شائقین ایسے تھے جو اس عمر میں بھی اسے رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے..... فرنٹ مین ظہور ہاوا کی گرفتاری سمیت جو کچھ بھی گینگسٹر جمشید خاں کے ساتھ ہوا تھا وہ سب

میڈیا کی زینت بن چکا تھا۔ یہ سب کچھ بہت حیرت ناک تھا مگر اس میں سب سے حیرت ناک بات یہی تھی کہ عدیل جو ایک اَن چاہے مقابلے کے بعد بستر پر جا پڑا تھا اب معجزانہ طور پر تندرست نظر آرہا تھا۔ اپنی اندرونی پریشانی کو دبا کر عدیل لڑکوں کے سوالات کے جواب دے رہا تھا جب جمیل تیز قدموں سے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر رنج اور تشویش کے سائے تھے۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''بھائی جان! اسے سانس ٹھیک سے نہیں آرہی۔ وہ آپ سے ملنا چاہ رہی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اجازت لی ہے۔''

اب عدیل بھی اُس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ کم از کم ایک بار تو ملنا چاہ رہا تھا۔ وہ بھرے ہوئے دل کے ساتھ اٹھا۔ ایک نرس نے اسے مخصوص سبز گاؤن پہنایا اور وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں داخل ہوگیا۔ وہ اپنے ڈیانا کٹ بالوں کے ساتھ بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ آکسیجن کے علاوہ اسے اور کئی نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ چہرے کی سوجن جس نے اسے بدشکل کردیا تھا اب کافی حد تک کم ہوچکی تھی مگر آنکھوں کے اندر سنگین سائے گہرے ہوگئے تھے۔

عدیل اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ عدیل کی طرف بڑھایا، جیسے چاہ رہی ہو کہ وہ اسے تھام لے۔ عدیل نے ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا ماسک سرکایا۔ اس کے زرد خشک ہونٹوں پر ایک دھیمی مسکان بکھر گئی۔ بہت ہلکی آواز میں بولی۔ ''سر! سارے پرستار تو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اب پرستاروں سے دور رہنا چھوڑ دیجیے گا۔''

''ایسی باتیں مت کرو تابانہ۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے، تم کو جلد اچھا ہوجانا ہے۔''

''آپ بہت سچے ہیں سر! سب کچھ آپ کے چہرے پر آجاتا ہے۔ آپ کو تو جھوٹی تسلی دینا بھی نہیں آتا۔''

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''تابانہ! میری سمجھ میں نہیں آتا، میں تم سے کن لفظوں میں معافی مانگوں۔ میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔''

''چیمپئن اور اسٹارز تو معافی نہیں مانگا کرتے۔ معافی تو پرستار مانگتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی نادانیوں سے آپ کو بہت پریشان کیا۔ آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ آپ کے لیے مشکلات کھڑی کیں۔ مجھے معاف کردیجیے گا۔'' وہ کراہ کر بولی۔

''پلیز تابانہ! ایسی باتیں مت کرو۔ اپنے ٹھیک ہونے کی باتیں کرو۔ تمہیں ٹھیک ہوجانا ہے۔''

اُس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایک شرط پر ایسی باتیں نہیں کروں گی..... پوچھیں کیا شرط ہے؟''

''کیا ہے؟''

''الہام دو چار برس میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر اپنے گھر جانے والی ہے۔ اس کے جانے سے پہلے یا جانے کے فوراً بعد آپ شادی کرلیں گے۔'' تابانہ کا انداز وعدہ لینے والا تھا۔

وہ بس خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''ایک بات اور..... آپ یہ شادی اپنی کسی پرستار سے کیجیے گا..... کسی بھی پرستار سے۔ دیکھنا وہ آپ کو پھولوں کی طرح رکھے گی۔ آپ پر نثار رہے گی۔''

عدیل نے ایک دکھی سانس لی۔ بڑے دھیان سے سفید بستر پر پڑی تابانہ کو دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کے دل کے اندر جیسے ایک سوتا سا پھوٹ پڑا۔ سوز و گداز کے رنگ میں رنگا ہوا ایک نایاب پانی نمودار ہوا اور اس کی رگوں میں داخل ہوکر خون کے ساتھ پورے جسم میں پھیل گیا۔ اس کا دل ایک دم ہی کسی اور انداز سے دھڑکنے لگا۔ اسے اس دیوانی سی لڑکی پر ایک دم ہی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

اس نے تابانہ کے ہاتھ کو ہولے سے دبا کر کہا۔ ''نئی ''پرستار'' ڈھونڈنا کافی مشکل کام ہے تابانہ..... نئی پرستار ڈھونڈنے کے بجائے کیوں نا اسی کے بارے میں سوچا جائے جو ہے۔''

وہ خالی، خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ اس نے پھر اس کا ہاتھ دبایا۔ ''ایک دن تم نے کہا تھا، تم میری ہر بات مان سکتی ہو۔ ہر بات چاہے نہ ماننا۔ اس کو پہلی اور آخری بات سمجھ کر مان لو۔ ٹھیک ہوجاؤ تابانہ! اپنی بیماری کو شکست دے دو۔''

اس کا رنگ مزید سفید پڑ گیا۔ آنکھوں میں گہرا کرب جاگ گیا۔ عدیل کو یوں لگا جیسے اس نے یکا یک اس پر ایک بہت بھاری بوجھ ڈال دیا ہے..... اس بوجھ سے وہ سرتاپا لرز گئی ہے۔ ایک دم اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ سینے سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ عدیل نے جلدی سے آکسیجن ماسک اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ کھانسی سے اس کے پہلو کے ٹانکے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر لپکتی ہوئی اندر آئی۔ عدیل کو ذرا جھڑک کر بولی۔ ''آپ سیانے بیانے ہوکر اپنے مریض کے لیے مشکلات پیدا کررہے ہیں۔ پانچ منٹ کی اجازت تھی، آپ دس منٹ سے یہاں موجود ہیں۔''

عدیل ''سوری'' کہتا ہوا الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اس کے بعد عدیل کبھی اسپتال نہیں گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے تابانہ سے جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا ہے۔ اب جو ہونا ہے اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں .... کرشموں اور معجزوں پر بھی کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ اوپر والے کی مرضی سے رونما ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ اس کی کمر ٹھیک ہونے والا واقعہ بھی تو کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ (جمشید گینگ کی بربادی اور کم از کم 40 افراد کے قاتل جمشید کا اچانک قانونی شکنجے میں آنا بھی تو معجزہ ہی تھا)

تابانہ کے زخموں کے انفیکشن کے لیے جو کچھ ڈاکٹرز سے ہو رہا تھا، وہ کر رہے تھے۔ عدیل نے جمیل اور الہام سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ تابانہ کے بارے میں اسے کوئی خبر نہ دیں..... وہ بس اس کے لیے دعا کر رہا تھا۔ جمیل ہمیشہ سے عدیل کا مزاج شناس اور رازداں تھا۔ وہ اس کی دلی کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے اسپتال میں تابانہ کی نگہداشت کی پوری ذمے داری خود اٹھالی تھی اور عدیل کے لیے "اسپتال" کے حوالے سے بلیک آؤٹ کر دیا تھا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا تھا کہ الہام زبردستی اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی لیکن اس کے آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے عدیل کو اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا تھا۔ "پاپا! ٹیچر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"وہ ٹھیک ہیں؟"

"آپ خود آکر دیکھ لیں۔"

عدیل اس کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا اور اسے پھر بے طرح چونکنا پڑا تھا۔ تابانہ گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ جمیل اور عرفان اسے سہارا دے کر وہیل چیئر سے اتار رہے تھے..... صوفے پر بٹھا رہے تھے۔ اس کا چہرہ زرد تھا مگر ہونٹوں پر مسکان تھی۔ اس کی والدہ بھی ہمراہ تھیں۔

"بڑی ضدی ہے یہ۔" اس کی والدہ نے کہا۔ "کہہ رہی تھی پہلے اپنے گھر نہیں جاؤں گی، الہام کے گھر جاؤں گی۔ عدیل صاحب کو سلام کروں گی۔"

عدیل کتنی ہی دیر سکتہ زدہ سا کھڑا رہا۔ "تھینکس گاڈ۔" اس نے کہا پھر جلدی سے واپس چلا گیا۔ وہ ایک چیمپئن باکسر تھا۔ اس کا ایک "امیج" تھا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ کسی کے سامنے اس کی آنکھوں میں نمی آئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ خود کو سنبھال چکا تو الہام اندر داخل ہوئی۔ اب وہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی اور اس کا چہرہ اوس میں دھلا ہوا گلاب نظر آتا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ بوکے تھا۔

"یہ کس لیے ہے؟" عدیل نے پوچھا۔

وہ عجیب انداز میں بولی۔ "اس کے لیے پاپا جس نے آپ کے کہنے پر اپنی زندگی اور موت کی جنگ جیتی ہے۔ اپنی بیماری کو ایسی یادگار "رزس ٹینس" (مزاحمت) پیش کی کہ ڈاکٹرز بھی حیران رہ گئے۔ ہاں پاپا! پچھلے دس بارہ دنوں میں مس تابانہ نے اپنی "ون پاور" کی مدد سے ایک انہونی کر دکھائی ہے۔"

عدیل ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "جایئے پاپا..... پلیز اپنے ہاتھوں سے یہ پھول ان کو دیجیے۔ کمرے میں اب کوئی نہیں، وہ اکیلی ہیں۔"

اپنے لاڈلے پن سے اس نے عدیل کے تذبذب کو دھکیل دھکیل کر ایک کونے میں کر دیا۔ عدیل بوکے لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ عدیل کو دیکھ کر اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ عدیل نے اسے روک دیا۔ بوکے اس کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ نم نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی..... دیکھتی رہی۔ پھر نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ کی بات مان لی نا۔" اس کا اشارہ اپنی صحت یابی کی طرف تھا۔

"شکریہ تابانہ۔"

"لیکن آپ کی دوسری بات مجھے بہت بُری لگی۔"

"کون سی؟"

"آپ نے کہا تھا میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ کہہ رہا ہوں..... آپ نے آخری بار کیوں کہا؟" تابانہ کے لہجے میں دنیا بھر کے شکووں کی ناراضی یکجا ہو گئی تھی۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "ٹھیک ہے تابانہ! وہ آخری بات نہیں تھی۔ میں ایک دو گزارشات تم سے اور بھی کروں گا۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ چمک گئی۔

کمرے کی خاموشی میں جیسے ایک ساز سا بج اٹھا تھا۔

وہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "ایک دو گزارشات نہیں جناب، میں چاہتی ہوں آپ مجھ سے بہت سی باتیں کہیں اور میں بہت سی باتیں مانوں..... بس مانتی چلی جاؤں۔"

کھڑکیوں سے باہر کئی دنوں کی دُھند اور ابر آلود سردی کے بعد اچانک ہی سورج اپنا چہرہ دکھانے لگا تھا..... ایک سنہری دھوپ..... اداس، یخ بستہ در و دیوار کو گرمانے جا رہی تھی۔

◆◆◆

قارئین کے تحریر کردہ حقیقی واقعات کی ایک دلچسپ تحریر

بعض اوقات آدمی وبال سمجھ کر نعمت کو نیچے دھکیل رہا ہوتا ہے اور کبھی خوش بختی جان کر شامت کو دعوت دے بیٹھتا ہے۔ جنت نظیر کشمیر کا یہ فسانہ بھی قسمت و حالات کی کچھ ایسی ہی بوالعجبی کا شاخسانہ ہے... اور اس بات کا عکاس بھی کہ کشمیر کے مجاہدین اپنی منزل کے حصول کے لیے کس کس طرح جدوجہد کر رہے ہیں۔

خنجر بکف

طاہر جاوید مغل



وقت ایک بہت مؤثر قوت کا نام ہے۔ یہ قوت ہمارے گرد و پیش کی ہر چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے ذہن پر بھی اور احساسات پر بھی۔ جو کچھ ہم کسی ایک وقت میں بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں، دوسرے وقت میں اتنی شدت سے محسوس نہیں کرتے، اور کبھی کبھی تو بالکل فراموش بھی کر دیتے ہیں۔

ایس پی چیتن چوہان کے ذہن میں بھی خطرے کا وہ احساس باقی نہیں رہا تھا جو آج سے ایک ماہ پہلے تھا۔ ایک ماہ پہلے جب وہ دو سب انسپکٹروں راجندر اور پرشاد کو اپنے گھر میں لایا تھا تو ان کی طرف سے بے حد فکرمند تھا۔ اس نے اپنے گارڈز کو چوکس کر دیا تھا۔ سب انسپکٹروں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ چار دیواری سے باہر نہیں نکلیں گے۔ ان کی تمام ضروریات چار دیواری کے اندر ہی پوری کی جاتی تھیں۔

سب انسپکٹر راجندر اور پرشاد کے سلسلے میں اس حد درجہ احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ وہ نادر شاہ کی "ہٹ لسٹ" پر تھے۔ نادر شاہ جموں کشمیر کی وادیوں میں چکرانے والے اس خونی بگولے کا نام تھا جو اب تک درجنوں پولیس اہلکاروں کی جان لے چکا تھا۔ وہ کسی آسیب کی طرح اچانک نمودار ہوتا تھا اور اپنے بدقسمت شکار کے جسم سے زندگی کشید کر کے ناپید ہو جاتا تھا۔

عام کشمیریوں کے نزدیک وہ حریت پسند تھا۔ مجاہد تھا اور

آزادی کا متوالا تھا۔ قابض قوتوں کے نزدیک وہ دہشت گرد تھا' لٹیرا تھا اور قاتل تھا۔ ایک ہی شخص کے حوالے سے یہ کتنے متضاد تصورات تھے۔ نادر شاہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مجاہدین کے کسی گروہ سے منسلک نہیں تھا۔ وہ تنہا کام کرنے کا عادی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی گرفتاری ایجنسیوں کے لیے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً مشکوک افراد کو گرفتار کیا جاتا تھا۔ "ٹارچر سیلز" میں ان سے نادر کا پتا دریافت کیا جاتا تھا لیکن کسی کو معلوم ہوتا تو بتاتا۔ اس کی صورت تک سے کوئی واقف نہیں تھا۔ نہ اس کا کوئی گھربار تھا' نہ عزیز و اقارب کے بارے میں کسی کو معلومات تھیں۔

قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے "جموں" کے نواح سے گرفتار ہونے والے ایک علیحدگی پسند (مجاہد) کے پاس سے ایک ڈائری ملی تھی۔ اس ڈائری میں ناموں کی ایک فہرست موجود تھی۔ بعد ازاں انکشاف ہوا تھا کہ یہ فہرست دراصل ایک ہٹ لسٹ ہے اور اس ہٹ لسٹ کا تعلق نادر شاہ سے ہے۔ اس فہرست میں قریباً پندرہ افراد کے نام درج تھے۔ یہ سب کے سب پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ہندو اہلکار تھے۔ ان میں سے دس افراد کو نادر ہلاک کرچکا تھا۔ تین افراد دور دراز علاقوں میں ٹرانسفر ہوچکے تھے۔ صرف دو افراد ایسے تھے جو وادی میں موجود تھے۔ یہ سب انسپکٹر راجندر اور پرشاد تھے۔ یہ وجہ بھی فوراً ہی سمجھ میں آگئی تھی کہ نادر نے ان دو افراد کا نام ہٹ لسٹ میں کیوں شامل کیا ہوگا۔ یہ دونوں سب انسپکٹر دو تین ماہ پہلے تک اے ایس آئی تھے۔ انہوں نے ایک کارنامہ انجام دیا تھا جس کے صلے میں انہیں فوراً سب انسپکٹر بنادیا گیا تھا۔ کارنامہ یہ تھا کہ ان دونوں افراد نے ایک سرگرم مجاہد کو گرفتار کرایا تھا۔ مجاہد کے ساتھ ہی جہادِ کشمیر کے فنڈ کی ایک کثیر رقم بھی پولیس کے ہاتھ لگی تھی۔ بعد ازاں یہ مجاہد پولیس کے ہاتھوں اذیتیں سہہ کر شہید ہوگیا تھا۔

نادر کی لسٹ میں جتنے بھی افراد تھے ان سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ انہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے مجاہدین کو شدید ذک پہنچائی تھی۔ کسی نے چادر اور چاردیواری کا تقدس پامال کیا تھا۔ کسی نے کسی شہید کے ورثا کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ کوئی ٹارچر سیل میں بہیمانہ تشدد کا مرتکب ہوا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں یہ لوگ وقتاً فوقتاً نادر شاہ کے ہاتھوں اذیت ناک موت مرے تھے۔ نادر شاہ کا خاص طریقۂ قتل تھا۔ وہ خنجر سے ہلاک کرتا تھا اور اکثر مقتول کا پیٹ اس بری طرح چاک کردیتا تھا کہ وہ موقع پر ہی دم توڑ دیتا تھا۔

نادر کی ہٹ لسٹ دیکھنے کے بعد ایس پی چوہان شدید بے چینی کا شکار ہوگیا تھا۔ یہ بات واضح طور پر اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ دونوں سب انسپکٹر شدید جانی خطرے سے دوچار ہیں۔ ان میں سے ایک اس کا سگا بھتیجا تھا۔

چند اعلیٰ افسران کے سوا اس ہٹ لسٹ کا کسی اور کو علم نہیں تھا۔ شاید ایس پی کو بھی علم نہ ہوتا لیکن چونکہ یہ لسٹ اسی نے دریافت کی تھی لہٰذا وہ آگاہ ہوگیا تھا۔ اس نے ایک میٹنگ میں اعلیٰ افسران کو تجویز پیش کی کہ دونوں سب انسپکٹرز کو فوری تحفظ دیا جائے کیونکہ اس امر کا شدید اندیشہ ہے کہ نادر شاہ حسبِ روایت ان دونوں افراد کی جان لینے کی کوشش کرے گا۔

ایس پی کی یہ تجویز مان لی گئی تھی۔ فیصلہ ہوا تھا کہ نادر شاہ کی گرفتاری تک دونوں سب انسپکٹر ایس پی چوہان کی ذاتی نگرانی میں رہیں گے اور وہ ان کی حفاظت کا انتظام کرے گا۔ اس فیصلے کے بعد ایس پی چوہان دونوں سب انسپکٹرز کو اپنے گھر لے گیا تھا اور ایک علیحدہ پورشن انہیں رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ ایس پی چوہان کو یہ توقع بھی تھی کہ شاید نادر شاہ ان دونوں اہلکاروں کا کھوج لگاتا ہوا یہاں پہنچے اور دھرلیا جائے۔

شروع کے دو تین ہفتوں تک تو ایس پی چوہان بے حد چوکس رہا تھا اور اس کے ملازمین بھی ہوشیار باش رہے تھے لیکن پھر رفتہ رفتہ سب کچھ "روٹین" میں آگیا تھا۔ دونوں سب انسپکٹروں کی یہاں موجودگی "معمولی بات" ہوگئی تھی۔ ان کی آمد سے کوٹھی میں جو ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوئی تھی' وہ بتدریج ختم ہوتی چلی گئی تھی۔ اب وہ دونوں کوٹھی میں آزادانہ گھومتے تھے۔ لان میں بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ ملازمین کے ساتھ گپ شپ لگاتے تھے' کوٹھی میں آنے جانے والی خادماؤں کو تاڑتے تھے۔ کبھی کبھی تاکا جھانکی کے لیے کوٹھی سے باہر بھی نکل جاتے تھے۔ خود ان دونوں کو بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ انہیں ایس پی کی ذاتی رہائش گاہ پر اتنی حفاظت سے کیوں رکھا گیا ہے۔ ایس پی چوہان نے بس انہیں یہ بتایا تھا کہ اوپر سے آرڈر ہے۔

جس رات دونوں سب انسپکٹر بے دردی سے قتل کیے گئے' ایس پی چوہان گھر ہی میں تھا۔ رات قریباً ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ وہ وسیع بیڈ روم میں اپنی پتنی کے پہلو میں بے خبر سویا پڑا تھا۔ اچانک ایک تیز آواز نے اسے جگادیا۔ یہ آواز برآمدے کی طرف سے آئی تھی۔ راجو نام کا ایک ملازم بڑے زور سے چلایا تھا۔ پھر چوہان نے تھری ناٹ تھری رائفل چلنے کی آواز سنی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور دیوار سے آویزاں ہولسٹر میں

سے سرکاری پستول کھینچ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ برآمدے کی طرف اٹھی تھی اور چند لمحے کے لیے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ برآمدے میں سب انسپکٹر راجندر اور پرشاد کے خونچکاں جسم پڑے تھے۔ پرشاد کا آدھا دھڑ کمرے میں اور آدھا برآمدے میں تھا۔ پرشاد سیدھا پڑا تھا اور راجندر اوندھا۔۔۔ پرشاد کے جسم میں زندگی کی رمق باقی تھی لیکن راجندر بے حس و حرکت نظر آتا تھا۔ پرشاد کا زخم صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی نیلی قمیص میں سے باہر نکلی ہوئی انتڑیاں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ اس کا پیٹ چاک ہے۔۔۔ اور یہ چاک شدہ پیٹ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ ان دونوں افراد کا قاتل نادر شاہ ہے۔ یہ سب کچھ ایس پی چوہان نے شاید سیکنڈ کے دسویں حصے میں دیکھ لیا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ملازم راجو پر پڑی۔ وہ ہیجانی انداز میں کسی کے پیچھے لپک رہا تھا۔ وہ خود بھی راجو کے پیچھے دوڑ پڑا۔ بیرونی دروازے سے نکل کر وہ گلی میں آئے۔ قریباً پچاس گز کی دوری پر چوہان نے دو تین سایوں کو سرپٹ بھاگتے دیکھا۔۔۔ ساتھ ساتھ وہ شور مچا رہے تھے "بھاگو' پکڑو۔ جانے نہ پائے"۔

راجو اور چوہان بھی تعاقب کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔ یہاں گلیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ تیزی سے بھاگتے ہوئے دو تین موڑ مڑنے کے بعد ایس پی چوہان کو اپنا دوسرا ملازم رام پال بھی نظر آیا۔ اس کے بھاگنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ قاتل کو دیکھ چکا ہے۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ وہ چلا رہا تھا لیکن پھر ایک دم فائر ہوا اور ایس پی چوہان نے رام پال کو الٹ کر گرتے دیکھا۔ یقیناً اسے گولی لگ گئی تھی۔ رکنے کا وقت تھا اور نہ رام پال کو سنبھالنے کا۔ اوّلین مقصد قاتل کو پکڑنا تھا۔ پیچھا کرنے والے سارے افراد بھاگتے ہوئے رام پال کے قریب سے گزر گئے۔

پچاس ساٹھ گز آگے جاکر سب کو رکنا پڑا۔ یہاں ایک سہ راہا تھا۔ تین اطراف میں تین تاریک گلیاں اپنے خالی منہ پھاڑے ہوئے تھیں۔ قاتل کا دور دور پتا نہیں تھا۔ تعاقب کرنے والے کچھ دیر ان گلیوں میں بھٹکتے رہے' ایک دوسرے کو آوازیں دیتے رہے۔ دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور چیخ چنگھاڑتے رہے لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

پورے علاقے کے مکین بیدار ہوگئے تھے اور ہر چہرہ سوال نظر آرہا تھا۔ ایس پی چوہان دوسرے افراد کے ساتھ واپس آیا تو رام پال کو اسپتال پہنچایا جاچکا تھا۔ قاتل کی چلائی ہوئی گولی اس کے بائیں شانے میں لگی تھی۔ اوندھے منہ پختہ سڑک پر گرنے سے اس کے چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔

ایس پی چوہان کی رہائش گاہ پر تہلکہ مچا ہوا تھا۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم تھا اور رہائش گاہ کے محافظ انہیں مین گیٹ سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہے تھے۔ اندر برآمدے میں دونوں سب انسپکٹروں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ دونوں کے پیٹ پر زخم آئے تھے اور یہ اسی دندانے دار خنجر کے زخم تھے جو نادر شاہ استعمال کرتا تھا۔

○☆○

نادر شاہ موقع سے فرار تو ہوگیا تھا لیکن ایک بات خوش آئند تھی۔ وہ ابھی تک ناقابلِ شناخت تھا لیکن اب قابلِ شناخت ہوگیا تھا۔ ایس پی چوہان کے ملازم رام پال نے اسے دیکھ لیا تھا۔ درحقیقت رام پال ہی اس واردات کا چشم دید گواہ تھا۔ واردات کی رات وہ پتے کے درد میں مبتلا تھا اور اپنے سرونٹ کوارٹر میں مسلسل جاگ رہا تھا۔ اچانک اسے آہٹ سنائی دی' اس نے باہر آکر دیکھا۔ تین افراد گتھم گتھا

قلمی دوستی

رشین' آسٹریلوی' یورپین' امریکن' کورین' انڈین' پاکستانی' لڑکے' لڑکیوں سے دوستی' سیروسیاحت' بیرون ملک تعلیم' کاروبار' ملازمت' میرج' ڈاک ٹکٹ' تحائف اور دیگر مشاغل کے تبادلہ و تکمیل کے لیے دو تازہ انٹرنیشنل میگزین آج ہی بذریعہ VP منگوائیں۔

مس حنا' پوسٹ بکس نمبر15514 کراچی کینٹ

موبائیل 0321-7274191

تھے۔ ان میں گہری نیلی شلوار قمیص والا ایک شخص کافی پھرتیلا نظر آتا تھا۔ رام پال کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے خنجر کا وار کیا اور ایک شخص پیٹ پکڑ کر برآمدے کے درمیان جا گرا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں رام پال نے دیکھا' وہ سب انسپکٹر پرشاد تھا۔ پھر رام پال نے سب انسپکٹر راجندر کو بھی لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ درحقیقت راجندر پہلے سے ہی زخمی تھا اور ہمت کرکے قاتل سے چمٹا ہوا تھا۔ رام پال نے دیکھا کہ قاتل کے منہ سے ڈھاٹا کھل گیا تھا۔ وہ ایک جوان سال شخص تھا۔ پیشانی چوڑی اور رخسار ابھرے ہوئے تھے۔ اس کے بال گھونگھریالے تھے۔ راجندر کے گرتے ہی وہ شخص پلٹ کر بھاگا۔ رام پال نے شور مچایا اور اس کا پیچھا کیا۔ اسی دوران میں کچھ اور لوگ بھی رام پال کے ساتھ اس تعاقب میں شامل ہوگئے لیکن کچھ آگے جاکر جب رام پال قاتل کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا' قاتل نے پلٹ کر فائر کردیا تھا۔

رام پال ایس پی کا جانا پہچانا ملازم تھا لیکن وہ مستقل ملازم نہیں تھا۔ وہ سری نگر کے کسی مضافاتی گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ سال میں دو تین دفعہ کھیتی باڑی کے کام سے فرصت ہوتی تھی تو وہ ایس پی کے پاس چلا آتا تھا۔ وہ محنتی اور قابل بھروسا تھا۔ ایس پی چوہان اسے جو کچھ دیتا تھا' وہ خوشی سے لے لیتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ ایس پی کی کوٹھی میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ رام پال گونگا تھا لیکن اشاروں کنایوں کے ساتھ اپنی بات اتنی وضاحت سے سمجھا دیتا تھا کہ اس کی "بے زبانی" محسوس تک نہیں ہوتی تھی۔ خاص طور سے ساتھی ملازم تو الف سے ے تک اس کی بات سمجھتے تھے۔

سب انسپکٹرز کے قتل والے خونی واقعے کے بعد رام پال ایک دم ایس پی کے لیے بہت اہم ہوگیا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جس نے "بدنام دہشت گرد" کو دیکھا تھا اور اب دوبارہ دیکھ کر پہچان سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ کم از کم سوپور کی پولیس کے لیے تو بہت بڑی بات تھی۔ پورے ڈپارٹمنٹ کو اطمینان ہوگیا تھا کہ کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جو نادر شاہ کو پہچان سکتا ہے۔

اس واقعے کے بعد بہت سے افراد کی گرفتاری ہوئی۔ کم و بیش ڈیڑھ سو نوجوان تو سوپور شہر سے ہی گرفتار کیے گئے۔ ان میں سے "زیادہ مشکوک" افراد کو اسپیشل عقوبت خانوں میں پہنچا دیا گیا۔ سوپور کے کئی تھانوں میں شناختی پریڈ کی کارروائی ہوئی۔ ایسی تمام شناختی پریڈز کا مرکزی کردار رام پال ہی تھا۔ اسے اس قاتل کو پہچاننا تھا جس نے ایس پی چوہان کے گھر میں گھس کر دو سب انسپکٹرز کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ رام پال کو ان عقوبت خانوں میں بھی لے جایا گیا جہاں بے گناہ کشمیری دن رات اپنے صبر و استقامت کا امتحان دے رہے تھے۔ بہرحال یہ ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ رام پال کو کہیں وہ شخص دکھائی نہیں دیا جو اس رات سہلکہ مچا کر فرار ہوا تھا۔

وہ پستول بھی موقع سے مل گیا تھا جس سے قاتل نے رام پال پر گولی چلائی تھی اور اسے زخمی کیا تھا۔ یہ پستول ایک خالی پلاٹ میں اگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ سے ملا تھا۔ پولیس نے پستول قبضے میں لے لیا تھا۔ اس پر فنگر پرنٹس کی تلاش ہوئی تھی لیکن پستول چونکہ کیچڑ میں لتھڑ چکا تھا اور رات بھر بارش میں پڑا رہا تھا لہٰذا فنگر پرنٹس مل نہیں سکے تھے۔

اس پستول کے سلسلے میں ایک بات اچنبھے کی تھی۔ پستول کے میگزین میں ابھی تک تین گولیاں موجود تھیں۔ یہ امر قابلِ غور تھا کہ اگر پستول میں تین گولیاں موجود تھیں تو مجرم نے اسے پھینکا کیوں؟ اس کا تعاقب کیا جارہا تھا۔ ایسے میں اسے ہتھیار کی شدید ضرورت تھی۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ پستول بھاگتے بھاگتے ہاتھ سے گر گیا ہو' اسے باقاعدہ پھینکا گیا تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد ایک ہی بات پولیس کی سمجھ میں آئی تھی۔ شاید بھاگتے بھاگتے پستول مجرم کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ جس شخص کے گھر کے سامنے پستول گرا تھا اس کی نگاہ پستول پر پڑی تھی اور اس نے پوچھ گچھ کے خوف سے پستول اٹھا کر خالی پلاٹ میں پھینک دیا تھا۔ اس لائن پر بھی پولیس نے تفتیش کی۔ اہلِ محلہ سے انویسٹی گیشن کی گئی لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔

نادر شاہ کے ہاتھوں دو سب انسپکٹرز کا قتل ایسا واقعہ نہیں تھا جسے آسانی سے بھلایا جاسکتا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں جب سوپور کے طول و عرض میں حریت پسندوں کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں اور آئے دن سنگین واقعات رونما ہو رہے تھے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کا ہر شخص اس کیس کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ رہا تھا۔ اعلیٰ افسروں کی طرف سے ایس پی چوہان پر سخت دباؤ تھا کہ وہ مجرم یا مجرموں کو فوری گرفتار کرے۔

ایس پی چوہان کا دل بار بار گواہی دے رہا تھا کہ یہ گتھی جب بھی سلجھے گی' رام پال کے ہاتھوں سلجھے گی۔ رام پال اس واردات کا چشم دید گواہ تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ رام پال نے ایس پی چوہان کی مدد کی تھی اور دو باغیوں (دہشت گرد) کو گرفتار کرائے تھے۔ یہ دونوں چوہان کے بقول خطرناک

دہشت گرد تھے اور انہوں نے دہشت گردی کی باقاعدہ ٹریننگ لے رکھی تھی۔ یہ ان دنوں کا واقعہ تھا جب رام پال پہلی مرتبہ ایس پی چوہان کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ اسے ملازمت کرتے شاید ایک ڈیڑھ مہینہ ہی ہوا ہوگا کہ ایک دن سرِراہ اس نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تھا۔ رام پال ایس پی چوہان اور اس کی پتنی کے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ وہ بازار سے گزر رہے تھے۔ اچانک رام پال نے ان دونوں افراد کو دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا۔ دونوں افراد کی تصویریں کئی مرتبہ اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں۔ رام پال نے چیخ کر ایس پی چوہان کو گاڑی روکنے کو کہا تھا اور اشاروں کنایوں کی مدد سے اسے ان دونوں دہشت گردوں کی طرف متوجہ کیا تھا۔ ایس پی چوہان کے ساتھ گن مین بھی موجود تھا۔ ایس پی نے اپنا پستول نکال لیا تھا اور گن مین کے ساتھ مل کر دونوں افراد کو قابو کر لیا تھا۔

یہ واقعہ جب بھی ایس پی کے ذہن میں آتا تھا' اس کا دل گواہی دینے لگتا تھا کہ اس مرتبہ بھی اس کا یہ گونگا ملازم شبہ ثابت ہوگا اور اس کی وساطت سے پیچیدہ واردات کی گتھی سلجھ جائے گی..... ایک دن وہ اشاروں کنایوں میں رام پال سے دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ رام پال کے بیان سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے مجرم کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ جو کچھ اشاروں کنایوں سے بتا رہا تھا' اس سے پتا چلتا تھا کہ مجرم درمیانے قد کا ہے' جسم چھریرا ہے' اس کا رنگ گندمی اور ناک ذرا اونچی ہے۔ دائیں رخسار پر ایک نمایاں تل بھی نظر آرہا تھا۔ رام پال نے یہ بھی بتایا کہ خنجر مجرم کے بائیں ہاتھ میں تھا اور اس نے سب انسپکٹروں پر بائیں ہاتھ سے ہی وار کیے۔

رام پال سے باتیں کرتے کرتے ایس پی کے ذہن میں اچانک ایک نئی بات آئی۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتما اٹھا۔ وہ کچھ دیر گہری نظروں سے رام پال کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"اٹھو رام پال' میں تمہیں ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں"

ساتھ ہی اس نے رام پال کو اٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔ رام پال کھڑا ہو گیا۔ ایس پی اسے لے کر باہر پورچ میں آیا۔ رام پال کو جیپ میں بٹھایا اور تیز رفتاری سے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہیڈ کوارٹر میں کمپیوٹر کا شعبہ حال ہی میں قائم ہوا تھا۔ اس شعبے کا ایک سیکشن خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں ماہر آپریٹر گرافکس کی مدد سے مجرموں کا خاکہ تیار کرتے تھے۔ ایسے خاکوں کی تیاری میں اکثر چشم دید گواہان مدد دیتے تھے۔ مغربی انداز کی یہ تفتیش ابھی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی پھر بھی گاہے گاہے خاطر خواہ نتائج نکل آتے تھے۔

ایس پی چوہان' رام پال کو لے کر سیدھا کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ میں پہنچا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ ایک بند کمرے میں بیٹھے نادر شاہ کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ رام پال کمپیوٹر کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور اشاروں کنایوں سے آپریٹر کی مدد کر رہا تھا۔ مانیٹر کی اسکرین پر ایک جواں سال شخص کی شبیہہ موجود تھی۔ مختلف قسم کے ہونٹ اس شبیہہ پر ایڈجسٹ ہو رہے تھے۔ رام پال مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ آخر یکبارگی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ یہ ہونٹ مجرم کے ہونٹوں سے قریب تر ہیں۔ اس کے بعد شبیہہ کے سر کو مختلف انداز کے بالوں سے ڈھانپا جانے لگا۔ ہر بار جب نئی طرز کے بال شبیہہ کے سر پر آتے' ایس پی چوہان سوالیہ نظروں سے رام پال کی طرف دیکھتا۔ رام پال نفی میں سر ہلاتا۔ کبھی اس کے چہرے پر الجھن نظر آتی' کبھی یقین کی سی کیفیت ہوتی۔ آخر کچھ دیر بعد اس نے اپنا سر اقرار میں ہلا دیا۔ بالوں کے بعد آنکھوں کی باری آئی۔ آنکھوں کے بعد گردن کی ساخت پر غور و خوض ہوا۔ قریباً دو گھنٹے بعد ایک مکمل شبیہہ کمپیوٹر کی اسکرین پر موجود تھی۔ اس شبیہہ کو دیکھ کر ایس پی چوہان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آرہے تھے۔ ان تاثرات میں تذبذب' بے یقینی' تشویش' سبھی کچھ شامل تھا۔ وہ ہونٹ کی چسکی لے کر گاہے گاہے غور سے کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔

○☆○

رات کے دو بجے تھے۔ ایس پی چوہان اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ قریب ہی بیڈ پر اس کی فربہ اندام پتنی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے خراٹے ایس پی چوہان کو تکلیف دیتے تھے لیکن اس وقت ایک ایسی سوچ ایس پی چوہان کے ذہن میں تھی جو ان خراٹوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ... تھی لہٰذا خراٹوں کی طرف ایس پی چوہان کا دھیان نہیں جا رہا تھا۔

آج جو شبیہہ ایس پی نے کمپیوٹر پر دیکھی تھی وہ اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھی۔ یہ شبیہہ ایک ایسے شخص سے مشابہ تھی جسے چوہان اچھی طرح جانتا تھا اور یہ مشابہت اتنی واضح تھی کہ چوہان کے جسم پر بار بار چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ وہ اپنے ذہن کو ادھر اُدھر کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن اس کا دھیان گھوم پھر کر ایک مخصوص نقطے پر ٹھہر جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اپنے برادرِ

نسیج راکیش کی صورت گھوم جاتی تھی۔ راکیش ایک بدنام شخص تھا۔ کچھ عرصہ پولیس میں بھی رہا لیکن پھر نکالا گیا تھا۔ پولیس سے نکل کر اس نے بہت سے کام کیے تھے۔ وہ سب کے سب برے کام تھے۔ پہلے اس نے شراب کا اڈا چلایا پھر جوا کرایا۔ اس کے بعد وہ اسلحے کی ناجائز خرید و فروخت کا دھندا کرنے لگا۔ یہ دھندا اسے راس آیا اور کئی دوسرے دھندوں میں پڑنے کے باوجود اس نے کسی نہ کسی طور اسلحہ فروشی سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ غیر قانونی دھندے کرنے والے اکثر لوگوں کی طرح راکیش کا مطمح نظر بھی صرف اور صرف پیسہ تھا۔ رقم لے کر وہ کسی کے بھی اسلحہ فراہم کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ راکیش نے فیروز نامی ایک شخص کے ساتھ مل کر مجاہدین کو بھی اسلحہ فراہم کیا ہے۔ بہرطور یہ سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات تھی۔

اب یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے چوہان کے ذہن میں آ رہی تھیں اور اس کا دماغ ہانڈی کی طرح ابلنا شروع ہو گیا تھا۔ ایک سوال رہ رہ کر اس کے دل کی گہرائیوں سے کسی چیخ کی طرح ابھرتا تھا اور پورے جسم میں سنسنی بن کر دوڑ جاتا تھا "کہیں۔۔۔ راکیش ہی تو نادر شاہ نہیں ہے؟"

اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور وہ لیزر پرنٹ آؤٹ نکال لیا جو آج صبح اس نے کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کیا تھا۔۔۔ یہ وہ خاکہ تھا جو آرٹسٹ نے گونگے ملازم رام پال کی مدد سے بنایا تھا۔ وہ روشنی کی طرف کر کے خاکے کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ وہی ٹھوڑی' وہی ناک' قریباً ویسے ہی ابھرے ہوئے رخسار اور دائیں رخسار پر ٹھیک اسی مقام پر تل جہاں راکیش کا تل تھا۔ دونوں سب انسپکٹرز کو قتل کرنے والے شخص کی طرح راکیش بھی اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا۔ جوں جوں چوہان گہرائی میں جا کر سوچ رہا تھا' اس کے اندرونی ہیجان میں اضافہ ہو رہا تھا۔

گونگے ملازم رام پال نے کبھی راکیش کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ دیکھ بھی کیسے سکتا تھا' راکیش سری نگر میں رہتا تھا اور کبھی اس نے چوہان کے گھر اس کا آنا نہیں ہوا تھا۔ اس کی حرکتیں ایسی تھیں کہ چوہان اس سے میل جول کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے دروازے راکیش پر بند کر رکھے تھے۔ ہاں اس کی بیٹی کی محبت کبھی کبھار جوش مارتی تھی تو وہ سری نگر جا کر بھائی سے مل آتی تھی۔ ایس پی چوہان خود بھی کوئی اچھا تو نہیں تھا لیکن اپنے سالے کی برائی کے سامنے اس کی ندائی پانی بھرتی تھی۔

راکیش کا ایس پی چوہان کو کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن جب سے اس نے کالے دھندوں میں ہاتھ پاؤں پھیلائے تھے' دونوں کے درمیان لامتناہی فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ راکیش اکثر ایس پی چوہان کے لیے مشکلات کھڑی کرتا رہتا تھا۔ کبھی تو ایس پی ان مشکلات سے بچ بچا کر گزر جاتا تھا لیکن کبھی اسے راکیش سے ٹکرانا بھی پڑتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے راکیش پر الزام لگا تھا کہ اس نے شکنتلا نامی ایک کالج گرل کو ریپ کر دیا ہے۔ نتیجے میں چوہان کو راکیش کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنی پڑی تھی۔ ایسے موقعوں پر چوہان پر کئی طرح کے "دباؤ" پڑتے تھے اور اسے راکیش کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ ان "کئی طرح کے دباؤ" میں ایک دباؤ چوہان کی بھاری بھرکم پتنی کا بھی تھا۔

آج اگر راکیش کے بارے میں سوچ کر ایس پی چوہان کا دماغ ہانڈی کی طرح کھولنے لگا تھا تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ایس پی چوہان کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ راکیش کوئی نہایت خطرناک کھیل' کھیل رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ درپردہ ان دہشت گردوں میں شامل ہو چکا ہو جو خود کو مجاہدین کہلاتے ہیں۔ پھر یہ سنسنی خیز خیال اس کے دماغ کی چولیں ہلانے لگا کہ کہیں یہ حرام زادہ راکیش ہی نادر شاہ نہ ہو۔۔۔ وہ چھلاوا جس نے سوپور کی پولیس کو ننگی کا ناچ نچا رکھا ہے اور جو پوری وادی میں خون آشام وارداتوں کا ذمے دار ہے۔ پھر ایس پی چوہان کا خیال اس امر کی طرف چلا گیا کہ سری نگر میں آج کل علیحدگی پسند (مجاہدین) جدید اسلحے سے لیس نظر آ رہے تھے۔ ایک دو واقعات میں علیحدگی پسندوں کے قبضے سے جدید ہتھیار بھی برآمد ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں اسلحے کی یہ فراوانی بھی تو راکیش کی ہی مرہونِ منت نہیں۔

وہ جتنا سوچ رہا تھا' اتنا ہی اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ معاملہ پیچیدہ ہے۔ اس کیس کے حوالے سے دو تین سوالات بار بار اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہے تھے' جن میں سے ایک یہ تھا کہ واردات کی رات بھاگتے ہوئے قاتل نے اپنا پستول لوڈڈ ہونے کے باوجود پھینک کیوں دیا تھا؟

ایک دم ایس پی چوہان کے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ وہ اسٹڈی میں گیا اور ایک الماری کھول کر مختلف اشیا کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ جلد ہی اسے دو بڑے سائز کے البم مل گئے۔ اس نے ایک البم کی ورق گردانی شروع کی۔ اس کی توقع درست ثابت ہوئی۔ راکیش کی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر البم میں موجود تھی۔ اس نے تصویر نکالی اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ رات کے ڈھائی تین بجے کا عمل تھا۔ یقیناً رام پال اپنے سرونٹ کوارٹر میں گہری نیند سو رہا تھا۔ ایس پی چوہان نے چوکیدار کو بھیج کر رام پال کو بلوایا اور راکیش کی تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔

رام پال گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ الجھن دھیرے دھیرے تحیر میں بدلنے لگی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ایس پی چوہان کو دیکھا۔ چوہان نے پوچھا "رام پال! کیا یہی ہے وہ شخص؟"

رام پال کے چہرے پر ایک لمحے کو تذبذب نظر آیا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک دم ایس پی چوہان کے دل و دماغ میں ابال سا آگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا' بیڈ روم میں جاکر سرکاری پستول کمر سے باندھا اور دروازہ کھول کر پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ابھی اور اسی وقت سری نگر روانہ ہو رہا تھا۔ سری نگر' جہاں راکیش رہتا تھا۔

○☆○

اگلے روز کے اخبارات میں یہ خبر موجود تھی "سری نگر میں ایس پی نے اپنے برادرِ نسبتی کو فائرنگ کرکے ہلاک کردیا۔"

ذیلی سرخی میں لکھا تھا "میرا برادرِ نسبتی راکیش پانڈے ہی نادر شاہ کے نام سے خونی وارداتیں کر رہا تھا۔ ایس پی چوہان۔"

ایک ذیلی سرخی میں لکھا تھا "ڈرامائی واقعے میں ایس پی چوہان بھی زخمی ہوئے۔"

ان سرخیوں کے نیچے واقعے کی تفصیل کچھ یوں درج تھی "آج علی الصباح سپرنٹنڈنٹ پولیس چیتن چوہان نے اپنے برادرِ نسبتی راکیش پانڈے کو فائرنگ کرکے ہلاک کردیا۔ راکیش پانڈے موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ اس کے سینے اور سر میں چار گولیاں لگیں۔ یاد رہے کہ راکیش پانڈے جرائم کی دنیا کا ایک بدنام شخص تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ ناجائز اسلحے کا دھندا کرتا تھا۔ وہ متعدد بار گرفتار ہوا لیکن بااثر افراد کے دباؤ کی وجہ سے طویل سزا پانے سے بچا رہا۔ باخبر ذرائع کے مطابق ایس پی چوہان کو کچھ ایسی اطلاعات ملی تھیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ راکیش پانڈے ہی دراصل نادر شاہ کے روپ میں قتل و غارت کی وارداتیں کر رہا ہے۔ دو تین ہفتے پہلے ایس پی چوہان کی سرکاری رہائش گاہ پر ہلاک ہونے والے دونوں سب انسپکٹروں کے قتل کا شبہ بھی راکیش پانڈے پر ہی کیا جا رہا تھا۔ آج صبح سات بجے ایس پی چوہان اپنے گن مین کے ساتھ سوپور سے سری نگر پہنچے۔ انہوں نے راکیش پانڈے سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں دونوں کے درمیان شدید تلخ کلامی ہوئی اور نوبت فائرنگ تک پہنچ گئی۔ راکیش پانڈے نے ایس پی چوہان پر گولی چلائی۔ ایس پی چوہان اور اس کے گن مین نے اپنے دفاع میں فائرنگ کی اور راکیش موقع پر ہلاک ہوگیا۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔"

اس خبر کے قریب ہی باکس میں یہ خبر بھی موجود تھی۔

"راکیش پانڈے کو ایس پی چوہان نے فرض شناسی کی بنا پر نہیں' ذاتی رنجش کی بنا پر قتل کیا۔ چوہان کا یہ بیان مضحکہ خیز ہے کہ راکیش پانڈے ہی نادر شاہ کے روپ میں جرائم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ راکیش کا کبھی کسی علیحدگی پسند سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ جرائم پیشہ ضرور تھا لیکن دیش بھگت تھا۔ مزید برآں ایس پی چوہان کی پتنی سروج دیوی نے کہا ہے کہ اس کا بھائی نردوش تھا۔ ایس پی چوہان نے اسے عداوت کی بنا پر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ ایس پی کے سسرالی رشتے دار ایس پی کے خلاف قتل کا پرچہ درج کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ چٹخارے دار اخبار بے شمار لوگوں کے ہاتھوں میں تھا اور ایس پی چوہان کے ہاتھ میں بھی تھا۔ وہ اسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کا ایک بازو پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ راکیش پانڈے کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کے دائیں کندھے پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔

اخبار کو بے دلی سے دیکھ کر اس نے ایک طرف پھینک دیا اور سر تکیے پر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ جسم کے مختلف حصوں سے اٹھنے والی درد کی لہریں برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً چوہان کا ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ پہلے تو چوہان یہی سمجھا کہ شاید اس کی غضب ناک پتنی یا کوئی سسرالی رشتے دار پہرا توڑ کر اندر گھس آیا ہے لیکن پھر فوراً اسے یہ خیال رد کرنا پڑا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے تلخ کلامی یا بحث مباحثے کی آواز سنائی دیتی۔

"کیا ہوا؟" چوہان نے بے ساختہ پوچھا۔

"سر! بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے" ملازم نے ہکلا کر کہا "کوٹھی میں واردات ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" چوہان دہاڑا۔

"سرجی' آپ۔۔۔ آپ۔۔۔"

"اوہ کچھ بکو بھی؟" چوہان پھر دہاڑا۔

"سرجی' کوئی مورکھ سارے گھر کا صفایا کرگیا ہے۔ کوٹھی میں بارہ گارڈز تھے۔ اس کے علاوہ دو چوکیدار بھی تھے۔ وہ سب کے سب بے ہوش پڑے ہیں اور ان کی رائفلیں' ایمونیشن' وردیاں سب کچھ غائب ہے۔ بالکل ننگے پڑے ہیں وہ۔۔۔ تہ خانے کے چھوٹے دروازے کا تالا بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ وہاں سے بھی ایمونیشن اور ہتھیار غائب ہیں۔ تہ خانے کے گودام کی رکھوالی گارڈ جسونت سنگھ کر رہا تھا' اسے پیٹ میں خنجر مار کر ہلاک کردیا گیا ہے۔"

لمحوں میں ایس پی چوہان کے سیاہی مائل ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ اس کا پورا بدن زلزلے کی زد میں تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ تین ہفتے پہلے اس کی رہائش گاہ میں بڑی دیدہ دلیری سے گھس کر دو سب انسپکٹروں کو ہلاک کر دیا گیا اور اب اسی قسم کی ایک اور واردات کی اطلاع مل رہی تھی۔ اگر سوپور میں ایس پی چوہان کا گھر اور اس کے مسلح گارڈز محفوظ نہیں تھے تو اور کون محفوظ ہو سکتا تھا۔ وہ بوکھلایا ہوا اٹھا۔ اس نے گلوکوز کی ڈرپ اتار پھینکی' چپل پہنی اور اندھا دھند بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈیوٹی پر موجود اسپتال کا عملہ اسے روکتا رہ گیا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے گھر میں موجود تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے ارد گرد کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ بڑی بے خوفی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اہل خانہ اور ملازمین و گارڈز سمیت تمام افراد کو کھانے میں تیز خواب آور دوا کھلا دی گئی تھی۔ اس کے بعد اطمینان سے کارروائی کی گئی تھی۔ گارڈز کو نہ صرف اسلحے سے محروم کیا گیا تھا بلکہ ان کی وردیاں تک اتار کر انہیں مادر زاد برہنہ چھوڑ دیا گیا تھا۔

"کس نے کی ہے یہ جرأت؟ کون ایسی بے خوفی کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟"

یہ سوال بار بار ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر برس رہا تھا "یہ کوئی جرائم پیشہ ہے؟ علیحدگی پسند ہے؟ کوئی دیرینہ دشمن ہے؟ یا پھر۔۔۔ یا پھر وہی نادر شاہ۔۔۔؟" چوکیدار کے قتل کا انداز ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ایس پی چوہان نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی "ہیلو چوہان! کیسے ہو؟"

"کون ہو تم؟" چوہان غرایا۔

"تمہارا مطلوب۔ جسے تم تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ جس کے لیے جگہ جگہ سر پٹخ رہے ہو۔"

"میں پوچھتا ہوں' کون ہو تم؟ اپنا نام بتاؤ۔"

"نادر شاہ!" دوسری طرف سے پُرسکون لہجے میں کہا گیا۔

"کک۔۔۔ نادر شاہ؟" چوہان کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں نادر شاہ۔۔۔ ویسے تم مجھے رام پال کے نام سے جانتے ہو۔"

"کون رام پال۔۔۔"

دوسری طرف سے ہلکا سا قہقہہ لگایا گیا "میرا خیال ہے ایس پی! تمہیں ابھی تک اپنے ایک ملازم کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ اچھے پولیس والے ہو تم؟ اپنے گھر ہی کی خبر نہیں ہے۔ تمہارا ملازم رام پال گھر میں موجود نہیں۔"

ایس پی چوہان کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلتی جا رہی تھیں "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔ تم نادر شاہ کو راکیش میں ڈھونڈتے رہے ہو لیکن وہ تمہارے کونگے ملازم رام پال میں تھا۔"

"کک۔۔۔ تو تم رام پال ہو؟"

"ہاں' رام پال ہوں لیکن تمہارے لیے۔۔۔ میری "اصل" نادر شاہ ہے۔"

ایس پی چوہان کی بولتی بند ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

بھاری آواز والے نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے ہوں گے۔ میں اس مختصر وقت میں ان تمام سوالوں کے جواب تو نہیں دے سکتا' ہاں تمہاری شدید الجھن رفع ضرور کر سکتا ہوں۔ تمہارے دونوں سب انسپکٹرز میرے ہی ہاتھوں جہنم واصل ہوئے تھے۔ اس کارروائی کے دوران میں تمہارے دو ملازمین کی آنکھ کھل گئی تھی' وہ وقوعہ کی طرف دوڑے تھے۔ میں ان سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ بعد ازاں بہت سے لوگ میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ تم بھی ان میں شامل تھے۔ وہ سب "بھاگو پکڑو" چیخ رہے تھے۔۔۔ میں نے بھی شور مچانا۔۔۔۔۔ شروع کر دیا تھا۔ اکثر لوگوں نے یہی سمجھا تھا کہ میں بھاگنے والا نہیں بلکہ پکڑنے والا ہوں لیکن یہ امکان بھی تھا کہ مجھ پر شبہ کیا جائے گا کیونکہ میرے آگے تو کوئی بھاگ نہیں رہا تھا۔ لہٰذا میں نے کچھ آگے جا کر اپنے ہی پستول سے خود کو زخمی کر کے گرا لیا تھا۔ پستول خالی پلاٹ میں پھینک دیا تھا۔ یقیناً اب تمہاری سمجھ میں یہ نکتہ بھی آ گیا ہو گا کہ میگزین میں گولیاں ہونے کے باوجود پستول کیوں پھینکا گیا تھا۔"

"تم۔۔۔ تم بکواس کر رہے ہو۔ تم جھوٹ بک رہے ہو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ۔۔۔"

"پلیز سائلنٹ۔۔۔ پلیز' میری بات مکمل ہو لینے دو" بھاری آواز والے نے بڑی نرمی سے کہا۔ ایس پی چوہان دانت پیس کر رہ گیا۔ ذرا توقف کر کے بھاری آواز والے نے کہا "تم لوگوں کو یقین تھا کہ میں نے نادر شاہ کو دیکھا ہے۔ میں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ میں نے تمہارے اس خیال کو تقویت دی کہ میں واقعے کا اکلوتا چشم دید گواہ ہوں اور نادر شاہ کو اچھی طرح پہچان سکتا ہوں۔ میں نے تمہارے برادرِ نسبتی راکیش کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ راکیش ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ بے شک اس نے ایک

مرتبہ مجاہدین کو اسلحہ فروخت کیا تھا لیکن مجاہدین سے اس کا دور کا تعلق واسطہ بھی نہیں تھا بلکہ اب تو کچھ عرصے سے وہ مجاہدین کے لیے شدید نقصان کا باعث بن رہا تھا۔ اس کا رابطہ بی ایس ایف کے ایک افسر سے ہو چکا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً بی ایس ایف کو مجاہدین کے خلاف معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ راکیش سے تمہاری پرانی عداوت ہے۔ میں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور جب تم نے کیپچر سیکشن میں مجھ سے مجرم کا خاکہ بنوایا تو میں نے کوشش کی کہ میں ہو بہو راکیش کا خاکہ بنوا سکوں۔ میرا خیال ہے کہ میری کوشش توقع سے زیادہ کامیاب رہی اور میرے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر تم نے بالآخر راکیش کا خاتمہ کر دیا۔ امید ہے کہ اب تم بھی دردی سے لطف اندوز نہیں ہو سکو گے۔ اس دردی کے طفیل تمہارے لیے وہسکی اور عورت کی جو ارزانی اب تک رہی ہے' وہ نہیں رہے گی۔ اللہ نے چاہا تو تمہارا سواستیاناس ہو گا۔ تمہارے خلاف اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے اور دہشت پھیلانے کا کیس بن رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ۔۔۔"

"میں۔۔۔ میں تمہاری کسی بات پر وشواش نہیں کرتا۔۔۔ تم جھوٹے ہو۔۔۔ ڈراما باز ہو۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔"

"میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہاں تمہاری معلومات ادھوری رہ جائیں گی۔"

"میں تمہاری معلومات پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تم صرف بکواس کر رہے ہو۔ اگر۔۔۔ اگر تم واقعی نادر شاہ ہو اور تم نے رام پال کی حیثیت سے میرے گھر میں ملازمت کی ہے تو پھر پچھلے سال فروری میں پیش آنے والے واقعے کو تم کیا کہو گے؟"

"کون سا واقعہ؟"

"تمہاری بے خبری اس بات کا ثبوت ہے کہ تم رام پال نہیں ہو۔"

"ہاں۔۔۔ سمجھ گیا" بھاری آواز والے نے اطمینان سے کہا "تم یقیناً اس واقعے کا ذکر کر رہے ہو جب میں تمہارے ساتھ گاڑی پر بازار سے گزر رہا تھا اور میری نشان دہی پر تم نے دو مجاہدین کو گرفتار کیا تھا۔"

"ہاں' میں اسی واقعے کا ذکر کر رہا ہوں۔"

ایک بار پھر ریسیور پر ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ بھاری آواز والے نے کہا "ایس پی ہونے کے باوجود کبھی کبھی تم ہیڈ کانسٹیبل نظر آتے ہو۔ جن دو مجاہدین کو تم نے گرفتار کیا تھا' انہیں سری نگر جیل میں رکھا گیا تھا۔ تین ہفتے بعد وہ جیل ٹوٹ گئی تھی اور ان دونوں مجاہدین کے ساتھ تقریباً چالیس دوسرے حریت پسند بھی فرار ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہاری سمجھ میں آجانا چاہیے کہ وہ دونوں مجاہد اسپیشلی ٹرینڈ کمانڈوز تھے۔ انہیں جان بوجھ کر جیل بھیجا گیا تھا۔"

ایس پی چوہان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے یا کرے۔ اس کا جسم لرز تا جا رہا تھا۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ریسیور کریڈل پر پٹخ دے' کبھی دل چاہتا تھا کہ وہ مخاطب کو اپنی ڈکشنری کی بدترین گالیاں دینا شروع کر دے۔ کبھی وہ کچھ سوچ رہا تھا' کبھی کچھ۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز آنا شروع ہو گئی تھی کہ مخاطب جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل درست ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو قدم قدم پر اسے زک پہنچاتا رہا ہے اور اس کی تمام فہم و فراست اور پیشہ ورانہ مہارت کے بخیے ادھیڑتا رہا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کے گھر میں ملازم کی حیثیت سے مقیم رہا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرتا رہا ہے۔

بھاری آواز نے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "ان بے قصور نوجوانوں کو چھوڑ دو چوہان' جنہیں تم نے میرے شبہے میں گرفتار کر رکھا ہے۔ ان سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے تشدد کی وجہ سے ان میں سے کوئی اور نادر شاہ نمودار ہو جائے پھر وہ تمہاری جان کا روگ بن کر کشمیر کی رگوں میں سرایت کر جائے' تم کلی کلی اسے ڈھونڈتے پھرو' وہ تمہاری راتوں کا ڈراؤنا خواب بن جائے اور تمہارے دن اس کے خوف سے اکارت ہو جائیں۔ تم اس کو دیکھ سکو' نہ پکڑ سکو' نہ اس کا کوئی کھوج پا سکو۔"

"یو باسٹرڈ۔۔۔ آئی ول کل یو۔۔۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا" ایس پی چوہان چلایا۔

لیکن اس کا فقرہ شروع ہونے سے پہلے ہی فون بند ہو گیا تھا۔

اس وقت ایس پی چوہان کی نگاہ سیڑھیوں سے گزر کر دہلیز کے دروازے کی طرف چلی گئی۔ مقتول چوکیدار جسونت سنگھ کی خون آلود لاش اسی دروازے کے سامنے سے ملی تھی۔ سیڑھیوں پر ابھی تک خون کے دھبے موجود تھے۔ کسی نے اس خون میں انگلی ڈبو کر دیوار پر یہ الفاظ لکھ دیے تھے۔

"کشمیر کی آزادی تک۔۔۔ جنگ رہے گی۔۔۔ جنگ رہے گی۔"

چوہان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ الفاظ نادر شاہ نے ہی لکھے ہیں۔

ہے اور اس کا ثبوت دیگر گواہوں کے ذریعے ثابت ہو جائے گا۔"

میرے یہ دلائل سن کر کرم علی گھبرا گیا' جلدی سے بولا۔ "جنابِ عالی' میں نے ایم ڈی صاحب کو قتل نہیں کیا۔ مجھے اس معاملے میں نہ گھسیٹیں۔ میری توبہ" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میں اب جھوٹ نہیں بولوں گا' ملازمت رہے یا نہ رہے۔ اور لیس احمد اور مس عالیہ کہیں بھی نہیں گئے تھے البتہ وقوعہ کے بعد تھوڑی دیر کے لیے دفتر سے باہر گئے تھے۔"

وکیلِ استغاثہ نے جلدی سے اٹھ کر کہا "جنابِ عالی' میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ گواہ کو بار بار بیان بدلنے کی بنا پر منحرف اور گواہی کے لیے نااہل قرار دیا جائے۔"

جج نے وکیلِ استغاثہ کی درخواست مسترد کر دی اور جرح مکمل کرنے کے لیے کہا۔ میں نے گواہ سے پوچھا "کیا تم نے اور لیس احمد کے کہنے پر یہ بیان دیا تھا کہ وہ اور مس عالیہ پونے سات بجے رخصت ہو گئے تھے؟"

"جی ہاں" اس نے جواب دیا "یہ دونوں ہال میں تھے اور بتی بجھا کر ایم ڈی صاحب کے کمرے میں ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔"

"اس دوران تم نے کوئی خاص بات دیکھی یا سنی تھی؟"

"جی ہاں" اس نے ایک نظر اور لیس احمد کو دیکھا اور یک دم چلایا "جج صاحب! اس شخص کو گرفتار کر لیں۔ یہ بھاگ جائے گا۔ ایک معصوم آدمی کو گناہ کی راہ پر ڈال کر اپنے جرائم کی سزائے ناحق اسے دلوانا چاہتا ہے۔"

جج سمیت سب اور لیس احمد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور لیس احمد اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر نکلنے لگا۔ جج نے کمرے میں موجود سادہ لباس پولیس والوں کو خبردار کیا۔ "اور لیس احمد فرار نہ ہونے پائے۔"

اور لیس احمد تیزی سے اٹھ کر باہر نکلنے لگا مگر اس کے پیچھے بیٹھے شخص نے اسے اڑنگا دے کر گرا دیا۔ اس اثنا میں کمرے میں موجود تفتیشی پولیس افسر نے اسے کالر سے پکڑ لیا۔ اور لیس احمد خود کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا تو تفتیشی افسر نے ایک زوردار تھپڑ مار کر اس کی ہوا نکال دی۔

چند منٹ تک عدالت میں اچھا خاصا ہنگامہ رہا۔ صورتِ حال معمول پر آنے کے بعد عدالت کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔

گواہ نے اپنے ادھورا بیان سنایا "جنابِ والا! جب شوکت ہمدانی ایم ڈی کے کمرے میں تھے' اور لیس احمد مشینوں کے پاس آیا اور ایک لوہے کی راڈ اٹھا کر ہال کی جانب گیا۔ یہ راڈ وہی ہے جو قتل میں استعمال ہوئی ہے۔"

جج نے پوچھا "بیگ صاحب' آپ کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

"جنابِ عالی۔ اس نے انکشاف سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور سازش کا شکار ہوا ہے لہٰذا میں عدالت سے استدعا کروں گا کہ اسے باعزت بری کیا جائے تاکہ اس کی شہرت کو جو نقصان پہنچا ہے' اس کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ ہاں اسے بطور گواہ مقدمے میں شامل رکھا جا سکتا ہے۔"

جج نے خاموشی سے فائل پر اپنا حکم لکھا اور کہا "فی الحال میں شوکت ہمدانی کو رہا کر رہا ہوں۔ اس کی بریت کے معاملے پر اگلی پیشی پر غور کیا جائے گا۔"

جج نے تفتیشی افسر کو حکم دیا کہ وہ مقدمے کا نیا چالان پیش کرے اور مس عالیہ کو شاملِ تفتیش کیا جائے۔

حتمی فیصلہ سن کر ہم جب باہر نکلے تو عروج ہمدانی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ برآمدے کے بینچ پر افسردہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو بغیر ہتھکڑی دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں پر باقاعدہ چٹکی لے کر خود کو حواس میں محسوس کیا پھر وہ بھاگتی ہوئی آئی اور شوکت ہمدانی کو بغور دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور لب خاموش۔ تینوں بچے بھی باپ کو دیکھ کر قریب آ گئے۔ شوکت نے ہماری موجودگی کی پروا کیے بغیر اپنی دنیا کو اپنے بازوؤں کے حصار میں مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں تشکر سے بھیگ گئی تھیں۔

"عروج' دیکھ خدا نے تجھے بے مکان نہیں کیا۔ تیرا گھر سلامت رہ گیا ہے۔ یہ قدرت کا معجزہ ہے اور بیگ صاحب کی ذہانت کا کرشمہ۔"

"کیا آپ واقعی آزاد ہو گئے ہیں؟" عروج کو ابھی تک یقین نہیں تھا۔

میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"اللہ نے نرگس بیگم کو وسیلہ بنا کر بھیج دیا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔"

"مسز شوکت' یہ آپ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ہمت کی اور اپنے شوہر کو بچا لیا۔ دعا کریں اگلی پیشی پر ان کی رہائی کا باقاعدہ فیصلہ ہو جائے۔"

"آمین" شوکت ہمدانی کے تینوں بچے بے ساختہ بولے۔ شوکت ہمدانی نے دوبارہ انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

دوسری پیشی سے قبل پولیس نے مس عالیہ کو بھی گرفتار کر لیا اس نے اعتراف کیا کہ اس نے اور لیس احمد کے کہنے پر مین سوئچ آف کیا اور قتل کا ارتکاب اور لیس احمد نے کیا۔ پولیس نے اور لیس کے قبضے سے راڈ کی نقلی مہریں اور رسیدیں بھی برآمد کر لیں۔

ایک آخری بات بھی سن لیں۔ عالیہ نے پولیس کی حراست میں آنے کے بعد مجھ سے رابطہ کیا اور قانونی مدد طلب کی تھی۔ میں نے اسے سلطانی گواہ بننے میں مدد دی تھی۔ آخر کو وہ میری فین تھی۔

تحریر و ترتیب۔۔۔ (شاہد نذیر چوہدری)

وہ پیدائشی عاشق تھا۔ اس نے پہلی محبت صرف تین سال کی عمر میں کی تھی "بلوکی" کے نزدیک سرکاری کوارٹرز میں وہ اپنے نانا نانی اور ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک چمکیلی آنکھوں والی ننھی گڑیا سی لڑکی اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن حامد اسے جوجی پکارتا تھا۔ حامد کو صرف اتنا یاد ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر مٹی اچھالتے تھے، پانی میں کھیلتے تھے اور کیچڑ میں لت پت ہو جاتے تھے۔ پھر جب حامد کے والد کو لاہور میں ملازمت مل گئی تو انہوں نے لاہور کے مضافات میں کرائے کا مکان لے کر حامد اور اس کی والدہ کو بھی بلا لیا۔ لاہور آ کر حامد ایک دم اداس ہو گیا تھا۔ وہ پہروں چارپائی پر لیٹا نیلے آسمان کو تکتا رہتا اور توتلی زبان میں پکارتا رہتا "کاوس کی بہاریں تلی گئیں" (کاوس کی بہاریں چلی گئیں) پھر کبھی کبھی وہ جوجی کا نام لیتا اور اس کا دل گہری اُداسی سے بھر جاتا۔

لاہور میں حامد کو نئے ہمجولی ملے۔ نیا ماحول اور نئی مصروفیات

● ایک شخص کی زندگی سے رخصت ہوتے موسموں کا احوال ●

ایک پیدائشی عاشق کا محبت خیز احوال۔ خوب صورتی اُس کی کمزوری تھی اور اُداسی اُس کا پسندیدہ موسم۔ اپنائیت کے نئے نئے جہان فتح کرتا، قربت کے مرحلے زینہ بہ زینہ طے کرتا وہ ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گیا جہاں کوئی منزل تھی اور نہ راستہ! بس ایک بھیگا... کُہرآلود منظر اُس کے سامنے تھا۔

زیرِ نظر داستان مصنف کے ایک قریبی دوست کی یادیں ہیں جنھوں نے کہانی کی صورت صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ تحریر کے لوچ نے کرداروں کے جذبوں کی شدت، انتظار کی لذت اور فرقت کی کسک کو گویا زبان عطا کر دی ہے۔ اس کی نزاکت اور خوب صورتی کو آپ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکیں گے۔

یہ اُداس صبحیں
یہ اُداس شامیں

طاہر جاوید مغل



میسر آگئیں۔ دھیرے دھیرے اس کا دل جھل گیا۔ وہ فطری طور پر شرمیلا اور کم آمیز تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ ہر خوب صورت چیز اس کی کمزوری تھی۔ خوب صورتی کو دیکھ کر اُس کے دل میں عجیب سا حزن و ملال بھر جاتا تھا۔ وہ ایک دم اداس اور غم زدہ ہو جاتا۔ اس کے اندر کی رومانیت ابھر کر سامنے آتی اور اس کے پورے وجود کو ڈھانپ لیتی۔ درحقیقت اس کے رومانی جذبوں پر الوہی پن کی چھاپ تھی۔ اس کو انوکھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ ساڑھے پانچ چھ سال کی عمر میں اس نے دوسری اہم محبت کی..... اور یہ محبت کسی ایک فرد سے نہیں تھی' پورے ایک گروہ سے تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس نے اپنے ہی ہم عمر قریباً چار درجن بچوں سے محبت کی..... حامد کے گھر کے سامنے سبزی کے کھیت تھے۔ کھیتوں سے آگے کھلا میدان تھا۔ یہاں اِکا دُکا نیم پختہ مکان موجود تھے۔ جہاں میدان ختم ہوتا تھا وہاں ایک اسکول کی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ دیوار کوئی پانچ فٹ اونچی ہو گی۔ بستی کے وہ بچے جو اسکول نہیں جاتے تھے وہ اس دیوار پر چڑھ کر بیٹھے رہتے اور اسکول کے وسیع احاطے کا نظارہ کرتے۔ حامد بھی ان بچوں میں شامل تھا (وہ اسکول کے بجائے سہ پہر کے وقت مسجد میں پڑھنے جاتا تھا) اسکول کے احاطے میں بچے "پی ٹی" کرتے تھے۔ کسی فنکشن کی تیاری ہو رہی تھی۔ رنگ برنگی وردیاں' چمکتے بوٹ' دمکتے چہرے' وہ ڈھول کی تھاپ پر ایک ساتھ بازو حرکت میں لاتے' ایک ساتھ جھکتے اور سیدھے کھڑے ہوتے۔ کبھی کبھی جب ٹیچر کسی کام سے اندر جاتے تو یہ شوخ و شنگ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور اٹکھیلیاں کرتے۔ حامد کو یہ سارے ہنستے کھیلتے اور صحت مند بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کا دل اداسی اور غم سے لبریز ہو گیا تھا۔ وہ گھنٹوں دیوار پر کسی مغموم پرندے کی طرح بیٹھا رہتا اور ان لڑکوں کو تکتا۔ وہ ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا' انہیں چھونا چاہتا تھا لیکن وہ سب اس سے بہت دور تھے۔ وہ ماڈل اسکول میں پڑھنے والے امیر بچے تھے' وہ آرمی گھر کا رہائشی گندہ اور غریب حامد تھا۔ وہ بس انہیں دور سے دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہی دوری تھی جو حامد کے دل میں کسک جگاتی تھی۔ وہ خوب صورت چیز سے اپنی دوری کو محسوس کر کے دن رات جلنے لگتا تھا اور اس کے عشق میں گرفتار ہوتا چلا جاتا تھا۔

اب یہ بھی کوئی بات تھی' وہ شب و روز ان چار درجن بچوں کے غم میں گھل رہا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے تصور میں سمائے رہتے۔ ان کی دید کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں پتھرانے لگتیں۔ وہ رات بھر خوابوں میں اپنے ان پیارے دوستوں کے ساتھ گھومتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا' ان کے ہجوم میں ڈوب جاتا۔ صبح بیدار ہوتے ہی وہ جلدی جلدی ناشتا کرتا اور گھر کے سامنے والا میدان پار کر کے اسکول کی دیوار پر مغموم پرندے کی طرح بیٹھ جاتا۔

چند ہفتے یہ مشق جاری رہی' پھر اسکول کی انتظامیہ نے دیوار پر سے آرمی گھر کے گندے بچوں کو بھگانا شروع کر دیا۔ چوکی دار لمبی چھڑی سے ان پر حملہ آور ہوتا اور دیوار سے نیچے اتار دیتا۔ چند روز بعد اسکول کی وہ دیوار آٹھ فٹ اونچی کر دی گئی..... حامد جدائی کی آگ میں تپنے لگا۔ اب وہ قریبی میدان میں بیٹھ کر بس بینڈ باجے کی آواز سنتا تھا اور آنکھیں بھگوتا تھا۔

کچھ عرصہ اسی طرح بیتا پھر حامد کی بے چین فطرت نے غم کھانے کے لیے ایک اور خوب صورتی ڈھونڈ لی۔ وہ اس کی ننھی منی تایا زاد بہن تھی۔ حامد بھی تو چھوٹا سا تھا۔ بمشکل آٹھ سال کا رہا ہو گا۔ حامد کی تایا زاد کا نام شمیم تھا۔ وہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ گاؤں سے ان کے ہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ شمیم کی والدہ گاؤں کے گرلز اسکول میں لیکچرر تھیں اور وہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ حامد سارا دن شمیم کے ساتھ کھیلتا۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کھیتوں میں گھومتے' پگڈنڈیوں پر بھاگتے۔ مٹی کے گھروندے بناتے اور ان میں مٹی کے کھلونے رکھتے۔ شمیم اسے اچھی لگتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اس سے ناراض ہو جاتا اور اسے خوب پیٹتا تھا۔ ایسی مار کٹائی کے بعد وہ چند گھنٹے روٹھے رہتے مگر جلد ہی من جاتے۔ بچپن کے کھیلوں کے نام بھی عجیب عجیب تھے۔ آنکھ مچولی' کیڑی کاڑا' روڑا چھپائی' اونچ نیچ' برف پانی اور پتا نہیں کیا کیا۔ جس کرائے کے مکان میں وہ رہتے تھے وہ اب ان کا اپنا ہو چکا تھا۔ حامد کے والد صاحب نے وسیع صحن میں ایک درمیانے سائز کا کمرا بھی بنوا لیا تھا۔ یہ دادا دادی کا کمرا تھا۔ دادا جی جب گھر سے باہر ہوتے' وہ اور شمیم اس کمرے میں گھس جاتے اور پہروں ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے۔ یہ بڑی معصوم محبت تھی۔ خالص اور شفاف۔ اس میں کسی طرح کی ملاوٹ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

دو تین ماہ ان کے گھر رہ کر شمیم جب چلی گئی تو حسبِ توقع حامد ایک بار پھر غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ بستی کے در و بام ویران ہو گئے۔ گلیوں میں زرد اداسی رینگنے لگی۔ گھر کے آنگن میں چھوٹی چھوٹی یادوں کی کرچیاں بکھر گئیں۔ یہ کرچیاں آتے جاتے حامد کے چھوٹے چھوٹے پیروں میں چبھتیں اور وہ بے چین ہو جاتا۔ وہ اس بات پر کڑھتا کہ وہ شمیم کو کیوں مارتا تھا' کیوں اُس سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا اور اپنی زیادتی کی تلافی کے لیے اسے ڈھیروں چیزیں کھلانا چاہتا تھا۔ آئس کریم' گول گپے' ہمکٹ' اور سب کچھ اپنے جیب خرچ سے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ دور جا چکی تھی اور خبر نہیں دوبارہ کب اس سے ملنا ہوتا۔

اس نے اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے اپنی والدہ کے پاس جمع کرانے شروع کر دیے "یہ کیوں جمع کر رہے ہو حامد؟" والدہ نے پوچھا۔

"امی جب گرمیوں میں بھائی حسنات کی شادی پر گاؤں جائیں گے تو وہاں شمیم بھی ہو گی نا؟"

"ہاں ہو گی' کیوں نہیں ہو گی؟" حامد کی والدہ نے شلجم چھیلتے

ہوئے جواب دیا تھا۔

"بس' میں ان پیسوں سے ایک بہت خوب صورت' بہت ہی خوب صورت گڑیا خریدوں گا اور اسے دوں گا۔"

"تو بڑا خبطی ہے حامدی۔" والدہ نے پیار سے اسے چپت لگائی تھی "بس کوئی نہ کوئی دُھن سوار رہتی ہے تیرے سر پر۔"

"شمیم بڑی اچھی ہے نا... امی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت اچھی ہے۔" امی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولیں۔ "تم بڑے ہوگے تو تمہاری شادی اُسی سے کردیں گے۔"

شادی کا لفظ حامد کے لیے بے معنی تھا۔ اس نے یہ لفظ بڑی بے پروائی کے ساتھ سنا اور شلجم کے ان چھلکوں کو گھورتا رہا جو سردیوں کی اس سرد شام کو کچے صحن میں بکھرے پڑے تھے۔ اسے یاد آنے لگا کہ اسی جگہ ایسے ہی دو تین ہفتے پہلے بھی شلجم کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے اور شمیم اور وہ انہیں دھو دھو کر کھا رہے تھے۔

حامد کی طبیعت میں مستقل مزاجی بہت تھی۔ یا شاید یہ بھی ضد یا انا ہی کی کوئی قسم تھی جو عاشقوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے گلّے میں آٹھ نو ماہ پیسے جمع کرتا رہا' یہاں تک کہ پورے ایک سو روپے ہوگئے۔ اب وہ شمیم کے لیے کوئی بہت ہی... بہت ہی اچھی گڑیا خرید سکتا تھا۔ بالکل ویسی' جیسی شمیم نے ایک روز پسند کی تھی۔ سردیاں بھی گزر چکی تھیں۔ بہار کے دن آنے والے تھے۔ انہیں ایک دو ہفتوں کے اندر گاؤں جانا تھا۔

لیکن پھر ہوا کا رخ حالات کو کسی اور ہی طرف لے اُڑا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوگئی۔ حامد کے تایا اور ان کے اہلِ خانہ ضلع نارووال کے ایک گاؤں مرشد پور میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ جنگ کی زد میں تھا۔ وہ جوانِ رعنا جس کی شادی ہونے والی تھی' ایک ابھی گولی کا شکار ہو کر راہیِ عدم ہوا۔ بھاگ دوڑ کے دوران میں حامد کے تایا بھی (شمیم کے والد) شدید زخمی ہوئے۔ وہ لوگ نارووال سے فیصل آباد چلے گئے۔ یہاں دو تین ماہ بیمار رہ کر حامد کے تایا بھی انتقال کر گئے۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ حامد کے سب سے بڑے تایا نصیرالدین ان کو اپنے پاس کوئٹہ لے گئے ہیں جہاں وہ سول اسپتال میں ملازم ہیں۔ حامد کے گھر والوں کے تعلقات چوں کہ بڑے تایا نصیرالدین سے ٹھیک نہیں تھے اور وہ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے نہیں تھے' حامد کے دل میں شمیم سے ملنے کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ مٹی کا گلّہ اور اس میں جمع شدہ سو روپے اسی طرح گھر کی پرچھتی پر پڑے رہ گئے' اور حامد کے دل میں غم کی گرہ سی پڑ گئی۔

دھیرے دھیرے شمیم کی معصوم شبیہ اس کی نگاہوں میں دھندلاتی چلی گئی۔ وقت کی گرد میں یادوں کے نقش مدھم ہونے لگے اور نئی معروفیات اپنی تمام تر تازگی اور قوت کے ساتھ اسے اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ والد صاحب کی مالی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ سرکاری نوکری کے علاوہ ایک پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہے تھے۔ وہ خالص مذہبی ذہن کے شخص تھے۔ حامد کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن حامد کا ذہن اس طرف چلتا نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر کہانیاں اور رسالے پڑھتا۔ اس نے چھت پر برساتی میں ایک قلم اور کاپی بھی چھپا رکھی تھی۔ فارغ وقت میں وہ برساتی پر پہنچ جاتا۔ یوں ہی بیٹھ کر شعر جوڑتا یا کسی خیالی ہستی کے نام بے تکے خط لکھتا۔ والد صاحب نے مایوس ہو کر حامد کو ساتویں کلاس میں داخل کرادیا۔ اس نے اسکول میں پہنچ کر اپنے جوہر دکھائے اور ایک سال میں دو جماعتیں پاس کر کے نویں میں پہنچ گیا۔

یہ بات نہیں تھی کہ مذہب کی طرف حامد کا رجحان ہی نہیں تھا۔ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھتا' جمعے کے خطبات بڑی توجہ سے سنتا اور قیامت کا خوف تو اس کے دل میں یوں جاگزیں تھا کہ تیز ہوا بھی چلتی تو وہ اس خوف سے کانپ جاتا کہ کہیں یہ قیامت کی شروعات تو نہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دنیا میں تو نہیں لیکن اس کی زندگی میں واقعی ایک قیامت آنے والی ہے۔ ایک ایسا چھوا اس کی نگاہوں میں چمکنے والا ہے جو اس کے دل و دماغ کو تہ و بالا کردے گا اور اس کی زندگی ایک نہ ختم ہونے والے طوفان کی زد میں آجائے گی۔ ہاں جیسے شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے' ایسے ہی غم خور کو غم اور "عاشق دل" کو تڑپنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ حامد کو بھی یہ بہانہ مل گیا۔

وہ اپریل کے دن تھے۔ وہی بہار کا موسم جب برف پگھلتی ہے' پھول کھلتے ہیں' جب پیڑوں پر بور آتا ہے اور دلوں میں انجانے میٹھے جذبوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ حامد نویں کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز وہ اوپر چھت پر بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ گلی میں کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے منڈیر کے جھروکوں میں سے جھانکا۔

تسلی

بیکری میں ایک خاتون کیک کا معائنہ کر رہی تھیں لیکن خریدنے میں کچھ ہچکچا رہی تھیں۔ دکاندار بولا "بہت لذیذ کیک ہے۔ بچے بڑے جو بھی کھائیں گے' خوش ہو جائیں گے۔ بالکل تازہ ہے۔ کل ہی بن کر آیا ہے۔"

"لیکن اس پر یہ پنجوں کے سے نشانات کیسے ہیں؟ لگتا ہے جیسے اس پر چوہے دوڑتے رہے ہیں" خاتون متذبذب لہجے میں بولیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بیکری والا تیزی سے بولا "رات بھر تو ہماری بلی پہرا دیتی رہی ہے۔"

ایک پیلی کالی ٹیکسی عبدل کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر ٹیکسی کے دروازے کھلے۔ اگلے دروازے سے عبدل نکلا' پچھلے دروازے سے ایک سیاہ برقع پوش وجود۔ برقع کے اندر سے دو گورے گورے ہاتھ جھانک رہے تھے۔ گورے ہاتھوں کے پیچھے کلائیاں تھیں۔ کلائیوں میں چاندی کی چوڑیاں تھیں۔ چوڑیوں سے پیچھے سرخ چکیلی قمیص کی آستینیں تھیں۔ یوں لگا جیسے کوئی ہی نویلی دلہن چھم سے ان کی سونی اور ویران گلی میں اتر آئی ہے۔ گورے ہاتھوں نے نقاب الٹا۔ وہ واقعی دلہن تھی۔ گلاب کا پھول' چودھویں کا چاند' خورشید تاباں۔ یہ سارے استعارے اس چہرے کے سامنے حامد کو ہیچ محسوس ہوئے۔ وہ مسکرائی تو جیسے اس کے اردگرد کی ہر شے دمک اٹھی۔ حامد مبہوت اسے دیکھتا رہ گیا۔

عبدل کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا۔ اس نے ٹیکسی والے کو کرایہ دیا اور سرخ پراندے اور مہندی لگی ایڑیوں والی دلہن کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوگیا۔ محلے میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں بھاگم بھاگ عبدل کے گھر پہنچ رہی تھیں۔ وہ اس کی دلہن دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ حامد کے گھر سے بھی اس کی والدہ اور دادی دلہن دیکھنے کے لیے لپک کر گئیں۔ شام تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ عبدل راج گیری کرتا تھا۔ عمر قریباً چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک معمولی شخص تھا۔ ایک معمولی گھر میں اپنے معمولی اہل خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی تعلیم بھی معمولی تھی' یعنی صرف پرائمری پاس۔ پہلے وہ معماروں کے پیچھے ٹوکری ڈھوتا تھا۔ پھر کسی نہ کسی طرح اس نے اینٹیں لگانا سیکھ لیا۔ اب وہ پچاس روپے... دہاڑی کماتا تھا اور اس معمولی کمائی کے ساتھ معمولی دال روٹی کھا کر سو رہتا تھا۔ والدہ کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہی سبب تھا کہ گزر بسر ہو رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے عبدل کی شادی کا چرچا تھا۔ ایک مہینہ پہلے معلوم ہوا تھا کہ عبدل کی منگنی مرید کے میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں ہوگئی ہے۔ مرید کے میں عبدل کا بڑا بھائی رہتا تھا۔ پروگرام کے مطابق عبدل کو اپنے بڑے بھائی کے گھر سے برات لے کر دلہن لینے جانا تھا اور یہ شادی وہیں پر انجام پانا تھی۔ یہ سب کچھ سن کر حامد کو یقین نہیں آیا تھا کہ عبدل جیسے شخص کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دیکھنے میں ہی گاؤدی نظر آتا تھا۔ اوپر سے جسمانی ساخت بھی اس کی تمام دوسری صفات کی طرح معمولی تھی۔ کوتاہ قد' مخنی جسم' سانولا رنگ اور آگے کو جھکے ہوئے کندھے' جیسے اپنے معمولی ہونے کے سبب خود ہی شرمسار ہوں۔ عبدل کا سر پکا ہوا تھا اور پیشانی چوڑائی میں بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ حامد نے کئی بار سوچا تھا' شاید نوکری اٹھا اٹھا کر اس کا سر واقعی پک چکا ہے "ایسے پکے ہوئے سر والے کو دلہن کون دے گا؟" وہ سوچتا۔

پھر اس نے خیال کیا تھا' شاید عبدل کی دلہن بھی اسی کی طرح بس ایویں ہوگی لیکن آج اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ عبدل الف سے ے تک معمولی تھا مگر اس کی دلہن معمولی نہیں تھی۔

چند دن تک تو حامد کو عبدل کی دلہن دکھائی نہیں دی پھر ایک دن وہ یوں "چھن" سے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی جیسے گھپ اندھیرے میں ایک دم ہزار پاور کا بلب جل اٹھے۔ حامد برساتی میں بیٹھا تھا اور علامہ اقبال کی نظم شکوہ کی تشریح کر رہا تھا۔ دروازے سے اس کی والدہ اور دادی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ دادی اور والدہ دروازے پر کھڑی ہیں' ان کے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے اور وہ سب اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کے سامنے ہزار پاور کا قمقمہ روشن تھا۔ وہ سبز ریشمی جھلملاتے سوٹ میں تھی اور اس سبزے میں اس کا چہرہ گلابی پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ والدہ بولیں "یہ ہماری برساتی ہے اور یہ ہے میرا بیٹا حامد۔ کل میں نے تم سے اسی کا ذکر کیا تھا۔"

"آسلام علیکم۔" دلہن نے دلنشیں تبسم کے ساتھ کہا۔

ایک گولا سا حامد کے گلے میں اٹک گیا۔ اس نے بھی جواباً السلام علیکم ہی کہا لیکن آواز اتنی پھنسی ہوئی تھی کہ خبر نہیں کسی کے کان تک پہنچی یا نہیں۔ دلہن کے ہونٹوں سے ہنسی کا ایک آبشار چھوٹا اور حامد جیسے بھیگتا چلا گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر بے تکلفی سے حامد کے سر پر ہاتھ رکھا اور بالوں کو بکھیر دیا "بڑا پیارا بچہ ہے۔" اس نے کہا۔

"اور شرمیلا بھی۔" حامد کی والدہ نے لقمہ دیا۔

حامد کچھ اور شرما گیا۔

"کس کلاس میں پڑھتے ہو؟" دلہن کی آواز نے اس کے کانوں میں جلترنگ بجائے۔

"نائنتھ میں۔" حامد نے سنبھل کر کہا۔

"ماشاء اللہ" دلہن بولی اور پھر حامد کی والدہ کے ساتھ باتیں کرتی باہر نکل گئی۔

حامد کتنی ہی دیر اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اس کے بالوں میں جیسے ابھی تک پانچ حنائی انگلیاں رینگ رہی تھیں۔ چاندی کی چوڑیوں کی چھن چھن اس کے کانوں میں تھی اور ایک دیوانی خوشبو اس کے دل و دماغ میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے نظم "شکوہ" کی طرف دیکھا۔ لیکن "نظم" کتاب کے صفحے پر سے صاف غائب ہو چکی تھی۔ وہاں ایک دلنشیں متبسم چہرہ چمک رہا تھا۔ یہ عبدل کی دلہن کا چہرہ تھا۔

عبدل کی دلہن نے محلے میں بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ جگہ بنائی۔ اس کا نام فرخندہ تھا۔ وہ میٹرک پاس تھی۔ والد "مرید کے" میں ملے ستارے کا کام کرتے تھے۔ پتا نہیں عبدل کی قسمت میں کیسی چمک تھی کہ اس گاؤدی کو فرخندہ جیسی دلہن مل گئی تھی۔ یا پھر یہ شاید اس... مجبوریوں کا شاخسانہ تھا جو بیٹیوں کے سلسلے

میں غریب اور متوسط گھرانوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ بہرحال اب یہ ایک حقیقت تھی کہ اونچی لمبی' خوب رُو اور ذہین فرخندہ کو تاہ قد' سانولے اور گاؤدی عبدل کی بیوی تھی۔ ان دونوں کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا بلکہ ذہانت اور حسنات کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو فرخندہ شوہر سے بڑی ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک خوش اخلاق' ہنس مکھ اور ہمدرد لڑکی تھی۔ اس کے کردار کی سب سے اہم صفت یہ تھی کہ وہ ہر کسی کی بات بڑے غور اور دھیان سے سنتی تھی اور بات کرنے والے کے غم یا خوشی میں شریک ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آناً فاناً محلے بھر کی عورتوں میں مقبول ہو گئی تھی۔ کسی دانا کا یہ قول سچ ثابت ہو رہا تھا کہ زیادہ سننے والے اور کم بولنے والے کی پذیرائی ہر محفل میں ہوتی ہے۔

عبدل کا گھر حامد کے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ فرخندہ اکثر حامد کے گھر بھی آجاتی تھی۔ حامد کی والدہ سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ محلے کی اکثر عورتیں حامد کی والدہ کو آپا کہتی تھیں' فرخندہ بھی بڑی اپنائیت سے آپا کہنے لگی تھی۔ وہ گھنٹوں ان کے ساتھ باتیں کرتی اور جب ان کے پاس بیٹھی ہوتی تو یوں لگتا جیسے وہ بھی کوئی بڑی بوڑھی ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں عبدل کے ساتھ باتیں کرتی نظر آتی تو اس کے انگ انگ سے شباب اور شوخی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوتے۔ ان دونوں کو باتوں میں محو پا کر نجانے کیوں حامد کا سینہ سلگنے لگتا۔ اسے عبدل کی قسمت پر رشک آتا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کی اُداسی اس کے دل میں بھری جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ ماڈل اسکول کی دیوار پر بیٹھا ہے اور بے وجہ بے سبب غم کے سمندر میں غرق ہوتا جا رہا ہے۔

ان دنوں برسات شروع ہونے والی تھی۔ جن مکانوں کی چھتیں کچی تھیں وہ مٹی وغیرہ ڈال رہے تھے اور لیپ کر رہے تھے۔ عبدل کے گھر کی چھت پر بھی لیپ ہونے والا تھا۔ فرخندہ نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ایک روز حامد نے اپنی چھت پر سے ان کے آنگن میں جھانکا تو وہ کمر سے دوہرا باہر مے گریستہ نظر آئی۔ صحن میں کئی اور کڑاہیاں وغیرہ نظر آرہی تھیں اور مٹی کو بھگو کر "سانی" کی جا رہی تھی۔ محلے کی دو تین جوان لڑکیاں بھی رضاکارانہ طور پر فرخندہ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ آخر وہ بھی تو اسی طرح دوسروں کے کام آتی تھی۔ چھت پر لیپ کرنے کا کام بڑے خوش گوار ماحول میں جاری تھا۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی چل رہا تھا۔ حامد بڑی محویت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بڑی محویت سے فرخندہ کو دیکھنے لگا۔ جب فرخندہ سامنے ہوتی تھی تو وہ صرف فرخندہ ہی کو دیکھتا تھا۔ ایک عجیب سی خود فراموشی اس پر طاری ہو جاتی تھی۔۔۔ اس کی نظر مستقل فرخندہ کا تعاقب کرتی تھی۔ وہ جھکتی تو نظر بھی جھک جاتی' وہ اٹھتی تو نظر بھی اٹھتی' وہ مسکراتی تو حامد کی نظر بھی مسکرانے لگتی۔ اپنی اس کیفیت کا اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ پختہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک لڑکی کا پاؤں پھسلا اور کڑاہی اس کے سر پر ڈول گئی۔ پتلا پتلا گارا پیچھے آتی فرخندہ پر الٹ گیا "ہائے تیرا بیڑا غرق سکینہ" فرخندہ چیخی اور اپنے سر اور چہرے سے گارا پونچھنے لگی۔

حامد کے حلق سے بے اختیار ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ لڑکیوں نے چونک کر اوپر منڈیر کی طرف دیکھا۔ سکینہ نے چیخ کر کہا "اوئے حامدی' تو یہاں کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟"

ثریا بولی "لگتا ہے کسی کو تاڑ رہا ہے۔"

سکینہ بولی "تجھی کو تاڑ رہا ہو گا۔ ہم تو بھئی شادی شدہ ہیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کسی شادی شدہ کو ہی تاڑ رہا ہے۔" ثریا نے جواب دیا۔

"تو پھر ضرور فرخندہ کو تاڑتا ہو گا۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

"مجھے کیوں تاڑے گا۔ میرا تو چھوٹا سامنا سا بھائی ہے۔" فرخندہ نے بلند آواز میں کہا پھر حامد سے مخاطب ہو کر بولی "اے حامدی! سچ بتا مجھے تو نہیں دیکھ رہا؟"

حامد کا چہرہ شرم سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ بڑبڑا کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور چارپائی پر آبیٹھا۔ قریباً چار فٹ اونچی پختہ منڈیر کے اندر چھوٹے چھوٹے مستطیل رخنے موجود تھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر بھی ان رخنوں میں سے فرخندہ کے آنگن کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ فرخندہ اور دونوں لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ حامد نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب کسی اور بات پر ہنس رہی ہیں۔ فرخندہ کا سر' چہرہ اور گریبان کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ اس نے بالٹی میں ڈونگا ڈبویا اور کھڑے کھڑے اپنا منہ سر دھونے لگی۔ سر اور چہرے سے کیچڑ صاف ہو گئی۔ اندر سے دُھلا دُھلایا سفید گلاب نکل آیا۔ بالائی جسم دھونے کی کوشش میں اس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ حامد کے لیے یہ نظارہ اور دلکش ہو گیا۔ بھیگے لباس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتی اور اترتی ہوئی فرخندہ اسے بہت اچھی لگی۔ بالکل جل پری' جس کا جسم نیلی جھیل میں تیرتے کنول کی طرح ڈولتا تھا۔ تاہم حامد کے ان محسوسات میں کسی طرح کی بداخلاقی کو دخل نہیں تھا۔ وہ بس اسے خوب صورت لگ رہی تھی۔ بالکل جیسے جو چیز اچھی لگتی تھی۔ ماڈل اسکول کے بچے اچھے لگتے تھے' حلیم اچھی لگتی تھی اور اوس میں نہائے ہوئے پھول اچھے لگتے تھے۔ اس کی محبت میں محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بالکل خالص محبت تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکیوں کی فقرے بازی کا غصہ بھول کر پھر منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ وہ بھی اب قدرے سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ فرخندہ نے ناز سے کہا "اے حامدی! تھوڑا سا کام تو کر دے ہمارا۔"

"کیا کرنا ہے؟" اس نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

اندر سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ فرخندہ نے پہلی بار

اسے کسی کام کے لیے کہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ سرتاپا اطاعت بن جائے اور اگر وہ اسے دنیا کے آخری کونے تک بھی بھیجے تو سرپٹ بھاگتا چلا جائے۔

فرخندہ بولی "ہائے ہائے' ذرا نیچے تو آ۔ ہم تجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔"

سب کھلکھلا کر ہنس دیں "اچھا آتا ہوں۔" حامد نے کہا۔

اس نے اپنی دھڑکنیں سمیٹیں۔ زینے اترا اور گلی پار کر کے فرخندہ کے آنگن میں پہنچ گیا۔ فرخندہ نے اوڑھنی کے پلو سے چند روپے کھول کر اس کے ہاتھ میں تھمائے "حامدی! ذرا چوک تک جانا ہوگا۔ حاجی کی دکان سے چار کلو سفیدی اور ایک کوچی لے آؤ۔"

"اور تھوڑا سا نیل بھی۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

"کیا کروگی اتنی سفیدی؟" حامد نے پوچھا۔

"بھئی ہمارا پروگرام بنا ہے کہ لگے ہاتھ کمروں میں سفیدی چونا اور رنگ روغن بھی کرڈالیں۔" فرخندہ نے جواب دیا۔

"یہ سب کچھ تم خود کروگی؟"

"تو اور کیا نوکر کریں گے۔ اپنا گھر ہے۔ اپنا کام خود کرنے میں کیا حرج ہے۔" وہ بولی۔

اس نے جس اپنائیت سے "اپنا گھر" کہا تھا وہ حامد کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس کے دل میں پھر عبدل اور اس گھر کے بارے میں حسد جاگ اٹھا۔

بہرطور اس نے روپے تھامے اور بھاگم بھاگ بازار پہنچ کر مطلوبہ سامان لے آیا۔

ایک بڑے ٹب میں سفیدی بھگودی گئی۔ سفیدی کو رات بھر بھیگنا تھا۔ فرخندہ لڑکیوں کے ساتھ مل کر کمروں کا مختصر سامان برآمدوں میں رکھنے لگی۔۔۔۔ کرسیاں' میز' بستر' برتن' کپڑے۔ غیر ارادی طور پر حامد بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اسے یہ سب کچھ بہت۔۔۔ بہت دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا یہ مصروفیت کبھی ختم نہ ہو۔ سامان اسی طرح کمروں سے نکل نکل کر برآمدے میں ڈھیر ہوتا رہے۔ فرخندہ کی مخصوص مہک بار بار اس کے قریب آتی رہے اور دور جاتی رہے لیکن وہ ایک غریب گھر کا سامان تھا۔ کتنی دیر کمروں سے نکلتا رہتا۔ جلد ہی ختم ہوگیا اور حامد کو بےدلی کے ساتھ گھر لوٹنا پڑا۔

جانے والے ہر دن کے ساتھ فرخندہ میں حامد کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارنے کی کوشش کرتا۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کام آتا۔ کبھی وہ اس کے گھر چلا جاتا کبھی وہ ان کے گھر آجاتی۔ وہ نویں کلاس میں پڑھتا تھا اور فرخندہ دسویں پاس کرچکی تھی لیکن حامد میں ایک خاص قسم کا ادبی ذوق موجود تھا اور اس ذوق کی موجودگی میں وہ خود کو فرخندہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور لائق سمجھتا تھا۔ اکثر وہ شعر جوڑتا تھا۔ اس کے شعر ویسے ہی ہوتے جیسے نویں' دسویں کلاس کے اردو کورسز میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے یہ شعر فرخندہ کو دکھاتا اور اس پر اپنی علمی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا۔ فرخندہ ناک چڑھا کر کہتی "حامدی! تیرے شعر بڑے روکھے پھیکے ہوتے ہیں۔" پھر ایک دم پینترا بدلتی۔ "ویسے ٹھیک ہی ہے۔ چھوٹی عمر میں ایسے ہی اچھے اچھے شعر لکھنے چاہئیں' خراب شعر لکھنے کو تو ابھی عمر پڑی ہے۔"

حامد کو یہ بات بڑی بری لگتی تھی۔ اسے فرخندہ کی ہر وہ بات بری لگتی تھی جو اسے یہ احساس دلاتی کہ وہ بچہ ہے' معصوم ہے' ننھا منا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرخندہ اسے ننھا منا سمجھے۔ وہ ایک دم ناراض نظر آنے لگتا۔ فرخندہ فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتی "اچھا علامہ صاحب! میری توبہ' مجھے معاف کیجئے۔ اب آپ کے شعروں کو روکھا پھیکا نہیں کہوں گی۔"

اس کا انداز حامد کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کردیتا۔ ایسے میں حامد کی والدہ کہتیں "فرخندہ! یہ تو بالکل عاشق ہے تیرے اوپر۔ مجھے پہلے پتا ہوتا تو عبدل کی جگہ اسے تیرا دلھا بنادیتی۔"

فرخندہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاتی۔ حامد غصے سے ماں کی طرف دیکھتا "امی کیا الٹی سیدھی باتیں کرتی ہیں آپ۔"

"اور تم جو الٹی سیدھی کرتے ہو۔" امی کہتیں "ہر وقت اسی کے پاس گھسے رہتے ہو۔ میرے چاند' اب ماشاءاللہ جوان ہو تم اور جوان مرد عورتوں کے پاس نہیں بیٹھتے۔"

"ہائے آپا' آپ بھی کیا کرتی ہیں۔" فرخندہ کہتی "یہ جوان ہے؟ یہ تو ہمارا ننھا سا بلونگڑا ہے۔"

ایسے خطابات پر حامد کا موڈ ایک بار پھر بگڑ جاتا۔ حامد کی والدہ اور فرخندہ لگاتار ہنسنے لگتیں۔

ایک ایسے ہی موقع پر عبدل کھنکھارتا اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر فرخندہ سنجیدہ ہوگئی اور اس نے سر اور اوڑھنی کے پلو سے اوڑھنا لیا۔ عبدل نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے اور بولا "فرخندہ جی! تم یہاں ہو' میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ رہا تھا۔"

"کیوں' خیر ہے؟" فرخندہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"پھوپا بشیر آیا ہے کراچی سے۔ وہاں اس نے ایک بڑی کوٹھی کا ٹھیکا لیا ہے۔"

"تو کیا یہی خوش خبری سنانے آیا ہے؟" فرخندہ نے پوچھا۔

"نہیں اور بات بھی ہے۔ چل گھر آ۔ بتاتا ہوں تجھے۔"

"اچھا تو چل' میں ابھی آتی ہوں" فرخندہ نے شوہر سے کہا۔ "ذرا جلدی آنا فرخندہ جی۔ پھوپا کو چائے پانی بھی پوچھنا ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔ اچھا۔" فرخندہ نے قدرے بےزاری سے کہا۔

اس کی بےزاری محسوس کرکے عبدل جلدی سے اٹھ گیا۔ جیسے وہ کوئی غلام ہو اور اسے اپنی ملکہ کی خفگی کا ڈر ہو۔ فرخندہ کے سامنے وہ ایسے ہی دبا دبا اور گھٹا گھٹا رہتا تھا۔ فرخندہ ہر اعتبار سے

MEDICAM میڈی کیم

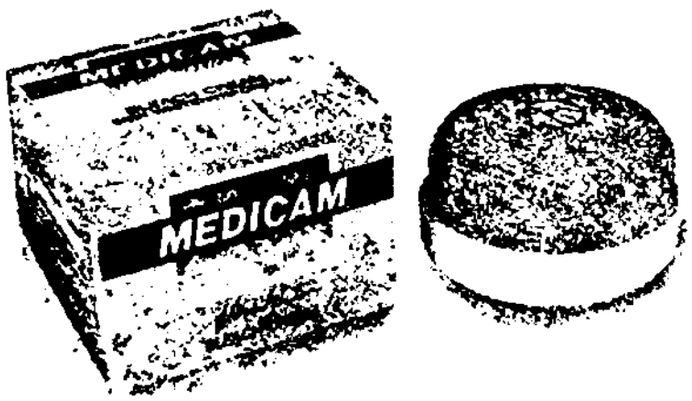
BLEACH CREAM

بلیچ کریم

ہم میں ساحرہ کون ہے اور مائرہ کون؟



مائرہ صرف اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے پہچانی جاتی تھی۔ مائرہ نے رنگ گورا کرنے والی میڈی کیم بلیچ کریم لگائی اور ساحرہ کی طرح گوری ہوگئی اور دونوں کی پہچان ختم ہوگئی اب انکو پہچاننا مشکل ہے۔



میڈی کیم بلیچ کریم
رنگت کے سب فرق مٹادے

LASERDOT

عبدل پر فوقیت رکھتی تھی اور اس کی یہی فوقیت غالباً عبدل کو احساس کمتری میں مبتلا کر چکی تھی' ورنہ فرخندہ کی طرف سے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ حتی الامکان اس کی عزت کرتی تھی بلکہ اتنی عزت کرتی تھی کہ عبدل کو ہضم ہی نہیں ہو پاتی تھی اور عبدل کے ساتھ ساتھ شاید حامد کو بھی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ عبدل جیسے گاؤدی کی یہ عزت افزائی دیکھ کر جل کڑھ جاتا اور نجانے کیوں شدید حسد محسوس کرنے لگتا۔

اس شام عبدل نے فرخندہ سے کیا خاص بات کہنا تھی' اس کا انکشاف تیسرے روز سہ پہر کو ہوا۔ حامد پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ عبدل اور اس کی بیوی فرخندہ کراچی جا رہے ہیں اور اب کچھ عرصہ وہیں رہیں گے۔ دراصل عبدل کا پھوپا اسے لینے کے لیے ہی لاہور آیا تھا۔ اس نے کراچی میں کسی رہائشی عمارت کا ٹھیکا لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی قابلِ اعتماد کارندہ اس کے پاس ہو' جو تعمیر کا کام بھی کرے اور دیگر مزدوروں کے کام کی نگرانی بھی کرے۔ اس سلسلے میں اس کی نگاہِ کرم اپنے رشتے دار عبدل پر پڑی تھی۔ اب وہ مفت رہائش اور خوراک کی یقین دہانی پر اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے فرخندہ کو بھی ساتھ جانا تھا۔

حامد یہ خبر سن کر جلدی سے چھت پر گیا اور منڈیر کے جھروکوں میں سے فرخندہ کے گھر جھانکنے لگا۔ وہاں چارپائی پر ایک تنومند شخص بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی اور کلف زدہ تھیں۔ یہی عبدل کا پھوپا تھا۔ نجانے کیوں یہ شخص حامد کو اچھا نہیں لگا تھا۔ عبدل اپنے پھپھی پھوپا کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا اور ایک سوٹ کیس بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرخندہ اندر برآمدے میں تھی اور ضروری سامان باندھ رہی تھی۔ حامد کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ وہ ایک ٹک فرخندہ کو دیکھتا چلا گیا۔ ماں کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ نجانے کب اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھیں "حامدی! جا بیٹا' جا کر مل آ عبدل اور فرخندہ سے۔ وہ جا رہے ہیں۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔" وہ جل کر بولا تھا۔

"اچھا چل' فرخندہ سے مل آ۔"

"میں کیوں جاؤں؟"

"ہائے ہائے' اتنا پیار کرتی ہے تجھ سے۔ اب جا رہی ہے۔ پتا نہیں کب آئے گی۔ اسے خدا حافظ تو کہہ آ۔"

"جا وہ رہی ہے۔ میں تو نہیں جا رہا۔ وہ خود خدا حافظ کہنے آجائے۔"

"پگلے' آئی تھی وہ۔۔۔ تو غسل خانے میں گھسا ہوا تھا' بیٹھ کر چلی گئی۔ کہتی تھی حامد کو بھیجنا۔"

"میں نہیں جاتا۔" اس نے کھناک سے کہا اور نیچے اتر گیا۔ نہ صرف نیچے اترا بلکہ ڈیوڑھی طے کر کے دروازے پر آیا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچا تو اس نے ایک تانگا دیکھا۔ وہ فرخندہ کے گھر کے سامنے رک رہا تھا۔

حامد پلٹا رہا اور بستی سے باہر نکل آیا۔ بستی سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھیتوں سے آگے جامن اور امرود کا چھوٹا سا باغ تھا۔ بڑی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ وہ باغ کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا اور شاخوں کی اوٹ سے اس راستے کو دیکھنے لگا جو بستی سے نکل کر وسطی شہر کی طرف جاتا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد اسے وہ تانگا نظر آیا جو عبدل اور فرخندہ کو اسٹیشن کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے دور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے صرف فرخندہ کی سبز اوڑھنی نظر آئی۔ وہ عبدل کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ ساتھ عبدل کی ماں بھی تھی۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ پھپھی پھوپا براجمان تھا۔ حامد تانگے کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ حامد کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔

اندھیرا گہرا ہونے پر وہ گھر واپس لوٹا تو عبدل کے مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ حامد گھر میں داخل ہوا تو ہر شے ویران اور سونی نظر آئی۔ باورچی خانے کی زرد روشنی میں اس کی والدہ روٹی پکا رہی تھیں۔ والد کمرے میں بیٹھے صبح کا باسی اخبار دیکھ رہے تھے۔ دادی اماں نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ حامد نے کھنکھار کر اپنی واپسی کا اعلان کیا اور پھر سیدھا اوپر برساتی میں چلا گیا۔

○☆○

فرخندہ کے جاتے ہی آرہا نگر ایک دم ویران ہو گیا تھا۔ حامد پہروں چھت پر لیٹا رہتا اور اس سنسان آنگن کو دیکھتا جہاں فرخندہ کا رنگین آنچل لہراتا تھا اور اس کی کھنکتی آواز گونجتی تھی۔ اس آنگن میں اب اداسی کی زرد دھول پھیلی تھی اور تنہائی مکڑی کے جالوں کی طرح لٹک رہی تھی۔ وہ انگور کی بیل جسے فرخندہ روز اپنے ہاتھ سے پانی دیتی تھی' کملائی ہوئی تھی۔ فرخندہ کی ایک ایک بات حامد کو یاد آتی اور اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ بڑے درد کے ساتھ سوچتا۔ کیا فرخندہ بھی اسے یاد کرتی ہے۔ کیا وہ بھی اس کے بارے میں سوچتی ہے۔ کبھی کبھی اسے افسوس ہونے لگتا کہ اس نے جاتے وقت فرخندہ اور عبدل کو الوداع کیوں نہیں کہا تھا۔ آخر اسے کیا ناراضگی تھی۔ عبدل اور فرخندہ نے اور خاص طور سے فرخندہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے کہنے پر اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے کیا جرم کیا تھا لیکن جلد ہی غم و غصہ پھر اس پر غالب آجاتا۔ نجانے کیوں اس کے ذہن میں بے معنی شکوے چیخنے چلانے لگتے۔ یہاں سے جانے کے بعد عبدل اور فرخندہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ٹیلی فون کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خط پتر بھی نہیں تھا۔

کوئی دو ماہ بعد جب ایک روز حامد اسکول سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ فرخندہ کے گھر کا مقفل رہنے والا دروازہ کھلا ہے اور اندر کوئی گھوم پھر رہا ہے۔ مسرت کی ایک بلند لہر اس کے سینے سے

اٹھی اور پورے جسم کو سنسنا گئی "تو کیا فرخندہ واپس آگئی ہے؟" اس نے بے چین ہو کر سوچا اور دروازے کی طرف لپکا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا' اس کی نگاہ عبدل پر پڑی۔ وہ انگور کی بیل کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے قریب حامد کی والدہ اور محلے کی دو تین دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ وہ سب باتیں کر رہے تھے۔ حامد کی نظر برق کی طرح گھر کے طول و عرض میں لہرا گئی۔ اسے فرخندہ کہیں نظر نہیں آئی۔

حامد کی والدہ نے کہا "تو حامد بھی آگیا۔"

"السلام علیکم۔" حامد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ حامد باؤ۔" عبدل نے اپنے مخصوص انداز میں دانت نکالے "اور سناؤ کیا حال شال ہے۔ امتحان کب شروع ہو رہا ہے تمہارا؟"

"بس ہونے ہی والا ہے۔" حامد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"اور..... تم..... سناؤ اکیلے ہی آئے ہو؟"

"ہاں باؤ یار۔ کچھ ضروری سامان رہ گیا تھا وہ لینے آیا ہوں۔ دراصل وہاں کام کچھ لمبا ہو گیا ہے نا... پھوپے بشیر کو دو کوٹھیوں کا ٹھیکا اور مل گیا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ سردیاں تو ہمیں کراچی میں ہی گزارنا پڑیں گی۔"

حامد کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ کندھے پر بستہ اسے منوں وزنی محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے بستہ اتار کر آہستگی سے چارپائی پر رکھ دیا۔ محلے والیاں عبدل سے باتوں میں مصروف تھیں۔ وہی کراچی کی باتیں۔ کام کاج کی باتیں۔ روز افزوں مہنگائی اور محدود آمدن کی باتیں۔ حامد بڑے دھیان سے یہ باتیں سنتا رہا اور منتظر رہا کہ ان باتوں میں کہیں فرخندہ کا ذکر بھی آئے اور اسے فرخندہ کا حال احوال معلوم ہو لیکن یوں لگتا تھا کہ یہ ذکر اس کے آنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ وہ مایوس سا ہونے لگا اور اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر چل دے اور عبدل کو خدا حافظ کہے بغیر بیرونی دروازے سے نکل جائے لیکن عین اسی وقت عبدل کی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔ وہ بولا "حامد باؤ! فرخندہ تو بڑا یاد کرتی ہے تجھے۔ ہر وقت تیری باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی یہاں کا ایک چکر لگا جائے مگر وہاں ماں کے پاس بھی تو کسی کو رہنا تھا نا۔"

حامد کے سینے میں انجانی مسرت کے ہزاروں شادیانے بج اٹھے۔ اس کے کان کچھ اور سننے کے لئے یوں بے تاب ہو گئے جیسے غوطہ خور ایک طویل کٹھن غوطے کے بعد سانس لینے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

حامد کی والدہ نے پوچھا "وہ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا عبدل؟"

"اب تو ٹھیک ہے' بس پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ گم صم پڑی رہتی تھی۔ دس بارہ روز دوائی کھائی۔ دوائی سے تو ٹھیک نہیں ہوئی لیکن جب دوائی چھوڑ دی تو بھلی چنگی ہو گئی۔"

حامد کے سینے میں گونجتے ہوئے شادیانوں کی آواز فلک شگاف ہو گئی۔ اس کے جسم میں انبساط کی انجانی لہریں دوڑنے لگیں۔ نجانے وہ کب عبدل کے گھر سے نکلا اور کب اپنے گھر کے زینے طے کر کے برساتی میں پہنچ گیا۔ اس کے کانوں میں بار بار عبدل کے الفاظ گونج رہے تھے "بس پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ گم صم پڑی رہتی تھی..... پتا نہیں کیا تھا۔" نجانے کیوں حامد کا دل گواہی دینے لگا کہ فرخندہ بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اس کے گم صم رہنے کی وجہ وہ خود تھا..... وہ خود تھا۔

اگلے روز عبدل واپس چلا گیا۔ فرخندہ کے گھر کا آنگن پھر ویران تر ہو گیا لیکن حامد کے لئے اس ویرانی میں اب ایک پہلو اطمینان کا بھی تھا۔ فرخندہ کے لیے اس کا بے معنی غم و غصہ اب دور ہو چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جیسے وہ فرخندہ سے محبت کرتا ہے' فرخندہ بھی اس سے کرتی ہے۔ انہی دنوں اس کی نگاہ الماری میں مٹی کے اس گلے پر پڑی جو چھ سات برسوں سے جوں کا توں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ حامد نے اس گلے میں سو روپے جمع کیے تھے۔ ان روپوں سے وہ اپنی تایا زاد شمیم کو کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا۔ اب وہ تحفہ لینے والی کہیں دور جا چکی تھی۔ اس کی یاد بھی مٹتے مٹتے حامد کے ذہن سے مٹ چکی تھی لیکن یہ گلہ اسی طرح الماری میں پڑا تھا۔ حامد نے تایا زاد شمیم کے بارے میں سوچا اور اسے وہ کوئی اجنبی لڑکی محسوس ہوئی' جس کے لیے اس نے بے کار میں سنہری تاروں سے خواب بُنے تھے۔ اسے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا کہ وہ شمیم کے بارے میں ایسی دیوانگی سے کیوں سوچا کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس گلے میں مزید رقم جمع کرے گا اور تب تک جمع کرتا رہے گا جب تک سردیاں گزر نہیں جاتیں اور فرخندہ واپس لاہور آ نہیں جاتی اور جب وہ واپس آجائے گی تو وہ اسے کوئی بہت اچھا..... بہت اچھا سا تحفہ پیش کرے گا۔ ایسا تحفہ جو حامد کی محبت ہی کی طرح قیمتی اور یادگار ہو گا۔ اس نے برسوں بعد ایک بار پھر گلے میں رقم جوڑنا شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ منصوبے بھی بناتا رہا کہ فرخندہ کو کیا تحفہ دے گا۔ کبھی وہ سونے کے جھمکوں کے بارے میں سوچتا۔ کبھی کسی بہت خوب صورت گھڑی کے بارے میں۔ کبھی کسی طلائی چین کے بارے میں جو حامد کی پُرخلوص محبت کی نشانی بن کر ہمیشہ فرخندہ کے سینے سے لگی رہتی۔

انہی دنوں حامد کے میٹرک کے امتحان شروع ہو گئے۔ دو ڈھائی ماہ کے لیے وہ کتابوں میں کھو سا گیا۔ فرخندہ کے تصور کے سامنے اس نے ہاتھ باندھ کر اسے خود سے دور کھڑا کر دیا تھا..... لیکن جوں ہی امتحانات ختم ہوئے' یہ تصور ایک بار پھر پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اس مرتبہ اس تصور میں ایک نئی کیفیت تھی۔ ایسی کیفیت جو حامد نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی

تھی۔ اس سے پہلے حامد کی محبت کا تعلق تین حواس سے تھا۔ یعنی دیکھنا' سننا اور سونگھنا۔ وہ فرخندہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی شیریں آواز سننا چاہتا تھا اور اس مہک میں کھویا رہنا چاہتا تھا جو اُس کے جسم اور اس کے ذات سے پھوٹتی تھی لیکن اب حامد کی محبت حواسِ خمسہ کی محبت بنتی جارہی تھی۔ یعنی چھونے اور چکھنے کی حسیں بھی اس میں شامل ہورہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا جب فرخندہ واپس آجائے اور تنہائی میں اس کے قریب بیٹھے اور یہ کہے کہ وہ اسے بہت یاد کرتی رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر کروٹ لیتا نظر آئے تو وہ اسے چھولے۔ بڑی آہستگی اور بڑی ملائمت کے ساتھ' پھر اسے چھو کر وہ یوں ہی بیٹھا رہے۔ دیر تک' مدتوں تک' صدیوں تک۔ نہ اسے اپنے پاس سے اٹھنے کی اجازت دے۔ نہ خود اس کے پاس سے اٹھ کر کہیں جائے۔ ساری دنیا جن میں عبدل بھی شامل ہو' چیخ چیخ کر فرخندہ کو بلاتی رہے لیکن فرخندہ یوں ہی بت بنی اس کے پاس بیٹھی رہے۔

عید کا چاند عید سے پہلے نظر آیا ہے لیکن اس بار یہ چاند عید سے دو روز بعد نظر آیا تھا۔ یہ چاند دراصل وہ خط تھا جو کراچی سے فرخندہ کی سہیلی سکینہ کے نام آیا تھا۔ یہ فرخندہ کا خط تھا اور اس خط میں اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور اُس کا میاں جمعے کے روز کراچی ایکسپریس سے لاہور واپس پہنچ رہے ہیں۔ حامد پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اس نے ایک دھماکے سے مٹی کا وہ گلہ پھوڑا تھا جس میں قریباً پانچ سو روپے جمع ہوچکے تھے۔ کالج سے واپس آتے ہوئے وہ "سوہا بازار" کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں سے اس نے ایک نہایت نفیس چھوٹا سا طلائی لاکٹ خریدا تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے نگینے لگے ہوئے تھے۔

جمعے کے روز حامد کی حالت دیدنی تھی۔ وہ صبح سے چھت پر بیٹھا تھا اور اس راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو وسطی شہر سے آرمی نگر کی طرف آتا تھا۔ سہ پہر کے وقت اس کی بنجر آنکھیں اپنے محبوب چہرے کی دید سے سیراب ہوگئیں۔ ایک ٹیکسی کے ذریعے فرخندہ اپنے میاں اور ساس سمیت بستی میں پہنچ گئی۔ اس نے بڑے دھیان سے فرخندہ کو دیکھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہی لپک' وہی طمطراق' وہی دل میں ڈوب جانے والی آنکھیں۔ محلے والیاں اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہوگئیں۔ اس کے مداحوں میں لڑکیاں ہی نہیں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں اور یہی فرخندہ کی خوبی تھی۔

"ہائے ری! اتنی دیر کہاں رہی؟"

"اف اللہ! کتنی دبلی ہوگئی ہو۔"

"اور سناؤ کوئی بال بچہ ہوا یا نہیں۔"

"اب واپس جانے کا ارادہ تو نہیں؟"

اس طرح کے فقرے حامد کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ اب وہ اپنے دروازے پر کھڑا شرابا شرابا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر فرخندہ کی نگاہ اس پر پڑی۔ حامد کا خیال تھا کہ وہ لپک کر اُس کی طرف آئے گی۔ سب کچھ بھول بھال کر اُس کی طرف متوجہ ہوجائے گی لیکن اس کی اچٹتی سی نگاہ نے حامد کو مایوس کردیا۔ اپنے میاں اور محلے والیوں کے ساتھ وہ صحن میں داخل ہوگئی۔ پیچھے پیچھے حامد بھی چلا گیا۔ یہاں فرخندہ نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور مسکرا کر حال چال پوچھا۔ حامد نے مختصر جواب دیا۔ اسے فرخندہ کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی خصوصی اہمیت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹھہر کر گھر واپس آگیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کی والدہ فرخندہ کے گھر سے واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

بولیں "یہ دیکھ رے حامدی! فرخندہ تیرے لیے کتنا پیارا تحفہ لائی ہے۔"

حامد نے بے تابی سے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک بڑے سائز کی خوب صورت لوڈو تھی۔ لوڈو کے تمام مہرے اسٹیل کے بنے ہوئے تھے اور ان پر بلوری ہیڈ تھے۔

"کیسی ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

"اچھی ہے۔" حامد نے مختصر جواب دیا اور چھت پر اپنی پناہ گاہ یعنی برساتی میں چلا آیا۔

برساتی کا دروازہ بند کرکے وہ دھم سے بستر پر گر پڑا۔ اسے فرخندہ کے مجسم رویّے سے اتنی کوفت نہیں ہوئی تھی جتنی اس تحفے سے ہوئی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کہہ رہی ہے "یہ لو میرے ننھے سے بلونگڑے! اپنا کھلونا لو اور چھت پر جاکر کھیلو۔"

تو کیا میں اس کی نظر میں ابھی تک ایک بچہ ہوں؟ لوڈو سے بہل جانے والا۔ اس نے بے زاری سے لوڈو ایک طرف رکھ دی اور بتی جلا کر خود کو کتابوں میں غرق کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

..... فرخندہ کو آئے دو روز ہوچکے تھے لیکن وہ ایک بار چند منٹ کے سوا ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ آنگن میں بھی وہ صرف دو تین بار نظر آئی تھی اور ہر دفعہ جلدی میں دکھائی دیتی تھی۔ حامد کو یوں لگا جیسے وہ بدل چکی ہے یا پھر شروع سے ہی وہ غلط اندازے لگاتا رہا ہے۔ فرخندہ کو اس سے کوئی خاص لگاؤ تھا ہی نہیں۔ جیسے وہ دوسروں سے انس کرہات کرتی ہے اس سے بھی کرتی تھی۔ یقیناً یہی بات تھی۔ کم از کم وہ ایک بار تو حامد کو بلاتی یا خود آکر اس سے ملتی۔ اس کے ذہن میں بار بار گھنی مونچھوں والے پھوپا بشیر کا خیال بھی آتا تھا۔ نجانے کیوں پھوپا بشیر کے حوالے سے اس کے ذہن میں انجانے اندیشے پروان چڑھ رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جہاں دیدہ اور زمانہ ساز پھوپا بشیر نے کراچی میں فرخندہ کے ساتھ کوئی تعلق..... بنالیا ہو۔ یہ ایک بے معنی سا رقیبانہ خیال تھا لیکن وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پارہا تھا..... اس روز شام تک حامد کی مایوسی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہوگئے اور گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس نے وہ لوڈو اٹھائی جو فرخندہ نے تحفے میں بھیجی تھی اور کسی

بپھرے ہوئے جانور کی طرح اس نے لوہے کے ٹکڑے کر دیے۔ پھر اپنے تکیے کے غلاف میں سے اس نے وہ چھوٹی سی سرخ ڈبیا نکالی جس میں جڑاؤ لاکٹ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں اس لاکٹ کو دیکھتا رہا پھر اس نے لاکٹ زمین پر رکھ دیا اور چارپائی کے ایک ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگا لگا کر اس کی شکل بگاڑ دی۔ جب وہ بالکل چور چور ہو گیا تو اسے کاٹھ کباڑ کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر اوندھا گر گیا اور سسکنے لگا۔ یہی وقت تھا جب سیڑھیوں پر مدھم چاپ سنائی دی پھر ماں کی آواز آئی "ہاں اوپر ہی ہے۔" وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔

اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی۔ حامد کا دل سینے میں اچھل گیا۔ یہ فرخندہ کے قدموں کی چاپ تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔

"اوہو' تو جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔" وہ چہک کر بولی۔ حامد بے سُدھ رہا "بنو مت لاٹ صاحب! مجھے پتا ہے تم سو نہیں رہے۔"

پھر وہ دھم سے اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی جانی پہچانی خوش بو حامد کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس کے ہاتھوں نے حامد کا شانہ جھنجوڑا۔ اس کے جسم میں برق لہرائی مگر وہ بے حرکت پڑا رہا "بڑے ایکٹر ہو بھئی تم۔ ندیم اور وحید مراد وغیرہ تو کوئی شے ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

چند لمحے بعد حامد کو اپنے کان میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' وہ حامدی کے بال پوائنٹ سے اس کے کان میں گدگدی کر رہی تھی۔ حامد نے یک دم اس کی کلائی تھام لی اور غصے سے بازو دور ہٹا دیا۔

"ہائے ہائے کیا ہے۔ کیوں روٹھے ہوئے ہو؟" وہ ذرا چہک کر بولی "اتنے دنوں بعد آئی ہوں اور ٹھیک سے سلام تک نہیں کیا تم نے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حامد گلوگیر آواز میں بولا۔

"اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر خراب کسے کہتے ہیں۔" اس نے حامد کی پسلیوں میں انگلی چبھوئی۔ تب اس کی نگاہ لوہے کے ان پھٹے ہوئے ٹکڑوں پر پڑی جو حامد نے چارپائی کے نیچے پھینک دیے تھے۔ وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ اس نے نیچے جھک کر وہ ٹکڑے اٹھائے اور خاموشی سے حامد کی طرف دیکھنے لگی۔ حامد آنکھوں پر بازو رکھے چت لیٹا تھا۔

"بہت ناراض لگتے ہو تم تو۔" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی "کیا غلطی ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔" وہ سسک کر بولا۔

یوں لگا جیسے کمرے کی فضا ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گئی ہے اور وہ بات حامد کی نوکِ زبان پر آنے والی ہے جو کسی وقت اسے بے حد بے حد مشکل محسوس ہوتی تھی۔ اس ایک لمحے کو فرخندہ نے حیران کن تیزی سے سنبھالا۔ اس سے پہلے کہ حامد کچھ بولتا' اس نے بات پلٹ دی "اچھا بھئی' مانا کہ تم ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر غلطی ہوئی ہے تو پھر معافی مانگو۔ چلو اٹھو شاباش' چلو اٹھو۔"

وہ اسے گدگدانے لگی۔ اس کے پہلو' اس کی بغلیں' اس کی گردن' فرخندہ کی انگلیوں کی زد میں تھے لیکن ہنسی اس کے ہونٹوں سے کوسوں دور تھی۔ فرخندہ کتنی ہی دیر اسے ہنسانے اور منانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ کس سے مس نہ ہوا۔ اسی دوران میں عبدل اپنے گھر کے صحن سے فرخندہ کو آوازیں دینے لگا۔

"بڑے ڈھیٹ ہو تم۔" وہ مصنوعی غصے سے دانت پیس کر بولی اور اس کے سر کے بالوں کو زور سے جھٹک کر باہر نکل گئی۔

اگلے روز شام کو آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ پھر برساتی میں آ گئی۔ اس مرتبہ وہ براہِ راست چھت سے آئی تھی۔ دونوں مکانوں کی درمیانی گلی بہت تنگ تھی۔ مکانوں کے شیڈوں آگے کی طرف بڑھے ہوئے تھے کہ گلی پر چھت سی پڑ گئی تھی۔ بس ڈیڑھ دو فٹ کا خلا باقی تھا۔ اس کو پھلانگنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔ فرخندہ بھی اس خلا کو پھلانگ کر آئی تھی۔ اس روز بھی وہ تو پون گھنٹے تک اس سے سر کھپائی رہی اور پوچھتی رہی کہ آخر کیا بات ہے جو وہ اس سے ناراض ہوا پڑا ہے۔ حامد اس روز بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ اس کے ساتھ کھینچا تانی کر کے سرخ ہو رہی تھی اور ہانپی ہوئی تھی۔ نو بجنے والے تھے اور حامد کے ابو کے گھر آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ تھکے ہارے لہجے میں بولی "اچھا' تمہارا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے میں کل پھر آؤں گی اور اس وقت تک آتی رہوں گی جب تک تمہارا دماغ ٹھیک نہ ہو جائے۔"

"تم نے میرا دماغ ٹھیک کرنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"ٹھیکا نہیں۔ بس یہ ضد ہے میری۔"

"تم ہار جاؤ گی۔" وہ مجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیسے؟"

"مجھے یقین ہے کہ کل تم نہیں آؤ گی۔"

"کیوں نہیں آؤں گی۔ اتنی کم ہمت نہیں ہوں میں۔"

"میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کل تم نہیں آؤ گی۔" وہ ذرا مائی لہجے میں بولا۔

"لیکن کیوں۔" وہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

ایک یکایک حرکت کے تحت حامد نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ فرخندہ کو تھما دیا "یہ کیا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پڑھ لینا۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"حامدی۔۔۔ حامدی!" وہ اسے پکارتی رہ گئی لیکن وہ بگولے کی طرح سیڑھیاں اتر کر باہر گلی میں آ گیا اور پھر بستی سے باہر نکل کر چلڈرن پارک میں جا بیٹھا۔

اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ آج وہ بات اس نے تحریر کی زبانی فرخندہ تک پہنچا دی تھی جسے کہنے کے لیے وہ طویل عرصے سے مچل رہا تھا۔ شاید صدیوں سے' شاید زمانوں سے۔ اس نے سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اپنے اس مختصر خط میں لکھ دیا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ کسی بچے کی محبت نہیں۔ یہ ویسی محبت ہے جیسی ایک عورت سے ایک مرد کرتا ہے۔ تم کو معلوم نہیں میں اپنی محبت میں کتنا آگے جا چکا ہوں۔ میں دن رات' سوتے جاگتے ہر وقت صرف اور صرف تمہارے بارے میں ہی سوچتا ہوں۔

حامد۔"

ایک بہت بڑا.... بوجھ حامد کے سینے سے اتر گیا تھا اور اسے سکون محسوس ہو رہا تھا لیکن اس سکون میں ایک بے سکونی بھی پنہاں تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فرخندہ کا ردعمل کیا ہوگا۔ ممکن تھا کہ وہ آگ بگولا ہو جاتی اور اپنے خاوند عبدل کو سب کچھ بتا دیتی۔ یا پھر وہ یہ خط حامد کی والدہ کے سامنے رکھ دیتی اور ان سے کہتی کہ وہ اپنے بیٹے کو سنبھالیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرتی لیکن اس خط کے ٹکڑے کر دیتی اور آئندہ حامد اور اس کے اہل خانہ سے ناتا توڑ لیتی۔ جوں جوں حامد اس بارے میں سوچ رہا تھا' اس کے اندر ایک احساس گناہ نمو پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خیال اس کے ذہن کو ڈسنے لگا کہ اس نے جلد بازی میں ایک غلط اور شرم ناک قدم اٹھا لیا ہے۔

وہ کافی دیر تک چلڈرن پارک میں بیٹھا رہا۔ جب پارک خالی ہو گیا اور ارد گرد کے مکانوں کی بتیاں بجھنے لگیں تو وہ اٹھا اور مختلف گلیوں سے گزر کر خاموشی سے اپنے محلے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بڑے ڈرے سہمے انداز میں اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ اسے لگ رہا تھا کہ والد صاحب ہاتھ میں جوتا لیے صحن کے بچوں بیچ بیٹھے ہوں گے اور اندر داخل ہوتے ہی اس پر پل پڑیں گے۔ یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ صحن خالی تھا اور والد صاحب کے کمرے کی بتی بھی بجھی ہوئی تھی۔ والدہ برآمدے میں بیٹھی پڑوسن سے باتیں کر رہی تھیں۔ حامد نے بغور والدہ اور پڑوسن کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کے تغیرات نظر نہیں آئے۔ وہ کچھ دیر صحن میں گھومنے پھرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے تین روز عجیب تذبذب میں گزرے۔ ماحول پر ایک گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ فرخندہ ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور نہ اپنے ہی آنگن میں اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ پتا نہیں کہاں گم تھی وہ؟ تیسرے دن حامد نے اسے دیکھا۔ وہ گلی میں کھڑی ایک خوانچے والے سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی سہیلی سکینہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ فرخندہ نے حامد کو دیکھا لیکن نظر انداز کر دیا جیسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا ہو۔ حامد پاس سے گزرنے لگا تو سکینہ بولی "اے حامدی! آج کل بڑے نخرے ہیں تیرے۔ کسی چھوٹے موٹے سے بات ہی نہیں کرتا۔ کالج میں داخل ہو گیا ہے نا۔"

حامد جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ سکینہ نے فرخندہ کو بیچ میں گھسیٹنے کی کوشش کی "دیکھ رہی ہے فرخندہ۔ بات کا جواب بھی نہیں دیتا۔"

"تو بات بھی تو شرارت کی کرتی ہے۔" فرخندہ کی مدھم آواز ابھری۔

شاید کچھ اور بھی کہا گیا ہو لیکن حامد اپنے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔

○☆○

روز و شب ایک دم بے کیف اور بے رنگ ہو گئے تھے۔ صبح سویرے کالج' سہ پہر کو واپسی پھر وہ دوستوں کے ساتھ قریبی گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ پورے آرہا محلے کے لڑکے وہاں جمع ہوتے۔ شام تک کرکٹ ہوتی۔ گھر واپس آتا اور کھانا وغیرہ کھا کر اوپر برساتی میں چلا جاتا۔ کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا۔ پڑھائی کس کو کرنا تھی۔ فرخندہ کے آنگن میں نگاہیں جمائے رہتا۔ وہ اب آنگن کی بتی بھی کم کم ہی جلاتی تھی۔ پورا گھر ایک خاموش تاریکی میں لپٹا نظر آتا تھا۔ اس تاریکی میں کبھی کبھی عبدل کی آواز گونجتی "فرخندہ جی! چائے کا پانی گرم ہے' آکر پتی ڈال دو۔" کبھی فرخندہ کی ساس اونچی آواز میں کھانستی اور بہو کو آواز دیتی "فرخندہ! ذرا مجھے کھانسی کی دوا پلا جا۔"

فرخندہ کو آواز دیتے ہوئے بڑھیا کے لہجے میں عجیب سا کرارہ پن آجاتا تھا۔ آج کل ساس بہو میں زیادہ سلوک نہیں رہا تھا۔ شادی کو پورے دو سال ہو چکے تھے اور ساس ابھی تک منتظر تھی کہ بہو کا جی متلائے اور وہ اچار وغیرہ ڈھونڈتی نظر آئے۔ بڑھیا کی اس محرومی نے اس کے لہجے میں غصے کی دھار تیز کر دی تھی..... اس روز برساتی میں بیٹھے بیٹھے اور فرخندہ کے آنگن میں نگاہ جمائے جمائے حامد کی اداسی اور قنوطیت عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سارے معاملے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لعنت بھیج دے گا اور یہ گھر چھوڑ کر کالج کے ہوسٹل چلا جائے گا۔ اسے اب ان در و دیوار سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ بھی کوئی جگہ تھی رہنے والی۔

یہ تیسرے یا چوتھے روز کی بات ہے۔ شام ہی سے آسمان گہرے تاریک بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہلے زوردار بارش ہوئی تھی اب مسلسل بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کئی روز سے جاں گسل حبس کے بعد مون سون کی یہ مہربانی ہر دل کو باغ باغ کر گئی تھی مگر حامد کو یوں لگتا تھا جیسے اس کے دل کا باغ جڑوں سے سوکھ گیا ہے اور ایک دائمی گھٹن کا موسم اس کی رگ جاں میں ٹھہر گیا ہے۔ وہ برساتی میں نیم دراز تھا اور بوندوں کی ٹپ ٹپ سن رہا تھا جب فرخندہ ہولے سے اندر آگئی۔ اسے دیکھ کر حامد مبہوت رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے زرد لباس پہن

رکھا تھا۔ لباس کی طرح اس کا چہرہ بھی زرد نظر آرہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں معمول سے کچھ زیادہ ابھری ہوئی تھیں۔ گردن کی جلد بہت زیادہ شفاف اور حساس نظر آتی تھی۔ ریشمی بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھے گئے تھے۔ وہ دروازے کے فریم میں ایک ایسی خوب صورت تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھی جس میں مصور نے زرد رنگ فراخ دلی سے استعمال کیا تھا۔

حامد اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ وہ اپنے سر سے بارش کی بوندیں جھٹک کر بولی "حامدی! کیوں ہم سب کو پریشان کررہا ہے۔ کیوں کررہا ہے ایسا؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"آپا (حامد کی والدہ) کا رو رو کر برا حال ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ تو ہوسٹل میں رہنا چاہتا ہے۔ گھر چھوڑ کر جارہا ہے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں دخل دینے والی کون ہو؟"

"ہاں سارے معاملے تیرے ذاتی ہیں۔ پھر بھی تو ان میں دوسروں کو گھسیٹتا ہے۔ کیا ہوگیا ہے تیرے دماغ کو؟"

"میں پاگل ہوگیا ہوں۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

وہ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر لرزاں لہجے میں بولی "دیکھ حامدی! تیری سوچ بڑی غلط ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بھائی حمید اور آپا سائرہ کا بیٹا ایسا نکلے گا۔ تو نے میری عزت کا ذرہ بھر خیال نہیں کیا۔ پتا نہیں تو نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ کیا میں تجھے ایسی عورت نظر آتی ہوں۔ کیا تو مجھے ایسی عورت سمجھتا ہے۔"

اس کا گلا رُندھ گیا اور وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے پر جھکتا چلا جارہا تھا۔ حامد کو یوں لگا جیسے سخت سردی میں اس پر گھڑوں پانی پڑگیا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لیے سُن رہ گیا۔ اگر ان لمحوں میں وہ خاموش رہ جاتا تو شاید حالات ایک بالکل مختلف سمت میں مڑ جاتے اور یہ روداد بھی یوں نہ ہوتی جیسے بیان کی جارہی ہے لیکن اس نے فوراً سنبھالا لیا۔ اس کی زبان کو گویائی ملی اور الفاظ خود بخود اس کے ہونٹوں سے اچھل پڑے "میں کیا کروں۔ کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے میرا جینا حرام کردیا ہے۔ میری زندگی عذاب کردی ہے۔ تم نے کیوں ملنا جلنا شروع کیا تھا مجھ سے؟ کیا گناہ تھا میرا جو مجھے یہ روگ لگایا تم نے؟ میں بہت رو چکا ہوں۔ خدا کے لیے اب مجھے معاف کردو۔ مجھے کہیں دور چلے جانے دو۔ ہمیشہ کے لیے کہیں دفع ہوجانے دو۔۔۔۔ مجھے مرجانے دو۔"

وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ وہ حیران تھا کہ وہ یہ کیا کررہا ہے۔ کیا واقعی یہ لفظ اس کی زبان سے ادا ہورہے ہیں۔ اس کی شرم، ہچکچاہٹ، اس کی بے زبانی ان سب کو کیا ہوا تھا۔ اپنے رویے کی اجنبیت محسوس کرکے اس کی ہچکیاں اور شدت پکڑ گئیں۔ وہ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی آواز بلند ہے۔ یہ آواز نیچے اس کی والدہ اور دادی تک پہنچ سکتی ہے لیکن کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ یکایک دو بازو اس کے کندھوں پر آگئے۔ اس کے کانوں میں چوڑیوں کی کھنک جاگی۔ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی فرخندہ کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی "چپ کرو حامدی! چپ کرو۔ میرے دل کو کچھ ہوجائے گا۔"

اس کی بے قرار بانہوں نے حامد کو گلے سے لگالیا۔ حامد کا چہرہ اس کے گداز شانے پر تھا اور آنسو آبشار کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہ فرخندہ سے اتنا قریب تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن تک محسوس کرسکتا تھا۔ اس کے جسم کی خوشبو ایک سحر انگیز گداز میں بس کر اس کی رگِ جاں میں اتر رہی تھی۔ اس کی نازک بانہوں کا حلقہ حامد کے گرد قائم تھا۔ وہ دونوں رو رہے تھے اور روتے چلے جارہے تھے۔ آنسو بہانے میں شاید آسمان بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ بارش کی بوچھاڑیں ایک دم زور پکڑ گئی تھیں۔ حامد نے محسوس کیا کہ اس کے تپتے ہونٹ فرخندہ کی شفاف گردن سے چھو رہے ہیں۔ یہ ایک جادوئی لمس تھا۔ وہ بے اختیار اس لمس کو چومنے لگا اور۔۔۔۔ پھر چومتا چلا گیا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا وہ کیا کررہا ہے۔ وہ آنسو بہارہا تھا اور آنسو ہی چوم رہا تھا۔ نمکین پانی جو فرخندہ کی پیشانی، رخساروں اور ہونٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس پانی کو دیوانہ وار چوس رہا تھا۔ وہ حامد کے ہونٹوں کے سامنے ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کی بانہیں حامد کے شانوں پر دھری تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے بہ مشکل خود کو حامد سے علیحدہ کیا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

○☆○

رات کی ملاقات حامد کے لیے ایک خواب جیسی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دنیا جہاں کی راحتیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی ہیں۔ اتنی خوشی تھی اس کے اندر کہ وہ سمیٹ نہیں پارہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ارشمیدس کی طرح چیختا ہوا گلیوں میں نکل جائے یا پھر ہواؤں میں اڑنے لگے۔۔۔۔ اوپر بہت اوپر آرمسٹرانگ کے نقشِ پا سے بھی آگے۔ کسی ایسے خلا میں جہاں کروڑوں میل کے دائرے میں کوئی متنفس نہ ہو۔ وہاں وہ چیخ چیخ کر کہے "میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ مجھے وہ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔ اب میرے دل میں کوئی حسرت نہیں۔ میں ابھی اور اسی گھڑی مرجانا چاہتا ہوں۔ اپنی بے مثال مسرتوں کو سینے سے لگا کر فنا کے گھاٹ اتر جانا چاہتا ہوں۔" برساتی بند کرکے وہ بہت دیر اپنی بے پناہ خوشی کے ساتھ دست و گریباں رہا۔

جب وہ برساتی سے باہر نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ رات کی بارش کے بعد ہر شے اجلی اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے فرخندہ کے آنگن میں نگاہ دوڑائی تو وہ سامنے ہی نظر آگئی۔ شاید وہ برساتی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ

حامد نے ابھی تک دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ حامد کو یوں سامنے دیکھ کر اس نے اچانک رخ پھیرلیا اور انگلی پر کپڑے پھیلانے لگی۔ آج وہ حامد کو بالکل اجنبی اور انجان نظر آرہی تھی..... ہاں یہ وہ فرخندہ نہیں تھی جسے حامد روز دیکھتا تھا۔ اس کی یہ اجنبیت بھی حامد کو اچھی لگی۔ اس اجنبیت میں ایک دل گداز راز پنہاں تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ نیچے اترا تو ماں نے کہا "کیا بات ہے حامدی! آج تو بڑا خوش نظر آرہا ہے۔"

"ہاں ماں! اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ خوش رہا کروں گا۔" وہ بے اختیار بولا۔

"شاید اسی طرح تیرے جسم پر کوئی بوٹی آجائے۔" دادی ماں نے تسبیح پھیرتے ہوئے کہا۔

"ضرور آئے گی بوٹی۔ دادای ماں ضرور آئے گی۔" وہ چہکا۔

"میں تو کہتی ہوں ہوسٹل جانے کا خیال بھی دل سے نکال دے۔" ماں نے اسے خوش دیکھ کر بات چھیڑی۔

"ٹھیک ہے ماں! اس بارے میں بھی سوچ لیتا ہوں۔"

"ارے..... کیا واقعی۔" حامد کی والدہ کی آنکھیں حیرت آمیز خوشی سے وا ہو گئیں۔

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟" اس نے کہا۔

اسی دوران میں فرخندہ صحن میں داخل ہوئی "سلام آپا۔" اس نے حامد کی والدہ کو سلام کیا۔

"وعلیکم سلام۔" حامد کی والدہ بڑی محبت سے بولیں۔

"آپا' میں اور عبدل جارہے ہیں۔"

"کہاں؟" حامد کی والدہ چونک گئیں اور ان سے کہیں زیادہ حامد چونکا۔ اس کے کانوں میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ کہیں وہ واپس کراچی تو نہیں جارہے۔ ان دونوں کے بے طرح چونکنے پر فرخندہ ہولے سے مسکرائی "کہیں نہیں آپا! بس بابا جی کے مزار تک جارہی ہوں۔ شام کو لوٹ آؤں گی۔ اماں باہر برآمدے میں لیٹی ہے۔ میں نے بڑے کمرے کو تالا لگادیا ہے۔ یہ چابی آپ رکھ لیں۔"

فرخندہ کبھی کبھار بابا جی کے مزار پر جاتی تھی اور جب بھی جاتی تھی' چابی حامد کی والدہ کو دے جاتی تھی بلکہ اسے اور عبدل کو کہیں بھی جانا ہوتا تھا' چابی حامد کی والدہ کے پاس ہی ہوتی تھی۔

حامد کے روز و شب میں بے حد رنگینی اور سرشاری آگئی تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار فرخندہ دل جوئی کے لیے اس کے پاس ضرور آتی تھی۔ حامد نے اب مستقل طور پر برساتی میں سونا شروع کردیا تھا اور اپنی سب کتابیں برساتی میں ہی لے آیا تھا۔ رات آٹھ نو بجے کے بعد فرخندہ چھت کا راستہ استعمال کرتی اور اس کے پاس آجاتی۔ وہ دونوں باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتے اور یوں ہی بے وجہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی فرخندہ بڑے شفقت بھرے انداز میں اس کا سر اپنے شانے سے لگالیتی۔ جنم جنم کے بھوکے کو جیسے محبت کی خوراک مل جاتی۔ ایسے میں برساتی کے اندر قیامت خیز سناٹا چھا جاتا۔ حامد کے لرزاں ہونٹ فرخندہ کے چہرے اور گردن پر بھٹکنے لگتے۔ اسے لگتا جیسے اس کائنات میں اس گردن اور چہرے کے محبت بھرے لمس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اس لمس کے سوا اسے کچھ بھی درکار نہیں تھا۔ مرد و زن کی محبت کے اس پہلے زینے کو وہ آخری زینہ سمجھتا تھا۔ اس "زینے" سے آگے بڑھنے کی اسے خواہش تھی اور نہ وہ ایسا سوچ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس روز اس نے اپنی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی' محبت کی دیوی اس سے روٹھ جائے گی اور یہ روٹھنا کوئی معمولی نہیں ہوگا۔ وہ کبھی..... کبھی بھی اسے اپنی صورت نہیں دکھائے گی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرخندہ اور حامد کا ملاپ دو جسموں کا نہیں' دو روحوں کا نہیں دو چہروں کا ملاپ تھا۔ یہ بات حامد کو کئی برسوں بعد معلوم ہوئی کہ یونانی فلسفے میں اس سے ملتی جلتی ایک بات کہی جاتی ہے..... کہا جاتا ہے کہ عورت کا بالائی جسم اس کے "چاہنے والے" کا ہوتا ہے جب کہ زیریں جسم اس کے شوہر کا۔

انہی دنوں حامد نے فرخندہ کو وہ طلائی لاکٹ بھی دے دیا تھا جو ایک روز اس نے توڑ موڑ کر کاٹھ کباڑ کے پیچھے پھینک دیا تھا۔ اس مڑے تڑے لاکٹ کو دوبارہ سے بنوانے پر حامد کے ۷۵ روپے مزید لگ گئے تھے لیکن اس مرتبہ وہ پہلے سے بھی خوب صورت بنا تھا۔ اور اسے خوب صورت بننا ہی چاہیے تھا۔ فرخندہ کے ساتھ حامد کا "کچ رچ" تعلق بھی تو پہلے سے زیادہ واضح اور خوب صورت ہوچکا تھا۔ فرخندہ کو لاکٹ بہت پسند آیا تھا لیکن اس نے اس تحفے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ حامد نے اسے لاکٹ کی ساری روداد بھی سنادی تھی اور بتادیا تھا کہ یہ لاکٹ اس نے کیسے اور کیوں توڑ پھوڑ دیا تھا۔ فرخندہ حیرت سے ہنستی رہی تھی۔ آخر میں دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی "تم بہت ضدی اور غصیلے ڈیش ہو۔"

"ڈیش ہو؟ یہ کیا بات ہوئی۔" حامد نے پوچھا تھا۔

"ڈیش کا مطلب ہے' خالی جگہ..... یہ خالی جگہ پُر کرکے فقرہ تم خود مکمل کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

حامد کو غصہ آرہا تھا لیکن وہ مسکرانے پر بھی مجبور تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ خالی جگہ پر کیا لفظ آئے گا۔ وہ کہہ گئی تھی کہ تم بہت ضدی اور غصیلے بچے ہو۔ لیکن حامد کو چوں کہ "بچے" کے لفظ سے بہت چڑ تھی لہٰذا وہ اسے شرارت سے چڑا گئی تھی۔

حامد نے ایک عجیب بات نوٹ کی تھی۔ جب بھی فرخندہ سے اس کی ملاقات ہوتی' اس سے اگلے روز یا اس سے اگلے روز فرخندہ بابا جی کے مزار پر ضرور جاتی تھی۔ اگر جمعہ ہوتا تو عبدل اس کے ساتھ ہوتا ورنہ وہ محلے کی کسی عورت کو ساتھ لے جاتی۔ شروع میں تو حامد نے اسے اپنا وہم خیال کیا لیکن جب اس نے معاملے پر دھیان دیا تو یہ وہم درست نکلا۔ ایک دو بار اس کا دل چاہا بھی کہ وہ

فرخندہ سے اس بارے میں پوچھے لیکن ایک عجیب سی ہچکچاہٹ مانع ہوگئی۔

..... تین چار ماہ اسی طرح گزر گئے۔ دھیرے دھیرے فرخندہ کے ساتھ حامد کی ملاقاتوں میں آسودگی کی وہ ناقابلِ فراموش کیفیت باقی نہ رہی جو شروع میں موجود تھی۔ وہ اب تک چہرے کے لمس کو ہی سب کچھ سمجھے ہوئے تھا۔ بالفاظِ دیگر اس ایک "زینے" میں ہی اس کے لیے ہزارہا زینے سمائے ہوئے تھے لیکن اب اس کے قدم اس "زینے" سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ انہی دنوں حامد نے محسوس کیا کہ فرخندہ بڑے سلیقے اور دانائی سے اس کی توجہ کا رخ کسی اور طرف موڑ رہی ہے۔ ایک ایسی بھولی بسری کہانی کی طرف جو کسی وقت حامد کے دل میں میٹھا میٹھا درد جگایا کرتی تھی اور اس کے ذہن کو ہواؤں میں اڑایا کرتی تھی۔ وہ اس کی توجہ شمیم کی طرف مبذول کرا رہی تھی۔ وہی شوخ چنچل شمیم جس نے چند سال پہلے حامد کے دل میں گھر کیا تھا اور جس کے لیے اس نے مٹی کے گلے میں پیسے جوڑنا شروع کیے تھے۔ وہ شمیم اب پھر لاہور آگئی تھی اور لاہور آکر حامد کے گھر میں ہی مقیم ہوگئی تھی۔ وہ اب تک کوئٹہ میں اپنے تایا نصیرالدین کے پاس تھی۔ تائی کے ساتھ شمیم کی ماں کا بدبودست جھگڑا ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ حامد کی فیملی اور کوئٹہ والے تایا کی فیملی میں تعلقات اچھے نہیں تھے' لہٰذا کوئٹہ والے تایا سے شمیم کی والدہ کی بگڑی تو وہ خود بخود حامد کی فیملی کے قریب آگئیں۔ حامد کے ابو نے خود اصرار کر کے شمیم اور اس کی والدہ کو اپنے گھر میں رکھا اور شمیم کی والدہ کو' جو "بی ایڈ" تھیں' ایک اسکول میں ٹیچر بھی کرادیا۔ اب وہ لوگ حامد کے گھر میں ہی مقیم تھے۔ دادا جان پچھلے سال وفات پاگئے تھے لہٰذا ان کا کمرا شمیم اور اس کی ماں کے تصرف میں آگیا تھا۔

شمیم اب وہ سات سال پہلے والی شمیم نہیں رہی تھی۔ وہ ایک نودمیدہ پھول تھی جس کی پُرشباب خوشبو اور جس کے الزر رنگ ہر شخص کو مسحور کرتے تھے۔ یہ پھول اچانک کوئٹہ سے لاہور پہنچا تھا اور حامد کی آنکھوں کے عین سامنے بہار دکھانے لگا تھا لیکن حامد تو کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اسے فرخندہ کے ملیح چہرے کے سوا کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ سجھائی۔ اس نے شمیم کی آمد کو زیادہ بھر اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ ایک ماہ سے اس کے قریب تھا لیکن اس سے کوسوں دور تھا۔ فرخندہ کو نجانے کیسے علم ہوگیا تھا کہ چند سال پہلے حامد اپنی تایا زاد شمیم میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور وہ دن رات ایک دوسرے میں مگن رہے ہیں۔ ظاہر ہے ماں کے سوا یہ بات فرخندہ کو اور کون بتا سکتا تھا۔ فرخندہ اب تنہائی میں حامد سے ملتی تو ہر بات میں سے شمیم کی بات نکالنے لگتی۔ وہ جابے جا اس کی تعریف کرتی "کتنی شوخ ہے وہ..... اور حاضر جوابی تو جیسے گھول کر پی گئی ہے۔ کل میں نے کہا شمیم....."

"اچھا اچھا چھوڑو یہ تذکرہ۔" حامد اس کی بات کاٹتا "میں جانتا ہوں' بڑی ہوشیار ہے وہ۔"

"لیکن تمہیں تو پھر بھی وہ نہ پٹا سکی۔" وہ شوخی سے کہتی۔

"حالاں کہ راہ چلتے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں اسے۔ وہ سامنے کھڑکی پر شریف لوہار کا لڑکا نہری ہے ہاں' ہر وقت چھت پر کھڑا رہتا ہے۔" فرخندہ حامد کے دل میں رقیبانہ جذبات ابھارنے کی کوشش کرتی۔

شروع شروع میں تو اس نے فرخندہ کی باتوں کو قطعاً اہمیت نہ دی لیکن دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر وہ شمیم کو دیکھنے لگا۔ گھر میں اس کی موجودگی کو محسوس کرنے لگا۔ واقعی اس کا حسن خطرناک حد تک دعوت انگیز اور فتنہ سامان تھا۔ اوپر سے وہ کپڑے بھی بڑے بھڑکیلے اور خوب صورت پہنتی تھی۔ وہ جدھر جاتی تھی کشش کا ایک ہالہ سا اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ حامد نے غور سے شمیم کو دیکھا تو اس کی شرقی آنکھوں میں اسے اپنے لیے ایک خاموش بلاوا نظر آیا۔ حامد کا دل انوکھے انداز میں دھڑکا لیکن اس کے ساتھ ہی فرخندہ کا بے پناہ تصور اس کے ہر خیال کو آندھی کی طرح اڑا لے گیا۔ حامد کبھی بھی شمیم کی طرف متوجہ نہ ہوتا اگر ایک عجیب واقعہ رونما نہ ہوتا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ جمعرات کی شام حامد کو ہمیشہ خوش گوار محسوس ہوا کرتی تھی۔ اگلے روز چھٹی ہوتی تھی اور وہ اطمینان سے دیر تک سو سکتا تھا۔ والد صاحب بھی جمعرات کی شام اندرونِ شہر ایک "درس" میں چلے جاتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ اس شام بھی وہ درس پر جاچکے تھے۔ حامد چھت پر ٹہل رہا تھا اور ان رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھ رہا تھا جو سورج غروب ہونے کے بعد تیزی سے اپنے اپنے "ٹھکانوں" کی طرف کھنچتی چلی جارہی تھیں..... شمیم چھت پر آئی۔ حامد کو دیکھ کر شرمیلے انداز میں مسکرائی اور تپائی پر ایک کاغذ رکھ کر چلی گئی۔ حامد نے جلدی سے کاغذ اٹھایا۔ وہ چھوٹا سا پرزہ تھا۔ اس پر انگریزی میں صرف چار لفظ لکھے تھے "I LOVE YOU TOO" حامد کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسے شمیم سے ایسی بے باکی کی توقع نہیں تھی۔ اسے اپنے ہاتھ کانپتے محسوس ہوئے۔ اس نے دو تین بار غور سے یہ مختصر ترین محبت نامہ پڑھا۔ فقرے کی بناوٹ کچھ سمجھ میں نہیں آئی "I LOVE YOU TOO" یعنی میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ "بھی" سے شمیم کی کیا مراد تھی؟ حامد نے اس سے کب کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے' جس کے جواب میں وہ لکھ رہی تھی کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس فقرے کا ایک مطلب اور بھی ہوسکتا تھا یعنی صرف فرخندہ ہی نہیں' میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ حامد کو یہی مطلب زیادہ قرینِ قیاس نظر آیا۔ یقیناً حامد کی والدہ اور کسی حد تک والد کی طرح شمیم بھی اس معاملے سے آگاہ ہوچکی تھی جو فرخندہ اور حامد کے درمیان چل رہا تھا۔ اب اس نے اپنے وجود کا احساس اس مختصر محبت نامے کے ذریعے دلایا تھا۔

حامد کے ذہن میں عجیب اتھل پتھل شروع ہوگئی۔ فرخندہ کا

تصور اس کے دل و دماغ سے یوں پیوست تھا کہ اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا محال تھا۔ وہ اس کے سوا کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اگلے روز حامد کالج سے واپس آیا تو اس کا کمرا یعنی برساتی جگمگ کر رہی تھی۔ پچھانا ہی نہیں جا رہا تھا کہ یہ وہ برساتی ہے۔ سب کاٹھ کباڑ غائب تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ کتابیں' کپڑے' جوتے' ہر شے میں جاذبِ نظر ترتیب نظر آ رہی تھی۔ وہ فوراً پہچان گیا کہ یہ سب کام شمیم کا ہے۔ وہ مسکرا کر بستر پر لیٹ گیا۔

اچانک اسے ایک کتاب کا خیال آیا۔ یہ ایک انگلش ناول تھا جو اس کے ایک کالیجیٹ دوست نے پڑھنے کو دیا تھا۔ خاصا بولڈ اور جذبات انگیز قسم کا ناول تھا۔ یہ ناول اس نے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھایا۔ ناول موجود نہیں تھا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ اس کی فاش غلطی تھی۔ صبح کالج جاتے ہوئے وہ ناول الماری میں منتقل کرنا بھول گیا تھا..... اب وہ ناول کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ شمیم نے اٹھالیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ شمیم کے آنے سے پہلے امی' تائی جان یا پھر ابو کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ ابو یا تائی جان کے ہاتھ لگ جاتا تو بیڑا غرق تھا۔ وہ دونوں "انگلش دان" تھے اور ناول ہرگز ہرگز ان کے پڑھنے لائق نہیں تھا۔ حامد اپنے کمرے میں ناچ کر رہ گیا' پھر وہ گھبرایا ہوا نیچے پہنچا۔ شمیم حامد کی والدہ کے پاس بیٹھی گوبھی کاٹ رہی تھی۔ حامد ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا بیٹے؟" حامد کی والدہ نے چونک کر پوچھا۔

"مم..... میری کوئی کتاب..... تو نہیں دیکھی آپ لوگوں نے؟"

"کتاب؟ نہیں تو۔" والدہ نے کہا۔

"میں نے بھی نہیں دیکھی۔" شمیم پوری سنجیدگی سے بولی۔

"میرے کمرے کی صفائی تم نے کی تھی؟"

"ہاں۔" شمیم کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی "لیکن..... کتاب تو میں نے کوئی نہیں دیکھی۔"

"چھوٹی سی کتاب تھی انگلش کی۔ بستر پر پڑی تھی۔"

"سرے سے کوئی کتاب تھی ہی نہیں بستر پر۔" شمیم نے کہا۔

"تمہارے ابو گئے تھے اوپر۔ کہیں وہ نہ لے آئے ہوں۔" والدہ نے خیال آرائی کی۔

حامد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا واپس کمرے میں پہنچ گیا۔ زمین آسمان آنکھوں کے سامنے رقصاں تھے۔ وہ والد صاحب کی جلالی طبیعت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ آج کل ویسے بھی وہ درس میں پابندی سے جاتے تھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ کوئی سخت مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ بہرحال ایک موہوم سی امید ابھی باقی تھی۔ شاید وہ خود ہی کتاب کسی کونے کھدرے میں رکھ کر بھول گیا ہو..... شام تک وہ اندھوں کی طرح پورے گھر میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا اور کتاب ڈھونڈتا رہا۔ کتاب کو تو خیر کیا ملنا تھا' پورا گھر کباڑ خانے کا نمونہ پیش کرنے لگا۔

رات نو بجے ابو آئے تو اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس کبوتر کی طرح جو بلی دیکھ لیتا ہے' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی پناہ گاہ یعنی برساتی میں گھس گیا۔ رات دس ساڑھے دس بجے تک وہ ہر آن کسی طوفان کا منتظر رہا' لیکن طوفان نہیں آیا۔ شاید ابو صبح تازہ دم ہو کر اس کا ریمانڈ لینا چاہتے تھے۔ وہ کانٹوں کے بستر پر تھا۔ اچانک چراں کی آواز سے برساتی کا دروازہ کھلا اور شمیم اندر آ گئی۔ اس کا سرخ کامدار کرتا بلب کی زرد روشنی میں دمک رہا تھا۔ کرتے کے ساتھ اس نے پھول دار سیاہ شلوار اور سیاہ دوپٹے کی میچنگ کی تھی۔ اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے اور ان بندھے ہوئے بازوؤں کے درمیان وہی گم شدہ کتاب نظر آ رہی تھی۔ شمیم کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ تھی۔ پہلے حامد کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی پھر اس کے جسم کا خون سر کو چڑھ گیا۔ شمیم نے کتاب اس کی طرف بڑھائی تو اس نے کتاب کے بجائے اس کی کلائی پکڑلی۔

"میچ چیل۔ شیطان کی بچی' اُلو کی پٹھی۔" وہ اس پر جھپٹا۔

اس نے مصنوعی خوف سے ہلکی سی چیخ ماری اور اپنا آپ چھڑانے لگی۔ حامد نے اس کے لمبے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ان لمحات میں حامد کو بالکل یوں لگا جیسے وہ دونوں ابھی لڑکپن کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ گڑیا گڈا کھیل رہے ہیں اور کسی بات پر مشتعل ہو کر وہ شمیم کو پیٹنے پر تل گیا ہے۔ شاید اس کا ہاتھ شمیم کو مارنے کے لیے اٹھا بھی تھا لیکن پھر وہ ایک دم اپنی جگہ جامد رہ گیا۔ وہ ننھی منی شمیم پر نہیں' ایک جوان خوب رو دوشیزہ پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ اس دوشیزہ کے سحر انگیز جسم کے خدوخال حامد سے قریب تر تھے۔ ایک دم جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے بہ آہستگی شمیم کے بال چھوڑ دیے۔ وہ بھی بھید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے جلدی سے رخ پھیرا اور کوئی لفظ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

حامد بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے کتاب کھولی۔ کتاب پر کئی جگہ "نازک" سطور کو پنسل سے انڈر لائن کیا گیا تھا۔ جہاں جہاں سطور انڈر لائن کی گئی تھیں وہاں وہاں لکھا تھا "توبہ ہے یا اللہ۔"

"توبہ ہے یا اللہ" کے الفاظ کتاب کے پہلے تین ابواب میں قریباً چالیس جگہ لکھے تھے۔ غصے کے باوجود حامد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ ربر لے کر ان نشانات کو مٹانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک عجیب ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ شمیم کا لجاں خیز سراپا بار بار اس کی نگاہوں میں آ رہا تھا۔

اس روز کے بعد حامد اور شمیم میں ایک بے نام سا ربط قائم ہو گیا۔ ان کی آنکھیں باتیں کرنے لگیں اور باتوں میں سے لگاؤ جھلکنے لگا۔ نجانے کیوں حامد کو پھر وہی گڑیا یاد آ گئی تھی جو سات آٹھ سال پہلے اسے شمیم کو دینا تھی۔ شمیم کو بھی وہ گڑیا ابھی تک یاد

تھی۔ وہ گڑیا جو کہیں نہیں تھی لیکن ان دونوں کے حافظے میں محفوظ تھی۔ ایک روز حامد کا دل چاہا کہ وہ شمیم سے کیا ہوا اپنا وہ برسوں پرانا وعدہ پورا کر ڈالے۔ اس نے بازار سے ایک قیمتی گڑیا خریدی اور گھر لے آیا۔

"آج شام مجھ سے ملنا۔" اس نے ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے یہ آہستگی کہا۔

"کیوں؟" شمیم نے وحشت زدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"ایک تحفہ دینا ہے تمہیں۔"

شمیم کی آنکھوں میں ایک دم سے سیکڑوں دیپ جل اٹھے۔

"اچھا میں آؤں گی۔" اس نے کہا۔

حامد ایف ایس سی کر رہا تھا۔ شمیم فرسٹ ایئر میں تھی "میتھ" کا سوال سمجھنے کے بہانے وہ شام کو اس برساتی میں آتی جو حامد کے اسٹڈی روم کے علاوہ اس کے بیڈ روم' ڈائننگ روم اور سٹنگ روم وغیرہ کی ضروریات بہ احسن پوری کرتی تھی۔

اس روز حامد نے شمیم کو گڑیا دی تو اسے یوں لگا جیسے یہ سلسلہ وہیں سے جڑ گیا ہے جہاں سے برسوں پہلے ٹوٹا تھا۔ ایک دوسرے کی برسوں پرانی مہک نے انہیں مدہوش کر دیا اور وہ یکایک ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ شمیم کا سرکش شباب ایک تند لہر کی طرح حامد کو اپنے ریلے میں بہانے لگا۔

"فرخندہ باجی آپ سے بہت بے تکلف ہیں۔" شمیم نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"فرخندہ ـــــ ہاں ـــــ فرخندہ۔" وہ چونک سا گیا۔

ان لمحات میں فرخندہ اسے کوئی بہت دور کی چیز محسوس ہوئی۔ بھولی بسری اور دھندلائی ہوئی۔

"ویسے فرخندہ باجی بڑی اچھی ہیں۔" شمیم نے پھر سرگوشی کی۔

"وہ ـــــ وہ کیوں؟"

"ارے وہ نہ ہوتیں تو تمہارے پتھر کے بتوں میں جان کیسے پیدا ہوتی۔ وہی تو جناب کا پہلا نامہ لائی تھیں۔"

"نن ـــــ نامہ۔ ہاں ـــــ ہاں۔" حامد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

شمیم نے خود کو حامد سے ذرا پیچھے ہٹاتے ہوئے اپنی قمیص کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی پرچی حامد کو تھماتی "دیکھیے۔ آپ کی یہ تحریر ہم نے ابھی تک سینے سے لگا رکھی ہے۔"

حامد نے حیرانی سے اس تہ شدہ پرچی کو کھولا۔ انگلش کے بلاک لیٹرز میں لکھا تھا "آئی لو یو شمیم۔ حامد۔" تحریر حامد کی تحریر سے ملتی جلتی ہی تھی۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ یہ الفاظ اس نے نہیں لکھے تھے تو پھر کس نے لکھے تھے۔ یقیناً ـــــ یقیناً فرخندہ نے خود لکھے ہوں گے اور شمیم تک پہنچائے ہوں گے ـــــ اب اس کی سمجھ میں وہ مختصر تحریر بھی آ رہی تھی جو شمیم نے اسے لکھی تھی "آئی لو یو ٹو۔"

دراصل یہ الفاظ اسی مختصر محبت نامے کا مختصر سا جواب تھے۔

اسی دوران میں نیچے صحن سے فرخندہ کی آواز آئی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ شاید صحن میں بیٹھی دادی اماں سے ـــــ پھر وہ بلند آواز میں بولی "آپا جی! بھائی جی آ رہے ہیں۔ چائے کا پانی رکھ دیں۔"

حامد کو محسوس ہوا کہ یہ آواز حامد کی والدہ کو سنانے کے لیے نہیں ان دونوں کو سنانے کے لیے تھی ـــــ شمیم جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے لباس کی شکنیں درست کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے "اچھا میں چلتی ہوں' چچا جان آ گئے ہیں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ حامد گم صم بستر پر نیم دراز رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ فرخندہ اسے اور شمیم کو انگلی پکڑ کر چلا رہی ہے۔ ان کے لیے ملنے کے مواقع پیدا کر رہی ہے۔ انہیں ایک دوجے کے قریب لا رہی ہے۔ کئی بار حامد کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس جال کو توڑ دے لیکن شمیم سے مل بیٹھنے اور اس کے قریب آنے کے مواقع اتنے زیادہ اور اتنے آسان تھے کہ وہ ایک اَن چاہی سمت میں بہا چلا جا رہا تھا۔ فرخندہ اس سے دور ہو رہی تھی اور شمیم نزدیک تر آ رہی تھی۔

ایک خنکی ہوئی شام کو جب آسمان پر شفق کی سرخی پھیلی تھی' حامد نے فرخندہ کو آنگن میں دیکھا۔ وہ اپنی ساس کی چارپائی کی ادوائن کس رہی تھی۔ حامد کو لگا جیسے فرخندہ میں وہ پہلے جیسی چستی نہیں رہی۔ اس کا رنگ قدرے سانولا ہو گیا تھا اور جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ وہ چپتے جیسی کمر جو نازک شاخ کی طرح لچکتی تھی' بھاری ہو چکی تھی۔ اچانک حامد کو احساس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ یہ موٹاپا بلاوجہ نہیں تھا۔ فرخندہ ادوائن کس کر سیدھی ہوئی تو اس کا دوپٹا خاص انداز میں سامنے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عبدل بچے کا باپ بننے والا ہے۔ ایک جلا پا سا اس کے سینے میں دھواں دینے لگا۔ اسے عبدل اور فرخندہ پر خواہ مخواہ طیش آنے لگا۔ وہ جانتا تھا یہ طیش بلاجواز ہے۔ میاں بیوی اپنی مرضی کے تنہا مالک تھے مگر نجانے کیوں وہ لاشعوری طور پر یہ سمجھتا تھا کہ فرخندہ کو کچھ بھی کرنے سے پہلے اس سے اجازت لینی چاہیے یا کم از کم مشورہ کرنا چاہیے۔

○☆○

فرخندہ کا موٹاپا' پڑمردگی اور اس کی بے اعتنائی دیکھ دیکھ کر حامد کا دھیان اس کی طرف سے ہٹتا جا رہا تھا۔ اس کی جگہ تیزی سے شمیم لے رہی تھی۔ ایک وقت تھا جب فرخندہ کراچی میں تھی اور اس سے بہت دور تھی لیکن وہ ہر آن اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے والے گھر میں رہتی تھی لیکن ہفتوں اس کا خیال حامد کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔

پھر ایک روز شمیم نے شوخ لہجے میں حامد کو بتایا کہ عبدل ایک بچی کا باپ بن گیا ہے۔

"چلو اچھا ہے' اب گھر میں کچھ تو عزت ہوگی بے چارے کی۔" حامد نے کہا تھا اور بات ختم کردی تھی۔

انہی دنوں گھر میں حامد اور شمیم کی شادی کی بات چل نکلی تھی۔ حامد کے والد اس شادی کے حق میں تھے۔ امی بھی راضی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ گھر کی لڑکی گھر ہی میں رہے لیکن شمیم کی والدہ کچھ تذبذب میں تھیں۔ یوں تو حامد انہیں بہت پسند تھا لیکن وہ کسی اور انداز سے سوچ رہی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور ان کا نظریہ تھا کہ خاندان کے اندر زیادہ شادیاں نہیں ہونی چاہئیں ورنہ اولاد پر اثر پڑتا ہے۔ کزن میرج کی ایک مثال ہر وقت ان کے ذہن سے چمٹی رہتی تھی۔ یہ مثال حامد کے خاندان میں ہی موجود تھی۔ حامد کی ایک پھوپو کی شادی ایک ماموں سے ہوئی تھی اور ان کے بچے نارمل نہیں تھے۔

جب حامد کی شادی کی بات شروع ہوئی تو امی ابو نے تائی کو یہ سمجھانے کی کوشش شروع کردی کہ ایب نارمل اولاد کا چانس ہزاروں میں ایک ہوتا ہے۔ اس کو اتنا اہم مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ تائی جان کبھی قائل نظر آتیں لگتیں کبھی پھر تذبذب میں پڑجاتیں۔ دوسری طرف حامد اور شمیم کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کا رومانس دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا تھا۔ یہ گھر کے اندر کا رومانس تھا اس لیے یہ خطرہ بھی نہیں تھا کہ اس کی خوشبو اڑ کر گلی' محلے یا بستی میں پھیل جائے گی۔ چہمت' سیڑھیاں' بالکونیاں غرض گھر کی ہر جگہ اس رومانس کے لیے سازگار تھی۔ فرخندہ سے اب کم کم ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی اپنے حال میں مگن نظر آتی تھی۔ اپنی ریں ریں کرتی سانولی بچی کو کندھے سے لگائے برآمدے میں ٹہلتی رہتی۔ کبھی صحن میں کھڑے نیم کے پیلے پیلے پوتڑے دھوتی' کبھی دیگچی میں بچی کا دودھ لیے کچن سے نکلتی اور تیزی سے کمرے میں داخل ہوجاتی۔ اس کی ساس کی کھانسی بڑھ گئی تھی اور اس نے مستقل طور پر کھاٹ سنبھال لی تھی۔ فرخندہ کو اس کی دیکھ بھال میں بھی اب کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ ہفتے دو ہفتے بعد وہ عبدل کے ساتھ بابا جی کے مزار پر بھی جاتی نظر آتی تھی۔ بہت دنوں سے فرخندہ سے بات نہیں ہوئی تاہم شمیم سے پتا چلا تھا کہ فرخندہ کبھی کبھار حامد کی والدہ سے ملنے آجاتی ہے۔ ایک دن شمیم نے کہا۔

"میری اور آپ کی شادی کی بات چلی ہے تو فرخندہ باجی بھی بہت خوش نظر آتی ہے۔ چچی جان کو اکثر اس سلسلے میں مشورے دیتی رہتی ہے۔"

"اس کے مشورے بھلا کس گنتی میں آئیں گے۔" حامد نے بے پروائی سے کہا۔

"یہ بات نہیں۔" شمیم نے ٹوکا "بڑی سیانی ہے باجی۔ بڑی بوڑھیوں میں بیٹھتی ہے تو ان سے بڑھ کر دانائی کی باتیں کرتی ہے اور پھر یہ کیوں بھولتے ہیں آپ کہ ان ہی کی کوشش سے میں اور آپ۔۔۔۔"

"اچھا اچھا۔ بہت دفعہ سنی ہے یہ کتھا۔" حامد نے شمیم کی بات کاٹ دی اور جھپٹ کر اس کی ہنت رنگ چوڑیوں والی کلائی پکڑلی۔

شمیم کی والدہ پڑھی لکھی تو تھیں ہی لیکن روحانیت پر بھی گہرا یقین رکھتی تھیں۔ اکثر گھر میں میلاد کرواتیں۔ دادی جان کے ساتھ مل کر وظیفے کرتیں اور نفل' استخارہ اور چلہ جیسے الفاظ ان کی گفتگو میں موجود رہتے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جو بات ان کے ذہن میں بیٹھ جاتی' آسانی سے نکلتی نہیں تھی۔ کبھی کبھی حامد یہ سوچ کر ڈر جاتا کہ کہیں ان کے بے معنی خیالات اس کے اور شمیم کے درمیان دیوار نہ بن جائیں۔

پھر ایک روز وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ جس اسکول میں تائی جان پڑھاتی تھیں وہاں جمعرات کو بارہ بجے چھٹی ہوجاتی تھی۔ ایک بجے تک تائی جان گھر پہنچ جاتی تھیں لیکن اس روز وہ شام سے تھوڑی دیر پہلے لوٹیں۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ حامد کو لگا کہ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ حامد نے پوچھا لیکن انہوں نے سردرد کا بہانہ بنایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ رات کو انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ماں کی پریشانی نے شمیم کو بھی پریشان کررکھا تھا۔ وہ ماں سے بہت محبت کرتی تھی۔ ہر وقت ان کی دل جوئی میں لگی رہتی تھی۔ باپ کی موت اور بہن بھائیوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے شمیم کی ساری محبتیں ماں میں سمٹ آئی تھیں۔

اگلے روز حامد نے یہ مایوس کن خبر سنی کہ تائی عصمت' حامد اور شمیم کے رشتے پر رضامند نہیں ہیں۔ یہ صاف انکار والی صورتِ حال تھی۔ حامد کی والدہ اور تائی جان کے تعلقات پہلے ہی سرد مہری کا شکار تھے۔ اس جھٹکے نے انہیں ایک دم ایک دوسرے سے دور کردیا۔ تائی جان کی بات سے حامد کے دل کو بھی سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ حامد گم صم ہو کر رہ گیا۔ شمیم نے ایک دوبار حامد سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کنی کترا گیا۔۔۔۔ پھر وہ بھی کچی کچی رہنے لگی۔ شاید انا کی ان دیوار ان دونوں کے درمیان حائل ہونا شروع ہوگئی تھی۔۔۔۔ سارا کام جمعرات کی اس منحوس شام نے خراب کیا تھا۔ خبر نہیں اس شام تائی جان کس سے مل کر آئی تھیں اور کیا سن کر آئی تھیں؟ یہ سوال حامد کے لیے معما تھا۔ صورتِ حال بگڑتی چلی جارہی تھی۔ ایک دن حامد کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ فرخندہ سے اس سلسلے میں مدد لی جائے' شاید وہ اس گتھی کو سلجھانے میں مدد کرسکے لیکن پھر نجانے کیسے یہ بات ذہن کی گرفت سے نکل گئی۔

شمیم کے ماموں اسلام آباد میں مقیم تھے اور محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ انہوں نے اپنی بہن یعنی تائی جان کے لیے ایک اچھی

سیاہ، لانبے، گھنے اور چمکیلے بال جاذبِ نظر بنا دیتے ہیں!



قدرت نے عطا کیا
اکسیری نے پیش کیا

ویوینول

بالوں کو گرنے اور سفید ہونے سے روکنے کی دوا

ویوینول بالوں کو لانبا، گھنا اور چمکیلا بنا
ہے۔ یہ نہ صرف بالوں کی دوسری بیماریوں مثلاً بالوں
کا خشک ہونا، پھٹنا، سفید ہونا، کمزور ہو کر گرنا بالوں
میں خشکی کا جمنا سے حفاظت رہتا ہے۔ بالوں کی چمک تھم
جانا، جلد کی خشکی، پھلبل، سر پکنا اور سکا دینے جیسی شکایتوں کو
بھی دور کرتا ہے۔ ویوینول بالوں کا قدرتی اور سائنٹفک علاج ہے

بالوں کی خصوصی
مفت معلومات کتاب
طلب کریں۔

امریکن کوالٹی ایوارڈ یافتہ
امریکہ کی نیویارک سے
تیار شدہ

خواجہ میڈیکل اسٹور بالمقابل ایبٹ روڈ مسکاپ
دارالشفاء ٹریڈرز مقابل سعید ڈسپنسری کراچی
شافی دواخانہ سبلان دواخانہ، شاہی بازار حیدرآباد
رؤف ٹریڈنگ کمپنی ایڈورڈز روڈ حیدرآباد
دہلی دواخانہ مارکیٹ روڈ۔ سکھر
نونہال دواخانہ ریلوے روڈ شاہدرہ لاہور
مرکزی میڈیکل اسٹور آرچرڈ روڈ سرگودھا
یونی پنسار اسٹور ہرکشن پورہ روڈ۔ سرگودھا
وقاص میڈیسن کمپنی چوک انارکلی لاہور
طاہر دواخانہ کوٹ ادو ایبٹ روڈ چوک انارکلی لاہور
ایچ بشیر اینڈ سنز المنصور مارکیٹ بیرون لوہاری گیٹ لاہور
خان برادرز میڈیکل اسٹور آشرف روڈ گلبرگ لاہور
کوثر دواخانہ بانڈ لیسل آباد
شافی دواخانہ جنوب بازار لیسل آباد
سعید دواخانہ ۱۸۔ صدر روڈ۔ پشاور صدر
حکیم صوفی لطف احمد چوک اہلحدیث جہلم
لال چند زراں داس پنسار اسٹور کراچی صدر

مریم میڈیسن دواخانہ مشہور میڈیسن دواخانہ کچہری بازار
گلزار دواخانہ قدیمی دواخانہ جین کوٹ روڈ
نیو ستارہ دواخانہ نیو مارکیٹ روڈ گنج گھر
مشتاق دواخانہ پاک گیٹ ملتان
ابن سینا اسٹور گنج بازار۔ ڈیرہ غازیخان
کاشف ٹریڈرز سیدابرار حسین شمیل خان
شہاب دواخانہ شہاب دواخانہ شاہی بازار بہاولپور
ریاض کیمیکل اسٹور مارکیٹ روڈ۔ ریحانہ
ریحانہ دواخانہ بیرون دہلی دروازہ لاہور
چوہدری ڈرگ ہاؤس مین مارکیٹ گلبرگ لاہور
عثمانی دواخانہ گنج مغلپورہ لاہور
الحبیب دواخانہ بکر لائبریری روڈ بہاولپور
عدنان دواخانہ انارکلی راولپنڈی
مشہور دواخانہ مسجد بازار پشاور صدر
صحت میڈیسن کمپنی میر بازار پشاور
دیسی دواخانہ مین بازار کھاریاں
حاذق دواخانہ قریشی دواخانہ سنگی بازار
بدر حسین

سرگودھا طاہر دواخانہ سرگودھا۔ گجرات
سنگر سیل ریلوے سٹیشن روڈ
صوفی دواخانہ پرانا گھنٹہ گھر انارکلی بازار
سیال دواخانہ مرغزار کالونی سمن آباد ٹوبہ ٹیک سنگھ
صدیقی دواخانہ نیو مارکیٹ گڑھی شاہو لاہور
نیو جمیل دواخانہ اسٹیشن روڈ گوجرانوالہ
فاروق میڈیسن کمپنی سرگودھا۔ شجرہ
انعام دواخانہ مین بازار۔ شجرہ
جعفری دواخانہ ریلوے بازار۔ جھنگ
کرم دواخانہ ریلوے بازار۔ ملتان چھاؤنی
عثمانی دواخانہ ملتان بازار۔ بہاولپور
دواخانہ دارالشفاء کچہری بازار۔ خانیوال
حافظ دواخانہ مین بازار۔ میاں چنوں
مشہور دواخانہ ریلوے بازار۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ
رشید اینڈ سنز مزنگ روڈ۔ بہاولپور
قادری دواخانہ ریلوے سٹیشن چوک شہیداں
رحمن دواخانہ نیو سعید بازار۔ میرپور آزاد کشمیر

ایچا دواخانہ ریلوے بازار۔ صادق آباد
الیاس پنسار اسٹور ظفروال۔ ساہیوال
تنویر دواخانہ خلد دواخانہ مہدیہ بازار ایبٹ آباد
نیو سلطانی دواخانہ قریشی دواخانہ نیو دواخانہ
خلیفہ دواخانہ مشتاق بازار۔ حیدرآباد
خالد میڈیسن کمپنی ہسپتال روڈ اٹک
جمیل دواخانہ کچہری بازار سرگودھا
دواخانہ رفاہ عامہ ریلوے روڈ خانپور
شکیل میڈیکل اسٹور اتحاد چوک میانوالی
رؤف پنسار۔ مین بازار پسرور
اکرم دواخانہ بازار۔ شجرہ
خواجہ دواخانہ انارکلی بازار ہسپتال روڈ
اسلامی دواخانہ ریلوے روڈ چوک
دارالشفاء مین بازار۔ حنگو سیداں
عوامی دواخانہ نیو پنسار اسٹور
محمد نواب محمد صالحین سوتی دواخانہ
اپنا دواخانہ عطیہ بازار

کامیابی خط و کتابت کے لئے ڈسٹری بیوٹر برائے پنجاب، سرحد و کشمیر:

وقاص میڈیسن کمپنی فرسٹ فلور۔ میاں میڈیسن مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لوہاری گیٹ۔ لاہور فون: 230710

ملازمت ڈھونڈ رکھی تھی اور کئی ماہ سے انہیں اسلام آباد بلا رہے تھے۔ حامد اور شمیم کے رشتے کی بات پکی تو ان کی جان کو فوراً اسلام آباد یاد آگیا۔ ایک روز انہوں نے اعلان کردیا کہ وہ بھائی کے پاس اسلام آباد جائیں گی۔

حامد کی آنکھوں میں ایک بار پھر جدائی کے وہی موسم اتر آئے جو برسوں سے اس کے ساتھی تھے۔ جیسے شکر خورے کو شکر ملتی ہے' غم خور کو ایک بار پھر غم کا پہاڑ چاٹنے کو مل گیا تھا۔ جس روز شمیم کو اپنی ماں کے ساتھ اسلام آباد رخصت ہونا تھا وہ چھت پر چلی آئی اور یوں ہی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ حامد کوئی بات کرے گا۔ کوئی وعدہ' کوئی تسلی' کوئی امید افزا جملہ لیکن حامد کے اندر جیسے خاموشی کا صحرا پھیل گیا تھا۔ وہ اس صحرا سے باہر آنا نہیں چاہتا تھا۔ ننگے پاؤں' بھوکا پیاسا اس میں بھٹکنا چاہتا تھا۔ حامد بس الوداعی نظروں سے شمیم کو دیکھتا رہا اور وہ حامد کو دیکھتی رہی "مجھے خط لکھنا۔" شمیم نے کہا تھا۔

حامد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ حامد ان لوگوں کو چھوڑنے اسٹیشن بھی نہیں گیا۔ یہ کام والد صاحب کو خود ہی کرنا پڑا۔

شمیم کے جانے کے بعد حامد کے روز و شب میں ایک اداس یکسانیت در آئی تھی۔ ایف ایس سی کے امتحانات ہو چکے تھے اور اب اسے نتیجے کا طویل انتظار کرنا تھا۔ ملکی حالات درہم برہم تھے اور یہ خدشہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ نتیجہ خاصا لیٹ ہو جائے گا۔ حامد کے لیے راوی فراغت ہی فراغت لکھ رہا تھا۔ حامد نے شاعری پڑھنی شروع کردی۔ غالب' میر' فیض' فراز اس نے سب پڑھ ڈالے۔ ایک دن وہ نیچے امی کے کمرے میں پڑا اینٹھ رہا تھا کہ فرخندہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کچن کے دروازے پر بیٹھی امی سے باتیں کررہی تھی۔ سکینہ بھی پاس ہی تھی اور اس کے ہاتھ مسلسل سوئٹر کی سلائیوں پر چل رہے تھے۔

ان کی باتیں سننے کے لیے حامد نے ریڈیو کی آواز آہستہ کردی اور کھڑکی کے قریب سرک گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لہٰذا باہر سے اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ فرخندہ اپنے زیور کی بات کررہی تھی جو اس نے خاوند کے روزگار کے لیے بیچ دیا تھا۔ طلائی جھمکے تھے ایک طلائی ٹیکا تھا اور چاندی کی چوڑیاں تھیں۔ عبدل بلڈنگ میٹریل کی دکان کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے ایسے موقعوں پر بیوی کے زیور ہی بکتے ہیں۔ کچھ پیسے کم پڑ رہے تھے لہٰذا وہ حامد کی والدہ سے ادھار مانگنے آئی تھی۔

حامد کی والدہ نے کہا "بیٹی! تیرے پیسے اور میرے کوئی جدا ہیں۔ کتنے چاہئیں؟"

"صرف پانچ سو آپا۔۔۔۔ دو مہینے میں دے دوں گی۔"

"اچھا' میں کردوں گی۔"

سکینہ نے چونک کر فرخندہ کے گلے کی طرف دیکھا اور بولی۔ "...نی تو تو کہتی تھی سب کچھ بیچ دیا' اور یہ لاکٹ؟"

"یہ تو جھوٹا ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ لیکن اگر سچا ہوتا تو بھی کبھی نہ بیچتی۔ ایک لاکھ روپے میں بھی نہ بیچتی۔"

جالی کی اوٹ سے حامد نے دھیان سے دیکھا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ وہی ننھا سا لاکٹ تھا جو اس نے فرخندہ کو تحفے میں دیا تھا۔

"آخر ایسی کیا بات ہے اس جھوٹے لاکٹ میں؟" سکینہ نے چڑ کر پوچھا۔

"بس ہے نا بات۔" وہ ناز سے بولی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کھڑکی کے پیچھے حامد کی موجودگی سے باخبر ہے۔

"عبدل نے دیا ہوگا۔" حامد کی والدہ بولیں۔

"نہیں۔۔۔۔ عبدل نے نہیں' ایک۔۔۔۔ ایک بڑی پیاری سہیلی تھی میری۔"

"سہیلی تھی تو پھر کوئی اچھی چیز دیتی۔"

"مجھے تو بھئی بچوں سے بھی پیارا ہے۔" اس نے عجیب انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا جیسے لاکٹ کو گلے لگا رہی ہو۔

حامد کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے عرصے بعد غور سے فرخندہ کو دیکھا۔ بچے کی پیدائش کے دوران میں اس پر چھا جانے والی پژمردگی اب دور ہو چکی تھی۔ وہ ایک دم کھلی کھلی اور خوش رنگ نظر آتی تھی۔ بالکل جیسے چار سال پہلے تھی۔ سیاہ نقاب اٹھائی ہوئی وہ دلہن جس کے ٹیکسی سے اترتے ہی گلی میں روشنی ہو گئی تھی۔

وہ ہنس ہنس کر حامد کی والدہ سے باتیں کررہی تھی۔ ہنستے ہوئے اس کی پیشانی کی رگ تھوڑی سی ابھر آتی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک ادا غور سے دیکھنے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ فرخندہ کو بھولا نہیں تھا۔ بس وہ اس کے دھیان میں نہیں رہی تھی۔ دل کے نہاں خانے میں اس کا وہ مقام برقرار تھا جسے شمیم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود نہیں چھو سکی تھی۔ شمیم ایک پُرشباب شعلہ تھی۔ فرخندہ شبنم تھی جو شب بھر برگِ گل پر بسیرا کرتی ہے اور اس کی رگوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ پھر برگِ گل اور شبنم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔۔۔۔ وہ دیر تک فرخندہ کو دیکھتا رہا اور اس کے سینے میں پرانی محبت کی کسک جاگتی رہی۔

وہ عیدالاضحیٰ کا دن تھا۔ حامد اپنے والد کے ساتھ عید کی نماز پڑھ کر لوٹا تھا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ برآمدے میں فرخندہ کھڑی تھی۔ چوڑی کناری والا گلابی دوپٹا' سفید زمین کی قمیص جس پر گلابی پھول تھے اور گلابی شلوار۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ حامد اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ ہنسی تو اس کے دانتوں کی کلیاں دمک اٹھیں۔

"بھائی جی' عید مبارک۔" اس نے والد صاحب سے کہا۔

اتنے میں حامد کی والدہ بھی باہر نکل آئیں۔ فرخندہ ان سے

عید ملنے لگی۔ والدہ کے کندھے پر سے اس نے حامد کو دیکھا۔ یہ فکر حامد کے دل میں دور تک اتر گئی۔

عید کا سارا دن حامد نے برساتی میں پڑ کر گزار دیا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ فرخندہ ایک بار پھر اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ اس سے اتنا بڑا جرم کیسے سرزد ہوا۔ وہ فرخندہ کی بے مثال محبت کو بھول کر کیوں کر شمیم کی اداؤں میں الجھ گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہی آگ جو ایک دفعہ فرخندہ کے کراچی سے لوٹنے پر اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ ایک جاں بلب پیاسے کی طرح فرخندہ کی شربتی آنکھوں کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس کا رواں رواں فرخندہ کا نام جپنے لگا۔

اگلے روز وہ بہانے بہانے سے فرخندہ کے گھر گیا۔ اس کا شوہر عبدل قربانی کے سری پائے کھا کر اور چار گلاس لسی پی کر کمرے میں بے خبر سویا ہوا تھا۔ ایک مہمان عورت گھر میں موجود تھی لیکن اسے چکمہ دینا حامد کے لیے چنداں دشوار ثابت نہیں ہوا۔ فرخندہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کہا "آج شام کے بعد مجھ سے ملنا۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ مسکرائی "کیا بات ہے' آج ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

"بس آ گئی نا' میں تمہارا انتظار کروں گا۔" فقرہ مکمل کرتے ہی وہ باہر نکل آیا۔

وہ شام جیسے ہزاروں برس کی دوری پر تھی۔ سورج افق پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ خدا خدا کر کے اجالے کو ٹھہری ہوئی تاریکی نے ڈھانپا اور آہستہ آہستہ گھروں میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ فرخندہ کے آنگن میں لگی ہوئی انگور کی بیل کا ایک پلو ڈیوڑھی کے بلب کی زرد روشنی میں چمکنے لگا۔ حامد برساتی میں آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔۔۔ آٹھ بجے' نو بجے پھر ساڑھے نو بج گئے۔ حامد کا انتظار طول کھینچتا جا رہا تھا۔ فرخندہ کے گھر سے پہلے اس کی بچی کے رونے کی آواز آتی رہی۔ بچی خاموش ہوئی تو عبدل کی ماں نے کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کی کھانسی رکنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ منڈیر کے جھروکوں سے حامد کو ایک دو بار فرخندہ کی مدھم جھلک نظر آئی۔ وہ غالباً بڑھیا کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔ حامد بہت دیر تک دانت پیستا رہا۔ گھڑی کی چھوٹی سوئی دس سے آگے نکل چکی تھی جب حامد کو چھت پر مدھم چاپ محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بڑے دھیان سے چاپ کا آہنگ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاں وہ فرخندہ ہی تھی۔ گلی کے درمیانی خلا کو عبور کر کے فرخندہ اپنی چھت سے ان کی چھت پر آ گئی تھی اور اب برساتی کی طرف بڑھ رہی تھی۔۔۔ اگلے ہی لمحے وہ برساتی کے سامنے تھی۔

"اتنی دیر؟" حامد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اماں کی تو آواز نہیں آ رہی تھی تمہیں۔ کھانسے چلی جا رہی تھی۔ تین چمچ "ٹینی ڈال" کے پلائے ہیں تو آ سکی ہوں۔"

وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرا اس کی روشنی اور خوشبو سے معمور ہو گیا۔ وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"کیوں بلایا تھا؟"

"یونہی باتیں کرنے کے لیے۔"

"تو کرو نا باتیں۔" وہ مسکرائی۔

وہ دونوں اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔ آخر حامد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "ایک سوال پوچھوں؟"

"اس سے پہلے اجازت لیا کرتے تھے؟"

"میں نے سمجھا شاید اب۔۔۔"

"اب کیا تمہارے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟"

"میں نے سمجھا شاید تمہارے سر پر نکل آئے ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ پوچھو کیا بات ہے؟"

"تم نے میری طرف سے شمیم کو چٹ کیوں لکھی تھی؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا لرا گیا پھر سنبھل کر بولی "ہاں میں نے لکھی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تم اور شمیم ایک دوسرے کے قریب آ جاؤ۔"

"لیکن کیوں؟"

"شمیم مجھے بڑی اچھی لگی تھی۔ میں چاہتی تھی۔۔۔ اسے اپنے ہاتھ سے۔۔۔ تمہاری دلہن بناؤں' افسوس سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔"

"بہتر اچھا ہی ہوا جان چھوٹی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ وہ تمہیں اچھی نہیں لگتی تھی؟"

"اچھی لگتی تھی اور کبھی میری بھول تھی۔"

"بھول کیوں؟"

"پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ وقتی ابال تھا۔ میرا پاگل پن تھا۔"

"کیا پتا کیا پاگل پن ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔

اس نے نہایت دلیری سے فرخندہ کی آنکھوں میں جھانکا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بولا "تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔۔۔ کوئی نہیں۔"

وہ پلکیں جھکا کر بولی "جو ہو چکا' اسے بھول جاؤ۔"

"میں نہیں بھول سکتا۔" وہ کسی ضدی بچے کی طرح بولا۔

اچانک وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ کسی بچے کے رونے کی باریک آواز سناٹے میں پھیل رہی تھی "ہائے اللہ' راحیلہ جاگ گئی۔" فرخندہ نے کہا اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

حامد نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی میں عید کی رنگین چوڑیاں چھنا چھن بج گئیں "کیا جا رہی ہو؟"

"ہاں..... وہ سب جاگ جائیں گے۔"
"اچھا اسے سلا کر آجاؤ۔"
"کوشش کروں گی۔"
"کوشش نہیں' آنا ہے۔"
"اچھا بابا! ہاتھ تو چھوڑ دو۔" وہ تیزی سے بولی۔
"وعدہ؟"
"اچھا۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ چند لمحے بعد حامد نے اس کی جھلک دیکھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بچی کے رونے کی آواز معدوم ہو گئی لیکن چار پانچ منٹ بعد وہ پھر ہولے ہولے ٹھنکنے لگی۔ فرخندہ اسے چپ کرا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ زور سے بولتی تو مدھم سی آواز گلی پار کر کے حامد کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ وہ اپنی جگہ پڑا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ فرخندہ کی محبت ایک دلدل ہے پھر بھی وہ اس دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ اسے نیک و بد کا پتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا' اچھی صحبت میں بیٹھا تھا' شریف خاندان سے تھا' پھر بھی فرخندہ کی محبت سے ہاتھ کھینچنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک انتظار کی سولی پر لٹکتا رہا۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے اعصاب بھی ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ کمبخت جنبش کرنے سے انکاری تھے۔ وہ کبھی خود کو کوستا' کبھی فرخندہ کو۔ آخر خدا خدا کر کے ایک بار پھر فرخندہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ حامد کو لگا جیسے اس کے اردگرد آگ بھڑک رہی ہے اور اس کا سر گردن پر ایک انگارے کی طرح دھرا ہے۔

فرخندہ اندر آئی۔ اس کی خنکی محسوس کر کے ایک ادا سے مسکرائی اور اس کے قریب بیٹھ گئی "بہت انتظار کیا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

حامد نے جواب دینا چاہا لیکن گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔

"اچھا چلو معاف کردو۔" اس نے ملائمت سے کہا۔

اس کا ہاتھ حامد کی پشت پر آیا۔ ایک دلنواز حرکت کے ساتھ اس نے حامد کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ وہی مانوس شانہ جس کا گداز حامد کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا تھا۔ آنکھ کے کناروں پر رکے ہوئے آنسو ضبط کا بند توڑ کر بہہ نکلے۔ وہ کسی بچے کی طرح آنسو بہانے لگا اور اپنے ہی آنسوؤں میں چہرہ بھیگنے لگا۔ اس کے ہونٹ اس لمس سے ہم کلام تھے جو اس کے لیے محبت کی کل کائنات تھا۔ چہرے اور گردن کا لمس' ہونٹوں اور رخساروں کا لمس۔ اس لمس سے آگے اسے سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ بے حرکت بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی نرمی سے حامد کی پشت پر رینگ رہے تھے' جیسے وہ کوئی بچہ ہو اور وہ اسے سلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اچھا اب جانے دو۔" وہ کافی دیر بعد منمنائی۔

حامد کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے جسم سے جان کھینچنا چاہتا ہو۔ وہ اسے ہٹا کر بہ آہستگی اٹھی اور باہر نکل گئی۔

..... اگلے روز یہ دیکھ کر حامد کی حیرت از سرِ نو تازہ ہو گئی کہ فرخندہ برقع پہن کر مزار پر جانے کے لیے تیار نظر آ رہی ہے..... یہ سوال ابھی تک حامد کے لیے پریشان کن تھا کہ اس سے ملنے کے فوراً بعد وہ مزار پر جانا کیوں ضروری سمجھتی ہے۔ اس نے سوچا کہ فرخندہ سے پوچھ تو کئی بار چکا ہے' کیوں نہ آج خود جا کر دیکھے کہ وہ کیا کرتی ہے؟

اس روز پہلی بار حامد نے فرخندہ کا تعاقب کیا۔ فرخندہ کے ساتھ محلے ہی کی ایک بارہ چودہ سالہ لڑکی تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ دونوں بڑی سڑک پر پہنچیں اور بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئیں۔ حامد ایک کھوکھے کی اوٹ میں رہا اور ان دونوں کے ساتھ بس کا انتظار کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد بس آئی۔ وہ دونوں لیڈیز گیٹ سے داخل ہو گئیں۔ حامد نظر بچا کر پچھلے حصے میں سوار ہو گیا۔ رش کافی تھا۔ خود کو چھپانے میں حامد کو خاص دشواری نہیں ہوئی۔ تقریباً پون گھنٹے کے سفر کے بعد بس اندرونِ شہر سرکلر روڈ کے بارونق علاقے میں رک گئی۔ یہاں سے "باباجی" کے مزار تک فرخندہ اور اس کی ساتھی لڑکی نے پیدل سفر کیا۔ حامد ہوشیاری سے ان کے پیچھے چلتا رہا۔

باباجی کا مزار ایک وسیع احاطے میں واقع تھا۔ مزار کے اردگرد صفیں بچھی تھیں اور مرد و زن نوافل پڑھنے اور دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ فرخندہ مزار کی ایک جالی کے قریب جا بیٹھی اور اپنا ماتھا جالی سے ٹیک دیا۔ کچھ دیر بعد حامد نے محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کے جسم کی جنبش اس کی ہچکیوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ بہت دیر وہاں بیٹھی رہی اور دعا وغیرہ مانگتی رہی۔ پھر اس نے اپنے برقع کے اندر سے نفیس ململ کی ایک چادر نکالی اور ساتھی لڑکی کے ساتھ مل کر مزار پر چڑھا دی۔ مزار کے قریب ہی سبز رنگ کا ایک بہت بڑا آہنی گلا پڑا تھا۔ فرخندہ نے اپنی اوڑھنی کے پلو میں سے کچھ روپے نکالے اور گلے میں ڈال دیے۔

حامد یہ ساری کارروائی برآمدے کے ایک بڑے ستون کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں نیم تاریکی تھی۔ حامد کو یقین تھا کہ وہ فرخندہ یا ساتھی لڑکی کی نظر میں آنے سے محفوظ رہے گا۔ گلے میں روپے ڈالنے کے بعد فرخندہ پھر ایک صف پر جا بیٹھی۔ اس کا نصف چہرہ برقع کے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ اور سوجی سوجی نظر آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا' وہ وہاں بیٹھ کر بہت سکون پا رہی ہے۔

حامد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کیا وہ کسی احساسِ گناہ کے نتیجے میں یہاں آئی تھی؟ شاید ایسا ہی تھا..... وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور حامد کے ساتھ اس کا تعلق ایک

نامناسب رخ اختیار کر گیا تھا۔ اس صورتِ حال کی ذمے داری زیادہ تر حامد پر ہی عائد ہوتی تھی۔ حامد کو ندامت محسوس ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فرخندہ سے ہر تعلق ہمیشہ کے لیے منقطع کر لے اور اسے ان پریشانیوں سے بچا لے جو اسے اس مزار پر لاتی ہیں اور رونے پر مجبور کرتی ہیں۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنا یہ "مضبوط" ارادہ بدلنا پڑا۔ اسے لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن تھم جائے گی۔ فرخندہ سے دائمی دوری کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تو پھر؟ پھر کیا کرنا چاہیے اسے؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اسے خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ جانتے ہوئے بھی انجان رہنا چاہیے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہونے دینا چاہیے اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔

قریباً آدھ گھنٹا وہاں گزارنے کے بعد فرخندہ اٹھ گئی۔ جونہی وہ باہر نکلی' حامد نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا' ایک ہاتھ دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر آ گیا۔ حامد نے چونک کر دیکھا۔ وہ ان کے ہائی اسکول کا پرانا چوکی دار رب نواز تھا۔ حامد اسے فوراً نہیں پہچان سکا۔ شاید اس لیے کہ وہ اسے تین چار سال بعد دیکھ رہا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ رب نواز کا حلیہ بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا سر "صفاچٹ" تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور وہ شلوار قمیص کے بجائے لمبے زرد چغے میں تھا۔

"ارے تم یہاں؟" حامد نے حیرت سے کہا۔

وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا اور اسے ساتھ لے کر صحن کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ یہاں دھوپ کی خوش گوار حرارت موجود تھی اور بیٹھے بیٹھے پورے احاطے پر نظر ڈالی جا سکتی تھی۔ رب نواز نے حامد کو بتایا کہ وہ پچھلے دو برس سے اس مزار کے خدمت گاروں میں شامل ہے۔ بیوی سے رب نواز کی علیحدگی ہو چکی تھی' وہ دونوں بچے بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اب رب نواز اکیلا تھا۔ یہاں مزار میں پیٹ بھر کر کھانا ملتا تھا' کپڑے لتے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ بس آرام ہی آرام تھا۔

دونوں کافی دیر گفتگو کرتے رہے۔ رب نواز نے حامد کو مزار کے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ ان میں کچھ "اسرار" اچھے تھے اور کچھ اچھے نہیں تھے۔ حامد کے سامنے ایک دیوار کے ساتھ قطار میں چھ سات حجرے بنے ہوئے تھے۔ ہر حجرے کے باہر دس بارہ عقیدت مند موجود تھے اور اندر جانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ بالکل جیسے یہ کوئی پرائیویٹ کلینک ہو اور مختلف امراض کے ماہر ڈاکٹر اپنے اپنے کمرے میں بیٹھے مریض دیکھ رہے ہوں۔

رب نواز نے بتایا "یہ سارے عامل اور بزرگ "حضرت بابا جی" کے شاگرد ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے سوالیوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ ان میں سے دو تین تو واقعی عزت اور احترام کے لائق ہیں اور لوگوں کو ان سے فائدہ بھی پہنچتا ہے مگر تین چار ایسے بھی ہیں جنھوں نے بس فقیروں کا بھیس بنا رکھا ہے۔" اس نے ذرا توقف کر کے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا "جیسے وہ چرسی تھا نا جو وہ دیکھو۔ یہاں جو ہیر فرتوت بیٹھتا ہے وہ کالے علم کی کاٹ کرتا ہے۔ بظاہر نیک صورت ہے مگر بھنگ کا زبردست رسیا ہے۔ یہ اور اس کے پیٹے بھنگ کو "پانی" کہتے ہیں اور "پانی" پینے کا اہتمام یوں کرتے ہیں جیسے عبادت کا اہتمام کر رہے ہوں۔۔۔۔ تیسرے حجرے میں پیر نذیر احمد رازی بیٹھتا ہے۔ یہ عملیات' وظیفے اور تعویذ گنڈے کا ماہر ہے لیکن ایک اور کام میں بھی اسے بڑی مہارت حاصل ہے۔ کبھی عمر کی کوئی خوب صورت عورت نظر آ جائے تو اسے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔"

حامد نے بے اختیار کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اسی دوران میں ایک حجرے کا دروازہ کھلا اور ایک عمر رسیدہ نورانی چہرہ دکھائی دیا۔ سفید براق داڑھی جو سینے تک چلی گئی تھی۔ نورانی آنکھیں' دل میں دور تک اتر جانے والی نوابیدہ سی نگاہ' سر پر ٹوپی' سفید بے داغ لباس اور ہاتھ میں تسبیح۔ حامد نے اس بارعب بزرگ کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بے حد متاثر کن شخصیت تھی بزرگ کی۔ حامد کی نظر صرف ایک لمحے کے لیے بزرگ کی نظر سے ملی اور اسے یوں لگا جیسے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی ہو۔ حامد نے پوچھا "ان کا نام کیا ہے؟"

رب نواز بولا "یہ پیر حضرت مزمل شاہ کرمانوالے ہیں۔ بابا جی کے سب سے پرانے شاگرد سمجھے جاتے ہیں۔ لوگ بہت مانتے ہیں انہیں۔" پھر ذرا توقف کر کے بولا "تمہارا کیا خیال ہے ان کے بارے میں؟"

حامد بولا "مجھے تو اصلی اللہ والے لگتے ہیں۔"

رب نواز مسکرایا "ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔"

"کیا مطلب؟" حامد نے حیرانی سے پوچھا۔

رب نواز نے کہا "بھئی ہم امر کے تو ہیں اس لیے ہمیں وہ باتیں بھی معلوم ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں۔ شاہ جی یوں تو بڑے اچھے ہیں لیکن کبھی کبھی خاص بندوں کے لیے دو نمبر کام بھی کرتے ہیں۔ اب تم پوچھو گے دو نمبر کام کیا ہوتا ہے۔"

"بالکل پوچھوں گا۔"

وہ بولا "دو نمبر کام کی مثال یہ ہے کہ گوجرانوالہ سے ایک عورت آئی ہے' وہ کہتی ہے کہ اس کا خاوند دوسری شادی کر رہا ہے۔ وہ شاہ جی سے درخواست کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کرشمہ دکھائیں کہ شادی رک جائے۔ شاہ جی دیکھ لیتے ہیں کہ اسامی موٹی ہے اور خرچہ کر سکتی ہے۔ وہ اس کے لیے خصوصی کوشش کرنے کا وعدہ کرتے ہیں اور اس کوشش کا نذرانہ دو ہزار روپے طلب کرتے ہیں۔۔۔۔ شاہ جی کے بہت سے چیلے ہیں جو اپنے حلیے اور بول چال سے عام آدمی ہی نظر آتے ہیں۔ یہ چیلے شاہ جی کے لیے مخبری کا کام کرتے ہیں۔۔۔۔ وہ دوسری شادی پر آمادہ شخص کے بارے میں تمام

معلومات حاصل کرتے ہیں اور اس گھرانے کے بارے میں بھی جان کاری لیتے ہیں جہاں وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کس مزاج کے ہیں۔ کس سے دشمنی ہے' کس سے دوستی ہے۔ ان کے مسئلے مسائل کیا ہیں۔ جب یہ ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں تو ایک دن پیر صاحب گوجرانوالہ پہنچتے ہیں اور اس شخص سے ملتے ہیں جو شادی کر رہا ہے لیکن یہ ملاقات ایسے انداز سے ہوتی ہے جیسے اتفاقیہ اور سرِراہ ہو گئی ہو۔ پیر صاحب اس شخص کو اس کی قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ اس کے ماضی اور حال کے بارے میں ٹھیک ٹھیک نشانے لگاتے ہیں۔ وہ شخص پیر صاحب کی سحر انگیز شخصیت اور باتوں کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اسے بتاتے ہیں کہ وہ دوسری شادی کرنے والا ہے اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ دوسری شادی اس کے لیے کیسے کیسے خوف ناک عذاب لانے والی ہے اور دوسری بیوی اس کا کیا حشر کرنے والی ہے۔ لوگوں کی سادہ لوحی اور وہم پرستی کی وجہ سے اکثر پیر صاحب کو کامیابی ہوتی ہے۔"

حامد حیرانی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ رب نواز سرگوشی میں بولا "یہ تو میں نے تمہیں بس ایک مثال دی ہے۔ ایسے ایک سو ایک کام پیر صاحب کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن بات پھر وہی ہے' کام خاص آدمیوں کے ہوتے ہیں اور ان کے ہوتے ہیں جو بھاری نذرانہ دے سکتے ہوں۔"

حامد بولا "بھائی رب نواز' سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

وہ مسکرایا "اگر تیرا کوئی کام ہے تو بتا۔ نذرانے میں رعایت کرا دیں گے۔"

"میرا کیا کام ہوگا۔" وہ بولا۔

"اس عمر میں بڑے کام پڑ جاتے ہیں بندے کو۔ کہیں آنکھ شانکھ ہی لگ جاتی ہے۔"

"نہیں' ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے سفید جھوٹ بولا۔

"چلو جب ہوگی تب سہی۔" رب نواز آنکھ دبا کر مسکرایا۔

حامد کچھ دیر مزید رب نواز کے پاس بیٹھا پھر اس "مزار" کے حوالے سے درجنوں خبریں سمیٹ کر گھر واپس آ گیا۔

—— کہتے ہیں کہ کیا وقت نہیں لوٹتا لیکن حامد کے لیے گیا وقت لوٹ آیا تھا۔ گلابی جاڑے کی وہ شامیں حامد کے لیے ناقابلِ فراموش تھیں۔ اس کی برساتی فرخندہ کی مہک سے پھر آباد ہو گئی تھی۔ اسے فرخندہ سے صرف ملنا ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے انتظار کی گھڑیاں' پل اور دن گننا بھی اچھا لگتا تھا۔ حامد کے ہونٹ ایک لامتناہی مسکراہٹ اور فرخندہ کے چہرے کا لمس ایک جل تھل کرنے والا بادل۔ ان کا رشتہ اٹوٹ تھا۔ معلوم نہیں لوگوں کو اس رشتے کی خبر تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کس حد تک تھی۔ وہ کبھی کبھی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا تھا لیکن یہ غرقابی اسے کسی نتیجے پر نہیں پہنچاتی تھی۔ کبھی اسے لگتا تھا کہ عبدل بہت کچھ جانتا ہے' امی بہت کچھ جانتی ہیں اور والد بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ کبھی اسے لگتا کہ کوئی کچھ نہیں جانتا' یہ سب اس کا وہم ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو فرخندہ اپنے گھر میں اور گلی محلے میں قابلِ عزت نہ ہوتی۔ بڑی بوڑھیاں اسے محبت سے اپنے پاس نہ بٹھاتیں۔ پڑوسنیں اس سے گھنٹوں باتیں نہ کرتیں اور عبدل اسے "فرخندہ جی' فرخندہ جی" نہ کہتا۔

ہاں وہ سرد شامیں یادگار تھیں۔ اندھیرا ہوتے ہی پتنگیں آسمان سے غروب ہو جاتیں۔ گھروں میں بتیاں جل اٹھتیں۔ دور کسی دکان پر یا شادی والے گھر میں فلمی گانوں کی ریکارڈنگ بجائی جاتی۔ گلی سے "گرم انڈے" والا آواز دیتا گزر جاتا۔ حامد کی برساتی میں مونگ پھلی کی تک تک گونجتی اور فرخندہ کا انتظار اس کی رگ رگ میں مٹھاس بھر دیتا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ محبت کے ایک زینے پر کھڑے کھڑے حامد کے پاؤں پھر تھکنے لگے۔ اس کا دل مچلنے لگا کہ وہ کچھ زینے اور طے کرے' اپنے محبوب سے کچھ اور قریب ہو جائے لیکن وہ ڈرتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے فرخندہ کو کھو دے گا۔ وہ ایک جاں گسل کشمکش کا شکار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ فرخندہ کیا چیز ہے۔ وہ اس کے بارے میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھ جاتا تھا——

وہ ایک بڑی سہانی رات تھی۔ ٹھہرے ہوئے آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ حامد لحاف میں گھسا مونگ پھلی ٹھکور رہا تھا اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کھلی تھی جہاں سے فرخندہ کے گھر کا آنگن نظر آتا تھا۔ آج رات اسے آنا تھا۔ وہ والہانہ بے چینی سے نو بجے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک طویل انتظار کے بعد گھڑی کی سوئی نے نو کے ہندسے کو چھوا۔ وہ چھت پر آ گیا اور فرخندہ کے آنگن کی طرف دیکھنے لگا۔ غیر متوقع طور پر اندرونی کمروں کی بتیاں جل رہی تھیں اور باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ فرخندہ کی ایک ممانی آئی ہوئی تھی۔ وہ فرخندہ کی ساس کی سہیلی بھی تھی۔ بس دونوں عورتیں گپیں ہانک رہی تھیں اور فرخندہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ کسی بات پر زور سے ہنستی تھیں تو آواز باہر تک آتی تھی۔ حامد کو غصہ آنے لگا۔ معلوم نہیں کیسی بوڑھی روح بسی ہوئی تھی فرخندہ میں؟ وہ کیوں دلچسپی لیتی تھی بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں۔ اس نے ایک دو بار فرخندہ سے پوچھا بھی تھا۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی تھی "بڑوں کے پاس بیٹھنے سے دانائی ملتی ہے۔"

"اور چھوٹوں کے پاس بیٹھنے سے؟"

"چھوٹوں کے پاس بیٹھنے میں بڑے خطرات ہیں۔" اس نے شرارت سے جواب دیا تھا۔

—— معلوم نہیں یہ کب تک یونہی بیٹھی دانائی حاصل کرتی رہے گی۔ حامد نے جھلا کر سوچا۔ وہ کچھ دیر منڈیر کے پاس کھڑا رہا اور زور زور سے کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہا

پھر واپس کمرے میں آگیا۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے چلتی رہیں اور گیارہ بج گئے۔ فرخندہ اور مہمان عورت کی باتیں مختصر ہونے میں ہی نہیں آرہی تھیں۔ حامد نے تھلا کر اپنا سر تکیے میں گھسیڑ دیا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کوئی گھنٹا بھر ہا پی بے آب کی طرح تڑپنے اور فرخندہ کو کوسنے کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو کسی کی انگلیاں اس کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ اس نے خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حامد کا ذہن نیم بیدار تھا۔ ایسے میں ایک عجیب سی بے باکی اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس بے باکی میں ہلکی سی جھنجلاہٹ بھی شامل تھی۔ اس نے فرخندہ کی گردن میں باند حمائل کیا اور اسے اپنے اوپر جھکا لیا۔

اس روز پہلی بار حامد' چہرے اور گردن کے لمس سے آگے بڑھا۔ وہ فرخندہ کے تھوڑا سا اور قریب آگیا تھا۔ محبت کے سفر میں اس نے چند زینے اور طے کر لیے تھے۔ اس کی بانہوں کی بے تاب گرفت فرخندہ کو حصار میں لیے ہوئے تھی اور وہ نیم دراز تھا۔

"حامدی! چھوڑو مجھے' پلیز نہ کرو۔۔۔۔۔" وہ دبی دبی زبان میں احتجاج کر رہی تھی۔ حامد کے کانوں میں اپنی سانسوں کی پھنکاروں کے سوا اور کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ حامد سے جدا ہوئی تو اس کا لباس شکن شکن اور ریشمی گیسو منتشر تھے۔ اس کی ایک چوڑی کلائی میں کھب گئی تھی اور وہاں سے خون رسنے لگا تھا۔

"بڑے خراب ہو تم۔" وہ سی سی کرتے ہوئے بولی۔

حامد نے کلائی کا خون بند کرنے کے لیے اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیے "اچھا میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر خفگی تھی۔

"ایسے نہیں جانے دوں گا۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"پہلے مسکرا کر دکھاؤ۔"

"اچھا جانے دو۔" وہ روہانسی ہنسی میں بولی۔

"بدھ کو پھر آؤ گی ناں؟"

"اچھا۔" اس نے عاجز لہجے میں کہا۔

حامد نے اسے چھوڑا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

○☆○

حامد پر ایک فاتحانہ سرشاری طاری تھی۔ آج چار برس بعد سہی' اس نے فرخندہ کی محبت میں چند زینے اور طے کیے تھے۔ اس کے جسم میں ایک ہیجان برپا تھا۔ قدم باقی زینوں پر دندنانے کے لیے مچل رہے تھے۔ وہ فرخندہ کے پیار میں ہر اندیشے' ہر خوف اور حد سے گزر جانا چاہتا تھا۔ فرخندہ کی قربت کا شوق اس کے رگ و پے میں سیال آگ کی طرح دوڑ رہا تھا۔ وہ پیدائشی عاشق تھا اور اپنے بہترین مقام پر تھا۔ شمیم جو کچھ عرصے کے لیے اس کی زندگی میں آئی تھی' فرخندہ کے پیار کی تند و تیز آندھی میں تنکا بن کر اڑ چکی تھی۔

اگلے روز حسب توقع فرخندہ پھر کالے برقع میں نظر آئی۔ وہ اپنی ساس کے ساتھ بابا جی کے مزار پر جا رہی تھی۔ اسے گھر میں ایک ایک پیسے کی ضرورت تھی' پتا نہیں وہ چادر چڑھانے اور خیرات دینے کے لیے پیسے کیسے اکٹھے کرلیتی تھی۔

اب حامد کو بے حد بے قراری سے بدھ کا انتظار تھا۔ بدھ کی شام ہونے میں ابھی پورے چھ روز باقی تھے۔ قریباً ۱۴۴ گھنٹے' جن میں ۸۶۴۰ منٹ تھے۔ وہ ایک ایک پل کا حساب رکھے ہوئے تھا۔ وہ برساتی کے سامنے بیٹھ جاتا اور دیر تک نوری لوہار کے گھر کی چھت دیکھتا رہتا۔ نوری کی چھت پر پہلے بھی کبوتر ٹہلا کرتے تھے لیکن اب انہیں دیکھنا حامد کو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ان پرندوں کی دلچسپ اداؤں میں کھو سا جاتا تھا۔ اس کا دل چاہتا' فرخندہ ایک کبوتری بن کر ہمیشہ کے لیے اس کے دل کی چھتری پر آبیٹھے۔ وہ اسے اپنا لے' اس سے شادی کرلے۔ ساری رکاوٹیں توڑ کر' ساری دنیا سے ٹکر لے کر' ایک انسانی کو ہونی میں بدل دے۔ ایسے میں والد صاحب کا بارعب چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا اور اس کی رگوں میں اینٹھن سی جاگ اٹھتی۔ جمعے کے روز فرخندہ کا خاوند بھی کراچی چلا گیا۔ وہ بلڈنگ میٹریل کا کام شروع کر رہا تھا اور یہ بھاگ دوڑ اسی سلسلے میں تھی' عبدل کے کراچی چلے جانے کے بعد حامد کے لیے میدان اور بھی صاف ہو گیا تھا۔ یہ حامد کے دل کی گواہی تھی کہ بدھ کی رات اسے اپنے سارے محبت بھرے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ وہ اپنے پیار کی طاقت سے بخوبی آگاہ تھا۔ فرخندہ کے خلاف اس کا سب سے بڑا ہتھیار روٹھ جانا تھا۔ اس کا روٹھنا فرخندہ کے لیے سوہان روح ہوتا تھا۔ وہ اسے منانے اور سلانے کے لیے بے چین ہو جاتی تھی۔۔۔۔ لیکن اس مرتبہ۔۔۔۔ فرخندہ نے حامد کو روٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع اور تکلیف دہ تھا کہ حامد سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے چہرے پر لگا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آخری "زینے" طے کرنے سے پہلے وہ پھسلے گا اور دھڑام سے پاتال میں جا گرے گا۔

وہ منگل کا دن تھا' حامد سہ پہر کے وقت کالج سے آیا تھا۔ گلی سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ فرخندہ کے گھر میں تالا پڑا ہوا ہے۔ اس نے سوچا' شاید وہ بازار گئی ہے یا پھر بابا جی کے مزار پر مگر گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے ماں کی زبانی پتا چلا کہ فرخندہ اپنی ساس کے ہمراہ اپنے شوہر کے پاس کراچی چلی گئی ہے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ لرزتے لہجے میں بولا۔

"بھئی ہو کیوں نہیں سکتا۔" اس کی والدہ نے جواب دیا تھا۔ "عبدل کا تار آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پھوپا بشیر نے دکان کے علاوہ کرائے کے مکان کا بندوبست بھی کر دیا ہے لہٰذا وہ کراچی آنا چاہے تو ماں کے ساتھ چلی آئے۔"

برآمدے سے حامد کی دادی بولیں "آئے ہائے' اس نے یہ تھوڑی کہا تھا کہ اڑ کر چلی آئے۔ ایک دو ہفتے میں آرام سے چلی جاتی۔ مل ملا بھی لیتی سب سے۔ وہ تو یوں نکلی ہے جیسے کوئی پیچھے پڑا

ہوا ہو۔"

"کک..... کب آیا تھا عبدل کا تار؟" حامد نے تھوک نگل کر ماں سے پوچھا۔

"یہ تو اتوار کی بات ہے۔ فرخندہ نے نہیں بتایا تھا تجھے؟"

"نن..... نہیں۔" حامد نے بمشکل کہا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا ذہن ایک صحرا تھا اور اس میں جھلسا دینے والی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہ کتابوں کی الماری میں عبداللہ حسین کے اس ناول پر پڑی جو وہ آج کل پڑھ رہا تھا۔ ناول کے صفحات میں ایک پرچہ دبا ہوا تھا۔ یقیناً یہ فرخندہ ہی نے رکھا تھا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ کاپی سائز کے ورق پر فرخندہ نے یہ چند الفاظ لکھے تھے۔

"میں جارہی ہوں۔ بہت بڑی گناہ گار ہوں۔ تمہیں بھی گناہ گار کررہی ہوں۔ میری سزا اب یہی ہے کہ کبھی تمہیں اپنی صورت نہ دکھاؤں۔ تمہیں بھلانے کی کوشش کروں گی' حالانکہ میرے لیے یہ آسان نہیں ہوگا۔ اللہ کرے تم خوش رہو۔ مجھے معاف کردینا۔"

○☆○

فرخندہ واپس نہ آنے کے لیے جاچکی تھی اور حامد کے سینے پر ایک ایسا داغ چھوڑ گئی تھی جو اسے ہر دم بے چین رکھتا تھا۔ کتنی بے رحم تھی وہ..... حامد کو تھوڑی دیر کے لیے بھی ناخوش نہیں دیکھ سکتی تھی اب اسے ہمیشہ کے لیے نیم گسل کرگئی تھی۔ آریا نگر اب حامد کے لیے ایک ایسا کھنڈر تھا جس میں محرومیوں اور اداسیوں کی چمگادڑیں پھڑپھڑایا کرتی تھیں اور آریا نگر ہی کیا پورا شہر اس کے لیے ایک منحوس خرابا تھا۔ وہ ناصر کاظمی کے اس شعر کی تصویر تھا دل تو میرا اداس ہے ناصر' شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے..... وہ جانتا تھا اب بھی موسم کروٹ بدلیں گے' روز و شب کی گنتی میں اب بھی ہزاروں بار "بدھ" کا دن آئے گا لیکن وہ "بدھ" اب کبھی نہیں آئے گا جس کا انتظار اس نے جذبوں کی انتہائی شدت کے ساتھ کیا تھا۔

وہ اس کرب ناک شہر کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں کچھ ہفتوں کے لیے مری چلا گیا لیکن جب دل میں سکون نہ ہو' مرغزاروں میں بھی وحشت ناچتی ہے۔ وہ تین ہفتے بعد واپس آیا تو یہ جان کر اس کی رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ گئیں کہ عبدل نے آریا نگر والا مکان بیچ ڈالا ہے۔ وہ آنگن' وہ در و دیوار' وہ ڈیوڑھی' وہ سرسبز بیل' وہ سب کچھ جو حامد کو فرخندہ ہی کی طرح پیارا تھا' اب کسی اور کے قبضے میں تھا۔ چند دن بعد حامد کو والدہ کی زبانی یہ پتا بھی چل گیا کہ مکان بیچنے میں عبدل سے زیادہ فرخندہ کی خواہش کو دخل تھا۔

○☆○

دو تین ماہ بعد دل کے بے حد مجبور کرنے پر وہ کراچی چلا گیا۔ بہانہ سمندر دیکھنے کا تھا مگر حقیقت سمندر سے بھی گہری تھی۔ عبدل کا پتا اس کے پاس موجود تھا۔ وہ ڈھونڈتا ڈھانڈتا لیاری کے اس پتے پر پہنچ گیا..... لیکن نجانے کیا ہوا' اس کی گلی کے نزدیک پہنچ کر ایک دم حامد کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے آخری خط کے آخری الفاظ حامد کی آنکھوں میں ناچنے لگے۔ اس نے لکھا تھا "مجھے معاف کردینا۔" یہ چند الفاظ تھے لیکن ان کا مطلب بہت وسیع تھا۔ ان میں ایک التجا تھی' آرزو تھی..... اور پھر کبھی نہ ملنے کی درخواست تھی۔ وہ جیسے بہت دور' کسی راستے پر کھڑی تھی اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن' اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا...

ان تمام خوب صورت موڑوں کی یادیں لے کر جو فرخندہ کے حوالے سے اس کی زندگی میں آئے تھے' وہ واپس پلٹ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان یادوں میں ایک بے حد لذیذ درد موجود ہے۔ ایسا درد جس نے "ادھورے پن" سے جنم لیا ہے۔ اس درد کے سہارے وہ ایک زندگی گزار سکتا تھا۔ شاید وہ فرخندہ سے آخری ملاقات بھی کرلیتا تو درد کی یہ دولت اسے نصیب نہ ہوتی۔

فرخندہ اور عبدل یوں گئے تھے کہ پھر انہوں نے پلٹ کر آریا نگر کی خبر نہیں لی تھی۔ حامد کو پتا چلا تھا کہ فرخندہ کی سہیلی سکینہ کبھی کبھار اسے خط لکھتی ہے' ان خطوں کا جواب کبھی آتا ہے' کبھی نہیں آتا پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ سکینہ کی زبانی معلوم ہوا کہ عبدل کا پھوپا بشیر سے کاروباری جھگڑا ہوگیا تھا اور وہ ان کے پاس سے چلا گیا ہے۔ وہ کہیں اور ذاتی دکان کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کراچی میں ہے یا کسی اور شہر چلا گیا ہے۔ یہ آخری اطلاع تھی جو فرخندہ کے بارے میں حامد کو ملی۔

○☆○

حامد نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا پھر لاہور کے ایک مقبول انگریزی روزنامے سے وابستہ ہوگیا۔ معقول تنخواہ تھی اور ترقی کے چانسز بھی تھے۔ ۸۰ کی دہائی کے شروع میں والدہ کے مجبور کرنے پر اس نے شادی کرلی۔ لڑکی خوب صورت اور پڑھی لکھی تھی۔ شادی چوں کہ خاندان سے باہر ہوئی تھی لہٰذا حامد کے رشتے کے سلسلے میں خاندان کے اندر جو کھینچا تانی پائی جاتی تھی' وہ ختم ہوگئی تھی۔ اور تو اور تائی عصمت یعنی شمیم کی والدہ سے بھی ان کے تعلقات اچھے ہوگئے تھے۔ شمیم کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہوچکی تھی اور وہ ایک بچے کی ماں تھی..... (حامد پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اگر شمیم کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہوئی تو یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا) ایک مرتبہ تائی عصمت حامد کے گھر آئیں اور دو تین ہفتے رہیں۔ ان کے ساتھ حامد کی وہ پہلے جیسی بے تکلفی پیدا ہوچکی تھی۔ ایک روز حامد کی بیوی سمیت تمام اہل خانہ محلے میں ہونے والی ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ تائی عصمت اور حامد کمرے میں اکیلے بیٹھے گفتگو کررہے تھے۔ پرانی باتیں ہورہی تھیں۔ حامد نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "تائی جان! ایک بات بتائیں....

ایک وقت ایسا آیا تھا جب میرے اور شمیم کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ آپ بھی راضی تھیں لیکن کشمکش میں تھیں۔ ایک دن کچھ سوچتی تھیں' دوسرے دن کچھ۔ پھر ایک دن اچانک آپ نے دوٹوک فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے۔ اس دن آپ کو کیا ہوا تھا؟"

پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے وہ ملول سی ہوگئیں۔ چھوٹی سی تسبیح گھماتے ہوئے بولیں "بیٹے! میرا نظریہ آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھا۔ خاندان میں شادیاں....."

"میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" حامد نے ان کی بات کاٹی۔ "لیکن آپ یہ بتائیں کہ اس دن آپ نے ایک دم فیصلہ کیوں کیا۔ کیا کسی سے مل کر آئی تھیں آپ؟"

وہ ہولے سے بولیں "ہاں..... اس لڑکی نے میری بڑی مدد کی' اس نتیجے تک پہنچنے میں۔"

"کس لڑکی نے؟"

"ارے وہی جو تیرے گھر کے سامنے والے مکان میں رہتی تھی۔ بڑی ملنسار اور ہنس مکھ تھی بے چاری۔ کیا نام تھا اس کا۔"

"فر..... فرخندہ؟"

"ہاں..... ہاں۔ وہ باباجی کے مزار پر جاتی تھی ناں۔ وہیں پر اس نے پیر صاحب سے بات کی تھی۔"

"کس کے بارے میں بات کی تھی؟"

"تیرے اور شمیم کے رشتے کے بارے میں۔ پیر شاہ جی نے کہا تھا کہ یہ رشتہ مبارک نہیں رہے گا۔ مزار سے واپس آکر اس نے مجھے بتایا اور اصرار کرنے لگی کہ میں بھی ایک بار پیر صاحب سے مل لوں۔ میں نے پہلے تو انکار کیا پھر اس کے ساتھ چلی گئی۔ پیر شاہ جی بڑے نظر والے تھے۔ انہوں نے وہی باتیں کیں جو میرے دل میں تھیں اور وہ باتیں بھی بتائیں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ شادی مبارک ثابت نہیں ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ اولاد پر بھی برا اثر پڑے۔ پیر شاہ جی کی باتیں سن کر ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ رشتہ نہیں کروں گی۔ ماشاء اللہ تمہارے لیے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ شمیم کو بھی اس کی قسمت کا مل ہی گیا ہے۔ اللہ نے جو کیا' اچھا ہی کیا ہے۔ خیر اب چھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی نئی بات کرو۔"

حامد نئی بات کیا کرتا اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ تائی جان کے پاس سے اٹھا اور جیسے خواب میں چلتا ہوا اس برساتی میں آبیٹھا جو کبھی اس کی پناہ گاہ ہوا کرتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں فرخندہ کا چہرہ رقصاں تھا اور کانوں میں پیر شاہ جی کا نام گونج رہا تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ فرخندہ سے اس کی محبت کا دوسرا دور اس لیے شروع ہوا تھا کہ شمیم اس کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شمیم کو اس کی زندگی سے نکالنے میں فرخندہ کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ وہی تھی جس نے شمیم کے ساتھ اس کا تعلق بنایا بھی تھا اور بگاڑا بھی۔ وہ کیسی عورت تھی؟ کیسی پہیلی تھی؟ وہ اس سے پیار کرتی تھی اور اس سے دور بھی بھاگتی تھی۔ وہ اس کے پیاسے ہونٹوں کو سیراب بھی کرتی تھی اور پھر اس گناہ کی تلافی کے لیے چادریں بھی چڑھاتی تھی۔ وہ اس کی زندگی سے نکلنے کے لیے شمیم کو اس کی زندگی میں داخل کرتی تھی اور پھر شمیم کو نکال کر دوبارہ اس کی زندگی میں داخل ہوجاتی تھی۔ وہ کیا راز تھی؟ کیا معما تھی؟ کیا وہ ساری عورتیں جن کی شادیاں "بے جوڑ" ہوتی ہیں' ایسی ہی سرپستہ ہوتی ہیں؟ حامد گم صم لیٹا تھا اور فرخندہ کے کردار کو سمجھنے کی ایک اور ناکام کوشش کررہا تھا۔

یہ بات طے تھی کہ فرخندہ نے مسلسل کوشش کرکے شمیم کو حامد سے قریب کیا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے ہر وقت مواقع تلاشتی رہتی تھی۔ جوں جوں مواقع ملتے گئے' وہ حامد سے دور ہٹتی گئی پھر ایک وقت آیا تھا کہ حامد شمیم میں گم ہوگیا تھا..... پھر کیا ہوا تھا؟ پھر یہ ہوا تھا کہ فرخندہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکی تھی۔ اس کی مزاحمت ٹوٹ گئی تھی اور وہ اپنی ہی کامیابی سے حسد کرنے لگی تھی۔ چاہے جانے کی ازلی خواہش اس میں پھر شدت سے جاگ اٹھی تھی۔ اس نے شمیم کو حامد سے دور کرنے میں رازداری سے اپنا کردار ادا کیا تھا اور اس سلسلے میں کسی حیلے وسیلے سے "شاہ جی" کا تعاون بھی حاصل کیا تھا (ممکن تھا کہ زیورات بیچنے سے جو رقم فرخندہ کے پاس آئی تھی' اس میں سے کچھ رقم شاہ جی کو نذرانے کے طور پر دے دی گئی ہو) بہرحال اہم بات یہ تھی کہ اس نے شمیم کو حامد سے دور کردیا تھا..... اور جب وہ دور ہوگئی تھی تو فرخندہ پھر سج دھج کر "پھپھو" سے اس کی زندگی میں آگئی تھی۔ اس کے پیاسے ہونٹوں کو پھر سے سیراب کرنے کے لیے۔ اس کے خیالوں کو پھر سے اپنا اسیر بنانے کے لیے۔ وہ کیسی پہیلی تھی؟ اس نے پارسائی اور گناہ کے درمیان ایک خود ساختہ حد بنا رکھی تھی۔ وہ بہت زیرک تھی۔ اسے معلوم تھا..... اسے پہلے سے معلوم تھا کہ ایک دن حامد یہ "حد" عبور کرنے کی کوشش کرے گا اور جب حامد یہ حد عبور کرے گا' وہ اس کے دل میں اپنی ازلی کسک چھوڑ کر کہیں بہت دور چلی جائے گی۔ ہمیشہ اس کے خیالوں میں زندہ رہنے کے لیے' سدا اس کے تصورات میں بسیرا کرنے کے لیے۔

حامد نے ایک طویل آہ کھینچی اور آنکھوں میں آنسو سمیٹ کر چھت پر نکل آیا۔ سورج کی الوداعی کرنیں فرخندہ کے گھر کے آنگن کو بوسہ دے رہی تھیں۔ فرخندہ کے صحن میں لگی ہوئی انگور کی بیل ابھی تک موجود تھی۔ اب وہ پھیلتے پھیلتے گلی کے اوپر سے گزر گئی تھی اور حامد کے گھر کی چھت پر لہلہایا کرتی تھی۔ بالکل جیسے فرخندہ گلی کے اوپر سے گزر کر آتی تھی اور حامد کے گھر کی چھت پر "لہلہایا" کرتی تھی۔ وہ بیل کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے پتوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔



طاہر جاوید مغل

ڈیڈ ڈاگ

آخری لمحے تک تجسس، تحیّر اور تأثر قائم رہتا ہے
اور قاری تیز رو واقعات کے ساتھ ساتھ
بے اختیار بہنے لگتا ہے

سراغ رسانی اور مہم جوئی کے ایک ہوشربا ناول "ڈیڈ ڈراپ" کی تلخیص۔

گرمی شدید تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کپاس کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کیتھرین گاڑی ڈرائیو کرتے طائرانہ نظر سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ سڑک بل کھاتی کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور گاڑی چلانے کے لیے زیادہ دیر تک سڑک سے نظریں ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ کیتھرین اب اپنی زمین کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ زمین اُسے ورثے میں ملی تھی۔

ایک موڑ پر کیتھرین اچانک ٹھٹک گئی۔ سامنے سڑک کے بیچوں بیچ کتا مرا پڑا تھا۔ اُس کی انتڑیاں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی تیز رفتار گاڑی اُسے کچلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ کیتھرین کوشش کے باوجود دوبارہ کتے کی طرف نہیں دیکھ سکی۔ پانچ فرلانگ آگے جا کر ایک درخت کی چھاؤں میں گاڑی روکی اور باہر نکل آئی۔ وہ نیلی جیکٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھی۔ پاؤں میں ٹینس شوز تھے۔ اُس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ گاڑی کی عقبی نشست سے اُس نے ایک بیگ اُٹھایا جس میں اُس کا پستول گولیاں اور بیئر کے خالی ڈبے تھے۔ ایک لمحے رُک کر اُس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر بیگ ہاتھ میں جھلاتے وہ ایک دوسرے درخت کی چھاؤں میں آ بیٹھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی کے بنے ہوئے دو کیبن نظر آ رہے تھے لیکن دُور دُور تک کوئی متنفّس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس نے بیگ سے بیئر کے ڈبے نکالے۔ کچھ فاصلے پر بنی مٹی کی منڈیر پر یہ ڈبے ایک قطار میں رکھنے کے بعد وہ درخت کے نیچے لَوٹی۔ پھر اُس نے پستول نکالا۔ اُس کے چیمبر کا معاینہ کیا اور بڑے ماہرانہ انداز سے دائیں ہاتھ کی کلائی کو بائیں ہاتھ سے سہارا دیا اور سانس روک کر فائر کر دیا۔ ایک دھماکے سے بیئر کا ڈبہ اُچھل کر دُور جا گرا۔ یکے بعد دیگرے چھ فائر ہوئے اور پانچ ڈبے منڈیر پر سے غائب ہو گئے۔ صرف ایک نشانہ خطا گیا۔

نشانہ بازی اُس کا پُرانا شغلہ تھا۔ اپنے باپ کی زندگی میں وہ اتوار کے روز اکثر مشق کے لیے اس جگہ آیا کرتی تھی۔ اُس نے پستول پھر لوڈ کیا۔ خالی ڈبے اُٹھا کر قطار میں رکھے۔ دوبارہ نشانہ بازی کرنے سے قبل اچانک اُس کی نگاہ لکڑی کے کیبن کی طرف گئی جس کی کھڑکی میں اُسے جو چیز نظر آئی اُس نے اُسے ہلا دیا۔ وہ ایک انسانی ہاتھ تھا جس کی ہتھیلی اُوپر کی طرف اُٹھی ہوئی تھی اور اُنگلیاں ساکت۔ کیتھرین کے ذہن میں انجانے خدشے جاگ اُٹھے۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ محتاط قدموں سے وہ کیبن کی طرف بڑھی۔ اُس نے دیکھا کہ ہاتھ کے اُوپر اور کلائی کے گرد کثرت سے مکّھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ وہ جانتی تھی مکّھیاں بھنبھنانے کا مطلب کیا ہے۔ اُس کے قدم لرز گئے ——— وہ ایک عورت کی لاش تھی جو پُشت کے بل زمین پر پڑی تھی۔ اُس کے سر سے بہنے والا خون فرش پر دائرے کی صورت جم گیا تھا۔ عورت کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ کیتھرین کچھ اور دیکھنے کی ہمّت نہ کر سکی۔ وہ اُلٹے پاؤں اپنی کار کی طرف بھاگی۔ چیخ اُس نے بڑی مشکل سے حلق میں دبائی۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی پُوری رفتار سے دوڑائی۔ چلچلاتی دوپہر، دُور دُور کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے قصبے لوفیلڈ پہنچنا چاہتی تھی۔ شیرف کا چہرہ بار بار اُس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

لوفیلڈ کے شیرف کا دفتر جیل کی عمارت کے ساتھ ہی

تھا۔ دفتر کے سامنے اُس نے گاڑی روکی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ خاصی بدحواس تھی۔ اپنے آپ پر کسی قدر قابو پالینے کے بعد اُس نے شیرف کو بتایا کہ ایک سفید فام عورت کی لاش کسی مزارع کے مکان میں پڑی ہوئی ہے۔ اپنا بیان ختم کرنے کے بعد کیتھرین نے جب شیرف کے چہرے پر افسردہ نگاہ ڈالی تو اُس کی آنکھوں میں تشویش کے ساتھ ساتھ رُوکھائی بھی تھا۔ وہ کیتھرین کے مرحوم باپ کا پُرانا دوست تھا لیکن اُس وقت وہ صرف شیرف دکھائی دے رہا تھا۔

*

تھوڑی دیر بعد کیتھرین، شیرف گیلیئن اور پولیس کے عملے کے ساتھ جائے وقوع کی طرف جارہی تھی۔ تین گاڑیوں کا قافلہ بڑی سڑک سے اُتر کر چھوٹی سڑک پر آگیا۔ جُوں جُوں منزل قریب آتی گئی۔ کیتھرین کے دل کی دھڑکن تیز ہورہی تھی۔ شیرف اُس کے ساتھ والی نشست پر تھا۔ اُس نے کیتھرین کا دھیان ہٹانے کے لیے اردگرد پھیلے کپاس کے کھیتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ کیتھرین نے بتایا کہ یہ ساری زمین اُس کے باپ دادا کی ہے۔ کئی برسوں سے مارٹن بارنز نے اسے پٹے پر لے رکھا ہے۔ شیرف کے پُوچھنے پر کیتھرین نے بتایا کہ مارٹن بارنز اُن کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے اور اُس کے خاندان کے ساتھ اُن کے پُرانے تعلقات ہیں۔

گاڑیاں جائے وقوع پر پہنچیں تو کیتھرین نے اُنگلی کے اشارے سے لکڑی کے کیبنوں کی نشاندہی کی اور خود آنکھیں بند کر کے حالات پر غور کرنے لگی۔

کچھ آہٹ سُن کر آنکھیں کھولیں تو اُس نے ادھیڑ عمر تنومند کارل پارکنز کو جو اُس کے مرحوم باپ کا دوست بھی تھا کھڑا پایا۔ وہ قصبے کا تفتیشی افسر تھا۔ کیتھرین اُسے دیکھ کر گاڑی سے باہر آئی۔ پھر وہ دونوں قریباً دس منٹ تک درختوں کے سایے میں ٹہلتے رہے۔ لاش کے متعلق پارکنز نے چند سوال کیے۔ کیتھرین نے اُسے تفصیل سے تمام واقعات بتائے۔ اتنے میں شیرف گیلیئن بھی آگیا۔ اُس کا بھاری بھرکم چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ اُس کی آنکھوں سے تشویش اور مزاج میں برہمی عیاں تھی۔ گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا:

"کیتھرین! تمہارا کہنا ہے کہ تم مقتولہ کو نہیں جانتیں لیکن میرا خیال ہے تم اُسے جانتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" کیتھرین کی آنکھوں میں خوف کے سایے لہرا گئے۔

شیرف نے سگار کا کش لگاتے ہوئے کہا: "مرنے والی تیس برس تک تمہارے والد کے کلینک میں بطور نرس کام کر چکی ہے۔"

کیتھرین کا مُنہ استعجاب سے کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

"اوہ میرے خدا! تو یہ لیونا کی لاش ہے لیکن وہ اس جگہ کیا کر رہی تھی؟"

شیرف نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُن اہلکاروں کی طرف متوجہ ہوگیا جو موقع واردات کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ کیتھرین نے پھر سوچنا شروع کیا۔ "مس لیونا اُس کے والد کے ساتھ تیس برس تک نرس کے طور پر کام کرتی رہی تھی۔ بظاہر وہ خوش اخلاق اور ملنسار تھی لیکن بچپن سے کیتھرین اُس سے متنفر تھی۔ اُس کا خیال تھا اُس میں دکھاوا اور بناوٹ زیادہ ہے۔ کیتھرین کی ناپسندیدگی کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کے والد ہر وقت مس لیونا سے ہمدردی جتایا کرتے تھے۔

کارونر جیوری نے موقع کا اچھی طرح معاینہ کیا اور اُسے قتل کی واردات قرار دیا۔ پولیس اہلکار لاش کو ایمبولنس پر چڑھانے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ پارکنز پھر آیا اور تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ اُس نے شکایت کی کہ والدین کی وفات کے بعد تم نے مجھ سے ملنا جُلنا بہت کم کر دیا۔ کیتھرین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ تنہائی میں زیادہ سکون محسوس کرتی ہے۔ بہرحال آئندہ وہ اُن کے

ہاں آیا جایا کرے گی۔ باتوں باتوں میں پارکنز نے قصبے کے نئے ڈاکٹر کا ذکر کیا۔ کیتھرین کو ڈاکٹر کا ذکر ہمیشہ ناگوار گزرتا تھا۔ ایسے موقع پر اُسے اپنے مرحوم باپ یاد آنے لگتے۔ جو شہرت و مقبولیت اُنہیں میسّر تھی کسی اور کے حصّے میں کہاں؟ ویسے ڈاکٹر میو کو شخصی حیثیت سے وہ زیادہ بلند نہیں سمجھتی تھی۔ کیتھرین نے نظریں اُٹھائیں تو ڈاکٹر میو ایک درخت تلے کھڑا اُس کی طرف تک رہا تھا۔ اُس نے نہایت بیزاری سے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اتنے میں ایمبولنس گاڑی حرکت میں آگئی۔ کارل پارکنز اور کیتھرین نے بات ختم کی اور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑیوں کا واپسی سفر شروع ہُوا۔ کیتھرین بہت تھک چکی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اب شیرف اُسے گھر جانے کی اجازت دے دے گا لیکن شیرف نے بتایا کہ ابھی تھانے چل کر کیتھرین کو اپنا مکمل بیان قلمبند کرانا ہوگا۔ اُس نے دیکھا نہ صرف شیرف بلکہ تمام لوگوں کا رویّہ اُس کے ساتھ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ ایک دم تمام آنکھیں شناسائی سے عاری نظر آئیں۔ جیوری کے افسران تھوڑی دیر اُس سے زبانی گفتگو کرتے رہے پھر اُس کا بیان قلمبند کیا گیا۔

*

اگلا دن اتوار کا تھا۔ کیتھرین قریباً دس بجے سو کر اُٹھی تو گزشتہ واقعات نے پھر آدبوچا۔ والدین کی موت کے بعد اس وسیع مکان میں تنہائی پہلے تو بہت کھلی پھر وہ اس کی عادی ہوگئی۔ اُس نے کمروں کی آرائش اور ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی نشست گاہ میں آئی تو تصوّر کی آنکھوں سے اُس نے اپنے والدین کو روزمرّہ کے معمولات میں منہمک دیکھا۔

نہا دھو کر غُسل خانے سے نکلی تو گیارہ بج چکے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مطالعے کے کمرے میں آ بیٹھی۔ کھڑکی سے پارکنز کے صحن کا نظّارہ کر رہی تھی کہ بیرونی گیٹ کے قریب کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز نے چونکا دیا۔ اوہ! یہ تو اُس کے باس کی گاڑی تھی۔ ہفت روزہ لوفیلڈ گزٹ کا ایڈیٹر ریبنڈل۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کیتھرین کے گھر کا رُخ کیا تھا۔ کیتھرین نے تنقیدی نظروں سے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ چوڑے شانے، متناسب قد، کسی حد تک فربہ لیکن مضبوط جسم، ہلکے رنگ دار شیشوں والی عینک چہرے پر بھلی لگ رہی تھی۔ وہ باوقار انداز میں چلتا ہُوا دروازے کے قریب پہنچا تو کیتھرین نے لباس دُرست کیا۔ لپک کر دروازہ کھولا اور مُسکراتے ہُوئے اُس کا استقبال کیا۔ ریبنڈل ایک متین اور سنجیدہ آدمی تھا۔ اُس کے رویّے میں گرمجوشی کے ساتھ بُردباری تھی۔ کیتھرین سمجھ گئی کہ وہ کل پیش آنے والے واقعے پر تبادلۂ خیال کرنے آیا ہے۔ ابھی رسمی جُملے ہی ادا ہُوئے تھے کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو ٹام سامنے تھا۔

ٹام دُبلا پتلا دراز قد شخص تھا۔ اُس کا شمار ہفت روزہ گزٹ کے محنتی رپورٹروں میں ہوتا تھا۔ کیتھرین کے مکان کے دو حصّے تھے۔ ایک حصّہ رہائش کے لیے مختص تھا اور دوسرا اُس کے والد بطور کلینک استعمال کیا کرتے تھے۔ ڈیڈی کی وفات کے بعد کلینک کا کوئی مصرف نہیں رہا تو اُس نے یہ حصّہ ٹام کو کرایے پر دے دیا۔ ٹام ایک خوش باش نوجوان تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک صحافی تھا اور ہر وقت کسی نہ کسی کہانی کی کھوج میں رہتا تھا۔ کیتھرین بھانپ گئی وہ کل کی واردات کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے کے لیے بے چین ہوگا۔ اُس کے سوالوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اُس نے ٹام کو فوراً ریبنڈل کی موجودگی کی اطّلاع دے دی۔ باس کا نام سُن کر وہ ایک دم محتاط ہو گیا۔ کیتھرین اُسے ریبنڈل کے پاس بٹھا کر کافی بنانے چل دی۔

ریبنڈل جانتا تھا کہ ٹام لیونا کے قتل کو اس ہفتے کی سُرخی کہانی بنانے کے لیے سخت محنت کر رہا ہے۔ اُس نے پُوچھا کیا وہ ڈاکٹر میو سے بھی ملا ہے۔ ٹام نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے کہا:

"ہاں، ڈاکٹر میو کا کہنا ہے کہ مس لیونا کو اُس جھونپڑی میں

قتل نہیں کیا گیا دراصل پرسوں رات پچھلے پہر اُس کو مکان میں قتل کرنے کے بعد جھونپڑی میں لایا گیا ہے۔ یہ ڈکیتی یا مجرمانہ حملے کی واردات نہیں۔"

*

دوسرے دن پیر تھا۔ ایک فٹ بال میچ کے سلسلے میں چھٹی تھی۔ کیتھرین آج بھی سوچوں میں غرق تھی۔ اگر اُس کے والدین اور مس لیونا کے قتل کے درمیان کوئی تعلق تھا تو وہ کیا تھا؟ کیا وہ تینوں کسی ایسے راز سے آگاہ تھے جو اُن کی موت کا باعث بنا؟ لیکن اگر ایسی بات تھی تو پھر دونوں وارداتوں کے درمیان چھ ماہ کا وقفہ کس لیے تھا۔ کیا مس لیونا کو قتل کرنا اتنا ہی دشوار تھا کہ قاتل کو چھ ماہ لگ گئے۔

وہ ان خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ رینڈل ہوگا لیکن کھڑکی سے شیرف کا چہرہ دیکھ کر اُس پر اداسی پڑ گئی۔

شیرف اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" شیرف نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ اُس نے ایک لمحہ رُک کر کیتھرین کے چہرے کی طرف دیکھا جو انتہائی سنجیدہ تھا۔ "جب تم نشانہ بازی کے لیے جا رہی تھیں کسی واقف کار سے سڑک پر ملاقات ہوئی تھی؟" شیرف نے پہلا سوال داغا۔

کیتھرین نے ذہن پر زور دیا اور پھر اچانک اُسے یاد آیا۔ راستے میں نیلی پک اپ نے اُسے کراس کیا تھا۔ پک اپ میں مارٹن بارنر تھا۔ اُس نے کیتھرین کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ مارٹن بارنر اُس کا پڑوسی ادھیڑ عمر کا شریف الطبع آدمی تھا۔ کیتھرین سوچ رہی تھی کہ شیرف کے سامنے اُس کا نام لینے سے وہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ بہرحال حقیقت کو چھپانا مناسب نہیں تھا۔ اُس نے شیرف کو بتایا کہ راستے میں مارٹن بارنر سے اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ شیرف نے پوچھا کہ اُس نے اُسے کس جگہ دیکھا تھا۔ کیتھرین نے ایک بار پھر ذہن پر زور دیا لیکن وہ کسی خاص جگہ کا تعین نہ کر سکی۔

شیرف نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرنے کے بعد سر اُٹھایا: "آخری دفعہ مس لیونا سے تمہاری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

کیتھرین نے سوچتے ہوئے کہا: "اگر آپ کی مراد لیونا کو دیکھنے سے ہے تو وہ دس پندرہ روز پہلے کی بات ہے۔ اگر ملاقات سے مراد بات چیت ہے تو اس کو کوئی تین مہینے گزر چکے ہیں۔ جب ٹام کو میں نے ڈیڈی کے دفتر والا حصہ کرایے پر دیا تو لیونا میرے پاس آئی۔ اُس نے کہا کہ وہاں کئی ایسی چیزیں موجود ہیں جو نئے ڈاکٹر میو نے نہیں خریدی ہیں اور اگر تم وہ چیزیں وہاں سے ہٹانا چاہتی ہو تو میں تیار ہوں۔ مجھے اُس کی موجودگی پسند نہیں تھی لیکن میں انکار نہ کر سکی۔ کچھ الماریاں اُوپر دوسری منزل پر لے جانا تھیں اور میں اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔" شیرف نے پوچھا: "اُس دن کی کوئی اور بات جو تمہیں یاد ہو!"

"کوئی خاص بات نہیں۔" کیتھرین نے سوچتے ہوئے کہا۔ "سامان کی منتقلی کے دوران لیونا نے مذاقاً کہا تھا کہ قصبے کے کچھ لوگ کتنے صحت مند ہیں کہ چھ ماہ گزرنے کے باوجود اُنہیں اپنی فائلوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ آدھی سے زیادہ فائلیں ڈاکٹر میو کے پاس پہنچ چکی ہیں لیکن ایک چوتھائی ابھی تک الماریوں میں موجود ہیں۔ شیرف نے گہری نظروں سے کیتھرین کو دیکھتے ہوئے ایک بالکل غیر متوقع سوال کیا۔ اُس نے پوچھا کہ کیا اُس نے اپنے ڈیڈی کے سامان میں سے کوئی چیز لیونا کو بھی فروخت کی تھی۔ اُس نے نفی میں جواب دیا۔

شیرف نے کہا:

"لیونا نے ایک وصیت بھی چھوڑی ہے۔ یہ وصیت چند سال پرانی ہے۔ اس کے مطابق مرحومہ کی ہر چیز مکان، رقم وغیرہ تمہارے ڈیڈی کے نام ہے۔ اب یہ ساری چیزیں تمہارے حصے میں آئیں گی۔"

کیتھرین نے شیرف کی طرف دیکھا اور اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ شیرف کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیتھرین

کا چہرہ غُصّے سے تمتما اُٹھا۔ شیرف نے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"ہفتے کی صُبح تم نے لیونا کی لاش دریافت کی لیکن اُسے جمعے کی رات ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل نے کسی گولائی نما وزنی چیز سے اُس کے سر پر دو ضربیں لگائی تھیں۔ شاید بیس بال کا بلّا استعمال کیا گیا ہو۔ قتل کے بعد قاتل یا قاتلہ نے اُس کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ صوفے اُدھڑے ہُوئے تھے اور ہر طرف لُوٹ پھُوٹ کے آثار دکھائی دیتے تھے۔"

پھر شیرف نے کہا: "یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاتل واردات کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت لینا چاہتا تھا۔ اگر لاش وہیں گھر میں پڑی رہتی تو اس موسم میں دو دن کے اندر اندر ہمسایوں کو خبر ہو جاتی لیکن اُس جھونپڑی میں ہو سکتا تھا کئی روز تک یہ راز افشا نہ ہوتا۔ قتل کے بعد اُس نے لاش کو گاڑی وغیرہ میں رکھ کر جھونپڑی تک پہنچایا۔ میرا خیال ہے قاتل یا تو مرد ہے یا کوئی لمبی تڑنگی صحت مند عورت۔"

شیرف کے آخری فقرے نے کیتھرین کے جسم میں اطمینان کی لہر دوڑا دی۔ اُس نے قدرے اعتماد سے پُوچھا،

"آخر لیونا کا قاتل اُس کے گھر میں کس چیز کی تلاش کرتا رہا؟"

شیرف نے سگار کا طویل کش لے کر کہا: "ہمیں پتہ چلا ہے کہ لیونا ایک بلیک میلر تھی۔ اس بات کی واضح شہادتیں ملی ہیں کہ وہ قصبے کے لوگوں کو بلیک میل کرتی تھی۔"

اس انکشاف پر کیتھرین سُن ہو کر رہ گئی۔

-*-

ابھی وہ شیرف کی جاتی ہُوئی کار ہی کو دیکھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سیلی کن تھی۔ سیلی، مارٹن بارنز کی شادی شدہ بیٹی تھی۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو کے بعد سیلی نے کہا۔

"مجھے ہفتے کے واقعے پر بہت تشویش ہے۔ اگر تم اپنے گھر میں خوف محسوس کرتی ہو تو ایک دو روز کے لیے ہمارے ہاں آ جاؤ۔" کیتھرین نے رسماً اُس کا شکریہ ادا کیا۔ سیلی نے کہا۔

"ڈیڈی نے مجھے پرسوں ہی بتایا تھا کہ راستے میں اُن کی ملاقات تم سے ہُوئی تھی۔ وہ دراصل زمین کا چکّر لگانے گئے تھے۔"

کیتھرین اس بات پر بُری طرح چونک گئی؛ تاہم اُس نے اپنی حالت ٹیلیفون پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ سیلی سے گفتگو ختم کرنے کے بعد وہ حیران تھی کہ مارٹن بارنز نے اپنے گھر والوں سے جھُوٹ کیوں بولا۔ جہاں تک کیتھرین کو یاد پڑتا تھا وہ اپنی زمین کی جانب سے ہرگز نہیں آ رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے سڑک کے کنارے بنے ہُوئے مکانوں میں سے موڑ کاٹ کر بڑی سڑک پر آیا ہو۔ یہ جگہ وہاں سے بہت قریب تھی جہاں لیونا کی لاش پڑی تھی۔

لوگوں کی ٹٹولتی ہُوئی نگاہوں نے اُسے سخت پریشان کر رکھا تھا۔ اطّلاعی گھنٹی پھر بجی۔ کیتھرین نے سوچا اس دفعہ ضرور ریندل ہو گا لیکن اس بار بھی توقّع پُوری نہیں ہُوئی۔ دروازے پر تفتیشی افسر پارکنز کی بیوی مولی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھی۔ اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا:

"مَیں سوچتی تھی تم پریشانی میں کھانا وغیرہ کیسے پکاؤ گی۔ اس لیے یہ لائی ہُوں۔" کیتھرین نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اندر آنے

کو کہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی اندر آگئی۔ وہ مختصر سے قد کی نہایت بھاری بھرکم عورت تھی۔

ابھی وہ صوفے پر بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے سوچا یہ رینڈل نہیں ہو سکتا، اس لیے ریسیور اُٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ رات ابھی دُور تھی لیکن کیتھرین کو ابھی سے وحشت ہونے لگی۔ اُسے گھر کے در و دیوار سے خوف سا آ رہا تھا لیکن اُس نے عزم کر لیا کہ اُسے یہیں رہنا ہے۔ دل بہلانے کے لیے اُس نے ٹام کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ بغلی دروازہ کھول کر وہ کھلے احاطے میں آگئی اور پھر گارڈنیا کی باڑ سے گزر کر ٹام کے دروازے پر پہنچ گئی۔ گھنٹی دینے پر ٹام نے دروازہ کھولا۔ وہ کیتھرین کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ تین ماہ پہلے اُس نے یہ مکان ٹام کو کرایے پر دیا تھا اور آج پہلی دفعہ وہ یہاں قدم رکھ رہی تھی۔ اُس نے گھر کے در و دیوار کا بغور جائزہ لیا۔ ٹام نے مکان کو اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا۔ کیتھرین ڈرائنگ رُوم میں آکر بیٹھ گئی۔ اُس کے والد اس کمرے کو انتظار گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اچانک اُس کی نگاہ دروازے کے بالائی حصّے پر پڑی اور وہ چونک پڑی۔ شاید اُسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ اُٹھ کر دروازے کے پاس پہنچی اور چوکھٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے لگی۔ ایک جگہ چھوٹا سا بٹن نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" ٹام نے پُوچھا۔

"یہ دراصل ایک ہنگامی گھنٹی کا بٹن ہے۔ یہ گھنٹی ڈیڈی نے مریضوں کی سہولت کے لیے لگائی تھی۔ اگر رات کے وقت کسی کو ڈیڈی کی ضرورت پیش آتی تو وہ یہ بٹن دبا دیتا تھا۔"

"ونڈرفل" ٹام نے دلچسپی سے کہا۔ "کیا یہ اب بھی کام کرتی ہے؟"

"کام تو کرتی ہے، لیکن تم اسے استعمال کر کے مجھے تنگ نہیں کرو گے۔"

"تم بے فکر رہو۔ مَیں جانتا ہُوں تم پہلے ہی کئی ذہنی صدمے برداشت کر چکی ہو۔" ٹام نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"بہت شکریہ!" پھر وہ کچھ یاد کرتے ہُوئے بولی: "ٹام! جہاں تک مجھے یاد ہے تم جمعے کی رات اپنی گاڑی پر کہیں گئے تھے۔ اُس وقت مَیں سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ تم جانتے ہو تمہاری کھٹارہ گاڑی کی آواز سینکڑوں میں پہچانی جا سکتی ہے۔"

ٹام نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے کہا کہ وہ ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ کیتھرین نے ٹام سے کہا: "اُسی رات لیونا قتل کی گئی تھی۔ کیا تم نے قصبے میں کوئی غیر معمولی چیز نوٹ کی تھی؟"

ٹام نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا "نہیں مَیں نے کوئی خاص چیز نہیں دیکھی لیکن پھر بھی اس معاملے میں میری معلومات تم سب لوگوں سے زیادہ ہیں۔" کسی انجانے خدشے کے تحت کیتھرین نے گھُور کر ٹام کو دیکھا اور نصیحت آمیز لہجے میں کہا: "لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور نہ کرو کہ تمہیں کوئی بہت اہم بات معلوم ہے۔ بعض اوقات کسی بات سے آگاہی بھی انسان کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے میرے ممّی، ڈیڈی اور لیونا کے قتل کی وجہ بھی یہی رہی ہو۔" ٹام اُس کی بات سمجھ رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنے دل کی بات کیتھرین کو بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھا۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ شیرف گیلیئن کا بیٹا قصبے میں منشّیات کا کاروبار کرتا ہے اور جیسا کہ شیرف خود اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مس لیونا بلیک میلنگ بھی کرتی تھی، ہو سکتا ہے شیرف کے بیٹے نے اُس کا مُنہ بند رکھنے کے لیے اُسے بڑی بڑی رقوم دی ہوں اور آخر زچ ہو کر اُس کا کام تمام کر دیا ہو۔

ٹام کی بات یکسر نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد کیتھرین اپنے گھر میں لوٹ آئی۔ شام کے سایے گہرے ہو رہے تھے۔ اُس نے مختلف کمروں کی روشنیاں جلا دیں۔ جب وہ ٹی وی آن کرنے کا سوچ رہی تھی تو اطلاعی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس مرتبہ رینڈل تھا۔ پچھلے دو روز میں وہ اچانک رینڈل کے بہت قریب آگئی تھی۔ رینڈل اور کیتھرین کے خاندانوں میں بہت پُرانے روابط

تھے۔ قصبے کی مختصر اور محدود زندگی میں ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع بے شمار تھے۔ کیتھرین، ریبنڈل اور اُس کے بھائی بہنوں میں کھیل کر جوان ہُوئی تھی۔ ایک سال پہلے وہ ریبنڈل کے ہفت روزہ میں ملازم ہُوئی تھی۔ اُس وقت سے اب تک اُن کے درمیان بالکل رسمی قسم کے تعلقات تھے۔ ہاں ایک دو بار اُس نے ریبنڈل کی آنکھوں میں ایک مُبہم تحریر دیکھی تھی جسے وہ اب صاف پڑھ سکتی تھی۔ ریبنڈل اُس سے محبت کرتا تھا۔

اُس نے کافی بناتے ہُوئے ریبنڈل کی طرف دیکھا۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اپنے مضبوط اور ورزشی جسم سے وہ کسی صورت رسالے کا ایڈیٹر نہیں لگتا تھا۔ کیتھرین نے سوچا اگر وہ عینک اُتار دے تو اتھلیٹ نظر آئے لیکن پھر اپنے خیال پر وہ خود ہی مُسکرا دی۔ وہ جانتی تھی عینک کے بغیر اخبار کی تحریر تو کیا اُسے اخبار بھی نظر نہیں آئے گا۔ کافی پیتے ہُوئے وہ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کیتھرین محسوس کر رہی تھی کہ خاصی دیر سے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر اُس نے کیتھرین کو باہر گھومنے کی دعوت دی لیکن اُس نے نہایت سلیقے سے انکار کر دیا۔ ریبنڈل نے ایک شریف اور بُردبار آدمی کی طرح اس انکار کو برداشت کیا۔ پھر وہ اُس سے رُخصت ہو کر اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

کیتھرین نے اُسے کھڑکی میں سے جاتے ہُوئے دیکھا۔ وہ کچھ بُجھا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ کیتھرین کو اپنے انکار پر دُکھ تھا لیکن وہ اپنی مقرر کردہ حدُود کو پھلانگنا نہیں چاہتی تھی اور اپنے معاشرے کی زبوں حالی سے واقف تھی۔ ہر طرف فحاشی کا دَور دَورہ تھا۔

-x-

منگل کا دن روشن تھا۔ تین چھٹیوں کے بعد کیتھرین دفتر جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی کہ اچانک اُس نے ڈاکٹر میو کی گاڑی دیکھی۔ وہ جاتے جاتے سڑک پر رُک گیا تھا۔

"ہیلو کیتھرین! کیسی گزر رہی ہے؟" اُس نے حسبِ معمول ہانک لگائی۔

یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ دفتر کے لیے نکلتے وقت عموماً دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ کیتھرین نے اُسے کبھی مُنہ نہیں لگایا لیکن وہ بلا کا ڈھیٹ تھا۔ پچھلے دنوں جب کیتھرین نے اُس کی شادی کی درخواست ٹھکرائی تھی تو اُس کا خیال تھا کہ اب وہ کبھی اُسے مُنہ نہیں دکھائے گا لیکن اُس کی بدتمیزی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کیتھرین نے بڑے خشک انداز میں اُس کے سلام کا جواب دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

دفتر پہنچ کر اُس نے اپنے ہمکاروں کی طرف دیکھا۔ تمام نگاہیں غیر محسوس طور پر اُس پر جمی ہُوئی تھیں۔ ایک دو ساتھیوں سے سلام دُعا کے بعد وہ اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ حسبِ معمول ہفتے کا پہلا دن کام کا انبار لے کر آیا تھا۔ کیتھرین ہفت روزہ 'گزٹ' میں سوسائٹی کا صفحہ مرتّب کرتی تھی۔ اس صفحے میں زیادہ تر شادی اور سالگرہ کی تقریبوں کا احوال ہوتا تھا۔ شاید شادی کی خبریں چھاپ چھاپ کر ہی وہ اپنے لیے شادی کو ضروری خیال کرنے لگی تھی۔ ورنہ جس ماحول میں وہ رہتی تھی، وہاں ان باتوں کی پروا کم ہی کی جاتی تھی۔

"مَیں نے سُنا ہے تم نے پولیس کو مارٹن کے خلاف بیان دیا ہے۔" اس آواز پر کیتھرین نے چونک کر بائیں طرف دیکھا۔ اُس کی ساتھی ٹائپسٹ جیول اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیول تیکھے نین نقش کی لمبی تڑنگی، جلد دوست بنانے والی عورت تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مَیں نے صرف اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ہفتے کی صُبح مارٹن ایک پک اپ پر قصبے کی طرف آ رہا تھا۔"

کیتھرین دو دن سے سوچ رہی تھی لیکن اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے مارٹن کو کس مقام پر دیکھا تھا۔ اب اُسے یاد آ گیا تھا کہ وہ جیول کے گھر کی طرف سے بڑی سڑک پر آیا تھا۔ جیول اُس سے کہہ رہی تھی کہ تم نے اس بارے میں بیان

دے کر مارٹن کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اُس کی بیوی نہایت شکّی مزاج عورت ہے۔ برسوں سے اُن کے گھر میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ مارٹن کا لیونا سے رومان تھا اور اُس سے ملنے کے لیے جھونپڑی میں گیا تھا اور اُسے مرا ہُوا دیکھ کر واپس بھاگ آیا۔ کم بخت یہ بات بھی نہ سمجھی کہ مارٹن اور لیونا کا بھلا کوئی جوڑ تھا؟ کیتھرین گہری نظروں سے جیول کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے وہ مارٹن اور جیول کو ایک ریسٹورنٹ میں دیکھ چکی ہے۔ اس کا مطلب تھا... کہ مارٹن اور جیول محبّت کا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ کیتھرین کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مارٹن کے گھریلو حالات ایسے تھے کہ وہ اس راز کے افشا کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر اُس کی جھگڑالو بیوی طلاق مانگتی تو مارٹن کو ایک بڑی رقم سے محروم ہونا پڑتا۔ ہو سکتا ہے لیونا اُسے بلیک میل کر رہی ہو۔ بالآخر تنگ آکر مارٹن نے یا مارٹن اور جیول دونوں نے لیونا کا کام تمام کر دیا ہو۔

کیتھرین کے عین سامنے اُنّیس بیس سالہ خوبرو کاپی پیسٹر پنکی کی نشست تھی — پنکی جب نئی نئی دفتر آئی تو کیتھرین کے کرایے دار ٹام نے اُس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن کیتھرین کی بروقت نصیحت نے پنکی کو اس چکّر میں گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا۔ یُوں وہ کیتھرین کا بہت احترام کرنے لگی اور اپنے دل کی باتیں اُس پر بے جھجک کھول دیا کرتی تھی۔ پنکی کیتھرین کے پاس رازدارانہ انداز میں آکر بولی:

"کیتھرین! مَیں نے اخبار میں مِس لیونا کے قتل کے بارے میں پڑھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ لاش آپ نے دریافت کی تھی۔ پولیس اس بارے میں آپ سے پُوچھ گچھ کر رہی ہوگی۔ دراصل مَیں لیونا کے متعلّق ایک اہم بات جانتی ہُوں۔ ہو سکتا ہے اس سے قتل پر کوئی روشنی پڑ سکے۔" کیتھرین ہمہ تن گوش ہو گئی۔ پنکی نے کہا: "شاید آپ کو اس بات کا پتہ نہ ہو کہ لیونا اسقاطِ حمل کا کام بھی کرتی تھی۔"

کیتھرین پہلے تو اس انکشاف پر بھونچکّی رہ گئی پھر اُس نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا: "پنکی، یہاں سے صرف تیس میل دُور میمفس (MEMPHIS) میں اسقاطِ حمل کو قانونی تحفّظ حاصل ہے کیا اس عمل کے خواہشمند وہاں نہیں جا سکتے؟"

پنکی نے جواب میں کہا کہ اُسے اچھّی طرح معلوم ہے لیکن اس صورت میں عورتوں کو کم از کم دو دن گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ کوئی نوجوان لڑکی والدین کو بتائے بغیر کس طرح میمفس جا سکتی ہے اور دوسری بات یہ کہ لیونا میمفس کے مقابلے میں نہایت سستی بھی تھی۔ کیتھرین نے پنکی کو گھورتے ہُوئے پُوچھا کہ اُسے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہُوئیں؟ پنکی کچھ دیر خاموش رہی۔ شاید اخلاقی جرأت کا سہارا لے رہی تھی پھر اُس نے اعتراف کیا کہ آج سے پانچ ماہ قبل وہ خود بھی اسقاط کرا چکی ہے۔

پانچ ماہ کا سُن کر کیتھرین کو قدرے اطمینان ہُوا۔ اُس کا مطلب تھا یہ اُس کے والد کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے۔ اب اُسے یاد آیا کہ شیرف نے اُس سے یہ سوال کیوں کیا تھا کہ لیونا کے پاس اُس کے والد کے اوزار تو نہیں۔ کیتھرین کو علم تھا کہ وہ اوزار جو ڈاکٹر میو نے خریدے تھے لیونا نے سنبھال لیے تھے۔ اس کا مطلب تھا ان ہی اوزاروں سے وہ اسقاطِ حمل کا گھناؤنا کام کرتی تھی۔

دروازے میں حرکت پیدا ہُوئی۔ کیتھرین نے دیکھا ٹام لمبے ڈگ بھرتا اُس کی طرف آرہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ آج وہ صبح سے لیونا کے قتل کے سلسلے میں لوگوں سے انٹرویو لے رہا ہے۔ کیتھرین کے پُوچھنے پر اُس نے اعتراف کیا کہ ابھی تک کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ پھر وہ اپنی کھٹارہ کار کا رونا لے کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بتایا کہ گاڑی پھر خراب ہو گئی ہے اور وہ اُسے ورکشاپ چھوڑ آیا ہے۔ اتنے میں گزٹ کا ایڈیٹر رینڈل آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر ٹام نے کھسکنے میں عافیت سمجھی۔

رینڈل تھوڑی ہی دیر اُس کے پاس بیٹھا تھا کہ چھُٹّی کا وقت ہو گیا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہُوئے دفتر سے باہر آ گئے۔

کیتھرین نے رینڈل کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ بیٹھ گیا تو کیتھرین نے اُس سے کہا "لیونا کے گھر سے ملنے والی رقم سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قصبے کے بہت سے افراد کو بلیک میل کر رہی تھی۔ ایک طرف حمل گرواتی اور دوسری طرف اپنے بدنصیب مریضوں کے راز سے فائدہ بھی اُٹھاتی تھی۔ اب نہ معلوم کون کون اُس کے ستم کا نشانہ بنا۔ ہر ایک پر شک کیا جا سکتا ہے۔"

کیتھرین کے خاموش ہونے پر رینڈل نے کہا: "اب تم اس بارے میں کس کس پر شک کرتی ہو؟"

کیتھرین نے بلا توقف مارٹن، جیول اور شیرف کے بیٹے کے بارے میں بتا دیا۔ اُس نے ٹام کے متعلق بھی بتایا کہ وہ واردات کی رات اپنی کار پر سوار ہو کر کہیں گیا تھا۔ تھوڑی دیر وہ مختلف امکانات پر غور کرتے رہے۔ پھر رینڈل گاڑی سے نیچے اُتر آیا اور کیتھرین گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

اُس شام کیتھرین باورچی خانے میں برتنوں کو درست کر کے رکھ رہی تھی ـــــ اچانک اُس کا ہاتھ ایک غیر مانوس چیز سے ٹکرایا ـــــ یہ مولی کی دی ہوئی ڈش تھی۔ اُس نے سوچا چلو اسے واپس کر آؤں۔ بس مولی کے گھر پہنچ کر اُس نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو غیر متوقع طور پر مسٹر پارکنز دروازے میں نظر آئے۔ اُنھوں نے ہمیشہ کی طرح لمبی آستینوں کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اُن کے تنومند جسم نے پورے دروازے کو روک رکھا تھا۔ رسمی کلمات ادا کرتے ہوئے مسٹر پارکنز نے اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ سامنے ہی مولی بیٹھی بُنائی کر رہی تھی۔

کیتھرین نے ڈش کے لیے شکریہ ادا کیا۔ وہ جلد ہی جانا چاہتی تھی لیکن مسٹر پارکنز کی شفقت نے اُسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اُنھوں نے مولی سے کافی لانے کے لیے کہا۔ جب مولی کافی لینے چلی گئی تو مسٹر پارکنز، کیتھرین کے ڈیڈی کا ذکر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مولی کافی لے آئی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ مسٹر پارکنز کو کافی تھماتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپے اور اُبلتی ہوئی کافی پارکنز کے ہاتھوں پر جا گری۔ کیتھرین کا خیال تھا کہ مسٹر پارکنز چیخ پڑیں گے لیکن اُنھوں نے غیر معمولی تحمل سے یہ تکلیف برداشت کر لی۔ وہ یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ مرہم لگانے کے لیے باتھ روم کی طرف چلے گئے۔ جونہی مسٹر پارکنز ہاتھ پر پٹی باندھے واپس آئے کیتھرین کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے دونوں سے اجازت طلب کی۔ مسٹر پارکنز "نہیں نہیں" کہنے کے باوجود اُسے گھر تک چھوڑنے آئے۔ کیتھرین نے کہا "مولی کچھ گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں کیا وہ بیمار ہیں؟"

پارکنز نے نفی میں جواب دیا تو کیتھرین نے کہا:

"میرا خیال ہے مولی کو مجھ پر شک ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے کہ لیونا کی موت میں میرا ہاتھ ہے۔ شاید اسی لیے میری موجودگی میں وہ خوفزدہ ہو؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" مسٹر پارکنز نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "وہ تمہاری وجہ سے خوفزدہ ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ تمہیں خدانخواستہ قاتل سمجھتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ تمہیں خطرے میں گھرا ہوا محسوس کرتی ہے۔"

کیتھرین نے وضاحت طلب نظروں سے مسٹر پارکنز کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "تین ایسے افراد قتل ہو چکے ہیں جن کا تمہارے ساتھ قریبی رشتہ ہے۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا مشورہ ہے کہ اپنے

بارے میں محتاط رہو۔ تمہارا تنہا رہنا مناسب نہیں۔ اگر تم چاہو تو کچھ دنوں کے لیے ہمارے ہاں آسکتی ہو۔"

وہ اُن کی تجویز سے متفق نہیں تھی پھر بھی اُس نے بات پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور احتیاط سے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کسی ہمسائے کے گھر جاتے ہوئے دروازے کو تالا لگایا تھا۔ مسٹر پارکنز نے کہا "اگر تمہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں"۔۔۔ کیتھرین نے یہاں تک آنے پر پارکنز کا شکریہ ادا کیا۔ خدا حافظ کہہ کر وہ پیچھے مڑے لیکن پھر رُک گئے۔ شاید اُنہیں کوئی بات یاد آگئی تھی۔ اُنہوں نے کہا:

"کیتھرین! میرے بڑے بیٹے کا طبی ریکارڈ تمہارے ڈیڈی کے پاس تھا۔ کیا ڈاکٹر میو تمہارے ڈیڈی کے تمام کاغذات اپنے ساتھ لے گیا ہے؟"

کیتھرین نے اُسے بتایا کہ ریکارڈ ابھی تک سابقہ دفتر کی بالائی منزل پر ہے۔ اگر وہ ضروری خیال کرتے ہیں تو وہ کل اُن کے بیٹے کی فائل ڈھونڈ کر لا دے گی۔ مسٹر پارکنز نے معذرت کے لہجے میں کہا کہ ایسی کوئی جلدی نہیں۔ پانچ چھ روز سے پہلے ضرورت نہیں پڑے گی۔ پارکنز کے رخصت ہونے کے بعد اُس نے سارے گھر کی بتیاں جلائیں۔ اچھی طرح کونے کھدروں کا جائزہ لیا۔ پھر بتیاں بجھا کر اپنے بیڈ روم میں آگئی اور دروازے کو مقفل کر کے بستر پر گر گئی .... دُور گلی میں ایک سایہ بے چینی سے متحرک تھا۔

*

دوسرے دن صبح جب کیتھرین دفتر کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف ٹام تھا۔ وہ اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کی گاڑی ابھی تک ورکشاپ میں ہے، اس لیے دفتر جانے کے لیے اُسے لفٹ کی ضرورت ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار ایسا موقع ضرور آتا جب اپنی کھٹارہ ویگن کے طفیل ٹام کو کیتھرین سے لفٹ کی درخواست کرنا پڑتی تھی۔ کیتھرین نے بے تکلفی سے کہا:

"ٹام کے بچے! آنا ہے تو جلدی آؤ، میں بالکل روانہ ہونے والی ہوں۔"

'ٹام کے بچے' نے واقعی دیر نہیں کی۔ ادھر کیتھرین نے ریسیور رکھا اُدھر وہ آموجود ہوا۔ دفتر پہنچ کر دونوں اپنے اپنے کاموں میں جت گئے۔ وہ دوپہر تک بے حد مصروف رہی۔ سرورق کی کہانی لیونا کے قتل پر مبنی تھی اور ٹام اُسے مکمل کرنے کے لیے زبردست بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ قریباً ایک بجے کیتھرین نے ٹائپ رائٹر سے سر اُٹھایا تو ٹام کے کمرے میں گہما گہمی آگئی۔ شیشے کے دوسری طرف ٹام اور شیرف گیلئین بڑے انہماک سے مصروفِ گفتگو تھے۔ ٹام کی چرب زبانی شیرف سے نئی نئی باتیں اُگلوا رہی تھی۔ قریب ہی مسٹر پارکنز ہاتھ میں ایک فائل پکڑے کھڑے تھے۔ جب اُنہوں نے کیتھرین کو اپنی طرف متوجہ پایا تو چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے اُس کی طرف بڑھ آئے۔ کیتھرین مصروفیت کی اس گھڑی میں کسی گفتگو کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لیکن پارکنز سے بے رُخی برتنا بھی مشکل تھا۔ اُس نے خوش اخلاقی سے اُن کا استقبال کیا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"بھئی آج رات تم اپنے نوائے فرینڈ کے ساتھ ہمارے گھر مدعو ہو۔" مسٹر پارکنز نے بے تکلفی سے کہا۔ کیتھرین اس اچانک حملے پر گھبرا گئی۔

"کون نوائے فرینڈ!" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی وہی تمہارا کرایے دار۔ کیا نام ہے اُس کا، ٹام؟"

کیتھرین نے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ وہ کن انکھیوں سے رینڈل کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اُس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد رینڈل ہوگا .... اور شاید آخری بھی۔ اُس نے مسٹر پارکنز کو بتایا کہ ٹام اُس کا نوائے فرینڈ نہیں صرف کرایے دار ہے۔ جاتے ہوئے پارکنز نے ایک دفعہ پھر اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی۔ تھوڑی دیر بعد کیتھرین لنچ کھانے گھر چلی گئی۔ دفتر واپس پہنچ کر وہ شام تک مصروف رہی۔ رینڈل سے صرف چند منٹ بات چیت ہوئی۔ اُس نے کیتھرین سے ہفتے کے اختتام تک

سیر کے لیے درخواست کی۔ کیتھرین نے یہ دعوت قبول کر لی۔ ٹام کی گاڑی ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ شام گھر جاتے وقت وہ اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹام کی صرف ایک بات کیتھرین کو ناپسند تھی۔ وہ لڑکیوں کے بارے میں گفتگو کرتے وقت بڑا غیر محتاط ہو جاتا تھا۔

*

اگلے دن کیتھرین نے گھر کی صفائی کی اور پھر تھک ہار کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اُس کا ذہن ایک بار پھر مس لیونا کے قتل میں اُلجھ گیا۔ رات آئی تو اُس نے اُٹھ کر گھر کے دروازے دیکھے۔ صرف سامنے والا دروازہ کھلا تھا۔ مکان میں مکمل خاموشی تھی۔ اچانک وہ ایک مدھم سی آواز پر چونک گئی۔ یوں محسوس ہُوا جیسے کوئی گھاس میں دبے پاؤں چل رہا ہو۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ اس دفعہ آواز اتنی واضح تھی کہ کیتھرین کو اپنا دل اُچھل کر حلق میں آتا محسوس ہُوا۔ وہ گھر کا صدر دروازہ بند کرنے کے لیے اُٹھی تو اُسے شیرف کو مطلع کرنے کا خیال آیا۔ پھر اُس نے سوچا آخر شیرف سے کیا کہے گی۔ اچانک اُسے گھنٹی کی ایک مخصوص آواز سُنائی دی۔ وہ سوچنے لگی اور پھر اُسے اندازہ ہُوا کہ گھنٹی کی آواز اُس کے ڈیڈی کے کمرے سے آ رہی ہے۔ یہ ہنگامی گھنٹی کی آواز تھی۔ کوئی اُس کے ڈیڈی کو بُلا رہا تھا... لیکن وہ تو مر چکے تھے اور پھر جیسے اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ ٹام گھنٹی بجا رہا ہے۔ کیا وہ اُس سے کوئی شرارت کر رہا تھا؟ لیکن نہیں۔ اُس نے تو بڑی سنجیدگی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے تنگ نہیں کرے گا... کیتھرین سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ گھنٹی کی آواز تیسری بار سُنائی دی۔ اُس نے جھپٹ کر دراز کھولی، ریوالور نکالا اور بھاگتی ہُوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ ایک بٹن دبا کر اُس نے گھر کا بغلی صحن روشن کیا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ وہ بھاگتی ہُوئی زمین کے خالی قطعے میں سے گزری اور دوسری طرف پہنچ گئی۔ اب وہ ٹام کے گھر کے پچھواڑے کھڑی تھی جس کا عقبی دروازہ کھلا ہُوا تھا... کھلے دروازے کو دیکھ کر اُسے اپنی سانس رُکتی محسوس ہُوئی۔ گھنٹی کی آواز نے اُسے اتنا خوفزدہ نہیں کیا تھا جتنا اس کھلے دروازے نے کیا۔ وہ سمجھ گئی کوئی نہایت خوفناک واقعہ رُونما ہو چکا ہے۔ پستول تھامے وہ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب پہنچی۔ دہلیز میں قدم رکھا تو کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں پہنچی لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ہال کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اُس نے دھیمے لہجے میں دو تین بار ٹام کو آوازیں دیں پھر دروازے میں سے جھانکا اور اُسے ٹام کی لمبی لمبی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ جی کڑا کر کے آگے بڑھی اور تب ٹام کا سارا جسم اُس کے سامنے آ گیا۔ وہ پُشت کے بل فرش پر گرا ہُوا تھا۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ سر خُون میں لتھڑا ہُوا تھا۔ خُون کی ایک پتلی لکیر ابھی تک اُس کے رُخسار پر دوڑ رہی تھی۔ کیتھرین نے قطرہ قطرہ خُون قالین میں جذب ہوتے دیکھا۔ اُس نے ٹام کی نبض ٹٹولی۔ اُس کی اُنگلیوں کے نیچے گردن کی شریان نے ایک دو بار حرکت کی اور پھر ساکت ہو گئی.... ٹام مر چکا تھا۔ اُس کا بھائیوں جیسا دوست اب اس دُنیا میں نہیں رہا تھا۔ دفعتاً اُسے اپنے سامنے شیشے کے پیچھے حرکت محسوس ہُوئی۔ اُس نے اپنی اُنگلی پستول کی نلی پر رکھی تب دروازہ کھلا اور اُسے پنکی کا چہرہ نظر آیا وہ حواس باختہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"پنکی! ٹام مر چکا ہے۔" اُس نے بھرائی ہُوئی آواز میں کہا۔

پنکی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ کیتھرین نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھُونے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔" وہ چیخی۔

اور تب کیتھرین نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو تمام کا تمام ٹام کے خُون سے رنگین تھا۔

پنکی اب بلند آواز میں رو رہی تھی۔ کیتھرین کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اُسے ٹام کا قاتل سمجھ رہی ہے۔ اُس نے پنکی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ کیتھرین نے محسوس کیا کہ اُسے ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس

کیفیت سے نجات دلانے کے لیے اُس نے دو زوردار تھپڑ پنکی کے مُنہ پر جڑ دیے: "بے وقوف لڑکی! تم مجھے ٹام کی موت کا ذمّے دار سمجھ رہی ہو، مَیں تو اُس کی مدد کے لیے آئی تھی۔ یہ دیکھو۔" اُس نے چوکھٹ کے اُوپر لگے بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "ٹام نے جدّوجہد کے دوران میں یہ بٹن دبایا تھا جس کا تعلق ہمارے گھر میں لگی گھنٹی سے ہے۔"

اب پنکی کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کئی مرتبہ ڈاکٹر کے پاس آچکی تھی اور اس بٹن کے بارے میں جانتی تھی۔ کیتھرین نے اُس کے قریب پہنچ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پُوچھا تم ٹھیک تو ہو؟

پنکی کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے۔ اُس نے کہا "مجھے قے آرہی ہے۔" کیتھرین اُسے جلدی سے غُسل خانے میں لے گئی۔ اُس کا اپنا دل بھی بُری طرح متلا رہا تھا۔ وہ فوراً اس منحوس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اُس نے پنکی کی خستہ حالت کے پیشِ نظر اُس سے پُوچھا: "کیا تم چل سکو گی؟" پنکی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اُسے گھسیٹتی ہُوئی اپنے گھر تک لائی۔ پھر اُسے ایک صوفے پر بٹھا کر اُس نے شیرف کو ٹیلیفون کیا۔ دوسری طرف سے عملے کا ایک آدمی بولا۔ کیتھرین نے اُسے اپنا نام بتایا اور کہا جتنی جلد ہو سکے شیرف کو یہاں بھیج دو۔ پھر اُس نے رینڈل کو رنگ کیا اور ٹام کے قتل کی اطلاع دی۔

پھر وہ پنکی کی طرف متوجہ ہُوئی جو خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ کیتھرین نے اُس کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔ پنکی نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ رُندھی ہُوئی آواز میں بولی: "مَیں آپ کی گناہ گار ہُوں۔ مَیں نے آپ کا کہنا نہیں مانا اور ٹام سے ملنے چلی آئی۔ ہم دونوں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے تھے۔ اچانک صحن کی طرف سے آہٹ سُنائی دی۔ ٹام نے مجھے خاموش رہنے کو کہا اور خود دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ قریباً ایک منٹ بعد دھینگا مُشتی کی آوازیں آئیں۔ بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔ مَیں چونکہ چوری چھپے ٹام سے ملنے آئی تھی اس لیے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مجھے ڈر تھا کہیں میرا راز فاش نہ ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ مَیں آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی باہر نکلی اور تب مَیں نے آپ کو پستول تھامے ٹام کی لاش کے پاس کھڑے پایا۔"

عین اُس وقت باہر سڑک پر ایمبولینس گاڑی اور پولیس کاروں کا شور سُنائی دینے لگا۔

*

کیتھرین کا گھر پولیس اسٹیشن کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پولیس اہل کار موقع واردات کا معائنہ کرنے کے بعد کیتھرین کے ڈرائنگ رُوم میں اکٹھے ہُوئے۔ رینڈل اور اُس کی والدہ بھی موجود تھیں ——— پنکی پچھلے دس منٹ سے پولیس آفیسرز کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ اُس کے والدین بھی پہنچ چکے تھے۔ پنکی نے بڑی ہوشیاری سے والدین کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرتے ہُوئے کہا۔ وہ دفتری اُمور کے سلسلے میں ٹام سے ملنے آئی تھی۔

کیتھرین کے گرد شکوک کے بادل گہرے ہو رہے تھے۔ پُراسرار حالات میں بات تھی بھی شک کی۔ چار دن کے اندر یہ دوسرا قتل تھا۔ دونوں مواقع پر وہ نہ صرف جائے واردات پر موجود تھی بلکہ لاش بھی اُسی نے دریافت کی تھی۔

دروازہ کُھلا اور شیرف داخل ہُوا۔ وہ بہت رنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اُس نے ترحّم آمیز نظروں سے اُس لڑکی کی طرف دیکھا جسے وہ گود میں کھلاتا رہا تھا اور جو اَب والدین کی موت کے بعد کٹھن حالات کا شکار تھی۔ وہ کیتھرین کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پولیس اب کیتھرین سے سوالوں کا سلسلہ شروع کرنے والی تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اُسے معلوم تھا زبان کی ذرا سی لغزش اُسے باقی زندگی کے لیے جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل سکتی ہے۔ ایک ڈپٹی نے پُوچھ گچھ کا آغاز کیا:

"ریٹا عرف پنکی کے مطابق اُس نے لڑائی بھڑائی کی آواز سُن کر چیخیں ماری تھیں۔ تمہارے گھر کی تمام کھڑکیاں بھی کُھلی ہُوئی تھیں۔ تم وہ چیخیں کیوں نہ سُن سکیں؟"

کیتھرین نے گلا صاف کیا: "پنکی ڈرائنگ رُوم میں

تھی جب کہ قتل ہال کمرے میں ہُوا۔ ڈرائنگ رُوم سے چیخ کی آواز کا میرے کانوں میں پہنچنا محال تھا۔"

"تم ٹام کے گھر کیسے پہنچیں؟"

"میں ہنگامی گھنٹی کی آواز سُن کر اُس کی مدد کو گئی تھی۔"

"جب تم نے گھاس میں کسی کے چلنے کی آواز سُنی تو پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟"

"میں سمجھی شاید یہ کوئی پرندہ وغیرہ ہے۔"

اس موقعے پر شیرف نے سوال شروع کیے: "کیا کبھی ٹام نے ذکر کیا تھا کہ وہ مس لیونا کے قتل کے بارے میں اہم بات جانتا ہے؟"

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنی معلومات کے بارے میں بلند بانگ دعوے کیا کرتا تھا لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اُسے اس بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں تھی۔"

"ٹام کے کمرے سے نشہ آور سفوف کا ایک پیکٹ بھی برآمد ہُوا ہے۔ اس بارے میں تم جانتی ہو؟"

"ہاں ... میں پچھلے ہفتے اُس کے گھر گئی تھی اور اُس نے بتایا تھا کہ یہ سفوف اُس نے قصبے ہی سے خریدا ہے۔"

شیرف کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا۔ شاید اُس کا دھیان اپنے بیٹے کی طرف چلا گیا تھا۔ پھر اُس نے پُوچھا: "ٹام کی کار کہاں ہے؟"

"وہ ورکشاپ میں ہے۔"

شیرف گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا: "ٹام کی کار موجود نہیں تھی اور گھر کی بیشتر روشنیاں بھی بجھی ہُوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے قاتل کسی چیز کی تلاش میں آیا ہو۔ وہ سمجھ رہا ہو کہ ٹام گھر میں موجود نہیں۔ پھر جب اچانک ٹام سامنے آگیا ہو تو اُسے قتل کر بیٹھا ہو۔ بعد میں اُس نے پنکی کی چیخیں سُنی ہوں اور اپنا مقصد حاصل کیے بغیر واپس چلا گیا ہو۔"

رینڈل نے متین لہجے میں کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل پنکی کی موجودگی سے بھی بے خبر تھا لیکن"... اُس نے فقرے کے درمیان کیتھرین کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں کا اشارہ پاکر خاموش ہو گیا۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ پنکی کی کار قاتل کو نظر کیوں نہیں آئی۔ پنکی نے کیتھرین کو بتایا تھا کہ ٹام سے اپنی ملاقات پوشیدہ رکھنے کے لیے اُس نے اپنی کار گھر سے خاصے فاصلے پر رکھی تھی۔ اب اگر رینڈل کے سوال کے نتیجے میں شیرف اس بات سے باخبر ہو جاتا تو پنکی کا بیان غلط ہو جاتا کہ وہ دفتری اُمور کے سلسلے میں ٹام سے ملی تھی۔ کیتھرین اس بات سے خوش تھی کہ رینڈل نے اُس کا مافی الضمیر سمجھ کر سوال اُدھورا چھوڑ دیا ہے۔

-x-

کوئی دو گھنٹے تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ شام ڈھلے پولیس کیتھرین کے گھر سے چلی گئی۔ پنکی بھی اپنے والدین کے ہمراہ رُخصت ہو گئی۔ شیرف نے کیتھرین کو بتایا تھا کل اُسے مزید پُوچھ گچھ کے لیے دفتر آنا ہو گا۔ وہ سوچ رہی تھی ہو سکتا ہے کل تک میں ایک اور لاش دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اُوپر تلے کے حادثات نے اُسے بُری طرح پریشان کر دیا تھا۔ رینڈل نے کیتھرین سے کہا کہ وہ آج رات یہیں رہے

گا، اُسے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اور یہ بات اُس نے اپنی والدہ کو بھی بتا دی ہے۔ رینڈل نے کیتھرین سے کہا اپنا یہ منحوس لباس تبدیل کر لو۔ کیتھرین نے شاید پہلی مرتبہ غور سے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ اُس کی پینٹ اور جیکٹ خون کے دھبّوں سے رنگین تھی۔ بازوؤں پر بھی دھبّے تھے۔ وہ فوراً غسل خانے میں چلی گئی جب اور لباس تبدیل کر کے آئی تو بُری طرح بجھی ہُوئی نظر آتی تھی۔ رینڈل ٹیلیفون پر ٹام کے گھر والوں کو اطلاع دینے کا ناخوشگوار فریضہ انجام دے رہا تھا۔ وہ ریسیور رکھ کر کیتھرین کی طرف مُڑا۔ اُس کا چہرہ بُتا ہُوا تھا۔ اپنے ہونہار رپورٹر کی موت نے اُسے پژمردہ بنا دیا تھا اور کیتھرین کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ اُس سے عمر میں بارہ سال بڑا ہے۔ اُس نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہُوئے کہا: "کیتھرین! اب سو جاؤ۔" لیکن نیند کیتھرین کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ خوف زدہ لہجے میں بُڑبڑائی:

"پہلے میرے والدین... پھر میرے باپ کی نرس اور اب ایک رپورٹر جس کا دعویٰ تھا کہ وہ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔"

رینڈل نے پائپ کا کش لیتے ہُوئے کہا: "کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے ڈیڈی بطور ڈاکٹر کوئی ایسی بات جانتے ہوں جو اُن کی موت کا باعث بنی ہو؟"

"نہیں، یہ ضروری تو نہیں۔ قصبے کی اکثریت ڈیڈی کو دل و جان سے چاہتی تھی۔"

"تمہارے خیال میں کیا مس لیونا تمہارے والدین کو قتل کر سکتی تھی.... تمہارے ڈیڈی کے بارے میں اُس کا رویّہ کیا تھا؟"

"بلیک میلنگ اور استحصال کا دھندا شروع کرنے سے پہلے وہ مدّت تک ڈیڈی کی قابلِ اعتماد نرس رہی ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ ڈیڈی سے محبت کرتی تھی۔"

رینڈل نے ہُنکارا بھرا: "ہو سکتا ہے یہ سوچ کر کہ وہ تمہارے ڈیڈی کو کبھی حاصل نہیں کر سکے گی اُنہیں قتل کر دیا ہو۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ اُس کے لیے ڈیڈی کی دن بھر کی رفاقت ہی بہت تھی۔ دوسری باتوں کے علاوہ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ وہ ڈیڈی کی کار میں خرابی پیدا نہیں کر سکتی تھی۔"

رینڈل بولا: "دونوں واقعات کے درمیان چھ ماہ کا وقفہ ہے۔ ممکن ہے کہ لیونا نے چھ ماہ تک اپنا مُنہ بند رکھا ہو اور قاتل اُسے خاموشی کی قیمت ادا کرتا رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لیونا کو تمہارے ڈیڈی کی موت کے بعد اس راز کا پتہ چلا ہو۔ جب وہ دفتر کا سامان منتقل کر رہی ہو یا اُن کے کاغذات دیکھ رہی ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ اُس نے کوئی ایسی گفتگو سُنی ہو جو ڈاکٹر کے کسی مریض یا دوست نے اُن کے ساتھ کی ہو۔"

کیتھرین نے اس سے اتفاق کرتے ہُوئے کہا: "ممکن ہے کیونکہ لیونا کا کیبن ڈیڈی کے کیبن سے اتنا قریب تھا کہ وہ مریضوں کے ساتھ اُن کی گفتگو آسانی سے سُن سکتی تھی۔ ہاں، جب خاص طور پر کسی شخص کی پردہ پوشی مقصود ہوتی تو ڈیڈی لیونا کو باہر جانے کا کہہ دیا کرتے تھے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دروازے سے کان لگا کر سُنتی رہتی ہو۔"

رینڈل اب سونے کے مُوڈ میں تھا۔ اُس نے کیتھرین کا شانہ تھپتھپایا اور دوسرے کمرے میں جانے کے لیے اُٹھ گیا۔ کیتھرین نے بستر پر گر کر آنکھیں میچ لیں۔ آج وہ گھر میں اکیلی نہیں تھی۔ دو مضبوط بازو اُس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔ تحفّظ کا بے پناہ احساس لیے وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

-*-

صبح کو جب کیتھرین جاگی تو رینڈل جا چکا تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے کافی پی تھی۔ پیالی کے نیچے ایک پرچی رکھی ملی:

"گڈ مارننگ کیتھرین! تم بہت تھکی ہُوئی ہو۔ اس لیے کام پر نہ آنا۔ مَیں نے تمہیں جگانا چاہا لیکن پھر یہ سوچا کہ نیند تمہارے ذہن کے لیے سب سے ضروری چیز ہے۔" کیتھرین مُسکرا دی۔ پھر وہ جلدی جلدی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ اُسے بیان قلمبند کروانے کے لیے شیرف کے دفتر پہنچنا تھا۔

-*-

اپنا طویل بیان قلمبند کروانے کے بعد جب وہ شیرف

کے دفتر کی سیڑھیاں اُتر رہی تھی، ایک نیگرو ڈپٹی نے اُس کا راستہ روک لیا۔ اس شخص کا نام مائیکل تھا جس کی ماں کیتھرین کے گھر صفائی کا کام کیا کرتی تھی۔ اُس نے کیتھرین کو اطلاع دی کہ اُس کی ماں اُسے یاد کر رہی ہے۔ اُس کے پاس کیتھرین کے لیے ایک اہم خبر ہے۔ کیتھرین نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ دفتر جانے سے پہلے وہ 'مسز بیٹی' سے ملے گی۔

جب وہ بوسیدہ پردہ اُٹھا کر بیٹی کے گھر داخل ہوئی وہ کُرسی پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ کیتھرین کی آہٹ سُن کر اُٹھی اور بڑے تپاک سے ملی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے مِس لیونا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مِس لیونا کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ ٹھیک ہے سب انسان خُدا نے بنائے ہیں لیکن اچھے بُرے کی تمیز بھی اُسی نے سکھائی ہے۔ مَیں جانتی تھی کہ لیونا تمہیں اور تمہاری ماں کو اچھا نہیں سمجھتی اس لیے مَیں ہر وقت اُس پر نگاہ رکھتی تھی۔ گاہے گاہے میں تمہارے ڈیڈی کے دفتر کی صفائی کے لیے بھی جایا کرتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت مَیں کلینک گئی تو معاینے کے کمرے سے باتیں کرنے کی اُونچی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص تمہارے ڈیڈی سے جھگڑ رہا ہو۔ یہ واقعہ تمہارے والدین کی موت سے تین روز پہلے کا ہے۔ مَیں اُس وقت نشست گاہ کی صفائی کر رہی تھی۔ اس کمرے میں امتحان گاہ سے آنے والی آوازیں صاف سُنائی نہیں دے رہی تھیں۔ پھر مَیں نے لیونا کو امتحان گاہ کی طرف جاتے دیکھا تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ اپنے ربڑ سول جُوتوں میں کتنی خاموشی سے چلا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تمہارے ڈیڈی کی آواز آئی۔ وہ اُسے کہہ رہے تھے کہ سب مریض فارغ ہو چکے ہیں اس لیے وہ گھر جا سکتی ہے۔ تب لیونا واپسی کے لیے مُڑی لیکن وہ واپس نہیں گئی۔ وہ دروازے سے کان لگائے سب کچھ سُن رہی تھی۔ جب تمہارے ڈیڈی نے دروازہ کھولنے کے لیے ناب گھمائی تو لیونا کمال ہوشیاری سے برابر والے کمرے میں غائب ہو گئی۔ تمہارے ڈیڈی اور اُن کا ملاقاتی باہر نکلے۔ دونوں

> "بڑا حصّہ عمرِ گراں کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں میں صَرف ہُوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے اُنہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچّہ نہ بن جائے تب تک بچّوں کے مناسبِ حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر اُنہیں بار بار کاٹنا اور بنانا، سکھانا اور مٹانا اور بھی زیادہ مشکل کام تھا۔ بڈھا ہو کر بچّہ بننا پڑا۔ چلتے پھرتے، جاگتے، سوتے، بچّوں ہی کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صَرف ہُوئے جب وہ بچّوں کے کھلونے تیّار ہُوئے۔"
>
> (مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط سے ایک اقتباس)

غصّے میں تھے لیکن ملاقاتی کا پارہ نقطۂ عُروج پر نظر آ رہا تھا کمرے سے باہر آ کر تمہارے ڈیڈی نے چند الفاظ کہے جو اب تک مجھے یاد ہیں۔ اُنہوں نے کہا تھا: 'بہر حال کچھ بھی ہو تمہیں حالات کا سامنا کرنا ہو گا۔ مَیں قانون شکنی نہیں کر سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے لیکن اس بات کی رپورٹ مجھے بہر حال کرنا ہو گی۔' مَیں گفتگو کو پُوری طرح نہیں سمجھ رہی تھی لیکن میرا اندازہ ہے کہ کسی سرکاری ادارے کی بات تھی۔ تمہارے ڈیڈی کہہ رہے تھے: 'تم جانتے ہو اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ کچھ عرصے بعد تم اپنے گھر واپس آ جاؤ گے۔ کوئی تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرے گا اور تم سکون سے زندگی گزار سکو گے۔' اس کے بعد کی گفتگو بالکل مُبہم تھی۔ تمہارے ڈیڈی شاید.... شاید کسی جانور کا ذکر کر رہے تھے۔ مجھے اُس کا نام یاد نہیں شاید وہ 'اے' سے شروع ہوتا تھا۔"

"مسز بیٹی!" اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کیا اُس ملاقاتی کی شکل آپ نے دیکھی تھی؟"

"یہی تو بدقسمتی ہے۔" بیٹی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "مَیں

اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اُس کی شکل دیکھ سکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ ایونا نے شکل دیکھی تھی۔"

*

مسٹر بیٹی کے ہاں سے وہ سیدھی دفتر پہنچی۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ رینڈل نے اُسے اپنے کمرے میں بُلا لیا۔ دورانِ ملازمت یہ شاید دوسرا موقع تھا کہ وہ رینڈل کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اُس کے بارے میں بڑا فکرمند نظر آرہا تھا۔ "میں تمہارے لیے ایک پیغام چھوڑ آیا تھا۔ تمہیں آج آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"میں تمہارے بارے میں پریشان تھی کہ تم اکیلے دفتر کیسے سنبھالو گے۔" کیتھرین نے اُس کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بہت اُلجھا ہوا نظر آرہا تھا۔

کیتھرین گہری نظروں سے رینڈل کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور رینڈل گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ کیتھرین دفتر کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے دیوار پر مختلف تصویریں لگی تھیں۔ کیتھرین نے ایک تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر میں رینڈل ایک نوجوان کھلاڑی کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ تصویر کافی پہلے اُتاری گئی تھی لیکن کیتھرین رینڈل کو پہچان گئی۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کے مطابق یہ دونوں دوست 'لوفیلڈ' کاؤنٹی کی جونیئر بیس بال ٹیم کے کوچ تھے۔ کیتھرین کے لیے یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ رینڈل نہ صرف بیس بال کا اچھا کھلاڑی رہا ہے بلکہ کالج کے زمانے میں کوچنگ بھی کرتا رہا ہے۔ اُس نے تصویر کی آنکھوں سے دیکھا۔ رینڈل ایک زوردار ہٹ لگا کر بلّا پھینک رہا ہے ..... بیس بال کا بلّا .... بالکل اچانک اُس کا ذہن دوسری طرف چلا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیس بال کا بلّا رینڈل نے سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ پھر وہ پوری طاقت سے بلّا مس لیونا کے سر پر مارتا ہے۔ مس لیونا کراہ کر زمین بوس ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا بلّا پھر اُٹھاتا ہے۔ اب اس بلّے کے نیچے ٹام ہے۔ کیتھرین نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دینا چاہتی تھی لیکن ذہن بے لگام ہو چکا تھا۔ اُس نے خوفزدہ نظروں سے رینڈل کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک گفتگو میں مصروف تھا۔

حالات نے یہ کیسا پلٹا کھایا تھا۔ کیتھرین کو ایک دم ہی رینڈل کی شکل اجنبی نظر آنے لگی تھی۔ وہ یہ سوچ کر کانپ گئی کہ کل رات اس اجنبی چہرے کے ساتھ وہ گھر میں تنہا تھی۔ اُس نے یہ سوچ کر آنکھیں جھکا لیں کہ کہیں رینڈل اُس کے ذہن میں اُٹھنے والے طوفان سے آگاہ نہ ہو جائے۔ اُس نے سوچا فی الحال مجھے رینڈل کو اُس گفتگو سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے جو بیٹی کے ساتھ ہوئی ہے۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور باہر نکل آئی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے سڑک پر آگئی۔ اُس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کیا رینڈل قاتل تھا؟ رینڈل جو اُس کے ارمانوں کا مرکز تھا۔ اُس نے سوچا اگر رینڈل ہی مجرم ہے تو اُسے چوکنا کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ سوچ کر وہ واپس دفتر جانے کے لیے مُڑ گئی۔

دفتر پہنچی تو حسبِ توقع رینڈل اُس کی تلاش میں باہر جانے کے لیے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ کیتھرین کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کیتھرین نے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے فوراً ایک گھڑا گھڑایا بہانہ اُسے سُنا دیا۔ اُس نے کہا کہ دانت میں شدید درد اُٹھا تھا اور وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ رینڈل کو مطمئن کرنے کے بعد وہ اپنی میز پر جا پہنچی۔ پھر اُس کا دھیان ٹام کی طرف چلا گیا۔ ٹام کے کاغذات دیکھنے سے ہو سکتا ہے اُس کے قتل پر کچھ روشنی پڑ جائے۔ ٹام کی میز قریب ہی تھی لیکن اب پولیس کی اجازت کے بغیر وہ اس میز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی۔ حسبِ توقع تھوڑی دیر بعد شیرف نے ایک ڈپٹی کو ٹام کی میز کی تلاشی لینے کے لیے بھیج دیا۔ کیتھرین نے اُس کے ساتھ مل کر میز کے دراز کھولے۔ آدھ گھنٹے کی اُلٹ پلٹ میں کوئی کام کی چیز ہاتھ نہ آئی۔ مس لیونا کے قتل پر ٹام کے تحقیقی کام کا ادھورا مسوّدہ ملا لیکن اُس میں کوئی ایسی بات درج نہیں تھی جو دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہو۔

ڈپٹی کے جانے کے بعد کیتھرین نے ٹام کی کھینچی ہوئی

تصویروں کو دھونے کا پروگرام بنایا۔ ڈارک روم میں گھس کر اس نے فلم دھو ڈالی۔ دو دن پہلے ایک مقامی ہوٹل میں ہونے والی تقریب کی تصویریں تھیں۔ بستی کی کئی جانی پہچانی شخصیتیں، شیرف، ڈاکٹر میو، سپیکر کے بالکل سامنے پارکنز اپنی لمبی آستینوں کی قمیص میں بیٹھا شاید کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ رینڈل منہ میں پائپ دبائے بیٹھا تھا۔

دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ کتنی ہی دیر اپنی نشست پر گم سم بیٹھی رہی۔ آنسو جیسے اندر ہی اندر اس کے حلق میں گر رہے ہوں۔ بیس بال کا بلّا بار بار اس کے ذہن پر ضربیں لگا رہا تھا۔ بیس بال کا بلّا کوئی ایسی نادر چیز تو نہ تھی۔ وہ کئی بار خود کو سمجھا چکی تھی۔ قصبے کے کئی گھروں میں بیس بال کے بلّے موجود ہوں گے۔ تم اس قدر تنگ نظری کا ثبوت کیوں دے رہی ہو۔ لیکن پھر فوراً ہی ذہن کے کسی گوشے سے کوئی مخالفانہ دلیل ابھر آتی۔

اس وقت اُسے کل رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا۔ رات پچھلے پہر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ باہر گھن گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ یہ خیال اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا کہ رینڈل دوسرے کمرے میں موجود ہے۔ اُسے دیکھنے کے لیے وہ دبے پاؤں دروازے کے پاس پہنچی لیکن یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ رینڈل بستر پر موجود نہیں۔ ابھی وہ اُسے تلاش کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ رینڈل تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ بھیگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ جلدی سے بستر میں گھس گیا۔ کیتھرین بھی یہ سوچ کر خوابگاہ میں واپس آ گئی کہ صبح اس سے پوچھے گی کہ وہ کہاں گیا تھا؟ .... لیکن اب تو ساری صورتِ حال ہی بدل گئی تھی۔ تاریکی کے اندر سے رینڈل کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔

ایک آہٹ نے اس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ رینڈل اس کے سامنے کھڑا تھا: "یہ دیکھو کیتھرین۔" اس نے کاغذ کی ایک چٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ "اس ہفتے کی بہترین تفریح، لوفیلڈ تھیٹر کی پیشکش 'پہلی محبت'۔ میں نے جمعے کی شب کے لیے دو نشستیں مخصوص کرا لی ہیں۔"

کیتھرین نے پلکیں اُٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ کس قدر پُراعتماد نظر آ رہا تھا وہ۔ "شاید ہم اس تفریح سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔" اس نے دل میں سوچا۔ "ہو سکتا ہے ہفتے کا دن تمہیں حوالات میں آئے۔"

"کیا سوچ رہی ہو، کیتھرین!" رینڈل نے اس کی میز پر جھکتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ بکھیری۔ "تمام کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کی لکھی ہوئی تحریر اور کھینچی ہوئی تصویروں میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے اس کی فوری موت کا سبب قرار دیا جا سکے۔" ایک لمحہ رُک کر وہ بولی۔ "رینڈل! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی نزدیکی شخص ان واقعات کا ذمے دار ہے۔ کوئی ایسا شخص جسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت اچھی طرح۔"

رینڈل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کیتھرین نے جلدی جلدی اپنی چیزیں سنبھالنی شروع کیں۔ وہ اس وقت شیرف سے ملنے جا رہی تھی۔ جب وہ کاغذوں کا ایک پلندہ دراز میں رکھ رہی تھی تو چند کاغذ پھسل کر فرش پر گر گئے۔ اس نے جھک کر انہیں اُٹھایا۔ یہ قصبے کے ڈاکٹر میو کا لکھا ہوا ایک مضمون تھا جو اس نے کوئی تین ہفتے قبل اشاعت کے لیے دیا تھا اور جسے کیتھرین نے لاپروائی سے اصلاح طلب مضامین میں پھینک دیا تھا۔ وہ یہ مضمون شائع کر کے ڈاکٹر میو کی مستقل آمد و رفت کی راہ نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

اس نے حسبِ سابق ایک طائرانہ نگاہ مضمون پر ڈالی اور چونک گئی۔ ایک جگہ لفظ ARMADILLO لکھا نظر آیا تھا۔ کیتھرین سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور جلد جلد مضمون پر نظر دوڑانے لگی۔ یہ تحریر کوڑھ کے مرض پر تازہ ترین تحقیق کا احاطہ کرتی تھی۔ ڈاکٹر میو نے ایک معروف ماہرِ طب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انہوں نے کوڑھ کے اثرات کا مشاہدہ کرنے کے لیے ARMADILLO (وسطی امریکہ کا نیولا نما جانور) پر تجربات کیے ہیں۔ ان تجربات سے

اُنہیں گراں قدر معلومات حاصل ہُوئی ہیں۔ کوڑھ کا مرض پہلے بھی قابلِ علاج تھا لیکن اب اس کا سدِباب اور بھی سہل اور یقینی ہو گیا ہے۔

کیتھرین کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جب اُس نے مضمون ختم کیا تو وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اُس نے رینڈل کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک فائل پر جھکا ہُوا تھا۔ ایکا ایکی سب کچھ جانا پہچانا اور حسین لگنے لگا تھا۔ وسوسوں کی دُھند چھٹ گئی تھی۔ رینڈل کا چہرہ ہمیشہ کی طرح روشن نظر آ رہا تھا... رینڈل مجرم نہیں تھا، مجرم کوئی اور تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا اب کیتھرین سے بچ نہیں سکتا تھا۔

*

وہ تیزی سے کار ڈرائیو کرتی ہُوئی گھر پہنچی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وقت بہت تھوڑا تھا۔ گھر کے سامنے ایک شیورلٹ گاڑی دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ ایک ادھیڑ عمر مرد عورت اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ٹام کے والدین تھے۔ دونوں کے چہروں سے بیٹے کی موت کا غم عیاں تھا۔ کیتھرین اُنہیں گھر کے اندر لے گئی۔ وہ قریباً پندرہ منٹ اُس کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ ٹام کی آخری رسوم ادا کرنے کے لیے ٹام کا ایک سوٹ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیتھرین نہیں چاہتی تھی کہ وہ خود اس عمارت میں داخل ہوں۔ اُس نے بہانہ بنایا کہ پولیس نے مکان کو سیل کر رکھا ہے؛ تاہم اُن سے وعدہ کیا کہ کل تک وہ اُنہیں سوٹ پہنچا دے گی۔ اُن کے رخصت ہوتے ہی کیتھرین نے ٹینس شوز پہنے، دراز میں سے پستول نکالا اور مکان کے اُس حصّے میں جانے کے لیے تیار ہو گئی جہاں کل ٹام قتل کیا گیا تھا۔ اُس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا لیکن غُصّے کی ایک لہر بار بار اُس کے خوف کو دبا دیتی تھی۔ آخری لمحے اُس نے سوچا کہ اگر مکان میں اُس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو وہ معلومات جو اُس کے دل میں ہیں بے کار چلی جائیں گی۔ اُسے مکان میں داخل ہونے سے پہلے کسی کو اس بارے میں بتا دینا چاہیے۔ اُس نے رینڈل کو فون کیا: "ہیلو رینڈل ... ڈیئر! میں جو کچھ کہہ رہی ہُوں غور سے سُنو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ ٹام لیونا اور میرے ممی اور ڈیڈی کا قاتل قصبے کا ایک کوڑھی شخص ہے۔ میں اُس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں جانتی۔ اُس کی میڈیکل فائل ڈیڈی کے سابقہ کلینک کی بالائی منزل میں پڑی ہے۔ میں یہ فائل لینے جا رہی ہُوں۔ خُدا حافظ۔"

رینڈل ہیلو ہیلو پکارتا رہا لیکن کیتھرین نے ریسیور رکھ دیا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بغلی صحن میں سے ہوتی ہُوئی باڑ کے دوسری طرف پہنچ گئی۔ مکان کا عقبی دروازہ مقفّل تھا لیکن اُس کی متبادل چابی کیتھرین کے پاس موجود تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ مکان میں عجب پُرہول خاموشی اور گہری تاریکی تھی۔ وہ روشنی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکالی اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہ دروازہ مقفّل نہیں تھا۔ عقبی برآمدے میں سے ہو کر وہ خواب گاہ میں داخل ہُوئی۔ سامنے ہال کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ذرا سے دباؤ سے دروازہ کھُل گیا۔ اُس نے دیوار پر لگا سوئچ آن کیا۔ بلب کی کمزور روشنی ہال کمرے میں پھیل گئی۔ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہُوئے تھے اس لیے روشنی باہر جانے کی توقّع نہیں تھی۔ کمرے کی تمام چیزیں کل ہی کی طرح اِدھر اُدھر بکھری ہُوئی تھیں۔ صرف ایک چیز کی کمی تھی اور وہ تھی ٹام کی لاش۔ اُس نے اس ہولناک منظر سے توجّہ ہٹائی اور زینے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ زینہ ایک چکّر کھا کر بالائی منزل پر آ گیا۔ یہاں ایک بڑے کمرے میں بہت سی الماریاں آگے پیچھے رکھی تھیں۔ کیتھرین کو معلوم تھا وہ فائل کہاں ہو گی۔

جس روز الماریاں اُوپر لائی گئی تھیں اُس نے لیونا کو ایک الماری میں کوئی چیز چھپاتے ہُوئے دیکھا تھا؛ تاہم اُس وقت غور نہیں کیا لیکن اب وہ جان گئی کہ لیونا نے وہاں کوڑھی مریض کی فائل چھپائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ فائل کسی اور جگہ سے یہاں زیادہ محفوظ رہے گی۔ اُس فائل کے ذریعے وہ اُس شخص کو چھ ماہ تک بلیک میل کرتی رہی تھی۔ کیتھرین نے ٹارچ روشن کی اور ایک الماری کے تختوں پر پاؤں رکھ کر اُوپر چڑھ گئی۔ بالائی

خانے میں ایک پرانے صندوق کے پیچھے ذرا ٹٹولنے سے وہ فائل اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ فائل لے کر الماری سے نیچے اُتر آئی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اُس نے ٹارچ کی روشنی فائل کے کور پر مرکوز کی۔ وہاں مریض کا نام لکھا تھا... مسٹر کارل پارکنز، عمر ۵۲ سال، پیشہ لوفیلڈ کا تفتیشی افسر۔

کیتھرین نے ایک طویل سانس لی..... اب وہ سمجھ گئی تھی کہ پارکنز ہر وقت لمبی آستینوں کی قمیص کیوں پہنتا ہے پھر اُسے یاد آیا کہ ہاتھوں پر اُبلتی ہوئی کافی گرنے کے باوجود اُس کا چہرہ تکلیف سے عاری رہا تھا۔ یقیناً اُس کی جلد مفلوج ہو چکی تھی، وہ کوڑھ کا مریض تھا لیکن اپنے مرض کو سماجی حیثیت، عزت اور وقار کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس لیے اُسے چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن کیتھرین کے والد اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ملکی قانون کے مطابق کوڑھ کے مریض کی رپورٹ کرنا ضروری تھا۔ وہ اُس کا علاج کرنا چاہتے تھے لیکن رپورٹ کرانا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

کیتھرین نے جلد جلد فائل کے صفحے اُلٹے۔ اُس کے ڈیڈی نے بڑی محنت سے پارکنز کی بیماری کا ریکارڈ تیار کیا تھا۔ وہ یقیناً اُن کے علاج سے شفایاب ہو جاتا لیکن اُس کی ہٹ دھرمی اور کمینگی نے نہ صرف کیتھرین کے ڈیڈی کی جان لے لی تھی بلکہ تین اور انسانوں کے خون سے بھی ہاتھ رنگ لیے تھے۔ اُس کے ظلم کا شکار ہونے والے ان چار افراد میں سے صرف لیونا ہی کو کسی حد تک قصوروار ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ باقی تینوں افراد بے گناہ تھے۔ اُس کے ڈیڈی کی خطا یہ تھی کہ وہ اپنا فرض پورا کرنا چاہتے تھے۔ اُس کی ممی اس لیے قتل ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کار میں سوار تھی اور ٹام کا گناہ یہ تھا کہ وہ کیتھرین کا کرایہ دار تھا اور ایک غلط جگہ غلط وقت پر موجود تھا۔

پارکنز اپنی فائل کی تلاش میں پہلے لیونا کے گھر گھسا تھا لیکن فائل اُسے نہیں ملی۔ بعد میں اُس نے لیونا کو قتل کر دیا لیکن یوں لگتا ہے جیسے قتل کرنے سے پہلے اُس نے لیونا سے پوچھ لیا تھا کہ اُس نے فائل کہاں چھپا رکھی ہے کیتھرین کو وہ شام یاد تھی جب پارکنز چہل قدمی کے بہانے اُسے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی فائل کے بارے میں پوچھا تھا۔ دراصل وہ لیونا کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ جب کیتھرین نے بتایا کہ فائلیں ٹام کے گھر کی بالائی منزل پر ہیں تو اُس نے وہاں گھسنے کا پروگرام بنا لیا۔ اُس سے اگلے روز دوپہر کے وقت وہ دفتر آیا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ٹام آج شام گھر میں موجود ہوگا یا نہیں۔ جب اُس نے ٹام کو پنکی سے باتیں کرتے سُنا تو وہ جان گیا کہ ٹام اس لڑکی کے ساتھ ڈنر پر جا رہا ہے۔ ستم یہ ہوا کہ گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے ٹام گاڑی گھر نہ لایا۔ دوسری طرف پنکی بھی اپنی گاڑی ایک دوسری گلی میں کھڑی کر کے ٹام کے گھر آئی۔ گیراج خالی دیکھ کر پارکنز کو یقین ہو گیا کہ ٹام گھر میں موجود نہیں۔ وہ فائل نکالنے کے لیے اندر گھسا۔ جب اُس نے ٹام کو اچانک اپنے سامنے پایا تو ہاتھ میں پکڑے ہوئے بلّے سے اُس کا کام تمام کر دیا۔ عین اُس وقت پنکی چیخنے لگی اور وہ اپنا مشن اَدھورا چھوڑ کر واپس آ گیا۔

اوہ میرے خُدا! کس قدر سفّاک قاتل تھا وہ۔ کیتھرین نے سوچا۔ وہ اب نچلی منزل کی خوابگاہ سے ٹام کا سُوٹ حاصل کر کے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی..... اور پھر وہ چونک اُٹھی اُس کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا تھا۔ خون کیتھرین کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔ وہ ٹام والی غلطی دُہرا چکی تھی۔ اُس نے بھی عقبی دروازہ کھلا رہنے دیا تھا، شاید رینڈل کے لیے... لیکن اُس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ رینڈل نہیں۔ یہ وہی سفّاک قاتل پارکنز ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بیس بال کا بلّا ہے اور وہ اپنا اَدھورا مشن مکمل کرنے اِدھر آ رہا ہے۔ یقیناً یہ وہی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ آج رات گھر میں کوئی نہیں۔ وہ اطمینان سے فائل تلاش کر سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے کھڑکیوں میں سے چھنتی ہوئی روشنی دیکھ لی ہو۔ یہ سب کچھ چند ثانیے میں کیتھرین کے ذہن سے گزر گیا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے مُڑ کر دیکھا۔ پارکنز اُس سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ نیچے ہال سے آتی ہوئی روشنی میں اُس کا نصف چہرہ نظر آ رہا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں بیس بال کا بلّا تھا اور آنکھوں میں دیوانگی ناچ رہی تھی۔

کیتھرین کو پوری شدت سے خطرے کا احساس ہوا۔ فائل اُس کے ہاتھ میں تھی اور پارکنز قدم بہ قدم اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" وہ چنگھاڑا۔ "میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا!"

فائل کی تلاش کے دوران کیتھرین اپنا پستول فرش پر رکھ چکی تھی۔ اور اب وہ اُن کی پہنچ سے دُور تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اُسے پارکنز کا کم از کم ایک وار بچانا ہوگا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بیس بال کے خُونی بلّے پر مرکوز کر رکھی تھیں اور پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ پارکنز نے بلّا گھمایا۔ کیتھرین تیزی سے نیچے جُھکی۔ بلّا زوردار آواز کے ساتھ الماری سے ٹکرایا۔ وار بچانے کے ساتھ ساتھ وہ جُھک کر ریوالور بھی اُٹھا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ پارکنز دوسرا وار کرتا، کیتھرین تیر کی طرح دروازے کی طرف لپکی ـــــ اور سیڑھیاں اُتر کر وہ ہال کمرے میں آئی۔ ٹارچ گر چکی تھی لیکن در و دیوار اُس کے جانے پہچانے تھے۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر بھی دروازے تک پہنچ گئی۔ پارکنز اُس کے پیچھے طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ پہلے اُس نے سوچا کہ گھر میں گھسنے کا ارادہ کیا لیکن پھر گلی میں مُڑ گئی۔ گلی سُنسان تھی۔ دُور ایک سٹریٹ لائٹ جل رہی تھی۔ یہ سٹریٹ لائٹ اُس کے لیے اُمید کی کرن تھی۔ اُس نے پُوری شدت سے روشنی کی طرف دوڑ لگا دی لیکن پارکنز کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اُس سے قریب ہو رہا تھا۔ کیتھرین جان گئی کہ وہ اُسے سڑک تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اُس نے رُکنے کا فیصلہ کر لیا اور تیزی سے مُڑی، ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی، پھر خود بخود اُس کے گھٹنوں میں خم آ گیا۔ اُس کا سر بھیجے کی طرف جُھکا، پستول والا ہاتھ سیدھا ہوا۔ بائیں ہاتھ نے دائیں ہاتھ کی کلائی تھامی۔ پارکنز قریب آ چکا تھا۔ کیتھرین کے پاس صرف ایک موقع تھا۔ صرف ایک فائر داغنے کا لمحہ۔ اُس نے گولی چلا دی۔ گولی عین پارکنز کے دل میں پیوست ہو گئی۔ وہ بیئر کے خالی ڈبے کی طرح فضا میں اُچھلا اور گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ عقب میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ کیتھرین نے دیکھا رینڈل چند دوسرے افراد کے ساتھ اُس کی طرف آ رہا تھا۔ فائل نیچے گر چکی تھی۔ کیتھرین نے فائل اُٹھائی۔ رینڈل نے قریب پہنچ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اُس کے بازو سے لگ کر سسکنے لگی۔

*

رہا تھا۔ بیگم صفراں نے جلدی سے اپنی چادر سر پر اوڑھی اور عزہ کو گھر لانے کے لیے پارک کا رخ کیا۔ بلڈنگوں کے قریب والی اس کھڑکی سے پارک کا منظر صاف نظر آتا تھا مگر کم و بیش ایک سال سے بیگم عزہ کا یہ معمول تھا کہ جب اس کا جی عزہ پارک میں کھیلنے جاتا تو وہ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کو تکتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں جیسے عزہ کے ساتھ چپک رہتی تھیں۔ عزہ کے ساتھ ان کی جیسے جان اٹکی رہتی تھی۔

بیگم صفراں جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت ان کا بیٹا ارسلان بہ مشکل دو سال کا ہوگا۔ ان کے شوہر شاہ عالی کی ایک دکان پر ملازم تھے۔ ایک دن وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی موٹر سائیکل پر کام پر گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ ایک بس ڈرائیور کی غفلت اور جلد بازی نے ان کی جان لے لی۔ اس حادثے کے بعد بیگم صفراں کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ زندگی کی تمام مشکلات اور محرومیاں جھیل کر انہوں نے ارسلان کو پال پوس کر بڑا کیا اور تعلیم دلائی بلکہ اس کی شادی بھی کر دی۔۔۔ آج کل ارسلان ملازمت کے سلسلے میں کویت میں مقیم تھا۔ بیگم صفراں اپنی بہو شازیہ اور پوتے عزہ کے ساتھ اس خوب صورت عمارت کی ساتویں منزل پر رہتی تھیں۔ ان کی ساری خوشیاں جیسے اپنے پوتے میں سمٹ آئی تھیں، وہ ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا اور وہ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ سب لوگ انہیں بڑی آپا کہہ کر بلاتے تھے۔

اس جمعے کو پارک میں وقت گزارنے کے بعد وہ عزہ کو گھر لے آئیں۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ان کی بہو شازیہ نے کہا۔ "کیا ہوا امی! آپ عزہ کو واپس لے آئیں؟"

"وہ آج پھر پارک میں ہے۔" بڑی آپا نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شازیہ کھڑکی کی طرف گئی۔ پارک میں جھانکا پھر واپس آ کر اپنی ساس کے پاس بیٹھ گئی۔ "امی! آپ بھی نا... کچھ زیادہ ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ بچہ خاصا سمجھدار لگتا ہے۔ بچوں سے پیار کرتا ہے۔ بچے بھی اس سے باتیں کرتے ہیں..."

آپا نے تلخ ہو کر کہا۔ "بچے اس سے باتیں کرتے ہیں تو کیا وہ ٹھیک ہو گیا؟ تم حالات کو نہیں دیکھ رہیں کہ کس طرح کے جا رہے ہیں۔ ہر روز بچے اغوا ہو رہے ہیں۔ ہر روز خبریں آ رہی ہیں۔ اب تو ظالم ایسے ہیں کہ ماں باپ کے ہاتھوں سے بچے چھین کر لے جاتے ہیں۔"

شازیہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے امی! لیکن آپ کو پتا ہے کہ میڈیا بہت زیادہ غلط چیز پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی وہ سرا اثر و رسوخ والا شخص کسی بھی الزام کو بنا لیتے ہیں اور پھر اسے اخبار پر پھیلا دیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اخباروں اور ٹی وی والے جو خبریں سنا رہے ہیں وہ اس طرح کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔ میرا مطلب ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ احتیاط ضرور کریں لیکن یہ تو نہ ہو کہ بچوں کو گھروں میں بند کر دیں، ان کی پڑھائی اور تفریح کو درہم برہم کر دیں۔ پرسوں میں بھی اس بچے سے ملی تھی۔ وہ پیار باتیں بھی کی تھیں۔ دل کا برا نہیں لگتا۔ اگر وہ کسی طرف کھنچا جاتا ہے۔ پھل تقدیر کرتے ہوئے ہمیشہ DOT ہے۔۔۔" بات کرتے کرتے شازیہ نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور ذرا چونک کر بولی۔ "وہ دیکھیں، اب بھی ان بزرگوں کے پاس نماز پڑھ رہا ہے۔"

آپا کھٹکوں پر زور دے کر اٹھیں اور کھڑکی سے جا لگیں۔ وہ شام عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ڈوبتی کے سفید بال ڈھلتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ آپا نے ایک دو بار پہلے بھی اسے نماز پڑھتے یا نماز ہی مسجد کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔ آپا نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کسی کو نماز پڑھتے دیکھ کر یہ سر جھکا تو نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ہر طرح سے نیک پاک ہے۔ دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دوں... جب یہ بچہ پارک میں ہوگا، میں عزہ کو پارک میں نہیں رہنے دوں گی۔"

شازیہ کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے سر ہلا دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے روز جب بڑی آپا بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں بیٹھی تھیں تو وہاں بھی یہی بات ہو رہی تھی۔ دو عورتیں اور کچھ بچے بھی بیٹھے تھے۔ ایک آنٹی کہہ رہی تھیں کہ کل اس پارک والے حصے میں ان کی تین سالہ پوتی کو کوئی سائیکل سے اتار کر گود میں لینے کی کوشش کی۔ بچی رونے لگی اور انہوں نے اس بندے کو جھڑک کر بھگا دیا۔

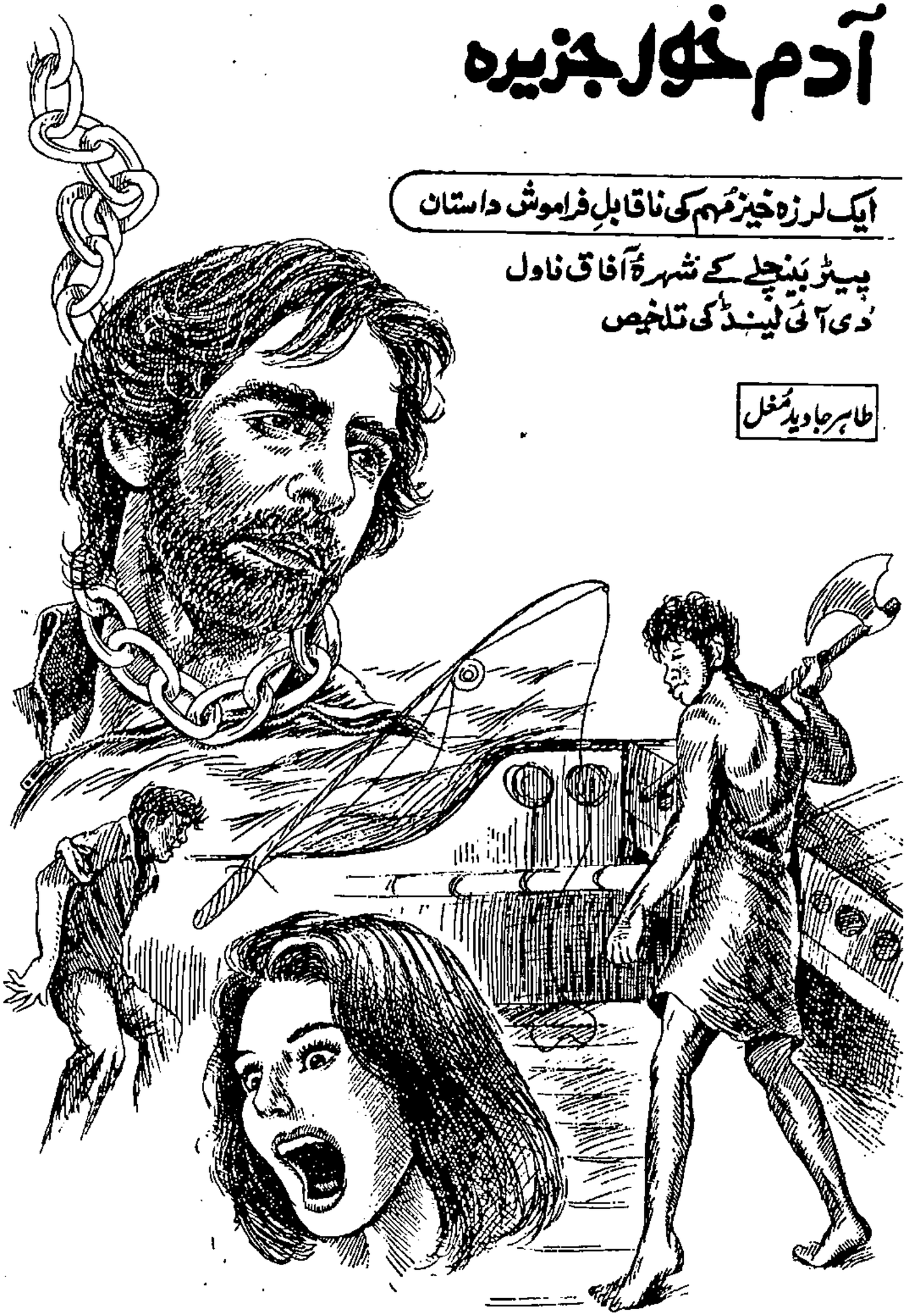
اسی دوران میں فلیٹ نمبر ۱۰ میں رہنے والی بیگم جلدی سے اٹھ کر باہر گئیں۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں کسی دوا کا سرخ رنگ کا پتا تھا۔ "یہ دیکھو کیا ہے؟" انہوں

آدم خور جزیرہ

ایک لرزہ خیز مہم کی ناقابلِ فراموش داستان

پیٹر بینچلے کے شہرۂ آفاق ناول
دی آئی لینڈ کی تلخیص

طاہر جاوید مغل



مچھلیاں

پکڑنے والی جدید طرز کی ایک خوبصورت کشتی کھلے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ سورج دُور مغرب میں ایک سُرخ تھال کی طرح نظر آ رہا تھا اور ڈیوڈ کشتی کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ مچھلی پکڑنے والی کُنڈی کی ڈور اُس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ دُوسرے ہاتھ سے وہ کبھی کبھی سگریٹ کا کش لے لیتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سُورج ڈُوبنے سے پہلے وہ ایک 'بیلوفن' مچھلی اور پکڑ لے تو اپنے دونوں دوستوں کا ریکارڈ توڑ سکتا ہے۔ جارج نے پیر کے روز تین اور ماریا نے بُدھ کے روز چار 'بیلوفن' پکڑی تھیں۔ وہ اس سے پہلے صرف ایک بیلوفن پکڑ سکا تھا۔ آج صبح ہی سے اُس کی قسمت ساتھ دے رہی تھی اور اُس نے دوپہر تک چار بیلوفن پکڑ لی تھیں لیکن دوپہر کے بعد ایک بیلوفن بھی اُس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ ریکارڈ اُس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ تینوں پچھلے ہفتے سے کھلے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ آج اُن کا یہ آخری روز تھا۔ ڈیوڈ نے سگریٹ کا کش لیتے ہُوئے سوچا کل اُن کو واپس روانہ ہو جانا ہے اور پرسوں پھر وہی بھاگ دوڑ کے روز و شب ہوں گے۔ صبح سات بجے دفتر روانگی اور شام چھ بجے واپسی۔ فائلوں کے انبار، مسائل کے ڈھیر، اُلجھنوں کے جال ـــــ اچانک اُسے سامنے سمندر میں کوئی چیز تیرتی نظر آئی۔ جب وہ شے کشتی کے قریب پہنچی تو ڈیوڈ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کسی شخص کی لاش تھی۔ مُردہ شخص کے جسم پر ایک پتلون کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور وہ اوندھے مُنہ پانی پر تیر رہا تھا۔ لاش آہستہ آہستہ کشتی کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ڈیوڈ نے جارج اور ماریا کو آواز دے کر بُلانے کا ارادہ کیا۔ جارج شاید بالکونی میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ ماریا وی سی آر پر فلم دیکھ رہی تھی ... لیکن پھر اس سے پہلے کہ ڈیوڈ اُن کو آواز دیتا لاش میں حرکت پیدا ہُوئی اور اب مُردہ شخص کا چہرہ ڈیوڈ کو صاف نظر آنے لگا۔ خُدا کی پناہ! وہ اک عجیب و غریب چہرہ تھا۔ جلد بالکل سیاہ اور آنکھیں بالکل سُرخ۔ وہ ایک انسانی چہرہ تھا لیکن اُس کی مجموعی کیفیت لفظوں میں بیان کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ڈیوڈ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اُس کا مُنہ عجیب انداز میں کُھلا ہُوا تھا۔ پھر اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس شخص کا بالوں سے بھرا ہُوا ہاتھ آگے کی طرف بڑھا اور اُس نے کشتی کا کنارہ تھام لیا۔ پھر اُس کا دوسرا ہاتھ پانی سے باہر نکلا۔ ڈیوڈ نے خنجر کی جھلک دیکھی، پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی ...

جب ڈیوڈ نے اپنی تمام جمع شدہ قوّت بروئے کار لا کر چلّانا چاہا تو اُسے یُوں لگا جیسے اُس کا گلا نرخرے سمیت کٹ چکا ہو۔ گرم گرم خُون کی حدّت وہ اپنے سینے پر محسُوس کر رہا تھا پھر اُس کی نظروں کے سامنے سب کچھ دُھندلا گیا اور وہ اُلٹ کر کشتی میں جا گرا۔

کشتی کے ایک سجے سجائے کمرے میں ماریا صوفے پر بیٹھی وی سی آر پر ایک تازہ فلم دیکھ رہی تھی۔ فلم کلائمیکس پر پہنچنے والی تھی اور ماریا پُوری طرح کہانی کے طلسم میں گرفتار تھی۔ دفعتہً کمرے کا دروازہ کُھلا اور جارج ناول ہاتھ میں تھامے نمُودار ہُوا۔

"فلم کتنی باقی رہ گئی؟ آج چائے ملے گی یا نہیں؟" وہ اپنی بیوی ماریا سے بولا۔

"زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔" ماریا نے ایک لمحے کے لیے اسکرین سے نگاہیں ہٹاتے ہُوئے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اسکرین پر توجّہ مرکوز کرتی، اُسے جارج کے پیچھے دروازے میں ایک ایسا منظر نظر آیا جس نے اُسے پاگلوں کی طرح چیخنے پر مجبُور کر دیا۔ جارج نے حیرت سے اُس کے چہرے کے بدلتے ہُوئے تاثرات دیکھے اور اُس کے مُنہ سے اُبلتی ہُوئی چیخ سُنی، لیکن پھر اس سے پہلے کہ وہ گھُوم کر دروازے کی طرف دیکھتا ایک نہایت

وزنی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی۔ اُس نے اپنی کھوپڑی کے ٹوٹنے کی آواز سُنی اور وہ دائیں طرف پڑے ہُوئے شیمپین کے کریٹ پر گرا۔ جارج کی آنکھوں نے زندگی کا جو آخری منظر دیکھا وہ بوتلوں کے فرش پر گر کر ٹوٹنے کا تھا۔

ماریا نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن بالوں سے بھرے ہُوئے دونوں ہاتھوں نے اُسے گرفت میں لے لیا اور اُس کے نتھنوں میں ایک انتہائی ناگوار بُو گھستی چلی گئی۔ عجیب طرح کی بُو تھی یہ۔ ماریا کو یاد آیا کہ ایسی بُو اُس نے اُس وقت سُونگھی تھی جب ایک دفعہ گھر کا ریفریجریٹر خراب ہو جانے کی وجہ سے اُس کے اندر پڑی ہُوئی مچھلیاں سڑ گئی تھیں۔ اُس نے پُوری قوّت سے خود کو حملہ آور کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ اُس نے دایاں پاؤں حملہ آور کی پسلیوں میں دے مارا۔ وہ غضبناک انداز میں غُرّایا پھر اُس کا ہاتھ اپنی پتلون کی بیلٹ تک گیا۔ پُرانے زمانے کا ایک چمکتا ہُوا خنجر اُس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ ماریا ایک بار زور سے مچلی پھر اُس نے محسوس کیا کہ انگارہ سا اُس کے دل کے مقام پر اُتر گیا ہے۔ اُس کا جسم حملہ آور کی گرفت میں ایک دو بار پھڑکا اور ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

□

آج پھر 'منیارڈ' دفتر سے لیٹ تھا۔ رات بھر ایک رسالے کے لیے مضمون لکھتا رہا تھا جس کے نتیجے میں آٹھ بجے سے پہلے اُس کی آنکھ نہیں کھُلی تھی۔ اُس نے ایک جماہی لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھر میں چاروں طرف عجیب قسم کی اُداسی چھائی ہُوئی تھی۔ جب اُس کی بیوی اور بچّہ اُس کے ساتھ رہتے تھے تو گھر کا ماحول کتنا مختلف تھا! جاتے وقت اُس کی بیوی بہت سا سامان لے گئی تھی۔ اب کھڑکیاں پردوں سے خالی تھیں۔ فرش پر قالین بھی نہیں تھا، فرنیچر بس حسبِ ضرورت ہی تھا۔ دیواروں پر آویزاں بڑی بڑی پینٹنگز کی جگہ اُن کے نشان ہی نظر آ رہے تھے۔ اس اپارٹمنٹ سے منیارڈ کی اَن گنت یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں اپنی بیوی 'ڈسیون' اور بچّے 'جوسٹائن' کے ساتھ اُس نے بارہ سال گزارے تھے... زندگی سے بھرپور بارہ سال اور اتنی لمبی رفاقت کے بعد دونوں ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ منیارڈ پیدائشی طور پر ایک ادیب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس میدان میں آمدن کے مواقع زیادہ نہیں لیکن اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اُس نے مسلسل ریاضت اور کاوش کے ذریعے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا لیکن اُس کی بیوی اُس کی رفتار سے غیر مطمئن تھی۔ گھر کی حالت سُدھارنے کے لیے اُس نے خود بھی نوکری کر لی۔ اُس کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور وہ تیزی سے ترقّی کے مراحل طے کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغرور ہوتی چلی گئی۔ کوئی چھ ماہ پہلے اُن میں طلاق ہو گئی۔ جوسٹائن کے بارے میں یہ فیصلہ ہُوا کہ وہ ماں کے پاس رہے گا اور منیارڈ اُس کی تعلیم و تربیت میں تعاون کے طور پر پانچ سو ڈالر ماہانہ ادا کرے گا۔

منیارڈ ماضی کی یادوں میں گُم، اپنی چھوٹی گاڑی ڈرائیو کرتا ہُوا ہفت روزہ 'ٹوڈے' کے دفتر کے سامنے رُکا۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ تیز قدموں سے چلتا ہُوا لفٹ کی طرف بڑھا۔ دفتر میں داخل ہوتے وقت اُس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، وہ ڈیڑھ گھنٹے لیٹ تھا۔ سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اُس کی اسسٹنٹ ڈیانا نے اُسے گڈ مارننگ کہا۔ پھر فکرمند نظروں سے اُسے دیکھتے ہُوئے بولی:

"آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہُوں" منیارڈ نے دلکش انداز میں مُسکراتے ہُوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈیانا اُسے بھائیوں کی طرح چاہتی ہے۔ اُس کے تاخیر سے دفتر پہنچنے پر فکرمند ہو جاتی تھی۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کی ایک خوبصورت

ایک رپورٹ بھی ملی۔ اس میں بھی کچھ کام کی باتیں درج تھیں۔ منیارڈ یہ دونوں چیزیں لے کر پھر سینیٹر ایڈیٹر کے دفتر پہنچا۔ ہلمر نے بیزاری سے کہا:

"مسٹر کین! پچاس ہزار افراد ہر سال سڑکوں پر مر جاتے ہیں، اگر یہاں تین سال میں ۲۰۰۰ لوگ مر گئے تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اگر تم بہت ضروری سمجھتے ہو تو کسی ماتحت کو اس کام پر لگا دو۔ خدا کے لیے خود تحقیق و تفتیش کرنے کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ یہاں ہمارے سر پر بہت کام چڑھا ہوا ہے۔"

منیارڈ نے اس خبر کی اہمیت پر زور دیا تو وہ طیش میں آکر بولا:

"منیارڈ! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ایک نیوز رائٹر ہو۔ اگر تم دوسرے چکروں میں پڑو گے تو نیوز رائٹر بھی نہیں رہو گے۔"

منیارڈ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا اور صاف لہجے میں بولا:

"جناب مجھے معلوم ہے کہ میں نیوز رائٹر ہوں... اور اسی لیے میں وہاں جانا چاہتا ہوں... خدا حافظ۔" اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

□

جوسٹائن بڑی محویت سے کارٹون رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر والی نشست پر اس کا باپ منیارڈ بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ دونوں طیارے کے ذریعے واشنگٹن جا رہے تھے۔ وہاں منیارڈ کا پروگرام اس ساحلی محافظ 'فلوریو' سے ملنے کا تھا جس کا بیان کشتی کی گمشدگی کے سلسلے میں شائع ہوا تھا۔ منیارڈ نے روانہ ہونے سے پہلے ہی ٹیلی فون پر اس سے ملاقات کا وقت لے لیا تھا۔ جوسٹائن نے اچانک رسالے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا:

"ڈیڈ! اگر میری پیانو کی کلاس نکل گئی تو ممی میرا حلیہ خراب کر دیں گی۔"

منیارڈ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "گھبرانے کی بات نہیں، پیانو کی کلاس سے پہلے پہلے ہم واپس پہنچ جائیں گے۔ اگر کچھ دیر بھی ہو گئی تو میں معذرت کر لوں گا تمہاری استانی سے۔"

جوسٹائن کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات کچھ ماند پڑنے لگے۔ پھر وہ بڑے دلکش انداز میں چار ماہ پہلے کی باتیں دہرانے لگا جب اس کی ممی ایسے ہی ایک دورے پر گئی تھی اور جوسٹائن کو اپنے باپ کے ہمراہ چند پُرلطف دن گزارنے کا موقع ملا تھا۔ وہ دونوں شاٹ گنوں سے مسلح ہو کر شکار کرنے چلے گئے تھے۔ شاٹ گن کی بات چل نکلی تو جوسٹائن نے ایک گن کی فرمائش کر دی۔ منیارڈ ٹالنے کے لیے اچھی سی دلیل سوچ ہی رہا تھا کہ جہاز کے رن وے پر اترنے کا اعلان ہوا۔ ہوائی اڈے سے انہوں نے ٹیکسی لی۔ منیارڈ نے جوسٹائن کو راستے میں 'ایئر اینڈ سپیس' میوزیم کی عمارت پر اتار دیا۔ اور خود فلوریو سے ملنے روانہ ہو گیا۔

فلوریو پینتالیس پچاس کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے گول شیشوں والی نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ بڑے تپاک سے منیارڈ کو گھر کے اندر لے گیا۔ منیارڈ نے اپنے آنے کا مقصد تفصیل سے بیان کیا اور کشتیوں کی گمشدگی کے بارے میں اس کی رائے طلب کی۔ فلوریو کا خیال تھا کہ یہ تمام واقعات کشتی رانوں کی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے پیش آ رہے ہیں۔ لوگوں کے پاس پیسہ بہت ہو گیا ہے۔ وہ نت نئی اور جدید کشتیاں خریدتے ہیں اور سیر و تفریح کے لیے کھلے سمندر میں نکل جاتے ہیں۔ انہیں کشتیوں کے بارے میں کچھ پتہ ہوتا ہے نہ سمندر کے بارے میں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔

منیارڈ نے سوال کیا: "کیا تمام کی تمام کشتیاں حادثات کا شکار ہوتی ہیں؟"

فلوریو نے لمبا سانس لے کر کہا: "تین برسوں میں

۶۱۰ کشتیوں کی گمشدگی کو دیکھتے ہوئے کچھ پُراسراریت سی محسوس ہوتی ہے۔ ۲۵ فیصد یعنی کوئی ۱۳۰ کشتیاں ایسی تھیں جنہیں مقامی دگراس ہوپرز نے اغوا کیا۔ پھر انہیں توڑ کر بیچ دیا یا بحرالکاہل میں لے گئے۔ تیس چالیس ایسی ہوں گی جن کو مختلف لوگوں نے چُرایا ہوگا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کوئی آپ کی کار یا موٹر سائیکل چُرا لیتا ہے۔ باقی کشتیوں کے واقعات پُراسرار معلوم ہوتے ہیں۔"

منیارڈ نے سوال کیا: "اب تک غائب ہونے والی کشتیوں کا کوئی مسافر زندہ بھی بچا ہے؟"

فلوریو نے پائپ کا کش لیتے ہوئے کہا: "حیرت انگیز امر یہی ہے کہ ابھی تک کوئی ایسا فرد ملا ہی نہیں جو صورتِ حال کو واضح کر سکے۔"

منیارڈ نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ مقامی حکام نے اس ضمن میں اب تک کیا احتیاطی تدابیر کی ہیں۔ فلوریو نے بتایا گشتی دستے قائم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کشتی رانوں کو سختی سے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ کھلے سمندر میں زیادہ دُور تک نہ جائیں، غیر آباد جزیروں پر نہ اُتریں، اپنے ساتھ ٹرانسمیٹر رکھیں اور وقتاً فوقتاً محافظ پولیس سے رابطہ قائم کرتے رہیں۔ بہت کم لوگ ان ہدایات پر عمل کرتے ہیں، البتہ اب وہ قصداً کیکاؤس گروپ کے جزیروں کی طرف جانے سے گریز کرتے ہیں۔ منیارڈ خاصی دیر فلوریو سے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتا رہا پھر اجازت لے کر واپس چل دیا۔ اُسے جلد از جلد ایئر اینڈ سپیس میوزیم پہنچنا تھا۔

جوسٹائن اُسے میوزیم کی سیڑھیوں ہی پر مل گیا۔ میوزیم سے وہ سیدھے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ طیارے کی روانگی سے بیس منٹ قبل ہی ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ منیارڈ کی نظر نیشنل ایئر لائنز کے لاؤنج کی طرف اُٹھ گئی۔ مسافروں کا ایک گروہ میامی جانے والے ہوائی جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔ منیارڈ رُک گیا۔ "کیا بات ہے، ڈیڈ!"

جوسٹائن نے انگلی پکڑ کے پکڑ کے پوچھا۔ منیارڈ کا ذہن کہیں دُور پہنچا ہُوا تھا اور دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ عقل کہتی تھی کہ چُپ چاپ نیویارک لوٹ جاؤ۔ کشتیوں کی گمشدگی پر لعنت بھیجو اور کل سے دفتر پہنچ کر پہلے مانسوں کی طرح روزمرّہ کا کام شروع کر دو لیکن جذبات کچھ اور کہہ رہے تھے۔ کہیں اُس کے اندر سے آواز آئی تھی کہ نیویارک واپس جا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔ تمہیں آگے بڑھنا چاہیے۔ خطرات کے اندھیروں میں اُمید اور کامیابی کی کرن بہت واضح نظر آ رہی ہے۔ اس کے اندر سے ایک لہر سی اُٹھی اور اُس نے جوسٹائن کا ہاتھ پکڑا اور میامی جانے والی فلائٹ کی طرف مُڑ گیا۔ جوسٹائن حیرت زدگی کی حالت میں بولا: "ڈیڈ! یہ ہمارا جہاز تو نہیں۔"

منیارڈ نے مسکراتے ہوئے کہا: "اب ہمارا یہی جہاز ہے، کیونکہ ہم اب میامی جا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ میامی کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ جوسٹائن بہت خوش دکھائی دے رہا تھا اور بڑی دلچسپی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا تھا۔ میامی ایئرپورٹ پر اُتر کر منیارڈ نے جوسٹائن کو نئے کارٹون رسالے خرید کر دیے اور پھر اُس کھڑکی کا رُخ کیا جس کے اُوپر "معلومات" کا بورڈ آویزاں تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کھڑکی میں وہاں موجود تھی۔ منیارڈ نے کہا۔ ہم کیکاؤس جانا چاہتے ہیں۔ لڑکی نے ایک بڑی سی کتاب کھولی اور کچھ دیر بعد سر اُٹھا کر کہا: "آپ کیکاؤس نہیں جا سکتے۔ کچھ عرصہ پہلے نیو بیئرڈ سے چند پروازیں جاتی تھیں لیکن اب وہ منسوخ کر دی گئی ہیں۔ آپ صرف جارٹر ڈ جہاز میں جا سکتے ہیں اور اس کے لیے برابر والی کھڑکی سے معلومات مل جائیں گی۔" منیارڈ سامنے والی کھڑکی پر پہنچا۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے اُسے بتایا کہ رات کے وقت کوئی جہاز کیکاؤس نہیں جاتا۔ وہاں کا رن وے اتنا خراب ہے کہ اُترنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ہاں کل صبح جہاز مل سکتا ہے۔ منیارڈ نے رات ہوٹل میں گزارنے کا فیصلہ

کیا۔ ایک ہوٹل میں کمرہ کرایے پر لینے کے بعد دونوں باپ بیٹا سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ میامی کے ساحل سے ہوتے ہوئے وہ مرکزی مارکیٹ میں پہنچے یہاں اسلحے کی دکان سے مینارڈ نے جوسٹائن کے اصرار پر ایک جدید آٹومیٹک پستول خریدا۔ پھر وہ ہوٹل میں واپس چلے آئے۔

□

ویران جزیرے میں وہ ستارے کی شکل کی اکلوتی عمارت تھی۔ ستارے کے پانچوں کونے دراصل پانچ چھوٹے چھوٹے فلیٹس تھے۔ ان میں ایک ایک خاندان باآسانی رہائش رکھ سکتا تھا۔ ستارے کا مرکز ایک بڑے ہال کی شکل میں تھا جو دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ کھانے کے کمرے کے طور پر استعمال ہوتا اور دوسرا عبادت کے لیے۔ یہ عمارت دراصل ایک اعتکاف گاہ تھی، وہ لوگ جو چند ہفتوں کے لیے دنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو کر اپنا وقت پُرسکون مذہبی ماحول میں گزارنا چاہتے تھے، ادھر آجاتے تھے۔ اس اعتکاف گاہ کی واحد منتظم چوبیس سالہ کیتھرائن تھی۔ اس وقت وہاں چودہ افراد رہائش پذیر تھے جو تین مختلف گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بچے عموماً کھیلتے کودتے رہتے اور بڑوں کا وقت عبادت اور مذہبی کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوتا۔ اس وقت کیتھرائن کھانے کے کمرے میں سب کو چائے پیش کر رہی تھی۔ اُس نے پوچھا "تمام لوگ موجود ہیں نا؟" ایک عورت بولی "نہیں، میری اور آرتھر دونوں باہر کھیل رہے ہیں" کیتھرائن نے کہا: "آپ لوگوں کو پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ شام کے وقت بچوں کو باہر نہ نکلنے دیا کریں۔ پچھلی دفعہ بھی ایک بچہ گم ہو گیا تھا اور بڑی مشکل سے ملا تھا۔" اتنے میں کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور ایک دس گیارہ سال کا بچہ بھاگتا ہوا اندر آیا۔ "وہاں سمندر میں ایک کشتی ہماری طرف آرہی ہے۔" اُس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ کیتھرائن اس اطلاع پر چونک اٹھی۔ اس کا رنگ یکدم سفید پڑ گیا۔ اُس نے پوچھا،

"تم نے اچھی طرح دیکھا ہے کہ وہ کشتی ہی ہے؟" بچے نے بڑے یقین سے اثبات میں جواب دیا۔ تمام افراد حیران تھے کہ اس وقت جزیرے پر کون آسکتا ہے۔ ایک چھوٹے جہاز کو سامان خورونوش لے کر آنا تھا لیکن اُس کے آنے میں ابھی چار پانچ روز باقی تھے۔ ایک شخص اُٹھتے ہوئے بولا: "میں دیکھتا ہوں وہ کون لوگ ہیں۔" کیتھرائن نے اُسے فوراً منع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں گہرا خوف نظر آرہا تھا۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں آرتھر سے پوچھا "میری کہاں ہے؟" اُس نے کہا وہ ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی میں اس کو پکڑ کر رہوں گی۔ کیتھرائن بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ عمارت سے باہر ایک پتھر پر چڑھ کر اُس نے دیکھا ساحل سے کوئی ۰۰ گز کے فاصلے پر ایک کشتی صاف نظر آرہی تھی۔ اُس کا رُخ جزیرے کی طرف ہی تھا۔ کیتھرائن کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "یا خدا! مجھ سے کونسا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔" پچھلے دس ماہ میں یہ دوسرا واقعہ تھا کہ کشتی ظاہر ہوئی تھی۔

پھر اُس نے جلدی جلدی میری کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دھیمی آواز میں اُس کا نام لے کر پکارا۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ بھاگتی ہوئی عمارت کے اندر چلی گئی۔

مُلّا واحدی کی علامہ راشد الخیری سے گہری دوستی تھی۔ ایک مرتبہ واحدی صاحب کسی بات پر ناراض ہو گئے اور دو ماہ تک بول چال بند رہی۔ اتفاق سے انہی دنوں مُلّا واحدی کے چھوٹے بھائی سیّد محمد مرتضیٰ کی شادی تھی۔ اُنہوں نے علامہ صاحب کو دعوت نامہ نہ بھیجا لیکن وہ بارات کے وقت ازخود پہنچ گئے اور اپنے غیر معمولی حُسنِ اخلاق سے واحدی صاحب کو پانی پانی کر دیا۔

(سید اوصاف علی واحدی)

ہال کمرے میں سب لوگ حیران کھڑے تھے۔ کسی توقف کے بغیر وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی: "آپ لوگ میری باتوں پر عمل کریں ورنہ ایک دردناک موت ہم سب کا مقدر بن جائے گی۔ اس کمرے سے اپنی موجودگی کا ہر نشان فوراً مٹا ڈالیں۔" اس کے بعد وہ خود بھی اُن کے ساتھ شامل ہوگئی۔ اُنھوں نے تمام برتن اکٹھے کر کے باورچی خانے میں رکھ دیے۔ ادھر اُدھر بکھری ہوئی چھوٹی موٹی چیزیں جمع کیں۔ پھر اُس نے سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور اُن کو لے کر ایک تہ خانے میں اُتر گئی۔ اُس نے تیل کا ایک لیمپ جلایا اور اُن کو ہدایت کرتے ہوئے بولی:

"مَیں دروازہ بند کر کے باہر جا رہی ہوں۔ آپ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔ جب تک مَیں نہ کہوں دروازہ نہ کھولیں۔ بچّوں کو خاموش رکھیں اور خود بھی کوئی آواز مُنہ سے نہ نکالیں۔"

پھر وہ باہر کی طرف لپکی۔ ایک عورت نے چیختے ہوئے کہا: "میری بچّی تو باہر ہے۔" کیتھرائن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا: "خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ اگر تمھاری بچّی کی زندگی ہے تو وہ ضرور بچ جائے گی۔ دُعا کرو کہ وہ جلد ہی واپس نہ آجائے۔"

پھر وہ تہ خانے کا دروازہ بند کر کے باہر آگئی۔ اُس نے کھانے کی میز کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو افراد نظر آئے۔ اُنھوں نے لنگوٹیاں پہن رکھی تھیں اور سر سے پاؤں تک کوئی سیاہ چیز جسم پر ملی ہوئی تھی۔ کیتھرائن نے اُن کے چہرے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئے ایک ناگوار قسم کی بُو کے بھبکے اُس کے نتھنوں میں گھستے چلے گئے۔ وہ جانتی تھی وہ کیا کریں گے۔ اُنھوں نے بغیر کچھ کہے کیتھرائن کو بازوؤں سے پکڑا اور میز پر لٹا دیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سانس روک لی۔ وہ اپنے ذہن میں شدّت کے ساتھ دُعاؤں کا ورد کر رہی تھی۔ ایک لحاظ سے اُس نے خود کو اپنے جسم سے بالکل علیحدہ کر لیا تھا... وہ اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر ریفریجریٹر کی طرف لپکے۔ کھانے پینے کا تمام سامان اُنھوں نے تھیلوں میں بھر لیا۔ ایک شخص نے غُراتے ہوئے کہا: "پنسلین کہاں ہے؟" کیتھرائن نے ایک الماری میں سے پنسلین کے دو ڈبے نکال کر اُنھیں تھما دیے۔ دوسرا شخص بولا: "تم سے کہا تھا اگلی دفعہ ہمیں شراب چاہیے۔" کیتھرائن نے کہا: جو کچھ موجود تھا تم نے سمیٹ لیا، اب خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔ دونوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ عین اُسی وقت کمرے سے باہر چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز آئی۔ مَیری تتلی پکڑ کر واپس آرہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد وہ کمرے کے اندر تھی۔ اُن دونوں کی آنکھوں میں درندگی عود کر آئی۔ کیتھرائن چیخی: "خدا کے لیے اس معصوم بچّی پر رحم کرو اور اسے چھوڑ دو۔" اتنی دیر میں اُنھوں نے اُسے دبوچ لیا تھا۔ ایک شخص کے ہاتھ میں خودکار پستول نظر آرہا تھا۔ کیتھرائن جانتی تھی کہ وہ کس قدر ظالم ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے معصوم بچّی کی چیخیں سُنیں ــــ چیخیں جو لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتی جا رہی تھیں۔

□

اگلے روز منیارڈ حسبِ وعدہ ساڑھے چھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔ جوسائن بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ آج کوئی بھی مسافر بردار طیارہ کیکاؤس نہیں جا رہا۔ منیارڈ نے واپس نیویارک جانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹے کو بھی اُس سے آگاہ کر دیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دُور چلے تھے کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا اور کتنی ہی دیر سے بنچ پر بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: "میرا نام وائنٹی ہے اور ایک طیارے میں کچھ سامان لے کر کیکاؤس جا رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ ایک خوش اخلاق

اور خوش گفتار شخص تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اُس کے ہمراہ کیکاؤس کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ اُن کا سفر نہایت خوشگوار اور پُرلطف رہا۔ کیکاؤس کے چھوٹے سے ہوائی اڈّے پر اُترنے کے بعد وہ جزیرے کے کمشنر 'پیس میک' سے ملنے چل دیے۔ پائلٹ وائٹی نے مژدہ سُنایا تھا کہ وہ تین گھنٹے آرام سے گھوم پھر سکتے ہیں۔ وہ جزیرے کے ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لیے پیدل ہی چل کھڑے ہُوئے اور آدھ گھنٹے بعد کمشنر کے دفتر میں داخل ہُوئے۔ منیارڈ نے ہفت روزہ 'ٹوڈے' کے سب ایڈیٹر کی حیثیّت سے اپنا تعارف کراتے ہُوئے کہا کہ اُس کا اصل مقصد اُن واقعات کا سُراغ لگانا ہے جن میں پُراسرار طور پر کشتیاں اور کشتی ران غائب ہو رہے ہیں۔ کمشنر نے کہا: "یہ آپ لوگوں کا معاملہ ہے۔ ہمارے پاس نہ تو اتنے وسائل ہیں اور نہ اتنا وقت کہ اس معاملے کی تحقیق کرتے پھریں۔" باتیں کرتے کرتے وہ دفتر سے باہر نکل آئے اور قریب ہی ایک ساحلی کلب میں جا بیٹھے۔ منیارڈ نے مہمان کے بجائے میزبان کا کردار ادا کرنا پسند کیا اور خود کھانا منگوایا۔ جوسٹائن نے چھوٹی کشتی پر ساحل کی سیر کرنے کی فرمائش کی۔ منیارڈ نے اُسے کشتی کرائے پر لے دی اور تاکید کر دی کہ زیادہ دُور نہ جائے۔ وہ کشتی پاکر بہت خوش ہُوا اور پیڈل چلاتا ہُوا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ کمشنر اور منیارڈ پھر باہمی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جوسٹائن واپس آتا دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کوئی خبر لے کر آرہا ہے۔ اُس نے آکر بتایا کہ آدھ فرلانگ کے فاصلے پر ریت کے اندر ایک کشتی کا ڈھانچہ دبا پڑا ہے۔

کمشنر نے ویٹرس کو بُلایا اور اس ڈھانچے کے بارے میں پُوچھا۔ ویٹرس نے حیرت کا اظہار کرتے ہُوئے کہا کہ اُس طرف بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمندر میں پانی چڑھنے کی وجہ سے کشتی پہلے نظر نہ آئی ہو۔

منیارڈ نے اُسی وقت کشتی دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تینوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے جوسٹائن کی بتائی ہُوئی جگہ پر پہنچے۔ واقعی کشتی کا ایک حصّہ ریت سے باہر نکلا ہُوا نظر آرہا تھا۔ کشتی اپنے پہلو کی طرف اُلٹی ہوئی تھی اور اُس کا اگلا حصّہ ریت میں دبا ہُوا تھا۔ اُنھوں نے ہاتھوں سے ریت ہٹانا شروع کی۔ یہ پچیس تیس فٹ لمبی ایک جدید طرز کی مچھلیاں پکڑنے والی کشتی تھی۔ سامنے کے حصّے سے تختے ٹوٹے ہُوئے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے کشتی کو جان بُوجھ کر ڈبونے کی کوشش کی گئی ہو۔ مختلف جگہوں پر ہتھوڑے کی ضربات بھی نظر آرہی تھیں۔ اسٹیئرنگ وہیل غائب تھا۔ اسٹیل اور پیتل کی تمام فِٹنگ بھی اُتار لی گئی تھی۔ منیارڈ کو ایک جگہ اُبھار سا نظر آیا۔ اُس نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ یہ لوہے کی کوئی چیز تھی جو لکڑی میں دھنسی ہُوئی تھی۔ جوسٹائن نے اپنا جیبی چاقو نکالا اور اُس چیز کے اردگرد لکڑی کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کی ایک چھوٹی سی گولی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ منیارڈ نے اس گولہ نما چیز کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا۔ کمشنر بھی تجسّس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منیارڈ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیتے ہُوئے کہا: "یُوں لگتا ہے جیسے کشتی پر کسی قدیم طرز کے پستول سے فائر کیا گیا ہو۔ یہ اٹھارہویں صدی کے پستول میں استعمال ہونے والی گولی ہے۔" وہ تینوں باتیں کرتے ہُوئے واپس ہوٹل کی طرف چل دیے۔

وہاں سے ایئرپورٹ آئے۔ جہاز اُن کے انتظار ہی میں تھا۔ اُن کے سوار ہوتے ہی وہ میامی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ پائلٹ وائٹی طیارے کو خودکار اُڑان پر سیٹ کر کے اُونگھنے لگا۔

راستے میں اُنھیں نیو بیڈ کے جزیرے پر چند منٹ کے لیے رُکنا تھا لیکن یہاں پر طیارہ ایسا اُترا کہ پھر پرواز ہی نہ کر سکا۔ تکنیک کار دو گھنٹے نقص دُور کرنے میں لگے

رہے۔ آخر کار اُنھوں نے اعلان کیا کہ وہیل سسٹم میں خرابی پیدا ہوگئی ہے اور وہ طیارہ پرسوں سے پہلے پرواز نہ کر سکے گا۔ منیارڈ نے فوری طور پر کوئی دوسرا طیارہ چارٹر کرنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا کہ صبح سے پہلے کوئی ہوائی جہاز میسّر نہ آسکے گا۔ اُنھوں نے ایک مقامی ہوٹل میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اسی ہوٹل کی بالکونی میں منیارڈ کی ملاقات ایک مقامی باشندے 'وُنڈسر' سے ہوگئی۔ وہ یہاں کرایے پر کشتیاں دینے کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ان جزائر کی معاشی اور سیاسی حالت پر دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے منیارڈ کو اپنا پتہ دیتے ہُوئے گھر آنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز بھی طیارے کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ منیارڈ کے اندر مُہم جُوئی کا شوق پھر سر اُٹھانے لگا۔ وہ اب تک کئی بار اُس لوہے کی گولی کا معاینہ کر چکا تھا۔ قدیم اشیا اور خاص طور پر اسلحے سے اُسے بہت دلچسپی تھی۔ اُس نے 'وُنڈسر' کے ہاں جانے کی ٹھان لی۔ وُنڈسر کا گھر جزیرے کی شمالی جانب گھنے سرسبز علاقے میں تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک درختوں کے درمیان بل کھاتی شمال کی جانب جاتی تھی۔ وہ پیدل ہی اُس پر چل دیے۔ راستے میں ایک شخص نے اُنھیں روکتے ہُوئے بتایا کہ وہ اس طرح اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکتے، یہاں زہریلے مچھّر اور کھٹمل کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اُس نے پچاس منٹ لیے اور دونوں پر ایک خاص قسم کی دوا کا سپرے کر دیا۔ اُس کے کہنے کے مطابق اب وہ مچھّروں وغیرہ سے محفوظ تھے۔

دونوں گھنے درختوں میں سفر کرتے ہُوئے آگے بڑھتے رہے۔ حبس بہت زیادہ تھا اور اُن کے جسموں سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ وُنڈسر کا گھر ایک الگ تھلگ جگہ پر واقع تھا۔ کال بیل بجانے پر وہ برآمد ہُوا اور بڑی محبت سے اندر لے گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد منیارڈ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہُوئے کہا کہ وہ ساحلِ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے کشتی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وُنڈسر نے پہلے تو انھیں اس ارادے سے باز رکھنا چاہا کہ سخت گرمی کی وجہ سے شکار کا ملنا بہت دُشوار ہے۔ منیارڈ نے اصرار کیا تو وہ اپنی کشتی دینے پر رضامند ہوگیا؛ تاہم یہ کہا کہ اس علاقے میں کشتی رانی خطرے سے خالی نہیں اس لیے آپ دُور نہ جایئے اور مجھے ریڈیو کے ذریعے ہر آدھ گھنٹے بعد اطلاع دیجیے۔

□

ہفت روزہ 'ٹوڈے' کے دفتر میں فون کی گھنٹی بجی۔ منیارڈ کی اسسٹنٹ ڈیانا نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے منیارڈ کی بیوی 'ڈسیون' بول رہی تھی۔ اُس نے بڑے غصّے سے منیارڈ کے بارے میں پُوچھا اور کہا کہ اُس کے بچّے کو اسکول جانا ہے اور منیارڈ اُسے اب تک لے کر نہیں آیا۔ اتنی دیر میں ڈیانا کے دوسرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اُس نے منیارڈ کی بیوی سے سینیئر ایڈیٹر ہلمر سے بات کرنے کے لیے کہا اور وہ دوسرا فون سُننے لگی۔ یہ فون واشنگٹن سے ساحلی محافظ 'فلوریو' کا تھا۔ وہ بھی منیارڈ کے بارے میں پُوچھ رہا تھا۔ ڈیانا نے اُسے بتایا کہ تین روز سے منیارڈ کا کچھ پتہ نہیں۔ پھر اُس نے یہ کال بھی ایڈیٹر ہلمر کی طرف منتقل کر دی۔ ریسیور رکھ کر وہ اٹھی اور راہداری میں چلتی ہُوئی ہلمر کے کمرے میں پہنچی۔ ہلمر اُس وقت 'فلوریو' کی کال سُن رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا: "مسٹر فلوریو! اگر وہ کہیں گیا ہے تو سراسر اپنی ذمّے داری پر گیا ہے۔ مَیں نے اُسے منع کیا تھا لیکن وہ ایک پاگل شخص ہے۔ مَیں اس سلسلے میں کوئی ذمّے داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس کی بیوی بول رہی تھی۔ وہ بھی سخت پریشان تھی۔ مَیں اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اُس کی تلاش میں کشتیوں کا بیڑا بھیجنا میرے بس میں نہیں۔" ڈیانا پاس ہی کھڑی ہلمر کی باتیں سُن رہی تھی۔ منیارڈ کی گمشدگی کا سُن کر وہ

سخت پریشان ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔

◘

سبزی مائل نیلا سمندر دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا اور اُن کی بائیس فٹ لمبی کشتی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اور سُورج کی کرنوں میں کافی تمازت تھی وہ ایک گھنٹے سے یہاں موجود تھے لیکن کوئی مچھلی اُن کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ جوسٹائن اب کچھ کچھ بور ہونے لگا تھا۔ منیارڈ نے اُس کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "اس شکار میں اگر ہر پانچ منٹ بعد ایک مچھلی ہاتھ نہ آئے تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنے سامنے نیو بیئرڈ کا نقشہ پھیلایا۔ اس پر وضاحت سے جزیرے کی سمندری حدود کی نشاندہی کی گئی تھی۔ منیارڈ نے ایک جگہ اُنگلی رکھتے ہُوئے کہا یہاں پانی بہت گہرا ہے۔ اگر ہم یہاں پہنچ جائیں تو کوئی بڑا شکار ہاتھ آسکتا ہے۔ جوسٹائن نے ٹھنکتے ہُوئے کہا: "تو پھر چلیں نا، ڈیڈ!"

منیارڈ نے کشتی کا انجن اسٹارٹ کیا اور وہ آگے روانہ ہوگئے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد اُس نے ایک جگہ کشتی روک دی۔ یہاں پانی میں نیلاہٹ تھی اور سطح پُرسکون۔ منیارڈ نے ریڈیو آن کرکے ونڈسر سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ تھوڑی دیر بعد ونڈسر کی آواز آئی: "ہیلو! میں ونڈسر ہُوں۔ تم کہاں ہو؟ میری دُوربین تمہیں دیکھ نہیں سکتی۔" منیارڈ نے نقشے کی مدد سے اپنی جگہ کی نشاندہی کی۔ ونڈسر کی آواز آئی: "تم بہت دُور نکل گئے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں واپس آجانا چاہیے۔ اگر ذرا اور آگے نکل گئے تو پھر ریڈیو کام نہیں کرے گا۔ ایسے میں اگر انجن بند ہوگئے تو سخت مشکل پیش آئے گی۔"

"گھبرانے کی بات نہیں۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔" منیارڈ نے کہا اور ریڈیو بند کردیا۔ اتنی دیر میں جوسٹائن کی چیخ سُنائی دی وہ ایک مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو

> دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مسلمان اکابرین کے تحریر کردہ تیس لاکھ مخطوطات منتشر اور غیر مربوط حالت میں تحقیق و جستجو کے محتاج ہیں۔ صرف تُرکی میں اُن کی تعداد چار لاکھ ہے جبکہ اسپین میں سولہ ہزار قدیم طبّی نسخے دریافت ہُوئے ہیں۔ نیشنل میوزیم میں بارہ ہزار مخطوطات کسی دیکھ بھال کے بغیر تہ خانوں میں پڑے ہیں جبکہ سندھ کی لائبریریوں میں انہیں دیمک چاٹ رہی ہے۔ (ڈاکٹر مہدی حسن۔ تذکارِ حکمت)

گیا تھا اور اُسے بڑی مشکل سے کھینچ کر کشتی میں لے آیا تھا۔ دونوں باپ بیٹا اُلٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگے۔ وہ ایک بھاری بھرکم اور خوبصورت مچھلی تھی۔ منیارڈ نے کہا یہ مچھلی جاکر ممّی کو دکھانا، اُس کا سارا غصّہ کافور ہو جائے گا۔ جوسٹائن کہنے لگا: "ممّی سے زیادہ غصّہ تو پیانو کی ٹیچر کو ہوگا۔ میرا خیال ہے مچھلی اُسے دوں گا اور لوہے کی گولی ممّی کو۔"

دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ قریباً ایک گھنٹہ اور وہ اُس جگہ لہروں پر ہچکولے کھاتے رہے۔ اس عرصے میں اُنہوں نے ایک چھوٹی مچھلی اور پکڑی۔ پھر منیارڈ نے ونڈسر کو ریڈیو پر بتایا کہ وہ آدھے گھنٹے تک واپس پہنچ رہے ہیں۔ اُس وقت جب منیارڈ واپسی کے لیے کشتی کا انجن اسٹارٹ کررہا تھا اچانک اُس نے دُور پانی کی سطح پر کوئی چیز تیرتی دیکھی۔ تجسّس سے مجبور ہوکر وہ رُک گیا۔ وہ شے اُنہی کی طرف آرہی تھی۔ شاید وہ کوئی شارک مچھلی تھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اُنہوں نے دیکھا کہ یہ ایک درخت کا تنا ہے جسے کشتی کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنے کے ساتھ ساتھ کوئی اور چیز بھی اُن کی سمت آرہی تھی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو ہاتھ ہلا ہلا کر اُنہیں اپنی طرف متوجّہ کررہی تھی۔ منیارڈ نے سوچا شاید یہ کسی جہاز یا کشتی سے سمندر میں گر

گئی ہے۔ اُس نے فوراً انجن اسٹارٹ کیا اور کشتی کا رُخ ساحل کی طرف موڑ دیا۔ قریب پہنچ کر اُس نے اپنا ہاتھ اُس لڑکی کی طرف بڑھایا۔ اُس کی عمر بارہ تیرہ سال ہوگی، وہ بالکل خاموش تھی اور اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت نظر آ رہی تھی۔ منیارڈ نے اُسے اُوپر کھینچنا چاہا تو احساس ہُوا کہ لڑکی کا وزن بہت زیادہ ہے، اتنا زیادہ کہ وہ اُسے اُوپر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ لڑکی کا بازو منیارڈ کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔۔۔ اور پھر دفعتاً پانی سے کوئی اور چیز نکلی، ایک ضرب منیارڈ کے سینے پر لگی اور وہ اُلٹ کر کشتی میں جا گرا۔ جب اُس نے اُٹھ کر دیکھا تو ایک بدہیئت شخص کشتی پر سوار ہو رہا تھا۔ اُس کے جسم پر ایک انڈرویر تھا اور تمام جلد پر کوئی روغن ملا ہُوا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال ماتھے اور گردن سے چپکے ہُوئے تھے اور اُس کے مُنہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ بائیں ہاتھ میں ایک وزنی کلہاڑا تھام رکھا تھا۔ منیارڈ پر مسلسل نگاہ رکھتے ہُوئے اُس نے دایاں بازو نیچے کی طرف بڑھایا۔ منیارڈ نے دیکھا کہ سانولی رنگت کا ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا اُس کا بازو تھام کر اُوپر چڑھ رہا ہے۔ اُس شخص نے اپنا کلہاڑا اُس لڑکے کو تھما دیا اور منیارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بھاری بھرکم آواز میں بولا "ختم کردو۔۔۔ ختم کردو" لڑکے نے منیارڈ کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہاتھ کلہاڑے کے دستے پر گردش کر رہے تھے لیکن یُوں لگتا تھا جیسے وہ حملہ کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور اُس نے خنجر سے لڑکے کا چہرہ چھیل ڈالا۔ زخم سے خُون رِسنے لگا۔ وہ شخص غُرایا: "ویسے ہی کرو جیسے تمہیں سکھایا گیا ہے" لڑکا ہچکچا کر ایک قدم آگے بڑھا۔

منیارڈ نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور اب اُس کے ہاتھ میں وہی پستول تھا جو اُس نے جوسٹائن کے اصرار پر میامی سے خریدا تھا۔ منیارڈ نے دونوں ہاتھوں سے اُس شخص کے سر کا نشانہ لیا اور مضبوط لہجے میں کہا: "چاقو نیچے پھینک دو" اس کے جواب میں اُس شخص نے منیارڈ پر پہلا وار لگا دی۔ ۳۲ء پوائنٹ کی سُبک رفتار گولی اُس کی دائیں آنکھ میں داخل ہو کر بائیں کان سے نکل گئی۔ منیارڈ تک پہنچنے سے پہلے اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی لیکن اتنی دیر میں لڑکا اُس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ منیارڈ اُس کی طرف سے غافل تھا۔ اس لیے اپنا دفاع نہ کر سکا۔ کلہاڑے کا بھرپور وار اُس کے سر پر پڑا اور وہ دُھندلائی ہُوئی نظروں سے جوسٹائن کی طرف دیکھتا ہُوا کشتی میں گر گیا۔ اتنی دیر میں وہ لڑکی بھی کشتی میں چڑھ آئی۔ جوسٹائن نے دیکھا کہ اُس کی گردن کے پچھلے حصّے میں آکسیجن کی ربڑ ٹیوب بندھی ہُوئی ہے۔ ہلاک ہونے والا شخص اور یہ لڑکا اس ٹیوب سے لپٹ کر آکسیجن حاصل کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکی اس قدر بھاری ہو گئی تھی۔ جوسٹائن کو یہ سارا منظر خواب کی طرح دکھائی دیا۔ اُس کے قریب ہی اُس کا باپ بے سُدھ پڑا تھا۔ اُس کے سر کے زخم سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ جوسٹائن نے غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ بڑھاتے ہُوئے ریڈیو آن کر دیا اور سرگوشی میں کہا: "مدد۔۔۔ مدد۔۔۔ اُنہوں نے ڈیڈی کو مار دیا ہے۔ اب وہ کشتی کو کسی اور طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں" ابھی اُس نے فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ لڑکا اُس پر جھپٹا۔ اُس کا زوردار مُکّا جوسٹائن کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وہ اُلٹے پاؤں اپنے ڈیڈی پر جا گرا۔ لڑکا غُرایا: "بھول جاؤ اب مدد کو۔ کوئی مدد یہاں نہیں آئے گی"

دوسری طرف اُس کی آواز 'ونڈسر' کے کانوں میں گونجی پھر اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ونڈسر نے ایک لمبا سانس لیا۔ "وہی ہُوا نا دوست! جس کا ڈر تھا" اُس کی آنکھوں سے گہرا دُکھ جھانک رہا تھا۔

□

منیارڈ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور پھر آہستہ سے بند کر لیں۔ وہ قریباً دس منٹ سے اپنے اردگرد کی آوازیں سُن رہا تھا۔ وہ بہت سے افراد تھے۔ تمام کے تمام مرد۔ اُن کے لباس عجیب و غریب تھے۔

کسی نے پینٹ کے اُوپر بنیان پہن رکھی تھی، کسی نے نیکر کے اوپر قمیص زیب تن کر رکھی تھی اور کوئی اوورکوٹ پہنے ہُوئے تھا اور بہت سوں کے جسم پر صرف لنگوٹیاں تھیں۔ وہ چیخ رہے تھے، اُچھل کود رہے تھے اور ایک بڑے برتن میں سے کوئی مشروب پی رہے تھے۔ وہ شاید کسی جزیرے پر تھا۔ چاروں طرف درخت تھے اور زمین پر ریت۔ پھر اُس نے اپنے بازو سخت ہاتھوں کی گرفت میں محسوس کیے۔ وہ اُسے اُٹھا رہے تھے۔ پھر اُنھوں نے اُسے کسی درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ اُس کے سر اور جسم کے مختلف حصّوں سے خُون بہہ رہا تھا لیکن کسی کو پروا نہ تھی۔ وہ اپنے حال میں مست تھے۔ منیارڈ عجیب اُلجھن کا شکار تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کن لوگوں میں گھرا ہُوا ہے۔ وہ جنگلی قسم کے تھے اور نہ مہذّب۔ کہیں قریب ہی ٹیپ ریکارڈر بج رہا تھا۔ گانوں کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ پھر گانے ختم ہو گئے اور ایک مذہبی دُھن سنائی دینے لگی۔ دُھن ختم ہُوئی تو ایک اور آواز گُونجی۔ کوئی شخص وعظ کرنے کے انداز میں بول رہا تھا "ہر شخص کو صرف ایک بار زندگی ملتی ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے، نجانے کہاں؟" پھر ایک اور شخص کی آواز گُونجی: "یہ زمین تمہاری ہے۔ تم اس زمین کے مالک ہو۔ تمہیں مشترکہ کھانا ملے گا۔ کپڑے ملیں گے اور انصاف ملے گا اور مال میں سے تمہیں حصّہ ملے گا۔ کھاؤ، پیو اور عیش کرو۔" پھر ایک گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ شور مچاتے ہُوئے لوگ خاموش ہو گئے۔

منیارڈ نے آنکھوں کی جھری میں سے دیکھا کہ تمام افراد ایک دائرے کی صُورت میں اُس کے گرد جمع ہیں۔ پھر دائرے میں راستہ پیدا ہُوا اور تین افراد ریت پر چلتے ہُوئے اُس کی طرف بڑھے۔ اُن میں سب سے آگے ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ شاید وہ اُن کا سردار تھا۔ اُس کے پیچھے ایک عورت تھی اور پھر ایک مرد۔ لمبے شخص نے ایک میلی کچیلی ریشمی قمیص پہن رکھی تھی۔ اُس کی پتلون کے پائنچے پھٹے ہُوئے تھے اور پاؤں ننگے تھے۔ اُس کے کندھوں سے دو پستول لٹک رہے تھے۔ عورت نے بڑا ہی قیمتی اور ماڈرن اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کے سر پر پُرانے فیشن کی ٹوپی تھی۔ عمر تیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ تیسرا آدمی عمر رسیدہ تھا۔ وہ اوورکوٹ پہنے ہُوا تھا۔ اُس کی پنڈلیاں ننگی تھیں اور پاؤں میں ربڑ سول کے جُوتے تھے۔ سردار نے منیارڈ کے قریب پہنچ کر ایک طمانچہ اُس کے مُنہ پر دے مارا۔ منیارڈ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے میلے دانتوں کی نمائش کرتے ہُوئے بولا: "مجھے معلوم تھا تم ہوش میں آ گئے ہو۔ مرنے سے پہلے آخری بار دُنیا کو اچھی طرح دیکھ لو۔" منیارڈ نے کراہتے ہُوئے پُوچھا: "آپ لوگ کون ہیں اور مَیں کہاں ہُوں؟" اُس شخص نے قہقہہ لگاتے ہُوئے جواب دیا: "تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ مرنے والوں کی آخری خواہش ضرور پُوری کرنی چاہیے۔ مَیں 'ناؤ' ہُوں۔ یہاں کے رہنے والے مجھے 'اولو نائز' کہہ کر پُکارتے ہیں۔"

منیارڈ 'اولو نائز' کے لفظ پر چونک سا گیا۔ اُس شخص نے اُس کی کیفیت بھانپتے ہُوئے کہا: "ہو سکتا ہے تم اولو نائز کے نام سے واقف ہو۔ ہاں ... یہ وہی 'اولو نائز' ہے جسے تمہاری تاریخ میں ایک ظالم اور سفّاک سمندری لُٹیرے کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ تم لوگ جانتے ہو کہ وہ زندہ آدمیوں کا کلیجہ نکال کر کھا جایا کرتا تھا۔ میری طرف دیکھو، مَیں اُس کی اولاد میں سے ہُوں۔ 'اولو نائز' نے چارلس دوم کے زمانے میں یہ ویران جزیرہ آباد کیا تھا۔ اُس وقت سے ہم نہایت خاموشی کے ساتھ یہاں آباد چلے آ رہے ہیں۔ 'اولو نائز' مر چکا ہے لیکن اُس کے بعد کئی اولو نائز پیدا ہُوئے ہیں۔ دسواں اولو نائز تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی روایت پر عمل کرتے ہُوئے مَیں بھی تھوڑی دیر میں تمہارا کلیجہ کھاؤں گا... ہا ہا ہا۔" اُس نے درندگی سے بھرپُور قہقہہ لگایا۔ منیارڈ نے چیختے ہُوئے

کہا: "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تم جو کچھ کہو گے میں وہی کچھ کروں گا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"نہیں، یہ ناممکن ہے۔" اُس نے سفّاکانہ انداز میں کہا۔ تم نے ہمارے ایک وفادار آدمی کا خون کیا ہے۔ ہمارا قانون تمہیں زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

منیارڈ کے ذہن میں گزرنے والے تمام واقعات تازہ ہونے لگے۔ پھر اُس کی نگاہوں کے سامنے جوسٹائن کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ چیخا: "میرا بچہ جوسٹائن کہاں ہے؟" لمبے تڑنگے شخص نے ہاتھ کا اشارہ کیا، لوگوں کے دائرے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہی لڑکا نمودار ہوا جس نے کشتی میں منیارڈ پر کلہاڑے سے حملہ کیا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے جوسٹائن آرہا تھا۔ اُس کی گردن رسّے سے بندھی تھی جس کا ایک سرا لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ منیارڈ کو دیکھ کر جوسٹائن کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے لیکن خلافِ توقع اُس نے چیخنے چلّانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "میرے ڈیڈی کو چھوڑ دیں۔" سردار شفقت سے جوسٹائن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا: "لڑکے! ہر چیز کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے۔ ابھی تم بچے ہو آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے۔ پھر اُس نے ساتھ والے لڑکے کو اشارہ کیا، وہ جوسٹائن کی رسّی کھینچتا ہوا دائرے سے باہر نکل گیا۔ ایک طرف چند بچے کھڑے تھے، وہ دونوں اُن میں شامل ہو گئے۔ منیارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا جوسٹائن... جوسٹائن۔ پھر وہ سردار 'ناؤ' کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے جو جی چاہے سزا دو لیکن اسے چھوڑ دو۔" منیارڈ نے محسوس کیا اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہے چلے جا رہے ہیں۔ 'ناؤ' نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا: "میں اسے کچھ نہیں کہوں گا... میں بیوقوف نہیں کہ اپنے ایک سپاہی کو میدانِ جنگ میں بھیجنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں ختم کر دوں۔ یہ بچے کل کے سپاہی ہیں۔"

اتنے میں 'ناؤ' کے پیچھے چلنے والی عورت آگے بڑھی۔ وہ اب تک بڑی گہری نظروں سے منیارڈ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ 'ناؤ' کی طرف مڑتے ہوئے بولی: "اولو نائز! یہ شخص مجھے کسی اعلیٰ خاندان سے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک ایسے بچے کی خواہش رکھتی ہوں جس کی رگوں میں کسی اعلیٰ نسل کا خون ہو۔ میں اب عمر کی اُن حدوں تک پہنچنے والی ہوں جہاں میری یہ خواہش ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گی۔ تم اس شخص کو میرے حوالے کر دو، جونہی میں اس سے بچہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، تم اپنے فیصلے پر عمل کرنے میں پوری طرح آزاد ہو گے۔" پھر وہ آپس میں دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ خاصی دیر تک 'ناؤ'، اُس عورت اور ادھیڑ عمر شخص کے درمیان فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ 'ناؤ' کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار نظر آرہے تھے۔ آخر کار اُس نے منیارڈ کی طرف دیکھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے کھول کر 'بیتھ' کے حوالے کر دو، اُس کا اشارہ عورت کی طرف تھا۔

عورت نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور ایک جھونپڑی کا رُخ کیا۔ یہ جھونپڑی مٹی اور گھاس کی بنی ہوئی تھی۔ نیچے ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ منیارڈ اُس پر لیٹ گیا۔ اُس کا جسم زخموں سے چُور تھا۔ عورت نے اُسے مشروب پلایا اور وہ گہری نیند سو گیا۔ پھر کچھ خبر نہ رہی وہ کتنے دن اور کتنی راتیں اس حالت میں رہا۔ کبھی کبھی وہ اُٹھتا، عورت اُسے کھانا کھلاتی، مشروب پلاتی اور وہ گہری نیند سو جاتا۔ آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہونے لگا۔ پانچ چھ روز میں اُس کے سر کا زخم بھی بڑی حد تک مندمل ہو گیا تھا۔ عورت نے اُس کے گلے میں زنجیر ڈال کر ایک آہنی ٹُک سے باندھ رکھا تھا۔ خاصے دن گزرنے کے باوجود عورت کا رویّہ انتہائی ہتک آمیز اور ظالمانہ تھا۔ اُس نے اپنی ذات اور اپنے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے تھے۔ منیارڈ

نے کئی بار اُس سے اپنے بیٹے کے بارے میں پُوچھا۔ اُس نے یہی جواب دیا مَیں کچھ نہیں جانتی۔ یہاں آ کر منیارڈ کی معلومات میں صرف اتنا اضافہ ہُوا کہ یہ لوگ اردگرد کے سمندر میں قزّاقی کرتے اور کشتیوں کو لوٹ کر روزمرہ کی ضرورتیں پُوری کرتے ہیں۔ جزیرے کی کُل آبادی چھ سو نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ کھانا پکا کر نہیں کھاتے کیونکہ جزیرے پر آگ جلانا سخت منع ہے۔ آگ کی وجہ سے یہ لوگ اُوپر سے گزرنے والے کسی بھی ہوائی جہاز کو نظر آسکتے ہیں یا قرب وجوار سے گزرنے والا کوئی جہاز اُن کے بارے میں آگاہ ہوسکتا ہے۔ ان کے آباؤاجداد نے جو قانون بنائے تھے وہ سختی سے اُن پر عمل کرتے ہیں۔

اس وقت 'بیتھ' اُس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی کسی جانور کی کھال سے اُس کے لیے پائجامہ تیار کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک پلیٹ پڑی تھی، اُس میں کچّی مچھلی اور کسی پرندے کے کچّے انڈے رکھے تھے۔ پہلے پہل تو منیارڈ کو انہیں دیکھتے ہی اُبکائی آجاتی لیکن بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب وہ سب کچھ کھانے لگا تھا۔

اُس کی ڈاڑھی بڑھی ہُوئی اور بال بکھرے ہُوئے تھے۔ اور 'بیتھ' کی طرح اُس نے بھی اپنے پُورے جسم پر ایک سیاہی مائل روغن ملا ہُوا تھا۔ اس جزیرے کے باسیوں کو یہ روغن ہر قسم کے مچھّروں اور کیڑوں سے محفوظ رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد 'ناؤ' بھی ادھر ہی آدھمکا۔ پستول حسبِ دستور اُس کے کندھوں سے لٹک رہے تھے اور ہاتھ میں ایک کلہاڑا تھا۔ اُس نے بیتھ کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا:

"اس سے پہلے بھی تم ایک دفعہ ناکام ہو چکی ہو۔ یہ تمہارا دُوسرا اور آخری چانس ہے۔ اگر اس دفعہ بھی بچّہ حاصل نہ ہُوا تو تمہیں دوسری عورتوں کے ساتھ رہنا ہوگا۔"

بیتھ نے بیزاری سے ناؤ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں خاموش تلخی بھری ہُوئی تھی۔ پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ناؤ، منیارڈ کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مُسکراتا رہا، پھر ایک طرف کو چل دیا۔

اُس کے جانے کے بعد منیارڈ نے بیتھ سے پُوچھا:

"یہ کیا کہہ رہا تھا؟ دوسری عورتوں میں جانے سے کیا مراد ہے؟"

بیتھ نے ہونٹ سکوڑتے ہُوئے کہا:

"دُوسری عورتوں میں جانے کا مطلب ہے کہ مجھے طوائف بن کر رہنا ہوگا۔ یہی اس جزیرے کا اصول ہے۔"

منیارڈ نے اُس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اُس کی حیثیت جزیرے میں ایک راہبہ یا گوشہ نشین کی سی ہے۔ وہ شاید اس بارے میں کچھ اور پُوچھتا لیکن بیتھ کا مُوڈ خراب ہوگیا تھا اس لیے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد بیتھ اُٹھی، اُس نے منیارڈ کی گردن سے لپٹی ہُوئی زنجیر کے ایک سرا چھت سے لگی ہُوئی ہُک کے اندر سے گزارا اور پھر زنجیر کے دونوں سرے ایک تالے میں پرو کر بند کر دیے۔ پھر اُس نے لکڑی اُٹھائی اور باہر کا رُخ کیا۔ شاید روغن تیار کرنے کے لیے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے گئی تھی۔ منیارڈ نے زنجیر میں لگے ہُوئے تالے کو غور سے دیکھا۔ یہ نمبروں والا تالا تھا۔ وہ پچھلے چار دن سے اُس کے نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا جب بیتھ جھونپڑی میں نہ ہوتی تو وہ فارغ بیٹھا یہی کام کرتا رہتا۔ وہ سینکڑوں نمبر آزما چکا تھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک طویل کام ہے۔ بیتھ مختصر سے عرصے کے لیے جھونپڑی سے باہر جاتی۔ شاید اصل نمبر ملنے میں کئی مہینے لگ جائیں۔

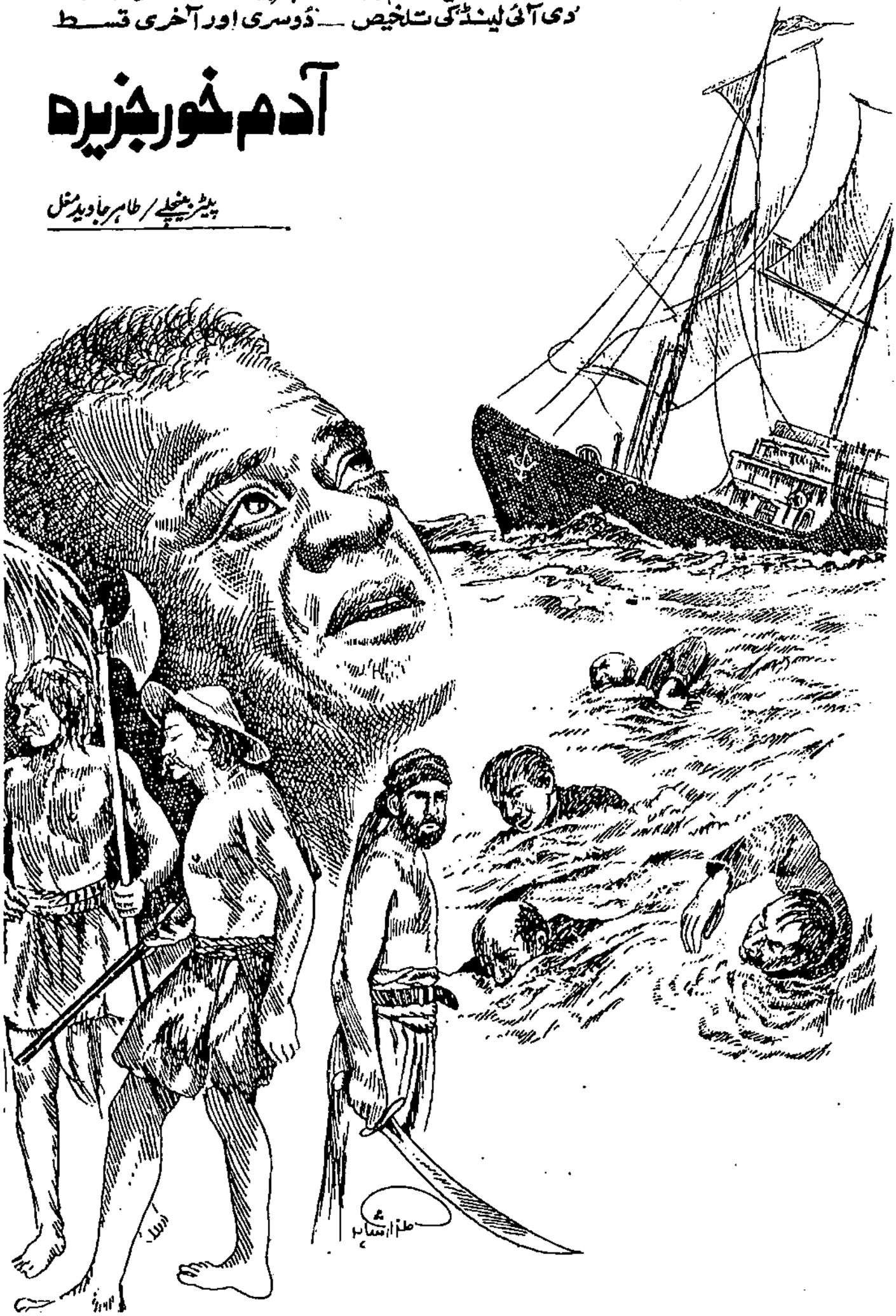
اچانک منیارڈ کے ذہن میں خیال آیا کہ اس قسم کے تالوں کا ایک ابتدائی نمبر ہوتا ہے۔ جو تالے کے ساتھ کارڈ پر لکھا ہوتا ہے۔ تالے کا خریدار بعد میں اپنی مرضی سے نمبر منتخب کر لیتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ لوگ ابھی تک ابتدائی نمبر ہی استعمال کر رہے ہوں۔ ابتدائی نمبر بہت آسان سا ہوتا ہے۔ اُس نے ۰۰۰ ملایا..... اور تالا کھل گیا۔ منیارڈ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

(جاری ہے)

بحری قزاقوں کے درمیان ایک مہم جو صحافی پر بیتنے والے لرزہ خیز واقعات
'دی آئی لینڈ' کی تلخیص ــــ دوسری اور آخری قسط

آدم خور جزیرہ

پیٹر بینچلے / طاہر جاوید مغل



منیارڈ اس غیر متوقع واقعے پر خوشی میں ڈوب گیا مگر اُسے فوراً ہی احساس ہُوا کہ وقت بڑا نازک ہے اور آزادی کا جو یہ لمحہ میسّر آیا ہے اُس کے صحیح استعمال ہی پر اُس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ سب سے پہلے زمین پر گھسٹتا ہُوا جھونپڑی کے اُس کونے تک گیا جہاں اُس کے خیال میں کوئی قیمتی شے دفن تھی۔ اُس نے لکڑی کا تختہ اُٹھایا تو اندر سے سیاہ رنگ کا ایک صندوق نکل آیا۔ وہ نہایت بوسیدہ کاغذات سے بھرا ہُوا تھا۔ اُن کی سیاہی بھی پھیکی پڑ چکی تھی۔ منیارڈ نے اُن کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اُسے جو چونکا دینے والی معلومات حاصل ہُوئیں اُن کا لُبِّ لُباب یہ تھا: اس جزیرے پر آباد لوگ بحری ڈاکو تھے۔ اُن کا تذکرہ سترہویں اٹھارہویں صدی کی مستند کتابوں میں بکثرت ملتا ہے۔ ۱۶۸۴ء میں 'ایسکو ملنگ' نامی مصنّف نے ان لوگوں کے درمیان رہ کر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا 'امریکی قزّاق'۔ اس تہلکہ خیز کتاب میں ان لوگوں کے رہن سہن اور حالاتِ زندگی تفصیل سے بیان ہُوئے تھے۔ منیارڈ خود بھی اس کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ان پُرانے کاغذات میں اُس کتاب کا اوّلیں ایڈیشن موجود تھا۔ منیارڈ نے اُس کی ورق گردانی شروع کی۔ یہ لوگ دراصل بہت سے علاقوں سے آئے تھے۔ اُن میں ڈاکو، لُٹیرے اور قاتل بھی تھے اور حکومتوں کے باغی اور غلام بھی۔ مہذّب دُنیا سے نکل نکل کر یہ لوگ بتدریج ایک جگہ اکٹھے ہونے لگے۔ ابتدا میں اُنھوں نے تورتگا اور ہسپانیولا کو اپنا مسکن بنایا۔ اُن کا بُنیادی ذریعۂ معاش شکار تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ علاقے میں سفر کرنے والے بحری جہازوں کے ساتھ چھوٹی موٹی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ بعد میں سپین کے بادشاہوں نے فیصلہ کیا کہ صرف سپین کے سرکاری جہاز ہی بیرونی ممالک سے تجارتی لین دین کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بحری قزّاق بیشتر ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو گئے۔ اُنھیں نے صرف شکار پر گزارا کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہُوئے۔ آخر مجبور ہو کر اُنھوں نے چھیننا جھپٹنا اور لُوٹ مار کا راستہ اختیار کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے حوصلے بڑھتے اور وہ منظّم ہوتے چلے گئے۔ اُن میں شامل ہونے والا ہر فرد اپنا پہلا نام اور پہلی ذات بھُول کر نئے کوائف اختیار کر لیتا اور وہ صرف ایک بحری قزّاق ہوتا۔ لُوٹ مار کرتے کرتے ایک وقت ایسا آیا کہ سمندر میدانِ کارزار بن گیا۔ ان سمندری لُٹیروں میں سے ایک شخص کا نام جین ناؤ تھا۔ وہ بڑا ہی ظالم اور سفّاک شخص تھا۔ تمام بحری قزّاق اُس کی قیادت میں جمع ہو گئے اور اُنھوں نے سپین کے جہاز رانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ یہ لوگ ہر قسم کے جہازوں پر حملہ آور ہوتے، مال و اسباب کے علاوہ عورتیں اور بچّے بھی اُٹھا کر لے جاتے۔ ۱۷۱۴ء کے بعد سپین اور دوسرے کئی ممالک نے مل کر بحری قزّاقوں کو زیر کرنے کی زبردست مُہم شروع کی۔ بحری قزّاقوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور بچے کھچے لوگ غلام بنا لیے گئے۔ یُوں بحری قزّاق صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔ منیارڈ ایک زنجیر سے بندھا ہُوا ایک جھونپڑی میں بیٹھا تھا اور تاریخ کا ایک تاریک گوشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کچھ اوراق اور پلٹے اور اُسے معلوم ہُوا کہ بحری قزّاقوں کو اس جزیرے کا سراغ ۲ر جولائی ۱۶۷۱ء کو ملا تھا۔ اُنھوں نے اسے اپنی سکونت کے لیے نہایت موزوں پایا۔ کاغذوں میں جزیرے کا محلِّ وقوع بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ منیارڈ نے اس نقشے کو دیکھتے ہُوئے اندازہ لگایا کہ جزیرہ، مغربی اور جنوبی کیکاؤس کے درمیان کہیں واقع تھا۔ یہ جگہ تمام فضائی اور بحری راستوں سے ہٹ کر تھی۔ تین سو سال سے بحری قزّاق اس جزیرے پر نہایت خاموشی سے زندگی گزار رہے تھے۔ بیرونی دُنیا سے کوئی اس طرف نہیں آیا تھا اور اگر آیا تھا تو زندہ واپس نہیں گیا تھا۔ منیارڈ نے کچھ اور کاغذات دیکھے جو اس جزیرے کی تاریخ، تہذیب اور معیشت کی مکمّل دستاویز تھے۔ منیارڈ پر بہت سے لرزہ خیز انکشافات ہُوئے۔ امریکہ اور قرب و جوار کی بہت سی نامور شخصیتیں، جو تاریخ کی کتابوں کے مطابق

سمندری حادثات میں ہلاک ہوئی تھیں یا پُراسرار طور پر گم ہوگئی تھیں، دراصل بحری قزاقوں کی وحشت کی بھینٹ چڑھی تھیں۔ اُن کا ذکر ان کاغذات میں تفصیل سے موجود تھا۔

منیارڈ کی آنکھوں کے سامنے تاریخ کا ایک نیا باب وا ہو رہا تھا۔ اُس نے سوچا اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو ہفت روزہ ٹوڈے دُنیا میں تہلکہ مچا دے گا۔ اُس نے چند ورق اور پلٹے، ایک جگہ جزیرے کے آئین و قوانین بیان کیے گئے تھے: "ہر شخص وقت کے اولونائز (سردار) کی اطاعت کرے گا۔ نافرمانی سنگین جرم تصور ہوگی۔ جزیرے سے بھاگنے کی کوشش یا بھاگنے والے کی پردہ پوشی ایک ناقابلِ معافی جُرم تصور ہوگا۔ بلا اشتعال اپنے گروہ کے کسی فرد پر حملہ کرنے والے کو تیس کوڑے لگائے جائیں گے۔ قتل کرنے والے کو مرتے دم تک کوڑے رسید کیے جاتے رہیں گے۔ کسی کی بیوی پر دست درازی کرنے والے کو گولی مار دی جائے گی اور کسی راست باز عورت پر دست درازی سنگین جُرم تصور ہوگی۔"

ان بُنیادی قوانین کے علاوہ بھی کئی ضوابط وضع کیے گئے تھے۔ مثلاً کسی شخص کو ذاتی ریڈیو رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف سرکاری طور پر ایک ریڈیو رکھا جا سکتا تھا اور وہ بھی ریسیور کے طور پر۔ ریڈیو سگنل بھیجنا ناقابلِ معافی جُرم تھا۔ ہر قسم کی کرنسی تلف کر دی جاتی۔ موٹر بوٹ اور لمبے فاصلے تک سفر کرنے والی کشتیاں لوٹنے کے بعد سمندر میں ڈبو دی جاتیں۔ پھر ایک اور نوٹ پر منیارڈ کی نظر پڑی۔ یہ ایک نیا کاغذ تھا۔ شاید حال ہی میں کوئی قانون وضع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا: "اولونائز نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد جو لوگ بھی پکڑے جائیں گے اُن میں سے تیرہ سال سے زائد عمر کے تمام افراد قتل کر دیے جائیں گے اور تیرہ سال عمر تک کے بچوں کو اپنا رُکن بنایا جائے گا۔ اولونائز نے یہ فیصلہ اس بنا پر کیا ہے کہ بڑی عمر کے لوگ پختہ ذہن کے مالک ہوتے ہیں، جس کے باعث وہ یہاں کے ماحول اور قوانین کو نیک نیتی سے قبول نہیں کرتے اور انتشار کا سبب بنتے ہیں۔"

منیارڈ بڑی دلچسپی سے اس دستاویز کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اُس کی چھٹی حس نے اُسے اچانک کسی خطرے سے خبردار کیا۔ اُس نے جھونپڑی کے دروازے میں سے جھانکا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ اُس نے جلد جلد صندوق مقررہ جگہ پر رکھا اور زنجیر پہن کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ بیتھ نے آ کر زنجیر کا تالا کھولا اور اُسے کھینچتے ہوئے باہر لے آئی اور کہا کہ تم ٹیوبارب سے ملنے جا رہے ہو۔ ٹیوبارب تمہارے بیٹے کا نیا نام ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے لیکن سنو! اب وہ تمہارا بیٹا نہیں رہا اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہاں کم سن بچوں کو خاص عزت دی جاتی ہے۔ اُس کے سامنے نظریں جھکائے رکھنا۔

منیارڈ کی آنکھوں میں پدرانہ محبت کی چمک نظر آنے لگی۔ وہ اُسے لے کر چل دی۔ جگہ جگہ تھوڑی سی زمین کو جھاڑیوں اور سبزے سے صاف کیا گیا تھا۔ ان خالی جگہوں پر جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ راستے میں اُنہیں دو آدمی ملے۔ دونوں جوان تھے۔ جزیرے کے دوسرے باسیوں کی طرح اُنہوں نے بھی بے ڈھنگا سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بیتھ کو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور پھر کسی بات پر قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ بیتھ نے اُنہیں دیکھ کر زمین پر تھوک دیا۔ پھر اُس نے منیارڈ کی زنجیر کو جھٹکا دیا اور اُسے لے کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ تھوڑا آگے چل کر تقریباً پندرہ جھونپڑیاں ایک دائرے کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ اُن کے باہر جزیرے کی طوائفیں بے ڈھنگا سا نیم عریاں لباس پہنے کھڑی تھیں۔ اُنہوں نے بھی بیتھ کو دیکھ کر اُس کا مضحکہ اُڑایا۔ اُن میں سے ایک بڑے انداز سے اِٹھلاتی ہوئی بولی:

"پیاری بیتھ! کب تک جان لڑاؤ گی؟ تم پہلے بھی آزما چکی ہو۔ تم ماں نہیں بن سکو گی۔ تھک ہار کر تمہیں ان ہی جھونپڑیوں میں آنا پڑے گا۔"

بیتھ کے چہرے پر غصے کے شدید آثار نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی اُن پر جھپٹ پڑے گی

لیکن اُس نے اپنے آپ پر ضبط کیا اور منیارڈ کو کھینچتی ہوئی آگے چل دی۔ منیارڈ نے پوچھا:

"بیتھ! تم نے بتایا تھا کہ جزیرے میں بیس عورتیں ایسی ہیں جو طوائفیں نہیں۔ وہ سب کی سب شادی شدہ زندگی گزار رہی ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق بیس بائیس مرد بھی ایسے ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں۔ پھر تم اُن میں سے کسی مرد کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

بیتھ نے کہا:

"شادی شدہ عورت کے لیے یہاں کا قانون کچھ دوسرے راستے تجویز کرتا ہے۔ یا تو وہ ماں بن جائے یا پھر طوائفوں میں شامل ہو جائے۔ پہلے میں نے ایک دوسرے شخص سے بچّہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اُسے ایک جرم کی بنا پر پھانسی دے دی گئی۔ اب مجھے طوائف بننے پر مجبور کیا جا رہا تھا لیکن میں ماں بننا چاہتی تھی۔ اس دوران میں تم یہاں آ گئے اور میں نے 'اولونائز' سے تمہیں مانگ لیا۔ ماں بننے کا اب یہ میرا آخری موقع ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک فرلانگ تک چلتے رہے۔ اب وہ ساحل پر پہنچ گئے تھے۔ لوٹی ہوئی کشتیوں کی ایک لمبی قطار کنارے پر نظر آ رہی تھی۔ منیارڈ نے دیکھا۔ دُور ایک لمبا سا شخص اُس کی طرف پُشت کیے کھڑا ہے۔ اُس کے دائیں بائیں دو لڑکے دکھائی دیے۔ بیتھ اور منیارڈ اُن کے قریب پہنچے تب لمبے شخص نے گھوم کر دیکھا۔ وہ سردار 'ناؤ' تھا۔ اُس کے ہمراہ جوسٹائن اور ایک دوسرا لڑکا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے کشتی میں منیارڈ کے سر پر کلہاڑا مارا تھا۔ اس کا نام 'مینوئل' تھا۔ پہلے تو منیارڈ نے جوسٹائن کو پہچانا ہی نہیں۔ اُس نے سر پر پٹکا باندھ رکھا تھا اور اُس کا لباس بھی بے ڈھنگا سا تھا۔ اُس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ منیارڈ کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ جائے لیکن اُس کے گلے میں زنجیر تھی۔ بیتھ نے اُس کی زنجیر کھینچ کر اُسے گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اُس کو 'ناؤ' کی تکریم میں جھکا رہی تھی۔ 'ناؤ' نے چند منٹ کے لیے دونوں باپ بیٹے کو علیحدگی میں گفتگو کرنے کی اجازت دے دی۔ منیارڈ، جوسٹائن کو لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے آ گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ اُس نے مختصر الفاظ میں جوسٹائن کو وہ تمام واقعات بتائے جو اُسے پیش آئے تھے۔ پھر اُس نے جوسٹائن سے اب تک کے حالات کے بارے میں پُوچھا۔ جوسٹائن نے جو کچھ بتایا اُس کا لُبِّ لُباب یہ تھا:

"یہ لوگ اُسے ایک جنگجو سپاہی بنانا چاہتے ہیں۔ اُس کو نشانہ بازی اور لڑائی بھڑائی کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کے پاس بندوقیں اور شاٹ گنیں تو بے شمار ہیں لیکن گولیاں اور کارتوس بہت کم۔ ڈاکہ زنی میں بھی زیادہ تر کلہاڑے، خنجر وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔"

اتنے میں 'ناؤ' کی آواز آئی وہ جوسٹائن کو بُلا رہا تھا۔ منیارڈ نے اُس کو جلد جلد سمجھایا کہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہ لے اور خاموشی سے حالات کے رُخ پر چلتا رہے۔ یہ بھی سمجھایا کہ وہ پستول کی چند گولیاں چُھپا کر کہیں رکھ دے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت کام آئیں۔ اُس نے جوسٹائن کو تسلی دی کہ وہ جلد ہی یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لے گا۔ 'ناؤ' نے جوسٹائن کو ایک اور آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔ وہ تینوں ایک جانب چل دیے۔ منیارڈ دُور تک اُن کو جاتا دیکھتا رہا، پھر وہ چونک پڑا۔ بیتھ اُس کی زنجیر کھینچ کر اُسے اُٹھنے کا کہہ رہی تھی۔

■

اگلی رات کا ذکر ہے۔ جب بیتھ گہری نیند سو گئی اور اُس کی گہری سانسوں کی آواز منیارڈ کے کانوں تک پہنچنے لگی تو اُس نے نمبروں والا تالا کھول کر خود کو زنجیر سے آزاد کیا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ اُس کا رُخ ساحل کی طرف تھا۔ وہ کشتیوں کی جانب جا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں ہر وقت محافظ

موجود رہتے تھے۔ اُس کا پروگرام تھا کہ کسی چیز کے سہارے تیرتا ہُوا جزیرے سے دُور نکل جائے۔ اُسے اُمید تھی کہ موافق لہریں مل جائیں گی اور صُبح ہونے تک وہ خاصی دُور نکل جائے گا۔ اُس نے جوسٹائن کو ڈھونڈنے یا اُسے چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس بارے میں اُس نے بہت سوچا تھا اُسے پُورا یقین تھا کہ وہ لوگ اُس کے فرار کے نتیجے میں جوسٹائن کو گزند نہیں پہنچائیں گے اور اگر وہ کل شام تک بیرونی دُنیا سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا تو پرسوں سُورج نکلنے سے پہلے یہ جزیرہ شیطانی قوتوں سے آزاد ہوجائے گا۔ ساحل سے کوئی دس گز کے فاصلے پر حسبِ توقع اُسے درخت کا ایک کٹا ہُوا چھوٹا سا تنا مل گیا۔ تھوڑی سی جدّوجہد کے بعد وہ تنے کو پانی میں لے آیا۔ اُس نے لکڑی بغل میں دبائی اور آہستہ آہستہ ساحل سے دُور ہٹنے لگا۔ لیکن جلد ہی اُس کو احساس ہُوا کہ اُس کی ٹانگوں کے ساتھ کوئی چیز لپٹ رہی ہے۔ اُس نے اپنی ٹانگیں چھڑانا چاہیں کہ اتنے میں اُس کے ہاتھ کسی زندہ چیز سے ٹکرائے۔ پھر اُسے اپنے بازو پر بھی ایسی ہی گرفت محسوس ہُوئی۔ اُس نے بازو پانی سے باہر نکالا۔ "اوہ میرے خدا!" اُس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آکٹوپس کی طرز کا ایک کریہہ صُورت آبی جانور اُس کے بازو سے لپٹا ہُوا تھا۔ پھر اُسے اپنی ٹانگ میں شدید قسم کی ٹیس محسوس ہُوئی۔ آبی جانور نے اُس کی پنڈلی پر اپنا ڈنک آزمایا تھا۔ اُس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ ساحل پر کھڑا ہُوا ایک شخص بلند آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد تین آدمی اُسے اُٹھائے ہُوئے بیتھ کی جھونپڑی میں داخل ہُوئے ۔۔۔ منیارڈ کی ٹانگ نیلی ہو رہی تھی اور وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

◘

دوسری طرف منیارڈ اور جوسٹائن کو ڈھونڈنے کی کوششیں جاری تھیں۔ اس ضمن میں ڈیانا بہت فعّال کردار ادا کر رہی تھی۔ صُبح سے شام تک وہ بے حد مصروف رہتی تھی۔ اُس وقت، وہ ایڈیٹر ہلمر کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ دفتر کے خرچ پر ایک طیارہ کرائے پر حاصل کرے اور مختلف جزائر کے اُوپر پرواز کر کے منیارڈ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے وہ اس طرح ہلمر کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ اُسے اپنی جان چھڑانا مشکل نظر آ رہی تھی۔ منیارڈ کی بیوی بھی اُسے ڈھونڈنے کی تگ و دو کر رہی تھی لیکن اُس کا انداز دوسرا تھا۔ اُس نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی کہ منیارڈ اُس کے بچّے کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔

◘

جزیرے کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ 'ناؤ' اور سرکر افراد کا ایک گروہ صُبح سویرے 'شکار' کی تلاش میں نکل جا اور شام کو عموماً خالی ہاتھ واپس آ جاتا ۔۔۔ ایک دو بار انہوا نے مایُوسی کی حالت میں کسی قریبی جزیرے کے ماہی گیر وا پر بھی حملہ کیا تھا لیکن حاصل کچھ نہ ہُوا۔ ضروری اشیا کی قلّ کے پیشِ نظر 'ناؤ' نے چند روز کے لیے راشننگ کا نظا قائم کیا جس سے ایک طبقے میں بغاوت کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ مجبوراً یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ منیارڈ کی ٹانگ اب ٹھیک ہوگئی تھی۔ بیتھ نے بتایا تھا کہ جزیرے کے اردگرد آکٹوپس کے ہم نسل آبی جانوروں کی بہتات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشتی کے بغیر کوئی سمندر میں اُترنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بیتھ اپنے بچّے کے بارے میں بہت محتاط تھی اور ہر وقت منیارڈ سے اس بارے میں سوالات کرتی رہتی تھی منیارڈ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بیتھ ضرور کسی اعلیٰ خاندان کی فرد رہی ہے اور اُسے بچپن میں اغوا کر لیا گیا ہوگا اور اب اپنے ماضی سے وہ بالکل لاعلم تھی لیکن اُس کی رگوں میں دوڑتا ہُوا خُون اُسے مہذّب اور شریفانہ زندگی گزارنے پر اُکسا رہا تھا۔ منیارڈ نے ایک دفعہ اُسے اعتماد میں لے کر فرار ہونے کی بات چھیڑی۔ وہ مشتعل ہوگئی۔ منیارڈ نے محسوس کیا کہ بیرونی دُنیا کے بارے میں ایک انجانا سا خوف اُس کے ذہن پر مسلّط ہو چکا ہے۔ شب و روز

ایک بیزار کُن کیفیت میں گزر رہے تھے۔ ایک اُکتا دینے والا تسلسل تھا۔ بیتھ اُس کی بہت نگہداشت کرتی تھی اور اُس کے آرام کا خیال رکھتی لیکن اس میں دلی لگاؤ کو دخل نہ تھا۔ وہ یہ سب کچھ 'ماں' بننے کے لیے کر رہی تھی۔

فارغ وقت میں منیارڈ فرار کے منصوبے بناتا رہتا۔ اس بار وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ کسی وقت 'ناؤ' کی جھونپڑی میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے جہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ اس بات کا پتہ اُسے صندوق سے ملنے والے کاغذوں سے چلا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر ریڈیو کے ذریعے ایس او ایس کا سگنل نشر کیا جائے تو ہو سکتا ہے ارد گرد کے سمندر میں کوئی جہاز وہ پیغام سُن لے۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا شاید کوئی اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ خود ہی اس خیال کو رد کر دیتا۔ اپنے حلقے میں وہ ایسا اہم آدمی نہیں تھا کہ اُس کی تلاش میں رات دن ایک کر دیے جاتے۔ ہو سکتا ہے ایڈمیٹر ہلمر چند روز پریشان رہا ہو اور پھر کسی اور کو ملازم رکھ لیا ہو۔ اُمید کی ایک مدھم سی کرن اُسے ڈیانا کی صورت میں دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا شفیق اور پُرخلوص چہرہ منیارڈ کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔ وہ سوچتا ڈیانا ضرور اُس کے لیے کوشش کر رہی ہوگی لیکن اس بات کا کیا امکان تھا کہ ان کوششوں کے رنگ لانے تک وہ زندہ رہے گا۔

منیارڈ کی بے حد منّت سماجت کے بعد بیتھ نے ایک دو بار اُسے جوسائن کی شکل دکھائی تھی ــــ اور وہ بھی دُور سے۔ ہر روز شام کے وقت بیتھ اُسے ساحل پر لے جاتی، اُسے نہلاتی، کھانا کھلاتی اور ایک دو گھنٹے کے لیے چہل قدمی کراتی تھی۔ ایک شام منیارڈ نے 'ناؤ' کو تنہا ایک پتھّر پر بیٹھے دیکھا۔ وہ اپنے اُن جوانوں کا انتظار کر رہا تھا جو شکار کی تلاش میں نکلے ہُوئے تھے۔ بیتھ اُس کی زنجیر کھینچتی ہُوئی 'ناؤ' کے قریب سے گزرنے لگی تو منیارڈ رُک گیا۔ 'ناؤ' اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرایا: "تمہاری زندگی کے اب تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں، منیارڈ!" جی بھر کر گھوم پھرا منیارڈ نے اُس کی دھمکی نظر انداز کرتے ہُوئے پُوچھا:

"ناؤ! جن آدمیوں کا تم انتظار کر رہے ہو اگر وہ واپس نہ آئے تو پھر؟"

'ناؤ' مُسکراتے ہُوئے بولا:

"کیوں واپس نہیں آئیں گے؟ اس جزیرے میں تمہاری عمر کے چند ہی بے وقوف ہوں گے جو یہاں سے فرار ہونا چاہتے ہوں ــــ لیکن اُن کے لیے یہ ممکن ہی نہیں۔ آبادی کا بڑا حصّہ امن و سکون کی زندگی گزار رہا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ باہر کی دُنیا کس قدر وحشت ناک ہے۔ عیّاری، دھوکے بازی بھوک اور بدامنی۔ وہ تمہاری دُنیا کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ جزیرہ اُن کے لیے گوشۂ عافیت ہے۔"

منیارڈ نے پوچھا: "تمہارے بعد کون جانشین ہوگا؟"

'ناؤ' مُسکرایا: "مَیں تمہارے سوالوں کا جواب اس لیے دے رہا ہُوں کہ تمہاری زندگی مختصر ہے۔ اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ میرے بعد میرا بیٹا جانشین ہوگا۔ وہ میرا حقیقی بیٹا نہیں ہوگا ــــ حقیقی بیٹا دس برس کی عمر میں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا ــــ اب میرے بیٹے کا کردار تمہارا بیٹا جوسائن ادا کرے گا۔"

وہ ایک آنکھ میچ کر بولا: "مَیں جوسائن کو لے پالک بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہُوں۔"

□

ایک صُبح منیارڈ عجیب قسم کا شور سُن کر جاگ اُٹھا۔ کوئی شخص بڑے تسلسل سے نقّارہ پیٹ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد بیتھ کی آنکھ بھی کھُل گئی۔ اُس نے نقّارے کی آواز سُن کر منیارڈ کو اپنے ساتھ لیا اور بھاگتی ہُوئی جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ وہ پُرجوش انداز میں بولی:

"کوئی بڑا شکار گھیرے میں آیا ہے۔"

کچھ ہی دیر میں وہ ایک کھلی جگہ پہنچ گئے۔ سردار 'ناؤ' اور

سفید بالوں والا بوڑھا ایک اونچے مقام پر بیٹھے تھے۔ اُن کے چاروں طرف لوگ ایک گھیرے کی صورت میں جمع ہو رہے تھے۔ اچانک 'ناؤ' نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور نقارہ خاموش ہو گیا۔ وہ تقریر کرنے کے سے انداز میں بولا:

"بڑی مدت بعد ہمارے باہمت جوانوں کو بہت اچھا شکار ملا ہے۔ ایک چھوٹا جہاز مغرب کی طرف سے سفر کرتا ہوا ہمارے علاقے میں داخل ہوا ہے۔ اُس پر لدے ہوئے سامان کے بارے میں فی الحال ہم کچھ نہیں جانتے۔ اطلاع کے مطابق اُس پر دو درجن افراد موجود ہیں۔ خیال ہے کہ وہ سب کے سب مسلح ہیں۔ کوئی اس مہم پر جانے سے خوفزدہ ہے تو ابھی بتا دے۔"

سب لوگوں نے بلند آواز میں نہیں کہا۔ اُن کے درمیان ایک بہت بڑے برتن میں کوئی نشہ آور مشروب رکھا تھا۔ چھوٹے بڑے سب پیالے بھر بھر کر پی رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ 'ناؤ' نے پھر کہا:

"قانون کے مطابق جو شخص لڑائی میں پیچھے رہے گا، اُسے اُسی جگہ موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔"

پھر وہ سفید بالوں والے کی طرف دیکھنے لگا۔ سفید بالوں والا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ سب لوگ اُسے ہنرونر کہہ کر بلاتے تھے۔ ہنرونر کا لفظ مذہبی پیشوا کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اُس کے کھڑے ہوتے ہی تمام مرد و زن نے اپنے سر زمین کی طرف جھکا دیے۔ وہ دعائیہ انداز میں بولا: "اے میرے آقا! آج کے دن ہماری مدد کر۔ ہماری کشتیوں کو اپنی حفاظت میں رکھ!" تمام لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر آمین کہا۔ پھر وہ سب مشروب پر ٹوٹ پڑے اور پیالے بھر بھر کر پینے لگے۔ بیتھ کے مجبور کرنے پر منیارڈ نے بھی ایک پیالے سے چند گھونٹ لیے۔ اُس کے سینے میں آگ سی بھڑک اُٹھی۔ اچانک اُس کی نظر جوسٹائن پر جا پڑی۔ وہ اپنے ساتھی لڑکے کے ساتھ مشروب پینے میں مصروف تھا۔ منیارڈ کتنی ہی دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا لیکن جوسٹائن اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ منیارڈ یہ سوچ کر سخت پریشان ہو رہا تھا کہ 'ناؤ' جوسٹائن کو بھی اس حملے میں اپنے ہمراہ لے جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد سمندری قزاقوں کا یہ قافلہ چھ کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ ہر کشتی پر چھ افراد سوار تھے۔ 'ناؤ' دونوں لڑکوں جوسٹائن اور مینول کے ساتھ ایک علحدہ کشتی میں سوار تھا۔ اُس کے کہنے پر بیتھ بھی منیارڈ کو لے کر ساتھ چل دی تھی۔ وہ دونوں ایک الگ کشتی میں سوار تھے۔ تمام افراد آہنی اسلحے سے لیس تھے۔ دھوپ بڑی تیز تھی۔ 'ناؤ' کی کشتی سب سے آگے تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سفر کے بعد انہیں جہاز نظر آیا جو بڑا ہی خوبصورت تھا۔ اُس کے بادبان کھلے ہوئے تھے اور آنے والے لمحوں سے بے خبر وہ بڑی روانی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ کشتیوں پر موجود تمام افراد حملے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ دوسرے نمبر پر جانے والی کشتی پر ایک لمبا تڑنگا حبشی کمند کے رسّے درست کر رہا تھا۔ بدقسمت جہاز اب بہت نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اُس کی لمبائی کم از کم سو فٹ تھی۔ بڑے بڑے سُرخ حرفوں میں 'بریگیڈیر' لکھا ہوا تھا۔ کشتیاں ایک نیم دائرے کی شکل میں جہاز کو سامنے سے گھیر رہی تھیں۔ قزاقوں کے چہرے چمک رہے تھے اور نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں نہایت خوفناک ہو گئی تھیں۔ جہاز نے کشتیوں کو سامنے سے ہٹانے کے لیے دو تین بار زور سے ہارن بجایا۔ اُسی لمحے بیک وقت دو کمندیں فضا میں بلند ہوئیں۔ جن میں سے ایک جہاز کے ساتھ اُلجھنے میں کامیاب ہو گئی ۔۔۔ لیکن وہ کمند بھی جہاز کی چکنی دیوار سے پھسل گئی اور اُس کے ذریعے اُوپر چڑھنے والا شخص پُرشور آواز سے سمندر میں گر پڑا۔ جہاز اب تیز رفتاری سے کشتیوں کے گھیرے میں سے نکل رہا تھا۔ کنٹرول رُوم میں جہاز کے اسٹیئرنگ وہیل کے سامنے کھڑا ہوا آدمی صاف نظر آ رہا تھا اور 'ناؤ' اپنی کشتی کے اگلے سرے پر سے دُوربین رائفل سے اُس کا نشانہ لے رہا تھا۔ اُس نے اپنی سانس

روک رکھی تھی اور اُس کی پوری توجہ نشانے پر مرکوز تھی۔ جہاز کی وجہ سے پانی میں بڑی بڑی لہریں پیدا ہوئی تھیں اور کشتی برابر اُوپر نیچے ہچکولے کھا رہی تھی۔ 'ناؤ' نے فائر کر دیا۔ گولی نشانے پر لگی۔ کنٹرول رُوم میں نظر آنے والا آدمی اُلٹ کر پیچھے کی طرف گرا۔ اسٹیئرنگ وہیل آزاد ہو کر تیزی سے دائیں جانب گھومنے لگا۔ حبشی نے اپنی کشتی میں سے ایک چپّو نکالا اور اُس کے ساتھی کشتی کو کھینچتے ہوئے جہاز کے قریب لے گئے۔ اُس نے چپّو بڑی مہارت سے نیزے کے انداز میں پھینکا۔ وہ سیدھا جہاز کی مشینی چرخی میں گھس گیا۔ کڑکڑاہٹ کی زوردار آواز آئی اور چرخی ساکت ہو گئی۔ چند ہی لمحوں میں جہاز کی رفتار صفر ہو گئی اور وہ پانی پر ہچکولے کھانے لگا۔ کمندیں ایک بار پھر فضا میں بلند ہوئیں۔ قزّاق چیختے چلّاتے جہاز پر چڑھنے لگے۔ چند لمحے بعد لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں، پھر ایک دو فائر ہوئے۔

منیارڈ ساکت و جامد اپنی کشتی پر بیٹھا تھا۔ بیتھ اُسے بھرا ہوا ریوالور دیتے ہوئے بولی:

"اُٹھو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاؤ ورنہ 'ناؤ' تمہیں اسی جگہ گولی مار دے گا۔"

پھر وہ خود بھی کمند کے ساتھ لٹک کر تیزی سے اُوپر چڑھنے لگی۔ منیارڈ نے گلے کی زنجیر گردن کے گرد لپیٹی اور بیتھ کے پیچھے چل دیا۔ ایک چاقو کسی جانب سے ہوا میں اُڑتا ہوا آیا۔ منیارڈ نے جلدی سے سر نیچے جھکا لیا۔ چاقو چھپاکے سے پانی میں غائب ہو گیا۔ جہاز کے عرشے پر دو لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک اور مسافر شدید زخمی حالت میں جنگلے کے قریب پڑا تھا۔ اچانک منیارڈ نے بائیں طرف دیکھا۔ 'ناؤ' دونوں لڑکوں جوسٹائن اور مینول کو سہارا دے کر عرشے کے اُوپر چڑھا رہا تھا۔ مینول کے ہاتھ میں کوئی نوائنچ لمبا تار نظر آ رہا تھا۔ اس تار کے دونوں سروں پر لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے بندھے ہوئے تھے۔ منیارڈ کے دیکھتے ہی دیکھتے مینول تیزی سے جہاز کی اندرونی جانب بھاگا۔ پچیس چھبیس سال کی ایک خوفزدہ خاتون دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ مینول نے چھلانگ لگائی اور عورت کو جا لیا ـــــ اُس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تار کو اُس کی گردن کے گرد ایک بل دیا اور زور لگانے لگا۔ خوفزدہ عورت بالکل مزاحمت نہ کر سکی اور چند ہی لمحے میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ منیارڈ نے 'ناؤ' کی طرف دیکھا۔ وہ جوسٹائن کو اُنگلی کے اشارے سے کچھ دکھا رہا تھا۔ ایک تیس بتیس سالہ، لمبے بالوں والا شخص خوفزدگی کے عالم میں بادبان کے رسّے کے سہارے سے اُوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'ناؤ' کے کہنے پر جوسٹائن نے اپنا پستول والا ہاتھ سیدھا کیا۔ وہ اُس شخص کا نشانہ لے رہا تھا۔ صحیح نشانے کے لیے 'ناؤ' نے بھی ایک ہاتھ سے پستول کو سہارا دے رکھا تھا۔ ہوا میں لٹکتا ہوا شخص بڑی بے بسی سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ 'ناؤ' کی آواز آئی:

"دباؤ ٹریگر... آہستہ آہستہ دباؤ۔"

فائر ہوا اور وہ شخص قلابازی کھا کر جہاز کے زیریں عرشے پر جا گرا۔ منیارڈ نے دیکھا جوسٹائن کے چہرے پر عجیب طرح کی خوشی پھیل گئی ہے۔ اتنی دیر میں جہاز کے اندرونی کیبنوں سے لڑائی کی آوازیں آنے لگیں۔ 'ناؤ' جوسٹائن کو اکیلا چھوڑ کر اُس طرف بڑھ گیا۔ منیارڈ بھاگتا ہوا جوسٹائن کے پاس پہنچا۔ "جوسٹائن!" وہ چیخا لیکن جوسٹائن اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اتنے میں بغلی دروازہ کھلا اور ایک شخص ایم۔ ۱۶ کی رائفل لیے کھڑا نظر آیا۔ رائفل کا رُخ جوسٹائن کی طرف تھا۔ منیارڈ کے جسم میں بجلیاں سی کوندیں۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور اُس نے کیبن کا دروازہ پوری طاقت سے بند کر دیا۔ حملہ آور کا بندوق والا بازو دروازے کے اندر آ گیا۔ دو تین گولیاں چھت کو پھاڑتی ہوئی نکل گئیں اور بندوق اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر منیارڈ اُس کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور اپنی زنجیر سے اُس کی گردن دبا دی۔ پھر وہ سانسیں درست کرتا ہوا اُٹھا اور جوسٹائن سے مخاطب

ہُوا:

"بس بیٹے، بہت ہو چکا، اب یہ پستول مجھے دے دو۔"

لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جوسٹائن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہُوا۔ منیارڈ دیکھ رہا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے پستول کا رُخ اُس کے سر کی طرف کر رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے سوچا شاید جوسٹائن مذاق کر رہا ہے لیکن اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی سنجیدگی تھی۔ تب ایک دھماکے کی آواز سُنائی دی۔ منیارڈ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گولی اُس کے کندھے کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ جوسٹائن بلند آواز میں ہنس رہا تھا اور تب منیارڈ نے محسوس کیا کہ وہ نشے میں مدہوش ہے۔ "جوسٹائن! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" منیارڈ چیخا۔ جوسٹائن نے اطمینان سے جواب دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اُس کا نام جوسٹائن نہیں ٹیوبارب ہے۔

منیارڈ نے اُسے اُس کے نئے نام سے پکارتے ہُوئے یاد دلایا کہ وہ اُس کا باپ ہے۔ جوسٹائن نے بے پروائی سے کہا کہ اُس کا باپ مر چکا ہے۔ منیارڈ نے بڑے کرب سے کہا کہ مرا تو نہیں لیکن شاید اب مر جائے۔ اتنے میں اُسے کسی نے آواز دی اور وہ بھاگتا ہُوا باہر نکل گیا۔ منیارڈ نے محسوس کیا کہ جہاز پر لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف 'ناؤ' کے آدمیوں کی فاتحانہ آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

اچانک ان آوازوں کے درمیان منیارڈ کو ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ ہوائی جہاز کی آواز تھی۔ وہ جلدی سے عرشے پر آیا۔ سُورج کی طرف ہاتھ کی اوٹ کر کے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جہاز اُن کی طرف آ رہا تھا۔ منیارڈ نے جلدی جلدی چاروں طرف دیکھا۔ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈ رہا تھا جسے اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ شیشہ یا کوئی چمکدار سکّہ۔ ایک مُردہ شخص کی کلائی پر خوبصورت گھڑی بندھی ہُوئی تھی۔ منیارڈ نے جلدی سے گھڑی اُتاری اور اُسے سُورج کے سامنے ایک خاص زاویے پر رکھ کر حرکت دینے لگا۔

□

ڈیانا کی شبانہ روز کوششوں سے طیارے کا انتظام ہو گیا تھا اور اس وقت بنیارڈ کی سابقہ بیوی 'ڈسیون' ایک پائلٹ کے ساتھ طیارے میں موجود تھی۔ دونوں تقریباً پانچ گھنٹے سے مختلف جزائر کے اُوپر پرواز کر رہے تھے۔ لرکس اور کیکاؤس گروپ کے جزیرے پر اُنہوں نے خاص طور پر توجہ دی تھی۔ ڈسیون کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار ہویدا تھے۔ وہ اس قسم کی کوششوں کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں تھی اور واپس چلنے کی سوچ رہی تھی۔ اچانک دُور نیچے اُسے کوئی چیز چمکتی ہُوئی نظر آئی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بحری جہاز تھا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے وہاں سے کوئی شخص سگنل دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس نے پائلٹ کو اُدھر چلنے کے لیے کہا۔ طیارے نے اپنا رُخ تھوڑا سا تبدیل کیا اور بحری جہاز کی طرف پرواز کرنے لگا۔ دوسری طرف منیارڈ عرشے پر کھڑا برابر گھڑی کو حرکت دے رہا تھا۔ دفعتاً اُس کے پیچھے دروازہ زور سے کھُلا۔ اُسے ایک دھکّا لگا اور وہ لڑھکتا ہُوا فرش پر جا گرا۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے زندگی کی آخری گھڑی آن پہنچی ہو لیکن اُسے کچھ اطمینان ہُوا کہ آنے والے نے اُسے سگنل دیتے ہُوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف دروازے کا پٹ لگنے سے گرا تھا۔ آنے والا 'ناؤ' کا آدمی تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور لحیم شحیم شخص چلا آ رہا تھا۔ دونوں طیارے کی آمد سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے بڑی پھرتی سے عرشے پر پڑی ہُوئی دو لاشیں کھینچ کر چھت کے نیچے کر دیں۔ پھر بحری جہاز کے ڈرائیور کی لاش سیدھی کی اور اُس کے سر پر دھوپ سے بچاؤ کرنے والی چھتری تان دی۔ لحیم شحیم شخص نے منیارڈ کی زنجیر اُس کی گردن کے گرد لپیٹ دی پھر وہ اُس کے گلے میں بازو ڈال کر بڑے دوستانہ انداز میں جنگلے کے قریب بیٹھ گیا۔

"اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مَیں گردن توڑ دوں گا۔" وہ

منیارڈ کو دھمکاتے ہوئے بولا۔

ایلٹی میٹر کے مطابق طیارے کی بلندی سو فٹ تھی اور وہ مزید نیچے آرہا تھا۔ پائلٹ نے ڈیسون سے پوچھا اتنا ٹھیک ہے یا اور نیچے لے آؤں۔ ڈیسون نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ وہ بڑے غور سے جہاز کے عرشے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک شخص عرشے پر کسی چیز سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ دو اور آدمی قریب قریب بیٹھے تھے۔ ایک نے دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں۔ لگتا تھا وہ نشے میں مدہوش ایک دوسرے پر گرے پڑے ہیں۔ طیارہ بحری جہاز کے اوپر سے گزر چکا تھا۔

جہاز کے عملے میں سے صرف پانچ افراد بچے تھے اور وہ پانچوں جوان تھے۔ چار مرد اور ایک عورت۔ وہ جہاز کے عرشے پر قطار میں کھڑے تھے۔ جہاز کا سامان کشتیوں پر لادا جا رہا تھا۔ بیتھ اس کام کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک چیز دیکھ کر لدوا رہی تھی۔ سامان میں کھانے پینے کی اشیا، کپڑے، اسلحہ اور کچھ فلیش لائٹس شامل تھیں۔ ہر قسم کی مشینری، بجلی سے چلنے والی چیزیں اور ادویات جہاز ہی میں چھوڑ دی گئی تھیں۔ جبٹی کے چہرے پر ایک گہرا زخم نظر آرہا تھا۔ اس نے لڑکی سے دست درازی کی کوشش کی تھی اور اس نے اسے کاٹ کھایا تھا۔ ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے 'ناؤ' سے پوچھا۔

"ہم لوگ کہاں ہیں اور تم کون ہو؟"

'ناؤ' نے جواب دیا:

"ہمیں صرف تمہارے سامان سے غرض ہے۔ اس کے بعد ہم تمہیں روانہ کر دیں گے۔"

منیارڈ نے دیکھا کہ چاروں افراد نے ایک دوسرے پر نگاہ ڈالی تو ان کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اسے ان کی حماقت پر غصہ آیا۔ وہ اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی لاشیں دیکھ رہے تھے اور پھر بھی سمجھتے تھے کہ بچ کر نکل جائیں گے۔ سفید بالوں والا آدمی آگے بڑھا۔

"تم لوگوں کا سامان کہاں ہے؟" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ان میں سے ایک شخص نے جو لیڈر معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھ کر کہا: "کون سا سامان؟ دوست! سارا سامان تو تم لوٹ چکے ہو۔"

'ناؤ' نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے جواب دینے والے کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر بیرونی دیوار کے اوپر رکھ دی پھر اس کا چاقو والا ہاتھ بلند ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، اس کی انگلی ہاتھ سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ انگوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹنڈ نظر آرہا تھا جس میں سے تیزی کے ساتھ خون ابل رہا تھا۔ زخمی شخص کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو گیا۔

"کہاں ہے تمہارا اصل سامان؟" 'ناؤ' دہاڑا۔

پانچوں خاموش تھے۔ 'ناؤ' نے حبشی کو اشارہ کیا۔ وہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی "نہیں... نہیں"۔ حبشی نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر دے مارا۔ وہ الٹے پاؤں جنگلے سے جا ٹکرائی۔

"بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں"۔ وہ چیخی۔ "نیچے تہ خانے میں ہے۔" اس نے تہ خانے کا راستہ بتایا۔ "کس قسم کا سامان ہے؟" 'ناؤ' نے پوچھا۔ "کوکین... ہم اسے بیچنے جا رہے تھے۔" لڑکی ہکلائی۔ 'ناؤ' نے منیارڈ کی طرف دیکھا۔ منیارڈ نے اس کی نظروں کا سوال سمجھتے ہوئے کہا:

"کوکین ایک قسم کی نشہ آور دوا ہے۔ لوگ اسے سکون حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"

لڑکی اب رحم طلب نظروں سے منیارڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کو منیارڈ میں تہذیب کی جھلک دکھائی دی تھی۔ منیارڈ اسے کیسے بتاتا کہ وہ بھی ان ہی کی طرح ایک بے بس قیدی ہے۔ لڑکی ان سب میں سمجھدار نظر آئی تھی اور وہ اپنے گرد موت کے منڈلاتے ہوئے سائے محسوس کر چکی تھی۔ اس نے کہا:

"آپ لوگ ہم سے سودا کرلیں۔ یہ کوکین بے حد قیمتی ہے۔"

'ناؤ' لڑکی کی بات سمجھ نہیں سکا۔ منیارڈ نے اُس کی ترجمانی کرتے ہُوئے کہا: "وہ کہہ رہی ہے کہ تہ خانے میں جو دوا ہے وہ نہایت قیمتی ہے۔ وہ چاہتی ہے اُن کے ساتھ سودا کرلیا جائے۔" ناؤ نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ وہ بولا:

"یہ ہمارے قبضے میں ہیں، ان کے اسلحے اور جہاز پر بھی ہمارا قبضہ ہے۔ سودا کس بات کا؟"

اتنے میں تین چار افراد کوکین سے بھرے ہُوئے تھیلے اُٹھائے عرشے پر پہنچ گئے۔ 'ناؤ' نے ایک تھیلا پھاڑ ڈالا، پھر سفید رنگ کا سفوف چکھا۔ منیارڈ نے بتایا اسے سُونگھتے ہیں۔ اُس نے ایک چٹکی سفوف سُونگھا۔ اُسے کچھ محسوس نہ ہُوا تو وہ بیزاری سے بولا:

"پھینک دو اس کو سمندر میں۔"

اُس کے آدمیوں نے کوکین کے تھیلے سمندر میں پھینکنے شروع کردیے۔ قیدیوں میں سے ایک چیخا: "یہ کیا کر رہے ہو؟ تمہیں اس کی قیمت کا اندازہ نہیں۔" 'ناؤ' کے آدمی اپنے کام میں لگے رہے۔ اُنہوں نے تمام تھیلے سمندر میں پھینک دیے۔ 'ناؤ' اب اُن پانچوں کی طرف مُڑا: "دوستو! اب سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ اس کا حساب آگے جا کر ہوگا۔ ہم تمہارے سفر کو زیادہ دشوار نہیں بنائیں گے۔" اُس نے ہنرو نر کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے سفید بالوں کو سنوارتا ہُوا آگے بڑھا۔ اُس نے ایک طویل مذہبی دُعا پڑھنی شروع کی۔ 'ناؤ' بے چینی سے اپنی جگہ پہلو بدل رہا تھا۔ جب دُعا ختم ہُوئی تو اُس نے حبشی کو اشارہ کیا۔ حبشی خوفناک انداز میں بازو پھیلا کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہُوئی تھیں۔ پلک جھپکتے میں اُس نے لڑکی کو دبوچ لیا اور ہاتھ میں پکڑا ہُوا باریک تار اُس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں لڑکی کی گردن ہڈی تک کٹ گئی۔

'ناؤ' نے پھر جوسٹائن کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا پستول نکالے پُرشوق انداز میں آگے بڑھا۔ اُس نے اُنگلی کٹے ہُوئے شخص کا نشانہ لیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو تھامے ہُوئے سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ جوسٹائن کی گولی نے اُس کی آنکھوں کے عین درمیان سوراخ کردیا۔ پھر 'ناؤ' آگے بڑھا۔ اُس کا وزنی کلہاڑا تین بار دھوپ میں چمکا اور تینوں افراد ڈھیر ہو گئے۔ 'ناؤ' نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی جہاز کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ اُس نے مینول سے کہا:

"جوسٹائن کو ساتھ لے لو اور جہاز کو ڈبو دو۔" مینول نے بڑی فرمانبرداری سے سر جُھکایا اور جوسٹائن کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہُوئے نیچے اُتر گیا۔ اب وہ سب کے سب اپنی کشتیوں پر آچکے تھے اور جہاز سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے لڑکوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاز پانی پر بالکل ہموار کھڑا تھا۔ تب منیارڈ نے محسوس کیا کہ اُس کا سامنے والا حصّہ دھیرے دھیرے پانی میں غائب ہونے لگا ہے۔ دونوں لڑکے جہاز کے عرشے پر نظر آئے پھر وہ رسّے کی سیڑھی کے ذریعے جلدی جلدی اُترے اور 'ناؤ' کی کشتی میں سوار ہو گئے۔ اب جہاز کا پچھلا حصّہ بھی پانی میں ڈُوبنے لگا تھا۔ جلد ہی وہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔ دس منٹ بعد پُورا جہاز ایک طویل گونج کے ساتھ سطحِ آب کے نیچے چلا گیا۔ اب وہاں پانی کے بلبلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

□

شام کے جھٹپٹے میں وہ سامان سے لدی ہُوئی کشتیاں لے کر جزیرے کے ساحل پر اُترے۔ منیارڈ اور بیتھ کی کشتی بھی کنارے پر لگی۔ ساتھ ہی ایک اور کشتی کھڑی تھی جو پہلے یہاں موجود نہیں تھی۔ کچھ دُور ایک شخص لینن کا سُوٹ پہنے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی پتلون کے پائنچے چڑھا رکھے تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے منیارڈ اُسے پہچان ہی نہ سکا۔ وہ ونڈسر تھا۔ وہی ونڈسر جس کی کشتی پر سوار ہو کر وہ مچھلیاں پکڑنے نکلے

تھے اور اس منحوس جزیرے پر پہنچ گئے تھے۔ ونڈسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ناؤ کی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ ناؤ نے اُٹھ کر گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا۔

"کیا لائے ہو اس بار؟" ناؤ نے پوچھا۔

"دو کلو پاؤڈر اور تمہارے جسموں کو صاف کرنے والی دوائی۔"

"بہت خوب۔" ناؤ نے کہا۔

"شراب کی کمی تو آج ہم نے پوری کر لی۔ باقی چیزیں تم لے آئے ہو۔"

'ناؤ' اُسے آج کے ڈاکے کی تفصیلات بتانے لگا۔ اچانک ونڈسر کی نظر جوسٹائن پر جا پڑی اور اُسے فوراً پہچان گیا۔ اُس نے جوسٹائن کو اپنے پاس بُلایا اور اُس کا حال دریافت کیا۔ پھر اُس کی نگاہ منیارڈ کی طرف چل گئی۔ وہ بیتھ کے ہمراہ کشتی سے اُتر کر جزیرے کی طرف آ رہا تھا۔ ونڈسر اُس کے پاس گیا اور منیارڈ اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ونڈسر نے حیرانی سے پوچھا: "تم ابھی تک زندہ ہو... یہ کیسے ممکن ہُوا؟ تم بار بار کے منع کرنے کے باوجود ادھر آ نکلے۔ اب وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ کہتے ہُوئے وہ 'ناؤ' کی جھونپڑی کی طرف واپس چلا گیا۔

بیتھ نے اُس کی زنجیر کھینچی اور وہ آگے چل دیے۔ آہستہ آہستہ جزیرے کی فضا پر کیف و سرور طاری ہو رہا تھا۔ بیتھ اُسے جھونپڑی میں لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد اُن کے حصّے کا مال بھی وہاں پہنچ گیا۔ بیتھ کو جزیرے کے قانون کے مطابق خاص اہمیت حاصل تھی۔ لُوٹ مار کے مال میں اُس کا حصّہ بھی عام شرح سے زیادہ تھا۔ اُن کی جھونپڑی خوراک، لباس اور شراب سے بھر گئی۔ بیتھ کا مُوڈ بڑا خوشگوار تھا۔ وہ دونوں سیر کے لیے ساحل کی طرف چل دیے۔ پُورا جزیرہ دادِ عیش دے رہا تھا۔ واپسی پر اُنہیں 'ناؤ' اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھا دکھائی دیا۔ لوگ اُس کے ساتھ ایک خاص مشروب پی رہے تھے۔

قریب سے ایک نسوانی چیخ سُنائی دی۔ کوئی عورت درد سے بے تاب ہو کر چیخی تھی۔ 'ناؤ' فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ اُس جھونپڑی کی طرف بڑھے جہاں سے آواز آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لمبے تڑنگے وحشی کو لے کر باہر آ گئے۔ 'ناؤ' نے سخت لہجے میں کہا: "جیکی! تمہیں معلوم ہے ہمارے قانون کے مطابق عورت پر تشدد کرنا جُرم ہے۔" وہ بہانے بناتا رہا۔ اتنے میں عورت 'ناؤ' کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اُس نے کہا: "اولونائز! یہ غلط کہہ رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس نے مجھے سونے کا ہار دینے کا وعدہ کر رکھا ہے اور اسے ٹالتا رہتا ہے۔ آج میں نے اصرار کیا تو وہ مجھے مارنے پر اُتر آیا۔" ہار کے ذکر پر 'ناؤ' چونک اُٹھا۔ "جیکی! جہاں تک مجھے علم ہے تمہارے پاس کبھی سونے کا ہار نہیں تھا۔ کہاں ہے وہ ہار؟" جیکی کے چہرے پر سراسیمگی پھیلنے لگی۔ 'ناؤ' کے ہاتھ میں اب پستول نظر آ رہا تھا۔ اُس کا رُخ جیکی کی پیشانی کی طرف تھا۔ "میں پُوچھتا ہُوں کہاں ہے وہ ہار؟" جیکی خاموش کھڑا رہا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اُس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا اب کیا ہونے والا ہے۔ اُس کا ہاتھ آہستہ آہستہ جیب کی طرف گیا۔ ناؤ نے ہزونر کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور اُس نے حبشی کی جیب سے ہار نکال لیا۔ ناؤ نے اُس کا معاینہ کرتے ہُوئے کہا: "تم میرے بچپن کے ساتھی ہو جیکی! لیکن تمہیں خوب معلوم ہے کہ چوری کی سزا کیا ہے۔" اُس کا پستول والا ہاتھ سیدھا ہُوا۔ ہلکا سا دھماکا ہُوا اور جیکی کی دونوں آنکھوں کے درمیان سوراخ ہو گیا۔ وہ مُردہ چھپکلی کی طرح زمین پر جا گرا۔ دو آدمی آگے بڑھے اور اُس کی لاش کو گھسیٹتے ہُوئے ایک طرف لے گئے۔ دھماکے کی آواز سُن کر ڈاکٹر ونڈسر جھونپڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ 'ناؤ' نے اُس کو ساری بات بتا دی۔

شراب کا دور پھر چلنے لگا اور ایک لڑکے اور عورت کے درمیان کشتی کا سلسلہ چل نکلا۔

منیارڈ، ونڈسر کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے دبی آواز میں پُوچھا کہ ان لوگوں سے اُس کا رابطہ کیسے ہُوا۔ ونڈسر نے لڑائی دیکھتے دیکھتے کہا:

"یہ آج سے تیس برس پہلے کی بات ہے۔ سفر میں میری کشتی خراب ہوگئی اور مجھے تیر کر اس جزیرے پر آنا پڑا۔ جزیرے پر اُترنے کے باوجود میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے بہت جلد اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ اجنبیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ کوئی پندرہ روز اس جزیرے میں چھُپا رہا۔ پھر ایک روز میں نے ایک شخص کو قتل کیا اور اُس کی لاش کے سہارے تیرتا ہُوا ساحل سے دُور نکل گیا۔ راستے میں لاش ایک شارک ہڑپ کر گئی اور میں بغیر سہارے کے تیرتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میری ہمت جواب دے جاتی ایک کشتی نے مجھے دیکھ لیا۔ یُوں میں واپس اپنے شہر چلا گیا۔ لیکن میں نے کسی کو ان لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا مجھے ان کا رہن سہن پسند آیا تھا۔ ان کا معاشرہ میرے خوابوں کی تعبیر تھا۔

میں تفریح کے لیے آنے والوں کو کشتیاں فراہم کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں خود بھی سمندر میں بہت آگے نکل جاتا۔ میں جزیرے کی طرف سفر کرنے والی لہروں کے دوش پر کچھ تحائف روانہ کرتا رہتا۔ اُن میں الکحل، کھانے کی اشیا اور بعض اوقات زیورات بھی ہوتے تھے۔ مجھے معلوم تھا اُن میں سے بہت سی چیزیں جزیرے کے ساحل پر پہنچ جاتی ہیں۔ ان تحائف کے ساتھ میں پیغامات بھی روانہ کرتا رہتا۔ ان پیغامات کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں دوستی کا خواہاں ہُوں۔ آخر کار میری ان طفلانہ کوششوں کا نتیجہ برآمد ہُوا اور اولونائز نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کھُلے سمندر میں ہماری ملاقات ہُوئی۔ میں نے اولونائز کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو اُس نے قبول کر لیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اولونائز اور اُس کے مشیر یہ سمجھتے تھے کہ اگر اُنھوں نے زیادہ دیر مجھے نظر انداز کیا تو میں مایُوس ہو کر اُن کا راز فاش کر دوں گا۔"

منیارڈ غور سے اُس کی کہانی سُن رہا تھا کہ اُس کی توجہ سامنے ہونے والی لڑائی کی طرف مرکوز ہوگئی۔ عورت اور لڑکا لڑ لڑ کر بے حال ہو چکے تھے۔ دونوں کے لباس تار تار تھے اور جسم کے مختلف حصّوں سے خون نکل رہا تھا۔ پھر اچانک عورت نے ایک داؤ لگایا اور لڑکے کو نیچے گرا دیا اور اپنے دانت پُوری قوّت سے اُس کے نرخرے میں گاڑ دیے۔ لڑکے کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ منیارڈ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو عورت فاتحانہ انداز میں میدان کا چکّر لگا رہی تھی اور دو آدمی نیم سالہ لڑکے کی لاش گھسیٹ کر باہر لے جا رہے تھے۔

تالیوں کی گونج میں ناؤ نے اعلان کیا کہ بیتھ ایک اہم انکشاف کرنے والی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اور مُسکراتے ہُوئے بولی:

"ساتھیو! میں منیارڈ کے بچّے کی ماں بننے والی ہُوں۔"

محفل کے شرکا نے بے پناہ خوشی اور جوش کا اظہار کیا۔ ہزونر کہہ رہا تھا: "کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ صبح ۵ بج کر ۲ منٹ پر تمہیں اگلے سفر پر روانہ کر دیا جائے گا۔"

منیارڈ اگلے سفر کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ اُس کے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے چور نظروں سے بیتھ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے حال میں مگن تھی۔ اُس نے ایک دفعہ بھی منیارڈ کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ دھیرے دھیرے سب سو گئے اور ناؤ بھی اپنی جگہ ٹیک لگا کر خراٹے لینے لگا۔ اب کچھ کرنے کا وقت تھا۔ شاید یہ آخری موقع تھا۔

وہ آہستہ سے اُٹھا۔ کسی شخص کی پتلون لٹک رہی تھی۔

اُس کی پیٹی میں ابھی تک خنجر اُڑسا ہُوا تھا۔ اُس نے خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا اور جوسٹائن کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا دوسرا لڑکا مینول بھی اُس کے ساتھ ہوگا لیکن وہ ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا ضرورت پڑنے پر وہ مینول کو بے ہوش یا ہلاک بھی کر سکتا تھا۔ اُس نے جھونپڑی کے دروازے پر کان لگا دیے۔ دونوں لڑکے سو رہے تھے۔ وہ پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہُوا۔ اُس نے چاند کی مدھم روشنی میں جوسٹائن کو پہچان لیا اور آہستہ آہستہ اُس کا بازو ہلایا تو وہ جاگ اُٹھا:

"کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟" جوسٹائن بولا۔

"منیارڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا: "مَیں تمہارا ڈیڈی ہُوں ... آہستہ بولو ورنہ یہ لڑکا جاگ جائے گا۔"

"کیا بات ہے؟ کیا کرنے آئے ہو تم یہاں؟" جوسٹائن جان بُوجھ کر اُونچی آواز میں بولنے لگا۔ اتنی دیر میں مینول بیدار ہو گیا۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی پُوری طرح سویا ہی نہیں تھا۔ وہ اُن کی تمام باتیں سُنتا رہا تھا۔ منیارڈ کو محسوس ہُوا جیسے ابھی جوسٹائن مدد کے لیے چیخنے لگے گا لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مینول اپنی جگہ سے اُچھلا اور سیدھا جوسٹائن کے اُوپر گر پڑا۔ اُس نے دونوں کو اندھیرے میں گتھم گتھا ہوتے دیکھا۔ چند لمحے بعد مینول، جوسٹائن کے اُوپر سے اُٹھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رسّی تھی۔ شاید اُس نے اس رسّی سے جوسٹائن کی گردن دبا دی تھی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا، لڑکے!" منیارڈ نے حیرت سے کہا۔

"کچھ نہیں، تھوڑی دیر کے لیے سو گیا ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گا ... تم اسے فوراً کندھے پر لادو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" اُس نے منیارڈ کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ منیارڈ، جوسٹائن کو کندھے پر لادے اُس کے پیچھے چل دیا۔ ایک مخصوص راستے پر چلتا ہُوا وہ کھاڑی تک لے آیا۔ دائیں طرف درختوں کے درمیان ایک کشتی موجود تھی۔ منیارڈ نے جوسٹائن کو کشتی میں لٹا دیا۔ پھر وہ لڑکا چپّو لینے کے لیے قریبی جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ اب پُوری بات منیارڈ کی سمجھ میں آرہی تھی۔ مینول دراصل جوسٹائن سے رقابت رکھتا تھا۔ جوسٹائن کی آمد سے قبل 'ناؤ' کی نظروں میں اُس کی بہت اہمیت تھی جو اب کم ہو گئی تھی۔ کچھ دن پہلے 'ناؤ' نے جوسٹائن کو مُنہ بولا بیٹا بھی بنا لیا تھا۔ اب یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ جوسٹائن ہی 'ناؤ' کا جانشین بنے گا۔ مینول کے دل میں پیدا ہونے والے حسد کے اس جذبے نے منیارڈ کی مشکل آسان کر دی تھی۔ اب وہ باپ بیٹے کو فرار ہونے کا موقع دے رہا تھا۔

ایک طویل چیخ نے منیارڈ کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ جوسٹائن کشتی پر کھڑا ہے اور زور زور سے چیخ رہا ہے ... "خطرہ ... خطرہ" پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جھونپڑیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہُوا۔ مینول چپّو لے کر اُس کی طرف آرہا تھا۔ اُس نے جب جوسٹائن کو چیختے دیکھا تو چپّو پھینک کر وہیں سے واپس چلا گیا۔ منیارڈ کے لیے تنہا فرار ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے چپّو لیے اور کشتی میں آکر بیٹھ گیا۔ اب وہ پُوری قوّت سے چپّو چلاتا ہُوا ساحل سے دُور ہٹ رہا تھا۔ چاند کی روشنی دُور دُور تک پھیلی ہُوئی تھی اور وہ تیزی سے سمندر کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس نے بادبان کھول دیے کیونکہ ہوا موافق تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُسے کسی خرابی کا احساس ہُوا۔ کشتی میں تیزی سے پانی داخل ہو رہا تھا۔ کشتی کے کئی تختے اُکھڑے ہُوئے تھے اور درزوں میں گتے کی راب بھر دی گئی تھی۔ مینول نے سارے پتّے اپنے ہاتھ میں رکھے تھے۔

منیارڈ نے ایک سردِ آہ بھری اور کشتی پر سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب وہ تیرتا ہُوا جزیرے کی طرف جا رہا تھا۔

□

منیارڈ کی اسسٹنٹ ڈیانا اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ پچھلے دنوں واشنگٹن گئی اور اُس کی ملاقات سینٹ کے ایک اہم رکن سے ہوئی تھی جو منیارڈ کی تحریروں کا زبردست مدّاح تھا۔ اُس نے ڈیانا کو اپنے تعاون کا پورا پورا یقین دلایا تھا۔ نتیجے میں ساحلی پولیس حرکت میں آگئی تھی۔ ایک فوجی بجرے میں دس محافظوں کا ایک دستہ فلوریو کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ اُن کا رُخ کیکاؤس جزائر کی طرف تھا۔

□

منیارڈ جزیرے کی کھاڑی میں ایک چھوٹے سے گڑھے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی اُس نے اپنے اُوپر ریت اور مٹی ڈالنی شروع کر دی تھی۔ اب صرف اُس کا سر ننگا تھا۔ دُھوپ نکلنے کے ساتھ ہی مچھروں نے اُس پر یلغار کر دی۔ اُس نے لیٹے لیٹے ہاتھ اُوپر اُٹھایا۔ اُس کے سر پر بیری کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے کچھ بیر توڑے، ہاتھوں میں بھینچ کر اُن کی لئی سی بنائی اور مُنہ پر اُس کا لیپ کر لیا۔ اب وہ مچھروں سے بڑی حد تک محفوظ ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ ناؤ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساحل پر کھڑا تھا۔ منیارڈ اپنی جگہ پر بالکل ساکت ہو گیا۔ ناؤ کا نائب کہہ رہا تھا:

"اوہ نائز! ہم نے اُس کا تعاقب کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے کشتی پانی میں ڈُوب گئی۔ ہم بڑی دیر یہاں کھڑے رہے لیکن کہیں اُس کے آثار دکھائی نہ دیے۔ ویسے بھی وہ نشے میں تھا۔ میرا خیال ہے وہ کشتی کے ساتھ ہی ڈُوب گیا ہے۔"

ناؤ نے اُسے تلاش کرنے کا حکم دیا۔

جوسٹائن نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ وہ تلاش کے سلسلے میں بڑا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام لوگ اُن ٹیلوں کی طرف چلے گئے جہاں چھوٹے بچّوں کے لیے جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ جب سب چلے گئے اور کھاڑی خالی ہو گئی تو منیارڈ نے اپنے جسم پر سے ریت ہٹائی اور جھاڑیوں میں رُوپوش ہو گیا۔ تمام لوگ کسی جانور وغیرہ کو ہنکانے کے انداز میں ایک طویل قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ قطار جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی تھی۔ اُن کے ہاتھوں میں چھوٹی تلواریں اور کلہاڑیاں تھیں۔ ناؤ اُونچی آواز میں احکام دے رہا تھا۔ منیارڈ اُن کے آگے آگے بھاگ رہا تھا اور کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا لیکن زمین اُس پر تنگ ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک دو جگہیں چھُپنے کے لیے چُنیں لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ اب وہ ساحل کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ منیارڈ کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ اُس نے گھاس کی ایک نلکی نما ڈنڈی توڑ لی تھی۔ آخری قدم کے طور پر اُس نے سوچا تھا کہ پانی میں چھلانگ لگا دے گا اور تہ میں چھُپ کر نلکی کے ذریعے سانس لینے کی کوشش کرے گا۔ اب وہ بالکل کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پانی میں چھلانگ لگاتا، اُسے ہارن سُنائی دیا۔ ہارن دو بار وقفے وقفے سے بجایا گیا تھا۔ منیارڈ کے چہرے پر خُون کی سُرخی دوڑ گئی۔ یہ کسی جہاز کی آواز تھی جسے سُنتے ہی اُس کے تعاقب میں آنے والے ٹھٹک کر ٹھہر گئے۔ پھر چند آوازیں آئیں اور سب لوگ کھاڑی میں پہنچ گئے۔ منیارڈ نے ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ سے جہاز کو دیکھا۔ وہ اندازاً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ پھر بھی وہ اُسے پہچان گیا۔ وہ ساحلی فورس کا جہاز تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور چیختا چلّاتا ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور گھنے درختوں میں سے ہوتا ہوا کھاڑی کی طرف بڑھتا گیا۔ اچانک اُسے ناگوار سی بُو محسوس ہوئی۔ وہ ٹھٹک کر اُس جگہ رُک گیا۔ کچّا گوشت

اور مُردار مچھلیاں کھانے کی وجہ سے جزیرے کے لوگوں کے جسم سے ناگوار سی بُو اُٹھتی رہتی تھی۔ اُس نے اُچک کر دیکھا۔ صرف تین گز کے فاصلے پر 'ناؤ' اور ونڈسر ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ اگر منیارڈ نے ایک قدم بھی اور بڑھایا ہوتا تو دونوں اُسے دیکھ لیتے۔ ونڈسر 'ناؤ' کو سمجھا رہا تھا کہ یہ ایک فوجی جہاز ہے۔ اس پر حملے کا مطلب ہے یونائیٹڈ سٹیٹس سے براہِ راست ٹکر۔ 'ناؤ' اُس کے خدشات جُھٹلا رہا تھا اور دُوربین کے ذریعے بڑی للچائی ہُوئی نظروں سے جہاز کو تک رہا تھا۔ منیارڈ نے اُسی سمت میں دیکھا۔ دُھوپ میں جہاز کی دیوار پر 'نیو ہوپ' کے الفاظ چمک رہے تھے۔ اُس کے رُخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جزیرے سے آدھ میل کے فاصلے سے نکل جائے گا۔ وہ تقریباً ۲۰ ناٹ کی رفتار سے اپنے راستے پر گامزن تھا۔ منیارڈ حرکت میں آیا۔ اب وہ بڑی احتیاط سے بھاگتا ہُوا اُس میدان کی طرف جا رہا تھا جہاں رات ناؤنوش کی محفل جمی تھی۔ اُس نے وہاں سے رم کی بوتلیں اور کچھ پُرانے کپڑے جمع کیے۔ مشروب کے بڑے برتن کے نیچے ابھی تک کوئلے سُلگ رہے تھے۔ عین اُس وقت جب جہاز اُس کی نظروں سے اوجھل ہونے والا تھا وہ ایک خوفناک دھماکہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

◘

فلوریو، جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ ایک چھوٹی موٹر بوٹ پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ لیفٹیننٹ مولڈ اور پنکس موٹر بوٹ پر سوار ہو چکے تھے۔ فلوریو نے کہا ایک رائفل مَین کو بھی ساتھ لے جائیں۔ مولڈ نے اپنے ہولسٹر کو تھپتھپاتے ہُوئے کہا: "یہ کافی ہے"۔ وہ ایک ویران اور دُور دراز جزیرہ تھا جہاں سے دھماکے کی آواز آئی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ زخمی ہو گئے ہوں ـــ اور اُنہیں مدد کی ضرورت ہو۔ یہی سوچ کر فلوریو نے یہ موٹر بوٹ جزیرے کی طرف روانہ کی تھی۔ مولڈ اور پنکس کھاڑی پر پہنچے تو اُنہیں وہاں دوسری کشتیاں بھی نظر آئیں۔ اُنہوں نے زور زور سے آوازیں دیں "کوئی ہے؟ کوئی ہے؟" جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ ایک جگہ اُنہیں وُوڈکا کی ٹوٹی ہُوئی بوتل نظر آئی۔ دونوں متعجّب نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے آگے بڑھنے لگے۔ اچانک اُنہیں کسی عورت کے گانے کی آواز سُنائی دی۔ چھوٹی سی خالی جگہ پر ایک عورت دھوئے ہُوئے کپڑے ٹہنیوں پر پھیلا رہی تھی۔ اُس نے ایک نہایت قیمتی ریشمی اسکرٹ پہن رکھا تھا اور چہرے پر کسی سیاہ روغن کا لیپ کر رکھا تھا۔ پنکس نے اُسے اپنی طرف متوجّہ کیا۔ اُس کی آنکھوں میں غُصّے اور نفرت کے آثار پائے جاتے تھے۔

"کیا اس جزیرے پر اور لوگ بھی ہیں؟" مولڈ نے پُوچھا۔

"ہاں" عورت نے جواب دیا۔

اردگرد کی جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہُوئی۔ مولڈ اور پنکس نے دیکھا اُن کے چاروں طرف مسلّح افراد کھڑے ہیں۔ اُن کے بال بڑھے ہُوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ تھیں اور جسموں سے ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔

◘

منیارڈ کھاڑی کے قریب ایک جھاڑی میں چھُپا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ موٹر بوٹ پر ایک ایک کر کے آدمی سوار ہو رہے تھے۔ دونوں ساحلی محافظ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ منیارڈ حیران تھا کہ 'ناؤ' کے بغیر یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ پھر اُس نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ 'ناؤ' اور اُس کا ایک ساتھی ساحلی محافظوں کی وردی میں ملبوس ہیں۔ ونڈسر کی آواز اُسے صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ 'ناؤ' کو اس جہاز پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ 'ناؤ' نے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور ونڈسر کے سینے میں دل کے مقام پر گھونپ دیا۔

"بُزدلوں کے لیے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں"۔ اُس

کی آواز آئی۔

موٹر بوٹ جہاز کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ ونڈسر یت پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ منیارڈ دیکھ چکا تھا کہ جوسٹائن بھی موٹر بوٹ میں سوار ہوا ہے۔ اب وہ جلد از جلد جہاز تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نکلا اور کھاڑی کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر اُس نے چپّو سنبھالے ہی تھے کہ کسی کے کپڑوں کی سرسراہٹ اور قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے سر اُٹھایا۔ سامنے بیتھ کھڑی تھی۔ "خدا حافظ!" وہ بولی۔ منیارڈ جانتا تھا کہ اس کے بعد گولی کی آواز آئے گی اور اُس کے سر میں سوراخ ہو جائے گا۔ وہ کسی بچّے کی طرح ڈر کر نیچے جُھکا لیکن ... دھماکا نہیں ہُوا۔ اُس نے دیکھا بیتھ کے ہاتھ خالی ہیں، اُس کی آنکھوں میں چمک ہے، شاید آنسوؤں کی۔

"اُس نے کہا "جلدی نکل جاؤ ورنہ کوئی محافظ پہنچ جائے گا۔"

"خُدا حافظ!" منیارڈ بولا اور تیز تیز چپّو چلاتا ہُوا ساحل سے دُور ہٹنے لگا۔

□

فلوریو عرشے پر کھڑا تھا۔ اُس نے ایک سپاہی سے پُوچھا "کیا دیکھا تم نے؟" سپاہی نے دُوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہُوئے کہا۔ "دونوں افسر واپس آ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں اور دو بچّے بھی لانچ میں موجود ہیں۔" فلوریو نے کہا۔

"یہ تو کوئی سنسنی خیز کہانی معلوم ہوتی ہے۔ تم کیمرہ مینوں سے کہو اگر وہ فلم بنانا چاہیں تو اُوپر آ جائیں۔" تھوڑی ہی دیر بعد ٹی وی کے دو کیمرہ مین لانچ کی آمد فلمانے لگے۔ لانچ جہاز کے پہلو سے آ لگی۔ فلوریو نے جنگلے پر رُکتے ہُوئے کہا: "کیا خبر ہے، مولڈ؟"

مولڈ! "خاموش تھا۔ فلوریو نے دو تین آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ جہاز سے سیڑھی لٹکائی جا چکی تھی۔ فلوریو سیڑھی پر پاؤں رکھ کے چند گز نیچے آیا۔

"کیا معاملہ ہے؟ مولڈ!"

مولڈ سر جُھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے جھٹکے کے ساتھ سر اُٹھایا اور چیخ مار کر فلوریو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ فلوریو موٹر بوٹ پر جا گرا۔ لانچ کے تمام افراد تیزی سے جہاز پر چڑھنے لگے۔

منیارڈ جہاز کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اُوپر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس نے اپنی کشتی جہاز کے لنگر سے باندھی۔ پھر وہ لنگر کی زنجیر کے سہارے اُوپر پہنچ گیا۔ اُس نے بیرونی دیوار سے سر نکال کر دیکھا۔ بالائی عرشہ خالی تھا۔ ہر قسم کے خدشات کو بالائے طاق رکھ کر وہ عرشے پر اُتر گیا۔ فائرنگ تھم چکی تھی۔ منیارڈ لڑائی کے انجام سے ناواقف تھا۔ زیریں عرشے سے سامان گھسیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اُسے ایک قہقہہ سُنائی دیا... وہ جان گیا کہ لڑائی کس نے جیتی ہے۔ وہ 'ناؤ' کا قہقہہ تھا۔ اُس نے 'برج' کی اوٹ سے جھانکا۔ نچلے عرشے پر چھ افراد قطار میں کھڑے تھے۔ اُن میں پانچ فوجی اور ایک موریلین تھا۔ ایک فوجی قریب ہی اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ وہ شدید زخمی دکھائی دیتا تھا۔

دو آدمی ریوالور تانے کھڑے تھے۔ قریب ہی 'ناؤ' کے پہلو میں جوسٹائن کھڑا تھا۔ کچھ آدمی جہاز کا سامان کشتیوں پر اُتارنے میں لگے ہُوئے تھے۔ ہزونر اپنی طویل دُعا شروع کر چُکا تھا۔ 'ناؤ' بے چینی سے اپنے ہاتھ میں ریوالور گھما رہا تھا۔ وقت بڑا کم تھا۔ منیارڈ نے ارد گرد نظر دوڑائی اور پھر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ رینگتا ہُوا لوہے کی سیڑھی کے پاس پہنچا۔ پھر آہستہ آہستہ اُترتا ہُوا نیچے آ گیا۔ وہ اب ایک انتہائی جدید اور طاقت ور مشین گن کے سامنے کھڑا تھا۔ ایمونیشن کا ایک بڑا ڈلّا مشین گن سے منسلک تھا۔ وہ اُس کے عقب میں لیٹ گیا۔ لانچ پر سامان اُتارنے والے افراد پُوری طرح اُس کی زد میں تھے۔ ایک ہاتھ سے اُس نے

کا کنگ لیور کھینچا۔ دوسرا ہاتھ ٹریگر پر پہنچ گیا تھا۔ ہنروز کہہ رہا تھا: "ایسے جرائم کی باز پرس آخرت میں ہوگی، اس لیے ہم تمہارا سفر آسان کیے دیتے ہیں۔" منیارڈ کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے خون اُتر رہا تھا۔ اُس کے جبڑے بھنچے ہُوئے تھے۔ پھر اُس نے ٹریگر دبایا۔ گولیاں پانی کی دھار کی طرح مشین گن سے نکلیں۔ لانچ پر سامان لادنے والے افراد اُچھل اُچھل کر فرش پر گرے اور ساکت ہوگئے۔

منیارڈ نے ٹریگر سے اُنگلی ہٹائے بغیر گن کا رُخ پھیرنا شروع کیا۔ جو جو اس خوفناک چھڑکاؤ کی زد میں آیا، ڈھیر ہوگیا۔ پانچ سیکنڈ کے اندر زیریں عرشہ خون سے رنگین ہوگیا۔ ناؤ نے پھرتی سے جوسٹائن اور مینول کو اپنے آگے کرلیا۔ منیارڈ نے ٹریگر پر سے اُنگلی اُٹھالی۔ ناؤ نے جوسٹائن کے ہولسٹر میں ہاتھ ڈالا اور اُس کا پستول اُس کی کنپٹی پر لگا دیا۔ منیارڈ نے ناؤ کا سر نشانے پر رکھتے ہُوئے کہا: "پستول پھینک دو۔"

ناؤ مُسکرایا۔ منیارڈ نے مشین گن ناؤ کی دونوں آنکھوں کے درمیان فکس کردی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ناؤ کے ٹریگر دبانے سے پہلے اُس کی پیشانی میں سوراخ ہوسکتا ہے لیکن پھر بھی اپنے بچّے کی زندگی کے لیے وہ کوئی خطرہ موا نہیں لے سکتا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" منیارڈ نے پُوچھا۔

ناؤ بولا: "تم رات اسی جگہ گزارو گے اور میں اپنے آدمیوں سے مشورہ کروں گا۔ صبح تم جزیرے پر آؤ گے اور اپنے آدمیوں کو لے جاؤ گے۔ وعدہ کرتا ہُوں کہ میں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

منیارڈ نے کہا: "تمہارے وعدوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا؛ تاہم یہ بتاؤ کیا جوسٹائن کو بھی چھوڑ دو گے؟"

"نہیں، یہ ناممکن ہے۔" ناؤ نے جواب دیا۔ "مجھے اُس کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں اُسے پاس رکھوں گا۔"

منیارڈ نے جوسٹائن کی طرف دیکھا۔ اُسے ایک بار پھر وہی پُرانا جوسٹائن نظر آرہا تھا۔ تیرہ سالہ معصوم بچّہ، ڈرا ہُوا، سہما ہُوا، رحم طلب نظروں سے اپنے باپ کو دیکھتا ہُوا۔ اُس کے معصوم ذہن کو مبہوت کرنے والا سحر ٹوٹ چُکا تھا۔ منیارڈ نے کہا: "تمہارے ساتھ بھیجنے سے بہتر ہے کہ میں اسے یہیں ختم کر ڈالوں۔"

ناؤ نے قہقہہ لگایا:

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تمہاری خواہش یہی ہوگی کہ تمہارا بیٹا کہیں بھی رہے، زندہ رہے اور خوش رہے۔"

منیارڈ نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا: "اچھا ٹھیک ہے۔"

اُس نے دیکھا جوسٹائن اب ناؤ کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چیخ رہا تھا: "نہیں ڈیڈی! نہیں۔"

منیارڈ نے پیار سے کہا: "جوسٹائن! جیسے یہ کہتا ہے ویسے ہی کرو۔ یہ تمہارے ڈیڈ کا حکم ہے۔"

ناؤ نے مینول سے کہا: "چلو تم پہلے سیڑھی سے اُترو۔"

منیارڈ نے دیکھا کہ مینول اپنی جگہ ساکت کھڑا ہے۔ منیارڈ کو اُس کی آنکھوں میں بھی جوسٹائن جیسی التجا نظر آئی۔ ناؤ دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر نیچے اُترنے لگا۔ لانچ اس جگہ سے نظر نہیں آرہی تھی اور منیارڈ سمجھتا تھا کہ مشین گن اب استعمال نہیں کی جاسکتی۔ جوسٹائن نے آخری بار منیارڈ کو اتنی بے چارگی سے دیکھا تھا کہ اُس کا کلیجہ لرز گیا تھا۔ اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر ایک فیصلہ کیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہُوا جنگلے کے پاس پہنچا، کمر سے اُڑسا ہُوا خنجر ہاتھ میں پکڑا اور لانچ پر چھلانگ لگادی۔ اُس وقت ناؤ جوسٹائن کو کشتی پر بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مینول پاس کھڑا تھا... پھر منیارڈ کی مختصر سی پرواز ختم ہوگئی۔ وہ ایک دھماکے سے ناؤ کے اُوپر گرا۔ لانچ ایک دفعہ بُری طرح ڈگمگائی۔ پُوری نفرت، پُوری عداوت اور غُصّے کے ساتھ منیارڈ کا ہاتھ بلند ہُوا اور چاقو ناؤ کی دو پسلیوں کے درمیان گھُس گیا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا۔ گرتے

ابھی چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ اسے ڈرپس لگی ہوئی تھیں اور کمر کے گرد بھی کوئی بھاری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا وہ زندہ ہے یا پھر جاگتی آنکھوں سے زندگی کا خواب دیکھ رہا ہے؟

اس نے سامنے لگا کیلنڈر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں سکوڑیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کم وبیش آٹھ روز کے بعد مکمل ہوش میں آیا ہے۔ آٹھ روز..... ان آٹھ روز میں اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا تھا؟

اسی دوران میں اسے کمرے کے دروازے پر نثار اور دراز قد ڈاکٹر احمد کی شکل نظر آئی۔ ڈاکٹر احمد تو اسے دور ہی سے دیکھ کر واپس چلا گیا اور نثار اندر آ گیا۔ نثار کے ساتھ بازار کی چھوٹی سی یونین کے صدر افتخار بھائی بھی تھے۔ وہ دونوں ندیم کے سرہانے آن بیٹھے اور اس کا حال احوال پوچھنے لگے۔ افتخار بھائی کی زبانی یہ جان کر ندیم حیرت کے سمندر میں غرق ہو گیا کہ اس کے جسم میں سرجری کے بعد گردہ لگایا جا چکا ہے اور اب اس کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔

''یہ کیسے ہوا؟ کہاں سے آیا گردہ؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے خاموش بیٹھے نثار کی طرف دیکھا۔

نثار نے کہا۔ ''اللہ کے بعد یہ سب کچھ ڈاکٹر احمد کی مہربانی سے ہوا ہے۔ انہوں نے تم پر بہت زیادہ توجہ دی۔ ہر مرحلے میں تمہارے ساتھ رہے۔ تمہارے آپریشن میں شامل ہوئے اور آپریشن کے بعد بھی دن رات تمہارا خیال رکھا.....''

ندیم نے کراہ کر کہا۔ ''یہ ان کی بہت بڑی مہربانی ہے..... لیکن میرے لیے گردہ دیا کس نے؟''

افتخار بھائی بولے۔ ''اس سوال کا جواب بہت حیران کرنے والا ہے۔ یہ تو ہم نے سنا ہے کہ کسی سرجن نے بہت محنت اور توجہ سے کسی مریض کا علاج کیا۔ اپنی ساری صلاحیتیں اس کی سرجری پر صرف کر دیں، لیکن یہ کم ہی سنا ہو گا کہ اپنے مریض کا گردہ بدلنے والے سرجن نے اسے اپنا گردہ بھی خود ہی دے دیا.....''

ندیم مجسم حیرت افتخار بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''گردہ..... بھی..... خود ہی..... دے دیا؟'' اس نے افتخار بھائی کے الفاظ دہرائے۔

''ہاں ندیم! ڈاکٹر احمد نے نہ صرف تمہارا علاج کیا بلکہ اپنا گردہ بھی دیا۔ تمہارے آپریشن کے وقت ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ خود آپریٹ کر سکتے، پھر بھی وہ سرجنوں کی اس چار رکنی ٹیم میں شامل رہے جو تمہیں آپریٹ کر رہی تھی.....''

''یہ..... میں کیا سن رہا ہوں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

اس سے پہلے کہ نثار یا افتخار بھائی جواب میں کچھ کہتے، خوبرو دراز قد ڈاکٹر احمد کمرے میں داخل ہوا۔ وہ قدرے مضمحل نظر آ رہا تھا مگر چہرے پر ایک نورانی سی مسکراہٹ موجود تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر نثار اور افتخار باہر نکل گئے..... ڈاکٹر احمد، ندیم کے بالکل پاس آن بیٹھا۔ اس نے ندیم کا ہاتھ اپنے دونوں ملائم ہاتھوں میں لیا اور نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کتنے ہی لمحے اسی جذب کی کیفیت میں گزر گئے۔ آخر ڈاکٹر احمد نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ کا سوال سن لیا ہے۔ آپ جاننا چاہتے ہیں نا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا..... میں نے یہ اس لیے کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں آپ کا لہو دوڑتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر احمد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے..... لیکن میرا پورا نام آیان احمد ہے..... اور یہ نام میری ماما نے اور دادا نے مل کر رکھا تھا.....''

الفاظ دھماکوں کی طرح ندیم کے کاسۂ سر میں گونجے۔ اس کی نگاہ تو ڈاکٹر احمد کے خوبرو چہرے پر مرکوز رہی مگر ذہن برسوں اور زمانوں کا فاصلہ طے کرتا ہوا بیمار گوشت کے اس لوتھڑے تک پہنچ گیا جو کبھی کبھی اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر اپنے کمزور بازو چلاتا تھا..... اور کبھی بڑی بے چارگی سے اس کا دامن پکڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہی کمزور ناتواں سا بیمار جسم اب ایک جوان، قد آور شخص بن چکا تھا۔ ایک وجیہہ ڈاکٹر..... ایک ایسا مسیحا جو مایوس مریضوں کے لیے نئی زندگی کا پیغام تھا۔ وہ نہ صرف خود اپنی ناتوانی اور بیماری سے ابھرا تھا بلکہ اب پڑھ لکھ کر ایک نہایت قابل کڈنی سرجن بن چکا تھا اور یہ ایک ایسا کڈنی سرجن تھا جس نے اپنا ہنر ہی اسے نہیں دیا بلکہ اپنا گردہ بھی اس کے جسم کا حصہ بنا دیا تھا۔

یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا لیکن یہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر احمد اس کے ہاتھ تھام کر عجب اٹک اٹک بار لہجے میں بولا۔ ''آپ میرے باپ ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں تو آپ کا تھا ابو! بے شک کمزور اور بیمار تھا لیکن تھا تو آپ کا..... ہم سب آپ کے تھے۔ باجی ثمرین، ماما..... ہم سب آپ کے تھے..... آپ ہمیں کیوں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کو کیا پتا ہم نے آپ کو کتنا یاد کیا۔ آپ کے لیے کتنا روئے.....''

وہ بولتا چلا جا رہا تھا اور ندیم حیرت سے گنگ یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور قریباً تیس سال کی ایک جواں سال عورت اندر داخل ہوئی۔ سرخ وسپید گول چہرہ، دلکش پیشانی۔ اس کے ساتھ دو پیارے

گرتے اُس نے ٹانگ منیارڈ کے پیٹ میں دے ماری۔ پھر اُس نے ایک جھٹکے سے چاقو اپنی پسلیوں میں سے نکالا۔ دونوں لانچ کے اُوپر گتھم گتھا ہو گئے۔

چھ کے چھ آدمی جہاز کے اوپر جنگلے کے پاس کھڑے بے بسی سے یہ لڑائی دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہُوئے تھے۔ جوسٹائن اور مینول بھی لانچ کے ایک کونے میں سہمے کھڑے تھے۔ 'ناؤ' اپنی قوت وحشیانہ انداز میں استعمال کرتے ہُوئے منیارڈ کو نیچے گرا چکا تھا۔ اُس وقت جوسٹائن اپنے باپ کی مدد کو آگے بڑھا۔ 'ناؤ' نے خنجر والا ہاتھ گھمایا اور جوسٹائن ایک طویل چیخ کے ساتھ کشتی میں اُلٹ گیا۔ منیارڈ پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ تڑپ کر ناؤ کے نیچے سے نکلا۔ پھر نجانے کس طرح اُس نے چاقو چھین لیا اور بڑی وحشت اور درندگی سے اُس نے 'ناؤ' پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیے۔ اُسے کچھ ہوش نہ تھا کہ چاقو کہاں لگ رہا ہے۔ پھر اچانک اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ دوبارہ 'ناؤ' کے نیچے آگیا۔ وہ اس طرح گرا تھا کہ لانچ کی دو سیٹوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اب 'ناؤ' اُس کے سینے پر سوار تھا اور کمر سے اپنا خنجر نکال چکا تھا۔ منیارڈ کا چاقو نجانے ہاتھ سے نکل کر کہاں چلا گیا تھا۔ 'ناؤ' نے چاقو دونوں ہاتھوں سے تھام کر آہستہ آہستہ سر سے اُوپر اُٹھایا۔ منیارڈ اُس کے نیچے ایک بار زور سے مچلا لیکن حرکت ممکن نہیں تھی۔ 'ناؤ' کے جسم کے مختلف حصّوں سے خُون کے دھارے بہہ رہے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ چند لمحوں کا مہمان ہو۔ اُس نے خنجر سر سے بلند کیا اور چیخا: "مَیں تمہیں بتانا چاہتا ہُوں کہ مَیں اپنی قوم کا شہزادہ ہُوں... آزاد شہزادہ۔"

منیارڈ نے دیکھا چاقو تیزی سے نیچے آیا۔ اُسے اپنے دل کے مقام پر ایک خیالی ٹیس محسوس ہُوئی۔ لیکن نہیں... چاقو نے اُس کے جسم کو نہیں چھُوا تھا۔ 'ناؤ' نے چاقو خود اپنے پیٹ میں گھونپ لیا تھا۔ ایک ڈوبتی ہُوئی کراہ کے ساتھ وہ پُشت کے بل لانچ میں گرا اور ایک دفعہ لرز کر ساکت ہو گیا۔

منیارڈ لپک کر جوسٹائن کے پاس پہنچا۔ وہ اپنا زخمی بازو دوسرے ہاتھ سے تھامے آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔

منیارڈ نے دیکھا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں؛ چنانچہ اُسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ پھر سینے سے علیحدہ کر کے اُس کا چہرہ دیکھا۔ جوسٹائن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ایک بار پھر منیارڈ کے سینے سے چمٹ گیا اور منیارڈ کے کان میں کہا: "پیارے ڈیڈ! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ اب مَیں کہیں بھی آپ کو جانے نہ دوں گا۔" منیارڈ نے اُس کے کان میں سرگوشی کی: "ممّی کا کچھ پتہ ہے؟ وہ تمہارا حُلیہ خراب کر دے گی۔"

اتنے میں جہاز کے اُوپر سے ایک لیفٹیننٹ کی آواز آئی: "جناب! واشنگٹن سے کال آئی ہے۔ آپ کی بیوی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" منیارڈ کو ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہُوا۔

**

ملائشیا میں حکومت لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ وہ شادی کر کے زیادہ سے زیادہ بچّے پیدا کریں۔ اس وقت ملائشیا کی آبادی ایک کروڑ بچپن لاکھ ہے اور ۲۰۰۰ء تک اس میں چار گنا اضافے کے لیے حکومت بڑے خاندانوں کو ٹیکس کی چھُوٹ دے گی۔ جن ماؤں کے پانچ بچّے ہوں گے اُنہیں خصوصی الاؤنس دیا جائے گا۔ سکولوں میں شادی اور بچّے کی پیدائش و تربیت کے متعلق خصُوصی مضمون بھی شاملِ نصاب کیا جا رہا ہے۔

معاشرے کے سب سے خطرناک اور پڑ کر پہلو کو اجاگر کرنے والی تحریر..... بجنگ آمد کی مکمل تفسیر

بجنگ آمد

طاہر جاوید مغل

مشرق ہو یا مغرب... انسانی معاشرہ اگر حدود و قیود سے آزاد ہو جائے تو... انسانیت اور حیوانیت میں فرق مٹ جاتا ہے... گویا قدرت نے جس کی جو حد مقرر کردی اسے اس تک محدود رہنا چاہیے مگر... کیا کیا جائے جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور برداشت اپنی حد سے باہر ہو جائے تو انتقام کی چنگاری رفتہ رفتہ حالات کی تیز ہوا سے بھڑک کر ایک دن شعلہ بن جاتی ہے۔ یہی حال اس بدحال کا ہوا جو جوانی اور دولت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح سرشار بڑھتا چلا جارہا تھا کہ ایک دن اس مظلوم کی برداشت نے جواب دے دیا... اس کے بعد قدرت نے ایسا طوفان اٹھایا کہ بھڑکتے شعلوں کے رقص نے معاشرے میں بلند مقام پانے والے ظالموں کے نشیمن کو جلا کر راکھ کردیا... وہ بچیاں جو معصومیت کا پیکر... دلوں کا سکون... گھروں کی رونق تھیں... ان درندہ صفت بھیڑیوں کے خونیں جبڑوں سے محفوظ نہ رہ سکیں جو عزتوں کے جنازہ نکالنے کے لیے ہی شاید دھرتی کا بوجھ بنتے ہیں۔





وہ دسمبر کی ایک چمکیلی اور خوشگوار سہ پہر تھی۔ سڑکوں پر رش بھی کچھ کم ہی تھا۔ عروبہ کو اپنی چھوٹی سوزوکی کار ڈرائیو کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ آج اس کی بیٹی حریم کی اکیسویں سالگرہ تھی۔ وہ سالگرہ کی شاپنگ کرنے ہی نکلی ہوئی تھی اور اب جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی کیونکہ عصر کی نماز کا وقت نکلتا جارہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے خود ہی گیٹ کا لاک کھولا اور گاڑی اندر لے گئی۔ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا باریال شاید کرکٹ کھیلنے کے لیے جاچکا تھا۔ کالج سے لوٹتے ہی اسے گراؤنڈ جانے کی بہت جلدی ہوتی تھی۔ تحائف اور دیگر سامان عروبہ نے گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور بس ایک دو شاپرز لے کر اندر چلی گئی۔

''حریم! کہاں ہو بھئی؟'' عروبہ نے بیٹی کو آواز دی اور پھر جواب نہ پاکر اس کے کمرے کی طرف ہی چلی گئی۔

حریم کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ ''دروازہ کھولو حریم۔''

دوسری دستک پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اس نے کان لگائے۔ واش روم میں پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ حریم واش روم میں تھی۔

عروبہ نے وال کلاک دیکھا۔ عصر کی نماز کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے شاپرز ایک طرف رکھے اور جلدی جلدی وضو کرکے نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ نماز پڑھ چکی، دعا مانگ چکی لیکن حریم کے کمرے کا دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ عروبہ کو تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ دروازہ ''ناک'' کیا۔ اس مرتبہ ذرا بلند آواز میں کہا۔ ''حریم! دروازہ کھولو، کیا کر رہی ہو؟''

اندر سے حریم کی کھانسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ پھر قدموں کی چاپ ابھری اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کمرے میں اندھیرا کر رکھا تھا اور چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ عروبہ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید بہن بھائی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے جس کا حریم نے کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے لیکن پھر جب عروبہ نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا تو اس کی حالت زیادہ ابتر نظر آئی۔ رنگ بالکل زرد ہورہا تھا۔

''کیا ہوا میرا بچہ؟'' عروبہ جلدی سے اندر آگئی اور اس کے دونوں شانے تھام لیے۔ وہ لائٹ آن کرنا چاہ رہی تھی مگر حریم نے اسے روک دیا۔

''میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے ممی۔ پلیز..... مجھے ذرا..... لیٹنے دیں۔'' حریم کی آواز جیسے تکلیف کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

عروبہ نے غور سے بیٹی کو دیکھا اور پھر جیسے کانپ کر بولی۔ ''اوہ خدایا! تمہارا تو برا حال ہورہا ہے۔ اگر زیادہ درد ہے تو چلو ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔''

''ڈاکٹر اس وقت کہاں ہوں گی..... م..... میں نے میڈیسن لی ہے..... کک..... کچھ دیر آرام کرلوں، شاید ٹھیک ہوجاؤں۔'' وہ ہکلائی۔

حریم کو کبھی کبھار سر کا درد ہوتا تھا..... خاص طور سے جب پڑھائی کا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ تاہم یہ درد جب بھی ہوتا، شدید نوعیت کا ہوتا تھا۔ عروبہ نے بیٹی سے پوچھا کہ اس نے کون سی دوا کتنی مقدار میں کھائی ہے پھر اس نے اسے ماتھے پر ''آئنمنٹ'' لگانے کا مشورہ بھی دیا اور اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے باہر آگئی۔ بدحال حریم نے دروازہ پھر اندر سے بند کرلیا۔

عروبہ بیٹی کے کمرے سے باہر تو آگئی تھی مگر اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ وہ ایک ماں کا دل رکھتی تھی اور یہ دل کہہ رہا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے شاید..... کہیں زیادہ سنگین نوعیت کا۔ وہ بے قرار ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ایک بار پھر حریم کے کمرے کی طرف گئی لیکن ''ناک'' کرتے کرتے رک گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اسے لگا کہ سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی نمی تھی۔ وہ ایک مضبوط اور حوصلہ مند عورت تھی مگر جب سے شوہر امین کو دل کا عارضہ ہوا تھا، وہ خود پر کئی اضافی ذمے داریاں محسوس کرنے لگی تھی۔ کسی بھی مسئلے کی صورت میں اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس پر بہت بڑا بوجھ آن پڑا ہے۔ اب بھی وہ کچھ ایسا ہی محسوس کررہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ امین کو آفس میں فون کرے اور انہیں حریم کی تکلیف کے بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ارادہ ملتوی کردیا اور شوہر کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کے سائے طویل ہورہے تھے۔ گھر میں بس وہ اور حریم تھے۔ باریال سے چھوٹی بیٹی ماہین چند روز کے لیے اپنی پھپھو کے گھر گئی ہوئی تھی۔ عروبہ نے سوچا کہ ابھی باریال کرکٹ کھیل کر واپس آتا ہے تو وہ حریم کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے۔ اس کا منہ خشک ہونے لگا تھا۔ اس نے تھوڑا سا پانی پیا، پھر اسے گاڑی میں پڑے سامان کا خیال آیا۔ اس میں وہ تحائف بھی تھے جو امین، باریال اور خود عروبہ کی طرف سے حریم کو دیے جانے تھے۔ اس نے وہ چیزیں نکال

لیں اور انہیں اندرونی کمرے میں رکھنے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں آئی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی۔ اسے قالین پر مٹی کے نشان نظر آئے۔ جیسے کوئی کیچڑ زدہ جوتوں کے ساتھ یہاں سے گزرا ہو۔ وہ غور سے دیکھنے لگی۔ یہ باریال کے جوتوں کے نشان تو ہرگز نہیں تھے۔ ویسے بھی وہ اتنا بدتہذیب نہیں تھا کہ اس طرح کی بے پروائی کرتا۔

تو کون آیا تھا یہاں؟ اور اگر آیا تھا تو حریم نے ابھی تک بتایا کیوں نہیں تھا؟ ایک دم اس کا دل زیادہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کہ اس گھر میں کچھ ایسا ہو چکا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کا منہ ایک بار پھر خشک ہونے لگا۔ اس نے سامان سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور تحفوں کے تینوں ڈبے ایک الماری میں کپڑوں کے پیچھے رکھنے کے لیے آگے بڑھی۔ اس نے الماری کھول کر اس کے بڑے خانے میں ڈھیر کی صورت پڑے کپڑوں کو پیچھے ہٹایا تاکہ تحفوں کے ڈبے ان کے پیچھے رکھ سکے۔ یکا یک ایک منظر دیکھ کر اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اسے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ اس نے وہاں حریم کے کپڑے دیکھے۔ وہی کپڑے جو چند گھنٹے پہلے تک اس نے پہن رکھے تھے لیکن اب یہ کپڑے سلامت حالت میں نہیں تھے۔ کئی جگہ سے دھجیوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ حریم نے ان کپڑوں کو بھائی اور ماں کی نظروں سے بچانے کے لیے اس بند الماری میں دیگر کپڑوں کے پیچھے گھسیڑ دیا ہے۔

گفٹ پیکس عروبہ کے ہاتھوں سے گر گئے۔

''حریم..... حریم!'' وہ چلائی اور حریم کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے ایک ہاتھ میں حریم کی پھٹی ہوئی گلابی قمیص تھی، اس مرتبہ اس نے حریم کے کمرے کا دروازہ پیٹ دیا.....

''دروازہ کھولو حریم..... دروازہ کھولو۔'' وہ ہیجانی انداز میں پکاری۔

اس کی تیسری چوتھی زوردار دستک پر حریم نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور نیم تاریکی میں آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں۔

''یہ کیا ہے حریم؟'' عروبہ دردناک انداز میں چلائی۔

ماں کے ہاتھوں میں اپنی دریدہ قمیص دیکھ کر حریم ماں سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی آواز میں وہ درد و کرب تھا کہ گھر کی دیواریں لرزتی محسوس ہوئیں۔ خود حریم کا سارا وجود بھی کانپ رہا تھا اور اس نے ماں کو اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔

''حریم! میری بچی..... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے، کیا ہوا ہے؟'' عروبہ نے زور لگا کر اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے ماں کے ساتھ لپٹ کر اس کے جسم کا حصہ ہی بن گئی تھی۔ اس کی آہ و بکا میں ایسی شدت تھی کہ عروبہ کا سینہ پھٹنے لگا۔ در و دیوار اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ہاں، وہ ایک ماں تھی اور بیٹی کے کچھ کہے بغیر ہی اس قیامت کو سمجھ رہی تھی جو اس ہنستے بستے گھر پر ٹوٹ چکی تھی۔

اس نے خود کو بہ مشکل بولنے کے قابل کیا اور دل نگار آواز میں بولی۔ ''حریم! کون آیا تھا اس گھر میں..... مجھے بتاؤ کون آیا تھا؟''

حریم بدستور ماں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور آہ و بکا کر رہی تھی۔ عروبہ نے بڑی دشواری سے خود کو بیٹی سے جدا کیا اور ٹی وی لاؤنج کا ادھ کھلا دروازہ بند کر دیا کہ کہیں ماں بیٹی کی آوازیں ساتھ والے گھر میں نہ سنی جائیں۔ اس نے حریم کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر کمرے میں لے آئی۔ اس نے لائٹ آن کی اور بیٹی کو پہلی بار دھیان سے دیکھا۔ وہ بربادی کی تصویر تھی۔ اس کی گردن اور کلائیوں پر گہری خراشیں تھیں اور کئی خراشوں سے خون رس رہا تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں روتی بلکتی ہوئی حریم نے آہوں و سسکیوں کے درمیان عروبہ کو جو کچھ بتایا، وہ واقعی قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ گرد و پیش کی ہر شے جیسے عروبہ کی نظروں میں گھومنے لگی۔ حریم نے بتایا کہ اس کے ساتھ ''زیادتی'' ہوئی ہے..... ہاں، وہی سب کچھ جو کسی بھی عورت کو زندہ درگور کر سکتا ہے۔

زیادتی کرنے والا محلے کا ہی ایک نوجوان عدیل تھا۔ ڈور بیل ہونے پر حریم صحن میں گئی تھی تب تک باریال کرکٹ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ حریم نے پوچھا کہ باہر کون ہے۔ جواب نہ پا کر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ عدیل نے کوئی بات کی اور پھر تیزی سے حریم کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ حریم کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب، کیا اور کیسے ہوا؟ ہاتھ کی مضبوط گرفت نے اس طرح اس کے منہ کو ڈھانپ لیا تھا کہ وہ چلا بھی نہ سکی۔ اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا، اسے سننے کے لیے پتھر کا کلیجا چاہیے تھا۔

عروبہ نے حریم کو اپنے سینے سے لگا لیا اور ماں بیٹی دونوں ہی ہچکیوں سے رونے لگیں۔ ایک طوفان برپا تھا عروبہ کے دل و دماغ میں..... عدیل عرف عادی نام کے اس اوباش کی صورت اس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہو اور وہ ابھی اسی وقت اس کی جان لے لے۔ کسی تیز دھار آلے سے اس کے

ٹکڑے کرڈالے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال ایک دہکی ہوئی میخ کی طرح اس کے دماغ میں گھستا چلا جارہا تھا۔

کیا وہ ابھی اپنے شوہر امین کو بتائے؟

کیا وہ پولیس کو فون کرے؟

کیا فی الحال وہ خاموش رہے اور امین کے گھر آنے کا انتظار کرے؟

ایک ساتھ کئی سوچیں اس کے ذہن پر یلغار کررہی تھیں..... اور وہ کانپتی چلی جارہی تھی۔ اسی دوران میں موٹر بائیک کا ہارن سنائی دے گیا۔ یہ امین ہی تھے۔ عروبہ نے اپنی اشک بار آنکھوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ شاید حریم کی سالگرہ کی وجہ سے ہی آج امین ذرا جلدی گھر آگئے تھے۔ غم کی شدت سے عروبہ کے دل کی رگیں جیسے ٹوٹنے لگیں۔ اس نے زیرِلب قرآنی آیات کا ورد کیا اور جاکر دروازہ کھول دیا۔

امین اپنی بائیک اندر لے آئے۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔ ''کیا بات ہے بھئی۔ آج گھر میں سناٹا کیسا ہے؟ باریال ابھی آیا نہیں؟''

عروبہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ تب موٹر بائیک کو اسٹینڈ پر لگاتے ہوئے امین نے عروبہ کی طرف دیکھا اور بے طرح چونک گئے۔ ''کیا ہوا عروبہ؟'' وہ لپک کر عروبہ کی طرف آئے اور اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔

''آ..... آپ اندر چلیں۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔'' وہ بہ مشکل بول پائی۔

امین کا چہرہ ایک دم ہلدی ہوگیا۔ ''عروبہ! کیا ہوا؟ باریال تو ٹھیک ہے؟ حریم کہاں ہے؟ حریم..... حریم۔'' انہوں نے مضطرب ہوکر حریم کو آوازیں دیں۔ تب تک حریم خود کو کمرے میں بند کرچکی تھی۔

عروبہ، شوہر کو اندر لے آئی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں انہیں کچھ ہو ہی نہ جائے۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ''آپ نے شام والی میڈیسن لے لی ہے؟''

''ہاں لے لی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' وہ تقریباً چلّا اٹھے۔

عروبہ نے واقعے کی شدت کم کرنے کے لیے پہلے صرف یہ بتایا کہ وکیل ریاض صاحب کا لڑکا عدیل زبردستی گھر میں گھسا ہے اور اس نے حریم سے ''دست درازی'' کی ہے۔

امین کا سارا وجود جیسے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ ''اوہ گاڈ!'' ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ بے دم سے ہوکر صوفے پر بیٹھ گئے..... لیکن پھر فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کہاں ہے حریم..... حریم! کہاں ہو؟'' وہ بے حد زخمی لہجے میں پکارے۔

عروبہ نے ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دوبارہ صوفے پر بٹھادیا۔ ''میں بتاتی ہوں آپ کو سب کچھ..... سب کچھ بتاتی ہوں۔'' وہ سسکی اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے امین کو ایمرجنسی میں دی جانے والی میڈیسن نکالی اور پانی کے ساتھ کھلادی۔

تب اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ وہ سب کچھ امین کے گوش گزار کردیا جو آج کے روز ایک بہت بڑی آفت کی طرح ان پر مسلط ہوا تھا۔ اگلا قریباً ایک گھنٹا بے حد اذیت ناک تھا۔ میاں بیوی اشک بار آنکھوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ باریال بھی اب گھر واپس آچکا تھا۔ ابھی اسے صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ اس کی بہن کے سر میں شدید درد ہے۔ بہرحال وہ اتنا بھی ناسمجھ نہیں تھا کہ اس بات پر مکمل یقین کرلیتا۔ وہ بھی گم صم اور حیران دکھائی دیتا تھا۔

بند کمرے میں عروبہ نے امین سے کہا۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتے..... اور چپ بھی نہیں رہ سکتے۔ آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟''

امین نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ ''میرا تو خیال ہے پہلے حریم کے خالو جی سے بات کرلی جائے۔''

''ہاں امین! میرے ذہن میں بھی یہی آرہا ہے۔ ہم..... میں انہیں فون کرتی ہوں..... اگر..... وہ گھر آچکے ہیں..... تو انہیں یہیں بلالیتے ہیں.....''

''ہاں..... کرو فون۔'' امین نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

حریم کے خالو یاور حیات کونسلر رہ چکے تھے اور ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازمت بھی کرتے تھے۔ وہ تھانے کچہری کے معاملات کو سمجھتے تھے اور ان کا ایک حلقۂ احباب تھا۔ وہ عروبہ سے بہت انس بھی رکھتے تھے۔

عروبہ کچھ دیر تک سر پکڑ کر بیٹھی رہی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ آخر وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھی اور دوسرے کمرے میں رکھے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ باریال کا کل کالج میں ٹیسٹ تھا۔ عروبہ نے کہہ سن کر اسے اوپر ٹیلری میں بھیج دیا تھا۔ وہ کچھ دیر لرزاں و ترساں، فون ہاتھ میں لیے کھڑی رہی پھر اس نے حریم کے خالو کا نمبر پریس کرنا چاہا۔ یہی وقت تھا جب اس نے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ اس نے مڑکر دیکھا۔ عقب میں امین کھڑے

تھے۔ آنکھوں میں نمی تھی اور رخساروں پر زردی کھنڈی تھی۔ بولے۔ ''عروبہ! ابھی ٹھہر جاؤ۔ کچھ اور سوچ لیں۔ ادھر آؤ میرے ساتھ۔''

امین اور عروبہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں آن بیٹھے۔ امین نے دلدوز لہجے میں کہا۔ ''ایک بار یہ بات کھل گئی تو پھر بہت دور تک جائی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا..... ہم ان سارے حالات کا سامنا کر پائیں گے یا نہیں۔ پتا نہیں کہ کیا کیا باتیں بنائی جائیں گی..... اور..... پھر..... تھانہ کچہری..... یا اللہ..... ہم کس آفت میں پھنس گئے ہیں۔''

عروبہ بھی جیسے بے دم سی ہوگئی۔ حریم کی منگنی ہوچکی تھی۔ پروگرام یہی تھا کہ گریجویشن کے فوراً بعد اس کی شادی کردی جائے۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو دیر تک گھر میں نہیں بٹھایا جاتا تھا۔ عروبہ نے ابھی سے اس کی شادی کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں اکٹھی کرنا شروع کردی تھیں۔ حریم کے حوالے سے بڑے خوبصورت سپنے سجا رکھے تھے اس نے اپنی آنکھوں میں اور آج..... دسمبر کی اس سیاہ شام میں اس چار دیواری کے اندر کیا آفت مچ گئی تھی۔

اس نے بے بسی سے اپنے سر کو دائیں بائیں ہلایا پھر سسک کر بولی۔ ''اتنا بڑا ظلم ہوا ہے ہمارے ساتھ..... کیا ہم چپ رہیں، اپنے ہونٹ سی لیں؟ یہ تو..... یہ تو ظلم کا ساتھ دینے والی بات ہے۔ ہمارا اسلام بھی یہی کہتا ہے جو ظالم کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا، وہ ظالم کا ساتھ دیتا ہے۔''

''لیکن عروبہ! یہ ہماری بیٹی کی زندگی کا سوال بھی تو ہے بلکہ ہماری دونوں بیٹیوں کی زندگی کا سوال ہے۔ ہم کس کس کا منہ بند کریں گے۔ اوہ خدایا..... اوہ خدایا۔''

عروبہ نے شوہر کے سارے بدن پر لرزہ طاری دیکھا تو اپنے لرزے کو بھول کر امین کے دونوں ہاتھ تھام لیے، ان کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اگر ایک بار یہ بات کھل گئی تو پھر کمان سے نکلے تیر کی طرح ہوگی جو واپس نہیں آتا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس پہاڑ جیسے صدمے کو اپنے سینے کی گہرائی میں چھپالیا جائے؟ اس قیامتِ صغریٰ کو اس چار دیواری کے اندر دفن کرنے کی کوشش کی جائے؟ ایک بار پھر عدیل عرف عادی کا منحوس چہرہ عروبہ کی نگاہوں میں گھوما اور اسے اپنے جسم میں چنگاریاں سی چبھتی محسوس ہوئیں۔

☆☆☆

عدیل عرف عادی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد ہائی کورٹ و سپریم کورٹ کے ایک نامی گرامی وکیل تھے جبکہ والدہ ایک مشہور انگلش میڈیم اسکول کی وائس پرنسپل تھی۔ ان دونوں کو اپنے اپنے پروفیشن سے کچھ ایسی انسیت تھی اور سروں پر مزید سے مزید ترقی کا کچھ ایسا بھوت سوار رہتا جس نے انہیں اپنی اولاد کے تربیتی تقاضوں اور اس سلسلے میں اپنے دیگر فرائض سے غافل کر رکھا تھا۔ اپنے بچے کی آوارہ گردی کو انہوں نے اولاد کے سماجی حقوق کا نام دے رکھا تھا۔ عدیل اب یونیورسٹی کا طالب علم تھا لیکن اس کو برائے نام طالب علم ہی کہنا چاہیے۔ اس کے آوارہ گرد اور اوباش دوست اسکول کے زمانے سے ہی اس کے ساتھ رہے تھے اور اب تو عدیل کے ماں باپ کو اس بات کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ یونیورسٹی میں امتحانات کی تیاری کا بہانہ کرکے راتیں باہر بسر کرنے والا ان کا بیٹا درحقیقت کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ گھر کے لیے ایک ادھیڑ عمر، کل وقتی ملازمہ رکھ کر عدیل کی والدہ گھر کے کام کاج اور عدیل کی ذمے داریوں سے ''سبکدوش'' ہوچکی تھی۔ شریفاں نامی یہ ملازمہ جب بھی عدیل کے کمرے کی صفائی کرتی، ڈسٹ بن سے کاغذ میں لپٹے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اور کبھی کبھی شیشے کی کوئی خالی بوتل بھی نکلتی جس میں سے عجیب طرح کی بدبو آرہی ہوتی۔ ایسی بوتلوں کے لیبل پھٹے ہوئے ہوتے اور صاف پتا چلتا تھا کہ ان کی اصل کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فحش فلموں کی سی ڈیز بھی اکثر شریفاں کو دکھائی دے جاتیں۔ ایک دو دفعہ اس بے چاری ہمدرد نوکرانی نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں عدیل کی والدہ کو یہ سب کچھ بتانے کی کوشش بھی کی، لیکن بدلے میں اسے اچھی خاصی ڈانٹ کھانا پڑی۔ اس سے یہ کہا گیا کہ اسے عدیل کے ذاتی معاملات میں دخل دینے اور اس کے کمرے کی تلاشیاں لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اب بالغ ہے اور اپنا بھلا برا جانتا ہے اور اگر واقعی ایسی کوئی بات ہوئی تو اسے سمجھانے کے لیے اس کے ماں باپ موجود ہیں۔

اس کے بعد سے ملازمہ شریفاں نے اس حوالے سے بالکل چپ سادھ لی تھی لیکن پچھلے چند ماہ سے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ عدیل کی آوارہ مزاجی حد سے بڑھتی جارہی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے اس لڑکے سے خوف سا آنے لگتا تھا۔ اس نے اسے گود میں کھلایا تھا، لیکن اب اسے یوں لگتا تھا کہ یہ کوئی اجنبی شخص ہے جسے وہ جانتی ہی نہیں۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ عروبہ کے شوہر امین سرور پچھلی رات کافی دیر تک جاگتے رہے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں

دور رہی۔ رات چار بجے کے قریب انہوں نے سکون آور گولی لی اور پھر سو گئے۔ اب صبح گیارہ بجے نہا کر وہ بوجھل قدموں سے باہر لان میں آئے تو عروبہ کہیں کھوئی کھوئی سی، پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی۔ آج اس قیامت کو گزرے چوتھا روز تھا مگر صدمے کی شدت وہی تھی۔ عروبہ کا چہرہ دیکھ کر امین سرور کو اپنا کلیجا کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ لان میں لگے پھول پودوں کے درمیان وہ خود ایک مرجھایا ہوا پھول نظر آرہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ بھی رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائی۔

امین سرور نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے شاور پکڑ کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ ''ادھر آؤ، یہاں بیٹھتے ہیں۔'' لان ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیبل تک لے آئے۔

''دیکھو عروبہ! یہ مشکلات اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں.....'' امین ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ عروبہ روہانسی ہوگئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر امین خاموش ہوگئے۔

عروبہ بولی۔ ''لیکن امین! اتنی بڑی پریشانی، اتنا بڑا دکھ ہمارے لیے ہی کیوں؟ ہم سیدھے سادے، بے ضرر سے لوگ، نماز روزے کے پابند، کبھی کسی سے کوئی اونچ نیچ نہیں کی اور نہ ہی ایسے ویسے لوگوں سے کوئی تعلق رکھا، اپنے بچوں کو باحیا اور سلیقہ مند بنایا، پھر ایسی پریشانی ہم پر ہی کیوں آگئی؟'' عروبہ کی درد زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ رات بھر انہی جانکاہ خیالات کی زد میں رہی ہے۔

امین نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے اور چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ کہیں اس کی آواز بچوں تک نہ پہنچ جائے۔ امین نے کہا۔ ''دیکھو عروبہ! اس دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ پاک سے اس بات کی سند لے کر نہیں آیا کہ اس پر کس قسم کی پریشانیاں آئیں گی اور کس قسم کی نہیں۔ وہ ہمارا معبود ہے، ہمارا مالک ہے۔ وہ کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ ہمیں آزماتا ہے، کبھی خوشی دے کر، کبھی تکلیف دے کر، کبھی تھوڑی دے کر، کبھی زیادہ دے کر..... اور قدرت کا یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ امیر غریب، عقل مند یا بے وقوف، نیک یا بد کسی کو اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔''

امین کی بات سے عروبہ کی بے پناہ بے قراری میں ذرا سی کمی واقع ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے نم کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا۔ امین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہر مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے عروبہ! اور حالات سے مقابلہ کرنے کی صفت بھی اللہ پاک نے انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہے.....''

''یہی بات تو میں بھی آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔'' عروبہ بے چین ہوکر بولی۔ ''آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں یہ سب کچھ خاموشی سے نہیں سہنا چاہیے..... ہمیں انصاف مانگنا چاہیے۔ ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیے.....''

''کون سا قانون؟'' امین نے زخمی لہجے میں عروبہ کی بات کاٹ ڈالی۔ ''میں ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا ہوں عروبہ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں لوگوں نے قانون کو موم کی ناک بنا رکھا ہے۔ انصاف حاصل کرنا ہی تو اس ملک میں سب سے مشکل کام ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایسے کیسوں میں رلتے اور خوار ہوتے دیکھا ہے۔ بدنامی اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ طاقتوروں کی دنیا ہے عروبہ! یہاں سب کچھ اثر رسوخ اور تعلق ناتوں سے ہوتا ہے۔ یہاں تو کسی بڑے آدمی کے چپڑاسی کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... اور اس خبیث کا باپ تو خود ایک بڑا آدمی ہے۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و سپریم کورٹ ریاض احمد جاوا صاحب۔'' امین نے بڑے درد سے کہا اور پھر خاموشی اختیار کی۔

اسی طرح کی گفتگو کل اور پرسوں بھی میاں بیوی کے درمیان ہوئی تھی اور نتیجہ یہی ایک کربناک خاموشی نکلا تھا۔

کچھ دیر بعد اس خاموشی کو امین نے ہی توڑا۔ ''ماہین اور باریال کی کیا پوزیشن ہے؟'' اس نے عروبہ سے دریافت کیا۔

''دونوں اس دن سے چپ چپ ہیں۔ باریال ایک دو بار مجھ سے پوچھ چکا ہے کہ اگر آپی کو بخار ہے تو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا رہے۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹالا ہے کہ وہ پرانے نسخے کے مطابق خود ہی دوا کھا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم حریم کو بھی اچھی طرح سمجھا دو کہ کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نہ نکالے۔''

عروبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو وہ کمینہ محلے سے غائب ہے لیکن آج نہیں تو کل واپس تو آئے گا۔ انہی گلیوں میں گھومے پھرے گا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ جب اس سے آمنا سامنا ہوگا تو دل کی کیا حالت ہوگی..... میں کچھ کر ہی نہ بیٹھوں۔''

''میں نے کل بھی تم سے کہا تھا عروبہ! سوچ بچار کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے، وہ یہی ہے کہ ہم وقتی طور

پر اس سارے منظر سے اوجھل ہو جائیں۔ خاموشی سے کہیں چلے جائیں اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہاں سے شفٹ ہو جائیں؟'' عروبہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں عروبہ! اس طرح کی بات جب پھیلتی ہے تو جنگل کی آگ بن جاتی ہے۔ ہمیں حریم کا ہی نہیں، ماہین کے مستقبل کا بھی سوچنا ہے بلکہ اپنے تینوں بچوں کا سوچنا ہے، ہمیں حکمت سے کام لینا پڑے گا عروبہ۔''

عروبہ نے کن انکھیوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ امین بزدل نہیں ہیں۔ وہ جب صحت مند تھے تو مشکل ترین حالات میں بھی اپنے موقف کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن جب سے دل کا عارضہ لاحق ہوا تھا، ان کے مزاج میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ ان میں دھیما پن اور مصلحت پسندی آتی چلی گئی تھی اور یقیناً وہ ٹھیک ہی تھے۔ رنج و غم سے ان کے دل پر براہِ راست اثر پڑتا تھا۔ ایسے کئی موقعوں پر انہیں سیدھا اسپتال جانا پڑا تھا..... اب وہ ایک پرائیویٹ فرم میں کمپیوٹر کے شعبے میں کام کر رہے تھے۔ آمدن محدود تھی، خدا کا شکر تھا کہ عروبہ کو اپنے نانا کی پراپرٹی میں سے تھوڑا سا حصہ ملا ہوا تھا۔ یہ تین دکانیں تھیں جن کے کرائے سے ان کی گزر بسر بہ آسانی ہو جاتی تھی۔

ابھی گھر چھوڑنے کی صرف بات ہی ہو رہی تھی، لیکن عروبہ کو ایک دم سب کچھ اجنبی اجنبی سا لگنے لگا۔ اس نے گھر کے در و دیوار پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اسے اپنے اس گھر سے اور جگہ سے محبت تھی۔ وہ بیاہ کر اسی گھر میں آئی تھی۔ ان کی شادی شدہ زندگی کے بائیس سال یہیں بیتے تھے۔ وہ آہ بھر کر رہ گئی۔

''دیکھو عروبہ! تم ہمت دکھاؤ اور خود کو مضبوط کرو۔ تم حریم کی ماں ہو۔ جو باتیں وہ تم سے کر سکتی ہے، مجھ سے نہیں کر سکتی۔ تم مضبوط بنو گی تو اس کو بھی سنبھال پاؤ گی۔ اس کو تمہاری جتنی ضرورت اب ہے، شاید تب بھی نہیں ہو گی جب تم نے اسے جنم دیا تھا۔ وہ اس وقت شدید ترین شاک میں ہے۔''

یہ سب کہتے ہوئے امین سرور کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کے دلوں کی طرح اس گھر کے تمام در و بام پر مردنی چھائی دکھائی دیتی تھی۔ یہی وہ لان تھا جہاں ان کی حریم کے ننھے ننھے قدموں کے نشان ثبت ہوئے تھے اور پھر اس کے بعد بدلتے موسموں میں اَن گنت سہانی یادوں کا سلسلہ تھا۔

امین سرور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آج اتوار ہے۔ میں ایک دو ''سوسائٹیز'' کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ لاہور بہت بڑا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی مناسب سا اپارٹمنٹ یا پورشن کرائے پر مل ہی جائے گا۔''

''اور یہ گھر؟'' عروبہ نے اداسی سے پوچھا۔

''ابھی جوں کا توں رکھتے ہیں۔ آگے چل کر اگر اچھی قیمت مل گئی تو فروخت کر دیں گے۔'' پھر امین سرور نے ذرا توقف کیا اور عروبہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم ذرا حریم کے کمرے کا چکر لگاؤ۔ اسے دیکھو، اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزارو۔'' یہ کہہ کر امین سرور اٹھے اور گیراج میں کھڑی مہران کا رخ کیا۔

عروبہ نے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور بڑبڑائی۔ ''بارہ بجنے والے ہیں، ابھی تک ناشتے کے لیے بھی نہیں اٹھی۔''

اس نے امین کو سی آف کیے بغیر ہی حریم کے کمرے کا رخ کیا۔

☆☆☆

حریم اپنے کمرے میں تھی اور سوچوں میں گم تھی۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ امین اور عروبہ نے اسے بڑے ناز و نخرے سے پالا تھا۔ بچپن سے ہی وہ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر بے قرار ہو جاتے تھے۔ اپنے اپنے کام کے علاوہ جتنا وقت ان دونوں میاں بیوی کے پاس ہوتا، وہ اپنی ننھی حریم کے ساتھ گزارتے۔ حریم کے بعد ان کے دو بچے اور پیدا ہوئے۔ ایک بیٹا باریال اور بیٹی ماہین۔ ان دونوں سے بھی ان کو ویسا ہی پیار تھا جیسا حریم سے تھا..... لیکن اس سے ہٹ کر ایک کشش، ایک انسیت تھی جو وہ حریم کے لیے محسوس کرتے تھے اور یہ بات حریم بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔

حریم جب ذرا بڑی ہوئی تو اس کے پاپا نے اس کے لیے سپنے دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ حریم کی ماں سے کہتے۔ ''عروبہ! میں اپنی حریم کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ چاہے مجھے اس کو پرائیویٹ ہی کیوں نہ پڑھانا پڑے۔''

انہوں نے ایک اچھی سوسائٹی میں پانچ مرلے کا پلاٹ اسی نیت سے لیا ہوا تھا کہ وقت آنے پر وہ اسے بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے فروخت کر دیں گے۔ حریم میٹرک میں تھی جب اس کے تایا نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگا..... آصف انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور اچھے کزنز کی حیثیت سے ملتے تھے۔ حریم کے والدین کو یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا۔ والدین اور دیگر اہلِ خانہ کی

رضامندی حریم کی رضامندی بھی بن گئی اور اس طرح ان دونوں کی باقاعدہ منگنی ہوگئی۔ منگنی کے بعد ہفتے میں ایک دوبار فون پر ان کی بات ہو جاتی تھی یا پھر کسی تہوار یا شادی بیاہ کے موقعے پر آمنا سامنا ہوتا۔ آصف کے بقول وہ حریم کو ایک عرصے سے پسند کرتا تھا پر کبھی یہ بات اس سے کہہ نہ پایا۔ اب وہ اکثر کہتا تھا کہ اس نے حریم کو پا کر سب کچھ پالیا ہے۔ وہ اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے، اس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کی خاطر اپنی جان بھی دے دینا اس کے لیے آسان ہے اور..... ایک لمبی فہرست تھی عہد و پیمان کی جو حریم کو اکثر سننا پڑتی تھی۔ ایسے میں وہ ہنس دیتی..... اور کبھی کبھی ڈر بھی جاتی۔ وہ سوچتی کہیں یہ آصف کا وقتی جوش اور اس کے سطحی جذبات تو نہیں؟ بہرحال اس کے لیے اس کی تعلیم، والدین اور بہن بھائی اولین ترجیح رہے اور اس کی ہر غمی خوشی انہی کے ساتھ جڑی رہی۔ بس اسی دھوپ چھاؤں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور پریشانیوں کے درمیان زندگی کا سفر جاری رہا تھا اور اب..... اب حریم کی زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا تھا جس نے اسے بنیادوں سے ہلا کر اس کی ساری ہستی کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ؟ کیوں ہو گیا تھا؟ کبھی کبھی تو اسے اپنے جسم سے گھن آنے لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دو ناپاک ہاتھ ابھی تک اس کے جسم سے چپکے ہوئے ہیں اور بدبودار سانسیں زہریلی پھنکاروں کی طرح اس کی سماعت کو اور حسِ شامہ کو مجروح کر رہی ہیں۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی جلد کو اپنے جسم پر سے کھرچ کر علیحدہ کر دے یا پھر آنکھیں بند کر کے کوئی ایسی چیز نگل لے جو اس کی جان کو اس کے داغ دار جسم کی قید سے آزاد کر ڈالے۔ اس وقت بھی وہ کسی ایسی ہی کیفیت میں بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی، دوپہر ہو چکی تھی لیکن دروازہ کھولنے اور باہر نکلنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جب وہ دروازہ کھولے گی اور باہر نکلے گی تو بے شمار نگاہیں اس کے چہرے پر جم جائیں گی۔ ان میں ایک نگاہ..... ہاں، ایک نگاہ آصف کی بھی ہوگی۔ یہ نگاہ اس سے پوچھے گی..... تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے حریم! تم وہ پہلے والی حریم تو نہیں ہو؟ تم نہیں ہو وہ پہلے والی حریم۔

☆☆☆

''حریم بیٹا! دروازہ کھولو۔'' عروبہ نے بے قراری سے بیٹی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

دوسری تیسری دستک پر حریم نے دروازہ کھولا۔ عروبہ نے اندر آ کر فوراً لائٹ آن کی۔ حریم کو دیکھ کر عروبہ کا دل ہول گیا۔ اس کے خوبصورت، شہد رنگ بال اجڑے ہوئے، آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرہ تپا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ''حریم! میری بچی۔'' عروبہ نے تڑپ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

اس کے جسم کی حرارت سے عروبہ کو فوراً پتا چل گیا کہ وہ بخار میں جل رہی ہے۔ اس لمحے اپنے شوہر امین کی باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ اس نے آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنے حلق میں انڈیل لیا اور بولی۔ ''ادھر آؤ میری بچی! ادھر بیٹھو۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' اس نے حریم کو بازوؤں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ تکیے سے ٹیک لگوا کر اس کی ٹانگیں سیدھی کیں اور کمبل اوڑھا دیا۔ تب اس نے کچن میں جا کر فرنچ ٹوسٹ اور چائے بنائی اور اپنے ہاتھ سے حریم کو ناشتا کرایا۔ اسے بخار کی دوا دے کر وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

وہ دسمبر کی ایک سرد دوپہر تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نکلنے والا سورج اب کہیں بادلوں کی دبیز تہ میں چھپ چکا تھا۔ عروبہ نے کمرے کی لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کی اور پردے درست کر کے اس کے پاس ہی کمبل میں بیٹھ گئی۔ اس نے حریم کے سر کو ہولے ہولے دباتے ہوئے وہ ساری باتیں اپنے انداز میں اسے سمجھائیں جو کچھ دیر پہلے امین نے اسے سمجھائی تھیں۔ آخر میں وہ بولی۔ ''دیکھو میری بچی! یہ ہم سب کا سانجھا دکھ ہے..... اور اسے ہم سب نے مل کر جھیلنا ہے۔ خود کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا مت سمجھنا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہو تو ہم ہیں۔ جو لوگ حوصلے کے ساتھ دکھوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اللہ بھی ان کا ساتھ دیتا ہے اور دیکھنا اللہ ہمارا ساتھ دے گا، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا.....''

''کیا ٹھیک ہوگا ماما؟ مجھے لگتا ہے کہ میرا دل دھڑکتا ہے، سانسیں چلتی ہیں لیکن میری روح نے میرے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں ایک مردے کی طرح اپنے آپ کو گھسیٹتی پھرتی ہوں۔ میں کسی سے آنکھ نہیں ملا سکتی ماما۔'' وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

عروبہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر بھینچا۔ ''چپ کر جا میری بچی! جو کچھ ہوا ہے، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔ وہ اوپر والا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ تم دیکھ لینا بہت جلد اس بدبخت کو اپنے کیے کی سزا ملے گی۔ مل کر رہے گی۔ سب کچھ تیری آنکھوں کے سامنے

ہوگا۔"

اس نے دیر تک بیٹی کو اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کا اپنا دل بھی رو رہا تھا لیکن آنکھیں خشک تھیں۔ کچھ دیر بعد حریم نے سسک کر کہا۔ "ماما! کہیں باریال اور ماہین کو کوئی شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں حریم"۔ عروبہ نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "انہیں صرف یہی پتا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پڑھائی میں بھی دقت پیش آرہی ہے۔ ایک دو ٹیسٹ اچھے نہیں ہوئے ہیں۔"

"ماما! کسی وقت باریال مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہے جیسے کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو مگر پوچھ نہ پا رہا ہو..... ماہین بھی بات کرتے کرتے ایک دم چپ ہو جاتی ہے۔"

"نہیں میری بچی! اس طرح کے واہموں کو دماغ میں جگہ نہ دو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

عروبہ دیر تک اسے تسلی دیتی رہی اور پُرسکون کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے اشارتاً حریم سے یہ ذکر بھی کر دیا کہ اس کے پاپا اس گھر سے شفٹ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

☆☆☆

امین سرور نے شہر کے شمالی علاقے میں ایک نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانچ مرلے کے مکان کا اپر پورشن کرائے پر لے لیا اور دو دن بعد ہی انہوں نے ایک مزدا کروا کر اپنا سامان بھیجنا شروع کر دیا۔ ہمسائے اور آس پاس کے لوگ ان کی آناً فاناً نقل مکانی پر حیران تھے۔ خاص طور پر ثمینہ آنٹی..... ثمینہ آنٹی کو تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے ثمینہ آنٹی کہتے تھے۔ وہ اپنی ساس، دو بچوں اور شوہر کے ساتھ امین صاحب کے گھر سے دائیں جانب دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں۔ چھوٹا بیٹا علی، باریال کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا جبکہ بڑا بیٹا عمر میڈیکل کر رہا تھا۔ اس کے والد صحافت کے پیشے سے منسلک تھے۔

ثمینہ آنٹی اور عروبہ کے درمیان اچھے تعلقات تھے اور یہ وہ واحد پڑوسی تھے جن کی طرف عروبہ کبھی کبھار چکر لگا لیا کرتی تھی۔ ثمینہ آنٹی بھی کسی نہ کسی بہانے عروبہ سے ملنے آجایا کرتی تھیں۔ دونوں کی مشترکہ پسندیدہ سندھی بریانی کا تبادلہ بھی چلتا رہتا تھا جبکہ باریال اور علی اکٹھے کرکٹ کے میدان میں نظر آتے تھے۔ عروبہ جب کبھی سرراہ عمر کو دیکھتی، وہ بڑے ادب سے سر جھکا کر سلام کہتا ہوا گزرتا۔ اس کی یہ ادا عروبہ کو بہت بھلی لگتی۔ حریم کو بھی اس کا یہ جھکی جھکی نگاہوں والا انداز بہت بھاتا تھا۔ وہ اکثر عروبہ کے سامنے عمر کی شریف النفسی کی تعریف کرتی اور کہتی کہ عمر بھائی بالکل اپنے ابو پر گئے ہیں۔

سامان لے جانے والا مزدا اپنا دوسرا پھیرا لے کر جا چکا تھا، اب عروبہ اور بچے اپنی مہران کار پر جانے کے لیے تیار تھے۔ آنٹی ثمینہ پریشان صورت بنائے ان کے پاس آئیں اور بولیں۔ "عروبہ! آناً فاناً یہ سب کیسے ہو گیا۔ کیا پہلے سے کوئی پلان تھا؟ تم نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ مجھے ابھی پندرہ منٹ پہلے پتا چلا ہے۔"

عروبہ بولی۔ "بس باجی! فیملی میں ذرا پراپرٹی کی تقسیم کی بات چل رہی تھی۔ امین نے سوچا ہے کہ اپنی زندگی میں ہی یہ گھر بیچ کر چھوٹے بھائی اور بہنوں کو ان کا حصہ دے کر فارغ ہو جاؤں۔ بعد میں اپنا گھر بھی بنا لیں گے۔ ابھی تو شفٹ ہو رہے ہیں۔ یہاں رنگ روغن کرائیں گے۔ کوئی اچھی قیمت ملی تو بیچ بھی دیں گے۔" عروبہ نے ثمینہ آنٹی سے آنکھیں چراتے ہوئے تھوڑی سی مزید وضاحت کی پھر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ فون پر انہیں اپنی نئی رہائش کا ایڈریس send کریں گی اور رابطہ برقرار رہے گا۔

ابھی ثمینہ آنٹی کے ساتھ عروبہ کی بات ہو رہی تھی کہ اچانک عروبہ کی نگاہیں بیرونی گیٹ سے گزر کر سڑک کی طرف گئیں۔ اس کی رگوں میں جیسے خون جم گیا۔ اس نے اسی منحوس عدیل کو دیکھا جس کو دیکھنے کے خوف نے اسے کئی دنوں سے ہلکان کر رکھا تھا۔ وہ خبیث اپنی موٹر بائیک کے پیچھے اپنے کسی اوباش دوست کو بٹھائے بڑی دھیمی رفتار سے ان کے گیٹ کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس کی شیطانی نگاہیں ان کے گھر پر ہی مرکوز تھیں۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ عروبہ کو محسوس ہوا کہ چند لمحے رگوں میں جامد رہنے کے بعد اس کے جسم کا سارا خون چہرے اور سر کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ ایک چکر سا آیا اور اس نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

آنٹی ثمینہ نے اس کی کیفیت دیکھ کر "ہائے اللہ" کہا اور تیزی کے ساتھ اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ "ارے، عروبہ کیا ہوا؟"

عروبہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بولیں۔ "چلو، اندر چل کر بیٹھو..... لگتا ہے کہ کچھ کھائے پیے بغیر تم اندھا دھند کام کر رہی ہو۔"

آنٹی ثمینہ اسے اس کے بیڈروم تک لے آئیں۔

اسے پانی پلایا۔ حریم اور ماہین کو آواز دی۔ آنٹی کے کہنے پر حریم اپنی ماں کے شانے دبانے لگی۔ ایک لمحے کے لیے عروبہ کا دل چاہا کہ اپنا کٹا ہوا کلیجا اپنی اس ہمدرد کے سامنے رکھ دے اور چیخ چیخ کر سارے محلے کو اکٹھا کرلے۔ ان سب کو اس سوال کا جواب دے جو وہ سب پوچھ رہے تھے۔ انہیں بتائے کہ وہ یہاں سے کیوں جارہے ہیں؟ کیوں اپنے اس گھر کے در و دیوار کو خیر باد کہہ رہے ہیں؟ کیوں اس گلی کو اور اس سے وابستہ ساری یادوں کو الوداع کہہ کر یہاں سے منہ موڑ رہے ہیں.....

لیکن وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔ اگر وہ کہتی تو اس علاقے کی ہر دیوار پر اس کی اور اس کے اہلِ خانہ کی بدنامی کے اشتہار لگ جاتے۔ ایسے معاملوں میں یہ معاشرہ ایسا ہی سنگدل ہوجاتا ہے۔ اس نے اپنے سلے ہونٹوں کو سلا ہی رہنے دیا۔

☆☆☆

کچھ دن پہلے تک انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ حالات ان کی زندگی میں ایسی حیران کن تبدیلیاں لائیں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہیں اپنا وہ پیارا آنگن چھوڑنا پڑا تھا جہاں ان کی زندگی کے کئی برس سنہری یادوں کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔ اب یہ ایک نامانوس جگہ تھی۔ اردگرد کے نامانوس لوگ تھے۔ پانچ مرلے کا یہ پورشن سامان رکھنے اور رہنے کے لحاظ سے کافی تو نہیں تھا مگر گزارہ ہونے لگا تھا۔ روز و شب کے معمولات ترتیب پانا شروع ہوگئے تھے۔

جمعے کا دن تھا۔ صبح گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا جب عروبہ سوسائٹی کی مارکیٹ سے گروسری لے کر گھر پہنچی۔ کچھ سامان اس نے گاڑی میں ہی رہنے دیا جبکہ گوشت، سبزی اور انڈے وہ اپنے ساتھ لے آئی۔ آج وہ حریم کا پسندیدہ چکن کارن سوپ بنانے جارہی تھی۔ حریم ابھی کالج میں تھی اور وہ اس کے آنے سے پہلے سوپ تیار کرلینا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے چکن ابالنے کے لیے رکھی ہی تھی کہ اس کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔

''السلام علیکم چچی! میں آصف بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟'' عروبہ نے رکے رکے لہجے میں جواب دیا۔

''میں تو ٹھیک ہوں چچی! آپ اور چچا تو خیریت سے ہیں نا۔ نئی جگہ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں بیٹا! خدا کا شکر ہے، سب ٹھیک ہے۔ اب تو ''سیٹنگ'' وغیرہ بھی سب ہوگئی ہے۔'' اتنا کہہ کر عروبہ خاموش ہوگئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

آصف بولا۔ ''آپ لوگوں کی اچانک شفٹنگ نے مجھے حیران کردیا تھا لیکن پھر ابو جان سے پتا چلا کہ آپ گھر کو ''رینوویٹ'' کرکے بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چلیں اچھی بات ہے۔ وہ علاقہ کافی گنجان ہوچکا ہے۔ طرح طرح کے لوگ آگئے ہیں۔''

''ہاں آصف! شفٹ ہونے کا ارادہ تو کافی دیر سے تھا لیکن پھر پچھلے مہینے اچانک پروگرام بھی بن گیا۔''

''چلیں جی۔ ہونے والا کام ہوگیا۔ ویسے ہم لوگ اگلے ہفتے لاہور آرہے ہیں۔ آپ کی طرف بھی چکر لگے گا..... ویسے چچی..... ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' آصف نے ذرا رک کے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف عروبہ کو لگا کہ دل اچھل کر گلے میں آگیا ہے..... کہیں آصف کچھ جان تو نہیں گیا ہے؟ اسے یا اس کے گھر والوں کو کوئی شک تو نہیں پڑ گیا.....؟ نہیں نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے..... عروبہ نے خود کو سمجھایا اور سنبھالا۔

''ہیلو چچی! ہیلو..... آپ سن رہی ہیں؟''

وہ جیسے چونک کر بولی۔ ''جی جی بیٹا! میں سن رہی ہوں۔'' عروبہ کی آواز میں لرزش تھی۔

''چچی! چھ سات روز پہلے فون پر آپ سے امی ابو کی بات ہوئی تھی۔ بقول امی، آپ کچھ پریشان لگے تھے انہیں۔ اس دوران میں حریم سے بھی میری بس ایک دو دفعہ ہی بات ہوسکی ہے۔ یا تو اس کا فون بند ہوتا ہے یا پھر وہ ٹھیک طرح سے بات ہی نہیں کرتی۔ کیا معاملہ ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

آصف کے لہجے کے تجسس اور ذومعنی انداز کو عروبہ نے پوری طرح محسوس کیا۔ ایک لمحے میں کئی خدشات اس کے ذہن میں ابھرے۔ تاہم وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں آصف! بالکل خیریت ہے۔ تم یونہی پریشان ہو رہے ہو۔ اصل میں امتحانات قریب ہیں۔ پڑھائی کا بوجھ ہے۔ اس وجہ سے ''اسٹریس'' لے رہی ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔ تم فکر نہ کرو۔''

ساتھ ہی ڈور بیل کی آواز آئی۔ اس سے عروبہ کو رابطہ منقطع کرنے کا جواز ملا۔ ''شاید کوئی دروازے پر ہے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے چچی! سب کو سلام دیجیے گا۔ ہم لوگ اس ہفتے ضرور چکر لگائیں گے۔ خدا حافظ۔''

فون بند ہوا تو عروبہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی....

اُن گنت اندیشے اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

☆☆☆

عروبہ نے اپنے شوہر امین سرور کو رات والی دوا کھلائی۔ خود ہی ان کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر لائٹ آف کی۔ سائڈ لیمپ آن کیے اور ان کے پاؤں کی جانب بیٹھتے ہوئے یہ خبر ان کے گوش گزار کی کہ آصف کا فون آیا تھا۔ اس نے مختصراً ساری گفتگو کا ذکر بھی کیا۔

امین سرور نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہماری حریم ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ کبھی نارمل ہو بھی پائے گی یا نہیں؟''

''وقت سب سے بڑا مرہم ہے امین۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کے زخم مندمل ہونے لگیں گے لیکن اس میں پتا نہیں کتنی دیر لگے۔ دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ وہ آصف سے اپنا سابقہ رویہ اور تعلق برقرار نہیں رکھ پا رہی۔ وہ بے حد اپ سیٹ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے رویے کی وجہ سے آصف کے امی ابو بھی کچھ کھنچے ہوئے ہیں۔''

امین سرور کا رنگ زرد ہونے لگا۔ عروبہ اسی لیے شوہر سے کسی نازک موضوع پر بات نہیں کرتی تھی۔ ان کے دل کا عارضہ ایک دم انہیں شدید تناؤ میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''قدرت انسان کو عجب امتحانوں میں ڈالتی ہے۔ کبھی کبھی انسان کھرا اور سچا ہونے کے باوجود چپ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہمارے دل میں کوئی کھوٹ نہیں، نہ ہی آصف کے لیے یا اس کے گھر والوں کے لیے کوئی دغا ہے، اس کے باوجود ہم مجبور ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ اس طرح کے معاملات انسان کو خاموشی سے اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ جہاں پر ہماری عقل اور ہمت جواب دے جاتی ہے، وہاں سے اس کی تدبیر شروع ہوتی ہے۔ تم بھی اسی سے مانگو۔'' امین سرور سیدھے لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ وہ نماز روزے کے پابند تو پہلے ہی تھے لیکن جب سے حریم والا سانحہ ہوا تھا ان کا رجحان مذہب کی طرف اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے جیسے، اپنا اور اپنی لاڈلی بیٹی کا انصاف اللہ پر چھوڑ دیا تھا لیکن عروبہ کے ذہن میں اکثر یہ سوال ابھرتا تھا کہ کیا بندہ جس طرح اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اپنا رزق حاصل نہیں کر سکتا..... کیا انصاف حاصل کر سکتا ہے؟

کچھ دیر بعد امین سو گئے۔ عروبہ نے ان کی ٹانگوں پر کمبل درست کیا اور بہت ہولے سے اپنے تکیے پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔ اَن گنت وسوسے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے اور دھندلا رہے تھے۔ اپنے بیمار شوہر کو مزید پریشانیوں سے بچانے کے لیے عروبہ نے ''ٹکراؤ'' کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا اور اپنے شوہر کا کہا مان کر خاموشی سے اس نئی رہائش گاہ پر چلی آئی تھی لیکن اس بدبخت نے اس کی پھول سی بیٹی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ کسی طور عروبہ کے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ عدیل اور اس کے گرانڈیل باپ ایڈووکیٹ ریاض کے منحوس چہرے عروبہ کی نگاہوں میں گھومتے رہتے تھے۔

وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی جب اس کے تصور نے ایک بار پھر اسے وہی منظر دکھایا جو وہ پچھلے چند برسوں میں درجنوں بار دیکھ چکی تھی۔ کھیت..... سرکنڈے..... گلاب کے سفید پھولوں پر خون کے سرخ چھینٹے۔ گلاب ہی گلاب..... چھینٹے ہی چھینٹے۔ وہ بھاگ رہی ہے۔ ایک دائرے میں گول گول چکرا رہی ہے۔ کچھ خون آشام جانور اسے گھیر رہے ہیں۔ اسے چیر پھاڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کدھر جائے۔ کہاں سے راستہ پائے۔ جانوروں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا ہے پھر ایک دم وہ اپنے تصور سے باہر نکل آئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ مقامی مسجد کے امام صاحب نے اسے ایک چھوٹا سا ورد بتایا تھا۔ وہ زیرِلب پڑھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ مناظر ایک ہی ڈھنگ سے کیوں بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟

وہ زیرِلب پڑھتی رہی اور پھر اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹے لیٹے سو گئی۔

☆☆☆

ہفتے کا دن تھا اور فروری کی ایک چمکیلی دوپہر۔ حریم آج پہلی مرتبہ اپنی اس نئی رہائش گاہ کے ٹیرس میں آ کر بیٹھی تھی۔ آج صبح سے ہوا کے ہلکے جھونکے دروازوں اور کھڑکیوں پر مدھم دستک دے رہے تھے۔ ذرا فاصلے پر سڑک کے درختوں سے ہوا ٹکراتی تو پتوں کے ساز بج اٹھتے۔ حریم ہوا میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی ایک موسم کا دوسرے موسم سے ملنے کا اشارہ تھا۔ موسم بدلنے والا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس کے دل کا موسم جوں کا توں تھا۔ ایک بے نام خزاں جیسے اس کے اندر ٹھہری گئی تھی۔

ہوا کے جھونکے اس کے شہد رنگ ریشمی بالوں کو لہرانے لگے۔ اس نے اپنی اوڑھنی درست کی اور ہاتھ بڑھا

کر اپنا سیل فون آف کر دیا۔ فون آف کر کے اسے ایک عجیب سا سکون ملا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ آصف اور اس کے سوالوں سے بہت دور چلی گئی ہے۔ وہ اس کا سنگیتر تھا۔ اس سے بات کرنا حریم کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا لیکن اب اس کے برعکس تھا۔ اسکرین پر اس کا نمبر دیکھ کر حریم کا دل ہول جاتا تھا۔ وہ فرار کے راستے سوچتی تھی۔ کبھی چارجنگ ختم ہونے کا بہانہ، کبھی فون دوسرے کمرے میں ہونے کا عذر اور کبھی اس طرح کا کوئی اور ایکسکیوز..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ ایک دو بار تو اس کے دل میں آئی تھی کہ وہ سینے پر بہت بڑا پتھر رکھ کر سب کچھ آصف کو بتا ڈالے۔ اس سے کہہ دے کہ اس پر کیا گزری ہے، پھر سب کچھ اس پر چھوڑ دے کہ وہ کیا کرتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں وہ اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتی تھی۔

جب عروبہ نے کچن کی کھڑکی سے حریم کو ٹیرس میں بیٹھے دیکھا تو اسے تھوڑی سی خوشی محسوس ہوئی۔ وہ فوراً گاجر اور مولی کاٹ کر اور اس پر تھوڑا سا چاٹ مسالا چھڑک کر باہر ٹیرس میں لے آئی اور حریم کے پاس جا بیٹھی۔ حریم کچھ دیر ماں کو دیکھتی رہی پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''ممی! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے آپ کو اور پاپا کو اتنی پریشانی ملی ہے.....''

وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر عروبہ نے اسے وہیں روک دیا۔ ''حریم! بے وقوف مت بنو۔ اب ان باتوں سے آگے نکلو۔ یہ دیکھو، میں تمہارے لیے بنا کر لائی ہوں۔ کھاؤ اسے۔'' عروبہ نے گاجر کا ایک ٹکڑا اچک کر زبردستی حریم کے منہ میں ڈالا۔

اسی دوران میں باریال اور ماہین بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماہین نے عروبہ کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ممی! آپ نے کہا تھا کہ گراسری کرنے چلنا ہے۔ وہاں سے جوائے لینڈ بھی چلیں گے۔'' ماہین ابھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔

باریال بولا۔ ''ممی! مجھے بھی اپنے لیے نیا کرکٹ بیٹ دیکھنا ہے۔'' وہ حریم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپی! آپ بھی ساتھ چلیں گی نا؟'' باریال کو حریم والے سانحے کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ پھر بھی اتنا تو وہ جانتا تھا کہ کسی وجہ سے اس کی آپی اور ممی، پاپا بہت ڈسٹرب ہیں۔ وہ اکثر حریم کی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔

باریال کی بات کے جواب میں حریم نے کہا۔ ''نہیں باریال! میں نہیں جا سکوں گی۔''

''کیا کرتی ہو حریم۔'' عروبہ نے اسے ٹہوکا دے کر کہا۔ ''مزہ آئے گا۔ تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ چلو اٹھو۔''

''نہیں ممی! میں نہیں جاؤں گی۔ میں کچھ دیر ادھر ہی بیٹھوں گی۔ پرسوں ایک ٹیسٹ ہے، اس کی تیاری بھی کرنی ہے۔'' حریم نے جلدی سے بہانہ کر ڈالا۔

کچھ ایسی ہی طبیعت ہو گئی تھی اس کی۔ کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کالج بھی مجبوری کے تحت اور خوف کے سائے میں جاتی تھی کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا اور یہ جو ٹیسٹ کے لیے پڑھنے کا بہانہ کیا تھا اس نے، یہ بالکل ہی ''بہانہ'' تھا۔ عروبہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ جب سے یہ حادثہ ہوا ہے، حریم نے شاید ایک دن کے لیے بھی توجہ اور دل جمعی سے نہیں پڑھا۔

وہ بیٹی کے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''بھئی! میں نے سوچا تھا کہ مل کر کچھ شاپنگ کر لیں گے اور کل کے ڈنر کے لیے میں کچھ سامان بھی خرید لوں گی۔ تمہارے تایا تائی آرہے ہیں نا.....'' عروبہ نے موقع دیکھ کر آصف اور اس کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع بڑے ہلکے پھلکے انداز میں حریم کو دی۔ یہ اطلاع پا کر حریم کے ملیح چہرے پر بے چینی کے سوا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''نہیں ممی! آپ لوگ ہو آئیں۔ میں اگلی دفعہ چلی جاؤں گی۔''

عروبہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ ہم..... ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس آجائیں گے، پھر مل کر چائے پئیں گے اور زیادہ دیر باہر مت بیٹھنا۔ جاتی سردی بیمار کر دیتی ہے۔ دروازے اچھی طرح بند کر لینا۔''

حریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد آج حریم پہلی مرتبہ گھر میں تنہا تھی۔ عروبہ نے اسے کبھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔ حریم ٹیرس میں بیٹھی رہی۔ ماضی قریب کی اس اندوہناک سہ پہر کے مناظر اس کے ذہن پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ کرخت گرفت..... بدبودار سانسیں، سرخ انگارہ آنکھیں۔ اس نے اپنی سوچوں کو ان اذیت ناک مناظر سے دور رکھنے کے لیے اپنی توجہ اردگرد کے مناظر پر مرکوز کر دی۔ ٹیرس کے خوبصورت پھول، سڑک کی دوسری جانب لہلہاتے پودے، کھڑکیوں پر دستک دیتے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ اب آہستہ آہستہ اسے اپنی سوچوں اور اپنے

لاغر دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ عروبہ اور حریم نے پنجاب کارڈیالوجی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ امین سرور کو سیڑھیاں اتار کر گیراج تک لے جانے کی تدبیر سوچ رہے تھے جب عروبہ کو محسوس ہوا کہ اس کے شوہر کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ وہ ایمرجنسی والی میڈیسن لینے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف دوڑی..... لیکن اس کے لیے بھی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے واپس لوٹنے سے پہلے ہی امین سرور دنیا اور اس کے دکھوں سے منہ موڑ چکے تھے۔ حریم کی منگنی کے بعد ان کی زندگی کی ڈور بھی ٹوٹ گئی تھی۔

''امین..... امین!'' عروبہ دلدوز انداز میں پکاری۔

بچے بھی دوڑے ہوئے آئے پھر پورا گھر دھاڑوں سے گونجنے لگا۔ حریم اپنے پیارے پاپا کی چھاتی پر گر گئی۔ یہ قیامت کا سماں تھا.....

☆☆☆

عروبہ کے گھر کا ماحول جو بتدریج بہتری کی طرف جا رہا تھا، امین سرور کے چلے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر سراسیمگی اور اندوہ کی لپیٹ میں آ گیا..... بیماری سے پہلے اور بیماری کے بعد بھی امین سرور نے اپنی ہمت طاقت کے مطابق اس گھر کے سربراہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اپنے شوہر کی موجودگی میں عروبہ کو ہمیشہ ایک احساس تحفظ رہا تھا لیکن اب اسے یوں لگا کہ وہ زمانے کے گرم سرد کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ باپ کی جدائی نے سب بچوں کو بری طرح متاثر کیا تھا لیکن سب سے زیادہ اثر حریم پر ہوا تھا۔ عروبہ کو یوں لگتا تھا کہ وہ خود کو براہِ راست اپنے پیارے پاپا کی موت کا ذمے دار سمجھتی ہے۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا اور رو رو کر ہلکان ہوتی رہتی تھی۔ کالج اور اکیڈمی جانا بالکل چھوٹ چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں بہ مشکل دو چار لقمے لیتی تھی۔ اس کی صحت روز بروز گر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ان سارے دکھوں کی بنیاد سمجھتی تھی۔

عروبہ نے اپنی دلکش حریم کو ہمیشہ پراعتماد اور بلند حوصلہ پایا تھا لیکن اب وہ اس کی حالت دیکھتی تھی تو اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتی تھی اور ایسے ہی لمحوں میں عدیل عرف عادی کا مکروہ چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ سوجی سوجی سی بھوری آنکھیں..... سر کے لمبے بال، قدرے موٹی ناک اور کسی سانڈ جیسا چوڑا چکلا جسم۔ اس کا دل چاہتا وہ اس کے سامنے ہو۔ وہ اس کا گریبان پکڑے، پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچے اور چلا کر پوچھے..... شیطان باپ کے شیطان بیٹے، تجھے پتا ہے تو نے کتنی زندگیاں برباد کی ہیں؟

امین کی وفات کے بعد ایک دو ہفتے تک تو عزیزوں اور دیگر، پرسہ دینے والوں کا آنا جانا لگا رہا تھا پھر بتدریج سناٹا چھانا شروع ہو گیا تھا۔ فقط ثمینہ آنٹی تھیں جو پرانے محلے سے آٹھ دس کلومیٹر کا سفر طے کر کے ہر دوسرے تیسرے روز ان کے پاس چلی آتی تھیں اور ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی تھیں۔ یقیناً وہ اس گھرانے کی سچی ہمدرد اور غمگسار تھیں۔ ان کی موجودگی میں عروبہ اور حریم کو بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔ اتنی بات تو ثمینہ آنٹی کو بھی معلوم ہو چکی تھی کہ امین کی وفات سے دو تین روز پہلے حریم کی منگنی ٹوٹ گئی تھی اور ممکن ہے کہ امین کو جو شدید ہارٹ اٹیک ہوا، اس میں اس واقعے کا بھی عمل دخل ہو۔

وہ آتیں تو دیر تک بیٹھتیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے عروبہ اور بچوں کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتیں لیکن ایک دن جب وہ عروبہ سے ملنے آئیں تو اپنے ساتھ پرانے محلے کی ایک اندوہناک خبر بھی لائیں۔ اس خبر کا تعلق ایک سنگین واردات سے تھا اور یہ ویسی ہی واردات تھی جو کچھ عرصہ پہلے عروبہ اور امین کے گھرانے کی زندگی کو تہ و بالا کر چکی تھی۔

ثمینہ آنٹی کو مسلسل خاموش دیکھ کر عروبہ نے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ جب سے آئی ہیں، کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟''

ثمینہ نے دائیں بائیں دیکھا۔ بچے آس پاس موجود نہیں تھے۔ حریم کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ ثمینہ نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ''عروبہ! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا ماحول اور معاشرہ کس سمت میں جا رہے ہیں۔ تم زویا کو جانتی ہو نا..... فرحت باجی کی چھوٹی بیٹی؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں جانوں گی۔ میری حریم کی ہم عمر ہے۔ اللہ خیر کرے، کیا ہوا اسے؟''

ثمینہ نے پھر محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ''عروبہ! بڑا ظلم ہوا ہے اس بے چاری کے ساتھ، کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اخباروں میں خبر تک چھپ گئی ہے، شاید تمہاری نظر سے نہیں گزری۔''

''ہائے میں مر گئی، ہوا کیا ہے؟'' عروبہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے تابی سے پوچھا۔

''وہی حرامزادہ عدیل..... وکیل ریاض جاوا کا بیٹا۔ اللہ کرے شام سے پہلے جنازہ اٹھے اس کا۔ اس نے پھول جیسی بچی کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پچھلے ہفتے کی رات کی بات ہے۔ فرحت اور اس کا میاں محلے میں ہی ایک مہندی پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں بچی تھی یا ایک ملازمہ تھی۔ ملازمہ دوا

کھا کر سوئی پڑی تھی، بچی ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ بدمعاش دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ پہلے مین سوئچ سے پورے گھر کی لائٹ بند کی پھر زویا کو پکڑ لیا۔ یہ بات بھی سنی ہے کہ شاید اس خبیث کا کوئی ساتھی بھی تھا لیکن ابھی یہ کنفرم نہیں ہوا ہے۔ گھر سے بھاگتے ہوئے بس اسی منحوس عدیل کو دیکھا گیا ہے۔"

ثمینہ کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ عروبہ کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو کا قطرہ نہیں۔ سینے میں اس کا دل کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا تھا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر بہ مشکل کہا۔

"اور..... اس ملازمہ کو کچھ پتا نہیں چلا؟"

"وہ مرن جوگی بھی بس مردار کی طرح پڑی رہی۔ وہ تو جب فرحت اور اس کا میاں گھر پہنچے اور انہوں نے دھڑا دھڑ گیٹ کھٹکھٹانا شروع کیا تو اندر سے چلانے کی مدھم آوازیں آئیں۔ اڑوس پڑوس والے بھی آ گئے۔ محلے کا ایک لڑکا دیوار پھاند کر اندر گیا اور اس نے مین سوئچ آن کیا۔ یہی وقت تھا جب وہ حرامزادہ پچھلی دیوار کود کر بھاگا۔ دو بندوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی پر وہ نکل گیا۔"

عروبہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی، اس کی نگاہوں میں معصوم صورت، نرم و نازک زویا کی شبیہ گھوم رہی تھی۔ وہ کالج جاتے ہوئے باقاعدہ حجاب لیتی تھی۔ انتہائی با اخلاق اور ہنس مکھ۔ کبھی کبھی حریم سے ملنے ان کے گھر بھی آتی تھی۔ یہ کیسی قیامت گزر گئی تھی اس پر۔

ثمینہ کہہ رہی تھی۔ "اگلے روز بے چاری نے مٹھی بھر کر گولیاں کھائیں۔ اسی وقت اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا دوا اثر کر چکی ہے۔ بچنا محال ہے، انہوں نے معدہ واش کیا اور ہر طرح کی طبی امداد پہنچائی۔ 48 گھنٹے تک تو یہی لگتا رہا کہ ابھی اسپتال سے کوئی بری خبر آ جائے گی لیکن پھر اتنا تو ہوا کہ اس کی جان بچ گئی۔"

"پپ..... پولیس..... میں..... رپورٹ وغیرہ درج ہوئی؟" عروبہ نے پوچھا۔

"وہ تو ہونا ہی تھی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو رہی نہیں تھی۔ اللہ کرے کسی کی آئی ہوئی اس خبیث کو آ جائے۔ وہ تو اس دن سے غائب ہو گیا ہے۔ پولیس اس کے چھوٹے بھائی کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس کا بے شرم باپ اپنی وکالت کا زور چلانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن یہ زور چلے گا نہیں..... بدنصیب بچی کی بددعائیں اس کے گلے کا پھندا ضرور بنیں گی..... انشاء اللہ۔" ثمینہ کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنی چادر کے پلو سے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرنے لگیں۔

عروبہ کو لگ رہا تھا کہ اردگرد کی ہر شے اس کی نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ چند ہفتے پہلے جو کچھ اس کی معصوم حریم کے ساتھ ہوا تھا، وہی کچھ اب، اسی محلے میں مسز فرحت کی بے گناہ بچی زویا کے ساتھ ہو گیا تھا..... اور یہ بھی ممکن تھا کہ چند ہفتے یا چند مہینے بعد کسی اور جگہ کوئی اور زویا کوئی اور حریم اسی بدبخت عدیل عادی کا نشانہ بن جاتی۔

ایک دم اچانک ہی ایک بلند و بالا آواز عروبہ کے سینے میں گونجی، اس چلاتی ہوئی آواز نے کہا۔ "عروبہ! ہفتے کے روز وہ گڑیا سی زویا اس لیے ظلم کا شکار ہوئی ہے کہ دو ماہ پہلے تم نے اور تمہارے شوہر نے اپنی حریم پر ہونے والی زیادتی کو خاموشی سے برداشت کر لیا تھا۔" عروبہ کو اپنا کلیجا شق ہوتا محسوس ہوا۔ وہ ہیجانی انداز میں بڑبڑائی۔ "مجھے چپ نہیں رہنا چاہیے تھا..... مجھے چپ نہیں رہنا چاہیے تھا....."

"کیا ہوا عروبہ؟ کیا کہہ رہی ہو؟" آنٹی ثمینہ کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔

عروبہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایک خوفناک کشمکش جاری تھی۔ وہ لمحے تھے لیکن اپنے اندر صدیوں کی تاثیر رکھتے تھے۔ آخر عروبہ نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے آنٹی ثمینہ کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "باجی! میں..... آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں..... آج میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

عروبہ کے تاثرات دیکھ کر ثمینہ آنٹی بری طرح چونک گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عروبہ کوئی بہت خاص بات کہنے جا رہی ہے۔ بند کمرے میں اور دھیمی آواز میں بولتے ہوئے، اگلے آدھ گھنٹے میں عروبہ نے وہ سبھی کچھ آنٹی ثمینہ کے گوش گزار کر دیا جو کچھ عرصہ پہلے اس پر اور اس کی بیٹی پر بلکہ پورے گھرانے پر گزرا تھا۔ آنٹی ثمینہ ہکا بکا سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت تھی، ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ چار دن پہلے جو کچھ زویا کے ساتھ ہوا ہے، وہی دو ڈھائی ماہ پہلے حریم کے ساتھ بھی ہو چکا ہے اور یہی وہ واقعہ ہے جس کے سبب ان لوگوں کو آناً فاناً وہ گھر اور محلہ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔

یہ ذکر اتنا گمبھیر تھا کہ اس روز آنٹی ثمینہ زیادہ دیر ان کے گھر نہ رک سکیں اور نہایت بوجھل دل کے ساتھ واپس لوٹ گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی کہا۔ "تم

ٹھیک ہی کہتی ہو عروبہ! ہم شریف لوگوں کی خاموشیاں ان بدمعاشوں کی طاقت بن جاتی ہیں۔ ان کے حوصلے آسمان کو چھونے لگتے ہیں لیکن میں یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ تم لوگوں کی مجبوریاں کیا تھیں۔ میں جانتی ہوں کہ اللہ بخشے تمہارا شوہر امین "بے ہمت" شخص نہیں تھا۔ اگر وہ بیماری کے گھیرے میں نہ ہوتا تو ہوسکتا ہے کہ ساری مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر قانونی کارروائی کا ارادہ کرلیتا۔"

اگلے تین چار روز تک آنٹی ثمینہ ان کے گھر نہیں آسکیں۔ شاید حریم والے صدمے سے ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن وہ آئیں تو انہیں پھر تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ عروبہ کے لب و لہجے میں ایک نیا عزم اور ارادہ تھا..... بلکہ ایک طرح کی بغاوت بھی اپنی مجبوریوں کے خلاف۔ وہ بولی۔ "باجی! اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ خاموش نہیں رہوں گی۔ یہ خاموشی مجھے ہمیشہ ایک گناہ کی طرح لگی ہے اور اب شاید یہ ثابت بھی ہوگیا ہے کہ وہ خاموشی ایک گناہ اور جرم تھی۔ اگر ہم اس وقت چپ نہ سادھتے تو شاید پچھلے ہفتے وہ معصوم زویا اس جانور کی زد میں نہ آتی۔ مجھے لگتا ہے باجی کہ اب میرے پاس کھونے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ امین دنیا سے چلے گئے۔ حریم ایک زندہ لاش بنی ہوئی ہے۔ بچے ڈری سہمی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ اب میں بولوں گی باجی! اب میں آواز اٹھاؤں گی اور تب تک خاموش نہیں ہوں گی جب تک میں مرنہیں جاتی یا وہ مکروہ انسان کیفرکردار کو نہیں پہنچ جاتا۔" عروبہ کے لہجے میں عجیب سی آگ تھی اور آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

آنٹی ثمینہ نے عروبہ کو گلے سے لگالیا۔ اس چھوٹے سے کنبے کے درد کا احساس ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ انہوں نے بس اتنا کہا۔ "یہ بڑا مشکل راستہ ہے عروبہ..... اور تم تنہا عورت ہو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، تمہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچ سمجھ لینا چاہیے۔"

"میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچ بچار کی ہے باجی! حریم سے بھی تھوڑی بہت بات ہوئی ہے۔ لاہور ہی میں حریم کے ایک خالو یا دور حیات ہیں۔ وہ کونسلر وغیرہ رہ چکے ہیں۔ ان کے لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ میں ان سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ابھی وہ فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی واپس آتے ہیں، ان سے ملتی ہوں پھر جو بات ہوگی آپ کو بتاؤں گی....."

آنٹی ثمینہ اپنے ساتھ کچھ چکن اور سبزی وغیرہ لے کر آئی تھیں۔ عروبہ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے چھوٹی ماہین کو ساتھ ملایا۔ آلو کی ٹکیاں اور ایک دو سالن بنا کر فریز کردیے۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتی تھیں۔

عروبہ نے کہا۔ "باجی! آپ یہ سب کچھ نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ اتنی دور سے چل کر آجاتی ہیں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"نہیں عروبہ! غیروں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارو۔ خاص طور سے حریم کو بہت زیادہ وقت دو۔ اس کو تمہاری توجہ کی بے حد ضرورت ہے۔ سچ پوچھو تو میری تو اب ہمت نہیں ہوتی اس کا سامنا کرنے کی۔ پھول سی بچی کیسے مرجھا کر رہ گئی ہے۔" آنٹی ثمینہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس نمی کو چھپانے کے لیے انہوں نے چہرہ دوسری طرف پھیرلیا۔ پھر وال کلاک کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ "عمر آنے ہی والا ہوگا، چار بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہوجاتی ہے..... اور ہاں، میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ عمر کا ہاؤس جاب ختم ہوچکا ہے۔ اب وہ موہنی روڈ والے اسپتال میں آگیا ہے۔ سمجھ لو کہ تمہارے گھر کے پاس ہی۔ میرا خیال ہے ابھی دس منٹ میں پہنچ جائے گا۔"

وہ واقعی دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اکثر وہ والدہ کو باہر سے ہی لے کر چلا جاتا تھا لیکن آج عروبہ نے اصرار کرکے اسے اندر بلالیا۔ وہ کچھ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر اکڑوں بیٹھا وہ عروبہ کو بہت نفیس اور بے حد شریف النفس لگا۔ جھکی جھکی نگاہیں، چہرے پر شرم و حیا کا عکس۔

عروبہ نے حریم کو آواز دی۔ "حریم بیٹا! چائے بنالو۔"

"نہیں آنٹی! بالکل ضرورت نہیں۔ ابھی دس منٹ پہلے پی کر آیا ہوں۔" اس نے اردگرد دیکھا۔ "باریال اور ماہین نظر نہیں آرہے؟" اس نے پوچھا۔

باریال اور ماہین دونوں عمر سے کافی مانوس ہوچکے تھے۔ عمر ہمیشہ باریال سے ایک بڑے بھائی کی طرح پیش آتا اور اس کی اسٹڈی کے حوالے سے سوال جواب کرتا رہتا۔ چھوٹی ماہین بھی اس سے کافی بے تکلف تھی۔

عروبہ نے کہا۔ "فائنل ہورہے ہیں ان دونوں کے۔ آج کل پڑھاکو بچے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھہرو، میں بلاتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی! پھر رہنے دیں، انہیں ڈسٹرب نہ کریں۔ ویسے بھی ذرا جلدی جانا ہے۔" اس نے یہ بات کہتے ہوئے ایک طائرانہ سی نظر اردگرد ڈالی۔

انکل امین سرور کی وفات کے بعد سے عمر نے ایک

دفعہ بھی حریم کو نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے بارے میں سوچتا اور فکرمند رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ حریم میں کوئی خاص تبدیلی آ چکی ہے۔ ایسی تبدیلی جس کو مثبت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ایک دفعہ اس کے سامنے آئے اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکے۔ وہ حریم کے بارے میں اس انداز میں کیوں سوچتا تھا؟ وہ کبھی خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ سوچنے لگا، بہتر تو یہ تھا کہ وہ چائے کے لیے منع نہ کرتا، شاید اسی بہانے وہ اسے ایک دفعہ دیکھ لیتا۔

''ممی! چائے بن چکی ہے، میں لا رہی ہوں۔'' کچن کی جانب سے ایک نرم، کھنکتی ہوئی سی آواز آئی جو سیدھی اس کے دل پر لگی۔

دو منٹ بعد حریم چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس نے اپنے سوٹ سے میچنگ شال کے بجائے ایک گرے رنگ کی کسی قدر سلوٹوں والی شال، اسکارف کی صورت میں لپیٹ رکھی تھی۔ عمر جو اکثر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نظریں جھکا لیتا تھا، آج ایسا نہ کر سکا۔ وہ بے ساختہ اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے دل پر جیسے کسی نے ایک گھونسا مار دیا تھا۔ اداس چہرہ، زردی مائل رنگ، آنکھوں کے گرد حلقے..... کیا یہ حریم ہی تھی؟

ثمینہ نے عمر کو یوں بے ساختہ حریم کو تکتے پایا تو اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''بیٹا! اب چائے پی کر نکلتے ہیں، علی گھر میں اکیلا پریشان ہو رہا ہوگا۔''

''جی امی!'' عمر نے فوراً اپنا کپ اٹھا لیا۔ حریم جس طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی اور عمر چائے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے یہی سوچنے لگا کہ اس پھول سی لڑکی کو کس موسم کی کرخت دھوپ نے ادھ موا کر دیا ہے۔

واپس اپنے گھر پہنچ کر بھی عمر، حریم کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ والد کی موت کا صدمہ بے شک اپنی جگہ موجود تھا لیکن پتا نہیں کیوں عمر کو لگتا تھا کہ بات اس صدمے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ امی اس سے کھانے کا پوچھنے کے لیے اس کے کمرے میں آئیں تو وہ جیسے بے ساختہ بول اٹھا۔ ''امی! حریم کو کیا مسئلہ ہے..... میرا مطلب ہے کہ اس کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟''

اسے محسوس ہوا کہ اس کی امی کچھ گڑبڑا گئی ہیں لیکن پھر خود کو سنبھال کر بولیں۔ ''ہاں بیٹا! ٹھیک ہے وہ۔ اپنے والد سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس بے چارے نے بھی اپنی لاڈلی کے بارے میں پتا نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ دونوں کا ساتھ چھوٹ گیا، اس سے بڑا غم کیا ہوگا۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک حریم کے گھریلو اور تعلیمی مسائل کے بارے میں بات کرتے رہے، پھر عمر کھانے کی ٹیبل پر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، عمر کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے امی ابو کے کمرے سے باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ ننگے پاؤں ادھ کھلے دروازے کے نزدیک گیا تو الفاظ اس کے کانوں تک پہنچنے لگے۔ اس کی امی اس کے ابو سے جو گفتگو کر رہی تھیں، اس کا موضوع، حریم اور اس کی فیملی ہی تھی..... اور پھر جو کچھ اس نے سنا اس نے اس کی روح تک کو فنا کر دیا۔ اس پر جو لرزہ خیز انکشاف ہوا وہ جانکاہ تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا کھڑا پسینے میں نہا گیا۔

حریم کا چہرہ وہ چہرہ تھا جو ایک دیے کی طرح برسوں سے اس کے سینے میں روشنی بکھیر رہا تھا۔ بڑی خاموشی لیکن بڑے تسلسل کے ساتھ یہ روشنی اس کے جسم کے ہر مسام میں سرایت کر چکی تھی۔ خاموش محبت جو کسی طوفان کی طرح پُرشور نہیں بلکہ جھیل کی طرح گہری اور پُرسکون ہوتی ہے۔ یہ وہ محبت نہیں تھی جس کے تار ملن اور شادی بیاہ پر آ کر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ یہ ہر قسم کے بندھن سے آزاد غیر مشروط محبت تھی، صرف محبت تھی۔

وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ عمر لڑکپن سے اسے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اس کی خوشنما جھلکیاں اس کے دل و دماغ پر نقش تھیں۔ اس کا اجلا یونیفارم پہن کر اسکول جانا، گھر کے بیرونی دروازے پر نظر آنا، چھت پر گھومنا، کسی حسین تہوار پر خوش رنگ کپڑوں میں ملبوس ایک روشن لکیر کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر جانا۔ کبھی کبھار اپنی امی کے ساتھ عمر، ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کبھی ایک دو جملوں سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے قریب سے اور غور سے دیکھنا چاہتا تھا، خاص طور سے اس کی آنکھوں کو۔ اس نے حریم سے بات کرنے کے اور اس کو اپنے دل کا حال سنانے کے ان گنت پلان بنائے تھے..... مگر لڑکپن کے یہ سارے پلان صرف پلان ہی رہے تھے..... اور وقت گزرتا چلا گیا تھا۔ دن ہفتے اور مہینے خشک ریت کی طرح اس کی مٹھی سے پھسلتے چلے گئے تھے۔ ایک اسٹیج پر جب اسے میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تھا، اس نے بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا کہ وہ اپنی امی کو اپنے دل کے حال

سے آگاہ کرے گا اور کہے گا کہ وہ انکل امین کی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے..... لیکن پھر انہی دنوں اسے یہ گھائل کر دینے والی اطلاع ملی تھی کہ حریم کا رشتہ اس کے خاندان میں ہی تایا کے بیٹے سے طے ہو گیا ہے۔ وہ کئی ہفتوں تک ایک بے کل پرندے کی طرح رہا تھا مگر اپنی کم ہمتی کے پنجرے میں بند پرندہ پھڑ پھڑانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے خود کو سنبھال کر اپنی اسٹڈی میں غرق کر لیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا اسے، لیکن وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بھلانے سے لوگ بھولا نہیں کرتے۔ وہ دماغ کے ایک حصے سے نکل جاتے ہیں لیکن دل کے خاموش گوشوں میں زیادہ گہری جگہیں بنا لیتے ہیں۔ حریم کی چاہت بھی اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں موجود تھی۔ چاندنی راتوں، ساون کی جھڑیوں، سرما کی دھوپوں اور تہواروں کے رنگوں میں لپٹی ہوئی یہ چاہت اب بھی کسی کو ڈھونڈتی تھی.....

''حریم! یہ کیا ہوا؟'' اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا اور اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ وہ رات عمر کی غم ناک ترین راتوں میں سے ایک تھی۔

☆☆☆

رشتہ ٹوٹنے کا صدمہ بہت بڑا تھا، مگر اس صدمے میں سے عروبہ کے لیے بے خوفی اور جرأت کے نئے راستے نکلے تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس کا پروگرام تھا کہ باریال اور ماہین کو مستقل طور پر ان کی پھپھو کے پاس کوئٹہ بھیج دے گی اور اپنی لٹی پٹی بیٹی حریم کے ساتھ خم ٹھونک کر میدان میں آ جائے گی۔ اس نے تمام مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر براہِ راست انصاف کے حصول کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے مرحوم نانا سے بہت سی باتیں سیکھی تھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حق سچ کے لیے آواز اٹھانا ایک جہاد ہے۔

عروبہ نے سب سے پہلے حریم کو اپنے اعتماد میں لیا..... اور اس کے بعد بڑا حوصلہ کر کے اور دل پر پتھر رکھ کر باریال اور ماہین کو بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو ان کی آپی پر گزرا تھا۔ یہ سب کچھ بتانا اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بچے عجیب سی الجھن اور شکوک کا شکار نظر آتے تھے۔ وہ جانتے بھی تھے کہ ان کی بڑی بہن کے ساتھ سب اچھا نہیں ہے لیکن کوئی مکمل کر انہیں بتاتا بھی نہیں تھا اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ پردہ داری ان کے رویوں پر نفسیاتی طور پر منفی اثرات ڈال رہی تھی۔

باریال اور ماہین نے شدید دھچکا تو محسوس کیا تاہم وہ بہت جلد سنبھل گئے اور یہ جان کر عروبہ کو حیرت ہوئی کہ ان کے خیالات بھی تقریباً وہی تھے جو خود عروبہ اور کسی حد تک حریم کے بھی تھے۔ خاص طور پر باریال نے کم عمر ہونے کے باوجود ایک نوجوان کی طرح ''ری ایکٹ'' کیا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولا۔ ''اس بارے میں خاموش رہیں گے ہی، تو مطلب یہی ہوگا کہ ہم ایک ظالم کی مدد کر رہے ہیں۔ آپی کے ساتھ..... جو ہونا تھا ہو گیا..... اب اس خبیث کو اپنے کیے کی سخت ترین سزا ضرور ملنی چاہیے۔''

بیٹے اور بیٹی کو اس بارے میں بتاتے ہوئے عروبہ کو کوفت تو بہت ہوئی لیکن بتانے کے بعد اس نے خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے لگا کہ اس کے آنگن میں جھوٹ کے جو سائے لمبے ہو رہے تھے اور ان کے باہمی اعتماد کو نگل رہے تھے، وہ سمٹ گئے ہیں..... اسی روز شام کے بعد اس نے حریم سے جو باتیں کی تھیں، وہ حریم کی سمجھ میں بھی آئی تھیں۔ وہ بھی اپنے مجرم کو، زویا کے مجرم کو اور نجانے کتنی لڑکیوں کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک آگ تھی جو اسے مسلسل جلا رہی تھی اور بھسم کر رہی تھی۔ وہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ صنفِ نازک سے تعلق رکھتی تھی، اس کے اندر کے خوف، اس کے چہرے پر زردی بکھیر دیتے تھے.....

عروبہ نے اپنے پروگرام کے مطابق حریم کے خالو یاور حیات صاحب سے ملاقات کر لی تھی (حریم کی خالہ یعنی عروبہ کی بہن کئی سال پہلے انتقال کر چکی تھیں) یاور حیات نے بھی حریم والی خبر بے پناہ حیرت اور دکھ سے سنی تھی۔ بہرحال یاور بھائی کو اپنا ہمراز اور معاون بنانے کے بعد عروبہ کو ایک بڑا سہارا ملا تھا۔ یاور بھائی کے ساتھ جا کر اس نے ایک وکیل سے بھی ابتدائی بات چیت کر لی تھی۔ جب اس نے یہ ساری باتیں حریم کو بتائیں تو وہ چپ سی ہو گئی۔ وہ اس کٹھن راستے پر چلنے کے لیے پرعزم تھی لیکن اس راستے کی دشواریاں بھی اس کے لیے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ تھانے کے چکر، کچہریوں کے پھیرے، تیکھے سوالات، بدنامی، چرچے..... یہ سب کچھ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔ عروبہ نے اس کے تاثرات دیکھے اور اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔

اس روز رات کو حریم کی بات اپنی اس دیرینہ دوست زویا سے ہوئی جو چند روز پہلے اس کی طرح اس درندے

کے ستم کا شکار ہوئی تھی۔ فون پر ہونے والی اس گفتگو نے حریم کو ایک دم بکھیر سا دیا۔ اس طویل گفتگو میں ایک موقعے پر زویا نے ان سوال و جواب کا ذکر کیا تھا جو عدالتی کارروائی میں وکیل وغیرہ اس سے پوچھتے رہے تھے۔ بے شک یہ سوال جواب قانون کے مطابق تھے مگر اتنے شرمناک تھے کہ حریم سن کر ہی پسینے میں نہا گئی۔ مثلاً ملزم نے تمہیں کہاں کتنی بار اور کیسے چھوا۔ اس نے تمہارے لباس کا کیا کیا؟ وہ کتنی دیر تمہارے پاس رہا۔ دورانِ جرم اس نے کیا کیا الفاظ بولے وغیرہ وغیرہ۔

زویا سے اس غم ناک گفتگو کے بعد حریم رات آخری پہر تک سو نہیں سکی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگلے روز ایک بجے عروبہ نے وکیل سلطان صاحب سے دوبارہ ملاقات کرنے جانا تھا۔ انہوں نے حریم کا ب فارم، آئی ڈی کارڈ اور کچھ دیگر کاغذات منگوائے تھے۔ ماں کے جانے کے بعد حریم نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور بستر پر ایک گٹھڑی سی بن کر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ حریم اور اس کی ممی نے ایک نہایت دشوار اور پُرخطر راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن حریم سمجھتی تھی کہ وہ اپنی ممی کی طرح دلیر نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کی رگوں میں ممی کے ساتھ ساتھ پاپا کا خون بھی دوڑتا تھا۔ پاپا جو بہت اصول پسند ہونے کے باوجود نسبتاً دھیمے مزاج کے اور خاموش طبع شخص تھے۔ پاپا یاد آئے تو اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہے اور اس کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہیں، اس لیے وہ بلند آواز سے رونے اور ہچکیاں لینے لگی۔

''پاپا! مجھے نہیں جینا ہے ایسی زندگی۔ مجھے اپنے پیاروں کے لیے دکھوں کی بنیاد نہیں بننا ہے، مجھے بھی آپ کے پاس آنا ہے۔ مجھے اپنے پاس بلا لیں پاپا۔''

اس کی گریہ وزاری بڑھتی گئی۔ سینے کے اندر عرصے سے جمع ہونے والے دکھ اور اشک، آنکھوں کے بند توڑ کر آزادانہ بہہ نکلے۔

وہ سسک رہی تھی۔ ''مجھے نہیں پڑھنا، مجھے نہیں شروع کرنی نئی زندگی..... میں بہت تھک گئی ہوں پاپا۔ میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پہلو میں ایک قبر میری بھی بن جائے، میری بس یہی خواہش ہے۔ ممی جو کچھ سوچ رہی ہیں، وہ بالکل درست ہے لیکن وہ کیسے کر پائیں گی یہ سب کچھ؟ باریال اور ماہین کا کیا کریں گی۔ وہ کب تک میری زندہ لاش کو گود میں اٹھائے در در کی ٹھوکریں کھائیں گی؟ اس لاش کو..... اب دفن ہو جانا چاہیے..... ہاں مجھے دفن ہو جانا چاہیے پاپا.....''

برداشت کا بند ٹوٹا تو غم کا سیلاب اتنی تیزی سے پھیلا تھا کہ حریم کی ذات اس میں ایک تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ وہ جیسے اپنے حواس میں ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں روتی ہوئی بستر سے اٹھتی اور اس الماری کی طرف جاتی جہاں اس کے پیارے پاپا کی ذاتی اشیا ''یادگار'' کے طور پر رکھی ہوئی تھیں..... ان کی کچھ کتابیں، کپڑوں کے ایک دو جوڑے، ان کی رسٹ واچ، ان کا پرس جس میں حریم، باریال اور ماہین کی تصویریں تھیں اور ایسی کئی چیزیں۔ اسی الماری کی ایک دراز میں ابھی تک کچھ ایسی دوائیں بھی پڑی تھیں جو اس کے پاپا کے زیر استعمال رہی تھیں۔ ان میں ایک ٹرنکولائزر بھی تھی۔ یہ خاصی تیز دوا تھی۔ ایک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر حریم نے دوا کی بوتل کھولی اور اکٹھی آٹھ دس گولیاں پھانک کر پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔ وہ ایک ایسی خود فراموشی چاہ رہی تھی جس کا اختتام ابدی نیند پر ہو۔

یہ کام گزرنے کے بیس تیس سیکنڈ بعد اس کے دل و دماغ کو ایک شدید دھچکا محسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ دیر کے لیے ایک نہایت خطرناک بہاؤ میں بہہ گئی تھی اور اسی بہاؤ میں وہ ایک ایسا کام کر گزری ہے جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے مدہوشی کی کیفیت میں خود سے سوال کیا۔ ''حریم! تم اتنے بڑے گناہ کی مرتکب کیسے ہو سکتی ہو؟ تم خود سے ہونے والی زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لے رہی ہو، حرام موت کو گلے لگا رہی ہو؟ دنیا میں تو رسوائی ہونی ہی ہونی ہے، تم تو اپنے رب کی بارگاہ میں بھی ذلیل و رسوا ہو گئی ہو.....''

پتا نہیں کہ کچھ دیر کے لیے یہ کیسا پردہ پڑ گیا تھا اس کی آنکھوں پر۔ اب اس کے حواس ایک جان لیوا تیرگی میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ اپنے پاپا کے پاس جانے کا یہ کون سا طریقہ سوجھا تھا تمہیں؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور کراہ اٹھی۔ ان لمحوں میں اپنے پیاروں کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومے اور ان میں سب سے نمایاں چہرہ اس کی ممی کا تھا۔ اس نے بہ زبان خاموشی خود سے کہا۔ ''اپنی تنہا دکھیاری ماں کے ساتھ یہ کیسا ظلم کیا ہے تم نے؟ وہ کیسے جھیل پائیں گی یہ سب کچھ۔ ان کی تو کمر ٹوٹ کر رہ جائے گی۔''

وہ زور سے چلائی، پھر ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کو اپنا جسم بے جان محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے اپنی دکھیاری ماں سے معافی مانگنا

چاہتی تھی۔ وہ بہ آوازِ بلند اپنے رب سے بھی معافی مانگ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر رہی ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے سیل فون تک پہنچنے اور اپنی ممی کا نمبر پریس کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

☆☆☆

وکیل صاحب سے ملنے کے بعد جب عروبہ نے اپنی مہران کار پر گھر کا رخ کیا تو اسے شدید ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ ایک معروف سیاسی شخصیت کا ''مرڈر'' ہوگیا ہے اور اسی وجہ سے شہر بھر میں ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے۔ اب بھی مشتعل لوگوں کا ایک ہجوم، جلوس کی صورت میں گزر رہا تھا اور لاتعداد گاڑیاں اپنی جگہ جام ہو کر رہ گئی تھیں۔ موسم اب تبدیل ہو رہا تھا اور گاڑی کے اندر سورج کی تپش خاصی تیز محسوس ہوتی تھی۔ عروبہ نے گاڑی کا پنکھا آن کر دیا۔ اسی دوران میں اس کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اسکرین پر حریم کا نام تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے بس تیز سانسوں کی آواز آئی تھی۔

''ہیلو بیٹا! بات کرو، چپ کیوں ہو؟'' عروبہ نے پریشان ہو کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

''ممی..... ممی..... آ..... آپ.....'' اس کی لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز گلے میں گھٹ گئی۔

''حریم .....'' عروبہ نے چیختے ہوئے کہا۔

عروبہ نے مزید دو تین دفعہ اس کا نام پکارا، پر اب دوسری طرف سناٹا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے اور وہ کیا کرے؟ اس نے کال منقطع کر کے اپنی لینڈ لیڈی کا فون ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ سے اٹھائے اور پھر اپنا سر تھام لیا۔ نہایت گھبراہٹ میں اس نے حریم کا نمبر دوبارہ پریس کیا۔ اب بیل تو جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ عروبہ کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر آ گیا۔

''یا اللہ! میری بچی کی حفاظت فرما۔'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے۔

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں آیا کہ وہ اس جام ٹریفک میں گاڑی سے باہر نکل آئے اور پیدل چل کر کسی سواری تک پہنچنے کی کوشش کرے لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا، پھر اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا۔ اس نے ''فون بک'' آن کر کے عمر کا نمبر تلاش کیا، جو کچھ دن پہلے ہی ثمینہ ماجی نے اسے لکھوایا تھا۔ نمبر موجود تھا، اس نے فوراً کال کی جو دوسری یا تیسری بیل پر عمر نے ریسیو کر لی۔

☆☆☆

عمر آج کل بہت ڈسٹرب تھا۔ حریم کا اجڑا ہوا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ عدیل عرف عادی کا چہرہ بھی۔ وہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ وہ عادی کو ایک اوباش اور بدچلن محلے دار کی حیثیت سے بخوبی جانتا تھا لیکن اس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ یہ اوباش ایک دن اس ہستی کے ہی درپے ہو جائے گا جو ایک مدت سے اس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک خوشبو اور ایک پاکیزہ روشنی کی طرح موجود تھی۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں آتے جاتے عدیل عرف عادی سے اس کا سامنا ہو جائے، وہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پر پل پڑے۔ اسے کسی گیند کی طرح کھینچ کھینچ کر دیواروں سے مارے۔ خود مر جائے یا اسے مار ڈالے لیکن وہ لٹیرا ارد گرد کہیں نہیں تھا۔ عمر کو پتا چل گیا تھا کہ زویا والے کیس کے بعد سے وہ غائب ہے اور مبینہ طور پر اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔

محسوس یہی ہوتا تھا کہ یہ عدیل عرف عادی واقعی ایک عادی مجرم ہے..... یقیناً اس کا شکار صرف حریم اور زویا ہی نہیں تھیں۔ اس شیطان صفت کی زندگی کے کچھ اور ناپاک گوشے بھی ضرور موجود رہے ہوں گے۔ عمر نے ایک کام یہ کیا تھا کہ اپنے ابو کے ایک صحافی معاون سے ملا۔ اس کا نام محسن تھا اور اس نے کرائم رپورٹنگ میں کافی نام کمایا تھا۔ عمر نے اپنے ہم عمر محسن رشید سے مشاورت کی اور اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ ایڈووکیٹ ریاض کے اس بدمعاش بیٹے کے روز و شب کا کھوج لگائے..... اور پتا چلائے کہ ماضی قریب میں اس کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں؟

اب بھی وہ فون پر محسن رشید ہی سے بات کر رہا تھا۔ دونوں اس کام کے لیے لائحہ عمل بنا رہے تھے۔ جونہی یہ گفتگو ختم ہوئی، عمر کے فون پر پھر کال کے سگنل آنے لگے۔ اس مرتبہ کال عروبہ آنٹی کی طرف سے تھی۔ اس کا دھیان سیدھا حریم کی طرف گیا اور دل دھک سے رہ گیا۔

''السلام علیکم آنٹی۔'' عمر نے فون، کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''عمر.....'' عروبہ کی گھبرائی ہوئی لرزاں آواز ٹریفک کے شور میں سے ابھری۔

''جی آنٹی! میں بول رہا ہوں، خیریت ہے نا؟''

''پتا نہیں بیٹا۔ میں یہاں ٹریفک میں پھنسی ہوئی ہوں۔ باریال اور ماہین بھی گھر میں نہیں ہیں۔ ابھی دو تین

منٹ پہلے حریم کا فون آیا ہے۔ وہ..... وہ.....'' دہشت سے عروبہ کی آواز ٹوٹنے لگی۔

عمر کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا اور آفس سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آپ..... پوری بات بتائیں آنٹی! کیا ہوا حریم کو؟''

''بیٹا۔'' وہ فون پر کچھ کہنا چاہ رہی تھی..... مگر بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی بھی تھی شاید..... ''اب میں اسے فون کر رہی ہوں تو ریسیو نہیں کر رہی۔'' یہ کہہ کر عروبہ نے سسکیوں سے رونا شروع کر دیا۔

''آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا اسے۔ میں آپ کے گھر جا رہا ہوں۔ ابھی کال کرتا ہوں آپ کو۔''

اس کے اسپتال سے حریم کے گھر کا فاصلہ دس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس نے گاڑی، پارکنگ لاٹ سے نکالی اور طوفانی رفتار سے حریم کے گھر کا رخ کیا۔

گھر پر پہنچ کر اس نے ڈور بیل... بجائی اور گیٹ کھٹکھٹایا پھر پنجوں کے بل اچھل کر گیراج میں جھانکا۔ باریال کی موٹر بائیک بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حریم ابھی تک گھر میں اکیلی ہے۔ مزید تاخیر کا فائدہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر کے باؤنڈری وال کے بالکل ساتھ کھڑی کی۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر بونٹ پر پاؤں رکھ کر بڑی تیزی سے باؤنڈری وال پار کر گیا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی پورشن کی طرف دوڑا۔

''حریم..... حریم! کہاں ہو؟'' اس نے دو تین بار اسے بلند آواز سے پکارا..... تب وہ بلا توقف حریم کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر دلخراش تھا۔ حریم کروٹ کے بل قالین پر پڑی تھی اور بالکل ساکت تھی۔ اس کے قریب ہی ایک گلدان ٹوٹا پڑا تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گری ہے۔

''حریم..... حریم! آنکھیں کھولو۔'' عمر نے اسے کندھوں سے تھام کر جھنجوڑا پھر اس کی نبض چیک کی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ساری صورت حال اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ پسینے کے قطرے اس کی ناک کی چوٹی سے گر کر حریم کے ریشمی بالوں میں جذب ہونے لگے۔ وہ عجلت کے ساتھ حرکت میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑی نیند آور گولیوں کی ''وائل'' اٹھا کر اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لی پھر حریم کو ایک اوڑھنی میں لپیٹ کر اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور نیچے گاڑی کی طرف لپکا۔ خوش قسمتی رہی کہ اکا دکا راہ گیروں کے علاوہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ حریم کو گھر سے اسپتال پہنچانے میں اسے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ ہرگز اسے ''میڈیکولیگل'' کیس بنانا چاہتا تھا۔ وہ حریم کو لے کر اپنے ایک سینئر دوست ڈاکٹر رضوان شہزاد کے پرائیویٹ کلینک میں ہی آیا تھا۔ ڈاکٹر شہزاد کو اس نے راستے میں ہی آگاہ کر دیا تھا۔ کلینک پہنچتے ہی حریم کی ٹریٹمنٹ شروع ہو گئی۔

اسی دوران میں پھر..... عروبہ کا فون بھی آ گیا۔ اب عمر نے کال ریسیو کی۔ اس نے کہا۔ ''آنٹی! آپ ریلیکسڈ ہو جائیں۔ میں حریم کو یہاں کلینک میں لے آیا ہوں۔ اس نے کسی چیز کا زیادہ اسٹریس لیا ہے اور بے ہوش ہو گئی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

کلینک میں معدے اور جگر کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر موجود تھا، مگر سڑکوں پر بدامنی کی وجہ سے وہ بھی ابھی تک ڈیوٹی پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ عمر نے ڈاکٹر رضوان کے ساتھ مل کر معدہ واش کرنے کا عمل مکمل کیا اور پھر حریم کو ڈرپس وغیرہ لگا دیں۔ چند منٹ کے لیے اسے ''برتھنگ مشین'' پر بھی رکھنا پڑا لیکن پھر اس کی ضرورت نہ رہی۔ اس کی حالت، بروقت طبی امداد کے سبب تیزی سے سنبھل رہی تھی۔

عمر نے کبھی حریم کو چھوا نہیں تھا لیکن اب ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو مسلسل چھو رہا تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی اس کی۔ کئی موقعوں پر تو ضرورت کے باوجود اس نے حریم کو چھونے سے گریز کیا اور وہ کام ڈاکٹر رضوان پر چھوڑ دیا۔ اس کا دل بار بار بے طرح دھڑکنے لگ جاتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد حریم اپنی پلکوں کو ایک دھیمی سی حرکت دینے لگی۔ اس کی سانس بھی ہموار ہو رہی تھی۔ تب اس نے کن انکھیوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی نس میں انجکشن لگانے میں مصروف تھا۔ عمر کو دیکھ کر اس کی غنودگی بھری آنکھوں میں شدید حیرت نمودار ہوئی، تاہم اس حیرت میں ایک طرح کا اطمینان بھی تھا۔

وہ کسمسائی اور ہولے سے کچھ کہا۔ عمر نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے پاس کیا۔ وہ رندھی ہوئی کمزور آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں کہاں ہوں..... ممی کہاں ہیں؟''

''وہ کسی ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی ہیں..... اور آپ بھی اب بالکل ٹھیک ہیں، بالکل پریشان نہ ہوں۔''

عمر نے چادر اس کے سینے تک کھینچی اور دوپٹے سے اس کا سر ڈھانپ دیا۔ حریم کی آنکھوں کے گوشے نم

ہو گئے۔

اسی دوران میں آنٹی عروبہ کا فون پھر آ گیا۔ ''بیٹا! حریم کیسی ہے اب؟'' ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہیں۔

''آنٹی! حریم بالکل ٹھیک ہے اب۔ ابھی تھوڑی دیر میں، میں اس سے آپ کی بات کراتا ہوں۔ میں نے گھر بھی فون کر دیا ہے۔ باریال اور ماہین گھر پہنچ چکے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔''

''بیٹا! اب ٹریفک تھوڑا تھوڑا حرکت میں آنا شروع ہو گیا ہے۔ میں بھی یہاں سے نکلتی ہوں تو کلینک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''ارے نہیں آنٹی..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حریم کو اب او کے کر دیا گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آدھ پون گھنٹے میں ہم ویسے ہی یہاں سے فارغ ہو جائیں گے۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ یہاں سے نکل کر سیدھا گھر ہی پہنچیں۔ ہم بھی بس پہنچ جاتے ہیں۔'' عمر نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ آنٹی عروبہ کو اصل بات کا پتا چلے۔ اولاد کی طرف سے ''سوسائڈ اٹیمپٹ'' کتنی اذیت ناک ہوتی ہے، اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حریم اس قابل ہو گئی کہ اسے کلینک سے گھر لے جایا جا سکے۔ آنٹی عروبہ ابھی تک گھر نہیں پہنچ پائی تھیں۔ بڑا زبردست قسم کا ٹریفک جام ملا تھا انہیں۔ گاڑیاں چار چار گھنٹے سے پھنسی ہوئی تھیں۔ عمر نے گھر پہنچنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا جس پر ''ٹریفک جام'' کا احتمال نہیں تھا۔ اس نے اپنے پہلو کی نشست اسٹریچ کر دی تھی اور حریم اس پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ عمر کے دل میں بہت رنج تھا اس واقعے کے حوالے سے..... لیکن حریم کی حالت فی الحال ایسی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کوئی سخت بات کی جاتی۔ ہاں، عمر نے اسے اس بات کی تاکید ضرور کی کہ وہ گولیاں نگلنے والی بات، اپنی ممی کو اور دیگر گھر والوں کو ہرگز ہرگز نہیں بتائے گی۔ حریم نے آنکھیں بند کیے کیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

دو روز بعد حریم کی طبیعت مزید سنبھل گئی۔ عمر کی ہدایت کے مطابق اس نے گولیاں نگلنے والی بات ممی سے بھی چھپالی تھی۔ عمر کو اس بات کی خوشی تھی کہ حریم نے اس کی بات کو اہمیت دی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے۔ تاہم جو حرکت حریم نے کی تھی، وہ اس کے حوالے سے حریم سے بات ضرور کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز اسے اتفاقاً بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ حریم کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے جب کسی قریبی گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ سامنے والے گھر میں ایک خاتون دل کے دورے کے سبب انتقال کر گئی ہیں۔ آنٹی عروبہ اور عمر کی امی جلدی سے فوتگی والے گھر میں چلی گئیں۔

عمر صوفے پر بیٹھا تھا۔ حریم سامنے کرسی پر سر جھکائے ہوئے تھی۔ عمر نے کہا۔ ''حریم! مجھے آپ سے اس طرح کی حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ آپ جیسی باشعور اور دین کی سمجھ رکھنے والی لڑکی سے ایسی مایوس کن حرکت کا سرزد ہونا بہت تکلیف دہ ہے۔'' حریم اپنی نظریں اٹھا نہیں پا رہی تھی۔

''حریم! میں جانتا ہوں کہ اپنے پاپا کی جدائی آپ کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے حالات میں بہت سختی ہے لیکن سختیوں کا مقابلہ کرنے اور حالات سے لڑ کر انہیں سدھارنے کا نام ہی تو زندگی ہے۔''

وہ دھیمے لیکن بوجھل لہجے میں حریم کو سمجھاتا رہا۔ آخر میں وہ ایک گہری سانس بھر کر بولی۔ ''وہ کیسے ہوا، کیوں ہوا؟ مجھے خود بھی پتا نہیں۔ میں اس پر بہت شرمندہ ہوں لیکن اب بھی کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں مر ہی جاتی تو اچھا تھا۔''

''ایسی باتیں منہ سے مت نکالیں۔'' وہ قدرے ترشی سے بولا۔ ''زندگی خدا کی نعمت ہے..... اور آپ کی زندگی آپ کے اردگرد موجود لوگوں کے لیے بہت اہم ہے۔ بہت زیادہ اہم۔'' اس نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کہی تھی کہ حریم بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس لمحے میں ان دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان دونوں کے ذہنوں سے گزرا۔ اس برقی لہر والے خیال نے خاموشی کی زبان میں حریم سے کہا۔

''ہاں..... تم ٹھیک سمجھ رہی ہو حریم۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جن کے نزدیک تمہاری زندگی کی بہت..... بہت زیادہ اہمیت ہے اور یہ اہمیت اب سے نہیں، بہت عرصے سے ہے۔ اس اہمیت کے پیچھے کئی موسموں، چاندنی راتوں، چمکیلی صبحوں اور خوش رنگ تہواروں کی چھوٹی چھوٹی یادیں ہیں۔''

حریم نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں اس کے چہرے کی طرف پھسل آئیں اور چہرے پر ایک چھوٹا سا گھونگھٹ بنا دیا۔ وہ اسی گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔ ''آپ میری مشکلوں کے بارے میں جانتے ہوں گے لیکن زیادہ نہیں جانتے۔ جو..... غلطی مجھ

سے ہوئی، وہ ایسے ہی تو نہیں ہو جاتی نا؟''

''ہوسکتا ہے کہ میں جانتا ہی ہوں۔'' وہ جیسے بے ساختہ کہہ گیا۔

حریم نے چونک کر عمر کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر زرد رنگ لہرا گیا۔ عمر نے جلدی سے بات بدلی اور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو حریم! ہمیں ہر تکلیف اور پریشانی میں بھی اس رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک تکلیف اور پریشانی اس موجودہ تکلیف اور پریشانی سے بھی بڑی ہے جس کا سامنا ہمیں نہیں کرنا پڑا۔ اپنے آپ کو سنبھالیں حریم۔ خود کے لیے نہیں تو اپنے باقی گھر والوں کے لیے۔ آپ بڑی بہن ہیں۔ آپ پر اس گھر کی بہت سی ذمے داریاں ہیں۔ ذرا سوچیں کہ آپ کی اس حرکت کا پتا باریال اور ماہین وغیرہ کو چلے تو کیا اثرات پڑیں گے ان پر؟'' عمر کے لہجے میں ایک اپنایت بھرا غصہ تھا۔

وہ کئی منٹ تک بڑی دردمندی اور اپنایت کے ساتھ حریم کو تسلی دیتا رہا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ وہ اسے اسٹڈی دوبارہ شروع کرنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں ایک پُرخلوص خوشبو تھی اور یہ خوشبو خود عمر کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مناسب ترین الفاظ جیسے بے ساختہ اس کی زبان سے ادا ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر میں اس نے ہمت کر کے حریم سے بس اتنا کہا۔ ''اپنی مشکلات میں خود کو کبھی تنہا نہ سمجھیے گا۔''

وہ ایک بار پھر ٹھٹک کر عمر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس کا یہ انداز اتنا پیارا تھا کہ عمر کو اپنی روح میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

حریم کو پوری طرح ٹھیک ہونے میں کئی روز لگ گئے۔ وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی مگر والدہ اور بہن بھائی کے سامنے تندرست اور خوش نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔

عمر کے علاوہ یہ حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی کہ پریشانی اور مایوسی کی انتہا کو چھو کر اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

اس دوران میں عمر دوبار ان کے گھر آیا۔ اس نے حریم کی والدہ کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ حریم پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس نے حریم کی والدہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس ظلم کے خلاف خاموش نہ رہیں لیکن اپنے اس مشورے پر وہ زیادہ زور بھی نہیں دے سکا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سفر کتنا دشوار اور کانٹوں بھرا ہے۔

مگر عمر جانتا نہیں تھا کہ ہونے والا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

حریم کی امی اب تہیہ کر چکی تھیں کہ انہوں نے اب آواز اٹھانی ہے۔ دو دن پہلے ماں بیٹی میں رات کو طویل گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے سارے منفی اور مثبت پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وکیل صاحب سے مزید بات بھی کر لی تھی..... اب حریم اور اس کی امی کو پہلا کام یہ کرنا تھا کہ تھانے جانا تھا اور اپنے مجرم کے خلاف ایف آئی آر درج کرانا تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ حریم ٹھیک سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے۔

اور آخر وہ تہلکہ خیز دن آن پہنچا جب چادروں میں لپٹی دونوں ماں بیٹی تھانے پہنچیں۔ حریم کے خالو یا در حیات کو بھی ساتھ جانا تھا مگر ایک ارجنٹ کام کے سبب وہ آ نہ پائے تھے۔ عروبہ کا حوصلہ جوان تھا، اس کے باوجود وہ اندر سے کانپ رہی تھی۔ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے تھانے کی دہلیز پار کی تھی۔ تھانے میں داخل ہونے کے دو تین منٹ بعد ہی عروبہ کو اپنے خوف میں نمایاں کمی محسوس ہوئی۔ اس کی کپکپاہٹ کم ہو رہی تھی اور اس کی جگہ ایک طرح کا طیش اور رنج و غم اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگا تھا۔

وہ مظلومہ اہلکار کے سامنے پہنچی اور مستحکم لہجے میں بولی۔ ''میں رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں۔''

موٹے تازے محرر نے ماں بیٹی کو سرتاپا گھورا پھر انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اکھڑے سے لہجے میں بولا۔ ''کس بات کی رپورٹ بی بی؟''

''مجرمانہ حملے کی..... میری بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔'' عروبہ ایک ایک لفظ چبا کر مستحکم لہجے میں بولی۔

محرر نے حیران ہو کر دونوں کو دیکھا۔ وہ پردے میں تھیں۔ عروبہ کی طرح حریم کی بھی بس آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ محرر نے اپنا رجسٹر بند کیا اور ذرا تعجب سے بولا۔ ''کس کے ساتھ ہوئی ہے زیادتی؟''

''میری اس بچی کے ساتھ۔'' وہ بے خوف اور بے جھجک لہجے میں گویا ہوئی۔

''آ... آپ دونوں کے ساتھ بھی کوئی آیا ہے یا اکیلی آئی ہیں؟''

''ہمارے ساتھ کوئی نہیں۔ ہم اکیلے ہیں۔ آپ بس رپورٹ درج کریں۔''

ہٹے کٹے محرر نے معنی خیز نظر سے اپنے ساتھ بیٹھے اہلکار کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شاید تھوڑا سا تمسخر بھی شامل تھا پھر اس نے کھنکھار کا گلا صاف کیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''آپ دونوں کافی پریشان لگ رہی ہیں۔

بہرحال کب ہوا ہے وقوعہ..... اور الزام کس پر ہے؟''

''میں آپ کو بتاتی ہوں سب کچھ..... آپ رپورٹ لکھیں۔'' عروبہ نے کہا۔

محرر تیکھے لہجے میں بولا۔ ''بی بی! رپورٹ ایسے درج نہیں ہوتی، آپ کسی سیانے بندے کو اپنے ساتھ.....''

''سیانے بندے نے کیا کرنا ہے یہاں؟'' عروبہ تڑخ کر بولی۔ ''جس بچی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے وہ یہاں ہے..... اس کی ماں یہاں ہے۔ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے یہاں آئی ہیں اور آپ کی ڈیوٹی ہے کہ آپ ان کی بات سنیں..... ان کی شکایت درج کریں۔'' عروبہ کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔

''لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی گرمی شری چڑھ گئی ہے آپ کے دماغ کو۔ اوئے نیاز محمد، ٹھنڈا پانی لے کر آ بھئی دو گلاس۔'' محرر کا انداز مذاق اڑانے والا ہی تھا۔

عروبہ جیسے طیش سے پھٹ پڑی، وہ بولی۔ ''آپ رپورٹ درج کرتے ہیں یا پھر میں ایس پی کے پاس جاؤں..... یا پھر اس سے اوپر؟''

عروبہ کا لب ولہجہ دیکھ کر نائب محرر نے بات کو سنبھالا اور بولا۔ ''بی بی! ایف آئی آر اس طرح درج نہیں ہوتی۔ پہلے آپ ہم کو اپنا مسئلہ بتائیں۔ ہم اس کی بچی رپورٹ لکھیں گے، پھر آپ کے بیان میں کوئی وزن ہوا تو بات آگے بڑھے گی۔''

''آپ نے جو بھی کرنا ہے کرو لیکن ایک بات اپنے دماغ میں رکھو۔ کوئی عورت جب اپنی زبان سے اتنی بڑی بات کہتی ہے تو پھر وہ بے وزن نہیں ہوتی..... اور اس کو ''مذاق'' میں لینے والا سخت بے وقوف شخص ہی ہوسکتا ہے۔''

محرر کا سانولا چہرہ ایک بار پھر سرخی مائل ہوا لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی نائب محرر بول اٹھا۔ ''جس وقوعے کی آپ بات کررہی ہیں، یہ کب ہوا ہے؟''

''یہ دسمبر کی تین تاریخ کی بات ہے۔''

محرر اور نائب محرر نے ایک بار پھر تمسخر کی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

محرر بولا۔ ''یعنی کوئی تین مہینے گزر چکے ہیں..... چلو خیر..... یہ کس قسم کا واقعہ تھا اور آپ کو کس پر شک ہے؟''

''شک نہیں ہے، یقین ہے..... پورا یقین ہے۔ یہ ایڈووکیٹ..... ریاض احمد کے بدمعاش بیٹے عدیل عرف عادی کا کام ہے۔ اس خبیث نے سب کچھ لوٹ لیا ہے..... سب کچھ.....'' عروبہ سسکیوں سے رونے لگی۔ حریم سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی پلکوں سے دو موتی جھڑ کر اس کی جھولی میں گرے۔

محرر نے ذرا حیرت سے کہا۔ ''بی بی! تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایڈووکیٹ ریاض صاحب کے بیٹے عدیل احمد نے آپ کی بیٹی کے ساتھ بھی.....'' اس نے حیرت کے عالم میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں وہی ہے ظالم۔ نہ جانے اب تک کتنی عزتوں پر ڈاکا ڈال چکا ہے..... کاش ہم نے پہلے ہمت کرلی ہوتی۔ کاش ایک اور ''حریم'' اس کے ظلم کا شکار نہ ہوتی.....'' عروبہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں عروبہ نے بلا جھجک پورا وقوعہ پولیس اہلکاروں کے سامنے کھول کر بیان کردیا۔ پتا نہیں کہ اتنی توانائی اور دلیری کہاں سے آگئی تھی اس کے اندر۔ اس نے جو کچھ بھی بتایا، پولیس والوں نے ایک سادہ کاغذ پر لکھ لیا۔ آخر میں محرر نے کہا۔ ''بی بی! بچی رپورٹ تو ہم نے لکھ لی ہے۔ پر یہ ایف آئی آر والا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے بھی ایس ایچ او صاحب اس وقت گشت پر ہیں۔ آپ کل دوپہر کے بعد کسی وقت آجائیں پھر ہی بات آگے بڑھ سکتی ہے۔''

اگلے روز دوپہر تک کا وقت عروبہ اور حریم نے بڑی مشکل سے کاٹا..... اور تب ایک بار پھر تھانے جا پہنچیں۔ ایس ایچ او صاحب تو آج بھی نہیں تھے، تاہم چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے ایک ادھیڑ عمر سب انسپکٹر سے ان کی بات ہوئی۔ سب انسپکٹر کا نام عطاءاللہ تھا اور وہ شکل وصورت سے کچھ شریف النفس ہی لگتا تھا۔ اس کو بھی پوری بات کا علم ہوچکا تھا۔

اس نے عروبہ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''بی بی! ایسے وقوعے میں رپورٹ جلدی درج کرانا پڑتی ہے..... تب ہی کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ اب تو آپ نے لگ بھگ تین مہینے گزار دیے ہیں پھر بھی آپ زور دیں گی تو رپورٹ تو ہم درج کرہی لیں گے کیونکہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے لیکن آگے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''بی بی! میں اب آپ کو کیا بتاؤں۔ یہ بڑا اوکھا راستہ ہے۔ ایک تو جن لوگوں کے خلاف آپ کیس کرنا چاہتی ہیں، وہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔ ایڈووکیٹ ریاض ایک دبنگ بندے کا نام ہے۔ ابھی جو پہلا کیس درج ہے، اس پر بھی کوئی خاص کارروائی نہیں ہوسکی۔ ہم نے بُرا بھلا چالان عدالت میں بھیج دیا ہے۔ مُلزم مفرور ہے، اس کے سوتیلے

بھائی کو کچھ دن کسٹڈی میں رکھا گیا تھا بعد میں اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ یہ لوگ ملزم کو بچانے کے لیے سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں اور ابھی تک کامیاب ہیں۔''

''لیکن بھائی صاحب! اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجرم طاقتور شخص ہے اس لیے ہم صبر کا گھونٹ بھر کر بیٹھ جائیں۔ ہم میں جتنی ہمت طاقت ہے، ہم آواز بلند کریں گے اور کر کے رہیں گے۔ ہر دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اخباروں تک جائیں گے۔ الیکٹرانک میڈیا تک جائیں گے۔'' عروبہ رہانسی ہو رہی تھی۔

''یہ کوششیں اس دوسری پارٹی نے بھی کی ہیں۔ ایک دو اخباروں میں ایڈووکیٹ کے بیٹے کے بارے میں کوئی لمبے چوڑے آرٹیکل بھی چھپے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے بی بی کہ اس سے ہونا ہوانا کچھ نہیں۔ اگر لڑکا پکڑا بھی گیا تو بہت ہوا دو ڈھائی سال کی سزا ہو جائے گی لیکن اس کے لیے بھی مدعی پارٹی کو بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔''

''جو بھگت چکے ہیں اس سے زیادہ اور کیا بھگتنا پڑے گا۔'' حریم جواب تک خاموش بیٹھی تھی، جیسے چیخ کر بولی۔

''آپ کی بہت مہربانی، آپ بس ہماری رپورٹ درج کریں۔'' نقاب کی اوٹ سے حریم کی بس آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں اور ان میں آتشیں آنسو تھے۔

سب انسپکٹر عطاءاللہ نے طویل سانس لے کر اپنی ڈاڑھی کھجائی اور بولا۔ ''چھوٹی بی بی! تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ یہ بڑا کانٹوں بھرا رستہ ہے..... بلکہ رستہ بھی کیا ہے، بس کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں پردہ دار بیبیوں کو۔ پوچھ گچھ، طبی معائنہ، آئے دن تھانے کچہری کے چکر..... اور پھر عدالت میں صفائی کے وکیل جیسے جیسے سوال پوچھتے ہیں بچیوں سے ..... اللہ معاف کرے۔''

عروبہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''سب انسپکٹر صاحب! لگتا ہے کہ آپ کی ڈیوٹی یہاں شکایت سننے کی نہیں، بلکہ ڈرانے کی ہے۔ آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم نے اب اپنے آپ کو ہر صورتِ حال کے لیے تیار کر لیا ہے۔ آپ بس ایچ او صاحب سے ہماری ملاقات کرا دیں تاکہ ہماری رپورٹ درج ہو سکے۔''

''ٹھیک ہے بی بی، جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ آپ ساتھ والے کمرے میں بیٹھ جاؤ۔'' وہ قدرے بے رخی سے بولا۔

کافی دیر انتظار کے بعد بھی ایس ایچ او سے ملاقات نہیں ہو پائی۔

دوسرے روز وہ دونوں پھر تھانے پہنچیں۔ اس مرتبہ خالو یاور حیات بھی ساتھ تھے۔ پتا چلا کہ ایس ایچ او صاحب آئے تو تھے مگر علاقے میں ایک ''وی آئی پی موومنٹ'' تھی، اس وجہ سے فیلڈ میں چلے گئے ہیں۔

یہ کام آغاز میں ہی اتنا دشوار ثابت ہو رہا تھا کہ عروبہ کو دانتوں پسینے آ گئے۔ کیس شروع ہونا تو دور کی بات، ابھی تک رپورٹ ہی درج نہیں ہو سکی تھی۔ معاملے کو ٹالنے اور لٹکانے کے، پولیس والوں کے پاس سیکڑوں حیلے بہانے تھے۔ وہ دو دو گھنٹے پولیس اسٹیشن میں بیٹھی رہتیں اور پولیس والے دزدیدہ نگاہوں سے انہیں گھورتے رہتے۔ ایک بار خالو یاور حیات کی اہلکاروں سے جھڑپ بھی ہوئی۔ آخر ایک روز عروبہ اور یاور حیات زچ ہو کر مقامی ایم پی اے کے پاس جا پہنچے۔ اس کی منت سماجت کر کے اسے اپنے ساتھ لیا اور اس روز بہ مشکل ان کی رپورٹ درج ہو پائی۔

☆☆☆

حریم اب صرف اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ تعلیم کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ خودکشی کی ناکام کوشش کو اب تقریباً تین ہفتے گزر چکے تھے مگر کسی وقت اب بھی طبیعت خراب ہو جاتی تھی، سر بری طرح چکرانے لگتا تھا۔ یہ والدہ کی حوصلہ افزائی اور ان کی دی ہوئی ہمت ہی تھی جس نے حریم میں پھر سے نہ صرف جینے کی امنگ پیدا کی تھی بلکہ اپنی زندگی برباد کرنے والے کے خلاف لڑنے کا حوصلہ بھی دیا تھا۔ والدہ کے بعد عمر وہ دوسرا شخص تھا جس کی ہمت افزائی نے حریم کو سنبھلنے میں مدد دی تھی، وہ دو چار دن بعد ان کے گھر کا چکر لگا لیتا تھا، لیکن آتا اسی وقت تھا جب اسے یقین ہوتا تھا کہ حریم کی امی بھی گھر پر ہوں گی اور ایک مرتبہ تو امی گھر پر نہیں تھیں، وہ دروازے سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی سنجیدگی اور ایک بامعنی خاموشی تھی جو اس سے ملنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی تھی..... شاید حریم بھی ان متاثر ہونے والوں میں شامل تھی۔ عمر کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ حریم اور آنٹی عروبہ نے کمال ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ایف آئی آر درج کرائی ہے اور اس مفرور بدمعاش ''عادی'' کے خلاف قانونی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عمر نے اس فیصلے کو بہت سراہا تھا اور ہر ممکن اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ عمر کے والد احسان سرمدی ایک معروف صحافی تھے، ماضی میں کرائم رپورٹر بھی رہ چکے تھے۔ عمر نے ان سے بھی بات کی تھی اور انہوں نے بھی اپنی سی کوشش کرنے کا یقین دلایا تھا۔

اس روز حریم کی امی کو بخار تھا، دوا کھا کر سوئی ہوئی

تھیں۔ اسی دوران میں کال بیل ہوئی۔ حریم کے دل سے آواز آئی کہ یہ عمر ہوگا..... وہ دروازے پر پہنچی... واقعی یہ عمر ہی تھا۔ ''آنٹی گھر پر ہیں؟'' اس نے حسب معمول پوچھا۔ حریم نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اندر آ گیا۔

اس کو راستہ دینے کے لیے حریم پیچھے ہٹی تو اتفاقاً پیچھے ایک خالی پلیٹ پڑی تھی جس میں تھوڑی دیر پہلے بلی کو دودھ ڈالا گیا تھا۔ حریم کا پاؤں پلیٹ پر پڑ کر پھسلا اور وہ پہلو کے بل چھوٹے بھائی باریال کی موٹر سائیکل پر گری۔ اس کی ایک کلائی اور کہنی پر چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ چوٹ زیادہ سنگین نہیں تھی مگر عمر جیسے تڑپ اٹھا۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھائے اور حریم کی چھلی ہوئی کہنی کو دیکھا۔ خون بند کرنے کے لیے اس نے اپنا رومال کہنی پر باندھ دیا اور اسے کمرے میں لے آیا۔

''پائیوڈین اور کاٹن وغیرہ ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں الماری میں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں خود ہی لگا لیتی ہوں۔''

''کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔ اچھا خاصا خون نکل رہا ہے۔ آپ یہاں سے دبا کر رکھیں۔ میں دوا لے کر آتا ہوں۔''

حریم نے کن انکھیوں سے دیکھا، عمر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت بناوٹی نہیں تھی۔ وہ جیسے اندر سے تڑپا تھا۔ حریم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

عمر نے بڑی توجہ اور فکرمندی سے حریم کی کہنی اور کلائی پر بینڈیج کی۔ وہ کلائی کی پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ یہ حریم کی امی کا فون تھا۔ وہ سوئی ہوئی تھیں۔ حریم انہیں جگانا نہیں چاہتی تھی۔ نامعلوم نمبر تھا پھر بھی اس نے کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو کون؟'' اس نے پوچھا۔

''عروبہ بی بی بول رہی ہیں؟'' دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز آئی۔

''جی نہیں۔ ان کی بیٹی بات کر رہی ہوں۔''

''اچھا حریم سرور۔ بھئی آپ سے غائبانہ تعارف تو پہلے ہی تھا، چلو آج بات بھی ہو گئی؟''

''آپ کون؟'' حریم نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''میں ایڈووکیٹ انور شاہ بات کر رہا ہوں۔ عدیل احمد کے محترم والد ایڈووکیٹ ریاض صاحب نے قانونی مشاورت کا جو ادارہ قائم کر رکھا ہے میں اس میں ملازمت کرتا ہوں۔ آپ کے والد مرحوم سے بھی تھوڑی سی جان پہچان تھی..... بیٹا جی! خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میں آپ کی والدہ صاحبہ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

''کیسا مشورہ؟'' حریم نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

''ان سے کہیں کہ وہ اس کیس کی پیروی نہ کریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ پیروی کر کے آپ لوگوں کو پریشانی اور جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔ میں نے آپ کی فائل پڑھی ہے۔ یہ بڑا کمزور کیس ہے اور یہ بات آپ کو آپ کا وکیل بالکل نہیں بتائے گا کیونکہ اس نے آپ سے بے کار میں ڈھائی تین لاکھ روپے کھینچنے ہیں.....''

''آپ اپنے قیمتی مشورے اپنے پاس رکھیے اور پلیز اس نمبر پر دوبارہ فون نہ کیجیے گا۔'' حریم خشک لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ حریم فون بند کر دیتی، دوسری طرف سے بات کرنے والا تیزی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے بیٹا جی۔ آپ کو میری بات بری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے خوامخواہ آپ کا ٹائم خراب کیا..... ویسے بھی ٹائم آپ دونوں ماں بیٹی کے پاس کافی کم ہوتا ہے۔ ملنے جلنے والے آتے رہتے ہیں۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بولنے والا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''آپ..... کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' حریم بمشکل خود پر ضبط کر کے بولی۔ ''آپ کن ملنے جلنے والوں کی بات کر رہے ہیں؟''

''ویسے تو کئی ہیں مگر ایک سوہنا منڈا تو کافی آمد و رفت رکھے ہوئے ہے۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا..... ہاں عمر..... عمر ولد احسان ایک لمبا چوڑا آرٹیکل بھی چھپوایا ہے اس نے تم ماں بیٹی کے حق میں بلکہ ماں بھی کیا صرف تمہارے لیے ہی چھپوایا ہوگا۔ خیر ہمیں کیا۔ یہ ساری اندر کی باتیں ''کیس'' میں خود ہی ڈسکس ہو جاتی ہیں۔''

''تم..... تم دھمکی دے رہے ہو ہمیں؟''

''کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں..... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ یہ تو شروعات ہے بیٹا جی۔ آگے آگے دیکھو۔''

''یو شٹ اپ..... یو شٹ اپ۔'' حریم نے دہاڑ کر کہا اور فون بند کر کے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کا سارا بدن خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''کیا ہوا حریم! کون تھا یہ؟'' عمر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

حریم سسکنے لگی۔ حریم کی بلند آواز سن کر اس کی ماما بھی جاگ گئی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی سی حریم اور عمر کی طرف آ رہی تھیں۔ ''یہ کس سے بول رہی تھیں حریم؟'' انہوں نے پاس آ کر پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے حریم نے ماں کے کندھے سے سر لگایا اور آنسو بہانے لگی، پھر ہچکیوں کے درمیان اس نے ایڈووکیٹ ریاض احمد کے کارندے سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتایا۔

عروبہ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے..... کیسا کھیل تھا یہ؟ کیسا بھنور تھا؟ یوں لگتا تھا کہ ان پر ہر وقت نظر رکھی جارہی تھی۔ عروبہ سر تھام کر رہ گئی۔

عمر کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ عروبہ نے حریم کو کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ عمر نے جگ سے دو گلاسوں میں پانی انڈیلا اور انہیں تھمایا۔ پھر خود بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ معاملات اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایسی گیدڑ بھبکیاں چلتی ہی رہتی ہیں۔'' اس نے حریم کے سن موہنے چہرے پر نظر ڈالی جو اب بھی آنسوؤں سے تر تھا۔

وہ بولا۔ ''ان فرعون صفت لوگوں کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھانے کی ہمت کر بھی لیتا ہے تو یہ لوگ اپنے دفاع کے لیے ہر اوچھا ہتھکنڈا استعمال کرتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عمر! ایف آئی آر درج ہونے کے بعد سے یہ جلے پاؤں کی بلی بنے ہوئے ہیں۔ ان کو سمجھ آرہی ہے کہ ان کے خلاف گھیرا تنگ ہوگا۔ زویا کے والدین سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ ان کو بھی دھونس اور لالچ سے پیروی سے دور رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے مگر وہ ڈٹے ہوئے ہیں۔''

حریم اٹھ کر اندر جاچکی تھی۔ عمر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اس شخص نے میرے حوالے سے جو دھمکی آپ کو دی ہے اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ یہ لوگ بس ہوا میں تلوار چلا رہے ہیں۔ اس سے انشاءاللہ ہمارا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ ویسے میں نے اپنے طور پر بھی اپنے ایک صحافی دوست کو ایک ناسک سونپا ہوا ہے۔ وہ ریاض احمد کی کرپشن اور اس کے بیٹے کی بداعمالیوں کے بارے میں ثبوت جمع کر رہا ہے۔ شاہدرہ کے قریب ایک اور کیس کا کھوج بھی ملا ہے جن کی بیٹی کو عادی اور اس کے ایک دوست نے بلیک میل کیا ہے۔ جلد ہی اس واقعے کے ثبوت بھی سامنے آجائیں گے۔''

''عمر ذرا احتیاط سے۔'' عروبہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم بچوں کو ٹھیک سے پتا نہیں ہوتا کہ تمہاری تکلیف پر تمہارے پیدا کرنے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔''

''آنٹی! اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ جب اوکھلی میں سر دے لیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ آپ تنہا عورت ہوکر، انصاف کے حصول کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، یہ کسی جہاد سے کم نہیں ہے اور میں اپنی بساط اور طاقت کے مطابق اس میں شرکت ضرور کروں گا۔''

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا آنٹی! اب میں چلتا ہوں۔ امی بھی آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ وہ تین دن تک دعا کے ساتھ آپ کے ہاں چکر لگائیں گی۔''

عروبہ بولی۔ ''کل کسی کیبل والے کا فون آیا تھا، یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ہمارے گھر کی کیبل لائن کرنا چاہ رہا ہے۔ تھوڑا وقت مانگ رہا تھا۔''

''تو آپ آنے دیں ان لوگوں کو۔ جو کچھ پوچھتے ہیں آپ ان کو بتائیں..... ہاں اگر حریم ان کے سامنے آنا نہیں چاہتیں تو نہ آئیں۔ اب یہ کھلی لڑائی ہے آنٹی! اور یہ کئی محاذوں پر لڑنا ہوگی۔''

عروبہ کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلتے ہوئے، عمر نے بے ساختہ اس دروازے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے حریم اوجھل ہوئی تھی۔ شاید اس نے خاموشی کی زبان میں اسے بھی الوداع کہا تھا۔

عمر کے جانے کے بعد عروبہ کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ عمر جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کے پیچھے اپنائیت اور انسانی ہمدردی تو ہے ہی، کوئی اور جذبہ بھی ہے۔ ایسا جذبہ جس کا تعلق حریم سے ہے۔ حریم کے لیے عمر کی آنکھوں میں اس نے بے پناہ عزت کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی دیکھا تھا۔ کچھ ایسا..... جس کو کوئی بھی عورت بہت جلدی محسوس کر لیتی ہے۔

☆☆☆

ایک جھٹکے سے عروبہ کی آنکھ کھلی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ جھٹکے کی آواز کے علاوہ کمرے کے اندر یا باہر کسی قسم کا شور نہیں تھا۔ سنہری دھوپ پردوں سے چھنتی ہوئی اندر آرہی تھی اور کمرے کو تھوڑا سا روشن کر رہی تھی۔ عروبہ نے آج پھر وہی خواب دیکھا تھا جو پچھلے برسوں میں وہ بیسیوں مرتبہ دیکھ چکی تھی۔

ایک جنگل نما جگہ ہے۔ جہاں ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں ہیں، کہیں کہیں جنگلی پھولوں کی جھلک نظر آتی ہے..... کچھ جانور ہیں جو اسے گھیر رہے ہیں، پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ فرار کا راستہ نہیں ڈھونڈ پارہی، شاید حریم بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی آگے نکلتی ہے۔ اسے اپنے اردگرد سفید گلاب کے پھول نظر آتے ہیں

جن پر خون کے چھینٹے ہیں۔ یہ کس کا خون ہے، یہاں کون مرا ہے، کیا وہ اور حریم بھی اسی طرح مر جائیں گی؟ جانوروں کی نامانوس آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ کون سے جانور ہیں..... جب ان کے نکیلے دانتوں کی کٹ کٹ اس کے کانوں میں گونجتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

وہ آج بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کا دل اس کے سینے میں مشین کی طرح چل رہا تھا۔ کام والی کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے سو گئی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا بارہ بج رہے تھے۔ اسے ماہین کو اسکول سے لینے جانا تھا اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور حریم اندر آئی (عروبہ، حریم سے یہ کہہ کر سوئی تھی کہ وہ اسے وقت پر جگا دے) عروبہ نے فوراً اپنے دوپٹے سے اپنے چہرے اور گردن کا پسینا پونچھا۔

''ماما! طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' حریم نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! پتا نہیں، آج گرمی محسوس ہو رہی ہے..... چلو خیر میں ماہین کو لینے جا رہی ہوں اور پکانے کے لیے چکن بھی لے آؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے عروبہ نے واش روم کا رخ کیا۔

چہرے پر مسلسل پانی کے چھینٹے ڈالے تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ تب اس نے الماری سے اپنی بڑی چادر نکالی اور باہر کا رخ کیا۔ ماہین انگلش لینگویج کی کلاس لے رہی تھی اور آج کل اس کی جلدی چھٹی ہو رہی تھی۔ وہ اسے خود ہی لینے جاتی تھی۔ پچھلے تین چار روز سے گاڑی چونکہ مسئلہ کر رہی تھی اس لیے وہ پیدل ہی نکل جاتی تھی۔ ایک کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔

ماہین کو اسکول سے لے کر اس نے چکن شاپ کا رخ کیا جو سڑک کے پار مارکیٹ کی پچھلی طرف تھی۔ عروبہ اور ماہین پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں۔ سڑک پر معمول کا ٹریفک تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار کار عقب سے آئی اور اس نے بلند آواز میں ہارن بجایا۔ عروبہ کو یہی لگا کہ وہ گاڑی ان کے بالکل عقب میں ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ واقعی عقب میں تھی اور تیز رفتاری سے ان کی طرف آ رہی تھی۔ عروبہ بے ساختہ چلائی اور ماہین کو اپنے ساتھ دھکیلتی ہوئی فٹ پاتھ سے نیچے اتر گئی۔

برق رفتار گاڑی بس چند انچ کے فاصلے سے ان کے پہلو سے گزر گئی، اس کی اڑائی ہوئی گرد سے ماہین بری طرح کھانسنے لگی۔

اردگرد کے راہ گیروں نے بھی چونک کر یہ منظر دیکھا تھا۔ گاڑی اب موڑ کاٹ کر ایک قریبی سڑک پر اوجھل ہو چکی تھی۔ چند افراد ہمدردانہ انداز میں ماں بیٹی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ ''کوئی چرسی لگتا ہے خبیث..... یا شاید پی رکھی تھی۔''

کوئی اور بولا۔ ''گاڑیوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو پیدل چلنے والے کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔ اس حرامزادے کا نمبر نوٹ کرنا چاہیے تھا۔''

عروبہ کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ماہین کا رنگ بھی ہلدی تھا۔ عروبہ نے نیم پختہ راستے سے شارٹ کٹ لیا اور چکن وغیرہ خریدے بغیر ہی پریشان حال گھر واپس آ گئی ابھی وہ چابی سے گیٹ کا لاک کھول ہی رہی تھی کہ اس کے موبائل فون پر کال آئی نمبر اجنبی تھا۔ نجانے کیوں اسے لگا کہ اس کال اور ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کا آپس میں تعلق ہے۔

''ہیلو۔'' عروبہ نے کہا۔

''جی جی، عروبہ میڈم! کیسے حال ہیں آپ کے؟''

''کون بول رہا ہے؟'' عروبہ نے بے حد سنجیدہ اور درشت لہجے میں کہا۔

''ارے، یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی جلدی بھول بھی گئے خاکسار کو؟ اچھا ہاں..... یاد آیا۔ اس سے پہلے آپ کی بیٹی حریم سے بات ہوئی تھی نا..... میں آپ کا خیر اندیش، ہمدرد ایڈووکیٹ انور شاہ عرض کر رہا ہوں۔'' اس نے تقریباً لفنگوں والے انداز میں کہا۔

''کیا تکلیف ہوئی ہے تمہیں اور تمہیں منع کیا گیا تھا نا کہ اب ادھر کال مت کرنا۔'' عروبہ نے تپے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''ہمیں دھمکانا چھوڑ دو۔ ورنہ تکلیف میں آ جاؤ گے۔''

''ارے واہ کیا بات کہی آپ نے۔ اور میڈم..... تکلیف تو ابھی ابھی آپ کو ہوئی ہے۔ بہت بڑا دل ہے آپ کا۔ اپنی تکلیف کو بھول کر دوسروں کی تکلیف کا سوچتی ہیں۔''

''کیا..... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عروبہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''میڈم! آپ سمجھ تو سب کچھ گئی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا ہے۔ پیاری سی بیٹی ہوتی ہے آپ کے ساتھ۔ اسی طرح لوگ نقصان کر کے نکل جاتے ہیں۔ کوئی پکڑنے پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ برا وقت آ گیا ہے۔'' اس خبیث نے مصنوعی افسوس کا اظہار کیا۔ عروبہ کو اپنی کنپٹیاں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھیں جی! اب آپ جس چکر میں پڑ رہی ہیں

نا.....اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر بہت ہوشیار اور چوکنا رہا کریں۔ جوان بچیاں ہوتی ہیں آپ کے ساتھ.....سو جن سو دشمن۔'' آخری الفاظ اس نے چبا چبا کر ادا کیے۔

''خبیث کی اولاد، ڈرپوک انسان! تو اس وقت ہے کہاں پر؟ سامنے آکر بات کر، تیری آنکھیں نہ نکال دیں میں نے تو کہنا۔'' عروبہ نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

''ارے اتنا غصہ میڈم! میں آپ کے آس پاس کہاں۔ میں تو اپنے آفس میں ہوں۔ بس ایک ہمدردی کا جذبہ ہے جس کی وجہ سے دل کی آنکھ آپ پر اور آپ کے پیاروں پر لگی رہتی ہے۔ زمانہ خراب ہے اور بیٹیاں جوان ہیں آپ کی..... ویسے تو آپ خود بھی اتنی گئی گزری نہیں۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ آپ کو بھی جوان ہی کہا جاسکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا.....''

''بکواس بند کر۔'' عروبہ سینے کی پوری قوت سے دہاڑی۔ ''تو حرامزادہ ہے اور تیرا وہ باس تجھ سے بڑا حرامزادہ ہے۔ بتادے اس سور کو بھی کہ ہم اس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ نہیں ہیں ڈرنے والے.....'' پتا نہیں کہ شدید طیش کے عالم میں وہ کیا کچھ بولتی چلی گئی پھر اسی کیفیت میں اس نے اپنا سیل فون کھینچ کر فرش پر مارا فون کے پرزے ادھر ادھر بکھر گئے۔ جن میں ٹوٹی ہوئی اسکرین کی کرچیاں بھی تھیں۔ اس کے مرحوم نانا ایک فوجی آفیسر تھے۔ عروبہ کی رگوں میں ان کا خون تھا۔ کبھی کبھی جب غصے کے عالم میں یہ خون اس کے اندر جوش مارتا تھا تو اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوجاتا تھا۔

اسی دوران میں حریم گھبرائی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتری اور دروازہ کھولا..... پندرہ سولہ سالہ ماہین نے وحشت زدہ انداز میں ماں کا بازو تھام رکھا تھا۔

''ماما! کیا ہوا؟'' حریم نے تقریباً چلاتے ہوئے پوچھا اور ماں کو بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ ''ماما! آخر بات کیا ہوئی ہے؟''

''اوپر چلو.....میں بتاتی ہوں۔'' عروبہ نے جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ چند لمحے کی مہلت یہ سوچنے کے لیے چاہ رہی تھی کہ حریم کو پوری بات بتائے یا نہیں۔ اسے ڈر تھا کہ حریم زیادہ ہی نہ گھبرا جائے۔ ابھی اس کے ذہن پر یک ڈاؤن کا پہلا واقعہ بھی اسے بھولا نہیں تھا۔

عروبہ اپنی چادر ایک طرف رکھ کر صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ حریم فوراً اس کے لیے پانی لے کر آئی اور خود بھی ماں اور بہن کے پاس بیٹھ گئی۔ ماہین کا چہرہ بھی حالات کی سنگینی کی چغلی کھا رہا تھا۔

حریم بولی۔ ''ماما دیکھیں، مجھ سے کچھ چھپانا نہیں۔ اس مشکل میں جتنی ثابت قدم آپ ہیں اتنی ہی میں بھی ہوں.....میرا خیال ہے کہ ریاض کے اس چمچے وکیل کا پھر فون آیا ہوگا۔''

عروبہ نے ایک گہری سانس لی اور حریم کو شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ ساتھ ساتھ وہ حریم کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ جان کر ایک اطمینان سا ہوا کہ حریم کے چہرے پر پہلے کی طرح ہلدی نہیں پھری ہے۔ وہ بتدریج خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال رہی تھی اور مضبوط بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ بولی۔ ''ماما! آپ فکر نہ کریں۔ ہم ان گیدڑ بھبکیوں سے نہیں ڈریں گے۔ اس کو نہ اس کا باپ بچا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے آوارہ کتے۔ اب یہ لوگ جو اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارا کیس مضبوط ہے اور بہت جلد اس خبیث انسان کے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔''

عروبہ جب حریم کو اس انداز سے بات کرتے ہوئے دیکھتی تھی تو اسے لگتا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کی جوان، بہادر بیٹی اس کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی ہے۔ ماہین دبی دبی آواز میں بولی۔ ''ماما! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ہمیں گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ خالو یاور کو فون کر کے بلائیں۔''

کچھ دیر تینوں ماں بیٹیوں میں اس موضوع پر بات ہوئی، پھر فیصلہ ہوا کہ اس بارے میں تھوڑا سا اور سوچ لیا جائے۔

حریم نے جیسے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ماما! مجھے یاد ہی نہیں رہا، جب آپ باہر تھیں ثمینہ آنٹی کا فون آیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ ہماری طرف آنے کے لیے گھر سے نکل رہی ہیں۔ علی بھی ان کے ساتھ ہے۔''

''اوہ، پھر تو وہ پہنچنے والے ہوں گے۔ تم ایسا کرو لاؤنج کو دیکھو، میں کچن میں جاتی ہوں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد ثمینہ آنٹی اور علی ان کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں باریال بھی ٹیوشن سے آگیا اور علی کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ دونوں بڑے دنوں سے کہیں اکٹھے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

ثمینہ آنٹی حسبِ معمول کچھ فروٹس بھی لے کر آئی

تھیں۔ حریم فروٹس کے شاپرز کچن میں رکھنے گئی تو ثمینہ آنٹی نے عروبہ سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''عروبہ! سب خیریت ہے؟''

عروبہ ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولیں۔ ''دراصل..... دروازے کے پاس..... تمہارا موبائل ٹوٹا ہوا پڑا تھا اسے دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی.....''

عروبہ اندر سے سٹپٹا گئی۔ پریشانی میں ان تینوں کو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ٹوٹے ہوئے موبائل کی باقیات دروازے پر سے اٹھانی ہیں۔ پہلے عروبہ نے سوچا کہ وہ اس بات پر پردہ ڈال دے، کوئی بھی جواب پیش کردے لیکن پھر اسے ایسا کرنا اچھا نہیں لگا۔ آنٹی ثمینہ ایک سچی غم خوار اور ہمدرد تھیں۔ عروبہ نے ہمیشہ ان کی جانب ایک حوصلہ بخش کھچاؤ محسوس کیا تھا۔ اس نے مناسب الفاظ میں یہ ساری بات ان کے گوش گزار کردی۔ انہوں نے اس واقعے کی اتنی ٹینشن لی کہ انہیں بلڈ پریشر کی گولی کھانا پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی پیشانی کا پسینا اپنی اوڑھنی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اللہ پاک تمہیں اور تمہارے بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ یہ دور انصاف کا نہیں، طاقت کا ہے، کمزور کو ہر دروازہ بند ملتا ہے اور طاقتور کو دیواریں بھی راستہ دے دیتی ہیں۔ تم نے اور تمہارے بچوں نے انصاف کے لیے آواز بلند کرکے بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔ سب لوگ تمہارے فیصلے کو سراہ رہے ہیں۔ تعاون کی پیشکش بھی کررہے ہیں لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے عروبہ کہ بالآخر یہ لڑائی تم کو اکیلے ہی لڑنی ہے۔''

''اس بات کا اندازہ تو مجھے ہے باجی۔'' عروبہ نے کھوئی کھوئی انداز میں کہا۔

آنٹی ثمینہ نے کہا۔ ''عمر اور اس کے ابو بھی تم لوگوں کی اس جدوجہد کو بہت سراہتے ہیں۔ خاص طور پر عمر کا تو سارا دھیان ہی تم لوگوں کی طرف لگا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب ہمیں اس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ تمہیں پتا ہی ہوگا، ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد اس کا سارا وقت اسی سوچ بچار میں صرف ہورہا ہے۔ اب وہ اور اس کا دوست محسن رضا سوشل میڈیا پر بھی اس معاملے کو اٹھا رہے ہیں۔ اللہ کرے یہ سب چیزیں ہمارے فائدے میں جائیں لیکن.....'' آنٹی ثمینہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔

''باجی! آپ بات کریں میں سن رہی ہوں۔''

وہ ذرا توقف سے بولیں۔ ''بس عروبہ! میرا دل بہت دکھتا ہے۔ میری کوئی بیٹی نہیں، میں جب بھی حریم کو دیکھتی ہوں مجھے ایسے لگتا ہے کہ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو وہ بالکل ایسی ہی ہوتی، اتنی ہی پیاری، ایسی ہی معصوم۔ اس نازک سی جان پر جو ظلم ٹوٹا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ پتا نہیں کہ وہ اس ظلم کو کیسے سہہ رہی ہے..... اور پھر جو تشہیر ہورہی ہے وہ تو.....''

ثمینہ آنٹی کی آواز بھرا گئی اور وہ بات جاری نہ رکھ سکیں۔

کچھ دیر تک انہوں نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی، پھر عروبہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''اس ریاض کو یوں تو بہت بڑا وکیل کہا جاتا ہے لیکن ایسے لوگ اس معتبر پیشے کے چہرے کا بدنما داغ ہیں۔ یہ خبیث تھوڑا بہت سیاست میں بھی عمل دخل رکھتا ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ پاؤں ہیں اس شیطان کے۔ بیٹے کو بچانے کے لیے بڑی دور تک جائے گا یہ۔ مجھے ان بچوں پر ترس آتا ہے..... میں تو کہتی ہوں عروبہ..... لعنت بھیج دو اس شیطانی ٹولے پر اور تھانے کچہریوں کے چکر پر۔ کہتے ہیں کہ ایک بدلہ تو وہ ہوتا ہے جو ہم انسان دوسرے انسانوں سے لیتے ہیں اور ایک اللہ پاک کی لاٹھی ہوتی ہے اور یقین کرو جب اللہ کی لاٹھی اٹھتی ہے تو ظالم اور مظلوم دونوں اپنی اپنی جگہ حیران رہ جاتے ہیں۔''

عروبہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

آنٹی ثمینہ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے عروبہ! تمہیں میری بات سے دکھ ہوا ہو لیکن میں وہی کہہ رہی ہوں جو میرے دل کی آواز ہے۔ عمر کا موقف بھی وہی ہے جو تمہارا اور حریم کا ہے۔ میں نے اس موقف پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب میں ان بچوں کی طرف دیکھتی ہوں تو میرا دل ہولنے لگتا ہے عروبہ! مجھے لگتا ہے کہ یہ بدذات لوگ تمہاری پیش نہیں چلنے دیں گے۔ ابھی تو یہ صرف اوچھی دھمکیاں دے رہے ہیں پھر اوچھی کارروائیوں پر بھی اتر آئیں گے.....''

''آپ کیا چاہتی ہیں باجی؟'' عروبہ نے شکستہ آواز میں پوچھا۔

''بس تمہاری اور تمہارے بچوں کی سلامتی اور ان کے لیے ایک اچھی زندگی۔'' وہ اشک بار ہوکر بولیں اور پھر جیسے بے ساختہ کہا۔ ''عروبہ! کبھی کبھی تو میرا دل کہتا ہے کہ تم ان بچوں کو لے کر کہیں دور چلی جاؤ۔ کسی اور شہر..... کسی اور جگہ۔ ان کو اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لو۔ ایک نئی زندگی شروع کرو۔ جس میں ان کے لیے کوئی بدنامی نہ ہو، کوئی ان کی طرف دیکھ کر دبی دبی سرگوشیاں نہ کرے۔ کوئی ان کی طرف انگلی نہ اٹھائے۔ ایک نارمل زندگی.....''

عروبہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ

جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اس کی سمجھ میں آرہا تھا لیکن اب وہ اتنا آگے آچکی تھی کہ واپسی میں نقصان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اس دوران میں ہاریال اور علی بھی باتیں کرتے لاؤنج میں آگئے۔ ثمینہ اور عروبہ کو آنسو پونچھ کر موضوع بدلنا پڑا۔

☆☆☆

عمر کو اس کی امی نے وہ واقعہ تفصیل سے بتا دیا تھا جس میں سربراہ عروبہ اور ماہین کو روڈ ایکسیڈنٹ سے ڈرانے کی کوشش کی گئی تھی اور پھر دھمکی آمیز فون بھی ملا تھا۔ عمر کو پہلے ہی ایسے حالات کی توقع تھی۔ بہرحال وہ اپنے محاذ پر سرگرم تھا۔ اس کے صحافی دوست محسن نے اہم پیش رفت کی تھی اور خود کو خطرے میں ڈال کر نہ صرف شاہدرہ والی فیملی سے معلومات اکٹھی کی تھیں بلکہ لاہور ہی میں عدیل عرف عادی کے ایک اور جرم کا سراغ لگا لیا تھا۔ یہ کیس بھی ایک تھانے میں رجسٹرڈ تھا اور متاثرہ لڑکی کے لواحقین کچھ نہ کچھ پیروی بھی کر رہے تھے۔ یہ لڑکی شادی شدہ تھی۔ اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ سرگودھا سے شیخوپورہ آنے کے لیے نکلی۔ غلطی سے لاہور والی بس میں بیٹھ کر لاہور بادامی باغ بس اڈے پہنچ گئی۔ یہاں عادی اور اس کا دوست اسے دھوکے سے ایک فلیٹ میں لے گئے۔ بچے کو چھین کر اسے نشہ آور دوا پلا دی اور لڑکی کو صبح تک زیادتی کا نشانہ بنایا۔

اہم ثبوت ملنے کے بعد محسن نے باقاعدہ ایک تحقیقی رپورٹ تیار کی تھی ... یہ رپورٹ عادی کو ایک عادی مجرم ثابت کرتی تھی اور اس کی جنسی بے راہ روی پر مہر تصدیق ثبت کرتی تھی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ عادی کے حوالے سے اگر تین چار کیس آن دی ریکارڈ موجود تھے تو پھر کچھ ایسے واقعات بھی ہوں گے جو منظر عام پر نہیں آئے ہوں گے۔ جس اخبار میں عمر کے ڈیڈی کام کرتے تھے اس نے یہ رپورٹ شائع کرنے میں پہلے تو کچھ ہچکچاہٹ دکھائی۔ اتنے بڑے قانون دان ریاض جاوا کے بیٹے کا نام اس رپورٹ میں آرہا تھا۔ اس شخص کی جڑیں کافی دور تک تھیں۔ بہرحال کچھ تاخیر اور کچھ صلاح مشورے کے بعد یہ رپورٹ شائع کر دی گئی۔ اس نے ہلچل مچا دی۔ الیکٹرونک میڈیا پر بھی نیوز لگ گئیں۔ سماجی حلقوں کی طرف سے بااثر شخص کے بیٹے کو جلد از جلد انصاف کے کٹہرے میں لانے پر زور دیا جانے لگا۔ اطلاعات کے مطابق عدیل عادی ابھی تک روپوش تھا.....

عمر کو والدہ کی زبانی جب سڑک پر پیش آنے والے واقعے اور دھمکی آمیز فون کال کی خبر ملی تو اس کے سینے میں دہکتے ہوئے انگارے کچھ اور دہک اٹھے۔ اس کی امی نے کہا۔ ''ماں بیٹیاں بہت ڈری ہوئی ہیں عمر۔ تم اسپتال سے فارغ ہو کر ان کے گھر کا ایک چکر لگا آنا۔ انہیں تسلی دینا..... اور یہ بھی کہنا کہ وہ بلاضرورت گھر سے نہ نکلا کریں۔''

''آپ فکر نہ کریں امی! میں تو چاہتا ہوں کہ ان کے لیے ایک دو ماہ کے لیے پولیس گارڈ مہیا ہو۔ میں اس سلسلے میں ڈیڈی سے بات کروں گا۔''

''چلو یہ بھی کر لینا، مگر آج جا کر ان کو تسلی ضرور دینا۔ تمہارا بڑا سہارا ہے ان کو۔''

عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

واپسی پر وہ عروبہ آنٹی کی طرف تو نہیں گیا، وہ سیدھا اپنے ڈیڈی کے پاس ان کے اخبار کے آفس میں چلا گیا۔ وہاں سے ڈیڈی کو لے کر وہ اس پولیس اسٹیشن آیا جہاں حریم اور عروبہ آنٹی نے عادی کے خلاف پرچہ درج کروا رکھا تھا۔ باپ بیٹا ایس ایچ او سے ملے اور اس سے پوچھا کہ ایف آئی آر پر اب تک کیا کارروائی ہوئی ہے؟ عمر اکیلا ہوتا تو شاید ایس ایچ او سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا مگر عمر کے ڈیڈی احسان سرمدی کی موجودگی میں اسے دو چار سوالوں کے جواب تو دینا ہی پڑے۔

منہ بنا کر ایس ایچ او نے بتایا۔ ''اب تک جو کچھ پتا چلا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم آزاد علاقے کی طرف نکل گیا ہے۔ خیبر ایجنسی میں اس کا تھوڑا سا کھوج تو ملا ہے۔''

''کھوج نہیں چاہیے، ہمیں مجرم چاہیے۔'' عمر تقریباً چلا کر بولا۔ ''آپ بتائیں اس خبیث کو پکڑنے کے لیے آپ نے کہاں کہاں چھاپا مارا ہے، کب مارا ہے؟''

ایس ایچ او بھی ایک دم بھڑک گیا، پھنکارا۔ ''دیکھو کاکے! یہ تمہارے گھر کا ڈرائنگ روم نہیں ہے، تھانہ ہے، یہاں اونچی آواز میں بولو گے تو پچھتانا پڑے گا۔''

''کیا پچھتانا پڑے گا اس سے زیادہ اور کیا پچھتائیں گے۔'' عمر چلایا۔ ''اس بے انصافی کے دور میں پیدا ہوئے، تمہارے جیسے لوگوں کو اپنا محافظ بنایا، اختیار والوں کو خریدنے کے لیے لمبے چوڑے راستے..... نہ بنائے..... یہ کوئی چھوٹے پچھتاوے نہیں ہیں اور کیا پچھتائیں گے..... تم جیسے افسر تو''

''چپ ہو جاؤ عمر۔'' اس کے ڈیڈی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایس ایچ او سکندر کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ چند لمحے

کے لیے یوں لگا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر عمر کے بال مٹھی میں جکڑ لے گا اور اسے کھینچتا ہوا لاک اپ کی طرف لے جائے گا تاہم عمر کے ڈیڈی احسان صاحب نے عمر کو پیچھے دھکیلا اور ایس ایچ او سے دور لے گئے۔

ایس ایچ او سکندر دہاڑا۔ ''لے جاؤ اپنے اس پھنے خاں کو یہاں سے، ورنہ ابھی اس کی بولتی بند کرادوں گا۔ رستم کہیں کا.....''

عمر بھی آگ بگولا ہو رہا تھا۔ دروازے پر سے گرجا۔ ''تم اکیلے نہیں ہو یہاں کے کرتا دھرتا۔ اس شہر میں کچھ لوگوں کے ضمیر زندہ ہیں ابھی۔ وہ تمہاری طرح زور آوروں کے پٹھو نہیں بنے ہوئے۔ ہم انصاف کے لیے نکلے ہیں اور انشاءاللہ انصاف لے کر رہیں گے۔ ہم آج ہی پریس کانفرنس کریں گے، میڈیا کو بلائیں گے۔ انہیں بتائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ.....'' عمر مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ڈیڈی اسے بہ مشکل وہاں سے کھینچ کر لے گئے۔

باہر گاڑی میں بیٹھ کر ڈیڈی نے اسے سمجھایا بجھایا اور دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کا مشورہ دیا۔ عمر پریس کانفرنس بلانے پر زور دے رہا تھا۔ ڈیڈی نے کہا۔ ''وقت آنے پر یہ بھی کریں گے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا بیٹے..... میڈیا اور این جی اوز وغیرہ ایسے ایشوز کو ہائی لائٹ تو ضرور کرتے ہیں۔ کچھ دنوں تک ہنگامہ بھی مچتا ہے لیکن پھر..... اصل لڑائی بندے کو خود ہی لڑنا پڑتی ہے۔''

''ڈیڈی! وہ لوگ دھمکیاں دے رہے ہیں آنٹی عروبہ کو اور باقی گھر والوں کو..... ان کے لیے زمین تنگ کر رہے ہیں یہ لوگ۔ اگر ان کے خلاف کھل کر بات نہ کی گئی اور ان کو لگام نہ ڈالی گئی تو یہ لوگ سانس لینا مشکل کر دیں گے اس گھرانے کے لیے۔''

ڈیڈی نے ذرا دھیان سے عمر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تجسس تھا اور جیسے ایک سوال سا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں عمر سے پوچھ رہے تھے..... میرا بیٹا! کچھ زیادہ ہی ''انوالو'' لگ رہا ہے اس معاملے میں۔ کہیں اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے؟

عمر نے بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈی! اب یہ بات تقریباً ثبوت کو پہنچ رہی ہے کہ عادی صرف نام کا ہی نہیں حقیقتاً بھی عادی ہے اور مجرم ہے۔ آپ نے اخبار میں جو رپورٹ چھپوائی ہے اس کو تو باقاعدہ عدالتی کارروائی کا حصہ بننا چاہیے۔ یہ سیریل کرائم ہے۔ کم از کم چار کیسوں کا ذکر تو آپ کی رپورٹ میں بھی ہے، اس کے علاوہ بھی نجانے کتنے لوگ زخم کھائے بیٹھے ہوں گے۔ ایسے جانور کا آزاد پھرنا کسی طور بھی خطرے سے خالی نہیں۔''

''تمہاری باتیں درست ہیں بیٹا، مگر بات پھر طاقت اور کمزوری کی آجاتی ہے۔ ایڈووکیٹ ریاض اور اس کے بھائیوں کی سیاسی وابستگی کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو بچانے کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کرتے ہیں۔ اب بھی کر رہے ہیں۔ مگر ہم اس معاملے کو اتنی آسانی سے دبنے نہیں دیں گے۔ ویسے عدالتی کارروائی ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ ایک دو پیشیوں کے بعد عدیل کو اشتہاری قرار دے دیا جائے گا.....''

☆☆☆

ماہین کے داخلے کا مسئلہ تھا۔ رزلٹ کارڈ میں چھوٹا سا نقص پریشان کر رہا تھا۔ تین دن سے عمر، ماہین کو ساتھ لیے لیے پھر رہا تھا اور آخر آج مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ماہین بہت خوش تھی۔

حریم سبزی کاٹ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آن بیٹھی۔ ''آپی! بڑے اچھے ہیں عمر بھائی۔ کبھی کبھی تو مجھے سگے بھائیوں کی طرح لگتے ہیں۔ اتنا پیار، اتنا خلوص، آج کل کون کسی کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے۔''

''ہاں..... آنٹی ثمینہ بھی تو کم اچھی نہیں ہیں۔ آخر ان ہی کے بیٹے ہیں۔'' حریم نے جھکی جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔

وہ عمر کے لطیف احساسات سے کافی حد تک آگاہ ہو چکی تھی..... مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ احساسات کبھی اس کی زبان تک نہیں آئیں گے۔ باقی رہی خود حریم کی بات..... تو وہ تو بس زندہ چل پھر رہی تھی، یہی بڑی بات تھی۔ زندگی کے سارے روشن اور خوشبودار پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اب اگر کوئی چیز اسے تھوڑی بہت خوشی دے سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ اس کا مجرم کیفر کردار کو پہنچے۔ ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو گلے سے لگا کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ انصاف کے حصول کے لیے ہر حد تک جائیں گی اور ہر خطرے کا سامنا کریں گی۔ اب بھی اس کی امی ایک فیملی سے ملنے لاہور کے نواحی علاقے شاہدرہ میں گئی ہوئی تھیں۔ یہ ان فیملیز میں سے ایک تھی جو عدیل عرف عادی کے خلاف زیادتی کا کیس درج کرانے کے بعد اور تھوڑی بہت پیروی کرنے کے بعد ہمت ہار چکی تھی اور کیس واپس لیا ہوا تھا۔

اچانک حریم کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے انجان..... نمبرز سے کال وصول کرنا چھوڑ دی تھی..... لیکن اس

کی امی چونکہ اپنا فون گھر بھول گئی تھیں اس لیے اسے خیال آیا کہ شاید یہ ان کی کال ہو۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اسے پتھرا دیا۔ وہ یوں سکتہ زدہ ہوئی کہ کال کاٹ بھی نہ سکی۔ دوسری طرف وہی منحوس تھا۔ وہ بولا۔ ''عدیل بول رہا ہوں۔ کال کاٹنے سے پہلے میری بس ایک بات سن لینا۔ میں تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ جب چاہوں سامنے آکر تمہیں ہیلو سویٹ ہارٹ بول سکتا ہوں۔ اگر یقین نہیں ہے تو میری بات نہ مان کر آزما لو۔ میں آج رات ساڑھے دس بجے دوبارہ فون کروں گا۔ اگر تمہارا فون بند ملا یا تم نے ریسیو نہ کیا تو تمہاری ''چھوٹی'' کل کالج میں اپنی پہلی کلاس نہیں لے سکے گی اور اگر گئی تو تو روتی ہوئی واپس آئے گی۔ گڈ بائے۔''

کال ختم ہوگئی، مگر حریم اسی طرح ساکتہ و ایستادہ رہی۔ اس کے جسم کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا تھا۔ اس نے جلدی کے ساتھ آنچل سے اپنا چہرہ پونچھا کیونکہ ماہین نے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ وہ حریم کو اپنی نئی یونیفارم اور بکس وغیرہ دکھانے میں مصروف ہوگئی۔ وہ چہک رہی تھی اور حریم کے دل میں جیسے ماتم ہو رہا تھا۔

''کہاں گم ہیں آپی! کیا ہوا؟'' ماہین نے اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ لہجے میں انجانا سا خوف اتر آیا تھا۔

''نہیں ماہین کچھ بھی نہیں۔ یونہی بس کوئی بات یاد آگئی تھی.....'' حریم نے چھوٹی بہن کو یہ مشکل ٹالا۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خوف و ہراس کی بھنک بھی اس کے گھر والوں کو ملے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی ماں کی طرح اپنا ہر صدمہ اپنی ذات تک محدود رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

رات تک اس نے بہت سوچا..... اور پھر جب ساڑھے دس بجے کے قریب وہ منحوس کال آئی تو اس نے ریسیو کرلی۔ وہ اس وقت اس چھوٹے سے کمرے میں اکیلی تھی جسے وہ لوگ اسٹڈی کے لیے استعمال کرتے تھے۔

''ہیلو سویٹ ہارٹ! مجھے پوری امید تھی کہ تم عقلمندی کا ثبوت دوگی۔'' مکروہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' حریم نے دھیمی مگر شعلہ بار آواز میں کہا۔ اس کا پورا جسم غم و غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''چاہتا تو بہت کچھ ہوں سویٹ ہارٹ، مگر فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ پرانی بات کو بھول جاؤ، جو ہوگیا سو ہوگیا، ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔''

''اور اس دوستی کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' حریم

فلم نگری سے

جس کام نے ہونا ہوتا ہے یا جس کو شہرت ملی ہوتی ہے، اس کا سبب خود بخود بن جاتا ہے 1948ء کے اوائل میں برصغیر میں ایک نئی آواز گونجی جس نے گیتوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا وہ آواز لتا منگیشکر کی ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں [illegible] اس نے گھریلو دور [illegible] اس کی بہن آشا بھونسلے اس [illegible] زیادہ گیت گائے [illegible] لتا نے آشا سے [illegible] میں اور [illegible] لتا منگیشکر نے 1952ء میں فلم [illegible] میں وہ پہلی بار گانے کا چانس ملا۔ [illegible] لے گانوں کے لیے لتا کو لیا گیا تھا مگر جب لتا کو پتا چلا کہ اس فلم کی موسیقی انیل بسواس نے موسیقار اوپی نیئر دے رہے ہیں تو اس نے یہ کہہ کر گانے سے انکار کردیا کہ نئے موسیقار کے ساتھ میں گانا نہیں گاسکتی [illegible] وہ خدا معلوم کیسی دھن بنائے۔ اوپی نیئر نے اس کے بعد لتا سے کوئی گیت نہ گوایا بلکہ اس کی چھوٹی بہن آشا سے گیت گوائے۔ بعد میں اوپی نیئر کے نام کا ڈنکا بجا تو لتا کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے اوپی نیئر سے معذرت بھی کی لیکن اوپی نیئر راضی نہ ہوئے۔

زخمی کانپوری کی کتاب ''دور کوئی گائے'' سے انتخاب

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

نیا شاعر

ایک نیا شاعر کسی رسالے کے ایڈیٹر کے پاس غزل لے کر گیا۔

ایڈیٹر نے پوچھا۔ ''کیا یہ غزل آپ کی ہے؟''

شاعر نے کہا۔ ''بے شک۔''

ایڈیٹر بولا۔ ''یہ غزل رسالے کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔''

شاعر صاحب آہستہ سے بڑبڑائے۔ ''یا اللہ اب غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہونے لگیں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

زہرخند لہجے میں بولی۔

''کچھ زیادہ نہیں..... کچھ زیادہ نہیں..... بس اتنا کردو سویٹی! کہ اپنی پیاری ماما کو اور خود اپنے آپ کو تھوڑا سا سمجھا دو۔ آپ دونوں اس گندے کھیل میں ہاتھ نہ ڈالیں تو اچھا ہے..... ورنہ اس گند کے چھینٹے دور دور تک جائیں گے۔''

''..... اور اگر میں تھوک دوں تم پر اور تمہاری اس بات پر تو۔'' حریم خود کو سنبھال نہ سکی اور غصے میں پھٹ پڑی۔

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر وہ اطمینان سے بولا۔ ''پھر بھی کچھ نہیں ہوگا جانِ من۔ میں کوئی دھمکی بھی نہیں دوں گا۔ نہ یہ کہوں گا کہ میں دوبارہ تمہارے گھر کی دیوار پھاند سکتا ہوں، نہ یہ کہوں گا کہ کالج کے راستے میں تمہاری چھوٹی چڑیا کے پر جھڑ سکتے ہیں، نہ یہ کہوں گا کہ تمہاری ماما آج شام گھر آتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرا سکتی ہیں۔ کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ آج تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے اور میری کال ریسیو کی ہے۔ مجھے اچھا لگا ہے..... اور میں چاہتا ہوں کہ تم کبھی کبھار اس عقل مندی کا ثبوت دیتی رہو کیونکہ..... کیونکہ..... کیونکہ اگر کبھی میری کال آئی اور تم نے ریسیو نہ کی تو پھر وہ سب کچھ ہوگا جو میں نے تم سے کہا نہیں۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے عادی کا لہجہ اتنا زہرناک ہوگیا کہ طیش میں ہونے کے باوجود وہ اندر سے لرز گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر اس کی نرم آواز ابھری۔ ''معاف کرنا سویٹی! شاید میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ تمہارا موڈ خراب ہوگیا ہے۔ اس لیے اجازت چاہتا ہوں۔ گڈ بائے..... اور..... ایک اور بات یاد آگئی۔ وہ جو ایک پیارا سا پالتو میاں مٹھو ہے تمہارا، وہ کل تھانے میں جاکر بڑا ٹائیں ٹائیں کررہا تھا اور ہمیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ میرے خلاف اخبار میں جو گند اچھالا گیا ہے اس میں بھی تمہارے اسی میاں مٹھو کا ہاتھ ہے۔ اس کے کمینے دوست محسن نے یہ من گھڑت رپورٹ تیار کی ہے۔ میاں مٹھو کے لیے وارننگ ہے کہ وہ ایویں کہیں ضائع شائع نہ ہوجائے..... تم لوگ بھی اس سے کچھ فاصلہ ہی رکھو تو اچھا ہے..... او کے گڈ بائے۔'' فون بند ہوگیا۔

حریم لرز رہی تھی اور اس کے پورے جسم کا خون اس کے سر میں جمع تھا۔ ان لمحوں میں اس کا دل چاہا، کاش کہیں سے اس کے پاس کچھ بارودی مواد آجائے، وہ اس بارود کو اپنے بے وقعت جسم کے گرد باندھ لے۔ پھر فون کرکے اس مکروہ شخص کو اپنے پاس بلائے اور اس کو دبوچ کر اپنے ساتھ اسے بھی ٹکڑوں میں تقسیم کردے لیکن یہ صرف ہیجانی سوچیں تھیں۔ عملی طور پر ایسا کرنا اس کے لیے کہاں ممکن تھا۔

اسی دوران میں مہران کار کا ہارن سنائی دیا۔ اس کی امی گھر واپس آگئی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا پسینا پونچھا اور آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔ وہ اس فون کال کے بارے میں امی کو بتا کر ان کی پریشانیوں کو مزید عروج دینا نہیں چاہتی تھی۔

امی بھی کچھ زیادہ امید افزا خبر لے کر نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جس متاثرہ فیملی کی طرف گئی تھیں وہ لاہور سے باہر گئی ہوئی تھی، صرف لڑکی کے تایا اور تائی سے ملاقات ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑی مشکل سے بچی کے رشتے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ کسی بھی طرح اس کیس کی پیروی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بہت تھک گئے ہیں.....

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ گھنٹے دنوں میں، دن ہفتوں میں بدل رہے تھے۔ موسم بدلنا شروع ہوگیا تھا۔ عروبہ اور اس کی بیٹی نے سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر انصاف کے حصول کے لیے جو علم اٹھایا تھا وہ ابھی تک اٹھا رکھا تھا۔ وہ تھک ضرور گئی تھیں لیکن ہاری نہیں تھیں، ان کے جسم شکستہ ضرور تھے، لیکن حوصلے ٹوٹے نہیں تھے۔ وہ اپنے جسم و جاں پر وقت اور معاشرے کا ہر وار سہہ رہی تھیں، جو لوگ ان کے ہمنواؤں میں شامل تھے، ان میں عمر اور اس کے والد احسان صاحب سرفہرست تھے۔ وہ اپنی سی ہر کوشش کرنے میں مصروف تھے۔ عدیل عرف عادی تاحال مفرور تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ پولیس کے کچھ کرپٹ آفیسر ریاض فیملی کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے عدیل کو تحفظ دینے میں مصروف ہیں۔ انجانے اندیشوں سے مجبور ہوکر حریم نے اپنی امی کو ان فون کالز کے بارے میں بتادیا تھا جو اسے وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھیں۔ وہ مکروہ شخص اسے تقریباً ہر بار ہی ''سم'' بدل کر فون کرتا تھا اور کبھی کبھی ایس ایم ایس بھی۔ ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ اس کی متوقع کال کے خوف سے حریم نے اپنا فون بند کردیا تھا۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ ایک بار اس کی والدہ کو ایک نہایت دھمکی آمیز کال موصول ہوئی تھی، دوسری مرتبہ حد ہوگئی تھی۔ باریال کھیل کے میدان سے گھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے نمبر سے ایک فون کال آئی تھی جس میں کسی گمنام شخص نے حریم اور اس کی والدہ کو بتایا تھا کہ باریال کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کی زندگی چاہتی ہیں تو 24 گھنٹے کے اندر اندر پچاس لاکھ روپے ''نیٹ

کیش'' کی صورت میں ادا کرنے کا انتظام کرلیں۔ یہ اتنی خوفناک خبر تھی کہ حریم نے چلانا شروع کردیا تھا اور اس کی امی بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھیں لیکن پھر فوراً ہی ایک پرلطف قہقہہ سنائی دیا تھا اور دھمکانے والے نے کہا تھا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں، باریال اس وقت خیریت سے ان کے پاس موجود ہے اور ریڑی کھا رہا ہے۔ ابھی آدھ پون گھنٹے میں بخیریت گھر پہنچ جائے گا، لیکن اگر ان ماں بیٹی نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ کال مذاق نہیں رہے گی، حقیقت بن جائے گی۔ باریال تو آدھ پون گھنٹے بعد واپس آگیا تھا لیکن اس روز حریم اور اس کی امی کا جو اعتماد اور حوصلہ ان سے جدا ہوا تھا وہ اپنی اصل شکل میں واپس نہیں آیا۔ اگلے ہی روز ماہین کا کالج جانا بند کردیا گیا تھا اور باریال کا کرکٹ کھیلنا بھی موقوف ہوگیا تھا۔ وہ کالج ضرور جاتا تھا لیکن اب اسے حریم کی امی گاڑی پر خود چھوڑنے جاتیں اور لاتی تھیں۔ اس فون کال نے انہیں اس قدر ہراساں کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہمدرد و غمگسار عمر کو بھی اس سے بے خبر رکھا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اپنی جدوجہد ترک کردی تھی۔ ماہین کو اس کی پھپھو کے پاس کوئٹہ بھیج دیا گیا اور وہ وہیں رہنے لگی۔ حریم کی تعلیم کا سلسلہ تو ویسے ہی منقطع ہوچکا تھا۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتی تھی۔ کبھی تاریخ پر عدالت میں جانا ہوتا، یا کسی آفس وغیرہ کا چکر لگانا پڑتا تو وہ اپنی امی کے ساتھ ہوتی۔ وہ ایک عادی مجرم کے ساتھ قانونی لڑائی لڑ رہی تھیں اور اسے انجام تک پہنچانا چاہتی تھیں۔ اب تک اپنی ان کوششوں میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ تھانے کچہری کے چکر، تاریخیں، گواہوں کی تلاش، ایسے بااثر لوگوں سے ملاقاتیں جو انہیں انصاف کے حصول میں مدد دے سکیں، وہ سب کچھ کررہی تھیں۔ دوسری طرف عمر نے بڑی خاموشی سے اپنا محاذ سنبھال رکھا تھا۔ اس نے سوشل میڈیا پر ایڈووکیٹ ریاض اور اس کے بدقماش بیٹے کے خلاف باقاعدہ ایک مہم چلا دی تھی۔ وہ اپنے والد کے تعاون سے صحافتی محاذ پر بھی کردار ادا کررہا تھا اور اس نے اس معاملے کو دبنے نہیں دیا تھا۔

لیکن پتا نہیں کیوں جوں جوں وقت گزر رہا تھا ایک مایوسی سی حریم اور عروبہ پر طاری ہونے لگی تھی۔ انہیں لگتا تھا، جیسے ہر راستے پر کوئی رکاوٹ موجود ہے اور ہر دروازے پر عدیل اور اس کے باپ کا کوئی خفیہ ہمدرد بازو پھیلائے کھڑا ہے۔ انہیں ہر طرح سے ''ڈس ہارٹ'' کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ نادیدہ لوگوں کی طرف سے حریم کے علاوہ عروبہ کے ماضی پر بھی کیچڑ اچھالا گیا تھا اور اب بھی اچھالا جارہا تھا۔ اس روز حریم اور عروبہ کو سب سے بڑا دھچکا لگا جب انہیں عمر کی زبانی پتا چلا کہ زویا اور اس کے گھر والے بڑی خاموشی سے پاکستان چھوڑ کر کینیڈا چلے گئے ہیں۔ زویا، حریم کی وہی محلے دار دوست تھی جسے حریم جیسے سانحے کا ہی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس بدمعاش نے حریم کو نشانہ بنانے کے چند ہفتے بعد ہی زویا کو بھی برباد کیا تھا۔ اب تک زویا کی فیملی ڈٹی رہی تھی۔ حریم اور عروبہ کی طرح وہ لوگ بھی اپنے کیس کی پوری پیروی کررہے تھے۔ دونوں مظلوم لڑکیوں کے والدین اور ان کے وکیلوں کے درمیان بھی اکثر صلاح مشورہ ہوتا رہتا تھا لیکن اب اچانک ہی یہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ ان دنوں حریم، عروبہ اور عمر نے بھی خود کو تنہا محسوس کیا۔ عمر نے اب تک کسی مرحلے پر بھی ہمت نہیں ہاری تھی، حریم اور عروبہ کی ڈھارس ہی بندھائی تھی۔ اس نے ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا اور اپنے اس کردار کی وجہ سے بالکل چپکے چپکے حریم کے دل میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی تھی لیکن جس روز زویا اور اس کی فیملی کے بیرونِ ملک جانے والا انکشاف ہوا، حریم کو پہلی بار عمر کا لہجہ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔

جس روز حریم اور عروبہ تک زویا والی مایوس کن خبر پہنچی اس سے اگلے ہی روز حریم کو پھر ایک نئے نمبر سے عادی کا منحوس میسج موصول ہوا۔ اس میں حسبِ معمول کہا گیا تھا کہ وہ پانچ منٹ بعد اس نمبر سے کال کررہا ہے وہ ریسیو کرے۔ ہمیشہ کی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی حریم نے کال ریسیو کی۔ (ایک دو مرتبہ فون کی مدد سے عادی کی لوکیشن ٹریس کرانے کی کوشش بھی کی گئی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی)

وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ''دیکھ لیا نا۔۔ جانِ من! کچھ لوگوں کا اگلا دھرنا شیر کا اور پچھا گیدڑ کا ہوتا ہے۔ زویا کے پاپا جانی زمین چیرنے اور آسمان پھاڑنے کی باتیں کرتے تھے اب کہاں گئیں ان کی دھمکیاں۔ ڈیڑھ کروڑ کی پراپرٹی نوٹے لاکھ میں بیچ کر بھاگے ہیں۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں حریم سرور! غصہ تھوک دو۔ روک لو اپنی جنونی والدہ محترمہ کو۔ اس بے کار کی پریکٹس سے کچھ حاصل وصول نہیں ہونا۔ کسی دن ہمت کرکے مجھ سے ملو۔ میں بتاؤں گا اب بھی میرے دل میں کتنی گنجائش ہے تمہارے لیے۔ پرانی باتوں کو بھول بھال کر ہم ایک نیا سفر شروع کرسکتے ہیں ..... اور کیا پتا اس سفر میں جیون بھر کی رشتے داری ہی بن جائے۔'' اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح معنی خیز تھا۔

''کچھ اور کہنا ہے تم نے یا میں فون بند کردوں؟'' حریم

نے کرخت لہجے میں کہا۔

وہ بگڑ کر بولا۔ ''جب اس طرح بولتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ دوستی کا ہاتھ کھینچ لوں اور دشمنی کا ہاتھ بڑھا دوں..... اور تمہیں پتا ہی ہے میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ جب پکڑنے پر آ گیا تو تم سات دیواروں کے پیچھے بھی چھپ نہیں سکو گی۔''

''تمہارے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں، میرے جسم تک نہیں پہنچ سکتے۔ میری لاش کو شاید چھو لیں۔''

''لاش بننے کی باتیں کرنا آسان ہوتا ہے لیکن لاش بننا آسان نہیں ہوتا، تجربہ شرط ہے۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔ ''عادی! خدا کے لیے۔ ہمارا پیچھا چھوڑ دو..... چھوڑ دو ہمارا پیچھا۔ سنا ہے تمہاری اپنی بھی بہنیں ہیں۔ بھانجیاں ہیں، کبھی ان لڑکیوں کا خیال بھی کرو۔ اللہ کے غضب کو آواز مت دو۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے..... ایک حد ہوتی ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ صبر اور انتظار کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے.....'' اس کا لہجہ پھر نرم اور میٹھا ہو گیا۔ حریم سسک رہی تھی۔ وہ چند لمحے توقف کر کے بولا۔ ''اچھا پھر بات کریں گے۔ لگتا ہے کہ تمہاری طرف بارش شروع ہو گئی ہے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

وہ بیٹھی، ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے فون کو تکتی رہی۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھا۔ گاہے بگاہے اسے فون بھی کرتا تھا، لیکن کوئی اسے ٹریس نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید کوئی ٹریس کرنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ کسی وقت تو وہ یہ سوچ کر ڈر جاتی تھی کہ وہ ان کے گھر بھی آ دھمکا تو شاید کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ اللہ سے مدد مانگنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آنٹی ثمینہ سہ پہر کے وقت عروبہ سے ملنے آئیں۔ حریم دوسرے کمرے میں تھی اور باریال کو ٹیسٹ کی تیاری کروا رہی تھی۔ آنٹی ثمینہ نے کولڈ ڈرنک کا ''سپ'' لینے کے بعد پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''عروبہ! میری ایک بات مانو۔ بہت بہتری آئے گی اس سے تم حریم کو اس کی بڑی پھپھو کے پاس دبئی بھیج دو۔ وہاں کافی زیادہ پاکستانی کمیونٹی ہے۔ ہمارے لاہور کے بھی بے شمار لوگ وہاں آباد ہیں۔ وہیں پر کوئی مناسب سا رشتہ دیکھ کر حریم کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔''

عروبہ کے سینے پر ہلکی سی چوٹ لگی۔ اس نے باجی ثمینہ کی طرف دیکھا۔ بے شک وہ یہ بات خلوص اور ہمدردی سے کہہ رہی تھیں لیکن شاید وہ جانتی نہیں تھیں کہ حریم کے حوالے سے ان کے بیٹے کے خیالات کیا ہیں یا شاید وہ جانتی ہوں مگر نظر انداز کر رہی ہوں۔

وہ بولی۔ ''آپ نے سو فیصد درست بات کہی ہے۔ باجی سچ کہتی ہوں، کبھی کبھی تو میں بالکل مایوس ہو جاتی ہوں اپنے آپ سے اور اپنے ارادوں سے..... یقین ہونے لگتا ہے کہ ہمارے ملک میں کمزور آدمی کے لیے انصاف کا حصول دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ہم کب تک سر پھوڑتے رہیں گے اس دیوار سے۔''

''یہی تو میں تمہیں سمجھاتی ہوں عروبہ! جو کچھ تمہارے بس میں تھا تم نے کیا..... اور کسی نہ کسی طور اب بھی کر رہی ہو..... اور مجھے یقین ہے کرتی رہو گی۔ مگر تمہارے بچے ہیں، ان کی زندگیاں ہیں۔ ان سب چیزوں کو کہاں تک داؤ پر لگائیں گے ہم۔ ہم نے ایک آواز تو بلند کر ہی دی ہے نا..... اور یہ آواز گنگنا لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچی ہے۔ اس آواز نے لوگوں کے دلوں کو چھوا ہے۔ یہ آواز کسی نہ کسی شکل میں اپنے اثرات برقرار رکھے گی۔''

اسی دوران میں ڈور بیل ہوئی۔ چار بج چکے تھے۔ عمر اپنی والدہ کو لینے آیا تھا۔ آج وہ کئی دنوں بعد آیا تھا۔ عروبہ نے دروازہ کھولا اور اسے چائے کے لیے اوپر لے آئی۔ وہ بمشکل رضامند ہوا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ چائے کے ساتھ رکھنے کے لیے اتفاقاً گھر میں اسنیکس نہیں تھے۔ عروبہ نے باریال کو بازار بھیجا۔ باریال واپس آیا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ عروبہ چونک گئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے کچن میں پہنچی۔ ''کیا ہوا باریال؟'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔

باریال نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور ہولے سے کہا۔ ''وہ ادھر کھڑا ہے، سڑک کے پار۔''

''کون؟''

''وہی..... عدیل..... میں نے خود دیکھا ہے۔ ساتھ میں اس کا کوئی فرینڈ بھی ہے، موٹی سی ناک والا۔''

عروبہ کی رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی۔ اسے اپنے پورے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔ ابھی تک اسے باریال کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا..... اچانک اسے لگا کہ کچن کے دروازے کے بالکل پاس کوئی موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی، عمر سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگے تھے۔ وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''سوری آنٹی جان! لیکن میں نے باریال کی بات سن لی ہے۔ میں..... میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس

حرامزادے کو۔ اسے بتاؤں گا کہ کس سے سامنے بدمعاشی کیسے دکھائی جاتی ہے میں دیکھتا ہوں اسے۔''

وہ تیزی سے باہر کو لپکا۔ ''عمر عمر میری بات سنو..... ٹھہرو عمر۔'' عروبہ چلائی مگر وہ عجیب کیفیت میں تند بگولے کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ اس کے پیچھے لپکتی سیڑھیوں تک پہنچ گئی۔ وہ آدھی سیڑھیوں سے پکارا۔ ''آپ پولیس اسٹیشن فون کریں..... اور وکیل انکل کو بھی۔''

حریم اور آنٹی ثمینہ بھی دوڑتی ہوئی سیڑھیوں پر آ گئی تھیں۔ دونوں کے رنگ ہلدی ہو رہے تھے۔ ''کیا ہوا عروبہ؟'' آنٹی ثمینہ نے پکار کر پوچھا۔

''عمر کو روکیں۔ وہ دیکھیں، وہ نیچے چلا گیا ہے۔ وہ لڑنے گیا ہے۔''

آنٹی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر تب تک حریم نیچے سڑک پر جھانک چکی تھی۔ اس نے سڑک کی دوسری طرف جنرل اسٹور کے قریب عدیل عرف عادی کا منحوس چہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے عروبہ کی طرف دیکھا۔ عروبہ نصف سیڑھیاں نیچے اتر کر رک گئی تھی۔ اب تو وہ عمر کو پکار بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ سڑک پار کر چکا تھا۔

حریم اور عروبہ نے دیکھا..... وہ لمبے بالوں والے منحوس صورت عدیل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ دونوں کے درمیان چند تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ موجود تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے، دونوں نے ایک دوسرے پر گھونسوں، لاتوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سڑک پر ایک دم ہلچل سی مچ گئی تھی۔ عروبہ نے دہشت زدہ ہو کر ون فائیو پر کال کی اور مدد کے لیے کہا۔

اسی دوران میں باریال بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اس لڑائی میں اپنے عمر بھائی کا ساتھ دینا چاہتا ہوگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان دونوں تک پہنچتا، عدیل عرف عادی کے ساتھ آنے والے اس کے غنڈا صورت ساتھی نے دبلے پتلے باریال کا گریبان پکڑا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ بیت اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس لڑائی سے الگ رہے اور بس تماشائی کا کردار ادا کرے اور واقعی یہ ایک سنگین لڑائی تھی۔ کچھ دیر تک تو پلڑا برابر دکھائی دیا لیکن پھر لمبے بالوں اور منحوس جسم والا عادی اپنے حریف عمر پر غالب آنے لگا۔ عمر بھی ورزشی جسم کا مالک تھا اور عادی ہی کی طرح دراز قد بھی تھا لیکن پھر بھی یہ ایک آوارہ غنڈے اور شریف النفس ڈاکٹر کا مقابلہ تھا۔ عادی وحشت میں چنگھاڑنے لگا اور عمر کو گھما گھما کر دیواروں سے پٹخنے لگا۔ اپنی تمام تر جرأت اور حوصلے کے باوجود عمر اب عادی کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ سیڑھیوں میں کھڑی خواتین چلانے لگیں۔ باریال کو دو تین بندوں نے آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ عمر کے ناک منہ سے اب خون جاری تھا۔ اس کی شرٹ پھٹ چکی تھی۔ کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کرانے کی اور عمر کو عادی کی زد سے بچانے کی کوشش کی۔ عروبہ بھی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی، ننگے سر سڑک پر پہنچ گئی۔ تب تک عمر لہولہان ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے عادی کو سنبھال رکھا تھا۔ وہ جھپٹ جھپٹ کر عمر کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تین چار افراد عمر کو بچانے کی کوشش میں تھے عروبہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ اس نے اپنے جسم کو عمر کے لیے ڈھال بنا دیا۔ عادی کی دو تین لاتیں کھا کر میں اسے اپنی کمر پر لگانا پڑیں لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹی۔

لوگ بیچ بچاؤ کرا کے عادی کو گھسیٹ کر دور لے گئے وہ عمر کے لیے گالیاں بک رہا تھا۔ ''او تیری ماں کا بھوسا تیری تو ''

بہرحال یہ بات وہ بھی اچھی طرح جان گیا تھا کہ عمر ڈاکٹر بابو ہی نہیں ہے۔ وہ باآواز بلند یہ بول رہا تھا دوسری طرف عمر بھی زخمی آواز میں اسے للکار رہا تھا۔ بالآخر عادی اپنے دو دوستوں کے ساتھ سلور رنگ کی ایک ٹویوٹا جیپ میں بیٹھا اور پھنکارتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اب آنٹی ثمینہ بھی چادر اوڑھے موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ عمر کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور ناک سے بھی خون جاری تھا۔ اس کی ایک کہنی اس بری طرح چھلی تھی کہ ہڈی نظر آ رہی تھی۔

''اس کو اسپتال لے جائیں۔'' ایک شخص نے مشورہ دیا۔

عمر نے کہنی کا زخم دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں..... میں ٹھیک ہوں۔''

باریال اور عمر وغیرہ عروبہ کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے آئے۔ اوپر لا کر اسے کرسی پر بٹھایا گیا۔ حریم جلدی سے ایک بڑا رومال گیلا کر کے لائی۔ عروبہ نے عمر کا خون آلود چہرہ صاف کیا۔ پھر وہ بولی۔ ''حریم بیٹی دیکھنا ذرا۔ ہونٹ پر اسٹیچنگ کی ضرورت تو نہیں؟''

حریم نے عمر کا زخم دیکھا اور قدرے مطمئن نظر آئی۔ پھر اس نے چھوٹا آئینہ لا کر عمر کو تھما دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ اور ٹھوڑی پر آنے والے کٹ دیکھے۔ ''نہیں۔ یہ بینڈیج سے ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اور کہنی؟'' آنٹی ثمینہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

''یہاں بھی بینڈیج ہوجائے گی۔'' عمر نے کہا۔ عادی سے چوٹیں کھانے کے باوجود وہ مکمل حوصلے میں تھا اور اس کے کشادہ سینے میں اضطرابی زیر و بم تھا۔

ایسے موقعوں پر پولیس کی پھرتیاں ہمیشہ سے زیر بحث رہی ہیں۔ پولیس یوں تو سڑکوں پر دندناتی نظر آتی ہے لیکن جب ضرورت ہوتی ہے دور دور اس کا پتا نہیں ملتا۔ یہاں بھی پولیس آئی لیکن تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد۔ تب تک حریم کے خالو یاور حیات اور وکیل سلطان صاحب بھی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پولیس انسپکٹر سے بات کی اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پولیس کا یہ مؤقف بالکل غلط ثابت ہوگیا تھا کہ عادی آزاد علاقے میں کہیں روپوش ہے۔ وہ یہیں لاہور کی گلیوں میں دندنا رہا تھا۔ تاہم اس کو پوری طرح ثابت کرنے کے لیے غیر جانبدار گواہی کی ضرورت تھی۔ یہ گواہی اردگرد کے لوگ ہی دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر گواہی دینے کے لیے کون تیار ہوتا ہے اور یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اگلے دو تین روز میں پولیس نے کافی پھرتی دکھائی مگر نتیجہ وہی رہا ڈھاک کے تین پات۔ شاید وہ لوگ دل سے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنے نادیدہ ہاتھوں سے ہر وہ دروازہ بند کر رکھا ہے جو قانون کو عادی کی سمت لے جاسکتا ہے۔ خانہ پری کے طور پر عادی کے سوتیلے بھائی کو پھر حراست میں لیا گیا مگر ایک دو دن کی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

واقعے کے چوتھے پانچویں روز کی بات ہے، عروبہ اور حریم، عمر کی عیادت کے لیے ان کے گھر گئیں۔ پرانے محلے میں جاتے ہوئے انہیں عجیب سی جھجک محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی مہران کے بجائے رکشا پر گئیں۔ حریم نے چادر کا نقاب کر رکھا تھا۔ عمر نے اسپتال سے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی تھی اور گھر میں ہی تھا۔ اس کے بازو پر ابھی تک پٹی تھی اور ٹھوڑی پر بھی میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ سارے مایوس کن حالات کے باوجود عمر کی آنکھوں میں اب بھی عزم کی چمک للکارا مارتی تھی۔ پانچ روز پہلے جو واقعہ ہوا تھا اس کی ایف آئی آر بھی عمر کی کوششوں سے ہی کٹی تھی۔

عروبہ کچھ پھل اور اسنیکس وغیرہ لے کر گئی تھی۔ آنٹی ثمینہ ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملیں تاہم حریم نے صاف محسوس کیا کہ وہ کچھ چپ چپ ہیں۔ وجہ کوئی ڈھکی چھپی تو تھی نہیں۔ حریم سے آنٹی کی انسیت اپنی جگہ تھی، مگر انہیں اپنا بیٹا بھی عزیز تھا اور ان کا اکلوتا بیٹا بتدریج ایک خطرناک رقابت اور دشمنی کی زد میں آگیا تھا۔ آنٹی ثمینہ اور عروبہ کوئی بات کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلیں تو عمر اور حریم کچھ دیر کے لیے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ عمر بستر پر نیم دراز تھا، حریم چند فٹ کے فاصلے پر سنگل صوفے پر بیٹھی تھی۔ بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ بولی۔ ''آپ کے چہرے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کو شاید بخار بھی ہے۔''

''ہاں کل کچھ ٹمپریچر لگتا تھا لیکن اب تو ہلکی سی حرارت ہی ہے۔''

حریم نے سائڈ ٹیبل کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں کچھ دوائیں پڑی تھیں۔ ''اگر آپ کہیں تو ''پیناڈول'' دوں آپ کو؟''

''نہیں رہنے دیں۔'' اس نے کہا، پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اگر کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں تو یہ ٹھوڑی والی بینڈیج ذرا اتار دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئنٹمنٹ لگا کر اسے کھلا رکھوں۔''

حریم فوراً اٹھی۔ اس نے کاٹن اور پائیوڈین وغیرہ لی۔ پہلے میڈیکل ٹیپ اتاری پھر چپکی ہوئی پٹی اتارنے کے لیے اسے پائیوڈین سے نم کرنے لگی۔ وہ نیم دراز عمر کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کے سلکی بالوں کا ایک پورشن ڈھلکا اور عمر کے چہرے کو چھونے لگا۔ وہ پوری طرح اپنے کام کی طرف متوجہ تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اس کی لٹیں عمر کی نرم اور محبت بھری گرفت میں ہیں۔ وہ بے طرح ٹھٹک گئی لیکن اسی طرح جھکی کھڑی رہی۔

عمر کی آنکھیں بند تھیں اور آنکھوں کے گوشوں سے ہلکی سی نمی جھانک رہی تھی۔ وہ جو ہمیشہ خاموش رہا تھا، آج خاموش نہیں رہا۔ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے اس نے اپنے ہونٹوں سے حریم کے بالوں کو چھوا اور سوئے سوئے سے لہجے میں بولا۔ ''حریم! مجھے تنہا نہ چھوڑیے گا۔ آپ کے بغیر..... مجھ سے جیا نہیں جائے گا۔'' یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے دو موتی ڈھلک گئے۔

حریم کے پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔ یہ چند الفاظ تھے لیکن لگتا تھا کہ ان کے پیچھے برسوں کی کشمکش اور تڑپ شامل ہے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں اس کی حساس سماعت نے کچن کی طرف قدموں کی مدھم چاپ سنی۔ ماما یا آنٹی میں سے کوئی اس طرف آرہا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے اپنے بال عمر کی محبت بھری گرفت سے چھڑائے اور سیدھی ہو کر کھڑی ہوگئی۔

باقی حصہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

www.PakiBooks.Site

معاشرے کے سب سے خطرناک اور پُرتشدد پہلو کو اجاگر کرنے والی تحریر..... بنگ آمد بجنگ آمد کی عملی تفسیر

دوسرا اور آخری حصہ

بجنگ آمد

طاہر جاوید مغل

مشرق ہو یا مغرب... انسانی معاشرہ اگر حدود و قیود سے آزاد ہو جائے تو... انسانیت اور حیوانیت میں فرق مٹ جاتا ہے... گویا قدرت نے جس کی جو حد مقرر کردی اسے اس تک محدود رہنا چاہیے مگر... کیا کیا جائے جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور برداشت اپنی حد سے باہر ہو جائے تو انتقام کی چنگاری رفتہ رفتہ حالات کی تیز ہوا سے بھڑک کر ایک دن شعلہ بن جاتی ہے۔ یہی حال اس بدحال کا ہوا جو جوانی اور دولت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح سرشار بڑھتا چلا جارہا تھا کہ ایک دن اس مظلوم کی برداشت نے جواب دے دیا... اس کے بعد قدرت نے ایسا طوفان اٹھایا کہ بھڑکتے شعلوں کے رقص نے معاشرے میں بلند مقام پانے والے ظالموں کے نشیمن کو جلا کر راکھ کردیا... وہ بچیاں جو معصومیت کا پیکر... دلوں کا سکون... گھروں کی رونق تھیں... ان درندہ صفت بھیڑیوں کے خونیں جبڑوں سے محفوظ نہ رہ سکیں جو عزتوں کے جنازہ نکالنے کے لیے ہی شاید دھرتی کا بوجھ بنتے ہیں۔



گھر آکر حریم بند کمرے میں دیر تک بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک عمر کے وہ الفاظ گونج رہے تھے۔ جو اس نے نہ جانے کس طرح، بند آنکھوں کے ساتھ کہہ ڈالے تھے۔ ''حریم! مجھے تنہا نہ چھوڑیے گا۔ آپ کے بغیر مجھ سے جیا نہیں جائے گا۔''

وہ سسک اٹھی۔ وہ ایک اجڑی بچوی ہستی تھی۔ اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے تھا ہی کیا؟ وہ دل و جان سے عمر کی عزت کرتی تھی۔ اس کے دل میں اس کا ایک اہم مقام بن گیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ خود کس مقام پر کھڑی ہے۔ وہ بے ساختہ سوچنے لگی۔ اگر عمر کی اس خاموش محبت کو ماضی کے شب و روز میں کوئی مل گئی ہوتی تو زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو شاید..... وہ شخص بھی اس کی زندگی میں نہ آتا جس کا نام آصف تھا۔ جس سے اس کی منگنی ہوئی تھی اور جو اس کو سمجھے بغیر اس کے حالات دیکھ کر یوں بھاگا تھا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ پچھلے ہی دنوں حریم اور عروبہ کو خبر ملی تھی کہ اس کا نکاح ہو گیا ہے اور رخصتی دو ماہ بعد متوقع ہے۔

اس نے اپنا چہرہ تکیے میں گھسیڑا..... اور دل ہی دل میں کربناک انداز میں کہا۔ ''عمر! مجھے معاف کر دینا۔ میرے اور آپ کے راستے نہیں مل سکتے۔ میں نے آپ کی امی کی آنکھوں میں وہ گریز دیکھ لیا ہے جس کے لیے وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ وہ لاکھوں میں ایک ہیں لیکن ان کی جگہ کوئی بھی ماں ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کے لیے میرے جیسی شریکِ حیات لانے کا نہ سوچتی۔''

وہ دیر تک روتی رہی اور اپنی بربادی پر خون کے آنسو بہاتی رہی۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا کہ شاید اس نے اور اس کی ماما نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کا جو فیصلہ کیا، وہ دانش مندانہ نہیں تھا۔ انہوں نے ہر طرح کی بدنامی مول لے لی تھی، صعوبتیں برداشت کی تھیں لیکن ابھی تک وہیں کھڑے تھے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا بلکہ اب تو یوں لگتا تھا کہ اس حوالے سے ان کی مکوس پیش رفت ہوئی ہے۔ جن کو چھپنا چاہیے تھا، وہ دندنا رہے تھے اور جو مدعی تھے وہ چھپتے پھر رہے تھے۔ باریال جو ہمیشہ سے بڑا سوشل تھا، اب الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ ماہین مستقل طور پر کوئٹہ شفٹ ہو چکی تھی اور وہاں بھی ڈری سہمی ہی رہتی تھی۔ حریم خود بھی بے شمار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو چکی تھی۔ خالو یاد حیات کی ہمت بھی ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے اپنے کچھ ذاتی مسائل بھی تھے اور اب حریم کو یوں لگ رہا تھا کہ ان کو اپنے اہم ترین سہارے کو بھی خود سے دور کرنا پڑے گا۔ وہ نہیں چاہتی تھی لیکن یقیناً اس کی ماما بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی وجہ سے عمر خدانخواستہ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو۔ وہیں بستر پر لیٹے لیٹے اور تکیے میں منہ گھسیڑ کر آنسو بہاتے بہاتے حریم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دل پر پتھر رکھ کر عمر سے بتدریج اپنا فاصلہ بڑھاتی چلی جائے گی۔ یہی سب کے حق میں بہتر تھا۔

☆☆☆

یہ عجیب سے شب و روز تھے۔ مایوسی کے ساتھ ساتھ اب ان میں ایک طرح کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ حریم جانتی تھی اور باقی اہلِ خانہ بھی جانتے تھے کہ عادی ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے لیکن اس روز کی لڑائی کے بعد وہ پھر سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی ابھی تک اس نے کسی اور طریقے سے رابطہ کیا تھا۔ بہرحال ایک دھڑکا سا ہر وقت حریم کے دل میں موجود رہتا تھا۔

میڈیا اب بھی حریم اور اس کے اہلِ خانہ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایک روز ڈور بیل ہوئی۔ ماما سو رہی تھیں۔ حریم نے دروازے پر جا کر پوچھا۔ ''کون؟''

باہر ایک چینل کی لیڈی رپورٹر اپنے کیمرامین کے ساتھ موجود تھی۔ ''مس حریم! آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔ آپ کی والدہ سے تھوڑا سا ٹائم چاہیے ہمیں۔ تھوڑی سی ڈسکشن کرنی ہے۔''

حریم دروازہ کھولے بغیر روکھے لہجے میں بولی۔ ''والدہ کے سر میں درد ہے، وہ گولی کھا کر سو رہی ہیں — اور آصف صاحب! پلیز فی الحال ہمیں اس معاملے میں ڈسٹرب نہ کریں۔ ہم نے جو کچھ بتانا تھا وہ آپ لوگوں کو بتا چکے ہیں۔ اب بتانے کو کچھ نہیں ہے۔''

لیڈی رپورٹر ملائمت سے بولی۔ ''دیکھیں، آپ کا معاملہ کورٹ میں ہے اور.....''

وہ ایک دم چڑ سی گئی، رپورٹر کی بات کاٹ کر بولی۔ ''ہمیں معلوم ہے ہمارا معاملہ کورٹ میں ہے اور کورٹ میں ہی رہے گا۔ آپ کو بھی بس اپنا کاروبار چمکانا ہوتا ہے۔ آپ بس تازہ خبروں کی بو سونگھتے ہیں اور پرانی خبروں کو مردار سمجھتے ہیں۔ پلیز..... ابھی ہم اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔''

اس نے بمشکل چینل والوں کو ٹالا اور واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ ماہین کافی دنوں بعد کوئٹہ سے آئی تھی اور کافی کمزور نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت بکھری بکھری سی بھی تھی۔ اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ دو تین ہفتے پہلے اس خبیث عادی اور عمر بھائی کے درمیان گھر کے سامنے مار ماری ہوئی ہے۔

...ریم کو مشورہ دے رہی تھی کہ یا تو وہ لوگ اب مکان ...ہ تبدیل کرلیں یا پھر کوئٹہ ہی منتقل ہوجائیں۔

حریم اور ماہین کے درمیان بات ہو رہی تھی جب حریم ...سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اسکرین ...س پر عمر کی کال تھی۔ کل سے وہ پانچ چھ مرتبہ اسے کال کر ...تھا۔ یقیناً وہ کوئی اہم بات ہی کرنا چاہتا ہوگا کیونکہ اس ...نے کبھی غیر ضروری فون نہیں کیا تھا لیکن حریم کال ریسیو نہیں ...رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے سخت امتحان سے گزرنا ...رہا تھا مگر وہ یہ امتحان دے رہی تھی۔ کال کے سگنل ختم ...ئے تو حریم نے فون ہی آف کردیا۔

ماہین نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''آپی! آپ ایسا کیوں ...رہی ہیں؟ ایسا تو غیروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ عمر بھائی ...اپنے ہیں۔ اپنوں سے بڑھ کر اپنے ہیں۔''

دور سے آتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اپنے ہیں، اسی لیے تو ایسا کر رہی ہوں۔ انہیں مصیبتوں سے بچانا چاہتی ہوں۔ وہ اور آنٹی ثمینہ میری ذات سے جتنا دور رہیں گے، اتنا ہی ...ن کے لیے اچھا ہے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس ...کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔

''لیکن آپی! اس طرح بھی تو انہیں تکلیف ہو رہی ہوگی۔''

''یہ تکلیف ان تکلیفوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو وہ ہماری خاطر جھیل رہے ہیں اور آئندہ جھیلیں گے۔''

اسی دوران میں باریال گھر میں داخل ہوا تو وہ دونوں خاموش ہوگئیں۔ اس روز شام کو جب عمر کا فون پھر آیا تو اس نے کال ریجیکٹ کردی اور پھر اس کے قریباً ایک گھنٹے بعد اس نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر عمر کو ایک میسج بھی کردیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''دیری سوری عمر! جس انداز سے آپ سوچ رہے ہیں، میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا۔'' یہ بہت بڑا جھوٹ لکھ کر وہ دیر تک غمزدہ اور گم صم بیٹھی رہی۔

وقت گزرتا رہتا ہے۔ آنے والے پلوں، دنوں اور ...وں میں ہمارے لیے کیا چھپا ہے، ہمیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ...ں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وقت کے آنے والے ...لمحے ''اپنے اندر ہمارے لیے کون سی خوشیاں اور دکھ ...چھپائے ہوئے ہیں، نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے ...حالات، ہمارے واقعات اور ہماری زندگی کی کہانیاں کیا ...رخ اختیار کریں گی..... ہاں، کہانیاں بدل جاتی ہیں، ان کا ...انداز بدل جاتا ہے۔ ان کے انداز اور مناظر نئے رنگ میں ...ڈھل جاتے ہیں۔ عروبہ اور حریم کو بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ان کی ''درد کہانی'' ایک نیا روپ اختیار کرنے والی ہے۔ یہ کہانی اس گھر اور اس گھر کے ...کو ایک نئی ...جگہ..... ایک اور سنسان مقام کا رخ کرنے والی تھی۔ یہ واقعات انہیں ایک خاص سمت میں دھکیلنے والے تھے اور محصور کرنے والے تھے۔

اس دفعہ بھی تاریخ پر وکیل صفائی ''تیار'' ہو گیا تھا اور عدالت نے پندرہ دن بعد کی ڈیٹ دی تھی۔ عدالت سے واپس آکر عروبہ کم صم سی صوفے پر نیم دراز تھی۔ دوپہر کے دو بج چکے تھے۔ سہ پہر کے کاروز تھا۔ عید الاضحیٰ کی آمد آمد تھی۔ تہوار اپنے ساتھ خوشی کی ایک نادیدہ لہر لاتے تھے اور یہ لہر کسی نہ کسی حد تک غم زدہ لوگوں اور مجبور ترین گھرانوں پر بھی اثر کرتی ہے۔ تمام تر پریشانیوں کے باوجود باریال اور ماہین کے لیے عروبہ نے نئے کپڑے سلوائے تھے اور انہوں نے تھوڑی سی شاپنگ بھی کی تھی۔ ماہین کی آمد کی وجہ سے گھر کے اداس در و دیوار میں تھوڑی سی رونق بھی محسوس ہوتی تھی۔ زندگی ایسے ہی آلام کی تاریکیوں کے درمیان اپنے لیے نم روشن راستے ڈھونڈا کرتی ہے۔

کچن میں حریم دوپہر کا کھانا تیار کرچکی تھی۔ اس نے آکر عروبہ سے پوچھا لیکن عروبہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''آپ لوگ کھالو۔ میرا دل چاہا تو بعد میں کھالوں گی۔ میں تھوڑی دیر سستالوں۔''

وہ صوفے پر سیدھی ہو کر لیٹی ہی تھی کہ باریال اور ماہین اندر آگئے۔ باریال نے عروبہ کی پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ لیے۔ وہ اچھے موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ بولا۔ ''ماما! دیکھیں، ماہین بھی آئی ہوئی ہے۔ مجھے بھی پورا ڈیڑھ ہفتہ کالج سے چھٹی ہے۔ اگر آپ اس دفعہ بھی سیر کے لیے نہ لے کر گئیں تو..... تو میں نے ہنڈ کرلینی ہے اور گلے میں مکوں کی مالا ڈال کر منگ بن جانا ہے۔''

''کہاں جانا چاہتے ہو؟'' عروبہ نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

''کہیں بھی..... لیکن لاہور میں نہیں — لاہور سے باہر۔ ذرا لمبی ڈرائیو ہو۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو باریال۔'' عروبہ نے اسے ٹوکا۔ ''عید میں پانچ چھ دن رہ گئے ہیں۔ لاہور سے باہر جاؤ گے تو عید کیسے مناؤ گے؟''

''عید واپس آکر منالیں گے ماما۔ اس میں بھی بڑا مزہ ہوتا ہے۔ عید سے پہلے سیر اور سیر کے بعد عید۔ آپ کو یاد ہے نا ایک دفعہ اسی طرح چھوٹی عید سے پہلے ہم خالہ نادیہ

کے فارم ہاؤس پر گئے تھے۔ عید سے ایک دن پہلے واپس آگئے تھے اور چاندرات لاہور میں منائی تھی۔"

فارم ہاؤس کے ذکر پر ماہین بھی چونک گئی۔ "ہاں ماما! اس دفعہ کیوں نا فارم ہاؤس ہی چلے جائیں۔ لانگ ڈرائیو بھی ہوجائے گی اور ذرا چینج بھی ہوجائے گا۔"

"زبردست بات کہی ہے ماہین نے۔" باریال فوراً بولا۔ "یہ آئیڈیا مجھے بھی پسند آیا ہے۔ کیوں آپی! کیسا رہے گا یہ خور؟"

حریم بس ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر رہ گئی۔ اس کے اندر جیسے سیر و تفریح کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی لیکن پھر ایک دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے سوچا، اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ان کے گھر سے کتنی دور ہوگئی ہیں۔ جیسے مدت ہوگئی ہے مسکرائے ہوئے۔ اس نے دیکھا کہ باریال اور ماہین دونوں اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور وہ جو صاف انکار کرنے جارہی تھی، اچانک بے ساختہ کہہ گئی۔ "بھئی! ماما سے پوچھ لو۔"

عروبہ کو توقع نہیں تھی کہ حریم اس طرح نیم رضامندی ظاہر کردے گی۔ وہ صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حریم کی نیم رضامندی دیکھ کر باریال اور ماہین مزید پُرجوش ہوگئے۔ وہ زور دینے لگے کہ آج ہی تھوڑی سی تیاری کرلی جائے اور کل صبح وہ لوگ فارم ہاؤس کے لیے روانہ ہوجائیں۔

وہ جس فارم ہاؤس کی بات کررہے تھے، وہ کہیں آس پاس نہیں تھا۔ وہ ساہیوال سے پینتیس چالیس کلومیٹر آگے چیچہ وطنی کے علاقے میں تھا۔ چھانگا مانگا کی طرز کا خوبصورت ایریا تھا اور کئی دیکھنے کی جگہیں تھیں۔ خالو یاور حیات کی بڑی بہن نادیہ شجاع نے یہ فارم ہاؤس بنا رکھا تھا۔ وہ کافی عرصہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر رہی تھیں۔ وہ ساہیوال میں رہتی تھیں اور اکثر اپنے فارم ہاؤس پر آتی جاتی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کام کے سلسلے میں مسقط میں مقیم تھے۔

عروبہ نے شروع میں تو اس پروگرام سے اتفاق نہیں کیا پھر اس کے دل میں بھی وہی بات آئی جو حریم کے دل میں آئی تھی۔ اس گھر سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی بالکل روٹھ کر رہ گئی تھیں۔

ویسے بھی ان کے اردگرد ٹینشن کا ماحول ہی تھا۔ دروازے پر ہونے والی ہر دستک پر یہی لگتا تھا جیسے کوئی نئی مصیبت آئی ہے۔ ایسے میں اگر دو چار دن کے لیے وہ آؤٹنگ پر چلے جاتے تو شاید دل و دماغ پر "اسٹریس" کم ہوجاتا۔ جب حریم کے بھائی بھی [illegible] باریال اور ماہین حریم کے ہوگئے۔ [illegible] نے خالہ نادیہ کو فون کرکے یہ خبر دی کہ [illegible] فارم ہاؤس میں تھے اور عید سے ایک دن پہلے لاہور واپس آگئے ہیں۔

ماہین بولی۔ "ماما! کیوں نہ ہم آنٹی نسیمہ کی طرف بھی چلنے کی دعوت دیں؟"

اس بات پر عروبہ اور حریم دونوں ہی چونک اٹھیں۔ عروبہ بولی۔ "نہیں بھئی! اگر وہ لوگ تم سے یہ پروگرام پوچھتے ہیں تو پھر اس کو اپنی حد تک ہی رکھو۔"

"ان سے پوچھنے میں کیا حرج ہے؟" [illegible] عمر کے بھائی کی کے ساتھ باریال کی [illegible]

"نہیں باریال!" حریم نے فوراً مداخلت کی۔ "عمر — بھائی — آج کل [illegible] بہت مصروف ہیں — آنٹی بھی بتا رہی تھیں کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

گفتگو کا رخ ایک بار پھر سفر کی پرلطف روداد پر نادیہ کے دورانیے کی طرف مڑ گیا۔ حریم چاہتی تھی کہ خالہ نادیہ کو زیادہ تکلیف نہ دی جائے اور پروگرام دو دن سے زیادہ کا نہ رکھا جائے۔

شام تک ان لوگوں نے پروگرام کی تفصیل طے کرلی۔

ایک عرصے بعد یہ چھوٹی سی فیملی کسی تفریح کے لیے نکلی تھی۔ اپنی مہران کار پر یہ لوگ علی الصباح لاہور سے نکلے اور چلتے چلتے بارہ بجے دوپہر تک ساہیوال پہنچ گئے۔ ساہیوال سے چیچہ وطنی اور پھر شجاع فارم ہاؤس تک پہنچتے سہ پہر کے [illegible] گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ خالہ نادیہ ان کی آمد پر بہت خوش تھیں۔ ان کے دو روزہ قیام کے لیے ایک کمرہ پہلے سے تیار تھا۔ شاندار لکڑی کا ہاتھ روم، صاف ستھرے بیڈ اور روشن کھڑکیاں۔ عروبہ کچھ اداس ہوگئی۔ جب وہ پچھلی دفعہ یہاں آئی تھی تو امین بھی ان کے ساتھ تھے [illegible] چھوٹی چھوٹی باتیں اسے یاد آئیں اور اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ خالہ اپنی میزبان اور اپنے بچوں کی خوشی کے لیے اس نے اپنی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حریم بھی کچھ اداس دکھائی دی لیکن جلد ہی اس نے بھی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

خالہ نادیہ نے انہیں بتایا۔ "ہمارے پراجیکٹ "زد" میں ایک بڑے جنگلی بلے اور سفید مور کے ایک جوڑے کا اضافہ ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک معمولی

[illegible]

[illegible] ہاریال نے تشویش سے پوچھا۔

[illegible] کے علاوہ حریم بیگ کے لیے [illegible] کے ٹوکرے سے [illegible] سے اتروائے تھے۔ [illegible] بہت بے چینی سے [illegible]

[illegible] عروبہ، حریم کی دلجوئی کی خاص طور پر کوشش کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حریم کتنے بڑے المیے سے گزری ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ عروبہ اور حریم نے کس طرح اس کے خوف کو ختم کرنا ہے۔ اور اطراف کے [illegible] کی کوشش کر رہی تھیں۔

شوخ و شریر حریم کا یہ دوروزہ قیام بڑا خوشگوار رہا۔ سب نے دیر تک کھائے کھائے اور گھومے پھرے بھی۔ عروبہ نے بھی پوری کوشش کی کہ بچے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اپنے تحفظ سے نکلیں۔ عید سر پر نہ ہوتی تو شاید وہ ایک ہفتہ حریم وہاں ٹھہر جاتے۔ بہرحال انہوں نے تیسرے روز بے حد شکریے کے ساتھ خالہ نادیہ سے رخصت چاہی اور صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ راستے میں ہڑپہ کے کھنڈرات بھی دیکھتے ہوئے جائیں گے۔

گاڑی عروبہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ حریم اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ فارم ہاؤس سے قریباً دس کلومیٹر آگے آچکے تھے۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ عروبہ سکون سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ اچانک اسے سامنے سے ایک تیز رفتار سلور گاڑی آتی دکھائی دی۔ دو تین لمحوں کے لیے عروبہ کی نگاہیں گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص پر پڑیں اور اسے یوں لگا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک ایک نہایت تیز برقی رو دوڑ گئی ہے۔ یہ ایک بالکل غیر متوقع منظر تھا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر عدیل عرف عادی کو بیٹھے دیکھا تھا..... اور اسے یوں لگا تھا کہ اس نے بھی عروبہ کو دیکھ لیا ہے۔

عروبہ کا پورا جسم لرز اٹھا۔ اگلے دو تین سیکنڈ میں اس کا یہ بدترین شبہ حقیقت میں بدل گیا کہ عادی نے بھی انہیں دیکھ لیا ہے۔ اس کا ثبوت عروبہ کو عقب نما آئینے میں نظر آیا۔ عادی والی گاڑی پچاس ساٹھ میٹر آگے جا کر رک گئی تھی..... اور فوراً بیک کرنے سے پہلے ہی اس نے یوٹرن لینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ہاں گاڑی مڑ رہی تھی..... اس کا مطلب تھا کہ وہ ان کے پیچھے آرہی ہے۔

اگلے دو ران میں پہلو میں بیٹھی حریم نے بھی اپنی ماما کو چونکتے اور پھر اضطراب زدہ ہوتے محسوس کر لیا تھا۔

"کیا ہوا ماما؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کک کچھ نہیں۔" وہ ہکلائی۔ اس کی نظریں بدستور عقب نما آئینے پر تھیں۔

حریم نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ اسے بھی سلور رنگ کی جیپ کی جھلک نظر آئی لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکی اور ماں کا خوفزدہ چہرہ دیکھنے لگی۔

تب تک عروبہ نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

"کیا ہوا ماما؟" اب حریم اور ہاریال نے ایک ساتھ پوچھا۔

عروبہ کا چہرہ بالکل زرد ہونے کے بعد اب سرخی مائل ہو رہا تھا۔ "یہ..... بہت برا ہوا ہے..... وہ..... پیچھے آرہے ہیں۔" عروبہ بڑبڑائی۔

"کون ماما؟" حریم نے روہانسی ہو کر پوچھا اور دوبارہ مڑ کر عقب میں دیکھا۔

سلور گاڑی اب واضح نظر آرہی تھی۔ ایک دم اس کے دماغ میں بھی زبردست جھماکا سا ہوا۔ اسے پتا چل گیا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کس کی ہے۔ اسے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ عادی اور اس کے دوست تھے۔ وہ بڑی تیزی سے ان کے عقب میں آرہے تھے۔

اب ہاریال اور ماہین بھی چونک گئے تھے۔ ماہین نے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے ماما؟ ہمارے پیچھے کون آرہا ہے؟"

"وہی..... ایڈووکیٹ ریاض کا بیٹا ہے۔" عروبہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ اسے جیسے اپنی ہی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" ماہین روہانسی ہو کر بولی۔

ہاریال بولا۔ "آ..... آپی..... مجھے موبائل دیں۔ میں ون فائیو پر کال کرتا ہوں۔"

حریم نے سوالیہ نظروں سے عروبہ کی طرف دیکھا۔ عروبہ کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ اس کے ذہن میں بس یہی سوچ تھی کہ وہ اس سنسان جگہ سے نکل کر کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں، جہاں اور لوگ بھی موجود ہوں۔ پھر ہو سکتا ہے کہ عادی ان کا راستہ روکنے سے باز رہے۔

دوسری طرف شاید عادی بھی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ اگر اس نے انہیں تین چار کلومیٹر مزید آگے جانے دیا تو وہ نسبتاً بارونق علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ اس لیے اپنی گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔ گاڑی کسی مقربت کی طرح اچھلتی کودتی ان سے قریب تر پہنچ رہی تھی، جیسے ایک ہی لقمے میں

انہیں لگ جانا چاہتی ہو۔
عقبی نشست پر باربال نے حریم کے موبائل سے ون فائیو پر کال ملانے کی کوشش کی پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''کیا ہوا باربال؟'' حریم نے پوچھا۔
''شاید..... سگنل نہیں آرہے۔''
عروبہ کی نگاہیں سامنے شکستہ سڑک پر تھیں۔ ''او مائی گاڈ۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔
آگے ایک درخت گرا ہوا تھا۔ سائڈ پر تھوڑا سا راستہ تو نظر آرہا تھا تاہم وہاں سے گزرنے کے لیے انہیں گاڑی کی رفتار بہت آہستہ کرنا پڑتی اور ایک گڑھے سے بھی بچنا پڑتا۔ یقینی بات تھی کہ اس دوران میں عادی ان کے سر پر پہنچ جاتا۔ عروبہ کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا اور اس نے گاڑی کو دفعتاً بائیں جانب ایک کچے راستے پر موڑ دیا۔ رفتار چونکہ اب بھی تیز تھی اس لیے کچے راستے پر آتے ہی سہران بری طرح اچھلنا شروع ہوگئی۔ ماہین گھٹی گھٹی آواز میں پکاری۔
''ماما! دھیان سے۔''
عروبہ کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا..... اسے عادی اور اس کے ساتھیوں سے بچنا ہے۔ وہ بھی کمزور دل نہیں رہی تھی، بلکہ اس کے نانا کہا کرتے تھے..... پریشانی اور خطرے میں میری عروبہ کا دماغ زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ انہیں ہمیشہ عروبہ پر فخر رہا تھا۔ اس کے نانا آرمی میں رہے تھے۔ انہوں نے عروبہ کو چھوٹی عمر میں ہی پیراکی سکھائی تھی۔ نشانہ بازی کی تربیت دی تھی اور جب وہ سری جاتے تھے تو نانا اور نواسی کا سب سے محبوب مشغلہ گھڑسواری ہوتا تھا۔ ہاں..... وہ ہمیشہ سے بے خوف رہی تھی لیکن اب بہت سا وقت گزر چکا تھا۔ نانا کو دنیا سے گئے تقریباً تیس سال بیت چکے تھے۔ اس سے کوئی پانچ سال بعد ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں عروبہ کو اپنے والد اور والدہ کی ابدی جدائی جھیلنا پڑی تھی۔ عروبہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ دادا نے چھوٹی عمر میں ہی اس کی شادی کردی۔ اپنے مہربان شوہر امین سرور کی رفاقت میں اس نے زندگی کے تیئیس برس گزارے..... اور اب وہ اپنے اس جیون ساتھی سے بھی محروم ہوچکی تھی۔ شاید یہی اکیلا پن تھا جس کے سبب اپنے نانا کی شیر دل نواسی نے بھی کبھی ڈرنا شروع کردیا تھا۔
آج اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ وہ ایک انجان راستے پر ایک نامعلوم منزل کی طرف گاڑی دوڑا رہی تھی اور اس کے تعاقب میں ایک شیطان زادہ پوری رفتار سے آرہا تھا۔
''یا اللہ! میری مدد کر۔'' وہ دل ہی دل میں پکاری۔
تینوں بچے بار بار مڑ کر عقب میں دیکھ رہے تھے۔ کچے راستے کی دھول نے ان کے عقب میں گرد کا ایک بادل سا بنا دیا تھا۔ اس بادل کی دوسری جانب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، مگر یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ لوگ بھی تعاقب کر رہے ہیں۔
''ماما! ہم کہاں جارہے ہیں؟'' ماہین نے روہانسی آواز میں پوچھا۔
اس سے پہلے کہ عروبہ جواب میں کچھ کہتی، انہیں ایک زوردار دھچکا محسوس ہوا۔ ان کی اچھلتی کودتی سہران ایک موڑ کاٹتے ہوئے اچانک خطرناک زاویے سے دائیں طرف جھک گئی تھی۔ عروبہ کے سوا وہ سب ہی چلا اٹھے۔ گاڑی کا دایاں اگلا پہیا ایک گڑھے میں چلا گیا تھا۔
گاڑی کو نکالنے کے لیے عروبہ نے دو تین بار ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ پہیا تیزی سے گھوما اور اس نے بہت سا کیچڑ اڑایا۔ عروبہ نے ہراساں نظروں سے عقب میں دیکھا۔ گرد کے دبیز بادل میں سے ابھی تک سلور جیپ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنی طرف والا دروازہ کھولا اور پکاری۔ ''حریم، باربال..... نکلو باہر۔''
تینوں بچوں نے ماں کی ہدایت پر سرعت سے عمل کیا۔ انہوں نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور جھاڑیوں میں گھس گئے۔ عروبہ نے ماہین کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور آگے تھی۔ حریم اور باربال پیچھے آرہے تھے۔ ''ماما! ہم کہاں جائیں گے؟'' باربال نے ہانپتی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔
''پتا نہیں..... یہاں سے تو نکلیں۔'' عروبہ نے کہا۔
کبھی بھاگتے اور کبھی تیز چلتے ہوئے وہ قریباً ایک تہائی کلومیٹر آگے آگئے۔ خاردار شاخیں ان کے جسموں کو چھیل رہی تھیں..... لیکن درد کا احساس نہیں تھا۔ وہ صرف دور نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ ایک بلندی پر تھے جب حریم نے مڑ کر دیکھا اور دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''ماما! وہ آرہے ہیں۔''
عروبہ نے بھی مڑ کر دیکھا۔ گرد کے بادل سے نمودار ہونے والی سلور جیپ ان کی سہران کے قریب رک گئی تھی۔ اس کے دروازے کھل رہے تھے۔ عادی اور اس کے دو ساتھی باہر نکل رہے تھے۔ عروبہ کو یوں لگا جیسے وہ ایک بھیڑ ہے اور اپنے بچوں سمیت خطرناک شکاریوں کے جال میں

بجنے والی ہے۔ اس نے بائیں جانب دیکھا۔ ادھر جھاڑیاں زیادہ گھنی تھیں اور جھاڑیوں کی پرلی طرف اونچے سرکنڈے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اچانک بازو کھینچا اور پکاری۔ "اس طرف......" اس نے اب بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

تینوں بچے بھی بھاگنے لگے۔ شاخیں بری طرح ان کے چہروں اور جسم کے کھلے حصوں سے ٹکرا رہی تھیں، مگر وہ رفتار کم نہیں کر سکتے تھے۔ ہوا کے دوش پر دور تک وہ آوازیں تیر کر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ لوگ یقیناً پیچھے آ رہے تھے۔ ابھی فاصلہ زیادہ تھا لیکن یہ کب تک "زیادہ" ٹک رہتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ کیچڑ زدہ زمین پر مائین کا پاؤں بری طرح پھسلا اور وہ اوندھے منہ گری۔ عروبہ والا موبائل فون مائین کے ہاتھ میں ہی تھا۔ گرتے ہوئے وہ اس کے ہاتھ سے نکلا اور ایک بار پھر گرے میں جا گرا۔ رکنے یا موبائل کو تلاش کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ مائین کے اٹھتے ہی وہ پھر بھاگنے لگے اور دس پندرہ فٹ اونچے سرکنڈوں کے اندر گھس گئے۔

عروبہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک نیم دائرے کی شکل میں بھاگ رہے ہیں۔ جونہی وہ سرکنڈوں کی دوسری جانب پہنچے، انہیں خودرو پودوں اور جھاڑیوں کے درمیان پیپل اور اشوکا کے درخت بھی دکھائی دیے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ جگہ مکمل غیر آباد نہیں ہے۔ اور پھر عروبہ کا یہ اندازہ درست نکلا۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک عمارت کے آثار نظر آئے جو درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

"کوئی ریسٹ ہاؤس لگتا ہے۔" مونا نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ تیزی سے اس عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔ اس کا ثبوت ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی آوازیں تھیں۔ مادی اور اس کے دوست ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ درختوں میں گھری ہوئی یہ عمارت کافی کشادہ تھی۔ عمارت کے اردگرد باؤنڈری وال ایک وسیع و عریض آہنی جنگلے کی صورت میں تھی مگر اس جنگلے میں دروازہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

باریال نے ایک جانب انگلی اٹھائی اور ہانپتا ہوا آواز میں بولا۔ "ماما وہ دیکھیں، وہاں سے جنگلا ٹوٹا ہوا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ طویل جنگلے کے درمیان دو تین فٹ کا ایک خلا سا تھا جس میں سے وہ گزر سکتے تھے۔ جھاڑ [illegible] سے یہ قدرے [illegible] ہوئے [illegible] تک پہنچ گئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک طرف [illegible] بڑے بڑے [illegible] اور دوسری طرف [illegible] نے [illegible] دروازے [illegible] [illegible] دھکا دیا [illegible] بھی پکارا۔

[illegible] کے [illegible] دروازہ [illegible] کرنے والا [illegible]

اندر داخل ہوتے ہی عروبہ نے تہ خانے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ مائین کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "ماما! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کی آواز تہ خانے میں گونجی۔

عروبہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی باریال سے کہا کہ وہ لائٹ آف کر دے۔

باریال نے لائٹ آف کر دی۔ عروبہ نے بچوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ مریم بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اس کا بازو زور سے تھاما ہوا تھا۔ ان چاروں کی تیز ہوتی سانسیں ان کے اپنے ہی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ ایسے ڈرے سہمے پنچھیوں کی طرح دبکے بیٹھے تھے جن پر خونخوار عقاب حملہ آور ہو گیا ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد کچھ آوازیں ان کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ یہ ایک سے زائد آوازیں تھیں لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ دروازے کھل رہے تھے اور بند

جو رہے تھے اور پھر عروبہ کا دل جیسے سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ اسے سیڑھیوں کے بالائی دروازے کے قریب آہٹیں سنائی دیں۔ کوئی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ اس دفعہ الفاظ بھی سمجھ میں آئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''ادھر کچن کی طرف دیکھ لیا ہے؟''

جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن یہ بات تو ان پر ثابت ہو رہی تھی کہ تعاقب کرنے والے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ماہین کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ پھر گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی۔

''چپ کر جاؤ ماہین۔'' عروبہ نے تیز سرگوشی کی۔

ماہین اپنی آواز روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ عروبہ نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ کر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے حریم نے اپنا موبائل فون بھی آف کر دیا تھا۔ اب ان کو بس اپنی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں یا پھر سانسوں کی آواز تھی۔ آوازیں اور آہٹیں بتاتی تھیں کہ وہ لوگ آس پاس موجود ہیں۔

یہ سوال ان چاروں کے ذہنوں میں ابھر رہا تھا کہ کیا یہ عادی اور اس کے دوست ہی ہیں یا اس ریسٹ ہاؤس کے مکین بھی ان کے ساتھ شامل ہیں؟ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ آوازیں اور آہٹیں کبھی فاصلے پر چلی جاتی تھیں، کبھی قریب آجاتی تھیں۔ کھڑکیاں دروازے کھل رہے تھے، بند ہو رہے تھے۔ اسی طرح تقریباً دس منٹ گزر گئے۔ یہ دس منٹ خوف اور دہشت میں لپٹے ہوئے دس برسوں کی طرح تھے۔ تب اچانک ایک بار پھر آہٹیں قریب آگئیں۔ اس مرتبہ بھاری قدموں کی تیز چاپ سیڑھیوں پر محسوس ہوئی۔ کوئی نیچے آرہا تھا۔ ''یا اللہ خیر!'' عروبہ دل ہی دل میں پکاری۔ اس نے ماہین کی سسکیاں ایک بار پھر اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ لی تھیں۔ حریم کی گرفت ماں کے بازو پر اور سخت ہوگئی۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنی انگلیاں اس کے گوشت میں دھنساتی چلی جا رہی تھی۔ باریال نیم تاریکی میں چاروں طرف نگاہ دوڑا رہا تھا، جیسے کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہو جس سے اپنا دفاع کیا جا سکے۔ مگر یہ ایک اضطراری عمل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

بھاری قدموں کی چاپ آہنی دروازے کے بالکل پاس پہنچی اور پھر ایک بالکل غیر متوقع کام ہوا۔ آنے والے نے دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے دروازے کو باہر سے بولٹ کرنے کے بعد قفل لگا دیا اور جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر دم بخود بیٹھے رہے، پھر باریال نے ہی تیز سرگوشی کی صورت میں اس خاموشی کو توڑا۔ ''ماما! یہ کیا ہے؟ کیا وہ ہمیں ..... بند کر گئے ہیں؟''

عروبہ کیا جواب دیتی، اس کی اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

اسی دوران میں ایک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں اب عمارت کے سامنے کی جانب سے آرہی تھیں۔ عروبہ اور حریم بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے تہ خانے کے دوسرے کمرے میں پہنچیں۔ باریال اور ماہین بھی ان کے پیچھے آئے۔ یہ مستطیل کمرا زیادہ کشادہ تھا۔ یہاں ایک چوڑا روشندان بھی نظر آرہا تھا۔ عمارت کے سامنے کی طرف سے آنے والی آوازیں اسی روشندان کے ذریعے ان تک پہنچ رہی تھیں۔ اب تقریباً چار بج چکے تھے۔ سورج کی کچھ ترچھی کرنیں روشندان کے راستے اندر پہنچ رہی تھیں۔

ایک آواز روشندان سے کچھ ہی فاصلے پر سے سنائی دی۔ ''احسن خاں! کہاں رہ گئے ہو؟ میری بس ہی نہ چھڑوا دینا۔'' یہ شخص مقامی لب و لہجے میں بولا تھا۔

کچھ فاصلے سے دوسرے شخص کی مدھم آواز ابھری۔ ''آیا جی آیا۔''

پہلے شخص نے کہا۔ ''ٹھیک ہے احسن! میں جا رہا ہوں۔ مین گیٹ کو دونوں تالے لگا دینا اور دو تین چکر ضرور لگانا یہاں کے..... مرغیوں کو دانہ وغیرہ ڈال دینا اور ذرا گھوم پھر کر دیکھ لینا۔ نئے گملوں میں پانی بھی دینا ہے۔''

''بے فکر رہو صرجی۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پہلا شخص روانہ ہو گیا۔ عروبہ اور حریم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو مدد کے لیے پکاریں یا نہیں۔ انہیں خوف تھا کہ عادی اور اس کے ساتھی آس پاس ہی موجود ہیں۔ موٹر سائیکل کی آواز دور ہوتی چلی گئی اور یہی وقت تھا جب عروبہ کے دل نے گواہی دی کہ عادی اور اس کے ساتھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ یہاں سے جا چکے تھے..... یا پھر..... ایک اور بات ہو سکتی تھی..... یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ..... یہاں تک آئے ہی نہ ہوں۔ جو آوازیں اور آہٹیں انہیں سنائی دیتی رہی تھیں، وہ اسی ریسٹ ہاؤس کے مکینوں یا ملازموں کی ہو سکتی تھیں۔

اس بارے میں سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ عروبہ نے تیزی سے فیصلہ کیا، وہ روزن کے بالکل نیچے پہنچی

ہی نہیں ہے۔

اگلے ایک گھنٹے میں عروبہ اور بچوں نے کئی جتن کر کے دیکھ لیے۔ انہوں نے دروازے پر کوشش کی۔ وہ روزن سے منہ لگا کر چلاتے رہے، انہوں نے روزن کا اوپر نیچے حرکت کرنے والا شیشہ توڑ دیا اور روزن کی گرل کو مختلف اشیا سے ضربیں لگائیں کہ شاید وہ اپنی جگہ چھوڑ دے۔ سب کچھ بے سود رہا۔ اب انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک تہوار کے موقع پر اس سنسان جنگل میں واقع اس عمارت میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔

ماہین نے پھر سسکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بھی کمزور تھی۔ حریم نے چھوٹی بہن کو اپنی بانہوں کے کٹہرے میں لے لیا اور پچکارنے لگی۔ عروبہ سر پکڑ کر ایک بوسیدہ سے نوسیٹر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سینے میں انگارے سے دہک رہے تھے۔ نگاہوں میں عدیل عرف عادی کا منحوس چہرہ تھا۔ بدقماش باپ کے اس شیطان صفت بیٹے نے ان کی زندگی کو وبال بنا کے رکھ دیا تھا۔ اس نے کس کس موقعے پر اور کہاں کہاں انہیں زخم نہیں لگائے تھے..... اس پریشان حال گھرانے کو اگر مدت بعد تھوڑی سی خوشی اس تفریحی ٹور کی شکل میں ملی تھی تو اس کا انجام بھی ایک جانکاہ صورت حال کی شکل میں ہوا تھا۔ اگر آج عروبہ اور اس کے بچے اس تاریک بیسمنٹ میں مقید ہوئے تھے تو اس کی وجہ بھی یہی منحوس چہرہ تھا۔ عروبہ کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے جھاڑیوں میں بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا تھا اور اسے عادی کی سلور جیپ نظر آئی تھی۔ لمبے بالوں والا بدمعاش صورت عادی اور اس کے ساتھی جیپ میں سے نکل کر ان کے پیچھے لپک رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر ان اونچے سرکنڈوں میں یا اردگرد کے ویرانے میں وہ اور اس کی بچیاں ان شیطان صفت جانوروں کے قبضے میں آجاتیں تو ان کا کیا حال ہوتا۔ یہ سب کچھ سوچ کر اسے یہ موجودہ مصیبت کمتر محسوس ہونے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے نانا کہا کرتے تھے، ہر مقام شکر کا مقام ہوتا ہے اور ہر مصیبت میں بھی شکر کا پہلو ہوتا ہے کیونکہ ہر مصیبت سے بڑی بہت سی مصیبتیں ہوتی ہیں جن سے اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا ہوتا ہے۔

لالٹین کی روشنی تہ خانے کے دونوں کمروں میں مدھم سی پراسرار روشنی پھیلا رہی تھی۔ عروبہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے ایک بار پھر گھوم پھر کر دونوں کمروں کا جائزہ لیا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک بوسیدہ سا ڈبل بیڈ اور تھری سیٹر صوفہ تھا۔ یہاں ایک بغلی دروازہ ایک چھوٹے سے گندے باتھ روم میں کھلتا تھا۔ ایسے باتھ روم میں عموماً ''سپوٹک ٹینک'' اور ڈرین کرنے کے لیے موٹر ہوتی ہے مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ شاید پانی کی نکاسی کے لیے کوئی متبادل انتظام کیا گیا تھا۔ نلکے میں پانی موجود تھا اور باتھ ٹب وغیرہ بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہاں بھی ایک روشندان تھا لیکن یہ بمشکل چھ انچ ضرب دس انچ کا رہا ہوگا۔ یہاں بھی متحرک شیشے کی دوسری جانب آہنی گرل تھی۔ باہر تاریکی کے سبب اب کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

عروبہ نے مڑ کر دیکھا، عقب میں حریم کھڑی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''ماما! مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ ماہین کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں خالہ نادیہ سے رابطہ کر کے انہیں بتا دینا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے..... ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی فارم ہاؤس میں ہی ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ سکتی ہیں۔''

عروبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر کر دو فون۔''

حریم نے موبائل آف کر رکھا تھا، وہ اسے آن کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ''اسے آف کیوں کر رکھا ہے؟'' عروبہ نے پوچھا۔

''ماما! چارجنگ بہت کم ہے۔ اگر لائٹ جلدی نہ آئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔''

فون آن ہوا تو حریم نے خالہ نادیہ کا نمبر پریس کر کے اسے عروبہ کی طرف بڑھا دیا۔ عروبہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے اسے مایوس کیا..... آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔

عروبہ نے دوسری بار بھی کوشش کی مگر جواب وہی ملا۔

اسی دوران میں عروبہ کی نگاہ موبائل فون کی اسکرین پر پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ موبائل کی اسکرین پر ایک طرف سرخ نشان تھا اور وہ فقط نو فیصد چارجنگ بتا رہا تھا۔ حریم ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اگر جلد ہی لائٹ نہ آجاتی تو یہ فون بھی بے کار ہو سکتا تھا۔ ویسے تو اس موبائل کا یہاں تک پہنچ جانا بھی غنیمت تھا۔ یہ گاڑی میں بھی رہ سکتا تھا۔ دراصل حریم کی اچھی عادتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے شولڈر بیگ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ جب وہ گاڑی سے نکل کر بھاگے تو اس وقت بھی شولڈر بیگ حریم کے کندھے پر تھا اور موبائل اور اس کا چارجر وغیرہ بیگ کے اندر تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں انہوں نے تین جگہ پر کال

نے کی کوشش کی۔ خالہ نادیہ کے نمبر پر تو ویسے ہی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ خالو یاور حیات کا نمبر بند جا رہا تھا۔ عروبہ کے اندازے کے مطابق وہ ویسے بھی دبئی میں تھے۔ جو تیسرا نمبر انہوں نے ملایا، وہ عمیر کا تھا۔ وہاں بیل تو جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ حریم کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اسے یاد آیا کہ چند روز پہلے اس نے کس طرح عمیر کی کار تھرا انداز کی تھیں اور پھر آخر میں کیا تیج کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عمیر بہت حساس طبع کا مالک ہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے بہت زیادہ تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آج وہ اس کی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔

چارجنگ اب اور کم رہ گئی تھی۔ حریم نے کہا۔ "ماما! ہمیں رک جانا چاہیے۔ لائٹ کا کوئی بھروسا نہیں۔ ہمیں تھوڑی بہت چارجنگ بچانا چاہیے۔"

"اوہ گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔" عروبہ نے سر تھام کر کہا۔

حریم نے فون آف کر دیا۔ پریشانی کے باوجود عروبہ کو اپنے بچوں کی بھوک کی فکر بھی تھی۔ وہ جب فارم ہاؤس سے نکلے تو انہوں نے لیٹ ناشتا کیا تھا۔ اب اس ناشتے کو قریباً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ لالٹین کو چولہے کے قریب لے گئی۔ اس نے دیوار گیر الماری کو ٹٹولا۔ اسے چنے کی دال کے علاوہ کچھ چاول بھی مل گئے۔ اولاد کو "فیڈ" کرنے کی تڑپ قدرت نے ماں کے خون میں نصب کر رکھی ہے۔ اس وقت یہی تڑپ ان سخت نامساعد حالات میں بھی عروبہ کو کچھ پکانے پر مجبور کر رہی تھی۔

اس نے نہ صرف حریم کے ساتھ مل کر دال چاول پکائے بلکہ زبردستی ماہین اور باریال کو چند لقمے کھانے پر بھی مجبور کیا۔ کھانے کے بعد ماہین کو ایک بار پھر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس کو سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ یہ اچھی نشانی نہیں تھی۔ اس کی یہ کیفیت دمے کے اٹیک میں بدل سکتی تھی۔ یہاں چولہے کے پاس والی الماری میں جو مسالے وغیرہ پڑے تھے، ان میں عروبہ نے ایک ڈبے کے اندر تھوڑی سی اجوائن بھی دیکھی تھی۔ آخری عمر میں عروبہ کے ناناکو بھی کسی وقت دمے کی شکایت ہو جاتی تھی۔ وہ اس کے لیے اجوائن کا دیسی ٹوٹکا استعمال کیا کرتے تھے اور اس سے انہیں بہت فائدہ ہوتا تھا۔ کئی دیگر اشیا کی طرح ماہین کی دوا وغیرہ بھی گاڑی کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ عروبہ نے اجوائن استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چولہا جلا کر تھوڑی سی اجوائن بھونی۔ اپنی چادر کا ایک کونا پھاڑ کر اس میں اجوائن ڈالی اور ایک چھوٹی سی پوٹلی بنالی۔

"ماہین بیٹا! اس کو اپنی ناک کے قریب رکھو۔ یہ تمہارے لیے "ان ہیلر" کا کام دے گی۔"

ماہین نے ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی سانس میں بہتری آ گئی۔ ذرا آرام ملا تو اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ عروبہ نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ ایک طرف بڑا سا جستی صندوق پڑا تھا، اس پر چند میلے کمبل اور ایک دو لحاف رکھے تھے۔ اب کسی طرح گزارا تو کرنا ہی تھا۔ عروبہ نے ایک نسبتاً بہتر کمبل ماہین کو اوڑھا دیا..... تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی۔

اسی دوران میں باریال نے جستی صندوق کے عقب سے ایک کام کی چیز ڈھونڈ لی تھی۔ "یہ دیکھیں ماما۔" اس نے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" عروبہ نے کہا۔

"یہ لوہا کاٹنے والی آری ہے۔ اگر ہم اس کا بلیڈ اس کے فریم میں سے نکال لیں تو اس کے ساتھ روشندان کی گرل کاٹنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔"

"لیکن یہ کام اتنی جلدی ہونے والا تو نہیں۔" حریم نے کہا۔

"آپی! جلدی ہونے والا نہیں تو بہت زیادہ دیر والا بھی نہیں۔"

باریال نے لالٹین اٹھا کر لکڑی کے تخت پر رکھی پھر کرسی پر چڑھ کر روشندان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے آزمائشی طور پر لوہا کاٹنے والا بلیڈ روشندان کی گرل پر چلایا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش کے بعد وہ گرل کی ایک پتری میں چھوٹا سا کٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ امید کی ایک موہوم سی کرن تھی۔

ماہین اپنی خراب طبیعت کے باعث سو چکی تھی۔ انہوں نے اس کی نیند خراب کرنا مناسب نہ سمجھا اور گرل کاٹنے کا کام کل تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی ذہنی اور جسمانی تھکن سے ان کا برا حال تھا۔ وہ ایک ہی کمرے میں جہاں جگہ ملی لیٹ گئے۔ کھلے ہوئے روشندان سے مارچ کی خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ جھینگروں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ سڑک کی طرف آوارہ کتے بھی کسی وقت شور مچانے لگتے تھے۔ وہ خود کو ایک جنگل کے بیچوں بیچ محسوس کر رہے تھے۔ عروبہ جاگ رہی تھی اور باریال اور حریم بھی جاگ رہے تھے۔ ان تینوں کے ذہن شاید ایک ہی رخ پر ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ وہ یہاں سے کیسے نکل پائیں گے، ان کو ایک سہارا حریم والے

سیٹلائٹ فون کا بھی تو مگر اس کی چارجنگ ایک سوالیہ نشان تھی اور لائٹ ایک بار جانے کے بعد پھر نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اب فون کو صحیح استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بے شک یہ اکلوتا فون ہی ان کا واحد سہارا تھا۔ مانیٹر و فون استعمال کرنے کی ابھی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔ جبکہ آزادی سے گھومنے پھرنے کے لیے باریال اپنا فون جان بوجھ کر گھر چھوڑ آیا تھا۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ لیٹے ہوئے تھے۔ بعض خاموشی کو توڑنے کے لیے بھی کوئی بات کر لیتے پھر کئی منٹ کے لیے سناٹا چھا جاتا۔ کبھی کبھی کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ باریال اور حریم سو گئے اور وہ اپنے بچوں پر اپنے بازو پروں کی طرح پھیلائے دیر تک جاگتی رہی۔ رات آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اونچی نیچی پہاڑیوں میں ننگے پاؤں وہ بے طرح دوڑتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف ایک سناٹا جنگل تھا۔ اس کے عقب میں کچھ نامعلوم جانور تھے۔ ان کی پھنکاریں اور ہانپتی ہوئی آوازیں اس کے قریب تر پہنچتی جا رہی تھیں۔ وہ ان کی زد سے بچنا چاہتی تھی، اندھا دھند بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

ایک جھٹکے سے عروبہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا کہ جانوروں کی خونخوار آوازیں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ یہ کون جانور تھے؟ کیوں اسے اپنے حصار میں لے کر مار ڈالنا چاہتے تھے؟ وہ اپنے حواس بحال کرنے لگی اور اپنی سماعت پر غور کرنے لگی — اس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ وہ اب خواب میں نہیں، پورے ہوش و حواس میں ہے۔ اس کے باوجود وہ کچھ فاصلے سے بلند ہونے والی غراہٹ آوازیں سن رہی تھی۔

وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا وہ اپنے حواس میں ہو کر بھی حواس میں نہیں ہے؟ اس نے دھیان سے سنا۔ آواز آرہی تھی بلکہ یہ آوازیں تھیں — اور یہ وہی آوازیں تھیں جو وہ ایک مدت سے سنتی آرہی تھی۔ یہ جانوروں کی آوازیں تھیں لیکن وہ انہیں پہچانتی نہیں تھی۔

اس نے لاشعور کی تو جنبش کی۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس نے حریم کو جگا دیا۔ ''کیا ہوا ماما؟'' حریم نے ڈر کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے چھپانے کی کوشش کی۔

لیکن اب حریم بھی یہ آوازیں سن چکی تھی۔ یہ آوازیں کتوں کی نہیں تھیں، نہ ہی گیدڑوں کی تھیں — یہ کچھ اور طرح کی آوازیں تھیں۔ اسی اثنا میں باریال بھی جاگ گیا۔ جلد ہی اسے بھی اپنی ماما اور آپی کی دہشت کی وجہ معلوم ہوگئی۔ آوازیں ہولناک تھیں اور روزن کے قریب

کتے تو ہرگز نہیں تھے۔ وہ گیدڑ بھی نہیں تھے کیونکہ ان کی آوازیں عروبہ بخوبی پہچانتی تھی۔ یہ وہی تھے..... یہ وہی تھے شاید۔ اس کا پورا جسم اندر تک لرز گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں جانور دڑبے کے پاس کی پکی زمین اپنے پنجوں سے کھودنے کی کوشش کررہے تھے۔ یقیناً ان کی وحشی بھوک نے انہیں پوری طرح اس دڑبے کی طرف متوجہ کررکھا تھا۔ اسی دوران میں عروبہ کو پتا چلا کہ کم از کم ایک جانور اور یہاں موجود ہے کیونکہ ایک آواز ریسٹ ہاؤس کے کسی اور حصے سے آئی تھی۔

عروبہ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور اسے یوں لگا کہ دونوں میں سے ایک جانور اپنا سر دڑبے کے نیچے کسی خلا میں گھسانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ مرغیوں کی ''آہ وبکا'' اور پھڑپھڑاہٹ اب عروج پر پہنچ گئی تھی۔ یہی وقت تھا جب عروبہ نے اس تیسرے جانور کا ہیولا بھی دیکھ لیا جس کی آواز تھوڑی دیر پہلے فاصلے سے سنائی دی تھی۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں اور وہ بلا کی رفتار سے دڑبے کی طرف آرہا تھا..... اس سے آگے دیکھنے کی ہمت عروبہ کو نہیں ہوئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی نیچے اتری، حریم اور باریال کو کھینچ کر دوسرے کمرے میں لائی اور دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند کردیا۔

حریم نے کہا۔ ''ماما..... وہ بھیڑیے ہی ہیں؟''

''یہی لگ رہا ہے۔'' عروبہ نے جواب دیا۔ دہشت کے سبب اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''وہ مرغیوں کو مار رہے ہیں؟'' باریال نے پوچھا۔

''ہاں۔'' عروبہ نے کہا اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لگالیا۔

درمیانی دروازہ بند ہونے کے باوجود مرغیوں کے چلانے اور پھڑپھڑانے کی دردناک آوازیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ بھوکے جانوروں نے دڑبا توڑ دیا ہے اور مرغیوں پر پل پڑے ہیں۔

''یااللہ..... یااللہ۔'' حریم نے کراہتے ہوئے کہا اور سر جھکا کر اپنی دونوں ہتھیلیوں سے دونوں کان ڈھانپ لیے۔

عروبہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ غنیمت تھا کہ ماہین ابھی تک سو رہی تھی ورنہ پتا نہیں کہ اس کا کیا حال ہوتا۔

بھیڑیوں کی غراہٹ اتنی خوفناک تھی کہ مرغیوں کی چیخ پکار دب کر رہ گئی تھی۔ قیامت کا سا سماں تھا۔

کچھ دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے قیامت گزر گئی ہے۔ اب اردگرد کوئی آواز نہیں تھی۔ بھوکے جانور پیٹ کی آگ ماند کرنے کے بعد شاید کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی وسیع عمارت کے اندر ہی کہیں یا احاطے میں موجود ہوں گے۔

وہ تینوں ڈرے سہمے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ عروبہ کے ہونٹ بے ساختہ بدبدانے والے انداز میں ہلتے جارہے تھے۔ وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

حریم نے گمبھیر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''ماما— جنگلی کتوں اور گیدڑوں کی آوازیں تو ہم خالہ ثانیہ کے فارم ہاؤس پر بھی سنتے رہے ہیں لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ یہاں یہ wolves بھی ہوتے ہیں۔''

عروبہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ثانیہ نے تم لوگوں کو شاید اس لیے نہیں بتایا کہ تم خوفزدہ نہ ہوجاؤ— لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہاں آگے جنگل کی گہرائی میں یہ جانور پایا جاتا ہے بلکہ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

باریال اور حریم مسلسل سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ اسے بات مکمل کرنا پڑے گی۔ وہ بولی۔ ''بتایا جاتا ہے کہ پندرہ بیس سال پہلے تک یہ جانور چیچہ وطنی سے کچھ فاصلے پر ''رکھوں'' اور ''ذخیروں'' میں بھی دیکھے جاتے تھے اور اس سے پہلے ہڑپہ کے اردگرد بھی پائے جاتے تھے۔ اب یہ ان مقامات میں تو نہیں ہیں مگر دور دراز جگہوں پر ہیں۔ پاس کے چولستانی علاقے میں بھی ان کو دیکھا جاتا ہے۔''

''لیکن ماما! یہاں سے تو سڑک گزرتی ہے۔ عام لوگوں کا اور سیاحوں کا آنا جانا ہے..... پھر بھی؟'' یہ سوال باریال نے کیا تھا۔ اچھی بھلی ٹھنڈ کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینا آرہا تھا۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے..... کہ یہ بھٹک کر اس طرف آنکلے ہوں۔'' عروبہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

باریال چپ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہیں سنا تھا کہ بعض اوقات جنگلی جانوروں کو جب شکار نہیں ملتا تو وہ بھوک سے بے تاب ہوکر آبادیوں کی طرف آجاتے ہیں۔''

''کچھ ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔'' عروبہ نے کہا۔ ویسے اس کے ذہن میں اب بھی یہ شک تھا کہ پتا نہیں یہ بھیڑیے ہیں بھی یا نہیں۔ دوسری طرف باریال اور حریم اس بات پر متفق تھے کہ یہ بھیڑیے ہی ہیں۔ باریال کا خیال تھا کہ ان کو ''گرے وولف'' کہتے ہیں۔

''ماما! میں ایک بار پھر فون پر ٹرائی کروں؟'' حریم

نے کہا۔

"نہیں بیٹا، ابھی نہیں۔ دیکھو نیٹ ابھی تک نہیں آئی۔ پتہ نہیں کہ آئی بھی ہے یا نہیں۔ جو تھوڑی بہت چارجنگ ہے، وہ ختم ہوگئی تو ——"

"پاپا ابھی تو ہر کوئی سو رہا ہوگا۔" باریال نے تائید کی۔

آوازیں اب نہیں آرہی تھیں۔ نہ کہیں کوئی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ ہاں سڑک پار سے آوارہ کتوں کا شور بھی کبھی کبھار ابھرتا تھا۔ چند بار کچھ دور الغداد آوازیں بھی سنائی دیں۔ یہ گیدڑوں کی تھیں اور ان آوازوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔

☆☆☆

ایک رات —— ایک خوفناک رات گزر چکی تھی۔ باتھ روم کے چھوٹے سے روزن سے جھانکنے والا اجالا بتا رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں سورج طلوع ہونے والا ہے۔ وہ تینوں سنبھل جاگتے رہے تھے۔ انہیں ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ ابھی عمارت کے کسی حصے سے پھر وہی ہولناک آوازیں آنا شروع ہوجائیں گی۔ نیم غنودگی کی کیفیت میں عروبہ کے پردۂ تصور پر پھر وہی خوفناک منظر نمودار ہوا۔ جنگل —— جانور —— بھیڑیے —— جان بچانے کی تگ و دو —— لیکن اس مرتبہ اس منظر کی مدت چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔

عروبہ نے گھٹنے اوپر اٹھائے اور دیوار سے ٹیک لگا کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بار بار سہمے ہوئے ان مناظر میں اور آج رات پیش آنے والے واقعے میں کیا واقعی کوئی ناتا تھا؟ اس کے نانا کہا کرتے تھے کہ انسان کے تصورات میں اور اس کے سپنوں میں وہی کچھ آتا ہے —— جو حقیقت میں ہونا یقین ممکن ہوتا ہے اور اکثر اوقات وہ سب کچھ اس کی زندگی میں گزر چکا ہوتا ہے یا گزرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی شکل تھوڑی بہت تبدیل ہوسکتی ہے لیکن اس کا لب لباب وہی ہوتا ہے ——

باریال کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ "ماما! لگتا ہے کہ اب کم از کم یہ خطرہ تو ٹل گیا ہے۔ کیوں نہ اب آری سے گرل پر کوشش کی جائے۔"

"کون سا خطرہ بھائی؟" ماہین نے پوچھا۔

وہ جاگ چکی تھی —— اور انہوں نے اسے رات والے واقعے سے مکمل بے خبر رکھا تھا۔

"وہی خطرہ جس سے بھاگتے بھاگتے یہاں پہنچے ہیں۔" حریم نے اس کے سوال کو دوسری طرف گھما دیا۔

وہ غیر مطمئن نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھتی رہی۔

باریال اب کہہ رہا تھا کہ بیٹری کے ذریعے آری چلانا شروع کی جائے۔ عروبہ نے کہا۔ "وہ بیٹری بہت زیادہ نہ کرو۔ پہلے ہم فون پر تھوڑی دیر بات کرتے ہیں۔"

حریم بھی ماں کی ہم خیال تھی۔ عروبہ نے ہمت کرکے فون آن کیا۔ اس کی چارجنگ اب صرف ۲ فیصد رہ گئی تھی۔ وہ تھا کہ وہ عنقریب جواب دے جائے گا۔ عروبہ نے ناذیہ کا نمبر پریس کیا۔ فوراً ہی مایوسی کا ایک تیز جھونکا آیا۔ جواب کال والا ہی تھا۔ "آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں، تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔"

عروبہ کو یاد آیا کہ ساحلوں کے قریب ناذیہ کی رہائش تھی، وہاں کسی ٹاور وغیرہ کا مسئلہ بھی تھا اور کبھی کبھی موبائل کے سگنل وہاں نہیں ملتے تھے۔ شاید اب بھی کوئی ایسا ہی صورتِ حال تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ بہرحال اس نے خالہ ناذیہ کو ایک مختصر میسج بھیج دیا۔ "خالہ! مجھے کال کریں یا میسج۔ ہم مصیبت میں ہیں۔"

انہوں نے دوسری ترائی عمر کے لیے کی۔ یہ ترائی خود حریم نے کی۔ عمر کو کال جانے لگی لیکن ریسیو نہیں ہوئی۔

چارجنگ مزید کم ہورہی تھی۔ حریم نے دل کڑا کے دوسرے مرتبہ عمر کا نمبر پریس کیا۔ اس مرتبہ بھی بس گھنٹی جاتی رہی۔ پانچویں گھنٹی بجنے جانے کے بعد حریم نے دکھ آمیز مایوسی کے ساتھ کال منقطع کردی اور اس کے ساتھ ہی فون بھی آف کردیا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ہر صورت اس موبائل کی رہی سہی چارجنگ بچانی ہے۔

فون کے حوالے سے ان ناکام کوششوں کے بعد باریال کی ساری توجہ ایک بار پھر روزن کی گرل کی طرف پھر گئی۔ اس مرتبہ حریم بھی اس کی حامی بھی۔ تاہم باریال کے کرسی پر چڑھنے سے پہلے عروبہ خود چڑھی تاکہ ایک دفعہ احتیاطاً باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لے سکے۔ باہر ہلکے بادل تھے اور بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔ ٹھنڈی میں اضافہ محسوس ہوتا تھا۔ روزن میں سے تین چار مخصوص مناظر ہی دکھائی دیتے تھے۔ ڈرائیوے اور سلاخ دار مین گیٹ کا تھوڑا سا حصہ۔ اس سے آگے ریسٹ ہاؤس کی پرائیویٹ سڑک کا سنسان ٹکڑا، سبزہ زار کی باڑ اور کچھ پھولدار پودے۔ مرغیوں کے دڑبے کا دائیں جانب والا حصہ بھی نظر آتا تھا۔

عروبہ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ مرغیوں کے پر اور ان کی خون آلود انتڑیاں جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان دو ڈھائی درجن دیسی مرغیوں میں

سے شاید کوئی ایک بھی زندہ نہ بچی ہو۔ وڑ با ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ وڑبے کے پاس ایک جگہ بھی زمین میں ٹھیک ٹھاک گڑھا نظر آرہا تھا۔ یقیناً یہ گڑھا ان بھوکے خون آشام جانوروں نے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بنایا تھا۔

یہ نگاہوں کے لیے ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ بہرحال اب آس پاس کہیں بھی کسی خطرے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اسی اثنا میں باریال بھی ماں کے پہلو میں آن کھڑا ہوا تھا اور سکتہ زدہ نظروں سے باہر کی صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔ یہی وقت تھا..... ہاں یہی وقت تھا جب عروبہ کی نگاہ وڑبے سے کچھ فاصلے پر موجود مستطیل کیاری کے اندر پھولدار پودوں پر پڑی۔ اس کے ذہن نے ایک عجیب طرح کا دھچکا محسوس کیا۔ شاید وہ پہلے دھیان سے نہیں دیکھ پائی تھی۔ اسے وہاں گلاب کے سفید پھول نظر آئے۔ ان سفید پھولوں کے پتے تھوڑے گہرے رنگ کے تھے۔

وہ سرتاپا لرز گئی۔ ایسا منظر تو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ بے شمار بار دیکھا تھا۔ خونی جانوروں کے گھیرے میں وہ قیامت خیز گھڑیاں..... وہ جان بچانے کی جدوجہد..... وہ اردگرد کا سنسان ماحول..... وہ سفید گلاب اور ان پر خون کے چھینٹے۔ اسے لگا اس کا دماغ پھٹ جائے گا یا وہ چکرا کر گر جائے گی۔ یہ سب ایک اتفاق تھا..... یا پھر اتفاق نہیں تھا۔ اس کے ناتے دور کہیں کسی ہونی انہونی سے جڑے ہوئے تھے..... اس کے نانا یہ بھی تو کہا کرتے تھے کہ کبھی کبھی انسان مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلکیاں بہت پہلے سے دیکھ لیتا ہے..... اور یہ انسانی ذہن کی ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فہم صلاحیتوں میں سے ایک ہے۔

''ماما! آپ ذرا نیچے اتر جائیں۔ مجھے کوشش کرنے دیں۔'' باریال کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

وہ جیسے چونک کر اور لرز کر نیچے اتر آئی۔

☆☆☆

باریال قریباً ایک گھنٹے تک بڑی دل جمعی سے لگا رہا تھا اور اس نے گرل کی دو جانب سے چھ سلاخوں کو کاٹ ڈالا تھا۔ اب ایک جانب سے بس دو سلاخوں کو کاٹنا باقی تھا۔ تیسری جانب کی دو سلاخوں کو کاٹنا ضروری نہیں تھا، کیونکہ پھر گرل کو موڑ کر باہر نکلنے کا راستہ بنایا جاسکتا تھا۔

یہ روزن قریباً ڈیڑھ فٹ ضرب تین فٹ کا تھا۔ اگر تخت کے اوپر رکھی ہوئی کرسی پر ایک جستی بالٹی اوندھی رکھ لی جاتی تو شاید وہ چاروں اسی روزن میں سے رینگ کر باہر نکل جاتے۔ باریال اب تھک چکا تھا اس لیے بقیہ دو سلاخیں کاٹنے کا ذمہ حریم نے لے لیا۔ باریال نے لوہا کاٹنے والے بلیڈ کے ایک سرے پر بڑی مہارت سے فوم کا ایک چھوٹا ٹکڑا اور کپڑے کی ایک پٹی لپیٹ دی تھی۔ یوں اس بلیڈ کا دستہ سا بن گیا تھا۔ کل والی خوفناک بھاگ دوڑ میں جہاں ان سب کو بہت سی گہری خراشیں آئی تھیں وہاں باریال کی ایک ہتھیلی بھی دو تین انچ تک کٹ گئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے قریباً ایک گھنٹے تک بے مثال قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی ہتھیلی خونم خون ہوگئی تھی مگر اس نے گرل کے چھ سریے کاٹ ڈالے تھے۔ اب باقی دو کے لیے حریم کوشش کررہی تھی۔

''حریم! میں مدد کروں۔'' نیچے کھڑی عروبہ نے کہا۔

''نہیں ماما! بس دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔'' وہ بلیڈ کو سریے پر رگڑتے ہوئے بولی۔

یہ کام کرتے ہوئے بھی پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار عمر کی طرف چلا جاتا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر جاتی تھی۔ وہ روٹھا ہوا تھا۔ بری طرح روٹھا ہوا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جن سے ناراض ہوکر اس نے اپنا رخ موڑ لیا ہے، وہ کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ دو چار دفعہ اور فون کرتی تو وہ اٹھا ہی لیتا، مگر مسئلہ چارجنگ کا تھا جو بہت تھوڑی رہ گئی تھی..... اور ''لائٹ'' کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

وہ دل ہی دل میں جیسے پکار اٹھی۔ ''عمر..... پلیز عمر..... آپ تو میری چھوٹی سی تکلیف برداشت نہیں کرتے تھے۔ گھر میں میرے بازو پر ذرا سی چوٹ آئی تھی اور آپ کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ دیکھیں، اب میں کتنی بڑی مصیبت میں ہوں، ہم سب کتنی بڑی مصیبت میں ہیں.....''

کچھ ہی دیر بعد دونوں سلاخیں یعنی سریے کٹ گئے۔ ان چاروں کے لیے یہ ایک طرح سے بڑی کامیابی تھی۔ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ عادی اور اس کے دوست اب بھی آس پاس موجود ہوں گے بلکہ اب تو ان چاروں کو ہی ایسا لگتا تھا کہ وہ خبیث ٹولا اس ریسٹ ہاؤس کی جانب آیا ہی نہیں..... ہاں، رات کو تنہا ہی بچانے والے تین عدد خونی جانوروں کے حوالے سے ان کے ذہن میں ابھی تک اندیشے موجود تھے کہ وہ ریسٹ ہاؤس کے آس پاس موجود نہ ہوں۔ تاہم ان واقعات کو بھی اب قریباً دس بارہ گھنٹے گزر چکے تھے اور اس نسبت سے کسی طرح کی کوئی پریشانی سامنے نہیں آئی تھی۔

سریے کٹ گئے تو نیچے سے باریال نے پوچھا۔

"آجاؤں آپی؟"

"ہاں آجاؤ۔" حریم نے ذرا ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

باریال لکڑی کے تخت پر چڑھا اور دوسری کرسی پر کھڑا ہوگیا۔ ان دونوں نے مل کر زور لگایا اور گرل کو اس طرح ٹیڑھا کردیا کہ باہر نکلنے کا راستہ مکمل گیا۔ باریال نے روزن میں سے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ بارش کی بوندیں اس کے سر اور چہرے پر پڑیں۔ اسے جزوی آزادی کا احساس ہوا۔

"ماما! باہر نکلوں؟" اس نے کہا۔

"نہیں بیٹا! پہلے اچھی طرح تسلی کرلو۔" عروبہ کے لہجے میں ایک ماں کی وہ ازلی جبلت جھلک دکھا رہی تھی جو اپنی اولاد کے لیے چھوٹے سے چھوٹا خطرہ بھی مول نہیں لیتی۔

عروبہ نے حریم کو نیچے اتارا اور اس کی جگہ خود دوسری کرسی پر کھڑی ہوگئی۔ مرغیوں کی باتیات نے ایک بار پھر اس کی نگاہوں کو مجروح کیا۔ اس نے اسٹیل کا ایک گلاس زور سے باہر پھینکا۔ وہ باہر کے پختہ فرش پر لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے اسٹیل کا ایک اور گلاس باہر لڑھکایا۔ وہ لڑھکتا ہوا کیاری میں جا گرا۔

اچانک عروبہ اور باریال کو لگا کہ زمین و آسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے ہیں۔ انہوں نے رات والے خونی جانوروں کو دیکھا۔ وہ گارڈینیا کی ایک باڑ کے پیچھے سے نکلے تھے اور طوفانی رفتار سے روزن کی طرف آرہے تھے اور ان کی تعداد دو یا تین نہیں تھی۔ وہ کم از کم پانچ جانور تھے۔ روزن سے ان کا فاصلہ پچیس تیس میٹر کے قریب تھا۔۔۔ اور ان کے جھپٹنے کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ پلک جھپکتے میں روزن تک پہنچ سکتے تھے۔ ان کی آوازیں لرزہ خیز تھیں۔ سکتے کے ایک یا دو سیکنڈ گزر گئے تو عروبہ چلائی اور اس نے جسم کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے گرل کو موڑنا چاہا۔ باریال نے بھی بچگانہ انداز میں اس کا ساتھ دیا۔ ابھی گرل بمشکل برابر ہی ہوئی تھی کہ خونخوار جانوروں کی تھوتھنیاں اس سے ٹکرائیں۔

گرل کو جو شدید جھٹکا لگا، اس نے باریال والی کرسی الٹا دی اور وہ فرش پر گرا۔ عروبہ نے جیسے اپنے جسم کے ریشے ریشے سے اپنی طاقت کشید کی اور گرل کو باہر کی طرف دھکیلے رکھا۔

"ماما۔۔۔ ماما!" حریم دہشت میں چلائی۔ پھر وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ اس نے کرسی سیدھی کی اور ماں کے پہلو میں کھڑے ہوکر گرل کو تھامے رکھنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

عروبہ چلائی۔ "باریال۔۔۔ ماہین۔۔۔ کرسیوں کو پکڑ کر رکھو۔"

ان دونوں نے عمل کیا۔ کرسیوں کے لڑھکنے کا خطرہ ختم ہوگیا تو عروبہ اور حریم نے زیادہ مضبوطی سے گرل کو سنبھال لیا۔ وہ قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ کمرے میں کہرام مچا ہوا تھا اور کمرے (= خانے) سے باہر ایک ایسا بھیانک منظر تھا جس کو دیکھ کر بھی نگاہیں اس پر یقین نہیں کر پا رہی تھیں۔ روزن کے سامنے کم از کم تین بھیڑیے موجود تھے۔ ان کی حیوانی بو اور ان کی بدبودار سانسیں عروبہ کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کے نکیلے مہلک دانت حریم اور عروبہ سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ ان کی آنکھوں میں وہ قاتل چمک تھی جس کو دیکھ کر ہی بندہ آدھا مر جاتا ہے۔ یہ ماں بیٹی کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اپنے حواس نہیں کھوئے تھے اور اس گرل کو تھام رکھا تھا جو ان کی زندگی کی ضمانت تھی۔

"ہمت سے حریم!" ان بدترین لمحوں میں عروبہ نے بیٹی کا حوصلہ بڑھایا۔

نیچے ماہین نے ایک کرسی کو تھام تو رکھا تھا مگر وہ مسلسل بلک بھی رہی تھی اور "ماما۔۔۔۔ ماما" پکار بھی رہی تھی۔

بھوک نے موذی جانوروں کو جیسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ وہ پنجے ہٹ ہٹ کر گرل سے ٹکرانے لگے۔ ان کی "ہاؤلنگ" سماعت شکن تھی۔

"ماما! یہ ٹوٹ جائے گی۔" حریم نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"نہیں۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔" عروبہ نے اسے حوصلہ دیا۔۔۔۔ تاہم وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوگا۔ بس وہ دل ہی دل میں اس اوپر والے کو پکار رہی تھی جو ہر وقت، ہر ڈھنگ سے ہر چیز پر قادر ہوتا ہے۔ "یا اللہ۔۔۔ میرے بچوں کی حفاظت کرنا۔۔۔۔ یا اللہ! مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔۔۔" اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مسلسل یہ آواز نکل رہی تھی۔

وہ قیامت کا دورانیہ تھا۔۔۔۔ پتا نہیں کہ کتنا وقت اسی طرح گزرا۔ شاید دو منٹ شاید تین چار منٹ۔۔۔۔ یا شاید اس سے کچھ زیادہ۔۔۔۔ اچانک عقب میں کیاری کے پاس موجود کسی بھیڑیے کی آواز نے اپنا آہنگ بدلا۔ اس آہنگ کے بدلتے ہی دوسرے بھیڑیوں کے تیور اور آہنگ بھی بدل گئے۔ ان کی توجہ روزن کی جانب سے ایک دم کم ہوگئی۔ یوں لگا کہ انہیں دائیں جانب کوئی اور ٹارگٹ نظر آیا ہے۔ شاید کوئی خرگوش، کوئی خارپشت یا اسی طرح کی کوئی اور چیز۔ وہ جس طرح اچانک آئے تھے، اسی طرح اچانک روزن کے سامنے سے ہٹے اور ٹولی کی صورت میں ایک طرف لپکے

چلے گئے۔

☆☆☆

خوفناک واقعے کو کم و بیش آدھ گھنٹا گزر چکا تھا، اس کے باوجود ان چاروں کے جسم لرزتے چلے جا رہے تھے۔ ماہین بالکل نیم جان تھی اور عروبہ جان گئی تھی کہ اس پردے کا ایک ہو چکا ہے۔ خونی جانوروں کے اوجھل ہونے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر انہوں نے جو پہلا کام کیا، وہ یہ تھا کہ کٹی ہوئی گرل کو اس کے ''دیوار والے'' آہنی فریم کے ساتھ تاروں کی مدد سے باندھ دیا۔ تانبے کے یہ موٹے تار جو ایک ''ٹیلی فون وائر'' کے تھے، ہاریال نے چھوٹے کمرے کی ایک الماری سے ڈھونڈے تھے۔ ان کو فریم کے ساتھ تین چار جگہ اچھی طرح لپیٹا گیا تھا اور پھر پلاس کے ذریعے کئی بل دے دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود یہ دل دہلا دینے والا خطرہ ان کے ذہنوں میں موجود تھا کہ خبر نہیں، خونخوار جانوروں کی یورش کی صورت میں یہ گرل اپنی جگہ قائم رہ سکے گی یا نہیں۔

بھیڑیے یقیناً ریسٹ ہاؤس کی چاردیواری میں موجود تھے۔ کسی وقت عمارت کے کسی نہ کسی حصے سے ان کی ''ہاؤلنگ'' سنائی دے جاتی تھی۔ حریم کو یہ بھی شک تھا کہ دو تین جانور مسلسل روزن کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ وہ بھوک سے بے تاب تھے اور انہوں نے اپنے شکار کی بُو پا لی تھی۔ لائٹ ابھی تک ندارد تھی۔ یہ چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔

حریم، ماہین کے سینے کا مساج کر رہی تھی تاکہ اسے سانس لینے میں آسانی رہے۔ بہن کی حالت نے جیسے اسے بھی نیم جان کر ڈالا تھا۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''ماما! کیا ایک بار پھر فون پر کوشش کروں؟''

''کس کو کرو گی؟'' عروبہ نے پوچھا۔

''خالہ نادیہ کو..... یا پھر..... عمر کو۔''

''پہلے بھی تو ناکامی ہی ہوئی ہے۔ بار بار فون آن کرنے سے بھی تو چارجنگ ضائع ہوگی۔''

حریم نے ماہین کے زرد چہرے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ماما! اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ ہم زیادہ دیر یہاں رکے تو اس کی حالت بگڑ سکتی ہے۔''

ہاریال نے کہا۔ ''کیوں نا ''ون لائیو'' پر کوشش کر کے دیکھیں؟''

اس تجویز پر عروبہ نے بھی نیم رضامندی کا اظہار کیا۔ حریم نے لرزاں ہاتھوں سے فون آن کیا۔ فون اب صرف پانچ فیصد چارجنگ بتا رہا تھا۔ عروبہ منہ ہی منہ میں دعائیہ کلمات پڑھ رہی تھی۔ حریم نے ''ون لائیو'' ملایا۔ کسی پولیس اسٹیشن کے کسی کمرے میں بیل جانا شروع ہوئی اور جاتی رہی۔ کال ریسیو نہیں کی گئی..... امید کی ایک اور کرن ڈوب گئی۔

اب فون تو آن ہو ہی چکا تھا۔ حریم نے ایک بار پھر خالہ نادیہ کو ''پکارنے'' کا فیصلہ کیا۔ اس نے جونہی نمبر پریس کیا، وہی مایوس کن آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں..... تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

حریم کراہ کر رہ گئی..... اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ میسج کی انڈیکیشن پر پڑی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن پھر مایوسی کی ایک اور لہر ہر احساس کو ڈھانپ گئی۔ یہ ''مختصر میسج'' اسی منحوس عادی کی طرف سے تھا جس کے طفیل وہ یہاں موجود تھے۔ اس کے بھیجے ہوئے مکروہ الفاظ اسکرین پر چمک رہے تھے۔ رومن انگلش میں لکھا تھا..... ''کہاں چھپ گئی ہو سویٹ ہارٹ۔ فون تک بند کر رکھا ہے لیکن اس طرح چھپ نہیں سکتی ہو اور نہ میں چھپنے دوں گا۔ میرے صبر کا امتحان نہ لو۔''

حریم نے فون ایک بار پھر آف کر دیا۔ شاید عروبہ نے اسے چونکتے اور فون کی اسکرین کو گھورتے دیکھ لیا تھا۔ ''کیا بات ہے حریم؟'' عروبہ نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں ماما۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی ماں کی طرح اپنی پریشانیاں اور دکھ اپنے تک محدود رکھنے والی۔

عروبہ نے ماہین کی حالت سنبھالنے کے لیے ایک بار پھر وہی دیسی ٹوٹکا استعمال کیا۔ ایک فرائی پین میں تھوڑی سی اجوائن بھونی۔ اسے کپڑے کی ایک پوٹلی میں رکھا اور یہ پوٹلی ماہین کی ناک کے قریب رکھ دی۔ اس کے بعد وہ ایک گوشے میں اپنی اوڑھنی بچھا کر نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ اب پتا نہیں کہ یہ نماز کی برکت تھی یا اس دیسی نسخے کی افادیت..... یا پھر دونوں ہی باتیں تھیں کہ ماہین کی سانس پہلے سے بہتر ہوگئی۔

''میری بچی کچھ کھائے گی؟'' عروبہ نے دلار سے پوچھا۔

ماہین نے انکار میں سر ہلا دیا۔ درحقیقت پچھلے قریباً تیس گھنٹوں سے ان میں سے کسی نے جانوں کے تین چار لقموں سے زیادہ نہیں لیے تھے لیکن پھر بھی بھوک کہیں نہیں تھی، ہاں ایک ناتوانی سی تھی جو ان سب کے رگ و پے میں اترتی جا رہی تھی۔ حریم نے اب واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ بھیڑیے روزن کے اردگرد موجود ہیں اور موقعے کی تاک

میں تھیں ـــ اور یقیناً عروبہ بھی یہ جان چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ان کی آوازوں سے بچنے کے لیے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ ایک بار پھر مضبوطی سے بند کردیا تھا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' یہ وہ سوال تھا جو ان چاروں کے دماغوں میں کسی دہکتے ہوئے نیزے کی طرح اترا ہوا تھا۔

حریم نے صوفے پر نیم دراز ہوکر آنکھیں بند کیں اور سوچنے لگی۔ کل عید تھی۔ یہ اپنے پاپا جانی کے بغیر ان کی پہلی عید تھی۔ اسے یاد آیا، بچپن کی بڑی عید پر سب سے بڑا ''چارم'' یہ ہوتا تھا کہ قربانی کے جانوروں کو لے کر گھوما پھرا جائے۔ قربانی کے لیے خریدے گئے بکرے عموماً بڑے تایا کے گھر ہوتے تھے لیکن عید سے دو دن پہلے وہ ضد کرکے بکرے اپنے گھر لے آتے تھے۔ پاپا ان بکروں کو لان سے تھوڑی دور ایک مضبوط پائپ کے ساتھ باندھ دیتے تھے۔ وہ ان کو بڑے اشتیاق سے چارا کھلاتے، ان سے کھیلتے، کبھی باہر سیر کرانے کے لیے لے جاتے اور اس وقت تک ـــ یعنی چاند رات کی آمد تک وہ تھک کر چور ہوجاتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بکرے بہت شور مچاتے تھے۔ ایسے میں باریال یا ماجن ٹرانسسٹر ریڈیو آن کرکے ان کے پاس رکھ دیتے کیونکہ اب وہ اتنا تھک چکے ہوتے تھے کہ بکروں کو مزید کمپنی نہیں دے سکتے تھے۔ پاپا اور ماما ان کی اس ترکیب پر مسکرائے بغیر نہ رہتے لیکن آج جو چاند رات آرہی تھی، یہ گزری ہوئی ان سبھی راتوں سے بہت مختلف تھی۔ بیتے دنوں کی یادیں، آنکھوں میں نمی جگا رہی تھیں ـــ اور یہ نمی ایک انجانے خوف میں لپٹی ہوئی تھی۔ حریم کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک خواب ہوا کرتا تھا کہ ان کا چھوٹا سا کنبہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے سرشار تھا۔ کہاں گیا تھا وہ گھر، وہ آنگن، وہ چہکاریں، سب کچھ ـــ ہاں سب کچھ اس منحوس سہ پہر کو برباد ہوگیا تھا۔ وہ بدیودار جانور جس کا نام عادی تھا، اس پر ایک شکرے کی طرح جھپٹا تھا اور وہ چڑیا کی طرح اس کے پنجوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئی تھی۔ اس کا مکروہ لمس، اس کی بدبودار سانسیں اور اس کی وحشی آنکھیں ـــ وہ کچھ بھی بھولی نہیں تھی ـــ اور شاید زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتی تھی ـــ اور پھر اس کے بعد کیا ہوا تھا ـــ زندگی کتنی تیزی سے تبدیل ہوئی تھی۔ جیسے پانی تیزی سے نشیب کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ پہلے وہ پیارا گھر گیا ـــ پھر مٹی ٹوٹی، پھر پاپا گئے پھر تعلیم اور مستقبل کے سہانے سپنے گئے ـــ اور پھر تھانے کچہریوں کے چکر۔ ایک مسلسل کوشش اور ایک سعی لاحاصل ـــ مسدود راستے ـــ بند دروازے ـــ اور ہر دروازے کے سامنے کوئی طاقتور راہ بھی پہرے پر ہو

اور اب آخر میں یہ سنسان سی رات جس نے ان کی جان کو سہمی ہوئی رات'' آنسوؤں اور سسکیوں میں ڈوب کر اتر رہی تھی۔ یہ موذی جانور سے ڈر کر وہ گھر اور موذی جانوروں سے ڈرنے میں آگئے تھے۔ پتا نہیں کہ یہاں سے ان کی جان کب چھوٹنے والی تھی۔ اس کا دھیان ایک بار پھر بیتے دنوں کی طرف چلا گیا۔ اس کا سر ماما کی گود میں تھا۔ اس کی سانسیں اب بھی پھولی تھیں۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے بخار بھی ہوچکا ہے۔ اگر اس کا بخار بڑھ جاتا تو اسے دوا دی جاسکتی تھی۔ حریم کے شولڈر بیگ میں پیناڈول کا ایک پتا بھی موجود تھا لیکن اصل مسئلہ تو ماجن کے خطرناک دے کا تھا۔

اچانک ایک مدھم آواز حریم کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہوا حریم؟'' عروبہ نے چونک کر پوچھا۔

''ماما! یہ آواز ـــ'' حریم نے اپنی توجہ آواز پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

اب عروبہ نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر امید کی موہوم سی کرنیں نمودار ہوئیں۔ یہ ایک پھنپھناتے موٹر سائیکل کی آواز تھی اور شاید یہ وہی موٹر سائیکل تھی جس پر یہاں کا چوکیدار کل سہ پہر یہاں سے گیا تھا۔

حریم اور عروبہ لپک کر دوسرے کمرے میں آئیں۔ پہلے حریم تخت پر پاؤں رکھ کر کرسی پر چڑھی، پھر عروبہ بھی آگئی۔ دونوں نے روزن سے باہر جھانکا۔ شام ہوئی تھی لیکن ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ حریم اور عروبہ نے دیکھا کہ ڈرائیوے سے آگے سلاخوں والے مین گیٹ پر حرکت نظر آرہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز بھی اسی طرف سے بلند ہورہی تھی۔ ''یہ وہی چوکیدار ہے حریم۔'' عروبہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اندازہ ہورہا تھا کہ اس نے مین گیٹ کھولا ہے اور موٹر سائیکل اندر لے آیا ہے پھر موٹر سائیکل کی آواز تھم گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ موٹر سائیکل وہیں درختوں کے نیچے کھڑی کرکے پیدل ان کی طرف آرہا تھا۔ یقیناً یہ وہی چوکیدار احسن خاں تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر ہے اور وہ مرغیوں کے دڑبے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی سفید شلوار قمیص اور زرد ٹوپی انہیں صاف نظر آرہی تھی۔

دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ احسن خاں نے اندر آکر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ ابھی وہ دڑبے سے کافی دور تھا۔ وہ

دونوں چلانے لگیں۔ حریم اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکاری۔ ''چوکیدار..... چوکیدار..... آگے نہ آؤ..... آگے جانور ہیں..... چوکیدار.....''

عروبہ بھی روزن کی گرل سے منہ لگا کر دہائی دینے لگی۔ وہ احسن خاں کو آگے آنے سے روکنا چاہتی تھیں..... لیکن وہ تو کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ جیسے بہرا ہو گیا ہو۔ یکا یک حریم کو پتا چلا کہ احسن خاں کیوں نہیں سن رہا۔ اس نے کانوں میں ایئر فون ٹھونس رکھے تھے۔ غالباً وہ کوئی میوزک سنتا ہوا بڑے خوشگوار موڈ میں چلا آرہا تھا۔ شاید وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ چاند رات اپنے اندر کتنا جان لیوا اسرار چھپائے ہوئے ہے۔

مرغیوں کے ڈربے سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر احسن خاں اچانک ٹھٹکا۔ اسے خون کے دھبے اور مرغیوں کے پر نظر آئے تھے، اس نے اپنا سر تیزی سے دائیں اور بائیں گھمایا۔ تب حریم نے دیکھا کہ وہ بدحواسی کے عالم میں ایئر فونز اپنے کانوں سے نکال رہا ہے۔

عروبہ ایک بار پھر چلائی۔ ''احسن خاں..... باہر نکل جاؤ..... بھاگ جاؤ احسن خاں۔''

احسن خاں نے پہلی مرتبہ چونک کر مرغی خانے کے روزن کی طرف دیکھا..... لیکن..... تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ حریم اور عروبہ نے بھیڑیوں کی مخصوص آوازیں سنیں۔ گارڈینیا کی پانچ چھ فٹ اونچی باڑ کے پیچھے سے تین بھیڑیے نمودار ہوئے اور بلا کی رفتار سے احسن خاں پر جھپٹے۔ مرغیوں کی خوراک والا بڑا شاپر احسن خاں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ پلٹ کر بھاگا..... ابھی آٹھ دس قدم دور ہی گیا تھا کہ بھیڑیے اس پر جا پڑے۔ حریم نے دیکھا احسن خاں کی زرد ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ وہ دردناک انداز میں چلایا اور مچھلی کی طرح تڑپا لیکن اب اٹھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ تب دو اور بھیڑیے برآمدے کی طرف سے نمودار ہوئے اور برق رفتاری سے اپنے شکار کی طرف بڑھے۔ حریم نے دیکھا، پہلے سے موجود مکمل بھیڑیوں میں سے ایک کے منہ میں گوشت کا ایک لوتھڑا نظر آرہا تھا۔ وہ مزید یہ منظر نہ دیکھ سکی اور چلاتی ہوئی کرسی سے نیچے اتر آئی۔ پھر احسن خاں کی آخری دلخراش آوازوں کو اپنی سماعت سے دور رکھنے کے لیے اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ عروبہ بھاگتی ہوئی باریال اور ماہین کے پاس پہنچی اور انہیں اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا۔ ان دونوں کے رنگ ہلدی ہو رہے تھے۔ باریال نے بھی کرب کے عالم میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں..... عروبہ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے ماہین کے کان ڈھانپ دیے۔ لائبین کی لو جیسے جان کنی کے عالم میں تھرتھرا رہی تھی۔

☆☆☆

اصل چاند رات تو عید الفطر کی ہوتی ہے لیکن اب عید الاضحیٰ کی بھی چاند رات منائی جاتی ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں میں جیسے رنگ و نور کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ بازاروں، مارکیٹوں اور شاپنگ سینٹروں میں شاپنگ عروج پر تھی۔ حالانکہ رات ہو چکی تھی، موسمی منڈیوں میں بھی رش تھا۔ عمر ایک شاپنگ سینٹر کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس کی امی اور چھوٹا علی اندر گئے ہوئے تھے۔ پچھلے سات آٹھ روز سے عمر بہت اداس تھا۔ وہ ہمیشہ سے بے حد حساس تھا۔ چھوٹی سی بات کو دل سے لگا لیتا تھا..... اور یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کی منزل اس کے قریب آکر بہت دور چلی گئی ہے۔ یوں تو حریم کے رویے میں تبدیلی وہ کئی ہفتوں سے محسوس کر رہا تھا لیکن پچھلے جمعے کو تو حد ہی ہو گئی تھی۔ پہلے تو حریم اس کی کالز اٹینڈ نہیں کر رہی تھی، پھر اس نے ایک کال ریجیکٹ کی تھی..... اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس کا وہ میسج موصول ہوا تھا جس نے اس کے سینے میں ایک گہرا، انمٹ چرکا لگا دیا تھا۔ ''ویری سوری جس انداز سے آپ سوچ رہے ہیں، میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا.....''

کہنے کو تو یہ چند الفاظ تھے لیکن ان کے اذیت ناک اثرات بہت گہرائی تک گئے تھے..... دو دن تک گاہے بگاہے عمر کی آنکھوں میں نمی تیرتی رہی تھی۔ پھر ایک دن وہ تنہائی میں بہت کھل کر رویا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر حالات کچھ روز جوں کے توں ہی رہے تو وہ بھی حریم کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔

اگلے روز اس کو ایک اور مایوس کن اطلاع ملی تھی۔ اسے امی کی ہی زبانی پتا چلا تھا کہ آنٹی عروبہ اور بچے لاہور سے باہر سیر کے لیے گئے ہیں اور شاید دو تین روز بعد آئیں گے۔ اس کے دل کو ایک اور گہری ٹھیس لگی تھی۔ آنٹی عروبہ اور حریم جو اس سے تقریباً ہر بات شیئر کرتی تھیں، اب آہستہ آہستہ بیگانی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے جانے کا علم ان کو تب ہوا تھا جب وہ لاہور سے روانہ ہو چکی تھیں۔

عمر کا خیال تھا کہ عید سے ایک دو روز پہلے وہ لوگ ضرور واپس آجائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اپنے آنے کی اطلاع بھی دے دیں۔ لیکن ایسی کوئی اطلاع بھی انہوں نے

[illegible]

وہ گم کے اسی اتھاہ گھیرے میں تھا جب کل شام حالات نے اچانک ایک پلٹا کھایا تھا۔ اسے اپنے سیل فون پر حریم کے نمبر سے ایک کال موصول ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹک گیا تھا..... بلکہ اس کے دل میں ایک اندیشہ سا جاگ گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اب وہ اور کیا کہنے والی ہے۔ شاید زیادہ واضح لفظوں میں اسے بتانے والی ہے کہ ان کے راستے ایک نہیں ہیں وہ اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔

اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی پھر ایک اور کال آئی تھی۔ یہ کال حریم نے آج صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ کی تھی..... سگنل آتے رہے تھے، میوزک بجتا رہا تھا مگر عمر نے فون نہیں اٹھایا۔ ایک دو منٹ بعد پھر کال آئی تھی۔ عمر شدید تذبذب کے عالم میں فون کی طرف دیکھتا رہا تھا تاہم اس نے یہ کال بھی ریسیو نہیں کی تھی۔

بعد میں وہ اسی جگہ بیٹھا دیر تک سوچتا رہا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے حریم ساری رات کسی پریشانی کے عالم میں رہی ہے اور صبح سویرے اس نے اسے کال کی ہے..... کیا ابھی کچھ امید باقی تھی؟ کیا مایوسی اور دکھ کے گھپ اندھیرے میں چند ایک کرنیں موجود تھیں، ان لمحوں میں عمر کو یوں بھی لگا تھا جیسے اس نے مکمل ناامید اور مایوس ہونے میں شاید تھوڑی سی جلدی کی ہے۔ کیا حریم کا بجھا بجھا رویہ، اس کا گریز اور اس کا ایک تیسرے اس برسوں پرانے تعلق کو ایک دم ختم کرنے اور ختم سمجھنے کے لیے کافی تھا؟ جواب اثبات میں نہیں تھا لیکن عمر اپنے دل کا کیا کرتا۔ محبت کے حوالے سے اس نے بے حد..... بے حد حساس طبع پائی تھی۔ یہی طبع ہی تو تھی جس کے سبب وہ لڑکپن سے حریم کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس

[illegible]

"ہاں بھئی۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی تھک گئے ہو۔" ثمینہ نے کہا۔

گاڑی ٹرن لے کر کشادہ سڑک پر آ گئی۔ ثمینہ نے اچانک کہا۔ "عمر! تمہیں پتا ہی ہے، میرا دل گھبراتا ہے۔ کیا تمہیں بھی حریم یا یار یال کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی؟"

"نہیں امی۔" عمر نے مختصر جواب دیا۔

"تو بھئی، تم نے فون کر کے پوچھ لینا تھا۔" ثمینہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"شاید..... وہ لوگ اب زیادہ ملنا جلنا چاہتے ہی نہیں۔"

"ہاں..... یہ تو مجھے بھی لگتا ہے لیکن پھر بھی کل عید ہے۔ تھوڑی بہت بات ہی ہو جاتی۔" پھر انہوں نے ایکدم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اور یہ دیکھو..... میں شہلا کے لیے یہ تھوڑی سی جیولری اور چوڑیاں لائی ہوں۔ راستے میں دو منٹ ان کی طرف رک کر یہ اس کو دے دیں گے۔ بڑی خوش ہو گی۔"

"لیکن امی....."

"اوہو۔ اگر تم نے نہیں جانا تو باہر گاڑی میں بیٹھنا۔ ہم دو منٹ میں واپس آ جائیں گے۔" ثمینہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ شہلا عمر کی وہی ماموں زاد تھی، جس کی طرف امی، عمر کے رشتے کی بات چلانا چاہ رہی تھیں۔

عمر نے دیکھا، ست رنگی چوڑیاں اور آرٹیفشل

بیماری کا ابا، امی کی گود میں رکھا تھا۔ بے ساختہ اس کے سینے سے آہ نکلی۔ ہرے نگینوں والا ایسا ہی ایک خوبصورت ہار وہ دو ہفتے پہلے حریم کے لیے لیعل آباد سے لے کر آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ عید کے موقع پر ہمت کر کے وہ یہ ہار اسے گفٹ کرے گا لیکن پرسوں یہ ہار اس نے سخت مایوسی کے عالم میں ایک نیلے شاپر میں لپیٹ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ زندگی کئی دفعہ کتنی بے رحم ہو جاتی ہے اور کس طرح ''زندہ لوگوں'' کو پٹخنیاں دیتی ہے۔

اس نے ایک بار پھر بے ساختہ ڈیش بورڈ پر پڑے اپنے موبائل فون کی طرف دیکھا، وہ یکسر خاموش تھا۔

☆☆☆

اس سنسان ریسٹ ہاؤس میں وہ بڑی اذیت ناک رات تھی۔ اس رات کا زیادہ تر حصہ انہوں نے جاگ کر ہی گزارا تھا۔ سرِ شام چوکیدار احسن خاں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس نے ان کے دل و دماغ کو دہشت کے بے رحم شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ ذہنوں میں بار بار یہی سوال اٹھتا تھا کہ کیا بالآخر ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا؟ یہ کل پانچ بھیڑیے تھے۔ ان کو اچھی خاصی خوراک مل گئی تھی لیکن لگتا تھا کہ ان کی بھوک بے پایاں ہے۔ وہ مسلسل روزن کے اردگرد چکرا رہے تھے۔ دو تین موقعے ایسے آئے تھے جب انہوں نے باقاعدہ روزن کی جالی پر منہ مارے تھے اور اپنا راستہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

زرد رو ماہین غنودگی کی حالت میں لیٹی تھی۔ اس کی سانسوں کا زیر و بم ٹھیک نہیں تھا۔ حریم نے ماں کے کان میں بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ ''ماما! لگتا ہے کہ ماہی کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ اب تو شاید آپ کی ادویات بھی اثر نہیں کر رہی۔''

''تو پھر کیا کریں بیٹا! یہاں سے نکل نہ سکے تو..... یہ..... بچ نہیں سکے گی۔'' عروبہ نے بمشکل اپنا فقرہ مکمل کیا۔

''ایسا نہ کہیں ماما! اللہ سے دعا کریں۔''

''وہ تو کر ہی رہے ہیں حریم۔ پر یہ دنیا اسباب کی دنیا بھی تو ہے۔ کوئی سبب پیدا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔''

یہ رات کے قریباً چار بجے کا عمل تھا۔ دور کہیں جنگل سے شب بیدار جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سنائی دینے والی یہ آوازیں ماحول کو اور بھی ڈراؤنا روپ دے رہی تھیں۔

حریم بولی۔ ''ماما! آج سردی بھی زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے تو ماہی کی طبیعت نہیں بگڑ رہی؟''

باریال بولا۔ ''سلینڈر میں کافی گیس ہے۔ کیوں نہ ہم چولہا مستقل طور پر جلا دیں۔''

''نہیں باریال۔'' عروبہ نے کہا۔ ''گیس تنگ ہو جائے گی اور یہ ماہی کے لیے اور بھی نقصان دہ ہے۔''

آخر ایک اور طویل رات اختتام پذیر ہوئی، باتھ روم اور بڑے کمرے کے روزنوں سے دن کا اجالا اس زمین دوز ''قید خانے'' میں جھانکنے لگا۔ حریم تخت پر چڑھ کر اور کرسی پر کھڑی ہو کر باہر جھانکنا چاہتی تھی مگر اب خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سب سے پہلے اسے جو چیز نظر آئے گی، وہ احسن خاں کے کپڑوں کی دھجیاں اور اس کی باقیات ہی ہوں گی اور یہ منظر دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا..... اور نہ ہی شاید اس کی ماما کے بس میں تھا۔

بڑے کمرے کے روزن کے اردگرد بھوکے جانوروں کی ملی جلی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ وہ آپس میں لڑ رہے ہیں، کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ وہ روزن کی گرل کو پنجوں سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے میں عروبہ، حریم اور باریال اندر سے لرز جاتے تھے۔ تانبے کے تاروں کے ساتھ مضبوطی سے بندھی ہوئی گرل ابھی تک تو ان کا ''دفاع'' کر رہی تھی لیکن وہ کب تک اپنی جگہ جمی رہے گی، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اور یہ عید کا روز تھا۔ خوشی اور شادمانی کا تہوار۔ انہیں اس تہ خانے میں بند ہوئے، اب 40 گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ان کے ہونٹ اور منہ ہی نہیں، ان کے معدے بھی جیسے اندر سے سوکھ رہے تھے۔ جو تھوڑے سے چاول تھے، وہ ختم ہو چکے تھے۔ اب یہاں ماش اور چنے کی دال کے دو تین پیکس کے سوا کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔ ان دالوں میں بھی نظر نہ آنے والی بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں موجود تھیں۔ باتھ روم کے ٹنکے میں جو پانی آتا تھا، وہ کسی نیلگی کا تھا اور اس میں ہلکی سی بُو موجود تھی۔ پرسوں اور کل تو انہوں نے یہ پانی پینے سے اجتناب کیا تھا مگر اب لاچار ہو کر انہوں نے اسے ابالا تھا اور تھوڑا تھوڑا پی رہے تھے۔

حریم نے اپنی رسٹ واچ دیکھی، اب دس بج رہے تھے۔ دیکھا جاتا تو چوکیدار احسن والا حادثہ گزرے اب قریباً سولہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ باریال نے اپنی زخمی ہتھیلی پر پٹی باندھتے ہوئے کہا۔ ''ماما! کیا احسن خاں کا آگے پیچھے کوئی نہیں؟ آج عید کا روز ہے۔ وہ پوری رات گھر واپس نہیں

گیا۔ کیا کوئی اس کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں نہیں آئے گا؟''

مروہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''امید تو تھی کہ کوئی رات کو یا پھر صبح سویرے آئے لیکن ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ..... وہ اکیلا رہتا ہو۔''

''یہی بات لگ رہی ہے ماما۔'' حریم نے افسردہ لہجے میں تائید کی پھر اسے اپنی گاڑی کا خیال آیا جو پرسوں بھاگتے وقت وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر چھوڑ آئے تھے۔ وہ بولی۔ ''ماما ہماری گاڑی اسی ویران جگہ پر کھڑی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی پولیس والے یا فارسٹ گارڈ کی نظر میں آجائے اور وہ کھوج لگائے کہ گاڑی یہاں کیوں کھڑی ہے؟ پھر وہ اس ریسٹ ہاؤس کی طرف متوجہ ہوجائے۔''

''اور ایسا ابھی تک نہیں ہوا۔ گاڑی کی چابی بھی اگنیشن میں ہی تھی۔ کیا پتا کہ اب وہ وہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔'' مروہ نے کہا۔

حریم کو ہلکی سی متلی محسوس ہورہی تھی۔ شاید یہ گندا، باسی پانی پینے کی وجہ سے تھا۔ مروہ اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا کرتی تھی۔ اس لیے وہ اپنے دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ کر صوفے پر لیٹ گئی اور بوسیدہ کمبل اپنی کمر تک کھینچ لیا۔ ماہین کی بوجھل سے بوجھل ہوتی سانسیں حریم کے سینے میں آرے کی طرح چل رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ سب دھیرے دھیرے مزید اذیت ناک صورت حال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ موبائل کی چارجنگ اب بہت کم رہ گئی ہوگی..... آن ہونے کے بعد شاید اس میں اتنا ہی کرنٹ ہو کہ ایک یا دو منٹ کی کال ہوسکے۔ اچانک وہ سٹپٹا سی گئی۔ اب تک اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ وہ عمر کو بھی ایک میسج کردے۔ شاید اس کی وجہ وہ حد درجے کی پریشانی تھی جس نے ان چاروں کو بے طرح پریشان کر رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ موبائل فون آن کرنے سے بھی تو ''بیٹری ایگزاسٹ'' ہوتی تھی۔ بہرحال اس نے یہ رسک لیا اور موبائل آن کرکے فوراً ہی عمر کے لیے یہ میسج لکھ دیا۔ ''مجھے فوراً کال کریں۔ ہم شجاع فارم اور چیچہ وطنی کے راستے میں ایک ریسٹ ہاؤس میں بہت بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔''

میسج سینڈ کرنے کے بعد وہ فون آن رکھنا چاہتی تھی لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ چارجنگ تیزی سے کم ہورہی تھی۔ اس نے فون آف کردیا۔

فون آف کرتے ہوئے اس کی نگاہ عادی کے ایک اور میسج پر پڑی۔ یقیناً یہ بھی اس نے ایک گھنٹے بعد بھیجا تھا۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور ان الفاظ سے جھلکتی بے چینی سے حریم عادی کے ایسے میسج اس کی رونمائی پر بھیجا کرتے تھے۔ وہ اکثر انہیں کھولتی ہی نہیں تھی اور اب تو وہ بھی موبائل کی چارجنگ زیرو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اب وہ موبائل کو کم از کم ایک گھنٹے بعد آن کرنا چاہتی تھی اور آن کرتے ہی عمر کو ٹرائی کرنا چاہتی تھی۔ مارچ کا سنہری دھوپ والا دن جو عید کا دن بھی تھا، تیزی سے گزرتا چلا جارہا تھا۔ آج ان تینوں نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی۔ بھیڑیوں کی آوازیں اور آہٹیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ کسی وقت ان کے ذہنوں میں یہ خوش خیالی جنم لیتی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھوک سے دیوانے یہ موذی جانور کسی اور طرف نکل گئے ہوں.....؟

ماما سے مشورہ کرکے قریباً ایک گھنٹے بعد حریم نے پھر دھڑکتے دل کے ساتھ فون آن کیا اور فوراً ہی عمر کا نمبر ملایا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر عمر نے میسج دیکھ لیا ہے تو وہ فوراً کال ریسیو کرے گا۔ ماہین تو نیم بے ہوش تھی مگر مروہ اور باریال امید بھری نظروں سے حریم کا چہرہ تک رہے تھے۔ ان کی امید بعد میں ٹوٹی، حریم کی اس سے پہلے ٹوٹ گئی۔ غیر متوقع طور پر اس کے کان میں آواز پڑی۔ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔

حریم نے ایک آہ کے ساتھ فون آف کردیا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے تھے۔

''فون بند ہے؟'' باریال نے مایوس لہجے میں پوچھا۔

حریم نے اثبات میں سر ہلا دیا..... وہ دوبارہ صوفے پر نیم دراز ہوگئی اور بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس نے بڑے درد سے سوچا..... یہ کیا ہورہا ہے ان کے ساتھ؟ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ عمر نے اس کا میسج پڑھا ہو اور فون بند کردیا ہو..... وہ ایسا تو نہیں تھا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ ایسی سیریس اطلاع کو مذاق سمجھا ہو۔

ماہین کی سانسوں کی آواز بتا رہی تھی کہ اس کی حالت خراب سے خراب ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف خونخوار جانوروں کا خوف اس بری طرح ان کے دل و دماغ میں جم گیا تھا کہ وہ باہر نکلنے کا سوچ کر ہی پوری جان سے لرز جاتے تھے۔ پتا نہیں کیوں عمر کا متین چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اس نے قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ اپنی بے لوث محبت سے ان سب کے دلوں میں جگہ بنالی تھی لیکن ان کی زندگیوں کے اس سنگین ترین موڑ پر وہ نجانے کہاں

تھا؟ اس کے آس پاس موجود نہ ہونے میں حریم کا اپنا قصور زیادہ تھا۔ وہ سوچنے لگی، شاید اس نے غلط کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنی حساس طبع کا مالک ہے۔ کہنے کو ایک ڈاکٹر لیکن مزاج کے اعتبار سے ایک نہایت گداز دل شاعر جیسا۔ اس کے نازک آبگینوں جیسے اصول احساسات کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا کہ اس نے کم وبیش سات برس تک اس سے خاموش محبت کی اور انگنت مواقع مہیا ہونے کے باوجود کبھی اظہار نہ کیا۔ حالانکہ آصف کے ساتھ منگنی سے پہلے اس نے کبھی بھی اظہار کیا ہوتا تو حریم خود کو اس سے بیگانہ نہ رکھ پاتی۔

وہیں آنکھیں بند کرکے لیٹے لیٹے اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں عمر کو مخاطب کیا۔ ''مجھے معاف کردو عمر! میں نے خود کو اس لیے آپ سے دور کیا کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ اگر یہ غلطی بھی ہے تو اس کی اتنی بڑی سزا تو نہ دیں۔ آپ تو میری چھوٹی سی تکلیف پر بے قرار ہوجاتے تھے۔ دیکھیں میں کتنی بڑی مصیبت میں ہوں۔ چلیں ایک بار۔۔۔ ایک آخری بار آجائیں۔ مجھے اور میری فیملی کو اس جان لیوا مصیبت سے چھٹکارا دلادیں۔''

اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے۔ وہ سوچنے لگی، ایک بار عمر نے اسے موت کے منہ سے کھینچا تھا اور زندہ رہنے کا حوصلہ دیا تھا۔ اس وقت وہ بن بلائے آیا تھا اور آج تو وہ بے بسی کی انتہا کو چھو کر اسے بار بار بلا رہی تھی۔ آج وہ کیوں نہیں سن رہا تھا؟

اسی طرح لیٹے لیٹے اور سوچتے سوچتے اسے ایک نقاہت بھری اونگھ نے آلیا۔۔۔ پھر وہ سوگئی۔ ایک شور نے اسے جگایا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ روزن کی طرف گئی۔ شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے مگر پھر بھی پتا چلتا تھا کہ آہنی گرل اپنی جگہ موجود ہے۔ تب اس نے ماما کی طرف دیکھا۔ دوزانو بیٹھ کر انہوں نے ماہین کا سر گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس پر جھک کر وہ اس کا ماتھا چوم رہی تھیں اور چلا رہی تھیں۔ ''میری بچی۔۔۔ ہائے میری بچی آنکھیں کھول۔۔۔ میں تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اٹھ جا میری بچی۔'' انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔

باریال کا رنگ بھی ہلدی ہو رہا تھا۔ حریم تڑپ کر ماہین کے پاس پہنچ گئی۔۔۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ماتھا بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے پا رہی تھی۔ آکسیجن کی کمی نے اس کے ہونٹوں کو نیلگوں کردیا تھا۔ حریم نے ماہین کا سر ماں کی گود سے نکال کر اپنی گود میں لے لیا، ماہین کے سر جھائے ہوئے سر اور رخساروں کو تھپتھپانے لگی۔

''باریال! میرے بیگ سے وینٹولین نکالو۔'' حریم پکاری۔

باریال لپکا اور حریم کے شولڈر بیگ سے وینٹولین کا مرہم لے آیا۔

عروبہ نے کربناک لہجے میں کہا۔ ''ان نوٹنکوں سے کچھ نہیں ہوگا حریم۔۔۔ یہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔۔۔ میں اسے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔''

حریم نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ عروبہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ عجیب نظروں سے روزن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حریم کے دل نے گواہی دی کہ ماں اب مزید انتظار نہیں کرے گی۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہے گی، ہر صورت۔۔۔

☆☆☆

یہ عید کا تہوار تھا لیکن عمر کو بے حد پھیکا اور اداس لگ رہا تھا۔ چاند رات کا بیشتر حصہ بھی اس نے جاگ کر ہی گزارا تھا اور اس بات کا انتظار کرتا رہا تھا کہ شاید حریم کی کال آجائے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس مرتبہ وہ کال ضرور اٹینڈ کرلے گا۔ صبح عید کی نماز پر جانے سے پہلے اس نے اپنی انا کی دیوار میں ایک رخنہ پیدا کیا تھا اور دل کڑا کرکے حریم کے نمبر پر بیل کی تھی۔ نمبر پریس کرتے وقت اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا مگر پھر ایک دم سینے میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ حریم کا نمبر بند جا رہا تھا۔

انا کی دیوار میں ایک رخنہ تو پیدا ہوا ہی تھا۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنٹی عروبہ کے نمبر پر ٹرائی کیا۔۔۔ لیکن یہاں سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ فون بند تھا۔ چھوٹے بھائی علی کے ساتھ نماز پڑھ کر وہ گھر واپس آگیا۔ قربانی کے لیے جو بکرا خریدا تھا، وہ چونکہ کل صبح ذبح کیا جانا تھا لہٰذا عمر کو اب کوئی کام نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک دو کزن اور کچھ دوست شام کے وقت سیر سپاٹے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن عمر کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ایک گہرے رنج کی کیفیت میں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس تہوار کی خوشی اور گہما گہمی اس کی اداسی اور دکھ میں مزید اضافہ کررہی ہے۔ کیا ایک دم ہی سب کچھ ختم کردیا تھا حریم نے اور آنٹی وغیرہ نے؟ اور تو اور۔۔۔ باریال کی طرف سے بھی علی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو عمر؟'' امی کی آواز نے اسے ایک دم خیالوں سے چونکایا۔

وہ ذرا توقف کرکے بولا۔ ''امی! کہیں ان لوگوں کے

ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ میرا مطلب ہے..... وہی خبیث عادی۔ وہ ان کے آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس سے ڈر کر کہیں غائب ہو گئے ہوں؟"

"نہیں بھئی۔ علی کل گزرا تھا ان کے گھر کے پاس سے۔ اس نے رک کر ان کے پڑوسی میاں احمد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ وہ چند روز کے لیے لاہور سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عید کے بعد ہی واپس آئیں۔ تم نے آنٹی کو فون کر کے دیکھا ہے؟"

"ہاں، بند جا رہا ہے ان کا فون بھی۔" عمر نے افسردگی سے جواب دیا۔

تھوڑا بہت میٹھا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ایسی روکھی پھیکی عید اس کی زندگی میں شاید پہلی بار آئی تھی۔ ایک تو کام کا بے انتہا بوجھ تھا، دوسرا یہ دل کا بگڑا ہوا معاملہ جس نے عمر کی نس نس میں کرب بھر دیا تھا۔

"کیا جدائیاں ایسی ہی کٹھن ہوتی ہیں؟" اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا اور ایک طویل سرد آہ بھر کر اپنے بیڈ پر سیدھا لیٹ گیا۔

اس کا فون مسلسل آن تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی نگاہ بے ساختہ فون کی اسکرین کی طرف اٹھ جاتی تھی..... رات کی تھکن اثر انداز ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے اونگھ آئی اور وہ سو گیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد والدہ ثمینہ اس کے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے دیکھا عمر سو رہا ہے۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر جیسے کسی کا انتظار درج تھا۔ وہ ایک ماں تھیں۔ اپنے بچے کی دلی کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں مگر وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ جو وہ چاہ رہا ہے، وہ کسی طور ممکن نہیں۔ حریم ان کو ہمیشہ بڑی پیاری لگی تھی۔ اس پر مصیبت کا جو پہاڑ ٹوٹا تھا اس کا بوجھ انہوں نے بھی اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی بہتری کے لیے دعا گو رہتی تھیں لیکن اسے ایک بہو کے طور پر قبول کرنا ان کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ ان کی نگاہوں میں گاہے بگاہے وہ ہولناک منظر بھی گھوم جاتا تھا جو کچھ عرصہ پہلے عروبہ کے گھر کی سیڑھیوں سے دیکھا تھا۔ لمبے بالوں والا پُرغضب عادی کسی خون آشام جانور کی طرح عمر پر جھپٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور رقابت کے شعلے ناچ رہے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو ایسے حالات کے سپرد کیسے کر سکتی تھیں..... کبھی نہیں۔

انہوں نے بڑی محبت سے عمر کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے بالوں کو نرمی سے سہلایا۔ موبائل فون اب بھی عمر کے سینے پر اوندھا رکھا تھا۔ انہوں نے فون عمر کے سینے سے اٹھا لیا۔ کچھ دیر پہلے عمر نے حریم اور [illegible] کالز کی تھیں، وہ اسکرین پر ظاہر ہو رہی تھیں۔ یہ کال [illegible] نہیں ہو سکی تھیں۔

انہوں نے دل میں سوچا [illegible] ہے شاید ٹھیک ہی ہے۔ انہوں نے فون آف کر کے موبائل کے چارجنگ والے خانے میں رکھ دیا۔ گھڑی کی سوئیاں دوپہر 11 بج کر 45 منٹ کا وقت بتا رہی تھیں اور یہ قریباً وہی وقت تھا جب حریم نے عمر کو ایک میسج کیا تھا۔ ثمینہ کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ بھی دو چار منٹ میں حریم کی طرف سے عمر کو ایک ٹیکسٹ میسج آنے والا ہے جس کے بارے میں جاننا عمر کے لیے اور ان سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ موت کے گھیرے میں زندگی کا میسج ہے..... یہ مدد کی پکار ہے..... ثمینہ کو ہرگز معلوم نہیں تھا۔

وہ موبائل الماری میں رکھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ عمر سخت تناؤ میں تھا۔ وہ سکون کی نصف گولی کھا کر لیٹا تھا۔ ایک بار سویا تو دیر تک سوتا رہا۔ ثمینہ نے بھی اسے جگانا مناسب نہ سمجھا..... یہاں تک کہ شام کے سائے طویل ہو گئے۔ عید ڈے کے بعد عید نائٹ شروع ہو گئی۔

☆☆☆

ماہین کی حالت بہت خراب تھی اور اس کی حالت دیکھ کر عروبہ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ عروبہ اس درمیانی عمر میں بھی چھریرے اور توانا جسم کی مالک تھی۔ اس نے جلت میں اپنے بال جوڑے کی صورت میں لپیٹے پھر وہ لکڑی کے تخت پر چڑھی اور دیوانہ وار روزن کی طرف بڑھی—

"ماما! آپ کیا کرنے لگی ہیں؟" حریم نے پکار کر پوچھا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا حریم..... ورنہ یہ لوگ بچے گی۔" عروبہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

باریال بھی لپک کر عروبہ کے پاس پہنچ گیا اور ساتھ والی کرسی پر کھڑا ہو کر روزن سے باہر جھانکنے لگا۔ اس نے گرل سے چہرہ لگا کر دائیں بائیں دور تک دیکھا، کہیں کسی حرکت کے آثار نظر نہیں آئے۔ یہ ایک مثبت اشارہ تھا۔ درحقیقت آج صبح سے انہیں نہ تو بھیڑیوں کی آواز سنائی دی تھی اور نہ کوئی ایسی آہٹ کانوں تک پہنچی تھی جو ان کی موجودگی کو ظاہر کرتی۔ عروبہ نے پھر ہیجانی انداز میں کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ ہمیں تھوڑا بہت رسک تو لینا پڑے گا۔ ورنہ ماہی کو کھو دیں گے ہم۔"

عروبہ تیزی سے تانبے کے تاروں کے بل کھولنے لگی باریال پہلے تو تذبذب میں رہا پھر وہ بھی اس کی مدد کرنے لگا حریم، ماہین کے گلے اور سینے پر وینٹوبین لگا چکی تھی، اب

اسے ٹیک لگانے والے انداز میں بٹھا رہی تھی تاکہ اس کی سانس میں بہتری آسکے۔ ماہین تقریباً بے ہوش تھی۔

جونہی تار کے سارے بل کھل گئے، عروبہ اور باریال نے زور لگا کر روزن کی گرل کو اتنا موڑا کہ دس بارہ انچ کا خلا پیدا ہوسکے۔ باریال نے عروبہ کی ہدایت پر پہلے اسکیل کا ایک گلاس اور پھر پلیٹ باہر پھینکی۔ پلیٹ کافی دور تک لوہے کی اور شور مچاتی ہوئی گئی۔ جواب میں بالکل سناٹا رہا۔ ہر شام پیڑوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی چہکار کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"کوئی ہے یہاں — کوئی ہے؟" عروبہ بلند آواز میں پکاری اور یہ فقرہ کئی بار دہرایا۔

اس بات کی امید تو نہ ہونے کے برابر تھی کہ کوئی یہاں ہوگا، وہ اس طرح پکار کر صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ بھیڑیے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں یا نہیں۔

ردعمل نہیں تھا۔ کمرے کے فرش پر بیٹھی حریم کے سینے میں بھی امید کی کرنیں روشن ہونے لگیں۔ شاید ماما ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ اس نازک جان کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اب رسک لیا جائے اور یہاں سے نکلا جائے لیکن حریم دیکھ رہی تھی کہ ماما کے لیے روزن میں سے باہر نکلنا آسان نہیں ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ بے ہوش ماہین کو اٹھا کر روزن تک پہنچاتے اور اسے وہاں سے نکالتے۔ پہلا اسٹیپ تو یہی ممکن تھا کہ وہ خود یا باریال اس روزن میں سے باہر نکلتے اور گھوم کر اور سیڑھیاں اتر کر اس تہ خانے کے بند دروازے تک پہنچتے جسے پرسوں باہر سے تالا لگایا گیا تھا۔ اس تالے کو توڑ کر دروازہ کھول لیا جاتا۔

حریم نے کہا۔ "ماما! آپ نیچے ماہین کے پاس آجائیں۔ پہلے میں باہر نکلتی ہوں۔"

"نہیں — میں تم لوگوں کو نہیں جانے دوں گی۔"

"آپ کیسی بات کرتی ہیں ماما۔" باریال بگڑ کر بولا۔ "ہمارے ہوتے آپ باہر کیوں جائیں گی؟"

ماں بچوں میں بحث ہوئی لیکن یہ بحث طول نہیں پکڑ سکی کیونکہ ماہین کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وقت ضائع کیا جاتا۔ باریال اس بات پر تلا ہوا تھا کہ وہ باہر جائے گا اور دوسری طرف سے سیڑھیاں اتر کر تہ خانے کا تالا باہر سے توڑے گا — بہرطور حریم نے اسے اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ اکیلا نہیں جائے گا بلکہ وہ اس کے ساتھ جائے گی۔ دونوں پہلے روزن کے آس پاس ہی رہیں گے اور کسی خطرے کو محسوس کرکے فوراً روزن سے واپس آجائیں گے۔

ایسے میں ماما کی ذمے داری صرف یہ ہوگی کہ وہ دونوں کرسیوں کو تھامے رکھیں تاکہ باریال اور وہ گرفت کو توڑ کر دوبارہ اس کی جگہ جما سکیں۔

حریم دیکھ رہی تھی کہ ماما اب بھی پوری طرح رضامند نہیں ہیں۔ ماں کی دلی جبلت کہ بچے کو خطرے میں ڈالنے کے بجائے خود مرجانا بہتر سمجھتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی سامنے کی تھی کہ باریال اور حریم کے لیے روزن میں سے باہر نکلنا آسان ہوگا — اور یہ کام جتنا جلد سے جلد ہوتا، اتنا ہی بہتر تھا۔ اپنے دفاع کے لیے باریال نے تہ خانے میں موجود کرکٹ کا وہ مضبوط بیٹ اٹھا لیا تھا۔ اس کے علاوہ چپکے سے کچن والی چھری بھی ایک رومال میں لپیٹ کر اپنی ایک جراب میں اڑس لی تھی۔ حریم کے ہاتھ میں وہی ڈنڈا تھا جس سے وہ تہ خانے کے آہنی دروازے پر ضربیں لگاتے رہے تھے۔

عروبہ ان دونوں کو مسلسل ہدایات دے رہی تھی۔

تین چار منٹ روزن کے آس پاس ہی رہنا ہے — اردگرد پتھر وغیرہ پھینک کر آواز پیدا کرنی ہے ..... خطرے کی صورت میں فوراً واپس پلٹنا ہے اور اوندھے لیٹ کر خود کو روزن کے اندر گرا دینا ہے ..... وغیرہ وغیرہ۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں کے ساتھ مسلسل دعائیں وغیرہ پڑھ رہی تھی اور گاہے بگاہے ماہین کے بے سدھ چہرے پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔

حریم کا دل جیسے اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ پہلے باریال کرسی پر چڑھا اور رینگ کر باہر نکل گیا۔ پھر تھوڑی سی کوشش سے حریم بھی باہر آگئی۔ اندھیرا اب گہرا ہوچکا تھا۔ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مشرق کی جانب سفیدے کے بلند درختوں کے عقب سے دسویں گیارھویں رات کا چاند جھانک دکھا رہا تھا۔ یہ شدید تناؤ کے لمحات تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کسی طرف سے سرخ آنکھیں چمکیں گی اور خون آشام بھوکے جانور ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ حریم مضبوط نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی ..... وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی ذرا سی کمزوری بھی ظاہر ہوئی تو اس کا اثر باریال پر پڑے گا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک یکسر تاریک اور خاموش تھی۔

ہوا کے سرد جھونکے میں حریم نے ہلکی سی بو محسوس کی اور تب اس کی نظر اس منظر پر پڑ گئی جسے دیکھنے سے وہ ڈر رہی تھی۔ یہ چوکیدار احسن خاں کی کٹی پھٹی لاش تھی۔ لاش بھی کیا تھی بس اس کی باقیات تھیں۔ اس کا ڈھانچا دو حصوں میں تقسیم ہوچکا تھا، بلب کی مدھم زرد روشنی میں اس کی

پسلیاں اور ایک لمبا کھچا بازو صاف دکھائی دیا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی نگاہوں سے گزرا اور اس نے جھرجھری لے کر منہ پھیر لیا۔ باریال شاید اس سے پہلے ہی یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہراس اور متلی کی سی کیفیت تھی۔

وہ نیچے جھکا اور گھاس پر پڑا ہوا اسٹیل کا ایک گلاس اٹھا کر پورے زور سے ڈرائیو وے کی جانب اچھالا۔ گلاس دور تک آواز پیدا کرتا چلا گیا، پھر خاموشی چھا گئی۔

باریال اور حریم کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے کچھ پتھر اردگرد پھینکے اور آوازیں بھی لگائیں۔ تب باریال ہمت کر کے بولا۔ ''آؤ آپی..... سیڑھیوں کی طرف جاتے ہیں۔''

''ہمیں وہاں سے گھوم کر ان کمروں کی پچھلی جانب جانا ہوگا۔'' حریم نے ایک کوریڈور کی طرف اشارہ کر کے لرزاں آواز میں کہا۔

اندر سے ان دونوں کو ماما کی کراہتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''حریم! سنبھل کے..... بہت سنبھل کے۔''

حریم جانتی تھی کہ کوریڈور کی تاریکی میں گھسنا کس قدر خطرناک ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ماہین کا بجھتا ہوا چہرہ مسلسل اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

باریال اجازت طلب نظروں سے حریم کو دیکھ رہا تھا۔ ''چلو آؤ۔'' حریم نے کہا اور تاریک کوریڈور کی طرف قدم بڑھائے۔ شیشم کی لٹھ پر اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ برآمدے کی طرف جو ایک بلب ''یو پی ایس'' کی مدد سے روشن تھا، اس کی روشنی اب ماند پڑ چکی تھی۔

بہن بھائی کوریڈور کی گمبھیر تاریکی میں گھسے، یہ آدھے منٹ کا سفر انہیں آدمی صدی کے مانند لگا۔ وہ گھوم کر عمارت کے عقبی حصے میں آ گئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دور دور تک کسی متنفس کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس عمارت کے اردگرد میلوں تک کوئی انسان موجود نہیں۔ عمارت کے اس پچھلے احاطے میں گھاس کی تراش خراش پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔ تعمیراتی سامان نے کافی جگہ گھیر رکھی تھی۔ لکڑی کے تختے، بالے، بجری، ریت وغیرہ۔

''وہ دیکھو باریال۔'' حریم نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

ایک زنگ آلود ہاتھ گاڑی کے پاس تھوڑے دستے والی ایک کلہاڑی پڑی تھی۔

تہ خانے کا تالا توڑنے کے لیے انہیں جس ہتھیار کی ضرورت تھی، وہ اس زنگ آلود کلہاڑی کی صورت میں شاید..... انہیں میسر آ گیا تھا۔

باریال نے جھپٹ کر کلہاڑی اٹھالی۔ جیسے ہی باریال نے کلہاڑی اٹھائی، حریم کو ایک طرح کے تحفظ کا احساس بھی ہوا۔ زندگی میں پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ خطرے میں ہتھیار کی کیا اہمیت ہوتی ہے، چاہے وہ ایک کلہاڑی ہی کیوں نہ ہو۔

مدھم چاندنی میں ریسٹ ہاؤس کی باؤنڈری کا دیوار دکھائی دیتا تھا۔ یہ باؤنڈری بلند آہنی جنگلے کی صورت میں ہی تھی۔ اس جنگلے کی دوسری جانب جھاڑیوں، سرکنڈوں اور لمبی گھاس کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ وہی ویرانہ جس میں سے گزر کر وہ اس ''بندی خانے'' تک پہنچے تھے۔

''چلو آپی! کوشش کرتے ہیں۔'' باریال نے کہا۔

وہ دونوں فوراً ہی تہ خانے کی تاریک سیڑھیاں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر لرزتے قدموں اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ تہ خانے کے آہنی دروازے پر پہنچ گئے۔ وہی منحوس دروازہ جس کی دوسری جانب وہ تین دن سے بتید تھے اور جہاں اب ماہین زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ دروازے پر چائنا کا موٹا سا قفل تھا۔ جب باریال نے الٹی کلہاڑی سے اس تالے پر ضربیں لگانا شروع کیں تو حریم کا دل گواہی دینے لگا کہ مشکل وقت ختم ہونے والا ہے۔ یہ قفل زیادہ دیر باریال کی ضربوں کی مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ اپنے زخمی ہاتھ کے باوجود باریال اندھا دھند چوٹیں لگا رہا تھا۔ اندر سے کسی وقت ماما کی دبی دبی آواز سنائی دے جاتی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے اور پھر قفل ٹوٹ کر لٹک گیا۔

جونہی کلہاڑی کی ضربوں کی آواز تھمی، حریم نے ایک اور آواز سنی۔ گونجتی ہوئی طویل آواز..... یہ بھیڑیوں کی آواز تھی۔ حریم کو یوں لگا جیسے پاؤں سے سر تک اس کا پورا جسم سن ہو گیا ہے لیکن پھر اگلے ہی لمحے وہ دیوانہ وار سیڑھیوں پر چڑھی اور اس نے عقبی احاطے میں جھانکا۔ اس سے زیادہ خوفناک منظر اس کی نگاہوں کی قسمت میں اور کیا ہو سکتا تھا؟ چار دیواری کے جنگلے کے ایک ٹوٹے ہوئے حصے میں سے بھیڑیے اندر داخل ہو رہے تھے اور پوری رفتار سے حریم کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کا درمیانی فاصلہ تیس چالیس قدم سے زیادہ نہیں تھا..... وہ یہیں تھے..... وہ کہیں

نکل گئے تھے ..... بس اپنے لیے ایک اچھے موقعے کا انتظار کر رہے تھے ..... اور یہ موقع شاید انہیں مل گیا تھا۔

''ہاریال .....'' حریم چلائی اور جیسے سیڑھیوں پر اڑتی ہوئی پہنچی دروازے تک پہنچی۔

ہاریال کو بھی پتا چل گیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ دونوں حتی الامکان تیزی سے دوبارہ تہ خانے میں داخل ہوئے لیکن جب تک بھیڑیوں کے اس جتھے میں سے سب سے اگلا جانور دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے ہاریال کی ٹانگ پر حملہ کیا..... اس حملے کے باوجود ہاریال اندر گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ حریم ایک لمحہ پہلے ہی اندر آچکی تھی۔

تہ خانے کا دروازہ اندر کی طرف بند ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ حریم دروازے کو کھینچ کر پوری طرح بند کر پاتی۔ بھیڑیا اپنا سر دروازے میں گھسا چکا تھا۔ پورے تہ خانے میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔ وہ سب چلا رہے تھے۔ حریم نے دیکھا، مامانے بے ہوش ماہین کا سر اپنی گود سے نکال دیا تھا اور اس کا نشانہ بھیڑیے کی طرف لپک رہی تھیں جو ابھی ابھی حریم کے ہاتھ سے گری تھی۔ ''دروازے کو کھینچ کر رکھو۔'' وہ چلائی۔

یہ ان تینوں کی خوش قسمتی ہی تھی کہ دروازہ باہر کی طرف نہیں اندر کی طرف بند ہوتا تھا۔ اگر اسے دھکیل کر بند کیا جانا ہوتا تو وہ کسی طرح اپنا دفاع نہ کر پاتے اور وحشی جانور جو بھاری پتھروں کی طرح اس آہنی دروازے سے ٹکرائے تھے، اسے push کرتے ہوئے اندر داخل ہوجاتے۔ اب بھی ایک بھیڑیے کی گردن دروازے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے نکیلے دانت، اس کی باچھوں سے جھانکتا سفید جھاگ، اس کی سرخ قاتل آنکھیں..... یہ سب کچھ حریم سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

عروبہ آگے آئی اور اس نے شیشم کی مضبوط لٹھ سے بھیڑیے کی تھوتھنی پر اندھا دھند ضربیں لگائیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے حریم کو محسوس ہوا کہ بھیڑیا پیچھے ہٹنا چاہ رہا ہے۔ اس نے دروازے پر اپنی گرفت ذرا سی ڈھیلی کی۔ جانور نے اپنا سر باہر کھینچا اور حریم نے دروازے کو کھینچ کر بند کردیا۔ ہاریال نے بھی اتنی ہی تیزی دکھائی اور اندر سے دروازے کو بولٹ کردیا۔ یہ موٹی گول سلاخ کا سلائڈنگ بولٹ تھا جس کو ارل بھی کہا جاتا ہے۔ کلہاڑی باہر ہی رہ گئی تھی۔

دروازے کے نیچے قریباً دو انچ کی درز تھی۔ بھیڑیے یہاں سے اپنی تھوتھنیاں اندر گھسا رہے تھے اور دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔ حریم، ہاریال اور عروبہ سکتے کے سے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شاید یہ بات غنیمت تھی کہ ماہین اپنے اردگرد سے بے خبر، بے سدھ پڑی تھی ورنہ موجودہ صورتِ حال، اس پر مہلک ترین اثرات ڈالتی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک یہ قیامت کا شور برپا رہا پھر آوازیں کچھ دھیمی پڑ گئیں۔ اچانک حریم کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا کہ بھیڑیے گھوم کر سامنے کی طرف آسکتے ہیں اور روزن میں سے اندر کود سکتے ہیں۔

''ماما، روشندان .....'' وہ چلائی۔

عین اس وقت شاید عروبہ نے بھی روزن کے بارے میں ہی سوچا تھا۔ وہ تینوں دوسرے کمرے کی طرف لپکے۔ ہاریال اور حریم تخت پر چڑھ کر کرسیوں پر پہنچ گئے۔ عروبہ نے آہنی گرل کو برابر کر رکھا تھا لیکن تانبے کا تار ابھی نہیں لپیٹا تھا۔ حریم اور ہاریال نے حتی الامکان تیزی سے روزن کے فریم اور گرل کو تین چار جگہ تار کی بندشوں سے جکڑ دیا۔ بھیڑیوں کی پوری توجہ ابھی تہ خانے کے دروازے کی طرف ہی تھی۔ ان کی آوازوں کا اتار چڑھاؤ، ان کی بے پناہ بھوک اور غضب ناکی کو ظاہر کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے ایک یا دو جانوروں کے سوا باقی سیڑھیاں چڑھ کر باہر چلے گئے ہیں۔

''ہائے اللہ! یہ کیا ہے؟'' حریم نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور کربناک انداز میں پکار اٹھی۔

لالٹین کی روشنی میں عروبہ نے بھی فرش اور کرسیوں کی طرف دیکھا۔ وہاں خون ہی خون نظر آرہا تھا۔ یہ ہاریال کا خون تھا جو اس کی پنڈلی کے پچھلے حصے سے بہہ رہا تھا اور اس کے جوتوں کو بھگوتا ہوا سارے فرش پر پھیلا ہوا تھا۔

ہاریال نے ابھی ابھی چند سیکنڈ پہلے اس زخم پر ایک پرانا کپڑا لپیٹا تھا۔ اب اس کپڑے پر بھی خون کے دھبے نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔

حریم تڑپ کر نیچے بیٹھ گئی اور ہاریال کا زخم دیکھنا چاہا۔

''کچھ نہیں ہوا آپی۔ میں ٹھیک ہوں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''ٹھیک کیا ہوا؟ سارا فرش تو خونم خون ہورہا ہے۔'' وہ کراہی اور زبردستی کپڑا ہاریال کی ٹانگ سے ہٹادیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ چکرا کر بے ہوش ہوجائے گی۔ ہاریال کی پنڈلی کے پچھلے حصے سے پاؤ بھر گوشت غائب تھا۔ یہاں سے اس کی نیلی جینز کا ٹکڑا بھی اوجھل تھا اور اس کی ٹانگ کی ہڈی تک دکھائی دے رہی تھی۔

اب عروبہ بھی یہ منظر دیکھ چکی تھی۔ وہ جیسے بے دم سی

ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

"ہائے میرے مالک ہائے میرے مالک۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

مگر جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی بری حالت، بچوں کی حالت کو بھی ابتر کر دے گی تو اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ آگے بڑھی، اس نے ہاریال کا خون آلود جوتا کھینچ کر اس کے پاؤں سے الگ کیا۔ لالٹین آگے کی اور دل کڑا کر کے اس کے نہایت سنگین زخم کو دیکھنے لگی۔

"سب سے پہلے اس کا خون بند کرنا ہوگا ـــ کسی بھی چیز سے۔" وہ بولی اور سوالیہ نظروں سے حریم کی طرف دیکھا۔

"یہاں کیا ہوگا؟" حریم گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

عروبہ لپک کر اس الماری کی طرف گئی جہاں مسالا جات اور کچن سے متعلق دیگر اشیا پڑی تھیں۔ اسکیل کے ایک بڑے ڈبے میں تھوڑا سا خشک آٹا بھی تھا۔ وہ آٹا لے کر واپس آئی۔ اس دوران میں حریم، ہاریال کو فرش پر ہی پہلو کے بل لٹا چکی تھی۔ عروبہ نے آٹے سے وہ کام لیا جو چولہے کی راکھ وغیرہ سے لیا جاتا ہے۔ اس نے ہاریال کے خونچکاں زخم پر خشک آٹے کا لیپ کر کے اور اوپر صاف کپڑے کی بہت سی دھجیاں وغیرہ رکھ کر مضبوطی سے اپنی اوڑھنی کی پٹی باندھ دی۔

ہاریال کا رنگ اخراجِ خون اور تکلیف کے سبب زرد ہو رہا تھا لیکن وہ خود کو حوصلہ مند دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھیڑیے اب تہ خانے کے دروازے سے پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دور نہیں گئے۔ سیڑھیوں کے آس پاس ہی ہیں۔ عروبہ اور حریم نے ہاریال کو فرش کی چٹائی پر ہی لیٹا رہنے دیا اور اس کی زخمی ٹانگ اٹھا کر بیڈ کے اوپر رکھ دی تاکہ وہ قدرے اونچی رہے اور خون کا اخراج کم ہو جائے۔ ہاریال کی ہتھیلی جو پہلی ہی کافی زخمی تھی، اس کھینچا تانی میں مزید زخمی ہو گئی تھی۔ زخم کا منہ کھل گیا تھا اور اس پر بندھی ہوئی پٹی خون سے گیلی ہو گئی تھی۔ عروبہ نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ یہاں بھی دوبارہ بینڈیج کی۔ ابھی وہ بینڈیج پوری طرح مکمل بھی نہ کر پائی تھی..... کہ حریم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ماما! ماہی کو دیکھیں۔"

ماہین کی حالت کچھ دیر سنبھلنے کے بعد پھر ابتر ہو رہی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ سانس کے ساتھ ایک نہایت تیز آواز بھی آنے لگی تھی۔

"ہائے میں مر گئی۔" عروبہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ ہاریال کی بینڈیج، وقتی طور پر ماہین کی طرف لپکی۔ یوں لگتا تھا کہ ماہین کسی ہموار راستے پر گاڑی میں سفر کر رہی ہے اور اس کے جسم کو مسلسل دھچکے لگ رہے ہیں۔ بہت ضبط کرنے کے باوجود حریم اپنی سسکیوں کو روک نہیں پائی۔ اس کے سینے کے اندر سے جیسے ایک چلاتی ہوئی سی آواز ابھری..... حریم! تم سب موت کے گھیرے میں ہو..... یہاں سے بچنا تمہارے لیے آسان نہیں ہوگا.....

بھیڑیے اب گھوم کر روزن کی طرف آ گئے تھے، تاریکی میں ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہ عید کا روز تھا اور شام کے آٹھ بج چکے تھے۔

☆☆☆

عمر نے عید کا آدھے سے زیادہ دن سو کر ہی گزار دیا تھا۔ وہ اٹھا تو وال کلاک آٹھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ وہ جاگ کر بھی اسی طرح چت لیٹا رہا پھر اسے اپنے موبائل فون کا خیال آیا۔ اس نے بیڈ پر اور تکیے کے نیچے دیکھا۔ تب اس نے وہیں لیٹے لیٹے ماں کو آواز دی۔ "امی! میرا فون؟"

امی شاید کچن میں مصروف تھیں، انہوں نے وہیں سے آواز دی۔ "الماری میں پڑا ہے، دائیں طرف۔"

وہ اٹھا اور موبائل لے کر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ فون آف تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے آن کرے لیکن پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ اسے پتا تھا کہ آج دو کزنز اور دو تین دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ یقیناً انہوں نے اسے کئی کالز کر ڈالی ہوں گی۔ اب بھی فون آن ہوتے ہی ان کا تقاضا یہی ہوگا کہ لبرٹی مارکیٹ پہنچو۔ لبرٹی مارکیٹ تو بہت دور تھی، عمر کا دل گھر کی دہلیز پار کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بہت اداس اور خراب موڈ میں تھا۔

تب اس کا دھیان ایک بار پھر حریم کی طرف چلا گیا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا پورا سراپا اپنی تمام جزئیات سمیت عمر کی آنکھوں کے اندر سما جاتا تھا۔ اس کے لمبے ریشمی بال، ستواں ناک، جھیل سی گہری اور شفاف آنکھیں، جن میں دیکھ کر نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے ہونٹ جن میں سے ایک نادیدہ کشش پھوٹتی تھی۔ اس کا جسم تو خوبصورت تھا ہی، دل اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ کہتے ہیں کہ آئیڈیل ملنا مشکل ہوتے ہیں لیکن عمر کو شاید ہو بہو اس کا آئیڈیل مل گیا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ اس کو حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے فون آن کر دیا۔ عید آئی تھی اور تقریباً گزر گئی لیکن عمر کے دل میں اب

بھی امید کی ایک کرن سی چمکتی تھی۔ شاید۔۔۔ شاید وہ رابطہ کرلے۔ فون آن ہوگیا۔ اسکرین روشن ہوئی اور پھر عمر کے رگ وپے میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اسکرین پر حریم کا ایک میسج موجود تھا۔ اس نے جلدی سے میسج کھولا۔ الفاظ چنگاریوں کی طرح اس کی آنکھوں میں رقصاں ہوئے۔

''مجھے فوراً کال کریں۔ ہم شجاع فارم اور چیچہ وطنی کے راستے میں ایک ریسٹ ہاؤس میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔''

اس نے دوبار میسج پڑھا اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ یہ میسج آج ہی گیارہ بج کر دس منٹ پر بھیجا گیا تھا، یعنی اس کے سونے کے تھوڑی ہی دیر بعد۔ ''اوہ خدایا۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

یہ کوئی مذاق تو نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ حریم کا نمبر پریس کیا اور ایک بار پھر وہی مایوس کن آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

اس نے جھلا کر ایک بار پھر آنٹی عروبہ کے نمبر پر ٹرائی کی۔ وہاں سے بھی وہی جواب ملا، جو حریم کے نمبر سے مل رہا تھا۔ آج صبح عمر نے اپنے چھوٹے بھائی علی سے باریال کا نمبر بھی لیا تھا، اس نمبر پر بیل تو جاتی تھی مگر کوئی ریسیو نہیں کرتا تھا۔ علی نے بتایا تھا کہ باریال جب کہیں تفریح وغیرہ کے لیے جاتا ہے تو فون گھر پر ہی چھوڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تفریح میں سیل فون ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔

پریشانی کے عالم میں عمر نے باریال کو بھی ٹرائی کرلیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ وہ پھر بار بار حریم کا نمبر پریس کرنے لگا۔ سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا نمودار ہوگیا تھا۔ اس کا ذہن عدیل عرف عادی کی طرف بھی جارہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس معاملے میں وہی خبیث ملوث ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ مقامی پولیس کہتی تھی کہ وہ قبائلی علاقے میں روپوش ہے۔۔۔۔ لیکن لاہور کا انارکلی بازار قبائلی علاقے میں تو نہیں تھا اور چھ سات روز پہلے اسے وہاں دیکھا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اس نے لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ ثمینہ نے بیٹے کو تیار دیکھا تو بولی۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ آج کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟''

''بس ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں آجاتا ہوں۔''

''خیر خیریت والا کام ہی ہے نا؟'' ماں کی آنکھوں میں ان گنت اندیشے جاگ اٹھے۔ جب سے عادی کے ساتھ لڑائی والا واقعہ ہوا تھا، ذرا سی بات پر ثمینہ کا دل خشک پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔

ماں کو تسلی دے کر عمر نے اپنی کلنس گاڑی نکالی اور طوفانی رفتار سے حریم کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ وہ پڑوسیوں سے جاننا چاہتا تھا کہ ان کے پاس آنٹی عروبہ اور ان کی فیملی کے بارے میں کوئی اطلاع ہے یا نہیں۔ ساتھ ساتھ وہ حریم، آنٹی عروبہ اور باریال کے فونز پر بھی ٹرائی کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اگر وہ لوگ واقعی کسی مصیبت میں ہیں تو پھر ان کے فون بند کیوں ہیں؟ خاص طور سے حریم کا فون اب بند کیوں ہے؟

آنٹی عروبہ کے گھر پہنچ کر وہ سب سے پہلے ان کی لینڈ لیڈی سے ملا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ ان لوگوں کو شاید عید سے ایک روز پہلے آجانا تھا مگر ہوسکتا ہے کہ پروگرام لمبا ہوگیا ہو۔ عمر نے پوچھا۔ ''پچھلے ایک دو روز میں ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا؟''

عمر رسیدہ لینڈ لیڈی بولیں۔ ''کل میں نے ہی دو تین دفعہ فون کیا تھا مگر ان کے نمبر تو بند جارہے ہیں۔ نوکر باریال کے فون پر بیل جاتی ہے لیکن آواز سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا موبائل گھر میں ہی چھوڑ گیا ہے۔''

عمر دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ دیوار سے اندر جھانکا۔ پچھلے چار پانچ روز میں ہاکر نے جو اخبار پھینکے تھے، وہ اسی طرح صحن میں پڑے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں پڑوسی میاں احمد بھی وہاں آگئے۔ انہوں نے بھی تقریباً وہی کچھ بتایا جو لینڈ لیڈی بتا چکی تھیں۔ انہوں نے بھی آج اور کل حریم وغیرہ سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن حریم کے علاوہ عروبہ کا فون بھی بند جارہا تھا۔

عمر کی چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ کوئی سنگین قسم کی گڑبڑ ہوچکی ہے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر حریم کے خالو یاور حیات صاحب کا نمبر پریس کیا۔ ان سے رابطہ ہوگیا۔ عمر نے کہا۔ ''انکل! میں عمر سرمدی بول رہا ہوں۔ آپ کو آنٹی جان اور حریم وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟''

''نہیں بھئی، میں تو دبئی میں تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے اسلام آباد ائرپورٹ پر اترا ہوں۔ ابھی گھر بھی نہیں پہنچا ہوں۔ کیوں؟ خیریت ہی ہے نا؟''

''ہاں۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ خیریت ہی ہے۔۔۔۔ لیکن آنٹی اور باقی لوگ عید سے پہلے کے کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید سارا ہوا اور چیچہ وطنی کی طرف۔۔۔۔ یا پھر اس سے کچھ آگے۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔ وہ شجاع فارم گئے

ہوں گے۔ وہاں کئی دفعہ سگنل بھی نہیں ملتے ہیں۔ میں نے بھی ابھی فون کیا تھا حریم کو ..... رابطہ نہیں ہوا ہے۔"

عمر فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ اس موقع پر یاور حیات صاحب کو حریم کے سنگین میسج کے بارے میں بتائے یا نہیں۔ ویسے بھی وہ اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہیں یہاں لاہور پہنچتے پہنچتے پانچ چھ گھنٹے تو لگ ہی جانے تھے۔ عمر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے موبائل نکال کر ایک بار پھر حریم کا میسج پڑھا۔ "مجھے فوراً کال کریں۔ ہم شجاع فارم اور چیچہ وطنی کے راستے میں ایک ریسٹ ہاؤس میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔"

اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ بدقماش عادی نے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہو؟ اس کے سینے میں انگارے سے سلگنے لگے۔ کیا اس معاملے میں اسے ابو کو مطلع کرنا چاہیے؟ لیکن ایک بات وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر ایک دفعہ امی ابو اور خاص طور سے امی کو پتا چل گیا تو وہ اسے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالنے دیں گی۔ عادی کا خوف بے طرح ان کے دل و دماغ پر سوار ہو چکا تھا۔ کریم پور کے قریب عمر کا ایک فارسٹ آفیسر دوست رہتا تھا۔ عمر کا دل چاہا کہ وہ اس سے رابطہ کرے اور اس سے پوچھے کہ چیچہ وطنی سے آگے یہ شجاع فارم کہاں اور کس راستے پر واقع ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر حریم وغیرہ کسی مصیبت میں ہیں تو انہیں فوری طور پر مدد کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

باریال کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ سخت بیتدتج کے باوجود اس کی پٹی پھر خون سے بھیگ چکی تھی۔ وہ بار بار پانی مانگتا تھا اور اس کے ہونٹ خشک ہو جاتے تھے۔ حریم اسے چمچی کا وہی گدلا سا پانی دینے پر مجبور تھی جسے اب ابالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ حریم کو خود بھی ہلکا سا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ ماہین کی حالت مزید بگڑی نہیں تھی اور نہ ہی سنبھلی تھی۔ وہ ہر لحظہ ایک آسان سانس کے لیے تڑپ رہی تھی۔ یہ رات کے قریب دس بجے کا عمل تھا۔ چاند کی کچھ کھڑکی ہوئی کرنیں روزن کی گرل میں سے چھن کر اندر آ رہی تھیں اور ماحول کو مزید پراسرار و گمبھیر بنا رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے حریم ہمت کر کے تخت اور پھر کرسی پر چڑھی تھی۔ اسے روزن سے کچھ ہی فاصلے پر پوپلر کے درخت کے پاس ایک بھیڑیا دکھائی دیا تھا۔ وہ منہ اوپر اٹھا کر ہاؤلنگ کر رہا تھا۔ وہی طویل آواز جو کانوں کے راستے جسم کے رگ و پے میں اترتی تھی اور ایک لرزہ پیدا کرتی تھی۔ اب بھی یہ [illegible] صورت میں ویسے ہی آوازیں ابھر رہے تھے۔ [illegible] کہیں پڑھا تھا کہ چاندنی راتوں میں بھیڑیے چاند کو [illegible] دیکھتے ہیں اور پراسرار انداز میں ہاؤلنگ کرتے ہیں۔ [illegible] ایک مرتبہ پاپا سے جنگلی جانوروں کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ بھیڑیوں کی آوازوں اور چاند کی روشنی میں [illegible] سائنسی طور پر ثابت نہیں ہے۔ اس وقت حریم سے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ ایک چاندنی رات میں اپنے اہل خانہ سمیت خونخوار بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں ہوگی ..... اور ان کی خوفناک "ہاؤلنگ" سن رہی ہوگی۔

ماہین چھوٹے چھوٹے سانس لے رہی تھی اور یہ اس امر کی علامت تھی کہ اس کے پھیپھڑے شاید پچاس فیصد سے زیادہ کام نہیں کر رہے۔ اسے فوری طور پر "ان ہیلرز" اور دیگر ادویات کی ضرورت تھی۔ اس کا سر ماما کی گود میں تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز حریم کے کانوں تک پہنچی ..... "میں ..... کہاں ہوں ماما ..... یہ ..... لمبے لمبے پروں والے جنگلی بلے ..... کہاں سے آئے ہیں ..... یہ کیوں رو رہے ہیں ..... ان کو چپ کراؤ ماما ... پلیز چپ کراؤ۔"

حریم نے دیکھا ماہین کے بے رنگ چہرے پر کرب کے آثار تھے ..... وہ بڑبڑاتے ہوئے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پھر وہ ہچکیاں لینے لگی، جیسے رو رہی ہو۔ ماما نے بستر پر لیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے دونوں کان اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ دیے اور اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ حریم نے اپنی حوصلہ مند ماما کو ایسی بے بسی کی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر اپنے نانا یعنی حریم کے پڑنانا کی بات کیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ انہوں نے اپنے نانا سے یہی سیکھا ہے کہ مایوسی گناہ ہے اور شدید مشکلات کے بعد آسانیوں اور راحتوں کو آنا ہی آنا ہوتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ حوصلے سے ان کا انتظار کیا جائے۔

باریال نے کراہ کر اپنی شدید زخمی ٹانگ کو تھوڑی سی حرکت دی اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "آپی! مجھے لگتا ہے کہ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ ایک بار پھر عمر بھائی کو ٹرائی کریں۔"

وہ بولی۔ "اب فون آن کروں گی تو مشکل سے دو یا تین منٹ کی چارجنگ ہوگی۔ اگر اب بھی رابطہ نہ ہوا تو پھر؟"

''لیکن اب تو یہ رسک لینا پڑے گا۔ آپ ماہین کی حالت دیکھ ہی رہی ہیں۔''

حریم ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ پھر فون آن کیا۔ جونہی سم کے سگنل نمودار ہوئے، اس نے عمر کا نمبر پریس کیا..... دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر دوسری لائن پر مصروف ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

''اوہ گاڈ..... اوہ گاڈ۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

فون کی اسکرین پر ''بیٹری کریٹی کلی لو'' کے الفاظ چمک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے فون آف کردیا۔

''کیا ہوا؟'' باریال نے سرگوشی میں پوچھا۔

''ان کا فون آن تو ہے لیکن وہ کسی سے بات میں مصروف ہیں۔''

''اب کیا کرنا ہے؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو باریال، اب رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ پانچ منٹ بعد دوبارہ کال کرتے ہیں۔''

حریم نے دیکھا، ماما ماہین کو اپنے ساتھ چمٹائے لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ سر پر دوپٹے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسی حالت میں نماز ادا کر رہی ہیں۔

وہ پانچ منٹ کا وقت پانچ گھنٹوں کی طرح گزرا۔ جتنی بھی دعائیں حریم کو یاد تھیں، وہ اس نے پڑھ ڈالیں۔ وہ جانتی تھی کہ گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ باہر کے لوگوں سے ان کے رابطے کا چانس کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

آخر اس نے پھر دل کو مضبوط کیا اور فون آن کیا۔ سگنل نمودار ہوتے ہی اس نے عمر کا نمبر پریس کیا۔ دو تین سیکنڈ بعد وہی دلدوز آواز آئی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر دوسری لائن پر مصروف ہے تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

حریم کا دل چاہا، وہ اس سیل فون کو کھینچ کر دیوار پر دے مارے اور سب خطروں سے بے نیاز ہوکر باہر نکل جائے۔ اپنی مرتی ہوئی بہن کے لیے مدد ڈھونڈ لائے۔

باریال کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ کچھ پوچھ سکے۔ وہ دونوں جیسے پتھرائے ہوئے تھے۔ فون آن تھا۔ پچیس تیس نہایت قیمتی سیکنڈ ضائع کرنے کے بعد حریم نے ایک اور کوشش کی..... شاید..... یہ قبولیت کی گھڑیاں ہی نہیں تھیں۔ اس کوشش کا نتیجہ بھی وہی نکلا۔ عمر ابھی تک دوسری لائن پر مصروف تھا۔ حریم کے موبائل کی اسکرین اب کسی وقت بھی بجھ سکتی تھی۔ اس نے ایک آہ کھینچ کر فون آف کردیا..... نہ جانے کہ کہاں اتنی لمبی بات کر رہا تھا ڈاکٹر عمر؟ حریم نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ عمر اس وقت اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب عمر نے اپنے اس فارسٹ آفیسر دوست سے ٹیلی فونک رابطہ کر رکھا تھا اور اس سے شجاع فارم اور اردگرد کے علاقے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر رہا تھا۔

باریال بھی ایک دم خاموش سا ہوگیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر یکایک کوئی چیز بجھ گئی ہے۔ شاید یہ رہائی اور زندگی کی امید تھی۔ باریال کی حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی نقاہت بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلسل فاقے سے پیدا ہونے والی نقاہت ہی کچھ کم نہیں تھی، اوپر سے اس کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا۔ نقاہت کی کچھ ایسی ہی کیفیت شاید حریم کی ماما پر بھی طاری تھی۔ پچھلے تین چار گھنٹے سے حریم محسوس کر رہی تھی کہ وہ اشد ضرورت کے تحت ہی بات کرتی ہیں۔ بس پپڑی جمے ہونٹوں کے ساتھ کچھ پڑھتی رہتی ہیں یا دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔

یہ وہ لمحے تھے جب حریم نے پہلی بار اپنا حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔ ابھی عید کا دن گزرا تھا اور یہ عید کی رات تھی۔ اگلے کم از کم دو روز تک تو کوئی امید نہیں تھی کہ اس ریسٹ ہاؤس کا کوئی ملازم چھٹیوں سے واپس آئے گا..... اور شاید بجلی واپس آنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ یہی لگتا تھا کہ اس تنہا عمارت تک بجلی کی اکلوتی لائن آتی ہے۔ باحیثیت لوگ عام طور سے پرائیویٹ طور پر ایسی لائن کا انتظام کرلیتے ہیں۔ حریم کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ باریال کے سر پر تھا اور وہ چٹائی پر بیٹھی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کرلیں..... کمرے میں سردی تھی مگر بخار کی حرارت کے سبب اسے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پچھلے پانچ منٹ سے دو بھوکے جانور مسلسل روزن کی گرل سے اپنی تھوتھنیاں ٹکرا رہے تھے۔ شاید باریال کے خون کی بو ان کے معدوں میں ہلچل مچا رہی تھی۔ حریم کو لگ رہا تھا کہ روشندان کی گرل کی بندشوں میں اب وہ پہلے جیسی مضبوطی نہیں رہی۔ شاید ایک جگہ سے سریا بھی اکھڑ گیا تھا۔ جب جانور گرل سے ٹکراتے تھے تو ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی تھی اور یہ یقیناً اکھڑ جانے والے چوکور سریے کی ہی تھی۔ وقتاً فوقتاً ایک دو جانور گھوم کر اور سیڑھیاں اتر کر تہ خانے کے دروازے کی طرف بھی آجاتے تھے۔ ان کی آوازیں دل دہلاتی تھیں اور ان کی تھوتھنیوں کی جھلک دروازے کی نچلی

ورز سے دکھائی دیتی تھی..... یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ حریم کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ حریم امین! اب شاید کوئی معجزہ ہی تمہیں اور تمہاری فیملی کو اس جان لیوا صورتِ حال سے نکال سکتا ہے۔ یہ مایوسی، لاچاری اور بے دلی کی انتہا تھی۔ اس کا بلیسر بچر بھی غالباً بڑھ رہا تھا۔ وہ بار بار اسکیل کے گلاس میں سے گدلے پانی کا "سپ" لیتی تھی اور اپنی خشک رگوں کو تر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ بخار کی وجہ سے اس کے دماغ میں جیسے دھند سی بھرنے لگی۔ اس دھند میں سے وہی منحوس چہرہ ابھرا جس نے اسے اور اس کی فیملی کو اس حال تک پہنچایا تھا — یہ عادی کا چہرہ تھا۔ وہ بڑی کمینگی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ حریم کو لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو رہا ہے۔ عجیب یاسیت کے عالم میں اس نے سوچا..... اگر وہ ایسے ہی مر گئی تو اس کی بربادی کا بدلہ کون لے گا؟ جو جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے، اس کا ازالہ کون کرے گا..... کون انصاف دے گا اسے..... کیا وہ "بھیڑیے جیسا خونی جانور" ایسے ہی اپنے اندر کی بھوک سے دیوانہ ہو کر گلی کوچوں میں دندناتا رہے گا؟ زندگیاں اجاڑتا رہے گا؟

ایک دم ایک خیال کسی الہام کی طرح اس کے دھند آلود ذہن میں چمکا..... وہ اب بھی اس سے ملنا چاہ رہا تھا — ابھی آٹھ دس گھنٹے پہلے بھی اس کا غلیظ، دھمکی آمیز پیغام موصول ہوا تھا..... "ایسے مت تڑپاؤ ورنہ تمہیں بھی تڑپنا پڑ سکتا ہے..... میں پھر کہتا ہوں۔ ایک بار مل کر دیکھ لو..... تمہارے سارے خوف دور ہو جائیں گے۔"

"تو پھر کیوں نا..... میں اس سے مل کر دیکھ لوں..... اسے یہاں بلا لوں.....' اس نے عجیب ہیجانی انداز میں سوچا۔ یہ خیال اتنا طاقتور اور برق رفتار تھا کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کچھ بخار کی شدت سے اور کچھ اس ہیجانی خیال کے سبب اس کا دل سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔ اس نے گدلے پانی کا ایک اور گھونٹ بھرا اور اپنا سر گھٹنوں پر ٹیک کر کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ جانتی تھی، اب چارجنگ اتنی کم ہے کہ وہ بمشکل ایک کال ہی کر سکتی تھی۔ یہ کال کتنے سیکنڈ کی ہوگی؟ وہ اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی..... ہاں وہ ایک کال کر سکتی تھی..... کیا وہ پھر عمر کو ترائی کرے..... یا مزید سیکنڈ ضائع کیے بغیر عادی کو کال کر دے.....؟ ان لمحوں میں اس نے خود کو جیسے ایک سنگین دوراہے پر پایا۔ اب تک اس نے عمر کو جتنی کالز بھی کی تھیں، وہ رائگاں گئی تھیں۔ کبھی فون اٹھایا نہیں گیا تھا..... کبھی بند ملا تھا..... اور آخری بار انٹرنیشنل مصروف ملی تھی..... اور اب اس کے پاس شاید آخری چند سیکنڈز تھے۔ وہ کیا کرے..... وہ کیا کرے؟ اس نے شدید ترین تذبذب کے عالم میں سوچا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا، لالٹین کی لو نگاہوں کے سامنے پھیلتی جا رہی تھی۔

ایکا ایکی وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ "کہاں جا رہی ہو؟" عروبہ نے سوئی سوئی سی نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

"واش روم میں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور واش روم میں گھس گئی۔

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ پانی کا نل کھولا۔ پانی کی دھار آواز پیدا کرتی ہوئی پلاسٹک کی بالٹی میں گرنے لگی۔ وہ لمبوترے واش روم کے آخری گوشے میں چلی گئی۔ ایک عجیب سی کیفیت کے تحت اس نے فون آن کیا۔ چند سیکنڈ بعد اسکرین روشن ہو گئی۔ چارجنگ شو کرنے والی انڈیکیشن زیرو کے قریب تھی۔ اس نے عادی کا نمبر پریس کیا۔

تین چار سیکنڈ بعد کال ریسیو ہو گئی۔ وہ کسی ایسی جگہ تھا جہاں ہیجان خیز میوزک بج رہا تھا..... اور شاید وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ہلا گلا کر رہا تھا۔ حریم کے پاس ضائع کرنے کو وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "ہیلو..... میں حریم بول رہی ہوں۔"

"یقین نہیں آ رہا سویٹ ہارٹ۔ کہیں کھلی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں ہے..... اور خود کو بہت سنبھال کر بول رہا ہے۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میں تمہارے تیور دیکھتی رہی ہوں..... آخر..... کیا چاہتے ہو تم؟"

"بس تم سے ملنا..... تم کو چھونا..... تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانا۔"

اس نے چند سیکنڈ توقف کیا..... اور بولی۔ "میری ایک شرط ہوگی۔"

"ایک شرط؟" وہ حیرت سے بولا۔ "ایک سو ایک شرطیں بتاؤ سوئٹی..... لیکن جلدی بتاؤ۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"دبئی میں..... یہاں ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں..... اور تم کہاں ہو؟"

میوزک کا بے ہنگم شور اب کم ہو گیا تھا، شاید وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ حریم اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "شرط یہ ہے کہ تم بالکل اکیلے آؤ گے۔

اگر ایسا نہ ہوا تو پھر..... یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔"

"پاکیلا..... بالکل اکیلا جانِ من..... بالکل بے فکر رہو۔ لیکن آنا کب ہے اور کہاں آنا ہے؟" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

حریم نے اپنے لہجے کو پست کر کے ذرا رازدارانہ انداز دیا اور بولی۔ "اس وقت موقع ہے اگر..... آج..... ہی آسکو تو اچھا ہے۔ سب دوسرے پورشن میں سوئے ہوئے ہیں۔ تم ابھی نکل سکتے ہو۔"

"مجھے واقعی لگ رہا ہے کہ میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں..... اگر....."

"پلیز..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

حریم نے اس کی بات کاٹی..... اور پھر اس نے بہ عجلت تمام اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق عادی کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کر دیا۔ اس نے تین چار فقروں میں شجاع فارم سے نکلنے والی سڑک کا ذکر کیا اور سرخ دیواروں والے اس ریسٹ ہاؤس کا ذکر کیا جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ آہنی سلاخوں والا سفید مین گیٹ اندر سے کھلا ہے..... لیکن اسی دوران میں فون کی چارجنگ ختم ہوگئی اور وہ خاموش ہوگیا لیکن وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اس نے ایک بہت اونچا پہاڑ سر کیا ہے۔ اس نے وہاڑی کا نام سنا ہوا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے مردہ سیل فون اپنی جرسی کی جیب میں ڈالا، پانی سے ہاتھ دھوئے اور ہولے سے دروازے کی چٹخنی اتار کر باہر نکل آئی لیکن اسے بری طرح چونکنا پڑا۔ دروازے کے عین سامنے ماما کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

انہوں نے حریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس کو فون کیا ہے؟"

اس نے ماما سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن آج بولا اور ٹلی میں سر ہلا کر پھر سے ہاریال کے پاس آن بیٹھی۔ اس نے دوبارہ ماما کی طرف نہیں دیکھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ماما وہیں کھڑی ہیں اور گھوم کر اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ وہ کئی سیکنڈ تک ساکت و جامد وہیں کھڑی رہیں۔ شاید انتظار کرتی رہیں کہ حریم ان کی طرف دیکھے پھر ماہین بے ہوشی کے عالم میں بری طرح ابکائیاں لینے لگی۔ حریم نے دیکھا کہ ماما جلدی سے پھر اس کے پاس بیٹھ گئی ہیں اور اس کا سر اونچا کر کے اپنے زانو پر رکھ لیا ہے۔ ماہین نے بے ہوشی کے عالم میں ہی ایک قے کی اور اس کی بگڑتی ہوئی سانس تھوڑی سی بہتر ہوئی۔ تاہم یہ عارضی بہتری تھی۔ ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے حریم اچھی طرح جانتی تھی کہ ماہین اسٹیما کی تیسری اسٹیج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے خطرے میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

حریم دیوار سے ٹیک لگا کر ہاریال کے پاس بیٹھی رہی اور اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ ساتھ ساتھ سوچتی رہی کہ ماما کو فون کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے یا نہیں۔ کچھ دیر بعد اسے ماما کی ہچکیاں سنائی دیں۔ وہ برف سے سفید چہرے والی ماہین کے پاس نیم دراز تھیں اور رو رہی تھیں۔ انہوں نے بے ہوش ماہین کا سر اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا اور اسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں لیا ہوا تھا۔ وہ حریم کی طرف دیکھے بغیر آنسیں لہجے میں بولیں۔ "تم نے اچھا کیا حریم..... تم نے بہت اچھا کیا..... اللہ کرے وہ یہاں آئے..... اللہ کرے وہ یہاں آئے۔ میں اس حرامزادے کو..... اس ظالم کو یہاں دیکھوں۔ اس نے جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ کیا، اللہ کرے اس کے ساتھ ہو..... ہماری آنکھوں کے سامنے ہو....."

اور یہ وقت تھا جب حریم کو پتا چلا اس کی ماں سب جانتی ہے۔

☆☆☆

وہ اکیلا ہی آرہا تھا لیکن اپنا بھرا ہوا کولٹ پستول اور اس کے کچھ فالتو راؤنڈز اس نے ضرور گاڑی کی نشست کے نیچے ایک خلا میں رکھ لیے تھے۔ یہ چاندنی رات کافی سرد تھی مگر عادی نے اپنی طرف والی کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا کھولا ہوا تھا۔ الکحل کی گرمی میں اسے یہ ٹھنڈک اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج اس لڑکی کی ہمت جواب دے گئی ہے، مسلسل تناؤ اور خوف نے آخر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔

وہ ان لڑکیوں کی نفسیات کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کو کس طرح گھیرنا ہے اور کیسے تھکانا ہے۔ حریم کے سلسلے میں اس کا اہم ترین حربہ اس کی چھوٹی بہن ماہین تھی جس کو وہ چھوٹی چڑیا کا نام دیتا تھا۔ اس نے بارہا اشاروں کنایوں میں حریم کو یہ بتایا تھا کہ اگر وہ راہِ راست پر نہ آئی تو اس کی چھوٹی چڑیا کے پر جھڑ سکتے ہیں لیکن وہ صرف دھمکاتا ہی نہیں تھا، بڑی مہارت سے حریم کو تھوڑی بہت "نرمی" کی جھلک بھی دکھاتا تھا یعنی یہ دُہرا ایک تھا..... اور آج مارچ کی اس چاندنی شب میں بالآخر اس کی کوششیں بارآور ہوتی نظر آرہی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں

ڈاکٹر عمر کا چہرہ گھوما اور اسے اس ساری صورت حال نے کچھ زیادہ ہی لطف دیا۔

اس نے بوتل سے آخری گھونٹ لیا اور باقی مشروب ... بوتل سمیت باہر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ وہ اتنی ہی پیتا چاہتا تھا کہ حریم کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کر سکے۔ حریم نے اپنی جو لوکیشن بتائی تھی، وہ بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

پچھلے سال اسی موسم میں وہ اپنے مقامی دوست شہباز چودھری کے ساتھ اس علاقے سے گزرا تھا۔ اس سڑک پر اس نے جنگل میں گھرے ہوئے دو تین ریسٹ ہاؤس بھی دیکھے تھے۔ یہ یقیناً انہی ریسٹ ہاؤسز میں سے ایک تھا۔

اس کے اندر عجیب سی ترنگ پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کسی قسم کے خطرے کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا اور اپنی پذیرائی کے لیے بھی۔ وہ ڈرنے والا نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ اکثر اپنے "مقاصد" تک پہنچ جاتا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اگر آج کی رات سب اچھا رہا..... اور اسے اس مشکل لڑکی کی طرف سے پذیرائی ملی تو کیا ہوگا..... کیا وہ مکمل طور پر سرنڈر کرے گی اور اسے اپنی من مانی کرنے دے گی..... یا پھر آج تھوڑی بہت پیش قدمی کرنے دے گی اور باقی کے معاملات آئندہ پر چھوڑنے پڑیں گے..... اور یہ بھی ممکن تھا کہ آج کی ملاقات صرف بات چیت تک محدود رہتی ..... یہ خوبصورت وقت صرف اس کا خوف دور کرنے میں گزر جاتا لیکن کیا وہ ایسا ہونے دے گا؟

اس نے بے قراری میں اسٹیئرنگ پر ایک مکا رسید کیا اور آڈیو پلیئر کی آواز کچھ بلند کر دی۔ ماضی کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے..... دسمبر کی وہ یخ بستہ سہ پہر اس کے دماغ پر مسلط ہونے لگی..... حریم کا اس کی بانہوں میں جکڑا جانا..... اس کی شدید مزاحمت..... اس کا سر بیڈ کے کراؤن سے بری طرح ٹکرانا اور اس کا نیم مکمل ہو جانا..... پھر اس کا لمس..... اس کا ان چھوا پیکر..... سب کچھ ماضی کے دھندلکے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔

آج وہ اپنے میزبان دوست شہباز اور دیگر دوستوں کو بتائے بغیر گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسی غلطی کرے جس سے اس کا شکار بدک جائے۔ وہ بعد میں دوستوں کو کوئی بہانہ تراش کر مطمئن کر سکتا تھا۔ وہ اب منڈی بورے والا سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ اس ویلی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں طرف خاموشی ہنکل تھا جس پر چاندنی کسی نرم پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا دھیان حریم اور اس کی ہیلی کی مہربان کار کی طرف چلا گیا۔ [illegible] گاڑی سرکنڈوں کے قریب چھپا دیتے تھے [illegible] اگلے روز تک وہ وہیں کھڑی رہی تھی۔ شہباز [illegible] گرگ اس گاڑی کے قریب متعین کیا تھا۔ وہ اسی کی صورت حال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ [illegible] فاصلے پر سرکنڈوں میں چھپا رہا تھا۔ [illegible] غلطی کی اور دوپہر کے بعد کھانے پینے کا سامان لینے قریبی قصبے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے پیٹرول کے چند ڈبے لگا لیے اور رات دس بجے کے بعد واپس موقعے پر پہنچا تب تک گاڑی وہاں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اتنی لمبی مسافت میں امکان یہی تھا کہ گاڑی کے مالکان ہی گاڑی وہاں سے لے گئے ہیں۔

عادی کی سوچ کی رو کافی دور تک چلی گئی تھی۔ پھر یہ سوچ واپس پلٹ آئی۔ اسے دور گھنے درختوں میں کچھ فاصلے پر ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہی علاقہ ہے جہاں چار پانچ کلومیٹر کے ایریا میں دو تین ریسٹ ہاؤسز موجود ہیں۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

☆☆☆

"کیا وقت ہوا ہے حریم؟" عروبہ نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"بابا! ساڑھے بارہ ہو گئے ہیں۔" حریم نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولی۔ "ہاریال کا خون مسلسل رس رہا ہے۔ ساری چادر گیلی ہو گئی ہے۔ کیا پٹی کھول کر نئی پٹی کر دیں؟"

"اس سے فائدہ کیا نقصان ہوگا۔ بس اس کا خیال رکھو۔ ذرا اونچی رکھو۔"

"یہ کہتا ہے اس طرح درد ہوتا ہے۔" حریم نے کہا۔

"یہ درد تو جھیلنا ہے بیٹا! اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ ایک دو "پینا ڈول" اور کھا لو۔"

ہاریال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی۔ تہ خانے کے دونوں کمروں میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو بس وہ دلخراش آوازیں اور آہیں ہی توڑتی تھیں جو روزن کی طرف سے ابھرتی تھیں۔ شکار کی طرح شکاریوں کے پیٹ میں بھی بے پناہ بھوک نے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ وہ خونی جانور بے قرار ہو کر اپنی تھوتھنیاں آہنی گرل سے رگڑا رہے تھے۔ اور اس سے جو آواز پیدا ہوتی تھی، وہ گواہی دے رہی تھی کہ یہ کمزور لوہے کی گرل مسلسل ٹھکتا ہو رہی ہے اور کسی بھی وقت "ڈایت

ناک موت" کو اس تہ خانے میں راہ دے سکتی ہے۔

ماہین کا سر عروبہ کی گود میں تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں ماہین بے ہوشی کے عالم میں تین بار قے کر چکی تھی۔ اب اس کے معدے میں کچھ باقی ہی نہیں تھا۔ وہ صرف ابکائیاں لے کر رہ جاتی تھی..... جو تھوڑا بہت پانی نکلتا تھا، وہ عروبہ کی گود میں رکھے کپڑے میں جذب ہو جاتا تھا۔

شدید نقاہت کے سبب کسی وقت اپنی پلکیں اٹھائے رکھنا بھی عروبہ کو مشکل لگتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں..... ایک بار پھر وہی ہولناک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا جو اکثر و بیشتر اس کے پردۂ تصور کو لرزا دیتا تھا۔ خونخوار جانور، ہولناک آوازیں، گھیراؤ، نکیلے دانتوں کی کٹ کٹ..... لیکن اب یہ منظر عروبہ کو اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس تصوراتی منظر کو اب جیتی جاگتی شکل میں دیکھ چکی تھی۔ یہ سب کچھ وہی تو تھا جس کا تجربہ اس کے دل و دماغ نے سیکڑوں مرتبہ کیا تھا..... اور شاید اس کے نانا ٹھیک ہی کہتے تھے..... کبھی کبھی ہمارا ذہن مستقبل کو کھینچ کر ہمارے حال میں ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ ہم وہ سب کچھ کسی نہ کسی شکل میں دیکھ لیتے ہیں جو مستقبل میں رونما ہونے والا ہوتا ہے..... ہاں، یہ سب کچھ وہی تھا جو وہ دیکھتی رہی تھی۔ یہی وہ آوازیں تھیں..... یہی وہ محاصرہ تھا..... یہی دانتوں کی کٹ کٹ تھی..... یہی وہ گلاب کے سفید پھول تھے..... لیکن..... ایک فرق تھا۔ ان سفید پھولوں پر ابھی خون کے چھینٹے نہیں تھے..... یہ کس کا خون ہوگا؟ کس کا خون ہوگا؟ کسی غیر کا..... کسی اپنے کا؟ اس کا دھیان اپنے مصیبت زدہ بچوں کی طرف گیا اور اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

یہی وقت تھا جب عروبہ کو اور حریم کو ایک ساتھ کسی گاڑی کے انجن کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے ہراساں نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "شاید..... وہ آگیا ہے۔" عروبہ نے سرسراتی آواز میں کہا اور ماہین کا سر گود سے نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

حریم بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لالٹین کی لو اونچی کرکے لکڑی کے تخت کی طرف بڑھی اور پھر ایک کرسی کے اوپر چڑھ گئی۔ ایک بھیڑیا جو شاید نر تھا، روشندان سے کچھ فاصلے پر ایک مور پنکھ کے قریب خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے کان، بے ساختہ کھڑے ہو گئے تھے اور وہ دور آہنی گیٹ کی طرف..... دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب کچھ حرکت سی محسوس تو ہوتی تھی لیکن دکھائی کچھ نہیں دیتا تھا۔ حریم کا دل گواہی دینے لگا..... ہاں، یہ وہی شخص ہے جو بظاہر انسان ہونے کے باوجود یہاں موجود خونخوار جانوروں ہی کی طرح سفاک ہے..... جو ظلم بھی ڈھاتا ہے اور سینہ تان کر بھی چلتا ہے۔ جو طاقت کے نشے میں رہتا ہے اور خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہتا ہے، انصاف اور احتساب میرے جوتے کی نوک پر ہیں..... اگر کوئی میرا کچھ بگاڑنا چاہتا ہے تو اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لے۔

پھر چمکتی ہوئی چاندنی میں حریم کو ایک پنک شرٹ کی جھلک نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، گیٹ سے اندر داخل ہو چکا تھا اور بڑی احتیاط سے برآمدوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد حریم کا پورا جسم سنسنا اٹھا۔ اس نے قد کاٹھ سے اور لمبے بالوں سے پہچان لیا کہ یہ وہی بدبخت ہے۔ شاید اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے حریم کو فون بھی کیا ہو، لیکن حریم کا فون تو بے جان ہو چکا تھا۔

وہ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بھیڑیے کہیں نہیں تھے۔ دو منٹ پہلے جو اکیلا بھیڑیا حریم کو مور پنکھ کے پودے کے پاس نظر آیا تھا، وہ بھی اب اوجھل تھا۔ ایک لمحے کے لیے حریم کے ذہن میں یہ روح فرسا خیال آیا کہ اگر بھیڑیے نمودار نہ ہوئے تو؟

یہ پہلا موقع تھا..... ہاں، یہ پہلا موقع تھا جب حریم چاہ رہی تھی کہ بھیڑیے یہاں موجود ہوں.....

اور پھر وہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ جس کا ہونا اشد ضروری تھا۔ خونی جانور ٹولی کی صورت میں ایک طرف سے نکلے اور برق رفتاری سے لمبے بالوں والے عادی پر جھپٹے۔ عادی کے چلانے کی آواز آئی..... وہ گر کر اٹھا اور برآمدوں کی طرف بھاگا۔ بلب کی کمزور روشنی میں وہ صاف دکھائی دیا۔ دو بھیڑیے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے تھے اور اس کی گردن پر حملہ آور تھے۔ ایک نے اس کی پنڈلی کو اپنے مہلک جبڑے میں جکڑ لیا تھا۔ "بچاؤ..... بچاؤ۔" عادی کی پاٹ دار آواز ایک دردناک پکار بن کر گونجی۔ یہ پکار حیرت آمیز دہشت میں لتھڑی ہوئی تھی۔

جب چوتھا جانور بھی اس پر حملہ آور ہوا، وہ اوندھے منہ چوکیدار احسن خان کے بدبودار ڈھانچے کے پاس گرا۔ ٹولی کا پانچواں بھیڑیا بھی برآمدے سے نکلا تھا اور برق رفتاری سے اپنے شکار کی طرف آرہا تھا۔

ان لمحوں میں حریم نے محسوس کیا کہ ماما بھی دوسری کرسی پر چڑھ کر اس کے پہلو میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اس نے مضبوطی سے ماما کا بازو تھام لیا۔ منظر لرزہ خیز تھا..... لیکن وہ دیکھ رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ بھیڑیوں کے

ترلے تک چوڑا پنکھا ہوا کھانے کی طرح تڑپا۔ اس نے ہوا میں گولی شوٹ کے پیچھے سے پکڑ لیا۔ یہ ایک سیاہ پستول تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے بپھرے ہوئے جانوروں کی طرف سیدھا کرتا۔ وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر مرغیوں والے ڈربے سے ٹکرایا اور فرش پر دور تک پھسلتا چلا گیا۔

پھر گولیوں کی دھائیں دھائیں فضا میں بکھرنے لگیں۔ ہاں، حریم کی چیخیں بھی تو گولی ہی تھی۔ اس کی دھائیں بھی تو اسی طرح بکھری تھیں۔ نخوت آرا اور سعدیہ کی نے اس کا بس بھی تو نہیں چلنے دیا تھا۔ اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا اور وہ مزاحمت کے لیے درکار توانائی کھو بیٹھی تھی۔

یہاں بھی تقریباً وہی کچھ ہو رہا تھا۔ اب کوئی نامی گرامی ایڈووکیٹ ریاض اپنے قانونی داؤ پیچ اور اپنے تعلقات کے ذریعے عادی کو بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ زندہ تو چبا جا رہا تھا۔ عادی کی پکاریں دور تک گئیں..... اور ایک روز حریم کی دادا نے بڑھاپے سے کہا تھا۔ ”حریم اندھیر ہو سکتی ہے، اندھیر نہیں۔ ریاض جاوا کے بیٹے نے جو کچھ کیا ہے، ایک دن ضرور بھگتے گا اور ہماری نگاہوں کے سامنے بھگتے گا.....“

سب کچھ حریم اور عروبہ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ تب حریم نے ایک بھیڑیے کے منہ میں عادی کی پشت کے گوشت کا ایک بڑا لوتھڑا دیکھا اور وہ مزید نہ دیکھ سکی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ماتھا روزن کے کنارے سے ٹیک دیا۔ لیکن عروبہ اب بھی دیکھ رہی تھی۔ تاہم اس کی نگاہ اب بھیڑیوں پر نہیں تھی اور نہ ہی ان بھیڑیوں کے شکار پر تھی۔ وہ سفید گلابوں کی طرف دیکھ رہی تھی، ان پر خون کے چھینٹے اب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

☆☆☆

ایک اور رات..... ایک اور خونی رات گزر گئی۔ دن کا اجالا پھیل گیا۔ یہ عید کا دوسرا روز تھا..... اور موت کے گھیرے میں ان کا چوتھا روز۔ ماہین تو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی لیکن ان تینوں کو لگ رہا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے یقینی موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نقاہت نے اب ان کے جسموں کے علاوہ ان کے ذہنوں میں بھی عجیب سی بے حسی بھر دی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ اچانک ماہین کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے گی اور وہ اسے دیکھتے رہ جائیں گے۔

آج رات پھر ان جنونی بھیڑیوں نے انسانی گوشت کا ذائقہ چکھا تھا..... اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس گوشت نے ان کی بھوک کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھایا ہے۔ وہ بار بار غسل خانے کے دریچیں دروازے کی طرف اور اوپر روزن کی طرف [illegible] ہوا کی [illegible] ضربوں [illegible] اپنی [illegible] سلاخ [illegible] تک پہنچ [illegible] لاشوں کے [illegible] نے ہادی کے [illegible] گوشت نوچ لیا تھا۔ اس کے [illegible] کپڑے اور گوشت کے ٹکڑے ہوا سے ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے۔ کچھ کوّے ان باقیات کے اردگرد پھڑپھڑا رہے تھے۔ منظر دردناک تھا لیکن اس کے اندر کہیں آسودگی کا احساس بھی تھا۔

عروبہ نے اس منظر سے توجہ ہٹا کر اپنی اگاہ سیاہ رنگ کے اس کولٹ پسٹل پر مرکوز کر دی جو کل رات عادی کے ہاتھ سے نکلا تھا اور فرش پر لڑھک گیا تھا۔ وہ پسٹل کو حیران سے دیکھنے لگی۔ اسے اس کا سیفٹی لیچ نظر آ رہا تھا اور ٹریگر بھی۔ عروبہ کے نانا فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ ان کے پاس اپنا ایک پرائیویٹ لائسنسی پستول بھی تھا۔ وہ اپنے مزاج کے جدا شخص تھے۔ نانی احتجاج کرتی رہ جاتی تھیں مگر وہ عروبہ کو اپنی گود میں بٹھا کر اسے پستول کے اسرار و رموز سمجھایا کرتے تھے، اس وقت وہ لڑکپن کے دور میں تھی۔ وہ اسے بتاتے پستول یا ریوالور کو تھامنا کیسے ہے؟ اس سے نشانہ کیسے لینا ہے، اس کا جھٹکا کیسے برداشت کرنا ہے؟ کبھی کبھی وہ اسے رہائش گاہ کے وسیع باغیچے میں لے جاتے اور محفوظ طریقے سے اسے فائر کرنا سکھاتے..... یہ سب کچھ عروبہ کے حافظے میں محفوظ ہو چکا تھا اور پتا نہیں کیوں آج صبح سے اسے لگ رہا تھا کہ اپنے بچوں کی زندگی کے لیے اسے باہر نکلنا ہوگا..... اس پسٹل تک پہنچنا ہوگا۔ وہ سیاہ رنگ کے پسٹل کو بغور دیکھتی رہی۔ اس کی اسلحہ شناسی اسے بتا رہی تھی کہ پسٹل کے میگزین میں دس بارہ گولیاں تو ضرور ہوں گی۔ پسٹل ایک کیاری کے قریب پڑا تھا۔ کیاری کا برآمدے سے فاصلہ دس پندرہ قدم کے لگ بھگ تھا۔ وہ ہر چیز کو ”کیلکولیٹ“ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے جسم میں شدید نقاہت کے باوجود ایک لہر سی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایک باہمت فوجی کی نواسی تھی۔ وہ لڑے بغیر ہتھیار نہیں ڈال سکتی تھی۔ اسے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اپنے جاں بلب بچوں کے لیے ایک آخری کوشش کرنا تھی اور ہر صورت کرنا تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں ماما؟" نیچے سے حریم کی خفیف آواز ابھری۔

"کچھ نہیں۔"

"وہ نظر آرہے ہیں؟" حریم نے پوچھا۔ اشارہ بھیڑیوں کی طرف ہی تھا۔

"نہیں..... لگتا ہے باڑ کے پیچھے ہیں یا پھر پچھلے احاطے میں۔"

وہ کرسی سے نیچے اتر آئی۔ حریم کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی تک بخار میں پھنک رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے پُرتشویش انداز میں اپنا چہرہ عروبہ کے کان کے پاس کیا اور سرگوشی میں بولی۔ "ماما! ہاریال کا خون بند نہیں ہو رہا۔ شاید ٹانگ کی کوئی بڑی رگ بھی کٹ گئی ہے۔" ساتھ ہی وہ سسک پڑی۔

عروبہ نے اسے کندھے سے لگایا اور تھپکی دے کر بولی۔ "حوصلہ رکھو..... اور اللہ سے مدد مانگتی رہو۔"

وال کلاک کی سوئیاں اب صبح آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھیں..... اور یہی لمحے تھے جب عروبہ اور حریم نے ایک بار پھر سنسان سڑک پر گاڑی کی آواز سنی۔ ہاریال تو گہری غنودگی میں تھا، وہ دونوں تڑپ کر اوپر روزن کے پاس پہنچ گئیں۔ انہیں یوں لگا کہ ڈرائیو وے سے آگے مین گیٹ کے پاس کوئی گرے کلر اسٹیشن ویگن کھڑی ہے..... پھر تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے دو افراد کو دیکھا جو ادھ کھلے گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر کسی کو پکار رہے تھے..... تب وہ اندر آگئے۔ دونوں نے پینٹ اور چرمی جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ یکایک عروبہ کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ یقیناً حریم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہاں ڈرائیو وے پر عمر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھی کو بھی تھوڑی سی دقت کے ساتھ انہوں نے پہچان لیا۔ وہ عمر کا قریبی دوست جرنلسٹ محسن تھا۔ ایک بندہ غائب اور بھی تھا لیکن وہ ابھی تک گیٹ کی دوسری طرف گرے اسٹیشن ویگن کے اندر ہی تھا۔

عمر اور محسن ذرا جھکتے ہوئے آگے بڑھے، یہی وقت تھا جب عروبہ اور حریم نے اپنی بچی کھچی توانائی کو جمع کیا اور پورے زور سے چلانا شروع کر دیا۔ "آگے نہ آؤ..... آگے بھیڑیے ہیں..... آگے نہ آؤ۔"

آواز مکمل طور پر عمر اور محسن تک نہیں پہنچی تاہم عروبہ نے عمر کو اچانک رکتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ دونوں پھر پوری طاقت سے پکارنے لگیں۔ "باہر نکل جاؤ..... آگے نہ آنا..... آگے بھیڑیے ہیں۔"

حریم پکارنے کے ساتھ ساتھ اسٹیل کی ایک پلیٹ سے روزن کی گرل کو بھی پیٹ رہی تھی۔ آوازیں ان دونوں تک پہنچ چکی تھیں اور وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ شاید جاننا چاہ رہے تھے کہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں اور ان کا مکمل مفہوم کیا ہے۔

"آگے نہ آنا عمر۔" عروبہ گرل سے منہ لگا کر پھر چلائی۔

اور تب اس نے دیکھا کہ عمر اور محسن ڈرے ڈرے انداز میں الٹے قدموں پیچھے ہٹے..... مگر جس تیزی سے انہیں ہٹنا چاہیے تھا، یہ وہ تیزی نہیں تھی۔ ابھی وہ چند قدم پیچھے ہی گئے تھے کہ قاتل بھیڑیے برآمدے کی طرف سے نمودار ہوئے اور ان دونوں کی طرف لپکے۔ بھیانک خطرے کو اپنے سامنے دیکھ کر عمر اور محسن پلٹے۔ چند قدم کے فاصلے پر لکڑی کا وہ سرخ کیبن تھا جو چوکیدار کی پوسٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ جان بچانے کے لیے ان دونوں کو اس کے سوا کچھ سجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کیبن میں گھس جائیں اور دروازہ اندر سے بولٹ کر لیں۔ بھوکے جانور عالم وحشت میں اس چوبی کیبن سے ٹکرائے۔ یہ کیبن ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ ان دونوں کا دفاع کر سکتا۔ اس کی سب سے بڑی خامی وہ تقریباً دو فٹ ضرب دو سائز فٹ کا خلا تھا جس میں شیشہ نہیں تھا..... تین چار سیکنڈ کے اندر یہ شیشہ چکنا چور ہو گیا اور دو تین بھیڑیے اندر گھس گئے۔ یہ قیامت خیز منظر تھا۔ پھر عروبہ اور حریم نے دیکھا، لکڑی کے کیبن کا دروازہ ٹوٹ کر کھلا اور عمر نکل کر بھاگا..... محسن یقیناً بھیڑیوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ بھیڑیے خونی خلریوں کی طرح عمر پر جھپٹے۔

عروبہ عجیب ہیجانی انداز میں پکاری۔ "آؤ حریم۔"

وہ دونوں نیچے اتریں اور دروازے کی طرف بڑھیں۔ تمام جانور گیٹ کی طرف تھے۔ اچھی بات تھی کہ اب اس دروازے کے پاس کوئی نہیں۔ عروبہ نے بپھرے ہوئے انداز میں دروازہ کھولا اور حریم کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں کرکٹ کا وہی مضبوط بیٹ تھا جو وہ اس سے پہلے بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کر چکے تھے۔ دروازے سے نکلتے ہی حریم نے وہ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اٹھالی۔ عروبہ نے دونوں بچوں کی حفاظت کے لیے آہنی دروازہ باہر سے بولٹ کر دیا..... ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر وہ دونوں بھیڑیوں کی طرف لپکیں اور باہر آگئیں۔ عروبہ آگے اور حریم ایک قدم پیچھے تھی۔ پھر انہوں نے وہ منظر دیکھا جو سینے کو شق کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ جوان کی مدد کے لیے یہاں آیا تھا..... اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر انہیں دھوندتا ہوا

یہاں پہنچا تھا ..... موت کے گھیرے میں تھا۔ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ تین بھیڑیوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ ان کی تھوتھنیاں خون سے سرخ تھیں۔ عمر کے ہاتھ میں شاید ٹوٹے ہوئے چوبی کیبن کی ایک مضبوط لکڑی تھی، وہ اس لکڑی کو چاروں طرف گھما رہا تھا اور قاتل جانوروں کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک بازو بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور چہرے پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کی یہ کوشش کسی طرح کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ان کے مہلک شکنجے میں جکڑا جانے والا تھا۔

عروبہ جیسے ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی، وہ چنگھاڑتی ہوئی اس بھیڑیے پر پل پڑی جو عمر کی چھاتی پر اپنے اگلے پنجے رکھ چکا تھا۔ حریم نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ بھیڑیا پلٹ کر حریم کی طرف آیا۔ وہ اندھا دھند کلہاڑی چلانے لگی۔ اس نے زنگ آلود کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور اسے بس گھماتی چلی جا رہی تھی۔ عمر گر گیا تھا، وہ اس کے سامنے جیسے ڈھال بن گئی تھی۔ یہ ایک گھمسان کا رن تھا۔ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر عروبہ کا بیٹ دو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار برآمدے کی طرف بھاگی۔ وہیں ایک کیاری کے پاس وہ کولٹ پسٹل پڑا تھا جو کل رات مدیل عرف عادی کے ہاتھوں سے چھوٹا تھا۔ دھوپ کی کرنیں سیدھی اس پسٹل پر پڑ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ پسٹل کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

وہ جیسے پسٹل کے اوپر ہی جا گری اور تڑپ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے درخت سے ٹیک لگائی۔ پچیس تیس قدم کے فاصلے پر منظر تہلکہ خیز تھا۔ اکیلی حریم خوف سے چلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کلہاڑی بھی گھما رہی تھی۔ وہ تینوں بھیڑیوں کو زخمی عمر سے دور رکھنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی، بھیڑیے دو قدم پیچھے ہٹتے تھے اور پھر جبڑے پھاڑ کر تین قدم آگے آ جاتے تھے۔ عمر گر چکا تھا لیکن تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب عروبہ نے باقی دو بھیڑیوں کو دیکھا۔ وہ بدقسمت محسن کو خون میں نہلانے کے بعد لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے کیبن میں سے نکلے تھے اور اب تیزی سے عروبہ کی طرف لپکے تھے۔ حریم اور عمر سے برسرِ پیکار ایک بھیڑیے نے بھی ان کو جوائن کیا..... تین قاتل جانور اس کی طرف جھپٹے اور درمیانی فاصلہ تھا تقریباً پچیس میٹر..... عروبہ کو لگا جیسے اس کے ناخن ماضی کے دھندلکے سے نکل کر اس کے بالکل پاس آ گئے ہیں۔ اسے اپنی گود میں بٹھا لیا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو کولٹ پسٹل کے دستے پر جما دیا ہے۔

ان کی سرگوشی عروبہ کو کانوں میں گونجتی محسوس ہوئی، سیفٹی کیچ ہٹاؤ..... بایاں ہاتھ بیرل کے قریب رکھو..... سر سیدھا کرو..... سامنے دیکھو..... صرف سامنے دیکھو.....

وہ سامنے دیکھنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ بھیڑیے پردۂ اسکرین پر اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سلوموشن میں اس کے قریب آ رہے ہیں..... اس کے ناخن کی آواز کانوں میں گونجی..... کئی دفعہ دشمن کے مقابلے میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی..... سانس روک لو..... ہاتھ کانپنا نہیں چاہیے..... ٹریگر دباؤ..... ہاں، اب ٹریگر دباؤ۔

اس نے ٹریگر دبایا اور پھر دباتی چلی گئی۔ اس پر جیسے ایک جنون طاری تھا۔ وہ چلا رہی تھی اور کولٹ پسٹل M1911 دھماکوں سے شعلے اگل رہا تھا..... ہاں، یہاں غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ دو جانوروں کو سر اور سینے میں گولیاں لگیں۔ وہ لڑھکنیاں کھا کر گرے۔ ان میں سے ایک عروبہ سے صرف دس بارہ فٹ کی دوری پر پھڑک رہا تھا۔ تیسرا جانور زخمی ہوا تھا..... اب وہ واپس پلٹا تھا۔ عروبہ اٹھ کر اس کے پیچھے گئی۔ اس نے ایک اور فائر کیا جو سیدھا اس کی گردن میں لگا۔ وہ بھی زمین بوس ہو گیا۔

باقی دو بھیڑیے حریم کا گھیراؤ چھوڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ پھر یکایک وہ چار دیواری کے جنگلے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے حصے کی طرف گئے تھے جہاں سے انہیں اندر آنے کی راہ ملی تھی۔ عروبہ جنونی کیفیت میں ان کے پیچھے بھی گئی۔ اس کی حالت زخمی شیرنی جیسی تھی۔ وہ ٹریگر دباتی چلی گئی لیکن اب صرف ایک فائر ہوا۔ اس کے بعد ٹریگر ٹرچ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ دس راؤنڈ والا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھاگنے والے دونوں جانور "جنگلا چار دیواری" کی دوسری جانب جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔

عروبہ پلٹ کر حریم اور عمر کی طرف آئی۔ عمر اب اٹھ گیا تھا۔ اس کے کندھے سے نیچے اس کا ایک بازو سخت زخمی تھا۔ وہاں سے سیاہ جیکٹ کا ایک بڑا ٹکڑا بھی غائب تھا۔ اس کے بعد دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بھی شدید زخمی تھیں۔ انگلیوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ بھیڑیے نے چبائی ہیں۔ اسے ایک لمحے میں شدید سوچ بھی آئی تھی۔

"محسن..... محسن۔" عمر کربناک انداز میں پکارا اور چوکیدار کے ٹوٹے ہوئے چوبی کیبن کی طرف بڑھا۔ کیبن میں چاروں طرف خون کے چھینٹے تھے۔ عروبہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ محسن کا پیٹ چاک ہے اور انتڑیاں جھک رہی ہیں۔

رہی تھی۔ لیکن اس کی سانس ابھی چل رہی تھی۔
عروبہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''عمر..... یہ بچ سکتا ہے۔ اسے اسپتال پہنچاؤ۔ جلدی کرو۔''
اسی اثنا میں گیٹ سے باہر کھڑی اسٹیشن وین میں سے بھی گول چہرے اور فربہ جسم والا ڈرائیور نکل آیا تھا۔ یہ تیس بتیس سالہ شخص وین میں سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا پھر بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔
اگلے تین چار منٹ میں ان سب نے مل کر نہ صرف جاں بلب محسن کو اسٹیشن وین میں ڈال لیا بلکہ تہ خانے میں اتر کر باریال اور بے ہوش ماہین کو بھی نکال لائے۔ ماہین کو زخمی عمر نے اپنے کندھے پر اٹھایا تھا..... اسے اسٹیشن وین کی پچھلی نشست پر لٹا دیا گیا۔ اس دوران میں عمر وہ ہولناک منظر دیکھ چکا تھا، جو عروبہ اور اس کے بچوں کو پچھلے کئی دن سے مسلسل ڈرا رہا تھا۔ یہ چوکیدار احسن خاں اور عدیل عرف عادی کی کچی پکی لاشوں کا منظر تھا..... لاشیں جو کپڑے کی دھجیوں، مرغیوں کے بہت سے پروں اور پنجوں کے درمیان پڑی تھیں۔ ایک کیاری کے بارشی پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا قیمتی موبائل فون بھی پڑا تھا جو یقیناً عادی کا ہی تھا۔
عمر نے وحشت زدہ نظروں سے عروبہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ..... کیا ہے..... آنٹی؟..... یہ عادی.....؟''
''مر گیا..... اپنی موت آپ مر گیا.....'' عروبہ نے آتشیں لہجے میں کہا۔
تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بڑے اور تیزی سے اسٹیشن وین کی طرف بڑھے۔ چند قدم آگے جا کر عروبہ رکی۔ اسے اس سارے منظر میں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک مُردہ بھیڑیا کیاری کے قریب پڑا تھا..... کیاری میں سفید گلاب تھے..... ہاں، سفید گلابوں پر اب خون کے چھینٹے موجود تھے.....

☆☆☆

ریسٹ ہاؤس کے ان خونی واقعات کو اب پندرہ روز گزر چکے تھے..... محسن کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا تاہم اسے پوری طرح تندرست ہونے میں ابھی کئی ماہ درکار تھے۔ باریال کی پنڈلی کا گہرا زخم مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ماہین ابھی تک اسپتال میں تھی لیکن اس کی حالت اب بہتر ہو رہی تھی۔ حالات آہستہ آہستہ نارمل ہو رہے تھے۔ دو مہربان کار پولیس نے ویرانے سے اپنی تحویل میں لی تھی جس میں سے عروبہ اپنے بچوں کے ساتھ نکل کر پناہ کی تلاش میں بھاگی تھی۔ وہ گاڑی اب واپس مل چکی تھی۔ عادی کی دردناک موت کا بھی خوب چرچا ہوا تھا۔ سب حقائق لوگوں کے سامنے آ گئے تھے۔ عروبہ نے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا اور سچ کی اپنی طاقت ہوتی ہے۔ اس طاقت نے ہر ایک کو باور کرا دیا تھا کہ عادی اپنی شامتِ اعمال کے نتیجے میں اس ''گزاری ولا'' نامی ریسٹ ہاؤس تک پہنچا اور وہاں بھیڑیوں کے غول نے اسے زندہ نوچ کھایا۔ عادی کے بااثر باپ ریاض کو اس واقعے کے بعد فالج کا اٹیک ہو چکا تھا اور وہ تصویرِ عبرت بن کر اسپتال میں پڑا تھا۔
عمر ڈیوٹی سے واپس آ کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بازو اور ہاتھ پر ابھی تک بینڈیج موجود تھی۔ ثمینہ صوفے پر نیم دراز تھی اور سیل فون کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہی تھی۔
''امی! کیا ہو رہا ہے؟'' عمر نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔
''وہی ویڈیو دیکھ رہی ہوں۔'' ثمینہ نے جواب دیا۔
عمر ٹائی ڈھیلی کر کے اور کرسی گھسیٹ کر ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سیل فون کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ یہ ویڈیو کلپ تین چار دن پہلے ہی عمر نے چھوٹے علی کے فون پر واٹس ایپ کیا تھا اور امی اب تک اسے آٹھ دس مرتبہ دیکھ چکی تھیں۔ ابو بھی اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہ تین چار منٹ کی تہلکہ خیز ویڈیو اس ڈرائیور نے بنائی تھی جو ریسٹ ہاؤس کے خونی واقعے کے وقت وین میں موجود تھا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ بنائی گئی اس ویڈیو کا رزلٹ بہت اچھا تو نہیں تھا پھر بھی مناظر پوری طرح واضح ہوتے تھے۔ ویڈیو میں ڈرائیور کی اپنی خوفزدہ آوازیں بھی ریکارڈ ہوئی تھیں۔
اس ویڈیو میں حریم کسی چیل کی طرح عمر کی طرف جھپٹتی نظر آتی تھی، عمر جو خونی بھیڑیوں کے نرغے میں تھا۔ عروبہ بھی حریم کے ساتھ تھی پھر کچھ دیر بعد عروبہ کا کرکٹ بیٹ تو دو ٹکڑے ہو گیا تھا مگر حریم دیوانہ وار عمر اور بھیڑیوں کے درمیان موجود رہی تھی۔ وہ شلوار قمیص اور جرسی میں تھی۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں، بال منتشر، چہرہ فاقہ زدہ..... اس کی بے مثال کوشش دیدنی تھی۔ وہ جان کی پروا نہیں کر رہی تھی..... شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے..... اسے کیسے استعمال کرنا ہے؟ بس وہ چلا رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے، اندھا دھند کلہاڑی کو حرکت دے رہی تھی۔
ویڈیو ختم ہوئی..... عمر نے امی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گداز اور آنکھوں میں نمی تھی۔ ماں بیٹا کتنی ہی دیر خاموش اور گم صم بیٹھے رہے۔ پھر ثمینہ نے گہری سانس لی

اور کھوئے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ ''کہتے ہیں جان اسی کی ہوتی ہے، جو جان بچاتا ہے۔''

عمر کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا۔ اس نے ماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ماں کو کیسے بتاتا کہ اس کا دل اور دماغ برسوں سے اس کے تھے اور جس کے دل اور دماغ ہوتے ہیں، جان بھی تو اسی کی ہوتی ہے۔ وہ جو بھی تھی، جیسی بھی تھی، جب بھی تھی..... اس کے دل و دماغ کی مالک تھی اور آج بھی ایسا ہی تھا۔ وہ لڑکپن کے دور میں آنے کے بعد کبھی اس کے حصار سے نکل ہی نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ عید اس خوشی کا نام ہے جو دل کے اندر سے پھوٹتی ہے اور جب دل خوشی سے محروم ہو تو وہ دن عید کا دن نہیں ہوتا..... اور جب دل میں خوشی موجزن ہو تو کوئی دن بھی عید کا دن ہوسکتا ہے۔ شاید وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ اپریل کی ایک سہانی سہ پہر تھی۔ آنٹی مردیہ کی اجازت سے عمر، حریم کو سپر مارکیٹ لے کر آیا تھا۔ دونوں ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ریسٹ ہاؤس والے واقعات کے حوالے سے حریم تقریباً سب کچھ ہی عمر کو بتا چکی تھی۔ اس نے عمر کو وہ بات بھی بتادی تھی جو کسی اور کو نہیں بتائی تھی اور وہ یہ کہ اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر خود ہی عادی کو وہاں بلایا تھا..... وہ مرنے سے پہلے چاہتی تھی کہ عادی کو اس کی سزا تک پہنچانے کی ایک آخری کوشش کرے۔ یہ سب کچھ سن کر عمر سناٹے میں رہ گیا تھا۔ پھر عمر نے حریم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس بات کو ہمیشہ خود تک محدود رکھے گی۔ بہرحال، یہ تو تین چار دن پہلے کی بات تھی۔ اب اس سہانی سہ پہر میں وہ آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ حریم نے کن انکھیوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ پچھلے کئی منٹ سے اس سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا۔ شاید وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ آخر بے حد حوصلہ کر کے وہ اتنا کہہ سکا۔ ''حریم! آپ کا بہت شکریہ، آپ نے..... میری جان بچائی۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گلابی چہرے کے ساتھ بولی۔ ''لیکن میں نے ابھی تک آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ ہمارے لیے ہی تو وہاں آئے تھے۔''

''اگر نہ آتا تو اس سے زیادہ شرمندگی کی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔ اس میں شکریہ وصول کرنے کا کوئی جواز نہیں حریم۔''

''لیکن ایک اور بات پر بھی تو میں نے اب تک آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بول رہی تھی۔

''کون سی بات؟''

''آپ نے بھی تو ایک دن میری جان بچائی تھی..... پتا نہیں اس دن کیا ہوا تھا مجھے۔ گولیاں کھا کر کار پٹ پر گر گئی تھی۔ آپ نہ آتے تو شاید وہیں پڑے پڑے..... مر گئی ہوتی۔''

''مریں آپ کے دشمن۔'' عمر نے ناراضگی سے کہا۔

''اب ایسی باتیں منہ سے کیوں نکالتی ہیں۔''

حریم نے پھر کن انکھیوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ حریم کے الفاظ نے اسے تکلیف پہنچائی ہے۔

''سوری۔'' وہ بولی۔

عمر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہی وقت تھا جب نئے ماڈل کی ایک بڑی جیپ فراٹے سے ان کی گاڑی کے پاس سے گزری اور بہت سا کیچڑ قریبی لوگوں پر اچھال گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی امیرزادہ بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے بال پونی کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔

''خبیث..... بدمعاش..... لگتا ہے نشہ کیا ہوا ہے۔'' ایک جواں سال راہ گیر عورت نے اس پر لعنت ارسال کی..... اور پھر کپڑے اور بال پونچھتی ہوئی مارکیٹ کے اندر چلی گئی۔

عمر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لوگ طاقت اور اختیار کے نشے میں جرم کرتے ہیں..... اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انجام سے بچ جائیں گے..... کیونکہ ان کے پاس بچنے کے بے شمار وسائل ہیں لیکن وہ ایک ''لاٹھی'' کو بھول جاتے ہیں، جو خدا کی لاٹھی ہے۔ وہ ہر جگہ انہیں ڈھونڈ سکتی ہے..... اور وہ ڈھونڈ لیتی ہے۔''

دونوں خاموش ہو کر کسی سوچ میں کھو گئے۔ لاہور کی اس حسین سہ پہر پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

''اب واپس چلیں؟'' حریم نے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے خالی خالی لہجے میں کہا۔

''نہیں، جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔ اس کے الفاظ میں ہلکی سی معنی خیزی بھی تھی۔ ان الفاظ میں وہ اقرار پوشیدہ تھا جس کا انتظار عمر کئی دنوں سے بڑی ہی بے تابی کے ساتھ کر رہا تھا..... بے شک کوئی دن بھی عید کا دن ہوسکتا ہے۔

''او کے.....'' اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے حریم کے گھر کی طرف موڑ دی۔

سلمان
SALMAN SALEEM
PRESENTS

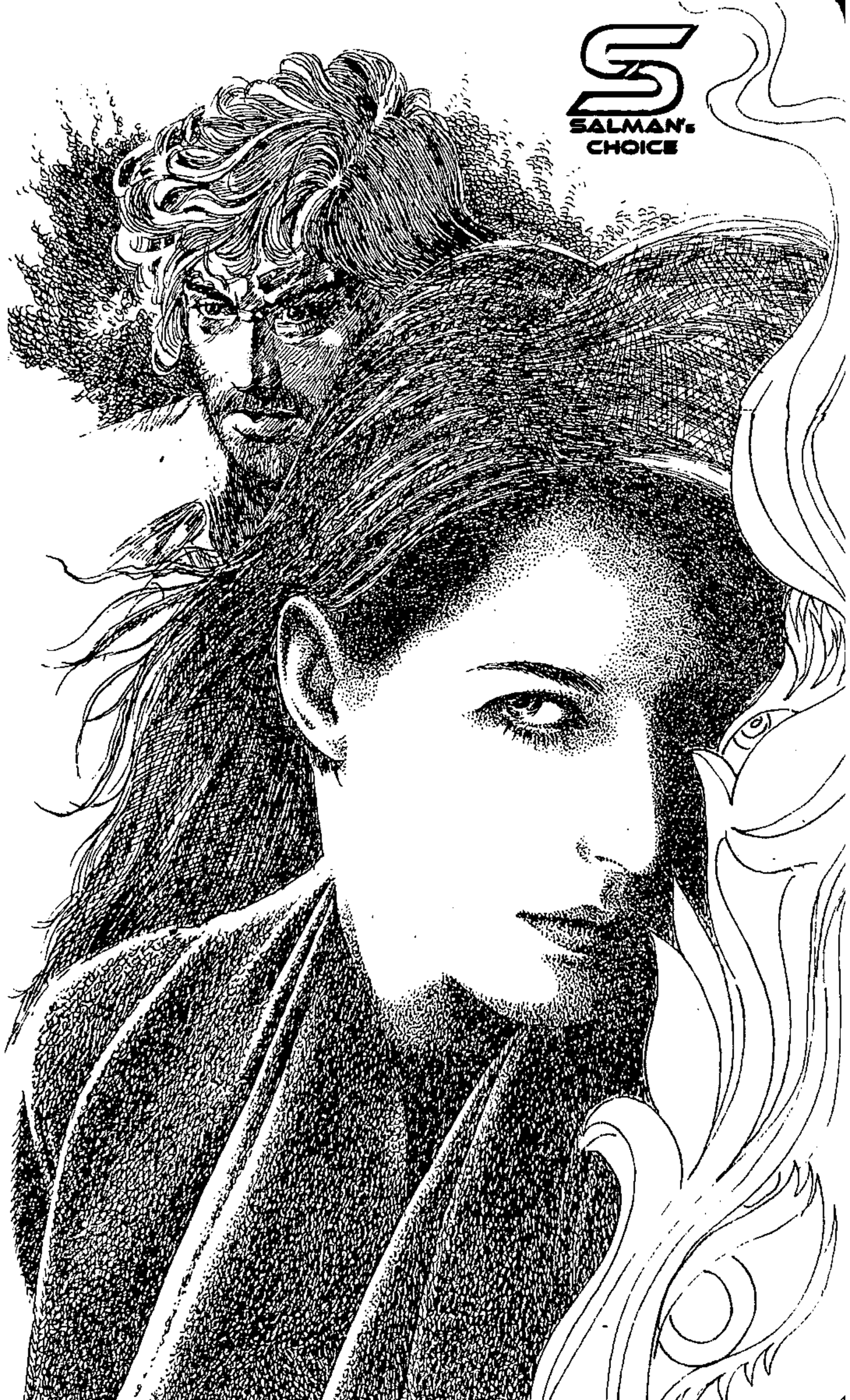


باغ سے باغ تک

طاہر جاوید مغل

کچھ واقعات انتہائی غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں... صدیوں کا سفر طے کرنے کے باوجود ہمیشہ ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ تاریخ سے جڑے ایک ایسے ہی یادگار واقعے کی ناقابلِ فراموش کہانی... جس کے ایک کردار کی تلاش و کھوج نے کہانی کو ایک نئے رخ سے ہمکنار کر دیا... بہادری... دلیری کا تمغہ سجائے محبت کی فصیلوں کو عبور کرتا ایسا کردار جو ہر دفعہ ایک نئے روپ میں نمودار ہو رہا تھا۔

گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ کے پسندیدہ مصنف کا خوبصورت یادگار تحفہ


SALMAN's
CHOICE

رات کا آخری پہر تھا۔ آنیہ جاگ چکی تھی مگر اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی..... وہ اس دروازے کی دوسری جانب کھڑا ہے جو دونوں کمروں کو آپس میں ملاتا ہے پھر دروازہ آہستہ سے کھلا..... وہ بے آواز چلتا ہوا اس کے کمرے میں آ گیا۔ آج اسے صبح سویرے نکلنا تھا، یہ بات اس نے آنیہ کو کل شام ہی بتا دی تھی۔ آنیہ نے اس کے کپڑے استری کر دیے تھے اور ضرورت کی دیگر اشیا بھی اس کے کمرے میں میز پر رکھ دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آنیہ کو جگائے بغیر نکل جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت دبے پاؤں اس کے بیڈ کی طرف آ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ آنیہ وہ مہک محسوس کرتی رہی جو اس کے بدن اور اس کے لباس میں سے اٹھ رہی تھی پھر وہ جھکا۔ اس نے بہت ہولے سے بالوں کی ایک لٹ آنیہ کی پیشانی سے ہٹائی۔ بڑی نرمی سے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے اور تب آواز پیدا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ آنیہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک دھیمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اُس نے آنکھیں وا کر کے وال کلاک کی طرف دیکھا اور ذرا سا چونکی۔ شام کو اس نے کہا تھا کہ ساڑھے چار بجے کے قریب نکلے گا مگر ابھی تو تین بجے تھے۔ وہ اتنی جلدی کیوں نکل گیا تھا؟ اس کے حوالے سے وہ ہر وقت اندیشے میں مبتلا رہتی تھی۔ اس کا جلدی نکلنا بھی اسے ٹھٹکا گیا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ رات کا سناٹا تھا۔ بالائی منزل پر خاموشی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ کر وال کلاک کو دیکھا اور اپنے بال سمیٹتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ چپل گھسیٹ کر وہ جلدی سے دیوار گیر الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کے ایک بڑے خانے میں کمبل اور لحاف وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے سب سے نیچے موجود ایک لحاف کو دیکھا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس کا دل جیسے چند لمحوں کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ ویلوٹ کا براؤن لحاف ایک جانب سے کٹا ہوا تھا۔ روئی باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ پستول غائب تھا جو آنیہ نے یہاں چھپایا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس نے شال اوڑھی، دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئی۔ وہ ابھی اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔ وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی اور اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم..... کہاں جا رہے ہو؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

''کیا ہو گیا ہے آنیہ؟ تمہیں بتایا تو تھا۔''

آنیہ نے جلدی سے ہاتھ چلایا اور اس کی سیاہ جیکٹ کے نیچے کولٹ پسٹل کی سختی کو محسوس کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر بائیک کی چابی نکالنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اس کے ہاتھ کو سختی سے پیچھے دھکیل کر بولا۔ ''کیا کر رہی ہو آنیہ؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

آنیہ نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور ہیجانی انداز میں بولی۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا..... تم نے وعدہ کیا تھا مجھ سے..... اب رک جاؤ گے۔ لیکن تم نہیں رک رہے۔ تم پھر اسی کی طرف جا رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گی۔ ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے بائیک کا ہینڈل پکڑ لیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے آنیہ۔ میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ یہ پسٹل تو صرف احتیاطاً لے کر جا رہا ہوں۔''

''نہیں، میں سب جانتی ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہو گئی ہوں..... پلیز پلیز..... مت کرو ایسا۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہیں پتا ہے میں نہیں رہ سکوں گی تمہارے بغیر..... تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی نہیں رہوں گی۔ مجھے اس طرح برباد مت کرو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے آنیہ کو پیچھے دھکیلا۔ ''میں وہیں جا رہا ہوں جہاں کا تمہیں بتایا تھا اور اگر.....''

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ رات کے سناٹے میں کسی قریبی سڑک سے سائرن کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے یہ کسی پولیس موبائل کا سائرن تھا..... آواز نزدیک آ رہی تھی۔

''آنیہ۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ خواہ مخواہ مجھے اور خود کو خطرے میں نہ ڈالو۔ اندر جاؤ۔ میں نے کہا ناں، شام سے پہلے میں واپس آ جاؤں گا۔ میں وعدہ کر رہا ہوں تم سے۔ فار گاڈ سیک اندر جاؤ..... فار گاڈ سیک۔'' اس نے بے قراری کے عالم میں آنیہ کو دھکا دیا۔ تاریکی میں آنیہ کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس دوران میں وہ موٹر بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ پولیس کار کا سائرن بتدریج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ کار یا جیپ یقیناً اسی جانب آ رہی تھی۔ اس نے بائیک کو گیئر میں ڈالا۔ بائیک کا پچھلا پہیا چرچرایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ''پلیز رک جاؤ..... پلیز۔'' آنیہ نے ایک بار پھر پکارا مگر تب تک وہ یخ بستہ تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا

آگے بڑھ چکا تھا۔

وہ سکتہ زدہ سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ سائرن کی آواز مزید نزدیک آگئی تھی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں عقب میں دیکھا اور پھر جلدی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوگئی۔

دروازہ اندر سے بند کر کے وہ لڑکھڑاتی ہوئی اسی کمرے کی نیم گرم فضا میں پہنچی اور بستر پر اوندھی گر کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے سینے میں تلاطم بپا تھا۔ پورا جسم لرز رہا تھا۔ سائرن کی آواز اب دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ کیا وہ زندہ واپس آئے گا؟ کیا وہ اسے پھر دیکھ سکے گی؟ یہ سوال بار بار ایک دہکی ہوئی میخ کی طرح اس کے دماغ میں پیوست ہورہا تھا۔

کئی منٹ بعد وہ سیدھی ہوئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرہ بارش میں دھلے سفید گلاب کی طرح نظر آتا تھا۔ ٹوٹنے والی چوڑیوں نے اس کی سرخ و سپید کلائی پر گہری خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس نے رسنے والا خون ٹشو پیپر سے صاف کیا۔ تب ایک بار پھر اپنے بال سمیٹے، کندھوں پر شال کو درست کیا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کے سبب کمرے کی کھڑکی کا منظر دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی سے باہر گھر کے صحن میں سفیدے کے پیڑ نیم تیرگی میں خاموش کھڑے تھے۔ بالائی منزل کے کمرے سے ماموں جی کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا، تقریباً دس انچ ضرب چار انچ کا ہوگا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''ہم نہیں مانتے..... ظلم کے ضابطے۔'' نیچے انگوٹھے کا نشان تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اسٹیکر پر یہ نشان روشنائی سے نہیں، کسی اور چیز سے لگایا گیا ہے۔ شاید خون سے۔ اس نشان کی بہت اہمیت تھی آنیہ کے نزدیک..... یہ نشان اس اندوہناک واقعے کی نشانی تھی جو کچھ عرصہ پہلے پیش آیا تھا اور ہمیشہ کے لیے اس کے دل و دماغ پر نقش ہوچکا تھا۔

آنیہ کی نگاہیں اس کھڑکی پر اور اس اسٹیکر پر جمی رہیں..... وہ خیالوں ہی خیالوں میں جیسے کہیں بہت دور پہنچ گئی..... وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئی تھی۔ چند مہینے پہلے کے مناظر اس کے پردۂ تصور پر نمودار ہوئے اور ایک ترتیب کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

چند ماہ پہلے وہ جالندھر میں تھی۔ جالندھر میں زیادہ مسلمان تو نہیں تھے پھر بھی کئی علاقوں میں وہ رہائش رکھتے تھے۔ آنیہ کے والد بیرسٹر خورشید عالم بھی وہاں کے رہائشی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خواہش رکھنے کے باوجود تقسیم کے وقت پاکستان نہیں گئے اور اب بھی انڈیا میں آباد ہیں۔ بہار کالونی کی ایک کینال کی کوٹھی میں آنیہ اپنے والدین اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ کمپیوٹر سائنس میں بیچلر کرچکی تھی جبکہ بھائیوں میں سے ایک سیکنڈ ایئر اور دوسرا میٹرک میں تھا۔ اس کوٹھی میں ایک بڑا بیسمنٹ بھی تھا۔ اس بیسمنٹ کا ایک حصہ کتب خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کتب خانے میں زیادہ تر کتابیں تو آنیہ کے والد خورشید عالم صاحب کی تھیں تاہم چند الماریوں میں اس کے پڑدادا کے زمانے کی کچھ کتابیں اور مخطوطے بھی محفوظ تھے۔ اس کے پڑدادا ہاشم علی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بڑے اچھے فوٹوگرافر بھی تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسٹل کیمرا بھی لوگوں کے لیے ایک انوکھی اور نئی چیز تھی۔ اس کے پڑدادا ہاشم علی کا زمانہ وہی تھا جب ہندوستان میں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ پورے ہندوستان میں لگی ہوئی آگ کے شعلے بتدریج بلند ہورہے تھے۔ امرتسر میں جب جلیانوالا باغ کا تاریخی واقعہ ہوا، آنیہ کے پڑدادا ہاشم علی کی عمر قریباً پچیس برس ہوگی۔ بے شمار دوسرے ہندوستانیوں کی طرح ہاشم علی نے اپنی آنکھوں میں انگریزوں سے آزادی کا سپنا سجا رکھا تھا۔ شوقیہ فوٹوگرافر ہونے کے باوجود انہوں نے سانحۂ جلیانوالا اور اس طرح کے کئی دیگر واقعات کی تصویر کشی کی تھی۔ پرانے کوڈک کیمرے سے کھینچی گئی وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں انہوں نے ایک خودساختہ البم میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ اس البم کی خصوصیت یہ تھی کہ اکثر تصویروں کے نیچے ہاشم علی نے اپنے ہاتھ سے تصویروں کا پس منظر اور ان کی اہمیت بھی لکھی تھی۔

آنیہ کو اپنے جدِ امجد کی نشانیوں اور خاص طور سے اس البم میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ لاڈلی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیلانی لڑکی بھی تھی۔ بس جو بات دماغ میں سما گئی، وہ سما گئی۔ ماما کے منع کرنے کے باوجود وہ اکثر تہ خانے میں گھس جاتی اور ان پرانی اشیا میں کھوئی رہتی۔ کبھی کبھی اس پر پینٹنگ کا بھوت بھی سوار ہوجاتا تھا۔

بی سی ایس کا رزلٹ اناؤنس ہوچکا تھا اور اب ماسٹرز میں داخلے تک وہ فارغ ہی تھی۔ اس دن بھی ناشتے کے بعد اپنے موبائل پر ایک دو سہیلیوں سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد وہ بیسمنٹ میں گھس گئی۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویروں والا البم ابھی تک مطالعے کی میز پر ہی رکھا تھا۔ اس نے ہیڈ فون لگایا اور میوزک سننے کے ساتھ ساتھ البم کے ورق پلٹنے لگی۔

ابتدائی حصے میں ایک تصویر ہمیشہ اس کی توجہ کو جذب کر لیتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو خصوصی دلچسپی سے دیکھتی چلی گئی اور پھر اس کے نیچے لکھی ہوئی وہ تحریر پڑھنے لگی جو لگ بھگ سو سال پہلے اس کے پڑدادا ہاشم علی نے لکھی تھی۔ صاف ستھری لکھائی تھی۔ ایک زمانہ گزرنے کے باوجود روشنائی کے رنگ میں معمولی فرق پڑا تھا۔ تصویر قدرے زرد ہو چکی تھی مگر اب بھی منظر بالکل واضح تھا۔

آنیہ نے ایک طویل سانس لی، ہیڈ فون اتارا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر تصویر کو بغور دیکھنے لگی۔ یہ ٹھیک سو سال پرانی تصویر جلیانوالا باغ کی تھی۔ یہ اس قیامت کی منظر کشی تھی جو 1919ء میں امرتسر کے اندر عوام کے ایک جمِ غفیر پر ٹوٹی تھی۔ اپریل کا مہینا تھا اور 13 تاریخ تھی۔ انگریزوں سے آزادی مانگنے والے ہزاروں لوگ اپنے فنکار سینوں کے ساتھ اس باغ میں جمع ہوئے تھے۔ ان میں سکھ، ہندو، مسلمان سب شامل تھے اور پھر جنرل ڈائر نام کے ایک درندے نے ان پر موت کی بارش کر دی تھی۔

زیرِ نظر تصویر میں ایک شخص کمر پر گولی کا زخم لے کر زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے اردگرد بھاگتے دوڑتے لوگوں کے پاؤں اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ نو دس سال کا ایک بچہ بھی اس تصویر میں موجود تھا۔ وہ اس زخمی کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے باپ پر اوندھا گرا ہوا تھا، جیسے اسے مزید گولیوں سے اور ان لاٹھیوں سے بچانا چاہتا ہو جو عالمِ وحشت میں آفت زدہ لوگوں پر برسائی جا رہی تھیں۔ بچے نے باپ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا..... اور پلٹ کر اس سپاہی کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اس کے باپ کو مارنے کے لیے لاٹھی دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں نظر آنے والی چمک بے مثال تھی۔ اس میں خوف تو بے شک تھا مگر اس میں ایک آگ بھی تھی۔ ایک نر شیر کی سی دلیری، بے خوفی اور غضب ناکی۔ اس چمک نے اس فوٹو گراف کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس تصویر کے نیچے آنیہ کے جدِ امجد ہاشم علی نے جو دو تین پیراگراف لکھے تھے، وہ بھی اپنی جگہ یادگار تھے۔ آنیہ انہیں کئی مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ اس تحریر میں انہوں نے اس تصویر کا سیاق و سباق بیان کیا تھا۔ انہوں نے تصویر کا عنوان ''شیر بچہ'' رکھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

''میں قیامت کی اس شام، خود جلیانوالا باغ میں موجود تھا۔ میں انگریز حاکموں کی اس ناقابلِ بیان سفاکی اور درندگی کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس وحشی جنرل ڈائر نے اپنے ایک بیان میں خود کہا ہے، میں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے نہیں ان کو سزا دینے کے لیے گولی چلوائی تھی اور اس وحشی کی اس سزا نے سیکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں نہلا دیا۔ سیکڑوں جاں بہ لب ایسے تھے جن کے لیے طبی امداد کے راستے مسدود کر دیے گئے اور انہوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ مقامی ذرائع کے مطابق 1000 سے زائد لوگ اس بے رحمانہ فائرنگ کی بھینٹ چڑھے۔ یہ تصویر ایک ایسے مسلمان بچے کی ہے جو اپنے زخمی باپ کو بچانے کے لیے اس کے اوپر گر گیا تھا اور ''ابا ابا'' پکار رہا تھا۔ گولیاں اس کے سر کے اوپر سے گزرتی رہیں اور وہ اپنے باپ سے چمٹا رہا۔ وہ اپنے باپ پر برسنے والی گولیوں اور لاٹھیوں کے لیے ایک ڈھال بن گیا۔ یہ تصویر اتارے جانے کے چند سیکنڈ بعد وہ اپنے باپ کے دفاع میں دیوانہ وار ایک سپاہی کی ٹانگوں سے چمٹا اور اسے گرا دیا۔ اسی دوران میں ایک اور شخص اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ مل کر اس نے اپنے زخمی باپ کو گھسیٹا اور خطرے والی جگہ سے دور لے گیا۔ میری معلومات کے مطابق وہ زخمی شخص ان قریباً 1500 زخمیوں میں شامل تھا جو بعد ازاں زیرِ علاج ہوئے اور مختلف اسپتالوں میں پہنچائے گئے۔ اس دس سالہ بچے کی حیران کن شجاعت کا بس دس بیس فیصد حصہ ہی اس فوٹو گراف میں قید ہو پایا ہے، باقی میں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اور میرے حافظے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔

پتا نہیں کیوں، اس روز تہ خانے میں بیٹھے بیٹھے اور اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے آنیہ کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ تصویر 1919ء کی تھی اور اب 2019ء تھا، پورے سو سال گزر چکے تھے اس تصویر کو۔ ان سو سالوں میں کیا کچھ ہو چکا تھا۔ یقیناً یہ شجاع لڑکا جوان ہو کر اور پھر شاید بوڑھا ہو کر مر چکا تھا۔ اس کے بچے بھی مر چکے ہوں گے، اب شاید تیسری نسل ہو گی۔ کون تھا یہ بچہ؟ کس فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اب کہاں تھے یہ لوگ؟ کئی سوال یکایک آنیہ کے ذہن میں اُبھر آئے۔ آنیہ کے جدِ امجد ہاشم علی نے اسے کسی نڈر اور بہادر فیملی کا ''شیر بچہ'' قرار دیا تھا۔ اس شیر بچے کی زندگی کہاں اور کیسے گزری، اور اب اس کی اولاد کہاں ہے؟

☆☆☆

آنیہ اپنی سفید آلٹو کار میں سوار امرتسر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی منزل امرتسر کی بڑی پبلک لائبریری تھی۔ یہاں اسے ایک سکھ لڑکی نہار کور سے ملنا تھا۔ نہار

ویسے تو لائبریرین تھی مگر اسے ہسٹری سے خاص دلچسپی تھی۔ آنیہ کو معلوم ہوا تھا کہ نہار کور نے جلیانوالا باغ کے سانحے پر کافی کام کیا ہے۔ خاص طور سے اس نے اس سانحے میں مرنے اور زخمی ہونے والوں کے درست اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ ان فیملیز کا بھی سراغ لگایا تھا جن کی زندگیاں کسی نہ کسی طور اس اندوہناک واقعے سے متاثر ہوئی تھیں۔

یہ ساری باتیں آنیہ کو تین روز پہلے اپنے پاپا سے ہی پتا چلی تھیں۔ آنیہ کے پاپا بھی اس تصویر کے بارے میں بہ خوبی جانتے تھے جو تہ خانے میں رکھے البم کے ایک پیج پر پچھلے قریباً سو برس سے موجود تھی۔ اپنی آنکھوں میں شیر جیسی دلیری کی چمک رکھنے والے بچے کی تصویر نے اس کے پاپا کو بھی متاثر کیا تھا بلکہ وہ ایسی تصویر تھی جو ہر دیکھنے والے کو متوجہ کر لیتی تھی۔ تین روز پہلے آنیہ نے پاپا کو بتایا تھا کہ وہ اس تصویر کے حوالے سے کچھ کھوجنا چاہتی ہے۔ پاپا سمجھ گئے تھے کہ اب جو کچھ آنیہ کے دماغ میں آ گیا ہے، وہ کر کے رہے گی۔ پاپا اس کی کچھ زیادہ مدد تو نہیں کر سکے تھے تاہم انہوں نے اسے اس لائبریرین نہار کور کا پتا بتا دیا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ شاید آنیہ کو اس سے کچھ معلوم ہو سکے۔

نہار کور مضبوط ہاتھ پاؤں اور لمبے ریشمی بالوں والی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ ابھی غیر شادی شدہ تھی اور اپنی والدہ کے ساتھ اندرونی شہر کے ایک کشادہ گھر میں رہتی تھی۔ جالندھر سے ٹرنک روڈ کے ذریعے قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے آنیہ امرتسر پہنچ گئی تھی۔ نہار کور سے اس کی ملاقات لائبریری کے ریڈنگ روم کی ایک میز پر ہوئی۔ آنیہ اپنے اسمارٹ فون میں البم کی وہ خاص تصویر اور اس کے نیچے لکھی ہوئی تحریر کا عکس بھی لے کر آئی تھی۔

نہار کور کو بھی اس تصویر اور اس تحریر میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ اسے یہ جان کر بھی خوشی محسوس ہوئی کہ آنیہ اسی کی طرح رومانی مزاج کی لڑکی ہے۔ فینٹسی پر یقین رکھتی ہے اور ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے ایک شاندار تصویر پر تحقیق کرنا چاہتی ہے۔ دونوں میں سیر حاصل گفتگو ہوئی اور نہار کور نے وہ تصویر اور تحریر اپنے موبائل میں لے لی۔ نہار نے آنیہ سے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں آنیہ کی جو مدد بھی ہو سکی، وہ کرے گی۔ نہار کور نے جلیانوالا کے حوالے سے جو اعداد و شمار اکٹھے کر رکھے تھے، ان میں چالیس پچاس مسلمانوں کا ذکر بھی تھا۔ ان میں سے کچھ جان سے گئے تھے اور کچھ زخمی ہوئے تھے۔ کم از کم بیس افراد ایسے تھے جن کی فیملیز کے بارے میں بھی معلومات موجود تھیں۔

آنیہ نے نہار کور کو تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''نہار! یہ ایک کلیو ایسا ہے جو شاید تمہاری کچھ مدد کر سکے۔'' اس نے تصویر پر ایک جگہ انگلی رکھی۔

نہار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ چیز میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ زخمی باپ کے جسم پر ایک پرانی فوجی قمیص ہے۔ اس طرح کا لباس برٹش انڈین آرمی کا ہوتا تھا۔''

''مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص فوجی تھا، یا ہو سکتا ہے کہ سابق فوجی ہو۔ تم اس اینگل سے کوشش کرو تو شاید کوئی کھوج مل جائے۔''

نہار ایک بار پھر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اس کی نگاہیں بدستور تصویر کے عکس پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

تصویر والی بات کچھ اس طرح آنیہ کے دماغ میں سمائی تھی کہ نکل ہی نہیں رہی تھی۔ نہار کور سے ملے ہوئے اسے اب آٹھ دس روز ہو چلے تھے۔ وہ دو بار نہار کو فون بھی کر چکی تھی۔ لائبریری میں کوئی فنکشن تھا جس کی وجہ سے نہار کی مصروفیت بڑھی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے آنیہ کو تسلی دی تھی کہ دو چار روز میں وہ اسے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور فراہم کرے گی۔

آج بھی آنیہ بیسمنٹ میں گم صم بیٹھی تھی۔ والد کورٹ جا چکے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے اپنے کام سے نکل چکے تھے۔ وہ مطالعے کی میز پر بیٹھی ایک پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اتنے میں بیسمنٹ کا دروازہ دھڑ دھڑ بجا۔ اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے دوپٹا اپنے سینے پر درست کیا اور دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ماما کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا ماما؟'' آنیہ نے پوچھا۔

ماما کے چہرے پر بیزاری تھی۔ ''آنو! کیا ہر وقت یہاں گھسی رہتی ہو، کچھ دین دنیا کی خبر بھی رکھا کرو۔ فرحان ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا ہے۔''

آنیہ نے ایک طویل سانس خارج کی اور کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ رسٹ واچ دیکھی۔ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ اسے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ فرحان آ ٹپکے گا۔ فرحان اس کا خالہ زاد تھا، عمارتی لکڑی کا کام کرتا تھا۔ اس کا شمار جالندھر کے گنے چنے تاجران میں ہوتا تھا۔ اس کے والد نے بھی اس کام میں نام اور پیسا کمایا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے آنیہ اور فرحان کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی۔

آنیہ ٹھٹک کر بولی۔ ''پلیز ماما! کسی طرح اسے ٹال دیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ دبی آواز میں بولیں۔ ''کیا بے وقوفوں جیسی باتیں کررہی ہو۔ تمہیں پتا ہے، وہ تم سے ملنے آیا ہے۔ کوئی غیر تو نہیں۔ تمہارا خالہ زاد ہے۔ تم پہلے بھی تو اس کے ساتھ جاتی رہی ہو۔ اب ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟''

''اب ہوگئی ہے ناں ماما۔ آپ لوگ مجھے پھنسا رہے ہیں۔'' وہ پھر ٹھنکی۔

''اچھا بند کرو بکواس۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔ کتنی چاہت سے آتا ہے، نئی گاڑی لی ہے۔ سب سے پہلے تمہیں دکھانے آیا ہے۔''

''اُف یہ نئی گاڑی۔'' آنیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اپنا لباس درست کرتی ہوئی ماما کے ساتھ باہر آگئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور فرحان چمچاتی ''ہنڈائی کار'' پر سی سینئر کی طرف جارہے تھے۔ فرحان اسے لنچ کرانا چاہ رہا تھا۔ فرحان کی عمر اٹھائیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس کا جسم تھوڑا سا فربہ تھا، پیشانی سے بال اُڑے ہوئے تھے مگر مجموعی طور پر وہ قبول صورت تھا۔ اس وقت بھی کلف دار شلوار قمیص اور واسکٹ میں وہ جچ رہا تھا۔ کوئی ایسی خاص کمی نہیں تھی اُس میں۔ آنیہ کو بہت پسند بھی کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، بطور ایک شریکِ حیات وہ کبھی بھی آنیہ کو بھایا نہیں تھا۔

''گاڑی کا نمبر پڑھا ہے تم نے؟'' اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو۔''

''گولڈن نمبر ہے۔ تین زیرو والا، ایک لاکھ تو اس نمبر کا ہی دینا پڑا ہے۔'' اس نے حسبِ عادت امارت کا اظہار کیا۔

''تو کیا ایسے نمبر کی وجہ سے گاڑی زیادہ آرام دہ ہو جاتی ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

وہ زور سے ہنسا۔ ''آرام دہ تو نہیں ہوتی لیکن کچھ جلنے والوں کے لیے تکلیف دہ ضرور ہو جاتی ہے۔''

''لیکن ہمیں دوسروں کی تکلیف کے بجائے اپنے آرام اور خوشی کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔''

''بھئی اسی لیے تو جارہے ہیں۔ بتاؤ کیا کھانا پسند کرو گی۔ چائنیز یا پھر کانٹی نینٹل۔ ویسے ذاتی طور پر تو مجھے دیسی کھانے ہی زیادہ پسند ہیں۔ مٹن گوشت کی کڑاہی ہو اور.....''

''اور ڈھیر ساری ہو۔'' آنیہ نے اُس کی بات اُچکی۔

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

فور اسٹار چائنیز ریسٹورنٹ میں وہ لنچ سے بمشکل فارغ ہوئے ہی تھے کہ آنیہ کے فون پر نہار کور کی کال آگئی۔

''ہیلو نہار! کیا حال ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''حال اچھا ہے، اور خبر بھی اچھی ہی ہے۔''

آنیہ کا جسم سنسنا اٹھا۔ ''مطلب کہ پیش رفت ہوئی ہے؟''

''بالکل ہوئی ہے..... مجھے لگتا ہے کہ میں ''شیر بچے'' کی فیملی کا سراغ لگانے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہوں..... تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ایک کام سے ہی نکلی ہوئی ہوں۔''

''آنیہ جانی! اگر اس وقت یہاں آسکو تو بہت اچھا ہو، کل مجھے دفتری کام سے دہلی جانا ہے پھر دو تین روز تو لگ جانے ہیں۔''

''..... آچھا..... میں کوشش کرتی ہوں..... بلکہ میں آرہی ہوں۔ کہاں ملو گی تم؟''

''لائبریری شام سات بجے تک کھلی ہے، میں وہیں پر ہوں۔''

''اوکے..... میں پھر نکلتی ہوں۔'' آنیہ نے بے تابی سے کہا۔

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے فرحان کی طرف دیکھا۔ فرحان کے چہرے پر مایوسی آمیز جھنجلاہٹ تھی۔

''کیا ہوا اب؟'' اس نے پوچھا۔

''فرحان! میری ایک دوست نہار کور کا فون تھا۔ یہ امرتسر میں لائبریرین ہے، میں اس کے ساتھ مل کر ایک آرٹیکل پر کام کررہی ہوں، میرا ابھی اس کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔ آئی ایم ویری ساری فرحان۔''

لائبریری اور آرٹیکل وغیرہ کے ذکر نے فرحان کو مزید ڈسٹرب کیا۔ اسے ایسے معاملات میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی تعلیم واجبی سی تھی۔ بس اتنی ہی جتنی حساب کتاب اور کاروباری سودے کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ بولا۔ ''یہ کن بکھیڑوں میں پڑی رہتی ہو آنیہ ڈارلنگ۔ ایسے کاموں سے حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھو اتنا پیارا چہرہ کتابیں پڑھ پڑھ کر کملاتا جارہا ہے۔ اگر کتابوں میں ہی سر کھپانا تھا تو پھر خالو خورشید کی طرح قانون شانون کی کتابیں پڑھتیں۔ کچھ فائدہ تو ہوتا۔''

''وکیل بیویوں کو سنبھالنے میں دانتوں پسینا آجاتا ہے۔'' وہ ذرا شوخی سے بولی اور اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

فرحان احمد اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں کہیں غصے کی جھلک نظر آتی تھی۔

☆☆☆

جالندھر سے امرتسر کا فاصلہ اپنی سوزوکی آلٹو گاڑی پر آنیہ نے قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور لائبریری میں نہار کے پاس جا پہنچی۔ اب ان دونوں نے کولڈ کافی کے کپ اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے اور مصروفِ گفتگو تھیں۔ دونوں کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا، ان کی نگاہیں سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں۔

نہار کہہ رہی تھی۔ ''یہ دیکھو آنیہ جانی! یہ ان بیس پچیس افراد کا ڈیٹا ہے جو مسلمان تھے اور جلیانوالا میں شہید یا زخمی ہوئے۔ ان میں سے یہ ایک شخص تاج محمد حیدر برٹش انڈین آرمی میں نائب صوبیدار تھا۔ یہ 1917ء تک برٹش آرمی میں ہی تھا اور بے شمار دیگر ہندوستانیوں کی طرح اپنے انگریز آقاؤں کی جنگ فرانس میں لڑ رہا تھا۔ یہ سب لوگ جرمنی اور اس کے اتحادیوں سے برسرِ پیکار تھے اور ایک ایسے کاز کے لیے سات سمندر پار، اپنا خون بہا رہے تھے جو اُن کا کاز تھا ہی نہیں۔ ایک خونریز جھڑپ میں تاج محمد حیدر کے سینے پر شدید ضرب آئی۔ جس نے بعد ازاں سخت سردی کی وجہ سے نمونیے کی شکل اختیار کر لی۔ بیماری کے بعد 1917ء کے وسط میں تاج محمد کو فوج سے فارغ کر کے واپس انڈیا بھیج دیا گیا تھا۔ میری تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جلیانوالا باغ کے اندر زخمی حالت میں گرا ہوا شخص وہی سابق صوبیدار تاج محمد ہے..... اور اس کے اوپر گرا ہوا بچہ اس کا بڑا بیٹا اسد اللہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسد اللہ کی ایک اور تصویر بھی موجود ہے۔ اس تصویر میں وہ دس سالہ بچہ نہیں بلکہ ایک کڑیل جوان ہے، دیکھنا چاہو گی؟''

دنیا جہان کا تجسس آنیہ کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ ''دکھاؤ پلیز! وہ مٹھیاں بھینچ کر سرخ گلابی چہرے کے ساتھ بولی۔

نہار تے کی پیڈ سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور اسکرین پر ایک فوجی دستے کا گروپ فوٹو نظر آنے لگا۔ نہار نے کہا۔ ''لیکن یہ پہلی جنگِ عظیم کی نہیں دوسری کی تصویر ہے۔ یہ زمانہ ہے قریباً 1942ء کا۔ یعنی 1919ء میں جو لڑکا دس سال کا تھا وہ قریباً 32 سال کا ہو چکا تھا۔ اس گروپ میں پہچاننے کی کوشش کرو کہ وہ کون ہے؟''

آنیہ نے دانتوں میں انگلی دبا کر چند لمحے سوچا اور پھر چوڑے سینے اور روشن چہرے والے ایک دراز قد فوجی پر انگلی رکھ دی۔

''زبردست..... بھئی مان گئے تمہیں۔'' نہار نے آنکھیں نچائیں۔ ''یو آر ابسولیوٹلی رائٹ..... یہی ہے وہ شیر بچہ۔ اس نے بھی اپنی معاشی مجبوریوں کے تحت آرمی جوائن کی۔ وہ لیفٹیننٹ سے کیپٹن کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا جب اس نے ایک انگریز میجر پر حملہ کیا اور اسے شوٹ کر کے فرار ہو گیا۔ 1947ء تک کوشش کے باوجود اس کا اور اس کے اہلِ خانہ کا سراغ نہیں ملا۔ آزادی کے بعد وہ واپس آیا اور مشرقی پنجاب کے ہی کسی شہر میں رہائش اختیار کی۔ اس کے چار بچے تھے..... باقیوں کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں تاہم اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تیمور حیدر کافی معروف ہوا۔ وہ ایک زبردست کوہ پیما تھا۔ یعنی اپنے بزرگوں کی طرح اس نے بھی ایک دلیرانہ پیشہ اپنایا۔ اس نے 800 میٹر تک کی کئی چوٹیاں سر کیں۔ میری معلومات کے مطابق وہ قریباً 48 برس کی عمر تک ایک سرگرم کوہ پیما رہا۔ تیمور حیدر کی وفات 2003ء کے لگ بھگ ہوئی۔ نیپال میں ایک چوٹی سر کرتے ہوئے تیمور نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈالتے ہوئے ایک جاپانی کی جان بچائی اور خود شدید زخمی ہوا۔ دو روز بعد اس نے کھٹمنڈو کے اسپتال میں دم توڑ دیا۔ کوہ پیمائی کی فیلڈ کے لوگ اسے ایک ہیرو کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اسی شیر بچے کا شیر بیٹا۔''

''تیمور حیدر کی بھی تصویر ہے؟'' آنیہ نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''بالکل ہے۔'' نہار بولی اور لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تیمور کی تین چار تصویریں ابھر آئیں۔ اپنے باپ ہی کی طرح کڑیل۔ آنکھوں میں بے خوفی کی باغی چمک اور صندوق جیسا سینہ۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر تک بھی وہ صحت مند اور مضبوط نظر آتا تھا۔ آنیہ نے بڑی محبت اور عقیدت سے اس جانباز کی یہ تصویریں دیکھیں۔

''اور تیمور حیدر کی اولاد؟'' آنیہ نے پوچھا۔

نہار نے ایک فائل میں کچھ تلاش کرنے کے بعد اسے اسکرین پر انلارج کیا اور بولی۔ ''تیمور حیدر کا ایک بیٹا اور بیٹی تو یورپ میں کہیں سیٹل ہیں۔ دوسرے بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں راجوری کے علاقے میں

ہے اور کسی اخبار یا چینل وغیرہ سے وابستہ ہے۔ میں کوشش کررہی ہوں کہ اس کے بارے میں درست جانکاری مل سکے۔ جیسے ہی مجھے کچھ پتا چلا، میں تمہیں انفارم کروں گی۔ ہوسکتا ہے کہ میرے دہلی سے واپس آنے تک کوئی کلیو مل جائے۔''

نہار کور اور آنیہ کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو بے حد دلچسپ اور معلومات افزا رہی تھی۔ آنیہ کے لیے تو یہ سب کچھ ایک دفینہ دریافت کرنے جیسا تھا۔ بالآخر اس تصویر سے منسلک لوگ پردۂ اخفا سے باہر نکلے تھے جو سو سال پہلے آنیہ کے جدِامجد نے جلیانوالا باغ میں اپنے کوڈک کیمرے سے اتاری تھی اور جو اَب تک ایک تہ خانے میں رکھے البم میں دبی ہوئی تھی۔

آنیہ نے اپنے اسمارٹ فون پر ایک بار پھر وہ کہنہ تصویر دیکھی۔ زخمی باپ کے اوپر گرے ہوئے دلیر بچے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک مظلوم کی آنکھیں، جن میں نظر آنے والے غیظ و غضب نے اور مزاحمت کی چمک نے اس تصویر کو بے مثال بنا دیا تھا۔ آنیہ نے تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور بہ زبانِ خاموشی کہا۔ آخر میں نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔

☆☆☆

تصویر والا شیر بچہ اب صرف شیر بچہ نہیں تھا۔ آنیہ کو اس کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے اوراق زندگی اس کے سامنے کھل چکے تھے۔ اس کا نام اسد اللہ تھا۔ اس نے ایک انگریز منیجر کو قتل کیا تھا اور آزادی کے بعد مشرقی پنجاب کے ہی کسی شہر میں اپنی باقی زندگی گزاری تھی۔ مگر اسد اللہ کی موجود نسل کے بارے میں ابھی تک نہار کور اور آنیہ کو کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا تھا۔ دو روز پہلے نہار سے آنیہ کی ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی۔ اس سے آنیہ کو بس اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ کنچن جنگا میں جاں بحق ہونے والے کوہ پیما تیمور حیدر کی اولاد میں سے ان کا صرف ایک بیٹا یہاں انڈیا میں ہے اور صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ان دنوں وہ ہماچل سے آگے کہیں ضلع راجوری میں رہائش پذیر ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے کسی شعبے سے وابستہ ہے۔

آنیہ ہمیشہ سے فینٹسی پر یقین رکھنے والی لڑکی تھی۔ اب یہ بھی ایک طرح کی فینٹسی ہی تھی کہ وہ اس نسل کے کم از کم کسی ایک فرد سے ضرور ملنا چاہتی تھی، بالمشافہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ ایک بھوت سا تھا جو اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔

ایک دن جیسے بیٹھے بیٹھے کسی نے اس کے کان میں پھونک ماری اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ماما ٹی وی دیکھ رہی تھیں، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''کیا ہوا آنو؟''

''ماما! میں ''راجوری'' جارہی ہوں، کل صبح۔''

''ہائیں! دیوانی ہوگئی ہے۔ راجوری کیوں جانے لگی تو؟ اور وہاں کیا کام ہے تجھے؟''

''آپ کو بتایا تو تھا کہ ایک آرٹیکل لکھ رہی ہوں، اس کے لیے وہاں جانا ضروری ہے شاید ایک دو دن رکنا بھی پڑے۔''

''آنو..... آنو! کچھ ہوش کے ناخن لے۔ یہ آرٹیکل شارٹیکل والا خناس دماغ سے نکال دے۔ کچھ ڈھنگ کی باتیں سوچ..... اور میں تو تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ اب باقی کی پڑھائی بھی باجی کے گھر جا کر، کر لینا۔ وہ لوگ خود تعلیم کو اہمیت دینے والے ہیں۔ وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی تجھے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' آنیہ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ تعلیم کو بہت اہمیت دیتا ہے خالہ کا گھرانا اسی لیے سب بچوں کو تعلیم کے زیور سے لاد رکھا ہے۔''

''آنو! بہت زبان چلانے لگی ہے تو..... یہ نہ ہو کہ میں بھی سخت بولنے پر مجبور ہو جاؤں اور میں صاف بتا دوں..... یہ تمہارا راجوری والا پروگرام بالکل نہیں چلے گا۔ اگر جانا ہی ہے تو پہلے پاپا سے مشورہ کرو اور اگر وہ اجازت دیں تو پھر کسی اور دن کے لیے رکھ لو۔''

وہ اٹھلا کر بولی۔ ''پاپا سے اجازت تو سمجھیں مل ہی گئی ہے..... لیکن..... آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں کہ پروگرام کسی اور دن کا رکھ لو۔''

وہ ٹی وی آف کرتے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں بولیں۔ ''کل تیری خالہ مریم کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آنا ہے۔ تمہارے خالو امجد بھی ساتھ ہوں گے۔''

''کس لیے آنا ہے؟'' آنیہ نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور تنک کر بولی۔

''بھئی! تھوڑی بہت بات کرنی ہے انہوں نے تمہارے پاپا سے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ باجی مریم بیمار رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جلد از جلد فرحان کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ وہ تو اسی سال کی بات کر رہی ہیں لیکن میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ ابھی ڈیڑھ دو سال کا وقت تو انہیں نکالنا ہی پڑے گا۔''

وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''پلیز ماما! ابھی میرا

شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ ابھی آپ میرے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہ کریں۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنے دیں۔ میں نے پاپا سے بھی اس بارے میں بات کی تھی۔ وہ مجھ سے ایگری ہیں.....''

''لیکن آنو! یہ بھی تو سوچو کہ.....''

''پلیز..... پلیز۔'' اس نے تیزی سے کہا اور بات بدل کر بولی۔ ''باقی رہی جانے کی بات، وہ تو مجھے کل ہر صورت جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ میرا سارا پہلا کام ضائع ہو جائے گا ماما! آپ نے پاپا سے ''پرمیشن'' کی بات کی ہے تو میں اُن سے لے لوں گی۔''

''کیسے لے لوگی۔'' وہ ذرا غصے سے بولیں۔ ''اکیلی جانا چاہ رہی ہو ناں؟''

''ابھی تو یہی ارادہ ہے۔ ویسے ہوسکتا ہے کہ میری ایک فرینڈ بھی ساتھ چل پڑے۔ آپ اس پرمیشن والے مسئلے کو مجھ پر چھوڑ دیں۔'' اس نے کہا اور اپنے بالوں کو جُوڑے کی صورت میں سمیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ماما کی بات پر اس کا دماغ کھول کر رہ گیا تھا۔ فرحان کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ماما اس سلسلے میں جتنا زور دیتی تھیں، اس کا دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا تھا۔ باقی پاپا سے اجازت لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ اجازت لے ہی چکی تھی۔ اس نے پاپا کو البم کی تصویر کے حوالے سے ہونے والی ساری پیش رفت سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ شاید اسے اس سلسلے میں دو چار دن کے لیے کسی دوسرے شہر جانا پڑے۔ انہوں نے نیم رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ ماما ان کو فون کر کے قائل کرنے کی کوشش کرتیں۔ آنیہ نے سوچا کہ وہ خود پاپا کو آفس میں فون کر لیتی ہے۔

اسی سہ پہر آنیہ ایک بار پھر امرتسر میں نہار کور کے پاس تھی۔ نہار کور نے ان دنوں لائبریری سے آٹھ دس روز کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ لہٰذا دونوں کی ملاقات نہار کور کے گھر واقع رنجیت کالونی میں ہوئی۔ آنیہ نے نہار کو بتایا کہ وہ دو چار دن کے لیے راجوری جانا چاہ رہی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ اسد اللہ حیدر کی موجودہ نسل کے بارے میں معلومات حاصل کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ اسد اللہ کے اس پوتے کا کھوج لگانے میں ہی کامیاب ہو جائے جو اطلاعات کے مطابق راجوری ہی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

آنیہ کا ارادہ جان کر نہار کی آنکھوں میں بھی ایک تفریحی موڈ دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ ''آنیہ جانی، تم راجوری میں رہو گی کہاں؟''

''یوتھ ہاسٹل میں رہ لوں گی..... نہ ہوا تو ہوٹل تو ہیں ہی۔''

''راجوری میں میرے ایک ماموں بھی رہتے ہیں۔ بڑی خوش باش پرسنالٹی ہے، اگر تم چاہو تو اُن کے گھر بھی قیام کر سکتی ہو۔''

آنیہ بولی۔ ''میں اکیلی کیسے قیام کر سکتی ہوں یا تو پھر..... تم بھی ساتھ چلو۔ دو چار دن اچھے گزر جائیں گے۔ ویسے بھی ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔''

نہار کور ایک دم سوچ میں پڑ گئی۔

اس کے چہرے پر نیم رضامندی کی جھلک دیکھ کر آنیہ نے فوراً زور دیا۔ ''ڈیئر! تم نے چھٹیاں بھی لے رکھی ہیں۔ کیا گھر میں پڑی پڑی بور ہوتی رہو گی۔ دونوں چلتے ہیں۔ بڑا مزہ رہے گا۔ ویسے بھی یہ تمہاری فیلڈ کا کام ہے۔ ہم تصویر والے شیر بچے کی موجودہ نسل کے بارے میں جاننے کی دلچسپ کوشش کر رہے ہیں۔''

پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد آنیہ کامیاب رہی۔ اس نے نہار کو اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کر لیا۔ نہار نے فون پر اسی وقت اپنے ماموں دلبر سنگھ کو اطلاع دے دی کہ وہ اپنی ایک دوست کے ہمراہ کل شام تک ان کے پاس پہنچ رہی ہے۔ انہوں نے بہت خوشی محسوس کی۔

نہار کور کا گھر ایک گنجان آبادی میں تھا۔ (وہ اس گھر میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی) دونوں اس وقت گھر کی دو منزلہ چھت پر بیٹھی تھیں۔ یہاں سے مشہور جلیانوالا باغ کا فاصلہ ایک ڈیڑھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ باغ کی باقیات اور وسیع احاطے کی کچھ جھلکیاں چھت سے بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ مخالف سمت میں کچھ فاصلے پر اس آبادی کے خدوخال دکھائی دیتے تھے جہاں ہونے والا ایک واقعہ اس المناک سانحے کا سبب بنا تھا۔ انگلش مشنری کی ایک انگریز ٹیچر بائیسکل پر ایک گلی سے گزر رہی تھی۔ پورے امرتسر میں فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ شروڈ نامی یہ ٹیچر بے خبر تھی کہ وہ بھی اس آگ کی زد میں آنے والی ہے۔ مقامی لوگوں کے ایک مشتعل گروپ نے اس انگلش لیڈی کو بائیسکل سے گرا کر پکڑ لیا اور بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ لیڈی کو نہایت نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ تشدد کی یہی لہر اس دورانیے میں قریباً 20 ہندوستانیوں اور 5 یورپین کو نگل چکی تھی۔ یہ سارے واقعات جلیانوالا کے قتل عام سے تین روز

پہلے دس اپریل کو ہوئے تھے..... (لیڈی شروڈ کو بعد ازاں بچالیا گیا تھا)

چھت کے اوپر سے ہی نہار کور نے دور اس گلی کی نشاندہی کی جہاں لیڈی شروڈ والا واقعہ ہوا تھا اور انگریز انتظامیہ نے اہلِ محلہ کو سزا کے طور پر حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں میں آنے جانے کے لیے اس گلی میں سے پیٹ کے بل رینگ کر گزریں گے۔

نہار کور کی معلومات اس حوالے سے وسیع تھیں۔ سو سال پہلے کے وہ سارے اندوہناک واقعات پوری جزئیات کے ساتھ آنیہ کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔

پھر دونوں دوست گھر سے نکلیں اور پیدل ہی چلتی ہوئی جلیانوالا باغ کے بیچ و خم میں پہنچ گئیں۔ نہار کور نے ایک گنجان گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''آنیہ! یہی وہ گلیاں تھیں جہاں سے گزر کر ہزاروں لوگ جلیانوالا باغ کے اندر جمع ہوئے تھے۔ وہ سب نہتے تھے۔ وہ صرف اپنا احتجاج ریکارڈ کرانا چاہتے تھے۔ ان میں جوان ہی نہیں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ وہ سب بے خبر تھے کہ جنرل ڈائر نام کا درندہ ان پر کیا ستم ڈھانے والا ہے، نہار کور کی آواز بھرا گئی۔

''اور وہ سامنے والی گلی کے موڑ پر کیا بورڈ لگا ہوا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''یہ وہ گلی تھی جہاں سے جنرل ڈائر مسلح سپاہیوں کے جتھے کے ساتھ باغ کی چار دیواری میں داخل ہوا تھا۔ وہ ہتھیارا تھا اور اس کے سر پر خون سوار تھا۔ تاریخ کے پنّوں پر اس کا نام ہمیشہ کے لیے سیاہ حرفوں میں لکھا جانے والا تھا۔''

وہ دونوں باغ کے اندر داخل ہو گئیں۔ آنیہ یہاں پہلے بھی دو تین بار آچکی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی آج وہ یہاں کے سارے مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ دیواروں پر گولیوں کے بے شمار نشانات..... وہ بلند جگہ جہاں سے فائرنگ شروع کی گئی، وہ اندھا کنواں جس میں سیکڑوں خوف زدہ لوگوں نے جانیں بچانے کے لیے چھلانگیں لگائیں اور پھر باغ کے وہ تنگ راستے جہاں سے بیک وقت سیکڑوں لوگوں نے نکلنے کی کوشش کی اور قریباً دس منٹ تک ہونے والی وحشیانہ فائرنگ کا شکار ہوئے۔

باغ کے وسط میں کھڑے کھڑے آنیہ نے نانک چندی اینٹوں کی ایک دیوار پر لگا ہیں جمائیں اور سوچا..... شاید یہی وہ جگہ ہوگی جہاں اسد اللہ حیدر نے اپنے زخمی باپ کو اپنے جسم سے ڈھانپا تھا اور پھر اسے مزید نقصان سے بچانے کے لیے مسلح سپاہی پر جھپٹا تھا۔

''نہار! تم نے مجھے اسد اللہ کے زخمی والد تاج محمد کے بارے میں نہیں بتایا، وہ بچ گیا تھا ناں؟''

''بچ تو گیا تھا آنیہ جانی، لیکن زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکا۔ اس کے پیٹ کے اندرونی عضلات بُری طرح گھائل ہو گئے تھے۔ وہ قریباً ڈیڑھ سال زندہ رہا لیکن تقریباً بیماری کی حالت میں ہی رہا۔ اب ذرا سوچو اس سانحے میں مرنے والوں کے جو اعداد و شمار انگریز بتاتے ہیں، وہ کس طرح درست ہو سکتے ہیں۔ قریباً پندرہ سو لوگ گھائل ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک مہینوں تک زیرِ علاج رہنے کے بعد اس جہاں سے چلے گئے۔''

آنیہ نے وہیں کھڑے کھڑے تصور ہی تصور میں سو سال پہلے کی المناک آوازیں سنیں۔ فائرنگ کی گونج..... چلّانے کی صدائیں، آہ و بکا، بھگدڑ..... للکارے، مرمٹنے والوں کا غیظ و غضب۔ ایسا نہیں تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ سب بھاگتے ہی رہے ہوں گے، ان میں سے کچھ زخم کھا کر پلٹے بھی ہوں گے..... کچھ نے اپنے پیاروں کو خونچکاں ہو کر گرتے دیکھا ہوگا اور بے ساختہ اس جانب بڑھنے کی کوشش کی ہوگی جہاں قاتلوں نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی ہوں گی۔ وہ پہنچ نہیں سکے ہوں گے، وہ بھی راستے میں گر گئے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں چمکنے والی چنگاریوں کو موت کی سیاہی نے ڈھانپ لیا ہوگا۔

پھر آنیہ کو یوں لگا جیسے سو سال پہلے کا وہ منظر جیتی جاگتی شکل میں اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔ اس نے چھوٹی اینٹوں کی دیوار کے پاس اسد اللہ کو زخمی باپ سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈرا ہوا تو تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک بجلی چمکتی تھی اور ایک للکارا گونجتا تھا۔ تم ظلم ہو تو میں بغاوت ہوں۔ تم جبر ہو تو میں ایک دیوانی مزاحمت ہوں۔ میں اپنی ہمت طاقت کے مطابق تمہیں روکنے کی کوشش ضرور کروں گا.....

نہار نے آنیہ کا کندھا ہلایا تو وہ جیسے اپنے ٹرانس سے باہر آئی..... اور کھوئی کھوئی نگاہوں سے اس سورج کو دیکھنے لگی جو آہستہ آہستہ بلند گھروں کی اوٹ میں اوجھل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز آنیہ اور نہار کور جالندھر سے بذریعہ بس راجوری جا رہی تھیں۔ سڑک تھی NH44..... انہیں ہماچل پردیش کے اندر سے ہوتے ہوئے ایک بس بدل کر راجوری

پہنچنا تھا۔ دونوں کے پاس ایک ایک چھوٹا ٹرالی اٹیچی کیس تھا جو بس کے سامان کے خانے میں رکھا تھا۔ مارچ کی وہ پربہار صبح بڑی چمکیلی اور سہانی تھی۔ ہماچل پردیش کے خوب صورت پہاڑی نظاروں نے آنیہ کو کچھ دیر کے لیے اپنے اندر جذب کرلیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے کہیں کھوسی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں کچھ نیا ہونے والا ہے۔ نیا اور انوکھا..... وہ ایک کہانی کو کھوجتے نکلی تھی اور شاید اس کے ساتھ ساتھ کوئی کہانی بھی جنم لے رہی تھی۔

یہ قریباً 370 کلومیٹر کا سفر انہوں نے ساڑھے سات آٹھ گھنٹے میں طے کیا۔ شام چھ بجے کے لگ بھگ وہ راجوری کے خوب صورت و پُرسکون قصبے میں پہنچ گئیں، جسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ شہر بھی کہا جاسکتا تھا۔ سرسبز پہاڑی نشیب و فراز نے اس دلکش بستی کا احاطہ کررکھا تھا..... ایک چمکیلا دریا اس کے مضافات کو چھوتا ہوا گزرتا تھا۔ دریا کے پل کو پار کرکے وہ شہر میں داخل ہوئیں۔ نہار کور کے ماموں دلبر سنگھ انہیں ریسیو کرنے کے لیے بس اسٹینڈ پر ہی موجود تھے۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ جسم فربہ تھا۔ تاہم اچھی صحت اور خوش باش چہرے کے سبب پینتالیس پچاس کے لگ بھگ نظر آتے تھے۔ وہ قدیم اور جدید کا امتزاج تھے۔ سر پر پگڑی اور پہلو میں کرپان تھی، تاہم لباس ٹی شرٹ اور جینز پر مشتمل تھا۔ حسبِ توقع انہوں نے تپاک سے دونوں لڑکیوں کا استقبال کیا۔

''جی آیاں نوں، ست بسم اللہ۔ میری پُتریاں آئی ہیں۔'' انہوں نے باری باری دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نہار کو گلے سے بھی لگایا۔

ایک درمیانی عمر کا ملازم جو شکل سے مسلمان نظر آتا تھا، ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ دلبر صاحب نے اسے مخاطب کیا۔ ''چل اوئے خیرو، ٹک ٹک کیا دیکھ رہا ہے۔ دھی رانیوں کا سامان پکڑ۔''

خیرو آگے بڑھا مگر دونوں نے منع کردیا اور خود ہی ٹرالی اٹیچی کیس کھینچتی ہوئی ماموں دلبر سنگھ کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔

دلبر صاحب نان اسٹاپ باتیں کرتے تھے اور بڑی اچھی باتیں کرتے تھے۔ گھر تک پیدل پہنچنے میں انہیں دس منٹ سے کم ہی لگے مگر اس دوران میں انہوں نے دو تین گھنٹوں کی باتیں کرلیں۔ وہ اس بات پر سخت ناراض تھے کہ وہ دونوں صرف تین چار روز کا پروگرام لے کر کیوں آئی ہیں۔ انہوں نے نہار کو بے تکلفی کے ساتھ گدی سے دبوچتے ہوئے کہا۔ ''بچو نگڑی، پردیہنا آتا اپنی مرضی کے نال ہے پر جاتا میزبان کی مرضی کے نال ہے۔ میں تمہیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا۔''

نہار نے کہا۔ ''ماما جی! آنیہ کی ماں بڑی سخت ہیں، وہ تین روز سے زیادہ کی اجازت نہیں دیں گی۔''

وہ چھاتی پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''میں اس کی ماں سے زیادہ سخت ہوں اور جو پیار والی سختی ہوتی ہے ناں یہ بڑوں بڑوں کو رام کردیتی ہے۔ میں بہن جی سے فون پر بات کروں گا۔''

نہار کور کے ماموں کا دو منزلہ گھر ایک صاف ستھری بارونق آبادی میں تھا۔ چار پانچ کمرے نیچے، تین چار اوپر تھے۔ کشادہ گیراج بھی تھا جس میں نیلے رنگ کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ دس سال پہلے اپنی پتنی کے گزرنے کے بعد سے دلبر صاحب یہاں اکیلے ہی رہتے تھے۔ بس پرانا ملازم خیروان کے ساتھ تھا۔ نہار نے بتایا تھا کہ ماموں کچھ عرصہ انڈین آرمی میں بھی رہے ہیں مگر پھر آرمی چھوڑ دی اور امرتسر سے یہاں آکر آباد ہوگئے۔ ایک بڑا پلاٹ ان کے پاس تھا۔ اس پلاٹ پر انہوں نے ایک چھوٹی سی مارکیٹ بنالی، اس مارکیٹ کے کرائے سے ان کی گزر بسر بہ آسانی ہورہی تھی۔

ڈنر زبردست تھا اور چائنیز تھا۔ نہار نے ذرا حیران ہوکر کہا۔ ''ماما جی! یہ کیا؟ آپ نے چائنیز منگوالیا۔ آپ تو دیسی کے دیوانے ہیں۔ کڑاہی گوشت، چانپیں، بھاجی پلاؤ وغیرہ؟''

''دھی رانی، آج کل ذرا ڈائٹنگ کررہا ہوں۔ چائنیز کے دو فائدے ہیں۔ تم خوش ہوکر کھاؤ گی، تے میں کم کھاؤں گا۔''

بہرحال عملاً ایسا نہیں ہوا۔ کم کھاتے کھاتے بھی دلبر ماموں کافی کچھ سمیٹ گئے۔ آنیہ سوچنے لگی۔ اگر یہ ڈائٹنگ پر نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔

کھانے کے بعد گفتگو کا دور ہوا۔ دلبر ماموں نے خیرو سے کہا۔ ''یار! تم کیا پھٹے پرانے جھنڈے کی طرح کھڑے لہرا رہے ہو، ہم باپ بیٹیوں کو ذرا کل بات کرنے دو۔''

وہ مسکراتا ہوا رخصت ہوگیا۔ مالک اور ملازم ہونے کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی بے تکلفی تھی۔ اچنبھے کی بات یہ بھی تھی کہ خیرو مسلمان تھا۔

دلبر ماموں نے کہا۔ ''اب ذرا کھل کر بتاؤ کہ دھی

رانیاں صرف سیر سپاٹے کے لیے آئی ہیں یا فیر کوئی مشن وغیرہ بھی ہے؟''

نہار نے مسکرا کر کہا۔ ''بس، ماماں جی! چھوٹا سا مشن بھی ہے۔''

''کسی منڈے کو قتل شتل تو نہیں کرنا؟'' وہ شوخ لہجے میں بولے۔

نہار پھر زور سے ہنسی، آنیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ''نہیں ماماجی، قتل تو نہیں کرنا کسی کو..... لیکن..... بہت عرصہ پہلے قتل ہونے والے کسی بے گناہ کی آل اولاد کا کھوج ضرور لگانا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے نہار سنجیدہ ہوگئی۔

''کیا سچی مچی کوئی قتل ہوا ہے؟'' نہار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کب کی بات ہے؟'' دلبر ماموں نے پوچھا۔

''سو سال پہلے کی..... پورے سو سال۔'' نہار نے 2019ء کے کیلنڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں پُتّری۔''

آنیہ نے طویل سانس لی اور گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم جلیانوالا کی بات کر رہے ہیں انکل جی! جلیانوالا اور امرتسر.....''

دلبر ماموں کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ بھی ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگے۔ انہوں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں اک قتل تو نہیں ہوا تھا دھی رانیو، سیکڑوں ہوئے تھے اور دیکھو، ہوئے بھی کس موقع پر تھے..... بے ساکھی کے موقع پر..... میری ماتا کہا کرتی تھی، تمہارے اک دور کے رشتے دار بھی جلیانوالا میں شہید ہوئے تھے، گھر سے بے ساکھی منانے نکلے اور لاش بن کر آگئے۔''

جلیانوالا کا ذکر شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا۔ نہار کور اور آنیہ نے دلبر ماموں کو اپنے یہاں آنے کا مقصد بتایا۔ وہ تصویر بھی دکھائی جس کا عنوان ''شیر بچہ'' تھا اور جس کے مستقبل کا سراغ لگاتے لگاتے وہ دونوں یہاں آپہنچی تھیں۔

آخر میں نہار نے کہا۔ ''ماماجی! تیمور حیدر ایک کوہ پیما تھے۔ وہ 2003ء میں ایک جاپانی کی جان بچاتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا یہیں کہیں راجوری ڈسٹرکٹ میں ہے، کسی اخبار یا نیوز چینل کے لیے کام کرتا ہے۔ جہاں تک میری جانکاری ہے اس کا نام شہاب حیدر یا شہباز حیدر ہے۔ ہم اسی کو کھوجنا چاہتے ہیں۔ اس کے کھوج سے ہی ہمارا آرٹیکل مکمل ہوگا۔''

دلبر ماموں خوش ہوئے کہ ان دونوں کی اس کاوش کے ڈانڈے جلیانوالا باغ کے تاریخی واقعے سے جا کر ملتے ہیں۔ انہوں نے دونوں کو ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔

☆☆☆

دوسرے روز دلبر ماموں کو ایک تاریخ پر جانا تھا۔ انہوں نے اپنی نیلی سوزوکی گاڑی نہار کور اور آنیہ کے حوالے کر دی۔ اس کے علاوہ ملازم خیرو کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ تینوں سب سے پہلے ائرپورٹ کے قریب ایک لوکل ہندی اخبار کے دفتر پہنچے اور اپنے مطلوب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ کچھ خاص پتا نہیں چلا۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی کا رخ ایک بڑے چینل کے زونل آفس کی طرف کر دیا۔ یہاں تھوڑی سی پیش رفت ہوئی۔ انہیں پتا چلا کہ مطلوبہ نوجوان کا اصل نام شہباز حیدر ہے تاہم اسے صحافتی حلقوں میں شہابی حیدر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شہابی حیدر نے کچھ عرصے تک اس چینل میں بھی کام کیا تھا لیکن اب چھوڑ چکا تھا۔ یہاں آنیہ اور نہار نے شہابی حیدر کی ایک دو تصویریں بھی دیکھ لیں۔ آنیہ اور نہار کو لگا کہ انہوں نے ''شیر بچے'' کے پوتے کے بارے میں جیسا سوچا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔ دراز قد، چوڑے شانے، روشن پیشانی، مردانگی اس کے پورے سراپا میں رچی بسی نظر آتی تھی۔ وہ کہیں آتشزدگی کے مقام پر مائیک تھامے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں شعلوں کی سرخی منعکس ہو رہی تھی۔

اگلا روز بڑا کارگر ثابت ہوا۔ صبح سویرے ہی انہیں پتا چل گیا کہ معروف کوہ پیما تیمور حیدر کا بیٹا اور ''شیر بچے'' کا پوتا، شہابی حیدر دہلی کے ایک انگلش نیوز چینل سے وابستہ ہے اور راجوری ڈسٹرکٹ میں چینل کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ آج کل یہاں سینئر فیلڈ رپورٹر کے طور پر بھی کام کر رہا تھا۔ دوپہر تک اس کی رہائش کا ایڈریس بھی آنیہ اور نہار کو معلوم ہوگیا۔

آنیہ بے حد ''ایکسائٹڈ'' تھی۔ بالآخر وہ شیر بچے (اسداللہ) کی موجودہ نسل کا کھوج لگانے میں کامیاب رہی تھی۔ اب وہ اس نسل کے ایک فرد سے ملنے جا رہی تھی۔

دوپہر کے تھوڑی دیر بعد آنیہ اور نہار دلبر ماموں کی سوزوکی کار میں سوار کنجی بادشاہ زیارت کے قریب شہابی حیدر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔ شہابی حیدر سے ملاقات کے حوالے سے ان کا ایک پروگرام تھا لیکن جب وہ موقع پر پہنچیں تو ساری پلاننگ دھری رہ گئی۔ وہاں پہلے سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک بڑی کوٹھی جس کی پیشانی پر ''زباب منزل'' کی تختی لگی ہوئی تھی، ان کے سامنے تھی۔ کوٹھی کے

سامنے درجنوں لوگ جمع تھے۔ بہت سے راہ گیر بھی وہاں رک گئے تھے۔ کوئی زوردار جھگڑا چل رہا تھا۔ نہار اور آنیہ نے کار کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی چل کر موقع پر پہنچیں۔ انہوں نے شہابی حیدر کو پہچان لیا۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور چہرہ لال بھبھو کا ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر، مسکین صورت عورت کو کندھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ گرجا۔ ''میں کہتا ہوں اماں جی! آپ اندر چلیں، میں دیکھ لوں گا ان کو..... اندر چلیں آپ۔''

وہ دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت کو کھینچتا ہوا کوٹھی کے گیٹ کے پاس لے آیا۔ اس کے ایک دو مددگار، ادھیڑ عمر عورت کو اندر لے گئے۔ اسی دوران میں بڑی توند والا ایک شخص آگے بڑھا اور کڑک کر بولا۔ ''شہابی! یہ تو اچھا نہیں کر رہا۔ ہم تمہیں اس طرح نہیں کرنے دیں گے۔ چھوکری اور چھوکرے کو باہر نکال، نہیں تو ابھی تماشا لگ جائے گا۔ میں پورا جلوس لے کر آجاؤں گا۔''

شہابی دہاڑا۔ ''تو لے کر آ جلوس..... میں دیکھ لوں گا تجھے اور تیرے چمچوں کڑچھوں کو بھی۔''

''حرامزادے..... مورکھ..... تیری ساری پھنّے خانی اور ''اینکری'' تیری ناک کے راستے نہ نکال دی تو ٹھیکیدار نام نہیں میرا۔''

گالی پر شہابی اور مشتعل ہوا۔ وہ خطرناک انداز میں توند والے ٹھیکیدار کی طرف بڑھا۔ ٹھیکیدار کا ایک ہٹا کٹا ساتھی شہابی کے راستے میں آیا۔ شہابی نے بے دریغ اس کے چہرے پر مُکّا رسید کیا۔ وہ الٹ کر دوسرے لوگوں پر جا گرا۔ ''سؤر کے بچے..... باسٹرڈ! تیری گندی زبان کھینچ لوں گا۔'' شہابی پھر توند والے نیم گنجے شخص پر دہاڑا اور اس کی طرف لپکا۔ شہابی کے دو تین ساتھیوں نے شہابی کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ ان کی گرفت سے نکل نکل جا رہا تھا۔ دوسری طرف فربہ اندام ''ٹھیکیدار'' بھی چلّا رہا تھا۔ اس کا ایک دبلا پتلا ساتھی اسے مخاطب کر کے بولا۔ ''ٹھیکیدار جی! اس خبیث کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ پولیس کو بلائیں۔''

''ہاں، ہاں بلاؤ۔ ابھی بلاؤ بلکہ میں خود فون کرتا ہوں۔ تمہاری بدمعاشی اب عدالت کے کٹہرے میں جائے گی۔'' شہابی گرجا۔

دونوں طرف کے کئی افراد بیچ میں پڑ گئے اور معاملے کو مزید بگڑنے سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ٹھیکیدار اور اس کے ساتھی قدرے ٹھنڈے نظر آئے۔ وہ دھمکیاں دیتے ہوئے اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے۔

آنیہ اور نہار کو رنے بہتر سمجھا کہ اب وہ واپس ہی چلی جائیں۔ شہابی حیدر سے ملاقات شام کو یا پھر کل کسی وقت بھی کی جا سکتی تھی مگر جب وہ اپنی گاڑی کی طرف آئیں تو گاڑی کے پیچھے کوئی اور بندہ اپنی کار پارک کر گیا تھا۔ انہوں نے دو چار منٹ انتظار کیا پھر اپنی کار کا ہارن دینے لگیں۔ کوئی نمودار نہیں ہوا۔ شہابی اور اس کے تین چار ساتھی اب بھی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے موجود تھے۔ وہ دونوں لڑکیوں کو پریشان دیکھ کر ان کی طرف چلے آئے۔

نہار نے شہابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی یہ کار پارک کر گیا ہے جی یہاں۔''

''بڑے بے پروا لوگ ہوتے ہیں۔ گاڑیاں مل جاتی ہیں مگر سڑک پر چلنے کے طور طریقے نہیں آتے۔'' شہابی حیدر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''شیر بچے'' کے پوتے کی آواز سن کر اور اسے اتنا قریب پا کر آنیہ کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جھگڑے کا جو سین ملاحظہ کیا تھا، وہ بھی عین حسبِ حال تھا اور شہابی حیدر کی جرأت مندی اور طور اطوار کی عکاسی کرتا تھا۔

شہابی نے ساتھیوں سے کہا کہ وہ آس پاس کار کے مالک کو دیکھیں..... بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والے ایک نوجوان نے کہا۔ ''او چھوڑو جی! گاڑی کو اٹھا کر ایک طرف کر دیتے ہیں بلکہ سڑک کے درمیان رکھ دیتے ہیں۔''

دو تین اور لڑکوں نے ہاں میں ہاں ملائی، اس سے پہلے کہ وہ ایسی کوئی کوشش کرتے، آنیہ نے ہمت کی اور دو قدم چل کر شہابی کے پاس آئی۔ ''آپ شہابی حیدر ہی ہیں ناں؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل ہوں، فرمائیں؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''دراصل..... ہم آپ ہی سے ملنے آئے تھے..... ہم ایک آرٹیکل لکھ رہے ہیں تحریکِ آزادی اور جلیانوالا باغ کے حوالے سے..... آپ سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل سے آپ کا پتا ملا تھا لیکن اس وقت چونکہ..... یہاں اور طرح کی صورتِ حال بنی ہوئی ہے اس لیے سوچا کہ پھر حاضر ہو جائیں گے۔''

شہابی حیدر چند سیکنڈ چپ رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ وہ بولا۔ ''اب آپ آ ہی گئی ہیں، تو پھر آجایئے، اس طرح دروازے سے واپس جانا تو ٹھیک نہیں۔''

آنیہ اور نہار نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

پانچ منٹ بعد وہ دونوں شہابی حیدر کے ساتھ گھر کے سجے سجائے کشادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ یہاں ایک شوکیس میں چند ایک ایوارڈز رکھے تھے اور دیواروں پر کچھ ایسی فریم شدہ تصویریں نظر آرہی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ شہابی حیدر صحافت کے میدان میں کافی سرگرم ہے۔ چند تصویریں کوہ پیمائی کے حوالے سے بھی تھیں۔ ان میں فلک بوس چوٹیاں نظر آتی تھیں، ان تصویروں کا تعلق یقیناً شہابی حیدر کے مرحوم والد تیمور حیدر سے تھا۔

بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والا نوجوان بھی یہاں ڈرائنگ روم میں موجود تھا مگر پھر اس نے شہابی سے اجازت چاہی اور کسی کام سے باہر نکل گیا۔ ایک ملازمہ کولڈ ڈرنک لے آئی۔ آنیہ جیسے کہیں کھوسی گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں کے ساتھ ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ اسداللہ (شیر بچے) کی تصویر کو وجود میں آئے پورے سو سال ہو چکے تھے اور اب اس کا پوتا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یقیناً یہ اس کا پوتا ہی تھا۔

شہابی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں جالندھر سے آٹھ گھنٹے کا سفر کر کے یہاں پہنچی ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ دونوں اصل اور حقیقی موضوع پر آگئیں۔ نہار نے لرزتے ہاتھوں سے اسمارٹ فون کی اسکرین پر شہابی حیدر کو وہ فوٹو گراف دکھائی جو اُن کے یہاں پہنچنے کا سبب بنی تھی۔

شہابی حیدر نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو شاید جلیانوالا باغ کے واقعے کی ہے۔“

آنیہ نے کہا۔ ”بے شک یہ وہیں کی ہے..... لیکن اس تصویر میں جو دو چہرے نظر آرہے ہیں، ان کو شاید آپ نہیں جانتے۔“

شہابی حیدر نے نفی میں سر ہلایا اور ایک بار پھر توجہ سے آنیہ اور نہار کور کو دیکھنے لگا۔ ان دونوں نے بھی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تب نہار نے لمبی سانس لی اور ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”شہابی صاحب! شاید آپ کو یہ سن کر بہت حیرانی ہو کہ اس تصویر میں جو کم سن چہرہ نظر آرہا ہے، وہ آپ کے دادا محترم کا چہرہ ہے، اسداللہ حیدر.....“

شہابی نے ان دونوں پر غیر یقینی نگاہ ڈالی اور تب دوبارہ دھیان سے تصویر کو دیکھنے لگا۔

نہار نے کہا۔ ”اور یہ جو زمین پر زخمی پڑے ہیں، یہ آپ کے پڑدادا ہیں۔“

شہابی حیدر کے چہرے پر بے پناہ حیرت نظر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ ان دونوں کی تصویر ہی ہے؟“

نہار کور نے کہا۔ ”آپ کو پتا ہے ناں کہ آپ کے پڑدادا جلیانوالا میں زخمی ہوئے تھے اور شاید یہ بھی پتا ہوگا کہ آپ کے دادا اسداللہ نے، جو اس وقت دس سال کے تھے، برستی گولیوں میں انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔“

”وہ سب..... ٹھیک ہے..... لیکن یہ تصویر..... مجھے یقین نہیں آرہا۔“

شہابی حیدر کو پوری طرح یقین کرنے اور سمجھنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ تصویر کا پورا سیاق و سباق جاننے کے بعد وہ بھی بے حد جذباتی نظر آنے لگا۔ آنیہ نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ یہ تصویر کیسے اتاری گئی، اب تک کہاں تھی؟ اور کیسے اس تک پہنچی، وغیرہ وغیرہ۔ (آنیہ اور نہار نے اس کلیو کی نشاندہی بھی کی جس نے ان کی تلاش کو آگے بڑھایا تھا۔ یعنی زخمی باپ کے جسم پر نظر آنے والی فوجی قمیص) تصویر کے ساتھ موجود تحریر نے بھی شہابی کو بہت متاثر کیا۔

اس نے تصویر اور تحریر کو اپنے فون میں منتقل کیا۔ پھر جذباتی انداز میں اٹھا اور بولا۔ ”ایکسکیوزمی میں ابھی آیا۔“

وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر اندرونی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس مرتبہ شہابی حیدر کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں۔ دونوں ادھیڑ عمر تھیں۔ ان میں سے ایک بارعب خدوخال اور امیرانہ لباس سے گھر کی مالکن لگتی تھیں۔ پتا چلا کہ وہ شہابی حیدر کی والدہ زباب بیگم ہیں۔ گھر کی پیشانی پر موجود ”زباب منزل“ انہی کے نام سے منسوب تھی۔ دوسری خاتون عام شکل و صورت کی تھیں۔ لباس بھی نسبتاً کم قیمت تھا۔ بہرحال رکھ رکھاؤ ان میں بھی نظر آرہا تھا۔ گھر کی مالکن بڑے تپاک سے ملیں۔ اس سو سال پرانی تصویر نے انہیں بھی بہت حیران کیا تھا۔ وہ آنیہ اور نہار کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ بڑی توجہ سے تصویر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”اگر یہ واقعی میرے شوہر کے محترم والد کی تصویر ہے تو ہم سب کے لیے بے حد اہم ہے۔“

سادہ لباس والی دوسری خاتون بھی اشتیاق سے تصویر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ اپنی مالکن کے پہلو میں کھڑی تھیں، بولیں۔ ”میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ تیمور صاحب کے والد اسداللہ صاحب کی ہی تصویر ہے۔ آپ نے بھی تو ان کے لڑکپن کی تصویریں دیکھی ہوئی ہیں۔ یہ وہی

ہیں۔"

زباب بیگم نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "یہ تو ایک بڑی دریافت ہوگئی ہمارے لیے..... کیوں شہابی؟" انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

شہابی کی کشادہ پیشانی پر بالوں کی لٹیں تھیں اور وہ بھی جیسے کھو سا گیا تھا۔

"امی! یہ تصویر کے نیچے والی تحریر بھی پڑھیں۔" وہ بولا۔

ماں، بیٹا سر جوڑ کر فون کی اسکرین سے تحریر پڑھنے لگے۔ ان کے عقب میں کھڑی دوسری خاتون بھی موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مالکن کی طرح ان کی عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ تھی، ان کو شہابی، آیا خالہ کہہ کر پکار رہا تھا۔

اس فیملی کے لیے یہ سب کچھ بہت دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ زباب بیگم نے بھی آنیہ اور نہار سے اس ساری تگ و دو کے سلسلے میں سنا جو اُن دونوں نے اس تصویر کے ساتھ یہاں تک پہنچنے کے لیے کی تھی۔ شہابی حیدر بھی آرام سے بیٹھا یہ گفتگو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے کوٹھی سے باہر ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا تھا، تاہم اس جھگڑے کے سبب کسی طرح کا تناؤ یا تفکر شہابی کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر بعد شہابی کے موبائل فون پر ایک کال آگئی۔ اس کے چہرے پر سرخی جھلکی اور وہ کشادہ ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں جا کر فون پر بات کرنے لگا۔ آنیہ اور نہار کو اندازہ ہوا کہ یہ گفتگو اسی جھگڑے کے سلسلے میں ہے۔

نہار نے ذرا جھجکتے ہوئے زباب بیگم سے پوچھا۔

"آنٹی جان! یہاں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "جھگڑا تو کسی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ سراسر بدمعاشی ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں، جب لڑکا لڑکی بالغ ہیں، راضی ہیں تو پھر یہ لوگ کون ہوتے ہیں انہیں ایک دوسرے سے دور کرنے والے، یہ پکی بات ہے۔ ان خبیثوں کا ارادہ ان دونوں کو مارنے کا ہے۔"

"ہاں جی، باہر کچھ باتیں تو ہم نے بھی سنی ہیں۔ وہ لوگ کسی لڑکی کو باہر نکالنے کا کہہ رہے ہیں۔"

"لڑکی ہے اور اس کا شوہر بھی ہے، دونوں نے اپنی مرضی سے کورٹ میں نکاح کیا ہے، دونوں مسلمان ہیں۔ لڑکی کا باپ پکا مسلمان کہلاتا ہے مگر جس طرح کی باتیں کر رہا ہے، وہ اسلام میں کہیں نہیں ہیں۔ ہمیں پکا پتا ہے، صبح کے بہانے یہ لوگ لڑکی لڑکے کو یہاں سے لے جائیں گے اور ان کے ساتھ کچھ بُرا کر گزریں گے۔"

"یہ بڑی توند والا ٹھیکیدار کون ہے۔ وہ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا تھا؟" آنیہ نے دریافت کیا۔

لڑکی کا باپ سلیم احمد اسی کے پاس فورمین کے طور پر کام کرتا ہے۔ بلکہ ٹھیکیدار کا سارا کام اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹھیکیدار اس طرح بڑھ چڑھ کر سلیم کی حمایت کر رہا ہے لیکن اب یہ سب کچھ بیٹے شہابی کے علم میں آگیا ہے۔ وہ اس طرح ان کی سینہ زوری نہیں چلنے دے گا۔" زباب بیگم نے ہال کمرے کے گوشے میں کھڑے شہابی حیدر کی طرف دیکھا جو ابھی تک فون پر گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔

زباب بیگم نے نہار کور اور آنیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ، میں تمہیں دکھاؤں ان دونوں بچوں کو۔ بالکل سیدھے سادے ہیں، کیا زندہ رہنا ان کا حق نہیں ہے۔"

زباب بیگم نہار اور آنیہ کو لے کر ایک قالین پوش راہداری سے گزریں اور پھر ایک کشادہ کمرے میں پہنچیں۔ آیا خالہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ کمرے میں ایک لڑکا اور لڑکی ڈرے سہمے پرندوں کی طرح بیٹھے تھے۔ لڑکا بمشکل بیس سال کا ہوگا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ کے لگ بھگ دکھائی دیتی تھی۔ لڑکی کے گورے چٹے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ اس کے نکاح کو ایک دو ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ معصومیت اس کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ لڑکا ذرا ہوشیار دکھائی دیتا تھا تاہم اس کے چہرے پر بھی سچائی کی چمک تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں وہی سوکھی سڑی غریب صورت عورت جائے نماز بچھائے سسک رہی تھی۔ جسے تھوڑی دیر پہلے آنیہ اور نہار نے باہر جھگڑے کے دوران میں دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ "لڑکے ظہیر" کی بیوہ والدہ ہے اور دونوں بچوں کے انجام سے سہمی ہوئی ہے۔

زباب بیگم نے اُسے گلے سے لگا کر تسلی دی اور کہا۔

"فکر نہ کرو بہن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دبلی پتلی عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "بیگم جی، شہابی بیٹے سے کہیں کہ ہمیں اپنی اس چار دیواری سے نہ نکالے۔ یہ لوگ چیر پھاڑ کھائیں گے ہم کو۔"

زباب بیگم بولیں۔ "کہا ہے ناں، وہ نہیں نکالے گا اور اگر ضروری بھی ہوا تو اس سے زیادہ محفوظ جگہ پر رکھے گا تمہیں۔ وہ ابھی علاقے کے ڈی ایس پی سے بات کر رہا

تھا۔ وہ اس کے جاننے والوں میں سے ہے۔ ویسے بھی کورٹ میرج کے پیپر تمہارے پاس ہیں، قانون تمہاری طرف ہے، ان لوگوں کی طرف نہیں۔''

معصوم صورت لڑکی کا نام نادیہ اور لڑکے کا ظہیر تھا۔ زباب بیگم کو دیکھ کر نادیہ بھی سسکنا شروع ہوگئی تھی۔ زباب بیگم نے اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا اور پھر آنیہ اور نہار کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔

شہابی اب بڑے مطمئن انداز میں صوفے پر بیٹھا ایک میگزین کی ورق گردانی کررہا تھا۔ اس نے والدہ کو بتایا کہ ڈی ایس پی اور مقامی ایم پی اے راجا انوار سے اس کی بات ہوگئی ہے۔ جب تک یہ معاملہ پوری طرح سیٹل نہیں ہو جاتا، لڑکا، لڑکی اور لڑکے کی والدہ ایم پی اے راجا انوار کی تحویل میں رہیں گے اور پوری تسلی تشفی ہونے کے بعد ہی انہیں کہیں اور بھیجا جائے گا۔

زباب بیگم کے چہرے سے بھی اضطراب اور تناؤ کی کیفیت کم ہوگئی۔ گفتگو کا موضوع ایک بار پھر وہی نادر تصویر بن گئی۔ زباب بیگم نے اپنے مرحوم شوہر تیمور حیدر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی اکثر جلیانوالا باغ کا اور وہاں ہونے والے سنگین واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ 1988ء میں جب تیمور نے پہلی بار ''نانگا پربت'' سر کی تھی تو چنڈی گڑھ میں ان کے لیے ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ ان کے والد مرحوم (اسداللہ حیدر) کی قبر بھی وہیں پر ہے۔ ہم ان کی قبر پر بھی گئے تھے۔ قبرستان میں ہی نیم کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر تیمور نے جلیانوالا باغ کا سارا واقعہ دہرایا تھا اور بتایا تھا کہ اس اندوہناک واقعے نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں کس طرح نئی روح پھونکی تھی..... اور اس قتل عام کے بعد کس طرح برصغیر میں جابر انگریزوں کے دن گنے گئے تھے۔

زباب بیگم نے معروف مسلمان قانون دان سیف الدین کچلو کا ذکر بھی کیا جن کی گرفتاری کے بعد مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے خلاف اشتعال میں زبردست اضافہ ہوا اور انہوں نے اپریل 1919ء میں جلیانوالا کے مزاحمتی اجتماع میں بھرپور شرکت کی۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو زباب بیگم نے محبت بھری نظروں سے آنیہ اور نہار کور کی طرف دیکھا اور بیٹے شہابی حیدر سے مخاطب ہوکر بولیں۔ ''بھئی، یہ اتنی دور سے چل کر ہمیں ملنے آئی ہیں، ان کو ذرا راجوری میں گھماؤ پھراؤ۔''

شہابی نے میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو کہاں جانا پسند کریں گی آپ؟''

نہار ایک دم بول اٹھی۔ ''یہ دنیدھر فورٹ کہاں ہے۔ اس کے بارے میں کافی سنا ہے۔''

''زیادہ دور نہیں، آپ کہتی ہیں تو کل چلے چلیں گے۔ یہاں سے بمشکل پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہوگی، آپ کے گھر سے تیس چالیس منٹ کی۔ موسم اچھا ہی ہے۔ صبح کے وقت بھی جاسکتے ہیں۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے اگلے روز فورٹ اور سائیں گنجی بادشاہ زیارت دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ زباب بیگم نے آنیہ اور نہار سے وعدہ لیا کہ وہ کل ڈنر ان کے ساتھ کریں گی اور نہار اپنے ماما جی دلبر سنگھ کو بھی ضرور ساتھ لائے گی۔

☆☆☆

موسم ذرا ابر آلود تھا۔ مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ شہابی اپنی ہلمین گاڑی پر آیا تھا۔ نہار اور آنیہ اس کے ہمراہ آدھ پون گھنٹے میں DHANIDHAR FORT (دنیدھر فورٹ) پہنچ گئیں۔ کل والا وہ نوجوان بھی شہابی کے ساتھ ہی تھا جس کے بال لمبے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا نام ان دونوں کو راسم معلوم ہوا تھا۔ شہابی حیدر اسے بے تکلفی سے راسو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کی موجودگی آنیہ اور نہار کو کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی لیکن وہ چپ بیٹھی رہیں۔ آنیہ اور نہار گاڑی کی پچھلی نشست پر تھیں۔ وہ دونوں اگلی نشستوں پر تھے۔ فورٹ پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اترے تو آنیہ نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ اسے راسو کے جسم سے اور لباس سے سگریٹ نوشی کی بُو آتی رہی تھی۔

دنیدھر قلعے کا منظر شاندار تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ کا ایک دلکش نمونہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں، محرابیوں اور شکستہ چبوتروں میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی۔ نہار کور اس میں خاص دلچسپی محسوس کررہی تھی۔ شہابی کسی گائیڈ کی طرح نہار کو مسلسل معلومات فراہم کررہا تھا۔ ''یہ انیسویں صدی کے وسط میں تعمیر ہوا تھا۔ یہاں ڈوگرے، اناج اور دیگر سامانِ رسد بھی جمع کرتے رہے ہیں۔ دراصل راجوری کے پرانے گورنر نے.....'' شہابی بول رہا تھا مگر آنیہ کو اس کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کو سن رہی تھی۔ اس کے تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز، اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے کا اسٹائل۔ وہ ایک نامعلوم سی کشش محسوس کرنے لگی تھی اس کی طرف۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس شخص کو بہت پہلے سے جانتی ہے۔ اس کی ہر ادا سے واقف ہے۔ یہ شاید ''شیر بچے'' کی

جرنلسٹ تک آن پہنچی تھی۔ شہابی سے کل دوپہر جو پہلا تعارف ہوا تھا، وہ بھی اس انسیت اور عقیدت کو بڑھانے کا سبب بنا تھا۔ چوڑے شانوں اور آنکھوں میں بے خوف چمک رکھنے والا یہ شخص ویسا ہی تھا جیسا اس نے تصور کیا تھا۔

وہ شہابی حیدر کو دیکھ رہی تھی جب اچانک چونک گئی۔ اس کی نگاہ شہابی حیدر کے دوست راسو پر پڑی۔ راسو کی نگاہیں اسے تاڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دم جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بے ترتیب سا بندہ کچھ اور بھی ناپسندیدہ محسوس ہوا۔ کہنے کو وہ شہابی کا دوست تھا مگر دونوں کی بول چال، حلیے اور طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شہابی حیدر جتنا نفیس اور خوش لباس تھا، وہ اتنا ہی اجڈ اور خستہ حال نظر آتا تھا۔ اب بھی وہ دونوں لڑکیوں کی پروا کیے بغیر مسلسل سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ وہ کم بولتا تھا مگر اس کی نگاہوں میں ایک تیزی سی تھی جو چبھتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ چاروں قریباً ایک گھنٹے تک فورٹ میں گھومتے رہے۔ یہاں سیاحوں کی اور ٹولیاں بھی موجود تھیں۔ آنیہ ذرا تھکن محسوس کرنے لگی مگر نہار تو دیوانی سی ہو رہی تھی۔ وہ جیسے اس فورٹ کے ہر ایک گوشے کو اپنے کیمرے میں قید کر لینا چاہتی تھی، بادل گہرے ہو رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ جلدی یہاں سے نکل جائیں۔ وہ سب جوس وغیرہ پینے کے لیے ایک سائبان کے نیچے بیٹھے تو نہار پھر کیمرا لے کر فورٹ کے پیچ وخم میں گم ہو گئی۔ وہ پانچ منٹ میں آنے کا کہہ گئی تھی مگر اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ ''آپ بولتی ہی کم ہیں یا ہم سے زیادہ بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔'' شہابی نے آنیہ کو بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اس کے سارے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل نہار زیادہ بولتی ہے اس لیے آپ کو لگ رہا ہے کہ میں کم بولتی ہوں۔'' اس نے بمشکل کہا۔

اس سے پہلے کہ شہابی حیدر کوئی جواب دیتا، ایک تیز کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دوپہر کے وقت ہی گہری شام کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ بوچھاڑیں ان کے پاؤں بھگونے لگیں۔

''میرا خیال ہے اس شیڈ میں تو ہم بھیگ جائیں گے۔'' شہابی حیدر نے کہا۔

''اور لگتا ہے کہ بارش مزید تیز ہو گی۔'' راسم عرف راسو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

وہ تینوں شیڈ کے نیچے سے نکلے اور بھاگتے ہوئے ایک کوٹھری نما جگہ پر گھس گئے۔ یہ کوٹھری جیسی جگہ قلعے کی بیرونی فصیل کے قریب ہی تھی۔ یہاں وہ تیز بوچھاڑوں سے محفوظ ہو گئے تاہم ان کے کپڑے جزوی طور پر گیلے ہو گئے تھے۔ شہابی حیدر کے دوست راسو کی نگاہیں ایک بار پھر آنیہ پر تھیں۔ اس نے چادر کو اپنے جسم پر درست کیا اور ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ بارش کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ سیاحوں کی چار پانچ اور ٹولیاں بھی قلعے کے اندر ہی مختلف پناہ گاہوں میں گھس گئی تھیں۔

''لگتا ہے کہ یہ جلدی تھمنے والی نہیں ہے۔'' شہابی حیدر نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے، گرجتے برستے آسمان کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں وہ کہاں رہ گئی ہے؟'' آنیہ مضطرب ہو کر بولی۔ ''پھر شولڈر بیگ سے اپنا موبائل فون نکالا۔

''ٹھہریں، میں کرتا ہوں۔'' شہابی حیدر بولا اور نہار سے کال ملائی۔

رابطہ ہو گیا۔ وہ قلعے کی عقبی طرف ایک پنجابی فیملی کے ساتھ ایک کشادہ شیڈ تلے پناہ لیے ہوئے تھی، آنیہ اور شہابی کو تسلی ہوئی۔

شہابی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی فرینڈ کو تو ہسٹری اور آثارِ قدیمہ میں بہت دلچسپی ہے، آپ کا شغل کیا ہے؟''

شہابی کے بے تکلفانہ انداز گفتگو نے آنیہ کو کچھ حوصلہ بخشا۔ وہ بولی۔ ''نہار کیمرے کی آنکھ سے دیکھ کر تصویر بناتی ہے، میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر بناتی ہوں۔''

''یعنی پینٹنگ۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فنونِ لطیفہ والے لوگ تو مجھے بھی بڑے پسند ہیں۔ آپ نے ہمارے ڈرائنگ روم میں کوہ ہمالیہ کے سلسلے کی کچھ پینٹنگز بھی دیکھی ہوں گی۔ آپ کو پتا ہے وہ کس نے بنائیں؟''

''آپ کے مرحوم والد تیمور حیدر صاحب نے؟''

''نہیں، وہ تو صرف پہاڑوں پر چڑھتے تھے۔ یہ تصویریں والدہ زرباب بیگم نے بنائی ہیں۔ جوانی میں اور شادی کے بعد بھی انہیں پینٹنگ کا شوق رہا ہے۔ کئی سفروں میں وہ والد کے ساتھ بھی رہیں۔ وہ اپنا کام کرتے رہے، یہ اپنا کام کرتی رہیں۔ جس سفر میں وہ جاپانی کوہ پیما کو بچاتے ہوئے شہید ہوئے اس سفر میں بھی وہ ان کے ساتھ تھیں اور بیس کیمپ میں موجود تھیں۔''

''دلیری آپ کے خون میں ہمیشہ سے شامل رہی

ہے۔'' وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی اور پھر کچھ جھینپ بھی گئی۔

''یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ویسے وہ پہلے لوگوں جیسا جذبہ اور حق کے لیے مر مٹنے کا عزم ہمارے نصیب میں کہاں؟ یہاں تو قدم قدم پر مصلحت اور مفاہمت کے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔'' پھر وہ ایک دم موضوع بدل کر بولا۔ ''ویسے اگر آپ واقعی اچھی پینٹر ہیں تو پھر آپ کے لیے میرا ایک بڑا قیمتی مشورہ ہے۔'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ پھر چند قدم دور کھڑے راسو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لیکن میں یہ مشورہ راسو کے سامنے آپ کو نہیں دوں گا، ورنہ یہ پتا نہیں کتنوں کو بتا کر اس کی ساری اہمیت اور سارا مزہ ختم کردے گا۔''

''تمہاری بے اعتباری کبھی ختم نہیں ہوگی۔ بہتر ہے کہ مجھے ساتھ ہی نہ لایا کرو۔'' راسو نے بھاری لہجے میں کہا اور بے تکلفی سے شہابی کو مکا دکھایا۔

اس دوران میں پتا نہیں کہاں سے ایک چھتری تیز ہوا میں اُڑتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔ شہابی حیدر نے جلدی سے اسے لپک لیا۔ چھتری کے پیچھے کوئی نہیں آیا۔ شہابی حیدر نے کہا۔ ''اسے کہتے ہیں نعمت غیر مترقبہ۔''

کافی کشادہ چھتری تھی۔ دو چار منٹ بعد بارش کا زور تھوڑا سا کم ہوگیا۔ ہوا کی رفتار بھی ماند پڑ گئی مگر کالے سیاہ بادل آسمان پر جمے کھڑے تھے۔ شہابی حیدر کے دوست راسو نے کہا۔ ''چھتری تو آگئی ہے اگر کہیں تو ان کی فرینڈ کو لے آؤں۔''

''ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ وہاں پریشان ہورہی ہوں گی۔'' شہابی نے کہا۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر چھتری لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اب اس نیم تاریک کوٹھری میں آنیہ اور شہابی تنہا تھے۔ آنیہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی، نہ ہی اس کے کردار پر کسی بھی طرح انگلی اٹھائی جا سکتی تھی۔ وہ صنف مخالف سے بہت لیے دیے رہتی تھی مگر پتا نہیں کیوں یہاں اس کا سارا دم خم ایک دم ناپید ہوگیا تھا۔

خاموشی بوجھل ہونے لگی تو وہ بولی۔ ''شہابی! آپ کے یہ دوست آپ سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''یہ صرف دوست ہی نہیں، ایک طرح سے گھر کا فرد بھی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ گھر میں آیا خالہ کو دیکھا تھا ناں آپ نے؟ راسو ان کا ہی بیٹا ہے۔ ذرا بے پروا سا ہے لیکن دل کا بُرا نہیں ہے۔ آیا خالہ بھی جوانی میں ہی ہمارے پاس آگئی تھیں۔ وہ زباب منزل کی سب سے پرانی ملازمہ ہیں۔ بلکہ وہ فیملی کا حصہ ہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں گود میں کھلایا ہے۔ راسو اُن کی واحد اولاد ہے۔''

''یہ کرتے کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے راسو صاحب؟''

''محترمہ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ جو کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں لیکن خیر راسو بالکل بھی بیکار نہیں ہے، یہ ایک اچھے معیار کا اسنوکر کلب چلاتا ہے۔ اپنی گزر بسر کرلیتا ہے۔''

''اور آپ اس الیکٹرانک میڈیا کی طرف کیسے آگئے؟'' آنیہ نے ایک لمحے کے لیے اس سے نظریں ملا کر پوچھا۔

''کیوں؟ نہیں آنا چاہیے تھا؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے آپ کے دادا اسد اللہ فوج میں تھے، آپ کے والد تیمور حیدر نے کوہ پیمائی جیسی سخت کوش فیلڈ اختیار کی۔''

''تو آپ کا کیا مطلب ہے یہ صحافت، کوہ پیمائی سے کچھ کم ہے؟ نہیں محترمہ! یہ زیادہ مشکل ہے اور سچائی کا ساتھ دینے والوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل۔''

شہابی حیدر کے فقرے نے آنیہ کو متاثر کیا، وہ ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''اور آپ فرمائیں..... آپ دیکھنے میں تو سچائی کو بڑی سنجیدگی سے لینے والی کوئی سائنس اسٹوڈنٹ لگتی ہیں، آپ مصوری کی طرف کیسے آگئیں؟''

''آپ کو بتایا ہے ناں کہ کمپیوٹر سائنس تو میں پڑھ رہی ہوں، مصوری بس شوق تھا جو دھیرے دھیرے بڑھتا گیا ہے۔''

''اچھا، آپ لینڈ اسکیپ بناتی ہیں یا پورٹریٹ وغیرہ؟''

''لینڈ اسکیپ..... لیکن کبھی کوئی خاص موقع ہو تو پورٹریٹ اور کیلی گرافی وغیرہ بھی کرلیتی ہوں۔''

''یہ تو پھر بڑی اچھی بات ہے، میں ابھی کچھ دیر پہلے آپ سے اسی سلسلے میں بات کرنے لگا تھا یہاں راجوری میں لینڈ اسکیپ پینٹنگز کا ایک بڑا مقابلہ ہونے والا ہے، کافی بڑی انعامی رقم ہے۔ حصہ لینے والوں کو خاصی پروجیکشن بھی ملے گی۔ ابھی باقاعدہ اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی

ہے لیکن میڈیا سے تعلق رکھنے کے سبب میرے پاس اس حوالے سے ایڈوانس انفارمیشن موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اس مقابلے میں حصہ لے سکتی ہیں..... آپ کے پاس اپنے کام کا کوئی نمونہ وغیرہ ہے، میرا مطلب ہے آپ کے موبائل فون میں؟''

شہابی حیدر کا اندازہ درست تھا۔ آنیہ کے اسمارٹ فون مین اپنی پینٹنگز کے کچھ عکس موجود تھے۔ شہابی حیدر کے کہنے پر آنیہ نے اسے وہ فوٹوگراف دکھائے۔ اس نے غور سے دیکھے اور متاثر ہوا۔ دبے دبے جوش سے بولا۔ ''میرا تو مشورہ ہے مس آنیہ! آپ اس ''کمپی ٹیشن'' میں ضرور حصہ لیں۔ موضوع آثارِ قدیمہ ہے۔ میں اس کے لیے آپ کو بڑی اچھی لوکیشن سجیسٹ کرسکتا ہوں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس نے ڈرامائی انداز میں سامنے دیکھا۔ موسلا دھار بارش کی اوٹ سے دنید ھر فورٹ کے خوب صورت نشیب و فراز اور پیچ وخم نظر آرہے تھے۔ وہ بولا۔ ''اگر آپ مقابلے میں حصہ لینا چاہیں تو آپ کے پاس کافی وقت ہے۔ آپ اس فورٹ کے کچھ دلکش حصے کینوس پر اتار سکتی ہیں۔''

یکا یک ہوا کا رخ بدلا۔ بارش کی تیز بوچھاڑیں اس کوٹھری کے اندر تک آنے لگیں۔ آنیہ گھبرا کر بائیں جانب ہٹی تو اونچی ایڑی کے سبب لڑکھڑا گئی۔ شہابی نے اسے بروقت کندھوں سے تھام لیا۔ اپنے کندھوں پر اس کی مضبوط گرفت محسوس کرکے وہ جیسے سرتاپا لرز گئی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ''سس سوری۔'' وہ گھبراہٹ میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ محویت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش آنیہ نے اپنے نم سراپا پر محسوس کی۔ قلعے کی بلند و بالا فصیل کی برجیوں پر بجلی چمکی اور پھر بادل دہاڑنے لگے۔ آنیہ کو اب گھبراہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ وہ رسٹ واچ دیکھ کر بولی۔ ''آپ کا دوست ابھی تک نہیں لوٹا۔''

''شاید وہ بارش کے ہلکا ہونے کا انتظار کررہے ہوں گے۔''

''کچھ دیر پہلے ہلکی تو ہوگئی تھی۔'' آنیہ نے کہا۔

''لیکن پھر تیز ہوگئی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ ابھی پہنچ جاتے ہیں۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

آنیہ کے ذہن میں خواہ مخواہ ہی وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ شہابی حیدر کا دوست اس کے ذہن میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کرسکا تھا۔

اس کو پریشان دیکھ کر ہی شاید شہابی نے اپنا موبائل فون نکال لیا مگر اسی دوران میں آنیہ کے فون پر نہار کور کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ وہ پنجابی فیملی کے ساتھ گپ شپ کررہی ہے۔ جونہی بارش ہلکی ہوتی ہے، وہ دونوں پہنچ جاتے ہیں۔

بارش ہلکی ہونے میں دس پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں آنیہ اور شہابی حیدر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی فیملیز کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ آنیہ تو پہلے ہی بہت کچھ جانتی تھی، زیادہ سوالات شہابی کررہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آنیہ کو لگ رہا تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر شہابی حیدر کی طرف کھنچتی چلی جارہی ہے۔ اسے محسوس ہورہا تھا جیسے جلیانوالا کے باغ والا دلیر اور مزاحم اسد اللہ حیدر ایک نئے روپ میں اس کے سامنے ہے۔

کچھ ہی دیر بعد نہار کور اور راسم عرف راسو کی واپسی بھی ہوگئی۔ اب سہ پہر، شام کی طرف سرکنا شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے سائیں سجی بادشاہ کی زیارت کا پروگرام کل پر ڈال دیا اور باقی کا وقت یہیں فورٹ میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

پروگرام کے مطابق نہار کے ماما جی کو بھی ڈنر کے وقت زباب منزل پہنچ جانا تھا۔ آنیہ، نہار، شہابی حیدر اور راسو، گھوم پھر کر آٹھ بجے کے لگ بھگ زباب منزل پہنچے تو وہاں ماموں دلبر سنگھ صاحب پہلے سے موجود تھے اور زباب بیگم وآیا خالہ کے ساتھ دھواں دھار گفتگو فرمارہے تھے۔ ان کو بھی کورٹ میرج کرنے والے لڑکے لڑکی کی کہانی کا پتا چل چکا تھا۔ ان کی ساری ہمدردیاں شادی شدہ جوڑے کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے چھوٹتے ساتھ ہی شہابی کا کندھا تھپکا اور کہا۔ ''پتر جی! خوش رہو، حق سچ کا ساتھ دینے سے رب سوہنا راضی ہوندا ہے۔ لڑکا لڑکی بالغ ہیں، سیانے ہیں، اپنی مرضی سے اِک ہوئے ہیں تو یہ ٹھیکیدار کون ہوندا ہے ان کو نکھیڑنے والا۔ کارروائی تو ان لوگوں کے خلاف ہونی چاہیے۔''

''انشاء اللہ سب اچھا ہوجائے گا انکل۔'' شہابی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''پتر جی! اب کہاں ہیں وہ دونوں؟'' دلبر صاحب نے پوچھا۔

شہابی کے بجائے زباب بیگم نے بتایا۔ ''ان کی والدہ اور ان دونوں کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایم پی اے

صاحب کی رہائش پر پہنچا دیا گیا ہے۔''

''جب تک معاملہ پوری طرح سیٹل نہیں ہو جاتا وہ تینوں وہاں رہیں گے۔'' شہابی حیدر نے وضاحت کی۔ دلبر صاحب نے ایک بار پھر شہابی کا کندھا تھپکا اور بولے کہ انہوں نے اس کے بارے میں جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔

زباب بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سردار صاحب، آپ کے لیے پرہیزی کھانا بنوایا ہے۔ نہار بیٹی بتا رہی تھی کہ آج کل آپ ''ڈائٹنگ'' پر ہیں۔''

''اوہو..... بہن جی..... آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا ہے۔ ان دونوں دھی رانیوں کی وجہ سے ڈائٹنگ کوفی الحال میں نے گڈ بائے کہہ دیا ہے۔''

''کیا مطلب ماما جی؟'' نہار کور نے حیران ہو کر کہا۔

''بھئی، ڈائٹنگ نہ چھوڑتا تو پھر تمہاری مہمان نوازی نہیں ہو سکتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ گھر میں چنگا کھانا پکا ہو تو پھر مجھ سے رہا نہیں جاسکدا۔''

کھانے کے دوران میں بھی ایک دو مرتبہ آنیہ اور شہابی میں نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ جب بھی ایسا ہوا آنیہ کو اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں محسوس ہوئیں۔ ایک مرتبہ اسے لگا جیسے نہار کور بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک گپ شپ کا دور چلا۔ آیا خالہ بھی اس گفتگو میں شریک رہیں۔ ان کا نام رابعہ معلوم ہوا۔ وہ بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرنے والی خاتون تھیں۔ زباب بیگم کو وہ ''باجی'' کہہ کر بلاتی تھیں۔ آنیہ کو عجیب لگا کہ ''آیا خالہ رابعہ'' جیسی دھیمے مزاج کی عورت کا بیٹا راسو جیسا ہے۔ راسم عرف راسو کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ پتا چلا کہ وہ اپنے اسنوکر کلب کے دوستوں کے ساتھ کسی پارٹی میں گیا ہوا ہے۔

دلبر صاحب نے بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ شہابی اور اس کے اہلِ خانہ کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور بتایا کہ ان کا مسلمان ملازم خیر دین بڑے مزیدار دیسی اور پنجابی کھانے بناتا ہے۔ جلیانوالا باغ کے تذکرے نے جیسے ان دونوں گھرانوں میں ایک قربت سی پیدا کر دی تھی۔

وقتِ رخصت جب وہ لوگ باہر اپنی گاڑی تک آئے تو گراسی لان کی کیاریوں کے قریب آنیہ کی نگاہ ایک بار پھر ایک دراز قد، سفید پوش لڑکی پر پڑی۔ وہ گارڈن لائٹ کی روشنی میں باغیچے کی ایک پتھریلی روش پر خاموش بیٹھی تھی۔ بالکل گم صم اور کھوئی ہوئی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال ایک چوٹی کی صورت اس کے سینے پر کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔

اس جواں سال لڑکی کو آنیہ اور نہار نے پہلے روز بھی یہاں زباب منزل میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ سفید لباس میں تھی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ درست نہیں تھی اور وہ بُری طرح لنگڑا کر چلتی تھی۔ اب کی بار آنیہ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زباب بیگم سے پوچھا۔ ''آنٹی جان! یہ کون ہیں؟''

زباب بیگم کے سرخ و سپید چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ پھر سنبھل کر بولیں۔ ''یہ راسو کے ایک دوست کی بیوہ ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں، یہاں ہمارے پاس ہی رہتی ہے۔''

اندازہ ہوا کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں بس اتنا ہی بتانا چاہتی ہیں۔ شہابی حیدر نے بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔

☆☆☆

ماموں دلبر سنگھ کے گھر میں آنیہ اور نہار نے ایک رات اور گزاری۔ رات کے کھانے کے بعد دلبر ماموں کا ایک دوست آ گیا۔ وہ بھی ان ہی کی طرح جولی تھا۔ وہ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی پر ایک پنجابی ڈراما دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ پاکستانی اسٹیج ڈراما تھا جس میں پاکستانی اسٹیج اسٹار زمان اللہ اور سہیل احمد وغیرہ نے کام کیا تھا۔ آنیہ کو معلوم ہوا کہ نہار کے دلبر ماموں پاکستانی ڈراموں اور خاص طور سے اسٹیج ڈراموں کے زبردست شوقین ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انڈیا کے بڑے بڑے کامیڈین پاکستانی کامیڈینز کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

آج سہ پہر نہار کور دنید ھر فورٹ سے جو درجنوں تصویریں اتار کر لائی تھی، ان میں ایک تصویر پتھر کے ایک ٹوٹے ہوئے کتبے کی بھی تھی۔ کتبے پر کچھ لکھا تھا مگر تحریر پتا نہیں کیا تھی، یہ ہندی تھی، نہ سنسکرت، نہ کوئی اور علاقائی زبان۔ آنیہ کے لیے کچھ نہیں پڑا۔ مگر نہار نے تھوڑی سی کوشش کے بعد اور گوگل سے کچھ معلومات لینے کے بعد تحریر پڑھ لی۔ اس نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاید ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے کا کتبہ ہے۔ کسی ڈوگرا رئیس زادے یا شہزادے نے اپنی محبوبہ و جیتی کے لیے لکھا ہے..... پیاری یہ وہ جگہ ہے، جہاں ہم تم راجا صاحب کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ ملے تھے اور ہمارے پریم کو زبان ملی تھی۔''

نیچے شاید ہندی کا ایک شعر بھی کندہ ہے مگر وہ حصہ

ٹوٹ چکا ہے۔ صرف چاند اور گگن وغیرہ کے الفاظ ہی نظر آتے ہیں۔ ''یہ الفاظ تو تمہاری سمجھ میں بھی آرہے ہوں گے۔''

آنیہ نے حیرت سے کہا۔ ''یار! تم نے یہ کیسے پڑھ لیا۔''

''آنیہ جانی! تمہاری یہ خاکسار دوست ہسٹری کی اسٹوڈنٹ ہی نہیں ہے، پرانی زبانوں کی بھی ماہر ہے۔ باقاعدہ کورس کر رکھا ہے میں نے..... لندن کی یونیورسٹی SOAS کی خاک چھان کر آئی ہوئی ہوں۔ کیا سمجھیں؟''

آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''پتا نہیں، یہ جنتی کون ہوگی؟ ان لوگوں کے پریم کا انجام کیا ہوا ہوگا؟''

نہار کور مسکرا کر بولی۔ ''اس کا تو پتا نہیں..... لیکن ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ یہ فورٹ ہمیشہ سے ہے رومان پرور..... اور اس رومانیت نے میری آنیہ جانی پر بھی کچھ نہ کچھ اثر کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' آنیہ چونک کر بولی۔

''تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں جناب۔'' نہار کور نے آنکھیں نچائیں۔

''یہ کیا فضول بکواس ہے۔'' آنیہ کا رنگ ایک دم گلابی ہوگیا۔

نہار زور سے ہنسی۔ ''اس کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں..... نہیں..... چورنی کے بالوں میں تنکا۔ آنیہ جانی میں نے تو صرف رومانیت کا تذکرہ کیا ہے۔ آثارِ قدیمہ میں بھی تو ایک طرح کی رومانیت ہوتی ہے۔ اس میں صنف مخالف وغیرہ کا ہونا ضروری تو نہیں۔''

آنیہ ابھی تک غصے میں نظر آرہی تھی۔ چہرے پر ایک شرمگیں سا تاثر بھی موجود تھا۔ نہار سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے آنیہ! مذاق کی بات تو رہی ایک طرف۔ شہابی حیدر ''پرسنالٹی'' زبردست ہے۔ ویسا ہی سج دھج اور آن بان والا جیسا کہ تم نے ایک تصور قائم کیا تھا اور مجھے شاکرنا، سچی بات کہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی تم سے کچھ نہ کچھ متاثر ہے۔''

آنیہ کچھ دیر تک نہار کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم پنجے نکال کر اس پر جا پڑی۔ دونوں بستر پر گریں۔ ''نہار کی بچی..... شیطان کی ٹولی..... میں تیری طبیعت ٹھیک کروں گی۔'' آنیہ نے اس کے پیٹ میں زوردار چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہائے ربا، مار دیا۔'' نہار نے دبی دبی کراہ کے ساتھ کہا اور آنیہ کو جوابی چٹکی کاٹنے کی ناکام کوشش کی۔

''شرم نہیں آتی، اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے۔'' آنیہ مصنوعی غصے کے انداز میں پھنکار کر بولی اور اس کی انگلیاں مروڑیں۔

''آتی ہے..... آتی ہے..... رب دی قسم، آتی ہے۔'' نہار نے اس کے نیچے سے نکلنے کے لیے زور لگایا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا شیشے کا ایک گلاس ٹوٹ گیا۔ قریبی کمرے سے ماموں دلبر سنگھ کی آواز آئی۔ ''او کیا ہوگیا ہے بھئی، خیر تو ہے؟''

وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئیں اور اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔ چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ماموں اسی طرف آرہے ہیں۔

دونوں نے جلدی جلدی اپنے لباس درست کیے۔ نہار نے اپنی ٹی شرٹ کی ادھڑی ہوئی آستین کھینچی۔ اسی اثنا میں ماموں دلبر اندر آگئے۔ انہوں نے ذرا حیرت سے کمرے کا منظر دیکھا۔ ''کیا ہوا دھی رانیو؟''

''کک..... کچھ نہیں ماما جی..... چھ..... چھپکلی اندر آگئی تھی، اسے مارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔'' نہار نے بہانہ بنایا۔

''بھئی کوئی خاص قسم کی چھپکلی ہوگی، گھس بیٹھیوں جیسی۔ ورنہ اِدھر تو کبھی چھپکلی کا کوئی دور کا رشتے دار بھی نظر نہیں آیا۔'' انہوں نے گہری نظروں سے آنیہ اور نہار کا جائزہ لیا پھر دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''بلکہ مجھے تو لگدا ہے کہ یہ شاید اک نہیں دو چھپکلیاں تھیں، جو آپس میں لڑ رہی تھیں۔'' وہ واپس چلے گئے۔ دونوں طویل سانس لے کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ آنیہ اپنے لمبے بال سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے روز انہوں نے شہابی حیدر کے ساتھ پھر راجوری کی تفریحی جگہوں کا ایک ٹور لگایا۔ وہ کنجی بادشاہ زیارت گئے، دریا کا نظارہ کیا، پھر ایک شاندار وزارت دیکھا۔ شروع میں تو شہابی کا دوست راسم عرف راسوان کے ساتھ نہیں تھا مگر جب وہ ''اسٹیڈیم'' کی طرف جا رہے تھے وہ بھی اپنی بیوی موٹر بائیک پر آیا اور ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کی طرح اس کی بائیک بھی خستہ حال ہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی موجودگی آنیہ کو بے چین سی کر دیتی تھی۔ ویسے وہ کچھ زیادہ بولتا نہیں تھا مگر اس کے دیکھنے کا انداز اور کبھی کبھی گھورنے کا انداز آنیہ کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

باتوں کے دوران میں وہ آنیہ سے مخاطب ہوا اور

ہنس کر بولا۔ ''کل تو آپ بہت پریشان ہوگئی تھیں۔ شاید آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ میں نے آپ کی دوست کو اغوا کرلیا ہے۔''

نہار چمک کر بولی۔ ''آپ جمع خاطر رکھیے۔ میں اتنی جلدی اغوا ہونے والی نہیں ہوں۔''

''اغوا ہونے سے پہلے سب ایسے ہی کہتے ہیں۔'' اس نے تُرت جواب دیا۔

شہابی نے کہا۔ ''اچھا بکواس بند کرو، یہ مہمان ہیں اپنی۔ لہٰذا تہذیب کا دائرہ۔''

وہ مسکرایا اور منہ پھیر کر سگریٹ کے کش لینے لگا۔

یہ دن بھی کافی خوشگوار گزرا۔ سیر سپاٹے کے دوران میں آنیہ اور نہار اپنے میزبان شہابی حیدر سے مختلف سوالات بھی پوچھتی رہیں۔ ان سوالات کا تعلق شہابی کے والد تیمور حیدر اور دادا اسداللہ (شیر بچہ) کے حوالے سے ہی تھا۔ دکھانے کے لیے آنیہ اپنی ڈائری میں ''آرٹیکل'' کے لیے کچھ نوٹس وغیرہ بھی لیتی رہی۔ شہابی حیدر کی زندگی میں جھانکنا، معاشرے اور موجودہ اقدار کے حوالے سے اس کی بے باک گفتگو سننا، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا، یہ سب کچھ آنیہ کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک تفریحی پارک کے مین گیٹ پر انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ کل سویرے آنیہ اور نہار کو بذریعہ بس واپس جالندھر چلے جانا تھا۔ ایک دوسرے سے فون نمبرز اور ای میل وغیرہ کا تبادلہ ہوا، الوداعی کلمات کہے گئے۔ آنیہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی کوئی قیمتی چیز یہاں چھوڑے جارہی ہے۔

اچانک ایک جانب سے راسو وارد ہوا اور ایک سیاہ گلاب آنیہ کو پیش کردیا۔ موقع ایسا تھا کہ وہ انکار بھی نہ کرسکی اور گلاب تھام لیا۔ وہ بالکل سیاہ نہیں تھا بلکہ پتیوں کے باہری کنارے ہلکے سے گلابی تھے۔ اس شیڈ نے پھول کو ایک منفرد Look دے دی تھی۔

راسو بولا۔ ''یہ بڑا کم یاب پھول ہے۔ شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔ اب بھی صرف ایک ہی ملا ہے۔ ورنہ ایک مس نہار کو بھی پیش کرتا۔''

شہابی نے ہنس کر کہا۔ ''تو مس آنیہ کو ہی کیوں پیش کیا؟''

''اس لیے کہ یہ پینٹر بھی ہیں، رنگوں سے کھیلتی ہیں۔ اگر..... نہار صاحبہ چاہیں تو میں ایک اور پھول کی کوشش بھی کرلیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں..... بہت زیادہ شکریہ۔'' نہار جلدی سے بولی۔ ''آپ نے کہہ دیا۔ سمجھیں مجھے مل گیا۔ پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ آنیہ کی طرح اس کے تاثرات بھی راسو کے بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک ''ٹیکسی'' میں بیٹھی واپس اپنی قیام گاہ پر جارہی تھیں۔ سیاہ گلاب خوب صورت تھا مگر آنیہ کو لگا جیسے وہ ڈراؤنا ہے، اسے اس کے اندر سے بھی سگریٹ کی بُو نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی سڑک پر پہنچ کر اسے باہر پھینک دیا۔

☆☆☆

راجوری سے جالندھر واپس آئے آنیہ کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ جو دو تین دن وہاں گزرے تھے، وہ اس کے حافظے پر نقش ہوچکے تھے۔ ایک کشش سی تھی جو اسے مسلسل شہابی کی طرف کھینچتی تھی۔ دو تین بار فون پر بھی اس سے بات ہو چکی تھی۔ شہابی کی شدید خواہش تھی کہ آنیہ مصوری کے اس اہم مقابلے میں حصہ لے اور اس حوالے سے دنید ھر فورٹ کو اپنے کام کا حصہ بنائے۔ ہر مصور کسی بھی مونومینٹ کی چار پینٹنگز اس ''کمپی ٹیشن'' میں شامل کرسکتا تھا۔ یہ ایک انٹر یونیورسٹی ایونٹ تھا اور اسے کافی پروجیکشن ملنے والی تھی۔

شہابی حیدر اور آنیہ کے درمیان جو کچھ چل نکلا تھا، نہار کور بھی اس سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ اس حوالے سے بڑی شوخ تھی۔ وہ آنیہ کو مسلسل مشورہ دے رہی تھی کہ وہ راجوری جائے اور مقابلے میں حصہ لے۔ اس سلسلے میں اس نے خود ہی آنیہ کے پاپا سے بھی بات کر چھوڑی تھی اور انہیں باور کرایا تھا کہ اسے اس مقابلے میں حصہ لینا چاہیے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس نے دفتر سے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی لے رکھی ہے اور وہ آنیہ کے ساتھ راجوری جانے کے لیے تیار ہے۔ وہاں وہ دونوں پہلے کی طرح بڑی سہولت سے دلبر ماموں کے گھر پر قیام کرسکیں گی۔

آنیہ کی ماما اس آئیڈیا کی سخت مخالف تھیں۔ گھر میں دو تین سنجیدہ قسم کی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ پاپا ہمیشہ کی طرح آنیہ کی سائڈ لے رہے تھے مگر ماما کا لب ولہجہ بڑا سخت تھا۔ انہوں نے آنیہ کے پاپا کو مخاطب کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''آپ بیٹی کو ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رہے ہیں۔ یہ آپ کے لاڈوں سے ہی بگڑی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جائیں۔ یہ پڑھائیاں اور مصوریاں وغیرہ بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ اس کے ہاتھ پیلے کریں

اور اس کے گھر بھیجیں اِسے، میں تو کہتی ہوں کہ یہ فرحان کی سعادت مندی ہے اور آپا مریم کی بھی مہربانی ہے کہ اس کی تیزی طراری کو نظر انداز کر رہے ہیں وہ لوگ۔ ہم ایسا رشتہ ڈھونڈنے نکلیں گے تو دانتوں پسینے آجائیں گے۔''

کافی بحثا بحثی ہوئی لیکن بالآخر آنیہ اور اس کے پاپا کے سامنے ماما کو اپنا رویہ کچھ نرم کرنا پڑا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹی بالکل ہی خودسر ہو جائے اور اپنی مرضی کرنے لگے۔ اس سلسلے میں کچھ کردار نہار کے ماموں دلبر سنگھ صاحب نے بھی ادا کیا۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے اور ہر کسی کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتے تھے۔ وہ اپنے کسی کام سے امرتسر آئے ہوئے تھے۔ وہیں سے عالندھر آنیہ کے گھر آن ٹپکے۔ وہ جب آنیہ کو پُتری یا دھی رانی کہہ کر بلاتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ واقعی ان کی بیٹی ہے۔ انہوں نے آنیہ کی ماما کو پورا یقین دلایا کہ آنیہ بڑی سہولت اور حفاظت سے ان کے گھر رہے گی۔ نہار بھی اس کے ساتھ ہوگی، دونوں کا وقت اچھا گزرے گا۔

ایک رات جب ماما دوا کھا کر سو رہی تھیں اور آنیہ بیسمنٹ میں پاپا کے ساتھ موجود تھی، پاپا نے ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے ''شیر بچے'' والی تصویر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کھوج لگا لیا۔ اب تو میرا دل چاہنے لگا ہے کہ تمہاری اس نئی دریافت شہابی حیدر سے ملا جائے۔ دیکھنے میں بھی کافی شاندار لگتا ہے۔''

''جی ہاں۔'' آنیہ کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا پھر جلدی سے بولی۔ ''اور پاپا! اصل بات اس کی ظاہری شکل صورت میں نہیں، اصل بات اس کے مزاج اور شخصیت میں ہے۔ وہی بے باکی، وہی دلیری اور وہی ظالم کا پنجہ مروڑنے والی خُو بُو۔ سمجھیں سارے ڈانڈے اسی تصویر سے جا کر ملتے ہیں۔''

اس کے پاپا دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''تمہارے بعد ایک دن فرحان آیا تھا۔ کچھ اَپ سیٹ لگ رہا تھا۔ اسے لگتا ہے کہ شاید تم اسے پوری اہمیت نہیں دیتی ہو۔''

آنیہ ٹھنک کر بولی۔ ''پاپا..... میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا، مجھے اس میں کوئی اہمیت والی بات نظر آئے تو میں اسے اہمیت دوں ناں، ایک اور گاڑی..... ایک اور مہنگا فون، ایک اور پلاٹ..... یہ باتیں اہمیت دینے والی تو نہیں ناں.....''

''لیکن بیٹا! اس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔ تمہاری ماما اس بارے میں بڑی سنجیدہ ہیں۔''

''وہی سنجیدہ ہیں ناں۔'' آنیہ نے عجب بیزاری سے کہا پھر جلدی سے بات بدل کر بولی۔ ''پاپا! آپ نے بھی کیا بدمزہ کرنے والا موضوع چھیڑ دیا۔ پلیز چینج اِٹ..... میں آپ کے لیے بڑا اچھا سا قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔'' وہ ان کے کندھے دباتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف چلی گئی' بیرسٹر خورشید عالم پُرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

.....راجوری سے واپسی کے تین ہفتے بعد آنیہ اور نہار ایک بار پھر راجوری کا رخ کر رہی تھیں۔ اس مرتبہ مصوری کے سارے لوازمات ایزل، پالٹ، برش اور رنگ آنیہ کے ہمسفر تھے۔ نہار مستقبل قریب میں ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کا پروگرام بنا رہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں راجوری ڈسٹرکٹ اور اردگرد کے قلعہ جات پر کچھ کام کرنا چاہ رہی تھی۔ بہرحال یہ بات نہار بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ راجوری میں اس کی واپسی کی اصل وجہ وہ ایک انوکھا رومانی تعلق ہی ہے جو آنیہ اور شیر بچے کے پوتے کے درمیان پیدا ہوا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اس تعلق کا پیدا ہونا جیسے بہت عرصہ پہلے ہی ٹھہر گیا تھا۔

حسبِ سابق وہ قریباً 370 کلومیٹر کا فاصلہ سات آٹھ گھنٹے میں طے کر کے راجوری ٹاؤن پہنچ گئیں۔ دلبر ماموں کی طبیعت زکام کی وجہ سے کچھ ناساز تھی لہٰذا بس اسٹینڈ پر انہیں شہابی حیدر نے خود ریسیو کیا۔ وہ ہاف سلیو سفید ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں بڑا باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے آنیہ نے عجیب سنسنی محسوس کی۔ ایک ایسی سنسنی جس میں بے خوفی اور تحفظ کا احساس بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔

آنیہ نے سب سے پہلے اس نوعمر جوڑے کے بارے میں ہی پوچھا جو محبت اور شادی کی پاداش میں چھپتا پھرتا تھا۔ شہابی نے بتایا۔ ''وہ ایم پی اے صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی طرف سے پوری طرح باخبر ہوں۔ لڑکے ظہیر کی والدہ بھی وہیں پر ہیں۔ میں ہر روز دو تین دفعہ انہیں فون کرتا ہوں۔ کوششیں ہو رہی ہیں کہ لڑکی کے گھر والے بہ دل سے اسے معاف کریں اور کچھ ایسے معتبر ضمانتی ہوں جو لڑکی لڑکے کی حفاظت کی ذمے داری قبول کریں۔''

''اس روز جو بڑی توند والا ٹھیکیدار بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا، وہ کون تھا؟'' نہار نے پوچھا۔

''وہی خبیث سارے فساد کی جڑ ہے۔ ٹھیکیدار تو ویسے ہی اس کی عرفیت بن گئی ہے۔ اس کا اصل نام نرائن

ڈت ہے۔ تھوڑا بہت سیاست میں بھی پاؤں رکھتا ہے۔ یہ لڑکی جس نے کورٹ میرج کی ہے اس کے ''کپڑا سپلائی'' کے کارخانے میں کام کرتی رہی ہے۔ باپ بھی وہیں پر کام کرتا ہے۔ نرائن کی اس لڑکی پر نظر تھی۔ پر اب یہ نرائن لڑکی کے باپ سلیم کا سب سے بڑا ہمدرد بنا ہوا ہے اور اسے اور اس کے خاندان کو بھڑکا رہا ہے۔''

''اب کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''چاہنا کیا ہے۔ وہ اس نکاح کو مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں ہماری لڑکی کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر نکاح کیا ہے۔ یہ لڑکی کو واپس لے جائیں گے۔ اس کے ایک ملنگ نما کزن سے اس کی شادی کردیں گے۔ لڑکے کی ٹانگیں شانگیں توڑ کر اسے کہیں پھینک دیں گے لیکن اب ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔''

..... آنیہ کی نگاہوں میں لڑکے لڑکی کی ڈری سہمی صورتیں گھوم گئیں۔ وہ ان کبوتروں کی طرح دکھائی دیے تھے جن کے گرد کوئی خوفناک بلی گھوم رہی ہو اور وہ دم بخت ہوگئے ہوں۔

اسی دوران میں شہابی کے فون پر کال آگئی۔ پیدل چلنے کے دوران میں وہ بات کرنے لگا۔ ''زیادہ ہوشیار مت بنو۔ ایس ایچ او سے بات کراؤ میری۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

چند سیکنڈ بعد وہ یوں گویا ہوا۔ ''ایس ایچ او رمضان بول رہا ہے؟ ہاں میں شہابی بول رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے تم ایزی لے رہے ہو..... یہ بڑا نقصان دہ ہو جائے گا تمہارے لیے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے شہابی نے سرخ چہرے کے ساتھ سنا پھر پھنکارا۔ ''تم مجھے قانون مت پڑھاؤ۔ جب ملزم کی ضمانت ہوگئی ہے تو پھر موٹر سائیکل کو کیوں اپنی ٹانگوں میں گھسا کر بیٹھے ہوئے ہو۔ مجھے ایک گھنٹے میں موٹر سائیکل تھانے سے باہر چاہیے۔'' منہ میں کوئی سخت لفظ بڑبڑا کر شہابی نے فون بند کر دیا۔ اس کا چہرہ بدستور سرخ تھا۔

چند سیکنڈ بعد آنیہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

پہلے تو شہابی نے گول مول بات کی، پھر بتا دیا کہ راسم کو کسی واردات کے شبے میں پکڑ لیا گیا تھا لیکن کل اس کی ضمانت ہوگئی ہے۔

''واردات کیا تھی؟'' نہار نے پوچھا۔

''بینک سے نکلنے والے کسی بندے سے کچھ رقم چھینی گئی تھی۔ واردات کا شکار ہونے والا ٹھیک سے بائیک کا نمبر نہیں پڑھ سکا۔ ملتے جلتے نمبروں والے دو تین لڑکے پکڑ لیے گئے۔''

آنیہ اور نہار نے کن انکھیوں سے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔ انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ شہابی کے یاروں دوستوں میں سے یہ راسو کچھ علیحدہ ٹائپ کا ہے۔ اب ان کے اندازے اور شبے کو مزید تقویت مل رہی تھی۔

بہرحال اس موضوع پر شہابی حیدر نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ آنیہ اور نہار نے بھی چپ رہنا مناسب سمجھا۔

گھر پہنچ کر آنیہ اور نہار کو معلوم ہوا کہ زکام بخار تو صرف بہانہ تھا درپردہ دلبر ماموں کی طبیعت خوش خوراکی کی وجہ سے خراب ہوئی تھی۔ اکیلے میں انہوں نے فوراً ہی اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ ''دراصل، میں پھر سے ڈائٹنگ شروع کرنے والا تھا۔ سوچا کہ اس سے پہلے ایک بار ذرا رج کے بدپرہیزی ہی کر لوں۔ گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو میری کمزوری ہیں..... اور اس ویلے میری کمزوری کی وجہ بھی ہیں۔ کافی سارے موشن آئے ہیں۔ کل تک تو اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا پر اب ٹھیک ہوں۔ ابھی کچھ دیر بعد پاکستانی ڈراما شرطیہ مٹھے دیکھوں گا تو طبیعت اور بھی مٹھی مٹھی ہو جائے گی۔ وشواس کرنا، شرطیہ مٹھے شرطیہ طور پر چالیس پچاس واری دیکھ چکا ہوں، اسی طرح لنڈا بازار..... بڑا مزہ آئے گا..... اور فیفا ان امریکا وغیرہ ہیں۔'' وہ بے تکان بولتے چلے گئے۔

وہ سیاست پر بھی مزیدار گفتگو کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ انڈین حکومت اور انڈیا میں ہندوؤں کی بالادستی سے خوش نہیں ہیں۔ فوج سے ان کے نکل جانے کی وجہ بھی یہی ناخوشی تھی۔ 1984ء میں دربار صاحب کے خونی واقعات اور بعد میں اندرا گاندھی کے قتل کے نتیجے میں سکھوں پر ہونے والے ظلم و ستم نے انہیں موجودہ نظام سے متنفر کر دیا تھا۔

آنیہ نے شہابی کے مشورے کے مطابق اگلے ہی روز سے فورٹ میں جا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک خستہ حال محراب کے عقب میں نظر آنے والا لینڈ اسکیپ منتخب کیا اور اس کو رنگوں کی مدد سے کینوس پر اتارنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں شہابی نے اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے نہ صرف پینٹنگ کی اجازت لے کر دی بلکہ دیگر سہولیات بھی مہیا کیں۔ یہ مصوری آنیہ نے فقط اس لیے شروع کی تھی کہ شہابی کو قریب سے دیکھنے اور اُسے سمجھنے کا موقع ملے..... لیکن جب ایک بار کینوس نے رنگوں کا ملاپ

شروع ہوا تو پھر بتدریج آنیہ کو اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ شہابی اپنی موٹر بائیک یا چھوٹی گاڑی پر سوار گاہے بگاہے فورٹ کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔

ایک دن وہ آیا تو آنیہ ایزل کے سامنے کھڑی بڑی محویت سے برش چلانے میں مصروف تھی۔ اس نے عقب سے آکر ایک دم زور سے ہیلو کہا تو وہ جیسے بدک گئی۔ رنگ میں لتھڑے ہوئے برش نے پینٹنگ پر ایسا اسٹروک لگا دیا جو وہ ہرگز نہ چاہتی تھی۔ وہ سٹپٹا گئی۔ ''یہ آپ نے کیا کر دیا شہابی؟'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''افوہ..... یہ تو واقعی غلطی ہوگئی۔'' شہابی نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ آپ یوں ڈر جائیں گی، ویری سوری۔''

آنیہ نے جلدی جلدی پائلٹ میں کچھ اور رنگ مکس کیے اور اس اضافی اسٹروک کو مہارت سے چھپا دیا۔ اس دوران میں شہابی پشیمان سا گم صم کھڑا رہا۔ آخر میں اس نے توصیفی نظروں سے تصویر کو دیکھا اور بولا۔ ''بھئی واہ، آپ تو چھپانے میں مہارت رکھتی ہیں۔''

''آپ شاید زیادہ رکھتے ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''اس کو مہارت نہ کہیں..... یہ تو خوف ہے۔'' وہ بھی معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کس بات کا خوف؟''

''انکار کا..... ناراضگی کا۔''

اُس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں جھوم رہی تھیں۔ انہیں برش کے پچھلے حصے سے اپنے کان پر اڑس کر وہ بولی۔ ''ناراضگی تو ناراض ہونے والی بات پر ہوتی ہے۔''

''پکی بات؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

آنیہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ سنہری دھوپ نے اس سرخی میں آمیزش کی اور اسے کچھ اور بھی دلکش بنا دیا۔

''آپ پتا نہیں کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں، ایک تو بلا یک نازل ہو کر خراب کیا، اب وقت بھی خراب کر رہے ہیں۔'' آنیہ نے ڈھلتے سورج کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔''

وہ سچ مچ مڑا اور بڑے اسٹائل سے چلتا ہوا اپنی چمک دار موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی مگر جب لگا کہ وہ واقعی بائیک اسٹارٹ کر کے چلا جائے گا تو بولی۔ ''سنیے۔''

وہ بھی شاید اسی آواز کا منتظر تھا فوراً پلٹ آیا..... اور سن گلاسز اتار کر چیسٹ پاکٹ میں اُڑس لیے۔ بہت ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ وہ ادا سے بولی۔ ''آپ نے سوری کہا ہے۔ معذرت کی ہے لیکن یہ تو جانا ہی نہیں کہ میں نے معذرت قبول کی یا نہیں؟''

''اوہ ہاں، یہ تو واقعی ٹیکنیکل غلطی ہوئی۔ آپ نے معذرت قبول کی یا نہیں؟''

''غیر مشروط طور پر قبول نہیں کی۔ اب میرا کام کا موڈ بالکل اُڑن چھو ہوگیا ہے۔'' آنیہ نے برش اور پائلٹ وغیرہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''آرٹسٹوں کا موڈ یقیناً اچھی چائے وغیرہ سے بحال ہوتا ہے اور یہاں قریب ہی راجوری ٹاؤن کی سب سے اچھی چائے ملتی ہے۔''

وہ مسکرا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ شہابی کے پیچھے اس کی بیوی بائیک پر بیٹھ رہی تھی، اس کے کشادہ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کو اپنے اندر ایک عجیب سی فرحت بخش کپکپی محسوس ہوئی۔

اگلے آٹھ دس روز بڑے دلکش تھے، سوائے اس کے کہ دو تین بار جالندھر سے اس کے خالہ زاد فرحان کا فون آیا اور وہ اس کی عامیانہ باتیں سن کر بدمزہ ہوئی۔ آنیہ سے شہابی کی ملاقات تقریباً روز ہی ہو جاتی تھی۔ آنیہ صبح نہار کے ساتھ ہی دلبر ماموں کے گھر سے نکلتی تھی، سواری عموماً رکشا یا ٹیکسی ہی ہوتی تھی۔ نہار، آنیہ کو وہیں فورٹ پر اتار دیتی تھی اور خود راجوری ٹاؤن کی بڑی لائبریری کی طرف چلی جاتی تھی۔ وہ مختلف زبانوں اور پرانے مخطوطوں کو پڑھنے اور جاننے کا زبردست شوق رکھتی تھی۔ یہاں راجوری میں اسے کچھ ایسی کتابیں مل گئی تھیں جو ڈاکٹریٹ کے تھیسس میں اس کے کام آسکتی تھیں۔ آنیہ نے دو شاندار پینٹنگز مکمل کر لی تھیں اور تیسری پر کام شروع کر دیا تھا۔ دن کے کسی حصے میں شہابی بھی فورٹ پر آجاتا۔ اگر لنچ کا پروگرام بنتا تو وہ لنچ پر چلے جاتے یا پھر اپنے پسندیدہ چائے خانہ میں کشمیری چائے یا قہوہ پی کر واپس آجاتے، وہ دونوں بتدریج ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ نصف دن گزر جاتا تو آنیہ شدت سے اس کا انتظار کرنے لگتی۔ جبکہ شہابی کے تاثرات سے بھی صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جارہی تھی اور جیسے بہار کی سہ پہر دھیرے دھیرے ایک دلکش شام میں ڈھلتی ہے یہ عادت بھی محبت میں ڈھل رہی تھی۔

ایک دن وہ دونوں بڑے اچھے موڈ میں ایک ریسٹورنٹ کے اوپن ایریا میں بیٹھے تھے کہ وہی، بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والا راسم عرف راسو وہاں آدھمکا۔ وہ جیسے ایک ہی لمحے میں آنیہ کو سرتاپا دیکھ لیتا تھا اور اپنی آنکھوں کے اندر جذب بھی کرلیتا تھا۔ اس کا یوں دیکھنا آنیہ کو بڑا الارمنگ لگتا تھا۔ آج تو وہ ویسے بھی بڑے اکھڑے اکھڑے موڈ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پر ایک میلی سی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ اس واقعے کی نشانی تھی جب کسی ڈکیتی کے شبہے میں اسے پولیس نے پکڑا تھا اور شاید اس کے ساتھ کچھ مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ آتے ساتھ ہی وہ بھنائے ہوئے انداز میں شہابی حیدر سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اِدھر ذرا اکیلے میں آکر میری بات سن لو۔''

''ایکسکیوزمی آنیہ! بس ایک منٹ۔'' شہابی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں ایک طرف جاکر کچھ کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ راسو ابتر موڈ میں تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر طیش میں باتیں کررہا تھا۔ گفتگو کے آخر میں راسو کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ اس کے ایک دو فقرے آنیہ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک فقرہ کچھ اس طرح تھا۔ ''اسے ہر صورت سرجری کی ضرورت ہے مگر کسی بڑے اسپتال میں لے جائیں گے تو فوراً گرفتاری ہو جائے گی۔''

کچھ دیر بعد شہابی حیدر اسے رخصت کرکے واپس میز کی طرف آگیا۔ جو آئسکریم وہ دونوں کھا رہے تھے، وہ پگھل چکی تھی۔ شہابی نے آئسکریم دوبارہ منگوانا چاہی تو آنیہ نے منع کردیا۔ اس کا موڈ غارت ہوچکا تھا۔ وہ دونوں باہر آگئے۔ شہابی آج کار پر آیا تھا۔ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ آنیہ نے راسو کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ شہابی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اس کی آمد پر وہ ایسے ہی گم صم ہوجایا کرتی تھی۔ شہابی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے بے ترتیب ریشمی بالوں کو اپنی انگلیوں کی کنگھی سے سنوارا۔ اس کے رخسار کے تل کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنی شہادت کی انگلی سے چھوا اور جذب سے بولا۔ ''آنیہ میں جانتا ہوں وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا، شاید وہ بہت سے لوگوں کو اچھا نہیں لگتا لیکن میں اس کے ساتھ ایک دیرینہ تعلق کی زنجیر سے بندھا ہوا ہوں۔ وہ آپا خالہ کا بیٹا ہے اور میری زندگی کا بڑا حصہ اس کے ساتھ گزرا ہے۔ پلیز میری اس مجبوری کو سمجھیں۔''

اس نے آخری الفاظ کچھ ایسی اپنائیت اور انکساری سے کہے تھے کہ آنیہ کو اپنا غصہ کافور ہوتا محسوس ہوا۔

آنیہ کے تاثرات دیکھ کر شہابی مطمئن ہوگیا۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے آنیہ کو اپنے ساتھ لگایا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

دوسرے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہڑتال کی وجہ سے سواری دستیاب نہیں تھی مگر آنیہ کو پینٹنگ پر کام کرنے کے لیے فورٹ بھی لازمی جانا تھا۔ شہابی کو پتا چلا تو وہ خود گاڑی پر آنیہ کو لینے آگیا۔ ماموں دلبر سے اجازت لے کر آنیہ گاڑی میں آبیٹھی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے جب ایک جگہ سڑک کے کنارے جمگھٹا سا نظر آیا۔ ایک شاندار بلینو کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک نہایت پھٹیچر سی موٹر سائیکل الٹی پڑی تھی۔ ایک ممی ڈیڈی ٹائپ لڑکا جو یقیناً کار سے نکلا تھا، ایک ادھیڑ عمر شخص سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ طیش میں بار بار اس شخص کو دھکے دے رہا تھا۔ فیشن ایبل لڑکے کی عمر مشکل سے سولہ سترہ سال رہی ہوگی، تاہم قد کی وجہ سے وہ بڑا لگتا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر شہابی نے بے ساختہ بریک لگا دیے۔ اس کے چہرے پر مخصوص سرخی جھلک دکھانے لگی تھی۔ ''ایک منٹ آنیہ۔'' اس نے کہا اور پھر موبائل پر بات کرنے لگا۔ ''تم کہاں ہو بیدی؟..... ٹھیک ہے..... کیمرا پاس ہی ہے؟..... جلدی آؤ..... دو منٹ میں۔'' شہابی نے کہا اور فوراً گاڑی سے نکل کر موقع پر پہنچ گیا۔

آنیہ وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ اُسے جھگڑے کے مناظر نظر آرہے تھے۔ شہابی جاتے ساتھ ہی دراز قد امیر زادے اور مفلوک الحال شخص کے درمیان آگیا۔ وہ دونوں کو تحمل کا مشورہ دے رہا تھا مگر اسی دوران میں ایک اور لگژری جیپ وہاں پہنچ گئی۔ اس میں سے ایک فربہ اندام بارعب شخص نکلا۔ جیسا کہ آنیہ کو بعد میں معلوم ہوا وہ فیشن ایبل لڑکے کا باپ تھا۔ اس کا نام مہندر ناتھ تھا اور وہ ایک بڑا بیوروکریٹ تھا۔ اس کا رویہ اپنے بیٹے سے بھی بدتر نکلا۔ اس نے آتے ساتھ ہی اپنی افسرانہ شان دکھانا شروع کردی۔ اسی دوران میں آنیہ نے دیکھا کہ نیلی پگڑی والا وہ سکھ کیمرامین بھی موقع پر پہنچ گیا جسے شہابی حیدر نے ہنگامی طور پر بلایا تھا۔

دوسری طرف جھگڑا مزید زور پکڑ چکا تھا۔ چٹاخ کی آواز سنائی دی اور ہٹے کٹے بیوروکریٹ نے ایک طمانچہ ادھیڑ عمر شخص کے منہ پر جڑ دیا۔ اس حرکت پر شہابی بھی مشتعل نظر آنے لگا۔ آنیہ نے دیکھا کہ شہابی اور مہندر ناتھ کے درمیان زوردار مکالمہ ہورہا تھا۔ وہ بھی گاڑی سے نکل کر

موقع پر پہنچ گئی۔ اس کے پہنچتے پہنچتے مہندر ناتھ قدرے ٹھنڈا ہو گیا۔ مفلوک الحال شخص اپنے حلیے سے مسلمان ہی نظر آتا تھا۔ مہندر ناتھ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو بڑے بھائی! بات جتنی بڑھاؤ گے بڑھتی چلی جائے گی۔ حاصل وصول کچھ نہیں ہونا ہے۔ بچے کی ٹانگ پر چوٹ لگی ہے۔ بھگوان نے اس کی جان بچالی ہے۔ آٹھ دس روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے چھوٹے بھائی کو بھی معمولی رگڑیں آئی ہیں۔''

اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ دیر اپنے نوعمر بیٹے کے ساتھ کانا پھوسی کی پھر ہزار ہزار کے چار نوٹ ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا دیے۔

رقم دیکھ کر ادھیڑ عمر شخص متذبذب نظر آنے لگا۔ چند لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ رقم تھام لے گا مگر اسی دوران میں شہابی بول اٹھا۔ ''ٹھہرو انکل! پہلے اسپتال سے معلوم کرنے دو۔''

شہابی اپنے فون سے اسپتال کا نمبر ملانے لگا۔ اردگرد جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے آنیہ کو پتا چلا۔ ادھیڑ عمر شخص کا نام رحیم ہے۔ سامنے ہی اس کی چھوٹی سی بیکری تھی۔ رحیم کا چھوٹا بھائی سلیم، رحیم کے آٹھ نو سالہ بیٹے کو لے کر دکان پر آ رہا تھا کہ اس تیز رفتار کار نے چچا اور بھتیجے کو ٹکر مار دی۔ اب وہ دونوں تو ایک رکشا والے کی مدد سے اسپتال پہنچ گئے تھے اور یہاں زخمی بچے کا باپ عبدالرحیم کار والے کو روکے کھڑا تھا۔ کار سوار نوجوان لڑکے نے بچے کو زخمی کرنے کے علاوہ ایک کھڑی وین کو بھی ٹکر مار کر نقصان پہنچایا تھا۔

اسپتال فون کرنے کے بعد شہابی کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ وہ مہندر ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ جسے ٹانگ کی معمولی چوٹ فرما رہے ہیں، وہ معمولی نہیں ہے۔ بچے کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ چکی ہے۔ بُری طرح مضروب ہوا ہے وہ۔''

''لیکن..... اس میں سارا دوش میرے بچے کا تو نہیں.....''

''آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔ اس میں سارا دوش آپ کے بچے کا نہیں..... کیا یہ آپ کی ذمے داری نہیں تھی کہ آپ اپنے اس کم عمر بچے کو گاڑی لے کر نکلنے سے روکتے۔ اس کا تو ابھی شناختی کارڈ بھی نہیں بنا ہوگا، لائسنس کہاں بن گیا ہوگا.....''

مہندر ناتھ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، موقع پر موجود ایک ٹریفک سارجنٹ آگے بڑھا..... اور شہابی کو ایک طرف لے جا کر کانوں میں بات کرنے لگا۔ آنیہ کو صاف پتا چلا کہ وہ جیپ سوار مہندر ناتھ، کا شناسا ہے اور اس کی طرف داری میں کچھ کہہ رہا ہے۔

حسب توقع شہابی حیدر نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ پلٹ کر مہندر ناتھ کی طرف آیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''مہندر صاحب! آپ اس طرح اس غریب فیملی کو نہیں دبا سکتے۔ آپ کی اور آپ کے بچے کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔ آپ جو چار ہزار روپیا اس پریشان باپ کو پیش کر رہے ہیں یہ تو بچے کے علاج کے پہلے دو تین روز میں ہی ٹھکانے لگ جائے گا..... یہ احسان آپ نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔''

''تو پھر اچھا کیا ہے؟'' مہندر ناتھ کا جوشیلا بیٹا تنک کر بولا۔

''اچھا یہ ہے کہ تم بھی اپنے پتا کی طرح اس بوڑھے شخص کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤ بلکہ ایک سے زیادہ لگاؤ تاکہ اسے سمجھ آئے کہ جب تم جیسے امیرزادے سڑک پر ہوں تو سب ایروں غیروں کو اپنی جان کی قدر و قیمت جانتے ہوئے سڑک خالی کر دینی چاہیے۔''

لڑکا گرجا۔ ''اوئے دو ٹکے کے صحافی، منہ سنبھال کر بات کر..... ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟'' شہابی نے کہا اور اسے دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا پھر وہ تیر کی طرح شہابی کی طرف آیا۔ وہ سینہ تانے کھڑا تھا۔ مہندر ناتھ کا ایک ساتھی ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ اس دوران میں مہندر ناتھ، شہابی کے کیمرامین کو دیکھ چکا تھا اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے غصے میں ادھیڑ عمر شخص کو جو تھپڑ رسید کیا ہے، وہ بھی ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اس کے تیور ایک بار پھر بدل گئے۔ اس نے مشتعل بیٹے کو جھاڑا..... اپنے دو ساتھیوں اور سارجنٹ سے مشورہ کیا۔ پھر ہزار ہزار کے پورے بارہ نوٹ نکال کر ادھیڑ عمر عبدالرحیم کی طرف بڑھا دیے۔ عبدالرحیم نے نوٹ لینے چاہے مگر شہابی نے ایک بار پھر منع کر دیا۔ ''ان کو اپنے پاس ہی رکھیں جناب! آپ یقیناً کوئی بڑا وکیل ہی کریں گے، اتنے روپے تو وہ ایک دو پیشیوں کے ہی لے لے گا۔''

اب بیوروکریٹ مہندر ناتھ کا پتا پانی ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنے نابالغ بیٹے کو گاڑی دینے کے علاوہ اس نے سرِعام مضروب بچے کے والد کو تھپڑ بھی مارا ہے۔ یہ سب

کچھ ٹی وی پر آن ایئر ہونے والا تھا۔ بھاری مالی نقصان کے علاوہ اس کی ملازمت اور نیک نامی بھی داؤ پر لگنے والی تھی۔ اب وہ ساری تن فن بھول کر مصالحت کی طرف آرہا تھا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے ٹی وی کیمرے کی طرف دیکھا، پھر عبدالرحیم اور شہابی سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں تماشا لگ رہا ہے..... چلیں سامنے آپ کی دکان (بیکری) میں بیٹھتے ہیں۔ شانتی سے بات کرتے ہیں۔''

آنیہ دوبارہ گاڑی میں آن بیٹھی۔ معاملہ گمبھیر تھا مگر اسے حل ہونے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ شہابی حیدر چہرے پر کامیابی کی چمک لیے گاڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ آنیہ اس سے یہ سن کر حیران رہ گئی کہ جو شخص شروع میں رحیم کو صرف چار ہزار روپے دے کر ٹرخا رہا تھا۔ اس نے پورے ستر ہزار کا چیک دیا ہے، یہ رقم بچے کے علاج معالجے اور دیگر نقصانات کے لیے تھی، آنیہ حیرت سے شہابی حیدر کی جانب دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

راجوری کی خوشگوار فضائیں تھیں اور بہار نے ہر طرف رنگ بکھیر رکھے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کے رقص اور بہتے پانیوں کی موسیقی، اس ماحول میں آنیہ اور شہابی حیدر کا تعلق بڑے دلنشیں انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ نہار کور اپنی سہیلی کی ہمراز ہی نہیں مددگار بھی تھی۔ آنیہ تقریباً روزانہ ہی ایک دو بار گھر میں بھی فون کر لیتی تھی۔ وہ ماما سے زیادہ پاپا سے قریب تھی اور بے تکلف بھی۔ اس نے پاپا کو شہابی حیدر کی تصویریں بھیجی تھیں اور انہیں شہابی حیدر کے بارے میں مزید بھی کافی کچھ بتایا تھا۔ کچھ واضح الفاظ میں بتایا تھا اور کچھ اشاروں کنایوں میں۔ پاپا اپنی اکلوتی بیٹی کے پورے مزاج آشنا تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کی سوچیں کس رخ پر جارہی ہیں اور حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بھی آنیہ کے خالہ زاد فرحان کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک روز دریائے تاوی کے کنارے کنارے موٹر بائیک پر سواری کرتے ہوئے وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کررہے تھے۔ ایک جگہ کھڈے کی وجہ سے بائیک اچھلی تو پیچھے بیٹھی ہوئی آنیہ بھی لڑکھڑا سی گئی۔ شہابی نے کہا۔ ''اتنا ہٹ کر نہ بیٹھیے..... گر جائیں گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہٹ کر نہ بیٹھنے میں بھی تو ''گرنے'' کا اندیشہ ہے، ویسے آپ کے کندھے پر ہاتھ تو رکھا ہی ہوا ہے۔''

''صرف ہاتھ نہ رکھیے..... اپنی زندگی کا پورا بوجھ ڈال دیجیے میرے کندھوں پر۔ میرے لیے اس بوجھ سے بڑھ کر خوب صورت چیز اور کوئی نہیں ہوگی۔''

آنیہ کے گال دہک سے گئے۔

شہابی جلدی سے بولا۔ ''دیکھیے..... دیکھیے..... آگے پھر خراب سڑک آرہی ہے۔''

''تو آپ اپنی رفتار تھوڑی سی کم کر دیں ناں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''میں اپنی رفتار کم کر دوں لیکن آپ اپنی رفتار میں تھوڑی سی تیزی نہ لائیے گا۔'' شہابی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

دونوں بلند آواز میں ہنس دیے۔ آنیہ غیر محسوس طور پر شہابی کے قریب سمٹ گئی۔ اس روز شام کو آنیہ نے فون کے ذریعے شہابی کو بتایا کہ وہ اسے پاپا سے ملوانا چاہتی ہے۔

''یعنی آپ مجھے جالندھر لے کر جائیں گی؟'' شہابی نے پوچھا۔

''نہیں جالندھر کو یہاں لاؤں گی..... بھئی وڈیو لنک کے ذریعے بات کریں گے آپ..... اپنی وہ لائنوں والی وائٹ شرٹ پہن لیجیے گا۔ اچھی لگتی ہے آپ کو۔'' وہ دبے لہجے میں کہہ گئی۔

وڈیو لنک کے ریلے بات کرنے کا پروگرام اگلے روز کا تھا مگر دوپہر کو ایک غیر متوقع واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت وہ حسب معمول نہار کور کے ساتھ دندھر فورٹ پہنچی۔ آنیہ کو اتار کر نہار آگے نکل گئی۔ اچانک آنیہ کو یاد آیا کہ اسے ایک چھوٹا برش بھی چاہیے۔ اس نے نہار کو آواز دینا چاہی مگر وہ کافی آگے نکل چکی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور پیدل ہی ایک بغلی سڑک پر مڑ گئی۔ یہاں انواع و اقسام کی دکانیں تھیں۔ کچھ آگے جا کر ایک اور بغلی سڑک نکلتی تھی۔ اس دوسری سڑک کے وسط میں اسٹیشنری کی ایک بڑی دکان تھی۔ وہاں سے مطلوبہ برش مل سکتا تھا۔ آنیہ نے شلوار قمیص کے ساتھ اسپورٹ شوز پہن رکھے تھے۔ اس نے بڑی سہولت کے ساتھ کوئی نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا۔ یکایک اس کی نگاہ قریب سے گزرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ یہ پچاس پچپن سالہ وہی عبدالرحیم تھا، چند دن پہلے جس کے بچے کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

''انکل!'' آنیہ نے آواز دی تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ آنیہ نے پاس پہنچ کر پوچھا۔ ''انکل! آپ کے بیٹے کا اب کیا حال ہے؟''

وہ حیرانی سے آنیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ آنیہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی ایکسیڈنٹ کی جگہ پر موجود تھی۔ شہابی حیدر میرے ساتھ ہی وہاں آئے تھے۔ وہ

میرے کزن ہیں۔"

شہابی حیدر کا نام سن کر عبدالرحیم کے چہرے پر تشکر کے تاثرات پھیل گئے۔ وہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولا۔

"شہابی صاحب کو اللہ نے ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا، ورنہ طاقتوروں کے سامنے ہم کمزوروں کی کون سنتا ہے۔ دیکھو ناں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اتنی بڑی بڑی گاڑیاں دے کر سڑکوں پر بھیج دیتے ہیں، دوسروں کے بچوں کو مارنے اور اپاہج کرنے کے لیے۔"

"آپ کا بچہ اب کیسا ہے؟" آنیہ نے دوبارہ پوچھا۔

"ایک آپریشن ہو چکا ہے، ایک ابھی ہونا ہے۔ علاج معالجے پر روپیا آج کل پانی کی طرح بہہ جاتا ہے اگر شہابی صاحب کی کوشش سے یہ تیس ہزار نہ ملتا تو کہاں سے اتنا خرچہ کرتا میں۔"

آنیہ ذرا چونکی۔ "تیس ہزار؟"

"ہاں بیٹی، شاید شہابی صاحب نے آپ کو بتایا نہیں۔ انہوں نے پورے تیس ہزار نکلوائے ہیں مہندر ناتھ سے، علاج معالجے کے لیے....."

آنیہ چپ سی ہو گئی۔ شہابی حیدر نے اسے خود بتایا تھا کہ مہندر ناتھ نے بچے کے علاج کے لیے ستر ہزار کا چیک دیا ہے۔ اس نے یہ چیک دکھایا بھی تھا۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی بات کر کے آنیہ نے عبدالرحیم سے اجازت چاہی۔ وہ عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ فورٹ میں جا کر برش اور رنگوں سے کھیلتے ہوئے بھی اس کا دھیان عبدالرحیم سے ہونے والی گفتگو کی طرف ہی لگا رہا۔ سہ پہر سے ذرا پہلے شہابی فورٹ میں آیا۔ آج اس کا کیمرامین بھی ہمراہ آیا تھا تاہم وہ اسے فورٹ سے باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔

آنیہ نے شہابی سے اس اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا جو آج عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ جب آنیہ نے وہ تیس ہزار والی بات بتائی تو شہابی حیدر واضح طور پر چونکا۔ آنیہ نے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرتے دیکھا۔ بہرحال وہ فوراً سنبھل کر بولا۔ "ہاں، عبدالرحیم کو تیس ہی مل سکا ہے، کک..... کچھ اور اخراجات بھی تھے۔"

"اور اخراجات؟"

"بھئی، وہ جس اسٹیشن وین کا نقصان ہوا اس کا مالک بھی تو پارٹی تھا۔ کچھ اس کو دینے پڑے، موقع پر موجود ٹریفک سارجنٹ کا بھی کچھ حصہ تھا۔ ایسے معاملے اسی طرح سے نمٹتے ہیں۔"

آنیہ نے مزید سوال جواب مناسب نہیں سمجھے مگر اس کی اُلجھن رفع ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ شہابی اسٹیشن وین کے مالک کا ذکر کر رہا تھا مگر وہ بھلا مانس سا شخص تھا۔ تصفیہ ہونے سے پہلے ہی وہ تاسف میں سر ہلاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ آنیہ نے اسے خود جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ باقی رہی ٹریفک سارجنٹ کی بات تو اس کا منہ بھی ڈیڑھ دو ہزار سے بہ آسانی بند ہو سکتا تھا۔ اصل بات آنیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہابی حیدر کوئی نچلے درجے کا شخص نہیں تھا۔ ایک بلند و بالا شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے حوالے سے کوئی منفی سوچ رکھنا بھی آنیہ کو گناہ کی طرح لگ رہا تھا۔

شہابی کی آواز نے اُسے خیالوں سے چونکایا۔ "کس سوچ میں کھو گئیں آپ..... شاید حساب کتاب جوڑنے لگ گئی ہیں۔"

"نن..... نہیں..... میں تو یونہی سوچ رہی تھی، اُس بچے کے بارے میں....."

"اس کا علاج بڑی سہولت سے ہو رہا ہے آنیہ..... میں نے پوری خبر رکھی ہوئی ہے۔"

فون پر کال کے سگنل آئے اور شہابی کو بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔ دوسری طرف شہابی کا کزن نما دوست راسو ہی تھا۔ شہابی اس سے بات کرتا ہوا تھوڑے سے فاصلے پر چلا گیا۔ کوئی پریشان کن بات ہی رہی ہو گی جس کے سبب شہابی کے لب و لہجے میں کچھ تناؤ محسوس ہونے لگا۔ گفتگو کا بس کوئی کوئی لفظ ہی آنیہ کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ ان میں ایک لفظ سدرہ بھی تھا۔ آنیہ کی معلومات کے مطابق سدرہ اسی گم صم لڑکی کا نام تھا جس کی ایک ٹانگ میں لنگس تھا اور جسے آنیہ نے دو مرتبہ زباب منزل یعنی شہاب کی رہائش گاہ پر دیکھا تھا۔ پتا نہیں کہ اس لڑکی کا کیا معما تھا؟

شہابی حیدر جلدی میں آیا تھا اور فون سننے کے بعد جلدی میں ہی واپس چلا گیا۔ اس نے شام کو پھر ملنے کا کہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد آنیہ گم صم سی ایزل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں یہ بندہ کیوں ہر وقت شہابی سے چمٹا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے..... تو پھر..... یہ راسو، شہابی کا دوست کیوں تھا؟ آنیہ کی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آج اس نے وڈیو لنک کے ذریعے شہابی کی ملاقات پاپا سے کرانی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اس ملاقات کو دو چار دن آگے کر دے۔

وڈیو لنک پر ملاقات کا وقت شام آٹھ بجے کا تھا۔ آنیہ

کے پاپا اس وقت اپنی لاء فرم کے آفس سے فارغ ہو جاتے تھے۔ بہر حال آنیہ کے لیے اچھا ہی ہوا کہ سات بجے کے لگ بھگ آنیہ کو شہابی کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آنیہ ڈیئر! معذرت چاہتا ہوں ایک ضروری کام میں پھنس گیا ہوں، آج تو آپ کے پاپا سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

''چلیں، کوئی بات نہیں، پھر کسی دن کا رکھ لیتے ہیں۔'' آنیہ نے رسان سے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد دلبر ماموں تو ایک پاکستانی اسٹیج ڈراما دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ آنیہ اور نہار کور نے ملازم خیرو سے زبردست قسم کی ادرک والی چائے بنوائی اور ٹیرس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ آنیہ کچھ بھی نہار سے چھپاتی نہیں تھی جو ہلچل سی اس کے اندر مچی ہوئی تھی، وہ سب اس نے نہار پر آشکار کر دی۔ ایک طرح سے نہار بھی شہابی حیدر اور اس کے ماضی کی پرستار تھی۔ اسے بھی یہ ساری بات سن کر شاک لگا۔ کچھ دیر خیالوں میں کھوئے رہنے کے بعد بولی۔ ''آنیہ جانی! اکثر جو کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ ہوتا نہیں ہے۔ شہابی حیدر جیسے شخص سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی..... ہرگز نہیں۔''

''مگر نہار! یہ سب کچھ ہوتا تو ہے ناں..... زرد صحافت بھی ہمارے اردگرد موجود ہے۔ میڈیا کے کچھ لوگ خبر تیار کر لیتے ہیں..... فوٹیج وغیرہ بنا لیتے ہیں پھر ملوث لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ خبر آن ایئر کروانی ہے یا معاملہ رفع دفع کروانا ہے؟''

''آنیہ! تم کیسی بات کر رہی ہو، ہم شہابی حیدر کے بارے میں ایسا سوچ بھی کب سکتے ہیں.....''

''نہیں نہار، میں تو ایک جنرل بات کر رہی ہوں۔ شہابی کے ماضی اور اس کے آباؤ اجداد کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں کچھ غلط سوچنا حماقت لگتا ہے۔''

''حماقت بلکہ اپرادھ۔'' نہار نے کہا پھر کچھ دیر پُرسوچ انداز میں خاموش رہ کر بولی۔ ''بس ایک بات ہے جو تمہاری طرح مجھے بھی اُلجھن میں رکھتی ہے۔ یہ راسو..... شہابی کے اتنا قریب کیوں ہے..... اور..... پھر وہ ٹانگ سے معذور لڑکی سدرہ؟ جس کے بارے میں شہابی نے بتایا تھا کہ اسے راسو نے اس کے گھر رکھا ہوا ہے، تم نے کبھی پوچھا نہیں شہابی سے اس لڑکی کے بارے میں؟''

''بس ایک روز تھوڑی سی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ راسو کے ایک قریبی فرینڈ کی بیوہ ہے، بالکل بے سہارا ہے۔''

''اور ٹانگ؟''

''سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی تھی۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، دلبر ماموں دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ گلاب جامن اور موتی چور کے لڈوان کی کمزوری تھے اور خاص طور سے لڈو، کوئی ایک درجن تازہ بہ تازہ لڈو انہوں نے اسٹیل کے تھال میں ڈال رکھے تھے، بولے۔ ''لودھی رانیو! کھاؤ اور میرے سامنے کھاؤ۔''

''آپ کے سامنے کیوں ماما جی؟'' نہار نے استفسار کیا۔

''میں تو کھا نہیں سکدا، پر جب تم کھاؤ گی تو مجھ کو وہی مزہ آئے گا۔''

نہار بلند آواز میں ہنسی۔ ''آپ کو تو مزہ آ جائے گا پر یہ لڈو ہمیں ہضم نہیں ہوں گے۔''

''اوئے کچھ نہیں ہوندا بے وقوفے، ماں پیو دی نظر بچوں کے کھانے کو نہیں لگدی۔'' انہوں نے کہا اور بڑی محبت سے ایک ایک لڈو آنیہ اور نہار کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ دوپہر کے بعد آنیہ نے شہابی کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جانا تھا۔ یہ شہابی ہی کا پروگرام تھا۔ وہ اسے ایک قریبی جھیل دکھانا چاہتا تھا۔ آنیہ نے دلبر ماموں سے اجازت لے لی تھی مگر دو بجے کے قریب شہابی کا فون آیا، وہ بولا۔ ''راسو بھی ساتھ جانا چاہ رہا ہے کیوں ناں اس کو ''گروپ ٹور'' بنا لیں۔ آپ نہار کو بھی ساتھ لے لو۔''

راسو کا نام سن کر آنیہ چڑ گئی۔ اس نے کہا۔ ''پلیز شہابی! اگر آپ نے پہلے والا پروگرام رکھنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں نہیں جا رہی۔''

''اوہو، تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو ٹھیک ہے، میں اسے ہینڈل کر لیتا ہوں۔''

آنیہ نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''اوکے..... اوکے..... تم بس تیار ہو جاؤ میں دس پندرہ منٹ میں لینے آ رہا ہوں۔'' اس نے 'بائے' کہہ کر فون بند کر دیا۔

یہ بھی ایک چمکیلی اور خوشگوار دوپہر تھی۔ بلندیوں سے چلنے والی ہوا میں سفیدے اور پاپلر کے درخت جھوم رہے تھے۔ اس ہوا میں نباتات کی مہک کے علاوہ ایک جدا طرح کی خوشبو تھی۔ شہابی گاڑی میں سینڈوچ، کافی اور فروٹ وغیرہ بھی رکھ لایا تھا۔ اس کے ذہن میں پکنک کا سا ماحول تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نفیس لباس میں تھا۔ پرفیسی کے اسپرے نے اسے مہکا رکھا تھا۔ تاہم اس مہک کے اندر سے ایک ''چغلی'' سی بھی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ اسموکنگ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ آنیہ جان چکی تھی کہ شہابی کبھی کبھی

اسموکنگ کرتا ہے۔ اسے یقین سا تھا کہ یہ بدعادت اسے راسو سے ہی پڑی ہوگی۔

ابھی وہ ٹاؤن سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک فون کال نے انہیں ڈسٹرب کر دیا۔ کوئی اروڑا صاحب تھے جو شہابی کو فوری طور پر بلا رہے تھے۔ شہابی نے ٹالنے کی کوشش کی مگر نہ صرف ناکام ہوا بلکہ مزید پریشان بھی۔ غالباً دوسری طرف سے ذرا سخت لہجے میں بات کی گئی تھی۔

''اوکے آرہا ہوں۔'' شہابی نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

''کون ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''بس ہے ایک مصیبت، پندرہ بیس منٹ اب ضائع ہونے ہی ہونے ہیں، چلو کوئی بات نہیں۔''

اس نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور ایک ذیلی سڑک پر مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک شاندار ہاؤسنگ سوسائٹی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ یقیناً نئی سوسائٹی تھی۔ بہت سے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ سوسائٹی کا وسیع و عریض آفس بھی زبردست تھا۔ پارکنگ اور سیکیورٹی وغیرہ کا ہائی فائی انتظام تھا۔ شہابی نے آنیہ کو آفس کی ائرکنڈیشنڈ انتظارگاہ میں بٹھایا اور اس سے بیس پچیس منٹ کی اجازت لے کر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہ ڈسٹرب نظر آرہا تھا۔ انتظارگاہ میں اور بھی خواتین و حضرات موجود تھے۔ اندر جانے کے لیے آئی ڈی کارڈ اور موبائل فون وغیرہ جمع کرانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔

آنیہ نے پندرہ بیس منٹ انتظار کیا پھر اس کے اندر کھد بدی ہونے لگی۔ شہابی کو یہاں اچانک کیا کام پڑ گیا تھا؟ جستجو بڑھی تو وہ جیسے ان دفاتر کی سیر کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آئی ڈی کارڈ اور موبائل وغیرہ جمع کرا کر وہ اندر چلی گئی۔ یہاں صاف شفاف خاموش راہداریاں تھیں، کاؤنٹرز تھے، آراستہ انتظارگاہیں تھیں۔ آنیہ نے شہابی کو شیشے کی ایک دیوار کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔ یہ دفاتر کا اندرونی پورشن تھا۔ وہ اس طرف گئی تو اسے روکا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ گیس ایپلی کیشن کا اسٹیٹس جاننا چاہ رہی ہے۔ گارڈز نے اسے جانے دیا مگر وہ گیس ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے کے بجائے بائیں جانب ایک خاموش کوریڈور میں مڑ گئی۔ کچھ آوازوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ یہ آوازیں شیشے کی دیواروں والے ایک اپارٹمنٹ کے اندر سے آرہی تھیں اور ان میں شہابی کی آواز بھی نمایاں تھی۔ یہ سوسائٹی کے کسی خاص الخاص عہدیدار کا آفس تھا۔ اندر پردے تھے۔ ایک جھری میں سے آنیہ نے ڈرتے ڈرتے جھانکا اور بے طرح چونک گئی۔ ایک نہایت بیش قیمت آفس ٹیبل کے پیچھے ایک درمیانی عمر کا بارعب شخص تھری پیس سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں ایک خوب صورت لڑکی فائل تھامے کھڑی تھی اور ایک مؤدب، مسلح گارڈ موجود تھا۔ بارعب شخص کی اوپر کو اٹھی ہوئی گھنی مونچھیں، سرخ آنکھیں اور جبڑوں کا ابھرا ہوا گوشت اس کی سخت گیری کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ شہابی حیدر اس کے سامنے چپ چاپ کھڑا تھا۔

شہابی کی آواز آنیہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اروڑا صاحب! لڑکی بالغ ہے۔ باقاعدہ اس کی کلائیوں کے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ ساری رپورٹس موجود ہیں۔ آپ جانتے ہیں کورٹ میں نکاح ہوا ہے اور.....''

''مجھے قانون مت پڑھاؤ۔'' بارعب شخص گرجا۔ ''اور..... یہ کھڑے کیسے ہو تم؟ اپنے ہاتھ باہر نکالو پتلون کی جیبوں سے..... باہر نکالو۔''

شہابی حیدر کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ''سوری۔'' اس نے کہا اور ہاتھ پینٹ کی جیبوں سے باہر نکال لیے۔

جس شخص کا نام اروڑا لیا گیا تھا، وہ ٹیبل کے پیچھے سے نکل کر شہابی کے سامنے آیا۔ اس نے شہابی کی طرف انگلی اٹھائی اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ''دیکھ شہابی! تیرا واسطہ پڑ گیا ہے کرنل اروڑا سے..... ساری صحافت تیری ناک کے راستے سے خارج ہو جائے گی اور وہ جو حرامی ایم پی اے تیرا یار ہے ناں اس کی پتلون گیلی ہونے میں بھی دیر نہیں لگے گی..... چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس لڑکی اور لڑکے کو ٹھیکیدار کے حوالے کر دو..... اور چوبیس گھنٹے کا مطلب چوبیس گھنٹے ہی ہوتا ہے۔''

''پپ..... پر اروڑا صاحب! یہ میرے لیے عزت بے عزتی کا معاملہ بن چکا ہے، اگر آپ.....''

''اوئے بھاڑ میں جائے تیری عزت۔ جب چینل والے تیری تشریف پر لات مار کر تجھے نوکری سے نکالیں گے تو اس وقت تیری عزت بچ جائے گی؟ اور جب جس بے جا اور اغوا کا کیس ٹھوکوں گا تیرے اوپر تو پھر کس کی ماتا کو ماسی کہہ کر بلائے گا؟ بتا کس باسٹرڈ کے چرنوں میں گرے گا؟''

آنیہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ شہابی حیدر کا رنگ زرد تھا اور پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ اروڑا کچھ دیر اسے قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس نے رومال نکال کر شہابی کی پیشانی تھپتھپائی اور بدلے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اس پرائے پنگے میں سے اپنی ٹانگ نکال لے۔

خود بھی سکون میں آجا اور دوسروں کو بھی شانتی سے چلنے دے۔ ہم دشمنوں کے دشمن ہیں تو یاروں کے یار بھی ہیں.....''

پاس ہی کھٹ پٹ ہوئی۔ آنیہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور ایک دیوار گیر شیشے سے باہر ان ڈور باغیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ دو باوردی ملازم فائلوں کے ایک پلندے کے ساتھ کسی اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔

اندر کی مدھم آوازیں اب بھی آنیہ تک پہنچ رہی تھیں۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ شہابی حیدر کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اب وہ مصالحت کی بات کر رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ جس شخص کا نام کرنل اروڑا ہے، وہ شہابی کو بُری طرح دھمکانے کے بعد اب شاید اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

شہابی کی مری مری آواز آنیہ کے کانوں میں جیسے سیسہ پگھلا گئی۔ ''اگر کوئی سخت بات کہہ دی ہو تو معافی چاہتا ہوں اروڑا صاحب! آپ کی بات ٹال نہیں سکتا.....''

وہ بولتا رہا۔ آنیہ وہاں سے ہٹ گئی اور بے جان قدموں سے چلتی ہوئی واپس ''مین سٹنگ ایریا'' کی طرف چلی گئی۔ اس نے کیا دیکھا اور سن لیا تھا؟ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنے تصور کے کینوس پر پچھلے کئی برسوں میں جو ایک پُرشکوہ پینٹنگ بنائی تھی وہ یکا یک اپنے سارے رنگوں سے محروم ہو گئی ہے۔ حقیقت کی تند بارش نے اسے سارے کا سارا دھو ڈالا ہے..... یکسر بیکار کر دیا ہے۔

وہ جھیل دیکھنے نہیں گئے..... وہ کہیں بھی نہیں گئے۔ آنیہ نے شدید سر درد کا بہانہ بنایا۔ شہابی حیدر نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اب تفریحی موڈ میں نہیں ہے۔ آنیہ کو دلبر ماموں کے گھر چھوڑنے کے بعد اس نے کل ملنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

رات کو آنیہ نے سب کچھ نہار کے گوش گزار کر دیا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک سکتہ زدہ بیٹھی رہیں۔ جب تصورات کے عالیشان بت ٹوٹتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے..... یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ نہار نے بتایا کہ وہ اس آکاش اروڑا کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''یہ دو سال پہلے ہی انڈین آرمی سے ریٹائر ہوا ہے۔ اب اپنے بھائی کا نام استعمال کرتے ہوئے اس نے یہاں راجوری میں یہ بڑی ہاؤسنگ اسکیم بنائی ہے۔ اثر و رسوخ والا طاقتور بندہ ہے۔ وزیر امیر اسے سلام کرنے آتے ہیں۔''

''تو اب کیا ہوگا؟'' آنیہ نے عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''شہابی حیدر اس لڑکے اور لڑکی کو ٹھیکیدار کے حوالے کر دے گا؟''

''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔''

آنیہ نے بیزاری کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلایا، پھر کہنے لگی۔ ''نہار! ہم کل واپس جالندھر جا رہے ہیں۔''

نہار ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک توقف کے بعد بولی۔ ''آنیہ جانی! اتنی جلدی کسی کے بارے میں کوئی نتیجہ نہیں نکال لینا چاہیے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے اب بھی وشواش نہیں ہو رہا کہ جلیانوالا باغ کے کرداروں سے شروع ہونے والی کتھا اس طرح ختم ہو سکتی ہے۔ ہم ٹھیک جگہ پر پہنچے ہیں۔ اصل وارث سے ملے ہیں۔ شہابی حیدر میں اس تاریخی تصویر والی ساری جھلکیاں موجود ہیں اور.....''

''خاک موجود ہیں۔'' آنیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں، اس نے ساری فینٹسی اور ساری خوش فہمیوں کے بخیے اُدھیڑ دیے ہیں۔''

نہار اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ آنیہ کو ذرا دھیرج سے کام لینا چاہیے۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ آنیہ کا شہابی سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ آنیہ اور نہار کو اس جوڑے کی طرف سے بھی پریشانی تھی جسے شہابی نے پہلے اپنے گھر میں اور پھر کسی دوست ایم پی اے کے پاس پناہ دی تھی۔ جو کچھ آنیہ نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے دفتر میں سنا تھا، اس کے بعد اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اس لڑکے لڑکی کی اب خیر نہیں۔ مغرب کے بعد آنیہ نے ایک بار پھر شہابی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ فون یا تو اٹینڈ نہیں ہوتا تھا یا بند ملتا تھا۔ پچھلے دس بارہ گھنٹے سے وہ مسلسل بند تھا۔ آنیہ جھنجلا سی گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ شہابی کی اور اس جوڑے کی موجودہ صورتِ حال جان کر ہی رہے گی۔ آنیہ اور نہار نے مشورہ کیا۔ دلبر ماموں شام کے بعد انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر کے عمومی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ نہار گھر میں ہی رہے گی اور کمرے کو اندر سے بند کر کے لائٹ آف کر دے گی۔ دلبر ماموں آئے تو یہی سمجھیں گے کہ دونوں لڑکیاں جلدی سو گئی ہیں۔

نو بجے کے قریب آنیہ خاموشی سے نکلی اور ایک رکشا پکڑ کر سیدھی زباب منزل شہابی کے گھر جا پہنچی۔ زباب منزل کی کچھ کھڑکیاں روشن اور کچھ تاریک نظر آرہی تھیں۔ تاہم زیادہ تر گارڈن لائٹس آن تھیں۔ آنیہ کو امید تھی کہ یہاں وہ شہابی سے مل سکے گی اور اس سے پوچھ سکے گی کہ وہ اپنا فون بند کیے کیوں بیٹھا ہے؟ وہ اس ڈرے سہمے جوڑے کے انجام کے بارے میں بھی شہابی سے جاننا چاہتی تھی اور اگر ان کے بچاؤ کے سلسلے میں کچھ ہوسکتا تو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ دروازہ کھولنے والا وہ شخص ہوگا جسے وہ ہرگز دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے بالوں والا راسو تھا۔

''زہے نصیب..... آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں، آجایئے..... آجایئے۔'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

''شہابی کہاں ہیں؟''

''سب یہیں ہیں، آپ اندر تو تشریف لائیں۔'' اس نے کہا۔

آنیہ جھجکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ راسو نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ بند کیا دونوں گراسی لان کے درمیان والی روش پر چلتے ہوئے اندرونی حصے میں آگئے۔ آنیہ کو کچھ خاموشی سی محسوس ہوئی۔

''زباب بیگم اور آیا خالہ کہاں ہیں؟''

''بھئی سب یہیں ہیں، آپ ڈر کیوں رہی ہیں؟'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور آنیہ کو اندر لے آیا۔

آنیہ کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔ گیراج کی جانب کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ راسو عرف راسو رہائشی حصے کا داخلی دروازہ بند کرچکا تھا۔ کسی قریبی کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ لیونگ روم کے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ گھبرایئے نہیں..... بیٹھیے..... میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔''

آنیہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ایک صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ راسو بظاہر شائستہ لہجے میں بولا۔ ''سہورہ کی متاثرہ ٹانگ میں پانچ چھ روز سے شدید درد ہے۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ امی (آیا خالہ) اس کے پاس ہیں۔''

''اور باقی لوگ؟'' آنیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہ سب ایک شادی پر ہوشیار پور گئے ہوئے ہیں۔ شاید کل رات تک لوٹیں گے۔''

آنیہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ ''اچھا..... تو میں..... چلتی ہوں۔''

''اوہو بھئی..... چلی جایئے گا لیکن جس کام سے آئی ہیں، وہ تو کرتی جایئے..... شہابی سے تو مل لیں۔'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ تو کہتے ہیں کہ گھر میں کوئی اور نہیں؟''

''تو فون پر بات کرلیں۔''

''فف..... فون تو اُن کا بند ہے۔''

''مجھے پتا ہے کہ اس کا فون بند ہے..... اور شاید اسی لیے آپ کو چل کر یہاں آنا پڑا ہے۔'' وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ اس کے دیکھنے کا انداز آنیہ کو کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اور آج تو بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہی برے کی طرح اندر تک گھستی ہوئی نگاہیں جن میں ایک طرح کی حسرت سی شامل رہتی تھی۔

آنیہ نے دروازے کی طرف قدم بڑھانا چاہا تو راسو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں، دو منٹ بیٹھ جائیں۔ میں شہابی سے آپ کی بات کرادیتا ہوں۔ اس کا ایک دوسرا نمبر بھی ہے اور وہ کھلا ہے۔''

اس نے اپنی جین کی جیب میں سے اپنا موبائل فون نکالا۔ اس پر ایک نمبر پریس کیا، چند سیکنڈ بعد بولا۔ ''ہیلو شہابی! تمہاری ایک بہت بڑی فین تم سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہیں لو ان سے بات کرو۔ بہت پریشان ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون آنیہ کی طرف بڑھادیا۔

''ہیلو شہابی! کہاں ہیں آپ..... کوئی ایک سو کالز تو کی ہوں گی میں نے۔''

''دراصل ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا اس لیے دوسرا فون بند کرنا پڑا۔'' شہابی نے کہا۔

آنیہ نے ایک توقف کے بعد پوچھا۔ ''کہیں یہ وہ..... اسی لڑکے ظہیر..... اور لڑکی نادیہ والا مسئلہ تو نہیں؟''

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے سناٹا سا چھا گیا پھر شہابی نے پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟''

''دراصل آج نہار کور کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ راجوری کا کوئی ریٹائرڈ فوجی افسر اس لڑکی نادیہ کی واپسی کے لیے سخت پریشر ڈال رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس لڑکی کو زبردستی اس کے وارثوں کے حوالے کردیا جائے۔''

''نہار کو یہ سب کس نے بتایا؟''

''بس کسی طرح پتا چل گیا اُسے۔ ابھی میں نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی۔'' آنیہ نے بات بنائی۔

''تو تم صرف اُس لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں زباب منزل چلی آئی ہو؟''

''نہیں شہابی! میں آپ کے لیے بھی پریشان تھی۔ مجھے آپ کی کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔''

شہابی اور آنیہ کے درمیان تین چار منٹ گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں دراز قد راسو اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑا رہا۔ شہابی حیدر نے تسلیم کیا کہ وہ جس مسئلے کا ذکر کررہا تھا، وہ ظہیر اور نادیہ سے ہی متعلق ہے۔

''تو اب کہاں ہیں وہ؟'' آخر میں آنیہ نے پوچھا۔ وہ شہابی کے لیے اپنی ناپسندیدگی بمشکل چھپا پارہی تھی۔

''انہیں نکال دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''سس..... سمجھو کہ وہ اب ایم پی اے کے پاس نہیں ہیں۔ انہیں محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔ باقی میں ایسی جگہ ہوں جہاں زیادہ لمبی بات نہیں کرسکتا۔ کل میں خود تم سے بات کر کے تفصیل بتاؤں گا۔ تم ذرا جلدی سے راسو کو فون دو..... بس ایک منٹ کے لیے..... ذرا جلدی کرو پلیز.....''

آنیہ نے شہابی کی عجلت محسوس کرتے ہوئے بیزاری کے ساتھ فون راسو کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شہابی سے سرگوشیوں کے انداز میں بات کرتا ہوا آٹھ دس قدم دور چلا گیا۔ راسو کے انداز سے ظاہر تھا کہ دونوں دوستوں میں تلخ کلامی ہورہی ہے۔

آنیہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی تو راسو فون بند کر کے پھر اس کے سامنے آگیا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا مس آنیہ! آپ کچھ کھا پیے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتیں۔ یہ زباب منزل کی روایت نہیں ہے۔ پلیز بیٹھیں۔''

''نہیں مجھے فوراً جانا ہے، میں ماموں کو بتائے بغیر آگئی ہوں۔'' وہ ذرا سختی سے بولی اور پھر بند دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

اس بار راسو نے اس کی کلائی تھام لی۔ کھلے گریبان سے اس کے سینے کے گھنے سیاہ بال جھانک رہے تھے اور وہی سگریٹ نوشی کی بُو باس، وہ مسکرا کر بولا۔ ''مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے مگر جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔ آپ کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھنا..... ایک کپ کافی کا پینا میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔''

اپنی کلائی پر راسو کا لمس آنیہ کو کسی انگارے کی طرح محسوس ہوا۔ ''چھوڑیں مجھے۔'' وہ طیش سے بولی اور اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھ کی پشت بڑے زور سے راسو کے چہرے سے ٹکرائی۔ یوں لگا جیسے اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ راسو کے منہ پر دے مارا ہو۔ دو سیکنڈ میں راسو کے بالائی ہونٹ سے خون رس آیا۔

''جانور نہیں ہوں کہ تمہیں پھاڑ کھاؤں گا۔'' راسو پھنکارا اور اس کی کلائی کو زور سے آگے پیچھے ہلایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ بھی اسے کوئی چوٹ لگا دے گا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنی بائیں آستین سے وہ خون پونچھا جو ہونٹ سے رس آیا تھا۔ تب نسبتاً ٹھہرے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ ''پہلے تو صرف درخواست تھی لیکن اب تمہیں ''کچھ وقت'' میرے ساتھ گزارنا ہی پڑے گا۔'' آنیہ کی کلائی پر اس کی گرفت سخت تھی۔

اُسے لگا کہ وہ ایک جال میں آپھنسی ہے۔ زباب منزل خالی پڑی تھی۔ دروازے بند تھے۔ وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''میں سوری بولتی ہوں، میں نے جان کے نہیں مارا، پلیز مجھے جانے دو۔''

وہ مسکرایا۔ ''شاید تم ''وقت گزارنے'' والی بات سے ڈر گئی ہو۔ کوئی غلط مطلب مت لو۔ بس ایک ساتھ بیٹھیں گے، کافی پئیں گے۔ تھوڑی سی باتیں کریں گے..... پھر میں تمہیں خود باہر تک چھوڑ کر آؤں گا۔ بڑے دنوں سے حسرت تھی کہ کہیں اکیلے میں تمہارے ساتھ بیٹھوں۔ تمہیں بڑے اطمینان سے دیکھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں کہ تمہارا چہرہ کیوں اتنا جانا پہچانا سا لگتا ہے۔''

آنیہ کو اس کی باتوں سے ڈر لگنے لگا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔

''آجاؤ ناں پلیز..... یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہیں۔ لان کی ساری پھلواری، فوارے اور روشنیاں نظر آرہی ہیں، میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔''

اس نے پہلے ذرا آرام سے اور پھر سختی سے اُسے دیوار گیر کھڑکی کی طرف کھینچا۔ ''اُف پلیز..... مجھے درد ہورہا ہے، میری کلائی.....''

اس نے گرفت ذرا نرم کر دی اور اسے کھڑکی کے قریب رکھی خوب صورت میز کے سامنے بٹھا دیا۔ آنیہ نے سوچا کہ مزاحمت کا رویہ اس جذباتی شخص کو سختی کی طرف مائل

کرسکتا ہے۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

''کافی کے ساتھ کیا لاؤں؟'' وہ بولا۔ ''شہابی نے بتایا تھا کہ تمہیں آملو کے چپس بہت پسند ہیں۔''

''اس وقت کچھ نہیں..... بلکہ..... کافی بھی نہیں۔'' وہ منمنائی۔ ''میں..... آدھا کپ چائے پی لوں گی۔''

وہ سامنے ہی واقع کچن میں داخل ہوگیا۔ آنیہ نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ مقفل تھا اور چابی آس پاس کہیں نظر نہیں آرہی تھی پھر اس کا دھیان اپنے موبائل فون کی طرف گیا۔ کیا وہ کسی طرح نہار یا ماموں دلبر کو اس ناگہانی مصیبت سے آگاہ کرسکتی تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی جب راسو نے کچن کا دروازہ پورا کھول دیا۔ اب وہ اس کی کوئی بھی حرکت دیکھ سکتا تھا۔ آنیہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں۔ وہ دل میں دعائیہ کلمات دہرانے لگی۔ زباب منزل بالکل خالی تھی۔ جو ایک دو ملازم تھے غالباً وہ بھی چھٹی پر تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ چائے کے دو گرما گرم کپ اور چپس لے کر آنیہ کے سامنے میز پر بیٹھا تھا۔ آنیہ نے پلکیں جھکا رکھی تھیں اور چائے کے چھوٹے چھوٹے ''سپ'' زہر مار کررہی تھی۔ وہ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کے چہرے کے ایک ایک انچ ایک ایک ملی میٹر کو اپنی آنکھوں میں جذب کرلینا چاہتا ہو۔

اچانک بولا۔ ''محبت، حاصل کرلینے کا ہی نام تو نہیں۔ یہ احساس بھی تو بڑا دلنشیں ہوتا ہے کہ ہم کسی کو چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں، وہ ہماری چاہت سے باخبر ہے۔''

آنیہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب بے ساختہ کپکپا کر رہ گئے۔

''مس آنیہ! یہ میری ایک بڑی حسرت تھی جو آج پوری ہوئی ہے۔ تمہیں قریب سے دیکھنا..... بغیر کسی کی مداخلت کے تمہاری آواز سننا..... تمہاری آنکھوں کے رنگ کے اندر ڈوبنا اور اس فرحت بخش کیفیت کو محسوس کرنا کہ جالندھر سے آنے والی یہ لڑکی صرف میرے لیے میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتا..... اور نہ کبھی چاہوں گا۔ مجھے پتا ہے ہم دو مختلف راستوں کے راہی ہیں۔ تمہاری زندگی میں شہابی کی جو اہمیت ہے، وہ بھی میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

وہ خاموش رہی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے۔ پھلواری میں پھول جھوم رہے تھے۔ بڑے فوارے کے پانی میں چاندنی کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ اس نے آنیہ کے خوب صورت ہاتھ پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھا۔ ''مجھ سے ڈر تو نہیں آرہا؟'' راسو نے پوچھا۔

آنیہ نے پلکیں جھکائیں اور بے ساختہ کہہ گئیں۔

''پپ..... پہلے آرہا تھا مگر اب نہیں۔''

''میں اس ملاقات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا..... ساری زندگی۔'' اپنے آخری دو الفاظ پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ ''ساری زندگی..... اور زندگی پتا نہیں کتنی ہے۔''

وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر پھر اسے یہ سب کچھ بے فائدہ لگا۔ وہ ایک بار پھر اٹھنے کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ راسو نے اپنا ہاتھ عادتاً سگریٹ کے پیکٹ کے لیے اپنی جیب کی طرف بڑھایا مگر پھر آنیہ کی موجودگی کو محسوس کر کے رک گیا۔ آنیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گارڈن لائٹ، اس کے چہرے کی ایک سائڈ کو روشن کررہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ اسے اتنا بُرا نہیں لگا جتنا لگا کرتا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ وہ اس گھر میں یکسر تنہا ہونے کے باوجود اب تک اخلاق کے دائرے میں رہا تھا۔

اس نے اپنا بایاں ہاتھ اب بھی آنیہ کے کومل ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کو اپنی کھردری گرفت میں لے کر ہولے سے دبایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''یاد رکھنا کہ کوئی تمہیں چاہنے لگا تھا..... اس کی زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہوگئی تھی..... چلو آؤ..... تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آنیہ کو یوں لگا جیسے مدتوں کی قیدِ تنہائی کے بعد کسی نے اس کے زنداں کا دروازہ کھول دیا ہو۔

ابھی وہ لان کی طرف آہی رہے تھے کہ آٹومیٹک رائفل کی زبردست تڑتڑ سنائی دی۔ یہ ایک لمبا برسٹ تھا جو کہیں پاس ہی چلایا گیا تھا۔ راسو بے طرح ٹھٹک گیا۔ آنیہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر لان میں آیا۔ یہی وقت تھا، جب دوسرا برسٹ چلا۔ اب آواز کی سمت اور فاصلے کا بھی درست اندازہ ہوا۔ یہ برسٹ کم و بیش دو فرلانگ کی دوری پر چلے تھے۔ اسی دوران میں سنگل فائر بھی شروع ہوگئے۔ جیسے دو گروپ ایک دوسرے پر گولی چلا رہے ہوں۔ راسو نے جلدی سے موبائل فون نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر اضطراب صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ تب وہ کمرے میں آکر ایک الماری کی طرف گیا اور کوئی چیز اپنی شرٹ کے نیچے چھپائی۔ آنیہ کو یہی لگا کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ ہے۔ اس کے خوف میں اضافہ ہوگیا۔

اسی دوران میں راسو کے موبائل پر کال آگئی۔ ایک

بار پھر اس نے تیز سرگوشی کے لہجے میں چند فقروں کا تبادلہ کیا اور آنیہ کی طرف آیا۔

کچھ کہے بغیر اس نے آنیہ کا بازو تھاما اور لان سے گزر کر مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کچھ ہی فاصلے پر کسی پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ راسو رک گیا۔

''یہ..... کیا ہو رہا ہے؟'' آنیہ نے ہراساں آواز میں قریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔

وہ آنیہ کو دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ چند لمحے تک باہر کی آوازوں پر غور کرتا رہا پھر مضطرب مگر ٹھہرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''مین بازار کے بڑے چوک کے پاس کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ شاید ایک دو بندے مر بھی گئے ہیں۔ ابھی ہمارا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔'' اس نے دیوار گیر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ دو قریبی کمروں کی روشنیاں بجھا دیں اور ٹیبل پر رکھے ہوئے چائے کے برتن بھی کچن میں پہنچا دیے۔ آنیہ ڈری سہمی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس فائرنگ سے راسو کا اور زباب منزل کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟

اب ایک دو ایمبولینس گاڑیوں کے ہوٹر بھی سنائی دینے لگے تھے۔ فضا میں سنسنی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ آنیہ نے پچھلے دنوں پہلے ہی یہ نیوز پڑھی تھی کہ راجوری میں گینگ وار کا سا ماحول بن رہا ہے۔ دو متحارب گروہ ایک دوسرے کے درپے ہو رہے ہیں، کوئی بڑا واقعہ ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ وہی معاملہ تو نہیں؟ اس نے سوچا۔

اگلے دس منٹ بے حد تشویش کے عالم میں گزرے۔ پھر راسو کو ایک ایسی فون کال آئی جس نے اسے زیادہ ڈسٹرب کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک سرخی سی چھا گئی تھی۔ اس نے بے حد بے چینی سے مین گیٹ اور اندرونی دروازے کے درمیان دو تین چکر لگائے۔ تب ایک اور کال سننے کے بعد تیزی سے آنیہ کے پاس آیا۔

''مس آنیہ! ویری ساری..... ابھی آپ یہاں سے نکل نہیں سکتیں..... معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے..... آپ کا سیل فون کہاں ہے؟''

آنیہ نے اسے سیل فون دکھایا جو اس نے جلدی سے جھپٹ کر جیب میں ڈال لیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' آنیہ حیران ہوئی۔

''یہ سوال جواب کا وقت نہیں..... آ..... آپ میرے ساتھ آئیں..... جلدی۔''

آنیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی راسو نے اس کا بازو پکڑا اور اسے قریباً کھینچتا ہوا زباب منزل کی اپر اسٹوری پر لے آیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو دروازے کھولے اور آنیہ کو ایک اسٹور نما جگہ پر لے آیا۔ وہ ہکا بکا تھی۔ سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔ ''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، آپ اس پر عمل کریں۔ ورنہ آپ کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ آپ کا شولڈر بیگ کہاں ہے؟''

''وہ..... تو نیچے پڑا ہے۔''

وہ دوڑ کر گیا اور شولڈر بیگ بھی اوپر اس اسٹور نما کمرے میں لے آیا۔ اس نے اپنی جین کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ دو چابیاں آنیہ کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ چابی اس کمرے کی ہے۔ یہ دوسری چابی باہر کے چھوٹے گیٹ کی ہے لیکن آپ کو یہاں سے ابھی نہیں نکلنا۔ کم از کم..... کم از کم دن کی روشنی اچھی طرح پھیلنے کا انتظار کرنا ہے۔ کسی کو فون نہیں کرنا، کسی کو پکارنا نہیں۔ بس یہی لگے کہ اس گھر میں کوئی موجود ہی نہیں۔''

''میری سمجھ میں..... کچھ نہیں آ رہا، کیا آپ کہیں جا رہے ہو؟''

راسو نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا گریبان کچھ اور کھل گیا۔ سینے کے گھنے بال مزید نمایاں ہو گئے۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''یہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ دو بندے مر گئے ہیں۔ پولیس یہاں زباب منزل کے باہر بھی موجود ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ مجھے بھی یہاں سے گرفتار کر کے لے جائیں۔ مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دو چار روز تک میں پھر باہر آ جاؤں گا لیکن اگر پولیس کو یہاں آپ کی موجودگی کا پتا چل گیا تو یہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا.....''

وہ آنیہ کو مختلف ہدایات دے ہی رہا تھا جب زباب منزل کا بیرونی گیٹ دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا۔ آنیہ کا موبائل فون اسے واپس کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا لیکن پھر جلدی سے واپس آیا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں گیا اور کوئی چیز ڈبل بیڈ کے نیچے کسی خفیہ جگہ پر چھپائی۔ آنیہ نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ راسو کا موبائل فون ہے۔ پھر آنیہ پر ایک نظر ڈالتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔

بوکھلائی ہوئی آنیہ نے راسو کی ہدایت کے مطابق اسٹور نما کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور لائٹس آف کر کے دم سادھ لیا۔

اگلے پانچ دس منٹ کافی سنسنی خیز اور بے حد تناؤ

بھرے تھے۔ زباب منزل کے مختلف حصوں میں بھاری بوٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ دروازے دھڑادھڑ کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔ کچھ آوازیں اس اسٹور نما کمرے کے بالکل نزدیک بھی سنائی دیں۔ کسی پولیس افسر کا ایک کرخت جملہ آنیہ کے کانوں تک بھی پہنچا۔ وہ غالباً راسو سے ہی پوچھ رہا تھا کہ وہ لنگڑی کہاں ہے؟ اشارہ یقیناً اس سدرہ نامی لڑکی کی طرف ہی تھا۔

اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ آنیہ کے کانوں تک نہیں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد آہٹوں، آوازوں اور للکاروں سے آنیہ کو اندازہ ہو گیا کہ راسو کو گرفتار کر کے زباب منزل سے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ دم سادھے، سکتہ زدہ کھڑی رہی۔

☆☆☆

آنیہ گہری تاریکی میں اس تنگ کمرے کے اندر ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ راسو کی ہدایت کے مطابق اس نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

راسو کے حوالے سے وہ پہلے بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی اور اب تو جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بے حد تشویشناک اور پُرخطر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا دو بندے مر گئے ہیں تو کیا ان ہلاکتوں سے اس کا کوئی براہِ راست تعلق تھا؟ اس سے پہلے وہ کسی واردات کے شبہے میں پکڑا گیا تھا اپنی موٹر بائیک سمیت، اور اس سے پہلے بھی خبر نہیں کیا کچھ کر چکا تھا (آنیہ کو وہ واقعہ بھی یاد تھا جب وہ اپنے کسی زخمی ساتھی کا خفیہ طور پر علاج کرانا چاہتا تھا)

فی الوقت آنیہ کے نزدیک سب سے اہم سوال یہی تھا کہ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں کب تک بند رہے گی۔ راسو کو اندیشہ تھا کہ اس کی گرفتاری کے بعد بھی پولیس زباب منزل کے قریب موجود رہے گی۔ تو کیا وہ ساری رات یہیں بند رہ کر گزار دے گی؟ آنیہ کے والد ایک بڑے وکیل تھے۔ جالندھر بلکہ پورے ضلع میں ان کو بڑی اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے آنیہ کے جی میں آئی کہ وہ پاپا کو فون کرے اور اس ساری صورتِ حال کے بارے میں بتا دے۔ وہ والدہ سے زیادہ والد کے نزدیک تھی اور ان سے ہر طرح کی بات کر لیتی تھی۔ بہرحال کچھ مزید سوچنے کے بعد اس نے پاپا کی پریشانی کے خیال سے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

تب اس کا دھیان نہار اور دلبر ماموں وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ نہار یقیناً اس کے لیے پریشان ہونا شروع ہو گئی ہو گی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اطلاع دینا ضروری تھا۔ زباب منزل میں اب مکمل خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھی کسی پالتو بلی کی ''می آؤ..... می آؤ'' سنائی دے جاتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد آنیہ نے تھوڑی سی ہمت کی اور راسو کی دی ہوئی چابیوں میں سے ایک چابی مضبوط قفل میں لگا کر اس اسٹور نما کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ دروازہ، دیوار کا ہم رنگ تھا اور دیوار کی PENELING کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اسے علیحدہ سے دیکھنا آسان نہیں تھا۔ اردگرد کے کمروں میں بے ترتیبی سی تھی۔ جاتے جاتے پولیس والوں نے کافی اکھاڑ پچھاڑ کی تھی۔ مختلف اشیا یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

اس نے لابی کی لائٹس آن نہیں کیں، اندھیرے میں ہی دھیان سے قدم رکھتی ہوئی ایک کشادہ سلائڈنگ ونڈو کے پاس پہنچی۔ شیشے کے پار زباب منزل کے سامنے والی سڑک کا کچھ حصہ اور ایک دو گلیاں نظر آتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی کہ گلی کے موڑ پر ایک نیلی روشنی ''ریوالو'' کر رہی تھی۔ یقیناً یہ کسی پولیس کار یا جیپ کی روشنی ہی تھی۔ راسو کا اندیشہ درست تھا۔ پولیس یہاں موجود تھی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے دوبارہ سے اسٹور نما کمرے میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر سوچ کر اس نے اپنا موبائل آن کیا اور جلدی سے ایک ٹیکسٹ میسج نہار کے لیے بھیج دیا۔ اس نے لکھا۔ ''میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں ایک مشکل میں ضرور پھنس گئی تھی لیکن اب بالکل خیر خیریت سے ہوں۔ صبح آٹھ نو بجے تک واپس آ جاؤں گی۔ فی الحال میرا فون بند رکھنا ضروری ہے اگر ممکن ہوا تو رات کو کسی وقت کال کروں گی۔ خدا حافظ۔'' میسج بھیج کر اس نے فون دوبارہ آف کر دیا۔

اس کا دھیان ایک بار پھر شہابی اور اس سے ہونے والی گفتگو کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپا بیٹھا تھا؟ نجانے کیوں آنیہ کو لگنے لگا تھا کہ وہ جھوٹ بھی بولتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ظہیر اور نادیہ کو ایم پی اے کے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ شاید اصل حقیقت یہ تھی کہ اس نے ان دونوں مصیبت زدگان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے بُرے انجام کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اگلے قریباً دو گھنٹے آنیہ نے اسی کمرے میں بند رہ کر گزارے۔ سیکڑوں ہی وسوسے اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے مگر پھر دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہونے لگا۔ رات

کے قریباً ایک بجے کا عمل تھا۔ زباب منزل میں مکمل خاموشی تھی۔ کم از کم اتنا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس عمارت کے اندر کوئی پولیس والا موجود نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور باہر نکل آئی۔ تاریک لابی میں سے دیکھا۔ سڑک کے موڑ پر پولیس کی موجودگی کو اب بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا، بہرحال نیلی لائٹ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس مستطیل بیڈ روم کی جانب آ گئی جہاں راسو نے جاتے جاتے کچھ چھپایا تھا۔ تجسس سے مجبور ہو کر وہ گھٹنوں پر جھک گئی اور بیڈ کے نیچے جھانکنے لگی۔ کئی منٹ کی کوشش سے وہ بیڈ کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا چور خانہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس خانے میں کچھ اشیا موجود تھیں۔ سب سے پہلے آنیہ کی نظر سیاہ رنگ کے کولٹ پسٹل پر پڑی۔ وہ فلی لوڈڈ تھا۔ پسٹل کے پاس ہی راسو کا موبائل فون بھی رکھا تھا۔ غالباً یہی دونوں اشیا تھیں جو گرفتاری سے پہلے راسو نے یہاں رکھی تھیں۔ اس نے موبائل نکالا وہ آن تھا مگر سائیلنٹ پر لگا ہوا تھا۔ اس پوشیدہ خانے میں تھوڑی سی جیولری نظر آ رہی تھی۔ کسی گاڑی کی رجسٹریشن بک تھی اور ڈارک براؤن کور والی ایک ڈائری تھی۔

آنیہ نے وہیں قالین پر بیٹھ کر راسو کے موبائل فون پر نگاہ دوڑائی۔ راسو اور شہابی کے بارے میں جاننے کی شدید خواہش اس میں موجود تھی۔ اس نے ''کال لاگ'' چیک کی، پھر پیغامات دیکھے۔ تین چار آخری پیغامات نے اسے چونکایا۔ غالباً راسو جلدی میں انہیں ڈیلیٹ نہیں کر سکا تھا۔ کل رات نو بجے راسو نے اپنے کسی دوست شادے کو ٹیکسٹ میسج بھیجا تھا۔ ''میری اطلاع کے مطابق لڑکی نادیہ کی طبیعت خراب ہے..... نادیہ اور ظہیر تھوڑی دیر میں کلینک جانے کے لیے نکلیں گے۔ ایم پی اے صاحبا کا گارڈ اور ڈرائیور ساتھ ہوگا۔ یہ بہترین موقع ہے۔ تم تیار رہو، میں آ رہا ہوں۔''

قریباً دو گھنٹے بعد رات گیارہ بجے راسو نے ایک مبہم سا پیغام اپنے کسی جاننے والے یا دوست ''شکیل اسنوکر'' کو ارسال کیا تھا۔ ''دونوں پنچھی، چیل کے جھپٹے سے بچ گئے ہیں۔ ہمارے پاس ہیں۔ بالکل خیریت سے ہیں۔ سمجھو کہ چہچہا رہے ہیں، تھینکس گاڈ۔''

قریباً 15 منٹ بعد سوا گیارہ بجے یکے بعد دیگرے شہابی کی تین کالز راسو کے اس نمبر پر آئی تھیں جو اس نے اٹینڈ نہیں کی تھیں۔ پھر شہابی کا ٹیکسٹ میسج راسو کے لیے آیا تھا۔ ''تم سؤر کی اولاد ہو۔ مجھے پتا ہے، جو کیا ہے تم نے کیا ہے۔ تمہاری یہ پائے خانیاں ہم سب کو لے ڈوبیں گی۔ اس کنجر اروڑا نے سب سے پہلے میرا ٹیٹوا ہی دبانا ہے اور اگر اسے کوئی ثبوت مل گیا ناں تو یاد رکھو، وہ تمہاری بھی ساری اگلی پچھلی کسر نکال دے گا، لعنت ہو تم پر۔''

آخری میسج آج صبح سویرے کا تھا اور یہ راسو نے شہابی کو بھیجا تھا۔ ''فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوگا اور اگر کوئی مشکل آئی بھی تو خود پر ہی لوں گا۔ ان پنچھیوں کو دردناک انجام سے بچا کر جو راحت ملی ہے، اس کے بدلے میں دو چار ہڈیاں بھی تڑوانا پڑیں تو گھاٹے کا سودا نہیں۔''

یہ پیغامات دیکھ کر، جیسے ایک تصویر سی آنیہ کی نگاہوں کے سامنے مکمل ہو گئی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہو رہی تھی کہ ''ظہیر'' اور ''نادیہ'' کو واقعی ایم پی اے انوار کے گھر سے نکال لیا گیا ہے اور اروڑا وغیرہ سے دور کر دیا گیا ہے مگر یہ کام شہابی حیدر نے نہیں راسو نے کیا تھا..... اور..... ابھی تھوڑی دیر پہلے راسو کی جو گرفتاری عمل میں آئی تھی، اس کے پیچھے بھی غالباً اس کی یہی سنگین کارروائی تھی۔

لگ یہی رہا تھا کہ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے مین بازار میں جو فائرنگ ہوئی ہے، وہ پولیس اور راسو کے ساتھیوں میں ہوئی ہے۔ شاید راسو کا کوئی ساتھی پولیس کے ہتھے بھی چڑھا تھا اور اسی وجہ سے پولیس چند منٹ میں دندناتی ہوئی زباب منزل پہنچ گئی تھی۔ مقامی پولیس اور راسو کے تعلقات پہلے بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے۔ یہ شخص عجیب سا گورکھ دھندا تھا۔ ایک دن نہار کور نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید اس کا تعلق کسی تنظیم وغیرہ سے ہو۔ ممکن تھا کہ وہ اپنی اسنوکر کلب والی مصروفیت کو صرف ایک آڑ کے طور پر استعمال کرتا ہو۔

آنیہ نے راسو کے موبائل میں کچھ مزید جھانکا۔ وہ جو اسنوکر کلب چلا رہا تھا، اس کی کچھ تصاویر تھیں، کچھ تصویریں اس کے قریبی دوستوں کی تھیں۔ وہ بھی اسی کی طرح اپنے حلیے سے بے پروا اور آوارہ گرد نظر آتے تھے۔ چند پیغامات ایسے تھے جن میں کسی اچھے کھلونے کا ذکر کیا گیا تھا۔ آنیہ کو یہی لگا کہ کھلونے سے مراد کوئی ہتھیار وغیرہ ہے..... اور جس بچے کے لیے کھلونا درکار ہے وہ خود راسو یا اس کا کوئی ساتھی ہے۔ کوئی ایک ماہ پرانی ایک تصویر دیکھ کر وہ بُری طرح چونکی اور ایک بار پھر اس کے اندر راسو کے لیے ناپسندیدگی اور غصے کی لہر سی ابھری۔ یہ خود آنیہ کی تصویر تھی اور راجوری میں اس کی پچھلی آمد کے موقع پر اتاری گئی تھی۔ آنیہ فورٹ میں بڑی محویت سے ایک محرابی دروازہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے

بال منتشر تھے اور گلابی آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا۔ یہ تصویر آنیہ کی بے خبری میں اتاری گئی تھی۔ راسو کے موبائل میں موجود اس تصویر کے نیچے ایک شعر لکھا تھا۔

خطا تو جب ہو کہ ہم حال دل کسی سے کہیں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

آنیہ کا دل چاہا کہ تصویر کو ڈیلیٹ کردے مگر پھر اسے یہ مناسب نہیں لگا۔ اس نے موبائل اسی طرح چور خانے میں واپس رکھ دیا۔ اس نے گاڑی کی بوسیدہ رجسٹریشن بک دیکھی اس میں بھی کچھ رسیدیں اور فوٹو گراف موجود تھے۔ ان میں سے دو فوٹوز چونکا دینے والی تھیں۔ ایک فوٹو میں وہی ٹانگ سے معذور لڑکی سدرہ نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ جو شخص نظر آرہا تھا، وہ یقیناً وہی کرنل اروڑا تھا جسے آنیہ نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے عالیشان آفس میں دیکھا تھا۔ اس نے سدرہ کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور بے دردی سے کھینچ کر کسی کمرے سے باہر لا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے اپنے کمرے یا دفتر سے باہر دھکیل رہا ہے۔ دوسری کارڈ سائز تصویر بالکل مختلف منظر پیش کرتی تھی۔ اس میں کرنل اروڑا شادی کے لباس میں تھا اور اگنی کے پھیرے لے رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جو دلہن اس کے ساتھ پھیرے لے رہی تھی، وہ سدرہ تھی۔ ادھیڑ عمر اروڑا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جبکہ کومل سی خوبرو سدرہ مظلومیت کی تصویر نظر آتی تھی۔

آنیہ چکرا سی گئی۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ایک ادھیڑ عمر ہندو سے؟ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اس شادی کے لیے ہندو ہوگئی ہو؟ یہ ناممکن تھا۔ پھر سدرہ کی ٹانگ کا نقص۔ کم از کم ان تصاویر سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تب سدرہ کی ٹانگ ٹھیک ہی تھی۔ وہ سوچتی رہی، پھر ایک نیا خیال آنیہ کے ذہن میں آیا، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ سدرہ پہلے ہندو ہو، بعد میں مسلمان ہوئی ہو مگر اتنی خوب صورت لڑکی کی شادی اتنی پکی عمر کے فوجی افسر سے..... جس تصویر میں اروڑا، سدرہ کو بالوں سے کھینچ کر کمرے سے باہر دھکیل رہا تھا، اس میں ایک اور چیز بھی نوٹ کرنے والی تھی۔ اروڑا کے گہرے گندمی چہرے پر کسی سرخ مائل پوائنٹ سے کراس کا نشان لگایا گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس شخص سے نفرت کا اظہار بھی تھا۔ یہ اظہار کس نے کیا تھا؟ کیا یہ راسو کی طرف سے تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پڑھا جانے والا میسج آنیہ کے ذہن میں آیا۔ شہالی نے راسو کو لکھا تھا۔ ''اس کنجر اروڑا نے سب سے پہلے میرا [illegible] ہی دبانا ہے اور اگر اسے کوئی ثبوت مل گیا ناں تو یاد رکھو وہ تمہاری بھی ساری اگلی پچھلی کسر نکال دے گا، تصویر کی پشت پر سرخ روشنائی سے ہی ایک فقرہ بھی درج تھا..... ہم نہیں مانتے، ظلم کے ضابطے۔

پتا نہیں کہ یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟ آنیہ نے تصویروں سمیت رجسٹریشن بک دوبارہ پوشیدہ خانے میں رکھ دی تھی۔ اسے ان سارے معاملات سے سخت اُلجھن محسوس ہورہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی رات کے دو بجے تھے۔ کم از کم پانچ چھ گھنٹے مزید اسے اسی خالی زباب منزل میں گزارنے تھے۔ عمارت کے عقبی باغیچے کی طرف سے ایک بار پھر بلی کی ''می آؤ می آؤ'' سنائی دی۔ پھر دو بلیاں لڑنے لگیں۔ آنیہ کا دل چاہا کہ وہ موبائل فون آن کرکے نہار کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرے مگر پھر راسو کی تاکید یاد آئی کہ وہ اپنا فون بند ہی رکھے تو بہتر ہے۔

اس نے ہاتھ لمبا کرکے بیڈ کے چور خانے میں سے ڈارک براؤن کور والی ڈائری نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اس ڈائری میں بس کہیں کہیں دو چار فقرے ہی ہندی ٹیکسٹ میں لکھے ہوئے تھے باقی ساری ڈائری کی تحریریں کسی اور زبان میں تھیں۔ بہت باریک، نفیس سی لکھائی تھی مگر کوئی لفظ پلے نہیں پڑتا تھا۔ یہ سنسکرت ہرگز نہیں تھی۔ شروع میں آنیہ کو لگا کہ شاید یہ گجراتی یا کشمیری ہے مگر یہ خیال بھی غلط ہی ثابت ہوا۔ پتا نہیں کہ آنیہ کے ذہن میں کیا آیا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور دس پندرہ منٹ میں اس ڈائری کے ساٹھ ستر صفحات کی تصاویر لے لیں۔

بعدازاں اس نے ساری اشیا اسی ترتیب کے ساتھ دوبارہ چور خانے میں رکھیں اور اسے بند کرکے واپس اسٹور نما کمرے میں آگئی۔ موبائل فون تو وہ آن کرہی چکی تھی۔ اس نے حیران و پریشان نہار کور سے رابطہ کیا اور بڑی دھیمی آواز میں اسے زباب منزل کی ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

گفتگو کے آخر میں نہار کور نے بے حد پریشان لہجے میں اسے مشورہ دیا کہ وہ صبح سویرے پانچ اور چھ بجے کے درمیان وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس وقت رات بھر ڈیوٹی دینے والے پولیس اہلکار اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی بار نہار کور بھی خوف زدہ محسوس ہوئی تھی۔ یہاں کے سارے معاملات بہت بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

تاریخ کے اوراق پر بکھری داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

آخری حصہ

belong to SANOBER IQBAL

باغ سے باغ تک

طاہر جاوید مغل

کچھ واقعات انتہائی غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں... صدیوں کا سفر طے کرنے کے باوجود ہمیشہ ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں... تاریخ سے جڑے ایک ایسے ہی یادگار واقعے کی.ناقابلِ فراموش کہانی... جس کے ایک کردار کی تلاش و کھوج نے کہانی کو ایک نئے رخ سے ہمکنار کر دیا... بہادری... دلیری کا تمغہ سجائے محبت کی فصیلوں کو عبور کرتا ایسا کردار جو اپنے شاندار ماضی سے جڑے رشتوں کی پاس داری کرنا جانتا تھا... نصف صدی گزرنے کے باوجود اس کی رگوں میں وہی جوشیلا خون دوڑ رہا تھا... دشمن سرکار کے ظلم و ستم اور اندھیر نگری نے اسے ایسے راستوں کا راہی بنا دیا کہ ہار بھی تو بازی مات نہیں...



کشمیر کی آزادی.....اور جدوجہد

کے گرد گھومتی خون رنگ داستان

محبت کے نشیب و فراز


SALMAN's
CHOICE

آنیہ اور نہار کو راجوری سے واپس جالندھر جارہی تھیں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہی ہوا تھا۔ ماموں دلبر سنگھ بھی ہکا بکا رہ گئے تھے اچانک دونوں کی واپسی کا پروگرام کیسے بن گیا۔ حقیقت یہی تھی کہ آنیہ اب ایک منٹ بھی یہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی کہ خیر خیریت کے ساتھ زباب منزل سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ راسو کی ہدایت کے مطابق وہ صبح چھ بجے کے لگ بھگ بالائی منزل سے اتری تھی۔ راسو کی دی ہوئی چابی کے ساتھ اس نے بیرونی گیٹ کا چھوٹا دروازہ ان لاک کیا تھا اور اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی..... اور اب صرف دس گھنٹے بعد وہ دونوں بذریعہ بس جالندھر کی طرف رواں تھیں۔

بس میں سوار ہوتے وقت نہار کور نے ایک اخبار لیا تھا اور اس کی ورق گردانی کررہی تھی۔ پھر وہ اخبار دیکھتے دیکھتے ایک دم چونکی۔ ''یہ دیکھو آنیہ جانی! یہاں رات والی خبر لگی ہوئی ہے۔''

آنیہ نے بھی ٹھٹک کر دیکھا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک ''دو کالمی'' خبر موجود تھی۔ لکھا تھا۔ ''راجوری میں مرغزار کے علاقے میں ایک پولیس ناکے پر مشکوک کار سواروں اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ اس میں ایک فرد موقع پر ہلاک ہوا، جبکہ دو شدید گھائل ہوئے۔ ان میں ایک اے ایس آئی بھی شامل ہے۔ گھائل ہونے والوں میں سے دوسرا فرد اسپتال میں چل بسا۔ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس واقعے کا تعلق پرسوں والی اس واردات سے ہے جس میں راجوری کے پرہمی جوڑے ظہیر اور نادیہ کو ایک پرائیویٹ کلینک کے پاس سے مبینہ طور پر اغوا کرلیا گیا تھا۔ ابھی تک ظہیر اور نادیہ کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس سلسلے میں چند گرفتاریاں بھی عمل میں آئی ہیں۔''

خبر دیکھ کر آنیہ نے ماتھے سے پسینا پونچھا۔ یقینی طور پر راسو اس کیس میں ملوث تھا۔ وہ گرفتار ہوچکا تھا۔ اب پتا نہیں اس نے کیا کچھ اگل دینا تھا۔ اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ نہار اور آنیہ کی زباب منزل میں آمد و رفت بھی سامنے آجاتی..... اور یوں پولیس ان تک بھی پہنچتی اور سوال جواب کرتی۔ بہرحال ابھی یہ صرف قیاس آرائی ہی تھی۔

راسو نے غالباً کام تو اچھا کیا تھا مگر اب اس واقعے میں دو ہلاکتیں شامل ہوگئی تھیں اور یہ سنگین تر ہوگیا تھا۔

بس ہموار سڑک پر تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ نہار نے نشست کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے مدھم آواز میں بولی۔ ''آنیہ اوپر والے کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے جلدی ہماری آنکھیں کھول دیں..... تمہارے سامنے شہابی حیدر کا اصل کردار آگیا۔ ورنہ شاید دیر ہوجاتی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' آنیہ نے تائید کی۔

نہار اسی کھوئے کھوئے آہنگ میں بولی۔ ''اس شہابی حیدر کے بارے میں تھوڑی سی مزید جانکاری مجھے بھی ملی ہے۔ صحافتی حلقوں میں اس کا نام تو ہے مگر اس کی ''ریپو'' کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ کئی ملازمتیں بدل چکا ہے..... ایک اخبار کی ملازمت کے دوران میں اسے بدعنوانی کے ایک معاملے کا سامنا کرنا پڑا اور اسے نکال دیا گیا۔ اگر یہ بندہ.....''

''پلیز نہار، اب چھوڑو اس ذکر کو۔ مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے، کوئی اور بات کرو۔'' آنیہ نے بیزار لہجے میں کہا۔

نہار گہری سانس لے کر چپ ہوگئی۔

اسی دوران میں آنیہ کے پاپا خورشید عالم صاحب کا فون آگیا۔ وہ ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں امرتسر میں تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''آنو! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم واپس آرہی ہو؟''

''جی پاپا۔''

''اتنی جلدی، خیریت تو ہے؟''

''بس پاپا! راجوری کا موسم عجیب ہورہا ہے۔ روزانہ ہی بارش ہوجاتی ہے۔ ٹھیک سے کام بھی نہیں ہورہا تھا۔ نہار کی طبیعت بھی کچھ خراب ہے اس لیے واپس آرہے ہیں۔''

''اور وہ کمپی ٹیشن؟''

''ابھی تو پوسٹ پونڈ ہی کردیا ہے پھر دیکھ لیں گے۔'' آنیہ نے کہا۔

☆☆☆

آنیہ کو راجوری سے واپس آئے دوسرا دن تھا۔ وہ بیسمنٹ میں موجود تھی۔ جو پینٹنگز اس نے راجوری کے قلعے میں بنائی تھیں، وہ ایک گوشے میں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ ان میں ایک ادھوری پوٹریٹ بھی تھی۔ یہ شہابی حیدر کی تھی۔ وہ بڑی نفیس پینٹ شرٹ میں..... باقاعدہ ٹائی لگائے ایک درخت سے کندھا ٹیکے کھڑا تھا۔ آنیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور عجب کوفت کے عالم میں تصویر پر برش پھیر کر اسے ضائع کردیا۔ تب اس نے وہ کینوس بھی پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ عجب یاس کے عالم میں سوچنے لگی۔ کبھی کبھی ہمارے ''خیال'' کتنے خام ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا ہمیشہ یہ خیال رہا تھا کہ البم کی سو سال پرانی تصویر میں نظر آنے والی بے مثل دلیری اور جرأت نے آگے تک سفر کیا ہوگا۔ کم از کم اگلی ایک دو نسلوں تک تو ضرور گئی ہوگی اور اسی دلیری اور بے مثل ''فیس

ایکسپریشنز'' کو ڈھونڈنے کے لیے وہ راجوری جا پہنچی تھی اور پھر یہ ثابت ہوا تھا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان کی ساری خوبیاں یا ساری خامیاں آئندہ نسلوں تک منتقل ہوں۔ خون میں خون شامل ہوتے ہیں اور انسانی فطرت میں تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں۔ شیر بچہ اپنے باپ کی طرح فوجی بنا تھا..... مگر اس کا بیٹا کوہ پیما بن گیا تھا اور اس کا بیٹا صحافی..... مگر ایسا صحافی نہیں جس پر فخر کیا جاسکتا.....

وہ ایک آہ سی بھر کر صوفے پر نیم دراز ہوگئی اور آنکھیں بند کرلیں..... پھر ایسا کیوں ہوا تھا؟ کیوں جب جب اس نے البم کی تصویر دیکھی تھی اور اسد اللہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا، اسے لگا تھا کہ ان آنکھوں میں للکارا مارنے والی دلیری منفرد ہے..... یہ رکنے والی نہیں، یہ منقطع ہونے والی نہیں..... یہ آگے تک جائے گی۔ جیسے شیر کیسے بھی حالات سے گزرے، رہتا تو شیر ہی ہے۔ اس کی جبلت کو مکمل طور پر بدلا نہیں جاسکتا۔

اچانک دستک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ یہ ماما تھیں اور اسے باہر آنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ وہ باہر آئی تو اسے پتا چلا کہ اس کا خالہ زاد فرحان آیا بیٹھا ہے۔ وہ مرے مرے قدموں سے باہر آئی۔ وہ اُسے دیکھتے ہی جوش سے بولا۔ ''میں تو یونہی خالہ سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آکر پتا چلا کہ تم بھی آگئی ہو، بہت اچھا سرپرائز ہے بھئی، زبردست۔''

ماما بولیں۔ ''بس اس کی فرینڈ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اس لیے یہ دونوں جلدی چلی آئیں۔''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' فرحان نے آنیہ سے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تک تو ٹھیک تھی۔'' اس نے کہا پھر ماما کے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''مگر اب سر میں ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔''

''تہ خانے میں بند رہو گی تو یہی کچھ ہوگا۔ چلو تمہیں تھوڑی سی تازہ ہوا کھلاتا ہوں۔ ایک بڑی اچھی خبر بھی سنانی ہے تم کو۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔

''تو یہیں پر سنا دیں نا۔''

''خالہ کو تو سنا چکا ہوں، تمہیں باہر جا کر سناؤں گا اور مٹھائی بھی کھلاؤں گا۔''

''ارے کہیں منگنی شنگنی تو نہیں ہوگئی آپ کی؟'' وہ بے حد خوش ہو کر بولی۔

فرحان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ چہرے پر واضح طور پر سٹپٹاہٹ نظر آئی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اس کے فون پر کال آگئی۔ یہ کوئی اہم کاروباری کال تھی۔ وہ باتیں کرنے لگا۔ ماما خشمگیں نظروں سے آنیہ کو گھور رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے آنیہ کو باہر بلایا۔

دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے دانت پیسے اور تیز سرگوشی کے لہجے میں بولیں۔ ''آنو! میں سچ کہتی ہوں، بہت بُری طرح پچھتائے گی۔ اپنی حرکتوں سے باز آجا۔ مرد ذات کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔''

''لیکن میں نے کیا کہہ دیا ماما؟'' وہ ٹھٹکی۔

''آہستہ بول۔'' انہوں نے آنکھیں نکالیں۔ ''وہ اتنے پیار سے تمہیں لے جانے کا کہہ رہا ہے اور تم آگے سے اسے منگنی کے ٹھٹھے مار رہی ہو۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔ ''بہت دل دُکھاتی ہو تم میرا..... بہت دل دُکھاتی ہو.....''

''ماما! میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا سر دکھ رہا ہے۔''

''مت کہا کر مجھے ماما، میں نہیں ہوں تیری ماما۔ اگر ہوتی تو تُو اس طرح ہر وقت اپنی باتوں کی چھری سے میرا گوشت نہ کاٹتی۔'' انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا اور دروازہ زور سے بند کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

آنیہ کچھ دیر تک گم صم کھڑی سوچتی رہی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ماما کا موڈ اتنا خراب ہو جائے گا۔ اس کے ذہن میں کشمکش سی تھی۔ کسی وقت وہ خود بھی سوچنے لگتی تھی کہ کہیں وہ کوئی غلطی تو نہیں کر رہی۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس کمرے میں آگئی جہاں فرحان فون پر باتوں میں مصروف تھا۔

آدھ گھنٹے بعد آنیہ اور فرحان چہچہاتی ''ہنڈائی'' پرسٹی سینٹر کی طرف جا رہے تھے۔ آنیہ کے ساتھ آنے سے فرحان کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ وہ بات بات پر ہنس رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کے فربہ رخساروں کا گوشت کانوں کی طرف دوڑتا محسوس ہوتا تھا۔ ''کس خوش خبری کی بات کر رہے تھے آپ؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''وہی خوش خبری جو میں تمہیں چھ سات روز سے سنانا چاہ رہا ہوں۔ کوئی بیس بار فون کیا ہوگا لیکن کبھی تمہارا فون بند جاتا تھا، کبھی کال اٹینڈ نہیں ہوتی تھی۔''

''بس..... بتایا ہے نا کہ نہار کی طبیعت کچھ خراب تھی، اسی کے چکر میں رہی۔''

''کسی نہ کسی چکر میں تو تم ہر وقت ہی رہتی ہو اور سب

سے بُرا چکر تو مجھے یہ پینٹنگ والا لگتا ہے۔ پلیز آنیہ! ختم کرو اب اس بچپنے کو، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ باقی کی پڑھائی بھی ہمارے گھر.....''

''فار گاڈ سیک فرحان۔'' آنیہ نے ناگواری سے اس کی بات کاٹی..... پھر چند سیکنڈ بعد نارمل لہجے میں بولی۔ ''آپ خوش خبری کی بات کرنے لگے تھے؟''

فرحان نے جوشیلے انداز میں اس کے گھٹنے کو دبایا اور بولا۔ ''چمبا ٹاؤن میں ایک بڑا ٹھیکا ملا ہے لکڑی کے کام کا۔ تمہیں اندازہ ہے کتنے کا ٹھیکا ہوگا؟''

''کتنے کا؟'' آنیہ نے بے دلی سے پوچھا۔

''قریباً قریباً ساڑھے پانچ کروڑ کا۔ پانچ پانچ مرلے کے پندرہ بیس گھر ہیں جن کا سارا لکڑی کا کام کرنا ہے۔''

''تو پھر چمبا جا رہے ہیں؟''

''جا تو نہیں رہا..... مگر آنا جانا لگا رہے گا۔ دو ڈھائی سو کلو میٹر سفر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بائی ائر کا کوئی انتظام ہو جائے۔''

''بائے ائر؟'' آنیہ حیرانی سے بولی۔

''وہ جو اپنا جے پوری یار ہے نا وہ ایک چھوٹا کمرشل ''چاپر'' لے رہا ہے۔ اکثر چمبا آتا جاتا رہتا ہے۔'' فرحان نے فخریہ انداز میں کہا۔ لہجے سے عیاں تھا کہ شیخی بگھار رہا ہے۔

آنیہ بولی۔ ''آپ کے زیادہ یار ہندو ہی ہیں۔ یہ وہی راجندر چوہان ہے نا جو پچھلے سال ابوظہبی میں شراب نوشی اور لڑکی سے زبردستی کرنے کے الزام میں پکڑا گیا تھا؟''

''اوہو آنیہ تم منفی باتوں پر ہی کیوں دھیان دیتی ہو۔ راجندر کو عدالت نے بری بھی تو کیا تھا اور پھر یہی راجندر ہے جس نے غریب لوگوں کی بھلائی کے لیے ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے۔''

''اور جناب نے خود ہی بتایا تھا کہ یہ ٹرسٹ اسے ''ٹیکس'' وغیرہ بھرنے کے سلسلے میں فائدہ دیتا ہے۔''

فرحان بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ شاید یہ گفتگو بحث کی شکل اختیار کر جاتی مگر اسی دوران میں گاڑی ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں داخل ہو گئی۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر فرحان نے آنیہ کو اس 'سائٹ' کی تصاویر بھی دکھائیں جہاں اسے بڑا ٹھیکا ملا تھا۔ یہ کوئی ہاؤسنگ سوسائٹی لگتی تھی۔ متعلقہ لوگوں کے ساتھ دو تین گروپ فوٹو بھی تھے۔ ایک گروپ فوٹو کو دیکھ کر آنیہ چونکی۔ اس میں چند سوٹڈ بوٹڈ افراد کے ساتھ وہی کرخت چہرے والا ریٹائرڈ کرنل اروڑا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین مسلح گارڈز تھے۔ فرحان اس کے پہلو میں موجود تھا۔

''یہ..... یہ کون ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''یہی تو مالک ہیں، سابق فوجی ہیں۔ بڑی توپ قسم کی چیز ہیں۔ ان کا رئیل اسٹیٹ کا کام تیزی سے پھیل رہا ہے..... تم جانتی ہو انہیں؟''

''نن..... نہیں۔ یونہی صورت کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔'' آنیہ نے بات بنائی۔

اسی دوران میں ویٹر جوسز اور دیگر لوازمات لے آیا۔ فرحان ان اشیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اروڑا کا خیال ذہن میں آتے ہی آنیہ کا دھیان شہابی حیدر کی طرف بھی چلا گیا۔ اس کے اندر ایک ناگوار سی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے آفس میں تھی اور اتفاقاً ایک ہائی سیکیورٹی ایریا میں جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے شہابی کو دیکھا تھا۔ وہ کرنل اروڑا کے سامنے بت بنا کھڑا تھا اور اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ پچھلے دو تین دن میں شہابی نے چار پانچ دفعہ آنیہ سے فون پر رابطے کی کوشش کی تھی۔ آنیہ نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی..... اور آخر میں اس کا نمبر ہی بلاک کر دیا تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا..... قریباً دو ڈھائی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ راجوری اور وہاں کے تمام معاملات سے آنیہ اور نہار کنارہ کش ہو گئی تھیں۔ آنیہ نے وہ ساری پینٹنگز اسٹور روم میں پھینک دی تھیں جو اس نے ''مصوری کے مقابلے'' کے لیے بنائی تھیں۔ اب تو مقابلے کی تاریخ گزرے بھی دو تین ہفتے گزر چکے تھے۔ بس ماموں دلبر سے کبھی کبھار فون پر آنیہ کی بات ہو جاتی تھی۔ پچھلے ہفتے دلبر ماموں سے جو گفتگو ہوئی، اس سے ایک اہم بات آنیہ کو اور نہار کو معلوم ہوئی تھی۔ ماموں نے بتایا تھا کہ شہابی حیدر کے دوست راسو کے بارے میں ایک خبر پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ پولیس کی حراست میں نہیں ہے بلکہ فرار ہو چکا ہے، پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ دلبر ماموں کے مطابق راسو کے فرار ہونے کا واقعہ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے پیش آیا تھا۔

یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔ راسو کو یقیناً اس وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا کہ اس نے پریمی جوڑے یعنی ظہیر اور نادیہ کو ٹھیکیدار نرائن اور کرنل اروڑا کے چنگل سے بچایا تھا۔ یہ بات

بھی طے تھی کہ لڑکی لڑکے کو برآمد کرانے کے لیے راسو پر تشدد وغیرہ بھی کیا گیا ہوگا۔ آنیہ اور نہار کو اندیشہ تھا کہ وہ ظہیر اور نادیہ کے بارے میں اُگل دے گا مگر اب اس تازہ خبر کے بعد یہ خوش فہمی پالی جاسکتی تھی کہ شاید شادی شدہ جوڑا ابھی تک محفوظ ہو۔

آنیہ اس بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ ایک روز اس نے خود دلبر ماموں کو فون کر ڈالا۔

''ہیلو، میری وھی رانی کیسی ہے؟'' وہ ہمیشہ کی طرح چہکے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ماموں، آپ کیسے ہیں؟''

''میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ ڈائٹنگ والا حربہ بھی تقریباً ناکام ہوگیا ہے جب تک راجوری کی سویٹ شاپس پر گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو بننا بند نہیں ہوندے، میرا کچھ نہیں ہوسکدا۔''

آنیہ اور دلبر ماموں دونوں ہنسنے لگے۔

چند لمحے بعد آنیہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ماموں! اس لڑکی نادیہ اور لڑکے ظہیر کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

''ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں اور وہ کہندے ہیں ناں کہ نو نیوز از گڈ نیوز۔ لگدا یہی ہے کہ وہ دونوں ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔''

''کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ راسو نے ہی ان دونوں کو بھگایا تھا؟''

''آہو وھی رانی! یہ بات تو اب کھل گئی ہے کہ اسی نے کڑی منڈے کو ایم پی اے ریاض کی کوٹھی کے پاس سے اٹھایا اور کسی محفوظ تھاں (جگہ) پر پہنچا دتا۔ وہ بھی جی دار منڈا ہے۔ اس نے زباب منزل میں ایک لنگڑی کڑی کو بھی پناہ دے رکھی ہے۔ کہندے ہیں کہ اس کے پتی کو بھی پولیس نے ہی مارا تھا، یا شاید فوج نے۔ اس کڑی کا نام سدرہ ہے۔''

''وہ..... سدرہ اب کہاں ہے؟''

''جہاں تک میری جانکاری ہے، وہ بھی اب زباب منزل میں نہیں ہے۔ پہلے شاید اسپتال میں تھی، پھر وہاں سے بھی چلی گئی۔ لگدا ہے، پولیس کے ڈر سے کہیں غائب ہوگئی ہے۔''

''اس..... راسو کے بارے میں اب کیا خبر ہے؟''

''سنا ہے کہ پولیس اس کے لیے چھاپے مار رہی ہے۔ یہ بھی کہندے ہیں کہ اس کا کسی گروپ وغیرہ سے سمبندھ ہے۔ باقی رب جانے۔ خیر وبتا رہا تھا کہ تین چار دن کے لیے شہابی حیدر بھی گرفتار رہا ہے..... پھر چینل والوں نے اُسے چھڑایا تھا۔''

ماموں دلبر سے گفتگو ختم کرنے کے بعد آنیہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار راسو کی طرف جارہا تھا۔ زباب منزل میں راسو نے جس طرح زبردستی اسے اپنا مہمان بنایا تھا، وہ بھی اس کے حافظے پر نقش تھا۔ پھر اس کے موبائل میں اس کی تصویر؟ عجیب ایب نارمل رویہ تھا اس کا۔ اس رویّے میں اور اس کی شخصیت میں ایک طرح کی پراسراریت شامل تھی۔ اس کی گرفتاری کے بعد آنیہ کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ کہیں اس سارے معاملے میں اس کا نام بھی نہ آجائے، کیونکہ راسو کی گرفتاری کے وقت وہ زباب منزل میں موجود تھی مگر اس حوالے سے خیریت ہی رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ راسو نے پولیس کو کسی کے بارے میں کچھ بتا کر نہیں دیا تھا۔

اچانک آنیہ کا دھیان اس ڈائری کی طرف چلا گیا جو اس نے راسو کے بیڈروم کے ایک چور خانے میں دیکھی تھی۔ آنیہ کے اسمارٹ فون میں اس ڈائری کے تقریباً سارے اوراق کی تصاویر موجود تھیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد اس ڈائری کا خیال آیا تو آنیہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ وہ کیا تحریر تھی۔ اس ڈائری کی تصاویر اتارتے وقت آنیہ نے سوچا تھا کہ وہ نہار سے یہ تحریر پڑھوانے کی کوشش کرے گی (وہ مشکل اور ناقابلِ فہم تحاریر پڑھنے کا ذوق رکھتی تھی) مگر پھر جالندھر آکر یہ بات آنیہ کے ذہن سے نکل گئی تھی۔

اس نے فون کی گیلری میں جاکر اس ڈائری کا عکس دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ کل نہار بھی امرتسر سے جالندھر آرہی ہے۔ اسے یہاں کی لائبریری میں کوئی کام تھا۔ یہ اچھا موقع تھا کہ اسے ڈائری کی یہ تحریر دکھائی جاتی۔

☆☆☆

اگلا روز بے حد انکشاف انگیز اور سنسنی خیز ثابت ہوا۔ نہار سے ملاقات ہوئی۔ آنیہ نے اسے دلبر ماموں سے ہونے والی ساری گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر ڈائری کی وہ نقل بھی دکھائی۔ کافی غور وخوض کرنے کے بعد بھی نہار اسے سمجھ نہیں سکی۔

اس نے کہا۔ ''یہ تو طے ہے کہ یہ کوئی قدیم طرزِ تحریر نہیں ہے یہ نیا ہے..... بلکہ شاید جدید ہے۔ کسی رائج زبان میں ایک 'کلید' کے تحت بہت سے اضافی حروف شامل کر کے اسے ناقابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً اگر ہم اردو کے لفظ کتاب

میں ف کا جابجا استعمال کریں تو کتاب کے بجائے ''کف تقابف'' بن جائے گا۔''

پھر وہ ایک دم چونکی اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ اپنے لمبے بالوں کو ہلکورا دے کر بولی۔ ''ہاں، ایک کام ہوسکتا ہے آنیہ جانی۔''

''وہ کیا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ایک جگہ چلنا ہے۔ تم گاڑی نکالو۔''

صرف بیس منٹ بعد وہ دونوں ایک بنگلا نما گھر کے ڈرائنگ روم میں فرنچ کٹ داڑھی والے ایک پروفیسر صاحب کے رُوبرو بیٹھی تھیں۔ زیڈ اے صدیقی نام کے یہ پروفیسر چند سال پہلے نہار کے ٹیچر رہ چکے تھے اور لسانیات کے ماہر تھے۔ نہار کور انہیں ڈائری کی نقل دکھا چکی تھی۔

پروفیسر صاحب کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں تحریر کے ''کی ورڈز'' کا پتا چل گیا ہے اور وہ ان کی سمجھ میں آرہی ہے۔ ان کے سرخ و سپید چہرے پر بتدریج ہیجان کے تاثرات پیدا ہوگئے۔ پڑھنے کے دوران میں انہوں نے تین چار مرتبہ اپنی عینک کے اوپر سے نہار اور آنیہ کو دیکھا۔ پندرہ بیس صفحات دیکھنے کے بعد انہوں نے موبائل کی اسکرین سے نگاہ ہٹائی اور سنسنی خیز نگاہوں سے نہار اور آنیہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آنیہ! آپ مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں، یہ ڈائری آپ کو کہاں ملی؟''

آنیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں سر! راجوری کی ایک بس میں سفر کرتے ہوئے کوئی شخص اسے اپنی نشست پر بھول گیا یا پھر اس سے گر گئی۔ جب کوئی اس کا دعویدار نہیں بنا تو میں نے اٹھالی۔ میرا خیال تھا کہ..... اس پر ایڈریس وغیرہ ہوگا اور..... میں اسے مالک تک پہنچا دوں گی لیکن اس کا کوئی لفظ میرے اور نہار کے پلّے نہیں پڑا۔''

صدیقی صاحب عجیب نظروں سے آنیہ اور نہار کی طرف دیکھتے رہے پھر ٹھہرے اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''کشمیر کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''

''وہی سر..... جو سارے جانتے ہیں۔ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ پاکستان کے پاس اور زیادہ تر انڈیا کے پاس ہے۔ پاکستان کا تقاضا ہے کہ یو این او کی قراردادوں کے مطابق وہاں رائے شماری ہونا چاہیے۔''

''اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی ہو؟'' صدیقی صاحب نے بیک وقت دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

نہار بولی۔ ''سر! بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ کشمیریوں کو حق خودارایت دینا چاہیے لیکن بھارت سرکار ایسا نہیں چاہتی۔ شاید ہمارے نیتاؤں کا خیال ہے کہ جس طرح انہوں نے خالصتان کے لیے سکھوں کی تحریک کو مار کوٹ کر دبالیا اس طرح کشمیری بھی ایک روز ہمت ہار جائیں گے۔'' خالصتان کی بات کرتے ہوئے نہار کور کے لہجے میں ایک طرح کی تپش نمودار ہوگئی۔ شاید اسے 1984ء کے خونی واقعات یاد آگئے تھے۔

''تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے آنیہ؟'' صدیقی صاحب نے پوچھا۔

وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ پروفیسر صاحب نے اچانک یہ سیاسی گفتگو کیوں چھیڑ دی ہے، وہ بولی۔ ''یہ بات تو طے ہے جناب! کہ دونوں ایٹمی ملکوں کے درمیان کشمیر ایک جلتا ہوا مسئلہ ہے۔ اس کو ایک نہ ایک دن ''سیٹل'' ہونا ہے مگر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی شدت پسندی کی قائل نہیں ہوں۔ چاہے یہ شدت پسندی آزادی چاہنے والے مسلمانوں کی طرف سے ہو یا آزادی کی تحریک کو دبانے والی انڈین فورسز کی طرف سے۔ دونوں فریقین کو تحمل سے کام لینا چاہیے۔ کشت وخون اور تشدد کسی مسئلے کا حل نہیں۔ آخر تو بات چیت کی میز پر ہی آنا پڑتا ہے۔''

پروفیسر صدیقی عجیب انداز سے مسکرائے بولے۔ ''آگ کو دور سے دیکھ کر اور اس کی خصوصیات کے بارے میں لیکچر سن کر اس کی صحیح تپش اور اذیت ناکی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ اندازہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہوتا ہے۔''

''آ..... آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں سر؟'' آنیہ نے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''مجھے نہیں پتا کہ تم دونوں نے مجھے اس ڈائری کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ کتنا صحیح ہے لیکن..... شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے کشمیر کاز کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ وہ ایسی اسٹیج پر ہے جہاں موت اور موت سے جڑے ہوئے سارے خوف بے معنی ہوجاتے ہیں۔''

''آ..... آپ کس کی بات کررہے ہیں سر؟'' آنیہ نے پوچھا۔

صدیقی صاحب نے اسکرین پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام راسم ہے۔ اسے جاننے والے اسے راسو کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔''

آنیہ اور نہار نے سکتے کی سی کیفیت محسوس کی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تب ایک بار پھر صدیقی صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔

وہ بولے۔ ''اس ڈائری کا ایک حصہ راسو کی اپنی زندگی کے حالات سے وابستہ ہے اور یہ کافی ڈرامائی تاثر لیے ہوئے ہے۔ شاید یوں کہنا چاہیے کہ اس حصے میں راسو نے اپنی زندگی کے ایک اہم ترین راز کو قلمبند کیا ہے..... دوسرا حصہ ان حالات کے بارے میں ہے جنہوں نے اسے ایک عام کشمیری نوجوان کے بجائے ایک سر بکف فریڈم فائٹر بنایا ہے۔ یہ بھی ایک دل ہلا دینے والی رُوداد ہے۔'' صدیقی صاحب ایک بار پھر ڈائری کے اوراق میں کھو گئے۔

آنیہ کو اپنی نرم ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس نے کشمیر کے فریڈم فائٹرز کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا۔ ان میں اکثر ایسے نوجوان تھے جن کے قریبی عزیز اور پیارے کشمیر میں لگی آگ کی نذر ہوئے تھے یا پھر بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اب ان کشمیری مجاہدوں نے پہاڑوں میں نشیمن بنا رکھے تھے اور گاہے بگاہے انڈین فورسز کو للکارتے تھے۔ کچھ لوگ ان کے اس عمل کو درست کہتے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ کشمیر میں آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ جدوجہد مسلح لڑائی میں نہیں بدلنی چاہیے۔ کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی حامی ہونے کے باوجود آنیہ بھی پُرامن جدوجہد کی حامی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کسی خطرناک کشمیر فریڈم فائٹر سے نہ صرف ملے گی بلکہ اس کے ساتھ ایک چاردیواری میں بند ہونے کے بعد اس کی ذاتی زندگی میں بھی جھانکے گی۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔

پروفیسر صدیقی مسلسل ورق گردانی میں مصروف تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''ڈائری کے آخری حصوں میں لکھنے والے نے بہت محتاط انداز اختیار کیا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق اس ڈائری کی زبان وہ ہے جو برسوں پہلے کشمیری مجاہدین نے باہمی پیغامات اور معلومات کے تبادلے کے لیے ایجاد کی تھی۔ اس خفیہ زبان کے باوجود راسم عرف راسو نے کئی جگہ کوڈ ورڈز کا استعمال کیا ہے.....'' وہ تحریر پر نگاہیں جماتے ہوئے بولے۔ ''بار بار کسی فاروق کا ذکر ہے..... یہ نوجوان یقیناً راسو کا قریبی دوست تھا۔ کسی امیر گھرانے کی برہمن لڑکی کا ذکر بھی ہے..... پھر..... سدرہ نام کی ایک نہایت خوش شکل لڑکی کا ذکر ہے۔ اس کی ایک ٹانگ اس کے ظالم شوہر نے توڑ ڈالی تھی..... شوہر کا نام بھی کوڈ ورڈز میں ہے۔ یہ سدرہ نامی لڑکی اپنے شوہر کے ستم سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے غالباً گھر سے بھاگنے کی کوشش کی اور ٹانگ گنوانے کی سزا پائی۔''

آنیہ کی نگاہوں کے سامنے وہ تصویریں گھوم گئیں جو اس نے راسو کے بیڈ کے نیچے چور خانے میں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کے اندر حیران کن طور پر مسلمان سدرہ کرنل اروڑا کے ساتھ اگنی کے پھیرے لے رہی تھی۔ مطلب یہ کہ اروڑا ہی اس کا شوہر تھا اور اسی نے سدرہ کو ٹانگ سے معذور کیا؟ یہ کوئی اُلجھی ہوئی بے مہر کہانی تھی۔

صدیقی صاحب بدستور تحریر کے پیچ وخم میں کھوئے ہوئے تھے۔ پُرسوچ انداز میں بولے۔ ''ڈائری کے اس حصے میں لکھنے والے نے زیادہ اشاروں کنائیوں سے ہی کام لیا ہے۔ یہ فاروق، راسو کا بہت گہرا دوست تھا۔ یہ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہوا۔ غالباً یہ کشمیر کی تحریکِ آزادی میں شامل ہونے کی وجہ سے کسی حادثے کی نذر ہوا۔ اور یہی وہ موڑ ہے جس کے بعد راسو کی زندگی کا رخ بھی تبدیل ہوا..... تحریر میں کئی جگہ کسی کھلونے کا ذکر بھی ہے جو راسو گراں قیمت پر اپنے کسی شناسا سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کھلونا اپنے کسی پیارے کو اس کی سالگرہ پر دینا چاہتا ہے، لگتا ہے کہ یہ کھلونا کوئی ہتھیار ہی ہے جس کی راسو کو ضرورت رہی ہے۔''

آنیہ اور نہار بڑی توجہ سے صدیقی صاحب کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ جلد ہی ڈائری کے پہلے حصے کی طرف آگئے۔ یہ راسو کی ذاتی زندگی کے ابتدائی واقعات تھے اور یہ صراحت سے بیان کیے گئے تھے۔ صدیقی صاحب نے کہا۔ ''یہ ایک مزے دار کتھا ہے اور اس میں ایک طرح کا ''کہانی پن'' بھی ہے۔ کیا تم سننا پسند کرو گی؟''

''ضرور۔'' آنیہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

صدیقی صاحب نے تحریر پر نظریں جمائے جمائے کہنا شروع کیا۔ ''یہ ایک طرح سے اس راسو نامی نوجوان کی حیات کا ایک اہم ترین راز ہے۔ اس نے یوں لکھا ہے..... ماں! میری یہ تحریر ایک خط کی طرح ہے۔ وہ خط جو میں تمہیں کبھی پوسٹ نہیں کروں گا۔ ماں! میں برسوں تیرے آس پاس رہا، تیرے ساتھ رہا پر تجھے ماں نہ کہہ سکا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ تو ماں ہے اور میری رگوں میں تیرے جسم کا خون دوڑتا ہے..... اور جب اس بات کا پتا چلا تب بہت دیر ہو چکی تھی..... اور مجھے یہ راز بتایا بھی کس نے؟ اس نے جسے میں ہمیشہ ماں سمجھتا رہا۔ وہ بھی مجھے اپنا بیٹا کہتی رہی لیکن پتا نہیں کیوں ماں..... جو کشش میں نے تیری طرف محسوس کی شاید اُس کی طرف بھی نہ کی۔ اس کے ضمیر پر بوجھ تھا ماں، اور پھر

میری اس غیر حقیقی ماں نے اس بوجھ کے سبب ایک دن مجھے سب کچھ بتا دیا۔ ان دنوں وہ بہت علیل تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ میں نے بھی سب کچھ جان لیا مگر یہ سب بے فائدہ ہو گیا۔ میں تب تک بہت دور نکل چکا تھا..... ہاں ماں! میں تجھ سے بہت دور ہوں۔ اب تجھے اپنا بیٹا ہونے کا صدمہ نہ ہی دوں تو اچھا ہے۔ کیا پتا کب موت کے سفر پر چل نکلوں، تو پھر ٹھیک ہے نا۔ یہ راز میرے سینے میں ہی رہنے دو..... تم کبھی نہ سنو..... ہاں تم کبھی نہ سنو..... اور میں کبھی نہ بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟..... تجھے کبھی معلوم نہ ہو کہ میں جس دن تیری کوکھ سے پیدا ہوا، اسی دن مجھے تجھ سے دور کر دیا گیا۔ دراصل..... میری غیر حقیقی ماں کے اصل بچے کے دل کو پیدائشی عارضہ لاحق تھا۔ وہ دل کو دھڑکانے والے سگنلز کی کمزوری کا مریض تھا۔ میری غیر حقیقی ماں اتنی استطاعت نہیں رکھتی تھی کہ مستقبل میں اس کا علاج کرا پاتی، اس پر ہزاروں لاکھوں خرچ کرتی۔ اسے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ مستقبل قریب میں اس کا بچہ مر جائے گا۔ اس نے اسپتال میں اپنی دوست نرس کی مدد سے اپنے نوزائدہ بچے کو ایک امیر، باحیثیت ماں کے بچے سے بدل دیا۔ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ اس نے امیر ماں کے بچے کو اپنا بنا کر پالا..... اور وہ راسو بن گیا۔ اب تو سمجھ گئی ہو گی ماں! کہ اس غریب ماں کا بچہ کون تھا اور وہ بہ حیثیت ماں کون تھی؟ وہ بچہ شہباز حیدر تھا۔ میرا دوست..... میرا بھائیوں جیسا دوست شہابی حیدر..... اور وہ بہ حیثیت ماں تو تھی۔

..... ہاں، اب یہ سب کچھ راز ہی رہنے دو ماں۔ اسی میں تیرا اور میرا بھلا ہے۔"

آنیہ اور نہار صم بکم سن رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ کسی ڈرامے یا فلم کی کہانی ہے مگر قرائن بتا رہے تھے کہ یہ جیتی جاگتی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ کہانیاں بھی تو ہماری زندگی میں سے ہی پھوٹتی ہیں۔ پروفیسر زیڈ اے صدیقی نے چند مزید اوراق "اسکپ" کیے اور پھر ایک جگہ رکتے ہوئے بولے۔

"یہاں راسم عرف راسو نے لکھا ہے..... کچھ عرصہ بعد میری غیر حقیقی ماں (جسے آپ سب لوگ آیا خالہ کہتے ہیں) ایک ملازمہ کی حیثیت سے زباب منزل میں آ گئیں۔ اس وقت میں چند ماہ کا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے ناانصافی کی۔ اپنا بچہ تو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا مگر آپ کے بچے کے بارے میں آپ کو کچھ پتا نہ چلا..... یہ بچہ آپ کے گھر میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہی ایک بے سمت زندگی گزارتا رہا شاید یہی زندگی کی بوالعجبی ہے۔"

اس سے آگے چند چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر تھا جن میں راقم کی محرومی اور یاسیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس کے نیچے چند پُردرد شعر لکھے تھے۔

اس رُوداد کے آخری حصے کا ایک پیرا صدیقی صاحب نے سنایا۔ کہنے لگے۔ "اپنی ماں زباب بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے..... میری غیر حقیقی ماں (یعنی زباب منزل کی آیا خالہ) آپ سب کے سامنے بھی اپنے جھوٹ کا اعتراف کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے اسے اپنے سر کی قسم دے کر منع کر دیا ہے۔ اب یہ راز ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان رہے گا۔ میں جانتا ہوں ماں! میں نے ٹھیک کیا ہے۔ میں تجھے ایسے ملاپ کی خوشی کیوں دوں جس کے اوپر جدائی کا گہرا سایہ ہے۔ میں اس جدائی کو جدائی ہی رہنے دوں تو ٹھیک ہے..... تمہیں یہ خط لکھ کر میرے دل کو کچھ نہ کچھ سکون مل گیا ہے۔ کاش میں یہ خط تمہیں پہنچا بھی سکتا....."

صدیقی صاحب بول رہے تھے۔ ان کی آواز آنیہ کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے پہنچ رہی تھی۔ وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ "شیر بچے" کی نظر انداز کی ہوئی تصویر اب ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اب اس کے رنگ پھر نکھر آئے تھے۔ اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ بالآخر "دھوکا" اختتام پذیر ہوا۔ بالآخر ایک ILLUSION کی موت ہوئی۔ بالآخر وہ اصل شخص تک پہنچ گئی ہے۔

اسے اپنے اس یقین پر ہمیشہ بہت "یقین" رہا تھا کہ شیر بچے کی موجودہ پود کے افراد کو وہ اعلیٰ اور باوقار مقامات پر دیکھے گی۔ ان کی آنکھوں میں اس دلیری اور جرأت مندی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لشکارے مارتا ہو گا، جو شیر بچے کی آنکھوں میں چمکتی تھی جو بہ زبان خاموشی پکار کر کہتی تھی..... تم ظلم ہو تو میں بغاوت ہوں۔ تم جبر ہو تو میں ایک دیوانی مزاحمت ہوں۔ مجھے اپنی ہمت طاقت کے مطابق تمہارا راستہ روکنا ہے..... یہی وجہ تھی کہ جب راجوری میں شہابی حیدر کا اصل چہرہ اس کے سامنے آیا تھا تو اسے لگا تھا کہ اس نے برسوں تک رنگ آمیزی کر کے اپنے پردۂ تصور پر جو ایک عالیشان تصویر بنائی تھی اس کے سارے رنگ کچے نکلے ہیں، بارش میں دھل کر نا پید ہو گئے ہیں..... مگر آج کئی ماہ بعد اس ڈائری کے اوراق نے ایک انکشاف کر دیا تھا۔ اگر یہ انکشاف درست تھا تو پھر حقیقت یہ تھی کہ وہ جس شخص کو دیکھ کر اتھاہ مایوسیوں میں ڈوب گئی تھی..... وہ تو اس ساری کہانی میں اجنبی تھا۔ جذبوں اور حوصلوں میں گندھی ہوئی اس صد سالہ

داستان سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور جس کا تعلق تھا..... جس کی آنکھوں میں اصل شجاعت کی چنگاریاں چمکتی تھیں اور جس کے سینے کو مزاحمت کی بے مثل آگ وراثت میں ملی تھی، وہ کوئی اور نہیں راسم تھا۔ راسم عرف راسو..... جلیانوالا باغ اور اسد اللہ سے شروع ہونے والی کہانی، چلتے چلتے کشمیر اور راسم تک آ پہنچی تھی۔ کہانیاں ایسے ہی اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ جذبے ایسے ہی نسل در نسل سفر کرتے ہیں۔ ''شیر بچے'' کا پوتا راسم ویسے ہی مقام پر پایا جا رہا تھا جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ آنیہ کے نزدیک یہ ایک علیحدہ سوال تھا کہ وہ جس مقام پر ہے وہ موجودہ حالات میں اس کے لیے ٹھیک ہے یا نہیں؟

صدیقی صاحب کی آواز نے آنیہ کو خیالوں سے چونکایا۔ وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔ ''لگتا ہے کہ اس راسو نام کے نوجوان کی شخصیت دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک روپ میں وہ ایک عام کشمیری نوجوان ہے۔ انڈین فورسز سے نفرت کرنے والا، ان کے خلاف پوسٹر لگانے والا، جلوس نکالنے والا اور ان کی گاڑیوں پر پتھراؤ کرنے والا۔ لیکن اس کا دوسرا روپ زیادہ خطرناک ہے۔ یقیناً وہ مسلح جدوجہد کا حصہ بن چکا ہے..... اور اپنے اندر خوفناک ارادے پال رہا ہے..... اور غالباً یہ سب کچھ اس کے دوست فاروق کو پیش آنے والے نامعلوم واقعے کے بعد ہوا ہے۔''

وہ ڈائری کے اوراق پر نظر دوڑاتے رہے پھر یکایک اُن کے چہرے پر سنسنی نظر آئی۔ انہوں نے موبائل کی اسکرین پر کچھ سطور کو غور سے پڑھا اور بولے۔ ''یہ دیکھو، یہ جس کھلونے کا اس تحریر میں کئی بار ذکر ہے، یہ بات یقینی ہے کہ یہ ایک ہتھیار ہے..... اور ہتھیار بھی کوئی عام نہیں۔ یہاں، یہ اس کونے میں ایک نمبر لکھا ہوا ہے۔'' صدیقی صاحب نے آنکھیں سکیڑ کر پڑھا۔ ''M2-HB..... مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی مشہور آٹومیٹک رائفل کا نمبر ہے۔''

انہوں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور ''گوگل'' کیا۔ کچھ ہی دیر بعد اُن کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ ''یہ دور تک مار کرنے والی ایک مشین گن ہے۔ قریباً ڈیڑھ پونے دو کلومیٹر تک یہ آسانی اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ امریکا کی بنی ہوئی یہ مشین گن افغانستان کی جنگ میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ یقیناً مہنگی بھی ہوگی۔ پرانی ہوئی تو بھی خاصی قیمت کی ہوگی۔''

''یعنی..... یہ وہ کھلونا ہے جو یہ راسو حاصل کرنا چاہ رہا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''چاہ ہی نہیں رہا بلکہ حاصل کر چکا ہے یا کرنے والا ہے۔ یہ نیچے ایک نوٹ لکھا ہوا ہے..... اُس نے وعدہ کیا ہے کہ جولائی کی 31 تک کھلونا مجھے مل جائے گا۔ اس کا مطلب ہے میں سالگرہ پر تحفہ پیش کر سکوں گا۔'' صدیقی صاحب نے سر اٹھا کر آنیہ اور نہار کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟''

''2 اگست۔'' نہار نے جواب دیا۔

صدیقی صاحب نے نیچے کچھ اور سطور پر نگاہ دوڑائی اور تحریر کو ''ڈی کوڈ'' کرتے ہوئے بولے۔ ''راسو لکھتا ہے..... ایک دفعہ کھلونا مل جائے..... پھر ایک دیرینہ ارمان پورا ہو جائے گا..... بلکہ باقی کے ارمان بھی پورے ہو جائیں گے۔ چھوٹی چھوٹی کئی خوشیاں ہیں جن کے لیے دل ترس رہا ہے۔''

آنیہ اور نہار کی آنکھوں میں سراسیمگی جمع ہو رہی تھی۔ آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کیا ارمان ہو سکتا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کیا ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ وہ کچھ لوگوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔'' پروفیسر صدیقی بولے۔ ''یہ بات طے ہے کہ یہ شخص اب پُرامن جدوجہد کے بجائے مسلح جدوجہد کی طرف آ چکا ہے۔ خطرناک زون میں قدم رکھنے والا ہے اور یہ کوئی اکیلا نہیں ہے۔ بہت سے کشمیری نوجوان اس راہ پر چل پڑے ہیں۔''

''اور نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔'' آنیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ انڈیا کی باقاعدہ فوج سے ٹکرا کر یہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ قریباً ایک لاکھ لوگ اپنی جان کی بازی ہار چکے ہیں، اَن گنت گھرانے برباد ہو چکے ہیں۔ چند دن پہلے میں نیٹ کے ذریعے آنے والی ایک وڈیو دیکھ رہی تھی۔ انڈین فوج کی گولیوں سے چھلنی ہونے والے سیکڑوں مجاہدوں کی لاشیں ایک ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ سب کے سب نوجوان تھے۔ کشمیری ماؤں کے لختِ جگر تھے۔ یہ لوگ کیوں مسلسل اس آگ کا ایندھن بن رہے ہیں۔ کیوں اس مسئلے کے حل کے لیے دوسرے راستے اختیار نہیں کیے جاتے؟ کیوں ٹیبل ٹاک اور مذاکرات کا وتیرہ اختیار نہیں کیا جاتا؟''

پروفیسر صدیقی نے عجیب نظروں سے آنیہ کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہیں بتا رہا تھا نا کہ آگ کو دور سے دیکھ کر اس کی صحیح تپش اور اذیت ناکی کا اندازہ نہیں ہوتا، یہ اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ کے جسم کا کوئی حصہ براہِ راست

آگ میں ہوتا ہے..... میں بھی ایک کشمیری ہوں۔ اسی جنت سے نکل کر یہاں آیا ہوں جو ایک جہنم ہے اور یہ جہنم تو برسوں سے تیار ہو رہی ہے۔ یہ شعلے 72 سال سے بھڑک رہے ہیں اور بلند تر ہو رہے ہیں۔ 1998ء میں میرا ایک کزن ان شعلوں میں زندہ جل چکا ہے اور یہ تو کشمیر میں بسنے والے تقریباً ہر ''مسلمان خاندان'' کی کہانی ہے۔ ہر خاندان میں کوئی نہ کوئی شہید پایا جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی لاپتا یا اپاہج موجود ہے۔''

آنیہ اور نہار خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ آنیہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''تم نے اپنی سوچ کے مطابق مذاکرات اور گفتگو کی بات کی ہے۔ ذرا چند لمحوں کے لیے تصور کرو۔ کشمیر کی ایک ٹھٹھری ہوئی شب ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے ہیں۔ چند فوجی ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ رائفلیں تان کر اہلِ خانہ کو ہراساں کرتے ہیں۔ ایک لڑکی کو ریپ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیا اس لڑکی کا باپ یا بھائی ان لوگوں سے مذاکرات کرے گا۔ نہیں، وہ اگر بندھا ہوا نہ ہوا، تو جا پڑے گا ان پر..... مارا جائے گا یا اتنا زدوکوب ہوگا کہ ہوش میں نہ رہے گا۔ یہاں گن پوائنٹ پر پامال کیا جا رہا ہے کشمیر کو۔ یہ بات مذاکرات اور گفتگو سے آگے نکل چکی ہے۔''

آنیہ افسردگی سے بولی۔ ''آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے سر! مگر مسلح جدوجہد بھی تو کسی منظم حکمتِ عملی کے تحت ہونی چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی صورت میں جان گنوا دینا تو شاید..... دانشمندی نہیں ہے۔''

شاید یہ بحث آگے چلتی مگر پروفیسر صدیقی کے فون پر کال آ گئی۔ انہیں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے یونیورسٹی جانا تھا۔ یہ نشست یہاں پر ختم ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹے آنیہ کے لیے نہایت تہلکہ خیز تھے۔ وہ گھر واپس آ چکی تھی مگر اس کا دل و دماغ اس ڈائری کے انکشافات کے اندر جذب ہو چکا تھا۔ وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ ایک اتفاق کے تحت وہ ایک بہت بڑے راز کی امین بن چکی تھی اور وہ راز یہ تھا کہ راجوری کی زباب منزل میں جس کو زباب بیگم کا بیٹا سمجھا جاتا تھا، وہ ان کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ (شہابی حیدر) آپا خالہ کا بیٹا تھا۔ زباب بیگم کا فرزند راسم تھا۔ راسم عرف راسو۔ اپنے کوہ پیما والد تیمور حیدر کی طرح نڈر اور اپنے دادا اسد اللہ کی طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا۔ وہ اس وقت شاید موت کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ آنیہ کو یوں لگا جیسے ایک لاکھ شہیدوں کے لاشے ایک ساتھ اس کی نگاہوں میں ابھر آئے ہیں۔ قطار اندر قطار خونچکاں جسم..... اور ان میں سے ایک گولیوں سے چھلنی جسم راسم کا بھی ہے۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس نے ایسا خطرناک ہتھیار کیوں حاصل کیا تھا؟ وہ کس کو مارنا چاہتا تھا۔ کس کو سالگرہ کا تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا؟ کیا اس سارے معاملے کا تعلق اس کے دوست فاروق سے تھا؟ یا پھر..... وہ ٹانگ سے معذور لڑکی جس کو اس نے پناہ دے رکھی تھی؟ ان گنت سوالات آنیہ کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

اسے لگا کہ اسے راسو کے لیے کچھ کرنا چاہیے..... کل ڈائری کے اوراق سے اسے اور نہار کو بہت سی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم انفارمیشن کسی ''چار کوٹھیاں'' کے حوالے سے بھی تھی۔ کھلونے، فاروق اور سالگرہ کی طرح ''چار کوٹھیاں'' کا لفظ بھی تحریر میں تین چار مرتبہ آیا تھا۔ آنیہ اور نہار کی طرح صدیقی صاحب کا بھی خیال تھا کہ یہ راسو کا کوئی خفیہ ٹھکانا یا پناہ گاہ ہو سکتی ہے۔ اب آنیہ کو یاد آ رہا تھا کہ جن دنوں وہ دنید ھر فورٹ میں پینٹنگز بنا رہی تھی اس نے کسی بچے اس ''چار کوٹھیاں'' کا نام سنا تھا۔ یہ جگہ یقیناً راجوری میں ہی کہیں تھی۔

آنیہ کے اندر ایک عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ خود بھی کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کے اندر کی سیلانی روح اسے کچھ کرنے پر اُکسا رہی تھی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا جب وہ ایک بار فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر اس پر مضبوطی سے جم جاتی تھی۔ اگلے ہی روز اس نے پاپا کو قائل کر لیا کہ وہ راجوری کے فورٹ میں اپنا ادھورا کام مکمل کرنے کے لیے واپس جانا چاہتی ہے۔''

''نہار بھی جا رہی ہے؟'' پاپا خورشید عالم نے پوچھا۔

''نہیں جی، اب اسے چھٹی ملنا مشکل ہے لیکن میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ماموں دلبر موجود ہیں نا، ان سے کل بات ہوئی ہے۔ بس ماما کی طرف سے ذرا ڈانٹ کا خطرہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں، اسے میں سنبھال لوں گا۔'' وہ مسکرائے۔

وہ اس نظریے کے حامی تھے کہ جوان بچوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیے۔ بس انہیں اچھے بُرے کا شعور دے دیا جائے۔ اس کے بعد انہیں اپنے راستوں کا انتخاب کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

☆☆☆

قریباً ڈھائی ماہ بعد آنیہ ایک بار پھر راجوری کی فضاؤں میں تھی۔ اس دفعہ وہ اکیلی آئی تھی۔ اس کے لیے اطمینان کی ایک بات یہ بھی تھی کہ آج کل شہابی حیدر راجوری میں موجود نہیں تھا۔ وہ نیو دہلی جاچکا تھا۔ وہاں ایک چینل میں نوکری کررہا تھا۔ پچھلے ڈھائی تین مہینے میں وہ آنیہ کی طرف سے پوری طرح مایوس ہوچکا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا تھا..... بس کبھی کبھی نہار سے ہیلو ہائے کرلیتا تھا۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اس بات کے قائل ہوتے ہیں..... تو نہیں اور سہی..... اور نہیں اور سہی۔

دلبر ماموں نے ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے آنیہ کا استقبال کیا۔ بہرطور ان کے چہرے پر ملال کے موہوم سائے بھی تھے۔ یقیناً یہ یہاں کے کشیدہ حالات کے حوالے سے تھے۔ راجوری سے ''پلوامہ'' کا فاصلہ 150 کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا..... پلوامہ اور سرینگر وغیرہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی، اس نے ہر باضمیر شخص کو رنجور کررکھا تھا۔ نوجوان بچے مررہے تھے..... اپاہج اور لاپتا ہورہے تھے۔ چادر اور چاردیواری پامال ہورہی تھی۔ وادیِ جنت نظیر پر قابض قوتیں ہر مزاحمت کو کچل رہی تھیں۔

ان حالات میں دلبر سنگھ صاحب کے اپنے پرانے زخم بھی تازہ ہوگئے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد انہوں نے دربار صاحب پر ہونے والے خونی حملے کی بات کی اور سکھوں کے اس قتلِ عام کی بات کی جو اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہوا۔ وہ کشمیر کو انڈیا کے سارے مظلوموں اور حریت پسندوں کے لیے ایک ٹیسٹ کیس قرار دے رہے تھے۔

بہرحال آنیہ نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی اور بس دلبر ماموں کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس نے انہیں یہی باور کرایا کہ وہ اپنی ادھوری پینٹنگز مکمل کرنے کے لیے دوبارہ یہاں آئی ہے۔

تیسرے روز وہ ''چار کوٹھیاں'' نامی جگہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ ایک رکشے والے نے بتایا کہ یہ شہر کے اندر ایک رہائشی کالونی کا بس اسٹاپ ہے۔''

''یعنی یہاں کوٹھیاں وغیرہ نہیں ہیں؟''

''کوٹھیاں تو ہیں میڈم جی۔ اسی کی وجہ سے تو اسٹاپ کا نام پڑا ہے۔ انگریزوں کے زمانے کی کوٹھیاں ہیں، اب وہاں گودام شودام بنے ہوئے ہیں۔''

آنیہ اسی رکشے پر بیٹھی اور چار کوٹھیاں اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ اس کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ ایک طرح کے خطرے کا احساس بھی ہورہا تھا۔ وہ فی الحال صرف احتیاط سے یہاں کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

یہ علاقہ رہائشی تھا مگر رہائشی علاقے کے ساتھ ہی ایک بڑی مارکیٹ بھی موجود تھی بلکہ یہ کئی چھوٹی چھوٹی مارکیٹیں تھیں۔ چاروں کوٹھیاں درمیانے سائز کی تھیں اور کافی پرانی تھیں۔ ان میں فرشی ٹائلز اور سینیٹری وغیرہ کے سامان کے گودام بنے ہوئے تھے۔ کیا ان گوداموں میں سے ہی کسی گودام میں راسو موجود ہوگا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھے اور کسی کوٹھی کے گیٹ پر دستک دے کر سن گن لینے کی کوشش کرے مگر اس میں سنگین خطرات تھے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس چلی آئی۔ وہ پچھلے چار پانچ روز میں درجنوں بار راسو کے پرانے فون نمبر پر ٹرائی کرچکی تھی مگر وہ بند ہی ملتا تھا۔ ماموں دلبر کے گھر آکر اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ نمبر بند جارہا تھا۔

اگلے روز وہ مجبوراً پینٹنگ کے سامان کے ساتھ فورٹ جا پہنچی۔ آج اسے یہاں راجوری میں چوتھا روز تھا۔ دلبر ماموں کو شبہ ہوسکتا تھا کہ اس نے اب تک پینٹنگ شروع کیوں نہیں کی۔ قلعے میں پینٹنگ کرتے ہوئے اسے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ ہیلمٹ پہنے ہوئے ایک شخص اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے دھیان سے دیکھا اور کسی حد تک پہچان گئی۔ وہ راسو کا دوست راجا تھا۔ راسو کے اسنوکر کلب کے ساتھیوں میں سے تھا۔

رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''آپ کو دوبارہ یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اور کون ہے آپ کے ساتھ؟''

''اس بار اکیلی ہی آئی ہوں۔'' آنیہ بولی۔ ''اور..... وہ..... راسو صاحب آج کل کہاں ہوتے ہیں؟'' آنیہ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کو پتا ہی ہے، اس پر کیس وغیرہ کا چکر ہوگیا تھا۔ آج کل وہ لاپتا ہے..... ویسے آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اس کے بارے میں؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس یونہی..... شہابی حیدر بھی آج کل راجوری میں نہیں ہے نا۔''

وہ اسٹول گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی باتوں سے آنیہ کو صاف پتا چل گیا کہ وہ اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ جاننا چاہ رہا ہے کہ وہ کس کے ساتھ راجوری آئی ہے اور اس وقت اس کے اردگرد کوئی اور بندہ تو موجود نہیں۔ آنیہ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ کل ''چار کوٹھیاں'' کے قریب اس کی موجودگی کو نوٹ کیا گیا ہے اور یہ راجا نامی شخص یہاں آموجود ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ

بھی تھا کہ وہ کل ٹھیک جگہ پر پہنچی تھی۔

آخر میں راجا بولا۔ ''راسو بھائی اس وقت کسی نامعلوم جگہ پر موجود ہیں۔ پر میں کوشش کر کے ان سے آپ کی بات کرا سکتا ہوں۔''

''تو کراؤ۔'' آنیہ نے کہا۔

وہ اردگرد دیکھ کر بولا۔ ''لیکن یہاں نہیں، آپ کو فورٹ سے باہر آنا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں، آپ میری بہن کی طرح ہیں۔''

کچھ پس و پیش کے بعد آنیہ مان گئی۔ اس نے اپنا سامان ایک قریبی کوٹھری میں لاک کیا اور راجا کے ساتھ فورٹ کے پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ ہیلمٹ ابھی تک راجا کے سر پر تھا۔ تاہم ونڈ شیلڈ اس نے اٹھا رکھی تھی۔ آنیہ کو محسوس ہوا کہ وہ چوکس نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ بھی لے رہا ہے جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ کوئی ان کے پیچھے تو نہیں آرہا۔ وہ فورٹ سے باہر نکلے۔ یہاں راجا کی بائیک کھڑی تھی اور بائیک کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سوزوکی کار بھی کھڑی تھی۔ کار خالی تھی۔ راجا نے اپنے اسمارٹ فون پر ''واٹس ایپ'' آن کیا اور پھر راسو سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ فون آنیہ کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی خالی ہے، آپ اس میں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرلیں۔''

آنیہ نے اچھی طرح جھانک کر دیکھا۔ کار واقعی خالی تھی۔ وہ فون تھام کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ سینے میں دل بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وڈیو کال تھی۔ آنیہ نے اپنے سامنے راسو کو دیکھا۔ تصویر والے شیر بچے اسد اللہ کا پوتا۔ وہ کسی بند کمرے میں بیٹھا تھا مگر بیک گراؤنڈ میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھ کر اچھا لگا لیکن آپ کی یہاں آمد بالکل غیر متوقع ہے۔ کیا آپ واقعی صرف پینٹنگ کے لیے آئی ہیں؟''

''یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس کی بھی ایک وجہ ہے، آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔''

''میں پینٹنگ کا کام مکمل کرنے کے لیے ہی آئی ہوں..... لیکن..... آپ سے بھی..... کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی۔''

''وہ کیوں محترمہ! آپ تو میرے سائے سے بھی دور بھاگتی رہی ہیں؟''

''مجھے آپ کے بارے میں ماموں دلبر صاحب سے کچھ پتا چلا ہے۔ اردگرد سے بھی کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مم..... میں اپنی ناچیز عقل کے مطابق آپ کو کچھ سمجھانا چاہتی ہوں۔''

''زہے نصیب۔'' راسو نے کہا۔ پھر اپنی بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر کہا۔ ''ویسے میرا خیال ہے مس آنیہ خورشید! اب ہم کھل کر بات کر ہی لیں تو اچھا ہے..... آپ..... کل ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' کے آس پاس منڈلا رہی تھیں؟''

''اوہ..... تو میرا یہ اندازہ درست ہے کہ کل مجھے وہاں دیکھا گیا ہے اسی لیے آپ نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ کیا آپ بھی وہیں موجود ہیں؟''

''نہیں، لیکن راجا اور ایک دو دوست موجود ہیں۔ انہوں نے آپ کو پہچانا اور.....''

''پھر میرا پیچھا بھی کیا۔'' آنیہ نے بات مکمل کی۔

''بے شک انہیں تجسس سے مجبور ہو کر کرنا پڑا۔''

آنیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''راسم صاحب! یہ سب ایک اتفاق کے تحت ہی ہوا ہے۔ میں کل وہاں تھوڑی سی شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ راجا یا آپ کا کوئی اور دوست وہاں موجود ہوگا اور مجھے دیکھ لے گا۔''

''مس آنیہ! میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا..... لیکن آپ نے وہاں خصوصی طور پر ''چار کوٹھیوں'' کی طرف توجہ دی۔ آپ ان کا جائزہ لیتی رہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہو کہ یہاں کچھ ہے۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''راسم صاحب! آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں ان کوٹھیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہوں گی تو ان کی ساخت اور ایک جیسی بناوٹ کی وجہ سے..... لیکن..... کچھ بھی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا ہے۔ آپ سے رابطہ تو ہوگیا ہے۔''

پتا نہیں کہ آنیہ کے جواب نے راسو کو مطمئن کیا یا نہیں مگر اس کا لب و لہجہ بدستور اپنائیت کا رہا۔ اس نے نہار کور اور دلبر ماموں وغیرہ کی خیریت دریافت کی پھر کہنے لگا۔ ''آپ ایک منٹ کے لیے میری بات راجا سے کروا سکتی ہیں؟''

آنیہ نے کار کی کھڑکی کھولی اور کچھ فاصلے پر موجود راجا کو موبائل فون دکھایا۔ وہ موٹر بائیک کے قریب بیٹھا اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ہیلمٹ اب تک اس کے سر پر تھا۔ وہ آنیہ کے پاس آیا اور موبائل فون لے کر راسو سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے ہوئے وہ دس پندرہ قدم دور چلا گیا۔ دو منٹ بعد واپس آکر اس نے موبائل آنیہ کو تھما دیا۔

راسو نے کہا۔ ''اس وقت میں راجوری میں ہی ہوں مگر کل کا پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ صبح یہاں سے جانا پڑے۔ پھر کئی دن تک واپسی نہیں ہوگی۔ اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو پھر آج ہی مل لیں۔''

آنیہ نے چند لمحے تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''کہاں مل سکتے ہیں آپ؟''

''آپ کو سب کچھ پتا ہی ہے میں جہاں ہوں وہاں سے میرا، آپ سے ملنے کے لیے نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ کو بھروسا ہے تو پھر راجا کے ساتھ آجایئے۔ یہ اسی گاڑی پر آپ کو یہاں لے آئے گا۔''

آنیہ نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آج راسو سے نہ مل سکی تو پھر شاید..... اس سے ملنا مشکل ہو جائے گا۔ نہ جانے اچانک اس کے دل میں کیا آئی کہ بہت سے اندیشوں کے باوجود اس نے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، اگر کوئی خطرہ نہیں ہے تو..... میں آجاتی ہوں۔''

یہ جاننے کے بعد کہ وہی اسد اللہ کا پوتا ہے، وہ اس کے لیے ایک عجیب سی اپنائیت محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کیفیت کو خیر، محبت تو نہیں کہا جاسکتا تھا مگر وہ اسے کوئی واضح نام بھی نہیں دے پا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ راجا کے ساتھ سوزوکی کار میں راسو کی طرف جا رہی تھی۔ راجا ڈرائیونگ کر رہا تھا، وہ عقبی نشست پر تھی۔ راجا نے موٹر بائیک وہیں لاک رہنے دی تھی۔ وہ غالباً راجا کے کسی ساتھی کی تھی۔ دوران ڈرائیونگ، راجا بار بار عقب نما آئینے میں اور دائیں بائیں بھی دیکھتا تھا۔ جیسے وہ غیر شعوری طور پر اپنے اردگرد سے باخبر رہنا چاہتا ہو۔ وہ ایسے اندرونی راستے استعمال کر رہا تھا جہاں کسی پولیس ناکے یا فوجی چیک پوسٹ کا احتمال کم سے کم ہو۔ قریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد وہ کل کی طرح آج پھر ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' کے قریب موجود تھی۔ ایک کوٹھی کا گیٹ کھلا اور سوزوکی اندر داخل ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ راسو نے غلط بتایا تھا کہ وہ ''چار کوٹھیاں'' میں نہیں ہے۔ یہ غلط بیانی غالباً اسے احتیاط کے پیشِ نظر کرنا پڑی تھی۔

اس گودام میں فرشی اور دیواروں والی ٹائیلوں کا بہت بڑا اسٹاک تھا۔ چھوٹے بڑے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ ایک دو چھوٹے لوڈر بھی کھڑے تھے۔ سوزوکی کوٹھی کے عقبی حصے میں آکر ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ آنیہ، راجا کے ساتھ ذرا جھجکتی ہوئی ایک زینے پر آئی اور کوٹھی کی بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ یہاں خاموشی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں اور ان کے آگے بھاری پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کوٹھی کا یہ حصہ گودام نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کہیں پکنے والے کھانے کی مدھم سی خوشبو بھی آرہی تھی۔ ایک کمرے میں پہنچتے ہی راجا کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور آنیہ کی طرف گھوم کر سخت لہجے میں بولا۔ ''دیکھو مس آنیہ! آپ اپنے لیے مشکل پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آپ کو صاف صاف بتانا پڑے گا کہ آپ کو ''چار کوٹھیوں'' کا پتا کس نے بتایا ہے۔''

آنیہ، راجا کا سرخ چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اسے پہلی بار شک ہوا کہ اس کے لباس کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ بھی موجود ہے۔ ''میں نے کچھ نہیں چھپایا اور آپ مجھ سے سوال جواب مت کرو۔ آپ مجھے یہاں راسو سے ملانے لائے ہو۔''

''راسو بھی آجائے گا، پہلے میرے سوال کا جواب دو تم۔'' راجا آپ سے تم پر آگیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سرخی چمکنے لگی تھی۔ ''شاپنگ والی اسٹوری مت سناؤ۔ تم صرف اس جگہ کے کھوج میں یہاں پہنچی تھیں اور تم اکیلی بھی نہیں ہو۔ ہمیں ڈاج دینے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''مسٹر راجا! آپ تمیز سے بات کرو۔ میں کسی کو دھوکا نہیں دے رہی۔''

''دھوکا اور کسے کہتے ہیں۔'' راجا نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

یہی وقت تھا جب کسی اندرونی کمرے سے راسو برآمد ہوا۔ اس کے شانوں تک جاتے ہوئے بال اب کچھ چھوٹے ہو چکے تھے۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ وہ بپھرے ہوئے راجا اور آنیہ کے درمیان آگیا۔ ''راجا! تم چپ رہو، میں خود بات کرتا ہوں ان سے۔ تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

راجا نے غصیلے انداز میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ آنیہ کو کڑی نظروں سے گھورتا ہوا وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ راسو نے آنیہ کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ''ریلیکس مس آنیہ! ہم ایسے حالات سے گزر رہے ہیں کہ اپنے سائے پر بھی شک کرنا پڑتا ہے..... اور کل آپ کا یہاں آنے کا جو انداز تھا، اس نے ہمیں واقعی ٹھٹکایا ہے۔ ضلع بھر کی پولیس میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور صرف پولیس ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی ہیں، میں کوشش کے باوجود آپ کی اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا کہ کل آپ اتفاقاً.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ

سگریٹ کے لیے اپنی جیسٹ پاکٹ کی طرف گیا مگر پھر آنیہ کی موجودگی کا احساس کر کے وہ رک گیا۔

''آپ کب پہنچی ہیں یہاں راجوری میں؟'' وہ اس سے سوال جواب کرنے لگا۔

آنیہ اس صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ لہٰذا راسو کے سوالوں کے مناسب جواب دیتی رہی۔ وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر سچ کیسے بتاتی؟ وہ کیسے بتاتی کہ زباب منزل میں اس کی گرفتاری کی رات وہ اس کے بیڈروم میں، اور بالآخر اس چور خانے تک پہنچی تھی جہاں اس کا موبائل اور اس کی سیاہ کور والی ڈائری پڑی تھی۔ وہ ڈائری جس میں ایک ناقابلِ فہم زبان میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز بند تھا، یہ حقیقت چھپی ہوئی تھی کہ وہ آیا خالہ کا بیٹا راسو نہیں، وہ حیدر ٹیملی کا چشم و چراغ ہے۔ زباب منزل اور اپنے باپ دادا کے شاندار ماضی کا اصل وارث۔ بے شک سیاہ گرد پوش والی وہ ساری ڈائری ہی انکشاف انگیز تھی۔ اسی ڈائری نے آنیہ کو یہ بتایا تھا کہ راسو جو بظاہر راجوری ٹاؤن کا ایک آوارہ گرد ہے، دراصل ایک بہت بڑے ''کاز'' سے وابستہ ہے۔ اس کی عام سی شخصیت کے اندر کشمیر کا ایک فریڈم فائٹر چھپا ہوا ہے۔

راسم کے سوال جواب نے طول پکڑا تو آنیہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ بولی۔ ''راسم! یہ بات درست ہے کہ میں ایک بار آپ سے ملنا چاہتی تھی، آپ سے بات کرنا چاہتی تھی مگر میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس میں کسی بھی طرح کی بُری نیت کو دخل نہیں ہے، نہ ہی اس سلسلے میں کوئی اور میرے ساتھ ہے۔ آپ اس بارے میں جس طرح کا حلف چاہیں مجھ سے لے سکتے ہیں۔''

راسم، راسو نے بڑے دھیان سے اس کی جانب دیکھا۔ آنیہ کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے یکدم شک کی بھول بھلیوں سے یقین کی منزل پر لا کھڑا کیا۔ اس نے آنیہ کی آنکھوں میں جھانکا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''اوکے..... آئی ایم سوری، میں اس بارے میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا..... لیکن مجھے..... راجا کو ذرا مطمئن کرنا ہوگا۔''

آنیہ خاموش رہی۔ اس کی پلکوں پر ایک دو موتی اٹکے ہوئے تھے۔ راسو نے مزید کہا۔ ''یہ گودام راجا کا ہی ہے۔ میرا قریبی دوست ہے۔ غصے کا تھوڑا تیز ہے لیکن دل کا اچھا ہے۔''

آنیہ کو وہیں چھوڑ کر راسو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد راسو اور راجا کے جھگڑنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ آنیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پہلے تو دونوں ہی بلند آواز میں بولے پھر دھیرے دھیرے راجا کی آواز مدھم ہونے لگی۔ قریباً پانچ منٹ بعد راسو واپس آ گیا۔

''آپ چائے پئیں گی؟'' اس نے نارمل لہجے میں آنیہ سے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ بس دو چار سوالات ہیں جو بڑے دنوں سے ذہن میں کلبلا رہے ہیں، وہ آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''چلیں سوالات بھی کر لیجیے گا مگر چائے تو ہونی چاہیے۔'' اس نے کہا اور دائیں جانب چلا گیا۔ آنیہ کے اندازے کے مطابق کچن اسی طرف تھا۔ آنیہ کا خیال تھا کہ وہاں کوئی عورت بھی موجود ہے۔ ایک منٹ بعد راسو واپس آ گیا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ کسی کمرے سے کسی عورت کے بلند آواز میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آنیہ چونک گئی راسو پھر باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی۔ اس نے کچھ نہیں بتایا نہ ہی آنیہ نے کچھ پوچھا۔ وہ اب گفتگو کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے آنیہ سے ڈھائی تین ماہ پہلے کی اس رات کے بارے میں بات کی جب وہ گرفتار ہوا تھا۔ اس نے آنیہ سے پوچھا کہ وہ زباب منزل سے کیسے نکل پائی؟

آنیہ نے اسے مختصراً اس بارے میں بتایا پھر اس سے پوچھا۔ ''راسم! لوگوں کا کہنا ہے کہ نوبیاہتا جوڑے ظہیر اور نادیہ کو آپ نے ہی ٹھیکیدار وغیرہ کے چنگل سے نکالا تھا، کیا یہ درست ہے؟''

''بس اللہ نے مجھے ان کی مدد کا وسیلہ بنا دیا، ورنہ میں اس قابل تو نہیں ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''اور آپ کی گرفتاری بھی اسی وجہ سے ہوئی؟''

''فی زمانہ اچھے کام کا کچھ خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی مقامی پولیس کو بڑی خوشی ہوتی ہے، مجھے مہمان بنا کر۔ کچھ عرصہ پہلے مجھ پر منشیات کا کیس ڈال دیا تھا اور پھر وہ واقعہ تو آپ کی یہاں موجودگی میں ہی ہوا تھا جب کہیں ڈکیتی ہوئی تھی اور مشتبہ افراد میں شامل ہونے کا اعزاز مجھے بھی بخش دیا گیا تھا۔''

اسی دوران میں دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ راسو جلدی سے اٹھا اور چائے والی ٹرے پکڑ لی۔ چائے لانے والی کو دیکھ کر آنیہ کو شدید حیرت ہوئی۔ یہ ایک ٹانگ سے معذور سدرہ احمد تھی۔ آج آنیہ پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی خوب صورت تھی۔ تاہم گہری سیاہ

آنکھوں میں ایک طرح کا دکھ ہلکورے لیتا تھا۔ ''السلام علیکم۔'' سدرہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

آنیہ نے وعلیکم السلام کہا اور اٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔ ''آجائیں ناں آپ بھی۔'' آنیہ بولی۔

''نہیں، میں ابھی ذرا کوکنگ کررہی تھی۔'' سدرہ دوستانہ لہجے میں بولی اور اجازت لے کر لنگڑاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

آنیہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی اور آہ سی بھر کر بولی۔ ''کتنی پیاری ہیں..... لیکن یہ ٹانگ کا نقص..... کیا..... واقعی یہ سیڑھیوں سے ہی گری تھیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' راسو نے مختصر جواب دیا۔ لگتا تھا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا۔

یکا یک آنیہ کا دھیان نو بیاہتا جوڑے کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی۔ ''راسم صاحب! ظہیر اور نادیہ کے بارے میں مجھے بڑا تجسس رہا ہے۔ وہ دونوں خیر خیریت سے تو ہیں ناں؟''

''بالکل خیریت سے ہیں۔''

''لیکن کہاں؟''

''راجوری سے کافی دور..... قریباً 3000 کلومیٹر دور..... بنگلور کے ایک قصبے میں، وہ جگہ ان کے لیے بہت محفوظ ہے۔ کیا آپ انہیں دیکھنا چاہیں گی؟''

''کیسے؟'' آنیہ نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

راسو نے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں ظہیر نے مجھے اپنی یہ وڈیو بھیجی ہے۔'' اس نے وڈیو پلے کر کے موبائل آنیہ کی طرف بڑھا دیا۔ گڑیا سی نادیہ ایک چھوٹے سے مگر آراستہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ بس اس کا عقب نظر آرہا تھا۔ ظہیر دبے پاؤں پیچھے سے آیا اور ایک دم آواز نکال کر اسے ڈرا دیا۔ وہ چلا کر مڑی۔ آٹے والا برتن بھی گر گیا۔ اس نے پیار بھرے غصے سے ظہیر کی طرف دیکھا۔ اس کے کومل ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے..... تب اچانک اس نے اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھ ظہیر کے چہرے اور گردن پر مل دیے..... اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ظہیر نے کیمرے کا رخ اپنی طرف موڑ کر اپنا آٹے میں سنا ہوا چہرہ دکھایا اور پھر نادیہ کے پیچھے لپکا۔ ''ٹھہر جا بتاتا ہوں تجھے۔'' اس کی آواز ریکارڈ ہوئی۔ پھر کیمرے نے نادیہ کو دکھایا۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہو رہی تھی اور اپنی ساس یعنی ظہیر کی والدہ کے پیچھے جا چھپی تھی۔ یہ ایک منٹ کا وڈیو کلپ ان دونوں کی خیر خیریت کی مکمل تفصیل پیش کر رہا تھا۔

آنیہ کو یہ سب اچھا لگا مگر پھر وہ کسی سوچ میں گم ہوگئی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن آپ کو اس کے لیے بھاری قیمت چکانا پڑی۔''

''زیادہ بھاری نہیں۔'' راسو ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ جسمانی ریمانڈ کے دوران میں ہی مجھے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ کورٹ کے احاطے میں ہی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھوڑی سی دھینگا مشتی کر کے میں نکل بھاگا۔''

''اور اب آپ اشتہاری ہو چکے ہیں۔ پولیس اور فوج آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''پولیس اور فوج، اکیلا مجھ کو ہی تو نہیں ڈھونڈ رہی..... ان کو تو اس خطے کے سارے ہی مسلم نوجوان مطلوب ہیں۔ ایک بہانہ نہ ہوگا تو کوئی دوسرا بہانہ ہوگا۔ بس کرنل اروڑا جیسے لوگ سلامت رہیں پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہنا ہے۔''

ایک دم کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ آنیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ابھی آپ نے فون پر، نہار کے ماموں دلبر صاحب کا ذکر کیا تھا..... آپ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا ہے۔''

''صرف انہوں نے ہی نہیں بتایا۔ بہت سے لوگوں کا خیال یہی ہے کہ.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہیں کر سکی۔

''دیکھیں آنیہ، آپ کو جو کہنا ہے کھل کر کہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔ اس کے علاوہ یہاں آپ جو کچھ بھی کہیں گی وہ بس ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ..... میرے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں، میں آپ سے جو بات کہوں گا، وہ لوہے پر لکیر ہوگی۔''

آنیہ کی پلکیں بے ساختہ لرز گئیں۔ وہ کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔ یہ ''خاص اہمیت'' والی بات اس نے زباب منزل میں بھی کہی تھی۔

''آپ کس سوچ میں کھو گئی ہیں، بات تو مکمل کر دیجیے۔''

وہ بولی۔ ''لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا تعلق کشمیر کی کسی خفیہ تنظیم سے ہے۔ آپ مسلح جدوجہد میں شریک ہو چکے ہیں..... یا ہونے والے ہیں۔''

''بالفرض ایسا ہے بھی تو اس میں برائی کیا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کو جدوجہد کے بغیر روکا جا سکتا ہے؟ اس وادی کو جابروں کے تسلط سے

آزاد کرایا جاسکتا ہے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن جدوجہد ہتھیار اٹھانے اور خون خرابے کا ہی نام تو نہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ ایک بندے کی آواز چند گھنٹوں کے اندر پوری دنیا میں سنی جاتی ہے تو پھر کیوں نا ہتھیار اٹھانے کے بجائے آواز اٹھائی جائے۔''

''مس آنیہ! آواز تو 72 برس تک اٹھائی جاتی رہی ہے اور اب بھی اٹھائی جارہی ہے لیکن ذرائع ابلاغ کا شور جتنا بڑھ گیا ہے، دنیا اتنی ہی بہری بھی ہوگئی ہے، اب وہ نعروں کی آواز پر نہیں چونکتی، بلکہ شاید گولی کی آواز پر بھی نہیں چونکتی۔ اب وہ دھماکے کی آواز پر چونکتی ہے..... ہمیں نعرے بھی بلند کرنا پڑیں گے اور دنیا کو چونکانا بھی پڑے گا۔''

آنیہ نے حیرت سے راسو کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ راسو جیسے بے ڈھنگے لباس اور اُلجھے بالوں والا بے ترتیب شخص ایسی فلسفیانہ بات بھی کرسکتا ہے۔

آنیہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''راسم صاحب! کشمیر کے لوگوں کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق ملنا چاہیے۔ اس میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں مگر آپ جانتے ہیں قریباً ایک لاکھ افراد اس جارحانہ راستے پر چل کر اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ اگر آپ.....''

''پلیز مس آنیہ! مجھے دکھ ہورہا ہے کہ آپ اسے جانیں گنوانا کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لیے جانیں دی ہیں۔ اور جان کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ جان اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔'' راسو کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ ایک آواز سن کر چونکی تھیں۔ چونکی تھیں نا؟'' اٹھیے..... آیئے، میں آپ کو دکھاتا ہوں وہ آواز کس کی تھی۔''

اس نے عجب جذب کے عالم میں آنیہ کی کلائی تھامی اور اسے اٹھا کر ایک کوریڈور میں لے آیا۔ نیم تاریک کوریڈور کے آخری سرے پر ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ راسو نے دروازہ کھولا اور آنیہ کو اندر لے آیا۔ یہاں دواؤں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بیڈ پر ایک زخمی عورت پڑی تھی۔ اسے گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس کشمیری عورت کی عمر پینتیس چالیس سال ہوگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی۔ آنیہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ اس کے چہرے پر چیچک یا خسرے جیسے بے شمار داغ تھے۔ کئی جگہ یہ داغ گہرے زخموں کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔

''یہ دیکھو مس آنیہ! پیلٹ گن کا ایک اور شاہکار۔ یہ راجوری میں ہی زخمی ہوئی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے اسی طرح بستر پر ہے۔ اس کا شوہر سات سال پہلے سرینگر میں ایک مظاہرے کے دوران میں شہید ہوچکا ہے۔ اس کا ایک بچہ تھا بابر۔ چار ماہ پہلے راجوری میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا۔ چودہ پندرہ سالہ بابر بھی اس میں شرکت کے لیے نکل گیا۔ اسے پتا چلا تو یہ دیوانی ماں اسے واپس لانے کے لیے گھر سے نکلی۔ اس نے بچے کو تو بچالیا مگر خود پیلٹ گن کا شکار ہوئی۔ کوئی دو سو چھرّے اس کے جسم میں پیوست ہیں۔ ایک آنکھ بھی ضائع ہوچکی ہے۔ اسے بڑی سرجری کی ضرورت ہے مگر یہ جس وقت کسی بڑے اسپتال میں جائے گی، پکڑی جائے گی۔ اب تو یہ شاید ویسے بھی علاج معالجے کی ضرورتوں سے گزرنے والی ہے۔ اس کے جسم میں زہر پھیل چکا ہے مگر اسپتال جانے کے بجائے یہاں مرنا اسے سہل لگتا ہے۔''

آنیہ سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ راسو نے کہا۔ ''اور یہ کوئی ایک عورت نہیں مس آنیہ! آپ جانتی ہیں ایسے سیکڑوں لوگ اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔ شدید زخمی ہوکر سسک رہے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو قبرستانوں کی آبادی بڑھا چکے ہیں۔ آپ پنجاب سے آئی ہیں۔ اس آگ کو دور سے دیکھتی رہی ہیں، ہم نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔''

آنیہ کو یاد آگیا۔ ڈھائی ماہ پہلے جب وہ یہاں راجوری میں ہی تھی، ایک دن اس نے راسو اور شہابی کو کسی زخمی عورت کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ راسو بڑے کرب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے مگر وہ فوراً پکڑی جائے گی..... اس وقت آنیہ نے سوچا تھا کہ شاید وہ کسی جرائم پیشہ زخمی کے بارے میں بات کررہا ہے۔

راسو کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ غالباً اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ہی وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اسی دوران میں سدرہ لنگڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور گلوکوز کی ڈرپ میں گرتے ہوئے قطروں کا جائزہ لینے لگی۔ (وہ فارمیسی کی طالبہ رہی تھی۔ میڈیکل کی سمجھ بوجھ رکھتی تھی) آنیہ بھی راسو کے پیچھے پیچھے نکل آئی۔ راسو دوبارہ کمرے میں آچکا تھا۔ وہ غمزدہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ آنیہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ویری سوری راسم! آپ کو میری بات سے تکلیف ہوئی ہے، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مس آنیہ! یہاں ہر جگہ دردناک کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ انسانیت لہولہو ہورہی ہے۔ ابھی آپ نے ٹانگ سے معذور سدرہ احمد کو دیکھا۔ آپ کے ذہن میں کئی سوال اٹھے ہوں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسے ہی کچھ سوال آپ کو یہاں کھینچ لائے ہیں۔ میں درست کہہ رہا ہوں نا؟''

آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا پھر ہولے سے بولی۔ ''کہا جاتا ہے کہ یہاں کشمیر میں آپ کا کوئی دوست تھا..... فاروق نام کا..... جو انڈین فورسز کے تشدد کا شکار ہوا۔''

''ہاں، سمجھیں کہ اس سدرہ اور فاروق کی کہانی ایک ہی ہے۔ آپ جاننا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بتاؤں گا، بلکہ سب کچھ بتاؤں گا۔ شاید پھر کبھی یہ موقع نہ ملے۔ مجھے..... مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ آپ اس وقت چل کر میرے پاس آئی ہیں۔ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے کچھ جاننا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں، ہم دونوں کے درمیان ہی رہیں گی۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' آنیہ نے جھکی پلکوں کے ساتھ کہا۔ ''اور راسم! ایک بار پھر سوری۔''

''نہیں آنیہ! سوری کی بات نہیں۔ بہت دیر نہیں ہوئی جب میری سوچ تھی وہی تھی جو آپ کی ہے۔ بالکل یہی خیالات..... فاروق میرا سب سے قریبی دوست تھا۔ ہم نے ایف ایس سی بھی اکٹھے ہی کیا تھا۔ وہ اپنی ایک بہن اور بوڑھے ہوتے والدین کے ساتھ رہتا تھا، ان کا واحد سہارا تھا۔ بے شمار دوسرے کشمیری نوجوانوں کی طرح اسے بھی قابض بھارتی فوج سے نفرت تھی۔ وہ مظاہروں میں شریک ہوتا تھا۔ پوسٹر لگاتا تھا اور مسلح فوجیوں پر غلیلوں سے کنکر برساتا تھا۔ یہ مزاحمت کی ایک کمزور سی شکل ہے لیکن میں اسے منع کیا کرتا تھا، خطروں سے آگاہ کرتا تھا مگر ہماری دوستی ایسی تھی کہ کسی بھی کام میں ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ مظاہروں میں، میں بھی اس کے ساتھ ہی شامل ہوتا تھا۔ فاروق مردانہ وجاہت میں اپنی مثال آپ تھا۔ کالج کی ایک برہمن لڑکی درشانا اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ درشانا خود بھی خوب صورت تھی مگر فاروق سے اس کی روز افزوں محبت اس کی مردانہ وجاہت سے زیادہ اس کے بے مثال اخلاق کی وجہ سے تھی۔ درشانا جانتی تھی کہ ان دونوں کا ایک ہونا مشکل ہے۔ برہمن تو نچلی ذات میں بھی شادی کرنے سے ہچکچاتے ہیں کہاں کہ ایک مسلمان سے پھر بھی وہ اس سے پیار کیے جارہی تھی۔ درشانا اسی کالج کے ہوسٹل میں رہتی تھی جہاں ہم گریجویشن کررہے تھے۔ اس دنیا میں ایک نانی اور ماموں کے سوا اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ ماموں بھی روزگار کے سلسلے میں ملائیشیا میں تھے۔

ایک دن فوجی ہمارے محلے کے دو نوجوانوں کو پکڑ کر فوجی کیمپ میں لے گئے۔ انہیں مارا پیٹا گیا، تذلیل کی گئی، مرغا بنایا گیا اور کہا گیا کہ وہ محلے کے ان لڑکوں کے نام بتائیں جو فوجی گاڑیوں پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ جان بچانے کے لیے ان دونوں نے مجبوراً کچھ نام لکھوا دیے۔ ایک روز میں بازار سے گھر واپس آیا تو مسجد کے قریب واقع خالی پلاٹ میں پریشان کن منظر دیکھا۔ محلے کے قریباً بیس لڑکے اور نوجوان دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دھوپ میں کھڑے تھے۔ فوجی ان کی پنڈلیوں پر چھڑیاں رسید کررہے تھے۔ ان میں فاروق بھی شامل تھا پھر ایک باوردی کیپٹن نے لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ بلند آواز میں ''پاکستان مردہ باد'' کا نعرہ لگائیں۔ دہشت زدہ لڑکوں نے نعرے لگائے۔ جنہوں نے پس وپیش سے کام لیا انہیں پھر چھڑیاں کھانا پڑیں۔

ایک سپاہی نے فاروق کے سر پر چھڑی سے ضرب لگائی اور گرج کر بولا۔ ''اوئے کنجر! تیرے گلے میں کیا پھنسا ہوا ہے۔ تیری آواز اونچی کیوں نہیں نکل رہی؟''

کیپٹن پہلے ہی تپا ہوا تھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور سپاہی سے کہا کہ اسے علیحدہ کرو۔ فاروق کو دوسرے لڑکوں سے علیحدہ کر کے ایک اسٹول پر کھڑا کر دیا گیا۔ کیپٹن نے ایک میگافون فاروق کو تھمایا اور بولا۔ ''اب اس میں بولو اور زور سے بولو لیکن اب نعرہ بدل گیا ہے۔ اب کہو۔ ''میں حرام زادہ ہوں.....'' کم از کم دس مرتبہ یہ لفظ بولو۔''

فاروق کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''معاف کر دیں سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بہت احتیاط کریں گے۔''

''معافی کی باتیں بعد میں ہوں گی۔ فی الحال جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔'' وہ دہاڑا۔

بیسیوں لوگ کھڑکیوں سے اور دروازوں کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ میں بھی چند افراد کے ساتھ فاصلے پر موجود تھا۔ ان لڑکوں کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ فاروق کی آواز جیسے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ایک حوالدار نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور میگافون اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیا۔ یکا یک فاروق نے میگافون پھینکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ فوجی اس کے پیچھے لپکے..... گلی کی نکڑ پر انہوں نے اسے دبوچ لیا۔ اسے رائفل کے کندوں اور بوٹوں

کی ٹھوکروں سے بُری طرح پیٹا جانے لگا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے، وہ بے طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا مگر اب اس کا اپنا انداز بھی جارحانہ ہو رہا تھا۔ وہ سینے کی پوری قوت سے چلّا رہا تھا..... پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد..... مودی قاتل..... مودی حرامی..... مشتعل فوجیوں نے اس کے منہ میں ریت بھر دی اور لہولہان کر کے جیپ میں پھینک دیا۔''

راسم عرف راسو خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر کرب تھا۔ غالباً وہی سنگین مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

''وہ اسے کیمپ میں لے گئے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''پتا نہیں، کہاں لے گئے۔ وہ کسی کو بتاتے تھوڑا ہی ہیں۔ کہا گیا کہ دو چار دن میں چھوٹ جائے گا مگر دو چار دن گزرے، پھر دو چار ہفتے اور پھر مہینے۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ باپ پہلے ہی دل کا مریض تھا، وہ چل بسا۔ ایک بڑا بھائی بال بچے دار تھا۔ وہ فوج کے ڈر سے کہیں غائب ہو گیا۔ بوڑھی ماں بیٹے کی بازیابی کے لیے جوتیاں چٹخاتی رہی اور متعلقہ لوگوں کی منتیں سماجتیں کرتی رہی۔ درشانا بھی ان چند افراد میں شامل تھی جو فاروق کا پتا چلانے کے لیے اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ کہا یہی جا رہا تھا کہ کیمپ انچارج کرنل آکاش اروڑا ہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے۔ درشانا ایک سفارش کے ذریعے کرنل اروڑا تک پہنچی اور دو تین بار اس کے دفتر جا کر اس سے ملی۔ وہ خوب صورت تھی۔ اروڑا کی نگاہوں کو بھا گئی۔ ایک موقع پر جب وہ اس کے دفتر میں تھی۔ اس نے درشانا سے کوئی نازیبا بات کی جس کا درشانا نے بُرا منایا۔ اروڑا بگڑ گیا اور اسے دھکے دے کر دفتر سے نکال دیا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ مجبور و بے بسی میں کوئی انا باقی نہیں رہتی۔ درشانا بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ پیار نہیں عشق کرتی تھی فاروق سے۔ اس کے لیے ہر حد تک جا سکتی تھی۔ اپنی ہستی تک لٹا سکتی تھی۔ وہ بے عزت ہونے کے باوجود چند دن بعد پھر کرنل اروڑا سے ملی۔ وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ پتا نہیں، اختیار کے نشے میں کتنی عزتیں پامال کر چکا تھا۔ اس کی بیوی نے چھ سات سال پہلے آتما ہتھیا کر لی تھی۔ اس نے درشانا کو باور کرایا کہ اگر وہ اپنے محبوب فاروق کو موت کے منہ سے بچانا اور آزادی دلانا چاہتی ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ایک بڑی قربانی دینا ہوگی۔ اس نے درشانا سے کہا۔ ''میں تم سے پریم کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ اونچی ذات کا ہندو ہوں۔ دولت اور اثر و رسوخ سب کچھ ہے۔ مجھ سے شادی کر لو۔ وہ لڑکا بچ جائے گا۔''

یہ ایک عجیب سودا تھا۔ زندگی اپنے زہر کا تلخ ترین گھونٹ درشانا کو پلا رہی تھی..... اور اس بے چاری نے پی لیا..... اس نے پی لیا۔''

راسم ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

آنیہ نے پوچھا۔ ''اس نے اروڑا سے شادی کر لی؟''

''ہاں، باقاعدہ شادی کر لی۔ اروڑا نے اسے بتایا کہ فاروق کشمیر کے بجائے ہماچل پردیش کی ایک جیل میں ہے۔ وہ اسے وہاں سے بخیریت رہا کرائے گا اور یہی اس رُوداد کا سب سے المناک پہلو ہے۔ جب اروڑا یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور خوبرو درشانا سے شادی رچا رہا تھا، فاروق کو جاں بحق ہوئے چار پانچ ماہ ہو چکے تھے۔ وہ بھی ان ہزاروں شہیدوں میں شامل ہو چکا تھا جو قابض فوج کے عقوبت خانوں میں سسک سسک کر دم توڑتے ہیں۔ سفاکی کی انتہا ہے ناں آنیہ! آپ ایک ایسے شخص کی رہائی کے لیے تاوان وصول کرتے ہیں جس کو آپ اپنے ہاتھوں سے مار چکے ہوتے ہیں۔ درشانا نے اپنا تن من جس چیز کے حصول کے لیے کرنل اروڑا کے حوالے کر دیا وہ چیز تو موجود ہی نہیں تھی۔ سفاکی اور سنگدلی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ اروڑا ایک ہوس کار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خود سے 22 سال چھوٹی درشانا اب ہر طرح سے اس کی دسترس میں تھی۔ کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ درشانا بار بار اروڑا کو اس کا وعدہ یاد دلاتی رہی۔ وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا پھر ایک روز جب وہ نشے میں دھت تھا اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ..... جو مر گیا ہے، اس کی جان کو کیوں روتی رہتی ہو۔

''اس روز درشانا کو یقین ہو گیا کہ اس کی ساری منتیں سماجتیں اور کوششیں بیکار ہیں۔ فاروق تو اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ وہ اب تک بے صلہ ہی ایک بدبودار بوجھ تلے روندی جاتی رہی ہے، زخمی ہوتی رہی ہے۔ وہ بہت روئی۔ اس کو اپنے گرد و پیش سے نفرت ہونے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایک روز وہ سب چھوڑ چھاڑ کر اروڑا کے گھر سے بھاگ گئی مگر وہ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اُسے پھر پکڑ لایا۔ اس بے چاری کا آگے پیچھے کون تھا، جو اس کی مدد کرتا۔''

راسو کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جذبات کو بمشکل سنبھال رکھا تھا۔ اس نے آنیہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگائی اور دوسرے کمرے میں جا کر چند گہرے کش

لیے پھر سگریٹ بجھا کر واپس آ گیا۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدل رہے تھے۔ آنیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''راسم! مجھے لگ رہا ہے کہ درشانا اور سدرہ ایک ہی لڑکی کے دو نام ہیں؟''

راسو نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''جب دوسری دفعہ درشانا نے اروڑا کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی ایک سنگین دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس نے ایک وزنی رائفل کا بٹ مار کر بچ درشانا کی ٹانگ توڑ دی۔ کہا یہی گیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ وہ ایک ماہ اسپتال میں زیرِ علاج رہی اور تب پھر اروڑا کے زنداں میں چلی گئی۔ چند دن بعد وہ بیمار ہو گئی۔ وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گئی تھی اور روتی رہتی تھی۔ اروڑا کا دل بھی بتدریج اس سے بھر گیا تھا۔ اس نے سراسر اپنی شرائط پر اسے طلاق دے دی۔ وہ بالکل بے آسرا تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دنیا کے اس سانپوں سے بھرے جنگل میں بھٹک جاتی، میں اپنے یار فاروق کی نسبت سے اسے زبابِ منزل میں لے آیا۔ وہ اب تک ایک بہن کی طرح میرے ساتھ رہی ہے۔ یہ کچھ ماہ پہلے کی بات ہے جب درشانا نے اچانک ایک اہم فیصلہ کیا۔ وہ اپنی رضا اور چاہت سے مسلمان ہو گئی۔ اس کا نام سدرہ رکھا گیا۔ میں اپنی اس مسلمان بہن کی ذہنی کیفیت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک طرح سے خود کو مطلقہ نہیں سمجھتی بلکہ فاروق کی بیوہ سمجھتی ہے..... اور باقی زندگی اسی کے نام پر گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی نانی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ماموں بے چارہ بیرونِ ملک ہے اور دنیا کے جھمیلوں سے گھبرانے والا شخص ہے۔''

اچانک کوریڈور کی طرف سے چلّانے کی آواز آئی۔ یہ سدرہ ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید راسو کو بلا رہی تھی۔ راسو لپک کر آواز کی طرف گیا۔ آنیہ اس کے پیچھے گئی۔

وہ اس کمرے میں پہنچے جہاں درمیانی عمر کی کشمیری عورت زخموں سے چور نازک حالت میں پڑی تھی۔ اس کی سانس ایک دم ہی اُکھڑ گئی تھی۔ سینہ بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ سدرہ نے پکارا۔ ''ان کو آکسیجن چاہیے فوراً..... ورنہ کچھ بھی ہو جائے گا۔''

راسو لپک کر ساتھ والے کمرے میں گیا اور وہاں سے آکسیجن کا ایک سلنڈر گھسیٹ کر لے آیا۔ اسٹینڈ وغیرہ بھی موجود تھا۔ لگتا تھا کہ ایمرجنسی میں پہلے بھی خاتون کو آکسیجن لگائی گئی ہے۔ خاتون کا چہرہ اور ہونٹ بالکل نیلے ہو رہے تھے۔ ان کی دھڑکن بحال رکھنے کے لیے راسو دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ آکسیجن کا ماسک ڈھونڈ رہا تھا۔ ماسک مل نہیں رہا تھا۔ وہ خاتون کو ماؤتھ ٹو ماؤتھ ''بریدنگ'' دیتے ہوئے پکارا۔ ''سدرہ ماسک دیکھو۔ میرے کمرے میں کہیں پڑا ہوگا۔ سدرہ بے چاری لنگڑاتی ہوئی قریبی کمرے کی طرف لپکی۔ آنیہ بھی اس کی مدد کے لیے بڑھی۔ ایک منٹ میں انہوں نے پورے کمرے کو الٹ پلٹ دیا۔ سدرہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے ماسک والا ڈبا اس الماری کے اوپر رکھا ہوا تھا۔''

آنیہ جلدی سے ایک اسٹول پر چڑھی اور الماری کے پیچھے جھانکا۔ نیلے رنگ کا ڈبا الماری کے پیچھے خلا میں گرا ہوا تھا۔ اس نے بازو لمبا کر کے ڈبے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں اسے ایک بڑی گن نظر آئی۔ وہ ایک ہی نگاہ میں پہچان گئی۔ یہ وہی ''M2HB'' تھی جس کا ذکر پروفیسر زیڈ اے صدیقی نے کیا تھا اور تصویر بھی دکھائی تھی۔ آنیہ جلدی سے ماسک اور اس کی نالی والا ڈبا لے کر واپس راسو کے پاس پہنچی۔ راسو نے پلک جھپکتے میں خاتون کو آکسیجن لگا دی۔ بروقت فرسٹ ایڈ ملنے سے ان کے چہرے کی نیلاہٹ کچھ کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سانس کی ابتری بھی کچھ ماند محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے اَن گنت زخموں کا زہر ان کے سارے جسم میں پھیل چکا ہے۔ اب تو شاید باقاعدہ سرجری اور پراپر ''ٹریٹ منٹ'' بھی ان کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سدرہ گلوکوز کی ڈرپ میں کچھ انجکشن لگانے میں مصروف ہو گئی تھی..... چند منٹ بعد مریضہ کی حالت میں افاقہ محسوس ہوا..... اور پھر وہ سو گئیں۔

کچھ دیر بعد آنیہ اور راسو واپس کمرے میں آ گئے۔ گن دیکھنے کے بعد آنیہ کے جسم میں عجیب سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ اس کا یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ راسو ایک نہایت خطرناک راستے پر قدم رکھ چکا ہے اور اب اس کی وجہ بھی بہت حد تک سمجھ میں آ رہی تھی۔ فاروق کی کہانی کشمیر کے اَن گنت نوجوانوں کی کہانی تھی۔ قابض قوتوں کو ان کا ہلکا پھلکا احتجاج بھی گوارا نہیں تھا۔ جابر حکمران ان کے ہونٹ سی دینا چاہتے تھے۔ ان کو مکمل طور پر کچل دینے کے ارادے رکھتے تھے۔ شاید پروفیسر صدیقی نے ٹھیک ہی کہا تھا، آگ کی اصل تپش کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب انسان اس کی لپیٹ میں ہوتا ہے۔

آنیہ نے کچھ دیر مریضہ کے حوالے سے بات کی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ''کرنل اروڑا تو شاید اب ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔''

''آنیہ، ایسے لوگ سروس سے ریٹائر ہو بھی جائیں تب بھی ظلم سے نہیں ہوتے بلکہ کئی تو پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص اب کشمیریوں کی زمینوں پر ناجائز قبضے کر رہا ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنا رہا ہے۔ راجوری میں تو پہلے سے بن رہی ہیں اب ایک چمبا ٹاؤن میں بھی شروع کر دی ہے۔'' اروڑا کا نام لیتے ہوئے راسو کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک شعلہ سا دہک جاتا تھا۔ شاید یہ شعلہ ہی اسے ایک بڑی آگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔

آنیہ نے کہا۔ ''آکاش اروڑا نے جو کیا، وہ سفاکی اور لاقانونیت کی بدترین مثال ہے اور تو اور اس نے ہوس کاری کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی ایک ہم قوم اور ہم مذہب کو بھی نہیں بخشا۔ میرے پاپا ایک بڑے وکیل ہیں راسم! اگر آپ چاہیں تو وہ آپ کی قانونی مدد کر سکتے ہیں۔ اس بدبخت اروڑا کے سلسلے میں بھی اور ظہیر نادیہ والے مسئلے میں بھی۔ بے شک آپ سے بھی ایک غلطی ہوئی ہے پولیس حراست سے بھاگنے والی مگر اسے بھی تو ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔''

راسم عجیب انداز میں ہنسا۔ ''آنیہ! میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہی ہیں لیکن..... میں شاید اس سے کافی آگے نکل چکا ہوں۔ ویسے بھی یہاں کشمیر میں قانون کی جو عملداریاں ہیں، وہ ایک کشمیری ہونے کے ناتے میں آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔''

''لیکن راسم، آپ جیسے باہمت نوجوانوں کی آپ کے کشمیر ہی کو ضرورت ہے۔ آپ اپنی جانوں کو کسی بہتر وقت کے لیے سنبھال رکھیں۔''

''اس سے بہتر وقت کوئی نہیں آئے گا آنیہ! ایک قصاب ہے جو اپنی کند چھری کے ساتھ کشمیر کی شہ رگ پر آن بیٹھا ہے۔ اب بھی سوچتے رہیں گے تو مٹ جائیں گے۔''

''مگر یہ ایک بڑی آگ ہے راسم، تھوڑا تھوڑا پانی آگ کو بجھاتا نہیں ہے، خود ختم ہو جاتا ہے۔''

''مگر وہ دھواں تو پیدا کرتا ہے، جو دور تک جاتا ہے اور ہم یہی دھواں دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔''

''آپ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟'' آنیہ نے اچانک پوچھا۔ راسم کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

''یہ آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ویری سوری..... لیکن ابھی جب میں گیس ماسک ڈھونڈ رہی تھی میں نے آپ کی الماری کے پیچھے ایک خطرناک رائفل دیکھی ہے اور اس کی گولیاں بھی۔''

''آپ کی نظر بہت تیز ہے۔'' وہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''مگر اتنی تیز نہیں کہ آپ کے اندر جھانک سکوں۔''

''ہاں اتنی تیز نہیں۔ ویسے آپ میرے اندر نہ ہی جھانکیں تو اچھا ہے۔ آپ بہت ناراض ہو جائیں گی۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ چہرے پر ہلکی سی شوخی تھی۔

''میں بہت سنجیدہ بات کر رہی تھی راسم، یہ بہت مہنگی رائفل لگتی ہے۔ کہاں سے ملی آپ کو؟''

''نادر چیزیں کہیں نہ کہیں سے تو مل ہی جاتی ہیں۔ آپ کو وہ نایاب تصویر کہاں سے ملی جو آپ نے زباب منزل میں شہابی کو دکھائی تھی؟'' وہ گفتگو کو پھر دوسری طرف لے گیا۔

''وہ جلیانوالا باغ کی تصویر تھی۔ 1919ء میں میرے ایک بزرگ نے اتاری تھی۔ ایک البم میں لگی ہوئی تھی اور پاپا کی ذاتی لائبریری میں موجود تھی۔''

''اب وہ میرے پاس بھی موجود ہے۔'' راسم نے اپنا موبائل فون دکھاتے ہوئے کہا۔ ''شاید شہابی نے اسے اتنا سنبھال کر نہ رکھا ہو، جتنا میں نے رکھا ہوا ہے۔''

''آپ کو اس میں کیا دلچسپی ہے؟ شہابی کے تو یہ دادا ہیں۔'' آنیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تو پھر میرے بھی دادا ہی ہوئے نا.....'' اس نے بات بنائی۔ ''ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ شہابی نیوز کا بندہ ہے۔ اسے صرف نئی خبروں اور نئی تصویروں سے دلچسپی ہے۔ یہ پرانی چیزوں اور واقعات سے تعلق رکھنے والی رومانیت اس میں نہیں ہے۔''

''آپ میں ہے؟'' آنیہ نے قدرے بے تکلف لہجے میں پوچھا۔

''بہت زیادہ۔ یادوں کو بہت دیر تک سنبھال کر رکھنے والا بندہ ہوں۔'' اس نے آنیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ گڑبڑا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس نے پھر موضوع بدلا۔ ''ہاں تو آپ بات کر رہی تھیں جلیانوالا کی تصویر کی۔ میں نے گریجویشن کی ہے۔ آگے ماسٹرز کرتا تو ضرور ہسٹری میں کرتا۔ تحریکِ آزادی کے سارے واقعات مجھے یاد ہیں۔ خاص طور سے جلیانوالا کے واقعے نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ جنرل ڈائر بچپن سے ہی میرے لیے ایک مکروہ کردار تھا۔ جب میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ زباب منزل کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے سفید رنگ کے دو سوٹر پال رکھے تھے۔ ایک بڑا تھا ایک چھوٹا۔ بڑے کا نام میں نے ڈائر رکھ چھوڑا تھا۔ جلیانوالا باغ کے واقعے کی بے شمار تصویریں اور اخباری تراشے

میرے پاس موجود ہیں..... وہ جابر حکمرانوں کے سامنے نہتے لوگوں کی مزاحمت کا ایک یادگار واقعہ تھا۔''

آپ کو اس واقعے میں اس لیے دلچسپی ہے کہ آپ کی رگوں میں اسی شیر بچے کا خون ہے جو اس تصویر میں نظر آتا ہے..... آپ اس کے پوتے ہیں..... یہ بات آنیہ نے زبان سے ادا نہیں کی بلکہ دل ہی دل میں کہی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ سیاہ ڈائری دیکھ چکی ہے اور اس کی اصلیت سے آگاہ ہو چکی ہے۔ وہ راز جو پچھلے کئی برس سے آیا خالہ اور راسم کے درمیان تھا، اب وہ بھی اس میں شریک ہو چکی تھی۔ وہ آیا خالہ کا نہیں، زباب بیگم کا بیٹا تھا۔

اسی دوران میں راسم نے آنیہ سے دو منٹ کی اجازت لی اور زخمی خاتون کو دیکھنے کے لیے کوریڈور والے کمرے میں چلا گیا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اب ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت تک آنیہ لازمی گھر پہنچ جاتی تھی۔ اس نے سوچا دلبر ماموں نے پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ اس نے دلبر ماموں کو فون کیا اور بتایا کہ وہ بارش کی وجہ سے اپنی دوست کے گھر رک گئی ہے۔ اب وہ کھانے پر اصرار کر رہی ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ واپس آجائے گی۔ دلبر ماموں کو مطمئن کر کے وہ خود بھی مطمئن ہو گئی۔ سدرہ واقعی اصرار کے ساتھ اسے کھانے کے لیے کہہ رہی تھی، وہ کشمیری پلاؤ بنا رہی تھی..... ہاں سدرہ، جو کبھی درشانا تھی۔

راسم واپس آنیہ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک پڑیا سی تھی۔ اچانک بولا۔ ''ایک مرتبہ میں نے آپ کو ایک سیاہ گلاب دینے کی جسارت کی تھی۔ گلابی کناروں والا گلاب۔ پسند آیا تھا آپ کو؟''

آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے یہ ذکر بے محل لگا تھا۔ راسم نے کہا۔ ''اسی لیے آپ نے گلاب ٹیکسی سے باہر پھینک دیا تھا۔ یہ دیکھیں، میں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' اس نے پڑیا کھول کر آنیہ کو دکھائی جس میں گلاب کی خشک پتیاں تھیں۔ وہ لاجواب سی ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ ''اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ میں یادوں کو سنبھال کر رکھنے والا بندہ ہوں..... زندگی کی آخری سانس تک۔''

''زندگی کی آخری سانس۔'' اس نے عجیب انداز میں کہا۔ آنیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ سے ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتائیے گا؟''

''آپ پوچھ رہی ہیں تو پھر سچ ہی بتاؤں گا بلکہ سچ بتانا ہی پڑے گا۔''

''کہیں آپ کی اس خطرناک رائفل کا ٹارگٹ..... ریٹائرڈ کرنل اروڑا تو نہیں؟''

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند گہری سانسیں لیں۔ کھڑکیوں سے باہر بارش کی آواز تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے آنیہ کو سرتاپا دیکھا اور جیسے اپنے اندر جذب کر لیا۔ پھر ٹھہری آواز میں بولا۔ ''پتا نہیں کہ پھر کبھی ایسا موقع آئے گا یا نہیں۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھ پائیں گی یا نہیں۔ میں آپ کو کچھ بتا پاؤں گا یا نہیں؟ جی چاہتا ہے آج آپ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں۔ وہ بھی نہیں، جو چھپانا چاہیے۔ آپ سامنے ہیں تو ہر مصلحت بالائے طاق رکھنے کو دل چاہتا ہے۔''

''اس اعتماد کے لیے شکریہ۔ میں اس پر پورا اتروں گی۔''

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''جس روز میں نے اپنے پیارے فاروق کی ہڈیاں ایک قبرستان میں دفن کی تھیں اور روتی سسکتی سدرہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اسی روز میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اروڑا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا مگر اروڑا تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ وہ سروس کے دوران میں بھی سخت سیکیورٹی میں رہتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے گرد سیکیورٹی کا حصار مزید مضبوط ہو چکا ہے۔ گھر، دفتر اور دیگر جگہوں پر درجنوں گارڈز اس کے اردگرد تعینات ہوتے ہیں۔ میں اب تک دو بار اس پر ATTEMPT کر چکا ہوں۔''

یہاں تک کہہ کے راسم خاموش ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ غالباً وہ اپنے دوست راجا کی طرف سے تسلی کرنا چاہتا تھا۔ دروازے اور کھڑکی کو اچھی طرح بند کر کے وہ پھر آنیہ کے قریب آبیٹھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلی مرتبہ ایک کشمیری مجاہد میرے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک ہوٹل کی تقریب میں گھسنے کی کوشش کی۔ وہاں اروڑا موجود تھا۔ گارڈز چوکنے ہو گئے۔ ہمارے اور گارڈز کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ گولی لگنے سے میرا ساتھی شہید ہوا اور میرے کندھے پر بھی زخم آیا۔'' راسم نے اپنا کندھا ننگا کر کے زخم دکھایا تو اس کا گھنے بالوں سے بھرا ہوا سینہ کسی شیر کا سینہ نظر آیا۔

''دوسری کوشش بھی بڑی زبردست تھی مگر خدا کو منظور نہیں تھا، وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ موت جیسے اس باسٹرڈ کو چھو کر گزر گئی۔ مجھے کہیں سے تین ہینڈ گرینیڈ ملے تھے۔ امریکن ساخت کے یہ ''ایم کے ٹو'' نامی ہینڈ گرینیڈ پرانے تھے مگر درست حالت میں لگتے تھے۔ ان میں سے ایک گرینیڈ کو میں نے راجا کے ساتھ جنگل میں جا کر ٹیسٹ کیا اور باقی دونوں

سنبھال لیے۔ ہم دونوں موقع کی تلاش میں رہے۔ یہ موقع ہمیں انڈیا کے پچھلے یوم جمہوریہ پر ملا۔ آکاش اروڑا کی ہاؤسنگ اسکیم میں رات کے وقت آتش بازی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ خود بھی وہاں آرہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اس کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں مزید قریب جانا چاہتا تھا مگر سیکیورٹی کے حصار کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ گارڈینیا کی ایک باڑ کے عقب سے میں نے دونوں گرینیڈ اس پر اچھال دیے تھے۔ دونوں گرینیڈ پھٹے لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اس کا ایک گارڈ ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے۔ اس کی اپنی ٹانگ پر بھی زخم آیا مگر وہ شدید نقصان سے محفوظ رہا۔ اسے میری خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ گرینیڈ دھماکوں کی وجہ سے موقع پر بجلی کا نظام درہم برہم ہوگیا اور میں وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔''

راسم نے ذرا توقف کر کے آنیہ کے تاثرات دیکھے جو ہمہ تن متوجہ تھی، وہ بولا۔ ''اس واقعے کے بعد اروڑا کی سیکیورٹی مزید سخت ہوگئی اور اس سختی میں روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے۔ جب تک یہ شخص اس زمین پر دندنا رہا ہے، میرے سینے میں ایک نیلی آگ روشن ہے اور یہ مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ یہ جو گن ابھی آپ نے الماری کے عقب میں دیکھی ہے، میں کئی ماہ سے اس کے پیچھے تھا۔ یہ دور تک مار کرنے والی بہترین آٹومیٹک گنز میں شمار ہوتی ہے۔ اس کو ایم ٹو براؤننگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قریباً پونے دو کلومیٹر تک بہ آسانی مار کرسکتی ہے اور اس کی یہی خوبی ہے جو میرے لیے سب سے اہم ہے۔''

''وہ کیوں؟'' آنیہ نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''اب تک میں نے اس مکروہ اروڑا کے سلسلے میں جتنا بھی ہوم ورک کیا ہے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میں اسے راستے میں تو مارنے کی کامیاب کوشش کرسکتا ہوں مگر اس کے کسی ٹھکانے پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہینڈ گرینیڈز والے واقعے کے بعد اس کی سیکیورٹی بہت بڑھ چکی ہے۔''

''راستے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' آنیہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ''کہا نا ہے کہ آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا وہ بھی نہیں جس کو جاننے کی آپ کو ضرورت نہیں۔''

وہ ایک مقفل دراز کے اندر سے ایک سفید کاغذ لے آیا۔ اس پر ہاتھ کی مدد سے ہی ایک نقشہ سا بنایا گیا تھا۔ یہ نقشہ اپنے سامنے رکھتے ہوئے راسم نے آنیہ کو بتایا کہ ہفتے میں تین روز آکاش اروڑا اپنی رہائش گاہ سے اپنی ہاؤسنگ اسکیم کی طرف جاتا ہے اور یہ راستہ اختیار کرتا ہے۔ ہائی وے جیسی یہ سڑک ایک جگہ خم کھاتی تھی اور وہاں اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ ایسا ہی ایک ٹیلا راسم کے لیے ''کمین گاہ'' کا کام دینے والا تھا۔ اس نے سب کچھ ''کیلکولیٹ'' کیسا ہوا تھا۔ جہاں راسم کو گھات لگانا تھی وہ ایسی جگہ تھی جہاں اروڑا کی گاڑی اور اس کے آگے پیچھے چلنے والی گاڑیوں کو کم از کم 30 سیکنڈ تک اس کی زد میں رہنا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ بہت اچھا نشانے باز نہیں ہے ورنہ شاید وہ اس گن کے بجائے کوئی اسنائپر وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ بیلٹ کے ذریعے فائر کرنے والی یہ گن ایک سیکنڈ میں کم و بیش 8 گولیاں نکال سکتی تھی۔ بے شک فاصلہ زیادہ تھا مگر راسم کو یقین تھا کہ اس گن کے تین چار برسٹ اروڑا کو اس کے انجام تک پہنچا دیں گے۔

آنیہ نے ہراساں ہوکر کہا۔ ''راسم! یہ بے حد خطرناک کام ہے۔ یہ آپ..... کس راستے پر چل نکلے ہیں؟''

''جب سب راستے بند ہوجاتے ہیں..... تو پھر ایسے ہی راستے نکلا کرتے ہیں۔ یہاں جنگل کا قانون نافذ ہے آنیہ.....'' کچھ کہتے کہتے وہ ایک دم رک گیا پھر مسکرایا اور ذرا ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ گن میں نے حاصل کیسے کی؟'' آنیہ بس اس کی طرف دیکھ کر اور پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ''اس طرح کی گنز امریکیوں نے افغان جنگ میں استعمال کی تھیں۔ وہاں لڑنے والا ایک شخص اسے پرزوں کی شکل میں اپنے ساتھ کشمیر لے آیا۔ یہ کافی عرصہ زمین میں دبی رہی ہے لیکن بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ اس شخص کا بیٹا اس گن کے لیے ایک لاکھ روپیا مانگ رہا تھا۔ اس سے کچھ رعایت کروائی ہے۔ اسے خریدنے کے لیے میں نے اپنی ذاتی اشیا اور موٹر سائیکل تک بیچی ہے۔ کچھ دوستوں سے قرض لیا ہے تب یہ اپنی ہوسکی ہے۔'' راسم کی آنکھوں میں جیسے اُمید کے دیے سے جگمگانے لگے تھے۔ آنیہ کو یہ سارا ماحول راسم کی ڈائری سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس ڈائری میں راسم نے اس ہتھیار کو اپنے من پسند کھلونے کا نام دیا تھا۔

بارش اب رم جھم کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ وال کلاک ساڑھے آٹھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ کچن کی طرف خوبرو سدرہ کی زخمی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ راسم نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ ''پرسوں پندرہ تاریخ ہے آنیہ، پرسوں میرے پیارے فاروقی کی سالگرہ ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، میں اپنی شادی اپنی سالگرہ کے دن کرکے ایک انوکھا ریکارڈ

قائم کروں گا۔ جوانی کے کئی خوش رنگ و معصوم منصوبوں کی طرح اس کا یہ منصوبہ بھی قبر کی مٹی میں مل گیا مگر سالگرہ تو موجود ہے۔ میں اپنے یار کو اس سالگرہ پر ایک یادگار تحفہ پیش کروں گا۔ اس شخص کی لاش کا تحفہ جس نے اسے کسی فوجی عقوبت خانے میں سسک سسک کر جان دینے پر مجبور کیا اور کیا پتا، ایسا موقع بھی آیا ہو جب فاروق نے ظلم کرنے والوں سے خود موت کی بھیک مانگی ہو۔ ان سے کہا ہو کہ وہ اسے اذیت نہ دیں، جان سے ماردیں۔ کیا اس طرح موت کی تمنا کرنا کوئی آسان ہوتا ہے مس آنیہ؟..... کیا گاڑیوں کو پتھر مارنے کی سزا اتنی کڑی ہوتی ہے؟ کیا ایک نعرے سے رُوگردانی کا خمیازہ ایسے بھی بھگتنا پڑتا ہے؟..... وہ بھری جوانی میں چلا گیا۔ اس کا باپ مر گیا۔ اس کا بھائی جلاوطن ہو گیا، اس کی ماں نیم دیوانی پھرتی ہے..... اور اس کی مدد کرنے والی کمزور لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہوا جس طرح اس کی قربانی کو مٹی میں ملایا گیا، وہ بھی آپ کے سامنے ہے.....''

راسم کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو ہلکورے لینے لگے۔

دونوں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ آنیہ جب یہاں راسم کے پاس پہنچی تھی اس کے خیالات اور تھے مگر اب خیالات اور احساسات بالکل مختلف ہو چکے تھے۔ وقت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں کتنا بڑا انقلاب آیا تھا اس کے اندر۔ پتا نہیں اسے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ظلم کی اور مزاحمت کی ایک ہی کہانی ہے جو ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان سے لے کر اور جلیانوالا سے لے کر آزادیٔ کشمیر تک بھی یہ کسی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں لگتی تھیں۔ اس نے ایک نظر پھر راسم پر ڈالی جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا..... ہاں، تم وہی ہو جس کو میں ڈھونڈنے نکلی تھی۔ اس نے عجیب کھوئے کھوئے سے آہنگ میں کہا۔ ''راسم! میں سمجھ گئی ہوں کہ برسوں آپ کو ہر صورت اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہے۔ یہی کہہ سکتی ہوں کہ اگر یہ سب ہونا ہی ہے تو اللہ آپ کو کامیاب کرے لیکن اس کے بعد.....''

''اس کے بعد میں، اگر بچ گیا، تو کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جاؤں گا۔ یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں آنیہ کہ بہادری اور خودکشی میں فرق ہے۔ کٹر ہندو حکمران کے آنے کے بعد حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ بہت جلد فیصلہ کن مرحلہ آنے والا ہے۔ میں اس فیصلہ کن مرحلے کا انتظار کروں گا۔''

''کھانا تیار ہے بھائی۔'' کچن کی طرف سے سدرہ کی آواز آئی۔

''آتا ہوں۔'' راسم نے کہا پھر آنیہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''جن لوگوں کی آپ کی زندگی میں اہمیت ہوتی ہے، ان کی دعائیں آپ کے لیے بہت کارگر ہوتی ہیں، آپ بھی میرے لیے دعا کرنا۔''

آنیہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ راسم کو کسی میدان کارزار میں جانے کے لیے الوداع کہہ رہی ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ہلکی سی مسکان کے ساتھ بولا۔ ''راجا ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائے گا جو باتیں میں نے آپ کے ساتھ کی ہیں، اس کی بھنک بھی اسے پڑ گئی تو مجھے کچا چبا جائے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' آنیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

راسم کھانا لینے کے لیے کچن کی طرف چلا گیا۔ بارش اب رک گئی تھی۔

☆☆☆

دلبر ماموں سے سلام دعا کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جس راسم سے مل کر آ رہی ہے، وہ اس کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ اسی کے لیے تو جالندھر سے چل کر یہاں راجوری پہنچی تھی۔ وہ برسوں سے اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اس کی دھڑکنوں میں رہتا تھا۔ وہ یہی تھا..... وہ یہی تھا۔ وہ پہلی بار جلیانوالا میں نظر آیا مگر وہ اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں..... سرنگاپٹم میں، میسور میں، جلیانوالا میں، اور پھر غازی علم دین کے جذبۂ حمیت میں، اور عزیز بھٹی کے عزم میں..... اور شیر خاں کی للکار میں، وہ بہت سی جگہوں پر موجود تھا۔ وہ اس کی روح سے عشق کرتی تھی اور اب وہ سراپا اس کے سامنے تھا۔ جلیانوالا کے ''شیر بچے'' اسد اللہ کا پوتا۔

یکا یک اس کی پیشانی پر پسینا آ گیا۔ اس نے سوچا اگر ابھی نہار کور کا فون آ جائے اور وہ اس سے پوچھے۔ ''وہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟ کہیں راسو سے محبت تو نہیں کرنے لگی ہو؟'' تو وہ کیا جواب دے گی؟ پھر اس کے شفاف گلابی رخساروں پر آنسو پھسلنے لگے۔ راسم کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''آنیہ! آپ میرے لیے دعا کرنا۔''

بے شک اسے دعاؤں کی ضرورت تھی۔ وہ ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں سے فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی

ہوگئی۔ رات کے خنک سناٹے میں یہ نماز اور یہ دعا اس کے لیے یادگار تھی۔ وہ اس کی کامیابی اور زندگی مانگ رہی تھی۔ وہی جو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لیے اہم ترین ہوگیا تھا۔

وہ جائے نماز سے اٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے شہابی حیدر کی ''ہیلو'' سن کر اس کے جسم وجاں میں بیزاری کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے کال منقطع کردی۔ وہ اس کا نمبر بہت عرصے سے بلاک کرچکی تھی۔ آج اس نے کسی دوسرے نمبر سے رابطہ کیا تھا۔

رات گزری اور پھر صبح ہوگئی۔ آنیہ ایک ایک پل گن کر گزار رہی تھی۔ وہ جانتی تھی راسم کی زندگی کے اہم ترین لمحات قریب آرہے ہیں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار پھر دن کا اجالا اندھیرے میں اور اندھیرا، اجالے میں بدلا۔ آج پندرہ تاریخ تھی۔ آج کشمیر کے ایک اور گمنام شہید فاروق کی سالگرہ کا دن تھا اور آج ایک اہم واقعے کا دن بھی تھا۔ راسم نے اسے بتایا تھا کہ آکاش اروڑا پر حملہ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوگا، جب وہ اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی سے واپس آرہا ہوگا اور شام ہونے والی تھی۔ آنیہ کے ہونٹوں پر خاموش دعائیں تھیں اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی بھی جارحانہ طرزِ عمل اور خونریزی کی قائل نہیں رہی تھی مگر جو کچھ وہ اروڑا کے بارے میں سن چکی تھی اور جان چکی تھی، اس کے بعد اس کے دل سے بھی یہی دعا نکل رہی تھی کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی جب دلبر ماموں کی آواز نے اسے چونکایا۔ ''آنیہ پتر، اِدھر آؤ..... یہ دیکھو..... یہ ٹی وی پر کیا سماچار آرہی ہے؟''

آنیہ کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب اٹھی..... اور کب ٹی وی لاؤنج میں پہنچی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

''یہ دیکھو، یہ وہی راسو ہے ناں۔ شہابی کا دوست۔'' دلبر ماموں نے جیسے چلا کر کہا۔

آنیہ نے اسکرین کی طرف دیکھا اور سکتہ زدہ رہ گئی۔ اسکرین پر ہیڈ لائن کے الفاظ تھے۔ ''سابق کرنل اروڑا قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے۔ حملہ آور راسم عرف راسو اسلحے سمیت گرفتار۔'' پھر راسم کی ایک فائل فوٹو بھی اسکرین پر ابھری۔ تب ایک بار پھر نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بولنے لگا۔ ''ہم یہ تازہ ترین سماچار آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ ریٹائرڈ کرنل اروڑا جو ''درشن ہاؤسنگ سوسائٹی'' کے مالک بھی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے سائٹ سے واپس شہر کی طرف آرہے تھے۔ ان پر گھات لگا کر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بی ایس ایف کی بروقت کارروائی سے یہ منصوبہ ناکام ہوا ہے۔ ملزم راسو کو فاصلے تک مار کرنے والی گن "M2HB" اور گولیوں سمیت پکڑ لیا گیا ہے۔ ملزم نے فرار ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش میں زخمی بھی ہوا۔''

پھر فیلڈ رپورٹر اسکرین پر ابھرا۔ وہ مائیک سمیت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔ یہ وہ ٹیلے تھے جہاں سے راسم کو فائرنگ کرنا تھی۔ فیلڈ رپورٹر نے کہا۔ ''جی ہاں، یہ ہے وہ جگہ جہاں سے، طویل رینج کی گن کے ذریعے اروڑا صاحب کے قافلے کو نشانہ بنایا جانا تھا۔ یاد رہے کہ راسم عرف راسو وہی شخص ہے جو کچھ عرصہ پہلے راجوری پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ.....''

رپورٹر مسلسل واویلا کررہا تھا۔ آنیہ کے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ اردگرد کی ہر شے گردش میں محسوس ہوتی تھی۔ دلبر ماموں کی آواز جیسے کہیں دور سے اس کے کانوں تک پہنچی۔ ''بھئی منڈا تو یہ ایویں سا لگدا تھا۔ پر کوشش جی داروں والی کی ہے اس نے۔ اگر یہ اپنے ارادے میں سپل ہوجاتا تو چنگا بھلا تہلکہ مچا دینا تھا اِس نے۔ یہ جو گن ٹی وی پر دکھا رہے ہیں ناں، یہ بڑی ہیوی ہے جب میں فوج وچ تھا.....'' وہ بولتے رہے۔ آنیہ ڈگمگاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن آنیہ گاہے بگاہے کرب کی انتہا کو چھوتی رہی۔ وہ ایک بار پھر راجوری سے واپس جالندھر اپنے گھر آچکی تھی۔ بہانہ اس نے یہی بنایا تھا کہ باقی کشمیر کی طرح راجوری میں بھی حالات ٹھیک نہیں۔ پکڑ دھکڑ ہورہی ہے۔ کرفیو لگنے کا بھی اندیشہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی وقت وہ ہمت کرکے ٹی وی یا اخبار بھی دیکھ لیتی۔ راسم کو اروڑا کا قافلہ گزرنے سے چار پانچ منٹ پہلے ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ یقیناً اس کے ساتھ سخت مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ اخبار میں اس کی ایک تصویر دیکھ کر آنیہ کا دل بے تحاشا رویا تھا۔ تصویر میں اس کا بالائی لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرہ دھول سے اٹا ہوا اور ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے اوندھا کرکے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے۔ قریب ہی مسلح فوجیوں کے سیاہ بوٹ دکھائی دے رہے تھے۔ آنیہ نے نہار کے سوا ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنے پاپا کو بھی نہیں۔ پاپا کو بھی ابھی تک اس رُوداد کے اہم ترین موڑ کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا۔ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ البم کی تاریخی فوٹو گراف کا تعلق

شہابی سے نہیں بلکہ راسم سے ہے۔

یہ چوتھے پانچویں روز کی بات ہے آنیہ کے پاپا بڑے غصے کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ وہ آتے ساتھ ہی آنیہ کو بیسمنٹ میں لے آئے۔ ''آنو! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولے۔

''کیا ہوا پاپا؟'' اس نے سہم کر پوچھا۔

''کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری دی ہوئی آزادی کا نتیجہ ایسا نکلے گا۔ یہ کون ہے راسم؟ تمہارا کیا تعلق ہے اِس سے؟''

آنیہ کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ پاپا نے ایک اخبار اس کے سامنے پھینکا۔ اس میں راسم کے حوالے سے خبر تھی اور ہتھکڑی لگی تصویر بھی موجود تھی۔

''راجوری میں اس سے ملتی رہی ہو تم؟ اس کے پاس آنا جانا رہا ہے تمہارا؟''

''پاپا! مم..... میں آپ کو سب بتانا چاہتی تھی۔ شاید آج ہی بتاتی، دراصل.....''

اس کے پاپا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں آنیہ اور پاپا کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ بہت گمبھیر تھی۔ اس گفتگو سے آنیہ پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ اس ساری مصیبت کے پیچھے کسی اور کا نہیں شہابی کا ہاتھ ہے۔ اسی نے یہ ٹوہ لگائی کہ وہ راجوری میں دو بار ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' پر پہنچی ہے اور راسم سے ملی ہے۔ کم ظرف تھا وہ۔ اُس نے رقابت کمائی تھی اور اپنی فرسٹریشن نکالنے کے لیے آنیہ کو ڈنک مارا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ راسم تو اریسٹ ہو ہی چکا ہے اس نے آنیہ کے پاپا اور فرحان وغیرہ کو راسم سے اس کے میل جول کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آنیہ نے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا اور پاپا کو یہ بھی بتایا کہ راسم سے خدانخواستہ اس کا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا جس پر انگلی اٹھائی جاسکے۔ پھر اس نے پاپا کو مکمل رازداری کی شرط پر اس بھید سے بھی آگاہ کر دیا جو سیاہ ڈائری کے ذریعے اس پر اور نہار پر کھلا تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ جلیانوالا باغ کی تصویر کا اصل تعلق راسم سے ہے، شہابی حیدر سے نہیں۔ اسے اپنے پاپا پر پورا بھروسا تھا اور اسے یقین تھا کہ جب اس نے کہہ دیا ہے تو پاپا اس راز کو کبھی اپنے سینے سے باہر نہیں نکالیں گے۔

اس کے پاپا کو بھی صورتِ حال کی اس نئی کروٹ نے ایک شاک پہنچایا لیکن ان کا غم و غصہ ان پر اتنا غالب تھا کہ وہ اس رُوداد کی بوالعجبی پر زیادہ غور نہیں کر سکے۔ انہیں شدید دکھ تھا کہ آنیہ کا میل جول اور اس کا جھکاؤ ایک ایسے شخص کی نسبت سے سامنے آیا ہے جو ایک آوارہ گرد کے طور پر پہچانا جا رہا ہے اور سنگین ترین کیسز میں ملوث ہے۔ بے شک ہر گھریلو معاملے میں ان کی حمایت آنیہ کے ساتھ ہوتی تھی مگر یہ صورتِ حال ان کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔

دو چار روز کے اندر ہی گھر میں اس طرح کی باتیں گردش کرنے لگیں کہ آنیہ اپنی باقی کی اسٹڈی اگر مکمل کرنا چاہتی ہے تو شادی کے بعد کر لے گی۔ ایک دن ماما نے دوٹوک الفاظ میں آنیہ سے کہا۔ ''آنو! فرحان بہت ڈسٹرب ہے جس طرح کی بات نکلی ہے، وہ تو شاید رشتے سے ہی انکار کر دیتا مگر وہ نیچر کا بُرا نہیں ہے۔ سمجھتا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنایا گیا ہے۔ تمہاری خالہ نے بھی کوشش کی ہے کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس معاملے کو اب زیادہ لٹکایا نہ جائے۔''

''کیا مطلب؟'' آنیہ نے خشک لہجے میں کہا۔

''دیکھو تمہاری خالہ مریم بیمار رہتی ہیں۔ وہ جلد سے جلد تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ.....''

''..... کہ میری ساری بے راہ رویوں کو معاف کرنے والے فرحان کو میرا دولھا بنا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟'' آنیہ کی آواز طنز کے سبب زہرناک ہو رہی تھی۔

''آنو! تو کیسی باتیں کرتی ہے؟ وہ سارا گھرانا تجھ سے پیار کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ فرحان.....''

''ہاں، ہاں..... کل رات جب وہ کھانے پر آیا تھا، میں دیکھ رہی تھی اُس کا پیار۔ مجھے یوں فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کا سر کیا ہوا قلعہ ہوں اور اب یہ قلعہ اپنے مکینوں سمیت اس کے رحم و کرم پر ہے۔ مجھے ایسا پیار نہیں چاہیے ماما۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ابھی کوئی اس گھر میں میری شادی کی بات نہ ہی کرے تو اچھا ہے.....''

وہ اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس گھر میں اسے ہمیشہ اپنے پاپا کا آسرا اور سہارا میسر رہا تھا لیکن اب یوں لگ رہا تھا کہ حالات کے سخت تھپیڑوں نے یہ آسرا بھی اس سے چھین لیا ہے۔

وہ بے حد کرب کے شب و روز تھے۔ ایک طرف گھر کی فضا میں تناؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف راسم کے بارے میں سوچ کر اس کا دل روتا رہتا تھا۔ وہ یقیناً اذیت ناک موت کے شکنجے میں تھا۔ مر چکا تھا یا پھر مرنے والا تھا۔

جان لینے کے لیے ان ظالموں کے پاس ہزار بہانے تھے اور کشمیر کے طول وعرض میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ تو کیا وہ بھی فاروق والے انجام کا شکار ہونے والا تھا اور فاروق نے تو صرف فوجی گاڑیوں کی طرف پتھر اچھالے تھے، راسم کا 'جرم' تو نسبتاً بہت..... بہت بڑا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا اس کے اندر۔ یہ کیسا دیوانہ انقلاب تھا۔ راسم کا نام اس کے سینے میں دھڑکن کی طرح گونجتا تھا مگر یہ انقلاب آیا کس وقت تھا؟ جب راسم موت کی دہلیز پر تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کرسکتی تھی۔ کوئی بھی کیا کرسکتا تھا؟

ایک دن وہ بیسمنٹ میں تھی جب پاپا ایک مختلف موڈ میں اس کے پاس آئے۔ وہ دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ حالات کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتے رہے۔ ''میں نے زندگی میں تم سے کچھ نہیں مانگا آنو، آج مانگ رہا ہوں۔ اس دنیا میں کسی کو مکمل آسمان نہیں ملتا ہے۔ کہیں نہ کہیں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ انکار والی ضد چھوڑ دو۔''

وہ پاپا کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔ ''ابھی میرے بس میں کچھ نہیں ہے پاپا! آپ مجھے کچھ وقت دیں..... چند مہینے..... میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کروں گی پاپا۔''

''چند مہینے؟'' وہ جز بز ہو کر بولے۔ ''تمہارے سسرال والے تو چند ہفتے بھی زیادہ سمجھ رہے ہیں اور تمہاری ماما تو صبح سے بہ ضد ہیں کہ شادی ہال وغیرہ دیکھنے کے لیے نکلنا چاہیے۔''

آنیہ نے دکھی نظروں سے پاپا کو بغور دیکھا۔ ''پاپا! آپ نے ہی مجھے جھوٹ سے نفرت کرنا سکھایا ہے۔ مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ نہ بلوائیں پاپا..... ابھی مجھ سے نہ بلوائیں پاپا۔'' وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

ایک روز اس نے بند کمرے میں پاپا اور فرحان کو بات کرتے سنا۔ فرحان انکشاف انگیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''اروڑا کسی معمولی بندے کا نام نہیں ہے خالو جان! راجوری کے پورے ڈسٹرکٹ میں تہلکہ مچا ہوا ہے اس قاتلانہ حملے کی وجہ سے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں پرسوں چمبا گیا تھا۔ وہاں اروڑا کا پی اے ملا۔ اس نے بتایا ہے کہ تفتیش کا دائرہ دوسرے علاقوں تک پھیلایا جارہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اس معاملے میں..... خدانخواستہ..... کسی حوالے سے آنیہ کا نام آگیا تو عذاب بن جائے گا۔ میں نے کل اپنے ٹریول ایجنٹ سے بات کی ہے۔ آنیہ کا پاسپورٹ تو بنا ہی ہوا ہے نا؟''

آنیہ کے پاپا نے اثبات میں جواب دیا۔

''اگر آپ کی رائے ہو تو شادی کے فوراً بعد میں آنیہ کو لے کر لمبے ٹور پر نکل جاؤں پھر حالات دیکھ کر آئندہ کا سوچا جاسکتا ہے۔''

آنیہ کا خون کھولنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی جائے اور فرحان سے کہے کہ وہ اپنی منحوس صورت لے کر بار بار یہاں نہ آئے اور اپنے یہ قیمتی مشورے بھی اپنے پاس رکھے مگر وہ اس پر عمل نہ کرسکی۔

اسی رات آنیہ کو گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ کال راجوری سے تھی۔ دلبر ماموں کے مسلمان ملازم خیرو کی آواز اس نے صاف پہچان لی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''آنیہ بی بی! آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں بولو چاچا خیرو۔''

''بی بی جی! راسم صاحب.....''

''ہاں..... کیا ہوا راسم کو؟'' وہ تڑپ گئی۔

''راسم صاحب اس وقت میرے پاس ہیں۔ بہت سخت زخمی ہیں۔ یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ وہ اس وقت یہاں میری بیٹی کے گھر میں موجود ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو چاچا خیرو۔ راسم اور آپ کے پاس.....''

''میں فون پر زیادہ بات نہیں کرسکتا۔ آپ کو اس لیے کال کی ہے کہ آپ کے ابا جان ایک بڑے وکیل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طرح ان کی مدد کرسکیں۔ راسم صاحب بڑی بُری حالت میں ہیں اور کسی بھی وقت دوبارہ پکڑے بھی جا سکتے ہیں..... کیا آپ اس وقت راجوری میں ہی ہیں؟''

آنیہ کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے ہیجانی کیفیت پر قابو پایا اور خیرو سے چند ضروری باتیں پوچھیں۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ سینے میں اس کا دل کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ سوا گیارہ کا عمل تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔ ''چاچا خیرو، میں صبح تک تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔ تم اپنا فون آن رکھو مگر اب کہیں کال نہیں کرو گے اور نہ گھر سے نکلو گے۔''

☆☆☆

آنیہ بس کے ذریعے راتوں رات جالندھر سے راجوری پہنچ گئی۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے بس پاپا کے لیے ایک رقعہ چھوڑا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک ارجنٹ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اس کے

بارے میں فکرمند نہ ہوا جائے۔ جونہی موقع ملا، وہ کال کر کے اپنی واپسی کے بارے میں بتائے گی۔ اس نے پہلی بار نہار کو بھی بے خبر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے مسلسل سوال جواب کا سامنا کرنا پڑے اور جھوٹ بولنا پڑے۔

وہ سرتاپا ایک کریم کلر چادر میں تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ راجوری ٹاؤن پہنچ گئی۔ ایک رکشے کے ذریعے اسے مطلوبہ پتے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خیرو کی بیٹی کے گھر سے کافی پہلے ہی رکشے سے اتر گئی۔ یہ ٹاؤن کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع تھے۔ یہاں چنار اور چیڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔

آنیہ کی دستک پر ڈرے ڈرے سے خیرو چاچا نے دروازہ کھولا اور آنیہ کو جلدی سے اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔ یہ گھر دو چھوٹے کمروں اور ایک ڈھارا نما جگہ پر مشتمل تھا۔ فروٹ کے کچھ خالی اور کچھ بند کریٹ یہاں وہاں پڑے تھے۔ خیرو کی جواں سال بیٹی اور داماد بھی گھر میں موجود تھے۔ داماد کا نام امیر حمزہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ بظاہر وہ ایک پھل فروش اور کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔

''راسم کہاں ہے؟'' آنیہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''بہت تکلیف میں ہیں۔'' خیرو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''رات دوسرے پہر سے جاگ رہے تھے، ابھی اونگھ آئی ہے۔ ویسے آپ دیکھ لیں۔'' اس نے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ نیم تاریک کمرے میں میلے کچیلے بستر پر کوئی کسمسایا۔ آنیہ نے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھی اور اس کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ آنکھیں سوج کر بند ہو چکی تھیں۔ ہونٹ پھٹے ہوئے اور چہرے پر بڑے بڑے نیلے داغ تھے۔ آنیہ نے جیسے کراہ کر دروازہ پھر بند کر دیا۔

رات کو خیرو چاچا نے کہا تھا، یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ راسم صاحب یہاں موجود ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کل شام تک آنیہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ مستقبل قریب میں راسم کی کوئی خبر پا سکے گی۔ وہ ڈھارا نما جگہ پر خیرو چاچا اور اس کے داماد حمزہ کے ساتھ آن بیٹھی۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف نلکے کے پاس خیرو کی بیٹی کچھ خون آلود پٹیاں دھو رہی تھی۔ یقیناً ان کا تعلق بھی راسم سے ہی تھا۔

خیرو چاچا اور امیر حمزہ نے جو کچھ بتایا، وہ واقعی تحیر خیز تھا اور کسی کرشمے کی جھلک دکھاتا تھا۔ ایک چھوٹا فوجی ٹرک، سات آٹھ، ''خطرناک'' قیدیوں کو کسی جگہ سے کسی دوسرے ٹارچر سیل میں منتقل کرنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ حمزہ کے گھر سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل سے گزرتے ہوئے یہ ٹرک ایک چھوٹی بارودی سرنگ سے ٹکرایا اور الٹ گیا۔ کچھ فوجی اور کچھ قیدی زخمی بھی ہوئے۔ افراتفری اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر تین چار قیدی موقع سے دور جانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں راسم بھی تھا۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا، خشک پتوں سے اٹے ایک گڑھے میں گرا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں پڑا رہا۔ یہ جگہ حمزہ کے گھر سے ڈھائی تین سو میٹر دور تھی۔ حمزہ کی نظر زخمی راسم پر پڑی۔ تب وہ نہیں جان سکا کہ وہ کون ہے؟ ہاں اتنا ضرور جان گیا کہ بھارتی سورماؤں کا کوئی معتوب ہے۔ وہ اسے کمر پر لاد کر اپنے گھر لے آیا۔ راسم کو پہچاننے کے بعد اس نے اپنے سسر یعنی خیرو چاچا کو بھی اطلاع دی اور وہ بھی یہاں پہنچ گیا۔

امیر حمزہ نے کہا۔ ''علاقے میں سرچ آپریشن جاری ہے۔ ہماری بستی سے بھی ایک پارٹی ہو کر گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم زیادہ دیر محفوظ رہ سکیں گے۔''

خیرو چاچا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''کل کی رات تو جیسے تیسے کٹ گئی ہے..... مگر مجھے نہیں لگتا کہ آج کی رات بھی کٹ سکے گی۔''

حمزہ بولا۔ ''اس کے علاوہ راسم صاحب کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ انہیں طبی امداد کی ضرورت ہے ورنہ زخم زیادہ خراب ہو جائیں گے۔'' آنیہ کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ حمزہ جیسے اچھل کر رہ گیا۔ خیرو چاچا کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ صحن میں موجود چاچا کی بیٹی لپک کر اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔ حمزہ نے آنیہ کو بھی اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ چند لمحے بعد یہ دیکھ کر آنیہ کی جان میں جان آئی کہ دروازہ کھلنے پر اندر داخل ہونے والے ماموں دلبر سنگھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح جین شرٹ اور پگڑی میں تھے۔ وہ ہنستے مسکراتے اندر آئے اور خیرو چاچا کو دیکھ کر بولے۔ ''اوئے خیرو! او میرے سجن پیارے! تم نے تو کبھی چھٹی کیتی ہی نہیں، کل کی ہو گیا؟''

''کک..... کچھ نہیں مالک۔ بس وہ ذرا.....'' خیرو گڑبڑا گیا۔

''اوئے فون پر بھی تیری آواز کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگدی تھی۔ اسی لیے میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ تے سوچیا کہ

تیری خیر خبر وی لینداجاؤں۔''

تبھی ان کی نظر نلکے کے پاس رہ جانے والی چند خون آلود پٹیوں پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گئے۔ ''خیرو! یہ کیا ہے بھئی؟ کسی کو سٹ شٹ (چوٹ) لگ گئی ہوئی ہے؟ اور تم سارے..... سہمے سہمے سے کیوں لگدے ہو؟''

اگلے تین چار منٹ میں سب کچھ ہی ماموں دلبر پر کھل گیا۔ آنیہ کی موجودگی بھی راز نہیں رہی..... اور سب سے بڑا اور سنگین سرپرائز زخمی راسم۔ وہ ہکا بکا تھے۔ اب خیرو اور حمزہ نے سبھی کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ آنیہ نے بھی یہاں اپنے آنے کے بارے میں وضاحت کی۔ سب کچھ جاننے کے بعد اور راسم کی لرزہ خیز حالت دیکھنے کے بعد دلبر صاحب گہری سوچ میں کھو گئے۔ آخر گہری سانس لے کر بولے۔ ''خیرو! تم نے یہ سب کچھ مجھ سے چھپایا۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مالک! مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں ناراض نہ ہوں۔ ویسے بھی میں اس خطرناک معاملے میں آپ کو شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آنیہ بی بی کو تو اس لیے فون کیا کہ ان کے ابا جی ایک بڑے قانون داں ہیں۔''

''اس کے ابا جی اک وڈے قانون داں ہیں..... اور دلبر سنگھ تو ایک چوڑا چمار ہے، دو ٹکے کا بندہ۔ یہ کسی کے کام کہاں آسکدا ہے؟'' دلبر سنگھ نے طنز کا تیر چھوڑا۔ خیرو چاچا ہکلا کر رہ گیا۔ دلبر سنگھ نے سینہ چوڑا کیا اور دبنگ آواز میں بولے۔ ''یہ خون پینے والے بھارتی درندوں کا نوچا ہوا شکار ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ یہ جگہ کسی طرح بھی اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ اس کو پناہ کی لوڑ ہے..... اور میں اسے پناہ دوں گا۔''

''مم..... مگر سرکار۔'' خیرو پھر ہکلایا۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ یہ میرے ساتھ جائے گا..... اور تم بھی آنیہ پُتر۔ تم لوگ دروازہ اندر سے بند رکھو۔ میں گڈی لے کے آرہا ہوں۔'' وہ عزم سے بولے۔

☆☆☆

پورے چاند کی رات تھی۔ چنار کے پیڑ ہولے ہولے خنک ہوا میں لہرا رہے تھے۔ آنیہ، زخمی راسم کے بستر کے قریب موجود تھی۔ دلبر ماموں نے اپنے لیے سخت ترین خطرات مول لیتے ہوئے بھی راسم کو پناہ دی تھی۔ وہ ان کے ہی گھر میں موجود تھا مگر یہ گنجان آبادی کا وہ گھر نہیں تھا جہاں وہ اور نہار رہتی رہی تھیں۔ یہ دریائے تاوی کی دوسری جانب قدرے کشادہ علاقے میں دو منزلہ گھر تھا۔ اچھا بنا ہوا تھا۔ یہاں زیادہ تر گھر ایک کینال کے تھے یا اس سے بڑے تھے۔ دو مساجد کے بلند مینار نظر آتے تھے۔ ایک کالج کا بوائز ہاسٹل تھا۔ جس کے قریب ایک پلے گراؤنڈ تھا اور ایک بڑا باغ تھا۔ اس علاقے کو مقامی لوگ ''باغ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ آنیہ پچھلے دس روز سے یہاں راسم کے ساتھ موجود تھی۔ وہ شروع میں تو راسم کی طرف نظر بھر کر دیکھتے ہی نہیں تھی۔ ان کا دل خون ہونے لگتا تھا۔ ظالموں نے بے پناہ تشدد کیا تھا اس پر۔ پورا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ہونٹ کٹ گئے تھے۔ جبڑے کو نقصان پہنچا تھا۔ وہ کوشش کر کے بڑی مشکل سے ایک دو الفاظ ہی بول سکتا تھا۔ ایک دن آنیہ نے اس کی ٹانگیں اور پاؤں دیکھے تو خود کو بمشکل رونے سے روک سکی تھی۔ اس کی رانوں پر یقیناً رولر پھیرا گیا تھا۔ وہاں بڑے بڑے نیل تھے اور خون جم کر رہ گیا تھا۔ اب آٹھ دس روز گزر چکے تھے پھر بھی اس کے پاؤں پر ورم موجود تھا۔ اس کے تلوؤں پر اتنی ضربات لگائی گئی تھیں کہ اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ تاحال اندرونی ضربات کی وجہ سے اسے پیشاب کرنے میں سخت دقت محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے صرف سیال خوراک دی جارہی تھی۔ اس مسلمان ڈاکٹر کا انتظام دلبر ماموں نے ہی کسی طرح کیا تھا۔ انہیں ان ڈاکٹر صاحب پر پوری طرح اعتماد تھا۔ وہ روزانہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور آتے تھے..... راسم کے زخموں کو ٹریٹ کرتے تھے اور انجکشن وغیرہ لگاتے تھے۔

اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر دلبر ماموں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اشارے سے آنیہ کو باہر بلایا۔ دلبر ماموں بھی آج کل اسی گھر میں قیام پذیر تھے۔ تاہم خیرو پہلے والے گھر میں تھا۔ ماموں کسی وقت وہاں کا چکر لگا آتے تھے۔ یہاں کھانا وغیرہ آنیہ ہی پکا رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دلبر ماموں نے کہا۔ ''دھی رانی! ابھی تمہاری ماما کا فون پھر آیا ہے۔ وہ بار بار مجھ سے تمہارے بارے پوچھتی ہیں۔ مجھے بار بار جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے۔ آج تو وہ رونے ہی لگ پڑیں۔ کہنے لگیں کہ ویر جی! کسی بھی طرح آنو کو تلاش کرو۔ ہم نے تو اس کی شادی کے دن رکھے ہوئے تھے۔''

''دلبر ماموں! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ بے شک ان کا فون ہی نہ سنیں۔ میں جانتی ہوں وہ ''اوورری ایکٹ'' کر رہی ہیں۔ ورنہ پاپا کو میں فون پر پوری تسلی دے چکی ہوں اور وہ بڑی حد تک میری بات سمجھ بھی چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں راجوری کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں اور پوری طرح خیریت سے

ہوں۔"

"تم نے راسم کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں..... مگر اس وجہ سے کہ یہ راسم کی سیکیورٹی کا معاملہ ہے۔ ورنہ ماموں، وہ بھی میرے اور راسم کے بارے میں تقریباً سب کچھ جان چکے ہیں۔"

دلبر ماموں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "یعنی وہ جان چکے ہیں..... کہ تم راسم میں انٹرسٹ لے رہی ہو؟"

"ہاں ماموں۔" وہ بے باکی سے بولی۔ "پاپا نے ہمیشہ مجھے سچ بولنا سکھایا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سچ کبھی کبھی بہت تلخ ہوتا ہے۔ ان کی تربیت کے مطابق میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ کیسے بول دوں۔ کیسے کہہ دوں کہ خالہ زاد فرحان مجھے بطور شوہر قبول ہے؟ وہ مجھے قبول نہیں ہے دلبر ماموں۔"

دلبر ماموں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے، جیسے اس کی بے باک، سیلانی طبع کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تب طویل سانس لے کر بولے۔ "مجھے لگدا ہے میری یہ دھی رانی ایک بڑے کٹھن رستے پر چل پڑی ہے۔ اس رستے پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ راسم اب ان لوگوں کی ہٹ لسٹ پر اوپر کے ناموں میں آچکا ہے..... رب کرے کوئی چمتکار ہو جائے، ورنہ وہ اسے چھوڑیں گے نہیں۔ میری سمجھ وچ تو تمہاری یہ باتیں بالکل نہیں آرہی ہیں۔"

"زندگی موت تو اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ماموں! اور آپ بھی مانتے ہیں کہ راسم اور اس جیسے دوسرے لوگ برسوں جس "کاز" کے لیے تکلیفیں سہہ رہے ہیں، وہ اب فائنل اسٹیج پر ہے۔ اب اس کشتی نے کسی نہ کسی کنارے لگنا ہے۔"

دلبر سنگھ جی نے کھوئے لہجے میں کہا۔ "رب سوہنے نے چاہا تو لگے گی کنارے..... اور سب کی کنارے لگیں گی۔" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئے۔ "دیکھو کیا الٹ پھیر ہے۔ اس جلیانوالا باغ کی تصویر کا تعلق شہابی حیدر سے ہے۔ ہم اسے کیا سمجھتے تھے اور وہ کیا نکلا ہے۔ راسم ہمارے نزدیک آوارہ گرد اور اجڈ تھا مگر اس نے وہ کام کیا ہے جو "ٹیر بنچے" کی نسل میں سے کسی کو کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے کہ راسم کی گرفتاری کے وقت کیا ہوا تھا؟"

"مجھے تو وہی پتا ہے جو خبروں میں آیا ہے۔"

"خبروں میں یہ نہیں آیا نا کہ اس نے خالی ہتھ تین بھارتی فوجیوں کو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ وہ تو ان کی خوش قسمتی کہ ایک فوجی کے سروس پسٹل سے گولی چل گئی اور آواز سن کر کچھ اور فوجی بھی وہاں پہنچ گئے۔ دست بدست لڑائی وچ اس دن گن ایک کھڈے وچ گر گئی تھی نہیں تو اس نے چھانی کر دینے تھے آٹھ دس بندے....."

اسی دوران میں اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔ "دیکھو اسے۔" دلبر ماموں نے کہا۔

آنیہ لپک کر اندر گئی۔ راسم تکیے سے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنیہ نے فوراً اس کے سر کے نیچے ایک کشن رکھا۔ نیند میں غالباً اس کا دایاں ہاتھ میز سے ٹکرایا تھا۔ اس ہاتھ کی دو انگلیاں ٹوٹ چکی تھیں اور زخم تھے۔ ہاتھ ٹکرانے سے خون رس آیا تھا۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟" آنیہ تڑپ کر بولی۔

راسم نے مچی مچی نظروں سے اُسے دیکھا۔ "اوگاڈ..... اوگاڈ..... آپ ابھی تک گئی نہیں؟" وہ کربناک انداز میں اٹک اٹک کر بولا۔ "آپ کیوں..... خود کو اور..... اپنے گھر والوں کو عذاب میں ڈال رہی ہیں؟"

وہ اس کی زخمی انگلیوں پر پٹی لپیٹتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ سے کہا ہے نا، مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں نے پاپا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ اس بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں۔"

اس نے سخت بے قراری میں سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔ آنیہ اس کے بالوں بھرے فراخ سینے پر ہاتھ چلانے لگی۔ اسے تھپکنے لگی۔ کھانسی کی شدت کم ہو گئی مگر کھانسی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ آنیہ نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور عقب میں بیٹھ کر اسے اپنے جسم کی ٹیک فراہم کی۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہو گیا۔ "آنیہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ تم اور دلبر سنگھ خود کو کیوں مار رہے ہو میرے ساتھ..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر زیادہ ہمدردی امڈ رہی ہے تو کسی طرح راجا کو اطلاع کر دو۔"

"میں نے آپ کو صبح بھی بتایا تھا راسم۔ راجا سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بھی پکڑا گیا ہے یا پھر روپوش ہو گیا ہے۔ مجھے تو سدرہ کی فکر ہے۔ آپ نے ابھی تک اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"اسے میں نے گرفتاری سے پہلے وہاں سے نکال دیا تھا۔" وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "وہ محفوظ جگہ پر ہے۔" کھانسی کی وجہ سے راسم کے مضروب سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہنے لگا۔ آنیہ اس کے عقب میں بیٹھی تھی۔ بازو آگے کر کے ایک بار پھر اس کا سینہ سہلانے لگی۔ گاہے

گا ہے وہ اس کے سر کے اُلجھے بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی۔
وہ دھیمی آواز میں رک رک کر بولنے لگا۔ ''آنیہ میرے دل میں آپ کا مقام بڑا اونچا ہے۔ خود کو اسی مقام پر رہنے دیں۔ میں نے آپ کو بہت چاہا ہے مگر آپ کی قربت کی خواہش کبھی نہیں کی۔ میں..... کبھی بھی آپ کی ان عنایتوں کے قابل نہیں تھا اور اب تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ مم..... میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت آئی تو میں..... مر کر بھی چین نہ پاسکوں گا۔ پلیز آپ چلی جاؤ یہاں سے۔''
''راسم! آپ خود کہتے ہیں، زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرے مقدر میں کوئی تکلیف لکھی ہے یا موت آنی ہے تو وہ سات دروازوں کے پیچھے بھی آسکتی ہے۔''
وہ جیسے کراہ کر رہ گیا۔ اس میں بولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے بالوں میں اپنی حنائی انگلیاں چلاتی رہی۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا..... پھر سو گیا۔ وہ اسی طرح اسے بازوؤں میں لیے بے حرکت بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی اس کے سر کے بالوں پر پیار سے بوسہ دیتی رہی۔ وہ انوکھی لڑکی تھی۔ اس نے ایک انوکھے وقت میں، انوکھی محبت کی تھی۔
دور کہیں وادی میں فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ آرمی کے بُوگیر کُتے شور مچا رہے تھے..... چنار زخمی ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ابھی راسم کو دیکھ کر گیا تھا۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی مگر سینے پر لگی ہوئی چوٹیں تکلیف دیتی تھیں اور ٹخنے اس بُری طرح زخمی تھے کہ اس کے لیے پاؤں پر کھڑے ہونا مشکل تھا۔ شروع میں تو اس سے ایک لفظ بولنا بھی مشکل تھا مگر اب وہ اٹک اٹک کر بول لیتا تھا۔ آنیہ کے بے حد اصرار پر وہ اسے اپنی قید و بند کے حالات بتا رہا تھا۔
''پکڑا تو فوجیوں نے ہی تھا مگر پھر وہ کسی نجی ٹاچر سیل میں لے گئے تھے۔ وہاں وہ بدبخت اروڑا بھی دو تین بار آیا۔ ایک بار وہ ٹھیکیدار نرائن بھی اس کے ساتھ تھا۔ اروڑا کو تو مجھ سے کئی تکلیفیں ہیں مگر ٹھیکیدار نرائن کو سب سے بڑی پریشانی اور تکلیف یہی ہے کہ میں نے شادی شدہ جوڑے (ظہیر اور نادیہ) کو کہاں چھپایا ہے۔''
''اروڑا کو کیا کیا تکلیفیں ہیں؟'' آنیہ نے اس کی پیشانی کو گیلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
''ظاہر ہے کہ سب سے بڑی تکلیف تو یہی قاتلانہ حملے کی کوشش ہے پھر اسے بھی ظہیر اور نادیہ والا دکھ ابھی بھولا نہیں۔ اسے اس بات کی بھی ہمیشہ رنجش رہی ہے کہ میں نے اس کی سابقہ بیوی..... یا کہہ لیں کہ..... سابقہ مظلومہ، سدرہ کو اپنے پاس پناہ دے رکھی ہے۔ اروڑا مجھ سے نادیہ اور ظہیر کے علاوہ سدرہ کا اتا پتا جاننے کی کوشش بھی کرتا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے الیکٹرک شاک دیتا رہا ہے اور بولنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بے لباس کر کے برف کے بلاک پر لٹا دیا۔ میں اس دن، تین روز کے فاقے سے تھا۔ اس نے زبردستی میرے منہ میں شراب انڈیلی اور سؤر کا گوشت کھلانے کی کوشش کرتا رہا.....''
آنیہ اب گیلے کپڑے سے راسم کے پاؤں صاف کر رہی تھی۔ ان کا ورم ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ پاؤں دیکھ کر آنیہ کا دل رونے لگتا تھا۔ ایسی سفاکی، ایسی سنگدلی؟ پاؤں پر کئی جگہ چھوٹے چھوٹے سیاہی مائل نشان تھے۔ یہ الیکٹرک شاک کی نشانیاں تھیں۔ وہ اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے پاؤں سہلانے لگی۔ اس نے پاؤں سمیٹ لیے۔
''ایسا نہ کیا کریں آنیہ۔'' وہ کراہا۔
اسی دوران میں تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر دروازے پر چھوٹی سی دستک کے بعد دلبر سنگھ اندر داخل ہوئے۔ آج ملازم خیرو بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ آتے ہی بولے۔ ''آنیہ، خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اب راسم پُتر کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ دو چار دن کے لیے تم نیچے چلے جاؤ۔''
''نیچے کہاں ماموں؟'' آنیہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔
''بتاتا ہوں۔ تم ضروری چیزیں سمیٹو۔'' وہ بولے۔ پھر خیرو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی آنیہ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ خیرو اور دلبر سنگھ جی نے راسم کو دونوں طرف سے سہارا دے کر بمشکل اٹھایا اور پھر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے ایک عقبی کمرے میں لے آئے۔ ایک چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آنیہ نے پہلی بار دیکھا کہ یہاں سے ایک تنگ سا زینہ نیچے جا رہا تھا۔
چند منٹ بعد آنیہ اور راسم ایک چھوٹے سے تہ خانے میں تھے۔ ''لگتا تھا کہ دلبر ماموں نے ہنگامی بنیادوں پر یہاں راسم اور آنیہ کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ راسم بستر پر لیٹ گیا اور اس کی سانسیں کچھ بحال ہو گئیں تو خیرو کو اس کے پاس چھوڑ کر دلبر ماموں، آنیہ کو باہر لے آئے بولے۔ ''دھی رانی! راجوری میں ہر تھاں (جگہ) راسم کی تلاش ہو رہی ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگا دیے گئے ہیں۔ ان پر راسم کی تصویر بھی ہے۔ اسے ایک بڑے دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے محلے میں بھی ایک جیپ آکر رکی ہے۔ دس بارہ فوجی ہیں اس کے اندر۔ سنا ہے کہ گھروں کی تلاشی وغیرہ لیں گے۔''
آنیہ جیسے اندر تک لرز گئی۔ ''اب کیا ہو گا دلبر

ماموں؟''

دلبر ماموں سینہ تان کر بولے۔ ''اوئے، میرے ہوندے ہوئے میری دھی رانی کو چنتا کرنے کی کیا لوڑ ہے۔ ایسی کم تیسی ان گیدڑوں کی۔ کوئی تم دونوں کی ہوا کو بھی تو چھو کر دکھائے۔ بس تم دونوں نے تسلی سے یہاں بیٹھے رہنا ہے۔ کوئی کُتّے دا پتر آیا تو سنبھال لوں گا اس کو میں۔''

اس روز تو خیریت ہی گزری۔ وہ رات ان دونوں نے اس چھوٹے سے کمرے میں گزاری۔ یہاں لوہے کی ایک بڑی الماری کے علاوہ ایک چھوٹا بیڈ اور ایک صوفہ تھا۔ ایک اٹیچ باتھ بھی تھا جس میں سیوتج مشین لگی ہوئی تھی۔ اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ جب آنیہ، راسم کو ناشتا کرا رہی تھی، یکا یک اوپر تہ خانے کی چھت پر بھاری بوٹوں کی دھمادھم سنائی دی۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئی۔ آنیہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یا اللہ خیر۔''

راسم بھی تناؤ میں دکھائی دینے لگا۔ آنیہ سیڑھیاں چڑھ کر بیسمنٹ کے دروازے کے قریب پہنچی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دھم آوازیں اس کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔

''سرچ وارنٹ کے بغیر یہ سب ٹھیک نہیں ہوندا لفٹین صاحب! آپاں نے بھی فوج کی نوکری بھگتی ہوئی ہے۔ قانون شانون کی تھوڑی بہت جانکاری آپاں کو (ہم کو) بھی ہے۔'' یہ دلبر ماموں کی آواز تھی۔

''اچھا تو جناب بھی فوج میں تھے؟'' لیفٹیننٹ کی آواز آئی۔

''آپ تو ایسے حیرانی سے کہہ رہے ہیں جیسے کسی سکھ کو فوج میں دیکھا ہی نہیں۔ اپنی فوج میں ہم سکھوں کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟''

''کیا مطلب؟'' آرمی آفیسر کی آواز تلخ تھی۔

''مطلب کا پتا تم کو اس وقت چل جائے گا جب خالصے فوج کو چھوڑ گئے، جب انڈین فوج کو ''ہم خالصوں'' کے بغیر پاکستان اور چین سے پنجہ لڑانا پڑا۔'' چند سیکنڈ بعد دلبر سنگھ جی بلند آواز میں ہنسے۔ ''لفٹین صاحب! آپ کا تو رنگ پھیکا پے گیا ہے۔ میں تو ویسے ہی اِک گل کر رہا تھا۔ رب کرے ہماری گورنمنٹ کو عقل آجائے..... اور اقلیتوں پر اپنا ہتھ ذرا ہولا کرلے، آپ سمجھو کہ اک طوفان ہے جو اندر ہی اندر پل رہا ہے۔''

لیفٹیننٹ کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد وزنی بوٹوں کی دھمادھم بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔

آنیہ طویل سانس لے کر واپس راسم کی طرف آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ قریباً بیس سال پہلے دلبر سنگھ جی نے بطور کیپٹن فوج کی نوکری کیوں چھوڑ دی تھی، ان کی سوچ وہی تھی جس کی ایک جھلک اس گفتگو میں دکھائی دی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی کہ انڈیا کی فوج نے ہمیشہ سکھوں کے بل بوتے لڑائیاں لڑی تھیں۔ وہی سکھ جنہیں گولڈن ٹیمپل میں سیکڑوں کی تعداد میں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور پھر اندرا کے قتل کے بعد سڑکوں پر زندہ جلایا گیا تھا۔ بہت سے زخم بظاہر بھر جاتے ہیں مگر اندر سے کچے رہتے ہیں، رستے رہتے ہیں، تین ہفتے پہلے جب آنیہ جالندھر سے چلی تھی، اس نے اپنی پرانی سم نکال کر پھینک دی تھی اور فون آف کر دیا تھا لیکن اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بذریعہ فون، کم از کم نہار سے رابطہ کرے اور اس سے گھر کے حالات جاننے کی کوشش کرے۔ کل اس نے دلبر ماموں سے کہہ کر نئی سم کا انتظام کرایا تھا۔ سہ پہر کو فون آن کر کے اس نے سب سے پہلے نہار کور کا نمبر ہی ملایا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ تیسری چوتھی کوشش پر نہار نے کال ریسیو کر لی اور آنیہ کی آواز پہچان کر ششدر رہ گئی۔ چند سیکنڈ میں اس نے کوئی نصف درجن سوال آنیہ سے کر ڈالے۔ ان سوالوں کے جواب میں آنیہ نے اسے بس یہی بتایا کہ وہ راجوری میں ایک جگہ موجود ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔

''راجوری میں کس جگہ؟'' نہار نے بے تابی سے پوچھا مگر پھر خود ہی اپنے سوال کو کینسل کر دیا۔ ڈھیلے لہجے میں بولی۔ ''نہیں رہنے دو۔ یہ جانکاری مجھے نہ ہی دو تو اچھا ہے۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں نہار، یہ میرے لیے بہتر ہے اور تمہارے لیے بھی۔''

چند لمحے تک دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر نہار نے ٹھہرے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''آنیہ! تمہارے لیے ایک اہم سماچار ہے..... فرحان کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔''

''کیا؟'' آنیہ تقریباً چلا پڑی۔ اسے سخت شاک لگا تھا۔ وہ سکتہ زدہ سی ہوگئی۔

اس خبر پر یقین کرنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ نہار نے جو کچھ بتایا اس سے انکشاف ہوا کہ یہ واقعہ پانچ دن پہلے ہوا ہے۔ معمولی بات پر فرحان کا کسی سے جھگڑا ہوا۔ بات بڑھ گئی اور مخالف فریق نے اس پر فائر کر دیا جو سیدھا سینے میں لگا۔

''کون تھا وہ؟'' آنیہ نے دکھ سے پوچھا۔
''بس کوئی راہ گیر تھا۔'' نہار نے جواب دیا۔ پھر کچھ توقف کرنے کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ''کہتے ہیں ناں کہ اوپر والے کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے آنیہ جانی، کہ فرحان پر بھی یہ لاٹھی ہی پڑی ہے۔ وہ اپنی حد سے آگے جارہا تھا۔''
''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو نہار؟''
''تم تو وہاں بیٹھی ہو۔ تمہیں کیا جانکاری کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے..... فرحان خطرناک ہتھکنڈوں پر اترا ہوا تھا۔ چھ سات روز پہلے وہ مجھ سے بھی ملا۔ اس کو شک تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ تمہارا پتا ٹھکانا معلوم ہے۔ اس نے مجھے صاف سیدھے لفظوں میں دھمکی دی کہ ریٹائرڈ کرنل اروڑا سے اس کے سمبندھ ہیں۔ اگر میں نے اسے تمہارا اتا پتا نہیں بتایا تو وہ بالآخر اروڑا کو بتانے پر مجبور ہو جائے گا کہ آنیہ کا اس بھگوڑے راسم سے ملنا جلنا تھا اور یہ وہی ہے جس نے آنیہ کو عین شادی سے پہلے جالندھر سے بھگایا ہے۔'' کچھ مزید تفصیل بھی نہار نے بتائی۔
آنیہ سناٹے میں رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کا خالہ زاد اس حد تک گر سکتا ہے۔ نہار نے مزید کہا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اس نے ایک دن پہلے یہی دھمکی تمہارے پاپا کو بھی دی تھی..... اور ساتھ میں انہیں ایک ہفتے کی مہلت کا بھی کہا تھا۔ شاید اسی کو رب کی کرنی کہتے ہیں۔ مہلت سے پہلے اس کی اپنی مہلت ختم ہوگئی۔ دس پندرہ روز پہلے اس نے نئی گاڑی نکلوائی تھی۔ اس پر جارہا تھا۔ تھوڑی بہت پی پلا بھی رکھی تھی۔ راستے میں ایک موٹر بائیک والا گاڑی کی سائڈ سے ٹکرایا اور دروازے پر اسکریچ ڈال دیا۔ بس اسی اسکریچ سے بات بڑھی اور فرحان کے پران لے گئی۔ فرحان نے مشتعل ہو کر بائیک والے کو تھپڑ مارا۔ اس نے پستول نکال کر سیدھا فائر کر دیا۔''
آنیہ ششدر تھی۔ نمود و نمائش کو بے پناہ اہمیت دینے والا، آخر نمود و نمائش کی بھینٹ ہی چڑھ گیا تھا۔ دھمکی والی جو بات نہار نے بتائی تھی، وہ بھی کبھی آنیہ کے دماغ میں بھی آئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی، کہیں کوئی ایسی اسٹیج نہ آجائے کہ فرحان اپنی اصلیت بتانے پر تل جائے۔ اس کے زیادہ تر یار انے ہندو امیر زادوں سے ہی تھے۔ اپنے طور طریقوں میں بھی وہ بس نام ہی کا مسلمان تھا۔ نہار نے آنیہ کو بتایا کہ آنیہ کے گھر والوں کو بھی فرحان کی اس اچانک موت کا صدمہ تو ہوا ہے لیکن فرحان کی اصلیت چونکہ ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اس واقعے میں شاید کہیں راحت کا ایک پہلو بھی ہے۔
اگلے روز دل بہت کڑا کر کے آنیہ نے پاپا سے کال ملائی۔ پاپا بھی اس رابطے پر ششدر ہوئے۔ آنیہ نے انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی ایک بار پھر یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ ان کی تربیت میں پروان چڑھنے والی بیٹی ہے۔ کسی بھی جگہ ہو، اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرے گی۔ وہ واضح طور پر آنیہ سے بہت خفا تھے۔ اس کے دس فقروں کے جواب میں ایک آدھ لفظ ہی بول رہے تھے۔ آنیہ نے فرحان کی ناگہانی موت پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔ اس موقع پر پاپا سے ایک دو فقروں کا تبادلہ ہوا۔ ان کی بات سے پتا چلا کہ کم از کم وہ اس بات کے قائل تو ہو چکے ہیں کہ آنیہ کو فرحان کی دلہن بنانے والی سوچ بالکل غلط تھی۔ وہ اس قابل ہرگز نہیں تھا۔ آٹھ دس منٹ کی گفتگو میں پاپا نے آنیہ سے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہے، نہ ہی آنیہ نے بتایا۔ شاید دونوں ہی یہ بات سمجھ رہے تھے کہ اس حوالے سے فی الحال خاموش رہنا بہتر ہے۔
سات آٹھ روز ہو چکے تھے۔ آنیہ اور راسم مسلسل اسی چھوٹے سے بیسمنٹ میں تھے۔ آنیہ بس کسی وقت کی ضروری کام سے ہی باہر نکلتی تھی۔ راسم کسی وقت گم صم سا ہو جاتا تھا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ وہ فاروق کو اس کی سالگرہ پر اپنا من چاہا تحفہ نہ دے سکا۔ اپنی وہ رائفل کھو جانے کا بھی اسے بہت دکھ تھا جو اس نے بہت جتن کر کے حاصل کی تھی۔ دیگر حالات جوں کے توں تھے۔ خیر و اب مستقل طور پر اس گھر میں شفٹ ہو چکا تھا۔ کھانا پکانا وہی کر رہا تھا۔ دلبر ماموں کا زیادہ وقت بھی اسی پُرسکون کوٹھی میں گزر رہا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والے اور خوش خوراکی سے ناتا نہ توڑنے والے شخص تھے۔ اس کوٹھی کے آس پاس بھی زبردست تناؤ موجود تھا۔ گردونواح میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیتے رہتے تھے۔ کسی وقت کہیں سے اِکا دُکا فائر کی آواز بھی آجاتی تھی۔ اس کے باوجود دلبر ماموں اپنے حال میں مگن رہتے تھے۔ وہ تہ خانے سے باہر آئی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ دلبر ماموں ایک بڑی تھالی میں موتی چور کے لڈو رکھے اہتمام سے کھا رہے تھے۔ ''یہ کیا ہے ماموں؟'' آنیہ نے ذرا ناراضگی سے کہا۔
وہ جواب میں بولے۔ ''حیرت کی گل ہے بھئی! جالندھر کی لڑکی موتی چور دیکھ کر کہہ رہی ہے کہ یہ کیا؟

ماموں۔ بھئی جالندھر کا موتی چور لڈو تو ولایت تک مشہور ہے۔''

''مگر آپ کی ڈائٹنگ؟''

''ڈائٹنگ والے فلسفے پر میں نے کافی غور کیا ہے دھی رانی۔ دراصل بندہ صرف خوراک کھانے سے ہی تو موٹا نہیں ہوندا ہے اور بھی کئی اک چیزیں ہیں۔ اب دیکھو خوشی بھی تو بندے کو موٹا کرتی ہے نا۔ اب ذرا سوچو یہ امان اللہ اور سہیل احمد کے اسٹیج ڈرامے بھی تو نرا ''ہاسا'' اور نری خوشی ہی ہیں ناں۔ میں کھانا چھڈ بھی دوں لیکن یہ ڈرامے تو نہیں چھڈ سکدا۔ اس کا مطلب ہے موٹا تو میں نے ہونا ہی ہونا ہے.....''

دلبر ماموں کی بات کو ایک دم بریک لگ گئے۔ کسی فوجی گاڑی کا تیز ہوٹر سنائی دیا تھا۔ دونوں ساکت بیٹھے یہ آواز سنتے رہے پھر گاڑی آگے نکل گئی۔ دلبر ماموں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''بھائیا خورشید عالم سے بات ہوئی؟''

''ہاں ماموں، دو تین دفعہ رابطہ ہوا ہے۔ کچھ نرم تو ہو گئے ہیں.....مگر.....''

''اوئے، ہو جائے گا..... ضرور ہو جائے گا نرم۔ تیرے پریم میں شکتی ہے اور مجھے وشواس ہے، یہ شکتی ایک دن ضرور کام دکھائے گی۔ ویسے بھی پاپا تیرا دل کا بہت چنگا بندہ ہے۔ ایسے لوگ یہ بات چنگی طرح سمجھدے ہیں کہ جیون صرف اِک دارملدا ہے۔ اس کو دل کی بات مان کر گزارنا چاہیے۔ سنسار جو کہے وہ کہندا رہے۔''

آنیہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر انہوں نے ذرا توقف کر کے آنیہ سے پوچھا۔ ''اور انہوں نے تیرے بارے میں دوسروں کو کیا بتایا ہوا ہے کہ آنیہ کہاں ہے؟''

''یہی کہ فائن آرٹ کا ایک کورس کرنے کے لیے دہلی گئی ہوئی ہے۔''

کچھ دیر بعد جب آنیہ بے آواز چلتی ہوئی تہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچی تو راسم جاگ رہا تھا اور اس نے تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ آہٹ سن کر وہ چونک گیا اور آنیہ کو لگا جیسے اس نے جلدی سے کوئی چیز تکیے کے نیچے چھپائی ہے۔ وہ راسم کے پاس آن بیٹھی اور اس کے زخمی ہاتھ کے ناخن .... بڑی احتیاط سے تراشنے لگی۔ اسی دوران میں اس نے صفائی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا راسم کے تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ یہ قریباً چار انچ ضرب دس انچ کا ایک رنگین اسٹیکر تھا۔ شاید خیرو کہیں باہر سے لے کر آیا تھا۔ اس پر ٹوٹی ہوئی زنجیر کی تصویر تھی۔ نیچے ایک نعرہ درج تھا۔ ہم نہیں مانتے..... ظلم کے ضابطے۔ اس نعرے کے ساتھ راسم نے اپنے انگوٹھے کے تازہ نشان سے مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ یہاں روشنائی تو نہیں تھی، بس اس کا خون تھا جو مختلف زخموں سے رس کر پٹیاں بھگوتا رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی زخم سے انگوٹھا تر کر کے اس نے یہ نشان لگا دیا تھا۔

''کیا جدوجہد کا کوئی اور راستہ نہیں؟'' آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''میرے لیے اب یہی راستہ رہ گیا ہے آنیہ۔ مجھے مارنا ہے یا مر جانا ہے۔ میرا فاروق ہر روز مجھ سے پوچھتا ہے، کیا ایک نعرہ نہ لگانے کی سزا اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔ کیا میری جان اتنی ہی سستی تھی؟ میرا قاتل اتنا طاقتور کیوں ہے؟ وہ کیوں اب تک اس زمین کے سینے پر دندناتا پھر رہا ہے؟ مجھے اپنے فاروق کو جواب دینا ہے، آنیہ! مجھے آخری سانس تک کوشش کرنی ہے۔''

''مگر..... وہ فی الحال آپ کی پہنچ سے دور ہے، دیوار سے ٹکرا کر خود کو شدید نقصان پہنچا لینا کہاں کی دانشمندی ہے راسم؟''

''کچھ قلعوں کو سر کرنے کے لیے بار بار جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ سومنات پر بھی تو کسی نے اَن گنت حملے کیے تھے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ آنیہ نے بھی بحث مناسب نہیں سمجھی۔ اسے خدشہ تھا کہ اسے پھر کھانسی شروع ہو جائے گی۔ وہ اس کے ورم زدہ پاؤں کے ناخن کاٹتی رہی۔ اپنے کومل ہاتھوں سے اس کے پاؤں کو سہلاتی رہی۔ وہ چہرے پر عجیب کیفیت لیے چپ چاپ لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں مضبوطی سے بند کر رکھی تھیں۔ وہ جب بھی اسے یوں خاموش دیکھتی تھی، اس کے ذہن میں اس کے پہلے موبائل فون پر دیکھا ہوا وہ شعر یاد آ جاتا تھا جو اس نے اس کی تصویر کے نیچے لکھ رکھا تھا۔

خطا تو جب ہو کہ ہم حالِ دل کسی سے کہیں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

اچانک تہ خانے میں اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ راسم نے بے تاب ہو کر کہا۔ ''آنیہ، آپ کہاں ہیں؟''

وہ اس کے پاؤں کی طرف سے اٹھ کر سرہانے کی طرف آ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ نہ جانے اسے کیوں لگا کہ وہ جس بات کو کئی دنوں سے کہنا چاہ رہی ہے اور جو اس کے

ہونٹوں تک آتے آتے رک جاتی ہے، اب کہی جاسکتی ہے۔
اس نے راسم کے ہاتھ کو اپنے کومل ہاتھ میں رکھا اور عجب کیفیت میں اسے اپنے رخسار تک لے گئی۔ اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنے گداز رخسار پر دباتے ہوئے وہ مستحکم آواز میں بولی۔ ''راسم! میں چاہتی ہوں کہ آپ کا ہاتھ ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

یوں لگا جیسے راسم کے ہاتھ پر بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کھینچا اور طیش سے بولا۔ ''آپ اپنے ہوش میں تو ہیں؟ کیا دیوانوں جیسی بات کر رہی ہیں۔ م..... مجھے آپ سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔''

''نہیں راسم، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ حالات جو بھی ہیں۔ جیسے بھی ہیں، میں آپ کی زندگی میں آنا چاہتی ہوں۔''

راسم غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر اسے شدید کھانسی ہونے لگی۔ آنیہ نے ہاتھ چلا کر ٹارچ ڈھونڈی اور اس کی روشنی میں راسم کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا مگر اس کے زخمی چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ آنیہ کف سیرپ لانے کا بہانہ کر کے ہیسمٹ سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

چھ سات روز تہ خانے میں گزارنے کے بعد دلبر ماموں ایک بار پھر راسم اور آنیہ کو اوپر بڑے کمروں میں لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ بہرحال اتنی احتیاط انہوں نے ضرور کی تھی کہ اس مرتبہ انہیں کوٹھی کے دو عقبی کمرے دیے گئے تھے۔ راسم کی حالت کی وجہ سے آنیہ اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سوتی تھی۔ وہ ایک ''صوفہ کم بیڈ'' استعمال کر رہی تھی۔ راسم کچھ کچھ ناراض تھا۔

ایک رات وہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے پاپا سے ''وائس ایپ'' پر رابطہ کیا۔ یہ وڈیو کال تھی۔ آنیہ نے سلسلۂ کلام وہیں سے شروع کیا جہاں سے پچھلی رات چھوڑا تھا۔ آج اس نے پاپا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی جھولی میں آنسو بارش کے قطروں کی طرح گر رہے تھے۔ ''پاپا! آپ نے مجھے سچ بولنا سکھایا..... اور سچ یہی ہے کہ میں راسم سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کی بیٹی کبھی کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہ فیصلہ بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے میں نے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پاپا! اگر راسم میری زندگی میں نہ آسکے تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ میں آپ ہی کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں، کوئی نہیں آئے گا۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

خورشید عالم خاموش تھے۔ اُن کے چہرے پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے، ان کی بیٹی ہمیشہ سے انوکھی راہوں پر چلتی رہی ہے مگر وہ جتنی انوکھی اور جدا تھی، اتنی ہی گہری بھی تھی۔ اس کے فیصلے آسانی سے بدلتے نہیں تھے۔

وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔ ''پاپا! اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ میں انہیں ان کے ارادوں سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں اور..... آپ کے تو تعلقات ہیں، SOURCES ہیں، آپ ہمیں باہر بھجوا دیجیے گا۔ ہم ان سارے بکھیڑوں سے نکل کر کہیں دور بھی تو جاسکتے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ گرجے۔ ''آنیہ! بچہ نہیں ہوں میں۔ لولی پاپ دکھا دکھا کر مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہارے لیے اپنے دل میں موجود تمام تر محبت اور رعایت کو بروئے کار لا کر سوچوں تو بھی تمہاری اس سنگین حماقت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

''پاپا! وہ کوئی مجرم نہیں ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو ظلم کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہزاروں، لاکھوں کشمیریوں کی آواز بنے ہوئے ہیں.....''

''شٹ اَپ..... شٹ اَپ۔'' وہ پھر دہاڑے۔ ''مجھے پولیٹیکل سائنس مت پڑھاؤ۔''

اس نے روتے روتے کسی ننھی بچی کی طرح پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''سوری پاپا..... سوری..... مگر میں کیا کروں؟''

''ڈوب مرو۔ دفع ہو جاؤ جہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم سمجھیں گے کہ مر گئی ہو..... مر گئی ہو۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا مگر وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھی رہی۔ روتی رہی..... اور روتی رہی۔ رات کا باقی حصہ اس نے جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ وہ ماہی بے آب تھی جس نے کبھی کچھ نہ کہا ہو اس کا تو مارا ہوا پھول بھی پتھر لگتا ہے۔ یہ شاید اس کی زندگی کی کربناک ترین رات تھی۔ اگلی صبح وہ اپنے فون پر ایک ٹیکسٹ میسج دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ میسج ابھی صبح سویرے اس کے پاپا کی طرف سے آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا ''کال می۔'' آنیہ نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ انہیں وائس ایپ پر کال کی۔ پاپا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر ان کے چہرے پر آنیہ کی محبت ایک پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع منظر تھا۔ وہ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اب یہ رونا دھونا بند کرو..... ٹھیک ہے..... تم جیسا

کہہ رہی ہو، ویسا ہی ہوگا۔''

اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا تھا، رونا دھونا بند کرو، وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنی پیشانی موبائل کی اسکرین پر رکھ دی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پاپا کی گود میں سر رکھ رہی ہے۔

☆☆☆

واقعات میں یکا یک تیزی آگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہر کام جلدی جلدی اور ڈرامائی انداز میں ہو رہا ہے۔ شکر کا مقام تھا۔ شہابی کی طرف سے مزید کسی خدشے نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی عداوت، فرحان کی عداوت سے کم ہی رہی ہے۔ وہ ایک ڈنک مارنے کے بعد اس سارے معاملے سے الگ تھلگ ہو گیا تھا جس روز راسم نے ازخود منہ ہاتھ دھویا اور پاؤں پر آہستہ آہستہ وزن ڈالتا ہوا کھڑکی کی طرف گیا، آنیہ بھی کندھے سے کندھا ملا کر اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ شام سفیدے اور چیڑ کے درختوں پر اتر رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں چوٹیاں تھیں اور چنار کے پیڑ تھے..... اور ان سے آگے..... کافی آگے، سرینگر تھا..... وہ نظر نہیں آرہا تھا مگر وہاں جو شعلے بھڑک رہے تھے، ان کی حدت محسوس کی جاسکتی تھی۔ سامنے سے گزرنے والی اندرونی سڑک پر کسی فوجی گاڑی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایسی گاڑیاں ہر گلی کوچے میں نظر آتی تھیں۔ ''آٹھ نو لاکھ'' کی نفری کچھ کم تو نہیں ہوتی۔

آنیہ نے کہا۔ ''پھر آپ نے کیا سوچا؟''

''کس بارے میں؟''

''آپ جانتے ہیں، کس بارے میں۔''

راسم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اپنے طیش کو دباتے ہوئے بولا۔ ''آنیہ! آپ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ کیا آپ ایک لاش سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

''ایک زندہ انسان سے کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ شاید، مجھے لاش میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اگر آپ کا یہ جواب حتمی ہے تو پھر..... مجھے بھی زندہ رہنے کی زیادہ خواہش نہیں ہے۔ میں جلدی مرنا چاہوں گی۔'' اس نے آخری الفاظ انگلش میں کہے تھے۔

''اپنی جان لینے کی دھمکی دے رہی ہیں؟''

''مسلمان ہوں۔ حرام موت کیوں مروں گی۔ مجھے کوئی ہتھیار دے دیں۔ ان انسان نما درندوں میں سے دو چار کو مار کر خود بھی مٹی اوڑھ لوں گی بلکہ اگر آپ کا جواب حتمی ہے تو یہ کام میں ابھی کر سکتی ہوں۔''

''آپ فضول بکواس کر رہی ہیں۔ میں ایسے فلمی مکالموں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔'' اس نے بیزاری سے کہا اور صوفے پر آن بیٹھا۔

وہ کچھ دیر تک عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر الماری کی طرف گئی۔ وہ جانتی تھی..... ماموں دلبر نے حفاظت کے خیال سے راسم کو ایک کولٹ پسٹل دے رکھا ہے۔ اس نے تہ در تہ رکھے کمبلوں اور چادروں کے نیچے سے وہ بھرا ہوا پسٹل نکال لیا۔ راسم کا پارا ابھی ایک دم چڑھ گیا۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے ابھی جاؤ۔ اسی وقت جاؤ۔ مار دو، دو چار کو اور خود بھی سکون پالو تم۔'' وہ پہلی بار اسے آپ کے بجائے ''تم'' کہہ رہا تھا۔

وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ دھڑام سے بند کر لیا۔ وہ آنیہ سے اس لہجے میں بولنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ جو کچھ کہتی تھی اسے سن کر اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ یکا یک اس کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر کوٹھی کے گراسی لان کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ آنیہ نے ایک چادر لپیٹ رکھی تھی اور سیدھی مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ دلبر سنگھ غالباً سو رہے تھے۔ خیرو کچن میں مصروف تھا۔ وہ کسی بھی لمحے گیٹ کے پار پہنچ سکتی تھی اور سڑک پر یقیناً کم از کم ایک فوجی گاڑی تو ضرور موجود تھی، کیا وہ ہوش کھو بیٹھی تھی؟ وہ اپنے پاؤں کی شدید تکلیف کو فراموش کر گیا۔ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی گیٹ سے آٹھ دس قدم دور تھی جب وہ پکارا۔

''آنیہ..... رک جاؤ۔''

وہ پلٹی اور راسم کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کانپتے جسم کے ساتھ اس کے قریب پہنچا۔ آنیہ کے گال پر اس کا طمانچہ بڑا زوردار تھا۔ آواز دور تک گئی پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ وہ لڑکھڑا کر ''ڈرائیوے'' پر گر گئی۔ پستول اس کی چادر سے نکل کر گھاس پر لڑھک گیا۔ خیرو اندر سے بھاگتا ہوا آیا۔ راسم نے پستول اٹھا کر شرٹ کے نیچے لگایا۔ اسی دوران میں دلبر صاحب بھی اپنے بھاری جسم کو جھلاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ وہ ہکا بکا تھے۔ راسم نے دلبر سنگھ جی کو دیکھا تو آنیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سنبھالیے اِسے، اس کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔'' پھر وہ لنگڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

رات کو جب وہ کھڑکی کے قریب خاموش کھڑا تھا، وہ کھانے کی ٹرے لیے ہوئے اندر آئی۔ اس کا ایک گال سوجا ہوا تھا۔ نچلے ہونٹ پر زخم تھا۔ اس نے جھک کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ اسی روزمرہ کے لہجے میں بولی۔ ''دوا کا وقت ہو

جائے گا۔ کھانا کھا لیجیے۔''

وہ گم صم اس کی طرف دیکھتا رہا، جیسے سوچ رہا ہو، کیا چیز ہے یہ لڑکی؟ پھر گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اِدھر آؤ میرے پاس۔''

وہ اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ وہ عجیب کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔ ''اور مارنے کو دل چاہ رہا ہے؟'' اس نے ایک دل گداز سادگی کے ساتھ پوچھا۔

راسم کا دل رو دیا۔ اس نے جیسے تڑپ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کے بالوں، پیشانی اور رخساروں پر بوسے دینے لگا۔ پھر وہ بھی سسک پڑی۔ اس کے کشادہ سینے میں جذب سی ہوگئی۔ وہ کراہا۔ ''مجھے معاف کردو آنیہ! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..... ہرگز نہیں۔''

''آپ کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ میری جان لے سکتے ہیں۔'' وہ روح کی گہرائی سے بولی۔

''آنیہ میں کیا کروں؟ تم نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بڑی سرعت سے ہوا۔ آنیہ کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلی تھی۔ چل ہی نہیں سکی تھی۔ ایک دن آنیہ کے پاپا (بیرسٹر خورشید عالم) نے فون پر اس سے پوچھا کہ کیا ان کا یہ شک درست ہے کہ وہ دلبر سنگھ جی کے پاس ہی رہ رہی ہے؟ وہ پاپا سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور اس نے نہیں بولا۔ اس سے آگے نہ پاپا نے پوچھا نہ اس نے بتایا اور یہ رازداری ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھی۔ پاپا کو صرف اتنا پتا تھا کہ وہ راجوری ڈسٹرکٹ میں کہیں ہے۔ پاپا نے براہِ راست دلبر سنگھ جی سے بات کی۔ دونوں میں دیر تک جذباتی گفتگو ہوئی۔ آخر آنیہ کے پاپا نے حلفیہ طور پر ماموں دلبر سنگھ کو آنیہ کا سرپرست قرار دیا اور انہیں اجازت دی کہ وہ اس کا نکاح اس کی مرضی کے مطابق کردیں۔ نکاح کے لیے آٹھ دن بعد کی تاریخ بھی انہوں نے خود ہی مقرر کی۔

راجوری سمیت کشمیر کے حالات روز بروز بگڑتے جارہے تھے۔ مودی کی مسلم کش پالیسیوں نے ایک ہیجان سا برپا کردیا تھا۔ راجوری حالانکہ سرینگر سے فاصلے پر تھا پھر بھی یہاں دن رات سڑکوں پر انڈین فوجی دندناتے لگے تھے۔ وہ راتوں کو گھروں میں گھستے، خواتین کو ہراساں کرتے۔ نوجوان لڑکوں کے موبائل اور شناختی کارڈز زبردستی لے جاتے اور انہیں حکم ملتا کہ وہ ایک یا دو روز بعد قریبی فوجی کیمپ میں رپورٹ کریں۔ علاقے میں راسم کی تلاش بھی زور و شور سے جاری تھی۔ خیرو کا کہنا تھا کہ اس علاقے (باغ) کی تقریباً ہر دیوار پر راسم صاحب کی تصویر نظر آتی ہے۔

یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت کچھ ہو جائے گا جو ڈاکٹر صاحب راسم کو دیکھنے آتے تھے، انہوں نے ہی ایک نہایت قابلِ بھروسا نکاح خواں کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ آنیہ کے سرپرست کا کردار، دلبر سنگھ جی نے خیرو کو سونپ دیا تھا۔ خیرو گھر کا ملازم نہیں فرد ہی سمجھا جاتا تھا۔ خیرو کا داماد امیر حمزہ اور اس کا بھائی گواہ بنا لیے گئے۔ بالکل آخری وقت میں آنیہ کے پاپا اس کی ماما کو بھی فون پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ حسبِ اندیشہ کافی رونے دھونے کے بعد ماما نے آنیہ کو یہ تاکید کی کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے سامنے کم از کم ایک شرط ضرور رکھے اور وہ یہ کہ یہ سارا گورکھ دھندا چھوڑ کر اس کے ساتھ بیرونِ ملک جانے کو تیار ہو جائے گا۔ آنیہ بس ''ہوں، ہاں'' میں جواب دیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ہوا کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا جو کچھ راسم کے سینے میں بھڑکتا رہتا تھا، وہ اس سے آگاہ تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کی ماما وڈیو کال سے اٹھ کر چلی گئیں۔

اب دلبر ماموں بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح جلد سے جلد ہو جائے۔ وہ اس وادیٔ کشمیر کی ایک نسبتاً پرسکون اور گلابی شام تھی، جب تین بار ''قبول ہے'' کہا گیا اور دو پیار کرنے والے ایک ہوئے۔ آنیہ خورشید بڑی سادگی کے ساتھ آنیہ راسم بن گئی۔ نکاح نامے میں راسم کا نام راسم حفیظ لکھا گیا تھا مگر وہاں موجود لوگوں میں صرف وہ جانتی تھی کہ وہ راسم حفیظ نہیں راسم تیمور ہے۔ اس کا نسب کہیں اور جا کر ملتا ہے۔

وہ تھوڑے دن تھے لیکن بڑے خوب صورت تھے۔ کسی حسین سپنے جیسے۔ وہ آنیہ کو چاہتا تھا مگر اس کے پیار سے انکار کرتا تھا۔ اب اس نے اقرار کیا تھا تو اقرار کا حق ادا کر دیا تھا۔ چاہا تھا تو اس طرح ٹوٹ کر چاہا تھا کہ وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ یک جان دو قالب ہو گئے تھے اور یہ کوئی عارضی کیفیت نہیں تھی۔ اس میں جو گہرائی تھی اس کی شدت کو وہ دونوں ہی محسوس کر سکتے تھے۔

آدھی شب کا وقت تھا۔ راجوری کی پہاڑیوں پر رم جھم ہو رہی تھی۔ آنیہ، راسم کے سینے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''کچھ

عرصہ پہلے دیکھی ہوئی ایک نیوز یاد آجاتی ہے۔ بیرونِ ملک تم جیسی کسی دیوانی لڑکی نے پھانسی کے ایک مجرم سے شادی کی تھی۔ یہ شادی اس کے ''ڈیتھ سیل'' میں ہوئی تھی۔''

اب وہ دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے تم کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔ آنیہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''راسم! تم خود ہی تو کہتے ہو، جو پل ہم گزار رہے ہیں وہی ہمارا ہے۔ نہ جانے والے پل پر ہمارا اختیار ہے نہ آنے والے پر۔''

''آنیہ! میں اب ٹھیک ہو چکا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے جانے کا وقت قریب آرہا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ عجب گمشدہ آواز میں بولی۔

''تو پھر؟'' اس نے پوچھا۔

ہوا نے چنار اور چیڑ کے اونچے پیڑوں میں سسکی سی بھری۔ آسمان سے پھر موتی برسنے لگے وہ اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ ''کم از کم میری ایک بات تو مانو راسم..... مجھے..... اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ اس کے ریشمی رخساروں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے کیا پتا، یہ ''آنے والا'' کب آئے گا..... اور بیٹا ہوگا یا بیٹی؟''

وہ اُس کے سینے میں منہ چھپا کر نم و شرمگیں لہجے میں بولی۔ ''جو بھی ہوگا، تمہارا ہوگا..... اور میرا ہوگا۔ میں بس یہی چاہتی ہوں۔'' آنسو راسم کے سینے کو بھگو رہے تھے۔

''آنیہ! مجھے کمزور مت کرنا پلیز۔''

''نہیں کروں گی، کبھی نہیں کروں گی۔ جو کہنا تھا، کہہ چکی۔ اب مزید کچھ نہیں کہوں گی۔ اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔'' وہ اس کے اندر جذب ہوتے ہوئے بولی۔

اس نے اسے اپنی مضبوط، مہرباں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ دونوں ایک ریشمی اندھیرے میں گم ہو گئے..... کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے۔ دور کہیں پہاڑوں میں کسی وقت کوئی فائر ہوتا تھا اور اس کی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر در و دیوار سے ٹکراتی تھی۔

..... دن گزر رہے تھے..... آنیہ کو لگتا تھا کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ایک وعدہ راسم کو پکار رہا ہے۔ ایک آواز ان دونوں کی جدائی کا اعلان کر رہی ہے۔ خوشی کے پھول کے ساتھ یہ درد کا ایک بے رحم کانٹا تھا جو ہر وقت اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ راسم کے بیشتر زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ صرف انگلیوں پر بینڈیج موجود تھی۔

اس نے کئی مہینوں سے شیو نہیں کی تھی۔ اب اس کی باقاعدہ، سیاہ چمکیلی داڑھی تھی۔ مونچھیں کافی بڑی اور گھنی ہو چکی تھیں۔ ایک دن آنیہ پر انکشاف ہوا کہ وہ مونچھ داڑھی کیوں بڑھا رہا ہے۔ وہ نہا کر باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے اپنے بیڈ پر، نیلی پگڑی والے ایک سکھ نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چلا اٹھتی، اسے پتا چلا کہ وہ کوئی اور نہیں خود راسم ہے۔ لباس اور پگڑی وغیرہ نے اس کا حلیہ حیران کن طور پر تبدیل کر دیا تھا۔

اسی دن شام کو وہ شاید اپنے آپ کو چیک کرنے کے لیے ہی موٹر بائیک پر سوار ہو کر کوٹھی سے باہر چلا گیا (یہ موٹر بائیک اس کوٹھی کے اندر سے ہی اسے ملی تھی) وہ جب تک واپس نہیں آیا، آنیہ کا دل اس کے سینے میں بے کل پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہا۔ وہ واپس آیا تو اس کے کندھوں پر ایک براؤن گرم چادر تھی۔ کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''راسم! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ایسے باہر کیوں چلے گئے؟''

''بڑا فائدہ ہوا ہے۔ چلو اندر آؤ تمہیں بتاتا ہوں۔'' وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک چھوٹا باکس بھی تھا۔ شاید کھانے کی کوئی چیز تھی۔ ''پتا ہے کہاں سے آرہا ہوں؟'' اس نے کہا۔ ''زباب منزل سے۔ شہابی کی امی جان زباب خالہ سے مل کر آیا ہوں۔ شہابی کی امی جان کو زباب خالہ ہی کہتا ہوں۔''

''اوہ گاڈ! زباب منزل چلے گئے تھے؟'' وہ ازحد حیران ہوئی۔

جواب میں راسم نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یوں تھا..... آج مہینے کا پہلا جمعہ تھا۔ زباب بیگم اس موقع پر زباب منزل سے باہر آتی تھیں اور ایک شامیانے میں موجود لوگوں میں خیر خیرات تقسیم کرتی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا اور دور سے کھڑا انہیں دیکھتا رہا تھا پھر اس نے مزید ہمت کی تھی اور خیرات لینے والوں کی قطار میں لگ گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکا۔ اپنی باری پر اسے بریانی والا باکس ملا اور چادر کا یہ پیکٹ ملا۔ پیکٹ اس نے جان بوجھ کر گرایا اور پیکٹ اٹھاتے ہوئے زباب بیگم کے پاؤں کو چھوا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔

آنیہ نے پوچھا۔ ''اپنی والدہ (آیا خالہ) سے نہیں ملے؟''

''نہیں، وہ اندر تھیں۔ اُن سے ملنا مشکل تھا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

آنیہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ پس پردہ کیا ماجرا ہے۔ اسے ہمیشہ سے زباب بیگم سے انسیت تھی۔ شاید اپنی ماں (آیا خالہ) سے بھی زیادہ وہ ان کے قریب تھا۔ اب تو اس پر یہ عقدہ بھی کھل چکا تھا کہ وہی اس کی اصل ماں ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب وہ انہیں حقیقت بتا کر جدائی کا صدمہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کسی وقت آنیہ کو لگتا تھا کہ وہ ہر چیز کو بیگانی سی نظر سے دیکھتا ہے۔ جیسے کوئی مسافر کسی نئی منزل کی طرف گامزن ہو اور سامان باندھے، پلیٹ فارم پر بیٹھا ہو۔ غالباً یہی سبب تھا کہ بیتے ہوئے دنوں میں وہ ماں کو ماں نہیں کہہ سکا تھا اور پھر آنیہ کو 'اپنی محبت' کہنے سے کتراتا رہا تھا۔

اس نے گتے کا باکس کھولا۔ اس میں خوشبودار بریانی تھی اور بریانی کے اوپر پانچ چھ سیخ کباب رکھے تھے۔ ''یہ کباب بھی اسی بریانی میں تھے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''نہیں، یہ گڈ لک ریستوران سے لیے ہیں۔ بندہ راجوری آئے اور گڈ لک ریستوران کے سیخ کباب، دہی کے رائتے کے ساتھ نہ کھائے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے۔''

اس نے بتایا۔ ''ریستوران کے مالک عمر رسیدہ، مگر خوش باش میاں بیوی ہیں۔ میاں کی عمر قریباً نوے برس اور بیوی کی پچاسی برس ہوگی۔ اب یہ یہاں کی ایک روایت بن گئی ہے کہ نوجوان شادی شادہ جوڑے اپنی شادی کی سالگرہ پر ریستوران میں جاتے ہیں۔ کباب آرڈر کرتے ہیں اور واپسی کے وقت عمر رسیدہ جوڑے کے ساتھ تصویر اتروا تے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چلو.....'' وہ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔

ماحول کے شیشے پر چوٹ سی پڑی۔ آنیہ کے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ وہ راسم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے سوچا کہ ہم دونوں تو شاید کبھی اس ریستوران میں نہ جاسکیں، چلو یہ کباب ہی سہی۔''

دونوں کا دل جیسے ایک دم بھر گیا تھا۔ کبابوں کی مہک، بریانی کی خوشبو، کھڑکی سے جھانکتا ہوا چاند، کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ دونوں بُت سے بنے وہاں بیٹھے رہے۔ آنیہ کی آنکھوں میں کاجل پھیلنے لگا۔ اس نے ڈبا بند کر کے فریج میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلیں، کل کھالیں گے۔''

اگلے چھ سات روز بھی اسی طرح گزرے۔ دکھ کے پانیوں میں راحت کے چند چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی آئے۔ آنیہ کے بہت منع کرنے کے باوجود راسم اپنے اس پگڑی اور داڑھی مونچھ والے بھیس میں دو بار گھر سے باہر بھی گیا۔ بے شک آنیہ دلی طور پر اس کی ''بے خوفی'' کی پرستار تھی مگر فی الوقت اسے یہ بے خوفی..... بے پروائی کے زمرے میں محسوس ہوتی تھی اور اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دلبر ماموں نے بھی اسے اس حوالے سے محتاط رہنے کا کہا تھا۔ کبھی کبھی آنیہ کو لسانیات کے ماہر، پروفیسر زیڈ اے صدیقی کی کہی ہوئی ایک بات بھی یاد آتی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ کشمیر میں فریڈم فائٹنگ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں ہمیشہ شہادت کی بہت سی ''ویکسینیاں'' ہوتی ہیں۔ امیدواروں کو مایوسی نہیں ہوتی۔ اپلائی کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال کے اندر ان کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ یہ سب یاد آتے ہی آنیہ کا دل ڈوبنے لگتا تھا.....

ایک روز آنیہ جب کچن میں اس کے لیے اس کی پسندیدہ، مکئی کی میٹھی روٹی بنا رہی تھی، اسے لگا کہ وہ کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت اس کی طرف سے متفکر رہتی تھی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا لیکن مایوسی ہوئی۔ وہ شاید کشمیری میں بات کر رہا تھا مگر پھر اس پر انکشاف ہوا کہ یہ کشمیری بھی نہیں ہے۔ یہ وہی ''جناتی'' زبان تھی جس میں اس کی ڈائری لکھی گئی تھی۔

اس روز ناشتے کے بعد دونوں میں دیر تک بحث ہوئی اور آنیہ نے کسی نہ کسی طرح اس سے عارضی طور پر وہ کولٹ پسٹل لے لیا جو اسے ہر وقت اضطراب میں مبتلا رکھتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کسی دن راسم یہ پستول لے کر نکل جائے گا اور کچھ کر بیٹھے گا۔ سہ پہر کے وقت وہ سو رہا تھا۔ آنیہ نے وہ پستول چھپا دیا۔ اس کے لیے اس نے ولیوٹ کا ایک براؤن لحاف ایک کونے سے ادھیڑا اور بڑی صفائی سے پستول اس کی روئی میں گھسیڑ دیا۔ یہ لحاف استعمال نہیں ہوتا تھا۔ آنیہ کی ذہنی کیفیت ان دنوں عجیب ہو گئی تھی۔ اسے ہر وقت راسم کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

تب ایک روز جب وہ دونوں خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے، راسم نے اسے بتایا۔ ''کل ایک دوست صبح چار بجے والی فلائٹ سے راجوری آرہا ہے۔ اس سے ملنا اشد ضروری ہے۔ صبح چار بجے کے قریب نکلوں گا اور بس اسے ریسیو کر کے آجاؤں گا۔''

''وہ بھی ساتھ آئے گا؟'' آنیہ نے پوچھا۔

راسم نے نفی میں جواب دیا اور بتایا کہ صرف ریسیو کرنا ہے۔ آنیہ پھر ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اسے قائل اور مطمئن کیا، بولا۔ ''صبح سویرے

نکلنا ہے اس لیے تمہیں جگاؤں گا نہیں؟''

وہ صبح تین بجے اٹھا تھا، اس نے آنیہ کو سویا ہوا سمجھا تھا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر چلا گیا تھا اور تب ہی آنیہ لپک کر ویلوٹ کے لحاف تک پہنچی تھی۔ وہ کٹا پھٹا ہوا تھا۔ اس میں پستول موجود نہیں تھا۔

آنیہ کا طویل فلیش بیک ختم ہوا۔ وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے، ماضی کے دریچے میں جھانکتے ہوئے، آنیہ نے قریباً دو گھنٹے گزار دیے تھے۔ کئی ماہ کے مناظر ترتیب وار اس کی نگاہ کے سامنے سے گزرے تھے اور وہیں آکر رک گئے تھے جہاں سے آغاز ہوا تھا..... وہ ڈبل بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے باہر سفیدے کے پیڑ خاموش کھڑے تھے۔ ادھ کھلی الماری میں سے وہ لحاف بھی جھانک رہا تھا۔ جسے راسم نے پھاڑا تھا اور اس میں چھپایا گیا پسٹل نکال کر لے گیا تھا۔ سامنے کھڑکی کی چوکھٹ پر اسٹیکر چسپاں تھا۔ ''ہم نہیں مانتے، ظلم کے ضابطے'' اوپر ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر کا عکس تھا اور نیچے انگوٹھے کا وہ نشان تھا جو سیاہی سے نہیں خون سے لگایا گیا تھا۔

وہ طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اجالے کی سیندھ لگنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھی تو پاؤں کی ایک ایڑی میں سخت درد محسوس ہوا۔ یہ چوٹ اس دھکے کی نشانی تھی جو راسم نے اسے موٹر بائیک سے دور ہٹاتے وقت دیا تھا اور پھر اندھیرے میں اوجھل ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ارووڑا کی طرف نہیں جا رہا، ابھی وہ کسی اور کام سے جا رہا ہے مگر آنیہ کے دل کی گواہی تھی کہ فی الوقت ارووڑا کے سوا اس کے ذہن میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ ارووڑا بہت بڑا شخص تھا، اس کی پہنچ سے بہت دور تھا مگر وہ اب بھی اس تک پہنچنے کی اپنی سی کوشش کرنا چاہتا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔

آنیہ کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ وہ دل ہی دل میں پکاری۔ ''راسم! تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کم از کم اس وقت تک مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے جب تک میرا ''اکیلا پن'' ختم نہ ہو جائے۔ اور تم ''آنے والے'' کا انتظار کیے بغیر ہی چلے گئے ہو۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کی مہندی کی طرف دیکھا۔ اپنی ٹوٹی ہوئی ست رنگی چوڑیوں پر نگاہ دوڑائی..... 'راسم! ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو میری ہتھیلی میں حنا کی خوشبو بھی ماند نہیں پڑی۔'

دلبر ماموں کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور آنیہ نے جلدی سے آنسو پونچھے۔ وہ اندر چلے آئے۔ ''دھی رانی! موٹر سائیکل کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ماموں! رات کو راسم لے کر گئے ہیں۔ کوئی ضروری کام تھا ان کو۔ کہتے تھے شام تک آجاؤں گا..... اور ہو سکتا ہے کہ صبح ہی آجاؤں۔''

''اوہو، یہ منڈا ابھی نا.....'' انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اسے پتا بھی ہے کہ تھاں تھاں، دیواروں پر اس کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے موبائل فون پر راسم کا نمبر پریس کیا۔ آنیہ جانتی تھی، اس کا نمبر بند ہوگا..... اور وہ واقعی بند تھا۔

ناشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے قراری سے بند کمرے میں چکراتی رہی، اس کے خشک ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ ''یا اللہ! میرے سہاگ کی حفاظت فرما۔ یا اللہ اس کی مشکلیں آسان کر۔''

اسے کچھ پتا نہیں تھا، وہ کہاں گیا ہے۔ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے صبح واپس آجانے کا کہا تھا۔ اب دس بجنے والے تھے۔ اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ یکا یک خبروں کو پَر لگ گئے۔ نیوز چینلز چنگھاڑنے لگے، ہر طرف تہلکہ سا مچ گیا۔ اطلاع دی جا رہی تھی کہ وہ مارا گیا ہے..... ہاں، وہ مارا گیا تھا..... ارووڑا مارا گیا تھا۔ اسے اس کے بیڈ روم میں تیز دھار آلے کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ آنیہ اور دلبر سنگھ جی، بُت بنے ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ نیوز کاسٹر چلا رہے تھے۔ فیلڈ رپورٹرز تازہ ترین اطلاعات دے رہے تھے۔ نامعلوم مسلح شخص ایک سکھ سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں ارووڑا کی رہائش گاہ میں جا گھسا تھا۔

ایک چینل پر نیوز ریڈر نے ہیجانی آہنگ میں کہا۔ ''اور یہ دیکھیے..... یہ سی سی ٹی وی فوٹیج ہمیں ابھی ابھی موصول ہوئی ہے۔ اس میں آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ حملہ آور دو تھے۔ ایک پک اپ میں موجود تھا۔ دوسرے نے باؤنڈری وال کے قریب سے گارڈ کو چھاپا اور گھسیٹ کر پک اپ میں لے گیا۔''

سی سی ٹی وی میں دکھایا جا رہا تھا۔ حملہ آور جس نے اپنا چہرہ پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا، بہت وحشت سے گارڈ .... پر جھپٹا۔ اسے گھما کر باؤنڈری وال کے ساتھ دے مارا۔ پھر اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر سیاہ رنگ کی ہائی روف میں لے گیا۔

آنیہ کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ وہ حملہ آور کی

نیلی پگڑی، اور لباس دیکھ چکی تھی۔ اسی نوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ راسم ہے۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ اس نے دلبر ماموں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی ہیجان تھا۔ فوٹیج میں اوپر کی طرف کلاک چل رہا تھا۔ سیکنڈ تیزی سے حرکت کررہے تھے۔ منظر کٹ ہوا۔ قریباً پانچ منٹ کے وقفے سے جو دوسرا منظر فوٹیج میں ابھرا، وہ سیاہ پک اَپ (ہائی روف) کا تھا جو رینگ کر باؤنڈری وال کے قریب پہنچی تھی پھر اس کی چھت پر ایک ہیولا نظر آیا۔

نیوز ریڈر بلند آواز میں بولا۔ ''اور یہ دیکھیں ناظرین..... غور سے دیکھنے پر پتا چلتا ہے کہ حملہ آور اب سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں ہے اور پک اَپ کی چھت پر چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ دیکھیں..... کتنی دیدہ دلیری ہے..... وہ چھت سے باؤنڈری وال پر چڑھ کر اندر کود رہا ہے۔'' نیم تاریکی میں ایک سرخ دائرہ حملہ آور کی نشاندہی کررہا تھا۔

دلبر ماموں کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا۔ وہ مختلف چینلز بدلتے رہے تھے۔ ایک چینل پر اس منظر کی فوٹیج تھی جس میں حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے اروڑا کی رہائش گاہ سے باہر نکل رہا تھا۔ کلاک سے پتا چل رہا تھا کہ یہ واردات صرف پانچ چھ منٹ میں مکمل ہوگئی ہے۔ کوٹھی کے اندر سے تین چار فائر سنائی دیے۔ پھر ایک ہیولا سا باؤنڈری وال پر نظر آیا اور باہر کود گیا۔ آگے کے مناظر اتنے واضح نہیں تھے کیونکہ ''ہائی روف'' اب اندھیرے میں تھی۔

''آخر اس نے مار دیا۔'' دلبر ماموں سنسنی خیز آواز میں بولے۔ ''یہ وہی ہے..... وہی ہے۔'' پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھے۔ ''دھی رانی! یہ بہت بڑا واقعہ ہوگیا ہے۔ اس کا ری ایکشن بڑا سخت ہوگا۔ اب تمہارا اوپر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم نیچے بیسمنٹ وچ چلی جاؤ۔ آؤ میرا پُتر۔''

آنیہ کے زرد رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ سینے میں تلاطم تھا۔ دلبر ماموں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لے کر بیسمنٹ کی طرف آگئے۔ نیوز کاسٹر کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''ابھی ابھی تازہ سماچار آئی ہے کہ اس گھٹنا میں دو گارڈز کی موت ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہے۔ فورسز نے پورے علاقے کو محاصرے میں لے لیا ہے۔''

دلبر سنگھ جی نے آنیہ کو بیسمنٹ میں بٹھایا، پھر لوہے کی الماری کا تالا کھولا اور اس کے اندر سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکال لی۔ ایک نظر دیکھ کر ہی آنیہ کو اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی رائفل ہے۔ وہ آنیہ کا شانہ تھپک کر بولے۔ ''پریشان نہیں ہونا آنیہ پُتر! کوئی تم دونوں کا بال بھی بیکا نہیں کرسکدا۔''

تب وہ ایک بار پھر راسم کو فون ملانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ آنیہ نے سوچا، اسی طرح کچھ عرصہ پہلے راسم نے ڈرے سہمے جوڑے ظہیر اور نادیہ کی مدد کی تھی، آج دلبر ماموں راسم اور اس کے سامنے ڈھال بنے ہوئے تھے۔

دلبر ماموں نے جہاں سے آٹومیٹک رائفل نکالی تھی وہاں ایک ٹیلی اسکوپ بھی پڑی ہوئی تھی۔ آنیہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اسے دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔ دلبر ماموں جا چکے تھے۔ اس نے وہاں موجود چھوٹا ٹی وی آن کر لیا۔ اب ''ری ویوز'' بھی آرہے تھے۔ ایک تبصرہ نگار کہہ رہا تھا۔ ''بالکل..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس گمبھیر گھٹنا میں بھی راسم عرف راسو کا رول ہو۔ یہ ہمارے اداروں کی ناکامی ہے کہ وہ ابھی تک مفرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس کے کسی سکھ ساتھی کی کارروائی ہو.....''

دوسرے تبصرے نگار نے قطع کلامی کی۔ ''دیکھیں، اب تو اس بات کے بھی واضح اشارے مل رہے ہیں کہ غالباً وہ خود ہی سکھ نوجوان کے بھیس میں تھا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق حملہ آور نے وہاں جو نعرے لگائے ہیں، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس نے اپنی شناخت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی.....''

پینل میں موجود ایک صحافی نے کہا۔ ''آکاش اروڑا صاحب کی ہتھیا جس بے رحمی سے کی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہتھیارے کے اندر کتنی نفرت چھپی ہوئی تھی۔ اروڑا صاحب کے شریر پر چاقو کے کم از کم پندرہ گھاؤ موجود ہیں۔ ان کا سارا بیڈ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ کچھ اس طرح کی جانکاری بھی دی جارہی ہے کہ شاید ان کی باڈی کو ''ڈیفیس'' بھی کیا گیا ہے..... غالباً ایک بازو کو۔''

یکا یک تہ خانے کی چھت سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ یہ بھاری بوٹوں کی آوازیں تھیں۔ تب فوجیوں کے بولنے اور دلبر ماموں کے گرجنے برسنے کی صدائیں آئیں۔ پھر یوں لگا کہ شاید انہیں گرفتار کیا جارہا ہے۔ کچھ دیر بعد تصدیق بھی ہوئی۔ وہ لوگ انہیں گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

آنیہ کا دل گھبرانے لگا۔ معدے میں اینٹھن ہورہی تھی پھر اسے قے شروع ہوگئی۔ کل رات بھی اسی طرح کی کیفیت ہوئی تھی جب راسم نے اسے متلی کی دوا دی تھی..... یہ سخت بے چینی کا وقت تھا۔ آنیہ نے ٹی وی بند کردیا۔ لائٹ

آف کردی مگر پھر نہار کی کال آگئی۔ ساری خبریں اس تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ وہ راسم اور آنیہ کے حوالے سے سخت فکرمند تھی..... پھر پاپا کا فون آیا۔ آنیہ کوشش کے باوجود کال اٹینڈ نہیں کرسکی۔ اس نے جواباً بس معذرت کا میسج بھیجا اور اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔

سہ پہر کے وقت تھوڑی سی راحت اس وقت ملی جب اسے پتا چلا کہ دلبر ماموں پولیس اسٹیشن سے گھر واپس آگئے ہیں۔ غالباً ان کا ''سابق فوجی ہونا'' ان کے کام آیا تھا۔ آنیہ اُن سے ملی۔ وہ اپنے لیے قطعاً خوف زدہ نہیں تھے۔ انہیں بس آنیہ اور راسم کی فکر تھی۔

تہ خانے میں آنیہ نے جائے نماز سنبھال لی تھی اور راسم کے لیے مسلسل دعا گو تھی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ تہ خانے کے دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ دوسری طرف دلبر ماموں تھے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اسے لگا کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے جو دعائیں وہ مانگ رہی تھی، وہ رنگ لائی ہیں۔ دلبر ماموں کے ساتھ راسم موجود تھا۔ اس کے سر پر نیلی پگڑی تھی اور اس نے خود کو براؤن رنگ کی گرم چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے حلیے میں جو تھوڑا سا فرق آیا، وہ یہ تھا کہ ایک رخسار پر چوٹ کا نیلگوں ابھار نظر آرہا تھا۔

دلبر ماموں نے اسے اندر دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ باہر سڑک سے گزرتی ہوئی فوجی گاڑیوں کے مخصوص ہارن سنائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ایمبولینس بھی شور مچاتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ دلبر ماموں واپس چلے گئے۔ آنیہ تڑپ کر راسم کے گلے لگ گئی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''دیوانی ہوئی ہو آنیہ! یہ رونے کا نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ اس سؤر کو چیر ڈالا ہے میں نے۔'' اس کا سینہ اندرونی جوش سے کچھ اور بھی فراخ نظر آنے لگا تھا۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

اس نے راسم سے الگ ہو کر اسے دیکھا۔ اسے راسم کی آنکھوں میں شعلے نظر آئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ دیکھا نا، گرا دیا نا سومنات کو۔ اس کی سیاہ جیکٹ کی اندرونی جیب کافی پھولی ہوئی تھی۔ آنیہ نے ٹٹولا۔ کوئی نرم سی چیز تھی۔ ''یہ کیا ہے؟''

راسم نے ذرا تذبذب کے بعد سبز رنگ کا ایک شاپر نکالا۔ اس میں کچھ تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں بولا۔ ''دل چاہتا تھا کہ تمہیں یہ دکھاؤں..... مگر..... شاید تم ڈر جاؤ گی۔''

''مگر ہے کیا؟''

وہ پھنکارا۔ ''اس بے رحم قاتل کا ہاتھ.....'' آنیہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہاں آنیہ اپنے اس ہاتھ سے اس بدبخت نے میرے فاروق کو تڑپا کر مارا تھا اور پھر سدرہ کے سر سے عزت کی چادر اتاری تھی۔ اسی ہاتھ سے اس نے ٹھیکیدار نرائن کے سامنے، مجھے برف کے بلاک پر ننگا لٹایا تھا۔ میں اس حرام زادے کی لاش کا تو کچھ نہیں کرسکا مگر اس ہاتھ کو آوارہ کتوں کی خوراک ضرور بناؤں گا۔''

آنیہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو پھر ردِعمل میں ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہیں۔ باہر باغ کالونی کی کسی گلی میں اوپر تلے تین چار فائر ہوئے اور پھر آوارہ کتوں کا شور سنائی دینے لگا۔

وہ عجب رات تھی، وہ اکٹھے تھے، ایک دوسرے کے بالکل قریب..... مگر جیسے سیکڑوں میل دور تھے۔ آنیہ نے اس کی طرف کروٹ لی، پھر اس کا دایاں ہاتھ اپنے سر و رخسار اور تکیے کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔ ''راسم! تم نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک میں ''اکیلی'' ہوں۔ تم کچھ نہیں کرو گے پھر تم کل رات کیوں نکل گئے؟''

''میرا دل کہتا ہے کہ تم اکیلی نہیں ہو..... اب نہیں ہو۔'' وہ بھی کھوئے لہجے میں بولا۔

وہ چونک سی گئی۔ سر اٹھا کر نیم تاریکی میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس کو کل رات بھی تو متلی ہوتی رہی تھی۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا سا گیا۔ وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہاں آنیہ! یہ تمہاری طبیعت کی خرابی بھی ہوسکتی ہے مگر میرا دل..... میرا وجدان کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسی وجدان اور یقین کے سہارے میں کل چلا گیا تھا۔''

وہ کتنی ہی دیر کچھ نہ کہہ سکی۔ اپنے وجود کے اندر کسی اور وجود کی شروعات کا احساس اس کے لیے بڑا انوکھا تھا۔

وہ موضوع بدل کر بولا۔ ''کاش کشمیر آزاد ہو جائے اور وہ آزاد فضاؤں میں پیدا ہو۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بول ہی نہیں سکی۔ اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''بھارت کا یہ مسلم کش حکمران جس طرح کے ظلم توڑ رہا ہے، لگتا ہے کہ اب صبح قریب ہے۔ لوگوں میں ایک بے تاب لہر پیدا ہو رہی ہے۔ کشمیری نوجوان سروں پر کفن باندھ رہے ہیں۔ راجا نے کل ایک عجیب شعر سنایا جو دل پر نقش ہو گیا ہے۔

ہم نے اندھی رات میں توڑا فصیلِ خوف کو
صبح کی پہلی کرن تک یہ حوالہ جائے گا۔''

باہر سرد ہوا چناروں میں سرسرا رہی تھی۔ آنیہ نے

پوچھا۔ ''راسم، کل راجا بھی تمہارے ساتھ تھا؟''

''ہاں، گاڑی میں وہی تھا۔ تمہیں پتا ہے، وہ کون ہے؟'' وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''پیلٹ گن سے چھلنی ہونے والی خاتون ناہید کا چھوٹا بھائی، بڑا پیار کرتا تھا اپنی آپی سے۔ مزاحمت اور جدوجہد کے یہ سلسلے ایسے ہی رشتوں ناتوں اور جذبوں سے جڑے ہوئے ہیں۔''

بولتے بولتے اچانک راسم کے ذہن میں نہ جانے کیا آیا، کہنے لگا۔ ''آنیہ! کسی وقت سوچتا ہوں، ازخود گرفتاری دے دوں۔''

''پلیز راسم۔'' آنیہ نے سسک کر کہا اور اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اگلی صبح مزید تہلکہ خیز تھی۔ اخبار چلّا رہے تھے۔ نیوز چینلز پر بھی سخت شور تھا۔ انڈین فورسز نے پورے علاقے میں نہایت سخت سرچ آپریشن کیا تھا۔ گھر گھر تلاشی لی گئی تھی۔ انہوں نے بڑی بے رحمی سے پندرہ سے زائد کشمیریوں کو مار ڈالا تھا۔ بے شمار گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ چادر اور چار دیواری پامال کی گئی تھی۔ آنیہ نے گوگل پر سرچ کر کے کوئی پاکستانی نیوز چینل ٹیون کرنا چاہا مگر ایک بار پھر انٹرنیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ اس بنے ٹرانزسسٹر ریڈیو پکڑا اور پاکستانی نیوز سننے میں کامیاب رہی۔ ریڈیو کے مطابق شہید ہونے والے کشمیریوں کی تعداد تیس سے کم نہیں تھی۔ علاقے سے چار سو کے قریب افراد گرفتار کیے گئے تھے۔ دو قریبی دیہات سے انڈین فوجی تین کشمیری لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے، ان پر سہولت کاری کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایریا میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ شہادتوں کی وجہ سے پورے راجوری میں شدید غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔

آنیہ کو لگا کہ راسم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ دوپہر تک آنیہ کو خوف محسوس ہوا کہ وہ جذبات کے دھارے میں بہہ کر پھر کہیں نہ نکل جائے۔ اس نے دلبر ماموں سے کہہ کر موٹر بائیک غائب کروا دی اور انہیں راسم کی طرف سے پوری طرح چوکس کر دیا۔ آج اسے پتا چل رہا تھا کہ کل رت اس نے اچانک یہ بات کیوں کہی تھی کہ وہ اپنی گرفتاری دینا چاہتا ہے۔ شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں اروڑا کے قتل کا ردِعمل بے گناہوں کے لیے جان کا خطرہ نہ بن جائے۔

آکاش اروڑا کے قتل اور پھر پچیس کے قریب بے گناہ کشمیریوں کی شہادت کے بعد علاقے میں زبردست انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ راجوری کی گلیوں میں چھوٹے چھوٹے احتجاج ہوئے تھے۔ ٹائروں کو آگ لگائی گئی اور فوجی گاڑیوں پر سنگ باری ہوئی تھی۔ اب لوگ ایک بڑے اور منظم احتجاج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ باغ کالونی میں جہاں ایک ہی گلی میں سات لوگوں کو شہید کیا گیا، ایک بڑا مظاہرہ کیا جائے گا۔ جمعے کے روز ہزاروں لوگ جمع ہوں گے اور پُرامن طور پر اس درندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے۔

یہ اضطراب قریبی علاقوں تک بھی پھیل گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ کلگام اور اننت ناگ سے بھی لوگ قافلوں کی صورت یہاں پہنچیں گے۔ بوائز ہاسٹل سے آگے ایک بڑا پلے گراؤنڈ تھا جس کے ساتھ ایک وسیع میدان بھی تھا۔ یہ اجتماع یہیں پر ہونے والا تھا۔ میدان سے کچھ فاصلے پر شمال کی طرف ایک فوجی کیمپ تھا جس کے گرد خاردار باڑ لگی ہوئی تھی۔ مقامی انتظامیہ کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ راجوری میں اتنا بڑا اجلسہ ہو۔ دیکھنے والے یہ سوچ سکتے تھے کہ اگر یہاں اتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو سکتے ہیں تو پھر سرینگر اور پلوامہ جیسے علاقوں میں کتنے بڑے پیمانے پر احتجاج ہو سکتا ہے۔ لہٰذا خبریں یہی آ رہی تھیں کہ یہ اجتماع ہونے ہی نہیں دیا جائے گا۔ دوبارہ کرفیو لگا دیا جائے گا یا پھر بڑے پیمانے پر مزید گرفتاریاں کر لی جائیں گی۔ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ سخت گیر ہندو ڈی سی اس پلے گراؤنڈ اور میدان میں پانی چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جوں جوں رکاوٹ کی اطلاعات آ رہی تھیں توں توں لوگوں کا غم و غصہ اور جوش بڑھ رہا تھا۔ وہ بدمست انڈین فوجیوں کی طرح خون خرابا نہیں کر رہے تھے، لوٹ مار کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، صرف بھارتی فوجیوں کی حد سے بڑھی ہوئی سفاکی کے خلاف عوامی طاقت کا پُرامن اظہار چاہتے تھے۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مقامی لیڈران بھی احتجاج کے اس پروگرام میں پیش پیش تھے۔

آنیہ دیکھ رہی تھی۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں راسم عجیب کیفیت میں رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے سینے میں جیسے نیلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے پل پل کی خبر رکھے ہوئے تھا۔ دوپہر کو دلبر سنگھ جی تہ خانے میں آئے۔ انہوں نے راسم کو بتایا۔ ''مقامی کشمیری رہنماؤں اور انتظامیہ میں ایک ایگریمنٹ ہوا ہے۔ انتظامیہ کو پوری طرح وشواس دلایا گیا ہے کہ اس احتجاج کے دوران میں

لوگ بالکل شانتی کے ساتھ رہیں گے۔ گارنٹی دی گئی ہے کہ کوئی ایک شیشہ نہیں ٹوٹے گا، ایک گملا خراب نہیں ہوگا۔ چار بجے سہ پہر کے بعد چند تقریریں ہوں گی اور اس کے بعد مغرب سے پہلے پہلے لوگ شانتی کے ساتھ منتشر ہو جائیں گے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے دلبر جی، کیا واقعی ایسا ہو سکے گا؟'' راسم نے پوچھا۔

''ہندو مہاشے پر وشواس کرنا تو مشکل ہے مگر یہ باوردی جانور اڑتالیس گھنٹے پہلے پچیس بے گناہوں کی ہتھیا کر چکے ہیں۔ ہر طرح کا ظلم ڈھا چکے ہیں۔ اب شاید ان کے اندر خون کی پیاس تھوڑی سی گھٹ (کم) پڑ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''پُرامن ''پروٹیسٹ'' کی آگیا دے رہے ہیں۔''

''دلبر جی! کیا پتا وہ دہری چال چل رہے ہوں۔ ایک طرف احتجاج یعنی جلسے کی اجازت دے رہے ہوں، دوسری طرف لمبی چوڑی گرفتاریاں کر لیں۔''

''یار لوگوں نے اس کا بندوبست بھی کیتا ہویا ہے۔'' دلبر جی جوش سے بولے۔ ''جن کی گرفتاریاں ہو سکدی ہیں ان میں سے زیادہ تر رات سے ہی روپوش ہو گئے ہیں۔ رب نے چاہا تو اپنے کچھ سکھ جتھے بھی اسی جلسے میں شریک ہوں گے۔ راجوری والے جتھے کے آگو (لیڈر) دلجیت سنگھ فوج کے زمانے سے میرے یار ہیں۔ وہ بھی رات سے زیرِ زمین ہیں۔ عین ٹائم پر اپنے لوگوں کے ساتھ یہاں باغ میں پہنچ جائیں گے۔''

دلبر سنگھ جی کے گلے کی رگیں جوش سے پھولی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کشمیر کی آزادی میں انہیں خالصتان کی آزادی کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔ شاید اسی لیے ایک روز انہوں نے کہا تھا۔ صرف کشمیر کی کشتی ہی نہیں، ساری کشتیاں کنارے لگیں گی۔

جمعرات کی شام تک باغ کے جلسے اور اجتماع کی خبر ایک اہم ترین خبر بن چکی تھی۔ راجوری میں بھی ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ مقامی کشمیری رہنماؤں کی طرف سے بار بار اعلان کیا جا رہا تھا کہ یہ قطعی طور پر ایک پُرامن احتجاج ہو گا۔ لہٰذا سب لوگ ایسے شر پسندوں سے ہوشیار رہیں جو اس زبردست عوامی اجتماع کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

رات کو آنیہ کا پریکٹیکل ٹیسٹ کا نتیجہ آ گیا تھا۔ وہ واقعی امید سے تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی لیکن خوشی کے ہر پھول کے ساتھ غم کا وہی زہریلا کانٹا بھی تھا جو سوچ کی پوروں کو زخمی رکھتا تھا۔ اب وہ آزاد ہے، اب وہ چلا جائے گا..... وہ سوچ رہی تھی۔ کیا یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرے گا کہ جو اس دنیا میں آنے والا ہے، وہ کون ہے؟ کیا وہ اس کی شکل دیکھنے کا انتظار بھی نہیں کرے گا؟ اس کا دل درد سے بھر گیا۔

رات کو اسے کافی دیر متلی ہوتی رہی۔ پھر واش روم میں منہ ہاتھ دھو کر اور اپنے بال سمیٹ کر وہ راسم کے قریب بستر پر آن لیٹی۔ ''راسم، کل تم بھی مظاہرے میں جاؤ گے؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے آنیہ؟''

''نہ جاؤ نا، ابھی اروڑا والا معاملہ تازہ ہے۔ تمہارے لیے بہت خطرہ ہوگا۔''

''خطرے والی بات اچھی کہی ہے تم نے۔ کہاں خطرہ نہیں ہے میرے لیے؟ اس ہجوم میں تو میرے لیے سب سے کم خطرہ ہوگا۔'' اس نے سامنے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو..... یہ کچھ لوگ کل والے جلوس کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ یہ کوئی دو سو موٹر سائیکل سوار تو ہوں گے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ وہاں ہزاروں میں کسی کو کون پہچان سکتا ہے اور پھر، اب تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ یہ ایک مکمل پرامن مظاہرہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جلسہ گاہ کے باہر چند ٹائر جلائے جائیں گے یا دو چار پٹکے نذرِ آتش ہو جائیں گے۔''

''اور پھر اس کے بعد.....؟'' آنیہ نے پوچھا۔ ''یعنی آنے والے دنوں میں؟''

''اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ گمبھیر آہنگ میں بولا۔ ''میں وقت سے پہلے کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے ہولے سے آنیہ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ''اگر کچھ ہو جائے تو تم پاپا کے پاس جالندھر چلی جانا۔ میرا خیال ہے کہ برقع میں سفر کرتے ہوئے تمہیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے خیرو کو ساری بات سمجھا دی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دلبر جی خود تمہیں چھوڑ آئیں۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو راسم! میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔'' وہ رو دی۔

''آنیہ، میری جان! تمہیں اپنے دل کو مضبوط کرنا ہو گا۔ تمہارے پاس میری امانت ہے اور وہ تمہیں شاید مجھ سے بھی زیادہ پیاری ہو۔ اسے سنبھالنا ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''لیکن راسم! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا اور مرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے پیار سے آنیہ کا رخسار سہلایا۔ ''اب تم نے یہ آپشن کھو دیا ہے آنیہ، تمہیں اب زندہ رہنا ہے۔ دلیری کے ساتھ اور مجھے پتا ہے تم رہو گی۔ تم نے مجھے بتایا تھا تم ہمیشہ دلیری کی پرستار اور متلاشی رہی ہو لیکن اب تم خود دلیر بنو گی۔ تمہارے وجود میں جو موجود ہے وہ تمہیں دلیر بنائے گا۔ تمہیں اور ڈھنگ سے جینا سکھائے گا، مجھے پورا یقین ہے۔''

اچانک لائٹ چلی گئی۔ تاریکی چھا گئی۔ ٹی وی آف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری۔ دستک ہوئی۔ خیرو ایک شمع دان اندر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ کل کے جلسے کے لیے لوگ بڑے پیمانے پر تیاری کر رہے ہیں۔ برہان وانی شہید کی تصویروں اور دیگر شہیدوں کی تصویروں والے بینرز تیار ہو رہے ہیں۔ پلے گراؤنڈ کے ساتھ والے وسیع میدان میں اسٹیج تیار کیا جا رہا ہے۔ خیرو خود بھی پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔

راسم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو جلیانوالا باغ یاد آ رہا ہے۔ شاید وہاں بھی اس سے ملتی جلتی صورتِ حال ہو گی۔ وہی جبر اور وہی صبر، وہی بربریت اور وہی مزاحمت۔ دور بدل جاتے ہیں، مقام بدل جاتے ہیں مگر جنگ تو وہی رہتی ہے۔''

آنیہ نے کن انکھیوں سے راسم کا چہرہ دیکھا..... وہ جانتی تھی یہ کون بول رہا ہے؟ یہ جلیانوالا کے اسد اللہ حیدر کا خون بول رہا تھا۔ اسے ایسے ہی بولنا چاہیے تھا۔

ایک بار پھر اس کی سوچوں کی پوروں کو غم کا نکیلا کانٹا لہولہان کرنے لگا۔ اس نے لیٹے لیٹے راسم کے مضبوط شانے سے ماتھا ٹیکا اور بھرائی آواز میں بولی۔ ''راسم! جس راہ پر چل پڑے ہو، اس سے کوئی واپسی بھی ہے یا نہیں؟''

وہ گم صم سا ہو گیا۔ چند لمحے کے لیے آنیہ کو یوں لگا جیسے وہ کوئی جواب ہی نہیں دے گا پھر وہ بولا۔ ''جب تک سانس تب تک آس۔ ناامیدی تو کفر کہلاتی ہے۔ ہم نے آزاد ہونا ہے۔''

''مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ راسم۔ مجھے صاف صاف بتاؤ پلیز۔ تمہیں تو پتا ہو گا جو راہ اختیار کر لی ہے، اس میں واپسی کا امکان کیا ہے؟''

وہ عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''زندگی موت کی ''ریشو'' جاننا چاہتی ہو۔'' پھر وہ اٹھا۔ شمعدان میں چھ شمعیں روشن تھیں۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری بجھا دیں۔ بس ایک شمع کا فیتہ ذرا سلگتا رہنے دیا۔ فیتے کے اوپر ایک چنگاری سی چمک رہی تھی۔ ''ریشو تو بس یہی ہے آنیہ۔''

وہ اپنے گرم آنسوؤں سے اس کا شانہ بھگونے لگی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ یہ آخری رات ہے۔ اس آخری رات میں وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ وہ قول دے چکی تھی، کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اگلے روز راسم صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ آنیہ نے اسے نماز پڑھتے دیکھا پھر اس نے اپنی داڑھی درست کی اور بڑی بڑی مونچھیں تقریباً صاف کر دیں۔ اس نے کل رات ہی کہا تھا کہ وہ جلسے میں جانے کے لیے ایک مسلمان کی شکل میں ہی نکلے گا۔ آنیہ نے بڑے اہتمام سے ناشتا بنایا تھا مگر اس نے فقط چند لقمے ہی لیے..... پھر وہ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے آنیہ سے کچھ روئی اور سوئی دھاگا مانگا تھا۔ دوپہر کے وقت آنیہ نے دیکھا کہ وہ انڈین وزیراعظم کا ایک پتلا سی رہا ہے۔ اس نے کشمیر کا ایک جھنڈا بھی تیار کر رکھا تھا۔ آنیہ نے دلبر ماموں کی آواز سن کر دروازے کی جھری سے آنکھیں ہٹائیں اور بیسمنٹ سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا، دلبر ماموں نے ایک مسلمان پینٹر سے ایک بڑا بینر تیار کروایا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''گجرات کے قسائی کو اب اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہو گا۔''

☆☆☆

آنیہ کو گم صم دیکھ کر راسم نے کہا۔ ''گھبراؤ مت، دعا کرو جلسہ خیریت سے گزر جائے۔ شام کو تمہارے پاس ہوں گا۔''

سہ پہر کو ہی مظاہرین کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں نعرہ زنی کرتی ہوئی جلسہ گاہ کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ دلبر ماموں اور خیرو بھی نکل چکے تھے۔ راسم بھی تیاری میں تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر سفید گول ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بڑا، ریشمی رومال اس نے نقاب کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے چھت پر گیا تو آنیہ کو اپنا ایک شک رفع کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے انڈین وزیراعظم کا نارنجی رنگ کا پتلا دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔ پتلے کے اندر ایک آٹومیٹک رائفل مع گولیوں والی بیلٹ کے چھپائی گئی تھی۔ یہ وہی رائفل تھی جو دلبر ماموں نے چند دن پہلے خطرے کے وقت بیسمنٹ والی الماری سے نکالی تھی۔

راسم واپس آیا تو آنیہ نے پتلے کی طرف اشارہ کیا اور

چلا اٹھی۔ ''راسم! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا ارادے ہیں تمہارے؟ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ ہرگز نہیں جانے دوں گی۔''

''آنیہ۔'' وہ گرجا۔ ''اس بحث کا وقت نہیں ہے، یہ صرف احتیاط.....''

''جھوٹ مت بولو۔ خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔'' اس نے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ راسم اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر یک لخت اس نے اسے دھکا دیا اور پتلے سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی، وہ اسے باہر سے لاک کر چکا تھا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگی۔ راسم کو پکارنے لگی، وہ آہنی گرل اور جالی والی کھڑکی کی طرف لپکی۔ وہ دوسری طرف کھڑا تھا۔ ''راسم! تم دھوکا دے رہے ہو مجھے۔ جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ تم شام کو واپس نہیں آؤ گے..... تم..... کبھی واپس نہیں آؤ گے۔''

وہ ٹھہری آواز میں بولا۔ ''آنیہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں یہ گن میں صرف احتیاط کے طور پر لے جا رہا ہوں۔ یہ ایک پُرامن جلسہ ہے لیکن ہمارا دشمن دھوکے باز ہے۔ اس پر مکمل بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کی طرف سے کچھ نہیں ہوگا تو پھر ہماری طرف سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''اور اگر کچھ ہو ہی گیا تو؟'' وہ کھڑکی سے منہ لگا کر چلائی۔ ''کیا تم، آج ہی خود کو گولیوں سے چھلنی کروا لو گے؟ آج ہی ہتھکڑیاں پہن کر پھانسی کی کوٹھری کی طرف چل پڑو گے؟''

اس کی آنکھوں میں شعلہ بھڑکا۔ وہی یادگار شعلہ جو جلیانوالا کی ایک دیوار کے پاس گرے ہوئے دس سالہ لڑکے کی آنکھوں میں نظر آیا تھا۔ وہ عجیب الوہی لہجے میں بولا۔ ''آنیہ! وہ بھی ایک باغ تھا جس کی تصویر تمہارے پاس ہے اور یہ بھی باغ ہے لیکن اس بار نہیں..... ہاں اس بار نہیں۔''

''کیا اس بار نہیں؟'' وہ پھر چلائی۔

''اگر اس طرح کی کہانی یہاں بھی دہرائی گئی..... تو میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔ تم دیکھ لینا میں یہ ہونے نہیں دوں گا.....''

وہ بلک اٹھی۔ ''راسم! تم گولیاں چلاؤ گے؟ خون بہاؤ گے؟''

''گولیاں تو چل رہی ہیں، خون تو کشمیریوں کا بہہ رہا ہے۔ اب اسے روکنا ہے، کسی بھی طرح روکنا ہے۔''

اس نے الوداعی نظروں سے دیکھا اور تیزی کے ساتھ کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

یہ بہت بڑا جلسہ تھا۔ ہزاروں لوگ تھے۔ ان میں خواتین اور بچوں کی بڑی تعداد بھی تھی۔ یقیناً سب کے سینے سلگ رہے ہوں گے مگر اپنے قائدین کی ہدایت کے مطابق وہ سب پُرامن تھے۔ ہاں ان کے کتبوں اور بینرز سے ان کے اندرونی غم و غصے کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ ایک بڑے بینر پر لکھا تھا۔ ''بے شک نعرے بھی ہوں گے..... لیکن اب للکارے بھی ہوں گے۔''

ایک بینر جو جگہ جگہ نظر آ رہا تھا اس پر مقبول بٹ، برہان وانی اور نصیر احمد پنڈت کی تصویریں تھیں۔ نیچے سرخ روشنائی سے درج تھا۔ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے۔ دو اور نعرے بار بار فضاؤں میں گونج رہے تھے، وہ یہ تھے۔ ''ہم نہیں مانتے..... ظلم کے ضابطے'' اور ''کشمیر بنے گا پاکستان''۔ جلسہ گاہ کے اردگرد عمارتوں کی چھتوں پر اور کیمپ کی جانب بہت سے فوجی شوٹر بالکل چوکس موجود تھے۔ وہ چاروں طرف گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

آنیہ بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑی پردے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اسے جلسہ گاہ کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی کھڑکی کی جالی کاٹ کر بمشکل کمرے سے نکل سکی تھی۔ جلسہ گاہ میں ایک جوشیلا نوجوان اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر موجود تھا۔ وہ اپنے سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ ''لے کے رہیں گے۔'' سیکڑوں لوگوں نے جواب دیا۔ ''آزادی'' وہ پھر پکارا۔ ''میں مر بھی جاؤں تو'' سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ ''آزادی'' وہ پھر دہاڑا۔ ''میری قبر پر لکھنا'' جواب آیا۔ ''آزادی'' ''ذرا زور سے بولو..... آزادی..... دل کھول کے بولو..... آزادی.....''

آنیہ سنتی رہی۔ رگوں میں لہو سنسناتا رہا۔ کہیں پس منظر میں نغمہ گونج رہا تھا۔ دنیا کے منصفو، سلامتی کے ضامنو! کشمیر کی جلتی وادی میں بہتے ہوئے خون کا شور سنو۔

اور پھر کچھ دیر بعد تقریریں شروع ہو گئیں۔ لوگ بڑے نظم و ضبط سے سنتے رہے۔ کہیں کوئی یورش نہیں تھی، کوئی اتھل پتھل نہیں تھی۔ اس کی امید بندھنے لگی کہ سب کچھ خیر و عافیت سے اختتام پذیر ہو جائے گا۔ تقریریں ختم ہوں گی تو لوگ نماز مغرب سے پہلے منتشر ہو جائیں گے اور پھر..... پھر

وہ بھی چلا آئے گا۔ خدا کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ وہ ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی کر کے دکھا دیتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ آج رات کا کھانا وہ اور راسم پھر اکٹھے کھاتے۔ پھر مستقبل کے بارے میں سوچتے۔ پھر حالات کی بے رحم دیواروں کے اندر سے زندگی کا کوئی در نکالنے کی کوشش کرتے۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا گیا اور آنیہ کی امید کی روشن کرنیں طلوع ہوتی گئیں۔ اچانک اسے اس ٹیلی اسکوپ کا خیال آیا جو ایک روز اس نے بیسمنٹ کی الماری میں دیکھی تھی۔ وہ اپنے سفید گلابی پاؤں سیڑھیوں پر احتیاط سے رکھتی، تیزی سے نیچے آئی اور وہ لونگ رینج کی دوربین لے کر پھر تیسری منزل کی اس کھڑکی تک چلی گئی۔ وہ ہزاروں کے ہجوم میں راسم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ کوشش کے باوجود وہ اسے دیکھ نہیں سکی۔ تاہم ایک جگہ اس نے دلبر ماموں کو ان کی سرخ پگڑی کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ بڑی محویت سے تقریر سن رہے تھے۔ اب جلسہ آخری مراحل میں تھا۔

اچانک ایک دھماکا ہوا۔ یہی لگا کہ کسی بڑی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا ہے مگر اس آواز کی وجہ سے لوگوں میں یکا یک ہلچل پیدا ہوئی۔ دائیں جانب کے ہجوم میں کچھ بھگدڑ سی نظر آئی۔ آنیہ نے دیکھا کہ کچھ لوگ مخالف سمت میں بھاگے۔ اس جانب کچھ دوری پر فوجی کیمپ بھی تھا۔ فائر کرنے والوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا (اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بہانہ انہوں نے ٹائر بلاسٹ کی شکل میں خود ہی ''تخلیق'' کیا تھا۔ درحقیقت اتنا بڑا اجتماع ان سے ہضم ہی نہیں ہو پایا تھا) پہلے کچھ ہوائی فائرنگ کی گئی اور آنسو گیس پھینکی گئی تب دفعتاً سیدھی فائرنگ ہونے لگی۔ آنیہ کا دل اچھل کر گلے تک آگیا۔ اس نے نہتے لوگوں کو زخم کھاتے دیکھا۔ قیامتِ صغریٰ کا سا منظر نظر آیا۔ جہاں چند لمحے پہلے ہزاروں لوگ تھے، وہاں اب کربناک آوازوں، افراتفری کی لہروں اور بھاگ دوڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹیلی اسکوپ آنیہ کی آنکھوں سے لگی تھی..... اور یہی وہ لمحے تھے جب اس نے دو نوجوانوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک راسم تھا..... ہاں وہ راسم ہی تھا۔ اس کے سر سے ٹوپی اتر چکی تھی۔ لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے پاس وہی رائفل ''اے کے 57'' تھی۔ وہ جوابی فائر کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر ان قاتلوں کو نشانہ بنا رہا تھا جو نہتے لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ آنیہ نے کچھ انڈین فوجیوں کو ''ہٹ'' ہو کر چھتوں سے گرتے دیکھا۔ جو فوجی دستہ زمین پر تھا، وہ بھی اس اچانک جوابی کارروائی سے بدحواس ہوا۔ وہ فوجی آڑ کی تلاش میں پیچھے ہٹے۔ ان کی رائفلیں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئیں۔ اسی دوران میں بے شمار لوگوں کو بھاگنے اور جانیں بچانے کا موقع مل گیا۔ آنیہ کی نگاہیں راسم پر چپکی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے گولی لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ اس کی گن اس کی گرفت سے نکل کر دور لڑھک گئی۔

''راسم۔'' آنیہ چلا کر رہ گئی۔ چند لمحوں کے لیے اس کا جی چاہا وہ دوڑتی ہوئی جائے اور زخمی راسم کے پاس جا پہنچے، اپنے جسم کو اس کی ڈھال بنا دے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ کرب کے عالم میں اس نے ٹیلی اسکوپ پھر آنکھوں سے لگائی۔ زخمی حالت میں راسم نے اپنی گن پھر اٹھالی تھی۔ اس کے جسم پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ گولی اس کے سینے یا کندھے پر دائیں جانب لگی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔ دونوں پلٹ کر فائر بھی کر رہے تھے پھر وہ جلسہ گاہ سے باہر ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ آنسو گیس کے دھوئیں نے دیکھنا محال کر رکھا تھا مگر آنیہ کی اشک بار نگاہیں اپنے راسم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ راسم اور اس کا ساتھی اب ایک خم دار گلی میں بھاگ رہے تھے۔ کچھ مسلح فوجی ان کے پیچھے لپک رہے تھے، کسی بھی لمحے وہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے۔ انہیں کیا فکر تھی اگر کوئی اور بھی گولیوں کی زد میں آتا۔ کچھ آگے جا کر راسم اور اس کا ساتھی علیحدہ ہو گئے۔ راسم بائیں جانب والی ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے لپکنے والے موت کے ہرکاروں کو جُل دینا چاہتا ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکے گا؟ آنیہ سوچ رہی تھی اور اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ کسی وقت دو تین سیکنڈ کے لیے آنیہ کی نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتا تھا، پھر نظر آنے لگتا تھا۔

پھر وہ آنیہ کو بہت فاصلے پر نظر آیا۔ وہ اب بھی بھاگ رہا تھا لیکن اب اس کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے سامنے گھنے درخت تھے..... اور پھر پہاڑیوں کا طویل سلسلہ تھا۔ یکا یک آنیہ نے دیکھا، ایک جانب سے دو موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے۔ راسم جھپٹ کر ایک سوار کے عقب میں بیٹھ گیا۔ آنیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی اسکوپ کا فوکس درست کیا۔ اس نے دیکھا یہ موٹر سائیکل سوار راجا تھا۔ دوسرا موٹر سائیکل سوار خیرو کا داماد امیر حمزہ تھا۔ اس کے

ماتھے پر ''اللہ اکبر'' کے الفاظ والا ہیڈ بینڈ نظر آرہا تھا۔ وہ تھوڑا آگے گئے تو ایک موٹر بائیک مزید ان میں شامل ہو گئی۔ اس پر بھی دو کشمیری نوجوان سوار تھے۔ انہوں نے چہروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر کوئی لمبوتری چیز جھول رہی تھی..... ہاں وہ راکٹ لانچر تھا..... ایسا ہی راکٹ لانچر دوسرے سوار کے کندھے پر بھی تھا۔ وہ برق رفتاری سے پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گاہے گاہے مڑ کر عقب میں بھی دیکھ لیتے تھے۔ وہ پیچھے آنے والے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے اور ان میں راسم بھی تھا لیکن فی الحال خطرہ کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے..... وہ پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ آنیہ کی ٹیلی اسکوپ اب بھی ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ اپنی رائفلیں لہرا رہے تھے..... وہ نعرے لگا رہے تھے..... اور وہ دور جا رہے تھے۔ پہاڑیوں میں گم ہو رہے تھے..... جب ہونٹ سی دیے جائیں، جب آنکھیں اندھی کر دی جائیں، جب دھڑکنوں کو زنجیر کر دیا جائے تو پھر ایسے ہی ویرانے جانبازوں کو پناہ دیا کرتے ہیں..... اور پھر انہی ویرانوں میں سے ایک دن آزادی کا مسکراتا ہوا سورج طلوع ہوتا ہے۔

ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھ کر آنیہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آج شام اور آنے والی شاموں میں اب یہاں کسی کو نہیں آنا۔ وہ شہادت کا راہی تھا اور اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

انڈین فورسز کی طرف سے اسٹیج کیے جانے والے اس سنگین ہنگامے میں پانچ کشمیریوں کی جان گئی اور کچھ زخمی ہوئے۔ یہ قیمتی جانوں کا نقصان تو بے شک تھا مگر جتنا اندیشہ کیا جا رہا تھا، اتنا نہیں تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ عین موقع پر بھارتی فوجیوں کو اپنی پڑ گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ بھارتی فوجیوں نے اپنی چار لاشیں اٹھائی ہیں اور کئی زخمی بھی ہوئے ہیں۔ جلسے کے شرکا میں سے جو لوگ زخمی ہوئے تھے ان میں سے ایک دلبر سنگھ جی بھی تھے۔ ان کی ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ بھارتی فوجی انہیں مارتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک ''قیدی گاڑی'' میں ڈال کر لے گئے تھے۔ دلبر جی آخر تک ست سری اکال کے پُرجوش نعرے لگاتے رہے تھے۔ شام کے بعد آنیہ کو راسم کا لکھا ہوا خط ملا۔ یہ چھوٹا سا خط وہ بیڈ کے سرہانے کے نیچے رکھ گیا تھا۔

☆☆☆

دو ماہ گزر چکے تھے۔ آنیہ اپنے شہر جالندھر واپس آچکی تھی۔ پاپا ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔ ماما بہت کم بات کرتی تھیں۔ آنیہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ نہار کی کال آئی۔ آنیہ اسی کال کا انتظار کر رہی تھی۔ کل آنیہ نے الٹرا ساؤنڈ اور بلڈ ٹیسٹ کرایا تھا۔ نہار نے کہا۔ ''آنیہ جانی! رپورٹ آگئی ہے مبارک ہو..... رب نے چاہا تو بیٹا پیدا ہوگا۔''

آنیہ کے جسم میں سنسناہٹ جاگی۔ دل عجیب گداز سے بھر گیا۔ وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی الماری تک پہنچی۔ ایک مقفل دراز کھول کر اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ یہ وہی خط تھا جو راسم نے جاتے ہوئے لکھا تھا۔ وہ اسے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

''آنیہ! کشمیر کی غلامی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ آزادی کی صبح ضرور طلوع ہوگی۔ بہت جلد ایک ایسا سورج نکلے گا جو سہانے موسموں کی نوید دے گا۔ اس صبح مجھے بھی یاد کرنا..... بھول نہ جانا۔ ارے تم تو پھر آنکھوں میں موتی لے آئی ہو..... اچھا چلو..... دوسری بات کرتے ہیں..... اس دن وہ چھ شمعیں بجھ گئی تھیں لیکن ایک شمع کے سرے پر ایک چنگاری تو موجود تھی ناں۔ چلو اتنی ہی امید سہی۔ جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی اور میں تب تک زندہ بھی ہوا تو تمہارے پاس لوٹ آؤں گا..... ہاں آنیہ! بس یہ دو ہی شرطیں ہیں، آزادی کی صبح اور میری زندگی..... اور اگر نہ آسکا تو تم پوری طرح آزاد ہو۔ ایسی صورت میں بس ایک ہی درخواست ہے میرے بچے کو میرا نام اور میرا کام بھولنے نہ دینا۔ اللہ حافظ۔

آنیہ نے آنکھیں پونچھیں۔ خط کو تہ کر کے پھر سے بڑی احتیاط کے ساتھ دراز میں رکھا، کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ سردی کی یخ بستہ رات دھیرے دھیرے در و بام پر اتر رہی تھی۔ یہ گرم بستروں میں جانے کا وقت تھا۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے دور شمال کی طرف دیکھا۔ اس کی ''نگاہِ تصور'' کے سامنے کشمیر کی وادی آئی۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے درمیان کچھ گونجتی ہوئی آوازیں اس نے سنیں۔ بارود کی آوازیں، لہو کے بہنے کی آوازیں، اور للکارنے کی آوازیں..... اور پھر کچھ مناظر اس کے تصور میں ابھرے۔ کچھ سربکف مجاہد اپنے ہدف پر عقابوں کی طرح جھپٹ رہے تھے، پلٹ رہے تھے، پھر جھپٹ رہے تھے۔ وہ لہولہو تھے اور پکار رہے تھے۔ ''لے کے رہیں گے آزادی..... لے کے رہیں گے آزادی۔''

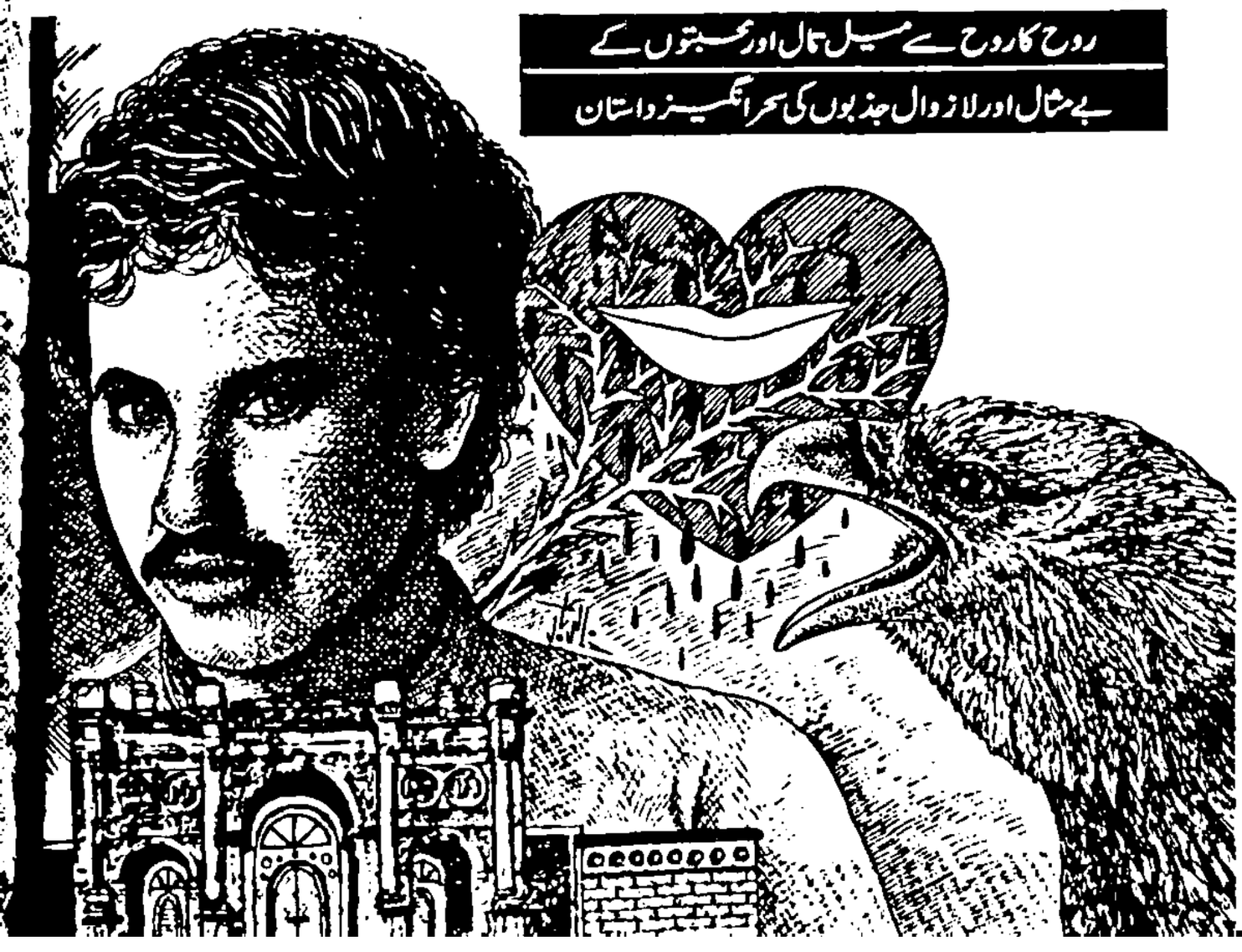
❖❖❖

غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کر دیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہو جائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولو گے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ اگرچہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس لیے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفرِ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کر دیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے میل تال اور محبتوں کے
بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان





سہ پہر ختم ہورہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ سہ پہر اور شام کے اس درمیانی وقفے میں ایک اداس ہوا چلتی تھی جو اس ریگستانی علاقے میں ریت کے ذرّوں کو یہاں سے وہاں لے جاتی تھی۔ اس اداس ہوا میں ایک سناٹا سا تھا جیسے..... دور بیابانوں میں بانسری کے لطیف سُروں پر کوئی اجنبی ساغم ہلکورے لے رہا ہو، سناٹے کا اَن دیکھا پھیلاؤ اسے اچھا لگتا تھا۔ سناٹے کی اَن سنی تانیں اس کے دل کے تار چھیڑتیں، اسے گدگداتی تھیں۔ تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ ماں جیسی شفیق ہستی سے وہ آشنا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے جانا ہی نہ تھا کہ باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے؟ بہن بھائی، رشتے دار، یہ سب کچھ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ جیسے تنہا آسمانوں سے پھینکا گیا تھا۔ شاید وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھا جو غلطی سے اس کرۂ ارض پر اتر آیا تھا۔

وہ ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتا تو بچپن کی جو پہلی یاد اس کے ذہن میں آتی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ ایک کھیت کے کنارے کھالے کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے اور تیرنے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک احساس اسے بتاتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ پاؤں نہ چلائے تو وہ پانی کے اندر چلا جائے گا اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو برسوں بیت چکے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوئی اور سڈول تھی۔ اس کے بازو معمول سے لمبے اور مسل مضبوط تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جیسے ایک بے قراری سی کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ وہی بے قراری جو بندے کو کسی جگہ ٹکنے نہیں دیتی۔ وہ بھی کہاں ٹکتا تھا۔ لاہور میں تھا تو اس نے دو تین ٹھکانے بدلے تھے۔ پھر وہ پنڈی چلا گیا۔ پنڈی میں ایک بندے سے اس کا جھگڑا ہوا۔ جھگڑے نے طول پکڑا تو وہ وہاں سے بھی نکل آیا۔ کراچی کے ساحل نے چار سال تک اس کے پاؤں پکڑے رکھے مگر اس کی بے چین طبع نے اسے وہاں بھی مستقل ڈیرا نہیں ڈالنے دیا۔

ہاں، تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ اجنبی سناٹے سے اس کا پہلا عشق تھا۔ تنہائیوں، سناٹوں اور اجنبی ویرانوں کی بہترین جگہ ریگستان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی اور اب وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ ماہ سے وہ چولستان میں تھا..... ترنڈا کا ایک قریبی گاؤں منڈ بھیرو اس کا مسکن تھا۔ پنڈی کے ایک پرانے دوست نے کراچی میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ منڈ بھیرو لے آیا تھا..... اور اب پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے وہ اس کے ساتھ اس کے تباہ شدہ گھر کی چھت تعمیر کرنے میں اس کی مدد کررہا تھا۔

ہاں تو سہ پہر ختم ہورہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ وہ ایک ریتیلے ٹیلے پر نیم دراز دور افتادہ سناٹوں سے اٹھنے والی بانسری کی غم انگیز آواز سن رہا تھا۔ اس نے نشیب میں دیکھا جہاں پانی ذخیرہ کرنے والے وسیع تالاب نما جوہڑ کا پانی سورج کی روشنی میں لشکارے مار رہا تھا۔ اس نے ایک جیپ دیکھی جو دھول اڑاتی، تیزی سے تالاب کے پاس سے گزر رہی تھی پھر اچانک کچھ عجیب ہوا۔ تیز رفتار جیپ نے ایک دو ہچکولے کھائے۔ بری طرح لہرائی پھر ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔ جیپ نے باقاعدہ قلابازی کھائی اور ایک زبردست چھپاکے کے ساتھ پانی میں جا گری۔ وہ آڑی گری تھی، اس کے دونوں عقبی پہیے نظر آرہے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ دونوں پہیے بھی اوجھل ہوگئے اور صرف پچھلا بمپر اور اسکرین وغیرہ ہی پانی سے باہر رہ گئے۔

آس پاس کوئی نہیں تھا بلکہ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آتا تھا۔ دلاور نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس نے جیپ الٹتے وقت دور سے مدھم سی نسوانی چیخ بھی سنی تھی۔ وہ اٹھا اور کسی چھلاوے کی طرح بے ساختہ ڈھلوان پر دوڑتا چلا گیا۔ اس کے چوڑے مضبوط پاؤں جیسے ریت پر بھنور سے بنا رہے تھے۔ تالاب تک تقریباً 100 میٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے آناً فاناً طے کیا اور ایک جست لیتا ہوا پانی میں کود گیا۔ وہ اس تالاب کی گہرائی سے واقف تھا۔ آڑی ترچھی جیپ اب مکمل طور پر پانی میں ڈوب چکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہاتھ پاؤں مار کر رہ جاتا لیکن وہ لہروں کا شناور تھا، پانی میں اترنا اور اس سے لڑنا جانتا تھا۔ اس نے سانس باہر نکالی اور دس بارہ فٹ نیچے چلا گیا۔ ایک لڑکی کے بال اس کے ہاتھ میں آئے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا اور کنارے پر ڈال دیا۔ لڑکی چند سیکنڈ سے زیادہ پانی میں نہیں رہی تھی مگر مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی کوئی چوٹ تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور فیشن ایبل لباس میں تھی۔ لگتا تھا کہ شہر کی رہنے والی ہے۔

شاید دلاور ابھی کچھ دیر مزید اسے دیکھتا رہتا مگر وہ جانتا تھا کہ ابھی کم از کم ایک فرد اور پانی کے اندر ہے۔ اس نے دوبارہ پانی میں جست کی اور غوطہ لگا کر جیپ تک پہنچ گیا۔

دروازہ کھل جانے سے لڑکی تو خود بخود پانی میں گر گئی تھی مگر اس کا ساتھی ابھی تک جیپ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس

نے سیفٹی بیلٹ بھی لگا رکھی تھی۔ دلاور نے دیکھا کہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی ہے اور آنکھیں بند ہیں، وہ شدید خطرے میں تھا۔ دلاور نے اس کی سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیلٹ بری طرح بکل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بکل کو توڑ کر یا بیلٹ کو کاٹ کر ہی اس شخص کو آزاد کرایا جاسکتا تھا۔ یہ لمحے اس شخص کی زندگی کے لیے بڑی قیمتی تھے۔ دلاور کا سانس سینے میں گھٹنا شروع ہوگیا۔ اگر وہ تازہ سانس لینے کے لیے سطحِ آب پر چلا جاتا تو پھر شاید دیر ہوجاتی۔ وہ پانی میں ہی رہا اور دیوانہ وار سیفٹی بیلٹ سے الجھتا رہا۔ آخر معجزہ ہوگیا۔ دلاور کے زور لگانے سے بکل کا کچر ٹوٹ گیا اور بے ہوش شخص اس جان لیوا بندش سے آزاد ہوگیا۔ دلاور نے اسے کھینچ کر جیپ سے نکالنے کی کوشش کی۔ جیپ کے الٹنے سے اسٹیئرنگ کا اینگل ایسا ہوگیا تھا کہ وہ شخص بہ آسانی ڈرائیونگ سیٹ سے جدا نہیں ہو پا رہا تھا۔ دلاور نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی آسان کی اور اس شخص کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سطحِ آب پر لے آیا۔ قریباً چھ منٹ بعد، بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی اور اس کے جسم و جاں میں پھر سے زندگی دوڑ گئی۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی، دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ بس درخت اور ریتیلی زمین کے نشیب و فراز تھے۔ وہ بے ہوش نوجوان کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور لٹا دیا۔ تب اس کی نگاہ دوبارہ خوبرو لڑکی پر پڑی۔ اس کی قمیص بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور بھیگی لٹیں بل کھا کر ایک رخسار کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ سورج کی ترچھی روشنی اس چہرے کو کچھ یوں منور کررہی تھی کہ وہ دیکھتا ہی چلا گیا۔ کچھ لمحے بڑے انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔ ان میں صدیوں کی وسعت ہوتی ہے اور کوئی ایسی توانائی ہوتی ہے جو پلک جھپکتے میں پوری زندگی کا احاطہ کرلیتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی ساعتیں تھیں۔ دلاور سب کچھ بھول بھال کر اس چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ کوئی نادیدہ کشش تھی جو اسے اس چہرے کے بالکل قریب لے گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ سانسوں کی آہٹ تک محسوس کرنے لگا۔ وہ عجب سوکی جاگی سی کیفیت تھی۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ بے ساختہ آگے کو جھکا تھا۔ پھر کیا ہوا، کیسے ہوا، سب کچھ ایک سحر انگیز دھندلکے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا جو شاید دنیا میں سب سے حسین ترین تھے۔ یا پھر وہ سب سے حسین ترین نہیں تھے لیکن اس جادوئی ماحول نے، سورج کی ان ترچھی کرنوں نے اور روہی کی مست کردینے والی ہوا نے انہیں حسین ترین بنا دیا تھا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا، اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ مدہوشی کی سی کیفیت تھی لیکن اس کے اندر سے ایک طرح کی ملامت کا احساس بھی نمودار ہورہا تھا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا، پھر اس سے یہ کیونکر ہوا؟

اچانک اسے خیال آیا کہ چند فٹ کے فاصلے پر وہ نوجوان بھی اوندھا پڑا ہے جسے اس نے موت کے منہ سے نکالا ہے اور جس کو ابتدائی طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ وہ پلٹا اور اس نوجوان پر جھک گیا۔ اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں یقیناً پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی کمر پر دباؤ ڈال کر اس کے اندر سے پانی نکالنے لگا۔ کافی پانی نکلا۔ تب اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بہت مدھم تھی، جیسے کسی اتھاہ کنویں میں پانی ہلکورے لے رہا ہو۔ وہ اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے ہوش نوجوان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا، پھر اس نے دو الٹیاں کیں..... وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دلاور کی مسلسل کوشش بے ثمر نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں خوبرو لڑکی بھی ہوش میں آچکی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی پھر اس کی نگاہ بے ہوش نوجوان پر پڑی۔

''شاہ زمان..... شاہ زمان!'' وہ چلاتی ہوئی اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے بھیگے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔

دلاور نے حوصلہ کرکے لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''میڈم! آپ حوصلہ رکھیں۔ یہ جلد ہوش میں آجائیں گے..... یہ دیکھیں..... ان کی پلکوں میں حرکت ہورہی ہے۔''

''اوہ گاڈ..... یہ کیا ہوگیا ہمارے ساتھ۔'' لڑکی کبھی اپنے ساتھی کی طرف اور کبھی اس تالاب کی طرف دیکھتی تھی جہاں ان کی جیپ پانی کے اندر گئی تھی۔

کچھ دیر بعد نوجوان کے حواس بھی بحال ہونے لگے۔ وہ مچی مچی آنکھوں سے تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کچھ چوٹیں آئی تھیں لیکن چہرے پر کوئی ایسا خاص نشان نہیں تھا۔ دلاور کو لڑکی کا نام سویرا معلوم ہوا۔ اس نے جدید تراش کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کو جو واحد چوٹ لگی تھی وہ اس کے سر پر تھی۔ کنپٹی کی طرف ایک گومڑ بن گیا تھا جس میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

اسی دوران میں قریبی گوٹھ سے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو بکریاں چرانے والے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ آناً فاناً شاہ زمان اور سویرا کو ایک اونٹ گاڑی پر بٹھا کر گوٹھ میں ایک ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ پاؤں کی شدید چوٹ کی وجہ سے شاہ زمان کو چلنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

گوٹھ کا چودھری ''رحیم سائیں'' شاہ زمان کے بڑے بھائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ فوری طور پر ان کو طبی امداد دی گئی۔ سویرا کو ڈیرے سے تھوڑی دور ایک حویلی کے زنان خانے میں بھجوا دیا گیا۔ سویرا کی ایک کلائی پر گہری خراش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی خراشیں تھیں لیکن شاہ زمان کی حالت پتلی تھی۔ اس کا ایک بازو نہیں مل رہا تھا، جبکہ ٹخنے کے قریب گہرا زخم آیا تھا۔ اس زخم کی وجہ یہ تھی کہ جیپ الٹتے وقت یہ پاؤں بریک پیڈل میں پھنس گیا تھا۔

رحیم سائیں نے فوری طور پر گاؤں کے ماہر کمپاؤنڈر کو بلایا اور اپنے سامنے شاہ زمان کے ٹخنے اور بازو کی ڈریسنگ کروائی۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر دو جیپیں آ کر کھڑی ہوئیں۔ ان میں سے دھڑا دھڑ لوگ اترنے لگے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ان کی قیادت کرنے والا پیر فضل تھا۔ بھاری تن و توش، گہری گندمی رنگت، سفید چھدری ڈاڑھی اور سر پر مخصوص چولستانی پگڑی۔ وہ سیدھا شاہ زمان کے پاس آیا۔ شاہ زمان نیم دراز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ زمان کو اپنے ساتھ لگایا اور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''وہی رانی تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں چاچا! وہ ٹھیک ہے، بس معمولی چوٹ آئی ہے۔'' وہ نقاہت سے بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں..... تو ہیر شیر ہے۔ میں نے جیپ پانی میں سے نکلوالی ہے۔ اپنے بندے ٹارچوں کی روشنی میں گڈی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایک ٹائر میں ہوا نہیں ہے۔ کہیں کوئی فائر شائر تو نہیں لگا؟''

''نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر ہوا کیا ہے؟''

''بس قسمت میں یہ چوٹیں لکھی تھیں۔ اسپیڈ تھوڑی سی تیز تھی۔ ایک کھڈے کی وجہ سے جیپ اچھلی اور کنٹرول سے باہر ہو گئی؟''

''تجھے کتنی دفعہ کہا ہے پتر! گڈی کو گڈی سمجھا کر، ہوا کا گھوڑا نہ سمجھا کر۔'' وہ اپنی بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ قریب کھڑے دلاور پر پڑی۔ دلاور بڑے دھیان سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

''یہ منڈا کون ہے؟'' پیر فضل، دلاور کو بغور دیکھ کر بولا۔

''یہی تو ہے چاچا..... جس نے ہم دونوں کو موت کے منہ سے نکالا ہے۔'' شاہ زمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا..... اور کہاں کے رہنے والے ہو؟'' پیر فضل کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا۔

''دلاور نام ہے جی..... میں منڈ بھیرو ..... میں رہتا ہوں۔''

''یہاں کے تو نہیں لگتے۔ کہاں سے آئے ہو؟'' پیر فضل نے پوچھا۔

''میرا دوست مجھے کراچی سے یہاں لایا ہے۔ چند مہینے سے یہاں اس کا مہمان ہوں۔''

اسی دوران میں ڈیرے کا مالک رحیم سائیں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ پیر فضل نے کھڑے ہو کر اس سے معانقہ کیا اور اچھے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

رحیم سائیں نے کہا۔ ''بچوں کی جان بچ گئی ہے، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہیں اور اس خوشی میں سے یہ خوشی بھی نکلی ہے کہ آپ لوگ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ بڑے بخت کی بات ہے۔''

رحیم سائیں اور پیر فضل ساتھ ساتھ بیٹھے۔ ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی میزوں پر کھانا چن دیا گیا۔ پیر فضل کے بے حد انکار کے باوجود انہیں کھانے کی دعوت قبول کرنا پڑی۔ شاہ زمان کی طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں تھی۔ اس نے بس چند لقمے لینے پر اکتفا کیا۔ کھانے کے دوران میں جب دلاور کو علیحدہ سے کھانا دیا جانے لگا تو شاہ زمان نے منع کر دیا اور اسے اپنے برابر میں بٹھا کر کھانا کھلایا۔

شاہ زمان خاموش تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی عجیب نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھتا تھا۔ ان نگاہوں میں احسان مندی کے رنگ لہریں لیتے تھے اور احسان مندی کیوں نہ ہوتی۔ جان بچانے والا تو اللہ ہوتا ہے لیکن جو کچھ دلاور نے کیا تھا، شاید کوئی اور نہ کر سکتا۔ جیپ تو مکمل ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر گہرے غوطے میں گیا تھا اور سخت کوشش کر کے پہلے سویرا اور پھر اسے نکال لایا تھا۔ اگر اس کا سانس ٹوٹ گیا ہوتا تو پھر ..... شاید

تالاب سے تین لاشیں ہی نکلتیں۔

پُرتکلف کھانے سے فارغ ہوکر پیر فضل نے سگار سلگا لیا اور موبائل فون پر شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کو خیر خیریت کی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ لوگ جیپ کو فی الحال یہیں پر چھوڑ رہے ہیں تاکہ اسے چلنے کے قابل بنایا جاسکے۔ اس کے بعد پیر فضل اور شاہ زمان نے رحیم سائیں کا پھر شکریہ ادا کیا اور سویرا کو بلوانے کا کہا۔

سویرا کا نام سن کر یکبارگی دلاور کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سویرا بڑی سی چادر میں لپٹی لپٹائی باہر برآمدے میں آئی تو پیر فضل نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''جیوندی رہ وڈی رانی۔''

سویرا نے سر جھکا کر پیار وصول کیا۔ اسی دوران میں کریم کلر کی پھولدار چادر میں لپٹی ہوئی سرو قد سویرا نے ذرا ترچھی نظر سے دلاور کی طرف دیکھا۔ یہ نظر جیسے کسی ورمے کی طرح دلاور کے سینے سے آر پار ہوگئی۔ وہ بس ''ایک'' نگاہ ہی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ جتنی دیر وہاں کھڑے رہے، سویرا بالکل لاتعلق ہی رہی۔

وقتِ رخصت رحیم سائیں نے مٹھائی کے دو بڑے بڑے تھال پیر فضل کو پیش کیے اور صدقے کے طور پر ایک کالے بکرے کی قربانی ان کے سامنے کی۔

شاہ زمان کو کرسی پر بٹھا کر دو کارندوں نے اٹھالیا۔ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے شاہ زمان نے ایک کارندے سے کہا۔ ''دیکھو، دلاور کہاں ہے؟''

دلاور جیپ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ کارندہ دلاور کو بلا لایا۔

شاہ زمان، دلاور کو خاموشی سے دیکھتا رہا..... پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ میٹھے لہجے میں بولا۔ ''دلاور! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ دو چار دن حویلی میں ہمارے مہمان رہو۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر ہم سب کو بہت اچھا لگے گا۔''

دلاور کے کانوں میں جیسے شادیانے سے بج اٹھے۔ ایک بار پھر وہی چہرہ اور وہی ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ وہ کیا لمحے تھے؟ وہ کیا جادو تھا؟ وہ سب کچھ کیوں ہوگیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کوئی مقناطیس سا تھا جو اپنی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا..... اور اس کی تمنا کے عین مطابق اسے چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس نے پہلے تو تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، پھر اپنے احسان مند میزبانوں کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔

منڈ بھیرو کے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ ''چوڑیرو'' نامی اس گاؤں کی خاص بات وہ خوبصورت نخلستان تھا جو ریگستانی پٹی کے ساتھ ساتھ چودہ پندرہ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ وہاں مال مویشی چرتے تھے۔ فربہ بھینسیں آزادانہ گھومتی تھیں اور خاص قسم کی بھیڑیں تھیں جن کے منہ سفید اچلے اور جسم پر خوبصورت چتکبرے دھبے سے تھے۔ تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ بڑے سائیں کی تقریباً پانچ ایکڑ پر پھیلی ہوئی حویلی مغلیہ دور کے کسی قلعے کی یاد دلاتی تھی۔ بلند فصیلیں، تین فٹ چوڑی دیواریں، اصطبل، نایاب گھوڑوں کے جتھے، دو کوہانی سفید اونٹ، شکاری کتے، چھیل چھبیلی ملازماؤں کی چہل پہل، دست بستہ ملازموں اور ہرکاروں کی فوج..... دلاور نے یہ شاندار حویلی دیکھی اور بس دیکھتا رہ گیا۔

درحقیقت دلاور کے پاؤں سے بگولے بندھے ہوئے تھے۔ وہ آزاد طبع رکھتا تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا شاید اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی بندھن میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شتر بے مہار تھا۔ اسی لیے اس نے پنڈی چھوڑا، اسی لیے شہر لاہور کے دلکش بھنور، جو بہت سوں کو جکڑ کر مفلوج کردیتے ہیں، اس کا راستہ نہ روک سکے، اسی لیے شاید وہ کراچی کے ساحل کی گیلی ریت کو پاؤں سے دھکیلتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اور اب وہ یہاں اس حویلی میں تھا۔ منڈ بھیرو سے چلتے وقت دلاور نے اپنے دوست ملانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ملانی بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ پیر فضل تو حویلی میں داخل ہوتے ہی اپنے دو گن مین لے کر حویلی کے جنوب کی طرف چلا گیا۔ شاہ زمان اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوتے ہی سرتاپا ''بڑا سائیں'' نظر آنے لگا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے بہت سی خواتین کھڑی تھیں۔ اس کی کرسی جب برآمدے میں رکھی گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ زمان کا رنگ گورا، بال گھنگرالے، بھویں موٹی اور آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ چوڑے جبڑے اس کی سخت مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا خواتین کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر جس عورت نے اس کا ماتھا چوما، وہ ادھیڑ عمر آپا صوفیہ تھی۔ سب انہیں بڑی آپا کہتے تھے۔ وہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کی سب سے بڑی بیوی تھیں۔ وہ

دلاور کو ایک باوقار اور نہایت زیرک عورت لگیں۔ ایک ایسی خاتون جس نے بہت دکھ سہہ کر اور زمانے کا بہت سا "سرد گرم" دیکھ کر اب اپنی زندگی کے لیے مناسب راستے ڈھونڈ لیے ہوں۔

انہوں نے دراز قد شاہ زمان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ "آپا صدقے، تو ٹھیک تو ہے نا؟"

شاہ زمان بولا۔ "بڑی آپا! خدا کا شکر ہے، اس نے نئی زندگی دی ہے ہم دونوں کو۔"

بڑی آپا نے شاہ زمان کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد سویرا کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ دلاور فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ جتنی بار بھی سویرا پر پڑی تھی، بس وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں حویلی کی دیگر خواتین آگے بڑھ کر سویرا اور شاہ زمان کی بلائیں لینے لگیں۔ دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ سویرا اور شاہ زمان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

اسی دوران میں شاہ زمان نے دلاور کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی آپا کو بتایا کہ یہی وہ بندہ ہے جس کے وسیلے سے آج ان دونوں کی جان بچ پائی ہے۔ بڑی آپا نے دلاور کو سر تا پا دیکھا پھر بڑے شائستہ انداز میں اس کے لیے شکریے اور تعریف کے الفاظ ادا کیے۔ بڑی آپا نے دلاور کی طرف دیکھ کر شاہ زمان کے کان میں ایک دو سرگوشیاں بھی کیں۔

دلاور اور ملتانی کو بڑی محبت کے ساتھ مہمان خانے کے ایک شاندار کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی میزبانی میں کسی طرح کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ ملتانی خوش خوراک تھا۔ موجودہ صورتِ حال اس کے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ ملتانی کو اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کھانے والی اشیا کے اشتہار وہ خاص رغبت سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ پانچ چھ جماعتیں ہی پڑھا تھا۔ اس کے برعکس دلاور نے کھینچ تان کر ایف اے پاس کر رکھا تھا۔ وہ صرف کھانے کے اشتہاروں کے لیے اخبار نہیں دیکھتا تھا بلکہ اسے پڑھتا بھی تھا۔

اگلے روز ملتانی حویلی میں تھوڑا سا گھوما پھرا۔ اس نے ملازمین سے باتیں کیں اور تھوڑی بہت سن گن بھی لی۔ اسے پتا چلا کہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان نے چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی بیوی آپا صوفیہ اور سب سے چھوٹی جو حال ہی میں بیاہی گئی ہے، شاہدہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شاہ زمان حالانکہ چھوٹا ہے پھر بھی اسے بڑا سائیں کہا جاتا ہے اور وہ اس لیے کہ وہ بڑے بھائی سے زیادہ قابل اور سمجھ دار ہے..... اور چوڑیرو کے لوگ اس کی بے پایاں صلاحیتوں کی وجہ سے اسے ہی بڑا سمجھتے ہیں، جبکہ اصل بڑا یعنی شاہ فرمان زیادہ تر نشے میں غرق رہتا ہے۔ شاہ زمان کے بارے میں ملتانی کو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے لیکن جلد ہی اس کی شادی رچنے والی ہے۔

شام کے وقت دلاور نے کمرے کی کھڑکی میں سے باغیچے کی طرف دیکھا۔ وہاں شاہ زمان کھڑا تھا۔ زخمی پاؤں کی وجہ سے اس نے ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھام رکھی تھی۔ اس کے قریب وہی ماہ رخ، پری پیکر تھی جس نے پلک جھپکتے ہی دلاور کے دل کی دنیا زیر و زبر کر ڈالی تھی..... ہاں وہ سویرا تھی۔ لمبے بال کمر تک جا رہے تھے، ریشمی اوڑھنی ان بے بہا بالوں کو سنبھالنے میں ناکام تھی۔ وہ شاہ زمان سے بات کر رہی تھی۔ شاہ زمان موچھوں پر انگلی پھیر رہا تھا اور بڑی پُرتپش نظروں سے سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمانے والے انداز میں مسکرائی اور پھر رخ پھیر کر سفید گلابوں کی کیاری کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک خاص دلکشی تھی اس کے نقوش میں۔

دلاور کے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ تو کیا سویرا ایسی وہ لڑکی تھی جس سے شاہ زمان کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی؟ وہ بے ساختہ سویرا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ آس پاس کا سارا منظر جیسے فیڈ آؤٹ ہو گیا۔ اس کے سامنے بس وہ دلکش مرمریں مورتی رہ گئی جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مجموعی خوبصورتی کی طرح لاجواب تھی۔ اس نے سوچا..... بے پناہ خوبصورت لوگوں کی ہنسی بھی ایسی ہی لاجواب ہونی چاہیے۔ اچانک اس نے خود کو اس "فرانس" میں سے نکالا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ وہ ایسا تو نہیں تھا؟ وہ تو کسی کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ پھر یہ کیسا منہ زور جذبہ تھا جو اسے اپنے ساتھ بہائے چلا جا رہا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی جو اس کے وجد کی طنابیں کھینچ رہی تھی؟

شاید کچھ معاملات انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتے۔ کچھ بے پناہ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتے ہیں۔ کچھ احساسات، جن کی ڈوریاں دستِ غیب سے حرکت میں آتی ہیں۔

سویرا آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھی اور دلاور زندگی کے صحرا میں اڑنے والا ریت کا ایک ذرہ۔ وہ چوڑیرو کی امیر زادی تھی اور وہ مگر مگر گھومنے والا بنجارا جسے اپنی ابتدا، اپنے ماضی کا بھی علم نہیں تھا۔ انجانے میں ایک جذبہ تھا جو

دلاور کے دل میں نمو پا چکا تھا۔ انسان کے اندر کوئی بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا ادراک سب سے پہلے خود اسی کو ہوتا ہے۔ دلاور سمجھ چکا تھا، کوئی بہت بڑی تبدیلی احساسات میں آچکی ہے۔

یہ دوسری رات کی بات ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بیڈ روم بہت شان دار تھا۔ ملتانی نے مرغ پلاؤ اور خالص دودھ کی کھیر بہت سیر ہو کر کھائی تھی۔ اب وہ سو سیر کا بچھ اوندھے منہ پڑا خراٹے لے رہا تھا مگر دلاور کی آنکھوں سے نیند روٹھ چکی تھی۔ وہ جونہی آنکھیں بند کرتا، دو گلابی ہونٹ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی یہی ہوا تھا، وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سنگِ مرمر کی تپائی سے جگ اٹھایا، پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی بار میں پی گیا۔ اسے گرمی محسوس ہونے لگی، دل گھبرانے لگا۔ وہ بیڈ سے اترا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ رات کا شاید پچھلا پہر تھا۔ مشرق کی طرف سے ہلکی صحرائی ہوا چل رہی تھی۔ وہ صحن میں آیا۔ یہاں زنانے اور مردانے حصے کے درمیانی احاطے میں ایک طرف دو جھولے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے کافی وسیع گراسی لان تھا جہاں انواع و اقسام کے پھول اور پھل دار پودے تھے جن میں سے زیادہ تر جنوبی پنجاب سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ لان کے اختتام پر اینٹوں کی سولنگ والا ایک اور احاطہ تھا جہاں جیپیں اور دیگر گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے ملازمین کے رہائشی کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی بائیں جانب زنانے حصے کی دو منزلہ عمارت تھی جو درختوں کے پیشِ منظر میں آدھی چھپی، آدھی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے کچھ کمروں میں مدھم روشنی تھی جو بیش قیمت پردوں سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی کسی کمرے میں سویرا سو رہی ہوگی۔ وہ بے مثل حسن سوتے میں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا حسن کے سونے کا انداز بھی حسین ہوتا ہے؟ ایک بار پھر وہی دو لب..... تھوڑے سے نم..... تھوڑے سے گرم اس کے تصور میں آن دھمکے۔ اس نے سوچا اگر اس وقت تالاب کے کنارے، کوئی اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

اس نے جھرجھری سی لی اور خیالات کے نرغے سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

چہل قدمی کرتا ہوا وہ ملازمین کے کوارٹرز سے آگے چلا گیا۔ وہاں کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ وہ ابھی واپس مڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے درختوں سے آگے کچھ کھٹ پٹ سی سنائی دی۔ وہ چونک گیا اور دبے پاؤں چل کر سرعت سے ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ وہ چند ملازمین تھے جو ڈھائی تین فٹ مربع کے تین چار چوبی ڈبے اٹھائے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ تجسس کے سبب اس کی تمام خوابیدہ حسیات جاگ اٹھیں۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں سے ملازمین کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی ہمت کی اور درمیانی فاصلہ کچھ اور کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے منظر تھوڑا اور واضح ہو گیا۔ وہ پانچ افراد تھے جو لکڑی کے چوکور ڈبوں کو بڑی احتیاط سے اٹھائے ایک تاریک دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ڈبوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی نظر آرہے تھے۔

ان ڈبوں میں کیا تھا؟ رات کے اس پہر اتنی رازداری سے یہ کام کیوں کیا جا رہا تھا؟ کئی سوال دلاور کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ ملازمین تاریک دروازے میں داخل ہو کر اوجھل ہو چکے تھے۔ باہر سناٹے میں بس مدھم صحرائی ہوا کی سرگوشی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا تاریک دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے سے آگے سیڑھیاں کسی تہ خانے میں اتر رہی تھیں۔ ملازمین سیڑھیوں کے نچلے سرے تک پہنچ چکے تھے۔ دلاور دروازے کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے عقب سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہیں کھڑا رہے یا پلٹ جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچتا، نیچے کسی ملازم کے ہاتھوں سے ڈبا چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ پھر اچانک کوئی چیز پھڑ پھڑانے لگی۔ پورے تہ خانے میں جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ ملازمین میں افراتفری پھیل گئی۔ وہ ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ننگی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

پھر ایک ملازم تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر آیا۔ دلاور نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کر دیتا تو اس شخص کی نظر میں آجاتا۔ اس شخص نے بڑی عجلت میں تہ خانے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔

دلاور دیوار سے پشت لگائے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ یہ ابھی، اس نے کیا دیکھا تھا۔ لکڑی کے چوکور ڈبے میں کیا تھا جو نکلا تھا اور پھڑ پھڑانے لگا تھا؟

دور کہیں مغرب کی جانب کسی ریگستانی گلی کی چھوٹی سی مسجد سے اذانِ فجر کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ اس نے

اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو ملتانی جاگ چکا تھا اور اس کی غیر حاضری پر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا..... دلاور کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔''

ملتانی بولا۔ ''کھانا تو میں ڈٹ کر کھاتا ہوں اور اینٹھن تمہارے پیٹ میں ہونے لگتی ہے۔''

''یہی تو سچی دوستی کا ثبوت ہے۔'' دلاور نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

ملتانی تو تھوڑی دیر باتیں کرنے کے پھر بعد سو گیا مگر دلاور جاگتا رہا۔ اس کا ذہن بار بار تہ خانے والے واقعے کی طرف جا رہا تھا۔

صبح دلاور کے لیے بے حد خوبصورت تھی۔ بیڈ روم سے نکل کر جب وہ نشست گاہ میں آیا تو سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ ایک چھوٹی ٹیبل پر ناشتا لیے بیٹھی تھی۔ چہرہ پر سوں رات سے بھی زیادہ پیارا اور روشن دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دودھ اور میدے سے نہا کر نکلی ہے۔ ملازمہ جھک کر ناشتے کی چیزیں ترتیب سے میز پر رکھ رہی تھی۔ سویرا تمکنت سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اب تک کے مشاہدے میں دلاور نے نوٹ کیا تھا کہ سویرا نہ صرف پڑھی لکھی اور روشن خیالات والی لڑکی ہے بلکہ کافی حد تک صاف گو اور بے تکلف بھی ہے۔ بے شک حویلی کا ماحول جاگیردارانہ رنگ ڈھنگ کا تھا مگر سویرا اپنے حلیے سے لے کر اپنی بول چال تک بالکل ماڈرن لگتی تھی۔

''ہیلو مسٹر دلاور۔'' وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے؟''

دلاور کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہ مؤدب انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''سویرا بی بی! آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکریہ لیکن..... آج رات میں..... ایک پل کے لیے بھی سو نہیں سکا۔''

وہ تھوڑی پریشان ہو گئی۔ ''کیوں؟ کوئی مسئلہ تھا؟''

وہ کہنا چاہتا تھا..... سب سے بڑا مسئلہ تو آپ ہیں سویرا بی بی..... لیکن کہہ نہیں سکا۔ ''اصل میں مجھے نئی جگہ نیند نہیں آتی۔'' اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو تمہیں بڑی مشکل پیش آتی ہو گی..... میرا مطلب ہے، تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تم شہر شہر اور بستی بستی گھومتے ہو۔''

وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ اسی دوران میں سویرا نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بڑی احتیاط سے کپ سویرا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں..... پہلے دو چار دن مشکل پیش آتی ہے، پھر میں عادی ہو جاتا ہوں۔''

سویرا کی تیز نگاہیں دلاور کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ نروس سا ہونے لگا۔ اپنی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے اس نے بیڈ روم کی طرف رخ کر کے ملتانی کو آواز دی۔ اس دوران میں سویرا نے ایک جیم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں کھنکھنا اٹھیں۔ وہ ایک سلائس پر جیم لگاتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم کچھ پریشان نظر آتے ہو؟''

''نن..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

سویرا نے ملازمہ سے کہا کہ وہ بیڈ روم سے ملتانی کو بلا لائے۔ ملازمہ جونہی کمرے سے نکلی، سویرا تھوڑا آگے ہوئی اور اس نے نہایت بے تکلفی اور اعتماد سے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''تھینک یو ویری مچ دلاور! تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بچانے والا تو بیشک اوپر بیٹھا ہے مگر وہ بچانے کا کام اپنے ہی کسی بندے کو سونپتا ہے نا۔''

دلاور کا سارا وجود جیسے اس نرم و نازک ہاتھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا، گھڑیاں ختم جائیں، وقت رک جائے..... اور وہ اسی مہرباں بوجھ تلے پڑا رہے۔ اس نے سویرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ ''میں کسی قابل نہیں ہوں سویرا بی بی! بس اوپر والے نے مجھ سے یہ کام لینا تھا، لے لیا.....''

سویرا کی کنپٹی پر ابھی تک ایک چھوٹی سی بینڈیج موجود تھی۔ وہ بے دھیانی میں اپنی اس چوٹ کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''جب جیپ پانی میں گری، تم اس وقت کہاں تھے؟''

دلاور نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ کیسے اس نے جیپ کو لہراتے اور زوردار آواز سے پانی میں گرتے دیکھا۔ کیسے وہ پانی میں اترا، غوطہ لگایا، دونوں کو باہر لانے کے لیے اس نے کیا کیا کوشش کی۔ اس نے سب کچھ بتایا مگر ان جادوئی لمحوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جب اس نے سویرا کو بالکل سیدھا، ریت پر لیٹے دیکھا تھا..... اس کی نگاہیں، اس کے دلکش چہرے پر پیوست ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر وہ کچھ ہوا تھا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اردگرد کی ہر چیز کو فراموش کر کے اس کے بے مثل چہرے پر جھک

گیا تھا..... اور وہ یہ سب کچھ بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ یہ تو ایک ایسا سنہری راز تھا جسے وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں سویرا نے اچانک کہا۔

"دلاور! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ہمارے ساتھ یہاں اس حویلی میں ہی رہو۔ شاہ زمان صاحب کوئی بھی مناسب کام تمہارے اور ملتانی کے ذمے لگا سکتے ہیں؟"

کل شاہ زمان نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی تھی مگر دلاور کوئی جواب نہ دے پایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس حوالے سے اس کی دلی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس حویلی کو اور اس میں "رہنے والی کو" ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے..... اور کسی وقت دل میں آتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے اور پھر بھول کر بھی ان راہوں پر قدم نہ رکھے جو اسے اس حویلی کی طرف اور اس کے مکینوں کی طرف لاسکیں۔ اب بھی وہ سویرا کو کوئی ٹھوس جواب نہ دے پایا اور صرف اتنا کہا کہ ان کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ وہ اس بارے میں سوچے گا۔

ملازمہ شگفتہ ناشتے کے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سویرا بھی اپنے سیل فون پر کال سنتی ہوئی باہر نکل گئی۔ دلاور اور ملتانی وہیں بیٹھے رہے۔ ملتانی کو یہاں جو کچھ کھانے کو مل رہا تھا، اس نے اس کی ساری سوچیں اس کے معدے میں جمع کردی تھیں۔ وہ آج کل جیسے دماغ سے نہیں معدے سے سوچ رہا تھا۔ اس نے دلاور کو گردن سے پکڑ کر ذرا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اوئے نا ہنجار! کیوں عزت کی روزی روٹی کو لات مار رہا ہے۔ دو ٹکے کے لوگ نہیں ہم اور یہاں ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا جارہا ہے۔ اگر یہ لوگ آفر کررہے ہیں تو مان جا۔ اگر کچھ زیادہ نہ بھی ہوا تو ان کا چھوٹا ملازم تو ضرور بن جائے گا تُو..... اور چھوٹے ملازموں کو یہ وڈے لوگ اپنی جان سے لگا کر رکھتے ہیں۔"

دلاور جیسے ملتانی کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں حویلی سے آگے، درختوں سے پرے..... مشرق کی جانب اس دشت کو دیکھنے لگا جسے مقامی لوگ روہی کہتے تھے۔ ان ریتیلے راستوں پر تند ہوائیں گشت کرتی تھیں۔ گرم جھونکوں کی تپش میں ایک بے نام سی اداسی اور تڑپ چھپی رہتی تھی۔ یہ ہوائیں اجنبی سناٹوں کی کوکھ سے جنم لیتی تھیں..... اور اجنبی سناٹے..... اس کا پہلا عشق تھے۔ اب یہ بے وجود عشق ایک ہیولے کی شکل اختیار کررہا تھا، ایک چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

☆☆☆

منظر ہال نما کمرے کا تھا۔ بیش قیمت قالین، شاندار مسہری، دلکش فانوس، کھڑکیوں پر بھاری کامدار پردے۔ سویرا گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں تھی۔ وہ مسہری کے پاس ہی غالیچے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی چچازاد رمشا، مسہری پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پاؤں سویرا کی گود میں تھے۔ سویرا اس کے پاؤں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی۔

رمشا نے کہا۔ "یہ بندہ کوئی شے ہی لگتا ہے۔ کل میں نے اسے زمان بھائی کے ساتھ باغیچے میں گھومتے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ پی ٹی وی کی کسی سیریل سے کوئی ہینڈسم ہیرو اٹھ کر ہماری حویلی میں چلا آیا ہے۔"

"تو تیرے کیا ارادے ہیں؟" سویرا نے ذرا شوخی سے کہا۔

"اگر تیری طرح میرے گلے میں بھی منگنی والی رسی نہ ہوتی تو ہوسکتا تھا میں اسے..... تین لفظ بول دیتی۔" وہ مزاحیہ انداز میں بولی۔

"ہائیں، تین لفظ؟" سویرا نے آنکھیں نکالیں۔ "یعنی شادی سے پہلے ہی اسے طلاق طلاق طلاق کہہ دیتیں۔"

"صرف یہی تین لفظ نہیں ہوتے۔ آئی لو یو بھی تو تین لفظ ہوتے ہیں۔" رمشا نے کہا اور شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

"دُر فٹے منہ تیرا..... اور تیری عقل کا بھی۔" سویرا نے اطمینان سے کہا۔

"اور تیری عقل بھی کوئی آسمان کو نہیں چھو رہی۔ یہ طلاق والا لفظ عورتیں نہیں بولتیں۔ انہیں کچھ کہنا ہی پڑے تو پھر کہتی ہیں۔ خلع ..... خلع ..... خلع....."

"اچھا بکواس بند کر اپنی۔" سویرا نے قدرے بیزاری سے کہا۔

رمشا نے مسہری چھوڑی اور دھپ سے سویرا کے سامنے غالیچے پر آبیٹھی۔ سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تجھے ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔"

"کیا؟"

"میں کل کچن سے نکل رہی تھی کہ اچانک بڑی آپا کی آواز کان میں پڑی۔ وہ تمہاری شادی کی بات کررہی تھیں، بے بے جی سے۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" سویرا نے نظریں جھکائے

جھکائے پوچھا۔
"دل میں لڈو پھوٹنے لگے ہیں نا..... دیکھو دیکھو ذرا..... میری سوہنی سہیلی کا مکھڑا کیسے لال گلابی ہوتا جارہا ہے۔"
"اپنی چونچ بند کرا اور اگر کوئی بات ہے تو بتا۔"
"بڑی آپا، بے بے جی سے کہہ رہی تھیں۔ وڈے بھا (شاہ فرمان) نے کہا ہے، دسمبر میں بہت سے کاروباری مسئلے ہیں، زمینوں کے ٹھیکے وغیرہ دینے ہیں اور بھی کئی کام ہیں، شاہ زمان کی شادی دسمبر کے بجائے اکتوبر میں ہی رکھ لی جائے۔"
سویرا کے دودھیا چہرے پر اب واقعی سرخی دوڑ گئی۔ یہ شرم کی سرخی تھی۔ اس کا سر جیسے بے ساختہ جھک گیا۔
رمشا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سویرا! تمہیں یقین ہے کہ شاہ زمان تمہیں بہت چاہتا ہے؟"
"اس میں کوئی شک نہیں۔" سویرا نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
"تم شہر کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شاہ زمان بھی کوئی ان پڑھ نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ زمینداری والا ذہن رکھتا ہے۔ یہاں حویلی کا ماحول بھی تم سے کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔"
"کیا کہنا چاہتی ہو؟"
"اس کے مزاج کو اور یہاں کے رسم و رواج کو بدل پاؤ گی؟"
"ارادہ تو مضبوط ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔
رمشا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اور اگر..... کچھ غلط ہونا شروع ہو گیا تو؟ میرا مطلب ہے..... مثلاً..... اگر..... دو چار سال بعد..... اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شاہ زمان نے بھی....."
سویرا نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور تیز لہجے میں بولی۔ "نہیں رمشا! میں نے کہا ہے نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے..... حویلی بھی بدل رہی ہے۔ ہمیں اچھے کی امید رکھنی چاہیے اور یہ امید میرے اندر موجود ہے۔"
"لیکن..... فرض کرو..... ایسا ہو گیا تو..... کچھ عرصے بعد تم سے شاہ زمان کو بانٹنے کے لیے کوئی اور آ گئی تو؟"
"تمہیں کہا ہے نا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا....." شاید سویرا کچھ اور بھی کہتی لیکن اسی دوران میں کہیں پاس سے وڈے بھا شاہ فرمان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی اور دونوں لڑکیاں جیسے ڈر کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

دلاور بہت بے چینی میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے سینے میں پنپ رہا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ہو نہیں سکتا۔ وہ محلوں میں پلنے والی شہزادی تھی، وہ ایک بے نام بے ہنر بے کار انسان تھا۔ ان کا میل ہوتا بھی تو کیسے؟ اس نے اس کی جان بچائی تھی، وہ اس کی عزت کرتی تھی، اسے خاص اہمیت دیتی تھی مگر یہ کوئی فلمی سچویشن تو نہیں تھی کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔ اپنی منگنی تڑوا دیتی اور اس کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں محبت کی پینگیں بڑھانے لگتی۔ کسی وقت وہ سوچنے لگتا تھا کہ جونہی شاہ زمان گاؤں واپس آئے گا، وہ اس سے سیدھی سیدھی بات کرے گا اور اس سے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔
کسی وقت اس کے دماغ میں وہ تہ خانے اور لکڑی کے ڈبوں والے مناظر بھی چکرانے لگتے تھے۔ اس کا فطری تجسس بیدار ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ وہ کیا قصہ تھا۔ اب بھی رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا اور وہ انہی سوچوں میں گم مہمان خانے کے وسیع برآمدے میں چکرا رہا تھا۔ اس کے قدم جیسے بے ساختہ اس تہ خانے کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی وہ تہ خانے سے کافی فاصلے پر ہی تھا کہ اسے دو پرچھائیاں بڑی تیزی سے چھت پر حرکت کرتی نظر آئیں۔ یہ یہاں کے پہریدار تو نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچانک تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کوئی بلند آواز سے للکارا۔ "اوئے..... کون ہو تم..... کون ہو....." اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز آئی۔ تاریکی میں شعلہ سا چمک کر رہ گیا۔ آٹو میٹک رائفل کا فائر ایک زبردست ہنگامے کی شروعات ثابت ہوا۔ ایک دم ہی جیسے حویلی کا سناٹا چکنا چور ہو گیا تھا۔ بھاگو دوڑو کی آوازیں آئیں، دروازے دھڑدھڑائے، کھڑکیاں کھلیں، بلب روشن ہوئے اور پھر جیسے کہرام سا مچ گیا۔ ایک دم ہی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔
دلاور نے خود کو ایک چوکور ستون کی اوٹ میں کر لیا۔ ہر طرف چنگاریاں سی بکھر رہی تھیں۔ اصطبل کی طرف گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ ملانی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ وہ بدحواس بھینسے کی طرح عین گولیوں کی زد میں جا رہا تھا۔ دلاور نے عقب سے اس کی قمیص کا کالر دبوچا اور گھما کر ایک چٹائی پر پھینک دیا۔

ملتانی ہراساں آواز میں بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے دلاور؟''

''برات روانہ ہو رہی ہے تیری ..... دیکھ نہیں رہا، فائرنگ ہو رہی ہے۔ سر نیچے رکھ۔'' آخری الفاظ دلاور نے چلا کر کہے اور خود بھی ستون کی اوٹ میں سمٹ گیا۔

چند گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے بالکل پاس سے گزریں۔ یکا یک ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور اوندھے منہ ان سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر گرا۔ دلاور نے پہچان لیا۔ یہ حویلی کا ہی ایک کارندہ تھا۔ گولی غالباً اس کی کمر میں لگی تھی اور وہ گرتے ہی بے حرکت ہو گیا تھا۔

وہ جس جگہ پڑا تھا، وہاں اسے کسی بھی وقت مزید گولیاں لگ سکتی تھیں لیکن اسے وہاں سے ہٹانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہٹانے والا براہِ راست گولیوں کی زد میں آ جاتا۔ آخر دلاور کی فطری دلیری نے اسے مہمیز کیا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر ..... اور لپک کر، معروب تک پہنچ گیا۔ اس نے اس کا ایک بازو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا محفوظ آڑ میں لے آیا۔

یہی وقت تھا، جب پیر فضل بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

''شاباش دلاور! تم نے بڑی ہمت دکھائی۔ ورنہ یہ مارا جاتا۔'' اس کا اشارہ زخمی کارندے کی طرف تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے فضل صاحب؟'' دلاور نے پوچھا۔

''حضور چانڈیو کے بندے گھس آئے ہیں۔ حرامزادے پکھیرو لینے آئے ہیں۔ پکھیرو تو ان کو ملے گا ایسا کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔''

اسی دوران میں دو کارندے زخمی کارندے کو اٹھا کر مہمان خانے کے اندرونی کمروں کی طرف لے گئے۔ حویلی کا خاص کارندہ شیرو دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی رائفل کی نال سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ بھاری بھرکم چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ تہ خانے کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے تمتمائے چہرے کے ساتھ پیر فضل کو اطلاع دی۔ ''پکھیرو کو کچھ نہیں ہوا جی۔ وہ کنجر سیڑھیوں تک تو آ گئے تھے مگر اندر نہیں جا سکے۔''

دو گولیاں شیرو کے بالکل قریب دیوار پر لگیں اور بہت سا پلاستر اکھڑ کر برآمدے کے فرش پر جا گرا۔

شیرو نے دانت پیس کر ایک گالی دی اور جوابی فائرنگ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ پیر فضل نے بھی اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے برآمدے کے آخری سرے پر جا کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں۔ اسی دوران میں پیر فضل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی ..... پھر گرج کر بولا۔ ''حضور چانڈیو کے بندے ہیں۔ آج ان بدمعاشوں کو ایسا مزہ چکھا دو پھر کبھی ایسی جرأت نہ کریں۔'' وہ بات کرتا ہوا اور دیوار کی آڑ لیتا ہوا آگے نکل گیا۔

دلاور گم صم کھڑا تھا۔ حضور چانڈیو، تہ خانہ ..... پکھیرو ..... یہ سب کیا گورکھ دھندا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں لکڑی کے ان ڈبوں میں پکھیرو یعنی پرندے تو بند نہیں تھے۔ ڈبوں میں سوراخ تھے اور اس رات دلاور کو ایک ڈبے سے پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دی تھی۔ اگر یہاں کسی پرندے کی بات ہو رہی تھی تو پھر وہ کیا ہو سکتا تھا؟ کہیں یہ کوئی باز یا عقاب قسم کی چیز تو نہیں تھی؟ اسے معلوم تھا کہ یہ زمیندار وڈیرے باز عقاب اور شاہین وغیرہ کے شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔

اچانک دلاور کو بالائی منزل سے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بالائی برآمدے میں اسے بڑی آپا دکھائی دیں۔ وہ ایک حملہ آور پر جھپٹی تھیں اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رائفل بردار نے ہٹا کر بڑی آپا کو زور سے دھکا دیا۔ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی کئی فٹ نیچے گریں۔ یہ منظر کسی اور نے بھی دیکھا تھا اور جس نے دیکھا تھا، وہ طیش سے دیوانہ ہو کر حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا اور یہ جھپٹنے والا کوئی اور نہیں تھا سویرا تھی۔ وہ شیرنی کی طرح اس ''حملہ آور'' پر آئی جس نے بڑی آپا کو دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس نے یہ ہاکی پورے زور سے حملہ آور کی کلائی پر ماری۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر جنگلے سے ٹکرائی اور پھر نیچے احاطے میں جا گری۔ سویرا نے دوسرا وار حملہ آور کے سر پر کیا۔ یہ وار حملہ آور نے اپنے ہاتھوں پر روکا اور سویرا سے ہاکی چھیننے کے لیے اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دلاور نے یہ منظر دیکھا تو اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اس کی جان تھی۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ سانس بن کر اس کے سینے میں چل رہی تھی۔ وہ برآمدے میں اندھا دھند بھاگتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا۔ کئی گولیاں اس کے آس پاس سے گزری ہوں گی لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی برآمدے میں آ گیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، حملہ آور کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ حملہ آور سویرا سے ہاکی چھین نہیں پایا تھا۔ وہ

اب بے دریغ اسے پیٹ رہی تھی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ حملہ آور کا ایک ساتھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں قریباً نو انچ لمبے پھل کا تیز دھار چاقو تھا۔ وہ سویرا پر جھپٹ رہا تھا جب دلاور اس کے راستے میں دیوار بن گیا۔ حملہ آور نے دیوانہ وار ہاتھ چلایا۔ چاقو دلاور کی چھاتی کو افقی رخ پر چیرتا ہوا نکل گیا۔ ایک آتشیں لکیر سی دلاور کے سینے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔ پہلا وار سہنے کے بعد اس نے دوسرے وار کا موقع نہیں دیا اور وحشت کے عالم میں چاقو بردار کو روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ دلاور کے سر کی ایک خوفناک ضرب اپنے چہرے پر کھانے کے بعد چاقو بردار، جنگلے سے ٹکرانے کے بعد کوئی پندرہ فٹ نیچے پختہ صحن میں گرا اور پھر بری طرح لنگڑاتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ فائرنگ کی شدت اب حویلی کے عقبی گیٹ کی طرف تھی اور اس صورت حال سے پتا چل رہا تھا کہ باقی حملہ آور بھی تیزی سے پسپا ہو رہے ہیں۔

سویرا نے اسی اثنا میں حملہ آور کی ایک دو ہڈیاں مزید توڑ ڈالی تھیں۔ پھر حویلی کے مسلح محافظ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے زخمی کو دبوچ لیا۔ یہی وقت تھا جب سویرا کی نگاہ دلاور کے خون سے لت پت سینے پر پڑی۔ چاقو گہرائی میں تو نہیں گیا تھا مگر اس کے سینے کے گوشت کو چوڑائی کے رخ پر ایک طویل کٹ لگا گیا تھا۔ سویرا ملازموں کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ''ان کو اسپتال لے جاؤ۔ جلدی کرو..... بہت خون نکل رہا ہے۔''

☆☆☆

دلاور کو بہاولپور کے بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی چھاتی پر کافی سارے ٹانکے لگے اور خون کی ایک بوتل بھی دینا پڑی۔ اگلے روز سویرا اور شاہ زمان اس کی تیمارداری کے لیے اسپتال بھی آئے۔ یہ شاہ زمان کا اثر رسوخ تھا کہ اسپتال کا عملہ اور ڈاکٹرز وغیرہ اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی ایک فوج تھی۔ کچھ اسپتال کے اندر تھے، کچھ باہر۔

شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے دلاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''تم ہمارے لیے بڑے لکی ثابت ہو رہے ہو۔ شاید تم بروقت وہاں نہ پہنچتے تو سویرا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا۔''

شاہ زمان کی بات پر دلاور بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ نہ صرف بروقت وہاں پہنچا تھا بلکہ اس نے سویرا کی طرف بڑھنے والا مہلک چاقو بھی اپنی چھاتی پر جھیلا تھا۔ غالباً سویرا کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہاں ان لمحوں میں اصل صورت حال کیا ہوئی تھی۔

دلاور نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑی آپا صاحبہ کا کیا حال ہے؟''

''وہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہوش میں بھی آ گئیں۔'' سویرا نے جواب دیا۔

''اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔'' دلاور نے بددل سے کہا۔

''اب ہم نے تمہیں کہیں جانے نہیں دینا۔ تم واقعی ہمارے لیے بہت لکی ہو۔'' شاہ زمان نے کہا۔

''میں کس قابل ہوں جی۔ یہ تو آپ کی نظر کی مہربانی ہے۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں حویلی میں کوئی ملازمت دینا چاہتا ہوں، تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

''آپ مجھے جس کام کے قابل بھی سمجھیں گے، میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی لیکن.....''

''لیکن نہیں.....'' شاہ زمان نے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن کے بعد بہانہ شروع ہو جاتا ہے۔'' پھر وہ اپنی گھنی مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''تم نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں اب نہیں چاہتا کہ تم ہماری نظروں سے دور رہو۔''

اس نے دوبارہ دلاور کو سرتاپا دیکھا۔ جیسے نظروں نظروں میں اس کی جسمانی طاقت اور ذہنی چستی کو تول رہا ہو۔ اس کی نگاہوں میں دلاور کے لیے چاہت تو تھی لیکن اس چاہت میں مفاد اور ملکیت کا احساس بھی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک طرح کا احسان بھی تھا۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا..... تمہاری حیثیت اور حسب نسب اس قابل تو نہیں کہ تمہیں اپنے اتنا قریب رکھا جائے لیکن چونکہ حالات نے تمہیں ہماری ایک بے مثال ''خدمت'' کا موقع دیا ہے اس لیے تمہیں برداشت کیا جا سکتا ہے..... اور آگے بڑھنے کے موقعے بھی دیے جا سکتے ہیں.....

وہ بولا۔ ''تم اسپتال سے ڈسچارج ہو کر سیدھے حویلی جاؤ گے۔ سمجھو یہ تمہارے لیے میرا پیار بھرا حکم ہے۔ میں بھائی صاحب (شاہ فرمان) سے بات کر لوں گا۔ وہ تمہیں اور تمہارے دوست کو مستقل طور پر حویلی میں رکھنے کا انتظام کر لیں گے.....''

دلاور نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

شاہ زمان نے مختصر الفاظ میں دلاور کو بتایا کہ حویلی میں گھس کر فائرنگ کرنے والے ان کی ایک مخالف پارٹی کے لوگ تھے۔ ان کو قرار واقعی جواب ملا ہے۔ ان کا ایک

بندہ جان سے گیا ہے۔ دو سخت زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف دو ایف آئی آر بھی کٹوائی گئی ہیں.....

وقتِ رخصت شاہ زمان نے دلاور کا شانہ تھپکا تو سویرا نے بھی کمال بے تکلفی سے، اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ وہ بہت فریک..... بے جھجک اور شفاف لڑکی تھی۔ اندر باہر سے ایک جیسی، کوئی بناوٹ نہیں تھی اس میں۔ دلاور نے کئی بار دیکھا تھا وہ حویلی کے عام ملازموں میں گھل مل جاتی تھی۔ ان کے کوارٹرز میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی تھی۔ شاہ فرمان اور شاہ زمان کی پروا کیے بغیر ملازمین کے دکھ درد میں شریک ہو جاتی تھی۔

کمرا وہی عالی شان تھا جس میں اس نے سویرا کی یاد میں بے چین راتیں گزاری تھیں۔ اس کی تیمارداری ہونے لگی۔ اس کی بہترین نگہداشت ہونے لگی۔ زخم دینے والا چارہ گر بن جائے تو قیامت ٹوٹتی ہے۔ دلاور پر بھی دن رات قیامت بیتنے لگی۔

سویرا حویلی کے گھٹے ہوئے ماحول کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ دوپہر اور رات کا کھانا اپنے سامنے ملازمہ سے لگواتی اور جب تک وہ کھانا چکتا، وہ وہیں رہتی۔ اکثر اس کے ساتھ رمشا بھی ہوتی۔ وہ دن رات دلاور کے لیے کیف آور تھے اور اذیت ناک بھی۔ جب تک سویرا وہاں رہتی وہ گھڑیاں اس کی خوشبو سے معطر رہتیں۔ وہ چلی جاتی تو اذیت کا زہریلا دھواں اس کے سینے میں بھر جاتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس نے دو تین بار چاہا کہ سویرا سے اس ہنگامے کے بارے میں تفصیل سے پوچھے جس نے حویلی میں تہلکہ مچایا تھا لیکن نہیں پوچھ سکا۔ نہ ہی اس نے سویرا کو یہ بات بتائی تھی کہ اسے چھاتی پر لگنے والا زخم دراصل اسے بچاتے ہوئے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں سویرا سے بات چھپانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایسی ہی دھوپ چھاؤں والی دوپہر تھی۔ سویرا ملازمہ کے ساتھ..... دیسی بٹیر کی یخنی اور مکئی کی روٹی لے کر آئی تھی۔ رمشا آج اس کے ساتھ نہیں تھی۔ ملازمہ کھانا چن کر چلی گئی۔ سویرا روزانہ تر و تازہ ہوتی تھی مگر آج کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ وہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر یخنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم نے ابھی تک شہر تو بہت سے گنوائے ہیں مگر یہ بتایا ہی نہیں، تم پیدا کس شہر میں ہوئے؟''

''سویرا بی بی! مجھے معلوم ہی نہیں.....'' وہ اداسی سے بولا۔

''کیا مطلب.....؟'' سویرا نے حیرانی سے کہا۔

''سویرا بی بی! میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سمجھیں میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔'' وہ تھوڑا سا آگے ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ بہت میٹھے اور نرم لہجے میں بولی۔

''تم خود کو اکیلا مت سمجھو..... ہم سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔'' اسے لگا کہ اتنی سی بات دلاور کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ وہ چند لمحے سر جھکائے دلاور کو خاموشی سے دیکھتی رہی پھر جیسے کچھ سوچ کر ایک دم سے چہکی۔ گردن کو ایک زاویے پر حرکت دے کر بولی۔

''آج میں تم سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ چلو ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے تم اور میں اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے، مجھے سویرا بی بی نہیں بلکہ صرف سویرا کہو گے۔ مگر تب جب صرف تم اور میں اکیلے ہوں گے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں سویرا بی بی ہی چلے گا..... سمجھے تم۔'' دلاور کو اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ پھر سے بولی۔ ''اور دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ دوست سے کوئی بات بھی چھپائی نہیں جاتی۔'' پہلی بار دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ یوں نظر آتا تھا جیسے روتا بچہ من پسند کھلونا مل جانے کے بعد آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے لگے۔

سویرا پڑھی لکھی تھی۔ سندھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کر چکی تھی۔ کوایجوکیشن میں ''یاری دوستی'' نبھا چکی تھی۔ شاعری اسے پسند تھی۔ خود بھی شعر فہمی تھی۔

شاعر رومان پرور ہوتا ہے۔ شاہ زمان سویرا کے دور کے رشتے داروں میں سے تھا۔ کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں چار، چھ دفعہ یونیورسٹی جانا ہوا جہاں سویرا کی کشش نے اسے دیوانہ کر دیا۔ یونیورسٹی کے چکر بڑھ گئے۔ کام لمبا ہو گیا، سویرا کے بچپن میں ہی اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ماں یورپ کے کسی ملک میں تھی جبکہ باپ امریکا میں اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ سویرا کو اس کی پھپھو نے پالا تھا۔ کسی عید شب برات وغیرہ پر..... ماں باپ کی طرف سے علیحدہ، علیحدہ کارڈ موصول ہوتے جن کو دیکھے بغیر وہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی تھی۔

اس کا کل جہاں اس کی پھپھو عالیہ ہی تھیں۔ پھپھو عالیہ سندھ یونیورسٹی کی پروفیسر اور بڑی آپا کی فرسٹ کزن تھیں۔ شاہ زمان نے بڑی آپا کے ذریعے سویرا سے شادی کا پیغام بھیجا..... جو چند ماہ کی سوچ بچار کے بعد پھپھو عالیہ نے سویرا کی رضامندی سے قبول کر لیا۔ شاہ زمان خوش شکل

تھا۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ والا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والی سویرا اور دنیا کو پڑھانے والی پھپھو عالیہ بخوبی جانتی تھیں کہ ایسے رشتے قسمت سے ہی دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ زمانہ خراب تھا۔ غیروں سے نبٹنے کی تاب پھپھو بھتیجی میں نہیں تھی..... اسی لیے کچھ تحفظات کے باجود ہامی بھر لی گئی تھی۔ اب پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سویرا اپنی پھپھو اور ان کی بیٹی رمشا سمیت اس حویلی میں مقیم تھے۔

سویرا نے ماسٹرز کرلیا تھا۔ جس دن پھپھو کا ٹرانسفر بہاولپور یونیورسٹی میں ہوا، وہ لوگ سامان سمیٹ کر بہاولپور آ گئے۔ بہاولپور میں ہوتے ہوئے بڑی آپا انہیں کرائے کے مکان میں کہاں رہنے دے سکتی تھیں۔ وہ دوسرے دن ہی بہاولپور گئیں اور ان کو اٹھا کر حویلی میں لے آئیں۔

پھپھو عالیہ نے سو ہاتھ پیر مارے مگر بڑی آپا کے آگے ایک نہ چلی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ''حویلی اتنی بڑی ہے تین لوگوں کے آنے سے کم نہیں پڑنے والی اور اگر انکار کروگی..... تو..... رشتہ ختم.....'' ظاہر ہے آخری بات انہوں نے مذاق میں کی تھی۔ چاروناچار انہیں بڑی آپا کی بات ماننا پڑی۔ ان کو اوپری منزل پر شاندار کمرے دے دیے گئے..... ایک کمرے میں پھپھو عالیہ رہ رہی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں سویرا اور رمشا تھیں۔

پھپھو عالیہ نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ جہاندیدہ اور دور اندیش پروفیسر تھیں۔ لالچی نہیں تھیں مگر زمانے سے خوبصورتی کا خراج وصول کرنا بھی اپنا حق سمجھتی تھیں۔ حویلی کھلے دل اور کھلے پیسے والوں کی تھی..... تین عورتیں تو کیا..... چوڈیرو حویلی تین سو لوگوں کو بھی خود میں سمو سکتی تھی۔

تو سویرا کی بات پر پہلی دفعہ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کے دل میں شادمانی ہلکورے لیتی تھی۔ سویرا نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، وہ ہاتھ کیسے جھٹک سکتا تھا۔ سویرا عجیب دل لگی کے موڈ میں تھی یا شاید وہ مغموم دلاور کا دل بہلانا چاہ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ''دلاور! تم نے لاہور تو دیکھا ہوگا..... بتاؤ کیسا ہے؟'' آنکھوں میں تجسس بھری چمک تھی۔

''اچھا ہے..... بلکہ بہت اچھا ہے۔'' اس نے کہا اور ذہن کے دریچے میں تنگ گلیاں اور ساتھ ساتھ جڑی چھتوں کی دھوپ پھیل گئی۔

''ایک دفعہ یونیورسٹی کا ٹرپ لاہور گیا تھا..... میں بیمار پڑ گئی، نہ جا سکی..... جس کا قلق ہمیشہ رہے گا۔''

''تو آپ اب چلی جائیں..... آپ کو کس نے روکا ہے۔'' وہ خاموشی کے خول سے رفتہ رفتہ باہر آنے لگا تھا۔

''تم چلو گے میرے ساتھ..... میں پرانا لاہور دیکھنا چاہتی ہوں..... تنگ گلیاں..... پُر پیچ بازار۔'' وہ خیالوں میں جیسے کہیں دور چلی گئی تھی.....

''آپ جب حکم کریں گی..... مجھے تیار پائیں گی۔'' ..... وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں..... گلابی ہونٹوں سے دور.....

سویرا بازو میں پڑی چوڑی کو گھماتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم ہمیں بچاتے ہوئے اپنی جان پر کھیل گئے.....''

''اس میں کوئی خاص بات تو نہیں سویرا.....'' سویرا کہتے ہوئے دقت پیش آ رہی تھی مگر وہ کہنے پر مجبور تھا۔

''مگر لوگ ایسے نہیں ہوتے، کسی کے جھگڑے میں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے..... تم جو نظر آتے ہو، وہ ہو نہیں۔'' وہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تو دلاور گڑبڑا گیا۔ فوراً سنبھلتے ہوئے بولا۔

''آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا میں ایسا ہی کرتا۔'' سویرا بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ ملازمہ آن ٹپکی..... اس کی آمد سویرا کو بری لگی۔ وہ اسے کسی بہانے سے بھیجنا چاہتی تھی کہ رمشا اسے بلانے آ گئی۔ دلاور نے غور کیا رمشا اور ملازمہ کی موجودگی میں سویرا پوری کی پوری ''سویرا بی بی'' نظر آنے لگی تھی..... پُروقار..... اور وضع دار۔

اگلے دو دن سویرا نہیں آئی۔ حویلی میں ایک عجیب سی ہلچل نظر آ رہی تھی۔ اس نے بلند کھڑکی کے پردے سرکا کر دیکھا تھا، حویلی کی باؤنڈری وال کے گرد خاردار تاریں لگائی جا رہی تھیں۔ ملازمین بڑی مستعدی کے ساتھ یہاں سے وہاں بھاگے چلے جاتے تھے۔ یہ تیسرے دن دوپہر کی بات ہے، سویرا ملازمہ کے ساتھ کھانا لے کر آئی۔ ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی تو سویرا بولی۔ ''تم میرا حال نہیں پوچھو گے، میں دو دن بیمار پڑی رہی۔''

دلاور کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ وہ شاید عشق کے ابتدائی اسباق کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تب اس کی ہلکی سی تکلیف بھی عاشق کو تڑپا دیتی ہے۔ یہ تیسرا موقع تھا جب وجود میں ہونے والی حیرت انگیز تبدیلی نے اسے پریشان کیا تھا۔ پہلا موقع تب آیا تھا جب وہ ڈوبتی سویرا کو بچا کر پانی سے باہر لایا تھا۔ وہ پہلی نظر پہلا احساس اور پہلا گھاؤ تھا۔ دوسرے موقع پر اس نے حویلی پر

حملے کے وقت سویرا کو ایک حملہ آور سے دست و گریباں دیکھا تھا اور ایک دم تڑپ سا گیا تھا۔ اب بھی سویرا نے اپنی بیماری کا بتایا تھا تو اس کا دل جیسے کسی غم کے اندھیرے کنویں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔

"سویرا! آپ اپنا دھیان رکھا کیجیے۔ آپ کمزور لگ رہی ہیں۔"

دلاور کی پریشانی سویرا سے چھپی نہ رہ سکی..... وہ یک ٹک ایسے دیکھتی رہی..... پھر مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ویسے تمہیں خود پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔" وہ رکی پھر بولی۔ "ظفر بتا رہا تھا تمہارا زخم پہلے سے بہتر ہے۔"

"جی! میں کل چل کر باہر تک بھی گیا تھا....." دلاور اندرونی کشمکش کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ دلاور کی اندرونی کیفیت کو سویرا نے جیسے اس کے چہرے سے پڑھ لیا تھا۔ دلاور خود میں پشیمان ہوا جا رہا تھا۔ اسی خفت کو مٹانے کی خاطر اس نے فوراً گفتگو کا رخ پھیرنے کی کوشش کی اور بولا۔ "سویرا! ایک بات پوچھوں، آپ بُرا تو نہیں منائیں گی؟"

"ہاں بولو....."

"تھوڑے دن پہلے حویلی میں جو کچھ ہوا وہ سب کیا تھا؟"

سویرا ایک دم سے خاموش ہو گئی جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلاور جواب کا انتظار کرتا رہا، سویرا خاموش رہی تو وہ بولا۔ "لگتا ہے..... آپ اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتیں۔"

اس کے جواب میں سویرا نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا جس سے دوپٹا کھسکا اور چند نسواری زلفیں چہرے پر پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ سے انہیں سر پر جمایا۔ دوپٹا سر پر سیدھا کیا اور تھوڑا مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کہہ چکی ہوں..... دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی..... تو میں اس پر قائم ہوں۔"

سویرا نے محتاط اور مختصر لفظوں میں جو کہانی سنائی، وہ کچھ اس طرح سے تھی کہ حویلی پر حملہ "شوکت سیال" نے کروایا تھا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک ایم پی اے حضور چانڈیو کا جگری دوست تھا۔ شوکت سیال نہایت بدمزاج، منہ پھٹ اور بات بات پر لڑنے مرنے پر اتر آنے والا بندہ تھا۔ اسے حضور چانڈیو کی پوری پشت پناہی حاصل تھی۔ حویلی پر حملہ کسی "باز" کو چرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ "باز" نہایت قیمتی اور تربیت یافتہ ہے۔ پولیس کے پہنچتے ہی حملہ آور اپنے دو زخمی ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ ان کا ایک ساتھی دھر لیا گیا تھا۔ قیمتی باز محفوظ رہا تھا۔

حویلی پر حملے کا سن کر شاہ فرمان اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ فوراً کراچی سے واپس آ گیا تھا جبکہ شاہ زمان ایک دن بعد ترنڈا سے واپس پہنچا تھا۔

سویرا بات مکمل کر چکی تو دلاور کافی سنبھل چکا تھا، بولا۔ "سویرا! کیا یہ باز بہت زیادہ قیمتی ہے؟"

"ہاں شاید..... سدھائے ہوئے عقاب قیمتی ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ کے خیال میں کیا قیمت ہو گی اس کی.....؟"

دلاور نے کہا تو سویرا نے تیز دلچسپی سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ "سننے میں آ رہا ہے..... آٹھ..... دس لاکھ کے قریب قریب ہو گی۔"

"مگر مجھے اس کے پیچھے کوئی اور کہانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ آٹھ دس لاکھ کے باز کے پیچھے حویلی پر اتنا بڑا حملہ..... اور آپ کے خیال کے مطابق حملہ شوکت سیال اور حضور چانڈیو نے مل کر کروایا ہے..... دس لاکھ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم تو نہیں ہے۔"

سویرا نے غور سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ "مجھے لگتا ہے..... تم کسی سراغ رساں..... فرم کے لیے کام کرتے رہے ہو۔" لہجے میں شوخی تھی۔ آج کی سویرا اور تھوڑے دن پہلے والی سویرا میں بہت فرق تھا۔ وہ دلاور سے یوں روانی سے باتیں کر رہی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو یا شاید یہ کوایجوکیشن یونیورسٹی کے ماحول کا اثر تھا۔

دلاور ہنس دیا بولا۔ "میں تو خود آج تک گم شدہ ہوں۔ میں کسی کا سراغ کیا لگاؤں گا۔"

دن گزرنے لگے۔ ہر روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ ایک علیحدہ کہانی ہوتی۔ ایک دن سویرا اپنی ڈائری لے کر آئی۔ اس پر نثر اور شاعری کی مشق کی گئی تھی۔ اس میں ایک آزاد نظم تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس وحشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

نظم دلاور کے دل کو چھو گئی۔ وہ ہر لمحہ اس کی گرفت

کرنے لگا۔ جس ڈر نے تھوڑے دن پہلے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی، وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وقت نے اسے ورغلا لیا تھا۔ حالات نے اسے خاموش طوفانوں سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ عشق کی منزلیں بڑی بے خبری سے طے کرنے لگا تھا۔ سویرا نے جو رومال اسے دیا تھا، وہ اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سویرا کی خوشبو رومال کے راستے اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر اور اسے مدہوش سا کر دیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دن بدن سویرا کے عشق میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا بوجھتا تھا پھر بھی عشق کی بے پناہ آگ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دھوپ بھرا بڑا چمکیلا ریگستانی دن تھا۔ دلاور کافی حد تک صحت یاب ہو چکا تھا۔ وہ بستر کی چادر درست کر رہا تھا کہ سویرا آن ٹپکی۔ اس نے بے بی پنک کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر اسی کلر کا کمیش کا دوپٹا تھا۔ آدھے بازو کے کناروں پر میرون کلر کے موتی جھول رہے تھے۔ ان کپڑوں میں سویرا کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ جھک کر بیڈ کی چادر درست کرواتے ہوئے بولی۔ ”دلاور! جو کام تم کر رہے ہو، یہ کام گھروں میں عورتیں کرتی ہیں۔“

”میرا کوئی گھر ہوتا..... تو شاید کوئی عورت بھی ہوتی اور اگر عورت ہوتی تو وہ چادر درست کرنے والا کام ضرور کرتی.....“ دلاور نے مسکرا کر کہا۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں..... عورت ہے..... کہاں؟“

وہ چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے بولی تو دلاور کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔ باریک دوپٹے کو سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے پوچھا ہی نہیں میں اس وقت تمہارے کمرے میں کیوں آئی ہوں..... حالانکہ دوپہر کے کھانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔“

”آپ خود ہی بتا دیجیے۔“ دلاور نے نظریں جھکا کر کہا۔

”صبح..... شاہ زمان نے تمہیں بلایا ہے..... تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....؟“

”کس بارے میں.....؟“

”حویلی میں رہنے کے بارے میں..... میرا مطلب ہے مستقل طور پر رہنے کے بارے میں؟“

دلاور اسے کہنا چاہتا تھا۔ ”سویرا! اب اس حویلی کے سوا تو میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا ہے۔ حویلی بھی اس لیے کہ اس میں تم رہتی ہو..... تمہاری خوبصورت باتوں کی چہکار اس حویلی کی فضاؤں میں رقص کرتی ہے۔ تمہاری خوبصورتی کے رنگوں کی قوسِ قزح اس ماحول میں ٹھہری ہوئی ہے۔ جس ہوا کو میں اپنے پھیپھڑوں میں اتارتا ہوں، اس ہوا میں تمہاری سانسوں کی خوشبو گھلی ہوئی ہے۔ تمہارے چہرے کی ہنسی کے کھلتے گلاب میرے دل میں تہلکہ مچاتے ہیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ میں حویلی چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔“

وہ یہ سب کچھ اسے نہ کہہ پایا۔ نہایت دھیمی سی آواز میں بولا۔ ”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب مجھے حویلی سے چلے جانا چاہیے۔“

”خبردار! ایسی بات دوبارہ کی تو..... تمہیں یہیں اسی حویلی میں رہنا ہے۔ یہی بات میں تمہیں کہنے آئی تھی.....“

دلاور کا دل بھر آیا بولا۔ ”کس حیثیت سے..... کہنے آئی ہیں مس؟“

”ایک دوست کی حیثیت سے.....“

”اگر نہ رہوں.....؟“

”دوست کا دل ٹوٹ جائے گا..... اور ایسے دوست کا..... جو خود کو تمہارا قرض دار بھی سمجھتا ہے اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔“ سویرا نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی.....

چند لمحے دلاور خاموشی سے اس دروازے کو تکتا رہا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سویرا گئی تھی۔ پھر ڈھول پر ایک زوردار چوٹ پڑی..... ایک، دو، تین، چار..... دھن دھنا دھن دھن..... دھن دھنا دھن دھن..... ڈھول کی تھاپ پر میلے میں رقص کرنے والا ملنگ جیسے دیوانہ وار خون کی آبیاری کرنے والی رگوں میں دھمالیں ڈالنے لگا..... دلاور کا انگ انگ ناچنے لگا۔ اس کا دل پھڑکنے لگا۔ سویرا خاص طور پر اسے کہنے آئی تھی کہ اسے حویلی میں ہر صورت رہنا ہے۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا۔ وہ تو حویلی سے اب دور رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو یوں ہی..... تکلفاً سویرا کو حویلی سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ کس کافر کو یہاں سے جانا تھا۔ صبح وہ شاہ زمان کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ فرمان بھی وہیں تھا..... اس کے چہرے پر سنگدلی اور بے رحمی کا کھچاؤ سا تھا۔ کثرتِ مے نوشی سے آنکھوں کے نیچے کا ماس ابھر آیا تھا۔ دلاور چند منٹ وہاں بیٹھا۔ بات ہو گئی۔ معاملات طے ہو گئے۔ دلاور کو ڈرائیور کم محافظ کی صورت میں رکھ لیا گیا۔ ڈرائیوری وہ بہت اچھے سے جانتا تھا۔ پنڈی میں جس دوست کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا، اس کی کار دلاور ہی ڈرائیو کرتا تھا۔

ان دنوں دلاور میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جن پر وہ

خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ کم گو، شرمیلا دلاور باتونی اور خوش اخلاق ہو گیا۔ عشق نے اس کے دل میں جوت جگائی تھی اور وہ سودائی ہو گیا تھا۔ جیسے صوفی اور ملنگ ہو گیا تھا۔

وہ ہر کسی کی خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ہر کسی کی مدد کے لیے کمربستہ رہنے لگا تھا۔

ایک دن وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ زنان خانے کی سواریوں کو لانے لے جانے کی ڈیوٹی اسی کی تھی۔ بڑی آپا نے "زہر پیر" جانا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت آئی جو ایک ٹانگ سے معذور تھی۔ اس نے آدھے چہرے کا نقاب بھی کیا ہوا تھا۔ دلاور نے اچٹتی نگاہ ڈالی تو نقاب کے نیچے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے ناک والی جگہ پر ناک نہ ہو..... کوئی خلا سا ہو۔ سارے رستے بڑی آپا دلاور سے باتیں کرتی رہیں، وہ ان کے جواب دیتا رہا۔ اپنی پرانی کہانیاں بھی سناتا رہا مگر اس کا ذہن نقاب والی عورت میں اٹکا رہا۔ وہ عورت سارے رستے ایک دفعہ بھی نہیں بولی۔ آخر دلاور سے نہ رہا گیا بولا۔ "بڑی آپا! گستاخی معاف۔ مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا مگر پھر بھی میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ محترمہ کون ہیں؟"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا یہاں تک کہ دلاور کو پشیمانی ہونے لگی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

پھر اچانک بڑی آپا کی گمبھیر آواز گونجی۔ "یہ شاہ فرمان کی تیسری بیوی اور میری سوتن نگینہ ہے۔"

دلاور ..... آگے کچھ نہ بول سکا۔ واپسی کا رستہ بھی خاموشی سے کٹا۔

ظفری دلاور کا روم میٹ اور حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ وہ دلاور سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ اس رات سوتے وقت دلاور نے داہنی طرف کروٹ لی اور ظفری سے بولا۔

"ظفری یار! یہ نگینہ بی بی کون ہیں؟"

"تو نے اسے کہاں دیکھا؟" ظفری حیرت سے بولا۔

"بڑی آپا کے ساتھ آج "زہر پیر" تک گئی تھیں۔"

"یہ بڑی لمبی اور دردناک کہانی ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کر بولا۔

"تو پھر سنا نا..... میرا آج جلدی سونے کا موڈ نہیں ہے اور تو..... تو آدھی رات تک جاگتا رہتا ہے۔"

ظفری دلاور کی بات پر ہنس دیا اور بولا۔ "یارا! چوڑیرو حویلی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ چوڑیرو حویلی کے بڑے بوڑھوں کی ایک قدر مشترک تھی۔ وہ تین سے چار شادیاں کرتے تھے۔ یہ ریت ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ شاہ زمان تو ابھی جوان ہوا ہے۔ شاہ فرمان بڑا ہے اور اب تک چار بیاہ رچا چکا ہے۔"

"چار بیاہ.....!" دلاور نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ..... ہاں چار بیاہ..... اور پانچویں کی باری بھی جلدی آ جائے گی۔ شاہ فرمان کی پہلی شادی بڑی آپا سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اگر اولاد ہوتی تو بھی وہ دوسری، تیسری، چوتھی شادی ضرور کرتا۔ دوسری شادی رخشندہ سے ہوئی..... جو بے اولادی میں ہی شادی کے تیسرے سال مر گئی۔ تیسری شادی نگینہ سے ہوئی..... اور اب چوتھی شادی شاہدہ سے ہوئی ہے۔"

"حویلی کی کوئی عورت نقاب نہیں کرتی مگر یہ نگینہ بی بی ... تو پوری کی پوری پردے میں تھیں، یہ کیا ماجرا ہے؟"

ظفری کے چہرے پر خوف پھیل گیا بولا۔ "یار! یہ شاہ فرمان بڑا ظالم بندہ ہے..... چوتھی شادی پر نگینہ نے واویلا مچایا اور طلاق مانگی تو شاہ فرمان نے اپنے ہاتھ سے اس کی ناک اور ہونٹ کاٹ ڈالے۔" ظفری کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"اور نگینہ نے احتجاج نہیں کیا؟"

"او بدھو، سائیں..... احتجاج کی وجہ سے ہی تو ناک اور ہونٹ کاٹے گئے تھے۔ اور ایک اور ستم ظریفی سنو۔ حویلی کی کوئی بہو نہ طلاق لے سکتی ہے، نہ حویلی سے بھاگ کر کہیں جا سکتی ہے۔ یہ چوڑیرو حویلی کا صدیوں پرانا اصول ہے..... جو ابھی تک چلا آ رہا ہے۔"

"ظفری! شاہ زمان کو سب بڑے سائیں کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ شاہ فرمان سے دس بارہ سال چھوٹا لگتا ہے۔"

ظفری بولا۔ "بدکرداری..... شاہ فرمان شروع سے ہی آوارہ اور بے پروا تھا۔ "بڑے سرکار" نے اپنی آخری وصیت میں شاہ زمان کو اپنا گدی نشیں چنا تھا۔ اسی وجہ سے اب شاہ زمان "بڑے سائیں" کہلوانے پر فائز ہیں۔"

"شاہ فرمان بڑا ہے، اسے کبھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی جب سب لوگ اس کے سامنے چھوٹے بھائی کو "بڑا سائیں" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"میرا نہیں خیال اس سے شاہ فرمان کو کوئی فرق پڑتا ہو بلکہ میرے خیال سے وہ اس میں خوش ہے۔ بڑے سائیں کہلوانے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ بہت سی پابندیاں ہیں۔ ایسی پابندیاں جو شاید شاہ فرمان جیسا عیش پرست بندہ نہیں نبھا سکتا..... اب اس دن حویلی پر ہونے والا حملہ ہی دیکھ لو ..... وہ سب کچھ شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔"

"شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے؟ میں تمہارا مطلب

نہیں سمجھا....." دلاور نے الجھن سے کہا۔ ظفری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ گہرا کش لے کر اسی سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگا کر دلاور کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"یارا! اس حویلی کے ایک تہ خانے میں ..... قیمتی پکھیرو کچھ عقاب ٹائپ چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ بعد میں سدھائے ہوئے قیمتی پکھیرو..... عرب ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں اور عربوں سے لاکھوں کمائے جاتے ہیں۔ یہ سب کام شاہ فرمان کرتا ہے۔ "بڑے سائیں" یہ سب جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر آنکھیں موندھے ہوئے ہیں بلکہ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ "بڑے سائیں" بھی اس دھندے میں برابر کے شریک ہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لیے انجان بنے ہوئے ہیں۔"

"اچھا تو حویلی پر جو حملہ ہوا، وہ لوگ قیمتی پکھیرو چرانے آئے تھے۔" دلاور نے کہا۔

ظفری مسکرا دیا دائیں بائیں سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "چرانے نہیں آئے تھے بلکہ اپنا چرا کے لایا ہوا ایک قیمتی "باز" واپس لینے آئے تھے۔"

"چرا کے لایا ہوا باز..... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"او یارا..... ایک تو تمہیں بات بڑی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ شاہ فرمان نے اپنے سب سے خطرناک کارندے "شیرو" سے رحیم یار خان کے ایک گوٹھ سے ایک باز چوری کروایا اور حویلی میں لے آیا۔"

دلاور باز کے متعلق سویرا سے سن چکا تھا پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولا۔ "کیا..... وہ باز..... قیمتی ہے؟"

"قیمتی نہیں بلکہ بہت قیمتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو..... وہ ایک سادہ چیک ہے۔" ظفری نے کہا۔

"ایسی کیا بات ہے اس میں؟"

"یہ بہت اندر کی باتیں ہیں..... رہنے دو....."

دلاور نے خاموشی اختیار کر لی تو ظفری خود ہی بولا۔

"تم پوچھو گے نہیں..... اندر کی بات کیا ہے؟"

دلاور ہنس دیا، بولا۔ "خود ہی تو تم نے کہا تھا..... رہنے دو..... میں نے رہنے دیا....."

"او بدھو سائیں! تمہیں اپنا یار کہا ہے اور یار سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جاتی۔ حویلی میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ "شان" نامی باز اتنا اہم اور قیمتی کیوں ہو گیا ہے۔ اصل میں اس کی وجہ دو شیخوں کی لڑائی بیان کی جا رہی ہے۔"

"دو شیخوں کی لڑائی۔"

"ہاں..... ہاں..... ایک شارجہ کا کوئی بڑا بزنس مین ہے..... دوسرا دبئی کا ارب پتی امیر زادہ ہے۔ دونوں کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ دونوں شاہ کے دعوے دار ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں۔" ظفری باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ دلاور اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ظفری کو دو بجے سے پہلے نیند نہیں آتی تھی مگر دو بجتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگتا۔ دلاور نے مسکرا کر اسے دیکھا، بستر پر اسے سیدھا کیا اور خود دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ آج رات نیند آنی مشکل تھی، اسے صبح سویرا کو یونیورسٹی لے کر جانا تھا۔ وہاں سے پھر سویرا کو بازار جانا تھا۔ وہ وقت کا حساب لگانے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو تو بن جاتی تھی۔ وہ گاڑی تھوڑی سست چلاتا تو تین گھنٹے بھی لگ سکتے تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے بہت وقت تھا۔ وہ سوچنے لگا سویرا سے کیا کیا باتیں کرے گا۔ سویرا کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس "بازوالی بات" میں بھی الجھا ہوا تھا۔

مگر صبح اس کے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ صبح سے گاڑی چمکائے جا رہا تھا، وہ اس سیٹ کو بار بار صاف کر رہا تھا جہاں سویرا نے آ کر بیٹھنا تھا۔ سویرا تو آئی مگر اس کے ساتھ پھپھو عالیہ بھی تھیں۔ سویرا نے بہت ہلکا میک اپ کر رکھا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ کوئی گلاب کی کلی کھلی ہے۔ گاڑی میں بیٹھی تو ہر سو اس کی خوشبو بکھر گئی۔ دلاور نے بیک مرر پہلے سے سیٹ کر رکھا تھا۔ سفر شروع ہوا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سویرا کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کچھ خاموش تھی۔ سفر خاموشی میں کٹا۔ جو کچھ اس نے رات جاگ کر سوچ رکھا تھا، سب اس سے الٹ ہو رہا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے خود بات کرنے کا سوچا مگر دونوں کی گمبھیر خاموشی دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی حویلی سے کسی کو لے جاتا تھا تو بے تکان بولتا تھا۔ پھپھو عالیہ، سویرا، رمشا، بڑی آپا سب سے بے تکلفی سے بات چیت کرتا تھا بلکہ سب مستورات اس کی ڈرائیونگ سے زیادہ اس کی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری سے خوش تھیں مگر آج کچھ گڑبڑ تھی ..... دونوں عورتوں کی گمبھیرتا کے پیچھے کچھ ناپسندیدہ حالات کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

یونیورسٹی آئی تو پھپھو عالیہ اور سویرا اندر چلی گئیں۔ ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ دلاور نے اتر کر باری

باری دونوں دروازے کھولے۔ پہلے سویرا بیٹھی' بعد میں پھپھو عالیہ بیٹھیں مگر انہوں نے گاڑی کا دروازہ بند نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے بولیں۔ ''سویرا! یوں کرو تم اکیلی بازار ہو آؤ..... مجھے واپسی پر یہاں سے پک کر لینا.....'' سویرا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا..... دروازہ بند ہوا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالنے والا رنگیلا شخص دلاور کے وجود میں بھنگڑے ڈالنے لگا۔ اسے کانوں کے قریب ڈھول کی دھائیں دھائیں سنائی دینے لگی۔ سویرا اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی تھی۔

''سویرا! آج آپ کو اس طرح دیکھ کر میرا دل دکھی ہے۔'' دلاور ہمت کرتے ہوئے بولا۔

''تم کیوں دکھی ہو..... پریشان تو میں ہوں۔'' سویرا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''دوست کو پریشان دیکھ کر دوست تو دکھی ہوگا۔''

''ہاں..... شاید.....'' سویرا گاڑی کے شیشوں سے پار کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

''بڑے کہتے ہیں کہ شیئر کرنے سے پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ بوجھل دھڑکنوں کو قرار آ جاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو..... پریشانی کم ہو جاتی ہے..... مگر واہموں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ پل پل ڈستے ہیں۔'' سویرا نے عجیب سے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو..... دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے آج سے پہلے سویرا کو یوں منتشر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور شروع ہو گیا۔ ''سویرا بی بی ـــ دیکھیں..... (اس نے جان بوجھ کر بی بی کا اضافہ کیا تھا) ''وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ اس کے دادا کے پڑ دادا کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ ایک منفی جذبہ ہے جو بدگمانی سے جنم لیتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اتنی مختصر جیسے ایک سانس آ بھی ہے..... دوسرے پل میں نہیں۔ اتنی چھوٹی زندگی کے لیے ..... اتنی فکر..... اتنی پریشانی..... کیوں.....؟ ہمیشہ مثبت سوچو..... ہمیشہ..... اچھا سوچو.....''

بیک ویو مرر میں دلاور نے دیکھا کہ سویرا کے خزاں رسیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔

دلاور کے دل میں خوشی ناچ اٹھی۔ وہ بولا۔ ''اچھا آپ ساری باتیں چھوڑیں ..... مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔''

''ہاں پوچھو.....؟'' سویرا نے دوپٹا سر پر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی دلکش لڑکی..... واہموں..... اور اندیشوں سے اس قدر پریشان کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو دنیا کے سب سے خوبصورت رنگ اترتے ہیں۔ ان پیارے رنگوں سے دکھ کا رنگ میل نہیں کھاتا..... اس بدصورت رنگ کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دیجیے۔''

سویرا کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ صنف نازک کو خود کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور دلاور نے یہ کام ایسے وقت میں کیا تھا جب سویرا غمگین تھی۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ سویرا کی پریشانی جو کوئی بھی تھی، وہ ایک لمحہ اس پریشانی کو کافور کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سویرا اپنی اصل حالت میں واپس لوٹ آئی۔

وہ واقعی ایک من موجی لڑکی تھی۔ وہ بازار گئی۔ اس نے بھرپور شاپنگ کی۔ دلاور کے لیے خوبصورت سی گھڑی خریدی۔ واپس آ کر خود اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پر باندھی اور بولی۔ ''شکریہ دلاور..... تم ایک بہترین دوست ہو.....''

''مگر..... شاید..... یہ بہت قیمتی گھڑی ہے۔ میں اسے.....''

سویرا نے اسے روک دیا۔ ''خاموش رہو..... یہ تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے..... YOU MAKE MY DAY''

واپسی پر دلاور تحفے کے بوجھ تلے دبا رہا۔ یونیورسٹی پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے سویرا نے خاموشی توڑی، شوخی سے بولی۔ ''اگر تم مجھے لاہور نہیں لے کر گئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہارا گھر تمہاری جنم بھومی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں تفصیل بتاؤں گا تو آپ ارادہ ترک کر دیں گی۔'' دلاور بھی شوخی کے موڈ میں آ گیا۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' وہ بچوں کی طرح منہ پھلا کر ایک ادا سے بولی۔

''جس گلی سے آپ کو گزرنا پڑے گا، وہاں سے دو انسان اکٹھے نہیں گزر سکتے۔''

''تو کیا ہوا..... میں تمہارے پیچھے چل پڑوں گی۔ تم مجھ سے آگے چلنا.....''

''اس گلی میں اندھیرا اور سیلن زدہ بو ہوگی۔ ایک سائڈ پر گندی نالی ہوگی جہاں اکثر بچے رفع حاجت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ نظارہ سہہ پائیں گی آپ.....؟'' دلاور کی ہنسی چھوٹ گئی..... سویرا نے ایک

جھرجھری سی لی.....

دلاور، سویرا کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ کسی کے ہاتھ کا کٹا پھل نہیں کھاتی تھی۔ جس گلاس کو کسی نے چھوا ہوتا، وہ اس میں پانی نہیں پیتی تھی۔ پھپھو عالیہ اسے برہمن کہتی تھیں مگر وہ عادت سے مجبور تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی نے اس کی بے خبری میں اس کے ہونٹوں کو بہت دیر تک چھوا ہے۔

یونیورسٹی کا موڑ آنے والا تھا جب سویرا نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے تمہیں بہترین دوست کیوں کہا؟''

دلاور کو خاموش پا کر بولی۔ ''اس لیے کہ تم نے میرے کہنے پر حویلی سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اتنا بڑا فیصلہ ایک بہترین دوست ہی کر سکتا ہے۔''

دلاور کی زندگی نے یکا یک ایک بہت بڑا موڑ لیا تھا۔ یہ موڑ اتنا بڑا تھا کہ دلاور خود بھی چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے پنڈی چھوڑا تھا، لاہور کو خیر آباد کہا تھا۔ کراچی سے بھاگ نکلا تھا مگر روہی کی فضاؤں میں کوئی سحر تھا۔ چولستانی ہواؤں کے جھونکوں میں ایک غیر مرئی گرفت تھی جن سے آزادی ناممکن تھی۔

وہ پورا کا پورا سویرا کے عشق میں بھیگ چکا تھا۔ بات دور نکل چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی وہ سوچنے لگا، جس شدت سے وہ سویرا کو چاہنے لگا تھا، کیا سویرا کے دل میں بھی، اس کے لیے کوئی جذبہ موجود ہے؟ جواب ''ہاں'' میں آیا۔ سویرا نے کچھ خوبصورت اشارے دیے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''دلاور! تمہیں حویلی میں رہنا ہے۔ میں یہی بات تم سے کہنے کے لیے آئی تھی۔'' پھر اس نے کہا تھا۔ ''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ایسے دوست کا جو خود کو تمہارا قرض دار سمجھتا ہے۔ اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟

اس کے دل میں کیا نہاں تھا۔ آج اس نے دلاور کو ایک خوبصورت سی گھڑی تحفے میں دی تھی اور کہا تھا۔ ''تم بہترین دوست ہو.....'' اس نے دلاور کو اپنا بہترین دوست کیوں کہا تھا؟ کیا اس کے دل کا موسم تبدیل ہو چکا تھا؟ اس کے اور شاہ زمان کے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو چکی تھی؟ عورت کی دوستی سے غلط مطلب تو مرد لیتے ہی ہیں۔ کہیں وہ بھی تو غلط مطلب نہیں لے رہا تھا؟

ساری رات وہ جاگتا رہا۔ باتوں کی کڑیاں ملاتا رہا..... صبح تک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لکھنا جانتا تھا۔ جو باتیں زبان بیان نہیں کر سکتی تھی، اس نے خط میں لکھ دیں۔

کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ جس دن سویرا کا موڈ سب سے اچھا ہوگا۔ وہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس دن وہ کاغذ کا ٹکڑا سویرا کو تھما دے گا۔ اس کے بعد جو بھی ہو دیکھا جائے گا.....

مگر اگلے آٹھ دس دن میں بھی وہ موقع پیدا نہ ہو سکا۔ پانچ دن کے لیے اسے شاہ زمان کے ساتھ رحیم یار خان جانا پڑا..... وہی قیمتی باز والا معاملہ تھا..... شاہ زمان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری سے یہ مسئلہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ چھٹے دن یہ لوگ حویلی واپس آ گئے..... تہ کیا ہوا کاغذ اس کی جیب میں ہی تھا۔ وہ دن میں کئی دفعہ ٹٹول کر اس کی موجودگی کا اندازہ لگاتا تھا۔ حویلی پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے رحیم یار خان میں پانچ دن کانٹوں پر بسر کیے تھے۔ اب حویلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ سویرا رمشا کے ساتھ فورٹ عباس رمشا کی کزن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سویرا کے بغیر اسے حویلی سونی سونی لگی..... ایک دم خالی اور بکواس۔ سویرا کی واپسی چوتھے دن ہوئی..... مگر اگلے تین دن بھی سویرا کی شکل نظر نہیں آئی۔ دلاور کے حلق میں تمکین آنسوؤں کا ذائقہ گھل گیا۔ پہلی دفعہ اسے سویرا پر غصہ آیا..... وہ سرتاپا انتظار بنا بیٹھا تھا اور سویرا کو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی..... اگلا سارا دن بھی گزر گیا مگر سویرا نہیں آئی۔ انتظار کی تاریکی طویل ہوتی چلی گئی۔ دیدار کا اجالا نہیں پھیلا۔ اس کا وجود مسلسل انتظار کی تپش سے پھٹنے لگا۔ رگ رگ میں آگ سی بھرنے لگی..... ایک دو دفعہ اس کا دل چاہا خط کو نکالے اور اس کے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

وہ ایک دھندلی یا شاید سیاہ دوپہر تھی۔ صحرا کے جنوب کی سمت سے دور کچھ بگولے سے اٹھے تھے جنہوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ صحرائی بگولے حویلی سے کئی میل دور دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بگولے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے جیسے سورج کو چھونا چاہتے ہوں۔

ظفری کمرے سے نکل کر حویلی کے جنوب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ کمرے سے نکلتے وقت اس نے دلاور سے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے..... ابھی تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا ہے..... میں سیبوں والی حویلی کے دروازے بند کر آؤں۔'' سیبوں والی حویلی احاطے کے اندر ہی ایک طرف واقع تھی۔

ظفری کو گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا

اور کوئی اندر آ گیا.....

دلاور کا کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ وہ سویرا تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ سویرا کا دوپٹا سر سے اتر کر اس کے شانوں پر پھیل گیا۔ سنواری زلفیں منتشر ہوئیں تو دلاور کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بے ترتیب کھلے بالوں نے اس کے حسن کو کئی گنا زیادہ کر دیا تھا۔ وہ بال سمیٹ رہی تھی، سرکش ہوا شرارت کے موڈ میں تھی۔ سویرا نے شولڈر بیگ لٹکا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ پھر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے دلاور کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی شاہ زمان اور رمشا کے ساتھ بازار سے لوٹی ہے۔ شاہ زمان نے ایک مہنگی دکان سے سینڈوچ خریدے ..... رمشا اور شاہ زمان نے تو اپنے حصے کے کھا لیے۔ اس نے اپنا سینڈوچ بچا لیا پھر وہ دلاور کی طرف سیدھی ہوئی اور بولی۔ ''بوجھو ..... میں نے سینڈوچ کیوں نہیں کھایا.....''

دلاور کے وجود میں تو ہر طرف آتش بازی چھوٹ رہی تھی مگر اس نے اپنے چہرے پر خفگی کا پہرا بٹھا لیا اور سویرا کے سوال پر کچھ نہ بولا۔

سویرا کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑا آگے ہوئی۔ دلاور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کیا بات ہے..... کوئی مسئلہ ہے؟''

دلاور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس نے پورے پندرہ دن سویرا کا انتظار کیا تھا۔ اس نے ایک ایک سیکنڈ میں اسے سو سو دفعہ یاد کیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو آگے بڑھ کر سویرا کو گلے لگا لیتا..... تب تک اسے چومتا چلا جاتا جب تک انتظار کی کڑھن آنکھوں کے رستے بہہ نہ جاتی۔

سویرا کمرے میں بہت خوش خوش داخل ہوئی تھی مگر دلاور کو یوں دیکھ کر بجھ سی گئی تھی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھ کر دلاور کو خود غرضی کا احساس ہونا چاہیے تھا مگر اس کا دل غم سے بھر گیا۔ حلق میں پھندا سا لگ گیا۔

''مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر ایسا انجانے میں بھی ہوا ہے تو پلیز مجھے معاف کر دو۔'' سویرا نے بڑے دکھی لہجے میں کہا تو دلاور کا سینہ شق ہوگیا۔ جذبات کی شدت سے اس کی آنکھوں میں وہی نمی امڈ آئی جو تالاب کے پاس سویرا کو بچانے کے بعد اس کی آنکھوں میں در آئی تھی۔

وہ سویرا کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا، گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''سویرا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل..... میں.....''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''اصل میں کیا.....؟'' آنکھوں میں ہلکی سی شوخی کی چمک تھی۔

''اصل میں..... میں آپ سے ناراض تھا۔ اتنے دن آپ کی شکل نہیں دیکھ سکا اسی لیے دل تھوڑا سا باغی ہوگیا تھا اور پھر آپ کو بھی تو کوئی خیال نہیں آیا۔'' لہجہ دھیما اور شکوہ کناں تھا۔

''اب تو میں آ گئی ہوں نا..... اب خوش ہو جاؤ..... میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی سویرا کے لیے ایک چیز ہے جو وہ پچھلے چودہ پندرہ دن سے جیب میں ڈالے پھر رہا ہے مگر وہ اتنی ہمت اکٹھی نہ کر پایا۔

سویرا نے شولڈر بیگ سے سینڈوچ نکال کے دلاور کی طرف بڑھایا۔ سینڈوچ اس نے لے لیا اور بولا۔ ''آپ نے نہیں کھایا۔''

''نہیں..... تم کھاؤ.....'' اس نے کہا اور شولڈر بیگ کی سائڈ والی زپ کھول کے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ بالوں کی ایک سرکش لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں پتا ہے میں آج بہت خوش ہوں۔ اتنی جتنی میں کبھی آج سے پہلے نہیں تھی۔'' دلاور کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں پڑے کاغذ کے ٹکڑے کو ٹٹولنے لگا۔ وہ سچ بولنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ چاہے وہ کتنی بھی غلط تھی، چاہے وہ کتنی بھی انوکھی تھی۔ ''تم نے کہا تھا..... ہمیشہ مثبت سوچنا چاہیے۔ میں نے تمہاری بات پر عمل کیا دلاور! اور یقین جانو، مسئلہ حل ہوگیا۔ تھوڑے دن پہلے جس وہم نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی، وہ ختم ہوگیا۔ میں بے چین کر دینے والے اندیشوں سے نکل آئی۔''

وہ پتا نہیں کن واہموں اور کیسے اندیشوں کی بات کر رہی تھی۔ دلاور کا دل تو بس کاغذ کے اس ٹکڑے پر اٹکا ہوا تھا جو اس کی جیب میں تھا۔ سویرا نے ایک دیدہ زیب کارڈ نکال کر دلاور کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''بوجھو..... یہ کیا ہے؟'' دلاور نے نفی میں سر ہلایا..... تو وہ بے حد شوخ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ شادی کا کارڈ ہے.....''

''کس کی شادی کا.....'' وہ ڈبے میں پیک سینڈوچ کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کس کی شادی کا ہو سکتا ہے.....؟'' آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

''اب میں مجرم تو ہوں نہیں..... آپ ہی بتا دیجیے۔''

''نہیں، تم خود ہی پڑھ لو.....'' اس نے کارڈ دلاور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دلاور نے کارڈ پڑھا۔ زمین و آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ دروازہ اتنی زور سے بجا کہ یوں محسوس ہوا چوکھٹ سمیت نیچے گر پڑا ہو۔ ظفری نے ٹھیک ہی کہا تھا، طوفان آرہا ہے۔ سویرا سہم گئی، جلدی سے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے تیز آندھی آرہی ہے۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ مڑی پھر رک کر بولی۔ ''میرا سرپرائز کیسا لگا؟'' جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجانا کس قدر مشکل ہوتا ہے، یہ اس روز دلاور کو معلوم ہوا۔

سویرا چلی گئی۔ اس کی خوشبو بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے رخصت ہوگئی۔ سویرا کی شادی کا کارڈ اس کے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پندرہ دن بعد اس کی شادی شاہ زمان کے ساتھ ہورہی تھی۔ کراچی میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا، خدا نے اتنا زیادہ پانی ایک جگہ کیسے اکٹھا کردیا ہے مگر آج اس کی آنکھوں میں شاید اتنا پانی خدا نے اکٹھا کردیا تھا۔ ریت کے طوفان نے چوڑیرو حویلی، اس سے باہر روہی اور اس سے آگے منڈ بھیرو کے رنگیلے بازاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ دھڑادھڑ بجنے لگے تھے۔ دلاور کی آنکھوں میں ویرانوں کی دھول تھی۔ اس کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔

اس رات اسے بخار ہوگیا۔ باہر ریتیلی آندھی کے جھکڑ چلتے رہے۔ وہ اپنے بستر پر پڑا بخار میں پھنکتا رہا۔ لاہور میں لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے ایک تنگ گلی والا بازار بائیں طرف اوپر کو چڑھتا تھا۔ اس بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں کا ایک گورکھ دھندا سا تھا۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی میں اس کا سارا بچپن گزرا تھا۔ نیم تاریک گلی کا سیلن زدہ ''تھڑا'' اس کی من پسند جگہ تھی۔

جس عورت کے پاس وہ رہتا تھا، وہ اس کی ماں نہیں تھی۔ چاچی..... ماسی..... نانی..... دادی بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کون عورت تھی وہ جس نے اسے پالا تھا۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو وہ عورت مرگئی۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بیٹھ کے وہ بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں رویا۔ رونا اسے اچھا نہیں لگتا تھا مگر آج وہ رونا دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ آج ایک جیتی جاگتی عورت نے اسے رولے پر مجبور کردیا تھا۔ وجہ صاف تھی۔ یہ دلاور کی زندگی میں داخل ہونے والی دوسری عورت تھی۔

اگلے تین دن بھی اس کا بخار نہ اترا۔ ظفری اسے دوا لاکر دے رہا تھا اور مسلسل اس کی تیمارداری بھی کررہا تھا۔ ظفری دلاور کے کہنے پر ہی ملتانی کو منڈ بھیرو سے بلا لایا تھا..... ملتانی کے آنے سے ظفری کی ڈیوٹی کم ہوگئی۔ ملتانی، دلاور کی خدمت میں جت گیا۔

دلاور کی حالت سدھرنے لگی۔ بخار کم ہونے لگا۔ یہاں ہر گزرتے دن کے ساتھ دلاور ٹھیک ہورہا تھا۔ دوسری طرف ہر گزرتے دن کے ساتھ حویلی کی سجاوٹ میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ برقی قمقمے لگ رہے تھے۔ رنگ برنگی لائٹوں اور مصنوعی پھولوں سے حویلی کو لاد دیا گیا تھا۔ ولیمے کے لیے بہت بڑے دسترخوان کا انتظام کیا جارہا تھا۔ دو ہزار کے قریب مہمانوں کی لسٹ تیار کی گئی تھی مگر سٹنگ اور کھانے کا انتظام اس سے بھی زیادہ کا رکھا جارہا تھا.....

شادی میں چار دن باقی رہ گئے تھے۔ ظفری کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ سویرا..... پھپھو عالیہ..... اور رمشا..... بہاولپور میں رمشا کے خالو کے گھر شفٹ ہوگئے ہیں۔ اب برات چوڑیرو حویلی سے بڑی آن بان سے نکل کر رمشا کے خالو کے گھر جانی تھی۔

شادی سے ایک دن پہلے دلاور ملتانی سے بولا۔ ''چل یار..... یہاں سے کہیں دور چلے جائیں..... اب میرا دل یہاں پر نہیں لگے گا۔''

''کہاں جائیں گے ہم؟''

''کہیں بھی مگر یہاں سے دور..... جہاں بہت ساری ہوا ہو..... میں..... میں کھل کے سانس لینا چاہتا ہوں.. یار..... یہاں کی ہوا صحیح نہیں ہے..... اس ہوا میں گندھک ملی ہوئی ہے۔ میرا سارا سینہ جھلس گیا ہے۔ میرا سارا اعلق چھل گیا ہے.....'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

دلاور کا درد بھرا لہجہ محسوس کرکے ملتانی چونک گیا۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوئے لالے! تیرے چہرے پر تو عشق کا پینٹ ہوا، ہوا ہے۔ مجھے ٹھیک سے بتا بات کیا ہے؟'' ملتانی دلاور کا رازدان تھا۔ اس کا اصرار بڑھا تو دلاور نے اپنی کہانی کے خاص خاص حصے سنا ڈالے۔ ملتانی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔

''یار..... یہ سب بہت برا ہوا۔'' ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے سر کو کھجایا اور پینترا بدل کر بولا۔ ''اب میں

تجھے یہاں زیادہ دیر رکنے نہیں دوں گا..... صبح ہوتے ہی ہم واپس منڈ بھیرو چلیں گے..... پھر اس سے اگلے دن ہم دونوں پنڈی چلے جائیں گے۔ ایک کام کا ٹھیکا ملا ہے مجھے' چار پانچ دن بعد جانا تھا مگر اب پرسوں ہی چلیں گے....." ملتانی بڑے ٹھوس لہجے میں کہہ رہا تھا مگر دلاور جانتا تھا..... اب رہائی ممکن نہیں تھی۔ سویرا تو پرسوں دلہن بن کر اس گھر میں آ رہی تھی، اپنی تمام تر کوششوں اور ارادوں کے باوجود وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ عشق کی نادیدہ ڈور نے اس کے ہاتھ باندھ کر اس کے پورے وجود کو جکڑ دیا تھا۔

شاید یہ خود اذیتی تھی۔ وہ سویرا کی شادی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی..... یہ چوڑیرو گاؤں کے "بڑے سائیں" کی شادی تھی۔ جتنی بھی خوشی منائی جاتی کم تھی۔ طوفان آتے ہیں تباہی مچاتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ شادی کا طوفان بھی ہر چیز کو نیست و نابود کر کے گزر گیا..... شادی کے بعد تین چار دن دلاور شراب کے نشے میں دھت اپنے بستر پر پڑا رہا۔ شراب کا حصول اس حویلی میں کون سا مشکل کام تھا۔

اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔ صرف سگریٹ پیتا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے نشہ شروع کر دیا۔ اس "بیماری" کو خود سے لپیٹ لیا جو اسے سویرا کی یاد سے نجات دلا سکتی تھی۔ شادی کے پانچویں دن ملتانی سو منت سماجت کے باوجود واپس لوٹ گیا' دلاور اس کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ ابھی اور اذیت سہنا چاہتا تھا۔

یہ شادی کے دو ہفتے بعد کی بات تھی۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب سویرا ٹہلتی ٹہلتی دلاور کے کمرے تک آ گئی تھی۔ اس نے بڑی کامدار شال لے رکھی تھی۔ اب وہ چوڑیرو حویلی کی نئی بہو تھی..... اس کی چال میں ایک شاہانہ تمکنت آ گئی تھی۔ وہ دلاور سے سخت خفا تھی۔ وہ شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً سویرا کو دلاور کی بیماری کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اس کا احوال جاننے کے لیے ہی ٹہلتی ہوئی اس طرف آ نکلی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ دلاور اندر موجود نہیں تھا۔ ظفری بھی کسی کام سے نکلا ہوا تھا۔ سویرا اندر داخل ہو گئی۔ سارا کمرا بے ترتیب اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ اس کے دل میں خیال آیا کہ دلاور والی سائڈ کی چیزیں سنبھال دے مگر دوسرے لمحے ہی اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔

الماری کھلی ہوئی تھی، کپڑے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہینگر کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی۔ اس کو جھٹکا لگا۔ اس نے فوراً الماری بند کر دی۔ الماری کے ساتھ ہی ایک ادھ کھلا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ اس نے وہ کھولا، اس میں بہت سی چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ان بے ترتیب چیزوں میں سے اس نے لکڑی کا ایک خوبصورت ڈبا اٹھا لیا۔ اس نے آہستگی سے اسے کھولا تو حیران رہ گئی۔ سب سے اوپر ایک رومال پڑا تھا۔ یہ وہی رومال تھا جو سویرا نے ایک بار دلاور کو آنسو پونچھنے کے لیے دیا تھا۔ رومال کے نیچے وہ گھڑی تھی جو سویرا نے اسے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اس سے نیچے ٹوٹی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے تھے۔ سویرا دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ یہ چوڑیاں اسی کی تھیں۔ پر یہاں کیسے پہنچی تھیں۔ چوڑیوں کے نیچے ایک کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ سویرا نے وہ کاغذ کھولا۔ خوش خط الفاظ میں نظم لکھی تھی۔ تم کب تک مجھ کو بھولو گے..... اس نے ساری نظم پڑھ ڈالی۔ یہ آزاد نظم اس کی تخلیق کردہ تھی۔ سویرا نے پلنگ کا پایہ تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ آج اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا تھا۔

☆☆☆

دلاور نہ زمین پر تھا نہ آسمانوں میں۔ اس کا وجود جیسے ہواؤں میں معلق تھا۔ ظفری اکثر اسے اپنی حالت سدھارنے کا کہتا۔ مگر کسی کے کہنے سے اس کی حالت کہاں سنبھلنے والی تھی۔ ظفری یہی سمجھتا تھا کہ دلاور گھریلو طور پر بے حد پریشان ہے۔ دلاور نے اسے اپنے گھر بار کے بارے میں دردناک من گھڑت کہانی سنا رکھی تھی اور یہ جھوٹ گھڑنے کا مشورہ دلاور کو ملتانی نے دیا تھا۔

دلاور اس وقت سیبوں والے باغ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ "سیبوں والا باغ" اصل میں وسیع و عریض چوڑیرو حویلی کا جنوب مشرقی حصہ تھا۔ یہاں کوئٹہ کا سب سے اچھا سیب لاکر پیک کیا جاتا تھا اور پھر مڈل ایسٹ میں ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ دلاور کی حالت ابتر تھی۔ اس کے بال الجھے، شیو بڑھی ہوئی تھی۔ شکل سے مہینوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ ظفری سیبوں والے باغ کا نگران مقرر تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ سیبوں کی پیٹیاں کنٹینر میں لوڈ کروا رہا تھا۔ سیبوں والے باغ میں آنے کا مشورہ ظفری نے ہی اسے دیا تھا۔ ظفری ہمدرد اور انسان دوست آدمی تھا۔ وہ

چاہتا تھا کہ دلاور اپنے کمرے میں پڑا رہنے کے بجائے چلے پھرے..... حویلی میں گھومے، خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرے جس سے اس کی موجودہ خراب طبیعت درست ہو۔ دلاور کو باغ میں آتا دیکھ کر ظفری کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری پھر گہری ہوگئی۔ وہ کنٹینر سے چھلانگ لگا کر اتر آیا بولا۔ ''یارا! بہت اچھا کیا تم ادھر آ گئے۔'' وہ ہاتھ میں پکڑا ایک سیب چمکا کر دلاور کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ ''یارا! خود کو سنبھالو..... نہاؤ..... شیو بناؤ..... اچھے کپڑے پہنو۔ بخار تو کب کا رخصت ہوگیا۔ تم اب اپنے ذہن سے پریشانی کو بھی رخصت کردو۔''

ظفری کی بات پر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ وہ دل کھول کے ہنسنا چاہتا تھا مگر اس کا دل مر گیا تھا۔ کوئی چیز کوئی منظر، کوئی بات بھی تو اسے اچھی نہیں لگتی تھی..... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے مرنے کے بعد بھی اس کی حالت کافی دن ایسی ہی رہی تھی۔ پھر تھوڑے دنوں بعد وہ بہتر ہوگیا تھا۔ کیا اب بھی ایسا ہوگا؟ تھوڑے دن..... کچھ ہفتے..... گزر جانے کے بعد وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا؟ جواب نفی میں آیا..... گھاؤ پہلے زخم سے زیادہ گہرا اور کاری تھا۔

ظفری..... سیبوں والا کنٹینر چوڈیرو کی حدود سے باہر نکلوانے کے لیے چلا گیا اور دلاور کو تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ گیا۔

باغ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر تھوڑا اونچا تھڑا سا تھا جس پر فاصلے سے لوہے کے پائپ لگے تھے اور ان پائپوں کے اوپر ٹین کی چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ ٹین کی چھت کے نیچے جابجا پرالی بکھری ہوئی تھی۔ دھلے دھلائے سیب صاف کرکے خوبصورت کریٹوں میں پیک کیے جارہے تھے۔ دھلے سیب دیکھ کر دلاور کے دل میں امید سی جاگی۔ وہ ٹین کی چادروں والی چھت سے پرے ہٹتا چلا گیا۔ وہ درختوں سے گھرے اس حجرے کی عقبی جانب بڑھ گیا جہاں سے دھلے ہوئے سیب لائے جارہے تھے۔ دلاور کو من کی مراد مل گئی۔ حجرے کی بیک سائڈ پر پانی کا تالاب موجود تھا۔ ہیوی موٹر کی آواز گونج رہی تھی اور تقریباً پانچ انچ قطر کے پائپ سے جھاگ اڑاتا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔ یہ حوض نما تالاب کم وبیش تین سو مربع فٹ کا تھا۔ تالاب میں سے پانی نکال نکال کر سائڈ پر بنی ہوئی حوضیوں میں سیب دھوئے جاتے تھے مگر اب نہیں دھوئے جارہے تھے۔ دلاور نے تالاب کے قریب بیٹھے ایک ملازم سے اجازت لی اور

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یا آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شہر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

کپڑوں سمیت تالاب میں اتر گیا..... وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا۔ گہرے پانی کی مچھلی جو لاکھوں ٹن پانی کے دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے جس دباؤ پر چیزیں پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں، وہ سکون سے تیرتی ہے۔ دباؤ کی زیادتی اس کی زندگی..... دباؤ کی کمی اس کی موت ہوتی ہے۔ وہ سینے سے سانس نکال کر تالاب کے پیندے میں جا بیٹھا۔ تالاب دس فٹ کے قریب گہرا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ یہاں دنیا کی مصیبتوں، اس کے رنج و غم سے دور ہو گیا ہو۔ ہلکی ہلکی سرگوشیوں جیسی آوازیں تھیں جو اس کی سماعت سے ٹکراتی تھیں..... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے گھر اکثر وہی آدمی آیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ دلاور کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کا گھر والا ہے۔ اس کا نام سرفو تھا، مگر سب اسے سرفو دم گھٹ کہتے تھے۔ وہ راوی کے پانیوں کا کینچوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بغیر سانس لیے پندرہ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔ وہ جب بھی اس گھر میں آتا دلاور کو اپنے ساتھ دریائے راوی لے جاتا۔ خود پانی میں اترتا، اسے بھی غوطہ لگانے پر مجبور کرتا۔ اس وقت دلاور کی عمر سات آٹھ سال ہوگی (دلاور کا نام..... دلاور بھی اسی نے رکھا تھا) پانی کے اندر شروع شروع میں دلاور کی حالت بری ہو جاتی۔ وہ کھانستا، غوطے کھاتا، پانی ناک میں داخل ہو کر اس کا تالو چھیل دیتا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے مگر سرفو دم گھٹ کو اس پر رحم نہ آتا۔ ان لمحات میں سرفو دم گھٹ، دلاور کو دنیا کا سب سے ظالم انسان لگتا مگر اس سختی کے پیچھے ایک تربیت چھپی ہوئی تھی..... پتا نہیں کیوں سرفو دم گھٹ جاتے جاتے اپنا فن دلاور میں منتقل کر گیا۔ سخت، جان لیوا تربیت میں دلاور کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب گہرے پانی کی مچھلی بن گیا ہے۔ سرفو دم گھٹ کی تربیت قریباً تین سال تک جاری رہی۔ دلاور کو پالنے والی عورت کے مرنے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ عورت دنیا سے کیا گئی، سرفو دم گھٹ بھی جیسے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد دلاور نے اسے کبھی نہیں دیکھا مگر تب تک ایک نایاب ہنر دلاور میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ جب حد سے زیادہ پریشان ہوا کرتا تو راوی کے پانی میں کود جاتا۔ کنارے پر کسی جڑ کو پکڑ کر تین چار منٹ تک زیرِ آب رہتا۔ جب سینے میں رکی سانس اس کے پھیپھڑوں کو جھنجوڑنے لگتی، وہ سطحِ آب پر آ جاتا۔ سانس لے کر دوبارہ زیرِ آب چلا جاتا۔ آج بھی وہ ہمیشہ سے زیادہ دکھی تھا۔ حویلی میں تالاب نظر آیا تو جیسے وہ جی اٹھا اور پھر..... من پسند کھیل شروع ہو گیا..... وہ روز سیبوں والی حویلی میں آتا اور بہت دیر تک اپنا پسندیدہ کھیل کھیلتا۔ دم توڑتی مچھلی پانی ملنے سے دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ وہ بھی جیسے دوبارہ زندہ ہونے لگا تھا، دن بدن بہتری کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ پہلے وہ ہر دم نشے میں رہتا تھا مگر اب نشے والی حالت میں کمی ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں ایک روز ایک عجیب واقعہ بھی ہوا۔ تالاب میں غوطہ زن رہنے کے بعد دلاور پانی کی سطح پر ابھرا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر بڑی آپا، کٹی ناک والی نگینہ بیگم اور سویرا وغیرہ کھڑی تھیں۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر باغ کی سیر کو آئی تھیں۔ دلاور کا بالائی جسم عریاں تھا۔ بڑی آپا کی نگاہ سیدھی دلاور کی چھاتی پر پڑی۔ وہاں افقی رخ پر وہی دس بارہ انچ لمبا زخم تھا جو سویرا کو بچاتے ہوئے دلاور کے سینے پر آیا تھا۔ دلاور صرف شلوار میں تھا، اس نے باہر نکل کر جلدی سے چادر میں اپنا جسم لپیٹا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ بڑی آپا نے کہا۔ ”دلاور! کافی لمبا چیٹ لگا ہوا ہے تجھے، شکر کر تیری جان بچ گئی۔“

دلاور نے کہا۔ ”جی ہاں، چیٹ تو لگا ہے..... لیکن اب پرانا ہو گیا ہے۔“

بڑی آپا کے پیچھے کھڑی ایک ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ”توبہ اللہ جی۔ بڑی خطرناک لڑائی تھی وہ۔ جب چانڈیو کے بندے نے چاقو چلایا تو میں نے اپنی انکھیوں سے دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ اگر اس ویلے دلاور سامنے نہ آتا تو یہ چاقو..... اللہ نہ کرے سویرا باجی کو ہی لگنا تھا۔“

دلاور کو لگا جیسے اس کا کوئی قیمتی راز افشا ہو گیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سویرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ عورتیں اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگ پڑیں۔ دلاور موقع دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد دو تین ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ سویرا، شاہ زمان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایسی بیوی ثابت ہوئی تھی جو اپنی اطاعت، ناز و ادا اور موقع محل کے مطابق بات چیت سے خاوند کا دل جیت لیتی ہے۔ شاہ زمان اس کے حسن کا اسیر تو پہلے سے تھا۔ اب اس کی سیرت کا گرویدہ بھی ہو چلا تھا مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی رگوں میں جاگیردارانہ خون بھی دوڑتا تھا۔ وہ کسی وقت رات کو حویلی میں راگ رنگ کی محفل بھی جما لیتا تھا۔ سویرا ادبی زبان میں اعتراض کرنے کے بعد خاموش ہو جاتی

تھی۔ ایک جوان چودھری کی حیثیت سے شاہ زمان ''نظربازی'' سے بھی باز نہیں آتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ شاہ زمان اور سویرا دالان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چائے کا سامان میز پر ترتیب سے رکھنے والی ملازمہ ماروی تھی۔ اس نے اپنا جسم باریک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے جسم کا انگ انگ کھنچ کر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ شریف سے شریف انسان کی آنکھیں بھی اس کے قیامت خیز جسم سے ٹکرائے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس کا رنگ گندمی، چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ لانبی آنکھوں میں لگے کاجل میں حسن کی ایک داستان رقم تھی۔ اس کا حسن کسی بھی پارسا کا بیڑا غرق کرسکتا تھا۔

وہ جھک کر چائے بنا رہی تھی اور شاہ زمان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وقتاً فوقتاً اسے دیکھ رہا تھا۔ سویرا کی لاعلمی کے دوران جتنی دفعہ اس کی نظر ماروی کی طرف اٹھتی، نگاہ کی پیش پہلے سے بڑھی ہوتی ..... عورت چار آنکھیں رکھتی ہے۔ سویرا سب جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔ شاہ زمان نے اس کے انجان بنے رہنے کو اپنا کارنامہ سمجھا اور مزید دلیر ہوگیا۔ وہ باتیں تو سویرا سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز ماروی تھی..... آخر سویرا زچ ہوگئی۔ اس نے تھوڑے سخت لہجے میں ماروی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو شاہ زمان یوں انجان بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو.....

تھوڑی دیر پہلے سویرا بہت اچھے موڈ میں تھی مگر شاہ زمان کی نظربازی نے سویرا کے موڈ کا ستیاناس کردیا۔ باقی وقت وہ خاموش رہی، صرف ہوں ہاں سے شاہ زمان کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔

اگلی رات، ڈنر میں کھانا سرو کرنے والی بھی ماروی تھی۔ بڑے ٹیبل پر کھانا لگایا گیا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے اور بظاہر شاہ زمان، شاہ فرمان سے باز کے سلسلے میں کوئی گرما گرم بحث کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں ماروی کا طواف کر رہی تھیں۔ کھانا سویرا کے حلق میں اٹکنے لگا۔ ابھی تو اس کی شادی کو ڈھائی تین ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔ شاہ زمان یہ کیا کر رہا تھا۔ آدمی عورتوں کی جانب دیکھتے ہیں مگر اس طرح دیکھنے اور شاہ زمان کے اب والے دیکھنے میں بڑا فرق تھا اور یہ فرق سویرا کو بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو لاکھ بہانے دے کر بہلا لیا کہ وہ یوں ہی شکی مزاج ہو رہی ہے۔ آدمی عورتوں کی طرف دیکھتے ہی ہیں۔ اسے شاہ زمان کی نظر پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے لیکن .....

بھلکڑ

جنرل وارڈ میں ایک صاحب سے جن کا ابھی ابھی آپریشن ہوا تھا، برابر میں لیٹے ہوئے مریض نے پوچھا۔ ''آپ کو آپریشن کے بعد کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

وہ صاحب بولے۔ ''اجی کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔''

پڑوسی مریض بولا۔ ''یہ ڈاکٹر صاحب دراصل بھلکڑ ہیں۔ ایک آپریشن کے بعد انہیں مریض کا پیٹ دوبارہ کھولنا پڑا کیونکہ وہ اس کے پیٹ میں قینچی بھول گئے تھے، دوسرے مریض کے پیٹ میں چاقو بھول گئے تھے۔''

اتنے میں ڈاکٹر صاحب گھبرائے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ''بھئی کسی نے میری چھتری تو نہیں دیکھی؟'' اتنا سننا تھا کہ آپریشن والے صاحب بے ہوش ہوگئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

لیکن یہ سلسلہ تو کئی ہفتوں سے سویرا کو نظر آرہا تھا۔ اس رات سویرا نہ سوسکی۔ صبح ناشتا دونوں نے باہر لان میں کیا۔ چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''آج کل آپ بڑے دل پھینک لگ رہے ہیں۔'' شاہ زمان ہنس دیا۔ سلائس کا ٹکڑا منہ میں چباتے ہوئے بولا۔

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' وہ لانبی انگلی شاہ زمان کے پہلو میں گھساتے ہوئے بولی۔

''آپ کی ..... اور مجھے لگتا ہے آپ کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔'' اس کی انگلی رینگتی ہوئی شاہ زمان کے سینے پر آگئی۔

شاہ زمان نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور سویرا کا ہاتھ فوراً پرے ہٹا دیا۔

''کیا ہوا.....؟'' سویرا قہقہہ مارتے ہوئے شوخی سے ہنسی۔

''کیا کر رہی ہو..... کوئی دیکھ لے گا.....'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''اچھا جی..... آپ کو اپنی عزت کا بڑا خیال ہے۔'' اس نے شاہ زمان کے پہلو میں چٹکی لی پھر بولی۔ ''ہاں ڈنر

میں تو سب کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کررہے تھے آپ..... ایک منٹ کے لیے بھی ماروی سے آپ کی نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔"

سویرا کی بات پر وہ دل کھول کر ہنسا..... بولا۔ "تم عورتیں بھی پتا نہیں کیا مخلوق ہو۔ ہر وقت شک کی دنیا میں جیتی ہو۔"

"تو کیا..... شک نہ کروں..... آپ برابر..... اسے گھورے جارہے تھے۔" وہ مصنوعی خفگی سے لاڈ دکھاتے ہوئے بولی۔ وہ ادائیں دکھارہی تھی..... شاہ زمان کو چھیڑ رہی تھی مگر اندر اس کے دل میں اک گرہ سی لگ گئی تھی۔

شاہ زمان بولا۔ "تو شک نہ کیا کر..... چوہدری حویلی کے مردوں کے خون میں یہ چیز شامل ہے۔ ہم لوگ عورتوں کے قدردان ہیں اور خاص طور پر خوبصورت عورتوں کے..... تمہارے جیسی....." وہ اس کی طرف اشارہ کرکے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "اور ضروری نہیں ہے ہر خوبصورت عورت کو ہم اپنی بیوی بنالیں..... اسی لیے میں مفت مشورہ دیتا ہوں..... تو ایویں شک کے بیج نہ بویا کر....." سویرا جانتی تھی کہ شاہ زمان نے یہ باتیں مذاق میں کی ہیں۔ وہ یہ باتیں کرتے ہوئے اشارے کنائیوں سے اسے چھیڑ بھی رہا تھا..... مگر سویرا یہ بھی جانتی تھی کہ اس مذاق کی آڑ میں سچ بھی جھلک رہا تھا۔ شادی سے قبل اس نے اپنے ذہن میں جو اندیشے دبادیے تھے، وہ صرف دو تین ماہ بعد ہی سر اٹھانے لگے تھے۔

☆☆☆

دلاور کے ہاتھ میں عجیب شغل آگیا تھا۔ اس نے ظفری سے اجازت لے لی تھی۔ وہ روزانہ سیبوں والے باغ کا رخ کرتا اور گھنٹوں اپنا من چاہا کھیل کھیلتا۔ تالاب کے پانی میں ڈبکی لگاتا تو دنیا کے رنج والم کچھ دیر کے لیے پانی سے باہر رہ جاتے..... ظفری کسی کام سے تھوڑے دنوں کے لیے صادق آباد گیا ہوا تھا۔ دلاور کمرے میں اکیلا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتا تو سرکش سوچیں اس پر حاوی ہونے لگتی تھیں۔

باہر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا تھوڑی دیر میں بارش شروع ہوگی اور کئی مہینوں سے پیاسی زمین سیراب ہوجائے گی۔

جس سوچ اور جس جذبے کو سلانے کی سعی وہ پچھلے دو تین ماہ سے کررہا تھا اور جس میں وہ کچھ کامیاب بھی ہوا تھا، جاگ گیا۔ بدلتے موسم اور مست ہواؤں نے یکا یک، اس کے اندر کا موسم بھی بدل ڈالا۔ شادی کے بعد اس نے دو تین دفعہ سویرا کو نئے ڈرائیور کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔ وہ سویرا کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پچھلے چند ہفتے سے اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ اب وہ یہ حرم چھوڑ جائے۔ مگر اب شاہ زمان نے اسے یہاں روک لیا تھا۔ وہ اس سے کوئی اہم کام لینا چاہتا تھا۔ وہ "اہم کام" کیا تھا، دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی دلاور کو معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ دلاور کے دل میں نشے کی مدہوشی کے عالم میں کئی دفعہ یہ سوال اٹھا تھا کہ سویرا کو ایک دفعہ بھی اس سے ملنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ چاہتی تو "پیار" دلاور کی خبر لینے ہی آجاتی۔ مگر وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ سویرا اس کی خبر لینے ہی آئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں وہ کچھ دیکھ گئی تھی کہ دوبارہ وہاں آنے کی ہمت اس میں نہ رہی تھی۔

سہانے موسم نے آج اس کے دل کے تار چھیڑ دیے تھے۔ تھوڑی دیر بوندا باندی ہوتی رہی پھر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس نے اٹھ کے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سوندی گیلی مٹی والی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ جھوم اٹھا۔ سویرا شدت سے اسے یاد آنے لگی۔ اس کے نرم گلابی ہونٹ اب تک اسے بھولے نہیں تھے۔ اس نے ان ہونٹوں سے ایسا جام پیا تھا کہ مرتے دم تک اس نشے سے آزاد نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے بھولنے کی خاطر اس واقعے کو بے خبری کے پاتال میں پھینک دیا تھا مگر ایسے "حادثے" کب بھولتے ہیں۔ جب جب کلیاں کھلتی ہیں، جب جب بارش برستی ہے، اس واقعے کی یاد دل کی دیواروں کو ٹھوکریں مارتی ہے۔

باہر بارش برستی رہی اور وہ رات بہت دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ اس کی آنکھ نہ جانے کب لگی..... مگر تھوڑی دیر میں ہی وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا..... حواس کچھ بحال ہوئے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھ بستر پر کوئی اور بھی ہے۔ ایک نامانوس سی خوشبو بھی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس نے لائٹ آن کردی..... خدا کی پناہ..... اس کے بستر پر ایک قیامت موجود تھی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کا جوان قاتل جسم دلاور کے دماغ میں دھماکے کررہا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ مخمور نگاہوں سے دلاور کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کاجل لگی آنکھوں میں ایک داستان رقم تھی۔

دلاور نے اس فتنہ پرور لڑکی کو بے شمار دفعہ حویلی کے برآمدوں اور نشست گاہ کے آس پاس کام کرتے اور آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ وہی ماروی تھی جس کو حویلی کا ہر مرد للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لڑکی..... یہاں..... اس کے بستر پر رات کے ڈیڑھ، دو بجے کے قریب اس حالت اور ایسے موسم میں کیا کر رہی تھی؟ دلاور کو سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ اس نے بڑی عجلت میں کمرے کا دروازہ کھولا، دھیمے مگر نہایت سخت لہجے میں بولا۔ ''چلو..... یہاں سے باہر نکلو..... تم کیا کر رہی ہو میرے کمرے میں؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر ایک ادائے قاتلانہ سے دلاور کی جانب دیکھا۔ آہستگی سے بستر سے اٹھی۔ دلاور کے قریب آ کر دروازہ بند کر دیا۔ دلاور نے غصے کے عالم میں دروازہ کھولنا چاہا تو وہ شعلہ بدن پوری کی پوری دلاور کے ساتھ آ لگی۔ دلاور ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ رات، تنہائی، بارش اور ساتھ لگا ایک جوان نسوانی جسم..... دلاور جیسے سرتاپا پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے اس لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے علیحدہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی کاجل لگی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ سمجھ پاتا یا اس سے کوئی سوال کرتا، وہ بولی۔ ''دلاور! مجھے معاف کر دینا۔ مجھے ایسا رستہ اختیار کرنا پڑا..... میں خود کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں تک پہنچی ہوں.....''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' دلاور کا لہجہ درشت تھا۔

''میں تم سے پیار کرتی ہوں..... اور اس دن سے کرتی ہوں جس دن تم نے اس حویلی میں قدم رکھا ہے.....'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر بولی۔ ''ٹھہرو، تمہیں یوں سمجھ نہیں آئے گی..... میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ یہاں آؤ..... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔''

اس لڑکی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دلاور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی اور بولی۔ ''میرا نام ماروی ہے۔ ترنڈا کی رہنے والی ہوں۔ اس حویلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں جس لڑکے سے پیار کرتی تھی اس کا نام بابو تھا۔ اس کی شکل تم سے بہت ملتی تھی۔ تمہارے جتنا قد کاٹھ، تمہارے جیسا جسم۔ تین سال ہوئے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گیا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں پگلی اور دیوانی ہو گئی۔ میں ہر روز اس کی یاد میں آنسو بہاتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے تمہیں حویلی میں دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا..... میں سمجھی بابو لوٹ آیا ہے مگر دلاور جانے والے کب واپس لوٹ کے آتے ہیں۔ تم بابو نہیں ہو..... بابو جیسے تو ہو نا..... روپے میں آٹھ دس آنے تو اس سے ملتے ہو نا۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے بابو ابھی زندہ ہے۔ میرے پاس ہے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اٹھ کر دلاور کو اپنی بانہوں میں لے لیا.....

دلاور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا سر کسی گداز میں دھنستا چلا گیا..... نسوانی بدن کی خوشبو نے اس کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بہک جاتا..... اپنی ہی نظروں میں گر جاتا، اس نے خود کو ماروی سے علیحدہ کیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ماروی! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ میں صبح تم سے بات کروں گا۔'' دلاور نے لاکھ جتن کر کے اسے وہاں سے رخصت کیا اور واپس آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ زمانے بھر کی خاک چھاننے والا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا دلاور اتنا تو سمجھ رہا تھا کہ ماروی خود سے یہاں نہیں آئی تھی، اسے کسی نے بھیجا ہے۔ کس نے بھیجا، یہ سوال جواب طلب تھا۔

ماروی نے جو کہانی اسے سنائی تھی، وہ نہایت کمزور اور بوگس تھی۔ کہانی سناتے ہوئے اس کے جذبات اور اس کا لہجہ میل نہیں کھا رہا تھا۔ وہ جیسے کسی کا یاد کرایا ہوا سبق پڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں ماروی اس کے لیے عجیب دردِ سر بن گئی۔ جب موقع ملتا وہ آن ٹپکتی اور پھر اس کی جان نہ چھوڑتی۔ وہ بہت دیر اس سے باتیں کرتی رہتی۔ صاف پتا چلتا تھا، وہ اسے خود کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر حربہ آزما رہی تھی۔

ایک دن وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا۔ آج وہ پہلے دن اپنی ڈرائیوری کی ڈیوٹی پر واپس آیا تھا۔ پستول اس نے اپنے ہولسٹر میں لگا رکھا تھا..... آگے جھک کر صفائی کرتے ہوئے پستول پسلیوں میں چبھنے لگا تو اس نے پستول نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب ماروی اگلا دروازہ کھول کے اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

''تم یہاں بھی پہنچ گئیں.....؟'' دلاور نے اسے گھورا۔

''میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گی.....'' وہ بالوں کی

ایک آوارہ لٹ کو انگلی پر گھماتے ہوئے بولی۔ جواب میں دلاور کچھ نہیں بولا، اپنے کام میں منہمک رہا..... ماروی نے ڈیش بورڈ سے پستول اٹھالیا، دلاور کی جانب کرتے ہوئے بولی۔

''اور اگر تم نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تو ..... میں تمہیں گولی ماردوں گی۔'' وہ ایک آنکھ بند کیے اس کا نشانہ لیے ہوئے تھی۔

دلاور نے جھپٹ کے اس سے پستول چھینا تو وہ ایک دم سہم گئی..... دلاور نے اسے بے نقط سنا ڈالیں..... پہلے وہ خاموش ہوئی پھر چہرے کے تیور بگڑے۔ نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر جلی آنکھوں میں آنسو لے آئی..... اس نے تیزی سے اس سے پستول چھینا تھا اسی دوران اس کے ناخنوں سے ماروی کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا۔ دلاور کا دل نرم پڑ گیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا..... اسی دوران شاہ زمان اندر سے برآمد ہوا۔ اس کا دھیان گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھی ماروی پر پڑا۔ ماروی نے چونک کر دلاور سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گاڑی سے نکل کر سر پر دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ شاہ زمان نے جاتی ہوئی ماروی کو بڑی گہری اور غصیلی نظروں سے دیکھا اور گاڑی کی طرف آ گیا۔ دلاور نے بڑی سرعت سے شاہ زمان کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا..... شاہ زمان بڑے کروفر سے گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی تیزی سے حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ خاموشی کے گزر گئے پھر شاہ زمان کی بھاری آواز گونجی۔

''اب تم کیسے ہو.....؟''

''اللہ کا کرم ہے بڑے سائیں..... پہلے سے بہت بہتر ہوں.....''

''اسپتال سے جو رپورٹس آئی تھیں، ان کا کیا بنا.....''

''بڑے سائیں..... رپورٹس آ گئی تھیں۔ اللہ کا کرم ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' رپورٹس کے بارے میں دلاور نے جھوٹ سے کام لیا تھا اور اس جھوٹ کا مشورہ بھی دلاور کو ملتانی نے ہی دیا تھا۔ نہ ہی کوئی ٹیسٹ ہوا تھا، نہ ہی کسی رپورٹس نے آنا تھا مگر حویلی میں یہی مشہور کیا گیا تھا کہ ملتانی، دلاور کی بیماری سے متعلق خون کے ٹیسٹ لے کر گیا ہوا ہے۔

چند لمحے پھر خاموشی سے گزر گئے پھر شاہ زمان نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کڑی'' تمہاری گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟

دلاور گڑبڑا گیا۔ ''کون سی کڑی..... بڑے سائیں.....''

شاہ زمان کا لہجہ قدرے ترش ہوگیا۔ ''اوئے.....

وہی..... جو میرے آنے پر گڈی سے نکل کر بھاگی تھی۔''

''بڑے سائیں! میں تو اسے ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔ تھوڑے دن سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں تو اب تنگ آ گیا ہوں۔'' شاہ زمان پُرسوچ انداز میں عقب نما شیشے میں دلاور کو دیکھنے لگا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''وہ تمہاری گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟ تم نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ رکھا تھا۔''

''بڑے سائیں! کیا بتاؤں..... یہ لڑکی جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ فلمی باتیں کرتی ہے۔ کہتی ہے تمہاری شکل میرے بابو سے ملتی جلتی ہے۔ بابو کو اپنا مگیتر بتاتی ہے جو تین سال پہلے کسی ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ اب بھی میں گاڑی کا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا کہ میری بے خبری میں اندر گھس آئی۔ میں نے اپنا پستول ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر میری طرف اس کا رخ کر دیا اور فضول ایکٹنگ کرنے لگی۔ میں گھبرا گیا جھپٹ کر اس سے پستول چھینا تو میرے ناخن اس کے ہاتھ پر نشان چھوڑ گئے۔ خون رسنے لگا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اوپر سے آپ آ گئے۔'' دلاور نے سب صاف صاف بیان کر دیا۔

شاہ زمان بڑی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا گیا اور سوچتا چلا گیا۔ جانے کیوں دلاور کو محسوس ہو رہا تھا کہ شاہ زمان کا دل ماروی پر آیا ہوا ہے۔

☆☆☆

سویرا نے اپنے ہاتھوں سے شاہ زمان کے لیے دودھ کی بادام والی سردائی بنائی تھی۔ وہ شام سے ہی اس کا انتظار کر رہی تھی مگر شاہ زمان رات گئے دلاور کے ساتھ واپس آیا۔ آرام گاہ میں پہنچا تو کافی تھکا ہوا دکھتا تھا۔ سویرا نے آگے بڑھ کر اس کی واسکٹ اتاری..... بستر پر بیٹھا تو اس کے جوتے اتار کر جرابیں اتارنے لگی۔

''لگتا ہے، آج آپ بہت تھک گئے ہیں.....''

شاہ زمان جواباً کچھ نہیں بولا۔ بیڈ پر بیٹھ کر سر پیچھے ٹکا دیا۔ سویرا نے ٹھنڈی سردائی گلاس میں انڈیلی اور شاہ زمان کو پیش کر دی، بولی۔ ''میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

شاہ زمان تین گھونٹوں میں ساری سردائی اندر انڈیل گیا۔

''آپ کچھ پریشان دکھتے ہیں۔'' سویرا فکرمندی سے بولی تو شاہ زمان سیدھا ہو کر بیٹھا اور بولا۔

''میں پریشان ہوں تمہیں اس سے کیا..... تم کھیل

کھیلوا پنے....."

سویرا دم بخود رہ گئی۔ پریشانی سے اس کا چہرہ کھنچ گیا۔ وہ بمشکل بولی۔ "کیا..... کھیل کھیلا ہے..... میں نے.....؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو..... حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ کیسی چالیں چلی جارہی ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں۔"

"میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی..... میں نے کونسا جرم کیا ہے جس کی خبر مجھے بھی نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"وقت آنے پر سب معلوم پڑ جائے گا..... ابھی مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال مت پوچھو۔"

"مگر..... میں....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

شاہ زمان سویرا کی بات کاٹ کر بہت زور سے دہاڑا اتنی زور سے کہ سویرا کو کمرے کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ "میں نے ایک بار کہا نا..... اس بارے میں مجھ سے ابھی کوئی سوال مت پوچھو....."

سویرا سہم گئی..... خاموش ہوگئی..... سندھ یونیورسٹی میں کلاس فیلوز کے ساتھ چہلیں کرنے والی، رومانوی شاعری کرنے والی..... بات بے بات قہقہے لگانے والی سویرا خاموش ہوگئی..... عورت کو اپنا گھر بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا..... اس کا ناتواں دل لحہ بہ لحہ لرزتا ہے، پل پل وہ ڈر جاتی ہے، سہم جاتی ہے۔

سویرا کی وہ رات خاموشی میں آنسو بہاتے ہوئے گزر گئی..... صبح ناشتے میں بھی شاہ زمان کا رویہ سویرا سے ٹھیک نہیں رہا..... وہ آدھا ناشتا کرکے باغیچے میں چلا گیا..... لنگڑاتے ہوئے حویلی کا چکر کاٹا۔ شاہ فرمان سے نشست گاہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا طویل گفتگو کی..... پھر گیارہ ساڑھے گیارہ کے قریب باغیچے میں واپس آ گیا۔ اس نے ایک ملازمہ کو ماروی کو بلانے کے لیے بھیجا..... تھوڑی دیر بعد ماروی سکڑی سمٹی اس کے روبرو تھی۔

"سر میں تیل کی مالش کرلیتی ہو....." شاہ زمان سخت لہجے میں بولا۔

"جج..... جی بڑے سائیں....." وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"تو جاؤ پھر تیل لے آؤ۔"

ماروی دوڑی ہوئی گئی اور دو منٹ میں واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی بڑی بوتل تھی۔ اس نے احتیاط سے سر میں تیل ڈالا اور مالش کرنے لگی۔

شاہ زمان کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔ وہ تنی گردن کے ساتھ بڑے کروفر سے کرسی پر بیٹھا مالش کروا رہا تھا۔ عادت سے مجبور مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "کیا نام بتایا تھا تیری ماں نے اپنے گاؤں کا؟"

"بڑے سائیں..... ترنڈا....."

"تیرا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"بڑے سائیں! ہم لوگ ٹھوری ہیں۔ میرا باپ بکریاں چراتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی چنی گوٹھ ہے..... وہ وہاں منڈی میں ہوتا ہے۔"

"تو کل..... گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟" اچانک شاہ زمان نے سوال کیا تو ماروی یکدم سے گڑبڑا گئی۔ لرزتے لہجے میں بولی۔

"وہ..... وہ بڑے سائیں..... م..... میں..... م..... میں....."

"کیا میں..... میں لگائی ہوئی ہے..... ٹھیک سے جواب دے۔" شاہ زمان کا لہجہ سخت ہوگیا۔ وہ ماروی کے ہاتھ کی انگلیاں بری طرح مروڑ رہا تھا۔

"وہ جی..... بی بی جی..... نے مجھے بھیجا تھا....." کانپتی آواز میں اس نے کہا۔

"کس کام کے لیے؟" لہجہ بدستور تلخ تھا۔

ماروی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا جواب دے پھر ایک دم سے بولی۔ "بازار سے کچھ سامان منگوانا تھا جی۔" تکلیف کے سبب اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

شاہ زمان سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس نے ماروی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے بولا۔ "اچھا..... اب تو جا۔" شاہ زمان نے دور سے آتی بڑی آپا کو دیکھ لیا تھا۔

بڑی آپا مسکراتے ہوئے شاہ زمان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں، بولیں۔ "میرے چھوٹے دیر کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا آج کل....."

"میں بالکل ٹھیک ہوں بڑی آپا....." وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"تیرا پیر کیسا ہے.....؟ زخم پورا بھر گیا ہے نا....."

"ہاں..... ہاں بڑی آپا..... اب تو پیر پر پورا وزن پڑتا ہے۔"

"وہ باز والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" بڑی آپا حویلی کے حالات سے آگاہی رکھتی تھیں اور کسی حد تک ان معاملات میں انوالو بھی رہتی تھیں۔

"بڑی آپا..... وہ باز ہماری سوچ سے بھی زیادہ [illegible] ہے۔" شاہ زمان کی آنکھوں میں [illegible]

"تمہارے خیال سے [illegible]"

"بڑی آپا! آپ کو [illegible]

شیخوں کے درمیان لڑائی کی وجہ بنا ہوا ہے۔"

"ہاں..... مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا چلا تھا....."

"شیخوں کی وہ لڑائی عروج پکڑ گئی ہے۔ وہ اب ایک ضد اور انا بن گئی ہے۔ مڈل ایسٹ پاکستان نہیں ہے جہاں ڈنڈے کے زور پر..... دھونس..... دھاندلی سے کوئی چیز حاصل کرلی جائے..... وہاں پر یہ سب چیزیں نہیں ہوتیں..... دونوں شیخ یہ سب دنگا فساد نہیں کرسکتے مگر..... جو وہ کرسکتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کررہے ہیں۔ سننے میں یہ خبریں بھی آرہی ہیں کہ شان نامی باز کی بولی ستر سے اسی لاکھ ریال تک لگ گئی ہے۔"

بڑی آپا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں..... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولیں۔ "ستر..... اسی لاکھ ریال..... یہ..... کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے..... یہ خبر جھوٹی ہو..... یا بڑھا چڑھا کر بتائی گئی ہو..... مگر بڑی آپا..... اس میں ایسی کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ یہ شیخ اپنے عیش و آرام اور کبھی کبھی تفریح طبع کے لیے لاکھوں ریال خرچ کردیتے ہیں..... تو..... جہاں..... ضد اور انا کا مسئلہ پیدا ہوجائے..... وہ....." شاہ زمان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بڑی آپا کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی..... شاہ زمان سے تھوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ "وہ باز..... اب ہے..... کہاں.....؟"

شاہ زمان آہستگی سے بولا۔ "بڑی آپا..... وہ ہمارے کنٹرول میں ہے۔ حضور چانڈیو اور شوکت سیال کے حویلی پر کیے جانے والے حملے کے بعد..... وہ باز ہم نے یہاں سے ترنڈا بھیج دیا ہے۔ تھوڑے دن پہلے جو میں ترنڈا گیا تھا..... اسی سلسلے میں گیا تھا۔ سفید حویلی کے تہ خانے میں "شان" اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ چار گارڈ اس کی حفاظت کررہے ہیں۔"

"مگر..... شوکت سیال.....؟" بڑی آپا نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"حویلی پر ہلا بول کے انہوں نے جو غلطی کی ہے، ان کی جان اتنی جلدی نہیں چھوٹے گی۔ ابھی بھی میں بھائی جی سے اسی کیس کے بارے میں بات کرکے آیا ہوں..... حویلی پر حملے کے بعد جو پرچہ ہم نے کٹوایا تھا، اس میں ہم نے ایک قتل بھی شوکت سیال پارٹی پر ڈال دیا تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے شوکت سیال کی پشت پناہی کرنے والا حضور چانڈیو ہے۔ الیکشن سر پر ہیں۔ فی الحال حضور چانڈیو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کی پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ سننے میں آرہا ہے کہ وہ تو حویلی پر کیے جانے والے حملے پر بھی پچھتا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ اس کے تربیت یافتہ کارندے گوریلا ایکشن کرکے بڑی صفائی سے باز اڑا لے جائیں گے..... اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی مگر ہمارے بندوں نے نا صرف بیرونی خطرے پر آنکھیں کھلی رکھیں بلکہ حملہ آوروں کو بھرپور جواب بھی دیا۔ حضور چانڈیو کی سازش بے نقاب ہوگئی۔ اس کو لینے کے دینے پڑ گئے..... اب وہ کیس ختم کرانا چاہ رہا ہے اور ہم لوگ کیس کو طول دے رہے ہیں۔"

بڑی آپا معنی خیز انداز میں مسکرائیں، بولیں۔ "اس کا مطلب ہے تم لوگ وہ باز واپس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"نہیں بڑی آپا..... ہم نے کیا باز کا اچار ڈالنا ہے۔ باز تو ہم حضور چانڈیو پارٹی کو واپس کریں گے مگر کڑی شرائط پر....."

"مگر مجھے تو کچھ ایسی خبر پہنچی تھی کہ وہ باز تمہارے "بھائی جی" نے شیرو کے ذریعے چوری کروایا تھا۔"

شاہ زمان آنکھ میچ کے بولا۔ "بڑی آپا..... یہ چوڑیر و حویلی کی سب سے خفیہ خبر ہے..... کہتے ہیں دیواروں کے کان بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے خاموشی بہتر ہے....." وہ کرسی پر سیدھا ہوا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "وہ باز بھائی جی نے شیرو کے ذریعے ہی حاصل کیا ہے مگر عدالت میں..... شیرو نے پیش ہوکر اپنا بیان ریکارڈ کروایا ہے کہ وہ باز اس نے رحیم یار خان کے قریب "ست پار" گوٹھ سے رانا قوم کے ایک بندے "تھی بابر" سے خریدا ہے۔"

"اور عدالت نے یہ سب سچ مان لیا.....؟"

"اور کیا تو نہیں..... عدالت کو سچ ماننا پڑا....." شاہ زمان زیر لب مسکرایا..... بڑی آپا کا سوالیہ انداز دیکھ کے بولا۔ "ہم نے تھی بابر کو عدالت میں پیش کردیا اور اس نے اقبالی بیان میں صاف کہہ دیا کہ یہ باز اس نے شیرو کو فروخت کیا تھا۔"

"یہ سب کیسے ممکن ہے.....؟" بڑی آپا کی حیرت عروج پر تھی۔

شاہ زمان نے ایک قہقہہ لگایا، بولا۔ "بڑی آپا..... روپیہ..... یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے آپ خوشیاں خرید سکتے ہو..... خواہشیں خرید سکتے ہو..... ایمان خرید سکتے ہو..... لوگ خرید سکتے ہو..... آپ کا کیا خیال ہے؟ سیاسی پارٹیوں کے آگے آگے چلنے والے

..... گلا پھاڑ کر نعرے لگانے والے لوگ اپنے لیڈروں کے ساتھ ہوتے ہیں..... نہیں..... نہیں..... وہ نامراد روپیہ ہوتا ہے جو انہیں ناچنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"سنی بابر کے بیان سے تو حضور چانڈیو پارٹی بری طرح پھنس جائے گی....." بڑی آپا نے کہا۔

"پھنس جائے گی کیا..... پھنس گئی ہے..... اب وہ دن دور نہیں جب شوکت سیال اور حضور چانڈیو گھٹنے ٹیکتے ہوئے چوڑیر و حویلی آئیں گے..... کیس ختم کرانے اور باز کی واپسی کے لیے ہمارے ترلے کرنے.....!"

بڑی آپا خاموش تھیں۔

☆☆☆

وہ نیم دراز تھی اور سوچوں کے پنچھی پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ دور ریگستان کے بیابانوں سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور پورے ماحول پر چھا جاتی تھی یا شاید یہ ہوک اس کے اپنے من میں کرلاتی تھی۔ جس دن سے وہ دلاور کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے لکڑی کے بکس میں پڑی ہوئی وہ چیزیں دیکھی تھیں، اک احساسِ جرم نے اسے گھیر لیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی سوچ اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی، کہیں اس کی بے وقوفی نے کسی کی زندگی عذاب تو نہیں بنا دی تھی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رخساروں کے پاس کسی چیز کا احساس جاگا۔ اس نے انگلی سے چھوا تو حیران رہ گئی..... وہ آنسو تھے جو بنا دستک دیے اس کی آنکھوں سے پھسل آئے تھے۔ آنسو تو کسی جذبے، کسی دکھ کے ساتھ آنکھوں سے چھلکتے ہیں مگر یہ کیا ہوا تھا؟ اسے خود کو بھی پتا نہ چلا تھا اور اسے پتا بھی کیسے چل سکتا تھا..... یہ آنسو بالکل اس کی لاعلم محبت کی طرح غیر محسوس تھے جو اس کے وجود میں کسی ہلکی سی چنگاری کی صورت پنپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ماروی اندر داخل ہوگئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" سویرا ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی.....

....."تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟"

"بی بی جی! مجھے لگتا ہے بڑے سائیں کو شک پڑ گیا ہے۔" وہ ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا..... انہوں نے تجھ سے کچھ کہا؟" سویرا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"میں اس دن دلاور کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ بڑے سائیں نے مجھے دیکھ لیا..... بڑی غصے والی نظروں سے گھور رہے تھے جی مجھے۔"

"انہوں نے تجھ سے کوئی بات کی.....؟"

"بات وات تو نہیں کی جی..... پر اگلے دن مجھ سے کہنے لگے میرے سر میں تیل کی مالش کردو۔"

"تو پھر....." سویرا کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میں نے کردی مالش..... مالش کرواتے ہوئے غصے سے پوچھنے لگے..... اس دن تو گڈی میں دلاور کے ساتھ کیا کر رہی تھی..... میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں بی بی جی..... مجھے سمجھ نہ آئی کیا جواب دوں، پھر میں نے بہانہ بنایا کہ بی بی جی نے مجھے بھیجا تھا..... بازار سے کچھ چیزیں منگوانی تھیں۔"

"آگے سے کیا بولے تمہارے بڑے سائیں۔"

"بولے وولے کچھ نہیں..... غصے سے مونچھوں کو تاؤ دیتے رہے اور بڑی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔" سویرا کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے شاہ زمان کا اس دن والا رویہ یاد آنے لگا۔ "تم کھیلو..... کھیل اپنے..... تم اچھی طرح جانتی ہو حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں....." تو کیا شاہ زمان باخبر ہو چکا تھا؟

اس نے ماروی کو جانے کا کہا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نیم دراز ہوگئی..... شاہ زمان نے کہا تھا۔ "تم کھیلو کھیل اپنے....." ہاں تو وہ کھیل رہی تھی..... یہ کھیل..... کیونکہ وہ ایک کمزور عورت تھی.....

وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی..... شاہ زمان کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتی تھی..... شاہ زمان جن نظروں سے ماروی کی جانب دیکھتا تھا..... وہ نظریں یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی تھیں کہ..... بہت جلدی نہ سہی، دیر سے ہی سہی..... شاہ زمان ماروی سے "ہر طرح" کے تعلقات استوار کر لے گا..... اور "ضرورت" پیش آنے پر اس سے بیاہ بھی رچا لے گا..... ماروی عام لڑکی ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور قیامت ڈھاتے جسمانی تشیب و فراز کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زمان کا "ایمان" خراب ہو جاتا..... سویرا..... ماروی کو دلاور کے ساتھ منسلک کر دینا چاہتی تھی۔

سویرا نے ہی ماروی کو اعتماد میں لے کر دلاور کے پیچھے لگایا تھا۔ ایک طرف وہ ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی..... دوسری طرف نا سمجھی میں جو غلطی اس سے ہوئی تھی، وہ اس کا مداوا کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دلاور..... ماروی کی طرف مائل ہو جائے اور دل میں پلنے

والے منفی جذبوں سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ وہ جذبے جن کا تعلق خود سویرا سے تھا۔ کچھ چیزیں پس منظر میں ہوتی ہیں، نظر نہیں آتیں۔ کچھ قباتیں سمندر کی گہرائی میں ہوتی ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ سویرا، ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ دلاور کے قریب لانا چاہتی تھی۔ بظاہر تو وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔ مگر اس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹی سی ''ندی'' بھی بہتی تھی اور اس ندی کے پانی سے جیسے آواز آتی تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
رہ رہ کے سسکیاں لیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

☆☆☆

وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ ماروی کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے۔ جس دن سے اس نے بڑے سائیں کے ساتھ ماروی والی بات کی تھی، اس دن سے ماروی کی پیش قدمی ست ہوگئی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں رہتی تھی۔ جب بڑے سائیں حویلی میں نہیں ہوتے تھے، وہ چھم سے دلاور کے روبرو آن کھڑی ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ سیبوں والے باغ کی طرف سے چلا آرہا تھا کہ وہ اچانک اس کے سامنے آگئی۔ دلاور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس نے لمبے بالوں کی چٹیا میں گجرے لگا رکھے تھے۔ ایک ادا سے دلاور کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم بڑے ظالم ہو.....''

''میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا۔ میں ظالم کہاں سے ہوگیا؟''

''اسی وجہ سے تو تجھے ظالم کہہ رہی ہوں۔ تو مجھے کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔'' وہ ادا سے لہراتے ہوئے بولی۔

''کیا کہوں تجھے؟'' دلاور آج دل لگی کے موڈ میں تھا۔

''میری طرف غور سے دیکھ..... میرے حسن کی تعریف کر..... میرے بارے میں کچھ کہہ..... حویلی کا کون سا ایسا مرد ہے جو میرے حسن کی تعریف نہ کرتا ہو..... بس ایک تو ہے جو پتا نہیں کس خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ ایسا ٹھنڈا مرد میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''تو آج سچ سچ بتا میرے سے چاہتی کیا ہے؟''

''سنے گا..... تو تڑپ جائے گا.....''

''میں تڑپنا چاہتا ہوں''

''تو سن.....'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی، اس نے دلاور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بولی۔ ''میں تجھ سے محبت کرتی ہوں..... تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں''

دلاور نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی، یہ نمی جھوٹی تھی یا سچی۔ اس سے دلاور کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو اس جہان کا باسی بن گیا تھا..... جہاں کسی بھی چیز سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ عشق کے ایسے دریاؤں کو عبور کر رہا تھا جن میں آگ بھی تھی اور ان دریاؤں کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا بھی تھا۔ دلاور نے جیسے سویرا کے عشق میں ڈوب کر ''فنا'' حاصل کرلی تھی۔

دلاور نے ماروی کی طرف دیکھ کر بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ''ماروی! تم بہت اچھی..... ہو..... خوبصورت اور جوان بھی ہو..... ہوسکتا تھا بلکہ یقیناً میں تمہاری طرف مائل ہوجاتا۔ اگر میرے ساتھ ایک بدقسمتی نہ ہوئی ہوتی۔''

''کیسی بدقسمتی.....؟'' ماروی نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''میں برف کا آدمی ہوں..... میرے دل میں پہاڑوں کی سینکڑوں ٹن برف نے بسیرا کر رکھا ہے۔ میرے جذبات کو ہمالیہ کی برف کی چادر اوڑھ کر سو چکے ہیں۔''

ماروی کانپ گئی، بولی۔ ''تمہاری کوئی بات بھی میرے پلے نہیں پڑ رہی.....'' وہ پاس پڑے سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔

دلاور بولا۔ ''تمہارے پلے پڑ بھی نہیں سکتی..... سنو..... میں تمہیں ایک بات بتاؤں..... تمہیں پتا ہے ایک جیتا جاگتا انسان..... ایک چلتی پھرتی لاش میں کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ جب اس سے جینے کا مطلب چھین لیا جاتا ہے''

..... ماروی گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھنے لگی..... اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی دلاور کو یوں بولتے ہوئے نہ دیکھ لے مگر یہ دوپہر کا وقت تھا..... جھلسا دینے والی چلچلاتی ہوا حویلی کے اس حصے میں دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور جس سنگی بینچ پر ماروی بیٹھی تھی اس کے اوپر نیم کے دو جڑواں درخت چھاؤں کیے ہوئے تھے۔

دلاور کہہ رہا تھا۔ ''ماروی..... میں آدمی نہیں ہوں..... میں پاکستان کے ہر شہر میں رہا ہوں..... جہاں میرا دل اچاٹ ہوجائے بھاگ اٹھتا ہوں..... میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں مگر بڑے سائیں..... لیکن شاید..... بڑے سائیں بھی اتنی طاقت نہیں ہے..... ماروی..... میں یہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتا ہوں

.....مگر بڑی بڑی فولادی بیڑیاں ہیں جو میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھاگتا ہوں اور منہ کے بل گر جاتا ہوں۔ پھر اٹھ کے دوبارہ کوشش کرتا ہوں پھر گر پڑتا ہوں۔ میری ٹانگیں زخمی ہو چکی ہیں، میرا سارا جسم چھلنی ہو چکا ہے..... ماروی..... تم نے کبھی ایسا پرندہ دیکھا ہے جو آگ میں جل رہا ہو..... وہ اڑنا چاہے تو نہ اڑ پائے..... اور نہ ہی موت سے اس کی خلاصی ہو.....'' دلاور ہذیانی انداز میں بول رہا تھا اور آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

ماروی کے جسم میں واضح کپکپی طاری ہو چکی تھی..... اس کا وہاں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی بہانہ بنایا اور وہاں سے بھاگ نکلی.....

☆☆☆

اس دن کے بعد ماروی نے دلاور کے پاس جانا کم کر دیا۔ سویرا نے وجہ پوچھی تو ماروی نے صاف کہہ دیا۔ ''بی بی جی..... میں نے ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہ بندہ توپ سے مس نہیں ہوتا..... کسی عجیب مٹی کا بنا ہوا ہے بلکہ اب تو مجھے اس سے خوف آنے لگا ہے۔ بڑی اول جلول سی باتیں کرتا ہے جی وہ.....''

''کیا کہتا ہے.....؟'' سویرا کے لہجے میں تجسس تھا۔

''وہ..... جی..... پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا ہے۔ کبھی عشق کی..... کبھی برف کی..... کبھی کہتا ہے تم نے زندہ لاش چلتی پھرتی دیکھی ہے۔ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑتا بی بی جی.....''

سویرا کی آنکھوں میں دکھ گہرا ہو گیا..... انگلی میں پڑی انگوٹھی کو مروڑتے ہوئے بولی۔ ''اور کیا کہتا تھا.....؟''

''کہتا ہے میں برف کا آدمی ہوں..... اس کی باتیں سن کر تو میں کانپ گئی تھی..... بی بی جی آپ..... آپ..... یہ کام اور کسی کو دے دیں۔ دلاور بڑا اور ٹائپ کا بندہ ہے۔ پتا نہیں کن چکروں میں ہے.....''

حویلی کا ہر مرد اسے یوں دیکھتا تھا کہ ابھی کھا جائے گا۔ ان مردوں میں سویرا کا خاوند سرفہرست تھا اور کیوں نہ ہوتا..... وہ اس حویلی کا بڑا سائیں تھا۔ اس سے زیادہ حق ماروی پر کسی کا نہیں بنتا تھا۔ وہ اسے نوچ کر بھی کھا جاتا تو کسی کی مجال نہیں تھی۔ سویرا کا دل کوئی ہتھیلی میں لے کر مسلنے لگا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا کہ ایک بھی نہ کر سکے گی۔

☆☆☆

دلاور اکثر شاہ زمان یا پیر فضل کی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ ''بیماری'' سے ٹھیک ہونے کے بعد یہ ڈیوٹی اس نے خود بڑے سائیں سے سفارش کر کے لگوائی تھی۔ وہ سویرا کی گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر عجیب بات تھی کہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وقت پَر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ ماروی اب بھی وقتاً فوقتاً اس سے ملنے آتی تھی مگر وہ بھی جان چکی تھی کہ ان ہلکوں میں تیل نہیں۔ مجبوراً سویرا بی بی کے کہنے پر اسے یہ ڈیوٹی بہرحال دینی تھی۔ حضور چانڈیو سے کیس زور و شور سے چل رہا تھا جس میں شاہ زمان کا پلڑا بھاری تھا۔ ''شان نای باز'' ترنڈا میں سفید حویلی کے تہ خانے میں بالکل محفوظ تھا۔ وہ ایک بلینک چیک تھا۔ شاہ فرمان کی غیر قانونی اسمگلنگ جاری تھی۔ ایک دو بار اس نے سوچا کہ اس شان نای باز کے سلسلے میں دونوں شیخوں سے خود سودا کیا جائے مگر ایسا کرنے سے اسے شاہ زمان اور پیر فضل نے باز رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

شاہ زمان کا ماروی سے آنکھ مٹکا مسلسل جاری تھا۔ یہ سویرا اور شاہ زمان کے درمیان ایک سرد جنگ تھی۔ سویرا ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنے کے لیے جو کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی..... جبکہ شاہ زمان ماروی سے قربت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

ملتانی دو چار دفعہ دلاور سے ملنے حویلی آیا تھا پھر واپس پنڈی چلا گیا تھا۔

دلاور کا کئی دفعہ سویرا سے آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ کسی بہانے سے کنی کترا کر گزر جاتا تھا۔ اس کے دل کا حبس جب حد سے بڑھ جاتا تھا تو وہ رات کے وقت روہی کی طرف نکل جاتا تھا۔ ظفری اسے اکثر منع کرتا کہ رات کے وقت جھاڑیوں اور کیکر کی جڑوں میں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ پر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ شیشے کی بلند دیواروں کے اندر کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رات کے وقت اکثر چلتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ کیکٹس کے پودوں سے بچتا بچاتا۔ کیکر کے درختوں سے ہمکلام ہوتا وہ ایک ریتیلے ٹیلے سے پار ایک پستہ قد بیری کے نیچے جا بیٹھتا۔ یہ جگہ اس کی جائے پناہ تھی۔ اس سے آگے روہی کی بے آب و گیاہ بیکراں وسعتیں تھیں۔ جہاں اجنبی سناٹے ''بستے'' تھے۔ اجنبی سناٹے جو اس کا پہلا عشق تھے۔ ان سناٹوں اور سویرا کے عشق میں کتنی مماثلت تھی۔ سویرا کا عشق بھی پہلے عشق کی طرح خاموش، پراسرار اور جان لیوا تھا۔

آج بھی وہ پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ شاہ زمان کسی کام کے سلسلے میں تھوڑے دنوں کے لیے کراچی گیا ہوا تھا..... حویلی کی عورتوں کا ڈرائیور بیوی کی زچگی کی وجہ سے چھٹی پر تھا اور شاہ زمان جاتے ہوئے دلاور کی ڈیوٹی زنان خانے کی ڈرائیونگ پر لگا گیا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر کوئی بہانہ نہ چل سکا تھا۔

دلاور بہت رات تک پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا..... سویرا کی ایک ایک بات اس کی سماعت میں گونجنے لگی..... اس کی ہر ہر حرکت..... ہر ہر ادا..... گلابی ہونٹ تھے جن کے گداز میں اس کا دل دھنستا چلا جا رہا تھا۔ یہ صرف نرم و نازک ہونٹ نہیں تھے، ایک دلدل تھی جس میں وہ ناک تک ڈوب چکا تھا۔ ہاتھ پیر منجمد تھے..... پورا جسم مفلوج تھا۔ صرف ناک سے سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ سانس اندر کھینچنے سے پورے جسم میں درد جاگ اٹھتا تھا۔

یکا یک اس نے تیز تیز سانس کھینچنا شروع کر دیے۔ دلدل اسے نگل رہی تھی۔ وہ اچانک اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز دور بیابانوں تک سفر کرتی چلی گئی۔ اجنبی سناٹوں تک پھیلتی چلی گئی..... اس نے گھبرا کر بیری کی ایک شاخ تھام لی..... یہ کانٹوں والی بیری تھی۔ کئی کانٹے اس کی ہتھیلی اور انگلیوں میں پیوست ہو گئے..... ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور رات کے اس سمے ریت کے کئی ذرّے اس کی نمناک آنکھوں میں گھس گئے..... مرد تھا..... رونا نہیں چاہتا تھا..... مگر ریت کے ذرّوں نے ایک جواز پیدا کر دیا تھا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس وحشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے.....

☆☆☆

پچھلی رات بہت دیر تک وہ روہی میں رہا تھا۔ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی بھی وقت وہ امتحان شروع ہو سکتا ہے جس سے وہ اتنے عرصے سے نظریں چراتا آیا ہے..... دلاور کے عشق کی کہانی بھی کتنی عجیب و غریب تھی۔ وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا..... مگر حویلی چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سویرا کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو میں معطر بھی رہنا چاہتا تھا۔ شاید بلند شیشے کی دیواروں کے اندر کے تقاضے اور تھے..... شیشے کی دیواروں سے باہر کی دنیا کے تقاضے اور تھے۔

جس امتحان سے وہ ڈر رہا تھا، اگلی صبح وہ ہو گیا..... وہ کیپ پہنے گاڑی میں بیٹھا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا کہ اچانک پچھلا دروازہ کھلا اور خوشبو کا ایک جھونکا گاڑی میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ خاص مہک تھی جو دلاور مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ دلربا مہک تب پہلی مرتبہ اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی جب ڈوبتی سویرا کو اس نے لا کر تالاب کے کنارے لٹایا تھا اور یہ خوشبو اس وقت تیز تر ہو گئی تھی جب..... اس نے اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر ثبت کیے تھے۔

ہاں، وہ سویرا ہی تھی جو دوپٹا گلے میں ڈالے، بال لہراتی گاڑی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ سر جھکا کر ہینڈ بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس کے کھلے بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا..... وہ دلاور کی موجودگی سے لاعلم بولی۔ ”اسلم! جلدی چلو..... مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔“ اسلم اس ڈرائیور کا نام تھا جو چھٹی پر گیا ہوا تھا۔

”بی بی جی! کون سی یونیورسٹی.....؟“ دلاور دھیمی آواز میں بولا تو جیسے سویرا ایک جھٹکے سے کسی خواب سے بیدار ہو گئی..... اس کی نسواری بالوں کی لٹیں گالوں پر جھول رہی تھیں اور حیرت سے دہن تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ ادا نہیں تھی، فطری تاثر تھا..... مگر یہ تاثر قیامت ڈھا رہا تھا..... دلاور نے ایک لمحے کے لیے یہ قیامت دیکھی تھی اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

”دلاور..... تم.....؟“

”جی بی بی جی!“

سویرا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا پھر وہ خود کو اعتدال پر لاتے ہوئے بولی۔ ”بہاولپور یونیورسٹی جانا ہے۔ رستہ معلوم ہے تمہیں.....؟“

”بہت عرصہ پہلے آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ کچھ یاد ہے۔“

”دوسرا ڈرائیور اسلم کدھر ہے.....؟“

”میرا خیال ہے وہ چھٹی پر ہے۔ بڑے سائیں نے اس کی جگہ میری ڈیوٹی لگائی تھی۔“

”اچھا پھر چلو..... جو رستہ یاد ہے اس پر چلتے جاؤ..... بھول جاؤ گے تو میں بتا دوں گی۔“ دلاور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سویرا اور دلاور معاشرتی تفاوت کے باوجود کبھی اچھے دوست تھے مگر وقت نے دراڑ

ایک جھجک پیدا کردی تھی دونوں کے بیچ..... دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد بالآخر وہ جھجک سویرا نے ہی دور کی۔ وہ ونڈ اسکرین سے پار کھلے بے آباد میدانوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں معلوم ہے، میں تم سے سخت خفا ہوں۔''

دلاور کا تاثر ایسا تھا جیسے اس نے سویرا کی بات سنی ہی نہیں..... وہ صرف جواباً ''اچھا جی.....'' کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''تم یہ نہیں پوچھو گے کیوں خفا ہوں.....؟'' سویرا کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ خود ہی بتا دیجیے.....'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تم میری شادی میں کیوں نہیں آئے..... میں خاص طور پر تمہیں کارڈ بھی دے کر گئی تھی.....'' اس کی ذات میں موجود شیشے کی بلند دیواروں کے اندر ایک دم سے بھونچال آ گیا۔ شیشے دھڑا دھڑ بجنے لگے..... اندر کی زہریلی فضا میں اذیت بڑھ گئی..... وہ بمشکل بولا۔

''بی بی جی! میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان دنوں میں سخت بیمار تھا..... اس لیے نہیں آ سکا.....''

''بعد میں بھی تم نے مبارک دینے کی زحمت نہیں کی..... کیا ناراض تھے مجھ سے؟'' آخری جملہ بڑی ملائمت سے کہا گیا تھا۔ دلاور کے وجود کا سارا لہو جیسے اس کے دل میں اکٹھا ہوگیا۔ دل دھڑا دھڑ بجنے لگا۔ وہ بولا۔

''نہیں بی بی جی!..... میری آپ سے کیسی ناراضی۔''

''تم نے یہ بی بی جی..... کی کیا رٹ لگائی ہوئی ہے۔ سویرا نام ہے میرا.....'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

''نہیں بی بی جی..... اب نہیں.....'' وہ روہانسا ہوگیا۔

''کیا اب نہیں.....؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''اب آپ ہمارے بڑے سائیں کی بیگم صاحبہ ہو..... اب میں آپ کو نام سے نہیں پکار سکتا۔''

''کیا اسٹوپڈ باتیں کرتے ہو.....''

''آپ جو مرضی کہیں جی..... اب اس منہ سے آپ کا نام ادا نہیں ہوگا۔'' دلاور نے بے پروائی سے کہا تو یکدم سے سویرا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا..... یہ ایک الارم تھا..... ہلکا سا اینٹی گیٹر تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں جو ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی، اس کی لہروں میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ گم صم بیٹھی ونڈ اسکرین سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتی رہی..... پھر جیسے کسی خیال سے جاگتے ہوئے بولی۔

''دلاور! ماروی کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے.....؟''

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بی بی جی! مجھے نہیں معلوم وہ لڑکی کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کئی دفعہ تو یوں لگتا ہے وہ مجھے نوکری سے نکلوا کے رہے گی.....''

آخری بات دلاور نے اپنے پاس سے جان بوجھ کے لگائی تھی۔

سویرا ایک دم سے سیدھی ہوگئی، تھوڑے جوشیلے لہجے میں بولی۔ ''تم بالکل پروا نہ کرو..... تمہیں یہاں نوکری سے کوئی نہیں نکال سکتا..... اس کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں..... اور دوسری بات یہ کہ تم یہاں نوکر ہو بھی نہیں۔ تمہاری حیثیت کچھ اور ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے بات جاری رکھی۔ ''اور اگر تم واقعی ماروی میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''آپ میری کیا مدد کریں گی.....؟''

''میں تمہاری شادی ماروی سے کروانے میں مدد کر سکتی ہوں۔ ویسے ایک دوست ہونے کے ناتے میں کہوں گی..... ماروی دل کی بہت اچھی لڑکی ہے..... تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگو گے۔'' سویرا کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔

دلاور سر جھکا کے تھوڑا سا کھانسا جس سے گلے میں لگا بے بسی کا پھندا کھل گیا۔ وہ بولا۔ ''بی بی جی.....! آپ کے خلوص اور تعاون کا بے حد شکریہ..... مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا.....''

''ماروی سے نہیں کرنا چاہتے..... یا.....''

''میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا..... پتا ہے بی بی جی..... یہ سب دل کا کھیل ہے۔ جب دل مر جاتا ہے تو ہر چیز، ہر جذبہ ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے..... ہونے..... نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہتا..... زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''

سویرا کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے بولی۔ ''آگے کسی بازار پر گاڑی روکنا، مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔''

آگے پیٹرول پمپ کے ساتھ ایک اسنیک بار تھا' سویرا اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آئی' اس کے ہاتھ میں بڑا سا پنگ بیگ تھا جس میں جنک فوڈ ٹائپ بہت سی چیزیں تھیں۔

دلاور یہ نہ جان سکا کہ سویرا رو کر اپنا من ہلکا کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے..... گلابی دکھنے لگے تھے۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ بہاولپور یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ بہت سے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سویرا بڑا شاپر لے کر ایک کوارٹر میں گھس گئی..... اس کی وہاں سے واپسی قریباً

آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔

وہ واپس آئی تو قدرے خوش تھی۔ بولی۔ ”چلو دلاور..... ہمیں اب صرف چند منٹ کے لیے مین بازار میں رکنا ہے۔ پھر حویلی واپس چلیں گے.....“

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ لوگ حویلی پہنچے..... گاڑی سے اترتے ہوئے سویرا بولی۔ ”دلاور! تم مجھے بی بی جی..... کہو..... یا جو مرضی کہو..... میری نظر میں پہلے بھی تم میرے دوست تھے، آج بھی میں تمہیں وہی دلاور سمجھتی ہوں۔ خود کو سنبھالو..... پہلے والے دلاور بن جاؤ..... جو ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ ہر کسی کا دل لگائے رکھتا تھا۔“

وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ایک دن دلاور بستر پر پڑا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ظفری معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”ایک خوش خبری ہے..... اور ایک بری خبر ہے۔ بول پہلے کون سی بتاؤں.....“ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے سر پر ہاتھ مارا بولا۔ ”یار..... خبر اصل میں ایک ہی ہے مگر وہ کسی کے لیے اچھی ہے..... کسی کے لیے..... دل دکھانے والی۔“

”پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے..... بات بتا کیا ہے؟“

”بات اصل میں یہ ہے کہ حویلی کی رونق، حویلی سے رخصت ہو گئی..... یہ ہوئی بری خبر اور اچھی خبر یہ ہے کہ ماروی سے تیری جان چھوٹ گئی ہے۔“

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”واقعی؟“

”ہاں..... واقعی.....! سویرا بی بی نے ماروی کا نکاح بہاولپور میں ایک بندے سے کر دیا ہے۔ ان کی ایک کلاس فیلو کا کزن بہاولپور یونیورسٹی کے کوارٹرز میں رہتا ہے۔ خوش شکل اور محنتی ہے۔ ہے بھی ماروی کی برادری کا۔ سویرا بی بی نے ماروی کی ماں سے بات کی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی..... دو چار دنوں میں یہ سارا چکر چلا اور ماروی ساری حویلی کو سوگوار کر گئی۔“ ظفری ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔

دلاور کو یاد آنے لگا۔ سویرا اسی کے ساتھ تو بہاولپور گئی تھی۔ تو کیا وہ ماروی کے رشتے کے سلسلے میں گئی تھی؟ وہ انہی سوچوں میں تھا کہ ظفری نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا بولا۔ ”یار!..... تو بھی پتا نہیں کیسا مرد ہے..... وہ تیرے آگے پیچھے پھرتی رہ گئی اور تو نے اس کو گھاس تک نہیں ڈالی۔“

”گھاس ڈال کے کیا کرتا.....؟“

”اس سے شادی کرتا..... کم از کم حویلی کی رونق..... یہاں سے رخصت تو نہ ہوتی.....“

”تو بہت بے غیرت آدمی ہے۔ تب وہ تیری بھابی ہوتی۔“ دلاور نے ہنس کے کہا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا کھسیانا سا ہو کر بولا۔

”یار! میں تھوڑا جذبات میں آ گیا تھا۔ پھر تو وہ واقعی ہماری بھابی بن جاتی..... سوری یار مجھے معاف کر دے..... یہ عورت ذات بڑی فتنے کی چیز ہے اور اگر خوبصورت ہو..... تو.....“

دلاور نے کہا۔ ”ظفری! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی..... بڑے سائیں اور شاہ فرمان کراچی کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ پیر فضل سیہون شریف عرس کی تقریبات میں مصروف ہیں۔ پیچھے سے ماروی کا نکاح۔“

”اس میں کون سی انہونی بات ہے۔ ماروی کی ماں تو بیچاری بڑے عرصے سے ماروی کی شادی کے لیے فکر مند تھی..... ماروی کی خوبصورتی نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ بھلا ہو سویرا بی بی کا جنہوں نے خود آگے بڑھ کر یہ فرض ادا کیا ہے..... مالک ہوں تو ایسے ہوں.....“

دلاور ظفری کی بات سن کر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بڑے سائیں اور شاہ فرمان دونوں کچھ دنوں سے کراچی میں ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دونوں بھائی ہی حویلی سے غائب ہیں۔“

”تو حویلی میں رہتے ہوئے بھی حویلی میں نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے جو تو رات بہت دیر تک روہی کے ویرانوں میں بیٹھا رہتا ہے، اس نے تیرے دماغ پر اثر کیا ہے۔ ایسی کھلی جگہوں پر بھوت پریت ہوتے ہیں..... آدمی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“

دلاور ہنس دیا بولا۔ ”ان سے زیادہ نقصان مجھے انسانوں نے پہنچایا ہے..... تو حویلی کے اندر والی بات بتا جو میں حویلی میں رہتے ہوئے بھی نہیں جانتا۔“

ظفری دلاور کی بات پر مسکرا دیا۔ انکشاف آمیز لہجے میں بولا۔ ”وہ بازو والا معاملہ تو جانتا ہی ہے نا.....“

دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اسی سلسلے میں دونوں بھائی کراچی میں ہیں۔ رحیم سائیں بھی کراچی میں ہیں۔ تم نہیں جانتے ہو گے رحیم مائیں لو..... یہ منڈ بھیرو کے پاس ایک گوٹھ کے مالک ہیں۔“

دلاور، رحیم سائیں کو جانتا تھا مگر خاموش رہا۔ رحیم سائیں وہی تھے جنہوں نے جیب تالاب میں [illegible] زخمی شاہ زمان اور سویرا کی مدد کی تھی [illegible]

اپنے ڈیرے پر لے آئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کروائی تھی، بعد میں انہیں کھانا بھی کھلایا گیا تھا۔

ظفری کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رحیم سائیں بیچ میں پڑکر حضور چانڈیو اور بڑے سائیں کی صلح کروا رہا ہے۔ خبریں یہ آرہی ہیں۔ رحیم سائیں کافی حد تک کامیاب ہوگیا ہے۔ بڑے سائیں بھاری رقم کے عوض شان باز واپس کرنے پر راضی ہوگئے ہیں اور جو کیس عدالت میں چل رہا ہے، اسے بھی واپس لیا جارہا ہے۔''

ظفری کچھ دیر خاموش رہا پھر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ''یارا! یہ ہمارے صاحب لوگ ویسے پیسے کے بڑے پجاری ہیں۔ دیکھو نا..... ''شان'' باز خود چوری کروایا اور بعد میں بھاری رقم کے ساتھ اب واپس کیا جارہا ہے۔ حضور چانڈیو پارٹی سے حویلی پر حملے والی غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے وہ پھنس گئے۔ اب دیکھو یہ کیس چھ مہینے چلتا رہا۔ کیس ختم کروانے کے لیے علیحدہ سے رقم لی ہے بڑی سائیں اور شاہ فرمان نے.....''

''وہ کیسے.....؟'' دلاور حیرت سے بولا۔

''خون بہا..... شاہ فرمان نے عدالت میں جو بیان دیا تھا، اس میں اپنا ایک بندہ مقتول بیان کیا گیا تھا۔ اسی لیے تو یہ کیس حضور چانڈیو کے گلے کا پھندا بنا رہا مگر اب یہ کیس ختم ہوگیا ہے یا ہونے کے قریب ہے۔ حضور چانڈیو سے اس بندے کا خون بہا لیا جارہا ہے۔ جو کبھی قتل ہوا ہی نہیں، کیسی لطیفے والی بات ہے۔ دو بندوں کا تبادلہ بھی ہوگا ایک وہ جو حویلی پر حملے میں پکڑا گیا تھا۔ اس کے بدلے شاہ فرمان وغیرہ اپنا ایک خاص بندہ چھڑوائیں گے۔''

''ہاں شاید دنیا ایسی ہی ہے۔'' دلاور نے کہا۔ بلند شیشوں سے پار سورج چمک رہا تھا، ہوائیں چل رہی تھیں۔ زندگی سانس لے رہی تھی۔

☆☆☆

آج دلاور کی جائے پناہ پر کچھ اور لوگ قابض ہوگئے تھے۔ ڈھولکی بج رہی تھی۔ دف بج رہے تھے۔ گھنگھروؤں کی چھنکار پستہ قد بیری کے آس پاس رقص کررہی تھی۔ وہ چار طوائفیں تھیں جن کے جوان جسموں سے پسینا چھوٹ کر ان کی ایڑیاں بھگو رہا تھا۔ ان کے کمانوں کی طرح تنے، تنگ کپڑوں میں پھنسے، وحشی بدن میوزک کی دھن پر جلوے بکھیر رہے تھے۔ رات کے اس سمے جنریٹر کی آواز ڈھولکی اور دف کی آواز میں مدغم ہورہی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہائی جارہی تھی۔ یہ حضور چانڈیو سے بھاری رقم وصول کرنے کا جشن تھا۔ حیدرآبادی طوائفوں نے ناچ ناچ کر روہی کی ریتیلی زمین میں دنگا مچادیا تھا۔ ایک جوان..... ملے رنگ کا سرائیکی جس نے سر پر شیشوں والی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جس کا میلا چہرہ بھی جنریٹر کی تیز روشنی میں لشکتا تھا، کان پر ہاتھ رکھے کوئی تان لگا رہا تھا۔

طوائفوں پر جوں جوں نوٹ نچھاور کیے جاتے تھے، ان کے پیر اور زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔

''شان'' باز تین کروڑ کے عوض حضور چانڈیو کو واپس کیا جانا تھا۔ جرگے میں طے ہوا تھا کہ رقم پہلے ادا کردی جائے گی، باز تین دن بعد حضور چانڈیو کے گوٹھ میں خود شاہ فرمان پہنچا کر آئے گا۔ اس پر بہت اعتراض تھا۔ حضور چانڈیو نے کہا تھا کہ باز رقم ادا کرتے وقت ہمارے حوالے کیا جائے۔ جس پر دونوں بھائی متفق نہیں ہوئے۔ بہت لمبی چوڑی بحث کے بعد رحیم سائیں کی گارنٹی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہوگیا۔

رقم چوڑیرو حویلی والوں کے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔ جن دو بندوں کا تبادلہ ہونا تھا، وہ بھی ہوچکا تھا۔ جو آدمی حضور چانڈیو سے رہا ہوکر آیا اس کا نام ''ٹریگر'' تھا۔

اب رقم بینک میں کنفرم ہونے کے بعد فوری طور پر اس جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جشن ختم ہونے کے بعد اس رات نشے میں دھت شاہ زمان حویلی میں داخل ہوا۔ مہمان خانے میں اکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ شیرو! ماروی کو بلا کر لاؤ۔'' اس کا لب ولہجہ بالکل ٹن تھا۔

''مگر سائیں..... اس وقت..... اس وقت آپ سو جائیں۔'' شیرو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''رات کا ایک بج رہا ہے۔''

''بکواس کرتے ہو..... زبان چلاتے ہو..... بڑے سائیں کے آگے..... کس حرامزادے کی مجال ہے..... جو میرے حکم کو نہ مانے..... بلاؤ..... اس ناگن کو..... جس نے..... یہاں۔'' وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ''یہاں ڈنگ مارے ہیں..... آج میں حساب برابر کرنا چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا بڑے سائیں!'' شیرو یہ کہتا ہوا پچھلے پاؤں پلٹ گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔ لرزتے لہجے میں بولا۔ ''وہ..... وہ بڑے سائیں..... ماروی تو یہاں نہیں ہے۔''

شاہ زمان گردن ٹیڑھی کرکے مخمور لہجے میں بولا۔ ''یہاں نہیں ہے..... یہ کیا بکواس کررہا ہے..... تو.....؟''

"بڑے سائیں! وہ..... وہ..... اس کی ماں..... جو ہے نا..... اس نے پچھلے ہفتے نکاح کر دیا ہے اس کا..... وہ چلی گئی ہے یہاں سے....."

یہ انکشاف نشے میں دھت شاہ زمان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا سائڈ ٹیبل پر پڑا بیش قیمت گلدان گھما کر زمین پر دے مارا۔ شیشے کا وہ گلدان کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ناقابلِ یقین غراتے لہجے میں بولا۔ "لاؤ بلا کر اس کی ماں کو میرے پاس....."

اگلے چند منٹوں میں ماروی کی آدمی سوئی، آدمی جاگی ماں شاہ زمان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا..... وہ حواس باختہ تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی رات گئے اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ٹوٹے گلدان کو دیکھ کر اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ شاہ زمان کی آنکھوں میں لہو اترا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے، گہری خوفناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماروی..... کہاں ہے.....؟"

"بڑے سائیں! اس کی شادی ہو گئی ہے..... اب وہ بہاولپور اپنے سسرال میں ہے۔"

ماروی کی ماں نے کانپتے لہجے میں کہا تو شاہ زمان ناقابلِ یقین تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اس بوڑھی کمزور عورت کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے، ایک جھٹکا دیا جس سے اس کی چادر اتر گئی۔ وہ درد سے کراہ اٹھی بادلوں کی گرج سے لہجے میں بولا۔ "تیری مجال کیسے ہوئی اس کی شادی کرنے کی..... بڑے سائیں کے حکم کے بغیر تو یہاں پتا بھی نہیں ہلتا..... اور تو نے..... اتنا بڑا کام مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا....."

شاہ زمان نے ایک جھٹکے سے اسے پرے پھینکا۔ وہ نہایت قیمتی پانچ فٹ اونچے پلر گلدان پر گری۔ گلدان گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ماروی کی ماں کی کلائی زخمی ہو گئی۔ گلدان ٹوٹنے سے وہ اور طیش میں آ گیا یا اسے بہانہ مل گیا۔ اس نے بوڑھی عورت کو ٹھوکر پر رکھ لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ خدا رسول کے واسطے دینے لگی..... مگر الکوحل کے زیرِ اثر شاہ زمان کے کان پر جوں تک نہ رینگی..... اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وقت رکے جب اس عورت کے منہ سے سویرا بی بی کا نام نکلا۔ وہ لرزاں روتے لہجے میں بولی۔

"بڑے سائیں.....! میری کیا مجال میں آپ کے حکم کے بغیر لڑکی کی شادی کر دوں..... وہ تو..... سویرا بی بی نے جلدی جلدی سارا انتظام کیا..... میں نے تو ایک دو دفعہ انہیں کہا بھی تھا کہ بڑے سائیں کی اجازت کے بغیر شادی کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا..... انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر بڑے سائیں نہیں ہیں..... تو کیا ہوا..... میں تو ہوں نا....."

شاہ زمان اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس کے دیدے پھٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کی غیر معمولی چمک میں کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی تھی..... شاہ زمان نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس عورت کو اٹھایا، چادر اسے تھمائی اور اشارہ کیا کہ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ.....

دو تین دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ شاہ زمان نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا..... بس وہ ہر روز دلاور کے ساتھ "فیروزہ" نکل جاتا تھا۔ فیروزہ لیاقت پور اور رحیم گوٹھ کے پاس ایک خوبصورت بستی تھی۔ شاہ زمان فیروزہ میں ایک دو منزلہ عالی شان مکان میں جاتا اور تین چار گھنٹے بعد وہاں سے نکلتا..... دلاور اتنی دیر باہر چھاؤں میں سستاتا رہتا۔ ایک دن شاہ زمان دو منزلہ مکان سے باہر آیا تو اس کے ساتھ بڑی سی پگڑی والا ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص بھی تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری جوتی تھی اور ہاتھ پاؤں غیر معمولی بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے پختون لگتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت پگڑی والے نے شاہ زمان سے مصافحہ کیا اور رواج کے مطابق اس کے گالوں کا بوسہ لیا۔ شاہ زمان کافی ہشاش بشاش تھا۔ چوڈیرو پہنچنے تک وہ پچھلی سیٹ پر پُرسکون انداز میں نیم دراز رہا۔ انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی نہایت اہم سنگِ میل عبور کر لیا ہے۔

☆☆☆

وہ چوڈیرو حویلی کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹی جا رہی تھی۔ حویلی کے کارندے ٹیپو ٹریگر کی خوشی میں اپنے انداز میں جشن منانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شاہ زمان بھی وہاں پر موجود تھا۔ وہ بھنگ کا رسیا تو نہیں تھا..... مگر کبھی کبھار شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ بھنگ بڑی بڑی تین، چار "دوریوں" میں گھوٹی جا رہی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اور سویرا سے "زخم" کھانے کے بعد اس نے ہر نشے کا ذائقہ چکھا تھا مگر فنا کی دیواریں کھڑی کرنے کے بعد اس نے یہ سب چھوڑا تو نہیں تھا..... محتاط ضرور ہو گیا تھا۔

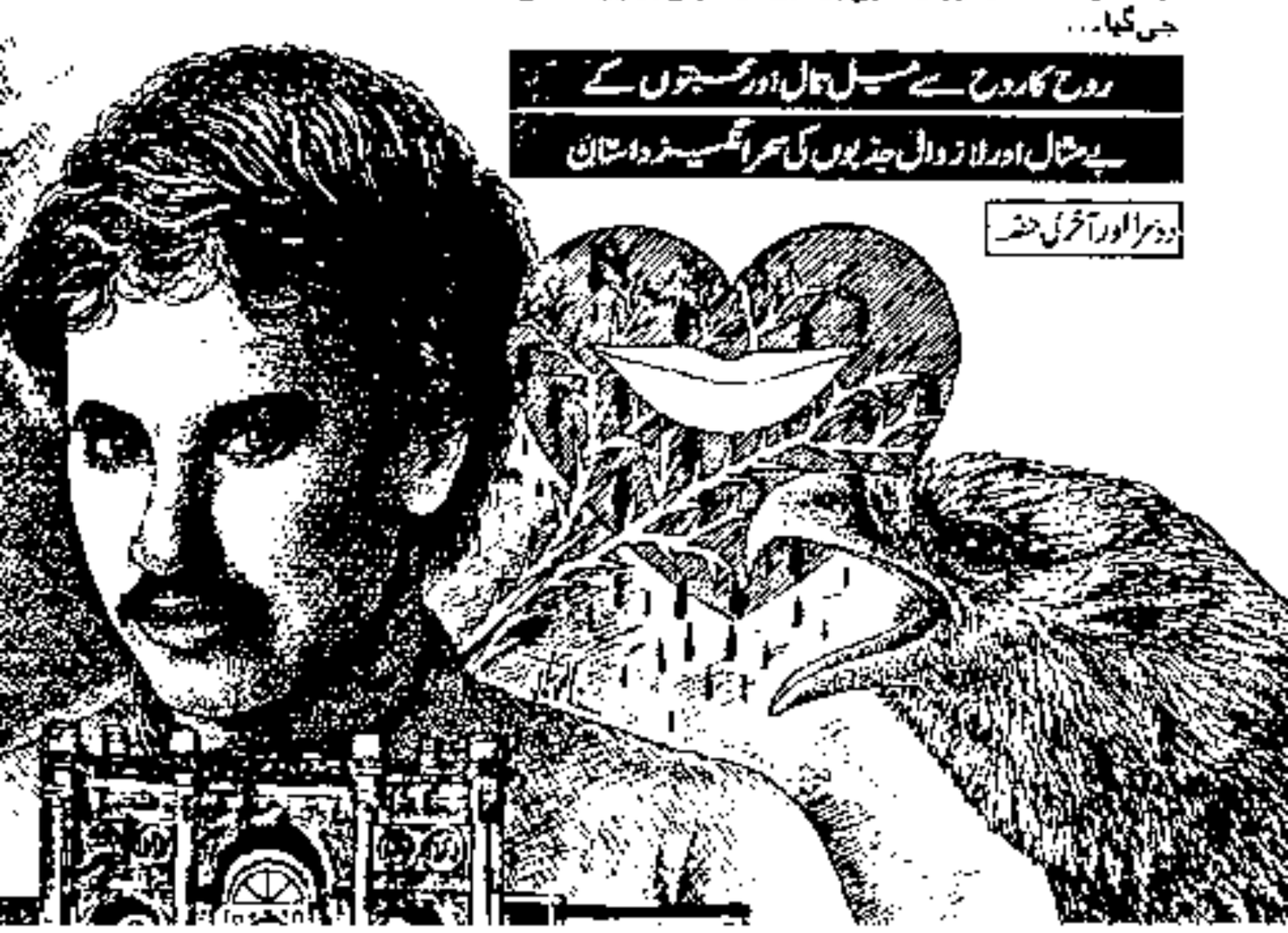
غرقِ محبت

طاہر حیاد یدمعنی

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں جنم لیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہو جائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک ہلچل مچا لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولو گی" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جا سکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی حرم کو نہ روک پایا۔ چہ چلتا رہا مگر اداسیوں کی پختگی بنا منزل کی آس کے چلتے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سلسلہ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کر دیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے مسلسل وصال اور محبتوں کے بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

دوسرا اور آخری حصہ





شاہ زمان جب سے کراچی سے لوٹا تھا، سویرا کو اس کا رویہ بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کرتی تھی۔ ماروی کے نکاح کے بارے میں دونوں میں بس سرسری سی بات ہوئی تھی۔ ابھی پچھلے ماہ میں شاہ زمان نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے کہا تھا..... کہ پھپھو عالیہ اور رمشا کو اب یہاں نہیں رہنا چاہیے..... اس میں ہماری ہی بے عزتی ہے۔ تو سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا ... مگر اگلے چند دنوں میں پھپھو عالیہ اور رمشا حویلی سے کوچ کر گئی تھیں۔ سادہ لوح سویرا نہیں جانتی تھی کہ اس کا "بڑا سائیں" دوسری شادی کی راہیں ہموار کر رہا ہے۔ وہ تو بس اس کے ہر فیصلے کے آگے سر جھکاتی چلی جا رہی تھی..... یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی شاہ زمان کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔

یہ بات سویرا کو پریشان کر رہی تھی۔ کیا عورت صرف مرد کی خدمت گزاری کے لیے بنی ہے؟ اس کو خوش رکھنا اس کا خیال رکھنا ... اس کی ضرورتیں پوری کرنا اور مرد کا جب دل چاہا ٹشو پیپر کی طرح اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے..... وہ ایسا ٹشو پیپر نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے تو شادی ایسے آدمی سے کی تھی جو اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اس کے دل میں رہنے کے لیے ہی تو سندھ یونیورسٹی سے اٹھ کر چوڑیرو آ گئی تھی مگر حالات کچھ اور اشارہ کر رہے تھے..... تقدیر کی کتاب کے ورق تیز آندھی کی زد میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور ایسے صفحے نگاہوں کے سامنے آنا چاہ رہے تھے جن میں ..... سویرا کے لیے دردِ ہی درد لکھا تھا..... اور یہ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پوری حویلی میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ چوڑیرو حویلی اور حضور چانڈیو کے بیچ پھر کوئی نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے مگر اس تنازعے کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو خبریں گردش کر رہی تھیں اور جو قیاس لگائے جا رہے تھے، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ پھر سے باز کا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ پرندے کی رقم وصول کرنے کے باوجود چوڑیرو حویلی والے پرندہ حضور چانڈیو کے حوالے نہیں کر رہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ بدعہدی تھی مگر معاملے کی اصل حقیقت چند لوگوں کو معلوم تھی اور وہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ سننے میں یہ بھی آ رہا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان کشیدگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ تصادم کا خطرہ تھا۔ کچھ سمجھدار بڑے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ایک جرگہ بلایا اور دونوں پارٹیوں کے صرف بڑے اس جرگے میں شریک ہوئے۔ باتوں باتوں میں آوازیں بلند ہو گئیں۔ لہجے سخت تر ہو گئے بندوقیں نکل آئیں..... مگر پھر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پیر فضل، رحیم سائیں نے اپنی پگڑیاں اتار کر پیروں میں رکھ دیں... کچھ ضمانتوں، کچھ شرائط کے ساتھ یہ جرگہ ختم ہو گیا۔

چوڑیرو حویلی والوں کو دو ہفتے کی مہلت چاہیے تھی۔ وہ بالآخر مل گئی.....

اس مہلت کے بعد یوں لگتا تھا ... حویلی میں چھائی تناؤ اور پریشانی کی کیفیت ختم ہو گئی ہے۔ ایک دن حویلی کے زنان خانے میں سیبوں کے چار کریٹ پہنچاتے تھے..... ظفری..... دلاور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا ..... مگر ظفری ضد پر اڑ گیا۔ اس دن دلاور نے زنان خانے کو پہلی دفعہ اندر سے دیکھا۔ جس وقت وہ کریٹ برآمدے میں رکھ رہے تھے، اوپری منزل کی بالکونی جو صحن کی طرف کھلتی تھی، اس پر سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سرجھایا ہوا لگتا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ دلاور سے ملی، سویرا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ..... دلاور دل تھام کے رہ گیا۔ انا کی دیواروں سے باہر کے منظر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اس نے جلدی سے کریٹ وہاں رکھے اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ظفری اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ ابھی دوپہر تھی، رات ہونے میں کافی وقت تھا..... پستہ قد کاٹنوں والی بیری والی جگہ یاد کرنے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔

ظفری کی واپسی وہاں سے ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ آتے ہی چوکڑی لگا کر بستر پر بیٹھ گیا بولا۔

"اسی دن سے جس بات نے میری نیند حرام کی ہوئی تھی، مجھے وہ پتا چل گئی۔" دلاور نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ "تمہیں معلوم ہے اس دن جب سب لوگ سیبوں والی حویلی میں جھنگ گھوٹ رہے تھے تو چھوٹے سائیں شیرو کے ساتھ بڑی گھبراہٹ میں وہاں آئے تھے..... پتا ہے کیا خبر لائے تھے؟"

"مجھے کیا پتا.....؟" دلاور بے زاری سے بولا۔

"جو باز انہوں نے ترنڈا کی سفید حویلی کے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا، وہ وہاں سے پھر چوری ہو گیا۔"

"اوہ خدایا..... یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے..... اس خبر نے چوڈیرو حویلی کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلا شک شوکت سیال اور حضور چانڈیو پر کیا گیا۔ باز کی چوری پوشیدہ رکھی گئی اور بڑے سائیں نے اپنے گماشتے ہر طرف بھگائے..... بہت جلد ان کو معلوم ہوگیا کہ باز حضور چانڈیو نے چوری نہیں کرایا بلکہ اسے چوری کرنے والے لوگ کچے کے علاقے سے آئے تھے۔ وہ چوری شدہ باز اب راجن پور سے آگے پانی کے بہاؤ سے پار کچے کے علاقے میں ہے۔ پہلے پہلے تو یہ بات حضور چانڈیو سے چھپائی گئی۔ ایک ہفتے تک انہیں جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دیے جاتے رہے مگر جب باز..... پہنچانے والی مہلت ختم ہوگئی..... تو حضور چانڈیو نے سنگین نتیجے کی دھمکی دے دی۔ دونوں طرف سے کشیدگی بے حد بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی نئی جنگ شروع ہوجاتی، بیچ میں رحیم سائیں اور پیر فضل کود پڑے۔ انہوں نے ایک جرگے کا اہتمام کیا..... جرگے میں بھی بدمزگی ہوگئی۔ شوکت سیال بدزبان اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے شاہ فرمان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی..... دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں۔ فائر ہوتے ہوتے رہ گیا..... رحیم سائیں اور پیر فضل نے اپنی پگڑیاں اتار کر لڑنے والوں کے پاؤں میں پھینک دیں۔ اس خوفناک صورتِ حال سے نبٹنے کے بعد پیر فضل نے مخالفین کو صاف صاف بتادیا کہ باز چوری ہوچکا ہے۔ ہم لوگ وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جیسے بھی ہوگا، وہ باز واپس کریں گے اور پھر باز کی واپسی کے لیے دو ہفتے کی مہلت مانگی گئی۔ وہ مہلت اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ اگر شاہ زمان وہ باز دو ہفتوں میں واپس نہیں کرتا تو تین کروڑ کی رقم..... اور خون بہا والی رقم فوری طور پر حضور چانڈیو کو واپس کی جائے.....''

ظفری خاموش ہوا تو دلاور کے چہرے پر حیرانی تھی۔ وہ بولا۔ ''تمہیں ان باتوں کا کہاں سے پتا چلا؟''

ظفری ہنس دیا۔ ''تم آم کھاؤ پیڑ مت گنو..... ہماری پہنچ بھی حویلی کے اندر تک ہے۔'' وہ آنکھ میچ کے بولا۔

☆☆☆

اس دن شاہ زمان، دلاور کو فیروزہ والی کوٹھی کے اندر لے گیا۔ دلاور اک سائڈ پر کرسی پر براجمان تھا۔ دوسری طرف بڑی میز پر بھاری جسامت والا پٹھان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر چٹی سفید عورت بیٹھی تھی جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ ایک میلے سے چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا نام صغراں تھا۔ تیز طرار اور آنکھیں مٹکانے والی صغراں بولی۔

''مفید جان! بڑے سائیں کو تھوڑا وقت اور دو.....''

مفید جان ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''ام اپنی طرف سے دو سال دینے کو تیار ہے مگر..... گارنٹی کوئی نہیں ہے۔ وہ حرام کا پلا کسی وقت بھی پہنچ گیا تو..... گڑبڑ ہوجائے گا.....''

''مفید جان! گڑبڑ کو ہم سنبھال لیں گے..... مگر ابھی ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے..... میں صرف بیس بائیس دن ہی تو مانگ رہا ہوں.....'' شاہ زمان نے کہا۔

چٹی سفید عورت بولی۔ ''تم بیس بائیس دن کی بات کرتے ہو..... ہم ایک دو دن کی گارنٹی بھی نہیں دے سکتے..... ادھر ابھی..... ام سے صاف صاف بات کرو..... اور قصہ خلاص کرو..... پرسوں اگر تم برات لے کر آتا ہے تو ٹھیک..... ورنہ ہم یہ شادی کینسل کرے گا.....'' عورت جتنی خوبصورت اور نرم و نازک دکھتی تھی، اس کا لہجہ اتنا ہی کڑوا کسیلا تھا۔

صغراں بولی۔ ''بڑے سائیں! آپ ایسا کریں آج مشورہ کرلیں..... کل..... آکر ان کو بتادیں گے.....''

مشورہ کرنے کی بات پر شاہ زمان بھڑک اٹھا..... چوڈیرو حویلی کا ازلی جوشیلا خون اس کے دماغ کو چڑھ گیا۔ غصے کو حتی الامکان دباتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کس سے مشورہ کرنا ہے..... دنیا مجھ سے آکر مشورہ مانگتی ہے۔ میں یہیں کھڑے کھڑے ہر فیصلہ کرسکتا ہوں۔ وہ تو بس بیچ میں ایک اڑچن آگئی ہے۔ نہیں تو.....''

ٹیشن میں آنے کے بعد شاہ زمان نے جو فیصلہ کیا وہ سراسر مفید جان وغیرہ کی مرضی کے مطابق تھا۔ طے ہوا کہ صرف دو دن بعد ہفتے کی شام کو شاہ زمان دس پندرہ خاص بندوں کے ساتھ آئے گا اور گلِ لالہ کو نکاحی بنا کر لے جائے گا۔ اس نے مفید جان وغیرہ کو تاکید کی کہ مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ اس نے ایک موٹی رقم بھی اس سلسلے میں مفید جان کو دے دی۔

اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا شاہ زمان نے کہا تھا۔ ایک شام بڑی رازداری کے ساتھ شاہ زمان خود بروگلِ لالہ کو اپنی دوہٹی بنا کر چوڈیرو حویلی میں لے آیا۔ جن لوگوں نے نکاح میں شرکت کی تھی ان میں بڑی آپا اور نگینہ بیگم کے علاوہ دو تین ملازمائیں بھی شامل تھیں جو زرق برق کپڑوں میں شاہ زمان کی رشتے دار ہی دکھائی دیتی تھیں۔

یہ ظلم سویرا پر ہوا تھا لیکن وہ جیسے پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔ دو تین دن سے بالکل سکتہ زدہ سی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے یہ سب کچھ سہنا ہے اور سہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

میں دیکھ کر بولا۔

''مجھے سہارا دینے کا.....'' وہ ممنونیت سے بولی۔

''میں تو آخری سانس تک آپ کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوں۔'' دل کی بات وہ زبان پر نہ لاسکا بولا۔.....

''بی بی جی.....! ایک بات بولوں۔'' سویرا کا سوالیہ انداز دیکھ کر کہنے لگا۔ ''بی بی جی.....! آپ خوش رہا کریں۔ آپ ایسے خاموش اور پریشان اچھی نہیں لگتیں.....''

سویرا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بالوں کی لٹ کو دھیرے سے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

''دلاور! خوش رہنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہے..... مگر..... میں زندگی سے دور ہوتی جارہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بے پناہ کرب امڈ آیا۔ دلاور اس کا غم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

اس کے جواب میں دلاور کے ذہن میں کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ شیشے کی بلند دیواروں کو پھاندنا نہیں چاہتا تھا..... وہ فنا کی چار دیواری سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلا دن دلاور کے لیے بڑا دھماکا خیز تھا۔ پوری حویلی میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے جب شاہ زمان نئے خریدے گئے اونٹوں کا معائنہ کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ملازمین کی ایک فوج کھڑی تھی۔ دلاور بھی ان میں شامل تھا کہ صدر دروازے کی طرف سے ایک جیپ دھول اڑاتی ہوئی آئی۔ شاہ زمان کے پاس پہنچ کر وہ جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ اس میں سے دو بندوق بردار بڑی سرعت سے نکلے۔ انہوں نے جیپ کی پچھلی جانب سے جھک کر ایک زخمی آدمی کو نکال کر باہر لٹادیا، وہ ٹیپو ٹریگر تھا۔ وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر وہاں کھڑے سب لوگ ششدر رہ گئے۔ شاہ زمان غصیلے لہجے میں دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اوے..... یہ کیا ہے..... کس نے زخمی کیا ہے اسے!''

''بس بہت گڑبڑ ہوگئی ہے جی۔'' بندوق بردار نے کہا، پھر وہ آگے کو جھک کر بڑی رازداری سے زمان کو کچھ بتانے لگا۔

ٹریگر سیریس حالت میں دکھتا تھا۔ شاہ زمان کے کہنے پر اسے فوری طور پر اسپتال بھجوادیا گیا۔ شاہ زمان پریشانی میں پیشانی مسلنے لگا۔ اس نے شاہ فرمان کو فون ملایا اور اس سے بات کرنے لگا..... تھوڑی دیر بعد پیر فضل، شاہ فرمان کو لے کر حویلی پہنچ گیا..... تینوں سر جوڑ کر حویلی کی نشست گاہ میں بیٹھ گئے..... ایک گھنٹے بعد شاہ زمان نشست گاہ سے نکلا اور اس نے دلاور کو جلدی سے گاڑی نکالنے کا کہا۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ نزدیکی اسپتال میں تھے۔ ٹیپو ٹریگر آئی سی یو میں تھا اور ہوش میں تھا۔ شاہ زمان کو اندر جانے کی اجازت مل گئی اور کیوں نہ ملتی۔ اسپتال کا ایم ڈی اس کا نمک خوار اور اطاعت گزار تھا۔ دلاور باہر کھڑا کھڑکی سے سب دیکھنے لگا۔ ٹیپو ٹریگر شاہ زمان سے کوئی بات کررہا تھا جسے شاہ زمان بڑے غور وانہماک سے سن رہا تھا۔ وقفے وقفے سے شاہ زمان اس سے کچھ پوچھنے بھی لگ جاتا..... یہ ملاقات آٹھ دس منٹ تک جاری رہی..... پھر شاہ زمان بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔

واپسی پر دلاور نے پوچھا۔ ''بڑے سائیں! ٹیپو بچ تو جائے گا؟''

شاہ زمان کسی خیال سے چونکا پھر تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے کچھ نہیں ہونے والا۔ ببر شیر ہے وہ..... حضور چانڈیو کے قبضے میں اتنی دیر رہ کر بچ نکلا ہے تو کوئی بات تو ہے نا اس میں۔''

شاہ زمان چند سیکنڈ تک مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا پھر دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جیپ ذرا سامنے، ان درختوں میں روکو۔''

دلاور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی جیپ روک دی۔ سائے گہرے ہورہے تھے۔ سورج مغربی افق میں چہرہ چھپاچکا تھا۔ دلاور سوالیہ نظروں سے شاہ زمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دلاور! میں نے ایک دن تجھ سے کہا تھا نا..... کہ تجھ سے ایک بہت خاص کام لینا چاہتا ہوں۔ بس سمجھو وہ وقت آگیا۔ تو اپنے آپ کو تیار کرلے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ کام بس تو ہی کرسکتا ہے۔''

دلاور کی دھڑکن انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ بولا۔ ''بڑے سائیں! آپ حکم کریں، جان بھی حاضر ہے۔''

شاہ زمان نے سگریٹ سلگایا اور اگلے آٹھ دس منٹ میں شاہ زمان کو جو کچھ بتایا، وہ تحیر خیز تھا۔ یہ بات تو خیر دلاور پہلے ہی جان چکا تھا کہ باز چوری ہوچکا ہے، مگر یہ خبر اسے شاہ زمان کی زبانی ملی کہ ٹیپو ٹریگر کے زخمی ہونے کی وجہ وہ باز ہی ہے۔ دراصل دو دن پہلے شاہ زمان نے اپنے اس دستِ راست کو باز کی بازیابی کے لیے ہی کچے کے ایک دور دراز گوٹھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ وہاں کوئی بہت بڑی اور پرانی حویلی تھی جسے کچا قلعہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علاقے کے ایک بدنام شخص ساجے بٹھل نے وہ باز کچا قلعہ میں رکھا

ہوا تھا اور وہاں بس کی حفاظت کا محفوظ انتظام تھا۔ شاہ زمان نے جو کچھ کیا تھا پلاننگ کے ساتھ کیا تھا مگر پلاننگ کامیاب نہیں ہوئی اور ٹریگر شدید زخمی ہو کر واپس آ گیا تھا۔ دراصل کل رات، شب برات کی تھی۔ شاہ زمان وغیرہ کو معلوم ہوا تھا کہ اس تہوار کے موقع پر کچا قلعہ میں ساجے شکیل کے بس دو چار پہریدار ہی موجود ہوں گے اور اگر اس موقع کا فائدہ اٹھا کر شب خون مارا جائے تو باز کو وہاں سے نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیپو ٹریگر پر سوں بڑی رازداری سے اس مہم پر نکلا تھا مگر وہاں پہریدار توقع سے زیادہ تھے۔ یہ لوگ کچا قلعہ کے اندر بھی داخل نہ ہو پائے تھے اور دو طرفہ فائرنگ میں ٹیپو ٹریگر کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

اور اب شاہ زمان یہ کام دلاور کے سپرد کرنے جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس کا علم دلاور کو تھوڑی دیر بعد ہوا۔ شاہ زمان نے کچھ دیر تک سوچ میں غرق رہنے کے بعد کہا۔

"دلاور! کچا قلعہ کا سارا نقشہ میرے پاس ہے۔ یہ ساری عمارت ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ تین طرف تو سانچے کے خطرناک کارندے پہرے پر رہتے ہیں لیکن چوتھی طرف پہرے کا نظام اتنا سخت نہیں ہے۔ اس طرف ایک بڑی برساتی جھیل ہے۔ چوڑائی کوئی آدھ فرلانگ کے قریب ہوگی، لمبائی ایک ڈیڑھ میل ہے۔ اگر کوئی اچھا تیراک چوڑائی کی طرف سے اس جھیل کو احتیاط سے پار کر لے تو کچے قلعے کی پچھلی طرف سے اندر گھس سکتا ہے۔"

"احتیاط سے پار کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے جناب؟"

"میری معلومات کے مطابق یہ خراماندے رات کے وقت بھی جھیل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہاں جنریٹر ہیں اور سرچ لائٹس وغیرہ بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ جھیل پار کرنے والے کو پانی کے اوپر آئے بغیر تیرنا پڑے گا اور پتا نہیں کیوں... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تمہارے اندر اس کام کو کرنے کی خداداد صلاحیت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، مجھے وہ منظر زندگی بھر نہیں بھولے گا..."

اس کے بعد شاہ زمان اس واقعے کی تفصیل میں کھو گیا جب دلاور نے زبردست بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ زمان اور سویرا کو پانی کی بے رحم موت سے بچایا تھا۔ اب ساری گتھیاں حل ہو رہی تھیں اور بات دلاور کی سمجھ میں آ رہی تھی... وہ دیر تک جیپ کے نیم گرم ماحول میں بیٹھے رہے۔ شاہ زمان اور دلاور کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوئی۔ شاہ زمان نے دلاور کو کچا قلعہ کا وہ نقشہ بھی دکھایا جو ہاتھ سے بنایا گیا تھا۔ اس میں اس خاص جگہ کی نشاندہی بھی تھی جہاں وہ نہایت قیمتی پرندہ موجود تھا۔ ایک ایسا پرندہ جس کے حصول کے لیے دشمنوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ پرندے کو کچا قلعہ کے ایک محفوظ حصے میں رکھا گیا تھا لیکن اگر کوئی شخص پانی کی طرف سے کچا قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے لیے پرندے تک رسائی چنداں مشکل نہ رہتی اور یہ بڑا اہم نکتہ تھا۔ شاہ زمان اور دلاور نے اس سارے سانحے پر بے حد تفصیل سے بات کی اور بہت سی جزئیات طے کر لیں۔

☆☆☆

یہ دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ وہ ایک سرد تاریک رات تھی۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تھا۔ دلاور اپنے ساتھی ہالے کے ساتھ شام کے فوراً بعد ہی کچا قلعہ کے نواح میں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں، ایک ایسے لوڈر کے ذریعے یہاں آئے تھے جو یہاں دودھ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے لوڈر میں جان بوجھ کر نقص پیدا کر دیا تھا اور اسے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اقبال عرف بالا لوڈر میں ہی تھا۔ دلاور جھیل کے کنارے سرکنڈوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے چست پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک فٹ کا دو دھاری خنجر اس کی ریگ زین کی جیکٹ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ واٹر پروف ٹارچ اور چھوٹا پٹھل بھی تھا جسے پانی کی زد سے بچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچا قلعہ کا نقشہ بھی ایک پولیتھین میں لپیٹ کر اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا واٹر کولر تھا جسے دلاور نے بیلٹ کے ذریعے اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ یہاں اس دنیا میں تھا بھی کون اس کو روکنے والا۔ اسے وہ مہربان عورت یاد آئی جس کے کچھ بال سفید اور کچھ مہندی رنگے تھے۔ وہ اس کی ماں کی طرح تھی۔ اس عورت سے دلاور کے دل کے بہت سے تار جڑے ہوئے تھے۔ جب وہ عورت اس دنیا سے رخصت ہوئی تو بہت سے تار ٹوٹ گئے لیکن بہت سے اب بھی سلامت تھے۔ اب ایک اور عورت سے اس کے دل کے تار جڑے تھے اور یہ سویرا تھی اور یہ تار اتنے مضبوط تھے کہ شاید دلاور کی موت پر بھی نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔ وہ ان دنوں جو کام بھی کرتا تھا، جس طرف بھی جاتا تھا، اسے اپنے سامنے سویرا ہی نظر آتی تھی۔ اب بھی یوں تو وہ شاہ زمان کے کہنے پر ایک "کام" کے لیے نکلا تھا مگر اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سویرا کی

خاطر سب کچھ کر رہا ہے۔ یہ کیسا ناتا تھا، یہ کیسا رشتہ تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، جب سویرا کی شادی ہوگئی تو دلاور نے چوڑیر حویلی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر پھر شاہ زمان کے اصرار نے اسے روک لیا اور شاید وہ خود بھی رک جانا چاہتا تھا۔ خود کو اذیت دینے کے لیے یہ ایک ایسی خواہش تھی جسے وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا اور اب تو صورتِ حال ایسی ہوگئی تھی کہ دلاور ہر صورت یہاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، شاہ زمان کی دوسری شادی کے بعد سویرا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے، مرجھاتی جارہی ہے، اس کی جڑیں سوکھ رہی ہیں۔ وہ اسے ایسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس کے آس پاس رہنا چاہتا تھا..... حویلی میں رہنا چاہتا تھا اور حویلی میں رہنے کے لیے اسے شاہ زمان کا اعتماد جیتنا تھا۔ اس پر ثابت کرنا تھا کہ وہ اس کی ضرورت ہے اور یہی ثابت کرنے کے لیے وہ آج دیوانہ وار اس سرد جھیل کے کنارے موجود تھا۔

اس نے جھیل کی خاموش سطح کو دیکھا ..... ہاں وہ پانیوں کا شناور تھا۔ سرفودم گھٹ کے ''ساتھ'' اور اس کی سخت تربیت نے اسے پیراکی کے ہنر میں طاق کردیا تھا..... وہ گہرے پانیوں کی مچھلی کی طرح ہوگیا تھا۔ گہرے پانیوں کی مچھلی جو سخت دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے۔ بس اپنا یہی ایک ہنر تھا جس پر وہ ناز کرسکتا تھا۔

اللہ کا نام لے کر وہ پانی میں اترا۔ غوطہ لگایا اور نیچے ہی نیچے تیرنا شروع کردیا۔ اس کے پاس قدرت کا تحفہ تھا۔ وہ پانیوں کے نیچے سانس روک لیتا تھا اور اتنا روکتا تھا کہ کناروں پر کھڑے اس کی زندگی سے مایوس ہوکر چلانے لگتے تھے۔ آج بھی وہ اپنے اس Skill کو استعمال کررہا تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنا سر سرد پانی سے باہر نکالا..... اپنے رخ کا تعین کیا اور پھر ڈبکی لگادی۔ دوسری مرتبہ بھی قریباً پانچ منٹ بعد ہی وہ بے آواز..... سطحِ آب پر ابھرا۔ ایک فکس سرچ لائٹ کی روشنی جھیل کے اس حصے کو مسلسل روشن رکھے ہوئے تھی۔ اوپر فصیل نما دیوار پر کوئی پہریدار حرکت کررہا تھا۔ وہ ایک بار پھر پانی میں روپوش ہوگیا..... اس مرتبہ اسے زیادہ دیر پانی میں رہنا تھا۔ اس کے پھیپھڑے آکسیجن کی طلب میں پھٹنے لگے لیکن یہ مشکل ترین مرحلہ بھی بالآخر گزر گیا۔

وہ بلند دیوار کی جڑ میں اس بارشی پانی کے پائپ کے پاس پہنچ چکا تھا جس کی نشاندہی نقشے میں موجود تھی۔ یہ کوئی 30 انچ قطر کا قدیم پائپ تھا۔ شاید انگریزوں کے دور کا۔

دلاور اس پائپ میں داخل ہوا اور اپنی پنسل ٹارچ روشن کرلی۔ پائپ کے اندر بھی پانچ چھ انچ تک بدبودار پانی موجود تھا۔ جگہ جگہ جالے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مینڈکوں اور چوہوں سے بھی سابقہ پڑا مگر وہ ان سارے مسائل کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوکر آیا تھا۔ وہ کراالنگ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر عمارت کے ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچ گیا جہاں کئی چھتوں کے پرنالے آکر گرتے تھے۔

اب دلاور نے اپنا پستول نکال لیا اور ہر آمدہ خطرے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات کے اس پہر کچا قلعہ کے بیشتر مکین یقیناً سو رہے تھے۔

حقیقی خطرے سے دلاور کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ عمارت میں قریباً سو میٹر اندر آچکا تھا۔ ایک پرچھائیں اس پر جھپٹی۔ یہ ایک مسلح شخص تھا۔ دلاور کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پھرتی سے نہ صرف خود کو حملہ آور کے وار سے بچایا بلکہ اسے گھما کر اتنی زور سے ایک دیوار کے ساتھ مارا کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہوگیا۔

آواز پیدا ہوئی تھی۔ دلاور نے ایک تاریک کونے میں چھپ کر کچھ دیر ردعمل کا انتظار کیا پھر مطمئن ہوکر باہر نکل آیا۔ پہریدار کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک تو ہوش میں نہیں آئے گا۔ دلاور نے اس کی شلوار قمیص کی تلاشی لی۔ واسکٹ کی ایک جیب سے چابیوں کا گچھا نکلا۔ ان میں سے ایک چابی بھاری بھرکم محرابی دروازے کی تھی۔ دلاور نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ بے ہوش پہریدار کو گھسیٹ کر تیل کے ڈرموں کے پیچھے گھسیڑا اور پنسل ٹارچ سے نقشہ دیکھنے کے بعد آگے بڑھنے لگا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

سب کچھ ٹھیک جارہا تھا۔ دلاور کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مطلوبہ کمرے تک پہنچ جائے گا۔ مزے کی یہ بات تھی..... سامنے کی طرف تو ہر طرح کے حفاظتی انتظامات تھے لیکن عقبی جانب کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کمرے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پالتو طوطوں کی چوں چوں سنائی دی۔ بے شک یہی باز والا کمرا تھا۔ دلاور نے پستول جیکٹ میں رکھ کر دو دھاری خنجر ہاتھ میں لے لیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے غنودگی بھری آواز آئی۔

دلاور نے دوبارہ دستک دی۔ ایک جوان لڑکے نے

دروازہ کھولا اور پکی پکی آنکھوں سے دلاور کو دیکھا۔ ایک دم اس کی نگاہ دلاور کے چمک مارتے خنجر پر پڑی۔ اس نے شاید چلانے کے لیے ہی منہ کھولا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دلاور نے اسے جکڑ لیا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دائیں ہاتھ میں خنجر تھا اور یہ لڑکے کی عین شہ رگ پر تھا۔

لڑکے کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ دبلا پتلا لیکن زور والا تھا۔ دلاور نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا اور پھنکارا۔ "زور مارو گے تو گردن کاٹ دوں گا، ابھی لاش پڑی نظر آئے گی۔"

وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور دلاور کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دلاور نے پھر سرسراتی سرگوشی کی۔ "گردن کٹ جائے گی تیری کسی کا کچھ نہیں جائے گا۔"

لڑکے میں ہوش کم اور جوش زیادہ تھا۔ وہ پھر بے طرح پھڑکا، دونوں گرتے گرتے بچے۔ اب دلاور کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ خنجر استعمال کرتا مگر لڑکے کی کم عمری دیکھتے ہوئے اسے ترس آیا۔ کسی ماں کا بیٹا تھا، ابھی تو اس نے جینا شروع کیا تھا.... ابھی تو شاید کسی سوہنی نے اس کی زندگی میں آنا تھا، ابھی تو شاید.....

اس نے گردن کے بجائے لڑکے کے پیٹ کے نچلے حصے کو نشانہ بنایا۔ خنجر پہلے لڑکے کے سویٹر پھر کپڑے اور پھر گوشت میں گھسا۔ لڑکے کی خطرناک مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ تب دلاور نے پستول کے دستے سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں اور بیہوش فرش پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ ارد گرد کی آہٹیں سنتا رہا پھر کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں اس مستطیل کمرے میں تین چار چھوٹے بڑے پنجرے تھے۔ ایک بڑے پنجرے میں کونجیں تھیں۔ ایک میں طوطے تھے۔ ایک بڑے پنجرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں ایک مقامی شکرا بند تھا، دوسرے میں وہ نایاب عقاب تھا جس نے ان گنت لوگوں کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ وہ واقعی بے مثل پرندہ تھا۔ پروں کی چوڑائی حیران کن تھی۔ اسے دیکھ کر دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوتی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ ایک بار پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

اس پنجرے میں اس نایاب پرندے کے آرام و آسائش کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ اسے بے قراری سے بچانے کے لیے اس کے سر پر تھیلی کی اندھیاری چڑھائی گئی تھی۔ اس اندھیری نے دلاور کا کام آسان کر دیا۔ دلاور نے اپنی پشت سے بندھا ہوا چھوٹا واٹر کولر اتارا، اس کا ڈبل ڈھکنا کھولا اور کولر کو پنجرے کے بالکل سامنے کر دیا۔ جونہی دلاور نے پنجرے کا دروازہ کھولا، پرندہ آگے بڑھا۔ چند لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر کولر میں داخل ہو گیا۔ دلاور نے کولر کے دونوں ڈھکنے بند کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس واٹر کولر میں اتنی آکسیجن تو بہرحال موجود تھی کہ یہ نایاب پرندہ اگلے ایک گھنٹے تک زندہ سلامت رہ سکتا تھا۔

لڑکا بے ہوش تھا۔ اس کے زخم سے خون تو بہہ رہا تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ دلاور امید کر سکتا تھا کہ اسے بچا لیا جائے گا۔ واٹر کولر کو ایک بار پھر اپنی پشت سے باندھنے کے بعد دلاور نے پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور واپس چل پڑا۔ ابھی وہ ڈکیتوں کے اس ڈیرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی جھیل میں بھی نہیں اترا تھا لیکن اس کی چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگی تھی کہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو چکا ہے۔

☆☆☆

دلاور نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ بغیر کسی بڑے خون خرابے کے وہ سانپ جیسے خطرناک شخص کی کچھار میں گھس کر اس کو ایک "زبردست چیت" لگا آیا تھا اور گوہر مطلوب حاصل کر لیا تھا۔ وہ باز واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور اگر اس کی وجہ سے دو شیخ دست و گریباں نہ ہوتے تو بات سمجھ میں آتی تھی۔

باز کو شاہ زمان کے حوالے کرنے کے بعد دلاور ایک طرح سے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دلاور نے اس امر میں زیادہ دلچسپی نہیں لی کہ باز کہاں پہنچایا گیا، کس نے پہنچایا اور اس کے نتائج کیا نکلے۔ بس ایک دن پیر فضل کی زبانی اسے اتنا پتا چلا کہ پرندہ حضور چانڈیو کو مل گیا ہے اور وہ تازہ بتازہ جوون بدن شدت اختیار کرتا جا رہا تھا، اب تقریباً ختم ہے۔

اس واقعے کے بعد حویلی والوں کی نگاہ میں اور خاص طور سے شاہ زمان کے نزدیک دلاور کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک روز دلاور کو زبردست سرپرائز ملا۔ اسے شاہ زمان نے بلایا۔ وہ اس کی بیٹھک میں پہنچا تو وہاں اس کے کئی عام اور خاص ملازم موجود تھے۔ ان سب کے سامنے شاہ زمان نے دلاور کے شانے پر ایک خاص قسم کی شال رکھی اور چھوٹے چھوٹے شیشوں سے مزین ایک نہایت قیمتی ٹوپی اسے پہنائی گئی۔

"تم آج سے میرے "کاربار خاص" ہو۔" شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سب حاضرین نے اسے مبارک باد دی۔ ''کارِ خاص'' کا لفظ حویلی میں دراصل اہم ترین ملازم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسے ایک طرح سے شاہ زمان کا مشیر اور ملازمین کا انچارج بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ ''اعزاز'' اس سے پہلے ٹیپو ٹریگر کو حاصل تھا مگر زخمی اور بیمار ہونے کے بعد ٹریگر کی کارکردگی وہ نہیں رہی تھی لہٰذا اسے آرام دیا جارہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ یہ آرام ٹیپو ٹریگر کو ہضم نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں ہی دلاور کو اندازہ ہوگیا کہ ٹریگر اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت چمکنے لگی ہے۔ بہرحال دلاور ایسی باتوں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ حقیقی معنوں میں اگر اس حویلی میں اسے کسی کی پروا تھی تو وہ صرف اور صرف سویرا تھی۔ سویرا بھی جانتی تھی کہ دلاور نے شاہ زمان کے کہنے پر خود کو ایک زبردست خطرے میں جھونکا ہے اور ساجے کے ڈیرے سے قیمتی باز نکال لایا ہے..... جس کے صلے میں اسے ''کارِ خاص'' بنایا گیا ہے۔ وہ اس صورتِ حال پر خوش تھی۔ شاہ زمان کی دوسری اچانک شادی نے سویرا کو کچھ دیر کے لیے بالکل مرجھا ڈالا تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس صدمے سے سنبھلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس جال میں کتنا بھی پھڑ پھڑائے گی، خود کو زخمی کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پائے گی۔ ایک ناک کٹی عورت یہاں پہلے ہی موجود تھی، وہ دوسری بننا نہیں چاہتی تھی۔ کسی وقت سویرا سے دلاور کا آمنا سامنا ہوتا تو سویرا کی حسین آنکھوں میں دلاور کو اپنے لیے کئی خاموش سوال نظر آتے۔

وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھتی، کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں تنہا درخت کی طرح اکیلے ہو؟ کیوں کسی بچھڑی ہوئی کونج کی طرح دل گرفتہ ہو؟ کیوں اپنی زندگی کو سنبھالتے نہیں ہو؟ کیوں اپنے ویران گلشن کو آباد نہیں کرتے ہو؟ زندگی اتنی بے وقعت تو نہیں، اسے یوں برباد کیوں کررہے ہو؟

ان سارے خاموش سوالوں کا دلاور کے پاس ایک ہی جواب تھا اور پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی دلاور کو یقین ہونے لگتا کہ وہ بھی اس جواب کے بارے میں جانتی ہے.....

شاہ زمان اب دلاور کو اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا اور عموماً اس سے حویلی کے اہم معاملات میں مشاورت بھی کرتا تھا۔ ایک رات دیر تک وہ نشست گاہ میں دلاور کے ساتھ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ گفتگو کے دوران میں ایک بار پھر ساجے اور اس کے کرتوتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ دلاور نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑے سائیں! ایک سوال بڑے دنوں سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے۔ کافی عرصہ پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ دلاور، تم سے ایک خاص کام لینا ہے اس لیے حویلی میں ہی رہوں..... آپ نے کہا تھا نا...؟''

''ہاں کہا تھا..... اور کام لیا بھی تو ہے۔ تمہیں ساجے کے ڈیرے میں گھسایا اور تم نے وہ کر دکھایا جو شاید کوئی دوسرا نہ کر پاتا۔''

''یہی تو سوال ہے سائیں! آپ نے حویلی میں رہنے والی بات مجھ سے کافی عرصہ پہلے کہی تھی، اس وقت تو باز چوری نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی آپ کو یہ پتا تھا کہ اسے چوری کرنے والا اسے کہاں لے کر جائے گا.....''

''مجھے پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی پتا تھا۔'' شاہ زمان ہولے سے مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

''سمجھو کبھی کبھار مجھے آنے والے وقت کا پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ جیسے الہام سا ہوجاتا ہے۔ میرے دل میں اچانک یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ فلاں کام ہوگا اور اس طرح ہوگا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ بات پختہ ہوتی جاتی ہے، بس ساجے ٹھل والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا.....''

اس نے اس سلسلے میں کچھ اور مثالیں بھی پیش کیں۔ اس نے کہا کہ شروع میں جو جیپ والا حادثہ پیش آیا تھا، اس سلسلے میں بھی اس کے ذہن میں پہلے سے ایک بڑا مضبوط شک اور خوف موجود تھا۔ وہ ایک طرح سے غیب دانی کا دعویٰ کررہا تھا لیکن وہ غیب دان نہیں تھا..... کیونکہ اس واقعے سے بے خبر تھا جو اگلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والا تھا۔

اس رات شاہ زمان اور دلاور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاہ زمان نے بتایا کہ اس نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر سے بات کی ہے۔ کچھ دنوں تک ساجے کے خلاف ایک بڑا آپریشن ہوگا اور علاقے سے یہ ''بیماری'' دور ہوجائے گی۔ اس کے بعد کچے میں ایک دو بڑے رقبے خریدنے اور ان کو آباد کرنے کی راہ ہموار ہوجائے گی۔ اس کے ذہن میں اس حوالے سے ایک دو شاندار منصوبے تھے۔ وہ علاقے کی سیاست کے بارے میں بھی پُرجوش تھا۔ وہ ایک ایسے شخص پر سرمایہ کاری کرنے کا منصوبہ رکھتا تھا جو ایک صوبائی نشست آسانی سے جیت کر اس کے دستِ راست کا کردار ادا کرسکتا تھا۔ شاہ زمان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! میں تمہارے آنے والے دن بڑے چمکدار دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے اندر کوئی خاص بات ہے..... اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس حویلی میں

تمہارا صحیح مقام ملے۔"

دلاور ممنونیت سے سر جھکا کر رہ گیا تو شاہ زمان بولا۔

"میں نے شیرو سے اور بالے سے کہہ دیا ہے۔ رائفلیں تیار رکھو۔ صبح ہم نے بصیرت پور کے میلے میں سور کے شکار کے لیے جانا ہے۔ تم نے کبھی... شکار کیا ہے... سور کا...؟"

دلاور کے نفی کے جواب میں شاہ زمان بولا۔ "بڑا مزے دار اور بڑا دل جگرے والا شکار ہوتا ہے یہ۔ تمہیں یہ سب کچھ آنا چاہیے..." پھر شاہ زمان آخری سگریٹ بجھاتا ہوا اٹھ گیا اور بولا۔ "جاؤ آج جلدی سو جاؤ... صبح شاید جلدی نکلنا پڑے۔" شاید اسے خود بھی اپنی نئی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ کل سویرے اسے ملنے کے بعد وہ حد سے زیادہ مضطرب تھا۔ آج نیند کہاں آنی تھی... آج بہت دنوں بعد اس کا رخ پسند قدیریوں کی جانب ہو گیا۔ وہ اپنی جائے پناہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ ریت کے بلند ٹیلے سے پار نہیں اترا تھا کہ ایک مخصوص سرسراہٹ، ایک ہلکے شور نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ یکایک اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں... اس کے سر سے کچھ اوپر تارے جگمگا رہے تھے مگر مشرق کے افق کی جانب تارے ناپید تھے اور اس کی جگہ سیاہی اور دھول سی تھی۔ دلاور کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ریت کا طوفان تھا۔ ایسا ہی ایک طوفان پہلے بھی آیا تھا۔ وہ سرعت سے واپس پلٹا اور اس نے حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے اس نے کندھے پر رکھا کپڑا اوڑھنے کی صورت چہرے اور سر پر لپیٹ لیا۔ اس کے حویلی میں داخل ہونے اور کمرے میں پہنچنے تک ریتیلا طوفان شروع ہو گیا۔ کھڑکیاں دروازے بجنے لگے۔ ہوا سیٹیاں بھرنے لگی۔ ظفری بے خبر سو رہا تھا۔ دلاور بستر میں دبک کر بیٹھ گیا۔

ہوا میں ایسی آوازیں تھیں جیسے بہت سی عورتیں کہیں بین کر رہی ہوں۔ بین کی آوازیں ہمیشہ اسے پریشان کرتی تھیں۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بھی عورتوں نے بہت بین کیے تھے۔

تب سے وہ بین کی آوازوں پر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے کانوں پر دونوں ہاتھ جما دیے تھے۔ چند منٹ تک ایسے ہی چلتا رہا پھر ہوا کا شور رک گیا... اس نے کھڑکی کھول دی اور جالی کے ساتھ منہ لگا کر باہر کے ماحول کا اندازہ لگانے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کسی کے چلانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اس نے اسے وہم جانا..... مگر ایک مختصر لمحے کے بعد آواز میں شدت آ گئی... وہ کسی بچے یا کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں۔ دلاور چھلانگ لگاتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا، رائفل اتار کر ہاتھ میں لی اور باہر دوڑتا چلا گیا... آندھی تھم چکی تھی مگر ہوا ہنوز چل رہی تھی۔ وہ جوں جوں آواز کی سمت چلتا گیا۔ رونے اور واویلا کرنے کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ یہ کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں جو حویلی کے کسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ دلاور کے پاؤں بلی کی سی تیزی سے اٹھنے لگے۔ ابھی وہ کوریڈور میں پہنچا تھا کہ کوئی وزنی چیز اس کے کندھے سے اس زور سے ٹکرائی کہ رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ کوئی اٹھائیس تیس سالہ جوان تھا جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ صاف آنکھوں میں سرمہ اور سر پر ململ والی ٹوپی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ سرمہ لگی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور وار سیدھا دلاور کے سینے پر کیا۔ دلاور نے خنجر والی کلائی پکڑ لی پھر اپنی ٹانگ کا وار اس کے پیٹ پر کیا۔ وہ اچھل کے گرا اور ڈھیر ہو گیا۔

خنجر ابھی اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ہمت کر کے دوبارہ کھڑا ہوا، بے دریغ خنجر چلاتے ہوئے ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا..... دلاور واپس پلٹا۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ ابھی وہ حملہ آور کی طرف سیدھی کرنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ حملہ آور بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں دلاور کی طرف دیکھا پھر خنجر سے اپنی شہ رگ کاٹ لی۔ وہ دو چار قدم چلا پھر کوریڈور کے چھپن کے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں حویلی کے ملازمین جاگ چکے تھے اور بھاگم بھاگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف ہلچل تھی۔ دلاور کوئی موقع ضائع کیے بغیر اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں سے ابھی تک رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آواز کا اندازہ لگاتا ہوا دلاور ایک کمرے کے پاس پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور رونے کی آوازیں اندر سے آ رہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا اندرونی منظر لرزا دینے والا تھا۔ شاہ زمان آدھا بیڈ پر اور آدھا کارپٹ پر تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور انتڑیاں باہر نکل پڑی تھیں۔ بیڈ کا ایک کونا خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ کارپٹ کا ایک حصہ بھی خون سے لتھڑ چکا تھا۔ نئی نویلی کم سن دلہن کا گلا رو رو کر بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ ہذیانی انداز میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر بکھری چیزوں کو

دیکھ رہی تھی۔ دلاور نے اس چھوٹی سی عمر کی دلہن کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکال دیا۔ کمرے سے باہر عورتوں کا جمگھٹا لگ چکا تھا، پھر کچھ عورتیں سراسیمہ حالت میں کمرے میں داخل ہوئیں۔ اچانک جیسے کلیجا پھاڑ دینے والے بین شروع ہو گئے۔

دلاور کی آنکھوں میں نمی تھی۔ چوڑیرہ حویلی کا بڑا سائیں اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ جو رات کو شکار کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور دلاور کے آنے والے کل کے لیے پیش گوئیاں کر رہا تھا، اپنے کل سے کتنا بے خبر تھا۔ وہ بے خبر انسان آج دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ یہ ساری کہانی مختصر اُیوں تھی ..... جس کم سن خوبرو لڑکی کو شاہ زمان اپنی دلہن بنا کر لایا تھا' اسی کا منگیتر بنوں سے چلا آیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر حویلی میں گھسا تھا۔ سوچے ہوئے منصوبے کے تحت اس نے شاہ زمان کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنی منگیتر کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی کے شور مچانے اور مزاحمت کرنے پر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں اس کا ٹاکرا دلاور سے ہو گیا تھا۔ دلاور سے لڑائی کے دوران اس نے اپنی شہ رگ کاٹ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ شاید اسی لڑکے کی وجہ سے لڑکی کے والدین چاہتے تھے کہ شاہ زمان جلد سے جلد برات لے کر آ جائے۔ وہ ساری گفتگو دلاور کے ذہن میں گونجنے لگی۔ شاہ زمان نے ایک دن سویرا سے کہا تھا۔ ''عورتیں خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی ہیں مگر وہ اصل میں احمق ہوتی ہیں، تمہارے جیسی .....'' اس نے سویرا کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تھا۔

وہ عورت تھی، کمزور تھی۔ وہ تب خاموش رہی تھی۔ نوعمر دلہن کے حویلی میں آنے سے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی مگر آج وہی دلہن شاہ زمان کی موت کا سبب بن گئی تھی۔ آج کوئی غائبانہ آواز کہہ رہی تھی ..... مرد خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتے ہیں مگر ان میں سے بھی کچھ احمق ہوتے ہیں۔ تمہاری طرح۔ ''شاید'' یہی مکافاتِ عمل تھا۔ کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے ختم ہوئی تھی کہانی اس حویلی کے وڈے سائیں کی۔ دلاور کو یقین نہیں آ رہا تھا ..... کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ہوائیں بدل گئی تھیں، موسم بدل گیا تھا۔ روہی سے آگے جو کیکر کے درخت تھے، ان پر بور آنا شروع ہو گیا تھا۔ اب روہی کی جانب سے چلنے والی ہواؤں میں خنکی ہوتی تھی۔ شاہ زمان کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ چھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ شاہ زمان ''بڑے سائیں'' کی ''گدی'' سنبھال چکا تھا۔ بیر نفل، کنڑ ملہل رہتے تھے۔ خاوند کی موت کا شدید صدمہ سہنے کے بعد سویرا اب سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ نوعمر بیوہ اپنے وارثوں کے پاس واپس جا چکی تھی۔

دلاور حویلی کا کارِ خاص ہونے کے ناتے تمام حویلی والوں کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا۔ وہ پھر سے باتونی اور ہر ایک کا دل بہلانے والا بن چکا تھا مگر اندر تو وہی اندھیرے تھے۔ اب بھی جب تھکن حد سے بڑھ جاتی تھی، ... رات کے اندھیرے میں جب روہی کی فضائیں سوتی تھیں۔ حویلی کے مکین خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے رہتے' وہ پستہ قد بیریوں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ نشہ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ عرصہ پہلے سویرا کو لکھا ہوا خط آج بھی اس کی پاکٹ میں موجود تھا۔ وہ خط جو اپنی ''منزل'' پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ آج بھی اپنی نارسائی پر روتا ہوا پلاسٹک کے کور میں محفوظ تھا۔ وہ خط دلاور نے پہلے دن سے خود سے جدا نہیں ہونے دیا تھا..... اور ..... وہ کیسے ہونے دیتا۔ اس پرانے خط میں اس کی سانسیں قید تھیں۔ اس خط کو اس کی موت کے بعد ہی منظرِ عام پر آنا تھا۔ وہ اکثر رات کے سناٹے میں بیریوں کے نیچے بیٹھا سویرا کی لکھی ہوئی نظم دہراتا تو ... یوں لگتا کہ سویرا اسے بہت پہلے سے جانتی ہے۔ شاید سیکڑوں ..... شاید ہزاروں سال پہلے سے ... جب اس روہی کی جگہ بستیاں آباد تھیں۔ وہ انہی بستیوں کے کسی نیم تاریک گھر کے کسی ویران کونے میں بیٹھ کر اپنے ''محبوب دلاور'' کے لیے ایک نظم تخلیق کرتی ہے اور وہ اشعار لکھتے وقت نہیں جانتی کہ ہزاروں سال بعد یہاں کوئی بستی نہیں ہو گی ..... صرف اور صرف ریت ہو گی اور روہی کی بیکراں وسعتیں ہوں گی ... اور رات کی خاموش تنہائی میں جب سارا جگ سوتا ہو گا کوئی دلاور پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھا یہ اشعار دہرا رہا ہو گا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس وحشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی جلنے دیتا ہے
چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے
سحرا کی کھلی دو پہروں میں، کجھان دیکھی کی راہوں میں
کجھان دیکھے سے سائے ہیں
جو سنگ سنگ میرے چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں

اک گرم دوپہر کی مستی میں
اِک خام خیال ہی ہستی میں
کچھ ان چھوئے سے جذبے ہیں
اَن جانے سے موسم ہیں
جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے!

سویرا اسے بھولنے کا کہتی تھی۔ وہ بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی سانسوں میں، اس کی نس نس میں سویرا سما چکی تھی۔ ایک عورت کی جدائی اس نے روتے ہوئے برداشت کرلی تھی مگر تب وہ چھوٹا تھا، نا سمجھ تھا مگر اب کی بار وہ دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ ماں بچے کو چھوڑ کر جانے لگے تو وہ روتے ہوئے اس کا دامن تھام لیتا ہے، پلٹتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی بچہ بن چکا تھا۔ ہر رشتے سے محروم دلاور سویرا کو اپنی نگاہوں سے دور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ اور نہیں چاہتا تھا۔ بس اس کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ بس ایک فاصلہ رکھ کر اس کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

ٹیپو ٹرگر تب یاب ہو کر حویلی میں آچکا تھا۔ وہ شاہ فرمان کا بہت خاص اور لاڈلا تھا۔ حویلی میں جو کچھ ہو رہا تھا، دونوں دیکھ رہے تھے۔ دلاور یہاں ہر دلعزیز تھا۔ حویلی کے مکین اس سے بے حد خوش تھے اور خاص طور سے سویرا کی نوازشیں تو بے انتہا تھیں۔ سویرا اس سے یوں رویہ رکھتی تھی جیسے وہ حویلی کا ملازم نہ ہو بلکہ کوئی بہت قریبی رشتے دار ہو۔ شاہ فرمان کو یہ باتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ ایسے سوتنوں پر کچھ کر نہیں سکتا تھا، صرف جل بھن کر رہ جاتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سویرا ہمیشہ سے من موجی ہے اور وہی کرتی ہے جو اس کے دل میں آتا ہے۔ سویرا ایک پڑھی لکھی ہوش مند لڑکی تھی۔ شاہ فرمان اس پر زیادہ سختی کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ ورنہ حویلی کی عام عورتوں کے حوالے سے وہ بڑا سنگدل تھا۔ چند دن پہلے اس نے اپنی ایک جوان ملازمہ کو پانچ گھنٹے کے لیے ایک کتے کے ساتھ "ڈاگ ہاؤس" میں بند کر چھوڑا تھا۔ ملازمہ کا خوف سے جو حال ہوا، بیان سے باہر تھا۔ ملازمہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے شاہ فرمان کے اس لاڈلے کتے کو باورچی خانے میں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی ... شاہ فرمان من پسند ملازماؤں سے تعلقات استوار کرنا بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔

ایک دن تنہائی میں شاہ فرمان ٹرگر سے بولا۔ "تو دل چھوٹا نہ کر۔ میں نے کچھ سوچا ہے اور بہت جلد ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔"

"بڑے سائیں! دلاور بڑا چالباز ہے۔ اس نے سویرا بی بی کو اپنے ہاتھوں میں کیا ہوا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے ... کہیں ..... لوگ باتیں بنانا نہ شروع ہو جائیں۔"

"میں نے کہا نا۔ خود کو حوصلے میں رکھ ..... یہ کام جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ ہر جگہ طاقت ہی مسئلے حل نہیں کرواتی ..... کبھی کبھی اس سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔" شاہ فرمان اپنی انگلی کنپٹی سے ٹکراتے ہوئے بولا۔

"تو کیا ..... دلاور ..... کو باہر ..... باہر سے ہی ..." ٹیپو ٹرگر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"او نہیں اوئے ..... تو بھی کسی سورنی کا بچہ ہے۔ ہر وقت ..... خون خرابا ... قتل و غارت۔ میں نے پہلے بھی تجھے کہا ہے۔ ہوش سے کام لے ..... دلاور کو چاہیے مکمل کی کنجی بھی ہے۔ ان کو کسی گڑبڑ کا پتا چل گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"تو پھر ... آپ کے دل میں کیا ہے؟"

"کل کا دن انتظار کر میں پرسوں تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔" شاہ فرمان کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ٹیپو ٹرگر ان آنکھوں کی کہانی پڑھ رہا تھا۔

سویرا دلاور سے ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ دلاور انجان تھا ..... وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سویرا اس کے احساسات سے لاعلم ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں سویرا نے اس کی الماری کی تلاشی لی تھی اور وہاں سے برآمد ہونے والے رومال ..... گھڑی ..... نوٹ چوڑیوں ..... اور ایک ورق پر لکھی ہوئی نظم نے سارے راز کھول دیے تھے ..... یہ چیزیں اس کا پول نہ بھی کھولتیں تو ایک عورت کی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ دلاور کے دل میں کچھ ہے۔ سویرا دلاور کے لیے جو کچھ کر رہی تھی، اس کی وجہ یہی رہی تھی۔ اس کے دل میں ابھرنے والے انجان جذبے جب زور پکڑتے تھے اور وہ جو ایک دل کے نہاں خانے کی ندی تھی، اس کے پانیوں میں خوفناک اچھال پیدا ہوتا تھا تو وہ حد سے زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔ متضاد کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی ..... وہ سر تھام کر بیٹھ جاتی تھی ..... بھیانک چیخیں اس کے وجود میں گونجنے لگتی تھیں۔ خود کو مجرم عظیم سمجھنے لگ جاتی تھی۔ جب جب ایسی حالت ہوتی تھی، تب تب وہ نماز پڑھتی تھی۔ کفارے کے طور پر دلاور کی بے پناہ دل جوئی میں لگ جاتی تھی لیکن ساتھ ساتھ ڈرتی بھی تھی کہ لوگ غلط مطلب نہ لینے

گئیں۔ وہ بھی ایسی ہی ایک شب تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ آنسو بھی اس کی خاموش محبت کی طرح نہ سمجھ آنے والے تھے۔ وہ ایسی محبت کا شکار ہو چکی تھی ... جس کی اسے خود بھی خبر نہ تھی اور اگر تھی بھی ... تو اس پر معاشرتی جبر کا اتنا موٹا اور دبیز پردہ پڑا ہوا تھا کہ پہچان ناپید تھی۔

اس نے آنسو پونچھے اور ایک ڈائری نکال لی جس پر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظم درج تھی۔ ... تم کب تک مجھ کو بھولو گے۔

وہ نظم دہرانے لگی۔ اچانک ساتھ والے کمرے میں کھٹکا ہوا ... پہلے اس نے وہم جانا ... مگر دوبارہ آہٹ ہونے پر وہ اٹھی اور دبے پاؤں دروازے تک گئی۔ جس دروازے پر سویرا کھڑی تھی، وہ جڑواں کمروں کا درمیانی دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ اس دروازے میں تھوڑی سی درز موجود تھی۔ سویرا ڈرتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر باہر نگاہ دوڑائی ... باہر مہیب سناٹا اور روشنی کی جانب سے آنے والی مدھر ہوا تھی ... اس نے دل میں سوچا شاید وہ رات کو دروازہ لگانا بھول گئی ہے۔ اس نے کنڈی چڑھائی اور واپس پلٹی۔ ابھی وہ چار پانچ قدم ہی چلی تھی کہ الماری کے پیچھے سے ایک ہیولا برآمد ہوا۔ وہ ایک ڈھاٹا پوش تھا۔ اس نے اپنا سر، کان، چہرہ ایک موٹے کالے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے اشارے سے سویرا کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ خوف سے سویرا کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں ... سخت گھبراہٹ کے عالم میں سویرا کی نگاہ ڈھاٹا پوش کے عقب میں پڑی جہاں ایک کالے رنگ کا تھیلا ... زیورات اور نقدی سے بھرا ہوا تھا۔ ساری بات سویرا کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چیخی ... ڈھاٹا پوش بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھا ... وہ پچھلے قدموں پیچھے اور بھاگی ... ڈھاٹا پوش نے ایک جست لگاتے ہوئے اسے دبوچ لیا ... سویرا بری طرح چیخنے چلانے اور ہاتھ پیر مارنے لگی۔ وہ اس کی گرفت سے نکل جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ بند کرنا چاہ رہا تھا۔ سویرا نے کئی تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیے اور ناقابل یقین انداز میں اسے ایک دھکا دیا ... وہ دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا ... وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ ڈھاٹا پوش نے اسے عقب سے تھام لیا اور اٹھا کر بیڈ پر پھینکا۔ سویرا کے ہاتھ میں شیشے کا لیمپ آ گیا۔ اس نے گھما کر ڈھاٹا پوش کے سر پر وار کیا۔ وہ جھکائی دے کر سر بچا گیا ... شیشے کا لیمپ اس کے کندھے پر لگ کر چکنا چور ہو گیا۔ وہ دوسرا لیمپ بھی آزمانا چاہتی تھی کہ وہ جست لیتا ہوا بیڈ پر چڑھ گیا۔ اس نے لیمپ سویرا کے ہاتھ سے چھینا اور دو تین تھپڑ جڑ دیے۔ وہ چکرا کر اس کے ساتھ آ گئی ... ڈھاٹا پوش غصے سے دیوانہ ہو چکا تھا۔ شیطانی حس بیدار ہوئی اور وہ سویرا پر پل پڑا۔ وہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ سویرا کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ لانبی سنہری زلفیں بکھر کر منتشر ہو گئیں۔ اس کی پیش قدمی نہیں رکی۔ سویرا اسے خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ مگر وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سویرا کو نیچے گرا لیا تھا ... وہ چیخ رہی تھی۔ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اسی دوران باہر کا دروازہ بجنے لگا۔ ڈھاٹا پوش اپنی جگہ پر ٹھٹکا۔ پھر اس نے سویرا کو چھوڑ دیا۔ بڑی سرعت سے دوسرے کمرے میں گیا۔ نقدی اور زیورات والا تھیلا اٹھایا اور دوسری طرف والا دروازہ کھول کر کسی چھلاوے کی طرح تاریکی کا حصہ بن گیا۔

دروازہ دھڑدھڑانے والی بڑی آپا تھیں۔ سویرا نے دروازہ کھولا۔ بڑی آپا اندر آئیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سویرا کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ بڑی آپا نے کلیجا تھام لیا۔ چیختے ہوئے بولیں۔ "سویرا! کیا ہوا ہے تجھے؟"

سویرا جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بڑی آپا کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ صبح تک یہ خبر پوری حویلی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کہانی تھی کہ رات سویرا بی بی کے کمرے میں کوئی بندہ گھسا تھا۔ پہلے اس نے چوری خالی کی۔ اس کے بعد سویرا بی بی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔

وہ تو شور شرابے سے بڑی آپا کی آنکھ کھل گئی اور وہ موقع پر پہنچ گئیں ... نہیں تو ... سویرا بی بی کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا ... بہت بڑا۔

شاہ فرمان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ہر قیمت پر اس بندے کو ڈھونڈ نکالوں گا ... اور پھر ایسی سزا دوں گا کہ اس کی اگلی پچھلی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس نے حویلی کی بہو کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اپنی قبر خود کھودی ہے۔ ڈکیتی سے اگلے دن شاہ فرمان نے وہ تہایت

تربیت یافتہ کھوجی بلا لیے ... آتے ہی انہوں نے اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا۔ صدر دروازے کے محافظین کے مطابق ڈکیت باہر سے نہیں آیا تھا۔ دو گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد کھوجیوں نے صدر دروازے کے محافظین کی بات کی تصدیق کر دی ..... ڈکیت حویلی کے اندر ہی موجود تھا۔ کمرا ڈھونڈتے ہوئے انہیں ایک پرنٹا لائٹر ..... ایک سرخ رنگ کا بال پوائنٹ ملا تھا۔ شاہ فرمان نے حویلی کے تمام داخلی دروازوں کو بند کروا دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، حویلی کا کوئی بندہ باہر نہیں جائے گا ..... ڈکیت کو ڈھونڈنا شاہ فرمان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ حویلی کو سیل کر دیا گیا ... کھوجیوں نے اپنا ایک اور ساتھی بہاولپور سے بلوا لیا۔

شاہ فرمان نے حویلی کے نچلے درجے کے تمام ملازمین کو ایک کمرے میں اکٹھا کر لیا۔ دہاڑتے ہوئے بولا "اوئے کتے کے پتر ..... مجھے صاف صاف بتا دو ..... یہ کام کس کا ہے ..... بندہ تو میں نے ڈھونڈ ہی نکالنا ہے۔ اگر خود بتا دو گے تو سزا کم اذیت ناک ہو گی ... ورنہ تم سور کے تخم مجھے اچھی طرح جانتے ہو ..... دھڑوں والی چھری سے کھال اتروا دوں گا میں تمہاری سب کی ... بولو اوئے ..... جواب دو کوئی ..." شاہ فرمان نے ایک دو کے منہ پر تھپڑ جڑ دیے۔ ایک کے زیرِ ناف ایسی لات ماری کہ وہ دہرا ہو گیا۔ ٹیپو ٹریگر بھی ان پر پل پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو چار کے منہ پھٹ گئے۔ ایک ملازم آنکھ پر ہاتھ رکھ کر بے تحاشا چلانے لگا۔ شاہ فرمان دوبارہ گرجا۔ "بولو اوئے ننگا کرو اوئے ان سب کو ..... میں ان کی ماں کی ....."

پانچ چھ ملازمین جو ان میں تگڑے تھے، ان کے کپڑے اتروا لیے گئے۔ صرف جسم پر ایک انڈرویئر رہنے دیا گیا۔ للکار کر ٹیپو ٹریگر انہیں بید کے ڈنڈے سے پیٹنے لگا۔ ان کی چیخ و پکار سے دلاور کا دل گھبرانے لگا۔ آدھ گھنٹے تک بہیمانہ تشدد چلتا رہا۔ کسی نے اعترافِ جرم نہیں کیا۔

شام نے ابھی اپنے پر نہیں پھیلائے تھے۔ روہی کی طرف سے اٹھنے والی ہواؤں میں ابھی ہلکی سی حدت برقرار تھی۔ کھوجیوں نے شاہ فرمان کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ سگار کے کش لیتا ہوا وہاں پہنچا تو ایک اہم خبر اس کی منتظر تھی ..... کھوجیوں نے انتھک محنت کر کے ڈکیت کے جوتی کے نشانوں کا کھرا ڈھونڈ نکالا تھا اور ان نشانوں کی نشاندہی حیرت انگیز طور پر ٹیپو ٹریگر نے کی تھی۔ وہ حویلی کا پرانا نمک حلال تھا۔ ایسے معاملات میں اس کی حس بے حد تیز تھی۔ یہ پٹاری جوتی کے نشان تھے جو کوریڈور سے نکلتے ہوئے باہیچ میں آئے تھے۔ پھر درختوں سے پرے چلے گئے تھے۔ کھوجیوں نے سفوف ڈال کر ان نشانات کو مزید واضح کر لیا تھا۔

اگلا مرحلہ نہایت اہم اور دلچسپ تھا۔ حویلی کے تمام ملازمین کی جوتیاں ایک جگہ اکٹھی کر لی گئیں۔ یہاں تک کہ دلاور اور ٹیپو ٹریگر کی جوتیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ ایک گھنٹے کی مزید عرق ریزی کے بعد نتیجہ صفر نکلا ... کسی جوتی کے تلے کا ڈیزائن مطلوبہ نشانوں پر پورا نہیں اترا .....

شاہ فرمان عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا۔ وہ پریشانی سے پیشانی مسلنے لگا۔ دلاور اور ٹیپو ٹریگر اس کے قریب کھڑے تھے۔ وہ دھیرے سے ان سے مخاطب ہوا بولا۔ "کہیں وہ بندہ حویلی کے باہر سے تو نہیں آیا تھا؟"

دلاور نے شاہ فرمان کے خدشے سے اتفاق کیا مگر ٹیپو ٹریگر ..... ایک نہایت ہوشیار اور تیز رفتار آدمی کا نام تھا۔ جھٹ سے بولا۔ "بڑے سائیں! سب ملازمین کے کمروں کی تلاشی لی جائے، کیا پتا ..... مطلوبہ جوتی کہیں سے برآمد ہو جائے۔" ٹیپو ٹریگر کی بات پر شاہ فرمان یوں چونکا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے تعریفی نظروں سے ٹیپو ٹریگر کی جانب دیکھا پھر اگلے چند منٹوں میں ٹیپو ٹریگر کے دیے ہوئے مشورے پر عمل شروع ہو گیا۔

تین کھوجی اور حویلی کے چار بڑے ملازمین حویلی میں ملازمین کے ہر کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ جوتی دلاور کے کمرے کی الماری کے عقب سے برآمد ہو گئی ... تقریباً پچھلے ایک ہفتے سے کراچی میں تھا۔ اسے شاہ فرمان نے کسی ضروری کام سے وہاں بھیجا ہوا تھا۔

زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھوم گئے ... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولا۔ "یہ ..... یہ کیا ہے ... ؟"

"یہ وہ چپل ہے جس کی تلاش میں ہم سب مارے مارے پھر رہے ہیں۔" ٹیپو ٹریگر غصیلے لہجے میں بولا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے کھوجی کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا بڑا پرچہ جھٹکے سے چھین لیا۔ جس پر زمین پر جا بجا نمودار ہونے والے "فٹ پرنٹ" کو کاپی کیا گیا تھا۔ ادھیڑ عمر شاہ فرمان کے ماتھے پر کئی سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں۔ وہاں موجود سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ٹیپو ٹریگر نے جوتی کا ایک پیر "فٹ پرنٹ" پر رکھ دیا۔ جوتی کا وہ پیر پورا پورا "فٹ پرنٹ" پر بیٹھ گیا۔

شاہ فرمان کا رخ اب دلاور کی جانب تھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے ... پھنکارتے لہجے میں بولا۔

"اوئے..... یہ..... سب کیا ہے..... یہ جُتی تیری ہے۔"

"بڑے سائیں! یہ جوتی میری ہی ہے..... مگر یہ یہاں کیسے آئی..... میں نہیں جانتا..... میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"اوئے پر یہ جُتی ... یہاں کیا انڈے دے رہی ہے۔" شاہ فرمان حق کے مل چیخا۔

"بڑے سائیں! مجھے پھنسایا جا رہا ہے۔ میں اس حویلی کا نمک حلال ہوں..... اس حویلی کے لیے میں اپنی جان پر بھی کھیلا ہوں۔ میں..... بھلا یہ سب کیسے کر سکتا ہوں..... آپ کی سوچ پر افسوس ہو رہا ہے۔"

"اوئے میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ تو ہے کیا..... تو نے کب سے اس گھر کی عزت پر آنکھ رکھی ہوئی ہے۔ اوئے میں تیری آنکھیں چہرے سے نکال کر زمین پر ڈال دوں گا۔" ٹیپو ٹائیگر جوشیلے انداز میں دھاڑتے ہوئے آگے بڑھا تو شاہ فرمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ بولا۔

"اوئے نہیں اوئے..... اسے اپنی صفائی کا موقع ملنا چاہیے ..... اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا ہے۔"

دلاور کا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دم توڑ گئی تھیں۔

حویلی کے تمام داخلی اور خارجی دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ تفتیش نے جو تیار رخ اختیار کیا تھا، اس نے سب کو حیران کر رکھا تھا۔ دلاور باری باری حویلی کے سب بڑوں کے پاس گیا۔ شاہ فرمان، پیر فضل، بڑی آپا..... اس نے سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ تو اس حویلی کے لیے اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ وہ سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت کرے۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ "آپ جانتی ہیں مجھ سے پہلے ٹیپو ہی حویلی کا "کارِ خاص" تھا۔ میرے متبع کرنے کے باوجود اللہ بخشے شاہ زمان صاحب نے یہ ذمے داری مجھے دے دی۔ ٹیپو اور اس کے ساتھیوں نے دل میں میرے لیے رنجش پالی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

بڑی آپا نے کہا۔ "میں جانتی ہوں تم ایسے نہیں ہو۔ تم نے حویلی کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ پر اب ..... جو کچھ سامنے آ رہا ہے اس کا کیا مطلب لیا جائے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ابھی ملازم فرزند نے بتایا ہے کہ تمہارے کمرے میں سے شراب کی بوتلیں بھی نکلی ہیں۔ کئی ایک نے گواہی دی ہے کہ تم کبھی کبھی اتنا نشہ کرتے ہو کہ تم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے اسی نشے میں کیا ہے۔"

وہ بولا۔ "بڑی آپا! میں آپ کو ماں کی طرح سمجھتا ہوں، یقین کریں ایک عرصے سے میں نے اس گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ایک چھوٹا سا دور آیا تھا جب میں نے پریشانیوں سے گھبرا کر اس منحوس چیز کا سہارا لیا تھا لیکن اب تو ..."

اچانک دلاور کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک اندرونی کمرے سے سویرا نکلی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی..... رنج و غم کی تصویر..... آنکھیں سوجی ہوئیں۔ اس نے دلاور کی طرف نہیں دیکھا۔

دلاور نے جیسے تڑپ کر کہا۔ "بب... بی بی جی۔ آپ ہی بتائیں۔ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ مجھ پر جو الزام لگایا جا رہا ہے، وہ درست ہو سکتا ہے؟ آپ اپنے دل سے پوچھیں..... آپ کا دل کیا کہتا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آپ کا دل جو بھی کہے گا وہ میں مان لوں گا۔ چاہے وہ گناہ میں نے کیا ہو یا نہ کیا ہو۔"

وہ عجب دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "میں کیا کہوں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ میں اندھی، گونگی اور بہری ہو چکی ہوں۔ میرے بارے میں جو کچھ بھی کہا یا کرنا ہے، دوسروں نے کرنا ہے۔" وہ سسکی اور ایک دم پلٹ کر واپس چلی گئی۔

وہ رات دلاور نے جاگ کر گزار دی۔ جب وہ حد سے زیادہ پریشان ہوتا تھا تو..... رات میں بلند ٹیلے سے پار پستہ قد بیریوں کے پاس چلا جایا کرتا تھا مگر حویلی کے کرتا دھرتاؤں نے آج اس سے یہ حق بھی چھین لیا تھا، کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھٹن بڑھنے لگی تو وہ باہر نکل گیا۔

اس کا رخ سیبوں والی حویلی کی جانب ہو گیا۔ سیبوں والی حویلی کے اندر ایک بلند گھنائی سی تھی جس پر بیٹھ کر روحی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ رات کے اس پہر اس گھنائی پر پہنچ گیا۔ وہ وہاں بیٹھ کر پستہ قد بیریوں کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر حویلی سے باہر مہیب تاریکی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جس طرح حویلی کے لوگوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا، آج دشت کے نظارے اور پستہ قد بیریوں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ جیسے آپس میں سب ملے ہوئے تھے۔

وہ وہاں بیٹھا رہا۔ شاید ایک گھنٹہ، شاید ڈیڑھ دو گھنٹے۔ صرف اپنی ستائے ہی تھے جو اس کے دل کی زبان پڑھ رہے تھے..... اور کیوں نہ ہوتے..... وہ اس کا پہلا عشق جو تھے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ کسی نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر نگاہ اوپر اٹھائی تو وہ حویلی کا ملازم بالا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ اضطراب تھا بولا۔ ''چلو..... تمہیں بی بی جی بلا رہی ہیں۔''

''کون بی بی جی۔۔؟'' دلاور نے چڑھیائی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سویرا بی بی نے تمہیں بلایا ہے۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ دلاور کے اندر یکا یک امید کی کرن جاگی۔ اسے لگا کہ سویرا کی طرف سے اس کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آئے گا اور شکوک کے وہ سارے زہریلے بادل بکھر جائیں گے جو اس کی سانس روک رہے تھے۔

مگر جب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زنان خانے میں سویرا کے روبرو پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی منظر نظر آیا۔ آنسو سویرا کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور آنکھوں میں دنیا جہان کی دکھ آمیز حیرانی سمٹی ہوئی تھی۔ وہ عجب دردناک لہجے میں بولی۔ ''دلاور! میں اب بھی یقین نہیں کر پا رہی۔ مجھے اب بھی آس ہے کوئی ایسی بات سامنے آجائے گی جو سارے حالات کو غلط ثابت کر دے گی.....''

''آپ..... کن حالات کی بات کر رہی ہیں؟''

اس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ایک طلائی بریکلس دلاور کے سامنے کیا اور بولی۔ ''یہ بڑی آپا کی ملازمہ صنیہ سے ملا ہے۔ مار کھا کر اس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ بریکلس بدھ کی رات تم نے اسے تحفے میں دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ بہاولپور چلے تم اسے عیش سے رکھو گے.....'' آخری الفاظ کہتے کہتے سویرا کا گلا رندھ گیا۔

دلاور تڑپ کر بولا۔ ''یہ جھوٹ ہے..... سراسر الزام ہے۔ اسے..... میرے سامنے لائیں، مجھے اپنی مری ماں کی قسم ہے بی بی..... یہ سفید جھوٹ ہے، مجھے نہیں پتا۔ یا تو اس کڑی کو بہت مارا پیٹا گیا ہوگا..... یا اس نے لالچ میں آکر یہ بیان دیا ہوگا..... آپ..... آپ مجھے یہ بتائیں، آپ کا اپنا دل کیا کہتا ہے؟ میں ایسا نیچ ہو سکتا ہوں؟ میں یہ سب کر سکتا ہوں.....؟''

سویرا نے جیسے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں پریشانی، تذبذب اور رنج کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ اور کہتا، بڑی آپا تیزی سے اندر آئیں۔ بڑی آپا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ چلا کر بولیں۔ ''بس..... بس اب صفائیاں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہمیں تمہاری صفائیاں سننے کی ضرورت ہے۔ سب کچھ چٹے دن کی طرح سامنے آگیا ہے..... سب کچھ.....''

سویرا نے ذرا تعجب سے بڑی آپا کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان، پیر فضل اور نیچ نرنگھ وغیرہ بھی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ شاہ فرمان نے سویرا کو بتایا کہ اس کا سارا چوری شدہ زیور دلاور کے کمرے کے فرش سے نکلا ہے۔ اینٹیں اکھاڑ کر زیور وہاں دبایا گیا تھا اور اینٹیں دوبارہ بڑی صفائی سے جوڑ کر اوپر جستی پیٹی رکھ دی گئی تھی۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے کئی گہنے شاہ فرمان کے ہاتھ میں تھے۔

اس سے پہلے کہ دلاور اپنے دفاع میں کچھ کہتا بڑی آپا تیزی سے آگے آئیں اور ان کا زناٹے دار تھپڑ دلاور کے رخسار پر پڑا۔ وہ بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ تھپڑ پڑنے کی دیر تھی کہ یکا یک شاہ فرمان کے تنومند کارندے دلاور پر جھپٹ پڑے۔ وہی کارندے جن کا وہ ''کارِ خاص'' تھا۔ جو کل تک اسے سلام کرتے تھے، اس کا حکم مانتے تھے، اسے لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ بے دردی سے پیٹنے لگے۔

ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ بڑی آپا کی چلاتی ہوئی آواز جیسے کوسوں دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی ..... ''ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں۔''

ہاں اسے بے دردی سے مارا جا رہا تھا۔ اسے سویرا کے سامنے مارا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کے دوران میں اس نے ایک دو بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے پھر گرا دیا گیا۔ سر پر لگنے والی ضربات نے جیسے اس کی نظر کو دھندلا دیا تھا۔ اس نے چاروں طرف ایک سرخ دھندلی چادر تنی ہوئی محسوس کی۔ سماعت سے وحشی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

''مار دو اسے..... جان سے مار ڈالو۔''

''ٹکڑے کر دو، کتوں کے آگے ڈال دو۔''

''پولیس کو بلاؤ..... ایس پی کو فون کرو۔''

''نہیں نہیں..... خود ساختہ انصاف کیسے کی گردن میں''

اور وہ دیکھ رہی تھی..... یقین نہ کر رہی تھی۔ راشد کا ایک دستہ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں لگا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا صحن میں جا گرا۔ وہ اسے غلیظ ترین گالیوں سے نواز رہے تھے۔ اسے مارتے اور گھسیٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اسے اس کمرے تک لائے جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ کمرے کا اینٹوں کا فرش کھدا پڑا تھا۔ ''یہ دیکھ حرامزادے..... یہ ہیں تیرے کرتوت.....'' شاہ فرمان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے دیکھا، اس کے سامان والا صندوق بھی اٹھا کر برآمدے میں پھینک دیا گیا تھا۔ سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ ایک دھکا کھا کر اپنے سامان کے اوپر ہی گرا۔ اس کا ہاتھ اس چوبی ڈبے سے ٹکرایا جس میں اس کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ اس نے جنونی سے انداز میں وہ ڈبا اپنے سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے اسے مارتے چلے گئے مگر وہ ڈبے کو تھامے رہا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ مارنے والے ہاتھوں میں سے کسی کی کوئی سخت چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی جس سے سر پھٹ گیا تھا اور خون پھٹی ہوئی شرٹ کے کالر کو بھگو رہا تھا..... پھر اس کے لڑکھڑاتے جسم کو بازوؤں سے تھام کر جیپ میں ڈالا گیا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ جیپ قریباً آدھا گھنٹا چلتی رہی۔ جیپ رکی تو اسے نیچے اتار لیا گیا۔ پاس ہی کہیں سے پانی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ جیپ سے اتار کر اسے پھر لاٹھیوں سے پیٹا جانے لگا۔ ایک لاٹھی اس کی کلائی پر پڑی تو ڈبا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر کر کھل گیا..... چیزیں بکھر گئیں۔ وہ دیوانوں کی طرح ان چیزوں کو سمیٹنے کے لیے جھکا تو اس پر لاٹھیوں، ڈنڈوں کی بارش ہوگئی..... وہ گھڑی کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو ہاتھ پر ڈنڈا پڑتا۔ رومال یا کاغذ کے ٹکڑے کو چھونا چاہتا تو ضربات سے ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھتیں...

تم کب تک مجھ کو بھولو گے..... اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے..... اس نے ڈنڈے کھاتے ہوئے بھی رومال اور وہ پرچہ اپنے ہاتھ میں کر لیا مگر پھر ایک لاٹھی کی جان لیوا ضرب اس کے سر پر لگی تو اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا..... وہ مر چکا تھا یا مرنے والا تھا۔ بس کہیں دور بہت دور سے کچھ سرسراہٹیں سی تھیں۔ اس کے جسم کے ساتھ کسی رسّا نما چیز سے کوئی وزنی شے باندھی جا رہی تھی۔ کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ "اوئے شیرو! ایکسل ٹھیک طرح سے باندھ..... یہ کھل گیا... تو یہ کمینہ پانی پر واپس اوپر آ جائے گا۔" یہ آخری آوازیں تھیں جو اس کے ڈوبتے ذہن میں سنائی دیں..... اس کے بعد یوں لگا کہ اس کا وجود پانی کے اندر کہیں نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔ بہت سی نیلی سرگوشیاں پانی کے دباؤ میں ابھرنے لگیں۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے.....

"چلو آج ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے میں اور تم اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے مجھے سویرا بی بی نہیں، صرف سویرا کہو گے..."

"دلاور! میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔ تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔"

"دلاور! تم خود کو اکیلا مت سمجھو... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں..."

"دلاور! میں نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ دیکھنا آنے والے دنوں میں تم حویلی کے بہت ہی خاص بندوں میں شمار ہو گے..."

"دلاور! میں تمہارے لیے کچھ الگ طرح سے سوچتی ہوں۔"

دلاور پانی کی تہ میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا۔ جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے مگر وہ زندہ کب تھا۔ وہ تو مر رہا تھا۔ فرشتۂ اجل کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ان جان لیوا لمحوں میں ایک کھڑکی سی دلاور کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے کھل گئی۔ یہ اس کے ماضی کی کھڑکی تھی..... گرمی کی چمکتی دوپہر تھی۔ لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے بائیں طرف ایک تنگ گلی اوپر کو چڑھتی تھی۔ بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں اور بوسیدہ مکانوں کا ایک گورکھ دھندا تھا۔ انہی تنگ گلیوں کے ایک بوسیدہ مکان میں جس کے برآمدے کے ایک کونے میں سنہری دھوپ اترتی تھی، وہاں پر ایک ٹوٹی چارپائی کو آدھے سفید آدھے مہندی رنگے بالوں والی عورت ٹھیک کرتے ہوئے مسکراتی ہے..... کیونکہ سرفراز دم گھٹنے نے اس کی جھولی میں ایک ننھا بچہ لا کر ڈالا ہے۔

"لے سنبھال اسے..... صبح جب میں راوی پر گیا تھا تو ایک کشتی میں روتا ہوا ملا تھا۔ مجھے... دوپہر تک اس کے مالکوں کو ڈھونڈتا رہا... مگر کوئی نہیں ملا..... تو پالنا اسے... تھوڑا بڑا کر اسے..... دیکھ... پھر میں اسے کیسا نوابتا ہوں..... لوگ سرفو کو بھول جائیں گے۔"

"دلاور پتر! جا بازار سے مجھے سبزی لا دے....."

"آ میرا پتر ادھر..... تو نال والے پوتے کے ساتھ نا کھیلیا کر..... دیکھ تیرے پنڈے پر لاس ڈال دی ہے۔"

"ماں... مجھے چاچا سرفو کے ساتھ نہیں جانا۔ مجھے پانی میں ڈبکیاں دیتا ہے۔ میری ناک میں پانی گھس جاتا ہے۔ میری آنکھوں سے پانی بھی بہنے لگتا ہے۔ وہ مجھے بڑی دیر پانی میں رکھتا ہے..."

"میرا پت تو بڑا بہادر ہے۔ دیکھ دلاورے! دل چھوٹا نہ کیا کر..... تیرا چاچا تیرے بھلے کے لیے ہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ تجھے کچھ سکھانا چاہتا ہے..... بنانا چاہتا ہے۔"

سرفراز عرف سرفو دم گھٹ جدی پشتی نوبا تھا۔ گہرے

پانیوں میں زیادہ سے زیادہ دیر رہنے کا فن نسل در نسل اس میں منتقل ہوا تھا..... اور اب وہ یہ فن..... آٹھ سالہ دلاور میں منتقل کر رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے دلاور کو دوبارہ پانی میں غوطہ دیا۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چلانا چاہتا تھا مگر منہ کھولتا تو ڈھیروں پانی اس میں چلا جاتا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ سانس اپنے سینے میں روک لیا۔ دس سیکنڈ..... بیس سیکنڈ..... تیس سیکنڈ..... پینتالیس سیکنڈ..... اس کے ننھے وجود میں آواز گونجنے لگی۔

"چاچا..... مجھے چھوڑ دے..... چاچا ہاتھ ہٹا لے..... میں مر جاؤں گا..... میرا دم گھٹ رہا ہے..... میرا سینہ پھٹنے والا ہے۔ چاچا..... مجھے پانی سے نکال لے..... میں مر رہا ہوں..... میں مر رہا ہوں....." ایک جھٹکے کے ساتھ وہ ہوش میں آ گیا..... چوڑیر دھوبی کے "غنڈوں" کی بدترین مار کھانے والا دلاور ہوش میں آ گیا..... گہرے پانی کی مچھلی..... گہرے پانیوں کا شکار..... سرفروم گھٹ کا "لے پالک" ہوش میں آ گیا۔

اس کے جسم کا ایک ایک حصہ اذیت کے سپرد تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ پانی حلق کے راستے اس کے جسم میں چلا گیا تھا۔ صورتِ حال خطرناک تھی۔ اس کے پھیپھڑوں کو ہوا درکار تھی..... جو پانی کی اس تہ میں ناپید تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سطحِ آب پر آنا چاہا مگر اس کے کرم فرماؤں نے ایک رسّی یہ بھی کی تھی کہ اس کی کمر کے ساتھ ایک رسّا باندھا گیا تھا۔ رسّے کا دوسرا سرا کسی گاڑی یا ٹریکٹر کے آہنی ایکسل کے ساتھ منسلک تھا۔ دلاور نے تیر کر اوپر آنا چاہا مگر وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلانے کے باوجود ایک فٹ بھی اوپر نہ جا سکا۔ یہ بڑے اہم اور سنگین لمحے تھے۔ دلاور نے رسّے کو پکڑ کر کھینچا اور ایکسل تک پہنچ گیا۔ اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے ایکسل کو اٹھایا۔ ایک ڈیڑھ فٹ اوپر لایا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ایکسل کو چھوڑ دیا۔ اب وہ کمر کے گرد بندھے رسّے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے رسّے کو پکڑ کر زور زور سے کھینچا..... شاید رسّا ایکسل سے جدا ہو جائے..... مگر قسمت کی دیوی مہربان نہیں ہوئی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا اور رسّے کو جھٹکے دینے لگا.....

"چاچا..... چاچا..... مجھے باہر نکال لے..... میں مر رہا ہوں..... میرا سینہ پھٹنے والا ہے چاچا..... بس کر چاچا میں مر جاؤں گا..... مجھے پانی سے نکال لے....."

اس نے تصور میں دیکھا، اس کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ اس پر ایک خوشبودار چادر تھی۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور بہت سے لوگ کندھوں پر اس چارپائی کو اٹھائے بھاگے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا سب کو بہت جلدی ہے۔ ہر طرف سرعی سرعی ہیں اور لوگ دیوانہ وار بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اس کا جنازہ تھا۔ اس کا ایک منظر غائب ہو گیا۔ سماعت ڈل گئی۔ رسّے کی گرہ تو نہیں کھلی مگر وہ ایکسل سے جدا ہو گیا۔ پانیوں کا بادشاہ..... پانی کو پچھاڑتے ہوئے سطحِ آب پر آ گیا..... وہ کنارے پر رینگتا ہوا نکل پڑا..... یہ کوئی بیلا تھا..... ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ اس کے ڈوبتے ذہن نے ایک فائر کی آواز سنی پھر اس کا ذہن اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوبارہ اس کی حسیات بیدار ہوئیں تو اس نے کچھ لوگوں کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"لگتا ہے..... اب بچ جائے گا یہ....."

"اسے اسپتال لے جاتے ہیں....."

"مگر یہ پولیس کیس ہے۔ کہیں.....؟"

"ابے دیکھ لیں گے..... کیس..... کو بھی..... پولیس کو بھی..... پتا نہیں کس مائی کا لال ہے..... ڈالو اسے جیپ میں، ابھی اسپتال لے کر چلتے ہیں۔"

پھر دلاور نے خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا۔ جب بھی کوہ جمالیہ سے بھی زیادہ بھاری دھند کے پار سے کوئی روشنی کی کرن نمودار ہوتی تو دلاور کو اس میں کچھ سایہ نظر آتے..... ڈاکٹر اس پر جھکے ہوتے..... نرس گلوکوز کی بوتل میں سرنج کے ذریعے کوئی پیلا سا محلول انجیکٹ کر رہی ہوتی۔ کبھی کچھ اجنبی سے لوگ اسے اپنے اردگرد منڈلاتے نظر آتے۔

یہ دھوپ چھاؤں پتا نہیں کتنے دن چلتی رہی۔ جب باقاعدہ اس نے آنکھ کھولی تو خود کو ایک درمیانے درجے کے کمرے میں پایا۔ اس نے پردہ سرکا کر دیکھا تو دن کی روشنی میں اسے کپاس کا ایک بلند پہاڑ نظر آیا۔ کچھ بندے سیدھے ہیجوں کی مدد سے کپاس کو اکٹھا کر رہے تھے۔ وہاں کچھ عورتیں بھی تھیں جنہوں نے موٹے دبیز کپڑوں کے جھولا نما بڑے بڑے فراک پہن رکھے تھے۔ ان میلی میلی عورتوں نے بڑی بڑی بالیاں پہن رکھی تھیں اور ناک کی درمیانی جھلی میں دو، دو..... تین، تین چھوٹی بالیاں پہن رکھی تھیں۔ کچھ ننگ دھڑنگ بچے اودھم مچا رہے تھے..... پتا نہیں کیوں..... اس کو یہ منظر بھلا لگا..... شاید..... یہ زندگی تھی.....

اور وہ..... اس "چارپائی" سے اتر کر آ رہا تھا جس کو بہت سے لوگ بڑی تیزی سے بھگائے لے جا رہے تھے۔

دلاور اپنے حواس میں آیا... سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں..... تو گزرے ہوئے واقعات کی فلم پوری جزئیات کے ساتھ اس کے دماغ میں چل گئی۔ اس کو غم سے نڈھال ہو جانا چاہیے تھا۔ درد سے بے حال ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کے من میں ٹھہراؤ ڈیرے ڈال چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس چارپائی سے نیچے اتر کر آ رہا تھا جسے لوگ بھگائے لے جا رہے تھے۔ شاید اس نے دوسرا جنم لیا تھا۔

دلاور کو اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی جان بچانے والے لوگ حضور چانڈیو کے کارندے تھے، جو صبح ہونے سے پہلے مرغابیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ شکار کے دوران میں ان کی نظر نیم مردہ دلاور پر پڑی اور وہ اسے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ دلاور سات آٹھ دن اسپتال میں رہا تھا۔ اسپتال میں ہی حضور چانڈیو کے ایک کارندے نے دلاور کو پہچان لیا۔ جب حضور چانڈیو تک خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دلاور کو سیر حویلی لایا جائے۔

سیر حویلی میں یہ اس کا دوسرا دن تھا۔ دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ یہی وہ حضور چانڈیو ہے جس کے ساتھ شاہ زمان اور شاہ فرمان کی خونی دشمنی چل رہی تھی۔ دونوں پارٹیوں کے کئی بندے قتل ہو چکے تھے اور ایک دوسرے پر درجنوں کیس بنے ہوئے تھے۔ پہلے حضور چانڈیو کے "کارِ خاص" افضل بھنگی نے دلاور سے سوال جواب کیے پر حضور چانڈیو خود دلاور کی کتھا سننے کے لیے آن موجود ہوا۔ حضور چانڈیو قدرے سانولے رنگ اور اونچی ناک والا ایک درمیانی عمر کا چوہدری تھا۔ وہی وڈیروں والی تن فن اور اونچے شملے والی پگڑی... بہرحال فی الوقت وہ دلاور کا محسن اور میزبان تھا۔

دلاور نے اپنی کہانی کے کچھ حصے چھوڑ کر باقی سب کچھ چانڈیو کے گوش گزار کر دیا۔ دلاور نے اسے بتایا کہ اس پر کتنا گھناؤنا الزام لگا کر اور کس طرح جال بچھا کر کے چوڑیر حویلی والوں نے اسے پانی کی نذر کر دیا تھا۔

حضور چانڈیو نے کہا۔ "سو حرامزادوں کو اکٹھا کیا جائے تو ان کا ایک حرامزادہ یہ شاہ فرمان بنتا ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے، اس نے چھوٹے بھرا کی موت کے بعد اس کی زنانی (سویرا) پر بھی اپنی گندی نظر رکھی ہوئی ہوگی۔ تم دیکھ لینا، وہ بہت جلیبی پائیں شادی بھی کھڑکا دے گا۔"

ان باتوں کے دوران میں ہی چانڈیو کی ایک ملازمہ ٹرے میں دودھ کی سردائی کا ایک بڑا جگ اور ایک گلاس رکھ کر لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ حضور چانڈیو کا "سردائی جام" ہے۔ ملازمہ کا نام بعد ازاں سندری معلوم ہوا۔ وہ کالے رنگ کی تھی لیکن بہت تیکھے نقوش اور تیز طرار۔ وہ انہی عورتوں کے قبیلے سے تھی جن کو دلاور نے کپاس کے چند ڈھیر کے پاس دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ میلی کچیلی نہیں تھی بلکہ یہ خوب اجلی اجلی ہوئی تھی۔ جیسے سیاہ بونوں کو پالش کر دیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں۔ وہ بھی سر پر تیل چپڑے، کس کے بال باندھے، آنکھوں میں کاجل لگائے ایسے ہی دمک رہی تھی۔

پچھلے چند ہفتوں میں دلاور کو بہت اچھی طبی امداد ملی تھی۔ ورنہ جس بے دردی سے اسے مارا گیا تھا، شاید وہ کئی ماہ تک بستر سے نہ اٹھ سکتا۔ اس کے جسم کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مسل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ کم از کم دو جگہ ہڈیوں میں میٹر لائن فریکچر تھے۔ بے شمار اندرونی اور بیرونی چوٹیں تھیں۔

جب وہ اکیلے میں ان سفاک لمحوں کو یاد کرتا تو اس کے سینے کے اندر جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرنے لگتا۔ اسے وہ قیامت کے لمحے یاد آتے جب شاہ فرمان کے چہیتے ٹیپو ٹریگر نے دیگر کارندوں کے ساتھ مل کر اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ دلاور کے لیے سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ سویرا کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اس ہستی کی موجودگی میں جس کے لیے وہ اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ جس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔

آہ..... وہ یہ سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کیا دلاور کے دل سے کوئی راہ سویرا کے دل تک نہ جاتی تھی؟ اگر جاتی تھی تو پھر اس کی آنکھوں میں نمی کیوں نہیں آئی تھی؟ اس کے قدم اسے چھڑانے کے لیے کیوں نہیں اٹھے تھے؟ کیوں وہ پتھر کا بت بنی کھڑی رہی تھی؟

وہ جب یہ سب کچھ سوچتا تھا تو دل ہی دل میں کراہ اٹھتا تھا..... سویرا! کیا تم نے بھی وہی سمجھا جو دنیا والوں نے سمجھا..... کیا ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا..... کیا دل سے دل تک جانے والی کوئی راہ نہیں تھی؟ یہ بات روز روشن کی طرح بالکل عیاں تھی کہ اس کے خلاف گھناؤنی سازش ہوئی تھی۔ اسے پھنسایا گیا تھا۔ اسے پھنسانے کے لیے جو ڈراما رچایا گیا، اس کا ڈائریکٹر یقیناً شاہ فرمان تھا اور ٹیپو ٹریگر نے اہم ترین رول ادا کیا تھا..... ایک دن وہ بستر پر لیٹا اسی طرح

اپنے خیالوں میں گم تھا کہ چونک گیا۔ کھڑکی میں سے سبز حویلی کے سرسبز لان میں اسے دور کچھ درختوں کے نیچے حضور چانڈیو نظر آیا۔ وہی چوڑھریوں جیسا بڑا پگڑ اور کلف دار کرتی ہوئی شلوار قمیص..... حضور چانڈیو کے ساتھ ایک بارعب عربی شیخ تھا۔ اس نے اماراتی طرز کا لمبا لبادہ پہن رکھا تھا اور سر پر ڈبی دار رومال تھا۔ ارد گرد مؤدب ملازمین تھے جن میں افضل بھگا بھی شامل تھا۔ شیخ کے ہاتھ پر دستانہ تھا اور دستانے پر وہی بے مثال باز پھڑ پھڑا رہا تھا جسے ایک دن کچا قلعہ کی اونچی دیواروں سے نکالنے کے لیے دلاور نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ باز کے سر پر ٹوپی اندھیاری یعنی غلاف تھا۔ موقع پر موجود ہر شخص بے حد اشتیاق سے اس نایاب پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ سارے لوگ درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

دلاور نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شیخ تھا جس نے اس پرندے کے حصول کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بنا رکھا تھا اور جس کے لیے ضد میں آ کر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے ادا کیے گئے ہیں۔ یہ شیخ ابھی تک اس سبز حویلی میں موجود تھا۔ یا شاید دوبارہ یہاں آیا تھا۔

شام کو جب افضل بھگا سے دلاور کی ملاقات ہوئی تو اس سے اس بارے میں بات ہوئی۔ شیخ صاحب کا نام بن باقر معلوم ہوا۔ افضل بھگا نے بتایا۔ "یہ لوگ اب واپس دبئی جا رہے ہیں۔ کافی سیر سپاٹے کر لیے ہیں انہوں نے۔"

"یہ لوگ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا شیخ صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں ان کی سب سے چھوٹی بیگم دو ملازم بھی ہیں۔ چھوٹی بیگم بہت زیادہ لاڈلی ہے۔ شیخ صاحب اس کی ہر بات مانتا ہے۔ وہ پاکستان دیکھنا چاہتی تھی، خاص طور سے وہ علاقے جہاں شکار وغیرہ ہوتا ہے، اس کی فرمائش پوری ہوئی لیکن اس کی کوئی ایک فرمائش تھوڑی ہے۔ ہر روز نئی فرمائش ہوتی ہے۔ کبھی کسی میلے میں جاتی ہے، کبھی پہلوانوں کی کشتیاں دیکھتی ہے۔ کبھی کسی کچی بستی میں جا کر رات گزارنا چاہتی ہے۔ اب اس کی ایک تازہ فرمائش ہے جسے سن کر شاید تمہیں بھی حیرانی ہو۔"

"کیا؟"

"پانی کے جہاز کے ذریعے واپس دبئی جانا چاہ رہی ہے۔ اب شیخ کے بندے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں کہ سمندری سفر کا بندوبست کیا جائے....."

افضل اور دلاور میں یہ گفتگو سبز حویلی کے پچھلے احاطے میں ہو رہی تھی۔ دونوں گھاس پر آلتی پالتی مارے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اچانک افضل کے چہرے کا رنگ بدلا، وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "لو بھئی..... بڑی کمبی عمر ہے شیخ صاحب کی..... وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

وہ دونوں جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر چند ملازموں کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔ حضور چانڈیو نے دلاور کی طرف اشارہ کر کے بن باقر سے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ بن باقر کے ملازم نے بن باقر تک پہنچایا۔ بن باقر کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوئی، حضور چانڈیو نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ "ہوئے دلاور! ادھر آ....."

دلاور اور افضل بھگا، حضور چانڈیو کے پاس پہنچے۔ دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ شیخ کی نگاہیں بدستور دلاور کا طواف کر رہی تھیں۔ حضور چانڈیو نے کہا۔ "دلاور ے، شیخ صاحب تیری سخت جانی کا سن کر بڑے حیران ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ شاہ زمان کے غنڈوں نے تجھے مردہ سمجھ کر ڈونگے چھپڑ میں پھینک دیا تھا اور تیرے پنڈے کے ساتھ کوئی دو من کا لوہے کا ایکسل باندھ دیا تھا مگر تو پھر بھی ہمت کر کے نکل آیا۔"

بن باقر نے عربی میں کچھ پوچھا۔ اردو دان ملازم نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب شیخ تم سے پوچھ رہے ہیں کہ ملازمت کرنا پسند کرو گے؟"

دلاور نے کہا۔ "میں تو چانڈیو صاحب کا بے دام کا غلام ہوں۔ اگر وہ آگ میں چھلانگ لگانے کا کہیں گے تو بھی لگا دوں گا۔"

دلاور کا جواب شیخ تک پہنچا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ دلاور کے سراپا کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گھوڑا، اونٹ یا باز وغیرہ خریدنے سے پہلے اسے دیکھا جاتا ہے۔ دلاور کو یہ انداز اچھا تو نہیں لگا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھا کرتا تھا۔

شیخ نے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے دلاور سے کہا۔ "شیخ صاحب فرماتے ہیں، وہ تمہیں ساتھ لے جانے کے بارے میں سوچیں گے۔"

افضل بھگا اور دلاور نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا۔ وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس دن شیخ بن باقر گور کا شکار کھیلنے کے لیے پوری پلٹن کے ساتھ رحیم یار خان سے کچھ آگے مالن پور کے بیلے میں موجود تھا۔ چھوٹی بیگم بھی ساتھ تھی۔ بن باقر چالیس سے

پینتالیس کے پیٹے میں تھا جبکہ چھوٹی بیگم بمشکل بائیس تیئس سال کی تھی۔ اس کی ایک فرمائش ابھی پوری نہیں ہونے پائی تھی کہ دوسری کا تقاضا شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس نے ایک مقامی میلے میں جانے کی فرمائش کردی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ بن باقر کا قافلہ اندرون شہر سے گزر رہا تھا۔ وہاں ایک کھلی جگہ پر میلے کا اہتمام تھا۔ روایتی چکوڑے.... مقامی کھانے ... انوکھے کھیل تماشے.... چھوٹی بیگم نے انگلی سے میلے کی جانب اشارہ کردیا۔ پھر کیا تھا۔ بن باقر کے حکم سے قافلے کا رخ میلے کی طرف ہوگیا۔

پاکستان سے روانگی میں تین دن باقی تھے اور آج چھوٹی بیگم کی شکار دیکھنے کی خواہش سب کو مالن پور لے آئی تھی۔ دلاور اور افضل بھگا بھی شکار پارٹی میں شامل تھے۔ شکار تین چار گھنٹے تک جاری رہا۔ پندرہ بیس پرندے تو صرف شاہین باز کے ذریعے شکار ہوئے۔ دلاور سارا دن غم کی تصویر بنا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج اتنے دنوں بعد اس کے دل کے موسم میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ سویرا بے طرح اسے یاد آرہی تھی۔ ہاں وہی سویرا جس نے اسے عشق کی ایک ایسی سولی پر چڑھایا تھا، جو مارتی نہیں تھی بس جاں کنی کے عالم میں رکھتی تھی۔ وہی سویرا جس کی موجودگی میں اس پر تشدد کی انتہا کردی گئی تھی۔ جس حویلی سے وہ مرتے دم تک نہیں نکلنا چاہتا تھا، وہاں سے اسے نکال باہر کیا گیا تھا۔ روہی کے اجنبی سناٹے اس سے جدا ہوگئے تھے۔ پستہ قد بیریوں سے وہ بہت دور چلا آیا تھا اور اس ہوا سے بھی جس میں اس کا بے رحم محبوب سانس لیتا تھا ... شاید کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لمبے پنڈے اوکھیاں راہواں عشق دیاں ...

اگلی رات حضور چانڈیو نے اسے نشست گاہ میں طلب کرلیا۔ دلاور نشست گاہ میں پہنچا تب بھی بے حد دل گرفتہ تھا۔ حضور چانڈیو نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''نہیں حضور سائیں!'' دلاور نے آہستگی سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔

''میں کہوں گا کہ تم بن باقر کے ساتھ دبئی چلے جاؤ....''

دلاور کچھ دیر سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''حضور سائیں! میں چوڑیرو حویلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں ... اپنے اوپر لگے ہوئے جھوٹے الزام کو مٹانا چاہتا ہوں۔''

حضور چانڈیو بڑی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اپنے سگریٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''شاہ فرمان بہت کمینہ آدمی ہے۔ جہاں تمہاری سوچ ختم ہوتی ہے، اس کی کمینگی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیپو ٹریگر اس کا خطرناک پتہ ہے۔ چوڑیرو حویلی جاؤ گے تو اس بار وہ تمہاری آخری سانس تک نکال لیں گے۔ میرا کہا مانو تو ابھی ادھر ادھر ہو جاؤ۔ اگر ان کنجروں کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم زندہ ہو.... تو وہ بھوکے بگیاڑوں کی طرح تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے اور تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس وہلے ان کا زور چل رہا ہے۔''

جواب میں دلاور خاموش رہا۔ حضور چانڈیو نے بات جاری رکھی۔ ''شیخ باقر بہت چنگا آدمی ہے۔ اس کی ملازمت کرکے بڑے فائدے میں رہو گے تم۔ تمہارے علاوہ سندری اور شاید دو لڑکے اور بھی جائیں گے۔ بس عام سا چھوٹا موٹا گھر کا کام ہوگا...''

دلاور کی نگاہوں میں یکایک وہ تمام مناظر روشن ہوگئے جب اسے بدترین مار پیٹ کا نشانہ بنا کر پانی میں پھینک دیا گیا تھا۔ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ یہ بھی ایسا ہی لمحہ تھا۔ دلاور کے ذہن نے مختصر وقت میں سارے حساب کتاب جوڑے اور وہ تین دن بعد پاکستان چھوڑنے کے لیے تیار ہوگیا۔ ہاں ... وہ اس زمین، ... اس دھرتی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوگیا جہاں اس کا سنگ دل محبوب رہتا تھا اور جہاں اس نے اپنی زندگی کے اَن گنت سال گزارے تھے۔ وہ ایسی غربت کی ماری، لاچار زندگی جینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر کچھ بدل چکا تھا۔

☆☆☆

جدید طرز کا تفریحی بحری جہاز کھلے سمندر میں دبئی کی طرف رواں تھا۔ گلف ڈریم نامی یہ جہاز درمیانے سائز کا تھا۔ اس میں قریباً 60 کمرے تھے اور ڈیڑھ سو مسافروں کے سفر کی گنجائش تھی۔ ان کا یہ سفر قریباً پانچ روز کا تھا۔ دلاور کو معلوم ہوا تھا کہ ویسے تو کراچی سے دبئی تک کا سمندری راستہ 1200 کلومیٹر سے کچھ کم ہی تھا اور یہ سفر ایک ڈیڑھ روز میں طے ہوسکتا تھا لیکن اس جہاز کو بہت آہستہ اسپیڈ پر کھلے سمندر کی سیاحت کرتے اور کچھ جگہوں پر رکتے ہوئے جانا تھا۔ بن باقر پاکستان سے جن چار ملازموں کو ساتھ لے کر جارہا تھا، ان میں دلاور کے علاوہ سندری، اس کی ماں اور ایک نگرانی لڑکا تھا۔ گلف ڈریم نے پاکستانی حدود کو چھوڑا تو دلاور کی آنکھوں میں نمی لہرا گئی۔ دور ... روہی کی رنیلی زمین پر کھڑی پستہ قد بیریوں کے آس پاس آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کچھ سرگوشیاں تھیں ... تم کب تک مجھ کو

بھولو گے..... صحرا کی جلسی دوپہروں میں کچھ ان دیکھی سی راتیں ہیں.....

یہ سفر کے دوسرے روز کی بات ہے۔ دلاور رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔ نگرانی لڑکا دلاور کے ساتھ والے بیڈ پر چھوٹے کیبن میں سو رہا تھا۔ لگژری جہاز بحیرۂ عرب کے سینے کو چیرتا ہوا منزل کی طرف گامزن تھا۔ رات آخری پہر دلاور کی آنکھ لگ گئی مگر پھر اچانک کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی وہ تھوڑی دیر سویا ہے۔ باہر دن کا خوبصورت اجالا پھیل چکا تھا۔ کچھ بلند آوازیں باہر سے سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی تیز عربی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ دلاور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ بڑی شاندار دھوپ تھی، اور گہرا نیلا آسمان۔ شیخ بن باقر اپنے ایک عربی ملازم سے سخت لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک جدید پنجرے میں وہ شاندار نایاب باز ٹہل رہا تھا جس کے لیے کروڑوں روپے ادا کیے گئے تھے۔ باز کی چونچ خون سے سرخ نظر آ رہی تھی۔ عرشے کے فرش پر بلی کا ایک معصوم سا بلونگڑا شدید زخمی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں۔

معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باز کو پنجرے سے نکالا گیا تھا۔ بن باقر کے عربی ملازم نے غلطی سے باز کی اندھیاری (آنکھوں کو ڈھانپنے والی ٹوپی) اس کے سر سے ہٹا دی۔ یہ بدقسمت بلونگڑا قریب ہی موجود تھا۔ باز اپنی تربیت کے مطابق اس پر جھپٹ پڑا اور چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اب اس کی ماں حسرت کی تصویر بنی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

دلاور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے لگا کہ ان چور عربوں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی اکثریت شکاری باز جیسی فطرت ہی رکھتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی کمزور پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ معاشرہ اور قانون وغیرہ بس چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اسی اثنا میں دلاور کی نظر حضور چانڈیو پر پڑی اور اسے پہلی بار یہ پتا چلا کہ وہ بھی اس جہاز میں موجود ہے۔ دلاور نے حضور چانڈیو کو دیکھ کر حیرانی ظاہر کی۔ وہ ایک آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو بس سیر سپاٹے کے لیے جا رہا ہوں دلاور..... دس پندرہ دن رہ کر ہوائی جہاز سے واپس آ جاؤں گا اور اگر میرا دل نہ لگا تو بے شک تو بھی آ جانا۔ پر میری صلاح تو یہی ہے کہ تو سال دو سال کے لیے وہاں ٹک جا۔“

شاید حضور چانڈیو کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں شیخ باقر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں آ گیا۔ چوکس ملازموں نے مستعدی سے دو تین مزید لگژری کرسیاں وہاں رکھ دیں۔ شیخ باقر کے ساتھ اس کے دو کویتی دوست بھی تھے۔

حضور چانڈیو نے مترجم کے ذریعے دلاور کا تعارف کرایا۔ آخر میں بولا۔ ”جناب عالی! جنات جیسا کام کیا ہے اس نے۔ ان ظالم دشمنوں نے کوئی تین من لوہا باندھا تھا اس کے پنڈے کے ساتھ..... اور یہ سخت زخمی بھی تھا۔ پر نکل آیا زندہ سلامت۔ بہادر جیسی ہمت ہے بلی اس کی۔“

شیخوں کی دلچسپی اس میں بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے مؤدب کھڑا رہا۔ اس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ گھوڑا یا کوئی اعلیٰ نسل کا پالتو جانور ہے اور حضور چانڈیو دوسروں کے سامنے اس کی ملکیت پر فخر محسوس کر رہا ہے۔ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے..... دیکھو یہ میرا ہے، میرا مطیع ہے، میرا انعام ہے، میرا پالتو ہے، دیکھو ذرا میری پسند کو۔

مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھتا تھا..... اور بڑی آپا بھی..... اور شاہ فرمان بھی..... اور شاید..... شاید..... نہیں..... وہ ایسی نہیں تھی وہ نہیں تھی ایسی..... لیکن اگر وہ ایسی نہیں تھی تو پھر.....

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو جاتا تھا..... یہ سمندری سفر کی تیسری رات تھی۔ گھپ اندھیری تاریکیوں کو چیرتا ہوا منزل کی طرف رواں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد حضور چانڈیو کو بدن دبوانے کی عادت تھی۔ نگرانی لڑکے کو بخار تھا اور الٹیاں آ رہی تھیں۔ مٹھی چاپی کی ڈیوٹی دلاور پر آ گئی۔ حضور چانڈیو کے لگژری روم میں وہ ایک گھنٹا اس کی مٹھی چاپی کرنے اور اس کی زبانی شاہ فرمان کی شان میں ”قصیدے“ سننے کے بعد وہ اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا جب اس نے سندری کو دیکھا۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ اس لگژری اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جہاں بن باقر کا کویتی دوست مقیم تھا۔ دلاور احتیاط سے پیچھے گیا اور ایک منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تنہائی ہوئی اور تندرے بنی ستورِ سندری بڑی خاموشی کے ساتھ کویتی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ بے شک وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے لیکن بہت ڈری سہمی ہوئی ہے۔

پتا نہیں کیوں باز اور معصوم بلونگڑے والا سین پھر دلاور کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہاں، باز طاقتور تھا اور بلونگڑا کمزور۔ اسے باز کے بچوں میں آنا ہی آنا تھا۔ سندری کالی سیاہ تھی لیکن تر و تازہ اور چمکدار تو تھی..... اور کالا انگور بھی تو

ہوتا ہے۔ پھلوں کے شوقین ہر طرح کا پھل چکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دلاور ایک طویل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

صبح وہ ایک نامانوس سا شور سن کر جاگا تھا۔ وہ کیبن سے باہر نکلا اور چند زینے طے کر کے عرشے پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ بن باقر کی نوجوان چہیتی بیوی ایک طرف کرسی پر بیٹھی بھوں بھوں رو رہی تھی اور بن باقر اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی دو بندے غوطہ خوری کے لباس میں کھڑے تھے۔

بیوی کو چپ کرانے کی ناکام کوشش کے بعد بن باقر غوطہ خور ملازموں پر برس پڑا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔

"لگژری شپ ہے یہ..... اور اس میں انتظامات کیا ہیں تم لوگوں کے۔ آکسیجن سلنڈر تک کام نہیں کر رہا تم لوگوں کا۔ ہزاروں ڈالرز سیکیورٹی کے کھاتے میں لیتے ہو تم لوگ کیا ہے تمہاری مینجمنٹ؟"

"سوری سر! ہم نے کوشش تو پوری کی ہے۔" ایک "سی ڈائیو" بولا۔

"کوشش کو میں نے چاٹنا ہے۔ مجھے میری چیز چاہیے۔ کہاں ہے تمہارا کیپٹن..... کس کی گود میں گھس کر سویا ہوا ہے۔ اسے بلاؤ۔"

اس مکالمے سے جو کچھ دلاور کی سمجھ میں آیا اور جو کچھ اسے اردگرد موجود لوگوں سے معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ بن باقر کی چہیتی بیوی عروسہ چڑھتے سورج کی نرم روشنی میں اپنی سیلفیاں لینے کے لیے عرشے پر آ گئی۔ اس کے پاس قیمتی جیولری سے بھرا ہوا ایک ونڈو باکس بھی تھا۔ وہ ایک ایک زیور اس میں سے نکال کر پہنتی۔ اپنی سیلفیاں لیتی اور اسے دوبارہ باکس میں رکھ دیتی۔ وہ اس خود ستائی میں اتنی مگن ہوئی کہ عرشے کے بالکل کنارے پر چلی گئی۔ باکس اس کے قریب ہی فرش پر رکھا تھا۔ ایک چوکس ملازم بھی قریب ہی کھڑا تھا مگر دونوں چوک گئے۔ جڑواں ڈمرو والا ایک میٹس پہن کر جب عروسہ سیلفی لے رہی تھی، اس کے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر جیولری باکس کو لگی اور وہ چکنی سطح پر پھسل کر تیس فٹ نیچے سمندر میں جا گرا۔ جہاز کو وہیں روک لیا گیا تھا۔ اسے تھوڑا سا ریورس چلا کر موقع واردات پر لایا گیا تھا۔ اب پچھلے قریباً ایک گھنٹے سے جہاز کی سیکیورٹی کے غوطہ خور قریباً تیس میٹر تک نیچے جا کر باکس کو تلاش کرتے رہے تھے۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اب مزید تلاش اس لیے روک دی گئی تھی کہ "سی ڈائیونگ" میں استعمال ہونے والے ایک سلنڈر کے میکنزم میں خرابی واقع ہو گئی تھی اور دوسرے کا ماؤتھ پیس کسی نکیلے پتھر سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔

..... اسی دوران میں کیپٹن کا معاون "کیپٹن" کو بلا کر عرشے پر لے آیا۔ نشے کی وجہ سے کیپٹن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بمشکل ہی اٹھ پایا تھا۔ بن باقر، کیپٹن پر بھی برسنا شروع ہو گیا۔ وہ اسے ناقص انتظامات کے طعنے دے رہا تھا اور دیر سے یہاں آنے پر بھی ناڑ رہا تھا۔ کیپٹن پہلے تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے بھی چند سخت جملے کہے۔ وہ بولا۔ "میڈم کو اس خطرناک انداز میں سیلفیاں لینے کے لیے کس نے کہا تھا۔ اگر جیولری کی جگہ خدانخواستہ ہن کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ اس طرح کی سیلفیاں بہت سے لوگوں کی جان لے چکی ہیں۔"

جہاز رکا ہوا تھا۔ ہنگامہ جاری تھا۔ شیخ کی دو ملازمائیں روتی دھوتی عروسہ کو اس کے کمرے میں لے گئیں۔ پتا چلا کہ باکس میں عروسہ کی تقریباً تمام جیولری موجود تھی۔ اس میں ہیروں کے سیٹ اور "اینٹیک پیسز" بھی تھے۔ کچھ نہایت بیش قیمت خاندانی گہنے اس کے علاوہ تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی ان اشیا کی قیمت اسی نوے کروڑ کے قریب تھی۔ حضور چانڈیو اور شیخ کے کوئی دوست بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ جہاز کا ترک کیپٹن وائرلیس کے ذریعے کسی اردگرد کے جہاز یا لانچ وغیرہ سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ غوطہ خوروں کا انتظام کیا جا سکے۔ مایوس کن اطلاع یہ تھی کہ علاقے میں طوفان کی آمد تھی اور قرب و جوار میں ایسا کوئی بیس تھا جو اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی مدد کو پہنچ سکتا۔ اچانک حضور چانڈیو کی نظر دلاور پر پڑی اور دلاور نے حضور چانڈیو کی نگاہ میں ایک تیز چمک نمودار ہوتے دیکھی۔ وہ کچھ دیر تک دلاور کو دیکھتا رہا پھر سیدھا اس کی طرف آیا۔ "دلاورے! یہ سچے فیشن کے غوطہ خور تو ٹکری بن گئے ہیں پر..... مجھے لگتا ہے کہ تو کوئی کام دکھا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی پنجابی لوہے کا پتر ہے تو۔ بڑی مشہوری ہے تیری اس بارے میں۔"

وہ ٹھٹک کر حضور چانڈیو کو دیکھنے لگا۔ "نن... نہیں چودھری جی! میں چھوٹے موٹے چھپڑوں، تالابوں میں تو چلا جاتا ہوں، پر یہ تو سمندر ہے۔"

"سمندر ہے، پر زیادہ ڈونگا تو نہیں ہے نا۔ وہ دیکھ اس پاسے ایک پتھر بھی نظر آ رہا ہے۔"

دلاور نے دیکھا جہاز سے کوئی آدھ کلومیٹر دور کسی

چٹان کا نوک دار سرا سمندر کے نیلے پانی میں سے نکلا ہوا تھا۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے کسی عقاب کی مڑی ہوئی چونچ ہو۔ اس سے پہلے کہ دلاور جواب میں کچھ کہتا' حضور چانڈیو لپکتا ہوا بن باقر کی طرف چلا گیا اور مترجم کے ذریعے بن باقر کے ساتھ جو شیلے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بڑے فخریہ انداز میں دلاور کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تیزی سے دلاور کی طرف آیا، اس کا کندھا تھپک کر جوش سے بولا۔ "ان کو یقین نہیں آ رہا کہ تو سلنڈر شلنڈر کے بغیر پانی میں لمبی ڈبکی لگا سکتا ہے۔ پر مجھے پتا ہے تو لگا سکتا ہے۔ تو کر سکتا ہے۔"

"ہم..... مگر چودھری جی....."

"اوئے اگر مگر کیا..... اب مجھے شرمندہ کرے گا؟ یہ بڑا زبردست موقع ہے اپنا آپ منوانے کا۔ اگر سچ مچ وہ ڈبا مل گیا تو شیخ کی انکھیوں کا تارا بن جائے گا تو۔ لمبا انعام شام بھی ملے گا۔"

دلاور سوچ میں تھا، حضور چانڈیو نے پھر اس کا شانہ تھپکا۔ "اوئے سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ پنجابی شیر ہے تو۔ اگے ودھ اور دکھا دے اپنی چھاتی کا زور۔"

قریباً پندرہ منٹ بعد سر تو دم گھسے کا تربیت یافتہ دلاور نیلے پانی میں اترنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی کمر سے ایک لمبا رسا باندھ دیا گیا تھا اور وہ کنارے پر اپنے ننگے پاؤں جمائے کھڑا تھا۔ پانی میں کام کرنے والی ایک ٹارچ اس نے بیلٹ کے ذریعے اپنے پیٹ سے باندھ لی تھی۔ دونوں مرجمس نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں جن میں حضور چانڈیو کی نگاہ بھی تھی۔ اس کی نگاہ میں ایک امید بھری فخریہ چمک تھی۔ دلاور نے اپنی سانس باہر نکالی۔ پانی میں جست لگائی اور نیچے اترتا چلا گیا..... ہاں پانی کی مچھلی۔ ایک فطری پیراک..... جسے ایک خانہ بدوش ٹوبے نے اپنی بے رحم تربیت سے کندن بنا ڈالا تھا۔ یہ کندن برسوں سے خاک میں رل رہا تھا..... لیکن آج اس کی زندگی میں ایک سنہری موقع آیا تھا۔

وہ پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھ کر اکثر سوچا کرتا تھا..... اللہ نے اسے کس لیے بنایا ہے۔ وہ کس مرض کی دوا ہے؟ نہ ڈھنگ سے پڑھ سکا، نہ کوئی فن سیکھ سکا..... نہ کوئی ایسا ہاتھ تھامنے والا اسے ملا جو دنیا کی تیز رفتاری اور آگے بڑھنے کے ہنر اسے سکھاتا۔ کیا اس کی قسمت میں معمولی کام اور چودھریوں کی چھوٹی موٹی ملازمتیں ہی لکھی ہیں؟ لیکن جب سے اس نے مرحوم شاہ زمان کے حکم پر کچے کی جھیل پار کی تھی اور ساجے ملاح کے چنگل سے باز نکال کر چوڑیرولا یا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔

وہ سر کے بل سمندر کے پانی میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ مناظر دھندلا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اسے سمندری نباتات اور چھوٹے بڑے پتھر نظر آنے لگے۔ ان پتھروں میں مچھلیاں اور دیگر آبی حیات متحرک تھیں، یہ اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ بالآخر اس نے ٹارچ یعنی واٹر لائٹ روشن کر لی۔ اب اسے پانی کے اندر قریباً چار منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اس کے پھیپھڑوں نے ہوا کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مونگے کی چٹانوں اور کائی لگے پتھروں کے درمیان تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں دیوانہ وار اس باکس کو تلاش کر رہی تھیں جو گلابی رنگ کے فاسفیر کا بنا ہوا تھا اور جس کا ہینڈل چمکیلے پلاسٹک کا تھا۔ واٹر لائٹ کا دائرہ ہر طرف حرکت کر رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی اور بیلٹ میں اڑس لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسی سانس کے ساتھ پانی کی سطح تک پہنچ بھی سکتا ہے یا نہیں۔

..... اور وہ پہنچ گیا۔ پھڑی ہوا دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی۔ وہ بے طرح ہانپ رہا تھا۔ درجنوں سوالیہ نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر وہ لوگ جان گئے کہ کم از کم اس غوطے میں تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

حضور چانڈیو کی پکارتی ہوئی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "ہمت نہیں ہارنی شیرا! آج کچھ کر کے دکھاؤ۔ میرا سر نیچا نہ ہونے دینا۔"

حوصلہ افزائی کی کچھ مزید آوازیں بھی اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ اوپر اسے عرشے پر عروسہ کی پریشان صورت بھی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر بھی امید و بیم کے سائے تھے۔ طوفان ابھی دور تھا لیکن سمندر میں ہلکی لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

تین چار منٹ تک سانس درست کرنے کے بعد دلاور نے اوپر عرشے پر ان تین تنومند ملازموں کو دیکھا جنہوں نے اس کی کمر سے بندھا ہوا رسا تھام رکھا تھا۔ انہیں اشارہ کر کے دلاور پھر سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ زیادہ تیزی سے پانی میں اترا اور تہ میں پہنچ کر تلاش شروع کر دی۔ سانس الجھنے لگی تھی، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یکایک واٹر لائٹ کا روشن دائرہ پتھروں کے درمیان کسی چمکیلی چیز پر پڑا۔ دلاور کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی سے

پاس گیا..... رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ وہ گلابی باکس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ کیوبک فٹ کا باکس دو نکیلے پتھروں کے درمیان لگا ہوا تھا اور ایک آبی پودا اس کے اوپر لہلہا رہا تھا۔ دلاور نے اس کے پلاٹینم کے ویجٹل کو ہاتھ لگایا تو کامیابی کی ترنگ جسم میں پھیل گئی۔ ابھی وہ سطح آب پر نہیں پہنچا تھا لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ عرشے پر کھڑے لوگوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے ہیں۔ وہ تالیاں بجا رہے ہیں اور نعرے بلند کر رہے ہیں۔ حضور چانڈیو کی خوشی دیدنی ہے۔ وہ فخریہ انداز میں عربی اور دیگر مسافروں کی طرف دیکھ رہا ہے اور دلاور کی پیٹھ تھپتھپا رہا ہے۔

دلاور نے باکس پتھروں میں سے نکالا۔ اب اس کا اوپر کا سفر شروع ہوا چاہتا تھا لیکن اچانک ..... بالکل اچانک ..... اس کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ ہو گیا ہے۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ ایک فقرہ کسی آتشیں تیر کی طرح اس کے تصور میں لہرایا اور دماغ میں پیوست ہو گیا۔

یہ چوڑیرو حویلی کی بڑی آپا کی آواز تھی ..... ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں.....

یہ آواز نہیں تھی، پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کانوں کے راستے اس کے دماغ میں اترا اور اسے پتھرا گیا۔ سانس اس کے سینے میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ حرکت نہ کر سکا۔

..... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں، وہ برسوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرا دیتے ہیں۔ چند ساعتوں کے اندر اندر دلاور کے ذہن نے جیسے مدتوں کے تجربے و مشاہدے کو لمحے میں سمیٹ لیا۔ سارے بھوکے ننگے ایک جیسے نہیں ہوتے ..... لیکن اگر بقول بڑی آپا ہوتے ہیں، تو پھر اکثر سرمایہ دار بھی ایک جیسے ہوتے ہوں گے۔ حضور چانڈیو بے شک شاہ زمان اور شاہ فرمان کا دشمن تھا لیکن فطرت تو اس کی بھی ان جیسی ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی انگارے تھے۔ اسے بھی اپنے اردگرد کیڑے مکوڑے ہی نظر آتے تھے۔ وہ بھی دلاور کی تعریفیں اسی انداز میں کرتا تھا جس انداز میں کبھی شاہ زمان کیا کرتا تھا۔ یہ میرا کارندہ ہے، یہ میرا پالتو ہے، بڑی اچھی نسل کا ہے..... ہاں یہ سب ایک جیسے ہی تھے۔ بڑی آپا ہو، شاہ فرمان ہو، حضور چانڈیو ہو، یا پھر شیخ بن باقر ہو اور عروسہ ہو ..... ان سارے بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے..... ایک جیسی ہوتی ہے..... آواز دلاور کے کانوں میں گونجتی چلی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ پانی میں پسینا نہیں آتا لیکن اسے لگا کہ اسے پسینا آ رہا ہے..... دیوانی سوچیں اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگیں..... اس نے شاہ فرمان اور شاہ زمان کی بے دام کی غلامی کی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی پروا بھی نہ کی۔ لاکھوں ریال کی مالیت کا "باز" اپنی جان پر کھیل کر واپس لایا ..... اس کے صلے میں اسے کیا ملا؟ صرف "کارِ خاص" کا خطاب ..... اور جھوٹی تعریفیں۔ ہاں کچھ لمحے ایسے ہی کایا کلپ ہوتے ہیں۔ وہ برسوں کا فاصلہ ساعتوں میں طے کرتے ہیں۔ دلاور نے یہ فاصلہ طے کر لیا..... اس نے بیش بہا جیولری باکس کو دوبارہ پتھروں کے درمیان پھنسا دیا۔ چوڑے پتوں والا آبی پودا اس کے اوپر کسی سبز ناگ کی طرح لہرانے لگا.....

دلاور کا سینہ آکسیجن کی طلب میں پھٹ رہا تھا۔ اسے پانی میں اترے کم از کم دس منٹ ہو چکے تھے اور ابھی سطح آب تک پہنچنے میں اسے کم از کم تین منٹ مزید درکار تھے۔ کیا دو تین چار منٹ تک سمندر کے قاتل پانی کو اپنے جسم میں داخل ہونے سے روک سکے گا؟ یہ بے حد سنگین سوال تھا..... بے حد مہلک..... سرفودم گرو نے کہا تھا..... پانی تو بے کو نہیں ڈبوتا، اس کی کم ہمتی ڈبوتی ہے..... پانی کے اندر اس وقت تک رہنا سیکھو جب تک تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر نہ کھلنے لگے۔ جب اندھیرے کی چادر کھلنے لگے تو پھر اوپر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دو.....

اور دلاور نے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیے۔

وہ اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے خوفناک لمحہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے خود کو دیوانہ وار حرکت دیتا چلا گیا۔ وہ اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا..... ہمت کر دلاور..... چند فٹ..... صرف چند فٹ۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اسے روشنی نظر آ رہی تھی، یہ سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ پانی سے باہر لہرایا..... اور پھر ڈھیروں پانی اس کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ اندھیرے کی چادر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ جہاز کے عرشے پر ایک سائبان کے نیچے چت لیٹا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور سمندر میں اچھال تھا۔ دن میں ہی رات کا سماں بنا ہوا تھا۔ سب

مسافر اور عملے کے زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ جہاز درمیانی رفتار سے لہروں پر ہچکولے کھاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دلاور کے قریب کمرانی لڑکے رشید کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "اپن کو بڑی فکر لگی ہوئی تھی، شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔"

"کیا ہوا تھا؟" دلاور نے پوچھا۔ (ویسے اسے ہر بات یاد آ چکی تھی)

"وڈی تمہارا ہاتھ تو نظر آ گیا تھا لیکن پھر تم ڈبکی کھا گیا، تم کو رسّے سے اوپر کھینچ لیا گیا..... تمہارے پیٹ سے پانی نکالا گیا اور ڈاکٹر نے ایک ٹیکا بھی لگایا....." کمرانی رشید اسے تفصیل بتانے لگا اور ساتھ ساتھ اس کے کندھے دبانے لگا۔

"چودھری جی کہاں ہیں؟" دلاور نے پوچھا۔

رشید ذرا چپ رہنے کے بعد بولا۔ "وڈی کہاں ہوتا ہے۔ اپنے کمرے میں ہوگا۔ تمہاری وجہ سے وہ کچھ شرمندہ بھی ہوا ہے۔ شیخ صاحب سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔ چلو چھوکرے نے کوشش تو کیا ہے۔"

"باقی کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہنا کیا تھا، بس منہ لٹک گئے تھے سب کے..... شیخ صاحب اور ترکی کیپٹن میں تھوڑا سا منہ ماری بھی ہوا۔ کچھو کہ نغرا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شیخ صاحب ابھی کچھ دیر اور وہاں رکنا چاہتا تھا مگر کیپٹن صاحب کا خیال تھا کہ سمندر میں اگلے آ رہی ہے۔ اپن زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ یہ نہ ہو کہ جیولری ڈھونڈتے ڈھونڈتے جان کالالہ پڑ جائے۔"

ان باتوں کے دوران میں سیاہ رنگت والی سندری بھی وہاں آ گئی۔ اسے بھی اس بات کا افسوس تھا کہ نیم بے ہوش دلاور کو یہاں عرشے پر چھوڑ کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ حضور چانڈیو بھی اپنے حال میں مست تھا اور کھا پی رہا تھا۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ دلاور اب کہاں ہے؟

سندری نے ہولے سے کہا۔ "یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہوتے ہیں۔ جب تک مطلب ہو ہیں نکما بڑا کھیال رکھتے ہیں، مطلب نکل جاوے تو پھر میں کون تو کون؟"

دلاور نے سندری کی طرف دیکھا۔ اس کا چمکیلا پن کچھ ماند تھا۔ وہ مرجھائی مرجھائی سی نظر آتی تھی۔ شاید وہ "بڈھی" ہی بیان کر رہی تھی..... یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہوتے ہیں.....

"تھوڑی سی گرم چائے مل جائے گی؟" دلاور نے کمرانی رشید سے پوچھا۔

رشید کے بجائے سندری نے جواب دیا۔ "میں ابھی لے کر آتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپس مڑی لیکن پھر رک کر بولی۔ "ویسے بھائی! تم نے کوشش تو پوری کی ہے۔ سب کو حیران کر دیا تھا اتنی دیر پانی میں رہ کر۔ وہ جو جہاز کا بڑا افسر ہے۔ اس کا تو ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔"

وہ چائے لینے چلی گئی۔ دلاور نے خود کو آرام کرسی پر نیم دراز کیا۔ رشید نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ یہ کمرانی رشید بڑا ہمدرد لڑکا تھا۔ سات آٹھ ماہ سے حضور چانڈیو کے ایک مچھلی فارم پر کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک شپنگ کمپنی کا پانڈی یعنی "لوڈر" تھا..... سیکڑوں دفعہ سمندر کے راستے دبئی جا چکا تھا۔ حضور چانڈیو نے مچھلی فارم ختم کر دیا تھا اس لیے وہ دوبارہ شپنگ کمپنی کی ملازمت کا ارادہ رکھتا تھا۔

سندری چائے لے آئی لیکن پتا نہیں کیوں دلاور کا چائے پینے کو دل نہیں چاہا۔ اسے سندری پر ترس آ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے چاری غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہے۔ اسے لگا سندری کی ساری بے بسی، لاچاری اور ناپاکی اس چائے میں بھی در آئی ہے۔ اس نے سندری کا شکریہ ادا کر کے چائے ایک طرف رکھ دی۔

سندری چلی گئی۔ دلاور اسی طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ بارش ہلکی تھی لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ لہروں میں اچھال تھا۔ لہروں پر نگاہیں جمائے ہوئے دلاور نے رشید کو مخاطب کیا..... اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "رشید! جس جگہ ہم کود کر گرا تھا، وہ کون سی جگہ تھی؟"

"جہاں جیولری باکس گرا تھا؟" رشید نے وضاحت چاہی۔ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ رشید بولا۔ "وڈی اس کو "برڈ سائٹ" کہوت ہیں۔ شاید آپ نے دیکھا ہووے گا، ادھر دائیں طرف ایک اونچا پتھر پانی میں سے باہر نکلا ہوا ہے۔ کسی پرندے کی چونچ کے مانق لگتا ہے۔"

"ہاں دیکھا تھا میں نے۔" دلاور نے بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"یہ جگہ مسقط اور برکا سے پچیس تیس ناٹ شمال کی طرف ہے۔ ناٹ سمجھتا ہے نا آپ؟ یہ سمندری میل کو کہوت ہیں۔ پچھلے سال کی بات ہے۔ ایک دفعہ اپن ادھر سے گزر رہا تھا....."

کمرانی رشید اپنی روانی میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ کسی

پرانے سفر کی روداد سنا رہا تھا۔ رشید کی آواز دلاور کے کانوں تک پہنچ رہی تھی لیکن دماغ تک نہیں جا رہی تھی۔ اس کا دماغ تو کہیں اور تھا۔ کہیں دور گمگین اور تاریک سمندر کی گہرائی میں... جہاں مونگے کی چٹانوں کے پیچھے، کالے اور نیلے رنگ کے پتھروں کے درمیان..... کچھ موجود تھا۔ اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بارش برس رہی تھی اور گلف ڈریم لہروں پر ہلکورے لیتا منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وقت ہمیشہ آگے کی طرف رواں رہتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتی رہتی ہیں۔ رات اور دن ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ بہاریں اور خزائیں ایک دوسرے کے عقب سے نمودار ہوتی ہیں۔ چاڈیرو میں بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ کھیتوں کھلیانوں، کچے پکے .. گھروندوں اور دھول اڑاتے راستوں پر دھوپ اور چھاؤں کی بساط بچھتی رہی..... اور اسی طرح چار برس گزر گئے.....

چاڈیرو حویلی کی بلند دیواروں کے اندر جوتی ہوئی گردنوں والے لوگ بستے تھے، ان کی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ الگ راہن سہن، الگ رسمیں اور آسائشوں میں گھرے ہوئے الگ شب و روز لیکن اس حویلی میں ایک لڑکی دوسروں سے جدا تھی۔ وہ ہمیشہ سے جدا تھی لیکن پچھلے تین چار برسوں میں تو اور جدا ہو گئی تھی۔ اس کا نام سویرا تھا۔ جس سیاہ رات میں حویلی کے اندر طوفان بپا ہوا تھا، چنگھاڑیں گونجی تھیں، للکارے بلند ہوئے تھے، دلاور کو جانوروں کی طرح مارا گیا تھا اور پھر نیم مردہ کر کے ایک جیپ میں پھینک دیا گیا تھا... اس سیاہ رات میں سویرا کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کرچی کرچی ہو کر اس کے جسم اور اس کی روح میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ایک خون سا رستا رہتا تھا۔ وہ سوچتی تھی... اس رات وہ بھی مر کیوں نہ گئی..... کیوں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ لیکن... لیکن وہ بالکل کھڑی تو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک بار بے ساختہ آگے بڑھی بھی لیکن بڑی آپا اور ایک ملازمہ نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ بالکل ہی پتھرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہی دیکھا تھا... وہ جیپ میں اوندھا پڑا تھا، اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا تھا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ لوگ اسے لے گئے تھے۔ دفن کرنے کے لیے یا پھر کسی قاتل پانی میں غرقاب کرنے کے لیے۔

... اور وہ پتھرائی رہی تھی..... شاید وہ اب تک پتھرائی ہوئی تھی۔ غم کے شدید ریلوں کے بعد اب اس کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جیسے سمجھ گئی تھی کہ یہ زندگی اسے ایسے ہی گزارنی ہے۔ شاہ زمان کی موت کے بعد وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ ایسی جوان بیوہ جس کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے کا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اگر وہ سوچتی بھی تو اسے اس حویلی کی اونچی دیواریں کون پار کرنے دیتا۔ یہاں کی رسمیں الگ تھیں۔ نہ طلاق کی صورت میں رہائی تھی نہ بیوگی کی صورت میں .... بلکہ شاید مر کے بھی رہائی نہیں تھی کیونکہ یہ حویلی اتنی بڑی تھی کہ اس کا خاندانی قبرستان بھی اونچی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ دلاور زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ پہلے تو یہی کہا جاتا تھا کہ وہ اسی رات مار دیا گیا تھا ... لیکن پھر تین چار ماہ بعد کچھ اڑتی اڑتی سی باتیں سویرا کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ بچ گیا تھا اور حضور چانڈیو کے لوگ اسے اٹھا کر اپنی سبز حویلی میں لے گئے تھے مگر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ان باتوں کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بار یہ اڑتی اڑتی بھی سنی گئی تھی کہ وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ حضور چانڈیو نے اسے مڈل ایسٹ بھیج دیا ہے..... پھر ایک مرتبہ سویرا کو اپنی پروفیسر پھپھو کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے کراچی کی ایک سڑک پر دلاور کی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار تھا اور اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ بس یہ ساری باتیں اور مفروضے ہی تھے۔ غالب گمان اور صحیح حقیقت شاید یہی تھی کہ وہ نومبر کی اسی تاریک شب میں مار دیا گیا تھا۔ اس کا نام ان بہت سے لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو ان وڈیروں کی اونچی دیواروں والی حویلیوں میں جان ہارتے ہیں۔ ان کا کوئی پرچہ درج ہوتا ہے، نہ کوئی تفتیش ہوتی ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ان کی قبر بھی نہیں ہوتی.....

وہ دلاور کو اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں، وہ اسے بھولتا نہیں تھا۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی ناتے سے وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ خون میں لتھڑا ہوا اور زخموں سے بھرا ہوا۔ وہ اس سے پوچھتا تھا "بی بی جی! کیا آپ بھی وہی سمجھتی تھیں، جو لوگ سمجھتے تھے؟ کیا آپ کا خیال بھی یہی ہے کہ میں نے منہ چھپا کر آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا؟"

وہ سسک اٹھتی۔ دل ہی دل میں کہتی۔ "مجھے کچھ پتا نہیں، میں سماج کی باندی ہوں۔ میں ایک گونگی بہری اندھی عورت ہوں۔"

وہ کہتا۔ ''لیکن آپ کا دل تو ہے بی بی جی، کیا آپ کے دل سے کوئی راہ میرے دل کی طرف نہیں آتی تھی؟''

وہ تڑپ اٹھتی، خیالی نیولے سے مخاطب ہو کر کہتی۔ ''ہاں آتی تھی..... ہاں آتی تھی، وہ اب بھی ہے..... شاید ہمیشہ رہے گی۔ لیکن وہ راہ ہمیشہ سات پردوں میں چھپی رہتی ہے اور وہ چھپی ہی رہے گی۔''

وہ بے آواز رونے لگتی۔ ایسے میں دل کے نہاں خانوں میں جو خاموش سی ندی تھی، اس میں اچھال پیدا ہوتا اور اونچی چٹانوں اور بلند دیواروں کے خوف سے اس کا سارا وجود لرز جاتا۔

شروع کے ایک دو برسوں میں شاہ فرمان نے کوشش کی تھی کہ اس حویلی کی پرانی رسموں کے مطابق اپنے بھائی کی بیوہ کو اپنے گھر میں ڈال لے لیکن جب اس نے دیکھا کہ بڑی آپا کی کوششوں کے باوجود سویرا سخت مزاحمت کر رہی ہے اور اس مزاحمت میں خودکشی کی حد تک جانے کو تیار ہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ مگر حویلی کی قید تو بہر حال موجود تھی..... ناک کٹی مجلیہ بیگم کی طرح اس نے بھی اس قید کو آہستہ آہستہ قبول کر لیا تھا..... شاہ فرمان کی دوسری بیوی سے اس کا بیٹا شاہ بابر اب بالغ ہو چکا تھا اور شاہ فرمان اسے مستقبل میں حویلی کا کل بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاہ بابر میں بھی اپنے باپ اور چچا کی ساری جاگیردارانہ خصوصیات موجود تھیں۔ آج کل وہ ایک سنگین چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ سامنے جنگل اور چوڑیروالوں کی دشمنی جنوز موجود تھی۔ گاہے بگاہے کوئی کھٹاگ..... بھی ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک کھٹاگ میں پچھلے سال نیپو ٹریگر گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ غفوری ایک کیس میں چار سال کے لیے جیل چلا گیا تھا۔ بڑی آپا پہلے کی طرح حویلی میں دندناتی تھی اور شاہ فرمان بھی کبھی کبھار شکار کے لیے نکلتا تھا لیکن یہ ''شکار'' جنگل میں نہیں حویلی کے اندر ہی ہوتا تھا اور اس کا نشانہ اکثر کوئی اچھی شکل والی ملازمہ یا بہاولپور وغیرہ سے آئی ہوئی طوائف بنتی تھی۔

وہ فروری کی ایک خنک شام تھی۔ سویرا کے کندھوں پر سفید شال تھی۔ وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ بڑی آپا جو پچھلے کئی دنوں سے کافی خوش تھی، روتی ہوئی سویرا کے پاس آئی اور بولی۔ ''سویرا! بہت برا ہوا ہے۔ حاجی اشرف نے راضی نامہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے دوٹوک بات کر دی ہے۔ پرسوں والی پیشی پر وہ عدالت میں نہیں گئے..... تو..... تو بابر لٹک جائے گا، وہ نہیں بچے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے بڑی آپا کی آواز بیٹھ گئی اور آنسو چپ چپ گرنے لگے۔

سویرا بے حد حیران تھی، کانپتی آواز میں بولی۔ ''لیکن..... لیکن وہ تو مان چکے تھے۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا.....''

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ وہ بالکل لوہے کے تھن بن گئے ہیں۔ مجھ انہوں نے دھکے مار کر شاہ فرمان اور پیر فضل کو گھر سے نکال دیا ہے..... یہ سب کچھ اسی شاہ لاہوری کی طرف سے ہو رہا ہے۔ وہ خبیث ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ نہیں تو حاجی اشرف کے خاندان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ راضی نامہ نہ کرتے۔ یہ سب کچھ اسی کمینے کا کیا دھرا ہے۔ پہلے ہماری زمین پر نظر تھی، اب کنبہ ہمارے پتر کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

بڑی آپا جس شاہ لاہوری کو کہہ رہی تھی، اس کا نام پچھلے سال ڈیڑھ سال سے ہی سننے میں آ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر لاہور میں ہی رہتا تھا مگر اس کے منیجر اور کارندے یہاں بڑا زبردست کام کر رہے تھے۔ انہوں نے چوڑیروالوں کی زمینوں کے ساتھ ہی بہت سی زمین خریدی تھی اور وہاں ایک بڑی کاٹن جننگ فیکٹری لگائی تھی۔ فیکٹری کی تعمیر کے دوران میں شاہ فرمان کا فیکٹری مالکوں سے زبردست جھگڑا بھی ہوا تھا۔ وہی زمین کی حد بندی کے معاملے تھے کوئی اور ہوتا تو شاہ فرمان اور پیر فضل وغیرہ اسے کہاں ٹکنے دیتے مگر شاہ لاہوری ایک بہت بڑی پارٹی تھا اور لوگ سچ کہتے ہیں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ شاہ لاہوری تو لاہور میں تھا، اس کے دست راست منیجر سلطان واہلہ نے ہی چوڑیروالوں کو تارے دکھا دیے تھے۔ بہر حال وہ معاملہ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر طے ہو گیا تھا۔ اب یہ بابر والا نیا کیس شروع ہو گیا تھا۔

بڑی آپا ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس نے سویرا سے کہا۔ ''مجھ سے تو حاجرہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ڈر لگ رہا ہے کہ اسے کچھ ہو ہی نہ جائے..... کلاکلا پتر ہے۔ اللہ خیر کرے۔ اسے کچھ ہو گیا تو وہ تو جیتے جی مر جائے گی۔''

سویرا نے کہا۔ ''اور بھائی فرمان کی بھی تو جان ہے بابر میں۔ جب سیشن کورٹ نے سزا بولی تھی بابر کو..... آپ کو پتا ہی ہے ان کی کیا حالت ہو گئی تھی۔''

''اب بھی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے، گولیوں کے چھکے مار رہے ہیں۔ کسی دن سرکاری افسر کو لے کر ایک بار پھر حاجی اشرف کی طرف جا رہے ہیں۔''

سویرا بولی۔ ''ہم عورتوں کو ان باتوں کا زیادہ پتا تو نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے لگتا ہے بڑی آپا کہ حاجی اشرف وغیرہ

سے بات کرنے کے بجائے اس شخص سے بات کی جائے جو اس معاملے کی جڑ ہے۔ شاہ لاہوری یا پھر اس کے کسی بااختیار بندے سے رابطہ کیا جائے۔"

"میں نے کہا ہے نا فضل سے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے، بلکہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ان بڑے لوگوں سے ملنا کون سا آسان کام ہوتا ہے۔"

بابر کی شکل سویرا کی نگاہوں میں گھومنے لگی ..... کیا واقعی..... اسے پھانسی ہو جائے گی؟ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اٹھارہ سال اور شاید چند مہینے..... یا پھر انیس پورے ہو گئے ہوں گے۔ ابھی مسیں ہی بھیگی تھیں۔ اونچا قد نمایاں طور پر اونچی ناک اور آنکھوں میں وہی تیز چمک جو چوڑیروحویلی والوں کی خاصیت تھی۔ بس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کا نتیجہ نکلا تھا۔ بالغ ہوتے ہی اس کے مزاج میں کچھ عجیب تبدیلی ہونے لگی تھی..... اسے کھیتوں سے دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا تعلق لہلہاتی فصلوں سے نہیں، گاؤں کی خوش شکل لڑکیوں سے تھا مگر پھر جب بات اس کی اپنی بہن پر آئی تھی تو وہ ایک "باغیرت" بھائی بن گیا تھا اور سارے چولستان کی آگ اس کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کی بہن مہرین کا نام ایک لڑکے عاطف کے ساتھ آ گیا تھا۔ عاطف ساتھ والے گوٹھ کے ایک درمیانی درجے کے زمیندار حاجی اشرف کا بیٹا تھا اور زرعی کالج میں پڑھتا تھا۔ عاطف اور مہرین ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ لیکن ان وڈیروں کی تو اپنی ہی "مباشرت" ہوتی ہے۔ اپنے لیے کچھ اور اصول ..... دوسروں کے لیے کچھ اور ضابطے۔ بابر نے کچھ ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لیا اور ایک دن منہ بھیرو کے قریب عاطف پر ٹوٹ پڑا۔ عاطف کے ساتھ اس کا بڑا بھائی شاہد اور ایک دوست تھا۔ انہوں نے عاطف کو بچانے کی کوشش کی۔ اس لڑائی میں بابر کی سیون ایم ایم رائفل سے چلنے والی دو گولیوں نے عاطف کے بڑے بھائی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ عاطف کے بازو میں بھی گولی لگی۔ بابر گرفتار ہوا۔ ثبوت بڑے واضح اور ناقابلِ تردید تھے۔ سیشن کورٹ سے بابر کو پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد کے مراحل میں بھی برقرار رہی اور اب وہ پھانسی کی کوٹھری میں اپنے انجام سے دوچار، ایک زندہ لاش کی طرح موجود تھا۔ تین چار بار فیل، پھلی مرتبہ اس حوالے سے امید کی کچھ کرنیں پیدا ہوئی تھیں ..... ایک مقامی سیاست دان کے توسط سے حاجی اشرف کے گھرانے سے بات آگے بڑھی تھی۔ خون بہا اور دیت کے قانون کے مطابق اگر وارث مجرم کو معاف کر دیتے تو بابر کی پھانسی ٹل سکتی تھی۔ یہ بات چیت مسلسل ڈیڑھ دو مہینے جاری رہی تھی۔ بالآخر چوڑیروحویلی میں خوشی کے شادیانے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ مدعی پارٹی نے کچھ شرائط کے ساتھ معافی نامے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی ... ان شرائط کے مطابق شاہ فرمان نے بیس مربعے زرعی اراضی حاجی اشرف کی بیٹی کو دینا تھی۔ مقتول کی بیوہ کے لیے ایک کروڑ روپے نقد بھی طے ہوا تھا۔ ایک شرط یہ بھی طے کی گئی تھی کہ مقتول کے گوٹھ کو جانے والا قریبی راستہ جو شاہ فرمان کی زمینوں کی وجہ سے بند تھا، آمدورفت کے لیے کھول دیا جائے گا۔

..... یہ سارے معاملے تقریباً طے پا چکے تھے اور چوڑیروحویلی میں ایک بار مٹھائی بھی تقسیم کی جا چکی تھی لیکن اب اچانک اطلاع آئی تھی کہ مدعی پارٹی نے مزید بات چیت سے انکار کر دیا ہے ..... اور خون بہا لینے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ چوڑیروحویلی میں تقریباً سب ہی جان گئے تھے کہ اس انتہائی تشویشناک تبدیلی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔

☆☆☆

منظر ایک سجے سجائے وسیع ڈرائنگ روم کا تھا۔ یہ ڈرائنگ روم جس کوٹھی کا تھا، وہ چوڑیروحویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہی کوئی سات کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ یہ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی اور شاہ لاہوری نے یہاں اپنے عارضی قیام کے لیے اپنی جننگ فیکٹری کے پہلو میں تعمیر کرائی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بے حد رقت آمیز منظر تھا۔ بابر کی ماں حاجرہ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، اپنی چادر پھیلا کر شاہ لاہوری کے دست راست سلطان واہلہ کی منتیں کر رہی تھی۔ شاہ فرمان اور بے فضل بھی جو کچھ دیر پہلے تھوڑا ترش بولے تھے اب بھیگی بلی بنے کھڑے تھے۔ ان کی پگڑیوں کے اونچے شملے بھی جیسے ان کی طرح ہی مرجھائے ہوئے تھے۔ شاہ فرمان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "واہلہ صاحب! اتنی گل کا تو ہم کو بھی پتا ہے کہ حاجی اشرف میں خود اتنا دم نہیں ہے، وہ جو کچھ کر رہا ہے آپ لوگوں کی راہنمائی اور مشورے سے کر رہا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، ہم اس لڑائی کو اور لمبا کرنا نہیں چاہتے۔"

"نہیں..... آپ کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔" سلطان واہلہ نے اپنی رعب دار مونچھوں کو سہلایا اور انداز بے نیازی سے بولا۔

بڑی آپا جیسے تڑپ گئی۔ ایک دم آگے بڑھ کر بولی۔ "نہیں بھائی صاحب! ہم تو آپ لوگوں کے سامنے اپنی

جھولی پھیلاتے آئے ہیں۔ بابر کو اللہ نہ کرے پھانسی ہوئی تو ایک نہیں دو موتیں ہوں گی۔ یہ کرماں سڑی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی قبر میں اتر جائے گی۔" بڑی آپا نے بابر کی پیاری ماں حاجرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں بلند آواز میں رونے لگیں۔ سویرا بھی یہاں موجود تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں۔ وہ بھی دونوں چھوٹائیوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ پیر فضل نے انہیں بہ مشکل چپ کرایا اور سلطان واہلہ سے مخاطب ہو کر ملائمت سے بولا۔ "واہلہ صاحب! حاجی اشرف نے جو تین شرطیں رکھی تھیں وہ ہم نے پوری کی پوری مان لی تھیں۔ اب اگر وہ کوئی اور شرط رکھتے ہیں تو ہم اس پر بھی ابھی غور کرنے کو تیار ہیں۔ سنا ہے کہ وہ ایک دو اور شرطوں کی بات کر رہے ہیں....."

"یہ آپ لوگوں سے کس نے کہا ہے؟" سلطان واہلہ درشت لہجے میں بولا۔ "وہ تو سرے سے کوئی بات کرنے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اپنے جوان پتر کا لاشہ دیکھا تھا، وہ آپ کے پتر کا بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"خدا اور واسطہ اے..... خدا رسول دا واسطہ اے۔ ایسی گل نہ کرو۔" بابر کی ماں حاجرہ نے روتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ شاہ فرمان کا لشکار رے مارتا ہوا رنگ بھی مٹی ہو رہا تھا۔

سلطان واہلہ نے سگریٹ سلگا کر اپنے بیش قیمت طلائی لائٹر کو جیب میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی نرمی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بولا۔ "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ آپ..... ایک دفعہ بڑے صاحب سے بھی بات کر کے دیکھ لیں۔ لیکن آج کل تو وہ بہت مصروف ہیں۔ اگلے ہفتے انہوں نے یہاں لیکچر کے کام سے آنا ہے۔ میں ان سے آپ کے لیے ٹائم لینے کی کوشش کروں گا۔"

پیر فضل ہراساں لہجے میں بولا۔ "پر تب تک تو بڑی دیر ہو جائے گی۔ وکیل پرا چہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے، اتوار کے دن تک کر لو۔ ورنہ....." شاید وہ آگے بھی کچھ کہتا مگر روتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

پیر فضل نے بڑی عاجزی سے سلطان واہلہ کو اشارہ کیا کہ وہ علیحدہ ہو کر اس کی بات سن لے۔ دونوں کوریڈور کی طرف چلے گئے۔ پانچ دس منٹ بعد دونوں کی واپسی ہوئی تو پیر فضل کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی ڈاڑھی پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ لیکن دونوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جہاں دیدہ اور تحمل مزاج پیر فضل کسی حد تک سلطان واہلہ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سلطان واہلہ نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ بڑے صاحب (شاہ لاہوری) اتوار کے بجائے منگل یا بدھ کو یہاں کا چکر لگا لیں۔ زیادہ لوگوں کو لانے کی ضرورت نہیں۔ یہی جو پانچ لوگ یہاں ہیں، وہی آ جائیں..... اور ایک دفعہ بات کر کے دیکھ لیں۔ حاجی اشرف کی فیملی تو بالکل کوئی بات نہیں سن رہی لیکن میں کوشش کروں گا کہ حاجی اشرف کو کسی طرح یہاں بلا لوں۔ آگے آپ کی قسمت۔"

پھر وہ سویرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بہن جی! آپ بھی ضرور آئیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں آپ ہی پڑھی لکھی ہیں..... اور آسانی سے بات کر لیتی ہیں۔"

وہ سب کے سب اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ ان ابتلا کی گھڑیوں میں ان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چوڑیروں کی اسی اونچی حویلی کے مکین ہیں جو گردشوں کو خم کرنا نہیں جانتے، جن کو ہوا بھی چھو کر گزرنے سے ڈرتی ہے اور جن کی ایک دھاڑ سے بچے لوگوں کے کپڑے گیلے ہو جاتے ہیں۔ آج وہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ شخص کے پنجے میں تھے۔ ہاں..... اونٹ پہاڑ کے نیچے تھا۔

☆☆☆

بدھ تک کا دن ایک ایک پل گن کر کاٹا گیا تھا۔ چوڑیرو حویلی میں جہاں بس مقدور بھی چھن چھناتے تھے، ایک درجن حفاظ قرآن شب و روز تلاوت میں مصروف تھے۔ عیاشی کی دعوتوں کی جگہ لنگر جاری کیا گیا تھا۔ ترنڈا... منڈ بھیرو اور نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اس لنگر پر آ رہے تھے اور "کاپا کلپ" پر تبصرے کر رہے تھے۔ چوڑیرو حویلی والے اچھی طرح جان چکے تھے کہ اس خوفناک تالے کی اصل کنجی اس شاہ لاہوری کے پاس ہے۔ ورنہ حاجی اشرف اور اس کے خاندان کی کیا حیثیت تھی۔ ان کو تو کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لیا تھا چوڑیرو والوں نے۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑیاں آئیں، جب حویلی کی روتی سسکتی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ شاہ لاہوری کے سامنے پہنچیں۔ انہیں وسیع ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد اندرونی دروازہ کھلا۔ دراز قد شاہ لاہوری اپنے منیجر اور سیکرٹری کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ کاٹن کی شاندار شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا..... چھوٹی چھوٹی نفیس ڈاڑھی اور فریم لیس عینک میں بڑا وجیہہ لگ رہا

تھا۔ سویرا نے دھیان سے اسے دیکھا اور اسے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کبھی وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ یا پھر... اس کی نگاہ درست کام نہیں کر رہی تھی۔ اسے لگا کہ جو شخص ابھی کلمات ادا کرنے کے بعد سامنے اٹالین صوفے پر بیٹھا ہے، وہ دلاور ہے۔ وہی دلاور جو چوہدری حویلی کا ڈرائیور رہا تھا، گارڈ رہا تھا۔ کار خاص رہا تھا اور پھر ایک گماشتے نے احترام کے ساتھ مار دیا گیا تھا۔

سویرا تالاب میں تھی لیکن اس کی آنکھیں اور پیشانی تو گہرائی دے ہی رہی تھی۔ اس نے چادر کھینچ کر اپنی پیشانی کو کچھ اور چھپایا... لیکن اسے لگا کہ یہ چھپانا بے کار ہے وہ جو کوئی بھی تھا، اسے دیکھ چکا ہے اور پہچان چکا ہے۔

"جی کہیں۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ ٹھہری ہوئی بھاری آواز میں بولا۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔

کون تھا جو اس کی بات کا جواب دیتا۔ سب کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں حیرت کا سمندر رقصاں۔

شاہ فرمان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "تم تم... آپ؟" اس سے آگے اس کی زبان بند ہو گئی۔

سویرا نے دیکھا، پیر فضل اور بڑی آپا بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ رعب دار آواز میں بولا۔ "اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو اڑتی اڑتی سی باتیں آپ نے سنی تھیں کہ دلاور اوپر گیا ہے... دلاور اوپر نہیں گیا۔ حضور چانڈیو کے پاس ہے۔ دلاور اوپر ہے وہ غلط نہیں تھیں۔ میرا جرم تو بہت بڑا تھا اور مجھے واقعی مر بھی جانا چاہیے تھا لیکن... بس اللہ کی مرضی تھی۔ اس تالاب میں سے نکلتے وقت میں بالکل مردہ نہیں تھا، کوئی دو چار سانسیں باقی تھیں میرے اندر..."

یہاں کون تھا جو اس کی باتوں کا جواب دیتا... یا اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ بھی سکتا۔ وہ سب لرزاں و ترساں کھڑے تھے یوں کہ کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں اگر کوئی کم لرزاں اور کم حیران تھا تو وہ سویرا تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

وہ پھر اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ کیوں اس کے سامنے آ گیا تھا؟ ہزاروں سال پہلے جب اس روہی کے گرد قدیم بستیاں تھیں، وہ شاید ان بستیوں میں بھی نظر آتا تھا۔ بار بار اس کے سامنے آ جاتا تھا... دور رہ کر بھی اس کے آس پاس ہی ہوتا تھا...

تم کب تک مجھ کو بھولو گے

اس وحشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ ان دیکھی سی راہوں میں
کچھ ان دیکھے سے سائے ہیں، جو ساتھ مرے ہی چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں اک گرم و پھریری مستی میں
اک خام خیال سی ہستی میں
کچھ ان چھوئے سے جذبے ہیں، جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

وہ اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اردگرد سے بے خبر ہو کر سب سے جدا ہو گئی تھی۔ کمرے میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ حاجرہ اور بڑی آپا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور تو اور... شاہ فرمان کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ وہ دلاور سے پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا مگر سارے لفظ عاجزی کے تھے شکست کے تھے اور ہزیمت کے تھے۔ شاہ فرمان کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سویرا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ٹوٹے ٹوٹے سے فقرے تھے... "اللہ نے تجھے بڑی اونچی شان دے دی ہے دلاورے۔ ہم سے پرانے بدلے نہ لے۔ جو ہو گیا ہم نے اس پر مٹی ڈال دی، تم بھی ہمیں معاف کر دو۔ جرم تھا تو بھی کر دو، نہیں تھا تو بھی کر دو۔"

پیر فضل بھی اسی طرح کے جملے بول رہا تھا۔ کچھ جملے سویرا کی سمجھ میں آ رہے تھے، کچھ نہیں آ رہے تھے۔ پھر اچانک بڑی آپا بری طرح چلا اٹھیں۔ بابر کی ماں حاجرہ، شاہ لاہوری کے پاؤں پکڑنے آگے بڑھی تھی اور وہیں پر بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

بابر کی والدہ کو آدھ گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔ پیر فضل وغیرہ اسے بہاولپور اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن وہ دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بچے کے لیے معافی نامہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔ اگر جان جاتی ہے تو چلی جائے۔

آخر فیصلہ کن مرحلہ پہنچ گیا۔ شاہ لاہوری یعنی دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تین شرطیں ایسی ہیں جن کو مانے بغیر یہ مسئلہ کسی صورت بھی حل نہیں ہو سکتا۔"

بابر کے لواحقین تناؤ اور دکھ کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ حاجرہ بیگم نے یہاں تک کہہ دیا۔ "وے میرے پتر!

مجھے تیری شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ تو بس میرے بابر کی گردن سے پھانسی کا پھندا نکلوا دے۔" وہ بلک رہی تھی۔

دلاور نے کہا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ شرطیں سن لیں۔ ویسے یہ کوئی ایسی شرطیں نہیں ہیں جو آپ نہ مان سکیں اور ایک شرط تو بالکل معمولی ہے۔"

"تم بتاؤ دلاور! ہم سن رہے ہیں۔" پیر فضل بے قراری سے بولا۔

"جو زری زمین آپ لوگ ہرجانے میں دے رہے ہیں، وہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہے۔ وہ کم از کم چالیس مربعے ہونی چاہیے۔ پچاس پچاس مربعے زمین تو آپ کے گھر کے ایک ایک بچے کے پاس ہے۔"

یہ شرط فوری طور پر مان لی گئی۔

اس کے بعد دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوسری شرط یہ ہے کہ..... حاجی اشرف کا بیٹا عاطف اور آپ کی بیٹی مہرین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی کوئی بے جوڑ رشتہ نہیں ہے۔ آپ لوگ ان دونوں کے راستے کی دیوار نہ بنیں، ان کی شادی کر دیں۔"

شاہ فرمان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے..... لیکن کچھ بھی تھا شیر لوہے کے جال میں تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ روہی کا سرکش وڈیرا مکافات کے شکنجے میں تھا۔ سب خاموش تھے ..... اور یہ خاموشی بوجھل ہو رہی تھی۔ بڑی آپا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ بات پہلے بھی ہمارے کانوں میں پڑ چکی ہے دلاور..... اور ہم اس بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اب تم نے بھی یہ بات کہہ دی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام بھی ہو جائے گا۔ بس ہم حویلی میں تھوڑا سا مشورہ کر لیں۔"

"مشورہ کس سے کرنا ہے آپ نے؟" دلاور چیخ کر بولا۔ "مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ سارے "مشورے والے" اسی جگہ یہاں موجود ہیں۔ جو کچھ ہو جانا ہے، اب یہیں پر ہو جانا ہے یا پھر نہیں ہونا۔"

دلاور کو برہم دیکھ کر ایک بار پھر چوڑیر و حویلی کے سرخیلوں کے رنگ اڑ گئے۔ حاجرہ بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ شاہ فرمان، پیر فضل اور بڑی آپا وغیرہ نے تھوڑی دیر تک سر جوڑ کر باتیں کیں۔ اس دوران میں ڈرائنگ روم کے اندر عجیب سنسنی خیز ماحول رہا۔ آخر شاہ فرمان نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔ "جس میں بچے خوش ہیں، ہم بھی اس میں خوش ہیں۔ ہمیں یہ شرط منظور ہے۔"

سویرا ایک طرف بیٹھی بہوت، سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اب سب کو تیسری شرط کا انتظار تھا۔ دل دھڑک رہے تھے۔ دلاور نے کہا۔ "تیسری شرط بھی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہے لیکن یہ میرے لیے بہت بڑی ہے۔" اس نے چند لمحے رک کر بڑی آپا کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "میں ایک بھوکا ننگا غریب تھا اور بھوکے ننگے غریبوں کے لیے عزت سے قیمتی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس یہی ان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ آپ کو اچھی طرح پتا ہے، چار سال پہلے آپ کی اپنی حویلی میں مجھ سے یہ سرمایہ چھینا گیا۔ مجھ پر چوری کا الزام لگا اور اس سے بھی بڑا الزام یہ لگا کہ میں نے ... اپنی مالکن کو بے عزت کرنے کی کوشش کی۔ وہ مالکن جس کو میں آنکھ بھر کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا ..." دلاور کی آواز بوجھل ہو گئی۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ سب سکتہ زدہ تھے۔ دلاور نے شاہ فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس بات کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ شاہ فرمان! تمہیں ابھی سب کے سامنے اس رات کی اصل حقیقت بتانا ہوگی۔ یہی تیسری شرط ہے۔"

شاہ فرمان کی صورت دیدنی تھی۔

..... اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہی کچھ ہوا جو دلاور چاہتا تھا۔ اپنے اندر کی ساری تڑپ پھڑک کے باوجود شاہ فرمان کو یہ تیسری شرط بھی ماننا پڑی۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار اپنی کسی غلطی کو تسلیم کیا ہوگا..... سویرا آنسوؤں میں ڈوبی یہ سب کچھ سنتی رہی۔ شاہ فرمان نے اعتراف کیا کہ وہ نیچ ترین اور رذیل ترین کارندوں کی باتوں میں آ گیا تھا۔ نشے کی حالت میں اس سے ایک غلط فیصلہ ہو گیا۔ وہ گول مول بات کر رہا تھا مگر دلاور کے کاٹ دار نہایت چبھتے سوالات کے جواب میں شاہ فرمان کو بتانا پڑا کہ دلاور کو سویرا کی نظر سے گرانے اور حویلی سے نکالنے کے لیے اسے یہ منصوبہ بنانا پڑا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس رات چہرہ چھپا کر لاکھوں کے گہنے چوری کرنے والا اور سویرا پر حملہ کرنے والا نیچ ترین کارندہ تھا.....

شاہ فرمان کا رنگ بدلتی ہوا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

سویرا انقلاب کے اوپر سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہی تھی... تم کون ہو..... تم کہاں سے آئے ہو ... ہزاروں سال پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ شاید اس روہی کے کنارے ... شاید انہی ریتیلے کھنڈروں کے آس پاس..... میرے دل کی اتھاہ گہرائی میں جو ایک بے نام سی بھٹی

ہے، اس کا پانی تمہیں جانتا ہے۔ میں نہیں جانتی لیکن وہ تمہیں جانتا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے تم ہمیشہ سے ایسے ہی بے خوف ہو۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن میں جو کچھ ہوا، بڑی تیز رفتاری سے ہوا۔ بلکہ حیران کن تیز رفتاری سے ہوا۔ نہ صرف زرعی زمین کے سلسلے میں ضروری کاغذات تیار ہو گئے بلکہ چند افراد کی موجودگی میں عاطف اور مہرین کا نکاح بھی ہو گیا۔ طے ہوا کہ رخصتی چند ہفتے بعد اچھے طریقے سے کی جائے گی۔ بابر کے ڈیتھ وارنٹ تک جاری ہو چکے تھے۔ متوکل کے لواحقین نے عدالت میں پیش ہو کر معافی نامہ اور دیگر ضروری دستاویزات پیش کر دیا۔

شاہ زمان کے اکلوتے بیٹے کے گلے سے پھانسی کا پھندا نکل گیا۔ مگر وہ فالج کے سبب خود بستر پر جا پڑا۔ شاید اپنی گردن جھکانے اور شرطیں ماننے کا صدمہ بھی اسے اسی طرح ہوا تھا جس طرح بیٹے کی پھانسی کا ہوتا۔ اسپتال میں ہی اسے فالج کا دوسرا شدید اٹیک بھی ہو گیا..... اور وہ کچھ بھی نگلنے کے قابل نہ رہا۔ ایک پھیپھڑا شروع میں ہی بے جان ہو گیا تھا۔

دلاور ابھی اپنی فیکٹری والی کوٹھی میں ہی تھا۔ ایک روز وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیکریٹری منشا ریاض اندر داخل ہوا بولا۔ "جناب! ایک خاتون آپ سے ملنے پر اصرار کر رہی ہے۔ دلاور صاحب نے اسے لان میں بٹھایا ہے۔"

"کون ہے؟" دلاور نے اخبار دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی بڑے اخبار کی رپورٹر ہے۔ کہتی ہے کہ اس کے پاس آپ کے لیے کچھ مفید اطلاعات ہیں اور وہ آپ کو براہِ راست دینا چاہتی ہے۔"

دلاور کے چہرے پر پہلے تو بیزاری کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتا ہوا لان کی طرف بڑھ گیا۔

سرسبز لان پر سرما کی نرم سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ دیدہ زیب سفید میز کے گرد قاعدے کی سفید کرسیاں دھری تھیں۔ ایک کرسی پر ایک برقع پوش خاتون بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ ہاتھ میں فائل تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ رسمی کلمات کے بعد دلاور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے محترمہ۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں تم سنو گے یا نہیں۔"

دلاور نے چونک کر دیکھا۔ برقعے کے نقاب میں سے بس آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا لیکن اگر اس سے بھی کئی گنا کم نظر آ رہا ہوتا تو وہ پہچان لیتا اور اس آواز کو بھی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ سویرا تھی۔

وہ سکتہ زدہ سا اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ بولی۔ "دلاور! اس طرح دیکھو گے تو کسی کو شک ہو جائے گا۔ کوئی بات کرو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فائل اپنے سامنے میز پر پھیلا لی۔

وہ اپنی لرزش کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہ امید تو تھی کہ آپ سے ملاقات ہو گی لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ اس طرح ہو گی۔"

"میں تم سے ملنا چاہتی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔" وہ بوجھل آواز میں بولی۔ "کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہو گا مجھ سے بات کرنے کے لیے؟"

دلاور کا دل بھر آیا۔ بے ساختہ بولا۔ "سویرا بی بی! آپ کہیں تو ساری زندگی اسی طرح بیٹھ کر آپ کی بات سن سکتا ہوں۔"

وہ کبھی سویرا بی بی کہنے پر ناراض ہو جایا کرتی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، بس نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔ "دلاور..... سب سے پہلے تو..... تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے..... تم نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مجھے..... ایک ایک بات یاد ہے..... میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"آ..... آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔ آپ تو ہانکن ہیں۔ میری وجہ سے رسوائی ہوئی آپ کی..... دکھ ملا آپ کو..... معافی تو مجھے مانگنی ہے۔"

سرسبز گراسی لان کے اوپر سرما کا سورج تھا۔ دریا کی طرف سے آنے والی ہوا دھوپ کو مزید خوشگوار کر رہی تھی۔ وہ دونوں جیسے اردگرد کی ہر چیز، ہر منظر سے کٹ گئے تھے۔ بس ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے اور ایک دوسرے کو سن رہے تھے۔ دل کے پھپھولے پھوٹنا شروع ہوئے تو پھوٹتے چلے گئے۔ ایک موقع پر سویرا نے اشک بار آواز میں کہا۔ "میں اس بات پر خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گی کہ وہ لوگ تمہیں میرے سامنے بے دردی سے مار رہے تھے اور میں تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ پچھلے چار سالوں میں وہ بات شاید ایک پل کے لیے

بھی میرے ساتھ سے نہیں نکلی دلاور....."

دلاور نے کہا۔ "میرے ان سارے زخموں پر، آپ کی بس یہ ایک بات ہی مرہم رکھ رہی ہے کہ آپ کو بھی مجھ پر لگنے والے الزام کا یقین نہیں ہوا....."

گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی۔ لمحے پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ ایک ملازم دو دفعہ چائے رکھ کر جاچکا تھا اور اب دلاور اسے تیسری مرتبہ طلب کرنے والا تھا۔ سویرا کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ اب جاننا چاہ رہی تھی کہ اس رات کے نیولہان آغاز کے بعد دلاور پر کیا بیتی۔ وہ کہاں کہاں سے ہوتا ہوا "لاہوری انٹرپرائزز" کی شاندار منزل تک پہنچا اور اس کے دیگر حالات کیا ہیں؟

دلاور تو ہمیشہ سے سویرا کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ جن کی ذات سے عشق ہوتا ہے، ان سے کچھ بھی چھپایا نہیں جاتا۔ شاید چھپایا جا ہی نہیں سکتا۔ دلاور نے دھیرے دھیرے سب کچھ سویرا کے گوش گزار کردیا۔ وہ حیرت میں غلطاں سنتی رہی۔ کئی سن وزنی آہیں ایکسل کے ساتھ دلاور کا پانی سے لڑنا، حضور چانڈیو کی سبز حویلی میں پہنچنا، زخموں کا علاج کرانا، پھر حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر کے ساتھ بحری سفر..... بحری سفر میں پیش آنے والا وہ خوفناک خونیں واقعہ جب بے شمار مالیت کا جیولری باکس سمندری پانی میں گرا۔ دلاور کا باکس کو ڈھونڈ لینا لیکن پھر اسے وہیں پر چھپا رہنے دینا..... دلاور نے سب کچھ سویرا کو کہہ سنایا۔

وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا اور بول رہا تھا..... "میرے اندر کچھ بدل چکا تھا سویرا بی بی..... ان اجنبی حویلی والوں نے مجھے اندر سے تبدیل کردیا تھا۔ ورنہ میں نے تو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں حضور چانڈیو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ دبئی پہنچ گیا۔ وہاں میں اور نگرانی رشید دو مہینے سے زیادہ نہیں رکے۔ رشید نے ایک زخمی عربی کو خون دیا تھا۔ ان لوگوں نے بخشش کے طور پر اسے کوئی پندرہ بیس ہزار ریال دیے۔ کچھ ریال ہم نے دیسے کمائے تھے۔ یہ ساری رقم لے کر ہم واپس سے واپس "برکا" پہنچے۔ نگرانی رشید بحری جہاز کا لوڈر رہا تھا اور کئی ملاحوں سے اس کی واقفیت تھی۔ میں نے اسے جیولری باکس کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر کے ایک لانچ کا بندوبست کیا..... اور ایک نتیجے کا انتظام بھی کرلیا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ایک روز کے پُرخطر سفر کے بعد ہم کھلے سمندر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پرندے کی چونچ جیسا بڑا پتھر سمندر میں سے نکلا ہوا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اس جگہ کو "برڈ سائٹ" کہتے ہیں۔ غوطہ خوری کا کچھ سامان بھی ہماری لانچ پر موجود تھا مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ تیسرے غوطے میں ہی میں پتھروں میں پھنسے ہوئے اس جیولری باکس تک پہنچ گیا.....

"میرا خیال ہے کہ اب آپ کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کافی کچھ سمجھ گئی ہوں گی۔ مجھے اس منزل تک پہنچنے میں اس جیولری باکس نے بہت مدد کی ہے۔ میں نے بن باقر قبیلی کے کچھ خاندانی زیورات کو چھوڑ کر باقی جیولری مسقط، دوبئی اور کراچی میں مختلف جگہوں پر فروخت کی۔ میرے پاس ایک کافی بڑی رقم آگئی۔ میں اس رقم کو کہیں لگانا چاہتا تھا۔ آخر میں نے اسے ایک محفوظ کاروبار میں انویسٹ کردیا۔"

"کون سا کاروبار؟" سویرا نے پوچھا۔

"مجھے معلوم تھا آپ یہ سوال کریں گی۔" دلاور نے کہا اور کچھ کھوسا گیا۔ چائے کی دو چسکیاں لے کر بولا۔ "شاید آپ کو عجیب لگے گا کہ میں نے آسان کاروبار چھوڑ کر ایک مشکل میدان کیوں منتخب کیا..... سویرا بی بی! میں نے دبئی میں "سی ڈائیونگ" کا ایک بڑا ٹریننگ سینٹر خریدا اور اس کو مزید وسیع کردیا۔ یہ مارکیٹ میں غوطہ خوری کے چند بڑے تربیتی مراکز میں سے ایک ہے۔"

"میں..... واقعی حیران ہورہی ہوں۔" وہ بھی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

دلاور نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ روہی کی ہوا نے بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھیر دیں۔ اس نے کہا۔ "سویرا بی بی! مجھے اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں پانی ہی کا بیٹا ہوں۔ جس تودے سے سرفودم گھاٹ کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، اس نے مجھے دریائے راوی کے پانیوں سے ہی تو نکالا تھا اور اپنی بانجھ بیوی کی گود میں ڈالا تھا۔ وہی جس کا آدھا سر سفید تھا اور آدھے بال مہندی رنگے تھے۔ وہ میری سگی ماں کبھی تھی لیکن اس نے سگی ماؤں کی طرح ہی میری پرورش کی تھی۔ چاچا سرفو لاہور کا بلکہ شاید پورے پنجاب کا نامور فوٹو گرافر تھا۔ اپنی جوانی میں اس نے بڑے یادگار کام کیے تھے۔ بڑھاپے میں اس نے اپنا فن مجھے سونپ دیا۔ اس نے مجھے گہرے پانیوں کی مچھلی بنادیا۔ لیکن یہاں میرے فن کی قدر کرنے والا کون تھا۔ میں باہر کے کسی ملک میں ہوتا تو شاید مجھے گولڈ میڈل ملتے..... مجھ پر ڈالروں کی بارش ہوتی لیکن یہاں مجھے ناقدری اور غربت کی بارش نے کچھ لون (نمک) کی طرح کھورد یا۔ ایک بار میں

ملازمت کے لیے ایک محکمے میں گیا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ ایک بار تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لینا چاہا لیکن ناکام ہوا..... پرائیویٹ ایف اے کرنے والے کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ آخر در بدر ہوگیا۔ پیٹ پالنے کے لیے چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے لگا۔ بڑی آپا اور شاہ فرمان جیسے سخت مزاج لوگوں کا چاکر ہوگیا۔ شاید یہی وجہ تھی ..... کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنے ''غوطے'' کی پوری قیمت وصول کی۔ برڈ سائٹ پر اس طوفانی شام میں وہ ''غوطہ'' صرف میں لگا سکتا تھا اور میں نے لگالیا.....''

وہ چند سیکنڈ چپ رہ کر بولا۔ ''سوری سویرا بی بی! بات دوسری طرف نکل گئی۔ میں بتا رہا تھا کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے بھی میرا ناتا پانی سے ہی تھا۔ اس لیے جب میرے پاس سرمایہ آیا تو میں نے اسے اس فن میں لگایا جو میرے اپنے اندر موجود تھا۔ میں نے ''سی ڈائیونگ کی ٹریننگ'' کے کام کو چکایا اور وہ ایسا چمکا کہ مجھے نہال کر گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مجھے اتنی جلدی اتنی بڑی کامیابیاں ملیں گی۔ اب خلیج میں میرے آٹھ بڑے ٹریننگ سینٹر ہیں۔ ایک سینٹر کراچی میں تیار کروا رہا ہوں جس کا سارا چارج نگرانی رشید کے پاس ہے۔ وہ ایک بہترین دوست اور پارٹنر ثابت ہوا ہے۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے میں دبئی میں شیخ بن باقر سے ملا تھا۔ میں نے پہلے اس سے معافی مانگی پھر اس کا سارا پیسا، منافع سمیت اسے واپس کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اسے مزید خوشی اس بات کی تھی کہ اسے اس کے باقی خاندانی زیورات بھی جوں کے توں واپس مل گئے تھے۔ آج کل ..... میں کچھ اور چھوٹے موٹے کام بھی کر رہا ہوں۔ جیسے آپ کے گوٹھ کے پاس یہ فیکٹری.....''

سویرا اور دلاور کی گفتگو کو بریک لگ گئے، تازہ چائے آگئی تھی۔ سویرا نے ابھی تک صرف ایک کپ پیا تھا۔ دلاور کے اصرار پر اس نے دوسرے کپ پر آمادگی ظاہر کی۔ دلاور نے خود چائے بنائی ..... اور کپ اس کی طرف بڑھایا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ..... کہ کہیں وہ اپنی انگلیوں سے اس کی انگلیوں کو نہ چھو لے۔ وہ نقاب کو ذرا... سرکا کر چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ ناگاہ دلاور کی نگاہ اس کے ہونٹوں پر پڑی۔ وہ جیسے سرتاپا جھنجھنا اٹھا۔ وہ اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ ان حسین گداز ہونٹوں سے اس کا ایک پرانا ناتا تھا۔ ایسا ناتا جس سے ''ہونٹوں والی'' بھی بے خبر تھی۔ دلاور کو لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی آگئی ہے۔

موبائل فون کے سگنلز نے دلاور کی مشکل آسان کی۔ یہ فون سویرا کے شولڈر بیگ میں گنگنایا تھا۔ اس نے اسکرین دیکھی لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ اب مضطرب نظر آنے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے حویلی سے نکلے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب اسے جانا ہوگا۔

دلاور نے کہا: ''کیا آپ دوبارہ آسکیں گی؟''

''پتا..... نہیں۔'' وہ تذبذب سے بولی۔

''آپ نے تو مجھ سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ ایک دو باتیں میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔'' دلاور کے لہجے میں درخواست تھی۔

اس نے ایک بار دلاور کی آنکھوں میں دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ''اچھا..... دو تین دن میں کوشش کروں گی.....''

پھر وہ عجلت میں چلی گئی۔ وہ دو تین دن کا کہہ رہی تھی، وہ دو تین زندگیاں انتظار کر سکتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کورے کار کو خود ڈرائیو کر کے آئی تھی، اسی پر واپس روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

چوڈیرو والی کوٹھی کے عقبی لان میں دلاور نے ایک چھوٹا سا خوبصورت تالاب بنوا رکھا تھا۔ نیلے ٹائلوں والا۔ اس میں اترنے کے لیے چمکیلے اسٹیل کی سیڑھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے پانی کے اوپر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پانی کی جانی پہچانی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ وہ ایک بے مثال غوطہ خور تھا۔ اس نے عشق کے پانیوں میں بھی ایک طویل ..... بہت طویل غوطہ لگایا تھا مگر گوہرِ مقصود آج بھی اس سے اتنا ہی دور تھا، جتنا بہت برس پہلے تھا..... شاید ہزاروں برس پہلے تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ سیکریٹری منشا نے آکر اطلاع دی کہ اس دن والی میڈم آئی ہیں۔ دلاور کے سینے میں جلترنگ سا بج اٹھا۔ وہ پل پل اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد دلاور اور سویرا سنہری دھوپ والے ہرے بھرے لان میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ملازم چائے اور لوازمات لے آیا تھا۔

''آج میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دلاور! تم کیا کہنا چاہتے تھے؟'' سویرا نے آدھے نقاب کی اوٹ سے پوچھا۔ آواز میں کسی بے نام دکھ کی لہر تھی۔

دلاور بات کو کسی دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو سوچا ہوتا ہے۔ دلاور کے منہ سے بھی بے ساختہ جو بات نکلی،

وہ کچھ اور تھی اس نے دلنا کہا۔ ''سویرا! میں اپنی حیثیت جانتا ہوں اور آپ کا مرتبہ بھی ... ہم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن کیا ..... کسی طرح، ایسا ہوسکتا ہے کہ ..... یہ زمین اور آسمان ... مل سکیں؟''

ایک چھناکا سا ہوا۔ جیسے ہزار ہا قمقموں والا کوئی فانوس دھماکے سے فرش پر گرے اور چکنا چور ہوجائے۔ وہ سکتہ زدہ نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ دلاور بھی پتھرایا ہوا تھا۔ اس کے لیے کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ گردش جب دوبارہ بحال ہوگی تو کس ڈھنگ سے ہوگی؟ سویرا کا ردعمل کیا ہوگا؟ خاموشی طویل اور بوجھل ہوتی چلی گئی۔ دلاور کے ضبط کے تار تناؤ کے سبب ٹوٹنے لگے۔ آخر وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔ ''تم نے یہ کیسے سوچ لیا دلاور؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے... ہم ..... مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ تم سے ..... کوئی ایسی بات سنوں گی۔''

نہ جانے اتنا حوصلہ دلاور کے اندر کہاں سے آ گیا تھا۔ شاید یہ حوصلہ اسے اس کی انوکھی اور سچی محبت نے دیا تھا جو برسوں بڑی خاموشی سے اس کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی۔ وہ بولا ''سویرا! اگر آپ نہ چاہیں تو کچھ نہیں ہوسکتا..... اور اگر آپ چاہیں تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ہر رکاوٹ گر سکتی ہے، ہر دیوار رستہ دے سکتی ہے۔ سب کچھ آپ پر ہے۔ صرف آپ پر۔''

وہ گم صم تھی، بس اس کی خوبصورت آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کا اور دکھ کا سمندر تھا۔

وہ بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ خوف ہماری خوشیوں کو کھا جاتا ہے سویرا..... اور عورت کا خوف تو اس کی پوری زندگی برباد کردیتا ہے۔ اس خوف سے نکل آنا ہی، اصل میں جینا ہے۔ آپ کی بہت سی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ چودھری حویلی کی وہ دیوار اشاہی دم توڑ رہی ہے۔ وڈا چودھری ایک زندہ لاش کی طرح اسپتال میں پڑا ہے۔ آپ کے پنکھ ہیں، آپ اڑ سکتی ہیں ..... اگر آپ اڑنا چاہیں .....'' اس نے سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے حد اعتماد سے کہا۔ ان لمحوں میں وہ صرف دلاور نہیں تھا... دلاور شاہ لاہوری تھا۔

سویرا نے نہایت بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ کسی صورت نہیں۔ تم جانتے نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم ایسی بات کہو گے۔ یہ تو آگ میں چھلانگ لگانے والی باتیں ہیں۔ تم ..... میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا تھا.....''

''آپ غلط کہہ رہی ہیں..... آپ غلط کہہ رہی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر زور دے کر بولا۔ اس کا سارا وجود اندر ہی اندر اضطراب سے لرزنے لگا تھا۔

سویرا نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں، وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو بری طرح مروڑ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انداز مستحکم تھا۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے ..... جانا چاہیے...''

روہی کی ہوا کراہ اٹھی۔ دھوپ کا رنگ ہلدی جیسا ہوگیا۔ اونچے پیڑوں نے اور جھوٹے قد کے دکھوں نے دکھ سے اپنے سر جھکا لیے۔ دلاور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی واسکٹ میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہی ایک خط میں نے برسوں پہلے آپ کو دینے کے لیے لکھا تھا۔ وہ آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کی جگہ یہ خط دے رہا ہوں۔ میری آخری درخواست ہے کہ اس خط کو ایک بار پڑھ ضرور لیجیے گا۔''

سویرا نے منع نہیں کیا تھا تو دلاور نے اسے اس کے شولڈر بیگ کی بیرونی پاکٹ میں ڈال دیا۔ ''خدا حافظ!'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''خدا حافظ!'' دلاور نے خود کو بمشکل سنبھال کر کہا۔ وہ مین گیٹ کی طرف چل دی۔

تم کب تک مجھ کو بھلا دو گے ..

☆☆☆

روہی کے اوپر گہرے تاریک آسمان پر تاروں کے جھرمٹ تھے۔ کیکروں، ٹاہلیوں اور بیریوں سے گزر کر آنے والی ہوا، دلاور کے بالوں کو اس کی پیشانی پر لہرا رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی کی چھت پر لوہے کی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ ابھی ابھی سلطان دلہ نے اسے اطلاع پہنچائی تھی کہ شاہ فرمان اسپتال سے لاعلاج ہوکر حویلی آ گیا ہے۔ اب اس نے جتنی دیر بھی جینا تھا، شاید بستر پر ہی جینا تھا۔ بڑی آپا نے حویلی کی باگ ڈور اپنے کمزور ہاتھوں میں لے لی تھی۔ بابر ابھی جیل میں تھا۔ ویسے بھی ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ باپ کی پگڑی سر پر رکھ سکتا۔ باقی اولاد اس سے بھی چھوٹی تھی۔

پرسوں جو خط دلاور نے سویرا کو دیا تھا، اس کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا۔ یہ خط اس نے پرسوں اس وقت جلدی

جلدی گھسیٹا تھا جب ایک فون سننے کے بہانے وہ سویرا کے پاس سے اٹھ کر اندر گیا تھا۔ وہ خط کچھ اس طرح تھا۔

''سویرا! میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جو کچھ ہے بس آخری بار ہے۔ ہفتے کی شام جل گوٹھ میں سائیں رحیم کے بیٹے کا ولیمہ ہے۔ آپ کے گھر سے بھی لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ بھی جا رہی ہوں گی۔ آپ کو یاد ہوگا جب کئی برس پہلے آپ نے مجھے تحفے میں گھڑی دی تھی تو میں نے بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ہمت دکھائی تھی اور آپ کو گلابی پھولوں والی ایک کشمیری شال کا تحفہ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ وہ اوڑھیں گی مگر میں نے وہ کبھی آپ کے جسم پر نہ دیکھی۔ اگر آپ نے میری جسارتوں کو نظر انداز کر کے، میری التجا کے بارے میں کچھ سوچا ہے..... اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ہے تو پلیز..... مجھے بے خبر نہ رکھیں۔ میں نے اس شال کا ذکر بھی اسی حوالے سے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ ہاں سویرا..... ہفتے کی شام میری زندگی کے لیے بہت اہم ہوگی..... بہت ہی اہم۔ میں جانتا ہوں وہ شال اب بھی آپ کے پاس موجود ہے..... اگر آپ وہ شال اوڑھ کر آئیں گی تو میں اپنی قسمت پر ناز کروں گا..... روئے زمین پر مجھ جیسا خوش قسمت اور کوئی نہ ہوگا اور اگر آپ نہیں اوڑھیں گی تو..... میں سمجھ جاؤں گا کہ مجھے اب کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھانی۔ میں ہمیشہ کے لیے پاکستان سے نکل جاؤں گا لیکن سویرا! اس میں بھی آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ ہاں سویرا! مجھے..... اپنی مری ہوئی ماں کی قسم ہے، میں کوئی گلہ نہیں رکھوں گا۔ آپ نے محبت کی جو دولت مجھے دے رکھی ہے، وہ ملاپ یا جدائی کی مرہونِ منت نہیں..... اور نہ کبھی ہوگی۔

خدا حافظ!''

خط کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا، اس کے ذہن میں پیوست تھا۔ اس کے جدید سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس کے لیے دبئی سے اس کے ایک منیجر کی کال تھی۔ وہ کوئی پاکستانی ہی تھا بولا۔ ''سر! سنگاپور سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چیف انسٹرکٹر سے ملنا ہے۔ وہ ''سی ڈائیونگ'' کے حوالے سے ایک بڑا شو کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس میں چند منٹ کی پرفارمنس دیں۔ چار پانچ منٹ کی لائیو پرفارمنس کے لیے وہ ایک لاکھ ڈالرز کی آفر کر رہے ہیں۔''

''کب ہے شو؟''

''اتوار کی دوپہر۔''

''ریجیکٹ کر دو۔ میں اتوار کے روز یہاں سے نکل سکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رحیم سائیں کے گاؤں کا نام جل گوٹھ تھا۔ رحیم سائیں نے بیٹے کی شادی تو عام سے انداز میں کی تھی مگر ولیمے میں ساری کسر نکال دی تھی۔ گوٹھ سے باہر دور تک قناتیں اور خیمے لگے ہوئے تھے۔ جنریٹرز کی مدھم گھوں گھوں میں ہر طرف بجلی کے لشکارے تھے۔ ڈھول تاشے، ناچ گانا، آتش بازی، غرضیکہ خوشی کا ہر رنگ یہاں موجود تھا۔ ڈیڑھ ہزار مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صوبائی وزیر، ایم این اے، سابق ایم این اے، ایم پی اے، اعلیٰ سرکاری افسران، نامی گرامی وڈیرے، ہر طرح کے لوگ یہاں موجود تھے۔ دلاور شاہ لاہوری، ان لوگوں میں سے تھا جنہیں یہاں خاص الخاص مہمانوں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اردگرد کیمرے بار بار چمکارے مار رہے تھے۔ رنگ و روشنی کی اس برسات میں دلاور کی نگاہیں کسی کا انتظار کر رہی تھیں..... دھڑکنیں زیروزبر تھیں۔ پل پل ایک پہاڑ تھا۔ بالآخر چوڈیرو حویلی کی دو پجارو گاڑیاں نظر آئیں۔ دلاور ہر طرف سے کٹ کر ان گاڑیوں کو دیکھنے لگا..... مجسم نگاہ بن گیا۔ سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ گاڑیوں میں سے چوڈیرو حویلی کے لوگ اترنے لگے۔ پہلے زرق برق لباس میں بڑی آپا اتریں پھر حاجرہ بیگم، پھر نگینہ بیگم اور دیگر عورتیں..... ایک ایک کر کے سب اتر گئے۔ گاڑیاں خالی ہو گئیں۔ دلاور کا دل ڈوب گیا۔ ہر طرف تاریکی چنگھاڑنے لگی۔ تو کیا وہ آئی ہی نہیں؟ اس نے خود کو حویلی کی اونچی دیواروں میں محبوط کر لیا ہے..... وہ دیوانہ سا ہو کر مہمانوں کے درمیان سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خیموں سے آگے نکل گیا۔ اسے پتا چلا کہ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ چوڈیرو حویلی سے شاید ایک یا دو گاڑیاں مزید آنا تھیں۔

اس کی دھڑکنیں زیروزبر تھیں۔ سانسیں الجھ رہی تھیں۔ وہ ریتیلے ٹیلوں میں تھوڑا آگے نکل گیا۔ چند قدم کی دوری پر وہی تالاب تھا جہاں دلاور نے سویرا کو پہلی بار دیکھا تھا..... مرحوم شاہ زمان اور سویرا، جیپ سمیت بارشی تالاب میں گر گئے تھے..... یہیں پر..... ہاں یہیں پر وہ یادگار واقعہ ہوا تھا جس نے دلاور کے جسم و جاں میں لازوال عشق کا بیج بویا تھا۔ پاکیزہ..... بے غرض..... اور فاصلے کا عشق..... اجنبی سناٹوں کی طرح خاموش..... یکسر خاموش۔ یہی وہ پیڑ تھے جن کے نیچے اس نے نیم بے ہوش سویرا کو لٹایا تھا..... اور..... اس کے نایاب ہونٹوں کو چھوا تھا۔ یہیں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی..... اور شاید آج

اسے..... یہیں پر ختم ہوتا تھا۔

روہی کا ذرہ ذرہ منتظر تھا۔ بابا فرید کی آواز جیسے نشیب و فراز میں گونج رہی تھی..... یہ عشق آسان نہیں۔ منٹی نہ۔ چھڑ لے فریدا..... یار گواچے نیں لبھدے (لیکن اس کا یار تو ابھی گم نہیں ہوا تھا)

اور پھر اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ چوڑا بردھولی کی ایک اور ٹویوٹا جیپ عظیم الشان ٹیلوں کی "سین انرنس" کے سامنے آن کر رکی تھی۔ کائنات کی گردش تھم گئی اور اسی کائنات میں اس کا دل بھی تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ان لوگوں کو دیکھتا جا رہا تھا جو جیپ سے اتر رہے تھے۔ پھر ایک چودھرائی کے عقب میں اسے سویرا نظر آئی۔ دلاور کی جان لبوں پر آ گئی۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا کہ وہ بھسم ہو گیا ہے اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ہلکے نسواری اور کریم لباس والی سویرا نے ایک پتلی سی سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ وہی سفید شال جو بیوگی اور اندوہ کی علامت ہوا کرتی ہے..... دلاور کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ وہ جیسے بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ دوبارہ جیپ کی طرف دیکھا۔ سویرا ادھ کھلے دروازے کے عقب میں تھی۔ اس نے سفید چادر اتار کر جیپ میں رکھی..... اندر سے، نفاست سے تہ کی ہوئی گلابی پھولوں والی کشمیری چادر نکالی۔ عجیب دلنشین انداز میں سر جھکائے ہوئے اس نے یہ شال اوڑھ لی۔ اسے کندھوں پر درست کیا اور دیگر عورتوں کے ساتھ شامیانوں کی طرف بڑھنے لگی۔

تھمی ہوئی کائنات دوبارہ گردش میں آ گئی۔ روہی کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ دلاور کا دل دوبارہ متحرک ہو گیا۔ آسمان پر کروڑہا ستاروں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خوف کے پتھر پر قطرہ قطرہ گرنے والی محبت نے اس میں سوراخ ہی نہیں کیا تھا، اسے چکنا چور بھی کر دیا تھا۔ دلاور تیم تاریکی میں کھڑا مسلسل سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بے شکل چاہ گئی اس دیکھنے میں۔ کسی درویش کے بول دلاور کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔

تیرے عشق دے وچ معشوقِ نا ہو، میں اج تک ظلمت نگاہ کیتی
تیری ہر ملاقات میں اج کیتی جیویں موسیٰ نال خدا کیتی
اک تینوں رب نیں کہہ سکدا باقی ساری رسم ادا کیتی

اے میرے محبوب! میں نے آج تک تجھے ظلمت نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے ساتھ میری جو بھی ملاقات تھی وہ ایسی ہی تھی جیسی موسیٰ اور خدا کے درمیان ہوتی تھی (اپنے شوق اور جذب کا بیان کیا کرو) میں بس تمہیں خدا ہی نہ کہہ سکا ورنہ دل میں تیرا رتبہ خدا کے قریب قریب ہی رہا ہے۔۔۔

"سویرا.....!" دلاور نے دل ہی دل میں کہا اور شامیانوں کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

منظر اسی کوٹھی کے ڈرائنگ روم کا تھا جہاں آج کل دلاور قیام پذیر تھا۔ دلاور کے سامنے سویرا کی پھپھو پروفیسر عالیہ بیٹھی تھیں۔ عینک اور تین چوتھائی سفید بالوں والی انتہائی سمجھدار اور زیرک خاتون وہ مسلسل رو رہی تھیں اور بار بار اپنے سفید رومال سے آنسو پونچھتی تھیں۔ یہ یقیناً خوشی کے آنسو تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "دلاور! خدا گواہ ہے، مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو چکا ہے..... مجھے لگتا ہے کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ سویرا تم سے شادی پر رضامند ہو چکی ہے۔ اس کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا ہے اپنے پنجرے سے نکلنے کا..... اپنے جال کو توڑنے کا۔ لیکن وہ اب بھی بہت ڈری ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے ایک دو باتیں کہی ہیں جو میں تم تک پہنچانا چاہتی ہوں بیٹا۔" وہ بے حد محبت بھری عاجز آواز میں بولیں۔

"آپ حکم کریں پھپھو! میں سویرا کو اپنانے کے لیے ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ ہر حد تک جا سکتا ہوں۔"

پھپھو عالیہ، دلاور کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔

"وہ شرطیں منوانے والی نہیں ہے دلاور۔ وہ تو..... وہ تو تمہاری محبت میں سر سے پیر تک ڈوبی ہوئی ہے۔ میں پھر کہوں گی، مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں یہ سب کچھ اپنے ہوش و حواس میں دیکھ رہی ہوں..... میں جو کچھ کہہ رہی ہوں دل کی پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر تم اس سے یہ کہو کہ یہ جو کچھ ہے یہ سب تمہارا نہیں ہے کسی اور کا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ چل کر کسی جھونپڑا بستی میں رہنا شروع کر دے تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گی۔ ایسی تبدیلیاں دو چار مہینوں یا برسوں میں نہیں آتیں دلاور۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان..... بہت پہلے سے..... کچھ موجود تھا۔ تم دونوں کے دلوں کی گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔"

وہ خاموش رہا مگر اس کے دل سے آواز آ رہی تھی..... شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ہزاروں سال پہلے جب روہی میں بستیاں تھیں..... چکنی گرم دوپہروں میں نیم عریاں جسموں والے جفاکش لوگوں کے سائے یہاں حرکت کرتے تھے، اس وقت بھی ہماری راہیں یہاں بھٹکتی تھیں۔

وہ پھر موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''سویرا کیا کہتی ہیں پھپھو؟''

''وہ کہتی ہے بیٹا! جو کچھ بھی ہونا ہے یہ جلد ہو، اس میں جتنی دیر ہوگی، اتنا ہی غلط ہوگا۔ دوسری بات وہ یہ کہتی تھی کہ شادی بہت سادگی سے ہو اور بہاولپور میں ہو۔ اس کے والدین تو بس نام کے ہیں، پچھلے کچھ عرصے سے تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کی شرکت کا ذکر تو بے معنی ہے..... تیسری بات اس کے دماغ میں یہ بیٹھی ہوئی ہے کہ شادی کے بعد تمہیں اور اسے زیادہ دیر یہاں پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی بس ایک ہی شرط ہے..... اور وہ یہ کہ شادی کے بعد چند دن کے اندر وہ تمہارے ساتھ پاکستان سے چلے جانا چاہتی ہے..... اور یہ بھی چاہتی ہے کہ تم یہاں اپنے کاروبار کو وائنڈ اپ کردو یا کسی دوسرے کے حوالے کردو مکمل طور پر..... کم از کم اگلے دس سال کے لیے۔''

دلاور چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پھپھو! سویرا کو جن لوگوں کا خوف ہے، ان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ان کی طرف سے ہونے والی ہلکی سی ہلکی مزاحمت کا بھی میں انہیں منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں لیکن سویرا کا کہا ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں ان کی ان ساری باتوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اور عین اس کے مطابق چلوں گا۔''

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کی مجازی تکمیل کے لیے وہ کہاں تک جاسکتا ہے۔ اگر سویرا اس سے کہتی کہ وہ انہی کپڑوں میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دے۔ دنیا کی آخری حد پر بسی ہوئی کسی بستی میں جا بسے اور کبھی ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھے تو اسے یہ بھی دل و جان سے قبول تھا۔

..... چوڈیرو حویلی کی اونچی دیواریں اب سویرا کو روک نہیں سکی تھیں۔ شاہ فرمان تو زندہ لاش کی صورت بستر پر تھا۔ فیملی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ باہمی بٹوارے شروع ہوگئے تھے۔ دلاور کے کہنے پر مقامی ایم این اے نے خود جاکر ''بڑی آپا'' سے بات کی تھی اور اس نے معمولی بس و پیش کے بعد سویرا کو آزادی کا پروانہ جاری کردیا تھا۔ حویلی کے اصولوں کے مطابق اسے کئی مربعے اراضی سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس نے خوشی سے یہ جائداد حویلی والوں کی جھولی میں پھینک دی تھی۔ پیش کیے گئے کاغذات پر دستخط کردیے تھے۔

..... اور یہ محبت کی تکمیل کی رات تھی۔ بہاولپور کی ایک کوٹھی میں سادگی سے سجائے گئے ایک حجلۂ عروسی کا منظر تھا۔ ایک چاند دلاور کے ہاتھوں میں تھا اور وہ ان گھڑیوں میں روئے زمین کا سب سے خوش قسمت شخص تھا۔ اس کے اردگرد ایک طلسماتی گلابی دھند تھی۔ اس نے اپنی پیشانی چاند کی پیشانی سے لگائی..... وہ ان سرخ ہونٹوں کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو صرف اس کے اور ان ہونٹوں کے درمیان تھا.....

وہ ہولے سے بولا۔ ''سویرا! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

''نہیں دلاور!'' اس نے پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔ پھر توقف سے بولی۔ ''دلاور! تمہاری محبت نے میرے خوف کو چکنا چور کردیا ہے لیکن اس کی کرچیاں اب بھی میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے یہاں سے دور لے جاؤ۔''

''آپ نے جو کہہ دیا..... وہ ہوگیا۔'' وہ ڈوب کر بولا۔

وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ہولے سے بولی۔ ''اب مجھے آپ نہ کہو دلاور۔''

''زندگی کی آخری سانس تک کہوں گا۔ آپ کے لیے کوئی اور لفظ میری زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنی پیشانی سویرا کے ان ہاتھوں پر ٹیک دی جو اس کے گھٹنوں پر دھرے تھے۔

یہ محبت تھی..... پرستش تھی..... مجازی عشق کی معراج تھی..... یا اس سے بھی آگے کی کوئی چیز.....

اگلے چند روز دلاور اور سویرا کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ ان شب و روز کی کیفیت کو وہ شاید دونوں ہی لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے تھے۔ بہاولپور کی یہ کوٹھی ان دونوں کے لیے ہر طرح سے محفوظ تھی۔ اونچی چار دیواری، خاردار تاریں، سیکیورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز۔ پھپھو عالیہ بھی ان دونوں کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔ ایک روز وہ دونوں بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور پرواز کرگئے۔ دلاور نے سویرا کی ایک دیرینہ خواہش پوری کی۔ اسے اندرونِ لاہور کے وہ گلی کوچے دکھائے جہاں وہ کھیلا کودا اور پروان چڑھا تھا، انہی تنگ گلیوں میں وہ بوسیدہ مکان بھی تھا جہاں کبھی سرفروم گھٹ رہتا تھا۔ جو اس کا چاچا بھی تھا، باپ بھی اور استاد بھی..... دلاور ان گلیوں میں اپنی یادیں تازہ کرتا رہا اور ماضی کے دھندلکوں میں گھومتا رہا۔ وہ ایک خطیر رقم کا چیک بھی اس بستی کی حالت سدھارنے کے لیے لایا تھا۔ ذمے دار لوگوں کو یہ چیک سپرد کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ جیسے ایک قدیم بوجھ اس کے کندھوں سے اتر گیا۔ وہ دونوں شاہراہ قائداعظم کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور

پورے تین روز لاہور کی سیاحت کرتے رہے۔ شاہ لاہوری اور اس کی دلہن بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور کی سڑکوں پر تھے لیکن سڑکوں پر کہاں تھے، وہ تو جیسے فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ دن میں کئی بار دلاور اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا تھا، کیا زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے؟ اتنے دلکش دن، اتنی طلسماتی راتیں؟ کسی وقت سویرا ایک دم چپ سی ہو جاتی تھی۔ وہ اس چپ کی وجہ سمجھتا تھا۔ سویرا کو ایک بات کا قلق تھا جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا..... چار برس پہلے وہ اس وقت بے عملی اور تذبذب کی کیفیت میں کیوں رہی جب چوہدری حویلی میں اسے اس کے سامنے زخموں سے چور کر کے موت کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ وہ ان لمحوں میں اس کے لیے کھڑی کیوں نہ ہو سکی..... کبھی کبھی اس کے اچانک چپ ہو جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اب جلد از جلد پاکستان سے پرواز کر جائیں۔ بہاولپور جا کر سویرا نے پھر یہی بات کہی تو دلاور بولا۔ "سویرا! آپ کے اور باپو کے کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ مجھے صرف تین روز کی مہلت اور دے دیں۔"

"وہ کس لیے دلاور؟" وہ ذرا اداسی سے اس کے ہاتھ پر اپنا سر ٹیک کر بولی۔

"مجھے کراچی کے دن میرا ایک بہت پرانا سپنا پورا ہونے والا ہے۔ کراچی کے "سی ڈائیونگ سینٹر" کا افتتاح۔ میں یہ افتتاح خود کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے اس سینٹر کا نام کیا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس کا نام ہے سرفراز سی ڈائیونگ ٹریننگ سینٹر۔ سرفراز..... جسے لوگ سرفو دم گھٹ کے نام سے جانتے ہیں اور میں جس کے تصور کو کبھی اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر مسکرا کر چپ ہو گئی۔

وہ دونوں بیش قیمت صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا سر دلاور کے شانے سے ٹکا دیا۔ ذرا کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "دلاور! کسی وقت بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟" وہ اس کی سنہری زلفوں کو اس کے کانوں کے پیچھے اڑس کر بولا۔

"پتا نہیں کس سے۔"

"ان لوگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ اب میری اور آپ کی ہوا کو بھی چھو سکیں۔"

"لیکن دلاور! میری ماں کہا کرتی تھیں، روہی رنگ رنگیلی ہے..... اور زہریلی بھی۔ اور جب یہ اپنے زہریلے روپ میں ہوتی ہے تو ناگن بن جاتی ہے اور اس کے بہت سے منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس منہ سے ڈس لے، کسی کو پتا نہیں ہوتا۔"

"آپ..... کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ چوڑیرو والے نہ سہی، کوئی اور ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

کراچی کے ساحل پر عظیم الشان ٹریننگ سینٹر کا افتتاح کرنے کے بعد دلاور نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب اس کی سوچوں کا رخ خلیج عمان کی ایک الگ تھلگ اور پرسکون جگہ "برکا" کی طرف تھا۔ یہاں سمندر کے قریب ایک درمیانے سائز کے لیکن نہایت خوبصورت بنگلے کو اس نے اپنی مستقل رہائش کے لیے منتخب کیا تھا..... اس کے حکم پر اس کے امارائی منیجر نے اسے دنیا کی ہر سہولت سے آراستہ کر دیا تھا..... وہ فی الحقیقت ایک جنت نشاں جگہ بن گئی تھی۔ اس سے بہتر رہائش کی آئیڈیا دلاور کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ صرف تین دن کے مختصر وقت میں اس نے اس جگہ کو اپنی سویرا کے شایانِ شان بنا ڈالا تھا۔

وہ بہاولپور والی کوٹھی میں دلاور کی آخری شام تھی۔ ٹکٹ کنفرم تھے۔ پچھوعالے، ڈرائیور اور دو گارڈز کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں..... سویرا ملازمہ کی مدد سے پیکنگ میں مصروف تھی۔ دلاور حسب عادت رات کے کھانے سے پہلے سوئمنگ پول میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہنے کا ہنر جانتی ہے۔ ریسپیریشن کے لیے وہ سانس باہر نکال کر پانی کی تہ میں چلا جاتا تھا اور دس پندرہ منٹ کے لیے آنکھیں موند لیتا تھا۔ باہر کی آوازیں ناقابلِ فہم سرسراہٹ کی طرح اس کی سماعت تک پہنچتی تھیں۔ اسے لگا کہ سویرا اسے پکار رہی ہے۔ اسے دن میں کئی مرتبہ اس طرح کا دھوکا ہوتا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جو ملاپ سے کم نہیں ہو رہی تھی، بڑھ رہی تھی اور وہ بھی بھرپور طرح جانتا تھا کہ یہ مارفی اضافہ نہیں ہے۔

اچانک اسے دوبارہ آواز کا فلٹر ہوا۔ اسے پتا چلا کہ اس مرتبہ دھوکا نہیں، وہ تیر کی طرح پانی کی سطح پر آیا۔ اس نے ایک قیامت خیز منظر دیکھا۔ سفید شلوار قمیص والا ایک کرخت چہرہ بلڑکا چلا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دو دھاری خنجر تھا۔ سویرا اس کے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے دلاور کی طرف آنے سے روک رہی تھی۔ اس کے ساتھ گتھم گتھا چلی آ رہی تھی۔ لڑکے کی عمر بمشکل چودہ پندرہ سال رہی ہوگی مگر اس کا تن و توش اچھا تھا۔ وہ پکار رہی تھی۔ "دلاور..... دلاور۔" سویرا کے پہلو میں اس کی

سفید پھولوں والی قمیص پر خون کا ایک بڑا داغ دکھائی دے رہا تھا۔ یکا یک بجلی سی چمکی۔ لڑکے نے دلاور کو پانی سے نکلتے دیکھا تو جھلا کر پلٹا اور سویرا کی کمر اور گردن پر خنجر کے پے در پے تین وار کیے۔ تب تک دلاور کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ دیوانہ وار حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا۔ سویرا نے ابھی تک حملہ آور کے قدم نہیں چھوڑے تھے۔ دلاور اوپر اور حملہ آور نیچے تھا۔ اس نے اتنی وحشت سے حملہ آور کی کلائی مروڑی کہ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی دوران میں گارڈز اور دو ملازم لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ چکے تھے۔ وہ حملہ آور سے لپٹ گئے۔ وہ چنگھاڑنے لگا۔ ''شاہ پرویز نام ہے میرا..... شاہ فرمان کا پتر ہوں۔ ہم اپنی دشمنی بھولتے نہیں ہیں۔ قبر تک پیچھا کرتے ہیں..... قبر تک کرتے ہیں.....''

چوڑے چکلے جسم کا وہ نوعمر لڑکا کسی پکی عمر کے مرد کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔ دلاور، سویرا کی طرف لپکا۔ اس کا سارا لباس خون سے تربتر تھا۔ اردگرد کی ہر چیز..... اور اس کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اس نے خونچکاں سویرا کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''سویرا.....'' وہ دیوانوں کی طرح پکارا۔ ''گاڑی نکالو..... جلدی کرو۔'' اس کی آواز کوٹھی کے در و دیوار میں گونجتی چلی گئی..... اس کے گارڈز نے حملہ آور کو پوری طرح چھاپ رکھا تھا۔

چند منٹ بعد ٹویوٹا کی جیپ برق رفتاری سے اسپتال کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سویرا کا خونچکاں چہرہ دلاور کی گود میں تھا۔ سویرا نے اپنا مہندی لگا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ست رنگی چوڑیاں اس کی کلائی میں چھنک اٹھیں۔ وہ دلاور کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''دلاور..... جب چوڑیرو حویلی میں آپ کو..... بے دردی سے مارا جا رہا تھا..... میں کچھ نہ کر سکی تھی..... دیکھتی رہ گئی تھی..... آج..... شاید میں نے..... کچھ نہ کچھ تو..... کفارہ ادا کر دیا ہے..... کر دیا ہے نا؟''

دلاور نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ اسی طرح اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے دوبارہ بولی۔ ''ہم نے دیر کر دی دلاور! ہم نے دیر کر دی نا..... آپ سے کہا تھا نا..... یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں..... خود کچھ نہ کر پائے..... تو..... کسی اور طریقے سے کریں گے..... ان کے..... بہت سے..... منہ ہیں دلاور.....'' اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی۔ گاڑی کے پہیے بہاولپور کی سڑکوں پر چرچرا رہے تھے۔

دلاور نے ڈرائیور کو گاڑی اور تیز چلانے کا حکم دیا۔ پھر وہ سویرا کی پیشانی چوم کر بولا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو بچنا ہے..... آپ کو زندہ رہنا ہے..... میری خاطر..... میری خاطر سویرا..... نہیں تو میں بھی نہیں رہوں گا۔''

اس نے لمبے لمبے سانس لیے۔ جیسے چاہتی ہو کہ اس کی سانسوں کی ڈور ٹوٹنے نہ پائے۔ اپنی روح کو اپنے جسم سے منسلک رکھنے کی کوشش کر رہی ہو..... وہ جیسے پوری جان کے ساتھ دلاور سے لپٹ گئی مگر موت کا فرشتہ زیادہ زور آور ہوتا ہے..... وہ اپنا کام کر گزرا..... وہ اسپتال کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے مر گئی.....

او کھے پینڈے لمبیاں راہواں عشق دیاں..... ورد جگر سخت سزاواں عشق دیاں.....

☆☆☆

منظر بہاولپور شہر کے ایک قبرستان کا تھا۔ اس قبرستان میں سویرا ابدی نیند سو رہی تھی۔ وہی سویرا جو عشق کے ایک انجانے بندھن کی اسیر تھی..... معروف رومانی کردار صاحباں کی طرح اس نے بھی اپنے مرزا سے کہا تھا کہ وہ دیر نہ کرے، وہ یہاں سے نکل جائے، وہ جلدی کرے۔ لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ یہاں بھی ہو کر رہی تھی۔

سویرا کو اس قبرستان کا مکیں ہوئے اب دو ماہ گزر چکے تھے۔ روزانہ شام سے پہلے اس کی قبر پر آنا دلاور کا معمول تھا۔ دلاور کی شیو بڑھ کر اب چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سر کے بال لمبے ہو چکے تھے۔ ایک عجیب صوفیانہ رنگ سا چڑھتا جا رہا تھا اس پر..... لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بزنس اور اپنے معمولات سے بالکل علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ کراچی میں اپنے ٹریننگ سینٹر اور چوڈیرو میں جننگ فیکٹری کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے یہیں بہاولپور شہر میں ایک مناسب گھر خرید لیا تھا۔

وہ قبر کے قریب گم صم کھڑا تھا جب کسی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، یہ اس کا عزیز ترین دوست اور بزنس پارٹنر رشید تھا، رشید مکرانی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ واقعی ایک جواں سال بزنس مین نظر آتا تھا۔

''تم یہاں؟'' دلاور نے پوچھا۔

رشید نے کہا۔ ''دلاور بھائی! اپن کا وکیل پورے سندھ میں نمبر ایک ہے۔ اس لونڈے کی عمر کم ہے۔ پھانسی کی سزا تو نہیں ہوگی، مگر تیرہ چودہ سال سے پہلے باہر آ گیا تو قسم ہے..... نام بدل دینا۔''

وہ جس کو لونڈا کہہ رہا تھا ... یہ وہی نہایت مقصیلا "چودھری زادہ" تھا جو دو ماہ پہلے دلاور کو قتل کرنے کی نیت سے اس کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اسے تو قتل نہ کر سکا مگر اس کا دو دھاری خنجر سویرا اور ایک گارڈ کی جان لے گیا۔ وارداتِ کے وقت اس نوعمر لڑکے نے چلا چلا کر کہا تھا ... میرا نام شاہ پرویز ہے۔ میں شاہ فرمان کا پتر ہوں.....

وہ شاہ فرمان کا بیٹا نہیں بھانجا تھا۔ اس کی بہن کا بیٹا۔ حویلی کی زہریلی فضا نے اس کے کچے ذہن میں زہر بھرا تھا۔ غرور، نفرت اور کینے سے بھری ہوئی وہ حویلی اپنے مکینوں کو اور مکینوں کے بچوں کو اور دے بھی کیا سکتی تھی۔ شاید سویرا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ رنگ رنگیلی دنیا جب زہریلی ناگن کا روپ دھارتی ہے تو اس کے کئی منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس طرف سے اور کس منہ سے ڈس لے گی، کچھ پتا نہیں ہوتا۔

رشید آنکھوں میں نمی لے کر عجیب نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے سامنے ایک کاغذ کرتے ہوئے بولا۔ "دلاور بھائی! یہ آپ کا ٹکٹ ہے۔ آپ نے اپنن سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ ٹائم گزر جائے ... پھر آپ سوچیں گے۔ اپنن کا خیال ہے کہ اب وہ ٹائم آ گیا ہے۔ وڑی وہاں دبئی میں آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کو جانا چاہیے۔"

دلاور نے ٹکٹ کا پرنٹ رشید کے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر پھاڑ کر پھینک دیا۔ "تم اپنے نام کا ٹکٹ جواڑ رشید۔"

"آپ ... کیا کہہ رہے ہو بھائی؟" رشید سخت حیرت میں تھا۔

"میری جگہ تم وہاں جاؤ گے رشید... تمہاری جگہ میں یہاں رہوں گا... دیکھو... وہ وہاں سوری ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

رشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پچھلے چار پانچ برسوں میں وہ اس کا مزاج شناس ہو چکا تھا۔ وہ دلاور کے اس لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سمجھ گیا کہ اس نے جو کچھ کہہ دیا ہے، وہ حتمی ہے۔ دونوں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ سورج جنتر، کیکر اور بیری کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ شہرِ خموشاں پر اس کی آخری کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ رشید نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "یہ بات اپنے مغز میں آ گئی ہے کہ اب آپ یہاں سے نہیں جائے گا لیکن آپ اپنن کو بس ایک بات بتا دیں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کا یہاں رہنا کتنا خطرناک ہے۔ بہاولپور اور چوڑیرو میں کوئی بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہ آگ جو آپ کے اردگرد سلگ رہی ہے اور ان گوٹھوں میں ہر جگہ جس کی چنگاڑیاں ہیں، آپ کو کسی بھی ٹائم نقصان پہنچا سکتی ہیں۔"

دلاور کی نگاہ چند میٹر دور سویرا کی قبر پر تھی۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "اب میرے پاس گنوانے کو کچھ نہیں ہے رشید! میں اب یہیں رہوں گا۔ انہی شاہ فرمانوں، شاہ پرویزوں اور ساجے مٹھلوں کے درمیان۔" اس نے عجب پُرعزم لہجے میں کہا ... اور جیکٹ کے نیچے اپنے بھرے ہوئے کولٹ پسٹل کو چھوا۔

کچھ دیر بعد جب رشید کرائی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو دلاور دبے دبے کرب کے ساتھ بولا۔ "وہاں جا کر ایک کام کرنا ہے رشید... برکا کے اس بنگلے کو ختم کر دینا جہاں جا کر ہم نے رہنا تھا۔"

"آپ ... کا مطلب ہے قروخت کر دیں؟"

"نہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "اسے ختم کر دینا ہے۔ بالکل مسمار... میں اگر کبھی وہاں جاؤں تو مجھے اس کی ایک اینٹ بھی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

رشید نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گارڈز کے ساتھ اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر چلا گیا تو دلاور بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ سویرا کی قبر پر گرے ہوئے خشک پتوں اور گھاس وغیرہ کو ہٹایا، اس پر تھوڑا سا پھیرا کا ڈالا۔ گلاب کی چند پتیاں اس پر بکھیریں اور گم صم سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ رات کی تھوڑی سرد تھوڑی رومانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس ہوا میں بیتے دنوں کی خوشبو تھی اور پھر وہ چند پُرمسرت دن جو کئی صدیوں پر بھاری تھے اور آخر میں وہ جانکاہ صدمہ۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "آپ ہمیشہ مجھ سے پوچھتی رہی ہیں۔ شاید صدیوں سے پوچھتی رہی ہیں..... تم کب تک مجھ کو بھولو گے؟..... آج میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں بھول سکتا ہی نہیں۔ یہ میرے بس میں ہے ہی نہیں۔

"دنیا میں ایسا ہوتا تو نہیں ہے لیکن آپ دیکھ لینا..... جب تک میری سانس ہے، میں آپ کو یہاں اپنے آس پاس ہی نظر آؤں گا..... ہاں سویرا! جب تک سانس ہے اور جب سانس نہیں رہے گی ... تو پھر..... تو پھر آپ کو پکاروں گا، آپ کو تلاش کروں گا۔"

آتش کدہ

طاہر جاوید مغل

بظاہر زندگی کی روش آسان نظر آتی ہے... مگر راستے ہمیشہ ہموار نہیں رہتے... ماہ و سال آسانی سے نہیں گزرتے... واقعات کی گردش ہو یا پھر کوئی سانحہ، دل کو ہلا دیتا ہے... یہ درد و غم برف کے مانند پگھلتے نہیں... بلکہ پتھر کی طرح دل پر نقش ہو جاتے ہیں... ایک ایسی ہی داستانِ تحیر... جس کے کردار پیشِ منظر میں رہتے ہوئے بھی پس منظر کا حصہ تھے... انہیں جاننے کے لیے ماضی کے جھرونکوں سے آگاہی ضروری تھی... برف پوش وادیوں میں کھو جانے والے کرداروں کی تلاش کا سلسلہ... اسرار کے پردوں میں چھپی سازشیں جو بلند و بالا قلعے کی دیواروں سے روزن تلاش کر رہی تھیں... دو دلوں کے بیچ ہوش مندوں نے ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کی ہیں... مگر جب عشق جنوں کی سرحدوں میں داخل ہو جائے تو پھر کوئی رکاوٹ... رکاوٹ نہیں رہتی... قدم قدم پر ایک نئے جہاں سے متعارف کراتی سنسنی خیز داستان...

فطرت و جذبات میں قیامت مچا دینے والی تلخیوں کا رقصِ حقیقت

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران کچھ دنوں سے بہت اداس ہے۔ اس کی اداسی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اُسے چند دنوں بعد وعدے کے مطابق انڈیا واپس چلے جانا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگلے ہفتے ماہین کی منگنی ہو رہی تھی اور مجھے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ چپکے چپکے ماہین کو چاہتا ہے۔ لاف زنی تو وہ بہت زیادہ کرتا تھا۔ مہوش حیات، کترینہ کیف، عالیہ بھٹ اور پتا نہیں کن کن سے اپنے تعلقات جوڑتا تھا مگر اس کی حرکات و کیفیات بتاتی تھیں کہ دلکش ماہین کے لیے واقعی اُس کے دل میں کوئی خفیہ گوشہ بن چکا ہے۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھو عمران، انڈیا تو تمہیں جانا ہی ہے تو پھر کیوں نہیں ماہین کی منگنی وغیرہ سے پہلے چلے جاتے۔''

''چاچو! آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور دکھ جھیلنا سیکھتے ہیں، اتنے ہی مضبوط ہوتے ہیں اور ہمارے لیے خوشیوں کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔''

''پچھلے دنوں کافی دکھ جھیلے ہیں تم نے۔ اب خوشیوں کی راہ ہموار ہو رہی ہے نا، تم اپنے وطن واپس جا رہے ہو؟''

وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ''چاچو! دیکھیں اب آپ غلط بات کہہ

رہے ہیں۔ میرا وطن انڈیا نہیں، یہ پاکستان ہے۔ میرے والد یہاں کے تھے، میری والدہ کے آباؤ اجداد بھی یہیں کے تھے۔ ان کی نس نس میں پاکستان رچا بسا ہوا تھا۔ میں تو بس پیدا ہونے کے لیے غلطی سے انڈیا چلا گیا تھا۔"

"چلو جو بھی ہے، تمہارا اب سب کچھ انڈیا میں ہے۔"

"لیکن بہت کچھ یہاں بھی تو ہے۔ مہوش حیات، کومل علی، اقرا عزیز وغیرہ لڑ لڑ کر ہلکان ہو رہی ہیں میرے لیے۔ اور پھر یہ، معاشرے کی پابندیوں اور بے رحم زنجیروں میں جکڑی ہوئی، وہ بے بس روح۔ میں اس کی منگنی کا سارا غم اپنے سینے میں اتار کر انڈیا جانا چاہتا ہوں۔ بقول مشہور فلاسفر انو کی پہلوان، غم بھی تو سفرِ حیات میں زادِ راہ کی طرح ہوتے ہیں۔"

مجھے پتا تھا کہ میں کچھ بھی کہوں، وہ منگنی تک یہیں رہے گا..... اور واقعی وہ رہا۔

جیسا کہ میں اب تک اندازہ لگا چکا تھا۔ ماہین کے ہونے والے شوہر حشام کو خودنمائی کا شوق کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس کے والد صاحب بھی اپنی امارت اور وسیع تعلقات کے اظہار میں اس سے پیچھے نہیں تھے۔ انگیج منٹ کا وہ فنکشن لاہور کے اعلیٰ ترین ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ گرما گرم وسیع ہال رنگوں اور روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ یہ منگنی کی نہیں بلکہ کسی ٹھیک ٹھاک شادی کی تقریب نظر آ رہی تھی۔ پانچ سو کے قریب مہمان ہوں گے۔ وہ سب کے سب بڑی بڑی گاڑیوں سے اتر کر اندر پہنچے تھے۔ منگنی کے قیمتی لباس میں وہ نہایت دلکش نظر آتی تھی۔ اردگرد کی ہر شے جیسے اس کے گال کے حسین ڈمپل کی طرف کھنچتی اور اس میں ڈوبتی محسوس ہوتی تھی۔ عمران اسے دیکھ کر مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ اب پتا نہیں، یہ واقعی ٹھنڈی آہیں تھیں یا اس میں اداکاری بھی شامل تھی۔ ماہین کی بڑی بہن شاہین کو خصوصی طور پر انگلینڈ سے اس تقریب میں شرکت کے لیے آنا تھا مگر بوجوہ نہیں آسکی تھی۔

عالی شان ڈنر کے بعد تقریب بڑے اچھے طریقے سے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب اسٹیج پر تصویریں وغیرہ اتاری جانے لگیں۔ ماہین کی خصوصی فرمائش پر مجھے اور عمران کو بھی اسٹیج پر بلایا گیا۔ حشام اسٹیج سے نیچے اپنے دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اور عمران، ماہین کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ عمران اب خوش نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ماہین میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔

"دیکھیں انکل! میرا انگیجمنٹ رینگ کتنا ہینڈسم لگ رہا ہے نا؟"

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے غالباً یہی سرگوشی عمران کے کان میں بھی کی۔ میں نے حشام کو دیکھا۔ ماہین کو یوں عمران کی طرف جھکتے اور اس کے کان میں بولتے دیکھ کر حشام کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اسے اپنے اور ماہین کے اردگرد عمران کی موجودگی اچھی نہیں لگی تھی۔ ہم اسٹیج پر سے اٹھنے ہی والے تھے جب ماہین نے پھر سرگوشی کی۔

"دیکھیں انکل، آپ مارشل آرٹ کے حوالے سے اب بھی کتنے پاپولر ہیں۔ محفل میں بہت سے لوگ آپ ہی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔"

عمران فوراً معنی خیز لہجے میں بولا۔ "بہت سے لوگ آپ کی طرف بھی تو دیکھ رہے ہیں۔" پھر جلدی سے بات بدلی۔ "آپ بھی تو ایک مارشل آرٹسٹ ہیں۔"

"اس حوالے سے مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔" وہ مسکرائی۔

عمران نے پوچھا۔ "ویسے ماہین، اگر شادی کے بعد آپ میں اور حشام میں خدانخواستہ جھگڑا ہو جائے تو آپ اپنا فن استعمال کریں گی؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "خدانخواستہ؟ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"خدا تو خدا ہوتا ہے اور نخواستہ وہی جو مٹھائیوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔"

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی اور عمران کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "اس کو خدانخواستہ کہتے ہیں۔" وہ بولی۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ماہین کو یوں بے تکلفی سے ہنستے اور عمران کے کندھے پر ہاتھ مارتے دیکھ کر حشام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ گھوما اور ہمارے سامنے سے گزر کر پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ ماہین کی ایک عزیزہ نے اسے آواز بھی دی لیکن وہ سنی اَن سنی کر گیا۔ اس کے انداز نے اسٹیج پر موجود کئی لوگوں کو چونکایا اور ساتھ ہی ماہین کو بھی۔ میں نے دیکھا، ماہین کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد ماہین میری کوٹھی پر آئی تو خلافِ معمول کچھ چپ چپ تھی۔ میں نے منگنی کے روز والی بات دہرانا مناسب نہیں سمجھا۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ بولی۔ "انکل، عمران انڈیا کب جا رہا ہے؟"

"میرے خیال میں تیاری میں ہے۔ دو تین ہفتوں میں چلا جائے گا..... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس یونہی..... پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ حشام خواہ مخواہ اس سے خار کھانے لگا ہے۔ شاید ایک دو الٹی سیدھی باتیں عمران سے بھی ہوئی ہیں جن کا حشام نے بُرا منایا ہے۔"

''چلو جو بھی ہے۔ اب اُسے چلے ہی جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ آہ سی بھر کر بولی۔ ''ویسے انکل! عمران اپنی طرز کا مختلف بندہ ہے۔ اس میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ یہیں رہے۔ آپ کے ساتھ۔ آپ کے زیرِ سایہ..... لیکن اب میں بھی سوچتی ہوں، شاید اس کا جانا ہی بہتر ہے۔''

''یہ بات تم حشام کی وجہ سے کہہ رہی ہو؟''

ایک دم اُس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ ''انکل! حقیقت یہ ہے کہ میں حشام سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اس کی جدائی یا ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ کچھ غصے والا ضرور ہے لیکن ہمارا طویل ساتھ رہا ہے۔ انگیج منٹ والی رات جو بات ہوئی، اس کے بعد میں نے حشام کو بڑی مشکل سے منایا ہے۔ وہ جلدی روٹھتا نہیں لیکن روٹھ جائے تو ایک دم ضدی ہو جاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ حساس بھی ہے۔''

''تھوڑا بہت حساس یا ضدی ہونا بُری بات نہیں لیکن اس میں جو خود نمائی اور غصے کی عادتیں ہیں، ان پر اسے کنٹرول کرنا چاہیے۔''

اس سے پہلے کہ ماہین جواب میں کچھ کہتی، اس کے موبائل پر کال کے سگنل آئے۔ اسکرین دیکھ کر اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو..... ہیلو آنٹی، کیا بات ہے؟''

جواب میں جو کچھ کہا گیا اس نے نہ صرف ماہین کا موڈ ایک دم بدل دیا بلکہ مجھے اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش بھی محسوس ہونے لگی۔ اس کے سرخ و سپید رنگ میں ایک طرح کی زردی گھل گئی تھی۔

کال ختم کر کے وہ بولی۔ ''انکل تابی! ایک مسئلہ ہو گیا ہے..... پلیز پلیز، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا..... میرے گھر تک۔''

''مگر بات کیا ہے ماہین؟''

''میں آپ سے اس بارے میں بات کرنے ہی والی تھی کہ یہ کال آ گئی..... یہ آنٹی راحت ہیں کئی دنوں سے بڑی پریشان تھیں۔ آج اس پریشانی کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ کوئی اُن کے بیٹے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ آپ آئیں میرے ساتھ، میں راستے میں آپ کو سب بتاتی ہوں۔'' ماہین کی پریشانی دیکھ کر مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

چند منٹ بعد میں ماہین کے ساتھ اس کی گاڑی میں کینال پارک کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے راستے میں مجھے بتایا کہ آنٹی راحت اس نوجوان ملازمہ ''رانو'' کی خالہ کا نام ہے جو اس کے گھر کام کرتی ہے۔ اس کا بیٹا کہیں لاہور سے باہر ملازمت کرتا تھا۔ آج کل وہ گھر واپس آیا ہوا تھا اور بہت بیمار اور پریشان تھا۔ آنٹی راحت کو لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑا دکھ دل میں چھپائے ہوئے ہے..... لیکن بتاتا کچھ نہیں۔ اور آج کوئی عورت اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔''

ہم نچلے درجے کی ایک گنجان آبادی میں پہنچے اور ڈھائی تین مرلے کے ایک گھر میں داخل ہوئے۔ جسے آنٹی راحت کہہ رہی تھی وہ اپنے بیٹے اور ایک پوتی کے ساتھ یہیں رہتی تھی۔ خاوند عرصہ پہلے فوت ہو گیا تھا۔ بیٹے کی بیوی بھی وفات پا چکی تھی۔ بیٹے کی چھ سالہ بیٹی کو آنٹی راحت ہی پال رہی تھی۔

میں اور ماہین اندر پہنچے تو پینتالیس پچاس سالہ راحت اپنی پوتی نایاب کا سر گود میں لیے اسے تھپک رہی تھی۔ معصوم بچی کے رخساروں پر خشک آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ کچھ یہی کیفیت نیم سفید سر والی راحت کی بھی تھی۔ اس گھر کی حالت بستی کے دیگر گھروں سے قدرے بہتر نظر آتی تھی۔

ماہین کو دیکھ کر عورت پھر زار و قطار رونے لگی۔ ماہین آگے بڑھ کے اس کے گلے سے لگ گئی۔ ''وہ لے گئی میرے فواد کو۔ مجھے پکا پتا ہے وہ زبردستی لے کر گئی ہے۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔''

''آنٹی، پتا تو چلے کون لے گئی ہے؟''

''مجھے کچھ خبر نہیں۔ وہ بڑی گاڑی میں آئی تھی۔ ساتھ دو ہٹے کٹے بندے بھی تھے۔ وہ تینوں چار پانچ گھنٹے ہمارے گھر میں رہے ہیں مگر ہمیں باہر نہیں نکلنے دیا اور نہ کسی سے بات کرنے دی ہے۔ وہ عورت میرے پُتر کو لے کر کمرے میں گھسی رہی۔ پتا نہیں اس سے کیا منواتی رہی۔ پھر وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ چلا گیا۔ میرا کلیجا نکل رہا ہے بیٹی، مجھے لگتا ہے اب وہ آسانی سے واپس نہیں آئے گا۔''

بچی نے پھر رونا شروع کر دیا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے والد سے کافی اٹیچ ہے۔ اس کا کومل جسم بھی تپ رہا تھا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں مجھے اس گھرانے کی جو کہانی معلوم ہوئی، وہ مختصراً یوں تھی۔ راحت کے جواں سال بیٹے کا نام فواد تھا۔ پانچ سال پہلے بیوی کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ فواد یہاں اسکول دیکن چلاتا تھا۔ بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی مگر کوئی دو سال پہلے بالکل اچانک اسے ایبٹ آباد کی طرف کوئی بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے اکیلے وہیں پر رہنا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی گھر کا چکر لگا پاتا تھا۔ شروع شروع میں

اس کی کم سن بیٹی نے اس کی غیر حاضری کو بہت محسوس کیا مگر پھر کچھ سنبھل گئی۔ یہ کوئی ایک مہینا پہلے کی بات ہے، فواد ڈھائی تین ماہ بعد گھر آیا تو اس کا حلیہ بہت بدلا ہوا تھا۔ سرخ و سپید اور توانا فواد کی جگہ ایک کملایا ہوا سا کمزور فواد، دادی پوتی کے سامنے تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، بال بکھرے ہوئے۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔

راحت نے بیٹے سے بہت پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے مگر اس نے لاکھ کوشش کے باوجود کچھ بتا کر نہیں دیا۔ کوئی گہرا غم اس نے سینے میں چھپا رکھا تھا اور تو اور کسی وقت وہ اپنی لاڈلی بیٹی نایاب کو بھی جھڑک دیتا تھا..... بعد میں خود ہی اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتا..... اسے مناتا.....اور آج ایک اور بڑا صدمہ دادی پوتی پر ٹوٹا تھا۔

تفصیل بتاتے ہوئے اشک بار راحت نے کہا۔ ''وہ کوئی پینتالیس پچاس سال کی عورت تھی۔ بہت صحت منداور بالکل سرخ رنگ والی۔ لگتا تھا کہ غیر علاقے سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ جو دو بندے تھے وہ بھی کہیں باہر ہی کے تھے۔ عجیب سی زبان بولتے تھے۔ اس عورت کو دیکھ کر میرا پتر ایک دم ڈر سا گیا تھا۔'' راحت سسکیاں لینے لگی۔

ماہین نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''آنٹی راحت، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ بس ہمیں پورا واقعہ ذرا تفصیل سے بتائیں۔ یہ میرے انکل پولیس میں ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم بڑی جلدی اس عورت اور اس کے دونوں غنڈوں کو ڈھونڈ لیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بہن جی، میں نے کال بھی چلوا دی ہے۔ ناکوں پر چیکنگ وغیرہ ہوگی۔ آپ تسلی رکھیں۔''

راحت نے روتے ہوئے بتایا۔ ''فواد اس عورت کو بیگم صاحبہ کہہ کر بلا رہا تھا۔ وہ اسے کمرے میں لے گئی۔ کبھی بڑی سخت اور کبھی نرم آواز میں بولتی رہی۔ اس کی بس ایک دو باتیں ہی میرے کانوں میں پڑیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''بس میں چاہتی ہوں کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو۔'' پھر اس نے یہ بھی کہا۔ ''بس تم یہ سمجھو فواد! کہ تم نے جو کچھ دیکھا، وہ ایک دھوکا تھا۔ وہ کبھی تھی ہی نہیں۔''

راحت سسکی۔ ''پتا نہیں، وہ کس کی بات کر رہی تھی۔ اللہ جانے وہاں میرے بیٹے کے ساتھ کیا ہوا ہے جو وہ اس طرح مہینوں کا بیمار نظر آتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بہن جی! آپ یہ بتاؤ کہ ایبٹ آباد میں اس کا کیا اتا پتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت تو بتایا ہوگا اس نے؟''

''نہیں اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ میں تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ایبٹ آباد ہی جاتا تھا یا کسی اور شہر میں۔''

ماہین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اور پھر جس طرح اچانک اسے بڑی اچھی نوکری مل گئی اور گھر میں پیسے آنے لگے، یہ بھی سوچنے والی بات ہے۔''

بچی نایاب کو کئی ہفتوں سے ٹائیفائڈ بھی تھا۔ ہم قریباً ایک گھنٹا قابلِ رحم راحت اور اس کی خوب صورت پوتی کے ساتھ رہے، پھر ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد واپس آ گئے۔

☆☆☆

دس دن گزر چکے تھے۔ فواد کا کچھ پتا نہیں چلا تھا، نہ ہی اُس کی طرف سے کوئی خیر خبر موصول ہوئی تھی۔ فواد کے ایک دو عزیز ایبٹ آباد کا چکر بھی لگا آئے تھے مگر کچھ حاصل وصول نہیں ہوا تھا۔ رو، رو کر راحت کا بُرا حال تھا اور فواد کی کم سن بیٹی تو پہلے ہی کملائی ہوئی کلی نظر آتی تھی۔ وہ اپنے والد کو بُری طرح ''مس'' کر رہی تھی۔

اس روز میں اپنے پرانے دوست جگت سنگھ کی طرف جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ ماہین اپنی سوزوکی کار پر آ دھمکی۔ ایک ''یوٹیوبر'' کی حیثیت سے وہ بڑی متحرک تھی۔ آج پُرجوش بھی نظر آ رہی تھی۔ گہری سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ ''انکل! میں نے جانے کا پکا پکا پروگرام بنا لیا ہے۔ آپ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ آپ نہیں جائیں گے تو پھر اکیلی چلی جاؤں گی۔''

''ایسی کیا مصیبت آن پڑی ہے؟''

''مصیبت مجھ پر نہیں انکل، بے چاری آنٹی راحت پر اور اس معصوم بچی پر آئی ہوئی ہے۔ مجھے فواد کے بارے میں ایک کھوج ملا ہے۔ شاید یہ بات درست ہی ہے کہ وہ ایبٹ آباد کی طرف ہی موجود ہے۔''

''کھوج کیا ہے؟''

اس نے جھٹ اپنی پینٹ کی بیک پاکٹ میں سے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور مجھے تین تصویریں دکھائیں۔ یہ فواد کی ہی تصویریں تھیں۔ وہ کسی پہاڑی مقام پر کھڑا تھا۔ دو تصویروں میں تو دھند تھی لیکن ایک کافی واضح تھی۔ ماہین نے کہا۔ ''جب شروع، شروع میں فواد اپنی نئی ملازمت پر لاہور سے باہر گیا تو نایاب اسے بے طرح یاد کرتی تھی۔ اس کے دل بہلاوے کے لیے ہی فواد نے یہ تصویریں اپنے موبائل سے والدہ کے موبائل پر منتقل کی تھیں۔'' پھر ماہین صاف تصویر کو انلارج کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھیں، پورے

یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ تصویر ایبٹ آباد اور مانسہرے سے کچھ آگے شوگراں کی ہے۔ غور کریں یہ سڑک، یہ پہاڑیاں اور گھروں کے اسٹائل وغیرہ۔"

مجھے بھی یہی لگا کہ یہ شوگراں کا ہل اسٹیشن ہے..... اگر فواد واقعی شوگراں میں کہیں ملازمت کرتا تھا تو پھر اسے ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کوئی بھی شخص ایک دو دن میں اسے کھنگال سکتا ہے (تصویر میں فواد قبول صورت اور دراز قد نظر آتا تھا)

میں نے بغور ماہین کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ شوگراں جانے سے ہرگز باز نہیں آئے گی۔ مجھے بھی آفس سے تین چار روز کی چھٹی تھی۔ نجانے دل میں کیا آئی کہ میں نے ماہین کے ساتھ جانے اور اس معاملے کو دیکھنے کی ہامی بھر لی۔ وہ خوش نظر آنے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔

"لیکن انکل پلیز! عمران کو اس بارے میں پتا نہ چلے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔ ایسے میں، میں نہیں جا سکوں گی۔ حشام بہت "پکی" ہو چکا ہے عمران کے حوالے سے۔"

"نہیں اس کے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ سنا ہے وہ واپس جانے کی تیاری میں ہے۔ ویسے بھی اس کی زیادہ تر انسان دوستی اسی علاقے تک محدود تھی جہاں وہ رہ رہا تھا اور اس کے والد رہا کرتے تھے۔"

"کاش ہم عمران کو سمجھ سکتے اور وہ بھی ہمیں سمجھ سکتا۔" ماہین نے افسردگی سے کہا۔ "انکل! میری دلی خواہش ہے کہ وہ زندگی میں آگے بڑھے، ترقی کرے، میں اس کے لیے بہت گڈ وشز رکھتی ہوں۔"

ماہین کے ساتھ آدھ پون گھنٹا مزید نشست رہی۔ کافی باتیں ہوئیں اور شوگراں جانے کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔ اپنے دوست کی طرف جانے کا میرا پلان دھرا رہ گیا تھا، ماہین کی خواہش پر ہم "گھریلو جم" میں چلے گئے جہاں وہ حسب معمول مجھ سے لڑائی بھڑائی کے داؤ پیچ سیکھتی رہی۔ جب ہم "جم" میں تھے..... پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ ایک سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے گزر کر باغیچے کی طرف گیا ہے۔ ملازمہ کرن تو کچن میں تھی۔ شاید مجھے وہم ہوا تھا۔

☆☆☆

ماہین اپنے منگیتر حشام کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر وہ اپنے ڈیڈ کے ساتھ ایک بزنس ڈیل کے لیے کراچی جا رہا تھا۔ تاہم اس نے ماہین کو میرے ساتھ شوگراں جانے کی اجازت دے دی۔ ہم دونوں علی الصباح پانچ بجے کلفٹن پر لاہور سے نکلے اور موٹروے سے دس بجے کے قریب اسلام آباد پہنچ گئے۔ مانسہرہ پہنچنے میں چار پانچ گھنٹے مزید لگ گئے۔ آگے شوگراں کی چوٹی کی طرف بہت زیادہ چڑھائی تھی مگر کسی نہ کسی طرح میں اپنی کلٹس کو اوپر پہنچانے میں کامیاب رہا۔ جب ہم مطلوبہ ہوٹل کے سامنے گاڑی سے اتر رہے تھے جس شخص نے سب سے پہلے ہمارا استقبال کیا، وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا..... وہ عمران تھا۔ اس نے اپنی چمکیلی بتیسی کی پوری نمائش کرنے کے بعد اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے اور پکارا۔ "واہ جی واہ..... یہ کیا چمتکار ہو گیا۔ آپ بھی میرے پیچھے ہی پیچھے یہاں پہنچ گئے۔ مجھے تو اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔"

ماہین یک دم چپ ہو گئی۔ میں نے بھی حیرت کے ریلے سے گزرنے کے بعد اسے کڑی نظروں سے گھورا۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے زبردستی اپنی چھاتی میری چھاتی سے ملائی اور چہکا۔ "مطلب تو آپ کو بتانا چاہیے نا۔ میں تو انڈیا جانے سے پہلے ایک دفعہ یہاں کے شمالی علاقہ جات دیکھنا چاہ رہا تھا۔ طوفانی دورے پر کل صبح ہی یہاں پہنچا ہوں۔ میرا دوست ضیا بھی ساتھ آنا چاہ رہا تھا لیکن چاچو جانی، بقول ابن انشاء اور ابن بطوطہ جو مزہ اکیلے گھومنے میں ہے، وہ ساتھیوں کے ہمراہ نہیں۔ بائی دی وے ان دونوں بھائیوں میں سے بڑا کون سا تھا۔ عینک سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابن انشاء بڑے تھے۔"

ماہین نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا لیکن میرے تو اپنے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے اس سفر کا ذکر اپنے سوا کسی سے نہیں کیا تھا۔ پھر یہ افلاطون یہاں کیسے آ ٹپکا تھا؟

"تم سو فیصد جھوٹ بول رہے ہو عمران۔ تم اتفاقیہ یہاں نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔

"اگر میں اتفاقیہ انڈیا میں پیدا ہو سکتا ہوں تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا؟"

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے تین روز پہلے کی وہ بات یاد آ گئی جب میں اپنے گھر میں ماہین کے ساتھ "ہوم جم" میں تھا اور مجھے لگا تھا کہ کوئی آس پاس موجود ہے۔ (میری اور ماہین کی اس ملاقات میں ہم نے گمشدہ فواد کے بارے میں تفصیلی بات کی تھی اور یہ شوگراں والا پروگرام بھی بنایا تھا) بات سمجھ میں آنے لگی۔ عمران اس وقت مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے کسی طرح چھپ کر میری گفتگو سن لی

تھی۔ مجھے بڑا تاؤ آیا مگر میں ماہین کے سامنے اسے بُرا بھلا کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اس بات پر ڈٹا ہوا تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے۔ ''کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ایک قریبی ہوٹل کا نام لیا اور بولا کہ اگر ہم کو بُرا لگا ہے تو وہ یہاں موجود ہوتے ہوئے بھی دوبارہ ہم سے ملنے نہیں آئے گا۔

اس نے گاڑی سے سامان اتارنے میں ہماری مدد کی اور اسے ہوٹل کے استقبالیہ تک بھی پہنچایا۔ ماہین نے ایک دو رسمی کلمات کے سوا اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اپنے ہوٹل واپس جانے کے لیے مڑا اور پھر جاتے جاتے رک گیا۔ ''پلیز چاچو، میری ایک چھوٹی سی بات سن لیجیے۔''

میں چند قدم چل کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ رازداری کے انداز میں گویا ہوا۔ ''چاچو! آپ جن لوگوں کو ڈھونڈنے یہاں آئے ہیں وہ آپ کو یہاں نہیں ملیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ اپنی جیکٹ کے کالر درست کرتے ہوئے بولا۔ ''چاچو! آپ کے اس نالائق بھتیجے کو کشف وغیرہ بھی تو ہوتے ہیں۔ میرا علم مجھے بتا رہا ہے کہ آپ یہاں شوگراں میں اُس موٹی عورت اور اس کے دو کارندوں کو ڈھونڈیں گے جو فواد کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ان کی اسکائی بلیو بیڈفورڈ کو بھی آپ یہاں تلاش کریں گے مگر یہ دونوں چیزیں آپ کو یہاں نہیں ملیں گی۔ میں آپ کے آنے سے پہلے ہی بہت سر کھپائی کر چکا ہوں۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ''اور اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ تم یہاں اتفاقیہ موجود ہو؟''

''بس جی، میڈیا والوں کے سامنے سیاسی بیان بھی تو دینے پڑتے ہیں۔''

''میڈیا والے کون؟''

''جناب! یہی آپ کی ماہین، سوشل میڈیا کی بندی ہے۔''

''کسی کے گھر میں بلا اطلاع آنا اور چھپ کر باتیں سننا اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔''

''چاچو! میں آپ کو پھر بتا رہا ہوں، یہ سب کشف کی باتیں ہیں۔''

''تو پھر یہ کشف بھی تم کو ہو جانا چاہیے کہ ماہین کو یہاں تمہاری موجودگی اچھی نہیں لگی۔ اس کے دل میں تمہاری جو عزت ہے، تم اسے خود برباد کر رہے ہو۔''

''اپنی عزت بچانے کے لیے میں ماہین کو کسی مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی خطرے میں پڑنے والی ہے اور ویسے چاچو! میں کوئی ایسا عزت بیگ بھی نہیں ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے ماہین کو بتایا کہ وہ کیوں اور کیسے یہاں پہنچ پایا ہے۔ وہ جز بز نظر آ رہی تھی مگر اگلے روز منظر نامہ بالکل بدل گیا۔

میں اور ماہین علی الصباح ہوٹل کے چھوٹے سے سرسبز لان میں بیٹھے موبائل فون پر وہ تصویریں دیکھ رہے تھے جن میں لاپتا فواد کسی پہاڑی مقام پر کھڑا نظر آتا تھا۔ اتنے میں عمران بھی آدھمکا۔ وہ ایک طرح سے بن بلایا مہمان تھا مگر اسے ہر طرح کے ماحول میں اپنی جگہ بنانا آتا تھا۔ وہ خود کو ہم میں شامل کر کے کرسی پر بیٹھ گیا اور تصویریں دیکھنے لگا۔ دو تصویریں دھندلی مگر ایک واضح تھی۔ تاحال ہم نے دھندلی تصویروں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب میں انہیں بھی دیکھ رہا تھا۔ عمران بھی دیکھنے لگا۔ اچانک وہ چونکا۔ اس نے میرے ہاتھ سے موبائل لیا اور اسے دیکھتا ہوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے کی نیم تاریکی میں جا کر اس نے مجھے پکارا۔

''چاچو! ایک سیکنڈ کے لیے اِدھر آئیں۔''

میں وہاں پہنچا تو وہ دھندلی تصویر کو نیم تاریکی میں ''انلارج'' کر کے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین میرے سامنے کی۔ ''چاچو جی! ذرا غور سے دیکھیں۔''

میں نے اسکرین پر نگاہ جمائی اور چند سیکنڈ بعد مجھے بھی چونکنا پڑا اس دھندلی تصویر میں بادلوں کے ساتھ ایک برفانی چوٹی کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ میں نے چونکہ کافی عرصہ ان برف پوش پہاڑوں میں گزارا تھا لہٰذا یہاں کے اکثر خدوخال پہچانتا تھا۔ اس چوٹی کی ساخت دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہ کے ٹو کی نواحی چوٹیوں میں سے ایک چوٹی ''ماشر بروم'' ہے۔

میں نے عمران کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی تحیّر کے آثار تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اس معروف پہاڑ کو پہچانتا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں اس کی دلچسپی بہت تھی، وہ بولا۔ ''چاچو! مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ یہ ماشر بروم ہے۔ اسے شاید ''K1'' بھی کہا جاتا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''فواد کا کہنا تھا کہ وہ اس

جگہ پر کام کرتا ہے مگر یہ جگہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اسکردو کی طرف۔ بلکہ اسکردو سے بھی آگے پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہوگا۔"

"مطلب یہ کہ فواد نے اپنی ماں اور بیٹی سے جھوٹ بول رکھا تھا کہ وہ ایبٹ آباد میں ملازمت کرتا ہے؟"

"لگ تو یہی رہا ہے لیکن..... ایک امکان یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس تصویر والے علاقے میں کہیں سیر کرنے گیا ہو؟"

"مگر چاچو، اس کے جسم پر جو کپڑے نظر آرہے ہیں، وہ سیر و تفریح والے نہیں ہیں۔ یہ دیکھیں اس کے ہاتھ بھی کالے ہیں اور قمیص پر چکنائی لگی ہوئی ہے جیسے کچن میں کھانا وغیرہ پکاتا رہا ہو یا گاڑی ٹھیک کرتا رہا ہو؟"

ہمارا تجسس اور ہماری حیرت دیکھ کر ماہین بھی ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی تھی اور عمران کی نکتہ آفرینی سن رہی تھی۔ یہ سب کچھ انکشاف انگیز تھا۔ جیسا کہ عمران پورے یقین کے ساتھ مجھے اس بات سے آگاہ کر چکا تھا کہ یہاں شوگراں میں اس دبنگ عورت کا کوئی سراغ نہیں جو لاہور سے فواد کو اپنے ساتھ لے کر گئی تھی اور نہ ہی آسمانی رنگ کی وہ بیڈفورڈ جیپ یہاں پائی جاتی ہے جس پر وہ عورت آئی تھی۔ اب یہ تصویر والا "کلیو" کافی منطقی محسوس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

حالات نے اچانک ہی ایک ایسا رخ اختیار کرلیا تھا کہ ہم جو صرف شوگراں تک کا پروگرام لے کر یہاں پہنچے تھے اب آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی اب عمران ہمارے ساتھ شریک تھا۔ ہم بذریعہ کار شوگراں سے اسکردو کی طرف روانہ ہو گئے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے ایک مقامی گائیڈ کو وہ دھندلی تصویر دکھائی تھی۔ اس تجربہ کار گائیڈ نے بیک گراؤنڈ کے مناظر دیکھ کر محل وقوع کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے تجربے کے مطابق یہ جگہ "ہوشے" نامی قصبے سے پچیس تیس کلومیٹر آگے اونچے پہاڑوں کے درمیان ہے۔ وہاں تک پیدل جایا جاسکے گا یا پھر ٹکڑی قسم کی جیپیں ہی وہاں پہنچ پاتی ہیں۔ اس کے مطابق وہاں پہاڑوں میں کچھ سخت گیر قسم کے لوگ آباد بھی تھے مگر آباد علاقوں سے ان کا رابطہ بہت کم تھا۔ منصور نامی اس گائیڈ نے ہمیں ہاتھ سے بنایا ہوا ایک نقشہ بھی فراہم کیا جو اس مقام کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتا تھا..... تاہم گائیڈ کا کہنا تھا کہ وہ خود بھی وہاں تک نہیں گیا..... اور اس نے بوجہ بیماری اب بھی جانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔

ہماری گاڑی، نئی بنی ہوئی ہموار سڑک پر کاغان سے ناران کی طرف پھسلتی چلی جارہی تھی۔ میں ڈرائیو کررہا تھا، عمران میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ ماہین پچھلی نشست پر تھی۔ جھاگ اڑاتا دریائے کنہار ہماری بائیں جانب نشیب میں بہہ رہا تھا۔ دونوں طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے فلک بوس پہاڑ تھے، آبشاریں تھیں، ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے خوش رنگ گھر تھے جو دنیا کے ان خوب صورت ترین نظاروں کا حصہ تھے۔ سرما کی پہلی برف باری کے آثار جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ میں اور عمران گفتگو کررہے تھے مگر ماہین اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لے رہی تھی، وہ اپنے شاندار پینا سونک کیمرے کے ذریعے فلم بندی میں مصروف تھی۔

پروگرام یہی بنا تھا کہ ہم خود کو ایک ٹی وی پروڈکشن ٹیم کا حصہ قرار دیں گے۔ اور یہ ظاہر کریں گے کہ ایک بڑی ٹی وی سیریل کے لیے لوکیشنز وغیرہ دیکھنے کے لیے ان علاقوں کا کٹھن سفر کررہے ہیں۔

عمران پُرخیال انداز میں بولا۔ "سوچنے کی بات یہ ہے کہ فواد نے اپنے گھر والوں سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ ایسی کون سی ملازمت ہے جس کے لیے اسے ان دور دراز برفیلے پہاڑوں میں جانا پڑا؟"

"تنگدستی میں بندہ بہت کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن چاچو جان! یہ کیسی تنگدستی تھی جو سارا پاکستان چھوڑ کر بابوسر ٹاپ اور اسکردو وغیرہ سے آگے جاکر ہی دور ہو سکتی تھی؟"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے حیرانی ہورہی ہے کہ تم نے پرورش تو انڈیا میں پائی ہے مگر پاکستانی جغرافیے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو؟"

"آپ پھر میری دم پر پاؤں رکھ رہے ہیں چاچو۔ میں نے آپ کو بتایا بھی ہے کہ میں جدی پشتی پاکستانی ہوں۔ صرف پیدا ہونے کے لیے غلطی سے انڈیا چلا گیا تھا۔ آخر نومولود بچے سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

عمران کی اس مزاحیہ بات پر ماہین نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور اپنے کیمرے کی طرف ہی متوجہ رہی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر بھی کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ "سوری، میں اپنا لطیفہ واپس لیتا ہوں۔" اس نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سفر طویل اور دشوار گزار تھا اور پھر یہ کوئی تفریحی سفر بھی

نہیں تھا۔ کئی طرح کے اندیشے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اس لیے تھکن بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ چلاس اور جگلوٹ سے ہوتے ہوئے ہم اسکردو کی یخ بستہ فضاؤں میں پہنچے اور وہاں شب بسری کا فیصلہ کیا۔ ایک آرام دہ ہوٹل میں دو کمرے لیے گئے۔ ایک میں ماہین اور میں رہے دوسرے میں عمران۔ برفانی ہوائیں رات بھر کھڑکیوں سے ٹکراتی رہیں۔ اب سفر کا خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس صرف میرا سروس پسٹل تھا جو میں لاہور سے ہی لے کر چلا تھا۔

اگلے روز تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ہوشے کے قصبے میں پہنچے۔ یہ وادی میں تھا اور یہاں سے ماشر بروم کی برف سے ڈھکی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ ہوشے میں میرا سروس کارڈ کام آیا۔ ہمارے لیے ایک پاور فل ڈسکوری جیپ اور ڈرائیور کا انتظام ہوگیا۔ ڈرائیور انعام خان نے کہا۔ ”برادر آگے راستہ بہت خراب ہے، ام آپ کو جہاں تک لے جاسکا ضرور لے جائے گا۔ اس سے آگے آپ خود پیصلہ (فیصلہ) کرلینا۔“

برف باری بہت زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کئی راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ڈرائیور انعام خان نہایت چابکدستی اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں بلند پہاڑوں کے درمیان کوئی پچیس کلومیٹر آگے تک لے گیا۔ اس سفر کے دوران ایک مقام پر ہمیں معروف زمانہ چوٹی عظیم الشان کے ٹوکی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دی۔

آخر ایک جگہ پہنچ کر ڈرائیور انعام خان اور فور وہیل جیپ کی ہمت جواب دے گئی۔ اب اس سے آگے ہمیں پیدل سفر کرنا تھا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ہمارے ساتھ عورت ذات ہے۔ سفر بھی کٹھن ہے، خود کو مشکل میں نہ ڈالا جائے اور واپس چلے جائیں مگر جب میں نے ماہین سے بات کی تو وہ مجھے خود سے زیادہ متحرک اور پُرجوش محسوس ہوئی۔ عمران کا خیال بھی یہی تھا کہ اب اتنی دور آنے کے بعد اس گتھی کو سلجھایا جانا چاہیے۔ میں نے کہا۔ ”ایک اور بات تم دونوں کو ذہن میں رکھنی چاہیے۔ شوگراں میں گائیڈ نے کہا تھا کہ اس علاقے کے رہنے والے لوگ کچھ سخت گیر ہیں۔“

عمران بولا۔ ”پہاڑوں میں رہنے والے اکثر لوگ اخروٹ کی طرح ہوتے ہیں اوپر سے سخت اندر سے نرم۔“

تھوڑی سی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ ڈرائیور انعام خان چار پانچ کلومیٹر نیچے جاکر ڈوڈا نامی بستی میں ہمارا انتظار کرے گا۔ ہم واپسی پر اس سے وہیں ملیں گے۔

ٹریکنگ کی پوری تیاری کے بعد ہم سرد ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ گائیڈ کا ہاتھ سے بنایا ہوا نقشہ کافی حد تک ہماری رہنمائی کررہا تھا۔ ماہین کو پورا یقین تھا کہ ہم اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس شخص کا سراغ پانے میں کامیاب ہوجائیں گے جو اپنی ماں اور کم سن بیٹی کو روتا بلکتا چھوڑ کر بوجوہ ان دور دراز پہاڑوں میں چلا آیا ہے۔ ماہین کا یقین غلط نہیں تھا ہم فواد کا سراغ پانے والے تھے مگر ہمیں یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ چند گھنٹے بعد ہماری نگاہیں ایک بڑے ہنگامے کا مشاہدہ کرنے والی ہیں.....

☆☆☆

ہمیں پیدل چلتے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ یہ سہ پہر کے بعد کا وقت تھا۔ اب ہواؤں میں شدت آگئی تھی اور کہیں کہیں بادلوں کے مرغولے دکھائی دینے لگے تھے۔ البتہ کسی وقت سورج بھی بلند چوٹیوں کے درمیان سے جھلک دکھا دیتا تھا۔ ماہین مسلسل فوٹوگرافی کررہی تھی۔ خود کو ٹی وی ٹیم کا حصہ ظاہر کرنے کے لیے میں ایک نوٹ بک میں لوکیشنز کے حوالے سے مختلف اندراجات بھی کررہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہم منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اچانک چیڑ اور دیودار کے درختوں کے درمیان ہمیں ایک تیز حرکت نظر آئی۔ پہلے تو ہم اسے کوئی جنگلی جانور سمجھے، لیکن پھر کسی گاڑی کے انجن کا مدھم شور سنائی دیا..... بلکہ شاید یہ دو گاڑیوں کے انجن تھے۔ پہلا سوال تو ذہن میں یہی آیا کہ جس مقام تک ہماری جیپ سخت کوشش اور مہارت کے باوجود نہیں پہنچ سکی وہاں یہ گاڑیاں کیسے پہنچ گئی ہیں؟ ابھی اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ فاصلے پر اوپر تلے کئی فائر ہوئے پھر ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ لوگوں کے گرجتے برسنے کی آوازیں کانوں تک پہنچیں۔ ان میں ایک نسوانی آواز بھی تھی۔

”یہ کیا ہے جی؟“ عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

ہم تینوں ڈھلوان پر بیس تیس قدم مزید آگے گئے اور پھر خود کو ایک برف پوش چٹان کے پیچھے چھپالیا۔ اس سے آگے ایک دوسرے پہاڑ کی ڈھلوان تھی۔ یہاں سے ہمیں جو مناظر نظر آئے، وہ سنسنی خیز تھے۔ بلندی پر ایک سیاہ جیپ نظر آئی جو بُری طرح ایک درخت سے ٹکرائی ہوئی تھی۔ اس جیپ کے عقب میں اور اردگرد چند بندے موجود تھے جو نشیب کی طرف فائر کررہے تھے۔ ایک جیپ ڈھلوان کے نچلے سرے پر بھی موجود تھی اور یہ فائرنگ ان جیپ سواروں پر ہی ہورہی تھی۔ ہمارے سامنے ہی نیچے والے اپنی سرخ

جیپ سے نکلے اور تناور درختوں کی اوٹ لے کر جوابی فائر کرنے لگے۔

ماہین میرے پہلو میں بیٹھی تھی، تیز سرگوشی میں بولی۔ ''انکل تابی اوہ دیکھیں درمیان میں کیا ہے؟''

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت دیکھا، فاصلہ کافی تھا لیکن پتا چلتا تھا کہ یہ کوئی لڑکی ہی ہے جس نے پھولدار کپڑے پہن رکھے ہیں اور خود کو ڈھلوان پر دو ڈھائی فٹ کے ایک قدرتی بھیجے کے نیچے چھپایا ہوا ہے۔ وہ دونوں طرف سے فائرنگ کی زد میں تھی۔ اگر اپنی پناہ گاہ سے نکلتی تو یقیناً کسی گولی کا شکار ہو جاتی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اوپر والوں کے ڈر سے چھپی ہوئی ہے۔

صورتِ حال ناقابلِ یقین حد تک سنگین تھی۔ نیچے صرف دو یا تین افراد تھے مگر اوپر زیادہ تھے۔ پھر ہماری نگاہوں کے عین سامنے نیچے موجود ایک شخص کو گولی لگی اور وہ مزید نشیب میں لڑھک گیا۔

عمران نے کہا۔ ''نیچے والوں کے لیے رسک زیادہ ہے۔ ان میں جو دو باقی ہیں، وہ بھی کسی وقت ''ہٹ'' ہو سکتے ہیں۔''

''لڑکی کو بھی دیکھو۔'' میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ وہ ڈر کر نیچے کی طرف بھاگے گی۔ اس نے یہ غلطی کی تو فوراً اوپر سے نشانہ بن جائے گی۔''

ابھی بات میرے منہ میں تھی کہ بدحواس لڑکی نے اٹھ کر نیچے جانے کی کوشش کی۔ اس کے اردگرد چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ وہ تڑپ کر پھر اپنی پناہ گاہ میں دبک گئی۔

''ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔'' عمران نے کہا۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور پیشانی تمتما اٹھی تھی۔ اس کے اس انداز نے مجھے کسی کا بھولا بسرا چہرہ یاد کرا دیا۔

سچویشن واقعی ایسی تھی کہ لڑکی کو فوراً مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے ماہین کو وہیں رکنے کی تلقین کی اور عمران کے ساتھ تناور درختوں اور پتھروں کی آڑ لیتا ہوا، ان دو افراد کے پاس پہنچ گیا جو اپنی ہمت طاقت کے مطابق لڑکی کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جواں سالہ شخص بڑے قیمتی لباس میں تھا، اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا کولٹ پسٹل تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس فالتو راؤنڈ نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ دوسرا مقامی شخص جس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، سیون ایم ایم رائفل سے مسلح تھا۔ ان سنگین لمحات میں دونوں کو غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اولین کام یہی تھا کہ نیچے پھنسی ہوئی لڑکی کو اوپر موجود نصف

اہم اطلاع

برائے ایجنٹ حضرات/قارئین

السلام علیکم! اطلاعاً عرض ہے کہ ناگزیر وجوہ اور کاغذ کی بے انتہا گرانی کے سبب ادارے سے شائع ہونے والے چاروں ماہناموں

سسپنس ڈائجسٹ..... ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ پاکیزہ..... جاسوسی ڈائجسٹ

کی قیمت مئی 2022ء سے =/150 روپے فی شمارہ ہوگی۔

آپ سے تعاون کی درخواست ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلشنگ کمپنی

درجن افراد سے بچایا جائے۔ ظالم کون تھا اور مظلوم کون، یہ بعد میں دیکھا جا سکتا تھا۔ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ اوپر والے جارحیت کر رہے ہیں۔

قیمتی لباس والے نے حیرت سے ہم دونوں کو دیکھا۔

"آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اپنا پسٹل نکال لیا۔

اس سے پہلے کہ قیمتی لباس والا جواب میں کچھ کہتا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر درختوں میں پیوست ہوگئی۔ ہم نے سر جھکا لیے۔ اوپر والے اب بلند آہنگ میں گالیاں دے رہے تھے اور آہستہ آہستہ لڑکی کے قریب آ رہے تھے۔

کچھ دیر پہلے جس شخص کو ہمارے سامنے گولی لگی تھی، وہ ایک کھڈ میں برف پر مردہ پڑا تھا۔ البتہ اس کی آٹومیٹک رائفل ایک درخت کی جڑ میں نظر آ رہی تھی۔ عمران نے رائفل تھام لی اور قیمتی لباس والے کے پہلو میں پوزیشن لے لی۔

میں نے کہا۔ "عمران کسی کو نشانہ نہیں بنانا۔ بس اس طرح فائرنگ کرو کہ وہ لوگ لڑکی کے قریب نہ آئیں۔"

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے نفیس لباس والے نوجوان سے اردو میں کہا۔

"میں اس لڑکی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

میں نے پہلی بار اس نوجوان کی آنکھوں میں احسان مندی کے جذبات نمودار ہوتے دیکھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ پتا بھی چلا کہ وہ اردو سمجھتا ہے۔ ایک لمحہ توقف کے بغیر میں اپنی اوٹ سے نکلا اور پتھروں کے ساتھ ساتھ پیٹ کے بل رینگتا ہوا اوپر کی طرف جانے لگا۔ دھند کے مرغولے مجھے زیادہ نمایاں ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں روتی چلاتی لڑکی سے صرف تین چار میٹر دور تھا جب ایک چوڑا چکلا شخص کسی وزن دار پتھر کی طرح مجھ سے آ ٹکرایا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک میرے اور اس کے درمیان اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ ایک موقع پر میں پشت کے بل گرا تو وہ آناً فاناً میرے اوپر آیا۔ میں نے گرتے گرتے ہی اسے اپنی ٹانگوں پر اچھال دیا۔ بڑی زبردست ٹائمنگ تھی۔ وہ اپنے ہی زور میں نشیب میں دور تک لڑھک گیا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر ایک اور پہاڑی نے مجھ پر رائفل کی سنگین سے حملہ کیا۔ میں نے یہ خطرناک وار بچایا تو وہ پورا گھوم گیا اور عقب سے میری گرفت میں آ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کروں کہ اس کے اپنے ہی کسی ساتھی کی چلائی ہوئی دو گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ ایک طرح سے اس کے جسم نے میرے لیے ڈھال کا کام کیا تھا۔ میں نے اس کی رائفل دبوچ کر اسے برف پر پھینکا اور لڑکی کے بالکل پاس پوزیشن لے کر چند ہوائی فائر کیے۔ یہ سخت وارننگ دیتے ہوئے فائر تھے۔ اوپر موجود لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ میں جہاں پہنچ گیا ہوں وہاں سے انہیں بہ آسانی شوٹ کر سکتا ہوں۔ وہ پوزیشنیں چھوڑ کر مزید پیچھے چلے گئے۔ نیچے سے بھی گاہے بگاہے جوابی فائر ہو رہے تھے۔ لڑکی کو نکالنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو پتا چلا کہ اس کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا ہے یا سخت قسم کی موچ آ گئی ہے۔ وہ بس "ہائے اُف" کر کے رہ گئی۔ میں نے اسے کمر پر لاد لیا اور اکا دکا فائر کرتا ہوا الٹے قدموں نیچے اترنے لگا۔ یہ کافی مشکل کام تھا مگر میں دو تین منٹ میں لڑکی کو نیچے والی پوزیشن پر لے آیا۔

یہی وقت تھا جب نشیب میں بائیں جانب کے برف پوش درختوں میں دو تین جیپیں دکھائی دیں اور کچھ مسلح افراد کے للکارے سنائی دیے۔ عقب میں کچھ اور لوگ بھی آ رہے تھے۔ پتا چلا کہ یہ قیمتی لباس والے جواں سال شخص کے ساتھی ہیں۔ ان کے آتے ہی بلندی پر موجود لوگوں کی فائرنگ رک گئی اور اندازہ ہوا کہ وہ اپنی پوزیشن چھوڑ گئے ہیں۔ میں اور عمران یہ جان کر حیران ہوئے کہ آنے والے افراد قیمتی لباس والے کو پرنس کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں اور بہت مؤدب ہیں۔ یہ لوگ جو زبان بول رہے تھے، وہ بلتستانی تو نہیں تھی تاہم اس سے ملتی جلتی تھی۔ بلتستانی بولی میں کافی حد تک جانتا تھا لہٰذا ان کی باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ وہ پرنس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا انہیں حملہ آوروں کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اس نے انہیں منع کر دیا پھر وہ اپنے اس ساتھی کی طرف متوجہ ہوا جو گڑھے میں مردہ پڑا تھا۔ طاقتور رائفل کی گولی اس کا سینہ چیر کر پشت سے نکل گئی تھی۔ وہ کسی طبی امداد کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ پرنس میری طرف متوجہ ہوا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر شکستہ اردو میں بولا۔ "آپ نے بہت ہمت دکھائی اور بڑے نازک وقت پر میری مدد کی۔ میرے پستول میں بس تین چار راؤنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔"

پھر اس نے عمران کا کندھا بھی تھپکا۔ "آپ دونوں کو یہاں دیکھ کر بہت حیرانی ہو رہی ہے۔ میں آپ دونوں سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا ہوں لیکن ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ یہاں سے نکلتے ہیں۔ محفوظ جگہ پہنچ کر آرام سے بات کریں گے۔" تب وہ دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ "کوئی اور تو نہیں آپ کے ساتھ؟"

"ہاں ایک اور ہے..... ہماری ساتھی ہے۔" میں نے کہا۔

عمران لپک کر عقب میں گیا اور ماہین کو وہاں سے نکال لایا جہاں ہم نے اسے رکنے کا کہنا تھا۔ قیمتی کیمرا ماہین کے گلے میں تھا اور کیمرے کا اسٹینڈ اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ پرنس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ ملتوی کر کے بولا۔ "فی الحال ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے۔ آپ تینوں میرے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ جایئے۔" اس نے شاندار سرخ جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دشوار ترین راستوں کی شہزادی لینڈ روور تھی۔

موقع پر دو لاشیں بھی موجود تھیں۔ ایک پرنس کے ساتھی کی دوسری حملہ آوروں میں سے ایک کی۔ لاشوں کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پرنس ہمارے ساتھ لینڈ روور میں آ بیٹھا۔ جس لڑکی کا پاؤں زخمی ہوا تھا، اس کا نام شائم معلوم ہوا۔ وہ عجیب سے لباس میں تھی۔ یہ لباس اس کے جسم کو چھپانے کے بجائے نمایاں کرتا تھا۔ اسے ایک دوسری جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ برفانی چوٹیوں پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ہم پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی بستی میں موجود تھے۔ بستی چھوٹی ہونے کے باوجود نہایت شاندار تھی۔ لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے گھر خوب صورت اور آرام دہ تھے۔ ولاز کی طرز کی کئی بڑی بڑی کوٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بیرونی دنیا سے تقریباً کٹی ہوئی اس بستی میں بُری بھلی سڑکیں بھی موجود تھیں۔ یہ سڑکیں یقیناً اپنی مدد آپ کے تحت بنائی گئی ہوں گی۔ اِکا دُکا جیپیں بھی متحرک نظر آئیں۔ اب اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بستی کے اکثر گھروں میں بجلی کی روشنی موجود تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ پن بجلی ان لوگوں نے مقامی وسائل سے ہی مہیا کی تھی۔ جس شاندار وسیع ولا میں ہمیں لایا گیا، وہ چھوٹے موٹے محل سے کم نہیں تھا۔ یہاں الیکٹرک لائٹس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے گیس کے ہنڈولے بھی لگائے گئے تھے۔ باوردی ملازم اور مسلح گارڈز تیزی سے قدم اٹھاتے یہاں سے وہاں جا رہے تھے۔ سارے ماحول میں ایک سنسنی سی موجود تھی۔ اس سنسنی کا ماخذ شاید وہ واقعہ تھا جو ابھی تھوڑی دیر قبل ہوا تھا اور جس میں دو بندوں کی جان گئی تھی۔

مجھے عمران اور ماہین کو ایک مہمان خانے کے شاندار کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک ملازم نے شکستہ اردو میں بتایا کہ پرنس ابھی تھوڑی دیر میں آپ سے دوبارہ ملاقات کرتے ہیں۔

عمران نے دیدے پھاڑ کر اردگرد کی شان و شوکت دیکھی اور بولا۔ "یہ سب کیا ہو گیا چاچو، یہ ہم ایک دم کہاں سے کہاں آ گئے؟"

"کہاں سے کہاں آ گئے اور ایک سنگین قسم کے جھگڑے کا حصہ بھی بن گئے۔" میں نے کہا۔

ماہین بولی۔ "جب اندر آتے ہوئے آپ دونوں پرنس سے باتیں کر رہے تھے، میں نے تھوڑا دائیں ہٹ کر پارکنگ کی طرف دیکھا تھا۔ یہاں اس ولا میں سات آٹھ جیپیں موجود ہیں۔ یہ دو طرح کی جیپیں ہیں۔ کچھ لگژری ٹائپ، جس طرح کی جیپ میں ہم آئے ہیں اور دوسری پرانی اور سخت جان قسم کی۔ یہ پرانی جیپیں شاید اس علاقے میں پہنچنے کے لیے استعمال کی جاتی ہوں گی۔"

عمران بولا۔ "لیکن یار..... سس سوری ماہین، یہ گاڑیاں یہاں تک پہنچی کیسے ہیں، ہماری گاڑی تو نہیں پہنچ سکی۔"

"برف باری سے پہلے شاید راستہ اتنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

ماہین نے کہا۔ "آپ دونوں نے میری اصل بات تو سنی ہی نہیں۔ پارکنگ میں جو گاڑیاں موجود ہیں، وہ ایک اہم خبر دے رہی ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"انکل ان میں وہ پیڈفورڈ کی اسکائی کلر جیپ موجود ہے جو لاہور میں دیکھی گئی تھی۔" ماہین کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ یہ واقعی ایک اہم اطلاع تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم اس پر مزید تبصرہ کرتے، دروازے پر آہٹ ہوئی اور دو خواتین شائستہ انداز میں اجازت لے کر اندر آ گئیں۔ وہ دونوں دیدہ زیب بلتستانی لباس میں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ بیٹی کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ خوب صورت تھی اور پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ دونوں پرنس کی قریبی عزیز ہیں۔ لڑکی کا نام شازینہ معلوم ہوا۔ وہ بہت تعریفی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اردو میں بولی۔ "پتا چلا ہے کہ آپ نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے شائم کی جان بچائی..... اور پرنس کی مدد بھی کی۔ ہم سب آپ کے بہت مشکور ہیں۔"

ادھیڑ عمر شائستہ خاتون نے بھی اپنی بیٹی کی تائید کی۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ پرنس اب کہاں ہیں۔ خاتون نے جواب دیا۔ ''ساتھ کے گاؤں والوں سے جو جھگڑا ہوا ہے، اسی کے سلسلے میں گئے ہیں۔ اللہ کرے بات زیادہ نہ بڑھے۔ یہ دونوں بستیوں کا نقصان ہے۔'' ساتھ والی بستی کا نام ہالاٹ اور اس بستی کا نام ''ذخیرہ'' معلوم ہوا۔

میں نے کہا۔ ''خاتون! یہ آپ لوگوں کے ذاتی معاملات ہیں لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ اسی لڑکی شانم کا جھگڑا تھا؟''

''ہاں یہی سمجھ لیں۔'' خاتون نے گول مول سا جواب دیا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''ویسے اگر اُن کا بندہ مرا ہے تو ایک بندہ ہماری طرف سے بھی جان ہار گیا ہے۔ اللہ کرے یہ نئی مصیبت یہیں پر ختم ہو جائے۔''

وہ نئی مصیبت کا ذکر کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی پرانی مصیبت بھی موجود تھی۔ اتنے میں دلکش شازینہ کی مترنم آواز نے مجھے چونکایا۔ ''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو آپ کو انکل کہہ لوں؟''

''بصد شوق۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''انکل! آپ لوگ اس دور دراز مقام پر کیسے.....؟''

اس کا جواب تو ہم پہلے ہی اچھی طرح تیار کر چکے تھے۔ میں نے شازینہ اور اس کی والدہ کو بتایا کہ ہم ایک ٹی وی پروڈکشن کے سلسلے میں اس علاقے کی ریکی کر رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے جس کی وجہ سے یہ ساری دشواری اٹھانا پڑ رہی ہے۔ ہم اپنے ڈرائیور کو کوسوں پیچھے چھوڑ کر پیادہ یہاں پہنچے ہیں۔''

ہمارے جوابات نے شازینہ اور اس کی والدہ کو تو کافی حد تک مطمئن کر دیا، ابھی یہ پتا نہیں تھا کہ پرنس وغیرہ بھی مطمئن ہو سکیں گے یا نہیں۔

شازینہ ہم سے تو کچھ ہچکچا رہی تھی لیکن ماہین کے ساتھ وہ جلد ہی گھل مل گئی۔ ایک اعلیٰ خاندانی طرز کی دلکشی اور نجابت کے باوجود اس میں متاثر کرنے والی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ نوکر چاکر بھی اسے بڑی تعظیم دے رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد شازینہ نے ہم سے اجازت لی اور ماہین کو یہ شاندار عمارت دکھانے کے لیے مہمان خانے سے باہر لے گئی۔ اس کی والدہ بھی ساتھ ہی چلی گئیں۔

میں اور عمران اس آسمانی رنگ کی جیپ پر تبصرہ کرنے لگے جو یہاں اس ولا میں موجود تھی اور یہ ثابت کر رہی تھی کہ فواد کی تلاش کے سلسلے میں ہم درست مقام پر پہنچے ہیں۔ اس پوری عمارت میں ہلچل سی محسوس ہو رہی تھی۔ دو تین گاڑیاں ہمارے سامنے بڑی تیزی سے باہر نکلیں۔ رکھوالی کے کتوں کا شور بھی سنائی دیا۔ پھر ہم نے چند مسلح گھڑسواروں کو بھی مہمان خانے کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد شازینہ اور ماہین دوبارہ نمودار ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں ہی یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ مدت سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ شازینہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''انکل! اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم دونوں ڈنر اکٹھے ہی کر لیں؟''

میں نے انکار مناسب نہیں سمجھا۔ سردی حد سے بڑھ گئی تھی۔ آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے اور باہر سرد ہوائیں پتھریلی دیواروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔

ماہین کی واپسی، رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے ولا کی شان و شوکت کی تعریف کی اور بتایا کہ پرنس کا اصل نام بخت آور ہے۔ وہ اس ساری پراپرٹی کا اکلوتا وارث ہے۔ پرنس کو چھوٹے خاقان بھی کہا جاتا تھا مگر پرنس کا لقب زبانوں پر زیادہ چڑھ گیا تھا۔ شازینہ، پرنس بخت آور کی کزن تھی۔ وہ اسکردو کی رہنے والی تھی۔ پرنس کی فیملی سے اس کی دور کی رشتے داری تھی۔ آج کل وہ اپنی والدہ اور والد کے ساتھ یہاں اس ولا میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ماہین نے کہا۔ ''جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق عنقریب پرنس اور شازینہ کی شادی ہونے والی ہے۔''

میرا دھیان پھر پرنس کی طرف چلا گیا۔ میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''پرنس کی واپسی ہوئی یا نہیں؟''

''نہیں، ابھی تو نہیں، لیکن اہلِ خانہ کچھ مطمئن نظر آ رہے ہیں۔ یہ لوگ یہاں اپنے معاملات خود ہی حل کر لیتے ہیں۔ شاید کوئی پنچایت وغیرہ بیٹھی ہوئی ہے۔ تصفیہ ہو جائے گا۔ تاہم شازینہ بتا رہی تھی کہ اب یہ لڑکی شانم اپنی بستی کے بجائے یہیں اس ولا میں رہے گی۔ کیونکہ مخالف پارٹی پھر اسے تنگ کرے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مخالف پارٹی کے لوگ ایک طرح سے شانم کو اس کی بستی سے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ پرنس اور اس کے دو گارڈز کو پتا چل گیا اور انہوں نے ان لوگوں کو روک لیا..... لیکن بات صرف اتنی سی نہیں ہے انکل۔ ان دونوں گروپوں میں ایک پہاڑ کی ملکیت کا جھگڑا کافی عرصے سے چل رہا ہے۔''

میرے ساتھ ساتھ عمران نے بھی تنبیہی انداز میں سر ہلایا۔

''وہ لڑکی اب کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہیں پر ہے۔ اُس کے پاؤں میں سخت موچ آئی

ہے۔ خاقان فیملی کے ذاتی ڈاکٹر نے اس کی مرہم پٹی کی ہے۔ وہ آپ کی بہت تعریفیں کررہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اگر آپ اسے کمر پر لاد کر نیچے نہ لاتے تو اب تک وہ یقیناً لاش بن گئی ہوتی۔"

پھر ذرا توقف کر کے بولی۔ "ویسے انکل، باقی لوگ بھی آپ کی ہمت کی داد دے رہے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جس بندے کو آپ نے الٹا کر کھڈے میں پھینکا تھا، وہ اس قبیلے کے خطرناک ترین بندوں میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی اس کے سامنے آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہ تو پھر میرے لیے بھی انکشاف ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

ہمیں اس خاقان ولا میں اب تین روز ہو چکے تھے۔ کل رات پھر برف باری ہوئی تھی اور سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں ہماری خاطر مدارت شاہانہ انداز میں ہو رہی تھی۔ پرنس بخت آور ایک قدرداں اور نہایت مہربان شخص کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ ہمیں اور خاص طور سے مجھے بہت عزت دے رہا تھا۔ وہ والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھی۔ اس کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ والد جو بڑے خاقان کہلاتے تھے، بستر علالت پر تھے۔ اب سارے معاملات تیس بتیس سالہ پرنس ہی سنبھالتا تھا۔ لڑکی کے جھگڑے والا معاملہ اب سیٹل ہو چکا تھا۔ ولا میں جو ایک بے چینی سی پائی جارہی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ میرے اور ماہین کے اندازے کے مطابق ایک دو ماہ کے اندر پرنس شادی کے بندھن میں بندھنے والا تھا۔ اسکردو کی خوشنما لڑکی شازینہ اور اس کے والدین اسی سلسلے میں اس خاقان ولا میں موجود تھے۔ لگتا یہی تھا کہ پرنس اور شازینہ کے بزرگ چاہتے تھے کہ شادی سے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کے طور اطوار سمجھ لیں۔

خاقان ولا میں نیلی بیڈفورڈ جیپ تو ہمیں نظر آ گئی تھی مگر نہ کہیں فواد نظر آیا اور نہ وہ دبنگ عورت جو فواد کو لاہور سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ ماہین کا خیال تھا کہ میں پرنس یا کسی اور سے نیلی جیپ کے بارے میں ٹوہ لوں مگر میں اس طرح کے سوال سے فی الحال اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ پرنس اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور جہاندیدہ نظر آتا تھا۔ لمبا قد، کھڑی ناک اور گہری بادامی آنکھیں، اس کی شخصیت کو نکھارتی تھیں۔

جس لڑکی شانم کے سلسلے میں جھگڑا ہوا تھا، وہ بھی ولا ہی میں موجود تھی۔ ایک دفعہ مہمان خانے کے سامنے لان میں بھی نظر آئی تھی۔ تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اُس کی صورت تو عام سی تھی مگر نہایت قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کا جسم عام نہیں تھا۔ وہ نہایت دلکش بلکہ ہوشربا جسم کی مالک تھی۔ اس کا پیکر اس کے لباس کے اندر سے پکارتا اور چنگھاڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کا لباس بھی باقی عورتوں کے لباس سے مختلف تھا۔ سردی کے باوجود اس کی پنڈلیاں اور نصف بازو عریاں نظر آتے تھے۔ ایک روز پہلے مجھے اور عمران کو ایک اور اُلجھن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہم لان میں بیٹھے تھے اور ولا کے ملازموں کو والی بال کھیلتے دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی کھلاڑیوں کے لیے پانی لے کر آئی اور کھیل دیکھنے لگی۔ اندر سے ہیڈ ملازمہ نے کڑے انداز میں اسے پکارا۔

"اے شانم! واپس آؤ۔" وہ واپس چلی گئی۔

"ہائیں۔" عمران نے دیدے گھمائے۔ "یہ بھی شانم ہے؟"

اس سوال کا جواب اگلی رات مجھے مل گیا۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ تھا جو مجھے ششدر کر گیا۔ میں مہمان خانے میں اپنے آرام دہ نیم گرم کمرے میں سویا ہوا تھا۔ ایک ہلکی سی دستک نے مجھے جگایا۔ وال کلاک دیکھا، ایک بجے کا وقت تھا۔ باہر برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی شانم لنگڑاتی ہوئی اندر آ گئی جسے میں نے گولیوں کی بوچھاڑ میں بچایا تھا۔

اس نے یکا یک جذباتی انداز میں میرے ہاتھ تھام کر چومنا شروع کر دیے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچے اور دروازہ بند کیا کہ کوئی اس مشکوک منظر کو دیکھ نہ لے۔

"یہ کیا حرکت ہے شانم؟" میں نے اردو میں پوچھا۔ پہلے تو اس نے کسی نا قابلِ فہم زبان میں ایک فقرہ بولا، پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "آپ بہت اچھا، لگتا ہے کہ اس دن دیوتاؤں نے آپ کو خاص میرے لیے بھیجا۔ آپ نے جس طرح اس علاقے کے سب سے خطرناک قاتل اور بدمعاش کو اٹھا کر کھڈ میں پھینکا، وہ منظر بھولنے والا نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے جو ہوا وہ ہوا۔ لیکن تم اب اس وقت یہاں کیوں موجود ہو؟"

کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی تھی، وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے جو بات کہی، اس نے میرا دماغ بھک سے اُڑا دیا۔ وہ بولی۔ "آپ نے میری زندگی بچائی۔ میں اپنا آپ..... آپ کو دینے آئی ہوں۔ اگر آپ کو قبول ہو تو....."

میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ وہ معمولی صورت کی تھی اور جو بات کر رہی تھی، وہ اس سے بھی کہیں زیادہ معمولی تھی۔ میں نے اس کا سڈول بازو، کندھے کے پاس سے تھاما اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ ایک دم میرے پاؤں میں بیٹھ گئی اور میری پنڈلیاں جکڑ لیں۔ وہ سسک اٹھی۔ پتا نہیں میں آپ کے قابل ہوں یا نہیں، مگر آپ اتنے اچھے ہیں کہ میں اپنا سب کچھ آپ پر قربان کر سکتی ہوں۔ اگر میں نے غلط بات کہی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔"

وہ ایک سادہ پہاڑن تھی۔ اس کے عاجزانہ انداز نے میرا غصہ کم کر دیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے دام غلام کی طرح بیٹھ گئی۔ اُس کا پیکر تو بہ شکن تھا مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری غرض یہ تھی کہ شاید وہ مجھے اس علاقے اور اس خاقان ولا کے بھیدوں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ تاہم سب سے پہلا سوال میں نے اس سے یہی کیا کہ اس نے میرے کمرے میں آ کر ایسی گھٹیا بات کیوں کی ہے؟

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "میں..... شانم ہوں۔"

"شانم ہوں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا شانم تمہارا نام نہیں؟"

اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں اٹھا کر ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "شانم نام نہیں ہوتا۔ شانم تو ہمارا خاندان ہے۔ میری طرح اور بھی کئی شانم ہیں، دو چار یہاں خاقان ڈیرے (خاقان ولا) میں بھی موجود ہیں۔ ہمارا..... کک..... کام وہی ہے، جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ وہ دبے ہوئے مگر عجب بے باک لہجے میں کہنے لگی۔ "دیوتاؤں نے مجھے اتنی عقل نہیں دی کہ میں کوئی زیادہ اچھی بات کہہ سکوں۔ بس میرے دل میں یہی آتا ہے کہ تین چار مہینے بعد جب میں پورے بائیس کی ہو جاؤں گی، میرے لوگوں نے مجھے کسی نہ کسی کے حوالے تو کر ہی دینا ہے۔ یہ میرے لیے بالکل عام سی بات ہو گی۔ لیکن اگر میں آپ کو کوئی خوشی دے سکوں اور آپ کے....." شاید وہ اور بھی کچھ کہتی لیکن میرے کڑے انداز میں گھورنے پر چپ رہ گئی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس لڑکی نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے پوچھا، اس کا خلاصہ یہ ہے۔ پہاڑوں میں گھری ہوئی ان دو بڑی بستیوں کے درمیان بیس میں گھروں پر مشتمل ایک اور چھوٹی سی بستی بھی تھی۔ یہ طوائفوں کی بستی تھی۔ ان کو مقامی زبان میں شانم کہا جاتا تھا جس طرح یہ خاقان ولا تھا اور اس کے اردگرد کی خوب صورت رہائش گاہیں تھیں، اسی طرح یہاں جو دوسری بڑی بستی متنازعہ پہاڑ کی پرلی طرف تھی وہاں بہراش ولا تھا۔ وہاں بھی کھاتے پیتے لوگوں کی کثیر تعداد آباد تھی۔ یہ لوگ خصوصی مہمانوں کی آمد پر یا موج میلے کے موقع پر شانم عورتوں کو تفریحِ طبع کے لیے بلاتے تھے اور انعام اکرام سے بھی نوازتے تھے۔ تاہم کچھ شرائط بھی تھیں جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ کوئی شانم لڑکی بائیس برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے کسی کے بستر پر نہیں جائے گی۔ یہ شانم جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی، اس کا اصل نام غنچہ تھا۔ یہ ابھی اکیس برس سے تھوڑا ہی آگے نکلی تھی۔ بہراش ولا کے کرتا دھرتا ٹھوک شکرے کا دل اس پر آیا ہوا تھا۔ اس نے مقامی رواج کی خلاف ورزی کی اور اپنے کارندوں کے ذریعے غنچہ کو زبردستی اٹھوا لیا۔ پرنس بخت آور اس وقت اپنے دو گارڈز کے ساتھ جنگل میں کچھ کرے ہوئے درختوں کو اٹھوانے نکلا ہوا تھا۔ اس نے تیز رفتار جیپ میں غنچہ کے رونے چلّانے کی آوازیں سنیں اور مدد کے لیے لپک پڑا، بعد کے واقعات میں بیان کر چکا ہوں۔

غنچہ اپنی رام کہانی بیان کر چکی تو میں نے اُس سے اپنے مطلب کے دو تین سوالات پوچھے۔ ان میں سے ایک سوال نیلی جیپ کے بارے میں بھی تھا۔ میری امید کے برخلاف غنچہ نے اپنی ٹوٹی ہوئی اردو میں اس سوال کا جواب کھٹاک سے دیا۔ بولی۔ "جہاں تک میرا اندازہ ہے جی وہ نیلی گاڑی پرنس جی کی پہلی بیوی کے پاس ہوتی ہے یا پھر..... کبھی کبھی ان کی ساس بھی اس میں سفر کرتی ہیں۔"

یہ ایک انکشاف تھا۔ ابھی تک شازینہ نے ماہین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے غنچہ سے کہا۔ "مجھے پتا نہیں تھا کہ پرنس پہلے سے شادی شدہ ہیں۔"

وہ ہولے سے بولی۔ "شادی شدہ تو ہیں جی..... لیکن بڑے دکھی ہیں۔ شادی کو چھ سات سال ہو گئے ہیں پر ابھی تک گھر میں کوئی رونق نہیں ہوئی۔ بہت علاج معالجہ بھی ہوا ہے۔ پشاور تک بھی گئے ہیں، کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ باہر کے ملکوں سے بھی دوائیں آتی رہی ہیں۔ اب لگتا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود پرنس جی نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پرنس جی کے والد بیمار رہتے ہیں، وہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے خاقان ڈیرے کا وارث دیکھنا چاہتے ہیں....."

غنچہ بول رہی تھی مگر میرا دھیان نیلی جیپ اور پھر پرنس کی ساس میں اٹکا ہوا تھا۔ غنچہ بتا رہی تھی کہ پرنس جی کی ساس صاحبہ بھی کبھی کبھی وہ نیلی جیپ استعمال کرتی ہیں۔ تو کیا برف باری سے قبل جو ہٹی کٹی عورت یہاں سے طویل سفر کر

کے لاہور پہنچی تھی اور فواد کو اپنے ساتھ لائی تھی، وہ یہی پرنس کی ساس تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہاں کے حالات اور فواد میں کیا تعلق تھا؟ کیا فواد بھی اب اسی خاقان ولا میں موجود تھا یا وہ کہیں اور تھا؟

میں نے غنچہ سے پوچھا۔ ''یہاں ولا میں بہت سے ملازم ہیں، یہ زیادہ تر تو مقامی ہیں۔ کیا کبھی کوئی پنجاب کا ملازم بھی یہاں رکھا گیا ہے؟''

وہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکی۔ میں رات کے اس پہر اسے زیادہ دیر اپنے کمرے میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کچھ نصیحتیں کرنے کے بعد میں نے اسے واپس بھیج دیا۔

☆☆☆

برف باری پھر شروع ہو چکی تھی۔ راستے بند تھے۔ پرنس بخت ہماری میزبانی کرتے ہوئے بہت خوش تھا۔ وہ اپنے بیمار والد سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی بیماری اور غیر معمولی کمزوری کا خیال کرتے ہوئے پرنس نے انہیں ولا کے باہر کے حالات سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تازہ جھگڑے میں دونوں طرف سے دو بندے دیرینہ دشمنی کی بھینٹ چڑھے تھے مگر پرنس نے اس بارے میں بھی والد کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ پرنس کے سامنے میں نے خود کو ٹی وی پروڈکشن کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر بتایا ہوا تھا۔ ماہین کو اسکرپٹ رائٹر اور عمران کو اہم ڈراما آرٹسٹ۔

پرنس کے ساتھ گپ شپ کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر برف کے گرتے گالوں کو دیکھ رہا تھا۔ ماہین، شازینہ کے ساتھ رہائشی پورشن کی طرف گئی ہوئی تھی۔ ماہین اور عمران کو میں نے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو پرسوں رات مجھے شانم یعنی غنچہ سے معلوم ہوا تھا۔ ماہین اور عمران کے لیے بھی یہ ایک انکشاف تھا کہ پرنس پہلے سے شادی شدہ اور بے اولادی کی وجہ سے دوسری شادی کرنا چاہ رہا ہے۔

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے دس بجنے والے تھے لیکن ماہین ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ہانپی ہوئی سی اندر آ گئی۔ اُس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ ''خیریت ہے ماہین؟'' میں نے پوچھا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''خیریت سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ میں نے ابھی اس عورت کو دیکھ لیا ہے جو فواد کو لاہور سے زبردستی یہاں لے کر آئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پرنس کی ساس۔''

''گڈ نیوز۔'' میں نے کہا۔ ''کہاں دیکھا؟''

''زنان خانے کے چھوٹے لاؤنج میں۔ کافی ہٹی کٹی ہے۔ مینک لگاتی ہے۔ کافی لڑاکو بھی نظر آتی ہے۔ جب میں نے دیکھا تب بھی لڑ رہی تھی۔ پتا ہے کس کے ساتھ؟''

''شازینہ کی امی کے ساتھ۔ بہت چبا چبا کر اور ہاتھ نچا نچا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ شازینہ کی امی بڑے دھیمے انداز میں جواب دے رہی تھیں۔ پھر ایک اور صورت مبارک نظر آئی۔ جانتے ہیں کس کی؟ پرنس کی پہلی وائف کی۔ چوبیس پچیس سال کی ہو گی۔ ہے تو کافی خوب صورت لیکن مزاج کی کچھ تیز بھی لگتی ہے۔ بس اُس کے ایک دو فقرے ہی میرے کان میں پڑے۔ ہٹی کٹی عورت کو ''ما'' کہہ کر بلا رہی تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ بات کو بڑھنے سے روکنا چاہتی ہے۔ پھر وہ ماں کو بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے گئی۔ پرنس کی اس پہلی وائف کا نام زوش جہاں معلوم ہوا ہے۔''

''شازینہ نے کچھ بتایا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''نہیں انکل، وہ بہت محتاط لڑکی ہے۔ گھر کے اندر کی کوئی بات مجھ سے نہیں کرتی۔ اس نے تو مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا کہ پرنس پہلے سے شادی شدہ ہیں۔''

''کوئی اور نئی بات جو پتا چلی ہو؟''

''پرنس سمیت ولا کے سارے لوگ شازینہ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ شازینہ اپنے والدین کے ساتھ دو تین ماہ سے یہیں خاقان ولا میں ہے..... اور لگتا یہی ہے کہ شاید ایک دو ہفتوں میں پرنس اور شازینہ کی منگنی کی چھوٹی موٹی رسم بھی ہو جائے۔''

''ظاہر ہے کہ پرنس کی پہلی وائف اور مدرانِ لاء کو یہ صورتِ حال ہرگز پسند نہیں ہو گی۔ یوں اس چھت کے نیچے ایک طرح کی کشمکش اور چپقلش کی فضا چل رہی ہو گی چلو خیر، یہ ان لوگوں کے ذاتی معاملات ہیں، ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ پرنس کی ساس لاہور سے فواد کو یہاں کیوں گھسیٹ کر لائی ہے؟''

میں نے لاہور کا ذکر کیا تو ماہین کچھ پریشان نظر آنے لگی۔ ذرا توقف کر کے بولی۔ ''انکل تابی! میں حشام کی طرف سے فکر مند ہوں۔ وہ میرے لیے پریشان ہو گا۔ میں نے اسے صرف تین چار روز کا کہا تھا۔ یہاں تو سگنل ہی نہیں ہیں کہ اسے کال کی جا سکے.....'' اسی دوران میں عمران دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اُس نے ہڈ والی سیاہ برساتی پہن رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ برف باری میں گھوم پھر کر آیا ہے۔ آتے

ساتھ ہی ماہین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لگتا ہے کہ حشام صاحب کا ذکرِ خیر ہو رہا ہے..... بے چارے بڑے پریشان ہوں گے..... ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے ہوں گے؟''

ماہین کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی کا سایہ لہرایا۔ متوازن لہجے میں بولی۔ ''عمران! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور میں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں کہ یہ عزت برقرار رہے۔ آپ حشام کا ذکر اس طرح مزاحیہ انداز میں نہ کیا کریں۔'' وہ اٹھی اور بغیر کچھ مزید کہے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

عمران نے بیمار بکرے کی طرح گردن جھکا لی۔ میں نے کہا۔ ''سمجھ دار کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔''

وہ دلدوز آواز میں بولا۔ ''آپ بھی تو اشارہ سمجھ لیں نا۔ مجھے اب زیادہ دیر نہیں جینا ہے۔''

''زیادہ دیر تو کوئی بھی نہیں جیتا۔ بہت ہوا تو اسی نوے سال۔''

''سالوں کی نہیں گھنٹوں کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج صبح نہار مجھے خودکشی کرنا پڑے گی۔''

''صبح نہار کیوں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''میرے پاس صرف تین چوہے مار گولیاں ہیں۔ انسان کے مرنے کے لیے یہ ڈوز کم ہے۔ میں اسے خالی پیٹ کھاؤں گا تو روح جلدی نقشِ فریادی سے پرواز کر جائے گی۔''

''نقشِ فریادی نہیں، قفسِ عنصری۔''

''جو بھی ہے، پرواز تو کرے گی نا۔ آپ کو جو وہم ہے میرے بارے میں پورا ہو کر رہے گا۔''

''اگر ارادہ پکا ہے تو پانچ چھ مزید گولیوں کا انتظام میں کر دیتا ہوں۔'' میں مسکرایا۔

''مگر چند گھنٹے مزید جینے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں آپ کو کچھ بتا کر جانا چاہتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہو گئی۔ اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ ظالم گاہے بگاہے اپنے باپ کا انداز یاد کرا دیتا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور بالکل پاس بیٹھ کر بولا۔ ''برف باری تو ہے پر بہت ہلکی ہے۔ میں ولا سے نکل کر کافی دور چلا گیا تھا.....''

''تو دور کیوں چلے گئے تھے۔ ان لوگوں نے کہا بھی ہے کہ دشمن داری ہے، احتیاط کرنا ہوگی۔''

''اتنی دور بھی نہیں گیا تھا۔ آپ جھگڑالو بیوی کی طرح پوری بات تو سنتے نہیں۔'' وہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ ذرا دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''جوں جوں بستی سے آگے جاتے ہیں۔ آبادی چھدری اور درخت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ میں ذرا بلندی پر کھڑا تھا۔ نشیب میں، میں نے ایک ایسے سینڈو ٹائپ بندے کو دیکھا جو ہمارے جانے ہوئے حلیے کا لگتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ جو دو بندے پرنس کی ساس کے ساتھ لاہور آئے تھے ویسا ہی حلیہ۔ اس سینڈو ٹائپ بندے کے ساتھ گرم چادر میں لپٹی ہوئی کوئی لڑکی بھی تھی۔ اتنے میں میرے والے راستے تین چار گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ یہ ہلکی سبز وردیوں والے، پرنس کے پہریدار تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ وقتاً فوقتاً ایک بگل جیسی چیز بجاتے ہیں۔ جب انہوں نے یہ بگل بجایا تو نیچے وہ سینڈو ٹائپ بندہ بُری طرح ٹھٹکا اور لڑکی سمیت ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ میں چونکہ بلندی پر تھا اس لیے سب دیکھ رہا تھا۔ پہریدار جب دائیں طرف مڑ کر دور چلے گئے تو سینڈو پھر اپنی جگہ سے نکلا اور لڑکی کے ساتھ ایک طرف چل دیا۔ ابھی برف باری بہت ہلکی تھی۔ شک کی وجہ سے میں ان دونوں کے پیچھے چل پڑا۔ بڑی احتیاط سے دس پندرہ منٹ اُن کا پیچھا کیا۔ ہم ڈھلوان پر پہنچ گئے۔ یہاں گھر فاصلے فاصلے پر ہیں۔ ایسے ہی ایک بڑے گھر کے گیٹ کے سامنے جا کر سینڈو اور لڑکی اوجھل ہو گئے۔ آپ کو پتا ہے کہ درختوں سے گھرے ہوئے اس گھر میں کون رہتا ہے؟''

میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

''وہی عورت جو پرنس کی ساس ہے۔ اس کا کوئی بھتیجا بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے لیکن وہ کبھی کبھار ہی وہاں جاتی ہے۔ اکثر یہاں خاقان ولا میں اپنی بیٹی زرش جہاں سے چمٹی رہتی ہے۔''

''تم نے کیا اندازہ لگایا۔ یہ کیا چکر ہوگا؟''

''کیا چکر ہوگا، یہ تو پتا نہیں لیکن کوئی چکر ہے ضرور۔ مجھے وہ گھر پُراسرار سا لگا ہے۔ اندر سے دیوہیکل کتوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ایک شیڈ تلے دو تین گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔''

اگلے روز سہ پہر تک برف باری بالکل تھم گئی۔ آسمان صاف شفاف ہو گیا۔ رات کو مشرقی چوٹیوں سے پوری رات کا چاند نمودار ہوا تو خاقان ولا کی بالکونی سے انوکھا نظارہ دکھائی دیا۔ حیرت گم ہو گئی۔ دور دور تک برف کی ہموار چادر اور اس پر چٹخی چاندنی۔ درختوں پر سفید گالے دمکتے ہوئے اور ماشر بروم، کیشر بروم کی چوٹیوں پر نقرئی آبشاروں کی موجودگی کا گمان۔ بڑھتی ہوئی سردی کے سبب پرنس کے والد

محترم بڑے خاقان کی طبیعت خراب تھی۔ پرنس روڈ اکفرز کے ساتھ ان کی گلہداشت میں مصروف تھا۔ میں اور عمران گھومنے پھرنے کے لیے خاقان ولا سے باہر چلے گئے۔ ہم نے برف پر چلنے والے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں واکنگ اسٹکس تھیں۔ عمران اور مائین آج کل بھاری بھرکم کپڑوں میں نظر آتے تھے لیکن میرا جسم موسمی اثرات کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ مجھے کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔ دو پہرے دار میرے اور عمران کے عقب میں تھے۔

کچھ دیر بعد ہم نے انہیں اس ڈیوٹی سے آزاد کر دیا اور لطف اندوز ہونے والے انداز میں قریبی ڈھلوان پر گھومنے لگے۔ ہمارا رخ بتدریج اس سمت تھا جہاں کل عمران نے باڈی بلڈر ٹائپ شخص اور لڑکی کو مشکوک انداز میں گم ہوتے دیکھا تھا۔ یہاں واقعی درخت زیادہ اور آبادی کم تھی۔ گھڑسوار پہریداروں کی ایک ٹولی بگل بجاتی، بالائی راستے سے گزر کر آگے چلی گئی تو ہم تیزی سے گھوم کر اس پتھریلی عمارت کے عقب میں آ گئے جو کسی بہت بڑی خاکستری چمگادڑ کی طرح ایک سفید ڈھلوان پر اپنے پر پھیلائے موجود تھی۔ عمارت کا کچھ حصہ دو منزلہ تھا اور اوپر مخروطی چھت تھی جس پر دو تین فٹ موٹی برف نظر آ رہی تھی۔ عمران کے چہرے کی چمک بتانے لگی کہ وہ عمارت میں گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بیان کے عین مطابق عمارت کا زیادہ تر حصہ تاریک تھا۔ اندر سے گاہے بگاہے کتوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ یہ یقیناً جسیم کتے تھے اور تعداد تین چار سے کم نہیں تھی۔

عمران دیوار پھاندنے کے موڈ میں تھا۔ ”کیسے جاؤ گے؟ کتے حملہ کر دیں گے؟“

”چاچو جانی، آپ کے پاس آپ کا سروس پسٹل ہے۔“

”یعنی گولی چلاؤں اور یہ لوگ پکڑ کر ہمیں چلا دیں۔ تم جانتے نہیں، اپنے کتوں کے حوالے سے یہ لوگ بڑے ”کچی“ ہوتے ہیں۔“

وہ مسکرایا۔ ”مذاق کر رہا تھا۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“

پلک جھپکتے میں وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ میں روکتا رہا لیکن وہ اندر کود گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کتے اس کی طرف لپکے۔ ان کا شور بلند ہوا مگر پھر ایکا ایکی خاموشی چھا گئی۔ چند ہی لمحے بعد عمران نے چار دیواری کا چھوٹا سا عقبی دروازہ کھول دیا۔ اس کے گرد تین جسیم السیشین کتے موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پھر اپنے کان کھڑے کیے مگر عمران گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور انہیں پچکارنے لگا۔ خطرناک کتوں کا انداز دوستانہ ہو گیا۔ اس کی یہ صلاحیت غیر معمولی تھی اور میں کم از کم دو دفعہ پہلے بھی بقائمی ہوش و حواس اس کا تجربہ کر چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ڈی این اے میں بھی وہ ساری ناقابل فہم صلاحیتیں کسی نہ کسی درجے موجود ہیں جو اس کے باپ میں تھیں۔ کئی بھولے بسرے مناظر پلک جھپکتے میں نگاہوں میں گھوم گئے۔ چند سیکنڈ بعد قدآور کتے دائیں بائیں ہو گئے۔

کڑک سردی تھی۔ چاندنی بلند درختوں میں سے چھلک رہی تھی۔ ہم دیواروں کے سائے سائے چلتے ایک اندرونی دروازے تک پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہ کھلا ملا۔ اب ہم رسک لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سانس منہ سے بھاپ بن کر خارج ہو رہی تھی۔ ہم ایک پتھریلی راہداری میں پہنچے..... اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک نیم روشن لابی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی کمرے سے بولنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ ہم وزنی لکڑی کی ایک کھڑکی میں تھوڑی سی درز ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں ایک بڑا آتشدان دہک رہا تھا اور شاید اسی آتشدان کی وجہ سے کھڑکی کو پورا بند نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین تھا۔ پرانی طرز کے فرنیچر نے اس کمرے کو کلاسیکل رنگ دے رکھا تھا۔ سامنے ہی طاق میں دو تین چھوٹے چھوٹے مجسمے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ دیوی دیوتاؤں کے لگتے تھے۔ کشادہ پلنگ پر جو شخص نیم دراز تھا اسے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ وہ لاہور کی اس کم سن نایاب کا باپ تھا جو ہفتوں سے رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اپنی بیٹی اور ماں سے سیکڑوں میل دور یہ شخص اس برف زار میں بستر پر لیٹا تھا اور اس کی ایک پنڈلی پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے قریب جواہر عمر عورت آرام کرسی پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی وہ پرنس بخت کی ویٹنگ سائس تھی۔ اس کے جسم پر کیلاشی رنگ ڈھنگ کے کپڑے تھے اور اس کا سرخ و سپید چہرہ آتشدان کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔ اس کی آواز صاف ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ شکستہ اردو میں بول رہی تھی۔ ”دیکھو، تم بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مجھے غصہ تو آئے گا۔ تم جانتے ہو میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں اس قسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہوں۔ تم جانتے ہو میں بُری عورت نہیں ہوں لیکن مجھے اس

غرانٹ عورت کی وجہ سے بُرا بننا پڑا ہے جو اپنی بیٹی کے ساتھ خاقان ولا میں آئی ہے اور چوڑی ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ مجھے نفرت ہے اس کی شکل سے اور نیت سے۔" پرنس کی ساس اندرانا جان کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا (ہمیں اس عورت کا یہی نام معلوم ہوا تھا)

فواد عجیب لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ نے مجھے کس جرم کی سزا دی۔ کیوں مجھے اس دلدل میں دھکیلا۔ میں یہاں سے نکلنا چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔ وہ سب کچھ نہیں بھولا جائے گا مجھ سے۔"

"وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے فوادے۔ تھوڑا ٹائم گزرنے دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی کسی ایک کے لیے تباہ نہیں کی جاتی۔"

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اسی لیے میں نے آپ سے کہا تھا مجھے اس گناہ کی طرف نہ لے جائیں۔ گناہ کتنا بھی خوب صورت ہو..... ہوتا تو گناہ ہے۔ اب میں اس گناہ کے عذاب میں ہوں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "بس ہٹ دھرمی مت دکھاؤ۔ اپنا دھیان کسی اور طرف لگاؤ۔ میں پھر اُس شانم لڑکی کو بھیجتی ہوں۔ کیا وہ کسی سے کم خوب صورت ہے؟"

فواد نے ایک بار پھر بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اندرانا جان کی بات کو رد کر رہا ہو۔ وہ اس کی طرف دھیان دیے بغیر اٹھی اور لکڑی کا وزنی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

میں بستر پر نیم دراز فواد کو بغور دیکھ رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ اس کی شکل میں پرنس بخت سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ ویسا ہی کتابی چہرہ، کھڑی ناک، گہری بادامی آنکھیں، بالوں کا اسٹائل بھی ملتا جلتا ہی تھا۔ مزید یہ کہ قد کاٹھ میں بھی وہ پرنس ہی کی طرح لگ رہا تھا۔ تو کیا کسی طور لاہور کا یہ ویگن ڈرائیور پرنس بخت آورکارشتے دار تھا؟ یہ خیال بہت مضحکہ خیز اور کسی حد تک فلمی لگ رہا تھا۔ ایسے بچھڑے ہوئے رشتے دار یا جڑواں بچے وغیرہ پاک و ہند کی فلموں میں ملتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ میں محسوس کر رہا تھا، اس سے بھی انکار ممکن نہیں تھا۔

میں اور عمران نیم تاریکی میں اسی طرح کھڑکی سے لگے ہوئے تھے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور نگاہیں چندھیا سی گئیں۔ خوب صورت مگر واہیات نظارہ تھا۔ بائیس تئیس سال کی ایک حسین لڑکی نہایت مختصر لباس میں اندر داخل ہوئی۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر تھے اور دانت لشکارے مار رہے تھے۔ یقیناً یہی وہ شانم لڑکی تھی جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے اندرانا جان نے کیا تھا۔

عمران نے میرے کان میں مدھم سرگوشی کی۔ "میرا خیال ہے کہ یہی وہ لڑکی ہے جو کل سینڈوئچ بندے کے ساتھ آئی تھی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لڑکی کمال بے تکلفی سے فواد کے پہلو میں لیٹ گئی اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں فواد کے سر کے بالوں میں چلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اشتعال دلانے والے انداز میں اپنا جسم فواد کے جسم سے مس کر رہی تھی۔ فواد نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے چہرے پر گریز اور اکتاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پیشہ ور شانم لڑکی کی پیش قدمی مزید بڑھی تو فواد ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "خدا کے لیے چلی جاؤ، مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں..... چلی جاؤ۔" وہ دہاڑا اور اس نے طیش کے عالم میں شیشے کا ایک منقش جگ اٹھا کر دیوار پر پٹخ دیا۔ لڑکی بھی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی۔ کسی قریبی کمرے سے غالباً اندرانا جان کے بولنے کی مدھم آواز آئی۔ پھر بھاری قدموں کی تیز چاپیں سنائی دینے لگیں۔ ایک یا دو پہریدار اس جانب آ رہے تھے۔ اب ہمارے یہاں رکنے کا مطلب سیدھا سیدھا ٹکراؤ تھا۔ میں نے عمران کا کندھا دبایا۔ ہم الٹے قدموں پیچھے ہٹے۔ راہداری سے گزر کر عقبی دروازے تک پہنچے اور باہر نکل آئے۔ الیشین کتوں نے اس بار بھی عمران کے اردگرد چکرانے کے سوا کچھ خاص نہیں کیا تھا۔ دروازہ بند کر کے ہم کڑاکے کی سردی میں تھوڑا سا بھاگے، پھر محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے..... اور عام رفتار سے چلنے لگے۔

☆☆☆

اس خاقان ولا میں کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انوکھا تھا اور یہ جو بھی انوکھا پن تھا، اس کا تعلق کسی نہ کسی طور "اندرانا" سے اور اس کی بیٹی زرش جہاں سے تھا۔ میرے اور عمران کے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے۔ اندرانا نے فواد کو یہاں لا کر خفیہ طریقے سے کیوں رکھا ہوا تھا؟ وہ فواد کا دھیان کس عورت کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لاہور میں بھی اس نے فواد سے ایک فقرہ بولا تھا..... کچھ لو فواد تم نے جو کچھ دیکھا، وہ ایک دھوکا تھا۔ وہ بھی تم سے ملی ہی نہیں تھی۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ فواد کا ڈیل ڈول اور اس کے نقش پرنس بخت سے کیوں ملتے تھے؟

ماہین آج کل اپنا زیادہ وقت شازینہ اور اس کی شائستہ مزاج والدہ بیگم وردا کے ساتھ گزارتی تھی۔ وہ دور سے میرے کمرے کی طرف آتی دکھائی دی تو عمران میرے پاس سے کھسک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ظاہر نہیں کر رہا تھا لیکن حقیقتاً اس روز ماہین کی سرد مہری کا اثر اس نے لیا تھا۔ ماہین نے سوٹ کی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑ رکھے تھے۔ اپنے خوب صورت بالوں کو ہلکورا دیتی ہوئی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''کہانی تازی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''انکل تابی! آپ تو ایک دم ہیرو بن گئے ہیں یہاں۔ دراصل شروع میں شائم غنچہ کو بچاتے ہوئے آپ نے جس عالم خان نامی بندے کو دھول بلکہ برف چٹائی تھی، وہ کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ لوگ اس کے سائے سے بھی کترا کر گزرتے ہیں۔ بغیر کسی ہتھیار کے کئی بندوں کی جان لے چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جیسا کلہاڑی باز اس علاقے نے بلکہ ارد گرد کے علاقوں نے آج تک پیدا نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''سیانے کہتے ہیں نا کہ بے خبری بھی ایک نعمت ہوتی ہے۔ اگر موصوف کے بارے میں مجھے پہلے ہی یہ سب کچھ پتا ہوتا تو شاید میں اتنی آسانی سے اسے زیر نہ کر پاتا۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''بہرحال جی، اب تو آپ کے سینے پر یہ تمغا لگ گیا ہے۔ کل جب آپ لان میں پرنس کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے، زنان خانے کی خواتین اور ملازمائیں کھڑکیوں سے آپ کو دیکھ رہی تھیں اور وہ غنچہ تو آپ کے نام کی مالا جپتی پھرتی ہے۔ میں نے خواتین کو بتایا ہے کہ میرے انکل صرف ٹی وی سے منسلک ہی نہیں ہیں، ماضی میں وہ ایک زبردست مارشل آرٹسٹ رہے ہیں اور اب بھی ایک جانے مانے فائٹر ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کل کو یہ بھی بتا دینا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور ہم یہاں کوئی لوکیشن وغیرہ دیکھنے نہیں آئے، پرنس کی ساس صاحبہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔''

وہ مسکرائی اور اس کے گال کا ڈمپل نمایاں ہو گیا۔ ''نہیں انکل تابی، اب اتنی بھی مخبوط الحواس نہیں ہوں بلکہ آج کل میں نے اپنے سارے حواس جگا رکھے ہیں۔ یہاں کے حالات کے بارے میں کافی کچھ پتا چل رہا ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔

ماہین کی باتوں سے پتا چلا کہ خاقان ولا میں ایک سرد جنگ چل رہی ہے۔ اپنے بیمار والد کی پُرزور خواہش پر پرنس دوسری شادی کے لیے ذہن بنا رہے ہیں۔ شازینہ اور ان کے والدین کو اسی لیے خاقان ولا میں بلایا گیا ہے کہ شازینہ یہاں کے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکے۔ یہ صورت حال پرنس کی مدر اِن لاء کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔ وہ شازینہ اور اس کے گھر والوں کو یہاں برداشت نہیں کر پا رہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''پرنس کی وائف زرش جہاں کا کردار کیسا ہے؟''

''وہ بہت خوب صورت ہے انکل مگر زیادہ پڑھی لکھی نہیں اور کچھ خاموش طبع بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے بہت زیادہ اثر میں ہے۔ والدہ کی کوئی بات بھی ٹال نہیں سکتی۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے والدہ سے اٹیچ بھی بہت ہے۔''

''یقیناً وہ بھی نہیں چاہتی ہو گی کہ اس کا شوہر دوسری شادی کے بارے میں سوچے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ تاہم یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات بھی بہت زیادہ اچھے نہیں رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ مزاجوں کا فرق اور بے اولادی بھی ہو۔''

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ پرنس اور شازینہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے؟''

''ابھی تک تو صورت حال شازینہ کے لیے موافق ہی ہے۔ ولا میں سب لوگ اسے پسند کر رہے ہیں مگر ایسی بات بھی نہیں کہ زرش جہاں کو ناپسند کیا جاتا ہو، یہاں کے مکینوں اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زرش کے حق میں بھی ہیں۔ شاید ان لوگوں کا خیال ہے کہ پرنس اور ان کی فیملی کو چاہیے کہ ابھی اولاد کے لیے کچھ مزید انتظار کریں۔''

''مگر اب مسئلہ پرنس کے بیمار والد صاحب کا بھی تو ہے۔ میں کل ملا تھا اُن سے انہیں جگر کا سنگین عارضہ ہے۔ لگتا ہے زیادہ دن نہیں جی پائیں گے۔''

ماہین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کل یہاں کی ہیڈ ملازمہ بھی کچھ ایسی ہی بات کہہ رہی تھی۔'' میں نے ماہین کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ کل رات میں اور عمران کس کارروائی پر نکلے تھے اور ہم پر کیا انکشاف ہوا ہے۔ ماہین ششدر ہو کر سنتی رہی۔ فواد کا یہاں موجود ہونا اور اندرانا کے گھر میں پابند ہونا؟ ماہین کے لیے بھی حیران کن تھا۔ میں نے ماہین کے مختلف سوالوں کے جواب دیے۔

اسی دوران میں شازینہ، ماہین کو ڈھونڈتی ہوئی پہنچ

گئی۔ وہ زرش جہاں کی طرح بہت خوب صورت تو نہیں تھی مگر دلکش تھی۔ پھر اس کی عمر بھی زرش سے چار پانچ سال کم تھی۔ اس نے اسکردو سے گریجویشن بھی کر رکھی تھی۔ یہ لوگ جدی پشتی بلتستانی تھے جبکہ پرنس کی موجودہ وائف زرش کی قبیلی وادی کیلاش کی طرف سے آئی تھی۔ یہ خالص کیلاش نہیں تھے، کسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ زرش جہاں تو پرنس سے شادی کے وقت مسلمان ہوگئی تھی مگر اس کی دبنگ والدہ اندرانا بیگم کے بارے میں کہا جارہا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے پرانے مذہب پر ہے۔ اس کی کھردری، سخت طبع کے باعث وہ خاقان ولا میں ایک غیر مقبول ہستی تھی۔

تو میں بات کررہا تھا شازینہ کی۔ وہ بے تکلفی سے میرے اور ماہین کے پاس آن بیٹھی۔ ہلکے سے میک اَپ نے اسے نکھار رکھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ پرنس بخت کو بہت عزت دیتی ہے اور مستقبل میں خاقان ولا کی بہو بننا اس کے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔ کچھ دیر بعد اچانک ایک شور نے ہمیں چونکایا۔ یہ شور زنان خانے کی طرف سے اٹھا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ کچھ خواتین بھاگ دوڑ کررہی ہیں مگر یہ ساری ہلچل پریشانی والی نہیں خوشی والی تھی۔ پھر ایسے لگا کہ دو چار پٹاخے بھی چھوڑے گئے ہیں۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر رہائشی حصے (زنان خانے) کی طرف سے کچھ جوان ملازمائیں بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں مٹھائی کی تھالیاں تھیں۔ ہیڈ ملازمہ نے ہمیں جھک کر سلام کیا اور چاندی کی تھالی آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”منہ میٹھا کریں جی۔ خوشی کی بات ہے..... خوشی کی بات ہے۔“

”کون سی خوشی؟“ شازینہ نے مٹھائی کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

ملازمہ ذرا شرما کر بولی۔ ”مالک خود بتائیں گے جی..... ابھی بتائیں گے۔“

ماہین اور میں نے بھی مٹھائی کے ٹکڑے اٹھائے۔ ملازمائیں جس طرح بھاگتی ہوئی آئی تھیں اسی طرح واپس چلی گئیں۔

”چلیں آپ دیکھیں کیا معاملہ ہے۔“ شازینہ نے اٹھلا کر ماہین کا بازو پکڑا اور اسے ساتھ لے کر زنان خانے کی طرف لپک گئی۔

اسی دوران میں عمران بھی میرے کمرے میں آگیا۔

”یہ کیا ماجرا ہے جی؟“

”کوئی خوشی والی خبر ہی ہے۔ وہ دیکھو لان میں..... ملازمائیں گلے مل رہی ہیں۔“

قریباً پندرہ منٹ بعد ماہین واپس آئی۔ وہ کچھ خاموش سی تھی۔ ”کیا خبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خبر تو ویسے خوشی کی ہی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ بالآخر پرنس کی وائف امید سے ہوگئی ہیں۔ دبی دبی سرگوشیاں کل سے ہی ہورہی تھیں۔ آج میڈیکل رپورٹ بھی آگئی ہے۔ اندرانا بیگم خوشی سے پھولے نہیں سمارہی۔ پورے ولا میں دندناتی پھر رہی ہے۔“

”بس یہ اوپر والے کے کام ہیں۔ ہمارے اپنے پروگرام ہوتے ہیں اس کے اپنے فیصلے۔“

پورے ولا میں اور ساری بستی میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ یہ بات اگلے روز تک کنفرم ہوگئی کہ زرش جہاں ”ایکسپیکٹ“ کررہی ہے۔ شام سے کچھ پہلے میں نے پہلی بار زرش جہاں اور پرنس بخت کو اکٹھے دیکھا۔ زرش جہاں ایک بھاری قیمتی شال میں تھی اور پرنس بخت کے ساتھ سرسبز لان میں ٹہل رہی تھی۔ پھر ایک جانب سے تمتماتے ہوئے چہرے والی اندرانا جان اپنے قدرے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی برآمد ہوئی۔ بیٹی اور داماد سے چند مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا، پھر بیٹی کے سر کے اوپر سے کچھ بڑے کرنسی نوٹ وار کر دو ملازماؤں کو دیے اور بیٹی کو احتیاط سے سیڑھیاں چڑھا کر برآمدے میں لے آئی۔ جہاں طویل میز پر چائے کے لوازمات اور مشروبات موجود تھے۔ پرنس بخت بھی زرش کے پہلو میں جا بیٹھا..... اس نے خود جوس کا گلاس بھر کے زرش کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چسکیاں لینے لگی۔

خاقان ولا کے اندر یہ ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ صرف دو تین روز میں ہی بہت کچھ بدل گیا۔ اس صورتِ حال نے ماہین کو کچھ غمگین کر دیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی۔ انکل! سچی بات یہ ہے کہ آج کل مجھے شازینہ پر بڑا ترس آرہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے کہ جس وجہ سے اسے خاقان ولا کی بہو بنایا جانا تھا، وہ وجہ اب ختم ہوگئی ہے۔ وہ کچھ چپ تو ہے مگر اسے قدرت کا فیصلہ سمجھتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت جلد اس تبدیلی کو قبول کرلے گی۔“

”اس کے والدین اب شاید یہاں سے جانے کا سوچ رہے ہوں؟“

”ہاں انکل، اندازہ یہی ہورہا ہے کہ اندرانا بیگم اب زیادہ دن شازینہ اور اس کے گھر والوں کو یہاں ٹکنے نہیں

دے گی۔ بہت جہاندیدہ اور چالاک خاتون ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا کردے گی کہ دو چار دن میں وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ اول تو پرنس اُن کے رکنے پر زیادہ زور نہیں دیں گے اور اگر دیں گے بھی تو اندرانا یہ زور چلنے نہیں دے گی۔"

ماہین نے دو چار روز کا کہا تھا مگر دوسرے ہی روز معلوم ہوا کہ شازینہ اور اس کے والدین خاقان ولا سے جارہے ہیں۔ غالباً اندرونِ خانہ خواتین میں کوئی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی جس کے بعد شازینہ کے والدین نے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ برف باری کی وجہ سے راستے بند تھے، لہٰذا وہ لوگ اسکردو تو واپس نہیں جاسکتے تھے اس بستی کے اندر ہی شازینہ کے کوئی خالو بھی رہائش پذیر تھے۔ ان کا گھوڑوں کا فارم تھا۔ شازینہ کے والدین نے بہانہ بنایا تھا کہ وہ دو چار روز اُن کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔ خاقان ولا سے خوش مزاج شازینہ کی رخصتی کا منظر ہمارے لیے یاس انگیز تھا۔ بظاہر تو وہ مسکرا رہی تھی مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اس اچانک روانگی پر وہ اندر سے افسردہ ہے۔ اس کی والدہ بیگم وردا بھی چپ تھیں، شازینہ، ماہین کے گلے لگی۔ اس کا رخسار چوما اور بھاری دل سے الوداع کہا۔

خوش رنگ شازینہ کے حوالے سے یہ ایک ٹریجک اینڈ تھا مگر پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی اس حوالے سے کچھ مزید ہونا باقی ہے۔ اسی روز مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بالاٹ والوں سے چند روز پہلے ہونے والی جھڑپ کا معاملہ چونکہ "سیٹل" ہوگیا ہے اس لیے طوائف زادی غنچہ اپنے گھر واپس چلی گئی ہے۔

شام کی چائے کے بعد میں اور عمران کمرے میں بیٹھے تھے۔ موضوع وہی پرنس کی وائف کا امید سے ہوجانا تھا۔ عمران بولا۔ "چاچو! شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اندرانا واقعی چالاک، چالباز عورت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس نے جھوٹ موٹ ہی بیٹی کا پاؤں بھاری ہونے کی افواہ اُڑا دی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر صورت خاقان ولا میں شازینہ کا راستہ روکنا چاہتی تھی۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوگا۔ ڈاکٹری رپورٹ کی بات بھی کی جارہی ہے پھر ایسے جھوٹ کو چھپایا کب تک جاسکتا ہے۔"

"دو تین ماہ تو گزارے ہی جاسکتے ہیں۔ بعد میں ابارشن وغیرہ کو ڈھونگ رچایا جاسکتا ہے۔"

"لیکن مجھے نہیں لگتا عمران کہ زرش اس حد تک جاسکتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے کافی مختلف ہے۔"

"لیکن ماں کے بہت زیادہ اثر میں بھی تو ہے....."

اسی دوران میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ماہین اپنی رو میں تیزی سے اندر آئی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی..... مگر عمران کو میرے کمرے میں بیٹھے دیکھ کر ایک دم چپ ہوگئی۔

"اوہ سوری" کہہ کر واپس چلی گئی۔

عمران کے ساتھ اس کے رویے میں واضح طور پر گریز اور کھچاؤ نظر آرہا تھا۔ عمران نے سر کھجایا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد عمران اپنے کمرے میں چلا گیا تو میں ماہین کے پاس پہنچا۔ میں نے واضح الفاظ میں اس سے پوچھا کہ وہ عمران کے ساتھ اس قسم کے رویے کا مظاہرہ کیوں کررہی ہے؟

ماہین کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی جھلک دکھانے لگی۔ اس نے بے خیالی میں اپنی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی کو گھمایا، پھر اپنی حنائی انگلیوں کے ساتھ بالوں کو اپنی پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ "انکل تابی! میں سچ کہتی ہوں، میں عمران کی بہت بہت عزت کرتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ یہ ہمیشہ برقرار رہے۔"

"تو اُس نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے۔"

وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔ "کہنا ضروری تو نہیں ہوتا انکل! اور آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں عورت کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی طرف اٹھنے والی نگاہوں کو پہچان لیتی ہے۔ میں ہرگز ہرگز نہیں چاہتی کہ میرے حوالے سے عمران، خدانخواستہ کسی طرح کی غلط فہمی کا شکار ہوں یا اپنے دل میں کوئی امید پال لیں۔ حقیقت یہی ہے کہ میں حشام سے بہت پیار کرتی ہوں، اس کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنا بھی گناہ لگتا ہے۔"

"واقعی؟" میں نے اچانک پوچھا۔

اس نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا پھر ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ بے چین سی نظر آنے لگی تھی۔ "اچھا چلو ٹاپک بدلتے ہیں۔" میں نے کہا اور اس سے زنان خانے کے حالات پوچھنے لگا۔ اس نے بتایا کہ شازینہ کے جانے کے بعد اندرانا جان اور اس کی حمایتی خواتین بہت خوش ہیں۔ مجموعی طور پر پورے خاقان ولا میں ہی خوشی کی لہر موجود ہے۔ اندرانا بیگم نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو مستقل طور پر ولا میں بلا لیا ہے۔ چند روز بعد یہاں "گود بھرائی" قسم کی رسم بھی ادا ہونے والی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اندرانا نے اپنی

رہائش گاہ پر کوئی چھوٹی موٹی پوجا بھی کرائی ہے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ زرش مسلمان ہو چکی ہے مگر اندرانا جان کے بارے میں بات گول مول تھی۔ غالباً اس کی عقیدت ابھی تک اپنے پرانے قبائلی مذہب سے تھی۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''فواد کے بارے میں کچھ سن گن ملی؟ کیا وہ یہاں ''ولا'' میں نظر آتا تھا؟''

''جی ہاں، ایک ملازمہ سے صرف اتنا پتا چلا ہے کہ دو تین ماہ پہلے تک اونچے قد کاٹھ والا ایک پنجابی بھی مردانے میں ہوا کرتا تھا۔ وہ شاید ڈرائیور تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد چھٹی پر ضرور جایا کرتا تھا مگر اب شاید اس کی پکی چھٹی ہو چکی ہے۔''

''یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' میں نے پیشانی کھجاتے ہوئے کہا۔

''انکل جی! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اس گورکھ دھندے میں زیادہ پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ کسی طرح ہم فواد کو یہاں سے نکال لیں، یہی بہت ہے۔''

''ایک پلان تو ہے میرے اور عمران کے ذہن میں۔ لیکن اس کے لیے پرسوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''پرسوں کیا ہے؟''

''بلیک آؤٹ۔ دراصل سردیوں میں یہاں بجلی کی روشنی جنریٹرز سے پیدا کی جاتی ہے جو کافی مہنگی ہے۔ گیس کی بھی کمی ہے اس لیے ہفتے میں ایک روز ساری بستی کے جنریٹرز بند رہتے ہیں۔''

ماہین نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر بولی۔ ''کوئی زیادہ رسک والا کام تو نہیں؟''

''رسک تو اب لینا ہی پڑے گا۔ محترمہ ماہین صاحبہ۔'' میں نے کہا اور اسے ضروری تفصیل بتانے لگا۔

☆☆☆

اگر بادل نہ ہوتے تو یہ ایک چاندنی رات ہوتی مگر گھپ اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہفتہ وار بندش کے سبب لائٹس آف تھیں۔ میں اور عمران ایک لوڈر نما طویل جیپ کے پچھلے حصے میں موجود تھے۔ پچھلے چھ سات روز میں ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ یہ لوڈر جیپ روزانہ شام کے بعد خاقان ولا میں آتی ہے۔ اس میں دو تین بکرے، چند مرغیاں اور دودھ کے برتن وغیرہ ہوتے تھے۔ یقیناً یہ سامان خاقان ولا کے وسیع باورچی خانوں میں استعمال ہوتا تھا۔ سامان اتار کر اب لوڈر جیپ واپس جانے والی تھی اور ہم دونوں خاموشی سے پچھلے حصے میں آگئے تھے۔ ہمارے اوپر ترپال تھی جلد ہی ڈرائیور اور اس کا ساتھی سخت سردی میں منہ سے بھاپ اڑاتے ہوئے آئے اور جیپ کے اگلے حصے میں بیٹھ گئے۔ ہماری توقع کے عین مطابق دو منٹ بعد جیپ خاقان ولا سے باہر تھی۔

مقامی ڈرائیور اور اس کا چترالی ساتھی غالباً برانڈی وغیرہ پی رہے تھے اور کہیں بھی ہانک رہے تھے۔ ان کی آوازیں انجن کے شور کے باوجود ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ پرنس بخت کے وفادار ساتھیوں میں سے تھے۔ پرنس کی تعریفوں میں لگے ہوئے تھے۔ ''دیکھ لیا نا، اس منہ پھٹ اندرانا جان کے سارے الزام غلط نکلے۔ اُس نے مشہور کر رکھا تھا کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ پرنس ہے۔ میری بیٹی بالکل تندرست ہے۔''

''بس یہ خدا کے کام ہوتے ہیں۔'' دوسرے شخص نے کہا۔ ''کئی دفعہ دس دس سال بعد بھی اوپر والے کا کرم ہو جاتا ہے۔ خوشی بس اس بات کی ہے کہ خدا نے پرنس جی کے گھر میں رونق کی امید لگا دی ہے.....''

اب ہم اس پتھریلی عمارت سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں چار روز پہلے ہم گھسے تھے اور فواد کو بے بسی کی حالت میں دیکھا تھا۔ ہمارا پروگرام ایک بار پھر اندر گھسنے اور فواد تک پہنچنے کا تھا۔ جونہی چڑھائی پر ایک موڑ کاٹتے ہوئے لوڈر جیپ کی رفتار سست ہوئی ہم احتیاط سے نیچے اتر گئے۔ جیپ برف پوش درختوں میں اوجھل ہو گئی۔ چاروں طرف تاریکی اور سردی کا راج تھا۔ آج تیز برفانی ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے عمارت کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارا سارا پروگرام ایکا ایکی تبدیل ہونے والا ہے۔

ابھی ہم عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ عمارت کا گیٹ کھلا اور ہم نے تاریکی میں ایک ڈولی دیکھی جسے دو تنومند کہاروں نے اٹھا رکھا تھا۔ ایسی ڈولیاں ان علاقوں میں عموماً خواتین کی نقل و حرکت کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ کوٹھی کا گیٹ پھر بند ہو چکا تھا۔ تنومند کہاروں نے اپنے کندھے بدلنے کے لیے لکڑی کی اس ڈولی کو ایک اونچی جگہ پر رکھا اور ایک کہار نے ٹارچ جلائی۔ اس ٹارچ کی روشنی میں مجھے جس شے کی جھلک نظر آئی اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ یہ کسی کی ٹانگ تھی جو ڈولی کے دبیز پردوں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی زخمی شخص ہے، جو ڈولی میں بیٹھنے کے بجائے لیٹا ہوا ہے اور ٹانگ کو پوری طرح موڑنے سے قاصر ہے۔

چشم زدن میں میرا اور عمران کا دھیان فواد کی طرف

چلا گیا۔ ہم اُسے زخمی ٹانگ کے ساتھ اندرانا کے گھر میں دیکھ چکے تھے۔ کہاروں نے ڈولی کو دوبارہ اٹھایا اور ٹیڑھے میڑھے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا کہ احتیاط سے ڈولی کے پیچھے جائیں۔

دس پندرہ منٹ میں کہار، ڈولی سمیت آبادی سے باہر تھے۔ یہاں چھوٹی بڑی کھائیاں تھیں اور ایک برف پوش ڈھلوان کئی سو فٹ اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہاں ضرور کچھ غلط ہونے والا تھا۔ ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وقفے وقفے سے ٹارچ کا روشن دائرہ بھی اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ ایک ویران جگہ پر کہاروں نے ڈولی اتار دی۔

ہم جھک کر درختوں میں چلتے ہوئے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ ڈولی کے اندر سے جو آواز ابھری، وہ صاف ہم تک پہنچی۔ یہ فواد ہی کی آواز تھی۔ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ ”یہ مجھے کہاں لے آئے ہو، تم تو کچھ اور بتا رہے تھے۔“

جواب دینے کے بجائے ایک تنومند شخص نے زخمی فواد کو بے رحمی سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا..... فواد بلند آواز میں احتجاج کرنے لگا۔ تب ٹارچ کے حرکت کرتے ہوئے روشن دائرے نے ایک اور منظر ہماری نگاہوں کے سامنے کیا اور جسم سنسنا اٹھا۔ ایک جگہ بیلچے کی مدد سے برف کو گہرا کھودا گیا تھا اور ایک قبر سی بنا دی گئی تھی..... مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ دونوں ہٹے کٹے بندے وہی ہیں جو چند روز پہلے اندرانا جان کے ساتھ لاہور پہنچے تھے اور فواد کو اٹھا کر لائے تھے۔ عمران انہیں سینڈوٹائپ کہتا تھا۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ جو شخص زخمی فواد کے عقب میں کھڑا تھا، اس نے اچانک ایک رسی نما چیز، بیٹھے ہوئے فواد کے گلے میں ڈالی اور اس کے گلے کو بے دردی سے بھینچنے لگا۔ فواد چلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور بُری طرح ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا۔ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اوٹ سے نکل کر لپکے۔ عمران سیدھا اس شخص پر جا پڑا جو موٹی رسی سے فواد کی گردن بھینچ رہا تھا۔ میں پستول نکال کر سیدھا اس دوسرے پر جھپٹا۔ تاہم وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس کے سر پر کیلاشی طرز کی گول ٹوپی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے ٹانگ چلائی۔ وزنی برفانی بوٹ کی زوردار چوٹ میرے ہاتھ پر لگی اور پستول میری گرفت سے نکل گیا۔ وہ کالے پتھر جیسا شخص نہ صرف مجھ سے ٹکرایا بلکہ اس کا بھرپور گھونسا بھی میرے منہ پر پڑا۔ تاہم اسے پتا نہیں تھا کہ اس وار کا جواب اسے بہت تگڑا ملے گا۔ اس کے دوسرے گھونسے سے بچتے ہوئے میں نے اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا اور چہرے پر سر کی ضرب لگا کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ گرتے گرتے اپنی وزنی جیکٹ سے ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے مجھ پر ڈائریکٹ فائر کیا مگر اعشاریہ 38 کی گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر سیدھی اس کے ساتھی کے سر میں لگی۔ اس کے دوسرے فائر سے پہلے میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی توانا گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ بے بس ہونے کے باوجود اس نے اندھا دھند زور لگایا۔ وہ اپنے ریوالور کا رخ میری طرف موڑنے کی دیوانہ وار کوشش بھی کر رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے گردن پر دباؤ بڑھایا اور گردن کی ہڈی بول گئی۔ اس کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔

فواد کی سمجھ میں چونکہ کچھ نہیں آیا تھا لہٰذا وہ اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ موقع سے دور ہٹنا چاہتا تھا۔ عمران نے اسے تھام لیا تھا اور سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”مجھے مر جانے دو۔“ فواد بار بار پکارنے لگا۔ تیز ہواؤں میں اس کی آواز ڈوب ابھر رہی تھی۔

اندرانا کے ملازم منڈھے ہوئے سروں والے دونوں تنومند شخص برف پر مردہ پڑے تھے۔ ایک کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی اور دوسرے کی کھوپڑی سرخ ہو رہی تھی۔ (وہ دونوں کہیں کیلاش کی طرف سے آئے تھے لیکن نسلاً کیلاشی نہیں تھے) ہم جانتے تھے کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ ہم نے دونوں کو اس برفانی قبر میں پھینکا جو یقیناً فواد کے لیے کھودی گئی تھی۔ ریوالور، گولیاں اور ٹوپیاں وغیرہ بھی وہیں پھینک دی گئیں۔ برف نرم تھی۔ ہم نے جلدی جلدی بیلچے کی مدد سے قبر بند کر دی۔ موسم خراب ہو رہا تھا۔ برف باری پھر شروع ہوگئی تھی۔ فواد ہذیان بول رہا تھا۔ ”مجھے برباد کر دیا ان لوگوں نے۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھے تم لوگ کوئی آسان موت دے دو۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں۔ اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمارے لب و لہجے سے حیران تھا۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ پنجاب سے کوئی یہاں پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے ڈولی کو تو وہیں رہنے دیا اور اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر ترائی میں آگے بڑھنے لگے۔ بڑے سائز کی ٹارچ عمران کے ہاتھ میں تھی اور وہ راستہ دیکھنے کے لیے وقفے وقفے سے اسے روشن کر رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر چند گھروں کے آثار نظر آئے۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ وہی چھوٹی سی شانم بستی ہے جس کا ذکر غنچہ نے کیا

تھا۔ ہم چار پانچ منٹ مزید چلے اور بستی کے قریب پہنچ گئے۔ فواد بڑبڑایا انداز میں بڑبڑایا۔ ”یہاں نہ جانا۔ یہ طوائفوں کی بستی ہے۔ یہ کوئی مدد نہیں کریں گی۔“

تاریکی میں ان پندرہ بیس گھروں کے ہیولے نظر آرہے تھے، مگر مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے شانم غنچہ کا گھر پہچان لیا ہے۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ بستی میں صرف اسی کا گھر ہے جو ہموار جگہ کے بجائے ڈھلوان پر بنا ہوا ہے۔

میں نے عمران اور فواد کو وہیں برف سے ڈھکے ہوئے درختوں میں چھوڑا اور گھر کے دروازے تک پہنچا۔ ساتھ والے گھر سے کوئی ساز بجنے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق غنچہ خاقان ولا سے اپنے گھر واپس آچکی تھی۔ دل کڑا کر کے میں نے لکڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند سیکنڈ بعد اندر کسی چراغ کی روشنی ہوئی اور پھر دو لڑکیاں میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اُن میں ایک غنچہ تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ ساتھ والی لڑکی شکل وصورت سے اس کی بڑی بہن لگتی تھی وہ ایک بڑی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے غنچہ سے کہا۔ ”تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا ایک بندے کو ایک رات کے لیے تمہارے گھر میں پناہ مل سکتی ہے؟“

وہ ترنت بولی۔ ”آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے جی۔ کون بندہ ہے وہ؟“

”جو کوئی بھی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ راز ہونا چاہیے۔“

اس نے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں۔ گھر میں ہم دونوں ہوتے ہیں یا ہماری نانی۔ ان کو بہت کم دکھائی سنائی دیتا ہے۔“ وہ شکستہ اردو میں بول رہی تھی۔

میں واپس گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد فواد کے ساتھ لوٹ آیا۔ عمران نے میرے ساتھ مل کر اسے سہارا دے رکھا تھا۔ ہم جلدی سے اندر چلے گئے۔ یہ لکڑی اور پتھر کا بنا ہوا مقامی طرز کا گھر تھا۔ دو تین کمرے تھے اور لکڑی کے ستونوں والا چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ کسی کمرے سے عمر رسیدہ عورت کی مدھم کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ چراغ کی روشنی میں فواد کو دیکھ کر دونوں لڑکیاں حیران ہوئیں۔ غنچہ بولی۔ ”یہ تو شاید پرنس جی کے ملازموں میں سے تھا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پانچ دس منٹ بعد ہم فواد کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ غنچہ اور اس کی بہن ہمیں گھر کے چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں لے آئی تھیں اور خالی جگہ پر گدا بچھا کر اس کے لیٹنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ غنچہ کا کہنا تھا کہ یہاں یہ بالکل محفوظ رہے گا۔ اگر کوئی اندیشہ ہوتا تو دونوں بہنیں اس اسٹور نما کمرے کو باہر سے تالا لگا سکتی تھیں۔

فواد کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہکی بہکی باتیں بھی کر رہا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا..... ”میں نے منت بھی کی تھی، ایسا نہ کرو۔ مجھے کس دلدل میں پھینک دیا۔ نکل سکتا ہوں، نہ مر سکتا ہوں.....“

میں نے ذرا سختی سے اسے منع کیا کہ وہ خاموش رہے تو بہتر ہے۔ ورنہ جو لوگ اس کی جان کے درپے ہیں، وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔

میری بات کسی حد تک اس کی سمجھ میں آگئی۔ عمران نے غنچہ سے پوچھا۔ ”اگر اسے ایک رات سے زیادہ یہاں رکنا پڑا تو رکھ لوگی؟“

غنچہ نے پھر فدا ہو جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ جیسا حکم کریں گے ہم ویسا کریں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔“

فواد کے بارے میں غنچہ اور اس کی بہن ایمل کو ضروری ہدایات دے کر ہم واپس خاقان ولا جانے کے لیے باہر نکل آئے۔ خاقان ولا سے زیادہ دیر باہر رہنا ہمارے لیے بہتر نہیں تھا۔ برف باری کے سبب ہڈیوں میں گودا جما جا رہا تھا۔ ہم آدھے راستے میں تھے جب جنگل کی دوسری جانب سے ایک مہیب گونج دار آواز سنائی دی۔ عمران سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”غالباً کوئی ایوالانچ ہے۔ بہت بڑے ایریا سے برف پھسل کر نیچے آئی ہے۔“

☆☆☆

دوسرے روز دوپہر تک کئی سوال میرے اور عمران کے ذہن میں ابھرتے رہے۔ اندرانا جان نے فواد سے کہا تھا کہ وہ اسے جان کی امان دے چکی ہے لیکن اب اس کی امان کہاں گئی تھی، وہ اسے مار کر گاڑنے کے درپے ہو گئی تھی۔ اگر وہ اسے مارنا ہی چاہتی تھی تو لاہور میں یا راستے میں کہیں کیوں نہ مار دیا؟ فواد بار بار حالات کی کس دلدل کا ذکر کر رہا تھا؟

ہمیں پرنس بخت ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ رات کو جو مہیب آواز سنائی دی، وہ ایک بڑی ایوالانچ ہی کی تھی۔ یہ ایوالانچ اسی ایریا میں گری تھی جہاں کل رات دونوں بدمعاشوں کی قبر بنی تھی۔ یہ ایک موافق صورتِ حال تھی۔

امید کی جاسکتی تھی کہ وہ ٹینٹ اور لکڑی کی ڈولی وغیرہ سب کچھ برف کے ریلے میں دفن ہوگیا ہوگا۔

دوپہر کے وقت برف باری کچھ ہلکی ہوئی تو پرنس اپنے کسی کام سے خاقان ولا سے روانہ ہوا۔ وہ جب بھی نکلتا تھا پوری سیکیورٹی کے ساتھ نکلتا تھا۔ کم از کم چار گاڑیاں ہوتی تھیں۔ ان گاڑیوں میں درجن بھر مسلح گارڈز ہوتے تھے۔ پرنس کی اپنی لینڈ روور جیپ میں بھی گارڈز موجود رہتے تھے۔

یہاں بھیڑوں اور پہاڑی بکریوں کے بڑے بڑے باڑے تھے جو خاقان فیملی کی ملکیت تھے۔ اس کے علاوہ کھالوں کا کاروبار بھی تھا۔ یہ علاقہ کافی بلندی پر تھا، پھر بھی گرم موسم میں یہاں ترائی کی طرف کھیتی باڑی ہوتی تھی اور چند باغات بھی تھے۔ جنگل کی کٹائی سے بھی لوگوں کو آمدن ہوتی تھی۔

پرنس کے جانے کے بعد ہمیں مناسب لگا کہ باہر نکلیں اور فواد کی خیر خبر لیں۔ میں نے ماہین کو اس ساری سنسنی خیز صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہم فواد سے ملنے چل پڑے۔ ماہین اور عمران میں بات چیت کم ہی ہوتی تھی۔ عمران ظاہر نہیں کرتا تھا اور اس صورتِ حال کو ہلکے پھلکے انداز میں لے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ماہین کے حوالے سے اس کے دل پر گہری چوٹ لگی ہے..... برف باری کے سبب طوائفوں کی بستی آج بھی سنسان ہی نظر آتی تھی۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ میں نے کل ہی غنچہ کو بتا دیا تھا کہ ہم دوپہر کے بعد آئیں گے۔ وہ الرٹ تھی۔ لہٰذا میری ہلکی سی دستک پر ہی فوراً دروازہ کھل گیا۔ غنچہ کی شکل سے ہی اندازہ ہو گیا کہ سب خیریت ہے۔ (غنچہ کی بڑی بہن کو بچہ ہونے والا تھا اس لیے وہ چادر میں لپٹی نظر آتی تھی)

ہم عقبی اسٹور روم نما کمرے میں پہنچے۔ فواد کے قریب کھانے پینے کی اشیا رکھی تھیں مگر اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس کا بخار برقرار تھا۔ میں نے اسے جگایا اور ہم نے اسے زبردستی گڑ والے دلیے کے چند لقمے کھلائے۔ وہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا اور بار بار اپنا سر بے قراری میں ہلاتا تھا۔ آج اس کمرے میں چھوٹا سا زرد بلب روشن تھا۔ ایک چھوٹی سی انگیٹھی نے کمرے کو قدرے گرم کر رکھا تھا۔ باہر برف بہت خاموشی اور تسلسل سے گر رہی تھی۔

میں نے اور عمران نے بڑے طریقے سے فواد کو اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ یہ کوشش طویل تھی مگر دھیرے دھیرے کامیابی کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ جان کر کہ ہم لاہور میں اس کی دکھیاری ماں اور لم سن بیٹی سے مل چکے ہیں اور صرف..... صرف اس کی مدد کے لیے یہاں سیکڑوں میل دور آئے ہیں تو وہ حیران اور متاثر نظر آنے لگا مگر یہاں کے حالات کے بارے میں وہ کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو فواد، تم یہاں جس جال میں پھنسے ہوئے ہو، اس میں سے ہم تمہیں تب ہی نکال سکتے ہیں جب ہمیں پوری صورتِ حال کا پتا چلے گا۔“

”آپ لوگوں سے کس نے کہا ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں تو بس..... اس زندگی سے چھٹکارا چاہتا ہوں اور اگر یہ چھٹکارا اس کی نظروں کے سامنے ملے تو شاید جان آسانی سے نکل جائے۔“ وہ کراہا۔

”کس کی نظروں کے سامنے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ جیسے وہ بات کہہ دی ہو جو کہنا نہ چاہتا ہو۔ بخار نے جیسے اس کا دماغ ماؤف کر رکھا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

میں نے موضوع بدلا۔ ”اچھا اتنا بتا دو۔ یہاں کے پرنس بخت سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ تمہارا قد کاٹھ، تمہاری آنکھوں کا رنگ اور تمہارے نقش کچھ نہ کچھ پرنس سے ملتے ہیں۔“

”کاش یہ نقش نہ ملتے۔“ وہ پھر کراہا اٹھا۔ ”یہی سب کچھ ہے جو مجھے اس حالت تک لایا ہے۔“

”یعنی اپنی شکل وصورت کی وجہ سے تم کو یہاں ملازم رکھا گیا؟“ عمران دور کی کوڑی لے آیا۔

”یہ بھی کہہ سکتے ہو مگر اصل زور تو میری بدقسمتی نے ہی مارا جو میں یہاں پہنچا۔“

”اچھا، تمہاری ڈیوٹی کیا تھی یہاں؟“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”یہی کہ اگر کوئی گولی پرنس صاحب کے سینے کی طرف آئے تو اسے اپنے سینے پر لوں۔“

وہ اب کچھ کچھ کھل رہا تھا۔ اس حوالے سے اس نے ہمیں مزید جو کچھ بتایا، وہ ہماری توقعات سے بالکل ہٹ کر تھا۔ فواد کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ مختصراً یوں تھا۔ کوئی دو سال پہلے لاہور کے بس اڈے پر پرنس بخت کے ایک دوست کی نظر اتفاقاً فواد پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ فواد ساٹھ ستر فیصد تک پرنس سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ پرنس کے اس دوست نے لاہور میں فواد کا اتا پتا معلوم کیا اور پھر آناً فاناً اسے ایک بڑی اچھی نوکری کی آفر کر دی گئی۔ شروع میں اسے یہی بتایا گیا کہ اسے ایبٹ آباد جانا ہوگا مگر بعد میں یہ راز کھلا کہ اسے ایبٹ آباد سے بہت آگے ماشر

بروم پہاڑ کے نواح میں جانا ہے۔ بہرحال ملازمت دینے والوں نے فواد کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اپنی جائے ملازمت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ملازمت کی نوعیت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں بالاٹ والوں سے پرنس کی پرانی دشمنی چل رہی تھی۔ آئے روز ایک دوسرے پر گولیاں بھی چل جاتی تھیں۔ فواد کو یہاں بظاہر بطور جیپ ڈرائیور رکھا گیا تھا مگر خاقان ولا کے خاص لوگ جانتے تھے کہ وہ کبھی کبھی نقلی پرنس کے روپ میں پرنس کی گاڑی میں سفر بھی کرتا ہے۔ وہ سب کچھ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے ہوتا تھا یا مخالف پارٹی کو چکما دینے کے لیے۔

ہمارے لیے یہ سب انکشاف انگیز تھا۔ مگر یہ بات ہمارے لیے ابھی تک معما تھی کہ اندرانا جان اس طرح ہاتھ دھو کر فواد کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی تھی۔ اسے کیوں یہاں لائی تھی اور کیوں شانم لڑکیوں کے ذریعے اسے بہلانے کی کوششیں کرتی تھی۔ اصل بات فواد ابھی تک نہیں بتا رہا تھا مگر یہ خوش آئند تھا کہ وہ ہم پر بھروسا کرنا شروع ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ گفتگو بہت طویل ثابت ہوئی۔ پھر ایک موقع ایسا آیا کہ ہمارے مسلسل سوالات سے گھبرا کر وہ ''ہائپر'' ہو گیا۔ زمین پر مکے برسانے لگا اور چلّانے لگا۔ عمران نے اپنی ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا اور گدے پر گر گیا۔ کروٹیں بدلنے لگا۔ بخار کی شدت سے اس کا چہرہ دہک رہا تھا مگر پھر یہ ہوا کہ اس پُر آشوب ہیجانی کیفیت کے بعد اس کے اندر کی کچھ گرہیں جیسے کھل سی گئیں۔ میں گدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، فواد کا سر میرے زانو پر تھا اور میں اپنے زانو پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کر رہا تھا۔

وہ جیسے بخار کی مدہوشی میں کراہا۔ ''انسان کے اندر کی نفرت اور ضد اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ یہ اندرانا جان بھی بے غیرتی کی حد تک گر چکی ہے۔ وہ کسی بھی طرح..... کسی بھی طرح ان لوگوں کو نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ اور شاید..... اپنی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ظلم کیا جس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''وہ کن لوگوں کو نیچا دکھانا چاہتی تھی؟'' عمران نے استفسار کیا۔

''وہی بی بی شازمینہ اور اس کے گھر والے..... جن کے ساتھ پرنس کی تیسری رشتہ جوڑنا چاہ رہی تھی۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں فواد نے جو کچھ ہمیں بتایا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ دل و دماغ قبول ہی نہیں کر رہے تھے کہ کوئی عورت اپنی ضد، انا اور نفرت میں اتنا آگے بھی جا سکتی ہے۔ ہم پر بہت بھروسا کرنے کے باوجود شاید فواد ہمیں یہ سب نہ بتاتا مگر وہ تیز بخار کی عجیب سی خود فراموشی میں تھا۔ اس نے مجھ سے اور عمران سے رازداری کی قسمیں اٹھوانے کے بعد بہکے سے لہجے میں یہ انکشاف کیا کہ پرنس بخت کی بیوی زرش جہاں سے اس کے قربت کے تعلقات تھے۔ یہ تعلقات از خود نہیں بنے تھے بلکہ بنائے گئے تھے..... اور انہیں بنانے والا کوئی اور نہیں خود زرش کی سگی ماں، اندرانا تھی۔ وہ پرنس کی ہونے والی منگیتر، شازمینہ اور اس کی والدہ دردانا بیگم سے دشمنی میں اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ بس اندھی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ پرنس کی دوسری شادی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بے اولاد ہے۔ اندرانا کو یہ بھی گمان تھا کہ شاید بے اولادی کی اصل وجہ پرنس بخت ہی ہے۔ ان سارے حالات کے پیشِ نظر اس نے ایک ایسا قدم اٹھایا جو ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے اپنی بیٹی زرش کو مجبور کیا کہ وہ پرنس بخت کے لیے بچہ پیدا کرے بے شک یہ بچہ کسی اور کا ہی کیوں نہ ہو۔ زرش خود بُری نہیں تھی لیکن اپنی ماں کے بے حد اثر میں تھی۔ وہی ماں جس کے اندر قدیم قبائلی عداوت پرستی انوکھی شکل میں موجود تھی۔ اس نے زرش کو مجبور کر دیا کہ وہ فواد کے ساتھ تعلق پیدا کرے۔ فواد کے انتخاب میں ایک ''رمز'' یہ بھی تھا کہ اس کی مشابہت کسی نہ کسی حد تک پرنس سے ملتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی گہری بادامی تھیں۔ عیار اندرانا کے ذہن میں یہ بات بھی موجود تھی کہ جب زرش کا بچہ پیدا ہو گا تو کوئی سوچ بھی نہ سکے گا کہ یہ پرنس بخت کا نہیں ہے۔

لیکن یہاں ایک اور صورتِ حال سامنے آ گئی۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ایک ارادہ انسان کا ہوتا ہے ایک اوپر والے کا۔ منصوبہ ساز نے کچھ اور سوچا ہوتا ہے اور نتیجہ کسی اور طرف نکل جاتا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوا، وہ فواد ہی کی زبانی سنیے۔

وہ اٹک اٹک کر لہجے میں بول رہا تھا۔ ''اندرانا بیگم جو کچھ کہہ رہی تھی، میں ہرگز اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کی منت کی، ہاتھ تک جوڑے۔ وہ پہلے لالچ دیتی رہی۔ اس نے مجھے سونے اور کیش کی شکل میں ٹھیک ٹھاک رقم دینے کا کہا اور وعدہ کیا کہ وہ ایبٹ آباد میں رہنے والے اپنے ایک عزیز سے کہہ کر مجھے باہر کے ملک بھجوا دے گی جہاں میں بعد میں اپنے گھر والوں کو بھی بلا سکوں گا۔ میں انکار کرتا رہا تو وہ دھمکیوں اور ڈراووں پر اتر آئی۔ میں نے اس سے کہا..... یہ

بڑا جرم ہوگا۔ پرنس میرے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔'' چند لمحے توقف کر کے فواد نے بات جاری رکھی۔ ''اندرانا بیگم اپنے مذہب کے مطابق کسی سوریزان دیوتا کی پجارن ہے۔ اس پر بے پناہ یقین رکھتی ہے۔ ایک روز اماوس کی رات میں سوریزان کے بت کے سامنے اس نے اپنی ایک انگلی پر چیرا دے کر اپنا خون اپنے ماتھے پر لگایا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ مجھے کچھ نہیں ہونے دے گی۔ کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہ پہنچنے دے گی۔ ہر طرح میری حفاظت کرے گی۔ اس نے زرش کو میکے یعنی اپنی کوٹھی پر بلا لیا۔ انہی دنوں اس نے اپنی نیلی گاڑی چلانے کے لیے مجھے پرنس سے ادھار بھی لے لیا تھا۔ ایک رات اس نے مجھے اور زرش کو ایک ہی کمرے میں سونے پر مجبور کر دیا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر لمبا ہوتا چلا گیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز اندرانا بڑی ہوشیاری سے مجھے زرش کے کمرے میں بھیج دیتی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، مجھے پسند نہیں تھا مگر میں اس میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔''

فواد نے چند لمحے توقف کر کے کانپتے ہاتھوں سے پانی کے چند گھونٹ لیے اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے اور زرش کے درمیان عورت مرد الاتعلق قائم ہو چکا تھا۔ مجھے یہ ماننے میں عار نہیں کہ زرش خوب صورتی کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ وہ خود کو ہوشیار، چالاک بھی سمجھتی ہوگی مگر اپنی ماں کے مقابلے میں بہت سادہ ہے۔ اس پر ماں کا کچھ ایسا اثر ہے کہ وہ اس کے حکم سے باہر نہیں جا سکتی..... دو تین ہفتے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا دل و دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ میں بڑی بے چینی سے دن کے گزرنے اور رات کو زرش سے ملاقات کا انتظار کرنے لگا تھا..... دوسری طرف ایک عجیب بات اور ہو رہی تھی۔ شاید آپ لوگ میری اس بات پر پوری طرح یقین نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ زرش کو بھی میرا انتظار رہتا تھا۔ ملاقات کی رات ہم صبح تک ایک دوسرے میں گم رہتے اور پھر بھاری دل کے ساتھ خود کو ایک دوسرے سے جدا کرتے۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ زرش کو پرنس جی سے وہ محبت چاہت کبھی نہیں ملی جس کی اُسے ضرورت تھی۔''

گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے فواد کی بادامی آنکھوں میں نمی سی چمکنے لگی تھی۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''انہی دنوں میں پرنس جی کو آٹھ دس دنوں کے لیے میری ضرورت پڑ گئی۔ میں ان کی گاڑی چلا کر اسکردو لے گیا۔ واپس آ کر جب میں اندرانا جان کی کوٹھی پر پہنچا تو اس نے مجھے زرش سے ملنے نہیں دیا۔ اس نے بتایا کہ زرش کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اطلاع دی کہ میری ڈیوٹی اب ختم ہے۔ ہمارے درمیان جو طے ہوا تھا، اس کے مطابق اندرانا نے 24 قیراط کا سونا مجھے دیا، بازار میں اس کی قیمت بارہ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کچھ نقد رقم بھی دی اور کہا کہ اب میں یہ سب کچھ بھول جاؤں۔ سمجھوں کہ کبھی کچھ ایسا ہوا ہی نہیں۔ پروگرام کے مطابق مجھے ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر کسی بھی بہانے سے پرنس کی نوکری چھوڑ کر واپس لاہور چلے جانا تھا۔

دو ماہ پہلے یہ سب کچھ بہت آسان لگ رہا تھا لیکن اب مجھے یہ لگا کہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ جوں جوں میں نے اس بارے میں سوچا، مجھے یہ دنیا کا مشکل ترین کام محسوس ہوا۔ زرش سے میری آخری ملاقات بھی نہ ہو پائی تھی ورنہ شاید میں اُس سے اپنے دل کا حال بیان کرتا۔ اسے بتاتا کہ اس کی والدہ کی ضد کی وجہ سے کن زنجیروں میں جکڑا گیا ہوں۔ میں خاقان ولا واپس تو چلا گیا لیکن میرا دل دماغ روح سب کچھ اسی کمرے میں رہ گیا جہاں میں نے زرش کے ساتھ کچھ راتیں بسر کی تھیں۔''

عمران اور میں حیرت میں ڈوبے ہوئے فواد کی ہوش رُبا رُوداد سن رہے تھے۔ وہ یقیناً ان مردوں میں تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی نہیں پیتے..... جس پانی سے اُن کی پیاس بجھتی ہے اور روح سیراب ہوتی ہے، وہ اسی پانی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فواد کی پہلی بیوی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد فواد کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ اب قریباً چھ سال بعد ایک عورت آئی تھی اور ایسے انوکھے انداز میں کہ وہ خود بھی ورطۂ حیرت میں تھا۔

غنچہ نے اس مختصر کمرے میں گرم قہوہ پہنچا دیا تھا اور انگیٹھی میں کچھ کوئلے ڈال دیے تھے۔ باہر برف باری جاری تھی۔ فواد کی باتوں سے پتا چلا کہ خاقان ولا واپس آنے کے بعد وہ کوشش کے باوجود زرش اور اس کی قربت کو دل و دماغ سے نکال نہیں پایا۔ جب تڑپ حد سے بڑھ گئی تو وہ حشیش کا نشہ کرنے لگا۔ وہ زرش کی ایک جھلک کو ترستا تھا مگر وہ تو سات پردوں میں چھپ چکی تھی۔ وہ بیمار ہو گیا جو کھاتا پیتا تھا الٹ دیتا تھا۔ اس کی مسلسل نشے بازی کی خبر پرنس تک پہنچی تو ایک دو وارننگز کے بعد انہوں نے اسے ملازمت سے فارغ کر دیا۔ ایک رات وہ روتا بلکتا اندرانا جان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ تنہائی میں اُس سے ملا۔ اندرانا سے کہا کہ اس نے اسے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔ وہ جی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

وہ ایک بار..... ایک آخری بار اسے زرش جہاں سے ملا دے۔ جہاندیدہ اندرانا سمجھ گئی کہ یہ بات کسی اور طرف چل نکلی ہے۔ ممکن ہے اس کے دماغ میں یہ بھی آیا ہو کہ وہ فواد کو مروا دے۔ مگر وہ سوریزان دیوتا کی پجارن تھی اور اس نے اپنے عقیدے کے مطابق بہت بڑی قسم کھا رکھی تھی کہ فواد کی جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اور نہ پہنچنے دے گی۔ اس نے فواد کو تسلی دی اور اس سے کہا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرے گی (اس کے دماغ میں غالباً یہی چل رہا تھا کہ فواد کو جوانی اور عشق کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی طور اس بخار کو اتار لے گی)

دوسری طرف فواد شدید ترین ڈپریشن کا شکار ہو کر لاہور واپس چلا گیا۔ اس کی حالت ایسے شخص کی تھی جو کانٹوں پر لوٹ رہا ہو، شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں تھوڑا بہت یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں اسے مروا نہ دیا جائے۔

اس کے لاہور جانے کے بعد جہاندیدہ اندرانا کو ایک اور طرح کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ فواد کی ذہنی حالت دگرگوں ہے۔ وہ نشہ بھی کر رہا ہے۔ اپنی ہیجانی کیفیت میں وہ اُن راتوں کا بھید کھول دیتا جو اس نے زرش کے ساتھ گزاری تھیں تو قیامت آ جاتی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ (زرش امید سے ہو چکی تھی مگر ابھی اندرانا نے یہ بات راز رکھی ہوئی تھی) وہ اپنے دو خاص ملازموں کے ساتھ طویل سفر کر کے ماشر بروم کے دامن سے لاہور پہنچی اور فواد کو مختلف حیلے بہانوں سے بہلا پھسلا کر بڑی رازداری سے یہاں لے آئی۔ اس کے بعد کے واقعات ہمیں معلوم ہی تھے۔

دوا کھانے سے فواد کا بخار کچھ ہلکا ہو گیا تھا مگر سردی کے سبب زخمی پنڈلی میں درد موجود تھا۔ پنڈلی کے بارے میں فواد نے بتایا تھا کہ چند روز پہلے اندرانا کی ویران رہائش گاہ پر پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا تھا اس نے ایک کھڑکی کی جالی اکھاڑ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کی مگر اندرانا کے دونوں ملازموں نے اسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کر دوبارہ بند کر دیا۔ یہ چوٹ اسی واقعے کی نشانی تھی۔

عمران نے فواد سے پوچھا۔ ”کیا پھر کبھی دوبارہ زرش جہاں سے تمہارا سامنا ہوا؟“

”نہیں۔“ اس نے دکھ کے عالم میں سر ہلایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مم..... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جب اس کی ماں نے ہم دونوں کو ایک راستے پر ڈال دیا..... تو پھر وہ چل پڑی..... وہ..... میرا انتظار کرتی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زندگی میں کچھ کمی تھی۔ لیکن ان محرومیوں کا اظہار اس نے مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ تنہائی اور پاس ہونے کے لمحوں میں وہ بالکل خاموش اور بے حرکت سی ہو جاتی تھی۔ جیسے اس صورتِ حال کے لیے خود پر کوئی بوجھ یا الزام نہ لینا چاہتی ہو۔ مگر یہ سب کچھ اسے..... بُرا..... بالکل..... نہیں لگتا تھا۔“

”اچھا..... کل رات کیا ہوا تھا..... جو اندرانا کے بندوں نے تمہیں مارنے کا فیصلہ کر لیا؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی لیکن ایسی عورت کا کیا بھروسا، کیا پتا کس بہانے اس نے اپنی قسم توڑ دی۔ اندرانا نے مجھ پر یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ میرا دکھ دیکھ کر اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور ہو گئی ہے اور مجھے کم از کم ایک بار اپنی بیٹی سے ملانا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ شام کے بعد اس کے دونوں خاص ملازم مجھے ایک ڈولی میں بٹھا کر ایک گھر میں چھوڑ کر آئیں گے۔ بعد میں وہاں زرش جہاں بھی پہنچے گی اور مجھ سے ملاقات کرے گی..... لیکن جو کچھ ہوا، وہ آپ لوگوں نے دیکھا ہی ہے۔ اگر آپ دونوں نہ آتے تو شاید میں اب برف کی قبر میں ہوتا۔“ اس کی سرخ آنکھوں میں نمی آ گئی۔

عمران ـــ گہری سانس لے کر بولا۔ ”یہ تو ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اندرانا ایک سخت مزاج عورت ہے..... اور شازمینہ کی ماں سے، خاقان ولا میں اس کی چپقلش چل رہی ہے مگر وہ اس لڑائی میں اور اپنی ضد میں اتنا آگے چلی جائے گی، اس کا نہیں سوچا تھا۔“

”تم نے ایک انوکھی کہانی سنائی ہے فواد۔“ میں نے کہا۔ ”رشتوں کی لڑائی میں کچھ عورتیں کتنی پستی میں جا گرتی ہیں اس کا پتا آج چلا ہے۔“

مجھے اور عمران کو اندازہ ہو گیا تھا کہ غنچہ اور ایمل کے گھر کے اس عقبی کمرے میں دو چار دن تک فواد بالکل محفوظ ہے۔ ہم اس کے حوالے سے اپنا آئندہ لائحہ عمل سوچ سکتے تھے۔ فواد کو خدشہ تھا کہ اپنے دو خاص کارندوں کی گمشدگی اندرانا جان کو بہت بے چین کر دے گی اور وہ ان کی تلاش میں بہت آگے تک بھی جا سکتی ہے مگر صرف پندرہ بیس منٹ بعد ہمیں پتا چل گیا کہ فواد کا خدشہ اتنا درست نہیں ہے۔ جب ہم فواد اور غنچہ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اس گھر سے نکلے تو اس مقام پر سے بھی گزرے جہاں قریباً 20 گھنٹے قبل اندرانا کے دو خاص کارندوں کی قبر بنی تھی۔ وہ سارا ایریا اب پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ کئی درخت بھی ناپید تھے۔ ایوالانچ

کی ہزاروں ٹن برف نے سب کچھ اپنے نیچے گہرائی میں دفن کرلیا تھا..... تلاش میں ناکامی کے بعد اندرانا یہ سوچ سکتی تھی کہ اس کے دونوں قاتل ہرکارے بھی لکڑی کی ڈولی سمیت برف میں دفن ہوئے ہیں، اب ان کی لاشیں کسی گرم موسم میں ہی دریافت ہوسکتی ہیں۔ برف پوش بلندیاں ایسے ہی حیران کن واقعات کو جنم دیتی ہیں۔

☆☆☆

صرف دو روز بعد خاقان ولا میں جشن کا سماں تھا۔ لائٹس لگائی گئی تھیں۔ محرابی دروازوں اور دالانوں میں گیس کے رنگ برنگے ہنڈولے جھول رہے تھے۔ شام سے ہی رنگین آنچل لہرانے شروع ہوگئے تھے۔ معزز مہمانوں میں زیادہ تر عورتیں اور بچے ہی تھے۔ درجنوں ہی بکرے ذبح کیے گئے تھے اور بھنے ہوئے گوشت اور قیمے کی خوشبو ٹھٹھری ہوئی فضا میں تیر رہی تھی۔ مردانے کی جانب کوئی بہت بڑا ڈھول پیٹا جارہا تھا اور نفیریاں اور بگل بج رہے تھے۔ ہم نے دیکھا قیمتی لباس میں ملبوس تنومند اندرانا جان، ولا کے طول وعرض میں دندناتی پھر رہی تھی اور کیوں نہ پھرتی اس کی بیٹی خاقان ولا کو بچے کی خوشی دینے والی تھی..... اور کیا پتا یہ نرینہ اولاد ہوتی اور خاقان ولا کو وارث مل جاتا۔

یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ جو بچہ اس دنیا میں آنے والا ہے، اس کا اصل "باپ" چند فرلانگ دور ایک چھوٹے سے گھر کے نیم تاریک کمرے میں کمبل اوڑھے لیٹا ہے اور اپنے دل کے روگ کا ناقابلِ برداشت درد جھیل رہا ہے۔ کسی نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس پر ایک "عنایت" کی تھی اور وہ دیوانہ عنایت کے اس تیر سے گھائل ہوکر عشق کا مریض بن گیا تھا۔

گود بھرائی کی یہ رسم زنان خانے میں ادا کی جارہی تھی، تاہم ماہین نے اپنے اسمارٹ فون پر اس کے کچھ کلپ بنالیے اور ہمیں دکھائے۔ پرنس بخت، اپنی سجی سنوری بیوی زرش جہاں کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ لمبی نازک گردن والی زرش جہاں بھی گاہے بگاہے مسکرا رہی تھی۔ تنومند اندرانا بیٹی پر صدقے واری جانے کے لیے اس کے اردگرد موجود تھی۔ مہمان خواتین میں مجھے کہیں بھی شازمینہ یا اس کے گھر والے نظر نہیں آئے حالانکہ وہ ابھی "ذخیرے" میں ہی موجود تھے۔ میں نے ماہین سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟

ماہین نے کہا۔ "وہ آئے ہوئے ہیں لیکن شاید کسی کونے میں بیٹھے ہوں گے، وڈیو میں نہیں آئے۔ پرنس بڑے وضع دار شخص ہیں۔ بے شک یہ رشتے والی بات اب ختم ہوگئی ہے لیکن وہ خود گئے تھے اور بڑے اصرار کے ساتھ ان لوگوں کو ولا میں لے کر آئے ہیں۔ شازمینہ بھی صاف شفاف اور کھلے دل کی مالک ہے جو آگئی ہے۔ اس پچویشن کی وجہ سے اندرانا کے سینے پر ضرور مونگ دلی جارہی ہوگی۔"

زنان خانے میں تقریب جاری تھی۔ میں نے وڈیو کلپ میں ایک بار پھر غور سے خوبرو زرش کو دیکھا۔ وہ پرنس کے پہلو میں مسکرا تو رہی تھی مگر نجانے کیوں مجھے لگا کہ اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک کھوکھلا پن سا ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ میرا وہم تھا یا حقیقت تھی..... پرنس کے بیمار والد بھی ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھے اور خوش نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس بھری پُری محفل میں کون جانتا تھا کہ جس بچے کے آنے کی خوشی منائی جارہی ہے، وہ بچہ پرنس بخت کا ہے ہی نہیں۔ وہ بچہ اس گناہ کی کوکھ سے جنم لے گا جس کے تانے بانے پرنس کی عیار ساس نے بُنے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی انا اور نفرت کے دوش پر سوار ہوکر بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔

آخرت میں تو جو ہونا ہے، وہ ہوگا ہی لیکن گناہ دنیا میں بھی اپنا نتیجہ ظاہر کرکے رہتا ہے۔ اس خاقان ولا میں بھی عنقریب ایک تہلکہ سا مچنے والا تھا۔ آتشدانوں، انگیٹھیوں، لذیذ کھانوں اور سُریلے لوک گیتوں سے سجی ہوئی یہ محفل آخر اختتام پذیر ہوئی۔ معزز مہمان رخصت ہونے لگے۔ مہمان خانے کی کھڑکی میں سے میں نے شازمینہ اور اس کے والدین کو بھی رخصت ہوتے دیکھا۔ پرنس خود انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ شازمینہ کے ساتھ پرنس کا کوئی "محبت" وغیرہ کا معاملہ نہیں تھا۔ اگر یہ شادی ہوتی تو یقیناً ارینج میرج کے زمرے میں ہی آتی۔ تاہم قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ولا میں اپنے قیام کے دوران میں شازمینہ ضرور پرنس میں کچھ نہ کچھ دلچسپی لینے لگی تھی۔ یقیناً پرنس تھا ہی چاہے جانے کے قابل۔

تقریب ختم ہونے کے بعد شازمینہ اور اُس کے والدین کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آنے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ "عمران! مجھے لگتا ہے کہ برف کی وجہ سے اگر راستے بند نہ ہوگئے ہوتے تو شاید شازمینہ اور اس کے گھر والے ایک دن بھی یہاں نہ رکتے۔"

"اور میں کہاں رکتا۔" عمران تڑخ کر بولا۔ "کب کا لاہور پہنچ گیا ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں اگر جانا ہوتا تو اس طرح بن

''دھماکا''۔ کیسے ہوا ہے؟

عمران اپنی کنپٹی کھجاتے ہوئے بولا: ''چاچو جان! پچانوے فیصد بلکہ ننانوے فیصد امکان تو اسی بات کا ہے، کسی طرح پرنس کو پتا چل گیا ہے کہ اس کی بیوی صاحبہ کا پاؤں کیوں اور کیسے بھاری ہوا ہے۔''

''لیکن پتا کیسے چلا۔ یہ بھی سوچنے والی بات ہے اور دوسری سوچنے والی بات یہ ہے کہ فواد کی جان کو اب دہرا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر پرنس کو یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ زرش کے حاملہ ہونے کا اصل ذمے دار کون ہے تو وہ فواد کی جان لے سکتا ہے۔''

''آپ کا اندیشہ درست ہے..... مگر فی الحال تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ فواد یہیں موجود ہے۔ خاقان ولا کے مکینوں کی معلومات کے مطابق وہ یہاں سے پنجاب واپس جا چکا ہے۔''

''بہر طور، اب ہمیں اس کی طرف سے مزید محتاط رہنا پڑے گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، زرش اور اس کی ماں اب کہاں گئی ہوں گی؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا، فی الحال تو راستے ہی بند ہیں۔ ویسے یہ لوگ کہیں کیلاش کی جانب سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ راستے کھلنے کے بعد وہیں چلے جائیں۔ فی الوقت وہ ذخیرے سے باہر کہیں پناہ لے سکتے ہیں۔''

موسم ٹھیک تھا۔ میں نے اور عمران نے مناسب سمجھا کہ ایک بار فواد سے ملا جائے اور غنچہ کے گھر میں اس کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے یا پھر اسے وہاں سے کسی طرح شفٹ کر دیا جائے۔

چہل قدمی کے بہانے ہم دونوں دلا سے نکل گئے۔ سورج، برف پوش مغربی چوٹیوں کے عقب میں اوجھل ہو چکا تھا، تاہم تاریکی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ ہم چیڑ اور اخروٹ کے گنجان درختوں میں سے گزر رہے تھے جب اچانک مجھے اپنے عقب سے ایک مشکوک اور تیز چاپ سنائی دی۔ میرا ہاتھ بے ساختہ اپنے پستول کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں پستول پوری طرح جیکٹ کی جیب سے نکال پاتا، کوئی شخص ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ حملہ بالکل غیر متوقع تھا، میں سنبھل نہ سکا اور پشت کے بل ایک تناور درخت سے ٹکرایا۔ مجھے اپنے فن حرب پر مان اور اعتماد تھا مگر چند سیکنڈ میں میرا اعتماد نصف سے بھی کم رہ گیا۔ نوجوان حملہ آور نے اتنی تیزی اور سفاکی سے وار کیے کہ میں چکرا گیا۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے اس نے اپنا کوئی ایک فٹ لمبا تیز دھار چھرا میرے سینے پر چلایا۔ مجھے اپنا بچاؤ کرنے میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر ہوتی تو کام تمام ہو جاتا۔ پھر بھی چھرا دستے تک میرے دائیں بازو میں گھس گیا۔ وار میں اتنی طاقت تھی کہ موٹی جیکٹ کے باوجود وہ میری کہنی سے تھوڑا اوپر آر پار ہو گیا۔ میں نے حملہ آور کے سینے پر زوردار ٹانگ رسید کر کے اسے خود سے دور ہٹایا، وہ اپنے خون آلود چھرے سمیت کمر کے بل ایک پتھر سے ٹکرایا۔ ایسے لگا جیسے پتھر سے کوئی پتھر ہی ٹکرایا ہے۔ وہ وحشی انداز میں پکار رہا تھا۔ ''مار چھوڑوں گا تجھے، ٹکڑے کر دوں گا۔ تو نے عالم خان سے ٹکر لی ہے.....'' اس کی سانس گاڑھی بھاپ کی صورت نکل رہی تھی، جیسے اس کے سینے میں لگی ہوئی آگ کا دھواں ہو۔

بے شک یہی وہ شخص تھا جس کی ساری آن بان اور دہشت میرے یہاں آتے ساتھ ہی غارت ہو گئی تھی۔ بالاٹ کا یہ بدمعاش اب سراپا غضب تھا۔ میرے زخمی بازو سے خون کی پچکاری سی نکلی تھی۔ میں بازو پکڑ کر تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ یہی لگا جیسے ہڈی بھی کٹ کر رہ گئی ہے۔ بہت چوٹیں کھائی تھیں، بہت زخم سہے تھے مگر اس زخم نے جسم میں درد کی ایک ایسی لہر پیدا کی جو میرے جیسے ڈھیٹ کے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا، یہ کیا ہوا ہے۔

اب عمران سنبھل گیا تھا۔ مجھے زخمی دیکھ کر وہ دیوانہ وار حملہ آور پر جھپٹا۔ اپنے چہرے پر اس کے مہلک چھرے کا وار بچا کر اس نے اپنی سیدھی ٹانگ اس کے جبڑے پر رسید کی اور پھر اس سے لپٹ گیا۔ عمران ٹھیک ٹھاک مار ماری کر لیتا تھا مگر اس مار ماری کا ''لیول'' ابھی وہ نہیں تھا جو عالم خان جیسے کسی وحشی لڑاکے کے سامنے ہونا چاہیے۔ پھر بھی میرے شدید زخمی ہونے کے خیال نے اس کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں، وہ بڑی شدت کے ساتھ حملہ آور سے بھڑ گیا تھا۔ اب میں نے بھی بائیں ہاتھ سے پستول نکال لیا تھا مگر وہ دونوں اس طرح گتھم گتھا تھے کہ میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آور نے چوٹیں کھانے کے باوجود چھرا ابھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور یہ بڑی سنگین بات تھی۔ اچانک درختوں سے ابھرنے والی آوازوں نے مجھے چونکایا، یہ آوازیں آبادی کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔

برف پوش پہاڑوں میں گھری داستان کے
مزید سنسنی خیز واقعات اگلے ماہ پڑھیں

آتش

طاہر جاوید مغل

بظاہر زندگی کی روش آسان نظر آتی ہے... مگر راستے ہمیشہ ہموار نہیں رہتے... ماہ و سال آسانی سے نہیں گزرتے... واقعات کی گردش ہو یا پھر کوئی سانحہ، دل کو ہلا دیتا ہے... یہ درد و غم برف کے مانند پگھلتے نہیں... بلکہ پتھر کی طرح دل پر نقش ہو جاتے ہیں... ایک ایسی ہی داستانِ تحیر... جس کے کردار پیش منظر میں رہتے ہوئے بھی پس منظر کا حصہ تھے... انہیں جاننے کے لیے ماضی کے جھروکوں سے آگاہی ضروری تھی... برف پوش وادیوں میں کھو جانے والے کرداروں کی تلاش کا سلسلہ... اسرار کے پردوں میں چھپی سازشیں جو بلند و بالا قلعے کی دیواروں سے روزن تلاش کررہی تھیں... دو دلوں کے بیچ ہوش مندوں نے ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کی ہیں... مگر جب عشق جنوں کی سرحدوں میں داخل ہو جائے تو پھر کوئی رکاوٹ... رکاوٹ نہیں رہتی... قدم قدم پر ایک نئے جہاں سے متعارف کراتی سنسنی خیز داستان...

فطرت و جذبات میں قیامت مچا دینے والی تلخیوں کا رقصِ حقیقت

تب میں نے درختوں میں ٹارچوں کی روشنی دیکھی، اور اس کے ساتھ ہی بگل کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ پرنس کے محافظ تھے اور ان کے ساتھ کچھ عام لوگ بھی تھے۔ یہ منظر دیکھ کر عالم خان نے اچانک عمران کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی۔ عمران تشیب میں لڑھکا، عالم خان اندھا دھند دوسری طرف بھاگا۔ سامنے سے ایک شخص نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور یہ اس شخص کی بدقسمتی ثابت ہوئی۔ عالم خان نے تیز دھار چھرا چلایا اور اس شخص کو ڈھیر کرتا ہوا درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ میرے قیافے کے مطابق عالم خان کی عمر بمشکل اکیس بائیس سال رہی ہو گی۔ اس کے وحشی جسم میں بلا کی تیزی طراری تھی۔ ٹارچ بردار محافظ اس کے پیچھے لپکے۔ تین چار گھڑسواروں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ کچھ افراد میری طرف آئے اور میرا زخم دیکھنے لگے۔ عمران اٹھ کر اس شخص کی طرف گیا جسے عالم خان جاتے جاتے گھائل کر گیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس بے چارے کی انتڑیاں پیٹ سے لٹکتی ہوئی نظر آئیں۔ سفید برف پر خون کی سرخی پھیل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند سیکنڈ میں اس نے دم توڑ دیا۔

عمران میری طرف بڑھا۔ ''چاچو! آپ ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے ایک چھوٹی ٹارچ کی روشنی میرے بازو پر ڈالی۔



میں نے جیکٹ اتار دی تھی۔ سبز وردی والے ایک محافظ نے میری آستین چڑھائی۔ زخم بازو پر کندھے اور کہنی کے درمیان آیا تھا۔ یہ کوئی چار انچ چوڑا زخم تھا جو آر پار ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ ایسے زخم شروع میں بہت تکلیف نہیں دیتے، مگر نجانے کیوں مجھے شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔

ظاہر ہے، اب طوائف زادی غنچہ کی طرف جانا تو میرے اور عمران کے لیے ممکن نہیں تھا، ہم پرنس کے محافظوں کے ساتھ واپس خاقان ولا آ گئے۔ مجھ پر حملے کی خبر بڑی تیزی سے خاقان ولا میں اور ارد گرد پھیل گئی۔ یہ حملہ یوں کچھ اور سنگین ہو گیا تھا کہ عالم خان کے ہاتھوں ایک شخص کی جان بھی چلی گئی تھی۔

ولا میں موجود ڈاکٹر عظیم فوراً میری مرہم پٹی کے لیے پہنچ گیا۔ پرنس بخت کو خبر ملی تو وہ بھی بھاگا ہوا آیا۔ ''تابش صاحب! آپ ٹھیک ہیں نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بھی میرا زخم دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی تھی۔ ''مجھے ان کمبختوں کی طرف سے پہلے ہی اس طرح کا اندیشہ تھا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ پھر اپنے انچارج محافظ طالب شاہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''طالب! کچھ پتا چلا اس کا؟''

''نہیں مالک..... نکل گیا ہے خبیث کا بچہ۔''

''جا کر گھس گیا ہوگا اپنے اس باپ شنگرے خاناں کی گود میں۔'' پرنس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''مگر اب میں چھوڑوں گا نہیں۔ اس کی سزا مل کر رہے گی اسے اور شنگرے خاناں کو۔''

اسی دوران میں میرے زخم کو صاف کرتے کرتے ڈاکٹر عظیم نے پرنس بخت آور کو کوئی اشارہ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ پرنس بھی اس کے پیچھے گیا۔ ایک دو منٹ بعد دونوں واپس آئے اور ڈاکٹر عظیم پھر میرے زخم کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر عظیم نے پرنس سے میرے زخم کے بارے میں ہی کوئی بات کہی ہے۔

ذخیرہ نام کی اس پوری آبادی میں شدید اضطراب پایا جا رہا تھا۔ عالم خان نے بڑی دیدہ دلیری سے ذخیرے کی حدود میں گھس کر نہ صرف مجھے نشانہ بنایا تھا بلکہ ایک شخص کو جان سے مار ڈالا تھا۔

میں اور عمران مہمان خانے میں اپنے کمرے کے اندر پہنچے تو ماہین بھی وہیں آ گئی۔ مجھ پر ہونے والے حملے کی وجہ سے وہ بھی ازحد پریشان تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ کہنے لگی، ''انکل تابش! مجھے لگ رہا ہے کہ یہ بات یہیں ختم نہیں ہو گی۔ پرنس اور ان کے ساتھیوں میں سخت غصہ پایا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار گھنٹوں کے اندر یہ کوئی جوابی کارروائی کریں۔''

''یہ تو پھر مزید خون خرابا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

ماہین بولی۔ ''اندر بڑے خاقان جی کی طبیعت بھی ایک دو دن سے زیادہ خراب ہے۔ اگر یہاں کوئی ٹین شین والا کام ہوا تو شاید وہ سہہ نہ سکیں۔ ان سے ہر بات چھپائی جا رہی ہے۔ ابھی شام سے پہلے پرنس اور ان کی بیگم زرش جہاں میں جو سخت لڑائی ہوئی ہے، اس کی خبر بھی ان تک نہیں پہنچائی گئی لیکن اس نئے واقعے کی وجہ سے اگر یہاں گولیاں وغیرہ چل گئیں تو پھر تو ان کو پتا چلے گا ہی۔''

کچھ ہی دیر بعد میں خاقان ولا کے وسیع ڈرائنگ روم میں پرنس بخت کے پاس موجود تھا۔ میرے بازو سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر ان کی پروا کیے بغیر میں یہاں آ گیا تھا۔ پرنس کے ایک باریش چچا اور کچھ چچازاد اور دو پھوپی زاد کزن بھی یہاں موجود تھے۔ انچارج گارڈ طالب شاہ بھی تھا۔ درحقیقت طالب شاہ کی حیثیت یہاں ایکشن کمانڈر کی سی تھی۔ سب کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بالائی دالوں کو اس جارحیت کا قرار واقعی جواب دینا چاہتے ہیں۔ تاہم ان میں دو چار ایسے بھی تھے جو فوری کارروائی کے حق میں نہیں تھے اور پرنس بخت کو ذرا تحمل کا مشورہ دے رہے تھے۔ ان میں پرنس کے چچا بھی شامل تھے۔ وہاں پرنس کی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ پرنس کو بے شک اپنے ایک بندے کی ہلاکت کا دکھ بھی ہے مگر زیادہ غم و غصہ اسے اس بات کا ہے کہ اس کے مہمان یعنی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

وہاں کچھ دیر گفتگو جاری رہی، پھر پرنس کے چچا عبدالرحمان نماز کے لیے چلے گئے تو میں نے پرنس سے درخواست کی اور اسے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ میں نے کہا۔ ''پرنس، میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ کسی فوری جوابی کارروائی سے گریز کیا جائے۔ اس وقت وہ لوگ پوری تیاری میں ہوں گے۔ اگر آپ نے انہیں کوئی جواب دینا ہی ہے تو پھر آپ ایسے وقت کا انتخاب کریں جو آپ کے لیے سودمند ہو۔''

مجھے فوری طور پر محسوس ہوا کہ میری اس دلیل نے پرنس بخت پر اثر کیا ہے۔ میں نے مزید کہا۔ ''آپ کو یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ بڑے خاقان کی حالت تشویشناک ہے، ڈاکٹر انہیں سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر

یہاں صورتِ حال کشیدہ ہو جاتی ہے تو اس کا اثر براہ راست بڑے خاقان جی پر پڑے گا۔ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوا تو.....“ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

پرنس اب واضح طور پر سوچ بچار کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے چچا عبدالرحمان کی رائے بھی یقیناً اس کے سامنے تھی۔ پرنس کے ساتھ میری گفتگو کچھ دیر مزید ہوئی اور پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ کسی فوری کارروائی کا خطرہ ٹل گیا ہے..... اور اب بات شاید پنچایت کی طرف جائے گی۔

☆☆☆

فوری لڑائی وغیرہ کا خطرہ ٹل گیا تھا مگر خاقان ولا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ اس بے چینی کی وجہ وہی پرنس اور زرش جہاں کا ازدواجی معاملہ تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان دونوں میں کیا مسئلہ ہوا کہ فقط دو دن پہلے ”ولا“ میں گود بھرائی کا جشن منانے والی اندرانا بیگم اور اس کی بیٹی اب ”ولا“ میں نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔ ہاں یہ راز ولا کے مکینوں کو معلوم نہیں تھا لیکن ہمیں معلوم تھا، ہم جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ ”آؤٹ سائیڈرز“ تھے لیکن یہاں کے مکینوں سے کہیں زیادہ جان چکے تھے۔

دو روز بعد ماہین کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ پرنس اور اس کے دوسرے چچا سلیمان خان خود چل کر شازمینہ اور اس کے والدین سے ملنے گئے ہیں۔ راستے مسدود ہونے کی وجہ سے شازمینہ اور اس کے والدین ابھی یہاں ذخیرے میں ہی اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ماہین نے بتایا کہ پرنس چاہتے ہیں، شازمینہ اور وردا خانم وغیرہ ولا میں واپس آ جائیں۔

”پھر کیا نتیجہ نکلا؟“

”وہ نہیں مانتیں۔ ان کا کہنا غالباً یہی ہے کہ موجودہ حالات میں ان کا دوبارہ یہاں آنا نہیں بنتا۔ یقیناً ان کو یہ الجھن بھی ہوگی کہ آناً فاناً پرنس اور زرش جہاں کے درمیان ایسا کیا ہوا ہے کہ زرش اور اس کی ماں کو ولا سے ہی نکلنا پڑ گیا ہے۔“

”تمہارے خیال میں آئندہ کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے ماہین سے پوچھا۔

”میرا اندازہ ہے کہ پرنس دوبارہ شازمینہ اور وردا خانم کے پاس جائیں گے اور انہیں ولا میں لانے کی کوشش کریں گے۔ پرنس کو یہ احساس ہے کہ عیار اندرانا بیگم کی وجہ سے شازمینہ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ ماہین نے چند لمحے توقف کیا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے گال کا ڈمپل نمایاں نظر آنے لگا۔ ”اور انکل



”یہ جاسوسی ناول مصنف نے واقعی نئے انداز میں لکھا ہے۔ اس میں قاتل آخر میں وہی نکلتا ہے جس پر آپ کو شروع سے شک ہوتا ہے۔“

جان! اب اس بلیٹن کی سب سے اہم اور دھانسو خبر آپ کے لیے..... ذرا توجہ مرکوز کریں۔“

”اس وقت تو واقعی کسی ویبنگ سوشل میڈیا چینل کی رپورٹر لگ رہی ہو۔“

وہ رازداری کے انداز میں بولی۔ ”زرش اور اس کی والدہ اندرانا کو یہاں سے دیس نکالا تو مل چکا ہے لیکن آخری خبریں آنے تک وہ اپنی اسی رہائش گاہ میں ہیں جہاں کچھ دن پہلے تک انہوں نے فواد کو بند رکھا ہوا تھا۔ میں تصور کی نظر سے دیکھ سکتی ہوں کہ اس عمارت میں اب رونا دھونا مچا ہوگا۔“

”کون رو رہا ہوگا؟“

”وہی زرش اور اس کی زندگی تباہ کرنے والی اس کی ماں اندرانا جان۔“ ماہین نے کہا اور پھر ذرا توقف کر کے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ پرنس نے زرش جہاں کو باقاعدہ طلاق دے دی ہے۔“

یہ واقعی دھماکا خیز اطلاع تھی اور ایک طرح سے یہ اس بات کا بین ثبوت بھی تھا کہ پرنس اس گناہ سے آگاہ ہو چکا ہے جو چالباز اندرانا نے اپنی بیٹی سے کروایا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آناً فاناً یوں طلاق کی نوبت کیوں آتی۔

یہاں اس ڈھیرہ نامی خوب صورت بستی میں واقعات اب تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ دو روز کے وقفے کے بعد ہلکی برف باری پھر شروع ہوگئی تھی۔ حسب سابق سہ پہر کے وقت میں اور عمران پھر رازداری کے ساتھ غنچہ کے گھر پہنچے۔ ہم نے ہڈ والی جیکٹس پہن رکھی تھیں اور مفلر وغیرہ لپیٹ رکھے تھے۔ کوئی ہمیں غنچہ کے الگ تھلگ گھر میں داخل ہوتے دیکھ بھی لیتا تو پہچان نہ سکتا۔ غنچہ ہمیشہ کی طرح مسکراتے چہرے کے ساتھ ملی اور ہمیں یقین ہوگیا کہ یہاں سب خیریت ہے۔ فواد کا بخار اب اتر چکا تھا اور وہ پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ مجھ پر ہونے والے حملے کی خبر یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ غنچہ کے علاوہ فواد نے بھی دردمندی کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ خاص طور سے غنچہ زیادہ فکرمند نظر آتی تھی۔ ٹین ایجرز والی شدید جذباتیت اس میں موجود تھی۔

فواد ہم سے اندرانا بیگم اور زرش وغیرہ کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ اس حوالے سے ہمارے پاس اہم ترین خبر موجود تھی مگر فی الحال ہم نے اسے اوپن کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فواد کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پرنس اور اس کی بیوی کے درمیان کچھ ناچاقی پائی جارہی ہے۔ فواد کی حالت بہت خستہ ہورہی تھی۔ شاید وہ کئی ہفتوں سے نہیں نہایا تھا۔ لباس بھی بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ عمران نے اصرار کرکے اسے گرم پانی سے نہانے پر آمادہ کیا۔ وہ اسے سہارا دے کر غسل خانے میں لے گیا۔ گھر میں آج اضافی خاموشی تھی۔ غنچہ نے بتایا کہ اس کی بہن ایمل دایہ کو دکھانے کے لیے کسی قریبی گھر میں گئی ہے اور نانی سو رہی ہے۔ کمرے کی تنہائی میں غنچہ کا چہرہ ایک دم تمتمانے لگا تھا۔ وہ معمولی شکل وصورت کی تھی مگر اس کا سانچے میں ڈھلا ہوا جسم غیر معمولی تھا۔ وہ ایک منقش صراحی میں شراب لے آئی اور بڑے اطمینان سے میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ پئیں گے؟ یہ ''مقدس'' شراب ہے۔ کیلاش میں تہواروں پر پی جاتی ہے۔''

''یہ کیوں پلا رہی ہو مجھے؟'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''کہتے ہیں کہ اس سے مرد عورت کے درمیان جھجک دور ہو جاتی ہے۔'' اس نے شکستہ اردو میں کہا اور کمال بے تکلفی سے میرے پہلو میں بیٹھ کر اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس کا پیکر آگ کی طرح دہکنے لگا تھا۔

''اچھا کھڑی ہو جاؤ۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی اور اپنے لباس کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ اس نے شاید یہ سمجھا تھا کہ میں اسے اپنے سامنے کھڑا کرکے اس کے ہوش ربا جسم کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

''اٹھاؤ یہ صراحی اور وہیں رکھ کر آؤ جہاں سے لائی ہو۔''

وہ ذرا ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اسی دوران میں عمران باتھ روم کی طرف سے تولیا لینے کے لیے نکلا۔ اس نے غنچہ کو مخاطب کرکے ہانک لگائی۔ ''کمرے میں جلدی سے انگیٹھی گرم کردو۔''

عمران کو آتے دیکھ کر غنچہ نے جلدی سے صراحی اٹھائی اور غڑاپ سے دوسرے کمرے میں اوجھل ہوگئی۔ میں اس کے لیے شدید جھلاہٹ محسوس کررہا تھا۔ میں نے کوئی ہیرو بننے کے شوق میں اسے جھڑپ کے دوران میں نہیں بچایا تھا۔ وہاں کوئی بھی اس صورت حال سے دوچار ہوتا تو میں یہی کرتا۔ اب وہ ٹین ایجرز والے دیوانے پن کا مظاہرہ کررہی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کا مزاج درست کرنے کی ضرورت ہے۔

نہانے دھونے کے بعد اور گرم سوپ پینے کے بعد فواد خود کو کافی بہتر محسوس کررہا تھا مگر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جلتا ہوا غم پہلے روز کی طرح فروزاں تھا۔ یہ غم ان بھید بھری راتوں کا دیا ہوا تھا جو چالباز اندرانا نے اس پر اور اپنی بیٹی پر ٹھونسی تھیں۔ آج کی ملاقات میں اس حوالے سے کچھ اور باتیں بھی فواد سے معلوم ہوئیں۔ پرنس اور زرش جہاں کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے بارے میں بات کرتے ہوئے فواد نے بتایا۔ ''کہا جاتا ہے کہ شادی سے پہلے پرنس کسی لڑکی سے بہت ٹوٹ کر محبت کرتا تھا مگر پرنس کی والدہ اس لڑکی کے لیے کسی طور رضامند نہیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی کی شادی پرنس سے نہ ہوسکی۔ پرنس کی والدہ نے اس کے لیے زرش جہاں کو چنا، اور پرنس نے والدہ کی منشا کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن پرنس کبھی بھی زرش کو وہ پیار نہ دے سکا جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے.....''

''اس دوسری لڑکی کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی شادی بھی کہیں اور ہوگئی۔ اپنے دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران میں وہ مرگئی تھی۔'' فواد نے بتایا۔

اس قسم کی کچھ بات میں اس سے پہلے ماہین سے بھی سن چکا تھا۔ اب اس کی تصدیق ہورہی تھی۔ کڑیاں جیسے آپس میں مل رہی تھیں۔ پرنس اور زرش جہاں نے چھ سات برس تک بالکل غیر مطمئن ازدواجی زندگی گزاری۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب اندرانا کے انوکھے فیصلے کے نتیجے میں زرش

جہاں، فواد سے ملی اور اس کے ساتھ "وقت" بسر کیا تو اس کا نتیجہ کچھ اور نکل آیا۔ کم از کم فواد کی حد تک تو یہ "نتیجہ" بالکل واضح تھا۔ وہ "سین زرش کی" "قربت" کا شکار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ساری رات بازو کے زخم میں درد رہا۔ یہ عجیب سا درد تھا۔ بازو سے لے کر چھاتی تک پھیل رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کی وجہ بڑھی ہوئی سردی بھی ہے۔ ناشتے سے پہلے میں نے جیکٹ پہننے کے لیے ہینگر سے اتاری تو ایک کاغذ سائڈ پاکٹ سے نیچے گر گیا۔ میں نے یہ تہ کیا ہوا کاپی سائز کا کاغذ کھولا تو دنگ رہ گیا، یہ خون سے لکھی ہوئی ٹیڑھی میڑھی تحریر تھی۔ زبان اردو ہی تھی۔ یہ خط غنچہ کی طرف سے تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ شکر کا مقام تھا کہ عمران کمرے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ ضرور کوئی لطیفہ گھڑ لیتا۔ خط ویسا ہی تھا جیسا کوئی نوعمر اور احمق لڑکی جوانی کے جوش میں لکھ سکتی ہے۔ لایعنی باتوں اور دو چار عشقیہ شعروں کے بعد اس نے تحریر فرمایا تھا..... "آپ نے میری زندگی بچائی ہے۔ جو زندگی بچاتا ہے زندگی اسی کی ہوتی ہے۔ آپ میرے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں ہیں۔ آپ کے چرنوں میں اپنی زندگی قربان کرنا میری سب سے بڑی آرزو ہے۔"

اسے اپنی اور میری عمر کا ذرہ بھر خیال نہیں تھا۔ میں نے دانت پیس کر خط آتشدان میں پھینک دیا۔ اسی دوران میں ہلکا سا شور سنائی دیا اور پھر باوردی ملازم نے آکر اطلاع دی کہ پرنس مجھ سے ملنے تشریف لا رہے ہیں۔ میں انیکسی کی نشست گاہ میں آ گیا۔ پرنس تپاک سے ملا۔ ساتھ ڈاکٹر عظیم بھی تھا۔ دونوں نے میرا حال دریافت کیا۔ میں نے رات بھر رہنے والے درد کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر عظیم نے میری بینڈیج کھولی اور بڑی احتیاط سے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر تفکر کے تاثرات ابھرے۔ مجھے لگا کہ ڈاکٹر نے اشارے کنایے میں پرنس سے کچھ کہا بھی ہے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تابش صاحب! میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ آپ کی صحت اور سلامتی کا معاملہ ہے۔ آپ کا یہ زخم معمولی نہیں ہے۔"

میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر کہا۔ "مجھے آپ کے رویے سے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔"

پرنس نے بات آگے بڑھائی۔ "دراصل..... جس آلے سے آپ کو یہ زخم لگایا گیا اس کی دھار پر زہر تھا۔ ہم لوگ مقامی زبان میں اسے گورنی کا زہر کہتے ہیں، یہ شہد کی مکھی کے ڈنک سے تیار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم کو شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر نے زخم کو چھیلنے اور دھونے میں بہت زیادہ وقت لیا۔ اس سے زہر کی شدت تو کچھ کم ہو گئی مگر اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے۔"

یہاں تک کہہ کر پرنس نے ڈاکٹر عظیم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ بھی کچھ بولے۔ ڈاکٹر عظیم صاف لہجے میں بولا۔ "تابش صاحب، اگر راستے کھلے ہوتے تو میں فوراً آپ کو اسکردو یا پھر ایبٹ آباد وغیرہ منتقل کرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں۔ لہٰذا ہم سے یہیں جو کچھ بن پڑے گا ہم کریں گے۔ آپ کو بھی حوصلہ رکھنا ہوگا اور ہمت نہیں ہارنا ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ ہم..... "اوور کم" کر لیں گے۔"

میں نے بازو کے زخم پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ زخم کچھ نیلا پڑتا جا رہا ہے۔ کیا یہ اثر باقی جسم پر بھی ہوگا؟"

ڈاکٹر اور پرنس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر پرنس گویا ہوا۔ "تابش صاحب، میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ آپ اندھیرے میں رہیں۔ دراصل یہ زہر کبھی کبھی جسم میں شدید قسم کا انفیکشن پیدا کر دیتا ہے۔ جسم سوج جاتا ہے اور بخار کے ساتھ خشک کھانسی بھی شدت پکڑ لیتی ہے۔ ہم اس بیماری کو گورنی کی نسبت سے گورنام کہتے ہیں۔ یہ تکلیف اکثر سانس کے ذریعے پھیلتی بھی ہے۔ لہٰذا مریض کو دوسروں سے ذرا الگ رکھا جاتا ہے۔ ساتویں، آٹھویں روز تکلیف کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور ڈیڑھ دو ہفتے میں مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے پرنس کا لہجہ تسلی تشفی والا ہو گیا۔

ڈاکٹر عظیم نے کہا۔ "سانس کے ذریعے اس بیماری کے پھیلنے کا چانس بہت زیادہ نہیں ہے لیکن مقامی لوگ اس "پھیلاؤ" پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ بہرحال احتیاط ضروری ہے، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ آپ کو ذرا حوصلے اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔ آپ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

پرنس کے رعب دار چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ان لمحوں میں اس کی نگاہ میں اسی عالم خان کی شبیہ گھوم رہی ہے جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور اس خونی وار کے بعد شنگرے خاناں کی گود میں جا چھپا تھا۔ (شنگرے کا پورا نام ٹموک شنگرے خاناں تھا تاہم اسے صرف شنگرے یا شنگرے خاناں کہا جاتا تھا)

یہ سب کچھ یقیناً پریشان کن تھا اور اس لحاظ سے کچھ اور زیادہ بھی کہ مناسب طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے اس بارے میں فی الحال عمران اور ماہین کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی مجھے اپنی قوتِ برداشت پر اعتماد اور بھروسا تھا۔ میں نے جسمانی تکالیف کے حوالے سے ماضی میں بہت کچھ کامیابی سے سہا تھا۔ اس رات پھر درد کی شدت رہی تاہم سوجن اور بخار وغیرہ کے آثار نظر نہیں آئے۔ دل میں امید پیدا ہونے لگی کہ شاید بلا ٹل ہی جائے۔ ڈاکٹر عظیم نے باقاعدگی سے میری میڈیکیشن جاری رکھی ہوئی تھی۔ اگلے روز شام کو ماہین کی زبانی معلوم ہوا کہ پرنس، شازمینہ کو واپس خاقان ولا میں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شازمینہ کی خوش اخلاق والدہ وردا خانم بھی ساتھ ہی آئی تھیں، تاہم والد نے فی الوقت اپنے عزیزوں کے ہاں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ماہین کی زبانی یہ بھی پتا چلا کہ پرنس کے حکم پر غنچہ بھی خاقان ولا میں واپس آ گئی ہے۔ اس کو واپس لانے کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر ہونے والے حملے کے بعد پرنس بخت اور شکرے خاناں کے درمیان پھر شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس بات کا خدشہ ہو سکتا تھا کہ شکرے خاناں پھر غنچہ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ماہین! لیکن اب اس بستی میں فواد کی حفاظت کون کرے گا؟''

ماہین رازداری کے انداز میں بولی۔ ''انکل تالی! میں غنچہ سے مل چکی ہوں، اس کا کہنا ہے کہ اگر پرنس جی کا حکم نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی نہ آتی۔ بہرحال اب وہ اپنی بہن ایمل کی مکمل ذمے داری لگا کر آئی ہے۔ فواد وہاں بالکل محفوظ رہے گا۔''

اسی دوران میں، میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شفق رنگ شام میں خاقان ولا کے در و دیوار اجلے نظر آ رہے تھے۔ زنان خانے کے سامنے سرسبز لان میں شازمینہ اپنی والدہ اور ولا کی دیگر خواتین کے ساتھ موجود تھی۔ ملازمائیں اور مشاطائیں وغیرہ شازمینہ کی یہاں دوبارہ آمد پر بہت خوش دکھائی دیتی تھیں اور اس کے اردگرد چہک رہی تھیں۔ وہ ایک گلابی اونی پہناوے میں تھی اور درمیانی شکل و صورت کے باوجود دلکش نظر آتی تھی۔ ماہین اسے دیکھ کر خوش ہوئی اور اس سے ملنے لان کی طرف چلی گئی۔

رات کو میرے زخمی بازو میں درد تو ہوتا رہا لیکن باقی خیریت ہی رہی۔ اگلے روز سہ پہر میں پرنس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے نجی حالات کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا، نہ ہی اس نے کچھ بتایا تھا..... تاہم زرش جہاں کو طلاق کی خبر ایسی نہیں تھی جو چھپنے والی ہو۔ اس حوالے سے دبی دبی سرگوشیاں خاقان ولا میں ہو رہی تھیں۔ یقیناً سب حیران تھے کہ بچے والی غیر معمولی خوشی ملنے کے بعد ایک دم کیا ہوا کہ جوڑے میں علیحدگی ہو گئی اور ماں بیٹی کو خوار ہو کر ولا سے نکلنا پڑا۔

میرے بازو میں زخم لگے اب چار یا پانچ دن گزر چکے تھے۔ پرنس بخت کو جیسے امید سی پیدا ہونے لگی تھی کہ شاید مجھ میں وہ شدید علامات ظاہر نہ ہوں جو زخمی کو قریب المرگ کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر عظیم کے خیالات بھی کچھ بدلتے جلتے ہی تھے۔ غنچہ مہمان خانے کے اردگرد ہی موجود رہتی تھی۔ شام کو گل دان میں تازہ پھول رکھنے کے لیے وہ میرے کمرے میں چلی آئی۔ بہت ہیجان خیز لباس میں تھی۔ موسم سرما کے چھوٹے چھوٹے نیلے پھول اس کے جوڑے میں بھی سجے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اپنے بے ہودہ ''خونی'' خط کی وجہ سے وہ مجھ سے نظریں نہیں ملائے گی مگر پتا نہیں کس ''بے جھجک مٹی'' کی بنی ہوئی تھی۔ بڑی فدویانہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر اس نے لمبی سرد آہ بھری اور پھول گل دان میں لگاتے ہوئے اپنی سرخ چنری اس طرح سامنے سے سرکائی کہ سراپا دعوت نظر آنے لگی۔

''میں نے یہاں مہمان خانے میں ہی ڈیوٹی لگوائی ہے جی۔ کوئی بھی ''خدمت'' ہو مجھے آواز دیجیے گا۔'' اس کے لہجے میں جذبات کی تیز آنچ تھی۔

میں خاموش رہا۔ فواد کے بارے میں کچھ پوچھنے بتانے کا یہ موقع نہیں تھا۔

وہ آدھی رات بھی خیریت سے گزر گئی، مگر پھر وہ کچھ ہونا شروع ہو گیا جس کا خدشہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں کی انگلیوں پر ورم آ رہا ہے اور کچھ بخار بھی ہو گیا ہے۔ صبح سے پہلے ہی یہ علامات واضح ہو گئیں۔ دوپہر تک یہ حال تھا کہ پورا جسم جیسے انگاروں پر تھا۔ سوجن بڑھتی جا رہی تھی اور آنکھوں سے مسلسل تیز ابی پانی بہہ رہا تھا۔

اس موقع پر میں نے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دینا مناسب سمجھا۔ میں نے عمران اور ماہین کو بلا کر وہ سب کچھ بتا دیا جو ڈاکٹر اور پرنس بخت سے معلوم ہوا تھا۔ ماہین کا رنگ سفید پڑ گیا، عمران بھی شدید کرب میں نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''ابھی یہ علامات ظاہر ہوئی ہیں۔ یہ کافی آگے جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہی ہے کہ مجھے کچھ دن کے لیے بالکل علیحدہ رہنا پڑے گا۔''

ماہین نے ہاتھ بڑھا کر میرا لمپریچر دیکھنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر عظیم اور پرنس تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئے۔ آج ایک اور ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ماہین اور عمران کو باہر جانے کا کہا۔ میرے بازو کے زخم اور وائٹل سائنز کا معائنہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں میری تکلیف بدترین صورت اختیار کر گئی۔ پورے جسم پر سوجن آ گئی، خاص طور سے بالائی دھڑ پر۔ شدید بخار تھا اور سانس سینے میں آرے کی طرح چل رہی تھی۔ لیٹتے ہی شدید کھانسی شروع ہو جاتی تھی، لہٰذا مجھے تکیے کے سہارے نیم دراز ہونا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر عظیم کے لیے بھی یہ ایک امتحان تھا، کیونکہ صرف وہی میری ٹریٹ منٹ کے لیے میرے کمرے میں آ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے خاص قسم کا ایپرن پہنے ہوتا تھا۔ منہ پر سرجیکل ماسک اور ہاتھوں میں دستانے ہوتے تھے۔ ملازمہ کھانے والی ٹرالی تیار کر کے دروازے پر لے آتی تھی۔ اسے اندر لانے والا بھی ڈاکٹر عظیم ہی ہوتا تھا، کھانے کا تو بس تکلف ہی کیا جا رہا تھا۔ میں دو چار لقمے ہی لیتا تھا، اس کے بعد معدہ وارننگ دینے لگتا تھا کہ مزید کچھ لو گے تو میں واپس کر دوں گا۔

گزرے ماہ و سال میں اذیت جھیلنا میرے لیے ایک مشغلے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سخت ترین مشقت اور تکلیف مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر زیادہ متاثر نہیں کرتے تھے، پھر بھی اس ''گورنام'' نامی بلا نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں ہر پل انگاروں کے بستر پر ہوں۔ میری اس حالت کا میرے میزبانوں اور خاص طور سے پرنس کو بہت رنج تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ پنچایت قسم کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں بندوقیں نکلتے نکلتے رہ گئی تھیں۔ درحقیقت میری وجہ سے بالاٹ کے عالم خان نامی بدمعاش کی جو بے عزتی ہوئی تھی، اسے شنگرے خاناں نے اپنی بے عزتی سمجھا تھا۔ ویسے بھی مقامی رہن سہن میں یہ بات طے تھی کہ باہر سے آنے والے لوگوں کو ان بستیوں میں ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے برعکس ہم کافی دنوں سے یہاں موجود تھے۔

تیسرے روز رات نو دس بجے کا وقت تھا۔ میں درد کی شدت سے سر پٹخ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں تکلیف برداشت نہیں کر پا رہا تو عام لوگ خاص طور سے عورتیں اور بچے وغیرہ اس موذی بیماری میں مبتلا ہو کر اسے کیسے جھیلتے ہوں گے۔ اچانک دروازہ کھلا اور عمران اندر آ گیا۔ اس نے منہ پر سرجیکل ماسک چڑھا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے میز پر رکھی۔ ''کیسے ہیں آپ؟'' وہ اطمینان سے بولا۔

''عمران! یہ کیا کر رہے ہو۔ تمہیں پتا نہیں ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے۔ چلو باہر جاؤ، چلو نکلو۔''

''چلو نکلو، تو آپ نے میری چڑ ہی بنا لی ہے۔ چلو نکلو کمرے سے..... چلو نکلو لاہور سے..... چلو نکلو پاکستان سے۔''

''عمران! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔'' میں اتنی زور سے بولا کہ شدید کھانسی ہونے لگی۔ گلے میں پھندا سا لگ گیا اور میں کروٹ کے بل دہرا ہو گیا۔

وہ لپک کر آگے آیا۔ مجھے سیدھا کیا۔ مجھے پانی پلانے کی کوشش کی۔ میں نے ایک گھونٹ پانی پی کر اسے پھر پیچھے دھکیل دیا۔ ''عمران! ایسا مت کرو۔ جاؤ یہاں سے۔ ڈاکٹر عظیم میری دیکھ بھال کر رہا ہے نا۔'' میرا لہجہ ہانپتا ہوا تھا۔

''آپ کو دیکھنا ڈاکٹر عظیم کی ڈیوٹی ہے لیکن میرا یہ فرض ہے۔ میں آپ کو اس طرح تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

اس نے اپنی پتلون کی جیب سے سرجیکل دستانے نکال کر پہنے اور پھر اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''نہیں عمران، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''نہیں چاچو، آپ واہموں کا شکار نہ ہوں۔ یہ تکلیف ضرور ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ اسے ''ہوا'' بنا لیا جائے۔ میں نے دونوں ڈاکٹر صاحبان سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ مریض کی دیکھ بھال کی جا سکتی ہے۔''

''تو ہو رہی ہے نا دیکھ بھال۔ تم خود کو کیوں نشانہ بنانا چاہتے ہو؟'' میرا لہجہ کربناک ہو گیا۔

''آپ مقامی لوگوں کی زبان بول رہے ہیں چاچو جان، جنہوں نے اسے موت کا دوسرا نام دے رکھا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ''بہادر'' ہوں گے جن کا بس چلے تو ایسے مریض کو زندہ دفن کر ڈالیں۔ یہ کم عقلی اور دقیانوسیت کی انتہا ہے۔''

''مگر عمران.....''

''مگر کچھ نہیں چاچو جان! احتیاط ضروری ہے لیکن موت کے خوف کو سر پر سوار کرنے والا میں نہیں ہوں۔ آپ

بے فکر رہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

میرے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ عمران سے بحث کر سکوں۔ دو لفظ بول کر سانس پھول جاتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

وہ ارادے کا اٹل تھا، اور وہ میرے پاس اس کمرے میں رہنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میرے مسلسل انکار کے باوجود وہ میرا سر دبانے کے لیے میرے سرہانے بیٹھ گیا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ درد میں کچھ کمی واقع ہوئی تو اس نے بے حد اصرار کے ساتھ مجھے چند لقمے کھلائے اور میڈیسن دی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر کسی خوف یا اندیشے کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"کس مٹی کے بنے ہوئے ہو تم؟" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کہا تو ہے، اسی پاکستانی مٹی کا، جس سے آپ بنے ہیں اور آپ کا "پیارا دوست" بنا تھا۔ آپ بھولے تو نہیں ہوں گے اسے۔"

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔

میں نے ماہین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔ "وہ بھی آنا چاہ رہی تھی جی، لیکن میں نے منع کر دیا۔ کچھ بھی ہے عورت ذات ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے ہمارے ہاں کی عورتیں اچھے بھلے مریض کی عیادت کر کے اس کی حالت نازک کر دیتی ہیں۔ اسے یہ باور کرا دیتی ہیں کہ وہ قریباً قریباً فوت ہو چکا ہے۔"

اسی دوران میں ڈاکٹر عظیم بھی آ گیا۔ وہ میرے پاس عمران کو دیکھ کر کچھ الجھن میں نظر آیا۔ بہر حال عمران نے تھوڑی سی کھسر پھسر کر کے اسے مطمئن کر دیا۔ غالباً یہی بتایا کہ وہ پوری احتیاط کر رہا ہے۔

رات کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا، ڈاکٹر عظیم نے ڈرپ میں دو تین انجکشن لگائے تھے، تکلیف میں انیس بیس کی کمی واقع ہوئی تھی مگر سانس اب بھی سینے میں کند آرے کی طرح چل رہی تھی۔ کمرے کے کھڑکیاں دروازے بند رکھے گئے تھے۔ عمران مجھ سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور ہر پل مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میری نگاہ ایک کھڑکی کی طرف اٹھی تو وہاں غنچہ کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ڈری ہوئی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

عمران بولا۔ "لیں جی، آپ پر جان نچھاور کرنے والے بھی آ گئے۔"

پھر اس کے دل میں نجانے کیا آئی اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور غنچہ کو اندر آنے کا کہا۔

"جی..... کیا؟" وہ حیرت زدہ نظر آئی۔

"تھوڑی سی مدد کرو میری، یہ کھانے کی خالی ٹرے اور برتن لے جاؤ کمرے سے۔" وہ کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھوم کر دروازے کی طرف آئے گی مگر وہ نہیں آئی۔

عمران مسکرایا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لو جی..... لگتا ہے کہ وہ تو سونے چلی گئی۔"

رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ تکلیف تو کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ تاہم عمران کی مسلسل موجودگی سے کئی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ میرے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ کمرے سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ اگلے روز دوپہر تک بالائی دھڑ کی سوجن اور بخار کی شدت بہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمران میرے سر پر مسلسل ٹھنڈی پٹیاں رکھنے لگا۔ اب قے آنا بھی شروع ہو گئی تھی۔ معدہ تقریباً خالی تھا، پانی ہی نکل رہا تھا۔ ہر بار جب قے آتی، عمران بڑے اطمینان سے ڈسٹ بن میرے منہ کے سامنے کرتا، یا پھر ایک کپڑے میں قے کو سمیٹتا اور دوسرے کپڑے سے میری گردن وغیرہ صاف کرتا۔ تب پھر میرے قریب بیٹھ کر برف کی پٹیاں رکھنے لگتا۔ گاہے بگاہے وہ انٹرکام پر ڈاکٹر عظیم سے رابطہ بھی رکھے ہوئے تھا۔

"عمران! پلیز جاؤ۔" میں نے نیم غشی کی سی حالت میں کہا۔

"چلا جاؤں گا تو بہت یاد کرو گے۔ اب تھوڑا وقت اپنے ساتھ گزار لینے دیں۔ چھوٹی موٹی خدمت کر لینے دیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"تم کیا چیز ہو عمران؟"

"اور آپ کیا چیز ہو چاچو، میں دیکھ رہا ہوں جتنی تکلیف اس وقت آپ کو ہے، کوئی لوہے پتھر کا بندہ بھی ہوتا تو رونے چلانے لگتا۔ آپ نے ایک بار ہائے بھی نہیں کیا۔"

"بس دعا کرو، یہ بھرم قائم رہے۔" میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ ان لمحوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بارونداجکی جیسے میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے لہجے میں وہی برسوں پرانی حکمت اور تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ کہہ رہا تھا..... تکلیف کی شدت وہ نہیں ہوتی جو ہمارے دل و دماغ محسوس کرتے ہیں۔ تکلیف کی اصل شدت بہت کم ہوتی ہے۔ اس کی اصل شدت پر دھیان دو تو اس میں کمی محسوس کرو گے۔

وہ قیامت کے تین روز تھے۔ کسی وقت غشی سی طاری ہو جاتی تھی۔ اس غشی میں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ شاید یہیں اس برف زار میں مجھے دفنا دیا جائے گا۔ عمران اور ماہین آنکھوں میں آنسو لیے یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔ پھر کسی اور موسم میں وہ لوگ یہاں آئیں گے۔ گزری باتیں یاد کریں گے۔ سوچیں گے کہ یہاں مجھ پر وہ غصیلا عالم خان حملہ آور ہوا تھا۔ یہاں اس درخت کے پاس اس نے مجھ پر وار کیا تھا پھر وہ اس طرف کو بھاگا تھا..... اور یہاں اس خاقان ولا کے اس کمرے میں، میں نے تڑپ، تڑپ کر جان دی تھی۔

غشی کے ان مایوس کن دوروں کا اختتام عموماً عمران کے محبت بھرے لمس سے ہوتا تھا۔ وہ کبھی میرا ماتھا سہلا رہا ہوتا، کبھی سینے پر مالش کر رہا ہوتا اور کبھی شاید میرا سر چوم رہا ہوتا تھا۔ بیماری کے ساتویں، آٹھویں روز مجھے محسوس ہوا کہ تکلیف میں چڑھاؤ نہیں رہا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر گئی ہے یا شاید تھوڑی بہت کم ہو گئی ہے۔ اگلے دس بارہ گھنٹوں میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا۔ بخار کنٹرول میں تھا اور سانس کے ساتھ جو کند چھری سی سینے میں چلتی تھی کچھ دھیمی پڑ گئی تھی۔

اس رات جب عمران میری پشت کو اپنے کندھے کی ٹیک فراہم کر کے مجھے چند نوالے کھلا چکا تھا اور دوبارہ لٹا رہا تھا کھڑکیوں کے سامنے سے غنچہ گزری۔ عمران کو نہ جانے کیا سوجھی مجھے لٹا کر جلدی سے کھڑکی پر پہنچا اور اسے کھول کر پکارا۔ ''غنچہ کہاں جا رہی ہو؟''

اس نے مری مری آواز میں کچھ کہا۔ عمران تحکم سے بولا۔ ''ٹھہرو، تم سے کام ہے۔''

وہ رک گئی۔ عمران دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ ایک منٹ بعد وہ اس طرح دروازے پر نمودار ہوا کہ اس نے غنچہ کو کلائی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ کسی اڑیل بکری کی طرح خود کو پیچھے کی طرف سرکا رہی تھی۔ اسے اندر لا کر عمران نے دروازہ بند کیا اور ذرا رعب سے بولا۔ ''کوئی آدم خور بلا نہیں ہے یہاں، جو تمہیں نگل جائے گی۔ دیکھو میں بھی تو پانچ چھ دن سے یہیں پر ہوں۔ ڈاکٹر بھی آتے جاتے ہیں۔ ملازم نوروز خان بھی صفائی کے لیے آتا ہے۔ ہم سب زندہ ہیں۔ تمہیں بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''لل..... لیکن میرے پیٹ میں درد.....''

''تمہارے پیٹ میں صرف خوف کا درد ہے اور کچھ نہیں ہے۔ صرف تین چار گھنٹوں کی بات ہے۔ میں ذرا نیند پوری کر لوں۔ فریش ہو کر صبح پانچ بجے سے پہلے پھر یہاں

اہم اطلاع

برائے ادارت حضرات ناظرین

السلام علیکم! اطلاعاً عرض ہے کہ ناگزیر وجوہ اور کاغذ کی بے انتہا گرانی کے سبب ادارے سے شائع ہونے والے چاروں ماہنامے

سسپنس ڈائجسٹ..... ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ پاکیزہ..... جاسوسی ڈائجسٹ

کی قیمت مئی 2022ء سے =/150 روپے فی شمارہ ہوگی۔

آپ سے تعاون کی درخواست ہے۔

ہوں گا۔ تم نے کرنا کیا ہے؟ بس یہاں دروازے کے پاس چیئر پر بیٹھی رہو۔ اول تو یہ سوتے رہیں گے۔ اگر پانی وغیرہ مانگیں تو دے دینا۔"

میں نے دیکھا غنچہ کا چہرہ برف کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

"مم..... میں..... وہ..... اگر..... لیکن....." وہ شکستہ اردو میں ہکلا کر رہ گئی۔

عمران طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "دیکھو، خدا کا خوف کرو۔ یہ کوئی اور نہیں تابش صاحب ہیں۔ جن پر تم جان نچھاور کرتی ہو۔ اپنے خون سے ان کو خط لکھتی ہو۔ تم نے ہی کہا تھا نا کہ آپ میرے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں۔ آپ کے چرنوں میں زندگی قربان کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں زندگی کی قربانی کون مانگ رہا ہے۔ تین چار گھنٹے ہی مانگ رہا ہوں۔ زیادہ ڈر ہے تو یہ ماسک وغیرہ لگا کر کمرے کے اس آخری کونے میں بیٹھ جاؤ۔"

وہ جان چھڑانا چاہ رہی تھی مگر عمران نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس نے اسے ماسک اور دستانے وغیرہ پہنائے اور دروازے کے بالکل پاس کرسی پر بٹھا کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ میں ایک بار پھر اسے منع کرتا ہی رہ گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ غنچہ کو اس کے ناپختہ اور ہیجانی جذبات کی سزا دینا چاہتا ہے اور یہ واقعی اس کے لیے سزا ہی تھی۔ وہ کرسی پر یوں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی جیسے اس پر چاروں طرف سے قاتل جرثومے یلغار کر رہے ہوں اور وہ کسی بھی وقت پھڑک کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دے گی۔ اس کا جسم جو اپنے اندر کمال کا تناسب اور دلکشی رکھتا تھا کسی مرجھائے ہوئے پتے کی طرح کرسی پر سمٹا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر خدانخواستہ رات کو کسی وقت مجھے متلی ہوئی تو وہ خود بھی اپنا معدہ خالی کرنا شروع کر دے گی۔

رات کسی پہر میری آنکھ کھلی تو وہ کرسی پر نظر نہیں آئی۔ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ کھڑکیوں پر آہنی گرل تھی۔ وہ کہاں گئی تھی؟ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کر رکھا ہے۔ اس کے کچے ذہن میں جان بچانے کا بس یہی طریقہ سمجھ میں آیا ہوگا۔ دوا کا اثر تھا، تکلیف کے باوجود میں پھر سو گیا۔

کچھ دیر بعد دوبارہ آنکھ کھلی تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ دونوں بازوؤں میں بھی جان لیوا اینٹھن تھی۔ عمران نے پین کلر دوا اور پانی کا گلاس میرے بالکل پاس ہی رکھا ہوا تھا مگر جب میں نے دوا نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شیشے کی بوتل سائڈ ٹیبل سے قالین پر گری اور پھر لڑھک کر بیڈ کے نیچے چلی گئی۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ غنچہ ابھی تک باتھ روم میں ہی بند تھی۔ میں نے اسے آوازیں دیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بھلا کر میں نے اپنی جسمانی توانائی کو سمیٹا اور ایک ہاتھ سے زخمی بازو کو سہارا دیتا ہوا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بخار کے سبب چکر سا آ گیا۔ خود کو سنبھال کر میں گھٹنوں کے بل جھکا اور بیڈ کے نیچے جھانکا۔ میڈیسن والی بوتل "رول" کر کے کافی آگے چلی گئی تھی۔ نیچے خلا مختصر تھا، میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہاتھ لمبا کر کے بوتل نکال سکوں۔ میں نے ایک بار پھر غنچہ کو پکارا۔ باتھ روم کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اندر موجود ہی نہیں ہے پھر دروازہ اندر سے بند کیوں تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ درد کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

اسی دوران میں عمران فرشتۂ رحمت کی طرح وہاں پہنچ گیا۔ دروازہ ان لاک کر کے وہ کمرے میں چلا آیا۔

"غنچہ کہاں ہے؟" وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں کراہ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ڈر کر اندر گھس گئی ہے۔"

عمران نے بھی دو تین بار زور سے دروازہ کھٹکھٹایا پھر متبادل چابی سے باتھ روم کا دروازہ کھولا، باتھ روم خالی تھا۔ باتھ روم کی مستطیل کھڑکی کی جالی ادھڑی ہوئی تھی۔ یقیناً دہشت زدہ غنچہ وہاں سے نکل کر جا چکی تھی۔ یہ اسی خوف کی کارستانی تھی جو اکثر مقامی لوگوں میں گورنام بیماری کے حوالے سے پایا جاتا تھا۔

عمران نے مجھے دوا کھلائی، بستر پر لٹایا۔ اور مجھے کمبل اوڑھا کر میرے پاس بیٹھ گیا بولا۔ "دیکھ لیا جی، یہ کچے پکے ذہنوں کا طوفانی عشق کس طرح کا ہوتا ہے۔"

"تم بڑے چالباز ہو۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "لیکن چلو، جو بھی ہوا اچھا ہوا، اسے جلدی سمجھ آ گئی۔"

"ویسے اتنا بے خبر نہیں ہوں میں۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں میں آپ کے اردگرد ہی موجود رہا ہوں۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "مجھے پتا تھا وہ گدھی آپ کے قریب نہیں پھٹکے گی۔"

دوا کھانے سے طبیعت سنبھل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد عمران باہر گیا اور آ کر اس نے مجھے بتایا۔ "غنچہ ولا کے اندر ہی ہے۔ اتنی شرمندہ ہے کہ میرے سامنے ہی نہیں آ رہی تھی۔"

میں نے کہا۔ ''اب اسے مزید شرمندگی سے بچانا۔ اس کے بھاگنے کا کسی کو نہ بتانا۔''

''اور وہ جو کھڑکی کی جالی ادھیڑ گئی ہے؟''

''اس کے لیے کوئی بہانہ بنا دینا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس بہانوں کی کون سی کمی ہوتی ہے..... لیکن اب ایک بات ہمیں اور بھی سوچنا پڑے گی۔ فواد وہاں غنچہ کی بہن کی پناہ میں ہے۔''

''یعنی آپ کا مطلب ہے کہ غنچہ کے عشق والا بخار اتر گیا ہے اور اب وہ اور اس کی بہن، فواد کو پناہ دینے سے ہاتھ کھینچ سکتی ہیں۔''

''یہ ہو بھی تو سکتا ہے۔''

''نہیں ہوگا جناب۔'' وہ یقین سے بولا۔ ''میں اس حوالے سے غنچہ کے کان بڑی اچھی طرح کھول آیا ہوں۔ دونوں بہنیں ایسا رسک لینے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

اب صبح ہو چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی۔ اچانک لان کی طرف سے بلند آوازیں آئیں۔ یوں لگا کہ پرنس بخت آور کسی کو بُری طرح ڈانٹ ڈپٹ رہا ہے۔

عمران دیکھنے کے لیے انیکسی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے بتایا۔ ''پرنس لان میں اوپن ایئر بریک فاسٹ کر رہے تھے۔ شازینہ اور والدہ ورداخانم بھی ساتھ تھیں۔ ایک ملازمہ نے سروس کرتے ہوئے گرم گرم کافی شازینہ کے پاؤں پر گرا دی۔ پرنس نے اسے غصے میں تھپڑ دے مارا۔''

''بچت ہو گئی شازینہ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، لیکن پاؤں پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر عظیم مرہم پٹی کر رہا ہے۔'' عمران جس ملازمہ کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ خاقان ولا میں ہیڈ ملازمہ کے بعد سب سے اہم ملازمہ تھی۔ اسے حاجن رانی کہا جاتا تھا۔ نام سے لگتا ہے کہ وہ بڑی عمر کی ہوگی مگر وہ بڑی عمر کی نہیں تھی اور حاجن بھی نہیں تھی۔ کوئی عمرہ وغیرہ شاید اس نے کر رکھا تھا، اور وہ بھی یوں کہ وہ اپنے کار پینٹر شوہر کے ساتھ پانچ چھ ماہ سعودی عرب میں رہی تھی، پھر انہیں وہاں سے واپس آنا پڑا تھا، وہ بمشکل پچیس چھبیس سال کی چھریرے جسم والی لڑکی تھی لیکن کئی بڑی عمر کی ملازماؤں پر بھی حکم چلاتی نظر آتی تھی۔

بظاہر یہ ایک عام سا واقعہ تھا لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ چند ہی دن بعد یہ ایک بڑے واقعے کا پیش خیمہ بننے والا ہے۔

☆☆☆

مجھے افاقہ تو تھا لیکن طبیعت پوری طرح سنبھل نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر عظیم کا کہنا تھا کہ میرا زخم مندمل ہو رہا ہے اور میں خطرناک دورانیے سے گزر چکا ہوں۔ پھر بھی ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر شاہد پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ ایک روز ڈاکٹر عظیم آیا تو اس نے انڈرویئر کے علاوہ میرے سارے کپڑے اتروا دیے اور جسم کا بغور معائنہ کیا۔

کہنے لگا۔ ''لگتا ہے کہ کوئی بڑی شدت سے آپ کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ آپ خطرات سے نکل رہے ہیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھیے، آپ خود بھی اپنے ہاتھ پاؤں اور جسم کا معائنہ کرتے رہیں۔ اگر کسی بھی حصے پر سرخ دھبے نظر آئیں یا وہاں پر اسکن کی رنگت نمایاں طور پر بدلی ہوئی ہو تو فوراً بتائیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے عظیم؟''

وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ''سمجھیں کہ یہ اس بیماری کا دوسرا ''فیز'' ہوتا ہے مگر یہ بہت کم ہی ظاہر ہوتا ہے۔ انشاء اللہ آپ اس سے محفوظ ہی رہیں گے۔ میں نے دیکھا ہے آپ کے اندر تکالیف کے لیے غیر معمولی مزاحمت موجود ہے۔''

''سرخ دھبوں سے مطلب کیا ہوتا ہے؟''

اس نے ایک دو میڈیکل اصطلاحات استعمال کرنے کے بعد کہا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ جسم کی کچھ باریک نسوں میں اضافی خون جما ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مریض کو مکمل بیڈ ریسٹ اور خاص میڈیسنز کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ معاملہ خراب ہو سکتا ہے لیکن ڈرنے کی بات نہیں۔ اگر فوری طور پر ابتدائی مرحلے میں ٹریٹ منٹ شروع کر دی جائے تو صحت یابی کے چانسز بڑھ جاتے ہیں۔''

سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تکلیف اور پریشانی آتو ایک دم جاتی ہے لیکن جاتے جاتے کافی وقت لیتی ہے۔ اب ڈاکٹر نے اس دوسری پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ بہرحال میں نے عمران اور ماہین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اور ڈاکٹر کو بھی منع کر دیا۔

اب احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باعث ماہین بھی میرے کمرے میں آ جاتی تھی۔ وہ میری بہتر ہوتی صحت سے خوش تھی۔ آج کل وہ اپنا زیادہ وقت وڈیوز وغیرہ بنانے میں صرف کر رہی تھی۔ خاقان ولا اور اردگرد کے برف پوش مناظر اس کے یوٹیوب چینل کے لیے ایک بالکل نئی چیز ثابت ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنے موبائل کیمرے پر مجھے

چند کلپس بھی دکھائے۔ یہ ان پرندوں کے تھے جو اس سخت ترین سردی میں بھی ہجرت کر کے یہاں سے نہیں گئے تھے۔ ان میں اُلو، ووڈ پیکر اور رابن چڑیاں وغیرہ شامل تھیں۔ ایک وڈیو میں برفانی لومڑی بھی ایک ڈھلوان پر جھلک دکھاتی نظر آتی تھی۔

میں نے ماہین سے اندرانا بیگم اور اس کی بیٹی زرش کے بارے میں پوچھا۔

ماہین بولی۔ ''اس سلسلے میں مکمل خاموشی ہے انکل، کسی کو کچھ پتا نہیں کہ اس شام کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اندرانا بیگم اسی علاقے میں ہے یا بیٹی کے ساتھ کہیں اور نکل گئی ہے۔ لگتا ہے کہ خاقان ولا میں اس بارے میں بات کرنے پر بھی پابندی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شازینہ تو تمہاری فرینڈ کی طرح ہے۔ اس نے بھی کوئی اشارہ نہیں دیا۔''

''نہیں انکل تابش، شازینہ بڑی سادہ دل ہے۔ کسی کے بُرے میں نہیں ہے۔ بس اپنے کام سے کام رکھنے والی، بلکہ وہ تو شاید اس بات پر افسردہ بھی ہو کہ پرنس اور زرش میں آناً فاناً طلاق کیوں ہوگئی۔''

یہ دوسرے، تیسرے روز کی بات ہے۔ رات نو بجے کا وقت تھا۔ موسم پھر برف باری والا ہو رہا تھا۔ میرے کمرے میں آتش دان دہک رہا تھا۔ میں نے قمیص اتار رکھی تھی۔ ڈاکٹر عظیم میری جلد کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور قمیص وغیرہ پہننے میں میری مدد کی۔ وہ عمران سے بہت متاثر نظر آتا تھا..... کہنے لگا۔ ''تابش صاحب! بیماری کے دوران میں جس طرح عمران نے آپ کی تیمارداری کی ہے، یہ بہت متاثر کن ہے۔ بہت قریبی لوگ ہی اس طرح کے رسک لیتے ہیں۔ میں دیکھتا رہا ہوں۔ جب بیماری کا زور تھا اور آپ نیم غشی کی حالت میں ہوتے تھے، یہ آپ کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ بہت دلیری کی بات ہے۔'' پھر ڈاکٹر عظیم نے تھوڑا سا توقف کیا اور بولا۔ ''ویسے یہ آپ کا لگتا کیا ہے؟''

''میں نے بتایا تھا نا بھتیجا ہے۔''

''لیکن آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ سگا بھتیجا نہیں ہے۔''

''عظیم! کچھ لوگ سگوں سے بھی زیادہ سگے ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا لیکن وہ مشکلات کی گھٹاٹوپ تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے محفوظ حصار میں لے لیتے ہیں۔ ہماری طرف آنے والے آلام کو اپنے سینے پر جھیلتے ہیں اور ہمیں اپنی محبت کا قیدی بنا لیتے ہیں.....'' میں جب یہ الفاظ کہہ رہا تھا میری نگاہوں میں عمران (عمران دانش) کا وجود دمکنے لگا تھا۔ وہی عمران جس نے برسوں پہلے مجھے خودکشی کے جبڑوں سے نکال کر زندگی کے راستوں پر چلایا تھا۔ آج شاید وہی عمران ایک بار پھر اپنے بیٹے کے روپ میں میرے پاس آ گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر میری ڈھارس بننا چاہتا تھا۔ میرے کندھے سے کندھا ملانا چاہتا تھا..... لیکن مجھے کچھ عجیب واہموں نے گھیر رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ میرے ساتھ رہے۔

ڈاکٹر عظیم چاہتا تھا کہ اب میں کسی وقت کمرے سے باہر تھوڑی سی چہل قدمی بھی کیا کروں۔ اس نے ملازم نوروز خان کو آواز دی لیکن نوروز سے پہلے ہی عمران لپکا ہوا کمرے میں آ گیا۔ اس نے سہارا دے کر مجھے بٹھایا۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے چپل پہنائی اور پھر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔

''فواد کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟'' میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''میں رات کو اس سے مل کر آیا ہوں۔ ایمل اچھی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کی پنڈلی کی چوٹ بھی بہتر ہے لیکن وہ جو روگ اسے چمٹا ہوا ہے چین نہیں لینے دے رہا۔ زرش جہاں کے ساتھ جو راتیں اس نے گزاری ہیں وہ اس کے اندر گہرائی تک اُتر چکی ہیں..... وہ اس سے ملنا چاہتا ہے پھر سے اسے دیکھنا چاہتا ہے۔''

''زرش کو طلاق ہونے والی خبر کا پتا اسے چلا ہے یا نہیں؟''

''چل گیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اور بھی بے چین ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس طلاق کی وجہ بھی زرش کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق ہی ہے۔ وہ اندرانا کو صلواتیں سناتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف اس کی بیٹی کی زندگی خراب ہوئی بلکہ خود وہ بھی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں جکڑا گیا۔''

چند لمحے توقف کر کے عمران نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے چاچو، جو کچھ یہ فواد محسوس کر رہا ہے..... یہ یک طرفہ ہے یا پھر زرش کی طرف بھی اس کا تھوڑا بہت اثر موجود ہے۔''

''اس کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن زرش کی ازدواجی زندگی کبھی بھی خوشگوار نہیں رہی۔ یقینی بات ہے کہ اس کے اندر ایک خلا موجود تھا۔ فواد نے اس خلا

کو پُر کیا..... مگر پھر مقررہ وقت پر وہ اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق اس سے علیحدہ ہوگئی۔ اب وہ اس علیحدگی اور دوری کو کہاں تک محسوس کرتی تھی یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "گود بھرائی کی رسم میں ماہین نے جو کلپس ہمیں دکھائے تھے، ان میں وہ بڑی شان سے پرنس کے پہلو میں بیٹھی نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خوشی اور شادمانی کے اندر جو کھوٹ سا ہے وہ اسے خود بھی محسوس کرتی ہے۔"

"میرا خیال بھی تم سے ملتا جلتا ہے۔"

تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد میں ہانپ سا گیا اور برآمدے میں رکھی ہوئی ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ اچانک ولا کے رہائشی حصے کی طرف سے چلانے کی آواز آئی۔ پرنس بخت کا ایک جواں سال کزن عمر دراز بھاگتا ہوا اندرونی حصے سے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے فربہ اندام ہیڈ ملازمہ بھی دوڑی چلی آرہی تھی۔ عمر دراز، عمران کو دیکھ کر پکارا۔ "ڈاکٹر عظیم کہاں ہیں؟"

"ابھی یہیں تھے، میرا خیال ہے ڈیوڑھی کی طرف گئے ہیں۔"

عمر دراز ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ فربہ اندام ملازمہ سرتاپا لرزتی ہوئی ہمارے پاس پہنچی۔ وہ رو رہی تھی۔ "کیا ہوا؟" میں نے بلتی زبان میں اس سے پوچھا۔

وہ فریاد کناں انداز میں پکاری۔ "کچھ پتا نہیں، شازمینہ بی بی اور وردا بیگم کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ ان کے کھانے میں کسی نے زہر ملا دیا ہے۔ ہائے میرے اللہ، یہ کیا ہوگیا؟ کس نے توڑی ہے یہ قیامت؟" وہ واویلا کرنے لگی۔

اسی دوران میں خود پرنس بخت بھی زنان خانے کے دروازے پر نظر آیا۔ آثار سے لگتا تھا کہ وہ بھی سخت شاک کی حالت میں ہے۔ ہم نے دور ڈیوڑھی کی طرف ڈاکٹر عظیم اور عمر دراز کو دیکھا۔ وہ بھاگتے ہوئے زنان خانے کی طرف آرہے تھے۔

"جلدی کرو۔" پرنس دہاڑا۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ سب زنان خانے میں اوجھل ہو گئے۔ شور سن کر ماہین بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ شازمینہ کے ساتھ کوئی سنگین معاملہ ہوگیا ہے تو وہ جیسے تڑپ گئی اور تیزی سے زنان خانے کی طرف چلی گئی۔ پورے ولا میں ایک دم ہی سنسنی اور تناؤ کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ ہم نے دیکھا لوگ تیزی سے زنان خانے میں آ اور جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے دوسرے سینئر ڈاکٹر شاہد کو دیکھا وہ بھی بھاگا ہوا زنان خانے کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چترالی ملازم تھا جس نے "نیبولائزر" ٹائپ کی کوئی مشین اٹھا رکھی تھی۔

ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی۔ میں اور عمران کمرے میں آگئے۔ اسی اثنا میں ماہین بھی ہانپتی کانپتی پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ "یہ زہر خورانی کا کیس ہے انکل۔ شازمینہ، اس کی والدہ اور پرنس بخت آج کل رات کا کھانا اکٹھے ہی کھاتے ہیں۔ ان کے کھانے میں کچھ ملایا گیا ہے۔ کوئی تیز قسم کا زہر ہے....."

ماہین کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"لیکن ماہین، پرنس تو ٹھیک ہے؟"

"اسے پرنس کی خوش قسمتی کہہ لیں۔ انہوں نے ابھی ایک دو نوالے ہی لیے تھے کہ ان کے بیمار والد ان کو آوازیں دینے لگے۔ وہ کھانا چھوڑ کر انہیں دیکھنے چلے گئے مگر جو ایک دو لقمے انہوں نے کھائے تھے وہ بھی تھوڑا بہت اثر کر گئے ہیں۔ پرنس کو دو تین بار "وومٹنگ" ہوئی ہے مگر شازمینہ اور آنٹی....." شدتِ غم سے ماہین کی آواز بیٹھ گئی۔

"کون ہوسکتا ہے یہ؟" عمران نے پوچھا۔

"گارڈز نے خانساماں سمیت تین چار ملازموں کو کمرے میں بند کر دیا ہے، لیکن جس ملازمہ نے کھانا سرو کیا تھا، وہ ابھی تک نہیں ملی۔ پتا ہے وہ کون ہے؟"

میں اور عمران سوالیہ نظروں سے ماہین کی طرف دیکھنے لگے، وہ بولی۔ "یہ وہی جواں سال حاجن رانی ہے جسے چند روز پہلے پرنس نے تھپڑ مارا تھا۔"

یہ بڑی متنی خیز صورتِ حال تھی۔ میرا تجربہ تھا کہ کئی گھریلو ملازم جن کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور وہ پرانے بھی ہوتے ہیں، ان کے اندر خاص قسم کی حساسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی وقت مالکوں کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو وہ اسے دل پر لے لیتے ہیں اور کبھی کبھی بڑا غیر متوقع ردِعمل ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ لگ رہا تھا۔ گرم کافی گرنے اور تھپڑ والے واقعے کے بعد میں نے حاجی رانی نامی ملازمہ کو کم ہی زنان خانے سے باہر دیکھا تھا۔

ماہین نے بتایا۔ "یہاں میڈیکل ٹریٹ منٹ کا کافی سامان اس لیے موجود ہے کہ بڑے خاقان جی کو اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر شاہد، شازمینہ اور آنٹی وردا کا معدہ واش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پرنس بخت کہہ رہے تھے ابھی ان دونوں کی حالت خطرے سے باہر نہیں۔"

ہمیں معلومات فراہم کر کے ماہین پھر رہائشی پورشن کی طرف لپک گئی۔ ہم نے دیکھا گارڈز خاقان ولا کے طول و عرض میں بھاگے پھر رہے تھے۔ یقیناً وہ ملازمہ حاجن رانی کو ہی تلاش کر رہے ہوں گے۔ گھڑسواروں کی ایک ٹولی بھی تیز رفتاری سے مین گیٹ کی طرف جاتی نظر آئی۔

ابھی آٹھ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ رہائشی حصے کی طرف جیسے کہرام سا مچ گیا۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ میں اور عمران سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایکسی کے اشک بار ملازم نور روز نے ہمیں اطلاع دی کہ وردا خانم انتقال کر گئی ہیں اور شازینہ بی بی کی حالت بھی ٹھیک نہیں۔ وہ گہری بے ہوشی میں ہیں۔

یہ بڑی تکلیف دہ خبریں تھیں۔ جس طرح کی صورت حال بتائی جا رہی تھی، یقیناً شازینہ کو ان برف پوش پہاڑوں کے بجائے ایبٹ آباد یا راولپنڈی کے کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ تاریک رات، دکھ، سردی اور بے یقینی کے کہرے میں لپٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وردا خانم کے عزیز اس کے جسدِ خاکی کو اسکردو پہنچانا چاہتے تھے جو کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا اس خوش پوش، خوش اخلاق خاتون کو اماتا ذخیرے کے قبرستان میں ہی دفن کر دیا گیا۔ خراب موسم کے باوجود پوری آبادی جنازے میں امڈ آئی۔ یہ ایک طرح سے ہر دلعزیز پرنس بخت کی مقبولیت کا ثبوت بھی تھا۔ وردا خانم کا یوں اچانک چلے جانا سب کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ خاص طور سے ان کے شوہر (شازینہ کے والد) کے لیے۔ تدفین کے وقت وہ صدمے سے نڈھال اور نیم جان نظر آتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کے لیے بڑے خاقان اور پرنس کے پُرزور اصرار پر یہاں خاقان ولا میں آئے تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ یہاں اندرانا بیگم جیسی خون آشام بلا موجود ہے جو انہیں نیچا دکھانے کے لیے ہر حد سے گزر جائے گی۔

شازینہ کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے سر توڑ کوشش کر کے اس کی سانس بحال رکھی ہوئی تھی۔ وہ کسی وقت تھوڑی سی امید بھی ظاہر کرتے تھے۔ شقی القلب ملازمہ رانی کا ابھی کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ کچھ لوگ یہ شک بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شاید وہ ارتکابِ جرم کے بعد پناہ لینے کے لیے بالاٹ چلی گئی ہو۔ تاہم ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ ماہین، شازینہ کے لیے ازحد پریشان تھی۔ اسے رہ رہ کر حاجن رانی پر بھی طیش آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ رانی ملازمہ ہونے کے باوجود بڑی اکڑفوں رکھتی تھی۔ یوں ظاہر کرتی تھی جیسے وہ اس گھر کا فرد ہو۔ پرنس سے طمانچہ کھانے کے بعد وہ بالکل گم صم رہنے لگی تھی۔ اپنی کسی ساتھی سے اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے گھرانے کی برسوں کی چاکری کا یہ اچھا صلہ دیا ہے مالکوں نے۔

میرے بازو کا زخم اب مندمل ہو رہا تھا۔ حالت میں بتدریج بہتری آ رہی تھی۔ لیکن وہ سرخ دھبوں والی مین شین ابھی برقرار تھی۔ میں قریباً روزانہ ہی اپنا جسم چیک کرتا تھا۔ ڈاکٹر عظیم بھی گاہے بگاہے اس بارے میں پوچھ رہا تھا۔

اس روز پرنس بخت کے سیٹلائٹ فون کے ذریعے ماہین نے ایک بار پھر لاہور میں بات کی۔ اپنے منگیتر حشام کو بھی اپنے بارے میں تسلی تشفی دی۔ حشام کو گمان تک نہیں تھا کہ یہاں لاہور سے سیکڑوں میل دور ماشر بروم پہاڑ کے نواح میں میرے علاوہ عمران بھی ماہین کے ساتھ موجود ہے۔

میں نے بھی بات کی۔ اپنے ڈی آئی جی صاحب کو اور ساتھی آفیسرز کو اپنی خیر خیریت کے بارے میں بتایا۔ میں نے عمران سے پوچھا کہ کیا وہ بھی انڈیا میں اپنی والدہ یا کسی اور سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اب تو ان سے بالمشافہ ہی بات ہوگی۔"

مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ماہین کا گریز اور اس کا رویہ دیکھ کر اب وہ واقعی واپسی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا ہے، یقیناً اس میں کچھ عمل دخل میرے اس اصرار کا بھی تھا کہ وہ چلا جائے۔

وردا بیگم کے جاں بحق ہونے کے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ میں میڈیسن لینے کے بعد کمرے میں ہی تھوڑی سی چہل قدمی کر رہا تھا جب ماہین طوفان کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند کر کے بولی۔ "انکل تابش! مجھے پتا چل گیا ہے آنٹی وردا اور شازینہ کا مجرم کون ہے۔ حاجن رانی صرف آلۂ کار تھی۔ اصل مجرم وہی باسٹرڈ اندرانا بیگم ہے۔ وہ انتقام میں اندھی ہو رہی ہے۔ اسی نے جان لی ہے آنٹی وردا کی۔"

میں نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد کہا۔
''ماہین! تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو، کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''
''بڑا بولڈ ثبوت ہے انکل۔ کوئی اس کو جھٹلا نہیں سکے گا۔'' وہ ایک یو ایس بی میرے سامنے کرتے ہوئے بولی۔
''اس میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''رابن چڑیوں کی آوازیں..... اور وڈ پیکرز کی چہچہاہٹ وغیرہ۔''
''میں اب بھی نہیں سمجھا؟''
ماہین نے بڑے جوشیلے انداز میں بتایا کہ مہمان خانے کے عقب والے باغیچے میں رابن چڑیاں اور کچھ دوسرے پرندے دانہ دنکا چگنے آتے ہیں اور چہکارتے ہیں۔ وہ ان کی دلکش آوازوں کو قریب سے ریکارڈ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک وائرلیس مائیک پودوں میں چھپا رکھا تھا۔ آج اس نے اس مائیک سے کی جانے والی ریکارڈنگ چیک کی تو اس میں پرندوں کی آوازوں کے علاوہ بھی کچھ ریکارڈ تھا۔ یہ ریکارڈنگ شام کے بعد تاریکی میں چند دن پہلے ہوئی تھی۔
ماہین نے بڑی تیزی سے اس یو ایس بی کو اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ اٹیچ کیا اور پھر اس آڈیو ریکارڈنگ تک پہنچ گئی جو مجھے سنانا چاہتی تھی۔ یہ جدید ڈیوائس کی خاصی صاف آواز تھی۔ ایک دبی دبی سسکی سنائی دی پھر ایک نسوانی آواز نے کہا۔ ''چھوڑو بھی نوروز خان، یہ کوئی وقت ہے ان حرکتوں کا.....'' میں نے پہچان لیا یہ اسی حاجن رانی کی آواز تھی۔
نوروز کی ہانپی ہوئی آواز ابھری۔ ''اوئے! اب پتا نہیں کب ہاتھ آؤ گی تم۔ تھوڑا سا کلیجا ٹھنڈا کر لینے دو۔''
چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر رانی کی آواز سنائی دی۔
''اور کیا کہا تھا اندرانا جی نے؟''
''بس یہی کہ کل کام ہونا چاہیے اور رات والے کھانے میں ہونا چاہیے۔ ویسے بھی کل بجلی کی ہفتہ وار چھٹی ہے۔ تمہیں ''ولا'' سے نکلنے میں بھی آسانی رہے گی.....''
سرگوشیوں میں چند فقرے مزید بولے گئے پھر قدموں کی چاپ ابھری اور خاموشی چھا گئی۔ اب بس ہوا کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی یا رکھوالی کے کتوں کی دور افتادہ آوازیں تھیں۔
ہم نے دو تین بار ''ری وائنڈ'' کر کے ریکارڈنگ سنی۔ یہ واقعی بہت ٹھوس ثبوت تھا۔ یہ بھی واضح ہو رہا تھا کہ اندرانا جان اور ملازمہ رانی جہاں بھی ہیں اس کا علم نوروز کو ہے۔
نوروز خاں کی عمر تیس بتیس سال تھی۔ وہ چھریرے جسم کا گھنی مونچھوں والا بندہ تھا۔ سر کے بال لمبے تھے۔ وہ زیادہ تر ٹیکسی میں ہی نظر آتا تھا۔ یہاں کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا تھا اور دوسرے ملازموں سے کام بھی لیتا تھا۔
ابھی میں اور ماہین بات ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر شائستہ دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے نوروز ہی مسکراتے چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موسم سرما کے نیلگوں پھولوں کا گل دستہ تھا۔ ''جی سرکار! آپ کے لیے تازہ پھول۔'' اس نے ادب سے جھک کر کہا۔
اس شخص کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی گھناؤنی سازش میں ملازمہ رانی کے ساتھ شریک رہا ہے۔

☆☆☆

پرنس بخت بہت شائستہ مزاج شخص تھا مگر بوقت ضرورت وہ بہت سخت بھی ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے علاقے کا نظم و نسق چلانے کے لیے یہ دونوں صفات ضروری تھیں۔ مہمان خانے کے کسی کمرے سے رونے چلانے کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ مردانہ آوازیں تھیں۔
میں اور عمران، جان گئے کہ نوروز کے حوالے سے جو اطلاع ہم نے پرنس کو دی ہے اس کے نتیجے میں نوروز کی شامت آئی ہوئی ہے۔ یقیناً نوروز سے اندرانا بیگم اور ملازمہ رانی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ بالاٹ میں پرنس کے ایک دو جاسوس موجود تھے۔ ان کے ذریعے پرنس نے بڑی اچھی طرح تصدیق کی تھی اور پتا یہ چل رہا تھا کہ اندرانا یا ملازمہ رانی کے بالاٹ میں آنے یا پناہ حاصل کرنے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ (اندرانا اب اپنی ذاتی رہائش گاہ میں نہیں تھی)
میں عمران کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں نوروز چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سفید رنگ کی بس ایک شلوار تھی۔ جسم پر بید کی، ایک لمبی چھڑی کے ان گنت سرخ نشان تھے۔ اس ہال نما کمرے میں پرنس، انچارج گارڈ طالب شاہ اور پرنس کے چھوٹی زاد عمر دراز کے علاوہ دو ملازم بھی موجود تھے۔ تنومند ملازم جس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی بُری طرح ہانپا ہوا تھا۔
دوسری طرف نوروز کی حالت بھی پتلی تھی۔
انچارج طالب نے معنی خیز نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''مالک، بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے۔ ایسے

کچھ نہیں بتائے گا۔"

پرنس بخت نے اثبات میں سر ہلایا۔ دو ملازم انچارج سمیت آگے بڑھے اور انہوں نے الٹے لٹکے نوروز کو چھت سے اتار لیا۔ انہوں نے نائیلون کی موٹی رسی اس کی ٹانگوں سے کھول کر اس کے ہاتھوں میں باندھی تو ایک دم جیسے کوئی بات نوروز کی سمجھ میں آئی اور اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ اتنے زور سے تڑپا مچلا کہ گارڈز کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بہرحال ایک دو منٹ میں ہی انہوں نے اسے دوبارہ چھت سے لٹکا دیا مگر اس مرتبہ اسے سیدھا لٹکایا گیا تھا۔

نوروز بلتی زبان میں فریاد کناں ہوا۔ "خدا کے لیے نہیں..... خدا رسول کے لیے نہیں....."

"تو پھر بتاؤ، کہاں ہے اندرانا بیگم اور کہاں ہے تمہاری وہ منہ بولی بیوی حاجن رانی؟" پرنس بخت نے مستحکم آواز میں پوچھا۔

"ہم..... مجھے کچھ پتا نہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وہ بلک کر بولا۔

پرنس نے آنکھوں سے انچارج کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ مل کر نوروز کی شلوار کے دونوں پائنچوں کو ڈوریوں کے ذریعے باندھ دیا۔ تب ایک شخص ہاتھ میں ایک چھوٹا پنجرہ لیے برآمد ہوا۔ اس میں بالکل برف کی طرح سفید رنگ کے تین موٹے تازے چوہے تھے۔ ان کی آنکھیں نارنجی رنگ کی تھیں اور وہ بار بار جارحانہ انداز میں اپنے دانت نکوسنے لگتے تھے۔ طالب شاہ کے دونوں ماتحتوں نے تڑپتے پھڑکتے نوروز کی دونوں ٹانگوں کو گھٹنوں کے پاس سے جکڑ لیا اور طالب شاہ نے نوروز کا ازار بند کھول کر تینوں چوہے اندر چھوڑ دیے۔ چند ہی لمحوں میں نوروز کی آہ و بکا فلک شگاف ہو گئی۔ وہ ایسے پھڑک رہا تھا جیسے وحشت میں خود ہی اپنے جسم کے حصے بخرے کر لے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی سفید شلوار پر سرخ داغ نمودار ہونے لگے۔ اب صرف نوروز ہی نہیں اس کی شلوار بھی پھڑک رہی تھی۔ ایک منٹ کے اندر اندر نوروز کی ہمت جواب دے گئی۔

وہ گلے پر چھری پھرنے والے بکرے کی طرح چلایا۔ "میں مر جاؤں گا۔ میں بتاتا ہوں۔" انچارج طالب کے دونوں ماتحتوں نے ہاتھوں پر خاص قسم کے دستانے پہن لیے تھے جیسے انہیں پہلے سے معلوم ہو کہ نوروز ہتھیار ڈالنے والا ہے۔

اس کی شلوار کے اندر سے چوہوں کو دبوچ کر باہر نکالا گیا اور پنجرے میں بند کر دیا۔ تاہم نوروز کو اسی طرح لٹکا رہنے دیا گیا۔

نوروز نے کربناک لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے تصدیق ہوئی کہ اندرانا اس کی بیٹی زرش اور ملازمہ رانی میں سے کوئی بھی بالاٹ نہیں گیا۔ وہ تینوں ذخیرے کی آبادی سے قریباً تین کلومیٹر آگے "گڑھی" نامی ایک مختصر سی بستی میں موجود تھیں۔ یہ بستی مشکل سے ڈیڑھ دو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک طرح سے یہ دونوں متحارب بستیوں یعنی ذخیرے اور بالاٹ کے قریباً درمیان واقع تھی۔ وہاں نوروز کے ایک ماموں کا آبائی گھر کافی عرصے سے خالی پڑا تھا۔ اندرانا بیگم اور زرش اپنے گھر سے نکلنے کے بعد بڑی رازداری کے ساتھ وہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اب ملازمہ رانی بھی وہیں پدھاری تھی۔ خاقان ولا میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اندرانا اور زرش، ولا سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چار دیواری میں موجود ہیں۔ پرنس بخت اور اس کے ساتھیوں کا شک کسی بھی طرح نوروز جیسے وفادار ملازم پر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا تھا صرف ماہین کی وجہ سے ہو پایا تھا۔ اس کے کیے ہوئے انکشاف نے سارے پول کھول دیے تھے۔

نوروز سے معلومات حاصل ہونے کے بعد وقت ضائع کرنا بے وقوفی ہی ہوتی۔ فی الفور تین گاڑیاں گڑھی نامی بستی میں جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ عمران کے اصرار پر میں بھی اس کے ساتھ پرنس والی لینڈ روور جیپ میں سوار ہو گیا۔ میں اب چلنے پھرنے کے لائق ہو چکا تھا۔ پختہ اور نیم پختہ راستے پر سفر کر کے گاڑیاں صرف بیس منٹ میں گڑھی نام کی اس برف پوش بستی میں پہنچ گئیں۔ یہاں ڈیزل سے چلنے والے چند آرے لگے ہوئے تھے..... جو اب ویران پڑے تھے۔ موسم گرما میں جنگل کی کٹائی سے حاصل ہونے والی لکڑی کو یہاں مزید کاٹا جاتا تھا۔ بستی کے لوگ پرنس اور اس کے مسلح گارڈز کو دیکھ کر جہاں بہت مؤدب نظر آئے وہاں اس اچانک آمد پر کچھ حیران بھی دکھائی دیے۔ زخمی نوروز کی نشاندہی پر طالب شاہ کی معیت میں مسلح گارڈز تیزی سے اس گھر میں داخل ہوئے جہاں تینوں خواتین موجود تھیں۔ نوروز کے ماموں کا یہ پتھریلا گھر کافی کشادہ تھا اور تین اطراف سے برف پوش چٹانوں میں گھرا ہوا تھا۔ پرنس بخت اور اس کا کزن عمر دراز بھی گاڑی سے اتر کر گھر میں داخل ہو گئے۔ تاہم دو منٹ بعد ہی انچارج طالب کا

ہوا چہرہ دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''کیا ہوا طالب شاہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''گھر خالی پڑا ہے۔ لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے اندرانا بیگم سمیت تینوں عورتیں یہاں سے نکل گئی ہیں۔'' انچارج نے انکشاف کیا۔

چند سیکنڈ بعد پرنس بخت بھی جیپوں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک باتحمل شخص تھا مگر اس وقت اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کے غم و غصے کا منبع اس کی سابق ساس ہی تھی۔ اس کی کینہ پروری کی وجہ سے دردانا خانم کی جان گئی تھی اور دروا بیگم کی بیٹی شازینہ زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔

پرنس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تابش صاحب! ہم ان کے پیچھے جا رہے ہیں۔ آگے راستہ زیادہ مشکل ہے صرف دو جیپیں ہی جا سکیں گی..... ویسے بھی ابھی آپ پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں، آپ یہیں رہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے رکتا دیکھ کر عمران بھی یہیں رک گیا۔ دو گاڑیاں اچھلتی کودتی۔ بالاٹ جانے والے راستے پر ہو لیں۔ غالب امکان یہی تھا کہ اندرانا، زرش اور ملازمہ بالاٹ کی طرف ہی گئی ہیں۔ وہاں پرنس کا دشمن اول شنگرے خاناں انہیں پناہ دے سکتا تھا۔ زخمی نوروز، پرنس کے ساتھ ہی روانہ ہوا۔ پرنس کے پانچ چھ مسلح محافظ بھی یہیں ہمارے ساتھ رک گئے تھے۔ میں اور عمران گھر کے اندر پہنچے۔ نوروز کا ماموں کھاتا پیتا شخص لگتا تھا۔ کسی وقت یہ گھر کافی آرام دہ رہا ہوگا لیکن اب ہر طرف ویرانی ہی تھی۔ اس گھر میں ایک تہ خانہ بھی تھا۔ ہم چند زینے اتر کر تہ خانے میں پہنچے تو یہ نیم گرم محسوس ہوا۔ ایک بڑی انگیٹھی کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تک اس میں آگ روشن رہی ہے۔ تہ خانے میں کھانا پکانے کا انتظام بھی تھا۔ نوروز نے یہاں دو تین ہفتوں کا راشن بھی ڈال دیا تھا جس میں خشک گوشت اور خشک دودھ بھی نظر آ رہا تھا۔ دو آرام دہ بستر تھے۔ ملازمہ رانی غالباً فرش پر بچھے گدے پر سوتی رہی تھی۔ تہ خانے میں مختلف اشیا اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ''لگتا تو یہی ہے کہ اس منحوس اندرانا کو کسی طرح نوروز کے پکڑے جانے کی خبر مل گئی اور وہ بیٹی اور ملازمہ کے ساتھ منہ اندھیرے یہاں سے نکل بھاگی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر اندرانا نے شنگرے خاناں کے پاس ہی پناہ لینا تھی تو پہلے کیوں نہ لے لی۔ یہاں کیوں چھپی رہی۔''

''ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے پکڑے جانے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ یہ تو ماہین کی ریکارڈنگ کی وجہ سے ان کی پلاننگ برہم پتر ہوئی۔''

''برہم پتر نہیں، درہم برہم۔'' میں نے تصحیح کی۔

''لیکن میں نے تو فیروز ال اغلاط میں یہی پڑھا تھا کہ پلاننگ برہم پتر ہوتی ہے۔''

''تم جان بوجھ کر اپنی گفتگو میں مشکل لفظ لاتے ہو اور جان بوجھ کر ہی انہیں غلط بھی بولتے ہو۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا اور ذرا دم لینے کے لیے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

میری نقاہت دیکھتے ہوئے اس نے اس لایعنی بحث کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر بولا۔ ''ویسے جناب! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خاقان ولا سے نکلنے کے بعد اندرانا نے بالاٹ میں پناہ لینے کا سوچا ہو مگر وہاں شنگرے خاناں وغیرہ نے انکار کر دیا ہو۔ انہوں نے سوچا ہو کہ دشمنی اور بھڑک جائے گی۔''

''ہاں یہ بھی خارج از امکان نہیں ہے۔''

''دیکھیں چاچو! مشکل لفظ تو آپ بھی بولتے ہیں..... لیکن کچھ بھی ہے میں اب آپ کی بات کو ملفوف خاطر (ملحوظ خاطر) رکھوں گا۔''

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ میرا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بیماری نے ابھی پوری طرح مجھے اپنے جبڑوں سے نہیں نکالا تھا۔ خاقان ولا سے یہاں تک آنے کی معمولی مشقت نے ہی تھکا دیا تھا۔

پرنس کے جو گارڈز یہاں رہ گئے تھے ان میں سے دو اوپر صحن میں موجود تھے۔ باقی تین چار گھر کے سامنے پہرا دے رہے تھے اور بستی کے لوگوں کو دروازے سے دور رکھے ہوئے تھے جو اپنے تجسس کی وجہ سے قریب آنا چاہتے تھے۔

سینے میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ عمران نے میری طبیعت دیکھتے ہوئے مجھے بستر پر نیم دراز ہونے پر مجبور کر دیا۔ جب میں بستر پر نیم دراز ہوا تو مجھے تہ خانے کی چھت کے قریب واقع مستطیل روشن دان کے باہر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ روشن دان پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ شیشے کے اس پار اونچے نیچے برف پوش پتھر تھے اور کچھ ٹنڈ منڈ پودے دکھائی دیتے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ان پتھروں اور پودوں کے بیچ کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور

وہ جو کوئی بھی ہے جانور نہیں ہے۔ یوں لگا جیسے وہاں کوئی دبکا ہوا ہے۔

میں نے عمران کو یہ بات بتائی..... پھر ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر مکان کے عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ عمران نے لوہے کا عقبی دروازہ کھولا تو ایک گارڈ بھی بھاگا ہوا آ گیا۔ ''کیا ہوا صاحب جی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں احتیاط سے باہر نکلے۔ مطلع ابر آلود تھا اور کچھ دھند بھی محسوس ہوتی تھی۔ ٹنڈ منڈ پودوں اور اونچے نیچے پتھروں میں ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ اچانک عمران بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے ایک بڑے پتھر کے پیچھے کسی کو دبوچ لیا۔ ایک تیز نسوانی آواز ابھری۔ وہ جو کوئی بھی تھی خود کو عمران سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم بھی پہنچ گئے۔ میں بھی عمران ہی کی طرح ششدر رہ گیا۔ عمران نے بکھرے بالوں والی جس خوب صورت لڑکی کو پکڑ رکھا تھا، وہ کوئی اور نہیں پرنس کی سابق بیوی اور اندرانا کی بیٹی زرش جہاں تھی۔ وہ ابھی تک اسی قیمتی لباس میں تھی جس میں چند روز پہلے خاقان ولا سے گئی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر طمانچوں کے گہرے نشان نظر آئے جو غالباً ایک آدھ دن پہلے کے تھے۔ نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ وہ کچھ بتا کر نہیں دے رہی تھی۔ بس روتی جا رہی تھی۔ کبھی اپنی قبائلی زبان بول رہی تھی، کبھی شکستہ اردو میں واویلا کرنے لگتی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو..... میں مر جانا چاہتی ہوں.....''

اسی دوران میں پرنس بخت اور اس کے ساتھی بھی اندرانا بیگم کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس آ گئے۔ پرنس نے زرش جہاں کو ہمارے ساتھ خستہ حالت میں دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ دیگر لوگوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ زرش اپنی ماں کے ساتھ ہی یہاں سے نکل گئی ہے۔

میں نے ساری بات پرنس کے گوش گزار کی۔ پرنس نے ابھی تک زرش کو مخاطب نہیں کیا تھا، وہ بھی بے رخی سے منہ پھیرے بیٹھی تھی۔ پرنس نے کمرے سے باہر آ کر مجھ سے کہا۔ ''آپ اس سے پوچھیں کہ یہ یہاں کیسے پائی جا رہی ہے؟ اور اسے مارا پیٹا کس نے ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی یہ کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ولا میں چلتے ہیں۔ اسے کچھ پُرسکون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔'' پرنس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

جب میں نے اور عمران نے اسے خاقان ولا میں چلنے کا کہا تو وہ اڑ گئی، بولی۔ ''میں اب اس چار دیواری میں نہیں جاؤں گی۔ میرا اور پرنس بخت آور کا اب کوئی رشتہ نہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''تو پھر اب کہاں جاؤ گی؟''

وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ آ کوشش بسیار کے بعد وہ اس حد تک تیار ہو گئی کہ خاقان ولا کے مہمان خانے تک چلی جائے گی..... مگر پرنس یا اس کی فیملی کے کسی رکن کا سامنا ہرگز نہیں کرے گی۔

☆☆☆

پرنس بہت غصے میں تھا۔ اسے زرش جہاں کا خاقان ولا میں آنا بالکل پسند نہیں آیا تھا مگر وہ خاموش اس لیے تھا کہ خود بھی الجھن میں تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں جا سکی اور اسے مارا پیٹا کس نے ہے؟

شام سے کچھ ہی پہلے پرنس نے مہمان خانے میں مجھے پیغام بھیجا کہ اگر میں آ سکتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس نشست گاہ میں آ جاؤں۔ زرش جہاں اس وقت مہمان خانے کے کامن روم میں ماہین کے ساتھ تھی اور ماہین اسے نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نشست گاہ میں پہنچا تو پرنس وہاں اکیلا تھا اور کمر پر ہاتھ باندھے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

بند نشست گاہ کی تنہائی میں میرے اور پرنس کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ نہایت سنگین تھی اور انکشاف انگیز بھی۔ تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد پرنس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تابش صاحب چند دن کی رفاقت ہے لیکن میں آپ کی بہت قدر کرنے لگا ہوں۔ یقیناً یہ سوال آپ کے ذہن میں بھی شدت سے ابھرتا ہوگا کہ خاقان ولا کو ایک بڑی خوشی ملنے کے بعد آناً فاناً میرے اور زرش جہاں کے درمیان علیحدگی اور طلاق کیسے ہو گئی۔ میں جانتا ہوں اس کے پیچھے جو حقیقت ہے وہ زیادہ دیر چھپی نہیں رہے گی بلکہ..... میرا اندازہ ہے کہ بہت سے لوگ اس بات کی تہ تک پہنچ بھی چکے ہیں۔ لہٰذا میں بھی اسے مزید چھپانا ضروری نہیں سمجھتا۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ہمارے رشتے کے خاتمے کی وجہ زرش کی بدکرداری ہے..... اس کے بطن میں جو بچہ ہے، وہ میرا نہیں ہے۔''

مجھے سب معلوم تھا لیکن اس موقع پر میں نے حیرت ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔

پرنس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''گناہ گار تو وہی ہوتا ہے جو گناہ کرتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے زرش کی ماں کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ وہ اپنے عناد اور بغض میں ہر حد تک جانے والی عورت ہے۔ اس نے ایک عرصے سے شازینہ اور اس کی والدہ کے لیے خدا واسطے کا بیر پالا ہوا تھا۔ ہر صورت انہیں نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ یہ جو بھی شرمناک صورتِ حال پیدا ہوئی اسی عورت کی رذیل خواہش کے سبب ہوئی۔ اس کے بعد وردا خانم کی جان بھی اسی خواہش کی بھینٹ چڑھی۔''

پرنس نے جو کچھ بتایا وہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ جو معلوم نہیں تھا وہ یہ تھا کہ زرش جہاں کا بھید آخر کس نے کھولا۔ میرے پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کا جواب پرنس نے خود ہی دے دیا اور یہ جواب اتنا حیران کن تھا کہ میں چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔ پرنس کی گفتگو سے انکشاف ہوا کہ اپنے گناہ کے بارے میں زرش نے خود پرنس کو بتا دیا۔ آنسوؤں کے سیلاب کے دوران میں اسے مطلع کر دیا کہ وہ جس بچے کے لیے آسیں امیدیں پال رہا ہے اور خوشی منا رہا ہے وہ اس کا بچہ نہیں ہے۔ یہ تھا تو بہت تکلیف، ہمت اور بے باکی والا اعتراف..... لیکن زرش کسی نہ کسی طور یہ کر گزری تھی۔ (اس نے شوہر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ کس کا بچہ ہے) اس نہایت سنگین گناہ کے بارے میں جاننے کے بعد پرنس کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ زرش اور اس کی ماں کو چند لمحوں کے لیے بھی اپنے گھر میں برداشت کر سکے۔ اس نے نہایت غم و غصے کے عالم میں انہیں نکل جانے کا کہا تھا۔

پرنس کی گفتگو دکھ آمیز اور نہایت بوجھل کیفیت کی حامل تھی۔ کچھ دیر تک نشست گاہ میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر پرنس نے کہا۔ ''میں اس عورت کو ایک منٹ کے لیے بھی اپنی چھت کے نیچے برداشت نہیں کر سکتا لیکن میں اتنا ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ یہ یہاں کیوں ہے۔ اپنی حرافہ ماں کے ساتھ بالاٹ کیوں نہیں پہنچی؟''

میں نے ذرا چونک کر پرنس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ زرش کی ماں بالاٹ پہنچ چکی ہے؟''

''ہاں۔'' پرنس نے پُرتپش انداز میں کہا۔ ''وہاں ہمارے انفارمر نے تصدیق کی ہے۔ وہ نمک حرام حاجن رانی بھی اس کے ساتھ ہے۔ شکرے خاناں ان کو پناہ دے کر بڑا مہنگا سودا کر رہا ہے۔ اس کو قیمت ادا کرنا پڑے گی۔'' پرنس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عنقریب ان برف پوش بلندیوں پر کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔

☆☆☆

میں مہمان خانے میں واپس پہنچا تو ماہین مسلسل زرش سے مصروفِ گفتگو تھی۔ ماہین میں یہ خوبی تھی کہ وہ ہر کسی کے ساتھ اس کے مزاج اور اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق گفتگو کر لیتی تھی۔ ان دونوں کی اجازت سے میں بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی سے ماہین اور زرش کی باہمی کیمسٹری متاثر ہوتی ہے تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ماہین اچھی کارکردگی دکھا رہی تھی۔

رات آٹھ بجے کے قریب ماہین نے زرش کو تھوڑا سا کھانا کھلانے کے بعد سکون بخش دوا دی، وہ سو گئی تو ماہین میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس اہم نیوز ہیں۔

اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''انکل تابش! یہ اسٹوری تو ڈرامائی ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا یہ اندازہ درست نکلا ہے کہ زرش جان بوجھ کر اپنی والدہ کے ساتھ بالاٹ نہیں گئی۔ دراصل اندرانا اپنی خباثت میں اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ ماں بیٹی کے رشتے کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ طلاق کے بعد اندرانا کا رویہ اپنی بیٹی سے بہت بُرا ہو چکا ہے۔ وہ اسے مارنے پیٹنے سے بھی نہیں چوکتی۔ پہلے خود ہی اس کو غلط راہ پر لگایا اب دن رات اسے کوستی ہے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ماہین، اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔ شاید زرش نے وہ تمہیں نہیں بتائی۔ ظاہر ہے کہ بتا بھی نہیں سکتی۔''

ماہین سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس پر انکشاف کیا کہ اپنی غلط روی اور گناہ کے بارے میں پرنس کو آگاہ کرنے والی زرش خود ہی ہے۔

ماہین کے لیے بھی یہ ایک زبردست بریکنگ نیوز ثابت ہوئی۔ اب بیٹی کے ساتھ اندرانا بیگم کے درشت رویے کی وجہ ماہین کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ بیٹی نے اپنے اندرونی خلفشار سے مجبور ہو کر ماں کا بنا بنایا کھیل تباہ کر کے رکھ دیا تھا..... اور طلاق لے کر عرش سے فرش پر آن بیٹھی تھی۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''اندرانا بیگم نے حاجن رانی کے ذریعے وردا خانم اور شازینہ کو جو زہر دیا اس کے متعلق زرش نے کچھ بتایا؟''

''نہیں انکل! اس سلسلے میں تو وہ میری توقع کے

مطابق بالکل خاموش رہی ہے۔ ہاں اس نے اتنا ضرور کہا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی من مانیوں سے عاجز آ چکی ہے۔ اب اس کی والدہ اسے اپنے ساتھ شنگرے خاناں کے ولا میں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ شنگرے خاناں اور اس کے سنگی ساتھی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ وہاں ہر مہینے دو مہینے بعد کوئی میلا ہوتا ہے جس میں شراب پی جاتی ہے اور رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ زرش کو وہاں جانے سے خوف آ رہا تھا اور اندرانا اس کو ہر صورت لے جانا چاہ رہی تھی۔ عین موقع پر زرش کو تہ خانے سے نکلنے اور قریبی جھاڑیوں میں چھپنے کا چانس مل گیا۔ اس کی والدہ کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ تادیر زرش کو تلاش کر سکے..... (اسے اطلاع مل چکی تھی کہ نوروز پکڑا گیا ہے اور خاقان ولا میں اس کی چمڑی ادھیڑی جا رہی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کسی بھی وقت پرنس اور اس کے گارڈز وہاں پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا بہ حالت شدید مجبوری وہ ملازمہ حاجن کو لے کر وہاں سے نکل گئی۔"

"اب وہ کیا چاہ رہی ہے؟" میں نے اپنے زخمی بازو کو دباتے ہوئے پوچھا۔

ماہین عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ذرا جھجک کر بولی۔ "انکل تابش! آپ فواد کو دیکھتے رہے ہیں اور بتاتے رہے ہیں کہ وہ زرش کی محبت میں شاید بُری طرح گرفتار ہو چکا ہے..... یہاں زرش کی طرف بھی میں نے کچھ ملتی جلتی بات ہی محسوس کی ہے۔ وہ کھل کر تو کچھ نہیں کہتی مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ فواد کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ وہ ملازمت سے فارغ ہو کر لاہور جا چکا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہم بھی لاہور سے ہیں تو وہ بار بار مجھ سے لاہور کے بارے میں پوچھنے لگی..... وہ کتنی دور ہے..... وہاں کیسے جایا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ اس کے اندر اس حوالے سے کچھ شدید چل رہا ہے۔"

یہ ساری صورت حال حیران کن اور سبق آموز تھی۔ ایک انا پرست عورت نے کسی کو نیچا دکھانے کے لیے ایک سازش بُنی اور خود اس کی خوب صورت بیٹی اس سازش کے تانے بانے میں پھنس گئی۔ وہ نہ صرف عالیشان خاقان ولا سے محروم ہوئی بلکہ اب وہ ایک عام سے اسکول وین ڈرائیور کے پیچھے اس کے شہر لاہور میں جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے جسم کو اور جسم میں پلنے والے بچے کو اس شخص سے منسوب سمجھنے لگی تھی۔ یہ کتنی بڑی سزا تھی اس انا پرست، ملتہم المزاج عورت کے لیے جس کو اندرانا بیگم کہا جاتا تھا۔

☆☆☆

خاقان ولا میں کشیدگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی چہروں پر غم و غصہ بھی نظر آتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ شنگرے خاناں نے بالاٹ میں اس عورت کو پناہ دی تھی جس نے یہاں وردا بیگم کو قتل کرایا تھا اور جواں سال شازینہ کو نازک حالت میں بستر پر ڈال دیا تھا۔ دوسری وجہ کے لیے الٹا چور کوتوال کو..... والا محاورہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بالاٹ والوں کی طرف سے الزام لگایا گیا تھا کہ اندرانا بیگم کی بیٹی کو طلاق دینے کے بعد پرنس بخت نے زبردستی اپنے پاس روکا ہوا ہے، بلکہ حبسِ بیجا میں رکھا ہوا ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ شاید ایک آدھ دن میں یہاں کوئی تصادم ہو جائے گا۔ بہرحال یہاں کی "پنچایت ٹائپ باڈی" بھی متحرک تھی جس میں دونوں بستیوں کے معززین شامل تھے۔

آج میں نے جو تھوڑی بہت چلت پھرت کی تھی اس نے مجھے بہت تھکا دیا تھا..... رات کو پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ میں قہوہ پی کر لیٹ گیا۔ کچھ سکون محسوس ہوا۔ بس پیٹ پر ناف کے پاس جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے یونہی سویٹر اٹھا کر دیکھا اور دل دھک سے رہ گیا۔ پیٹ کے زیریں حصے پر وہی سرخ داغ نظر آ رہے تھے جن کے خطرے سے چند روز پہلے ڈاکٹر عظیم نے آگاہ کیا تھا۔

"اوہ خدایا۔" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور روشنی کی طرف رخ کر کے دھیان سے دیکھنے لگا۔ قریباً دس انچ مربع جگہ پر یہ نشانات غیر معمولی تھے اور میرے لیے شدید خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے سویٹر نیچے گرا دیا اور سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ "آ جاؤ۔" میں نے کہا۔

عمران ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا اسمارٹ فون تھا۔ "یہ دیکھیے چاچو..... نوروز کا کارنامہ۔" اس نے موبائل کی اسکرین میرے سامنے کی۔

بڑے کرنسی نوٹوں کی تین گڈیاں اور سونے کے چار بسکٹ نظر آ رہے تھے۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ وہ رشوت کا مال ہے جناب جو نوروز خاں سے برآمد ہوا ہے اور جو اندرانا بیگم نے اسے اور ملازمہ رانی کو دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے کپڑوں میں پھر برفانی

چوہے چھوڑنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس نے یہ سب کچھ برآمد کرایا۔"

"مجھے تو لگتا ہے عمران کہ یہ بندہ ضرور بالا اٹ والوں کے لیے مخبری بھی کرتا ہوگا۔"

"پچاس فیصد تک یہ بات بھی مان رہا ہے جی۔ بہت کائیاں شخص ہے۔ اب یہ زہر والی سازش ہی دیکھیں کتنی ہوشیاری سے تیار کی گئی۔ پہلے سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق حاجن رانی نے شازمینہ پر گرم کافی گرائی اور پرس سے تھپڑ کھایا۔ پھر اس واقعے کو تفتیش کا رخ غلط سمت میں موڑنے کے لیے استعمال کیا گیا..... یہ تو بھلا ہو جی آپ کی بھتیجی کا جس نے نوروز اور رانی کی گفتگو پکڑی، ورنہ کسی کا دھیان ہی نہیں جانا تھا اندرانا بیگم کی طرف، اب نوروز اس سارے منصوبے کا اعتراف کر رہا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں عمران کی باتیں تو سُن رہا تھا مگر دھیان اسی سنگین معاملے کی طرف تھا جو ابھی ابھی مجھ پر آشکار ہوا تھا..... میرے پیٹ کے سرخ داغ۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور میرے اندر کی اتھل پتھل کچھ اور بڑھ گئی۔ ماہین اپنے خوب صورت بالوں کو لہراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور عمران کو میرے پاس دیکھ کر ذرا جھجک گئی۔ ماہین کے ہاتھوں میں بڑی پلیٹ کے اندر ایک خوش رنگ کیک تھا جو اس نے خود کچن میں تیار کیا تھا۔ کیک کے ساتھ ایک شمع بھی روشن تھی۔

"یہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی صحت یابی کی خوشی میں۔ چھوٹا سا کیک چھوٹی سی تقریب۔" وہ اٹھلائی۔

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ جب آپ کے پیارے آپ کو صحت مند سمجھ رہے ہوں اور آپ صحت مند نہ ہوں، اندر سے کسی بیماری میں جکڑے ہوئے ہوں تو چہرے پر خوشی کے تاثرات سجانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال ماہین نے کیک کاٹا۔ تھوڑا سا مجھے کھلایا، تھوڑا سا عمران کی طرف بڑھایا۔ بہرحال وہ دونوں ایک دوسرے سے کھچے ہوئے تھے۔ کوئی بہت ضروری بات ہی ہوتی تو کرتے تھے۔ ماہین تو خاص طور سے عمران سے کنی کترا رہی تھی۔

کیک وغیرہ کٹ گیا۔ مجھے اپ سیٹ دیکھ کر وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں بیٹھے۔ پہلے ماہین ہی گئی۔ اسے ویسے بھی زرش کے پاس پہنچنا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کبھی دل چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر عظیم کو بلاؤں اور اسے اس پُراندیش صورتِ حال سے آگاہ کروں، کبھی سوچتا تھا کہ فی الحال خاموش رہوں۔

رات جیسے تیسے گزری۔ اگلے روز دیکھا، نشان اوپر کی طرف مزید پھیل گئے تھے اور رنگ بھی نسبتاً گہرا ہو گیا تھا۔ متاثرہ حصے میں جلن بھی شدید تھی۔ میں اٹھ کر کمرے کے اندر ہی ٹہلتا رہا، پھر ایک شال لپیٹ کر باہر آ گیا۔ سردی گرمی مجھ پر زیادہ اثر نہیں کرتی تھی مگر چونکہ آج کل بیماری کے زیرِ اثر تھا اس لیے احتیاط کر رہا تھا۔ دسمبر کی آخری تاریخوں کا سورج دھند کی چادر کے اندر سے جھلک دکھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ لان کی دوسری جانب ایک برآمدے میں غنچہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ لان کی طرف ہی آ رہی تھی مگر مجھے دیکھ کر اس نے ایک دم رخ بدلا اور غڑاپ سے ایک راہداری میں اوجھل ہو گئی۔ باتھ روم سے نکل بھاگنے والے واقعے کے بعد سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ عمران کی حکمتِ عملی نے غنچہ پر سے "طوفانی محبت" کا بخار اتارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

میں برآمدے میں رکھی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ صبح کی ان اولین گھڑیوں میں خاقان ولا میں خاموشی محسوس ہوتی تھی مگر یہ خاموشی کسی بڑی ہلچل کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ مہمان خانے کے ایک ٹیرس کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں کمرے کے سامنے کوئی بیٹھا تھا۔ اس نے ہلکا گلابی لباس پہن رکھا تھا اور اداسی بھرے انداز میں اپنا سر ستون کے ساتھ ٹکایا ہوا تھا۔ یہ کوئی اور نہیں زرش جہاں ہی تھی۔ وہ ایسے زاویے سے بیٹھی تھی کہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال کرسی سے نیچے لٹک کر فرش کو چھوتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کسی پینٹنگ کی طرح نظر آتی تھی۔ شاید ماہین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو آگ فواد کے سینے میں بھڑک رہی ہے، اس کی بہت سی چنگاریاں اڑ کر زرش کے سینے میں بھی پہنچ چکی ہیں۔ وہ خود کو اس شخص سے منسلک سمجھنے لگی ہے جس کے ساتھ اس نے پُرحرارت قربت کی کچھ راتیں بسر کی ہیں اور جس کی نشانی اب اس کے جسم میں ہے۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ یہاں خاقان ولا میں جس کی جدائی کو بری طرح محسوس کر رہی ہے، وہ یہاں سے فقط دو کلو میٹر کی دوری پر شانم بستی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں موجود ہے۔

اسی دوران میں ہلکی سبز وردیوں والے چند گارڈز آئے اور زنان خانے کی طرف جانے والا راستہ بلاک کر دیا۔ انچارج گارڈ طالب شاہ نے وہ بڑا گیٹ بھی بند کر دیا جو زنان خانے یعنی رہائشی حصے کو باقی عمارت سے جدا کرتا

تھا۔ یہ صورتِ حال کچھ چولکا دینے والی تھی۔ اسی دوران میں مجھے ماہین زنان خانے کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ وہ ہر صبح سب سے پہلا کام یہی کرتی تھی کہ شازینہ کی عیادت کو جاتی تھی۔ شازینہ کی حالت زہر خورانی کے بعد ابھی تک سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ وہ زیادہ تر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں رہتی تھی۔ اسے ابھی تک اس کی پیاری والدہ کی موت کی خبر نہیں دی گئی تھی۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''یہاں یہ اضافی سیکیورٹی کیوں نظر آرہی ہے؟''

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے بالکل قریب لے آئی۔ ''انکل! ولا میں یہ خبر گردش کررہی ہے کہ اندرانا کی خباثت کا سلسلہ رکنے میں نہیں آرہا۔ اس نے کسی شخص کو بہت زیادہ بھاری رشوت اس بات کے لیے دی ہے کہ وہ کسی بھی طرح بیمار پڑی شازینہ کو اس کی والدہ کے پاس پہنچا دے۔ دوسرے لفظوں میں شازینہ کو جان کا شدید خطرہ ہے اور یہ ساری سیکیورٹی پرنس کے حکم پر اسی کے لیے ہے، زنان خانے میں موجود تمام سرونٹس کو بھی تبدیل کردیا گیا ہے..... کچھ اور اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔''

''اس خطرے کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کہا یہی جارہا ہے کہ یہ اطلاع بڑے باوثوق ذرائع سے ملی ہے مگر شازینہ پر یہ حملہ کیسے اور کس ذریعے سے ہوگا یہ ابھی واضح نہیں ہے۔''

لگتا یہی تھا کہ اندرانا کے پاس نقدی اور سونے کی شکل میں کافی سرمایہ موجود ہے۔ وہ اس کے بل بوتے پر اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل چاہ رہی ہے۔ خاجن رانی اور نوروز خان کو بھی اسی طرح دولت کی چمک سے اندھا کیا گیا تھا۔ نوروز کے پاس سے سونے کے چار بسکٹ ملے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ہر بسکٹ کا وزن سو گرام تھا اور ان کی ٹوٹل قیمت لگ بھگ سولہ لاکھ تھی۔

وہ بڑا تناؤ بھرا دن تھا..... ایک تو میرے پیٹ پر نمودار ہونے والے سرخ نشان تھے جن کے متعلق میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا۔ دوسری وجہ وہ ٹین شین تھی جو ہر پل پرنس بخت اور شنگرے خاناں کے درمیان بڑھ رہی تھی۔ وہی کچھ ہورہا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ پرنس کا کہنا تھا کہ اندرانا اور ملازمہ رانی ان کی مجرم ہیں، انہیں فوراً حوالے کیا جائے۔ دوسری طرف شنگرے خاناں کہہ رہا تھا کہ اندرانا بیگم کی بیٹی کو زبردستی خاقان ولا میں رکھا گیا ہے، اسے چھوڑا جائے۔

پرنس نے مجھ سے جس کام کا کہا تھا وہ ماہین نے کردیا تھا۔ یعنی ہمیں معلوم ہوچکا تھا کہ زرش جہاں اپنی ماں کے ساتھ بالاٹ کیوں نہیں گئی اور ماں کا سلوک اس کے ساتھ کیا رخ اختیار کرچکا ہے۔ سہ پہر کو میں نے نشست گاہ میں جاکر پرنس کو یہ ساری بات بتائی۔ جس وقت ہم دونوں میں یہ گفتگو ہورہی تھی، وہ کچھ ہوگیا جس کا اندیشہ صبح سے محسوس کیا جارہا تھا۔ انچارج طالب شاہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چوڑے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے سیلیوٹ کرنے والا انداز اختیار کیا اور بولا۔ ''پرنس! ہم پر حملہ ہوا ہے، بالاٹ والوں نے ہم پر فائرنگ کی ہے۔ آپ کے پھوپی زاد جناب عمر دراز زخمی ہوئے ہیں۔ ہمارے دو بندے موقع پر شہید ہوگئے ہیں۔''

پرنس کسی تند بگولے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر جیسے بجلیاں سی کوند گئی تھیں۔ اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی اپنی سیون ایم ایم رائفل اتاری۔ گولیوں والا بیگ کندھے سے لٹکایا اور طالب شاہ کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے پرنس کے چچا سلمان صاحب کی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ پرنس کو تحمل اور ہوش مندی کا مشورہ دے رہے تھے۔

میں بھی نشست گاہ سے نکل آیا۔ خاقان ولا کی کھڑکیوں میں خواتین خانہ کے ہراساں چہرے نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور عمران دیکھ رہے تھے کہ مسلح گارڈز سے کھچا کھچ بھری ہوئی قریباً چھ جیپیں مین گیٹ سے نکل رہی ہیں۔ کچھ مزید گاڑیاں بھی حرکت میں آرہی تھیں۔ دور شمال مشرق کی طرف بلندی پر فائرنگ کی مدھم آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ یہ دو بستیوں میں نہیں بلکہ دو قبیلوں میں دو بدو لڑائی کا ماحول بن گیا تھا۔ بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی برف پوش بلندیوں پر سارا دن فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں۔ دونوں طرف سے کئی طرح کے چھوٹے ہتھیار استعمال کیے جارہے تھے۔

شام کو عمران نے مجھے خبر دی۔ ''پرنس کا زخمی ہونے والا پھوپی زاد جانبر نہیں ہوسکا۔ معاملہ اور سنگین ہوگیا ہے۔ ایک لاش اور دو تین زخمی بھی اوپر سے لائے گئے ہیں۔ دونوں طرف کے گن مینوں نے آمنے سامنے پوزیشن لے رکھی ہے۔''

''پرنس کہاں ہے؟''

''وہ بھی لڑائی والی جگہ پر ہی ہے۔ میں اس سے مل کر آیا ہوں۔ بالاٹ والے بلندی پر ہیں اس لیے ان کا پلا کچھ

بھاری نظر آتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کے کم از کم ڈیڑھ سو بندے میدان میں ہیں۔"

"اور پرنس کی نفری؟"

"یہ بھی سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ انہوں نے بڑی دلیری سے وہ راستہ روکا ہوا ہے جو لشکر سے اور اس کے ساتھیوں کو ذخیرے کی طرف لا سکتا ہے۔ شاید بالاٹ والے اس ہلے میں متنازعہ پہاڑی پر بھی قبضہ جمانا چاہتے ہیں..... بہرحال ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی چاچو..... کیا یہاں قانون کی عملداری نہیں ہے؟"

"عمل داری تو ضرور ہوگی لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو اس موسم میں یہ علاقہ ازدگرد سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ اب کیا قانون اور کیسی عملداری؟ اب تو ان لوگوں کو... خود ہی فیصلہ کرنا ہے۔"

"اور وہ جرگہ، پنچایت وغیرہ؟"

"ہوسکتا ہے کہ وہ لڑائی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔"

اچانک لڑائی والے مقام کی طرف سے ایک زوردار آواز آئی۔ "یہ کیا ہے؟" عمران نے چونک کر پوچھا۔ "دستی بم وغیرہ تو نہیں لگتا۔"

"نہیں..... میرے خیال میں یہ راکٹ لانچر تھا۔"

"اوہ!" عمران نے ہونٹ سکیڑے۔ "یہ اڑتی اڑتی سی خبر میں نے بھی سنی ہے کہ بالاٹ والوں کے پاس درمیانے سائز کے کچھ راکٹ لانچر بھی ہیں۔"

اسی دوران میں خاقان ولا کے رہائشی حصے کی طرف سے خواتین کے رونے دھونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"میرا خیال ہے کہ پرنس کے کزن کی موت کی خبر اب اندر پہنچی ہے۔" عمران نے کہا۔

یہ آوازیں سن کر ماہین بھی چلی آئی۔ وہ صورتِ حال جاننے کے لیے رہائشی حصے کی طرف بڑھی تو وہاں موجود مستعد گارڈز نے بڑے ادب کے ساتھ اسے روک دیا۔ انہوں نے ماہین کو بتایا کہ پرنس کی طرف سے سخت ہدایات ہیں۔ خصوصی اجازت کے بغیر کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا اور نہ باہر آسکتا ہے۔

یہ سب کچھ اس خفیہ انفارمیشن کی وجہ سے تھا جو پرنس کو ملی تھی اور جس میں بتایا گیا تھا کہ اندرانا، کسی کو بھاری رشوت دے کر شازینہ کو مروانا چاہتی ہے البتہ ابھی تک اس سازش کا کوئی مہرہ سامنے نہیں آسکا تھا۔ رات کو میرے پیٹ کے سرخ نشانات کی جلن بہت بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ اب ڈاکٹر عظیم کو بتا دینا چاہیے کہ یہ معاملہ پیش آچکا ہے۔ میں نے ایک ملازم کو بھیجا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔

اس نے چند منٹ بعد واپس آکر بتایا۔ "جناب! ڈاکٹر صاحب تو درے (لڑائی والی جگہ) پر ہیں۔ وہاں ایک اور گارڈ شہید ہوا ہے، دو تین زخمی بھی ہیں۔ وہ ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔"

اپنی اس تکلیف کے بارے میں، میں عمران اور ماہین کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں بتانے سے اس کے سوا حاصل بھی کیا تھا کہ وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتے۔

اگلے روز بھی سارا دن لڑائی جاری رہی۔ شام تک چار لاشیں مزید خاقان ولا میں پہنچ گئیں۔ تاہم کل شام کے بعد کسی راکٹ لانچر کا دھماکا سنائی نہیں دیا تھا۔ زیادہ تر آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک رائفلیں استعمال ہو رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے کلاشنکوفوں کے مہلک قہقہے بھی سنائی دیتے جاتے تھے۔ شام کو ماہین نے مجھے آکر بتایا کہ زرش نے موجودہ صورتِ حال کی بہت "اسٹریس" لے رکھی ہے۔ حالانکہ وہ جس حالت میں ہے اسے زیادہ "اسٹریس" نہیں لینی چاہیے۔"

"کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"روتی چلی جا رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اگر یہ لڑائی میرے بالاٹ جانے سے رک سکتی ہے تو میں جانے کے لیے تیار ہوں میں۔ مجھے اب مرنا ہی ہے۔ یہاں مروں یا بالاٹ میں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ایسی مایوسی کی باتیں مت کرے۔ اسے زندہ رہنا ہے۔ اپنے ہونے والے بچے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ اور ویسے بھی وہ اکیلی اس لڑائی کی وجہ نہیں اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ میری اس بات سے وہ کچھ نارمل تو ہوئی مگر پھر اس طرح کی باتیں کرنے لگی..... بالکل بے سروپا....."

"مثلاً کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بار، بار کہنے لگی، میں لاہور جا کر بھی کیا کروں گی۔ انہوں نے اسے مار دیا ہوگا۔ انہوں نے اسے نہیں چھوڑا ہوگا..... میں نے پوچھا، کس کو مار دیا ہوگا۔ اس کا کوئی جواب نہیں دیا..... اور مجھے جھڑکیاں دینے لگی کہ میں کیوں ہر بات کے پیچھے پڑتی ہوں۔ بال کی کھال اتارتی ہوں۔"

"اس کی باتوں سے کیا اندازہ ہوتا ہے تمہیں؟"

"یوں لگتا ہے انکل! کہ وہ فواد سے ملنا چاہتی ہے..... کم از کم ایک بار تو..... ضرور ملنا چاہتی ہے..... اور اسے یہ ڈر

بھی ہے کہ کہیں اس کی ماں نے اسے مروا ہی نہ دیا ہو۔"

اَن چاہے اتفاق سے شروع ہونے والی یہ محبت کی عجیب کہانی تھی جو سامنے آرہی تھی۔ ماہین کی باتوں سے یہ پتا بھی چلا کہ زرش اپنی ماں کے برعکس حساس طبع رکھتی ہے۔ وہ اس بات پر بھی دکھی ہے کہ شازینہ کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی۔ ایک طرف یہ سب چل رہا تھا اور دوسری طرف بستی سے صرف تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر راکٹیں شعلے اگل رہی تھیں۔

رات کو دو ڈھائی بجے تک تو فائرنگ کی آوازیں ہلکی ہی رہیں مگر پھر ایک دم جیسے طوفان سا آگیا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی، دستی بموں کے دھماکے بھی سنائی دیے۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ آوازیں قریب آتی جارہی ہیں۔ ولا کے بہت سے لوگوں کی طرح عمران اور ماہین بھی جاگ گئے۔ عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

"محسوس ہورہا ہے کہ بالاٹ والے آگے بڑھ رہے ہیں۔"

ماہین مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ "ابھی میں نے ٹیرس سے دیکھا ہے فائرنگ کے شعلے نظر آرہے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔"

"اس کا مطلب ہے پرنس اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

صبح تک سب جاگتے رہے۔ چھ سات مزید لاشیں اور زخمی بھی ولا میں پہنچے..... گولیوں کی آوازیں اب صرف ڈیڑھ دو کلومیٹر کی دوری پر تھیں۔ اجالا ہوتے ساتھ ہی فائرنگ تھم گئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ لڑائی کے بعد ایک وقفہ تھا۔ اسی دوران میں یہ تکلیف دہ اطلاع بھی ولا میں پھیل گئی کہ پرنس بخت آور سخت زخمی ہوچکا ہے۔

صورتِ حال دیکھتے ہوئے مجھے اور عمران کو لگا کہ اب ولا میں ٹھہرے رہنا کسی طور مناسب نہیں۔ ماہین کو شازینہ کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر میں اور عمران مین گیٹ کی طرف آگئے۔ دو لوڈر جیپیں، لڑنے والوں کے لیے ایمونیشن اور کھانے پینے کا کچھ سامان لے کر جارہی تھیں۔ ہم بھی ایک جیپ میں سوار ہوگئے۔

قریباً بیس منٹ بعد ہم اس مقام پر تھے جہاں یہ قبائلی معرکہ جاری تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ایک بہتر خبر ملی کہ پرنس شدید زخمی نہیں تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر کچھ چھرے لگے تھے اور وہاں ڈاکٹر شاہد نے پٹی باندھ دی تھی۔ وہ لڑنے مرنے کے لیے پُرعزم نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ وہ مجھ سے اور عمران سے مخاطب ہوکر بولا۔ "آپ دونوں کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ ہمارے مہمان ہیں..... اور آپ تو ابھی پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے جواب دیا۔ "پرنس! جو صورتِ حال ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم پیچھے نہیں رہ سکتے۔"

"صورتِ حال ایسی بری بھی نہیں ہے۔" پرنس نے کہا۔ "ہم پیچھے ضرور آگئے ہیں لیکن آپ نے ایک بات نوٹ کی ہوگی۔ اب شنگرے خاناں کے لوگ بلندی پر نہیں ہیں اور نہ ہم نشیب میں ہیں۔ یہاں میدان ہموار ہے۔"

"مگر پرنس..... یہاں سے خاقان ولا کا فاصلہ بمشکل دو کلومیٹر ہوگا۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے..... لیکن شنگرے جانتا ہے اس سے آگے بڑھنے کے لیے اسے اپنی بہت سی جانیں گنوانا پڑیں گی۔ دونوں طرف کا سخت نقصان ہوگا..... اب اسے سوچنا پڑے گا۔"

پرنس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ جرگے والوں نے عارضی طور پر لڑائی روک دی ہے اور کوئی اہم فیصلہ کررہے ہیں۔ پہلے دو تین معزز افراد شنگرے خاناں کے پاس پہنچے..... پھر وہ علیحدگی میں پرنس سے ملے۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے یہ عمر رسیدہ قبائلی کسی بھی طرح بڑا خون خرابا روکنا چاہتے تھے۔ اس پنچایت نما جرگے کے "سرپنچ" کو یہاں "بڑا ملک" کہا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ہم نے سنا تھا کہ اس کی عمر ایک سو پانچ سال ہے۔ بہرحال وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔

ان مذاکرات کے دوران میں ایک بار ہم نے دور سے شنگرے خاناں کو بھی دیکھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ ایک برف پوش چٹان کے پاس کھڑا تھا۔ ایک گارڈ سے ٹیلی اسکوپ لے کر میں نے دیکھا۔ اس کے جسم پر گولیوں والی بیلٹس تھیں، دائیں بائیں دو ہولسٹر لٹک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے شراب نوشی کے نمایاں ابھار نظر آتے تھے۔ اس کے نقوش دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ ایک عیاش اور رنگ باز قسم کا شخص ہے۔

سہ پہر تک یوں محسوس ہوا کہ حالات کچھ سنبھل گئے ہیں۔ پھر ایک عجیب فیصلے کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوا کہ جرگے والوں نے خون خرابا روکنے کے لیے "محالہ" کا فیصلہ کیا ہے۔ "محالہ" یہاں کی پرانی روایت تھی۔ جب کوئی دو برادریاں یا قبیلے آمنے سامنے ہوجاتے تھے اور مار ماری کی نوبت آجاتی تھی تو اس لڑائی کا فیصلہ کبھی کبھی محالہ نامی رسم

سے بھی کیا جاتا تھا۔ دونوں متحارب گروہ اپنا ایک سب سے بہتر آدمی میدان میں اتارتے تھے۔ ان دونوں میں ''مرو یا مارو'' کا مقابلہ ہوتا تھا۔ جو جیت جاتا تھا۔ اس کا گروہ یا اس کی جماعت بھی فاتح تصور ہوتی تھی۔

اب دوپہر ہونے والی تھی، بلکہ ہو چکی تھی۔ دوپہر کے بعد موسم ان بلندیوں پر اکثر خراب ہو جاتا تھا۔ اب سورج بادلوں میں گم ہو چکا تھا۔ میں اور عمران دیکھ رہے تھے کہ یہاں کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ سرمئی پگڑیوں والے پنچ حضرات بھی مخالف گروپ کی طرف جاتے تھے۔ کبھی پرنس وغیرہ کی طرف آتے تھے۔ پرنس کا چہرہ غصے سے سرخ نظر آنے لگا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''میں سن گن لیتا ہوں، کیا معاملہ چل رہا ہے؟''

''دھیان سے۔'' میں نے کہا۔ ''فائرنگ رکی ہوئی ہے لیکن اوٹ میں رہنا۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ لیتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں ایک بڑی برف پوش چٹان کے پیچھے پرنس اور اس کے ساتھیوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ میں ایک جیپ کے اندر ہی سیٹ کو اسٹریچ کر کے بیٹھا رہا۔ پرنس کے تین چار گارڈز بھی جیپ کے اردگرد موجود تھے۔ انہیں بھی کچھ خاص خبر نہیں تھی کہ یہاں کیا چل رہا ہے، ہاں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اگر پرنس کے کزن کی جان گئی ہے تو وہاں دوسری طرف شنگرے خاناں کا ایک برادران لاء بھی ہلاک ہو گیا ہے۔

عمران نے کہا تھا کہ وہ بس سن گن لے کر آتا ہے..... مگر پورا ایک گھنٹا گزر گیا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ مجھے تشویش ہونے لگی اور اس تشویش کی وجہ سے میں وہ شدید جلن بھی بھول گیا جو میں پیٹ کے متاثرہ حصے پر محسوس کر رہا تھا۔

میں نے سوچا اس کے پیچھے جاتا ہوں اور پرنس سے بھی بات کرتا ہوں مگر اسی اثنا میں عمران مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں تھے۔ عمران کا حلیہ دیکھ کر میں تھوڑا سا چونکا۔ اس نے برف پر چلنے والے فل بوٹ پہن لیے تھے۔ موٹے چمڑے کی ایک جیکٹ نما چیز بھی اس کے جسم پر تھی۔ یہ دیکھنے میں بلٹ پروف جیکٹ کی طرح نظر آتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک کوئی سی تھی۔ اس کوٹ میں کسی درخت کی نہایت سخت چھال بھری جاتی تھی اور لوہے کی باریک پلیٹیں رکھی جاتی تھیں۔ میں نے یہاں انچارج گارڈ اور کچھ دیگر گارڈز کے جسم پر یہ کوٹ دیکھی تھی۔ عمران خلافِ معمول بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گارڈز نامعلے پر رک گئے، وہ اندر جیپ میں آ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں دو دو ہاتھ کرنے جا رہا ہوں یہاں کے سب سے اکڑو خان بدمعاش سے۔''

''تم عالم خان کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں..... بس آپ مجھے ایک چھتری دے دیں۔ ابھی دو چار منٹ میں اسے لمبا لٹا کر واپس آ جاؤں گا۔''

''تم اپنے ہوش میں تو ہو؟ تم کیوں لڑو گے اس سے جا کر۔ یہ ہماری لڑائی نہیں ہے۔''

''ہماری لڑائی نہیں تھی لیکن اب کسی حد تک بن گئی ہے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

اگلے دو چار منٹ میں اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس نے میرا ٹمپریچر ہائی کر دیا۔ سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ عمران نے بتایا کہ لڑائی روکنے کے لیے یہاں محالہ کا فیصلہ ہوا ہے۔ محالہ کے لیے بالاٹ والوں کی طرف سے عالم خان سامنے آیا ہے مگر اس نے ایک شرط رکھی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ذخیرے والوں کی طرف سے اسی بندے کو سامنے لایا جائے گا جس نے یہاں آتے ہی اسے زک پہنچائی تھی اور شرمندگی سے دوچار کیا تھا (یہ اشارہ میری طرف تھا) پرنس یہ بات ماننے کو کسی طور تیار نہیں تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ خود عالم خان کے سامنے جانے کو تیار ہے۔ مگر عالم خان اپنی بات پر اڑا رہا۔ جب بات طول پکڑ گئی تو عمران درمیان میں آ گیا۔ اس نے عالم خان تک پیغام پہنچایا کہ تم جس کو بار بار چیلنج کر رہے ہو، میں اس کا بھتیجا ہوں۔ میں تمہارا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔ اس پیشکش کے بعد تھوڑی سی بحث تمحیص ہوئی اور بات طے ہو گئی۔

میرا دماغ کھولنے لگا۔ عالم خان کی مکروہ شکل پوری جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں خطرات کی بہت سی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ مجھے عمران کی دلیری اور فائٹنگ اسپرٹ پر شک نہیں تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ان معاملوں میں ابھی بہت پختہ کار نہیں ہے۔ دوسری طرف عالم خان کی صلاحیت بھی میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک نہایت خطرناک اور عیار ''لڑاکا'' تھا۔ (کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ بھی بالاٹ کا مانا ہوا جنگجو تھا مگر بعد ازاں وہ کسی گھریلو تنازعے کی وجہ سے خود عالم خان

کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا) میرے دل نے گواہی دی کہ اگر جوش کے عالم میں عمران، عالم خان کے سامنے چلا گیا تو خدانخواستہ شدید زخمی ہو کر یا لاش کی صورت میں واپس آئے گا۔

کئی لمحے بڑے کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ یہ لمحے انسان کی اصل ہمت طاقت کو باہر پاس کر کے اس کے اندر ایک غیر مرئی توانائی بھر دیتے ہیں۔ میں گاڑی میں سے باہر نکل آیا۔ میں نے اٹل لہجے میں عمران سے کہا۔ ''اگر بات یہاں تک پہنچی ہوئی ہے تو پھر عالم خان کے سامنے تم نہیں جاؤ گے..... میں جاؤں گا۔''

''لیکن چاچو آپ.....''

''میں..... اب..... بالکل ٹھیک ہوں عمران۔ پوری طرح فٹ ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔''

''تم اپنی چونچ بند رکھو۔'' میں نے دانت پیس کر آتشیں لہجہ اپنایا۔ ''تم لڑائی بھڑائی کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ تم اس وقت پالنے میں ہو گے جب سے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں..... اور مجھے یہ بھی پتا ہے، تم عالم خان کے جوڑ کے نہیں ہو۔''

اسی دوران میں پرنس بخت اور انچارج طالب شاہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہ اس موڈ میں نظر آ رہے تھے کہ محالہ والے آپشن کو ویسے ہی رد کر دیا جائے..... دو بدو مقابلہ کیا جائے پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں نے اٹل لہجہ اپنایا۔ ''پرنس! میں جانتا ہوں آپ زبان پر قائم رہنے والی فیملی کے فرد ہیں۔ محالہ کا چیلنج قبول کر کے اس سے پیچھے ہٹنا آپ کو زیب نہیں دیتا..... میں آپ سے پُرزور درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے جانے دیں، آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر آپ میری نہیں مانیں گے تو بھی میں وہی کروں گا جو میں نے سوچ لیا ہے۔''

''لیکن تابش، آپ ابھی.....''

''پلیز پرنس بخت آور.....'' میں نے اس کی قطع کلامی کی۔ ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں..... چاروں خانے فٹ ہوں..... اور اس بندے نے مجھے چیلنج کیا ہے..... اس کا جواب میں ہی دوں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، دو چار منٹ میں اسے کیچوے کی طرح مسل ڈالوں گا۔ ایسے بہت حشرات دیکھے ہیں میں نے۔''

انچارج طالب شاہ نے ذرا ہچکچاتے ہوئے مداخلت کی۔ ''جناب! وہ بہت خطرناک کلہاڑی باز ہے۔ دو بدو مقابلے میں اس نے شاید ہی کبھی شکست کا منہ دیکھا ہو۔ یہ بات درست ہے کہ یہاں آمد کے موقع پر آپ یکا یک اس کے سامنے آ گئے تھے اور اسے چند بڑی چوٹیں لگا کر کھڈے میں بھی پھینک دیا تھا لیکن اب وہ پوری تیاری اور طیش کے ساتھ آپ کے سامنے آئے گا.....''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں..... اس کی حسرت نکل جائے اور غلط فہمی بھی دور ہو جائے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

گہرے ہوتے بادلوں اور زور پکڑتی ہوا میں، برف پوش چٹانوں کے عقب میں یہ ایک طویل بحث ثابت ہوئی مگر اس کا نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتا تھا اور جس کا میں فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

بے شک دو دن سے میرے پیٹ کے متاثرہ حصے پر انگارے سے دہکے ہوئے تھے، پورے بدن میں درد کی غیر مرئی لہریں تھیں مگر موجودہ سچویشن میں یہ سب کچھ کسی حد تک پس منظر میں چلا گیا تھا۔ دونوں متحارب گروہوں کے درمیان ایک ہموار سطح پر میں اور جواں سال عالم خان آمنے سامنے کھڑے تھے۔ چوڑے سرخ چہرے اور گھنگریالے بالوں والے عالم خان کی عمر اکیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے ڈیل ڈول اور نقوش کی وجہ سے وہ پختہ عمر نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی شکاری درندے کی سی چمک تھی۔ اس کا پسندیدہ ہتھیار چھوٹے دستے کی کلہاڑی اس کے دائیں ہاتھ میں بے تابی سے گردش کر رہی تھی۔ مقامی طرز کی ایک بھاری جیکٹ نے عالم خان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے جسم پر بھی درخت کی چھال والی ویسی ہی جیکٹ (کوٹی) تھی جو کچھ دیر پہلے عمران نے اپنے جسم پر چڑھائی تھی۔ ہتھیار کے طور پر میں نے بھی چھوٹی کلہاڑی ہی چن لی تھی۔ میرا ''عقیدہ'' تھا اور ''مہان فائٹر'' باروندا جیکی بھی یہی کہا کرتا تھا کہ میدان میں ہتھیار کی نہیں ہتھیار چلانے والی کی اہمیت ہوتی ہے۔ دونوں طرف کے لوگ محو نظارہ تھے۔ وہاں چٹانوں میں کئی خزاں رسیدہ، برف پوش درخت بھی موجود تھے۔ اکا دکا تماشائی ان پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں طرف کے لوگ تھے۔ تماشا دیکھنے کے علاوہ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ ایک دوسرے کی پوزیشنوں پر نظر رکھی جا سکے۔

محالہ کی رسم مختلف ناموں کے ساتھ ان قبیلوں میں مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ شروع میں یہ صرف ''مرو یا مارو'' کا مقابلہ ہوتا تھا مگر آج کے دور میں اسے کچھ تبدیل کیا گیا تھا۔ اب قاعدہ یہ تھا کہ اگر دونوں فریقوں میں سے کوئی ہار مان لے یا اتنا زخمی ہو جائے کہ مقابلہ جاری رکھنے کے قابل نہ ہو تو دوسرے کو فاتح قرار دیا جائے گا۔ مقابلے کے خاتمے کی دوسری صورت یہ تھی کہ کوئی ایک فریق اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مقابلے سے پہلے ایک پنچ نے ہم دونوں کی تلاشی اچھی طرح لی تھی کہ لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ نہ چھپایا گیا ہو۔ میرے کہنے پر دونوں کلہاڑیوں کے پھل بھی چیک کیے گئے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ عالم کی کلہاڑی پر پھر کوئی زہر وغیرہ نہ لگا ہو۔

میرے سینے میں دھڑکن کسی نقارے کی طرح گونج رہی تھی۔ اپنی جسمانی تکلیف کو یکسر فراموش کر کے میں نے مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ وہ نخوت سے دانت نکوس رہا تھا۔ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''عالم خان کے ساتھ ٹکر لینے سے پہلے اپنی عمر کا خیال تو کر لیا ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بکواس تو تم تب کرو جو میں اپنی عمر کے لیے تم سے کوئی رعایت مانگوں۔ تو ایک بزدل دشمن ہے۔ تو نے چھپ کر مجھ پر زہریلا وار کیا۔ اب یہ کھلا میدان ہے۔''

''اس کھلے میدان کے لیے تو بُری طرح پچھتانے والا ہے بڈھے۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا اور ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر پل پڑا۔ اس کی کلہاڑی کا پہلا وار ہی میری کلہاڑی سے اچٹ کر میرے بائیں کندھے پر لگا۔ اس نے پے در پے سات آٹھ وار کیے جن میں سے کچھ میں نے کلہاڑی پر اور کچھ جھکائی دے کر بچائے۔ اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے میں نے بھی ایک دو جوابی وار کیے جو اس نے بڑی مہارت اور مضبوطی سے کلہاڑی کے دستے پر روکے۔ غالباً ٹھیک ہی کہا جاتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح وہ ماہر کلہاڑی باز ہے۔

گہری ہوتی دھند میں لوہے سے لوہا ٹکرا رہا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ اردگرد سیکڑوں لوگ موجود تھے لیکن ایسی خاموشی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ ایک جگہ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس نے آہنی گھٹنے کی تین چار ضربیں میرے پیٹ میں لگائیں۔ یہ متاثرہ حصہ تھا جس کے بارے میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ میرا سفاک مدِمقابل بھی نہیں۔ بہرحال ان ضربوں نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یوں لگا کہ اسکن پھٹ گئی ہے اور گرم خون کی لکیریں میری ٹانگوں کی طرف سفر کر رہی ہیں۔ اگر میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا تو یہ میری وہ غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جسے میں نے برسوں کی ریاضت سے حاصل کیا تھا..... اپنے جسم کو اپنا جسم ہی نہ سمجھنا، اسے سخت ترین اذیتوں سے دوچار کرنا، اور اس کی ہر فریاد کو اس کے اپنے فائدے کے لیے ہی رد کر دینا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے کربناک لمحوں میں میری قوتِ برداشت میرے ارادے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

میں نے اپنی دگرگوں جسمانی حالت کی پروا کیے بغیر عالم خان پر چند جوابی وار کیے اور اس کی اندھا دھند پیش قدمی کو روک دیا۔ یہ ایک طرح سے جوانی کے اندھے جوش و خروش اور تجربے کا مقابلہ تھا۔ تجربہ..... جو زخمی بھی تھا۔

ہم کچی برف پر لڑ رہے تھے۔ میری نگاہیں میدان کے اس گوشے پر تھیں جہاں قدرے ڈھلوان پر چند دن پرانی پکی برف موجود تھی۔ میری فائٹنگ اسپرٹ مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ اگر میں مدمقابل کو وہاں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تو کچھ فائدہ حاصل کر سکوں گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں کلہاڑی کے وار کرتا ہوا اسے آٹھ دس قدم پیچھے لے گیا۔ وہ پختہ برف پر پہنچا..... اور میرا ایک وار بچانے کی کوشش میں پھسل کر اوندھے منہ برف پر گرا۔ اس کے گرنے سے چند سیکنڈ پہلے ہی میرا ایک وار اس کے گھٹنے کو زخمی بھی کر چکا تھا۔ وہ گرا تو پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سینے اور کندھوں پر کلہاڑی کی تین چار تگڑی ضربیں کھا کر اس نے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو میرے سر کی ایک دھواں دھار ضرب نے اس کی ناک کی ہڈی توڑ دی اور اسے برفیلی ڈھلوان پر لڑھکا دیا۔ کلہاڑی اس کی گرفت سے نکل گئی۔

اردگرد کی خاموشی کو اب ایک قیامت خیز شور نے توڑ دیا تھا۔ ذخیرے والوں کو اب میری فتح واضح نظر آرہی تھی۔ میں پختہ برف پر پاؤں جماتا ہوا نشیب میں عالم خان کی طرف جا رہا تھا، جب اس ''محالہ لڑائی'' کا سب سے بڑا فاؤل کھیلا گیا۔ عالم خان زخمی حالت میں لڑھکتا اور پھسلتا ہوا جس تناور درخت کے تنے تک پہنچا تھا وہاں اوپر بالاٹ والوں کا ایک بندہ بھی موجود تھا۔ میں نے دیکھا درخت کے اوپر سے ایک سیاہ چیز برف کی طرف آئی ہے جیسے کوئی مردہ چمگادڑ سخت سردی سے راہی عدم ہو کر زمین پر گری ہو۔

یہ ایک لوڈڈ پسٹل تھا۔ عالم خان نے جھک کر پسٹل

اٹھایا۔ پسٹل پر گرفت مضبوط کرنے اور میری طرف مڑنے کے لیے اسے صرف دو سیکنڈ درکار تھے..... اور قریباً اتنا ہی وقت میرے پاس تھا اس کے سر پر پہنچنے کے لیے۔ میں نے اپنی لہو میں لتھڑی ہوئی ٹانگوں کی پوری قوت استعمال کی۔ اس سے پہلے کہ سیاہ پسٹل کی آتش رنگ گولی میرے جسم میں داخل ہو جاتی، میں نے کلہاڑی کا تیز پھل عالم خان کے سر میں دھنسا دیا۔ پسٹل استعمال کرنے کی حسرت اس کے دل میں رہی۔ وہ ایک کربناک کراہ کے ساتھ برف پر گرا..... نجانے کیوں..... نجانے کیوں..... ان لمحوں میں مجھے لگا جیسے میں نے بے مہار بدمعاش سے اس نامعلوم شخص کا بدلہ بھی لے لیا ہے جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں اور جو اس منحوس کا باپ کہلاتا تھا جو اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ اکثر قبائلی جرگے اور پنچایتیں وغیرہ لڑائی جھگڑے پر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ محالہ میں اپنی واضح شکست کو تسلیم کرنے کے بجائے بالاٹ والوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی (جبکہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ فائرنگ کا آغاز پرنس اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا) ایک دفعہ رائفلوں کے منہ کھلے تو پھر کھلتے چلے گئے۔ گولیوں کی بوچھاڑوں میں، میں جھک کر بھاگتا ہوا پرنس اور اس کے قریبی ساتھیوں کی پوزیشن تک پہنچا۔

میری ٹانگیں اور میرے برفانی بوٹ میرے پیٹ کی رگوں سے بہنے والے خون کی وجہ سے لہولہان تھے۔ ''یہ کیا ہوا تابش صاحب؟'' پرنس چلایا۔

''میں ٹھیک ہوں..... عمران کہاں ہے؟'' میں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

پرنس اور انچارج طالب نے بھی دائیں بائیں دیکھا۔ عمران کہیں نظر نہیں آیا۔

''ابھی تو یہاں تھا۔'' پرنس نے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے پانچ چھ ساعت شکن دھماکے ہوئے۔ ایک دھماکا تو ہماری پوزیشن کے بالکل پاس ہوا جس میں دو گارڈز مارے گئے اور دو تین زخمی ہوئے۔ بہت سی برف اور پتھروں کے ٹکڑے ہمارے اوپر گرے۔ کم از کم تین دھماکے ہمارے عقب میں کافی فاصلے پر ذخیرے کی آبادی میں ہوئے تھے۔

پرنس نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔ ''حرامزادوں نے راکٹ چلائے ہیں۔''

ہم نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ یہ راکٹ بلندی سے خاقان ولا پر ہی چلائے گئے تھے۔ کئی جگہ آگ بھڑکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جیسا کہ پرنس اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ بالاٹ والوں کے پاس سات آٹھ راکٹ موجود ہیں۔ ان میں سے ایک راکٹ تو انہوں نے پرسوں فائر کیا تھا اور باقی غالباً آج چلا دیے تھے۔ (انہوں نے اچانک یہ راکٹ کیوں چلائے؟ اس سوال کا جواب ہمیں قریباً بارہ گھنٹے بعد ملا۔ میری اور عالم خان کی لڑائی کے بعد اندھا دھند شروع ہو جانے والی فائرنگ میں ایک گولی سیدھی شنگرے خاناں کے سینے میں لگی تھی اور وہ نیم مردہ ہو گیا تھا) قریباً دس منٹ کی تابڑ توڑ فائرنگ کے بعد یوں لگا جیسے دونوں طرف کا ایمونیشن ختم ہو گیا ہے۔ اب بس اِکا دُکا گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ لکڑی کی ایک سیاہ پالکی مین اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں نے عالم خان سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ سیاہ پالکی میں سے جھکی ہوئی کمر والا ایک بہت بوڑھا شخص برآمد ہوا۔ اس کی لمبی داڑھی جیسے اس کے گھٹنوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے بلند آواز میں کچھ کہا جو ہم تک نہیں پہنچی۔ اس آواز میں گہرا کرب شامل تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے جیسے فائرنگ روکنے کا کہہ رہا ہو۔ فائرنگ رک گئی۔

خاقان ولا میں دو تین جگہ آگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ درمیانی فاصلہ دو کلومیٹر کے قریب تھا، اس لیے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا نقصان ہوا ہے۔ پرنس اب فوراً ولا میں پہنچنا چاہ رہا تھا۔ اس کے اشارے پر دو تین جیپیں حرکت میں آ گئیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ عمران کہاں ہے؟ ویسے بھی میرے پیٹ کی اسکن سے مسلسل رسنے والے خون کو فوری ٹریٹ منٹ کی ضرورت تھی۔ پرنس کے حکم پر اس کے پرسنل گارڈز نے مجھے سہارا دے کر پرنس کی جیپ میں سوار کرا دیا۔ ہمیں خاقان ولا تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگے۔ یہ بیس منٹ میرے لیے بے حد کٹھن تھے۔ ایک تو تکلیف..... دوسرے عمران کا خیال کہ وہ کہاں گیا ہے۔ یہاں چار پانچ منٹ کے لیے گولیاں بارش کی طرح برسی تھیں، کہیں.....

اس سے آگے سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ خاقان ولا میں سخت ہلچل نظر آئی۔ ایک راکٹ ''ولا'' سے باہر اور تین اندر گرے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا کہ مہمان خانے کا آدھا حصہ بھی دھڑا دھڑ جل رہا ہے..... ماہین اور زرش جہاں مہمان خانے میں ہی تھیں۔ خاقان ولا کے درجنوں ملازمین برفیلے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر آگ

پر ڈال رہے تھے..... مگر یہ سب کچھ بے سود نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر عظیم کا اسسٹنٹ نظر آیا تو میں نے اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ''یہاں دو لڑکیاں تھیں؟ کہاں گئیں؟''

''دو نہیں جی ایک ہی تھی۔ ان محترمہ کو آپ کے ساتھی عمران صاحب نے نکال لیا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر عظیم انہیں دیکھ رہے ہیں۔''

مجھے ایک ساتھ خوشی اور پریشانی کا شاک لگا تھا۔ خوشی اس بات کی کہ عمران صحیح سلامت یہاں موجود تھا۔ تشویش اس بات کی تھی کہ اسسٹنٹ صرف ایک لڑکی کو نکالے جانے کا کہہ رہا تھا اور اس کو ابھی ٹھیک سے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ ایک کون ہے؟ فضا میں جلے ہوئے گوشت کی ہلکی سی بو تھی جو ثابت کرتی تھی کہ یہاں جانی نقصان بھی ہوا ہے۔

اپنی حالت کی پروا کیے بغیر میں اس جانب لپکا جہاں ڈاکٹر عظیم موجود تھا۔ پرنس بخت نے مجھے روکنا چاہا پھر وہ بھی میرے پیچھے آیا۔ نکالی جانے والی کون تھی؟ یہ سوال ہتھوڑے کی طرح دماغ پر برس رہا تھا۔ تب ہم اس مستطیل کمرے میں پہنچے جہاں چند زخمیوں کو رکھا گیا تھا۔ تب پتا چلا کہ نکالے جانے والی ماہین تھی..... ماہین ایک بستر پر نیم دراز تھی۔ ڈاکٹر عظیم اسے انجکشن لگا رہا تھا۔ میری ابتر حالت دیکھ کر ماہین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''عمران کہاں ہے؟'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''آپ کے پاس تو کھڑا ہوں۔'' دائیں جانب سے آواز آئی۔

میں نے اسے بمشکل پہچانا۔ اس کا چہرہ دھوئیں کی کالک سے سیاہ ہو رہا تھا۔ سر کے بائیں حصے کے بال تیز حرارت کے سبب چرمر ہو کر رہ گئے تھے۔ بائیں جانب سے جیکٹ کا کچھ حصہ بھی جلا ہوا تھا۔

میں نے اسے گلے سے لگایا اور پھر خود ہی کراہ اٹھا۔ پیٹ کی جلد ذرا سے دباؤ کے سبب چھل رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں میرے لیے تشویش ابھری۔

زرش جہاں کے بارے میں پتا چلا کہ آتشزدگی کے وقت وہ مہمان خانے کے بجائے عقبی باغیچے میں موجود تھی۔ وہ خیریت سے رہی تھی۔

ماہین کے بارے میں معلوم ہوا کہ راکٹ دھماکے کے وقت وہ اپنے بیڈ روم میں تھی۔ دھماکے کے سبب دیواروں میں دراڑیں پڑیں اور بیڈ روم کا دروازہ اس طرح پھنس گیا کہ ماہین کی بہت کوشش کے باوجود کھلنے میں نہیں آیا۔ تب مہمان خانے میں آگ تیزی سے پھیلنا شروع ہو گئی تھی اور کسی بھی وقت بیڈ روم تک پہنچ سکتی تھی۔ عمران پہلے تو ماہین کو آوازیں دیتا رہا پھر ایک دھڑا دھڑ تبلتی راہداری میں گھس کر بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ عمران نے اسے لاتیں رسید کیں پھر کندھے سے ضربیں لگائیں اور اسے کھولنے میں کامیاب رہا۔ دم گھٹنے کے سبب ماہین کی بری حالت تھی۔ عمران اسے سہارا دیتا ہوا باہر لے آیا۔ ماہین کی قوتِ برداشت کی بھی داد دینا پڑتی تھی، اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید سانس گھٹنے سے ہی ختم ہو جاتی۔

☆☆☆

راکٹ گرنے سے تیرت انگیز طور پر خاقان ولا میں زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ ایک عورت جاں بحق ہوئی چند افراد کو معمولی زخم آئے۔ ہاں مالی نقصان کافی زیادہ تھا۔ تین روز تک ہونے والی دو طرفہ فائرنگ میں صرف پرنس کی سائڈ کے کم و بیش تیس افراد جان سے گئے تھے۔ زخمیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک زخمی میں بھی تھا۔ میرے پیٹ کی جلد میں سے خون کا رساؤ بند نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عظیم نے اگلے 48 گھنٹوں میں شب و روز میری نگہداشت کی۔ وہ اس بات پر بہت خفا بھی تھا کہ میں نے نشانات نمودار ہوتے ساتھ ہی اسے آگاہ کیوں نہیں کیا تھا۔ بہرحال یہ اوپر والے کا کرم اور اس کی بخشی ہوئی میری اضافی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے مزید سیریس ہونے سے بچا لیا اور تیسرے روز میری طبیعت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ پرنس اور دیگر لوگ بھی حیران تھے کہ میں نے ''گورنام'' کی اس دوسری اسٹیج کا مقابلہ بھی کامیابی سے کر لیا ہے۔

ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر شاہد کو یقین تھا کہ میری بیماری کا یہ مرحلہ چھونت والا نہیں لہٰذا مجھے الگ تھلگ نہیں رکھا گیا تھا۔ عمران ہر وقت میرے اردگرد موجود تھا۔ تیسرے دن میری طبیعت سنبھلی تو میں نے اس کے سر کے آدھے جلے ہوئے بالوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟ فی الحال یہ باقی بال بھی کٹوا دو، کارٹون لگ رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''چاچو! آپ اسے ہیئر اسٹائل سمجھ لیں۔ اگر ماضی کے اداکاروں دلیپ کمار اور وحید مراد کے ہیئر اسٹائل مشہور ہو سکتے ہیں تو حال کے ہیرو عمران جونیئر کا ہیئر اسٹائل مشہور کیوں نہیں ہو سکتا۔''

اپنے والد کی طرح بدترین حالات میں بھی اس کی

حسِ مزاح کسی نہ کسی حد تک برقرار رہتی تھی۔ کئی حوالوں سے تو وہ ''کاربن کاپی'' تھا۔ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''ہاں عمران! کام تو تم نے واقعی ہیرو والا ہی کیا ہے۔ کئی لوگوں نے تمہاری تعریف کی ہے۔ تم بروقت اندر نہ جاتے تو ماہین کا زندہ رہنا مشکوک ہو جاتا۔''

اس نے سرد آہ بھری۔ ''چاچو! اب کیا ہو وت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یہ سب کچھ شروع شروع میں ہو جاتا تو شاید..... ماہین کے دل میں میرے لیے کچھ جگہ پیدا ہوتی۔ وہ یوں کھٹاک سے حشام کی منگیتر نہ بن جاتی۔''

''سب کچھ شادی بیاہ ہی تو نہیں ہوتا عمران۔ محبت کے کئی اور رنگ بھی تو ہوتے ہیں۔ کئی اور رشتوں کے حوالے سے بھی تو کسی سے محبت کی جا سکتی ہے اور اگر کوئی اور رشتہ نہ بن پائے تو کسی سے ''دور'' رہ کر بھی تو پیار کیا جا سکتا ہے۔''

''چاچو! جا تا رہا ہوں دور..... اب انڈیا سے آگے کہاں جاؤں۔ آگے پانی ہی پانی ہے آسٹریلیا تک۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ مجھے، تم عین وقت پر یہاں ''ولا'' میں کیسے پہنچ گئے۔ تم تو وہاں لڑائی والی جگہ پر تھے؟''

''یہ کیا سوال ہے چاچو! یہاں راکٹ گرے تھے..... بزوکا راکٹ۔ آگ لگ گئی تھی۔ ایکسی میں بھی آگ نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ یہاں پہنچوں۔''

''اب تم پھر بکواس کر رہے ہو۔ راکٹ بعد میں گرے تھے۔ تم لڑائی والی جگہ سے پہلے نکل آئے تھے۔''

اس نے پھر ٹھنڈی سانس لی اور مزید اول فول بولنے کا ارادہ ترک کر کے بولا۔ ''دراصل چاچو! مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب خاقان ولا میں کچھ ہونے والا ہے۔ میں ایک جیپ والے کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس کو چھٹی حس کہتے ہیں۔''

کسی اور نے چھٹی حس کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو میں اسے زیادہ اہمیت نہ دیتا..... کیونکہ یہ لفظ بہت استعمال کیا جاتا ہے لیکن عمران کے سلسلے میں بات مختلف تھی۔ میں نے اب تک بہت دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ واقعی کچھ واقعات کی بو پہلے سے سونگھ لیتا ہے۔ یہ اس کی چند غیر معمولی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت تھی۔ مجھے پھر وہ واقعہ یاد آ گیا جب اندرانا کی رہائش گاہ پر خونخوار کتوں نے جارحیت چھوڑ کر عمران کے گرد دُم ہلانا شروع کر دیا تھا۔

یہی وقت تھا جب میری اور عمران کی گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ پرنس بخت آور بڑے جوشیلے انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔ ''آپ کو مبارک ہو تابش صاحب! بڑے ملک (سرپنچ) نے محالہ کی لڑائی کا فیصلہ ہمارے حق میں دیا ہے۔ ہم فاتح ہیں۔''

''تو کیا..... شکرے خاناں وغیرہ نے یہ قبول کر لیا ہے؟''

''موت کو آس پاس دیکھ کر بڑوں بڑوں کی اکڑ پانی ہو جاتی ہے۔ شکرے خاناں شدید زخمی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بڑوں نے اسے سمجھایا ہے کہ وہ مزید وبال اپنے اوپر نہ لے اور اپنی شکست کو تسلیم کر لے.....'' پرنس نے اس بارے میں مزید تفصیل بھی بتائی۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے پرنس، کہ آپ کی مجرمہ اندرانا بیگم کو آپ کے حوالے کر دیا جائے گا؟''

''اندرانا ہی نہیں وہ غدار حاجن رانی بھی حوالے ہو گی۔ نوروز خان کے علاوہ وہ دونوں بھی قاتل ہیں وردا خانم کے اور..... شازینہ کی ابتر حالت کی۔''

یہ ایک خوشی کی خبر تھی مگر شازینہ کا ذکر ہوا تو میرا اور عمران کا دھیان اس کی طرف چلا گیا۔ اس کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ وزن تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ بس اسے ڈرپس کے ذریعے خوراک پہنچائی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس بے چاری کے لیے زبردست ''تھریٹ'' بھی موجود تھا۔ اس اطلاع کی تصدیق ہو چکی تھی کہ منتقم المزاج اندرانا نے بہت بھاری معاوضہ دے کر کسی شخص کو شازینہ کی جان لینے پر مامور کیا ہے اور وہ کوئی ایسا میل یا فی میل ہے جو یہ کام کر سکتا ہے۔ شازینہ کے اردگرد سیکیورٹی اب بھی ہائی الرٹ تھی۔ ماہین بڑی مشکل سے ایک دو بار ہی اس سے مل پائی تھی۔ اس کے غم زدہ والد اور چند مخصوص افراد کے سوا کوئی اس کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔

☆☆☆

برف باری کے طویل ''اسپیل'' کے بعد آج کل سورج نکل رہا تھا۔ دور ماشر بروم اور گیشر بروم کی چوٹیاں چاندی کی طرح دمکتی نظر آتی تھیں۔ (میں جب بھی ''کے ٹو'' کا نام سنتا تھا، میرے ذہن میں آتا تھا کہ کوئی ''کے ون'' بھی تو ہو گی، تبھی تو اسے ''کے ٹو'' کہا جاتا ہے۔ اب یہ پتا چلا تھا کہ اس ماشر بروم کو ''کے ون'' کہا جاتا ہے۔ کچھ اسی قسم کا سوال ہاکی کے معروف کھلاڑی رشید جونیئر کا نام سن کر ذہن میں آیا کرتا تھا۔ آخر کوئی گمنام کھلاڑی رشید یا رشید سینئر بھی تو ہو گا جس کی وجہ سے دوسرے کھلاڑی کو رشید جونیئر کہا گیا۔ شاید اس رشید سینئر کو ہم کبھی نہ جان پائیں گے)

اب اُمید تھی کہ معاہدے کے مطابق عنقریب اندر بیگم اور حاجن رانی کو ذخیرہ بستی پہنچا دیا جائے گا۔ میری حالت کافی بہتر تھی۔ دونوں ڈاکٹر اور خاص طور سے ڈاکٹر عظیم

میرے لیے بہت کوشش کر رہا تھا۔ شازمینہ کے لیے پرنس نے بہت سخت سکیورٹی برقرار رکھی ہوئی تھی ..... مگر اس کی حالت نازک تھی۔ پرنس اور اس کے ساتھی اسے کسی بھی طرح یہاں سے نکال کر کسی شہری اسپتال میں پہنچانے کا سوچ رہے تھے۔ راستوں کی حالت ایسی تھی کہ فی الحال ہیلی کاپٹر کے سوا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا مگر ایسے موقعوں پر ہیلی کاپٹر کا انتظام ہو بھی جائے تو اچھے موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس روز ڈاکٹر عظیم مجھے دیکھنے کے لیے آیا تو میری سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر خوش ہوا۔ ''نابش صاحب! آپ اس درمیانی عمر میں بھی ماشاء اللہ بہت فٹ ہیں..... اور آپ نے ہر طرح اپنی ''فٹ نس'' ثابت کی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے لوگوں کے ذہنوں میں اپنا جو تصور بنا لیا تھا، آپ محالہ والی لڑائی میں اس پر پورا اترے ہیں۔''

''اس تعریف کے لیے میں شکریے کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ڈاکٹر عظیم عینک درست کرتے ہوئے مسکرایا۔ ''کسی وقت تو لگتا ہے کہ آپ شوبز سے نہیں بلکہ مارشل آرٹ سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر ماضی میں آپ کو بہت دلچسپی رہی ہے فائٹنگ آرٹ سے۔''

''یہ ماضی والی بات درست ہے۔'' میں نے موضوع کو لپیٹتے ہوئے کہا (یہاں ابھی تک سب کو یہی پتا تھا کہ ہم کسی بڑی ٹی وی سیریل کے لیے لوکیشنز ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ چند روز پہلے صرف پرنس بخت کو میں نے حقیقت سے آگاہ کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر تاحال یہ ارادہ پورا نہیں ہوا تھا)

ڈاکٹر عظیم میرے پیٹ کے متاثرہ حصے کی بینڈیج کرتے ہوئے بولا۔ ''جو کچھ بھی ہے نابش صاحب! آپ نے اتنی بری حالت میں جس طرح اس بپھرے سانڈ جیسے عالم خان کا مقابلہ کیا وہ یہاں کے لوگوں کے لیے بہت یادگار رہے گا۔ ان فیکٹ آپ نے لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر عظیم، متاثر تو آپ بھی کر رہے ہیں۔ جس طرح اس دور دراز ایریا میں دن رات لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔''

وہ انکساری سے مسکرایا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''ڈاکٹر عظیم! آپ عرصے سے یہاں موجود ہیں۔ اس اندرانا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے جی۔ وہ نفرت اور کینہ پروری میں ہر حد سے گزری ہوئی عورت ہے۔ اس نے پرنس کے رشتے والے معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا..... اور اس بُری طرح بنایا کہ بیٹی کو طلاق دلوا بیٹھی اور پھر اپنی بیٹی کو بھی اپنے خلاف کر لیا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ وردا بیگم کی جان لے چکی ہے، پھر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا۔''

''بالکل، اب وہ شازمینہ کی جان کے درپے ہے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی ایک طرح سے بستر مرگ پر ہے۔''

میں بولا۔ ''اس کے پاس پشتنی پیسا ہے..... اور پیسے سے بڑے بڑے لوگوں کا ایمان خرید لیا جاتا ہے..... یہاں تک کہ ڈاکٹر عظیم جیسے لوگوں کا بھی۔''

''جی..... کیا مطلب؟'' ڈاکٹر عظیم کا رنگ اڑ گیا۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''شازمینہ اس لیے بستر مرگ سے اٹھ نہیں پا رہی کہ تم اسے اٹھنے نہیں دے رہے ہو ڈاکٹر عظیم۔ تم بس دو چار دن میں ہی اسے راہی عدم کرنے والے ہو۔''

ڈاکٹر عظیم کا رنگ ہلدی اور آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ وہ اضطراری طور پر تھوڑا سا پیچھے کو ہٹا۔ میں نے لیٹے لیٹے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ حواس باختہ ہو گیا، اس نے یکا یک زور مارا اور خود کو چھڑانا چاہا۔ اس کی قمیص نیچے تک پھٹ گئی۔ اسی دوران میں عمران اندر داخل ہوا اور ڈاکٹر عظیم کو سر کے بالوں سے پکڑ کر صوفے پر پٹخ دیا۔ ڈاکٹر عظیم کی عینک اچھل کر دور جا گری۔

عمران نے کہا۔ ''تمہیں ڈاکٹر عظیم کہتے ہیں۔ لیکن عظیم تو کیا تم صرف ڈاکٹر بھی نہیں ہو۔''

وہ دم بخود تھا۔

☆☆☆

ہال نما کمرے میں انچارج طالب شاہ کے ہاتھوں مزید تشدد اور ذلت سے بچنے کے لیے ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈاکٹر عظیم نے اعتراف کر لیا کہ وہی وہ ''خوش قسمت'' شخص تھا جسے اندرانا جان نے 24 قیراط کا کوئی آدھ کلو سونا اور پانچ لاکھ نقد پہنچائے تھے اور اسے، شازمینہ کو جان سے مارنے کا ٹاسک سونپنے میں کامیاب رہی تھی۔

ڈاکٹر عظیم سے زیادہ بہتر طریقے سے یہ کام اور کون کر سکتا تھا اور وہ کر رہا تھا، اپنی میڈیکیشن سے شازمینہ کو موت کے دہانے پر پہنچا چکا تھا۔

رابن چڑیوں کی آڈیو ریکارڈنگ والی کارکردگی کے بعد یہ مابین کی ایک اور کامیابی کہی جا سکتی تھی۔ یہ مابین ہی تھی جس کو ملاقات کے دوران میں شازمینہ نے بتایا تھا کہ

دواؤں کی ڈوز کے بعد اس کی حالت مزید ابتر ہو جاتی ہے۔
پھر ایک ملاقات میں ماہین نے دیکھا کہ ڈاکٹر عظیم نے شازینہ کو انجکشنز دینے کے بعد باقی کے "وائل" ڈسٹ بن میں پھینکے لیکن ایک جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ ماہین آنکھیں اور کان کھلے رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ مجھے بتایا۔ میری ہدایت پر عمران نے کل رات ڈاکٹر عظیم کی غیر موجودگی میں اس کے دفتر کی الماریوں کی تلاشی لی اور ایک مقفل دراز میں سے نہایت مہلک انجکشن دریافت کر لیے۔ یوں ایک اور سازش کو فل اسٹاپ لگ گیا۔ عمران اور ماہین والا معاملہ جوں کا توں تھا۔ اتوار کے روز عمران نے جس طرح دروازہ توڑ کر ماہین کو دھواں دھواں مہمان خانے سے نکالا تھا، مجھے لگتا تھا کہ ان دونوں کی بند بات چیت پھر سے شروع ہو جائے گی..... مگر ماہین صرف شکریے اور احسان مندی کے چند الفاظ بول کر ہی رہ گئی تھی۔

عمران دو روز تو سر کے آدھے جلے بالوں کے ساتھ ہی گھومتا رہا اور اسے ہیئر اسٹائل قرار دیتا رہا پھر میرے اصرار پر اس نے باقی بال بھی چھوٹے کرا دیے تھے۔ آتشزدگی والے اس واقعے کے حوالے سے مجھے عمران کی وہ بات بھی یاد آئی جو اس نے شروع میں شوگراں سے روانہ ہوتے وقت کہی تھی۔ کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ جائے گا کیونکہ اسے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ماہین کسی خطرے میں پڑنے والی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ بات بھی اس نے یونہی ہانک دی تھی، یا پھر واقعی اس کی چھٹی حس نے کوئی اشارہ وشارہ دے دیا تھا۔

☆☆☆

حالات اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے تھے...
یوں لگتا تھا کہ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے ہیں۔ ایک دن بعد صلح کے معاہدے کے مطابق درداخانم کی اصل قاتلہ اندرانا بیگم کو پرنس فیملی کے حوالے کیا جانے والا تھا..... مگر رات کو ایک دھماکا خیز خبر آئی اور جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شنگرے خاناں کی محل نما کوٹھی میں اندرانا بیگم نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کے لیے اس نے وہی زہر استعمال کیا تھا جو درداخانم اور شازینہ کو مارنے کے لیے اس نے نوروز اوزحاجن کو مہیا کیا تھا۔ مرنے سے پہلے اندرانا نے ایک خط اپنی "باغی" بیٹی کے نام بھی لکھا تھا۔ یہ خط اندرانا کی لاش اور ملازمہ حاجن رانی کے ساتھ ہی خاقان ولا میں پہنچا۔ بعدازاں یہ خط پرنس کے ذریعے مجھے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ اندرانا بیگم نے اپنی ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں، بیٹی کو جی بھر کر بددعائیں دی تھیں اور لکھا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا اس کی بھلائی کے لیے کیا مگر اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری اور دشمنوں سے بڑھ کر اپنی ماں کی دشمن نکلی۔ آخر میں اس نے لکھا تھا..... زرش، میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میرے بعد میری روح بھی قیامت تک تمہیں بددعائیں دیتی رہے گی۔

جس کو وہ بددعائیں دے کر گئی تھی۔ وہ اپنے لیے کچھ اور راستے چن چکی تھی۔ وہ ایک بے مایہ شخص کی قربت اور محبت کا شکار ہو چکی تھی اور وہ شخص خاقان ولا سے کچھ فاصلے پر شانم بستی کے ایک نیم سرد کمرے میں موجود تھا، ہجر کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اس موقع پر میں نے پرنس کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ فواد جسے وہ عرصہ پہلے اپنی ملازمت سے فارغ کر چکا تھا ایک بار پھر یہاں ذخیرہ میں ہی موجود ہے۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ پرنس کو ساری تفصیل بتا دوں گا، اور وہ بھی جو زرش جہاں نے نہیں بتایا تھا، اس خوف سے کہ فواد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

میں نے پرنس کو آگاہ کیا کہ کس طرح اندرانا نے فواد کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی سے تعلق قائم کرے..... اور زرش کے امید سے ہونے کے بعد وہ کس طرح فواد کو ملک سے باہر بھجوانے یا پھر مروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بعدازاں جب فواد، زرش کی محبت میں گرفتار ہو گیا تو اندرانا نے جس طرح شانم لڑکیوں اور دیگر ذریعوں سے اسے بہلانے کی کوششیں کیں وہ سب بھی میں نے پرنس پر آشکار کیا۔ پرنس عجب بیزاری اور کوفت کے عالم میں سنتا رہا..... پھر بہت معذرت سے میں نے پرنس بخت کو اپنی اور اپنے دونوں ساتھیوں عمران اور ماہین کی اصلیت سے بھی آگاہ کر دیا۔ اسے بتا دیا کہ ہم کس طرح فواد کی دکھیاری ماں اور غمزدہ بیٹی کی خاطر اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور کیا مجبوری تھی کہ ہم نے خود کو ٹی وی پروڈکشن سے متعلق ظاہر کیا۔ پرنس کے لیے یہ سب کچھ بھی حیران کن ثابت ہوا۔

پھر ایک روز میں اور عمران فواد سے ملنے شانم بستی پہنچے۔ موسم خوشگوار تھا، آج یہاں گھنگروؤں کی جھنکار تھی اور یقیناً بند کمروں کے اندر نرم گرم معاملات بھی چل رہے ہوں گے۔ غنچہ گھر میں ہی موجود تھی لیکن ہمارے سامنے اس کی بہن ایمل ہی آئی۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور زیرلب مسکرا کر رہ گیا۔ ہم اسٹور نما کمرے تک پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لمبے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو والا فواد جانماز پر سجدے کی صورت میں گرا ہوا تھا۔ وہ بالکل

بے حرکت تھا، لیکن نہیں..... حرکت اس کی پشت کے خفیف ہچکولوں میں موجود تھی۔ وہ رو رہا تھا..... گڑگڑا رہا تھا، خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا اور شاید اپنے لیے زندگی بھی مانگ رہا تھا..... زندگی جو اس کے لیے خوبرو شازینہ کے وصل کا دوسرا نام بن گئی تھی..... اور کھڑکیوں سے باہر سورج چمک رہا تھا۔ درختوں پر اور زمین پر برف کے ہزار ہا ذرے مسکرا رہے تھے۔ کہیں کہیں برفانی راہبن چڑیاں اور وڈ پیکر جھلک دکھا رہے تھے۔ وہ دعا مانگ رہا تھا اور شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں اور عمران خاموشی سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر جیسے اچانک فواد کو ہماری موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں نے گدے پر اس کے بالکل قریب بیٹھ کر اس کے استخوانی ہاتھ تھام لیے۔ ہجر کی آگ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں فروزاں تھی۔ ''کیا مانگ رہے تھے؟'' میں نے محبت سے پوچھا۔

دو تازہ آنسو اس کی خودرو سیاہ داڑھی میں جذب ہوئے..... وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ''زندگی یا..... موت.....''

میں نے کہا۔ ''فواد! ہمارے خیال میں یہ قبولیت کی گھڑی ہے۔ اچھی چیز مانگو اور اچھی چیز زندگی ہے۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں ٹھہرے لہجے میں گویا ہوا۔ ''فواد! یہاں کوئی ایسا موجود ہے..... جو تمہاری ہی طرح تمہیں یاد کر رہا ہے۔ وہ تمہارے پیچھے لاہور تک جانا چاہتا ہے۔ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کچھ سننا چاہتا ہے۔''

فواد کے ہونٹ بے ساختہ لرزنے لگے۔ ''آ..... آپ..... زرش کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور پھر آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے ٹکا دیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے..... کہ وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ خاقان ولا کی بہو، وہ لاکھوں میں کھیلنے والی۔ اس نے تو بس ایک وقتی سمجھوتا کیا تھا۔ یہ..... یہ غلط ہے۔ آپ مجھے صرف..... تسلی دے رہے ہو۔''

عمران نے کہا۔ ''دیکھو فواد! اس کھڑکی سے باہر سورج چمک رہا ہے۔ جیسے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ایسے ہی یہ بھی جھوٹ نہیں ہے جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

☆☆☆

اندرانا کی آخری رسومات مسلمانوں کی طرح ہی ادا کی گئی تھیں، مگر کئی لوگوں سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ دل سے کبھی مسلمان نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی سوریزان کو دیوتا مانتی تھی۔ مزاجاً بھی وہ اپنی بیٹی زرش جہاں سے بہت مختلف تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نفرت کی آگ میں جلتے جلتے اس کا دل آتش کدہ بن چکا تھا۔

خاقان ولا میں شدید علیل شازینہ کی حالت ایکا ایکی سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ اب اسے اس کی والدہ وردا خانم کی وفات کی خبر بھی دے دی گئی تھی۔ ڈاکٹر شاہد اس کی ٹریٹ منٹ کر رہا تھا۔ نوروز کی طرح اب ڈاکٹر عظیم سے بھی مال حرام برآمد ہو چکا تھا۔ عظیم کو نوروز اور حاجن رانی ہی کی طرح خاقان ولا میں بند کر دیا گیا تھا۔ پرنس بخت آور فطری طور پر ایک قانون پسند شخص تھا۔ وہ ان تینوں کو خود سزا دینے کے بجائے قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر فی الحال ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے تھوڑا انتظار کرنا تھا۔ فواد ابھی تک شانم بستی کے اسی گھر میں تھا۔ البتہ ہم نے زرش کو اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں بتا دیا تھا اور ان تمام کربناک حالات سے بھی آگاہ کر دیا تھا جن سے وہ محبت کا مارا یہاں گزرتا رہا تھا۔ اندرانا بیگم کا اسے لاہور سے یہاں لانا، اسے شانم لڑکیوں کے ذریعے بہلانے کی کوشش کرنا، پھر اس کی جان لینے کے درپے ہو جانا۔ ہم نے سب اس کے گوش گزار کر دیا۔

زرش فوراً اس سے ملنا چاہتی تھی مگر وہ خاقان ولا کی سابق بہو بھی تھی۔ اسے فی الحال فواد سے ملانا مناسب نہیں تھا۔ زرش کی حسین آنکھوں کے اندر جھانکا تو جا سکتا تھا مگر عورت کی آنکھوں کی گہرائی میں کیا ہوتا ہے اس کا پتا چلانا آسان نہیں ہوتا۔ ابھی ہمیں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ اس کے دل میں اگر واقعی فواد کی محبت موجود ہے تو وہ کس نوعیت کی ہے۔ کیا وہ اس سے صرف ملنے کی خواہش مند ہے یا زندگی کا ساتھ چاہتی ہے۔

موسم خوشگوار تھا۔ سورج کے مسلسل چمکنے نے کام دکھایا۔ ایک روز خبر ملی کہ نشیب میں ایک بڑی ایوالانچ بنی ہے۔ لاکھوں ٹن برف پھسل کر مزید نشیب میں گئی ہے اور یوں ایک ایسا راستہ سا بن گیا ہے جو نیچے جانے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ایوالانچ والے واقعے کے قریباً چار دن بعد پرنس ہمیں اپنے خاقان ولا سے رخصت کر رہا تھا۔ وہ کئی طرح سے خوش اور مطمئن تھا۔ اس کا جری دشمن شنگرے خاناں اپنے ہی اعمال

کی زد میں آکر نہایت کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ لمبے عرصے کے لیے بستر پر پڑ گیا تھا۔ درحقیقت شانم لڑکیوں سے شب و روز کی قربت نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ لہٰذا گولی کا ایک زخم ہی اس کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا۔ اس کا دستِ راست اور سب سے بڑا بدمعاش عالم خان راہی عدم ہو چکا تھا۔ پرنس کے لیے اطمینان کی ایک بات یہ بھی تھی کہ شازمینہ صحت یاب ہو رہی تھی۔ میں نے اور ماہین نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے رخساروں کے گلاب پھر اپنے رنگ پر آرہے تھے۔ اس نے خاقان ولا میں بسنے کے جو معصوم سپنے اپنے ذہن میں سجائے تھے..... وہ پورے ہونے والے تھے۔ پرنس نے محبت تو زندگی میں ایک ہی بار کی تھی اور وہ لڑکی اب دنیا میں نہیں تھی..... لیکن یوں لگتا تھا کہ شازمینہ کے ساتھ وہ ایک اچھی شادی شدہ زندگی گزار سکے گا (زرش کے ساتھ اس کا بچہ نہ ہونے کا سبب بس قدرتی عمل تھا ورنہ پرنس ہر طرح سے ایک صحت مند اور توانا مرد تھا)

ہم خاقان ولا اور ذخیرے سے روانہ ہوئے تو فواد اور زرش بھی ہمارے ساتھ تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے دونوں نے مدت بعد ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں کے چہروں پر کئی طرح کے رنگ بکھر گئے مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔

ہمارے قافلے میں لکڑی کی دو ڈولیاں بھی شامل تھیں۔ یہ زرش اور ماہین کے لیے منگوائی گئی تھیں۔ تاہم ماہین نے ہمارے ساتھ پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ فواد سے کہا گیا کہ وہ دوسری ڈولی استعمال کرلے کیونکہ اس کی پنڈلی کا زخم ابھی پورا مندمل نہیں ہوا تھا مگر فواد نے بھی انکار کر دیا۔ ڈولی واپس کر دی گئی۔ ہمارے قافلے میں دو مقامی کوہ پیما اور پندرہ کے قریب مسلح گارڈز بھی شامل تھے۔ وقتِ رخصت خوبرو زرش جہاں نے مڑ کر بھی پرنس یا خاقان ولا کی طرف نہیں دیکھا۔ درحقیقت پرنس اور زرش کے درمیان کبھی پیار کا تعلق قائم ہوا ہی نہیں تھا۔ بس ایک بوجھل سا رشتہ تھا جسے دونوں کسی نہ کسی طرح نبھاتے رہے تھے۔

اس سفر کی مشکلات کا ذکر کیا جائے تو روداد بہت طویل ہو جائے گی۔ ہم بہت سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے دو روز میں ایسے مقام تک پہنچ پائے جہاں سے گاڑیوں کی سہولت حاصل کی جا سکتی تھی۔ جس ڈرائیور انعام خان کے ساتھ ہم یہاں پہنچے تھے وہ ہمارا انتظار کر کے دو ہفتے پہلے واپس جا چکا تھا۔ بہرطور تھوڑی سی کوشش سے ہمیں ایک اچھی حالت کی بیڈفورڈ جیپ ڈرائیور سمیت مل گئی۔ ہم پانچوں اس میں سوار ہو گئے اور اپنے ساتھ آنے والے گارڈز کو الوداع کہا۔ اب ماشر بروم کی خوب صورت بلندیاں اور ان بلندیوں کے سارے اسرار ہمارے عقب میں تھے۔ ہمارا رخ جنوب کی طرف تھا۔ جنوب جہاں کے سرسبز میدانوں اور بہتے دریاؤں سے آگے لاہور واقع تھا۔ لاہور کے پُرہجوم گلیاں کوچے ہمیں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ میں نے فواد اور زرش کو علیحدہ علیحدہ سمجھا دیا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کریں گے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ پردہ داری اس لیے بہت ضروری تھی کہ شکی مزاج حشام کی وجہ سے ماہین اور حشام کا رشتہ خطرے میں نہ پڑ جائے۔

لمبے سفر کے بعد جب ہم خوب صورت شہر اسلام آباد پہنچے تو عمران ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اب اسے اپنے طور پر لاہور پہنچنا تھا۔

☆☆☆

وقت کا گھوڑا اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہی رہتا ہے۔ کبھی دلکی چال، کبھی تیز گام اور کبھی سرپٹ۔ ہمیں لاہور پہنچے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ ماہین اپنے گھر جا چکی تھی۔ میں اپنے گھر آگیا تھا اور عمران اسی گنجان آبادی میں جہاں وہ رہائش رکھے ہوئے تھا۔ زرش میرے گھر میں تھی اور میری ملازمہ کرن اس کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی تھی۔ امید سے ہونے کے سبب اسے اچھی دیکھ بھال کی ضرورت بھی تھی۔ فواد اپنے گھر واقع کینال پارک جا چکا تھا۔ اپنی ماں اور بچی نایاب سے اس کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ وہ ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر دیر تک روتا رہا تھا۔

پھر ایک دن میں نے زرش سے وہ بات پوچھ ہی لی جو کئی دنوں سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ کسی تمہید کے بغیر میں نے اس سے سوال کیا۔ ”زرش..... کیا تم فواد سے نکاح کرنا چاہتی ہو؟“

اس نے سر ہلایا، جیسے اسے میرا سوال بالکل بے محل لگا ہو۔ آنکھوں میں نمی بھر کر شکستہ اردو میں بولی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں آپ کے ساتھ کیوں چلی آئی ہوں؟“

”یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”میں..... اب اس شخص کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جو میرے ہونے والے بچے کا باپ ہے..... اگر وہ مجھے قبول کرلے تو میرے لیے بڑی خوش بختی کی بات ہوگی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”لیکن زرش! ایک بات پر

غور کرلو۔ تم نے ناز و نعم میں زندگی گزاری ہے۔ روپے پیسے میں کھیلی ہو۔ وہ معاش کے لحاظ سے ایک معمولی شخص ہے۔ چھوٹے گھر میں رہتا ہے۔ اس کی ایک بچی بھی ہے۔''

زرش نے پھر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے سوال کو احمقانہ سمجھ رہی ہو، بولی۔ ''میں یہ سب کچھ پہلے بھی جانتی تھی۔ اس نے مجھے اپنی بچی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ سب کچھ بتایا تھا۔'' پھر اس کی لمبی پلکیں بے ساختہ جھک گئیں۔ عجیب مستحکم لہجے میں بولی۔ ''جس سے پیار ہوتا ہے اس کی ہر چیز سے پیار ہوجاتا ہے۔''

ان لمحوں میں نجانے کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ پہاڑوں سے اُترنے والی یہ لڑکی پہاڑوں جیسے مضبوط ارادے کی بات کررہی ہے۔ مگر اس کے ذہن میں ایک اندیشہ بھی تھا اور وہ یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو، وہ اسے قبول کرنے سے انکار کردے یا اگر قبول کرلے تو بعد میں کوئی طعنہ ان دونوں کے درمیان آجائے۔ اس حوالے سے میں نے سے تسلی دی۔ میں نے کہا۔ ''زرش! بے شک تم دونوں سے ایک گناہ سرزد ہوا مگر اس گناہ کا اصل بوجھ تو تمہاری والدہ پر ہے۔ تم پر اپنا غیر معمولی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اس نے تمہیں مجبور کردیا کہ تم اس راہ پر چلو۔ ورنہ خود تمہارے اپنے کردار میں تو کوئی خامی نہ تھی۔ اور پھر یہ بھی ایک بڑی بات ہے کہ تم نے چپ سادھ کر عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے بجائے خود پر ترس کو اپنی اس ''صورتِ حال'' کے بارے میں بتایا۔ یہ باتیں فواد بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

میری باتوں سے زرش کے اندیشوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔

اگلے ہی روز میں فواد کے پاس جاکر اس سے اور اس کی والدہ سے ملا۔ چند دن میں معاملات طے ہوگئے۔ زرش کی جائز خواہش تھی کہ یہ بندھن جلد باندھا جائے۔ وہ اپنے بچے کو جلد از جلد اس کے باپ کا نام دینا چاہتی تھی۔ ہمارے لاہور آنے کے قریباً تین ہفتے بعد ایک سادہ سی گھریلو تقریب میں خوبرو زرش جہاں اور فواد کا نکاح ہوگیا۔ وہ انوکھی پہاڑن اپنی انوکھی وفا کے ساتھ فواد کی زندگی میں آگئی۔ اندرانا بیگم کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے جو سازش تیار کی ہے ایک روز اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ جنوری کی اس خوش رنگ شام کو خوب صورت نایاب کو خوب صورت زرش کی گود میں مچلتے دیکھ کر مجھے یہی لگا کہ وہی اس کی ماں ہے۔ پرنس بخت اور اسکول وین ڈرائیور فواد کی شکلوں میں معمولی مشابہت سے شروع ہونے والی کہانی بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ زندگی کے پُرپیچ راستوں پر کہانیاں ایسے ہی انوکھے موڑ لیا کرتی ہیں۔

اس تقریب میں کچھ دوسرے لوگوں کے علاوہ ماہین اور حشام بھی شریک ہوئے تھے مگر میرے بلانے کے باوجود عمران نہیں آیا تھا۔ وہ جیسے ہر ایک سے روٹھا ہوا تھا اور مجھے پتا تھا اس کے روٹھنے کی اصل وجہ خاقان ولا والی بات ہے۔ ماہین کی بات اس کی حساس طبع پر بہت بھاری پڑی تھی۔ اب وہ واقعی یہاں سے جانے کی تیاری میں تھا۔ اس رات پہلی بار میں نے عمران کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا۔ فواد کے گھر سے واپس آکر میں دیر تک بستر پر لیٹا رہا اور اس کے متعلق سوچتا رہا۔ خاقان ولا میں اس نے میری بیماری سے خوف کھائے بغیر جس طرح رات دن میری تیمارداری کی تھی وہ بھلائے جانے والی بات نہیں تھی، پھر عالم خان سے لڑائی میں میری جگہ اس کا خود کو پیش کرنا..... پھر ماہین کو بیڈ روم کے پھنسے ہوئے دروازے میں سے نکال کر لانا۔ کئی واقعات نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اسی حالت میں مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ میں نے تصور کی نگاہوں سے عمران دانش کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہی برسوں پہلے والا عمران دانش، وہ آزردہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''یار تابی! میں نے تو بڑے چاؤ اور پیار سے اپنے بیٹے کو تیرے پاس بھیجا تھا۔ میں اپنے بعد اسے تیرا دست و بازو بنانا چاہتا تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر تجھے ایسا ہی لگے جیسے میں آج بھی تیرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہوں۔ وہ میری ساری محبتوں اور خوبیوں کے ساتھ تیرے شہر میں تیرے دروازے پر آیا تھا۔ مگر یار! تو نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس کے سارے ارادوں اور حوصلوں کو اپنی بے رخی سے توڑ دیا۔ اب وہ تم لوگوں سے مایوس ہوکر واپس جارہا ہے۔ کبھی نہیں لوٹے گا میری طرح..... دیکھ لینا کبھی نہیں۔''

میں ایک شدید دھچکے کے ساتھ اپنی غنودگی سے باہر آیا۔ میرے یار عمران دانش کا ہیولا اوجھل ہوگیا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

وہ رات میرے لیے دکھ بھری تھی۔ اگلی ہی صبح میں نے عمران کو بلا بھیجا۔ شکر تھا کہ وہ آگیا لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہ ہوسکا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اگر اس کے جانے کی بات کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ مجھے اس کی سلامتی عزیز ہے۔ میں نے قریباً سارا دن اسے قائل کرتے ہوئے گزارا کہ وہ فی الحال انڈیا واپسی کا ارادہ ترک کردے۔ بسیار

کوشش کے باوجود وہ صرف اس حد تک تیار ہوا کہ دو تین ماہ بعد پاکستان واپس آئے گا۔ مگر مجھے اس کے وعدے پر پختہ شک تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اس کی حساس طبع اسے پھر واپس نہیں آنے دے گی۔ سوچ بچار کرتے کرتے ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ مجھے یوں لگا کہ اس تالے کی چابی ماہین کے پاس ہے۔ ماہین کی وجہ سے ہی اس کے دل میں گرہ پڑی ہے۔ وہی یہ گرہ کھول سکتی ہے۔

شام کو جب عمران اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر واپس چلا گیا تو میں نے ماہین کو فون کیا۔ میرے اور ماہین کے درمیان فون پر ہی قریباً آدھ گھنٹا بات ہوئی۔ ہم دونوں نے ایک لائحہ عمل بنایا۔

تیسرے روز میں نے عمران کو فون کیا۔ وہ گھر سے باہر تھا۔ میرے کہنے پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ والد کی قبر پر گیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے عمران دانش کی قبر گھوم گئی۔ وہی جگہ جہاں وہ ہمتوں اور بے مثال جراتوں کا شہزادہ جنتر کے درختوں کی چھاؤں میں ابدی نیند سو رہا تھا۔

عمران بولا۔ ''چاچو! آپ نے ان کی قبر پر بڑا دل گداز کتبہ لگوایا ہے۔'' ''میرا دوست عمران..... جس کے آنسو مسکراتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے عمران کہ الفاظ اس کے مرتبے کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔''

عمران نے میری طرف دیکھ کر آہ بھری۔ ''شاید سچ ہی کہتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے پہلے مرنا پڑتا ہے۔''

میں نے عمران کی اس نشتر جیسی بات کو نظر انداز کیا۔ اسی دوران میں ''ڈور بیل'' ہوئی۔ پروگرام کے مطابق ماہین ''اتفاقاً'' آ گئی تھی۔ اس کے آنے کے دو تین منٹ بعد ہی میں باہر چلا گیا۔ بہانہ یہ کیا کہ میں ایک کال کرنا چاہ رہا ہوں اور یہاں سگنل نہیں آ رہے۔ میں ماہین کو عمران سے بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے واپس آ کر ادھ کھلی کھڑکی کی درز سے جھانکا۔ کئی ہفتوں بعد آج ماہین اور عمران بات کر رہے تھے۔ ان کی آوازیں سننے کے لیے میں نے توجہ مرکوز کر دی۔ ماہین کے چہرے پر اور لہجے میں سچائی کی جھلک تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''عمران! مجھے اپنی غلطی ماننے میں بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ وہاں خاقان ولا میں میرے منہ سے بے ساختہ کچھ سخت باتیں نکل گئیں۔ عمران! میں دل کی گہرائی سے اس کے لیے معافی مانگتی ہوں۔''

''معافی تو مجھے بھی آپ سے مانگنی چاہیے۔ میں اکثر ضرورت سے زیادہ اور غلط بول جاتا ہوں۔''

''لیکن میرے الفاظ آپ کے لیے بڑے سخت تھے عمران۔ میں اس کے لیے ندامت محسوس کرتی ہوں۔ آپ نے..... آپ نے جس طرح.....'' ایک دم اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ میں سمجھ گیا اور عمران بھی سمجھ گیا کہ وہ خاقان ولا میں آگ لگنے والے واقعے کا ذکر کرنا چاہتی تھی۔ میں نے پہلی بار ماہین کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے۔ عمران حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ جیسے یہ جان کر وہ بھی ششدر ہو کہ وہ چنچل رو بھی سکتی ہے۔ ماہین نے عجیب بھیگے لہجے میں کہا۔ ''عمران! میری اور انکل کی شدید خواہش ہے کہ آپ انڈیا نہ جائیں۔ یہاں ہمارے ساتھ رہیں..... پلیز۔''

وہ کچھ دیر گم صم کھڑا رہا۔ ''لیکن ماہین! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ میری وجہ سے آپ اور حشام کے تعلق پر اثر پڑ سکتا ہے۔''

''یہ میرا معاملہ ہے عمران! میں اسے اچھی طرح ہینڈل کر سکتی ہوں۔ ایسے تعلق اعتماد کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور حشام کو مجھ پر اعتماد کرنا پڑے گا..... اور شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ماشر بروم کے علاقے میں آپ ہمارے ساتھ تھے اور یہ بھی کہ یہ ساتھ کیسے بنا تھا..... میں نے کچھ بھی چھپایا نہیں۔''

عمران واقعی حیران ہوا۔ وہ کافی دلیر نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندر کی سچائی اس کے چہرے پر منعکس تھی اور اس کے گال کا ڈمپل چمک رہا تھا۔ وہ عمران کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''عمران! میرا اور آپ کا رشتہ پُرخلوص دوستی کا ہے..... اور یہ قائم رہے گا۔ ہمیشہ قائم رہے گا۔'' ایک لمحہ توقف کر کے اس نے بات مکمل کی۔ ''اپنے رویے پر آپ سے ایک بار پھر..... ویری ویری سوری۔''

''شرمندہ نہ کریں۔'' عمران نے کہا۔ اس کے چہرے پر نرمی اور نیم رضامندی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک گہری سوچ بھی تھی۔ شاید سوچ رہا تھا کہ ماہین کے ساتھ ''پُرخلوص دوستی'' نبھا سکے گا یا نہیں؟

❖❖❖

زہریلا تریاق

طاہر جاوید مغل

کسی بڑے واقعے کے پہلے دن کی خوشی ہو یا افسردگی... اِس قدر لامحدود ہوتی ہے کہ اس کے اثرات دور تک پیچھا کرتے ہیں... اُن دونوں کی زندگی کا بھی وہ واقعہ حد سے سوا تھا... اس واقعے سے جنم لینے والی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونا آسان نہیں تھا... قدم قدم پر پاؤں ڈگمگاتے اور خارِ راہ دامن کو مضبوطی سے تھام لیتے... چاروں جانب کسی طرف کوئی جائے پناہ نہ تھی... جھوٹ و فریب نے جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں... سچ تک پہنچنے کے لیے کڑے مراحل درپیش تھے... اس کڑے اور بے سائباں وقت میں صرف سچائی ہی زادِ راہ تھی...

کوچۂ جاناں میں بے خطر آوارہ گردی کے خواہش مند مجنوں کی عشوہ طرازی

اِس کہانی کا آغاز نومبر کی ایک نہایت سرد لیکن سنہری دھوپ والی دوپہر کو ہوا۔ اتوار کا روز تھا۔ میں عمران جوئیئر سے ملنے اسی گنجان آبادی میں پہنچا جہاں اس کی رہائش تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر اس کے ساتھ گپ شپ لگاؤں گا اور حال احوال دریافت کروں گا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہاں پہلے ہی ایک مسئلہ موجود ہے..... گاڑی ایک نسبتاً کشادہ جگہ پارک کرنے کے بعد میں بارونق بازار سے گزر کر اس کے دروازے تک پہنچا۔ اس کے دوست ضیا نے بتایا کہ وہ کہیں باہر نکلا ہوا ہے، ابھی آتا ہی ہوگا۔ ضیا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ فوراً ہی نظر آ گیا مگر اس حالت میں کہ ایک، دو تین سالہ بچہ کمبل میں لپٹا ہوا اس کی بانہوں میں تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں تقریباً دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں یقیناً بچے کی پریشان والدہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک معمر جوڑا بھی بھاگا آ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر عمران سیدھا میری ہی طرف آیا۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بچہ بیمار ہے، بہت زیادہ..... اِسے اسپتال لے جانا ہوگا۔''

''ہوا کیا ہے عمران؟''

''نمونیا کی شکایت ہے۔ الٹی سیدھی دوائیں کھانے سے معاملہ بگڑ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے سانس لے رہا ہے۔''

بچے کی جواں سال والدہ جو شکل سے ہی مفلسی کی ماری نظر آتی تھی، ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''اللہ کے واسطے میرے ندیم کو بچالو۔ اسے کچھ ہوگیا تو میں بھی نہیں بچوں گی۔''

میں نے کمبل سرکا کر بچے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ مرجھائے پھول کی طرح تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر ہچکولوں سے سانس لے رہا تھا۔ ہم اسے لے کر گاڑی تک آئے۔ بچے کی والدہ اور اس کا نانا بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے حتی الامکان تیزی سے سڑک پر لے آیا۔ پتا چلا کہ یہ لوگ پتوکی قصبے سے آگے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ بچے کی طبیعت زیادہ بگڑنے پر کل رات یہاں لاہور میں اپنے عزیزوں کے پاس آئے ہیں۔

قریباً چالیس منٹ بعد ہم میو اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹرز نے فوری طور پر کچھ دوائیں منگوائیں جو عمران لے آیا۔ ایسے موقعوں پر عمران کی پریشانی دیکھ کر ایسے ہی لگتا تھا کہ یہ کسی اور کی نہیں اس کی اپنی ذاتی پریشانی ہے۔ اس نے بتایا۔ ''یہ عورت بیوہ ہے۔ بس دو بچے ہیں۔ چھ سات سال کی لڑکی اور یہ لڑکا۔ ایک طرح سے اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔''

یہ بچہ اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اسپتال پہنچنے کے قریباً ایک گھنٹے بعد یہ سہارا اس سے چھن گیا۔ بچہ جانبر نہیں ہوسکا۔ وہ روتے، روتے بے ہوش ہوگئی۔ نانا بھی دہاڑیں مار رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر میرے اور عمران کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک میلا کچیلا شاپر تھا۔ اس شاپر میں وہ دوائیں تھیں جو بچے کے گھر والے اسے گاؤں میں دیتے رہے تھے۔ یہ دوائیں ڈاکٹری نسخے کے عین مطابق تھیں مگر صرف ناموں کی حد تک۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن اور ایک سیرپ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔ ''مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ یہ دونوں میڈیسنز جعلی ہیں۔ اگر یہ اصل ہوتیں تو شاید یہ معصوم اس نازک حالت تک نہ پہنچتا..... دکھ کا مقام ہے کہ ہمارے اکثر چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں میں یہ مکروہ دھندا چل رہا ہے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب اس کا کیا کریں گے آپ؟''

وہ بولا۔ ''آپ کا تعلق جس ڈپارٹمنٹ سے ہے وہاں آپ سے کون سی بات چھپی رہتی ہے۔ وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ تجزیے میں دوائیں نقلی ثابت ہوگئیں تو اس میڈیکل اسٹور پر چھاپا پڑے گا جہاں سے یہ خریدی گئی تھیں۔ میڈیکل اسٹور والا ہول سیلر کو پکڑوائے گا۔ ہول سیلر ٹکرا ہوا تو خود پر کیس ہی نہیں بننے دے گا اور اگر بن گیا تو دو چار پیشیوں میں خود کو بچالے گا۔ بات تو تب ہے جب اس زہریلے درخت کی جڑوں تک پہنچا جائے۔ جڑوں کو زمین سے کھینچا جائے۔''

سینئر ڈاکٹر صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بڑے مجرموں تک پہنچے بغیر ایسی برائیوں کا قلع قمع ممکن نہیں..... اور یہ جعلی ادویات والی لعنت تو ایسی زہرناک تھی کہ اس کی تباہ کاری اور وسعت لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی تھی۔ میں خود بھی اس کا ڈسا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ماضی کی فلم سی چلنے لگی۔

اپنے بچے کی لاش سے لپٹ کر بین کرتی ہوئی ماں کو چھوڑ کر میں اور عمران اسپتال کے احاطے میں آگئے۔ عمران نے بچے کے نانا اور ماموں کو ساتھ لیا اور لاش لے جانے کے لیے کاغذی کارروائی مکمل کروانے لگا۔ میں سوچ میں گم ہوگیا۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے میری بیوی ثروت کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا..... آہ..... کتنی جانکاہ یادیں تھیں..... میں اور ثروت کافی عرصے بعد لاہور سے نکلے تھے۔ ہم تین ہفتے کے تفریحی ٹور کے لیے ایبٹ آباد، خانسپور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں پر ثروت کو ہلکا بخار ہوا تھا۔ وہ اکثر اپنی تکلیف مجھ سے چھپالیتی تھی کہ میں پریشانی میں مبتلا ہوجاتا تھا۔ وہاں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دائیں پہلو میں ہلکا سا درد بھی تھا جو اس نے مجھ سے چھپائے رکھا۔ یہ پتے کا درد تھا۔ وہ بے چاری نہیں چاہتی تھی کہ اتنے عرصے بعد مجھے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے جو تھوڑا سا فارغ وقت ملا ہے، وہ اس کی وجہ سے غارت ہوجائے۔ ہم نے وہیں پر ایک ڈاکٹر کو دکھایا اور اس نے بخار کی دوا کے علاوہ ایک اینٹی بائیوٹک بھی لکھ دی۔ سات آٹھ روز تک ثروت وہی دوا کھاتی رہی اور بظاہر ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش بھی کرتی رہی مگر پھر تھیا گلی میں اس کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی۔ اسے بہت ''وومٹنگ'' ہوئی۔ میں اسے لے کر فوراً لاہور پہنچا۔ ڈاکٹرز نے تفصیلی معائنہ کیا اور پتا چلا کہ اس کا گال بلیڈر سوج چکا ہے اور بُری طرح متاثر ہے۔ گال بلیڈر (پتے) کا انفیکشن قریبی اعضا کو بھی متاثر کرچکا تھا۔ جو اینٹی بائیوٹک دوا وہ استعمال کرتی رہی تھی، وہ نقل بمطابق اصل تھی اور اس کی وجہ سے ثروت کا بلڈ پریشر غیر معمولی طور پر

بڑھ گیا تھا۔ ایمرجنسی میں ثروت کے بچے کا آپریشن کیا گیا..... تاہم آپریشن کے صرف چار گھنٹے بعد جب ابھی وہ نیم بے ہوشی میں تھی، اسے سخت قسم کا بریین ہیمرج ہوا اور وہ اپنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھڑا گئی۔

قریباً ڈیڑھ برس پہلے کے یہ واقعات میرے لیے ایک ایسی تلخ یاد کی طرح تھے جسے میں کسی صورت اپنے دماغ تک راستہ دینا نہیں چاہتا تھا مگر یہ ہزار ہا زہریلے کانٹوں والی یاد کسی نہ کسی سبب میرے دل و دماغ میں گھس ہی آتی تھی۔ جیسے آج اس بدنصیب بچے کی وجہ سے یہ واقعہ ہوا تھا۔

ثروت کی ناگہانی موت کے بعد میں کئی ہفتوں تک تو سوگ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبا رہا تھا۔ وہ در و دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے جہاں سے وہ میرے ساتھ خوشی خوشی ایک تفریحی سفر کے لیے نکلی تھی اور پھر ایک ایمبولینس میں لاش کی صورت واپس آئی تھی، بالآخر میں نے خود کو سنبھالا تھا اور ان اصل مجرموں کی تلاش میں نکلا تھا جو اب تک نجانے کتنے لوگوں کو سسکا سسکا کر مار چکے تھے۔ میڈیکل اسٹور، سلائر اور ہول سیلر وغیرہ تو چھوٹے چھوٹے مہرے تھے۔ ضلع ایبٹ آباد کی مقامی پولیس نے انہیں گرفتار بھی کیا تھا۔ جعلی ادویات بنانے والی ایک چھوٹی فیکٹری کو ایبٹ آباد میں ٹریس بھی کیا گیا تھا..... مگر اس کی صحیح لوکیشن ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ثروت کے سوگ سے نکلنے کے بعد میں نے خود ایبٹ آباد جا کر تگ و دو کی تھی اور بالآخر اس فیکٹری تک جا پہنچا تھا مگر اسی رات اس فیکٹری کا مالک اپنے بیڈ روم میں پُراسرار طور پر مردہ پایا گیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ شخص بھی ایک مہرہ ہی تھا اور اسے صرف اسی وجہ سے خاموش کیا گیا تھا کہ وہ قانون کو اصل ذمے دار یا ذمے داروں تک رسائی نہ دے دے۔

وہاں دسمبر کی اس سنہری دھوپ میں اسپتال کے احاطے میں بیٹھے بیٹھے یہ سارے واقعات ایک دو منٹ کے اندر اندر میرے ذہن سے گزر گئے۔ بچے کا اشک بار ماموں بچے کی لاش کو بازوؤں میں اٹھائے باہر آ رہا تھا۔ دکھیاری ماں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ نانا زور زور سے رو کر ہتار ہا تھا۔

''ہمارے گھر میں فاقے تھے لیکن اپنے بچے کو بچانے کے لیے ہم نے گاؤں میں اپنے برتن تک بیچ دیے۔ ہمیں کیا پتا تھا برتن بیچ کر ہم اپنے بچے کے لیے دوا نہیں زہر لا رہے ہیں۔''

☆☆☆

بچے والے اندوہناک واقعے کو دس پندرہ روز گزر چکے تھے۔ اس واقعے نے میرے اندر تحریک پیدا کر دی تھی۔ جعلی ادویہ سازوں کے خلاف میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ جو ذرا ماند پڑ گئی تھی پھر بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے کیس کی فائل منگوا کر ایک بار پھر اس کا مکمل مطالعہ کیا اور ضروری نوٹس لیے۔ یہ کیس میرے دوست اور خیر خواہ انسپکٹر زبیر کے ذمے تھا۔ وہ ان لوگوں کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا جنہوں نے ایبٹ آباد میں جعلی ادویات کی ایک چھوٹی فیکٹری کے مالک کو قتل کیا تھا۔

موسم سرد تھا۔ کئی دنوں بعد ہلکی سی دھوپ نکلی تھی۔ میں گھر کے لان میں چہل قدمی کر رہا تھا، جب عمران اپنی خستہ حال موٹر بائیک پر آ دھمکا۔ وہ آج کل عجیب الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ ''کے ٹو'' کے نواحی پہاڑوں سے واپسی کے بعد ماہین نے اسے کسی نہ کسی طرح منا تو لیا تھا اور اس بات پر نیم رضامند بھی کر لیا تھا کہ وہ انڈیا واپس نہیں جائے گا مگر اس کے ارادے سخت ڈانوں ڈول تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آج بھی اسی موضوع پر بات کرنے آیا ہے۔ خلافِ معمول سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ کرسی کھینچ کر میرے پاس دھوپ میں بیٹھ گیا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔

میں سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ''چاچو! میں غلط بیانی نہیں کروں گا..... اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ جو کچھ میرے دل میں ہے، وہ آپ بھی اچھی طرح جان ہی چکے ہیں۔ ماہین کو میں کسی اور نظر سے دیکھتا ہوں اور یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپوں آپ ہوا ہے..... میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔''

''تو پھر؟'' میں نے اس کے چہرے پر کرب کا سایہ دیکھ کر پوچھا۔

''تو پھر..... جو کچھ ماہین نے کہا ہے، وہ بھی آپ کے علم میں ہے۔ وہ مجھے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اسی حیثیت سے مجھے اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہے۔''

''اور تم اس بات پر آمادہ بھی ہو گئے تھے۔''

اس نے افسردگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں چاچو جان! میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ میں اپنی سچائی پر جھوٹ کا پردہ ڈال کر ماہین کے اردگرد رہنا نہیں چاہتا۔ یہ مجھ سے ہو ہی نہیں سکے گا..... آپ بھی جانتے ہوں گے جھوٹ کے اثرات کسی نہ کسی طور ظاہر ضرور ہوتے

ہیں۔ میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں کہ کہیں میری وجہ سے ماہین اور حشام کی زندگیوں میں کوئی دراڑ نہ آجائے۔"

"واپس انڈیا جانا چاہتے ہو؟"

"چاہتا نہیں ہوں..... میں جارہا ہوں چاچو۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔ "بدھ تک مجھے سفری کاغذات مل جائیں گے۔"

اس کے لہجے کی قطعیت کو محسوس کر کے اداسی کی ایک لہر سی میرے سینے میں دوڑ گئی۔ مجھے لگا کہ اب اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "اور بات صرف اکیلی ماہین ہی کی تو نہیں ہے پیارے چاچو! اس میں کچھ نہ کچھ دخل آپ کا بھی تو ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی تو ہر وقت یہ وہم گھسا رہتا ہے کہ یہاں میرے ساتھ کچھ نہ کچھ برا ہو جانا ہے جس کی تمام تر ذمے داری آپ پر آجانی ہے۔"

"اب الٹی سیدھی مت ہانکو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے خیالات اب وہ نہیں جو پہلے تھے، میں تمہیں یہاں اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"چلیں جو بھی سمجھ لیں لیکن اب چند روز تک مجھے یہاں سے جانا ہے۔ ہاں یہ وعدہ ہے کہ آپ سے مسلسل رابطہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ذہنی طور پر بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گا..... اور ہاں....." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا کہنے لگے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایک درخواست کرنی تھی آپ سے..... لیکن..... چلیں ابھی نہیں۔ ایک دو روز ٹھہر کر کروں گا۔"

اس کی خوب صورت آنکھوں میں ایک افسانوی سا رنگ تھا، ایک بھید بھرا رنگ۔ اس کا یہ روپ ایک رومانی ہیرو کا سا تھا اور اس روپ سے بہت مختلف تھا جو کبھی کبھار کسی خطرے کے وقت نظر آتا تھا اور اس کے مدِمقابل پر لرزا طاری کرتا تھا۔

میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

"ماہین کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتا چکے ہو؟"

"اررررے..... نہیں، نہیں اور آپ بھی یہ غضب نہ کرنا۔ اُسے بالکل آخر میں بتائیں گے۔" وہ بولا۔

☆☆☆

تھوڑا سا دکھ تو ہوا تھا مگر گہرائی میں جا کر سوچا جاتا تو وہ جو کہہ رہا تھا، ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی کا بہت بُرا اثر ماہین اور حشام کے رشتے پر پڑ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ایسے دیگر خطرات بھی تھے جو عمران کی جوشیلی طبیعت کی وجہ سے اسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔ میں اسی سوچ میں گم بیٹھا تھا کہ فون پر کال آئی۔ یہ ماہین کی اُس خالہ کی طرف سے تھی جو ماہین کے پاس رہ رہی تھیں۔ دو تین روز پہلے بھی وہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کر چکی تھیں۔ وہ فون پر بولیں۔ "تابش! دراصل میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اتفاق سے اس وقت ماہین گھر میں نہیں ہے۔ اگر آپ ابھی آجائیں تو مناسب ہے۔"

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔ ماہین کے بارے میں ماہین کی خالہ فوزیہ نے بتایا کہ وہ حشام کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہے۔

راستے میں، میں ماہین اور حشام کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ ماہین نے دل کڑا کر کے حشام کو یہ بات بتا دی تھی کہ شمالی علاقے کے سفر میں عمران بھی میرے اور اس کے ساتھ تھا۔ بقول ماہین، حشام نے یہ بات سن تو لی تھی مگر کوئی فراخدلانہ تاثر نہیں دیا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ جو ہو گیا، سو ہو گیا لیکن اب عمران سے ان دونوں کا ملنا جلنا کم ہی رہے تو اچھا ہے۔ یہ نسبتاً نرم رویہ بھی حشام نے غالباً اسی لیے اختیار کیا ہوگا کہ اسے ہمارے سفر میں پیش آنے والے خطرناک واقعے کا علم ہوا ہوگا (پچھلی رُوداد میں قارئین پڑھ چکے ہیں کہ خاقان دلا میں آتشزدگی کے دوران میں عمران نے ماہین کو ایک پھنسے ہوئے دروازے میں سے بحفاظت نکلنے میں مدد دی تھی)

میں ماہین کے گھر پہنچا تو رانو نامی نوجوان ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ میں زینے طے کر کے بالائی منزل کے اس آرام دہ کمرے میں پہنچ گیا جہاں ماہین کی علیل خالہ لیٹی رہتی تھیں۔ وہ اب بھی بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ عمر پچاس سے اوپر تھی۔ بالوں کی چند لٹیں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ کسی وقت وہ یقیناً خوب صورت رہی ہوں گی۔

رسمی کلمات کے بعد انہوں نے کہا۔ "تابش! میں ماہین کے لیے بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ آج کل وہ ہر وقت کسی گہری الجھن میں رہتی ہے۔ کھوئی کھوئی سی اور بالکل غیر حاضر۔ کیا آپ کو بھی ایسا لگا ہے؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولیں۔ "وہ آپ کو بہت عزت دیتی ہے..... اکثر باتیں آپ سے شیئر بھی کرتی

ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے اندر کیا چل رہا ہے۔ اپنے چینل میں بھی وہ کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہی۔ پچھلے ہفتے بیٹھے بیٹھے اچانک مجھ سے کہنے لگی۔ ''خالہ! آپ اور ماموں بہت سست ہیں، آپ لوگ اب میری شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ کب تک اس طرح مگیتر بن کر پھرتی رہوں گی۔ پھر خود ہی حساب کتاب جوڑنے بیٹھ گئی کہ ایک ڈیڑھ مہینے میں اس کی شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو پھر اچھی علامت ہے جی، کہ وہ جلدی شادی پر رضامند ہو گئی ہے۔'' (مجھے اونچی آواز میں بولنا پڑا کیونکہ ان کی قوتِ سماعت کم تھی)

خالہ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار برقرار رہے۔ پانی کا گھونٹ لے کر بولیں۔ ''مگر تابش! مجھے لگتا ہے کہ ماہین شادی والی بات بھی اپنی اندرونی پریشانی سے فرار حاصل کرنے کے لیے کر رہی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ دو ڈھائی سال بعد کی بات کر رہی تھی۔ ویسے بھی اتنی جلدی شادی ہو کیسے سکتی ہے۔ حشام کے پاپا اس کے لیے راولپنڈی میں نیا بزنس سیٹ اَپ بنا رہے ہیں۔ بہرحال ماہین ہی کے کہنے پر ہم نے ان لوگوں سے بات کی ہے اور وہ کسی حد تک رضامند بھی ہو گئے ہیں مگر..... مگر اصل میں تو اس بات کا پتا چلنا چاہیے کہ وہ اس شادی سے پوری طرح خوش بھی ہے؟''

''کم از کم اتنا تو مجھے پتا ہے کہ وہ ناخوش نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اپنے اور حشام کے طویل ساتھ کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔''

ماہین اور حشام کسی بھی وقت واپس آسکتے تھے۔ فوزیہ بیگم سے تھوڑی مزید گفتگو کے بعد میں وہاں سے آگیا۔

یہ چوتھے، پانچویں روز کی بات ہے، میں انسپکٹر زبیر احمد سے مصروفِ گفتگو تھا اور ساتھ ساتھ اپنے گھر کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر زبیر احمد کو نقلی دواؤں والے کیس کے سلسلے میں ہی ایبٹ آباد بھیجا ہوا تھا۔ ایک بار پھر سرگرمی سے ان لوگوں کی تلاش جاری تھی جنہوں نے قریباً پانچ ماہ قبل ہماری اور مقامی پولیس کی تفتیش کو فل اسٹاپ لگایا تھا اور نقلی ادویہ بنانے والے شخص کو قتل کر دیا تھا۔

انسپکٹر زبیر کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایبٹ آباد میں تفتیش تسلی بخش طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے..... اور ایک دو نئے کلیو بھی ملے ہیں۔

انسپکٹر سے میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ عمران آگیا۔ وہ اب روانگی کے لیے پوری طرح پر تول چکا تھا۔ وہاں اس کے کسی عزیز کی شادی بھی شیڈول تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج وہ قدرے خوش گوار موڈ میں ہے۔ ایک دو چٹکلے چھوڑنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ''آپ کو یاد ہے چند روز پہلے میں نے آپ سے اپنی ایک درخواست کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں ذکر کیا تھا لیکن بتایا کچھ نہیں تھا۔''

''آپ مذاق تو نہیں اُڑائیں گے؟''

''نہیں۔''

''اور مجھے ابھی نہیں ستائیں گے۔''

''مجھے امید ہے کہ تم کوئی ایسی بات کرو گے بھی نہیں۔''

وہ چند لمحوں کے لیے کسی سوچ میں گم رہنے کے بعد بولا۔ ''ہر بندے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایک چہرہ ایسا ہوتا ہے جو آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتا ہے اور پھر کبھی بھی پوری طرح نکلتا نہیں۔ شاید ماہین کا چہرہ بھی وہی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اسے کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ کاش میں اُس سے ملا ہی نہ ہوتا..... یا پھر بہت پہلے ملا ہوتا جب کوئی دوسرا اس کی زندگی میں نہیں تھا۔''

میں گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ آج ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی ٹھوڑی کھجا کر ہولے سے مسکرایا۔ ''چاچو! میں جانے سے پہلے ایک بار ماہین سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''تو ملو نا..... بلکہ ضرور ملو۔ اس میں کون سی رکاوٹ ہے؟''

''نہیں چاچو، میں ذرا اور طرح ملنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اپنی زندگی کا ایک دن..... ایک پورا دن اُس کے ساتھ گزاروں..... بلکہ وہ اپنا ایک پورا دن مجھے دے دے۔ میں اسے جہاں چاہوں لے جاؤں۔ وہ میرے ساتھ گھومے پھرے..... ہم تفریح کریں، کھائیں پئیں، کھل کر ہنسیں بولیں پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''دیکھیں نا چاچو! پھر تو اُس کی شادی ہو ہی جانی ہے۔ اگر کبھی دوبارہ اس سے ملنا ہوا بھی تو پھر وہ اور طرح کا ہوگا۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ بات کرنا بھی پسند نہ کرے۔ ایک شوہر اور دو تین پیارے پیارے بچے اسے گھیرے

ہوئے ہوں۔"

میں نے دیکھا اُس کی خوب صورت آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی کسی انمول جذبے کے رنگوں میں گندمی نظر آتی تھی۔ میں نے کہا۔ "آج تو قلموں اور کہانیوں جیسی باتیں کررہے ہو۔"

"کہانیاں بھی تو میرے اور آپ جیسے لوگوں سے ہی بنتی ہیں اور ویسے بھی، دیوانوں سی جو نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا۔"

ان لمحوں میں مجھے پھر وہ گفتگو یاد آگئی جو چار پانچ روز پہلے میرے اور ماہین کی خالہ فوزیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس نے ماہین کی کسی خاموش اُلجھن کا ذکر کیا تھا۔ کئی بار یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماہین کی اس کیفیت کی وجہ عمران ہی ہو۔ تاہم ایک بات میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ ماہین بے حد مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ وہ اپنے بڑوں کی مرضی کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے علاوہ حشام کے ساتھ اپنا دیرینہ ساتھ بھی اُسے بے حد عزیز تھا۔

عمران سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھے چلا جارہا تھا، میں نے کہا۔ "میری طرف ایسے کیا دیکھ رہے ہو، جو بات تم کہنا چاہتے ہو، ماہین سے خود کہہ لو۔"

"وہ تو خود ہی کہوں گا۔ لیکن آپ سے اجازت بھی تو ضروری تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ وہ ہر کام آپ سے پوچھ کر کرتی ہے۔ اگر وہ اس بارے میں بھی پوچھے تو میری درخواست آپ کے پیشِ نظر ہونی چاہیے نا۔" وہ پھر مسکرایا۔

اُس کے بھرے بھرے ہونٹ کچھ سانولے سے نظر آرہے تھے۔ مجھے اس کے قریبی دوست ضیا کی بات یاد آئی اس نے ایک روز فون پر مجھے بتایا تھا کہ عمران آج کل بہت سگریٹ پی رہا ہے۔ ضیا کا ایک دوست وکی بھی زبردست قسم کا سگریٹ نوش تھا بلکہ وہ بھی بھی "بھرا ہوا سگریٹ" بھی پیتا تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا تھا کہ کہیں کسی ترنگ میں عمران بھی اس طرف نہ چل پڑے۔ میں نے احتیاطاً ضیا سے کہا تھا کہ وہ اس حوالے سے عمران پر نگاہ رکھے اور وکی سے اپنا میل جول ختم کرے۔

"تمہارے ہونٹوں کی رنگت بتا رہی ہے کہ آج کل بہت اسموکنگ کررہے ہو؟"

"آپ جمع خاطر رکھیے، اس اسموکنگ کا تعلق ماہین وغیرہ سے ہرگز نہیں ہے۔"

"تو پھر کس سے ہے؟"

وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت ناچی، آہ بھر کر بولا۔ "جب سے مہوش حیات کو میرے جانے کا پتا چلا ہے، رو رو کر ہلکان ہورہی ہے۔ کسی پل میری جان نہیں چھوڑتی۔ کہتی ہے مجھے نیلا تھوتھا لادو یا اپنے ساتھ انڈیا لے جاؤ۔ میری عقل گھاس چرنے نہیں گئی کہ اسے اپنے ساتھ انڈیا لے جاؤں اور وہاں اُس کے اور رانی مکرجی کے درمیان یوں پس جاؤں جیسے چکی کے دو پاٹوں میں گندم پستی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے مہوش کے ساتھ کسی جوان ہیروئن کا ذکر کیا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی، یہ رانی مکرجی تو زیادہ عمر کی ہے۔"

"تو کیا آپ مہوش کو کم عمر سمجھتے ہیں۔ کیا ہوگیا ہے چاچو آپ کو؟ وہ تو آپ کے ایج گروپ میں آتی ہے۔"

"بکواس بند کرو، وہ ہماری انڈسٹری کی ہردلعزیز ٹاپ ہیروئن ہے۔"

"لیکن خدا جانتا ہے، میں تو کترینہ، کریشہ اور عالیہ بھٹ جیسی باکی دوشیزہ ہیروئنز سے جان بچاتا پھر رہا ہوں یہ تو پھر مہوش ہے۔ ہونٹ صرف اس لیے کالے کیے ہوئے ہیں کہ تمباکو کی بُو سے وہ بھاگ جائے..... بس اور کچھ نہیں۔"

اس کی باتوں کا چرغا چل نکلا تھا۔ اب اس نے رکنا نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس ٹریننگ سینٹر سے میرے ایک سینئر اسٹوڈنٹ کا فون آگیا۔ میں گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ تاہم دل ہی دل میں یہ بھی سوچتا رہا کہ عمران چلا گیا تو اس کی ان اوٹ پٹانگ باتوں کو مس کروں گا۔

دوسرے روز ماہین کی متوقع کال آئی۔ اُس نے وہی کچھ بتایا جو ایک روز پہلے عمران نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ جذباتی ہورہا تھا اور ایک دن اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ ماہین ذرا اداسی سے بولی۔ "آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری رائے وہی ہوگی جو تمہاری ہے۔"

"تو پھر..... چلی جاتی ہوں۔ دو اچھے دوستوں کی طرح تو مل ہی سکتے ہیں۔"

"حشام سے بات کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو تین چار روز سے کراچی گیا ہوا ہے۔ اتنا مصروف ہے کہ رابطہ بھی نہیں ہو پارہا۔ اس کے ڈیڈ بھی ساتھ ہی ہیں، کوئی کاروباری ڈیل ہے وہاں۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حشام کو بتانے سے کچھ جھجک بھی رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی حشام نے کچھ تنگ

ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ ماہین نے شمالی علاقوں کے سفر کے بارے میں صورتِ حال کو چھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور حشام کو بتادیا تھا کہ اس ٹور میں عمران بھی ان کے ساتھ تھا۔ تاہم ماہین کی اس صاف گوئی کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود حشام نے بہت ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' فون پر ماہین کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔

''مجھے کیا سوچنا ہے۔ سوچنا تو تم کو ہے۔ اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، چند گھنٹوں کی بات ہی ہوگی۔''

''چلیں..... پھر دیکھتی ہوں۔'' وہ اُلجھی اُلجھی سی آواز میں بولی۔

دسمبر یخ بستہ تھا۔ سردی اور دُھند جوبن پر تھی۔ اگلے روز دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ ہلکی سی لرزتی کانپتی دھوپ نکلی۔ تبھی مجھے ماہین کا فون موصول ہوا۔ وہ اور عمران ساتھ تھے۔ ماہین کی گاڑی پر وہ دونوں شالامار باغ پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے جلو پارک اور پھر ایک شاپنگ سینٹر جانا تھا۔ عمران کی طرح ماہین بھی اچھے موڈ میں نظر آتی تھی۔

مجھے خوشی ہوئی کہ اپنی جذباتی ترنگ کے مطابق عمران کچھ وقت ماہین کے ساتھ گزار رہا ہے۔ اگر کوئی واقفِ حال انہیں دیکھ بھی لیتا تو مضائقہ نہیں تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ دونوں پبلک پلیسز پر تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے عمران کا فون آیا۔ وہ چہک رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''آج کا دن بہت یادگار رہا چاچو! میں اسے بہت سنبھال سنبھال کر رکھوں گا۔ ہم نے دریائے راوی کی سیر کی۔ ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں بھاگتے رہے۔ ہم جوائے لینڈ میں بچوں کی طرح جھولے، جھولے، پھر ہم نے جی ٹی روڈ کے ایک چھپر ہوٹل میں بہت مزیدار کھانا کھایا اور ایک فور اسٹار ہوٹل میں چائے پی کر ''میٹرو'' میں شاپنگ کی۔''

''اور اب کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اب ہم جلو پارک میں ہیں۔ ماہین کی گاڑی میں ہی ڈرائیو کر کے یہاں لایا ہوں۔ اب میں لکڑی کے بینچ پر بیٹھا ہوں۔ ماہین میرے لیے اپنی پسند کی آئس کریم لینے کے لیے وہ سامنے اسٹال پر گئی ہوئی ہے۔''

''اتنی سردی میں آئس کریم؟''

''آپ کو بتایا ہے نا کہ آج جو کچھ ہوتا رہا ہے انوکھا ہی ہوتا رہا ہے اور اس انوکھے پن کو دسمبر کی اس دُھند میں لپیٹ کر میں اپنے دل کے سب سے خفیہ خانے میں چھپالوں گا۔ بہت سنبھال کر رکھوں گا۔''

''اچھا اب اس انوکھے پن کو بریک لگاؤ۔ شام ہونے والی ہے، واپس آجاؤ۔''

''دسمبر کے دن کتنے چھوٹے ہوتے ہیں، اس کا پتا مجھے آج چلا ہے۔'' اس نے آہ بھری۔ اسی دوران میں کچھ فاصلے سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ ماہین ہی تھی جو شاید آئس کریم لے کر آرہی تھی۔ ''ٹھیک ہے باس۔'' عمران نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

سات بجے کے قریب میں نے یہ جاننے کے لیے ماہین کو فون کیا کہ وہ گھر پہنچ گئی ہے۔ مجھے اس کا فون بند ملا۔ میں نے عمران کے نمبر پر کال کی۔ وہاں بیل تو جاتی رہی مگر عمران نے فون نہیں اٹھایا۔ دو تین کوششوں کے باوجود جب کال اٹینڈ نہیں ہوئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے پھر ماہین کا نمبر پریس کیا۔ اس کا نمبر بدستور بند جا رہا تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے ماہین کی خالہ فوزیہ کا نمبر ملایا۔ ان کی نقاہت سے بھری ہوئی آواز ابھری۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ماہین گھر آگئی ہے۔

وہ میری آواز پہچان کر بولیں۔ ''تابش! میں خود آپ کو فون کر رہی تھی۔ اندھیرا ہو گیا ہے..... بلکہ سات بج چکے ہیں، وہ ابھی نہیں پہنچی۔ حشام بھی ایک دن پہلے ہی لوٹ

عملی مظاہرہ

زہویلا تریاق

ایک دیوہیکل پہلوان ٹائپ آدمی ایک شراب خانے میں آیا اور بارٹینڈر سے کہنے لگا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک کن کٹے بدمعاش کی ضرورت ہے جو تمہارا پسندیدہ افراد سے نمٹ سکے۔''

''ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ بھی ہے؟'' بارٹینڈر نے پوچھا۔

''تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں عملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر کن کٹے بدمعاش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی قسم کا آدمی فون پر کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ کن کٹے نے کمرے میں جا کر اس شخص کو دبوچا اور کسی احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے جھومتا ہوا واپس آکر کہنے لگا۔

''عملی مظاہرہ پسند آیا؟''

''بہت خوب۔'' بارٹینڈر نے کہا۔ ''مگر نوکری کی اجازت تمہیں باس سے لینی پڑے گی۔''

''باس کہاں ہے؟'' بدمعاش نے پوچھا۔

''جسے تم باہر پھینک آئے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔''

رہا ہے۔ وہ کراچی سے روانہ ہو چکا ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک پہنچ جائے گا۔ وہ سیدھا ماہی سے ملنے ہی آئے گا۔ اگر اسے پتا چلا کہ وہ آپ کے بھتیجے عمران کے ساتھ گئی ہے تو اسے اچھا نہیں لگے گا۔ وہ پہلے ہی آپ لوگوں کے پہاڑی علاقے والے ٹور سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ ابھی وہ فون پر بتا رہا تھا کہ کراچی سے کسی لیڈی ڈریس ڈیزائنر کو ساتھ لا رہا ہے۔ ماہین کے عروسی جوڑے کا ناپ وغیرہ لینے کے لیے..... اصل میں شادی کی تیاری بھی شروع ہو گئی ہے نا۔"

میں نے انہیں تسلی دی۔ ایک بار پھر عمران کے نمبر پر ٹرائی شروع کی۔ ایک دفعہ کال گئی لیکن پھر فون بند ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انجانے اندیشے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ عمران کے دو دوستوں کے فون نمبر بھی میرے پاس تھے۔ انہیں بھی کال کی۔ وہ بھی اس کے بارے میں لاعلم تھے۔ رات نو بجے کے لگ بھگ میں نے پھر ماہین کی خالہ کو فون کیا۔ اس مرتبہ جواب میں ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ یہ ماہین کے چچا ثاقب رشید صاحب تھے۔ ماہین ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ذرا سخت گیر بھی ہیں۔ ان کی سختی واقعی ان کے لب و لہجے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ "آپ تابش صاحب بول رہے ہو؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، آپ غالباً ثاقب صاحب ہیں۔ مجھے ماہین کے بارے میں پوچھنا تھا۔"

"ماہین اس وقت اسپتال میں ہے۔ میں بھی وہیں سے بول رہا ہوں۔"

"کیا ہوا ماہین کو؟" میں بُری طرح چونکا۔

"یہ تو آپ کو پتا ہو گا یا آپ کے اُس منہ بولے بھتیجے کو۔" زہر خند لہجے میں کہا گیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"مزید سمجھنے کے لیے آپ یہاں اسپتال میں تشریف لے آئیں۔" غصیلے لہجے میں جواب آیا اور اسپتال کا ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا گیا۔

ثاقب رشید کے لب و لہجے سے سخت خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ ماہین اسپتال میں تھی تو کیسے پہنچی تھی..... اور عمران..... وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔

میں نے اسی وقت گاڑی نکالی اور جیل روڈ پر واقع اس پرائیویٹ اسپتال میں پہنچ گیا۔ یہاں کا منظر ہی کچھ مختلف نظر آ رہا تھا۔ ماہین کے چچا اور خالہ فوزیہ کے علاوہ ایک دو اور رشتے دار بھی یہاں موجود تھے۔ ثاقب رشید چالیس کے پیٹے میں تھے۔ وہ الیکٹرانکس کا کاروبار کرتے تھے اور اپنی مارکیٹ کے صدر وغیرہ بھی تھے۔ اُن کے بھاری بھرکم چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ فوزیہ بیگم بھی بالکل گم صم نظر آ رہی تھیں۔

میں ماہین کو دیکھنا چاہ رہا تھا مگر ثاقب رشید مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے۔ گمبھیر آواز میں گویا ہوئے۔ "تابش صاحب، آپ اصل بات بتائیں، یہ عمران آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"وہ میرے عزیز دوست کا بیٹا ہے لیکن میرے لیے سگے بھتیجے سے بڑھ کر ہے۔"

"تو جناب، آپ کے اُس سگے بھتیجے نے ماہین کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماہین نے چلتی گاڑی سے کود کر اپنی جان بچائی ہے۔ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔ وہ نیم بے ہوش پڑی ہوئی ہے..... اور آپ کا سگا بھتیجا ماہین کی گاڑی سمیت فرار ہو چکا ہے۔"

میرا دماغ چکرانے لگا۔ یہ میں کیا سن رہا تھا۔ مجھے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ "یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟" میں نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"خود ماہین نے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "کچھ دیر پہلے وہ چند منٹ کے لیے ہوش میں آئی تھی۔ اسی نے ساری حقیقت بتائی ہے۔ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرا رہے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ثاقب صاحب، بچی کا معاملہ ہے۔ کیوں اس کی بدنامی کا اشتہار لگانا چاہ رہے ہیں۔ آپ ذرا تحمل سے کام لیں۔ معاملے کی تہ تک پہنچنے دیں۔ اگر واقعی کسی قسم کا جرم ہوا اور پرچہ کٹوانا ضروری ہوا تو میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"جرم تو ہو چکا ہے جناب..... اور آپ کے بھتیجے نے کیا ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں ہے کہ اُسے بچا لیں گے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ معاملہ کافی بگڑ چکا ہے۔ شاید ابھی آپ کو پتا نہیں چلا۔ ماہین کو اغوا کرنے کی کوشش میں آپ کے بھتیجے صاحب نے ایک ناکے پر دو پولیس والوں کو بھی کچل دیا ہے۔ ان میں سے ایک کی حالت اسپتال میں نازک ہے۔ پرچہ تو اس کے خلاف آل ریڈی درج ہو چکا ہے۔"

میں سناٹے میں تھا۔ میں ماہین کو دیکھنا چاہ رہا تھا مگر ثاقب رشید اور ڈیوٹی ڈاکٹر نے صرف اتنی اجازت دی کہ میں اسے دور سے دیکھ سکوں۔ وہ سفید بستر پر چت لیٹی تھی۔

اس کے سر پر بھاری پٹی تھی۔ گردن پر بھی دو جگہ میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ وہ بالکل بے حرکت تھی۔ کچھ چوٹ کے سبب اور غالباً کچھ ٹرینکولائزرز کے سبب وہ بے ہوش نظر آرہی تھی۔

انسپکٹر زبیر احمد دو روز پہلے ایبٹ آباد سے واپس آچکا تھا۔ میں نے اسے فون کیا اور صورتِ حال پوچھی۔ اسے مکمل تفصیل تو معلوم نہیں تھی تاہم اس نے تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ ''کینال روڈ کے ایک ناکے پر یہ واقعہ ہوا ہے۔ ایک تیز رفتار کار کو روکنے کی کوشش کی گئی تو کار چلانے والے نے کار اہلکاروں پر چڑھا دی۔ پہلے دو اہلکاروں کے زخمی ہونے کی اطلاع تھی، اب تین کی ہے۔ ان میں سے ایک کی حالت جنرل اسپتال میں سیریس بتائی جاتی ہے۔''

''کار کا نمبر وغیرہ نوٹ ہوا؟''

''نہیں جی، کافی دُھند تھی۔ پلیٹ دیکھی نہیں جاسکی۔ کچھ ایسی بات بھی سننے میں آرہی ہے کہ کار کی پلیٹس تھیں ہی نہیں۔''

انسپکٹر زبیر احمد نے کار کا جو ماڈل اور رنگ بتایا وہ ماہین کی کار ہی کا تھا۔ شام سے پہلے مجھے عمران کا جو فون آیا تھا، اس میں بھی عمران نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ماہین کی کار کو ڈرائیو کر کے جلو پارک لایا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں سے واپسی پر بھی وہی کار ڈرائیو کر رہا تھا جو الزام عمران پر لگایا جارہا تھا اس پر تو میں کسی صورت یقین نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ ان دونوں کو پولیس ناکے پر روکنے کی کوشش کی گئی ہو اور کسی غلطی کے سبب پولیس اہلکار گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہوگئے ہوں مگر اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ذہن میں اُبھر رہا تھا کہ اگر ایسا ہی ہوا ہے تو پھر عمران نے ابھی تک مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔

اسی اثنا میں ایک اور بُری خبر اسپتال پہنچی اور اس نے صورتِ حال مزید گمبھیر کردی۔ پتا چلا کہ گاڑی کے نیچے کچلا جانے والا اے ایس آئی زخموں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہو گیا ہے۔ یہ عمران کے لیے بہت مخدوش صورتِ حال تھی۔ بلکہ اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ عمران کے دوستوں میں سے ایک دو کو دھر لیا جاتا۔ میں نے اسپتال ہی سے عمران کے قریبی دوست ضیا کو فون کیا اور اسے صورتِ حال بتانے کے بعد ہدایت کی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دو تین روز کے لیے دائیں بائیں ہو جائے پولیس انہیں پریشان کرسکتی ہے۔

اس کے بعد میں فوراً ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ایس ایس پی جمشید وڑائچ صاحب میرے بہی خواہوں میں سے تھے۔ میں نے کچھ عرصہ اُن کی ماتحتی میں بھی کام کیا تھا۔ وہ اپنے آفس میں مل گئے۔ ایک اہلکار کی ناگہانی موت نے انہیں بھی ملول کر رکھا تھا۔ میرے پہنچتے ساتھ ہی انہوں نے جو تازہ اطلاع مجھے دی، وہ یہ تھی کہ مطلوبہ گاڑی کا پتا چل گیا ہے۔ وہ بولے۔ ''گاڑی نشاط ہاؤسنگ سوسائٹی کی ایک ویران سڑک پر کھڑی ملی ہے۔ اس کی جانچ کی جارہی ہے۔'' اس کے بعد وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ جیسے جاننا چاہ رہے ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ یہ بات تو وہ جان ہی چکے تھے کہ اس واردات میں جس نوجوان کا نام لیا جارہا ہے وہ میرا قریبی ہے۔

میں نے کہا۔ ''جمشید صاحب! میں یہاں کسی کے لیے فیور مانگنے نہیں آیا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایف آئی آر میں جلدی نہ کی جائے.....''

''ایف آئی آر تو پہلے ہی کٹ چکی ہے۔ لیکن اب اس میں قتل اور اغوا کی دفعات شامل کرتا ہوں گی۔ لڑکی کے لواحقین نے جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق لڑکی ماہین کو اس نوجوان عمران نے اغوا کیا ہے.....''

''میں یہی عرض کرنا چاہ رہا ہوں جی۔ ابھی ہم نے براہِ راست لڑکی کا بیان نہیں سنا ہے۔ اُس کی زبانی یہ سب سننا ضروری ہے۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں دفعات شامل کرلیں۔''

''ابھی اُس کی حالت بیان دینے کے قابل نہیں ہے تابش۔''

''تو چند گھنٹے انتظار کر لیتے ہیں جی..... یہ ملزم کے لیے اب زندگی موت کا سوال بن گیا ہے۔''

میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ جمشید صاحب کی وسیع ٹیبل پر رکھے ایک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر بات سنتے رہے اور اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ پھر فون رکھ کر انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تابش! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گاڑی کی ایک سیٹ کے نیچے سے سو گرام کے قریب چرس بھی ملی ہے۔ لگتا ہے کہ گاڑی چلانے والا نشے میں بھی تھا۔ اس کے علاوہ لڑکی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اور خون کے کچھ دھبے بھی نظر آئے ہیں۔''

کمرے میں کچھ دیر تک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ تب میں نے کہا۔ ''جمشید صاحب! یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمارا ایک ساتھی جان سے گیا ہے اور دو

زخمی ہوئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بچی بھائیوں کا غم و غصہ ایک قدرتی بات ہے....."

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ چرس وغیرہ خود تفتیشی انسپکٹر نے ڈالی ہے۔ یہ ہو بھی سکتا ہے، لیکن باقی کے شواہد بھی تو کچھ کم سنگین نہیں ہیں۔ گاڑی کی نمبر پلیٹس نہیں ہیں۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ چکا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ لڑکی چلتی گاڑی سے کودی ہے....."

"اسی لیے تو گزارش کر رہا ہوں جی کہ جتنی جلدی ممکن ہو لڑکی کا بیان قلم بند کیا جائے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لڑکی ماہین کے لواحقین اس کا بیان دلوانے سے کنی کترا رہے ہیں۔"

دوپہر سے کچھ دیر پہلے ہم، یعنی میں اور جمشید وڑائچ صاحب، تفتیشی انسپکٹر کے ساتھ ماہین کے گھر پہنچے۔ اطلاع کے مطابق اب اس کی طبیعت سنبھل چکی تھی اور وہ بیان کے قابل تھی۔ ہم ماہین کا بیان تنہائی میں لینا چاہتے تھے مگر وہاں موجود ماہین کے چچا ثاقب رشید نے کہا کہ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔ اکیلے میں بیان نہیں دے سکے گی۔ وہاں پر ماہین کے ایک خالو اور ایک ماموں زاد بھی پائے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی تائید کی کہ ماہین بہت خوف زدہ ہے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ہم ابھی اسے بیان دینے پر مجبور ہی نہ کریں۔

بہرحال ہم ماہین کے چچا ثاقب کی موجودگی میں ماہین کے پاس پہنچے۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ سر پر بینڈیج بھی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ پھر میری طرف سیدھا دیکھنے کے بجائے اس نے چہرہ ذرا سا پھیر لیا۔ کیا واقعی عمران کا کوئی دوسرا روپ بھی تھا جو اب میرے سامنے آ رہا ہے؟ یہ سوال ایک کراہ کی طرح میرے اندر سے ابھرا۔

ایس ایس پی جمشید کے علاوہ میں نے بھی ماہین کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ وہ بلا کسی اندیشے اور دباؤ کے بے خوف ہو کر اپنا بیان لکھوائے۔

ماہین نے کچھ بولنا چاہا مگر ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ "بولو بیٹی بولو۔" اس کے چچا ثاقب نے اس کی ہمت بندھائی۔ "اس لوفر نے کس بہانے تمہیں اپنے پاس بلایا تھا؟"

کوشش کے باوجود ماہین کچھ بول نہ سکی۔ اس کا چہرہ مزید زرد ہو گیا تھا۔ اس کے چچا ثاقب نے دو تین بار کہا کہ وہ اپنا بیان لکھوائے۔ مگر جب وہ چند بے ربط الفاظ کے علاوہ کچھ نہ بول پائی تو ثاقب رشید نے کہا۔ "اس بدمعاش کے اصل روپ سے ماہین آگاہ نہیں تھی۔ اُس نے فون پر ماہین کو بتایا کہ وہ دو تین روز میں واپس انڈیا جا رہا ہے۔ لاہور کی قابلِ دید جگہوں کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ ماہین اپنی گاڑی پر اسے تھوڑا سا گھما دے۔ یہ نادان اسے اپنا مخلص دوست سمجھتی تھی۔ اس کے کہنے پر چلی گئی۔ اپنی گاڑی پر اسے گھماتی رہی۔ اِسے اُس بدنیت کے ارادوں کا پتا نہیں تھا....."

اس مرحلے پر میں نے ثاقب رشید کو ٹوکا۔ میں نے ماہین سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ماہین! آپ کے انکل جو کچھ کہہ رہے ہیں آپ اس سے اتفاق کرتی ہیں؟"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ماہین نے بڑے کرب سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چچا کی بات کی تائید کر رہی تھی۔ ثاقب رشید نے ماہین کا کندھا تھامتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ بیٹا! جب تمہاری گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ویران سڑک پر مڑا تو تم نے کیا کہا؟"

ایک دلدوز ہچکی سی ماہین کے سینے سے اُبھری۔ اس نے بمشکل کہا۔ "میں نے..... اُسے..... میں نے اُسے گاڑی..... روکنے کو کہا۔"

"مگر اس نے گاڑی نہیں روکی۔ دروازے اندر سے لاک کر دیے۔ رفتار بھی ایک دم تیز کر دی....." ثاقب رشید نے جیسے ماہین کی بات مکمل کی اور سوالیہ نظروں سے ماہین کو دیکھا۔ ہماری سوالیہ نظریں بھی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ماہین نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو اس کے رخساروں کی طرف رینگ گئے۔ آج میں جس ماہین کو دیکھ رہا تھا، وہ اُس ماہین سے بہت مختلف تھی۔ جو اپنے اندر بلا کا اعتماد رکھتی تھی اور جس کی چہکاریں ساعتوں میں رس گھولتی تھیں۔

اگلے چند منٹ میں ثاقب رشید اور انسپکٹر عاقل کے سوالات کے ٹوٹے پھوٹے مختصر جوابات سے ہمیں جو کچھ معلوم ہوا وہ میرے لیے بہت تحیر خیز تھا..... اس گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شام سے تھوڑی دیر پہلے عمران کے رویے میں یکا یک تبدیلی رونما ہوئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دہرا روپ رکھتا ہے۔ اُس نے ماہین کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ ماہین اس کے رویے سے ششدر تھی۔ اس نے اپنی ہمت طاقت کے مطابق عمران کے خلاف مزاحمت کی اور جب پانی سر سے گزرنے لگا تو اس نے ایک موڑ پر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔

بیان دینے کے بعد ماہین ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے چچا ثاقب رشید اور خالو امتیاز احمد نے اسے بمشکل چپ کرایا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میں اور جمشید صاحب، تفتیشی افسر سمیت کمرے سے باہر آ گئے۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حقیقت وہی ہے جو ماہین بتا رہی ہے۔ ابھی کمرے میں ہونے والی گفتگو پر اعتبار کیا جاتا تو پھر تو عمران نہ صرف اغوا کا مرتکب ہوا تھا بلکہ اس سے ایک سرکاری اہلکار کا قتل بھی سرزد ہو چکا تھا۔ اس واقعے نے میڈیا پر بھی بہت "ہائپ" پکڑ لی تھی۔ اتفاقاً دو ہفتے پہلے اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا جس میں ایک امیر زادے نے پولیس کے روکنے پر اپنی لینڈ کروزر جیپ ایک بدنصیب ہیڈ کانسٹیبل پر چڑھا دی تھی اور اس بے چارے نے موقع پر ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔ اب میڈیا پر شور بپا تھا کہ اس تازہ واردات کے مجرم کو بھی پکڑا جائے اور قرار واقعی سزا دی جائے۔

ابھی ہم وہیں تھے کہ ماہین کا ہونے والا شوہر حشام بھی وہاں آ گیا۔ ان سارے واقعات کی واضح برہمی اس کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مکمل بے رخی برتی اور بس ایک دو فقروں کا تبادلہ کر کے ماہین کے چچا ثاقب رشید سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

ماہین کے گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ماہین کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ تازہ رنگ و روغن کی باس تھی۔ ایک میز پر شادی کارڈز کے کچھ نمونے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ اطلاع یہی تھی کہ اس مہینے ماہین رخصت ہو کر حشام کے گھر جانے والی ہے۔ اب اس نئی ابتلا کی وجہ سے بہت کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔

سکتہ زدہ سی ماہین کو تسلی تشفی دے کر میں سینئر ایس پی جمشید صاحب کے ساتھ واپس آ گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر عمران کی طرف سے تھی۔ اس نے ابھی تک رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟

میری یہ تشویش رات ایک بجے کے لگ بھگ دور ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ہر چینل پر یہ خبر مرچ مسالے کے ساتھ موجود تھی۔ جاں بحق ہونے والے پولیس اہلکار کے اشک بار لواحقین کو دکھایا جا رہا تھا۔ مجرم کو قرار واقعی سزا کی اپیلیں ہو رہی تھیں۔ خبروں میں واقعے کی سی سی ٹی وی فوٹیج کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ حالانکہ میری اطلاع کے مطابق پولیس ناکے کے قریب بھی ایک کیمرا موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر متعلقہ پولیس اسٹیشن فون کیا اور ایس ایچ او سے فوٹیج کا پوچھا۔ "نہیں جناب!" قدرے بے رخی سے جواب ملا۔ "وہاں دو کیمرے تھے۔ ایک تو ایک مہینے سے بند پڑا تھا۔ دوسرے میں بھی فالٹ ٹریس ہوا ہے۔"

"آگے کسی کیمرے کا ریکارڈ ملا ہے؟"

"جی ہاں، سلیم احمد کو مارنے کے بعد مجرم جی ٹی روڈ کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔ آگے دھند بہت زیادہ تھی۔ مزید ٹریسنگ ابھی تک نہیں ہوئی۔" (سلیم احمد وہی اے ایس آئی تھا جس کی موت واقع ہوئی تھی) میں نے جھلا کر فون بند کر دیا۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فوٹیج واقعی نہیں ملی یا پھر اسے چھپایا جا رہا ہے۔

میں نے فون صوفے پر پھینکا ہی تھا کہ وہ پھر بول اٹھا۔ میں نے لپک کر اٹھایا۔ عمران کا نمبر دیکھ کر دھڑکن سرپٹ ہو گئی۔ "ہیلو عمران کہاں ہو؟"

"مصیبت میں ہوں چاچو جان! چارجنگ بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ لمبی بات نہیں کر سکتا۔"

"ہوا کیا تھا پولیس ناکے پر..... مجھے جلدی بتاؤ۔"

"وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس کی آواز شکستہ تھی۔ "ناکے پر ایک پولیس والا بالکل اچانک ہمارے سامنے آ گیا تھا، بلکہ گر گیا تھا۔ میں نے اُسے بچانے کے لیے تیزی سے گاڑی موڑی، مگر وہ ٹائروں کے نیچے کچلا گیا۔ اس کے بعد گاڑی بُری طرح لہرا گئی تھی۔ اس نے دو پولیس اہلکاروں کو زخمی بھی کیا۔ اس کے بعد ہم پر ناکے سے دو فائر کیے گئے۔"

"تم ناکے پر رکے کیوں نہیں؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

"اس کی بھی وجہ تھی۔ چارجنگ بڑی کم ہے۔ فون بند ہو جائے گا۔ پھر بتاؤں گا۔ ناکے سے پولیس کی گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ میں اس معاملے میں ماہین کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ آگے جا کر میں نے جلدی سے اسے اتار دیا۔ خود جی ٹی روڈ کی طرف نکل گیا۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ پولیس سے پیچھا چھوٹ گیا ہے مگر کچھ آگے جا کر پھر ایک ناکے پر مجھے روکنے کی کوشش کی گئی۔"

"اب کہاں ہو تم؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"کچھ پتا نہیں ہے۔ قریباً آدھ گھنٹا گاڑی بھگانے کے بعد میں نے اسے کسی ویران ہاؤسنگ سوسائٹی میں چھوڑ دیا۔ ایک دیہاتی سے موٹر سائیکل پر لفٹ لے کر کچھ آگے

گیا۔ اب ایک گھر میں چھپا ہوا ہوں۔ کسی بڑے مجاور یا پیر وغیرہ کا گھر لگتا ہے۔ دیوار پھاند کر اندر آیا ہوں۔ اوپر والی منزل پر کوئی موجود ہے شاید۔ پولیس والے بھی آس پاس ہی ہیں۔ فی الحال نکل نہیں سکتا۔"

"کچھ اندازہ نہیں کہ لاہور سے کس جانب نکلے تھے اور کتنی دور ہو؟"

"بتایا ہے نا کہ آدھ گھنٹا سے زیادہ گاڑی چلائی ہے اور رخ تو شاید شمال کی طرف ہی تھا۔ جہاں چھپا ہوا ہوں وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر کوئی خانقاہ یا مزار وغیرہ بھی ہے۔ وہاں سے "حق ہُو" کی آوازیں آرہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو عمران، کام پہلے ہی بہت خراب ہو چکا ہے۔ اب کسی سے بھی کوئی پنگا نہیں لینا، خاص طور سے پولیس کے ساتھ۔ پولیس اہلکار کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

وہ ایک دم چپ سا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس والے کے جانبر نہ ہونے کی اطلاع اسے مجھ سے ہی ملی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، فون بند ہو گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ چار جنگ ختم ہو گئی تھی۔

میں اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ عمران جونیئر کو لاہور کے سوا ارد گرد کے علاقے کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ فی الوقت بتانے سے قاصر تھا کہ کہاں ہے۔ ہاں اس کی فون کال کی بنیاد پر لوکیشن ڈھونڈنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی حیرانی تھی کہ ابھی تک لاہور پولیس کو یہ پتا کیوں نہیں چلا کہ لاہور سے تیس چالیس میل دور کسی علاقے کی پولیس مفرور عمران کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں نے گوجرانوالا اور شیخوپورہ وغیرہ میں اپنے ہرکاروں کو فون کیے اور ان سے اس بارے میں جاننا چاہا مگر کوئی ٹھوس اطلاع سامنے نہیں آسکی۔ میں نے انسپکٹر زبیر اور انسپکٹر رائے کو ضروری ہدایات دیں اور انہیں یہ معلوم کرنے کو کہا کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں عمران خود کو پولیس کے گھیرے میں محسوس کر رہا ہے۔

☆☆☆

اگلے قریباً 72 گھنٹے سخت تشویش کے تھے۔ سوشل میڈیا اور مین اسٹریم میڈیا پر اے ایس آئی سلیم احمد کا قتل بہت ہائپ پکڑ چکا تھا۔ مجرم کو عبرت ناک سزا دینے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ عمران کے حوالے سے میں سخت الجھن میں تھا۔ اس سے دوبارہ رابطہ نہیں ہوا تھا پھر اس نے حادثے کے سلسلے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ اُس بیان سے بالکل مختلف تھا جو ماہین اور اس کے اہل خانہ دے رہے تھے۔ تیسرے دن پھر دو فون کالز ایسی آئیں جنہوں نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پہلی کال ماہین کے سخت گیر چچا ثاقب رشید کی طرف سے تھی۔ ثاقب رشید اپنی مارکیٹ کا صدر تھا اور گھن گرج سے بولتا تھا۔ اس نے کہا۔

"نابش صاحب، اگر تمہارا خیال ہے کہ اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر بھتیجے کو بچا لو گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ اسے اس کے کیے کی سزا مل کے رہے گی۔ اگر آپ جناب نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے تو اس سے آپ کے لیے بھی مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"تمیز سے بات کرو ثاقب رشید، یہ چھپانے والی بات کر کے تم ایک ذمے دار سرکاری اہلکار پر الزام لگا رہے ہو۔"

"الزام اس لیے لگا رہے ہیں کہ تم نے خود بتایا ہے کہ اس نے کسی جگہ سے تمہارے ساتھ رابطہ کیا ہے۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ اس نے صرف ایک بار رابطہ کیا ہے لیکن اسے خود بھی معلوم نہیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ ارد گرد کی پولیس بھی اس کی "فون لوکیشن" نہیں ڈھونڈ سکی۔"

ثاقب بولا۔ "کب تک بچے گا۔ اس نے ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہ تو شکر ہے اوپر والے کا۔ ہمارا داماد فرشتہ صفت ہے۔ ورنہ ہماری بچی کی شادی والا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہوتا۔ اُس بدبخت نے عین شادی کے دنوں میں اپنا یہ گندا کھیل کھیلا ہے۔"

"دیکھو ثاقب! تم زبان سنبھال کر بات کرو۔ وہ مجرم نہیں صرف ملزم ہے اور ملزم بھی صرف اتنا کہ حادثاتی طور پر ایک اہلکار اس کی گاڑی کے نیچے آیا ہے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے کسی کو دھوکے سے بلایا ہے اور نہ اغوا کیا ہے اور یہ بات تم لوگ بھی جانتے ہو۔"

"ان باتوں کا پتا تو اب عدالت میں چلے گا۔" ثاقب نے آتشیں لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کال کے دوران میں ہی بیپ کی آواز سنائی دیتی رہی تھی۔ یہ ایک دوسری کال تھی جو ایک ایجنسی کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے "کال بیک" کی۔ یہ خفیہ ایجنسی کا افسر تھا جو پہلے بھی ایک بار عمران کے بارے میں بات کر چکا تھا۔ اس نے شائستہ لہجے میں مگر کچھ سخت باتیں کہیں۔ اس نے کہا کہ ابھی یہ خبر عام نہیں ہوئی کہ عمران انڈیا سے آیا ہے اور اس کے ویزے کی میعاد بڑھائی گئی ہے وغیرہ

وغیرہ۔ یہ خبریں پھیل گئیں تو شکوک وشبہات اور بڑھ جائیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی گرفتاری دے دے، اور جو جرم ہوا ہے، اس کی سزا پائے۔

اگلا دن میرے لیے بے حد حیرت ناک تھا۔ میں گھر میں تھا۔ میری ملازمہ کرن جو اپنے نام کے برعکس کافی فربہ اندام تھی، ڈگمگاتی ہوئی اندر آئی اور بولی کہ کوئی برقع پوش عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ وہ عورت کے بجائے لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ کرن کے جانے کے بعد جب بند کمرے میں اس نے اپنا نقاب اٹھایا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں خود ماہین تھی۔ اس کے سر کی پٹی تو اتر چکی تھی مگر گردن پر ابھی تک دو جگہ بینڈیج موجود تھی۔ اس کا رنگ ہلدی تھا اور خوب صورت آنکھوں میں نقاہت اتری ہوئی تھی۔

''ماہین! تم یہاں؟''

وہ سسک کر میرے بازو سے لگ گئی اور سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔ میں نے اسے پچکارا، دلاسا دیا۔ تھوڑا پانی پلا کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''انکل تابش! میں چھپا تا قب اور ماموں سے چھپ کر یہاں آئی ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''تو تم نے فون کر لیا ہوتا۔''

''میرا فون تو ابھی تک پولیس والوں کے پاس ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں پھر نمی آ گئی۔

میں نے اُسے دوبارہ دلاسا دیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھ کر انکشاف کیا۔ ''انکل تابش! جب ناکے پر پولیس والا نیچے آ کر کچلا گیا تب گاڑی عمران نہیں چلا رہا تھا، میں چلا رہی تھی۔ اگر کوئی مجرم ہے تو میں ہوں۔ وہ بالکل بے قصور ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ بولی۔ ''انکل..... اُس نے صرف مجھے بچانے کے لیے یہ الزام اپنے سر لیا۔ اسے پتا تھا کہ میری شادی کی تیاری ہو رہی ہے اور بس چند دن بعد شادی ہے۔ وہ مجھے مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ شاید..... وہ شاید کسی کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ بالکل اور طرح کا بندہ ہے انکل.....'' وہ پھر سسک پڑی۔

میں نے حیرت کے دھچکے سے سنبھل کر کہا۔ ''لیکن پتا تو یہ چل رہا ہے کہ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کیا..... اس نے حادثے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی؟''

''ہاں انکل! دراصل ہمیں اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ دو بندے زخمی ہوئے ہیں مگر تیسرا جو گاڑی کے نیچے آیا ہے، بچ نہیں پایا ہوگا۔ وہ دور تک گاڑی کے نیچے ہی گھسٹ گیا تھا۔ ہم پر دو گولیاں بھی چلائی گئیں۔ جلد ہی ہمیں یہ پتا بھی چل گیا کہ پولیس پیچھے لگ گئی ہے۔ تب درختوں کے درمیان ایک موڑ پر عمران نے گاڑی روکنے کا کہا۔ میں نے بریک لگائے۔ وہ مجھے باہر نکال کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ وہ مجھے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ جب میں نہیں مانی تو وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے مجھے زبردستی باہر دھکا دے دیا۔ یہاں تاریکی اور دُھند تھی۔ ڈھلوان کے سبب میں لڑھکتی اور گر گئی۔ میرا سر درخت سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا جو آخری آواز میں نے سنی، وہ فاصلے پر پولیس کاروں کے سائرنوں کی تھی۔''

یہ مناظر بیان کرتے ہوئے ماہین کے زرد چہرے پر کرب کے سائے لہرانے لگے تھے۔

''لیکن یہ ہوا کیسے ماہین! تم اچھی بھلی ڈرائیونگ کرتی ہو..... تم نے گاڑی پولیس والوں پر کیسے چڑھا دی..... اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ تم دونوں ناکے پر رکے نہیں۔''

''اس کی وجہ بھی پولیس کے لوگ ہی ہیں انکل! ہم جلو پارک سے نکلے تو اندھیرا ہو رہا تھا۔ پارکنگ کی جگہ پر صرف ہماری گاڑی ہی موجود تھی۔ ہماری گاڑی کے پیچھے ایک ہائی ایکس کھڑی تھی۔ ہم اندر بیٹھنے لگے تو تین پولیس والے آ گئے۔ ایک شاید سب انسپکٹر تھا اور وردی میں تھا، دو سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کے ساتھ چلنا ہوگا کیونکہ انہیں شبہ ہے کہ یہ گاڑی آج دوپہر ایک واردات میں استعمال ہوئی ہے۔ عمران اُن سے بحث کرنے لگا، میں اس دوران میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور دروازے اندر سے لاک کر لیے تھے۔ عمران نے روکنے والوں سے کہا کہ ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ گاڑی صبح سے ہمارے استعمال میں ہے۔ پولیس والا بولا کہ غلط فہمی ہے تو تھانے پہنچ کر دور ہو جائے گی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، شاید رشوت کھانا چاہتے تھے۔ ہم سے الٹے سیدھے سوال بھی پوچھ رہے تھے۔ عمران آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا مگر انہوں نے فون نہیں کرنے دیا۔ فون چھیننے کی کوشش کی تو بات بڑھ گئی۔ انہوں نے گالیاں دیں۔ عمران نے تھانیدار کو دھکا دیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف آیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ عمران اندر آ گیا اور اس نے مجھے نکلنے کو کہا۔

پیچھے پولیس والوں کی گاڑی تھی، سامنے معمولی سی باڑ تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم تیزی سے سڑک پر آگئے۔ ہمیں یہ بھی پتا نہیں کہ وہ لوگ پیچھے آئے یا نہیں اور اگر آئے تو کتنی دور تھے۔ اچانک آگے بھی پولیس ناکا نظر آیا۔ ہم نے رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ پتا نہیں کہ اب یہ غلطی تھی یا نہیں تھی....." اس کی آواز بھرا گئی۔

اُس نے سر جھکایا اور آنسو اس کے شفاف زرد رخساروں پر ریگ گئے۔ گال کا ڈمپل بھی تر نظر آنے لگا۔

"چلو، یہ غلطی تو تم سے ہوگئی۔ مگر پولیس والوں پر گاڑی چڑھا دینا.....؟" میں نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

ماہین نے ایک دم سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ "انکل! میں یہی بات آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا اور اگر تھا تو بہت کم۔ جب ہم ناکا کراس کر رہے تھے ایک پولیس والا بالکل اچانک گاڑی کے سامنے آگیا، بلکہ گر گیا۔ وہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ میں نے آخری کوشش کی مگر گاڑی نے اسے کچل دیا۔ میری بدحواسی کے سبب گاڑی لہرا کر سڑک کے بائیں کنارے چلی گئی۔ دو اور پولیس اہلکار بھی اس سے ٹکرائے اور زخمی ہوئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں دو کیمرے بھی موجود تھے۔ آپ..... پلیز آپ ان کی فوٹیج نکال کر دیکھیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ اس میں میرا قصور کتنا تھا اور کتنا نہیں تھا۔"

"سی سی ٹی وی فوٹیج نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ روہانسی ہوگئی۔ "انکل ثاقب! آپ تو جانتے ہیں ایسے سارے جھنجھٹ..... مجھے یقین ہے اپنے پپی بھائی کے لیے ان لوگوں نے فوٹیج چھپائی ہوگی۔ وہ جو گاڑی میں چرس وغیرہ کی بات ہو رہی ہے، وہ بھی سراسر جھوٹ ہے انکل۔ عمران اسموکنگ ضرور کرتا رہا ہے مگر میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں، اس نے کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔"

"ماہین! گاڑی میں کچھ خون کے دھبے اور ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بھی ملی ہیں۔"

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ عمران نے مجھے زبردستی گاڑی سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس میں تھوڑی سی کھینچا تانی بھی ہوئی۔ یہ اس کلائی پر بھی زخم آئے۔" اس نے کلائی دکھائی۔

ماہین جو کچھ بتا رہی تھی، وہ میرے ذہن میں موجود خدشات کو ابھار رہا تھا۔ فوٹیج کے حوالے سے بھی مجھے پختہ شک تھا۔ ماہین اب عمران کے بارے میں سخت پریشان تھی۔ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اسے کیا بتاتا جب خود میں بھی بے خبر تھا۔

وہ بولی۔ "انکل ثاقب میرے دل پر بہت زیادہ بوجھ ہے۔ میں سچ بولنا چاہتی ہوں لیکن....." اس کی آواز پھر بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس پر اپنے چچا ثاقب اور دیگر بڑوں کی طرف سے زبردست دباؤ تھا۔ یہ دباؤ میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا جب اس کا بیان قلم بند کیا گیا تھا۔ بات بالکل واضح تھی۔ میڈیا پر شور برپا تھا اور صورتِ حال ایسی تھی کہ ماہین کے اہلِ خانہ حقیقت چھپانے پر مجبور تھے۔ وہ حقیقت ظاہر کرتے تو کئی سوالات پیدا ہو جاتے۔ مثلاً ماہین، جس کی دو ہفتے بعد شادی تھی ایک فیئر لڑکے کے ساتھ کیوں گھومتی پھر رہی تھی؟ وہ رات کے وقت ایک ویران جگہ پر کیوں موجود تھے؟ گاڑی میں موجود نشہ کس کے استعمال میں تھا؟ ماہین نے ناکے پر گاڑی کیوں نہ روکی، کیوں بھاگنے کی کوشش میں آن ڈیوٹی سرکاری اہلکار کی جان لے لی؟ یہ بڑے سنگین سوال تھے۔ نہ صرف ماہین کی شادی اور شادی کی تیاریاں خاک میں مل جاتیں بلکہ وہ جیل جا سکتی تھی اور پوری زندگی کا روگ پلے پڑ سکتا تھا اور بات صرف ماہین تک ہی محدود نہ رہتی پورے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ اس کا حل اُس کے بڑوں نے یہی نکالا تھا کہ سارا ملبا عمران پر ڈال دیا جائے اور واقعے کو وہ رنگ دے دیا جائے جس سے ماہین پر کوئی حرف نہ آئے۔ اس واقعے پر یہ جھوٹا رنگ بڑی اچھی طرح اس لیے بھی چڑھ گیا تھا کہ ماہین زخمی تھی اور دوسرے یہ کہ بعد ازاں جی ٹی روڈ کے ایک پولیس ناکے پر ماہین کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر عمران کی شناخت ہوئی تھی۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ماہین میرا ہاتھ تھام کر کراہی۔ "انکل! بیان دیتے ہوئے میں یہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر میرے گھر والوں نے مجبور کر دیا۔ خاص طور سے انکل ثاقب نے۔ وہ بہت زیادہ بدحواس تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے پولیس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو وہ مجھے گولی مار دیں گے اور اپنی جان بھی لے لیں گے۔ انہوں نے نیویارک میں آپی شاہین سے بھی میری بات وڈیو لنک پر کرائی۔ آپی نے مجھے اپنے سر کی قسم دی کہ میں وہی کہوں جو میرے بڑے کہہ رہے ہیں..... آپ جانتے ہیں، آپی کی کسی بات کو ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ میں اُن کے

کہنے پر جان بھی دے سکتی ہوں۔'' اس کا گلا رُندھ گیا۔

وقتِ رخصت وہ کہنے لگی۔ ''انکل تابش! جو کچھ ہوا، نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عمران نے میری خاطر ایک بڑا الزام اپنے سر لیا ہے۔ میڈیا پر اسے قاتل کہا جا رہا ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے..... بلکہ..... کوئی بھی قاتل نہیں ہے..... اگر اس حادثے کی فوٹیج مل جائیں تو سب کچھ کلیئر ہو جائے گا۔ وہ سراسر ایک حادثہ تھا۔''

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں اس سلسلے میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ فوٹیج کا کھوج لگ جائے۔''

وہ اس سارے واقعے کی وجہ سے بے حد افسردہ تھی۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس کی شادی والا معاملہ کچھ دنوں یا ہفتوں کے لیے ٹل گیا ہے۔ ماہین کے جانے کے فوراً بعد میں نے انسپکٹر زبیر کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ پتا کرے، بدھ کے روز جلو پارک کے علاقے میں، شام کو وہ کون سے اہلکار تھے جنہوں نے عمران اور ماہین کو ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ زبیر سے مجھے یہ پتا بھی چلا کہ متعلقہ پولیس نے عمران کے دو دوستوں ضیا اور وکی کو پکڑا ہے اور ان کی سفارش آنے سے پہلے ہی ان سے کچھ مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اب جمشید صاحب نے اس معاملے میں مداخلت کی ہے۔

اسی روز شام سات بجے کے لگ بھگ ایک بار پھر وہ کال آ گئی جس کا انتظار میں بے حد شدت سے کر رہا تھا۔ یہ عمران کی کال تھی۔ وہ حسبِ سابق آواز دبا کر بول رہا تھا۔ میں چھوٹتے ہی اس پر برس پڑا۔ ''ہم پر قیامت گزر رہی ہے، تم نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

وہ سرگوشی جیسے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو بتایا تو تھا میں یہاں پھنسا ہوا ہوں اور میرے فون کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ آج خوش قسمتی سے ایک بوسیدہ الماری کے اندر رکھے کاٹھ کباڑ میں ایک چارجر مل گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے فون کرنے کے قابل ہوا ہوں۔''

''تمہارے ساتھ معاملہ کیا ہے۔ 72 گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ کہاں پھنسے ہوئے ہو تم؟''

''چاچو جانی، آپ کو بتایا تو تھا یہ کسی پیر مخدوم صاحب کا گھر ہے۔ پاس ہی کوئی مزار بھی ہے جسے پرانا دربار کہا جاتا ہے۔ میں یہاں ایک درمیانے سائز کے کمرے میں ہوں، یہ ایک اسٹور نما جگہ ہے یہاں باتھ روم میں بھی لنگر خانے کی چیزیں پڑی ہوئی ہیں، اب آپ پوچھیں گے کہ میں یہاں سے نکلتا کیوں نہیں ہوں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے کسی بھی چھوٹے بڑے پنگے سے منع کیا ہوا ہے۔ خاص طور پر پولیس والوں کے ساتھ۔''

''تو یہاں پولیس ہے؟''

''جی جناب! ایک پولیس موبائل 24 گھنٹے گھر کے عین سامنے کھڑی رہتی ہے۔ پولیس اہلکار بھی گھر کے اردگرد موجود ہیں۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ میری میزبانی کے لیے ہیں مگر پھر پتا چلا کہ یہ یہاں مخدوم صاحب کی ڈیوٹی پر ہیں۔ کیونکہ جب میں یہاں گھسا تھا یہاں کوئی پہرا نہیں تھا۔ یہ سیکیورٹی انتظام مخدوم صاحب کی آمد کے بعد ہوا اور مسلسل جاری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں سے نکلتے ہی پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں گا۔''

''اب تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ ہو کہاں پر؟''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ اب اگر آپ کا حکم ہو تو رسک لے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے بھی لنگر کے سوکھے نان، پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہوں، حشر ہو گیا ہے۔''

''نہیں..... یہ ٹھیک نہیں ہوگا..... ایسا کرتے ہیں کہ تم دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ کال کرو، میں تمہاری لوکیشن ٹریس کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جیسا آپ کہتے ہیں مگر ذرا جلدی کیجیے گا۔ پھر مخدوم صاحب ایک ساتھ والے کمرے میں تشریف لے آئیں گے اور میں بات نہیں کر سکوں گا۔''

عمران نے فون بند کیا تو میں نے اپنے مہربان ایس ایس پی جمشید صاحب کو کال کی اور ان سے کہا کہ وہ اپنے طور پر موبائل فون کی لوکیشن ٹریس کرانے کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے میں نے گوجرانوالا اور شیخوپورہ پولیس سے یہ درخواست کی تھی اور کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

جمشید صاحب سے بات کرنے کے بعد میں عمران کی کال کا انتظار کرنے لگا اور وہ فوراً ہی آ گئی۔ وہ اسی طرح آواز دبا کر بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے مخدوم صاحب کا جغرافیہ پوچھا تو وہ بولا۔ ''بڑا دبنگ سا بندہ ہے۔ عمر پینتالیس کے قریب رہی ہو گی۔ گھنی داڑھی، بھاری مونچھیں اور کندھوں تک جاتے ہوئے بال ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں بلوچستان کی طرف کا ہے مگر بندہ مگ نہیں لگتا۔''

''وہ کیوں؟''

''اس نے دو بیویاں کر رکھی ہیں اور دونوں خوب

صورت ہیں۔"

"تو کیا دو بیویاں رکھنا گناہ ہے؟"

"لیکن دونوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اور سونا گناہ ہے بلکہ حرام ہے۔" عمران سختی خیز لہجے میں بولا۔

"اوہ۔" میں نے ہونٹ سکیڑے۔ "مطلب یہ کہ عیاش ٹائپ شخص ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ میں جس کمرے میں پھنسا ہوا ہوں وہاں سے مخدوم صاحب کا بیڈ روم دور نہیں ہے۔ رات کے وقت بیڈ روم سے اُبھرنے والی آوازیں میرے کانوں تک پہنچتی ہیں..... اور کبھی کبھی ہلکی ہلکی سی ہُو بھی نتھنوں تک آجاتی ہے۔ یہ مخدوم صاحب جس کا اصل نام ابھی تک معلوم نہیں ہوا، آبائی طور پر کہیں نوشکی کی طرف کا رہنے والا ہے۔ پرانے دربار کے پہلے متولی اور مجاوروں سے اس کی کوئی دشمنی وغیرہ بھی چل رہی ہے۔ اس کی اضافی سیکیورٹی کی وجہ یہی ہے۔"

میں اور عمران گفتگو کو دانستہ طول دے رہے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ لوکیشن کو ٹریس کرنے میں آسانی ہو۔ عمران نے بتایا کہ وہ جس اسٹور روم نما کمرے میں موجود ہے وہاں مزار پر چڑھائی جانے والی ریشمی چادروں کے تھان کے تھان انبار لگے ہوئے ہیں۔ ایک کافی بھاری تجوری بھی موجود ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس میں نذرانوں کی رقوم یا رقوم کا کچھ حصہ موجود ہوتا ہو۔

پھر عمران نے بتایا۔ "ایک الماری کے اندرونی خانے سے مجھے کچھ کاغذات بھی ملے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کا اصل نام شاید عابد خان ہے اور یہ نوشکی کے علاقے میں پندرہ بیس سال پہلے پراپرٹی ڈیلری بھی کرتا رہا ہے۔"

تب عمران نے اچانک اپنی آواز زیادہ پست کرلی۔ "یہ سنیں جی..... یہ ہلکی ہلکی آوازیں مخدوم کے بیڈ روم کی طرف سے آرہی ہیں۔ اپنی "شرکائے حیات" کے ساتھ موجود ہے۔"

میں نے دھیان سے سنا۔ نسوانی ہنسی اُبھر رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک بھاری مخمور سی آواز بھی سنائی دیتی تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ یقیناً یہ رنگین مزاج مخدوم ہی رہا ہوگا۔ دنیا میں کیا کیا تماشے ہوتے ہیں اور چہروں پر کیسے کیسے خول چڑھائے جاتے ہیں، بندہ گہرائی میں جاکر دیکھتا ہے تو ورطۂ حیرت میں رہ جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ "عمران! میرا خیال ہے کہ اب کال ختم کردینی چاہیے۔ اللہ کرے لوکیشن ٹریس ہوجائے۔ ایسا ہو گیا تو میں تمہیں میسج بھیجتا ہوں..... اور آگے کا بھی بتاتا ہوں۔"

"لیکن چاچو! آپ نے ماہین کا کچھ نہیں بتایا۔" اس نے مدھم سرگوشی کی۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"بس اس کے سر پر تھوڑی سی چوٹ آئی تھی مگر اب ٹھیک ہے۔" میں نے اسے تفصیل بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

"پولیس کو کوئی الٹا سیدھا بیان تو نہیں دیا ماہین نے؟"

"الٹا سیدھا کیا دینا تھا۔ سیدھا سیدھا معاملہ ہے جلو پارک کے قریب تمہیں کچھ پولیس والوں نے ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ تم وہاں سے نکل آئے..... تم ڈرائیونگ کررہے تھے۔ آگے ناکا آگیا۔ تم نے گاڑی نہ روکی۔ وہ پولیس والوں پر چڑھ گئی۔" میرے لہجے کی تہ میں ہلکا سا طنز موجود تھا جو عمران نے شاید محسوس کیا یا نہیں۔

"اور ماہین کے گھر والوں کا کیا رویہ ہے اور حشام کا؟"

"بس ٹھیک ہی ہے۔ تمہارے بھاگ جانے کی وجہ سے اور اس سارے واقعے کی وجہ سے وہ کچھ پریشان تو ہیں۔" میں نے گول مول بات کی۔ میں فی الحال اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے اس پر اغوا اور دھوکا دہی جیسے سنگین الزام لگائے گئے ہیں۔ اس پر سنگین دفعات کے تحت ایف آئی آر کٹ چکی ہے اور حشام بھی اس کے لیے آگ بگولا ہوا پھرتا ہے۔

عمران سے بات ختم کرتے ہی میں نے جمشید صاحب کو کال کی۔ انہوں نے مجھے دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کا کہا اور پھر یہ خوش خبری سنائی کہ فون کی ٹھیک ٹھیک لوکیشن کا پتا چل گیا ہے۔ یہ جی ٹی روڈ پر نشاط ہاؤسنگ سوسائٹی سے قریباً دس کلومیٹر آگے ایک "لال پُلی" نامی جگہ تھی۔ یہ جگہ ضلع گوجرانوالا کی حدود میں آتی تھی۔ لاہور سے اس کا فاصلہ قریباً 55 کلومیٹر تھا۔ اب انتظار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے اسی وقت متعلقہ پولیس اسٹیشن... فون کیا۔ انہیں اہم معلومات دیے بغیر تیار رہنے کا کہا۔ پھر جمشید صاحب سے اجازت لی اور انسپکٹر زبیر اور چند اہلکاروں کے ساتھ اس "لال پُلی" نامی علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ یہ قریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا لیکن میں جانتا نہیں تھا اور نہ انسپکٹر زبیر جانتا تھا کہ ہم وہاں پہنچ کر عمران کو اپنی تحویل میں نہیں

لے سکیں گے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے پہلے وہاں ایک ایسا واقعہ رونما ہو چکا ہوگا جو عمران کو مزید بُری طرح پھنسا دے گا..... اور میڈیا کو ایک اور دھماکا خیز خبر مل جائے گی۔

☆☆☆

جب ہم جی ٹی روڈ اور دو ذیلی سڑکوں پر سفر کر کے لال پُلی کے علاقے میں پہنچے، رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دیہاتی فضا کی وجہ سے گہرا اور اضافی سردی بھی موجود تھی۔ وہ مزار جسے عمران نے پرانا دربار کہا تھا، دور ہی سے نظر آ گیا۔ یہاں جھنڈے لہرا رہے تھے اور وسیع احاطے والی ایک سفید مسجد بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ مزار اس قصبے کی اصل آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا اور درختوں میں گھرا ہوا تھا..... میں نے فون پر پھر عمران سے رابطے کی کوشش کی مگر غیر متوقع طور پر رابطہ نہیں ہوا۔ صرف بیل جاتی رہی، اسی دوران میں کچے پکے راستے کے کنارے پر ہمیں مقامی تھانے کی پولیس موبائل نظر آ گئی۔ اس کی چھت پر گھومتی ہوئی نیلی لائٹ آن تھی۔ انجن بھی اسٹارٹ تھا۔ مقامی ایس ایچ او وحید گوندل گاڑی کے قریب ہی کھڑا نظر آ گیا۔ وہ تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سگریٹ بجھایا اور ہماری جیپ کے قریب آ گیا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا سلیوٹ کیا اور بولا۔ ''آپ آ گئے جی۔''

''ہاں..... کوئی کارروائی تو نہیں کی تم نے؟''

''نہیں جی، ہم تو آپ کے انتظار میں تھے۔ کارروائی دوسری طرف سے ہو گئی ہے۔''

اس کے گمبھیر لہجے نے مجھے چونکایا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''عمران نام کے جس بندے کا آپ بتا رہے تھے، اس نے مخدوم صاحب کو قتل کر دیا ہے اور بھاگ گیا ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو گوندل، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں جیپ سے اتر آیا۔ انسپکٹر زبیر بھی میرے ساتھ تھا۔

''سر! اس نے مخدوم جی کو گولی مار کر شدید زخمی کیا پھر ان کو یرغمال بنایا اور ان کے مسلح سکیورٹی اہلکاروں کے سامنے انہیں گھسیٹتا ہوا پولیس موبائل میں لے گیا۔ یہاں سے کوئی دو کلو میٹر آگے اس نے مخدوم جی کو مردہ حالت میں پولیس موبائل کے اندر چھوڑ دیا اور فرار ہو گیا۔''

میں گرجا۔ ''میں اس اسٹوری پر یقین نہیں کر سکتا۔ ابھی 45 منٹ پہلے فون پر میری بات ہوئی ہے عمران سے۔''

''جناب پینتالیس پچاس منٹ میں کیا نہیں ہو سکتا۔ ابھی چند منٹ میں ایس ایس پی صاحب بھی پہنچ رہے ہیں۔ وہ ساری بات بتائیں گے آپ کو..... بلکہ شاید وہ پہنچ ہی گئے ہیں۔'' اس نے دور کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اگر مخدوم جیسا شخص واقعی کسی وجہ سے مارا جا چکا تھا تو یہ بہت ہائی فائی کیس بن جاتا تھا۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ کا ہنگامی طور پر یہاں پہنچنا اسی بات کی غمازی کرتا تھا۔ مجھے اور زبیر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ دوسری طرف مقامی ایس ایچ او گوندل کے تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ وہ یہ خبر پورے اعتماد کے ساتھ دے رہا ہے۔

اسی اثنا میں ایس ایس پی کی جیپ دھول اُڑاتی موقع پر پہنچ گئی۔ مجھے اتنا پتا تھا کہ گوجرانوالا کا یہ ایس ایس پی چند ہی روز پہلے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میری جانی پہچانی شخصیت ہے۔ یہ محترم و مکرم رانا صاحب تھے۔ رانا صاحب کو ہمیشہ مجھ سے کچھ نہ کچھ شکایت رہی تھی، بلکہ اسے باہمی تسلسل کہنا چاہیے جیسا کہ قارئین ایک پچھلے واقعے میں پڑھ چکے ہیں وہ اکثر مجھ سے خفا ہی رہتے تھے۔ میں نے ڈی ایس پی کی حیثیت سے انہیں سلیوٹ کیا جس کا روکھے پھیکے انداز میں جواب ملا۔ پھر انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تابش! میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا، یہ منڈا تمہارے لیے مصیبت پیدا کرے گا۔ مجھے اس کی آنکھ میں سٹور کا ہال نظر آیا تھا۔ اب دیکھ لو کیا چاند چڑھایا ہے اس نے۔ پہلے لاہور میں ایک اے ایس آئی کی جان لی۔ اب یہاں مخدوم صاحب کی جان سے کھیل گیا ہے اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ پورے علاقے میں آگ لگ جائے گی۔ میڈیا پہلے ہی ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

رانا صاحب ایک ہی سانس میں بولتے چلے گئے۔

مجھے اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں مقامی پولیس کی طرف سے ہم کو اندھیرے میں کیوں رکھا گیا۔ اس کی وجہ یقیناً ایس ایس پی رانا صاحب ہی تھے۔ مقامی پولیس جانتی تھی کہ ناکے والے حادثے کے بعد عمران کو آخری بار ''لال پُلی'' کے آس پاس دیکھا گیا ہے مگر ہمیں تین روز تک بے خبر رکھا گیا۔ یقیناً رانا صاحب اور ان کا ماتحت عملہ کسی مداخلت کے بغیر عمران کو خود گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اگر ہم کو یوں بے خبر نہ رکھا جاتا تو شاید یہ مخدوم والا واقعہ بھی رونما نہ ہوتا۔

رانا صاحب نے حرب یہ حرف اپنے ایس ایچ او گوندل کی تائید کی اور بتایا کہ کچھ دیر پہلے عمران، زخمی

مخدوم صاحب کی آڑ لے کر فرار ہوا ہے اور انہیں پولیس کی موبائل میں مردہ چھوڑ گیا ہے۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ آدھی رات کے وقت اس پورے علاقے میں پولیس کی نقل و حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً عمران کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اگر واقعی صورتِ حال وہی تھی جو بتائی جا رہی تھی تو پھر عمران ایک ناقابلِ بیان مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ وہاں سے ایک ٹریکٹر ٹرالی گزری۔ اس پر پندرہ بیس افراد سوار تھے۔ چند عورتیں بھی تھیں۔ یہ لوگ ''مخدوم صاحب'' کی ناگہانی موت کی خبر سن کر مزار کی طرف جا رہے تھے۔ ان سب کے چہرے غم و غصے کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ چند افراد باقاعدہ رو رہے تھے۔

رانا صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر زہرخند انداز میں بولے۔ ''دیکھ لیا نا اپنے سگے کا کارنامہ اور اس کا ری ایکشن۔ صبح تک یہاں خلقت جمع ہو جائے گی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو وہ ہماری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے۔''

اسی اثنا میں ایک پرائیویٹ لوڈر گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزری۔ اس میں تین چار بُوگیر کُتے موجود تھے۔ یہ پولیس کے کُتے نہیں تھے۔ یقیناً مخدوم کے کسی کھاتے پیتے مرید کے ہوں گے..... ظاہر تھا کہ یہ عمران کی تلاش کے لیے لے جائے جا رہے ہیں۔ کافی فاصلے پر پولیس موبائلز کے ہوٹر بھی سنائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں کہ یہاں کیا ہوا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ میرے مرحوم یار عمران دانش کا بیٹا یہاں ایک بدترین مشکل میں پھنس چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے ذہن میں کئی ہفتوں سے جو وہم پل رہا تھا، وہ صرف وہم یا خدشہ نہیں رہا، حقیقت بن گیا ہے۔ میں اور انسپکٹر زبیر جیپ پر سوار موقع واردات پر پہنچے، یعنی وہ جگہ جہاں مخدوم صاحب کی لاش ملی تھی۔ یہ جگہ درختوں میں گھری ہوئی تھی اور اس کا فاصلہ مزار سے تقریباً دو کلومیٹر تھا۔

یہ مخدوم کی سیکیورٹی والی وہی پولیس موبائل تھی جس کا ذکر عمران نے اپنے فون میں کیا تھا۔ گرد میں اٹی ہوئی اس گاڑی کے گرد پولیس اہلکار موجود تھے۔ گاڑی کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر خون کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ مقتول کا ایک جوتا بھی ابھی تک جیپ میں ہی پڑا تھا اگر یہ سب کچھ عمران نے کیا تھا تو پھر آثار سے تو یہی نظر آتا تھا کہ وہ مخدوم کو زخمی حالت میں گن پوائنٹ پر گھسیٹ کر گاڑی میں لے آیا۔ ایک بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹے رکھا، دوسرے ہاتھ سے ڈرائیونگ کی اور یہاں تک پہنچ کر گاڑی چھوڑ کر نکل گیا۔

ایک بات میرے ساتھ ساتھ زبیر نے بھی نوٹ کی۔ گاڑی میں خون کا کوئی زیادہ اخراج ثابت نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سیکیورٹی پر مامور ایک اہلکار سے پوچھا۔ ''گولی کہاں لگی تھی مخدوم صاحب کو؟''

''لگتا تو یہی تھا جی کہ پیٹ میں دائیں طرف لگی ہے مگر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''ملزم کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

اس نے جو حلیہ بتایا وہ عمران سے ملتا جلتا ہی تھا۔

''ہتھیار کون سا تھا اس کے پاس؟'' میں نے سیکیورٹی اہلکار سے دریافت کیا۔

''یہ ماؤزر تھا جی۔ اس نے مسلسل مخدوم جی کے سر سے لگائے رکھا اور ہمیں دور رہنے کے لیے دھمکیاں دیں۔''

''تم لوگوں نے تو مخدوم صاحب کی لاش دیکھی ہو گی۔ بعد میں ملزم نے کوئی اور فائر بھی کیا تھا اُن پر؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے جی۔ لیکن فائر کی آواز دوبارہ نہیں آئی۔''

''فائر کی پہلی آواز کہاں سے آئی تھی؟'' انسپکٹر زبیر نے پوچھا۔

''مخدوم جی کی رہائش گاہ کے اندر سے، اس کے چند سیکنڈ بعد ہی وہ بندہ مخدوم جی کو ڈھال بنا کر باہر نکل آیا.....''

میں سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ یہ شخص جسے مخدوم جیسے معزز لقب سے پکارا جاتا تھا، شدید زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک گولی لگی تھی، خون کا اخراج بھی زیادہ نہیں تھا، پھر سات آٹھ منٹ کے اندر وہ ہلاک ہو گیا.....

گہری تاریکی اور سردی میں درختوں کے درمیان ہماری یہ گفتگو جاری تھی کہ مزار کے اندر سے لاؤڈ اسپیکر پر کچھ جذباتی اعلانات ہونے لگے۔ ان میں مخدوم کی ناگہانی موت کا ذکر تھا اور کچھ اشتعال انگیز باتیں بھی کی جا رہی تھیں۔ پورے ایریا میں ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں وائرلیس پر ایک خبر چلی اور اس نے صورتِ حال کو ایک دم بدل دیا۔ بتایا گیا کہ قاتل مزار شریف سے تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جگہ گھیر لیا گیا ہے۔

مخدوم صاحب کی آڑ لے کر فرار ہوا ہے اور انہیں پولیس کی موبائل میں مردہ چھوڑ گیا ہے۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ آدھی رات کے وقت اس پورے علاقے میں پولیس کی نقل و حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً عمران کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اگر واقعی صورتِ حال وہی تھی جو بتائی جا رہی تھی تو پھر عمران ایک ناقابلِ بیان مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ وہاں سے ایک ٹریکٹر ٹرالی گزری۔ اس پر پندرہ بیس افراد سوار تھے۔ چند عورتیں بھی تھیں۔ یہ لوگ ''مخدوم صاحب'' کی ناگہانی موت کی خبر سن کر مزار کی طرف جا رہے تھے۔ ان سب کے چہرے غم و غصے کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ چند افراد باقاعدہ رو رہے تھے۔

رانا صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر زہر خند انداز میں بولے۔ ''دیکھ لیا نا اپنے سگے کا کارنامہ اور اس کا ری ایکشن۔ صبح تک یہاں خلقت جمع ہو جائے گی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو وہ ہماری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے۔''

اسی اثنا میں ایک پرائیویٹ لوڈر گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزری۔ اس میں تین چار بُوگیر کُتے موجود تھے۔ یہ پولیس کے کُتے نہیں تھے۔ یقیناً مخدوم کے کسی کھاتے پیتے مرید کے ہوں گے..... ظاہر تھا کہ یہ عمران کی تلاش کے لیے لے جائے جا رہے تھے۔ کافی فاصلے پر پولیس موبائلز کے ہوٹر بھی سنائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں کہ یہاں کیا ہوا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ میرے مرحوم یار عمران دانش کا بیٹا یہاں ایک بدترین مشکل میں پھنس چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے ذہن میں کئی ہفتوں سے جو وہم پل رہا تھا، وہ صرف وہم یا خدشہ نہیں رہا، حقیقت بن گیا ہے۔ میں اور انسپکٹر زبیر جیپ پر سوار موقع واردات پر پہنچے، یعنی وہ جگہ جہاں مخدوم صاحب کی لاش ملی تھی۔ یہ جگہ درختوں میں گھری ہوئی تھی اور اس کا فاصلہ مزار سے قریباً دو کلومیٹر تھا۔

یہ مخدوم کی سیکیورٹی والی وہی پولیس موبائل تھی جس کا ذکر عمران نے اپنے فون میں کیا تھا۔ گرد میں اٹی ہوئی اس گاڑی کے گرد پولیس اہلکار موجود تھے۔ گاڑی کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر خون کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ مقتول کا ایک جوتا بھی ابھی تک جیپ میں ہی پڑا تھا اگر یہ سب کچھ عمران نے کیا تھا تو پھر آثار سے تو یہی نظر آتا تھا کہ وہ مخدوم کو زخمی حالت میں گن پوائنٹ پر گھسیٹ کر گاڑی میں لے آیا۔ ایک بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹے رکھا، دوسرے ہاتھ سے ڈرائیونگ کی اور یہاں تک پہنچ کر گاڑی چھوڑ کر نکل گیا۔

ایک بات میرے ساتھ ساتھ زبیر نے بھی نوٹ کی۔ گاڑی میں خون کا کوئی زیادہ اخراج ثابت نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سیکیورٹی پر مامور ایک اہلکار سے پوچھا۔ ''گولی کہاں لگی تھی مخدوم صاحب کو؟''

''لگتا تو یہی تھا جی کہ پیٹ میں دائیں طرف لگی ہے مگر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''ملزم کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

اس نے جو حلیہ بتایا وہ عمران سے ملتا جلتا ہی تھا۔

''ہتھیار کون سا تھا اُس کے پاس؟'' میں نے سیکیورٹی اہلکار سے دریافت کیا۔

''یہ ماؤزر تھا جی۔ اُس نے مسلسل مخدوم جی کے سر سے لگائے رکھا اور ہمیں دور رہنے کے لیے دھمکیاں دیں۔''

''تم لوگوں نے تو مخدوم صاحب کی لاش دیکھی ہو گی۔ بعد میں ملزم نے کوئی اور فائر بھی کیا تھا اُن پر؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے جی۔ لیکن فائر کی آواز دوبارہ نہیں آئی۔''

''فائر کی پہلی آواز کہاں سے آئی تھی؟'' انسپکٹر زبیر نے پوچھا۔

''مخدوم جی کی رہائش گاہ کے اندر سے، اس کے چند سیکنڈ بعد ہی وہ بندہ مخدوم جی کو ڈھال بنا کر باہر نکل آیا.....''

میں سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ یہ شخص جسے مخدوم جیسے معزز لقب سے پکارا جاتا تھا، شدید زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک گولی لگی تھی، خون کا اخراج بھی زیادہ نہیں تھا، پھر سات آٹھ منٹ کے اندر وہ ہلاک ہو گیا.....

گہری تاریکی اور سردی میں درختوں کے درمیان ہماری یہ گفتگو جاری تھی کہ مزار کے اندر سے لاؤڈ اسپیکر پر کچھ جذباتی اعلانات ہونے لگے۔ ان میں مخدوم کی ناگہانی موت کا ذکر تھا اور کچھ اشتعال انگیز باتیں بھی کی جا رہی تھیں۔ پورے ایریا میں ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں وائرلیس پر ایک خبر چلی اور اس نے صورتِ حال کو ایک دم بدل دیا۔ بتایا گیا کہ قاتل مزار شریف سے قریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جگہ گھیر لیا گیا ہے۔

ہم تیز رفتاری سے وہاں پر پہنچے۔ یہ انگریزوں کے زمانے کا ایک ڈاک بنگلا تھا۔ کسی نے اس کی چھت پر بھی ایک دو کمرے بنا لیے تھے مگر فی الحال یہ خالی پڑا تھا۔ کہا جارہا تھا کہ مخدوم کو مارنے والے شخص نے یہیں پر پناہ لی ہے۔ ڈاک بنگلے کے خستہ دروازے کے سامنے بو سونگھنے والے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔ اور ان کے رکھوالوں نے انہیں زنجیروں سے تھاما ہوا تھا۔ ایس ایس پی رانا صاحب بنفسِ نفیس یہاں موجود تھے۔ ان کی جیپ کی چھت پر ایک بڑی سرچ لائٹ نظر آرہی تھی جس نے بنگلے کے زیادہ تر حصے کو روشن کر رکھا تھا۔ رانا صاحب نے تلخ لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اندر ہی موجود ہے اور اس نے دھمکانے کے لیے اندر سے دو تین ہوائی فائر بھی کیے ہیں۔

اسی دوران میں معلوم نہیں کہاں سے ایک ٹی وی چینل کی مختصر سی ٹیم بھی وہاں آن دھمکی۔ رپورٹر مائیک تھام کر اس انداز میں کیمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ عقب میں ڈاک بنگلا بھی دکھائی دیتا رہے۔ وہ ہیجانی انداز میں بولنے لگا۔ ''تو ناظرین! یہ ہے وہ جگہ جہاں اس خطرناک شخص نے پناہ لی ہے۔ اس کے پاس مہلک آتشیں اسلحہ موجود ہے اور اس نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو خود سے دور رہنے کی وارننگ دے رکھی ہے۔ یاد رہے کہ یہ خطرناک شخص تین روز قبل لاہور میں ایک لڑکی کے اغوا کی ناکام کوشش کر چکا ہے۔ اس کوشش میں اس نے ایک اے ایس آئی کی جان بھی لی ہے۔ اب یہ دوسرا قتل ہے جو اس کے کھاتے میں آرہا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، عوامی حلقوں میں سخت بے چینی پائی جارہی ہے۔ سفاک مجرم کو کڑی سے کڑی سزا دینے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔''

رپورٹر کا واویلا جاری تھا اور میرا خون کھول رہا تھا۔ بغیر تصدیق کے یہ لوگ اسے سفاک ترین مجرم اور بے رحم قاتل گردان رہے تھے اور تو اور مجھے رانا صاحب کے ارادے بھی کچھ اچھے نظر نہیں آتے تھے۔ بے شک وہ قانون کی پاسداری کرنے والے آفیسر تھے مگر جب کسی معاملے میں میرا نام شامل ہوتا تھا ان کے رویّے میں کچھ منفی تبدیلیاں خود بخود آجاتی تھیں۔ مجھے یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر معاملہ بگڑا تو وہ شاید عمران کو شوٹ کرنے سے گریز نہ کریں۔

اچانک مجھے ایک بار پھر عمران سے رابطہ کرنے کا خیال آیا۔ اس مرتبہ بھی صرف بیل جاتی رہی لیکن جب میں نے دوسری مرتبہ کال کی تو کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف عمران ہی تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ درختوں کے اندر جا کر میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''تم کہاں ہو عمران؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''بس جنت دوزخ سے تھوڑی ہی دور ہوں۔ یہ مزار سے کچھ فاصلے پر کوئی پرانا ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلا ہے..... اور آپ کہاں ہیں؟''

''میں اس ڈاک بنگلے کے سامنے ہی ہوں۔ مجھے بتاؤ عمران، یہ سب کیا ہوا ہے؟ میں نے تو تمہیں منع کیا تھا کسی بھی پھڈے سے..... اور تم نے پھڈا چھوڑ کر بندہ ہی مار دیا۔''

''اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے بندہ مار دیا ہے..... تو پھر مجھے ہی غلطی لگی ہوگی۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''عمران! یہ بے تکی ہانکنے کا وقت نہیں۔ تمہارا یہی رویّہ ہے جس نے تمہیں اتنی بڑی مصیبت میں پھنسایا ہے۔ یہ لوگ یہیں پر شوٹ کر سکتے ہیں تمہیں۔''

''تو کر دیں نا۔ یہاں منع کون کر رہا ہے۔ میں قصوروار ہوں..... مجھے سزا تو ملنی چاہیے اور میں یہ بات مذاق میں نہیں کہہ رہا ہوں..... یہ جو کچھ ہوا، میری وجہ سے ہوا۔ میری ایک بیکار خواہش کی وجہ سے ہوا۔ نہ میں ماہین کو اپنے پاس بلاتا، نہ نا کے پر حادثہ ہوتا اور نہ نوبت یہاں تک پہنچتی۔''

''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔'' میں نے دانت پیسے۔ ''اب سوچو آگے کیا ہونے والا ہے؟ مجھے بتاؤ کیا مخدوم کو گولی تم نے ماری تھی؟''

''دل تو یہی چاہتا تھا چچا جان کہ میں مارتا..... لیکن بندے کی ساری خواہش تو پوری نہیں ہوتی نا۔ اور میں تو ہوں ہی ایسے معاملوں میں بدنصیب۔'' وہ حسبِ عادت پٹڑی سے اترنے لگا۔ ''اب دیکھیں نا، ہر جگہ ناکام ہوتا ہوں۔ انڈیا کی فلموں میں کام کرنا چاہتا تھا۔ لیلا بھنسالی جیسے مہان ڈائریکٹر کو آڈیشن دیا۔ وہ اش اش کر اٹھا۔ اگر صرف اش اش ہی کرتا تو ٹھیک تھا۔ اس نکمے نے یہ کہہ دیا کہ میں تو اکشے کمار جیسے ایکٹر کی بینڈ بجا دوں گا۔ وہ خانہ خراب اکشو بھی آس پاس ہی موجود تھا۔ اس نے سن لیا۔ اگلے روز اسٹوڈیو کے ایک کونے میں میرا گریبان پکڑ لیا، بڑا کراٹے ماسٹر بنتا ہے نا۔ وہ تو اچھا ہوا اس کی بیوی ٹوئنکل کھنہ بیچ میں آگئی۔ ٹوئنکل، راجیش کھنہ کی بیٹی ہے اور راجیش کھنہ کی میں بڑی عزت کرتا ہوں..... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

میرا تھوبڑا کچھ نہ کچھ راجیش کھنہ سے ملتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے....."

"میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے دفع ہو جاتا ہوں اور چھوڑ جاتا ہوں تمہیں یہاں ذلت کی موت مرنے کے لیے۔" میں پھنکارا۔ "میں پھر کہتا ہوں، تمہارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ مجھے کچھ بتا سکتے ہو تو بتاؤ۔"

میرے لب و لہجے نے اُسے سمجھا دیا کہ میں فون بند کر دوں گا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس نے جو حقیقتِ حال بتائی، وہ کچھ یوں تھی۔ بے شک عمران نے اسٹور روم کے اندر سے میرے ساتھ فون پر مدھم سرگوشیوں میں بات کی تھی مگر پتا نہیں کیسے اپنی بیویوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے مخدوم کو کچھ شک ہو گیا۔ وہ ٹوہ لیتا ہوا اسٹور نما کمرے تک پہنچا تو ایک دم معاملہ بگڑ گیا۔ مخدوم نے ایک دم اپنا سلور کلر کا خوب صورت "سی 96" ماؤزر نکال لیا اور عمران پر گولی چلانا چاہی، عمران نے اسے موقع نہیں دیا اور اس کا ماؤزر والا ہاتھ دبوچ لیا۔ بیڈ روم میں اس کی بیویوں نے شور مچانا شروع کر دیا..... باہر موجود مسلح سیکیورٹی اہلکار دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ تنومند مخدوم عمران سے گتھم گتھا تھا۔ جب عمران کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آئی تو اس نے کوشش کر کے ماؤزر کا رخ خود مخدوم کی طرف ہی کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ اسی اثنا میں غضب ناک سیکیورٹی اہلکاروں نے اس پر رائفلیں تان لیں۔ اُن میں سے ایک نے للکار کر کہا۔ "یہ وہی ہے جس نے لاہور میں اے ایس آئی کو مارا۔"

عمران نے زخمی مخدوم کو اپنی ڈھال بنایا اور اُس کی اوٹ لیتا ہوا باہر پولیس کی گاڑی تک آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے زخمی مخدوم کو سنبھالے رکھا اور دوسرے سے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکل آیا۔ مخدوم کا زخم زیادہ سنگین نہیں تھا مگر وہ شدید ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اچانک اس کی سانس اُلجھنا شروع ہو گئی۔ اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ غالباً نشے اور رنگ بازیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ عمران نے گاڑی روکی۔ اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش بھی کی لیکن آناً فاناً اس کی آنکھوں کی پُتلیاں الٹ گئیں، تعاقب کرنے والے کسی بھی وقت پہنچ سکتے تھے۔ عمران وہاں سے نکل گیا۔

عمران نے جس طرح اور جس لب و لہجے میں یہ سب کچھ بتایا تھا، مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ مگر میرے یقین یا بے یقینی سے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہاں سب کچھ اُس کے خلاف جا رہا تھا۔

میں نے اس کی ساری بات سننے کے بعد کہا۔ "عمران! تم معاملے کو حد سے زیادہ بگاڑ چکے ہو، اس کو اور مت بگاڑنا، میں ایک بار پھر تم سے یہی کہتا ہوں کہ کسی پولیس اہلکار پر فائر نہ کرنا۔ بہتر یہی ہے کہ سرنڈر کر کے باہر نکل آؤ۔"

وہ عجیب انداز سے ہنسا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ یہ میرا سرنڈر قبول کریں گے۔ میں نے ان لوگوں کی آنکھوں میں خون دیکھا ہے۔"

وہ کہہ تو ٹھیک رہا تھا۔ پیر مخدوم کی ہلاکت نے یہاں بہت سے لوگوں کو سخت مشتعل کر دیا تھا۔ ان میں وہ مقامی پولیس اہلکار بھی شامل تھے جو مخدوم کی سیکیورٹی پر مامور تھے۔ پھر مجھے رانا صاحب کے ارادے بھی کچھ ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ چار دن پہلے کچلے جانے والے اے ایس آئی کی موت کا غم و غصہ اُن کی آنکھوں میں صاف نظر آتا تھا۔ دوسری طرف عمران تھا۔ وہ ایک دم بے پروا نظر آنے لگا تھا۔ میں اس کی کئی رگوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کی یہ بے پروائی بڑی خطرناک تھی۔ وہ جب مرنے مارنے کے موڈ میں آ جاتا تھا تو اس کے لب و لہجے میں ایک خاص قسم کا لاابالی پن اور بے خوفی شامل ہو جاتی تھی۔

اسی دوران میں میگا فون پر پولیس فورس کا جانا پہچانا اعلان کیا جانے لگا۔ "تمہیں چاروں طرف سے پولیس نے گھیر لیا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار نیچے صحن میں پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔" چند سیکنڈ بعد پھر اعلان دہرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے باہر نکلنے کے لیے پانچ منٹ کی مہلت دی گئی۔

میں سپرنٹنڈنٹ رانا صاحب کے پاس پہنچا۔ انہیں ایک طرف لے جا کر اُن سے بات کی۔ میں نے کہا۔ "رانا صاحب! ابھی میری فون پر اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ حلفیہ کہتا ہے کہ استعمال ہونے والا ماؤزر پیر مخدوم کا تھا اور اسے صرف اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی۔ دوسری بات وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مخدوم صاحب کی موت پیٹ کے زخم سے نہیں بلکہ ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پوسٹ مارٹم میں یہ بات ثابت ہو جائے گی۔"

رانا صاحب نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "اگر گولی لگنے کے بعد مخدوم کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے تو بھی یہ دفعہ 302 ہی بنے گی اور جس غریب اے ایس آئی کو گاڑی کے نیچے دے کر مارا ہے اس بدقسمت نے، اس کے بارے میں کیا خیال

ہے؟"

"سر! میں اُس کے لیے کوئی "فیور" نہیں مانگ رہا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ سرنڈر کرنے کے لیے تیار ہے، اگر اسے موقع پر ہی شوٹ نہ کر دیا جائے۔"

رانا صاحب کی آنکھوں میں طیش کے سرخ لہر بے نظر آئے، بولے۔ "تم بھی جانتے ہو تابش! شوٹ کر دینا کوئی سزا نہیں ہوتی۔ سزا تو یہی ہوتی ہے کہ قاتل کا ٹرائل ہو اور وہ پل پل پھانسی کے پھندے کی طرف جائے۔ بے فکر رہو، ہم نے اسے صرف پکڑنا ہے مارنا نہیں۔"

"میرے پاس اس کا فون نمبر ہے۔ میں اسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرتا ہوں۔"

"جو کرنا ہے جلدی کرو، اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"ایسا نہیں ہوگا جی، لیکن آپ بھی اہلکاروں کو ذرا محتاط رہنے کا مشورہ دیں، میں اُس سے بات کرتا ہوں۔"

"کرو، کرو۔" انہوں نے ہاتھ لہرایا۔

مجھے اپنے "پٹی بھائیوں" کا پتا تھا اور عمران کا بھی۔ وہ بپھر جاتا تو گھیرا ڈالنے والوں کو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ میں فحش وڈیوز والے کیس میں اس کی اسپرٹ اور ایگریشن دیکھ چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس سے فون پر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ اپنے معاملے کو مزید سنگین بنانے کی کوشش نہ کرے اور ہتھیار ڈال کر باہر نکل آئے۔ لیکن جب میں عمران سے بات کر رہا تھا، اچانک ڈاک بنگلے کے عقبی جانب سے ہلا بول دیا گیا۔ شور وغل سنائی دیا، اس کے ساتھ ہی دو تین فائر بھی ہوئے۔ آوازوں سے ہی پتا چل گیا کہ یہ پولیس والوں نے کیے ہیں۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرے ذریعے عمران کو باتوں میں لگا کر اس پر چھاپا مارا گیا ہے۔ کال کٹ چکی تھی۔ اب ڈاک بنگلے کے سامنے والے حصے سے بھی پولیس اہلکار اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں اور انسپکٹر زبیر بھی لپکتے ہوئے اندر چلے گئے۔ شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو عمران کو اہلکاروں کے ساتھ گتھم گتھا پایا۔ وہ اسے رائفلوں کے کندوں سے مار رہے تھے پھر اچانک عمران چنگھاڑا۔

"گالی نہ دینا..... میں کہتا ہوں گالی نہ دینا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے جوابی حملہ کیا۔ ایک اہلکار کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور اس کے دستے کی زوردار ضرب ایک قریبہ اندام حوالدار کے چہرے پر لگائی۔ اس کے جسم میں برق سی کوند گئی تھی اور یہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں تیزی سے عمران اور اہلکاروں کے درمیان آ گیا۔ میں نے اہلکاروں کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ بھی دیوانے ہو رہے تھے۔ ان میں سے تین چار وہی تھے جو پیر مخدوم کی سیکیورٹی پر مامور تھے۔ میں انہیں روکنے میں ناکام ہوا تو عمران کو دھکا دے کر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ میرے انسپکٹر زبیر نے پھرتی سے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ میرا ایک اور ماتحت بھی وہاں پہنچ گیا اور ہم دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ صورت حال مزید بگڑنے سے بچ گئی۔ میں نے مشتعل اہلکاروں کو پیچھے ہٹا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری موجودگی میں عمران کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔ اس نے ماؤزر بھی مقامی پولیس کے حوالے کر دیا۔ گرفتاری کے وقت عمران نے ایک بڑا زبردست کام کیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے ایک تہ شدہ کاغذ میری مٹھی میں تھما دیا۔ اس کاغذ نے بعد میں بہت کام دکھایا۔

☆☆☆

پیر مخدوم کی ہلاکت چونکہ ضلع گوجرانوالا کی حدود میں ہوئی تھی، لہٰذا وہ مقامی تھانے کی تحویل میں تھا۔ وہاں رانا صاحب کی عملداری تھی۔ عمران پر کچھ تشدد بھی ہوا تھا مگر پھر ایس ایس پی جمشید صاحب کی فوری مداخلت سے یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ ویسے بھی ایسی مار پیٹ کا عمران پر زیادہ اثر ہونے والا نہیں تھا۔ اسے اپنے سے زیادہ فکر اپنے دوستوں ضیا اور وکی کی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ ضیا گھر آ چکا ہے اور وکی بھی ایک دو دن تک آ جائے گا۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مجھے اطلاع ملی تھی کہ ایک ہفتے کی تاخیر کے ساتھ ماہین کی شادی کی تیاری پھر شروع ہو گئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حشام بری طرح چونک گیا ہے اور وہ جلد از جلد ماہین پر اپنا قبضہ مستحکم کر لینا چاہتا ہے، دوسری طرف ماہین کے اہل خانہ بھی یقیناً یہی چاہتے ہوں گے کہ یہ کام جلدی نمٹ جائے۔

ایک رات دو بجے کے قریب مجھے ماہین کا فون آیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر والوں سے چھپ کر بات کر رہی ہے۔ اس نے مجھ سے عمران کا حال احوال پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی وہ گوجرانوالا پولیس کے پاس ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ اسے لاہور کے متعلقہ تھانے میں منتقل کیا جا سکے۔

وہ بہت دکھی لہجے میں بولی۔ "انکل تابش! یہ سب

میری وجہ سے ہوا ہے۔ اُس کی جگہ مجھے لاک اَپ میں ہونا چاہیے تھا۔ پلیز آپ اس کے لیے کچھ کریں۔"

"جو کچھ ہو سکا ماہین..... ضرور کروں گا۔ بس تم دعا کرو..... اور بہت فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، اپنے حالات پر توجہ دو۔ تمہاری شادی کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟"

وہ بھرائی آواز میں بولی۔ "کبھی سوچا بھی نہیں تھا انکل کہ میری شادی ایسے حالات میں ہوگی۔ یوں لگتا ہے کہ ایک بہت بھاری فرض سے جواد اکرنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا انکل۔ وہ میری وجہ سے لاک اَپ میں پڑا ہے اور میں یہاں رسمیں نبھا رہی ہوں۔ وہ صرف اور صرف میری وجہ سے پھنستا جا رہا ہے۔"

"گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے نا کہ مخدوم والے معاملے میں اسے ریلیف ملنے کا امکان ہے۔"

"انکل! کیسے ملے گا ریلیف؟ اس کے ہاتھوں جان گئی ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"ماہین، اُس نے صرف اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی..... لیکن اس سے بھی بڑی ایک اور بات ہے۔ ایک دو دن میں سامنے آجائے گی۔"

وہ چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد گویا ہوئی۔ "لیکن انکل وہ اے ایس آئی والا معاملہ بھی تو ہے جو زیادہ خطرناک ہے۔ اسے میں نے گاڑی کے نیچے دیا مگر اس کی سزا بھی اسے ملے گی۔"

"دیکھو ماہین! تمہیں کہا ہے نا کہ خوامخواہ خود کو ہلکان نہ کرو۔ اس سے کچھ حاصل وصول نہیں۔ بس تم اس کے لیے دعا کرو۔"

اسے تسلی تشفی دے کر میں نے کال ختم کر دی۔ وہ غم کے گہرے پانی میں محسوس ہوتی تھی۔ اس کے اندر جیسے کوئی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اس جنگ کو وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں سوچنے پر مجبور تھا کہ عمران جونیئر کے سینے میں محبت کی جو خاموش پکار موجود تھی اس نے کسی نہ کسی طور ماہین پر بھی اثر کیا ہے مگر یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ایک بہت مضبوط لڑکی ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف ایک اور اطلاع نے مجھے سخت اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں نے انسپکٹر زبیر کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ اس بات کا پتا کرے کہ جلو پارک میں عمران اور ماہین کو ہراساں کرنے والے اہلکار کون تھے؟ حیران کن طور پر یہ ثابت ہوا تھا کہ اُس شام تو ایک وی آئی پی موومنٹ کی وجہ سے مذکورہ علاقے میں کوئی اہلکار موجود ہی نہیں تھا تو پھر کون لوگ تھے جن کی وجہ سے یہ سارا بکھیڑا شروع ہوا۔ کیا وہ یونیفارم والا بندہ بھی جعلی پولیس والا تھا؟ اس حوالے سے مزید چھان بین کی ضرورت تھی۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت مجھے وہ خبر مل گئی جس کا شدت سے انتظار تھا اور یہ خبر لال پُلی کے مزار پر مرنے والے پیر مخدوم کے حوالے سے تھی۔ میں نے اس سلسلے میں انسپکٹر زبیر کو پانچ روز سے کوئٹہ کے قریب، نوشکی کے علاقے میں بھیجا ہوا تھا اور وہ وہاں سے نہایت انکشاف انگیز اطلاعات لے کر واپس آیا تھا۔ اپنی گرفتاری کے وقت عمران نے جو ایک تہ شدہ کاغذ رازداری سے مجھے تھمایا تھا، وہ دراصل ایک پلاٹ کے حوالے سے کوئی پرانا اقرار نامہ تھا۔ اس کے ساتھ شناختی کارڈ کی کاپی بھی اٹیچ تھی۔ اس کاپی پر چھوٹی چھوٹی داڑھی والے جس شخص کی تصویر تھی، وہ مخدوم سے بہت ملتا جلتا تھا۔ شناختی کارڈ پر اس کا نام عابد خان درج تھا۔ یہ کاغذ اور اس طرح کے چند دوسرے کاغذ عمران نے اس اسٹور روم کی الماری میں دیکھے تھے جہاں وہ تین روز چھپا رہا تھا۔ عمران نے اپنی فون کال میں شک ظاہر کیا تھا کہ یہ پیر مخدوم کچھ برس پہلے نوشکی کے علاقے میں رہتا تھا اور پراپرٹی ڈیلر تھا۔ اس پر شاید ایک دو کرمنل کیس بھی تھے۔

اب انسپکٹر زبیر اس دور دراز علاقے سے جو اطلاعات لے کر آیا تھا، وہ حد درجہ تہلکہ خیز تھیں۔ پتا چلا تھا کہ پیر مخدوم کا اصل نام عابد خان ہے۔ یہ تقریباً دس سال پہلے بلوچستان کا رہائشی تھا اور پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ وہیں پر ایک تنازعے میں اس نے ایک اسکول ہیڈ ماسٹر کو قتل کر دیا اور اس کے بعد وہ ایک ڈیلر کے بجائے ایک قاتل بدمعاش کے طور پر سامنے آیا۔ اس پر قتل، اغوا اور آبروریزی کے دو چار نہیں کم و بیش تین درجن مقدمات درج تھے۔ بعدازاں وہ اچانک علاقے سے غائب ہوگیا اور صوبے کی پولیس لاکھ سر پٹخنے کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ پا سکی۔ سراغ پاتی بھی کیسے وہ تو اس دور دراز علاقے سے، بدلے ہوئے روپ میں، یہاں اس مزار پر چلا آیا تھا اور اپنی ہوشیاری کے سبب دو تین سال میں ہی اسے گدی نشین بننے کا موقع مل گیا تھا۔ اب اس کی گرفتاری یا اس کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے دس لاکھ کی انعامی رقم کا اعلان موجود تھا۔

میں یہ سب کچھ فوراً اپنے مہربان ایس ایس پی جمشید صاحب کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اپنے پرانے افسر رانا صاحب کے لیڑھے پن کا بھی پتا تھا۔ ویسے بھی یہ کیس ان کی حدود میں تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ انہیں اعتماد میں لے کر یہ سب کچھ بتا دیا جائے..... پیر مخدوم کی ہلاکت کے بعد مقامی لوگوں میں عمران کے خلاف جو خطرناک اشتعال پایا جا رہا تھا، اسے کم کرنے میں بھی رانا صاحب اور ان کا ایک بھانجا اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ میرا یہ فیصلہ اگلے چند ہفتوں میں عمران کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس معاملے کی تفصیل شاید قارئین کے لیے دلچسپ نہ ہو۔ مختصراً یہ کہ ان حیران کن انکشافات کے بعد عمران اس قتل سے بری الذمہ ہو جاتا..... بلکہ اگر قانون کے عین مطابق چلا جاتا تو اسے انعامی رقم کا حق دار بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا تھا نہیں۔ جو لوگ ہمارے ہاں انصاف کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ پولیس کی گرفت میں آئے ہوئے فرد کو بے گناہ ہونے کے باوجود ان کے شکنجے سے نکالنے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لہٰذا میں نے کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر رانا صاحب کو نرم رویے پر آمادہ کر لیا۔ رانا صاحب کا ایک بھانجا انسپکٹر وحید متعلقہ تھانے میں انچارج تھا..... اور اس نے مزار کے ارد گرد ہونے والی کارروائی میں بھی حصہ لیا تھا۔ جعلی پیر مخدوم کے حوالے سے جو تہلکہ خیز انکشافات عمران کی جستجو کی وجہ سے ہوئے، ان کا سارا کریڈٹ انسپکٹر وحید کو دیا گیا۔ بالفاظ دیگر عرصہ دراز بعد اس خطرناک مجرم کو شناخت کرنے والی کارکردگی انسپکٹر وحید کے کھاتے میں ڈالی گئی اور یوں اس کی پروموشن وغیرہ کا راستہ ہموار ہوا۔ نتیجے میں عمران کو اس کیس میں نوے فیصد ریلیف مل گیا۔ وہ ضمانت کے بعد رہا ہو سکتا تھا مگر اس سے بھی بڑا کیس اب تک اس پر موجود تھا۔ اے ایس آئی کی ہلاکت کا کیس۔ بہرحال میں عمران کو گوجرانوالا سے لاہور پولیس کے پاس لانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس روز پیر مخدوم والے کیس میں عمران کی ضمانت ہوئی، اس سے اگلے روز ہی میرے گھر میں دو ان چاہے مہمان آ دھمکے۔ وہ ایک نئی پراڈو گاڑی میں پہنچے تھے۔ یہ ماہین کا ہونے والا شوہر حشام اور اس کے بزنس مین والد وہاب صاحب تھے۔

حشام ہمیشہ کی طرح جینز اور جیکٹ میں تھا۔ بال اسپائکس کی شکل میں تھے۔ اس کے والد نہایت قیمتی تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ حشام آتے ساتھ ہی مجھ پر برس پڑا۔ ''انکل! میں ماہی کی وجہ سے آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ اپنی عزت کا خیال کریں اور جو کام کر رہے ہیں، اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''آپ اس باسٹرڈ کی پشت پناہی کر رہے ہو۔ اس نے ماہی (ماہین) کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے منہ پر کالک ملنی چاہی۔ ایک فرض شناس پولیس ملازم کو بے رحمی سے قتل کیا اس نے..... اور آپ اپنے عہدے کے بل بوتے پر اسے چھڑانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہو۔''

''دیکھو حشام، تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو۔ ورنہ مجھے بھی بھولنا پڑے گا کہ تم ماہین کے ہونے والے شوہر ہو۔''

''آپ اپنی افسری کی اکڑفوں دکھا رہے ہو۔ اگر آپ کی وجہ سے وہ جانور آزاد ہوا اور اس نے ماہی کو یا ہمیں کوئی نقصان پہنچایا تو آپ کی یہ افسری بچے گی اور نہ یہ نوکری، کوئی گرے پڑے لوگ نہیں ہیں ہم۔ دن میں تارے دکھا دیں گے۔''

''یو شٹ اپ..... میری چھت کے نیچے کھڑے ہو، ورنہ میں تمہیں بتاتا۔''

اس سے پہلے کہ منہ پھٹ حشام کوئی مزید کرخت جواب دیتا، اس کا والد درمیان میں آ گیا۔ حشام کو تھوڑا ڈانٹ کر پیچھے ہٹایا پھر مجھے غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''تابش صاحب! آگ سے مت کھیلو، ایسے بندے کی پشت پناہی مت کرو جس نے ہماری بیٹی پر غلط نگاہ ڈالی ہے۔ وہ ہمارا اور ہماری بیٹی کا مجرم ہے بہتر یہ ہے کہ تم اس کے لیے قانون کو اپنا راستہ بنانے دو۔''

''قانون ہی راستہ بنا رہا ہے اور بنائے گا۔''

''ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں ہم بھی کہ قانون کو چلنے دیا جاتا ہے یا نہیں۔''

وارننگ دے کر وہ دونوں دندناتے ہوئے باہر چلے گئے، جہاں ان کے دو گارڈز مستعد کھڑے تھے۔

میں سوچتا رہ گیا۔ ماہین کے گھر والوں کو تو حقیقت معلوم تھی مگر اس کے سسرالیوں کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ جس کو اغوا کار اور قاتل کہہ رہے ہیں، وہی ہے جس نے بڑے حوصلے سے ماہین کی بلا اپنے سر لے رکھی ہے اور اسے جیل سے بچا کر سہاگ کی سیج کی طرف بڑھا رہا ہے۔ وہ ایک ظرف مند باپ کا ظرف مند بیٹا ہے۔ وہ تو غیروں کے دکھ

بھی سمیٹ لیتا تھا، ماہین کے لیے تو پھر اس کے دل میں خاص جذبات موجود تھے۔

پیار محبت کی وہی المیہ کہانی، جو ہر دور میں ہر جگہ بکھری نظر آتی ہے۔

میڈیا پر یہ معاملہ اور ہی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ پبلک میں بھی شور تھا کہ بے گناہ پولیس ملازم کو "طاقت کے نشے" میں گاڑی کے نیچے کچلنے والے کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس سلسلے میں جو ایک دو واقعات پہلے ہوئے تھے، ان کی وجہ سے بھی معاملے کو شہرت ملی تھی۔

باپ بیٹے کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی عمران کے دوست ضیا کا فون آ گیا۔ تھانے میں مار پیٹ کی وجہ سے اس کی ناک پر بھی چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اس کی آواز ابھی تک نزلہ زدہ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ وکی بھی چھوٹ کر گھر آ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ "دیکھو تمہیں کتنا کہتا رہا کہ سنبھل کر رہو اور عمران کو بھی سنبھالو مگر تم لوگوں نے نہیں سنی۔ اب سب کو بھگتنا پڑا ہے مگر یہ بھی یاد رکھو، بلا ابھی ٹلی نہیں ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کے بعد "ہیلو، ہیلو" کہا تو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔ "کیا بات ہے ضیا؟"

لمبے توقف کے بعد وہ بھرائی ہوئی گمبھیر آواز میں بولا۔ "انکل جی، پتا نہیں کہ مجھے یہ بات آپ سے کہنی چاہیے یا نہیں مگر رہ بھی نہیں سکتا..... میں آپ کو سچ بتاتا ہوں، عمران بھائی بھی لڑکیوں کے پیچھے نہیں رہے شاید لڑکیاں ہی پیچھے رہی ہوں۔ مگر وہ مس..... ماہین..... سے بہت پیار کرتے ہیں، بلکہ اسے عشق کہنا چاہیے۔ وہ ظاہر نہیں کرتے مگر مجھے اندازہ ہے کہ وہ اس معاملے میں کتنی دور جا چکے ہیں۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ سب کچھ مجھے بتا کر اب تم کیا چاہتے ہو؟"

میرے انداز نے اُسے چپ سا کرا دیا۔ اس کی آزردگی دیکھ کر میں نے ذرا نرم رویہ اختیار کیا۔ "دیکھو ضیا! یہ بات تم نے مجھ سے کہہ دی ہے، اب کسی اور سے نہ کہنا۔ یہ آگ سے کھیلنے والی بات ہو گی۔ بس ذہن میں یہ بات رکھو اسی مہینے اس کی شادی ہو رہی ہے اور اس کی مرضی سے ہو رہی ہے۔" میں نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

اے ایس آئی سلیم کی ہلاکت والے کیس سے عمران کی جان آسانی سے چھوٹنے والی نہیں تھی جس وقت اے ایس آئی کچلا گیا، عمران ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا۔ حوالات میں، میں نے عمران کو بتایا تھا کہ مجھے یہ سب معلوم ہو چکا ہے۔ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا، چاچو، جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ کو اپنے مرے ہوئے دوست کی قسم ہے کہ اس بات کو اسی طرح رہنے دیں۔ اس کی شادی سر پر ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب ختم ہو جائے گا اور اس خاتمے کے لیے میں خود کو زندگی بھر معاف نہیں کر پاؤں گا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آخر تو میری ہی بچکانا خواہش کا نتیجہ ہے۔

مجھے یہ بھی پریشانی تھی کہ ابھی تک ناکے پر ہونے والے حادثے کی فوٹیج نہیں مل سکی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ اسے دانستہ اوجھل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ "معما" بھی حل نہیں ہوا تھا کہ جیلو پارک میں وہ جعلی پولیس والے کون تھے جنہوں نے عمران اور ماہین کو ڈرایا دھمکایا اور اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی..... ڈنر میں کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا۔ زبردستی دودھ کا گلاس پی کر میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ نگاہ سیدھی سامنے مرحومہ شریکِ حیات ثروت کی تصویر پر پڑی۔ جب بھی اس کا چہرہ دیکھتا تھا، ڈیڑھ سال پہلے کے سارے دلدوز مناظر نگاہوں کے سامنے آ جاتے تھے۔

مجھے احساس ہوا کہ عمران والے سنگین معاملے کی وجہ سے جعلی ادویات والے کیس سے ایک بار پھر میری توجہ کم ہو گئی ہے۔ تین ہفتے پہلے میں نے اس سلسلے میں انسپکٹر زبیر کو ایبٹ آباد بھیجا تھا اور اس نے تھوڑی بہت پیش رفت بھی کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کام کا تسلسل ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ میں نے اسی وقت فون پر زبیر سے بات کی اور اسے تفتیش جاری رکھنے کا کہا۔ ہمارا ٹارگٹ اس فرد یا افراد کا سراغ لگانا تھا جنہوں نے عین موقع پر جعلی دواؤں کی ایک فیکٹری کے مالک کو قتل کر کے باقی سیٹ اَپ کا سراغ مٹا دیا تھا۔

فون کال کے آخر میں انسپکٹر زبیر نے مجھ سے کہا۔ "سر آپ کو تھانے فون کر لینا چاہیے تھا۔ عمران صاحب کو کل سے تیز بخار ہے۔ صبح قے وغیرہ بھی ہوئی ہے۔"

"تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"انہوں نے خود منع کیا تھا، کہتے تھے وہ پریشان ہوں گے۔"

عمران کے دس روزہ ریمانڈ میں ابھی دو دن باقی تھے۔ امید یہی تھی کہ مزید ریمانڈ نہیں ہو گا اور اُسے جوڈیشل کر دیا جائے گا۔ میں نے متعلقہ تھانے فون کیا۔

انچارج نے ذرا پس و پیش کے بعد اُس سے میری بات کرا دی۔ اس کی آواز ہی بتا رہی تھی کہ وہ تیز بخار کی غنودگی میں ہے، تاہم اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میرے سوال کے جواب میں بولا۔ ''میں نے کبھی بخار کو چڑھنے نہیں دیا، بلکہ خود اس پر چڑھ جاتا ہوں۔''

''جھوٹ مت بولو، مجھے پتا چلا ہے، صبح تمہیں الٹیاں بھی آئی ہیں۔''

''اوہو..... الٹیاں ہی آئی ہیں نا ''سیدھیاں'' تو نہیں آئیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا بچوں کا پیٹ خراب ہو جائے اور انہیں سیدھیاں آنے لگیں تو دو گھنٹے میں مرجھائے پھولوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔''

''خدا کا خوف کرو عمران، ڈینگی اور ملیریا وغیرہ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر بھجواتا ہوں تمہارے لیے۔''

''آپ فکرمند نہ ہوں۔ بہت سخت جان ہوں۔ سخت جانی اور ''ڈھیٹ پنے'' کے عالمی مقابلے ہوں تو میں ضرور سلور میڈل لے جاؤں گا۔ ظاہر ہے آپ کے ہوتے ہوئے یہ بھی کوئی کم کارکردگی نہیں ہوگی۔'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی تو کھانسی ہونے لگی۔ میں نے جھلا کر فون بند کر دیا اور زبیر کو کال کر کے کہا کہ وہ اسے ڈاکٹر کو دکھائے۔

اگلے روز جب میں ڈیوٹی سے واپس پہنچا اور اپنے ہوم جم کا رخ کیا تو ایس ایس پی جمشید صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''تابش! مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے بھتیجے کے لیے کل کوئی اچھی خبر ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ریمانڈ میں توسیع کر دی جائے۔ بڑا اکھڑا وکیل کیا ہے لڑکی کے گھر والوں نے۔''

''گھر والوں سے آپ کی مراد ماہین کا چچا ثاقب رشید ہے؟''

''وہ تو ہے ہی مگر اس سے بھی بڑھ کر کردار لڑکی کے ہونے والے سسرالی کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا ہونے والا شوہر حشام اور کیا نام ہے اس کے باپ کا وہاب قادر۔''

''فالتو رویہ بول رہا ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''وہی بول رہا ہے اور ایک جگہ نہیں دو جگہ بول رہا ہے۔ یہ باپ بیٹا اس تفتیش پر اوپر سے دباؤ ڈلوانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ کل وہ دونوں ایک اعلیٰ افسر سے بھی ملے ہیں۔''

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ دونوں یہاں گھر آ کر مجھے جو دھمکی دے کر گئے تھے، اب اس کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ یہ ساری زیادتی میری نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی اور میرے لیے اسے برداشت کرنا مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔

جمشید صاحب نے مجھے ایک اور اطلاع بھی دی جس نے میرے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ انہوں نے بتایا کہ کل حشام اور اس کا والد اپنا کوئی تعلق استعمال کر کے حوالات میں عمران کے پاس پہنچے تھے۔ وہاں انہوں نے عمران سے تُو تُکار کی اور وہاب قادر نے عمران کو تھپڑ بھی مارا۔ میں اس اطلاع پر حیران رہ گیا تھا۔ کل ہی شام کو میں نے عمران کی عیادت کے لیے اسے فون کیا تھا اور اس نے اس تکلیف دہ واقعے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جمشید صاحب نے کہا کہ وہ اس واقعے کے ذمے دار پولیس اہلکاروں کی ٹھیک ٹھاک خبر لیں گے۔ میں طیش کے عالم میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ یہ بھی ایک ششدر کر دینے والی کروٹ تھی۔

وہ ایک یخ بستہ رات تھی۔ رات کے کھانے میں چند نوالے لے کر میں نے ملازمہ کرن سے کہا تھا کہ وہ جا کر سو جائے۔ خود میں جاگ رہا تھا اور عمران کی گمبھیر تر ہوتی مصیبت کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف خود ماہین تھی۔ آج اس کے ابٹن کی رسم تھی، لہٰذا اس کی کال نے مجھے حیران کر دیا۔

''السلام علیکم انکل تابش!'' وہ عجیب دبے دبے لہجے میں بولی۔ بیک گراؤنڈ میں کہیں ڈھولک کی بہت مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ رسم ختم ہو چکی ہے، ویسے ہی کوئی اِکا دُکا لڑکیاں ڈھولک بجا رہی ہیں۔

''خیریت ہے ماہین..... اس وقت کال کر رہی ہو؟''

''میں..... آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں انکل۔ بہت ضروری بات ہے۔ میں وہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' آواز میں لرزش تھی۔

''ماہین، مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ابھی سو جاؤ، صبح بات کر لینا۔''

''نہیں انکل، صبح مجھے موقع نہیں ملے گا۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اس کا تعلق..... میری..... پوری لائف سے ہے۔ پلیز..... پلیز میری بات سنیں۔''

''اچھا کہو، میں سن رہا ہوں۔''

وہ جیسے آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''انکل تابش! میاں بیوی کا ریلیشن محبت اور خلوص کا ہوتا ہے لیکن..... مجھے کسی وقت لگتا ہے کہ حشام مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔ وہ جیسے..... جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا ہے کہ دیکھو میں تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری بدنامی کو بھی گلے لگا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ اغوا کی واردات جڑی ہوئی ہے۔ تمہارا نام ٹی وی اور اخباروں میں آچکا ہے..... دیکھو پھر بھی تمہیں وہی پہلے والا مقام دے رہا ہوں۔ انکل تابش! مجھے یہ سب کچھ قبول نہیں ہے۔ میرے بڑوں نے میرے لیے جو کچھ کیا، وہ وقتی طور پر تو میری ڈھال بن گیا مگر میں اس جھوٹ کے ساتھ حشام کی زندگی میں داخل ہونا نہیں چاہتی۔ اور میں صرف حشام کی ہی نہیں، حشام سے زیادہ عمران کی گناہ گار بن رہی ہوں۔ وہ حوالات میں پڑا ہے اور میں یہاں شادیانے بجا رہی ہوں۔ میں اس بھاری بوجھ کو اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں سب کچھ سچ سچ کہہ دینا چاہتی ہوں۔ میں سب کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ اُس روز میں اپنی مرضی سے عمران کے ساتھ گئی تھی..... اور یہ بھی کہ پولیس مین کو عمران نے نہیں میں نے کچلا تھا۔'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

''ماہین..... یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ چار پانچ دن بعد تمہاری شادی ہے۔''

''یہ شادی نہیں سمجھوتا ہے انکل..... اور میں حشام سے شادی کی تمنا رکھتی تھی۔ پلیز آپ مجھے نہ روکیں۔ مجھے یہ سچ بولنے دیں۔ پھر جو میری قسمت۔''

میں حیران تھا کہ وہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''ماہین! تم جذباتی ہو رہی ہو۔ ایسے موقعوں پر ایسے رویّوں سے نقصان ہوتا ہے۔ ابھی تم اپنا دھیان صرف اس بات پر رکھو کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی عزت اس معاملے سے جڑی ہوئی ہے جہاں تک عمران کی بات ہے، اس کی لڑائی بھی ہم لڑ رہے ہیں اور اچھے طریقے سے لڑ رہے ہیں، مقدمہ والے کیس میں بھی اس کی ضمانت ہو چکی ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے انکل! میں اس جھوٹ کے ساتھ حشام کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتی، مجھے اس کا ترس نہیں اس کی محبت درکار ہے۔''

''اچھا، تم ایسا کرو فی الحال سو جاؤ۔ کل کسی وقت اس بارے میں تسلی سے بات کریں گے..... اور دیکھو مجھ سے پوچھے بغیر تم کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔''

میں نے اسے حتی الامکان سمجھایا۔ کال ختم ہونے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا..... کسی وقت لگتا تھا کہ وہ کچھ شدید اُلجھنوں کے گھیرے میں ہے۔ جیسے اپنے آپ کو خود بھی سمجھ نہیں پا رہی۔ مجھے اس کی خالہ فوزیہ کی باتیں یاد آئیں جو اس کے بے حد اُلجھے ہوئے رویّے کے بارے میں انہوں نے کہی تھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ جو کچھ عمران کے بارے میں سوچتی ہے، وہ خود اس کی اپنی سمجھ میں بھی نہ آ رہا ہو۔

میرا ارادہ تھا کہ صبح پہلے ماہین کی خالہ سے فون پر بات کروں گا پھر اسے سمجھاؤں بجھاؤں گا۔ مگر اگلے روز جو کچھ ہوا، اس نے میرا دماغ بھک سے اُڑا دیا۔ یقین ہی نہیں ہوا کہ ماہین سب مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ارادے میں اس حد تک آگے چلی جائے گی۔

میں صبح دس گیارہ بجے تک اسے فون کرتا رہا مگر رابطہ نہیں ہوا۔ تب انسپکٹر زبیر کی زبانی مجھ پر انکشاف ہوا کہ آج صبح نو بجے کے لگ بھگ ماہین ایک خاتون کے ہمراہ علاقہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئی ہے اور اس نے حلفیہ یہ بیان دیا ہے کہ تین دسمبر کے روز وہ اپنی مرضی سے عمران سے ملنے گئی تھی۔ وہ اس کے اچھے دوستوں میں تھا۔ اس کے فرینڈ سرکل میں اس کے بارے میں سب جانتے تھے۔ وہ پاکستان سے واپس جا رہا تھا اور جانے سے پہلے لاہور کے قابلِ دید مقامات دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ ہو گئی۔ بدقسمتی سے جب شام کے بعد انہیں پولیس ناکے پر روکا گیا تو وہ نہ رکی۔ اس وقت وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہی تھی اور اس کی رفتار بھی بہت زیادہ تیز نہیں تھی لیکن ایک پولیس اہلکار اتنی تیزی سے اور غیر متوقع طور پر سامنے آیا کہ وہ اسے بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ اس نے حلفیہ یہ بھی کہا کہ اس کا پہلا بیان غلط بیانی پر مبنی تھا۔ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی اور مکمل حقیقت بیان کر رہی ہے۔ عمران نے صرف اسے بچانے کے لیے خود پر الزام لیا ہے، وہ اس معاملے میں قطعی بے قصور ہے۔

انسپکٹر زبیر نے مجھے بتایا کہ مس ماہین نے اپنے بیان کی تصدیق میں کوئی ثبوت وغیرہ بھی پیش کیا ہے جس کے بعد پولیس نے اسے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے۔

میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس جذباتی لڑکی نے وہ سب کر دیا تھا جو کرنے کا سوچ رہی تھی۔ انسپکٹر زبیر کسی خاتون کا ذکر بھی کر رہا تھا جو بیان کے وقت اس کے ساتھ تھی۔ میں نے زبیر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

''جہاں تک مجھے معلوم ہے، خاتون کا نام شاہین ہے۔ وہ غالباً مس ماہین کی بڑی بہن ہیں اور دو تین روز پہلے ہی انگلینڈ سے آئی ہیں۔''

.....شاہین وہ تھی جس نے میرے بچھڑے یار عمران دانش سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور اس کی زندگی میں آنے کے پہلے برسوں تک اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔ پھر جب وہ ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنی بے مثال مسکراہٹوں سمیت ابدی سفر پر روانہ ہو گیا تھا، تو شاہین بھی اس کی یادیں سمیٹ کر کسی جانب چل نکلی تھی اور اب مدتوں بعد وہ پھر منظر پر ابھری تھی۔

☆☆☆

میں اب جلد از جلد شاہین سے ملنا چاہتا تھا اور یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ ماہین نے یہ سب کیوں کیا ہے، تاہم اگلے تین چار روز میں دو تین کام ایسے ہنگامی آن پڑے کہ میں کسی اور طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔ ان میں سے ایک کام بڑی سنگین نوعیت کا تھا اور اس نے مجھے خاصا ڈسٹرب کیا۔

اندرون ملک اور بیرون ملک سے مجھے کافی ڈاک موصول ہوتی تھی۔ اس میں مارشل آرٹ کے حوالے سے میرے بہت سے پرستاروں کی ڈاک بھی ہوتی تھی۔ ایک سوال بہت کامن تھا جو مجھ سے کیا جاتا تھا..... میں نے خود کو اتنا سخت جان اور تکلیف برداشت کرنے کے قابل کس طرح بنایا.....؟ اور یہ کہ ہم خود کو ایسا کس طرح بنا سکتے ہیں؟ میرا جواب بھی تقریباً ایک ہی ہوتا تھا۔ ''میں نے ایک بے مثال استاد کی رہنمائی میں اپنے نفس کی مرضی کے خلاف چلنا سیکھا اور دھیرے دھیرے اس مخالفت کے لیول کو بڑھاتا چلا گیا، اس کامل یقین کے ساتھ کہ مجھے اس جفاکشی کا صلہ جلد یا بدیر مل کر رہے گا، خود کو ذائقے، جنس اور آرام طلبی جیسی ساری جسمانی لذتوں سے حتی الامکان حد تک دور کیا اور ذہنی و جسمانی مشقت کے کانٹوں پر ننگے پاؤں چلنا سیکھا۔''

تو میں بات کر رہا تھا خود کو موصول ہونے والی ڈاک کی۔ کبھی کبھی کوئی جوشیلا فین چھوٹا موٹا گفٹ بھی ارسال کر دیتا تھا۔ اُس روز ایک ایسے ہی چھوٹے سے پارسل کو دیکھ کر مین چونکا۔ یہ ایک ڈبیا سی تھی، میں نے اسے احتیاط سے کھولا تو اندر سے ایک تہ شدہ کاغذ برآمد ہوا۔ اس کاغذ کی تحریر کا آغاز ہی گندی گالیوں سے ہوا تھا۔ ساتھ میں دو عدد مارر انگلش کی دو گولیاں بھی تھیں۔ گولیوں پر سرخ رنگ کے باریک مارکر سے لکھا گیا تھا۔ ایک پر تحریر تھا۔ ''تمہارے دل کے لیے'' دوسری پر درج تھا۔ ''تمہاری منحوس کھوپڑی کے لیے۔''

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کاغذ کی کمپوز شدہ تحریر میں لکھا تھا۔ ''ایبٹ آباد کا موسم بڑا ٹھنڈا ہے۔ اکڑ کر رہ جاؤ گے۔ اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔ ہم دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے یادگار دشمن ہیں۔ تم خود تو ڈوبو گے ہی تمہارے پیاروں کے پھیپھڑوں میں بھی ایسا برفیلا پانی بھریں گے کہ اگلی نسل بھی یاد رکھے گی۔ اس کو آخری وارننگ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔''

ایبٹ آباد کا اشارہ یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہ وہی تفتی ادویات والا معاملہ ہے جس کی تحقیق میں نے دوبارہ شروع کی ہے۔ آخری وارننگ اور پیاروں والی بات نے میرا دھیان پلک جھپکتے، نجانے کیوں اس واقعے پر پہنچا دیا جس میں جعلی پولیس کی طرف سے عمران اور ماہین کو سخت ہراساں کیا گیا تھا۔ میں نے فوراً یہ ساری صورتِ حال ایس ایس پی جمشید صاحب کو بتائی اور انہوں نے اس سلسلے میں مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے علاوہ خود بھی اس معاملے کی چھان بین کا آغاز کر دیا۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ ایک شام گوجرانوالا سے ایس ایس پی جناب رانا صاحب کی طویل فون کال آئی۔ میرے حوالے سے اُن کے دل میں کبھی نرم گوشہ نہیں رہا تھا مگر میرے اور عمران کی وجہ سے انہیں کافی فائدہ ہوا تھا، وہ کچھ نرم پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''تابش! ویسے وہ مُنڈا، تمہارا بھتیجا ہے لکی یوائے۔ پیر مخدوم والا کیس بڑا ٹگڑا تھا مگر اس کی ضمانت ہو گئی..... بلکہ سمجھو بچ گیا۔ اب اس دوسرے کیس سے بھی خارج ہو رہا ہے..... مگر وہ کُڑی تو پھنس گئی ہے نا۔''

''ہاں رانا صاحب! اور یہ میڈیا والے بھی معاملے کو برابر اٹھائے ہوئے ہیں۔''

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں۔ اس کُڑی ماہین نے اور کچھ نہیں تو چھ سات سال کے لیے جیل چلے جانا ہے۔ تباہ ہو کر رہ جائے گی۔''

بات ایسی ہی تھی، یہ تو مجھے بھی لگ رہا تھا کہ کچھ لوگ اس معاملے کو ٹیسٹ کیس بنا کر مثالی سزا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

''آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' میں نے رانا سے پوچھا۔

''مشورہ تم نے کبھی مانا تو نہیں مگر دینے میں کیا حرج

ہے۔ اصل نکتہ ایک ہی ہے۔ کسی بھی طرح اس فوٹیج کا پتا چلو: ڈجونا کے پر بنی۔"

"وہ ہمارے پٹی بھائیوں نے ہی غائب فرمائی ہے گی رانا صاحب۔"

"مگر مجھے اس کے علاوہ بھی شک ہے۔ واقعے کے پندرہ بیس گھنٹے بعد میں نے سنا تھا کہ فوٹیج مل گئی ہے مگر پھر اچانک اس کل کو پلٹا پار دیا گیا۔"

"سر پلیکس آفس کے دو بندوں سے کافی پوچھ گچھ ہوئی ہے ایک تو کئی دن حراست میں بھی رہا ہے لیکن کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔"

ایک دو "قیمتی مشوروں" سے نوازنے کے بعد خشک رویے والے رانا صاحب نے مجھے پہلی بار اپنے مخصوص انداز میں "رب راکھا" کہا۔

یہ پانچویں چھٹے روز کی بات ہے، مجھے اپنی طوفانی مصروفیت سے فراغت مل چکی تھی۔ میرے گھر میں، میں اور شاہین آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گزرے ماہ و سال نے اس کی خوب صورتی و دلکشی پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔ بس بالوں کا گھنا پن تھوڑا کم ہوا تھا اور وزن میں انیس بیس کا فرق پڑا تھا۔ جنوری کی اس خنک شام میں کئی یادیں جیسے یلغار کر کے اس کمرے میں گھس آئی تھیں۔ وہ رو رہی تھی، میری آنکھوں میں بھی نمی تھی..... لگ رہا تھا عمران دانش آج ہی بچھڑا ہے۔ آج ہی اس نے موت سے جنگ ہاری ہے اور آج ہی میں نے اس کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا ہے۔ ہم پچھلے بیس منٹ سے عمران دانش کی باتیں ہی یاد کر رہے تھے۔ وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "ثروت کی موت کا بھی بہت دکھ ہوا تابش صاحب! پچھلے پندرہ سولہ برسوں میں وہ بھی اکثر میرے خیالوں میں رہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ملازمہ کرن نے آکر اطلاع دی کہ عمران آیا ہے۔ (شاہین کے اقبالی بیان کے بعد دو روز پہلے ہی عمران کی ضمانت ہوئی تھی۔ اس حوالے سے ایک بار پھر میڈیا پر سنسنی خیز نیوز چلی تھیں) میں نے شاہین سے پوچھا۔ "عمران جونیئر کو دیکھا ہے تم نے؟"

"نہیں، ابھی صرف تصویر دیکھی ہے۔"

"کتنا ملتا ہے عمران دانش سے۔ لگاہوں کو دھوکا ہونے لگتا ہے۔"

"ہاں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"صرف شکل کی بات ہی نہیں، اس کی زیادہ تر عادات بھی باپ جیسی ہی ہیں، اس کا ہنسنا بولنا، اٹھنا بیٹھنا....."

اسی دوران میں عمران دروازے پر نمودار ہوا۔ پہلے سے کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ "سلام چاچو جان..... سلام آنٹی۔" اس نے کہا۔

شاہین ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر عجیب سا رنگ ابھرا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ عمران کے قریب پہنچی۔ عمران نے اپنا سر جھکایا۔ شاہین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گلے سے لگا لیا۔ "ہو بہو اپنے باپ کی تصویر ہو۔" وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولی۔

ہم بیٹھ گئے۔ کرن چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ گئی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ عمران نے کہا۔ "آنٹی جان! آپ سے غائبانہ تعارف بہت پرانا ہے۔ آپ سے کہنے پوچھنے کی بھی بہت سی باتیں ہیں..... مگر فی الحال ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں..... ماہین نے یہ سب کیوں کیا؟ ماہین کو اپنے پاس بلانا اور اس کے ساتھ شہر میں گھومنا میری غلطی تھی۔ غلطی بھی کیا شاید بلینڈر تھا۔ اس بلینڈر کی سزا اس نے خود کو کیوں دی؟"

"وہ بھی تو یہی بات کہتی ہے عمران۔" شاہین مشفق لہجے میں بولی۔ "پولیس اہلکار کی موت اس کی غلطی کی وجہ سے ہوئی۔ تم اس کی سزا کیوں بھگتو۔"

"لیکن....."

"لیکن، کچھ نہیں عمران بیٹا۔" شاہین نے اس کی بات کاٹی۔ "ماہین نے جو کچھ کیا ہے، ٹھیک کیا ہے..... اور مجھ سے مشورے کے بعد کیا ہے۔ وہ ایک جھوٹ کے ساتھ حشام کی زندگی میں داخل ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے سب سچ کہہ دیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ گئی تھی۔ حادثے کے وقت ڈرائیونگ وہ کر رہی تھی۔ اس کی یہ بات اس کے لیے کم خطرناک ہے مگر تمہارے لیے بہت خطرناک تھی۔ تمہارے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس تک نہیں تھا۔ اس کے پاس لائسنس ہے اور وہ شہری بھی ہے۔ اب اگر عدالت میں یہ ثابت ہو گیا کہ اے ایس آئی حادثاتی طور پر اچانک گاڑی کے سامنے آ گیا، تو یہ کیس کافی کمزور پڑ جائے گا پھر اس پر قصاص دیت وغیرہ کا قانون بھی لاگو ہو سکتا ہے۔"

"مگر یہ حادثہ ثابت ہو گا تب ہے نا۔ کیس تو یہ بن رہا ہے کہ ندرکنے کے لیے بے رحمی سے گاڑی اے ایس آئی پر چڑھا دی۔"

"اسے حادثہ ثابت کرنے کے لیے ہم کوشش کر سکتے ہیں۔" شاہین بولی۔

''مگر میڈیا پر جو طوفان برپا ہے، اس کا کیا ہوگا۔ وہ سارے تیر جو میری طرف چلائے جا رہے تھے، ان کا رخ ماہین کی طرف ہو گیا ہے۔''

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اصل مسئلہ تو سی سی ٹی وی فوٹیج کا ہے۔ کسی وقت تو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے جان بوجھ کر ادھیل کر دیا گیا ہے۔''

عمران نے گہری سانس لے کر اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو سہلایا اور بولا۔ ''ایک اور بات بار بار میرے ذہن میں آتی ہے چاچو! جو پولیس اہلکار اچانک گاڑی کے سامنے گرا، وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ وہ نشے میں لگتا تھا یا کسی دوا کے اثر میں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے معمولی ٹھوکر بھی لگی ہو مگر وہ جس طرح گرا، وہ منظر بار بار نظروں کے سامنے آتا ہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنا پر گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اُس وقت نارمل نہیں تھا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اگر کسی غیر جانبدار ڈاکٹر نے اس کا پوسٹ مارٹم کیا ہے تو رپورٹ میں بھی یہ بات لازمی آنی چاہیے۔''

''میں نے رپورٹ دیکھی تھی عمران، اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں۔''

''تو پھر چاچو..... آپ کو اُس سرجن پر بھی شبہ کرنا چاہیے۔''

عمران نے یہ بات بہت زور دے کر نہیں کہی تھی مگر ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب شاہین اور عمران دونوں چلے گئے تو میں نے انسپکٹر زبیر کے ذریعے اس سرجن کا پتا کرایا۔ 48 گھنٹے بعد زبیر نے جو رپورٹ دی، وہ چونکانے والی تھی۔ سرجن کا نام ماجد اکرام تھا اور وہ سرو سز اسپتال کے قریب ہی رہائش رکھتا تھا۔ زبیر اور رائے نے اس کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی تھیں۔ زبیر نے کہا۔ ''جناب! یہ بندہ ایک عام سی پوسٹ پر ہونے کے باوجود بڑے لمبے ہاتھ رکھتا ہے۔ اس کے جو اثاثے سامنے نظر آتے ہیں، وہ بھی اس کی آمدن وغیرہ سے میل نہیں کھاتے۔ ڈیفنس میں دو کینال کی کوٹھی اس کی بیوی کے نام ہے۔ ایک بڑا پلاٹ بھی اسی علاقے میں ہے۔ اس کے علاوہ مصروف ہاؤسنگ سوسائٹی میں یہ ایک چھ منزلہ پلازہ کا مالک بھی ہے۔''

''یعنی بندہ ٹھیک نہیں۔''

''لگتا تو یہی ہے جی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کسی بہت بگڑے بندے یا پارٹی کا ہاتھ ہے۔''

میں نے کہیں پہلے بھی اس بندے کا نام سنا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ فوٹیج کے سلسلے میں مزید ٹکریں مارنے سے پہلے اس ڈاکٹر سے ملوں۔

عمران کی رہائش والے محلے ندیم ٹاؤن میں اس کی واپسی کا باقاعدہ جشن منایا گیا تھا۔ چند ماہ کے مختصر وقت میں ہی اس نے مقامی لوگوں کے دلوں میں کافی جگہ بنا لی تھی۔ اس کے خلاف جو خبریں پھیلی تھیں، ان پر کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا اور اب تو ماہین کے بیان کے بعد سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا تھا۔ علاقے کے لوگ اس پر صدقے واری جا رہے تھے۔ حوالات میں عمران کو تھپڑ مارنے والی خبر بھی پتا نہیں کس طرح لیک آؤٹ ہو گئی تھی اور لوگ سیٹھ وہاب کے خلاف غم و غصے سے بھر گئے تھے مگر خود عمران پر ایسی باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے روز میں عمران کے ساتھ سرجن ڈاکٹر ماجد اکرام سے ملنے جیل روڈ پر واقع اس کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ اتوار کا روز تھا اور رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ میں نے ڈور بیل دی۔ ایک گارڈ نما چوکیدار باہر نکلا۔ میں نے اپنا نام تابش بتایا تو جواب میں اس نے مسکراہٹیں بکھیریں اور بڑی خوش دلی سے ہمیں اندر لے گیا۔ میں نے اور عمران نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا کہ چوکیدار کو ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا ہمیں اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ہمارے سامنے ڈرائی فروٹس سے بھری ہوئی طشتری رکھ دی۔

''ڈاکٹر صاحب نے آپ کا بتایا تھا۔ بس ابھی آجاتے ہیں۔'' چوکیدار نے ٹی وی آن کرتے ہوئے کہا۔

ابھی صرف دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خوبرو دراز قد لڑکی گھبرائی ہوئی برآمد ہوئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی۔ رنگین دوپٹا پاؤں میں الجھ رہا تھا، بال منتشر تھے۔ لڑکی کے پیچھے ہی ماجد اکرام برآمد ہوا۔ اس کا نصف سر گنجا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اس نے لڑکی کو بازو سے تھاما۔ وہ فریادی لہجے میں بولی۔ ''پلیز ماجد صاحب! ابھی مجھے جانے دیں۔ بہت دیر ہو جائے گی..... پلیز.....'' وہ دونوں ہمیں نہیں دیکھ پائے تھے۔

''دیکھو عالیہ یہ ٹھیک نہیں۔ پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا.....''

اسی دوران میں ایک اور لڑکی دروازے سے نکلی۔ یوں لگا جیسے وہ ڈاکٹر ماجد کی مددگار ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر سہمی ہوئی لڑکی سے کچھ کہنا چاہا اور یہی وقت تھا جب ماجد اکرام کی نگاہ ڈرائنگ روم کے اس گوشے کی طرف اٹھ گئی جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں حیرت سے کھل رہ گئیں۔ بدحواس لڑکی کی کلائی اس کی گرفت سے نکل گئی۔ دونوں لڑکیاں بھی حیرت زدہ سی نظر آرہی تھیں۔

ماجد اکرام لڑکھڑا کر ہماری طرف بڑھا۔ ''کون ہیں آپ لوگ؟'' اس نے رعب دار لہجہ بنا کر پوچھا۔

''آپ کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔ میں ڈی ایس پی تابش ہوں۔ ہمیں آپ کے بارے میں کچھ مشکوک اطلاعات ملی ہیں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''مشکوک اطلاعات۔'' وہ گرجا۔ ''یہ کیا فضول بکواس کر رہے ہو آپ۔'' پھر وہ دروازے کی طرف منہ کر کے دہاڑا۔ ''گلریز خان..... گلریز خان۔''

چوکیدار لپکا ہوا اندر آیا۔ ماجد اکرام چلایا۔ ''ان کو کس نے اندر آنے دیا؟''

''جج..... جی، آپ نے ہی تو کہا تھا کہ.....''

میرے اشارے پر عمران نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر میں... فی الوقت ان چاروں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ''ماجد اکرام، یہ دونوں کون ہیں؟'' میں نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور اب یہ نہ کہنا کہ میں پوچھنے والا کون ہوتا ہوں۔'' میں نے اپنا سروس کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ زیادہ پریشان نظر آیا مگر آنکھوں میں بدستور طیش کی چمک تھی۔

''میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ تھیلے انداز میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے نکلا تھا۔

''بالکل نہیں۔'' میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''ابھی کوئی فون نہیں، نہ تم کرو گے نہ یہ لڑکیاں اور نہ کوئی اور.....''

''پیچھے ہٹو۔'' وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ اس نے دھکا دے کر مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے جوابی دھکا دیا اور کوٹ کے اندر سے اپنا سروس پسٹل نکال لیا۔

''نہیں ماجد اکرام، فی الحال یہ زور زبردستی نہیں چلے گی۔''

''تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں دس منٹ میں..... تم دونوں کی دنیا اندھیر کر دوں گا۔''

''فی الحال تو تم اپنی دنیا کی فکر کرو۔'' عمران نے دھکا دے کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر دونوں لڑکیوں سمیت گلریز خان کی سٹی بھی گم ہو گئی تھی۔

''ادھر بیٹھو تم دونوں بھی۔'' عمران نے حکم سے کہا۔ اور دونوں لرزتی کانپتی لڑکیاں بھی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عمران نے چوکیدار سمیت ان تینوں کے سیل فون قبضے میں لے لیے۔

یہی وقت تھا جب کمرے میں سیل فون کا میوزک بجنے لگا۔ یہ ڈاکٹر ماجد کا فون تھا۔ عمران اندر گیا اور اٹھا لایا۔ اسکرین پر کسی تابش چودھری کا نام چمک رہا تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ فون خاموش ہوا تو میں نے گلریز خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ وہی تابش ہے جس کے مغالطے میں تم نے ہمیں اندر آنے کا شرف بخشا ہے۔ دوبارہ کال آئے تو تم وہی کہو گے جو ہم کہیں گے۔ ورنہ تھانے کی مار تم سمجھتے ہی ہو گے۔'' وہ بس سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کال آئے تو اسے کیا کہنا ہے۔ ابھی میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ تابش چودھری صاحب کی کال پھر آ گئی۔ گلریز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑی جلدی میں کہیں نکل گئے ہیں، فون بھی گھر ہی چھوڑ گئے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ دوسری طرف سے مایوسی کا اظہار کیا گیا اور پوچھا گیا کہ دونوں لڑکیاں کہاں ہیں؟ گلریز نے بتایا کہ وہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔ تابش چودھری نے فرمایا۔ ''میں تو گھر سے نکلنے ہی والا تھا..... چلو جب بھی ماجد صاحب آئیں، مجھے فون کریں۔''

اس گفتگو کے دوران میں ماجد اکرام بے چینی سے پہلو بدلتا رہا تھا۔ اس کی کھا جانے والی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں مگر مجھے پسٹل بدست دیکھ کر وہ کسی بھی حرکت سے باز رہا۔

میں نے اب اپنے ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ میں نے پسٹل عمران کے ہاتھ میں دیا تاکہ وہ ماجد اکرام کے غصے کو جھاگ بنانے اور بٹھائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ دونوں لڑکیوں کو میں نے باری، باری دوسرے کمرے میں بلایا اور ان سے پوچھ گچھ کی۔ میں

پچیس منٹ کے اندر سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

جولڑکی ماجد اکرام کی منت سماجت کرتی رہی تھی، اس کا نام عالیہ تھا۔ دوسری کا نام الفت تھا اور وہ اپنی کچھ تصویروں کے سبب ماجد اکرام کے ہاتھوں کئی ماہ سے بلیک میل ہو رہی تھی۔ ماجد نے اسے اپنے جال میں پھنسایا ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ گاہے بگاہے اس کی عزت سے کھیل رہا تھا بلکہ اس شاطر نے الفت کے ذریعے اس کی سہیلی عالیہ پر بھی جال پھینک دیا تھا۔ اب عالیہ کی کچھ تصویریں بھی ماجد اکرام کے پاس تھیں اور وہ ایک بار اس کے ہاتھوں کھلونا بن چکی تھی۔ ماجد نے اسی پر بس نہیں کیا تھا اب وہ ان دونوں ڈری ہوئی لڑکیوں کو اپنے دو چار قریبی دوستوں کے سامنے بھی پیش کرنا چاہ رہا تھا۔ الفت تو اس ذلت پر بھی راضی ہو چکی تھی مگر عالیہ بدک رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ماجد اور عالیہ کا جو سین ہم نے دیکھا، وہ اسی حوالے سے تھا۔ الفت نے مجھے تصویروں کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے یہی معلوم ہوا کہ بظاہر وہ کوئی ایسی نازیبا تصویریں نہیں تھیں مگر الفت کے لیے اس لحاظ سے بے حد نازک معاملہ تھا کہ ان تصویروں میں وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ نظر آتی تھی۔ بس اس جال میں پھنستے پھنستے وہ زیادہ ہی پھنس گئی۔ (یہ ہمیں آگے جا کر پتا چلا کہ بات بلیک میلنگ کی تو تھی لیکن تصویروں کی نہیں تھی)

کئی دفعہ حالات اپنا رخ خود منتخب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم یہاں صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کے حوالے سے ڈاکٹر ماجد کی ٹوہ لینے آئے تھے مگر یہاں کچھ اور ہی منظر نامہ کھل گیا تھا۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر ماجد اکرام کرپٹ شخص ہے۔

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر ایس ایس پی جمشید صاحب کو فون کیا اور انہیں ماجد اکرام کے بارے میں اور یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ ماجد اکرام کے نام نے جمشید صاحب کو بھی چونکا دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”تابش! یہ بندہ معمولی نظر آنے کے باوجود معمولی نہیں ہے۔ تم نے یوں اس پر ہاتھ ڈال کر بڑا رسک لیا ہے۔ اب تمہیں کچھ نہ کچھ ثابت کرنا پڑے گا ورنہ بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔“

”آپ کا مشورہ کیا ہے؟“

”میں کیا مشورہ دوں، جو کچھ تم بتا رہے ہو، اس کے مطابق تو اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتے ہو۔ اب اسے گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لاؤ گے تو فوراً ہی فون کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جائیں گی۔ تم بے بس ہو کر رہ جاؤ گے۔“

”تو پھر اس کی گرفتاری ڈالے بغیر اس سے پوچھ گچھ کر لی جائے؟“

”مگر اس کی کوٹھی میں پوچھ گچھ کرو گے تو ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس کی گرفتاری کا پول کھل جائے گا۔“

میں جمشید صاحب کی بات سمجھ رہا تھا۔ انہیں تسلی دے کر میں نے کال ختم کر دی۔

☆☆☆

یہ قریباً ایک گھنٹے بعد کا منظر تھا۔ ہم دریائے راوی کے پار ایک کوٹھی میں موجود تھے۔ یہ ایک جانے والے کی کوٹھی تھی اور خالی پڑی تھی۔ ماجد اکرام بھی یہیں موجود تھا لیکن اس حالت میں کہ وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں لڑکیاں اور چوکیدار گلریز بھی یہیں پر تھے اور دو علیحدہ کمروں میں بند تھے۔ ماجد اکرام پہلے تو بڑے دھڑلے سے گالیاں بکتا رہا تھا پھر اس نے مجھے اور عمران کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھ پاؤں تڑوا کر ہمیں سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دے گا اور ایسا نہ کر سکا تو اپنی شیو پیشاب سے کروائے گا۔ اسے گرا کر اس کے ہاتھ عمران نے ہی باندھے تھے۔ لہٰذا وہ زیادہ غصہ عمران پر ہی نکال رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھیں ماجد صاحب! جو کچھ آپ نے بہت ذلیل ہو کر بکنا ہے، وہ پہلے ہی بک دیں تو فرشتے آپ کا نام سمجھداروں کی فہرست میں لکھیں گے۔“

”فرشتوں نے جو لکھنا تھا، وہ لکھ چکے۔“ ماجد پھنکارا۔ ”آج سورج ڈوبنے تک جن لوگوں نے ہاتھ پاؤں تڑوا کر اپاہج ہونا ہے تم ان کی لسٹ میں پکے ہو...“

”تو پھر آپ کے ان خادموں کو یعنی ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”وہی کرو جو کرنا چاہتے ہو، ننگا کر کے الٹا لٹکاؤ مجھے.....“

عمران ہنسا۔ ”الٹا کیوں لٹکائیں گے جناب کو..... سیدھا لٹکائیں گے۔ غالباً حضور کو لٹکنے اور لٹکانے کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں۔ شاید غیر عورتوں کے ساتھ سو سو کر آپ کے دماغ کی بتی گل ہو چکی ہے۔“ وہ ماجد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ”غور فرمائیں..... لٹکنے والے کے لیے الٹا لٹکنا تو ایک زبردست رعایت کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی پنڈلیوں

کوشکنوں کے قریب سے باندھ کر اسے ہوا میں جھلا دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے جسم کا سارا بوجھ ٹانگوں پر آسانی سے سہار لیتا ہے۔ لٹکنے کا اصل سواد تو سیدھا لٹکنے میں آتا ہے۔ کندھے اکڑنے لگتے ہیں یاروں کے۔'' عمران کے لہجے میں مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ عجیب سی تپش بھی آ گئی تھی۔

''یہ سب کچھ تجھے تیرے خیال سے بھی زیادہ مہنگا پڑنے والا ہے۔ انسان کا بچہ بن انسان کا۔''

''انسان کا بچہ ہی ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ مجھ سے اردو میں گفتگو فرما رہے ہیں۔ کبھی جانوروں سے بھی کسی نے اس طرح گفتگو کی ہے۔ ہاں آپ کے لیے ہمیں ضرور جانوروں والی زبان استعمال کرنا پڑے گی۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا فرما گئے ہیں، اس سلسلے میں مولانا رومی.....''

اسے خاموش دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''کیا فرما گئے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میں آپ سے پوچھ رہا ہوں، آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔''

قریباً پانچ منٹ بعد فریہ اندام ماجد اکرام چھت کے پنکھے سے سیدھا لٹکا ہوا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ قدرے بھاری جسم والے شخص کو سیدھا لٹکا دینا ہی اس کے لیے بہت بڑی اذیت ہوتی ہے۔ شاید کسی اضافی ایذا رسانی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ جسم کا سارا بوجھ کلائیوں اور کندھوں کے جوڑوں پر آجاتا ہے۔ کم ہمت لوگ تو آٹھ دس منٹ کے اندر ہی رونا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ماجد اکرام کم ہمت نہیں تھا اس لیے پانچ چھ منٹ تو وہ گزار گیا۔ اس دوران میں اس نے گندی گالیاں وغیرہ بھی بکیں، جس کے نتیجے میں عمران نے ایک جھاڑن اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ کندھوں کی تکلیف کے سبب تڑپنے لگا۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''لگتا ہے تمہارے ''دوست'' کو اضافی بونس کی ضرورت ہے۔''

عمران نے تھکی تھکی انداز میں سر ہلایا۔ ایک طرف ویٹ لفٹنگ میں استعمال ہونے والی ''پانچ کے جی'' کی آہنی پلیٹیں پڑی تھیں۔ ان کے ساتھ لاسٹک کی چوڑی پٹیاں منسلک تھیں۔ عمران نے یہ پلیٹیں ماجد اکرام کے ٹخنوں سے منسلک کر دیں۔

درحقیقت اس بندے پر ہاتھ ڈال کر بڑا رسک لیا تھا ہم نے یا کہنا چاہیے کہ جوا کھیلا تھا۔ اب ہماری بپت اسی میں تھی کہ وہ اپنے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کر دے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کرے گا..... اُس کے چہرے پر درج تھا کہ وہ ایک غیر معمولی کریہہ شخص ہے۔

دو چار منٹ مزید گزرے اور حالت یہ ہو گئی کہ سخت سردی میں ماجد کے سر سے ایڑیوں تک پسینا چل رہا تھا۔ اس پسینے میں اس کی بنیان اور پینٹ بھیگ چکی تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اندر کمرے میں دونوں لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ کسی ادھ کھلی کھڑکی میں سے ماجد اکرام کی حالت زار دیکھ رہی تھیں۔

اس کی بس ہونے لگی تو عمران نے اس کے منہ میں سے جھاڑن کا کپڑا نکال دیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے اور چلّانے کے بعد التجائی لہجے میں بولا۔ ''دیکھو میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں..... مجھے ہارٹ اٹیک یا برین ہیمرج ہو گیا تو تم بھی بُری طرح پھنسو گے۔''

''ہمارے غم میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''لاسٹک اور فوم کی جس بندش کے ذریعے تمہیں لٹکایا گیا ہے، وہ تمہاری کلائیوں پر کوئی نشان نہیں چھوڑے گی۔ باقی رہی مار پیٹ..... تو وہ ہم تمہارے ساتھ کر ہی نہیں رہے، لہٰذا تم ہارٹ اٹیک وغیرہ کی وجہ سے وفات بھی پا گئے تو تم پر کوئی تشدد ثابت نہیں ہوگا۔''

کم و بیش پانچ منٹ کی گریہ وزاری کے بعد بظاہر بہت مضبوط نظر آنے والے ماجد اکرام نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے۔ عمران نے لکڑی کی روفٹ اونچی ایک چوکی اس کے پاؤں کے پاس رکھ دی تاکہ وہ اس پر اپنے پاؤں کے پنجے ٹکا سکے۔ میں نے اسٹینڈ پر لگے وڈیو کیمرے کے ذریعے ماجد کے چہرے کو نائٹ کلوز کیا اور کیمرا آن کر دیا۔

اگلے آٹھ دس منٹ میں ہم نے ماجد اکرام سے جو کچھ اگلوایا، وہ ہماری توقع سے زیادہ انکشاف انگیز تھا۔ (اس کے لیے ہمیں ایک دو منٹ کے لیے پھر اس کے پاؤں کے نیچے سے چوکی نکالنا پڑی تھی)

ماجد اکرام ایک ایسا شخص تھا جو سر تا پا کرپشن کی کیچڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے وہی اعتراف کیا جس کی خاطر ہم اُس تک پہنچے تھے۔ اس نے بتایا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے اس پر دباؤ آیا تھا اور وہ رپورٹ مکمل درست نہیں ہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ متوفی اے ایس آئی سلیم کے جسم میں حادثے کے وقت ZELEPLON وغیرہ کی غیر معمولی مقدار کا سراغ ملا

تھا۔ اس سے قیافہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر پریشان تھا اور ٹرینکولائزر وغیرہ کا استعمال کررہا تھا۔

میرا اور عمران کا خیال تھا کہ ماجد اکرام پر غلط رپورٹ کا دباؤ پولیس کی طرف سے ہی آیا ہوگا مگر یہ قیافہ بھی ماجد کے بیان کی رُو سے غلط تھا۔ ماجد نے رپورٹ میں یہ ردّوبدل ایک اہم اخبار کے کرائم رپورٹر عدنان رفیع کے کہنے پر کیا تھا اور عدنان رفیع نے اس کے لیے اسے بھاری رشوت دی تھی۔

لڑکیوں والے معاملے میں ماجد نے انکشاف کیا کہ پہلی لڑکی الفت تصویروں کی وجہ سے بلیک میل نہیں ہوئی تھی..... بلکہ اس کی وجہ ایک سی سی ٹی وی فوٹیج تھی۔ یہ فوٹیج دراصل سرد پلیکس کے شعبے میں ایک کرپٹ شخص کے پاس آگئی تھی۔ ایک پارک کی اندرونی سڑک پر لگے ہوئے ایک کیمرے کی اس فوٹیج میں الفت ایک اسٹیشن ویگن کے پاس اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ نظر آئی۔ یہ کرپٹ شخص ''سرجن ماجد اکرام'' کا بھی دوست تھا۔ ان دونوں نے مل کر الفت کو پھانسا اور وہ نکلنے کی کوشش میں مزید پھنستی چلی گئی بلکہ اپنی ایک سہیلی کی بے آبروئی کا سبب بھی بنی۔

یہ فوٹیج ماجد اکرام کے اسمارٹ فون کے ایک فولڈر میں بھی پڑی تھی۔ اس کی نشاندہی پر ہم دونوں نے یہ فوٹیج دیکھیں۔ سہ پہر کے وقت پارک کی ایک سنسان سڑک پر نیلے رنگ کی وین کھڑی تھی جس کی کھڑکیوں پر پردے بھی تھے۔ فوٹیج میں الفت ایک فیشن ایبل لڑکے کے ساتھ چلتی ہوئی آتی ہے..... اور پھر ذرا جھجکتی ہوئی سی اس کے ساتھ وین میں چلی جاتی ہے۔ دو یا تین منٹ کے بعد وہ پھر باہر نکلتی ہے۔ اس مرتبہ شال اس کے سر کے بجائے ایک کندھے سے جھول رہی ہے۔ وہ جانا چاہتی ہے مگر اس کے پیچھے ہی لڑکا بھی باہر نکل آتا ہے..... وہ اسے منا کر اور تھوڑا سا کھینچ کر دوبارہ وین میں لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ لڑکے اور الفت کے چہرے بالکل واضح نظر آتے ہیں۔ ریکارڈنگ کے مطابق الفت دوبارہ کم و بیش دس منٹ بعد وین سے باہر آتی ہے۔

یقیناً یہ وڈیو اس بے وقوف لڑکی کو پھنسانے کے لیے بہت کافی تھی۔

ماجد اکرام نے جب اپنے اس دوست کا نام بتایا جس نے فوٹیج حاصل کی تھی تو میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سرد پلیکس ڈپارٹمنٹ کا وہی بندہ مقصود احمد تھا جس سے ہم متوفی اے ایس آئی کے حوالے سے بھی پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ واقعے کی وڈیو غائب ہونے کی نسبت سے جن دو تین ملازموں سے تفتیش کی گئی تھی، ان میں مقصود بھی شامل تھا بلکہ وہ تین روز پولیس کسٹڈی میں بھی رہا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ شکلیں دھوکا دیتی ہیں۔ شکل و صورت سے وہ بھی بے حد شریف نظر آتا تھا مگر اب ماجد اکرام کے بیان کے بعد وہ مشکوک تر ہو گیا تھا۔

میں نے ماجد اکرام سے پوچھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم اس فوٹیج کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتے ہو جو اے ایس آئی سلیم کی موت کے وقت بنی اور پھر غائب ہوئی۔''

''مجھے جو پتا تھا، وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔'' وہ بُری طرح کراہتے ہوئے بولا۔

عمران نے کہا۔ ''جناب ماجد اکرام صاحب، الفت والی وڈیو سے پتا تو یہی چل رہا ہے کہ آپ اور یہ حضرت، مقصود احمد صاحب لنگوٹیے یار ہو..... بلکہ شاید آپ دونوں کے درمیان لنگوٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اس طرح کی اہم باتیں وہ آپ سے چھپاتا ہو.....''

پہلے تو ماجد صاف انکار کرتا رہا، مگر جب ایک بار پھر عمران نے اس کے پاؤں کے نیچے سے چوکی نکالنے کا ارادہ کیا اور پانچ کلوگرام والی آہنی پلیٹیں اس کی پنڈلیوں سے جوڑیں تو اس نے بک دیا۔ اسے معلوم تھا اس وڈیو کے بارے میں..... اور یہ بھی معلوم تھا کہ مقصود احمد نے اسے جان بوجھ کر چھپایا ہے۔

اس نے لرزاں و ترساں لہجے میں بتایا۔ ''حادثہ ہونے کے بعد یہ فوٹیج پولیس شاید چھپانا چاہتی ہوگی..... مگر مسئلہ یہ تھا کہ حادثے کے بعد کیمرے میں واقعی فالٹ سامنے آیا تھا۔ فوٹیج ٹریس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مقصود اسے پلے کرنے اور کیمرے کا نقص دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے روز امید تھی کہ فوٹیج مل جائے گی اور وہ مل بھی گئی..... مگر.....'' ماجد اکرام کہتے کہتے پھر اٹک گیا۔

میرے اور عمران کے تاثرات نے اسے دوبارہ بولنے پر مجبور کیا۔ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''اسی دوران میں ایک فون کال آگئی جس میں مقصود کو رشوت لینے پر مجبور کیا گیا۔''

''کیا مطلب؟ مجبور کیا گیا؟''

''اسے کہا گیا کہ وہ یہ فوٹیج منظرِ عام پر نہ آنے دے۔''

میں نے ماجد اکرام کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے

گہا۔ ”کیا یہ وہی بندہ تھا جس نے تمہیں بھی رشوت لینے پر ”مجبور“ کر دیا تھا۔ میرا مطلب ہے وہی کرائم رپورٹر عدنان رفیع؟“

”نہیں..... یہ کوئی اور تھا۔ کم از کم مقصود نے مجھے تو یہی بتایا ہے۔“

”اب آپ پر بکواس فرما رہے ہیں۔“ عمران تڑخ کر بولا۔ ”اب آپ کو لٹکایا گیا تو آپ کی وفات کے بعد ہی اتارا جائے گا۔ مجھے یقین ہے اس مرتبہ آپ کے دل پر ”ہارٹ اٹیک کا حملہ“ ضرور ہو جانا ہے۔“ عمران جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تو میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں نے اسی وقت انسپکٹر زبیر کو فون کیا اور اسے کہا کہ وہ فوٹیج والے مقصود احمد کو پکڑ کر فوراً یہاں لے آئے۔ دوسری طرف میں نے انسپکٹر توفیق رائے سے کہا کہ وہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع کے بارے میں پتا کرے کہ وہ کہاں ہے اور کس چکر میں ہے۔

مقصود احمد کو پہنچنے میں کچھ ٹائم لگنا تھا لہٰذا میں نے ماجد اکرام کو عمران کے ساتھ مل کر چھت سے اتارا اور کرسی پر بٹھایا۔ اب اس کے ہاتھ باندھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس کی ساری اکڑفوں پسینے کے ساتھ ہی بہہ چکی تھی، دوسرے لفظوں میں پتا پانی ہو چکا تھا۔ وہ ہاؤ ہاؤ دو باکی دے رہا تھا کہ اس کے گندموں کے جوڑ اکھڑ چکے ہیں حالانکہ حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

دونوں لڑکیوں کے سلسلے میں ہم نے ماجد اکرام کا طویل اقبالی بیان ریکارڈ کیا جس میں اس نے اعتراف کیا کہ اس نے اور مقصود نے سی سی ٹی وی فوٹیج کے ذریعے الفت کو پھنسایا..... اور پھر مزید پھنسانے کے لیے اس کی دو اور وڈیوز بھی بنائیں۔ وہ دونوں گاہے بگاہے اسے اپنے پاس بلاتے رہتے تھے۔ پھر انہوں نے اس کے ذریعے اس کی سہیلی عالیہ کو بھی ٹریپ کیا۔ اس نے لاہور ہی کی دو اور لڑکیوں کے نام بھی لیے جو مختلف سی سی ٹی وی فوٹیج کی وجہ سے ہی پہلے مقصود اور پھر ماجد اکرام کے ہتھے چڑھیں۔ وہ جو سلوک ان کے ساتھ کرتے رہے تھے، اس کی تفصیل بھی وڈیو بیان میں ریکارڈ ہوئی۔ یہ صرف اقبالی بیان ہی نہیں تھا جس سے اکثر مجرم عدالت میں مکر جاتے ہیں، اس میں کچھ ٹھوس ثبوت بھی موجود تھے۔

اسی اثنا میں مقصود احمد کی تشریف آوری بھی ہو گئی۔ شکل مومناں کرتوت کافراں والی ضرب المثل اس پر صادق



گردش افلاک

تیز دھوپ میں ایک جلتے سائبان کی بے وقعتی کی عبرت اثر داستان..... **ناہید سلطانہ اختر** کا شاہکار

باغی

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات **زویا صفوان** کے قلم کا جادو

شہ زور

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

جنگ باز

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی ولولہ ور داستان **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم کی جادوگری

اس کے علاوہ

محمد ظفر حسین، عائشہ نصیر، عبوق بخاری، خالد شیخ طاہری، عاطر شاہین، احمد سلیم سلیمی، صائمہ دانش و دیگر کی خوب صورت تحریریں

آتی تھی۔ بدبخت کا شریفانہ حلیہ اور بول چال دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس قسم کی بدکاریوں میں معروف ہوگا۔ انسپکٹر زبیر راستے میں بھی اس کی تھوڑی بہت ''مزاج پرسی'' کرچکا تھا۔ اس کی ایک آنکھ نیلگوں نظر آرہی تھی۔ یہاں پہنچ کر جب اس نے اپنے سرجن دوست کی حالتِ زار دیکھی تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی بھی وجہ سے ماجد اکرام کے پھنسنے کے سبب وہ بھی پھنس گیا ہے۔ جب اس نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ''معصوم'' صورت کی پروا کیے بغیر چند کرارے تھپڑ اسے جڑ دیے۔ میرے تیور بھانپ کر وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ جب میرے اشارے پر عمران اور انسپکٹر زبیر نے اسے چھت سے لٹکانے کا ارادہ کیا تو وہ سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا اور باقاعدہ رونے لگا۔ وہ پہلے بھی پوچھ گچھ کے مرحلے سے گزرا تھا مگر تب کی بات اور تھی۔ مجھے اور زبیر کو اس پر تھوڑی سی محنت مزید کرنا پڑی اور پھر اس نے اپنی ناک سے بہتا ہوا خون پونچھنے کے بعد سب کچھ اگل دیا۔ وہ مان گیا کہ اس نے کسی کے کہنے پر فوٹیج جان بوجھ کر سامنے نہ آنے دی۔ پہلے تو اس نے کہا کہ اس نے فوٹیج ڈیلیٹ کر دی تھی مگر میرے چند مزید تھپڑ کھانے کے بعد وہ مان گیا کہ فوٹیج اس کے پاس موجود ہے۔

''تمہیں کس نے کہا تھا فوٹیج چھپانے کے لیے؟''

''اس کا مجھ سے رابطہ بس فون کے ذریعے ہوا تھا۔ میں اُسے جانتا نہیں ہوں۔ پتا نہیں اس نے کیا چکر چلایا ہوا تھا۔ موبائل پر اس کا فون نمبر بھی نہیں آرہا تھا۔ اس نے پیسے بھی مجھے آن لائن بھجوائے تھے اور کہا تھا کہ فوٹیج فوراً ڈیلیٹ کردو۔''

''اور تم نے پھر بھی ڈیلیٹ نہ کی۔ حالانکہ کہتے ہیں، بے ایمانی کے کام بڑی ایمانداری سے کیے جاتے ہیں۔''

''دو..... دراصل مجھے آدھی رقم بھیجی گئی تھی، آدھی ابھی تک آنی ہے، میں نے سوچا تھا، بعد میں ڈیلیٹ کروں گا۔''

''آن لائن رقم بھیجنے والے کا سراغ بینک کے ریکارڈ سے تو لگ ہی سکتا ہے۔''

''وہ کوئی اٹلی کے شہر کا اکاؤنٹ تھا۔''

''چلو یہ بھی پتا کرا لیتے ہیں۔ تم اس فوٹیج کے درشن کراؤ۔'' میں نے کہا۔

مقصود احمد کے پاس دو اسمارٹ فون تھے۔ ایک فون میں دسمبر کی اُس دُھندلی شام میں پیش آنے والے واقعے کی فوٹیج موجود تھی۔ پولیس ناکے پر پیش آنے والا وہی واقعہ جس نے ماہین کو سنگین دفعات کے تحت جیل بند کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا اور میڈیا کی ساری بلاؤں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔

میں نے اور عمران نے فوٹیج دیکھی۔ اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا مگر دُھند گہری ہونے کے سبب مکمل رات ہی معلوم ہوتی تھی۔ ایک طرف سے ماہین والی گاڑی نمودار ہوئی۔ ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔ ناکے پر موجود اہلکاروں نے ''اسٹاپ'' والا سائن دکھا کر کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ رک رہی ہے مگر پھر رفتار بڑھا دی گئی۔ جب گاڑی ناکا کراس کر چکی تھی، دائیں جانب کے درختوں میں سے ایک فربہ اندام اہلکار تیزی سے نکل کر گاڑی کی طرف بڑھا وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ اچانک اسے واضح طور پر کسی شے سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ ماہین کی کار کے سامنے گرا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ شاید ماہر ڈرائیور بھی اسے بچا نہ سکتا۔ یہ سارا سیکنڈ کے شاید آدھے حصے کا کھیل تھا۔ پھر بھی چلانے والے نے پھرتی سے اسٹیئرنگ کو بائیں گھمایا تھا۔ گاڑی الٹتے الٹتے بچی لیکن اہلکار کے اوپر چڑھ گئی۔ اس کے بعد وہ دو مزید اہلکاروں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ بدقسمت اے ایس آئی دس پندرہ میٹر تک گاڑی کے نیچے ہی گھسٹنے کے بعد ایک کنارے پر لڑھک گیا۔ گاڑی لہراتی ہوئی سی آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد ناکے کی طرف سے ایک اہلکار فائر کرتا بھی نظر آیا۔

ہم نے چار پانچ بار اس فوٹیج کو چلا کر دیکھا۔ کئی جگہ اسے ''پاز'' بھی کیا۔ ہر بار ہمارے اس تاثر میں اضافہ ہوا کہ یہ سراسر ایک حادثہ ہے جو اس وجہ سے پیش آیا کہ ڈگمگاتا ہوا سا پولیس اہلکار ٹھوکر کھا کر گاڑی کے عین سامنے جا گرا۔

میں نے شریف صورت مقصود کی گدی پر ایک جھانپڑ رسید کیا۔ ''تمہاری حرامزدگی کی وجہ سے یہ وڈیو غائب ہوئی اور یہ کیس اتنا سنگین بنا۔''

''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں لالچ میں آگیا تھا..... مم..... مگر یہ صرف لالچ نہیں تھا مجھے ڈرایا بھی گیا تھا۔''

''کون تھا وہ؟''

''مجھے پتا ہوتا تو ایک منٹ سے پہلے بتا دیتا۔''

عمران بولا۔ ”تم سب جانتے ہو، صرف گنتے بنے ہوئے ہو۔ تمہیں ”گیدڑ کٹ“ کی ضرورت ہے۔“

یہاں سوچنے کی بات تھی کہ پولیس کے علاوہ وہ کون تھا جس کو اس فوٹیج کے اوجھل ہونے سے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط ہونے سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

اگلے پانچ دس منٹ تک ہمارے اور مقصود کے درمیان زبردست کشمکش چلی۔ ماہین جیل میں تھی۔ اے ایس آئی کی موت کے ذمے دار کے خلاف میڈیا نے ایسی فضا بنا رکھی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہم جلد از جلد اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ عمران تو اس حوالے سے ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔ آخر مقصود کو اپنی زبان کا تالا کھولنا پڑا۔ کچھ مزید مار کھانے کے بعد اس نے بتا دیا کہ آن لائن ادائیگی اور اٹلی کے شہر کے اکاؤنٹ والی ساری بات ”بکواسیات“ کے زمرے میں آتی تھی۔ اسے فوٹیج چھپانے کے لیے مجبور کرنے والا وہی تھا جس نے سرجن ماجد اکرام سے پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط بنوائی تھی۔ یعنی وہی کرائم رپورٹر عدنان رفیع۔ اسے عدنان شاہ بھی کہا جاتا تھا۔

اس نئے کردار عدنان رفیع شاہ کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے اس کیس کو سنگین بنانے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

اس ہال کمرے کے ایک گوشے میں جا کر میں نے عمران سے ڈسکشن کی۔ عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”ایسا لگتا ہے چاچو جان کہ اس کرائم رپورٹر کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ یہ فوٹیج منظرِ عام پر آ گئی تو میرے حق میں جائے گی۔ لہٰذا اس نے اسے دبانے کی اسکیم بنائی۔ یہی کچھ اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے سلسلے میں کیا۔“

”یہ بات تو یقیناً سمجھ میں آتی ہے عمران، یہ کرائم رپورٹر عموماً تھانے کچہری کے اندر کی باتیں جان لیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ تمہارا دشمن کیوں تھا؟“

ایک دم عمران کی آنکھوں میں ایک نئی سوچ ابھرتی دکھائی دی۔ ”چاچو! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ فوٹیج وہ لوگ غائب کروانا چاہتے ہوں جو مجھے اغوا کار اور قاتل ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میرا مطلب ہے ماہین کے چچا ثاقب اور ماموں وغیرہ۔“

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو پھر میرا دھیان ماہین کے چچا اور ماموں کے بجائے کسی اور طرف جائے گا۔“

عمران نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”کہیں.....

آپ..... حشام اور اس کے والد کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”وہی کر رہا ہوں۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع کا ”لنک“ حشام اور اس کے والد سے ہو۔ اس لنک کی وجہ سے عدنان رفیع نے حشام کو بتا دیا ہو کہ فوٹیج سامنے آئی تو تمہارے رقیب کی گردن سے پھندا ڈھیلا ہو جائے گا اور حشام نے اس سے کہا ہو کہ وہ فوٹیج سامنے نہ آنے دے۔“

”مگر رپورٹر عدنان رفیع کو کیسے پتا چلا کہ فوٹیج میرے حق میں جائے گی؟“

”تمہیں بتایا ہے نا کہ ان کرائم رپورٹرز کے رابطے پولیس سے گہرے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تھانے کے پر موجود اہلکاروں میں سے ہی کسی نے عدنان رفیع کو بتایا ہو کہ اے ایس آئی کا گاڑی کے نیچے آنا سراسر حادثہ تھا۔ اس کے بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ کے سلسلے میں بھی یہی چابکدستی دکھائی گئی ہو مگر فی الحال تو ہم ایک مفروضے پر ہی بات کر رہے ہیں۔“

”کیا آپ کا شک کسی اور طرف بھی جاتا ہے؟“ عمران نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ حوالات میں حشام کے والد نے اس کے منہ پر جو تھپڑ مارا تھا، اس سے اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ یہ نشان اب بھی موجود تھا اور یہ نشان میرے سینے میں انگارے سے سلگا دیتا تھا مگر نجانے کیوں، فوٹیج غائب ہونے کے حوالے سے میرا دھیان حشام اور اس کے والد سے زیادہ کسی اور طرف جاتا تھا۔ وہی لوگ جنہوں نے میری وجہ سے پہلے بھی عمران کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے عمران کو اس سلسلے میں ابھی تک صرف اتنا بتایا تھا کہ میں جعلی دواؤں کے سلسلے میں تحقیقات کر رہا ہوں اور مجھے شبہ ہے کہ جلو پارک میں جن لوگوں نے اسے اور ماہین کو ہراساں کیا ان کا تعلق اسی معاملے سے تھا۔

”آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟“ عمران نے کہا۔

”کیا آپ کا شک کسی دوسری طرف بھی جاتا ہے؟“

”ہاں عمران! وہی پارٹی جو غیر قانونی میڈیسنز کا دھندا کر رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے تمہیں دوبارہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔“

عمران پُرسوچ انداز میں سر ہلاتا رہا، پھر گویا ہوا۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر اس سلسلے میں وہی رپورٹر عدنان رفیع کچھ اگل سکتا ہے۔ ڈاکٹر ماجد اور ملزم پارٹی کے درمیان ”مڈل

مین" تو وہی ہوا۔"

"لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ پھر فون نکال کر میں نے چوتھی مرتبہ انسپکٹر رائے سے رابطہ کیا۔ رائے نے اطلاع دی کہ عدنان رفیع کا کہیں پتا نہیں، لگتا ہے کہ وہ خطرہ سونگھ کر غائب ہو چکا ہے۔

اس اطلاع کے بعد میں اور عمران ایک بار پھر چربیلے جسم والے ڈاکٹر ماجد اور شریف صورت مقصود کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ وہ عدنان رفیع کے بارے میں کچھ بتا سکتے۔ ابھی انہیں دو، دو تھپڑ ہی پڑے تھے اور ماجد اکرام کو دوبارہ لٹکانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ میرے فون کی بیل ہوئی، دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اسکرین پر نمبر یا نام کے بجائے بس تین ہندسوں کا ایک فگر آ رہا تھا۔ ایک بھاری اور نہایت سرد آواز سنائی دی۔ "ڈپٹی تابش! تم باز نہیں آئے۔ اپنی ذلت و خواری کو خود آواز دی ہے تم نے..... بلکہ شاید موت کو بھی۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ "کون ہو تم؟"

"تمہارے پرستار۔ ہمارا محبت نامہ اور پارسل تمہیں مل گیا تھا۔ اس کے باوجود تم حرامزدگی سے باز نہیں آئے۔ تم نے ڈاکٹر پر ہاتھ ڈال کر اپنے عدم آباد کے ویزے پر پکی مہر لگوائی ہے۔"

یکا یک مجھے احساس ہوا کہ قدرت کمالِ مہربانی سے میرا ہاتھ تھام رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے عمران سے جس شک کا اظہار کیا تھا۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ یقین میں بدل رہا تھا۔ اس ڈاکٹر ماجد کے لیے ان لوگوں کی طرف سے کال آ گئی تھی جو ایبٹ آباد میں کہیں سات پردوں میں چھپے بیٹھے تھے اور جن کی تلاش میں ہم ایک سال سے سر پٹخ رہے تھے۔

تب اچانک مجھ پر حیرت کا ایک اور حملہ ہوا۔ دریائے راوی کے کنارے اس خالی کوٹھی میں ہم اتنی رازداری سے پہنچے تھے کہ متعلقہ افسران کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ نہ ہی ہم نے یہاں پر کسی کو اجازت دی تھی کہ وہ فون کو ہاتھ لگائے۔ مگر ہماری یہاں موجودگی ان لوگوں پر عیاں ہو چکی تھی۔ جمشید صاحب کی یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر ماجد کے رابطے بااثر اور بدترین لوگوں سے ہیں۔

سرد آواز دوبارہ ابھری۔ "تمہیں ہماری پہنچ کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ زمین کی ساتویں تہ میں بھی اتر جاؤ گے تو اسی طرح ہمارے ریڈار پر رہو گے۔ اس وقت میرا ایک اشارہ تمہیں اور تمہارے اس ہاسٹرڈ بھتیجے کو خون میں نہلا سکتا ہے۔ صبح ہونے تک تمہارے گنتی کے لواحقین تمہارے کفن دفن کی تیاری کر رہے ہوں گے لیکن میں تمہیں چیمپئن احمق مانتے ہوئے اب بھی ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ کیڑے مکوڑے مارنا مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔" وہ ڈرامائی لہجے میں بول رہا تھا۔

"زبان کو لگام دو..... اور بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سب انسپکٹر کو اشارہ کیا کہ وہ فون کر کے اس نامعلوم کالر کی لوکیشن معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

بھاری آواز گونجی۔ "تین چار دفعہ بھی پیدا ہو جاؤ گے تو ہمیں دھوکا نہیں دے پاؤ گے۔ یہ کال ٹریس نہیں ہو گی۔ حماقتیں چھوڑ کر کام کی بات سنو اور عمل کرو۔" سب کچھ کسی فلمی سین کی طرح لگنے لگا تھا۔

میں نے دیکھا، کچھ فاصلے پر بیٹھے نیم جان ڈاکٹر ماجد کے چہرے پر اب رونق نظر آنے لگی تھی۔ بند کمرے کے اندر سے دونوں لڑکیوں کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔

تھوڑے توقف کے بعد بے حد حتمی لہجے میں کہا گیا۔ "تم دونوں ہاسٹرڈز کے پاس صرف بیس منٹ کی مہلت ہے۔ تمہیں تین شرطیں ماننا ہوں گی، ان میں سے ایک فوری نوعیت کی ہے۔ ڈاکٹر ماجد اور اس کے ساتھی سے معافی مانگو اور انہیں بڑی عزت سے ان کے گھروں تک پہنچا دو۔ نمبر دو وعدہ کرو کہ دوبارہ کبھی ان کے معاملے میں اپنی گندی ناک نہیں گھسیڑو گے۔ نمبر تین صدقِ دل سے توبہ کر لو کہ آئندہ ایبٹ آباد وغیرہ کی قاتل ٹھنڈ سے دور رہو گے اور تمہارے بڑے بھی دور رہیں گے۔"

میں نے فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا۔ عمران بھی یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ بولنے والے کے غیر معمولی اعتماد سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے یا کم از کم ہمارے بہت قریب موجود ہے جہاں سے بہ آسانی ہم کو ٹارگٹ کر سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ راوی کنارے کی اس کوٹھی کو گھیر لیا گیا ہو..... کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا..... سرد رات کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی اور بل کھا رہی تھی۔

سرد اور قاتل فضاؤں میں پنہاں اس قاتل قصے کا دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیے

زہریلا تریاق

طاہر جاوید مغل

کسی بڑے واقعے کے پہلے دن کی خوشی ہو یا افسردگی... اس قدر لامحدود ہوتی ہے کہ اس کے اثرات دور تک پیچھا کرتے ہیں... ان دونوں کی زندگی کا بھی وہ واقعہ حد سے سوا تھا... اس واقعے سے جنم لینے والی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونا آسان نہیں تھا... قدم قدم پر پاؤں ڈگمگائے اور خارِ راہ دامن کو مضبوطی سے تھام لیتے... چاروں جانب کسی طرف کوئی جائے پناہ نہ تھی... جھوٹ و فریب نے جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں... سچ تک پہنچنے کے لیے کڑے مراحل درپیش تھے... اس کڑے اور بے سائباں وقت میں صرف سچائی ہی زادِ راہ تھی...

کوچہ جاناں میں بے خطر آوارہ گردی کے خواہش مند محبوں کی عشوہ طرازی...

دوسرا اور آخری حصہ

میں نے اپنے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا کہ وہ کوٹھی سے باہر جا کر جائزہ لے۔ سب انسپکٹر نے تین کانسٹیبل ساتھ لیے اور باہر دیکھنے چلا گیا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ڈپٹی جی (ڈپٹی جی)۔" بھاری سرد آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ "اچھے بچے غلطی ہونے پر معافی مانگتے ہوئے زیادہ ہچکچاتے نہیں۔ میں کوئی پاؤں کو ہاتھ لگانے کا نہیں کہہ رہا۔ بس ذرا معافی شافی، سوری شوری بول دو ڈاکٹر صاحب کو، اور ان کے دوست کو۔ چلو شاباش دیر اچھی نہیں ہوگی۔"

اس گفتگو کے دوران میں ہی میرا سب انسپکٹر واپس آ گیا۔ اس نے اشارے سے ہی مجھے بتایا کہ کوٹھی کے گرد کسی طرح کا کوئی گھیراؤ نہیں ہے۔"

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ہماری طرف آ رہے ہوں۔ ہمیں کمک کی ضرورت ہوگی۔"

میرے ذہن میں بھی یہی خیال آ رہا تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے کہ بھاری آواز والے کے ساتھ کال ڈراپ ہو گئی ہے۔ انسپکٹر زبیر


SALMAN's
CHOICE

رادی کے پل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اسے کال کی اور فوراً انگلی نفری کے ساتھ کوٹھی پہنچنے کا کہا۔

اسی دوران میں نامعلوم شخص کی طرف سے پھر کال آگئی۔ ”کہیں کوئی ہوشیاری تو نہیں کررہے ہو۔ بہت بُرا کرو گے اپنے ساتھ۔“ اب اس کی آواز میں شعلے لپکنے لگے تھے، یہ ایک قاتل آواز تھی۔

اس آواز نے میرے اندر ایک بٹن سا دبا دیا۔ وہی بٹن جو عمران دانش کے دور میں میرے اندر دبا کرتا تھا اور ہر خطرے اندیشے سے بے نیاز کردیا کرتا تھا۔ میں اور عمران دانش دیوانہ وار خطرات کی طرف لپکا کرتے تھے۔ شہر لاہور کے بڑے بڑے پائے خانوں سے لڑتے تھے۔ اکثر جیت جاتے تھے مگر کبھی کبھی ہارتے تھے اور زخم زخم بھی ہوتے تھے مگر اس صورتِ حال کو بھی دل کی گہرائیوں سے انجوائے کرتے تھے۔ آج عمران دانش میرے ساتھ نہیں تھا مگر اس کا بیٹا تو تھا اور وہ اسی جیسے خصائل کے ساتھ اسی جیسی آنکھیں مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ مجھے محسوس ہوا وہ سب لوٹ آیا ہے جو مجھ سے چھن گیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میری شریکِ حیات ثروت کے اصل قاتلوں کا سراغ مل چکا ہے۔ اب میرے لیے قدموں کا پیچھے ہٹانا ناممکن تھا۔

بھاری آواز گونجی۔ ”ڈپٹی جی! تمہارے نہایت قیمتی آٹھ منٹ گزر چکے ہیں، اب صرف بارہ منٹ باقی ہیں تمہارے پاس۔ صرف 720 سیکنڈ۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کہنا یہی چاہتا ہوں کہ تمہارے اور تمہارے بھتیجے کی بدبختی میں مجھے اب ذرہ برابر شک نہیں رہا۔ تم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنستے جارہے ہو۔“

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”چھوٹی مصیبتوں کو تو ہم خود بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے، بڑی مصیبتوں کا تیا پانچا کرکے ہی ہمیں مزہ آتا ہے۔“

”شاید تم خود کو بڑی ریس کا گھوڑا سمجھ رہے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تم گھوڑے نہیں ایک بدنصیب گدھے ہو جو سرپٹ بھاگ کر اپنے اس منحوس بھتیجے سمیت موت کے گڑھے میں گرنے والا ہے۔“ اس نے دو لمحے توقف کیا پھر گویا ہوا۔ ”اور اب میں اپنا مطالبہ بھی بدل رہا ہوں۔ تم دونوں میں سے بس ایک کو رہائی مل پائے گی۔ دوسرا فی الحال گارنٹی کے طور پر ہمارے ساتھ رہے گا۔ اگر بھتیجے بچے رہو گے تو مناسب وقت پر اسے چھوڑ دیں گے۔“

بولنے والے کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا۔ ایسا اعتماد جو تمام مقابل کو ڈانواں ڈول کردیتا ہے۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجھے لگا، میرا خون سیروں بڑھ گیا ہے۔

بھاری آواز آئی۔ ”اب صرف دس منٹ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس قیمتی وقت کو استعمال کرتے ہوئے اچھی طرح سوچ لو.....“ اس نے فون بند کردیا۔

عمران اور میں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عمران، چربیلے جسم والے ڈاکٹر ماجد کی طرف بڑھا جو اَب خاصے اعتماد کے ساتھ کرسی پر بیٹھا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”ماجد اکرام صاحب! دیکھیں آپ کو کتنی عزت تکریم سے بلا رہا ہوں۔ اتنی عزت تو میں نے کبھی خود کو بھی نہیں دی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی یہ عزت برقرار رہے اور آپ کی زندگی بھی۔ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو سب سے پہلے آپ دونوں کی زندگیوں کو فل اسٹاپ لگے گا۔“

”کیا چاہتے ہو آپ؟“

”اپنے باس سے رابطہ کرو۔ اسے یقین دلاؤ کہ پولیس فورس اس کوٹھی کے چاروں طرف موجود ہے۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ تمہارے باس کی طرف سے کوئی بھی ایڈونچر بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔ خاص طور پر تم دونوں کو۔“

اسی دوران میں انسپکٹر رائے بھی پہنچ گیا۔ چار، پانچ مسلح اہلکار بھی ہمراہ تھے جو اس نے باہر صحن میں متعین کردیے تھے۔ رائے نے بتایا کہ انسپکٹر زبیر بھی اپنی نفری کے ساتھ پہنچنے والا ہے۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے ماجد اکرام کی طرف دیکھا، وہ بولا۔ ”میرا اور مقصود کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔“

”یہ سفید جھوٹ سے بھی آگے کی چیز ہے۔ تمہارا تعلق واسطہ نہیں تو پھر وہ تم دونوں کا باپ بن کر کیوں سامنے آیا ہے؟“ عمران نے سوال کیا۔

”مم..... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک بات آپ کو بتا دوں۔ میں جتنا اس شخص کو جانتا ہوں، وہ دھمکی دے کر پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔ کاش آپ اسے جانتے ہوتے اور نوبت یہاں تک نہ پہنچاتے۔ مجھے آپ لوگوں سے معافی وغیرہ منگوانے کا کوئی شوق نہیں۔ لیکن بہتر ہے کہ آپ معافی مانگ لو اور معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرو۔“

میں نے دیکھا، یہ بات کہتے ہوئے ماجد کی آنکھوں میں ہمارے لیے دبی دبی حقارت دکھائی دینے لگی تھی۔

عمران نے دایاں ہاتھ گھمایا اور چناخ سے ایک تھپڑ ماجد کے گال پر پڑا۔ وہ ششدر ہو کر عمران کی طرف دیکھنے لگا۔

"اتنی معذرت ٹھیک ہے یا باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی جائے۔" عمران نے کہا۔

میں عمران کے عقب میں اندازاً چھ فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ دفعتاً بالکونی میں مجھے ایک نہایت مشکوک حرکت نظر آئی۔ کسی رائفل وغیرہ کی بیرل نما چیز دکھائی دی تھی۔ بیرل نما چیز کا رخ دیکھتے ہوئے میں نے چھلانگ لگائی اور عمران کو اپنے ساتھ لیتا ہوا اوندھے منہ فرش پر گرا۔ یہ زندگی کی چھلانگ ثابت ہوئی۔ کسی ماؤزر نے ایک ساتھ تین چار گولیاں اگلیں جو سنسناتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اپنا پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا تھا۔

"پوزیشن لو۔" میں چلایا۔

اس ہال نما کمرے میں موجود چار پانچ اہلکار بھاگ بھاگ کر مختلف کانوں میں دبک گئے۔ میں اور عمران بھی فرش پر رول کر کے ایک کوریڈور میں چلے گئے تھے۔ ہم پر ایک اور برسٹ چلایا گیا۔ اس مرتبہ دیوار کا بہت سا پلاستر اکھڑ کر ہمارے قدموں میں گرا اور ہمیں ماؤزر کے سائز اور طاقت کا اندازہ ہوا۔ بند کمرے میں لڑکیاں بے طرح ڈری ہوئی تھیں اور چلا رہی تھیں۔ فائرنگ ہال کمرے کی اندرونی بالکونی سے ہو رہی تھی۔ عمران خالی ہاتھ تھا۔ میرے پاس پسٹل تھا۔ میں نے تین چار جوابی فائر کیے۔ کمرے میں موجود پولیس اہلکاروں میں سے بھی دو مسلح تھے۔ انہوں نے بھی کاؤنٹر فائر کیا۔ میں نے جس وقت عمران پر چھلانگ لگائی تھی، میرا پاؤں ایک آہنی میز کے پائے سے بے طرح ٹکرایا تھا۔ ٹخنے کی چوٹ بُری ہوتی ہے اور ٹخنے سے ہی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

میں نے دیکھا، ڈاکٹر ماجد کے دوست مقصود نے خود کو اس بڑی آہنی میز کے نیچے چھپا لیا تھا۔ ماجد نے بھی اسی میز کے نیچے گھسنے کی کوشش کی۔ تھوڑے فربہ جسم کی وجہ سے وہ فوری طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ اسی دوران میں بالکونی سے اسے نشانہ بنایا گیا۔ میں نے اسے پھڑک کر سجدے کی سی حالت میں جاتے اور پھر ایک طرف لڑھکتے دیکھا۔

یکایک بالکونی والی فائرنگ رک گئی۔ ہمیں لگا کہ فائر کرنے والا بھاگ گیا ہے یا پھر دوسرا میگزین چڑھانا چاہ رہا ہے۔ یہ قیمتی لمحے تھے۔ میں اور عمران اپنی اوٹ سے نکلے اور جھک کر دوڑتے ہوئے زینوں تک پہنچے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی ہمت کر کے اوٹ سے نکل آیا تھا۔ ہم بالکونی میں پہنچے تو وہ خالی تھی، بس گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پستول چاروں طرف گھمایا، کوئی ہدف دکھائی نہیں دیا۔ مگر لگتا یہی تھا کہ حملہ آور اندر ہے۔ اب باہر کے کئی اہلکار بھی اندر پہنچ گئے تھے۔ "سارے دروازے بند کر دو۔" میں نے بلند آواز میں ایک سب انسپکٹر منصور کو ہدایت کی۔

عمران کو شبہ تھا کہ حملہ آور عقبی باغیچے کی طرف گیا ہے۔ وہ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ عقبی جانب لپکا۔ میں زینے اتر کر واپس ہال کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر ماجد اکرام فرش پر پڑا تھا۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں، جن میں سے دو سر میں لگی تھیں۔ وہ موقع پر ہی ختم ہو چکا تھا۔ ان لمحوں میں میرے ذہن میں ایک خیال لپک گیا۔ ایبٹ آباد میں دو نمبر ادویات کی فیکٹری کے مالک کو بھی تو عین موقع پر قتل کر دیا گیا تھا۔ ہم جامک توئیاں مارتے رہ گئے تھے۔

"یہ بھی ختم ہو چکا ہے۔" ایک حوالدار کی آواز نے مجھے چونکایا۔

حوالدار کا اشارہ ماجد کے دوست مقصود کی طرف تھا۔ اسے صرف ایک گولی لگی تھی، مگر یہ بھی سینے میں، دل کے مقام پر۔ اس کے اردگرد بھاپ دیتا خون تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آخری ہچکی لی۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ جو برسٹ ڈاکٹر ماجد کو مارا گیا، اس میں سے ایک گولی اتفاقاً مقصود کے حصے میں بھی آ گئی۔

کوٹھی میں چاروں طرف بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ میں بھی حملہ آور کی تلاش میں شامل ہو گیا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ ایک ہے مگر ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مجھے اور عمران کو مارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک کھڑکی میں بیرل کی خفیف حرکت میری نگاہ میں آ گئی تھی اور ہم اپنا بچاؤ کر پائے تھے۔ ورنہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اس وقت ہم دونوں کی لاشیں بھی یہاں الٹی سیدھی پڑی ہوتیں۔

یکایک کوٹھی کے گیراج کی طرف سے شور اٹھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی پکڑا گیا ہے مگر گیراج میں پہنچا تو زخمی ہونے والا پولیس اہلکار نظر آیا۔ اسے پیٹ میں گولی لگی تھی اور وہ گاڑی تک پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کے ہاتھ سے میگافون پکڑا اور بلند آواز میں ہدایت کی۔ "فائرنگ کرنے والا اندر ہی ہے، کوٹھی کو گھیرے رکھو، کوئی نکلنے نہ پائے۔"

اس کے بعد میں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر چلا گیا۔ یہاں پر بھی ساری لائٹس آن کردی گئی تھیں اور پولیس اہلکار ٹانگیں مار مار کر مختلف دروازے کھول رہے تھے۔ میرا دھیان ان تنگ زینوں کی طرف گیا جو چھت پر جاتے تھے۔ گرد آلود زینے چڑھ کر میں چھت پر آگیا۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ چاندنی رات کو ٹھنڈی ہوا مزید سرد کررہی تھی، دور بائیں جانب دریائے راوی کا سکڑا سمٹا پانی چمک رہا تھا۔ دائیں جانب شاہدرہ سے ملحق آبادی تھی۔ چھوٹے بڑے مکان تھے جو آگے جاکر گنجان آباد میں مل جاتے تھے۔ یکایک میرے ہاتھ کو جیسے ہزار واٹ کا شاک لگا۔ یہ شیشم کی ایک لٹھ تھی، جو کسی نے تاریکی سے نکل کر میرے ہاتھ پر رسید کی تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر نجانے کس جانب لڑھک گیا۔ حملہ آور نے لٹھ کا دوسرا مہلک وار میرے سر پر کرنا چاہا مگر میں نے جھک کر یہ وار خالی دیا اور تب پہلی بار میں حملہ آور کو دیکھ پایا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ یہ کوئی اور نہیں، میرا انسپکٹر رائے تھا۔ میری اس لحاتی حیرت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ٹانگ کی شدید ضرب میرے سینے پر لگائی۔ میں چند قدم لڑکھڑا کر کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ''سی 96'' ماؤزر میری طرف سیدھا کیا۔ یہی قاتل ماؤزر تھا جو نیچے ڈاکٹر ماجد اور مقصود کی جان لے چکا تھا۔ یہ نہایت طاقتور ماؤزر تصور ہوتا تھا۔ ماؤزر میری طرف سیدھا کرتے ہوئے وہ الٹے پاؤں چھت کی منڈیر کی طرف بڑھا..... تاہم اس نے مجھ پر فائر نہیں کیا۔ فائر کیوں نہیں کیا، اس کی وجہ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہمیں معلوم ہوئی، ماؤزر کی گولیاں ختم ہوچکی تھیں۔

''رائے تم؟'' میں نے حیرت آمیز طیش کے عالم میں کہا۔

جواب دینے کے بجائے توفیق رائے نے نفرت انگیز انداز میں میری طرف دیکھا، پھر وہ منڈیر کے بالکل پاس پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کا پیغام بھی تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو..... میں تمہاری نگاہوں کے سامنے بھاگ رہا ہوں، تم کچھ نہیں کرسکتے۔

زینوں پر شور تھا۔ غالباً میرے ساتھی اوپر آرہے تھے۔ تاہم چھت تک پہنچنے میں ابھی انہیں دس پندرہ سیکنڈ تو لگ ہی جانے تھے، رائے نے ایک مرتبہ پھر مجھے ماؤزر کا ڈرا دیا۔

دائیں طرف جھک کر اس نے دو منزلہ چھت سے نیچے جھانکا۔ پھر میری طرف دیکھ کر تھوکا اور نیچے چھلانگ لگادی۔ میں نے اس کی ٹوپی کو ہوا میں اڑتے دیکھا، میں لپک کر منڈیر پر پہنچا۔ نیچے دیکھا۔ یہ کوٹھی کی عقبی سمت تھی۔ نیچے چودہ پندرہ فٹ کی گہرائی میں ایک چھوٹے سے گھر کی چھت نظر آرہی تھی۔ زرد بلب کی روشنی میں چھت پر ایک ٹوٹی چارپائی نظر آئی۔ یہ چارپائی ابھی ٹوٹی تھی۔ اس پر ہی رائے نے چھلانگ لگائی تھی۔ اب وہ گھروں کی چھتیں پھلانگتا ہوا تیزی سے دور جارہا تھا۔ عام پولیس والوں کے برعکس رائے چھریرے جسم کا خاصا پھرتیلا بندہ تھا۔

ڈاکٹر ماجد اور مقصود ہلاک ہوچکے تھے۔ فی الوقت تو یہ رائے ہی وہ واحد سراغ نظر آتا تھا جو ہمیں پردہ نشین مجرم تک پہنچا سکتا تھا اور یہ سراغ بھی اوجھل ہورہا تھا۔ اگلے چند سیکنڈ کے اندر وہ اس آبادی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے والا تھا۔ یہ لمحوں کا کھیل تھا اور یہ بڑے قیمتی لمحے تھے۔ میرے ٹخنے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور چودہ پندرہ فٹ کی بلندی سے چھت کے فرش پر یا ٹوٹی ہوئی چارپائی پر چھلانگ لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہی لمحے تھے جب میرے پردۂ تصور پر ثروت کا چہرہ چمکا..... کفن میں لپٹا ہوا۔ اس کی لمبی پلکوں نے اس کی آنکھوں کو چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے بند ہونٹوں سے، جیسے مجھ سے پوچھ رہی تھی..... تابش، میں تو آپ کے ساتھ بڑی خوشی، خوشی گھر سے نکلی تھی، عرصے بعد چند روزہ تفریح کے لیے۔ اس تفریح کی اتنی بڑی سزا کیوں ملی مجھے کہ میں ایک لاش کی صورت ایمبولینس میں واپس آئی..... اور اکیلی میں ہی تو لاش نہیں بنی ہوں۔ نہ جانے کتنے لوگ زہر کو دوا سمجھ کر کھاتے ہیں اور اپنے پیاروں کو دکھ دینے کے لیے موت کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ ہمارے گلی کوچوں میں ایسے زہر کب تک پھیلے رہیں گے تابش؟

یہ سب کچھ دو چار لمحوں کے اندر میرے ذہن میں آیا اور گزر گیا پھر ایک علامتی لمحہ مجھ پر وارد ہوا۔ میں نے حوصلہ جمع کرکے چھت سے چھلانگ لگائی اور ٹوٹی ہوئی چارپائی کے ایک حصے پر گر کر ٹھنڈے فرش پر لڑھک گیا۔ حتی الامکان تیزی سے اٹھا اور توفیق رائے کے پیچھے لپکا۔ وہ جست لگا کر کسی تنگ گلی کو پھلانگتے ہوئے کسی دوسری چھت پر کود رہا تھا۔ وہ پانچ چھ چھتیں پھلانگ چکا تھا۔ فی الحال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ انسپکٹر توفیق رائے جیسے بندے نے یہ سب کیوں کیا اور کس کے کہنے پر؟ فی الحال تو مجھے کسی بھی طرح اس تک پہنچنا تھا۔ لہٰذا مضروب تھا مگر اس تکلیف کو میں نے یکسر ذہن سے نکال دیا۔ یہ ایک جواں سال بھگوڑے اور ایک درمیانی

عمر کے ایتھلیٹ کی دوڑ تھی۔ چاندنی رات میں منظر ایسا دھندلا نہیں تھا۔ بھاگتے بھاگتے رائے نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس کا تعاقب قبول کرتے ہوئے میں نے نہ صرف کوٹھی کی چھت سے نیچے والی چھت پر چھلانگ لگائی ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی آرہا ہوں۔

اگلے تین چار منٹ سرتوڑ کوشش اور جسمانی فٹ نس کی آزمائش کے تھے۔ ہم دونوں چھتیں، بالکونیاں اور چھوٹی چھوٹی گلیاں پھلانگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ماؤزر یا تو رائے کے ہاتھ سے گر چکا ہے یا پھر خالی ہو چکا ہے۔ رائے نے جب مجھے خود سے بس پندرہ بیس قدم پیچھے پایا تو اچانک ایک تنگ گلی میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے بھی نیچے پہنچنے میں تاخیر نہیں کی۔ یہ ایک اندرونی بازار تھا، صرف ایک چائے خانہ کھلا تھا اور وہاں چند مزدور ٹائپ افراد نظر آرہے تھے۔ ساتھ ہی ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے کھڑے ایک گارڈ کو دیکھ کر میں پکارا۔

"پکڑو اسے۔"

گارڈ نے کندھے سے رائفل اتاری مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پکڑنا کسے ہے۔ باوردی رائے کو دیکھ کر تو وہ لوگ یہی سمجھے ہوں گے یہ "پکڑنے والا" ہے بھاگنے والا نہیں۔

اس طویل دوڑ نے یقیناً رائے کو بھی بُری طرح تھکا دیا تھا۔ یقیناً وہ اپنی پوری توانائی استعمال کر رہا تھا مگر اس سے میرا فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ یکا یک اس نے آبادی سے نکل کر راوی کنارے کے درختوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ اور یہی وقت تھا جب میں نے اپنی ساری جان لگاتے ہوئے اسے دبوچ لیا۔ ہم اوپر نیچے گرے۔ میرے گھٹنے میں شدید چوٹیں آئیں مگر میں نے اسے چھاپے رکھا اور اس کی دونوں کلائیاں دبوچ لیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں اب بے حد کیلا، چمک دار چاقو نظر آرہا تھا مگر مجھے اندازہ ہوا کہ رائے اس چاقو سے مجھ پر وار کرنے سے زیادہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ اسے اپنی گردن میں گھونپ لے۔

مسلح چوکیدار بھاگتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے عقب میں چائے خانے والے افراد تھے پھر ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر مجھے اپنے ماتحت بھی نظر آگئے، وہ لپکے آرہے تھے۔

☆☆☆

انسپکٹر رائے اب ایک عام حوالاتی کی طرح پولیس کسٹڈی میں تھا۔ اس پر سنگین دفعات کے تحت کیس تھا۔ وہ بے حد خوف زدہ بھی تھا۔ اس کی دہشت دیکھتے ہوئے یہ خطرہ تھا کہ وہ پھر اپنی جان لینے کی کوشش کرے گا۔ ہم نے اسے حوالات سے نکال کر ایک ہائی ایٹ جگہ پر سخت نگرانی میں رکھا تھا۔ میں نے جو پوچھ گچھ کی، اس میں توفیق رائے نے اپنا جرم قبول کر لیا۔ وہ بھاری معاوضہ لے کر نہایت خطرناک لوگوں کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ اس جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ وہی شخص تھا جس کی آواز میں نے فون پر سنی تھی۔ توفیق رائے کا کہنا تھا کہ وہ بھی اس سے ملا نہیں، بس یہ معلوم ہے کہ اسے چاولہ بھائی کہا جاتا ہے۔ اس کا معاملہ چاولہ بھائی کے کارندوں سے طے ہوا تھا۔ توفیق رائے نے جن کارندوں کے نام بتائے، وہ سب انڈر گراؤنڈ کے جرائم پیشہ تھے۔ ان پر قتل اور ڈکیتی جیسے سنگین کیسز تھے۔

"کیا ڈیوٹیاں انجام دیتے رہے ہو ان لوگوں کے لیے؟" میں نے رائے سے پوچھا۔

"مجھے کے اندر کی خبریں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور سر جھکا لیا۔ رائے سے کافی مار پیٹ بھی ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ ایک جانب سے سوج کر گپا ہو گیا تھا، اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اعلیٰ افسران کی ہدایت تھی کہ اس سے کوئی رعایت نہ کی جائے۔

"تمہاری طرح کی اور کون سی کالی بھیڑیں ہیں ہمارے اندر؟"

"میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"تم غداری کے مرتکب ہوئے ہو۔ تمہاری قسم جتنی بڑی ہوگی اتنی ہی جھوٹی ہوگی۔ لعنت ہے تمہارے ہر جھوٹ پر۔" میرا پارا چڑھ گیا تھا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ "راوی والی کوٹھی میں تم نے ہی میرا فون نمبر اس حرامی چاولہ کو دیا اور اسے یہ انفارمیشن بھی دی کہ ڈاکٹر ماجد اور مقصود ہمارے ہتھے چڑھے ہوئے ہیں۔" اس نے اثبات انداز میں سر جھکا لیا۔

"اپنے مالکوں کے لیے اب تک کتنے بندے پار کر چکے ہو؟"

پہلے شاید اس نے جھوٹ بولنا چاہا، پھر میرے تاثرات دیکھ کر بولا۔ "بس دو، چاولہ بھائی کے ساتھ شاید ان کا کوئی لین دین کا معاملہ تھا۔"

"کون تھے وہ؟"

"ایک تو ماجد کی طرح ڈاکٹر ہی تھا۔ دوسرا ایک کاروباری طبیعات احمد۔ جس کے شہر میں کئی میڈیکل اسٹور بھی ہیں۔"

"ڈاکٹر ماجد اور وہ دوسرا ڈاکٹر تمہارے چاولہ بھائی کے لیے کیا کرتے تھے؟"

"بس یہ جعلی اور ممنوعہ دواؤں کی سپلائی وغیرہ کا ہی چکر تھا۔" پھر رائے نے دائیں بائیں دیکھ کر ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے، بولا۔ "تابش صاحب! کچھ بھی ہے میں آپ کا پٹی بھائی ہوں۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ میں تو ان کے نشانے پر آ ہی چکا ہوں۔ یہ آپ کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔ آپ خود پر رحم کریں۔"

"میری بڑی فکر ہو رہی ہے۔ اپنی کوئی فکر نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے میرے لالچ کی سزا تو ملنی ہی ہے۔ چاولہ بھائی سے بچ بھی گیا تو پھانسی تو ہے ہی۔" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر ذرا بدلے لہجے میں بولا۔ "میرے لالچ نے مجھے ایک ڈیڑھ کروڑ کا مالک تو بنایا ہے۔ جوہر ٹاؤن اور بحریہ میں دو کمرشل پلاٹ بھی چار کروڑ سے کم نہیں۔ آگے پیچھے کوئی ہے نہیں میرا۔ سوچتا ہوں میرے بعد کس کے کام آئیں گے۔ کوئی یہ سب کچھ لے کر مجھے صرف دو کپڑوں میں ملک سے باہر بھجوا دے تو خوشی سے قبول کر لوں گا۔"

"یعنی دبے لفظوں میں مجھے رشوت کی پیشکش کر رہے ہو؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ "آپ کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ م..... میں تو....."

ہوا کے زور سے کسی قریبی کمرے کا دروازہ زور سے بند ہوا تو دھماکے کی آواز آئی۔ تو فیق رائے یوں بدکا جیسے کسی نے سیدھی اس کے ماتھے پر گولی مار دی ہے۔ اپنے نامعلوم مالکوں کا خوف اس پر اس قدر طاری تھا کہ لگتا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے ہی اس کا دم نکل جائے گا۔

اسی دوران میں میرے فون پر بیل ہوئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ ہر بیل پر یہی لگتا تھا کہ شاید اس "چاولہ بھائی" نے دوبارہ کال کی ہو مگر وہ چپ تھا۔

☆☆☆

میری کلائی پر رائے نے بڑے زور سے لٹھ کی ضرب لگائی تھی۔ یہ چوٹ تو اب قدرے بہتر تھی مگر لٹھا تا حال تنگ کر رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مضروب لٹھے کے ساتھ ہی میں نے رائے کے پیچھے قریباً ایک کلومیٹر تک اندھا دھند دوڑ لگائی تھی۔ بہرطور بے حد اطمینان کی بات تھی کہ اب رائے ہمارے پاس تھا۔

آنے والے چار، پانچ روز میں حالات میں کچھ تیز رفتار تبدیلیاں آئیں۔ مقصود سے برآمد ہونے والی فوٹیج نے میڈیا اور سوشل میڈیا پر بھی ہلچل مچائی۔ اس فوٹیج کو جھٹلانا کسی صورت ممکن نہیں تھا اور اس میں صاف پتا چلتا تھا کہ یہ سراسر حادثہ تھا اور اس میں پچانوے فیصد غلطی اس اے ایس آئی کی تھی جو ڈگمگاتا ہوا سا گاڑی کی طرف بڑھا اور بدقسمتی سے ٹھوکر کھا کر عین ٹائروں کے سامنے گر گیا۔ یہ بات بھی پوری طرح ثابت ہو رہی تھی کہ اے ایس آئی سلیم تنگ دست تھا۔ بیوی روٹھ کر میکے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بے چارہ خود فراموشی کے لیے کثرت سے سگریٹ نوشی کر رہا تھا اور ٹرینکولائزر لے رہا تھا۔ اس فوٹیج کے حوالے سے یہ بات بھی تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ اسے انہی لوگوں نے غائب کروایا جن سے میں نے ٹکر لے رکھی تھی۔ وہ ہر طرح مجھے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ جلو پارک میں عمران اور ماہین ان کے ہتھے نہیں چڑھے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ناکے پر ہونے والے واقعے میں انہیں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ مرنے والے ڈاکٹر ماجد اور مقصود کا یہ بیان غلط ثابت ہو چکا تھا کہ انہیں کسی کرائم رپورٹر نے فوٹیج چھپانے اور غلط رپورٹ بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ ایک سن گنگت کہانی ثابت ہو رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع سے ان کی کوئی غار بازی چل رہی ہو۔ اس کی مزید تصدیق عدنان رفیع کے سامنے آنے سے ہو سکتی تھی مگر خیر متوقع طور پر وہ منظر سے اوجھل تھا۔

میں نے جیل میں جا کر ماہین سے ملاقات کی۔ اس نے اپنے خاندان کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اپنی بڑی بہن شاہین کے مشورے سے ایک بہت دلیرانہ قدم اٹھایا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھی۔ میں نے اس کے حوصلے کی داد دی۔ وہ بھی فوٹیج کی برآمدگی کے بارے میں جان چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے احسان مندی نظر آتی تھی۔

میں نے اسے بتایا۔ "ماہین! اگر ہم فوٹیج تک پہنچ سکے ہیں تو اس میں میرے ساتھ، ساتھ عمران کا بھی بڑا کردار ہے۔ درحقیقت سب سے پہلے اسی نے ڈاکٹر ماجد پر شک کا اظہار کیا۔ اس شک کے نتیجے میں جو راستہ نکلا، اس نے ہمیں مقصود اور پھر فوٹیج تک پہنچا دیا۔ تمہاری اس "پیش" پر وہ فوٹیج بہت اہم ثابت ہوگی۔"

"انکل تابش! مجھے پتا چلا ہے کہ راوی والی اس کوٹھی میں کافی فائرنگ بھی ہوئی..... اللہ کا شکر ہے کہ آپ دونوں محفوظ رہے۔" پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "عمران اب کہاں ہے؟"

"وہ فی الحال حفاظت پر ہے۔ ظاہر ہے کیس ختم ہونے تک واپس انڈیا تو نہیں جاسکتا۔ وہ اس پر بہت زیادہ شرمندہ ہے ماہین کہ اس کی ایک فضول خواہش کی وجہ سے یہ سارا معاملہ خراب ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ اس نے بڑی ندامت کے ساتھ تم سے معافی مانگی ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں انکل، جو کچھ ہوا وہ قسمت کا لکھا تھا۔" اس نے سر جھکایا۔ شہد رنگ بالوں کی لمبی لٹیں اس کے زرد رخساروں پر جھول گئیں۔

"گھر والوں کا رویہ تم سے کیسا ہے؟"

"چچا ثاقب تو سنا ہے بہت زیادہ غصے میں ہیں۔ وہ ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ ماموں شوکت بھی سخت ناراض ہیں۔ بہرحال خالہ فوزیہ کے کہنے سننے پر ہی انہوں نے میرے لیے وکیل اور قانونی مشاورت کا انتظام کر رکھا ہے۔"

"اور حشام؟" میں نے پوچھا۔

ماہین کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو لرز گئے۔

"مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اس سے میری آخری ملاقات اٹھن کی شام کو ہی ہوئی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب اس کی ناراضگی میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ اسے پتا چل چکا ہے کہ حادثے کی شام میں اپنی مرضی سے عمران کے ساتھ تھی۔"

"تم نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے کوئی پیغام بھجوایا حشام کو؟"

"میں کیوں بھجواؤں۔ اگر وہ مجھے بے قصور سمجھتا ہے تو اسے مجھ سے ملنے کے لیے آنا چاہیے تھا۔ میں اس کے ہر سوال کا جواب دے سکتی ہوں مگر شاید وہ میرے سچ بولنے کو ہی میرا جرم سمجھنے لگا ہے۔"

"حشام کے والدین میں سے بھی کسی نے تمہارے گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" اس نے شال کے کونے سے اپنے آنسو پونچھے۔ پھر یکایک ذرا چونک کر بولی۔ "آپی شاہین نے بتایا ہے کہ جب عمران لاک اَپ میں تھا اور بیمار تھا تو حشام کے ڈیڈ وہاں گئے تھے اور انہوں نے عمران کو تھپڑ بھی مارا تھا....."

"ہاں..... لیکن اس قسم کی سچویشن میں اس طرح کی جذباتی حرکتیں تو ہو ہی جاتی ہیں ماہین۔"

وہ سسکی۔ "وہ صرف میری وجہ سے اتنا خوار ہوا ہے۔ اس نے کیوں کیا ایسا۔ اگر..... اگر اس کے دل میں میرے

شادی

"مس! میں آپ کو کیا لگتا ہوں؟"

"بہت پیارے..... صاف ستھرے.....!"

"تو میں اپنی امی کو آپ کے گھر بھیج دوں؟"

"کیوں؟" تیور بگڑنے لگے۔

"بات آگے بڑھانے کے لیے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا..... ابھی زمین سے ابھرے نہیں اور چلے ہو شادی کی باتیں کرنے!"

"مس! دماغ آپ کا خراب ہو چکا ہے..... ٹی وی ڈرامے، انڈین فلمیں اور انٹرنیٹ دیکھ دیکھ کر..... میں تو ٹیوشن کی بات کر رہا تھا..... آپ کو شادی کے سوا کچھ خیال نہیں آتا کیا؟"

کراچی سے محمد اقبال کاسپنا

حوالے سے کوئی ایسی ویسی بات ہے تو..... تو اسے نکال دینی چاہیے۔ واپس چلے جانا چاہیے۔ میں بھلا اسے کیا دے سکتی ہوں۔ پلیز انکل! آپ اسے مزید تکلیفوں سے بچائیں، اسے سمجھائیں۔ ایوین اپنا آپ نہ رولے۔ وہ بہت اچھا ہے، بہت اونچے مقام پر جاسکتا ہے۔ میں اسے اونچے مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں دل ہی دل میں حیران ہوا۔ یہی ماہین تھی، جب اس نے پہلی بار عمران جونیئر کو دیکھا تھا تو سخت سیخ پا ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا تم اپنے باپ کی شکل صورت لے کر کیوں آگئے ہو یہاں۔ کیا ہمیں کچھ اور زخم دینا چاہتے ہو؟ اور آج وہی ماہین اس کے لیے اشک بار تھی۔

اچانک آہٹی سلاخوں کے پیچھے ماہین کی نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ وہ کسی کو دیکھ کر چونکی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ حشام ملاقات کے لیے آرہا تھا۔ میں نے پہلی نظر میں بھانپ لیا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے بجائے نرمی اور کسی حد تک ندامت کے آثار نظر آتے تھے۔ غیر متوقع طور پر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ماہین نے اسے دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ یقیناً اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ماہین۔" اس نے نرم آواز میں اسے پکارا۔

وہ منہ پھیرے کھڑی رہی۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔

"مجھے افسوس ہے ماہی! میں پہلے نہ آسکا۔ کچھ مجبوری تھی۔"

"بیٹھو حشام۔" میں نے سلاخوں کے سامنے رکھی

دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ ”تم بھی بیٹھو ماہین۔“ میں نے کہا۔ وہ اندر رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ میری وجہ سے جیل کی انتظامیہ نے خصوصی پروٹوکول دیا تھا۔

حشام میری طرف متوجہ ہوا۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ سے ہی معافی چاہتا ہوں انکل، آپ سے بدتمیزی کی..... آرگو کی..... دراصل اس وقت میڈیا نے طوفان مچا رکھا تھا۔ میں اتنے ڈپریشن میں تھا کہ خود کو سنبھال نہ سکا۔“

”مشکل میں خود کو سنبھالنا ہی تو بہادری ہوتی ہے حشام۔“ میں نے کہا۔

اس نے آہ بھری۔ ”ماہین کے سلسلے میں، میں بالکل بہادر نہیں ہوں انکل۔ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا، یہ پچھلے دو تین ہفتے میں نے کس کرب میں گزارے ہیں۔“ تب اس نے ذرا توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”انکل! میں عمران سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے بھی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ ڈیڈ نے غصے میں آکر اسے تھپڑ مارا۔ حالانکہ اس نے ماہین کو بچانے کے لیے سب کچھ اپنے سر لے رکھا تھا۔ میں ڈیڈ کی طرف سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔“

حشام کا رویہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اب پتا نہیں وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس کے دل سے نکل رہا تھا یا یہ نقلی باتیں تھیں۔

ماہین ماتھے پر بل ڈالے، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ یقیناً حشام اس سے بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ان دونوں کے درمیان رہنا مناسب نہیں سمجھا اور اجازت لے کر وہاں سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

عمران پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمہ وقت ماہین کے بارے میں ہی سوچ رہا ہے۔ ماہین جو جیل میں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس روز عدالت میں ماہین کی پیشی تھی، وہ اپنی کھٹارا موٹر سائیکل پر لاہور کے گلی کوچوں میں نکل گیا۔ اسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔

امید تھی کہ فوج سامنے آجانے کے بعد ماہین کی ضمانت ہو جائے گی۔ ویسے بھی خاتون کی ضمانت میں آسانی رہتی ہے اور یہ آسانی ماہین کے حصے میں بھی آئی۔ اسے مچلکوں پر ضمانت ملی اور وہ گھر آگئی۔ کچھ دیر بعد عمران بھی مٹھائی کا ڈبا لیے میری رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے محلے میں بھی شیرینی تقسیم کی تھی۔

مجھے تیار دیکھ کر بولا۔ ”کہیں جا رہے ہیں آپ؟“

”توفیق رائے کی مزاج پرسی کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔

چار، پانچ دن بعد عمران نے پہلی بار پھر سے اس معاملے میں دلچسپی لی اور بولا۔ ”چاچو جان! یہ رائے جو کچھ بھی کہتا رہے مگر یہ چاولہ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اپنی گرفتاری کے وقت یہ اپنی جان لینے کی کوشش نہ کرتا۔“

”اور نہ ہی اُسے یہ ڈر ہوتا کہ چاولہ اسے مروا ڈالے گا۔“ میں نے عمران کی بات مکمل کی۔ ”کل آدھی رات کو اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ”پھانسی نہ دو بھائی..... پھانسی نہ دو۔ بھائی سے اس کی مراد چاولہ ہی ہوگی۔ اپنی دہشت میں وہ بھول گیا ہے کہ اسے پھانسی چاولہ نے نہیں عدالت نے دینی ہے۔“

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اور عمران اسی پرائیویٹ جگہ پر موجود تھے جہاں خاص ملزموں کو تفتیش کے لیے لایا جاتا تھا۔ رائے کا وزن آٹھ دس روز میں تین چار کلو کم ہو گیا تھا۔ چہرے پر زردی تھی۔ ”نقاہت“ کسی تصدیقی مہر کی طرح اس کے نقوش کو داغ دار کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے اس سے جو مار پیٹ ہوئی تھی، اس کے چند نشانات اس کی ٹھوڑی اور گردن پر موجود تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ اس کی فائرنگ سے جو ہیڈ کانسٹیبل زخمی ہوا تھا، اس کی جان بچ گئی تھی۔

تفتیشی انسپکٹر کی موجودگی میں، میں نے رائے سے ایک بار پھر پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی سوئی اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی کہ چاولہ بھائی سے براہِ راست کبھی اس کا رابطہ نہیں ہوا۔ وہ مڈل مین کے طور پر دو تین غنڈوں کا نام لے رہا تھا اور وہ سب انڈر گراؤنڈ تھے۔ میں نے جھنجلا کر تفتیشی افسر سے کہا کہ یہ سخت ڈھیٹ بنا ہوا ہے۔ اس کی کچھ مزید دُھلائی کراؤ۔ میں اور عمران دوسرے کمرے میں آبیٹھے۔

کچھ دیر بعد ہم اس کے پاس پہنچے تو اس کی ناک سے خون رس رہا تھا اور وہ چٹائی پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی حرص نے اسے چند ہی روز میں عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔ دروازہ کھلنے سے جو آہٹ ہوئی، اس سے وہ بُری طرح بدک گیا۔ ہر آہٹ پر اسے یہی لگتا تھا کہ چاولہ بھائی کے بندے اسے مارنے کے لیے پہنچ گئے ہیں۔ وہ گھگیایا۔ ”تابش صاحب! مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے بتا دیا۔ آپ مجھے جیل پہنچانے میں جتنی دیر کریں گے، میری زندگی کو خطرہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ یہ لوگ..... یہ لوگ اپنے شکار کو وکیل

اپیل تک پہنچنے کا موقع کم ہی دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا یہی خوف اس بات کا ثبوت ہے کہ تم جو کچھ بتا رہے ہو، اس سے بہت زیادہ جانتے ہو۔"

اس نے پھر اپنی بے گناہی کی ٹیپ چلا دی۔ اب وہ یہ موقف اختیار کر رہا تھا کہ اس نے چاولہ کے لیے جو کچھ کیا، بلیک میل ہو کر کیا۔ وہ اس کی بہن کو اٹھا لے جانے اور بے آبرو کرنے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اس سے پہلے رائے کہہ چکا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ یہ بعد از تحقیق پتا چلا کہ وہ جس کو اپنی بہن کہہ رہا تھا، وہ اس کی کوئی خالہ زاد تھی۔ اس کی عمر چالیس سے کچھ ہی کم ہوگی، معمولی شکل و صورت کی تھی۔

رائے کی حالت اب ایسی نہیں تھی کہ اس سے مزید مار پیٹ کی جا سکتی۔ اسے ایک دن آرام کا موقع دینا ضروری تھا۔ ویسے بھی متعلقہ لوگ جانتے ہیں کہ ایک مقررہ وقت میں ٹارچر کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ٹارچر کو "کٹی نیو" رکھا جائے تو وہ اپنی افادیت کھونے لگتا ہے۔ میں اور عمران اس تفتیشی سینٹر سے نکل آئے۔ گیٹ سے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ موٹر سائیکل پر ایک ہوم ڈلیوری والا نوجوان گیٹ کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ شاید تفتیشی انسپکٹر عاقل نے لنچ کے لیے کچھ منگوایا تھا۔ نجانے کیوں لڑکے کو دیکھ کر مجھے اس کی صورت پہچانی سی لگی۔ دماغ پر زور دینے کے باوجود کچھ یاد نہیں آیا۔

میں واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ عمران بھی ساتھ ہی تھا۔ راستے میں وہ اپنی زبان کی قینچی چلاتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ "چاچو جان، آپ نے شاہدرہ میں جس طرح انسپکٹر رائے کے پیچھے جوانوں والی دوڑ لگائی، آپ کو چاچو جان کے بجائے بھائی جان کہنے کو جی چاہتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں عزت راس نہیں آ رہی، اور تم پھر بدتمیزی پر اتر رہے ہو۔" میرے تاثرات دیکھ کر اس نے بات وہیں ختم کر دی تھی۔ وہ ماہین کو اس کی ذہانت کی مبارک باد بھی دینا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "اگر میری بات ہوئی تو تمہاری مبارک باد اس تک پہنچا دوں گا۔" اس کے چہرے پر میرے لیے تشکر کے آثار نظر آئے۔

"حشام کے ساتھ ماہین کے معاملات کچھ ٹھیک ہوئے؟" عمران نے دریافت کیا۔ اس مرتبہ لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ٹھیک سے پتا نہیں۔ وہ کوشش تو کر رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

عمران نے حشام کے ڈیڈ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا۔ "وہ بہت غصے میں ہے۔ سنا ہے کہ وہ ماہین اور حشام کا رشتہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں ماہین نے پورے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے مگر حشام کے خیالات شاید مختلف ہیں۔"

بات کرتے، کرتے اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے اس ڈلیوری بوائے کا چہرہ یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی پورے بدن میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ میں یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا ہوا چاچو؟" عمران چونکا۔

"عمران! اٹھو، ہمیں جانا ہوگا۔ جلدی کرو۔" میں گیراج کی طرف لپکا۔

"مگر کہاں چاچو؟"

"رائے کی طرف۔ اس کی جان کو خطرہ ہے۔"

ہم دوڑتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔ میرے ذہن میں سخت ہلچل تھی۔ وہ ڈلیوری بوائے نہیں تھا۔ وہ ان دو بندوں میں سے ایک تھا جن کا چند ماہ پہلے ہمیں ایبٹ آباد میں سراغ ملا تھا۔ انہی میں سے کسی ایک نے بعد ازاں فارماسوٹیکل فیکٹری کے مالک کو قتل کر دیا تھا۔ بعد ازاں وہ دونوں گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ یہ سب کچھ میرے پردۂ تصور پر بڑی وضاحت سے نمودار ہوا اور ہم اس مضافاتی گھر کی طرف گاڑی بھگاتے چلے گئے جہاں رائے کو رکھا گیا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے کرتے میں نے تفتیشی افسر عاقل کو فون کیا۔ دوسری کال پر اس نے فون اٹھایا تو مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ "کہاں ہو تم؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"سر، میں گھر آ گیا ہوں۔"

"سینٹر میں رائے کے پاس کون ہے؟"

"سر جی حوالدار خدا بخش، ہیڈ کانسٹیبل سراج اور دو تین سپاہی ہیں۔"

"کسی کا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟"

"حوالدار کا ہے..... لیکن خیریت تو ہے نا؟"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "خیریت کا پتا نہیں، تم نمبر بتاؤ۔"

عاقل کے بتائے ہوئے نمبر پر عمران نے دو تین بار ٹرائی کی۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ یہ میرے لیے بڑی پُراندیش خاموشی تھی۔

مجھے وہ منظر بہت دنوں تک نہیں بھولا۔ میں اور عمران

گھر میں داخل ہوئے تو حوالدار خدا بخش اوندھے منہ گرا ہوا ملا۔ اس کا آدھا دھڑ چارپائی پر اور آدھا نیچے تھا۔ برآمدے میں ہی ایک سپاہی بھی لکڑی کی میز کے پاس فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ میز پر ہوم ڈیلیوری والا بچا کھچا کھانا پڑا تھا جس میں بریانی اور برگر کے چند ٹکڑے تھے۔ اس چھت تلے چار بندے گہری بے ہوشی میں تھے۔ ہم لپکتے ہوئے رائے والے کمرے میں پہنچے اور بدترین اندیشہ بھی حقیقت کا روپ دھار گیا۔ رائے کے جسم پر خنجر کے کئی گھاؤ تھے۔ اس کے اردگرد فرش پر خون کا تالاب سا بن چکا تھا۔ وہ بظاہر ختم نظر آتا تھا مگر جب عمران نے نیچے بیٹھ کر اس کا چہرہ گھمایا تو اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں زندگی کی رمق سی نظر آئی۔ شاید ایک آدھ سانس ابھی اس کے سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ اسے اسپتال لے جانے کا سوچا جا سکتا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سر فرش سے تھوڑا سا اٹھایا۔ گردن پر نظر پڑی، شہ رگ بھی جزوی طور پر کٹی ہوئی تھی۔ اس نے ڈوبتی نظروں سے میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو..... 'دیکھ لیا نا..... کہا نہیں تھا کہ یہ چھوڑیں گے نہیں مجھے۔'

"کچھ بتاؤ رائے..... کچھ بتاؤ۔" میں نے اسے تھوڑا سا جھنجوڑا۔

اس نے اپنا منہ کھولا لیکن آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ شہ رگ والے زخم سے تازہ خون بہنے لگا۔ میں نے کان اس کے خون آلود ہونٹوں کے قریب کر دیا۔

"چا..... و..... لہ..... نا..... ہیں....." یہ چند حروف ہی سمجھ میں آئے۔

"کہو..... کہو رائے، میں سن رہا ہوں۔" میں نے پھر اسے جھنجوڑا۔

اس نے ایک بار پھر چاولہ کا نام لیا اور نفرت انگیز انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

بڑی کوشش سے اس نے یہی حرکت ایک دفعہ مزید دہرائی مگر اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی الجھتی ہوئی سی نگاہیں، ساکت ہو گئیں۔ آنکھوں میں موت کی سفیدی ابھری اور سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

☆☆☆

میں عمران کے گھر ندیم ٹاؤن میں موجود تھا۔ ہم دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ انسپکٹر توقیر رائے جاتے جاتے کیا کہہ گیا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس نے چاولہ کا نام لے کر نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیں چاولہ کے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ایک یہ بھی ہو سکتا تھا، وہ بتا رہا ہو کہ یہاں قتل کر اس کی جان لینے والے چاولہ کے لوگ نہیں۔ اس طرح کے اور کئی معنی بھی ہو سکتے تھے۔

میں اور عمران اسی معاملے میں الجھے ہوئے تھے جب ڈور بیل ہوئی۔ عمران ٹریک سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اپنے الجھے بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتا ہوا اٹھا اور چند ہی لمحے بعد چار پانچ افراد کے ساتھ اندر آ گیا۔ یہ اس کے محلے دار ہی تھے۔ کوئی بازار کا دودھ فروش، کوئی کریانہ فروش، ایک ہوٹل والا، ایک سائیکل کونسلر۔ یہی سب لوگ تھے جنہوں نے چند روز پہلے عمران کی ضمانت ہونے کے بعد محلے میں جھنڈیاں لگائی تھیں۔ ڈھول بجایا تھا اور شیرینی تقسیم کی تھی۔ وہ سب اس کے دیوانے تھے کہ وہ اپنی ہمت طاقت سے بڑھ کر ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ اس شرکت کا ایک اور پہلو بھی تھا جو ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ حاجی فراز بھی تو وہ خود ہی تھا۔ حاجی فراز کے نام سے اہلِ علاقہ کے لیے جو بھی بھلائی کے کام ہوتے تھے، وہ در پردہ عمران ہی کر رہا تھا۔

دودھ فروش غلام محمد نے اپنے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ "عمران پتر! ہمیں پتا ہے کہ تو اس وقت مشکل میں ہے، تجھ پر کیس بنا ہوا ہے اور آج کل کیس لڑنا کون سا سوکھا (آسان) کام ہوتا ہے۔ پانی کی طرح پیسے لگتے ہیں۔"

ہوٹل والے الیاس بٹ نے کہا۔ "اوپر سے تم پر دیسی ہو، روزگار بھی کوئی نہیں۔ ہم نے تمہارے لیے کچھ پیسوں کا انتظام کیا ہے۔ اس کو کوئی احسان نہ سمجھنا بلکہ جو احسان تم ہم سب پر کرتے رہتے ہو، اس کا معمولی سا بدلہ ہے۔ بلکہ معمولی سا بھی نہیں ہے۔"

ادھیڑ عمر کریانہ فروش غلام رسول نے کہا۔ "تو ہمارے لیے ہیرو بھائی کا نیا روپ بن کر آیا ہے۔ تجھے دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ہمارا تو دل یہی چاہتا ہے تو پردیسی نہ رہے، ہمارا اپنا بن جائے۔ سدا کے لیے ہماری نظروں کے سامنے رہے لیکن ہمیں پتا ہے کہ ایک دن تو نے چلے جانا ہے، ہم نے تجھے بہت یاد کرنا ہے۔"

قمیص کے دامن سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور بغلی جیب سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکال کر عمران کو دکھایا۔ اس پر کسی بچے نے رنگ دار پنسلوں سے ایک اسکیچ بنایا ہوا تھا۔ عمران کی شبیہ بنا کر اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے اور لوگوں نے اسے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ "یہ

میرے آٹھ سال کے پوتے نے بنایا ہے۔ کہتا تھا ہم سب بچوں کی طرف سے عمران بھائی کو دینا۔"

سابقہ کونسلر افتخار احمد نے ذرا سنجیدہ لہجے میں مجھے اور عمران کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ نہ صرف عمران باعزت بری ہو بلکہ اس پر سے چور والا جھوٹا مقدمہ بھی ختم ہو۔"

"اور اس کے علاوہ جس بندے نے عمران پر حوالات میں تشدد کیا ہے، اس کو بھی کیے کی پوری سزا ملے۔" الیاس بٹ نے گرج کر کہا۔

محلے داروں نے کیس کی پیروی کے لیے جمع شدہ رقم جو قریباً پچیس ہزار تھی، عمران کے سامنے رکھ دی۔

یہ لوگ بے چارے جانتے نہیں تھے کہ انہوں نے جس کے لیے چندہ کیا ہے، وہ کروڑوں کے بزنس اور پراپرٹی کا مالک ہے۔ لیکن اگر احساس اور جذبے کے پہلو سے دیکھا جاتا تو یہ پچیس ہزار ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کر تھے۔

عمران نے اپنے ان پرستاروں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے بصد شکریہ وہ پیسے رکھ لیے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ دس بیس روز میں یہ پیسے پھر سے ان ہی لوگوں پر خرچ ہو جائے گے۔

عمران نے ان لوگوں کو کھلا پلا کر بڑی محبت سے رخصت کیا۔ جاتے، جاتے دودھ فروش غلام محمد نے ایک بار پھر مجھ سے منت کی۔ "ڈپٹی صاحب، آپ نے عمران پتر پر کوئی "ڈز" نہیں آنے دینی ہے۔ اس کو کوئی دکھ پہنچا تو ہم سب کو اس کی پیڑ (تکلیف) ہوگی۔"

ابھی وہ لوگ گئے ہی تھے کہ میرے فون پر ماہین کی وڈیو کال آ گئی۔ میں نے فون کو ایسے رخ پر رکھا کہ پتا نہ چل سکے کہ میں کہاں ہوں۔

ماہین اب پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔ بال سلجھے ہوئے تھے۔ رنگت کا پیلا پن ختم ہو گیا تھا۔ گال کا ڈمپل بھی کسی حد تک چمکنے لگا تھا۔ "کہاں ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"ایک کام سے آیا ہوا ہوں۔"

"آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"ہاں کہو، کہو..... سمجھو میں اکیلا ہی ہوں۔"

وہ بولی۔ "انکل تابش! میں نے کل اخبار میں ایک نیوز پڑھی تھی جس میں پولیس کے ریفرنس سے ہی لکھا گیا ہے کہ کچھ سال پہلے اس جاوید بھائی اور مشہور اسٹیٹ ڈویلپر رامے صاحب میں دوستی بھی رہی ہے۔"

"ہاں، یہ نیوز تو موجود ہے لیکن یہ دوستی کافی پرانی بات ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر ان رامے صاحب کی شخصیت بھی کافی دلچسپ ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو، ان کو جادو رامے بھی کہا جاتا ہے۔ جادو شاید اس لحاظ سے بھی کہ یہ مٹی میں ہاتھ ڈال کر سونا بنا رہے ہیں۔ ان کی ہاؤسنگ سوسائٹی چالیس پچاس ایکڑ سے شروع ہوئی تھی، اب بہت آگے پہنچ گئی ہے۔"

"تم کافی کچھ جانتی ہو۔"

"دراصل میں نے اپنے یوٹیوب چینل پر کچھ عرصہ پہلے جادو رامے صاحب کی شخصیت پر ایک دلچسپ آرٹیکل بھی اَپ لوڈ کیا تھا۔ میں ابھی آپ کو وہ آرٹیکل بھی Send کرتی ہوں۔ آپ کو کافی دلچسپی محسوس ہوگی، اور ہو سکتا ہے کہ کچھ مدد بھی ملے۔"

"ٹھیک ہے ماہین! تم بھیجو۔"

"ہم کچھ دیر کیس کی تازہ صورت حال اور انسپکٹر رائے کے قتل کے بارے میں بات کرتے رہے پھر ماہین نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "انکل جی، عمران کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے، منگل کے روز اس کی پیشی ہے۔"

اس کے خوبرو چہرے پر اندیشے کا سایہ لہرایا۔ "انکل! آپ اس کا بہت خیال رکھیں۔ وہ کبھی کبھی حماقت کی حد تک جذباتی ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں..... اس کے لیے فکرمند رہتی ہوں جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑا ہے، حد سے زیادہ خطرناک ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

عمران قریب ہی بیٹھا سن رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک موہوم سے اداس مسکراہٹ تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "حشام کے ساتھ اب کیا صورت حال ہے؟"

"اس نے معافی مانگی ہے۔ اپنے سابقہ رویے پر شرمندہ ہے۔ اپنے ڈیڈ کو بھی منا کر ہمارے گھر لایا تھا۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

اسی اثنا میں بیک گراؤنڈ سے آواز آئی۔ ماہی..... ماہی..... کہاں ہو.....؟" یہ حشام ہی کی آواز تھی۔

پھر وہ چھپاک کر کے اس لیپ ٹاپ کے سامنے آ گیا جس پر ماہین یہ وڈیو کال کر رہی تھی۔ آج اس کے بال کچھ ڈھنگ کے تھے۔ جیکٹ اور جینز میں تھا، ہاتھ میں ایک پیکٹ سا نظر آ رہا تھا۔ وڈیو کال میں مجھے دیکھ کر اس نے سلام

کیا اور بے تکلفی سے ماہین کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

رسمی کلمات کے بعد بولا۔ "چلو، اچھا ہوا انکل، آپ بھی یہیں پر ہیں۔ آپ بھی دیکھ لیں، کیا لایا ہوں ماہی کے لیے۔"

اس نے پیکٹ کھولا جو دراصل ایک جیولری باکس تھا۔

"پلیز حشام، رہنے دو، میں پھر دیکھ لوں گی۔" ماہین نے جز بز ہو کر کہا۔

"یار، کیا کرتی ہو، انکل تابش کوئی بیگانے تھوڑی ہیں۔"

اس نے باکس کھولا۔ اس میں ایک شاندار ڈائمنڈ نیکلس تھا۔ نیچے والی ایک لڑی میں سبز زمرد بھی لگے ہوئے تھے۔ خاصا قیمتی لگ رہا تھا۔ ساتھ میں چاندی کی ایک انگوٹھی تھی اس میں بھی نگینہ جڑا ہوا تھا۔ وہ شائستہ لہجے میں بولا۔ "یہ نیکلس ماہی نکاح کے موقع پر پہنے گی..... اور یہ انگوٹھی پتا ہے کس لیے ہے اور یہ چاندی کی کیوں ہے؟ آخری جملہ اس نے ماہین سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"کس لیے؟" ماہین نے پلکیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"یہ ہماری صلح کے لیے ہے، بڑے کہتے ہیں کہ چاندی ٹھنڈی ہوتی ہے اور سفید رنگ بھی صلح اور امن کا سمبل ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا اور ماہین کی ہچکچاہٹ کے باوجود وہ انگوٹھی اسے پہنا دی۔

اسی دوران میں ماہین کی بہن شاہین بھی اس وڈیو کال میں شامل ہو گئی اور کیسوں کی تازہ صورت حال کے بارے میں بات کرنے لگی۔ ماہین نے موقع غنیمت جانا اور کیمرے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے حشام بھی چلا گیا۔

شاہین چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن کی جان جلد از جلد اس ایکسیڈنٹ والے کیس سے چھوٹ جائے۔ اس کے علاوہ وہ عمران کو بھی باعزت بری دیکھنا چاہتی تھی۔ عمران کو دیکھ کر اس کی بے شمار سنہری یادوں نے خوشنما پرندوں کی طرح اپنے پر کھول لیے تھے اور اس کے اردگرد پرواز کر رہے تھے۔

شاہین سے گفتگو ختم کر کے میں نے اردگرد دیکھا، عمران کچن میں گھس چکا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ آج میری پسندیدہ ڈش، مٹن اور ماش کی دال مجھے اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلائے گا۔ عمران دانش اور اس کے بیٹے میں جو ایک دو باتیں مختلف تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ عمران بڑا اچھا کھانا بھی پکاتا تھا۔ یہ کوکنگ اس نے اپنی والدہ سے سیکھی تھی اور اس کی والدہ نے اپنی والدہ سے۔ وہ لاف زنی کرتے ہوئے بتاتا تھا کہ یہ سلسلہ اسی طرح اس کی پڑدادی کی پڑدادی تک چلا جاتا ہے جو دراصل ہیر رانجھا کے دور کی تھی۔ ہیر اپنے رانجھے کو ویسی تھی اور شکر کی جو خاص چوری کھلایا کرتی تھی، اس کے سارے "انگریڈینٹس" اسی پڑدادی نے ہیر سیال کو بتائے تھے۔ ہیر نے اس "چوری" کو اپنا کمال بتایا اور یوں کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رانجھے کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

میں کچن میں پہنچا تو عمران اپنی جیکٹ کی آستینیں چڑھائے بڑی مشاقی سے پیاز کاٹنے میں مصروف تھا۔ اس کا دوست ضیا باہر صحن کی روشنی میں بیٹھا دال صاف کر رہا تھا۔ عمران نے پیاز کاٹتے ہوئے، ناک سے سُوں سُوں کی زوردار آواز نکالی اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ "چاچو! ایک دفعہ ایشور یا رائے کو بھی پاکستانی ڈش بنا کر کھلائی تھی۔ یقین کریں وہ اس کالے بے لذتے ایسیک بچن سے خلع لینے پر تیار ہو گئی تھی۔ آپ بھی انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔"

"ہندوؤں میں خلع وغیرہ نہیں ہوتا، سیدھی، سیدھی طلاق ہوتی ہے اور تمہاری یہ مٹن والی بات بھی تمہاری کہانی نویسی کو کمزور بنا رہی ہے۔ ایسے گھرانوں میں گوشت وغیرہ کم ہی کھایا جاتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور انسپکٹر زبیر کی کال سننے میں مصروف ہو گیا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں عمران کے ہاں سے مزیدار ڈنر کر کے گھر واپس پہنچا تو اچانک اس آرٹیکل کا خیال آیا جو ماہین نے وٹس ایپ کرنے کا کہا تھا۔ میں نے موبائل دیکھا۔ آرٹیکل موجود تھا اور واقعی دلچسپ بھی تھا۔ سب سے دلچسپ اور توجہ طلب تو اس جادو راے کی تصویر ہی تھی۔ سب شکلیں اللہ کی بنائی ہوتی ہیں۔ نقص نکالنے سے گریز کرنا چاہیے مگر راے یا جادو راے کے تاثرات اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جو خوامخواہ گریز اور ناپسندیدگی کو ابھارتی تھی، بلکہ اسے شدید ناپسندیدگی کہنا چاہیے۔ اس کی ناک اتنی چپٹی تھی کہ لگتا تھا کہ ہونٹوں سے ذرا اوپر دو سوراخ ہی ہیں۔ ہونٹ بھی ضرورت سے زیادہ موٹے تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرے کی سب سے انوکھی چیز اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ بڑی آنکھیں خوب صورتی کی علامت بھی جاتی ہیں مگر یہ آنکھیں صرف بڑی ہی نہیں تھیں، باہر کو نکلی ہوئی بھی تھیں۔ نہایت گھنی اور آپس میں جڑی

بھوؤں کے نیچے یہ آنکھیں، دیکھنے والے کے ذہن میں خوف ابھارتی تھیں۔ نجانے کیوں ان آنکھوں کو دیکھ کر میرے تصور میں مشہور انڈین اداکار عرفان خان کی آنکھیں آگئیں۔ (حالانکہ مذکورہ اداکار مجموعی طور پر قبول صورت تھا) اچانک دیکھنے سے یہی لگتا تھا کہ جیسے اس شخص کے ڈیلے اس کی بھوؤں کے نیچے ویسے ہی دھرے ہوئے ہیں۔ تصویر میں اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ محسوس ہوتی تھی۔

اس آرٹیکل میں ماہین کی ایک وڈیو بھی موجود تھی جس میں اس نے بتایا تھا کہ اس نے رامے صاحب کا انٹرویو لینے کی بہت کوشش کی مگر ان کی ترش روئی اور بدمزاجی کے سبب یہ ممکن نہ ہوسکا۔

تفصیل میں ماہین نے بتایا تھا کہ رامے صاحب کا بچپن ایک نچلے درجے کی بستی میں گزرا۔ ان کا اصل نام تو شاکر تھا مگر گہرے رنگ کی وجہ سے لڑکپن میں ان کا نام کالا جادو پڑ گیا جو بعد میں جادو رامے بن گیا۔ جادو رامے کے والد ایک نائی تھے اور محلے کی ایک چھوٹی سی دکان میں ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے۔ جادو رامے کے بچپن کا تذکرہ ان کے ایک ہم عمر دوست سلمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا جسے بعد میں چاولہ اور چاولہ بھائی کہا گیا۔ چاولہ اور جادو رامے بستی کی گلیوں میں اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے۔ پڑھائی لکھائی میں دونوں کو دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے آوارگی کا ہاتھ تھاما اور غلط راستوں پر چل نکلے۔ جادو رامے کا باپ فوت ہوگیا تو اس نے باپ کی ہومیو پیتھک والی دکان چلانے کی کوشش کی لیکن کچھ اس کی شکل وصورت اور کچھ اس کا چال چلن، کوئی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ اسی زمانے میں جادو رامے اور اس کے لنگوٹیے یار چاولہ نے ایک اور بندے کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اور نقلی ہومیو پیتھک دوائیں تیار کرنا شروع کردیں۔ لیبل جرمنی کا اور مینوفیکچرنگ لاہور کی ایک گندی بستی کی۔ دو چار سال کے عرصے میں ہی جادو رامے اور چاولہ نقلی دوائیں تیار کرنے اور بیچنے میں ماسٹر ہو گئے۔ اب وہ اصلی ہومیو پیتھک دوائیں بھی بڑے دھڑلے سے تیار کررہے تھے اور اپنے کام کو پنجاب کے مضافاتی علاقوں میں تیزی سے پھیلا رہے تھے۔ پکڑے جاتے تھے تو رشوتیں دے کر چھوٹ بھی جاتے تھے۔ نجانے کتنے لوگ ان کی وجہ سے قبروں میں جاسوئے تھے۔ یہ ہمارے نظام انصاف اور معاشرے کی خامیاں ہی ہیں جن کی وجہ سے ایسے لوگ نہ صرف سینہ تان کر چلتے ہیں بلکہ پھلتے پھولتے بھی ہیں۔

جادو رامے کی شکل وصورت ہی نہیں، اس کا کردار بھی کراہت کا حامل تھا مگر پیسے میں طاقت ہوتی ہے۔ وہ ایک قبول صورت لڑکی سے شادی رچانے میں کامیاب رہا۔ ماریہ نامی اس لڑکی سے ڈیڑھ دو سال تو اس کی شادی بھی پھر جادو رامے کو پتا چلا کہ ماریہ نے کسی خوبرو نوجوان سے یارانہ لگا لیا ہے اور اس سے ملتی بھی ہے۔ ماریہ انہی دنوں اپنے میکہ دوست سمیت ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماری گئی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان دونوں کی موت کا ذمے دار بھی جادو رامے اور اس کا پارٹنر چاولہ بھائی ہی تھے۔

بے راہ روی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو خدا کی پکڑ بھی آتی ہے۔ نقلی دواؤں کے اس بڑھتے ہوئے کاروبار کو آخر قانون کی نظر لگ ہی گئی۔ ایک ناکارہ ویکسین کی وجہ سے دیہی علاقے میں کچھ اموات ہوئیں۔ ایک بڑا ہائی فائی کیس بنا۔ جادو رامے اور چاولہ بھائی دونوں اندر ہو گئے۔ طویل عدالتی کارروائی کے بعد دونوں کو آٹھ، آٹھ سال قید اور خطیر جرمانے کی سزا ہوئی۔

قریباً آٹھ سال بعد جب وہ دونوں رہا ہوئے تو دونوں کے نظریات میں بہت فرق آچکا تھا۔ دونوں کی بدخصلتی تو اپنی اپنی جگہ موجود تھی مگر جادو رامے اب جرائم میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی داغ بیل ڈال دی جبکہ چاولہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس چلا گیا..... اور انڈر گراؤنڈ ہوگیا۔ اب وہ جعلی اور ممنوعہ ادویات کے وسیع دھندے میں ملوث تھا جبکہ جادو رامے اسٹیٹ ڈویلپر کے طور پر ابھرا تھا۔ دونوں کے راستے بدلنے سے دونوں کے تعلقات بھی اب مکمل طور پر ختم ہو چکے تھے۔ بہرحال میڈیا کے کچھ لوگ اب بھی اس شک کا اظہار کرتے تھے کہ ان میں تھوڑا بہت "لنک" موجود ہے۔

جادو رامے اور خاص طور سے چاولہ بھائی کے بارے میں یہ مفصل آرٹیکل دیکھنے کے بعد ماہین کے کام کی سنجیدگی اور اس کے معیار کا اندازہ ہوا۔ وہ آگے چل کر یوٹیوبر کی حیثیت سے نام کما سکتی تھی۔ اپنے اس طویل آرٹیکل میں جادو رامے کی شخصیت کے بارے میں ماہین نے کچھ توجہ طلب اور دلچسپ حقائق بیان کیے تھے۔ اس کا قد غالباً پانچ فٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا، وہ بہت تند مزاج تھا، کروڑ پتی ہونے کے باوجود وہ اکثر بدوضع لباس میں نظر آتا تھا۔ وہ پان کا رسیا تھا، شراب کے قریب بھی نہیں جاتا تھا مگر عورت سے دور رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے لگا کہ جادو رامے نامی اس شخص سے ملنا اب ضروری ہوگیا ہے۔

ماہین کا وائس ایپ کیا ہوا یہ آرٹیکل مکمل دیکھنے کے بعد

میں بستر پر نیم دراز ہو گیا اور سوچنے لگا۔ عمران کے کھلائے ہوئے مرغن کھانے کی وجہ سے غبار سا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرا نیم گرم تھا البتہ ٹھنڈی ہوئی رات کا "خنک پسینا" کھڑکیوں کے شیشوں پر حرکت کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں آنکھیں بند کرتا تھا تو میرے بچھڑے یار عمران دانش کا ہیولا پوری وضاحت کے ساتھ میرے سامنے آجاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ پندرہ سولہ برس کا عرصہ میرے اور اس کے درمیان سے یک دم اوجھل ہو گیا۔ وہ اپنے روشن روشن چہرے کے ساتھ میرے عین سامنے صوفے پر آن بیٹھا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ سفید رنگ کی ہاف سلیو شرٹ اور کاٹرائے کی براؤن پینٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح جاذب نظر دکھائی دیتا تھا۔ میں سوچنے لگا ان پندرہ سولہ برسوں نے اس پر بہت کم اثر ڈالا تھا۔ سر کا کوئی بال سفید نہیں تھا، ہاں رخساروں کی ہڈیوں کا ابھار کچھ کم نظر آتا تھا، یا پھر ٹھوڑی کے ساتھ ایک دو دلکش لکیروں کا اضافہ تھا۔ وہ مسکرایا۔ "یہی سوچ رہے ہو نا کہ مجھ میں بہت کم تبدیلی آئی ہے اور تم بھلا کون سے تبدیل ہوئے ہو۔ بال ویسے کے ویسے کالے ہیں۔ ناک تھوڑی سی لمبی ہو گئی ہوگی یا وزن میں انیس بیس کا فرق پڑا ہے۔ آج بھی چیتے لگتے ہو..... لیکن..... آج میرا چہرا کچھ اداس لگ رہا ہے۔"

میں نے تصوری تصور میں کہا۔ "وہی ہو رہا ہے جس سے ڈرتا تھا۔ تمہارا بیٹا پھنس رہا ہے یہاں۔ اس پر کیس ہیں۔"

وہ اداسی سے مسکرایا۔ وہی دلکش ادا اس مسکراہٹ جو دیکھنے والے کی جان نکال دیتی تھی۔ "یہ کیس تو ختم ہو جائیں گے جگر..... مگر اس پر ایک دوسرا کیس بھی تو بن گیا ہے نا۔ محبت کا کیس۔ تمہارے شہر میں آکر وہ لٹ گیا ہے۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"کسی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ دراصل جگرا وہ میرا خون ہے اور ہم شاید ان لوگوں میں سے ہیں جن کی قسمت میں پیار کا حصول نہیں ہوتا، صرف پیار کرنا ہوتا ہے اور درد سہنا ہوتا ہے۔ میری اور شبانہ کی کہانی تمہیں بھولی تو نہ ہوگی۔"

"تم نے تو شبانہ سے عشق کیا تھا..... لیکن عمران تو....."

"نہیں پیارے، وہ بھی عشق ہی کر بیٹھا ہے..... گہری چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، آج شام جب وہ پیاز کاٹ رہا تھا تو صرف پیاز کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے؟"

میں حیران رہ گیا۔ آنکھیں کھولیں۔ سامنے صوفا خالی تھا مگر کمرے میں عمران دانش کی مخصوص مہک موجود تھی۔ ہاں ہر بار وہ مہک واضح موجود ہوتی تھی۔

مجھے یاد آیا جب شام کو وڈیو کال میں حشام نے ماہین کو عروسی مکسس دکھایا تھا اور اُسے چاندی کی انگوٹھی وغیرہ پہنائی تھی تو عمران خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلا گیا تھا۔

دل پر چوٹ سی پڑی۔ میں بے تاب ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ دل چاہا ابھی گاڑی پکڑ کر ماہین کے پاس پہنچوں۔ اسے وہ سب کچھ بتاؤں جو عمران جونیئر محسوس کر رہا ہے اور وہ سب کچھ بھی جو آگے پیش آسکتا ہے مگر میرے اس خیال کی عمر دس بیس سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ کمرے سے باہر ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے جیسے جھنجوڑ کر جگایا اور میں تلخ حقائق کی دنیا میں واپس آگیا۔

☆☆☆

میں گھر میں تھا اور چائے پی رہا تھا۔ عمران جونیئر اپنی شور مچاتی موٹر سائیکل پر چلا آیا۔ کچھ سنجیدہ موڈ میں تھا، بولا۔

"کل آپ کھانے کے بعد جلدی چلے گئے۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ آپ کو ایک چیز دینا تھی، بہت میٹھی بلکہ کہنا چاہیے سویٹ ڈش۔"

"سویٹ ڈش تو تم نے کھلائی تھی، گرم گلاب جامن۔"

"نہیں چاچو، یہ کھانے والی چیز نہیں ہے۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک کلائی کی گھڑی نکالی۔ اس کا اسٹریپ براؤن چمڑے کا تھا۔ ڈائل سلور کلر تھا۔ یہ روئیکس واچ تھوڑی پرانی تھی۔ اسٹریپ بھی استعمال شدہ نظر آتا تھا۔

"اپنی کلائی آگے کریں جی۔" وہ بولا۔

"بھئی، میں عام طور پر رسٹ واچ استعمال نہیں کرتا اور یہ کس کی ہے؟"

"آپ مجھے پہنانے تو دیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ اسے اتاریں گے نہیں۔"

اس نے میری کلائی پکڑ کر گھڑی باندھ دی اور بھرائی آواز میں بولا۔ "یہ آپ کے بچھڑے دوست اور میرے مرحوم والد کی ہے۔ جب میں انڈیا سے اپنے اصل وطن پاکستان آرہا تھا، والدہ نے خاص طور سے میرے سامان میں رکھی تھی اور کہا تھا کہ یہ میں ان کے بھائی یعنی آپ کو والد کی نشانی کے طور پر دوں۔"

میں ایک دم ماضی میں کھو گیا۔ میں نے گھڑی کے ڈائل پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے اسٹریپ کو سہلایا۔ عمران دانش ایسے ہی براؤن اسٹریپ والی گھڑی پہنا کرتا تھا۔ بے ساختہ

دل چاہا کہ میں اسے سو گھنوں..... اور پھر واقعی میں نے اسے تھپنوں سے کے قریب کیا۔ اپنے یار کی بھولی بسری خوشبو کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

کچھ دیر تک میں اور عمران اسی کی باتیں کرتے رہے۔ عمران دانش نے جو مختصر وقت انڈیا میں گزارا تھا، میں اس کے متعلق عمران سے پوچھتا رہا۔ تب گفتگو کا رخ موجودہ حالات اور جعلی ادویات کے سنگین معاملے کی طرف مڑ گیا۔

عمران کو نجانے کیا سوجھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے پر میرے پہلو میں آن بیٹھا اور میرے شانے کے ساتھ اپنا شانہ ملا دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"چچا جان! میں اس کیس میں آپ کے شانہ بشانہ کوشش کرنا چاہتا ہوں۔"

"عمران! کوئی ضرورت نہیں فالتو پنگے لینے کی۔ یہ پولیس کا کیس ہے۔ جمشید صاحب پوری دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہم نمٹ لیں گے اس معاملے سے۔ تم بس اپنے عدالتی کیسوں پر توجہ دو۔ اگلے ہفتے اس منشیات والے کیس میں بھی پیشی ہے۔"

اس نے سامنے لگی ثروت کی تصویر کو دیکھا اور بولا۔

"وہ آپ کی شریک حیات تھیں، تو میری چچی ہوئیں نا۔ ان کی زندگی جس طرح سے چھینی گئی، وہ ایک المناک رُوداد ہے اور پھر وہ بچہ ندیم جس نے ہمارے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ میں اس کی موت کو نہیں بھول سکتا۔ نجانے ایسے کتنے ندیم ہوں گے..... اور کتنی ثروت ہوں گی جن کو ان کے پیاروں نے دوا کے دھوکے میں اپنے ہاتھوں سے زہر پلایا ہوگا اور پھر قبروں میں اتارا ہوگا۔"

"یہ کیس اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے نا۔" میں نے ذرا جھنجھلاہٹ سے جواب دیا۔

"لیکن چاچو..... پلیز پلیز۔" اس نے میرے گھٹنے پکڑ لیے۔ "میں اصل مجرم تک پہنچنے کی کوشش میں آپ کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں..... پھر تو مجھے پاکستان سے..... آپ کی نگاہوں سے دفع ہو ہی جانا ہے۔ جاتے جاتے کوئی ایسا کام کر جاؤں کہ آپ کو یاد رہ جاؤں..... کوئی ایسا بہانہ جس کے سبب کبھی آپ لوگوں کی باتوں میں اور محفلوں میں میرا تذکرہ ہو جایا کرے..... کہ ایک دیوانہ بھی آیا تھا یہاں جو چاہتا تھا، وہ تو نہ کر پایا، لیکن چند ایک آنکھوں سے آنسو تو پونچھے اس نے۔"

"اموشنل بلیک میل کر رہے ہو۔ اس سلسلے میں اپنی

چونچ بند رکھو تو بہتر ہے۔"

دراصل میں جادو رائے سے ملاقات کرنا چاہ رہا تھا اور عمران کے دل میں آ رہا تھا کہ کسی حیلے بہانے وہ بھی اس ملاقات میں شریک ہو۔ مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ اسے بے وجہ خطروں میں جھونکوں۔ وہ پہلے ہی سنگین مشکلات میں سے کسی حد تک نکلا تھا۔ لاک اَپ میں باقاعدہ اس سے مار پیٹ ہوئی تھی اور پھر مجھے وہ تھپڑ بھی ابھی بھولا نہیں تھا جو حشام کے والد نے لاک اَپ میں جا کر اس کے منہ پر مارا تھا۔ عمران کو اس کی پروا نہیں تھی لیکن مجھے تھی۔ اس کے ہونٹ پر زخم کا وہ تورم سا نشان مجھے اپنے سینے میں گھاؤ کی طرح لگتا تھا۔

بہرحال، تیسرے دن میں بڑی خاموشی سے خود ہی جادو رائے سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔ میں سادہ لباس اور پرائیویٹ گاڑی میں تھا۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ رائے صاحب صرف منگل، بدھ اور جمعرات کو اپنے آفس میں بیٹھتے ہیں اور بہت ضروری ملاقاتیں ہی کرتے ہیں۔ میں نے اپائنٹمنٹ لینے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ میرے حاضر سروس پولیس ملازم ہونے کو بھی رائے نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی، لہٰذا جھنجلا کر میں خود ہی چلا آیا تھا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کا آفس کم و بیش ایک ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا۔ سیکیورٹی کے زبردست انتظامات تھے۔ بڑی بڑی پرائیویٹ گاڑیاں اور جیپیں بھی کھڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ رائے صاحب آفس میں ہی ہیں۔

میں نے اپنا سروس کارڈ اندر بھجوایا اور انتظار میں بیٹھ گیا۔

میرے یہاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ شاید "رائے صاحب" سے ان کے سابقہ ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست چاولہ بھائی کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔ جیسا کہ یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ اب ان دونوں میں تعلقات ختم ہو چکے ہیں بلکہ شاید بگڑ چکے ہیں تو عین ممکن تھا کہ وہ چاولہ بھائی کے بارے میں کوئی خاص بات ارشاد فرما سکتے۔

یہاں جادو رائے کی حیثیت بگ باس کی تھی۔ اُس کی آمد کی وجہ سے ہر کوئی ڈرا سہا نظر آتا تھا۔ عملے کے ارکان ہاتھوں میں فائلیں پکڑے پھرتی سے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔

مجھے بیٹھے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا جب اچانک اندر سے گرجنے برسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کو کسی کا دھکا کھا کر چکنے فرش پر گرتے اور پھسلتے دیکھا۔ یہ عملے ہی کا کوئی رکن تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل کے کاغذ دور تک بکھر گئے۔ اس کے

پیچھے ہی پیچھے جادو رائے برآمد ہوا۔ غصے کے سبب اُس کا رنگ مزید سیاہ ہو گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابھری نظر آتی تھیں۔ لگتا تھا کہ ابھی سویا ہوا اٹھا ہے۔ بال منتشر اور اُلجھے نظر آتے تھے۔ وہ اپنے ٹھگنے قد کے ساتھ اپنے ملازم پر جھپٹا اور اس کے پہلو میں ٹھوکر رسید کر کے ایک فائل اس کے منہ پر ماری اور چنگھاڑا۔ ''اب یہ تمہاری ماں بالکل بیکار ہے۔ پھاڑ کر پھینک دو اسے۔'' پھر وہ جیسے پھنکارتا ہوا آیا تھا ویسے ہی دندناتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے بارے میں جو سنا تھا، اس سے بڑھ کر پایا۔

کم و بیش ایک گھنٹے بعد انتظامیہ کا ایک بندہ میرے پاس آیا اور بڑے روکھے پھیکے لہجے میں بولا۔ ''آپ جا سکتے ہیں۔ باس کا کہنا ہے کہ وہ چھوٹے درجے کے پولیس ملازمین سے نہیں ملتے۔ اگر آپ کو کچھ کہنا ہے تو اپنے کسی بڑے کو بھیجیں۔''

میرا دماغ گھوم گیا۔ جی چاہا ابھی اٹھوں اور اس عفیلے گینڈے کے آفس میں گھس جاؤں۔ تاہم پھر خود پر کنٹرول کیا۔ اس دوران میں میری نگاہ ایک دراز قد خوبرو لڑکی پر پڑی۔ اس کا تعلق بھی عملے سے تھا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس کا نام جاذبہ تھا۔ یہ اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کے ساتھ کرائے کے ایک مکان میں رہتی تھی۔ مالک مکان سے کوئی جھگڑا چل نکلا تھا اور اس سلسلے میں، میں نے اس کی مدد کی تھی۔ میں نے اسے دیکھ لیا لیکن اس نے نہیں دیکھا اور یہ اچھا ہی ہوا۔

اسی شام میں جاذبہ کے مختصر سے گھر میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈیڑھ دو برس پہلے وہ کافی شوخ اور باتونی تھی لیکن اب بجھی بجھی سی نظر آئی تھی جیسے زندگی کے کئی معاملات میں اپنی ہار تسلیم کر رکھی ہو۔ اس نے مجھے پُرتکلف چائے پلائی تھی اور اب ہم باتوں میں مصروف تھے۔

میں نے کہا۔ ''ملازمت تو تمہیں ٹھیک ہی مل گئی ہے۔''

وہ بولی۔ ''سر! دیکھنے میں تو ٹھیک ہے لیکن ایسی ٹھیک بھی نہیں۔ آج آپ نے رائے صاحب کی جارحانہ ناراضی دیکھی ہی ہو گی۔ ہفتے میں تین روز آفس آتے ہیں اور یہ تین روز ہمارے لیے خاصے سخت ہوتے ہیں۔''

دفعتاً میرے ذہن میں مالین کے آرٹیکل والی بات آئی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جادو رائے شراب کے قریب بھی نہیں جاتا لیکن خوب صورت عورت سے دور رہنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں۔

میں نے کہا۔ ''جاذبہ! اخلاقی طور پر یہ شخص کیسا ہے؟''

''سر! اخلاقی لحاظ سے وہ اس طور تو ٹھیک ہے کہ کالا دھندا چھوڑ چکا ہے اور ہاؤسنگ سوسائٹی والا کام بھی ایمانداری سے کر رہا ہے..... اور کامیاب بھی جا رہا ہے سر..... مگر ویسے.....'' وہ جھجک کر چپ ہو گئی۔

مجھے اس کو ڈھب پر لانے میں تھوڑا ٹائم لگا لیکن وہ آ گئی۔ منجی لہجے میں بولی۔ ''سر جو کچھ میں بول رہی ہوں، پلیز اپنے تک ہی رکھیے گا۔ میں..... والدہ..... کی بیماری کی وجہ سے مجبور ہوں ورنہ شاید کب کی یہ نوکری چھوڑ چکی ہوتی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے رک، رک کر جو کچھ بتایا، اس سے تصدیق ہوئی کہ یہ بدنما شخص باہر سے زیادہ اندر سے بدنما ہے۔ خواتین کے حوالے سے وہ بے حد حریص مشہور ہے۔ یہ بات ایک طرح سے طے ہے کہ وہ جن خواتین کو بھی پُرکشش نوکریاں دیتا ہے، ان کے ساتھ سوتا بھی ہے بلکہ ان خواتین کو بھی شاید یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی ہے۔

مالین کے آرٹیکل کی طرح جاذبہ نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ جادو رائے کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا، خاص طور سے اس کی والدہ بہت مذہبی تھی، اس نے اپنی زندگی میں صرف دو جڑواں بچوں کو جنم دیا اور ان میں سے ایک یہ جادو رائے تھا لیکن اس میں اتنی کج روی پیدا ہو گئی جو بیان سے باہر ہے۔

جاذبہ نے سر جھکائے جھکائے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''سر! وہ کسی سے زیادتی تو نہیں کرتا لیکن مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی تو زیادتی ہے۔ وہ دور سے جتنا کریہہ نظر آتا ہے پاس سے اور بھی زیادہ ہے۔ غلیظ، بدبودار اور ناقابلِ برداشت۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔ اس کے چہرے پر واقعی کراہت کے آثار نمودار ہو گئے۔

وہ جیسے غیر ارادی طور پر اس بات کا اظہار بھی کر گئی تھی کہ وہ بھی اس شخص کو بھگت چکی ہے یا بھگت رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ہاں جاذبہ! آج میں نے بھی اسے دیکھا ہے، وہ اتنی اونچی پرواز کر رہا ہے لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اپنا منہ تک نہیں دھوتا، مجھے اس کی باہر اُبلی ہوئی آنکھوں سے گھن آ رہی تھی۔''

''وہ..... وہ دوسروں کی کراہت کو بھی انجوائے کرتا ہے۔ پتا نہیں کہ زمانے سے اپنی بدصورتی کا بدلہ لے رہا ہے۔ حالانکہ انسان کا اندر اچھا ہو تو ظاہری بدصورتی بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔''

''جاذبہ! تم انتظامیہ کی ایک اہم رکن ہو، کیا تم سمجھتی ہو

کہ جادو رائے اپنے پرانے یار چاولہ بھائی سے رابطے بالکل منقطع کر چکا ہے؟"

"سر! میری اتنی حیثیت نہیں کہ اندرونی معاملات کے بارے میں جان سکوں۔ لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ رائے صاحب نے کم از کم فیئر قانونی کاروبار سے خود کو علیحدہ کر لیا ہے۔ پچھلے دنوں کسی ٹی وی چینل پر رائے صاحب کا ایک ریکارڈ شدہ انٹرویو بھی چلا تھا جس میں انہوں نے اس ٹیکس کی تفصیلات بتائی تھیں جو وہ گورنمنٹ کو دے رہے ہیں۔ اس انٹرویو میں انہوں نے چاولہ کو بھی کھری کھری سنائی تھیں اور اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا کالا دھندا ختم کر کے قانون کے سامنے سرنڈر کر دے۔"

میں نے کہا۔ "اگر وہ اتنی اصلاحی باتیں کرتا ہے تو پھر ایک نارمل زندگی کی طرف کیوں نہیں آتا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ اسے شادی کے لیے خوب صورت سے خوب صورت لڑکی مل سکتی ہے۔ وہ اپنے بال بچوں کی خوشیاں دیکھ سکتا ہے یا پھر ایسا ہے کہ عیش و عشرت اس کے بدنما وجود میں رچ بس گئی ہے؟"

جاذبہ نے ایک گہری سانس لے کر اپنے سیاہ بالوں کو چہرے سے ہٹایا اور بولی۔ "آپ کی یہ عیش و عشرت والی بات درست ہے۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جیل میں جانے سے پہلے جب جادو رائے اپنے پارٹنر چاولہ بھائی کے ساتھ مل کر نقلی دواؤں کا مکروہ کاروبار کر رہا تھا، کسی فقیر نے اسے بددعا دی تھی اور کہا تھا کہ جس طرح تو دوسروں کے پیاروں کو مار رہا ہے اس طرح کوئی تیرا پیارا بھی تیری نظروں کے سامنے تکلیف اٹھا کر مرے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنا کوئی پیارا رکھا ہی نہیں جس کا دکھ اسے دیکھنا پڑے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سر! اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ بیوی تھی جو ایکسیڈنٹ میں مر گئی یا ماردی گئی۔ اس عمر میں انسان کے لیے زیادہ پیاری تو اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ اس نے اولاد کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔"

عجیب پیچیدہ شخصیت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر یہ "نائب" شخص اتنا پیچیدہ ہے تو اس کا حرام پیشہ یار چاولہ کیسا ہوگا؟

جاذبہ کے ذاتی حالات پر افسوس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھ سے ہو سکا تو اس کے لیے کسی اچھی نوکری کی کوشش کروں گا۔ میں اس سے مل کر واپس آ رہا تھا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ آج کل میں اپنے اردگرد سے بہت محتاط تھا۔ انسپکٹر رائے کی صورت میں چاولہ بھائی کا ایک مددگار شکنجے کے اندر سے ہی نکل آیا تھا۔ یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ ہمارے اردگرد اس کے مزید مددگار بھی موجود نہیں ہیں۔ البتہ ابھی تک کوئی مزید بندہ پکڑا نہیں گیا تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے مجھے شک سا ہوا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اس شک کی تصدیق تو نہ ہو سکی مگر میں کچھ چوکنا سا گیا۔ نہایت سفاک لوگوں سے پالا پڑا تھا۔ ایسا ہونا ممکن تھا کہ جاذبہ سے میری ملاقات جاذبہ کو مہنگی پڑ جاتی۔ میں نے گاڑی چلاتے، چلاتے انسپکٹر زبیر سے رابطہ کیا اور اسے جاذبہ کا ایڈریس دے کر ہدایت کی کہ وہ وہاں سادہ لباس میں فوری طور پر گارڈ متعین کرے۔

"بہت ہوشیار بنتے ہو چیمپئن جی۔" میرے عین عقب سے ایک آواز ابھری اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی پستول کی سرد نال میری کنپٹی سے آن لگی۔ بولنے والے کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ درمیانی عمر کا ہے اور بہت گھاگ شخص ہے۔

اس نے دوبارہ کہا۔ "جانتا ہوں، بہت بڑے فائٹر ہو۔ لیکن اعشاریہ 38 بور کی اس گولی سے زیادہ پھرتی نہیں دکھا سکتے۔ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر ہی رکھو، اور بالکل سیدھا دیکھتے رہو۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ میں اپنی گاڑی جاذبہ کے گھر سے باہر پارک کر کے گیا تھا۔ وہیں پر یہ شخص گاڑی کے اندر داخل ہوا اور نشستوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھ گیا۔ تاریکی کے سبب میں اس کی موجودگی سے باخبر نہ ہو سکا۔

"خبردار، حرکت نہ کرنا۔" اس نے پھر وارننگ دی اور ہاتھ بڑھا کر میرے کوٹ کی جیب سے پہلے میرا سیل فون اور پھر اندرونی جیب سے میرا پستول نکال لیا۔ اب مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ تعاقب کے بارے میں کچھ دیر پہلے مجھے جو شبہ ہوا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ وہی گاڑی جو پہلے عقب میں نظر آ رہی تھی اب پھر نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ہیڈ لائٹس سے ہی پہچان لیا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال تو تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔ اتنے بڑے چیمپئن کو اس طرح بے موت نہیں مرنا چاہیے۔" طنزیہ لہجے

میں کہا گیا۔ اس شخص کا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ ایسے کاموں کا ماہر ہے۔

میں نے یکا یک اتنے زور سے بریک لگائے کہ میری کنپٹی پر رکھا ہوا پستول میرے سر سے دو فٹ آگے چلا گیا۔ پستول بردار میرے اوپر ہی آن گرا تھا۔ میں نے اس کی پستول والی کلائی جکڑ لی۔ اس نے اضطراری حرکت کے طور پر فائر کیا۔ گولی ونڈ اسکرین کو توڑ گئی۔ گاڑی لہرائی اور سڑک سے اتر کر نشیب میں لہراتی چلی گئی۔ پھر ایک کمزور سے درخت کو توڑ کر رک گئی۔ وہ ایک زور آور شخص تھا۔ اس نے اپنا فولادی مُکا میرے جبڑے پر رسید کرنا چاہا جو اچٹتا ہوا سا میری ٹھوڑی پر لگا۔ میں نے سر کی تباہ کن ضرب اس کے چہرے پر لگائی..... اور کلائی مروڑ کر پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ میرے سر کی ضرب نے اس کے دم خم کو نصف کر ڈالا تھا پھر بھی ایک چنگھاڑ کے ساتھ وہ مجھ پر پل پڑا۔ وہ اتنے جوش میں تھا کہ اپنا بیلنس کھو بیٹھا۔ جونہی میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے ہیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے پوری طاقت کے ساتھ اسے ونڈ اسکرین سے ٹکرا دیا۔ اسکرین پہلے ہی شکستہ تھی ٹوٹ گئی اور وہ بونٹ پر سے لڑھکتا ہوا ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔ میری گاڑی کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ چکی تھی دوسری کی روشنی میں، میں نے دیکھا وہ منڈے ہوئے سر والا ایک گرانڈیل بدمعاش تھا۔ اس کا تھوبڑا خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

یہ سب کچھ چار پانچ سیکنڈ کے اندر ہوا۔ عقب میں آنے والی گاڑی رکتے رکتے بھی بیس پچیس میٹر آگے چلی گئی تھی۔ اب یقیناً اس میں سے کچھ اور آفت زادے برآمد ہونے والے تھے۔ منڈے سر والے کا پستول گاڑی میں ہی کہیں گرا تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں دائیں بائیں ہاتھ چلایا مگر تاریکی کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور درختوں میں بھاگ کھڑا ہوا..... درختوں میں بھاگنے کا فائدہ یہ تھا کہ اگر عقب سے مجھ پر فائر کیا جاتا تو بچنے کے امکانات زیادہ تھے۔

جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ تعاقب کرنے والے گاڑی سے نکل کر میرے پیچھے لپک رہے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے مجھ پر فائر نہیں کیا تھا۔ شاید زندہ پکڑنا چاہ رہے تھے۔ مجھے زیرو اعشاریہ ایک پرسنٹ بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ وہی کالے دھندے والے لوگ ہیں جن کے ساتھ میں نے ٹکر لی ہوئی ہے۔ سڑک یہاں نیم دائرے کی شکل میں گھومتی تھی۔ قریباً ایک منٹ تک درختوں میں بھاگنے کے بعد مجھے پھر سڑک کی روشنی نظر آئی۔ یہاں ایک بڑی حوصلہ افزا روشنی بھی موجود تھی۔ یہ نیلے رنگ کی ریوالونگ لائٹ تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کسی پولیس موبائل جیپ کی لائٹ ہے۔ میرا رخ سیدھا اس روشنی کی طرف ہو گیا۔ یہ واقعی ایک پولیس موبائل تھی۔ مجھے دور ہی سے اس کے گرد دو تین اہلکار بھی نظر آ گئے۔ وہ جیسے کسی ناکے پر کھڑے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے آنے والوں نے بھی یہ منظر دیکھ لیا ہوگا اور اب مزید آگے نہیں آئیں گے مگر ان میں سے کسی ایک کا پکڑا جانا بھی ضروری تھا۔ میں لپکتا ہوا ناکے پر پہنچا۔ یہ بالکل کم ٹریفک والی سڑک تھی۔ دو اہلکار وردی میں اور دو سادہ لباس میں تھے۔ وہ میری طرف لپکے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ غیر متوقع طور پر تعاقب کرنے والے بالکل قریب آ چکے تھے۔ پتا نہیں کہ وہ کتنے تھے مگر فی الوقت تین نظر آ رہے تھے۔

"پوزیشن لو۔" میں نے ناکے کے مسلح اہلکاروں سے چلا کر کہا۔

"پوزیشن تو ہم لے چکے ہیں سر۔" ان میں سے ایک نے اطمینان سے کہا۔

یہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ باوردی اہلکار کی ٹرپل فور رائفل کا رخ میری طرف تھا۔ سفید لباس والے "اہلکار" نے بھی بلا جھجک اپنی آٹومیٹک میری گردن پر رکھ دی۔ تعاقب کرنے والے بدمعاش صورت افراد بانچھیں ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ میں تین اطراف سے آتشیں اسلحے کی زد میں تھا۔ ایسے موقعوں پر مزاحمت خودکشی کے زمرے میں آتی ہے۔

بڑی چابکدستی اور مہارت سے مجھے دھکیل کر پولیس موبائل کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اندر آتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ یہ پولیس موبائل نہیں، اسے پولیس موبائل کی شکل دی گئی ہے۔ فوراً ہی ایک دھچکے کے ساتھ گاڑی حرکت میں آ گئی۔

☆☆☆

اگلے 48 گھنٹے میرے لیے بڑے سخت اور تکلیف دہ تھے۔ مجھے لاہور کے اندر ہی ایک بہت بڑی کوٹھی میں لایا گیا جس کا سامنے والا لان ہی کوئی دو ایکڑ جگہ میں تھا۔ یہاں مجھے ایک کمرے میں بند کیا گیا اور کسی سے بات کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ اگلی رات مجھے چھوٹے سائز کے ایک بالکل بند کنٹینر میں سوار کرایا گیا۔ اس بند کنٹینر میں عارضی طور پر دو نشستیں اور ایک لمبی بنچ نما نشست فٹ کی گئی تھی۔ میں

ایک نشست پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ کنٹینر پر چار مسلح گارڈز بھی موجود تھے۔ میرا یہ شک پایۂ تصدیق کو پہنچ چکا تھا کہ یہ چاولہ بھائی کے لوگ ہیں۔ ان کا انچارج ایک سفاک صورت شخص تھا۔ شکرے جیسی آنکھوں اور کھڑی ناک والے اس شخص کو یہ لوگ یادر خاں کہہ رہے تھے۔ یادر خاں کے بارے میں بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ چاولہ بھائی کا خاص الخاص کارندہ ہے اور جلاد صفت ہی نہیں واقعی جلاد بھی ہے۔

دورانِ سفر اس نے مجھ سے کئی طنزیہ باتیں کیں۔

''گیدڑ کی موت اسے شہر کی طرف لاتی ہے۔ چیمپئن صاحب! تمہاری موت تمہیں چاولہ بھائی کے مقابلے میں لے آئی۔ جس کام کو تمہارے محکمے کے بڑے بڑے سورما نہ کر سکے، اسے تم کیسے کر سکتے تھے؟''

پھر ایک موقع پر اس نے مجھے راکھل سے باقاعدہ شہ کا دیتے ہوئے پوچھا۔ ''اس شریفوں کے شریف بیوپاری رامے کی بغل میں کیا لینے گھسے تھے؟ ٹوہ شوہ لگانا چاہتے تھے نا چاولہ بھائی کی۔ ٹوہ لگ گئی ہے تمہاری۔ خیر سے تمہیں چاولہ بھائی کے چرنوں میں ہی بٹھانے لے جا رہے ہیں۔''

سفر کے دوران میں یہ گارڈز آپس میں جو گفتگو کر رہے تھے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منڈے سر والے جس گینڈے کو میں نے اپنی گاڑی سے باہر پھینکا تھا، وہ زخمی حالت میں تھا اور کسی پرائیویٹ اسپتال میں تھا۔ وہ بڑا بھنے خان لڑاکا تھا مگر سر کی شدید چوٹ نے اس کی پھٹے خانی موت کے دہانے پر پہنچا دی تھی۔ مجھے اس شخص کی نسبت سے بھی خوفناک دھمکیاں دی گئیں۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ ابھی تک عمران ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔

بند کنٹینر میں ٹھٹھری ہوئی رات کا یہ سفر کئی گھنٹے طویل ثابت ہوا..... میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مجھے ایبٹ آباد کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ رات آخری پہر جب یہ تھکا دینے والا سفر ختم ہوا تو میں واقعی ایبٹ آباد کے ایک نواحی ایریا میں تھا۔ یہ ایک قدرے سنسان علاقہ تھا۔ دور جنوب مغرب کی طرف تھنیا گلی کے بلند و بالا آثار نظر آتے تھے۔ یہاں بھی ہم مخروطی چھتوں والی ایک وسیع کوٹھی میں داخل ہوئے۔ کشادہ احاطے میں تین چار اور کنٹینر کھڑے تھے۔ ایک کنٹینر پر لکھے ہوئے الفاظ سے پتا چلا کہ یہ کسی فارماسوٹیکل کمپنی کے ہیں اور دواؤں کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

سردی انتہا کی تھی۔ ہر طرف برف کی سفید چادر تاریکی کے اندر سے اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ مجھے کڑے پہرے میں عمارت کے اندر لایا گیا۔ یہاں بھی دواؤں کے کارٹن دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دروازہ کھول کر ہم ایسی جگہ پہنچے جو بظاہر گودام نظر آتی تھی۔ لوہے کے بڑے بڑے اسٹینڈز میں چھتوں تک کارٹن چنے ہوئے تھے مگر جب یادر خاں نے ایک جگہ ان کارٹنوں کو دھکیلا تو اوپر تلے دو قطاروں میں رکھے ہوئے چھ کارٹن بڑے آرام سے سلائڈ کر کے اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ یہ دراصل ایک خفیہ دروازہ تھا۔

ہم اس دروازے سے اندر داخل ہوئے تو خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔ یہ بڑی فرنشڈ جگہ تھی۔ لمبے لمبے قالین پوش کوریڈورز اور آرام دہ کمرے۔ مگر ایک مقام سے زینے اتر کر جب ہم پیسمنٹ نما جگہ پر پہنچے تو سب کچھ اوجھل ہو گیا۔ میں نے خود کو ایک نہایت سرد، سیلن زدہ سے کھنڈر میں پایا۔ یہاں بالکل جیل کے سے انداز میں ساتھ ساتھ تین سلاخ دار کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب ایک چبوترا سا نظر آ رہا تھا۔ یہ ساری جگہ نہایت سرد ہونے کے ساتھ ساتھ نیم تاریک بھی تھی۔ دو کوٹھریاں خالی تھیں لیکن ایک میں کوئی موجود تھا اور اسے قے ہو رہی تھی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ وہ کوئی بیمار عورت ہے۔ میرے ہاتھ کھول کر مجھے بھی ایک کوٹھری میں دھکیلا گیا اور زنگ آلود سلاخوں والا بھاری دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔

اس کال کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے میری نظر دو الفاظ پر پڑی تھی اور ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ کوٹھری کی پیشانی پر لکھا تھا۔ ''ڈیتھ سیل''۔

☆☆☆

یوں لگ رہا تھا کہ میں برف کے دوزخ میں ہوں۔ مجھ میں تو سردی گرمی برداشت کرنے کی اضافی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی، میں اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ساتھ والی کوٹھری میں تھی اور بہت بیمار بھی لگتی تھی۔

دوپہر کے وقت ایک بدمعاش صورت شخص اس تہ خانے میں داخل ہوا اور اس نے ہم دونوں قیدیوں کو برا بھلا کھانا پہنچایا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد بھاری گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا وہ شخص اندر داخل ہوا جسے دیکھنے کا تجسس میرے اندر مسلسل پروان چڑھ رہا تھا۔ گارڈز نے اس کے لیے ایک آرام دہ کرسی میری کوٹھری کی سلاخوں کے عین سامنے رکھ دی۔ وہ چاولہ بھائی تھا۔

اس کی عمر بھی اس کے سابقہ دوست جادو رامے کی طرح چالیس کے قریب تھی۔ چہرے پر خشونت تھی اور دو پرانے زخم تھے۔ اس نے ایک ہاتھ میں سگریٹ اور

دوسرے میں برانڈی کی چھوٹی بوتل تھام رکھی تھی۔ آنکھوں میں سفاکیت کا جوار بھاٹا تھا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔ ”تمہیں کہا تھا نا ڈپٹی جی! کہ اتنے بچے غلطی ہونے پر معافی مانگتے ہوئے زیادہ ہچکچاتے نہیں۔ تم نے معافی نہ مانگی اور معاملے کو اتنا بگاڑ دیا کہ واپسی کا کوئی راستہ ہی نہ چھوڑا۔ ہمیں اپنے وفادار ساتھی کی جان اپنے ہاتھوں سے لینا پڑ گئی۔ چچ، چچ، چچ۔“ اس نے عجیب زہریلے انداز میں اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ ”بڑا پیار کرتے تھے نا اپنی بیوی سے۔ اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے تڑپ رہے ہو۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کی سوجی سوجی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ برانڈی کا ایک طویل آخری گھونٹ بھر کر گویا ہوا۔ ”بدلہ تو تم اس کا نہیں لے پاؤ گے۔ ہاں تمہاری جدائی کا سدباب کر دیتے ہیں۔ تمہیں اس کے پاس بھیج دیتے ہیں۔“

”زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر اپنی ثروت بیگم کی موت کا الزام ہم پر کیوں لگاتے پھرتے ہو۔ یہ اصلی دوائیں، نقلی دوائیں، سب اسٹینڈرڈ دوائیں، سب باتیں ہیں۔ لوگ یہاں خوراک میں پتا نہیں کیا کیا زہر کھاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ اس کی بھی موت آئی ہوئی تھی مر گئی۔ اب تمہاری آ گئی ہے، تم بھی مر جاؤ گے۔“

پھر اس نے اپنے قریب کھڑے اپنے دست راست یاور خاں سے کہا۔ ”فائل دکھاؤ اس کی۔“

یاور خاں نے جھک کر ایک فائل جاولہ کے سامنے یوں رکھی جیسے جاولہ ایک جج ہو اور عدالت کا اہلکار اس کے سامنے کیس کی فائل رکھ رہا ہو۔ جیک لگا کر جاولہ نے دو تین منٹ تک فائل کے چھ سات اوراق پلٹے پھر بولا۔ ”ایک سال پہلے ایبٹ آباد شہر میں فیکٹری مالک اور اس صوبے کے اسٹاکسٹ ذوالفقار احمد عباسی کا قتل..... اس کے بعد ڈاکٹر ماجد اور اس کے دوست مقصود احمد کا قتل..... اور اب دو روز پہلے ہمارے انچارج گارڈ سراج شاہ کو شدید زخمی کر کے تقریباً نارہ کرنے کا جرم۔ ان میں سے ہر جرم پر علیحدہ علیحدہ سزائے موت بنتی ہے۔ لیکن یہاں چونکہ اپیل کا حق نہیں لہٰذا ایک ہی سزا کافی ہوگی۔“

پھر وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے ڈپٹی تابش! اسی ہفتے تمہیں تمہاری پیاری زوجہ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک ہفتہ اس لیے رکھا ہے کہ اس دوران میں تمہارا وہ چھپورا بھتیجا بھی شکنجے میں آ گیا تو دونوں کو اکٹھا ہی روانہ کر دیا جائے گا۔“ وہ چاٹ لہجے میں نہایت سفاک گفتگو کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سمیت لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ ان لوگوں کی غیر معمولی سفاکی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، بالکل درست ثابت ہو رہا تھا۔

اگلے 24 گھنٹے اس طرح گزرے جیسے میں واقعی پھانسی پانے والا مجرم ہوں اور کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا ہوں۔ دس فٹ ضرب دس فٹ کی اس کوٹھری میں ایک چھوٹا سا میلا کچیلا باتھ روم بھی تھا جس کی ٹونٹیاں برستی رہتی تھیں۔ کوٹھری میں ایک پتلا سا گدیلا اور ایک لحاف تھا۔ لحاف گو خاصا موٹا تھا پھر بھی اس ظالم سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ کوٹھری کی دیواریں چھوٹے چھوٹے سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی تھیں اور خصوصاً رات کے وقت اتنی ٹھنڈی جاتی تھیں کہ انہیں ہاتھ لگانا ممکن نہیں رہتا تھا۔ ہٹا کٹا بدمعاش صورت شخص تین مرتبہ کھانا کوٹھری میں پہنچا دیتا تھا۔ آہنی سلاخوں والے دروازے کے نیچے اتنی درز موجود تھی کہ کھانے کی ٹرے بہ آسانی کمرے میں کھسکائی جا سکتی تھی۔ کھانا پہنچانے کے بعد وہ اس تہہ خانے کے دوسرے گوشے میں ایک چھوٹے سے کمرے میں جا بیٹھتا تھا جہاں اس نے غالباً الیکٹرک ہیٹر وغیرہ لگایا ہوا تھا۔ تاہم وہ مستقل طور پر نہیں بیٹھتا تھا۔ کسی وقت باہر بھی چلا جاتا تھا۔

ساتھ والی کوٹھری میں موجود عورت مسلسل بیمار تھی۔ اس کے کھانسنے اور کبھی کبھی ابکائیاں لینے کی آواز مجھے آتی رہتی تھی۔ اس سے رابطے کا بظاہر کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا مگر دوسری رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں باتھ روم میں برفاب جیسے پانی سے ہاتھ دھونے کی کوشش کر رہا تھا جب دیوار کے ایک اینٹ نما سیاہ پتھر میں جنبش پیدا ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد یہ پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا اور وہاں ایک چھوٹا سا خلا نظر آنے لگا۔ میں نے حیران نظروں سے دیکھا، دوسری طرف بیمار عورت کی آنکھیں اور اس کے مدقوق چہرے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا کہا۔ یہ اٹھائیس تیس سالہ عورت یقیناً کسی وقت خوب صورت رہی ہوگی لیکن فی الوقت اس کا حال برا تھا۔

وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے جانتی ہو۔ سرگوشی کرتے ہوئے حیران لہجے میں بولی۔ ”آپ مشہور..... مارشل آرٹسٹ ہیں نا..... تابش تابی صاحب؟“

"اگر ایسا ہے تو پھر؟" میں نے بھی سرگوشی کی۔

"پھر مجھے بے حد دکھ ہے۔" اس کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ "آپ کو یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ تو ایک اسٹار کی طرح ہیں۔ مارشل آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے بے شمار لوگ آپ کے فین ہیں۔ آپ کے فن سے اکتساب کرنا چاہتے ہیں، میں نے خود بھی اپنے اخبار میں آپ کے بارے میں ایک آرٹیکل لکھا تھا۔"

"تو تمہارا تعلق صحافت سے ہے؟" میں نے اس کی بے ساختہ تعریف و توصیف کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام انیلا آغا ہے۔" پھر اس نے اپنے انگلش اخبار کا نام لیا اور پھر اشک بار لہجے میں مختصراً بتایا کہ وہ کس "جرم" کی وجہ سے یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ یہ وہی جعلی دواؤں والا کالا دھندا ہے جس کا کھوج لگانے کی پاداش میں وہ ان بے رحم لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔

"اور آپ؟" اس نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

"اگر تم مجھے مارشل آرٹ کے حوالے سے جانتی ہو تو پھر یہ بھی جانتی ہوگی کہ میرا تعلق پولیس کے محکمے سے بھی ہے۔"

"یعنی آپ اس جعلی دواؤں والے کیس پر کام کر رہے تھے؟"

"بس یہی سمجھ لو۔"

میں اُس سے کئی سوال پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اچانک اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ پورا ایک منٹ کھانستی رہی۔ ذرا سنبھلی تو اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے وہی سوال پوچھا جو میرے ذہن میں سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیوار کا یہ پتھر اپنی جگہ سے کیسے نکلا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے یہاں آئے بس آٹھ دس روز ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ مجھ سے پہلے جو بدنصیب یہاں موجود تھا شاید اس نے کافی عرصہ یہاں گزارا۔ اس نے کسی نکیلی شے سے کُرید کُرید کر اس پتھر کو یہاں سے ہلایا ہوگا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، اسے مار دیا گیا؟"

میں نے سوراخ میں دیکھا۔ اس کی میلی آنکھوں میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آیا، بولی۔ "جو اِن کوٹھریوں میں آجاتا ہے اسے مرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں ان پر ڈھیر سیل لکھا ہوا ہے۔" شدید سردی اور بیماری کے سبب انیلا آغا کی آواز لرز رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ یہاں کا نگران اندر آرہا تھا۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "وہ آرہا ہے۔ اب آپ جائیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے وہ اینٹ نما چوکور پتھر غلاف میں رکھ دیا۔ میں بھی باتھ روم سے نکل آیا۔

اگلے روز رحیم چاچا بھائی نے دوپہر کے وقت پھر مجھ سے ملاقات کی۔ اس مرتبہ وہ کھڑے کھڑے ہی آیا تھا۔ وہ بھاری بھرکم گرم کپڑوں میں ملبوس تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ مجھے عام کپڑوں میں دیکھ کر اس کی اذیت پسندی کی تسکین ہو رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے امپورٹڈ سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور منہ سے ایک بار پھر "چچ، چچ" کی تاسف بھری آواز نکالی۔ "ہم جانتے ہیں کہ تم بہت باصلاحیت بندے ہو، لیکن ہمارے بار بار منع کرنے کے باوجود تم باز نہ آئے اور موت کا پھندا گلے میں ڈال لیا۔"

میں خاموش رہا۔ وہ اپنے دستانوں والے ہاتھ بھاری اوورکوٹ کی جیبوں میں گھساتے ہوئے بولا۔ "اور ڈپٹو (ڈپٹی) یہ نہ سمجھنا کہ گلے میں پھندے والی بات میں محاورے کے طور پر کر رہا ہوں۔ یہاں ہم اپنے مجرم کو واقعی پھانسی دے کر مارتے ہیں۔" اس نے ایک ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہ چبوترا دیکھ رہے ہو۔ اس کی سیڑھیاں دوسری طرف ہیں۔ تمہیں یہاں سے نظر نہیں آرہی ہوں گی۔ دراصل یہ پھانسی گھاٹ ہی ہے۔"

پھر اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے خاص کارندے یاور خاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ڈیٹ طے ہوئی ہے اس کی؟"

یاور نے وہی دو دن پہلے والی فائل کھولی اور دیکھ کر بولا۔ "پانچ دن بعد چوبیس تاریخ۔ جمعہ کا دن ہے۔"

"گڈ، اچھا دن ہے۔ مرنے کے لیے مبارک سمجھا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے ڈپٹو جی، تمہارے گناہ معاف ہو جائیں اور شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ تمہیں مارنا ہی ہے تو پھر ابھی کیوں نہیں مار دیا جاتا۔ تاریخ وغیرہ کیوں دی جارہی ہے..... تو اس کی ایک وجہ تو تمہیں کل بتائی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارا وہ باسٹرڈ بھتیجا بھی پکڑا جائے اور دونوں چچا، بھتیجا کی گردن ایک ساتھ لٹکی کی جاسکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سزائے موت کے قیدی کو آخری دنوں میں جو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑتا ہے، اس کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ اس کا رونا گڑگڑانا، گناہوں سے توبہ کرنا، اور آخر وقت تک کسی کرشمے کا منتظر رہنا۔" اس نے لذت لینے والے انداز میں اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔

کچھ دیر تک اسی طرح کی خوفناک باتیں کرنے کے بعد اس نے یاور خاں کو ہدایت کی کہ ان آخری دنوں میں میرا اچھی طرح خیال رکھا جائے۔ اچھا کھانا دیا جائے اور ایک لحاف کا انتظام مزید کر دیا جائے۔

اس کے بعد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ واپس مڑ گیا۔ مگر چند قدم چل کر رک گیا اور کسی فلمی کردار کی طرح واپس مڑا۔ میری یخ بستہ کوٹھری کی سلاخوں کے بالکل قریب پہنچ کر بولا۔ ”یہاں کسی کو اپیل کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن تم ایک نامور شخص ہو تمہارے لیے میں تھوڑی سی رعایت نکال سکتا ہوں۔ اس کی ایک شرط ہے۔“

میں سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”اپیل کا حق حاصل کرنے کے لیے تمہیں معافی مانگنا ہوگی۔ وہی معافی جس کا میں نے شروع میں تم سے کہا تھا۔ اب ڈاکٹر ماجد تو زندہ نہیں ہے۔ اب اس کے وارث ہی ہیں بلکہ ایک ہی وارث ہے۔ اس کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگ لو تو تمہاری سانسوں میں بیس سے پچیس روز کا اضافہ ہو سکتا ہے۔“

تب اس نے اپنے دستِ راست یاور خاں کی طرف رخ کر کے پوچھا۔ ”کب آ رہے ہیں بگ باس؟“

یاور خاں نے ایک پاکٹ سائز ڈائری نکال کر بتایا۔ ”بیس تاریخ کو چاولہ بھائی۔“

چاولہ سفاک انداز میں مسکرایا۔ ”پورے پچیس روز کی مہلت۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری اپیل منظور ہوگی یا نہیں۔ لیکن زندگی میں پچیس روز کا اضافہ ہو جانا کچھ کم تو نہیں ہوتا۔ میں تمہیں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بارے میں سوچ کر بتا دینا۔“

وہ اپنے کارندوں کے ساتھ بڑے دبنگ انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اب تک چاولہ بھائی کو ہی کرتا دھرتا سمجھ رہا تھا۔ اب وہ اپنے کسی بگ باس کی بات بھی کر رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟

میں رات تک سوچتا رہا اور سر دُھنتا رہا۔ یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے عمران کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی۔ وہ اپنے لاابالی پن اور مہم جوئی کی وجہ سے کسی وقت بھی ان بے رحم لوگوں کے ہتھے چڑھ سکتا تھا۔ یہ بات بھی چبھتی تھی کہ میری گمشدگی نے محکمے میں تہلکہ مچایا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ میری لوئی اسکرین والی گاڑی بھی ٹریس ہو چکی ہو اور جمشید صاحب زمینی شواہد کی مدد سے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں انسپکٹر زبیر اس سلسلے میں ان کی بہت مدد کر سکتا تھا۔

رات کو ایک بار پھر واش روم کی دیوار میں موجود سوراخ کی مدد سے انیلا آغا کے ساتھ میری بات ہوئی۔ وہ آج پہلے سے بھی زیادہ نحیف اور زرد رو نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ شدید سردی کے سبب نیلگوں تھے۔ وہ جیسے مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہ رہی تھی لیکن تذبذب میں بھی تھی۔ پھر ایکا ایکی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کمزور آواز میں بولی۔ ”پرسوں صبح سویرے یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“

”کون..... کون کہہ رہا ہے؟“

”یاور خاں نے ہی مجھے بتایا ہے۔“

”مگر کیوں انیلا؟“

”اس سوال کا جواب آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ اس نے چند لمحے توقف کر کے بھیگی آواز میں کہا۔ ”اور تابش صاحب..... مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ آپ کو بھی..... چھوڑیں گے نہیں۔ آج دوپہر چاولہ نے جو باتیں آپ سے کہیں، ان میں سے کچھ میرے کانوں میں بھی پڑی ہیں۔ وہ آپ کو مجبور کر رہے ہیں کہ آپ کسی سے معافی مانگیں..... ان کا مقصد آپ کو صرف ذلیل کرنا ہے، معاف کرنا نہیں۔ اپیل وغیرہ کی جو بات چاولہ کر رہا تھا، وہ سراسر ڈھونگ ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو چند روز کی مہلت مل جائے..... لیکن..... میرے منہ میں خاک..... انجام آپ کا بھی وہی ہونا ہے جو میرا ہو رہا ہے۔“ وہ چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ ”پرسوں صبح وہ مجھے اس چبوترے پر چڑھائیں گے اور گلے میں رسّا یا پھندہ کر لٹکا دیں گے۔“

مجھے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سفاکی کی بدترین مثال تھی۔ دوسری طرف انیلا آغا کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، پورے یقین سے کہہ رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ”انیلا! تمہاری عمر مرنے کی نہیں ہے۔ کیا تم شادی شدہ ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”چھ سات برس کی ایک بچی ہے میری۔ ایمن نام ہے اس کا۔ وہ آج بھی میری راہ تک رہی ہوگی۔ اس کے پاپا نے اسے دلاسا دے رکھا ہوگا کہ میں نیوز پیپر کے کام سے کہیں دور گئی ہوئی ہوں۔“

”کہاں کی رہنے والی ہو انیلا؟“

”آپ ہی کی طرح لاہور کی۔ اسی لیے تو آپ کو اتنی اچھی طرح جانتی بھی ہوں۔ میری ایک کولیگ نے ایک دفعہ آپ کا ایک انٹرویو بھی لیا تھا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں جی، آپ

کو یہاں دیکھ کر مجھے جتنا دکھ ہے، لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔"

اسے کھانسی ہوئی اور تب وہ ایک بار پھر ابکائیاں لینے لگی۔ میں سوراخ کے اندر سے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "انیلا! ذاتی سوال پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم امید سے ہو؟"

اس نے سر جھکایا اور پھر اثبات میں ہلا دیا۔ تب وہ ایک بار پھر سسک اٹھی۔ "یہ سب..... ان ہی کا کیا دھرا ہے۔ ڈیڑھ ماہ تک مجھے نوچتے کھسوٹتے رہے ہیں۔ اب مجھ میں کچھ باقی نہیں رہا تو اس برفیلے تہ خانے میں پھینک دیا ہے۔ پرسوں میری یہ بُری بھلی زندگی بھی چھین لیں گے۔"

"مایوسی کفر ہے انیلا۔ انسان کو آخر تک امید نہیں چھوڑنی چاہیے۔"

"امید تو میں نے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ کم حوصلہ نہیں ہوں میں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں ان لوگوں کا مکروہ نیٹ ورک آشکار کر دوں گی۔ انہیں قانون کی گرفت میں لانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں نے ان کے انتباہ اور دھمکیوں کی پروا نہیں کی اور شاید..... یہ میری غلطی تھی۔"

سرگوشیانہ لہجے میں انیلا آغا نے اٹک اٹک کر مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ اب تک کرتی رہی تھی۔ شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ امید موجود تھی کہ میں یہاں سے زندہ نکل پاؤں گا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ ہے۔

ایک انویسٹی گیٹو جرنلسٹ کی حیثیت سے انیلا آغا نے کافی گراں قدر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ انیلا کے مطابق چاولہ بھائی کا گروہ جعلی ادویات تیار کرنے سے زیادہ ان کو اسٹاک کرنے اور سپلائی کرنے میں ملوث تھا۔ ان کا دھندا زیادہ تر چھوٹے قصبوں اور دیہات میں چلتا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں انہوں نے اپنے اسٹاکسٹ مقرر کر رکھے تھے۔ یہ جرائم پیشہ اسٹاکسٹ "جعلی اور ممنوعہ دوائیں بنانے والی چھوٹی بڑی فیکٹریوں سے مال خرید لیتے تھے اور پھر انہیں ڈسٹری بیوٹ کرتے تھے۔ متعلقہ محکموں کی کالی بھیڑیں ان کے ساتھ تعاون کرتی تھیں۔ اگر کسی وقت قانون حرکت میں آتا بھی تھا تو صرف نچلے درجے کے ذمے دار گرفت میں آتے تھے۔

انیلا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ سرجن ڈاکٹر ماجد بھی ایسا ہی ایک اہم اسٹاکسٹ تھا جو لاہور اور قرب و جوار کے ملاقاتوں کا احاطہ کرتا تھا۔ ایبٹ آباد میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مرنے والا فیکٹری مالک بھی ایک ڈسٹری بیوٹر اور اسٹاکسٹ تھا۔ اپنے اہم لوگوں کو یہ گروہ قانون کے ہتھے چڑھنے نہیں دیتا تھا۔

دھمکیوں کے باوجود جب انیلا آغا نے اپنی ڈگر نہیں چھوڑی تو اسے اٹھا لیا گیا۔ اسے پہلے لاہور ہی میں ماجد اکرام کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔ اس پر جسمی تشدد کا آغاز وہیں پر ہوا تھا۔ بعد ازاں اسے یہاں ایبٹ آباد کے نواح میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں بھی اس پر ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رہا۔ یاور خاں اس میں پیش پیش تھا۔ اب اسے یہاں اس سیلن زدہ برفیلے تہ خانے میں پھینک دیا گیا تھا۔

آخر میں انیلا اٹک اٹک کر لہجے میں بولی۔ "میں اپنے رب سے یہ دعا کرتی ہوں کہ آپ کے لیے کوئی کرشمہ ہو جائے اور آپ یہاں سے زندہ نکل سکیں۔ اگر ایسا ہو جائے اور میری دی ہوئی یہ معلومات کسی کام آ جائیں تو میں سمجھوں گی کہ میری تکلیف اور موت رائگاں نہیں گئیں۔"

میں نے کہا۔ "انیلا! تم حوصلہ رکھو۔ جو کچھ تم بتا رہی ہو، اس کے مطابق تمہارے پاس ابھی تیس بتیس گھنٹے موجود ہیں۔ ہونے کو تو چند منٹ میں بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ کیا پتا ہم کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

وہ چپ رہی، کچھ نہیں بولی۔ بس ان آنسوؤں کو پونچھتی رہی جو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی ستواں ناک تک پہنچے تھے اور ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے۔

وہ واپس جانے کے لیے مڑی اور پھر رک گئی۔ "نابش صاحب! اگر میری دعا قبول ہوئی اور آپ کسی طرح بچ گئے تو میری بیٹی ایمن تک ضرور جایئے گا اور اس سے کہیے گا کہ تمہاری ماما تم سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی اور اس کے پاپا سے کہیے گا کہ مجھے..... معاف کر دیں..... ایک ورکنگ وومن ہونے کی وجہ سے میں اُن کی وہ خدمت نہ کر سکی جو مجھے کرنا چاہیے تھی۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے چوکور پتھر پھر سے دیوار کے خلا... میں رکھ دیا۔ اس یخ بستہ رات کا بیشتر حصہ میں نے جاگتے اور کوٹھری میں ٹہلتے گزارا۔ بلب کی مدھم روشنی میں، میں نے کوٹھری کے ایک ایک انچ کا معائنہ کیا۔ زنگ آلود سوئی سلاخوں والا دروازہ کسی قدیم بندی خانے کا دروازہ لگتا تھا۔ باہر دو عدد وزنی کنڈل لگے ہوئے تھے۔ اس دروازے کو توڑنا تو کجا، حرکت دینا بھی ممکن نہیں تھا۔ مجھے ساتھ والی کوٹھری سے گاہے گاہے انیلا آغا کی دبی دبی سسکیاں اور رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ملکی قوانین میں بھی

عورت کو پھانسی دینے کا قانون تو موجود ہے لیکن عموماً پھانسی دی نہیں جاتی اور یہاں انیلا تو نہ صرف عورت تھی بلکہ امید سے بھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس زندگی کو بھی موت کے گھاٹ اتارا جانے والا تھا جو اس کے نحیف جسم کے اندر موجود تھی۔ میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر کیسے؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے چاولہ کا دست راست یاور خاں تہ خانے میں اترا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا یہ کاغذ انیلا کی کوٹھری کی طرف جا کر اسے دے دیا۔ پھر اس کی بھاری آواز میری سماعت تک پہنچی۔

"میڈم انیلا! یہ تمہارا بلیک وارنٹ ہے۔ کل صبح سویرے پانچ بجے تمہیں پھانسی دی جائے گی۔"

جواب میں خاموشی رہی، مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ تب یاور خاں سنجیدہ لیکن قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"آخری ملاقات کے لیے تم اپنے جن قریبی عزیزوں کو بلانا چاہتی ہو۔ ان کے نام بتا دو، آج کسی وقت تمہیں ان سے ملا دیا جائے گا۔"

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مزہ لینے کے لیے کہا اور کیا جا رہا تھا۔ انیلا نے بے رحم بھیڑیوں کے اس جھٹ میں بھلا اپنے کس پیارے کو بلانا تھا۔

"اگر تمہاری کوئی آخری خواہش ہے تو وہ بھی انچارج کو بتا سکتی ہو۔ ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

انچارج سے یاور خاں کی مراد اس ڈسمنٹ کا نگران تھا جس کا نام مقبول عرف تھولا معلوم ہوا تھا۔

اس مرتبہ انیلا کی چند سسکیاں سنائی دیں۔ یاور خاں جس طرح دندناتا ہوا آیا تھا، اسی طرح واپس مڑا۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا۔ "میں تمہارے چاولہ بھائی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے اپنے چوڑے جبڑے کو کھجاتے ہوئے کہا۔

"چیمپئن صاحب! اگر اس میڈم کی کوئی سفارش وغیرہ کرنا چاہتے ہو تو یہ بیکار ہے، ہاں اگر کچھ اپنے بارے میں کہنا ہے تو میں بات کرا دیتا ہوں۔"

اس نے اپنی پھولی ہوئی سموری جیکٹ میں سے کورڈلیس، انٹر کام نکالا اور تھوڑی سی بات کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف پاٹ دار آواز والا "ڈان صفت" چاولہ بھائی ہی تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ "ڈپٹی جی! کیا حال چال ہیں؟ پھر کیا سوچا تم نے میری کل والی آفر کے بارے میں؟"

"چاولہ! میں اس وقت اپنے بارے میں نہیں اس مظلوم عورت کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، جس کو تم پھانسی کے نام پر دہشت زدہ کر رہے ہو۔"

اس نے ایک مسرور قہقہہ لگایا۔ "ہم دہشت زدہ نہیں کر رہے، پھانسی دے رہے ہیں۔ کل صبح اگر تم جلدی جاگ گئے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔"

"کیوں کر رہے ہو یہ ظلم، تمہیں بھی ایک دن خدا کو جان دینی ہے۔"

"بالکل دینی ہے، اسی لیے تو جہاں رحم کی گنجائش نکلتی ہے وہاں رحم کرتا ہوں..... تم پر رحم کر رہا ہوں نا۔ ایک معافی کے بدلے تمہیں پورے پچیس دن کی مہلت دے رہا ہوں۔"

"میں اس عورت انیلا آغا کی بات کر رہا ہوں۔" میں چلایا۔ "مت کرو ایسا، اس کی زندگی مت چھینو، اس کی معصوم بچی اور اس کے گھر والے اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ....." میری بات ادھوری رہی۔ "ٹک" کی آواز سے لائن کٹ گئی۔ میں "ہیلو..... ہیلو" کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

وہ بڑی دلدوز شام تھی اور بڑی المناک رات تھی۔ یہ اذیت پسندی کی انتہا تھی۔ اگر یہ لوگ اپنے مخالفین کو مارنا ہی چاہتے تو گولی مار سکتے تھے، مگر انہوں نے یہاں پورا، پھانسی کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ وہ ان بدنصیبوں کو پل، پل موت کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے اور لطف اٹھاتے تھے اور پھر یہ تہ خانہ، یہ اپنی جگہ ایک سخت عذاب تھا۔

میں نگران مقبول عرف تھولا اور یاور خاں سے کوئی دس بار کہہ چکا تھا کہ وہ ایک بار چاولہ سے میری بات کرا دیں۔ وہ پہلے ٹالتے رہے تھے، پھر انہوں نے بتایا تھا کہ چاولہ بھائی کسی ضروری کام سے یہاں سے جا چکے ہیں، وہ اب کل شام کو لوٹیں گے۔

میں نے آہنی سلاخوں پر مکے برسائے تھے اور گرجا برسا تھا مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ شام کو چبوترے کی طرف کچھ سرگرمی بھی نظر آئی۔ یہ سوچ کر میری روح کانپ گئی کہ انیلا کو واقعی علی الصباح پھانسی دینے کی تیاری ہو رہی ہے۔

وقتاً فوقتاً انیلا کے رونے کی آواز آتی تھی اور سینہ چھلنی کر دیتی تھی۔ پورا سین کری ایٹ کیا جا رہا تھا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ کٹے بالوں والی ایک ادھیڑ عمر عورت آئی اور اس نے کھانے کے طور پر صرف دودھ اور رس انیلا کو دیے۔ میں

جانتا تھا یہ ویسے کے ویسے ہی پڑے رہیں گے۔ پچھلے قریباً 36 گھنٹوں سے انیلا نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور صرف انیلا پر ہی موقوف نہیں کل شام سے میرے گلے سے بھی کچھ نیچے نہیں اترا تھا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ میں واش روم میں گیا اور بڑی احتیاط سے سیاہ رنگ کا پتھر دیوار سے نکالا۔ انیلا کی کوٹھری سے کچھ پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے پتا چلا کہ وہ اس رات کو زندگی کی آخری رات سمجھتے ہوئے قرآن پاک پڑھ رہی ہے۔ غالباً یہ انیلا کی درخواست پر اسے کفنے والوں والی عورت نے ہی فراہم کیا ہوگا۔ شاید یہ وہ آخری خواہش تھی جو انیلا نے کی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کی آواز تھمی تو میں نے سرگوشی میں اسے پکارا۔ ایک مٹیالی کمبل اونی شال میں لپٹی وہ میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ وہ بہت دلیر رہی ہوگی لیکن آج موت کا خوف اس کی آنکھوں میں موجزن تھا۔ موت کی سزا پانے والے کی امید آخری لمحوں تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ شاید کچھ ہو جائے..... شاید کچھ ہو جائے۔ انیلا نے بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کسی انہونی کی توقع کر رہی ہو لیکن انہونی کہیں نہیں تھی اور ''ہونی'' گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر رہی تھی۔ آج اس کا چہرہ مجھے برف کی طرح سفید نظر آیا۔ میرا دل چاہا کہ میں پوری شدت سے اس دیوار پر مکے برساتا جاؤں۔ اس سوراخ کو اتنا کشادہ کر دوں کہ انیلا تک پہنچ سکوں۔ اسے اپنی بانہوں میں لے کر سینے میں چھپا لوں اور اس کی طرف بڑھنے والے ہر خطرے کو چکنا چور کر دوں۔

میں نے کہا۔ ''انیلا! مجھے یاد آرہا ہے۔ تمہاری کسی دوست نے میرا جو انٹرویو شائع کیا تھا، اس میں مجھے ''آئرن مین'' کا خطاب دے ڈالا تھا۔ اب دیکھ لو حالات کی بے پناہ سختی کے سامنے کوئی بھی آئرن مین نہیں ہوتا۔''

وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''مجھے پتا ہے تابش صاحب! اس برفیلے تہ خانے میں کسی کا کوئی بس نہیں چل سکتا لیکن..... میں آپ کی مشکور ہوں..... آپ نے..... میری زندگی کی آخری گھڑیوں کو..... میرے لیے قدرے آسان بنایا ہے۔ آپ کی وجہ سے میں یہ مشکل وقت کاٹنے میں کامیاب ہو رہی ہوں۔''

پھر وہ رو دی۔ ''میں نے آج آپ کے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ بیماروں اور تکلیف میں مبتلا لوگوں کی دعائیں دوسروں کے لیے قبول ہوتی ہیں۔''

مجھے الفاظ نہیں سوجھے کہ میں کیا جواب دوں۔ اس نے رخ پھیر کر جیسمنٹ کے منحوس کلاک کی طرف دیکھا، بولی۔ ''ابھی چار پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ یہ وقت کیسے کٹے گا۔ سوچتی ہوں جو ہونا ہے..... جلد ہو جائے۔''

میری ذہنی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ میں نے سوراخ کے اندر سے ہاتھ گزار کر اس کے یخ بستہ ہاتھ کو تھام لیا۔ ''اگر تم چاہتی ہو تو ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ تم وہ سامنے والا اسٹول گھسیٹ کر اس پر بیٹھ جاؤ۔ میں یہاں کھڑا رہتا ہوں۔''

میرے اصرار پر وہ اسٹول گھسیٹ لائی اور اس پر بیٹھ گئی۔ باتیں تو جیسے ختم ہو چکی تھیں۔ بس میں اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا رہا۔ کبھی کبھی اس کے سر کے الجھے ہوئے بوسیدہ بالوں کو سہلا دیتا تھا۔ میرے اندر جوار بھاٹا تھا مگر اس جوار بھاٹے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے انیلا اور میں واش روم سے نکل کر کوٹھریوں میں چلے جاتے تھے تاکہ نگران قبولا کو شک نہ ہو۔ وہ شاید دو چار پیگ لگا کر اپنے آپ کو خاصا مست کر چکا تھا۔

رات دو بجے کے قریب میں نے پھر بار بار یاور خان اور قبولا کو پکارا لیکن انہوں نے اپنے کان جیسے مکمل طور پر بند کر لیے تھے۔ ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ تین چار افراد بیسمنٹ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے بھاری لباس پہن رکھے تھے اور اپنی سانسوں کے ساتھ بھاپ خارج کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ تراشیدہ بالوں اور شلوار قمیص والی وہی عورت بھی تھی جو شام کے بعد آئی تھی۔ پتا چلا کہ یہ لوگ حسب رواج انیلا کو آخری غسل دینے کے لیے گرم پانی لے کر آئے ہیں۔ تین بندے چبوترے کی طرف چلے گئے۔ عورت ایک گارڈ کے ساتھ انیلا کے سیل میں داخل ہو گئی۔

میں نے گدے پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ آخر شب کی یہ مصروفیت، یہ آوازیں، یہ آہٹیں، یہ سب اتنا تکلیف دہ تھا کہ بیان سے باہر۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب ان پتھر دل لوگوں کو پکارنا یا آہ و بکا کرنا بیکار ہے۔ وہ وہی کریں گے جو فیصلہ کر چکے ہیں۔

تب میں نے ایک نہایت صحت مند سرخ و سپید عورت کو تہ خانے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے سے اسٹیتھو اسکوپ لٹک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پھانسی کے بعد بدنصیب انیلا کی موت کی تصدیق کے لیے یہاں آئی ہے۔ اس عورت کا نام بعد ازاں شاربہ معلوم ہوا۔ وہ کوالیفائڈ ڈاکٹر تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ

انیلا مزاحمت کر رہی ہے اور اسے کھینچ گھسیٹ کر ڈھ سیل سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ اس کی یہ مزاحمت، ہر طرح کے جانداروں کی جبلت کے زمرے میں آتی تھی۔ ہر ذی نفس موت سے بچنا چاہتا ہے..... ان میں انسان بھی شامل ہے۔ اکثر اوقات انسان جانتا بھی ہے کہ اب مفر کا راستہ نہیں اور اجل یقینی ہے، پھر بھی وہ موت کو اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ پکار رہی تھی۔ ''یہ ظلم مت کرو..... خدا کے عذاب سے ڈرو۔ چھوڑو مجھے چھوڑ دو مجھے۔ میری چھوٹی سی بچی ہے۔''

میں نے دیکھا۔ وہ اُسے کھینچتے ہوئے چبوترے پر لے جا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اس کے چہرے پر سیاہ غلاف چڑھا دیا گیا تھا۔ ان آخری لمحوں میں شاید وہ نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ دو تین منٹ بعد میں نے وہ منحوس آواز سنی جو تختے کے پاؤں کے نیچے سے ہٹنے اور رسّے کو جھٹکا لگنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً انیلا آغا کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز جب میں بدبودار ڈنل لحاف لپیٹے بے سدھ سا لیٹا تھا۔ عجیب واقعہ ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور پاؤں بھی حرکت نہیں کر رہے۔ میرے سر پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ پلکیں اٹھانا مشکل ہو رہی تھیں۔ میں جان گیا کہ رات سونے سے پہلے میں نے جو گرم دودھ پیا تھا، اس میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی۔ بے ہوشی کی سی حالت میں ہی میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ اب رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں نے چندھیائی نگاہوں سے دیکھا۔ میرے سیل سے باہر قولا اور ایک دوسرا گارڈ راکھلیں تانے کھڑے تھے۔ ایک عورت کوٹھری یعنی سیل کے اندر تھی۔ اس کے ہاتھ میں بید کی ایک لمبی چھڑی تھی۔ یہ ہی تنومند، سرخ و سپید ڈاکٹر تھی جو کل صبح انیلا کی پھانسی کے موقع پر آئی تھی۔

اس نے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''میرا نام شاربہ اکرام ہے۔ ڈاکٹر ماجد اکرام میرا خاوند تھا جو تمہاری منحوس تفتیش اور ہٹ دھرمی کی نذر ہوا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا۔ وہ مجھ پر پل پڑی۔ بید کی موٹی چھڑی سے اس نے میرے جسم پر اندھا دھند ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ وہ میرے چہرے سمیت جسم کے ہر حصے کو بے دریغ نشانہ بنا رہی تھی۔ وہ جنونی کیفیت میں تھی۔ میرے جسم کے کئی حصوں سے خون رسنے لگا۔ سر پھٹ گیا۔ میری سخت جانی آڑے آ رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اب تک بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ وہ اپنا غصہ اچھی طرح اتار چکی تو اس نے چند لمحے تک اپنی سانسیں درست کیں۔ پھر اپنا برفانی بوٹ والا پاؤں بڑی رعونت سے لکڑی کے اسٹول پر رکھا اور پھنکاری۔ ''دو دن بعد موت سے بچنے کا اور مہلت حاصل کرنے کا آخری چانس ہے تمہارے پاس، معافی مانگو۔''

میرے کانوں میں چاولہ کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے تین دن پہلے مجھ سے کہا تھا اب ڈاکٹر ماجد تو زندہ نہیں ہے، اب اس کا ایک ہی وارث ہے۔ اس کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگ لو تو تمہاری سانسوں میں بیس پچیس روز کا اضافہ ہو سکتا ہے اور اپیل کا حق مل سکتا ہے۔

وہ وارث ماجد اکرام کی بیوی تھی اور وہ ''دبنگ'' اپنا پاؤں میرے سامنے اسٹول پر رکھے بڑے تکبر سے کھڑی تھی۔ تب بدنصیب انیلا کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا یہ لوگ آپ کو معاف نہیں کریں گے صرف آپ کی توہین اور رسوائی چاہیں گے۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ میں ان کی بربریت دیکھ چکا تھا۔

یاور خاں آہنی سلاخوں کے پاس آ کر دہاڑا۔ ''سر رکھو مادام کے پاؤں پر اور معافی کی درخواست کرو۔ یہی چاولہ بھائی کا حکم ہے۔'' (جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا چاولہ عقوبت خانے میں موجود، تین خفیہ کیمروں کے ذریعے یہاں کے اکثر مناظر دیکھتا تھا)

''معافی مانگو۔'' یاور خاں پھر گرجا۔

یہ ذلت مجھے منظور نہیں تھی اور نہ ہی مرنے کا خوف تھا۔ بہت سال گزر رہے تھے جب جولائی کی ایک تپتی دوپہر میں، میں نے اپنے ''جگری'' عمران دانش کا ہاتھ تھاما تھا اور ہم نے عہد کیا تھا کہ ہم خطروں میں رہنا سیکھیں گے اور موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگیں گے۔ وہ عہد آج بھی میرے سینے میں تر و تازہ تھا۔

میں نے یاور کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ ''اپنے چاولہ بھائی سے کہہ دو، مجھے اس کی آفر منظور نہیں۔''

موٹی مسنڈی شاربہ اکرام نے اپنا پاؤں اسٹول سے نیچے اتارا۔ مجھے بید کی کئی اور سنگین ضربیں لگائیں اور پھر گالیاں بکتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

برف کے اس دوزخ میں دو میلے کچیلے لحاف اوڑھے میں گدیلے پر نیم دراز تھا۔ آج سردی معمول سے کچھ زیادہ تھی، شاید اس تہ خانے سے باہر مزید برف باری ہوئی تھی۔ میرے جسم پر بید کی چھڑی کے گہرے نشان تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔ یہ جسمانی چوٹیں مجھے کچھ زیادہ تکلیف نہیں پہنچاتی تھیں مگر دماغ میں جو انگارے دہک رہے تھے، وہ اذیت ناک تھے۔ میں ثروت کا بدلہ لینے کے لیے اس گورکھ دھندے میں گھسا تھا۔ یہ انڈر ورلڈ کے لوگ تھے۔ انہوں نے جس طرح انیلا آغا کو دار تک نذر دی تھیں اسی طرح مجھے بھی دھمکایا تھا۔ میں پیچھے نہیں ہٹا تھا اور نہ ہی مجھے ہٹنا تھا۔ نتیجہ کچھ بھی ہو جاتا۔

مجھے یہاں بند ہوئے اب پانچ روز ہونے کو آئے تھے۔ باہر کیا ہو رہا تھا یا ہو رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا میرے ساتھی آرام سے نہیں بیٹھے ہوں گے۔ خاص طور سے عمران۔ مجھے عمران کی طرف سے اندیشہ بھی تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔ میں سوچتا رہا، یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں آ گئی تھی۔ روتی بلکتی ماں کی گود میں اس کے کم سن بچے ندیم نے دم توڑا تھا اور میرے اندر ثروت کے غم نے پھر شدت پکڑی تھی۔ میں نے ایبٹ آباد میں دوبارہ تحقیق کا آغاز کرایا تھا اور اس نئی شروعات نے مجرموں کو سیخ پا کر ڈالا۔ جب عمران اور ماہین کو تفریح کے دوران میں باقاعدہ اغوا کرنے کی کوشش کی گئی اور معاملات بگڑتے چلے گئے۔

قدموں کی ٹھک ٹھک نے مجھے چونکایا۔ یاور خاں اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے سلاخوں کے اندر سے انٹر کام مجھے تھما دیا۔ دوسری طرف چاولہ ہی تھا۔ حسب عادت منہ سے ''چچ، چچ'' کی تاسف بھری آواز نکال کر بولا۔ ''تمہارے پاس اب دو دن ہی رہ گئے ہیں۔ 24 تاریخ کو صبح پانچ بجے تمہیں تختے پر چڑھا دیا جائے گا۔ تمہارا بلیک وارنٹ بھی اب سمجھو تیار ہی ہے۔ میں نے کل بھی تم سے بات کی تھی۔ آج آخری بالکل آخری موقع دے رہا ہوں۔ یہ اکڑ چھوڑ دو جس طرح تمہیں کہا ہے، اس طرح ڈاکٹر شاہ اکرام سے معافی مانگ لو۔ تمہاری موت کچھ دنوں کے لیے ٹل جائے گی۔''

''جس کو تم اکڑ کہہ رہے ہو، یہ خودی اور اصول پرستی ہے۔ تم نے مجھے ہر صورت مارنا ہی ہے۔ سو یہ کام کر گزرو۔ تم اپنا ظلم آزماؤ میں اپنے صبر کے ساتھ رہوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے ڈپٹو، اپنی ثروت بی بی سے ملنے کے لیے تیار رہو۔'' جھنجلائے لہجے میں کہہ کر انٹر کام بند کر دیا گیا۔

یہ اسی رات کی بات ہے۔ میں لحافوں کے نیچے گٹھڑی سا بنا اونگھ رہا تھا۔ اس سیلی مائل تہ خانے میں اتنی سردی تھی کہ لحافوں سمیت ہر چیز گیلی محسوس ہوتی تھی۔ انیلا کے جانے کے بعد سے اس تہ خانے کی خاموشی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وقت سرک تو رہا ہے لیکن دبے پاؤں، اور یہ سرکتا ہوا وقت بدترین لمحوں کو میرے نزدیک لا رہا تھا۔ چاولہ کی دی ہوئی ڈیڈ لائن قریب آ رہی تھی مگر تسلی کی بات میرے لیے یہ تھی کہ میرا خوف بڑھنے کے بجائے کم ہو رہا تھا۔ ذہن میں یہی بات تھی کہ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔

نصف شب کا وقت تھا جب میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ تہ خانہ شور سے گونج رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک پینتیس چالیس سالہ شخص تھا۔ اس نے کوٹ اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ زخم زخم تھا۔ مسلح کارندے اسے مارتے پیٹتے اور کھینچتے گھسیٹتے، کوٹھریوں کی طرف لا رہے تھے۔ وہ پکار رہا تھا۔ ''مار دو ام کو۔ جان سے مار دو۔ لیکن جو حق ہے ام وہی کہے گا۔ مت کرو اس طرح کے ظلم۔ یہ زمین پھٹ جائے گا۔''

کارندوں نے اسے دو ہتڑ مارتے ہوئے انیلا والی خالی کوٹھری میں دھکیل کر دروازہ مقفل کر دیا۔

یہ شخص ساری رات بلند آواز میں دہاڑتا رہا اور کراہتا بھی رہا۔ نگران قبولا ایک رائفل لے آیا، بولا۔ ''انوار گل اس میں ربڑ کی گولیاں ہیں۔ مار مار کر تمہارا جسم نیلو نیل کر ڈالوں گا، چپ کر کے بیٹھ جا۔''

''ام نہیں بیٹھے گا چپ کر کے۔ تم ام کو ربڑ کا نہیں اصلی گولی مارو۔ امارا قصہ پاک کر دو۔''

صبح کو حسب معمول دونوں کوٹھریوں میں انڈوں کے آملیٹ، خمیری روٹی اور چائے کا ناشتا بھجوایا گیا۔ انوار گل نامی اس شخص نے ناشتے والی ٹرے دروازے پر دے ماری اور ایک بار پھر چلانے لگا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ انہی لوگوں کے لیے کسی طرح کا کوئی کام کر رہا تھا۔ اب مالکوں سے اس کا کوئی اختلاف ہو گیا ہے۔

اس اختلاف کا پتا مجھے اگلی شب ایک بجے کے لگ بھگ لگا۔ مجھے پتا تھا کہ نگران قبولا چیک لگا کر لم لیٹ ہو چکا ہے۔ میں واش روم میں گیا اور اینٹ نما پتھر ہٹا کر حیرت زدہ انوار گل سے رابطہ کر لیا۔ اسے پُرسکون کرنے اور ڈھب پر لانے میں مجھے پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ لیکن

اس کے بعد انوار گل نامی اس بندے نے مجھے جو کچھ بتایا، وہ بے حد لاارمنگ تھا۔ کھچڑی داڑھی والا انوار گل اپنی بیمار بیوی کی مجبوری کے سبب ان لوگوں کے ہتھے چڑھا تھا اور پیکنگ کے شعبے میں تھا۔ اسے ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلوم تو نہیں تھا مگر اتنا وہ بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ اصل دواؤں کے ساتھ ساتھ جعلی دواؤں کی سپلائی بھی کرتے ہیں بلکہ اصل دواؤں کی تو صرف آڑ تھی جس کے بہانے نقلی اور ممنوعہ دواؤں کا وسیع کاروبار ہو رہا تھا۔

انوار گل بولا۔ ''ام بہت گناہ گار بندہ ہے۔ لیکن اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑا ظلم ہوگا جو یہ لوگ کرے گا۔ اماراابھی چھوٹا چھوٹا بچہ ہے۔ یہ خبیث لوگ اپنے لالچ کے لیے بے شمار بچہ لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دے گا۔''

میں نے اُس سے خطرے کی نوعیت پوچھی۔

اس نے کہا۔ ''ام نے پارمیسی (فارمیسی) کا کورس کیا ہوا ہے اور پیکنگ کرنے والوں کا انچارج ہے۔ اس وجہ سے ام کو یہ سب معلوم ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ام پولیس تک پہنچتا ان ارام زادوں کو شک ہو گیا۔''

وہ بلند آواز میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹوکا کہ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولے۔

اس نے جو بتایا، اس کی تفصیل کچھ یوں تھی..... بچوں میں ''نمونیہ'' کے لیے استعمال ہونے والے ایک مہنگے انجکشن کی بہت بڑی کھیپ بیرونِ ملک سے پاکستان پہنچی تھی۔ یہ ہزاروں نہیں لاکھوں ڈالرز کا مال تھا۔ کسی بے پروائی کی وجہ سے اس انجکشن کو مناسب طریقے سے اسٹور نہ کیا جا سکا اور پھر وہ پڑے پڑے اپنی افادیت کھو گیا۔ یہ کروڑوں روپے کی ناکارہ کھیپ چاولہ بھائی کے گروہ نے حاصل کر لی تھی۔ اب بڑی ہوشیاری سے ان کی ''ری لیبلنگ'' کی گئی تھی۔ نئے لیبلوں کے مطابق اب وہ بالکل فریش انجکشن تھا جبکہ حقیقت میں نہایت مضرِ صحت ہو چکا تھا اور اب سپلائی کے لیے بالکل تیار تھا۔ چار، پانچ روز میں یہ زہر آلود انجکشن، چھوٹے شہروں اور قصبوں کے ہزاروں میڈیکل اسٹورز اور اسپتالوں تک پہنچنے والا تھا۔

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں اس پر پوری طرح یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے انوار گل سے کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق سرکاری لیبارٹریز میں ادویات کی باقاعدہ پیکنگ ہوتی ہے اور انہیں انسپکشن سرٹیفکیٹ ایشو کیے جاتے ہیں۔''

''جہاں تک ام کو معلوم ہے، یہ بڑے لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔ ہر ہتھکنڈا جانتے ہیں۔ انہوں نے کچھ درست مال معائنے کے لیے پیش کر کے سرٹیفکیٹ لے لیا ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے، نمونیے کی دوا بہت زوروں پر ہے۔ خاص طور پر بچہ لوگ میں..... مارکیٹ میں انجکشن کا بہت ڈیمانڈ ہے۔ یہ اندھا دھند بکے گا۔ ام کوئی بہت زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا اندازہ ام کو ہے کہ اگر بیس پچیس بچوں کو انجکشن لگے گا تو ان میں سے ایک ضرور اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔ پتا نہیں..... کتنے معصوموں کا جان چلا جائے گا۔'' انوار گل اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

انوار گل کی باتیں سن کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، بہت دردمندی اور کرب سے کہہ رہا تھا۔ کسی انقلاب آفریں لمحے میں ضمیر کا جاگ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ مگر اب ضمیر کی بیداری کی سزا بھگتنے کے لیے وہ بھی اس ''ڈیتھ سیل'' میں موجود تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ سیکڑوں ہزاروں والدین جو اپنے بیمار بچوں کو گود میں اٹھائے ان کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہے تھے، اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک زہریلا تریاق اُن کے ''معصوموں'' کی رگوں کی طرف آ رہا ہے۔ وہ قیمت دے کر یہ زہر حاصل کریں گے اور اپنے بچوں کو موت کی راہ پر ڈال دیں گے۔

ہاں کچھ لمحے واقعی انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔ ان میں فیصلے کرنے آسان ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ میں چاولہ کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر شاربہ اکرام سے معافی مانگوں گا۔

☆☆☆

منظر میری کوٹھری کا ہی تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، پھر بھی سردی اتنی تھی کہ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں ٹیڑھی ہو رہی تھیں۔ چاولہ کے ہاتھ میں برانڈی کی چھوٹی بوتل تھی اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بڑے رعب سے کوٹھری کے سامنے کھڑا تھا۔ دائیں بائیں اس کے کارندے تھے۔ ہٹی کٹی ڈاکٹر شاربہ کوٹھری کے دروازے کے بالکل قریب موجود تھی۔ اس نے اپنا ایک پاؤں سلاخوں کے اندر سے گزار کر دو فٹ اونچے اسٹول پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چاولہ کی ہدایت کے مطابق گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنا سر شاربہ کے پاؤں سے لگا کیا۔ یہ بڑے تکلیف دہ لمحے تھے۔ پھر تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر میں نے چاولہ کے کہے ہوئے یہ فقرے دہرائے۔ ''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے

ڈاکٹر ماجد صاحب کی جان گئی۔ میں اپنی جان بخشی کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔"

"ایک بار پھر دہراؤ۔" یاور خاں نے کڑک کے کہا۔

شاربہ نے اپنا پاؤں باہر نکال لیا۔ "بس رہنے دو۔ اتنا کافی ہے اس کے ڈوب مرنے کے لیے۔"

دو ہی گھنٹے بعد مجھے ڈسٹرکٹ سیل سے نکال کر اس بالائی پورشن میں پہنچا دیا گیا، جس کو بڑے اچھے طریقے سے فرنشڈ کیا گیا تھا۔ برفیلے تہ خانے سے نکلتے وقت میں نے ایک نگاہ انوار گل والی کوٹھری پر ڈالی۔ وہ گھٹنے پیٹ سے لگائے، ایک بھاری لحاف کے نیچے گدیلے پر پڑا تھا۔ غالباً اس کے شور سے بچنے کے لیے نگران مقبول عرف تولا نے اسے کوئی نشہ آور دوا دے دی تھی۔

اوپر والے پورشن میں آنا ایسا ہی تھا جیسے کسی کو برف کے دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے۔ تاہم اس "جنت" میں بھی میرے لیے آزادی نہیں تھی۔ مجھے اسٹیل کے سلائڈنگ ڈور والے ایک نیم گرم کمرے میں منتقل کیا گیا۔ یہاں آرام دہ بستر، الماری اور ضرورت کی کچھ دیگر اشیا موجود تھیں۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ انوار گل نے جو انکشاف کیا تھا، اگر وہ درست تھا تو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اَن گنت گھرانوں پر بدترین مصیبت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا..... کسی بھی طرح..... کسی بھی طرح۔ اس رات معلوم نہیں کیوں ثروت کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ مجھے لگا کہ اس کے حسین لب میرے کان سے چھو رہے ہیں۔ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی ہے..... میں آپ سے خوش ہوں تابش، آپ نے اچھا فیصلہ کیا۔ اس میں سے امید کی راہ نکلتی ہے۔ آپ مجھے نہ بچا سکے، بس آپ کا اور میرا ساتھ اتنا ہی تھا لیکن آپ ان زندگیوں کو بچانے کی کوشش ضرور کریں جو ان بے رحموں کے نشانے پر ہیں۔

مجھے یہاں پچیس روز کی اضافی "زندگی" دی گئی تھی مگر پہلی ہی رات وہ کچھ ہوا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک ایسی انہونی جو ایک الو کے قفس کے ذریعے مجھ تک پہنچی اور جس نے بہت کچھ بدل کر رکھ دیا۔ میں گرم، آرام دہ بستر پر لیٹا تو ساتھ ہی اس کھچڑی داڑھی والے انوار گل کا خیال آ گیا جو ضمیر کا قیدی بن کر برفیلے تہ خانے میں پڑا تھا۔ نیند شولی پر بھی آتی ہے، مجھے بھی آ گئی۔ میری آنکھ ایک عجیب ارتعاش کی وجہ سے کھلی تھی۔ یہ ارتعاش میری بائیں کلائی پر ہوا تھا۔ جیسے کوئی چیز وائبریٹ کر رہی ہو اور اسکن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہوں۔ میں نے لیٹے لیٹے بے ساختہ اپنی کلائی کو جھاڑا۔ ارتعاش دوبارہ ہوا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں سکتے میں رہ گیا تھا۔ یہ ارتعاش اس پرانی، سادہ سی گھڑی میں ہو رہا تھا جو کچھ عرصہ پہلے عمران نے مجھے دی تھی اور بتایا تھا کہ یہ اس کے والد کی نشانی ہے۔ وہ ابھی تک میری کلائی پر بندھی تھی۔

میں نے ٹیبل لیمپ آن کر کے گھڑی کو حیرت سے دیکھا اور لیمپ دوبارہ آف کر دیا۔ اب کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مدھم سی وائبریشن بار بار ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی کی ناب کو گھمایا پھر اوپر نیچے کیا۔ اچانک گھڑی میں سے "سائیں سائیں" کی نہایت مہین آواز ابھرنے لگی۔ میں ششدر تھا اس بوسیدہ رسٹ واچ کے اندر کوئی نہایت قیمتی ڈیوائس نصب تھی جو سگنل دے رہی تھی۔ میں نے نیم تاریکی میں ہی کمرے کی کھڑکیاں، دروازے چیک کیے۔ میں نے گھڑی کے ڈائل کو ہونٹوں کے بالکل ساتھ لگایا اور سرگوشی کی۔ "ہیلو..... ہیلو....."

ڈائل پر الفاظ ابھرے۔ "اسپیکنگ۔"

یعنی دوسری طرف سے کوئی بول رہا تھا۔ میں نے ڈائل کان سے لگایا۔ عمران کی زندگی بخش آواز سنائی دی۔

"ہیلو..... چاچو جی..... آپ کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا کہاں ہوں..... تم کہاں ہو؟"

"چاچو! میں آپ کے بہت قریب ہوں۔ بلکہ کئی دنوں سے بہت قریب ہوں۔ آپ کے سگنل نہیں مل رہے تھے۔ سیکڑوں ہی مرتبہ کوشش کر چکا ہوں۔ کہاں تھے آپ؟"

ایک دم وہ بات میری سمجھ میں آ گئی جو عمران کہہ رہا تھا۔ مجھے یہاں آتے ہی اس منحوس تہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ زیریں زمین ہونے کی وجہ سے مجھے عمران کی دی ہوئی اس خاص الخاص واچ سے سگنل موصول نہیں ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ "عمران! میں بہت خطرناک جگہ پر ہوں اور سمجھو کہ بہت مصیبت میں ہوں۔ اگر تم..... کچھ کرنا چاہتے ہو تو تمہیں ہر قدم بہت پھونک کر رکھنا ہوگا۔ اور دیکھو تن تنہا کسی طرح کی مہم جوئی کا سوچنا بھی نہیں۔ یہ خونخوار لوگ ہیں۔ مجھے بتاؤ تم اس وقت کہاں ہو؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "بتایا ہے نا کہ آپ کے بہت قریب، ایبٹ آباد شہر سے یہ جگہ آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ کافی وسیع عمارت ہے۔ ایک بڑی قارما سوٹیکل کمپنی کا بورڈ یہاں لگا ہوا ہے۔ احاطے میں کچھ لوڈرز

بھی نظر آتے ہیں اور آپ بے فکر رہیں۔ میں اکیلا بھی نہیں ہوں اور نہ ہی جلد بازی میں کچھ کرنے والا ہوں۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر کچھ آہٹیں سن کر خاموش ہو گیا۔ کوئی مسلح گارڈ دروازے کے آس پاس موجود تھا۔ "کوئی آس پاس ہے۔ دوبارہ بات کریں گے۔" میں نے کہا اور جلدی سے گھڑی کی ناب کو دبا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ عمران کی آواز مجھے گہری تاریکی میں زندگی، امید اور روشنی کی آواز محسوس ہوئی تھی۔

میں اس کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یقیناً اسے کچھ روز پہلے ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ میں ان جرائم پیشہ لوگوں کے حوالے سے اکیلا ہی کچھ کرنے والا ہوں۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے یہ گھڑی میری کلائی پر باندھ دی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ گھڑی صرف ظاہری طور پر شکستہ ہے اندر سے یہ ایک چھوٹے سائز کا جدید ٹرانسمیٹر ہے۔ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ پتا نہیں یہ عمران دانش کی گھڑی ہے بھی یا نہیں۔

باقی کی ساری رات میں نے جاگتے ہی گزاری تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ اگر میں خود عمران سے رابطہ کرنا چاہوں تو کیسے کرنا ہے۔ رات آخری پہر ایک بار پھر رسٹ واچ میں بغیر کسی آواز کے ارتعاش پیدا ہوا۔ میں نے تاریکی میں کمبل کے اندر گھس کر یہ کال ریسیو کی۔ عمران نے سب سے پہلے تو مجھے یہ بتا کر تسلی دی کہ اس ڈیوائس کا بیٹری ٹائم ایک ہفتے سے زیادہ ہے۔ پھر اس نے مجھے آگاہ کیا کہ جب میں جادو رامے کی ہاؤسنگ سوسائٹی میں کام کرنے والی دراز قد ملازمہ جاذبہ سے ملنے اس کے گھر گیا تب بھی وہ میری لوکیشن سے آگاہ تھا۔ پھر جب اگلے روز میری لوکیشن تیزی سے تبدیل ہوئی اور کڈنیپ کرنے والے مجھے لاہور سے باہر لے جا رہے تھے تو وہ بری طرح چونک گیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ مجھے ایبٹ آباد لے جایا جا رہا ہے۔ انسپکٹر زبیر کے ساتھ مل کر اس نے میرا طویل تعاقب کیا۔ پنڈی سے آگے نکلنے کے بعد ایک ٹریفک بلاک کے سبب مجھ سے عمران اور زبیر کا فاصلہ بہت بڑھ گیا اور سگنل گم ہو گئے۔ تاہم ان دونوں کو یقین تو ہو ہی چکا تھا کہ مجھے ایبٹ آباد لے جایا گیا ہے۔ وہ میرے پیچھے ایبٹ آباد پہنچے لیکن لاکھ سر پٹخنے کے باوجود میرا کھوج نہیں ملا۔ (اس کی وجہ یہی تھی کہ میں تہ خانے میں پہنچ چکا تھا) بہرحال انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل میری تلاش میں رہے۔ بالآخر آج رات ان کی مراد بر آئی اور انہیں میرے سگنل مل گئے۔ اب عمران اور انسپکٹر زبیر شہر کے ایک مضافاتی ہوٹل میں مقیم تھے۔

اس کی پوری رُوداد سننے کے بعد میں نے کہا۔ "یہ لوگ ہماری توقع سے زیادہ خطرناک اور ہوس کار ہیں۔ دو چار روز میں یہ ایک ایسا کام کرنے جا رہے ہیں جس سے بے شمار لوگوں کی صحت اور زندگی داؤ پر لگ جائے گی۔ ہمیں بہت جلد کچھ کرنا ہوگا لیکن جو بھی کرنا ہوگا بہت احتیاط سے۔ سب سے پہلا کام تو تم یہ کرو کہ....."

"اپنی تعریف خود ہی کر لو۔" اس نے جلدی سے میرا فقرہ مکمل کیا۔ پھر شکوہ کناں آواز میں بولا۔ "کبھی تو میری تعریف کر دیا کریں چاچو جی، جتنا پیچھا آپ کا کیا اتنا اگر انجلینا جولی کا کیا ہوتا تو وہ مجھ پر ریشماں خجلی (ریشہ خطمی) ہو جاتی۔"

"عمران! یہ تم لوگوں کی توقع سے زیادہ سیریس معاملہ ہے۔ یہ معصوم بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ چیسٹ انفیکشن اور نمونیہ ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے، اس میں ایک مہنگا انجکشن....."

ایک بار پھر میری بات ادھوری رہ گئی۔ دروازے پر ناک ہوئی تھی۔ میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ دروازہ کھولا تو دو گارڈز دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ایک راکٹل تانے مجھ سے دور کھڑا رہا۔ انہوں نے بڑی تیزی اور باریک بینی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کچھ اشیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر باہر نکل گئے۔ غالباً انہیں کسی طرح کا شک ہوا تھا۔ میں نے سوچا، عین ممکن ہے کہ اس کمرے میں کوئی ڈکٹافون قسم کی چیز موجود ہو اور میری نہایت تدھم سرگوشیوں نے بھی کسی قسم کا شک ابھار دیا ہو۔

بہرحال اس واقعے کے بعد میری گھڑی پر تین چار دفعہ ارتعاش تو ہوا مگر دوپہر تک میں نے عمران سے رابطہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔ دوپہر سے کچھ ہی دیر بعد چاولہ بھائی میرے کمرے کی گرل دار کھڑکی کے سامنے نمودار ہوا۔ ایک مسلح گارڈ بھی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں سرگوشیوں کے حوالے سے ہی کوئی بات شروع نہ کر دے مگر وہ ایک اور خبر لے کر آیا تھا۔ مسکراتے لہجے میں بولا۔ "ڈپٹو جی! تمہارے لیے ایک خبر ہے۔ ایک پہلو سے اچھی ہے۔ دوسرے پہلو سے بُری بھی کہہ سکتے ہو۔ باس جن کو قریباً تین ہفتے بعد یہاں آنا تھا، وہ اتفاقاً آج ہی آ رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ تمہیں چوبیس پچیس دن کی جو مہلت

دی گئی تھی اب وہ تمہیں مہیا نہ ہو سکے اور باس کی اسی وزٹ میں تمہاری اپیل کا فیصلہ بھی ہو جائے۔ اس خبر میں اچھا پہلو یہ ہے کہ تمہیں لمبے انتظار کی کوفت سے نہیں گزرنا پڑے گا اور جو کچھ بھی ہونا ہے، ایک دو دن کے اندر ہی ہو جائے گا۔" اس کے نیم سیاہ ہونٹوں پر شیطانی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو اصل مقصد تو تمہاری گردن جھکانا تھا اور وہ جھک گئی۔ مرنا تو تمہارا کنفرم ہے۔

واپس جانے سے پہلے وہ یاور خاں سے مخاطب ہوا۔

"ڈپٹی جی کو نکالو یہاں سے۔ ہال کمرے میں لے جاؤ۔ یہ بھی آج کا رونق میلا دیکھ سکیں۔"

یاور خاں نے ادب سے سر جھکایا۔ یاور کو دیکھ کر میرے دماغ میں انگارے دہک جاتے تھے۔ انیلا آغا نے بتایا تھا کہ اسے لاہور سے یہاں لانے کے بعد جن لوگوں نے مسلسل تاراج کیا ان میں یہ یاور خاں پیش پیش تھا۔

کمرے سے نکالنے سے پہلے مجھے ہتھکڑی لگائی گئی اور پھر راہداریوں کے سائے میں آگے بڑھایا گیا۔ گارڈ کی غیر معمولی چوکسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری فائٹنگ اسپرٹ سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی ذرا سی چوک کسی بڑے مسئلے کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ جس ہال کمرے میں مجھے لے جایا گیا، وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا ہال معلوم ہوتا تھا۔ وہاں ایک ڈائننگ فلور تھا۔ بہت سی کرسیاں اور میزیں تھیں۔ ایک طرف بار بھی نظر آتا تھا۔ ہال کے چاروں طرف ایک اندرونی گیلری تھی جس کے ساتھ ساتھ کمروں کے دروازے نظر آتے تھے۔ مجھے سیڑھیاں چڑھا کر ایسے ہی ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی تھی۔ کمرے کی کشادہ کھڑکی میں سے میں نیچے ہال کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ تاہم اس کھڑکی میں سے باہر نکلنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہاں مضبوط اسٹیل کی خوشنما گرل موجود تھی۔ کھڑکی کے عین سامنے دو تین مسلح کارندے مسلسل آمد و رفت جاری رکھے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے تین چار بار میری رسٹ واچ میں خاموش وائبریشن ہوئی مگر اب میرے لیے قطعی ممکن نہیں تھا کہ عمران سے رابطہ کر سکوں۔

جونہی شام ہوئی نیم گرم ہال مختلف روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ میزوں پر قیمتی برتن اور ڈرنکس وغیرہ بھی نظر آنے لگے۔ یہ کل سات آٹھ میزیں تھیں لیکن نہایت دیدہ زیب اور سجی ہوئی۔ کہیں آس پاس سے مرغن پکوان کی ہلکی سی خوشبو بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی تقریب کا انتظام ہے اور یقیناً اس تقریب کو رونق بخشنے والا وہی تھا جس کو چاولہ نے کبھی باس اور کبھی بگ باس کا نام دیا تھا۔

اور پھر وہ گھڑی آن پہنچی۔ وقفے وقفے سے دس پندرہ سوٹڈ بوٹڈ افراد ہال میں داخل ہوئے اور مختلف میزوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے زیادہ تر درمیانی عمر کے تھے۔ وہ شکلوں سے ہی جرائم پیشہ لگتے تھے۔ تاہم سب کے سب خوشگوار موڈ میں تھے۔ دو چار کے لیے ویٹریس لڑکیوں نے جام بھی تیار کر دیے۔ تب چاولہ بھائی نے میزوں کے قریب جا کر کچھ کہا۔ سب لوگ مؤدب نظر آنے لگے۔ ایک بلند منقش دروازہ کھلا اور باس اپنے دو تین ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں جادو رامے ہی تھا۔ چھوٹا سا قد، چوڑا جسم، نہایت چپٹی ناک اور آنکھیں اتنی ابھری ہوئی کہ لگتا تھا کہ ابھی گر پڑیں گی۔ شکلیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں مگر اُس کے چہرے پر جو خباثت تھی، اس نے اسے کریہہ المنظر کر دیا تھا۔

"خوش آمدید رامے بھائی۔" یہ الفاظ چاولہ نے جھک کر کہے تھے اور ان دو وکٹورین اسٹائل کرسیوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو ڈائننگ فلور پر رکھی تھیں۔ ٹھگنا جادو رامے بڑے ٹھاٹ سے چلتا ہوا ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اس کے بارے میں، میں نے یہی سنا تھا کہ وہ بدلباس ہے اور بہت ابتر حالت میں رہتا ہے۔ لیکن میں نے اسے دو مرتبہ دیکھا تھا، ایک آج اور ایک چند روز پیشتر ہاؤسنگ سوسائٹی کے دفتر میں۔ جہاں وہ ایک کاروباری کے طور پر موجود تھا۔ دونوں مرتبہ وہ مجھے کوئی ایسا گندہ نظر نہیں آیا تھا بلکہ آج تو لگتا تھا کہ اس نے اپنی بدصورتی کے باوجود خود کو کافی چمکانے کی کوشش بھی کی ہے۔

یاور خاں میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس ہی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر شیطانی لہجے میں بولا۔ "کیسا لگا تمہیں ہمارا باس؟"

"بہت کامیاب بہروپیا۔ لوگوں کی نظروں میں توبہ تائب کر کے کاروباری بن جانے والا۔ حقیقت میں اس مکروہ کالے دھندے کا سرغنہ۔"

وہ زہریلے آہنگ میں گویا ہوا۔ "اور میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اپنی رحم کی اپیل کے انجام کا پتا بھی چل گیا ہو گا۔"

"جمع خاطر رکھو یاور خاں، یہاں کوئی اس سفاک قاتل سے رحم کی اپیل کرنے نہیں جا رہا۔"

"اب بھی اکڑ دکھا رہے ہو۔ اکڑ تو تمہاری اسی وقت

مٹی میں مل گئی تھی جب میڈم شاربہ کے پاؤں پر سر رکھا تھا۔"

یکایک ہال میں ہلچل نظر آئی۔ روشنیاں کچھ اور دلفریب ہوگئیں۔ دس بارہ خوش لباس لڑکیاں اندر آئیں اور قطار بنا کر کھڑی ہوگئیں۔ تب ایک دروازہ کھلا اور ایک پری چہرہ دکھائی دیا۔ میزوں پر موجود سب لوگ ایک بار پھر مؤدب کھڑے ہوگئے۔ وہ درمیانے قد کی لڑکی حسین و جمیل تو تھی ہی اس کے جھلملاتے لباس نے اسے کچھ اور بھی ہوشربا بنا دیا تھا۔ اس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ اس کا طویل لبادہ فرش پر گھسٹتا ہوا آرہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ایک لڑکی نے مؤدب انداز میں تھام رکھا تھا۔ قطار میں کھڑی لڑکیاں ایک ایک کر کے اس کے بائیں ہاتھ کو بوسا دے رہی تھیں اور اس پر گل پاشی کر رہی تھیں۔ اس دلکش لڑکی کو فلور پر چڑھایا گیا تو کوتاہ قد جادو راے بھی کھڑا ہوگیا۔ لڑکی کو اس کے پہلو میں بٹھایا گیا تو وہ بھی بیٹھ گیا۔ لڑکی کا قد اس سے چند انچ بڑا ہی تھا۔ وہ دونوں بیسٹ ایٹڈ بیوٹی کی مثال نظر آتے تھے۔

جادو راے نے اپنے پان سے رنگے ہونٹوں کو رومال سے پونچھا اور ستائشی نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ عورت باز مشہور ہے۔ اس کے ادارے میں اہم پوسٹوں پر جاب حاصل کرنے والی تمام لڑکیوں کو پتا ہوتا تھا کہ انہیں پوری رضامندی کے ساتھ ایک کراہت سے گزرنا پڑے گا۔ اس کا یہ کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ بس جسمانی قربت کا رسیا تھا، محبت اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ دانستہ محبت کے قریب نہیں جاتا تھا۔ کسی بھی رشتے کی محبت اس نے اپنے پاس نہیں پھٹکنے دی تھی۔ بہن، بھائی، بیوی، بیٹا، بیٹی، اس نے اپنا کوئی رشتہ بننے ہی نہیں دیا تھا۔ کسی دل جلے فقیر نے اسے بددعا دی تھی کہ ایک دن اس کا اپنا ہی کوئی پیارا اس کے اعمال کی زد میں آئے گا۔ یقیناً اس فقیر کا اشارہ اس زہریلے تریاق کی طرف ہوگا جو وہ گلی کوچوں میں پھیلاتا تھا اور شاید اس کا اشارہ اس بات کی طرف بھی تھا کہ وہ زہر کسی طور اس کے کسی اپنے کی زندگی بھی تو لگ سکتا ہے اور ایسی مثالیں موجود ہیں۔ مکافاتِ اس طرح کی "زہر خورانی" کو بھی وجود دے دیتی ہے۔ لیکن قدرت اپنی کہانیوں کے بیچ و خم میں کچھ ردوبدل بھی تو کرتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا جس سے ہر کوئی بے خبر تھا۔

"چڑھاوا لاؤ۔" جادو راے کی آواز ہال میں گونجی۔

دو افراد ایک بڑا اٹیچی کیس اٹھا لائے اور اسے جادو راے کے قدموں کے پاس رکھ دیا۔ قریباً چالیس سالہ جادو راے نے حسین و جمیل دوشیزہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا نام چاندنی ہے..... اور تم سب دیکھ رہے ہو یہ "چاندنی" ہی ہے۔ عورت کو حاصل کرنا ہمارے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا، چاندنی کو حاصل کرنا بھی نہیں۔ لیکن ہم اسے کسی دوسرے طریقے سے اور رسم و رواج کے مطابق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ابھی پورے اٹھارہ سال کی نہیں ہے۔ قریباً ایک ماہ باقی ہے۔ ہم اس کے لیے انتظار کریں گے۔ بہرحال آج چاندنی باقاعدہ طور پر ہم سے منسوب ہو رہی ہے۔"

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مٹی کو بھی سونا بنانے والے جادو اثر، جادو راے کے لیے جام سے جام ٹکرا گئے۔ جادو راے کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی بدنما نظر آنے لگیں۔ اس کے اشارے پر چاولہ نے اٹیچی کیس کھولا۔ وہ کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ڈالرز تھے۔ یہ گڈیوں کی شکل میں تھے۔ مگر گڈیوں کی بائنڈنگ کھول دی گئی تھی۔ جادو راے جھکا، پھر اس نے ڈالر نکال نکال کر دوشیزہ پر نچھاور کرنے شروع کر دیے۔ وہ خاموش کھڑی شرمیلے انداز میں مسکراتی رہی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے قدموں میں ڈالرز کا ڈھیر لگ گیا۔

جادو راے نے دوشیزہ کا کومل ہاتھ تھام کر اسے ڈالرز کے ڈھیر سے تھوڑا دور کر دیا۔ پھر ملازمین کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم لوگ اپنا حصہ حاصل کر سکتے ہو۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی۔ ملازم، موقع پر موجود گارڈز اور دوشیزہ کا استقبال کرنے والی لڑکیاں، سب کے سب نوٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈالرز اکٹھے کرنے کے لیے جانوروں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔ کھینچا تانی کر رہے تھے۔ ایک لڑکی کا لباس پھٹا اور وہ نیم عریاں ہوگئی مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ کچھ لٹیرے اور لٹیریاں کرنسی نوٹ اپنے گریبانوں میں ٹھونس رہے تھے۔ ان میں ایک ایسا چہرہ بھی دکھائی دیا جو لاہور میں انسپکٹر رائے کی موت کے موقع پر نظر آیا تھا۔ یہ وہی تھا جو ڈیوری بوائے کے روپ میں رائے تک پہنچا تھا۔

جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو جادو راے نے نوخیز حسینہ کا ہاتھ تھام کر اسے پھر سے کرسی پر بٹھایا۔ ایسے میں وہ تھوڑا سا ڈگمگائی اور تب مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ وہ نابینا تھی۔ میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ اب اس کی شرمیلی مسکراہٹوں کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔ اسے نظر

ہی کیا آتا تھا۔

تالیوں کے شور میں جادو رائے نے لڑکی کو انگوٹھی پہنائی اور پھر اس کا بوسہ لیا۔ دونوں بیٹھے ہوئے تھے پھر بھی کوتاہ قامت رائے کے ہونٹوں تک پہنچنے کے لیے لڑکی کو اپنا سر تھوڑا سا جھکانا پڑا۔ ایک بار پھر میزوں پر سے ہاؤ ہو کے مدہوش نعرے بلند ہوئے۔ میرے اندازے کے مطابق اس جشن میں شریک یہ زہر فروش وہی لوگ تھے جو ملک کے مختلف پسماندہ حصوں میں جادو رائے اور چاولہ کے لیے ڈسٹری بیوٹرز کا کردار ادا کرتے تھے۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ ان میں اہم محکموں کی دو تین کالی بھیڑیں بھی شامل ہیں۔ ایک جانب کرسی پر مجھے وہ فربہ اندام ڈاکٹر شاربہ بھی نظر آ رہی تھی جسے ڈاکٹر ماجد کی بیوہ بتایا گیا تھا۔ اس پر بیوگی کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔

ان مدہوش لوگوں میں ''ڈلیوری بوائے'' کو دیکھنے کے بعد انسپکٹر رائے کی موت کا منظر میری نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔ یہ منظر تصور میں آیا تو بدنصیب رائے کے آخری لمحات بھی نگاہوں میں آئے۔ اس کی شہ رگ کٹ چکی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا، مجھے کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ ''چاولہ..... نہیں'' اس کی اس نفی کو میں اور عمران مختلف معنی پہناتے رہے تھے لیکن اب اس کی ادھوری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ رائے نے وہی انکشاف کرنا چاہا تھا جو آج مجھ پر ہوا تھا۔ چاولہ بھائی باس نہیں تھا، اصل باس یہی جادو رائے تھا۔

یادر خاں ہال کے بجائے گیلری میں موجود تھا۔ وہ کھڑکی میں سے میری طرف دیکھ کر زہریلے انداز میں بولا۔ ''تمہاری اپیل کا فیصلہ آج ہی ہو جانا تھا مگر یہ خوشی کا موقع ہے۔ شاید باس اس میں تمہاری منحوست کو شامل کرنا نہیں چاہتے۔''

''تم سب لوگ بہت بُری طرح پچھتانے والے ہو یادر خاں! مجھے مار بھی دو گے تو کچھ نہیں ہوگا جو بات اب چل نکلی ہے، وہ رکے گی نہیں۔ تم اپنی آنکھوں سے اپنا بُرا انجام دیکھو گے۔''

وہ زہرخند انداز میں بولا۔ ''فی الحال تو کل پرسوں تک ہم تمہاری دو فٹ لمبی گردن دیکھیں گے۔'' پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''چیمپئن صاحب! فنکشن ختم ہو گیا۔ اب اپنا منہ دوسری طرف کر کے دونوں ہاتھ کھڑکی کی گرل میں سے باہر نکالو تاکہ تمہیں دوبارہ مردوں کا زیور پہنایا جا سکے۔ بلکہ ہارے ہوئے مردوں کا زیور۔''

''ہار جیت دیکھنا چاہتے ہو یادر! تو کھلے میدان میں آؤ، تم جیسے دو چار کو درمیان سے نہ چیر ڈالوں تو نام بدل دینا۔''

اسی دوران میں چار اور مسلح گارڈز آ گئے۔ مجھے پھر ہتھکڑی لگا دی گئی اور اسی نیچے والے آرام دہ کمرے میں لے جایا گیا جہاں میں نے کل رات گزاری تھی۔ کمرے میں بند کرنے کے بعد کھڑکی ہی کے راستے میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔

میں نے کمرے کی لائٹ آف کرنا چاہی تو یادر خاں نے منع کر دیا۔ ''کمرے اور واش روم کی لائٹ آن رہے گی۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں نہ مانوں؟''

''تو ہمیں منانا آتا ہے۔'' اس نے اطمینان کے ساتھ ایک گارڈ کے ہاتھ سے رائفل پکڑی اور دانت پیس کر بولا۔ ''یہ ربڑ کی گولیوں والی رائفل ہے۔ اس کھڑکی کے اندر سے ہی مار مار کر تمہیں نیوٹرل کر دوں گا۔ ایسی حالت ہو گی کہ تمہیں خود پر ترس آنے لگے گا۔''

لائٹ آن رکھنے والی بات سے میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ اس کمرے میں خفیہ کیمرا یا کیمرے موجود ہیں۔

جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اپنے بہتر موقع کی تلاش میں رہنا چاہتا تھا۔

رات کو دو تین بار پھر گھڑی پر واچ مین ہوئی مگر میں نے عمران سے بات کرنے کا رسک نہیں لیا۔ کمرے کا کیمرا تو فی الحال مجھے دکھائی نہیں دیا تھا مگر واش روم کا باتھ جیسا منی کیمرا میں نے دیکھ لیا تھا۔ یہ چھت کے ڈیزائن کی پھول پتیوں میں شاور کیبن کے قریب اس طرح لگایا گیا تھا کہ ہر اینگل COVER کر رہا تھا۔

میں نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ گھڑی کی واچ مین مجھے شدید اضطراب میں مبتلا کرتی رہی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی پلاننگ بھی کرتا رہا اور کمرے کا جائزہ بھی لیتا رہا کہ خفیہ کیمرا کہاں ہو سکتا ہے۔ صبح تک میں کمرے میں موجود دو خفیہ کیمرے ڈھونڈ چکا تھا۔ ایک الماری کے ایک ہینڈل میں تھا اور دوسرا ایک ڈیکوریشن پیس میں۔

اگلے روز شام کو مجھے پھر الٹی ہتھکڑی لگائی گئی اور اس ہال کمرے میں پہنچایا گیا جہاں کل موج میلا ہوا تھا۔ آج ماحول بالکل مختلف تھا۔ جادو رائے اور چاولہ بھائی دو

دکٹوریہ کرسیوں پر براجمان تھے۔ ڈاکٹر شاربہ اور کل کی پارٹی میں شریک چار پانچ مزید اوباش افراد بھی وہاں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب مجھے بڑے تجسس اور کسی حد تک تمسخرانہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ مارشل آرٹ اور دیگر حوالوں سے مجھے جانتے تھے اور اب میری اس بے بسی کو انجوائے کر رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے دھیمی آواز میں فقرہ اچھالا۔

"اگر قضائے الٰہی سے مرنی گئی تھی تو صبر کر لیا ہوتا، کچھ لوگ تو ایسے موقعوں پر صبر کے علاوہ شکر بھی کرتے ہیں۔" دیگر مسکرانے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فقرہ میری شریکِ حیات ثروت کے حوالے سے ہے۔

مجھے جادو راے کے سامنے ایک چھوٹی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔

مجھے پہلے ہی معلوم تھا، یہاں کیا ہونے والا ہے۔ میں ان سب کی منحوس صورتیں دیکھ چکا تھا۔ اب یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ نہایت مختصر سی کارروائی ہوئی۔ مجھے چار نئی شیٹ سنائی گئی، جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ میں کئی بار کی وارننگ کے باوجود اپنی فرض شناسیوں اور طراریوں سے باز نہیں آیا۔ میری اور انسپکٹر زبیر کی وجہ سے گروپ کے کئی اہم افراد کی جان گئی اور کروڑوں کا نقصان بھی ہوا۔ لہٰذا معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

میں نے براہِ راست راے کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جادو راے! معافی کی گنجائش تو تمہارے لیے بھی نہیں ہے۔ تم اپنی بدصورتی کا انتقام دنیا والوں سے لیتے رہے ہو۔ حالانکہ تمہاری اصل بدصورتی تمہارے اندر کی ہے۔"

اس نے اپنی فضیلی طبع کا ثبوت دیتے ہوئے میز پر زور سے مکا مارا۔ سوفٹ ڈرنک کی بوتل اچھلی اور اس کے تھری پیس سوٹ کو داغ دار کر گئی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اٹھ کر مجھ پر پل پڑے گا مگر پھر اس نے خود کو کنٹرول کیا۔

اس کے جذبات سمجھتے ہوئے، یاور خاں نے رائفل کا بٹ بڑے زور سے میری گردن پر رسید کیا۔

میں نے یہ ضرب برداشت کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں راے، بات صرف تمہارے اندر کی بدصورتی کی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارا ایک جڑواں بھائی بھی تھا۔ اس کی شکل و صورت بھی تم سے کچھ... مختلف نہیں ہے مگر اس کی فطرت تمہاری طرح بد نہیں تھی۔ اس نے تعلیم حاصل کی اور محنت کی۔ اب وہ اپنی ظاہری بدصورتی کے ساتھ امریکا میں ہے اور اس کی اندرونی خوب صورتی نے اسے وہاں کا ایک معزز شہری بنایا ہے۔ وہ کسی جگہ کا نائب میئر بنا ہے اور ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔"

"لے جاؤ اس باسٹرڈ کو یہاں سے۔" راے اچھل کر چنگھاڑا۔ اس کے ہونٹ کسی خاص قسم کے پان کی پیک سے لہو رنگ تھے اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ یاور نے ایک اور بٹ میری گردن پر رسید کیا پھر وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے چلے۔ میں نے پکار کر کہا۔ "تم نے جو بویا ہے، وہ کاٹو گے جادو راے۔ کبھی بیٹھ کر حساب لگانا، کتنی زندگیاں تیری وجہ سے برباد ہوئیں۔ کتنے لوگوں نے صحت کی آس امید کے ساتھ تیرے زہر کو دوا جان کر پیا اور سسک سسک کر قبروں میں اترے۔ تو جتنی مرضی ہوشیاریاں دکھا لے تو بچ نہیں سکے گا راے اور نہ تیرے یہ ہمکار۔ نہیں بچیں گے یہ بھی....."

مجھے دوبارہ اسی پُرآسائش، نیم گرم کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میں دو راتیں گزار چکا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ کل صبح مجھے پھر اس یخ بستہ خانے میں شفٹ کر دیا جائے گا جہاں کی سیلن زدہ، نیم سیاہ دیواروں میں پانی کی کمی رچی بسی تھی..... اور جہاں ایک ہوم میڈ پھانسی گھاٹ میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد گھڑی کے سگنل بند ہو جاتے تھے۔ اگر مجھے عمران سے رابطہ کرنا تھا تو آج رات ہی کسی طرح کرنا تھا مگر اس کمرے اور واش روم کا ہر انچ کیمروں کی زد میں تھا..... اور ایک سیکنڈ کے لیے بھی مجھے لائٹ آف کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کمرے میں لحاف اور کمبل وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں تھی اور ان لوگوں نے کوئی ایسی چیز رکھی بھی نہیں تھی۔

گھڑی وقفے وقفے سے مسلسل وائبریٹ کر رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..... لیکن ایک ترکیب ایسی تھی جو میں آج رات ضرور آزمانا چاہتا تھا۔ رات دس بجے کے قریب میں بستر سے اٹھا۔ شیشے دار کھڑکی کی دوسری جانب یاور خاں کا رائفل بردار بدمعاش چوکس کھڑا تھا۔ میں نے الماری سے تولیا وغیرہ نکالا اور شاور لینے کی غرض سے باتھ روم میں گھس گیا۔ پُرآسائش باتھ روم کی سب سے خاص چیز "اسٹیم شاور کیبن" تھا۔ اور یہ ایک طرح سے کیمرا لگانے والوں کی سنگین غلطی بھی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ جدید کیمرے کی موجودگی کے باوجود یہ "اسٹیم کیبن" میری مدد کرے گا۔ میں نے کپڑے اتارے اور کیبن میں گھس گیا۔ گھڑی میں نے کلائی میں ہی رہنے دی تھی۔ میں نے اسٹیم والی ناب کو گھمایا تو کیبن بھاپ سے بھرنا شروع ہو گیا۔ میں

نے تاب پوری گھما دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھاپ اتنی ہوئی کہ کیبن کے اندر دیکھنا ممکن نہ رہا۔ مجھے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑا۔ مگر یہ انتظار رائگاں نہیں گیا۔ جونہی گھڑی پر وائبریشن شروع ہوئی، میں نے عمران سے رابطہ کرلیا اور گھڑی کو کان اور ہونٹوں سے قریب تر کرلیا۔ عمران کی بے حد سٹپٹائی ہوئی آواز آئی۔ ''آپ جواب کیوں نہیں دے رہے تھے۔ قسم سے ہلکان کردیا ہے آپ نے۔''

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''عمران! میں یہاں بُری طرح پھنسا ہوا ہوں۔ بات کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ اب بھی بہت تھوڑی سی مہلت ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں، دہراؤں گا نہیں۔ بس پورے غور سے سن لو۔ ان حرامزادوں نے ناکارہ اور ایکسپائرڈ انجکشنوں کی ایک بہت بڑی کھیپ خریدی ہے۔ یہ کھیپ ہمارے میڈیکل اسٹوروں پر سپلائی ہو چکی ہے یا بس ہونے والی ہے۔ یہ بہت بڑا نقصان کرے گی عمران۔'' میں نے عمران کو انجکشن کا نام بتایا پھر اسے کہا کہ وہ انسپکٹر زبیر سے کہہ کر فوراً یہ اطلاع جمشید صاحب تک پہنچائے اور ان سے کہے کہ وہ بالکل وقت ضائع کیے بغیر اقدامات کریں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کو بھی مطلع کردیا جائے۔''

''ٹھیک ہے چاچو جان! انسپکٹر زبیر میرے ساتھ ہی ہیں۔ یہ کام بس پانچ دس منٹ کے اندر ہی ہو جائے گا۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کسی بڑے خطرے میں ہیں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''اس گھڑی کے سگنل قریباً تین کلومیٹر کے دائرے میں پہنچتے ہیں، مگر میں آپ کے بہت قریب ہوں۔ سمجھیں اس فارماسوٹیکل کمپنی کے مین گیٹ سے قریباً پچاس میٹر کے فاصلے پر ایک پرائیویٹ گھر کی چھت پر موجود ہوں۔ انسپکٹر زبیر بھی میرے ساتھ ہیں۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے علاوہ ٹھیک ٹھاک نفری بھی ہے۔ ان میں زیادہ تر سادہ پوش ہیں، اردگرد کے چند پرائیویٹ گھروں میں موجود ہیں۔ آپ سمجھیں، اس فیکٹری اور گودام کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ مختصر نوٹس پر درجن تھانوں کی نفری مزید پہنچ جائے گی۔ میں انسپکٹر زبیر سے آپ کی بات کراؤں؟''

''نہیں، میں سب سمجھ گیا ہوں مگر کسی بھی کارروائی کے لیے یہ وقت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ بتائیں۔''

اہم اطلاع

برائے ایجنٹ حضرات/قارئین

السلام علیکم! اطلاعاً عرض ہے کہ ناگزیر وجوہ اور کاغذ کی بے انتہا گرانی کے سبب ادارے سے شائع ہونے والے چاروں ماہناموں

سسپنس ڈائجسٹ..... ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ پاکیزہ..... جاسوسی ڈائجسٹ

کی قیمت مارچ 2023ء سے =/180 روپے فی شمارہ ہوگی۔

آپ سے تعاون کی درخواست ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

میں نے چند لمحے کے توقف سے کہا۔ ''میں نے نوٹ کیا ہے کہ یہاں صبح چھ بجے صورتِ حال بہت ایزی ہوتی ہے۔ نگرانوں کی شفٹ بھی تبدیل ہوتی ہے اور اندازاً آدھ گھنٹے تک عملی طور پر کوئی سیکیورٹی نہیں ہوتی۔''

''آپ کا مطلب ہے، چھ سے ساڑھے چھ بجے تک۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر عمران اور انسپکٹر زبیر کو بتایا۔ ''مین گیٹ پر تھوڑی سی مزاحمت کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔ اندر داخل ہونے پر گودام کا وہ حصہ دکھائی دے گا جہاں اصل اور ''پینٹ'' ادویات رکھی جاتی ہیں۔ بائیں جانب آٹھ دس قدم کے فاصلے پر ایک بلند دروازہ نظر آئے گا۔ اس کے اندر داخل ہو گے تو یہی لگے گا کہ یہ بھی گودام کا حصہ ہی ہے۔ چھت تک دواؤں کے کارٹن چنے ہوں گے۔ کارٹن کی قطاروں میں سے پہلی دو قطاریں چھوڑ کر جو کارٹن لگے ہیں، وہ دراصل اندرونی دروازے کو چھپانے کے لیے ہیں۔ انہیں ذرا طاقت سے دھکیلا جائے گا تو اصل گودام اور رہائشی کمپاؤنڈز وغیرہ دکھائی دیں گے.....''

میں نے عمران اور زبیر کو تفصیل سے بتایا کہ یہاں چار پانچ مسلح افراد سے ان کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس عمومی اسلحے کی تفصیل سے بھی انہیں آگاہ کیا۔ میں نے عمران کے ساتھ اپنی گھڑی بھی ملائی۔

اسی اثنا میں باتھ روم سے باہر میرے کمرے کا دروازہ دھڑا دھڑ بجایا جانے لگا۔ ''کہاں مر گئے ہو۔ باہر کیوں نہیں آ رہے؟'' یہ یاور خاں کی کرخت آواز تھی جو کمرے کی کھڑکی کے راستے باتھ روم کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے اسٹیم کیبن کا دروازہ کھول کر بلند آواز میں کہا۔ ''آ رہا ہوں۔''

پتا نہیں کہ میرے الفاظ اُس کے کانوں تک پہنچے یا نہیں لیکن دروازہ دھڑ دھڑانا بند ہو گیا۔

میں سمجھ گیا کہ کیمروں میں میرے دکھائی نہ دینے سے ان لوگوں کی سٹی گم ہو رہی ہے۔ میرے حوالے سے وہ لوگ غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

میں پہنچ کر کے باہر آیا تو یخ پا یاور خاں گرل دار کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ نشے کے سبب اس کا چہرہ کچھ اور بھی تمتمایا ہوا تھا۔ ''فرما لیا حسل؟'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

''فرما لیا۔'' میں نے سر پر تولیا رگڑتے ہوئے کہا۔

''بس ایک غسل تمہارا اور رہ گیا ہے اور وہ کل یا پرسوں ہو جائے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''جو اوپر والے کی مرضی ہے، وہی ہو گا۔''

''مگر یہاں کا اوپر والا تو رامے صاحب ہی ہے اور آج کل تو وہ تمہارا اوپر والا بھی اُن کی بات مان رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''اندھے ہو؟ کل دیکھا نہیں، چاند کا ٹکڑا بیٹھا تھا، ان کے پہلو میں۔''

''نابینا ہے نا بے چاری۔''

''اوئے مردار چیمپئن! ہاتھ میں پیسا ہو تو پتھر کا بت بھی دیکھنے لگ جائے۔ وہ تو پھر جیتی جاگتی لڑکی ہے۔'' یاور نے نشے کے سبب ہچکی لی۔

''لیکن تمہاری طرح گدھا نہیں ہے تمہارا باس..... وہ کبھی اس کی آنکھیں بحال کرنے کا رسک نہیں لے گا۔''

یاور خاں نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر نشیلا، مسرور قہقہہ لگایا۔ آواز دبا کر بولا۔ ''بدنصیب ترین شخص ہے تو جو رامے اور چاؤ صاحب سے ٹکر لی۔ لیکن یہ آنکھوں والی بات تو نے شاید ٹھیک ہی کہی ہے۔ رامے صاحب یہ رسک شاید نہ لیں گے۔ ان کو عشق ہو گیا ہے اس پری سے۔ اور عشق بھی طوفانی۔ طوفانی عشق سمجھتا ہے نا تو؟''

اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ پھر مزید وضاحت کے لیے اپنے ہاتھ کی پشت کو بڑے زور سے بوسہ دیا۔ ''لیکن تو کیا جانے نوسوتوں کے چیمپئن..... اس طوفانی عشق کو۔'' اس نے کھڑکی کی گرل پر زور سے ٹانگ جمائی اور لہراتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا جہاں اوپر اس کا کمرا تھا۔

اس نیم گرم کمرے سے باہر رات یقیناً برف میں دبی ہوئی تھی۔ اور اس تاریکی میں میرے ساتھی میرے آس پاس پہنچ چکے تھے۔ شمالی علاقوں کی برف پوش چوٹیوں کا فسوں نظر نہیں آتا تھا مگر موجود تھا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں اور رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی تھی۔ مجھے اس یخ بستہ خانے کا خیال آیا جہاں یہ لوگ مجھے آج صبح پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انوار گل کی صورت بھی نگاہوں میں گھوم گئی۔ پتا نہیں کہ وہ اس برفیلی قبر میں زندہ تھا یا تختے پر جھول چکا تھا۔

اس کمرے کے اندر رات دن کا کوئی احساس نہیں تھا لیکن پھر گھڑی کی سوئیوں نے بتایا کہ فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ چھ بجنے میں دو منٹ باقی تھے جب میں نے کھڑکی سے باہر کھڑے پہریدار کو آواز دے کر قریب بلایا۔ اسے کچھ خبر

نہیں تھی، یہ قربت اسے کتنی مہنگی پڑے گی۔ جونہی وہ میرے بازو کی پوری لمبائی تک پہنچا، میں نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھڑکی کی آہنی گرل میں سے گزارا اور اس کا گریبان تھام کر اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ اس کی پیشانی گرل سے ٹکرائی اور ایک گہرا گھاؤ نظر آیا۔ دوسری ضرب نے اسے مردہ چھپکلی کی طرح جھلا دیا۔ مجھے پتا تھا اس کی جیکٹ کی کس جیب میں کمرے کی چابی ہے۔ میں نے پھرتی سے چابی نکالی اور اندر سے دروازہ کھول لیا۔ اس کام میں مجھے بمشکل پانچ سیکنڈ لگے تھے۔ باہر آتے ہی میں نے اس کی ٹرپل نو رائفل پکڑی، اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک ستون کی اوٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ آوازیں سن کر کچھ لوگ اس طرف آئیں گے مگر غیر متوقع طور پر ایسا نہیں ہوا۔ چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد میں زینوں کی طرف لپکا۔ مجھے معلوم تھا کہ یاور خاں کا کمرا کہاں ہے۔ سب سے پہلے میں اسی کی مزاج پرسی کرنا چاہتا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ پلائی وڈ کا تھا، مجھے اس کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ چند قدم بھاگ کر میں نے دروازے کو کندھے کی زوردار ٹکر لگائی۔ اندرونی چٹخنیاں ٹوٹ گئیں اور میں نیم روشن کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یاور خاں یہاں اکیلا ہوگا۔ مگر بستر میں کوئی اس کے ساتھ موجود تھا اور وہ کوئی خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ وہی موٹی مسٹنڈی عورت تھی جس کا نام شاربہ اکرام تھا اور جو قطعاً ڈاکٹری جیسے مقدس پیشے کی اہل نہیں تھی۔

گورا چٹا کڑیل یاور خاں مجھے دیکھ کر سکتہ زدہ رہ گیا۔ اس نے ایک چادر اپنے اوپر تک کھینچ لی تھی۔ ''کیا خیال ہے یاور..... تمہارے سامنے مردار چیمپئن ہے یا زندہ؟'' میں نے آتشیں لہجے میں کہا۔

یقیناً میرے تیوروں نے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ میرے ہاتھ میں ٹرپل نو دیکھتے ہوئے بھی اس نے تیزی سے کروٹ لی اور اپنا ہاتھ سائڈ ٹیبل پر رکھے ماؤزر تک پہنچانا چاہا۔

''رکو۔'' میں چلایا اور ساتھ ہی لبلبی دبائی۔

پہلی گولی اس کے پہلو میں لگی اور دوسری جبڑے سے گزر کر سر میں اتر گئی۔ دھماکوں نے در و دیوار کو تھرا دیا تھا۔ وہ برہنہ حالت میں پٹ سے قالین پر گرا۔ اس کے سینے پر ایک ناگ کا ٹیٹو نظر آ رہا تھا۔ وہ خود بھی تو ایک ناگ ہی تھا جس نے اس عمارت میں اتنا آغا کو بار بار ڈسا تھا۔ اب وہ ایرانی قالین پر چت پڑا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور آنکھوں میں حیرت کی یلغار تھی۔ اس کے لیے یقیناً شہرِ اجل کا دروازہ کھل چکا تھا۔

شاربہ اکرام نے غالباً یہی سمجھا کہ میں لمحۂ غفلت میں ہوں۔ وہ بستر سے نکل کر اٹھ بھاگی۔ وہ اپنی نائی پہننے کی کوشش کر رہی تھی جو ابھی صرف اس کے گلے تک ہی پہنچی تھی۔ باقی جسم عریاں تھا۔ موت کا خوف بڑے بڑوں کا پتا پانی کر دیتا ہے۔ وہ کمرے سے نکل اور اسی حالت میں اس طویل گیلری میں بھاگتی چلی گئی جو اس ہال کے اندر چاروں دیواروں کے ساتھ موجود تھی۔

میں رائفل بدست اس کے پیچھے لپکا۔ ''رک جاؤ شاربہ۔'' میں گرجا۔

وہ ایک اہم کردار تھی، میں چاہتا تھا کہ وہ میری گرفت میں آ جائے اور میں اس کے سر پر رائفل کا بیرل رکھ کر جادو راسے اور چاولہ کے گماشتوں کو خود سے دور رکھ سکوں۔ مگر وہ نہیں رکی۔ اس کے یوں بھاگنے کا منظر میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ اپنے قدرے ڈھلکے ہوئے عریاں جسم کے ساتھ وہ اندھا دھند بھاگتی انتہائی مضحکہ خیز اور عبرت ناک لگ رہی تھی۔ نیچے ہال میں موجود کارندوں نے اسے اس حالت میں دیکھا اور چند ثانیوں کے لیے ساکت و جامد رہ گئے۔ وہ سیڑھیوں پر پہنچی تو شومئی قسمت اس کی لٹکتی ہوئی گلابی نائی اس کے پاؤں میں الجھی اور وہ چلاتی ہوئی سر کے بل نیچے کی طرف گئی۔ میں نے اسے ایک چوکور ستون کے کونے سے ٹکراتے ہوئے دیکھا جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فرش پر اس کے برہنہ جسم کی بے ترتیبی کا منظر اتنا بدنما تھا کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسلح کارندے جیسے ہوش میں آ کر میری طرف لپکے۔ میں نے ایک کی ٹانگ اور دوسرے کے پیٹ میں گولی ماری۔ بائیں طرف سے توپ خانے کا گراں قبولا توپ کے گولے کے مانند مجھ سے آ ٹکرایا۔ میں پہلو کے بل گیلری کے جنگلے سے ٹکرایا۔ یہ تصادم اتنا شدید تھا کہ جو ٹرپل نو میں نے تھام رکھی تھی اس کا میگزین جدا ہو کر نیچے ہال میں جا گرا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے رائفل کا آہنی دستہ قبولا کے منہ پر رسید کیا اور دوسرے کارندے کو جو رائفل سونت رہا تھا۔ کندھے کی دھتکیل سے گیلری سے نیچے گرا دیا۔ آٹھ دس سیکنڈ تک میرے اور تین چار کارندوں کے درمیان زوردار رن پڑا۔ ان کا واسطہ کسی عام بندے سے نہیں پڑا تھا اور یہ حقیقت وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں طیش کے ساتھ ساتھ خوف بھی نظر آتا تھا۔

یہی وقت تھا جب میں نے ہال کمرے سے باہر فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سنی۔ میرے سراپا میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اندر گھس چکے تھے۔ ایک تجربے کار عدے نے رائفل کو لٹھ کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر کو نشانہ بنایا۔ میں نے جھک کر اس کا وار بچایا اور اس کے ساتھ ہی فرش پر سے وہ تیز دھار چاقو اٹھالیا جو کسی کارندے کے ہاتھ سے چند لمحے پہلے گرا تھا۔ ایک کارندے کو گھائل کرتا ہوا میں سیڑھیوں کی جانب آیا اور تب مجھے وہ سنہری موقع مل گیا جس کی تلاش تھی۔ ایک کمرے کے اندر سے چاولہ بھائی گھبرایا ہوا برآمد ہوا اور سیدھا میری گرفت میں آیا۔ میں نے اسے دبوچ کر لمبے پھل کا تیز دھار چاقو اس کی شہ رگ پر رکھ کر اپنی پیٹھ دیوار سے لگالی۔

"خبردار جو کوئی آگے بڑھا۔" میری آواز ہال کمرے میں گونجی۔

دو رائفلیں میری طرف اٹھی کی اٹھی رہ گئیں اور تب میں نے باوردی اور سادہ پوش اہلکاروں کو ہال کمرے میں گھستے دیکھا۔ سادہ پوشوں میں عمران بھی شامل تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ سرکاری نہیں تھی بلکہ عمران نے ایک گیٹ کیپر سے چھینی تھی۔ یہ طاقتور کالاشکوف تھی اور یہی تھی جو کارروائی کے آغاز میں چھاپا پارٹی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا سکتی تھی۔

"ہینڈز اَپ..... ہینڈز اَپ۔" کی آوازوں سے ہال گونج اٹھا۔

تبھی سفاک چاولہ نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ وہ بڑی تیزی اور طاقت کے ساتھ پیچھے کی طرف گیا، میں عقب میں تھا، میرا سر بڑی شدت سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ آنکھوں میں تارے ناچے، چاولہ نے موقع غنیمت جان کر اپنی لمبی قمیص کے نیچے سے پسٹل نکال لیا، لیکن اسے چلانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہی۔ میں نے تو اپنے چاقو نما خنجر سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ خون فوارے کی طرح نکلا اور پچکاریاں نیچے ہال تک گئیں۔

یہ ایک زوردار ہنگامہ اور کامیاب چھاپا تھا۔ لیکن اس میں ایک ناکامی بھی تھی۔ جادو راے فرار ہو چکا تھا۔ اسے عمارت کے چپے چپے میں دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ میں، عمران، انسپکٹر زبیر اور انسپکٹر وحید برقاب تہ خانے میں بھی گھسے۔ مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ نہ ہی وہ پری چہرہ تھی جس کی دلکشی نے دو تین ماہ میں ہی اسے یوں اپنی زلفوں کا اسیر کیا تھا کہ وہ اس کے طوفانی عشق میں غرق ہو گیا تھا۔

تہ خانے میں ہمیں صرف ایک بے حس و حرکت جسم ملا۔ سردی میں اکڑا ہوا اور بدترین نمونیے کا شکار۔ وہ اپنے ضمیر کا قیدی "انوار گل" تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سر گود میں لیا۔ اس کا سر چوما۔ دو تین ایمبولینسز پہلے ہی عمارت کے باہر موجود تھیں۔ انوار گل کو فوراً اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ پولیس اہلکار کال کوٹھریوں اور پھانسی گھاٹ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

☆☆☆

اس کامیاب کارروائی نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ انڈر ورلڈ کے جرائم پیشہ چاولہ کی موت میڈیا پر بہت ہائی لائٹ ہوئی۔ کروڑوں کی جعلی اور ممنوعہ ادویات اس وسیع گودام سے پکڑی گئیں۔ ان میں نمونیہ اور چھاتی کے انفیکشن وغیرہ میں استعمال ہونے والے انجکشن کی ایک بہت بڑی کھیپ بھی تھی۔ اور بات صرف ایک لیکٹری اور گودام تک محدود نہیں رہی تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں اس نیٹ ورک سے منسلک اور بھی کئی چھوٹے بڑے "چاولے" دھر لیے گئے تھے، کچھ زیرِ زمین چلے گئے تھے۔

اس کارروائی میں چاولہ، یاور خاں اور شاربہ اکرام کے علاوہ قریباً چھ افراد ہلاک ہوئے اور کئی زخمی حالت میں پکڑے گئے۔ زخمی حالت میں پکڑے جانے والوں میں ہیبت ناک تہ خانے کا نگران متبول عرف قبولا بھی تھا۔ عمران نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ یہ خبیث ان جعلی پولیس اہلکاروں میں بھی شامل تھا جنہوں نے شروع میں جلو پارک سے ماہین اور عمران کو اٹھانے کی کوشش کی تھی اور نتیجے میں ایک ناکے پر ایک سنگین حادثہ رونما ہو گیا تھا۔ ڈلیوری بوائے کا روپ دھارنے والا کارندہ بھی زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔

اس ساری کارروائی میں عمران کا کردار بہت اہم تھا۔ مگر یہ اس کی اعلیٰ ظرفی اور مست حالی ہی تھی کہ اس نے ایک بار پھر یہ کریڈٹ نہیں لیا۔ جس طرح اُس رُوداد کے ایک ثانوی کردار پیر مخدوم کی ہلاکت کا کریڈٹ رانا صاحب کے بھتیجے وحید گوندل کو دے دیا گیا تھا۔ اس طرح یہ کارروائی بھی مکمل طور پر انسپکٹر وحید گوندل اور انسپکٹر زبیر کے کھاتے میں ڈال دی گئی۔ کچھ کریڈٹ قرار واقعی طور پر ایس ایس پی جمشید صاحب اور ایک ایبٹ آبادی آفیسر ریحان شاہ عباسی کو بھی ملا۔ یہ نکمانہ مجبوریاں شاید عام قارئین کے لیے دلچسپی کی حامل نہ ہوں۔

اب درمیان سیدھا اس رُوداد کے اہم ترین کردار

جادو رائے کی طرف جاتا ہے۔ وہ جس کے ہاتھ بے شمار لوگوں کے خون سے رنگے تھے۔ شاید ان مکروہ ہاتھوں پر لہو کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہو جاتا اگر ہم بروقت یہ کارروائی نہ کر پاتے اور ایکسپائر ڈائجسٹ کی اس بہت بڑی کمیپ کو استعمال ہونے سے روک نہ لیتے۔

وہ کہاں گیا تھا، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ کارروائی کو اب چار روز ہونے کو آئے تھے۔ میں اور عمران ایبٹ آباد ہی کے ایک ہوٹل میں موجود تھے اور تلاش کی کارروائیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ جمشید صاحب سے ہمارا مسلسل رابطہ تھا۔ عمران بولا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ گھنا باسٹرڈ اپنی دلربا کے ساتھ قبائلی علاقے کی طرف نکل گیا ہو؟''

''نہیں عمران بھائی۔'' انسپکٹر زبیر نے جواب دیا۔ ''ان راستوں پر تو سخت ناکا بندی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ وہ سلور رنگ کی ہنڈا گاڑی پر نکلا ہے اور وہ گاڑی ابھی تک ملی نہیں ہے۔''

عمران بولا۔ ''کتنا اچھا ہو کہ اس گاڑی کا کہیں ایکسیڈنٹ ہوا ہو۔ اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے رائے کی نابینا محبوبہ کی بینائی لوٹ آئی ہو۔ بینائی لوٹتے ہی اس نے خوف زدہ ہو کر رائے کے جبڑے پر تھپڑ دے مارا ہو اور الامان پکارتی بھاگ گئی ہو۔ بعد ازاں دل برداشتہ ہو کر رائے نے پرماتما ہتھیا کر لی ہو۔''

''پرماتما ہتھیا نہیں آتما ہتھیا۔'' میں نے تصحیح کی۔

ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ زبیر کے فون پر اہم کال موصول ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اثباتی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ کال ختم کر کے وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''عمران بھائی! آپ تو پہنچے ہوئے ہیں۔ ابھی آپ نے رائے کے کار ایکسیڈنٹ کی بات کی اور وہ ہو گیا۔''

''کہاں..... کب؟'' میں اور عمران ایک ساتھ بولے۔

''ہری پور سے کچھ فاصلے پر۔ ایک روکڑی نام کے گاؤں کے پاس۔ کار سامنے سے پچک گئی ہے لیکن یہ سلور ہنڈا نہیں ہے، گرے مہران ہے جو کسی سے چھینی گئی ہے۔ جادو رائے کو تو مقامی پولیس نے پہچان لیا ہے اور پکڑ لیا ہے۔ اس کی ساتھی ''نابینا چاندنی'' جانبر نہیں ہو سکی۔''

میں اور عمران فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں اب ہری پور جانا تھا۔

☆☆☆

درحقیقت جادو رائے اپنی کوتاہ قامتی اور ''خصوصی'' شکل وصورت کے سبب ایکسیڈنٹ سے پہلے ہی پہچان لیا گیا تھا۔ وہ کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔ دو موٹر سائیکل سوار اہلکار اس کے پیچھے لگ گئے۔ تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے اس نے گاڑی ایک درخت سے ٹکرا دی۔ چاندنی موقع پر ہی ہلاک نہیں ہوئی تھی۔ اسے جائے حادثہ پر طبی امداد دینے کی کوشش کی گئی پھر ہری پور روانہ کیا گیا لیکن وہ راستے میں ہی دم توڑ گئی۔ شاکر عرف جادو رائے کا بھی ایک بازو ٹوٹا تھا اور سر پر چوٹیں آئی تھیں۔ سر کی چوٹوں کے سبب وہ ''اول فول'' بول رہا تھا۔

اسے اسپتال کے بیڈ پر دیکھ کر عمران نے کہا۔ ''چاچو جی الگتا ہے کہ جسمانی چوٹ سے زیادہ اسے روحانی چھترول کی تکلیف ہے۔ اس کی چاندنی چھن گئی ہے۔ بڑی بات نہیں کہ اس دکھ سے مر جائے۔''

مقام عبرت تھا۔ بے شمار کالے دھن کا مالک جو پانچ چھ روز پہلے اپنی نوخیز محبوبہ پر لاکھوں ڈالر نثار رہا تھا، اب ہری پور کے چھوٹے سے اسپتال میں ہتھکڑی سے جکڑا پڑا تھا اور جسمانی و روحانی کرب سے ماہی بے آب کی طرح پھڑک رہا تھا۔ سر اور پیشانی کی چوٹوں نے اس کی بدنمائی کے لیے ''سونے پر سہاگے'' کا کام کر ڈالا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ ہیجانی کیفیت میں بار بار کسی چاندنی کا نام لیتا ہے۔

چاندنی کے بارے میں ہمیں اتنا معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے کسی لوئر مڈل گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سر راہ شاکر عرف جادو رائے کی نظروں میں آئی اور پھر یوں ہوا کہ جادو پر جادو چل گیا۔ وہ کچھ اس انداز سے اس پر فریفتہ ہوا کہ بہت کچھ لٹانے کو تیار ہو گیا۔ چند ہی ہفتوں میں چاندنی کے بھائی بھائیوں اور اس کے سوتیلے والد کی زندگیاں بدل گئیں اور اس کے ساتھ ہی چاندنی کی زندگی بھی بدل گئی اور پھر اتنی بدلی کہ وہ قبرستان میں چلی گئی۔ مبینہ طور پر وہ خود بھی کسی حد تک آرام آسائش کی زندگی چاہتی تھی جیسا کہ میں نے بتایا ہے مقبول عرف قبولا، پولیس کسٹڈی میں تھا اور اس سے لگاتار تفتیش ہو رہی تھی۔ اس حوالے سے ایک نکتہ مجھے مسلسل الجھن میں ڈال رہا تھا۔ جوں جوں ٹائم گزر رہا تھا، یہ نکتہ میرے لیے مزید قابل غور ہو رہا تھا۔ قبولا نے تقریباً ہر بات قبول کی تھی، اس نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ جلو پارک کی اس دھند آلود شام میں ماہین اور عمران کو اٹھانے کی کوشش کرنے والوں میں وہ شامل تھا۔ وہ یہ بھی مانتا تھا کہ جب ناکے پر ایکسیڈنٹ ہوا اور اے ایس آئی سلیم کچلا گیا تو وہ

موقع سے قریباً پچاس میٹر کی دوری پر موجود تھے۔ ڈاکٹر ماجد اور مقصود سے اپنے گروہ کا تعلق بھی اس نے قبول کیا لیکن وہ یہ بالکل نہیں مانا کہ مقصود کو فوٹیج چھپانے اور ڈاکٹر ماجد کو غلط پوسٹ مارٹم رپورٹ بنانے کے لیے گروہ کے لوگوں نے کہا تھا۔ وہ یہ بھی بتانے سے قاصر تھا کہ مقصود اور ڈاکٹر ماجد سے ملنے والا کرائم رپورٹر عدنان رفیع اچانک کہاں غائب ہو چکا ہے۔ باقی گرفتار افراد بھی قبولے کی تائید کرتے تھے۔

مخبوط الحواس جادو راے کو ہری پور سے لاہور کے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ ہم بھی لاہور واپس آ گئے۔ لاہور جہاں سردی تو تھی مگر ہڈیوں میں گودا جمانے والی نہیں تھی۔ جنوری کی شامیں گلابی اور دل آویز تھیں۔ باغیچوں میں گل داؤدی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ایسی ہی شام کو میں ایزی چیئر پر ثروت کی تصویر کے سامنے بیٹھا تھا۔ بہت عرصے بعد لگ رہا تھا کہ ثروت کی تصویر دیکھتے ہوئے میرے دل و دماغ پر جو ایک بوجھ سا پڑ جاتا تھا، وہ بہت کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

قریبی گلی میں بچوں کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔ یہ ویک اینڈ کی شام تھی۔ ایسی شاموں میں یہ چہکاریں اور بھی سُریلی ہو جاتی ہیں۔ میں نے سوچا ان گنت گلیوں میں ایسی ہی بے شمار چہکاریں گونج رہی ہوں گی۔ خدا کرے ان چہکاروں کو کبھی کسی راے جیسے کی نظر نہ لگے۔ میں نے اپنی بچھڑی ساتھی کی تصویر کی طرف دیکھا۔ لگا جیسے ان لمحوں میں وہ بھی یہی سوچ رہی ہے۔

ایک آہٹ پر میں چونکا۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ مابین مجھ سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہ ہمارے پل پل سے باخبر رہی تھی۔ اپنے یوٹیوب چینل پر اس نے دیہی علاقوں میں جعلی ادویات کے اس مکروہ دھندے کے خلاف باقاعدہ مہم چلا دی تھی۔

وہ خوش نظر آتی تھی۔ حشام کے ساتھ اس کی معافی تلافی ہو چکی تھی اور اب وہ اس سے رشتہ برقرار رکھنے کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی۔ تاہم عمران کے لیے اس کے دل میں انسیت کا جو خاص جذبہ تھا، وہ اپنی جگہ موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''انکل تابی! جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے، اس ساری کارروائی میں عمران کا کردار اہم ترین رہا ہے مگر بیڑ مخدوم والے واقعے کی طرح یہ کریڈٹ بھی رانا صاحب کے بھانجے کی جھولی میں ڈال دیا گیا ہے۔''

''ان باتوں کو تم نہیں سمجھو گی مابین۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔''

''عمران نے کیا پایا اس میں؟''

میں مسکرایا۔ ''کم از کم اتنا تو ہو گا کہ اس پر جو کیس بنے ہوئے ہیں وہ جلد انجام کو پہنچ جائیں گے۔''

''یہ ناانصافی ہے انکل.....'' پھر جیسے اسے ایک دم کچھ یاد آیا۔ حسبِ عادت اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر بولی۔ ''وہ جو گھڑی والی بات میں نے سنی ہے وہ واقعی درست ہے؟ میرا مطلب ہے عمران نے اپنے والد کی کوئی پرانی گھڑی آپ کو نشانی کے طور پر دی..... اور پھر اس گھڑی کی وجہ سے.....''

''ہاں مابین۔'' میں نے جیب سے وہ گھڑی نکال کر اسے دکھائی۔

وہ بڑے اشتیاق سے اس کا معائنہ کرنے لگی۔ میری طرح اس نے بھی گھڑی کو سونگھا، جیسے عمران دانش کی خوشبو لینے کی کوشش کی ہو۔ میرے تاثرات دیکھ کر ذرا جھجکی۔ ''انکل تابی..... یہ واقعی..... عمران دانش صاحب کی گھڑی ہے نا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں مابین! یہ بھی عمران کی ہوشیاریوں میں سے ایک ہوشیاری ہے۔ یہ اس نے ندیم ٹاؤن میں اپنے ایک دوست سے چھ سو روپے میں حاصل کی تھی مگر چھ سو کی اس گھڑی میں اس نے کوئی دو لاکھ کا ڈیوائس انسٹال کروایا اور خطرہ بھانپتے ہوئے، میری کلائی پر باندھ دی۔''

وہ ایک لمحے توقف کے بعد بولی۔ ''انکل تابش! عمران غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ کاش ہم اس کی وہ قدر کر سکتے جس کا وہ حق دار ہے..... مگر انکل..... اس ڈیوائس کے لیے اتنا روپیہ عمران کے پاس آیا کہاں سے؟''

''اس کا دوست جگجیت سنگھ جو کاروباری ہے، لاہور میں ہی ہے۔ روپے کا انتظام اُس نے کیا تھا۔''

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ تو خود بھی کروڑپتی ہے۔ ایسی ایک نہیں ایک سو گھڑیاں تیار کرا سکتا ہے۔''

اسی دوران میں سوٹڈ بوٹڈ حشام بھی وہاں آ دھمکا۔ وہ سائے کی طرح مابین کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ اپنے والد صاحب کو بھی پھر سے اپنے اور مابین کے رشتے پر آمادہ کر چکا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر پتا نہیں کبھی کبھی مجھے کیوں لگتا تھا کہ مابین کے اندر، حشام کے حوالے سے وہ پہلا سا جوش و خروش موجود نہیں ہے۔ کسی وقت وہ حشام کے حوالے سے کسی دوراہے پر کھڑی نظر آتی

تھی ..... بہرطور ایک بہاؤ تھا جس میں وہ بہتی چلی جارہی تھی، اور اس کی شادی کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔

ایک دن پہلے مجھے ماہین کی بڑی بہن شاہین کا فون آیا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی اُلجھن کا شکار نظر آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''نابش صاحب! کسی وقت مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد حشام بالکل بدل جائے۔ ماہی نے ایکسیڈنٹ کی ذمے داری خود قبول کر کے ایک بڑی جسارت کی تھی۔ پتا نہیں، حشام نے اس کی یہ جسارت دل سے معاف کی ہے یا نہیں؟'' میں نے اسے تسلی دی تھی اور دور دراز کے اندیشوں کو دل میں جگہ نہ دینے کا کہا تھا مگر سچ یہی تھا کہ میرا اپنا دل بھی مطمئن نہیں تھا۔

وہ شام کچھ دیر سے آئی مگر ایسی آئی جس نے ہم پر بہت کچھ آشکار کر دیا۔ ماہین کی شادی سے صرف پانچ چھ روز پہلے کی بات ہے۔ ہمارے ایس ایس پی رفاقت رانا صاحب جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے (خاص طور سے مجھے تو بالکل بھی نہیں) اب عمران کی وجہ سے کچھ نرم پڑے ہوئے تھے۔ ان کے بھانجے وحید کو ہراکریڈٹ مل گیا تھا۔ تعریفی اسناد ملی تھیں اور پروموشن کی توقع بھی تھی۔ انہوں نے مجھے اور عمران کو گوجرانوالا میں کھانے پر بلایا..... مقامی کھانوں اور مشہور چیزوں وغیرہ سے ہماری تواضع کی۔ اس کے بعد میں اپنے ایک دوست سے ملنے قریبی شہر گجرات چلا گیا۔ عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ گجرات سے ہم رات بارہ بجے کے قریب واپس ہوئے۔ گجرات کی ایک زیرِتعمیر سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ ہم ایک دوسری بڑی سڑک پر ہو لیے۔ مگر یہاں بھی وہی صورتِ حال تھی۔ یکایک کھڑی گاڑی میں سے ایک شاپنگ مال کا منظر دیکھ کر میں بے طرح چونک گیا۔ ایک بڑے ریستوران کی جگمگاتی کھڑکی میں مجھے دو افراد نظر آئے۔ وہ ایک میز پر کچھ کھا رہے تھے اور بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ماہین کا منگیتر حشام اور دوسرا گمشدہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع تھا۔ دونوں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے، جیسے ہلکے سے نشے میں ہوں۔

میرے دماغ میں بجلی کی سی چھوٹی اور اس کی روشنی میں چند سیکنڈ کے اندر بہت کچھ عیاں ہو گیا۔ وہ گتھی تقریباً سلجھ گئی جو مجھے مسلسل اُلجھن میں ڈالے ہوئے تھی۔ فوٹیج کو غائب کرنے والے مقصود اور فلط رپورٹ بنانے والے ڈاکٹر ماجد سے رابطہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع نے کیا تھا اور عدنان کا دوستانہ حشام سے ثابت ہو رہا تھا۔ یعنی حشام ہی تھا جس نے عمران کو اے ایس آئی کا قاتل ثابت کرنے اور پھنسانے کی اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔

عمران بھی یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ اس نے بھی کرائم رپورٹر عدنان کی بہت سی تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ ہم حیران نظروں سے ایک دوجے کو تکتے رہے۔ ہم نے ٹریفک جام میں سے گاڑی نکال کر ریستوران کے قریب ہی روک دی۔ میں نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کیا اور اپنا تعارف کرا کے فوراً ایک پولیس موبائل موقع پر بلالی۔ میرا ارادہ تھا کہ جب کھانے کے بعد حشام اور عدنان رفیع علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تو عدنان کو تحویل میں لے لیا جائے۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میرے اور عمران کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ میں حشام اور عدنان کے تعلق کو پوری طرح ثابت کرنا چاہتا تھا مگر عمران راضی نہیں تھا۔

''چاچو جی! بات تو ساری، ہماری سمجھ میں آگئی ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ حشام نے جو کیا بُرا کیا۔ مگر اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ ماہین کو بہت چاہتا ہے۔''

''لیکن میرا خیال مختلف ہے۔ وہ ماہین کو نہیں اپنی ضد کو چاہتا ہے۔ اس کا کردار واضح ہونے کے بعد بھی ہم چپ رہیں گے تو مطلب یہ کہ ہم ماہین کی زندگی خراب ہونے کا خطرہ مول لیں گے۔''

''ماہین کی زندگی تو یوں بھی ڈسٹرب ہو گی۔ ایک بار پھر یہ سارا معاملہ اُچھلے گا۔ خبروں میں آئے گا۔ پوچھا جائے گا کہ حشام کیوں میرے اس قدر خلاف تھا۔ وغیرہ وغیرہ، اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں، یہ بگڑے لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ عدنان رفیع کو گرفتار کر کے بھی کچھ ثابت نہ کر سکیں۔''

''یہ بعد کی باتیں ہیں عمران۔ اور تمہاری پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ سچ کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اور ماہین پہلے بھی یہ قیمت ادا کرنے سے نہیں ڈری۔''

''چلیں فرض کریں آپ نے حشام اور عدنان رفیع کا گٹھ جوڑ ثابت کر بھی دیا نتیجے میں حشام اور ماہین کی شادی رک بھی گئی تو کیا ہو گا؟ آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ آپ کے اس ناکارہ بھتیجے کی منکوحہ بن جائے گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا چاچو، وہ مجھے اس نظر سے دیکھتی ہی نہیں ہے۔''

''چلو نہ دیکھے۔ مگر یہ تو ہو گا کہ وہ کسی ضد اور انتقام کی بھینٹ نہیں چڑھے گی۔ تم پرانی سوشل فلموں کے ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ قربانی، ایثار وغیرہ کی تاریخ رقم کرنے کے چکر میں ہو، لیکن میں چپ نہیں رہ سکتا۔'' پھر چند سیکنڈ

کے توقف سے میں نے کہا۔ ”چلو، اس عدنان رفیع کو پکڑنے یا نہ پکڑنے کے بارے میں بعد میں سوچا جا سکتا ہے لیکن کم از کم ماہین اور اس کی بڑی بہن شاہین کو تو میں یہ سب کچھ ضرور بتانے جا رہا ہوں۔“

”اب..... اس کام کے لیے بہت دیر نہیں ہو گئی، چاچو، چند دن بعد تو.....“

”اچھے کام کے لیے کبھی دیر نہیں ہوتی۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

ہمارے درمیان کافی بحث ہوئی۔ وہ قائل تو نہیں ہوا مگر گم صم سا ضرور ہو گیا۔

میں نے عدنان رفیع کو پکڑوایا نہیں۔ تاہم وہ جس سوزوکی کار میں ریستوران پہنچا تھا اس کا نمبر وغیرہ نوٹ کروا لیا۔

لاہور پہنچ کر اگلے روز صبح میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ شاہین کو فون کیا اور اسے تمام صورت حال بتا کر معاملہ اس پر چھوڑ دیا۔ یہ سب کچھ شاہین کے لیے بھی بہت حیران کن تھا (وہ بھی جانتی تھی کہ جب کچھ عرصہ پہلے عدنان رفیع کے حوالے سے حشام اور اس کے والد سے پوچھا گیا تو دونوں نے بتایا تھا کہ وہ اس نام کے کسی بندے کو نہیں جانتے)

اسی رات دس بجے کے لگ بھگ مجھے شاہین کے ذریعے ہی فون پر یہ اطلاع ملی کہ دونوں فیملیوں کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ حشام کے والد وہاب اور ماہین کے تند مزاج چچا ثاقب کے درمیان شدید تلخ کلامی ہوئی ہے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتے پہنچتے رہی ہے۔ شوگر لیول بہت گر جانے کی وجہ سے حشام کے والد وہاب قادر کو کئی گھنٹے اسپتال میں گزارنا پڑے ہیں۔ (یہی شخص تھا جس نے پولیس کسٹڈی میں عمران کو تھپڑ مارا تھا) شاہین کی اطلاع کے مطابق شادی ملتوی کر دی گئی تھی تاہم جو کچھ وہ بتا رہی تھی اس سے عیاں تھا کہ شادی صرف ملتوی نہیں ہوئی بلکہ ختم ہو گئی ہے۔

پتا نہیں کیوں میرا دل اس موقع پر گواہی دینے لگا کہ قدرت عمران کی غیر معمولی محبت کو پذیرائی بخش رہی ہے..... اور اس کے لیے کچھ نئے امکانات کے در وا ہو رہے ہیں مگر ایک منفی امکان یہ بھی تھا کہ وہ یہاں سے جانا چاہے گا۔

اس رُوداد کے آخر میں، میں بتانا چاہوں گا کہ بدشکل و بدخصلت جادو راے کا یہ انجام کیوں اور کیسے ہوا تھا (وہ اسپتال میں تھا اور پچانوے فیصد تک ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ اس کی اس حالت کا اصل سبب چاندنی کی حادثاتی موت ہی تھی۔ اگر وہ صحت یاب ہو بھی جاتا تو پھانسی کا پھندا یقینی طور پر اس کا منتظر تھا)

درحقیقت چاندنی کی موت انہی جعلی دواؤں کی وجہ سے ہوئی جو جادو راے کا گروہ مضافاتی علاقوں میں پھیلاتا تھا لیکن یہ موت جعلی دوا کھانے سے نہیں ہوئی..... جعلی دوا کے خوف سے ہوئی۔ یہ واقعہ عبرتناک ہے۔ جادو اور چاندنی کی کار کا حادثہ ایک دیہی علاقے میں ہوا تھا۔ حادثے کے بعد چاندنی شدید زخمی ہوئی تھی۔ اس کو اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ سر اور ریڑھ کی چوٹ کی وجہ سے اس کے باڈی سسٹم میں کچھ ایسا تغیر ہوا تھا کہ اس کا بلڈ پریشر تیزی سے بڑھتا چلا گیا تھا۔ اسے نازک حالت میں پاس ہی واقع دیہی ڈسپنسری میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا وہ اس کا بلڈ پریشر دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ اس بلڈ پریشر میں ہارٹ اٹیک ہوتا ہے یا دماغ کی نس پھٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے بلڈ پریشر گرانے کے لیے چاندنی کو ”کیپوٹین“ کھلانا چاہی۔ جادو راے نے ایسا نہیں کرنے دیا تھا۔ نہ ہی اس نے ڈاکٹر کو کوئی انجکشن لگانے دیا۔ بس وہ یہی چلاتا رہا۔ ”اس کو شہر پہنچاؤ، اس کو ہری پور پہنچاؤ۔ یہاں اس کو کوئی دوا نہیں دینی۔“

حالانکہ اگر چاندنی پر سے موت نے ٹلنا ہوتا تو وہ ادویہ جعلی نہیں تھیں۔ درحقیقت شاکر عرف جادو راے کا اندرونی خوف اور اس کے دل کا چور ہی چاندنی کی جان لے گیا تھا، وہ شہر کے راستے میں ہی دم توڑ گئی تھی۔

قدرت کو اس کے ہدف تک پہنچنے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کرا سکتی ہے۔ جادو راے نے بھی اپنی دانست میں اپنے لیے مکافاتِ عمل کے راستے بند کر دیے تھے۔ مبینہ طور پر کسی فقیر کی بددعا کے بعد اس نے اپنا کوئی ایسا رشتہ بننے ہی نہیں دیا تھا جس کی تکلیف سے اس کو تکلیف ہوتی..... مگر یہ رشتہ چاندنی کی صورت میں بنا تھا اور آناً فاناً بنا تھا اور پھر اُس کے مرنے سے راے کو وہ تکلیف بھی ہوئی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں..... ہاں قدرت کو اور مکافاتِ عمل کو اپنے ہدف تک پہنچنے سے کون روک سکتا ہے؟ ہر جادو راے اور جادو لے کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے..... اس پر یقین کر لینا چاہیے۔ جب بھی کوئی معصوم ندیم کسی ظلم کا نشانہ بن کر اپنے والدین کی بانہوں میں دم توڑے گا، جب بھی کوئی ثروت بے موت مرے گی اور جب بھی کوئی انیلا آغا جرم بے گناہی میں تختۂ دار پر جھولے گی، خدا کی لاٹھی ضرور حرکت میں آئے گی..... آ کر رہے گی۔

❖❖❖

قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح..... ٹوٹے ہوئے دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حسینہ کی پرفکر داستان

شکست کی فتح

طاہر جاوید مغل

زندگی کی بساط پر ایک ایسا اسرار چھپا ہے جسے کوئی چاہے یا نہ چاہے... کھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اناڑی بازی مات کرلیتے ہیں... یہ بھی ایک ایسی اسرار بھری گرہ ہے جسے شاید کھولنا آسان نہیں۔ جو جتنا بڑا بے ایمان ... اتنا ہی بڑا فنکار۔ وہ بھی اپنے پرائیوں کے درمیان دوڑتے دوڑتے ہار گئی... اگرچہ انسان کے تصورات اور بلند خیالات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر... معاشرے میں رہنے اور ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے کچھ حدود و قیود کا نفاذ از حد ضروری ہوتا ہے البتہ ... حدود اور قید میں کچھ فرق بھی ہونا ضروری ہے ورنہ انسان پنجرے میں قید طائر کے مانند بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی جسارت کر ڈالی اور بلند پرواز کی خواہش میں اپنے مسکن سے جدا ہو گئی... لیکن یہ عارضی جدائی نہ صرف اسے بلکہ اس کے خون کے رشتوں کو بھی زندگی کی باریکیاں سمجھا گئی کہ ہر ایک کی زندگی کا مقصد جدا اور انفرادی ہوتا ہے جسے ہر حال میں اسے پورا کرنا ہوتا ہے... چاہے کوئی مانے نہ مانے اسے حق دینا پڑتا ہے اور جب کوئی نہ دے تو چھین لینے کی جسارت بھی ضروری ہے کیونکہ حق کے لیے اڑ جانا بغاوت نہیں سعادت ہے۔





وہ دسمبر کے چوتھے ہفتے کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ بے حد تاریک، بے حد سرد اور بارش میں بھیگی ہوئی۔ کبھی کبھی بجلی زور سے چمکتی تھی اور کچھ ہی دیر بعد بادل دھاڑنے لگتے تھے لیکن بادلوں کی دھاڑوں کے علاوہ بھی کچھ دھاڑیں تھیں جو در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ نور، جس کا پورا نام عین النور تھا۔ ان دھاڑوں کو سنتی تھی تو سرتاپا لرز جاتی تھی۔ یہ انسانوں کی دھاڑیں تھیں، وحشی انسانوں کی دھاڑیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقص کررہے تھے اور انہوں نے اس قدیم حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار حویلی کے مضبوط چوبی پھاٹک پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ کی کوشش تھی کہ وہ دیواروں پر بانس کی لمبی سیڑھیاں لگا کر اندر گھس جائیں اور کچھ ایک دوسرے کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر بیرونی دیوار کے بالائی کنارے تک اپنے ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حویلی میں موجود لوگ اندر سے ان پر خشت باری کرتے تھے، یا پھر طویل لاٹھیوں کے ذریعے انہیں بیرونی دیوار پر سے دھکیل کر نیچے گرا دیتے تھے۔

حویلی میں موجود تمام عورتیں ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس کمرے سے باہر مسلح پہرے دار موجود تھے تاہم ان کے چہرے بھی حالات کی سنگینی کے سبب تاریک دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ ان میں چھ سات نوجوان لڑکیاں تھیں، باقی درمیانی عمر کی یا بڑی عمر کی خواتین تھیں۔ تیئیس سالہ نور بے دم سی ہوگئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ایک قیامت ان کے سر پر ہے اور کسی بھی وقت ان پر ٹوٹ سکتی ہے۔

باہر سے کسی شرابی شخص کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔

"اوئے مولوی مہرا! ہم منڈے کو سہرا باندھ کر لائے ہیں۔ تیری دھی کو ہمارے ساتھ جانا ہی جانا ہے۔ زندہ یا پھر مردہ۔ اب بھی وقت ہے سوچ لے..... تیرے حق میں چنگا یہی ہے کہ اس کو تیار کردے۔"

نور نے دیکھا، اس کے والد مولوی اشفاق مہرا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ، جیسے کمرے کی پرانی دیوار پر لرز رہا تھا۔ اسی اثنا میں ان کا بوڑھا ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ تھا جس میں سرخ رنگ کا کوئی کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ بوڑھے ملازم خدا بخش نے نور کے والد سے مخاطب ہوکر کہا۔ "مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔" خدا بخش کی آواز لرز رہی تھی۔

نور کے والد نے لفافہ لے کر سرخ جوڑے کو ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔ مخمل پر چمکیلا کام تھا اور یہ واضح طور پر دلہن کا لباس نظر آتا تھا۔ اشفاق مہرا نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا اور بے دم سے ہوکر قالین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی نور ہی کی طرح دیوار سے ٹیک لگالی۔ پاس ہی نور کی بڑی بہن بسمہ بھی بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا۔ اس نے باپ کے بازو کو یوں تھام رکھا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا کنارے کو تھامتا ہے۔

اسی دوران میں نور کی والدہ زلفت بیگم اندر داخل ہوئیں۔ وہ نور اور بسمہ کی سگی والدہ تو نہیں تھیں مگر آفت کی اس بھیانک گھڑی میں ان کا چہرہ بھی درد کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فرش پر گرا ہوا سرخ جوڑا اٹھالیا اور پھر بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آبیٹھیں۔ انہوں نے بڑی نرمی سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بوڑھے ملازم خدا بخش کی طرف دیکھا۔ وہ مالکن کا اشارہ سمجھ کر باہر نکل گیا۔ زلفت بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "مہرا صاحب! یہاں کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔"

"تو کس طرح کروں میں اپنی مدد آپ؟" مولوی اشفاق مہرا نے زخمی آواز میں کہا۔ "اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کردوں؟ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے..... اپنے کلیجے ٹھنڈے کرلو۔"

"نہیں مہرا صاحب! لیکن ..... جو کچھ بھی ہورہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی....."

"اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟" اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"مہرا صاحب! کچھ بھی ہے..... وہ لوگ ..... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اگر ان سے صلح کی بات ہوجاتی ہے تو پھر وہ پورے طریقے سے اور عزت کے ساتھ اپنی بسمہ کو لے کر جائیں گے..... ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں بلکہ ابھی ان سے ہر طرح کی لکھت پڑھت بھی ہوسکتی ہے لیکن....." زلفت بیگم کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔

بادل ایک بار پھر زور سے گرجا اور اس کی آواز، باہر سے بلند ہونے والے للکاروں اور دھاڑوں میں گڈمڈ ہونے لگی۔

زلفت بیگم نے ہمت جمع کر کے اپنی بات مکمل کی..... ''لیکن اگر خدانخواستہ..... خدانخواستہ..... یہ لوگ اندر گھس آئے اور..... دو چار اموات ہوگئیں..... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہوجائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

بسمہ نے سہمی ہرنی کی طرح نور کی طرف دیکھا اور اس کی گرفت اپنے باپ کے بازو پر کچھ اور سخت ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن زرد دکھائی دینے لگے تھے اور ایسی ہی زردی اس کے ریشمی رخساروں پر بھی کھنڈی تھی۔ وہ خوش شکل تھی۔ اس کے جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ کنگھی کیے ہوئے لمبے بال چوٹی کی صورت میں کمر کی طرف گئے ہوئے تھے مگر ابتلا کے ان لمحوں میں وہ بالکل بے ترتیب اور ہراساں تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح محفوظ پناہ گاہ میں گھس جانا چاہتی تھی جس پر نکیلے پنجوں والا عقاب جھپٹ رہا ہو۔

مولوی اشفاق مہرا کی خاموشی دیکھ کر زلفت بیگم کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے بوڑھے ملازم خدا بخش کو آواز دی۔ وہ مؤدب انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ زلفت بیگم نے کہا۔ ''خدا بخش! تم برآمدے والی بیٹھک خالی کرواؤ..... اور بھائی جی سے کہو کہ ان لوگوں سے کل بات کرنے کے لیے، ان میں سے تین چار بندوں کو اندر بلالیں۔ پر کسی کے پاس کوئی ہتھیار شتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

اس موقع پر اشفاق مہرا نے کچھ کہنا چاہا مگر بس، ان کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے تین چار گھنٹے کی جان لیوا کشمکش نے انہیں اندر سے بالکل توڑ ڈالا ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔

یہی وقت تھا جب انگریزوں کے زمانے کی اس دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔ یوں لگا کہ ناتک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی کوئی بڑی دیوار مسمار ہوکر گری ہے۔ اس دھماکے نے کمرے میں موجود خواتین کو چلّانے پر مجبور کردیا۔ بسمہ بھی دہشت زدہ ہوکر باپ سے چمٹ گئی۔ مولوی مہرا خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ ملازم خدا بخش ان کے ساتھ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواروں کے قریب شوروغل میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ لکڑی اور لوہے کے مضبوط پھاٹک کو توڑنے کی کوششیں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ چھت پر سے کی جانے والی خشت باری میں بھی تیزی آگئی تھی۔

سہمی ہوئی خواتین رو رہی تھیں اور ان میں سے کئی ایک کے ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلتے چلے جارہے تھے۔ زلفت بیگم نے بسمہ کو اپنے گلے سے لگالیا اور اس کا منہ سر چومنے لگیں۔ وہ بے چاری سرتاپا کانپ رہی تھی۔ نور کی خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے اسے بانہوں میں لے کر لکڑی کی ایک چوکی پر بٹھایا۔ خالہ عریفہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''نہ میری دھی، اتھرو پونچھ لے..... بیٹیاں ہمیشہ اپنے ماں پیو کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔ دیکھنا رب سوہنا تیری مدد کرے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اج کے ویری کل تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے..... ساری مصیبتیں دفع دور ہوجائیں گی۔''

زلفت بیگم نے ایک ملازمہ لڑکی کو خفیف اشارہ کیا۔ وہ دھیمے قدموں سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پیلا دوپٹا تھا اور مٹی کا ایک بڑا سا روغنی پیالہ تھا۔ پیالے میں گھلی ہوئی مہندی تھی۔ خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے دوپٹا بسمہ کے جھکے ہوئے سر پر ڈال دیا۔ وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

نور نے اپنی بڑی بہن کی حالت دیکھی اور سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ شاذ و نادر ہی روتی تھی۔ رونا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا لیکن آج جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو گرم آنسوؤں کی دھاریں سی اس کے سرد رخساروں پر بہہ نکلیں۔ وہ جیسے اندر سے چکنا چور ہورہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا، اس سے تھوڑی دور فرش پر تانبے کی ایک گول طشتری پڑی تھی۔ اس طشتری میں مٹی کے قریباً ایک درجن دیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی روشن نہیں تھا۔ کچھ دیے اوندھے اور کچھ سیدھے تھے۔ نور کی دادی ان کے قریب افسردہ بیٹھی تھی۔ اس تنہا حویلی سے باہر درختوں اور جھاڑیوں پر اور اونچے نیچے ٹیلوں پر اور بارشی نالے کے کناروں پر بجلی چمک رہی تھی اور بادل دھاڑ رہے تھے..... مگر حویلی کی بیرونی دیوار کے قریب سے بلند ہونے والی دھاڑیں اب ماند پڑگئی تھیں۔ خشت باری کی آوازیں بھی معدوم ہوگئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ..... حویلی کی چھوٹی بیٹھک میں بات چیت شروع ہوگئی ہے۔ نور سوچنے لگی۔

کیا یہ بات چیت کامیاب ہوسکے گی؟

کیا وہ قیامت ٹل جائے گی جو دسمبر کی اس طویل رات میں اس حویلی کی دیواروں کے باہر منڈلا رہی تھی؟

کیا مہرا خاندان کی عزتیں بچ جائیں گی؟

کیا اپنی عزت و آبرو کا دفاع کرتے ہوئے اس کے ابا، اس کے تایا، اس کے دونوں ماموؤں اور بہنوں بھائیوں کو اپنی جانیں نہیں گنوانا پڑیں گی؟

سوال تو بہت تھے لیکن جواب کوئی نہیں تھا۔

عین النور نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور خود کو اردگرد کے ماحول سے کاٹنے کی کوشش کرنے لگی..... اور وہ اکثر ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ سب سے الگ تھلگ..... کم گو..... اپنی ہی سوچوں میں گم رہنے والی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے .....نور کو نیند تو نہیں آئی مگر ایک تھکن سی اس پر طاری ہونے لگی۔ اس تھکن نے اس کی شدید ترین تشویش اور گھبراہٹ کو کسی حد تک کم کر دیا تھا..... ویسے بھی وہ نسبتاً مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسے حالات سے لڑنا آتا تھا..... یہ اور بات ہے کہ ایسی لڑائیوں میں وہ بہت مرتبہ ہاری بھی تھی ..... وہ سوچنے لگی..... وہ اس ہولناک رات تک کیسے پہنچی ہے؟ کس طرح کے واقعات نے کس طرح کا رخ اختیار کیا کہ آج وہ اور اس کے خاندان والے اس قیامت کے دہانے پر ہیں۔ اس کا ذہن بڑی تیزی لیکن بڑی تفصیل سے واقعات کی پرتیں کھولنے لگا۔ وہ عارضی طور پر ہی سہی لیکن اپنے اردگرد کے دہشت ناک ماحول سے تھوڑے فاصلے پر چلی گئی۔ بارش، گرج، للکاریں، دھاڑیں، ڈری ہوئی سرگوشیاں، چلتے پھرتے بے تاب قدموں کی آوازیں..... سب کچھ ساعت میں دھندلا سا گیا۔ ماضیِ دور اور ماضیِ قریب کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگے۔

☆☆☆

عین النور نے گجرات سے آگے تحصیل پھالیہ کی طرف موراں والی نام کے گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ اب تو وہاں پکی سڑک پہنچ چکی تھی مگر نور کے بچپن میں وہاں صرف کچا راستہ تھا، پکی سڑک تک جانے کے لیے ان لوگوں کو تانگوں وغیرہ پر کوئی دس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ نور نے ایک بھرے پُرے آسودہ گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والد مولوی اشفاق اور تایا خلیل مہرا علاقے کے خوشحال زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ نور سے بڑی دو بہنیں بتول اور بسمہ تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ تینوں بہنوں کا بچپن اسی گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں اور سرسبز ٹیلوں پر کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ تایا خلیل بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی مہرین جو تقریباً نور ہی کی ہم عمر تھی۔ اس کے کزن شرجیل اور عثمان تھوڑے سے پڑھاکو تھے لیکن کھیل کود میں وہ بھی سب کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

نور کے بچپن اور لڑکپن کی یادیں بڑی سہانی تھیں۔ ماموں اور تایا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر بھر کے بچوں میں سب سے چھوٹی وہی تھی۔ اسے خصوصی پروٹوکول ملتا تھا..... برسات کے موسم میں آموں کے باغوں میں جھولے، سردیوں کی سنہری دھوپوں میں وسیع لان کے اندر کھیل کود اور گیندے کے پودوں میں تتلیوں کا تعاقب..... گرمیوں میں چاندنی راتیں اور کشادہ چھت پر بچھی ہوئی بہت سی چارپائیاں..... کہانیاں، چٹکلے اور شریر سرگوشیاں..... اور بہار..... بہار کا موسم تو جیسے نور کے دل میں کھب جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں ایک وسیع پھلواری تھی جو ان کی اپنی ہی ملکیت تھی۔ اس پھلواری میں ایک جانب پھل دار درختوں کا باغ تھا۔ نور کی والدہ، دادی جان، پھوپیاں و ممانیاں اور ان کے بچے اکٹھے ہوتے تو اس باغ میں بہار پر بہار آجاتی۔ ایک بہت بڑی دری بچھائی جاتی۔ اس پر ایک درخت کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر دادی جان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی۔ ایک جانب ڈھولک رکھ کر گانے گائے جاتے، وہیں پر کھلے میں پکوان بنائے جاتے اور کھیل کود ہوتا۔ ایسی محفلوں میں خاندان کا کوئی مرد شریک نہیں ہوتا تھا اور اونچی دیواروں والے باغ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

گاؤں کی خوشگوار زندگی میں خوشی کی ایک تازہ لہر اس وقت آتی تھی جب سردیوں کے گلابی موسم میں بڑے پیر جی کا میلا آتا تھا۔ اسے عرفِ عام میں امنالے کا عرس کہا جاتا تھا۔ قرب و جوار میں اس میلے کی دھوم تھی۔ لوگ دو ماہ پہلے سے ہی اس موقع کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ چوڑیاں، پراندے اور جوتے وغیرہ خریدے جاتے تھے۔ چڑھاوے کی چادریں تیار ہوتی تھیں۔ بچوں کی تیاری کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ میلا پورا ہفتہ جاری رہتا تھا..... اور ہر بار اہلِ علاقہ کو بہت سی سنہری یادیں دے کر رخصت ہوتا تھا۔

بچپن میں نور بھی اس میلے کو بڑی روانی سے امنالے کا میلا کہا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ لفظ ''امنالا'' نہیں بلکہ امناں والا ہے۔ یعنی امن اور محبت والا۔ بڑے پیر صاحب کا مکمل نام پیر برکات امناں والا تھا۔ وہ زندگی بھر پیار اور محبت کا درس دیتے رہے تھے۔ کہا

جاتا تھا کہ وہ جانی دشمنوں کو جانثار دوستوں میں بدل دیتے تھے۔ ان کی بابرکت ذات کی وجہ سے بہت سے خاندانوں اور برادریوں کے چھوٹے بڑے جھگڑے جڑ سے ختم ہو گئے تھے۔ انہی کی نسبت سے میلے کا نام امناں والے کا میلا پڑ گیا تھا۔

نور نے ساتویں کا امتحان ''موراں والی'' کے ہائی اسکول سے ہی پاس کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر قریباً تیرہ سال تھی..... منجھلی بہن بسمہ کوئی پندرہ سال کی اور بڑی بہن بتول انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دو ڈھائی سال پہلے میٹرک کر چکی تھی۔ اسکول کے بعد اب وہ کالج جانا چاہتی تھی اور کالج جانے کے لیے اس کا گجرات جانا ضروری تھا۔ وہاں وہ اپنے کچھ ننھیالی عزیزوں کے پاس رہ سکتی تھی۔ نور کے والد مولوی اشفاق بالکل اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کافی ہو گئی ہے، بتول اب سلائی کڑھائی سیکھ لے..... اور اگر زیادہ بات ہے تو پھر آرٹس کے مضامین لے کر پرائیویٹ ایف اے کر لے۔ بتول بڑوں کی ہر بات پر سر جھکانے والی لڑکی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے والدین چاہتے تھے۔ بڑی بہن بتول سے نور کو بڑا لگاؤ تھا۔ جب آپی بتول کے بارے میں نور کو پتا چلا کہ وہ کالج نہیں جائے گی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی کہ اب اسے آپی کی مزیدار کمپنی میسر رہے گی۔

ہاں، وہ بڑے اچھے دن تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر پھر ایکا ایکی نور کو محسوس ہونے لگا کہ گھر میں سب اچھا نہیں ہے۔ بڑے کچھ پریشان تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے صلاح مشورے کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی تھیں پھر ایک دن نور کو بسمہ سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اپنے بڑے بیٹے ابدال احمد کے لیے آپی بتول کا رشتہ مانگ رہا ہے..... اور یہ رشتہ آپی سمیت گھر میں کسی کو بھی قبول نہیں۔

یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کھاپری برادری کے چودھری طغرل کے دونوں بیٹے انتہا کے بگڑے تگڑے تھے۔ لڑائی جھگڑا، زمینوں پر قبضے، نشے بازی..... کون سی ایسی لت تھی جو ان میں موجود نہیں تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں چودھری طغرل بھی کچھ کم نہیں رہا تھا۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ وہ کچھ دھیما پڑ گیا تھا مگر فطرت تو وہی تھی۔

بڑی بہن بسمہ نے سراسیمہ لہجے میں نور کو بتایا تھا۔

''یہ کھاپری برادری والے بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے بہت آگے تک جاتے ہیں۔ پہلے تو پیار محبت اور پالیسی سے کام لیتے رہے ہیں، پر اب دھمکیوں پر اتر آئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟'' نور نے بھولپن سے پوچھا تھا۔

''کہتے ہیں کہ ہمارے ابا جی زبان دے کر مکر رہے ہیں، حالانکہ ابا جی نے کوئی زبان دی ہی نہیں تھی۔ وہ سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور طاقت کے زور پر اس کو سچ بنانا چاہتے ہیں۔''

نور نے کہا۔ ''تو ابا جی..... پولیس والوں کو کیوں نہیں بتاتے۔ وہ جو مونچھوں والے لمبے سے انکل آیا کرتے ہیں، وہ ابا جی کے دوست ہیں۔ ابا جی نے کہا تھا کہ وہ تھانیدار ہیں۔''

''وہ چھوٹے تھانیدار ہیں نور۔ یہ جو چودھری طغرل ہے اس کے تعلقات تو بڑے بڑے تھانیداروں سے ہیں۔ ویسے بھی اس طرح کی باتیں پولیس وغیرہ تک نہیں پہنچائی جاتیں۔ بڑے بوڑھے خود ہی بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔''

''تو پھر کیوں نہیں کرتے فیصلہ؟ ہم اپنی پیاری آپی کی شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔ کسی اور کی مرضی سے نہیں۔''

وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسے پریشان کن باتوں سے دور رکھا جاتا تھا پھر بھی اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ابا اور تایا کے چہرے بُجھے رہتے تھے۔ دونوں ماموں جواں سال تھے۔ وہ کسی وقت بہت طیش میں نظر آتے تھے۔ ایک دن اس نے چھوٹے ماموں کو چھت پر بیٹھ کر بڑے غصے میں مسواک چباتے اور اپنی رائفل بھی صاف کرتے دیکھا تھا۔ گھر میں پنچایت وغیرہ کا ذکر بھی چل رہا تھا۔

پھر ایک دن سب کچھ ٹھیک ہوتا محسوس ہوا۔ نور کو پتا چلا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے ابا جی کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور ان پر سے بلا ٹل گئی ہے۔

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آپی بتول کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اپنے خاندان میں ہی ایک دور کے رشتے داروں میں آپی کی بات ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ملتان میں رہتے تھے۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی لیکن نور ان دنوں کچھ اداس بھی رہا کرتی تھی۔ اس کی آپی بیاہ کر اس سے دور جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا اور اس کی آپی شادی کے بعد اپنے پیا کے شہر چلی گئی۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا..... اور یہ کچھ عرصے تک ٹھیک بھی رہا مگر پھر آہستہ آہستہ گھر کے ماحول میں دوبارہ بے چینی پائی جانے لگی۔ معاملہ وہی کھاپری برادری والوں کا تھا۔ انہوں نے بات اپنے دل سے نکالی

نہیں تھی۔ ایک روز ماں نے اسے بتایا۔ ''تمہارے ابا باغ والی اپنی زمین بیچ رہے ہیں۔''

''پر کیوں امی؟ وہاں تو ہم جھولے ڈالتے ہیں، اتنا مزہ کرتے ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔

''وہ زمین کھاپرا والوں کی زمین کے ساتھ لگتی ہے اور وہاں آئے روز جھگڑا ہوتا ہے۔''

''جھگڑا ہو تو زمین بیچ دی جاتی ہے؟ اور جھگڑا ہوتا کیوں ہے امی؟''

''جنہوں نے جھگڑنا ہوتا ہے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور تمہارے ابا اور تایا خوامخواہ کی دشمنی سے بچنا چاہتے ہیں۔''

''تو دشمنی سے بچنے کے لیے ہم اپنی زمین کیوں بیچیں۔ وہ لوگ بیچ دیں نا۔''

''جس کا زیادہ زور چلتا ہے اس کی بات بھی چلتی ہے۔'' ماں نے آہ بھر کر کہا تھا۔

وہ زمین بک گئی جہاں نور کے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ نہ صرف زمین بک گئی بلکہ چند ماہ کے اندر اندر حالات اتنے خراب ہوئے کہ ابا اور تایا نے اپنی باقی زمین بھی فروخت کر دی..... اور آبائی گاؤں موراں والی کو اور گجرات کو چھوڑ کر خاموشی سے لاہور آ گئے۔ نور ان دنوں آٹھویں کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔

لاہور کی ایک نئی رہائشی کالونی میں ان لوگوں نے دس دس مرلے کے دو بنے بنائے گھر خریدے تھے۔ دونوں گھروں میں مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ایک گھر تایا کے لیے اور دوسرا ان کے لیے تھا۔ نور کو یہاں ایک اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ تایا کے بچوں کو بھی مناسب جگہوں پر داخلے مل گئے۔ بسمہ اب میٹرک پاس کر چکی تھی اور یہاں مسئلہ پھر وہی کالج میں داخلے کا تھا۔ نور کے ابا جی تذبذب میں تھے۔ بہرحال تایا جان کی کوشش سے یہ مسئلہ حل ہوا اور ابا جی ایک قریبی کالج میں بسمہ کا داخلہ کرانے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں تو نور کے والد کی طرح اس کے تایا بھی مذہبی ذہن رکھتے تھے اور انہی کی طرح باریش بھی تھے مگر مولوی جی کا سابقہ صرف نور کے ابا جی کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں بہت سلوک اور یگانگت کے باوجود تھوڑا سا فرق بھی موجود تھا۔ تایا جان کے گھر میں ٹی وی، ٹیلی فون وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے پینٹ شرٹ اور دیگر جدید لباس پہنتے تھے اور گھر میں کچھ آزادی دکھائی دیتی تھی مگر نور کے گھر میں چونکہ صرف بیٹیوں نے ہی پرورش پائی تھی، اس لیے یہاں ماحول قدرے سخت تھا۔ پردے اور نماز روزے کی پابندی تایا جان کے گھر سے تھوڑی زیادہ تھی۔ موبائل فون تو ان دنوں موجود ہی نہیں تھا..... مگر عام فون بھی ان کے گھر میں کبھی نہیں لگوایا گیا۔ یوں تو تائی جان بھی پردہ کرتی تھیں لیکن نور کی امی باقاعدہ برقع پہنتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے گھر میں اکثر ایک طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ ابا جی مخلوط تقریبات میں شرکت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شادی کے موقع پر اضافی رسموں سے بھی انہیں اختلاف تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے شہر میں آ جانے کے بعد نور کے لیے چند ماہ تک تو روز و شب بڑے اجنبی سے رہے۔ یہاں کی تیز رفتار زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں سب کو دشواری پیش آئی لیکن پھر جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اسکول میں نور کی ایک دو سہیلیاں بھی بن گئیں۔ وہ پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ انہی دنوں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ نور نے سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لیا اور پہلے نمبر پر آئی۔ اسے ایک چھوٹا سا کپ بھی ملا۔ وہ اسکول سے گھر واپس آئی تو امی جان، تائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بسمہ کالج سے واپس آ چکی تھی۔ اس نے نور کا پھولا ہوا بستہ دیکھا تو پوچھا۔ ''اوئے، یہ کیا گھسایا ہوا ہے اس میں؟''

''تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟'' نور نے الٹا اس سے سوال کیا۔

بسمہ نے بستے کے اندر ہی کپ کو ٹٹول کر دیکھا اور بولی۔ ''کوئی سخت سی چیز لگ رہی ہے۔''

''سخت سی چیز ہے اور سخت محنت کر کے جیتی ہے بھئی۔'' نور نے کہا اور بستے سے کپ نکال کر بسمہ کو دکھایا۔

بسمہ خوش ہوئی۔ ''کس چکر میں ملا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری بہن دوڑ میں پہلے نمبر پر آئی ہے..... سو میٹر کی دوڑ۔''

بسمہ تھوڑا سا چونکی پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ''اوئے تیرا بیڑا ترے۔ تو نے دوڑ میں حصہ لیا ہے؟''

''بتا تو رہی ہوں۔''

بسمہ نے کہا۔ ''ابا جی کو پتا چل گیا نا... تو ٹھیک ٹھاک جھاڑیں پڑیں گی۔ ان کو یہ کبھی اچھا نہیں لگے گا۔''

''مگر بسمہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے کوئی تیرا کی... میں تو حصہ نہیں لیا۔ دوڑ میں ہی لیا ہے نا..... اور وہ بھی حجاب پہن کر۔''

''مگر تو دوڑی تو ہے نا پھرتیلی بیگم۔ دڑنگے تو مارے ہیں نا تو نے؟''

''میری کسی بات پر یہاں تو کوئی خوش ہی نہیں ہوتا۔'' نور نے منہ بنایا۔ ''آپی یا تمہاری ہر بات کی تعریف ہوتی ہے۔ مجھے تو جیسے ایک کونے میں ڈالا ہوا ہے۔ ابا جی تو رحم کی نظر ہی نہیں ڈالتے۔ لگتا ہے ان کی سگی بیٹی ہی نہیں ہوں۔''

''خبیث کہیں کی۔'' بسمہ نے اس کا کان مروڑا۔ ''بہت محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے۔ بس یہ جو تیری وکھری رگ ہے نا اس کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کبھی کبھی۔''

''کیا وکھری رگ ہے میری؟''

''یہ جو ہر وقت رسالے پڑھتی ہے..... کسی کونے میں گھسی رہتی ہے..... اور نمازیں بھی قضا کر دیتی ہے۔''

''کب نمازیں قضا کرتی ہوں میں؟'' نور نے لڑا کی مرغی کی طرح پر پھیلائے۔ ''کب کونے میں گھسی رہتی ہوں ..... اور رسالے کو تو ہاتھ لگائے، آج مجھے پورا ایک مہینا ہو گیا ہے۔''

''توبہ توبہ..... پورا ایک مہینا۔ ابھی پرسوں اتوار کو چھت پر بیٹھی کیا پڑھ رہی تھیں؟''

''وہ رسالہ نہیں تھا، اسکول کا میگزین تھا۔ اسپورٹس کے صفحے دیکھ رہی تھی۔'' نور تنک کر بولی۔

شاید یہ بحث مزید آگے چلتی مگر اسی دوران میں بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بسمہ نے نور کا چھوٹا سا کپ جلدی سے اس کے اسکول بیگ میں گھسا دیا اور بیگ کو بیڈ کے نیچے کر دیا۔ اندر آنے والے ابا جی ہی تھے۔ وہ آج کل لاہور کے مضافات میں کچھ زمین خرید کر وہاں چھوٹے چھوٹے رہائشی پورشن وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے..... اور اس سلسلے میں بڑے ماموں مراد کے ساتھ مل کر کافی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو بازار میں ایک دکان بھی خریدی تھی جہاں وہ اسلامی کتب کی ہول سیل کا ارادہ رکھتے تھے۔

اپنی کامیابی اور کپ کے حصول کی خوشی نور کو کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اگلے روز اس نے والدہ کو بھی اپنا جیتا ہوا کپ دکھایا۔ والدہ خوش ہوئیں لیکن انہوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو اس سے پہلے بسمہ کہہ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''نور! بس اپنی پڑھائی کی طرف توجہ رکھو۔ اب تم نے میٹرک کا امتحان دینا ہے اور یہ کوئی آسان نہیں ہوتا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں پاس کر لوں گی۔'' وہ بے پروائی سے بولی اور الہڑ انداز میں چارپائی پھلانگتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

اس سے اگلے روز جب وہ اسکول پہنچی تو اسکول میں اسپورٹس کی ٹیچر مسز نبیلہ وجدان نے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فزیکل ٹریننگ میں باقاعدگی سے حصہ لے اور خاص طور سے رننگ میں۔ اس کی رننگ اچھی ہے اور وہ محنت کرے تو مقابلے جیت سکتی ہے۔

نور نے کہا۔ ''ٹیچر! شاید میرے گھر والے بھی مجھے اس کی اجازت نہ دیں۔''

''ہائیں۔'' مسز وجدان نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ تم ایک صحت مند سرگرمی میں حصہ لے رہی ہو اور وہ بھی چار دیواری کے اندر۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟''

وہ بولی۔ ''ٹیچر! دراصل..... میرے ابا جان..... اس معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ شاید وہ منع کر دیں۔''

''کبھی بھی نہیں کریں گے۔ تم کسی دن مجھے ان سے ملواؤ۔ میں خود بات کروں گی۔'' مسز وجدان نے پورے یقین سے کہا۔

نور نے یہ بات بڑی بہن بسمہ کو بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں اسے ابا جی سے اجازت لے کر دے۔ نور کی نسبت بسمہ اور بتول کی بات اشفاق صاحب ذرا نرمی سے سن لیتے مگر یہ موضوع ایسا تھا کہ بسمہ کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دو تین دن کوشش کرتی رہی کہ اس حوالے سے تھوڑا بہت ابا جان کو بتا دے..... تاکہ اگر انہیں بعد میں پتا چلے تو وہ بہت زیادہ ناراض نہ ہو جائیں مگر نور اور بسمہ میں سے کوئی بھی یہ بات ابا جی کے سامنے زبان پر نہ لا سکیں۔ رہیں والدہ تو ان کی والد صاحب کے سامنے سٹی ہی گم ہو جاتی تھی۔ اشفاق صاحب آج کل ویسے بھی ذرا ناخوشگوار موڈ میں تھے۔ تعمیری کام کے سلسلے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ آتے اور ان کی پیشانی کا بل دیکھ کر ہی نور سمجھ جاتی کہ بسمہ آج بھی کوئی بات نہیں کر سکے گی۔

تین چار روز بعد دونوں بہنوں نے یہ کوشش ویسے ہی ترک کر دی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ ایک دن اسپورٹس ٹیچر مسز وجدان نے پھر نور کو اسٹاف روم میں بلایا۔ انہوں نے کہا۔ ''نور! تم نے اپنے والد صاحب سے بات نہیں کرائی؟''

وہ جواب پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ ''ٹیچر! آج کل وہ کنسٹرکشن کرا رہے ہیں۔ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ اب بھی

لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، جب بھی موقع ملے مجھے ان سے ضرور ملواؤ..... اور دیکھو اگلے مہینے ایک اچھا ایونٹ ہے۔ ہمارے اسکول کی لاہور کی تمام برانچز کے مشترکہ کھیل ہو رہے ہیں۔ تم ان میں حصہ لو۔ تھوڑی محنت کرو تو پہلی، دوسری پوزیشن حاصل کر سکتی ہو۔"

"مجھے کرنا کیا ہوگا ٹیچر؟"

"کچھ بھی نہیں۔ فزیکل ٹریننگ کا پریڈ تو ہوتا ہی ہے، اس میں باقاعدگی سے حصہ لو۔ پھر ہفتے میں دو روز ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رننگ کی ٹریننگ ہوتی ہے، جو گر تو ہوں گے تمہارے پاس؟"

"نہیں ٹیچر! لیکن میں لے لوں گی۔" وہ بولی۔

"شاباش۔ تم ضرور آگے بڑھو گی۔ ایک اچھی "اسپرنٹر" بنو گی۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

نور خاموشی سے ٹریننگ میں حصہ لیتی رہی۔ مسز وجدان اس پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ پریکٹیکل کے ساتھ ساتھ وہ اسے تھیوری بھی سمجھا رہی تھیں۔ "دیکھو نور! چھوٹے فاصلوں کی دوڑوں میں اسٹارٹنگ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایتھلیٹ اسٹارٹ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر کرتا ہے تو یہ دسواں حصہ آگے جا کر ایک یا دو سیکنڈ میں بدل جاتا ہے....."

ایک دن انہوں نے کہا۔ "نور! دوسری لڑکیوں کی نسبت تمہارے reflexes بہت اچھے ہیں..... کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم نیچرل ونر ہو۔ کیا تمہاری فیملی میں پہلے بھی کوئی ایتھلیٹ رہا ہے؟"

"نہیں ٹیچر۔" نور نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اگر آپ بھاگ دوڑ کو ایتھلیٹس کہیں تو پھر بھاگ دوڑ تو ہم نے خوب کی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم پہلے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر کے ساتھ بہت بڑا باغ تھا۔ ہم بہن بھائی سارا سارا دن اس میں دوڑیں لگاتے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کزنز نے میرا نام اڑن چھو" ڈال رکھا تھا۔"

"تم واقعی اڑن چھو بن سکتی ہو نور۔ بس تھوڑی سی محنت اور مستقل مزاجی چاہیے۔"

اسکول کی "برانچز" کے مقابلے ہوئے۔ ان میں سو میٹر کی ریس بھی تھی۔ نور نے یہ فائنل مقابلہ بہ آسانی جیت لیا۔ وہ دوسرے نمبر پر آنے والی کھلاڑی سے کم از کم دو سیکنڈ آگے رہی تھی۔ ٹیچرز کے علاوہ ڈائریکٹر صاحب نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ اسے ٹرافی ملی اور تعریفی سرٹیفکیٹ بھی۔

اس مرتبہ اس کی یہ کامیابی چھپی نہیں رہ سکی۔ تایا کے گھر میں بھی سب کو پتا چل گیا تھا لہٰذا بسمہ نے ضروری سمجھا کہ ابا جان کو بھی یہ بات خود بتا دی جائے۔ اس روز ان کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا نمازِ مغرب کے بعد بسمہ نے اوڑھنی سختی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹی اور ابا جان کے پاس چلی گئی۔ اس نے ٹرافی ابا جان کو دکھائی۔ "یہ کس کی ہے؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"نور کی..... اسکول سے ملی ہے۔"

"مگر اس کے نمبر تو اتنے اچھے نہیں تھے؟"

"ابا جی! اس نے دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ یہ دیکھیں یہ سرٹیفکیٹ بھی ہے۔" مولوی اشفاق مہر کی پیشانی پر بے ساختہ ایک بل نمودار ہو گیا۔ سرٹیفکیٹ اور ٹرافی دیکھنے کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں آہستہ سے ایک طرف رکھ دیں اور بولے "وہ خود کہاں ہے؟"

"ڈ ڈ..... ڈر رہی تھی کہ آپ کو برا نہ لگے۔"

"ڈر تو اللہ کا ہونا چاہیے۔ ہم نے یہاں کون سا بیٹھے رہنا ہے تم لوگوں پر پابندیاں لگانے کے لیے۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر آواز دی۔ "عین النور! کہاں ہو عین النور!" وہ اسے ہمیشہ پورے نام سے پکارتے تھے۔

نور ڈری ڈری سی باپ کے بستر پر پائینتی کی طرف آ بیٹھی۔ وہ نسبتاً دھیمے لہجے میں بولے۔ "دیکھو بیٹی، ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کی رائے اور مشورے میں بھلائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کھیل کود، اچھل پھاند لڑکوں کے کام ہیں۔ لڑکیاں پڑھائی اور گھر گرہستی کے کاموں میں ہی اچھی لگتی ہیں....."

"بس ابا جی! ٹیچر نے ہی زور دیا تھا کہ تھوڑا بہت....." آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔

"کیا تھوڑا بہت؟" وہ عینک درست کر کے بولے۔

"یہی کہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ بھی تھوڑا بہت..... ہونا چاہیے۔"

"تو بھئی، نصابی سرگرمیوں کے علاوہ تم اور بھی تو کچھ کر سکتی ہو۔ تمہاری آواز اچھی ہے۔ قرأت اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لے سکتی ہو۔ پھر تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ سلائی کڑھائی کے کمپی ٹیشن ہوتے ہیں....."

"ٹھیک ہے ..... ابا جان ..... میں کوشش کروں گی۔" اس نے کہا۔

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ''دیکھو عین النور! ہم ایک دیندار گھرانے سے ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں، کچھ اصول ضابطے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے دوسرے بچوں کی بہ نسبت تم ان اصول وضابطوں سے کچھ دور ہو۔ یہ چیز مجھے کبھی کبھی رنج بھی دیتی ہے..... اپنے ان معاملات پر غور کرو اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں، والدین کبھی بھی اپنے بچوں کا برا نہیں سوچتے۔''

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی اوڑھنی سر سے سرک نہ پائے۔ کل اس نے اپنے بالوں کی کچھ کمزور لٹیں کاٹی تھیں۔ یہ کٹنگ اس موقع پر ابا جی کے سامنے آجاتی تو ان کی خفگی ایک دم غصے میں بدل سکتی تھی۔

نور پڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی۔ تاہم وہ ان طالب علموں میں سے تھی جو تھوڑی کوشش کے ساتھ امتحان بہ آسانی پاس کر لیتے ہیں۔ پڑھائی جاری رہی اور اس کے ساتھ تھوڑا تھوڑا شوق بھی ہوتا رہا۔ اسے اب خود بھی رنگ میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسپورٹس ٹیچر کی ہدایت کے مطابق اسے اسکول میں آدھی چھٹی کے بعد ایک پریڈ کی اضافی چھٹی مل جاتی تھی۔ وہ اور اس کی کلاس فیلو شاہینہ اس دوران میں رنگ کرتی تھیں۔ اسکول کا گراؤنڈ خاصا وسیع تھا۔ ایک چکر تقریباً نصف کلومیٹر کا بن جاتا تھا۔ وہ دونوں روزانہ قریباً چار چکر لگاتیں۔ اس کے بعد گھنے درختوں کے نیچے ایک ہاتھ پر ''اسپرنٹس'' یعنی سو میٹر کی تیز رفتار دوڑیں لگائی جاتیں۔ اکثر اوقات مسز وجدان بھی موقع پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کو سو میٹر کے اسرار و رموز سمجھاتیں۔ اسٹاپ واچ ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی..... اور نگاہیں فنش لائن پر۔ وہ اس بات پر خوش تھیں کہ دونوں لڑکیوں کا ٹائم روز بروز بہتر ہو رہا تھا۔ خاص طور سے نور کا۔

ٹرافی والے واقعے کے بعد ابا جان اور نور میں دوڑ وغیرہ کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح تعمیراتی کام میں الجھے ہوئے تھے۔ ابا جان کو نور سے جو دو چار شکایتیں تھیں، وہ اس نے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ صبح جلدی اٹھتی تھی۔ نماز میں بے قاعدگی ختم کر دی تھی۔ کزنز کی موجودگی میں دوپٹا اپنے سر سے سرکنے نہیں دیتی تھی، اس کے علاوہ پڑھائی پر بھی توجہ دے رہی تھی۔

ایک دن نور اسکول سے گھر آئی تو بسمہ کو روتے ہوئے پایا۔ وہ بھی ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی اور اپنے سفید براق یونیفارم میں پیاری لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا بسمہ؟'' نور نے بڑی بہن کو بے تکلفی سے بانہوں میں لیتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ پہلے تو ٹالتی رہی پھر اس نے بتایا کہ آج گاؤں سے دو بندے آئے تھے۔ وہ ابا جی اور تایا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک دو باتیں بسمہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھیں۔

''کیا کہا انہوں نے؟'' نور نے پوچھا۔

بسمہ ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالتے ہوئے بولی۔ ''نور! ہم حیران ہوتے تھے نا کہ آپی بتول والا معاملہ تو ختم ہو گیا..... پھر تایا اور ابا جان گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر میں کیوں آ گئے۔''

''ہاں، یہ حیرانی تو تھی۔''

''اس کی وجہ امی اور دادی کو بھی معلوم تھی۔ پر انہوں نے کبھی ہم سے ذکر نہیں کیا۔''

''کیا وجہ تھی؟''

''وہ لوگ ابھی تک اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹے نور..... خاص طور سے چودھری کا بیٹا ابدال۔ وہ ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم ہے، چودھری اب کہتے ہیں کہ اگر بڑی کا رشتہ نہیں ہو سکا تو چھوٹی کا..... یعنی میرا رشتہ انہیں دیا جائے۔ اب پنچایت والے بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ ایک ہی بات کہتے ہیں کہ ہمارے گھر والے زبان دے کر انکاری ہوئے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک لڑکی کا رشتہ تو دینا ہوگا۔''

''اوہ گاڈ۔'' نور نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ''یہ ضد اور ہٹ دھرمی بھی کیا بلا ہوتی ہے ان چودھریوں وڈیروں میں..... خدا کے بندو! شادی تو زندگی بھر کا ساتھ ہے اور اس میں لڑکے لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی کو گائے بکری کی طرح کان سے پکڑا اور کسی کھونٹے سے باندھ دیا۔'' نور کے لہجے میں تپش تھی۔

''یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' بسمہ بولی۔

''اب کیا ہوگا؟''

''ابا جان اور تایا جان کل گجرات جا رہے ہیں۔ کسی ایم پی اے سے بات کرنی ہے انہوں نے تاکہ یہ جھگڑا زیادہ نہ بڑھے۔''

امی بڑے کمزور دل کی تھیں۔ وہ تو جیسے بستر سے لگ گئیں۔ ان کی بیماری کی ایک نہیں دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہی بسمہ والا معاملہ۔ وہ کئی بار بے حد دکھی لہجے میں کہہ چکی تھیں، یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں..... ان

کی پریشانی کی دوسری وجہ بڑی بیٹی بتول کے گھریلو حالات بھی تھے۔ وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ ملتان میں وہ اپنے سسرال میں زیادہ خوش نہیں تھی۔ شوہر غیاث سخت مزاج کا تھا اور کسی وقت مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ دو تین دفعہ وہ ناراض ہوکر میکے آگئی تھی مگر پھر صلح ہوجاتی تھی اور شوہر اسے لے جاتا تھا۔

ابا اور تایا جان بار بار گجرات جارہے تھے۔ کسی وقت ان کے ساتھ بڑے ماموں بھی ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میں نور کے ابا جان کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف بھی ہوئی اور وہ گھر آنے کے بجائے اسپتال پہنچے۔ اس دن نور کی امی بڑی آزردہ تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہمارے بڑے کہا کرتے تھے کھاپریوں سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہ رکھنا۔ یہ کھوٹے اور خطرناک لوگ ہیں۔ پر تیری دادی.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔

نور نے ماں کو ذرا کریدا تو انہوں نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب تیری دادی کا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ ان کی کھاپریوں کی وڈی ماں سے اتنی دوستی ہوتی اور نہ یہ مصیبت ہمارے گلے پڑتی۔''

نور اب قدرے سیانی ہوچکی تھی۔ اب اسے بات کو کریدنا اور اس کی تہ تک پہنچنا آگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''امی! اگر چودھری طغرل کی ماں کے ساتھ ہماری دادی کا اٹھنا بیٹھنا تھا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ ہم نے کھاپریوں کو آپی بتول کے رشتے کے لیے زبان دے دی تھی؟''

''یہ بات کافی پیچھے تک گئی ہوئی ہے نور۔'' والدہ نے کہا۔ ''یہ دونوں عورتیں سہیلیوں کی طرح تھیں۔ اس وقت تیری آپی بتول کی عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ کھاپریوں کی ماں نے بتول کو کھیلتے دیکھا اور کہا کہ اسے تو میں اپنے پوتے ابدال کی دوہٹی بناؤں گی۔ بس اتنی سی بات تھی جو بنتے بنتے بتنگڑ بن گئی۔ کھاپریوں کے ساتھ تمہارے ابا اور تایا کا کوئی زمین کا جھگڑا بھی تھا لیکن یہ جھگڑا دونوں عورتوں کی دوستی اور میل جول کے نیچے دبا رہا۔ کھاپریوں کو اس بات کا لالچ تھا کہ جب بتول کا رشتہ طے جائے گا تو وہ زمین بھی خود بخود ان کے پاس چلی جائے گی جس کا جھگڑا تھا۔ بتول ویسے بھی شکل صورت کی اچھی تھی۔''

نور نے کہا۔ ''ابا جی اور تایا جی کو ان ساری باتوں کا پتا نہیں تھا؟''

''پتا تھا لیکن اس وقت یہ تو پتا نہیں تھا کہ طغرل کے پتر بڑے ہوکر اسے طرح کے نکلیں گے۔ بہرحال تمہارے ابا نے کبھی بھی منہ سے اس رشتے کے لیے اقرار نہیں کیا تھا۔ ہاں کھاپریوں کی وڈی ماں زور زوری کرتی رہی۔ کبھی بتول کے کپڑے لے آتی، کبھی عید شب برات شروع کردی۔''

اب بات کافی حد تک نور کی سمجھ میں بھی آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد باغ والی زمین کا جو جھگڑا شروع ہوا، اس کی وجہ آپی بتول کی شادی ہی تھی اور اب بات وہیں تک نہیں رکی تھی۔ وہ لوگ ان کے ابا جی کو مجبور کررہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ ان کو دیں، اسے یہ بھی پتا چلا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد ایک اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابدال کا بڑا چاچا ایم پی اے بن گیا تھا۔ انہیں سیاسی اثر رسوخ حاصل ہوگیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب آپی کے بعد وہ بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع ہوگئے تھے۔

تین چار ہفتے کافی تناؤ میں گزرے پھر یہ معاملہ کچھ سدھر گیا۔ ابا جی بھی اب بہتر تھے لیکن اس سارے تصفیے نے ایک نقصان کردیا تھا اور یہ کافی بڑا نقصان تھا۔ نور نے اپنی والدہ کو کھودیا تھا۔ تناؤ بھرے دنوں میں ایک دن ایسا آیا جب ان کا ایک پہلو بے جان ہوگیا۔ ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ منوں مٹی کے نیچے جاسوئیں۔

ان کی وفات نے نور اور بسمہ کو جیسے بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ والد نے تو ہمیشہ ان سے تھوڑا فاصلہ رکھا تھا، یہ والدہ ہی تھیں جو ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک رہتی تھیں اور تینوں بیٹیوں کے ہر طرح کے مسائل کا حتی المقدور سامنا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ نور ہر وقت غم اور اداسی کے ایک نادیدہ حصار میں رہنے لگی۔ میٹرک کا فائنل امتحان سر پر تھا مگر وہ پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دے پارہی تھی۔ اسپورٹ والی سرگرمی بھی ایک دم ماند پڑ چکی تھی۔ ویسے بھی وہ امتحان کے لیے اسکول سے فارغ ہوچکی تھی۔

ایک روز اسپورٹس کی ٹیچر مسز وجدان بالکل غیر متوقع طور پر ان کے گھر آن پہنچیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس وقت نور کے ابا جان گھر میں موجود نہیں تھے ورنہ جونہی مسز وجدان نے اپنا تعارف کرانا تھا ابا جان کا پارہ چڑھنا شروع ہوجانا تھا۔ مسز وجدان نے نور کے ساتھ دیر تک دلجوئی کی باتیں کیں۔ پھر اس کے بڑے ماموں مراد کو بھی بلالیا۔ مسز وجدان نے نور کے ماموں مراد اور بہن بسمہ کو بتایا کہ نور میں ایتھلیٹکس کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے بڑا افسوس ہوگا اگر کسی وجہ سے نور کا ٹیلنٹ ضائع ہوجائے۔ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں

کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگر نور کے والد صاحب کے ذہن میں کچھ تحفظات ہیں تو آپ لوگ ان سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں۔''

ماموں مراد بولے۔ ''ٹیچر! ہم نور کے حوالے سے آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہیں مگر ہر گھر کے اپنے معاملات اور مسائل ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بھائی جان سے بات کرنے کا کچھ فائدہ ہوگا۔ یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی..... اس حوالے سے خاموشی ہی بہتر ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ نور خاموشی سے رنگ میں حصہ لیتی رہے؟''

''جی ہاں۔ اگر اسے شوق ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ یہ اس کے لیے اچھا شوق ہے تو پھر یہ شوق خاموشی سے بھی پورا ہوسکتا ہے۔''

مسز وجدان نے نور کو مجبور کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی ان سے رابطہ کرے اور فراغت کے ڈھائی تین ماہ میں اپنی ٹریننگ کو آگے بڑھائے۔

نور مناسب قد اور چھریرے جسم کی مالک تھی۔ رنگ بچپن میں گندمی تھا لیکن اب کافی کھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نقوش بھی جاذب تھے۔ گو بسمہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی مگر اس کی کمی نور کے نہایت متناسب جسم اور الہڑ پن نے پوری کردی تھی۔ یہ نوخیز شباب کے دن تھے، اس کے جسم سے جیسے توانائی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ڈٹ کر کھاتی تھی مگر بھاگ دوڑ کے سبب یہ خوش خوراکی اس کے ''فگر'' کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔

امتحانات کے بعد نور خاموشی سے مسز وجدان کے پاس ان کی ٹریننگ اکیڈمی میں جاتی رہی۔ مسز وجدان چند سال پہلے تک خود بھی نیشنل لیول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی تھیں اور انہوں نے ریس کے کئی اہم ایونٹس جیت رکھے تھے۔ انہیں نور میں ایسا اسپارک نظر آرہا تھا جو اس کو آگے لے جاسکتا تھا۔ نور نے بسمہ سے مشورے کے بعد ابا جان اور دادی کو یہی بتایا تھا کہ وہ کوکنگ کا ایک کورس اٹینڈ کررہی ہے اور یہ سفید جھوٹ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ایک کوکنگ کے اسکول میں جاتی تھی مگر وہاں سے فوراً مسز وجدان کی اکیڈمی میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے جوتے اور ٹریک سوٹ وغیرہ بھی وہیں پڑے رہتے تھے۔ وہ بڑی لگن سے سیکھ رہی تھی۔

میٹرک کا امتحان نور نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ تاہم اس دوران میں اسے رنگ میں کئی چھوٹی چھوٹی کامیابیاں ملیں۔ اس کا اعتماد بڑھنے لگا۔ کھیل کے حوالے سے اس پر ایک جنون سا سوار ہونے لگا۔ اس نے ان بڑے ملکی اور غیر ملکی رنرز کے بارے میں پڑھا جنہوں نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا اور کامرانیاں سمیٹیں۔ اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہونے لگی۔ وہ جب جب آپی کی تلخ گھریلو زندگی کو دیکھتی تھی اور اپنی مرحومہ ماں کے کٹھن زدہ روز و شب کو یاد کرتی تھی، اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا شوق فزوں تر ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے یہی لگا تھا کہ وہ ایک چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مختلف تھی اور بات فقط دونوں بہنوں کی ہی نہیں تھی، وہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں سے بھی مختلف تھی۔ گڑیوں سے کھیلنا اسے بچپن اور لڑکپن میں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کپڑوں کا بھی بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ خوامخواہ شرمانا، چلمنوں کے پیچھے چھپنا، لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر خود کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کرنا، بات بات پر اوئی اللہ..... ہائے اللہ مرگئی..... جیسے جملوں کا استعمال اور ناز و نزاکت کے سارے انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ اس نادیدہ حصار کو توڑنا چاہتی تھی جو موراں والی گاؤں کی اکثر لڑکیوں کے اردگرد موجود تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے پر دیے گئے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی اس کی ماں اور آپی کی زندگی سے بہت مختلف ہوسکتی ہے۔

پچھلے پانچ چھ ماہ میں اس نے کئی چھوٹے بڑے میڈل اور کپ جیتے تھے۔ وہ یہ سارے انعامات گھر کے بیسمنٹ میں موجود امی جان کی ایک پرانی جستی پیٹی میں لحافوں کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ بسمہ کے علاوہ کسی کو اس کلیکشن کا پتا نہیں تھا۔

دو سال پہلے بسمہ کو تو کالج میں داخلہ مل گیا تھا مگر جب نور کی باری آئی تو ابا جان نے برملا کہہ دیا کہ وہ کالج نہیں جائے گی۔ ان کے سخت رویے کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر وقت نور کی طرف سے چونکے رہتے تھے۔ ایک روز جب نور... کوکنگ اسکول سے (اور دراصل مسز وجدان کی اکیڈمی) واپس گھر آئی تو دادی اور ابا جان میں بات چیت ہورہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے کچھ اڑتے اڑتے فقرے نور کے کانوں میں بھی پڑے۔ دادی نے کہا۔ ''توبہ یا اللہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا ہم نے۔ لڑکیاں اکیلی گھومنے نکلتی ہیں اور جب دل چاہے واپس آتی ہیں۔ کوئی پوچھنے بتانے والا نہیں۔ میں تمہیں صاف بتادیتی ہوں اشفاق! تیری اس چھوٹی کے لچھن ٹھیک نہیں۔ اس کو ذرا سنبھال کر رکھ۔ لڑکوں

کی طرح کدا ڑے مارتی پھرتی ہے۔ لڑکیوں بالیوں والی کوئی شرم کوئی نزاکت ہی نہیں اس میں۔"

"اماں جی! آپ جانتی ہیں، شروع سے ہی ایسی ہے وہ۔ اب بڑی ہو رہی ہے، طور طریقے بھی آ جائیں گے۔"

"آئے ہائے..... اور کتنی بڑی ہوگی۔ کوٹھے جتنی ہوگئی ہے۔ کل سیڑھیوں پر یوں چڑھ رہی تھی، جیسے کوئی گھوڑی دولتیاں مارتی ہوئی جا رہی ہو۔ نہ سر پر دوپٹا نہ پاؤں میں جوتی۔ میں تو کہتی ہوں بتول کی طرح اسے بھی گھر میں ہی بارھویں کروا دے۔"

"سوچ تو یہی رہا ہوں اماں جی! پر اب بسمہ کالج جا رہی ہے۔ بھائی خلیل کے سارے بچے جا رہے ہیں..... وہ کہے گی، مجھ پر ہی پابندی کیوں؟"

"خلیل کی بات تو چھوڑ دو۔ وہ تو ویسے ہی اپنی آخرت کو بھلا کے بیٹھا ہوا ہے۔ حج کر کے بندہ دنیا داری سے دور ہو جاتا ہے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیسے کے پیچھے جو دوڑ پہلے تھی، وہ اب بھی ہے۔ راحت کو دیکھ لے، اسی طرح پتلی سی چادر لے کر بازار چلی جاتی ہے۔ کہتی ہے اب بوڑھی ہوگئی ہوں۔ پر شادی بیاہ پر اس کی تیاریاں دیکھو تو کہیں بڑھاپا نظر نہیں آتا۔"

نور برا سا منہ بنا کر وہاں سے ہٹ آئی تھی۔

کالج میں داخلے کا معاملہ بہ دستور اٹکا ہوا تھا۔ اس مرتبہ پھر تایا خلیل کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ کچھ کردار بسمہ اور بڑے ماموں مراد نے بھی ادا کیا۔ نور کو اس شرط پر بمشکل اجازت ملی کہ بڑے ماموں اسے خود کالج چھوڑ کر آیا کریں گے اور لایا بھی کریں گے۔ کالج ان کے شوروم کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔

☆☆☆

کالج میں پہنچنے سے پہلے ہی نور کی تھوڑی بہت شہرت کالج میں بھی پہنچ چکی تھی۔ کئی ایک اسٹوڈنٹس جانتے تھے کہ وہ ایک اچھی ایتھلیٹ ہے۔ اس کی اسپورٹ ٹیچر بھی اس کے نام سے شناسا تھیں۔ ایک فائدہ نور کو یہ ہوا کہ نئی ٹیچر فرحانہ بیگ ذاتی طور پر مسز وجدان کی دوست بھی تھیں۔ فرحانہ بیگ نے شروع میں ہی نور پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ اسے ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور وہ مراعات بھی دی گئیں جو ایک ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کے لیے ضروری تھیں۔ مسز وجدان اور فرحانہ بیگ کی ہدایت کے مطابق نور مختلف ٹرائلز میں بھی شرکت کر رہی تھی۔ فرحانہ بیگ بہت اچھی کوچ بھی تھیں۔ ایک روز فرحانہ بیگ اور منیجر الیاس صاحب نے اسے خوشخبری سنائی۔ انہوں نے کہا۔ "تمہارے لیے ڈیپارٹمنٹل ٹیم میں شامل ہونے کا زبردست چانس بن رہا ہے۔"

"ڈیپارٹمنٹل ٹیم؟" نور نے ذرا حیرت سے کہا۔

"بھئی اکثر سرکاری اور غیر سرکاری محکمے اچھے کھلاڑیوں کو ملازمت دیتے ہیں اور انہیں "گروم" کرتے ہیں۔ تمہیں واپڈا کی سروس کا موقع مل رہا ہے۔" فرحانہ بیگ نے ایک لیٹر نور کے سامنے رکھ دیا۔

اس لیٹر کے مطابق لاہور سے پانچ چھ ایتھلیٹ لڑکیوں کو ٹرائل اور انٹرویو وغیرہ کے لیے اسلام آباد بلایا گیا تھا۔ ان میں نور کا نام بھی تھا۔

نور نے لیٹر پڑھنے کے بعد کہا۔ "لیکن میڈم! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے....."

"اوہو، چھوڑو اس بات کو۔ ابھی انہیں کچھ نہ بتاؤ، تم ٹرائل وغیرہ تو دو۔ یہ کوئی معمولی موقع نہیں ہے۔ کامیاب ہوگئی تو ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ پھر دیکھ لینا جس طرح بھی کرنا ہوگا۔"

"مگر میڈم! یہ بات چھپی تو نہیں رہے گی بلکہ..... میرا تو اسلام آباد جانا ہی ممکن نہیں ہوگا۔"

"صرف دو دن کی بات ہوگی۔ بہن اور ماموں کو بتا دو۔ والد صاحب کو ابھی نہ بتاؤ۔ انہیں کالج کے تفریحی ٹور وغیرہ کا کہہ دو۔ خدانخواستہ تم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی صلاحیت دے رکھی ہو تو اسے استعمال نہ کرنا بھی بہت بڑی ناشکری ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے والد بھی جلد یا بدیر اس بات کو سمجھ جائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اور پرنسپل صاحب کسی دن اکٹھے ان سے ملاقات کریں اور انہیں تمہارے حوالے سے قائل کریں۔"

"مگر میڈم....."

"دیکھو نور!" میڈم فرحانہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کہتے ہیں کہ بچے کا ایک باپ وہ ہوتا ہے جو اسے آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور دوسرا باپ استاد ہوتا ہے جو اسے زمین سے اٹھاتا ہے اور بلندی پر پہنچاتا ہے۔ کیا تم اپنے اساتذہ کو یہ درجہ نہیں دیتی ہو؟"

اس روز میڈم فرحانہ نے اسے نوے فیصد قائل کر لیا۔ وہ خیالوں میں الجھی اور ایک چمکیلے مستقبل کا سوچتی ہوئی سہ پہر کے بعد پہنچی۔ تاہم گھر پہنچ کر اسے ایک نئی طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ دادی اماں اور پھپھو حاجرہ اسے مختلف

نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ابا جان بھی گھر میں ہی موجود تھے۔ کچن سے بریانی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آج نور نے ذرا لمبی ٹریننگ کی تھی۔ اس کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اس نے بسمہ سے پوچھا۔ ''کھانا تیار ہے؟''

بسمہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کھانا تو دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جائے گا لیکن مہمان ابھی نہیں آئے۔''

''کون سے مہمان؟'' نور نے سلاد پر منہ مارتے ہوئے کہا۔

''تیرے مہمان۔''

''میرے مہمان؟ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون آ رہا ہے بھئی؟''

بسمہ کی مسکراہٹ جو پہلے ہی پھیکی سی تھی کچھ اور بھی پھیکی ہو گئی۔ وہ شاید بولنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی جب پھپھو حاجرہ اندر آئیں۔ نور کو گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ بسمہ کنی کترا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ نور حیرت زدہ تھی۔ ساتھ والے کمرے سے ابا جان کے کھنکھارنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھپھو حاجرہ نے بڑے دلار سے کہا۔ ''نور! اچھے رشتے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک رشتہ مل جانا، اللہ کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اب دیکھ لے تیری خالہ کی تینوں بیٹیاں ستائیس اٹھائیس سال سے اوپر کی ہیں اور اسی طرح بیٹھی ہیں۔''

''پھپھو! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' کم سن نور کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔ پھپھو بولیں۔

''اچھا رشتہ آیا ہے۔ تیرے ابا جی کے جاننے والے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ عالم دین ہیں، ان کا بڑا بیٹا ذوالقرنین۔ تیرے ابا جی کی شاپ کے ساتھ ہی اس کی شاپ بھی ہے۔ اسلامی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کا کام کرتا ہے۔ اچھی آمدن ہے۔ اپنا گھر ہے۔ صرف ایک جڑواں بہن ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔ بالکل چھوٹی سی فیملی ہے۔ یہ دیکھو۔''

پھپھو نے ایک کارڈ سائز تصویر نور کے سامنے کر دی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ تیس چوبیس سال کا نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ کہنے کو قبول صورت کہا جا سکتا تھا مگر چہرے پر عجیب طرح کی سنجیدگی اور سختی تھی۔ جیسے ہر چیز سے بیزار بیٹھا ہو۔

نور نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ تصویر میز پر رکھ دی اور اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ اس کے جسم کا سارا خون جیسے اس کے سر کی طرف یلغار کر رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' پھپھو نے پوچھا۔

نور نے اشک بار نظروں سے پھپھو کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یہ..... یہ آپ لوگ کس طرح کا مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا..... شادی بیاہ کی بات..... اس طرح کی جاتی ہے۔ نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا، نہ کچھ بتایا۔ میں نے.....'' اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھپھو نے گھبرا کر اسے کندھوں سے تھاما اور دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔ ''نور پتر! تیرے ابا جی گھر میں ہیں۔ ان کے کانوں تک آواز نہ چلی جائے۔ میری بات سن، ذرا ٹھنڈے دل سے.....''

''نہیں پھپھو..... نہیں..... میں نے کچھ نہیں سننا۔ میں نے یہ شادی نہیں کرنی۔'' وہ باقاعدہ رونا شروع ہو گئی۔ حالانکہ وہ بہت کم روتی تھی مگر آنسو جیسے بھرا مار کر اس کی آنکھوں تک آئے تھے اور آنکھوں میں ہی نہیں پورے جسم میں رواں ہو گئے تھے۔

اب بسمہ بھی اندر آ گئی تھی۔ شاید وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے نور کو اپنے ساتھ لگایا اور ہراساں لہجے میں بولی۔ ''نوری..... نوری! چپ ہو جا ابا جی نے سن لیا تو مصیبت آ جائے گی۔'' شاید بسمہ کے اشارے پر ہی پھپھو نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

بریانی کی خوشبو اب بھی نتھنوں تک پہنچ رہی تھی مگر اب یہ گندھک کی بو کی طرح نور کی ناک اور اس کے گلے کو چھیل رہی تھی۔ وہ بسمہ کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے بسمہ! تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا..... کیا تم بھی اس سارے کھیل میں شریک ہو..... کیا تم بھی یہی چاہ رہی ہو؟''

بسمہ بولی۔ ''نہیں نور! مم..... مجھے بھی ابا جان نے کل دوپہر ہی بتایا تھا..... اور تمہیں سمجھانے کے لیے کہا تھا لیکن سچی بات ہے میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی تم سے بات کرنے کی..... اور پھر رات کو وہ مجھے بازار لے گئے۔ میں واپس آئی تو تم سو رہی تھیں۔''

پھپھو بولی۔ ''ان باتوں کو چھوڑو۔ تم سب کو پتا ہے کہ ہونا تو اس گھر میں وہی ہے جو تمہارے ابا جی چاہتے ہیں اور ماں پیو کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ لڑکے کی ماں اور بہن نے پچھلے مہینے تمہارے حفیظ انکل کی شادی پر تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ بات چیت چل رہی تھی۔''

''کیوں چل رہی تھی بات چیت..... ہاں کیوں چل رہی تھی؟'' نور تڑخ کر بولی۔ ''کس نے پوچھا تھا مجھ سے؟

کس نے بات کی تھی؟ اباجی خود کہتے ہیں، اسلام میں بیٹیوں کو حق دیے گئے ہیں۔ میرا حق کہاں تھا؟ میرا حق کہاں ہے؟ اور یہ کیا بات ہے کہ کالج سے گھر آؤ تو آگے آپ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور ابھی تو مجھ سے آگے بسمہ ہے۔ اباجی کے جاننے والوں کو وہ کیوں نظر نہیں آتی؟ انہوں نے مجھ پر ہی کیوں نشانہ لے لیا ہے؟''

''ناشکری کی باتیں نہ کر۔'' پھپھو پہلی بار غصے میں بولی۔ ''ہر ایک کا مقدر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بسمہ بھی... انخواستہ کوئی لولی لنگڑی نہیں ہے۔ دیکھنا دو چار ماہ میں اس کا بھی بڑا چنگا برمل جائے گا۔ بھائی اشفاق تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔''

''فرض سے نہیں بوجھ سے۔ شاید ہم بوجھ ہیں ان کے لیے۔ وہ ہمیں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔'' نہ چاہنے کے باوجود نور کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب دروازے پر دستک ہوئی اور تینوں عورتیں ٹھٹک گئیں۔ بسمہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ باہر سے اباجی کی بھاری آواز سنائی دی۔

''بسمہ! تیار ہوگئی ہے عین النور؟''

''ہاں اباجی ہو رہی ہے۔''

''جلدی کرو بھئی! وہ لوگ آنے والے ہیں۔'' اباجی نے ملائمت سے کہا۔

ان کے قدموں کی مدھم چاپ ابھری۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نور ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ نہ جانے اتنا حوصلہ، اتنی ہمت اور جرأت اچانک اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اندر تھی اور ابا جان باہر۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جالی دار کھڑکی تک پہنچی اور کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

'ابا جان۔''

وہ ٹھٹک کر رک گئے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

''نور! کیا بات ہے؟'' انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

چند لمحوں کے نہایت بوجھل وقفے کے بعد نور نے کہا۔

''ابا جان! آپ..... ابھی..... میری کوئی بات نہ کریں۔''

مولوی اشفاق مہرا کے چہرے پر جیسے حیرت اور طیش کا دریا بہہ گیا۔ وہ بولے۔ ''مم..... میں سمجھا نہیں..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''ابا جان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے مگر میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ میری بات نہ کریں۔'' اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ نور کو خود یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کھڑکی کی اوٹ سے یہ الفاظ اپنے والد سے کہہ چکی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے لمحے تھے جنہوں نے اس طرح کی جرأت اسے عطا کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں اس کی والدہ مرحومہ کی ساری گھٹن زدہ زندگی سمٹ آئی ہے اور اپنی آپی بتول کی ازدواجی زندگی کی ساری تلخیاں بھی اکٹھی ہوگئی ہیں۔ ہاں، یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ مولوی اشفاق مہرا تیزی سے دروازے کی طرف پلٹے۔ اگلے ہی لمحے دروازے کے تختے اس طرح دھڑ دھڑائے جیسے پورا دروازہ دیواروں سے نکل کر کمرے میں آ گرے گا۔ ''دروازہ کھولو، بسمہ دروازہ کھولو۔'' وہ خوفناک آواز میں دہاڑے۔

بسمہ نے سہمی ہوئی نظروں سے پھپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''بھائی جان! ہم اسے سمجھا رہے ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''میں کہتا ہوں دروازہ کھولو، ورنہ میں توڑ دوں گا۔''

مولوی اشفاق کی آواز پورے گھر میں گونجی۔ وہ جیسے پھٹ پڑے تھے، شاید ان کا ''بی پی'' بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے دروازہ نہ کھولا تو مولوی جی کا طیش مزید بڑھے گا اور نتائج مزید برے نکلیں گے۔ پھپھو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

مولوی اشفاق کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ہاکی کا دستہ تھا۔ اندر آتے ساتھ ہی وہ جیسے نور پر پل پڑے۔ وہ چلاتی ہوئی زمین بوس ہوگئی۔ دستے کی ضربیں اس کے جسم پر تواتر سے لگ رہی تھیں۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ مولوی اشفاق دہاڑ رہے تھے۔ ''بدبخت! زبان چلاتی ہے..... میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔''

بسمہ تڑپ کر باپ کے سامنے آ گئی۔ ''اباجی نہیں..... پلیز اباجی.....''

اس نے کئی چوٹیں اپنے ہاتھوں پر سہیں۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ناخنوں سے خون بہہ نکلا۔ پھپھو بھی اپنے طور پر انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی سمیت گھر میں موجود دیگر افراد بھی ہانپتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ مولوی اشفاق غم و غصے کے عالم میں گرج رہے تھے۔ ''تیری یہ جرأت..... تیری یہ ہمت..... بے شرم بے حیا..... اپنے باپ کے منہ پر کالک مل رہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے مجھے۔ اپنے

ہاتھوں سے ذبح کر ڈال مجھے۔"

وہ پھر نور کی طرف جھپٹے۔ بڑے ماموں نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

دادی نوحہ کرنے والے انداز میں پکاریں۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا، اس کلموہی نے ایک نہ ایک دن کوئی چاند چڑھانا ہے۔ یہ ہماری جانیں لے کر رہے گی۔ میں پہلے ہی کہتی تھی، اس بے شرم کو کالجوں کی ہوا نہ لگواؤ۔ دس دس گھنٹے غائب رہتی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا کرتی پھر رہی ہے۔ اس گھر میں کوئی میری بات سنتا ہو تو پھر ہے نا۔ ہائے اللہ، یہ مجھے کیا دیکھنا پڑ رہا ہے....."

نور ایک کونے میں گٹھڑی بن کر سمٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کالج کی سفید یونیفارم پر خون کے داغ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ وہی خون تھا جو اس کا سر پھٹنے سے بہا تھا۔ اس کی گھٹی گھٹی آواز ایک دردناک فریاد بن کر کمرے میں گونج رہی تھی۔

ماموں مراد نے نور کے ابا جی کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور انہیں بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ان کی ٹوپی گر گئی تھی اور عینک ناک کے آخری سرے تک سرک آئی تھی۔ وہ دہاڑے۔ "شام تک اس خبیث کو سمجھا لو اگر سمجھتی ہے تو..... ورنہ پھر وہ ہوگا جو اس خاندان میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ میں مر جاؤں گا یا اس کو مار ڈالوں گا۔"

پورا گھر ایک طوفان کی زد میں تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ نور کے ابا جان نے کسی ایمرجنسی کا بہانہ کر کے مہمانوں کو فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع سن کر تائی جان اور مہرین وغیرہ بھی بھاگے آئے تھے۔ نور کو گھر میں ہی طبی امداد دی گئی اور اس کے سر سے مسلسل بہنے والا خون روکا گیا۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ تایا خلیل لاہور میں موجود نہیں تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر بات کو سنبھال لیا کرتے تھے۔

بسمہ نے گلوگیر آواز میں تائی جان راحت سے کہا۔ "بڑی امی! آپ بڑے ابا کو فون کریں۔ انہیں کہیں وہ آج ہی واپس آ جائیں۔"

"پتا نہیں کہ رابطہ ہوتا ہے یا نہیں۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ انہیں بتائیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر جا کر خود انہیں فون کر لیتی مگر میں چاہتی ہوں کہ یہاں نور کے پاس رہوں۔"

تائی جان نے تحمل انداز میں سر ہلایا۔ وہ نور اور بسمہ کو تسلی دیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئیں تاکہ شوہر کو فون کر سکیں۔ پھپھو مسلسل نور کو سمجھانے بجھانے میں لگی ہوئی تھیں۔ گاہے بگاہے دادی بھی کوئی کڑوا کسیلا لقمہ دے دیتی تھیں۔ دادی پرانے خیال کی عورت تھیں اور ان کی سوچ یہی تھی کہ لڑکیوں کو سات آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر گرہستی سیکھ لینی چاہیے اور ان کی شادی جلدی کر دینی چاہیے۔ دادی کی اپنی شادی فقط پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور وہ پردے کی اتنی پابند تھیں کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہوں نے ساری عمر اپنے سسر اور جیٹھوں کو اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔

وہ بار بار کہہ رہی تھیں۔ "نوری! تیرے پیو کا غصہ بڑا بھیڑا ہے۔ اگر تو نے اس کی بات نہ مانی تو اس نے جان سے مار دینا ہے تجھے۔ پھر اس راحت بی بی (تائی) نے تجھے بچانے کے لیے نہیں آنا۔"

پھپھو حاجرہ بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہہ رہی تھیں مگر پتا نہیں کہ نور کو کیا ہوا تھا۔ مار کھانے کے بعد اور باپ کی ٹھوکریں سہنے کے بعد نور کے اندر کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک باغی سر اٹھا رہا تھا۔ اپنے والد اور اپنی دادی کا باغی، اپنے اردگرد کے حالات کا باغی، اس باغی سے آج سے پہلے نور کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔

دوسرے کمرے سے ابھرنے والی دادی کی آواز مسلسل نور کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ اب اس کی مرحومہ ماں کو مجرم ٹھہرا رہی تھیں۔ ان کی تربیت کو ناقص گردان کر نور کو ان کا پرتو قرار دے رہی تھیں۔

پھپھو انہیں ایسی تلخ باتیں کرنے سے روک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی ہمنوائی بھی کر رہی تھیں۔ ابا جان نے شام تک کا الٹی میٹم دیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ شام کے فوراً بعد ہی تایا جان گجرات سے لاہور پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ان کے گھر ہی آئے تھے..... انہوں نے ہمیشہ نور سے بہت پیار کیا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا سر، زخمی کلائیاں اور سوجی ہوئی آنکھ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے سرخ و سپید چہرے پر بس سرخ رنگ ہی باقی رہ گیا۔ نور کا خیال تھا کہ شاید تایا کو دیکھ کر وہ رو پڑے گی لیکن آنسو جو بہت کم ہی اس کی آنکھوں تک آتے تھے، اب بالکل روٹھے ہوئے تھے۔ بس آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے اور ایک انگارہ سا تھا جو سینے میں دھرا ہوا تھا۔

نور کے سر پر پیار دے کر تایا جان دوسرے کمرے

میں ابا جان سے ملنے چلے گئے۔ بسمہ نے جلدی سے کوریڈور اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کردیا تاکہ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے اتنی بلند ہوگئی کہ دونوں دروازے بھی اس کی گونج کو نہ روک سکے۔ نور کے ابا جان بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتے تھے مگر آج تو وہ بھی ان کے سامنے بول رہے تھے۔ تایا کی آواز زیادہ بلند تھی اور پھر وہ بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اڑتے اڑتے کچھ الفاظ بسمہ اور نور کے کانوں تک بھی پہنچے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''بہت افسوس ہے اشفاق! بہت افسوس ہے۔ تم اپنی ہی بچی کے بارے میں ایسی غلط سوچ رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کے گلے میں پھندا ڈال کر مار دو اسے یا زندہ گاڑ دو زمین میں۔''

''خدا کے لیے بھائی جان! مجھے بولنے پر مجبور نہ کریں۔ یہ آپ لوگوں کا لاڈ پیار ہے جس نے اس کو اس حال تک پہنچایا ہے۔''

''کس حال تک پہنچایا ہے؟ کیا کردیا ہے اس نے؟ مجھے بتاؤ کون سی قیامت توڑ دی ہے اس نے؟ تم سے جینے کا حق ہی مانگ رہی ہے نا۔ یہی کہہ رہی ہے نا کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر شادی اور بال بچے کی ذمے داری نہ ڈالو اور کیا کہہ رہی ہے وہ؟''

''بھائی جان! آپ کو کچھ معلوم نہیں۔'' نور کے ابا جان نے قدرے دبی آواز میں کہا۔ ''اس کے طور طریقے بہت بدل گئے ہیں۔ یہ دیکھیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ یہ دیکھیں..... یہ ہے اس کا سامان جو نیچے پرانی پیٹی سے نکلا ہے..... یہ بھی دیکھیں.....''

دھاتی اشیا کے گرنے اور پٹخے جانے کی آوازیں آئیں۔ ایک لمحے میں نور کو اندازہ ہوگیا کہ بیسمنٹ میں موجود اس کے کپ اور ٹرافیاں وغیرہ ابا جان کی نظر میں آچکے ہیں..... اور آج دوپہر سے یہاں جو کچھ ہورہا ہے، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہاتھ ان چیزوں کی برآمدگی کا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ چکر کتنے دنوں سے چل رہا تھا۔

''تو کیا ہے اشفاق؟'' تایا جان کی بلند آواز دروازوں سے گزر کر نور اور بسمہ کے کانوں تک پہنچی۔ ''کون سا گناہ کردیا ہے اس نے۔ کون سی ایسی حرکت کی ہے جس سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟ میں پھر کہتا ہوں اشفاق! اس طرح کا کٹر پن تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم اللہ کے احکام کو مانتے مانتے اللہ کے احکام سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''بھائی جان! میں اس بارے میں آپ سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔''

''مگر میں کرنا چاہتا ہوں۔'' تایا خلیل گرجے۔ ''مجھے بتاؤ، اپنی روتی سسکتی بچی کو مار کوٹ کر کسی کی ڈولی میں دھکیلنے کا حق کس نے دیا ہے تمہیں؟''

آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ شاید درمیان میں موجود کوئی اور دروازہ بھی بند کردیا گیا تھا لیکن یہ اندازہ تو ضرور ہورہا تھا کہ ابا اور تایا میں زوردار تکرار چل رہی ہے۔ چار پانچ منٹ مزید گزرے پھر تایا جان غصے سے بھرے ہوئے ..... تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کونے میں دبکی نور کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ''چل میری بچی! یہ گھر تیرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اندھا بہرا ہوگیا ہے اس گھر کا سربراہ۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔''

پھپھو نے تایا خلیل کو روکنا چاہا پر انہیں بھی زور کی ڈانٹ کھانا پڑی۔ تایا بولے۔ ''بس، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ میرے پاس رہے گی جب تک تم لوگوں کے دماغ ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں رکھوں گا اسے۔''

قریبی کمرے سے نور کے ابا جان کی دبی دبی مگر تلخ آواز ابھری۔ ''لے جائیں..... لے جائیں اس تحفے کو۔ میں بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھوں گا یہ مرگئی ہے میرے لیے۔''

☆☆☆

اس دن کے بعد نور کے سارے روز و شب ایک دم بدل گئے۔ تایا ابا اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔ تایا کی طرح تائی راحت نے بھی ہمیشہ اس سے بہت پیار کیا تھا۔ پھر تایا کے تینوں بچے، نور کے لیے بالکل بھائی بہنوں کی طرح تھے۔ وہ شرجیل، عثمان اور مہرین کے ساتھ ایک ہی گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ مہرین اس سے صرف ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی اور فزیوتھراپسٹ بن رہی تھی۔

تایا خلیل کافی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی کے لیے بھی ان کی بات کو رد کرنا یا ان سے طویل بحث مباحثہ کرنا ممکن نہیں تھا..... اور نور کے ابا جان سے تو ان کا رشتہ بڑے بھائی کا بھی تھا۔ نور کے ابا جان مولوی اشفاق کے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ ایک حد سے زیادہ تناؤ پیدا کرسکیں۔ انہوں نے جیسے ایک دم نور

سے لاتعلقی سی اختیار کرلی۔ چار پانچ روز بعد ایک شام تایا ابا گھر آئے تو ملازم خدا بخش نے کیوس کا ایک بڑا سا بیگ کندھے پر لاد رکھا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ''لو بھئی نور! یہ میں تمہارے کپ اور ایوارڈ وغیرہ اس نامعقول کے قبضے سے نکال کر لایا ہوں۔'' نامعقول سے ان کی مراد یقیناً چھوٹا بھائی ہی تھا۔

تایا ابا نے بیگ کی زپ کھولی..... اور اس میں سے ایک بڑا کپ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ کپ ٹیوب لائٹ میں چمک رہا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ''آج میری ملاقات تمہاری ٹیچر میڈم فرحانہ بیگ سے بھی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ نور اسلام آباد جائے گی اور میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ وہ بڑی خوش ہوئی ہے۔ اسے تم سے بہت زیادہ امیدیں ہیں اور بات صرف میڈم فرحانہ کی ہی نہیں، تمہارے اکثر ٹیچرز تمہیں ایک کامیاب ایتھلیٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔''

''پر تایا ابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے اباجی کو بہت ناراض کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان سے معافی مانگ لوں۔''

''جب معافی کا وقت آئے گا تو وہ بھی مانگ لینا لیکن یہ وقت معافی کا نہیں ہے۔ اس معافی کی کم از کم قیمت یہی ہوگی کہ وہ تمہیں کمرے میں بند ہونے پر مجبور کردے گا اور پھر چند روز میں تمہارا نکاح پڑھوا کر تمہیں کسی قاری ذوالقرنین کے حوالے کردے گا۔''

''لیکن تایا ابا.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' انہوں نے نور کی بات کاٹی۔ ''میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرتی جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تائی راحت نے بھی اس کا شانہ سہلایا۔ مہرین دلچسپی اور حیرت سے نور کے درجنوں کپ اور ٹرافیاں دیکھ رہی تھی۔

دو روز بعد نور اپنے تایا جان کے ساتھ بذریعہ کوچ اسلام آباد گئی۔ اس نے ٹرائل میں حصہ لیا۔ اس کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔ اسے فوری طور پر ملازمت تو نہیں ملی تاہم اسے شارٹ لسٹ کرلیا گیا اور پوری امید دلائی گئی کہ وہ جلد ہی محکمے کی طرف سے کھیلتی ہوئی نظر آئے گی۔

اسلام آباد کے وزٹ سے نور کے اعتماد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ اسے سینئر ایتھلیٹس سے ملنے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس کے اندر زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ لاہور واپس آنے کے بعد نور نے باقاعدگی سے فرحانہ کے کوچنگ سینٹر جانا شروع کردیا۔ یہ سینٹر کئی برس پہلے فرحانہ بیگ نے کھیل سے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع کیا تھا۔ اس کا اصل نام ''فرحانہ ایتھلیٹکس اسکول تھا۔'' اسے عام طور پر ایف اے ایس کہا جاتا تھا اور ایتھلیٹکس کے حلقوں میں اس کا نام تھا۔

میڈم فرحانہ بیگ اس ادارے کی روح رواں تھیں..... اور بڑی محنت سے لڑکیوں کو رنگ کی تربیت دے رہی تھیں۔ اپنے اسکول کی دوست شاہینہ سے بھی نور کا مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ شاہینہ کا تعلق ایک ایلیٹ کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے والد ایک کامیاب صنعت کار تھے۔ اس نے ایک ہائی فائی کالج میں داخلہ لیا تھا اور اسپورٹس میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ اکثر سومیٹر کی دوڑ میں دونوں سہیلیوں کا آمنا سامنا بھی ہوجاتا تھا۔ ان دونوں کی ٹائمنگ میں بس انیس بیس کا فرق ہی تھا۔ کسی وقت نور اور کسی وقت شاہینہ کی ٹائمنگ بہتر رہتی تھی۔

دونوں فرصت کے لمحات میں بے تکلف گفتگو بھی کرلی تھیں۔ شاہینہ بھی نور ہی کی طرح دراز قد اور اسمارٹ جسم کی مالک تھی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی دونوں شاید ہم پلہ ہی تھیں تاہم شاہینہ کے نسبتاً زیادہ خوش حال لائف اسٹائل نے اس میں اضافی نکھار پیدا کردیا تھا۔ کسی بھی ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کی طرح شاہینہ بھی مستقبل کے خوب صورت سپنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی اس کی پوری سپورٹ کررہے تھے.....

ایک روز نور اپنے تایا ابا کے ساتھ ان کی سوزوکی کار میں ڈیفنس کی طرف شاہینہ سے ملنے جارہی تھی۔ تایا ابا ڈرائیو کررہے تھے۔ انہیں چار بجے تک شاہینہ کے گھر پہنچنا تھا اس لیے وہ گاڑی تھوڑی تیز چلا رہے تھے۔ ایک چوراہے سے وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ حالانکہ انہوں نے اشارہ دے رکھا تھا پھر بھی غلط سمت سے اوورٹیک کرتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے آ ٹکرایا۔ تایا ابا بمشکل موٹر کاٹا اور گاڑی کو کنارے پر لگایا۔ موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں گرے اور تھوڑی بہت چوٹیں بھی آئیں۔ دوسری طرف گاڑی کے دونوں دروازوں پر بھی ٹھیک ٹھاک رگڑیں آئیں۔ تایا جان باہر نکلے تو لڑکوں نے ان سے بدتمیزی شروع کردی۔

تایا نے ایک کو دھکا دیا، وہ تایا سے گتھم گتھا کرنے لگے۔ نور بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے لڑکوں کو تایا

سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی' اسے بھی ایک زوردار دھکا کھانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب نور نے ایک دراز قد لڑکے کو دیکھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھوٹے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور حملہ آور لڑکوں کی طرف جھپٹا۔ "اوئے کیا کرتے ہو۔ بزرگ آدمی ہیں۔" وہ پکارا۔

"بزرگ ہے تو ساری سڑک کا ماماں بن گیا ہے یہ۔" سرخ ٹی شرٹ والا لڑکا چلایا۔

اگلے ہی لمحے دونوں لڑکے دراز قد نوجوان سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دراز قد نوجوان ورزشی جسم کا مالک تھا اور لگتا تھا کہ لڑائی بھڑائی سے بھی واقف ہے۔ اس نے سرخ شرٹ والے کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی تو وہ کراہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کے اوپر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے چند مکے چلائے مگر پھر دراز قد نوجوان نے اسے اڑنگا لگا کر سڑک پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی۔ موقع پر جمع ہو جانے والے لوگوں نے سرخ شرٹ والے کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اب بھی اچھل اچھل کر نور کے تایا جان اور دراز قد نوجوان کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کوشش میں اب زیادہ دم خم نہیں تھا۔ چند تماشائیوں نے سڑک پر گرے ہوئے دوسرے لڑکے کو دراز قد نوجوان کی گرفت سے چھڑایا اور اسے لعنت ملامت کی۔ اس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

دراز قد نوجوان کی قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا اور اس میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ جھانک رہا تھا۔ وہ نور کے پاس آیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔ "آپ گاڑی میں بیٹھیں اور انکل آپ بھی بیٹھیں۔ آپ نکلیں یہاں سے، میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔"

"نہیں نہیں بیٹا! لڑائی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس ان کو سبق مل گیا ہے۔ تم بھی جاؤ یہاں سے۔"

اسی دوران میں دور سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی سفید موٹر سائیکل کی جھلک دکھائی دینے لگی..... تایا جان نے دراز قد نوجوان سے کہا۔ "ابھی ٹریفک والے آ جائیں گے۔ تم جاؤ یہاں سے بیٹا۔ وہ دیکھو، وہ خبیث بھی نکل رہے ہیں۔"

"میں بھی چلا جاؤں گا لیکن آپ گاڑی میں بیٹھیں۔" نوجوان نے بڑے اطمینان سے کہا۔

تایا ابا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، نور پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔ انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کافی آگے جا کر نور نے مڑ کر دیکھا۔ ان کا مددگار..... ٹریفک سارجنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں زبردست اعتماد تھا۔

چند روز بعد انٹر کا الجبرا مقابلے شروع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا ایونٹ تھا۔ ٹریننگ سینٹر میں میڈم فرحانہ نور کو بھرپور پریکٹس کروا رہی تھیں۔ کافی سخت شیڈول تھا۔ ہفتے میں پانچ دن، کم از کم تین گھنٹے تک وہ سخت مشقیں کر رہی تھی۔ پہلے وارم اپ ہوتا پھر جسم اور پٹھوں کو لچک دار بنانے والی ورزشیں ہوتیں۔ ان کو عرف عام میں اسٹریچنگ کی ایکسرسائزز کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد رننگ کا سیشن ہوتا۔ اس تربیتی دورانیے کے علاوہ بھی نور بس دوڑ اور مقابلے کے بارے میں ہی سوچتی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی پریشان کن سوچوں کی طرف اس کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ ہاں، رات کو جب وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹتی تو ابا جان کی صورت نگاہوں کے سامنے آ جاتی۔ ان کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکراتی۔ انہوں نے تایا جان سے کہا تھا۔ "ٹھیک ہے لے جائیں اس ٹھگنے کو یہاں سے..... میں سمجھوں گا یہ مر گئی ہے میرے لیے۔"

پچھلے دو تین ہفتوں میں بس ایک بار بسمہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چوری چھپے کالج سے سیدھی تایا کے گھر آئی تھی اور نور سے ملی تھی۔ نور کو گلے لگا کر اس نے خوب آنسو بہائے تھے اور دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ابا جان نے انہیں نور کے ساتھ ملنے سے منع کر دیا ہے۔

ایک دن اس کے لیے پھپھو حاجرہ کا فون آیا۔ وہ کسی پی سی او سے بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "نور! تیرے ابا جی بہت پریشان ہیں، تم نے بہت دکھ دیا ہے انہیں۔ یاد رکھنا انہیں ناراض کر کے تو کبھی خوش نہیں رہ سکے گی، کسی بھی کام میں کامیابی نہیں ملے گی تجھے۔"

"میں کیا کروں پھپھو؟" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "وہ جس شرط پر مجھے معاف کریں گے، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ..... اور اپنی من مرضی سے۔ بالکل جس طرح انہوں نے آپی بتول کی شادی کی۔ اسے ایک ایسے سنگ دل بندے کے حوالے کر دیا جو انہیں ہم سے ملنے تک نہیں دیتا..... جس نے آپی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے..... مجھے شادی کے نام سے ہی خوف آنے لگا ہے پھپھو۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟ شادی تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہو گی تو کیوں نا اس میں اپنے باپ کی خوشنودی شامل کر لو۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہو گی شادی لیکن ابھی نہیں پھپھو۔ ابھی..... میں کچھ کرنا چاہتی

ہوں..... کچھ بن کے دکھانا چاہتی ہوں.....''

''بن کے دکھانا چاہتی ہو۔'' پھپھو نے تلخ لہجے میں اس کی نقل اتاری۔ ''ڈاکٹر بن رہی ہونا..... انجینئر بن رہی ہونا؟ کچھ شرم کرو نور، کبڈی کھیلنے والوں کی طرح دوڑتی پھر رہی ہو۔ ہمارے خاندان میں کس نے کیا ہے اس طرح کا کام؟ اس سے کیا حاصل ہونا ہے تم کو.....؟''

''ہوسکتا ہے پھپھو کچھ ہو ہی جائے۔'' نور نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

''کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔'' پھپھو نے بھنا کر کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

وہ وہیں پر کافی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ مہرین نے اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

یہ پنجاب بھر کے کالجوں کے مقابلے تھے۔ نور اپنے کالج کی تمام برانچز کی طرف سے اس کمپی ٹیشن میں سومیٹر ریس کی نمائندگی کررہی تھی۔ اس کی دوست شاہینہ نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لینا تھا مگر مقابلوں سے صرف ایک ہفتہ پہلے شاہینہ فوڈ پوائزننگ کا شکار ہوگئی تھی اور ڈاکٹرز نے اسے تین ہفتے آرام کا مشورہ دے دیا تھا۔

یہ مقابلے نور کے لیے بڑے سودمند رہے۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی ہونہار ایتھلیٹ کے طور پر سامنے آئی۔ ان مقابلوں کے دوران میں ایک اور اہم بات ہوئی۔ اس کی ملاقات اسی دراز قد نوجوان سے بھی ہوگئی جس نے چند ہفتے پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی مدد کی تھی اور بدتمیزی کرنے والے اوباش لڑکوں کو سبق سکھایا تھا۔ وہ بڑا فلمی سا سین تھا اور اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ ابھی تک نور کے ذہن پر نقش تھا۔

مقابلوں کے دوران میں اپنی ''ہیٹ'' میں پہلا نمبر حاصل کرنے کے بعد نور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہانپ رہی تھی۔ میدان میں تالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ویل ڈن۔ مبارک ہو۔'' ایک آواز سن کر وہ چونکی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے وہی کھڑا تھا۔ دراز قد، مضبوط شانے، چمکتی ہوئی پیشانی۔

''اوہ آپ یہاں؟'' نور کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی ہاں..... میرا نام فرہاد ہے۔ میں ویکلی سپر اسٹار میں اسپورٹس کے شعبے کا انچارج ہوں۔ یہ میرا کیمرا مین تنویر ہے۔''

''آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' نور نے رسمی انداز میں کہا۔

''کیا ہم آپ کی ایک تصویر لے سکتے ہیں؟''

''نو..... آئی ایم سوری..... مجھے تصویر بنوانا پسند نہیں ہے۔'' نور نے اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے..... کوئی بات نہیں۔'' فرہاد نے خوشدلی سے کہا اور کیمرا مین کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گیا۔

''آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں مس نور؟'' فرہاد نے کہا۔

''جی پوچھیے۔''

''یہاں کافی لڑکیاں حصہ لے رہی ہیں مگر آپ اپنے لباس اور رویے کے حوالے سے سب سے مختلف نظر آرہی ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ایک لڑکی مناسب اور باوقار لباس کے ساتھ بھی اکثر کھیلوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کرسکتی ہے۔''

فرہاد نے کہا۔ ''بہت اچھی بات کہی ہے آپ نے..... لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کرے آپ آگے جائیں اور بڑے مقابلوں میں حصہ لیں۔ جب آپ اپر لیول پر پہنچتے ہیں تو پھر یہ لباس وغیرہ کے معاملے آڑے آتے ہیں۔''

''میں انشاء اللہ ایسے کسی معاملے کو آڑے نہیں آنے دوں گی۔ ثابت کروں گی کہ اگر ایک عورت میں صلاحیت ہے تو پھر اس طرح کی مجبوریاں اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔'' وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنا اسکارف بھی درست کررہی تھی۔ اس کا یہ انداز جیسے فرہاد کے دل کو بھا رہا تھا۔

اسی دوران میں نور کی استاد اور کوچ فرحانہ بیگ موقع پر پہنچ گئیں۔ نور کے تایا اور تایا زاد بھائی شرجیل بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے نور کو ''ہیٹ'' جیتنے پر مبارک باد دی اور اگلی ہیٹ کے لیے وش کیا۔ نور اپنی کوچ فرحانہ بیگ سے باتیں کرنے لگی۔ نور کے تایا خلیل بھی اب فرہاد رازی کو دیکھ چکے تھے۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملے اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ نور کی طرح تایا خلیل بھی فرہاد کے بہت شکر گزار تھے۔

فرہاد رازی بہت جلد بے تکلف ہوجانے والا نوجوان تھا۔ اس کی خوش گفتاری سے اخلاص اور انسیت جھلکتی تھی۔ فرہاد اور خلیل صاحب تماشائیوں کے درمیان آبیٹھے۔ فرہاد نے خلیل صاحب کو بتایا کہ ایک والدہ کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ دو بڑے بھائی مستقل طور پر فرانس میں

شفٹ ہو چکے ہیں۔ وہ سیلف میڈ شخص تھا۔ اپنی کوشش سے ایک ہائی فائی میگزین میں ایک اچھی جاب تک پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ اسے فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے ایک چچا ماضی میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل چکے تھے۔ شاید وہ مزید آگے جاتے لیکن چوٹ لگنے کے باعث اس فیلڈ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی کسمپرسی دیکھ کر فرہاد کو یہ خیال آیا تھا کہ ماضی کے ایسے باصلاحیت کھلاڑی جو اب گمنامی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے۔ آج کل وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست فیضان علی کے ساتھ مل کر اس پلان پر کام کر رہا تھا۔

جواب میں خلیل صاحب نے کہا۔ ”بھئی پھر تو ہم دونوں میں ایک قدر مشترک موجود ہے۔ میں نے بھی اپنے علاقے میں ایک فری کلینک قائم کیا ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں مستحق مریضوں کا حتی المقدور مفت علاج کیا جائے۔“

”اس سلسلے میں آپ کو کسی بھی طرح میرا تعاون درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔“ فرہاد نے کہا۔

خلیل صاحب نے کہا۔ ”تعاون کی صورت تو بالکل موجود ہے بھئی۔ تم نے اپنے ڈاکٹر دوست کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے دو ڈاکٹرز کا انتظام کر رکھا ہے لیکن کم از کم ایک ڈاکٹر کی ضرورت اور ہے۔ اگر تمہارے دوست اپنی سہولت کے مطابق کچھ وقت دے سکیں تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اگر وہ مناسب معاوضہ چاہیں گے تو وہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔“

”آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں انکل۔“ فرہاد نے محبت سے کہا۔ ”کسی نیک کام میں حصہ ڈالنے کا موقع ملنا تو ایک سعادت کی طرح ہوتا ہے۔“

کوئی دو گھنٹے بعد نور کی دوسری ہیٹ ہوئی۔ یہ ہیٹ بھی اس نے ایک سخت مقابلے کے بعد جیت لی۔ یہ بڑی اہم کامیابی تھی، سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ تماشائیوں میں صرف فیملیز کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ بڑا اچھا ماحول تھا، نور کی کلاس فیلوز نے نور کی اس کامیابی کو بڑی اچھی طرح ”سیلیبریٹ“ کیا۔ اب فائنل ہیٹ تھی، اس میں پنجاب کے انٹر کالجیٹ مقابلوں کی تیز رفتار ترین لڑکی کا انتخاب ہونا تھا..... نور کے اچھے چانسز موجود تھے۔

دوسری ہیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد جب نور انکلوژر میں پہنچی تو تایا خلیل اور فرہاد پرانے شناساؤں کی طرح بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ تایا خلیل، فرہاد کو مدعو کر چکے تھے کہ وہ ان کے گھر آئے اور گھر کے بالکل پاس ہی واقع ان کے فری کلینک اور ڈسپنسری کا معائنہ کرے۔

اگلے روز کا فائنل مقابلہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ نور یہ مقابلہ جیت تو نہیں سکی مگر اس نے تیسری پوزیشن حاصل کر لی اور وکٹری اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ اس نے کانسی کا تمغا جیتا۔ یہ کامیابی بھی معمولی نہیں تھی۔ تایا خلیل نے اسے گلے سے لگایا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ ”مجھے اپنے اللہ سے پوری امید ہے، ایک دن تم کوئی بڑی کامیابی حاصل کر کے اس نامعقول کا منہ بند کرو گی۔“

نامعقول کا لفظ وہ اکثر و بیشتر اپنے چھوٹے بھائی اشفاق کے لیے ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ اشفاق جن کو عام لوگ مولوی اشفاق مہرا کہتے تھے اور جن کا کتابوں کا کاروبار آہستہ آہستہ جم رہا تھا۔

انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد نور کا اکثر فرہاد سے آمنا سامنا ہونے لگا۔ فرہاد اور اس کا دوست ڈاکٹر فیضان، تایا جان کے فری کلینک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ فرہاد اکثر گھر بھی آ جاتا تھا۔ شرجیل اور عثمان سے بھی اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں نور کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دل کی گہرائی میں کسی گوشے کے اندر فرہاد کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کیفیت شاید یک طرفہ نہیں تھی۔ اس نے بھی اکثر فرہاد کی گہری آنکھوں میں اپنے لیے ایک بے نام سا عکس لرزاں دیکھا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی، اس کے دور شباب کے کچھ تقاضے تھے مگر وہ ان معاملوں سے کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے مہربان اور محسن تایا کے لیے کسی بھی درجے کی معمولی سے معمولی پریشانی کا باعث بنے۔ وہ اپنے حوالے سے انہیں ہمیشہ سربلند اور سرخرو دیکھنے کی خواہش مند تھی..... اور اس کے لیے اپنے جسم اور جان پر ہزار ہا صدمے سہنے کے لیے تیار تھی۔

ایک روز بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ تایا ابا گھر میں ہی تھے۔ فرہاد بھی آیا ہوا تھا اور ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ نور کو ٹریننگ سینٹر جانا تھا۔ بڑے تایا زاد بھائی شرجیل کو کوئی کام تھا اور وہ گاڑی لے کر گیا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر تایا ابا یا عثمان اسے موٹر بائیک پر لے جاتے تھے۔ آج بھی یہی پروگرام تھا مگر پھر بارش شروع ہو گئی۔

”تایا ابا! مجھے دیر ہو جائے گی۔ آج میرا جانا بہت ضروری ہے۔“ نور نے ڈرائنگ روم میں جا کر اور ذرا ٹھنک کر کہا۔

بادل گرج رہے تھے اور بارش برسنا شروع ہو گئی تھی۔

تایا ابا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ”ایسا کرو تم فرہاد

بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ یہ تمہیں چھوڑتا ہوا نکل جائے گا، واپسی پر شرجیل لے آئے گا۔''

''لیکن تایا ابا .....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا جی! میں کہہ رہا ہوں نا کہ چلی جاؤ۔'' تایا ابا نے اعتماد سے کہا۔ فرہاد کے پاس چھوٹی سوزوکی مہران تھی۔ وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ہلکی بارش ہو رہی تھی لیکن پھر سہ پہر میں ہی اندھیرا چھا گیا اور تابڑ توڑ مینہ برسنے لگا۔ یہ جولائی کا وسط تھا اور مون سون کی دوسری بارش تھی۔ انہیں ریواز گارڈن سے قذافی اسٹیڈیم کی طرف جانا تھا۔ ابھی وہ نہر والی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں شدید ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑا ہورڈنگ سڑک پر گر گیا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہے اور گاڑیاں آمنے سامنے سر جوڑے کھڑی ہیں۔ ایسے شدید موسم میں عام طور پر ٹریفک پولیس بھی دائیں بائیں ہو جاتی ہے اور پھنسی ہوئی سیکڑوں گاڑیاں قدرت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ گاڑی موڑ لی جائے۔'' فرہاد نے کہا۔

''ہاں، وہ دیکھیں اور لوگ بھی مڑ رہے ہیں۔'' نور نے تائید کی۔

فرہاد نے پھرتی سے گاڑی موڑ لی۔ اب انہیں ایک لمبا چکر کاٹ کر کینال روڈ پر پہنچنا تھا مگر وہ دو تین سو میٹر دور ہی گئے ہوں گے کہ یہاں بھی ٹریفک جام ملا۔ فرہاد نے بہتر سمجھا کہ گاڑی ریس کورس پارک کی پارکنگ میں لے جائے۔

انہوں نے گاڑی پارکنگ میں روک دی اور سڑک کی صورتِ حال بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش اتنی تابڑ توڑ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اردگرد کے راستوں پر کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ اب اگر ٹریفک کھل بھی جاتا تو وہ اتنی جلدی یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

''یہ تو اچھا نہیں ہوا۔'' نور بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ''میڈم فرحانہ سینٹر میں پریشان ہوں گی۔ ادھر تایا جان کو گھر میں فکر ہو گی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں نور، وہ سامنے پی سی او نظر آ رہا ہے۔ میں انکل خلیل کو فون کر دیتا ہوں۔''

''ابھی ٹھہر جائیں، بارش تیز ہے۔'' نور نے کہا۔

آدھ پون گھنٹا مزید گزر گیا۔ بارش کچھ دیر کے لیے ہلکی ہو کر پھر تیز ہو جاتی تھی۔ سیوریج کے نظام میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے اردگرد کی سڑکوں پر پانی کی سطح بلند ہوتی جا رہی تھی۔ آخر نور کے منع کرنے کے باوجود فرہاد نے اپنی جینز گھٹنوں تک اڑسی اور فون کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی اور نور کو تشویش لاحق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی مگر تھی تو لڑکی ہی۔ آخر فرہاد واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جو اس نے شاپر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

''ہو گیا فون؟'' نور نے پوچھا۔

''بالکل ہو گیا۔ انکل نے ہی اٹھایا تھا، پریشان تھے۔ انہوں نے سینٹر میں فون کیا تو وہاں سے میڈم فرحانہ نے انہیں بتایا کہ نور نہیں پہنچی۔''

''مجھے یہی پریشانی تھی۔''

''نہیں۔ میں نے انہیں پوری تسلی دے دی ہے اور کہا ہے کہ وہ میڈم کو بھی آگاہ کر دیں۔''

اس طرف سے پریشانی ختم ہوئی تو نور نے شاید پہلی بار اردگرد کے موسم کی نیرنگی پر دھیان دیا۔ دور تک ریس کورس پارک کے خوب صورت سبزہ زار نظر آ رہے تھے۔ ان میں درخت تھے اور پھولوں کے تختے تھے ..... اور روشیں تھیں۔ یہ سب کچھ تسلسل کے ساتھ مون سون کی اس دھواں دھار بارش میں بھیگ رہا تھا۔

''یہ لیں جی! کے ایف سی کے برگر۔ مجھے پتا تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔'' فرہاد نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے؟''

''اگر میں کہہ بھی دوں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔ آپ ہر وقت جسمانی مشقت کی صورتِ حال میں رہتی ہیں۔ عام لوگوں کی نسبت آپ کو انرجی کی زیادہ ضرورت ہے۔''

''تو پھر عام لوگ اپنے لیے برگر کیوں لے آئے ہیں؟'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔'' وہ اپنے بھیگے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔

اس نے ایک برگر نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور نے ابھی دو بائٹ ہی لیے تھے کہ وہ پکارا: ''ٹھہریے محترمہ! آپ کا زنگر تو یہ رہا۔ یہ میرا ویلیو برگر ہے۔'' اس نے نور والا برگر اس سے لے کر دوسرا تھما دیا۔

زنگر واقعی نور کو پسند تھا مگر فرہاد کی اس حرکت میں تھوڑی سی شوخی اور چالاکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ

کر ''برگر'' نور کو تھما دیا تھا۔ اب وہ اس کے جھوٹے برگر کو بڑے اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا۔ یہ ایک معنی خیز اشارہ تھا۔ نور کے سارے جسم میں جیسے سنسنی اور انبساط کی ایک لہر سی دوڑی۔

اس نے بائٹ لیتے ہوئے کن انکھیوں سے فرہاد کی طرف دیکھا۔ وہ یوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ دلکش شخصیت کا مالک تھا اور یہ دلکش شخصیت دن بدن اس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔

کولڈ ڈرنک کا سپ لے کر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''یہ راستے بھی کیا چیز ہوتے ہیں نور! اپنوں کو غیر اور غیروں کو اپنا بنا دیتے ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر اس روز میں خلافِ معمول اس سڑک سے گزر کر آفس نہ جا رہا ہوتا تو آپ سے اور انکل سے کبھی ملاقات نہ ہو پاتی۔''

''ہاں، راستے کیا چیز ہوتے ہیں اور یہ بارش بھی کیا چیز ہوتی ہے..... دو اچھے بھلے بندوں کو ایک گاڑی میں بند کر کے، فلسفیوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' وہ بولی۔

''تو میں آپ کو فلسفی لگ رہا ہوں؟''

''باتیں تو ایسی ہی کر رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔''

''ویسے برا نہ مانیے گا۔ یہ بڑا گھسا پٹا فقرہ ہے۔''

''الفاظ اہم نہیں ہوتے محترمہ، ان کا مفہوم اور ان کی تاثیر اہم ہوتی ہے۔''

اچانک سامنے آسمان پر بجلی کا نہایت زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ نور نے بے ساختہ فرہاد کا بازو تھام لیا۔ اس کی انگلیاں جیسے اس کے سڈول بازو میں کھب سی گئی تھیں۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ ہٹا بھی لیا۔ بارش کی بوچھاڑیں تیز ہو گئیں۔

فرہاد نے کہا۔ ''آپ بہادر لڑکی ہیں۔ چھوئی موئی لڑکیوں سے بہت مختلف لیکن ہیں تو لڑکی۔'' اس کا اشارہ یقیناً اس گرفت کی جانب تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نور نے اس کے بازو پر بنائی تھی۔

وہ اپنے نیلے اسکارف کو درست کرتے ہوئے بولی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر آپ تھوڑی سی ''مزید لڑکی'' ہوتیں۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''فلموں ڈراموں میں تو لڑکیاں ایسے موقعوں پر ڈر کر قریبی مرد حضرات کے اوپر ہی گر جاتی ہیں۔''

''آپ کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہے۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔

''سس..... سوری۔''

وہ ذرا توقف سے گویا ہوئی۔ ''میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر پانی کافی کم ہو گیا ہے۔''

فرہاد نے ٹھنڈی سانس لی۔ پانی واقعی ایک دم کم ہونا شروع ہو گیا تھا حالانکہ بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فرہاد کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اتنے خوب صورت موقع کو یونہی بغیر ''پیش رفت'' کے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ کبھی سڑک کو دیکھ رہا تھا، کبھی آسمان کو۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' نور نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا..... اس کی خوب صورت آنکھوں میں پھر ہلکی سی شوخی عود کر آئی۔ ''اوکے۔'' اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ تین چار بار سیلف لگایا لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ ''ہو جا..... ہو جا۔ میری جان کی دشمن ہو جا.....'' وہ بڑبڑایا۔

پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے نور صاحبہ! گاڑی ہم سے متفق نہیں۔ وہ اس موسم سے تھوڑا سا اور لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔''

''کچھ لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ سمجھ دار سمجھتے ہیں..... مثلاً، ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس وہی جانتے ہیں کہ گاڑیوں میں چور سوئچ بھی ہوتے ہیں۔''

''آپ کا خیال ہے میں نے چور سوئچ دبایا ہے؟''

''میرا خیال یہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ حرکت فرمائی ہے۔''

''اوہ گاڈ..... تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں۔'' فرہاد نے بے بسی کی اداکاری کی اور تھکے ہوئے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسے برا نہ مانیے گا۔ کیا آپ کا بھی کوئی چور سوئچ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے؟''

''یہ کیا سوال ہوا۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''دراصل، مجھے لگتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے جس کے سبب آپ نے اپنی خاص قسم کی دھڑکنوں کو بند کیا ہوا ہے..... پلیز، اس سوئچ کو آف کریں۔ دل کو دھڑکنے دیں، آزادی سے..... جب وہ دھڑکے گا تو زندگی کی رگوں میں خون خود ہی اپنے راستے تلاش کرنا شروع کر دے گا۔''

''مجھے شاید نئے راستوں کی ضرورت نہیں۔ میں جس راستے پر چل رہی ہوں، وہی میرے لیے کافی ہے۔''

''دیکھا نا۔ ہے چور سوئچ۔ بالکل ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

اس کے انداز نے نور کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کردیا مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سنجیدہ ہوگئی۔ ''اچھا اب چلیں۔ ابھی اندھیرا ہوجائے گا۔''

''لیکن..... آپ نے یہ سوئچ آف کرنے والا کام ضرور کرنا ہے۔ پلیز..... پلیز۔''

وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی پھر اسے لگا کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی طرح ہے۔ اس نے گھبرا کر کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

''تھینک یو..... تھینک یو۔'' فرہاد نے کہا اور نیچے جھک کر گاڑی کا چور سوئچ دبا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گئی۔ پارکنگ سے باہر نکلتے ہی وہ چوراہے پر پہنچ گئے۔ ٹریفک سگنل بند تھا، انہیں رکنا پڑا۔ دفعتاً نور کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر بائیں جانب کھڑی ایک ایف ایکس گاڑی پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا کرخت شکل اور چھوٹی ڈاڑھی والا جو نوجوان بیٹھا تھا، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اسے پہچان سکتی تھی، یہ وہی تھا..... ہاں، یہ وہی تھا۔ پھپھو اور بسمہ نے اس کا نام... ذوالقرنین بتایا تھا۔ یہی تھا جسے اباجی نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ بھی بڑے دھیان سے نور ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نور نے گھبرا کر اسکارف کو اپنی ٹھوڑی سے اوپر کھینچ لیا اور اپنا ایک تہائی چہرہ چھپالیا۔ فرہاد نے اس وقت کوئی مزاحیہ بات کی تھی اور ہنس رہا تھا۔ نور کو اس کی بات کی سمجھ آئی تھی اور نہ اس کی ہنسی کی، اس کے اندر تو جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے ایف ایکس پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً وہ مولانا حبیب کا بیٹا قاری ذوالقرنین تھا اور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران میں فرہاد نے بھی نور کی بے چینی کو نوٹ کرلیا۔ وہ بولا۔ ''کیا بات ہے نور..... آپ کچھ پریشان ہوگئی ہیں؟''

''نہیں، پریشان تو نہیں۔'' اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

اسی دوران میں سگنل سبز ہوگیا۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ فرہاد آگے نکل گیا۔ ذوالقرنین غالباً آخر تک نور کو دیکھتا رہا تھا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جاکر نور نے سائڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نیلے رنگ کی ایف ایکس اب بھی ان کے پیچھے آرہی تھی۔ نور کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔

اب ایف اے ایس کا ٹائم تو گزر چکا تھا، اس لیے نور واپس گھر ہی جارہی تھی۔ مزنگ چونگی کے چوراہے پر نور نے ایک بار پھر عقب نما میں جھانکا، نیلی گاڑی عقب میں موجود تھی مگر پھر آگے جاکر وہ نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

رات کو نور دیر تک جاگتی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ ذوالقرنین نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، وہ شکوک وشبہات سے اٹی ہوئی تھیں۔ کیا وہ اس بارے میں کسی کو آگاہ کرے گا؟ کہیں وہ یہ بات نور کے گھر اور اس کے اباجی تک تو نہیں پہنچادے گا؟ اور اگر ایسا ہوا تو اباجی جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، ان کا ردعمل کیا ہوگا؟

اس نے سوچا کہ کیا وہ اس حوالے سے پیش بندی کرے اور پہلے ہی تایا جی اور تائی جی کو بتادے؟

اگلے روز وہ قریبی مارکیٹ میں گئی اور وہاں سے بسمہ کی ایک دوست کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ بسمہ پی سی او سے تایا کے فون پر رابطہ کرے یا خود گھر آکر اس سے ملے۔ شام سے کچھ دیر پہلے گھر کے فون پر بسمہ کی کال آگئی۔ نور نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''بسمہ! گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟''

''بس اسی طرح کی خیریت ہے جس طرح کی چل رہی تھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟''

''نن..... نہیں..... مگر مجھے پریشانی تھی۔ انٹر کا لجیٹ مقابلوں کے بعد میری ایک تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی۔ اباجی کی نظر سے تو نہیں گزری؟'' نور نے بات بنائی۔

''گزری بھی ہوگی تو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ آج کل بالکل گم صم سے ہیں نور! آپی بتول کی طرف سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔ بھائی غیاث کا رویہ دن بدن خراب ہوتا جارہا ہے۔ اتوار کو بڑے ماموں مراد ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپی سیڑھیوں سے گری ہے۔ ماتھے اور کلائی پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ گری ہیں یا کچھ اور ہوا ہے۔''

نور کے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔ اپنے بہنوئی غیاث کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور شاید اچھا ہی کرتا تھا کیونکہ اس کے منہ سے اکثر پتھر ہی جھڑتے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب کبھی بھی اس کے

تصور میں اپنے بہنوئی غیاث کی سخت گیری یا اپنی مرحومہ ماں کی بے بسی آتی تھی، اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہوجاتی تھی۔ اس کے پاؤں جیسے بے ساختہ حرکت کرنے لگتے تھے۔ اس کے سینے میں ترنگ سی جاگنے لگتی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن، کچھ کر دکھانے کی تڑپ، مرد کے تسلط سے آزادی کی آرزو۔

پانچ چھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس روز والے واقعے کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ نور اب سوچنے لگی کہ شاید وہ ذوالقرنین تھا ہی نہیں۔ اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے یا شاید اسکارف کی وجہ سے وہ اسے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نور کو پہچان تو لیا ہو مگر فرہاد کو اس کا تایازاد بھائی یا ماموں سمجھا ہو۔

☆☆☆

ذوالقرنین نماز روزے کا پابند ایک پرہیز گار نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ والد مولانا حبیب اللہ ایک جانے پہچانے عالم دین تھے لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو بچوں کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔ زندگی کے ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اسی طرح شباب کے بھی۔

ذوالقرنین ان نوجوانوں میں سے تھا جو کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اسے بالغ ہوئے سات برس ہونے والے تھے اور اس کے جسمانی تقاضے شاید اس سے بھی پہلے کے تھے پھر ایک روز اس نے ماں سے کہہ ہی دیا تھا.....

"امی! میرے لیے کوئی ڈھونڈیں....."

اس واقعے کے کوئی دو ماہ بعد اس نے ایک شادی میں پہلی بار مولوی اشفاق صاحب کی دختر عین النور کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی مکمل عبایا میں تھی۔ ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ نے اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ذوالقرنین! وہ کریم کلر عبایا والی ہے جس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔"

اس کے بعد شادی کی پوری تقریب میں ذوالقرنین کی نگاہوں میں اس کا من موہنا چہرہ گھومتا رہا تھا۔ بعد ازاں اسے ایک دن عین النور کی ایک تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ اس کے دل کو یہ لڑکی ہر طرح سے بھائی تھی۔ اس نے کئی شب و روز اس کی سوچ میں گم گزار دیے تھے۔ اس نے آنے والے خوشگوار دنوں کی چاپیں سنی تھیں اور دھڑکنوں کو بے ترتیب محسوس کیا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آیا تھا جب یہ معاملہ فائنل ہونے جا رہا تھا..... اور تب سب کچھ اٹھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات جہاں تک پہنچی تھی وہیں پر ختم ہو گئی تھی..... اور کچھ دنوں بعد یہ اڑتی اڑتی سی بات دل گرفتہ ذوالقرنین کے کانوں تک پہنچی تھی کہ لڑکی اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر تایا کے گھر میں رہنے لگی ہے اور کھیلوں وغیرہ میں حصہ لے رہی ہے..... چار دن پہلے ذوالقرنین نے مولوی اشفاق کی بیٹی عین النور کو پھر دیکھا تھا اور اس مرتبہ کسی شادی کی تقریب میں نہیں بلکہ بارش کی رم جھم میں ریس کورس پارک کے سامنے ایک گاڑی کے اندر۔ وہ ایک خوبرو نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور ذوالقرنین کی طرف دیکھ کر بے طرح ٹھٹک گئی تھی۔ تب سے ذوالقرنین کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکی کچھ غلط سلط چکروں میں پھنس چکی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ اپنی بہن خدیجہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرے..... لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ ایک بار خود اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے یہ کھوج بھی لگا لیا تھا کہ نور اس روز جس خوبرو لڑکے کے ساتھ دیکھی گئی تھی، اس کا نام فرہاد رازی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کے ہفت روزہ میگزین میں کام کرتا ہے اور آج کل نور کے تایا خلیل مہرا صاحب کے گھر میں اس کا بہت آنا جانا ہے۔ یہ معلومات اس نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے حاصل کی تھیں۔ یہ دونوں دوست ایک مقامی تنظیم اصلاحِ معاشرہ کے کارکن تھے۔ کچھ عرصے سے ذوالقرنین بھی اسی تنظیم کا رکن تھا۔

☆☆☆

نور ٹریننگ سینٹر ائیر ایس میں موجود تھی اور اسٹریچنگ کی ورزشیں کر رہی تھی۔ کوچ میڈم فرحانہ کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں دیگر لڑکیوں کو انسٹرکشن وغیرہ دینا بھی نور کی ذمے داری تھی۔ اتنے میں چوکیدار زمان خان نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ "بی بی صیب! ایک بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت دیر سے ضد کر رہا ہے۔ اپنا نام ذوالقرنین بتا رہا ہے۔"

نور کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ اس نے پونی ٹیل کس کر باندھی۔ اپر پہنا پھر اسکارف لیا اور باہر پہنچی۔ وہ میڈم فرحانہ کے آفس میں بیٹھا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور "السلام علیکم" کہا۔

"جی فرمائیے۔" نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''اہم بات ہے۔ کیا آپ مجھے بیٹھنے کا نہیں کہیں گی؟''

پہلے تو نور کے جی میں آئی کہ نفی میں جواب دے پھر اس نے خود کو سنبھالا اور میڈم کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی کہنا ہے چند لفظوں میں کہہ دیں۔''

''چند لفظوں میں کہنے والی بات ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔'' وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''آپ کو تسلی سے سننا ہوگا۔ ورنہ میں کسی اور وقت آجاؤں گا۔''

''آپ کوئی بہت بڑا انکشاف نہیں فرمانے والے، آپ نے مجھے گاڑی میں تایا جان کے دوست کے ساتھ دیکھا ہے اور اب اسی سلسلے میں کوئی بے کار بات ارشاد کرنے والے ہیں۔''

''میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ آپ گمراہی کی طرف جارہی ہیں۔ آپ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کے والد مولوی اشفاق ایک عزت دار آدمی ہیں۔ آپ کیوں ان کو رسوا کرنا چاہ رہی ہو؟'' وہ نور کی طرف دیکھے بغیر بات کررہا تھا۔

''دیکھو مسٹر! تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرسکتے۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم خوامخواہ ٹھیکیدار بننے کی کوشش نہ کرو۔''

''اگر تمہیں اپنے اچھے برے کی تمیز ہوتی تو اپنے محسن اور اپنے بدخواہ کو پہچانتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔''

''بلیک میل کررہے ہو؟ ٹھیک ہے بتادو جس کو بتانا ہے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے.....''

''اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم ایک نہیں کئی غلط کام کررہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ نہ بھی ہو تو انسانیت کے طور پر میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ یہ پتلونیں کس کے چھلانگیں مارنا، فٹ بال اور جوڈو کراٹے کھیلنا، کیا یہ لڑکیوں اور عورتوں کے کام ہیں؟ قدرت نے عورت کو صنفِ نازک بنایا ہے، اس کی کچھ اور ذمے داریاں ہیں، اس کی محنت مشقت کے کچھ اور میدان ہیں۔''

''ہاں کچن میں برتن دھونا، ڈھیروں کپڑے استری کرنا، سستے بازاروں میں جاکر بچوں کے لیے شاپنگ کرنا..... یہ ہیں اس کے میدان..... تم جیسے لوگ ہیں مسٹر ذوالقرنین! جنہوں نے اسلامی دنیا کی نصف آبادی کو مُردار بنا کر رکھ دیا ہے، اپنی یہ تقریر تم اپنے پاس رکھو تو بہت بہتر ہے۔''

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

ذوالقرنین کا چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا۔

وہ واپس ہال کمرے میں جاکر بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بندہ جاچکا ہے۔

تین چار دن پھر تناؤ میں گزرے۔ نور کو اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ردعمل ظاہر ہو۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ اب کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔ کسی اور سے، اس کی مراد نور کے ابا جان کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی؟

بہرطور خیریت ہی گزری۔ نور اب فرہاد کے سلسلے میں زیادہ محتاط ہوگئی تھی۔ وہ دو تین بار گھر بھی آیا مگر نور نے اس کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ حسبِ معمول اسے کالج چھوڑنے اور واپس لانے کے لیے ماموں مراد کی ڈیوٹی تھی۔ الیف اے ایس کی آمدورفت تایا ابا کے ذمے تھی۔ تایا اب اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے تھے اور شب و روز اس کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے۔ وہ تہجد بھی پڑھتے تھے۔ ایک رات نور کھانسی کی دوا لینے کے لیے اٹھی تو اس نے چار بجے کے لگ بھگ تایا ابا کو مصلے پر بیٹھے اور اشک بار آنکھوں سے دعا مانگتے دیکھا۔ نور کو دیکھ کر انہوں نے دعا ختم کی اور اس سے اٹھنے کی وجہ پوچھی تو نور نے بتایا کہ یونہی رات کے کھانے میں دہی پکوڑیاں کھالی تھیں جس کی وجہ سے کھانسی ہورہی ہے۔

وہ مضطرب ہوگئے۔ ''اگر زیادہ مسئلہ ہے نور تو ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ تمہیں اس طرح کی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے۔ سالانہ ایونٹ میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہیں ہر طرح فٹ ہونا چاہیے۔''

اس نے تایا ابا کو تسلی دی اور بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

وہ بالکل ٹھیک تھی..... لیکن شاید بالکل ٹھیک نہیں بھی تھی۔ وہ فرہاد سے مکمل گریز کررہی تھی مگر اس گریز میں شاید اس کا دل اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک دن دور سے فرہاد کا ستا ہوا چہرہ دیکھا تھا اور اس کے سینے میں ایک درد سا لہریں لینے لگا تھا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں خود ہی سے پوچھا..... ''کیا تم فرہاد کو چاہنے لگی ہو؟''

جواب نفی میں نہیں تھا۔ اسے ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ ان راستوں پر چلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے کھیل پر مرکوز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے ایسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی لغزش بھی نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے تایا ابا کو ابا جان کے سامنے یا دیگر لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے اندر ایک

جنگ سی رہنے لگی۔ وہ ٹریننگ میں بھرپور حصہ لے رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت اس کے تصور میں فرہاد کا ستا ہوا اداس چہرہ بھی آجاتا تھا۔

ایک دوپہر جب گھر میں سب سو رہے تھے، فون کی بیل ہوئی۔ نور نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فرہاد تھا۔ نور کی آواز پہچان کر وہ فوراً بولا۔ ''پلیز نور! فون بند نہ کرنا۔ میں آپ سے بس ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کہیے میں سن رہی ہوں۔''

''نور! مجھے لگتا ہے کہ اس روز میں نے گاڑی میں آپ سے جو بے تکلف باتیں کیں، وہ آپ کو بری لگی ہیں۔''

''بری نہیں لگیں تو اچھی بھی نہیں لگیں۔'' اس نے مبہم جواب دیا۔

''میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں..... اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''چلیں، آپ وعدہ کرتے ہیں تو اچھی بات ہے۔''

''لیکن صرف ایک درخواست ہے میری۔''

''فرمائیں۔''

''صرف ایک بار..... آپ سے دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن فون پر نہیں آپ کے سامنے بیٹھ کر۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے ابھی جو وعدہ کیا ہے وہ آغاز ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا ہے۔''

''نہیں نور! یقین کریں میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے۔ اپنی وجہ سے میں آپ کے ماتھے پر ایک چھوٹی سی شکن دیکھنا بھی نہیں چاہوں گا۔ مجھے آپ کے صرف دس پندرہ منٹ درکار ہیں، جہاں بھی آپ کہیں۔''

نور صاف انکار کردینا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں کیوں نہ کرسکی۔ کچھ فرہاد کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ وہ اسے سخت جواب نہ دے سکی۔

تایا جان فرنیچر کا کام کررہے تھے۔ وہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں چنیوٹ جاتے تھے اور پھر گجرات کا چکر لگاتے ہوئے اگلے روز واپس آتے تھے۔ دو روز بعد وہ جانے والے تھے، ان کی غیر موجودگی میں گاڑی بھی ان کے پاس ہی ہوتی تھی، ایک دن کے لیے نور کو رکشا پر ایف اے ایس جانا پڑتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ رکشا پر گئی اور گلبرگ مارکیٹ کی ایک کیفے شاپ میں اس نے آدھ پون گھنٹے کے لیے فرہاد سے بات چیت کی۔ اس نے چادر کا نقاب کیا ہوا تھا اور آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ فرہاد نے بڑے سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں نور کی سماعت تک اپنے دل کی بات پہنچائی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا اس کے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ نور کا جواب بھی حوصلہ شکنی والا نہیں تھا۔ تاہم اس نے دو باتیں فرہاد پر بالکل واضح کردیں۔ اس نے کہا کہ اس کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ اس کے بڑوں نے کرنا ہے اور وہ ان کے اس حق میں ایک ذرا سی کمی بیشی کی بھی متحمل نہیں ہے..... کیونکہ وہ پہلے ہی اس حق کے حوالے سے بہت شرمندہ ہے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ فی الحال اس کی ساری توجہ اپنے کیریئر کی طرف ہے، اس کے تایا ابا نے جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا ہے، وہ اسے پورا کرنا چاہتی ہے..... جب وہ اس مرحلے سے نکل جائے گی تو پھر شادی وغیرہ کا معاملہ زیر غور آئے گا۔ تب تک وہ فرہاد سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ہاں ان کے دلوں میں جو کچھ موجود ہے، وہ موجود رہے گا اور وہ اس حوالے سے دعاگو رہیں گے۔

یہ دوسری شرط کافی کڑی تھی۔ فرہاد نے بصد منت و سماجت نور سے اتنی سی رعایت لے لی کہ مہینے میں فقط ایک بار وہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے بات کرلیا کریں گے اور وہ بھی فون پر۔

وہ بے حد خوش گفتار تھا۔ اس کی باتوں میں محبت اور لطافت کی ایسی چاشنی تھی کہ نور اس کے پاس سے اٹھ نہیں پارہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''نور! میں نے آپ کو پہلی بار شادی کے فنکشن میں دیکھا تھا، آپ نے بڑے کلرفل کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ آپ کو بالکل سادہ لباس میں دیکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو ایک بار پھر رنگین لباس میں دیکھوں۔ لگتا ہے کہ اگلے ہفتے شاید میری یہ مراد پوری ہوجائے۔''

''کیا مطلب؟'' نور نے اپنی لمبی پلکیں جھپکیں۔

''آپ کے کالج میں گیٹ ٹوگیدر ہے، چھوٹے موٹے کھیل بھی ہوں گے۔ مجھے رسالے کی طرف سے کوریج کے لیے آنا ہے.....''

بنا سنورنا نور کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ لڑکپن میں جب وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتی تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔ ایسا عموماً شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی ہوتا تھا..... اور اس وقت تو نور کی باقاعدہ ہنسی چھوٹ جاتی تھی جب وہ دیکھتی کہ ابا جان کے ڈر سے ان کا سارا بناؤ

سنگھار بھاری اوڑھنیوں کے نیچے چھپ گیا ہے اور وہ زرق برق کپڑے پہن کر جس طرح لپٹی لپٹائی ہوئی، تقریب میں گئی تھیں اسی طرح واپس آ گئی ہیں۔

لیکن آج وہ خود کو بناؤ سنگھار کے لیے تھوڑا سا مجبور پا رہی تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط سے ہی کام لیا۔ ہلکی سی لپ اسٹک، تھوڑا سا پف پاؤڈر اور بائیں کلائی میں چند چوڑیاں، لباس بھی زیادہ شوخ نہیں تھا۔ کالج کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں میلے کا سماں تھا، بے شمار اسٹالز اور تفریح کے لوازمات تھے۔ اس کی کولیگ شاہینہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی آج کل پوری تندہی سے صوبائی سطح کے مقابلوں کی تیاری کر رہی تھی۔

فرہاد اور چند دیگر اخباری نمائندے اس تقریب میں چکرا رہے تھے۔ فرہاد کے ساتھ ایک خاتون فوٹو گرافر تھی۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا نور تک آ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد بولا۔ ''آپ کو رنگین لباس میں دیکھنے کی خواہش تو کسی حد تک پوری ہو گئی..... مگر..... یہ جو چلمن ہے دشمن ہے ہماری۔''

''اور یہ ہمیشہ دشمن ہی رہے گی۔'' نور نے مستحکم لہجے میں کہا۔ (چلمن سے فرہاد کی مراد، نور کا اسکارف تھا)۔

''چلیں، کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی شکر کا مقام ہے۔'' فرہاد نے نور کے سراپا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

نور کو اپنے رخساروں پر شرم کی تمتماہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔ ''اب اگر آپ کسی اور طرف تشریف لے جائیں تو بہتر نہیں؟''

''اور کہاں جائیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

''جی ہاں، الو کو بھی اجالے میں کچھ نظر نہیں آتا۔'' نور نے کہا اور ایک دوست کو پکارتی ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شاہینہ بھی وہاں آ گئی۔ وہاں مٹکا ریس اور بوری ریس ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکیوں نے نور اور شاہینہ سے کہا کہ وہ بھی ان ریسوں میں حصہ لیں۔

میڈم فرحانہ نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی یہ دونوں تو اب اپر لیول کی رنر ہیں۔ یہ ان دوڑوں میں حصہ لیں گی، تو دوسری لڑکیوں کا حق مارا جائے گا۔''

وہ دونوں ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور یہ مقابلے دیکھنے لگیں۔ شاہینہ ذرا چبھتی ہوئی سی نگاہوں سے نور کو دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ''یہ لڑکا تمہارے اردگرد کیوں گھوم رہا تھا؟'' اس کا اشارہ فرہاد کی طرف ہی تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں..... یونہی انٹرویو کا ماحول بنا رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔''

شاہینہ اب بھی تیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''دیکھو نور! ہمارا آپس میں کمپی ٹیشن ہے لیکن ہم دوست بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بھلائی چاہتی ہیں۔ ہمیں اس طرح کے معاملوں سے دور رہنا چاہیے۔''

''کس طرح کے معاملوں سے؟'' نور نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ یہ سب لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں کھینچ کر سیڑھی سے گرا دینے والے، ہمیں اس وقت سارا دھیان اپنے گیم پر رکھنا چاہیے۔ گوجرانوالہ کی نشو کی ٹائمنگ بڑی اچھی جا رہی ہے۔ ویسے بھی ایک کھلاڑی خاندان سے ہے وہ۔ فزیکلی بڑی فٹ ہے۔ ہم ذرا ڈھیلی پڑیں گی تو وہ ''لیڈ'' لے جائے گی۔''

''پتا نہیں تم نے اپنے ذہن میں کیا بنا لیا ہے۔ وہ تو بس بات کر رہا تھا مجھ سے.....''

''ساری بات..... بات کرنے سے ہی شروع ہوتی ہے پھر بات گلے پڑ جاتی ہے۔ ذرا سنبھل کر رہو۔ ویسے بھی تم نے ایک بہت بڑا چیلنج قبول کیا ہوا ہے۔ والد کو ناراض کر رکھا ہے اور انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ ایسا ہو جائے جو ان کو مزید خفا کر دے۔''

شاہینہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ اندر سے کانپ سی گئی۔ بہرحال اس نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''اس بارے میں تم بے فکر رہو ڈیئر! باقی جہاں تک نشو کی بات ہے۔ اس کا غرور تو ہم دونوں میں سے کسی ایک نے توڑ ہی دینا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کافی منہ پھٹ بھی ہے، میڈم کے بارے میں کچھ الٹی سیدھی باتیں بھی کی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایف اے ایس کی آڑ میں مال بنا رہی ہے.....''

ابھی نور اور شاہینہ میں بات ہو ہی رہی تھی کہ ان کے عقب میں کچھ لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ وہ گوجرانوالہ سے آئی تھیں اور نشو عرف نشو بلی کی سپورٹر تھیں۔ ان میں سے دو تین نے نشو کی تصویر والے پوسٹر بھی اٹھا رکھے تھے اور سالانہ مقابلوں میں نشو کو فیورٹ قرار دے رہی تھیں۔ انہوں نے شاہینہ اور نور پر آوازے کسے۔ خاص طور سے نور کو نشانہ بنایا اور اسے نور پینڈو قرار دیا۔

نور کی حمایت کرنے والی لڑکیوں کے ایک گروہ نے اس ہوٹنگ کا بھرپور جواب دیا۔ جھگڑے کی صورتِ حال

پیدا ہوگئی۔ منتظمین نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔

نور نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ٹریننگ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سالانہ صوبائی مقابلے جیتنے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کے پیچھے اپنے ابا جان کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ سو میٹر کا ٹائٹل جیت گئی تو یہ اتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ ابا جان کا دل موم ہوجائے گا۔ ایک بار وہ خود کو ثابت کردے پھر ابا جان کی بات مانتے ہوئے وہ کھیل کا میدان چھوڑ دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی انہونی ہوجاتی اور ابا جان کچھ شرائط کے ساتھ اسے اتھلیٹکس کے ساتھ جڑے رہنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ کسی وقت اس کی ٹائمنگ 12.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی اور یہ نشو بکلی کی عمومی ٹائمنگ سے بہتر تھی۔

ذوالقرنین والا معاملہ بھی بظاہر سردخانے میں چلا گیا تھا۔ تین چار ہفتے گزر چکے تھے، اس کی طرف سے مزید کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس ”ایڈونچر“ میں اس کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ نور ڈرنے اور دبنے والی لڑکی نہیں تھی۔

فرہاد والی صورتِ حال بھی جوں کی توں تھی۔ اس نے نور سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر کاربند تھا۔ کسی وقت آمنا سامنا ہوجاتا تو اس کا رویہ اتنا نارمل ہوتا کہ کسی کے لیے کسی طرح کے شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مہینے کے آخر میں طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف ایک بار چند منٹ کے لیے دونوں میں ٹیلیفونک رابطہ ہوا۔ یہ مختصر سا بے ضرر رابطہ نور کو بڑا اچھا لگا۔ اس کے اندر جیسے ایک خلا سا پورا ہوگیا۔ ایک بے نام خوشی اس کے اندر پیدا ہوئی..... ہاں کوئی تھا جو دل کی گہرائی سے اسے چاہتا تھا..... اس کے لیے دعا کرتا تھا..... اسے سوچتا تھا اور اس کی آس رکھتا تھا۔ یہ احساس بڑا حوصلہ افزا اور توانائی بخش تھا۔

دوسری طرف شاہینہ کے پند و نصائح بھی جاری تھے۔ وہ بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔

اس روز نور نے اقرار نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ جان چکی تھی کہ نور اور اسپورٹس ایڈیٹر فرہاد رازی کے درمیان کوئی ”راز“ موجود ہے۔ وہ اکثر اسے فون کردیتی اور محتاط رہنے کی یاددہانی کراتی۔

ایک دن نور نے مذاق میں کہہ ہی دیا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں شاہینہ کہ تم خود..... اس میں دلچسپی محسوس کرنے لگی ہو۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم رہو گی پینڈو کی پینڈو ہی۔ تمہارے بھلے کا کہتی ہوں۔ ان ماڈرن شہری لڑکوں کے داؤ پیچ بتا رہی ہوں تمہیں۔ ٹھیک ہے، نہیں تو نہ سہی۔“ اس نے فون بند کردیا۔

نور اپنی جگہ بیٹھی کچھ دیر مسکراتی رہی پھر اس نے شاہینہ کو رنگ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں اس نے کال ریسیو کی۔ سوری کرنے کے بعد نور بولی۔ ”یار! مذاق کررہی تھی۔ تمہاری ہمدردی اور محبت ہر شبہے سے بالاتر ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میری حدیں اور میری ذمے داریاں کیا ہیں اور یہ بھی پتا ہے کہ نشو ہم دونوں کی مشترکہ حریف ہے۔ ہمیں اسے ہرانا ہے اور ہر صورت ہرانا ہے.....“

”اور مجھے پتا ہے کہ اسے تم ہی نے ہرانا ہے۔ کل میڈم فرحانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کوچ سرمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ان دونوں کو یقین ہے کہ اگلے دو تین ہفتوں میں تمہاری ٹائمنگ میں کم از کم..... کم از کم ایک سیکنڈ کی بہتری اور آئے گی۔“

”یہ تو اللہ کو پتا ہے اور اصل فیصلہ تو اس دن اور اس وقت ہونا ہے جب فائنل اسپرنٹ لگائی جائے گی اور مجھے تو لگتا ہے کہ بہت معمولی مارجن ہوگا۔“

”یہی تو ہوتا ہے کانٹے دار مقابلہ۔“ شاہینہ نے کہا۔

سالانہ ایونٹ میں اب بس بیس روز باقی تھے۔ تناؤ میں دن بدن اضافہ ہورہا تھا۔ تایا ابا اور ماموں مراد اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ اس کی ڈائٹ کا مکمل خیال رکھا جارہا تھا اور تربیتی سیشن بھی باقاعدگی سے اٹینڈ کرائے جارہے تھے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت پھپھو حاجرہ کے کہے ہوئے الفاظ نور کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ انہوں نے ایک روز کہا تھا۔ ”کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا نور! یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔“

ایسے وقت میں وہ کانپ جاتی۔ نماز پڑھنے کے بعد دیر تک دعا مانگتی رہتی..... ”اے رب کریم! مجھ پر رحم فرما۔ اپنے ابا جان کے حوالے سے مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، مجھے اس کا ازالہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دل میں میرے لیے رحم ڈال دے میرے مالک۔ میں اندھی ہوگئی ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے راستہ سوجھا دے۔“

ایک بار اس کے دل میں آئی کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر گھر چلی جائے اور ابا جان کے قدموں میں سر رکھ دے۔ اسے معلوم تھا کہ آپی بتول بھی ملتان سے آئی ہوئی ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ سب مل جل کر اسے اباجی سے

معافی دلا دیتے لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر پائی..... اور اس نے تایا ابا کی ہدایت کے مطابق سب کچھ سالانہ ایونٹ کے بعد پر چھوڑ دیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس ایونٹ میں نور کی کامیابی کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ شاہینہ کے حوالے سے بھی توقعات بہت بلند تھیں۔ مقابلے سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ نور نے آخری پہر کو اٹھ کر دیکھا۔ تایا ابا حسبِ معمول تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی میں وضو کا پانی شاید..... آنسوؤں کا پانی چمک رہا تھا۔ انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور جینز کی پتلون پنڈلیوں کے وسط تک اڑسی ہوئی تھی۔

وہ انہیں دیکھتی رہی۔ ابا جان کی نسبت تایا ابا زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ وہ ہر معاملے کو معروضی انداز میں دیکھنے کے عادی تھی۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے نور کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قالین پر ان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور کوئی آیت پڑھ کر اس پر پھونکی..... پھر عجیب وجدانی سے لہجے میں بولے۔ ''نور بیٹا! تم بہت محنت کر رہی ہو اور یاد رکھو، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس حوالے سے دیر تو ہو سکتی ہے لیکن اندھیر کبھی نہیں ہوتی۔ ہمارے قائد نے یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم کی جو بات کی تھی، وہ اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جب مشکلات کے باوجود عملِ پیہم رہتا ہے تو پھر وہ مقام آ جاتا ہے جب خدا بندے سے خود پوچھتا ہے..... بندے تو بتا تو کیا چاہتا ہے۔''

اس نے تایا ابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی تایا ابا۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ سوچا ہے، اسے عملی شکل دینے کے لیے ہر حد تک جاؤں گی۔''

''مجھے یقین ہے، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ہم نے اس نامعقول کو دکھانا ہے کہ بیٹے نہ ہوں تو بیٹیاں بھی بیٹوں جیسے کام کر کے اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کر سکتی ہیں۔''

نور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ تایا ابا نے اس کا سر چوما۔ ''مجھے بیٹی کی بڑی خواہش تھی۔ شرجیل اور عثمان پیدا ہو چکے تھے۔ مہرین کی پیدائش ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر جیسے ایک بڑا خلا سا تھا۔ وہی دن تھے جب اشفاق کے ہاں تم نے جنم لیا۔ تم سارے گھر کی اور خاص طور سے میری لاڈلی بن گئی تھیں۔ میں تمہیں سارا سارا دن گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ تم نے صرف سات ماہ کی عمر میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ سب دنگ رہ گئے تھے۔ ایک سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تم باقاعدہ بھاگنے لگی تھیں۔ میں تمہیں مشکل سے پکڑتا تھا اور تمہیں لان کی گھاس پر لٹا کر تمہاری ٹانگیں دبایا کرتا تھا..... تمہیں وہ باتیں تو یاد نہیں ہوں گی؟''

''کچھ کچھ..... دھندلے دھندلے سے منظر یاد ہیں تایا ابا۔''

''تم تین چار سال کی تھیں، جب میلے کے موقع پر تم سب بچوں نے حویلی کے سامنے والے باغ میں دوڑیں لگائی تھیں۔ تم نے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو ہرا دیا تھا۔ میں نے اس وقت پتا ہے تمہاری تائی سے کیا کہا تھا؟''

وہ سوالیہ نظروں سے تایا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولے۔ ''میں نے کہا تھا یہ نور ہے..... اور نور کی رفتار 299274 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔''

نور مسکرا دی۔ مصلے پر بیٹھے ہوئے تایا ابا بھی مسکرا دیے۔ نور کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولے۔ ''آج میں پھر کہتا ہوں۔ تم نور ہو.....''

تایا ابا کی باتوں نے نور میں ایک نئی امنگ، ترنگ پیدا کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس موقع پر اس کا یہ دل بھی چاہا کہ وہ تایا ابا کو فرہاد کے حوالے سے تھوڑا بہت بتا دے۔ اشارتاً ہی ذکر کر دے لیکن پھر اس نے یہ کام بھی ایونٹ کے بعد تک اٹھا رکھا۔

☆☆☆

سومیٹر کی دوڑ کا ٹریک تھا اور کالج کے گراؤنڈ میں یہ ایک طرح کی فائنل ریہرسل تھی۔ کوچ میڈیم فرحانہ نے کہا۔ ''نور! تم سمجھو کہ مقابلہ کل نہیں آج ہے اور یہ تمہاری فائنل ہیٹ ہے۔ اس میں تم نے اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ گھٹنوں پر جھک جاؤ، اپنے پاؤں کو فٹ بلاکس پر پوری طرح ایڈجسٹ کرو۔ نظر ٹارگٹ پر..... اور یہ بات یاد رکھو اسٹارٹ کی بے حد اہمیت ہے۔ او کے..... تم تیار ہو؟''

''یس میڈم!'' نور نے جھکے جھکے اپنا سر اٹھایا اور ٹارگٹ پر نگاہیں جما دیں۔

''ایک بار پھر کہہ رہی ہوں۔ تم نے ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ کانوں کو پسٹل کی آواز پر مرکوز رکھو..... ریڈی.....''

نور نے سانس اندر کی طرف کھینچی۔ اس کی تمام تر توانائی جیسے اس کے جسم کے نچلے حصے اور خاص طور سے اس کے پاؤں میں جمع ہو چکی تھی۔ اس کے اردگرد تین چار اسپرنٹرز اور بھی تھیں..... ہاں یہ فائنل ریہرسل تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی نور گولی کی رفتار سے اپنے

ٹارگٹ کی طرف بڑھی۔ اب تک اس کا سب سے اچھا ٹائم 12.90 تھا۔ آج وہ اس کو بیٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی توانائی کے ساتھ..... اور جب اس نے فنش لائن کراس کی، میڈم فرحانہ اور مسز وجدان کا مشترکہ نعرہ نور کے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ اپنے مومنٹم میں بیس تیس میٹر تک بھاگتی چلی گئی پھر اس نے مڑ کر اپنی کوچ اور ٹیچر کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں اسٹاپ واچز تھیں اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ نور نے 12.50 کا ٹائم حاصل کرلیا تھا اور یہ رزلٹ اس امر کی نہایت روشن امید تھا کہ وہ کل پہلی پوزیشن حاصل کرلے گی۔ بہرحال حتمی فیصلہ تو کل میدان میں ہونا تھا۔

نور کی فرینڈز نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر آج اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کرلیا تو وہ انہیں ٹریٹ دے گی۔ اب وہ اس کے درپے ہوگئی تھیں۔ نور نے سینٹر کے فون سے تایا کو کال کی اور انہیں بتایا کہ آج وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کی گاڑی پر آجائے گی۔

دراصل وہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ کررہی تھی۔ چار دن بعد عید کا تہوار بھی تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ تو اسے فرہاد کو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ واپسی پر وہ چند منٹ کے لیے بازار میں بھی رک جائے گی اور فرہاد کے لیے کوئی گفٹ پیک خرید لے گی۔

تین فرینڈز فوکسی کار پر ایک قریبی آئس کریم پارلر میں چلی گئیں۔ نور بالکل پرہیزی ڈائٹ لے رہی تھی، ایک کپ آئس کریم کی گنجائش تو یقیناً نکل ہی سکتی تھی۔ وہ پارلر کی گیلری میں جا بیٹھیں اور آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر بعد اچانک نور کی نگاہ نیچے ہال میں ایک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بری طرح چونکی، وہاں فرہاد موجود تھا۔ اس کے دو دوست بھی تھے۔ تینوں بے تکلفی سے باتیں کررہے تھے۔ نور نے ذرا دھیان سے دیکھا اور اسے دوسری بار چونکنا پڑا۔ فرہاد سے گپیں ہانکتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک کی صورت نور کو شناسا لگ رہی تھی۔ یہ وہی سرخ شرٹ والا لڑکا تھا جس نے ان کی گاڑی سے موٹر سائیکل ٹکرائی تھی اور پھر تایا ابا سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔

یقیناً یہ وہی تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے فرہاد کے ساتھ اٹکھیلیاں کررہا تھا..... نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور ذرا، ایک ستون کی اوٹ میں ہوگئی۔ اس شخص سے فرہاد کی دوستی کب اور کیسے ہوئی؟ فرہاد نے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں کھد بدی ہونے لگی۔ آرڈر آچکا تھا۔ وہ بے دلی سے آئس کریم کھانے لگی۔ نیچے ہال کمرے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ تینوں دوستوں میں کسی بات پر تکرار چل رہی تھی۔ پھر یہ باقاعدہ جھگڑے کی شکل اختیار کرنے لگی..... دوستوں میں تفریح کے دوران میں اکثر تلخی کی صورتِ حال بھی پیدا ہوجاتی ہے مگر یہ تلخی کچھ زیادہ تھی۔ غالباً ان کے درمیان کسی کیمرے اور ادھار رقم کی بات ہورہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکا جس کا حوالہ سرخ شرٹ تھا، فرہاد کا گریبان دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تیسرا دوست ان دونوں کے درمیان آگیا۔ ہیڈ ویٹر اور ایک دوسرے شخص نے بھی مداخلت کی اور بہ مشکل بیچ بچاؤ کرایا۔ سرخ شرٹ والا جو آج نیلی دھاری دار قمیص میں نظر آرہا تھا، بکتا جھکتا باہر چلا گیا۔

پتا نہیں کہ اچانک نور کے دل میں کیا آئی۔ اس نے دونوں فرینڈز سے کہا۔ ”پلیز، تم دونوں ادھر ہی میرا انتظار کرو..... میں ابھی آتی ہوں۔“

ان دونوں کو حیران چھوڑ کر وہ بائیں جانب والی سیڑھیاں اتری اور اس جانب بڑھی جدھر نیلی قمیص والا گیا تھا۔ وہ لڑکا اسے پارلر سے کچھ فاصلے پر اپنی موٹر بائک کو جھلاہٹ میں کِکس مار تا مل گیا۔ نور نے اپنا اسکارف ٹھوڑی سے اوپر ہونٹوں تک کھسکایا اور اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

”ایکسکیوزمی، میں آپ سے دو منٹ بات کرسکتی ہوں؟“

ایک اسمارٹ لڑکی کو اپنے روبرو دیکھ کر لڑکے کے چہرے سے جھلاہٹ رفو چکر ہوگئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”آپ کون؟“

لڑکا چند منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنی موٹر بائک کو پھر سے لاک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ نور اس کے ساتھ چند سیڑھیاں اتر کر پارک میں پہنچ گئی۔ یہاں سایہ دار درخت تھے اور پھولوں کے پودے بھی تھے۔ وہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان جو ابتدائی گفتگو ہوئی، اس میں لڑکے کا نام پرویز معلوم ہوا اور نور پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ دو ڈھائی سال سے فرہاد کا دوست ہے۔ وہ وی سی آر اور کیمروں وغیرہ کی ریپئرنگ کا کام کرتا تھا، اس کی اپنی دکان تھی۔

گفتگو کے دوران میں پرویز نے اچانک چونک کر نور کی طرف دیکھا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

”معاف کریں۔ کہیں آپ کا نام نور تو نہیں؟ وہی جو اسپرنٹ میں حصہ لیتی ہیں؟“

نور نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''آپ کا بہت تذکرہ ہوتا رہتا ہے نور صاحبہ، وہ..... جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہا ہے..... ہم کو پتا ہے۔''

''مم..... میں کچھ سمجھی نہیں؟ کون وہ؟''

''آپ سمجھ سکتیں..... تو اب تک..... اس کے چکر سے نکل چکی ہوتیں..... خیر چھوڑیں..... اب آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ نے خود ہی اس ''الو بنو'' چکر سے نکل جانا ہے۔''

''الو بنو؟'' نور کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''جی ہاں..... الو بنایا جاتا رہا ہے آپ کو۔ سیڑھی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کسی اور تک پہنچنے کے لیے۔''

نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے روہانسی ہو کر بولی۔ ''کیا..... تم یہ سب کچھ فرہاد کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''تو اور کس ذات شریف کا ذکر ہو رہا ہے۔''

پتا نہیں کیوں نور کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ پرویز نامی لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے، بے بنیاد نہیں ہے۔

اس نے اس سے درخواست کی کہ اگر اس نے یہ بات چھیڑ دی ہے تو پھر اسے ادھورا نہ رکھے۔

پرویز تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے نور سے کہا کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کل کسی جگہ مل کر یہ بات کر سکتے ہیں۔ نور کل تک کا انتظار کیسے کر سکتی تھی۔ اس نے پرویز کو مجبور کیا۔ وہ پارک سے اٹھ کر مارکیٹ کی عقبی سمت ایک کیفے میں آن بیٹھے۔ رازداری کی شرط پر پرویز نے جو کچھ بتایا، وہ شاید پرویز کے لیے تو بہت زیادہ اہم نہ ہو لیکن نور کے لیے تہلکہ خیز تھا۔ اس نے کہا۔ ''نور صاحبہ! یقیناً تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ فرہاد تم سے نہیں تمہاری دوست شاہینہ سے محبت کرتا ہے اور یہ چکر تمہارے والے چکر سے بھی پہلے کا ہے۔ فرہاد اور شاہینہ کے درمیان کچھ دوری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گیم میں بہت زیادہ مگن ہو کر اس کو Avoid کرنے لگی تھی۔ شاہینہ میں حسد پیدا کرنے کے لیے ہی فرہاد نے تم سے راہ و رسم بڑھائی اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے۔''

''میں..... یہ نہیں مانتی۔''

''سوری مس! تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ دونوں پریمی پھر ایک ہو چکے ہیں۔ اب بہت جلد تمہیں اپنے مقام کا بھی پتا چل جائے گا۔''

نور کی نگاہوں کے سامنے ماضی قریب کے مناظر گھومنے لگے۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو شاہینہ وقتاً فوقتاً اس سے کہتی رہی تھی۔ اس نے شروع میں ڈھکے چھپے انداز میں اسے فرہاد سے دور رہنے کے مشورے دیے تھے۔ نور سے کہا تھا کہ وہ کہیں اس سے فلرٹ نہ کر رہا ہو..... اور اس طرح کی کئی اور باتیں لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ نور سے فرہاد کا تعارف ایک ایکسیڈنٹ کے بعد اتفاقیہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اتفاقیہ نہیں تھا۔

پرویز نے بھی اس کی تصدیق کی۔ نور سے ایک بار پھر رازداری کا وعدہ لینے کے بعد اس نے بتایا۔ وہ سب فرہاد کی پلاننگ تھی۔ وہ دن رات شاہینہ کے لیے تڑپ رہا تھا اور اسے واپس اپنے پاس لانے کے منصوبے سوچتا تھا۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا پلاننگ کے ساتھ ہوا۔

''تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے؟'' نور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''شاید تم کوئی گواہ مانگ رہی ہو یا کوئی تصویر وغیرہ دیکھنا چاہتی ہو لیکن میں تمہیں اس کا ''لائیو'' ثبوت دے دیتا ہوں اور وہ بھی آج ہی بلکہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو پرویز صاحب؟''

''دونوں پریمی آج کل ڈیفنس کے ''اوڈی کافی ہاؤس'' میں مل رہے ہیں۔ آج بھی ملیں گے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔''

نور کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز گردش کر رہی تھی۔ اس کا ذہن دھندلایا ہوا تھا۔ پرویز سے رخصت ہو کر وہ سیدھی آئس کریم پارلر پہنچی۔ اس کی دونوں دوست بے حد پریشان تھیں اور اب وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہی تھیں۔ نور نے ان سے معذرت کی۔ وہ دونوں شدید الجھن میں تھیں اور اسی الجھن میں وہاں سے رخصت ہو گئیں کیونکہ نور نے انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد نور نے گھر فون کیا اور تائی جان کو بتایا کہ اسے تھوڑی سی مزید دیر ہو جائے گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

اس کام کے بعد اس نے ایک آٹو رکشا لیا اور اس ایریا میں جا پہنچی جہاں معروف اوڈی کافی ہاؤس واقع تھا۔ وہ بڑی ٹھہری ہوئی روشن شام تھی مگر نور کے لیے اس میں

تاریکی اور نوحے کے سوا اور کچھ نہیں تھا..... اور پھر وہ جان لیوا گھڑی بھی آئی جب اس نے کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں شاہینہ اور فرہاد کو ہنستے اور باتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرہاد فیشن کے طور پر شیشا پی رہا تھا اور شاہینہ ایک کپ سے چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ پونی ٹیل باندھے ہوئے تھی۔ شاید رننگ کرنے کے بعد سیدھی یہاں آ گئی تھی۔ کل اس نے بھی اہم ترین مقابلے میں حصہ لینا تھا۔

وہ شام اور وہ رات نور کے لیے بڑی عذاب ناک تھی۔ تایا ابا نے صدقے کے طور پر بکرے کی قربانی دی تھی۔ گھر میں سب نور کے لیے دعائیں کر رہے تھے، منتیں مان رہے تھے اور وہ جیسے اندوہ و ناتوانی کے اتھاہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ذرا ستانے کے بہانے وہ بند کمرے میں چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس نے فرہاد کو چاہا تھا اور دل و جان سے چاہا تھا۔ اس حوالے سے اس کی کنواری آنکھوں میں ان گنت سپنوں نے جگہ بنائی تھی۔ وہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا..... اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ندامت اور شرمندگی کے گہرے غار میں جا گری تھی۔ اس شخص نے شاہینہ کی محبت پانے کے لیے بڑی بے رحمی سے نور کا استعمال کیا تھا اور وہ بڑی سادگی سے استعمال ہوئی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی۔ ان لڑکیوں کو نادان سمجھتی تھی جو تکیے بھگوتی ہیں لیکن آج اسے خود رونا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک آنسو بہانے کے بعد اسے اپنے دل کا بوجھ قدرے کم محسوس ہوا..... مگر جو غم تھا وہ تو ہر رگِ جاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ واش روم میں جا کر بہت دیر تک منہ دھونے اور چہرے پر لوشن وغیرہ لگانے کے باوجود وہ اپنے رونے کے آثار چھپا نہیں سکی اور اس روز اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جب غم آنکھوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے چھپانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بند کمرے سے باہر سب چہک رہے تھے۔ ان کی امیدیں جوان تھیں اور وہ کل کا انتظار کر رہے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ کل جس لڑکی نے سالانہ کھیلوں میں حصہ لینا ہے وہ اندر سے مر گئی ہے۔

حوصلے کیسے ٹوٹتے ہیں، توانائی، ناتوانی میں کیسے بدلتی ہے، منزلیں نگاہوں کے سامنے کیسے دھندلاتی ہیں، یہ نور کو اس روز پتا چلا..... اور ہزاروں لوگوں کے سامنے چلا۔ وہ سومیٹر کی فائنل ''ہیٹ'' تک تو پہنچ گئی..... مگر وہ پہلا نمبر حاصل نہیں کر سکی۔ دوسرا اور تیسرا بھی نہیں کر سکی۔ وہ چوتھے نمبر پر آئی۔ یہ بہت بڑا اپ سیٹ تھا۔ نور کے سپورٹرز کے لیے بڑا بھی اور غم ناک بھی۔ وہ تو 12.50 کی ٹائمنگ حاصل کر چکی تھی، پھر اتنا پیچھے کیسے رہ گئی۔ جو اس پر گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے۔

ریس ہارنے کے بعد نور کی نگاہ سب سے پہلے اپنے تایا ابا پر ہی پڑی۔ ان کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے آنسو بہ مشکل روکے ہوئے ہیں پھر اس نے اپنی محبوب ٹیچر اور کوچ میڈم فرحانہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور تھکے تھکے انداز میں چلتی، تماشائیوں کے اسٹینڈز کی طرف آ گئی۔

تایا ابا نے آگے بڑھ کر نور کو گلے لگایا اور پیٹھ تھپکی۔

''کوئی بات نہیں..... ہار جیت کھیل کا حصہ ہے، ہمارا کام کوشش کرنا ہے..... اور ہمت برقرار رکھنا ہے۔'' ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

بسمہ بھی چوری چھپے یہ ریس دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے کزنوں مہرین، شرجیل اور عثمان وغیرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آدھے نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا لیکن بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے نور کو تسلی دی۔ ''کوئی بات نہیں۔ پورے پنجاب میں چوتھا نمبر ہے تمہارا۔ آگے اور چانس ملیں گے۔''

یہ ریس نشو بجلی نے جیت لی تھی۔ لاہور کی شاہینہ کا دوسرا نمبر آیا تھا۔ نشو اپنی ایسوسی ایشن کے بینر کے ساتھ پورے گراؤنڈ میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کی سپورٹر لڑکیاں ساتھ تھیں۔ نشو خاص طور پر اس جگہ رکی جہاں نور اپنے کوچ اور ساتھیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ یہاں ان سب نے خوب نعرے لگائے اور فقرے اچھالے۔ اسپیکر پر کمنٹری کرنے والے صاحب نشو کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پیشین گوئی کر ڈالی کہ نشو اسپرنٹ کے میدان کا سب سے تابناک..... ابھرتا ہوا ستارہ ہے اور وہ نیشنل گیمز میں بھی میدان مار لے گی۔

''کوئی بات نہیں نور صاحبہ! ایسے اپ ڈاؤن آتے ہی ہیں۔'' یہ آواز نور کے عقب سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں فرہاد کھڑا تھا۔ میگزین ''سپر اسٹار'' کا وجیہہ اسپورٹ ایڈیٹر۔ اس کے خوبصورت بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ کتنا معصوم اور سادہ نظر آتا تھا۔ ہاں، یہی شخص تھا جس نے آج ایک نہایت اہم سنگِ میل نور سے چھینا تھا..... ہاں یہی تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ایونٹ کے بعد نور بیمار ہوگئی۔ اسے بخار ہوا، بعد میں پتا چلا کہ ملیریا ہے۔ وہ اس کے لیے بڑے مایوس کن دن تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو ہاری اور دھتکاری ہوئی محسوس کرتی تھی حالانکہ تایا اور تائی اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ تینوں کزن شرجیل، عثمان اور مہرین بھی ہر طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ ایک روز پھپھو حاجرہ آئیں۔ تائی راحت اس وقت مہرین کو لینے کالج گئی ہوئی تھیں۔

پھپھو نے کہا۔ ''بتا کیا ملا تجھے اپنے باپ کا دل دکھا کر۔ کون سا میدان مار لیا ہے تو نے جس کی وجہ سے تیرے پالنے والوں کا سر اونچا ہوگیا ہے؟ بڑے لمبے چوڑے وعدے کر رہے تھے بڑے بھائی جان بھی.....''

''آپ تایا جان کو کچھ نہ کہیں پلیز۔'' نور نے کہا۔

''انہی کے بے جا لاڈ نے تیری بیڑیوں میں وٹے ڈالے ہیں۔ بھائی جان اور باجی راحت دونوں قصوروار ہیں۔''

''پلیز پھپھو..... پلیز..... چپ ہوجائیں۔''

وہ عینک کے پیچھے سے دکھ آمیز غصے سے نور کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ''دیکھ نور! اب بھی وقت ہے سنبھل جا۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑا میڈل اور کوئی نہیں ہوتا کہ اس کے پالنے والے اس سے راضی ہوں اور اس کا گھر بس جائے۔ اپنے ابا جی سے معافی مانگ لے۔''

''آپ، معافی کہتی ہیں۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہوں مگر وہ مجھ پر کچھ رحم تو کریں۔ مجھے اس طرح تو گھر سے دھکا دے کر نہ نکالیں۔ میں نہیں کرنا چاہتی ابھی شادی۔''

''تو اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ تیرے دماغ میں کیڑا ہے..... اور وہ کیڑا یہی ہے کہ تو شاید کوئی بہت بڑی کھلاڑی بننے والی ہے۔ نہیں بنے گی تو۔ کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ جو بچے اپنے والدین کی بددعا لیتے ہیں وہ کسی جگہ بھی کامیاب نہیں ہوتے.....''

پھپھو اشارتاً اس ناکامی کا ذکر کر رہی تھیں جو چند دن پہلے اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ اس ناکامی کے پیچھے کیا سنگین حالات تھے۔ کس طرح کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے کیے تھے اور اسے مٹی کا ڈھیر کر ڈالا تھا۔

وہ خود سے ہرگز ناامید نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ کرسکتی ہے۔ اپنے تایا ابا اور اپنے دیگر چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکتی ہے۔ اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کیا ہوا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

پھپھو اسے جلی کٹی سنا کر چلی گئی تھیں۔ نور ان سے گھر کے حالات پوچھنا چاہتی تھی، خاص طور سے بسمہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی کہ چودھری طغرل کے بیٹے سے اس کا پیچھا چھوٹا ہے یا نہیں..... لیکن پھپھو اسے کوئی موقع دیے بغیر بھنائی ہوئی باہر چلی گئی تھیں۔ (ویسے نور کو اتنا پتا چل چکا تھا کہ جو مقامی ایم پی اے یہ مسئلہ حل کرا رہا تھا، اسے کامیابی ملی ہے اور وہ کھاپری برادری کے لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اب ابا جان اور پھپھو وغیرہ کہیں بسمہ کی منگنی کا سوچ رہے ہیں)۔

چند دن بعد نور کا بخار اتر گیا..... اور وہ ایک بار پھر ٹریک پر آ گئی۔ اس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اس نے فرہاد کے تصور کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی کوشش کی تھی اور بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اسے تھوڑا سا شکوہ شاہینہ سے بھی تھا کہ ایک بے تکلف دوست ہوتے ہوئے بھی اس نے اسے شروع میں ہی اصل صورت حال سے آگاہ کیوں نہ کردیا۔ اسے فرہاد سے دور رکھنے کی کوشش تو کرتی رہی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ شاید اس کی بھی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ اس سے اب بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ فرہاد سے بھی دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اور اس کے دوست ڈاکٹر فیضان نے تایا جان کے فری کلینک میں بھی شکل نہیں دکھائی تھی۔ تایا ابا اس سلسلے میں فرہاد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر رابطہ نہیں ہوسکا تھا..... انہوں نے ایک اور ڈاکٹر ہائر کرلیا تھا۔ یہ بات اب پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ یہ سب فرہاد کا ڈراما تھا۔ مہرین کو بھی اس ڈرامے کا شک ہو چکا تھا۔

سب کچھ بھول بھال کر نور نے ایک بار پھر ایف اے ایس جانا شروع کردیا۔ اب وہ نیشنل گیمز کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے کوچ اس کی طرف سے پُرامید تھے۔ وہ چھوٹے بڑے مقابلوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ اس کی ہیڈ کوچ فرحانہ بیگ نے اس کی ایک خامی نوٹ کی..... وہ کسی وقت فالس اسٹارٹ (غلط شروعات) کر جاتی تھی۔ اہم مقابلوں میں فالس اسٹارٹ کی وجہ سے بڑے بڑے ایتھلیٹ ڈس کوالیفائی ہوجاتے ہیں اور ان کے کیریئر داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ فرحانہ بیگ نے دن رات محنت کی اور نور کی اس کمی کو پچانوے فیصد تک درست کردیا۔ وہ تکنیک کے ہر پہلو پر توجہ دے رہی تھیں۔ ٹریک پر پوزیشن کیسے لینی ہے..... فٹ بلاکس کا بہترین استعمال کیسے ممکن ہے؟ کس طرح جھک کر اپنے ہاتھوں کو اسٹارٹنگ لائن سے لچ کرنا ہے۔ فنش لائن پر پہنچتے ہوئے خود کو کس طرح آگے جھکانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف نور کی اہم ترین حریف نشو بجلی کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ اس کے والد اور چچا نہ صرف اسپورٹس مین تھے بلکہ سیاسی اثر رسوخ بھی رکھتے تھے۔ کہا جارہا تھا کہ نشو کے اہلِ خانہ نے اسے پرائیویٹ طور پر انگلینڈ کا دورہ کرایا ہے۔ وہاں اس نے غیر ملکی کوچز سے بھی ''ٹپس'' لیے ہیں اور ممکن ہے کہ انگلینڈ سے کوئی کوچ اس کی ٹریننگ کے لیے پاکستان بھی آئے۔

شاہینہ کے حوالے سے اطلاعات تھیں کہ وہ سرگرمی سے تربیت میں حصہ نہیں لے رہی پھر ایک روز نور کی تایا زاد مہرین نے اسے رازداری کے انداز میں خبر سنائی۔ ''تمہیں پتا ہے کہ شاہینہ کی شادی ہورہی ہے؟''

''کیا؟'' نور حیرت زدہ رہ گئی۔

''ہاں جی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا ہے اور لڑکا پتا ہے کون ہے؟''

''کون؟''

''وہی ذات شریف جس نے ہمارے روبرو رفائے عامہ کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور ابا جان کے فری کلینک میں کردار ادا کررہا تھا..... فرہاد رازی۔ سنا ہے کہ اس چٹ منگنی پٹ بیاہ کے پیچھے فرہاد رازی کا کوئی راز ہے۔'' مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''دونوں نے تعلقات بنا رکھے تھے۔ ایک دن شاہینہ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے گر گئی۔ پتا چلا کہ وہ ''پریگننٹ'' ہے۔ شاہینہ کے والدین نے فرہاد کو جا دبوچا۔ وہ کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں۔ انہوں نے فرہاد کے سامنے دو آپشن رکھے۔ شادی کردیا پھر بھگتنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ وہ شادی بھگتنے کو تیار ہوگیا۔''

نور نے یہ سب کچھ سناٹے میں سنا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس کی دوست اور کولیگ کے ''رنگ کیریئر'' کا اختتام اس طرح ہوگا۔ شاہینہ اور فرہاد کی اس کہانی میں ایک کردار نور کا بھی تھا اور یہ کردار اس سے زبردستی کروایا گیا تھا۔ وہ اس کردار اور اس سے وابستہ ساری تلخ یادوں کو اب ہمیشہ کے لیے ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی۔

چند روز بعد واقعی شاہینہ کی شادی ہوگئی۔ اس شادی کی خبر نور کو ایک مشترکہ فرینڈ کے ذریعے ہی ملی تھی۔

نور پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن تھی۔ یہ بڑا کٹھن راستہ تھا۔ وہ تایا جان یا پھر ماموں مراد کے ساتھ صبح منہ اندھیرے ایف اے ایس پہنچ جاتی تھی۔ وارم اپ ہوتی، اسٹریچنگ کرتی، تب کئی کلومیٹر کی دوڑ اور پھر سو میٹر کے ڈیش لگاتی۔ وہ تھک کر چور ہوجاتی، کئی مرتبہ اسے لگتا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے خون بہہ نکلے گا۔ جب وہ جان توڑ محنت کررہی ہوتی اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال ہوتا۔ وہ اپنے تایا جان کو سرخرو دیکھے، تایا جان بھی ہر دستیاب سہولت اس کے لیے فراہم کررہے تھے۔

تایا زاد بہن مہرین فزیوتھراپسٹ بھی تھی۔ یہ سہولت نور کو گھر میں ہی مل گئی تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہوتا تو مہرین فوراً اس کی مدد کو آجاتی۔ ایک روز نور کو گھٹنے میں ہلکا سا کھچاؤ محسوس ہوا۔ تایا کی ہدایت پر مہرین نے فوراً فون پر اپنی سینئر پروفیسر سے مشورہ کیا اور نور کے مساج میں لگ گئی۔

نور جلد ہی بہتر محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

''مہرین! کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔''

''اسی منہ سے کردیا کرو۔ کافی پیارا ہے، جب کس کر پونی ٹیل باندھتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ شاید فلورنس بھی ایسے ہی باندھتی ہوگی دوڑتے وقت۔''

فلورنس ایک طرح سے نور کا آئیڈیل تھی۔ ہر کھلاڑی کا کوئی نا مور کھلاڑی آئیڈیل ہوتا ہے۔ نور کے بھی اسی طرح کچھ آئیڈیل تھے۔ سو میٹر کی امریکن ریکارڈ ہولڈر فلورنس..... جس کی ٹائمنگ 10.49 سیکنڈ تھی۔ یہ ٹائمنگ ہر اسپرنٹر کے دل و دماغ میں ایک روشن سنگِ میل کی طرح جگمگاتی تھی..... اور پھر انڈین پی ٹی اوشا، جس نے جکارتہ میں 11.39 کی ٹائمنگ حاصل کی تھی اور پاکستان کی ایتھلیٹکس کا جگمگاتا ستارہ عبدالخالق جو مردوں کی کیٹگری میں 10.04 کی ٹائمنگ کے ساتھ ایشیا کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔

وہ بھی خود کو ایسے ہی چمکتے دمکتے ستاروں کے درمیان یا ان کے آس پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ ایک عورت کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے کی آرزو رکھتی تھی..... تاکہ آپی بتول کے شوہر جیسے مرد..... اور ذوالقرنین جیسے مرد..... اور فرہاد جیسے مرد..... اس کی حیثیت کو تسلیم کریں۔

مہرین کے جادوئی لمس نے نور کے گھٹنے کا کھچاؤ یوں چن لیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

مہرین بولی۔ ''تمہیں پتا ہے نور جب میں نے فزیو تھراپسٹ بننے کا سوچا تھا تو چچا جان (نور کے ابا جی) نے بڑی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ مالشیا بننے جارہی ہے۔ لڑکیوں کو یہ کام زیب نہیں دیتے۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے اور ایسی ہی باتیں ہیں جو ہمیں

سوچنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر تم فزیوتھراپسٹ نہ بنو..... اور دیگر ہزاروں لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں نہ آئیں تو پھر اس تھراپی کے حوالے سے ایک فیمیل دوسری فیمیل کی مدد کیسے کرسکتی ہے۔ ہمیں ایسی تنگ نظریوں سے نکلنا پڑے گا۔''

وہ بہت ہی کٹھن اور مشقت والے دن تھے۔ نور کو ایف ایس سی کا امتحان بھی دینا تھا۔ ٹیچرز کے ساتھ مشورے سے اس نے اس امتحان کو اگلے سال تک ملتوی کردیا اور تمام تر توجہ رننگ پر مرکوز رکھی۔ پرنٹ میڈیا کے کئی لوگ اسے اپنے صفحات پر ہائی لائٹ کرنا چاہتے تھے مگر وہ جیسے..... ایک شخص کی وجہ سے..... پورے میڈیا سے ہی الرجک ہوگئی تھی۔ وہ شدید ضرورت کے وقت ہی تصویر اتروائی تھی اور وہ بھی اسکارف کے ساتھ۔ رننگ کے وقت بھی اس کا لباس سب سے علیحدہ اور باوقار ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایتھلیٹ کا ظاہری حلیہ اور لباس وغیرہ اس کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی، اسے لگا کہ اس کے پاؤں پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا تایا ابا اس کے پاؤں کی طرف موجود تھے، ان کے ہاتھ میں ایک آئنٹمنٹ کی ٹیوب تھی۔ وہ اس کے ایک زخمی پاؤں پر دوا لگا رہے تھے۔

''تایا ابا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''اپنی بیٹی کے زخم پر مرہم رکھ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟''

''تایا ابا۔'' وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ ''زخم کہاں ہے۔ زیادہ رننگ کی وجہ سے تھوڑی سی سرخی آگئی ہے۔''

''میری بچی۔ ایتھلیٹ کے پاؤں کی تھوڑی سی سرخی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ اس معاملے میں غفلت نہ کیا کرو اور کل کا دن ریسٹ کرو۔ یہ میرا حکم ہے۔''

وہ تایا ابا کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے اس کا سر چوما۔ اس کے پاؤں کو سہلاتے ہوئے بولے ''جب تم چھوٹی سی تھیں، میں تمہیں دبوچ کر تمہارے پاؤں پر گدگدی کیا کرتا تھا۔ تم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھیں۔ بہت گدگدی ہوتی تھی تمہیں تلوؤں پر..... یاد ہے نا؟''

''ہاں تایا ابا..... اور آپ کو میرے گندے پاؤں بہت برے لگتے تھے۔ آپ مجھے جوتے یا چپل کے بغیر چلنے نہیں دیتے تھے۔''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ ''شاید یہ تمہاری محبت ہی تھی جس کے صلے میں اللہ نے پھر مجھے اپنی بیٹی بھی عطا کردی لیکن مہرین کی پیدائش کے بعد بھی تمہاری محبت کبھی کم نہیں ہوئی.....''

''آپ کی محبت اور آپ کی توجہ میرے لیے بے حد قیمتی ہیں تایا ابا۔ شاید اسی محبت اور توجہ کی بدولت میں خود کو ثابت کرسکوں اور کسی دن میرے ابا جی بھی مجھے واپس مل جائیں۔''

''کیوں نہیں ملے گا وہ..... ضرور ملے گا۔ بس محنت شرط ہے اور مستقل مزاجی شرط ہے۔ میرا ایمان ہے نور، محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ وہ رائگاں جا ہی نہیں سکتی۔''

''آپ کا ایمان، میرا ایمان بھی بن چکا ہے تایا ابا۔''

''تم دیکھنا..... اس مرتبہ اللہ تعالیٰ تمہیں محنت کا پھل ضرور دے گا۔ کل میری بات تمہاری سینئر کوچ سے بھی ہوئی ہے۔ وہ بہت پُرامید ہیں۔''

اسلام آباد میں ہونے والے قومی کھیلوں کے لیے نور نے بہ آسانی کوالیفائی کرلیا تھا۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب ابتدائی دوڑوں (یعنی Preliminary Heats) کے بعد نور کو فائنل ہیٹ میں حصہ لینا تھا۔ اس ہیٹ میں جو دو تین اہم مدمقابل موجود تھیں، ان میں ایچی سن کالج کی ایک لڑکی کے علاوہ نشو بجلی بھی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں میں نور کی ٹائمنگ میں قریباً 0.30 سیکنڈ کی بہتری آئی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ بہتری اسے گولڈ میڈل دلانے میں اہم ثابت ہوگی۔

آخر وہ گھڑی آگئی۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ نور میدان میں پہنچی۔ وارم اپ کے دوران میں نشو بجلی اسے کڑی نظروں سے گھورتی رہی۔ جیسے نور کو دیکھ دیکھ کر خود کو تاؤ دلا رہی ہو اور اس تاؤ کو اپنی انرجی بنا رہی ہو۔ نور نے بھی اس کی گرم نگاہوں کا جواب گرم نگاہوں سے ہی دیا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے نشو نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پھونک مار کر اپنی پیشانی سے ہٹایا اور سرگوشی کرتے ہوئے آگے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ آج پینڈو واپس پنڈ چلی جائے گی۔

گولڈ میڈل ہیٹ اسٹارٹ ہوئی..... پوزیشن لی گئی..... پسٹل کی آواز کے ساتھ ہی ایتھلیٹس کے رگ پٹھوں نے بجلی کی طرح رسپانس کیا اور وہ اپنے پاؤں سے فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے ٹارگٹ کی طرف جھپٹیں۔

پسٹل کی آواز کے فوراً بعد ہی نور کو محسوس ہوا کہ آج اس کا اسٹارٹ بہت اچھا نہیں تھا۔ بہرحال وہ بھاگنے میں اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے رہی تھی۔ یہ سارا قریباً 50 قدم کا کھیل تھا، شاید ایک دو قدم زیادہ۔ قریباً پندرہ قدم کے بعد نور نے اسٹارٹ کی کمی کو دور کرنے کے لیے اضافی توانائی

لگائی۔ اس وقت نشو اس سے قریباً چار پانچ فٹ پیچھے تھی۔ اپجی سن والی لڑکی کا فاصلہ زیادہ تھا مگر پھر نور کو لگا کہ نشو سے اس کا فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی دائیں آنکھ کے گوشے سے دیکھا، نشو کی آگے بڑھتی ہوئی شبیہہ نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کے برابر آنے کے بعد چند انچ آگے نکل گئی ہے۔ ریس دیکھنے والوں کا شور فلک شگاف تھا۔ آخری مرحلہ بے حد جاں گسل تھا۔ آخری چودہ پندرہ قدموں میں نور نے جسم و جاں کی پوری توانائی صرف کی اور فنش لائن پار کر لی۔

وہ ایک بار پھر ہار چکی تھی۔ نشو نے یہ ریس جیت لی تھی۔ نور کا خیال تھا کہ وہ دوسرے نمبر پر آئی ہے مگر جب فوٹو فنش کا رزلٹ سامنے آیا تو وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ اپجی سن کالج کی ارم نے نہایت تھوڑے مارجن سے اس سے دوسری پوزیشن بھی چھین لی تھی۔ ان دونوں کا فرق صرف 0.08 سیکنڈ رہا تھا۔

نور بے دم سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کی سانس ابھی تک نارمل نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی بار کے موقع پر اس نے اپنے ساتھیوں اور اپنے تایا جان کی طرف دیکھا تھا مگر اس مرتبہ اسے یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ آخر اسے اپنی کمر پر تایا جان کے مشفق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ نور کے آنسو اکثر اس سے روٹھ جایا کرتے تھے۔

لیکن اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ سینے میں ایک ہچکی سی تھی جو آزاد ہونا چاہتی تھی، وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔ تایا جان اس کے کانوں میں تسلی آمیز سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں پر ڈھول کی تھاپ حاوی ہو رہی تھی..... اور وہ نعرے حاوی ہو رہے تھے جو نشو بجلی کے سپورٹرز بلند کر رہے تھے۔ ان لمحوں میں نور کے دل میں خیال آیا۔ کہیں واقعی یہ اباجی کی بددعا تو نہیں جو جان توڑ کوشش کے باوجود اسے کامیابی سے دور رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆

وہ کمرے میں بند تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو شکل ہی دکھانا نہیں چاہتی۔ اس نے رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ تایا جان تو اپنے ماہانہ دورے پر گجرات چلے گئے تھے لیکن تائی راحت اور تینوں کزنز تو گھر میں ہی تھے۔ پہلے مہرین دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ اب شرجیل بار بار دستک دے رہا تھا، گاہے بگاہے تائی راحت کی آواز بھی آ رہی تھی، اس آواز میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ نور نے مایوسی کے عالم میں کوئی ایسی ویسی چیز نہ کھالی ہو مگر ایسی بات نہیں تھی۔

آخر وہ دروازے کے پاس پہنچی اور کراہ کر بولی۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن پلیز..... مجھے ابھی آرام کرنے دیں۔"

"مگر چندو اے تو لے لو بیٹی۔" تائی نے دلار سے کہا۔

"ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ آپ سو جائیں، میں خود ہی لے لوں گی۔"

تائی کے بڑبڑانے کی مدھم آواز آئی۔ بہرطور اس کے بعد دستک وغیرہ نہیں ہوئی۔ نور نے کاغذ قلم سنبھالا اور اپنے اباجان کو ایک خط لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ کافی طویل خط تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"اباجی! میں آپ کی فرمانبردار بیٹی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو، آپ سے جدا ہو کر میں نے ہر پل آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ کی محبت کو ترسی ہوں، امی کے بعد ہم بہنوں کے لیے آپ ہی تو سب کچھ ہیں۔ وہ واقعہ ایسا اچانک تھا کہ اس نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں تایا ابا کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ مجھے پتا ہے اباجی، میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔ پلیز..... آپ اپنی اس ناسمجھ اور کمزور بیٹی کو معاف کر دیں۔ پلیز اباجی پلیز۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے تو میں خود کو دنیا کی بدقسمت ترین ہستی سمجھتی رہوں گی اور کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔"

اگلے روز اس نے یہ خط مہرین کے ہی ذریعے اباجان تک پہنچایا تھا۔ دو روز بعد بڑی عید تھی اور اڑتی اڑتی سی یہ خبر بھی آ رہی تھی کہ شاید بسمہ کی کہیں بات پکی ہونے والی ہے۔ یہی دو وجوہات تھیں جن کی بنا پر نور کو ایک بار پھر اپنے گھر میں قدم رکھنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن، شام کے وقت پھپھو اس کے پاس آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئیں۔ اباجی اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ آپی بتول بھی اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ آپی اور پھپھو "لرزتی کانپتی نور" کو اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں گئیں۔

اباجی صوفے پر بیٹھے تھے۔ رخ دوسری طرف تھا، پہلے سے کمزور نظر آ رہے تھے۔ پھپھو نے لجاجت سے کہا۔

"بھائی جان، یہ..... نور آئی ہے۔"

اباجی نے مڑ کر دیکھا۔ نور کو کچھ اور تو نہیں سوجھا، وہ جلدی سے آگے بڑھی اور بیٹھ کر اباجی کا گھٹنا تھام لیا۔ ان کے گھٹنے پر پیشانی رکھ کر اشک بار لہجے میں بولی۔ "پلیز

ابا جی! مجھے معاف کردیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے، میں خوش نہیں ہوں..... میں بہت دکھی ہوں.....'' وہ بولتی چلی گئی۔

انہوں نے اپنا گھٹنا چھڑانے کی کوشش کی مگر نور کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ برہمی سے بولے۔ ''یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ پیچھے ہٹو۔''

مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ پھپھو نے ڈرے لہجے میں کہا۔ ''چلیں معاف کردیں بھائی جان..... بڑے معاف ہی کیا کرتے ہیں، اپنی غلطی پر شرمندہ ہے یہ.....''

انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''پیچھے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے جانا ہے۔''

''پہلے آپ مجھے معاف کریں ابا جی۔'' اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''اچھا ٹھیک ہے..... پیچھے ہٹو۔''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور واش روم کی جانب بڑھ گئے۔

اگلے روز عید تھی۔ دونوں گھروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا تھا کہ عید اکٹھے ہی مناتے تھے بلکہ اس میں پھپھو کا گھرانا بھی شریک ہوتا تھا۔ پھپھو کے شوہر عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے۔ عید کی گہما گہمی میں تھوڑا سا حزن بھی شامل تھا۔ نور کی والدہ کی وفات کے بعد یہ پہلی بڑی عید تھی۔ عید کی رات نور نے اپنے گھر میں ہی گزاری۔ اگلے روز پھپھو اور آپی بتول نے نور کو سمجھایا۔ پھپھو نے کہا۔ ''دیکھو نور! تمہارے ابا جی نے تمہیں گھر آنے کی اجازت تو دے دی ہے لیکن ان کی اصل ناراضگی اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ شادی پر رضامند ہو جاؤ۔ وہ تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔''

''پھپھو! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرے لیے آپ سب کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیوں مجھے کچھ دیر کے لیے مزید اپنی محبت کے سائے میں نہیں رکھ سکتے؟''

''یہ محبت ہی تو ہے نور۔'' آپی بتول نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ابا جی، تمہیں اپنے گھر کی ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''انہوں نے آپ کو اپنے گھر کی، دیکھ ہی لیا ہے نا..... اس سے ان کو کچھ تسلی ہو جانا چاہیے۔'' نور کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ہر ایک کی اپنی قسمت ہوتی ہے نور۔'' پھپھو نے کہا۔ ''اور تیرے لیے تو بہت اچھا رشتہ آیا تھا..... تیری وجہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 9,800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ کریں (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

سے وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا۔ دین دار، کماؤ اور بڑوں کے سامنے سر جھکا کر رکھنے والا۔ آج کل ایک مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا ہے اور بالکل فی سبیل اللہ۔ اس عمر میں اتنی خدا خوفی کم کم ہی ہوتی ہے۔''

نور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی..... اور دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں بسمہ، مہرین اور دیگر کزن موجود تھے۔

رات کو ایک بار پھر پھپھو کا فقرہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا..... ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا.....

''ہوں۔'' اس نے سر کو بیزاری سے حرکت دی اور کروٹ بدل لی۔

بے شک ذوالقرنین کی ایک بات نور کو اچھی لگی تھی کہ اس نے ایک موقع پر فرہاد کو نور کے ساتھ کار میں دیکھنے کے باوجود، یہ بات اپنے تک محدود رکھی تھی۔ اس نے بعد میں بھی اپنے گھر میں یا نور کے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا (حالانکہ ایک موقع پر نور کو ڈر پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسے بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرے) لیکن جہاں تک ذوالقرنین کے لیے پسندیدگی کا تعلق تھا، یہ سوال خارج از نصاب تھا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے نور کے دل و دماغ میں جو آئیڈیل تھا، وہ بالکل اور طرح کا تھا۔ نرم مزاج، خوش گفتار، خوش لباس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوی پر بے جا پابندیاں عائد نہ کرنے والا۔ اس کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے والا۔ بے شک مذہبی لیکن روشن خیال۔

وہ سوچنے لگی، کہیں نہ کہیں تو کوئی ہوگا جو اس کے لیے ہوگا۔ جو اس کے مطابق ہوگا۔ اسے اس کی ساری بشری خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ چاہے گا۔

☆☆☆

عید گزر چکی تھی۔ ذوالقرنین کی روزمرہ مصروفیات پھر شروع ہو چکی تھیں۔ عصر تک اپنی کتابوں کی دکان پر رہنے کے بعد وہ قریبی مسجد میں چلا جاتا تھا اور بچوں کو تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کے لیے پھر دکان پر جانا ہوتا تھا لیکن آج چونکہ بارش ہو رہی تھی، اس لیے وہ جلدی گھر آ گیا۔ شیروانی اتار کر ہینگر پر لٹکائی۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی، اپنی چھوٹی ہموار ڈاڑھی سے بارش کے قطرے جھاڑے اور تھکا تھکا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

سہانا موسم ہر کسی پر اثر کرتا ہے۔ دل میں کچھ شگوفے سے پھوٹتے ہیں، چاہے وہ دل کسی کا بھی ہو۔ مولانا حبیب اللہ کے بیٹے قاری ذوالقرنین کا بھی ہو۔ ہاں اپنی تمام تر شرافت، نجابت اور حیا داری کے باوجود اس کا دل دھڑکتا تھا، اس کی رگوں میں خون کی یورش ہوتی تھی۔ اس نے بارہا خود کو سمجھایا تھا..... وہ اسے بھول کیوں نہیں پاتا۔ وہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نہیں ہے، وہ کیوں اپنی زندگی کو ایک مسلسل ناہمواری کے حوالے کرنا چاہتا ہے لیکن وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے اسے پہلی بار شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ عورتوں والے پورشن میں تھی اور اپنا اسکارف کھول کر باندھ رہی تھی۔ بس ایک جھلک سی تھی، دلکش چہرے کی، لمبے شہد رنگ بالوں کی اور شربتی آنکھوں کی۔ وہ جھلک قاری ذوالقرنین کے اندر گہرائی تک پیوست ہو گئی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ ''بھائی! آج تم جلدی آ گئے؟''

''بس، بارش ہو رہی تھی، ایسے موسم میں گاہک وغیرہ کہاں آتا ہے۔''

''امی آج بھی کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکی دیکھنے جانا ہے.....''

''خدیجہ! کہا بھی ہے کہ ابھی تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔''

''ایسا کیوں ہے بھائی، تم تو خود ہی سے کہا کرتے تھے کہ..... شادی بیاہ میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے اور اب دیر پر دیر کیے جا رہے ہو۔''

''دراصل..... میں اپنے دل کو ذرا ٹھکانے پر لانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے، وہ ٹھکانے پر کیوں نہیں ہے۔'' خدیجہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

شروع میں ذوالقرنین نے نور کے حوالے سے اپنے سارے احساسات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے تھے۔ یہ کوئی ناجائز احساسات نہیں تھے مگر ذوالقرنین نے خود کو جس خول میں چھپا رکھا تھا، وہ اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ایک نہایت دین دار نوجوان کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ اصلاح معاشرہ نامی تنظیم کا ایک سرگرم رکن تھا۔ لوگ اس کی شرافت کی مثالیں دیتے تھے۔ اب عالم دین مولانا حبیب اللہ کا یہ بیٹا کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ذوالقرنین کے نزدیک یہ بہت معیوب صورت حال تھی۔ اس نے اپنی سوچوں کو سات پردوں میں لپیٹ کر سات تہ خانوں کی گہرائی میں دھکیل دیا تھا۔ صرف..... اور صرف خدیجہ ایسی تھی جو ان تہ خانوں کی گہرائی میں سے کچھ ڈھونڈ لائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کسی شدید ذہنی کوفت کا

شکار ہے۔ وہ نور کے حوالے سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی تھی کیونکہ وہ بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھی (اب کچھ عرصے سے اس نے بھائی کے اصرار پر کالج میں اصلاح معاشرہ تنظیم کی داغ بیل بھی ڈالی تھی) اسے کالج میں نور کے بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی تو بھائی سے شیئر کرتی۔

خدیجہ بولی۔ ''ذوالقرنین! مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی ڈگر سے ہٹنے والی ہے۔ عید کے موقع پر وہ واپس اپنے والد اشفاق صاحب کے گھر چلی گئی تھی۔ معافی وغیرہ بھی مانگی ہوگی اس نے..... مگر اب پھر تایا کے گھر میں ہے..... اور وہ بھاگ دوڑ والی روٹین بھی جاری ہے۔ پتا نہیں وہ کیا نکالنا چاہتی ہے اس میں سے.....؟''

''اپنے والد سے صلح ہوئی اس کی؟'' ذوالقرنین نے پوچھا۔

''مکمل صلح تو نہیں ہوئی، ورنہ وہ واپس تایا کے پاس کیوں جاتی شاید اتنا ہوا ہے کہ اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ شاید اس نے کچھ مہلت وغیرہ مانگی ہو۔ کسی وقت مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔''

''مہلت کس لیے چاہتی ہے۔ وہی بھاگ دوڑ ہی ہے نا اور اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی ہے۔''

''یہ جو کھلاڑی اور فن کار وغیرہ ہوتے ہیں ذوالقرنین! ان کے ذہن میں ایک بار جو کیڑا گھس جائے وہ آسانی سے نہیں نکلتا۔ خود کو خراب کر رہی ہے۔ اتنی پیاری ہے، اتنے اچھے گھر سے ہے مگر خود کو مصیبتوں میں پھنسا رہی ہے۔ مولوی اشفاق کے لیے یہ کتنی شرمندگی کی بات ہوگی کہ ان کی بیٹی اس طرح کے کاموں میں پڑی ہوئی ہے۔''

''ایسے بندے کو اللہ ہی ہدایت دیتا ہے۔''

''لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے کے بعد ہدایت پائے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے کالج میں سنا تھا کہ گوجرانوالہ کی ''چیمپئن ایتھلیٹ'' نشو بجلی کے ساتھ نور کا زبردست ٹاکرا چل رہا ہے۔ وہ لوگ کسی صورت نور کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ جہاں کہیں کوئی ایونٹ ہوتا ہے اور یہ دونوں اکٹھی ہوتی ہیں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔''

''بس یہی معاملے ہیں نا خدیجہ جن کی وجہ سے عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے کو احسن سمجھا جاتا ہے۔ باہر کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو بنایا ہے اور وہی اس کے لیے بہتر ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تم خود بھی تو اس سے ملتی ہو نا؟''

''ہاں۔ کبھی کبھی، عام سے انداز میں۔''

''اسے شک تو نہیں ہوا کہ تم کون ہو؟''

''نہیں۔ اس نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کہیں دیکھا بھی ہوگا تو بھول چکی ہے۔''

بہن سے گفتگو کے بعد بھی ذوالقرنین دیر تک جاگتا رہا۔ کھڑکیوں سے بارش کی پھواریں ٹکرا رہی تھیں اور دل میں جلترنگ کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ نور کی آواز، اس کی آنکھوں کے رنگ، اس کا دلنشیں لب ولہجہ اور پھر خفگی کے عالم میں پیشانی کی ایک چھوٹی سی سلوٹ..... سب کچھ اس کے تصور میں گھوم رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کا دل چاہا کہ وہ کم از کم ایک بار نور سے پھر ملاقات کرے اور اسے اس ''سعیٔ لاحاصل'' سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اسے سمجھائے کہ اس کی جدوجہد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔

☆☆☆

نور آہستہ آہستہ شکست کے بعد صدمے سے نکل رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی ''ایف اے ایس'' سے واپس آئی تھی اور تھکی ہاری سی بستر پر دراز تھی۔ ذرا ستانے کے بعد وہ مغرب کی نماز پڑھنا چاہ رہی تھی۔ اسی دوران میں تایا ابا اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''گاؤں چلنا ہے؟''

''گاؤں؟''

''بھئی، بھول گئی ہو تم۔ امنالے کا میلا آ گیا ہے۔ تمہاری دادی تو ایک مہینے سے تیاریوں میں لگی ہیں۔ پچھلی دفعہ وہ لوگ اکیلے چلے گئے تھے مگر میرا خیال ہے اس دفعہ ہمیں ضرور جانا چاہیے۔''

امنالے کا میلا یعنی پیر امناں والے کا میلا..... اس میلے کا ذکر ہی اپنے ساتھ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادیں لے آتا تھا۔ دل میں ایک ترنگ سی جاگتی تھی لیکن آج کل نور کا تربیتی شیڈول بھی ٹائٹ چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کتنے دن رکنا ہوگا تایا ابا؟''

''کم از کم پانچ دن لیکن تم ضرور جاؤ۔ ایک تو تمہارا موڈ بہتر ہوگا۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس نامعقول کے آس پاس رہنے کا موقع ملے اور اس کے دل میں مزید نرمی پیدا ہو۔'' نامعقول سے تایا ابا کی مراد ہمیشہ کی طرح نور کے ابا جی ہی تھے۔

وہ بچنا چاہتی تھی مگر دل بھی چاہ رہا تھا۔ آخر وہ آمادہ ہوگئی۔ ٹریننگ سینٹر یعنی ''ایف اے ایس'' سے پانچ چھ دن کی چھٹی اس شرط پر مل گئی کہ وہ اسٹریچنگ وغیرہ کی ورزشیں

جاری رکھے گی اور ڈائٹ کے حوالے سے بھی پوری پابندی کرے گی۔ بسمہ اور نور دوسرے دن بازار گئیں تاکہ روانگی کے حوالے سے کچھ شاپنگ کرسکیں۔ شاپنگ کرتے ہوئے بسمہ ذرا تھک گئی تو وہ دونوں ایک جوس کارنر میں داخل ہوگئیں۔ ابھی انہیں میز پر بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ نور نے دیکھا کسی شخص نے بسمہ کو مخاطب کیا ہے۔ ''بسمہ بہن! کیا میں دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

بسمہ اور نور نے ایک ساتھ اس شخص کی طرف دیکھا۔ نور بے طرح چونک گئی۔ وہ ذوالقرنین تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ سر پر چمکیلے حاشیے والی گول ٹوپی تھی۔

بسمہ اور نور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نور نے غصے سے کہا۔

''پلیز ..... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف.....صرف دو چار منٹ۔''

نور کا دل چاہا کہ وہ اپنی کرسی کو پیچھے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہو مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنا حجاب درست کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ ہمارا پیچھا کررہے تھے؟''

''میں شرمندہ ہوں لیکن خدا گواہ ہے، میں کسی بری نیت سے یہاں موجود نہیں ہوں۔ صرف آپ کی بھلائی کی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ حسب عادت نظریں جھکائے جھکائے بولا۔ پچھلی ملاقات کی نسبت آج اس کا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

''معاف کیجیے۔ ہم نابالغ نہیں ہیں۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہیں۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ آپ سب کچھ سمجھنے کے باوجود سمجھ نہیں پارہیں۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ ایک ایسے راستے پر چل رہی ہیں جہاں آپ اور آپ کے نہایت نیک نام والد صاحب کے لیے بہت سی پریشانیاں ہیں۔''

''آپ کس حوالے سے مجھے لیکچر دے رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی ناسمجھ جاہل ہوں؟''

''ایسا ہوتا تو پھر اتنے دکھ کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا نہیں ہے اور اس کے باوجود آپ گمراہی کی طرف جارہی ہیں۔''

''جسے آپ گمراہی فرمارہے ہیں، وہ ہمارے نزدیک نہیں ہے اور یہ بحث اتنی طویل ہے کہ..... آپ کے بال سفید ہوجائیں گے۔'' نور نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بسمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ذوالقرنین کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا مگر وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔

نور اور بسمہ نے باقی شاپنگ ادھوری چھوڑ دی۔ موڈ ایک دم خراب ہوگیا تھا۔ نور بڑبڑا رہی تھی۔ ''پتا نہیں کہاں سے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اب اگر یہ سامنے آیا تو منہ توڑ جواب ملے گا اسے۔''

اگلے روز دادی اور پھپھو کی فیملی کے ساتھ ساتھ دونوں بھائیوں کی فیملیاں، تین گاڑیوں پر سوار گاؤں روانہ ہورہی تھیں۔ ماموؤں کو ایک روز بعد آنا تھا۔ بہت عرصے بعد نور کو لاہور سے باہر نکلنے اور اپنی مصروفیات کو بریک لگانے کا ایک موقع مل رہا تھا۔ وہ تایا جان والی گاڑی میں سوار ہوتی لیکن وہاں دادی بیٹھی ہوئی تھیں اور نور کو معلوم تھا کہ وہ پورے راستے میں اس کی والدہ مرحومہ کو نشانے پر لیے رکھیں گی اور نور کو مادر پدر آزاد قرار دے کر اس کے لتے لیں گی۔ وہ اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں پھپھو اور کزن موجود تھے۔

گجرات سے آگے تنگ سڑک پر ایک گھنٹے کا سفر تھا اور کچے پکے راستے پر قریباً دو گھنٹے کا نہایت دشوار سفر طے کرنے کے بعد وہ بالآخر موراں والی گاؤں پہنچ گئے۔ (بسمہ کے رشتے والا معاملہ حل ہوچکا تھا۔ ایک ایم این اے ضامن تھا۔ اب اس حوالے سے انہیں کھاپری برادری کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ چودھری طغرل کی والدہ وڈی اماں آج کل بیمار تھی اور نور کی دادی اس کی خبر گیری بھی کرنا چاہتی تھیں۔)

موراں والی میں وہ بڑے پُرلطف دن ثابت ہوئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ رونق میں اضافہ ہورہا تھا۔ میلے کی قدیم روایت کے مطابق تین دن پہلے علاقے کے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر ہر طرح کا آتشیں اسلحہ تھانے میں جمع کرادیا تھا لیکن یہ اسلحہ تھانے میں جمع نہیں ہوتا تھا۔ رسم کے مطابق بلند و بالا مزار کے سامنے سات آٹھ بڑی چارپائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ ان پر سفید چادریں بچھائی جاتی تھیں اور لوگ اپنے اپنے ہتھیار لاکر یہاں رکھتے جاتے تھے اور تھانے کے محرر سے ٹوکن لیتے جاتے تھے۔ ایک ٹوکن ہتھیار یا ہتھیاروں کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس میں ناجائز اسلحہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس اسلحے کے لیے بالکل علیحدہ طریقہ کار تھا..... یہ اسلحہ لوگ رات کی تاریکی میں جمع کراتے تھے۔ جو ضروری سمجھتے، وہ اپنا منہ سر بھی ڈھانپ لیتے تھے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں مستطیل شکل کی ایک طویل کوٹھڑی تھی۔ ناک

چندی اینٹوں کی بنی ہوئی اس قدیم کوٹھڑی کی موٹی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے بہت سے خانے بنائے گئے تھے۔ ان خانوں پر لوہے کے قریباً ایک مربع فٹ کے ڈھکنے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ ہر خانے کا نمبر تھا۔ اپنے غیر لائسنسی ہتھیار لوگ ان خانوں میں رکھتے اور چابی اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ میلے کے اختتام پر رات کے وقت یہ لوگ اپنے ہتھیار نکال کر لے جاتے تھے۔ مدتوں گزرنے کے باوجود اس معاملے میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے ہی ہتھیار لے کر جاتا تھا اور اگر پولیس کو ناجائز اسلحے کے مالک کی کچھ خبر ہو بھی جاتی تھی تو مطلق باز پرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہ سب اس میلے کی بے مثال اور انوکھی روایات تھیں یعنی غیر قانونی کام بھی بے حد ایمانداری کے ساتھ۔ اس حوالے سے لوگوں کے عقیدے اتنے پختہ تھے کہ کوئی انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میلے کے سات روز میں علاقے میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ چوری، رسا گیری اور جیب تراشی کی چھوٹی موٹی وارداتیں بھی ناپید ہو جاتی تھیں۔ یہ تھا امناں والے کا میلا۔

نور اور فیملی کے دیگر بچوں بڑوں نے اپنی ساری سنہری یادیں تازہ کیں۔ آبائی مکان کا بڑا حصہ اور ملحقہ باغ تو بک چکے تھے مگر دریا کی طرف پرانی حویلی اب بھی دونوں فیملیز کی ملکیت تھی اور وہ یہاں بھرپور تفریح کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی بڑی اچھی کھلاڑی نکلی ہے اور اخباروں وغیرہ میں اس کا ذکر آتا ہے کئی عورتیں اور لڑکیاں اس سے ملنے کے لیے آئیں۔ کچھ آنکھوں میں واقعی ستائش تھی مگر کچھ کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اور بیگانگی کی جھلک تھی، جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں..... تم ہمارے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکیوں کو کیا راستہ دکھا رہی ہو۔ مولوی اشفاق کی بیٹی ہو کر تم کس راستے پر چل رہی ہو۔ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جوانی سنبھالو، اپنا گھر سنبھالو، بال بچے دار بنو، کڑیوں کے یہ کام نہیں ہوتے۔

میلے میں ایک دن صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز نور، بسمہ، مہرین اور فیملی کی دیگر لڑکیاں بھی گئیں اور خوب تفریح کی۔ ہاں نور کو کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ صرف دو ہفتے بعد اسے ایک اہم ایونٹ میں حصہ لینا تھا اور اس میں نشو بھی آ رہی تھی۔

گاؤں میں قیام کے دوران نور نے ابا جی کی دلجوئی کی کافی کوشش کی۔ ان کی خدمت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی مگر ان کا رویہ بدستور کھچاؤ کا رہا۔ تایا جان کے سامنے وہ بول تو نہیں سکتے تھے مگر دونوں بھائیوں میں پہلی والی گرمجوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نور خود کو اس کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

گاؤں سے واپس آ کر نور پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں لگ گئی۔ پانچ چھ روز کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے اضافی محنت کی۔ اتھلیٹکس کا یہ ایونٹ دراصل واپڈا میں ملازمت کے حوالے سے تھا۔ صوبے کی چار پانچ ٹاپ رنرز بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ نور نے سوئمٹر کے ٹرائلز میں سخت جدوجہد کی۔ فائنل ہیٹ میں اس نے اپنی اہم ترین حریف نشو بجلی کو 0.75 سیکنڈ کے ساتھ شکست دی (حالانکہ مبینہ طور پر نشو کو ایک غیر ملکی کوچ کی خدمات بھی حاصل تھیں اور وہ نیشنل گیمز میں ٹائٹل مقابلہ بھی جیت چکی تھی)۔

اس فتح کے بعد نور کو قوی امید ہو گئی کہ وہ اگلے قومی مقابلوں میں بھی نشو کو پچھاڑ سکے گی۔ اس ایونٹ کی فتح سے نور کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایک مناسب جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ تایا جان پر اس کے اخراجات کا جو اضافی بوجھ پڑ رہا تھا وہ کم ہو گیا۔ مثلاً اگر پہلے اس پر 30 ہزار ماہانہ خرچ ہو رہا تھا تو اب یہ شرح چودہ پندرہ ہزار رہ گئی۔ تنخواہ کے علاوہ نور کو کچھ مراعات بھی مل رہی تھیں۔

نور کو خدشہ تھا کہ شاید ذوالقرنین پھر اس کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری دل جمعی سے میگا ایونٹ یعنی نیشنل گیمز کی تیاری میں لگی رہی۔ اس نے تایا جان کے کہے کو اپنا ''موٹو'' بنا لیا تھا۔ محنت اور مسلسل محنت، اس یقین کے ساتھ کہ صلہ مل کر رہے گا۔ سخت تربیت اور رنگ کے دوران میں بھی وہ کئی بار یہ جملہ زیر لب دہرانے لگی تھی..... ''مسلسل محنت کا صلہ مل کر رہتا ہے۔''

اس کی ٹائمنگ اب کسی وقت 11.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی۔ اس کا اور اس کے کوچ کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ گولڈ میڈل یا کم از کم سلور میڈل تک پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

میگا ایونٹ نیشنل گیمز میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ نور کا اوڑھنا بچھونا اس کی ٹریننگ بنی ہوئی تھی۔ وہ کہیں آنے جانے میں بھی بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی تایا یا ماموں کے ساتھ کہیں موٹر بائک پر بھی چلی جاتی تھی مگر اب تایا ابا کا حکم تھا کہ وہ صرف گاڑی استعمال کرے گی۔ ایسے موقعوں پر چوٹ لگ جانا یا کسی طرح اَن فٹ ہو جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

وزارتِ کھیل کی طرف سے صوبائی سطح پر کوئی ٹیلنٹ ہنٹ اسکیم ہورہی تھی۔ انڈر 16 کی لڑکیوں میں سے قابل جوہر تلاش کیا جارہا تھا۔ یہ ٹرائلز نور کے کالج کے وسیع و عریض میدان میں ہونا تھے۔ انتظامیہ نے نور کو بھی سینئر ایتھلیٹ کی حیثیت سے دعوت نامہ جاری کیا ہوا تھا۔

وہ ایونٹ کے روز کالج پہنچی تو وہاں رش لگا ہوا تھا۔ شامیانوں کے نیچے مختلف شہروں سے آنے والی بے شمار چھوٹی لڑکیاں موجود تھیں۔ نور پر انکشاف ہوا کہ نشو بجلی بھی آئی ہوئی ہے۔ نشو کی موجودگی اسے ہمیشہ ناگوار ہی گزرتی تھی اگر اسے پتا ہوتا کہ اس نے بھی آنا ہے تو شاید وہ نہ آتی۔

نور کے ساتھ بسمہ اور مہرین بھی آئی ہوئی تھیں۔ بسمہ حسب معمول برقعے میں تھی۔ تقریب میں ایک موقع پر وہی ہوا جس کا نور کو خدشہ تھا۔ نشو کی سپورٹرز نے ہلڑ بازی شروع کردی۔ بسمہ کو ''ڈاکو'' کہا گیا۔ (کیونکہ اس نے برقع پہن رکھا تھا) نور کو دیکھ کر ''پینڈو..... پینڈو'' کے نعرے لگائے گئے..... اور بات صرف ہوٹنگ تک ہی نہیں رہی۔ ہجوم میں سے کسی لڑکی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور نور کا اسکارف کھینچ کر اتار دیا۔ یہ بدتمیزی مہرین سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا اور اس کے بال کھینچے۔ ان لوگوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا۔ ایک دم لڑائی شروع ہوگئی۔ کئی لڑکیاں مہرین اور بسمہ پر پل پڑیں۔ بسمہ کا برقع پھٹ گیا، وہ گرگئی۔ بسمہ اپنی چھوٹی بہن کے برعکس بالکل دھیمے مزاج اور دبلے جسم کی تھی، ٹھیک سے دفاع بھی نہ کرسکی۔ اپنی بڑی بہن کو یوں بے بس دیکھ کر نور تماشائی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں سے بھڑ گئی۔ نشو چلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ نور نے اسے گھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ اسی دوران میں ایک ہٹی کٹی لڑکی کے ہاتھ میں کسی ٹوٹی ہوئی کرسی کا پایہ آگیا تھا۔ وہ نور پر جھپٹی اور تاک کر اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ مضبوط لکڑی کے پائے کی دو تین شدید ضربیں نور کو لگیں۔ نشو کی حمایتیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ صاف محسوس ہوا کہ انہوں نے یہ سب پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔

یہی موقع تھا جب نور نے خدیجہ کو دیکھا۔ اس کا گلابی اسکارف تیزی سے قریب آرہا تھا۔ وہ اصلاح معاشرہ کے فیمیل ونگ کی جنرل سیکریٹری تھی۔ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ وہ حملہ آور لڑکیوں پر جھپٹی۔ ایک دو منٹ کے لیے ٹھیک ٹھاک مار ماری ہوئی۔ کئی لڑکیوں کو چوٹیں آئیں پھر نشو کی سپورٹرز پسپا ہوگئیں۔ کالج کی انتظامیہ اور گارڈز وغیرہ بھی آگئے اور دونوں گروپوں کو ایک دوسرے سے دور کردیا۔

نور کو سب سے پہلے اپنی ٹانگ کی فکر ہوئی۔ اس نے ٹانگ پر وزن ڈالا اور پھر چل پھر کر دیکھا۔ چوٹ ابھی گرم تھی ..... اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ بہرحال گھٹنے کے پاس ایک بڑا نیل نمودار ہوچکا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا خون بھی رسا تھا۔ اس نیل کی موجودگی ظاہر کررہی تھی کہ ہنگامے میں جان بوجھ کر نور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس واقعے پر میڈم فرحانہ اور ڈیپارٹمنٹ کے اسپورٹس ہیڈ نے شدید ردعمل ظاہر کیا..... نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی پوائنٹ آؤٹ ہوگئی تھی۔ نور کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نشو اور اس لڑکی کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائی جائے مگر پھر فونز کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں۔ گوجرانوالہ سے دو تین بااثر افراد کی کالیں بھی آگئیں۔ مختلف ذریعوں سے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو بھی اپروچ کرلیا گیا۔ اندازہ ہوا کہ معاملہ صلح صفائی پر ختم ہوگا۔ ویسے بھی نور کسی شدید چوٹ سے بچ گئی تھی۔ میڈم فرحانہ اسے اپنے ساتھ لے کر آرتھوپیڈک اسپتال پہنچیں۔ اس کی ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ کیے گئے اور تسلی ہونے کے بعد اسے ضروری ٹریٹ منٹ بھی دی گئی۔ ڈاکٹرز نے اسے تین چار روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

بظاہر سب ٹھیک ہوگیا تھا مگر چار پانچ روز آرام کے بعد جب نور ٹریک پر پہنچی اور اس نے باقاعدہ رننگ شروع کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا اب تک نظر آیا ہے۔ اس کا متاثرہ گھٹنا پوری طرح کام نہیں کررہا تھا۔ یہ وہی گھٹنا تھا جس پر شروع شروع میں کھچاؤ محسوس ہوا کرتا تھا مگر بہترین فزیکل ٹریننگ سے یہ کھچاؤ ختم ہوگیا تھا۔ اب اس سخت چوٹ نے اس کھچاؤ کو دوبارہ نمودار کردیا تھا۔

یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ چار پانچ روز تک تو نور نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ امید پالی تھی کہ شاید دوڑنے سے اور روٹین میں آنے سے گھٹنے کی حالت بھی معمول پر آجائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ تکلیف میں کمی کے بجائے اضافے کا احساس ہوا..... وہ اس صورت حال کو مزید راز نہ رکھ سکی۔ ڈیپارٹمنٹ کی کوچ اور منیجر وغیرہ بھی آگاہ ہوگئے۔ ایک بار پھر اس کی چوٹ اور ''ٹریٹ منٹ'' کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر کا اندیشہ تو ''سی ٹی اسکین'' وغیرہ سے دور ہوگیا مگر ایک دو مسل متاثر تھے..... تفصیلی معائنے کے بعد محکمے کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''مس نور! آپ کو کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرنا پڑے گا۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن ڈاکٹر! دو ہفتے آرام کے بعد تو صرف تین ہفتے بچیں گے۔ میں اتنی جلدی فارم کیسے حاصل کر پاؤں گی؟''

''تو پھر آپ..... میرا مشورہ مانیں۔ ان مقابلوں سے دستبردار ہو جائیں۔ جلد بازی کر کے آپ اپنے کیریئر کو خطرے میں ڈال دیں گی۔''

یہ الفاظ برق کی طرح نور کے حواس پر گرے۔ ''نہیں..... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ دل ہی دل میں پکار کر بولی۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے..... ''مس نور! ابھی آپ کی عمر بائیس سال ہے۔ آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آئندہ سال قومی ایونٹ میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ بہتر کارکردگی دکھا سکیں۔''

''اوہ نو۔'' اس نے کرب کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ وہ تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب ایک سال کی بات کر رہے تھے۔

میڈم فرحانہ بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اس کی باڈی میں ریکوری کی زبردست صلاحیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس بارہ روز کے مزید آرام سے یہ فٹ ہو جائے گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے امکان نظر نہیں آرہا۔ ویسے میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو اس لڑکی کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ نور کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔''

''وہ بڑے بااثر لوگ ہیں۔'' فرحانہ بیگ نے کہا۔ ''کیس ہوا تو پھر کیسوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آپ کا ڈیپارٹمنٹ بھی اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ''میں نے اس واقعے کی ویڈیو دیکھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر وہ دوسرے گروپ کی لڑکیاں مدد کو نہ آجاتیں تو نور اور اس کی چار پانچ ساتھیوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔''

''جی ہاں۔ وہ ہمارے کالج کی ہی ایک آرگنائزیشن کی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے بڑا بروقت قدم اٹھایا۔''

نور نے ابھی تک تایا جان اور بسمہ وغیرہ کو اپنی ہولناک افتاد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تاہم مہرین کو کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گھٹنے کی اندرونی سائڈ پر لگنے والی چوٹ کتنی مضر ہوتی ہے۔ وہ بہت فکرمند تھی۔ اس روز ڈاکٹر سے مل کر جب نور گھر پہنچی تو کافی افسردہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تایا جان کو اس خبر سے کیسے آگاہ کرے۔ دوسری طرف اسے یہ امید بھی تھی کہ وہ چند روز کے آرام کے بعد دوبارہ ٹریک پر آجائے گی۔

گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ دراصل اسے نور نے ہی بے حد ''ریکوئسٹ'' کر کے بلایا تھا۔ یہ وہی لڑکی خدیجہ تھی جس نے ہنگامے کے روز ڈٹ کر نور اور اس کی فرینڈز کی مدد کی تھی۔ وہ ''عبایا'' میں تھی اور تائی جان اور مہرین کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

نور اسے دیکھ کر گرمجوشی سے گلے ملی۔ ''سوری خدیجہ! مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ وہاں ٹریننگ سینٹر میں ایک لیکچر سننا پڑ گیا تھا۔'' نور نے ڈاکٹر اور اسپتال والی بات گول کی۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ کی تائی جان اور مہرین سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں آپ کی بہن سے بھی ملنا چاہتی تھی مگر وہ شاید دوسرے گھر میں ہیں۔'' نور نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''ان کو بھی تو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ سارا برقع بھی پھٹ گیا تھا ان کا۔''

''ہاں، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''اور آپ؟''

''آپ کی مہربانی سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ سے ملاقات تو پہلے بھی ہوتی رہتی تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ ایک دن آپ اس طرح ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوں گی۔''

''نہیں بھئی نور! آپ تو ہمارے کالج کا بلکہ پورے شہر کا ایک روشن نام ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور مزید ترقی دے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ اب پھر رونین کی ٹریننگ کر رہی ہیں۔''

نور کو سینے میں غم کی لہر سی محسوس ہوئی۔ خدیجہ اور نور کے درمیان بیس تیس منٹ تک گفتگو کا دور چلا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں ہی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئیں۔ جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ خدیجہ، نور سے قریباً دو سال سینئر تھی۔ وہ اب نور کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور نور کو یہ اچھا لگ رہا تھا۔

خدیجہ نے کہا۔ ''اب ہم اس گروپ کی طرف سے پوری طرح الرٹ ہو گئے ہیں۔ ان ''پرکٹی'' شتونگڑیوں نے کسی بھی موقع پر گڑبڑ کی تو منہ توڑ جواب ملے گا۔ انشاء اللہ۔''

اچانک نور کو خیال آیا۔ ''خدیجہ! آپ آئی کیسے ہیں؟''

''بھائی ساتھ ہے۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔''

''ارے یہ کیا بات ہوئی۔ انہیں باہر بٹھا دیا ہے۔''

تائی جان بولیں۔ ''کہا بھی تھا اسے اندر لے آؤ لیکن مانی نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ وہ ذرا..... تنہائی پسند ہے۔''

خدیجہ ہنسی۔ ''تنہائی پسند بھی..... اور آج اس کا روزہ بھی ہے، کچھ کھائے پیے گا نہیں۔''

''لیکن خدیجہ! انہیں ڈرائنگ روم میں تو بٹھا دیتیں۔'' نور نے کہا۔

''چلیں، پھر سہی..... اس وقت تو کافی دیر ہوگئی ہے۔'' وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب آپ لوگ اجازت دیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔'' وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

نور اور مہرین اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔

ان کی ایف ایکس گاڑی پندرہ بیس قدم دور کھڑی تھی۔ گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ نجانے کیوں یہ نیلی گاڑی نور کو جانی پہچانی سی لگی..... جب خدیجہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو نور کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ ذوالقرنین تھا قاری ذوالقرنین۔ تو کیا خدیجہ، ذوالقرنین کی بہن تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے نور کے رشتے کی بات چلی تھی؟ وہ کافی دیر تک اس غیر متوقع اتفاق کے حوالے سے سوچتی رہی۔ کہیں خدیجہ کی یہاں آمد کے پیچھے بھی تو کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی؟

اپنی چوٹ کے بارے میں نور کے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا مگر وہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر امید کو روشن رکھے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ چند دن کے مکمل آرام سے وہ نارمل ہو جائے گی۔ گاہے بگاہے نشو بجلی اور اس کے گروپ کے حوالے سے بھی اس کے اندر شدید غم و غصہ نمودار ہوتا تھا مگر اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ان لوگوں سے لڑائی مول لینا آسان نہیں ہے۔

اس نے بند کمرے میں ہلکی پھلکی ورزش کر کے اپنی چوٹ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ اسے گھٹنے میں تیز درد شروع ہوگیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ تایا ابا تھے۔ انہیں ابھی تک نور کی فٹنس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ یہ اسپیشل ایتھلیٹ شوز تھے جو انہوں نے یو ایس اے سے منگوائے تھے۔

''لو بھئی! تمہارا یہ کام بھی ہوگیا۔'' وہ اسے پیکٹ تھماتے ہوئے دبے دبے جوش سے بولے۔

پھر ان کی نگاہ نور کے چہرے پر پڑی اور وہ ذرا ٹھٹکے۔ ''خیریت تو ہے نوری؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بس یونہی..... سر میں تھوڑا سا درد تھا۔'' اس نے بہانہ بنایا۔

''تو آرام کرو نا بیٹی! کل تو تمہاری پریکٹس بھی نہیں ہے۔''

''جی تایا ابا۔'' اس نے اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

تایا ابا کو دکھانے کے لیے اس نے پیکٹ کھولا۔ شوز پہن کر بھی دیکھے، تعریف بھی کی اور شکریہ بھی ادا کیا لیکن اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، وہی جانتی تھی۔

تایا ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نور! تمہیں پتا ہے چاند پر پہلا شخص کون پہنچا تھا؟''

''جی..... نیل آرمسٹرانگ۔'' وہ بولے سے بولی۔

''اور دوسرا؟''

''دوسرے کا نام..... نہیں..... دوسرے کا نام یاد نہیں۔''

انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''اپنے لیے ہمیشہ نمبر ون کو ذہن میں رکھو۔'' اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

وہ دروازہ بند کر کے جیسے سسک اٹھی۔

☆☆☆

ایونٹ سے چھ سات دن پہلے تایا ابا کو بھی پتا چل گیا تھا کہ نور پوری طرح فٹ نہیں ہے لیکن پوری طرح پُرعزم ہے اور ہر صورت ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ محکمے کے سینئر ڈاکٹر کے علاوہ بھی ایک دو بہترین اسپیشلسٹ اسے زیر معائنہ رکھے ہوئے تھے۔ نور کوشش کے باوجود اپنی بہترین ٹائمنگ حاصل نہیں کر پا رہی تھی اور یہ اس کے لیے بے حد تکلیف دہ بات تھی لیکن ایک جنون تھا، ایک دیوانہ پن تھا، وہ ہر صورت میگا ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ ایک وجدان سا تھا اس کے اندر..... اس نے مسلسل محنت کی ہے۔ اپنی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اسے ضرور صلہ ملے گا..... مل کر رہے گا۔ یہی تو کہتے تھے تایا جان بھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن وہ اس مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہوگئی جس کا انتظار وہ ایک عرصے سے کر رہی تھی.....

(جاری ہے)

وہ اپنی فٹنس کے حوالے سے مطمئن نہیں تھی مگر اپنی ہیڈ کوچ میڈم فرحانہ کو بتا بھی نہیں رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے اس حوالے سے میڈم فرحانہ سے تفصیلاً بات کی تو ہوسکتا ہے کہ معاملہ خراب ہوجائے۔ نتیجہ یہ نکلے کہ اسے ایونٹ میں حصہ لینے سے ہی روک دیا جائے۔ وہ فٹنس حاصل کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی اور ساتھ ساتھ شب و روز دعا گو بھی تھی۔

بالآخر فیصلے کا دن آن پہنچا۔ توقع کے عین مطابق ٹاپ کی پانچ چھ اسپرنٹرز آسانی سے فائنل تک پہنچ گئیں۔ ان میں نشو بجلی، نور اور ایچی سن کالج کی ارم بھی شامل تھیں۔ ہر کسی کو فائنل ریس کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔ اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمروں کی فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ٹی وی کیمرے اور عام ویڈیو کیمرے بھی چمکراتے دکھائی دے رہے تھے۔ دل دھڑک رہے تھے اور سانسوں کے زیر و بم میں تیزی آچکی تھی۔ اس کے کزن مہرین، شرجیل، عثمان وغیرہ بھی یہاں موجود تھے..... اور تایا جان کی موجودگی تو ہمیشہ لازمی ہوتی تھی۔ ہاں بسمہ اس دفعہ نہیں آسکی تھی لیکن یقیناً وہ بھی کہیں نہ کہیں ٹی وی کے سامنے موجود تھی۔

رنرز نے ٹریک پر پوزیشن لی۔ اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے۔ آگے جھک کر اسٹارٹنگ لائن کو چھوا اور فائر ہوتے ہی اپنے سپنوں کی تعبیر کی طرف دوڑے۔ ان لمحوں میں نور نے اپنے فٹنس کے پرابلم کو قطعی طور پر ذہن سے نکال باہر کیا تھا۔ بس ایک ہی بات اس کے ذہن میں تھی، اس نے جیتنا ہے اور ہر صورت جیتنا ہے۔ اس نے اپنی اس حریف کو نیچا دکھانا ہے جس نے اسے ہرانے کے لیے بدترین حربے اختیار کیے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ اس لڑکی سے قانونی طور پر نہیں لے سکتی تھی مگر کھیل کے میدان میں تو لے سکتی ہے اور وہ ضرور لے گی.....

ایک دوسرا تصور جو اس کے حوصلے کو مہمیز کررہا تھا، وہ اس کے تایا ابا کا تصور تھا۔ انہوں نے بہت انتظار کیا تھا۔ آج وہ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتی تھی..... خوشی اور فتح کی چمک۔

وہ فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے دوڑی اور اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی توانائیاں صرف کردیں۔ وہ آغاز میں ہی دفاعی چیمپئن نشو سے تین چار فٹ آگے نکل گئی..... نشو نے چالیس میٹر طے کرنے کے بعد پورا زور لگایا اور نور کے برابر آگئی۔ وہ آج پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر آج نور نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنی لیڈ برقرار رکھے گی۔ تماشائیوں کے شور سے پورا اسٹیڈیم گونج رہا تھا..... اور پھر یکایک زمین و آسمان نور کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ اس کے ایک گھٹنے میں ایسی شدید ٹھیس اٹھی تھی جیسے کسی نے ٹانگ میں دہکا ہوا نیزہ اتار دیا ہو پھر شاید وہ ایک دو نہیں کئی پلٹیاں کھا گئی تھی۔ وہ فنش لائن سے پچیس تیس میٹر پہلے ہی گر چکی تھی۔ کئی سیکنڈ تک تو اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دل و دماغ یقین نہیں کر پارہے تھے مگر نگاہوں کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ وہ اسپرنٹرز کو عقب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ فنش لائن پار کرچکی تھیں۔ نشو بجلی کے دونوں بازو بے ساختہ فضا میں اٹھ گئے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں اور اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا رہی تھی۔ بھاگتی چلی جارہی تھی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

نور اپنی جگہ پڑی رہی، وہ کیسے اٹھتی؟ مُردے بھی کہیں اٹھتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ مُردہ ہی تو تھی۔ انتظامیہ کے چند مرد و زن اس کی طرف لپکے۔ فی میل ورکرز نے اسے بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح تھی۔ وہیں ٹریک پر بیٹھی رہی۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ ان میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سر اپنے گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ وہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان لوگوں کو نگل لیتا ہے، یا زمین پھٹ جاتی ہے اور وہ اس میں سما جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی انہونی کی منتظر تھی۔ اس وقت جس منظر کی دید کا خوف اسے سب سے زیادہ ''ہانٹ'' کررہا تھا، وہ تایا جان کے ہلدی رنگ چہرے کا منظر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مزید مضبوطی سے بھینچ لیں۔

☆☆☆

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، محنت کا صلہ ملتا ہے۔ عمل پیہم رائگاں نہیں جاتا..... کہاں تھے ان محاوروں کے خالق، کیوں بنائے گئے یہ محاورے؟ کیوں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے امید کی شان میں قصیدے کہے اور اسے زندگی کی بقا کی بنیاد قرار دیا۔ وہ رات دن سوچتی تھی اور سوچتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کمرے میں بند ہوگئی تھی، نہ کسی سے مل رہی تھی، نہ کسی کی بات سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تین دن گزرنے کے باوجود تایا جان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا پھر مہرین

کی مدھم آواز ابھری۔ ''دروازہ کھولو نور! یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہو؟''

''نہیں مروں گی بھوکی۔'' وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ ''بسکٹ ہیں اندر اور دودھ بھی ہے فریج میں۔ جاؤ تم۔ میں کھالوں گی۔''

''لیکن یہ کیا بیوقوفی ہے نور! تم تو تماشا بنا رہی ہو اپنے آپ کو۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب اپنے حواس ٹھکانے پر کرو۔ اگر گھٹنے کا مسئلہ زیادہ ہے تو اس کو بھی ٹریٹ منٹ کی فوری ضرورت ہے۔''

''نہیں..... ٹھیک ہے گھٹنا میرا۔'' وہ لہجے کی تلخی کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔

''دیکھو نور! تمہیں ابا جان کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا نا؟ لیکن وہ تو کل شام ہی چنیوٹ چلے گئے تھے۔'' (ابا جان سے مہرین کی مراد اپنے ابا جان تھے)۔

''گھر میں اور کون ہے؟'' نور نے مری مری آواز میں پوچھا۔

''بس میں اور امی۔ وہ بھی بازار گئی ہیں۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد نور نے ایک لمبی سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ مہرین اندر آگئی۔ نور جیسے سسک کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنسوؤں کے بغیر کیسے رویا جاسکتا ہے؟

''کوئی بات نہیں نور۔ ہر کام میں اللہ کی بہتری ہوتی ہے۔ تم نے کوشش تو پوری کی۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب جو اللہ کو منظور۔ کل ابا جی بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔'' وہ نور کو دلاسا دینے لگی۔

نور بالکل بجھ سی گئی تھی۔ کوئی دلاسا کام نہیں کررہا تھا۔ وہ کہیں چلے جانا چاہتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے ہر ایک سے دور ہوجانا چاہتی تھی..... مگر کہاں جاتی؟

اچانک اس کی نگاہ خدیجہ پر پڑی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ یقیناً نور کو حوصلہ تسلی دینے کے لیے ہی آئی تھی۔ نور کے قدم جیسے بے ساختہ خدیجہ کی طرف اٹھ گئے۔ اس سے بات کرکے نور کو بہت اچھا لگا کرتا تھا مگر پھر یکایک وہ ٹھٹک سی گئی۔ اسے خدیجہ کے ساتھ اس گھر میں اپنی آخری ملاقات یاد آگئی تھی۔ خدیجہ کا بھائی اسی کے ساتھ آیا تھا اور وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ ذوالقرنین کا خیال آتے ہی نور کے اندر کچھ بجھ سا گیا۔ خدیجہ کے حوالے سے اس کی ساری چاہت ایک دم گہنا گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے خدیجہ کے پاس پہنچی اور عام سے انداز میں اس سے ملی۔

خدیجہ بے حد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ نور کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کافی دیر سے یہاں مہرین کے پاس موجود تھی اور دونوں میں نور کی چوٹ وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی بات ہوتی رہی ہے۔ نور کو مہرین پر تھوڑا سا غصہ بھی آیا کہ اس نے کیوں خدیجہ سے اس معاملے پر بات کی مگر پھر یہ سوچ کر اسے اپنا غصہ ماند پڑتا محسوس ہوا کہ اس کی ہار کی وجہ اور اس کی چوٹ کے بارے میں تو اب ہر کسی کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا اور پھر جب سب کو معلوم ہو چکا ہے تو خدیجہ کو بھی سہی۔

رسمی کلمات کے بعد خدیجہ نے کہا۔ ''میں کل کے اخبار میں تمہارے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رضوان کا مختصر انٹرویو تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تمہارے گھٹنے کی چوٹ سے آگاہ تھے اور انہوں نے تمہیں اور تمہاری ہیڈ کوچ کو مشورہ بھی دیا تھا کہ تمہارا ایونٹ میں حصہ نہ لینا بہتر ہے۔''

''لیکن میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کرسکتی ہوں مگر جو میری قسمت میں تھا۔''

''میں سمجھتی ہوں نور کہ جو تمہاری قسمت میں تھا وہ تمہیں نہیں ملنے دیا گیا اور اس کی قصوروار صرف اور صرف نشو ہے۔ وہ مدت سے تمہارے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور آخر اپنا کام دکھا گئی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ سارے ثبوت ہونے کے باوجود ہم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے..... اور اس لیے نہیں بگاڑ سکے کہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں۔ کوئی باہر کا ملک ہوتا تو تمہارا کیریئر داؤ پر لگانے والی اس خبیث کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کردیا جاتا۔''

''چھوڑیں خدیجہ! خود کو پریشان نہ کریں، جو ہونا تھا ہوچکا۔ اب میں یہ سب بھول جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر لہجے کی تہ میں جو غیر معمولی کرب تھا، وہ چھپائے نہیں چھپا تھا۔

خدیجہ نے جیسے بے قرار ہوکر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ایسے مت بولو نور! سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف ایک ایونٹ کی بات ہے، تم بھلی چنگی ہوجاؤ گی۔ ڈاکٹر رضوان نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ کا مکمل آرام تمہیں پھر سے فٹ کرسکتا ہے، اس کے علاوہ.....''

''پلیز خدیجہ! آپ یہ ذکر نہ ہی کریں، مجھے اب گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ویسے بھی میں کچھ دن کے لیے ذرا تنہائی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اب بھی..... سکون کی گولی کھائی ہوئی ہے..... تھوڑی دیر سونا چاہ رہی تھی۔'' وہ کہتے کہتے کہہ ہی گئی۔

یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ زیادہ دیر خدیجہ کے

پاس بیٹھنا نہیں چاہتی۔ نور کی یہ بے رخی محسوس کرنے کے باوجود خدیجہ کی خندہ پیشانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا..... نم آنکھوں کے ساتھ اس کے سر کو چوما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا تم آرام کرو۔ اگر موڈ اچھا ہو اور کسی وقت بات کرنے کو دل چاہے تو فون ضرور کرنا۔''

☆☆☆

وہ کسی صورت اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس کا خیال تھا۔ شادی کی تقریب کا وہ منظر جیسے ذوالقرنین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا..... اس نے اپنا ڈھیلا اسکارف کھول کر پھر باندھا تھا۔ ستاروں کے درمیان جیسے ایک چاند چمکا تھا اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ کئی گھڑیاں ایسی ہی کایا پلٹ ہوتی ہیں۔ وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہیں۔ کہنے کو تو بس چند سیکنڈ لیکن جھیلنے کو ساری زندگی۔

تین دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ نور ایک بار پھر ٹائٹل جیتنے میں ناکام رہی ہے اور بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ آدھے راستے کے فوراً بعد ٹریک پر گر گئی تھی اور دور تک لڑھکی تھی۔ اس کی یہ تصویر کئی اخباروں میں چھپی تھی اور پی ٹی وی پر بھی یہ منظر دکھایا گیا تھا۔

ذوالقرنین کا دل غم سے بھرا ہوا تھا، اتنے میں اس کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ذوالقرنین کے کہنے پر ہی وہ نور سے ملنے گئی تھی۔

خدیجہ بالکل گم صم تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''وہ بہت خاموش ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں ذوالقرنین..... دانشوروں نے شاید درست ہی کہا ہے کہ ظلم کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے مگر ناانصافی کی نہیں۔ یہاں دو طرح کا انصاف ہے۔ ایک غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے، دوسرا امیر اور اثر رسوخ والوں کے لیے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''نور کی ناکامی کی وجہ وہی چوٹ ہے جو اس کمینی نشو نے اسے کالج والے ایونٹ میں لگوائی تھی۔ اس کا گھٹنا پوری طرح فٹ نہیں تھا پھر بھی اس نے ریس میں حصہ لیا اور شکست کھا گئی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ نشو کہیں میرے سامنے آئے اور میں اسے گولی مار دوں۔ سنا ہے آج کل وہ لاہور آئی ہوئی ہے، اس کے اعزاز میں تقریبات ہو رہی ہیں۔''

''اب کیا کہتی ہے نور..... کیا اب بھی اپنی ضد پر رہے گی؟''

''نہیں، اس بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یقین کرو ذوالقرنین! آج اسے دیکھ کر بڑا ترس آیا ہے مجھے۔ اپنے تایا اور والد کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے بڑی جان ماری تھی اس نے مگر.....''

ذوالقرنین ذرا توقف سے بولا..... ''چلو تم اس سے ملتی رہو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی جیت نہیں ہے اور ایک ہی میدان نہیں ہے۔ بندہ ایک جگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کسی اور شعبے میں نام کما سکتا ہے۔''

''تمہیں کہا تھا نا ذوالقرنین! یہ جو کھلاڑی اور آرٹسٹ ہوتے ہیں نا، یہ دھن کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی بھی نہیں کی جا سکتی۔''

خدیجہ نے بھائی سے یہ بات چھپائی کہ نور اس سے بڑی سرد مہری سے ملی ہے۔

اگلے روز ذوالقرنین عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف خدیجہ کی ایک دوست تبسم تھی۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

''ذوالقرنین بھائی! خدیجہ زخمی ہو گئی ہے۔ شیخ زید اسپتال میں ہے۔ آپ جلدی آئیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' ذوالقرنین چلا کر بولا۔

''فیڈریشن کے آفس میں لڑائی ہوئی ہے۔ نشو اور اس کی دوستوں نے خدیجہ کو بری طرح مارا ہے۔ اس کی..... کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور بھی کئی زخم ہیں۔''

ذوالقرنین اپنی ایف ایکس پر آندھی کی رفتار سے شیخ زید اسپتال پہنچا۔ خدیجہ ابھی ایمرجنسی میں ہی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی پر عارضی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کے سر، کندھے اور پاؤں کی انگلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تنظیم کی کئی ممبران بھی وہاں موجود تھیں۔ زخمی ہونے کے باوجود خدیجہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ ذوالقرنین نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔ پھر تبسم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ فیڈریشن کے آفس میں نشو کے اعزاز میں ایک فنکشن تھا۔ خدیجہ اکیلی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اسٹیج پر آ کر اور ڈائس کے سامنے نشو کے خوب لتے لیے۔ اسی پر لڑائی ہو گئی۔

ایک دوسری لڑکی بولی۔ ''خدیجہ باجی نے غلطی کی، اگر ایسا کچھ کرنا تھا تو کم از کم ہم میں سے دو چار کو انفارم کر دیتیں۔''

واقعے کی جو تفصیل معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ خدیجہ کے اندر نشو کے لیے مسلسل غصہ پل رہا تھا۔ آج اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ فیڈریشن کے آفس پہنچ گئی۔ وہاں نشو اور اپچی سن کالج کی ارم کو نقد انعامات دیے جانے والے تھے۔ جب نشو ڈائس پر آئی تو خدیجہ نے وہاں پہنچ کر مائک کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ نشو کی چیمپئن شپ کو فراڈ قرار دیا..... اور بتایا کہ اس نے کس طرح ''پری پلاننگ'' اصل حق دار نور کو ایونٹ سے باہر کیا ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ ہٹی کٹی لڑکی بھی موجود تھی جس نے نور کی ٹانگ پر کرسی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگائی تھیں۔ وہ حاضرین میں سے نکل کر خدیجہ پر جھپٹ پڑی۔ خدیجہ نے اس کی بھی ٹھکائی کر دی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ نشو بچلی پہلے تو ہکا بکا زدہ کھڑی رہی مگر پھر خدیجہ پر جھپٹی۔ خدیجہ نے اسے ایک یادگار طمانچہ رسید کیا۔ بعد میں تقریباً اسے بھی طمانچے پڑے اور وہ زدوکوب بھی ہوئی مگر وہ پہلا طمانچہ درجنوں کیمروں میں ریکارڈ ہو گیا۔

☆☆☆

مہرین نے نور کو زبردستی بیڈ پر نیم دراز کر رکھا تھا اور اس کو گھٹنے کی مختلف ورزشیں کرا رہی تھی۔ اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجی۔ مہرین نے کال ریسیو کی اور اس کے تاثرات میں ہلچل مچ گئی۔ دوسری طرف سے کسی جھگڑے کی بات ہو رہی تھی۔ فون سننے کے بعد مہرین نے نور سے کہا۔

''اچھی خبر نہیں، خدیجہ اور نشو کی لڑائی ہوئی ہے۔ خدیجہ کا بازو فریکچر ہو گیا ہے، اسپتال میں اس کا آپریشن ہوگا۔''

''اوہ گاڈ۔'' نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کس نے بتایا ہے؟''

''میری کولیگ ہے..... وہ بھی شیخ زید کے فزیوتھراپی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔''

''لیکن معاملہ کیا تھا..... کوئی اپنی بھی دشمنی ہے ان کی؟''

''نہیں بھئی۔ تمہاری والی دشمنی ہی ہے۔ ایک فنکشن میں خدیجہ ڈائس پر پہنچ گئیں اور خطاب فرماتی ہوئی نشو کا اچھا خاصا ریمانڈ لیا۔ کافی ہنگامہ ہوا ہے۔''

آدھ پون گھنٹے میں نور اور مہرین کو اس واقعے کی ساری تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ چند دن پہلے نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی سلطانہ اس لڑائی میں اسٹیج سے گر کر تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ نشو کے ورثاء پرچہ وغیرہ بھی درج کرا دیتے مگر چونکہ خدیجہ کو بھی سخت چوٹ لگی تھی اس لیے ابھی تک پولیس کو انفارم نہیں کیا گیا تھا اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

''خدیجہ اچھی بھلی سمجھ دار ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں میرے لیے لڑائی مول لے رہی ہیں۔''

''کبھی کبھی اس طرح کی بات اپنے بس میں نہیں رہتی نور! صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو پھر زیادہ ہی چھلک جاتا ہے۔ میں نے اس دن نوٹ کر لیا تھا کہ کہیں دیکھ کر خدیجہ بہت پریشان ہو گئی ہیں.....''

تین دن بعد کی بات ہے، نور اور مہرین نے خدیجہ کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ کا آپریشن کامیابی سے ہو چکا تھا۔ نور چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اسپتال پہنچیں جب خدیجہ کا بھائی ذوالقرنین آس پاس موجود نہ ہو۔

خدیجہ پرائیویٹ روم میں تھی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہ روم میں اکیلی ہی تھی۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں، ایک خوبصورت ''بکے'' اس کے سرہانے رکھ دیا۔ رسمی کلمات کے بعد نور نے کہا۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا خدیجہ..... خوامخواہ لڑائی مول لی۔ آپ تو مجھے سمجھاتی تھیں کہ ان باتوں میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

''پتا نہیں نور کہ کیسے ہو گیا۔ جب میں تم سے مل کر آئی تو میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں وہاں پہنچ گئی۔ آئی ایم سوری لیکن ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔''

''آپ جانتی ہیں خدیجہ! یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔''

''نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوگی انشاء اللہ! انہیں پتا تھا کہ اگر وہ پولیس تک گئے تو پھر بات آگے تک جائے گی۔ کل صلح صفائی کی بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صاف بتایا ہے کہ وہاں فیڈریشن کے دفتر میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔''

''مگر اس سے فائدہ کیا ہوا خدیجہ؟'' نور نے جز بز ہو کر کہا۔

''بہت فائدہ ہوا ہے نور! کم از کم ان لوگوں کو ایک جواب تو ملا ہے۔ اب آئندہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچیں گے۔ تمہیں پتا چلا ہی ہوگا، وہ ماڈرن غنڈی تو اسٹیج سے گر کر کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی.....''

مہرین بولی۔ ''مگر آپ کو بھی تو قیمت چکانا پڑی خدیجہ آپی! آپ اسپتال میں پڑی ہیں۔''

''کوئی قیمت نہیں۔'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

''بھلی چنگی ہوگئی ہوں، کل تک شاید چھٹی بھی مل جائے۔''

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور ذوالقرنین تولیے سے بازو صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ذوالقرنین کو دیکھ کر نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا ٹھٹکا پھر اس نے شائستگی سے ''السلام علیکم'' کہا۔ نگاہیں حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔ نور اور مہرین نے جواب دیا۔ وہ شاید وضو کر کے نکلا تھا۔ بولا۔ ''خدیجہ! نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ مہرین نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون تھے خدیجہ آپی؟''

''میرا بھائی ذوالقرنین۔''

''اچھا، آپ انہی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں؟''

خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بہت زیادہ خیال رکھتا ہے میرا۔ چار دن سے مسلسل یہاں میرے پاس ہے۔''

اسی دوران میں مہرین کی وہ دوست آ گئی جو اسی اسپتال میں فزیوتھراپسٹ تھی۔ مہرین اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں ایک بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ نور کے علاوہ جیسے خدیجہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ آخر نور نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ پہلے سے جانتی ہیں؟''

''کیا؟'' خدیجہ نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''یہی کہ میں وہی ہوں جس کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے آپ کے بھائی کے رشتے کی بات چلی تھی؟''

خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہاں نور..... میں جانتی تھی..... مگر میں نے تمہیں بتایا نہیں..... مجھے ڈر تھا کہ تمہیں پتا چل گیا تو ہماری دوستی شروع میں ہی ختم ہو جائے گی لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میرے اور تمہارے ملنے میں کوئی پلاننگ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک ہی کالج میں تھیں، جو کچھ ہوتا رہا خود بخود ہوتا رہا۔''

''..... آپ میرے لیے صرف خدیجہ ہی رہتیں تو بہت اچھا ہوتا۔'' نور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی نہیں آئے گا۔''

اس سے پہلے کہ خدیجہ مزید کچھ کہتی، مہرین اور اس کی دوست واپس آ گئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نور اب جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے رخصت ہو کر وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں تو ان کی ملاقات پھر ذوالقرنین سے ہوگئی۔ وہ کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس وغیرہ لے کر اوپر آ رہا تھا۔

''آپ جا رہی ہیں؟'' وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''جی ہاں۔ گھر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔'' مہرین نے جواب دیا۔

''آپ پانی تو پی لیتیں۔''

''شکریہ۔ دیر ہو رہی ہے۔'' مہرین نے کہا۔

وہ دونوں سلام لیتے ہوئے نیچے اتر آئیں۔

راستے میں مہرین نے گہری نظروں سے نور کو دیکھا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''ویسے نور! بندہ اتنا برا بھی نہیں لگتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''سیانے کہتے ہیں نا کہ شکلوں پر نہیں جانا چاہیے۔ شکل صورت سے یہ ذرا سخت مزاج اور گم صم سا ہے مگر جب بات کرتا ہے تو اور طرح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔''

''اچھا، تم زیادہ مردم شناس نہ بنو۔'' نور نے چڑ کر کہا۔

''یار! میں تو ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔''

''لیکن میرے لیے یہ عام نہیں ہے مہرین! میں اس طرح کے کسی بندے کو اپنی زندگی میں لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''کوئی آئیڈیل؟'' مہرین دبی دبی شوخی سے بولی۔

''نہیں۔ کوئی آئیڈیل نہیں مگر یہ قاری ذوالقرنین بھی نہیں۔''

نور کا موڈ دیکھتے ہوئے مہرین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

..... پندرہ بیس روز گزر گئے۔ انہوں نے دوبارہ خدیجہ کی خیر خیریت دریافت نہیں کی حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ کم از کم ایک بار تو اسے فون کر لیتیں۔ (نور نے مہرین کو بتا دیا تھا کہ خدیجہ اور اس کے درمیان ذوالقرنین والی بات کھل چکی ہے) آخر ایک روز مہرین نے خدیجہ کو فون کر ہی دیا۔ حال احوال پوچھا۔ نور نے بھی تھوڑی سی بات کی۔ گفتگو کے آخر میں خدیجہ نے نور سے کہا۔ ''نورا تمہارے پاس اور کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔ مہرین تھی، باہر چلی گئی ہے۔''

خدیجہ بولی۔ ''تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نور؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے کبھی خفا

نہیں ہوسکتی۔ میرے دل میں آپ کا ایک مقام بن چکا ہے۔ بس تھوڑا سا افسوس ضرور ہے۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ ماضی کی ایک بات ہمارے درمیان آ گئی ہے۔ ہم پہلے کی طرح آزادانہ نہیں مل سکتیں لیکن کچھ بھی ہے خدیجہ! آپ دور رہ کر بھی میرے قریب ہی رہیں گی۔''

دوسری طرف کچھ دیر بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نور! اس دن اسپتال میں، میں نے تم سے ایک فقرہ کہا تھا، اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں..... تمہیں یاد ہے؟''

نور نے کہا۔ ''ہاں، آپ نے کہا تھا، میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔''

''میں اپنی اس بات پر قائم ہوں نور۔ بس تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ یہ پہلی اور آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ اس موضوع کا صفحہ ہماری گفتگو کے باب میں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوجائے گا۔''

''آپ..... کیا..... کہنا چاہتی ہیں؟''

''نور! ہر بہن کو اپنا بھائی پیارا ہی ہوتا ہے لیکن میں جو بات کہنے جارہی ہوں، یہ بالکل بے لاگ ہے..... وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے نور! اس کی محبت میں اتنی گہرائی ہے کہ کبھی کبھی میں ڈر جاتی ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو جب تم دونوں کے رشتے کی بات ختم ہوئی تو وہ کئی دن اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ اب کافی عرصہ گزر چکا ہے، وہ گھر والوں پر ظاہر تو کچھ نہیں کرتا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں کئی موقعے ایسے آئے جب اچھی جگہ اس کا رشتہ ہوسکتا تھا مگر وہ انکار کردیتا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں نور.....''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید خدیجہ منتظر تھی کہ نور ہنکارا بھرے گی مگر وہ چپ رہی۔ خدیجہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''نور! ہم بچپن سے ایک دوسرے کے رازداں تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ مار بھی اکٹھے کھاتے اور ہمیں پیار بھی اکٹھا ہی ملتا تھا۔ میں اسے مذاق میں اخروٹ کہا کرتی تھی۔ جب وہ غصہ کرتا تو میں کہتی، ذوالقرنین! میں تمہاری تعریف کررہی ہوں۔ اخروٹ اوپر سے سخت لیکن اندر سے کتنا نرم ہوتا ہے۔ وہ کہتا کہ پھر تم خرمانی ہو، اوپر سے نرم لیکن اندر سے سخت۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں نور۔ وہ جتنا سنجیدہ اور کم گو ہے، اندر سے اتنا ہی خوش مزاج ہے۔ وہ تمہیں بہت پیار دے سکتا ہے نور..... تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ وقتی جذبہ نہیں ہوگا۔ اس میں اتنی پائیداری ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم میری بات سن رہی ہو نا؟''

نور ذرا توقف سے بولی۔ ''میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتی..... صرف یہی گزارش ہے کہ..... آپ..... اپنے وعدے پر قائم رہیے گا..... میرا مطلب ہے..... آپ جو کہنا چاہتی تھیں آپ نے کہہ دیا..... اور میں نے سن لیا۔ اب اگر ہم..... کبھی کوئی بات چیت کریں گے تو اس میں یہ موضوع نہیں آئے گا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ سناٹا سا رہا پھر خدیجہ کی بوجھل آواز ابھری۔ ''ٹھیک ہے نور! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لیکن تم اس بارے میں ایک بار سوچنا ضرور۔''

رسمی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ابھی وہ ریسیور رکھ ہی رہی تھی کہ تائی جان آ گئیں۔ آج کل ان کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔ اب بھی ان کی پیشانی پر ہلکا سا بل موجود تھا۔ بولیں۔ ''کس سے بات کررہی تھیں؟''

''خدیجہ تھیں۔ ان کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔''

تائی بولیں۔ ''دیکھو اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ خدیجہ، اسی ذوالقرنین کی بہن ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔''

''آپ اس بارے میں بے فکر رہیں تائی امی۔ اب بھی میں نے فون نہیں کیا تھا۔ مہرین نے حال چال پوچھنے کے لیے کال ملائی تھی۔''

تائی جان نے نور کی جانب پُرسوچ انداز میں دیکھا پھر اس کے قریب ہوگئیں۔ نرم لہجے میں بولیں۔ ''دوپہر کو جب تم سو رہی تھیں تو تمہاری کوچ میڈم فرحانہ کا فون بھی آیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

نور خاموش بیٹھی رہی۔

تائی راحت نے دلار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔ ''نور! کئی کاموں میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ ہم کتنی بھی کوشش کرلیں وہ کام ہو نہیں پاتے۔ تم نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے کھیل کے میدان میں۔ کوئی کسر اٹھا نہیں

رکھی۔ تمہارے تایا ابا نے بھی اپنی حیثیت اور ہمت سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ذرا دوسرے انداز میں سوچنا چاہیے۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تین چار سال کا ایک دور ہوتا ہے جس میں ان کا گھر بس جانا چاہیے، ورنہ مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔''

''آپ..... کیا کہنا چاہتی ہیں تائی امی؟'' نور ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''تم ہمیں بہت پیاری ہو نور..... جس طرح یہ مہرین کا گھر ہے اسی طرح تمہارا بھی ہے لیکن ایک دن تو مہرین کو بھی جانا ہی ہے نا۔ میرا مشورہ ہے نور کہ اب تم گھر گرہستی کے بارے میں سوچو، ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہے تم میں۔ اچھے سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔''

نور نے تائی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا تایا ابا نے یہ کہا ہے؟''

''انہوں نے کہا تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ رات دن تمہاری بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہارے اباجی کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ تمہارے کاموں میں تمہارے والد کی مرضی شامل ہو۔ اسی میں خیر ہے اور اسی میں دین و دنیا کی بھلائی بھی ہے۔''

''میں نے تو ہر طرح کوشش کر کے دیکھی ہے تائی امی۔ ان کی ناراضگی وقتی طور پر کچھ کم تو ہو جاتی ہے مگر دور نہیں ہوتی۔''

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولیں۔ ''اور اس کی وجہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہو جب تک تم یہ بھاگ دوڑ والا کام چھوڑ دو گی نہیں، ان کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوگا۔ میرا تو مشورہ یہی ہے نور! اب تم میڈم فرحانہ سے صاف صاف بات کر لو۔ انہیں بتا دو کہ تم کلب میں نہیں آؤ گی۔ سیانے کہتے ہیں کہ باپ کی بددعا نہیں لینی چاہیے۔ وہ بڑی سخت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کسی ایسی ہی سختی کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔ پلیز نور..... پلیز۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا اور التجائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے دیوار کو گھورتی رہی۔ تائی راحت کچھ دیر انتظار کرتی رہیں پھر جز بز سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

نور نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر ڈھے سی گئی..... ''میں کیا کروں میرے خدا ..... کس طرف جاؤں؟'' وہ دل ہی دل میں پکاری۔

پتا نہیں کیوں جب وہ رنگ سے پیچھے ہٹنے کا سوچتی تھی اور ابا جان کی نصیحتوں کے سامنے سر جھکانے کا سوچتی تھی تو اس کے سامنے ایک دیوار سی کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ کیسی دیوار تھی؟ کیا یہ انا کی دیوار تھی؟ کیا یہ اس عزم کی دیوار تھی کہ اس نے کچھ بن کر دکھانا ہے اور تایا ابا کا سر لوگوں کے سامنے جھکنے نہیں دینا؟ کیا اس دیوار کی تعمیر اس کے اندر کے جنون سے ہوئی تھی، وہ جنون جو سو میٹر کے ٹریک سے وابستہ تھا؟

اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ابا جان اپنے نظریات پر بالکل درست ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی ناراضگی بھی بجا ہے اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ ابا جان اس سے راضی ہو جائیں۔ اس کا مقصد ہرگز بھی ان کے نظریات و خیالات سے ٹکرانا نہیں تھا مگر وہ اپنے اندازِ زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ بہت دیر سوچتی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدلنے لگے، ذہن تھک سا گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سوتے جاگتے کی درمیانی کیفیت میں تھی۔ اس نے تصور میں دیکھا۔ اسے دلہن بنایا گیا ہے۔ بھاری بھرکم چمکیلے کپڑے، زیورات، چوڑیاں، نیکلس، ناک میں نتھلی، چہرے پر میک اپ کی تہ۔ وہ سکڑی سمٹی بیٹھی ہے..... جس طرح اس کے گاؤں موراں والی کی لڑکیاں دلہن بن کر بیٹھتی تھیں۔ ایک ہیولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کا دلہا ہے، شاید ذوالقرنین ہے۔ ہاں ذوالقرنین ہی ہے۔ وہ اسے دبوچتا ہے، مسہری پر گراتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چاپر (برچھا) ہے۔ وہ کہتا ہے..... چلو ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم اس جھگڑے کو ختم کرتے ہیں جو ہماری ازدواجی زندگی میں زہر گھول سکتا ہے۔ وہ بے دردی سے چاپر چلاتا ہے اور نور کے دونوں پاؤں ٹخنوں کے پاس سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ لرزتے ہوئے سفید پاؤں کمرے کے گلابی قالین پر پڑے ہیں۔

نور جیسے تڑپ کر اپنے تصور سے باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، اپنی گردن کو بھگویا اور باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک دیوار پر فلورنس کی تصویر آویزاں تھی۔ امریکا کی وہی فلورنس جس نے 10.49 سیکنڈ کا عالمی ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اس تصویر میں وہ برق کی رفتار سے فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہزاروں نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی، پھر ایک گہری لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر پھر تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ دور کہیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر کسی گیت کے

بول گونج رہے تھے۔ گر گر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے..... جل جائیں مگر آگ پہ چلتے ہی رہیں گے۔

وہ ذرا جھک گئی اور اپنے گھٹنے کا جائزہ لینے کے لیے آہستہ آہستہ ٹانگ کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ دن کا اجالا اور رات کا اندھیرا ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے..... گھڑی کی سوئیاں متحرک رہیں..... اسی طرح چار ماہ گزر گئے۔ نور ابھی تک تایا ابا کے گھر میں تھی۔ تائی راحت کے رویے میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر تایا ابا بدستور اس کے ساتھ جم کر کھڑے تھے۔ وہ ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے۔ انہوں نے کبھی اسے رنگ سے دور جانے کا مشورہ نہیں دیا..... ہاں کسی وقت اتنا ضرور کہتے کہ وہ دیگر معاملات پر بھی توجہ دے اور اپنے والد سے اپنا فاصلہ گھٹانے کی کوشش کرے۔ وہ جیسے، نور سے خفا ہونا یا اس کی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔

دو ڈھائی ماہ کے مکمل آرام کے بعد نور ایک بار پھر رننگ میں حصہ لینا شروع کر چکی تھی۔ اب گھٹنا اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ وہ اپنی پہلی فارم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پہلے والی فارم حاصل ہو تو جائے گی مگر آسانی سے نہیں۔ وہ اب گاہے بگاہے ٹریننگ سینٹر (ایف اے ایس) بھی جاتی تھی۔ تایا ابا اسے چھوڑ کر آتے تھے اور واپس بھی لاتے تھے۔ وہ کسی عذر کو اس معمول کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے..... بسمہ کو تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ کئی جگہ جیتی بھی تھی۔ ابا جان کی غیر موجودگی میں دونوں بہنیں آپس میں مل بھی لیتی تھیں..... اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتی تھیں۔

خدیجہ یا اس کے بھائی ذوالقرنین کے ساتھ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ایک بار نور کا دل چاہا کہ وہ کم از کم فون کر لے اور خدیجہ کی خیریت دریافت کرے مگر پھر وہ فون کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ ایسے موقعوں پر عجیب سی کشمکش اس کے اندر نمودار ہو جاتی تھی۔

اور پھر ایک دن نور کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس واقعے نے اسے اپنے والد سے کچھ اور دور کر دیا ہے۔ نور چھت پر بیٹھی پیپرز کی تیاری کر رہی تھی کہ تائی راحت اس کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کا انداز دیکھ کر ہی نور کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''نور! تمہیں کچھ پتا چلا ہے اشفاق کے بارے میں؟''

''کیوں، کیا ہوا ہے ابا جان کو؟'' وہ چونک گئی۔

''وہ شادی کر رہے ہیں..... میرا مطلب ہے، نکاح کر رہے ہیں۔''

وہ کتنی دیر سناٹے میں رہی..... پھر بہ مشکل بولی۔

''آپ سے کس نے کہا ہے؟''

''کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ایک دو روز میں ہونے والا ہے۔ کوئی بیوہ عورت ہے۔ بچے وغیرہ بھی نہیں ہے۔ امام مسجد صاحب کی کوئی عزیزہ ہے۔ انہوں نے ہی بات طے کرائی ہے۔''

''مگر..... وہ.....'' نور کچھ بول نہ سکی۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تائی راحت نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا عجیب تو لگتا ہے مگر شرعی طور پر اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ تمہاری امی کے انتقال کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ڈھائی تین سال بیماری کے بھی کاٹے۔ شاید اشفاق کو دکھ سکھ کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ تم بہنوں نے تو بیاہ کر اپنے گھروں کو چلے جانا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ توقف سے بولی۔

''شاید اسی لیے ابا جان کو ہمیں بیاہ دینے کی جلدی تھی۔''

''نہیں نور! ہر بات کو منفی انداز میں نہیں لیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے تمہارے رشتے کی بات چلانے میں بہت جلدی کی..... اور شاید وہ لڑکا تمہارے جوڑ کا بھی نہیں تھا مگر نیت تو ان کی ٹھیک ہی رہی ہوگی۔ وہ دراصل تمہاری مصروفیات سے بھی ڈرے ہوئے تھے اور..... دیکھا جائے تو ان مصروفیات نے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں دیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر.....'' پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ غالباً انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس موقعے پر یہ نیا موضوع چھیڑنا مناسب نہیں۔

انہوں نے نور کو بتایا کہ وہ خود بھی اس خاتون سے ملی ہیں۔ ملنسار اور اچھے مزاج کی لگتی ہیں۔ تم تینوں بہنوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ تمہارے بارے میں تو پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتی ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ کسی اخبار میں تمہاری تصویر بھی دیکھی تھی۔

تائی راحت باتیں کر رہی تھیں اور نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے عجیب سی شرمساری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے والد دوسری شادی کر رہے تھے۔

یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ آیا اور گزر گیا۔ ابا جان چند افراد کے ساتھ گئے اور زلفت نامی اس خاتون کے ساتھ نکاح کر کے اسے گھر لے آئے۔ پھپھو حاجرہ کے علاوہ تایا ابا بھی بوجھل دل کے ساتھ اس مختصر تقریب میں شریک ہوئے۔ ماموؤں نے شرکت نہیں کی۔ نور بھی اس وقت شریک ہوئی جب اس کی نئی امی گھر آ چکی تھیں۔ چھریرے جسم کی دراز قد کشمیری خاتون تھیں۔ عمر 35 اور 40 کے درمیان رہی ہوگی۔ اپنی اس ''نئی والدہ'' سے مل کر نور کو اتنا برا نہیں لگا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بیگم زلفت نے اسے پیار کیا، اپنے پاس بٹھایا اور محبت آمیز باتیں کرتی رہیں۔ پھر بھی کوشش کے باوجود نور زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مرحومہ والدہ جنہوں نے ساری عمر ابا جان کی جھڑکیاں سہی ہیں، کہیں آس پاس ہی موجود ہیں اور نم آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

دو ڈھائی سال بعد یہ پہلا موقع تھا جب ابا جان نے اس کے سر پر پیار دیا اور نارمل انداز میں چند باتیں بھی کیں مگر نور جانتی تھی کہ یہ عارضی تبدیلی ہے۔ ابا جان کے اندر جو ناراضی جڑ پکڑ چکی ہے وہ اپنی جگہ قائم ہے۔ ایک عجیب سی دیوار حائل تھی باپ اور بیٹی کے درمیان۔

''میں مانتی ہوں ابا جان آپ اپنی جگہ بالکل درست ہیں..... شاید میں ہی غلط ہوں..... مگر..... مگر یہ کیسی جنگ میرے اندر ہوتی رہتی ہے۔ مجھے جو بھی صلاحیتیں ملی ہیں وہ بھی تو اللہ کی طرف سے تحفہ ہے میرے لیے۔ میں نے تو کبھی کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہا۔ ہمیشہ اللہ کی نیک بندی اور آپ کی فرماں بردار بیٹی بن کر رہنا چاہا..... معلوم نہیں قدرت کو مجھ سے کیا کام لینا ہے..... میرے پیارے ابا جان..... بس مجھے زندگی میں اس ایک لمحے کا انتظار ہے۔ جب میں آپ کے سامنے سرخ رو ہو جاؤں گی۔''

اس دن گھر آ کر نور دیر تک روئی۔ اس کا رونا آنسوؤں کی صورت میں نہیں ہوتا تھا، بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہتے تھے۔ دل میں ایک دھواں سا بھر جاتا تھا اور یہ دھواں آنکھوں تک آ کر شدید جلن میں بدلتا رہتا تھا۔

وہ تکیے میں چہرہ گھسا کر جیسے خیالوں ہی خیالوں میں بہ زبان خاموشی اپنے ابا جان سے مخاطب ہوتی..... ابو! میں تیسری تھی نا۔ اُن چاہی تھی نا..... آپ نے ہمیشہ مجھے خود سے کچھ فاصلے پر رکھا لیکن میں تو آپ کے بہت قریب تھی۔ ہر وقت آپ کی بانہوں میں سمائے رہنا چاہتی تھی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنا چاہی۔ بچپن سے ہی اس کھوج میں رہتی تھی کہ میری کوئی بات آپ کو بھا جائے، آپ آپی بتول اور بسمہ سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھیں۔ جب آپ نہیں دیکھتے تھے تو میں اور سہارے ڈھونڈتی تھی، شاید تایا جان کی مہربان آغوش میں بھی آپ کی محبت ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ میری یہ حسرت میرے ساتھ ہی جوان ہوتی رہی ہے ابو! آپ کو کیا پتا میں نے آپ کی توجہ پانے کے لیے کیا کیا جتن کیے لیکن میرا ہر جتن مجھے آپ سے دور ہی لے گیا۔ میں چاہت کی نگاہ کو ترستی تھی لیکن آپ نے تو کبھی مجھ پر رحم کی نگاہ بھی نہ ڈالی۔

وہ دیر تک اسی انداز میں سسکتی رہی پھر سو گئی۔

اس کی نئی امی زلفت نے دو تین ہفتے میں ہی گھر میں اپنی جگہ بنا لی۔ وہ نور اور بتول سمیت ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ نور کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کے اور ابا جان کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک روز وہ نور کو زبردستی گھر لے گئیں۔ وہ شام تک وہاں رہی پھر ایک دن جب تایا ابا کی طبیعت کچھ ناساز تھی، وہ ان کی عیادت کے لیے آ گئیں۔ ابا جان بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ کوشش کرتی رہیں کہ نور کے ابا جان، نور سے بھی بات کریں اور ان دونوں کے درمیان جو ایک دیوار سی کھڑی ہو چکی ہے، وہ مسمار ہو۔ اس دن پہلی بار نور نے خود پر جبر کر کے ان کو ''چھوٹی امی'' بھی کہا۔

ایک روز جب تایا جان اپنے کام کے سلسلے میں گجرات گئے ہوئے تھے اور مہرین کالج میں تھی، چھوٹی امی ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اکیلے میں نور کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''نور! اس بات میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس تمہاری طرف سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے اور یہ انہیں ہر وقت دکھی رکھتی ہے۔''

''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ٹھیس پہنچنے میں میرا قصور ہے؟ کیا آپ جانتی ہیں کہ جس وقت میرے رشتے کی بات چلائی گئی اس وقت میری عمر کیا تھی؟''

''مجھے سب پتا ہے بٹیا جی! اور میں مانتی ہوں کہ اس معاملے میں ان سے ذرا جلدی ہوئی ہے مگر اب تو ان باتوں کو لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔''

''لمبا عرصہ گزر چکا ہے پر مجھے معلوم ہے کہ ابا جان کے دل سے نکلا کچھ نہیں۔ وہ آج بھی یہی کہیں گے کہ میں موٹی سی چادر اوڑھ کر اور گھونگٹ نکال کر گھر میں بیٹھ جاؤں اور چپ چاپ اسی جگہ شادی کر لوں جہاں وہ کہتے تھے۔''

''اس جگہ شادی والی بات تو میں بھی نہیں مانتی.....

لیکن نور! جہاں تک کھیل والی بات ہے..... شاید اب تم بھی محسوس کرتی ہوگی کہ..... یہ سفر اب کافی لمبا ہوگیا ہے۔ تم نے ماشاء اللہ کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس معاملے پر پھر غور کرو۔''

نور نے ذرا بے رخی سے کہا۔ ''چھوٹی امی! اگر آپ مجھے یہی سب کچھ سمجھانے آئی ہیں تو پلیز..... نہ سمجھائیں۔ آخر ایک دن تو مجھے کھیل چھوڑنا ہی ہے لیکن کب چھوڑوں گی، اس کا فیصلہ میں نے خود کرنا ہے۔''

''اچھا..... تم اپنے اندازے کے مطابق کوئی ٹائم بتادو کہ کب تک یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا؟ میں تمہارے ابو کو مطمئن کرلوں گی۔''

''اگر انہوں نے اس شرط پر مطمئن ہونا ہے تو بے شک نہ ہوں۔'' وہ جھلا کر بولی۔ شاید اٹھ ہی کھڑی ہوتی مگر چھوٹی امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پچکارنے لگیں پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور سر چوما، بولیں۔

''میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ تمہیں بھی اسی طرح تمہارے ابا جان سے باتیں کرتے دیکھوں جس طرح بتول اور بسمہ کرتی ہیں۔ اللہ وہ دن جلدی لائے۔''

وہ اس سے بڑی بہن بتول اور اس کے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور بتانے لگیں کہ کس طرح وہ بتول کے شوہر غیاث کو راہ راست پر لانے کی کوشش کررہی ہیں۔ انہوں نے نور کی دادی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ ذرا سخت مزاج تو ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی نور کو پھر سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نور اور مہرین بازار گئیں۔ کچھ شاپنگ کرنا تھی، سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ شاہراہ قائداعظم کے ایک ریستوران میں جاکر سوپ پینے لگیں۔ دو نوعمر لڑکیوں نے نور کو پہچان لیا اور اس سے آٹوگراف لینے لگیں۔ پرجوش افراد کی ایک ریلی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور کتبے لہرا رہے تھے۔ نور دیکھ کر چونکی، ریلی میں سب سے آگے ذوالقرنین نظر آرہا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی دھول میں اٹی ہوئی تھی اور بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

وہ بلند بھاری آواز میں پکارا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا؟''

نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ غالباً اسی تنظیم اصلاح معاشرے کی ریلی تھی۔ کتبے اور بینرز کچھ اس قسم کے تھے..... فحاشی و عریانی نامنظور۔ امریکیوں، یہودیوں کے ایجنڈے نہیں چلیں گے۔

تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ریلی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی اور اس کے عقب میں رینگتی ہوئی ٹریفک دکھائی دینے لگی۔ مہرین نے کہا۔ ''بھئی! یہ تو وہی ہے خدیجہ کا بھائی..... اس وقت تو پورا پورا لیڈر لگ رہا تھا۔''

''چلو پورا پورا لیڈر ہو یا آدھا آدھا، ہمیں کیا۔'' وہ سوپ کا چمچ لیتے ہوئے بولی۔

''ہمیں ہے نا بھئی۔ ریلی تو گزر گئی مگر ٹریفک پھنس گئی۔ ابھی ہم نکلیں گے تو کچھ نہ کچھ بھگتنا پڑے گا۔''

''بھگت لیں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر چند لمحے توقف کرکے کہا۔ ''خدیجہ سے تو بات نہیں ہوئی دوبارہ؟''

''تم نے ہی روک دیا تھا، میرا تو دل چاہ رہا تھا۔''

''دراصل دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ ایک عجیب سی انسیت محسوس ہوتی ہے ان سے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ گلاب کے ساتھ کانٹا بھی ہو تو گلاب کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''لیکن کانٹا بھی تو گلاب کا بھائی ہی ہے نا۔ ویسے ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا کانٹا بھی نہ ہو۔ جب تک بندے کو پرکھا نہ جائے اس کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھو نا..... وہ جو اسپورٹس صحافی فرہاد تھا شکل سے کیسا لگتا تھا، مگر نکلا کیا؟''

اس موضوع نے نور کو بدمزہ کردیا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

مہرین بولی۔ ''لگتا ہے کہ فرہاد کے ذکر نے تمہارا منہ کڑوا کردیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز منگواتے ہیں۔'' اس نے ویٹر کو بلایا۔

نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ٹریفک رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ جن دو کم سن لڑکیوں نے نور سے آٹوگراف لیے تھے، وہ دور ایک کرسی پر بیٹھی اشتیاق سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے بڑی اہم تھی۔ شاید ایک اسٹار کی حیثیت رکھتی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹار کن کالے بادلوں کی زد میں ہے۔ پتا نہیں کیوں اب کبھی کبھی مایوسی بھی اس پر طاری ہونے لگتی تھی۔ محنت اور مسلسل محنت مگر وہ صلہ کہیں نہیں تھا جس کی وہ آرزومند تھی۔ پھر تایا ابا کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ نور کی ایک ہار کے موقع پر انہوں نے کہا تھا..... خدا کے گھر میں دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں۔

اس شام جب وہ بازار سے گھر پہنچیں تو ٹی وی آن تھا۔ ان دنوں پی ٹی وی کے علاوہ بس دو چار چینلز ہی اور ہوتے تھے جن میں سی این این اور این ٹی ایم وغیرہ کے

علاوہ ایک اسپورٹ چینل بھی تھا۔ وہاں ایک نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا..... ''مسٹر فرہاد کا تعلق اسپورٹس نیوز کے شعبے سے ہے۔ وہ ایک بڑے میگزین کے اسپورٹس انچارج ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی ایک ویڈیو کلپ چلایا گیا جس میں ایک اسٹریچر کو تیزی سے کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل کیا جارہا تھا۔ نیم بے ہوش فرہاد صاف پہچانا جارہا تھا۔ اس کے سر، دونوں بازوؤں اور ایک پاؤں پر پٹیاں تھیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''میاں بیوی کے درمیان خلع کے کیس کی خبر دو دن پہلے آئی تھی۔ ایتھلیٹ شاہینہ کے والد کی طرف سے فرہاد پر کیس کیے جانے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن آج جو واقعہ ہوا وہ زیادہ غیر متوقع ہے۔ شاہینہ کے بھائیوں کی طرف سے فرہاد کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ گاڑی پر سوار جیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی روک کر اسے اور اس کے وکیل دوست کو باہر گھسیٹا گیا اور فرہاد کو سڑک پر لٹا کر بے دریغ مارا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے ہیں۔ اس سے گاڑی بھی چھین لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہنڈا گاڑی بھی اسے سسرال کی طرف سے ہی ملی ہوئی تھی اور بیوی کے نام رجسٹرڈ تھی۔''

نور اور مہرین حیرت میں گم یہ سب کچھ سنتی رہیں۔ آج ہی ان کی گفتگو میں فرہاد کا ذکر آیا تھا اور آج ہی یہ خبر سننے میں آگئی تھی۔ رات تک اس بارے میں مزید تفصیل کا پتا بھی مختلف ذریعوں سے چلا۔ معلوم ہوا کہ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی شاہینہ اور فرہاد میں اختلافات شروع ہوگئے تھے۔ فرہاد کی نگاہ سراسر شاہینہ کے والد کے روپے پیسے پر تھی۔ اس کے علاوہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ کئی بار کی تنبیہ اور وارننگ کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بالآخر نتیجہ خلع کے مطالبے، دیگر کیسز اور فرہاد کی شدید درگت کی صورت میں نکلا۔

کمرے میں بند نور دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے کافی عرصے بعد بالآخر اس کے نہایت شدید اور توہین آمیز دکھ کا مداوا ہوگیا ہے۔ فرہاد نے جس طرح اسے اپنے کھیل کا حصہ بنایا اور مطلب نکلنے کے بعد منہ پھیرا، وہ سب نور کے لیے ایک کربناک تجربہ تھا اور یہی کربناکی تھی جس نے اسے اپنے کیریئر کے نہایت اہم دور میں ایک حوصلہ شکن شکست سے دوچار کیا تھا۔

ایک بار پھر تایا ابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے..... اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ہاں یہاں بھی شاید دیر تو ہوئی تھی مگر مکافات کا قانون حرکت میں آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہوکر تکیے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگی..... کیا اس کی مسلسل محنت، جانفشانی اور غیر مشروط کمٹ منٹ کے حوالے سے بھی کوئی قانون قدرت حرکت میں آئے گا؟ اسے اور اس کے تایا ابا کو کوئی صلہ ملے گا؟

اگلے روز تایا ابا سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے کہیں اخبار میں یہ خبر دیکھی تھی۔ بولے۔ ''نور! تمہیں پتا چلا ہے اس فرہاد کے بارے میں؟''

نور نے اثبات میں جواب دیا اور ٹی وی کی نیوز کا ذکر کیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''بندے کی اصلیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لڑکے نے کلینک کے سلسلے میں مجھے بہت دھوکا دیا۔ پچیس تیس ہزار روپیہ بھی لے گیا مگر زیادہ تکلیف اس ذہنی پریشانی کی ہے جو اس کی وجہ سے ہوئی۔''

نور اب تایا ابا کو کیا بتاتی کہ وہ جس دھوکے کا ذکر کررہے ہیں وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو اس شخص نے خود اسے دیا تھا، اپنے مطلب کے لیے اسے کھلونا بنا ڈالا تھا۔ تایا ابا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر موضوع بدلا۔ ''تمہیں پتا ہے، امنالے کا میلا آنے والا ہے؟''

''کب؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

انہوں نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور حساب لگا کر بولے۔ ''بس تین ہفتے رہ گئے ہیں تقریباً۔ میں تو کہتا ہوں پروگرام بنالو۔ پچھلی دفعہ بھی اچھا وقت گزرا تھا تم لوگوں کا۔''

امنالے کا ذکر ہی ایسا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادوں کو ہانک کر دل و دماغ کے باڑے میں لے آتا تھا۔ یادوں کے اس احاطے میں سرپا کی سنہری دھوپ ہوتی تھی، ڈھول کی تھاپ، گھوڑوں کے رقص، جھولے، تماشے، پکوانوں کی مہک، کشتیاں، کبڈیاں، رنگین آنچل، دلنشیں گیت..... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

نور تناؤ اور پژمردگی کے عجیب دور سے گزر رہی تھی (اس کی نوکری کی بنیاد ایتھلیٹکس پر تھی اور کسی وقت یہ نوکری بھی خطرے میں محسوس ہوتی تھی)۔ امنالے کے نام پر اس کا دل دھڑکا اور سینے میں امنگ سی جاگی۔ اس نے کہا۔ ''تایا ابا! دل تو چاہتا ہے لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس تم پروگرام بناؤ، سب

ٹھیک ہوجائے گا۔''

''دادی اماں بھی کچھ بیمار ہیں۔'' نور نے کہا۔

''تو ان کے علاج کی بات ہی تو کررہا ہوں میں..... دیکھنا میلے پر جانے کے لیے وہ کیسے بستر سے اٹھتی ہیں اور تیاری کرتی ہیں۔''

پتا نہیں کیوں نومبر دسمبر کے مہینے ہمیشہ سے نور کے لیے کچھ اداسی لے کر آتے تھے۔ سردی بڑھ جاتی تھی۔ شامیں چھوٹی ہوجاتی تھیں۔ لوگ دیر تک کمروں میں بند رہتے تھے، کہرا مناظر کو ڈھانپتا تھا اور درخت بے لباس نظر آتے تھے۔ آج کل بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کررہی تھی۔ کئی دن سے آسمان پر بن بارش کے بادل تھے۔ سورج شکل نہیں دکھا رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آج اسے پریکٹس کے لیے جانا تھا مگر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کمبل اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا وا کیا۔ باہر باغیچے میں حسین بودے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کیاریوں میں گیندے اور چائنا روز کے پھول بھی جیسے سردی سے سکڑے سمٹے تھے۔ اسے وہ منظر یاد آگیا جو دو دن پہلے اس نے اور مہرین نے شاہراہ قائداعظم کے ریستوران میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا جلوس جو نعرے لگاتا اور کتبے لہراتا کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس میں سے سب آگے وہ تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا مکا فضا میں لہراتا اور نعرہ بلند کرتا تھا..... پاکستان کا مطلب کیا؟ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سچائی تھی جو اپنے موقف کے حوالے سے اس کے اندر موجود تھی۔ اپنی تمام تر سخت گیری کے باوجود وہ کھرا شخص دکھائی دیتا تھا..... اور اس کی بہن خدیجہ نے کہا تھا کہ وہ اندر سے اخروٹ کے مغز کی طرح نرم ہے۔ یہ ایک بہن کے تاثرات ایک بھائی کے بارے میں تھے اور ابھی تایا ابا نے کہا تھا..... حقیقت کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی انسان سے مستقل طور پر واسطہ پڑتا ہے۔

خدیجہ کی کہی ہوئی باتیں نور کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلی اور آخری بار کہے گی اور واقعی تب سے اب تک اس نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی بلکہ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اب تک ان کی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے کہا تھا..... نور، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ کوئی عارضی یا سطحی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے..... تمہارے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

نور نے ایک آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ خدیجہ کی باتوں کے حوالے سے وہ کبھی کبھی بے چین سی ہوجاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی واقعی اس کا انتظار کررہا ہے۔ اس کی آس لگائے بیٹھا ہے، اس کی نسبت سے کسی انہونی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

وہ کیوں کررہا تھا ایسا؟ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا؟ نور کو اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ جیسے اندر سے جھنجلا سی گئی۔ وہ کیوں یہ بات سمجھ نہیں جاتا کہ نور کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور مختلف سوچوں کے انسان ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے..... اور انہیں ملنا بھی نہیں چاہیے۔

پتا نہیں کیوں نور کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اس سے بات کرے..... ٹیلی فون پر ہی سہی مگر اس سے رابطہ کرے۔ اسے سمجھائے کہ وہ کسی انہونی کی آس نہ لگائے۔ جو وہ سوچ رہا ہے کبھی نہیں ہوگا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن جلد از جلد اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ان کا دل نہ دکھائے۔

یہ عصر کا وقت تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ امنالے کے میلے پر جانے کی تیاری ہورہی تھی۔ اسے بھی اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے اپنی کالونی کی مارکیٹ تک جانا تھا۔ اس نے گرم شال لی۔ اونی ٹوپی پہنی اور شولڈر بیگ لے کر قریبی مارکیٹ کو چل پڑی۔ اس کے پاس ذوالقرنین کی دکان کا نمبر موجود تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس وقت وہ دکان پر ہی ہوگا۔

وہ ایک پی سی او باکس کے اندر چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس نے تہیہ کررکھا تھا کہ وہ ٹھوس بے لچک لہجے میں وہ سب کچھ کہہ دے گی جو اس نے سوچ رکھا ہے اور بات کو مزید طول دیے بغیر فون بند کردے گی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنا شروع ہوئی پھر فون اٹھایا گیا۔ اردو بازار کا شور کانوں میں گونجا، تب ذوالقرنین کی بھاری مگر ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ ''ہیلو..... ہیلو..... کون؟''

پتا نہیں یہ کیسے لمحے تھے۔ نور کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ وہ جو نہایت روکھے پھیکے لہجے میں ذوالقرنین کی مکمل حوصلہ شکنی کا ارادہ رکھتی تھی، ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد آواز دوبارہ ابھری۔

''ہیلو، کون بول رہا ہے؟ کس سے بات کرنی ہے؟''

نور نے ایک بار پھر کوشش کی مگر گلے میں پھندا سا تھا۔ کبھی نہ گھبرانے والی اور شدید ترین تناؤ میں بھی خود کو یکسو رکھنے والی نور منتشر سی ہوگئی تھی۔ اس نے ریسیور کو مضبوطی سے تھاما۔ کچھ کہنے کے لیے [illegible] مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دم ریسیور [illegible] دیا گیا۔

وہ قریباً ایک منٹ تک وہاں گم صم کھڑی رہی پھر باہر نکل آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں ابھی تک ہلچل تھی۔ وہ یونہی گارمنٹس کی ایک دکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور شوکیس میں جھانکنے لگی۔ اس نے اپنے دل کو سخت کرنا چاہا۔ شعوری طور پر ذوالقرنین کی وہ ساری باتیں یاد کیں جو اسے بری لگتی تھیں۔ اس کا Tipical لباس، اس کا بے لچک لب ولہجہ، اس کی گھنی بھویں جنہیں وہ غصے کے وقت اچکاتا تھا اور اس کا وہ رویہ جو خواتین کو کھیل کے میدان اور اس طرح کی دیگر مصروفیات سے دور رکھنے کے حوالے سے تھا۔

وہ ایک بار پھر پی سی او کے کیبن کی طرف بڑھی۔ ایک خاتون اپنی بات ختم کرکے باہر نکل رہی تھی۔ نور اندر چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا، اس نے ریسیور اٹھایا۔ اچھی طرح کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ دل ایک بار پھر شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے ہمت کرکے ڈائل پر انگلی رکھی..... لیکن..... آدھا نمبر ڈائل کرنے کے بعد ہی ایک بار پھر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ وہ بے خوف لڑکی تھی اور دل کی بات کہہ دیا کرتی تھی لیکن آج پتا نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

ذوالقرنین اپنی شاپ پر گم صم بیٹھا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اسے ایک فون کال آئی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کئی بار ہیلو کہا تھا مگر جواب ندارد تھا بس سانسوں کی آواز آتی رہی تھی۔ تب اس نے دوبارہ پوچھا تھا کہ کون بول رہا ہے۔ آواز اس مرتبہ بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں کسی کلائی کے بینگل ٹکرانے کی مدھم صدا ضرور ابھری تھی اور فون بند کردیا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ فون کسی اور کی طرف سے نہیں، نوریا اس کی تایازاد بہن مہرین کی طرف سے تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ نور کی طرف سے ہوگا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ اگر وہ نور ہی تھی تو کیا کہنا چاہتی تھی؟ ذوالقرنین کے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ خدیجہ کالج گئی ہوئی ہے۔ وہاں فیئر ویل کی ایک تقریب تھی۔ وہ جب بھی کسی ایسی تقریب میں جاتی تھی، ذوالقرنین کو تشویش ہونے لگتی تھی۔ چند مہینے پہلے ایک ایسی تقریب میں ہی تو خدیجہ کا بازو ٹوٹا تھا اور چوٹیں لگی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ نشو بجلی یا اس کے گروپ کی طرف سے کم از کم اب تک تو کوئی [illegible] نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ذوالقرنین کو ایسے موقعوں پر [illegible] جاتا تھا۔ اس نے گھر فون کیا۔ والدہ نے بتایا [illegible] وہ ذرا بے چینی سے دکان کے اندر ہی ٹہلنے لگا۔ [illegible] فون کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری طرف خدیجہ ہی تھی [illegible] بولا۔

''واپسی میں دیر لگانی ہو تو کسی طرح [illegible] تمہیں معلوم ہے تمہارا بھائی پنجوں پر کھڑا ہو کر تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہے۔''

''سوری۔ بس رش کی وجہ سے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔ تم نے فون کیا تھا؟''

''ہاں، تمہاری واپسی کا پوچھنا تھا..... اور ایک دوسری بات بھی کرنا تھی۔''

''دوسری بات؟ کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی؟'' اس نے حسبِ عادت چھیڑا۔

''دیکھی تو نہیں سنی ہے..... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ نور ہی تھی۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''کیا مطلب..... کوئی..... فون آیا تھا؟''

''ہاں، آیا تو فون ہی تھا مگر دوسری طرف سے صرف سانسوں کی آواز ہی آتی رہی۔''

''اور سانسوں کی آواز سے جناب کو پتا چل گیا کہ وہ نور تھی؟''

''ہاں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فون اس مارکیٹ سے کیا گیا تھا جس کے پاس انکل اشفاق کی رہائش ہے۔ اب تم پوچھو گی کہ یہ نتیجہ میں نے کیسے نکالا؟''

''بالکل۔ بات تو پوچھنے والی ہے۔''

''مارکیٹ کی جامع مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں وہاں کے مؤذن عبید اللہ صاحب کو اور ان کی اذان کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہاں کئی بار جمعہ بھی پڑھا ہے، کیا سمجھیں؟'' ذوالقرنین معنی خیز لہجے میں بولا۔

''تمہیں تو سی آئی ڈی میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔'' خدیجہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے نا کہ وہ نور ہی ہو۔''

''میرا اندازہ تو یہی ہے کہ وہ نور یا مہرین میں سے کوئی

ایک تھی۔ باقی واللہ علم بالصواب۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ ''خدیجہ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ایک بار اور اس سے مل لو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔''

''نہیں ذوالقرنین، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس حوالے سے پہلی اور آخری بار اس سے بات کر رہی ہوں۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتی ہوں..... اور..... ویسے بھی ذوالقرنین! سیانے کہتے ہیں کہ محبت کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے، بغیر شرط کے..... بغیر کسی بندھن کے..... اگر وہ واقعی محبت ہوگی تو کسی نہ کسی طور آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ ہم نے اس سے جو بھی کہنا ہے کہہ دیا ہے۔ اب انگریزی کے محاورے کے مطابق گیند اس کی کورٹ میں ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فون پر اس نوع کی مزید گفتگو مناسب نہیں تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے خدیجہ نے کہا۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟'' ذوالقرنین نے بتایا کہ گیارہ ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کچھ یاد آیا تمہیں؟ آٹھ دس دن بعد امنالے کا میلا آنے والا ہے۔ پچھلے سال نور کے ابا جی نے تمہیں میلا دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اس بار ہو آؤ وہاں سے..... ہوسکتا ہے کہ کوئی اچھی بات ہو جائے۔''

''میرے خیال میں تو یہ بے کار کی باتیں ہیں.....'' شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر لائن میں شور اور کھڑکھڑاہٹ شروع ہوگئی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ دل میں ایک بے قراری سی تھی۔ اگر وہ واقعی نور یا مہرین کی کال تھی تو ہوسکتا تھا کہ دوبارہ کال آئی کل یا پرسوں..... یا ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد۔ اس نے سیاہ رنگ کے فون سیٹ کا ریسیور اچھی طرح کریڈل پر جمایا اور جیسے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کیوں اسے بھول نہیں پاتا؟ کیوں ہر گھڑی اس کا انتظار رہتا ہے؟ وہ کوئی عاشق مزاج کا لجیٹ لڑکا تو نہیں تھا..... وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔ اس کے گھرانے کی پہچان تھی۔ لوگ ان کی نجابت کی مثالیں دیتے تھے اور جو کچھ ہوا اس میں ذوالقرنین کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ نور اس کی سوچوں اور نظروں میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ اس کے والدین نے اسے ذوالقرنین کے لیے پسند کیا تھا۔ نور اس کو دکھائی گئی تھی۔ اس کی باتیں اسے بتائی گئی تھیں۔ ذوالقرنین کے دل میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی اور جب جھکی جھکی نگاہوں والے خاموش طبع ذوالقرنین کے دل میں اس کی جگہ بن گئی تھی تو سب الٹ پلٹ ہوگیا تھا اور اب وہ بے پناہ کوشش کے باوجود اس کی سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ بے شک وہ اس کے مزاج کی نہیں تھی، بے شک اس کی مصروفیات ذوالقرنین کو پسند نہیں تھیں لیکن وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت ایسی ہی بے دلیل اور منہ زور ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے اور اپنے اصول ضابطے خود مقرر کرتی ہے۔

ایک گاہک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ''بیٹا ذوالقرنین! سیرت امام زین العابدین ہوگی آپ کے پاس؟'' یہ ایک قریبی مدرسے کے استاد تھے اور ذوالقرنین کے پرانے کسٹمر۔

''جی سر! ایک کاپی موجود ہے۔ اوپر پڑی ہے، میں دیکھتا ہوں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور سیڑھی چڑھ کر دکان کے بالائی حصے کی طرف گیا۔ ابھی وہ پانچ چھ سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ وہ بڑا باتحمل نوجوان تھا مگر گھنٹی کا بجنا اور نور کا خیال ذہن میں آنا اتنا ہی ہیجان خیز تھا کہ وہ جلدی سے پلٹا۔ شلوار کے پائنچے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ چار پانچ زینوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے سر پر ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی اور ناک سے خون رسنے لگا۔ کہنیوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے قریبی کلینک میں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور تسلی دی۔ اس کی ایک آنکھ خون کی طرح سرخ ہوگئی تھی۔ پیشانی پر پٹی بندھوا کر اور انجکشن وغیرہ لگوا کر وہ دوبارہ دکان پر آ گیا۔

اردگرد کے دکاندار حال احوال پوچھنے کے لیے جمع ہوگئے۔ ایک نے کہا۔ ''یار! تم تو ہمارے بازار کے سب سے رکھ رکھاؤ والے دکاندار ہو، دکان میں دو سیلز مین موجود تھے پھر خود کیوں سیڑھی چڑھ گئے اور اگر چڑھ ہی گئے تھے تو پھر چھلانگ کیوں لگا دی؟''

دوسرے نے کہا۔ ''کوئی ضروری فون آ گیا تھا۔ جناب پلٹے تو گر گئے۔''

ایک بے تکلف ہمسائے نے کہا۔ ''کوئی اور ہوتا تو اس بات کا بھی بتنگڑ بناتا کہ ایسا کون سا ضروری فون تھا مگر بھئی، تم پر شک کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی میاں مٹھو پر شک کیا جائے کہ وہ رات کو مرغ کی طرح اذان دیتا ہے۔''

دوست ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے اور وہ اپنے اندر ہی اندر بے پناہ خجل ہو رہا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں بتایا گیا

تھا۔ اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے ایک پڑوسی دکاندار کو ساتھ لیا اور اپنی ایف ایکس خود ہی ڈرائیو کر کے گھر چلا گیا۔

..... اگلے روز رات کو اسے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ تسلی کے لیے سی ٹی اسکین وغیرہ بھی کرالیا گیا۔ اوکے رپورٹ ملی۔ ڈاکٹر نے کہا دو تین دن تک بخار چلے گا..... اگلے روز بخار نسبتاً کم تھا مگر غنودگی بدستور تھی۔ رات کو ذوالقرنین کے کمرے میں خدیجہ تیمارداری کے لیے موجود تھی۔ رات گئے بخار کی مدہوشی میں ذوالقرنین نے دو تین بار کچھ کہا۔ خدیجہ نے اٹھ کر سنا۔ اس کا بھائی بہت مدھم آواز میں دلفگار لہجے میں ''نور'' کا نام لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے نور سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب کبھی اس سے اپنے بھائی کے حوالے سے بات نہیں کرے گی اور وعدہ ایفا کرنا خدیجہ کی خو تھی لیکن وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ مہرین کو فون کرتی اور اسے ذوالقرنین کی چوٹ کے بارے میں بتاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مہرین رات کو دیر تک جاگتی ہے۔ اس کو فون کرنے کے لیے وہ فون سیٹ کے پاس آن بیٹھی۔ دل و دماغ میں کشمکش سی تھی۔ کافی دیر تک فون کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کے بعد وہ نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ کچھ باتوں کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

نور کمرے میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ نئی ملازمہ ابھی ابھی کمرے میں صفائی کر کے گئی تھی۔ چاندی نام تھا۔ بہ مشکل پچیس چھبیس سال کی رہی ہوگی۔ قبول صورت تھی لیکن بڑی بجھی بجھی اور ڈری ڈری سی۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا، تھوڑا سا لنگڑاتی بھی تھی۔ کل تائی امی نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر پچپن سال سے زیادہ عمر کا ہے اور اس کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔

تائی امی کمرے میں آئیں تو نور نے پوچھا کہ یہ کیوں اس کی مار کھاتی ہے؟

تائی بولیں۔ ''دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں۔ راجن پور کے آس پاس۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔''

''وہ کیوں؟''

''کوئی لمبا چکر تھا۔ اس کے بھتیجے نے کسی لڑکی کو بھگایا تھا۔ لڑکی والوں نے پنچایت بلائی۔ ایسی پنچایتوں میں بڑے بڑے منحوس فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ملزم لڑکے کی بہن کی شادی لڑکی کے باپ سے کر دی جائے لیکن دوسری پارٹی نہیں مانی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی مشکل سے چودہ پندرہ سال کی۔''

''تو پھر؟''

''پھر ملزم پارٹی نے آفر کی کہ ہم لڑکے کی چھوٹی پھوپی چاندی کا رشتہ دے دیتے ہیں۔ چاندی بھی اچھی شکل کی تھی مگر اس کو پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اس بار مدعی پارٹی نہیں مانی۔ انہوں نے کہا ہمیں کنواری کے بدلے کنواری چاہیے۔ اندازہ لگاؤ ان لوگوں کی جاہلیت کا۔ مرد عورت کا رشتہ کتنا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ اسے بدلے کی آگ سے گھناؤنا اور مکروہ بنا دیتے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' نور نے پوچھا۔

''وہی سودے بازی۔ معتبر لوگوں کے بیچ میں پڑنے سے مدعی پارٹی چاندی کے رشتے پر مان تو گئی مگر ساتھ میں دو بھینسوں اور نقد رقم کی صورت میں بہت سا جرمانہ بھی وصول کیا۔ اب یہ بے چاری اپنے سے دوگنا عمر کے شوہر کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ وہ پکا جواری ہے، بہت کچھ ہار چکا ہے۔ اب گھر میں پڑا اینٹھتا ہے۔ یہ بے چاری گھروں میں کام کرتی ہے۔''

''یعنی اپنے بھتیجے کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے؟''

''بالکل۔ ایسی کہانیاں ہمارے دیہاتوں اور گوٹھوں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں نور..... کنواری کے بدلے کنواری۔ بیاہتا کے بدلے بیاہتا۔ یا ایک کنواری کے بدلے دو بیاہتا..... سن کر اور دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم پتھر کے زمانے میں بستے ہیں اور ہم پر جنگل کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔''

''ایسا قانون جس میں مردوں کے کیے ہوئے کی سزائیں بھی صرف عورتوں کو ہی ملتی ہیں۔'' نور نے تائیدی انداز میں کہا۔

''بالکل..... اب یہی چاندی والا معاملہ ہی دیکھو۔ اس کا کیا قصور تھا؟ یہ بیٹھی بٹھائی اس گھیرے میں آ گئی۔ لڑکے کی پھپھو کی حیثیت سے اسے قربانی دینا پڑی۔ اچھی صورت کی تھی، جوان تھی، بھگائے جانے والی لڑکی کا کوئی جوان بھائی یا چچا وغیرہ ہوتا تو اس کے پلے باندھ دی جاتی۔ کوئی ایسا نہیں تھا اس لیے لڑکی کے کھوسٹ باپ نے یہ جرمانہ وصول کیا اور اسے اپنے گھر ڈال لیا۔''

نور آہ بھر کر رہ گئی۔

اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نور نے دیکھا، یہ فون انہی چھوٹی لڑکیوں کی طرف سے تھا جن سے ایک دن ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے ایتھلیٹکس کے حوالے سے ہی بات کرنا تھی۔ آج کل نور کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرے یا اس بارے میں سوچے۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی۔ تیسری بار بیل ہوئی تو نور نے کال ریسیو کرلی۔ بچیوں کی والدہ بول رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے نور نے خوش خلقی سے بات کی۔

بچیوں کی والدہ صباحت بولی۔ ''نور! تم میری بچیوں کی آئیڈیل ہو۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی لے رہی ہیں رننگ میں۔ اس حوالے سے میں تم سے دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی کہیں۔''

''میں ایک بڑی بہن کی طرح تم سے آزادانہ بات کرسکتی ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی ایک دینی رجحان والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کیا طریقہ ہوسکتا ہے نور کہ بچیاں پُروقار طریقے سے اور اپنے حجاب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی صحت مند تفریحات میں حصہ لے سکیں؟''

''یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے صباحت صاحبہ لیکن جو کچھ میری ادنیٰ سمجھ میں آیا تھا، وہ میں نے ایک اخباری انٹرویو میں بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ آپ.....''

''ہاں۔ وہ انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔'' صباحت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہاری کچھ باتیں ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ اس میں تم نے ایک لباس کا آئیڈیا بھی پیش کیا تھا جو لڑکیاں اور خواتین رننگ کے وقت پہن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے نور، خواتین کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جنہیں کسی بھی طرح نمایاں نہیں ہونا چاہیے اور مردوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔''

''جی ہاں۔ اس لباس میں، میں نے یہی چیز مدنظر رکھی تھی۔ بہت سی نئی لڑکیوں نے اسے اپنایا ہے اور مفید پایا ہے۔''

''نیکر کے بجائے غالباً ٹراؤزر قسم کی چیز تھی۔'' صباحت نے کہا۔

''ہاں لیکن زیادہ کھلا ٹراؤزر نہیں اور کپڑا بھی ہلکا پھلکا لچکدار اور ملائم ہو۔ جو سامنے سے ہوا کی مزاحمت نہ کرے۔ لباس کا اوپر کولہوں سے نیچے تک جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے بھی آپ کے جسم کے ساتھ رہتا ہے، سامنے کی طرف دو ایک جگہ ہلکی پھلکی پیکنگ ہے جو باڈی کی شیپ کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہیں گی تو میں آپ کو انٹرویو کی فوٹو اسٹیٹ بھجوادوں گی۔ تفصیل سے دیکھ لیجیے گا.....'' اب وہ پیچھا چھڑانے کے موڈ میں تھی۔

بہتر ہوا کہ دوسری طرف کوئی بچہ رونے چلانے لگا اور صباحت نے کہا۔ ''اچھا نور! چھوٹا بیٹا رو رہا ہے، پھر بات کریں گے۔''

نور کو یہ ساری گفتگو بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے، سہ پہر اور شام کے درمیان ایک کمزوری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

نور کمرے میں بیٹھی تھی۔ مہرین لپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ''مبارک ہو بھئی۔ کوئی مٹھائی وغیرہ ہونی چاہیے۔'' نور کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے لگا جیسے شاید اس کے حوالے سے کوئی اچھی خبر ہے۔ واپڈا والی نوکری خطرے میں دیکھ کر اس نے دو تین اور جگہوں پر ٹرائل دے رکھے تھے۔ اس نے سمجھا شاید کہیں سے کوئی لیٹر آیا ہے مگر مہرین کی مبارک دوسرے حوالے سے تھی، اس نے کہا۔ ''آل پنجاب تقریری مقابلے میں گولڈ میڈل حیا ہے بسمہ نے..... تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہوئی؟''

بسمہ کی کامیابی کا سن کر نور کا دل بلیوں اچھل گیا، مہرین کہہ رہی تھی۔ ''مجھے تو دوپہر ایک بجے ہی پتا چل گیا تھا، میں نے سمجھا تم تک بھی خبر پہنچ چکی ہوگی۔''

خوشی کے اس موقع پر نور کو اپنے سینے میں کچوکا سا محسوس ہوا۔ شام ہونے کو آئی تھی اور وہ ابھی تک اپنی بہن کی اتنی اہم کامیابی سے بے خبر تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی، ابا جان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، ان کے سبب دونوں گھروں میں اطلاعات کا تبادلہ کم ہی ہوتا تھا۔ ابا جان نے ابھی تک ٹیلی فون بھی نہیں لگوایا تھا۔

ابھی نور اور مہرین باتیں ہی کررہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف بسمہ تھی، کسی پی سی او سے بات کررہی تھی۔ ''نور! میں نے گولڈ میڈل جیت لیا۔'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

''ہاں..... مجھے ابھی پتا چلا ہے مہرین سے۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' وہ بولی۔

نور کے لہجے میں اداسی کی جھلک کو بسمہ نے فوراً نوٹ کیا۔ بولی۔ ''ویری سوری نور! میں تمہیں دوپہر کو ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی مگر ابا جان اور چھوٹی امی ساتھ تھیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو تمہارا فون نہیں آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ فائنل آج نہیں ہوگا۔''

''بس اب جلدی سے گھر آجاؤ۔ اکٹھے ''سیلیبریٹ'' کریں گے، آپی بتول بھی آئی ہوئی ہے۔''

''ابا جان کا موڈ کیسا ہے؟'' نور نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ نہ بھی ہو تو چھوٹی امی ہیں نا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نور اور مہرین کو بلالو۔''

اسی دوران میں رابطہ منقطع ہوگیا۔ بہرحال ضروری بات ہوگئی تھی۔ نور کو امید تھی کہ ابھی پھپھو یا چھوٹی امی میں سے کوئی آئے گا اور نور کو اپنے ساتھ لے جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رات گزر گئی، اگلا روز بھی گزر گیا۔ اگلے روز شام کو تایا ابا گھر آئے تو انہوں نے نور کو بتایا۔ ''بھئی آج دعوت پر چلنا ہے۔''

''کہاں؟'' نور نے پوچھا۔

''تمہارے گھر اور کہاں؟ بسمہ کی کامیابی پر تمہارے ابا جان نے کافی بڑا فنکشن کر ڈالا ہے۔ پاس کے سارے رشتے دار آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے جہاں بسمہ کے رشتے کی بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی آئیں گے۔''

''ہمیں تو کسی نے نہیں بتایا۔'' مہرین نے کہا۔

''چلو اب میں جو بتا رہا ہوں، تیار ہوجاؤ۔ نو بجے تک پہنچنا ہے۔''

نور کو سینے میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ ابا جان کی طرف سے بسمہ کی کامیابی پر خوشی کا یہ غیر معمولی اظہار اسے دکھانے کے لیے بھی ہے۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتے ہوں اور تایا ابا کو بھی بتانا چاہتے ہوں کہ یہ ہوتی ہے کامیابی اور یوں ملتا ہے والدین کی فرمانبرداری کا صلہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ نور اپنی بہن کی کامیابی پر خوش نہیں تھی۔ اس کی کامیابی کا سن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائی سے خوشی کے سوتے پھوٹے تھے مگر ابا جان اور دیگر اہلِ خانہ کے رویّے نے اسے تھوڑا سا افسردہ کیا تھا۔

تقریب میں کافی مہمان تھے۔ بسمہ کے ہونے والے سسرالی بھی آئے تھے۔ باقاعدہ کیک کاٹا گیا اور بسمہ کی کامیابی کو سیلیبریٹ کیا گیا۔ بسمہ کے متوقع سسرالیوں سے ابھی تک نور کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک انکل نے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بیٹی کون ہے؟''

دادی نے کہا۔ ''چھوٹی پوتی ہے میری۔ پچھلی دفعہ کہیں گئی ہوئی تھی، آپ سے نہیں ملی ہوگی۔''

''اچھا یہ وہی ہیں جو ریس وغیرہ میں بھی حصہ لیتی ہیں۔'' انکل نے اپنی نیم سفید ریش میں انگلیاں چلا کر ذرا چبھتے لہجے میں کہا۔

''ایک مرتبہ..... شاید گر بھی گئی تھیں، تصویریں وغیرہ آئی تھیں۔'' ایک لڑکی بے ساختہ بول اٹھی۔

تایا ابا نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو بس گرنا یاد رہ گیا، کچھ اور یاد نہیں آیا۔ یہ صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں کئی بار وکٹری اسٹینڈ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا کمرا ایوارڈز اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے.....''

بسمہ کے ہونے والے دیور نے کہا۔ ''دراصل انکل! کرکٹ کا کھیل باقی سب کھیلوں کو کھا گیا ہے، ان بے چارے ہاکی والوں کو ہی دیکھ لیں۔ قومی ٹیم میں آکر ریٹائرڈ بھی ہوجاتے ہیں لیکن ہم انہیں شکلوں سے نہیں پہچانتے۔ کچھ کے تو نام بھی معلوم نہیں ہوتے اور جب ہاکی جیسے قومی کھیل کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا پوچھنا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' تایا ابا نے دفاع کیا۔ ''بے شک کرکٹ بہت حاوی ہوچکی ہے مگر دیگر کھیلوں کے پرستار بھی موجود ہیں۔''

''چلیں جی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ ویسے بھی لڑکی والوں سے ہمارا بحث کرنا تو بنتا ہی نہیں ہے۔'' بسمہ کے ہونے والے سسر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

نور کو یہاں بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی، وہ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کا اٹھنا ہی بہتر تھا کیونکہ ابا جان کو بھی اس کی موجودگی زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے نئے رشتے داروں سے اسے اور اس کے شوق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

وہ دیر تک بسمہ کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں کھانا کھائے بغیر ہی واپس تایا ابا کے گھر آگئی۔

تایا ابا کو ساری صورتِ حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بے شک بسمہ نے اہم کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کو جس طرح سیلیبریٹ کیا گیا تھا، اس میں ایک طرح کی مسابقت بھی شامل تھی۔ تایا ابا کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ اشفاق نے اس گیٹ ٹوگیدر کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اور ان لوگوں کو بالکل آخر وقت میں اطلاع دی تھی۔ اس کا جواب دینے کا موقع بھی تایا ابا کو جلد ہی مل گیا۔

مہرین فزیوتھراپی کے دوسرے سال میں تھی، اس نے فزیوتھراپی میں نئے رجحانات اور اسپورٹس میں ان کے

اطلاق کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلینڈ کے ایک اچھے میڈیکل میگزین میں بھی شائع ہوا اور اسے طبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ انگلش جریدے کی طرف سے مہرین کو معقول معاوضہ اور تعریفی... سرٹیفکیٹ بھی موصول ہوا۔ تایا خلیل نے بھی نامعقول اشفاق کو جواب دینے کے لیے فوراً ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ یہ تقریب بھی گھر میں ہوئی اور اس میں کافی مہمان شریک ہوئے۔ اپنی دونوں بہنوں کی کامیابی پر نور دل کی گہرائی سے خوش تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ دونوں تقاریب اس کے لیے بوجھل ثابت ہوئیں۔ اس نے خود کو بالکل سائڈ لائن پر محسوس کیا۔ اب کبھی کبھی اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید اس نے واقعی اپنے لیے ایک غلط لائن منتخب کرلی تھی۔ یہ اس کا میدان ہی نہیں تھا یا پھر میدان تو تھا لیکن وہ درست طور پر اس میں داخل نہیں ہوئی تھی، جب وہ داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک بددعا تھی اور یہ بددعا کسی اور نے نہیں اس کے والد نے دی تھی۔

دو تین روز بعد جب نور ایف اے ایس میں پریکٹس کے بعد گھر واپس آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا، ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس محکماتی لیٹر میں بڑے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے نور کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا۔

اسے ہمت نہیں ہوئی کہ تایا ابا کو بتاتی تاہم اس نے مہرین کو بتادیا۔ ''یہ سراسر ناانصافی ہے۔'' مہرین نے تڑخ کر کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ اس سلسلے میں بھی نشوبکلی کا گروپ کام کررہا ہے۔''

''نہیں بھئی، ہمیں ہر معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔''

''تو پھر اور کیا وجہ ہوسکتی ہے نور! تم اب فٹ ہو، باقاعدگی سے رننگ بھی کررہی ہو۔ میڈم فرحانہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری یہی روٹین رہے تو تم دو تین ماہ میں پہلے والی فارم حاصل کرسکتی ہو۔''

وہ بے دم سی ہوکر کرسی پر بیٹھ گئی اور جوتے اتار کر دور پھینک دیے۔ بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ میں کسی اور سے نہیں اپنی قسمت سے لڑ رہی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ مہرین جواب میں کچھ کہتی تایا ابا کی آواز آئی۔ ''کہاں ہو لڑکیو! میں ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔''

نور نے جلدی سے کہا۔ ''تایا ابا کو جاب کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

مہرین نے اثبات میں سر ہلایا۔

تایا ابا کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے جو وہ درزی سے لے کر آئے تھے۔ یہ نور اور مہرین کے دو دو سوٹ تھے جو انہوں نے امنالے کے میلے پر لے کر جانے تھے۔ ایک زرق برق سوٹ تائی امی کا بھی تھا۔ وہ ہمیشہ سے خوش لباس تھیں اور دادی اماں کے طعنے ان کی خوش لباسی پر کبھی کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی (پڑھی لکھی ہونے کے باوجود) امنالے کے میلے کا شدت سے انتظار کرتی تھیں۔

تایا ابا نے کہا۔ ''پرسوں صبح سویرے روانگی ہے، جو کام نمٹانے ہیں آج نمٹالو۔ میں ذرا گاڑی کا تیل فلٹر بدلوانے جارہا ہوں۔''

وہ چلے گئے۔ نور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مہرین نے بے تکلفی سے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''باجی جان! موڈ ٹھیک کریں اپنا زندگی میں اونچ نیچ چلتی رہتی ہے کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ سب اچھا ہوجائے گا، آپ بس تیاری فرمائیں۔''

''پتا نہیں کیوں دل بجھ سا گیا ہے مہرین۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تیاری فرمائیں۔ چند دن کے لیے آب و ہوا تبدیل ہوگی، ماحول تبدیل ہوگا تو جناب کے دماغ میں جھاڑو پھرے گا اور کافی کچرا شچر انکل جائے گا۔''

وہ دیر تک نور کو قائل کرتی رہی اور آخر کافی حد تک کامیاب ہوگئی، یقیناً ابا جان بھی جارہے تھے اور یہ آس ہمیشہ نور کے دل میں موجود رہتی تھی کہ شاید ابا جان کے قریب رہنے سے کسی وقت کوئی ایسا موقع بھی مل جائے جو ان کی دوریاں ختم کردے۔ انا اور بیگانگی کی وہ بلند دیوار گر جائے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہوچکی تھی۔

اگلے روز نور اور مہرین بھی دیگر لڑکیوں کے ساتھ روانگی کی تیاری میں لگ گئیں۔ نور اور مہرین نہیں جانتی تھیں..... بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ ان کا یہ سفر کتنا تہلکہ خیز ثابت ہونے والا ہے۔ کچھ حالات ''ماحول کے ہم رنگ سانپوں'' کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں گھات لگائے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان کے اندر زہر پنپتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں..... اور آخر جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ سانپ موجود تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

امنالے کا میلا تو خوشی کا باعث ہوتا ہی تھا۔ اس کی

تیاریاں بھی خوشی و شادمانی کے زمرے میں آتی تھیں..... تیاری مکمل تھی اور اب سفر درپیش تھا۔ ایک اسٹیشن وین اور تین گاڑیاں لاہور سے گجرات کی طرف روانہ ہورہی تھیں۔ شرجیل، عثمان، مہر۔ین اور نور اسٹیشن وین میں تھے۔ ابا جان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر مہرین، بسمہ کو کھینچ تان کر اسٹیشن وین میں لے آئی تھی۔ اس نے آپی بتول کو بھی آنے کا کہا تھا مگر وہ ابا جان اور چھوٹی امی زلفت کے ساتھ ٹویوٹا گاڑی میں رہی تھیں۔ خوشی کے موقع پر نور بھی سب میں گھل مل جایا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو دوسروں میں مکس نہیں کرپارہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان چار پانچ روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا جاتا تھا۔ آخر وہ ذوالقرنین سے بات کیوں نہیں کرپائی تھی؟ کیوں اس کی غلط فہمیاں دور کرنے میں ناکام رہی تھی؟ کیا وہ واقعی غلط فہمیاں ہی تھیں؟ یہ سوال اسے اندر سے لرزا دیتا تھا۔ وہ جس شخص کو پسند ہی نہیں کرتی تھی اس سے دوٹوک بات کرنے میں کیا چیز مانع آگئی تھی؟ اسے جیسے اپنی ہی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

اس کی پژمردگی کی دوسری وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس کی ڈیپارٹمنٹل جاب ختم ہوگئی تھی اور اپنی پریکٹس وغیرہ جاری رکھنے کے لیے اس پر اضافی بوجھ پڑنے والا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے شاید وہ مستقبل میں پوری تندہی کے ساتھ رنگ پریکٹس جاری ہی نہ رکھ سکے۔ ان باتوں کے علاوہ ابا جان کا رویہ بھی اسے مسلسل ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں معافی یا رحم کی کوئی رمق اسے نظر نہیں آتی تھی۔

دادی اماں علیحدہ گاڑی میں پھپھو حاجرہ اور خالہ عریفہ کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ گاڑی ماموں مراد ڈرائیو کررہے تھے۔ دادی اماں پچھلی نشست پر تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ان کی دواؤں والا شاپر بھی ان کے سرہانے رکھا تھا اور پھپھو اس شاپر کی حفاظت پر مامور تھیں۔

سفر ہنسی خوشی کٹا۔ گجرات سے آگے پھالیہ کے نواح میں دوپہر کا کھانا ایک آب جو کے کنارے کھایا گیا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ، ہلکی ہوا میں دور تک جھومتی ہوئی فصلیں اور درختوں کے تالیاں بجاتے ہوئے پتے۔ یہ ان لوگوں کا بچھڑا ہوا ماحول تھا اور اس ماحول میں آکر وہ سب عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

موراں والی گاؤں پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہوگئی۔ میلے کے آثار گاؤں کے نواح سے ہی شروع ہوجاتے تھے۔ بہت سے شامیانے لگ چکے تھے۔ کچھ لگائے جارہے تھے۔ جھولوں کی تنصیب ہوچکی تھی۔ سرکس اور تھیٹر کی تزئین و آرائش کا کام تیزی سے جاری تھا۔ مٹھائیوں، سموسوں اور کتلموں کی جانی پہچانی خوشبو دور ہی سے ان سب کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ گاؤں میں بھی سب کو معلوم ہوگیا کہ مہرا گھرانے کے لوگ بھی پہنچ گئے ہیں۔ اہلِ دیہہ کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔

گاؤں والی رہائش گاہ تو اب مکمل طور پر فروخت ہوچکی تھی۔ ان لوگوں کا قیام اس پرانی حویلی میں تھا جو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بارشی نالے کے کنارے واقع تھی۔ دریا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حویلی تک جانے کے لیے ایک نیم پختہ رستہ بنادیا گیا تھا۔ اشفاق مہرا اور خلیل مہرا کی آمد سے پہلے ہی اس حویلی کو بالکل تیار کردیا گیا تھا۔ رنگ و روغن ہوا تھا۔ لان اور درختوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ کچن کا سامان بھرا گیا تھا اور دیگر ضروریات فراہم کی گئی تھیں۔ موراں والی سے آگے ایک زمیندار کے ڈیرے تک ٹیلیفون کی لائن آچکی تھی۔ وہاں سے آگے قریباً ایک کلومیٹر تک خلیل مہرا نے اپنے خرچے پر فون لائن کا انتظام کررکھا تھا۔ اس مرتبہ حویلی میں جنریٹر کی سہولت بھی مہیا تھی۔ مہرا فیملی کے پرانے ملازم اور ملازمائیں بھی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے حویلی میں موجود تھے اور خدمت کے لیے کمربستہ نظر آتے تھے۔

نور کے تایا ابا خلیل مہرا نے پرانے ملازم فدا حسین سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے اس دفعہ چودھری طغرل سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

فدا حسین بولا ''شاید آپ کو پتا نہیں چلا، پچھلی جمعرات چودھری صاحب کی والدہ فوت ہوگئی ہے۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے ایک ساتھ کہا۔ پھر خلیل مہرا ذرا برہمی سے بولے۔ ''فدا حسین! تم لوگوں کو کسی طرح اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔''

''جی میں نے اپنے پتر کو پھالیہ بھیجا تھا تاکہ آپ کو فون کرسکے مگر آپ کا فون ملا ہی نہیں۔ وہ خود لاہور جاکر آپ کو بتادیتا پر ہڑتال تھی۔ پہیا جام تھا..... صبح چار بجے وہ فوت ہوئی۔ پیشی (ظہر) کے بعد جنازہ بھی ہوگیا۔''

''اوہو۔ ہمیں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔'' نور کے ابا اشفاق مہرا نے کہا اور تھکاوٹ کے باوجود دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

..... کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ٹویوٹا کار پر سوار تین

کلومیٹر دور گاؤں میں داخل ہورہے تھے۔ وہ سیدھے چودھری طغرل کی حویلی میں پہنچے۔ میلے کے دنوں میں چودھری طغرل کی حویلی میں مسلسل چراغاں کیا جاتا تھا مگر اس بار صورتِ حال مختلف تھی۔

چودھری طغرل کے ملازموں نے خلیل مہرا اور مولوی اشفاق مہرا کو حویلی کی وسیع بیٹھک میں بٹھا دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چودھری طغرل اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے..... کھڑکھڑاتے ہوئے بادامی رنگ کے شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر اسی رنگ کی طرّے دار پگڑی تھی۔

خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے گلے مل کر افسوس کا اظہار کیا اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خلیل مہرا بولے۔ ''اس بات کا بھی بہت افسوس ہے کہ ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکی، ورنہ ہر صورت جنازے میں شریک ہوتے۔''

اشفاق مہرا نے کہا۔ ''آپ ہی ہمیں اطلاع کردیتے۔ چھ سات گھنٹے کا راستہ تھا، ہم پہنچ ہی جاتے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اطلاع ملی ہے۔ ابھی ہم نے ماں جی کو نہیں بتایا۔ ان کو بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وہ تو یہاں آتی ہی وڈی اماں جی سے ملنے کے لیے تھیں۔''

''چلو جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب تو دعا ہی کی جاسکتی ہے۔'' چودھری طغرل نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

مولوی اشفاق مہرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چودھری طغرل اور خلیل مہرا نے بھی اٹھا لیے۔ دعا کے بعد خلیل مہرا نے چودھری طغرل سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ''ابدال اور وارث کہاں ہیں؟''

''کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈیرے پر گئے ہیں۔'' چودھری نے مختصر جواب دیا۔

مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ وڈی اماں کی بخشش کرے اور ان کے درجے بلند کرے۔ ہماری والدہ سے ان کی دوستی بڑی گہری تھی اور کئی طرح کی اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود یہ برقرار ہی رہی۔''

چودھری طغرل نے لمبی سانس لی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، وڈی اماں نے کئی دکھ بھی سہے پر یہ دوستی نبھاتی رہیں۔ کافی احسان ہیں ان کے تم لوگوں پر۔''

چودھری طغرل کے آخری الفاظ نے دونوں بھائیوں کو چونکایا پھر خلیل مہرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک..... بے شک وہ بڑی مہربان عورت تھیں۔ سب کے لیے مہربان تھیں۔''

چودھری اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کچھ احسانوں کا تو لوگوں کو پتا ہے اور کچھ کا پتا بھی نہیں۔ بہرحال اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔''

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے کھنکھارنے اور بولنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے پہچان لیا۔ یہ چودھری طغرل کے بڑے بیٹے ابدال ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید کسی ملازم سے بات کررہا تھا اور طغرل نے کہا تھا کہ ابدال اور وارث گھر میں نہیں ہیں۔

شاید ابدال وغیرہ ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری طغرل کا رویہ بھی واضح طور پر بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس میں والدہ کی موت کا دکھ بھی شامل تھا۔ یا پھر یہ بات کہ وہ لوگ آخری رسومات میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔

حویلی واپس آکر خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے اپنی بیمار والدہ کو ان کی پرانی سہیلی وڈی اماں کی رحلت کی خبر سنائی۔ وہ کافی دیر گم صم رہیں پھر اپنی اوڑھنی سے نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ خود ان کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''ماں جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سفر کی تھکاوٹ بھی ہے۔ کل یا پرسوں کسی وقت چلے جائیں گے۔''

دو دن بعد وڈی اماں کا دسواں تھا۔ دسویں تک تو میلے کی تیاری کچھ سست رہی مگر پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور اکثر اوقات سوگ کی کیفیت میں بھی لوگ خوشی کے مواقع مکمل طور پر ضائع نہیں ہونے دیتے اور پھر وڈی اماں تو ویسے بھی پچانوے سال سے اوپر کی ہوکر گزری تھی۔ اس کے جنازے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجابی میں اسے وڈا کرنا کہتے ہیں۔ بعض برادریوں میں تو ایسے موقعوں پر باجے تک بجائے جاتے ہیں اور خیر خیرات کے علاوہ شیرینی وغیرہ بھی بانٹی جاتی ہے۔ خیر یہاں باجے تو نہیں بجائے گئے تھے مگر میٹھے چاول کی دیگیں پکی تھیں اور کچھ دیگر رسومات بھی ادا ہوئی تھیں۔

دسویں کے بعد امناں والے کا میلا پورے جوبن پر آگیا۔ وہ ساری مصروفیات اور تفریحات شروع ہوگئیں جو اس میلے کا خاصہ تھیں۔ بارشی نالے کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی منڈی لگ گئی۔ میلے کی دکانیں سجنے سنورنے لگیں۔ سرکس اور تھیٹر کی رونقوں میں اضافہ ہوگیا۔ جھولوں کی گردش بڑھ گئی..... اور پھر وہ دن آیا جب قدیم رسم کے مطابق علاقے کے لوگ اپنے اپنے ہتھیار رضاکارانہ طور پر مزار کے سامنے جمع کرادیتے تھے..... اور سات دن کے لیے قرب و جوار

میں مکمل امن و امان کی فضا قائم ہوجاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھتے تھے۔ مہرا گھرانے کی عورتیں بھی یہ رسم دیکھنے کے لیے، تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے اپنی پرانی حویلی سے گاؤں میں آگئی تھیں۔ وہ اپنے فروخت شدہ گھر کی چھت پر موجود تھیں اور مزار کے سامنے اہلِ دیہہ کی طویل قطار دیکھ رہی تھیں۔ جہازی سائز کی سات بڑی بڑی چارپائیاں تھیں جن پر ہر طرح کا لائسنسی اسلحہ ڈھیر کیا جارہا تھا۔ باوردی پولیس اہلکار موجود تھے اور اسلحہ جمع کرانے والوں کو رسید نما کوپن دے رہے تھے۔ اسلحے سے بھی کوپن منسلک کیے جارہے تھے۔

قطار میں سے ایک شخص آگے بڑھتا، اپنا ہتھیار جمع کراتا، کوپن حاصل کرتا اور پھر مزار کی طرف رخ کرکے ادب سے سلام کرتا۔ اس کے بعد الٹے قدموں پیچھے پلٹ جاتا۔ اس عمل کے مکمل ہونے تک قریباً ساتوں چارپائیاں مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے آتشیں اسلحے سے لد گئیں۔

دوسرا مرحلہ رات کو تھا۔ اس میں ناجائز اسلحہ بھی اس قدیم کوٹھڑی میں جمع ہوجانا تھا جہاں ناتک چندی اینٹوں کی دیواروں میں بے شمار خانے بنے ہوئے تھے اور تالے لگے ہوئے تھے۔

یہ رسم اور اس طرح کی ساری رسمیں اہلِ علاقہ کے دلوں میں گھر کرچکی تھیں۔ مثلاً آج ہی کے روز شام کے بعد گھروں میں ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی رسم بھی ادا ہونا تھی۔ یہ ترنجن سے ملتی جلتی تقریب تھی۔ انگیٹھیاں دہکائی جاتی تھیں، گڑ اور باداموں والا حلوا بنایا جاتا تھا۔ علامتی طور پر ایک آدھ رنگین چرخا بھی پاس رکھ لیا جاتا تھا اور سہاگنیں اور کنواریاں ملن اور جدائی کے گیت گاتی تھیں۔

بتول نے کہا۔ ''نور! آج رات تو یہیں رہیں گے۔ مزہ آئے گا۔''

نور بولی۔ ''آپی..... آپ کو پتا بھی ہے، مجھے یہ ڈھولک شولک اچھی نہیں لگتی۔''

چھوٹی امی زلفت نے کہا۔ ''تو مت ڈھولک بجانا تم۔ سن تو سکتی ہو نا۔''

''نہیں چھوٹی امی! میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابا جان کے ساتھ حویلی چلی جاؤں گی۔ صبح پھر آجاؤں گی۔''

ایک عورت نے بسمہ سے مخاطب ہوکر ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ ''بسمہ! تمہاری یہ بہن شروع سے ہی وکھرے ٹائپ کی ہے۔ اس کو تو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ جس طرح مردوں کی کبڈی ہوتی ہے، اسی طرح ہم عورتوں کی بھی کبڈی رکھ لیں۔''

سب ہنسنے لگیں..... نور کا چہرہ سرخ ہوگیا مگر اپنی ماں کی عمر کی عورت کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی..... اور بات صرف اس ایک عورت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر عورتیں اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھتی تھیں۔ خاص طور سے بڑی عمر کی عورتوں کی نگاہوں میں تو اس کے لیے واضح بیگانگی اور تلخی نظر آتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے کسی طور پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک لڑکی مردوں کی طرح بھاگ دوڑ کرے اور مقابلوں میں حصہ لے..... اور لڑکی بھی کوئی عام نہیں، مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی..... گھر کے وسیع صحن میں موجودہ مالک مکان حاجی اکرام صاحب کے بچے جھنڈیاں وغیرہ تیار کررہے تھے۔ وہ برآمدے میں سے گزری۔ ایک کمرے سے ابا جان کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ کمرے میں اکرام صاحب کے اہلِ خانہ موجود تھے اور وہ ان میں بیٹھے بسمہ کی باتیں کررہے تھے۔ اس کامیابی کا ذکر ہورہا تھا جو بسمہ کو چند دن پہلے تقریری مقابلوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ابا جان کے لب و لہجے میں ایک سرشاری سی بھر جاتی تھی۔

نور ایک طویل سانس لیتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی اور اسے عبور کرکے ڈیوڑھی کی طرف آگئی۔ یہ سب وہی در و دیوار تھے جن میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ چپے چپے پر

لوڈ شیڈنگ

ایک انگریز نے پاکستان آکر اردو سیکھی۔ جب واپس گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بولنا سیکھا تو اس نے کہا۔ ''لائٹ چلی گئی ہے۔ لائٹ آگئی ہے۔ لائٹ جانے والی ہے۔ لائٹ آنے والی ہے۔ لائٹ نہیں آئی۔ لائٹ نہیں گئی۔ لائٹ جا بھی سکتی ہے۔ لائٹ آ بھی سکتی ہے۔ لائٹ ڈم آرہی ہے۔ لائٹ تیز آرہی ہے۔ لائٹ آ کیوں نہیں رہی۔ لائٹ جا کیوں نہیں رہی۔ لائٹ ابھی تو آئی تھی لو پھر چلی گئی۔''

مرسلہ: کاشف قیوم، کراچی

یادیں نقش تھیں مگر اب یہ سب کچھ کسی اور کی ملکیت تھا۔ مہرا فیملی کی حیثیت یہاں ایک دو دن کے مہمان جیسی تھی۔ اس نے اسکارف درست کیا۔ اوڑھنی اچھی طرح لپیٹی اور باہر آ گئی۔ سامنے ہی پرالی کے ڈھیر لگے تھے اور کالی سیاہ بھینسیں کھرلی میں منہ مار رہی تھیں۔ تایا زاد عثمان گاڑی کے پاس کھڑا بچپن کے کسی ہم جولی سے گپ شپ کر رہا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ چونکا اور پاس آ گیا۔ ''کیا بات ہے نور؟''

''عثمان بھائی! طبیعت ذرا بوجھل سی ہو رہی ہے۔ پلیز مجھے حویلی چھوڑ آئیں۔''

''لیکن آج تو یہاں ڈھولک کا پروگرام تھا۔''

''نہیں بھائی۔ یہ نہ ہو بیمار پڑ جاؤں۔ آرام کرلوں گی تو کل تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''کسی دوا وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟'' عثمان نے اپنایت سے پوچھا۔ نور نے نفی میں جواب دیا۔

وہ عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور حویلی چل دی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ میلے کی رونق کے درمیان سے ہو کر گزرے۔ شامیانوں اور عارضی دکانوں کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ جگہ جگہ پنجابی میوزک بھی پلے ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ہلا گلا کر رہی تھیں۔ یکا یک وہ چونکی۔ اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ ہاں، یہ وہی تھا..... یہ وہی تھا۔ اس کے سر پر شاید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کالی گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ گاڑی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کے لیے ان دونوں کی نگاہیں بھی ملی تھیں۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی اور اس کی شکل اوجھل ہو گئی۔ شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ذوالقرنین ہی تھا۔ اس کی ایک جھلک کل شام بھی اس نے حاجی اکرام صاحب کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ مین دروازے پر کھڑا ابا جان اور تایا جان سے علیک سلیک کر رہا تھا۔ تب نور کی طرف اس کی پشت تھی۔ نور کو بس شک سا ہوا تھا کہ یہ ذوالقرنین ہے لیکن آج تو اس نے اسے صاف دیکھا تھا۔

عثمان پوری توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ نور کسی کو دیکھ کر بری طرح چونکی ہے۔ نور کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کیا عام لوگوں کی طرح صرف میلا دیکھنے آیا تھا؟ یا پھر عام لوگوں کی طرح نہیں آیا تھا؟

حویلی کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر عثمان نے نور کو ڈراپ کر دیا۔ وہ بولی۔ ''عثمان بھائی! تائی امی کو بتا دینا کہ میں یہاں آ گئی ہوں۔''

''او کے۔'' اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

ایک کمرے سے دادی اماں کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی وقت تکلیف میں ہوتی تھیں اور کسی وقت نہیں بھی ہوتی تھیں مگر عادتاً ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی پھپھو حاجرہ اور ایک ملازمہ ان کے پاس موجود تھیں اور ان کی مٹھی چاپی کر رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نور بستر پر گر گئی اور ذوالقرنین کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا وہ اکیلا تھا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا؟ یوں تو شرجیل اور عثمان کے کچھ دوست بھی لاہور سے میلا دیکھنے کے لیے آئے تھے اور ویسے بھی لاہور سے لوگ یہاں پہنچتے تھے مگر ذوالقرنین کا یہاں نظر آنا نور کے لیے اہم اور پریشان کن تھا۔ اس کے ماتھے پر کوئی چوٹ وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پھپھو یا شرجیل سے اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ خیالوں میں الجھی ہوئی وہ سو گئی۔

یوں تو لاہور میں اچھی سے اچھی چوڑیاں اور مہندی وغیرہ مل جاتی تھی مگر یہ بھی میلے کا ''کریز'' تھا کہ دوسرے دن شام کے وقت عورتیں میلے سے چوڑیاں، مہندی اور خوشبو وغیرہ خریدتی تھیں۔ مہرین اور دو ماموں زاد بہنیں نور کو بھی کھینچ کر اس شاپنگ کے لیے لے گئیں۔

نور نے ابھی تک مہرین کو بھی کل والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی مہرین نے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ یہاں ذوالقرنین کی موجودگی سے آگاہ ہے۔ لڑکیاں ایک ریڑھی والے کے پاس کھڑی گول گپے کھا رہی تھیں جب اچانک مہرین نے اس کے بازو پر چٹکی لی اور سرگوشی میں بولی۔ ''وہ دائیں طرف دیکھو..... کراکری کی دکان کے پاس۔''

نور نے اس رخ پر دیکھا اور اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ وہاں لوگوں کے درمیان ذوالقرنین کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول شلوار قمیص میں تھا اور ایک موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خدیجہ کا بھائی ہے نا یہ؟'' مہرین نے تیز سرگوشی کی۔

نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ذات شریف یہاں کیسے؟'' مہرین بولی۔

ذوالقرنین کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے شاید اپنی چوٹ چھپانے کے لیے اور گرد و غبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبی دار رومال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جس موٹر سائیکل کو

کلکس مار رہا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کی تھی جو پاس ہی کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی۔ عمر رسیدہ شخص خوش ہوگیا..... اور ذوالقرنین کے لیے غالباً شکریے کے الفاظ استعمال کیے۔

موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔ ذوالقرنین کے دونوں ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ موٹر سائیکل کے پلگ وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے اس نے اردگرد دیکھا اور پھر گول گپے والی ریڑھی کی طرف بڑھا، جہاں بالٹی میں پانی نظر آ رہا تھا اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ نور وغیرہ پر پڑی۔ درمیانی فاصلہ بیس پچیس قدم کے قریب تھا۔ پھر بھی ذوالقرنین نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ریڑھی کی طرف آتے آتے ذرا ٹھٹکا اور پھر رخ پھیر کر ایک شامیانے کی طرف بڑھ گیا جہاں چائے خانے کے باہر نلکا نظر آ رہا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ہاتھ دھوئے۔ اس عمل کے دوران میں اس نے ایک دو بار اچٹتی نظروں سے نور اور مہرین کی طرف بھی دیکھا۔

مہرین نے کہا۔ ''یہ اصلاحِ معاشرہ یہاں بھی موجود ہے۔''

''ہاں۔ مجھے بھی کل شک ہوا تھا حویلی جاتے ہوئے۔'' نور نے پوری وضاحت نہیں کی۔

''بھئی! امنالے کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی ہے۔ پر پتا نہیں یہ امنالے کی کشش ہے بھی یا نہیں۔'' مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ اب ہاتھ دھو کر سیدھا کھڑا ہوگیا تھا اور قدرے دراز قد ہونے کی وجہ سے ہجوم میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ شانے کشادہ اور سر اور ڈاڑھی کے بال ہموار تھے۔ چائے خانے والے لڑکے نے اسے ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک تولیا رومال دے دیا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ہاتھ پونچھنے لگا۔ نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں لیکن تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نور اور مہرین کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہے۔

نور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گول گپا واپس تھالی میں رکھ دیا تھا۔ چہرے پر اسکارف درست کرتے ہوئے اس نے مہرین سے سرگوشی کی۔ ''چلو چلیں۔''

''بھئی! یہ دو تین گول گپے مجھے بددعائیں دیں گے۔ انہیں تو نگل لو۔'' اس نے پورا گول گپا منہ میں ڈالنے سے پہلے کہا۔

نور تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ اسی دوران میں کہیں پاس ہی موجود سرکس کا شیر اپنے پنجرے میں دھاڑنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی دھاڑ دیکھنے اور سننے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف بھاگے۔ نور نے دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور ذوالقرنین کو بھی کھینچتا ہوا سرکس کی طرف لے گیا۔ ذوالقرنین جیسے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے دو تین بار مڑ کر نور اور مہرین کی جانب دیکھا، پھر اسے ہجوم نے چھپا لیا۔

گول گپے کھانے کے بعد گروپ کی چند لڑکیاں بھی شیروں کو دیکھنے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف چلی گئیں مگر نور دیگر لڑکیوں کے ساتھ میلے کے دوسرے حصے کی طرف روانہ ہوگئی، وہ اپ سیٹ تھی۔

☆☆☆

رات کو مہرین اور نور اپنے اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی مگر جنریٹر کا انتظام موجود تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ دھند..... جامن، مالٹے اور بیری کے ٹنڈ منڈ درختوں کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

مہرین نے کہا۔ ''میں نے پھپھو حاجرہ سے تھوڑی سی سن گن لی ہے۔ انہیں بھی پتا نہیں کہ خدیجہ کا بھائی یہاں آیا ہوا ہے۔ ہاں یہ کہہ رہی تھیں کہ لاہور سے اردو بازار کے تین چار دکاندار بھی میلاد دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟'' نور نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ خاص تمہارے لیے نہ آیا ہو۔''

''نہیں مہرین۔'' نور نے اپنی سبز جرسی کی آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو خود کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے۔''

''کیا تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا کہ پرسوں وہ ابا جان اور چچا جان سے بات کر رہا تھا؟''

''ہاں بھئی۔ یہی تھا لیکن تب مجھے صرف شک ہوا تھا۔ اگلے روز تصدیق ہوگئی۔''

دونوں خاموش ہوگئیں۔ باہر تاریکی میں کہیں کوئی رات کا پرندہ چہکارا۔ نور کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ اسے کچھ نہیں دے سکتی تھی، پھر اس کی آنکھوں میں سوال کیوں تھے؟ وہ کیوں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا برا انسان نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہو لیکن نور کے ذہن میں جیون ساتھی کا جو تصور تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھا۔

خاموشی کے وقفے کے بعد وہ دونوں پھر باتیں کرنے

لگیں۔ اس مرتبہ موضوع ابا جان کی ناراضگی تھی، جن کو لڑکیوں کا ڈھولک بجانا اور حاجی اکرام صاحب کے گھر رہنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں دادی جان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دی پھر انہوں نے لاٹھی سے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''اولڑکیو! کیا چوں چوں لگا رکھی ہے، آدھی رات ہونے والی ہے، سوجاؤ اب۔''

''اچھا دادی۔'' مہرین نے ناگواری سے کہا اور لحاف میں منہ گھسالیا۔ ''دس بجے کو آدھی رات کہہ رہی ہیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

دادی نے کمرے میں جھانکا۔ دروازے کے پاس ہی نور کے جوگر پڑے تھے۔ انہوں نے لاٹھی سے ہی انہیں ایک طرف ہٹایا۔ جیسے وہ جوگر نہ ہوں، کوئی پلید بدبودار شے ہو۔ نور پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور بگڑ کر بولیں۔ ''کہا بھی ہے کہ جلدی سوجایا کرو۔ بند کردو لائٹ۔''

''ابھی کردیتی ہوں۔ واش روم میں جانا ہے۔'' نور نے کہا۔

''بات ماننی ساری زندگی نہیں آئے گی تجھے۔ بات ماننے والی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ ساری کی ساری ماں پر ہے۔'' ان کی آواز میں زخمی کرنے والی کاٹ تھی۔ وہ باہر نکل گئیں۔

نور کا دل چاہا کہ وہ چلّا کر دادی سے کہے کہ اب تو وہ عرصے سے منوں مٹی کے نیچے سوئی ہوئی ہیں..... وہ اب تو انہیں معاف کردیں مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور ایک نہایت طویل، نہایت تلخ سا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بے طرح جلنا شروع ہوگئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکھ آمیز جھلاہٹ کے ساتھ اٹھی اور لائٹ آف کرنے کے بعد مہرین کی طرح لحاف میں منہ گھسالیا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم ابر آلود تھا۔ رات کو تھوڑے سے چھینٹے بھی پڑے تھے۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خواتین نے حلوا پوری، چنوں اور دودھ پتی کا ناشتا کیا۔ نور چکنائی والی خوراک سے ذرا دور ہی رہتی تھی۔ اس نے دو تین سلائس، انڈے اور اورنج جوس سے کام چلایا۔

ابا جان، تایا جان اور ماموں مراد صبح سویرے ہی گاڑی پر کہیں نکل گئے تھے۔ نور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہیں۔ چودھری طغرل کے گھرانے کی عورتیں بھی کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ کل چوڑیوں کی خریداری کے موقع پر ابدال کی دو بہنیں نظر آئی تھیں مگر انہوں نے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ نور اور مہرین نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید طغرل گھرانے کے ساتھ کوئی تلخ ترش بات ہوئی ہے۔ تائی امی، چھوٹی امی زلفت اور پھپھو حاجرہ وغیرہ کا بھی یہی خیال تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد مہرین اس کے سر پر سوار ہوگئی۔

''چلو بھئی چلیں۔ اس مرتبہ بڑا زبردست آسمانی جھولا آیا ہے۔ مزہ آجائے گا۔ دور دور تک سارا علاقہ نظر آئے گا۔''

''مہرین! آج نہیں۔ طبیعت بالکل بھی نہیں چاہ رہی۔''

''یار چھوڑو۔ دادی جان کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔ تمہیں تو پتا ہے وہ جیسی ہیں۔''

وہ چپ رہی۔ وہ اسے کیا بتاتی، بات صرف دادی جان ہی کی نہیں تھی، یہاں کون تھا جو اسے اپنایت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت جیسے بے مہر اجنبیوں کے حصار میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ ان گنت سوالیہ نگاہوں کی چبھن اپنے جسم پر محسوس کرتی تھی..... دیکھو اس لڑکی کو..... یہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی ہے۔ یہ بتول اور بسمہ کی بہن ہے۔ یہ اپنے بڑوں کی نافرمان ہے۔ اسے باپ نے دھتکارا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا کام کرتی ہے جو عورتوں کے لیے باعثِ ننگ ہے۔

مہرین نے اپنی انگلی سے نور کے پہلو میں کچوکا دیا۔

''کیا مایوس صورت بنائی ہوئی ہے۔ بھئی، ہم کسی چہلم میں نہیں، میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد اس میلے سے دور ہوں گے اور ہر طرح کے جھمیلے سے قریب ہوں گے۔ چلو اٹھو، میں آج تمہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔''

چھوٹی امی بھی آگئیں۔ وہ پہلی مرتبہ اس میلے میں آئی تھیں اور بہت انجوائے کررہی تھیں۔ اس میلے کی انوکھی رسموں ریتوں نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

چھوٹی امی اور مہرین کے زور دینے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ براؤن شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہری براؤن جرسی پہنی اور لمبی شال کے ساتھ اسکارف پہن کر تیار ہوگئی۔ میلے کی گہما گہمی میں اضافہ ہوچکا تھا۔ بارش کے اندیشے کے پیشِ نظر خیمہ زن لوگوں نے اپنے خیموں پر بڑے بڑے پلاسٹک منڈھ دیے تھے اور دیگر احتیاطی تدابیر کی تھیں۔ کسی قریبی میدان میں آج کشتیوں کے مقابلے بھی ہورہے تھے تاہم وہ ایونٹ شام کا تھا۔ ابھی تو لوگ دیگر تفریحات سے لطف لے رہے تھے۔ آپی بتول بسمہ اور ممانیوں سمیت مہرا فیملی کی اکثر عورتیں برقعوں میں تھیں۔ جو نہیں تھیں، انہوں نے بھی چہرے حجاب یا نقاب

میں چھپا رکھے تھے۔

اچانک نور نے محسوس کیا کہ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں..... ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر آئے..... یا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر نہ آئے؟ نہیں نہیں، وہ اسے دیکھنے کے لیے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیوں دیکھنا چاہے گی؟ وہ شاید لاشعوری طور پر چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو۔ اس کا اردگرد نظر نہ آنا ہی نور کے لیے اچھا تھا۔ ہاں اسی لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

سب لڑکیاں آسمانی جھولے پر بیٹھیں اور دو تین بار بیٹھیں، جب بلند و بالا جھولا اوپر جاتا تھا تو اردگرد کا علاقہ دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پورا موراں والی گاؤں، اس کی گلیاں، اس کے بیچ و خم اور پھر آگے سوئی منڈی، خریداروں کا ہجوم، بائیں طرف ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر بارشی نالے کا نیالا پانی اور اس پانی کے کنارے پرکھوں کی پرانی حویلی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ حویلی کے باہر کھڑی ان کی دو گاڑیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس نالے کے پار آگے تک درختوں، جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے سلسلے تھے اور اس کی دوسری جانب پولیس چوکی کی چھت خاکستری دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس چھت پر شاید پولیس والوں کی وردیاں سوکھ رہی تھیں۔ دائیں کنارے پر ایک چٹیل میدان تھا جہاں سیم تھور کی سفیدی تھی۔ اس میدان کی ایک جانب موراں والی گاؤں کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ جن میں سے کچھ پر ٹریکٹر چلائے گئے تھے اور کچھ پر کھاد، بیج اور سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں تھیں۔ دور ایک ڈیرے پر ٹیوب ویل کے پانی کی موٹی دھار چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے اردگرد بچے دوڑتے تھے اور چند عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔

جھولا ابھی رکا ہوا تھا۔ اس کی ڈولی بلندی پر تھی۔

مہرین نے کہا۔ ''اوپر سے چیزوں کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔''

''ہوں۔'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

مہرین بولی۔ ''آج تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔''

''اللہ کرے نہ ہی آئے۔''

''سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ مسکرائی۔

''جب اس طرح بات کرتی ہو تو زہر لگتی ہو۔'' وہ چڑ کر بولی۔

وہ دونوں اس ڈولی میں اکیلی تھیں۔ اچانک نور کی نگاہ دور نیچے ایک منظر پر پڑی۔ اس نے چودھری طغرل کے چوڑے چکلے بیٹے ابدال کو دیکھا۔ وہ چمکیلے شلوار کرتے اور واسکٹ میں تھا۔ کندھوں پر چودھریوں کے انداز میں تہ شدہ گرم شال ڈال رکھی تھی۔ (یہ وہی تھا جس کے لیے پہلے آپی بتول اور پھر بسمہ کا رشتہ مانگا گیا تھا) ابدال کے پاس ہی ابا جان کا پرانا ملازم خدا بخش تھا۔ کافی فاصلہ تھا، پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ ابدال بڑے سخت لہجے میں خدا بخش سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کسی طرح کی تلخ کلامی تھی، پھر دو تین بندے آگے آئے اور انہوں نے صلح صفائی کا کردار ادا کیا۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' مہرین الجھن سے بولی۔

''لگتا ہے کہ دو تین دن سے کچھ گڑبڑ ہے۔ کل ماموں مراد بھی بڑے غصے میں نظر آ رہے تھے۔''

''کہیں وہ پرانا معاملہ ہی تو پھر اٹھ کھڑا نہیں ہوا۔'' مہرین نے ذرا تشویش سے کہا۔

''یہ تو بڑے ہی بتا سکتے ہیں۔ تم جا کر ابا یا تایا جان سے پوچھنا۔''

اس منظر نے مہرین کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ اس کا تفریحی موڈ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گرم شال کو مضبوطی سے اپنے گداز شانوں پر لپیٹ کر بولی۔ ''پتا نہیں کب چلے گا جھولا؟''

''تمہیں تو بلندی اچھی لگ رہی تھی؟'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ (ویسے وہ بھی پریشان تھی)۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر سردی بھی بڑی ہے۔''

''بلندی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اردگرد کے منظر اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ بلندی صرف اتنا کرتی ہے کہ ہمیں زیادہ کچھ دکھا دیتی ہے اور تفصیل سے۔''

''اچھا زیادہ فلسفہ نہ بگھارو۔ دعا کرو کہ یہ آسمانی چرخا چل پڑے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔'' مہرین نے اپنے مرمریں ہاتھ اوورکوٹ کی جیبوں میں ٹھیرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں جنریٹر کی آواز بلند ہوئی اور جھولا حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور مینہ تواتر سے برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ جنریٹر کل سے کام نہیں کر رہا تھا۔ حویلی میں لالٹین اور گیس کیمپس روشن کر دیے گئے۔ حویلی سے تقریباً تین کلومیٹر دور موراں والی میں بھی یقیناً میلے کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ حویلی سے باہر چاروں طرف وہی خاموشی اور یکسانیت تھی جو

متواتر برستی بارش میں ماحول کا حصہ ہوتی ہے۔ سردیوں کی طویل رات سر پر تھی اور صبح بہت دور تھی۔

نور، مہرین، بسمہ اور بتول ایک ہی کمرے میں بیٹھی انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ رشتے میں ان کے ایک چچا تھے جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملتان میں رہتے تھے۔ ملتان سے میلا دیکھنے یہاں پہنچے تھے اور اچھی کوالٹی کا ملتانی سوہن حلوا بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سوہن حلوا سامنے پڑا تھا مگر لڑکیوں نے بس چکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی نے ماحول کو غنودہ سا کر رکھا تھا۔ کچن میں ملازمائیں کھانا تیار کر رہی تھیں اور پلاؤ اور پالک گوشت کی خوشبو اونچی چھتوں والے کمروں میں چکرا رہی تھی۔

نور نے چھوٹے شیشوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے سے آگے حویلی کے چوبی گیٹ کے پاس دو پہریدار حسب معمول ایک شیڈ کے نیچے لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ ان کے ہتھیار تو میلے کے آغاز میں ہی جمع ہو چکے تھے، اب وہ بس لاٹھیوں سے مسلح تھے۔

نور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابا جان اور تایا ابا ابھی تک نہیں آئے۔ اللہ خیر کرے۔''

''بارش کی وجہ سے رک گئے ہوں گے۔'' بسمہ خود کو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''انہوں نے کون سا پیدل آنا تھا۔'' بتول نے اپنی شیر خوار بچی کو چھاتی سے لگا کر اس پر اپنی گرم شال پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تائی امی نے کچھ نہیں بتایا؟'' نور نے مہرین سے پوچھا۔

''انہیں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی کہہ رہی تھیں، شاید کوئی لین دین کا جھگڑا ہے۔''

''مگر ماموں مراد تو بڑے غصے میں لگ رہے تھے اور وہ چھوٹی موٹی بات پر غصے میں نہیں آتے۔''

اسی دوران میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ''شاید ابا جان آ گئے ہیں۔'' بسمہ بولی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے ابا جان اور تایا ابا ہی تھے۔ دو ملازم چھتریاں تان کر ان کو برآمدے تک لے آئے۔ ان کی شیروانیوں پر بارش کے چھینٹے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے موڈ سخت خراب ہیں۔ لڑکیوں میں سے کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ رات کا کھانا بھی بے دلی سے کھایا گیا۔ خلافِ معمول نور کے ابا جان اور تایا ابا سمیت سب مردوں کا کھانا مردانے میں ہی بھیج دیا گیا۔

نور کافی تھکی ہوئی تھی۔ دادی اماں کی بات کی وجہ سے کل رات اسے بارہ ایک بجے تک نیند نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے مہرین نے جگا کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ جلدی سونا چاہتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوئی اور وہیں آڑی ترچھی پڑی سو گئی۔

وہ کھانسی کی وجہ سے جاگی تھی، وہ خوش خوراک ضرور تھی لیکن پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ کل دوسری لڑکیوں کے ساتھ چند گول گپے کھا کر اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، مہرین اور بسمہ بھی ایک ہی پلنگ پر ڈبل لحاف کے نیچے سوئی پڑی تھیں۔ گیس لیمپ کی روشنی کچھ مدھم ہو گئی تھی اور انگیٹھی تقریباً بجھ چکی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش کبھی آہستہ کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس نے الماری سے کھانسی کا سیرپ نکالا اور ڈیڑھ ڈھکن پیا۔ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اور ہیئر پن اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے نو ہی بجے تھے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ لحاف میں گھسنے سے پہلے وہ دروازے کو بولٹ کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اسے مدھم آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ابا جان، تایا خلیل اور ماموں مراد کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ مردانے حصے میں تھے اس لیے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس گونج سی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

نور میں تجسس تو پہلے سے ہی جاگا ہوا تھا۔ اس نے شال اوڑھی، بیٹ بستہ چپل پہنی اور باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں، چھوٹی امی زلفت، آپی بتول کی بڑی بیٹی حنا کو اپنے ساتھ لگائے لحاف کے نیچے اونگھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی سو چکے تھے۔ فقط کامن روم میں سے دادی جان کے کھانسنے اور بڑبڑانے کی صدا آ رہی تھی۔

نور دبے پاؤں چلتی نیم روشن راہداریوں سے گزری اور ایک بند دروازے کی چٹخنی بہت آہستہ سے اتار کر مردانے حصے میں آ گئی۔ آوازیں اب واضح سنائی دینے لگی تھیں مگر الفاظ اب بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بڑی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور سننے لگی۔

ابا جان کی سخت آواز ابھری..... ''میں پھر کہتا ہوں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ سویرا ہوتے ہی نکل جائیں۔''

''ایسی بھی لٹ نہیں پڑی ہوئی بھائی جان! ان کی

اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں ہم۔ مگر اندر کی بات کا تو پتا چلے کہ اچانک یہ کایا پلٹ ہوئی کیوں ہے؟'' یہ چھوٹے چچا احسان کی آواز تھی جو ایک ماہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں احسان۔'' تایا خلیل کی پاٹ دار آواز نور کے کانوں تک پہنچی۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ''سارا معاملہ چودھری طغرل کی ماں کے مرنے کے بعد خراب ہوا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دراصل چودھری طغرل اور اس کا گھرانا اپنی ضد سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں ان لوگوں کی تین نسلوں کو جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت کتے کی اس دم جیسی ہے جو سو سال حقے کی نال میں رہ کر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔''

''تو پھر وہ صلح صفائی کیا تھی۔ ان لوگوں نے تیسری پنچایت میں خود کہا تھا کہ معاملہ ختم ہوگیا ہے۔''

''نہیں احسان! معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوا۔ زہر ان کے اندر پلتا رہا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بتول کا رشتہ مانگا۔ پنچایت کا فیصلہ ہمارے حق میں آیا اور ہم نے فوراً بتول کی شادی کردی۔ اسی دوران میں ابدال کا چچا سکندر ایم پی اے بن گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی ضد کی باسی کڑی میں ابالا دیا۔ اسی کے کہنے پر ان لوگوں نے بتول کے بعد بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع کردیا۔ تم سب کو یاد ہوگا اس مرتبہ پنچایت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان دنوں حالات بڑے خراب ہوگئے تھے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید بسمہ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا۔ بہرحال اللہ نے کرم کیا۔ ایک روز ماں جی (نور کی دادی) خاموشی کے ساتھ اپنی سہیلی وڈی اماں (طغرل کی ماں) کے پاس گئیں۔ کسی زمانے میں یہ دونوں عورتیں دوپٹا بدل بہنیں بھی بنی تھیں۔ دوپٹا بدلی کی یہ رسم امناں والے کے مزار پر ہوئی تھی۔ ماں جی نے اس روز وہی تیس سال پرانا دوپٹا طغرل کی ماں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس دوپٹے کے صدقے اس کی پوتی بسمہ کو معاف کردے۔ وڈی اماں بھی اپنے زمانے کی مانی ہوئی ہٹ دھرم تھی۔ پر کچھ وسیلے ایسے ہوتے ہیں جب بندہ نرم پڑ جاتا ہے۔ پتا نہیں اس دن دونوں عورتوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہوئیں۔ آخر وڈی اماں نے وہ دوپٹا دوبارہ ہماری ماں کے سر پر رکھ دیا..... اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرے گی..... ساتھ ہی اس نے ماں جی سے یہ بھی کہا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہوجائے تو وہ اپنے بیٹوں اور پوتریوں کو لے کر یہاں سے چلی جائے.....''

تایا ابا کے اگلے ایک دو جملے نور کی سمجھ میں نہیں آئے کیونکہ بادل زور سے گرجے تھے اور در و دیوار جیسے لرز گئے تھے۔

تب تایا ابا کی آواز دوبارہ نور کے کانوں تک پہنچی..... ''خدا جانے اس عورت نے اپنے بیٹے طغرل اور پوتروں ابدال وغیرہ کو کس طرح ان کے منحوس ارادوں سے باز رکھا اور وہ کس طرح باز آئے۔ بہرحال یہ کام ہوگیا.....''

اس موقع پر چھوٹے ماموں مراد نے کچھ کہا۔ چونکہ وہ دور بیٹھے تھے اس لیے الفاظ نور کی سمجھ میں نہیں آئے۔ یہی اندازہ ہوا کہ انہوں نے کھاپریوں کی کمینگی کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔

نور کو ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اسے یہاں دروازے سے لگا دیکھ نہ لے۔ اندر ہونے والی گفتگو کے اثرات سے اس کا دل بے طرح دھڑکنا شروع ہوگیا تھا۔

اچانک احاطے کی طرف سے ایک بلند آواز نور کی سماعت تک پہنچی۔ پہلے تو وہ اسے چوکیدار کا آوازہ سمجھی لیکن پھر پتا چلا کہ یہ آواز حویلی کے باہر سے آئی ہے۔ بیٹھک کے اندر سے کسی نے کھڑکی کھولی۔ شاید آواز کا ماخذ جاننے کی کوشش کی تھی۔

نور کا پول کھل سکتا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی اور اسی طرح بلی کی چال چلتی ہوئی واپس کوریڈور میں اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اسے یوں لگا، جیسے حویلی کے پھاٹک سے باہر کئی افراد موجود ہیں اور بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی نور پر انکشاف ہوا کہ حویلی سے باہر کافی زیادہ لوگ جمع ہیں اور غالباً ان کی ٹارچوں اور لالٹینوں وغیرہ کی روشنی تھی جو بلند چاردیواری کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کردیا۔

یہ کون لوگ تھے؟

اس وقت اس خراب موسم میں یہاں کیوں آئے تھے؟

کہیں یہ؟..... کہیں یہ.....؟

وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکی۔ اس نے بے تاب ہوکر دوبارہ کھڑکی کھولی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ یہ دس بیس یا چالیس پچاس لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت زیادہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں اور قہرناک آوازوں میں للکار رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے گہرے بادلوں میں سے چاند نے ایک جھلک دکھائی اور دوبارہ اوجھل ہوگیا۔ ہوا کے یخ بستہ تھپیڑوں نے کمرے کی رہی سہی حرارت بھی ختم کردی۔

بسمہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دراز ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ویلوٹ کی گلابی قمیص بے ترتیب تھی۔ ''کیا ہوا نور؟'' اس نے ہراساں آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں۔ شاید کچھ لوگ ہیں باہر۔'' نور نے دوبارہ کھڑکی بند کردی۔ اس کا منہ خشک ہونا شروع ہوگیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب کیا ہورہا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دیگر خواتین بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نور نے دیکھا، تایا ابا احاطہ پار کرکے مین گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ ملازم خدا بخش نے ان پر چھتری کا سایہ کررکھا تھا۔ ماموں مراد، احسان اور دیگر افراد برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ نور نے ایک بار پھر کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھول دی تاکہ باہر کی آوازیں سنی جاسکیں۔ چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ، تائی راحت اور دیگر خواتین بھی اس ادھ کھلی کھڑکی کے پاس آگئیں۔ لوہے اور کھڑکی کے اس مضبوط گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ نور کے تایا ابا نے شاید یہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا مگر اسی دوران میں حویلی کا پرانا ملازم فدا حسین لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں مالک!'' وہ ہراساں آواز میں بولا۔ ''دروازہ نہ کھولیں۔ مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔''

''تو پھر؟'' تایا ابا کی آواز نور وغیرہ کے کانوں تک پہنچی۔

فدا حسین آگے بڑھا اور اس نے گیٹ میں ایک جانب موجود وہ چھوٹا سا روزن کھول دیا جس میں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔

تایا ابا اس روزن کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے باہر کسی سے مخاطب ہوکر کہا۔ جواب میں چودھری طغرل کی بلند آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو خلیل! ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں۔''

''بات کرنے کا یہ کون سا وقت اور طریقہ ہے۔'' تایا خلیل نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''یہی طریقہ ہے..... یہی طریقہ ہے۔'' ایک اور گرجدار آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً طغرل کے بڑے بیٹے ابدال کی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا، کوئی چیز گیٹ سے ٹکرائی اور ملازم فدا حسین نے لپک کر روزن کو بند کردیا۔ جونہی روزن بند ہوا گیٹ کو دھکیلا جانے لگا اور اس پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ چودھری طغرل کی للکار سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو خلیل! نہیں تو توڑ دیں گے ہم۔''

اب نور کے ابا جان، ماموں مراد اور تایا زاد بھائی شرجیل اور عثمان وغیرہ بھی بارش کی پروا کیے بغیر احاطے میں نکل آئے تھے۔ رکھوالی کے کتوں نے جیسے شدید خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور مسلسل شور مچا رہے تھے۔ حویلی کی چودہ فٹ بلند باؤنڈری وال کی دوسری جانب بیسیوں افراد کے للکارے سنائی دے رہے تھے۔

نور کے ابا جان نے ماموں مراد کو مخاطب کرکے بلند آواز میں کہا۔ ''مراد! ٹیلی فون کرو..... پولیس چوکی میں فون کرو۔''

ان کی آواز یقیناً باہر بھی سنی گئی تھی۔ باہر سے چودھری طغرل کی دہاڑ سنائی دی۔

''مولوی مہرا! خیریت چاہتا ہے تو دروازہ کھلوادے۔ ورنہ آج سارے اگلے پچھلے حساب برابر ہوجائیں گے۔ ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب نور نے دیکھا کہ ماموں مراد کامن روم کی طرف سے گھبرائے ہوئے نکلے۔ پھپھو حاجرہ نے کھڑکی میں سے پوچھا۔ ''کیا ہوا مراد؟''

وہ دانت پیس کر بولے۔ ''حرامزادوں نے فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔''

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' پھپھو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ماموں مراد جواب دیے بغیر احاطے کی طرف چلے گئے۔

اسی دوران میں حویلی کی بالائی چھت پر سے چوکیدار گل محمد پکارا۔ ''مہرا صاحب! یہ لوگ سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

تب نور اور دیگر عورتوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا..... گیٹ کے دونوں چوکیدار لاٹھیاں سونت کر باؤنڈری وال کی طرف لپکے۔ باؤنڈری وال کے بالائی

سرے پر دو انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی افراد تھے جو اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ چوکیدار نے بے دریغ ان پر لاٹھیاں برسائیں ..... دونوں ہیولے اوجھل ہوگئے۔ اب صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کھلی لڑائی کی شکل بن گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس صورتِ حال میں فائرنگ یا ہوائی فائرنگ بھی شروع ... ہوجاتی مگر حویلی میں اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا اور شاید باہر والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔

ماموں مراد، شرجیل اور عثمان وغیرہ سرتاپا آتش بن گئے تھے۔ ماموں مراد نے ملازموں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی کی ''لوردف'' پر چلے گئے۔ یہاں سے وہ کسی بھی ایسے شخص کو روک سکتے تھے جو سامنے سے بیرونی دیوار پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ باہر سے سنائی دینے والا شور وغل بڑھتا جارہا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں۔ حویلی میں مہرا فیملی کے قریباً پندرہ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ لاہور سے آنے والے سات آٹھ مہمان حویلی کے مہمان خانے میں بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حویلی کے ملازم تھے جن میں ایک مالی، اس کے دو جوان بیٹے، خانساماں اور چوکیدار وغیرہ شامل تھے۔

تین چار منٹ کے اندر اندر سب لوگوں کو صورتِ حال کی شدید سنگینی کا احساس ہوگیا۔ شرجیل کو جب پتا چلا کہ کچھ افراد دو بانسی سیڑھیاں لے کر حویلی کی عقبی دیوار کی طرف گئے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر والی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں پر اینٹیں وغیرہ برسائیں اور انہیں اوپر نہیں چڑھنے دیا۔

عورتوں کے رنگ فق ہورہے تھے۔ دادی اماں بھی آگئی تھیں اور انہیں دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑجائے گا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی تھیں۔ باہر بارش ہلکی ہوگئی تھی، تاہم گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور احاطے کے مناظر روشن ہوجاتے تھے۔ مہرین، نور اور بسمہ زینے چڑھ کر دوسری منزل پر آگئیں۔ یہاں سے منظر زیادہ وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نور کا دل بیٹھ گیا کہ اس تاریک سنسان رات میں ان کی حویلی سے باہر بپھرے ہوئے دیہاتیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور چمکیلے کوکوں والی لاٹھیاں چمک رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں پرانی طرز کی برچھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلحہ تھانے میں جمع ہوچکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی موجود ہوتا۔ ان لوگوں کی بھڑکوں اور للکاروں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں سے کئی نشے میں ہیں۔ شاید خشت باری سے ان کے کچھ ساتھی زخمی بھی ہوگئے تھے۔ وہ گندی گالیاں بک رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

نور حوصلہ مند لڑکی تھی، سکہ بند نسوانیت سے اسے زیادہ تعلق نہیں تھا مگر اس موقع پر اس کا دل بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

دوسری منزل سے وہ گفتگو واضح سنائی دینے لگی جو تایا ابا اور چودھری طغرل وغیرہ کے درمیان ہورہی تھی۔ یہ گفتگو بڑی بلند آواز میں ہورہی تھی، وجہ یہی تھی کہ چودھری طغرل گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ چودھری طغرل دہاڑ رہا تھا۔

''اوئے مہرا! دعائیں دو اس عورت کو جس کی وجہ سے اب تک بچے ہوئے تھے تم۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے تو بھی کم تھا۔'' (وہ اپنی ماں کا ذکر کررہا تھا)

نور کے تایا ابا نے کہا۔ ''تو پھر اب کیا ہوگیا ہے چودھری؟ اب کیوں کررہے ہو یہ سب کچھ؟ کیوں طوفان کھڑا کررہے ہو؟''

''اب وہ نہیں رہی۔ وہ چلی گئی ہے۔ مرگئی ہے، صبر کا گھونٹ پی کر اور اس کے ساتھ ہی وہ بات بھی ختم ہوگئی ہے۔ اب ہمیں اپنی منگ چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ہم کھا پری ہیں اور کھا پری اپنی بات دیا ہنے کے لیے سو سال تک بھی انتظار کرتے ہیں۔''

''غلط بات نہ کرو چودھری! تم چنگی طرح جانتے ہو، کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک اڑتی اڑتی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنایا اور اب تو وہ بات بھی ختم ہوچکی تھی..... سب کو پتا ہے کہ.....''

''نہیں ہوئی تھی بات ختم..... نہیں ہوئی تھی۔'' طغرل خلیل مہرا کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ ''تم مولویوں کو کیا پتا کہ ہم نے کیا کیا باتیں سنی ہیں لوگوں کی۔ کہاں کہاں ہماری پگ گری ہے اس رشتے کی وجہ سے۔ نزدلی، بے غیرتی کے طعنے سنے ہیں ہم نے۔ بس اس ماں کی وجہ سے چپ تھے.....''

طغرل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سابق ایم پی اے سکندر بولا۔ ''مولوی اشفاق! اب بھی ہم تیری بیٹی کو اٹھانے کے لیے نہیں دیا ہنے کے لیے آئے ہیں۔ شرع کے مطابق اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے نوں (بہو) بنانا ہے ہم نے۔ اپنے ان غنڈوں کو باز کر جو اینٹیں چلا رہے ہیں۔ ورنہ پھر فساد ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جو ہم نہیں چاہتے۔''

زور سے بجلی چمکی اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار دور تک روشن ہوگئے۔ نور کی نگاہوں نے ایک حیران کن منظر کی جھلک دیکھی۔ ایک سفید گھوڑی پر ایک شخص سہرا

باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد چمکیلے کپڑوں والے کچھ لوگ براتیوں کی طرح موجود تھے۔ سہرے والا شخص یقیناً ابدال ہی تھا۔ نور کے سینے میں دل جیسے ٹھہر گیا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا۔ اس نے کن انکھیوں سے بسمہ کی طرف دیکھا، وہ شاید یہ منظر نہیں دیکھ پائی تھی مگر مہرین کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے وہ جھلک دیکھی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جتنی وہ سمجھ رہے ہیں۔

''یا اللہ رحم کر۔'' نور کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اشفاق مہرا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کچھ شرم کرو چودھری۔ کیا یہ طریقہ ہوتا ہے بیٹیوں کو بیاہنے کا۔ تمہاری دھی کی برات اس طرح آئے تو کیا تمہیں قبول ہوگی؟''

''میری دھی کی برات اس طرح نہیں آئے گی مولوی اشفاق، کیونکہ میرے منہ میں زبان ہے..... کسی پلید جانور کا چمڑا نہیں۔ ہم نے کل بھی تمہیں سمجھایا تھا۔ اب یہ کام ہونا ہی ہے، تم چاہو تب بھی، نہ چاہو تب بھی۔ چنگا یہی ہے کہ دروازہ کھول دو اور کڑی کو تیار کرو۔ نکاح خواں ساتھ ہے۔ ابھی سب کچھ ہوگا، ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب دائیں طرف سے پھر کچھ افراد نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لٹھ بردار تیار تھے، وہ لپکے اور اندھا دھند لاٹھیاں برسا کر انہیں نیچے گرا دیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد گھیراؤ کرنے والوں کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے جیسے گیٹ پر ہلّا ہی بول دیا تھا۔ انگریزوں کے دور کا یہ قدیم گیٹ کسی قلعے کے دروازے جیسا تھا۔ باؤنڈری وال کی طرح اس کے اوپر بھی نوکدار آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اوپر سے بند تھا اور اسے پھاندا نہیں جاسکتا تھا۔ درجنوں افراد ایک ساتھ مل کر اسے دھکیلنے لگے اور وزنی چیزوں سے ضربیں لگانے لگے۔ یہ دہشت ناک مناظر تھے۔

ماموں مراد بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ وہ نور سمیت تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ چلو نیچے چلو۔ جب تک ہم نہ کہیں کوئی کمرے سے باہر نہ نکلے۔''

وہ انہیں لے کر نیچے آگئے۔ نیچے بھی کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آپی بتول بے ہوش ہوگئی تھیں۔ چھوٹی امی ان کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''آنکھیں کھولو، بتول! ہوش کرو۔'' پھپھو حاجرہ نے بے تاب ہوکر اسے جھنجوڑا۔

اس کی آنکھیں بند رہیں، تاہم وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔

''اب کیا ہوگا مراد۔'' تائی راحت نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا..... یہ لوگ..... بسمہ کی بات کر رہے ہیں..... بسمہ کے رشتے کی.....؟''

''میں دوں گا ان کو رشتہ، بڑی اچھی طرح دوں گا۔'' مراد پھنکارا اور پھر کچن کے اندر سے ایک بڑی چھری نکال لایا۔ ''میں آنتیں نکال دوں گا اس کنجر ابدال کی اور اس کے باپ کی۔ مار ڈالوں گا سب کو۔''

وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہوکر احاطے کی طرف بڑھا۔ عورتیں ایک ساتھ چلّائیں۔ ان کی پکار سن کر چوکیدار اور دیگر افراد مراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا ہے اور باہر نکلتے ہی ابدال کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ شرجیل بھی اس کے عقب میں تھا۔

تین چار افراد نے مراد سے لپٹ کر اسے روک لیا اور کھینچ کر واپس برآمدے میں لے گئے۔ تایا خلیل نے مراد کو بری طرح ڈانٹا۔ پھر انہوں نے نور کے ابا جان سے کہا۔ ''اشفاق! تم ان لڑکوں کو لے کر اندر چلے جاؤ۔ ہم بات کر رہے ہیں۔ اس طرح کام اور خراب ہوجائے گا۔''

چھت پر سے ہونے والی خشت باری اب رک گئی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ فی الحال باہر سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

نور نے دیکھا، تایا ابا اور مہمان خانے سے نکلنے والے دو بارعب افراد گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ گیٹ کا چھوٹا روزن کھلا ہوا تھا اور کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ بات چیت یقیناً تکرار کی شکل میں تھی لیکن آوازیں بلند نہیں تھیں۔ حویلی کے زیادہ تر مرد اور لڑکے چھت پر تھے۔ اگر باہر موجود مشتعل لوگوں میں سے کوئی باؤنڈری وال کی نوکدار سلاخیں پھلانگنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے روکنے کے لیے تیار تھے۔

چند منٹ بعد تایا جان اور ابا جان ستے ہوئے منہ سے حویلی کے اندرونی حصے میں واپس پہنچ گئے۔ ملازم خدا بخش کے ہاتھ میں ایک گول طشتری تھی۔ تانبے کی اس منقش طشتری میں قریباً ایک درجن دیے پڑے تھے۔ مٹی کے ان دیوں میں سے کچھ الٹے تھے اور کچھ سیدھے۔ خدا بخش نے دل گرفتہ انداز میں یہ طشتری میز پر رکھ دی اور بیزار سا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا ہے تایا ابا؟'' بتول نے سراسیمہ

لہجے میں پوچھا۔
تایا ابا گم صم رہے پھر خدا بخش سے بولے۔ ''تم ہی بتاؤ چاچا۔''
خدا بخش گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اس کو ''نیاں'' کی رسم کہتے ہیں جی۔ پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ نہیں بھی مانتے۔''
''یہ ہے کیا؟'' چھوٹی امی زلفت نے استفسار کیا۔
خدا بخش نے پریشان نظروں سے نور کی دادی اماں اور پھپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ دادی اماں کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ تانبے کی طشتری اور دیوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔
خدا بخش نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ ''رشتے ناتے یا پھر لین دین کے معاملے میں جب کوئی بڑا جھگڑا ہوتا ہے تو حضرت امناں والے کی رائے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھالی میں بارہ دیے رکھے جاتے ہیں اور رکھنے والا یہ کہتا ہے کہ اگر وہ حق پر ہے تو پھر دیے اس پر گواہی دیں۔ یہ دیے مزار کی ایک محراب میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ وہی سرخ محراب ہے جو مزار کی دائیں جانب پتھر کی جالی کے پاس نظر آتی ہے۔''
''محراب میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' انگلینڈ پلٹ احسان نے پوچھا۔
''یہ محراب دراصل ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں ہر وقت ہوا آتی رہتی ہے۔ شام کے بعد چلنے والی ہوا اس میں سے کچھ دیے بجھا دیتی ہے اور کچھ جلتے رہتے ہیں۔ اگر زیادہ دیے جلتے رہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیاں لینے والا حق پر ہے..... یہاں بھی چودھری طغرل نے نیاں لیا ہے اور کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔''
''یہ دیے جو اوندھے پڑے ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟'' بیگم زلفت نے پوچھا۔
''یہ وہ ہیں جو بجھ گئے تھے۔'' خدا بخش نے جواب دیا۔
نور نے اوندھے پڑے دیے گنے، وہ چار تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چار دیے بجھے تھے اور آٹھ جلتے رہے تھے۔ یہ فال ہی کی کوئی قسم تھی۔ اس کے بارے میں اور اس طرح کی کئی رسموں کے بارے میں نور نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔
شرجیل بولا۔ ''یہ تھالی بھی تو یہ خبیث ہی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا کہ کتنے جلے اور کتنے بجھے اور آپ خود ہی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نیاں شیاں کو مانتے ہی نہیں۔''
فدا حسین نے مدھم آواز میں کہا۔ ''نکاح خواں مولوی شمس بھی ساتھ ہیں۔ وہ گواہی دے رہے ہیں کہ نیاں ہوا ہے۔''
''یہ سب کیا بے ہودگی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' شرجیل تڑخ کر بولا۔ ''ایک طرف یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امن والے کا میلا ہے اور اپنے ہتھیار جمع کراتے ہیں، لڑائی جھگڑے کو بڑا گناہ سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟''
خدا بخش مری مری آواز میں بولا۔ ''اس لیے تو یہ نیاں وغیرہ کیا ہے ان لوگوں نے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس رسم کے بعد انہیں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔''
مراد نے نفرت سے ایک طرف تھوک دیا۔
شرجیل نے کہا۔ ''پرسوں ایک متولی کہہ رہا تھا، میلے پر کبھی بارش نہیں ہوئی۔ یہ مزار والے کی کرامت ہے اور شام کو جب بارش شروع ہوئی تو وہی متولی اسے رحمت کہہ رہا تھا اور خیال ظاہر کر رہا تھا کہ اس مرتبہ اوپر والے نے زائروں کے گناہ دھونے کا فیصلہ کیا ہے۔''
''بس یہ وہم اور بے کار عقیدے ایسے ہی لمبی لمبی جڑوں والے ہوتے ہیں۔'' تایا ابا نے کہا۔ ''بے شک یہ ایک اللہ والے کا مزار ہے اور وہ بلند پایہ ہستی تھے مگر ایسی پاک جگہوں پر اپنے کاروبار چمکانے والے لوگ نت نئی حکایتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔''
مراد نے غصے میں طشتری کو ہاتھ مار کر دور ہٹا دیا۔ ''میں نہیں مانتا ان فالوں شالوں کو۔ یہ لوگ بس بدمعاشی کر رہے ہیں۔ زور دکھا کر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ ہماری بیٹی کوئی گاجر مولی نہیں جو یہ اکھاڑ کر لے جائیں گے۔ ان کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا۔'' وہ ہمیشہ سے غصے والا تھا اور اس وقت اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔
مولوی اشفاق مہرا بھی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے تھوڑی دیر پہلے بڑے بھائی خلیل مہرا نے انہیں بہانے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔
خلیل مہرا نے مراد کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ''یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے، بارش ہو رہی ہے۔ نہ اس طرف کسی نے آنا ہے نہ جانا ہے۔ ہم کو یہ لوگ باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے کچھ سوچنا ہوگا۔''

مراد نے ایک بار پھر طیش بھری نظروں سے تانبے کی طشتری اور اس میں سیدھے اور اوندھے پڑے مٹی کے دیوں کو دیکھا اور بولا۔ ''لیکن میں ان بے کار رسموں کو نہیں مانتا۔ یہ لوگ بس اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ان رسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ رسم نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی..... کوئی اور فال ہوتی۔ ان لوگوں نے ہم پر چڑھائی کرنا ہی تھی۔''

عمر رسیدہ ملازم خدا بخش نے کہا۔ ''بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان رسموں کے بہت سے نقصان ہیں پر کچھ فائدے بھی تو ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر اسلحہ جمع کرانے کا رواج نہ ہوتا اور لوگ اس پر پورا یقین نہ رکھتے تو .....اب تک شاید یہاں بہت نقصان ہو گیا ہوتا.....''

''نقصان کیا، دونوں طرف سے کئی لاشیں گر گئی ہوتیں۔'' خلیل مہرا صاحب نے تائید کی۔

یہی وقت تھا جب احاطے کی طرف سے کچھ ٹوٹنے اور گرنے کی آواز آئی۔ رکھوالی کے کتوں نے شور مچایا اور مختلف آوازیں بھی سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد بوڑھا ملازم فدا حسین ہانپا ہوا اندر آیا۔ خلیل مہرا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مالک! انہوں نے رسے ڈال کر ایک طرف سے دیوار کا جنگلا گرا دیا ہے..... لگتا ہے کہ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔''

خلیل مہرا، اشفاق مہرا، مراد اور دیگر افراد احاطے کی طرف لپکے۔ نور، مہرین اور دیگر لڑکیوں نے کھڑکی سے جھانکا، صاف طور پر تو دکھائی نہیں دیا مگر اندازہ ہوا کہ بلند باؤنڈری وال کے بالائی حصے پر لگی نوکدار سلاخوں والی باڑ کا کچھ حصہ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہاں سے باڑ اکھاڑ دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹے آہنی تار کی مدد سے اس باڑ پر کمند ڈالی گئی تھی اور اس کمند کو جھٹکے دے دے کر قریباً پندرہ بیس فٹ چوڑائی کا ایک ٹکڑا نیچے گرا دیا گیا تھا۔ اب اس حصے سے باؤنڈری وال پر چڑھنا آسان ہو گیا تھا۔ بہر حال ابھی یہاں سے چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید یہ کارروائی صرف دباؤ ڈالنے کے لیے کی گئی تھی کہ اگر ان کی بات نہیں مانی گئی تو وہ ہر حد تک جائیں گے۔

گیٹ کے مختصر روزن میں سے ایک بار پھر دو طرفہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ مستطیل روزن چوڑائی میں دو فٹ کے قریب اور اونچائی میں صرف سات آٹھ انچ تھا۔ تانبے کی طشتری بھی اسی خلا سے اندر بھیجی گئی تھی۔

گیٹ پر ہونے والی گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی۔ بارش کی بوچھاڑوں ہی کی طرح کبھی لہجے مدھم اور کبھی تند و تیز ہو جاتے تھے۔ شرجیل اندر آیا تو سب عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ''کیا بات ہوئی شرجیل؟'' تائی راحت نے بیٹے سے پوچھا۔

''بس ہو رہی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

''کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ..... شاید..... کوئی اچھا مشورہ ہی دے دیں۔'' بیگم زلفت نے استفسار کیا۔ خالہ عریفہ نے بھی ساتھ دیا۔ سب کے رنگ زرد تھے۔

''وہ خبیث اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں.....'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر بسمہ کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ہلدی ہو رہی تھی۔

خالہ عریفہ بسمہ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شرجیل نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اور اس کے ہمنوا بسمہ کے حوالے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ وہ اسی وقت نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں۔ ابا جان، چچا جان اور دیگر اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم آج رات کے لیے اس معاملے کو ٹال دیا جائے اور کل پنچایت میں اس کا حل نکالا جائے لیکن یہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

باہر سے ایک دم شور بلند ہوا اور مار دھاڑ کی آوازیں آئیں۔ لڑکیاں چلا اٹھیں۔ شرجیل بھی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں باقاعدہ لڑائی کا منظر تھا، باہر کے لوگوں نے جس جگہ سے باؤنڈری وال کی نوکدار گرل اکھاڑی تھی، اب وہاں سے کچھ افراد اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بجلی چمکی اور چند ساعتوں کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ نور نے دیوار کا منظر دیکھا۔ یہ ایک جنگی منظر جیسا تھا، کم از کم چار پانچ افراد تھے جنہوں نے چوٹ سے بچنے کے لیے سروں پر بھاری پگڑیاں کس رکھی تھیں اور دیوار پھاندنے کی کوشش میں تھے۔ ان پر چھت پر سے اینٹیں برس رہی تھیں اور احاطے میں موجود افراد لمبی لاٹھیوں سے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور اب وہ لوگ ہر صورت اندر گھسنا چاہتے ہیں۔

ان کے للکارے خوفناک تھے۔ وہ گندی گالیاں دے رہے تھے اور اندر موجود عورتوں کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

بسمہ، بتول اور ماموں کی لڑکیوں نے رونا شروع کردیا۔ تائی راحت سجدے میں گرگئیں اور جان آبرو کی سلامتی کے لیے گڑگڑانے لگیں۔ دادی اماں کا برا حال تھا اور ان کو سنبھالتے سنبھالتے پھپھو حاجرہ خود بھی نیم جان ہورہی تھیں۔

حویلی کے مردوں نے، جن میں باہمت ملازم بھی شامل تھے، جان پر کھیل کر اندر گھسنے والوں کی کوشش ناکام بنادی۔ اس کوشش میں چار پانچ افراد کو شدید زخم آئے لیکن جس کو شدید ترین چوٹ لگی وہ نور کے ماموں مراد تھے۔ باہر سے جوابی خشت باری بھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ لگنے سے ان کے سر پر گہرا زخم آیا تھا..... اور بالائی ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

انہیں اندر لایا گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر عورتوں نے رونا شروع کردیا۔ بہرحال نور اور مہرین کسی حد تک حوصلے میں رہیں۔ ایک فزیوتھراپسٹ کی حیثیت سے مہرین میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ حویلی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ مہرین نے سب سے پہلے مراد کے سر سے بہنے والا خون بند کیا اور پھر عارضی بینڈیج کردی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''فوری خطرے کی تو کوئی بات نہیں..... مگر ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوگی۔''

حویلی کے سامنے ''لوروف'' پر حویلی کے آٹھ دس افراد موجود تھے۔ اگر باؤنڈری وال کے شکستہ حصے سے کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے موثر طریقے سے روکا جاسکتا تھا مگر یہ دفاع کتنی دیر تک چل سکے گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نور نے دیکھا، بسمہ سکڑی سمٹی ہوئی ایک سہمی چڑیا کی طرح کونے میں دھنسی ہوئی تھی۔ گاہے بگاہے دہشت زدہ نظروں سے اپنے بڑوں کے چہرے دیکھتی تھی۔ اسی اثنا میں چھوٹی امی زلفت اور پھپھو حاجرہ نے اس کے ابا جان کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں جاکر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ کوئی خاص قسم کی گفتگو کررہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد تینوں باہر آگئے۔ ابا جان کا چہرہ بدستور کرب کی آماجگاہ تھا۔ یہی وقت تھا جب ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا تھا اور اس نے پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ ابا جان کی طرف بڑھایا تھا۔ اس لفافے میں سرخ رنگ کا کوئی کامدار کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ خدا بخش نے نور کے ابا جان سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔''

یہ بسمہ کے لیے شادی کا جوڑا بھیجا گیا تھا۔ نور کے ابا جان نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا تھا اور بے دم سے ہوکر بسمہ کے پاس قالین پر بیٹھ گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منظر نور کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا جب اس نے چھوٹی امی زلفت کو سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ ابا جان کے پاس بیٹھے اور انہیں سمجھاتے دیکھا تھا۔ ابا جان جھلا کر بولے تھے۔ ''تو کیا کروں میں؟ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کردوں۔ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے، اپنے کلیجے ٹھنڈے کرلو۔''

''نہیں جی..... لیکن..... جو کچھ بھی ہورہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔''

''اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟'' اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''..... جو کچھ بھی ہے، وہ لوگ..... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں..... لیکن..... اگر خدانخواستہ..... یہ لوگ اندر گھس آئے اور..... دو چار موتیں ہوگئیں..... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہوجائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

اسی دوران میں دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ حویلی کی سہمی ہوئی عورتیں بے طرح چلا اٹھی تھیں اور مرد سیڑھیوں کی طرف لپک گئے تھے۔ بعدازاں پتا چلا تھا کہ شرجیل، عثمان اور غیاث وغیرہ نے ملازموں کے ساتھ مل کر حویلی کی خستہ برساتی کی ایک دیوار گرادی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر دوبارہ مارا ماری کی نوبت آئے تو چھت سے خشت باری کرنے کے لیے اینٹیں اور روڑے مہیا ہوسکیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں چھوٹی امی زلفت اور پھپھو حاجرہ وغیرہ نے ابا جان اور تایا ابا کو نیم رضامند کرلیا تھا۔ کوئی دوسری راہ سجھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ مراد شدید زخمی تھا اور حالات اتنے سنگین تھے کہ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ یہ حکم حاکم مرگِ مفاجات والی صورتِ حال تھی اور پھر نور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اشک بار چھوٹی امی اور خالہ عریفہ نے، باہر سے بلند ہونے والے پُرغضب للکاروں کی گونج میں بیلا دوپٹا روتی سسکتی بسمہ کے سر پر ڈالا اور اس کے لرزاں ہاتھوں پر مہندی لگانا شروع کی۔

آہ..... یہ کیسی شادی تھی..... یہ کیسا نکاح تھا؟ پنچایتوں، بیٹھکوں اور جرگوں کے حکم پر یہ زنا بالجبر کے کیسے تماشے لگائے جاتے ہیں۔ جاہلیت اور انا پرستی کے حصار میں آبروریزی کے یہ کیسے کھیل، کھیلے جاتے ہیں؟

نور نے سوچا اور اس کے سر کی نسیں پھٹنے لگیں۔ وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

ہاں..... اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلی تھیں..... اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی طویل فلم چلی تھی جو بچپن اور لڑکپن سے شروع ہوئی۔ موراں والی گاؤں کے گلی کوچوں سے ہوکر نکلی اور لاہور پہنچی..... وہاں کی شاہراہوں، درس گاہوں اور کھیل کے میدانوں سے ہوتی ہوئی، سومیٹر کے ہیجان خیز ٹریک تک آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ماضی کی کھڑکی سے یادوں کا کتنا بڑا ہجوم دیکھا تھا..... اور اب ایک بار پھر وہ تصور کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں موجود تھی۔ حقیقت جو دسمبر کی اس خوفناک رات میں بے حد بے رحم اور لرزہ خیز تھی۔ حویلی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اردگرد دور تک کوئی مددگار نہیں تھا اور نہ کسی کو خبر تھی کہ اس برسات کی رات میں یہاں بارشی نالے کے کنارے اس تنہا حویلی پر کیا گزر رہی ہے۔ بچاؤ کی بس ایک ہی شکل رہ گئی تھی۔ بسمہ کو سرخ جوڑا پہنایا جاتا اور اسے ان زبردستوں کے حوالے کردیا جاتا جو باقاعدہ برات کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ وہ اسے لے جاتے۔ بدمست چودھری زادہ آج رات ہی شادی کے نام پر اسے روند ڈالتا۔

ساتھ والے کمرے سے بسمہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ چھوٹی امی، پھوپھو حاجرہ اور تائی وغیرہ کی سرگوشیاں بھی جو اسے حوصلہ دینے میں مصروف تھیں۔ نور نے وال کلاک کی طرف دیکھا..... آہ، ابھی صرف دو بجے تھے۔ صبح بڑی دور تھی۔ قرب و جوار میں بھیگی ہوئی سنسان رات نے اپنے بے مہر پنجے گاڑ رکھے تھے۔ لق ودق، سنسان اور پھنکاتی ہوئی رات۔

یکا یک دوبارہ زبردست شور سنائی دیا۔ نور کے ابا جان، تایا ابا اور ملازمین احاطے کی طرف لپکے۔ نور کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ عورتیں سسکنے لگیں۔ شور حویلی کے دائیں پہلو میں مہمان خانے کی جانب تھا۔ یہ مہمان خانہ (جو پندرہ بیس سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا) حویلی کی بیرونی چار دیواری سے ملا ہوا تھا۔ کھا پریوں کے للکارے، گالیاں، دھاڑیں، ہر آواز ان کی سماعتوں کا عذاب تھی۔ صورتِ حال واضح ہونے میں تقریباً پانچ منٹ لگے۔

☆☆☆

برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ نور نے دیکھا کہ ملازمین نے کسی کا خونچکاں جسم اٹھا رکھا ہے اور اسے مردانے کی طرف لے جارہے ہیں۔ وہ دیکھ کر کانپ گئی۔ یہ حویلی کے سب سے پرانے ملازم فدا حسین کا بیٹا رشید تھا۔ ہاں نور کی نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں، وہ رشید ہی تھا۔ غالباً اس کے سینے پر کوئی بہت بڑا گھاؤ تھا جس نے اس کے پورے بدن کو لہورنگ کررکھا تھا۔ یہ محسوس کرکے نور کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ رشید شاید زندہ نہیں ہے۔

خواتین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جارہا تھا لیکن نور نے اپنے تایازاد عثمان کو سیڑھیوں کے نیچے گھیر لیا۔ ''آخر کیا چھپا رہے ہو تم؟'' وہ اس کے بازو میں اپنے ناخن گھساتے ہوئے بولی۔

اس نے گول مول بات کرنے کی کوشش کی مگر نور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ آخر وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''ان حرامزادوں نے مار ڈالا ہے اس کو..... جان لے لی ہے اس کی۔''

نور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی پھر ہمت کرکے بولی۔ ''مگر ہوا کیا ہے؟''

جواب میں تایازاد عثمان نے دلدوز لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا..... مہمان خانے کے عقبی کمرے باؤنڈری وال سے ملے ہوئے تھے۔ فدا حسین کے بیٹے رشید نے یہاں سے نکلنے اور پولیس چوکی تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ وہ دلیری کے ساتھ مہمان خانے کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے باہر چھلانگ لگا کر اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی قسمت اچھی ہوتی تو شاید وہ نکل جاتا مگر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھ لیا گیا۔ وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس کے پاس وہی مراد والی چھری تھی، اس نے چھری چلا کر خود کو چھڑانا چاہا مگر..... بپھرے ہوئے شرابیوں نے اسے کلہاڑیوں اور خنجروں سے کاٹ ڈالا۔ پھر اس کی لاش دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دی گئی۔ اب وہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ دوسروں کا حشر بھی یہی ہوگا۔ اندر گھس آئے تو ایک ایک کو مار ڈالیں گے۔

نور نے سنا، باہر سے بلند ہونے والی آوازوں میں وحشت نمایاں تر ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

مولوی اشفاق مہرا اور خلیل مہرا نے مشورہ کیا۔ انہیں اب بالائی منزل، نچلی منزل سے زیادہ محفوظ لگ رہی تھی۔ لڑکوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولوی اشفاق عورتوں کو لے کر دوسری منزل پر آ گئے۔ ان کی ہدایت پر نور کی دادی اماں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور شرجیل، عثمان، غیاث وغیرہ کرسی اٹھا کر دوسری منزل پر لے گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت دادی اماں کو رونے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو مولوی اشفاق نے انہیں گول مول سا جواب دیا۔

یہ آوازیں دراصل فدا حسین اور اس کی بیوی کی تھیں۔ اپنے بچے کی دردناک موت نے انہیں نوحہ کناں کر رکھا تھا۔

اشفاق صاحب بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ دکھ اور تشویش کی انتہا پر تھے۔ ایک طرف بے گناہ بیٹی اور اس پر ہونے والے ظلم و ستم کا تصور تھا، دوسری طرف اپنے پورے خانوادے کی جان اور آبرو تھی۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ بسمہ کو اس کی پھپھو حاجرہ اور چھوٹی امی نے سرخ جوڑا تک پہنا دیا تھا مگر حتمی فیصلے کی ہمت ابھی تک کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

اشفاق صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ لرزتی کانپتی بسمہ ان کی بائیں جانب اور بتول دائیں جانب تھی۔ مہرین اور ماموں زاد سلیمہ ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ اشفاق صاحب نے بسمہ اور بتول کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

''ارے نور کہاں ہے؟'' پھپھو حاجرہ نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ''نور..... نور!'' انہوں نے آوازیں دیں۔

اشفاق صاحب کی بیگم زلفت بھی اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''کہاں گئی وہ؟'' بتول نے بھی بے قراری سے کہا۔

اشفاق صاحب کچھ بڑبڑائے اور اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ بادل چھٹے تھے اور پوری رات کا چاند جھانکنے لگا تھا۔ اشفاق صاحب نور کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے، مہرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کا سنگل اسٹوری پورشن دکھائی دے رہا تھا۔ چھت پر لگا ہوائی وی انٹینا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اچانک ایک منظر نے اشفاق صاحب کو جکڑ لیا۔ ان کی ساری حسیات جیسے سمٹ کر ان کی آنکھوں میں آ گئیں۔ انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر ان کی اپنی ہی نگاہوں کو بھروسا نہیں ہوا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟ وہ مہمان خانے کی چھت سے نیچے پرالی کے ایک ڈھیر پر چھلانگ لگا رہی تھی..... ہاں، یہ وہی تھی..... یہ وہی نافرمان تھی، وہی سرکش تھی.....

مہرین نے بھی بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی فلم ہوتی اور یہ منظر سلوموشن میں دیکھا جاتا تو بے حد سنسنی خیز ہوتا۔ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی پرالی کے ڈھیر پر گری۔ وہاں سے اٹھی..... سنبھلی..... اور بھاگی۔ ہاں..... وہ بھاگی، اس کے سامنے تھور زدہ طویل میدان تھا۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے للکارے بلند کیے اور اس کے پیچھے لپکے..... ابھی کچھ دیر پہلے وہ فدا حسین کے لڑکے رشید کے پیچھے بھاگے تھے اور اسے پکڑ لیا تھا..... لیکن..... یہ رشید نہیں تھا۔ یہ نور تھی۔ یہ پاکستان کی مانی ہوئی اسپرنٹرز میں سے ایک تھی اور وہ بھاگ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس نے دوپٹا کس کر کمر سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوگرز تھے۔ آج اس کا اسکارف پھسل گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

''پکڑو..... جانے نہ پائے۔'' ایک للکار ابلند ہوا۔

لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چمکیں۔ تعاقب کرنے والوں کے قدم برق رفتار ہوئے، وہ اسے دبوچنے کے لیے پوری طاقت سے بڑھے مگر ان کے آگے نور تھی..... اور نور کی رفتار..... بہت ہوتی ہے.....

مولوی اشفاق منڈیر کے آخر تک آئے اور سینے کی پوری قوت سے چلّائے۔ ''بھاگو عین النور..... بھاگو..... ان کے ہاتھ نہیں آنا عین النور..... بھاگو۔'' ان کی آواز گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے عین النور کا جواب نہیں سنا..... مگر مولوی اشفاق نے سنا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا..... میں آپ کی بیٹی ہوں ابا جان! آپ کی ناکارہ ترین بیٹی۔ آپ کو بہت دکھ دینے والی، مایوس کرنے والی لیکن آج میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی..... ہاں، میں نہیں کروں گی کیونکہ یہ میرا میدان ہے، یہ میرا راستہ ہے۔

''بھاگو عین النور..... بھاگو۔'' مولوی اشفاق پھر پوری طاقت سے پکارے اور یہ وہی مولوی اشفاق تھے، جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا..... مت بھاگو عین النور۔

''رن فاسٹ..... نور! رن فاسٹ۔'' مہرین بھی چلّائی۔

اور وہ بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ چھریرے بدن کی ایک لڑکی اور..... اس کے عقب میں موت کے ہرکارے، درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم کے قریب۔ تعاقب کرنے والوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، کڑیل جوان بھی اور بالکل نوجوان چودھری زادے بھی۔ انہیں یقین تھا، وہ حصار توڑنے والی اس لڑکی کو بارشی نالے تک نہیں پہنچنے دیں گے کیونکہ بارشی نالے کے پار جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا اور پھر اس سے آگے وہ راستہ تھا جو سیدھا پولیس چوکی تک پہنچتا تھا اور وہ شاید اسی رخ پر جا رہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام ہوئے تو بھاگتے بھاگتے اس کی طرف چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں اور لاٹھیاں وغیرہ پھینکنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ان کی جھلاہٹ دیدنی تھی۔ ایک لڑکی، ایک کمزور لڑکی..... ان کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔

ہاں، قدرت ایسے ہی ہار کو جیت میں بدلا کرتی ہے۔ ایسے ہی جاں گسل مشقتوں کا صلہ دیا کرتی ہے۔ ایک طرح سے نہ سہی دوسری طرح سے..... دوسری طرح سے نہ سہی، تیسری طرح سے۔ بے شک محنتیں رائگاں نہیں جاتیں۔ جاں سوزیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ آخر صلے مل کر رہتے ہیں۔

مولوی اشفاق اپنی بیٹی کی جیت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ منڈیر کے آخری سرے تک پہنچ چکے تھے..... ''بھاگ جاؤ نور..... پولیس تک پہنچ جاؤ۔'' وہ بار بار کہتے تھے۔ انہوں نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں، ان کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

اب بسمہ، بتول، سلیمہ، چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ اور بہت سے دیگر لوگ اس جگہ جمع ہو چکے تھے اور روشن چاندنی میں، سکتہ زدہ کرنے والی یہ انوکھی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ٹویوٹا گاڑی بھی نور کے پیچھے لپکی۔ یہ پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس پر بسمہ کو لے جایا جانا تھا..... زندہ یا مردہ..... (چودھری طغرل نے یہی کہا تھا) گاڑی برق رفتاری سے نور کے تعاقب میں پہنچی تو وہ دائیں جانب کے ان تھور زدہ کھیتوں میں گھس گئی جن میں کچی منڈیریں بنا کر، انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بری طرح پھدکنے اور ڈگمگانے لگی۔ نور اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم برق کی طرح حرکت کر رہے تھے..... بال لہرا رہے تھے۔ وہ ایک ایتھلیٹ کی تمام تر مہارت کے ساتھ فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی اور آج اس کی فنش لائن یقیناً وہ بارشی نالا تھا جس کی دوسری جانب جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا۔

ٹویوٹا گاڑی کسی گڑھے میں پھنس کر گھوم گئی اور ڈھیروں مٹی اڑانے لگی۔ دوڑنے والوں میں بہت سے لوگ ہمت ہار کر ست پڑ چکے تھے مگر کھاپری برادری کے چند تیز طرار لڑکے اب بھی بھیڑیوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے..... اس تک پہنچنے کی سعی کر رہے تھے..... انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوڑ کے لیے ایک نہایت غلط حریف چن بیٹھے ہیں۔ بے شک کمزور، بے شک لڑکی..... لیکن بے شمار ایونٹس کی فاتح، پروفیشنل رنر۔ اس نے ایک بار پھر اپنا رخ تھوڑا سا پھیرا اور بھاگتی ہوئی اس بارشی نالے میں اتر گئی جہاں پانی اس کی کمر سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ جس رفتار سے دوڑی تھی، اسی ہمت سے اس نے نالے کو پار کیا اور دوسرے کنارے سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے نالے میں کودنے والے نوجوان کھاپریوں کو ابھی کنارے تک پہنچنے میں کم از کم ایک منٹ درکار تھا۔ یہ ایک منٹ نور کے لیے بہت زیادہ تھا۔

☆☆☆

نور نے نالے کے مٹیالے سرد پانی میں سے نکل کر کنارے پر چڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، چاندنی میں ان کھاپریوں کے ہیولے صاف نظر آ رہے تھے جنہوں نے اس کے پیچھے برساتی نالے میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ وہ ابھی نصف پاٹ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ انہیں نور تک پہنچنے کے لیے کم و بیش ایک منٹ درکار تھا..... اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔ وہ جب بے دلی کے ساتھ بھی بھاگتی تھی تو بارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ میں سو میٹر طے کر لیتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ اندھا دھند تو نہیں بھاگ رہی تھی مگر پھر بھی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس کے اردگرد اب خودرو جھاڑیاں تھیں اور دس بارہ فٹ بلند سرکنڈے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ شاید آج اسے کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ آج اس کے کانوں میں اس کے ابا جان کی آواز پڑی تھی۔ یقیناً وہ اس کے ابا جان کی آواز ہی تھی۔ جب اس نے چاول کی چھال کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے پاؤں کو پوری رفتار سے حرکت دی تھی، اس نے مہمان خانے کی چھت سے یہ آواز سنی تھی۔ انہوں نے پکار کر اسے

بھاگنے کا اور کھا پریوں کے ہاتھ نہ آنے کا کہا تھا..... وہی تو تھے جو اسے عین النور کے نام سے پکارتے تھے۔ بے شک یہ وہی تھے۔ اس آواز نے نور کے حوصلوں کو پہاڑ کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ آج اسے کوئی نہیں چھو سکے گا اور کوئی نہیں چھو سکا تھا۔

اب بھی وہ پوری ہمت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس کے کپڑے سخت سردی میں نالے کے پانی سے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے مگر شدید جسمانی مشقت کے سبب اس کے زیریں جسم کو بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فقط شانوں اور چہرے کو ہوا کے تھپیڑے لگ رہے تھے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا، کہیں عقب سے بپھرے ہوئے کھا پری اس پر کوئی فائر نہ کر دیں۔ ابھی تک تو خیریت گزری تھی اور اسے لگتا تھا کہ خیریت ہی رہے گی۔ یہ امنالے کے میلے کے دن تھے۔ علاقے کے بدترین افراد بھی نسلوں سے چلے آنے والے رواج کے مطابق فائر ہونے والے ہتھیاروں کو چھونا گناہ سمجھتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سیدھی پولیس چوکی کی طرف جا رہی ہے۔ کل دوپہر اس نے آسمانی جھولے کی بلندی سے جو فضائی منظر دیکھا تھا، وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ پھر بھاگتے بھاگتے ایک دم ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ڈر گئی۔ میلے کے دنوں میں علاقے میں آتشیں ہتھیار ممنوع ہو جاتے تھے۔ کیا پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتے تھے؟ اس بارے میں اسے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا لیکن اگر پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں تھے تو پھر ..... وہ بپھرے ہوئے ہجوم کو اور جنونی کھا پریوں کو کیسے روک سکتے تھے؟

اس نے اپنی شلوار کے پائنچوں کو جرابوں میں گھسا کر ٹراؤزر کی شکل دے رکھی تھی۔ جوگرز کے تسمے بھی کس کر باندھ رکھے تھے، پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ چاندنی پھر ایک دم اوجھل ہو گئی تھی اور اسے تیز بھاگنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پروفیشنل اسٹیمنا کی مالک ہونے کے باوجود ہانپ رہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اب چوکی زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید ایک دو منٹ کا فاصلہ تھا..... یہی وقت تھا جب اسے عقب سے ایک فائر سنائی دیا۔

☆☆☆

ذوالقرنین کا دل شام سے ہی کچھ اکھڑا ہوا سا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ رات گہری ہونے کے ساتھ ساتھ گرج چمک اور بارش کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ذوالقرنین کو کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت۔ نور کی مسلسل سرد مہری نے ذوالقرنین کو جیسے اس کی اپنی نظروں سے ہی گرا دیا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ گرے پڑے لڑکوں کی طرح وہ کام کر رہا ہے جسے عرفِ عام میں ''بھونڈی'' کہا جاتا ہے۔ وہ اصلاح معاشرہ کا ٹھیکیدار بنتا تھا اور اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور تھا کہ کسی موہوم امید کے سہارے نور کے پیچھے یہاں موراں والی تک چلا آیا تھا۔ بے شک میلا دیکھنے کی دعوت اسے پچھلے سال اشفاق مہر اصاحب نے بھی دی تھی اور یہ ایک معقول بہانہ تھا مگر جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ تو ذوالقرنین اچھی طرح جانتا تھا۔

اردو بازار کے تین اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ سب ایک مقامی کے گھر کرائے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میلے کے دنوں میں اپنے گھر کرائے پر دینے کا رواج موراں والی میں بھی پایا جاتا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک ذوالقرنین کی طبیعت اتنی بیزار ہو گئی کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی موراں والی سے نکل جائے گا..... (دوستوں کو بتائے بغیر) وہ لوگ علیحدہ گاڑی پر آئے تھے اور جب چاہے جا بھی سکتے تھے۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ خاموشی سے اٹھا۔ وضو کر کے نمازِ حاجات ادا کی۔ سفر کے نفل پڑھے۔ صرف ایک دوست رمیز کو اٹھایا جس سے وہ اپنی کیفیت شیئر کر سکتا تھا۔ اسے اپنی روانگی کا بتا کر اور قائل کر کے وہ چپ چاپ اپنی قیام گاہ سے نکل آیا۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی اور کسی وقت بند بھی ہو جاتی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی اونی کوہاٹی چادر اچھی طرح بالائی جسم پر لپیٹ لی۔ نیلی الیف ایکس گاڑی کھلے میں کھڑی تھی اور برف ہو رہی تھی۔ فوری طور پر تو گاڑی کا ہیٹر بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موراں والی سے اور موراں والی کے میلے سے نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے نکلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر آ جاتا تھا جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیلے والے کے پاس کھڑی تھی اور پھر اسے دیکھ کر بالکل منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کتنی بے اعتنائی، بیگانگی اور بیزاری جھلکتی تھی اس کے انداز سے۔

اس نے گاڑی کو دوسرے گیئر میں ڈالا اور کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پختہ سڑک تک پہنچنے کے لیے اسے قریباً دو کلومیٹر تک اسی نیم پختہ راستے پر جانا تھا اور پھر برساتی نالے کا تنگ پل بھی پار کرنا تھا۔

اس کے دائیں بائیں جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔ چاند نے تھوڑی دیر کے لیے گہرے بادلوں کی اوٹ سے جھلک دکھائی تھی اور پھر اوجھل ہوگیا تھا۔ اچانک ذوالقرنین بری طرح ٹھٹک گیا۔ اسے بائیں جانب سے کچھ فاصلے پر فائر کی آواز سنائی دی..... ابھی وہ اسی پر غور کررہا تھا کہ بائیں جانب کے سرکنڈوں میں عجیب سی حرکت ہوئی اور کوئی تیزی سے بھاگ کر سامنے سے گزرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ایف ایکس کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آیا تھا۔ ذوالقرنین سکتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ بھیگے لباس اور بھیگے بالوں والی وہ دراز قد لڑکی جو لڑکھڑاتی ہوئی سی بھاگ رہی تھی..... نور کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی.....

حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے گاڑی کے بریک دبائے اور کھڑکی کھول کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ''نور..... نور۔''

وہ رک گئی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ''یہ میں ہوں نور۔'' وہ پھر چلایا۔

تب تک شاید وہ بھی ذوالقرنین کی نیلی ایف ایکس پہچان چکی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد گاڑی کی طرف جھپٹی اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔

''جلدی کرو..... پولیس چوکی چلو۔ انہوں نے حویلی کو گھیر لیا ہے..... وہ..... میرے پیچھے بھی آرہے ہیں۔'' اس کی آواز دہشت کے سبب ناقابلِ شناخت ہورہی تھی۔

ذوالقرنین بھی حیرت اور سنسنی کے شدید گھیرے میں آگیا لیکن کوئی سوال پوچھنے کے بجائے اس نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھانا مناسب سمجھا۔ گاڑی غیر ہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی..... اور پھر اس نے ایک جگہ سے نالے کا پل پار کرلیا۔

''آپ زخمی تو نہیں ہیں؟'' ذوالقرنین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مضطرب آواز میں بولی۔

ایک آدھ منٹ کے اندر ہی وہ پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ پولیس چوکی کے مختصر صحن میں تاریکی تھی۔ ایک دو کمروں کے روشن دانوں میں لالٹین وغیرہ کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔ نور اور ذوالقرنین ایک ساتھ گاڑی سے نکلے اور چوکی کا بیرونی دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ بیرونی دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی۔

''دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔'' نور چلّانے والے انداز میں بولی۔

اس سے ملتا جلتا فقرہ ذوالقرنین نے بھی دہرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔ پھر ذوالقرنین کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی کی کھلی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ گزار کر ہارن پر رکھ دیا۔

اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ''پتا نہیں بھنگ پی کر سو گئے ہیں سارے۔'' ذوالقرنین جھلا کر بولا۔

نور سخت پریشانی میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور سینے کا زیر و بم واضح تھا۔

اچانک ذوالقرنین کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ اسے چلا کر دیوار کے بالکل قریب لے آیا۔ پھر اس کی چھت پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ نور اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ ''کنڈی چڑھا دیں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور صحن پار کر کے اندرونی کمروں کی طرف لپکا۔

اس نے ایک کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔ اس مرتبہ یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ دروازہ کھلا اور سادہ کپڑوں میں ایک بھاری بھرکم شخص نظر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ چوکی انچارج سب انسپکٹر جان محمد تھا اور خاصا دبنگ شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالقرنین نے جھلا کر کہا۔ ''آپ لوگ کس طرح کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ باہر غدر مچا ہوا ہے اور آپ نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔''

سب انسپکٹر نے اپنی سرخ آنکھوں سے ذوالقرنین کو گھورا، ہوسکتا تھا کہ وہ جواب میں کوئی سخت بات کہتا لیکن اس کی نگاہ خستہ حال نور پر پڑ گئی۔ ''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

نور اپنا سر ڈھانپتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔ ''آپ یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا۔ کھاپریوں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایک بندے کو سخت زخمی اور دوسرے کو قتل کردیا ہے۔ وہ..... میرے پیچھے..... بھی لگے ہوئے ہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

دو تین اور کمروں کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ کچھ باوردی اور کچھ سادہ لباس والے اہلکار باہر نکل آئے

تھے۔ نور مسلسل بولتی چلی گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر اس نے تقریباً ساری صورتِ حال پولیس والوں کے گوش گزار کردی۔ یہ انکشاف ذوالقرنین کے لیے بھی تہلکہ خیز تھا کہ حویلی کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہیں اور نور کی بہن بسمہ کو ایک طرح سے اغوا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نالے کی طرف کوئی فائر کیا گیا ہے بلکہ شاید یہ دو فائر تھے۔ فائر اور وہ بھی میلے کے دنوں میں۔ گڑبڑ تو ضرور ہورہی ہے جی۔"

دو تین منٹ کے اندر اندر پولیس اہلکار چوکی سے باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ وردی میں اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ دو چار کو چھوڑ کر سب کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ سب انسپکٹر جان محمد خود بھی کھاپری برادری سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے فوراً بذریعہ فون قریبی تھانے تک بھی اطلاع پہنچادی تھی۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے پار حویلی کی جانب روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کہیں تھوڑی بہت آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

سب انسپکٹر جان محمد اپنی نفری کے ساتھ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ کچھ اہلکار موٹر سائیکلوں پر تھے، تین چار ذوالقرنین کی ایف ایکس میں لد گئے۔ تھوڑا آگے جاکر سب انسپکٹر نے گاڑی رکوالی۔ یہاں بہت بڑی ایک جھونپڑا بستی تھی۔ بارش کی وجہ سے ان میں سے کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ سب انسپکٹر نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ پکی رنگتوں والے پانچ چھ افراد لپک کر اس کی طرف آئے۔ اس نے ان سے کچھ کھسر پھسر کی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس جھونپڑا بستی میں ہلچل نظر آئی اور درجنوں افراد کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہوکر نکل آئے۔ ان میں سے کچھ گھوڑا ریڑھیوں پر اور کچھ گدھا گاڑیوں پر سوار ہوگئے۔ اس سارے قافلے نے پل پار کیا اور تیزی سے وقوعہ کی طرف بڑھا۔

نور، ذوالقرنین کے ساتھ ایف ایکس میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس نم تھا اور اب وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پولیس اہلکاروں کو حویلی کی تشویشناک صورتِ حال سے بھی آگاہ کررہی تھی اور بتارہی تھی کہ وہ کس طرح بچ کر یہاں پہنچ پائی ہے۔

ذوالقرنین نے اسے کانپتے دیکھا تو اپنی گرم کوہاٹی شال اتار کر نور کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ پہلے تو جھجکی اور یوں لگا کہ وہ شال لینے سے انکار کردے گی مگر پھر خاموش رہی۔ "اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔" ذوالقرنین نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پولیس موبائل کی عقبی سرخ بتیاں ذوالقرنین کی راہنمائی کررہی تھیں۔ ان کے عقب میں خانہ بدوشوں کے ریڑھے اور گدھا ریڑھیاں تھیں۔ غالباً ان کے دو چار کتے بھی شور مچاتے ساتھ آرہے تھے.....

تھوڑا زدہ طویل میدان میں پہنچتے ہی حویلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید حویلی کے کسی کونے میں آگ بھی سلگ رہی تھی۔ سب انسپکٹر نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور ایک جگہ گاڑی روک کر آٹومیٹک رائفلوں سے کئی برسٹ چلوائے۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی اور بلوائیوں کے لیے پیغام تھا کہ پولیس آگئی ہے، وہ ٹکر نہ لیں۔

..... کچھ دیر بعد جب وہ لوگ حویلی کے سامنے پہنچے تو گھیراؤ کرنے والے بکھر چکے تھے۔ ذوالقرنین اور نور نے کچھ ٹولیوں کو دریا کی جانب بھاگتے دیکھا۔ کچھ ٹارچوں اور لالٹینوں کی دور ہوتی ہوئی روشنیاں سرکنڈوں کی جانب نظر آرہی تھیں۔

نور نے دیکھا مشتعل کھاپریوں نے حویلی کے قدیم چوبی دروازے کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش یقیناً نور کے فرار ہونے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ مگر لکڑی اور لوہے سے تیار ہونے والے اس دروازے کا کچھ خاص نہیں بگڑ سکا تھا۔ اب خانہ بدوش بھی پہنچ گئے تھے اور پولیس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے تھے۔ زبردست ہوائی فائرنگ اور پولیس گاڑی کا مسلسل ہوٹرسن کر حویلی والوں کو یقین ہوگیا کہ پانسا پلٹ چکا ہے۔ حویلی کا جہازی سائز دروازہ کھول دیا گیا۔ نور کی نگاہ سب سے پہلے شرجیل، چچا احسان اور اپنے ابا جان پر پڑی وہ لپک کر ان کی طرف گئی۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ٹھٹک گئی، جیسے سمجھ نہ پارہی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر وہ ایسے ہی منتشر سی ہوجایا کرتی تھی لیکن اس بار صورتِ حال مختلف رہی۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے عجیب کیفیت میں اپنے دونوں بازو نور کے لیے کھول دیے۔ وہ لپک کر گئی اور ان کی بانہوں میں سما گئی۔

"میری بچی..... میری عین النور۔" وہ پکارتے چلے گئے۔ "آج تم نے وہ کیا جو کوئی اور نہ کرسکتا تھا۔ آج تم میرا بیٹا بنی ہو۔ آج تم نے ہم سب کو ایک بہت بڑی مصیبت اور

خواری سے بچایا ہے.....'' انہوں نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا اور اس کا سر اور ماتھا چومتے چلے گئے۔

وہ سسک رہے تھے اور وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ جب روتی تھی تو بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلا کرتے تھے لیکن آج اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

اس کے ابا جان اٹک اٹک بار آواز میں بولے۔ ''میری بہادر بیٹی..... میری دلیر بیٹی..... شیر بیٹی.....''

سب انسپکٹر جان محمد اور اس کے ماتحت تعجب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نور کے ابا جان نے خود کو نور سے علیحدہ کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ میری بیٹی ہے..... یہ..... بہت بڑی رنر ہے..... بڑے میڈل جیت چکی ہے۔ اسی نے آج ان بدبخت کھاپریوں کا گھیرا توڑا ہے اور آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ سوہنے نے اسے ہم سب کی جان آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔''

انہوں نے ایک بار پھر نور کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ نور بولی ''ماموں مراد کہاں ہیں۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔''

'' تمہارے تایا اور عثمان وغیرہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو گاڑی آ رہی ہے۔'' انہوں نے ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کیا۔ تاریکی کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس گیٹ تک آ گئیں۔

گاڑی قریب پہنچی تو تایا ابا نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر نور کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف جھکا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اٹک بار آنکھوں کے ساتھ لیے جانے والے اس بوسے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ نور نے پچھلی نشست پر دراز ماموں مراد کو دیکھا۔ ان کے سر کی بینڈیج خون سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں، عثمان نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں نور! ٹرنکولائزر کے اثر میں ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ یہی وقت تھا جب ایک چنگھاڑ سی نور کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ گیٹ کے بالکل پاس گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سے ایک پرچھائیں سی جھپٹتی ہوئی نظر آئی۔ تاریکی میں نور کو بس یہی نظر آیا کہ حویلی کے چوکیدار گل محمد کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص پرچھائیں سے لپٹ گیا..... ورنہ یہی لگ رہا تھا کہ وہ پرچھائیں سیدھی نور کی طرف آئے گی۔

ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔ کوئی جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ''مار دوں گا..... کاٹ ڈالوں گا..... ٹوٹے کر دوں گا۔''

نور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور ابا جان نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ نور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹارچوں کی روشنی تصادم والی جگہ پر پہنچی تو نور نے دیکھا کہ چوڑا چکلا ابدال کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جس سے لپٹا ہوا تھا، وہ ذوالقرنین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ابدال کے ہاتھ میں چھوٹے دستے والی چمک دار کلہاڑی تھی اور اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے شعلے تھے۔ صاف طور پر پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے..... اور کسی بھیڑیے سے بڑھ کر خون آشام ہو رہا ہے۔ اس کی کلہاڑی پر ذوالقرنین نے بھی گرفت بنا رکھی تھی اور دونوں تقریباً گتھم گتھا تھے۔ پھر وہ دونوں گر گئے لیکن ذوالقرنین نے کلہاڑی کے دستے پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ اس کی مزاحمت زبردست تھی۔

پھر پولیس والے اور دیگر افراد بھی ابدال پر جھپٹے اور اس خون آشام کو دبوچ لیا گیا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں دہاڑ رہا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ بس ایک فقرہ ہی نور کی سمجھ میں آیا۔ ''اپنی دوہتی لے کر جاؤں گا، چھوڑوں گا نہیں اسے.....''

نور یہ سوچ کر لرز گئی کہ یہی وہ شخص تھا کہ آج رات بسمہ کو جس کے حوالے کیا جانا تھا۔ پولیس والوں نے وہیں گیٹ کے قریب اسے بے دریغ پیٹا اور نیم بے ہوش کر ڈالا۔ لرزتی کانپتی نور کو اس کے ابا جان نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ نور نے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان چاک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں سے خون رس رہا تھا لیکن ویسے وہ بالکل ٹھیک تھا۔

چوکیدار گل محمد کے چہرے پر کلہاڑی کا سخت وار لگا تھا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور ایک طرف کا گال قریباً کان تک چر کر رہ گیا تھا۔ ایک دوسری گاڑی میں اسے بھی فوراً اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

صورت حال سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پولیس پارٹی کی آمد پر باقی لوگ تو یہاں سے تتر بتر ہو گئے تھے مگر یہ شرابی ابدال کہیں آس پاس چھپ گیا تھا اور کسی موقع کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلنے کے بعد یہ موقع اسے نور پر حملے کی صورت میں ملا جو چوکیدار گل محمد اور ذوالقرنین نے ناکام بنا دیا۔

سب کے سامنے ہی بری طرح مدہوش ابدال کو الٹی ہتھکڑی لگا کر پولیس کی گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ وہ لہولہان

تھا اور ایک ٹوٹا ہوا چمکیلا ہار اب بھی اس کے گلے سے لٹک رہا تھا۔ سب انسپکٹر جان محمد کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے حویلی کے اردگرد سرچ آپریشن شروع کردیا کہ کوئی اور کھاپری بھی کہیں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ حویلی کا گیٹ بھی بند کردیا گیا تھا۔

ماموں اور چچا وغیرہ اب ذوالقرنین سے باتیں کررہے تھے۔ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ پھر سب انسپکٹر جان محمد نے ماموں اور چچا کو اپنے پاس بلالیا اور ان کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران میں نور نے دیکھا کہ ذوالقرنین آگے آیا۔ نور کے ابا جی سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''انکل! زخمیوں کو اس طرح اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے، کوئی ساتھ ہو۔ یہ لوگ یہاں سے تو بھاگ گئے ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔''

ذوالقرنین کی بات کا وزن سب نے محسوس کیا۔ افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ذوالقرنین نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے۔ تین مسلح پولیس اہلکار اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی زخمی چوکیدار والی گاڑی کے پیچھے روانہ ہوگئی..... حویلی میں اب حالات مکمل کنٹرول میں تھے۔ معلوم ہوا کہ جب نور چھت سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور کھاپریوں کی زد سے نکل کر سرکنڈوں میں اوجھل ہوگئی تو مایوس ہوکر اور جھنجلا کر کھاپریوں نے حویلی کے گیٹ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیوار کے اوپر سے صحن میں کچھ پیٹرول بم بھی پھینکے۔ جواب میں ان پر چھت سے سخت خشت باری کی گئی..... پیٹرول بموں سے دو تین افراد کو معمولی زخم آئے۔ کسی بڑے نقصان سے بچت ہوگئی۔

.....خطرہ ٹل چکا تھا پھر بھی سب انسپکٹر جان محمد نے چند اہلکار گیٹ پر متعین کردیے اور باقیوں کو ساتھ لے کر لاش کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ نور کے ابا جان، چچا جان اور دیگر مرد بھی ساتھ گئے۔ نور، پھپھو حاجرہ اور تائی راحت کے ساتھ خواتین والے حصے میں آگئی۔ آپی بتول، بسمہ، مہرین، سلیمہ سب اس کے گرد اکٹھی ہوگئیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک لرزاں تھیں۔ وہ ان سب جیسی تھی لیکن سب جیسی نہیں بھی تھی۔ وہ مختلف تھی اور آج ایک بڑے واقعے نے یہ ثابت بھی کردیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ستائش تھی اور محبت آمیز نمی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں والی بسمہ نے اسے ایک بار پھر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور سسکنے لگی۔ جب وہ دونوں جدا ہوئیں تو سب اردگرد بیٹھ گئیں اور نور پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ حویلی سے باہر اب پولیس کی مزید گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دینے لگے تھے۔

☆☆☆

.....اور یہ منظر تھا لاہور میں مولوی اشفاق مہرا کی رہائش گاہ کا۔ نور اب اپنے گھر میں تھی۔ کچھ لمحے عجیب کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ مشکلیں آسان کردیتے ہیں۔ بلند و بالا دیواریں جن کے گرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، ریت بن کر مسمار ہوجاتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب ابا جان نے اسے حویلی کے دروازے پر سینے سے لگایا تھا اور اس کا ماتھا چوما تھا اور اسے بہادر بیٹی کہہ کر اس کی پیٹھ تھپکی تھی..... انہی لمحوں میں..... ہاں، انہی لمحوں میں نور نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے ابا جان جو بھی کہیں گے وہ سر تسلیم خم کردے گی۔ اب وہ ساری زندگی ان کی کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ شاید اس کے ابا جان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی ایک تھپکی کی قیمت کتنی زیادہ ہے۔ وہ اس ایک تھپکی پر اپنی زندگی نثار کرسکتی تھی۔

اپنے والد کی مرضی و منشا کے لیے جو یہ خداداد آمادگی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ اسے اب ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جلد از جلد اسے استعمال میں لے آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے اٹھ کر وہ ایک دن تایا ابا کے گھر میں جا بسی تھی۔ دل فگار اور پارہ پارہ۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنوری کی شفق رنگ شام لاہور کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ رنگ برنگی پتنگیں فرائے بھرتی ہوئی فضا میں تیر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ٹھکانوں کی طرف سمٹ رہی تھیں۔ ایسی مختصر اور سرو شامیں اسے اکثر اداس کردیتی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی وہ گرم کوہاٹی چادر دیکھی جسے اس نے استری کرکے تہ کردیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ خدیجہ سے ملاقات ہو تو وہ اس کے بھائی کی چادر اسے واپس کردے۔ اس نے بے خیالی میں چادر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں بھر گیا جب اس تہلکہ خیز رات میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھاما تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کندھوں سے اتار کر نور کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ ان لمحوں میں وہی تڑپ، وہی لگن اور لازوال انتظار دکھائی دیا تھا جس کا مشاہدہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی کیا تھا اور جس نے اسے سرتاپا لرزا دیا تھا۔ وہ شروع میں اسے بہت برا شخص سمجھتی تھی پھر وہ اسے صرف برا سمجھنے لگی لیکن اب وہ اس کے لیے ایک اچھا شخص بن چکا تھا۔ سچا، کھرا اور شاید انسانیت سے محبت کرنے والا بھی لیکن

وہ کیا کرتی؟ وہ اچھا ہونے کے باوجود بلکہ بہت اچھا ہونے کے باوجود اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مجبور سی ہو جاتی تھی۔ کیوں مجبور ہو جاتی تھی؟ شاید..... کوئی آئیڈیل اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ کلین شیوڈ، ماڈرن لباس، چلبلا۔ یا پھر کوئی انجانا خوف تھا جو اس کا راستہ روکتا تھا۔ یہ کیا کیفیت تھی؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی تھی۔

مہرین کبھی کبھی زیادہ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک دو بار اس تہلکہ خیز رات کے حوالے سے اسے چھیڑا بھی تھا۔

ایک دن کہنے لگی تھی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم چوکی کی طرف جا رہی تھیں، خدیجہ کا بھائی اتفاقاً ہی تمہیں آ ملا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''کہیں کوئی رابطہ وغیرہ تو نہیں ہوا تھا پہلے سے؟''

''تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ گلا س مار کر تمہارا سر توڑ دوں۔''

''مگر اس سے مجھے جواب تو نہیں مل جائے گا نا۔ اچھا چلو چھوڑو اس بات کو..... جب تم دونوں اکٹھے گاڑی میں حویلی جا رہے تھے کیسا محسوس ہوا تمہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی بات تو کی ہوگی اس نے یا تسلی کے لیے تمہارا ہاتھ شاتھ تھاما ہوگا.....''

''اس وقت تین پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے گاڑی میں..... اور کلیجا منہ کو آ رہا تھا۔'' نور نے بیزار لہجے میں کہا تھا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

حویلی والے واقعات کو اب قریباً دس روز ہو چکے تھے۔ دو تین اخبارات میں حویلی والے واقعے کی تفصیلی خبر بھی چھپ چکی تھی..... اس میں جانی پہچانی ایتھلیٹ نور کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا اور بتایا گیا کہ اس نے کس طرح ایک نہایت سنگین صورتِ حال میں اپنی فیملی کی مدد کی اور بھاگ کر ایک قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچی۔ جو بھی نور سے ملتا تھا، پہلے اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا جان گھر میں ہی تھے۔ آپی بتول، آپی کے شوہر غیاث اور بسمہ ماموں مراد کی خبر گیری کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے سر کا باقاعدہ آپریشن ہوا تھا اور اب وہ روبہ صحت تھے۔ چوکیدار گل محمد کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے اور جبڑے کی ہڈی بھی فریکچر ہوئی تھی۔ وہ زیر علاج تھا۔ مہرا فیملی اس کی پوری نگہداشت کر رہی تھی۔

نور، ابا جان کے سر کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ ان کے عقب میں تھی۔ اپنی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ابا جان نور کو حویلی کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے مطابق فدا حسین کے بیٹے رشید کے قتل کا مقدمہ چودھری طغرل اور اس کے بڑے بیٹے ابدال کے خلاف ہی درج ہوا تھا۔ آٹھ دس اور افراد بھی نامزد تھے مگر بڑے مجرم یہی دونوں تھے۔

ابا جان نے کہا۔ ''یہ بھی پتا چلا ہے کہ پرسوں طغرل کو پولیس اسٹیشن میں دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے جہلم کے اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ اس کی حالت ڈانواں ڈول ہے۔ دراصل سب انسپکٹر جان محمد نے دونوں باپ بیٹے پر بڑی ٹائٹ ایف آئی آر کاٹی ہے۔ دو تین اور کیس بھی کھل گئے ہیں ان کے خلاف۔ پھانسی سے بچ بھی گئے تو آٹھ دس سال تو باہر نہیں آئیں گے انشاء اللہ۔''

''ابو! اس فائر کی سمجھ نہیں آئی جو نالے کے پار کیا گیا۔ پتا نہیں کہ مجھے نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر وہ ہوائی فائر تھے؟''

''اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔'' ابا جان نے اپنے ہاتھ میں موجود ننھی سی تسبیح کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے نکل جانے کے بعد یہ لوگ ناچ کرتے رہ گئے تھے۔ مایوسی میں ہی انہوں نے گیٹ پر پٹرول ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی اور اسی مایوسی اور بدحواسی میں ایک کھاپری نے یہ دو فائر بھی کیے۔ یہ فائر نالے کے پار کے ایک ڈیرے سے کیے گئے۔ وہاں ایک چرسی ٹریکٹر ڈرائیور نے بھوسے کے ڈھیر میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہوا میں دو گولیاں چلائیں اور سمجھا کہ شاید تم اس طرح ڈر جاؤ گی مگر تب تک تم چوکی کے سامنے پہنچ چکی تھیں.....''

تھوڑی دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ہولے سے بولی۔ ''ابو! ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں، بولو عین النور۔''

''میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ مجھے دل کی گہرائی سے معاف کر دیں..... میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی۔ آئندہ زندگی کے بارے میں آپ میرے متعلق جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔''

انہوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے تھے۔ اسے بازو سے پکڑ کر انہوں نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ

رہی تھی وہ اس کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

"میری بچی!" انہوں نے بڑے جذبے سے کہا اور اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگالیا۔ "تم .... بھی مجھے معاف کردو۔ میں نے بھی تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ تمہیں دکھ دیا ہے۔"

نور کا سر ان کے سینے پر تھا۔ وہ اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ آنکھوں کے کنارے جل ہی نہیں رہے تھے، بھیگ بھی رہے تھے۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ "دیکھو، قدرت بھی کیا کیا منظر دکھاتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کو ہمیشہ بُرا کہا..... اس وجہ سے ہمیشہ تم سے خفا رہا مگر..... تمہارے اسی شوق کی وجہ سے اس رات ہم سب نے نئی زندگی پائی۔ جو کام کوئی اور نہ کرسکا، وہ تم نے کیا۔ میں ان لمحوں کو کبھی بھول نہیں سکتا نور۔ اگر تم ان کے ہاتھ آجاتیں تو..... تو....." وہ اس سے آگے کچھ بول نہ سکے اور چند لمحے کے لیے رقت آمیز کیفیت میں رہے۔

تب سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"انسان خود کو عقلِ کل سمجھتا ہے اور قدرت اسے بتاتی ہے کہ اس کی فہم و دانش کی کیا حقیقت ہے..... پتا نہیں کیوں آج مجھے لگتا ہے کہ تم اس رویّے کی حقدار نہیں تھیں جو میں نے اب تک تم سے اپنائے رکھا....."

"ابو جی! اب چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ سب ماضی کا حصہ ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بس آپ کی بیٹی ہوں۔" اس نے اپنے گرم آنسو اپنے ابو کے سینے کو سونپ دیے۔ وہ حیران تھی کہ یہ آنسو کئی برسوں تک کیوں اس کی آنکھوں میں آزادانہ راہ نہیں پاسکے..... کیا پہلے..... وہ اپنی شناخت چاہتی تھی، اپنی ذات کو منوانا چاہتی تھی، اس کے بعد ان آنسوؤں کو راستہ ملنا تھا؟

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہ بہار کے آغاز کی ایک سہانی رات تھی۔ سارے میں موتیے اور گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ پرسوں نور کی سگائی تھی۔ ابا جان کی دیرینہ آرزو کے مطابق اس کی منگنی مولانا حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ذوالقرنین سے ہی ہونے والی تھی۔ اپنے عزم کے مطابق اس نے ابا جان اور تایا جان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ تائی راحت نے اپنے دلنشیں انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "نور..... عورت کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے جو اسے چاہتا ہے۔ نہ کہ اس سے جسے وہ چاہتی ہے۔"

اور وہ بھی جانتی تھی کہ ذوالقرنین دل کی گہرائیوں سے نور پر فدا ہے۔ اس کے کئی ثبوت تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ امناں والے کے میلے میں بھی موجود تھا اور اس موقع پر بھی موجود تھا جب طوفانی شب میں نور اس ویران پولیس چوکی کے دروازے پر دستکیں دے رہی تھی..... اور اس وقت بھی جب چوکیدار گل محمد حملہ اور ابدال کو روکنے کی کوشش میں گر چکا تھا..... وہ خاموش محبت اپنے سینے میں لیے برسوں سے اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

اور نور بھی یہی سوچ رہی تھی۔ انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے اور ایک دن شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی تھی..... تو پھر کیوں نا اس میں بڑوں کی خوشنودی شامل ہوجاتی۔

اگلے روز نور ایک اور امتحان سے دوچار ہوگئی۔ یہ بھی کڑا امتحان تھا۔ وہ تایا زاد مہرین سے مل کر واپس اپنے گھر آئے تو ملازمہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ شاید آپ کا ہے چھوٹی بی بی۔"

نور نے لفافہ دیکھا اور اس کے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ محکماتی لیٹر تھا۔ اسی مہرباں نامہرباں ادارے کی طرف سے جس نے جاب فراہم کی تھی اور جس کی نمائندگی وہ قومی کھیلوں میں کرچکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والے ٹرائلز کی بنیاد پر نہ صرف اس کی ملازمت بحال کردی گئی تھی بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ دو دوسری ایتھلیٹس کے ساتھ نیشنل اسپورٹس میں محکمے کی نمائندگی بھی کرے گی۔

یہ ایک بڑی خوشخبری تھی لیکن ایک ایسے موقع پر آئی تھی جب اس کی شادی کی تیاری ہورہی تھی۔ اس نے خود کو زندگی کے ایک مشکل ترین دوراہے پر محسوس کیا۔ خط اس کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی اور اسپورٹس دونوں کام ایک ساتھ کبھی نہیں چل سکتے۔ وہ اپنے ہونے والے سسرالیوں کے خیالات اچھی طرح جانتی تھی اور اپنے ابا جان کے مزاج کو بھی۔ وہ ان دونوں راستوں میں سے بس ایک ہی راستہ چن سکتی تھی۔ ایک جاں گسل کشمکش کے بعد اس نے وہی راستہ چنا جو اسے چننا چاہیے تھا۔ اس نے نہ صرف وہ خط پھاڑ دیا بلکہ گھر کے عقبی کمرے میں پہنچی۔ یہاں وہ سارے ایوارڈز اور ٹرافیاں وغیرہ موجود تھیں جو تایا ابا کے گھر سے واپس اس کے گھر میں آئی تھیں۔ چھوٹی امی زلفت نے یہ ٹرافیاں اس کمرے میں سجادی تھیں۔ اس نے ان ساری ٹرافیوں اور ایوارڈز کو ایک ڈبل بیڈ شیٹ میں گٹھڑی کی طرح باندھا اور تہ خانے میں

جا کر اس پرانی جستی پیٹی میں پھینک دیا جو شاید اسی کام کے لیے خالی پڑی تھی۔ اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، سینے میں جیسے دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوق سے یوں بچھڑ رہی تھی جیسے کوئی دیرینہ محبوب ساتھی سے بچھڑتا ہے۔

ملازمہ سودا سلف لینے قریبی مارکیٹ جا چکی تھی۔ اس وقت نور گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ایک الماری تک پہنچی۔ وہاں وہ امپورٹڈ اتھلیٹکس شوز رکھے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تایا ابا نے اسے یو ایس اے سے منگوا کر دیے تھے۔ یہ اس کے سب سے محبوب شوز تھے۔ وہ انہیں لے کر چھت پر چلی گئی۔ ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ دکھا دی۔ وہ جل گئے تو ان کی راکھ ایک شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ اس کے بعد کمرے میں بند ہو کر اس نے دیر تک آنسو بہائے اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ تب جاگی جب شام گہری ہو گئی اور ڈرائنگ روم میں پھر سے ڈھولک بجنا شروع ہو گئی..... اس کی منگنی میں اب بس چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے تھے اور شادی میں بھی زیادہ دن نہیں تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ شاید ان دنوں بھی ایسا ہی تھا۔ دن مختصر تھے اور شادی کی تیاری میں صبح سے شام اور پھر رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ شاپنگ ہو رہی تھی۔ دو تین بار خدیجہ بھی نور کے ساتھ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بھائی کی دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ جیسے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ایک دن وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شادی سے پہلے اپنے ہونے والے میاں سے نہیں ملو گی؟''

''وہ کیوں؟''

''بھئی، تمہاری ہچکچاہٹ اور خوف میں کمی واقع ہو جائے گی۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کے بھائی خوفناک ہیں؟''

''اگر خوفناک نہیں تو پھر تم نے سگائی کے بعد ایک بار بھی میل ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟''

''اب ایک ہی بار مل لیں گے..... اور بھگت بھی لیں گے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے..... بھگت لیں گے۔'' خدیجہ نے اس کے سر پر ہولے سے چپت لگائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نور! تم سے کہا تھا نا کہ وہ سخت ضرور ہے، کئی معاملوں میں دوٹوک رائے رکھتا ہے لیکن یہ سختی ویسی ہی ہے جیسے..... اخروٹ کی ہوتی ہے۔ اندر سے کتنا نرم اور مزیدار ہوتا ہے۔''

نور بولی۔ ''لیکن اخروٹ کی ''نرمی'' تک پہنچنے کے لیے کافی مشکل پیش آیا کرتی ہے جناب..... کچھ کی ''نرمی'' تو اپنے سخت خول سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔''

''وہ ایسا نہیں ہے نور! تم بے فکر رہو۔ بس تھوڑا سا..... ٹائم دینا اسے۔''

اور یہ نور کی شادی کی رات تھی۔ اپریل کی درمیانی تاریخیں تھیں۔ بہار کا شباب تھا..... اور شباب پر بہار تھی۔ پوری راتوں کا چاند دمک رہا تھا۔ بہار اور چاندنی کا ملاپ دلوں میں جادو جگا دیا کرتا ہے۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی میں پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے میک اپ اور بھاری گہنے وغیرہ کبھی پسند نہیں رہے تھے مگر کچھ معاملات وقت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ اسے اپنا یہ روپ بالکل بھلا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے دل و جان سے نبھانا چاہتی تھی اور پھر وہ گھڑیاں آئیں جب اس کا شریک حیات، اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ نور کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سانسوں کی آمد و رفت تیز ہو گئی۔ گلاب، گیندے اور نرگس کے پھولوں کی مہک اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی۔ سرخ جوڑے کے اندر اس کا سیمیں بدن تھا اور اس بدن کے اندر اس کا دل تھا اور اس دل میں امید کی کرنیں روشن تھیں۔ کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں ان نیلی سفید کرنوں کو دھڑکانے لگی تھیں۔ کرنیں متحرک تھیں اور جھلملا رہی تھیں۔

اس نے گھونگٹ اٹھایا۔ چند رسمی فقرے ادا کیے، ادھر پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں پر مہندی تھی اور نقرئی پازیبوں کی جھلملاہٹ تھی۔ اس نے نور سے تمام تر توجہ ہٹا کر اس کے پاؤں پر نگاہ جمالی، پھر عجیب انداز سے ان پر ہاتھ پھیرا۔

یکا یک نور کے ذہن میں ایک سیاہ جھکڑ چلا اور اس کے پورے بدن میں پھیل گیا۔

اسے لگا..... اسے لگا اس کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا ہے۔ وہی مناظر اس کے ذہن پر جھپٹے جو ایک مرتبہ غنودگی کے عالم میں اس کے پردۂ تصور پر ابھرے تھے۔ اس نے کہا تھا، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی کہ تمہیں پانے کے بعد کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا مجھے ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ ہماری جدائی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں..... اور پھر.....

... خون کی پچکاریاں اور نور کی اپنی ہی آہ و بکا اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنے کے اوپر سے کاٹ ڈالے گئے تھے۔ نہ رہیں گے پاؤں، نہ بھاگے گی تُو..... نہ بھاگے گی تُو۔

تو کیا آج وہی تصور حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا..... یا اس تصور جیسا کوئی اور بے رحم منظر سامنے آنے والا تھا؟ پھولوں کی لڑیوں کے درمیان سے نور کو ذوالقرنین کی پشت نظر آرہی تھی۔ اس کی کریم کلر شیروانی، اس کی ہموار ڈاڑھی کی ایک سائڈ اور اس کا ایک ہاتھ جس میں ایک چابی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ان کے تاثرات۔ اس نے چابی سے الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکال لیا۔ وہ دیکھ نہیں سکی۔ اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کیا نکالا تھا؟ کیا ایک تیز دھار چاپر..... یا اس جیسی کوئی اور چیز؟ نہیں، وہ چاپر نہیں تھا۔ وہ ایک ڈبا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی گہرا سرخ خون جو اس کے عروسی لباس کا تھا..... مگر نہیں، وہ سرخ خون نہیں تھا۔ وہ تو سرخ رنگ کا ڈبا تھا جس کے نیچے کی طرف سفید دھاریاں تھیں۔ وہ ڈبا لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے کھولا..... اس میں اسٹھلیٹک شوز تھے۔ امپورٹڈ، سفید رنگ کے یو ایس اے کے بنے ہوئے، اسپرنٹرز کے لیے مخصوص۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ نہیں، یہ حقیقت تھی۔ ذوالقرنین نے شوز نکالے۔ عجیب نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ محبت سے مسکرایا اور بولا۔ ''پاؤں آگے کرو نور۔''

وہ ششدر تھی۔ کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

کون کہتا ہے محبت لوگوں کو نہیں بدلتی؟

محبت لوگوں کو بدلتی ہے۔

ان کی سوچوں کو بدلتی ہے۔

ان کے خیالات کی سب سے گہری پرتوں میں بھی اتر جاتی ہے اور وہاں نئے معیار ایجاد کرتی ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہے۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند روز کے اندر ہی وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئے تھے کہ نور سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ شریک حیات کے لیے جو ایک موہوم سا آئیڈیا نور کے دل و دماغ میں ابھرا کرتا تھا، نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس آئیڈیل کی جگہ حقیقت نے لے لی تھی اور حقیقت خوبصورت تھی۔ اس شخص سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلنواز تھی جو کبھی ایک میگزین کے اسپورٹس انچارج کے طور پر اس کے سامنے آیا تھا..... اب وہ اس کا نام بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔

''ماشاء اللہ۔'' ذوالقرنین نے اس کے عقب میں آکر کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چونک گئی۔ ڈریسنگ میز کے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کھانے کی ایک دعوت پر جارہے تھے۔ نور نے ہمیشہ کی طرح بہت ہلکا میک اپ کیا تھا۔ چوڑیاں اور جھمکے پہننا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ یہ بھی نہ پہنتی۔ اس معمولی تیاری کے ساتھ بھی وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ ذوالقرنین نے کندھوں سے تھام کر اسے اور اس کے سنگھار کو سونگھا پھر ایک فرحت بخش سانس لے کر بولا۔ ''اللہ آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ میں اپنی قسمت پر ناز کرسکتا ہوں۔''

''کیا اب مجھے شکریہ ادا کرنا ہوگا؟'' وہ مسکرائی۔

''نہیں۔ صرف، میری شیروانی کا اوپر والا بٹن بند کرنا ہوگا۔'' وہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

نور نے اس کی خوبصورت تراش کی براؤن شیروانی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ جچ رہا تھا۔ نور نے شیروانی کا بالائی بٹن ذرا زور لگا کر بند کیا۔ کالر تھوڑا سا ٹائٹ تھا۔ وہ مصنوعی انداز میں کراہنے لگا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اتنے تنگ گلے والی شیروانی میرے سسرالیوں نے سازش کے تحت سلوائی ہے..... جب مجھ سے پیچھا چھڑانے کو دل چاہے گا، آپ مجھے یہ شیروانی پہننے کے لیے دے دیں گی۔''

''آپ زیادہ ڈراما نہ کریں۔ ہاں، یہ ہے کہ دو ماہ پہلے کے حساب سے تھوڑا سا وزن بڑھ گیا ہے آپ کا۔''

''آپ اتنا اچھا پکاتی ہیں تو پھر یہی کچھ ہوگا۔'' اس نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''چلیں، اب دیر ہورہی ہے۔ خدیجہ اور خالہ نیچے انتظار کررہی ہوں گی۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور آئینے کے سامنے دوبارہ لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

وہ بولا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ صبح آپ نے ایف اے ایس بھی جانا ہے، کتنے بجے اٹھنا ہوگا؟''

''چھ بجے سے پہلے۔'' وہ مسکرائی۔ ''کل رننگ سیشن بھی ہونا ہے۔''

''یا خدا..... یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟'' ذوالقرنین نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کتنا Cool لگ رہا تھا۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بار بار

''پر انہوں نے وعدہ کیا تھا۔''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے..... مگر نور! وہ تم سے خوش ہے۔ تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔''

اناؤنسمنٹ ہوگئی کہ فائنل ریس میں حصہ لینے والی اسپرنٹرز ٹریک پر آجائیں۔

دیگر لڑکیوں کی طرح نور بھی پہنچ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ابو جان یہاں آئیں۔ انہوں نے اسے نیک دعاؤں سے رخصت کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے جلدی واپس آگئے تو اسٹیڈیم پہنچیں گے۔

نور نے ان کی دی ہوئی دعاؤں کو یاد کیا اور ان کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دعا اور بددعا میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ابو جان کی دعائیں اس کے ساتھ نہیں تھیں..... نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول پھپھو حاجرہ ایک بددعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرنٹرز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہوسکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آرگومنٹ کررہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

''کیا ہوا تایا ابا؟'' وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تماشائیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وی آئی پی کی تیسری یا چوتھی رو میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آگئے تھے..... وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے..... نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے ناخنوں سے اٹھی اور سر کے بالوں تک چلی گئی۔

لاہور کی اس چمکیلی سہ پہر میں آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تھے۔ پوزیشن لینے کا اعلان ہوا۔ اسپرنٹرز نے اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے، آگے کو جھکیں، اسٹارٹنگ لائن کو چھوا۔ سیکنڈ پوزیشن لی اور ان کی سماعتیں فائر کی آواز سننے کے لیے تیار ہوگئیں۔ یہ سب کچھ وہی تھا۔ وہی پوزیشن، وہی ٹریک، وہی تماشائی، وہی دور سے نظر آتی ہوئی فنش لائن کی جھلک لیکن آج ایک چیز نور کے لیے مختلف تھی۔ آج ایک شخص یہاں موجود تھا..... اور آج ایک تھپکی یہاں موجود تھی۔ اور یہ اس محترم شخص کی تھپکی تھی جس نے اسے جنم دیا تھا۔ جس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی تھی۔ جس کو وہ کچھ بن کر دکھانا چاہتی تھی، جس کی نگاہوں میں وہ اپنی ستائش دیکھنے کے لیے ہمیشہ ترسی تھی۔ کبھی بچپن میں بے تکی شرارتیں کی تھیں، کبھی بندر کی طرح اچھل کودی تھی۔ کبھی نیک پروین بن گئی تھی، کبھی جھگڑے کیے تھے اور بے ڈھنگے لباس پہنے تھے، کبھی کوئی انوکھا ہنر سیکھنا شروع کردیا تھا..... ابو! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، ابو میری طرف بھی دیکھیں..... ابو! میں تیسری ہوں لیکن آپ کی ہوں..... اس ایک ذرا سی زندگی کے مختلف مرحلوں میں جو کچھ بھی کیا تھا، ان کی نگاہوں میں آنے کے لیے ہی تو کیا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ ان سے دور سے دور ہوتی چلی گئی تھی اور پھر میلے والا واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی برسوں پرانی آرزو میں پوری کردی تھیں۔ [illegible] بوسے اس کا ماتھا چوما تھا۔ آج اسے ایک اور موقع ملا تھا اپنے ابو کی نگاہوں میں اپنا مقام مستحکم کرنے کا۔ اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آج کچھ کر گزرے گی..... آج سب کچھ وہی تھا جو پہلے ایونٹس میں ہوا کرتا تھا لیکن آج ایک شخص یہاں موجود تھا اور آج ایک تھپکی اسے مل رہی تھی۔

پھر وہ بھاگی..... اس کا دل کہہ رہا تھا، کوئی انہونی نہ ہوجائے ورنہ آج اسے کوئی ہرا نہیں سکے گا۔ اس نے اپنی سخت ترین حریف نشو بجلی کو دیکھا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے تھی۔ بڑی تیزی سے پاس آرہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ نصف فاصلے کے بعد اپنا مومنٹم بڑھاتی تھی اور مارجن Cover کرلیتی تھی۔ آج وہ پھر وہی کررہی تھی۔ اسپرنٹرز کے لیے بھاگنے کے دوران میں بولنا آسان نہیں ہوتا لیکن نور نے نشو کو کن انکھیوں سے دیکھا اور گرجی..... میں چینڈو ہوں..... شادی شدہ بھی ہوں لیکن آج ہراؤ مجھے..... ماں کا دودھ پیا ہے تو ہراؤ مجھے۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی..... اور پھر فنش لائن کا فیتا نور کے سینے سے ٹکرایا تھا.....

یہ وہی ساعتیں تھیں جن میں صدیوں پرانے سپنے پورے ہوتے ہیں، یہ وہی لمحے تھے جن میں شکستوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مستقل مزاجوں کے قدم چومتی ہے اور یہ وہی وقت تھا جب سر بے ساختہ سجدۂ شکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔

نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پُرجوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت ترسی تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مسکرانے لگا۔

ختم شد

سنگین مذاق

طاہر جاوید مغل

کبھی کبھی رائی سے بننے والے پہاڑ کسی کی پُرسکون زندگی اس طرح تہس نہس کر دیتے ہیں جس کا گمان شاید ہی کبھی کسی نے کیا ہو... وہ جو بے فکری کے دن چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور موج مستی میں گزارتے تھے اور... زندگی کی کتاب کو بہت ترتیب سے سنوار رہے تھے... بہت اونچے ارادوں اور خوبصورت خوابوں سے مزین لمحات میں... کیا خبر تھی کہ ایک معمولی سا مذاق اس طرح گلے میں پھانسی کا پھندا بن جائے گا کہ سارے خواب... سارے رشتے... اور بچپن کے رستے... سب کچھ بکھر جائے گا... ایک ذرا سی دل لگی اس طرح دل کی لگی بن جائے گی کہ لوگ خون کی ہولی کھیلنے پر اتر آئیں گے... وہ جو طاقت کے گھمنڈ میں معمولی انسانوں کو حقارت سے چیونٹی کے مانند مسلنے کے عادی تھے پھر کیسے اپنے سب سے بڑے دشمن کی خطا کو معاف کر دیتے... ان معصوم دلوں میں محبت کے چھوٹے سے جلنے والے چراغ نے جانے کتنی ہی زندگیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا... لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی راکھ میں چاہت کی چنگاریوں کو وہ پھر بھی بجھا نہ پائے۔

رنگین مذاق سے شروع غمگین واقعات پر مشتمل

ایک داستان کی عبرت اثر سنگینی





میں اور کمالی بچپن کے دوست ہیں۔ ہم نے جو کام کیا، اکٹھے کیا۔ اب بھی ہم جو تماشے لگاتے ہیں، مل کر ہی لگاتے ہیں۔ میں انیس کا ہوں اور کمالی مجھ سے قریباً ایک سال بڑا ہے۔

آج ہم نے جو تماشا لگایا تھا وہ بریانی کی ایک دکان پر تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ شاپ کا مالک بھاری بھرکم مونچھوں والا ایک ادھیڑ عمر خان تھا۔ دو تین ملازم لڑکے اور دو تین گاہک بھی دکان پر موجود تھے۔ خان صاحب بریانی کی دیگ کے قریب بیٹھے گاہکوں سے مل وصول کر رہے تھے۔ میں اور کمالی طے شدہ پروگرام کے مطابق دکان میں داخل ہو گئے۔ میرے ہاتھ میں "ٹیک اوے" بریانی کا ڈبا تھا جو میں ابھی دس منٹ پہلے یہیں سے لے کر گیا تھا۔ جو تماشا میں اور کمالی لگانے جا رہے تھے، اسے آج کل عرفِ عام میں "پرینک" کہا جاتا ہے۔ ہم دونوں بھی پرینک کرتے تھے۔ خیر سے ہمارا ایک چھوٹا سا یوٹیوب چینل بھی ہے۔

کمالی ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا اور موبائل کا کیمرا کاؤنٹر کی طرف سیٹ کر لیا۔ میں نے غصہ آمیز سنجیدگی کے ساتھ بریانی والا ڈبا خان صاحب کے سامنے رکھا۔ "دیکھو خان صاحب! یہ آپ کیا کھلا رہے ہیں لوگوں کو۔" میں نے ڈبے میں موجود مُردہ کاکروچ کی طرف اشارہ کر کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

خان صاحب کے چہرے پر بے پناہ پریشانی اور حیرت نظر آئی۔ "اوہ خدائی خوار! یہ کیا بات کر رہا ہے تم؟ ہمارے کھانے میں کبھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ جو بھی گڑبڑ ہوا ہوگا، بعد میں ہوا ہوگا۔"

"یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں آپ سے؟ میری کوئی دشمنی چل رہی ہے جو آپ پر یہ بہتان لگا رہا ہوں۔" میرا لہجہ غصیلا تھا۔

"دیکھو، آہستہ بولو۔ ہمارا کاروبار خراب مت کرو۔ تم کو یقیناً غلط فہمی ہوا ہے..... ہم نے....."

"پلیز، خان صاحب پلیز! یہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات ہے۔ ایک تو آپ لوگوں کو زہر کھلا رہے ہیں اوپر سے یہ سینہ زوری۔"

پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ بات بڑھتی چلی گئی۔ سرگوشیاں ختم ہوئیں، آواز بلند ہو گئی پھر تند و تیز ہو گئی۔ خان صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا تھا۔ قریباً آٹھ دس منٹ کی ویڈیو بن گئی۔ جب کام زیادہ بھڑک گیا تو حسبِ معمول میں نے یکایک خان صاحب کا بازو تھاما اور پھر انہیں گلے سے لگا لیا۔

وہ سخت طیش اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے انگلی سے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھیں جی کیمرا..... وہ سامنے..... ہم یوٹیوب کے لیے ویڈیو بنا رہے تھے..... پرینک کر رہے تھے۔ گستاخی کی معافی۔"

خان صاحب ایک بار تو حیرت کے ریلے میں بہے پھر غصہ عود کر آیا۔ مجھے پیچھے ہٹا کر بولے۔ "یہ کیا پاگلپنا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے۔ پہلے کسی کا جان نکالتے ہو پھر اپنے دانت نکال کر کہنے لگتے ہو..... وہ دیکھو کیمرا..... وہ دیکھو کیمرا..... نہیں دیکھتا م تمہارا کیمرا..... جاؤ، ہمارا مغز خراب مت کرو۔"

حسبِ معمول کمالی بھی موبائل بند کرتا ہوا آ گیا اور خان صاحب کے کندھے وغیرہ دبا کر انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ یہ کام وہ بڑے اچھے طریقے سے کر لیا کرتا تھا۔

خان صاحب کے چہرے پر کچھ بشاشت نظر آنے لگی لیکن تب پھر ان کے رویے میں چند ایک چنگاریاں چمکنے لگیں۔ بریانی شاپ کا ایک لڑکا اندر سے آیا اور اس نے خان صاحب کو بتایا کہ پچھلے ہفتے ان کی ڈرائی فروٹ والی شاپ پر بھی ہم نے ایسا ہی "پرینک" فرمایا تھا اور کافی پریشان کیا تھا۔

خان صاحب جو اچھے بھلے مسکرانے لگ پڑے تھے، پھر لیے دیے نظر آئے۔ کچھ دیر پہلے ہم دونوں کو شک گزرا تھا کہ شاید وہ ہمارے لیے کوک وغیرہ بھی منگوائیں گے مگر اب وہ پند و نصائح کے ساتھ فوراً رخصت کر دینا چاہتے تھے۔

ہم لوگوں کے موڈ کے ایسے اتار چڑھاؤ سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے لہٰذا خان صاحب سے فوری مصافحے میں ہی عافیت سمجھی اور نکل آئے۔

میرا نام جمال اور میرے یار کا اکمل ہے۔ جب ہم گاؤں میں تھے تو لوگ ہم دونوں کو جمالی اور کمالی کی جوڑی کہتے تھے۔ ہمارا دوستانہ مشہور تھا۔ کمالی جب چار پانچ سال کا تھا تب اس کے والدین ایک حادثے کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہمارے گھر میں ہی پل بڑھ کر جوان ہوا۔ میرے لیے وہ میرے بھائیوں جیسا تھا بلکہ بھائیوں سے بھی بڑھ کر۔ مجھے بچپن کی ایک بات آج بھی یاد ہے۔ میری والدہ جب بھی کبھی کہتی تھیں کہ کمالی تمہارا بھائی ہے تو مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں بھنا کر کہتا تھا۔ "وہ میرا بھائی نہیں، میرا دوست ہے۔" اس عمر میں میرا خیال یہی تھا کہ دوست کا درجہ بھائی سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ لڑائی بھڑائی میں ہم

دونوں ہی تیز تھے۔ ہم عمروں میں کوئی آکڑ خان ہوتا تو عموماً اس سے ہمارا متھا لگ جاتا۔

تو بات ہو رہی تھی پریکٹ کی اور یوٹیوب چینل کی۔ دھیرے دھیرے یہ ہلکے پھلکے ہنسی مذاق والے پریکٹ ہمارا فل ٹائم جاب بنتے جا رہے تھے۔ چینل سے کوئی کمائی وغیرہ تو نہیں ہو رہی تھی لیکن امید تھی کہ کچھ عرصے میں تھوڑی بہت ہونے لگے گی اور امید پر ہی دنیا قائم ہے۔

خان صاحب والے پریکٹ کے بعد اگلے دو ہفتوں میں ہم نے چار پانچ کامیاب پریکٹ اور کیے۔ ان میں سے دو ایسے تھے جن میں کافی جان تھی۔ انہیں ہم نے چینل پر بھی ڈال دیا۔

مجھے یاد ہے وہ نومبر کی ایک چمکیلی سہ پہر تھی۔ ہم نے مغل پورہ کے علاقے میں گرم کپڑوں کی ایک دکان پر پریکٹ کیا۔ یہ لوگ کپڑے کی سلائی بھی کرتے تھے۔ میں نے یہاں سے گرم شلوار قمیص سلوائی تھی اور ایک دن پہلے سلائی شدہ جوڑا لے کر گیا تھا۔ حسب معمول کمالی اپنے موبائل کیمرے کے ساتھ میرے ہم رکاب تھا۔ میں نے سلا ہوا سوٹ جا کر کاؤنٹر پر پھینکا۔ ٹیلر ماسٹر سے کہا۔ "یار! یہ کس اسکول سے ٹیلری سیکھی ہے آپ نے؟ مجھے تو ٹیلر ماسٹر کم اور مزاحیہ فنکار زیادہ لگتے ہیں۔"

ٹیلر ماسٹر کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ "ہوا کیا ہے بھئی؟" وہ پریشان ہو کر بولا۔

میں نے شلوار اس کے سامنے پھیلائی۔ "یہ دیکھو، سامنے کی طرف زپ تو پینٹ میں ہوتی ہے۔ کیا کبھی کسی نے شلوار میں بھی ایسی زپ لگائی ہے؟ اور یہ دیکھیں..... یہ دیکھیں قمیص۔ اس کی "چیسٹ پاکٹ" آپ نے خیر سے کمر کی طرف لگا دی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ یار! آپ بھنگ وغیرہ تو نہیں پیتے یا پھر کسی بھٹکی شاگرد سے سوٹ سلوایا آپ نے؟"

ٹیلر ماسٹر کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر موجزن تھا۔ کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی اپنی بائیں جانب مشینوں پر بیٹھے دو تین ہیلپرز کی طرف دیکھتا تھا۔ وہ بھی حیران پریشان تھے۔

آخر ٹیلر ماسٹر نے غصے سے کہا۔ "اگر یہ مذاق ہے تو بڑا بھونڈا ہے۔ کیا آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اندھے ہیں۔ یہ..... یہ جیب والی غلطی بھی ہم سے آج تک نہیں ہوئی۔ لیکن یہ شلوار میں پینٹ والی زپ.....؟ یہ تو ناممکن ہے۔ یہ تم سے کسی نے گھر میں شرارت کی ہوگی۔"

"دیکھو بھائی صاحب! گھر تک نہ پہنچو۔ ایک تو غلطی اوپر سے سینہ زوری۔"

اس کے بعد وہی تُو تُو، میں میں تھی۔ اب میں کلائمیکس کے قریب تھا جس کے بعد میں نے لال بھبوکا ٹیلر ماسٹر کو گلے سے لگانا تھا اور اسے بتانا تھا کہ وہ دیکھو سامنے کیمرا لگا ہوا ہے لیکن اس مصالحتی عمل سے ایک آدھ منٹ پہلے ہی بالکل غیر متوقع طور پر ایک دھماکا ہو گیا۔

کہیں اندر سے کسی نے بھاری آواز میں ٹیلر ماسٹر کو مخاطب کیا۔ "ارشاد! یہ کیا طوفان مچا ہوا ہے یہاں؟" ساتھ ہی بھاری قدموں کی آواز تھی جو قریب آتی جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یقیناً کمالی کے بھی ہو گئے ہوں گے۔ وہی بریانی والے خان صاحب ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ پہلے ان کے چہرے پر تحیر اور پھر شدید ترین غصہ نمودار ہوا۔ ان کا جاہ و جلال اور انداز اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس دکان کے "اونر" بھی وہی ہیں۔ کمالی کی صلح صفائی والی صلاحیتیں ایسے موقع پر پوری طرح بیدار ہو جاتی تھیں۔ وہ فون جیب میں ڈال کر جلدی سے آگے گیا لیکن اس مرتبہ ایسی کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ خان صاحب کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔ ان کے حکم پر ان کے ملازموں نے سب سے پہلے تو کمالی کو دبوچا کہ موبائل اسی کے پاس تھا پھر وہ میری طرف آ گئے۔

خان صاحب دہاڑے۔ "پکڑو ان کمینہ رنگ بازوں کو۔ ام کو جانتا نہیں یہ خدائی خوار! آج ان کا چٹنی پولیس اسٹیشن میں بنواؤں گا۔"

وہ ہم لوگوں کو کافی ہلکا لے رہے تھے۔ ہٹا کٹا گارڈ میری طرف آیا تو میں نے جھکائی دے کر اس کا مکا بچایا اور پھر اپنے کندھے کی چوٹ سے اسے دو تین قدم پیچھے پھینک دیا۔ جن لڑکوں نے کمالی کو دبوچا تھا، انہیں بھی دو چار ٹکڑی چوٹیں لگیں۔ اس نے ایک لمبے نوجوان کو جو شاید خان کا بھتیجا وغیرہ تھا، بازو سے پکڑ کر زور سے گھمایا۔ وہ کاؤنٹر پر پڑے شٹیل کے تھانوں پر گرا۔ ملائم تھان حسیناؤں کے بالوں کی طرح کھلتے اور بکھرتے چلے گئے۔

خان صاحب نے ایک قینچی پکڑی اور ہم پر جھپٹے۔ تب تک ہم سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ "پکڑو ان کو۔ جانے نہ پائیں۔" خان صاحب چنگھاڑے۔

اگلے تین چار منٹ کافی ہنگامہ خیز تھے۔ گارڈ سمیت تین چار مشتعل افراد ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ پہلے ہم تنگ گلیوں میں بھاگے پھر گندے نالے کی طرف نکل آئے۔ یہاں کمالی نے ایک موٹر سائیکل سوار انکل کو دھکا دے کر

موٹر سائیکل سے گرایا اور موٹر سائیکل سنبھال لی۔ میں بھی لپک کر عقب میں سوار ہو گیا۔

خیال تھا کہ ہم فلمی انداز میں اس "چیزنگ" سے بچ نکلیں گے مگر ایسا ہوا نہیں۔ دو منٹ بعد ہمیں پتا چلا کہ خان صاحب سفید جیپ پر سوار آندھی کی طرح ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ ڈرائیونگ یقیناً ان کا ڈرائیور کر رہا تھا۔ ایک یا دو بندے اور بھی جیپ میں سوار تھے۔ شیر طاقتور ہوتا ہے مگر جب دبلا پتلا شکار تنگ جگہوں پر پھنس جاتا ہے تو کھسیانا شیر بس کھسیانا نوچ کر رہ جاتا ہے۔

آٹھ دس منٹ بعد ہم شالامار باغ کے قریب سے گزر کر مضافاتی علاقے میں نکل آئے۔ تعاقب کرنے والے وارفتہ والا کے آس پاس ہی کہیں سٹک گئے۔

شیر سے بچ جانے والے شکار کی طرح ہم نے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ کر گہری سانسیں لیں اور موٹر سائیکل کی فیول ٹینکی میں جھانکا کہ واپسی کا پیٹرول بھی ہے یا نہیں۔ پیٹرول موجود تھا۔ نومبر کی مختصر سہ پہر تیزی سے شام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کیکر، شیشم کے درختوں اور دھان کے کھیتوں کے پار دور مغربی افق پر سورج کا نارنجی گولا آہستہ آہستہ منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے دن بھر کا تھکا ماندہ نوجوان محنت کش اپنے گھر کی طرف جا رہا ہو، جھک رہا ہو اپنے پہلے بچے کی روشن پیشانی کی طرف اور اپنی بیوی کے راحت بخش ہونٹوں کی طرف۔

ہم "بھاگم بھاگ" میں قریباً اسی سڑک پر پہنچ گئے تھے جو ہمارے گاؤں سے نکلنے والی پتلی سڑک کو اپنی بغل میں لیتی تھی۔ اب طبیعت ہلکی پھلکی تھی۔ درختوں ہی درختوں میں موٹر بائیک چلا کر ہم اس دوراہے کے پاس پہنچ گئے جہاں وہ پتلی سڑک موجود تھی اور لاہور جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔ اس دوراہے پر ایک چھوٹا سا رنگ آلود بورڈ لگا تھا "بھاڑ گھر، سولہ کلومیٹر"۔ بائیں طرف درختوں سے گھری ہوئی تنگ، خستہ حال سڑک جیسی بھی تھی، ہمیں بہت پیاری لگی کیونکہ وہ اس گاؤں سے ملتی تھی جہاں ہماری جنم بھومی تھی، جہاں ہماری بے شمار یادیں تھیں۔

اب موٹر سائیکل میں چلا رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کا رخ اس تنگ سڑک کی طرف کر دیا اور ڈیڑھ دو سو فٹ آگے جا کر رک گیا۔

"تھوڑا آگے چلیں کمالی؟" میں نے کہا۔

"نہیں یارا" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "جس گاؤں جانا نہ ہو، اس کا پتا پوچھنے سے اور اس کی طرف رخ کرنے سے کیا فائدہ؟"

"چلو، ایک دو کلومیٹر ہی سہی۔" میرا بھی دل گرفتہ تھا۔

اس نے میری گردن دبوچی۔ "زیادہ دیوداس نہ بن۔ چل موڑ واپس..... اور یہ بھی نہ بھول موٹر سائیکل تھکی ہوئی ہے۔ پانچ دس منٹ کے اندر اس سے چھٹکارا پانا ہے نہیں تو مہینوں کے لیے پتلی دال اور سڑی ہوئی روٹی کھانی پڑ جائے گی۔"

میں نے دور جاتی تنگ سڑک پر ایک نظر ڈالی۔ ایک آہ بھری پھر اپنے منہ موبائل سے درختوں کے درمیان ملی کھاتی تنگ سڑک کی دو تصویریں اتاریں اور موٹر سائیکل کا رخ پھیر لیا۔ ذہن میں کچھ جھماکے سے ہو رہے تھے۔ ایک کھیت سرسوں کے زرد پھولوں والا، ایک سانپ، ایک دلکش لڑکی روٹی چلاتی ہوئی..... اور پھر گاؤں کا وہ دبنگ چودھری مجھے اپنے گماشتوں سے بے طرح پٹواتا ہوا۔ میں پرانی ٹانکوں کے رنگ دار فرش پر ماہی بے آب کی طرح..... پھر ایک عورت اپنا دوپٹا چودھری کے پاؤں میں ڈالتی ہوئی اور... پھر ایک جنازہ..... ہاں ایک جنازہ اور ایک قسم۔

☆☆☆

ہم نے گڑھی شاہو کے پاس ایک چھوٹا فلیٹ 14 ہزار روپے ماہوار کے عوض کرائے پر لے رکھا تھا۔ ایک چھوٹی سی موٹر سائیکل بھی ہمارے پاس تھی۔ شام کے بعد میں تو یوٹیوب اور ٹک ٹاک وغیرہ پر ہی مصروف رہتا تھا تاہم کمالی ایک بڑے ریسٹورنٹ کے لیے ڈیلیوری بوائے کا کام کرتا تھا۔ اس آمدن سے گزارہ ہو رہا تھا۔ ایک اچھا موبائل بھی ہمارے پاس موجود تھا مگر خان صاحب والے واقعے میں مسئلہ یہ ہوا تھا کہ موبائل کی اسکرین ٹوٹ گئی تھی۔ دس بارہ ہزار سے کم کا خرچہ نہیں تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ فلیٹ کے مالک نے کرائے میں پر یکمشت دو ہزار کا اضافہ کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس صورت حال میں ایک غیبی مدد یہ ہوئی کہ اپنے ہی جیسے ایک "لفنڈر" یاسر پنڈی وال سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ اس کے پاس ایک اچھا آئی فون موجود تھا۔ وہ سر چھپانے کے لیے بھی کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم اسے شکی کرائے دار بنا کر اپنے فلیٹ میں لے آئے۔ یاسر ایک لاک ماسٹر کا شاگرد بھی رہ چکا تھا۔

ایک دو ہفتوں میں ہی یوں لگنے لگا کہ یاسر جنم جنم سے ہمارے ساتھ ہے اور یوٹیوب والی دنگا مستیاں کر رہا ہے۔ ایک روز ایک عجیب سچویشن بنی۔ ہم نے ایک بیکری میں پریک کیا۔ موبائل کیمرا حسب معمول کمالی کے پاس تھا

جو ایک مناسب جگہ پر کھڑا ہو چکا تھا۔ یاسر بھی ہیلپر کے طور پر بیکری میں ہی موجود تھا۔ میں نے چکن رول والا ڈبا اسسٹنٹ منیجر کے سامنے رکھا۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" اسسٹنٹ منیجر نے گھبرا کر کہا۔

"بدتمیزی آپ کے اس ڈبے میں ہے، ملاحظہ فرمائیں۔" میں نے ڈبا کھولا اور ایک چکن رول نکال کر منیجر کی ناک کے قریب کیا۔ بو کے سبب منیجر نے برا سا منہ بنایا پھر اس نے دائیں بائیں دیکھ کر دوسرا چکن رول اٹھایا پھر تیسرا۔ باقی چکن رول بالکل ٹھیک تھے اور یہ میں آدھا گھنٹا پہلے ہی یہاں سے لے کر گیا تھا۔ باسی چکن رول چار دن پہلے کا تھا جو ہم نے ڈبے میں گھسایا تھا۔

بحث شروع ہوئی۔ اسسٹنٹ منیجر حیران تھا کہ باسی چکن رول کیسے "پیک" ہو گیا۔ وہ مجھے بار بار آواز دھیمی رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اسی دوران میں یاسر بھی آ گیا۔ میری تائید کرتے ہوئے بولا۔ "گستاخی معاف، محترم منیجر صاحب! پچھلے ہفتے میرے چکن سموسوں میں سے بھی ایک سموسا ایسا ہی قدیم نکل آیا تھا۔ یہ بہت نچلے درجے کی حرکت ہو رہی ہے آپ کی بیکری میں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو پولیس کیس بھی بن سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ہماری بات بیکری کے مالک سے کرائیں۔"

ہیڈ سیل مین بھی آ چکا تھا۔ دونوں کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان پر "پریک" کا انکشاف کرتے، منیجر نے مجھے بازو سے پکڑا اور دفتر میں لے گیا۔ دو منٹ بعد ہزار ہزار کے دس نوٹ اس نے زبردستی میری جیب میں ٹھونس دیے۔ اس کے ساتھ ہی منت سماجت بھی کی کہ ہم اس بات کو بس یہیں پر دبا دیں۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے اسسٹنٹ منیجر کی منت اور رشوت دونوں قبول کر لیں۔

رات کو واپس فلیٹ آ کر ہم تینوں دیر تک اس دلچسپ صورتِ حال کے بارے میں سوچتے رہے، مٹن کڑاہی کھاتے رہے اور انار کا جوس ڈکارتے رہے۔

میں نے سگریٹ پھونکتے ہوئے کمالی کو یاد دلایا۔ "ایسا ہی ایک واقعہ عید کی چاند رات کو بھی پیش آیا تھا۔"

"ہاں، تب بھی ایسی توقع بالکل نہیں تھی۔"

یاسر کا تجسس جاگ اٹھا تھا۔ وہ اس واقعے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اب یاسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ میں نے اسے بتایا۔ "ہم نے چاند رات کو لبرٹی مارکیٹ میں یہ پریک کیا تھا۔ ایک اور نک ٹاکر لڑکے مٹھو کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔ میں سیاہ جینک پہن کر موٹر بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھ جاتا تھا۔ پارکنگ میں جونہی کوئی کار ریورس ہوتی تھی، مٹھو موٹر بائیک ہولے سے پچھلے بمپر پر ٹکرا دیتا تھا۔ ہم دونوں گر پڑتے تھے۔ میری سیاہ جینک بھی گر جاتی تھی۔ میں دہشت زدہ ہو کر مٹھو کو بتاتا تھا کہ مجھے پھر سے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ کار سوار ششدر رہ جاتا تھا کہ اتنی معمولی ٹکر سے لڑکے کی بینائی کو کیا ہوا ہے؟ مٹھو بتاتا تھا..... "دو ہفتے پہلے میرے ساتھی کی دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ اب یہاں ایک دم گرنے سے اس کی بینائی کا مسئلہ پھر ہو گیا ہے۔"

"اچھا بھلا سیاپا پڑتا تھا پھر ہم کیسرا دکھا دیتے تھے مگر ہمارے ان شکاروں میں سے ایک امیر زادہ ایسا نکلا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بوکھلا گیا۔ پریک شروع ہوتے ہی وہ مٹھو کو ایک طرف لے گیا اور پھر منت سماجت کر کے پانچ ہزار والے چار نوٹ مٹھو کی جیب میں گھسا دیے۔ مزید تعاون کے لیے اپنا فون نمبر بھی دیا۔"

اس واقعے کی یاد تازہ ہوئی تو کمالی کچھ زیادہ تیزی سے سگریٹ پھونکنے لگا۔ کڑاہی گوشت کے بعد سبز چائے کی حرارت سے اس کا دماغ شاید کچھ اور روشن ہو گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد دبے دبے جوش سے بولا۔ "یار جمالی! یہ ٹیوب والے تو ابھی تک ہم سے بیگار ہی لے رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم "ٹو ان ون" والا کام کریں۔"

کمالی نے ابھی وضاحت نہیں کی تھی مگر بات کافی حد تک میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ ہم دونوں کی سوچوں کی فریکوئنسی اکثر ایسے ہی مل جاتی تھی۔

"ٹو ان ون سے کیا مطلب؟" یاسر نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ پریک تو کیے جائیں لیکن..... پریک کے دوران میں اگر کہیں کوئی جیک لگ جائے تو وہ بھی لگا لیا جائے۔"

"یعنی اگر کوئی خوفزدہ ہو کر دے دلا دے تو وہ بھی قبول فرما لیا جائے؟" یاسر نے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی کئی طرح کی ہیوپیشن بن سکتی ہے۔" میں نے گفتگو میں حصہ لیا۔ "امریکا میں ایک پریک کے دوران میں ایک لڑکے نے ایک سیٹھ کی کمر پر سفید موٹی چھبوئی تھی اور اس نے اپنی 50 ہزار ڈالر کی گھڑی اتار کر اسے پیش کر دی تھی۔"

"یہ تو بڑا دلچسپ ثابت ہوگا۔" کمالی نے دبے دبے جوش سے کہا پھر ذرا دھیما پڑتے ہوئے بولا۔ "لیکن واردات ہے بن جائیں گے ہم۔"

''تو یار! یہ دنیا واردات نہیں کر رہی ہم سے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''ویڈیوز ڈال ڈال کر ہلکان ہو گئے ہیں۔ فالو کرنے والوں میں کسی مہینے تین چار سو کا اضافہ ہوتا ہے، کسی مہینے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ مونا ٹائزیشن تک ہو نہیں پا رہی۔''

اس رات ہم تینوں میں جو سیر حاصل گفتگو ہوئی، اس نے ہمارے آنے والے شب و روز بدل ڈالے۔

☆☆☆

اب ہم صرف پریکٹ نہیں کر رہے تھے بلکہ پریکٹ کا بھی پریکٹ کر رہے تھے۔ یعنی جہاں موقع ملتا، چھوٹی موٹی کارروائی بھی ڈال دیتے۔ یاسر اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی ایڈونچرس تھا۔ ہم دونوں اسے یاسر وارداتیا کہتے تو وہ فخر محسوس کرتا۔

''یار! یہ جرم نہیں، ہماری ذہانت اور محنت مشقت کی کمائی ہے۔'' وہ اطمینان سے کہتا۔

ایک روز ہم نے ایک بڑا ہاتھ مارنے کا سوچا۔ یہ آئیڈیا تو یاسر کا ہی تھا تاہم اسے ''نکھارنے'' اور پالش کرنے میں کمالی کی کمال دانش نے بھی کردار ادا کیا۔

ہمارے فلیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک مارکیٹ تھی۔ وہاں کسی دکاندار کی گرے مہران کار کھڑی رہتی تھی۔ یاسر کہیں سے بالکل اسی رنگ کی گرے مہران رینٹ پر لے آیا۔ ہم نے یہ مہران دکاندار کی مہران سے آٹھ دس قدم دور اسی رخ سے کھڑی کر دی۔ جیسا کہ میں نے بتایا یاسر نے ایک اچھے لاک ماسٹر سے کام بھی سیکھ رکھا تھا۔ دو ماسٹر چابیاں اس کے پاس موجود تھیں۔ مقررہ وقت پر وہ گیا اور بڑے اطمینان سے دکاندار کی مہران میں ماسٹر چابی گھما دی۔ اب اگر کوئی اوپر سے آجاتا تو بہانہ بڑا آسان تھا۔ یاسر زبردست حیرانی کی ایکٹنگ کرتا اور پھر ہنس کر کہتا۔ ''سوری جی! میں اپنی گاڑی سمجھا تھا۔ میری تو وہ کھڑی ہے۔''

البتہ ایسے کسی مکالمے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یاسر نے اطمینان سے گاڑی کھولی، اسٹارٹ کی اور لے کر نکل گیا۔ کسی سی سی ٹی وی وغیرہ سے بچنے کے لیے اس نے سخت سردی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ ٹوپی پہن کر منہ، سر مفلر میں لپیٹا ہوا تھا۔ جو رینٹ والی مہران وہاں کھڑی تھی، اس کا تو مسئلہ ہی کوئی نہیں تھا۔ دس منٹ بعد کمالی نے اسے بھی موقع سے ہٹا دیا۔

یاسر لڑائی بھڑائی میں تو ایسا طاق نہیں تھا لیکن ویسے چلتا پرزہ تھا۔ اس نے پانچ چھ روز میں ہی گاڑی کا پرزہ پرزہ کروا کر بیچ ڈالا۔ یہ کارروائی پریکٹ تو نہیں تھی لیکن پریکٹ سے ملتی جلتی ہی تھی۔

انہی دنوں لاہور میں ایک اور ٹک ٹاکر کا بھی نام گونج رہا تھا۔ یہ کرشمہ علی تھی۔ کرشمہ بلا کی خوبصورت تھی۔ ایک لڑکا بابر اور دو تین لڑکیاں بھی اس کے گروپ میں شامل تھیں۔ کیمرا بابر کے سپرد تھا اور ویڈیوز کی ایڈیٹنگ وغیرہ کرشمہ خود کرتی تھی۔

ہمارے چینل ''کمالی جمالی پرینکس'' کی طرح اس کا چینل ''کرشمہ مرچی ویڈیوز'' بھی کافی ''گرو'' کر رہا تھا۔ ہمیں اب یوٹیوب سے تھوڑی بہت آمدن شروع ہو گئی تھی۔ کچھ ویڈیوز کے لیے لوکل اشتہار بھی مل رہے تھے۔ یہی پوزیشن کرشمہ مرچی ویڈیوز کی بھی تھی۔ ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ کرشمہ نے نئے نئے آئیڈیاز کے لیے باقاعدہ ایک ایکسپرٹ کو ہائر کر رکھا ہے۔

ایک دن میں اور کمالی ایم ایم عالم روڈ کے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے گئے۔ ڈائننگ ہال میں، میں نے ایک گوشے میں بیٹھی کرشمہ کو پہچان لیا۔ اس کے گروپ کی ہی دو تین لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں۔ میں نے کمالی کی توجہ ادھر مبذول کرائی۔ کمالی نے بھی کرشمہ کو پہچان لیا۔ اسے ایک شرارت سوجھی۔ اس نے اپنی پی کیپ کو پوری طرح پیشانی کے اوپر جھکایا۔ اسموگ سے بچاؤ کے لیے اوکا ڈکا لوگوں نے ماسک لگا رکھے تھے۔ ہم دونوں نے بھی لگا لیے۔ کمالی سیدھا کرشمہ کے پاس پہنچا۔

''سوری میڈم! آپ اچھا وقت گزار رہی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اب یہ وقت کچھ زیادہ اچھا نہیں رہے گا۔''

کرشمہ نے اپنی اٹکی نیلی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کمالی اور میری جانب دیکھا۔ نگاہیں سوالیہ تھیں۔

کمالی بولا۔ ''میں ساحر کرائم برانچ کی طرف سے ہوں۔ آپ کے خلاف رپورٹ ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شہریوں کو لوٹ رہی ہیں۔''

کرشمہ کچھ دیر تو گم صم سی ہم دونوں کی جانب دیکھتی رہی پھر اس کے گلابی چہرے پر ایک نیا رنگ نظر آیا۔ اطمینان سے کہنے لگی۔ ''ایسی ہی ایک رپورٹ ہمارے علاقے میں بھی درج ہوئی ہے۔ کمالی اور جمالی نام کے دو لفنڈروں نے علاقے کے سادہ لوح لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔''

جس طرح وہ اچانک گم صم ہوئی تھی، ہم بھی ہو گئے پھر ایک دم ہم سب بلند آواز میں ہنس پڑے۔

میں نے کہا۔ ''مس کرشمہ! جیسا آپ کے بارے میں سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ کافی تیز ہیں آپ..... اور آپ سے

زیادہ آپ کی نظر۔"

کمالی نے بھی اب ماسک اتار دیا تھا۔ "سوری ٹو ڈسٹرب جی!" وہ بولا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ اپنے ریشمی بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے گویا ہوئی۔ "ہمارا تو پروفیشن ہی ڈسٹرب کرنا ہے۔" ایک بار پھر سب ہنسنے لگے۔

"اگر برا نہ مانیں تو آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں؟" کمالی نے کہا۔

کرشمہ نے ذرا تذبذب کے ساتھ اپنی ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ انکار کردے گی مگر پھر ہم دونوں کو سرتاپا دیکھنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ویٹر نے ایک اور میز پہلی میز کے ساتھ جوڑ دی۔ ہم گپ شپ کرنے لگے۔ شروع میں گفتگو خاصی دوستانہ رہی۔ ایک دوسرے کے اچھے پرینکس پر تبصرے کیے گئے مگر پھر گفتگو میں بتدریج ہلکی سی کاروباری رقابت بھی جھلک دکھانے لگی۔ کرشمہ نے ہمارے اس مشہور پرینک کو "بے ہودہ" قرار دیا جس میں ہم کسی راہ چلتی خاتون کے پاؤں میں پلاسٹک کا چابی والا چوہا پھینک دیتے تھے اور وہ اچھلتی کودتی پھرتی تھی۔

جواب میں، میں نے کرشمہ مرچی ویڈیوز کے اس پرینک پر تنقید کی جس میں کرشمہ نے ایک غیر معمولی شوخ و آزاد خیال لڑکی کا روپ دھارا تھا اور بڑی عمر کے مردوں کو اپنے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے اکسایا تھا۔

بہرحال تیز تیکھی باتوں کے ساتھ ساتھ میٹھی میٹھی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کمالی لڑکیوں سے کم ہی متاثر ہوتا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کرشمہ کی کھٹی میٹھی شخصیت سے اثر لے رہا ہے۔ دوسری طرف شاید وہ بھی اس کی باتوں میں تھوڑی بہت دلچسپی محسوس کر رہی تھی۔ تاہم ایک بات میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ آسانی سے عشق محبت کے دھاگوں میں بندھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ دوسری طرف میں اپنے یار کمالی کو بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دل پھینک ہرگز نہیں تھا البتہ کرشمہ کے لیے اسے جو فیلنگ آرہی تھیں، ان میں رومانیت کی جھلک تھی۔

☆☆☆

ہماری مالی حالت اب بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ چینل چونکہ "مونا ٹائزڈ" ہو چکا تھا لہٰذا وہاں سے کچھ آمدن ڈالرز کی شکل میں ہونے لگی تھی۔ اس کے علاوہ ہم تینوں بھی کبھی کبھی دو نمبر کام بھی کر گزرتے تھے۔ یاسر کا تو پتا نہیں لیکن میں اور کمالی اس حوالے سے اپنے دل و دماغ پر بوجھ بھی محسوس کرتے تھے۔ چند روز پہلے یاسر نے پرینک پر بنک میں ہی ایک نوجوان لڑکے کی والدہ کو خوفزدہ کر کے اس سے بیس ہزار روپے اینٹھ لیے تھے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ وہ ایک سفید پوش بیوہ عورت تھی۔ ہم دونوں کے مجبور کرنے پر یاسر کو یہ رقم بیوہ عورت کو ٹرانسفر کرنا پڑی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کرشمہ کے چینل مرچی ویڈیوز اور ہمارے چینل کمالی جمالی پرینکس کے درمیان ایک طرح کا مقابلہ بھی چل رہا تھا۔ فالوورز کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سبسکرائبرز حاصل کرنے کے لیے نت نئے طریقے آزمائے جا رہے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ نئے نئے آئیڈیاز کی خاطر کرشمہ نے باقاعدہ ایک رائٹر فیاض احمد کو رکھا ہوا ہے جو ماضی میں فلمی ویڈیوز اور شارٹ فلمز بھی بناتا رہا ہے۔ میں نے اور کمالی نے مشورہ کر کے ایک منصوبہ بنایا۔ کرشمہ کے چینل مرچی ویڈیوز کے اندر کے حالات جاننے کے لیے چینل کے ایک بندے کو توڑ لیا۔ اس لڑکے کا نام ارمغان تھا۔ اسے چالیس پچاس ہزار کی فوری ضرورت تھی۔ ہم نے اس کی یہ ضرورت پوری کر دی اور وہ ہماری ضرورت پوری کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اگلے ہفتے کرشمہ کے چینل کے دو تین اچھے آئیڈیاز چرا کر ہمیں دیے جن میں سے دو پر ہم نے فٹافٹ پرینک بنا کر اپنے چینل پر ڈال دیے اور وہ کافی مقبول ہوئے۔ یقیناً کرشمہ اور اس کے ساتھی کافی سٹپٹائے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ انہیں کوئی شک بھی گزرا ہو لیکن زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ انہوں نے اسے ایک اتفاق سمجھا ہوگا۔

وہ ایک شفق رنگ شام تھی۔ میں اور کمالی اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھے تھے اور اب ایک اچھے فلیٹ میں شفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ چلغوزے ٹھکورے جا رہے تھے اور چائے پی جا رہی تھی۔ ایک پرانے ماڈل کی ایف ایکس بھی ہم نے خرید لی تھی۔

موبائل فون کمالی کے ہاتھ میں تھا۔ اسکرین پر کرشمہ کی ایک تصویر کو اینلارج کرتے ہوئے بولا۔ "یار! اس کی یہ ہلکی نیلی آنکھیں دیکھی ہیں تم نے۔ شوخی کیسے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ان میں۔"

میں نے اپنے موبائل پر کرشمہ کی ایک قدرآدم تصویر کو تھوڑا بڑا کر کے کمالی کو دکھایا۔ "تم بس آنکھیں ہی دیکھتے رہتے ہو۔ دیکھنے والی کافی اور چیزیں بھی ہیں اس کے پاس۔"

کمالی نے میرا بازو مروڑا۔ ”دیکھو، مستقبل میں یہ تمہاری بھابی وغیرہ بھی ہوسکتی ہے لہٰذا تبصرہ کرتے ہوئے احتیاط سے کام لو۔“

”کمالی! مجھے تو دور دور تک ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کسی کو آسانی سے پہلے پر ہاتھ رکھنے دے گی۔“

وہ بولا۔ ”ہمیں کون سی جلدی پڑی ہے۔ ویسے اس طرح کے کام میں آسانی ہونی بھی نہیں چاہیے۔ آسانی ہو تو سارا مزہ کرکرا ہوجاتا ہے۔“

اسی دوران میں آہٹ ہوئی اور مڑ کر دیکھا تو ارمغان نامی وہی لڑکا کمرے میں آموجود ہوا تھا جو ہمارے لیے ”خبری“ کا کام کررہا تھا۔

ہم بھی کمرے میں آگئے۔ ”ہاں بھئی ارمغان! کوئی تازہ آئیڈیا؟“ کمالی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل جی۔ ایک تازہ آئیڈیا اور ساتھ میں ایک اطلاع بھی۔ اب آپ بتائیں پہلے آئیڈیا بتاؤں یا اطلاع؟“

”چلو، آئیڈیا ہی بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”مس کرشمہ اینڈ کمپنی نے چند دستی بم تیار کرائے ہیں لیکن یہ بالکل بے ضرر قسم کے ہیں۔ پن نکال کو جب ان کو پھینکا جائے گا تو ان میں سے دھواں بھی تیز رفتاری سے نکلے گا لیکن آخر میں یہ ایک زوردار آواز کے ساتھ ٹھس کرکے رہ جائیں گے۔ یہ پریکٹ کار سواروں کے ساتھ کیا جائے گا۔ نقلی دستی بم کار کے اندر پھینکے جائیں گے۔“

اچھا آئیڈیا تھا۔ ہم ایک، دو منٹ اس پر بات کرتے رہے پھر ایک دم مجھے یاد آیا۔ میں نے ارمغان سے پوچھا۔ ”اور وہ اطلاع؟“

وہ مسکرایا۔ ”اطلاع یہ ہے بردر..... کہ یہ پریکٹ پہلی بار آپ سے ہی کیا جائے گا۔“

ہم حیرت سے ارمغان کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے بتایا۔ ”مرچی ویڈیوز والوں کو معلوم ہے کہ آج کل آپ دونوں رات کا کھانا فاسٹ ریسٹورنٹ میں کھاتے ہیں اور گاڑی میں ہی جاتے ہیں۔“

کمالی کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا۔ ”یہ تو پھر دلچسپ صورتِ حال ہے۔“ وہ دبے دبے جوش سے بولا۔

”اب تم اس کو کیا کہو گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”چھیڑ چھاڑ یا پھر کاروباری رقابت؟“

”زیادہ امکان تو کاروباری رقابت کا ہی ہے۔ یہ ہم کو نیچا دکھانا چاہ رہی ہے۔ پھر نکلی ویڈیو اپنے چینل پر ڈالے گی اور کہے گی کہ پریکٹ ماسٹر بننے والے خود کس بری طرح پریکٹ کا شکار ہوئے۔“

ارمغان تو یہ اطلاع دے کر چلا گیا اور ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ اسی دوران میں ہمارا تیسرا ساتھی یاسر پنڈی وال بھی آگیا اور اس سوچ بچار میں شریک ہوگیا۔ جلد ہی ہمارے زرخیز ذہنوں نے ایک پروگرام بنالیا۔ یاسر کے سب سے بڑے بھائی کا نام محمد حفیظ تھا۔ عمر چالیس سے اوپر تھی۔ کچھ عرصے سے دل کے عارضے میں بھی مبتلا تھے۔ ہم نے یاسر سے کہا کہ وہ اپنے بھائی محمد حفیظ کو جوابی پریکٹ کے لیے تیار کرے۔

وہ ہفتے کی شام تھی۔ میں اور کمالی فاسٹ ریسٹورنٹ پہنچے۔ سوزوکی کار میں ہی ڈرائیو کررہا تھا۔ یاسر کا بھائی محمد حفیظ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ شلوار قمیص اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔

جونہی ہماری گاڑی ریسٹورنٹ کے سامنے رکی، ہماری اطلاعات کے عین مطابق ہم پر پریکٹ ہوگیا۔ کرشمہ کے بارے میں سنا تھا اور دیکھا بھی تھا کہ وہ روپ بدلنے میں ماہر ہے۔ آج بھی اس نے بڑا اچھا بہروپ بنایا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر بھکارن کی طرح ہمارے پاس آئی۔ سراپا چادر میں تھا، بس چہرے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ کھڑکی پر جھک کر بولی۔ ”کچھ اللہ کے نام پر بابو!“

میں نے کہا۔ ”معاف کرو جی!“

دو تین بار یہی بات دہرائی گئی پھر اس نے کسی سڑی عورت کی طرح اپنی میلی کچیلی بتیسی نکالی اور جنونی انداز میں بولی۔ ”معاف تو نہیں کروں گی۔ آج تو معاف نہیں کروں گی۔ مار ڈالوں گی..... مار ڈالوں گی۔“

اس نے چادر میں سے ہاتھ نکالا اور وحشی انداز میں دستی بم گاڑی میں پھینک کر الٹے قدموں پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ ہم دونوں نے ہراساں ہونے کی اداکاری کی۔ نقلی بم میں سے تیزی کے ساتھ دھواں خارج ہورہا تھا پھر تیز سیٹی کے بعد ٹھس کی آواز آئی اور ”بم“ ٹھنڈا ہوگیا۔ ہم ”وحشت زدہ“ ہوکر گاڑی سے باہر نکل آئے تھے مگر اسی دوران میں ہمارے تیسرے ساتھی حفیظ پنڈی وال صاحب کو دہشت کے سبب دل کا دورہ پڑچکا تھا۔ ہم انہیں سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے۔ شور و غوغا کے سبب عام راہگیر بھی چاروں طرف سے لپک کر آنے لگے۔ نیم بے ہوش حفیظ صاحب کو پہلے تو گاڑی میں ہی طبی امداد دینے کی کوشش کی گئی پھر کسی نے پکار کر کہا۔ ”ان کی حالت ٹھیک نہیں، اسپتال لے چلو۔“

''یہ ہوا کیا تھا؟ یہ دھواں کیسا تھا؟'' کسی اور شخص نے سوال اٹھایا۔

ایک قریبی دکاندار نے پکار کر کہا۔ ''وہ دیکھو، وہ کھڑی ہے وہ عورت..... اس نے کوئی چیز پھینکی تھی گاڑی میں۔''

لوگ کرشمہ کی طرف لپکے۔ ہم نیم بے ہوش حفیظ صاحب کو لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ حفیظ صاحب کی نیم بے ہوشی بس دکھاوے کی تھی۔ وہ بھلے چنگے تھے لیکن اس کام میں ہار یہی تھی کہ وہ پہلے سے دل کے مریض تھے۔ اسپتال میں انہیں بالکل ٹھیک ٹھاک ثابت کرنا آسان نہیں تھا۔

..... اگلے 36 گھنٹے بے حد ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔ میڈیا اور سوشل میڈیا پر یہ خبر پھیل گئی کہ معروف ٹک ٹاکر کرشمہ نازلی کے ایک پرینک کی وجہ سے ایک ادھیڑ عمر شخص کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹرز اسے بچانے کی کوشش کررہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ سوشل میڈیا پر تو اس خبر کو اور بھی مرچ مسالے لگ گئے تھے۔ حفیظ صاحب نے حسب ہدایات اداکاری بھی اچھی فرمائی تھی۔

خبر جب سوشل میڈیا پر وائرل ہوتی ہے تو عموماً پولیس کو بھی حرکت میں آنا ہی پڑتا ہے۔ میں اور کمالی اپنے ''مریض'' کے پاس اسپتال میں ہی تھے جب مقامی پولیس اسٹیشن کا ایک سب انسپکٹر ایک اہلکار سمیت ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے رسمی انداز میں ہم سے ہمدردی جتائی۔ ''یہ عجیب وبا چل پڑی ہے۔ لڑکیاں، منڈے ہاتھوں میں موبائل لیے ہر طرف ٹک ٹاک بناتے پھر رہے ہیں۔ کئی جانیں ضائع ہورہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سب ٹک ٹاکرز یا یوٹیوبرز تو ایک جیسے نہیں۔ ہاں، جو لوگ خطرناک کام کرتے ہیں اور مس کرشمہ کی طرح لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالتے ہیں، ان کے خلاف تو کچھ ہونا ہی چاہیے۔''

اسی اثنا میں میرے موبائل پر کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو! کمالی بول رہے ہو؟'' دوسری طرف سے ایک مترنم لیکن گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ کرشمہ ہی تھی۔

''نہیں، جمالی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا..... کمالی سے بات کرا سکتے ہو؟''

میں نے فون کمالی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بات کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ کرشمہ، کمالی سے صلح صفائی کی بات کرنا چاہتی ہے۔ یقیناً اسے لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

تھوڑی دیر بعد کمالی واپس آیا۔ جب سب انسپکٹر نے اس سے پوچھا کہ وہ ٹک ٹاکر کرشمہ کے خلاف کیا کارروائی کرانا چاہتے ہیں؟ تو اس نے منع کردیا، بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! یہ سب اتفاقیہ ہوگیا۔ ویسے بھی اب ہمارے بھائی صاحب کی طبیعت کافی بہتر ہے۔''

سب انسپکٹر پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا لیکن چلا گیا۔

☆☆☆

درحقیقت اچانک پیدا ہوجانے والی سچویشن نے کرشمہ اور اس کے ساتھیوں کو خاصا خوفزدہ کردیا تھا۔ جاڑے کے روز کرشمہ نے فون پر کمالی سے جو بات چیت کی تھی، اس میں عاجزی شامل تھی، منت ترلا بھی تھا۔ کمالی کا دل پسیجنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے کرشمہ سے نہ صرف یہ کہہ دیا تھا کہ وہ کوئی رپورٹ وغیرہ نہیں کروائیں گے بلکہ یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ اس واقعے کے حوالے سے کسی طرح کی کوئی پیچیدگی پیدا ہوئی تو کرشمہ اور اس کے چینل ''مرچی ویڈیوز'' کا دفاع بھی کریں گے۔ کرشمہ زود فہم لڑکی تھی۔ وہ پہلے دن ہی سمجھ گئی تھی کہ ہارٹ اٹیک وغیرہ تو سب ڈراما ہی تھا، درحقیقت ہم دونوں نے اس کا پرینک اسی پر الٹ ڈالا تھا۔

صرف دو دن بعد ہی ایک اور مصیبت کھڑی ہوگئی۔ کمالی کو کرشمہ کا فون آیا۔ کمالی نے اسپیکر آن کردیا۔ ان دونوں کی گفتگو میں بھی سننے لگا۔ کرشمہ نے پریشان آواز میں کہا۔ ''کمالی! تم نے تو کہا تھا کہ رپورٹ درج نہیں کرواؤں گا۔ اب کروا بھی دی ہے۔ ابھی تھانے سے فون آیا ہے۔''

''ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔'' کمالی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسے یہ بھی ہوتا ہے کہ کئی معاملوں میں پولیس والے اپنی مدعیت میں پرچہ درج کرلیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی ہوا ہے۔''

''لل..... لیکن کمالی! تم تو کہتے تھے کہ پولیس میں تمہاری واقفیت بھی ہے۔ یار..... پلیز! کچھ کرو نا۔ میں تو بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گی۔ پاپا بیمار ہیں، اوپر سے مالک مکان گھر خالی کرنے پر زور دے رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''اچھا تم پریشان نہ ہو۔ میں اور جمالی کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ باقی اس بات کا یقین رکھو، پرچہ وغیرہ ہم نے ہرگز نہیں کروایا۔''

کال ختم ہونے کے بعد کمالی نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے تو

اس سب انسپکٹر کی نیت میں ہی فتور لگتا ہے۔ آج کل لوگوں کو وہم ہے کہ یہ سارے ہی یوٹیوبرز لمبی لمبی رقمیں کماتے ہیں۔ شاید وہ جیب گرم کرنا چاہ رہا ہے۔"

میرے کہنے پر کمالی نے اس سب انسپکٹر قدیر کو فون کیا اور ہمارا اندازہ کافی حد تک درست نکلا۔ یہ قدیر گوندل کھانے کے چکر میں تھا۔

میرا اور کمالی کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ ہی گزرتا تھا۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے دو چار دن کے لیے جدا ہونا پڑا ہو۔ آٹھ دس ہفتے سے کمالی کو آدھے سر کا درد تھا۔ لگتا تھا کہ نزلہ وغیرہ بگڑ کر سر میں جم گیا ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ "یار! مجھے ایک دن کے لیے ملتان جانا پڑے گا۔ سنا ہے کوئی ہومیو پیتھک ڈاکٹر اس درد کا بڑا اچھا علاج کرتا ہے۔"

"تو ہو آؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج اس سب انسپکٹر قدیر گوندل سے ملنے بھی تو جانا تھا؟"

"کوئی بات نہیں، مل لیں گے آ کر۔" اس نے کہا۔

وہ اگلے روز شام کے بعد فلیٹ واپس آیا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بنا درد شقیقہ کے علاج کا؟"

بولا۔ "ہو گیا..... بلکہ وہ انسپکٹر قدیر گوندل والا علاج بھی ہو گیا۔ اب تنگ نہیں فرمائے گا۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔ پر یہ ہوا کیسے؟"

کمالی نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "چلو، کھانے کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر بات کریں گے۔"

ہم فلیٹ سے نکل کر باہر سڑک پر آئے تو ہماری ایف ایکس موجود نہیں تھی۔ "ارے جانا کس پر ہے؟ گاڑی کہاں ہے؟"

"گاڑی بک گئی ہے۔ یہ قدیر گوندل والا خطرہ یوں ہی تو نہیں ٹلنا تھا نا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ملتان وغیرہ نہیں گیا تھا، نہ ہی کسی ڈاکٹر واکٹر سے ملا۔ وہ یہیں لاہور میں تھا اور مناسب قیمت پر گاڑی فروخت کر رہا تھا۔ اسے قریباً سوا چار لاکھ ملے تھے جن میں سے تین لاکھ قدیر گوندل کو دے کر اس سے کرشمہ کی جان چھڑائی تھی۔

اس روز مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ فیئر رومانی مزاج والا کمالی، کرشمہ کے سلسلے میں واقعی رومانی ہو چکا ہے۔ کرشمہ کے لیے اس کے جذبات میں خاصی گہرائی تھی۔ اب پتا نہیں کہ دوسری طرف کیا پوزیشن تھی۔ اس نے مجھے سختی سے کہا کہ گاڑی فروخت کرنے والے واقعے کا ذکر کرشمہ یا اس کی ٹیم کے کسی بندے سے ہرگز نہیں کرنا۔

تب اس نے مجھے ایک لاکھ روپے تھماتے ہوئے کہا۔ "ڈیڑھ لاکھ تمہارا بھی تو تھا گاڑی میں۔ کہیں سے آتے ہیں تو باقی بھی دے دوں گا۔"

میں نے اس کے سر کے لمبے بال پکڑے اور کھینچ کر بیڈ پر دے مارا۔ "جی چاہتا ہے کہ ایک جھانپڑ ماروں تمہارے بوتھے پر۔ شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے ہوئے۔ تمہارے اور میرے پیسے الگ کب تھے جو اب ہو گئے ہیں؟"

میں نے نوٹ اس پر پھینکے اور منہ بنا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دل واقعی دکھ گیا تھا۔ بچپن سے اب تک بہت ہی کم موقعے ایسے آئے تھے جب ہم ایک دوسرے سے ناراض ہوئے لیکن جب کبھی بھی ایسا ہوا، کچھ لینے کے لیے نہیں، دینے کے لیے ہی ہوا۔ ہمیشہ قربانی، ایثار اور خطرہ مول لینے کا جھگڑا ہی رہا اور میں مانتا ہوں کہ کمالی میں ایثار کا جذبہ شاید مجھ سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں بستر پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر کیلنڈر کے ساتھ ایک تصویر آویزاں تھی۔ یہ بچپن کی ایک تصویر تھی جس میں ہم ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر تھی۔ یہ اسی نہر کھاتی تنگ سڑک کی تصویر تھی جو بڑی سڑک سے جدا ہو کر ہمارے گاؤں کی طرف جاتی تھی اور جس کے آغاز پر لکھا ہوا تھا "جھاڑ نگر 16 کلومیٹر"۔

میں ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کھوئی کھوئی نظروں سے اس تصویر کو دیکھ رہا تھا جب کمالی دھم سے میرے پاس آن بیٹھا۔ "یار! ایک تو تم اب روٹھنے شوٹھنے زیادہ لگے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اور تم بھی اب بیگانوں جیسی باتیں کچھ زیادہ کرنے لگے ہو۔" میں اٹھ کر جانے لگا تو اس نے میری گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔

"چھڈ یار! کیا زنانیوں کی طرح کرنے لگ جاتا ہے۔" اس نے مجھے جھنجوڑا۔

ہمارے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا پھر دھکم پیل شروع ہو گئی۔ اسی دھکم پیل میں تنگ سڑک والی وہ تصویر دیوار سے گر گئی جو میں نے بڑے اہتمام سے یہاں آویزاں کر رکھی تھی۔ ہم دونوں نے بڑی پھرتی سے تصویر کو فرش پر گرنے اور فریم کو چکنا چور ہونے سے بچایا۔

اس مشترکہ اور کامیاب کوشش کے سبب گرما گرمی کچھ کم ہوئی پھر کچھ دیر بعد صلح بھی ہو گئی۔ کمالی نے میرا اور میں نے اس کا سگریٹ سلگایا اور دونوں پھر سے کیل گاڑ کر تصویر کو آویزاں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کمالی ریسٹورنٹ میں ڈیلیوری بوائے والی ملازمت دو تین ماہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ اب چونکہ وہ ایک جانا پہچانا ٹک ٹاکر تھا لہٰذا ریسٹورنٹ والے اسے انتظامیہ میں ایک اچھی ملازمت کی پیشکش کر رہے تھے۔ میرا مشورہ تھا کہ ملازمت ایسی ہو کہ ہمارا ویڈیوز بنانے والا کام زیادہ متاثر نہ ہو۔ وہ اسی سلسلے میں بات کرنے چلا گیا تو میں بستر پر کمبل اوڑھ کر نیم دراز ہو گیا۔ یاسر بھی کہیں گیا ہوا تھا۔ میں فلیٹ میں اکیلا تھا۔

دوراہے سے آگے "تنگ سڑک والی تصویر" دیوار پر میرے سامنے آویزاں تھی۔ میری کھوئی کھوئی نگاہیں ایک بار پھر اس پر مرکوز ہو گئیں۔ ذہن میں کچھ جھماکے سے ہونے لگے۔ کچھ فلیش..... سرسوں کا کھیت..... ربڑ کا سانپ..... نہر میں غوطے کھاتی لڑکی..... پھر ایک دبنگ و غضبناک چودھری..... پھر ایک جنازہ..... پھر ایک قسم۔

میں تصویر کو دیکھتا رہا اور ذہن میں ایک کھڑکی سی کھل گئی۔ میں اس کھڑکی سے نکل کر ماضی قریب کی بھول بھلیوں میں چلا گیا۔ مناظر ایک فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے چل پڑے۔ میں مناظر کا حصہ بن گیا۔

..... کتنے سہانے دن تھے جب میں اپنے گاؤں جھاڑ نگر کی گلیوں میں کدکڑے مارتا پھرتا تھا۔ جھاڑ نگر کا کرتا دھرتا ملک مختار تھا۔ اردگرد کے تقریباً بیس دیہات اس کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ وہ جس حویلی میں رہتا تھا اسے چنا چوبارا کہا جاتا تھا لیکن وہ باہر سے جتنا چنا نظر آتا تھا، اندر سے اتنا نہیں تھا۔ اس کے اندر کا لک تھی اور تقریباً وہ سب برائیاں تھیں جو ایسی حویلیوں میں ہوتی ہیں۔ بہرحال اس بات کا پتا تو مجھے بہت بعد میں چلا تھا۔

میری عمر بمشکل چار سال ہوگی جب کمالی کے ماں باپ کا انتقال ہوا اور وہ یتیم ہو کر ہمارے گھر آ گیا۔ اسے لانے والے میرے والد سراج دین تھے۔ جھاڑ نگر سے تھوڑے ہی فاصلے پر جہاں نیالے پانی والی ٹھنڈی ٹھار نہر گزرتی ہے، ہمارا چھوٹا سا باغ تھا۔ اس باغ کی آمدن سے ہماری گزر بسر بڑی اچھی طرح ہو جاتی تھی۔ میرے والد کی خدا ترسی اور دیانت داری مشہور تھی۔ جب بھی وہ اپنا باغ کسی کو ٹھیکے پر دے دیتے تو پھر اس کے پھل کا ایک دانہ بھی خود پر حرام سمجھتے تھے۔

میرے والدین نے کمالی کو کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ وہ یتیم ہے۔ وہ میرے سگے بھائی کی طرح پل بڑھ کر لڑکپن کی حدود تک پہنچا۔ ہم دونوں نے جھاڑ نگر کے اسکول سے ہی میٹرک کیا۔ اس دوران میں میری دو بڑی بہنوں میں سے ایک بہن کی شادی ہو گئی۔ اب بس ایک تھی جو ہم دونوں کو ہی سگی بہن لگتی تھی۔ گھر میں میری اور کمالی کی من مستیاں عروج پر رہتی تھیں۔ باغ کی دیکھ بھال کے علاوہ ہم دونوں ایف اے کی پرائیویٹ تیاری بھی کر رہے تھے۔ ارادے مزید پڑھائی کے لیے لاہور جانے کے بھی تھے مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

اب ہمارے گاؤں بھی گاؤں جیسے کہاں رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن اور کیبل سے لے کر انٹرنیٹ اور موبائل تک سب کچھ ہمارے گاؤں میں موجود تھا۔ مجھے اور کمالی کو بھی موبائل فون کا چسکا پڑ گیا اور پھر یہ چسکا دیکھتے ہی دیکھتے ٹک ٹاک کے شوق میں بدل گیا۔ ہم دونوں نے دیہات کی زندگی اور اس کے شب و روز پر ویڈیوز بنا کر اپنے چینل اور دوسرے گروپس میں شیئر کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی پذیرائی ملی تو شوق اور بڑھا۔ پھر ہم مزاحیہ ویڈیوز اور پرینکس کی طرف چل پڑے۔ بڑے بڑے شہروں میں کیے جانے والے پرینکس تو نیٹ پر موجود ہوتے ہی ہیں، ہمارے پرینکس کا ماحول چونکہ دیسی ہوتا تھا لہٰذا ایک حلقہ انہیں توجہ سے دیکھتا تھا۔

کبھی کبھی ہمیں کسی بڑے بوڑھے سے گالیاں بھی پڑ جاتی تھیں۔ کسی وقت پر بیک کا شکار ہونے والا ہی ڈانگ سوٹا لے کر ہمارے پیچھے پڑ جاتا تھا مگر ہم باز آنے والے نہیں تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چنے چوبارے والوں کی طرف سے ہمیں ابھی تک کوئی سرزنش کی گئی تھی اور نہ ڈانٹ پڑی تھی۔ دراصل ہم نے ملک مختار صاحب کے چھوٹے بھائی ملک اشرف کی دوسری شادی کی بڑی شاندار ویڈیوز بنا کر اپ لوڈ کی تھیں اور وہ ہمارے کام سے خوش ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہم کبھی کبھی جھاڑ نگر کے مقامی مسائل پر بھی کوئی ویڈیو بنا دیتے تھے۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ہم بے خبری میں ایک ایسی ویڈیو بنا بیٹھے جس نے آناً فاناً مجھے ایک جال میں جکڑ دیا۔

ابا جان کچھ بیمار تھے۔ میں ایک مزدور کے ذریعے باغ میں کینو کے پودوں پر اسپرے کروا رہا تھا۔ کمالی نے کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو..... دو لڑکیاں۔ لگتا ہے سرسوں کے کھیت میں گلاب اور موتیے کے دو بوٹے کھڑے ہیں۔"

میں نے نظر دوڑائی۔ ایک لڑکی کے کپڑے سفید اور دوسری کے کچھ کچھ گلابی تھے۔

''گاؤں کی تو نہیں لگتیں۔'' میں نے کہا۔ کمالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

اچانک میری رگِ شرارت پھڑک اٹھی۔ میں نے کہا۔ ''کمالی! موبائل ریڈی ہے تمہارا؟''

''کیوں، کیا ارادہ ہے؟''

''کیوں نا وہ سانپ والا پریکٹ کیا جائے۔''

کمالی کچھ تذبذب میں نظر آیا۔ تاہم میں بھاگ کر باغ کے ڈھارے میں گیا اور ربڑ کا تین چار فٹ لمبا کوبرا سانپ اٹھا لایا۔

میں نے کمالی کو ساتھ لیا۔ سرسوں کے کھیت کے کنارے کیکر کے چار پانچ درخت جھنڈ کی صورت میں تھے۔ ہم بڑی احتیاط سے ان کی آڑ میں چلے گئے۔ کمالی کی فنکاری بھی اب پوری طرح جاگ گئی تھی۔ اس نے موبائل کا کیمرا بڑے اچھے طریقے سے سیٹ کرلیا۔ وائرلیس مائیک میرے گریبان میں تھا۔ ہم گھات لگا کر کھڑے ہوگئے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ گاؤں کی دوپہریں کافی سنسان ہوتی ہیں۔ یہ جگہ ویسے بھی عام راستے سے ہٹ کر تھی۔

دونوں لڑکیاں یقیناً سہیلیاں تھیں۔ سفید کپڑوں والی کی طرح گلابی کپڑوں والی نے بھی لمبی چادر کا نقاب کر رکھا تھا۔ بس آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا مگر جتنا بھی نظر آتا تھا وہ گواہی دیتا تھا کہ وہ دلکش نقوش والی ہے۔ کچھ گواہی اس کے متوازن جسم اور دلربا چال سے بھی مل رہی تھی۔ سفید کپڑوں والی درمیانی شکل کی لگتی تھی۔ دونوں کے لباس معمولی ہی تھے جیسے کھیت مزدور گھرانوں کی عورتوں کے ہوتے ہیں۔

ہمارا ارادہ تو یہی تھا کہ لڑکیوں کے پاؤں میں سانپ پھینکیں گے اور جب وہ خوفزدہ ہوکر ایک دو اوٹ پٹانگ حرکتیں کرلیں گی تو ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگ لیں گے۔ چونکہ ان کے چہروں کی شناخت نہیں ہو رہی تھی لہٰذا ان کی اجازت سے ویڈیو اپ لوڈ بھی کی جاسکتی تھی مگر جو ہوا وہ توقع کے خلاف تھا۔

جونہی میں نے سانپ درخت کی اوٹ سے لڑکیوں کے پاؤں میں پھینکا، وہ ضرورت سے زیادہ ڈر گئیں۔ ایک پگڈنڈی کی طرف گئی، دوسری چلاتی ہوئی نہر والی سائڈ پر گئی اور ٹھوکر کھا کر پانی میں گر گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ہم چکرا کر رہ گئے۔ یقیناً وہ تیرنا نہیں جانتی تھی۔ بری طرح غوطے کھا رہی تھی۔ میں چونکہ زیادہ قریب تھا لہٰذا بھاگتا ہوا گیا اور اسے بچانے کے لیے نہر میں کود گیا۔

یہ کام بہت زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا کیونکہ میں اچھا تیراک تھا اور میرے پاؤں زمین پر بھی لگ رہے تھے لیکن وہ مجھ سے چپک گئی تھی اور اس کے جوان جسم کے قرب اور گداز نے مجھ پر قیامت ڈھا دی تھی۔ اس کے لمبے بھیگے بال کسی سانپ ہی کی طرح میری گردن سے لپٹ گئے تھے۔

کنارے پر پہنچتے ہی اس نے مجھ پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ''بے شرم..... بے غیرت..... تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی۔ مم..... میں..... میں تیرا وہ حال کراؤں گی کہ سارا گاؤں دیکھے گا۔''

اس کی ساتھی لڑکی بھی اب اپنے حواس کافی حد تک بحال کرچکی تھی اور ہمیں اسی انداز میں لتاڑ رہی تھی۔

شکر کا مقام یہ تھا کہ فی الوقت کافی دور تک کوئی یہ مناظر دیکھنے والا موجود نہیں تھا۔ صرف کمالی موجود تھا اور وہ بھی سکتہ زدہ سا درختوں کے جھنڈ کے پاس کھڑا تھا۔ یقیناً میری طرح وہ بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ہم کچے ٹانکے ہیں۔ پرینکس کی وہ سمجھ بوجھ نہیں جو ہمیں ہونی چاہیے۔

پریکٹ کرنے والے جانتے ہیں کہ اکثر انہیں اپنے مشتعل شکار کے سامنے بہت عاجزی کا مظاہرہ کرنا پڑ جاتا ہے۔ پاؤں کو ہاتھ تک لگانے پڑتے ہیں۔ میں نے بھی لگائے۔ دست بستہ معافی مانگی۔ اسے بتایا کہ ہم سے بے وقوفی ہوئی ہے۔ ہم پریکٹ کرنے کے چکر میں تھے۔

اب کمالی بھی قریب آگیا تھا۔ جب میں نے پریکٹ کا ذکر کیا تو دونوں لڑکیاں زیادہ غور سے ہماری طرف دیکھنے لگیں۔ یوں لگا جیسے انہوں نے بھی ہماری کوئی دو چار ویڈیوز دیکھ رکھی ہیں۔ گلابی کپڑوں والی من موہنی صورت والی تھی۔ بونا سا قد، چھریرا جسم۔ میں نے بھیگی اوڑھنی اسے دی نے جلدی سے لپیٹ لی اور چہرے پر نقاب بھی کرلیا۔ میں نے اور کمالی نے پھر ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ وہ گھر والوں کو کچھ نہ بتائیں۔ زیادہ کچھ دریافت کرنے کا موقع نہیں تھا مگر لگ یہی رہا تھا کہ سفید کپڑوں والی تو ہمارے گاؤں کی ہی ہے۔

جیسے جیسے وہ گئیں تو کمالی نے چونک کر میری بھیگی آستین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اوئے جمالی! یہ کیا چیز ہے؟''

میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ ایک بالی تھی جس پر سرخ نگینے بھی لگے ہوئے تھے۔ بظاہر سونے کی لگتی تھی مگر یہ فریب گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ آرٹیفیشل تھی۔

پتا نہیں کیوں کمالی کو کچھ شک ہو رہا تھا۔ دو روز بعد وہ

لاہور گیا تو آ کر اس نے ایک عجیب خبر سنائی۔ سنسنائے لہجے میں بولا۔ ''یار جمالی! یہ کیا چکر ہے؟ بالی سونے کی ہے اور بات صرف بالی ہی کی نہیں، اس پر لگے تینوں نگینے بھی اصلی ہیں۔''

''اصلی ہیں..... کیا مطلب؟''

اس نے مجھے مزید حیران کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک موٹے سے اندازے کے مطابق اس ایک بالی کی قیمت ایک لاکھ سے کم نہیں۔ مطلب دو بالیوں کی قیمت دو لاکھ۔''

میری نگاہوں کے سامنے بھی وہ لمحے گھوم گئے جب میں نے گلابی کپڑوں والی کو یخ بستہ خیالے پانی سے نکالا تھا اور وہ مجھ پر چلا رہی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں ایک ایک چوڑی نظر آئی تھی، بالکل طلائی چوڑیوں جیسی..... اور شاید ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سرخ ''روبی'' بھی تھے ان چوڑیوں پر۔

یہ کیا ماجرا تھا؟ ہم نے رات کا بیشتر حصہ یہی سوچتے اور سگریٹ پھونکتے گزارا۔ بہرحال ایک تسلی تو تھی کہ ابھی تک ان لڑکیوں نے اپنے گھروں میں کوئی شکایت نہ کی تھی۔

گاؤں میں جوان لڑکیاں غیر مردوں کے سامنے کم ہی آتی تھیں پھر بھی ہم دونوں کو شک سا گزرتا تھا کہ سفید کپڑوں والی ہمارے ہی گاؤں کی ہے۔ میں تو والد کی تیمارداری میں مصروف تھا کہ انہیں دے کا الیک تھا تا ہم کمالی نے اگلے روز اس سفید کپڑوں والی کا سراغ لگالیا۔ اس کا نام فرح تھا۔ فرح نے ایک حیرت ناک انکشاف کیا۔ جو لڑکی فرح کے ساتھ آئی تھی وہ کسی غریب گھرانے کی نہیں تھی۔ وہ تو جھاڑ گر کے سب سے طاقتور شخص ملک مختار کے چھوٹے بھائی اشرف ملکو کی بیٹی تھی۔ چٹے چوبارے کی عورتیں عام لوگوں کے سامنے کہاں آتی تھیں۔ سات پردوں میں رہتی تھیں۔ اشرف ملکو کی اس بڑی بیٹی کا نام رانیہ تھا اور وہ سات پردوں میں رہنے والی رانیہ نہ صرف میرے سامنے بے پردہ ہوئی تھی بلکہ مجھ سے لپٹی بھی رہی تھی۔ اس کے گداز لمس کی خوشبو ابھی تک میرے دل و دماغ میں تھی۔

میں نے حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''یار کمالی! لیکن وہ تو عام سے کپڑوں میں تھی اور پھر اس طرح کھیتوں میں اس کا گھومنا.....؟''

کمالی بولا۔ ''یار! تم نے دیکھا تو ہے کئی فلموں میں۔ اونچے گھرانوں کی لڑکیاں جو ہر وقت گھروں میں ہی بند رہتی ہیں کسی وقت دکھری ٹائپ کا کام کر جاتی ہیں۔ یہ رانیہ بھی کبھار ایسا ہی کرتی ہے۔ فرح ان کے ملازم مجیدے کی لڑکی ہے۔ رانیہ ماں سے اجازت لے کر کسی وقت اسی طرح فرح کے ساتھ چٹے چوبارے کی اونچی دیواروں سے نکل آتی ہے۔''

''یہ تو پھر بڑی گڑبڑ ہوگئی۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ نہر والا سین اس وقت کوئی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کمالی بولا۔ ''لیکن رولے والا سین تو کچھ کچھ اب بھی بن رہا ہے۔'' وہ تھوڑا سا مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

کمالی بولا۔ ''رانیہ نے تمہارا نام پوچھا ہے اور یہ بھی پوچھا ہے کہ تم کس باغ کی مولی ہو..... اور موبائل کے ذریعے شیطانیاں وغیرہ کرنے کے علاوہ اور کیا کرتے ہو؟''

پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ممکن ہے کہ ٹھنڈے پانی میں غوطے کھانے کے بعد جب وہ تم سے لپٹی لپٹائی تو..... اس کے دل میں کچھ کچھ ہوا ہو۔''

میں نے لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ ''یار! کچھ کچھ تو میرے دل میں بھی ہوا ہے مگر وہ کیا کسی شاعر نے کہا ہے..... اپنی تھاں متھا لایا، بڑی مصیبت پائی..... یہ تو ڈھاڈا مشکل کام لگتا ہے۔'' ایک دم مجھے سونے کی بالی کا یاد آیا۔ میں نے کمالی سے پوچھا۔ ''اپنی بالی کا ذکر تو نہیں کیا اس نے یا اس کی سہیلی نے؟''

''بالکل بھی نہیں۔ میرے خیال میں وہ دونوں یہی سمجھتی ہیں کہ بالی پانی میں کہیں گر گئی ہوگی۔''

اگلے پندرہ بیس روز میں جو کچھ ہوا، اس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں حیران پریشان تھا اور جذبات کے ایک سندر ریلے میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایسا ریلا جو میرے، میرے اہل خانہ اور کمالی وغیرہ کے لیے بھی سخت خطرناک تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک برقی رو سی ہے جو اچانک ہی میرے اور رانیہ کے درمیان چل پڑی ہے۔ پہلے رانیہ کی سہیلی فرح کے ذریعے دو تین پیغامات چلے پھر فون پر میسج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک رات فون پر ہم دونوں ہم کلام بھی ہو گئے۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے معاملوں میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے..... اور یہ مشک تو اتنی تیز خوشبو والی اور اتنی زہریلی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ موسم بہار کی ایک چاندنی رات میں ہم دونوں کی پہلی ملاقات فرح ہی کے ذریعے ایک باغ میں ہوئی۔ اسی کی دوسری ملاقات میں مجھے رانیہ کے مرمریں ہاتھ میں ایک انگوٹھی بھی نظر آئی اور مجھ پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ رانیہ کی منگنی اپنے تایا زاد شمشیر سے ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے وہ شمشیر کو پسند نہیں کرتی تھی ورنہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا جو

ہو رہا تھا۔ ہم سب کچھ جان بوجھ رہے تھے پھر بھی حسین جذبات کا ایک ناقابلِ مزاحمت بہاؤ تھا جس میں بہتے چلے جا رہے تھے۔

ایک دن ایسی ہی ملاقات میں رانیہ نے کہا۔ ''میری والدہ زیادہ خوشحال گھرانے سے نہیں ہیں جمال! وہ میرے اس رشتے کے بھی بہت خلاف ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے امید ہے کہ اگر وقت آیا تو وہ میرا ساتھ دیں گی۔''

''کیا ایسا وقت آسکے گا؟'' میں نے اداسی سے کہا۔

''کہتے ہیں نا جذبے سچے ہوں تو اوپر والا بھی ساتھ دیتا ہے۔'' رانیہ نے کہا اور میرا کندھا چوم کر میرے ساتھ لگ گئی۔

اس کے گداز جسم کے دباؤ سے مجھے اپنے سینے کی پاکٹ میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے یاد آگیا۔ میں نے آہستہ سے اسے پیچھے ہٹایا اور جیب سے وہ قیمتی بالی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی جو ''پریک'' کے بعد میری آستین میں اٹکی رہ گئی تھی۔ رانیہ حیران نہیں ہوئی بلکہ اس کی جھیل آنکھوں میں ایک نمی سی مسکرا اٹھی۔

''تمہیں حیرانی نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بڑی ادا سے نفی میں سر ہلا دیا پھر بالی کو دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''مجھے پتا تھا جمال! ایک دو روز میں تم نے یہ بالی مجھے لوٹا دینی ہے بلکہ شاید اسی وقت پتا لگ گیا تھا جب بالی سے باہر آکر میں نے بالی تمہاری آستین سے اٹکی ہوئی دیکھی تھی۔ شکلیں بندے کے اندر کا پتا دے دیتی ہیں جمال!'' رانیہ نے عجب دلگداز انداز میں یہ بات کہی تھی۔

اور پھر ایک روز وہی کچھ ہوا تھا جو ہو جایا کرتا ہے۔ رانیہ اور میرے میل ملاپ کا پتا جھاڑ نگر کے کرتا دھرتا ملک مختار کو چل گیا تھا۔ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ وہ کیسے گھر برداشت کرسکتا تھا کہ اس کی بیٹی اور ہونے والی بہو گاؤں کے ایک معمولی باغبان کے بیٹے کے ساتھ تعلق بنائے۔ یہ تو شکر تھا کہ رانیہ کا شمشیر ملک جھاڑ نگر میں موجود نہیں تھا ورنہ شاید وہ یہ خبر سنتے ہی مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیتا۔ بہرحال ملک مختار اور اس کے چھوٹے بھائی اشرف ملک نے بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھایا۔ وہ مجھے پکڑ کر اپنے چوبارے کی حویلی میں لے گئے اور مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ والد تو بیمار تھے۔ میری ماں روتی پیٹتی اپنے چوبارے میں پہنچ گئی۔ اشرف ملک نے میرے منہ کے اندر گن گھسا دی تھی اور گولی مارنا چاہتا تھا۔ میری ماں ان دونوں بھائیوں کے قدموں میں گر پڑی۔ اپنا دوپٹا ان کے پاؤں میں رول دیا۔

ملک مختار بولا۔ ''مالی اترس کھا رہے ہیں تیرے پتر پر کہ جلدی سے جان لے رہے ہیں ورنہ بڑا تڑپ تڑپ کر مرتا۔''

اشرف ملک نے لقمہ دیا۔ ''اور ابھی تو نے اپنے گھر کے جلنے کا تماشا بھی دیکھنا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ساتھ ہی تیری بیٹی کا تماشا بھی لگے۔ دل بڑا کر ذرا۔''

میری ماں نے گن میرے منہ سے نکال کر اپنے منہ میں رکھ لی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر گولی ہی مارنی ہے تو پہلے مجھے مار دو۔

شاید وہ مار ہی دیتے لیکن اس سے پہلے ملکانی نور جہاں درمیان میں آگئی۔ اپنے چوبارے میں وہ واحد عورت ہے جس کے دل میں تھوڑا بہت رحم موجود ہے۔ میری ماں نے اپنا سر ملکانی کے قدموں پر رکھ دیا۔ اس قہرناک دوپہر کو مجھے اس شرط پر معافی ملی کہ میں جھاڑ نگر سے اور اس علاقے سے نکل جاؤں گا اور کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ اگر دوبارہ جھاڑ نگر کے آس پاس بھی کہیں میری صورت نظر آئی تو مجھے گولی ماردی جائے گی اور میرے وارثوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میری اور میری ماں اور ماموں کی آوازیں بھی ریکارڈ کی گئیں۔

اس معافی تلافی کے بعد جب ہم گھر پہنچے تو ایک اور صدمہ انتظار کر رہا تھا۔ میرے ابا جی دنیا میں نہیں تھے۔ وہ بستر پر لحاف اوڑھے لیٹے تھے مگر مردہ حالت میں۔ دے کے اٹیک میں ہی انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ چلے گئے۔ ان کی موت کی وجہ یہ خبر ہی تھی کہ مجھے اپنے چوبارے میں لے جایا گیا ہے اور وہاں مجھے جان کا خطرہ ہے۔

اسی رات ابا جان کا جنازہ اٹھا تھا اور جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی روتی بلکتی ماں نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر قسم دی تھی کہ میں دوبارہ جھاڑ نگر میں قدم نہیں رکھوں گا۔ اگلے روز جب میں نے رختِ سفر باندھا تو میرے جسم کا دوسرا حصہ کیسے جھاڑ نگر میں رہ سکتا تھا۔ میرے یار کمالی نے بھی میرا ہاتھ پکڑا تھا اور ہم نم آنکھوں کے ساتھ جھاڑ نگر کو خیرآباد کہہ آئے تھے۔ جھاڑ نگر سے نکلتے ہوئے ہمارے پاس دو ہزار روپے اور ایک موبائل فون کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جھاڑ نگر کی گلیوں، کھیتوں، کھلیانوں اور فضاؤں سے نکلتے وقت ہمیں بالکل یہی لگا تھا کہ ہمیں جنت سے نکال کر کسی دوزخ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔

فلیٹ کے دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور میں اپنے طویل خیالوں کی دنیا سے چونک کر باہر آگیا۔ دروازہ

کھولا، باہر کمالی ہی تھا۔ اس کے ہاتھوں میں نیا لیپ ٹاپ تھا۔ ویڈیوز کی ایڈیٹنگ وغیرہ کے لیے ہمیں نئے لیپ ٹاپ کی ضرورت تھی مگر مجھے یہ پھر بھی کچھ فضول خرچی محسوس ہوئی۔

"کمالی یار! کیوں پیسے اڑا رہے ہو؟ تم تو مجھے سمجھایا کرتے ہو۔" میں نے کہا۔

"خیر کچھ ایسی فضول خرچی بھی نہیں ہے یہ۔" وہ بولا اور اپنا موبائل فون میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "شاید تم نے ابھی تک کمالی جمالی پر ٹیکس کی موجودہ پروگریس نہیں دیکھی۔ پچھلے 36 گھنٹوں میں ساڑھے بارہ ہزار مزید فالوورز اور سبسکرائبرز بڑھے ہیں۔ میں نے ابھی اسٹیٹ دیکھا ہے۔"

کمالی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کرشمہ کے "مرچی ویڈیوز" نے مصنوعی بم والا جو ناکام پریک کیا تھا، اس کے بعد ہمارے چینل کی سبسکرپشن میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "کمالی فالوورز کی دوڑ میں تو تم کرشمہ سے جیت رہے ہو مگر لگتا ہے دوسری جانب سے ہار رہے ہو۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ کر بولا۔ "کوئی بات نہیں شہزادے! اس طرح کے معاملوں میں ہار جیت کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی کمالی کے فون پر کال کا میوزک آیا۔ وہ اسکرین دیکھ کر بولا۔ "بھئی بڑی لمبی عمر ہے اس کی..... ماشاءاللہ!"

دوسری طرف کرشمہ ہی تھی۔ اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ (ہم دونوں کے درمیان کسی طرح کا پردہ نہیں تھا)۔

کرشمہ کی مترنم آواز ابھری۔ اس نے احسان مندی کے لہجے میں کہا۔ "بہت شکریہ اکمل! آپ نے میری بہت مدد کی ورنہ یہ انسپکٹر قدیر گوندل تو گوند ہی کی طرح چمٹ گیا تھا۔ کیسے سنبھالا اسے؟"

"بس ایک دو لنک تھے، وہ کام آ گئے۔" کمالی نے مختصر جواب دیا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کی جان چھڑانے کے لیے اسے اپنی سواری سے محروم ہونا پڑا ہے اور اپنے آدھے سر کے درد کے باوجود آج کل اسے سردی میں بائیک پر سفر کرنا پڑ رہا ہے۔

دو تین ہفتے مزید گزر گئے۔ میں جانتا تھا کہ کمالی چپکے چپکے کرشمہ کے لیے آہیں بھرتا ہے مگر وہ ان لڑکوں میں سے نہیں تھا جو اس طرح کے مقصد کے حصول کے لیے خود کو گرا لیتے ہیں۔ دوسری طرف کرشمہ کی طرف سے بھی مکمل خاموشی ہی تھی۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ کرشمہ، کمالی کو ناپسند تو نہیں کرتی مگر ایک انا سی ہے جو اسے فاصلے پر رکھے ہوئے ہے۔ شاید چینل کی دوڑ میں جو وہ کچھ پیچھے رہ گئی تھی، اس کا اثر تھا یا پھر ہمارے ساتھ پریک کرنے میں اسے جو ناکامی اور سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ انا کی وجہ بن رہا تھا۔

ایک روز فلیٹ میں سر تک کمبل اوڑھے میں خاموش لیٹا تھا۔ والدہ اور بہن کوئل بری طرح یاد آ رہی تھیں اور وہ اکثر یاد آتی ہی رہتی تھیں۔ ان سے بچھڑے دو سال کے لگ بھگ ہو چکے تھے۔ جھاڑ نگر کے ایک بہت خاص دوست کے ذریعے کبھی کبھار ان کی خیریت کی اطلاع مل جاتی تھی..... اور بس۔ انہی سوچوں میں تھا کہ مجھے کرشمہ کی طرف سے ایک میسج آیا۔ اس میسج نے بہت کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ اس کے نتائج بہت دور رس اور حیران کن رہے۔ میسج میں کرشمہ نے کہا تھا کہ وہ کمالی کو سرپرائز دینا چاہتی ہے لہٰذا میں خاموشی کے ساتھ اسے کال کروں۔ میں نے کرشمہ کو کال کی اور اس کے بعد رازداری سے ہم دونوں کی ملاقات ایک کافی ہاؤس میں ہوئی۔

میرے اور کرشمہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ میرا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ دل ہی دل میں وہ بھی کمالی کو چاہنے لگی ہے مگر اس حوالے سے اپنی ہار ماننے سے پہلے وہ اپنی ایک جیت بھی چاہتی ہے۔ کمالی جو اپنے یوٹیوب چینل پر ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ایک پرینکسٹر کے ساتھ پریک کرنا آسان نہیں ہوتا..... وہ اسے غلط ثابت کرنا چاہتی تھی۔ خاص طور سے اپنے پچھلے پریک کی ناکامی کے بعد اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ ایک کامیاب پریک کے ساتھ کمالی کو کم از کم ایک بار تو ناک آؤٹ ضرور کرے گی۔ ایک کامیاب اور بڑا پریک۔

میں اس ساری صورت حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ پیار محبت کے معاملات میں اس طرح کی Ego کبھی کبھی ایک بے موسمی ہوا کی طرح چل پڑتی ہے۔ میں نے کرشمہ کی مسکراہٹوں کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور اس پریک میں کرشمہ کا ساتھ دینے کی ہامی بھر لی۔

جس پریک کا آئیڈیا مجھے کرشمہ نے بتایا، وہ کچھ سیریس تو ضرور تھا مگر امید تھی کہ اگر پریک کامیاب ہوا تو اس کے ختم ہونے پر کمالی بے حد خوشی اور طمانیت محسوس کرے گا۔

کچھ روز بعد کمالی کی سالگرہ تھی۔ پروگرام یہ بنا کہ پریک سالگرہ سے پہلے ہی ہوگا۔ یہاں میں یہ کہوں گا کہ ہم

پریک کرنے والوں کو کبھی کبھی اپنے دل بہت سخت بھی کرنا پڑتے ہیں۔ یہاں کمالی سے ہونے والے پریک کے لیے بھی مجھے اپنا دل کافی سخت کرنا پڑا۔ کچھ بھی تھا، آخر میں تو اس میں کمالی کی بھلائی ہی تھی۔

یہ پریک پانچ روز بعد ہوا۔ اب اس پریک کو قارئین کمالی کی نظر سے دیکھیں تو زیادہ بہتر دیکھیں گے۔

رات ایک ڈیڑھ بجے کا وقت ہے۔ کمالی فلیٹ میں میرے ساتھ والے بیڈ پر سویا ہوا ہے۔ اچانک کچھ آہٹوں سے اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں اپنے بیڈ پر موجود نہیں۔ وہ مجھے آواز دیتا ہے پھر چپل پہن کر ساتھ والے کمرے میں پہنچتا ہے۔ وہاں بھی کوئی موجود نہیں۔ تب اسے کچن کی طرف سے مدھم آوازیں آتی ہیں۔ وہ دبے پاؤں ایک ادھ کھلی کھڑکی تک آتا ہے۔ اندر مدھم روشنی میں خوبرو کرشمہ میرے ساتھ کھڑی ہے۔ وہ رو رہی ہے۔ میرے چہرے پر بھی غم ٹوٹ کر برس رہا ہے۔ کرشمہ کے ہاتھوں میں چند میڈیکل رپورٹس ہیں۔ وہ کہتی ہے۔

''جمالی! میرا تو کلیجا منہ کو آرہا ہے۔ گیارہ بجے یہ رپورٹس کراچی سے آئی ہیں اور ان کے آتے ساتھ ہی میں تمہاری طرف بھاگی ہوں۔ اب تو شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ بیماری شروع تو سر سے ہی ہوئی لیکن اب نیچے ریڑھ کی ہڈی تک چلی گئی ہے اور..... تمہیں..... پتا ہی ہے کہ یہ کینسر جب.....'' وہ فقرہ مکمل نہیں کر پاتی۔

میں لرزتے ہاتھوں سے رپورٹس پکڑتا ہوں۔ نفی میں سر ہلاتا ہوں۔ ''یقین نہیں آرہا..... یقین نہیں آرہا۔'' میری نگاہیں رپورٹس پر ہیں۔ آواز بھرا جاتی ہے۔

''لیکن جمال! ناامیدی گناہ ہے۔ قدرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کرشمے بھی تو ہوتے ہیں۔ ہمیں کسی بہت اچھے ڈاکٹر سے Second Opinion لینا چاہیے..... بلکہ ایک سے زیادہ ڈاکٹروں سے۔ ایک بہت اچھے اسپیشلسٹ ڈاکٹر مدثر تو ادھر گارڈن ٹاؤن میں بھی ہیں۔''

''م..... مگر کرشمہ..... یہ تو کافی آگے کی اسٹیج لگ رہی ہے۔'' میں رپورٹ پر نظریں جمائے گلوگیر لہجے میں کہتا ہوں۔

''پلیز، آہستہ بولو جمال..... اوہ جاگ نہ جائے۔''

پھر ہم دونوں بہت دھیمی آواز میں کھسر پھسر کرنے لگتے ہیں۔

اب اندازہ لگایا جائے کہ جب کمالی نے کچن کی کھڑکی کی درز میں سے یہ ساری گفتگو سنی ہوگی تو اس پر کیا گزری ہوگی۔ میں نے کہا ہے نا کہ پریک کافی سخت تھا لیکن کرشمہ کی خاطر بلکہ کرشمہ اور کمالی کی خاطر مجھے اس کا حصہ بننا پڑا۔

چار روز پہلے میں اسے زبردستی ہی سر کے درد کے لیے ایک ڈاکٹر امتیاز کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے خون کے دو ٹیسٹ لکھ دیے تھے اور اب وہی ٹیسٹ اس پریک کی بنیاد بن رہے تھے۔ ڈاکٹر امتیاز بھی اس ''ہائی فائی'' پریک کا ثانوی کردار تھا۔

کرشمہ جس طرح آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی۔ میں بھی آکر لیٹ گیا۔ اگلے روز توقع کے عین مطابق کمالی بالکل خاموش تھا۔ میں بھی خاموشی اور گہری سنجیدگی کی اداکاری کرتا رہا۔ کمالی کی طرح میں نے بھی ناشتا ٹھیک سے نہیں کیا۔ ناشتے کے بعد ہم چائے کے کپ لے کر بالکونی میں آبیٹھے۔

آخر اس بوجھل خاموشی کو کمالی نے ہی توڑا۔ اچانک بولا۔ ''وہ رپورٹس کدھر ہیں؟''

میں حیران ہوا اور کچھ حیرانی کی اداکاری بھی کی۔

''کک..... کون سی رپورٹس؟''

''رات والی رپورٹس۔'' کمالی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا پھر ایک دم اٹھا اور کمرے میں جا کر میری الماری کی تلاشی لینے لگا۔ ذرا ہی دیر میں ایک دراز کے اندر سے اس نے رپورٹس ڈھونڈ لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تیزی کے ساتھ دروازہ اندر سے بند کیا۔ میں دروازے پر ہی کھڑا رہ گیا۔

''کمالی! دروازہ کھولو۔ میری بات سنو۔'' میں نے دروازے پر دستک دینا شروع کردی۔

مجھے معلوم تھا وہ رپورٹس دیکھنے کے بعد ہی دروازہ کھولے گا۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد میں واپس بالکونی میں آگیا۔ اسی دوران میں نیچے سڑک پر کرشمہ بھی اوبر ٹیکسی سے اترتی نظر آئی۔ یہ اچھا ہی ہوگیا۔ وہ اوپر آئی تو میں نے اسے بتایا کہ کمالی کمرے میں ہے۔

وہ دروازے پر دستک دینا ہی چاہ رہی تھی کہ وہ خود باہر آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل تھیں اور چہرے پر سنجیدگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ رپورٹس ہاتھ میں تھیں۔

''پرفیکٹ'' اچھے اداکار تو ہوتے ہی ہیں۔ کرشمہ نے اپنے لہجے میں ہمدردی آمیز کرب سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''کمالی! کون سی بیماری ہے جس کا آج کل علاج نہیں ہے۔ سب کچھ ہوجاتا ہے..... یہ سائنس کا دور ہے یار!''

میں نے کہا۔ ''کمالی! کرشمہ ڈاکٹر صاحب سے ٹائم

لے کر آئی ہے۔ ڈاکٹر مدثر مجید کا نام شاید تم نے بھی سنا ہو۔ لاہور کے بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ ہم آج ہی انہیں دکھاتے ہیں۔ یہ جو ٹیسٹ ہیں ان کی بھی کسی دوسری لیبارٹری سے تصدیق کراتے ہیں۔" وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"تمہارے سر درد کا کیا حال رہا رات کو؟" کرشمہ نے لہجے میں بہت ہمدردی سمیٹ کر کہا۔

"درد تو ایک دو دن سے ٹھیک ہی ہے۔" کمالی نے مختصر جواب دیا۔

رات کو ہم دونوں کمالی کو ڈاکٹر مدثر مجید کے پاس لے کر گئے۔ جواں سال ڈاکٹر مدثر کرشمہ کے ایک فیملی ممبر کے قریبی دوست تھے۔ کرشمہ ان سے بات کر چکی تھی لہٰذا انہوں نے بھی رپورٹس کی تصدیق ہی کی بلکہ دو ٹیسٹ اپنی ذاتی لیبارٹری میں فوری طور پر کروائے اور بتایا کہ معاملہ وہی ہے جو پہلی رپورٹس میں آیا..... لیکن ناامیدی گناہ ہے۔ فوری طور پر علاج شروع کرایا جائے۔ قدرت چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا، وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز ہم ایک اور ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ یہ بھی اسپیشلسٹ تھے۔ ذرا بڑی عمر کے تھے اور کسی حد تک ٹھرکی بھی۔ کرشمہ نے کافی کوشش کر کے انہیں اس پریکٹ کے لیے تیار کیا تھا۔ انہوں نے ہم سے براہِ راست تو کچھ نہیں کہا تاہم کمالی کے ایکسرے کیے اور ایم آر آئی کے علاوہ خون کے دو نمونے کراچی بھجوا دیے۔ یہ نمونے بھی کراچی نہیں گئے۔ وہیں ڈاکٹر صاحب کی ایک اسٹاری میں پڑے رہے۔ اس کے باوجود ان کی تفصیلی رپورٹ تیسرے ہی روز کراچی سے آ گئی۔

ہمارا خیال تھا کہ یہ نئی رپورٹس دیکھنے کے بعد کمالی خود کو باقاعدہ طور پر راہِ عدم کا مسافر محسوس کرنے لگے گا..... اور پھر دو دن بعد اس کی سالگرہ کے روز جب ہم انکشاف کریں گے کہ وہ راہِ عدم کا مسافر ہرگز نہیں..... اور پریکٹ کرنے والوں کا مشہور فقرہ دہرائیں گے..... "وہ دیکھو کیمرا..... وہ دیکھو کیمرا" تو وہ ہکا بکا رہ جائے گا۔

مگر ہم نے محسوس کیا کہ تازہ رپورٹس دیکھنے کے باوجود وہ بالکل اطمینان سے ہی رہا۔ ہم اس کے ساتھ علاج اور تسلی تشفی کی باتیں کرتے رہے اور وہ سنتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے واش روم میں گیا تو کرشمہ نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "کہیں کوئی شک تو نہیں ہو گیا اسے؟"

"شک کے لیے کوئی کسر تو نہیں چھوڑی تم نے۔" میں نے جواب دیا۔

"یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا دل کچھ ٹھکانے پر کر لیا ہو۔ سوچا ہو کہ اب جو کچھ بھی ہونا ہے، اس کا سامنا تو کرنا ہے۔" پھر ذرا توقف سے بولی۔ "تمہارے بغیر کہیں آیا گیا تو نہیں؟"

"نہیں یار! سائے کی طرح ساتھ رہا ہوں۔ ویسے سچ پوچھو تو اب میرے دل کو کچھ کچھ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہم اس "پریکٹ" میں کافی آگے نکل گئے ہیں۔ ترس آ رہا ہے اس پر۔ میں تو کہتا ہوں سالگرہ کا انتظار ضروری نہیں۔ ہم کل ہی اسے سب بتا دیتے ہیں۔"

کرشمہ سوچنے لگی۔ اسی دوران میں ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ کمالی واپس آ گیا تھا۔

رات بارہ سے ایک بجے کا عمل ہوگا۔ میں نے اپنے کمرے میں بستر پر کروٹ بدلی تو آنکھ کھل گئی۔ کمالی اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے واش روم اور کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی لائٹس آف تھیں۔ میں نے سوچا شاید بالکونی کی طرف چلا گیا ہو مگر رات کو پھر اس کے سر میں ہلکا درد ہو رہا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں وہ بالکونی کی ٹھنڈی ہوا میں کیسے نکل سکتا تھا۔

میں لحاف پھینک کر جلدی سے بیڈ پر سے اتر آیا۔ فلیٹ میں اسے ہر طرف دیکھا، آوازیں دیں مگر وہ کہیں تھا ہی نہیں۔ مجھے اس طرح بتائے بغیر وہ کبھی کہیں نہیں گیا تھا، اب کیسے جا سکتا تھا۔ میں نے نیچے جا کر دیکھا، موٹر سائیکل بھی موجود تھی۔ اوپر آ کر اسے فون کیا، فون بھی بند تھا۔

"یا اللہ! کیا ماجرا ہے؟" میں پریشان ہو گیا۔

پھر خیال آیا کہ کہیں کرشمہ کی طرف ہی نہ چلا گیا ہو۔ کرشمہ کو تیسری بار فون کیا تو وہ نیند سے جاگی۔ میں نے اسے بتایا کہ کمالی فلیٹ میں نہیں ہے۔

وہ بھی پریشان ہو گئی۔ "کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا تم دونوں میں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ "تمہارا ساتھی یاسر کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کام سے گوجرانوالہ گیا ہوا ہے۔ اسے بھی فون کر چکا ہوں۔"

باقی کی ساری رات اور اگلا دن بھی ہم نے اسے تلاش کرتے ہوئے ہی گزارا۔ اس کے ہر جاننے والے سے رابطہ کیا۔ کوئی کھوج نہیں تھا۔ اس کا فون مسلسل بند تھا، نہ ہی وہ کوئی نوٹ وغیرہ چھوڑ کر گیا تھا۔

سیانے کہتے ہیں کہ جب ذہن میں کوئی اچھی سوچ

آئے تو اس پر عمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے ذہن میں بھی ایک اچھی سوچ آئی تھی کہ "پرینک" کو زیادہ طول نہ دیا جائے اور سالگرہ کے دن سے پہلے ہی اس کا انکشاف کر دیا جائے۔ ہم اس سوچ بچار میں ہی تھے کہ یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں بار بار یہ شک آ رہا تھا کہ اگر کمالی اس طرح اچانک کہیں غائب ہوا ہے تو اس میں اس صورت حال کا بھی عمل دخل ہے جو ہم نے پیدا کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ بہت زیادہ ڈپریشن میں آ کر کہیں دائیں بائیں ہو گیا ہو یا پھر کہیں ملتان کی طرف ہی نکل گیا ہو جہاں اس نے اپنے آدھے سر کے درد کے حوالے سے کسی ہومیو پیتھک معالج کا ذکر کیا تھا۔

مگر اس سے زیادہ خطرناک امکانات بھی موجود تھے۔ پرینکس کرنے والے اپنے کئی دشمن بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ جیسے وہ بریانی اور بیکری والے خان صاحب تھے۔ جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ جو گمبھیر قسم کا پرینک میں نے کرشمہ کے ساتھ مل کے کر ڈالا تھا، اس پر شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی اور میرے اندازے کے مطابق کرشمہ کی شرمندگی اور پریشانی مجھ سے سوا تھی۔

تین روز سخت پریشانی کے عالم میں گزر گئے۔ یہ چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ میں اور یاسر مختلف جگہوں پر کمالی کو تلاش کر کے ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے واپس فلیٹ آئے تھے۔ کال بیل ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو سکتہ زدہ رہ گیا۔ نگاہوں پر بھروسا ہی نہیں ہوا۔ میرے سامنے میری والدہ اور بہن کومل کھڑی تھیں۔ کومل کے کندھے سے ایک بھاری بیگ جھول رہا تھا۔ والدہ کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا۔

"آپ..... یہاں؟" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

"بہت مشکل سے ڈھونڈا ہے تمہارا پتا۔ بہت کٹل ہوئے ہیں۔" والدہ نے گلوگیر آواز میں کہا اور بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

کتنی ہی دیر انہوں نے آنسو بہائے۔ میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ والدہ کے بعد کومل میرے گلے لگی اور آنسو بہائے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آمنے سامنے بیٹھے بات کر رہے تھے۔ میں نے یاسر کو چائے کا سامان وغیرہ لینے کے لیے بھیج دیا۔ "آ..... آپ کو یہاں کا پتا کیسے؟"

کومل جو میرے کندھے سے لگی بیٹھی تھی، حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "بھائی! آپ نے خود ہی تو بلایا ہے اور اب پوچھ بھی ہم سے رہے ہیں؟"

"ہم..... میں نے بلایا ہے؟"

"کمالی بھائی نے تو یہی کہا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے یہاں جھاڑ نگر میں ہمارے لیے خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔"

والدہ بولیں۔ "ہم تو تیار ہی نہیں تھے جمالی..... ! کمالی نے فائٹ راتوں رات ہمیں تیار کرایا اور صبح منہ اندھیرے ہی ہمیں گاؤں سے لے کر نکل آیا۔ وہ دارو غہ والا ٹینک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ ہمیں بس میں بٹھا کر واپس گیا ہے۔"

کومل نے کاغذ پر لکھا ہوا فلیٹ کا مکمل ایڈریس مجھے دکھایا۔ "کمالی بھائی نے سب کچھ زبانی بھی مجھے سمجھایا تھا پھر بھی ڈھونڈنے میں مشکل ہوئی۔" وہ بولی۔

"اب..... اب وہ کہاں ہے؟" میں نے اپنی آواز کی لرزش کو بمشکل چھپایا۔

"ہمیں تو کچھ پتا نہیں، نہ ہی اس نے کچھ بتایا ہے۔" والدہ نے کہا۔ "بس یہی کہتا جا رہا تھا کہ آپ دونوں کے لیے اب یہاں بہت زیادہ خطرہ ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے جمالی!"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ دماغ چکرانے لگا۔ یوں لگا کہ دل پسلیاں توڑ کر نکل آئے گا۔ مجھ پر ایک خوفناک انکشاف ہو رہا تھا۔ دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا جو کچھ ہم نے مذاق مذاق میں کیا تھا، وہ ایک نہایت سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ جان کر کہ اس کے سر کا درد عام سر درد نہیں بلکہ ایک سنگین ترین بیماری کا نتیجہ ہے، کمالی ہر طرح کے خطرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم دونوں ہی جھاڑ نگر کے دلدوز واقعات کو بھولے نہیں تھے۔ خود کو فنی مذاق اور پرینکس وغیرہ میں مشغول کر کے ہم بھولنے کی کوشش تو کرتے تھے مگر ایک آگ سی ہر وقت سینے میں سلگتی رہتی تھی۔ خاص طور سے کمالی تو کسی وقت سوتے میں بھی بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں میری والدہ کی دہائیوں کا ذکر ہوتا تھا اور اس شفیق باپ کے جنازے کا ذکر ہوتا تھا جسے ہم دونوں نے روتے ہوئے کندھا دیا تھا..... اور اس جلاوطنی کا ذکر جو ہم پر زبردستی مسلط کی گئی۔

پھر ایک روز سگریٹ پھونکتے ہوئے کمالی نہ جانے کس موڈ میں تھا۔ اس نے بھوئے بھوئے لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔ "جمالی! میں جانتا ہوں تو رات دن راحیہ کو یاد کرتا ہے۔ میں تجھے تیرے پیار میں ہارنے نہیں دوں گا۔"

"تو کیا کریں گے ہم؟" میں نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا۔

"تم بھی جانتے ہو کیا کریں گے۔ ایک نہ ایک دن تو

ہمیں ملک مختار اور اشرف ملکو سے ٹکرانا ہی پڑے گا۔"

"مگر لوگ کہتے ہیں کہ اُٹھتے چوبارے والوں سے ٹکرانے کا مطلب سیدھا سیدھا موت کو دعوت دینا ہے۔"

"اور موت کو دعوت دینے سے ہی ظالم کا پنجہ مروڑا جاسکتا ہے اور اسی سے سچی زندگی ملتی ہے۔ ویسے ٹکرانے کے کئی طریقے ہیں۔ براہِ راست ٹکر کے بجائے ہم کوئی حکمتِ عملی بنا سکتے ہیں۔"

"اور ماں کی قسم؟"

"ماں کی قسم تیرے لیے تھی جمالی! میرے لیے نہیں۔"

میرے دل نے پکار کر کہا..... جو آگ ہم دونوں کے سینوں میں ہولے ہولے سلگ رہی تھی، وہ کمالی کے سینے میں ایک دم الاؤ بن گئی ہے..... انگاروں والے بھانبھڑ میں تبدیل ہوگئی ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک دم خود کو ہر خطرے سے بے نیاز محسوس کرنے لگا ہے۔

اسی دوران میں کرشمہ کا فون آگیا۔ اس نے کہا۔ "جمالی! ابھی ابھی یاسر نے بتایا کہ گاؤں سے تمہاری والدہ اور بہن آئی ہیں اور انہیں بھیجنے والا خود کمالی ہے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہوا ہے کرشمہ!"

"لل..... لیکن جمالی..... جھاڑ نگر کی ملکو فیملی کے بارے میں تو یہی سنا ہے کہ وہ بہت خطرناک ہے۔ وہ تو دیکھتے ہی مار ڈالیں گے اسے..... وہ..... کیوں گیا ہے وہاں؟"

"اسے ہم دونوں نے ہی بھیجا ہے وہاں۔" میں نے بہت افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ تم فوراً فاسٹ ریسٹورنٹ پہنچو۔ سچویشن تمہاری توقع سے بہت زیادہ خطرناک ہے کرشمہ!" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

☆☆☆

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور کرشمہ فاسٹ ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں کرشمہ کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرچکا تھا۔ کرشمہ کی اگلی نیلی آنکھیں سرخی مائل ہوگئی تھیں۔ لگتا تھا کہ ابھی اس کے آنسو بہنے لگیں گے۔

میں نے کہا۔ "کرشمہ! یہ ایسے ہی ہے جیسے کہیں سلگتی ہوئی دھیمی دھیمی آگ کو شعلہ فشاں الاؤ بنانے کے لیے تیل کے ایک چھینٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے "بریک" نے کمالی کے لیے اسی چھینٹے کا کام کیا ہے۔ وہ بھوکے شیروں کی کچھار میں جا گھسا ہے اور..... وہ..... اپنے شکار کا گوشت ہی نہیں نوچتے، ہڈیاں تک چبا جاتے ہیں۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اکیلے تو ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

یکایک کرشمہ کے آنسو ضبط کا بندھن توڑ کر بہہ نکلے۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا اور میز پر جھک کر سسکیوں سے رونے لگی۔ کوشش کے باوجود اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ڈائننگ ہال میں اکا دکا لوگ ہی موجود تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سسکیوں کے درمیان کراہی۔ "کاش ہم اسی شام کمالی کو سب بتادیتے۔ ہم نے دیر کردی جمالی..... دیر کردی۔"

وہ اس طرح زار و قطار روئی کہ مجھے آنسو اس کی انگلیوں اور شفاف کلائیوں پر چلتے ہوئے نظر آئے۔ اس گھڑی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ کمالی سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ خاموش طبع تھا اور کرشمہ کسی حد تک انا کے حصار میں تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی محبت ابھی تک اظہار کے مرحلے تک نہ پہنچی تھی۔

میں رات بھر سوچتا رہا تھا اور اب ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہیں ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے میں نے یہ فیصلہ کرشمہ کو بھی سنادیا۔ میں نے کہا۔ "کرشمہ! میں کمالی کے پیچھے جھاڑ نگر جارہا ہوں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"..... اور تم خود کہتے ہو کہ اس طرح براہِ راست ملکو فیملی سے ٹکر لینا سراسر خودکشی ہے۔ یعنی تم بھی کمالی کے ساتھ خودکشی کرنا چاہو گے؟"

"یہ بعد کی باتیں ہیں کرشمہ! فی الحال تو کمالی کو یہ سمجھانا ہے کہ وہ چند مہینوں کا مہمان نہیں ہے۔ وہ بالکل تندرست ہے۔ وہ اس طرح مایوسی کی حالت میں خود کو موت کے منہ میں نہیں پھینک سکتا۔"

"اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے ہم کوئی اور طریقہ بھی تو اختیار کرسکتے ہیں؟"

"اور کوئی طریقہ نہیں کرشمہ!" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور ہمارے پاس وقت نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"ہوسکتا ہے جمالی اس کا فون ایک آدھ روز تک کھل جائے یا پھر اس تک اطلاع پہنچانے کی کوئی اور شکل بن جائے۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گا۔ میں آج رات جھاڑ نگر کے لیے نکل رہا ہوں۔"

وہ لمحوں آنکھیں پونچھتے ہوئے کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "اور تمہاری والدہ کی دی ہوئی قسم؟"

"یہ میرا معاملہ ہے۔ میں ان سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ کمالی کی جان بچانے کے لیے مجھے اجازت

دے دیں گی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کرشمہ بھی اٹھ گئی۔ کچھ سیکنڈ تک کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی جمالی!"

☆☆☆

..... اور یہ تھا جھاڑ نگر..... میری جنم بھومی..... میری زندگی کی ساری تلخ و شیریں یادوں کا مرکز۔ یہ علاقہ چونکہ بارڈر ایریا کے نزدیک تھا لہٰذا یہاں جرائم کی شرح بھی کافی زیادہ تھی اور اس کی ایک وجہ یہاں کاشتکار دھرتا ملک مختار ملکو بھی تھا۔ خشیات، اسلحے کی فراوانی، ڈکیتی، اسمگلنگ کیا تھا جو یہاں نہیں تھا۔ ملک مختار خود تو زیادہ تر اپنے ہاتھ صاف رکھنے کی کوشش کرتا تھا تاہم چھوٹا بھائی اشرف ملکو کھل کھلا کر ہر طرح کی بدمعاشیاں روا رکھتا تھا۔ اشرف ملکو کا ایک دستِ راست شیر بھٹی تھا۔ پتا نہیں کس طرح اس کا نام شیر اشیرو پڑ گیا تھا۔ نہایت خطرناک و سفاک شخص تھا اور ملکو خیلی کا بہت لاڈلا بھی۔ میرے یار کمالی کے والدین چودہ پندرہ برس پہلے شیر اشیرو سے ڈر کر ہی بالاکوٹ کی طرف شفٹ ہو گئے تھے جہاں وہ بدقسمتی سے 2005ء کے زلزلے میں جان سے گئے۔

..... ہاں تو یہ تھا جھاڑ نگر..... یہ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی تاریک شب تھی۔ میں، کرشمہ اور یاسر پنڈی وال رات نو بجے ایک لوکل بس کے ذریعے جھاڑ نگر کی حدود میں پہنچے تھے۔ اب جھاڑیوں اور کھیتوں میں پیدل سفر کرتے ہوئے آگے جا رہے تھے۔ ہم تینوں عام دیہاتی بھیس میں تھے۔ میں نے ایک ڈبی دار کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ منہ اور سر گرم مفلر اور ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ خوبرو کرشمہ بہروپ بھرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ وہ کھچڑی بالوں والی ایک سانولی سی ادھیڑ عمر عورت کے روپ میں تھی۔ یاسر نے دیہاتی لباس پہن لیا تھا تاہم وہ اصل شکل صورت میں ہی تھا۔ میرے اور یاسر کے پاس بوسیدہ سے سفری بیگ تھے۔ ہمارے پاس دو پستول بھی تھے، البتہ یہ پستول کرشمہ نے اپنے لباس میں چھپا رکھے تھے۔ ان کے تین فالتو میگزین اسی نے اپنے بالائی اندرونی لباس میں بڑی صفائی سے ٹھونس لیے تھے۔ بالفرض کسی جگہ ہماری تلاشی بھی ہوتی تو یہ ہتھیار بچ جاتے کیونکہ ایسے موقعوں پر عورتیں اکثر تلاشی سے گھبراتی ہیں۔

ہمارا رخ راجے اکرم کے گھر کی طرف تھا۔ راجے اکرم ٹریکٹر ٹرالی اور ڈیزل انجن وغیرہ ٹھیک کرنے کا کام کرتا تھا۔ جھاڑ نگر سے کوئی ایک کلومیٹر باہر ہی پکی سڑک کے کنارے اس کی دکان تھی اور دکان کے عقب میں دو کمرے کا نیم پختہ گھر تھا۔ قریباً دو سال پہلے جب میں اور کمالی جھاڑ نگر سے نکالے نہیں گئے تھے، راجے اکرم بھی ہمارے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ وہ عمر میں ہم سے چار پانچ سال بڑا تھا لیکن ہم خیال تھا۔ جب ہم گاؤں میں ویڈیوز وغیرہ بناتے تھے، کسی وقت اکرم بھی ہمارا ساتھ دے دیتا تھا۔

مجھے امید تھی کہ ہمیں ایک آدھ دن کے لیے اکرم کے پاس پناہ مل جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ کمالی کا کوئی کھوج کھرا بھی مل جائے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دھند آلود یخ بستہ شب نے کھیتوں کھلیانوں اور نشیب و فراز کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ بس کہیں کہیں روشنی کے آثار نظر آتے تھے۔ عموماً یہ ان کھیت مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے جن کی رہائش عموماً کھیتوں کے آس پاس ہی ہوتی ہے۔ میں نے دور ہی سے راجے اکرم کے گھر کی روشنی دیکھ لی۔ بند دکان کے پہلو میں گھر کا آہنی دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے تین چار بار دستک دی۔ بالآخر اندر کچھ مزید روشنی نمودار ہوئی اور قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اندر صحن میں بندھے ہوئے کتے نے بھی شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

"کون ہے؟" راجے اکرم کی نہایت ڈری ڈری آواز میں نے پہچان لی۔

"اکرم بھائی دروازہ کھولو۔"

اکرم نے میری آواز نہیں پہچانی۔ اس کا خوف کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ "کون ہو تم؟ اپنا نام بتاؤ!"

"نام بتایا تو حرہ غراب ہو جائے گا۔ خود دیکھ کر پہچانو گے تو زیادہ اچھا لگے گا۔" میں نے کہا۔

اندر ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ ایک لمبے وقفے کے بعد کانپتی ہوئی سی آواز ابھری۔ "تم..... تم جمالی ہو؟" لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

"ہاں یار! اب آواز بھی بھول گئے میری؟" میں نے جواب دیا۔

ایک دم دروازہ کھلا۔ لالٹین کی روشنی میں راجے اکرم کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں نظر آئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ عقب میں رکھوالی والا کتا شور مچا رہا تھا۔ اکرم نے حیرت اور ڈر کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ہم تینوں کو دیکھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم یہاں کیوں آ گئے ہو؟ خدا کے لیے..... خدا کے لیے..... ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہ

کر دینا۔ میں اتنا بھارا اٹھانے جوگا نہیں ہوں۔"

"اکرم بھائی! کیا بات کر رہے ہو۔ میں تمہارے لیے مصیبت کیوں کھڑی کروں گا۔ ہم تو بس رات بھر کے لیے....."

"نہیں جمالی نہیں۔" اس نے تیزی سے میری بات کاٹی اور دروازے کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے ہمیں یہیں پر روک لینا چاہتا ہو۔ گھبرائے سے لہجے میں بولا۔ "دیکھ جمالی! میری بیوی ہے، دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں اس خطرناک سیاپے میں نہیں پڑ سکتا۔"

میری سمجھ میں اکرم کا رویہ بالکل نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران میں کچھ فاصلے سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی اور روشنی چمکی۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے وقت ملک مختار ملکو کے گماشتے موٹر سائیکلوں یا کبھی کبھار گھوڑیوں وغیرہ پر علاقے کا گشت لگاتے رہتے ہیں۔

موٹر سائیکل کی آواز سننے کے بعد اکرم کا چہرہ اور بھی دھواں ہو گیا۔ "یار! تم لوگوں نے مروا دینا ہے مجھے۔ خدا کے لیے....." اس نے لالٹین نیچے رکھ کر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کچی پکی سڑک پر دھند کے اندر سے موٹر سائیکل کی اچھلتی کودتی روشنی قریب تر آ رہی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ میں نے اکرم کو ذرا دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اکرم بھائی! مصیبت تو تم اپنے لیے خود پیدا کر رہے ہو۔ اندر آنے دو ہمیں۔" میں اسے قریباً دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ میرے پیچھے کرشمہ اور یاسر بھی گن میں آ گئے۔ غالباً راجے اکرم بھی اب سمجھ گیا تھا کہ ہمارا دروازے پر رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے جلدی سے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی، لالٹین بجھائی اور ہمیں لے کر فاؤنڈ نیم گرم کمرے میں آ گیا۔

راجے اکرم کی خوش شکل بیوی بھی ڈری ہوئی سی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ ہمیں اندر گھستے دیکھ کر اس نے تیزی سے لمبا گھونگٹ نکالا اور چند ماہ کے بچے کو گود میں سمیٹ لیا۔ راجے اکرم ہمیں لے کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے کان جیسے مسلسل موٹر سائیکل کی بھاری آواز پر لگے ہوئے تھے۔ آواز کچھ دیر بعد آگے نکل گئی تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ "یہ ملکو جی کے لوگ ہی تھے۔"

راجے اکرم کو سنبھلنے اور اپنے حواس کچھ بحال کرنے میں پانچ دس منٹ لگ گئے۔ وہ اب کچھ کہہ تو نہیں رہا تھا مگر اس کی "باڈی لینگویج" پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہماری یہاں موجودگی اس کے لیے ایک عذاب جیسی ہے۔ میری چھٹی حس کہنے لگی تھی کہ دال میں کافی سارا کالا ہے۔

وہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے ہم سے رسماً بھی چائے پانی کا نہیں پوچھا۔ بس اتنی مہربانی کی کہ دوسرے کمرے سے سلگتی ہوئی انگیٹھی اٹھا کر ہمارے پاس رکھ دی۔

وہ بہت سے سوال کر سکتا تھا مگر اس نے جو پہلا سوال پوچھا، وہی حیران کن تھا۔ کہنے لگا۔ "تم بچ کیسے گئے؟"

"بچانے والی خدا کی ذات ہے اکرم بھائی!" میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ جیسے کراہ اٹھا۔ "جمالی.....! یہ درندے ہیں درندے..... چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے تمہیں۔ اگر اوپر والے نے تمہیں موقع دے ہی دیا ہے تو نکل جاؤ یہاں سے..... ایک منٹ کی دیری نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "اکرم بھائی! کچھ بتاؤ گے تو ہمیں پتا چلے گا نا کہ دیری کیوں نہ کریں؟"

"وہ گھیرا جا چکا ہے جمالی! اب بچ نہیں سکے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب وہ اسے اتنی آسانی سے ماریں گے بھی نہیں .....اور.....اور شاید تمہیں پتا نہیں، وہ کڑی بھی کچھ ماری گئی ہے جس نے کمالی کا ساتھ دیا۔"

میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔ خدشہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ اکرم جو کچھ کہہ رہا ہے کمالی کے سلسلے میں ہی کہہ رہا ہے۔ میں نے سامنے بیٹھی کرشمہ کی آنکھوں میں بھی خوف کی واضح پرچھائیاں دیکھیں۔

میں نے کہا۔ "اکرم بھائی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ طریقے سے بتاؤ تو کوئی بات پلے پڑے۔"

ساتھ والے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ وہ شیر خوار بچہ اور ماں تھے۔ انگیٹھی میں اکرم نے کچھ لکڑیاں ڈال دی تھیں۔ وہ جو کچھ ہمیں بتا رہا تھا، وہ ہمارے اندیشوں سے کہیں زیادہ تھا۔ ہم پر خوفناک انکشاف ہو رہے تھے۔

.....تین روز پہلے میری والدہ اور بہن کو یہاں سے نکالنے کے بعد کمالی دوبارہ یہاں پہنچا۔ اس کے ارادے اچھے چوہارے والوں سے ٹکرانے کے تھے اور وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اسے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ راضیہ کی شادی ہونے میں بھی اب کچھ زیادہ دیر نہیں ہے اور وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا..... "جمالی! تیری جان کو تجھ سے جدا نہیں ہونے دینا ہم نے....."

راجے اکرم کے انکشاف کے مطابق یہاں آتے ہی

کمالی نے سب سے پہلے رانیہ کی اسی سہیلی فرح سے رابطہ کیا جو دو برس پہلے سانپ والے پریک میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ ہر طرح سے رانیہ کی ہمراز تھی۔ اسی کے ذریعے کمالی نے رانیہ کو پیغام بھیجا اور وہ کمالی سے ملنے فرح کے گھر آ گئی۔ لگتا یہی تھا کہ رانیہ بھی کسی ایسے رابطے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اپنے ناپاک ارادے شمشیر ملکو کی ڈولی میں بیٹھنے کے بجائے اسے مرنا قبول تھا اور میں جانتا تھا وہ بھی میری ہی طرح مجھے ایک پل کے لیے بھولی نہیں ہوگی۔

لیکن راجے اکرم کے بیان کے مطابق یہاں ہوا یہ تھا کہ ملکو فیملی اس رابطے سے آگاہ ہوگئی۔ انہیں پتا چل گیا کہ کمالی نہ صرف یہاں جھاڑ نگر میں موجود ہے بلکہ فرح کے ساتھ مل کر رانیہ کو لے اڑنے کی پلاننگ بھی کر رہا ہے۔ اس انکشاف نے ان کے سروں پر جیسے ہزاروں پونڈ کا بم پھوڑ دیا۔ ان کے غیظ و غضب کے شعلے آسمان کو چھونے لگے۔ فوری طور پر کمالی تو ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ انہوں نے غریب مالی کی بیٹی فرح کو جا دبوچا۔

راجے اکرم نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ہمیں بتایا۔ ”پہلے تو اسے مارا پیٹا گیا اور قریباً ننگا کر کے گاؤں کی گلیوں میں گھمایا گیا پھر بھی ان کے غصے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اسے چوبارے کے مردانے کے وسیع و عریض (صحن) میں لے جا کر کئی مشٹنڈوں اور ملازموں کے سامنے اس کی عزت برباد کر دی گئی..... اور ایک ظلم اس سے بھی بڑا ہوا ہے۔“ راجے اکرم کی آواز بھرا گئی۔

اپنی میلی، پھیلی تیل کے دھبوں والی قمیص سے اپنی آنکھیں صاف کر کے وہ دوبارہ بولا۔ ”فرح کا ایک بھائی بھی ہے ملنگی۔ سائیں ٹائپ تھا۔ تم بھی جانتے ہو گے؟“

”ہاں..... کیا ہوا اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”مار دیا اس کو بھی۔“ راجے اکرم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”وہ سائیں ٹائپ تھا لیکن اتنی سمجھ تو رکھتا تھا کہ ملکو فرح کو اٹھا چوبارے میں لے گئے ہیں اور وہ اندر رو چلا رہی ہے۔ وہ اشرف ملکو کے گن مینوں کے ساتھ بھڑ گیا۔ بدبختوں نے اسے پیپل والے پرانے کنویں میں دھکا دے دیا۔ تمہیں پتا ہے تھانے والے بھی اپنے ہی ہیں ان کے۔ رپورٹ یہ درج ہوئی ہے کہ وہ قبرستان سے بھنگ پی کر اچھے چوبارے کی طرف آ رہا تھا کہ ڈل (پرانا کنواں) میں گر گیا۔“

”تم کمالی کی بات کر رہے ہو کہ وہ کسی گھیرے میں ہے؟“ کرشمہ نے بے تابی سے پوچھا۔

”میں نے بتایا تو ہے بی بی.....! وہ بھاگ گیا تھا۔ گولی چلا کر اشرف ملکو کے دو بندے بھی پھل کیے اس نے..... مگر اب برساتی نالے کی پرلی طرف کلری زمین پر درجنوں بندوں نے گھیر لیا ہے اس کو۔ اب وہ بچے گا نہیں۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تم بھی اس کے ساتھ تھے اور بچ کر نکل آئے ہو..... مگر تم الٹی بات بتا رہے ہو کہ وہ اکیلا آیا تھا۔“

تب ایک دم اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”دیکھو جمالی! میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ مجھ پر اور اپنے آپ پر رحم کرو۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، واپس چلے جاؤ۔ یہاں کام بہت بگڑ چکا ہے۔ وہ لوگ وحشی ہو رہے ہیں۔ مار دیں گے تم کو بھی۔“

”یہ کلری زمین کہاں ہے جمالی؟“ کرشمہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں سے پانچ چھ کلومیٹر آگے ہے۔ نالے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے رقبے میں سرکنڈے اور جھاڑیاں شاڑیاں ہیں۔ بس نام ”کلری زمین“ پڑ گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

کرشمہ کی نگاہوں میں ایک دیوانی سی دلیری تھی اور یہ نگاہیں مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ اب کیا کرنا ہے؟

صورت حال کی سنگینی بہت بڑھ چکی تھی اور اس بڑھ جانے والی سنگینی کے ساتھ ہی میری اور کرشمہ کی پیشانی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم نے ایک خطرناک کھیل کھیلا اور اس کھیل نے دیکھتے ہی دیکھتے کمالی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

☆☆☆

کرشمہ کا تعلق راجپوت گھرانے سے تھا اور مجھے پہلی بار اس کی انا اور دلیری کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس محبت کا اندازہ بھی جو وہ کمالی کے لیے دل میں رکھتی تھی۔ قریباً دو گھنٹے ہم نے ڈرے سہمے راجے اکرم کے گھر میں گزارے پھر اسے مزید تکلیف میں رکھے بغیر وہاں سے نکل آئے۔ اب رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ ہم ہڈیوں میں گودا جما دینے والی دیہاتی سردی اور دھند میں پیدل سفر کرتے ہوئے ”کلری زمین“ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں یہاں کا شناور تھا۔ ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جہاں ملکو فیملی کے گشتی ہرکاروں سے مڈبھیڑ ہونے کا امکان کم سے کم ہو۔ ہاں، کہیں کہیں آوارہ کتوں کے گروہ ضرور ہمارا استقبال کر لیتے تھے۔

میرے پاس ایک بڑی ٹارچ موجود تھی لیکن میں اس کا استعمال کم سے کم کر رہا تھا..... لیکن کہتے ہیں کہ ہونی ہو کر

رہتی ہے۔ ہم کیکر اور ٹاہلی کے درختوں کے درمیان ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلے جارہے تھے جب اسی موٹر بائیک کی بھاری بھرکم آواز آئی جو ہم نے دو ڈھائی گھنٹے پہلے راجے اکرم کے گھر کے پاس دیکھی تھی۔ اردگرد تو کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ہم چھپ سکتے۔ بس یہی دعا کی جاسکتی تھی کہ موٹر سائیکل ہمارے رخ پر نہ آئے مگر ایسا ہوا نہیں..... کچھ ہی دیر بعد درختوں سے چھن کر آنے والی روشنی سیدھی ہم پر پڑنے لگی۔ یہ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ تھی۔

موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ ہمارے سر پر پہنچی۔ چادر پوش دو ہٹے کٹے افراد سوار تھے۔ ایک کے کندھے پر رائفل صاف نظر آرہی تھی۔ ''اوئے رک جاؤ۔ کون ہو؟'' گرج دار آواز میں کہا گیا اور ایک موچھیل رائفل بردار ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔

میں نے مسکین آواز میں کہا۔ ''سرجی! شیخوپورہ سے آئے ہیں۔ یہاں رنگ پور میں ہمارے رشتے دار ہیں۔ بس خراب ہوگئی تھی، اس نے بہت پیچھے اتار دیا۔ پھر رستہ بھول گئے۔''

''رنگ پور میں کون ہے تمہارا؟''

''مستری اللہ دتا میرا سگا ماموں ہے جی۔ شاید آپ بھی جانتے ہوں۔''

مستری اللہ دتا ہمارا رشتے دار نہیں بلکہ برادری کا ایک بندہ تھا۔ میرے جواب نے رائفل بردار کو کسی حد تک مطمئن کردیا۔ اس نے چند سوال مزید پوچھے پھر میرے علاوہ یاسر کی بھی جامہ تلاشی لی۔ ایک بٹنوں والے موبائل اور قریباً پندرہ سو روپے کے علاوہ انہیں اور کچھ نہیں ملا۔ بڑی دھنائی کے ساتھ رائفل بردار نے بارہ سو روپے اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔ ہمیں مشترکہ طور پر ایک گالی دے کر بولا۔ ''اس طرح آوارہ بکریوں کی طرح رات کے ٹائم پھرو گے تو کوئی چیر پھاڑ دے گا..... چلیں پہنچو اپنے ٹھکانے پر۔'' اس کے منہ سے الکحل کی بو آرہی تھی۔

میرا دل جو اب تک شدت سے دھڑک رہا تھا، قدرے سکون میں آیا..... مگر یہ سکون زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ہم ان سے رخصت ہوکر چند قدم ہی آگے گئے تھے کہ رائفل بردار کے ساتھی کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ''اوئے ٹھہرو ذرا۔''

ہمارے قدم زمین میں گڑ گئے۔ رائفل بردار کا ساتھی موٹر سائیکل سے اتر کر ہمارے پاس آیا۔ سردی کے سبب اس کے نتھنوں سے بھی بے تحاشا بھاپ خارج ہورہی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اوئے، تیری آواز کچھ سنی سنی سی لگ رہی ہے۔ یہ مفلر تو ہٹا ذرا اپنے تھوبڑے سے۔''

میرا دل یکبارگی شدت سے دھڑک اٹھا۔ اب میں نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اشرف ملکو کے اس ہرکارے کا نام غالباً ناجی تھا۔ اچانک میں نے اپنا سر جھکایا۔ اپنے سر کی نہایت شدید دھکیل کے ساتھ میں نے اسے قریباً ہوا میں اٹھا کر ایک تناور درخت سے دے مارا۔ ناجی کے سر کے عقبی حصے کے لیے یہ ضرب بے حد کاری ثابت ہوئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گرا۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ میں مجھے ایک چاقو ناجی کے لباس میں سے گرتا نظر آیا۔ میں نے چاقو اٹھایا اور گھوما۔ کرشمہ اور یاسر دونوں رائفل بردار پر پل پڑے تھے۔ یاسر اس سے آٹومیٹک رائفل چھیننے کی کوشش کررہا تھا مگر وہ نیم خمیم ہونے کے ساتھ ساتھ زور آور بھی تھا۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ اگر چند لمحے کی دیر ہوئی تو وہ رائفل کا رخ یاسر یا کرشمہ کی طرف کرکے لبلبی دبادے گا۔

میں نے لپک کر چاقو کا وار اس کی پشت پر کیا۔ گرم چادر اور اونی سوئیٹر کی وجہ سے چاقو کا لمبا پھل بس ایک دو انچ ہی اس کے جسم میں اترا ہوگا۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ میری طرف پلٹا۔ اس کا منہ کسی درندے کے جبڑے کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ گھمایا اور چاقو بچ کی آواز سے اس کے منہ کے اندر تالو میں گھس گیا۔ غالباً بس چاقو کا دستا ہی تالو سے باہر رہ گیا ہوگا۔ گرم خون کی پچکاری میرے ٹھٹھرے ہاتھ پر گری اور رائفل بردار کٹے شہتیر کی طرح موٹر سائیکل کے قریب گرا جو اب تک اسٹارٹ تھی۔

اس کا جسم چند بار پھڑکا اور پھر ساکت ہوگیا۔ وہ ختم ہوچکا تھا۔ یقیناً ختم ہوچکا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں قتل کرچکا ہوں۔ زندگی کا پہلا قتل۔ چند لمحوں کے لیے جسم پر لرزہ طاری ہوا لیکن پھر اس خیال نے کچھ تقویت دی کہ جو مرا ہے وہ شاید زندہ رہنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ کیا پتا کہ بدھ کے روز جنہوں نے جھاڑ نگر کی حویلی میں سرعام فرح کی عزت تار تار کی تھی، ان میں یہ بھی شامل ہو۔ یہ اشرف ملکو کا گماشتہ تھا اور اس کے گناہوں کی فہرست یقیناً لمبی تھی۔

کچھ بھی تھا، کرشمہ عورت ذات تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یاسر بھی گھبرایا ہوا تھا۔ درخت سے ٹکرانے والا ناجی صرف بے ہوش تھا۔ میں نے دونوں کی شلواروں سے ازار بند نکالے اور اس ناجی نامی بدمعاش کی مشکیں اچھی طرح کس دیں۔ اس کے بعد ہم نے دونوں کے بے حرکت جسموں کو گھسیٹ کر درختوں کے قریبی جھنڈ میں چھپا دیا۔

چاقو ابھی تک رائفل بردار کے خونچکاں تالو میں تھا البتہ اس کا جبڑا اب بند ہو چکا تھا۔ ذرا فاصلے سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے چاقو کا دستہ ایک سگار ہو جسے وہ پی رہا ہو۔

ان دونوں کے سامان میں سے ہمیں جو سب سے اہم چیز ملی وہ رائفل اور اس کے دو بھرے ہوئے قالتو میگزین تھے۔ ایک چھوٹا ونڈ گرینیڈ تھا جس پر اسٹیکر چسپاں کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ دو موبائل فون تھے جن میں سے ناجی کا فون زیادہ اہم محسوس ہوتا تھا۔ ڈھائی تین ہزار روپے بھی تھے جن میں سے ہم نے صرف اپنے بارہ سو روپے نکالے باقی ناجی کی جیکٹ میں چھوڑ دیے۔

موٹر سائیکل پر بیٹھنا خطرناک تھا۔ ویسے بھی اب ہم "کچی زمین" سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ہم نے حتی الامکان اپنی موجودگی کی شہادتیں مٹائیں اور پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے دل پر جبر کر کے تیز دھار چاقو پہریدار کے تالو میں سے کھینچ لیا تھا۔

اس پہلے سنگین معرکے کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور غالباً کرشمہ کا بھی۔ یاسر بھی کوئی کمزور دل ساتھی نہیں تھا۔ کمزور دل ہوتا تو ہمارے ساتھ جھاڑ جھنکار کا رخ نہ کرتا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم بالکل صحیح رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہوا کے دوش پر تیر کر اکا دکا فائر کی آوازیں ہم تک پہنچیں پھر ایک دو چھوٹے برسٹ بھی سنائی دیے۔ رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔

"کیا یہ وہی جگہ ہے؟" کرشمہ نے لرزاں آواز میں کہا۔

"لگ تو یہی رہا ہے۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "جمالی! اگر کمالی کو کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گی۔ ہم نے کتنا سنگین مذاق کیا اس سے اور کتنی بے دردی کے ساتھ۔ شاید پتھر پڑ گئے تھے میری عقل پر۔"

"کرشمہ! اب سانپ کی لکیر پیٹنے کا فائدہ نہیں۔ اب آگے کا سوچنا ہے۔"

"لیکن جمالی! یہاں تو لگتا ہے کہ کام بہت بگڑا ہوا ہے۔ ہم دو تین کیا کر سکیں گے؟" تب ایک بار پھر اس نے اپنی جیکٹ کے اندرونی حصے سے اپنا آئی فون نکالا اور کمالی سے رابطے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ شاید اب بھی اس کا خیال تھا کہ وہ کمالی کو اپنے "پریک" سے آگاہ کرے گی تو صورتِ حال میں کچھ بہتری پیدا ہو جائے گی لیکن میں جانتا تھا کہ اب ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔

مایوس ہو کر وہ میری طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ اب کیا کرنا ہے؟ میرے ذہن میں بھی کچھ واضح نہیں تھا۔ بس ایک ہی دھن تھی، میرا یار جو میرے لیے خطروں میں کودا ہے، اسے کسی بھی طرح ان خطروں سے نکالنا ہے۔

☆☆☆

نالے کے ساتھ ساتھ ہر طرف آٹھ دس فٹ تک اونچے سرکنڈے تھے۔ یہیں پر ایک "تھے" (مٹی کا ٹیلا) بھی تھا۔ لگتا تھا کہ کمالی اکیلا یا اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ اس "تھے" پر ہے اور اسے ملکوفیملی کے زہری گماشتوں نے گھیر رکھا ہے۔ یہ سارا واقعہ ہم سے بمشکل نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم تینوں ایک قدرتی نشیب کے جھاڑ جھنکاڑ میں رکے ہوئے تھے۔

گاہے بگاہے فائر سنائی دیتے تھے۔ یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ کمالی کے پاس ایمونیشن محدود ہے۔ اس کے جوابی فائر کا پتا چل جاتا تھا اور یہ فائر کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ اچانک ناجی والے فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ کوئی تھرڈ کلاس سا پنجابی گانا تھا، خود کو تیار کرتے ہوئے میں نے کال ریسیو کی۔

دوسری طرف سے کرخت آواز سنائی دی۔ "کہاں ہو ناجی؟"

میں نے بری طرح کھانستے ہوئے کہا۔ "چھوٹی پلی کے پاس جی۔"

"اشرف صاحب خود آ رہے ہیں موقعے پر۔ ابھی حویلی سے نکلنے ہی والے ہیں۔ تم دونوں ان کے ساتھ ہو جانا۔ ان کی سیکیورٹی کا خیال رکھنا۔ اس کتے کے پتر کمالی کے اور ساتھی بھی ہو سکتے ہیں آسے پاسے۔"

"ٹھیک ہے جی۔" میں نے کھانستے ہوئے کہا۔

کال کرنے والے کا نام ڈوگر بھائی کے نام سے "سیو" تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں موجود ہے جنھوں نے "تھے" کے آس پاس کمالی کو گھیر رکھا ہے۔ اسے پکڑنے میں ناکامی پر یہ "ڈوگر صاحب" کافی جھلایا ہوا بھی ہے۔ غالباً اس ناکامی کی وجہ سے ہی اب اشرف ملکو خود بھی موقع پر پہنچ رہا تھا۔

میرے ہاتھوں مرنے والے گن بردار کا اسمارٹ فون یاسر کے پاس تھا۔ وہ یونہی آٹھ دس منٹ سے اسے چیک کر رہا تھا۔ اس نے کرشمہ کی نگاہ سے بچاتے ہوئے فون کی اسکرین پر دو تصویریں مجھے دکھائیں۔ دماغ سنسنا اٹھا۔ ان دردناک تصویروں کا تعلق عصمت دری کے اسی واقعے سے تھا جو بدھ کے روز اسے چوہارے کے گن میں ہوا تھا۔ ایک تصویر میں روتی بلکتی نیم عریاں فرحا مجید نیم عریاں گن بردار اور اس کے ایک ساتھی کے شکنجے میں تھی اور وہ اس کے

جسم سے لباس کی آخری دھجیاں بھی نوچنے کی کوشش کررہے تھے۔ دوسری تصویر اس سے بھی گھناؤنی تھی..... ابھی تک میرے ذہن پر تھوڑا بوجھ سا تھا جو ان تصویروں کو دیکھ کر بالکل اتر گیا۔ کن مین جس طرح مرا، وہ اس سے کہیں زیادہ بری موت کا مستحق تھا۔

کرشمہ کی پریشان آواز نے مجھے چونکایا۔ ''اب کیا کرنا ہے جمالی؟ ہم..... میرا تو دل بیٹھ رہا ہے۔''

کرشمہ نے نامعلوم ڈوگرا سے فون پر میری گفتگو سنی تھی اور اشرف ملکو کی یہاں آمد سے بھی آگاہ ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی پریشانی بڑھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف میں ایک رسک لینے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس کے سوا ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ میں نے کرشمہ اور یاسر کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ ان دونوں سے مشورہ کیا پھر ان دونوں سے ایک قسم بھی لی اور اگلے قدم کے لیے تیار ہوگیا۔

ایک درندے کو جہنم واصل کرنے اور دوسرے کو بے بس کرنے کے بعد ایک عجیب سی توانائی مجھ میں پیدا ہوچکی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں ہینڈ گرینیڈ کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنے دونوں پستول اور آٹو میٹک رائفل ٹائپ 20 بھی پوری طرح تیار کرلیے۔ سرکنڈوں کی طرف اکادکا فائر اب بھی سنائی دیتے تھے۔

چند منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے ہینڈ گرینیڈ کی پن کھینچی اور اللہ کا نام لے کر اسے خشک جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ رات کے سناٹے میں چمک کے ساتھ ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کرشمہ اور یاسر نے پستول کے ساتھ درختوں کی طرف فائر شروع کردیے۔ میں نے بھی گن سے ایک چھوٹا برسٹ چلایا۔ گن کے اس آتشیں قہقہے نے تہلکہ سا مچادیا۔ دوسری طرف ہینڈ گرینیڈ کے دھماکے سے جھاڑیوں نے بھی آگ پکڑلی تھی۔

میں نے ناجی کے موبائل پر نامعلوم ڈوگرا بھائی کو کال کی۔ کال فوراً ریسیو ہوئی۔ میں نے بری طرح کھانستے ہوئے بے حد ہراساں آواز میں کہا۔ ''بھائی! حملہ ہوگیا۔ اشرف جی کی گاڑی پر حملہ ہوگیا ہے۔ درجنوں بندے ہیں..... جلدی کریں۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ایک ہوائی برسٹ چلایا اور فون بند کردیا۔

ایک سیکنڈ کے لیے..... صرف ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں آج بھی ایک پریکٹ کررہا ہوں مگر یہ پریکٹ نہیں تھا۔ یہ فروری کی اس یخ بستہ تاریک شب میں زندگی اور موت کا کھیل تھا..... خون کی ہولی تھی۔ اس کی شروعات تو بے شک ایک پریکٹ سے ہوئی تھی مگر اب یہ ایک ''مہلک'' لڑائی تھی۔

ہمارے اندازے کے عین مطابق دو تین منٹ کے اندر ہی اونچے سرکنڈوں کی طرف سے کئی اچھلتی کودتی روشنیاں ہماری طرف آتی دکھائی دیں۔ یہ کم از کم تین گاڑیاں تھیں۔ دو تین موٹر سائیکل اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اچھا پانچ گھوڑے بھی تھے۔ یقیناً یہ لوگ اسی جتھے میں سے تھے جس نے ٹیلے کے اردگرد میرے یار کا گھیراؤ کررکھا تھا۔ اب میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے ٹائپ 20 رائفل کا سارا میکینزم سمجھ لیا تھا اور میرے اندر جو آگ روشن تھی، اس نے مجھے یہ حوصلہ بھی دے دیا تھا کہ میں اس رائفل کو بے دریغ استعمال کرسکوں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کرشمہ سے جو قسم لی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ اور یاسر میرے ساتھ آگے نہیں جائیں گے۔ یہیں پر میرا انتظار کریں گے۔ اگر میں واپس نہ آسکا یا کسی طرح کوئی رابطہ قائم نہ کرسکا تو پھر وہ اپنے طور پر فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔ میں اب اپنے یار کی مدد کے لیے جارہا تھا لیکن سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم منصوبہ بندی میں سوچتے ہیں۔ یہاں بھی سب کچھ بہت مختلف ہوا۔

میں رائفل سونت کر سرکنڈوں کے رخ پر بڑھا تو کرشمہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''بہت دھیان سے جمالی!''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ جھاڑیوں میں لگنے والی آگ کی روشنی میں کرشمہ کا خوبصورت چہرہ اندیشوں کی آماجگاہ نظر آتا تھا۔ ابھی میں تیس قدم ہی بھاگا تھا کہ اچانک ایک موڑ سے ایک اچھلتی کودتی جیپ نمودار ہوئی اور اس کی ہیڈ لائٹس سیدھی مجھ پر پڑیں۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس جانب سے کوئی جیپ نمودار ہوجائے گی۔ دو سیکنڈ کے لیے میں ٹھٹک گیا پھر تڑپ کر ایک بڑے درخت کی اوٹ میں ہوا۔

یقیناً جیپ سواروں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ جیپ ایک دھچکے سے رک گئی۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا مگر پھر جو آواز جیپ کی طرف سے آئی، اس نے مجھے بھونچکا کردیا۔

''کون ہو تم..... ؟ تم جمالی ہو؟'' آواز میں بے پناہ حیرت تھی اور تھوڑا سا شک بھی تھا۔

دوسری طرف میں بھی مسرت آمیز حیرت کے زنے میں آیا تھا۔ یہ میرے دلدار، میرے بھائیوں سے بڑھ کر پیارے یار کمالی کی آواز تھی، میں اوٹ سے نکل کر ہیڈ لائٹس کے سامنے آگیا۔ منظر مکمل طور پر چہرے سے ہٹادیا۔

کمالی پکارا۔ ”جمالی.....! آجاؤ، جلدی کرو۔“

”میں اکیلا نہیں ہوں۔“ میں بھی پکارا۔

”لے آؤ جو بھی ہے۔“ کمالی نے بے قراری سے کہا۔

میں بھاگ کر واپس چند قدم پیچھے گیا۔ ”کرشمہ..... یاسر! ادھر آؤ جلدی۔“ ذرا تذبذب کے بعد وہ دونوں بھی جھاڑ جھنکاڑ والے نشیب سے نکلے اور میری طرف بڑھے۔

جھاڑیوں کی آگ اب بلندی تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے ٹائپ 20 سے دو ہوائی برسٹ چلائے۔ اپنے محترم اشرف جی کو ”فیک حملے“ سے بچانے کے لیے اس کے نمک خوار منڈے تیزی سے موقع پر پہنچ رہے تھے۔ آگ کی روشنی میں سب سے پہلے گھڑ سوار ہی پہنچے تھے۔ ان کے عقب میں دو ہیوی موٹر بائیکس نظر آرہی تھیں۔

میں نے کرشمہ کا بازو پکڑا اور ہم تینوں بھاگتے ہوئے اس بڑی جیپ میں پہنچ گئے جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر خود کمالی موجود تھا۔ سوال جواب کا وقت کہاں تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کمالی نے ریس دے کر کلچ چھوڑا اور جیپ ایک جست بھرتی ہوئی طوفانی رفتار سے آگے بڑھی۔

مجھے معلوم تھا کہ کمالی ایک مشاق ڈرائیور ہے۔ وہ کچے پکے راستوں پر تیزی سے جیپ دوڑا رہا تھا۔ مجھے اس کی سفید قمیص اور سیاہ جیکٹ پر خون کے تازہ چھینٹے نظر آرہے تھے۔

”تم یہاں کیسے جمالی؟“ وہ بے پناہ حیرت سے بولا۔

”اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو پھر؟“ میں نے بھی چلا کر کہا۔ ”آج تک ہم نے کوئی کام اکیلے نہ کیا..... اب تم اس خطرناک ترین کام کے لیے کیوں اکیلے چلے آئے؟“

کمالی نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کرشمہ پر نظر ڈالی۔ ”یہ..... بی بی کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

نیم تاریکی اور کرشمہ کے بہروپ کے سبب وہ اسے پہچان نہ پایا تھا۔

”یہ کرشمہ ہے کمالی!“ میں نے انکشاف کیا۔

وہ مششدر نظر آنے لگا۔ میں نے مزید کہا۔ ”میری طرح کرشمہ کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ تم خطرے میں ہو۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود یہ ساتھ چلی آئی۔“

”بہت برا کیا تم لوگوں نے..... بہت برا کیا۔“ کمالی نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دانت پیسے۔ وہ بار بار عقب نما آئینے میں بھی دیکھ رہا تھا۔ عقب میں فی الحال کوئی نہیں تھا۔ تاہم جیپ کے پچھلے حصے میں نشستوں کے عقب میں مجھے کوئی بھاری بھرکم چیز نظر آئی جس پر ایک ترپال سی ڈال دی گئی تھی۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں کمالی؟“ کرشمہ نے موضوع بدلا۔

”ایک محفوظ ٹھکانا ہے یہاں..... اگر خیریت سے پہنچ گئے تو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

مجھے شک ہو رہا تھا کہ وہ زخمی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ایک ٹرپل ٹو رائفل اس نے گود میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ گھیرا توڑ کر نکلا تھا اور اسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اگر وہ گھیرا توڑنے میں کامیاب ہوا ہے تو اس میں ہماری مدد بھی شامل ہے۔

ہم ایک اجاڑ باغ کے قریب پہنچے۔ یہاں زیادہ تر درخت سوکھ چکے تھے۔ کچھ کاٹ لیے گئے تھے۔ کمالی نے جیپ درختوں کے اندر ایک ٹنڈ منڈ تناور درخت کے نیچے جا روکی اور لائٹس فوراً آف کر دیں۔ اردگرد بھی سوکھے ہوئے لیکن تناور درخت موجود تھے۔ جیپ کا آسانی سے نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا کچا پکا مکان بھی تھا۔ ایک کمرے کی چھت گر چکی تھی لیکن دوسرے کی ابھی سلامت تھی لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ بھی کوئی ایسی سلامت نہیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جب بھی یہ باغ اور یہ زمین آباد تھے تو ان کمروں میں رکھوالی کرنے والے رہتے ہوں گے پھر سیم تھور کی وجہ سے باغ اجڑ گیا۔

لوہے کا دروازہ کھول کر ہم چاروں اندر پہنچے۔ یہاں زمین پر چاول کی چھال یعنی پرالی ایک گدے کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ ایک لکڑی پر سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے نظر آرہے تھے اور ایک بڑی ٹارچ بھی پڑی تھی۔ فوراً اندازہ ہو گیا کہ کمالی پہلے بھی یہاں ایک آدھ دن رہا ہے۔ اس نے ٹارچ کو ایک خاص زاویے سے رکھ کر روشن کیا اور کمرے میں ہمیں ایک دوسرے کے چہرے اور لباس نظر آنے لگے۔

کمالی کے چہرے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ اس ٹھکانے کو کافی محفوظ سمجھ رہا ہے۔

”چچی اور کومل کہاں ہیں؟“ کمالی نے پہلا سوال میری والدہ اور بہن کے حوالے سے ہی کیا۔

”وہ میرے پاس پہنچ گئے ہیں اور بالکل محفوظ ہیں۔“ میں نے اطمینان دلایا۔

”لیکن..... جمالی! تم تینوں نے یہاں پہنچ کر بڑی غلطی کی۔“

”اور..... تم نے بھی کی کمالی!“ میں نے ترنت جواب دیا۔

”لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی میری ہی غلطی تھی۔“

کرشمہ گمبھیر آواز میں بولی۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"پتا نہیں تم لوگ کیا بھارتیں بھوار رہے ہو۔" کمالی جھلائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا پھر ذرا توقف سے اس نے سوال کیا۔ "کیا تم لوگوں نے کوئی فائرنگ وغیرہ کی ہے یہاں؟" یہ سوال کرتے ہوئے کمالی کی نگاہ میری گود میں رکھی رائفل پر تھی۔

"ہاں کمالی! اور اسی فائرنگ کا نتیجہ ہے کہ تمہیں ملکوں کا گھیرا توڑنے میں کامیابی ہوئی ہے۔" میں نے مختصر لفظوں میں تقریباً ساری کتھا کمالی کو سنا ڈالی۔ وہ حیرت کے عالم میں سنتا رہا پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔

"یار جمالی! اب کیا کہوں تجھے۔ تم تینوں نے خود کو بہت بڑے خطرے میں ڈالا۔"

"اور تم نے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہے اس کی وجہ بھی ہم جانتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی وجہ ہم ہیں۔" کرشمہ نے گلوگیر ہو کر کہا اور بے ساختہ کمالی کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہاری..... یہ بات..... بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہی۔" کمالی نے سخت الجھے ہوئے لہجے کا اظہار کیا۔

یاسر نے اس خستہ حال کمرے کے اندر سے ہی کچھ لکڑیاں جمع کر کے چند پرانی اینٹوں کی ڈھیری پر آگ جلا دی تھی۔ اس آگ کی روشنی نے ماحول کو ذرا مانوس سا کر دیا تھا۔

کرشمہ نے ہچکی لیتے ہوئے نمناک آواز میں کہا۔

"مجھے معاف کر دو کمالی! تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش میں..... مجھ سے، بڑی نیچ حرکت ہوئی ہے۔ پتا نہیں، میں کیوں اتنی بے حس ہو گئی تھی۔ میں نے بے رحمی سے ایک جھوٹ بولا اور پھر اس کا سدباب کرنے میں بھی بڑی تاخیر کر دی۔"

کمالی کی الجھی ہوئی سوالیہ نظریں ہم دونوں کے چہروں پر جمی تھیں۔ میں کرشمہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور کرشمہ میری طرف۔ آخر میں نے ہی تمہید باندھ کر بولنا شروع کیا۔ پریک کی سوچ سے لے کر پریک کی تیاری اور پھر اس کی کارروائی تک میں نے سب کچھ دھیرے دھیرے کمالی کے گوش گزار کر دیا۔ کہیں کہیں کرشمہ نے بھی دلگیر لہجے میں میرا ساتھ دیا۔ کمالی کے اردگرد "مس انفارمیشن" کا جو جال ہم نے بُنا تھا، اس کے سارے تانے بانے ہم نے کھول دیے۔

..... یہ جان کر کہ طبعی طور پر اس کی زندگی موت کے دہانے پر ہرگز نہیں ہے، کمالی کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے حیرت آمیز خوشی کے تاثرات نظر آئے لیکن پھر فوراً ہی اداسی بھی ہو گئے۔ آگ کے سامنے اس نے اپنا سر اپنے اوپر کو اٹھے ہوئے گھٹنوں پر جھکا لیا۔ ایک طرف سے میں نے اس کا کندھا تھام لیا، دوسری طرف سے کرشمہ اس کے بازو سے لگ گئی۔ وہ جیسے بہت کچھ سوچ رہا تھا اور حیران بھی ہو رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے ذہن میں وہ منظر بھی گھوم رہا ہو جب ہم نے اپنے فلیٹ میں بڑی زبردست پلاننگ کے ساتھ اسے اپنی (میری اور کرشمہ کی) دکھ بھری گفتگو سنوائی تھی اور کینسر والی رپورٹس کا رونا رویا تھا۔

کرشمہ بولی۔ "سوچا بھی نہ تھا کمالی کہ یہ پریک اتنی سنگین صورت اختیار کر جائے گا۔ لیکن اب ہم تمہیں اس خطرے میں مزید نہیں رہنے دیں گے۔ جس طرح بھی ہوگا، یہاں سے نکلیں گے۔ باقی کے جو معاملات ہیں، ان کے بارے میں ہم بعد میں سوچ سکتے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر کمالی نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ لمبے بالوں کی دو لٹیں ماتھے پر جھول رہی تھیں۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ مہیب آواز میں بولا۔ "شاید کچھ غلطی میری بھی ہے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ حرکت میں آچکا ہے، اب اسے روکا نہیں جا سکتا اور میں اسے روکنا چاہتا بھی نہیں۔"

"کیا مطلب کمالی؟" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور کرشمہ بھی اٹھ گئے۔ میں اور کمالی ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ مجھے پہلی بار کمالی کی سرخ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرتی نظر آئی۔

اچانک اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میرا سر چوما پھر مسلم لہجے میں بولا۔ "اب میرے لیے واپسی ممکن نہیں۔ میں تیرے لیے وہ سب کروں گا جمالی..... جو کرنے کا کہا کرتا تھا۔"

"تم ضرورت سے زیادہ ایموشنل ہو رہے ہو کمالی!"

"بات تمہاری توقع سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے جمالی! مکو جیلی اپنے کسی ایک کارندے کی موت بھی معاف نہیں کرتی اور میرے ہاتھوں کم از کم چار کارندے سرکٹڑوں میں قتل ہو چکے ہیں اور پانچواں جیپ میں پڑا ہے۔ پتا ہے وہ کون ہے؟"

مجھے نشستوں کے عقب میں پڑی ہوئی وہ وزنی سی شے یاد آئی جس پر کوئی ترپال ڈال دی گئی تھی۔

"آؤ دکھاؤں تمہیں۔" کمالی نے کہا۔

وہ مجھے لے کر باہر آیا۔ ہوا سرد تھی۔ تاریکی میں ستاروں کے آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اس نے جیپ کے

عقبی حصے سے ترپال تماشے اٹھائی اور ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہاں عقار ملکو اور اشرف ملکو کے دست راست..... اہم ترین ساتھی شیرا شیرو کی لاش پڑی تھی۔ کمالی والی رائفل کی دو گولیاں سیدھی اس کے چہرے پر لگی تھیں اور اسے جہنم واصل کر گئی تھیں۔

کمالی نے بتایا کہ جب وہ جیپ لے کر بھاگا تو شیرا شیرو چھلانگ لگا کر اندر گھس آیا۔ کمالی نے فائر کیے اور کمالی کی سیاہ جیکٹ پر خون کے چھینٹے بھی جھاڑ نگر کے اسی خطرناک ترین شخص کے تھے۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے، یہ منشیات فروشی اور اسلحے کی اسمگلنگ میں اس بار ڈرائیور یا کا اہم ترین بندہ تھا۔ گناہوں میں لتھڑا ہوا اور ملکو قبیلی کی آنکھ کا تارا..... اور یہ تارا بجھ چکا تھا۔ یقیناً اس کی موت کی خبر پھیلتے ہی ایک بڑا طوفان کھڑا ہو جاتا۔

کرشمہ بھی شال لپیٹتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ کمالی نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بتایا ہے نا کہ حالات کے گھوڑے کو ایک دم چابک لگ گیا ہے۔ وہاں جھاڑ نگر کے اپنے چوبارے میں بھی یکا یک ایک تبدیلی آئی ہے اور اس تبدیلی کے بعد میری واپسی بالکل ناممکن ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”اب تم بھی پہیلیوں میں بات کرنے لگے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہمیں ہر بات سے بے خبر ہی رکھو گے؟“

کمالی نے ایک گہری سانس لی جیسے تذبذب میں ہو۔ اس سے پہلے کہ کچھ بتاتا، کہیں دور کسی موٹر سائیکل کی بھاری بھرکم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچی۔ ہم ٹھٹک کر خاموش ہو گئے۔ میری گرفت رائفل کے دستے پر بے ساختہ سخت ہو گئی۔ دو تین منٹ سخت اضطراب میں گزرے پھر موٹر بائیک کی آواز بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔ ہم ٹارچ روشن کیے بغیر واپس کمرے میں آ گئے۔

”تم کچھ بتانے لگے تھے کمالی؟“ میں نے کہا۔

وہ سگریٹ سلگانے کے بعد ایک گہرا کش لے کر بولا۔ ”جمالی.....! جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ رانیہ کی کمالی فرح کو صرف اس لیے ڈکیل و خوار کیا گیا ہے کہ اس نے رانیہ کو مجھ سے ملانے میں مدد کی۔ ملکو قبیلی کو یقین ہو چکا ہے کہ اگر میں واپس جھاڑ نگر آ گیا ہوں تو تم بھی ضرور آ چکے ہو اور یہ لوگ تو تمہارا نام بھی رانیہ کے ساتھ سننا نہیں چاہتے۔ اپنے نابالغ داماد شمشیر خبیث کے ساتھ رانیہ کی شادی کا پروگرام مارچ، اپریل میں تھا لیکن اب انہوں نے فوری طور پر شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ زیادہ بڑی تقریب نہیں ہوگی۔ صرف دو ہفتے بعد اسے اس بدبخت شمشیر کے پلے باندھ دیا جائے گا..... اور یہ میں نے ہونے نہیں دینا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے میرے یار کا لہجہ پھر جنونی ہو گیا۔

میرے تن بدن میں بھی چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ آخر وہ وقت آ گیا تھا جو ہر وقت مجھے ڈراتا رہتا تھا' میرا ہانکا کرتا رہتا تھا لیکن یہ وقت یوں اچانک اتنی جلدی آئے گا، اس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ رانیہ کی من موہنی صورت میرے تصور میں آئی۔ وہ دلہن بنی تھی۔ اس کا کاجل آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ وہ حسرت سے میری طرف دیکھتی تھی۔ خاموشی کی زبان میں کہتی تھی..... ”میں نے تو کہا تھا جمال میں اپنی زندگی تو ہار سکتا ہوں، تمہیں نہیں ہار سکتا۔ میں لاہور جاؤں گا۔ بہت روپیہ کماؤں گا۔ ایک دن جیت لوں گا تمہیں.....“ وہ کہہ رہی تھی اور کاجل آنکھوں سے نکل کر گل رنگ رخساروں پر پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

باہر ہوا تیز ہو گئی تھی اور تاریکی میں بادل گرجنا شروع ہو گئے تھے۔ آگ میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ ایک طویل خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا کمالی؟“

”تمہیں نہیں..... صرف مجھے کرنا ہوگا۔“ وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا۔

”بکواس بند کرو۔ تھوبڑا توڑ کر رکھ دوں گا تمہارا۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”اور جو اکیلے اکیلے کر چکے ہو..... اس کے لیے بھی معاف نہیں کروں گا تمہیں۔“ میں نے ”اپنی“ رائفل کے دستے پر زور سے ہاتھ مارا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ بھی بلند آواز میں بولے گا اور بحث پر اتر آئے گا مگر پھر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

کرشمہ نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ ”کمالی! رانیہ کی کمالی فرح اب کہاں ہے؟“

وہ ایک دم چونک سا گیا۔ ”اس پر ہونے والے ظلم کا حساب بھی لینا ہے۔“ وہ آہنی آواز میں بولا۔ ”ان درندوں نے اس بیچاری کو نوچ نوچ کر بھی چھوڑا نہیں ہے۔ اپنے ایک کارندے باشو کے حوالے کر دیا ہے۔ سنا ہے وہ بھی ایک نمبر کا شرابی اور کمینہ بندہ ہے۔ ملکو قبیلی کے لیے ٹکٹی گیری بھی کرتا رہا ہے..... ایک بار میں اس سے ملا بھی تھا۔“

”نام تو شاید میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ یہ ساتھ والے گاؤں سرید پور کا تو نہیں؟“

کمالی نے اثبات میں سر ہلایا۔ درحقیقت ارد گرد کے یہ سارے گاؤں عقار اور اشرف ملکو کی رعایا کی طرح ہی تھے۔

باہر بارش ہونے لگی تھی۔ دو چار منٹ میں ہی کمرے کی بوسیدہ چھت سے پانی ٹپکنے لگا۔ یوں لگنے لگا کہ اگر اس طرح بارش ہوتی رہی تو ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہم پانی میں بیٹھے ہوں گے۔ کمالی کے دماغ میں کچھ چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اچانک کھڑا ہوگیا۔ ''چلو، آؤ چلیں۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہم کمرے سے نکلے اور پاس ہی کھڑی جیپ میں گھس گئے۔ تبھی سوالیہ نظروں سے کمالی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''جمالی! اشرف ملکو کے اس ہاشو نامی کارندے کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ میرے خیال میں اس تک پہنچنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ ہمیں پناہ مل جائے گی اور اس بدبخت کی بدمعاشی کا تیا پانچا بھی ہوجائے گا۔''

''اور اس جیپ اور لاش کا کیا کرو گے؟'' کرشہ نے پوچھا۔

''مجھے امید ہے کہ اس کا حل بھی وہاں نکل آئے گا۔'' کمالی نے جواب دیا۔

بارش بہت تیز تو نہیں تھی مگر سردیوں کی بارش تھی۔ اس نے ماحول کو یخ بستہ کر ڈالا تھا۔ ہم جلد ہی مرید پور گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ برساتی نالا یہاں مرید پور کی دائیں جانب سے گزرتا تھا۔ بجلی کی چمک میں یہاں بلند سرکنڈے بھی لہلہاتے نظر آئے۔ ایک تو تاریک رات دوسرے بارش۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ کمالی نے جیپ سیدھی بلند و بالا سرکنڈوں کے اندر گھسا دی۔ اندر شیر اشیر د کی لاش پر جو سبز ترپال پڑی تھی، وہ ہم چاروں نے الٹی کر کے سروں پر رکھی اور تیزی سے ہاشو کے گھر کی طرف بڑھے۔ یہ گھر گاؤں کی آبادی سے پچاس ساٹھ قدم ہٹ کر تھا۔ بیرونی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ کمالی نے آسانی سے چار دیواری پھلانگی اور اندر داخل ہوگیا۔ رائفل اس کے کندھے پر تھی۔ میں نے بھی اپنی رائفل تیار کرلی تھی۔ کمالی نے اندر جا کر بیرونی دروازہ بغیر آواز پیدا کیے کھول دیا۔ ہم ایک پختہ صحن سے گزر کر تاریک برآمدے میں پہنچ گئے۔ اندر سے شیشے کے برتن ٹکرانے کی مدھم آوازیں آئیں۔ کچھ دیر بعد کوئی شخص بھاری آواز میں بولا۔ الفاظ وضاحت سے ہماری سمجھ میں نہیں آئے تاہم صاف پتا چلتا تھا کہ بولنے والا نشے میں ہے۔ یقیناً یہ ہاشو ہی تھا۔ ایک کھڑکی سے اگلی روشنی چھلک رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد ایک منمناتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں، ایسا مت کرو۔ پلیز مت کرو۔ اب۔''

پھر بہکی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔ فرح کے نام اور ایک دو الفاظ کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تب تیکھی آواز پھر ابھری۔ ''پلیز..... پلیز ہاشو! دیکھو میری حالت پہلے بھی اچھی نہیں..... اب تم.....'' آواز بھرا کر مدھم ہوگئی۔ مزید سنائی نہیں دیا۔

تب کوئی چیز گر کر ٹوٹی اور سناٹا چھا گیا۔ میں نے کمالی کی طرف دیکھا اور اس کی رضامندی پاتے ہی ہم دونوں چند قدم پیچھے ہٹے اور کندھے کی زوردار ٹکر سے دروازے کی کنڈی توڑ ڈالی۔ اندر بلب کی زرد روشنی میں سارا منظر کھل گیا تھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی زور سے چلائی۔ میں نے پہلی نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ رانیہ کی سہیلی فرح ہی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے۔ ہونٹوں، رخساروں اور گردن پر نیلگوں اور سرخی مائل نشان نظر آتے تھے۔ وہ ایک چارپائی پر تھی۔ قریب ہی کرسی پر وہ دوسرا شخص تھا جس کا نام ہاشو تھا۔ لکڑی کی تپائی پر شراب کی بوتل تھی اور پورے کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ملکو قبیلی کی منشی گیری کرنے والا ذرا بڑی عمر کا ہوگا مگر وہ جواں سال ہی تھا۔ جسم اکہرا لیکن قد لمبا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیزی سے پستول کے اس ہولسٹر کی طرف لپکا جو دیوار پر جھول رہا تھا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ زیادہ تنومند نہ ہونے کے باوجود اس کے جسم میں طاقت تھی..... شاید یہ وہ مصنوعی طاقت تھی جو الکحل نے اسے فراہم کی تھی۔ اس نے میرے جبڑے پر کہنی رسید کی۔ میں نے جھنا کر اسے اٹھایا اور کرسی پر پٹخ دیا۔ کرسی چکنا چور ہوگئی..... میں نے گھونسوں سے اسے دھنک کر رکھ دیا۔

فرح کی چلائی ہوئی آواز آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہی تھی اور دہائی دے رہی تھی۔ ''مت مارو..... مارو..... اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ بے گناہ ہے۔ پلیز چھوڑ.....''

فرح کی یہ آہ و بکا ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاشو کا لمبوترا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے دبوچ کر اٹھایا اور چارپائی پر دھکیل دیا۔ فرح میرے اور اس کے درمیان آگئی۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔

فرح کے کہنے پر ہم نے ہاشو کو اٹھا کر دوسری چارپائی پر ڈالا جہاں گدا بچھا ہوا تھا اور لحاف بھی تھا۔ خون اس کی کنپٹی سے بہہ بہہ کر اس کے سوئیٹر کو بھگو رہا تھا۔ اس کی سانس گہری ہوگئی اور وہ قریباً بے ہوش ہوگیا۔ تاہم میں اور کمالی جانتے تھے کہ اس کے لیے خطرے والی کوئی بات

نہیں۔ کمالی نے فرح کو بھی تسلی دی۔

ساتھ والے کمرے کی کھڑکی میں بھی روشنی تھی۔ میں نے جھانکا۔ وہاں ایک میز پر پائیوڈین اور روئی وغیرہ نظر آرہی تھی۔ شاید یہ چیزیں فرح اپنے زخموں کے لیے استعمال کرتی رہی تھی یا ہاشو اسے استعمال کراتا رہا تھا۔ ہاشو کی کنپٹی سے رسنے والا خون بند کرنا ضروری تھا۔ میں نے پائیوڈین لانے کے لیے اس کمرے میں داخل ہونا چاہا تو فرح جیسے تڑپ کر میرے سامنے آگئی۔

''نہیں جمال! آپ کمرے میں نہ جائیں۔''

یقیناً میرے ساتھ باقی سب بھی حیران ہوئے۔

''کیوں..... کیا ہے کمرے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''بب..... بس آپ نہ جائیں۔'' فرح کے چہرے پر کچھ عجیب سا خوف آمیز تاثر نظر آیا۔ ''مم..... میں..... آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔''

''تو تم خود لے آؤ دوا اور روئی وغیرہ۔'' میں نے الجھ کر کہا۔

''نہیں..... میں بھی نہیں جاسکتی۔ کہا ہے نا، میں آپ کو بتاؤں گی۔''

وہ گئی اور کہیں اور سے ایک پٹی اور روئی وغیرہ لے آئی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور مینہ کا تیز اپڑ رہا تھا۔ یہ عجب ہنگامہ خیز اور اسرار بھری رات تھی۔

☆☆☆

فرح نے مٹی کی انگیٹھی میں کچھ آگ جلادی تھی جس سے کمرے کی غیر معمولی ٹھنڈک کم ہوئی تھی۔ ہاشو کی بے ہوشی اب گہری غنودگی میں بدل چکی تھی۔ وہ چارپائی پر لحاف کے نیچے بے سدھ پڑا تھا۔ فرح مسلسل رو رہی تھی۔ اس کے جسم کے جو حصے لباس سے باہر تھے، وہ صاف گواہی دے رہے تھے کہ اسے چوبارے کے صحن میں اس پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔

وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''میرا بھائی مرگیا۔ میں اب کہاں ڈھونڈوں اسے..... اور میں اب خود بھی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اس سے اچھا ہے موت آجائے۔''

کرشمہ نے اس کی کمر سہلائی اور اسے اپنے ساتھ لگایا۔ فرح میری طرف دیکھ کر فریادی انداز میں بولی۔ ''جمال بھائی! میرے ساتھ تو جو ہونا تھا، ہوگیا۔ آپ کسی طرح راحیلہ کو بچالیں۔ وہ..... وہ آپ کا نام لے لے کر چیختی ہے۔ وہ اپنے تایا زاد شمشیر کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی اور وہ اس کا مالک بننے والا ہے۔ وہ اس کی زندگی تباہ کرڈالے گا۔''

''اس کی فکر نہ کرو فرح!'' کمالی نے کہا۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تمہیں بھی انصاف ملے گا..... ضرور ملے گا۔''

وہ پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اپنے باپ (مالی مجید) کو یاد کرنے لگی جو دو تین روز ہی چپ چاپ کسی طرف منہ کرگیا تھا۔ اپنے ایب نارمل بیٹے کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوسکا تھا پھر اپنا تر بتر چہرہ اٹھا کر اس نے میری اور کمالی کی جانب دیکھا اور بولی۔ ''کمال بھائی! یہ جگہ کسی بھی طرح آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ وہ خونی جانوروں کی طرح آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ پتا نہیں آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''وہ سب کچھ بھی تمہیں بتائیں گے لیکن پہلے اس ہاشو کے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔ تم اس شرابی کے قبضے میں ہو اور اس کی حمایت بھی کررہی ہو؟''

وہ سسکی۔ ''شرابی ضرور ہے لیکن ان تین دنوں میں اس نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مجھے بہن کہہ رہا ہے۔ میری طرف آنکھ تک نہیں اٹھاتا۔ یہ خود بھی تو اس جہنمی جگہ ملکو کا ڈسا ہوا ہے۔ جمال بھائی! اس کی بیوی عارفہ کے مرنے کی وجہ یہ اچھے چوبارے والے ہی تھے..... وہ..... وہ بے چاری اس کمرے میں مری تھی..... اس سامنے والے پلنگ پر۔'' فرح نے ڈرے ڈرے ناقابلِ فہم انداز میں اس ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں داخل ہونے سے اس نے مجھے منع کیا تھا۔

چادر کے میلے پلو سے وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''جمال بھائی! کمال بھائی! آپ حیران ہورہے ہوں گے کہ میں نے آپ کو اس کمرے میں جانے سے کیوں منع کردیا۔ اس کمرے میں نہ جانے کا ہاشو ہی کہتا ہے۔ میں کل غلطی سے وہاں چلی گئی تھی۔ اس کو سخت دکھ ہوا ہے۔ آٹھ پہر سے زیادہ ہوگئے ہیں، اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ بار بار آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے..... وہ کہتا ہے.....'' فرح گڑبڑا کر فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

''کیا کہتا ہے؟'' کرشمہ نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے حوصلہ دیا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اسے وہم ہے کہ..... وہ اس کمرے میں آئی ہے..... مہینے کی ایک خاص تاریخ کو وہ وہاں آئی ہے۔ بس یہ خیال اس کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔''

بجلی چمکی پھر بادل زور سے گرجا اور رکی ہوئی بارش دوبارہ شروع ہوگئی۔

(جاری ہے)

سنگین مذاق

طاہر جاوید مغل

آخری حصہ

کبھی کبھی رائی سے بننے والے پہاڑ کسی کی پُرسکون زندگی اس طرح تہس نہس کردیتے ہیں جس کا گمان شاید ہی کبھی کسی نے کیا ہو... وہ جو بے فکری کے دن چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور موج مستی میں گزارتے تھے اور... زندگی کی کتاب کو بہت ترتیب سے سنوار رہے تھے... بہت اونچے ارادوں اور خوبصورت خوابوں سے مزین لمحات میں... کیا خبر تھی کہ ایک معمولی سا مذاق اس طرح گلے میں پھانسی کا پھندا بن جائے گا کہ سارے خواب... سارے رشتے... اور بچپن کے رستے... سب کچھ بکھر جائے گا... ایک ذرا سی دل لگی اس طرح دل کی لگی بن جائے گی کہ لوگ خون کی ہولی کھیلنے پر اتر آئیں گے... وہ جو طاقت کے گھمنڈ میں معمولی انسانوں کو حقارت سے چیونٹی کے مانند مسلنے کے عادی تھے پھر کیسے اپنے سب سے بڑے دشمن کی خطا کو معاف کردیتے... ان معصوم دلوں میں محبت کے چھوٹے سے جلنے والے چراغ نے جانے کتنی ہی زندگیوں کو جلا کر خاکستر کردیا... لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی راکھ میں چاہت کی چنگاریوں کو وہ پھر بھی بجھا نہ پائے۔

رنگین مذاق سے شروع غمگین واقعات پر مشتمل

ایک داستان کی عبرت انگیز سنگینی





میں جن بھوت اور ماورائی مخلوقات کا انکاری تو نہیں تھا مگر جس انداز میں فرح ساتھ والے کمرے کا منظر دکھا رہی تھی اور ہاشو کی بیوی کی روح کی بات کر رہی تھی، اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔

فرح کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کمالی کی مدد کرنے کی پاداش میں اشرف ملکو نے جو کچھ اس کے ساتھ کرایا تھا، ناقابلِ بیان تھا۔ میرے اشارے پر کرشمہ اس کی دلجوئی میں لگ گئی۔ میں کمالی کے ساتھ گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے میں آبیٹھا جہاں تھوڑی حرارت بھی موجود تھی۔ باہر گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی۔ رات کی تاریکی میں بارش کی بوچھاڑیں کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوتیں۔

میں نے کہا۔ ''کمالی! سرکنڈوں میں جیپ اور جیپ میں شیر اشیر دکی لاش کب تک اوجھل رہ سکیں گے؟''

''دھند بہت زیادہ ہے جمالی اور لگتا نہیں ہے کہ ایک دو دن تک چھٹے گی۔ گھبراؤ مت۔''

کچھ دیر بعد کرشمہ ہم دونوں کو چائے کی گرم پیالیاں دے کر دوبارہ ''روتی سسکتی فرح'' کے پاس جا بیٹھی۔ سنگین پریشانی کے حوالے سے کرشمہ نے تو کمالی سے معافی مانگ لی تھی، میرا دل بھی چاہ رہا تھا کہ کھل کر اپنی ندامت کا اظہار کروں۔

میں نے اس سلسلے میں دو فقرے ہی بولے تھے کہ کمالی نے محبت بھرے غصے سے مجھے جھاڑ دیا۔ ''بکواس بند کرو۔ جہاں دوستی ہوتی ہے وہاں کوئی سوری، کوئی شکریہ اور پلیز وغیرہ نہیں ہوتا۔ یہ بات تم خود بھی تو کہا کرتے ہو۔ کہا کرتے ہو کہ نہیں؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''بہرحال، بڑی بے وقوفی ہوئی ہم سے۔ اب سوچتا ہوں تو دل کانپ جاتا ہے۔ پتا نہیں کس بہاؤ میں بہہ گیا تھا میں بھی۔'' پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''کمالی! کیا کسی مرحلے پر تمہیں شک ہوا کہ ہم کوئی ڈراما کر رہے ہیں؟''

وہ پیشانی سے لمبے بالوں کو ہٹا کر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تمہاری اور کرشمہ کی پلاننگ بہت اچھی تھی۔ ایک دو موقعوں پر تھوڑا سا شک تو ضرور ہوا لیکن دوسرے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے بعد یہ شک نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔''

ہماری گفتگو جاری تھی کہ دوسرے کمرے سے کرشمہ اور فرح کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی ہاشو کی کراہیں بھی سنائی دیں۔ وہ اب گہری غنودگی سے بیدار ہو رہا تھا۔ ہم اسے دیکھنے اور سنبھالنے کے لیے بڑے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

اگلا دن بدستور ابر آلود تھا۔ کمالی کا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا کہ گہری دھند نے اس سارے علاقے کو بے طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ شیر اشیر دسمیت پانچ افراد کی ہلاکت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ اشرف ملکو کے خونخوار ہرکارے ہر طرف ہماری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں یہ سوچ کر لرز جاتا تھا کہ اگر اس ساری کارروائی سے پہلے کمالی نے میری والدہ اور بہن کو جھاڑ نگر سے نکالا نہ ہوتا تو ان کے ساتھ کیا گزرتی۔ ملکو ٹیلی یہاں کی بے تاج بادشاہ تھی۔ وہ سیاست میں بھی قدم رکھتے تھے۔ علاقے میں پولیس افسروں کی تبدیلیاں ان کی منشا اور صوابدید پر ہوتی تھیں۔ تھانے کچہری میں ان کا پورا پورا اثر رسوخ تھا۔ پورے علاقے میں ان کے خلاف گواہی دینے کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

مشورے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ کم از کم کل رات تک ہم یہاں روپوش رہیں اور پھر حالات دیکھ کر آئندہ کا لائحہ عمل بنائیں۔ ہاشو اب مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ ہم سب نے اور میں نے خصوصی طور پر اس سے معذرت کی کہ سوچے سمجھے بغیر ہم نے اسے چوٹ پہنچائی اور اس کے بارے میں غلط سوچا۔

رات کو ہم نے دیہی طرز کا سادہ سا کھانا کھایا جو چاول اور چنے کی دال پر مشتمل تھا۔ یہ کھانا کرشمہ اور یاسر نے ہی تیار کیا۔ فرح کو زبردستی چند لقمے کھلائے گئے۔ وہ اپنے مجذوب بھائی کی موت پر ازحد دکھی تھی۔ کرشمہ نے اب اپنا ادھیڑ عمر عورت والا روپ ختم کر دیا تھا۔ اس کا دُھلا دُھلایا چہرہ اچھا لگ رہا تھا۔ موسم اور اندیشوں کی گہری دھند میں لپٹے ہوئے ہم رات آٹھ، نو بجے کے قریب ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں لحاف میں منہ گھسائے نیم غنودگی میں تھا جب پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ اٹھ کر صحن کی طرف گیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ برآمدے کے ساتھ ہی صحن کے گوشے میں دو سائے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو یہ کرشمہ اور کمالی تھے۔ کرشمہ کی گرم اوڑھنی اس کے سر سے سرکی ہوئی تھی۔ وہ کمالی کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اس نے کمالی کے سامنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور غالباً گلوگیر انداز میں کچھ کہہ رہی تھی پھر اس نے اپنا ماتھا کمالی کے کندھے سے ٹکا دیا۔ ہاتھ اسی طرح جڑے رہے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کمالی سے اپنے سنگین مذاق اور ناروا

رویے کے حوالے سے معافی مانگ رہی تھی۔

کمالی کچھ دیر تو ساکت کھڑا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ آہستگی سے کرشمہ کی کمر پر رکھ دیا۔ ایک طرح سے یہ اس امر کا اظہار تھا کہ وہ اس کی معذرت قبول کر رہا ہے۔ کرشمہ دفعتاً کمالی کے گلے لگ گئی۔ اس سے چمٹ گئی۔ یہ اس گہری محبت کا اظہار تھا جو اس کے دل میں بتدریج کمالی کے لیے نمو پا چکی تھی۔

میں جلدی سے واپس اپنے بستر پر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمالی بھی بستر پر آ گیا۔ وہ کمر بالکل سیدھی رکھ کر چلتا تھا۔ بڑی دلکش چال تھی اس کی۔ میں جانتا نہیں تھا کہ آج کے بعد میں اس کی یہ دلکش چال کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

واش روم سے لوٹنے کے بعد میں دوبارہ کھدر کے لحاف میں لیٹ گیا۔ دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ بار بار ذہن میں اپنے اس پہلے قتل کا منظر آ جاتا تھا جو میں نے کل رات نعیم شمیم بائیک سوار کا کیا تھا۔ شاید اس قتل کا منظر مجھے تادیر نیند سے دور رکھتا مگر غنودگی کے سیاہ مرغولے بھی بڑی تیزی سے امڈے چلے آتے تھے۔ بالآخر میں ان امڈتے مرغولوں اور لحاف کی گرمی میں گم ہو کر سو گیا اور جب سو گیا تو سب اندیشے اور دکھ بھی میرے ساتھ ہی سو گئے۔ وہ پہلا قتل جو میں نے کیا، وہ پہلا دستی بم جو میں نے جھاڑیوں میں اچھالا، وہ آٹو بینک رائفلوں کی مہلک تڑتڑاہٹ..... وہ شیرا شیرو کی لاش..... اور وہ دردناک خبر کہ وہ من موہنی رانیہ جو میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی تھی، چند ہی روز میں دلہن بننے والی ہے۔ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہونے والی ہے..... ہاں، سب اندیشے اور دکھ بھی میرے ساتھ ہی سو گئے۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو سر بہت بھاری تھا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ میں شاید کافی دیر تک سویا ہوں۔ مجھے کسی نے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ یہ یاسر تھا۔ اس کا چہرہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی جاگا ہے اور بہت تشویش میں ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر گھوم رہا تھا۔

"کیا ہوا یاسر؟" میں نے پوچھا۔

"آئیں..... خود دیکھ لیں۔" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ مطلب یہ کہ میں چودہ پندرہ گھنٹے سویا رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اترا اور برآمدے میں پہنچا۔ کرشمہ اور فرح ابھی تک دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئی پڑی تھیں۔ ایک گدیلے پر کمالی لیٹا ہوا تھا مگر اس حالت میں کہ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ اس کی ایک ٹانگ خون سے تربتر تھی۔ سر سے بہنے والا خون اس کی گردن کو ہی نہیں، ایک کندھے کو بھی بھگو رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔

میں نے اسے جھنجوڑا اور پکارا۔ "کمالی، کمالی.....! کیا ہوا تمہیں؟"

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ خون آلود لب تھوڑے سے وا تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے یاسر کی طرف دیکھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں کسی کے گرنے کی آواز سے جاگا تھا۔ باہر آیا تو کمالی بھائی صحن میں اوندھے پڑے تھے۔ مشکل سے اٹھا کر اندر لے آیا۔ آپ دیکھیں ان کے سارے کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں۔ ان کی رائفل بھی کہیں نظر نہیں آ رہی۔"

"ہاشو کہاں ہے؟" میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی گھر میں نہیں تھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی یہاں نہیں ہے۔"

"میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کوئی نشہ آور چیز دی گئی ہے۔ کیا تمہیں بھی ایسا لگ رہا ہے؟"

"بالکل، ایسا ہی ہے۔ میری سمجھ میں یہی آ رہا ہے کہ وہ جو دودھ پتی چائے سونے سے پہلے ہم نے پی تھی، اس میں کچھ تھا۔ شاید..... اس ہاشو نے ہی کچھ ملایا ہو۔ اس نے چائے نہیں پی تھی۔ میں نے بھی بس آدھی پیالی پی تھی۔ شاید اس لیے تم سے پہلے جاگ گیا۔"

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر کمالی کو ہاشو نے ہی زخمی کیا تھا تو پھر یہاں فائرنگ کی آواز کیوں نہ آئی؟ دوسرے کمالی کے کپڑے وغیرہ کیوں بھیگے ہوئے تھے۔ اس کی پشاوری چپل بھی کیچڑ میں لتھڑی پڑی تھی۔ فی الوقت سب سے پہلے زخمی کمالی کو توجہ کی ضرورت تھی۔ اس کی ٹانگ میں گھٹنے سے ذرا اوپر دو گولیاں لگی تھیں۔ سر پر بھی گہری چوٹ تھی۔ سب سے پہلے تو اس کا خون بند کیا جانا ضروری تھا۔ میں اور یاسر اس کوشش میں لگ گئے۔ اسی اثنا میں کرشمہ اور فرح بھی یکے بعد دیگرے جاگ گئی تھیں۔ یہ ساری صورت حال ان کے لیے بھی نہایت تشویشناک تھی۔ اگر اس ساری صورت حال میں ملکو چیکی کے اس دیرینہ ملازم ہاشم عرف ہاشو کا کردار تھا تو موجودہ سچویشن اور خطرناک ہو جاتی تھی۔ کسی بھی وقت اشرف ملکو کے قاتل ہرکارے یہاں پہنچ سکتے تھے۔ البتہ فرح یہ بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ اس کا گمان تھا کہ ہاشو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔

یکا یک موٹر بائیک کی آواز سنائی دی۔ یہ چھوٹی موٹر بائیک تھی۔ ہاشو کی بھی ہوسکتی تھی مگر ہم معمولی سا رسک بھی نہ لے سکتے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی، ایک بندہ مارنے کے بعد اب مجھے کسی طرح کا ڈر خطرہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے رائفل سنبھالی اور پوزیشن لے لی۔ کرشمہ اور فرح پچھلے کمرے میں زخمی کمالی کے پاس چلی گئیں۔ یاسر مار دھاڑ والا بندہ نہیں تھا پھر بھی میں نے اسے پستول تھما دیا تاکہ وہ وقت پڑنے پر اپنا دفاع تو کرسکے۔

تھوڑی ہی دیر بعد تصدیق ہوگئی۔ موٹر بائیک پر آنے والا ہاشو ہی تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار دور ہی سے نظر آتے تھے۔ اس نے موٹر بائیک صحن میں کھڑی کرکے دروازہ اندر سے بند کیا اور ہیجانی انداز میں پکارا۔ ''فرح..... فرح.....! کہاں ہو تم سب لوگ؟''

میں اور یاسر اس کے سامنے آگئے پھر کرشمہ اور فرح بھی نکل آئیں۔ وہ ہانپتے لہجے میں بولا۔ ''تت..... تم لوگوں کو پتا ہے، تمہارا ساتھی کمالی کہاں ہے؟''

''کہاں ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے بہت بے وقوفی کی ہے۔ ایسی دلیری کو بے وقوفی ہی کہنا چاہیے۔ وہ تم سب کو یہاں چھوڑ کر اکیلا ہی اُچے چوبارے کی طرف نکل گیا تھا۔ اشرف ملکو کے بندوں نے اس پر فائر کھولا ہے۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں؟'' ہاشو نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا پھر اس کی نگاہ اچانک خون کے ان دھبوں پر پڑی جن کا تعلق کمالی کی شدید زخمی ٹانگ سے تھا۔ وہ خوفزدہ ہوکر بولا۔ ''یہ کس کا خون ہے؟''

''کمالی کا۔'' میں نے جواب دیا پھر حیران پریشان ہاشو کو لے کر اس کمرے میں آگیا جہاں بے ہوش کمالی موجود تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں ساری کی ساری صورتحال ہم پر واضح ہوگئی۔ ہمیں چائے میں نشہ آور دوا دینے والا کوئی اور نہیں، خود کمالی ہی تھا۔ اس کے سینے میں ایک آگ فروزاں تھی۔ رانیہ کی ہنگامی شادی نے اس آگ کو فروزاں تر کر رکھا تھا پھر اس آگ پر فرح کی عصمت دری کے چھینٹے بھی پڑ گئے تھے اور یہ تیل کے چھینٹے تھے۔ وہ جلد از جلد عتار ملکو اور اشرف ملکو کی شہ رگ تک پہنچنا چاہتا تھا اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اُچے چوبارے کی طرف بڑھے گا تو میں اسے اکیلا ہرگز نہیں بڑھنے دوں گا۔ اس نے ہمیں بے ہوشی نما نیند کے حوالے کیا اور رات کے پچھلے پہر اُچے چوبارے کے ظلمت کدے کی طرف نکل گیا۔

ہاشو کو اُچے چوبارے اور جھاڑ نگر سے جو تفصیلات ملی تھیں، وہ بہت کچھ واضح کر رہی تھیں۔ کمالی نے رات کی یخ بستہ تاریکی میں یہاں سے نکل کر ایک دودھ فروش سے اس کی موٹر بائیک چھینی اور دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے جھاڑ نگر پہنچ گیا۔ اس نے خطرناک حد تک دلیری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اُچے چوبارے کی عقبی جانب سے اندر گھسنے کی کوشش کی۔ وہ چار دیواری کے اوپر بھی پہنچ گیا البتہ اُچے چوبارے کے پہریدار کمالی کی توقع سے زیادہ چوکس تھے۔ اچانک ایک طاقتور ٹارچ کی روشنی اس پر پڑی۔ اسے دیکھ لیا گیا۔ دو گولیاں اس کی ٹانگ پر لگیں اور وہ نیچے گر گیا۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود اس نے اُچے چوبارے کے شوٹرز کی زبردست مزاحمت کی۔ زخمی ٹانگ کے ساتھ ہی وہ ان درختوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا جہاں مسروقہ موٹر بائیک چھپا رکھی تھی۔

ہاشو نے کہا۔ ''حیرت ہوتی ہے کہ زخمی حالت میں ہی اس نے سات آٹھ کلومیٹر تک پیچھا کرنے والوں کو اپنے پیچھے دوڑایا۔ چلتی موٹر بائیک سے یہ گاہے بگاہے فائر بھی کرتا رہا ہے۔'' پھر ہاشو ذرا رک کر بولا۔ ''کیا گن اب بھی اس کے پاس ہے؟''

میں نے نفی میں جواب دیا۔

ہاشو بولا۔ ''میرا خیال ہے وہ نالے میں ہی کہیں گر گئی ہوگی۔''

''نالے میں..... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''اشرف ملکو کے بندوں کو دودھ فروش کی موٹر بائیک تو برساتی نالے کے کنارے درختوں سے مل گئی ہے مگر گن کہیں نہیں ملی۔ اندازہ یہی ہوا ہے کہ جب کمالی نے پیچھا کرنے والوں کو قریب آتے دیکھا تو بائیک چھوڑ کر برساتی نالے میں چھلانگ لگائی اور بہاؤ کے ساتھ ساتھ یہاں پہنچ گیا۔'' پھر ہاشو ذرا رک کر کہنے لگا۔ ''یار! بہت ہی سخت جان ہے یہ۔ زخمی حالت میں ٹھنڈے ٹھار پانی کے اندر چھلانگ لگانا اور پھر یہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے دو چار بندے اور ہوں تو.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا پھر ایکدم اس کے چہرے پر دبے دبے جوش کی جگہ تشویش نے لے لی۔ وہی تشویش جو اس یخ بستہ سناٹے ماحول میں ہمارے چاروں طرف گردش کر رہی تھی۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے ایک بھاری موٹر بائیک کی بھاری گڑگڑاہٹ کچھ فاصلے سے گزری تھی اور ہم دو تین منٹ کے لیے دم سادھے رہے تھے۔

☆☆☆

ہمارا ساتھی یاسر کچھ عرصہ پہلے کمپاؤنڈری بھی کرتا رہا تھا۔ میں نے کمالی کی بے ہوشی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور یاسر کی مدد سے کمالی کی ٹانگ میں لگی ہوئی ایک گولی گرم تیز دھار چاقو کی مدد سے نکال لی۔ یہ وہی چاقو تھا جو ناجی کے لباس میں سے گرا تھا اور جسے میں نے بعد ازاں پہریدار کے تالو میں گھونپا تھا۔ ہمارے اس خانہ ساز آپریشن کے دوران میں ہی کمالی ہوش میں آگیا تھا۔ اسے شدید ترین تکلیف سہنا پڑی۔ دوسری گولی اس کی ران کے گوشت کو چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔

گولی نکالنے کے دوران میں کمالی کی تڑپ پھڑک دیکھ کر کرشمہ خود پر ضبط نہ کرسکی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ گولی نکلنے کے بعد کمالی ایک بار پھر نیم بے ہوش ہوگیا۔ کرشمہ گھٹنوں کے بل اس کی پائینتی کی طرف بیٹھ گئی، اس کے پاؤں پکڑ لیے اور ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار خود کو سمجھتی تھی۔

کمالی سہ پہر کے وقت جاگا۔ دھند نے پھر نشیب و فراز کو ڈھانپنا شروع کردیا تھا۔ کمالی غنودگی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ گھر میں ہی ایک پین کلر موجود تھی۔ ہم نے اسے کھلائی وہ پھر سوگیا۔

شام کے بعد پھر بوندا باندی شروع ہوگئی۔ میں اور ہاشم مختصر باورچی خانے کی نیم گرم فضا میں موجود تھے۔ یہاں سے وہ نیم روشن کمرا نظر آتا تھا جس میں جانے سے ہاشم (ہاشو) نے سب کو منع کررکھا تھا۔ اب بھی وہ سوئی سوئی نظروں سے اسی کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً ایک دو پیگ اس نے لگا رکھے تھے۔ وہ اس بات پر بضد تھا کہ اس کی مرحومہ بیوی عارفہ چاند کی کسی ایک درمیانی تاریخ کو اس کمرے میں آتی ہے۔ وہ اس کمرے کو ایک سال سے جوں کا توں رکھے ہوئے تھا۔ بستر کے قریب ایک میز پر وہ دوائیں بھی اسی طرح پڑی تھیں جو وہ اپنے آخری ایام میں کھاتی تھی۔ پلنگ کے نیچے عارفہ کی جوتی، کھونٹی پر اس کی شال، الماری میں اس کے کپڑے سب کچھ جوں کا توں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کمرے میں اشیا کی ترتیب بدل گئی تو عارفہ اس سے روٹھ جائے گی..... اور ایک دن پہلے فرح سے یہی غلطی ہوئی تھی۔ اس بے چاری نے سوچا تھا کہ سخت سردی میں وہ باہر برآمدے میں سوتا ہے۔ وہ اس کے لیے کمرا درست کرنے کے لیے کمرے میں چلی گئی تھی۔

باہر بادل گرج رہے تھے۔ کسی وقت بجلی کا کشکارا بھی پڑتا تھا۔ میں نے ہاشو سے کہا۔ ”کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”بی اے کر رکھا ہے میں نے۔ یہاں مرید پور کے پرائمری اسکول میں ٹیچر بھی رہا ہوں۔ بھوت پریت اور جادو ٹونے وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا مگر جہاں تک اس کمرے کے حالات کا تعلق ہے، میں جانتا ہوں وہ یہاں آتی ہے۔ مجھ سے ملتی ہے، باتیں کرتی ہے۔ تم بھی مجھے اس سلسلے میں سمجھانے کی کوشش نہ کرنا۔“

میں اس کی بیوی عارفہ کی روداد سننا چاہتا تھا۔ میں اسے کریدتا رہا۔ آخر اس نے برآمدے میں جاکر مشروب کے چند اور گھونٹ لیے اور سگریٹ پھونکتا ہوا میرے پاس آن بیٹھا۔ پرسوں مارا ماری کے دوران میں اس کا سر چارپائی کے پائے سے ٹکرایا تھا۔ وہاں اب پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آتشیں سی نمی تھی۔ وہ اپنی روداد سناتے ہوئے بولا۔

”میری شادی کو پانچ چھ ماہ ہی ہوئے تھے۔ یہاں مرید پور میں ہی ایک شادی کے موقع پر جھاڑ نگر کے ظالم مختار ملکو نے عارفہ کو دیکھا اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے بدمست لوگ طاقت اور اختیار کے نشے میں کرتے ہیں۔“

ہاشو نے ایک دکھ بھری سانس لی اور گویا ہوا۔ ”کہانی تو بڑی لمبی ہے، بس اتنا ہی کہوں گا کہ ایک رات اشرف ملکو کا بے رحم ہرکارہ شیر اشیر دو اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ آیا اور روتی پکارتی عارفہ کو اٹھا کر اپنے چوبارے میں لے گیا۔ ایک غریب ٹیچر کی اوقات ہی کتنی ہوتی ہے۔ میرا تو آگے پیچھے بھی کوئی نہیں تھا۔ تڑپا پھڑکا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ الٹا اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ گاؤں کے ہی ایک سیانے نے مجھے سمجھایا کہ جھاڑ نگر کے یہ فرعون صفت ملکانے تمہیں آسانی کے ساتھ چار پانچ سال کے لیے جیل میں ڈلوادیں گے۔ سوچ کہ تیرے بعد تیری بیوی کہاں کہاں خراب ہوگی۔ بس چپ کرکے تین چار مہینے کا یہ زہر پی جا۔

”دراصل مختار ملکو نے اس سیانے کو یقین دلایا تھا کہ تین چار مہینے بعد میری بیوی مجھے واپس مل جائے گی۔ میرے پاس مرجانے یا سیانے کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ملکو فیملی نے مجھ پر ایک واردات کا الزام لگایا تھا جس کی وجہ سے میری اسکول کی نوکری بھی چلی گئی تھی۔ میں نے ہار مان لی تو اشرف ملکو نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے مجھے اپنے ڈیرے پر خشیانے کی نوکری دے دی۔ میں یہ سارے زہر صرف اس امید پر پیتا رہا کہ ایک روز میری عارفہ جیسی بھی ہے، مجھے واپس مل جائے گی۔“ ہاشو کی

آواز بھرا گئی۔

''تو کیا نہیں ملی وہ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بڑے کرب سے مسکرایا۔ ''ملی واپس..... اور میرے ساتھ پورا ایک سال رہی بھی لیکن یہ وہ عارفہ ہی نہیں تھی۔ نہ ہی میں وہ ہاشم رہا تھا۔ ہم ایک ہی جگہ، ایک ہی پلنگ پر پاس پاس لیٹے ہوتے تھے مگر ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوتے تھے۔ کچھ بجھ چکا تھا بے چاری کے اندر۔ وہ کوشش کر کے اسے روشن کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر وہ روشن ہوتا نہیں تھا۔ دوسری طرف میں بھی عداوتوں کی دلدل میں ہاتھ پاؤں چلاتا تھا مگر باہر نہیں نکل پاتا تھا بلکہ اور دھنس جاتا تھا۔ ہمیں بھی ایک دن بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہوتا تھا۔ اب ایک ہی چھت کے نیچے ہفتوں ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتے تھے۔ اسے جیسے خبط سا ہو گیا تھا۔ وہ ہر روز نہاتی تھی، بار بار اپنا چہرہ دھوتی رہتی تھی۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس سے علیحدہ ہو جاؤں، دوسری شادی کر لوں۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ وہ بالکل گم صم ہو گئی۔ وہ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ اکثر بخار ہو جاتا تھا، سانس کی تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جو چند ماہ پہلے تک تازہ گلاب کی طرح تھی، تیزی سے مرجھاتی جا رہی تھی۔ میں اسے علاج کے لیے دو بار لاہور بھی لے کر گیا مگر لگتا تھا کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔''

ہاشو کی آواز بھرا گئی۔ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''ہماری شادی کی دوسری سالگرہ سے دو روز پہلے وہ اسی سامنے والے کمرے میں دم توڑ گئی۔ مجھ سے اپنا کمزور ہاتھ چھڑا کر اوپر چلی گئی لیکن..... لیکن میں جانتا ہوں میری عارفہ کا بس جسم ہی اوپر گیا ہے۔ وہ خود اس گھر کے آس پاس ہی منڈلاتی رہتی ہے۔''

ہاشو کی آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر ہو گئیں۔ ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔ ایک لمبے وقفے کے بعد اس نے کہا۔ ''کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ اب میری زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہے..... عثمار ملکو اور اشرف ملکو سے اپنی عارفہ کا انتقام۔''

میں نے کہا۔ ''ہاشو! اگر تم واقعی ایسا چاہتے ہو تو یہ کام تمہارے لیے تو زیادہ مشکل نہیں۔ تم ان کے ملازم ہو۔ اچھے چوبارے سے بھی زیادہ دور نہیں ہو تم۔''

وہ کرب آمیز انداز میں مسکرایا۔ ''بھائی! میں اچھے چوبارے کا نہیں، ان کے ڈیرے کا ملازم ہوں اور تم واقف نہیں ہو اس لیے ملکو برادران کی سیکیورٹی کو بہت ہلکا لے رہے ہو۔ یہ دونوں بھائی بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہوں نے کتنی دشمنیاں مول لے رکھی ہیں۔ ان دونوں کے اردگرد ہر وقت وفادار گارڈز کا بہت سخت گھیرا رہتا ہے۔''

ہاشو ان دونوں بھائیوں کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا۔ اس حوالے سے کمالی اور میں نے بھی کافی کچھ سن رکھا تھا بلکہ کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ ہر نسل میں ملکو خاندان کے سربراہ پر کسی پیر خانے کا سایہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ساری بداخلاقیوں اور ظلم و ستم کے باوجود لمبی عمر پاتے ہیں اور طبعی موت مرتے ہیں۔ بڑے بوڑھے بتاتے تھے کہ ماضی میں ملکو کے باپ پر بھی کئی قاتلانہ حملے ہوئے لیکن اسے کبھی خراش تک نہ آئی۔

ہاشو نے بھی یہ سب باتیں سنی ہوئی تھیں اس کے باوجود اس کے ذہن میں سمایا ہوا تھا کہ وہ کسی نہ کسی موقع پر عثمار اور اشرف ملکو سے عارفہ کا بدلہ لینے کی کوشش کرے گا۔ جب میں نے ہاشو کو بتایا کہ عثمار اور اشرف ملکو کا اہم ترین کارندہ شیر اشیر و مارا جا چکا ہے اور اس کی لاش قریب ہی سرکنڈوں کے اندر جیپ میں پڑی ہے تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس کا اور دیگر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ شیر اشیر و گم ہے۔

☆☆☆

میرے سینے میں آگ روشن تھی۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میرا یار، میرا جگر، میرا بھائیوں سے پیارا بھائی ساتھ والے کمرے میں زخمی پڑا تھا۔ وہ صرف اور صرف میرے لیے ملکو گینگ کے بھڑکائے ہوئے الاؤ میں کودا اور زخم زخم ہو کر واپس آیا۔ گزرنے والا ہر پل میری رائفل کو بھی مجھ سے دور لے جا رہا تھا۔ میں اندر ہی اندر ہر اقدام کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

رات کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میرا جان سے پیارا یار کمالی بہت دیر کراہنے کے بعد سو چکا تھا۔ کرشنہ بھی اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں لحاف کے اندر سے اب بھی کبھی کبھی اجڑی بکھری لرح کی سسکی سنائی دے جاتی تھی۔ بہرحال مجھے لرح کی طرف سے دیکھے جانے کی پریشانی نہیں تھی۔ میں نے گن چادر کے نیچے چھپائی اور گھر سے نکل آیا۔ آج دھند کم تھی لیکن سردی معمول سے زیادہ تھی۔ میں اس جیپ کی طرف گیا جو سرکنڈوں میں چھپی ہوئی تھی اور جس میں اس علاقے کے چنگیز خان، شیر اشیر و کی لاش بھی موجود تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر گونا گوں تسلی ہوئی کہ بلند و بالا سرکنڈوں نے خاکستری جیپ کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور اسے

سرکنڈوں میں گھسے بغیر دیکھ لینا ناممکن تھا۔

جیپ کے قریب پہنچ کر میں نے چھوٹی ٹارچ روشن کی۔ اندر سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں ششدر ہوا کہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے بھاری بھرکم شیرا شیرو کی لاش آدھی جیپ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ درحقیقت آوارہ کتوں نے اس کے نچلے دھڑ کو بری طرح کھینچا اور بھنبھوڑا تھا۔ کوئی ایک دروازہ شاید کھلا رہ گیا تھا جس کے سبب لاش کی یہ حالت ہوئی تھی۔ دن کے وقت یہاں گدھ بھی منڈلا سکتے تھے جو ہمارے لیے خطرے کی علامت ہو سکتے تھے۔ بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے لاش کو باہر گھسیٹا۔ جیپ میں سے ہی لوہے کے دو خاصے وزنی راڈ مل گئے۔ میں نے انہیں لاش کے ساتھ باندھا اور لاش کو بہ مشکل گھسیٹتا ہوا برساتی نالے کے کنارے تک لے گیا۔ چند ہی لمحے بعد یہ پھولی ہوئی لاش نالے کے یخ بستہ پانی میں اوجھل ہو چکی تھی۔

میں جیپ تک اس لیے آیا تھا کہ مجھے یہاں کوئی اضافی رائفل یا ایمونیشن وغیرہ مل جائے لیکن جیپ کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد مجھے یہاں سے جو کچھ ملا، وہ میرے اندازے اور توقع سے بہت زیادہ تھا بلکہ شاید ضرورت سے بھی بہت زیادہ تھا۔ جیپ کے فرش میں نشست کے نیچے موجود خانے میں جو سب سے پہلی چیز مجھے نظر آئی وہ کوئی ڈیڑھ درجن دستی بم تھے۔ بالکل ایسا ہی ایک دستی بم ہمیں کارندے نامی کے پاس سے بھی ملا تھا۔ کلاشنکوف رائفل کی تین چار سو گولیاں بھی ٹارچ کی روشنی میں لشکارے مارنے لگیں۔ دو شاٹ گن کے علاوہ ڈائنامیٹ کے کچھ شیل بھی نظر آ رہے تھے۔ خانے سے باہر ایک سیٹ کے نیچے ایک نامانوس سی چیز پڑی تھی۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ بلٹ پروف جیکٹ ہے۔

پتا نہیں کیوں یہ پرانی طرز کی جیکٹ دیکھ کر میرا حوصلہ اور ارادہ مزید مضبوط ہوا۔ ایک دستی بم تین دن پہلے استعمال کرنے کے بعد اب میرے لیے یہ بھی کوئی نئی شے نہیں رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہونے لگی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن لی۔ یکایک مجھے اپنے بالکل قریب سرکنڈوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے فوراً ٹائپ 20 رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ لی۔ ایک سایہ میرے سامنے آیا۔

"اوہ، گولی نہ چلانا۔" ایک آواز نے مجھے منجمد کر دیا۔

میں نے اپنی ٹارچ کے روشن دائرے میں دیکھا، میرے سامنے چادر پوش ہاشو کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی لیکن اس نے روشن نہیں کی تھی۔

وہ کچھ دیر تک یک ٹک میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ "بے وقوفی کر رہے ہو جمالی! یہ پریکٹس نہیں ہے جو ہنستے کھیلتے ہو جائے گا۔ تم ٹھیک سے جانتے نہیں ان درندوں کو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے تلخی آواز میں کہا۔

"مارے جاؤ گے۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیا پتا کہ وہ اپنی لڑکی کو بھی مار دیں۔ اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر میرے ساتھ آؤ۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں تمہیں لے جانا چاہوں۔" اس کے لہجے میں عجب حرارت تھی۔

میں تھوڑی دیر اس کا نشے میں تمتمایا چہرہ تکتا رہا۔ میرے دل سے آواز آئی، یہ نشے میں ہونے کے باوجود فی الوقت ہوش مندوں سے زیادہ ہوش مند ہے۔

"ٹھیک ہے، کہاں جانا ہے؟" میں نے توقف کے بعد کہا۔

میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اس نے نتھنے سکیڑے اور وہ بدبو محسوس کی جو اب بھی جیپ کے اردگرد موجود تھی۔ "شیرا شیرو کی لاش کہاں ہے؟" اس کے لہجے میں کچھ تجسس ابھر آیا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ میں نے لاش کے ساتھ کیا کیا ہے۔ میں نے جیپ میں موجود اسلحے کے بارے میں بھی اسے آگاہی دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ہلکی دھند اور یخ بستہ تاریکی میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان پیدل چلتے ایک جانب بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

یہ مرید پور کی جنوبی سمت میں عیدگاہ سے تھوڑا ہٹ کر ایک مزار تھا۔ اسے چاہ مٹھا کا مزار کہا جاتا تھا۔ جب میں اور کمالی اپنے دیہاتی چینل کے لیے ویڈیوز وغیرہ بنایا کرتے تھے، ایک دو دفعہ اس مزار کے آس پاس بھی گھومے تھے۔

خون جما دینے والی اس سرد رات میں ہم ایک بغلی دروازے کے ذریعے مزار کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے۔ اس پہر احاطہ قریباً سنسان پڑا تھا۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے اور ایک کمبل پوش شخص ہمارے سامنے آ گیا۔ ہاشو نے اس کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کی۔ کمبل پوش

ایک جانب چلا گیا۔ ہم دونوں وہیں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد کمبل پوش باریش شخص واپس آ گیا۔

''آجاؤ ہاشم! اچھے موقع پر آئے ہو۔'' اس نے کہا اور ہمیں ساتھ لے کر اندرونی زینوں تک پہنچ گیا۔

زینے اتر کر ہم اس درگاہ کے زیریں حصے میں داخل ہوئے اور پھر ایک بڑے حجرے میں پہنچ گئے۔ حجرے میں مدھم روشنی تھی اور اگربتیوں کی دھیمی خوشبو تھی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا۔ رات کے اس پہر اس الگ تھلگ حجرے کے اندر کم و بیش بیس افراد موجود تھے۔ یہ سب مقامی لوگ تھے۔ شاید ان میں سے دو چار مجھے پہچانتے بھی ہوں۔ ان افراد کے سامنے ایک دبلا پتلا درمیانی عمر کا شخص گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ پگڑی کے نیچے اس کی ڈاڑھی لمبی اور سنوار تھی۔ گلے میں ایک تسبیح نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ چاہ مٹھا مزار کا گدی نشین پیر انوار الٰہی شاہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے بس نام ہی سنا ہوا تھا۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی سب لوگ حیرت اور دبے دبے جوش سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ہاشو کے ذریعے تازہ ترین صورتِ حال ان لوگوں تک پہنچ چکی تھی اور یہ سب یہ جان کر ششدر تھے کہ شیر ہاشیر دھیما خطرناک اور سفاک شخص ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔

پیر انوار الٰہی نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور کندھا تھپکا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اشارے یہی بتاتے ہیں کہ ملکو خاندان کی جو ری عرصے سے دراز تھی، وہ اب مولا پاک نے کھینچنا شروع کر دی ہے۔''

''بے شک..... بے شک۔'' کئی جذباتی آوازیں آئیں۔

پیر انوار اور کمبل پوش شخص نے سوالیہ نظروں سے ہاشو کی طرف دیکھا۔ ہاشو نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کہا۔ ''شاہ جی! میں نے ان دو تین دنوں میں ان دونوں لڑکوں میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ میں اپنی طرف سے آپ کو ان دونوں کی پوری پوری ضمانت دیتا ہوں۔ یہ شاید ہم سے بھی بڑھ کر عمار اور اشرف کے خون کے پیاسے ہیں۔''

تب ہاشو نے میرے اور کمالی کے بارے میں کچھ مزید باتیں شاہ جی اور حاضرین کو بتائیں۔ جلد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ اس نیم روشن حجرے میں اس وقت جتنے بھی افراد بیٹھے ہیں، وہ کسی نہ کسی طور ملکو فیملی کے ڈسے ہوئے ہیں اور بات صرف ان چند لوگوں تک ہی محدود نہیں تھی، جھاڑ نگر کے سارے علاقے میں ایک زبردست قسم کی بے چینی دھیرے دھیرے اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ان پندرہ بیس دیہات کی زیادہ تر آبادی اُچے چوبارے کو شدید نفرت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ مگر کچھ وہم اور کچھ خوف تھے جو لوگوں کو صدائے احتجاج بلند کرنے سے روکتے تھے۔ ان میں سے ایک وہم تو وہی تھا جس کے بارے میں کمالی اور میں بھی کچھ نہ کچھ جانتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ملکو خاندان کے سربراہ کے سر پر ملتان کے کسی بڑے پیر خانے کا ہاتھ رہتا ہے۔ اس قدیم پیر خانے کی ''برکت'' کے سبب اُچے چوبارے کے کرتا دھرتا کو کبھی کوئی دشمن نقصان نہیں پہنچا سکا۔ اب خدا جانے یہ اتفاق تھا یا اہلِ علاقہ کی بدقسمتی تھی کہ مختار ملکو کے ستم گر ... باپ کی طرح خود مختار ملکو پر بھی ماضی قریب میں دو تین قاتلانہ حملے ہو چکے تھے لیکن وہ بال بال بچا تھا۔ چار پانچ سال پہلے ایسے ہی ایک حملے میں اس کی سیکیورٹی کے چھ بندے جان سے گئے تھے۔ مختار ملکو کی لینڈ روور جیپ جنگلا توڑ کر نہر میں جا گری تھی۔ مختار ملکو کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک ممبر صوبائی اسمبلی بھی جاں بحق ہوا مگر مختار ملکو محفوظ رہا۔

یہی حملہ تھا جس کے بعد مختار ملکو خود تو کافی حد تک غیر فعال ہو گیا تھا۔ اس کی عیاشیاں وغیرہ اب اُچے چوبارے کے اندر تک محدود تھیں یا پھر سیاست کے جوڑ توڑ میں مصروف رہتا تھا۔ مار دھاڑ اور قانون شکنی کے سارے کام اس کا چھوٹا بھائی اشرف ملکو ہی انجام دیتا تھا۔

نیم روشن حجرے میں کچھ دیر شاہ جی اور حاضرین کے ساتھ بیٹھنے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آج کی یہ رات بے حد اہم ہے۔ یہاں اُچے چوبارے کے حوالے سے ایک زبردست منصوبہ بندی ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے۔ حاضرین کا مرکزِ نگاہ ایک اچھے قد کاٹھ کا پینتیس چالیس سالہ شخص تھا۔ اس کا ایک بازو فریکچر تھا اور پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کا نام غیور احمد معلوم ہوا۔ غیور یہاں مرید پور میں قصاب کا کام کرتا تھا۔

ہاشو نے سرگوشیوں میں مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ غیور کل دوپہر مختار ملکو کو قتل کرنے کے لیے اُچے چوبارے جا رہا ہے۔

''اکیلا؟'' میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

''ہاں اکیلا..... یہ بھی اپنے سینے میں ایک بڑا دکھ لیے پھرتا ہے۔ آج سے کوئی پندرہ سال پہلے اس کی بیوی اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے بعد مر گئی تھی۔ ثوبیہ نام کی اس پیاری سی بچی کو اس کی دادی نے اور غیور نے پالا۔ بے پناہ پیار کرتا تھا وہ ثوبیہ سے۔ وہ سات آٹھ سال کی تھی جب مختار ملکو کی تیز رفتار جیپ نے سرِ راہ ثوبیہ کو کچل دیا۔ وہ شدید زخمی

ہوئی، لاہور پہنچنے سے پہلے ہی مرگئی۔ اس وقت جیپ مختار ملکو کا بیٹا شمشیر چلا رہا تھا جو ابھی پورا بالغ بھی نہیں ہوا تھا۔ جیپ میں اس کا باپ مختار ملکو بھی موجود تھا۔ دادی اس صدمے سے مرگئی لیکن مختار ملکو جیسے لوگوں کا کوئی کیا کرسکتا ہے۔ غیور احمد کو بھی کچھ ڈرا دھمکا کر اور کچھ دے دلا کر چپ کرا دیا گیا لیکن آنسو تو ایک سیلاب کی طرح اس کے سینے میں گرتے رہے اور آگ تو جلتی رہی۔" ہاشو میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہوگیا۔

اسی دوران میں پیر انوار شاہ (شاہ جی) نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر کہنا شروع کیا۔ "جو دو تین بندے بعد میں آئے ہیں ان کے لیے پھر بتا دیتا ہوں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مختار ملکو کا بیٹا شمشیر آنے والے الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل چوہدری مختار ملکو کے دل میں غریب لوگوں کا درد بڑے زوروں سے جاگا ہوا ہے۔ کل دوپہر وہ اپنے چوبارے کے احاطے میں آکر غریب غرباء میں راشن اور گرم کپڑے وغیرہ تقسیم کرنے والا ہے۔ غیور بھی ان لوگوں میں شامل ہوکر احاطے میں جائے گا۔ غیور کے پاس ایک ہتھیار بھی ہے۔"

ایک مفلوک الحال کسان نے کہا۔ "شاہ جی! معافی چاہتا ہوں پر ہم سب جانتے ہیں کہ چوبارے میں جانے والوں کی اتنی ڈھاڈی تلاشی ہوتی ہے کہ سوئی تک اندر نہیں جاسکتی۔ زنانیوں کی تلاشی زنانیاں لیتی ہیں اور....."

انوار شاہ نے ہاتھ اٹھا کر کسان کو چپ کرایا۔ "بشیرے! پوری بات سن لو۔ میں یہی بتانے لگا ہوں۔" پھر پیر انوار شاہ نے غیور احمد کے ٹوٹے بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "غیور احمد کا بازو ٹوٹا ہوا نہیں ہے اور یہ پلاستر بھی ایسا ہے جس کے ایک حصے کو بہ آسانی کھولا جاسکتا ہے..... دکھاؤ غیور احمد!"

بڑھی ہوئی سفید شیو والے خستہ حال غیور کی آنکھوں میں نادیدہ شعلے لپک رہے تھے۔ اپنی لاڈلی کا کبھ دکھ انتقام کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ یقیناً وہ بھی جانتا تھا کہ گھرانے کا سربراہ مختار ملکو ہی وہ ستون ہے جس پر پورے اچھ چوبارے کی وسیع عمارت کھڑی ہے۔ یہ ستون گرا تو ساری عمارت اور سارے واہے دھڑام سے زمین بوس ہوجائیں گے۔ غیور احمد نے اپنے ناخنوں کے ساتھ ایک جانب سے سفید پلاستر کو کریدا تو ایک ڈھکنا سا کھل گیا۔ اس میں ایک تیز دھار خنجر تھا۔ غیور نے بتایا کہ یہ زہر میں بجھا ہوا ہے۔

☆☆☆

دوپہر ہوچکی تھی۔ ہم آٹھ دس افراد انوار شاہ سمیت مزار کے نیچے حجرے میں موجود تھے۔ ہاشو نے علیحدگی میں انوار شاہ کو بتا دیا تھا کہ میں وہی ہوں جس کے ساتھ اشرف ملکو کی بیٹی شادی کرنے کی خواہش مند تھی اور وہ کمالی میرا ہی دوست ہے جس نے یہاں آکر تہلکہ مچایا ہے اور شیر اشیر و جیسے زہریلے سانپ کا سر کچلا ہے۔ ان انکشافات نے انوار شاہ کو متاثر کیا تھا۔

مرید پور کا قصاب غیور احمد اپنے مشن پر روانہ ہوچکا تھا۔ ایک موقع پر میں نے بڑے اصرار کے ساتھ پیر انوار شاہ سے کہا تھا کہ وہ مجھے بھی اجازت دیں تاکہ میں اس خطرناک کارروائی کے لیے غیور احمد کے ساتھ جاسکوں۔ انوار شاہ نے مجھے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں نے شیر اشیر و جیسے عفریت کو جہنم واصل کرکے ثابت کیا ہے کہ تم اور بھی بہت کچھ کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "پھر آپ کوئی حکم دیں۔ میرا دوست شدید زخمی پڑا ہے اور اس بے گناہ فرح کو جس طرح سرِعام بے آبرو کیا گیا، اس نے میرے سینے میں آگ بھر رکھی ہے۔ میں..... میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

پیر انوار شاہ نے کربناک انداز میں کہا۔ "مالی مجید کی بیٹی اور مجذوب بیٹے کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ہم سب کے لیے بہت تکلیف دہ ہے اور جو کچھ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، وہی بندے کے اندر اضافی حوصلہ اور طاقت بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی اضافی حوصلے کا نتیجہ ہے کہ غیور احمد اس وقت اچھ چوبارے میں موجود ہے۔ اللہ کرے وہ کامیاب ہو۔ اس کے کامیاب ہونے کے فوراً بعد جو حالات پیدا ہوں گے، ان میں ہمیں تمہارے اور کمالی جیسے جی دار لڑکوں کی بہت ضرورت ہوگی۔"

ذرا توقف کے بعد پیر انوار شاہ نے کہا۔ "فی الحال ہم دو کام کریں۔ ایک تو شیر اشیر و جیسی بلا سے چھٹکارے پر سجدۂ شکر ادا کریں، دوسرے دل کی گہرائی سے غیور احمد کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔"

پیر انوار شاہ کی ہدایت کے مطابق سب نے سجدۂ شکر کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہاشو یہاں موجود نہیں تھا۔ وہ مکمل پوش شخص کے ساتھ اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ایک تو اس نے کمالی اور دوسروں کو میری خیر خیریت کی اطلاع دینا تھی، دوسرے اس جیپ کا جائزہ لینا تھا جس میں اسلحہ اور ایمونیشن وافر مقدار میں موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جھاڑ نگر میں جو لڑائی مدتوں سے رکی ہوئی تھی، وہ ایکا ایکی بڑی

خاموشی کے ساتھ شروع ہوگئی ہے۔

جس خبر کا بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جارہا تھا، وہ سہ پہر تین بجے کے قریب چاہ مٹھا کے اس حجرے میں پہنچی اور خبر یہ تھی کہ بہت کوشش کے باوجود غیور احمد، چودھری مختار ملکو تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے۔ وہ صرف ایک گارڈ کو زخمی کرسکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک نعرہ لگانے کے بعد پھر مختار ملکو پر جھپٹتا، کسی کلاشنکوف کی چار گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

یہ نہایت تکلیف دہ اور مایوس کن خبر تھی۔ کتنی ہی دیر تک حجرے میں گہری خاموشی چھائی رہی پھر انوار شاہ نے چند جملے بول کر حاضرین کو صبر اور حوصلے کی تلقین کی۔ پیغام دینے والے کی باتوں سے پتا چلا کہ اس واقعے کے بعد پورے جھاڑ نگر اور ارد گرد کے دیہات میں ہائی الرٹ کردیا گیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس واقعے کو الیکشن کی آمد کا شاخسانہ قرار دے رہے ہیں مگر زیادہ تر لوگ اس کے ڈانڈے ''جلاوطن'' کمالی کی واپسی سے جوڑ رہے ہیں۔ ملکو فیملی میں شبر اشیرو کی گمشدگی کے حوالے سے بھی سخت تشویش پائی جارہی تھی۔

.....رات کو ہاشو بھی گھر اور ڈیرے کا چکر لگا کر مزار پر واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ کمالی کی حالت اب کچھ بہتر ہے۔ کرشمہ مسلسل اس کی تیمارداری میں مصروف ہے۔ وہ گہری سانس لے کر دکھ بھری آواز میں بولا۔ ''جمالی! تم سے کہا تھا نا یہ کوئی پریکٹ نہیں ہے، زندگی موت کا کھیل ہے۔ بلکہ شاید موت ہی کا کھیل ہے۔ سمجھو کہ مختار ملکو ہر وقت قلعہ بند رہتا ہے۔ درجنوں گارڈ اس پر جدید اسلحے کا سایہ رکھتے ہیں۔ گئے دنوں میں وہ جو جو کچھ کرچکا ہے، اس کی سزا کے اندیشے اس کے دل و دماغ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''اس واقعے کے بعد عام لوگوں کا کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مزید دھیمی آواز میں بولا۔ ''جمالی! یہ سوال تم خود سے پوچھو نا۔ تمہارا دل نہیں چاہتا کہ یہ بدبخت شخص کل کا سورج نہ دیکھ پائے؟ یہی سوچ اکثریت کی ہے لیکن اپنی جان اور عزت کا خوف ان پر غالب ہے۔ بلکہ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں جمالی کہ جو ناکامی آج ہوئی ہے، ایسی ناکامیوں کے بعد جھاڑ نگر کے توہم پرست لوگوں کے خوف اور بڑھ جاتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ مضبوط ہونے لگتا ہے کہ ملکو فیملی پر ضلع ملتان کے کسی قدیم پیر خانے کا سایہ ہمیشہ سے ہے۔''

میں بڑی افسردگی سے حجرے کے اس گوشے کو دیکھنے لگا جہاں آج صبح غیور احمد آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر عزم لیے اپنا آخری ناشتا کررہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حملے کے بعد اس کے بھاگ نکلنے کے امکانات کم ہیں مگر زندگی کی آس تو آخری سانس تک قائم رہتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا..... ''غیور تو چلا گیا لیکن ناکام نہیں ہوا۔ تو شاید اپنی حرارت کئی سینوں میں منتقل کرگیا ہے۔ ان میں سے ایک سینہ میرا بھی ہے۔ اگر میرا بس چلا تو میں تیری ناکامی کو کامیابی میں ضرور بدلوں گا۔''

مزار کے نیچے والے ہال میں رات کے آخری پہر تک میں بس جاگتا ہی رہا تھا۔ یادیں تھیں جو بس اُمڈی چلی آرہی تھیں۔ یہ رانیہ کی یادیں تھیں۔ جب شروع شروع میں اس نے میری طرف قدم بڑھائے تو میں حقیقت میں ڈر گیا تھا۔ کہاں وہ اُپچے چوبارے کی چشم و چراغ، کہاں میں ایک عام باغبان کا بیٹا..... مگر رانیہ کی چاہ میں اتنی طاقت تھی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور پھر وہ اندوہناک واقعات ہوئے جنہوں نے مجھے اور کمالی کو جھاڑ نگر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ آس تھی کہ کوئی انہونی ہوجائے گی۔ ایک نہ ایک دن میں اسے پالوں گا لیکن آخر وہ وقت آ ہی گیا تھا جو ٹالے نہیں ٹلتا۔ رانیہ اپنے تایا زاد شمشیر ملکو کی دائمی گرفت میں آنے والی تھی۔

میں سوچتا رہا اور آنکھوں میں نمی جمع ہوتی رہی۔ کیا میں اسے کبھی دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں؟ ذہن میں سوال ابھرا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں چند گھنٹے بعد اسے دیکھنے والا ہوں اور اسی مزار میں دیکھنے والا ہوں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ باقی سب لوگ تو جاچکے تھے لیکن میں حجرے میں ہی موجود تھا۔ پیر انوار شاہ نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں باہر نکلنے کا خطرہ مول نہ لوں۔ ہاشو بھی اپنی منشی گیری والی ڈیوٹی کے لیے ملکو فیملی کے ڈیرے پر جاچکا تھا۔ اچانک مجھے اوپر مزار کے احاطے میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ مزار میں کام کرنے والے رضاکار عام لوگوں کو احاطے سے نکال رہے تھے۔ میں نے سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کی اوٹ سے دیکھا، مردوں کو ہی باہر نکلنے کا کہا جارہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں احاطہ خالی نظر آنے لگا۔ تب میری نگاہ تین خواتین پر پڑی۔ ان میں سے دو تو اُپچے چوبارے کی خدمت گار معلوم ہوتی تھیں، تیسری مکمل طور پر نقاب میں تھی اور شاہانہ چال چلتی اندرونی حصے کی طرف آرہی تھی۔

پیر انوار شاہ ایک گدی پر زانو تہ کیے بیٹھے تھے۔ عقیدت مند مرد و زن کے مسئلے مسائل وہ یہیں پر سنتے تھے۔ عورتوں کے لیے پردے کا انتظام تھا۔ اب چونکہ مردوں کو تو باہر نکالا جا چکا تھا، صرف خواتین ہی چٹائیوں پر موجود تھیں۔ اسپ چوبارے کی تینوں خواتین کو انتظار کی زحمت نہیں دی گئی۔ وہ پیر انوار شاہ کے پاس ہی جا بیٹھیں۔ ملازم عورتیں تھوڑا پیچھے تھیں۔ نقاب والی انوار شاہ کے بالکل قریب چلی گئی اور تب ہی میرے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

میں نے آنکھوں اور پیشانی کی جھلک سے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی تھی جس کی یادیں دو سال سے ہر پل میرے ساتھ تھیں۔ یہ رانیہ تھی۔ وہ دھیمی آواز میں پیر انوار سے کچھ کہہ رہی تھی اور کچھ جھجک بھی رہی تھی۔ اس کی جھجک دیکھتے ہوئے پیر انوار شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ دونوں بھی سیڑھیاں اتر کر مزار کے زیریں حصے میں آ گئے۔

پیر انوار شاہ اور رانیہ حجرے کے دروازے کے سامنے بچھی چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد رانیہ کی گلوگیر لیکن جانی پہچانی آواز مجھ تک پہنچی۔ ”شاہ جی! میرے لیے خاص دعا کریں۔ م..... میں بڑی مشکل میں ہوں۔ میرے دل میں سکون نہیں۔ جب میں خود بے سکون ہوں، ناخوش ہوں تو کسی کو کیا خوشی دے سکوں گی۔“

پیر انوار شاہ نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں بیٹی! تیری شادی ہو رہی ہے اور تو جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ شاید اپنی شادی کے حوالے سے ہی کہہ رہی ہے..... دیکھو بیٹی! شرع میں شرم نہیں۔ کیا تو کسی اور کو پسند کرتی تھی؟“

کافی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سسک کر بولی۔ ”لیکن میرا اور اس کا میل ممکن نہیں شاہ جی! وہ میرے خاندان کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہے۔ اگر..... اگر وہ مجھے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا بھی تو اس میں سوائے خون خرابے اور رسوائی کے کچھ حاصل نہ کر سکے گا۔ آپ..... اس کے لیے بھی دعا کریں کہ اس کے دل کو سکون ملے اور وہ اس آگ سے دور رہے۔“ رانیہ کی آواز پھر بھرا گئی۔

پیر انوار شاہ نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اگر میں کہوں کہ وہ اس آگ سے دور نہیں رہ سکا تو.....؟“

”جی.....؟ میں سمجھی نہیں۔“

انہوں نے اپنی نیم سفید ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ ”تم سامنے اس حجرے میں جاؤ، میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔“

وہ کچھ سمجھ نہ آنے کے باوجود اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہی پھر پیر انوار کے حکم پر عمل کرتے ہوئے حجرے میں چلی گئی۔ پیر انوار ستون کے پاس سے اٹھ کر میری طرف آئے۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا اور تسبیح کو اپنی انگلیوں میں گردش دیتے ہوئے بولے۔

”جاؤ، مختصر بات کر لو اس سے۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔ دروازے پر دستک دوں تو اسے باہر بھیج دینا۔“

میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ حجرے کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ اب بھی نقاب میں تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ پہلے تو جیسے ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹی پھر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

”جمال.....!“ اس نے کہا اور آگے بڑھ کر بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے کومل جسم کی نرمی اور گرمی کو میں نے پوری شدت سے محسوس کیا۔ تصور میں ماضی کا وہی یادگار منظر کوندے کی طرح لپک گیا جب اسی طرح ربڑ کے سانپ سے ڈر کر وہ نہر میں گر گئی تھی۔ میں اس کے پیچھے نہر میں کودا تھا اور وہ امربیل کی طرح مجھ سے لپٹ گئی تھی اور وہی لمحہ تھا جو ایک انوکھے جذبے کا آغاز بن گیا تھا۔

”جمال..... جمال..... تم کیوں آئے یہاں..... تم کیوں آئے..... بہت بڑی غلطی کر رہے ہو تم اور کمال.....“ وہ نیم روشن حجرے میں مجھ سے لپٹی میرے کانوں کے قریب بولے چلی جا رہی تھی۔ اس کی گرم سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔

پھر ایک دم جیسے وہ اپنے حواس میں آئی۔ ٹھٹک کر اور اپنے آپ میں سمٹ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ نقاب سرک گیا تھا۔ اس کے سفید چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ بدن کانپنے لگا تھا۔

میں نے عزم کے ساتھ اسے کاندھوں سے تھاما۔ ”رانیہ! میں آ گیا ہوں..... اور تم جانتی ہو میں تمہیں کسی اور کی ہوتے نہیں دیکھ سکتا..... اب تو.....“

اس نے اپنی ہتھیلی سے یکایک میرے ہونٹ ڈھانپ دیے۔ ”پلیز جمال..... پلیز..... اور کچھ نہ کہنا۔ میرے تھوڑے کہے کو زیادہ جانو..... بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو اب

ایک لفظ اور نہ بولنا۔"

اس نے ہتھیلی میرے ہونٹوں سے ہٹائی اور پھر اپنے مرمریں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔

"جمال..... ! بھول جاؤ سب کچھ..... ہمیں یہ سب بھولنا ہی پڑے گا۔ سہنا ہی پڑے گا۔ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اگر ہم اس کے پیچھے بھاگیں گے تو رسوائی اور سخت تکلیف کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم کمال بھائی کو لے کر جتنی جلدی ہوسکتا ہے، یہاں سے نکل جاؤ۔" اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

میں نے اس کے جڑے ہاتھ تھامے مگر اس سے پہلے کہ کچھ بولتا، دروازے پر دستک ہوگئی۔ باہر پیر انوار شاہ ہی تھے۔ میری آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ رانیہ بھیگی آنکھیں پونچھ کر چادر کا نقاب درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

چند ہی لمحے بعد باہر سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "السلام علیکم شاہ جی!"

میں نے دروازے کی باریک جھری سے دیکھا۔ گول ستون کے پاس انوار شاہ اور نقاب پوش رانیہ کے سامنے لمبا تڑنگا شمشیر ملکو کھڑا تھا۔ وہی شمشیر جو اب جلد سے جلد بطور شوہر رانیہ کا قبضہ حاصل کرنا چاہتا تھا (جیسے رانیہ ایک مخدوش زمین ہو)۔

"رانیہ! اتنی دیر لگادی؟" وہ اپنی گندمی پیشانی پر تیوری چڑھا کر بولا۔

"میری ہی باتوں میں کچھ دیر ہوئی۔" انوار شاہ نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے بادشاہو..... لیکن اب بھی یہ فارغ ہوئی ہے یا نہیں؟" شمشیر کا لہجہ کٹیلا اور کسی حد تک غصیلا تھا۔

اسی اثنا میں دونوں خادماؤں بھی سیڑھیاں اترتی نظر آئیں۔

انوار شاہ نے رانیہ کے سر پر پیار دیا اور کچھ پھونکا۔ شمشیر مسلسل جلتی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا ہو..... "کیا دکھڑے اور رونے دھونے لے کر بیٹھی ہوئی تھی یہاں؟"

رانیہ سر جھکا کر اپنے تایازاد کے ساتھ چل پڑی اور میری نظر سے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

رات ایک بجے کے لگ بھگ انوار شاہ کے حجرے میں پھر بڑی خاموشی سے دس پندرہ افراد کا اجتماع ہوا۔ یہ سب وہی لوگ تھے جو کسی نہ کسی طور ملکو قبیلے سے بری طرح ڈسے گئے تھے۔ ایک چھوٹا کاشت کار تھا جس کی زمین پر شیر اشیرو نے زبردستی قبضہ کرکے اپنا ٹریکٹر چلایا تھا اور مزاحمت پر اس کے دونوں بازو توڑ دیے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کمپاؤنڈر تھا جس کے گھر اور دواخانے کو کسی ناراضگی کی بنا پر آگ لگوا کر راکھ کردیا گیا تھا۔ ایک غریب کو چوان تھا جسے مجبور کیا گیا تھا کہ وہ خود اپنی نوجوان بیوی کے منہ پر تیزاب پھینکے۔ ایسے بہت سے واقعات تھے..... اور یہ ظلم و ستم صرف ان دس پندرہ افراد تک ہی تو محدود نہیں تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ جھاڑ نگر کے حالات بہت بدل چکے ہیں۔ سارے علاقے میں ملکو قبیلے کے خلاف چپکے چپکے ایک آتش دہک رہی ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اب اپنے چوبارے کے جارحانہ تسلط سے نجات چاہتے تھے۔ وہی صدیوں پرانی کہانی اور وہی صدیوں پرانی مجبوری بھی تھی۔ اپنے چوبارے پر پہلا پتھر کون پھینکے گا؟ پہلی کھڑکی کون توڑے گا؟ اور اس خوف کو یہ واہمہ مزید گمبھیر کردیتا تھا کہ گئے وقتوں سے ملکو قبیلے کے سربراہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جاسکا..... اور وجہ کسی پیر خانے کی پشت پناہی ہے۔

حجرے میں موجود سب افراد آج بہت خاموش اور غمزدہ تھے۔ قصاب غیور احمد کی رائگاں قربانی نے سبھی کو ملول کر رکھا تھا۔ اپنی لاڈلی بیٹی پر ہونے والے ظلم کا حساب لیتے لیتے وہ خود بھی جان سے گیا تھا۔ بقول ہاشو، وہ کہا کرتا تھا۔ "میری معصوم بیٹی کو دلہن بننے کا بہت شوق تھا، شاید اسی لیے اس نے چھوٹی سی عمر میں خون کے رنگ والا لال جوڑا پہن لیا اور چھوٹی سی قبر میں جا سوئی۔"

آج حجرے میں اگربتیوں کا لطیف دھواں بھی بوجھل اور بے اثر محسوس ہوتا تھا۔ اس نشست کے آخر میں پیر انوار شاہ نے کہا۔ "رات کا اندھیرا جتنا گہرا ہوتا ہے، صبح کی امید اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ ہم اپنی امید برقرار رکھے ہوئے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ درحقیقت مالی مجید کی مظلوم بیٹی فرح پر سرعام ہونے والے ظلم نے لوگوں میں غم و غصے کی ایک نئی لہر پیدا کی ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ لہر ختم نہ ہو۔"

انوار شاہ کے جواں سال کمبل پوش مرید یوسف اچکزئی نے کہا۔ "شاہ جی! میں ہاشو کے ساتھ سرکنڈوں میں کھڑی جیپ دیکھ کر آیا ہوں۔ اس میں کافی اسلحہ ہے۔ دستی بموں کے علاوہ دو دو لانچر راکٹیں، کارتوس، ڈائنامیٹ کے شیل اور بہت سی گولیاں ہیں۔"

پیر انوار شاہ نے کہا۔ "وقت آنے پر یہ سب ہمارے کام آسکتا ہے یوسف! لیکن فی الحال میں چاہتا ہوں کہ دو تین روز ہم خاموشی سے گزار لیں۔ حجرے میں جمع بھی نہ ہوا جائے۔ آج دوپہر شمشیر احمد خود یہاں آچکا ہے۔ ممکن ہے کہ

اسے کسی طرح کا شک بھی ہوا ہو۔"

پیر انوار شاہ کی ہدایت پر مرحوم غیور احمد کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی اور رات تین بجے کے قریب یہ نشست برخاست ہوگئی۔

میں اب کمالی کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی میں ہاشو کے ساتھ اس کے گھر واپس پہنچ گیا۔ کمالی سویا پڑا تھا۔ ٹانگ اور سر پر پٹی تھی۔ سرہانے مختلف دوائیں پڑی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ کرشمہ اس کی پائینتی کی طرف کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی ہے۔ اس کا سر کمالی کی پنڈلیوں پر دھرا تھا۔ ریشمی بال کمالی کے گھٹنوں پر بکھرے تھے۔ کمالی سے کرشمہ کی محبت دن بدن گہری ہورہی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ کمالی پہلی ملاقات میں ہی اس کی چاہت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ کئی دوسری باتوں کے علاوہ کرشمہ کو یہ بات بھی معلوم ہوچکی تھی کہ کمالی نے اپنی گاڑی بیچ کر سب انسپکٹر قدیر سے اس کی جان چھڑائی تھی۔

میں نے دونوں کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ یاسر نے بتایا۔ "کمالی بھائی کی حالت اب بہتر ہے۔ بخار نہیں ہورہا مگر ٹانگ میں ہلکا اور کبھی تیز درد ہے۔ کئی بار پوچھ چکے ہیں کہ جمالی کہاں ہے۔"

"فرح کا کیا حال ہے؟" میں نے یاسر سے پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے مگر روتی رہتی ہے۔ بھائی کی موت کا بہت دکھ کررہی ہے۔ اسے یہ بھی ڈر ہے کہ اشرف ملک کے کارندے اسے یہاں سے پھر اٹھا کر نہ لے جائیں۔"

اسی دوران میں فرح بھی آگئی۔ اس کی آنکھیں مسلسل رونے دھونے سے ورم زدہ تھیں۔ جسم پر تشدد کے نشان تو کچھ مدھم ہوگئے تھے مگر جو نشان اس کی روح اور اس کے دل پر لگے تھے، وہ اتنی جلدی مدھم کیسے ہوسکتے تھے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "فرح، میری بہن! تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے ذمے دار میں اور کمالی بھی ہیں۔ میں اپنی اور کمالی کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں..... اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ تمہاری طرف اب جو آنکھ اٹھے گی، وہ میں تمہارے سامنے نکال ڈالوں گا۔ کوئی مجھے اور کمالی کو مار کر ہی تمہاری طرف آسکتا ہے۔"

میں نے اسے ساتھ لگایا، اس کا سر چوما۔ وہ بولی۔ "بھائی! میں رانیہ کا سوچ سوچ کر اور زیادہ دکھی ہوجاتی ہوں۔ وہ آپ کی آس پر زندہ تھی۔ شمشیر کے ساتھ اس کی زندگی مُردوں سے بدتر ہوجائے گی۔ اس کا کیا ہے گا بھائی؟"

سستی لذیذ ڈش

ایک صاحبہ جو بنائی میں بہت مشاق اور ڈیزائن نقل کرنے میں ماہر تھیں، ایک روز چینی ریستوران میں گئیں اور وہاں کے مینیو پر بنے ہوئے ڈیزائن سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہوں نے فوراً اسے نقل کیا اور بعد میں اپنے دیدہ زیب جمپر پر بنالیا۔ وہ اس پر بہت فخر کرتی تھیں، یہاں تک کہ وہ اپنی ایک دوست سے ملیں جو کہ چینی زبان پڑھ سکتی تھی۔

اس نے جمپر کو دیکھا اور ہنسنا شروع کردیا۔ جمپر پر لکھے ہوئے الفاظ تھے۔

"یہ ڈش سستی لیکن لذیذ ہے۔"

ہر شاخ پہ الو

صدر ایوب خان مرحوم کے زمانے میں پاکستان کی قومی اسمبلی میں معزز ارکان کے درمیان بڑی دلچسپ فقرے بازی ہوا کرتی تھی۔ یہ فقرے بازی لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ مثلاً اس زمانے کی قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر سردار بہادر خاں نے جب قومی اسمبلی کی کارکردگی کو غیر موثر سمجھا تو یہ شعر پڑھ کر استعفا دے دیا۔

اب راز یہ کوئی راز نہیں
سب اہل گلستاں جان گئے
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے
انجام گلستاں کیا ہوگا

فالج

جو بات کہی جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس صورت میں کیا نقصانات ہیں؟

ایک نوجوان نے اپنی محبوبہ سے کہا۔ "آج تم اتنی حسین نظر آرہی ہو کہ جی چاہتا ہے تمہیں چوم لوں۔"

محبوبہ کے خاموش رہنے پر نوجوان نے پھر اپنا جملہ دہرایا۔ جب تیسری بار بھی اسے خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہ ملا تو اس نے جھلا کر کہا۔

"کیا تم بہری ہو؟"

محبوبہ نے اور بھی جھلا کر کہا۔ "اور کیا تم پر فالج گر گیا ہے۔"

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

میں نے پچکارا۔ ''سب اچھا ہوگا، بس تم دعا کرو۔''

صبح دس بجے کے قریب ہاشو دس کلومیٹر کا فاصلہ موٹر سائیکل پر طے کر کے روزمرہ کی ڈیوٹی پر ملکو فیملی کے ڈیرے پر گیا۔ شام کو واپس آ کر اس نے بتایا کہ اچھے چوہارے میں رانیہ اور شمشیر کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ کچھ فرنیچر وغیرہ آیا ہے۔ ایک حصے میں رنگ و روغن اور صفائی ستھرائی کا کام بھی ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ گمشدہ جیپ اور شیر اشیرو کی تلاش بھی زور و شور سے جاری ہے۔ سیکیورٹی بہت سخت کر دی گئی ہے۔

رات گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ زخمی کمالی سے کافی دیر لڑائی کرنے کے بعد میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لڑائی اس بات پر ہوئی تھی کہ وہ ہمیں نشہ آور چائے کے ذریعے نیم بے ہوش کرنے کے بعد تن تنہا اس آگ میں کیوں کودا جہاں سے اسے زخمی ہو کر واپس آنا پڑا۔ ہماری اس قسم کی لڑائیاں آخر میں صلح پر ہی ختم ہوتی تھیں۔ یہ بھی شکووں کی بھرمار کے بعد صلح پر ختم ہوئی تھی۔

میں ابھی سویا نہیں تھا، غنودگی میں تھا۔ یاسر نے ہولے سے میرا شانہ ہلا کر جگایا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''ہاشو اسی خاص کمرے میں ہے، ذرا دیکھیں آ کر۔''

میں اٹھ کر دبے پاؤں اس کمرے تک پہنچا۔ اندر جھانکنا ممکن نہ ہو سکا تاہم کھڑکی سے کان لگانے پر اندر سے رونے کی مدھم آواز آنے لگی۔ یہ ہاشو ہی تھا۔ پھر یوں لگا جیسے وہ کسی دیوار پر مکے برسا رہا ہو۔ کچھ دیر بعد میں نے یاسر کو اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔ تب میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ''ہاشم! یہ میں ہوں، جمالی۔''

کافی تاخیر کے ساتھ ہاشو نے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ پر نظر پڑی۔ وہ بری طرح چھلا ہوا تھا۔ یقیناً وہ نشے میں بھی تھا۔ منہ سے بو آ رہی تھی۔ میں اسے لے کر نیم گرم باورچی خانے میں آ بیٹھا اور دلاسا دیا۔ رونے کی وجہ پوچھی۔ اس کے آنسو زیادہ شدت سے گرنے لگے۔

''جمالی! وہ اب نہیں آئے گی، کبھی نہیں آئے گی۔ اس لڑکی فرح نے بڑی غلطی کی۔ اس کمرے میں چلی گئی۔ سب کچھ اِدھر اُدھر کر ڈالا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی مرحومہ بیوی کا ذکر کر رہا ہے جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ اس کی روح ہر ماہ مقررہ تاریخوں پر یہاں آتی ہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرتی ہے، وقت گزارتی ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ صرف اس کا وہم تھا یا پھر اس میں حقیقت کی بھی کچھ آمیزش موجود تھی۔ بہرحال فی الوقت ہاشو کی حالت بری تھی۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے مطابق وہ پورے چار روز سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ آج اس کی امید کا آخری روز تھا۔ وہ نہیں آئی اور اس نے نہیں آنا تھا۔

میں اسے دیر تک دلاسا دیتا رہا۔ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ نشے میں نہ ہوتا تو شاید کچھ سمجھتا بھی مگر فی الوقت الکحل کے بے دریغ استعمال نے اس کی حالت پتلی کر رکھی تھی۔

اگلے روز نشہ اترنے کے بعد وہ پھر اپنی موٹر سائیکل پر حساب کتاب کے رجسٹروں والا بیگ لٹکا کر ڈیوٹی کے لیے ڈیرے پر چلا گیا لیکن جلد ہی واپس بھی آ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو کر آیا تھا۔ اس نے یہ تشویش ناک خبر دی کہ کمالی اور جیپ کی تلاش نے اب نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ اشرف اور اس کے ہونے والے داماد شمشیر کے کہنے پر مقامی پولیس نے اردگرد سے کوئی پچاس بندوں کو شبے میں گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایک کو پوچھ گچھ کے لیے بٹھایا گیا ہے۔ گمشدہ جیپ کے حوالے سے چار پانچ دیہات میں منادی وغیرہ بھی کی گئی تھی۔

ہاشو اپنی بڑھی ہوئی شیو کھجا کر بولا۔ ''زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ مزار سے شاہ جی کے خاص مرید یوسف کو بھی پوچھ گچھ کے لیے تھانے لے جایا گیا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ ان لوگوں کو شاہ جی پر بھی کسی طرح کا شک شبہ ہو چکا ہے۔''

یہ واقعی پریشان کن بات تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''اب کہاں ہے یوسف؟''

''فی الحال تو واپس آ گیا ہے لیکن ڈی ایس پی نے کہا ہے کہ وہ کہیں دور نہ جائے، اسے پھر بلایا جا سکتا ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ ہاشو اور یوسف میں کافی قربت ہے۔ دونوں زیادہ تر اکٹھے ہی دیکھے جاتے تھے۔ میں نے اس سے کمبل پوش یوسف کا حدود اربعہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ کسی تنظیم کے ساتھ جموں کشمیر میں بھی رہا ہے۔ ایک جھڑپ میں اس کے بازو پر گولی بھی لگی تھی۔ البتہ اب وہ یہیں شاہ جی کے پاس ہوتا ہے۔

وہ سارا دن سخت فکرمندی میں گزرا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہمارا یہ ٹھکانا بھی زیادہ دیر محفوظ نہ رہ پائے گا۔ ہاشم عرف ہاشو تو بالکل ہی گم صم ہو گیا تھا مگر پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہاشو نارمل نظر آنے لگا۔ اس نے صحن میں موجود گلاب اور گیندے کے پودوں کو پانی دیا،

لیمو کے درخت کی تراش خراش کی۔ وہ اس چھوٹے سے درخت کا بہت دھیان رکھتا تھا۔ اس نے فرح کو بتایا تھا کہ یہ اس کی مرحومہ بیوی عارفہ کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔

شام کے بعد وہ موٹر سائیکل پر کہیں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے پاس مکئی کا ڈیڑھ دو کلو آٹا اور دیسی مرغی کا گوشت وغیرہ تھا۔ اس نے خود مرغی کا سالن تیار کیا۔ کرشمہ کے ساتھ مل کر مکئی کی مکھن والی میٹھی روٹیاں تیار کیں اور چاول بھی بنائے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکیں گے اس لیے وہ ہماری میزبانی پر تلا ہوا تھا۔

کھانا بہت لذیذ تھا۔ خاص طور سے مکئی کی مکھن والی میٹھی روٹیاں تو کمال کی تھیں۔ کمالی نے بھی تھوڑا بہت کھایا۔ رات کو ہاشو اس خاص کمرے میں چلا گیا جہاں کسی کو جانے نہ دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے کمرے میں جھانکا۔ وہ ایک بڑے صندوق میں اپنی مرحومہ بیوی کے کپڑے تہ در تہ رکھ رہا تھا۔ ایک دوسرے صندوق میں ہاشو اور اس کی بیوی عارفہ کے ذاتی استعمال کی اشیاء تھیں۔ ان میں میک اپ کا سامان، تصویروں کے دو تین البم، رومال، پراندے، ہینڈ بیگ، جیولری کے دو چھوٹے ڈبے، کانچ کی ست رنگی چوڑیاں، پرفیوم اور پتا نہیں کیا کچھ تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو ہاشم؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا پتا، اب یہاں سے نکلنا پڑے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

اگلا روز میرے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آج رات ملکو فیملی کے اچھ چوبارے میں رانیہ کے ابٹن وغیرہ کی رسم ادا ہونی ہے۔ اردگرد کے دیہات کے علاوہ لاہور سے بھی کچھ خواتین آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ سہ پہر کے وقت ایک تقریب شاید الیکشن کے حوالے سے بھی تھی۔ چودھری مختار ملکو نے قریبی دیہات کے معززین کو بلا رکھا تھا۔ ہاشم عرف ہاشو صبح سویرے ہی ڈیرے کے لیے نکل گیا تھا۔

سہ پہر کوئی دو بجے کا وقت ہوگا جب مجھے موبائل فون پر ہاشو کی ایک کال موصول ہوئی۔ اس کی آواز میں کچھ عجیب طرح کی کیفیت تھی۔ کہنے لگا۔ ''جمالی! پلنگ والے کمرے میں الماری کی چھوٹی دراز کے اندر ایک خط پڑا ہے، اسے پڑھ لینا۔''

''کس کا خط؟''

''سمجھو میرا ہی ہے۔ پڑھ ضرور لینا۔''

''خیریت تو ہے ہاشو.....؟'' میرا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

میں جلدی سے کمرے میں گیا۔ الماری میں دیکھا۔ ایک تہ شدہ کاغذ موجود تھا۔ یہ ہاشو کا خط تھا۔ تحریر نہایت سنسنی خیز تھی۔ آغاز اس طرح سے تھا۔

''میں جانتا ہوں اب وہ نہیں آئے گی اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک میں اسے انصاف نہ دلا سکا، اس کی روح یونہی اِدھر اُدھر بھٹکتی رہے گی۔ مجھے عارفہ کے اصل مجرم مختار ملکو کو ختم کرنا ہے، ہر صورت کرنا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کو ختم کرنے کے لیے مجھ جیسے کمزور شخص کو قربانی دینا پڑے گی۔ میں نے قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

اس کے بعد کی تحریر بہت سنسنی خیز اور جذباتی ہو جاتی تھی۔ تحریر کا لب لباب یہ تھا..... مختار ملکو تک پہنچنے کے لیے ہاشو خود کو انسانی بم کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ جیسا کہ میرے علم میں آیا تھا، وہ سرکنڈوں میں چھپی جیپ کے اندر کمبل پوش یوسف کے ساتھ کافی وقت گزارتا رہا تھا اور یوسف کافی عرصہ پہلے کشمیر میں ایک جہادی کی طرح وقت گزار چکا تھا۔ اس نے ہاشو کے ساتھ مل کر ایک عجیب کام کیا تھا۔ ڈائنامیٹ کی اسٹکس، کچھ دیگر اشیاء اور بارودی مواد کو جوڑ کر ایک دھماکا خیز جیکٹ تیار کر لی تھی۔ آج یہی جیکٹ ہاشو کے جسم پر تھی اور وہ علاقہ معززین کی محفل میں گھس کر مختار ملکو کو اجل کی جھپی ڈالنا چاہتا تھا..... بہت ڈرامائی تھا یہ سب کچھ لیکن یہاں کیا تھا جو ڈرامائی نہیں تھا۔

خط کے آخر میں اس نے لکھا تھا۔ ''جمالی! تم سے درخواست ہے کہ میری عارفہ کی ساری اشیاء کو کہیں سنبھال لینا۔ جو تھوڑا سا زیور ہے، اسے بیچ کر صدقے خیرات کے لیے شاہ جی کے حوالے کر دینا۔ اگر باقی اشیاء کو سنبھالنا ممکن نہ ہو تو وہ بھی صدقے خیرات کے لیے شاہ جی کے سپرد کر دینا۔ یہ گھر بھی ملکو فیملی نے ہی مجھے دیا تھا۔ یہ ان کو مبارک ہو۔ اب تم خود بھی اس گھر کو جلد از جلد چھوڑ دو۔ اپنے سارے ملنے جلنے والوں سے درخواست ہے کہ میرا کچا سا معاف کر دیں۔ اگر میرے جسم کے جلے بجھے مل جائیں تو انہیں چاہ مٹھا مزار کے عقبی قبرستان میں میری ماں اور عارفہ کی قبروں کے ساتھ دفنا دیا جائے۔ یہ خط پڑھ کر فوراً ضائع کر دینا۔''

خط کے آخر میں ہاشم نے اپنا نام ہاشم احمد کے بجائے ماسٹر ہاشم احمد لکھا تھا۔

خط کے متن نے مجھے لرزا دیا۔ ایک پڑھے لکھے شریف استاد کو اس بات کی سزا دی گئی تھی کہ اس غریب کی

بیوی خوبصورت تھی۔ اسے کیا سے کیا بنا دیا گیا تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ یہ بات مشہور تھی اور ہاشو خود بھی کہتا تھا کہ مختار ملکو کا حفاظتی حصار بے حد مضبوط ہے۔ اس تک پہنچنے سے پہلے ہر شخص کی کم از کم تین مرتبہ تلاشی ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے بارودی مواد کے ساتھ مختار ملکو تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ میرے پاس کمبل پوش یوسف اچکزئی کا فون نمبر موجود تھا۔ میں نے بار بار اسے فون کیا مگر کال ریسیو نہیں ہوئی پھر فون ویسے ہی بند کر دیا گیا۔ ہاشو کا فون بھی اب بند تھا۔

کیا میں ہاشو کو اس خطرناک عمل سے روکنے کے لیے اس کے پیچھے جاؤں؟

کیا میں خود یہاں سے نکل کر پیر انوار شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں؟

اگر میں ہاشو کے پیچھے جاؤں تو کیا جان سکوں گا کہ وہ کس جگہ ہے اور کیا میرے پہنچنے تک وہ کچھ کر نہ گزرے گا؟

کئی سوال تھے جو ہتھوڑوں کی طرح سر پر برس رہے تھے۔

میں نے کمالی اور کرشمہ کو بھی خط دکھایا۔ وہ بھی بہت پریشان ہو گئے۔ ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اگر وہ وہاں کچھ کر گزرتا تو اس کا یہ گھر جہاں ہم پناہ لیے ہوئے تھے، فوراً ملکو فیملی کے ریڈار پر آجاتا۔

ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر چودھری مختار ملکو واقعی اس کارروائی میں ہلاک ہو گیا تو آگے حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟ کیا مختار ملکو والا بت گرنے کے بعد لوگ واقعی اسپے چوبارے پر چڑھ دوڑیں گے؟ کیا اس حوالے سے پیر انوار شاہ اور کمبل پوش یوسف کوئی کردار ادا کر سکیں گے؟

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہماری دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ ہم اس خبر کے منتظر تھے جس نے یہاں سے دس کلومیٹر دور آج اسپے چوبارے کے سامنے ایک اجتماع میں وجود پانا تھا۔

یہ خبر کوئی چار بجے کے قریب ہم تک پہنچ سکی۔ اس خبر نے ہمیں حسرت، مایوسی اور دکھ کے گہرے اندھیرے میں ڈبو دیا۔ قربانی، جانبازی اور دلیری جیسے عظیم جذبوں کے ساتھ آج صبح یہاں سے اسپے چوبارے کی طرف روانہ ہونے والا ہاشم عرف ہاشو اب نہیں تھا..... وہ قریباً بے موت ہی مارا گیا تھا۔ زندگی موت کی بازیوں میں یہ سب کچھ چلتا تھا۔

یاسر کے ذریعے اس خبر کی جو تفصیل ہم تک پہنچی، وہ اس طرح تھی..... اجتماع میں داخل ہوتے وقت دوسری تلاشی میں پہریداروں کو ہاشو پر شک ہوا۔ انہوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ اس شامیانے کی طرف بھاگا جس کے نیچے چودھری مختار ملکو اور شمشیر ملکو وغیرہ موجود تھے۔ ابھی وہ دور ہی تھا کہ دو پہریداروں نے اسے دبوچ لیا۔ وہ بے بس ہوا تو اس نے خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔

جلد ہی اس خبر کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہم نے شکستہ زدہ حالت میں یہ سب کچھ سنا۔

کمالی بھی کراہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ”جمالی! اب ہمیں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رکنا چاہیے۔“

”تیرا خیال بھی یہی ہے لیکن کیا تم چل سکو گے؟“

”ہاں، سہارے کے ساتھ چل لوں گا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نے کرشمہ اور یاسر کے ساتھ مل کر حتی الامکان تیزی سے اس گھر میں اپنی موجودگی کے نشانات مٹائے۔ معلوم نہیں کہ یہ ٹھیک سے مٹ سکے یا نہیں۔ بہر حال ہم دونوں رائفلوں اور پستول سمیت کچھ ضروری سامان لے کر بلند و بالا سرکنڈوں میں گھس گئے۔ فرح بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کمالی کو ایک طرف سے کرشمہ اور دوسری طرف سے میں نے سہارا دے رکھا تھا۔

ہم گھنے سرکنڈوں کے عین درمیان اس جیپ تک پہنچ گئے جو چار پانچ دن سے اب تک متلاشی نگاہوں سے محفوظ و مامون تھی۔ یہاں پر سرکنڈوں کی بلندی چودہ پندرہ فٹ سے تجاوز کر رہی تھی۔ ہم چاروں خاموشی کے ساتھ کشادہ جیپ کے اندر گھس گئے۔ یہ قریباً دس نشستوں والی آرام دہ ”فورس سٹی لائن“ جیپ تھی۔ کمالی احتیاط کے ساتھ ایک عقبی نشست پر لیٹ گیا۔ بے شک یہ اچھی پناہ گاہ تھی لیکن موجودہ حالات میں اتنی اچھی بھی نہیں رہی تھی۔

کمالی نے کہا۔ ”جب وہ لوگ ہاشو کے گھر پر چڑھائی کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ ارد گرد کے ایریا کو کھنگالیں۔“

کرشمہ نے کہا۔ ”ہمیں دوسری بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہاشو کے کہنے کے مطابق اگر کمبل پوش یوسف کو پھر سے تھانے بلا لیا گیا اور اس پر تشدد ہوا تو وہ جیپ کی لوکیشن بھی بتا سکتا ہے۔“

کرشمہ کی بات میں وزن تھا اور یہ بات بھی سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔

ہاشو کی رائگاں موت نے دل ایک بار پھر بری طرح دکھا دیا تھا۔ گہرے ہوتے اندھیرے میں نشست سے ٹیک لگا کر میں سوچنے لگا، کیا واقعی ایسی موتیں رائگاں جاتی ہیں؟

دل سے آواز آئی..... ”نہیں جاتیں رائگاں۔ کہیں

نہ کہیں، کسی نہ کسی پر، کبھی نہ کبھی تو وہ ضرور اثر انداز ہوتی ہیں، اپنا خراج وصول کرتی ہیں۔"

دل پھر بھی درد سے بھرا رہا۔ میں نے سوچا جب پہریداروں نے اسے دبوچ لیا ہوگا تو جان دیتے وقت اس نے کیا سوچا ہوگا؟ اس نے سوچا ہوگا، وہ اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکا..... ایک اتھاہ مایوسی نے اسے گھیرا ہوگا اور اسی مایوسی میں اس نے جان گنوائی ہوگی۔

میں نے نشست پر دراز کمالی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی غالباً ایسی ہی سوچوں میں گم تھا۔ یوں چلے جانے والے ہم خیال ساتھیوں کے دکھ دل و دماغ پر گہرا اثر کرتے ہیں۔

میرے اور کمالی کے اندر ایک عجیب سی تپش اور شدید جھنجلاہٹ سی جاگ رہی تھی۔ یہ سب کیوں تھا؟ کیسے تھا؟ چند لمحوں کے لیے تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا۔ کہیں واقعی اس بدبخت مختار ملکو کو کوئی ماورائی تحفظ تو حاصل نہیں۔ بہرحال میری اس خام خیالی کی عمر چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ایک تنی ہوئی رسی پر چل رہے ہیں اور کسی بھی وقت اتھاہ گہرائی میں گر سکتے ہیں۔ کمالی کی ٹانگ کا ایک زخم ٹھیک ہونے کے بجائے بگڑ رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو پتا چلا کہ بخار بھی ہے۔

کرشمہ نے دیکھا کہ کمالی ذرا غنودگی میں ہے تو میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "جمالی! مجھے لگتا ہے کہ ٹانگ کا انفیکشن بڑھ رہا ہے۔ ٹانگ کے پر اپر علاج کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر یہاں محفوظ نہیں رہ پائیں گے۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک ہیوی موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ سرکنڈوں کے بالکل قریب سنائی دی پھر ایک دو ہیپوں کا شور کانوں میں پڑا۔ یقیناً ان لوگوں نے ہاشم کے مکان پر ہلا بولا تھا۔ ہم نے وہاں سے بروقت نکل کر اچھا ہی کیا تھا۔ کچھ دیر بعد سرکنڈوں کے آس پاس اور اندر بھی ٹارچوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

کرشمہ واقعی ایک دلیر لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ کم از کم ہمارے ساتھی یاسر سے تو دلیر ہی تھی۔ وہ پچھلے چند روز میں گن استعمال کرنا اچھی طرح سیکھ چکی تھی۔ اب سنگین صورت حال کو دیکھتے ہوئے وہ گن تھام کر پوری طرح تیار تھی۔ میں نے بھی اپنی ٹائپ 20 تیار کر لی تھی۔

یہ تو ظاہر تھا کہ حملے کی صورت میں ہم بچ نہ پائیں گے لیکن ہم لڑے بغیر مرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یاسر کی حالت بہت پتلی تھی۔ شاید قدرت کو اس پر ترس آیا تھا۔ روشنیاں ہم سے کوئی تیس چالیس قدم دور چکرانے کے بعد دوسری طرف نکل گئیں۔

اگلا روز بھی شدید سنسنی خیزی کے ماحول میں گزرا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ راتیہ کے ایشن کے موقع پر ہاشم کی موت کے بعد ہماری تلاش میں مزید شدت آ گئی ہے۔

صبح سویرے ہمیں ایک اور اندوہناک خبر مل گئی۔ اس خبر کا ذریعہ میں ہی بنا تھا۔ صبح سویرے چونکہ ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں اور قرب و جوار میں مکمل سناٹا تھا لہٰذا میں بڑی احتیاط کے ساتھ سرکنڈوں سے نکلا اور جھاڑیوں میں چلتا ہوا کچھ آگے تک گیا۔ میں نے خون جما دینے والی سردی کے سبب عام دیہاتیوں کے انداز میں منہ سر ایک مفلر میں لپیٹ رکھا تھا۔ گن چادر میں چھپائی ہوئی تھی۔ دو کاشت کار جن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، باتیں کرتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔ وہ مجھے نہیں دیکھ پائے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ اونچا لمبا خوش شکل یوسف اچکزئی بھی مختار ملکو سے ٹکرانے کی کوشش میں اپنی جان ہار چکا ہے۔ پولیس اسے گرفتار کرنے مزار کی طرف آئی تھی۔ اس نے سخت مزاحمت کی۔ غالباً مزار کے احاطے میں ہی اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا..... وہ جو چودھری مختار ملکو کو شکست کا مزہ چکھانے کا عزم رکھتا تھا، خود موت کا مزہ چکھ کر راہی عدم ہوا تھا۔

ایک دیہاتی کاشت کار کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ اس نے کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ اب یوسف کے بھائی نے اس کی لاش پر قسم کھائی ہے۔ مجھے تین دن پہلے ہاشم سے ہی پتا چلا تھا کہ یوسف کا ایک عدیل نامی بھائی بھی چاہ مٹھا کے مزار میں موجود ہے۔

میں نے جیپ میں واپس آ کر یہ افسوسناک اطلاع ساتھیوں تک پہنچائی۔ ہم کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ یوسف کا پُرعزم چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا۔

یوں لگتا تھا کہ شیر اشیر دو کی گشتدگی اور "کلری زمین" پر اپنے چار بندوں کی موت نے ملکو کیلی کو دیوانہ کر چھوڑا ہے۔ وہ لوگوں کو جان سے مار رہے تھے اور ان لوگوں کی چڑیاں بھی بے دردی سے ادھیڑ رہے تھے جن پر معمولی سا شک بھی تھا۔

جیپ کے اندر کھانے پینے کی اشیاء اب ختم ہوتی

جارہی تھیں دوسری طرف کمالی کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ پوری ٹانگ سوج چکی تھی۔ بخار بھی دوا کھانے سے وقتی طور پر کم ہوتا تھا۔ سر پر لگنے والی چوٹ کے سبب اس کی آنکھ ورم زدہ ہوکر تقریباً بند ہوگئی تھی۔ چہرے کی یہ ساری سائڈ بھی نیلگوں تھی۔ وہ بولنے میں دشواری محسوس کرتا تھا۔

دوپہر کے وقت ہمیں برساتی نالے کے دائیں کنارے پر پولیس موبائل کے ہوٹر وغیرہ بھی سنائی دیے۔ کچھ ہی دیر میں گھوڑوں کی ٹاپیں بھی ہاشم کے مکان کی طرف گونجتی رہیں پھر ان ٹاپوں کا رخ اسی ''کلری زمین'' کی طرف ہوگیا جہاں چند دن پہلے ٹیلے پر کمالی کا گھیراؤ کیا گیا تھا۔

کمالی کو تیز بخار تھا۔ زخموں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ میرے علاوہ کرشمہ بھی بہت فکرمند تھی۔ وہ اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار خود کو ہی گردانتی تھی۔ جیپ سے نکل کر میں نے اور کرشمہ نے دیر تک مشورہ کیا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچ گئے۔ بے شک یہ تکلیف دہ فیصلہ تھا لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

میں نے کمالی کے سرہانے بیٹھ کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''کمالی! یہاں سے آگے بڑھنا خود کو جانتے بوجھتے موت کے منہ میں ڈالنا ہوگا۔ فی الوقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ رات کے وقت یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔''

کمالی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو جمالی کہ ہم جان بچا کر یہاں سے نکل پائیں گے۔ یہ لوگ وحشی ہورہے ہیں۔ دیکھتے ہی گولیوں سے بھون دیں گے اور..... اور پھر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ رانیہ کے ساتھ یہاں بُرا ہونے والا ہے۔ دو تین روز میں ہی شادی کے نام پر اس کی زندگی برباد کردی جائے گی۔ وہ بے چاری تو اب بھی آس لگائے بیٹھی ہوگی کہ..... ہم کچھ کرسکیں گے۔'' وہ بمشکل بول پارہا تھا۔

''کمالی! دلیری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جو سچویشن ہم دیکھ رہے ہیں، اس میں خودکشی کے سوا اور کچھ نہ ہوسکے گا اور پھر تم اپنی حالت بھی دیکھو۔ تمہارے زخم بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ تمہیں.....''

''مگر جمالی! رانیہ کا کیا ہوگا؟'' اس نے کراہ کر میری بات کاٹی۔

میں نے کہا۔ ''اگر بات صرف میری زندگی کی ہوتی تو خدا گواہ ہے میں اسے داؤ پر لگا دیتا لیکن یہ پانچ زندگیوں کا سوال ہے کمالی! یہ پانچ زندگیاں تو شدید خطرے میں پڑیں گی ہی۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ اس ہنگامے میں رانیہ کی جان بھی چلی جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی مونچھ اونچی رکھنے کے لیے بیٹیوں، بہنوں کو ذبح کرڈالتے ہیں۔''

ہمارے درمیان کافی دیر بحث چلی۔ کرشمہ بار بار کمالی کی منت کررہی تھی۔ دوسری طرف فرح بھی بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ ایک طویل مکالمے کے بعد بالآخر ہم نے کمالی کو نیم رضامند کرلیا۔ ویسے بھی شام ہوتے ہی ہلکی بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔ یقینی بات تھی کہ کڑاکے کی سردی کے اس مہینہ میں ہماری تلاش میں وہ شدت نہیں رہے گی۔ پلاننگ یہی ہوئی تھی کہ اگر ہم یہاں سے نکل جائیں تو فوراً ایک معروف نیوز چینل کے اینکر شہباز صدیقی سے رابطہ کریں اور اسے پوری اسٹوری ان تصویروں کے ساتھ دیں جو ہمیں میرے ہاتھوں ہلاک ہونے والے یحییم شحیم گن مین کے موبائل فون سے ملی تھیں۔ اینکر شہباز سے ہماری تھوڑی بہت سلام دعا بھی تھی۔ کم از کم مجھے تو اس بات کی امید تھی کہ فرح کی آبروریزی والی خبر مین اسٹریم میڈیا پر چڑھ گئی تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔

ہم یہ سوچ رہے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ ہم نے باہمی مشورے سے یاسر کو سرکنڈوں سے باہر بھیجا۔ ذہن میں یہی تھا کہ وہ کچھ دور تک جائے اور واپسی کے راستے کی صورتِ حال دیکھے۔ بارش سے بچنے کے لیے سبز ترپال کا کچھ حصہ کرشمہ نے کاٹ کر یاسر کو دے دیا تھا۔ سرکنڈوں کی زمین پر کافی سارا کیچڑ بھی جمع ہوچکا تھا۔ ہمارا پروگرام یہ بھی تھا کہ یہاں سے نکلتے وقت کیچڑ کو اچھی طرح جیپ پر لیپ دیں گے تاکہ آسانی سے پہچانی نہ جاسکے (بعد ازاں یہ ہوبھی نہیں سکا تھا)۔

رم جھم مسلسل ہورہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ سردی نے ہر ذی نفس کو بند کواڑوں کے پیچھے اوجھل کردیا ہے۔ ہم دھڑکتے دل کے ساتھ یاسر کی واپسی کا انتظار کررہے تھے مگر اسے دیر ہوتی چلی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کے پاس موبائل موجود تھا۔ میں مسلسل اسے کال کرنے لگا۔ بیل جاتی رہی لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔ کئی طرح کے اندیشے دل میں سر اٹھانے لگے۔ رات ایک بجے کے لگ بھگ ہمارا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ وہ کسی گمبھیر مسئلے کا شکار ہوچکا ہے۔ یہ بہت روح فرسا سوچ تھی۔ اگر وہ ملکو فیملی کے غضب ناک گماشتوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا تو پھر کسی بھی لمحے ہمارے سروں پر بھی قیامت ٹوٹ

سکتی تھی مگر کم و بیش ساڑھے تین گھنٹے گزرنے کے باوجود یہ قیامت ابھی تک نہ ٹوٹی تھی (حالانکہ یاسر اتنا سخت جان ہرگز نہیں تھا کہ وہ تشدد برداشت کرسکتا) تو پھر کیا ہوا تھا؟

کمالی نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ پوزیشن سے ڈر کر وہ اکیلا ہی نکل گیا ہو؟''

''نہیں کمال!'' کرشمہ نے یقین سے کہا۔ ''وہ لڑائی بھڑائی والا لڑکا نہیں لیکن اتنا ڈرپوک بھی نہیں تھا کہ ایسا قدم اٹھائے۔ ضرور اس کے ساتھ کچھ ہوگیا ہے۔''

ترپال کا دوسرا ٹکڑا میں نے سر پر اوڑھا، گن پکڑی اور کیچڑ میں دھیان سے قدم رکھتا ہوا کوئی پچاس قدم آگے تک گیا۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بس سرکنڈے تھے، ان کے درمیان بھیگ کر سکڑے سمٹے بیٹھے آوارہ کتے تھے۔ واپس جیپ میں آکر میں نے موہوم امید کے سہارے یوسف کے نمبر پر رابطہ کرنے کا سوچا۔ اس کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ اس کا نمبر بند ہے۔ یقیناً فون کی طرح یوسف کی زندگی کا باب بھی بند ہوچکا تھا۔

فرح نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''جمالی بھائی! کہیں ایسا تو نہیں کہ ملکو قبیلی کے خوف سے یاسر کہیں روپوش ہوگیا ہو؟''

''ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہاشم کی دھماکا خیز موت نے یقیناً پورے علاقے میں ہلچل مچادی ہے۔ ایسی ہلچل میں لوگ یا تو سہم جاتے ہیں یا پھر ری ایکشن دیتے ہیں اور کچھ کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔''

☆☆☆

اگلے قریباً 16 گھنٹے بھی سخت تشویش اور بے یقینی کی کیفیت میں گزرے۔ اگر یاسر واقعی پکڑا گیا تھا تو پھر اب تک ہم یہاں محفوظ کیوں تھے؟ سہ پہر کے وقت بارش تھم گئی تھی اور اب اس سرد شام میں آسمان پر ستارے جھلملاتے نظر آتے تھے۔ ایسے ہی ستارے گاہے بگاہے آنسوؤں کی صورت میرے دل میں بھی جھلملانے لگتے تھے۔ میں جانتا تھا آج اچے چوہارے میں اس لڑکی کی رسم حنا ہے جو میری رگِ جاں میں بستی تھی اور جسے میں عمر بھر بھول نہ سکتا تھا۔ کرشمہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی تھی۔ شاید وہ بھی میرے دل کا درد محسوس کررہی تھی۔ پیار کرنے والوں کے دکھڑے ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔ کمالی بخار میں تپا ہوا آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کے زخم انگاروں کی طرح دہکتے تھے۔ جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر بیٹھی فرح کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔

.....اور پھر ہمیں وہ کال آئی جس نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ کال میرے ہی موبائل پر آئی تھی۔ یہ یاسر کی کال تھی۔ اس کی ہیجانی آواز ابھری۔

''جمالی بھائی! کہاں ہیں آپ؟''

میں نے تڑخ کر کہا۔ ''ہم تو وہیں ہیں، تم کہاں ہو؟ فون کرکر کے ہلکان ہوگئے ہیں ہم۔''

وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ''جمالی بھائی! مجھے پکڑ لیا تھا ان سؤر کے بچوں نے۔ یوسف صاحب کے بھائی عدیل نے میری جان بچائی۔ اب عدیل صاحب جھاڑ نگر میں ہیں۔ تین چار سو بندہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ میں بھی وہیں ہوں..... لوگ پڑ گئے ہیں جمالی بھائی ان حرامزادوں کو۔ آج ان کے ڈیرے پر طوائفوں کا ناچ گانا تھا۔ مختار ملکو اور شمشیر وغیرہ بھی سب وہیں تھے۔ سو ڈیڑھ سو بندہ ڈیرے کے اندر گھس چکا ہے..... پچ..... پانچ منٹ پہلے تک یہاں اندھا دھند فائرنگ ہوتی رہی ہے.....''

میں نے موبائل فون کو اسپیکر پر ڈال رکھا تھا۔ یہ سب سن کر کرشمہ اور کمالی بھی ورطۂ حیرت میں تھے۔

یاسر کی پُرجوش آواز ابھری۔ ''جمالی بھائی! ڈیرے کے ایک حصے کو آگ لگادی ہے لوگوں نے۔ مجھے لگتا ہے کہ..... مختار ملکو کے کارندے بھاگ رہے ہیں۔ وہاں اچے چوبارے کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ آپ بھی دیر نہ کریں..... جلدی پہنچیں یہاں۔''

''یوسف کا بھائی اب کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

دوسری طرف سے ''ہیلو، ہیلو'' کی آواز آتی رہی۔ میری آواز یاسر تک پہنچ نہیں پارہی تھی پھر فون ویسے ہی بند ہوگیا۔

کمالی کا بخار میں تپا ہوا چہرہ اندرونی جوش سے کچھ اور بھی تمتمانے لگا تھا۔ میرا خیال بھی یہی تھا کہ اب ہمیں مزید یہاں چھپنا نہیں چاہیے۔

☆☆☆

میرا ڈرائیونگ کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ راستے میں کسی بھی وقت مجھے مزاحمت کرنا پڑسکتی تھی۔

کرشمہ بولی۔ ''میں اچھی ڈرائیونگ کرلیتی ہوں جمالی بھائی! تم گن سنبھالو، میں جیپ چلاتی ہوں۔''

کچھ تذبذب کے بعد میں مان گیا۔ کرشمہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سرکنڈوں میں بارش کے سبب بالکل دلدل بن چکی تھی۔ جیپ کے پہیے گھومتے چلے جارہے تھے۔ کرشمہ نے جس مشاقی کے ساتھ جیپ کو سرکنڈوں سے نکالا اور کھلے راستے تک لائی، اس سے ثابت ہوگیا کہ وہ

ہمیں دشوار راستے کے باوجود منزل تک پہنچا دے گی۔

سرید پور سے جھاڑ نگر تک کم و بیش دس کلومیٹر کا سفر تھا۔ راستے میں کہیں بھی ملکو فیملی کے غنڈوں سے مڈبھیڑ ہونے کا امکان موجود تھا۔ ہم جیپ پر کیچڑ وغیرہ پوتنے کے خیال پر بھی عمل نہ کر سکے تھے کہ اب صورت حال بدل گئی تھی۔

جب سے ہم جیپ میں تھے، ایک ڈر ہمہ وقت ہم پر مسلط رہا تھا اور وہ ڈر تھا جیپ میں بڑی مقدار میں اسلحہ اور آتش گیر مادہ ہونے کا۔ اب ہچکولے دار سفر میں یہ ڈر کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

اس بات کا اندازہ مجھے اچھی طرح تھا کہ مرحوم ہاشم اور یوسف اچکزئی نے قریباً 48 گھنٹے اکٹھے ہی اس جیپ کے اندر گزارے تھے۔ انہوں نے نہ صرف دھماکا خیز جیکٹ تیار کر لی تھی بلکہ مجھے اور کمالی کو یہ شک بھی تھا کہ انہوں نے جیپ کے اندر کچھ اور دھماکا خیز مواد اس طرح سے رکھا ہے کہ اسے ڈیٹونیٹر کے ذریعے بلاسٹ کیا جا سکے۔ یوسف اچکزئی اس کام میں ایکسپرٹ تھا۔

راستہ کچا تھا۔ جگہ جگہ گڑھے بھی تھے۔ جیپ مسلسل اچھل رہی تھی۔ پچھلی نشست پر نیم دراز کمالی پہلے تو ضبط کرتا رہا پھر اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا۔ کرشمہ کو جیپ کی رفتار کم کرنا پڑی۔ ویسے بھی کم رفتار بہتر تھی کیونکہ ہم ہیڈ لائٹس کے بغیر سفر کر رہے تھے۔

کرشمہ نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ”جمالی بھائی! یاسر سے دوبارہ رابطہ کرو۔“

”اس کا فون بند جا رہا ہے۔ شاید چارجنگ ختم ہو گئی ہے۔“

جوں جوں جھاڑ نگر سے ہمارا فاصلہ کم ہو رہا تھا، دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ جو کچھ یاسر نے بتایا تھا، وہ تو بہت حوصلہ افزا تھا تاہم اصل صورت حال موقع پر پہنچ کر ہی واضح ہونی تھی۔ پیر انوار شاہ کی خفیہ مجلس میں بھی میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ جھاڑ نگر کے سارے علاقے میں غم و غصے کی ایک دبی دبی لہر ہے جو شدید بھی ہے۔

ملکو فیملی کا ڈیرا ان کی رہائش گاہ اچے چوبارے سے قریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ایک طرح سے یہ جھاڑ نگر کی آبادی سے باہر تھا۔ اب ہم کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ بہرحال فائرنگ وغیرہ کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ جھاڑ نگر کے اردگرد فی الحال کسی طرح کی بھاگ دوڑ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سارا ہنگامہ کسی ایک ہی جگہ پر مرکوز ہے۔ ہم عام راستے سے ہٹ کر جا رہے تھے۔ اب تک ہم نے ہیڈ لائٹ بھی آن نہیں کی تھی۔ ہمیں تاحال دو تین گاڑیاں ہی دکھائی دی تھیں جن میں ایک پولیس کی تھی۔ ان گاڑیوں کا رخ ڈیرے کی طرف ہی تھا۔

اچانک کرشمہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ ”جمالی.....! وہ سامنے ڈیرے کی روشنیاں ہی تو نہیں؟“

میں نے رخ پھیر کر دیکھا۔ فاصلے پر درختوں کے درمیان میں سے ڈیرے کی آرائشی روشنیاں جھلک دکھا رہی تھیں۔ ”آگ کے آثار تو اب نظر نہیں آ رہے۔ شاید بجھ گئی ہو گی۔“ میں نے کہا۔

اسی اثنا میں زوردار فائرنگ کی آوازوں سے فضا گونجنے لگی۔ یہ آوازیں ڈیرے کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔ کرشمہ نے کہا۔ ”مطلب یہ کہ ابھی کارروائی جاری ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے اس طرح کی لڑائیوں کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ تاہم مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہوائی فائرنگ ہے۔ ویسے بھی مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ ڈیرے کے اردگرد اس طرح کی افراتفری نظر نہیں آ رہی تھی جیسی ہم توقع کر رہے تھے۔ جیپ درختوں میں کھڑی کی۔ میرے اشارے پر کرشمہ نے انجن بند کر دیا۔ ہم احتیاط سے اترے اور ڈیرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ہم قدرے بلندی پر تھے۔ ڈیرے اور جھاڑ نگر کی آبادی قدرے نشیب میں تھی۔ گھنے درختوں کے درمیان سے ڈیرے کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملاتی دکھائی دیتی تھیں۔ میری طرح کرشمہ بھی الجھن میں تھی۔

میں نے جیپ میں موجود کمالی سے بات کرنا چاہی تو یکایک جیپ کا دروازہ کھلا اور فرح لڑکھڑاتی ہوئی سی جیپ سے باہر آ گئی۔ بالکل یہی لگا کہ اسے دھکا دے کر نکالا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ بند کرنے والا کمالی ہی تھا۔ میں لپک کر جیپ کی طرف گیا۔ دروازہ کھولنا چاہا تو وہ اندر سے لاک تھا۔ پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بھی لاک تھا۔

”کمالی! کیا ہوا؟“ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔

یہ دیکھ کر حیرت مزید بڑھی کہ کمالی اپنی زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا تھا۔ یکایک میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ مجھے لگا کہ کمالی نے میرے ساتھ کوئی دھوکا کر دیا ہے۔ کرشمہ بھی اب میرے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہکا بکا تھے۔ فرح کے باہر آ جانے کے بعد کمالی اب جیپ میں تنہا تھا اور دروازے اندر سے لاک ہو چکے تھے۔

میں گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کی طرف آیا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل کو بری طرح جھنجوڑا۔
"کمالی..... کمالی..... یہ کیا دیوانہ پن ہے..... دروازہ کھولو۔"
جیپ کی اندرونی روشنی میں مجھے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات نظر آئے جنہوں نے مجھے سرتاپا لرزا دیا۔
اس نے کھڑکی کے آٹو بینک شیشے کو بس دو تین انچ نیچے سرکایا۔ "سوری میرے یار! میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔" وہ عجیب لہجے میں بولا۔
"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"ڈیرے پر ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔ "نہ آگ لگی ہے، نہ لوگوں نے یہاں چڑھائی کی ہے۔ کچھ بھی نہیں، سب بے چارے اپنے گھروں میں دبکے ہوں گے اور ہمیشہ کی طرح اپنے ہی لہو کے گھونٹ بھر رہے ہوں گے۔ یہ جو فائرنگ تھوڑی دیر پہلے تم نے سنی ہے، یہ کسی لڑائی کی فائرنگ نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے یہ خوشی کی فائرنگ تھی۔" ذرا توقف کرکے وہ پھر زہرناک لہجے میں بولا۔ "ہاں، آج خوشی کا دن ہے مختار ملکو کے لیے اور اس سے بھی بڑھ کر اس کے بیٹے شمشیر ملکو کے لیے۔ وہ کل اپنے چاچے کی بیٹی کو اپنی منکوحہ بنانے والا ہے..... ہاں، رانیہ کا قبضہ لینے والا ہے وہ..... اور..... میں نے ایسا ہونے نہیں دینا میرے یار.....! میں نے نہیں ہونے دینا ایسا۔" مجھے کمالی کے چہرے پر جنون کی کیفیت نظر آئی۔
"یہ سب کیا ہے کمالی.....؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" میں نے دروازے کے ہینڈل کو پھر بری طرح جھنجوڑا۔
"تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہا جمالی؟ تمہاری سمجھ میں آچکا ہے۔ اب شاید تم میرے منہ سے سننا چاہتے ہو..... تو سن لو۔ تم نے اور کرشمہ نے میرے ساتھ پریک کیا۔ اب یار! اتنا تو حق بن گیا تھا نا میرا کہ ایک آخری پریک میں بھی تم دونوں کے ساتھ کرلوں۔ تو میں نے کیا ہے..... ہاں کیا ہے۔ یاسر اس میں شریک ہے۔ وہ یہاں سے نکل چکا ہے۔ اس نے لاہور سے فون کیا تھا تمہیں۔ جمالی.....! میرے پاس..... میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اس کے سوا۔ تم مجھے واپس لے جانا چاہتے تھے..... اور مجھے نہیں جانا تھا۔ جو لڑائی میں شروع کرچکا ہوں، اسے اب انجام تک پہنچانا ضروری ہے ورنہ ہم جی سکیں گے نہ مر سکیں گے۔ لہٰذا میرے جانی! جو لڑائی ایک پریک سے شروع ہوئی تھی، وہ اب ایک پریک پر ہی ختم ہورہی ہے۔"
"کیا مطلب..... کیا مطلب..... کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" اس بار کرشمہ بھی میری ہی طرح چلا اٹھی تھی۔
وہ کرشمہ کی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب رہا۔ "پتا ہے ہم نے ایک بار "سیمسن اینڈ ڈیلائیلا" فلم دیکھی تھی۔ سیمسن نے آخر میں کیا کیا تھا؟ ایک جابر بادشاہ کو شکست فاش دینے کے لیے اس نے خون کی ندیاں نہیں بہائی تھیں۔ بس ایک ایسے ستون کو گرادیا تھا جس پر جبر کے عظیم الشان قلعے کا سارا دارومدار تھا۔ میں بھی آج اس ستون کو گرادوں گا جس کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ اسے گرایا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ ستون مختار ملکو ہے۔ جمالی! میں آج اس وہم کے پرخچے اڑادوں گا جس نے یہاں کے لوگوں کو سہما رکھا ہے، ان کی رگوں میں خون جما رکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ وہم بھرے ہوئے لوگوں کی رگوں میں خون بھی دوڑ پڑے گا۔ تم دیکھنا جمالی.....! تم دیکھنا، پھر یہ ریت کا محل کس طرح سے گرتا ہے۔"
کمالی کے چہرے پر جنون کے سوا اب اور کچھ نہیں تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی اور غصے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔
"پلیز کمالی! پلیز، دروازہ کھولو۔" کرشمہ بلکی۔ اس نے اپنا ہاتھ شیشے کے خلا سے اندر گھسا دیا تھا اور منت کرنے والے انداز میں کمالی کی ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔
میں نے دیکھا، کمالی کی آنکھ سے ایک آنسو گرا۔ پتا نہیں کیوں ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ کرشمہ کا ہاتھ چومنا چاہتا ہے لیکن پھر اس نے کرشمہ کا ہاتھ تیزی کے ساتھ کھڑکی سے باہر نکال کر شیشہ مکمل چڑھا دیا۔ وہ جارہا تھا..... اور میں نے اسے روکنا تھا۔ میں نے اپنی گن کا آہنی دستہ زور سے کھڑکی کے شیشے پر رسید کیا۔ شیشہ تڑخ گیا مگر یہ مضبوط سٹی لائن جیپ کا شیشہ تھا۔ ایک ضرب سے کیسے ٹوٹ سکتا تھا۔ گیلی زمین پر جیپ کے پہیے گھومے اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ میں نے اپنی ٹائپ 20 گن کے دستے کی دوسری ضرب عقبی کھڑکی کے شیشے پر لگائی مگر وہ بھی بیکار گئی۔ میں اندھا دھند جیپ کے عقب میں بھاگا۔ میں کمالی کو پکار رہا تھا اور زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے یار کو پکارا تھا اور اس نے مجھے جواب نہیں دیا تھا۔
میں جیپ کے پیچھے بھاگا جارہا تھا۔ تیز رفتار جیپ کا فاصلہ مجھ سے بڑھتا چلا گیا۔ جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ڈیرے کی رنگ برنگی روشنیوں کی طرف جارہی تھی۔ اب ڈیرے کے سامنے لگے ہوئے شامیانے صاف نظر آرہے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا کینوپی شیٹ تھا۔ مختار ملکو

کی مشہور لیموزین کار بھی دکھائی دیتی تھی اور وہ درجنوں پہریدار بھی جو چوبیس گھنٹے شفٹیں بدل بدل کر اپنے آقا کی حفاظت کرتے تھے۔

جیپ کافی آگے نکل چکی تھی۔ یکا یک میں رک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اب وہی ہوگا جو کمالی سوچ چکا ہے۔ تیر جب کمان سے نکل جاتے ہیں تو پھر ٹھہرتے ہیں، نہ راستے بدلتے ہیں۔ اپنے نشانے پر لگتے ہیں..... یا نہیں لگتے۔

شاندار کینوپی کے اندر رنگ و طرب کی محفل..... محفل کے شرکاء اور جھاڑ فانوس کا کرتا دھرتا، سب ایک دیوانے کے نشانے پر تھے۔ وہ دیوانہ جو ایک دیرینہ وہم کے ٹکڑے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا..... ہاں، اب کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میں بھی نہیں۔ اس لیے میں رک گیا۔ دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اور ذرا جھک کر اپنی سانسیں درست کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ دور نشیب میں بھی دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ نظروں میں دھندلایا ہوا تھا۔ ساعت بھی جیسے کند ہو گئی تھی۔

میں نے فاصلے سے شدید فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ میں نے رنگ برنگی روشنیوں کی لڑیوں کو ٹوٹتے اور گرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے خوفزدہ آوازوں کی پکار صاف صاف محسوس کی..... پھر ایک دھماکا..... ساعت ساکن دھماکا۔ مجھے یہی لگا کہ دیوانے نے جیپ کو ٹکرا دیا ہے۔ میرے دل سے بے ساختہ دعا نکلی۔ ''جیپ اگر ٹکرائی ہے تو اس شخص سے ٹکرائی ہو جس کے متعلق جھاڑ نگر میں کئی نسلوں سے دھونی کیا جا رہا تھا کہ وہ ناقابلِ شکست ہے۔''

لگ رہا تھا کہ اب ڈیرے کے سامنے والے حصے میں واقعی آگ لگ چکی ہے۔ سرخ روشنی کافی اوپر تک پہنچ رہی تھی۔ میرے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ سیکڑوں ہی کرچیاں میرے دل میں پیوست ہو گئی تھیں۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ کمالی اب تک زندہ ہے پھر بھی میں درختوں اور کماد کے اونچے کھیتوں کی آڑ لیتا ہوا ڈیرے کی طرف بڑھا۔ ٹائپ 20 گن میرے ہاتھ میں بالکل تیار تھی۔ مجھے ڈیرے کی طرف سے تین چار گاڑیوں کی تیز رفتار روشنیاں نظر آئیں۔ یہ گاڑیاں سڑک کی طرف جا رہی تھیں۔ ایک پولیس موبائل بھی ہوٹر بجاتی بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ زخمی ہوئے ہیں جنہیں یہاں سے نکالا جا رہا ہے۔

دفعتاً مجھے گنے کے کھیت میں سرک جانا پڑا۔ کسی گاڑی کے انجن کی آواز بالکل قریب سنائی دی تھی پھر گرجتی برستی کچھ بلند آوازیں آئیں۔ میں بلند فصل کے اندر ہی احتیاط سے چلتا قریب پہنچا۔ یہ ملکو کیمپلی کی ہی ایک نیلی جیپ تھی۔ اس کی عقبی اسکرین ٹوٹ چکی تھی۔ اردگرد سات آٹھ افراد اور تین چار ہیوی موٹر بائیکس بھی نظر آ رہی تھیں۔ ہیڈ لائٹس میں جو لمبا تڑنگا شخص کھڑا تھا، وہ مختار ملکو کے ''شیر پتر'' شمشیر ملکو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں چلا رہا تھا۔

''یہ جو کوئی بھی حرامزادہ تھا، اس کے ساتھی آس پاس ہی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ چوبارے میں گھسنے کی کوشش بھی کریں۔''

ایک بندے نے پکار کر کہا۔ ''چھوٹے سرکار! چوبارے پر کافی نفری چلی گئی ہے۔ پانچ چھ پولیس والے بھی ہیں۔''

''تو تم لوگ آسے پاسے پھیل جاؤ۔'' شمشیر ہیجانی انداز میں دہاڑا۔ ''سیدھی سر میں گولی مارو جو بھی کنجر کا تخم نظر آئے۔''

موٹر بائیکس اسٹارٹ ہوئیں۔ دو تین گھوڑے بھی حرکت میں آئے۔ اب شمشیر اور اس کا ایک مسلح کارندہ ہی جیپ کے پاس موجود تھے۔ شمشیر نے کارندے کو مخاطب کر کے جنونی لہجے میں کہا۔ ''انورے! تم جلد سے جلد مزار پر پہنچو۔ پانچ چھ بندے ساتھ لے کر جاؤ۔ پکڑ لو اس شیطان پیر کو۔ میں سب سمجھ گیا ہوں اس خبیث کی نوسر بازیاں۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس کے پیچھے اس کا اور اس کے ٹوٹے کا ہاتھ بھی ہے۔'' وہ انور شاہ کی بات کر رہا تھا۔

کارندے نے کسی کو فون کرنے کے لیے موبائل سے کان لگایا ہی تھا کہ میری چلائی ہوئی گولی سیدھی اس کی گردن کے پچھلے حصے پر لگی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گرا۔ یہ دوسرا بندہ تھا جو پچھلے چند دنوں میں میرے ہاتھوں مرا تھا۔

گولی کے دھماکے کے ساتھ ہی شمشیر آواز کی سمت پلٹا تھا۔ ''خبردار! گولی مار دوں گا۔'' میں چلایا۔

مگر وہ کسی وحشی جانور کی طرح مجھ پر آ پڑا۔ میں جھاڑ جھنکاڑ میں پشت کے بل گرا۔ اس میں بلا کی طاقت تھی۔ قد کاٹھ میں بھی شاید وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس نے مجھے جکڑ سا لیا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ بھی کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ابھی حالات کا کچھ پتا نہیں۔ کیا پتا کہ مختار ملکو بھی ابھی زندہ ہو۔ چند دن بعد یہاں پھر رانیہ اور شمشیر کی شادی کے شادیانے بجیں اور پھر رانیہ..... ہاں میری رگوں میں خون کی طرح دوڑنے والی دلکش کومل رانیہ ایسے میری ہی طرح شمشیر کے نیچے جکڑی پڑی ہو۔ یہ خیال اتنا دلدوز تھا

کہ میرے جسم میں بجلیاں سی بھر گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے سر کی ایک شدید ٹکر شمشیر کی ٹھوڑی پر لگائی۔ اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو میں نے پلٹ کر اسے اپنے نیچے کرلیا۔ وہ اپنی سیاہ جیکٹ کے اندر سے اپنا پستول نکالنا چاہ رہا تھا۔ وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ گن ابھی تک میرے دائیں ہاتھ میں ہے۔ میں نے نال اس جنونی کے پہلو سے لگائی اور ٹریگر دبادیا۔ شعلے کے ساتھ پھر دھماکا گونجا۔ آخری غلیظ گالی اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔

میں نے پستول اس کے ہاتھ سے چھینا اور اس کے چوڑے تھوبڑے کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اٹھنے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ اس اضافی کوشش کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ وہ بطور رقیب مجھے پہچان چکا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اگلی گولی اس کے سر پر ماروں لیکن پھر رک گیا۔ میں ایسی سفاکی کا مظاہرہ ہرگز نہ کرسکتا تھا۔ پہلے دو ''قتل'' بھی جو مجھ سے ہوئے، وہ اپنے دفاع میں ہوئے۔

پھر اچانک صورتِ حال تبدیل ہوئی۔ میں نے جس کارندے کو مردہ سمجھ لیا تھا، وہ صرف زخمی تھا۔ اس نے زمین پر پڑے پڑے مجھ پر ماؤزر سے فائر کیا۔ میں تڑپ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہوا، قسمت اچھی تھی ورنہ اس قسم کی سچویشن کا تجربہ مجھے کہاں تھا۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ گولی لگنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اس کے نشانے پر ہی ہوں۔ گیلی زمین پر زخمی پڑا شمشیر ملکو گولی کی رینج میں ہرگز نہیں تھا مگر برسٹ کی ایک گولی جیپ کی مضبوط باڈی سے ریفلیکٹ ہوکر سیدھی اس کے سر میں لگی۔ اس سے پہلے کہ کیچڑ اور خون میں لت پت کارندہ مجھ پر دوبارہ گولی چلاتا، میں نے بے دریغ دو گولیاں اس کے بالائی جسم میں اتار دیں۔ چند سیکنڈ میں دونوں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

کئی گولیاں چلنے کے بعد اب میرا یہاں رکنا خطرناک تھا۔ میں نے جلتے ہوئے ڈیرے کی طرف بڑھنا چاہا تاہم آگے بڑھنے سے پیچھے ہٹنا اور دونوں لڑکیوں کو محفوظ کرنا زیادہ مناسب لگا۔ ڈیرے کی جانب ہلچل اور بھاگ دوڑ کے آثار اب واضح تھے۔

میں واپس پلٹا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ہانپتی ہوئی کرشمہ اور فرح کی صورتیں نظر آگئیں۔ وہ دونوں ہی بے حد خوفزدہ تھیں۔ کرشمہ تو باقاعدہ رو رہی تھی۔ مجھے گریبان سے پکڑا اور جھنجوڑ کر بولی۔

''جمالی! کیا ہوا ہے ڈیرے پر..... کمالی نے شاید بہت فائرنگ کی ہے اور وہ دھماکا..... کیا وہ..... کیا وہ.....''

کرشمہ بات مکمل نہ کرسکی۔ اس سے آگے کہنے کی اسے شاید ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''ابھی کچھ پتا نہیں کرشمہ کہ کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کئی افراد زخمی ہوئے ہیں۔ کچھ دیر میں سب پتا چل جائے گا۔ علاقے کے حالات بہت خراب ہونے والے ہیں۔ ہمیں فوری طور پر پناہ کی ضرورت ہے۔''

کہنے کو تو میں نے پناہ کا کہہ دیا تھا مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں کو لے کر کہاں جاؤں؟ پھر ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اپنا پرانا ساتھی راجا اکرم یاد آیا۔ وہ جھاڑ نگر سے کچھ ہی فاصلے پر پکی سڑک کے کنارے ڈیزل انجن وغیرہ ٹھیک کرتا تھا۔ پانچ چھ دن پہلے جب رات کے وقت ہم نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا تو وہ بہت خوفزدہ تھا اور ہمیں بمشکل پناہ دینے پر تیار ہوا تھا مگر فی الوقت ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ اکرم کو دوبارہ زحمت دیں۔

ہم کھیتوں کی درمیانی پگڈنڈیوں پر بڑی احتیاط سے چلتے راجا اکرم کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ کرشمہ مسلسل رو رہی تھی اور مجھ سے بار بار کمالی کا پوچھ رہی تھی۔ میں کیا جواب دیتا، میرا اپنا دل رو رہا تھا۔ سخت سردی نے ایک بار پھر کھیتوں کھلیانوں کو ڈھانپنا شروع کردیا تھا۔ چاندنی رات تھی لیکن بہت ٹھٹھری ہوئی۔ یہ رات کے دس بجے کا عمل ہوگا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار وہ جلدی ہی کھل گیا تاہم راجے اکرم کے بجائے اس کی بیوی کی شکل نظر آئی۔ ہماری شکلیں دیکھ کر اس نے ہمیں اندر آنے دیا اور دروازے کو کنڈی چڑھادی۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں عقبی کمرے میں لے گئی جہاں لالٹین کی روشنی تھی اور انگیٹھی کی روشنی سردی میں کچھ کمی واقع کررہی تھی۔

وہ ہیجانی انداز میں میری طرف دیکھتی گئی پھر جذباتی لہجے میں بولی۔ ''بہت بڑے دھماکے کی آواز آئی ہے یہاں..... بہت زیادہ گولیاں بھی چلی ہیں۔ کیا وہ..... بڑے چودھری (مختار ملکو) والی بات درست ہے؟''

''کیا سنا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہکلا کر بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے شوہر (راجے اکرم) کو فون آیا ہے اس کے کسی دوست کا..... بڑے چودھری مختار اور چھوٹے اشرف ملکو کو ڈیرے پر مار دیا ہے کسی نے۔ ڈیرے کے پانچ چھ اور بندے بھی مرے ہیں۔ کئی گھائل ہوئے ہیں۔''

میرا دل درد سے بھرا ہوا تھا البتہ اس درد میں ہلکا سا جوش بھی موجود تھا۔ قرائن بتاتے تھے کہ میرا یار اپنے

ارادے میں کامیاب ہوا ہے..... مگر کیا وہ زندہ بھی تھا؟

کرشمہ نے عورت سے پوچھا۔ ''بہن! تیرا شوہر اب کہاں ہے؟''

''وہ بھی رائفل لے کر نکل گیا ہے۔ بہت جوش اور غصے میں تھا وہ بھی۔ کہہ رہا تھا..... اگر واقعی مختار ملکو مر گیا ہے تو آج جھاڑ نگر والے اچے چوبارے کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔''

غالباً یہ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ جھاڑ نگر کی مرکزی آبادی اور اردگرد سے فائرنگ کی شدید آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شمشیر کے حکم پر ملکو فیملی کے کارندوں نے جو مار دھاڑ شروع کی تھی، اس کا جواب علاقے کے لوگوں نے دینا شروع کردیا ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں فائرنگ کی شدت میں اضافہ ہوگیا اور اس کا دائرہ بھی پھیل گیا۔ میں نے چمکتی ہوئی چاندنی میں مشتعل لوگوں کی کچھ ٹولیوں کو تیزی سے جھاڑ نگر کی مرکزی آبادی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ کرشمہ اور فرح اس مکان میں کافی حد تک محفوظ ہوچکی تھیں۔ میں نے ٹائپ 20 گن سنبھالی اور ان دونوں کو منع کرنے کے باوجود جھاڑ نگر کی طرف نکل گیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی دیکھ لیا ڈیرے سے بلند ہونے والے شعلے اب آسمان سے باتیں کررہے تھے۔

☆☆☆

میں اب ڈیرے کے اندر تھا۔ یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ ڈیرے کا ایک حصہ جل کر خاکستر ہوچکا تھا۔ کہیں کہیں سے اب بھی شعلے بلند ہورہے تھے۔ چاروں طرف کسانوں اور عام دیہاتیوں کے جتھے چکرا رہے تھے۔ کچھ کے پاس آتشیں ہتھیار تھے لیکن زیادہ کے پاس کلہاڑیاں اور لاٹھیاں تھیں۔ ملکو فیملی کے بیشتر کارندے بھاگ چکے تھے، باقی ہجوم کے ہاتھوں مارے گئے تھے یا زخمی تھے۔

میں گلے اندھیرے میں دیوانوں کی طرح اپنے یار کو ڈھونڈ رہا تھا۔ تب مجھے یوسف اچکزئی کا جواں سال بھائی عدیل نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ وہ ایک لاش کو بے دردی سے ٹھوکریں رسید کررہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا اور کٹی پھٹی لاش کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

''یہ دیکھو..... یہ ان بندوں میں سے ہے جنہوں نے بدھ کے روز یہاں پر ہماری بہن کا عزت خراب کیا تھا۔ ہم نے ان تینوں بندوں کو عبرت کا نشان بنایا ہے۔''

کلہاڑی بردار کئی کسانوں نے نعرہ زنی کرکے عدیل کے جذبات کی تصدیق کی۔

میں نے کہا۔ ''عدیل.....! کمالی کہاں ہے؟ مجھے کمالی کا بتاؤ۔''

وہ جذبات سے ٹوٹتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''وہ دیکھو بھائی! وہ ہے آپ کا دوست۔ اس نے ہم سب کا سر فخر سے بلند کیا ہے۔'' اس نے انگلی سے کچھ فاصلے پر ڈیرے کی ایک منہدم دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں لپک کر وہاں پہنچا۔ وہاں کافی بڑے حصے کو رسی تان کر باقی رقبے سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ یہاں ایک گاڑی کا چرمر ڈھانچا پڑا تھا۔ میری نگاہیں دھندلانے لگیں۔ ایک طرف زمین پر ہی دو تین لاشیں پڑی تھیں جنہیں چادروں وغیرہ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ایک لاش قد میں بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ بمشکل تین چار فٹ۔ عدیل اچکزئی نے اس پر سے گرم چادر ہٹائی۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اپنے یار، اپنے دلدار، اپنے بھائی کمالی کا خون آلود چہرہ نظر آیا۔ وہ جاچکا تھا..... اپنا وعدہ نبھا کر جاچکا تھا۔ ناقابلِ تسخیر قلعوں کو مسمار کرنے کے لیے ایسی قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔

عدیل نے کہا۔ ''ان کا نچلا دھڑ دھماکے میں اڑ چکا ہے۔''

میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر کمالی کی سرد پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کے رخسار کو چوما۔ یقین نہیں آیا کہ ابھی صرف ایک گھنٹا پہلے میرا یار مجھ سے باتیں کررہا تھا..... اپنے ارادے بیان کررہا تھا۔

میرے گرم آنسو بارش کے قطروں کی طرح کمالی کے چہرے پر گرنے لگے۔ جی چاہا کہ یہ سب کچھ بھی ایک پریکٹیک ہی ہو۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ جائے۔ اپنی کہنی چھپائی ہوئی ٹانگوں کو بھی سیدھا کرلے۔ مسکرا کر کہے۔ ''دیکھو پھر ہرا دیا نا تمہیں اور ''مرچی ویڈیوز'' کی اس کرشمہ کو بھی..... وہ دیکھو، وہ لگا ہوا ہے کیمرا.....''

لیکن کیمرا یہاں کہیں نہیں تھا اور نہ ہی کمالی تھا۔

عدیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کمالی صاحب نے پہلے مختار اور اشرف ملکو پر گولیاں چلائی تھیں۔ عینی شاہدوں نے کہا ہے کہ چھوٹا بھائی اشرف معمولی زخمی ہوا لیکن مختار ملکو کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مسلح کارندوں کی اندھا دھند فائرنگ سے کمالی بھائی زخمی ہوچکے تھے۔ وہ جیپ کو یوٹرن دیتے ہوئے دوبارہ اسٹیج کی طرف آئے اور جیپ

گرادی۔ مختار ملکو اور اشرف ملکو کے علاوہ دو گارڈز اور ایک طوائف کے تو پرخچے اڑ گئے۔ شدید زخمی ہونے والوں میں سے بھی چھ سات یہیں پر دم توڑ چکے ہیں۔"

میں نے اپنی آواز کی لرزش کو بمشکل چھپاتے ہوئے کہا۔ "پولیس کہاں ہے؟"

ایک جواں سال کسان طیش سے بولا۔ "پولیس کہاں تھی یہ، جی..... یہ تو نوکر چاکر تھے اچے چوبارے والے خبیثوں، بدبختوں کے۔ بھاگ گئے ہیں کمینے۔ اب شاید دوسرے تھانوں کی پولیس پہنچے گی یہاں۔"

اپنے یار کا ماتھا ایک بار پھر چوم کر میں نے چادر سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ کچھ دیہاتی ایک چارپائی لے آئے تھے جس پر گدیلا بچھا ہوا تھا۔ کمالی کی لاش کو احترام کے ساتھ چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ میں جلد سے جلد اچے چوبارے کی صورتِ حال جاننا چاہتا تھا۔ اپنے آنسو پونچھتا ہوا میں عدیل کے ساتھ اچے چوبارے کی طرف لپکا۔ جھاڑ نگر کی غالباً ساری آبادی گلیوں اور گھروں کی چھتوں پر تھی۔ ڈیرے سے چھ سات فرلانگ کا فاصلہ ہونے کے باوجود بارود کی بو یہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اچے چوبارے کے صرف مردانے حصے میں توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور گولیوں کے خول بھی نظر آ رہے تھے۔ عدیل نے بتایا۔ "لوگ اتنے غصے میں تھے کہ شاید ان کی زنانیوں کو بھی مار ڈالتے لیکن پھر بچت ہو گئی۔ چودھرانی نور جہاں کا نام سنا ہوگا آپ نے بھی؟"

"ہاں، سنا ہوا ہے..... اس نے کیا کیا؟"

"عام لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ سامنے بالکونی میں آ گئی تھی۔ اس کی منت سماجت پر ہی لوگ اندر داخل ہونے سے رک گئے۔"

چودھرانی نور جہاں کے بارے میں، میں نے بھی سنا ہوا تھا کہ وہ اس ملکو فیملی میں بہتر عورت ہے۔ مجھے آج بھی یاد تھا، ایک مرتبہ رانیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اچے چوبارے میں کوئی میری بات سمجھ سکتا ہے تو وہ صرف تائی امی ہی ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور عدیل تین چار دیگر افراد کے ساتھ اچے چوبارے کی بالائی منزل پر پہنچے۔ پوری عمارت دیہاتی طرز کی شان و شوکت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔ البتہ تمام خواتین اور ملازمین ڈرے سہمے تھے۔ ان کا غیر معمولی خوف دور کرنے کے لیے میں نے اور عدیل نے انہیں تسلی دی۔

کچھ ہی دیر بعد مختار ملکو کی بیوی اور اچے چوبارے کی بڑی چودھرانی نور جہاں میرے سامنے تھی۔ ایک دو بار پہلے بھی میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ اونچی لمبی، سرخ و سپید اور چہرے پر ایک باوقار رعب۔ تاہم فی الوقت وہ بھی خوف اور دکھ کے شدید گھیرے میں تھی۔ بار بار میرے ہاتھ میں پکڑی گن کو دیکھتی تھی۔

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "چودھرانی جی! ہم نے کسی کو کچھ نہیں کہنا۔ ہم ابھی واپس جا رہے ہیں۔ بس..... میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ خیریت سے ہے نا؟" میرا اشارہ رانیہ کی طرف تھا اور چودھرانی میرا اشارہ سمجھ رہی تھی۔

وہ چند لمحوں کے لیے بالکل گم صم نظر آئی۔ میرے ذہن میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑنے لگے۔ ہم سب نے سن رکھا تھا کہ اگر بات ملکو فیملی کی آن بان اور عزت پر آ جائے تو وہ اپنی لڑکیوں کو ذبح تک کر ڈالتے ہیں۔

میں نے لرزاں لہجے میں کہا۔ "پلیز چودھرانی جی!"

اس نے مجھے اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کیا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ دبیز قالین پر قدم رکھتا میں چودھرانی کے پیچھے ہی پیچھے ایک دروازے کے سامنے پہنچا..... چند ہی لمحے بعد چودھرانی نے رانیہ کو کمرے سے نکال کر میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ ابھی تک مہندی کی رات والے زرد لباس میں تھی (مہندی کی وہی رسم جو آج رات ادھوری رہ گئی)۔ اپنے زرد لباس کی طرح رانیہ بھی اجڑی بچڑی نظر آتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اپنے باپ اشرف ملکو کی دھماکا خیز موت کی خبر بھی اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں لیکن ان سوجی آنکھوں میں امید کی کچھ کرنیں بھی تھیں۔

رانیہ کو دور ہی سے دیکھ کر میں واپس پلٹ آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے دور ڈیرے کی طرف دیکھا۔ دھوئیں کے بادل جیسے یہ اعلان کرتے تھے کہ ناقابلِ شکست کو آج شکست ہو چکی ہے۔

قصاب غیور احمد کی رائگاں موت کے وقت میرے دل سے جو ہوک اٹھی تھی، وہ اب تک یاد تھی۔ مجھے لگا شاید عالمِ ارواح میں سے غیور احمد نے بھی دیکھ لیا ہو کہ اس کی تنہی لاڈلی کا بدلہ آج چکا دیا گیا ہے..... اور شاید ہاشم کی بے چین روح بھی آج سکون میں ہو۔ اس نے بھی ناقابلِ شکست مختار ملکو کے ٹکڑے اڑتے دیکھ لیے ہوں جو اس کی نوبیاہتا عارفہ کا مجرم تھا..... ہاں، اور وہ جواں سال یوسف بھی تو آسودہ ہوگا جسے چاہ مٹھا مزار کے احاطے میں گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔

میں عدیل کے ساتھ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ اچ چوبارے کے مین دروازے کی جانب دیکھا۔ دبلے پتلے جسم والے پیر انوار شاہ اچ چوبارے کی طرف آ رہے تھے۔ پُرجوش مقامی لوگوں کا ایک ہجوم انہیں ساتھ لے کر آ رہا تھا۔ میں ان سے ملنا چاہتا تھا مگر جھاڑ نگر کے نواح میں اب پولیس موبائلز کے ہوٹر سنائی دینا شروع ہو گئے تھے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ فی الحال فوری طور پر کرشمہ اور فرح کو لے کر کہیں دائیں بائیں ہو جاؤں۔

☆☆☆

کہانی کے باقی واقعات مختصر ہی ہیں۔ شاہدرہ اور لاہور سے کئی تھانوں کی پولیس جھاڑ نگر پہنچی تھی۔ یاسر نے لاہور سے کوشش کی تھی اور اینکر شہباز صدیقی بھی اپنی دو رکنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ مالی مجید کی بیٹی فرح کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور اس کے مجذوب بھائی کے قتل کے دستاویزی اور ڈیجیٹل ثبوت موجود تھے اور یہ کوئی دو جرائم ہی تھوڑے تھے۔ جب معاملات کھلنا شروع ہوئے تو پھر کھلتے چلے گئے۔

دو تین ہفتے بعد ایک موقع ایسا آیا کہ چودھرانی نور جہاں کا کردار سلطانی گواہ جیسا ہو گیا۔ مختار ملکو اور اشرف ملکو کو کمالی نے جہنم واصل کیا تھا۔ اب وہ مقدموں اور سزا جزا کے معاملوں سے بہت دور جا چکا تھا۔ صرف ایک بندے کے قتل کا الزام مجھ پر آ سکتا تھا اور یہ وہی بائیک سوار مسلح پہریدار تھا جو خود بھی عرصے سے پولیس کو مطلوب تھا۔

..... مجھ پر کیس بنا مگر صرف چند ماہ بعد ہی میں ضمانت پر باہر آ گیا۔

لاہور جیل سے باہر آتے ہی میں سب سے پہلے کرشمہ سے ملنے گیا۔ وہ ''پرینکس'' وغیرہ سے اب بہت دور جا چکی تھی۔ چینل مرچی ویڈیوز ختم ہو چکا تھا۔ چھ سات ماہ میں ہی وہ برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔ نیلی آنکھیں جیسے بجھی ہوئی تھیں۔ اس نے کمالی کی یادوں کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ درد کے طویل موسم میں جی رہی ہے لیکن موسم تو موسم ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے آخر تو گزرنا ہوتا ہے۔ مجھے یقین تھا ایک نہ ایک دن وہ بھی زندگی کی طرف آ ہی جائے گی۔

کرشمہ کی طرح میں نے بھی پرینکس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا۔ کچھ نفرت سی ہو گئی تھی اس کام سے۔ ایک سنگین پرینک ہی تو تھا جس نے جیتے جاگتے کمالی کو کسی ہتھکڑی پلاننگ کے بغیر موت کے رخ پر روانہ کیا تھا۔ بہرحال وہ ایسی موت تھی جو علاقے کے لوگوں کو مدتوں یاد رہنا تھی۔ بالاکوٹ والے زلزلے نے اس بے چارے کو یتیم اور بے آسرا کر دیا تھا۔ وہ چار سال کی عمر میں اپنوں کی ستم ظریفیوں کا شکار تھا۔ ایک دن کوڑے کے ڈھیر سے روزی ڈھونڈ رہا تھا جب میرے والد حاجی سراج نے اسے اٹھایا تھا، سینے سے لگایا، اس کا گندہ ماتھا چوما تھا اور اسے اپنے بچے کی طرح اپنے گھر لے آئے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے سگے بیٹے کی طرح پالا بلکہ کبھی کبھی مجھ سے بھی بڑھ کر اسے محبت دی۔ ان کی محبت معصوم کمالی کے دل و دماغ میں گھر کر گئی۔ جوں جوں وہ جوان ہوتا گیا، اس کے دل میں یہ عزم پختہ ہوتا گیا کہ وہ وقت پڑنے پر اپنے پالن ہاروں کے لیے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا پھر جب مجھے مختار ملکو کے حکم پر جھاڑ نگر سے نکالا گیا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی چل دیا۔ میری ماں نے اس سے کہا۔ ''بیٹا.....! اپنے بھائی کا خیال رکھنا۔''

..... اور اس نے رکھا۔ یوں رکھا کہ میرے سر پر احسان کا ایک کوہِ ہمالیہ رکھ کر دنیا سے چلا گیا۔

چودھرانی نور جہاں نے رانیہ کی شادی کر دی ہے۔ وہ ایک دبنگ عورت کے روپ میں سامنے آئی ہے۔ اس نے رانیہ کی شادی کے لیے اسی کو منتخب کیا جسے رانیہ چاہتی تھی۔ میری ضمانت کے دو ماہ بعد ہی ہم دونوں میاں بیوی بن گئے۔ سب سے پہلے ہم اپنے عظیم محسن کمالی کی قبر پر پہنچے۔ دیر تک وہاں آنسو بہاتے رہے۔ کرشمہ، میری بہن کومل اور والدہ بھی ساتھ ہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج میرے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ میں نے روتے ہوئے جذباتی انداز میں والدہ سے کہا۔

''دیکھو ماں! کتنا دھوکے باز نکلا یہ۔ کتنا جھوٹا..... تم نے اس سے کہا تھا..... پتر! اپنے بھائی جمالی کا خیال رکھنا..... اسے کبھی اکیلا نہ چھوڑنا..... دیکھو اس نے چھوڑ دیا اکیلا.....!''

ماں نے مجھے گلے سے لگایا۔ ہم دیر تک روئے۔ ہم سب رو رہے تھے۔ کرشمہ بھی..... ہاں وہ بھی آنکھوں کو جل تھل کر رہی تھی۔ مجھے پتا تھا ابھی اسے کافی عرصے تک رونا ہے۔ ابھی وہ موسم دور تھا جب زندگی نے اسے کوئی نیا راستہ دکھانا تھا۔

(ختم شد)

SALMAN's CHOICE

رات کے مسافر

طاہر جاوید مغل

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جارہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا.... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کے مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظور نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا

نگہت مرزا

وہ اپریل کی ایک نیم گرم شام تھی۔ آج میری مہندی کی رسم ادا ہونا تھی۔ زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میری شادی میری تایازاد عارفہ سے ہو رہی تھی۔ وہ لوگ بھی لاہور کے رہائشی تھے اور وہ گلبرگ میں رہتے تھے جبکہ ہم چوبرجی میں تھے۔ ہمارا رشتہ قریباً ڈیڑھ سال پہلے طے ہوا تھا۔ یہ عرصہ دن گن گن کر ہی گزارا گیا تھا اور اب..... آخر کار وہ گھڑیاں آگئی تھیں جن کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا اور خاص طور سے مجھے اور عارفہ کو۔

میں سارا دن مختلف کاموں میں مصروف رہا تھا اور اب قریباً تھک کر چور ہو چکا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بستر پر پڑ کر سو جاتا اور اگلے روز صبح دس بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتا لیکن آج ایسا کیسے ہو سکتا تھا جبکہ یہ میری مہندی کی رات تھی۔

دونوں گھروں میں علیحدہ علیحدہ مہندی ہونا تھی۔ یہ


SALMAN's
CHOICE

1973ء کی بات ہے۔ ان دنوں ابھی شادی ہالز کے رواج نے زور نہیں پکڑا تھا اور ابٹن مہندیاں وغیرہ تو گھر سے باہر کرنے کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ بڑے بھائی جان نے مہمانوں کے لیے بریانی کی دو دیگیں چڑھوا دی تھیں۔ پورے گھر میں گہما گہمی تھی۔ ڈھولک پر گیت گائے جارہے تھے۔ خاندان کی عورتوں نے مجھے مہندی لگائی اور رسمیں وغیرہ ادا کیں پھر وہ سب لوگ عارفہ کے گھر چلے گئے۔

اب گھر میں، میں اور بس ایک دو ملازم ہی رہ گئے تھے۔ میں نے عارفہ کو فون کرنا چاہا۔ دوسری طرف سے عارفہ کی چھوٹی بہن نے فون اٹھایا اور شوخی سے بولی۔ ''بس بھائی جان! اب کوئی بات نہیں..... کوئی فون نہیں۔ اب تھوڑا سا انتظار فرمایئے۔ چند گھنٹوں کا فاصلہ ہے پھر جی بھر کر باتیں فرمایئے گا۔''

میں نے اس کی منت سماجت کی لیکن وہ سماج کی دیوار بنی رہی اور مجھے ستاتی رہی۔ میں نے تھک ہار کر فون بند کردیا۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر نیم دراز ہوگیا اور سوچنے لگا، وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اور مختلف منزلیں یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ میرا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ والد صاحب کا لکڑی کا کاروبار تھا۔ بڑے بھائی ٹی ٹرالیز بناتے تھے اور ہماری فرم کا اچھا خاصا نام تھا۔ میں بھی گریجویشن کے دوران میں ہی اپنے کاروبار کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ لکڑی یعنی ٹمبر کا کام میری طبیعت کے مطابق تو نہیں تھا لیکن والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کام میں آجاؤں۔ آج کل میں والد کے ساتھ دکان پر ہوتا تھا اور اپنی ہمت کے مطابق ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ میری زندگی لگے بندھے راستوں پر بڑے ہموار طریقے سے چل رہی تھی۔ شام تک دکان پر رہتا، پھر اپنے بچپن کے دوست تنویر کے ساتھ گپ شپ کرتا یا فلم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا۔ ٹی وی ان دنوں نیا نیا آیا تھا۔ اس میں بھی ہم لوگ بے حد دلچسپی محسوس کرتے تھے۔ اردو ڈراموں کے علاوہ، رابن ہڈ، فیوجی اور آئرن سائڈ جیسی سیریز شوق سے دیکھا کرتے۔ میرا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔ میں اپنے حال میں مست رہنے والا شخص تھا۔ اسی لیے گھر والے بعض اوقات مجھے پیار سے ہارون کے بجائے ہارون بادشاہ بھی کہا کرتے تھے۔ ہاں تو میں بات کررہا تھا اپنی مہندی کی رات کی۔ میں تھکن سے چور تھا، ذرا سکون لینے کے لیے بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا..... میں جو کچھ آپ کو بتانے لگا ہوں، اس سے پہلے میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کردوں۔ میں صدقِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں ایک حقیقت پسند بندہ ہوں۔ میں نے مافوق الفطرت سوچوں کو کبھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی اور نہ اب دیتا ہوں۔ ہر نا قابلِ فہم بات کے پیچھے میں نے ہمیشہ ٹھوس وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب رہا ہوں۔

اب میں پھر اصل روداد کی طرف آتا ہوں۔ میں بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ تو گیا لیکن میرا ابھی سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے گھر والوں کی واپسی کا انتظار کرنا تھا، مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ پلکوں پر بوجھ محسوس ہورہا تھا۔ میں اسی طرح نیم دراز رہا اور خیالوں کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ وہ نیند اور بیداری کی کوئی درمیانی حالت تھی، مجھے ایک دم لگا جیسے اس اکیلے کمرے میں کوئی اور بھی میرے آس پاس موجود ہے۔ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ کمرے کے دروازے کے سامنے نظر آیا۔ وہ ایک سفید ہیولا سا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس جس کا سر بھی سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ بس سیاہ اور سفید ڈاڑھی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا..... اور ایسا نہیں ہوا..... اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔''

پھر ایک دم وہ ہیولا اوجھل ہوگیا۔ میں جیسے چونک کر غنودگی کی حالت میں سے نکل آیا۔ کمرا خالی تھا۔ دروازہ بند تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک سنائی دی۔ سوئیاں رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہوا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ قریب ہی ریڈیو سیٹ پڑا تھا۔ میں نے اٹھ کر پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے پھر ریڈیو پر کوئی اسٹیشن تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

غنودگی کی حالت میں جو فقرہ میں نے سنا تھا، وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا..... ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا..... اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

یہ کیا فقرہ تھا؟ مجھے اس کا کوئی سر پیر سمجھ نہیں آیا لیکن عجیب بات تھی کہ فقرے کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود تھا اور لفظ ہی نہیں، لہجہ، آواز، آواز کا اتار چڑھاؤ، سب کچھ جیسے میری سماعت میں نقش ہوگیا تھا۔ بہرحال اس وقت میں نے اس واقعے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ انسانی تصورات عجیب وغریب شکلیں بناتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی یہ تصورات کسی غیر مرئی آواز کا روپ دھار لیتے ہیں،

کبھی کسی منظر کا۔ کبھی کوئی اندیشہ بن جاتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور کبھی کوئی خوب صورت سپنا بن کر آنکھوں میں سما جاتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی ہی قلبی واردات تھی۔

میرے گھر والوں کی واپسی ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ایک بار پھر گھر میں شور اور ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ڈھولک بجنے لگی اور گیت گائے جانے لگے۔ اب ہر ایک کو آنے والے دن کا انتظار تھا۔ تاریخ تھی 17 اپریل اور یہ دن تھا میری شادی کا۔ ہاں، وہی دن جس کا پل پل انتظار کیا گیا تھا۔

ان دنوں براتیں شام کے فوراً بعد ہی دلہن کے گھر جا پہنچتی تھیں۔ میری برات بھی آٹھ بجے کے قریب گلبرگ میں موجود تھی۔ وہ رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کی رات تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے۔ نکاح کی رسم کے فوراً بعد کھانا شروع ہوگیا۔ میں اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ رواج کے مطابق میرا کھانا اسٹیج پر ہی میز پر سجا دیا گیا۔ میرے دائیں بائیں میرے گھر والے موجود تھے۔ بڑے بھائی فاروق نے میرے لیے کھانا پلیٹ میں نکالا۔ میں نے پہلا لقمہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری نظر سامنے مہمانوں کی طرف اٹھی۔ بہت سے افراد کے پیچھے مجھے ایک شخص نظر آیا اور مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہے۔ یہ وہی کل رات والا ہیولا تھا۔ سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس۔ چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا۔ بس سفید اور سیاہ ڈاڑھی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ جیسے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لحظے کے لیے نظر آکر وہ اوجھل ہوگیا۔ میں ہکا بکا سا بیٹھا تھا۔ بڑے بھائی جان نے کہا۔ ''کیا بات ہے ہارون! کیا ہوا؟''

''کک..... کچھ نہیں بھائی جان۔''

''کسی سے کچھ کہنا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں..... نہیں۔''

''تو کھانا کھاؤ نا بھئی۔'' وہ چمچ میرے ہاتھ میں تھما کر بولے۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں اب کھانا کھاتے ہوئے مہمانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دل پر جبر کر کے میں نے کھانا کھانے کی کوشش کی۔ پتا نہیں کیوں، کل رات سنا ہوا فقرہ..... بے معنی فقرہ پھر میرے کانوں میں گونجنے لگا..... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

یہ کیا فقرہ تھا؟ یہ کیا لفظ تھے؟

انسان کے دشمن

انسان کے چار دشمن بڑے خطرناک ہیں، ان سے بچنے کے لیے نہایت ہوشیاری اور کوشش درکار ہے۔

1۔ دنیا..... نہایت دھوکے باز اور مکار ہے۔

2۔ نفس..... یہ تمام دشمنوں سے زیادہ عیار ہے۔

3۔ شیطان..... اس کا تو مشن ہی انسان دشمنی ہے۔

4۔ برا انسان..... برا ساتھی، شیطان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تو لاحول ولا سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ تو ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید عباسی، نیو سینٹرل جیل ملتان

میں نے خود کو ملامت کی اور اپنے بے مطلب خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ماورائی خیالات..... اور توہمات کے لیے میرے ذہن میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی۔ میں نے ہر چیز کو ہمیشہ ٹھوس ثبوتوں اور سائنسی نقطۂ نظر کے ساتھ دیکھا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات بھی اس واقعے نے مجھ پر تادیر اثر نہیں کیا۔ میں نے اپنی اس پریشان خیالی کو جلد ہی فراموش کر دیا اور شادی کے ہنگاموں میں کھو گیا۔

کھانے کے بعد پورے جوش و خروش سے مختلف رسمیں ادا ہوئیں اور میری برات، گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں، دلہن کو گلبرگ سے لے کر چوبرجی پارک ہماری رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اپریل کی وہ شب بڑی خوشگوار تھی۔ موسم قدرے ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں بہانے سے بار بار اپنے کمرے کی طرف جاتا تھا۔ میری بہنیں اور کزنز وغیرہ مجھ پر فقرے کستی تھیں اور مجھے وہاں سے چلتا کرتی تھیں۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنا مشکل ہو رہی تھیں۔ کتنا اہم ہوتا ہے یہ شادی کا دن۔ زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے..... اور اس سے بھی اہم شبِ عروس۔ خوشیوں اور مرادوں کی گھڑیاں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جوڑوں کی صورت میں بنایا پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کی پھر انہیں قربت کی مسرتوں اور جدائی کی

تکلیفوں سے آشنا کیا..... ایک ایسا نظام بنایا جو اس کائنات میں زندگی کو رواں دواں رکھتا ہے۔

میں گھر کے سامنے گراسی لان پر اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ مجھے چھیڑنے اور تنگ کرنے میں میرا قریبی دوست تنویر پیش پیش تھا۔ دل کے اندر خوشی ہو تو ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میری زندگی ایک کتنے سنگین رخ پر مڑنے والی ہے۔ میں ایک ایسے دوراہے پر پہنچ چکا ہوں جس کی ایک جانب میری دلہن ہے، میرا گھر ہے اور بے مثال خوشیاں ہیں۔ دوسری طرف تاریکی ہے، ویرانی ہے اور لرزا دینے والے واقعات ہیں۔

بعض اوقات انسانی زندگی کا رخ موڑنے کے لیے کسی بڑے واقعے یا حادثے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی چھوٹی سی بات، کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی تہلکہ خیز تبدیلیاں لے آتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ آج ان باتوں کو کم و بیش 41 سال گزر چکے ہیں۔ میں ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میرے بچے ہیں، ان کے بچے ہیں۔ زندگی کا باقی سفر شاید اب بہت طویل نہیں رہا لیکن میں آج بھی اس رات کو اور اس رات میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ کیا وہ اتنی ہی بڑی بات تھی جس کی وجہ سے میرے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس نے مجھے ہی نہیں، میرے اہلِ خانہ اور میرے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، تہس نہس کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے لگاتے مجھے پیاس محسوس ہوئی تھی۔ میں پانی پینے کے لیے اندر آیا۔ لان میں بھی ایک شامیانہ لگا تھا۔ قنات کے قریب سے گزرتے ہوئے میں ذرا ٹھٹک گیا۔ قنات کی دوسری طرف ہمارے محلے کی ہی دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ کوئی ان کے اتنا پاس ہے اور ان کی آواز صاف سن رہا ہے۔ ایک عورت نے کہا۔

''ہاں..... ہارون ابھی کرتا ورتا تو کچھ نہیں۔ باپ ہی پیسے اس کی جیب میں ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے بوجھ اٹھائے گا بیوی کا اور پھر بچوں کا۔''

دوسری عورت نے کچھ اس سے بھی زیادہ سخت بات کی۔ مطلب اس بات کا بھی وہی تھا جو پہلی عورت کی بات کا تھا۔

پہلی عورت نے دوبارہ کہا۔ ''بس بڑوں نے ہی پکڑ دھکڑ کر شادی کر دی ہے۔ اب وہی اس کا گھر بھی چلائیں گے۔''

میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ عورتیں سرگوشی کے لہجے میں زہر اگل رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں زمین کے اندر گڑ گیا ہوں۔ میں اتنا گیا گزرا تو نہیں تھا جتنا وہ مجھے سمجھ رہی تھیں اور پھر ان کی زبان اور لہجہ..... میرا دل چاہا کہ ان کے سامنے چلا جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں اور یہ سب کچھ کہنے کا کیا جواز ہے ان کے پاس۔ میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ بندے کو پتا چلتا ہے کہ اس کی پیٹھ پیچھے کس طرح کی بات کی گئی ہے اور وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔

میں اپنی پیاس وغیرہ بھول گیا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ چھت خالی تھی، میں جیسے نڈھال سا ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چھت پر بجلی کے وہ تار بچھے تھے جن کے ذریعے آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ چھت پر بھی محسوس کی جا سکتی تھی لیکن میرے اندر کا منظر کچھ اور ہو گیا تھا۔ میرے اندر کی ساری روشنیاں جیسے ایک دم بجھ گئی تھیں۔ گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی تھی۔ مجھے لگا میں دُلہا نہیں ہوں، ایک مرا ہوا شخص ہوں جس کے کفن دفن کا انتظام کیا جانے والا ہے۔ ایک کھنڈر ہوں جو تیز بارش میں کسی بھی وقت مسمار ہو جائے گا یا ایک کھوکھلی جڑوں والا درخت جسے ہوا کا ایک تیز جھونکا اکھاڑ پھینکے گا۔

یہ کیا ہو گیا تھا میرے ساتھ؟ آناً فاناً میں کیا سے کیا بن گیا تھا۔ اردگرد کی خوشیوں، رونقوں اور روشنیوں سے بہت دور پہنچ گیا تھا۔ سب اجنبی محسوس ہو رہے تھے اور آوازیں غیر لگ رہی تھیں..... ہاں، میں آج بھی سوچتا ہوں، کیا صرف اتنی سی بات تھی کہ میں نے دو عورتوں کو اپنے بارے میں طنزیہ گفتگو کرتے سنا تھا یا پھر کوئی اور وجہ بھی تھی..... کوئی ایسی وجہ جو زیادہ بڑی تھی، زیادہ گہری اور گمبھیر تھی؟

میں قارئین سے کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا، صاف سیدھے الفاظ میں بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ کہیں کہیں مجھ سے اتفاق نہ کیا جائے۔ میرے عمل کو غیر حقیقی یا جذباتی سمجھا جائے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ شاید اصل روداد سے فلاں واقعے کا زیادہ تعلق نہیں..... لیکن میں وہی بتاؤں گا جو جو میرے ساتھ ہوا اور جو اس کہانی کا حصہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں قریباً آدھ گھنٹا اس تاریک چھت پر بیٹھا رہا اور اپنے اندر کی بجھی ہوئی روشنیوں میں سے کوئی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کرن کہیں نہیں تھی۔ روشنی کا نقطہ تک نہیں تھا۔ میں بجھ چکا تھا۔

مکمل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ دل و دماغ پر ایک سیاہ دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی جیسے میرے اندر سے بہ آوازِ بلند کہہ رہا تھا..... ہارون! چلے جاؤ یہاں سے..... بہت دور نکل جاؤ..... سب کچھ چھوڑ دو..... خیر آباد کہہ دو۔ یہاں کچھ نہیں ہے تمہارے لیے..... یہاں رکے رہو گے تو دم گھٹنے سے مر جاؤ گے۔ تم یہاں کے لیے نہیں ہو..... اور یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ایک بے کار انسان ہو۔ دنیا کی حقیر ترین مخلوق ہو۔ تم کسی کے کام کے نہیں ہو۔ اپنا چہرہ چھپالو..... اپنی شکل لے کر ویرانوں کا رخ کرلو، کسی سمندر کی تہ میں بیٹھ جاؤ..... کسی صحرا کی ریت میں دفن ہو جاؤ یا پھر خاک بن کر دور دراز کی ہواؤں میں بکھر جاؤ۔

کوئی مجھے کھینچ رہا تھا۔ مجھے میرے گھر سے نکال رہا تھا۔ جگمگاتی روشنیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ میری دلہن چند قدم کے فاصلے پر حجلۂ عروسی میں موجود تھی۔ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سننے کی منتظر تھی اور میں ذہنی طور پر اس سے ہزار ہا میل کے فاصلے پر جا چکا تھا۔ نچلی منزل سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے چہکار رہے تھے۔ صحن میں بڑے بھائی جان کھڑے تھے۔ شاید کل کے ولیمے کے لیے ابا جان اور دوسرے بھائیوں سے مشورہ کر رہے تھے۔

میں جیسے ایک سیاہ غبار میں چلتا ہوا نیچے آیا۔ کسی نے مجھ سے کیا کہا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے کسی کو کیا جواب دیا، مجھے یہ بھی یاد نہیں..... میرے اردگرد اس وقت کیا ہو رہا تھا، میں یہ بھی بھول چکا ہوں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے..... بہت سے مہمان سو چکے تھے۔ کئی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا والدہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ شاید شکرانے کے نفل ادا کرنے میں مصروف تھیں۔ میں ان کے پاس سے گزر کر اپنی الماری تک آیا۔ الماری میں میرا پاسپورٹ اور کچھ دیگر کاغذات موجود تھے۔ میں نے پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈالا، کچھ نقدی الماری میں سے لی، کچھ سلامیوں کی صورت میں میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ میں کسی معمول کی طرح چلتا ہوا صحن میں پہنچا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ شاید کسی نے عقب سے مجھے آواز دی تھی، شاید میں نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً یہ کہا تھا کہ میں ذرا بازار تک جا رہا ہوں..... کولڈ ڈرنک لینے.....

اور میں نکل آیا تھا۔ اپنی شب عروسی کو چھوڑ کر، اپنی دلہن کو چھوڑ کر اور اپنے جگمگاتے گھر کو چھوڑ کر۔ میرے قدم بے ساختہ اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ میرے جسم پر وہی دولھے والا پینٹ کوٹ تھا..... اور ان پھولوں کی خوشبو ابھی تک میرے لباس میں موجود تھی جو رسموں کے دوران میں مجھ پر نچھاور کیے گئے تھے۔ وہ رات قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں نے مین سڑک پار کی اور مزنگ چونگی کی طرف چل دیا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ جو لوگ لاہور کے اس علاقے کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہوگا کہ چوبرجی پارک اور مزنگ چونگی کے درمیان لاہور کا سب سے بڑا..... بلکہ شاید پاکستان کا سب سے بڑا قبرستان میانی صاحب پڑتا ہے۔ میں اسی قبرستان کے اندر سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور حدِ نگاہ تک بس جھاڑیاں تھیں یا قبروں کے بیکراں سلسلے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں بھی ایک مردہ ہوں اور ابھی ابھی کسی قبر سے نکل کر چل پڑا ہوں۔ جتنی تاریکی باہر تھی، اس سے کئی گنا زیادہ میرے اندر تھی۔

اچانک مجھے دو جسیم کتے نظر آئے۔ یہ آوارہ کتے جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں بھاگ کھڑا ہوتا لیکن میں زندہ کہاں تھا۔ اپنے اندر کی روشنیاں بجھنے کے بعد، میں تو ایک مردہ تھا اور جو پہلے ہی مردہ ہو اسے مرنے یا تکلیف جھیلنے کا ڈر کہاں ہوتا ہے۔ کتے شور مچاتے ہوئے میری طرف لپکے تو میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا..... ان کا جوش قدرے ماند پڑ گیا۔ وہ جیسے تعجب کے عالم میں مجھے دیکھتے رہے، پھر وہ آگے بڑھے اور ان کی تھوتھنیاں میری ٹانگوں سے آ لگیں۔ مجھے بالکل یہی لگا کہ وہ اپنی تھوتھنیوں کے ساتھ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ جیسے وہ جان گئے ہیں کہ میں کتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہا ہوں۔ وہ مجھے واپس بھیج رہے ہیں۔ مجھے اس سنگین اور بھیانک غلطی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں ایک ٹرک سنسان سڑک پر سے فراٹے بھرتا ہوا گزرا۔ یہ سڑک بس دس پندرہ قدم کی دوری پر تھی۔ ٹرک کے شور اور اس کے کرخت ہارن نے کتوں کی توجہ میری طرف سے ہٹا دی..... وہ ڈرے ڈرے انداز میں پیچھے ہٹے اور پھر جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ میری دیوانگی کا ریلا مجھے پھر اپنے آپ میں بہانے لگا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلتا مزنگ چونگی پہنچا۔ وہاں جو بس سب سے پہلے نظر آئی، میں اس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس چوک یتیم خانے کی طرف جا رہی تھی۔ چوک یتیم خانے کی جانب جاتے ہوئے یہ بس پھر ہماری رہائش گاہ کی جانب سے گزری۔ قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر مجھے اپنے دو منزلہ

گھر کی رنگ برنگی روشنیاں نظر آئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سینے میں پھیلا ہوا غبار کچھ اور بھی گہرا ہوگیا۔ ایک بار جی میں آیا کہ اپنے قدم روک لوں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ واپس چلا جاؤں..... لیکن تیر کمان میں سے نکل چکا تھا..... تقریباً دس منٹ بعد میں چوک یتیم خانے میں تھا۔ یہاں سے دوسرے شہروں کو جانے والی گاڑیاں۔۔ بہ آسانی مل سکتی تھیں۔ میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ جگہ بھی ہمارے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک بس کھڑی تھی۔ ساہیوال جانے کے لیے تیار تھی، میں اس میں سوار ہوگیا۔

کچھ واقعات اتفاقاً پیش آتے ہیں اور ہم انہیں اپنے ساتھ اور اپنے حالات کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ بس میں جو تین بہ ظاہر غیر اہم واقعات پیش آئے، ان کا تعلق میری ذات سے تھا یا نہیں لیکن وہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ میں انہیں بغیر کمی بیشی کے یہاں لکھ دیتا ہوں۔ ہم ابھی بہ مشکل لاہور شہر سے باہر نکلے تھے کہ اچانک بس کے بریک زور سے چرچرائے۔ پھر وہ بری طرح لہرائی۔ مسافروں کے منہ سے بے ساختہ 'یا اللہ خیر' کے الفاظ نکل گئے۔ ڈرائیور گاڑی کو بہت مشکل سے کنٹرول کرسکا تھا۔ دراصل کوئی جانور گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔ پتا نہیں کیوں میری آنکھوں سے لگاتار آنسو بہتے چلے جارہے تھے، جنہیں چھپانے کے لیے میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اپنی پیشانی اگلی نشست کی پشت سے ٹکائی ہوئی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ کیوں ہو رہا تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

بس لاہور سے ساٹھ ستر میل دور آچکی تھی، جب ایک بار پھر مسافروں کے دل سینوں میں اچھل کر رہ گئے۔ سڑک کراس کرنے والے کسی دیہاتی کو بچاتے ہوئے بس ایک بار پھر بری طرح لہرائی اور سڑک کنارے بجری کے ایک ڈھیر پر چڑھ گئی۔ ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ اس نے بس کو۔۔ بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ مسافروں میں سے کئی ایسے بھی تھے جو اسے تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔ کچھ احتیاط سے گاڑی چلانے کی ہدایت کرنے لگے۔ ڈرائیور بہ ظاہر تجربہ کار ہی دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ تاہم اس مرتبہ گاڑی کی رفتار خاصی کم تھی..... اور ڈرائیور کے علاوہ مسافر بھی الرٹ نظر آرہے تھے۔ ابھی ہم ساہیوال سے دس پندرہ میل دور ہی ہوں گے کہ ایک بار پھر سب دہل گئے۔ اس مرتبہ گاڑی کے نیچے سے کچھ زوردار آوازیں آئی تھیں۔ جیسے لوہے کے ساتھ لوہے نے زوردار رگڑ کھائی ہو۔ کئی مسافروں نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کنارے پر روک دی۔ کنڈیکٹر بھی نیچے اتر آیا اور ٹارچ کے ذریعے گاڑی کے نیچے تاک جھانک کرنے لگا۔

مجھے ڈرائیور کے الفاظ آج تک یاد ہیں۔ وہ پہلے تو پھیکے سے انداز میں مسکرایا پھر مسافروں کی طرف دیکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں پندرہ سال سے گاڑی چلا رہا ہوں لیکن اس طرح کا تماشا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ سواریوں میں سے جو بھی اپنا برا مقدر لے کر اس بس میں بیٹھا ہوا ہے، خدا کے واسطے نیچے اتر جائے۔ نہیں تو ہم کبھی ساہیوال نہیں پہنچیں گے۔''

پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور نیچے اتر کر چل دیا۔ کئی مسافر۔۔ بکا بکا سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے بعد سواریوں نے میرے بارے میں کیا کہا یا ڈرائیور اور کنڈیکٹر وغیرہ نے کیا تبصرہ کیا..... مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں تو بس اپنے ہی ریلے میں بہتا چلا جارہا تھا..... اور اس وقت مجھے یہی لگ رہا تھا کہ شاید ڈرائیور نے ''برے مقدر والی سواری'' کی جو بات کی ہے وہ میرے بارے میں ہی تھی۔ واقعی مجھ سے برے مقدر والا اور کون ہوسکتا تھا..... جو اپنی من چاہی دلہن کو پھولوں کی سیج پر چھوڑ کر ویرانوں کی طرف نکل آیا تھا۔

اب رات کا آخری پہر تھا۔ کچے راستے کو گھنے درختوں اور گھٹا ٹوپ تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اپنی چمچماتی ہوئی گھڑی دیکھی۔ فجر کی اذان ہونے میں تقریباً پون گھنٹا باقی تھا۔ میں اندازاً ایک فرلانگ چلنے کے بعد کھیتوں کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے اردگرد تاریک تنہائی تھی اور ان دیکھے راستے تھے۔ مجھے اپنا گھر یاد آیا۔ اپنی تہجد گزار ماں یاد آئی..... اور عارفہ یاد آئی۔ میں رونے لگا۔ پہلے سسکیاں لیتا رہا..... پھر ہچکیوں سے میرا سینہ دہلنے لگا۔ میں رویا اور کھل کر رویا لیکن لگاتار بہتے ہوئے آنسوؤں نے بھی سینے کی آگ کم نہیں کی۔ یہاں کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ..... اے پہلی رات کے سجے سجائے دُلہا تم ان ویرانوں میں بیٹھ کر کیوں گریہ کررہے ہو..... دیکھو، تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے۔ تمہارا عروسی لباس مٹی میں لتھڑ گیا ہے۔ تمہارے چہرے پر مسافت کی

گرد ہے اور تمہاری آنکھوں میں بربادیوں نے ڈیرے ڈال لیے ہیں..... ہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور نہ دلاسا دینے والا تھا۔ بس کانوں میں وہی زہریلے الفاظ گونج رہے تھے جو شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی ان دو عورتوں نے کہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ الفاظ صرف ان دو عورتوں نے نہیں کہے، ساری دنیا نے کہے ہیں لیکن میں پھر کہوں..... میں نے اس وقت سوچا تھا اور اب بھی یہی سوچتا ہوں..... کیا بس وہ چند طنزیہ الفاظ ہی تھے جنہوں نے مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کرایا؟ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر جگہ ہوا ہی کرتی ہیں۔ خوشی کے موقع پر بدخواہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ بڑے بڑے اچھوں کو بھی برا بنا دیا جاتا ہے۔ غلط بیانیاں، جھوٹ، الزام تراشیاں، تضحیک، کردار کشی، کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن کیا کسی ایسے واقعے کی وجہ سے اتنا بھیانک قدم اٹھایا جاسکتا ہے؟ یا پھر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی، اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ تھی..... اور تب..... ایک بار پھر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔

میرے کانوں میں وہی ناقابلِ فہم فقرہ گونجا..... یہ کیا الفاظ تھے؟ یہ کیوں کہے گئے تھے؟ کیا یہ بھی بس ایک اتفاق ہی تھا یا پھر یہ اتفاق نہیں تھا۔ میری سماعت ان الفاظ کی بازگشت کو پھر محسوس کرنے لگی..... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ان الفاظ میں اور میرے یہاں اس جگہ موجود ہونے میں ایک تعلق ہے۔ گہرا تعلق۔

میں ان بے معنی الفاظ کی بازگشت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اسی کوشش میں اٹھ بیٹھا۔ میرا نیا نکور پینٹ کوٹ کھیتوں کی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے جھاڑا اور ایک بار پھر نامعلوم سمت میں چل دیا۔ میں کہاں جارہا تھا۔ سینے میں پھر دھواں سا بھر رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اپنی اس بے کار اور گناہ گار زندگی سے پیچھا چھڑا لوں..... خود کو ختم کرلوں۔ بس یہی ایک حل نظر آتا تھا اپنے اندر کی بے پناہ اذیت سے چھٹکارا پانے کا۔ اچانک مجھے پانی کے بہاؤ کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں تھوڑا آگے گیا تو جھاڑیوں کے درمیان ساہیوال کی بڑی نہر نظر آئی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور شب کی خاموشی میں پانی کے بہنے کی صدا بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اس وسیع نہر کے کنارے گھاس پر جا کھڑا ہوا۔ پانی کو دیکھنے لگا۔ دل و دماغ میں پیدا ہوجانے والے خیالات بڑے خوفناک تھے۔ مجھے اس پانی کی گہرائی میں اپنی نجات نظر آرہی تھی۔ جو قدم اٹھا کر میں اپنے گھر سے یہاں چلا آیا تھا، وہ بہت بڑا تھا۔ اس کے نتیجے بھی بہت بڑے اور سنگین نکلنا تھے۔ ان سارے نتیجوں اور اندیشوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی نظر آرہا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اگر میں نہر میں کود جاتا تو یقیناً اس دنیا کے غموں سے چھٹکارا پا جاتا۔

اچانک ''اللہ اکبر'' کی صدا میرے کانوں میں پڑی۔ یہ اذان فجر تھی۔ آخر شب کی جادوئی فضا میں یہ آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی تو جیسے چند لمحوں کے لیے میرے سینے میں سلگتی ہوئی آگ مدھم پڑ گئی۔ اسی دوران میں مجھے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تاریکی میں دھیان سے دیکھا..... وہ ذرا لمبے قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر گول براؤن ٹوپی تھی۔

وہ ذرا ڈرے ڈرے لہجے میں بولا۔ ''کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کک..... کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی کھڑا تھا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں..... کوئی..... نشہ وغیرہ تو نہیں کیا ہوا تم نے؟''

''نن..... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

اس شخص کا خوف اب ذرا کم ہوگیا تھا۔ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ میں تمہیں وہاں اس کھیت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے تم نہر میں گر پڑو گے۔ کہاں سے آئے ہو تم..... ساہیوال کے تو نہیں لگتے ہو؟''

''نہیں..... میں..... ملتان سے آیا ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔

اس نے ایک بار پھر مجھے سرتاپا گھورا۔ میرا نہایت قیمتی سوٹ، مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ''ہش پپی'' کے بوٹوں کی حالت اس سے بھی پتلی تھی۔ میری گھڑی، میری انگوٹھی وغیرہ مجھے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ثابت کرتے تھے۔ وہ الجھے الجھے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک ٹیوب ویل کے قریب نیم کے پیڑ کے نیچے آبیٹھے۔ اس شخص

نے اپنا صافہ نما کپڑا گھاس پر بچھا دیا تھا۔ اب ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو زیادہ اچھے طریقے سے دیکھ سکتے تھے۔ اس شخص کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ اردو بولتا تھا تاہم لہجہ کسی حد تک بلوچی تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام فیروز خان بتایا اور..... یہ بتایا کہ وہ یہاں ایک پاس کے گاؤں میں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی بوڑھی والدہ بھی اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ خود کوئٹہ میں ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ مہینے دو مہینے بعد یہاں گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ یہ گھر اس کی بیوی کو اپنے والدین کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ میں نے فیروز کو اپنا نام اشرف بتایا اور کہا کہ میں ملتان سے اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے ساہیوال آیا تھا۔ رات کو کسی بات پر والد سے جھگڑا ہوگیا اور میں ناراض ہوکر ادھر چلا آیا۔

فیروز نے میری بات پر کس حد تک یقین کیا؟ اور پتا نہیں کیا بھی یا نہیں؟ بہرحال اس نے مجھ سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ اس کے رویے میں سب سے اہم بات یہی تھی کہ وہ میری حالتِ زار کو دکھ کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور میرے لیے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آج شام ہی کوئٹہ کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور اگر میں اس سے کسی طرح کی مدد چاہتا ہوں تو اسے بتاؤں۔

ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کوئٹہ لے جاسکتے ہیں؟ میں چند دنوں کے لیے اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''

وہ چند لمحے سوچ کر بولا۔ ''لیکن تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ تمہیں کسی طرح انہیں اطلاع تو پہنچا دینی چاہیے۔''

''آ..... آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں اطلاع پہنچا دوں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ کرائے وغیرہ کی فکر نہ کرے، میرے پاس پیسے موجود ہیں۔

وہ بولا۔ ''آؤ، میں تمہیں اپنے گھر لے چلتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ مناسب نہیں ہوگا انکل۔ میرا حلیہ دیکھ کر آپ کے گاؤں والے حیران ہوں گے۔ میں یہاں سے سیدھا ساہیوال ریلوے اسٹیشن چلا جاتا ہوں۔ آپ نے بھی وہاں سے ہی سوار ہونا ہے نا؟''

انکل فیروز کا جواب ''ہاں'' میں تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے درمیان سارا پروگرام طے ہوگیا۔ مجھے ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر انکل فیروز کا انتظار کرنا تھا۔ اسے شام پانچ بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔

میں نے اپنے کپڑے وغیرہ جھاڑے۔ جہاں مٹی کے سخت داغ تھے ان جگہوں کو گیلے رومال سے صاف کیا۔ ٹیوب ویل کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا اور اپنے بکھرے بالوں میں کنگھی کی، اس کے بعد میں انکل فیروز سے رخصت ہوکر پکی سڑک کی طرف چل دیا۔ اب میری طبیعت کچھ بدلی ہوئی تھی۔ فجر کے وقت تادیر رونے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ اب میں آگے..... اور آگے نکلنا چاہتا تھا۔

میں بذریعہ بس دن گیارہ بجے کے قریب ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل سے بسکٹ اور چائے کا ناشتا کیا۔ کچھ بھی گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ یہ سوچ کر آنکھیں پھر نم ہوگئیں کہ اگر اس وقت میں اپنے گھر میں ہوتا تو شاید عارفہ کے گھر والے اس کا ناشتا لے کر ہمارے گھر آئے ہوتے..... ہر طرف کھانوں کی خوشبو اور قہقہے بکھر رہے ہوتے۔

اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔ گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ میں انتظار گاہ سے باہر لکڑی کی ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ دل میں پھر دھواں سا جمع ہونے لگا۔ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا؟ عارفہ پر کیا بیت رہی ہوگی؟ گھر والے مجھے کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے؟ لوگ کس طرح کی باتیں بنا رہے ہوں گے؟ دل چاہا کہ کسی جگہ سے، گھر ٹیلی فون کروں اور گھر والوں کو کم از کم اتنا بتا دوں کہ خیریت سے ہوں۔ والدہ کی صورت نگاہوں کے سامنے گھومی اور یہ خیال مزید پختہ ہونے لگا کہ مجھے کسی طرح گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دے دینی چاہیے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا، ایک بار پھر میرے اندر کی ساری بتیاں بجھ گئیں۔ گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہی سفید کپڑوں والا ہیولا میرے پیچھے کہیں موجود ہے۔ جسے میں نے اپنی مہندی کی رات دیکھا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ بھی سفید کپڑے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ مجھے ہرگز واپس نہیں جانے دے گا اور اگر میں جانے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھے زبردستی روکے گا۔ شاید زخمی کردے گا یا پھر مار دے گا۔

مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جو قرآنی سورتیں یاد تھیں، انہیں پڑھنے کی کوشش

کرنے لگا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ میرے گھر سے نکلنے میں دو عورتوں کی زہریلی گفتگو کو اتنا دخل نہیں ہے، جتنا اس سفید پوش ہیولے کو ہے۔ اگر میں ان دو عورتوں کی گفتگو نہ بھی سنتا تو شاید کوئی ایسی بات ہو جاتی جس کی وجہ سے مجھے اپنی دلہن کو چھوڑ کر آنا پڑتا۔ یہ سب کچھ ایک پہیلی کی طرح تھا اور اس کا کوئی پہلو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

پروگرام کے مطابق پانچ بجے سے پہلے ہی فیروز اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہ میرے لیے گھر سے آلو والے پراٹھے پکوا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی دہی کی چٹنی تھی۔ اس نے بہت اصرار کر کے مجھے دو چار لقمے کھلائے۔ وہ ٹکٹ کے پیسے نہیں لینا چاہتا تھا لیکن میں نے زبردستی دیے۔ وہ دو ٹکٹ لے آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے گھر والوں کو فون کیا؟ میں نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بھی مجھے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

گاڑی قریباً دو گھنٹے لیٹ تھی۔ جب گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا پلیٹ فارم پر کھلبلی سی مچ گئی۔ قلیوں کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ہمارے پاس چونکہ برائے نام ہی سامان تھا اس لیے ہم اطمینان سے تھے۔ میں نے یونہی اپنے عقب میں دیکھا۔ ایک بار پھر مجھے یہی لگا جیسے سینے میں میرا دل رک گیا ہے۔ بھاگتے دوڑتے لوگوں کے پیچھے مجھے ایک بار پھر اسی سفید پوش کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ جھلک ایک سیکنڈ کے لیے تھی یا شاید اس سے بھی کم وقت کے لیے۔ میں آنکھیں پھاڑے اس سمت میں دیکھتا چلا گیا۔ فیروز نے میرا کندھا ہلایا۔ ''کیا بات ہے اشرف؟''

''کچھ..... نہیں۔'' میں نے گڑبڑا کر کہا اور ریلوے لائن کی طرف دیکھنے لگا جہاں دور ہماری گاڑی کی جھلک نظر آرہی تھی۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ کیا میں واہموں کا شکار تھا؟ میری نظریں بار بار دھوکا کھا رہی تھیں؟ مجھے ایک ایسا منظر دکھا رہی تھیں، جس کا کوئی وجود نہیں تھا؟ نفسیات کی زبان میں اسے ''بصری دھوکا'' کہا جاتا ہے..... یعنی Optical illusion۔ ایسے بصری دھوکوں کا تعلق عموماً انسان کے اپنے اندر کی کیفیات سے ہوتا ہے۔

اسی دوران میں گاڑی پلیٹ فارم پر آگئی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے اور ساہیوال سے کوئٹہ کی طرف ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔ میں گاڑی کی کھڑکی میں سے شمال کی طرف دیکھنے لگا..... شمال کی طرف لاہور تھا..... میرا گھر تھا..... میرے گھر والے تھے..... اور میری دلہن تھی۔ میں ان سب سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تیسرے روز ہم کوئٹہ میں تھے۔ بلوچستان کا دارالحکومت، ایک خوب صورت شہر۔ یہاں موسم قدرے خنک تھا۔ انکل فیروز کو اب میں فیروز چاچا کہنے لگا تھا اور ایسا فیروز چاچا کی خواہش پر ہی ہوا تھا۔ فیروز چاچا کا خیال تھا کہ ''انکل'' کا لفظ کچھ بھاری بھاری ہے اور اس میں بیگانگی بھی پائی جاتی ہے۔ ان تین دنوں میں فیروز چاچا نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ ان کے بہت اصرار کرنے پر میں نے انہیں اپنا اصل نام ہارون بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا تعلق ملتان سے نہیں بلکہ لاہور سے ہے لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا اور فیروز چاچا کی دانائی تھی کہ انہوں نے مزید کچھ جاننے پر زور بھی نہیں دیا تھا۔

کوئٹہ کے بارونق علاقے میں فیروز چاچا کا چھوٹا سا ہوٹل تھا لیکن ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ رات بارہ بجے تک ہوٹل بند ہو جاتا تھا اور ہم اس کے اندر ہی سو جاتے تھے۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے، ہم سونے سے پہلے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فیروز چاچا نے میری گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں فی الحال پاکستان میں رہنا نہیں چاہتا اور میری خواہش ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ایران چلا جاؤں۔ فیروز چاچا کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پاس معقول رقم موجود ہے جو ایران کے سفر میں میرے کام آسکتی ہے۔ فیروز چاچا نے کہا۔ ''ہارون! تم کسی اچھے گھر کے چشم و چراغ لگتے ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو۔ میں تمہیں مشورہ دینے کے قابل تو نہیں ہوں پھر بھی ایک بڑے کی حیثیت سے اتنا ضرور کہوں گا کہ وطن..... وطن ہی ہوتا ہے۔ پردیس میں بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ اپنی جان پر بڑا ظلم سہنا پڑتا ہے۔''

''میں نے سب سوچ لیا ہے چاچا..... اور بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔''

''گھر والوں کو جانے کی اطلاع ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا چاچا..... کہ ساہیوال سے ہی فون کر دیا تھا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

فیروز چاچا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر تم ارادہ کر ہی چکے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم سو گئے..... لیکن اگلے روز یہ ہوا کہ فیروز چاچا کی مدد لینے کے بجائے میں نے خود ہی ایرانی ویزے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ پتا نہیں کیا

ہو رہا تھا میرے اندر۔ دل یہ چاہتا تھا کہ بس جلد از جلد پاکستان کی سرحدوں سے نکل جاؤں۔ پیچھے کا خیال کرتا تھا تو ایک دم میرے اندر کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی تھیں۔ یہ اندر کا اندھیرا مجھے ڈراتا تھا اور اس اندھیرے میں ایک سفید پوش کا ہیولا چمکنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ ویزے کی درخواست کے لیے سب سے پہلے حفاظتی ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں اور اس کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میں مقررہ اسپتال گیا اور وہاں سے حفاظتی ٹیکے لگوائے۔ حفاظتی ٹیکے لگانے والا بلوچی نوجوان عابد میرے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ ملنسار شخص تھا۔ ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہوا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر گھر لے گیا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے مجھے پرتکلف کھانا کھلایا اور ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لاہور چھوڑنے کے بعد میرے اندر ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ''مجھ سے ملنے والے'' مجھ سے ہمدردی اور لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔ پہلے فیروز چاچا اور اب عابد بھائی بھی ایسے ہی رویّے کا اظہار کر رہے تھے۔ فیروز چاچا کی طرح میں نے عابد کو بھی یہی بتایا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ والد سے جھگڑے کے بعد گھر چھوڑ آیا ہوں اور اب انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔ میرے اندر کا دکھ میرے لہجے میں بولتا تھا اور سننے والے کو متاثر کرتا تھا۔

میں نے وہ رات عابد بھائی کے گھر ان کی بیٹھک میں ہی گزاری۔ صبح اس نے مجھے ڈبل روٹی، انڈے، بسکٹ اور چائے کا ناشتا کروایا اور اپنے ساتھ ہی اسکوٹر پر دفتر لے آیا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس نے میرا ٹیکوں کے کورس والا سرٹیفکیٹ تیار کروا دیا۔

میں نے عابد کا شکریہ ادا کیا اور واپس فیروز چاچا کے ہوٹل پہنچ گیا۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ سفر کے لیے معقول رقم بھی موجود تھی۔ مجھے امید تھی کہ ایران کے لیے میرا ویزا لگ جائے گا لیکن اگلے روز مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایرانی قونصلیٹ پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ پنجاب میں رہائش رکھنے والوں کو ایرانی ویزا کوئٹہ سے نہیں اسلام آباد سے ملتا ہے۔

میں سخت پریشان ہوا۔ کسی بندے نے مشورہ دیا کہ فلاں افسر سے ملو شاید کام بن جائے۔ میں اس افسر کے دفتر کی طرف جانا چاہ رہا تھا جب ایک گارڈ نے مجھے روکا اور سخت کلامی کی۔ بڑا بدتمیز سا بندہ تھا۔ ایسے لوگوں کا دماغ ٹھکانے لگانا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ وہ اپنے تن وتوش میں مجھ سے دوگنا کے قریب تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ میں چند سیکنڈ میں اسے ناکوں چنے چبوا سکتا ہوں مگر میں اپنے شہر میں نہیں تھا۔ پردیسی تھا اور بدحال تھا۔ کسی بڑے جھگڑے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس خردماغ گارڈ کی گالیاں بھی سن لیں اور دو چار دھکے بھی کھا لیے۔ اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ ایک قریبی باغیچے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ ایک بلوچی..... جو شاید میری ہی طرح یہاں کے عملے کا ستایا ہوا تھا، میرے قریب آ بیٹھا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔

شام کے وقت میں فیروز چاچا کے ہوٹل واپس پہنچ گیا۔ چاچا کے ہوٹل میں میرا قیام وطعام بالکل مفت تھا۔ دلجوئی کی باتیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ دنیا میں برے لوگوں کی کمی نہیں تو اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ میں نے وہ رات بے چینی کے عالم میں گزاری اور اگلے روز پھر عابد بھائی کے پاس اس کے دفتر میں جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق عابد بھائی بڑی خوش دلی سے ملا۔ چائے بسکٹ سے میری تواضع کی۔ میری کل کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی آزردہ ہو گیا۔ میرا کندھا تھپک کر بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کل میں تمہارے ساتھ قونصلیٹ جاؤں گا۔''

دفتر کا ٹائم ختم ہو گیا تو عابد مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میری دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اچھا کھانا کھلایا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے آٹو رکشا میں بٹھا کر ایرانی قونصلیٹ لے گیا..... جس خردماغ سیکیورٹی گارڈ نے کل مجھ سے بدتمیزی کی تھی، وہ دور کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ بہرحال عابد بھائی کو میرے ساتھ دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھ سے کچھ کہتا یا مجھے روکنے کی کوشش کرتا۔ ہم دونوں برآمدے سے گزرتے ہوئے سیدھے ہائی کمشنر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہائی کمشنر خندہ پیشانی سے ملا۔ عابد کا حال احوال دریافت کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ عابد نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ ہائی کمشنر چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، تمہیں ویزا دے دیتے ہیں۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بہ مشکل شکریے

کے الفاظ کہے۔

گھنٹی بجا کر ایک ملازم کو بلایا گیا۔ اس نے ویزا درخواست کا فارم اور قلم میرے سامنے رکھا اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ''اسے پُر کر دیجیے۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے فارم بھرنا شروع کیا۔ اس وقت مجھے مزید حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہائی کمشنر صاحب خود اٹھ کر میرے پاس چلے آئے اور میرے قریب کھڑے ہو کر فارم بھرنے میں میری مدد کی۔ اسی دوران میں باہر کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو چائے لانے کا آرڈر بھی ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہی خردماغ گارڈ میرے سامنے جھک کر چائے پیش کر رہا تھا جس نے کل مجھ سے بدزبانی کی اور دھکے دیے تھے۔ میں چاہتا تو کمشنر صاحب سے شکایت کر سکتا تھا مگر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

عابد بھائی کی کوشش رنگ لائی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہی ایرانی ویزا میرے ہاتھ میں تھا۔ عابد بھائی کے لیے میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔ بہ وقتِ رخصت میں نے باقاعدہ عابد بھائی کے ہاتھ چومے اور اس نے مجھے گلے سے لگایا..... ساتھ ہی صدقِ دل سے دعا کی کہ اللہ میری مصیبتیں آسان کرے اور مجھے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو۔ وہ ایک بے لوث شخص تھا۔ میں اس کے بعد اس سے کبھی نہیں ملا لیکن وہ میرے ذہن میں نقش ان گنت یادوں میں سے ایک یاد کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔

میں فیروز چاچا کے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اپنی شادی کی رات کو لاہور چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے اندر تھوڑی سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ یہ آگے کے سفر پر روانہ ہونے کی خوشی تھی مگر میں ان سنگین حالات اور واقعات سے بالکل بے خبر تھا جو مجھے آئندہ پیش آنے والے تھے۔ یہ واقعات میرے راستے میں شکاری جانوروں کی طرح گھات لگائے بیٹھے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے جب فیروز چاچا کو بتایا کہ مجھے ایرانی ویزا مل گیا ہے تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے سفر کے بارے میں بے شمار ہدایات دیں (ماضی میں وہ بھی ایک دفعہ ایران کا سفر کر چکا تھا) فیروز چاچا نے مجھے نماز پڑھنے کی ہدایت بھی کی۔ اس نے کہا۔ ''اللہ اپنے بندوں پر مصیبتیں اسی لیے ڈالتا ہے کہ وہ اس کی طرف اپنا دھیان کریں اور جب بندہ دھیان کر لیتا ہے تو مصیبتیں دھند کی طرح چھٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔''

فیروز چاچا کی ہدایات کے مطابق ضروری تھا کہ میں کل بس اڈے پر جا کر اپنا ٹکٹ بک کروا لوں۔ رات ہوٹل میں گزارنے کے بعد میں صبح بس اڈے پہنچا اور تفتان بارڈر کے لیے ٹکٹ بک کروایا۔ یہیں سے میں نے ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ کرنسی بھی تبدیل کروائی۔ اب میرے پاس پاکستانی روپوں کے علاوہ ایرانی ''تومان'' بھی آ گئے۔ بس کے ڈرائیور اسحاق سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا قیمتی لباس اور چہرہ مہرہ دیکھ کر مجھے خصوصی اہمیت دی۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ نام وغیرہ پوچھا اور لاہور کا حال احوال دریافت کیا۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سے ملنے والے اکثر افراد مجھ میں دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ مجھ سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دل میں میرے لیے ہمدردی بھی جاگتی ہے۔ بس ڈرائیور اسحاق سے ہونے والی گپ شپ بھی میرے لیے فائدہ مند رہی اور اس کا پتا مجھے اگلے روز چلا۔

اگلے روز فیروز چاچا اور دیگر لوگوں سے رخصت ہو کر اور فیروز چاچا کی ڈھیروں دعائیں لے کر میں بس اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ بس کے روانہ ہونے کا ٹائم ہے اور میں آدھ پون گھنٹا لیٹ ہو چکا ہوں۔ رکشا پر سوار جب میں بس اسٹینڈ پر پہنچا تو ڈرائیور اسحاق دو تین دیگر سواریوں کے ساتھ کھڑا بے قراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے مجھ پر غصہ تو تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور بولا۔ ''ہارون! یار تم نے تو ہمارا بلڈ پریشر ایک دم آسمان کو لگا دیا ہے، کہاں رہ گیا تھا تم؟''

''میں..... بہت بہت معافی چاہتا ہوں اسحاق بھائی! بس سواری ملنے میں ذرا دیر ہو گئی۔''

''کوئی اور ہوتا تو پندرہ بیس منٹ پہلے یہاں سے نکل گیا ہوتا لیکن ام تمہارے لیے رکا رہا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ اسحاق بھائی..... اور ان سب سواریوں کا بھی جنہیں میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔''

میں بس میں داخل ہوا، مجھے کہیں جگہ نظر نہیں آئی۔ میں نے رونی صورت بنا لی۔ مجھے لگا کہ شاید اب گھنٹوں تک مجھے یونہی کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑے گا۔ ڈرائیور اسحاق نے مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''گھبراؤ نہ یار! ام نے تمہارے لیے بالکل فرنٹ پر ایک سیٹ رکھا ہوا ہے۔''

میں نے شکر کی سانس لی اور فرنٹ پر بالکل اسحاق کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ میرے قیمتی لباس اور حلیے کی وجہ سے سب لوگ بڑے دھیان سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور کسی حد تک مرعوب بھی نظر آتے تھے۔ بس میں زیادہ تر

مسافر بلوچی ہی تھے۔ میلے کچیلے سندھی افراد کا ایک گروپ بھی نظر آرہا تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ میں نے سب پر نظر دوڑائی اور یہی وقت تھا جب میری نظر پہلی بار اس پر پڑی۔ وہ سندھی عورتوں اور بچوں کے درمیان بیٹھی تھی، اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ دبلی پتلی، تیکھے نقوش والی۔ وہ زیادہ خوب صورت بھی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں کوئی کشش تھی جو دیکھنے والے کو چونکاتی تھی۔ اس کا رنگ دیگر سندھیوں سے قدرے صاف تھا اور چھوٹی سی ناک میں بڑی سی نتھ چمک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ناک بہ مشکل نتھ کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس کی چنچل آنکھیں تھیں۔ میں اس کی آنکھوں کی بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا کیونکہ اس نے فوراً ہی اپنی بھاری اوڑھنی اپنے چہرے کے سامنے کرلی تھی اور رخ بھی ذرا سا پھیر لیا تھا۔

میری ذہنی کیفیت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ میں کسی خوب صورت چہرے یا خوب صورت منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہوسکتا۔ میرے سینے میں تو ہر وقت ایک گاڑھا سیاہ دھواں بھرا رہتا تھا اور اردگرد کی کوئی شے بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

جلد ہی بس چل پڑی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جوں جوں بس آگے بڑھتی گئی اردگرد کے مناظر بدلتے گئے۔ یہ مناظر میری توجہ کو کسی حد تک اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہ لق ودق صحرائے بلوچستان تھا۔ آبادیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب میلوں تک کوئی متنفس دکھائی دیتا تھا اور نہ کسی آبادی کے آثار۔ بس سیاہ چٹانیں تھیں اور خشک بنجر پہاڑ تھے۔ بڑی دیر تک گاڑی چلتی رہتی تھی، تب کہیں جا کر کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر کوئی کچی بستی دکھائی دیتی تھی۔ دھوپ میں جلتی ہوئی اور ریت سے ڈھکی ہوئی۔ نہ کہیں سبزے کا نشان، نہ پانی کے آثار۔ بستی کے گھروں کو سفیدی مائل رنگ کیا جاتا تھا۔ سیاہ پہاڑوں کے پیش منظر میں یہ گاؤں نما بستیاں کچھ زیادہ ہی سفید دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہلکے صحرائی جھکڑ چلنے شروع ہوگئے۔ ریتیلی گرد آلود ہوا بس کے شیشوں سے ٹکرانے لگی اور انہیں مزید دھندلا کرنے لگی۔ راستے میں پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں ایک ریلوے لائن کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر ڈرائیور اسحاق نے بتایا۔ ''یہ زاہدان کو جانے والا لائن ہے۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''اسحاق بھائی! یہ ہماری سڑک ایسے ہی تنگ رہے گی یا آگے جا کر کچھ اچھی بھی ہوجائے گی۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''حوصلہ رکھا کرو بابو صاحب۔ آگے جا کر یہ اور خراب ہوگا۔''

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہمارا سفر مزید مشکل اور ہچکولے دار ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ میں بس پر نہیں بلکہ اونٹ پر بیٹھا ہوں اور کسی پرانے دور کا مسافر ہوں۔

وزنی نتھ والی لڑکی کے قریب بیٹھے ایک بڑی عمر کے شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور عاجزی کے لہجے میں بولا۔ ''بابو سائیں، کھڑکی پھر کھل گئی ہے، بند کردو۔''

میں نے کھڑکی بند کردی۔ یہ دوسری تیسری بار ہوا کہ میں نے کھڑکی بند کی تھی۔ بے دھیانی میں، میں کھڑکی پھر کھول دیتا تھا..... اور گرم ہوا اندر آنے لگتی تھی، کسی نہ کسی سواری کی درخواست پر مجھے کھڑکی بند کرنا پڑتی تھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد پھر یہی ہوا۔ دھندلے شیشے کی وجہ سے مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ویرانے میں اونٹوں کے ایک کارواں کو دیکھنے کے لیے میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ گرد آلود ہوا اندر آگئی۔ اب پھر ایک سواری نے مجھے کھڑکی بند کرنے کے لیے کہا لیکن اس مرتبہ عاجزی کے لہجے میں درخواست نہیں کی گئی بلکہ بڑے سخت لہجے میں چلا کر کہا گیا۔ ''بند کرو..... بند کرو..... نان سینس۔''

مجھے ڈانٹنے والا ایک پچیس چھبیس سالہ شخص تھا۔ چہرہ لمبا، ناک اونچی اور آنکھوں میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی سندھی لباس میں تھا اور لڑکی والی نشست کے عین پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اب تک کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب اگر بولا تھا تو اتنے درشت طریقے سے۔

میرا دماغ کھول گیا۔ میں نے کھڑکی بند تو کردی مگر گھوم کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''یار! بات تو تمیز سے کرو۔''

''کیا بات؟..... کیا تمیز..... تم خبیث..... تم.....'' اس کو آگے بات نہیں آئی اور وہ کسی نامعلوم زبان میں بڑی تیزی کے ساتھ بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اپنی نشست سے اٹھا اور غصیلے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی فوراً سیل مرغ کی طرح سینہ پھلایا اور میری طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں بس کے اندر ہی ایک دوسرے سے بھڑ جاتے، دو تین افراد ہمارے درمیان آگئے۔ ڈرائیور اسحاق نے بھی بس سڑک کے کنارے روک دی اور بیچ بچاؤ کرانے لگا۔ وہ شخص میری توقع سے زیادہ آتش مزاج تھا۔ تاہم میں نے بھی اسے برابر کے جواب دیے۔ اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ عربی

جیسی زبان بول رہا ہے۔ کسی وقت اس کی زبان پر سندھی کے لفظ آجاتے تھے۔

سواریوں نے ہم دونوں کو ٹھنڈا کر کے اپنی اپنی نشست پر بٹھایا اور دس پندرہ منٹ کی تاخیر سے بس پھر روانہ ہوئی۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان پنجاب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام سلیم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ سندھی کو ا،ہں اور کہاں جارہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ان کے پاس سعودی عرب کے ویزے ہیں۔''

''سعودی عرب کے ویزے؟'' میں نے حیران ہوکر کہا۔ ''ان کی حالت تو سعودی عرب والی نہیں ہے۔''

سلیم مسکرایا۔ ''سنا ہے جی شاہ فیصل نے ہماری گورنمنٹ سے خاص رعایت کی ہے اور وہاں سعودی عرب میں ناجائز رہنے والے کئی لوگوں کو ویزے دے دیے ہیں۔ یہ لوگ بھی شاید ان میں سے ہیں۔''

اس دوران میں، میں نے دیکھا کہ اس شخص نے آگے کی طرف جھک کر نتھ والی چنچل لڑکی سے کوئی بات کی۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ بہرحال لڑکی کا چہرہ مجھے نظر نہیں آیا کیونکہ وہ گھونگھٹ کے پیچھے تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ لمبے قد والے اس سخت گیر نوجوان کا تعلق اس لڑکی سے ہے۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس کا کیا لگتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ میرے ساتھ اس کے سخت رویے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں اس بس میں سب سے خوش لباس اور اچھے حلیے والا شخص تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے دو چار دفعہ بے دھیانی میں لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

میں نے سوچا کہ اب اس سلسلے میں محتاط رہوں گا اور کھڑکی بھی بند رکھوں گا۔ خوامخواہ ٹینشن پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بس نے قریباً 100 کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا جب ڈرائیور اسحاق نے اسے روک دیا اور مسافروں سے کہا کہ وہ کچھ کھا پی لیں۔ میں نے ویرانے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کہیں کوئی ہوٹل نام کی چیز نظر نہیں آئی۔ سواریاں ایک طرف چل پڑی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ کچھ آگے گئے تو ایک منظر دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک بہت بڑی چٹان کو کاٹ کر ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ یہ ہوٹل اندازاً 300 فٹ گہرا اور 100 فٹ چوڑا ہوگا۔ اوپر بوسیدہ چھپر تھے۔ بڑے بڑے مٹکوں میں پانی رکھا تھا۔ یہاں بجلی وغیرہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جہازی سائز کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، ان کے آگے لکڑی کی بڑی بڑی میزیں تھیں جن پر لالٹینیں رکھی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں پر بڑی بڑی پگڑیوں والے دیومالا لوگ بیٹھے تھے۔ کوئی قہوہ پی رہا تھا، کوئی چرس سے شغل کر رہا تھا۔ کوئی کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ میزوں پر ان کا اسلحہ وغیرہ بھی نظر آرہا تھا۔ شوخ آنکھوں والی لڑکی بھی دیگر افراد کے ساتھ ایک چارپائی پر موجود تھی۔ یہ لوگ کھانے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ہوٹل کا ایک ملازم میرے پاس آیا۔ اس نے میلی سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''کیا کھائے گا بابو جی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بس روٹی سالن لے آؤ۔''

چند منٹ بعد میرے سامنے ایک کشادہ سی پلیٹ رکھی تھی۔ اس میں اونٹ کے گوشت کی دو بڑی بڑی بوٹیاں تھیں اور شوربے کے اندر تین سالم آلو بھی نظر آرہے تھے۔ ساتھ میں خمیری روٹیاں تھیں۔ لاہور میں برگر اور چائنیز کھانے والے کے لیے یہ بڑا انوکھا کھانا تھا۔ بہرحال بھوک تھی اس لیے چاروناچار کھانے لگا۔ گوشت ذرا سخت تھا۔ ایک بوٹی کو دانتوں سے توڑنے کی کوشش کی تو وہ میرے ہاتھ سے نکل کر میز پر جا گری اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔

میرے کانوں سے ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ جلترنگ جیسی یہ دبی دبی ہنسی انہی افراد کی طرف سے ابھری تھی۔ فوارے کی طرح بے ساختہ ابل پڑنے والی یہ ہنسی اسی شوخ چشم لڑکی کی تھی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو وہ ایک بار پھر گھونگھٹ میں دکھائی دی۔ اونچی ناک والے دراز قد شخص نے لڑکی کو گھورا اور غصے میں کچھ کہا۔ لڑکی رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دو دیگر عورتوں نے بھی رخ پھیر لیا۔

اس ہوٹل نما جگہ کا ماحول عجیب تھا۔ دیوہیکل انسان اور ان کے اسلحے کو دیکھ دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میرے قیمتی لباس کی وجہ سے یہ سب لوگ مجھے بڑے دھیان سے دیکھتے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی بس کی سواریاں وہاں سے نکل آئیں اور واپس بس میں آبیٹھیں۔ یہ قریباً ایک گھنٹے کا وقفہ تھا، بس دوبارہ چل پڑی۔

اس مرتبہ میں نے دیکھا کہ نتھ والی چنچل لڑکی کچھ پیچھے چلی گئی ہے۔ اس کا اونچی ناک والا کرخت ساتھی بھی اب ایک پچھلی نشست پر نظر آرہا تھا۔ نوجوان اور لڑکی کی شکل کچھ ملتی جلتی بھی لگتی تھی۔ وہ بہن بھائی ہوسکتے تھے اور قریبی کزن بھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لڑکی تو روانی سے سندھی

میں بات کرتی تھی لیکن نوجوان نے مجھ سے لڑتے وقت عربی جیسی زبان بولی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت کم سندھی جانتا ہے۔

صبح آٹھ بجے روانہ ہونے والی بس سہ پہر چار بجے کے قریب نوکنڈی پہنچی۔ پاک ایران بارڈر یہاں سے قریباً پانچ میل دور تھا۔ ہمارے دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگئے۔ باوردی اہل کاروں نے کاغذات کی چیکنگ شروع کی۔ سندھی خواتین وحضرات کافی گھبرائے ہوئے تھے۔ اپنے حلیوں سے وہ بے چارے گداگر ہی لگتے تھے۔

میری باری آئی تو پہلے مکمل جامہ تلاشی لی گئی۔ پھر کرنسی کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے کوئٹہ سے تقریباً 1000 پاکستانی روپوں کو ایرانی کرنسی میں تبدیل کروایا تھا، اس کے علاوہ قریباً 2000 روپیا پاکستانی کرنسی کی صورت میں میرے پاس تھا۔ ان دنوں یہ کافی بڑی رقم تھی۔ میں نے آفیسر سے کہا۔ ''میرے پاس پانچ سو پاکستانی روپے ہیں۔''

اس نے مجھے سرتاپا گھورا پھر مسکرا کر بولا۔ ''لگتا تو ایسا نہیں..... اگر اور پیسے ہیں تو بتادیں۔ آپ جناب کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

اس کے خوشگوار رویّے سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے جراب میں نیچے کی طرف رکھے ہوئے پانچ پانچ سو کے تین نوٹ اسے دکھادیے۔ وہ ہنس کر چپ ہوگیا (ایرانی کرنسی ڈرافٹ کی صورت میں تھی)

اس دوران میں میری نظر نتھ والی دبلی پتلی لڑکی پر پڑی۔ وہ ہر وقت جیسے اپنے ہی حال میں مست رہتی تھی۔ اب بھی وہ چیکنگ وغیرہ کی پریشانی سے بے پروا صحن میں کھڑی تھی۔ ایک درخت پر بیر کی طرح کا چھوٹا چھوٹا سا پھل لگا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ میں ہونے کے باوجود پنجوں کے بل کھڑی ہوکر پھل اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اونچی ناک والے کرخت نوجوان نے قریب جاکر اسے منع کیا اور اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں آگیا۔ چیکنگ سے فارغ ہوکر ہم سب پھر بس میں آبیٹھے اور بقایا پانچ میل کا فاصلہ طے کرکے پاک ایران بارڈر پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ ''تفتان'' کہلاتی ہے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ سورج کا سرخ گولا دور مغربی افق کی طرف جھکتا چلا جارہا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ٹھنڈی ریگستانی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا۔ ہمیں آج کی رات اسی ریگستان میں کھلے آسمان کے نیچے گزارنا تھی۔ کسی موزوں جگہ کی تلاش میں ہم تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومے۔ پھر ٹیلوں کے پیچھے ایک جگہ قیام کے لیے چن لی۔

بس کی تمام سواریاں تھکی ہاری تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد سب نے اپنی اپنی مرضی کی جگہ بستر وغیرہ بچھانے کے لیے چن لی۔ میرے پاس بستر تو کیا اوپر اوڑھنے کے لیے چادر تک نہیں تھی۔ ایک گلاس تک نہیں تھا کہ پانی ہی پی سکوں۔ بہرحال میرے لباس اور شکل وصورت کی وجہ سے بس کی اکثر سواریاں مجھے کوئی افسر قسم کی شے ہی سمجھ رہی تھیں..... اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی تھیں۔ ایک ٹیلے کے پاس مجھے تھوڑی سی ہموار جگہ نظر آئی۔ میں نے اس جگہ کو کنکر وغیرہ سے صاف کیا۔ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولے، انہیں تکیے کی طرح سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ اوپر تاریک آسمان تھا اور اس پر ہزارہا ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا یہی آسمان سیکڑوں میل دور لاہور میں بھی دکھائی دے رہا ہوگا۔ یہی ستارے وہاں بھی چمک رہے ہوں گے۔ پتا نہیں، وہاں کیا حالات ہوں گے۔ مجھے کیسے کیسے یاد کیا جارہا ہوگا اور تلاش کیا جارہا ہوگا۔ پہلے اپنی والدہ کا تصور ذہن میں آیا، پھر اپنی نوبیاہتا بیوی کا اور آسمان کی طرح بے شمار ستارے میری آنکھوں میں جھلملانے لگے۔ رخساروں پر نمی رینگنے لگی۔ مجھے کیا ہوگیا تھا؟ کیوں ہوا تھا یہ سب کچھ.....؟ اور وہ سفید ہیولا؟ کیا وہ میرا وہم ہی تھا؟ یقیناً وہم ہی تھا لیکن یہ وہم اتنا طاقتور کیوں تھا؟ اور پھر وہ بے معنی الفاظ.....

اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ میرے سامنے کھڑی ناک والا وہی دراز قد نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر خشک لہجے میں مجھ سے کچھ کہا۔ اس کی سندھی میں سے بس دو چار لفظ ہی میری سمجھ میں آئے..... ادھر..... عورتیں..... پردہ..... وہاں.....

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے پھر سندھی میں کچھ کہا۔ سندھی کچھ کچھ میرے پلّے پڑ جاتی تھی کیونکہ میں کالج کے زمانے میں کچھ عرصہ سانگھڑ میں رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے یہاں سے ''بستر'' اٹھانے کے لیے کہہ رہا ہے..... اور کہہ رہا ہے کہ میں ٹیلے کی دوسری طرف چلا جاؤں کیونکہ یہاں میری نظر عورتوں پر پڑے گی۔

وہ بالکل نامناسب بات کر رہا تھا۔ مجھے قافلے سے الگ تھلگ سلانا چاہ رہا تھا۔ یہاں غیر مرد تو اور بھی موجود تھے۔ اس کا نزلہ مجھ پر ہی کیوں گر رہا تھا؟ اتنے میں سندھیوں میں سے گھنی ڈاڑھی والا ایک اور شخص بھی آگیا۔ اس ادھیڑ

عمر شخص کا نام نور بخش تھا۔ اس نے کھڑی ناک والے نوجوان کو تلخ کلامی سے روکنا چاہا اور میری طرف سے بات کی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے میرے لیے یہاں سے اٹھنے کا حکم جاری کرتا رہا۔ بات بڑھ گئی۔ جب کھڑی ناک والے نے میرے بوٹ اٹھا کر دور پھینکنا چاہے تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ اب میرے لیے بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ تیموری خون نے میرے اندر جوش مارا۔ میں نے سر جھکا کر اس کی کمر کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور پوری طاقت سے دھکیلتا چلا گیا۔ وہ قد میں مجھ سے لمبا تھا اور جسم بھی اچھا خاصا تھا لیکن میں نے اس کے قدم جمنے نہیں دیے۔ میں اسے بیس پچیس قدم پیچھے لے گیا۔ ہم عورتوں اور ان کے سامان کے اوپر گرے۔ برتن بکھرتے نظر آئے اور پانی والے چھوٹے مٹکے ٹوٹ گئے۔ عورتیں چلاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں۔ میں نے کھڑی ناک والے کے چہرے پر کئی زوردار مکے رسید کیے۔ میری طلائی انگوٹھی نے اس کا چہرہ چھیل کر رکھ دیا۔ اس نے مجھے ٹانگوں کی دھکیل سے دور پھینکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی آگئی تھی۔ یہ چھوٹی لیکن وزنی لاٹھی تھی۔ اس پر لوہے کے موٹے چھلے سے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ لاٹھی سونت کر دیوانہ وار میری طرف لپکا۔ میں اس وقت تک کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ میرے سر پر وار کیا۔ میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ وہ اتنا شدید وار تھا کہ اگر مجھے لگ جاتا تو میرا تہلکہ خیز سفر وہیں ختم ہو جاتا..... اور آج میں آپ کو یہ روداد سنانے کے لیے زندہ نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم، میں نے کس طرح خود کو اس وار سے بچایا۔ ہاں یہ پتا مجھے چل گیا کہ میں نے اس شخص کو دوسرا وار کرنے کا موقع نہیں دینا، کیونکہ اگر اسے دوسرا موقع مل گیا تو وہ ضرور میری کھوپڑی توڑ ڈالے گا۔ میرے کانوں میں مرد وزن کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نیچے جھکا اور طوفانی رفتار سے اپنے سر کی ٹکر اس غضب ناک شخص کے سینے پر رسید کی۔ وہ وار کرنے کے لیے لاٹھی اٹھا چکا تھا۔ بھرپور ٹکر نے اسے آٹھ دس قدم پیچھے ہٹا دیا لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ میں نہتا تھا اور آہنی چھلوں والی خطرناک لاٹھی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی مگر پھر قدرت نے کرشمہ دکھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص پھر میری طرف آتا یا کسی بھی طرح میری ضرب کا جواب دیتا..... ایک دم کھٹکے کی زوردار آواز آئی۔ جیسے لوہا لوہے سے ٹکرایا ہو، اس کے ساتھ ہی کافی ساری ریت میرے حریف کے پاؤں کے پاس سے اچھلی۔ وہ الٹ کر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے، پھر اللہ داد تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جھک کر اس کا پاؤں دیکھنے لگا، اس کا پاؤں جیسے کسی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ تین چار دیگر افراد بھی میرے حریف کی طرف بڑھے۔

''کیا ہوا میڈے سائیں۔'' اللہ داد نے چلا کر پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس کراہ رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ ایک شخص نے لالٹین اونچی کی اور تب مجھے بھی پتا چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ لوہے اور لکڑی کا بنا ہوا ایک زنگ آلود پھندا تھا..... جو نہ جانے کب سے ریتیلی مٹی میں دبا ہوا تھا۔ شاید کبھی کسی شکاری نے کسی جانور کے لیے یہ پھندا لگایا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ پھندے کی جگہ بھول گیا ہو، یا کوئی اور وجہ ہوگئی ہو۔ آج اتفاقاً میرے دراز قد حریف کا پاؤں اس پھندے میں جکڑ گیا تھا اور وہ اس جکڑن کی تکلیف سے تڑپنے لگا تھا۔ چند لمحے بعد میں بھی لڑائی کی گرما گرمی بھول کر موقع پر پہنچ گیا۔ میرے دراز قد حریف کے ہاتھوں سے وزنی لاٹھی چھوٹ چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنڈلی دبائی ہوئی تھی اور کراہ رہا تھا۔ اس کی پنڈلی پر خون کی لالی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً وہ ایک سخت جان شخص تھا۔ کوئی اور ہوتا تو کراہنے کے بجائے چلا رہا ہوتا۔ اس پھندے میں ایک طاقتور اسپرنگ تھا۔ وزن پڑنے کے بعد وہ پورے زور سے کھلا تھا اور لوہے کی دو قوسوں نے اس شخص کی پنڈلی، ٹخنے کے اوپر سے بری طرح جکڑ لی تھی۔ ایک قوس تو اس کی پنڈلی کے اندر دھنس گئی تھی اور شاید ہڈی تک جا پہنچی تھی۔ یہ پھندا ایک زنگ آلود زنجیر کے ذریعے ایک پتھر کے ساتھ اٹیچ تھا۔ پھندے کی طرح یہ زنجیر بھی ریت میں دبی ہوئی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ دراز قد شخص کے لیے بڑے اذیت ناک تھے۔ پھندا چونکہ پرانا ہو چکا تھا اس لیے کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دو تین افراد مل کر جب پھندا کھولنے کے لیے زور لگاتے تو دراز قد شخص کا حال اور برا ہو جاتا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی پیشانی پسینے سے تر نظر آرہی تھی۔

میرا ذہن ہمیشہ سے کچھ ٹیکنیکل رہا ہے، میرے بڑے بھائی جان ٹی ٹرالیز بنانے والا ایک بڑا کارخانہ چلاتے تھے۔ مجھے بھی مینوفیکچرنگ کی کافی سمجھ بوجھ تھی۔

میری یہ سمجھ بوجھ اس ویرانے میں اس پھنسے ہوئے شخص کے لیے کام آئی۔ میں نے غور کیا تو اندازہ لگالیا کہ یہ شکنجہ زور لگانے سے نہیں کھلے گا بلکہ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ اگر کسی طرح شکنجے کے اسپرنگ کو ایک طرف سے نکال دیا جاتا تو وہ بے پناہ دباؤ ختم ہوسکتا تھا جو اسپرنگ کھلنے کی وجہ سے پنڈلی پر آیا ہوا تھا۔

میں نے وزنی نتھ والی چنچل لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ان پریشان کن لمحوں میں وہ اپنا لمبا گھونگھٹ بھی بھول چکی تھی۔ میں نے ادھیڑ عمر اللہ داد سے کہا۔ ''چاچا! تمہارے سامان میں کوئی پیچ کش وغیرہ ہوگا؟''

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''ہاں سائیں، مینڈے پاس ہے پیچ کش۔''

وہ دوڑ کر گیا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا سا پیچ کش لے آیا۔ میں لالٹینوں کی روشنی میں شکنجے کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ دراز قد شخص کا خون بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہورہا تھا۔ یوں لگتا تھا، وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ طاقتور اسپرنگ کے ایک سرے کو اسٹیل کی ایک موٹی پن کے ذریعے لاک کیا گیا ہے۔ یہ پن سوراخ میں سے نکل جاتی تو اسپرنگ کا ایک سرا آزاد ہوجاتا اور اسپرنگ کھینچنے سے باہر نکل آتا۔ میں نے ہتھوڑی کا کام ایک گول پتھر سے لیا۔ پیچ کش کے سرے کو سوراخ میں ڈال کر تین چار ہلکی چوٹیں لگائیں تو لوہے کی پن باہر نکل آئی۔ جو کام بے پناہ زور لگانے کے باوجود نہیں ہوسکا تھا، وہ ایک پن نکل جانے سے ہوگیا۔ اسپرنگ باہر آگیا اور اس کے ساتھ ہی دراز قد شخص کا لہولہان پاؤں شکنجے میں سے نکل آیا۔

سب نے سکھ کی سانس لی۔ اللہ داد اور دیگر عمر رسیدہ افراد نے مجھے باقاعدہ شاباش دی۔ دراز قد شخص کا نام مجھے جعفر معلوم ہوا۔ وہ اب لڑنے کے قابل کہاں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی پنڈلی دبا رکھی تھی اور کراہتا چلا جارہا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر فاصلے پر چلا گیا۔ عمر رسیدہ سندھی افراد میں سے ایک مفلوک الحال شخص کا نام نور بخش تھا۔ یہ بندہ دیسی طریقہ علاج جانتا تھا۔ اس کے پاس مرہم پٹی کا برا بھلا سامان بھی موجود تھا۔ اس ویرانے میں زخمی جعفر کے لیے اور کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ نور بخش نے اس کا خون بند کرنے کی کوشش کی۔ خون کا رساؤ کم ہوگیا تو اس کے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ دی گئی۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ساکت و جامد بیٹھ گئے۔ سب کے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں ارد گرد ایسا کوئی اور پھندا موجود نہ ہو۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا اہم تھا۔ ایرانی اہلکاروں نے ہمارے کاغذات وغیرہ چیک کرنا تھے اور ہمیں ایران میں داخلے کی اجازت ملنا تھی۔ بس کی بیشتر سواریوں کی حالت گداگروں جیسی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ان لوگوں کو ایران میں ''انٹری'' مل جائے گی۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سب نے برا بھلا ناشتا کیا اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ بارڈر کی طرف چل دیے۔ دراز قد جعفر کے پاؤں پر بھاری بھرکم پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دو سندھی افراد کے سہارے چل رہا تھا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کے لمبوترے چہرے پر کدورت کے آثار تھے۔ حالانکہ رات کو جو کچھ بھی ہوا، اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ باقی سب لوگ مجھ سے بہت زیادہ مرعوب نظر آنے لگے تھے۔

بارڈر پر پہنچے تو وہاں ایرانی بارڈر پولیس کے اہلکار تو نظر آئے لیکن کوئی افسر قسم کا شخص دکھائی نہیں دیا۔ ہمیں روکھے لہجے میں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ ہم وہیں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنے سامان کے اوپر بیٹھنا مناسب سمجھا۔ جعفر کا چہرہ بری طرح تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی سی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پاؤں کی سوجن کی وجہ سے اسے تیز بخار بھی ہوگیا تھا۔

قریباً دو ڈھائی گھنٹے کے مشکل انتظار کے بعد ہمیں ایک ایرانی افسر کی صورت نظر آئی۔ اس نے اشاروں کنائیوں اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں ہمیں بتایا کہ ان کے بارڈر انسپکٹر کو حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ بولا۔ ''یہ بات کلیئر ہے کہ جب تک تم لوگوں کے کاغذات چیک نہیں ہوتے، تم ایران میں داخل نہیں ہوسکتے اس لیے صبر سے انتظار کرو۔''

میں نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایرانی افسر کی یہ بات بس کی دیگر سواریوں تک پہنچائی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ جعفر بھی غصیلے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

بس کی تقریباً تمام سواریوں نے ایک طرح سے مجھے اپنا لیڈر بنالیا تھا۔ یہ وہی اندھوں میں کانا راجا والی بات تھی۔ وہ سب میرے گرد اکٹھے ہوگئے۔ مدقوق چہرے والے ایک دیہاتی نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ''بابو جی! آپ پڑھے لکھے ہیں، ان سے بات کریں۔ اگر ہم آج یہاں سے نہ نکل سکے تو کسی اور مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں کیا بات کروں، میں بھی آپ لوگوں کی طرح انجان ہی ہوں۔''

عورتیں اور بچے بھی پریشان نظر آرہے تھے۔ گرمی اور پیاس علیحدہ پریشان کررہی تھی۔ بس کی ساری سواریاں بلند آواز میں باتیں کررہی تھیں۔ پھر کچھ لوگ احتجاجی انداز میں شور مچانے لگے۔ اب دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ شور بڑھا تو ایرانی اہلکاروں میں سے ایک سینئر بندہ باہر آیا۔ اس نے وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی کافی چوڑی تھی۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں مجھ سے بات چیت شروع کردی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ''مجھے اردو وغیرہ بالکل نہیں آتی۔ میں کیسے آپ لوگوں سے سوال جواب کرسکتا ہوں۔ مجھ سے پاسپورٹ بھی چیک نہیں ہوں گے۔''

پھر اچانک جیسے اس کے ذہن میں خیال آیا۔ مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''اگر آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں اور پاسپورٹوں کا اندراج رجسٹر میں کردیں تو کام آسان ہوسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ کرسکتا ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اس شخص نے مجھے ساتھ لیا اور بارڈر انسپکٹر کے بجائے ٹھنڈے دفتر میں پہنچ گیا۔ بس کی سواریاں گرتی پڑتی ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔ اس شخص نے مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر ایک بڑی میز کے سامنے ایک لگژری کرسی پر بٹھادیا اور میں نے مسافروں کے پاسپورٹ چیک کرنے شروع کردیے۔ میں سوٹڈ بوٹڈ تھا، کرسی پر بیٹھ کر مجھے لگا جیسے واقعی کوئی افسر ہوں۔ اپنے اس خیال پر میں خود ہی ہنس دیا۔ صرف چار دن پہلے ایرانی دفتر کے ایک معمولی گارڈ نے مجھے گالیوں سے نوازا تھا اور باقاعدہ دھکے دیے تھے۔

اگلے دو گھنٹے میرے لیے کافی کٹھن تھے۔ پٹھانوں اور سندھی بھائیوں کے نام خاصے مشکل اور گنجلک تھے۔ خاص طور سے خواتین کے نام۔ ان کا اندراج رجسٹر پر کرنا میرے لیے کافی مشکل ثابت ہورہا تھا۔ مجھے ہر مسافر سے دو چار سوال بھی کرنا پڑرہے تھے۔ جعفر تو زخمی ہونے کی وجہ سے باہر ہی بیٹھا رہا۔ بہرحال اس کی ساتھی لڑکی کو اندر میرے سامنے آنا پڑا۔ میں کچھ اور بھی اکڑ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی اندر آئی۔ وہ واضح طور پر ڈری سہمی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا رعب سے اس کا نام پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

''مہرالنساء ..... سائیں۔''

''یہ سائیں کیا ہے۔ صرف اپنا نام بتاؤ۔''

''مہرالنساء ..... جی۔ گھر میں مہرو کہتے ہیں۔''

''والد کا نام؟''

''غلام نبی ..... جی۔'' وہ ذرا جھجک کر بولی۔

''والدہ کا نام؟''

''حبیبہ مائی۔''

''یہ پاسپورٹ پر فوٹو تمہاری ہے؟''

''ہاں جی۔''

''اپنا چہرہ دکھاؤ۔'' میں نے رعب سے کہا۔ حالانکہ چہرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔

وہ چپ ہوگئی۔ پھر لرزاں لہجے میں بولی۔

''سائیں ..... میں پردہ کرتی ہوں۔''

میں بھی اسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔ ویسے یہ ضرورت بھی تھی کہ اس کی شکل دیکھی جاتی۔ میں نے کہا۔ ''چہرہ نہیں دکھاؤ گی تو کارروائی کیسے پوری ہوگی؟ چلو، اٹھاؤ یہ گھونگھٹ۔''

اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے لرزتے ہاتھ سے گھونگھٹ تھوڑا سا ہٹایا۔ چنچل آنکھوں میں فی الحال شوخی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ چھوٹی سی نازک ناک میں چاندی کی وزنی نتھ ظلم ڈھا رہی تھی۔ عام شکل وصورت کے باوجود اس میں کشش تھی۔ میں اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں نے بھاری آواز میں کہا۔

اس نے گھونگھٹ دوبارہ نکال لیا۔

میں نے رجسٹر میں اس کا پاسپورٹ نمبر درج کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ جعفر تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''وہ جی ..... وہ جی ..... بابو سائیں .....''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، ایرانی افسر اندر آگیا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی کام نمٹانے کو کہا اور میرے اب تک کے کام کو چیک کرنے لگا۔ مہرو کا اندراج ہوچکا تھا۔ وہ باہر چلی گئی اور اس کی جگہ ایک اور عورت اندراج کے لیے آگئی۔

یہ کام مکمل ہوتے ہوتے قریباً ڈھائی بج گئے۔ ایرانی افسر نے خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے لیے لنچ منگوایا۔ ایرانی طرز کی بریانی اور روسٹ چکن تھا۔ ساتھ میں خوشبودار قہوہ۔ مجھے اے سی والے ٹھنڈے دفتر میں بیٹھ کر لنچ کرنا اچھا لگا۔

کچھ دیر بعد جب میں باہر نکلا تو پھر وہی گرمی تھی اور وہی پھٹے پرانے کپڑوں والے میرے مسافر ساتھی۔ بچے

ریں ریں کر رہے تھے اور مائیں انہیں جھڑکیاں دینے میں مصروف تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک سے نکل کر اچانک تیسری دنیا کے کسی مصیبت زدہ ملک میں آ گیا ہوں۔

ہم ایرانی علاقے میں داخل ہوئے اور کچھ دور تک پیدل چلے۔ یہاں ماحول بدلا ہوا تھا اور صفائی ستھرائی نظر آتی تھی۔ ہمیں لے کر جانے والی بس سامنے ہی کھڑی تھی۔ یہ جرمنی کی بنی ہوئی شاندار بس تھی اور ان دنوں دنیا کی بہترین بسوں میں شمار ہوتی تھی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے عزت بخشتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر جگہ دی۔ جعفر بھی دو افراد کے سہارے لنگڑاتا ہوا بس میں آ بیٹھا۔ بھاری نتھ والی مہرو بھی اس کے ساتھ تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات بھی عجیب لگی تھی۔ مہرو نے اپنی والدہ کا نام ''حبیبہ'' لکھوایا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اندرون سندھ عورتوں کے ایسے نام نہیں ہوتے، خاص طور سے پرانی عورتوں کے۔ کیا ''حبیبہ'' کا تعلق سندھ سے نہیں تھا؟ جعفر کو سندھی کیوں نہیں آتی تھی؟ کیا جعفر اور مہرو قریبی رشتے دار تھے؟ ایسے ہی کئی سوال میرے ذہن میں چکراتے رہے اور ہماری لگژری بس ایرانی شہر زاہدان کی طرف محوِ سفر رہی۔

جعفر کے چہرے پر میرے لیے اب بھی بیگانگی اور کدورت کے آثار تھے۔ وہ اور مہرو اس دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے جعفر کی پیشانی پر گاہے بگاہے بل پڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنا زخمی پاؤں اٹھا کر نشست پر رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ مہرو نے اپنی بھاری اوڑھنی کے اندر سے اپنا نازک ہاتھ نکالا اور آہستہ آہستہ جعفر کی پنڈلی دبانے لگی۔ وہ جب سے زخمی ہوا تھا، وہ اس کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔

میرا تجسس اب کافی بڑھ چکا تھا۔ میرے ساتھ والی نشست پر رحیم یار خان کا ایک غریب صورت نوجوان امین بیٹھا تھا۔ وہ بھی روزگار کے سلسلے میں قسمت آزمانے کے لیے کویت کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ کوئٹہ میں وہ سندھی افراد کے ساتھ ہی بس میں سوار ہوا تھا۔ میں نے امین سے پوچھا۔ ''یہ جو لڑکی ہے لال اوڑھنی والی، یہ کیا لگتی ہے جعفر کی؟''

''یہ بہن ہے جی اس کی۔'' امین نے کہا۔ ''یہ اسے اپنے ساتھ عراق لے کر جا رہا ہے۔ یہ وہیں عراق میں ہی رہتا ہے نا۔ شاید بغداد میں۔''

''لیکن..... لیکن لڑکی تو سندھی ہے اور یہ جعفر شاید عربی بول رہا تھا۔''

''مجھے اس بارے میں زیادہ پتا تو نہیں ہے جی۔ میرا خیال ہے کہ یہ جعفر صیب عراق میں پلا بڑھا ہے جبکہ یہ لڑکی یہاں نواب شاہ میں رہی ہے اپنی دادی کے پاس۔ باپ شاید فوت ہو چکا ہے۔''

میرا تجسس ان دونوں کے بارے میں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ بہرحال امین کو اس بارے میں اس سے زیادہ معلوم نہیں تھا۔

بس صاف ستھری سڑکوں پر رواں دواں رہی اور میرا ذہن بھی مختلف سمتوں میں بھاگتا رہا۔ پچھلے چند دنوں میں جو کچھ ہوا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ اپنی مہندی کی رات میں نے غنودگی کی حالت میں اپنے سامنے ایک سفید ہیولا دیکھا۔ اس نے چند ناقابلِ فہم الفاظ کہے..... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی..... اور پھر شادی کی رات میں نے دو عورتوں کا مکالمہ سنا۔ وہ قنات کے پیچھے بیٹھی بول رہی تھیں۔ ان عورتوں کے الفاظ نے میرے اندر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ کیا وہ اتنی ہی بڑی بات تھی کہ اس کے نتائج اتنے برے نکلتے؟ کبھی کبھی میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آتا تھا۔ میں سوچتا تھا..... کیا وہ عورتیں وہاں موجود بھی تھیں یا نہیں؟ کہیں وہ میرا وہم ہی تو نہیں تھا۔ بصری واہمے کی طرح سماعتی واہمہ یعنی Audio Illusion

اچانک میں اپنے سنسنی خیز خیالات سے چونک پڑا۔ ایک شخص بڑے غصے سے چلایا تھا۔ یہ شخص بس کے تین چار ایرانی مسافروں میں سے ایک تھا۔ دراصل سندھی افراد کے گروہ میں سے ایک چھوٹے بچے نے ایرانی کا بوٹ گندا کر دیا تھا۔ بچے کا شاید پیٹ خراب تھا۔ اس نے بس کے فرش پر ہی اپنی حاجت پوری کر لی تھی۔ اب ایرانی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو کر تابڑ توڑ فارسی بول رہا تھا۔ بچے کے مفلوک الحال والدین لرزہ بر اندام تھے، ایک مرد نے اپنی چادر سے ایرانی کا بوٹ صاف کیا مگر اس کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب پاکستانی خود کو خجل محسوس کر رہے تھے..... اور کسی حد تک سہم بھی گئے تھے۔ آدھ پون گھنٹا بولنے کے بعد ہی ایرانی کا ٹمپریچر کسی حد تک کم ہوا۔

باقی کا سفر گہری خاموشی اور تناؤ کی کیفیت میں گزرا۔ خدا خدا کر کے زاہدان کے مضافات نظر آنے شروع ہوئے۔ زاہدان ایران کے اچھے اور خوب صورت شہروں

میں سے ایک ہے۔ یہاں کے باشندوں میں سکھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ شہر کا نام زاہدان بھی سکھوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں دیکھ کر باہر سے آنے والے لوگوں نے سمجھا کہ یہ متقی و پرہیزگار مسلمانوں کا شہر ہے۔ اس لیے اسے زاہدان یعنی زاہدوں کے رہنے کی جگہ کہا جانے لگا۔

بس ایک خوب صورت اسٹینڈ پر رکی۔ شہر کی شان و شوکت دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ شیشے کی طرح صاف شفاف سڑکیں، بلند عمارتیں، باغیچے۔ صفائی ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ہم آہستہ آہستہ بس سے اترے۔ زاہدان کی خوشبودار، ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ زخمی جعفر بھی اپنی بہن اور ایک دوسرے شخص کے سہارے بہ مشکل بس سے اترا۔ ایک بار دل چاہا کہ اس سے دو چار الوداعی کلمات کہوں لیکن پھر اس کا سوجا ہوا تھوبڑا دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی اب میں تنہائی اور سکون کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

میرے پاس سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس ایک شاپر سا تھا جس میں میں نے پانی کی دو تین بوتلیں اور کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ ذرا آگے جا کے مڑ کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ سندھی مسافروں کا گروہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ جیسے انہوں نے مجھے مستقل طور پر اپنا راہنما تصور کر لیا ہو اور اب میرے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہوں۔ مجھے الجھن محسوس ہوئی۔ میں تو خود ''راہ گم کردہ'' مسافر تھا۔ میرے اندر اتنی اہلیت کہاں تھی کہ کسی معاملے میں ان لوگوں کی راہنمائی یا مدد کر سکتا۔ میں رک گیا۔

''کیا بات ہے بزرگو؟'' میں نے اللہ داد سے پوچھا۔

وہ عاجزی سے بولا۔ ''بابو سائیں! تم پڑھے لکھے ہو، بات کر سکتے ہو۔ رہنے کے لیے جو جگہ تمہیں ٹھیک اور چنگی لگے گی، وہاں ہم بھی رہ لیں گے۔ کوئی سستا سا سرائے مل جائے تو سب کے لیے ٹھیک رہے گا۔''

میں نے ذرا بیزاری سے کہا۔ ''چاچا! ابھی میرا، کسی سرائے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ لوگوں نے جو کرنا ہے اپنے طور پر کر لیں اور یہ جعفر بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔ یہ تو تھوڑی بہت یہاں کی زبان بھی جانتا ہوگا۔''

''اس کو تو اپنی پڑی ہوئی ہے بابو سائیں۔ آپ ہی کچھ مدد کرو نا.....''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ یہ واقعہ آج تک پوری تفصیل کے ساتھ میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں اس کو اپنے لیے ایک شرم ناک واقعہ ہی کہوں گا۔ ان لمحوں میں جو ذلت میں نے اپنے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے محسوس کی، وہ تاحیات یاد رہے گی۔

ہوا یوں کہ جب ہم وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے قریب ہی ایک ایرانی اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں بچے اسکول سے باہر سڑک پر نظر آنے لگے۔ یہ سب لڑکے تھے۔ ان کی عمریں چھ سات سال سے لے کر چودہ پندرہ سال تک تھیں۔ جب یہ بچے اسکول سے باہر آئے، مسافروں میں سے ایک بوڑھا ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کر رہا تھا۔ پتا نہیں ان بچوں کے ذہن میں کیا بات آئی۔ ان میں سے کچھ نے پہلے مفلوک الحال مسافروں پر آوازے کسے، پھر انہیں پتھر مارنے شروع کر دیے۔ شاید وہ انہیں گداگر سمجھے تھے یا پھر چوراچکا تصور کر رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماضی قریب کا کوئی تلخ واقعہ ان کے طیش کا سبب بنا ہو۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا، میں اور اللہ داد باقی قافلے سے بیس پچیس میٹر دور کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ قافلے میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں چلانے لگیں۔ مسافروں کے ہاتھوں سے بستر بند گر گئے اور وہ کنستر وغیرہ بھی جن میں انہوں نے آٹا یا چاول قسم کی اشیا ڈال رکھی تھیں۔ ماؤں سے بچے علیحدہ ہو گئے اور شوہروں سے بیویاں۔ ایرانی بچے انہیں پتھر مار مار کر بھگا رہے تھے۔ میں بھی بھاگ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ مفلوک الحال سندھی ساتھی میرے سامنے سے یوں دوڑتے ہوئے گزر رہے تھے جیسے ان کے پیچھے موت کے فرشتے لگے ہوں۔ ایک لڑکی دھڑام سے میرے قدموں میں گری۔ وہ چلائی ''بابو سائیں بچاؤ۔''

میں نے دیکھا یہ وہی بھاری نتھ والی مہرو تھی۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اپنی اوٹ میں لے لیا۔ امید تھی کہ ہم بپھرے ہوئے لڑکوں کی نظر سے بچ جائیں گے لیکن پھر ایک گھر کی چھت پر کھڑے شخص نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا اور فارسی میں چلا کر کچھ کہا۔ تین لڑکوں کی ایک ٹولی گلی سے نکل کر ہماری طرف آئی۔ ایک لڑکے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی۔ اس نے مہرو کو دیکھ لیا۔ وہ پُرطیش انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

''رک جاؤ..... اسٹاپ اٹ۔'' میں چلایا۔

ایک لڑکے نے مجھے دھکا دے کر مہرو سے علیحدہ کرنا

چاہا۔ میرا سر پیچھے دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ جب دوسرے لڑکے نے مہرو کے جسم پر ہاکی سے ضرب لگانا چاہی تو میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ تیسرا لڑکا قد میں ذرا لمبا تھا۔ اس نے عقب سے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر کھینچا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ اب ضروری تھا کہ میں دفاع کرتا۔ میں نے سامنے والے لڑکے کے پیٹ میں لات رسید کی اور ایک جھٹکا دے کر ہاکی اسٹک اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ مہرو پشت سے میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ دائیں طرف والے لڑکے نے میری گردن پر گھونسا رسید کیا۔ میں نے بھی بے دریغ ہاکی گھمائی جو اس کی کنپٹی کے پاس لگی۔ وہ سر پکڑ کر اوندھے منہ گرا۔ یقیناً اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر باقی دونوں لڑکے الٹے قدموں پیچھے ہٹے۔ یہ سارا واقعہ بہ مشکل آٹھ دس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ میں نے مہرو کا بازو پکڑا اور ایک تنگ گلی میں بھاگا۔ چھت پر کھڑا شخص بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ شاید دیگر لڑکوں کو بتا رہا تھا کہ ہم اس طرف سے بھاگ رہے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کس طرف جاؤں۔ ہم بیس پچیس قدم آگے گئے تھے کہ دور کچھ فاصلے پر مجھے ایک نیون سائن نظر آیا۔ اس پر جو الفاظ لکھے تھے، وہ یقیناً پولیس اسٹیشن کے ہی تھے۔

''آؤ مہرو۔'' میں نے مہرو کا بازو کھینچا اور پولیس اسٹیشن کے رخ پر بھاگا۔

لیکن ابھی ہم نے بہ مشکل آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ گلی کے ایک موڑ پر دو تین ایرانی نظر آئے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں دور سے ہی ایک موٹی لکڑی دکھائی دی۔ یہ لکڑی اس نے یقیناً ہتھیار کے طور پر ہی اٹھا رکھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ زور سے بولا اور انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ میں مہرو کو کھینچ کر ایک اور گلی میں داخل ہوگیا۔ یوں لگتا تھا کہ گھیرا تنگ ہوگیا ہے اور ہم ان مشتعل لوگوں سے بچ نہیں سکیں گے۔ ایرانی اسکول بوائے کے زخمی ہونے سے یہ معاملہ یقیناً اور بھی سنگین ہوگیا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک اسٹیشن وین نظر آئی۔ اسے ایک دیوار کے ساتھ پارک کیا گیا تھا۔ میری نظر وین کی کھڑکی سے گزری اور مجھے پتا چل گیا کہ اس کا بائیں جانب والا دروازہ لاک نہیں ہے۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر جھٹکا دیا۔ سلائڈنگ دروازہ کھل گیا۔ میں مہرو کو گھسیٹ کر اندر لے آیا اور دروازہ بند کردیا۔ یہ ظاہر گلی خالی تھی لیکن کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں صرف دعا ہی کرسکتا تھا کہ کسی نے ہمیں وین میں گھستے دیکھا نہ ہو۔

ہم پچھلی نشستوں کے درمیان دبک کر بیٹھ گئے۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس گلی میں مشتعل لڑکے اور دیگر افراد داخل ہوگئے۔ وہ چاروں طرف بھاگ رہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں ہاکیاں یا لکڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کچھ نے پتلونوں کی وزنی بیلٹس ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں، وہ گاڑیوں کے اندر جھانک رہے تھے اور ہر ایسی جگہ پر نگاہ دوڑا رہے تھے جہاں کسی کے چھپنے کا امکان ہوسکتا تھا۔

اندر مہرو کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور چنچل آنکھوں میں دہشت کے ڈیرے تھے۔ میں دو نشستوں کے درمیانی خلا میں سیدھا لیٹ گیا..... میں نے مہرو کو اپنے اوپر لٹالیا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔ وین کے اندر نیم تاریکی تھی اور ہم امید کرسکتے تھے کہ شاید ہمیں دیکھا نہ جاسکے۔

''سائیں! یہ لوگ ماردیں گے ہم کو۔'' مہرو کراہی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

وین کے اردگرد بھاگ دوڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر وین ہولے ہولے ہلی۔ وہ لوگ یقیناً اندر جھانک رہے تھے۔ یہ نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ہم اپنی جگہ پتھر کے بت بن گئے۔ مہرو بے چاری کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور یہ برق رفتار دھڑکن میں صاف محسوس کررہا تھا۔ خود کو اوجھل رکھنے کے لیے وہ میرے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل ترین گھڑیاں گزریں اور وین کے اردگرد قدرے سکون محسوس ہوا۔

بہرحال یہ سکون تادیر برقرار نہ رہا۔ کچھ دیر بعد وین کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور کوئی شخص دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور وہ اسٹارٹ ہوگئی۔

مہرو نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح نشستوں کے درمیان پھنسی پھنسائی لیٹی رہی۔ اسٹیشن وین اب تیزی سے چل رہی تھی اور موڑ وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ پتا نہیں یہ شخص کون تھا؟ ہمیں دیکھ لیتا تو اس کا ردعمل کیا ہوتا؟ اسکول بوائے سے جو ہاکی اسٹک میں نے چھینی تھی، وہ ابھی تک میرے پاس موجود تھی۔ اپنے دفاع کے

لیے میں اسے استعمال کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

قریباً دس منٹ تک زاہدان کی سڑکوں پر چلنے کے بعد وین رک گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سایہ دار درختوں کے درمیان یہ ایک خاموش جگہ تھی۔ گاڑی والے نے انجن بند کیا۔ اب اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ہمیں فوراً دیکھ لیتا..... اور پھر یہی ہوا۔ اس ڈاڑھی والے نیم گنجے شخص نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہاکی کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہوگئی لیکن اس کے بعد جو ہوا، وہ توقع کے مطابق نہیں تھا۔ وہ شخص پہلے فارسی میں کچھ بولا پھر انگریزی میں کہنے لگا۔ ''گیٹ ڈاؤن..... ناؤ گیٹ ڈاؤن۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ ہماری موجودگی کے بارے میں جانتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے ہاتھ بڑھا کر سلائڈنگ دروازہ کھول دیا۔ پہلے مہرو اٹھ کر باہر نکلی پھر میں بھی نکل آیا۔ ہاکی اسٹک میں نے وین کے فرش پر ہی رہنے دی تھی۔

یہ ایک درمیانی عمر کا گورا چٹا ایرانی تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر بل تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر شکستہ انگلش میں بولا۔ ''میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن لڑکے کو چوٹ لگا کر تم نے بے وقوفی کی ہے۔ اگر تم ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ یقیناً تمہاری دو چار ہڈیاں تو توڑ ہی ڈالتے۔''

میں نے بھی انگریزی میں کہا۔ ''جناب! ہم نے یہ سب خود کو بچانے کے لیے کیا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں وہ لڑکے بے وجہ.....؟''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے..... مجھے وضاحت کی ضرورت نہیں۔'' اس نے میری بات کاٹی اور بولا۔ ''اب جاؤ یہاں سے..... اور ان سے بچ کے رہنا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وین اسٹارٹ کی اور ایک موڑ کاٹ کر درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ جہاں برے لوگ ہوتے ہیں، وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں۔

مہرو ابھی تک تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کروں؟ لڑائی کے دوران میں وہ شاپر بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا جس میں، میں نے کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھی۔ اب میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ مہرو کا حال بھی یہی تھا۔ اس کے سر پر شاید کوئی پتھر لگا تھا۔ بالوں میں سے خون رس کر پیشانی تک آگیا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے اپنی بھاری اوڑھنی سے خون صاف کیا۔

''اب کہاں جانا ہے تو نے؟'' میں نے بیزار لہجے میں اس سے پوچھا۔

''بابو سائیں..... مم..... میں نے پا (بھائی) کے پاس جانا ہے۔''

میں نے جھلا کر کہا۔ ''تو مجھے کیا پتا کہ اب کہاں ہے وہ تیرا پا؟ خوامخواہ کی مصیبت ڈال دی ہے تم لوگوں نے مجھے۔ سر پیش بن کر چمٹ گئے ہو مجھ سے۔''

مجھے غصے میں دیکھ کر وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالنے لگی اور پھر رونے لگی۔ قریب سے دو سائیکل سوار ہمیں گھورتے ہوئے گزرے۔ اس کی وجہ سے کوئی اور مسئلہ کھڑا ہوسکتا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''اب یہ رونا دھونا بند کر۔ کسی اور مصیبت میں نہ ڈال دینا۔''

اس نے سہم کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے تاہم اس کا سینہ وقفے وقفے سے ہچکی سے دہلتا رہا۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ جب کوئی سڑک پار کرنا ہوتی تھی، مجھے اس کا ہاتھ پکڑنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے مستقل طور پر ہی اس کی کلائی پکڑ لی یعنی ایک پردیسی دوسرے پردیسی کا ہاتھ تھام کر پناہ کی تلاش میں نکلا تھا۔ ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم غلطی سے پھر اسی طرف نہ نکل جائیں جہاں اسکول کے لڑکوں سے واسطہ پڑا تھا۔

مجھے پتا چلا تھا کہ یہاں زاہدان میں مسافر سرائے بھی ہوتی ہیں جہاں پردیسیوں کو بہت کم قیمت پر رہائش اور کھانے کی سہولت مل جاتی ہے۔ میں نے راستے میں دو چار لوگوں سے پوچھا اور مہرو کو لے کر ایک ایسی ہی مسافر سرائے میں آگیا۔ یہ ایک ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے کی دونوں سائڈز پر بھی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ تاہم دروازہ کسی کمرے کا نہیں تھا۔ فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، کئی مسافر ان چٹائیوں پر ہی تکیے وغیرہ رکھے سو رہے تھے۔ ان میں ایک دو فیملیاں بھی تھیں۔ ایک فیملی شاید پاکستانی تھی۔ میں مہرو کے ساتھ ایک کمرے میں آگیا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا بھائی بہت پریشان ہوگا۔ وہ زخمی بھی ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا حالت ہوگی۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی۔ سرائے کے ملازم سے کھانا منگوایا۔ عجیب طرز کی لمبوتری سی روٹی تھی اور ساتھ کسی ترکاری کا سالن تھا۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن مہرو نے چکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے سندھی لہجے میں کہنے لگی کہ میں باہر جاؤں اور پتا کروں کہ بس کے باقی مسافر کہاں گئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''بے وقوفی کی بات نہ کرو۔ ابھی لڑکوں والا معاملہ تازہ ہے۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہ ہو اور وہ لوگ ہمیں تلاش کررہے ہوں۔''

اس کے سر پر پتھر لگنے سے کٹ سا آگیا تھا۔ میں باہر گیا اور ایک میڈیکل اسٹور سے اس کے لیے دوا لے کر آیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے یہ ''پاؤڈر میڈیسن'' اس کے کٹ پر لگائی۔ مجھے اس کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس کوئی سفری کاغذ نہیں تھا پاسپورٹ، ٹکٹ وغیرہ اس کے بھائی جعفر کے پاس تھے۔ ایسے میں اگر کوئی پوچھ تاچھ کرلیتا تو یہ لڑکی مصیبت میں پڑسکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں بھی۔

ہم نے رات جیسے تیسے گزاری۔ اگلے روز میں نے اس سے کہا۔ ''میں باہر نکل کر کچھ پتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم کمرے کے اندر ہی رہنا۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''سائیں! اگر کسی نے کچھ پوچھا تو؟''

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''تم بس سندھی ہی بولنا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ تمہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔''

اسے ضروری ہدایات دے کر میں باہر نکل گیا۔ میں نے دو تین جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تفتان بارڈر سے زاہدان کی طرف آنے والی بسوں کا اسٹینڈ کس طرف ہے۔ کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ جواب مل بھی جاتا تو ابھی اس طرف جانے میں خطرہ تھا۔ میں گھومتا گھومتا ایک بازار میں نکل گیا۔ یہاں کپڑوں کی بہت سی دکانیں بھی تھیں۔ ان میں زنانہ گارمنٹس کی شاپس بھی تھیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ سب سے پہلے اس مہرو نامی لڑکی کا حلیہ تبدیل کرنا ضروری ہے۔ میں نے ایک مقامی طرز کی سستی سی شلوار قمیص لے لی۔ اوپر پہننے کے لیے وہ گاؤن تھا جو اکثر ایرانی خواتین زیب تن کرتی تھیں۔ براؤن رنگ کا ایک اسکارف بھی لباس کا حصہ تھا۔

میں یہ چیزیں لے کر سہ پہر کے وقت سرائے پہنچا تو مہرو نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ ''بابو سائیں! دیر کیوں لگائی؟'' اس نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔

''بس دیر ہوگئی۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''سائیں! پتا چلا کچھ پا (بھائی) کا؟''

''اب یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ کچھ ٹائم لگے گا اس میں۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اور تم مہربانی فرما کر ذرا حلیہ بدلو۔ اتارو یہ بدبودار کپڑے۔''

''جی؟'' وہ چونک کر بولی۔

میں نے کپڑوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو، ادھر پیچھے زنانہ حمام ہے۔ وہاں جاکر نہالو اور پہن لو۔''

اس نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پریشان ہوکر بولی۔ ''یہ کپڑے سائیں؟''

''ہاں یہی۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

وہ کچھ دیر ہچکچاتی رہی لیکن جب میں نے سختی سے کہا تو وہ کپڑے لے کر حمام کی طرف چلی گئی۔

وہ قریباً آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو کافی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا گندمی رنگ نکھر آیا تھا۔ اس نے اسکارف بھی باندھ لیا تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے جاذب نظر کہا جاسکتا تھا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں لیکن فی الوقت ان میں گہری پریشانی کی دھند تھی۔

یہ مسافر سرائے زیادہ صاف نہیں تھی۔ کھانا بھی ناقص تھا۔ باتھ رومز کی طرف سے کسی وقت بدبو کا جھونکا بڑے ہال کمرے تک آجاتا تھا۔ میں نے سوچا کوئی بہتر جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ میری اگلی منزل تہران تھی لیکن تہران روانہ ہونے سے پہلے میں اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہتا تھا جو مہرو کی صورت میں مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ میں رات کو بھی صدقِ دل سے دعا کرتا رہا تھا کہ اس کے وارث اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ جائیں اور میں اسے ان کے حوالے کردوں۔ آج صبح جب میں باہر نکلا تھا، اس وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا اور وہ یہ کہ کیوں نہ میں سرائے واپس ہی نہ جاؤں میرا کون سا سامان وہاں پڑا تھا لیکن پھر میرے ذہن نے یہ بات قبول نہیں کی۔ وہ جو بھی تھی مسلمان تھی اور میری ہم وطن تھی۔ میں یوں پردیس میں اسے چھوڑ جاتا تو میرا ضمیر یقیناً مجھے ملامت کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے اسے چھوڑ کر میں کسی اچھی جگہ کی تلاش میں نکلا۔ اچھی جگہیں تو بہت تھیں لیکن ان کے کرائے بھی بہت تھے۔ کافی کوشش کے بعد میں ایک مناسب جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ایک سستا سا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر چھ سات کمرے بنے ہوئے تھے۔ کرایہ پاکستان کرنسی کے حساب سے قریباً 100 روپے یومیہ تھا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ کے ذریعے ہوٹل کے رجسٹر میں اندراج کرایا۔ مہرو کا اندراج میری بیوی کے طور پر ہوا۔ شکر کا مقام تھا کہ اندراج کرنے والے نے مہرو کا پاسپورٹ طلب نہیں کیا۔

سہ پہر تک ہم اس نئی جگہ منتقل ہو گئے۔ رات کو سونے کا ٹائم ہوا تو میں نے مہرو سے کہا۔ ''میں فرش پر چادر بچھا لیتا ہوں۔ تم بیڈ پر سو رہو۔''

وہ لرز کر بولی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے بابو سائیں؟ آپ اوپر سوئیں، میں نیچے سو جاؤں گی۔''

میں نے بہت کہا لیکن وہ نہیں مانی۔ مسلسل نفی میں سر ہلاتی رہی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ایک چادر بچھالی اور صوفے کی ایک گدی تکیے کے طور پر رکھ لی۔ ہم اکیلے کمرے میں تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے خوف نہیں کھا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میری ذات پر بہت بھروسا کر رہی تھی۔ میں بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پریشان لہجے میں بولی۔ ''بابو سائیں! میرا پا (بھائی) بہت گھبرا رہا ہوگا۔ پتا نہیں کہاں کہاں مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میں کیا کروں؟''

میں نے کہا۔ ''میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم کیا کرو۔ مجھے تو خود پتا نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں تمہارا وہ پا (بھائی) مجھ پر تمہیں اغوا کرنے کا الزام ہی نہ لگا دے۔''

''اغ وا؟ یہ کیا ہوتا ہے بابو سائیں؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''کسی کو زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا۔''

''نہیں نہیں بابو سائیں! تم بہت اچھا ہے۔ ہمارا پا (بھائی) بھی بہت اچھا ہے۔ وہ اس طرح کبھی نہیں سوچ سکتا اور پھر میں خود بھی تو سب کچھ بتاؤں گی اس کو۔''

''وہ مجھے بہت غصے والا لگتا ہے اور سندھی بھی نہیں لگتا۔ تم پوری سندھن ہو۔ وہ تمہارا بھائی کیسے بن گیا؟''

''وہ ادھر عراق میں رہتا ہے بابو سائیں۔ ہم وہاں نواب شاہ میں رہتا۔ اس لیے وہ ذرا اور طرح کا لگتا ہے۔''

''مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہیں۔'' میں نے کہا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے مہرو سے پوچھا۔ ''تم نے رجسٹر میں اپنی ماں کا نام حبیبہ مائی لکھوایا تھا۔ ہمارے سندھ میں تو عورتوں کے نام اس طرح کے نہیں ہوتے۔''

''ماؤ (ماں) تو عراق کی رہنے والی تھی نا سائیں۔''

''یعنی تمہاری ماں عراق کی تھی اور باپ سندھ کا؟''

''جی سائیں! یہ بڑی پرانی بات ہے، انگریزوں کے وقت کی۔ میرا ابا انگریزوں سے لڑتا تھا، پھر وہ بھاگ کر عراق چلا گیا۔ نواب شاہ میں رہتا تو انگریز اسے جندہ نہ چھوڑتے۔ اس وقت میرے ابے کی عمر کوئی بیس سال تھی۔ وہاں بغداد میں وہ سخت مجدوری کرتا رہا۔ وہاں پر ہی اس کو میری ماؤ (ماں) ملی۔ دونوں کا سنجوگ ہو گیا۔''

''اب کہاں ہے تمہارا ابا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ''وہ تو سات آٹھ سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اب میں اپنے تاؤ کے پاس رہتی تھی اور داذی (دادی) کے پاس۔''

''اور تمہاری ماؤ؟''

''وہ بھی کچھ سال پہلے اللہ سائیں کے پاس چلی گئی تھی۔''

''وہ بھی یہیں پاکستان میں فوت ہوئی؟''

''نہیں وہ وہاں بغداد میں ہوتی تھی۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا تمہارا باپ پاکستان واپس آ گیا تھا اور ماؤ وہیں رہی تھی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ''ہاں بابو سائیں! ان دونوں کے درمیان بگاڑ ہو گیا تھا۔ میں پانچ چھ سال کی تھی جب میرا ابا مجھے لے کر پاکستان آ گیا تھا۔ میرا پا (بھائی) جعفر مجھ سے بڑا تھا۔ وہ وہیں ماؤ کے پاس رہ گیا۔ شروع میں ابا سوچتا تھا کہ شاید میری ماؤ میرے پا کو لے کر پاکستان آ جائے گی۔ پر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نہ ہی پھر میرا ابا سائیں کبھی واپس عراق گیا۔ پر وہ میری ماؤ کو یاد جرور کرتا تھا۔''

''کیا تم بھی اپنی ماؤ کو یاد کرتی تھیں؟''

''ہاں..... کچھ کچھ..... لیکن میں اپنے پا جعفر کو زیادہ یاد کرتی تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑا ہے۔ ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے، پھر میں ابا سائیں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ وہ وہاں اکیلا رہ گیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اب تیرہ چودہ سال بعد وہ تم کو بغداد سے ڈھونڈتا ہوا وہاں نواب شاہ پہنچا؟''

مہرو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی ناک کی نتھلی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمکنے لگی۔ میرے سوالوں کے جواب میں مہرو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں رک رک کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مہرو کا بھائی جعفر بغداد میں رہا لیکن اپنے باپ اور بہن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس کی بہن مہرو پاکستان کے شہر نواب شاہ میں کہیں رہتی ہے اور ایک پسماندہ بستی میں اپنے تایا کے پاس تنگی کی زندگی گزار رہی ہے۔ دوسری طرف جعفر کا شمار کھاتے پیتے

لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے دل میں اکثر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ پاکستان جائے اور اپنی بہن سے ملے۔ اس کے بعد کوشش کرے کہ وہ اس کے ساتھ بغداد چلی آئے۔ وہ پاکستان پہنچا اور مہرو کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ اس نے مہرو کو اپنے ساتھ چلنے پر کیسے راضی کیا اور مہرو کے تایا نے کیسے اجازت دی، یہ ایک علیحدہ کہانی تھی۔ بہرحال اب مہرو اپنے بھائی کے ساتھ اپنی رضامندی سے بغداد جارہی تھی۔ سندھی قافلے میں جونور بخش نام کا بوڑھا شخص تھا، وہ بھی دور نزدیک سے مہرو کا رشتے دار ہی تھا اور ان دونوں کے ساتھ بغداد جارہا تھا۔ اب راستے میں یہ واقعہ ہوگیا تھا اور سب لوگ بکھر کر رہ گئے تھے۔ شوخ آنکھوں والی یہ بھولی بھالی سی مہرو میرے پلے بندھ گئی تھی اور میری مصیبتوں میں اضافہ کررہی تھی۔

اپنی روداد سنانے کے بعد وہ فرش پر میرے جوتوں کے پاس ہی لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور مختلف سوچیں میرے ذہن پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ میں جو کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ بہرحال اس کے عجیب عجیب نقشے میرے ذہن میں بن رہے تھے اور میرے اندر خوف جگا رہے تھے۔ ذہن میں خیال آتا تھا، پتا نہیں، وہاں کیا قیامت مچی ہوگی؟ مجھے کیسے کیسے تلاش کیا جارہا ہوگا؟

جسم تھکن سے چور تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سوگیا۔ دوبارہ آنکھ کسی شور کی وجہ سے کھلی تھی۔ یہ بھی پتا نہیں چلا کہ شور کس چیز کا تھا۔ شاید کوئی زور سے بولا تھا یا پھر کوئی دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، مہرو فرش پر الٹی سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ بالوں کی لٹیں گندمی چہرے پر بکھری تھیں۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے ایک چادر اس پر ڈال دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سوئی رہے گی لیکن وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے اوڑھنی اپنے سینے پر درست کی۔ پھر آنکھیں مل کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

میں دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ واش روم میں چلی گئی اور وضو کرکے باہر آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے دعا کرتی رہی۔ یقیناً اپنے وارثوں سے دوبارہ ملنے کی دعا کررہی تھی۔

یکایک نچلی منزل سے پھر شور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے ایک دروازہ زور سے بند ہوا پھر دو تین افراد بلند آواز میں گرجنے برسنے لگے۔ یقیناً یہ ایرانی ہی تھے۔

میں نے باہر والی کھڑکی ذرا سی کھولی اور احتیاط سے جھانکا۔ ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایرانی پولیس کی دو گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ دو باوردی اہل کاروں کے ساتھ دو تین سادہ پوش افراد بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میرا خون رگوں میں جم سا گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ نوجوان ان افراد میں شامل تھا جنہوں نے اسکول کے سامنے لڑائی کے بعد ہمارا پیچھا کیا تھا۔

تو کیا ہمیں ڈھونڈ لیا گیا تھا؟ یا پھر ویسے ہی یہاں تلاشی وغیرہ ہورہی تھی؟ یہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کا دور تھا۔ ایجنسیاں بہت سرگرم نظر آتی تھیں..... مجھے معلوم ہوا تھا کہ مشکوک افراد کے لیے اکثر ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں چیکنگ وغیرہ ہوتی ہے۔

مہرو دعا سے فارغ ہوئی اور ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا ہوا بابو سائیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں ہوٹل میں تلاشی ہورہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔''

''ہائے اللہ، اب کیا ہوگا بابو سائیں؟'' مہرو کا رنگ ہلدی ہوگیا۔

اب سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید اہلکار اب تلاشی لینے کے لیے اوپر آرہے تھے۔

میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ''مہرو! تم اپنی نماز جاری رکھو۔ وہ لوگ تمہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں گے تو ہوسکتا ہے کہ واپس چلے جائیں۔ وہ اس حلیے میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکیں گے۔''

''لیکن بابو سائیں.....''

''بس کوئی سوال نہیں۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم نماز پڑھو، میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔''

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اَن لاک کردیا اور خود واش روم میں چلا گیا۔ لرزتی کانپتی مہرو نے میری ہدایت کے مطابق نفلی نماز شروع کردی تھی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ لوگ اب اوپر کی منزل پر تھے۔ دروازے دھڑا دھڑ بجائے جارہے تھے۔ اہلکاروں کی آوازیں گرج دار تھیں۔ وہ فارسی بول رہے تھے۔ میں واش روم کی دیوار کے ساتھ لگ گیا اور... کی ہول میں سے چابی نکالنے کے بعد ہول میں سے جھانکنے لگا۔ مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ نظر آرہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس دروازے پر بھی زور سے دستک ہوئی۔ میری ہدایت کے مطابق مہرو نماز پڑھنے میں مشغول رہی۔ دوسری

تیسری دستک کے بعد دروازے کا ہینڈل گھوما اور ایک باوردی اہلکار اندر آیا۔ مجھے بس اس کی ٹانگیں اور پیٹ ہی نظر آرہا تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھا، یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ آخر یہ لمحے گزر گئے۔ اہلکار واپس چلا گیا اور دروازہ بند کردیا..... اپنے بدلے ہوئے لباس اور حلیے کی وجہ سے مہرو سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی۔ میں جلدی سے باہر آیا اور دروازہ پھر اندر سے لاک کردیا۔

مہرو کی پیشانی پر پسینا نظر آرہا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے اس نے اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر اور چہرے پر رکھا تھا کہ اس کی نتھلی بالکل نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ یہ نتھلی بڑی خطرناک تھی اور فوراً اس کی پہچان کرا سکتی تھی۔ نتھلی کے علاوہ وہ سندھی لباس بھی ایک شاپر میں موجود تھا جو مہرو نے مسافر سرائے میں بدلا تھا۔ یہ شاپر بھی سامنے الماری میں ہی رکھا تھا۔ اگر تلاشی لینے والے تھوڑی سی کوشش اور کرتے تو ہم سخت مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

میں نے سب سے پہلے تو مہرو سے وہ وزنی نتھلی اتروائی اور اسے ٹشو پیپر میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا۔ اس کے بعد مہرو کا سندھی لباس بھی اچھی طرح الماری کے عقبی خلا میں چھپا دیا۔

''بابو سائیں! کون لوگ تھے یہ؟'' مہرو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہی تھے جن کے ساتھ ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ ساتھ میں پولیس کے لوگ بھی تھے۔''

مجھے نیچے سڑک کی طرف سے کچھ آوازیں آئیں۔ میں نے کھڑکی کی درز میں سے احتیاط کے ساتھ نیچے دیکھا۔ باوردی ایرانی اہلکار چار پانچ افغانی باشندوں کو گرفتار کرکے گاڑی میں بٹھا رہے تھے۔ یقیناً یہ لوگ ہوٹل کی تلاشی میں ان کے ہتھے چڑھے تھے۔ ممکن تھا کہ مہرو کی طرح ان کے پاس بھی سفری کاغذات نہ ہوں۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔

وہ دن بھی ہم نے ہوٹل کے اسی کمرے میں چھپ کر گزارا۔ مہرو نے مجھے اپنے بارے میں کچھ مزید باتیں بھی بتائیں مثلاً یہ کہ اس کی دادی اس سے بہت پیار کرتی ہے لیکن اب وہ بہت بیمار رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے بھائی جعفر کے ساتھ عراق بھیجنے پر تیار ہوگئی ہے..... مہرو نے اپنے معصوم لب ولہجے میں یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی جعفر اسے بغداد لے جاکر کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

وہ بڑی خدمت گزار قسم کی لڑکی تھی۔ میں کھانا لاتا تو وہ کہتی۔ ''پہلے آپ کھائیں بابو سائیں۔ میں بعد میں کھاؤں گی۔''

میں نہانے کے لیے باتھ روم میں گیا تو اس نے وہاں پہلے ہی صابن تولیا وغیرہ رکھ دیا اور بالٹی بھر دی۔ نہاتے ہوئے میں نے کی ہول سے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنی پرانی اوڑھنی سے میرے بوٹ صاف کررہی تھی۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ مہرو کل رات کی طرح فرش پر چادر بچھا کر سو چکی تھی۔ میں بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے نچلے حصے سے موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ جدید قسم کی موسیقی تھی جس میں شور شرابا زیادہ ہوتا ہے۔ میں کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا کہ شاید یہ سلسلہ رک جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند تو ابھی ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا سوئی ہوئی مہرو کے چہرے پر سادگی اور معصومیت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جوان لڑکی نہ ہو چھوٹی سی بچی ہو..... میں نے اس کے جسم پر چادر درست کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں سیڑھیاں اترا اور نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر چلا گیا۔ اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ڈائننگ ہال کی اکثر روشنیاں بجھ چکی تھیں اور ایک دو کے سوا سب میزیں خالی نظر آتی تھیں۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر دو ملازم اونگھ رہے تھے۔

میں ایک کوریڈور میں داخل ہوا تو موسیقی کی دھمادھم مزید شدت سے سنائی دینے لگی۔ یہ دھمادھم سیاہ رنگ کے ایک دروازے کے پیچھے سے ابھر رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دروازے کو تھوڑا سا اندر کی طرف دھکیلا۔ موسیقی کی آواز کان پھاڑنے لگی۔ اندرونی منظر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ یہاں تین چار درجن لوگ موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ یہ ہپیوں کا کوئی گروہ تھا اور شاید آج شام ہی اس ہوٹل میں اترا تھا۔ یہ نیم برہنہ مرد وزن اندھا دھند ناچ رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں شراب کے جام تھے، کچھ سگریٹ وغیرہ کے کش لے رہے تھے۔ اس پورے ہال میں چرس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اور نیم تاریکی میں رنگ برنگی روشنیاں اسپارک کررہی تھیں۔

ابھی میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لمبی تڑنگی گوری نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے تیزی سے اندر کھینچ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک دم میرے ساتھ کیا ہوگیا

ہے۔ میں دیوانہ وار رقص کرتے لوگوں کے گھیرے میں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے، نازیبا حرکات کر رہے تھے۔ نیم عریاں جسم موسیقی کی تیز لہروں پر اندھا دھند تھرک رہے تھے۔ مجھے اندر کھینچنے والی دراز قد لڑکی نے مجھے بھی رقص میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بار بار اپنی طرف کھینچا۔ میرے ہونٹوں سے بدبودار وہسکی کا جام لگانا چاہا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس سے علیٰحدہ کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن تب ایک اور قیامت میرے سامنے آگئی۔ چوبیس پچیس سال کی یہ خوش اندام ہپی لڑکی دھوئیں کے مرغولوں میں سے نکلی اور جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔

''ڈانس بوائے ڈانس..... ڈانس بوائے ڈانس۔'' وہ مسلسل کہتی جارہی تھی۔

میں خود کو چھڑانے کے لیے اس سے کوئی زبردستی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوجائے۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگی اور اس نے مجھے نیچے گرانے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک دم برہم ہوگئی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر انگلش میں پتا نہیں کیا کیا بولنے لگی۔ ایک ہٹے کٹے ہپی نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے لڑکی کو زور سے دھکا دیا ہے اور وہ گرتے گرتے بچی ہے۔ درمیانی عمر کا یہ ہپی نشے میں چور تھا۔ بڑے غصیلے انداز میں میری طرف آیا۔ بالکل ایسے ہی لگا جیسے مجھے تھپڑ مارنا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ یہ غلطی کر گزرتا تو یقیناً اس کے لیے..... بلکہ ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوتا۔ میں تھپڑ کھا کر چپ رہنے والا شخص نہیں تھا۔ بہرحال اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس سے پہلے کہ ہٹا کٹا ہپی مجھ تک پہنچتا، ایک شخص تیزی سے میرے اور ہپی کے درمیان آگیا..... اس نے کہہ سن کر ہپی کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ یہ کوئی پاکستانی لگتا تھا۔ اس نے صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے پورے جسم پر لپ اسٹک کے نشان نظر آرہے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ رحیم یار خان کا وہی امین نامی نوجوان تھا جس نے بس میں ہمارے ساتھ زاہدان تک کا سفر کیا تھا۔ امین کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ خود بھی نشے میں چور تھا۔ اس کی توانا گردن کی رگیں نشے کی حدت سے پھولی ہوئی تھیں۔

''امین! تم یہاں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہی بات میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں جی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

موسیقی کے شور کی وجہ سے ہم دونوں کو بہت زور سے بولنا پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس غلطی سے یہاں آگیا۔''

''یہ اچھی غلطی ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر انجوائے کرلو۔ یہ کھاتے پیتے ہپی ہیں۔ سب کچھ ان کے خرچے پر ہی ہورہا ہے۔''

یہ امین کا ایک نیا روپ تھا۔ بس میں وہ مجھے ایک غریب صورت، شریف النفس لڑکا نظر آیا تھا جو حق حلال کی روزی کے لیے پردیس کا رخ کررہا تھا لیکن یہاں وہ کسی اور ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے ساتھ ساتھ حرص و ہوس کی چمک بھی تھی۔ مجھے اس سے کراہت محسوس ہوئی۔ اسی دوران میں ایک ذرا صحت مند ہپی لڑکی نظر آئی اور ڈارلنگ کہتے ہوئے امین سے لپٹ گئی۔ امین کے سرخ و سپید جسم پر نظر آنے والے سرخ نشان شاید اسی بھدی سی ہپی لڑکی کی لپ اسٹک کے تھے۔

میں نے حیران نظروں سے دیکھا۔ کئی بدمست جوڑے ہال کے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور اردگرد کے ماحول سے یکسر بے پروا نظر آتے تھے۔ شاید امین بھی کچھ دیر بعد گندگی کی اسی دلدل میں دھنسنے والا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ شاید چرس کا دھواں بھی مجھ پر اثر کررہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھرکتے جسموں کے درمیان سے راستہ بنایا اور ہال کمرے کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

مجھے مہرو کی فکر تھی۔ میں اسے کمرے میں مقفل چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ آہستہ سے چابی گھما کر دروازہ کھولا۔ یہ دیکھ کر شاک لگا کہ مہرو ڈری سہمی میرے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرا بازو پکڑ لیا۔ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے بابو سائیں! آپ مجھ کو بتا کر تو جاتے۔''

''سوری..... سوری۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بے آرام نہ کروں۔ میں بس ذرا سڑک تک گیا تھا۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا، جیسے جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرے بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

''یہ نیچے کوئی ناچ گانا ہورہا ہے بابو سائیں!''

''پپ..... پتا نہیں۔ میں اس طرف گیا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

میرا بازو بدستور اس کے نازک ہاتھوں کی گرفت میں

تھا۔ جیسے اس پردیس میں یہ بازو ہی اس کا واحد سہارا ہو اور وہ ہرگز اسے چھوڑنا نہ چاہتی ہو۔ وہ بدستور روہانسی آواز میں بولی۔ ''بابو سائیں! آگے ایسا مت کرنا۔ یہ دیکھو میرا کلیجا کیسے دھک دھک بج رہا ہے۔'' اس نے کسی چھوٹی بچی کی سی معصومیت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا۔

میں سٹپٹا گیا۔ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ تمہیں تمہارے بھائی کے حوالے کرنے سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا۔''

وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ پاکستان، لاہور..... اور اپنے گھر کی یاد آتی رہی۔ آنکھیں بھیگتی رہیں اور خشک ہوتی رہیں۔ اگلے روز صبح میں ناشتا لینے کے لیے نیچے گیا تو ایک بار پھر امین پر نظر پڑی۔ وہ موٹے نقوش والی قدرے فربہ اندام گوری کے ساتھ موجود تھا اور مزے سے اورنج جوس پی رہا تھا۔ دو تین اور جوڑے بھی اردگرد موجود تھے۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔

ہماری بات دوپہر کے وقت ہوئی۔ اس وقت امین اکیلا تھا، اس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ہم دونوں لابی کے ایک صوفے پر آبیٹھے۔ باہر آنے سے پہلے میں نے مہرو کو اچھی طرح تسلی دے دی تھی کہ میں ہوٹل کے اندر ہی موجود ہوں۔

امین کا نشہ اب اترا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات والے واقعات پر شرمندہ نظر آئے گا لیکن کوئی خاص شرمندگی مجھے اس کے چہرے پر نظر نہیں آئی۔ اس کے بجائے اس نے مجھے قدرے شوخ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ہارون بھائی! آپ تو چھپے رستم نکلے۔''

''کیوں، کیا ہوا ہے؟''

''نہیں..... کچھ برا تو نہیں ہوا۔ اگر کوئی لڑکی آپ کے ساتھ ہے تو اچھا ہی ہے۔ یہ سب کچھ یہاں کے ماحول کے مطابق ہی ہے۔'' اس نے اپنے میلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ اندھے کو سارے اندھے ہی نظر آتے ہیں۔ جو تم سمجھ رہے ہو، ویسا کچھ نہیں ہے۔ یہ کوئی اور عورت نہیں..... وہی سندھی لڑکی ہے جس نے بس میں ہمارے ساتھ سفر کیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے اس کا بھائی بھی ساتھ ہی تھا۔''

''اوہو..... تو یہ اس عراقی جعفر کی بہن ہے۔'' امین کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور وہ حیران نظر آنے لگا۔ ''لیکن ہارون صاحب! اس کا بھائی اور وہ رشتے دار نور بخش کہاں ہیں؟''

''تمہیں نہیں معلوم، وہاں بس سے اترنے کے بعد کیا ہوا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ سب کچھ تو بہت شرمندہ کرنے والا تھا۔ سمجھ ہی نہیں آئی، ایک دم کیا ہو گیا تھا جی۔ وہ لڑکے تو اس طرح پتھر مارنے لگے تھے جیسے ہم کوئی آوارہ جانور ہیں اور ان کے محلے میں گھس آئے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ گیا۔ میرے کندھے پر بھی ایک پتھر لگا تھا جی۔ میں ایک کوڑے دان کے پیچھے چھپ گیا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک چھوٹی گلی میں گھس گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ کسی نے سامنے سے مجھے پکڑا نہیں اور میں بڑی سڑک پر آ گیا..... اور آپ کے ساتھ کیا ہوا؟'' آخر میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''وہی کچھ جو دوسروں کے ساتھ ہوا۔'' میں نے کہا اور پھر اس واقعے کی مختصر روداد اسے سنا دی۔

پوری روداد سننے کے بعد وہ بولا۔ ''اب اس لڑکی کا کیا کریں گے آپ؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس کے پاس پاسپورٹ ہے اور نہ کوئی اور کاغذ۔ پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتا، نہ کسی اور ادارے سے رجوع کر سکتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے وہ..... اور ساتھ میں، میں خود بھی۔''

امین بولا۔ ''ویسے تہران میں دو تین سندھی فیملیوں کے پتے میرے پاس ہیں، اگر یہ لڑکی ان فیملیوں تک پہنچ جائے تو ہو سکتا ہے کہ اپنے وارثوں سے بھی مل جائے.....''

میں نے امین کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ نیت کا ٹھیک بندہ نہیں۔ وہ مجھے اس بات کے اشارے دے رہا تھا کہ وہ اس بے آسرا لڑکی کو اپنے ساتھ تہران لے جا سکتا ہے اور اس کے وارثوں تک پہنچانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سندھی قافلے کے لوگوں کی اگلی منزل تہران ہی تھی۔

میں نے کل رات امین کو جس حالت میں دیکھا تھا، اس کے بعد میں اس پر ہرگز اعتبار نہیں کر سکتا تھا..... اور مہرو کے سلسلے میں تو ہرگز نہیں۔ میں نے یہ موضوع ہی بدل دیا اور دیگر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ان دو چار دنوں میں ہی امین ان ہپی لوگوں کے ساتھ خوب گھل مل گیا تھا۔ اس کے منہ سے چرس کی ہلکی سی بو بھی آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عنقریب کسی برے چکر میں پھنسنے والا ہے۔ گفتگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ ویسے تو وہ کویت پہنچنے اور محنت مزدوری کرنے کا ارادہ رکھتا

ہے لیکن کبھی کبھی اسے یہ بھی لگتا ہے کہ ان مزدوریوں میں بندہ اور بندے کی عمر خرچ ہو کر رہ جاتی ہے۔

وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''ویسے ہارون بھائی! ایک بڑے منافع بخش کام کا پتا مجھے چلا ہے۔ ابھی میں خود ریسرچ کر رہا ہوں، کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو پھر آپ کو بھی بتاؤں گا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیسے بتاؤ گے، میں تو بغداد جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم نے خیر سے پہنچنا ہے کویت۔''

''لیکن ہارون بھائی! جانا تو میں نے بھی بغداد سے ہو کر ہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہاں دس پندرہ روز ہم رکیں گے بھی۔'' ''ہم'' سے اس کی مراد یقیناً اس کے لوفر ہی ہم سفر ہی تھے۔

اس نے پتلون کی ایک جیب میں سے بوسیدہ بٹوا نکالا اور پھر ایک پرچی پر ایک فون نمبر لکھ کر مجھے دیا۔ یہ کسی یوتھ ہاسٹل کا نمبر تھا۔ کہنے لگا۔ ''ہارون بھائی! بغداد میں آپ اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے رابطہ ہو جائے گا۔'' پھر ذرا چونک کر بولا۔ ''لیکن ہارون بھائی! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بغداد کیوں جا رہے ہیں آپ؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''وہاں میرا کوئی اپنا ہے۔''

''کوئی رشتے دار ہے؟''

''رشتے دار تو غم دیتے ہیں۔ وہ غم لینے والا ہے، درد بانٹنے والا ہے۔ بڑا غم گسار، بڑا مہربان۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے بہت سے دکھوں کا مداوا کرے گا اور میرا ہاتھ بھی پکڑے گا۔''

''اللہ کرے جی کہ آپ کی امیدیں پوری ہوں..... ویسے پردیس میں ایسی امیدیں کم ہی پوری ہوتی ہیں۔''

میں چپ رہا۔ اسے کیا جواب دیتا..... دیتا بھی تو شاید اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ میں عالی مرتبت حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی بات کر رہا تھا۔ وہ بغداد میں ہی مدفون تھے۔ ان کے مزار اور عالی شان مسجد کی تصویریں میں نے کئی بار دیکھی تھیں۔ اب وہی جگہ مجھے اپنی طرف کشش کر رہی تھی۔ میں غموں کے ایک ناقابلِ فہم گھیرے میں تھا۔ ایک ریلا سا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں کسی اللہ والے کے دستِ مہربان کی ضرورت مجھے بڑی شدت سے محسوس... ہو رہی تھی۔ میں کہیں بھی جانے سے پہلے، کسی بھی ملک کا رخ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت شیخ جیلانیؒ کے روضے پر جانا چاہتا تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ وہی بھدی سی سفید فام لڑکی دوبارہ نظر آئی جو کل رات جونک کی طرح امین سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ تھا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور امین سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اب میں اور مہرو تہران کی طرف محوِ سفر تھے۔ جرمنی کی شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس تھی جس میں باہر کی گرمی بالکل بے اثر ہو جاتی تھی۔ کسی رن وے کی طرح کشادہ اور صاف شفاف سڑک پر بس بڑے ہموار طریقے سے تیرتی چلی جا رہی تھی۔ مہرو مقامی لباس میں تھی۔ اس نے اپنا چہرہ حجاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ میرے پہلو میں بالکل خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تہران میں کچھ سندھی فیملیوں کے ایڈریس میرے پاس ہیں، ان میں دو فیملیاں نواب شاہ کی بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں سے اس کے وارثوں کا کچھ پتا چل جائے۔ یہ فیملیاں ایک ہی بڑی بلڈنگ میں رہتی تھیں اور یہ ایڈریس میں نے امین اکرم سے ہی لیا تھا۔

سڑک کی دونوں جانب ہمیں کہیں کوئی بڑا درخت نظر نہیں آیا۔ چھوٹے چھوٹے قصبے دکھائی دیتے تھے جو نہایت خوب صورت اور صاف ستھرے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ لوگوں نے جدید گھر اور شیشے کی نفیس دکانیں پیرس سے منگوا کر یہاں رکھ دی ہیں۔

راستے میں ایک جگہ بس کچھ دیر کے لیے رکی۔ میں اور مہرو بھی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ یہاں موسم بدلا ہوا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا راؤنڈ اباؤٹ تھا، جس کے اندر باغیچہ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں بہت سی درمیانی عمر کی ایرانی عورتیں بیٹھی اور لیٹی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھیں اور کچھ سو رہی تھیں۔ میں اور مہرو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ عورتیں اتنی بے فکری سے لیٹی ہوئی تھیں۔ مہرو کی نگاہیں شرمیلے انداز میں جھک گئیں۔ بہرحال یہ یہاں کا رواج تھا۔

ہم کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک ہوٹل میں داخل ہوئے تو جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بہت سے ایرانیوں کی میزوں پر بکروں وغیرہ کی ابلی ہوئی سریاں رکھی تھیں۔ وہ چھری کانٹے سے ان سریوں کو نوچ

نوچ کر کھا رہے تھے۔ ہلکی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔

''بابو سائیں امیر اول گھبرا رہا ہے۔'' مہرو نے کہا۔

میں اسے لے کر فوراً باہر نکل آیا۔ ایک اسٹال سے ہم نے دو چکن برگر لیے اور واپس بس میں آن بیٹھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی میں جب بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، مجھے وہ فقرے ضرور یاد آجاتے تھے جو میں نے اپنی مہندی کی رات اپنے کمرے میں سنے تھے۔ جب سے میں اس طویل سفر پر روانہ ہوا تھا، وہ فقرے مجھے دوبارہ سنائی نہیں دیے تھے اور نہ ہی وہ ہیولا نظر آیا تھا۔ جس نے پہلے مہندی کی رات اور پھر شادی کی شام مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اس کے باوجود پتا نہیں کیوں کھانا شروع کرتے ہوئے مجھے اس ہیولے کی اور ان فقروں کی یاد ضرور آتی تھی اور چند لمحوں کے لیے جسم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بات مہرو نے بھی نوٹ کی تھی اور ایک دو بار مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میں کھانا شروع کرتے ہوئے ایک دم چپ سا کیوں ہو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس کا کوئی معقول جواب اسے نہیں دے سکا تھا۔

ایک طویل سفر کے بعد ہماری بس عظیم الشان تہران کے مضافات میں پہنچ گئی۔ پہلے بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ نظر آئیں پھر شاندار عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دیکھ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ اہلِ تہران کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔ جابجا وسیع باغات اور آبی گزرگاہیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ باغات اور شاہراہوں پر جگہ جگہ شاہ ایران کے مجسمے نصب تھے۔ جوں جوں ہم تہران کے قریب پہنچتے گئے، عمارتوں کے نقشے بدلتے گئے اور ان کی بلندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان فلک بوس عمارتوں کے پس منظر میں پہاڑ تھے اور دور برفیلی چوٹیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ ہم جیسے رنگ و بو کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔

بس سے اترے تو شام ہو چکی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر پیدل ہی چلتے رہے۔ پھر ایک شاندار باغیچے میں بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ہمیں کوئی چھوٹا سا ہوٹل تلاش کرنا تھا۔ وہیں باغیچے میں بیٹھے بیٹھے مہرو بولی۔ ''بابو سائیں! آپ تھک گئے ہیں تو میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔''

میں سٹپٹا گیا۔ ''تمہاری عقل کام کر رہی ہے یا نہیں؟ کیا میرا اور اپنا تماشا بنانا چاہتی ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہم پھر چل پڑے۔ ہم دو مسکینوں کی طرح تھے جو انتہائی خوش لباس لوگوں اور نہایت قیمتی گاڑیوں والے ایک ''پیرس نما شہر'' میں گھوم رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ایک اندرونی سڑک پر ہمیں اپنے بجٹ کے مطابق ایک سستا سا ہوٹل مل گیا۔ یہاں اندراج کے لیے پھر میرا پاسپورٹ استعمال ہوا۔

یہاں کمرے میں پھر وہی مسئلہ تھا۔ ایک ہی ڈبل بیڈ تھا۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود مہرو نے یہاں بھی وہی ترتیب بنائی۔ یعنی خود لکڑی کے فرش پر چادر بچھالی اور مجھے بستر پر سلایا۔ کافی تھکاوٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم سو گئے۔ آنکھ کھلی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مہرو کا چہرہ بھی بھوک کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ہم نے کمرا لاک کیا اور نکل آئے۔ تہران رنگوں اور روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ یہ سستا علاقہ تھا اس کے باوجود لاہور کے مال روڈ یا میکلوڈ روڈ سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا..... ایک جگہ ہمیں ایک ریڑھی پر کھانے پینے کی اشیا نظر آئیں۔ ہم نے

سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای

WELCOME BOOK SHOP

ویلکم بک شاپ

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی

پی او بکس: 27869 کراما، دبئی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 052-9695984

ای میل: welbooks@emirates.net.ae

دوبرگر اور لسی کے دو گلاس لیے اور چل پڑے۔ کھاتے رہے اور ساتھ ساتھ اردگرد کے مناظر دیکھتے رہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی ایک ہی جیسی عمارتیں اور سڑکیں نظر آرہی تھیں۔

اگلے دو تین منٹ کافی پریشانی میں گزرے۔ مہرو نے پوچھا۔ ''کیا ہوا بابو سائیں؟''

''لگتا ہے ہم راستہ بھول گئے ہیں۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ منمنائی۔

میں کیا جواب دیتا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ذہن پر زور دیا اور پھر اندازے سے ایک راستہ منتخب کرکے اس پر چل پڑا۔ ہم قریباً ایک گھنٹے تک جوتیاں چٹخاتے رہے لیکن کہیں کوئی جانی پہچانی عمارت نظر آئی اور نہ راستہ۔ ہم گم ہو چکے تھے۔ آخر میں ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھے لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گیا اور سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ تھکن اور پریشانی سے برا حال تھا۔ یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ میرا پاسپورٹ وغیرہ بھی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ سنگین غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ ہوٹل سے نکلتے وقت میں نے ہوٹل کا نام غور سے دیکھا اور نہ ہی ہوٹل کا کارڈ اپنی جیب میں رکھا۔ ہم کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔

''یا اللہ اب میں کیا کروں؟'' میں نے دل ہی دل میں پکارا۔

بے بسی کا یہ عالم تھا کہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اگر ہم وہ ہوٹل نہ ڈھونڈ سکے تو کیا ہوگا؟ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹا مزید تہران کی سڑکوں پر گھومے اور بالکل نڈھال ہوگئے۔ شدید پریشانی کے سبب میرے بازو میں درد ہونے لگا..... مجھے یوں محسوس ہوا کہ بے ہوش ہوکر گر جاؤں گا۔ سب سے زیادہ فکر مجھے اپنے پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ کی تھی۔

مہرو نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''اب ہم کیا کریں گے بابو سائیں؟''

میں نے جھلا کر جواب دیا۔ ''اب ہم نے کیا کرنا ہے۔ جو کریں گے یہاں کے پولیس والے ہی کریں گے۔ ہمیں اٹھا کر کہیں جیل میں ڈال دیں گے اور ہم سڑتے رہیں گے وہیں پر۔''

''بابو سائیں! آپ کسی اچھے بندے سے بات کرکے دیکھو، شاید وہ ہماری کوئی مدد کرسکے۔''

''کس سے بات کروں؟ کون سمجھے گا یہاں ہماری بات؟'' میں نے تقریباً چلا کر کہا۔

''بابو سائیں! مجھ پر کیوں غصہ ہوتے ہیں، میرا کیا قصور ہے؟''

''ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔ میں ہی گناہ گار ہوں۔ جوتے مارو میرے سر پر۔ میں نے ہی تمہیں اپنے ساتھ چمٹایا ہوا ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لیے لیے پھر رہا ہوں۔ مجھے ہی شوق چڑھا ہوا ہے تمہارے ساتھ سیر سپاٹے کرنے کا۔ بے وقوف کہیں کی..... الو کی پٹھی..... میں نے کہا بھی تھا کہ کمرے میں رہ..... میں کھانے کے لیے کچھ لے کر آجاتا ہوں..... لیکن تو کسی کی سنتی بھی ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب تیری وجہ سے..... سب تیری وجہ سے ہے۔'' میں دہاڑ کر بولا۔

قریب سے گزرتے ہوئے دو ایرانی چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ یہ رات ایک بجے کا عمل تھا۔ ویک اینڈ کے باوجود سڑکوں پر رش کم ہوگیا تھا۔ میری ڈانٹ سن کر وہ بالکل گم صم ہوگئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حجاب کے اندر سسکیاں لے رہی ہے۔

میں اٹھ کر ایک بار پھر چل دیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ بڑے اذیت ناک لمحے تھے۔ میں انہیں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ اچانک مجھے عقب سے مہرو کی آواز آئی۔ وہ کراہ کر پہلو کے بل پختہ سڑک پر گری تھی۔ دراصل یہ موٹر سائیکل پر سوار دو اوباش لڑکے تھے۔ انہوں نے مہرو سے بدتمیزی کی تھی اور ان کا دھکا لگنے سے وہ گر گئی تھی۔ اب وہ موڑ کاٹ کر راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ یہ سارا منظر ایک سیکنڈ کے اندر اندر میری نظروں سے گزر گیا اور میری سمجھ میں بھی آگیا۔ میں پہلے ہی غصے سے بھنایا ہوا تھا۔ نتیجے سے بے پروا ہوکر میں موٹر سائیکل کے پیچھے بھاگا۔ ساتھ ہی میں چنگھاڑا تھا۔ ''ٹھہرو حرامزادو۔''

مجھے خود پر جھپٹتے دیکھ کر موٹر سائیکل چلانے والا بوکھلا گیا۔ موٹر سائیکل ایک بڑے ڈسٹ بن سے ٹکرائی اور بری طرح ڈگمگا گئی۔ پیچھے بیٹھا ہوا لڑکا اس پر سے گر گیا لیکن اس کا ساتھی بھاگ نکلا۔ یہ ایک دبلا پتلا لڑکا لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی اٹھ کر بھاگ نکلتا، میں نے اسے چھاپ لیا۔ اس نے فارسی میں مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور میرے سینے پر سر کی ٹکر مار کر مجھے گرانا چاہا۔ یہ سارے داؤ پیچ میرے آزمائے ہوئے تھے۔ میں نے نہ صرف اس کا یہ وار بچایا بلکہ اس کی گردن پر ایسا زوردار جھانپڑ رسید کیا کہ وہ چار پانچ میٹر تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میری ٹانگ اس کے

سینے پر پڑی اور وہ ڈسٹ بن سے ٹکرا کر پھول دار پودوں میں گرا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا واسطہ کسی کمزور بندے سے نہیں پڑا۔ وہ پھولوں والی کیاری سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا لیکن مہرو نے میرے راستے میں آکر مجھے روک لیا۔ ''نہیں بابو سائیں..... جانے دیں..... دفع ہوگیا ہے..... جانے دیں۔''

یہ ایک چھوٹی سی نیم تاریک سڑک تھی۔ بس چند دکانوں کے اندر ہی روشنی نظر آرہی تھی۔ اردگرد کسی شخص نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ میں نے اپنا لباس درست کیا..... مہرو سے اس کی خیریت پوچھی..... اور تب ایک بار پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ اس بار میں مہرو کے آگے آگے چلنے کے بجائے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب میرا رخ قدرے بڑی اور روشن سڑک کی طرف تھا۔ مہرو کچھ مزید سہم گئی تھی۔

یوں لگتا تھا کہ چل چل کر اب ہم دونوں کی ہمت جواب دینے والی ہے۔ اچانک مہرو نے ایک طرف انگلی اٹھائی اور بولی۔ ''بابو سائیں..... وہ دیکھیں جرا۔ وہ کون ہے؟''

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا اور یکایک دل خوشی سے سینے میں اچھل پڑا..... یہ ایک لمبے قد کا انگریز تھا اور اسے میں نے اسی ہوٹل میں دیکھا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو..... ہاؤ آر یو۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ میں کیسا ہوں۔ میں نے دردناک لہجے میں اسے بتایا کہ میں ہوٹل کا راستہ بھول گیا ہوں اور اپنی ساتھی کے ساتھ قریباً تین گھنٹے سے دربدر پھر رہا ہوں۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے بیئر کا ایک طویل گھونٹ لیا اور مسکرا کر انگلش میں بولا۔ ''مجھے نہیں پتا تم کہاں رہے ہو..... لیکن اب تم اپنے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہو۔ وہ سامنے دیکھو۔ یہی ہوٹل ہے۔''

میں حیرت سے گنگ ہوکر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ہوٹل کا عقبی دروازہ ہے۔ وہ سفید رنگ والا بڑا دروازہ سامنے کی طرف ہے۔''

اس نے مجھے اور مہرو کو ساتھ لیا اور تیس چالیس قدم چل کر سامنے کی طرف آگیا۔ میں ہوٹل کا سفید بڑا دروازہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں لگا کہ خوشی سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے۔ ہم بوسیدہ لباس والے اس دراز قد گورے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہ بہ ظاہر شائستہ نظر آتا تھا لیکن گاہے بگاہے چور نظروں سے مہرو کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس زمانے کا ایران کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھا۔ چلتی پھرتی عورتوں کو ایسے ہی بے باک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ گورا..... امریکن ہے اور اکیلا ہی مڈل ایسٹ کی سیاحت کو نکلا ہوا ہے۔ اس کا نام اینڈرسن معلوم ہوا۔

میں اپنے کمرے میں یوں آیا جیسے پانی سے بچھڑی ہوئی مچھلی واپس تالاب میں آتی ہے۔ سب سے پہلے الماری کا اندرونی خانہ کھول کر اپنا پاسپورٹ اور نقدی وغیرہ چیک کی..... پاسپورٹ کو باقاعدہ ہونٹوں سے لگا کر چوما اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں احتیاط کے ساتھ رکھ لیا۔

مہرو اپنے فرشی بستر پر کسی مجرم کی طرح گم صم بیٹھی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ راستے میں میری طرف سے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت پریشانی ہی اتنی تھی کہ میں اپنے لب و لہجے پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ جائے۔ وہ پہلے تو جھجکتی رہی لیکن جب میں نے ذرا تحکم سے کہا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے مہرو! میں نے تم سے سخت لہجے میں بات کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اس کے لیے معاف کردو۔''

وہ ایک دم تڑپ سی گئی۔ ''آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں بابو سائیں! کیوں مجھ کو گناہ گار کر رہے ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ میں نے اپنی مصیبتیں آپ کے گلے میں ڈال دی ہیں۔ میرے لیکھ ہی ایسے ہیں۔ اللہ سائیں کرے میرا پاپ مجھے مل جائے..... یا پھر ویسے ہی مجھے موت آجائے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں نے تمہیں رلایا ہے اور غلطی رونے والے کی نہیں ہوتی رلانے والے کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔ بولو معاف کیا ہے یا نہیں؟''

وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ''بابو سائیں! کہاں آپ کی شان..... کہاں میں گلیوں میں رلنے والی نیچ ذات..... آپ مجھے اتنا شرمندہ نہ کریں سائیں کہ میری جان ہی چلی جائے۔''

میں نے اسے اٹھا کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ تسلی آمیز

انداز میں اس کا کندھا تھپکا اور اسے نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوئی موئی کے پھول جیسی تھی۔ جلدی سے مرجھا جاتی اور جلدی سے کھل بھی جاتی تھی۔ اس نے اسکارف کے پلو سے اپنی نم آنکھیں صاف کرلیں۔ میں نے کہا۔ ''چلو اب دوبارہ دوستی ہوگئی ہے۔ اس خوشی میں کل دوپہر تمہیں ہوٹل سے اچھا سا کھانا کھلواؤں گا۔ تمہاری پسندیدہ بریانی.....''

وہ کچھ دیر سوچ کر بولی۔ ''نہیں..... بابو سائیں! آپ کے پاس پیسے کم ہیں۔ ہم فضول خرچی نہیں کریں گے۔ ہم بریانی کھائیں گے لیکن خود پکا کر۔ آپ مجھے دو چار چیزیں لادیں، میں آپ کو سندھی بریانی کھلاؤں گی۔''

''پکاؤ گی کہاں؟''

''یہاں ساتھ والے کمرے کے پیچھے باورچی خانہ بھی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے بابو سائیں! بڑا صاف ستھرا ہے۔ برتن وغیرہ بھی ہیں۔''

''نہیں۔ میں تمہیں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنے دوں گا۔''

''نہیں بابو سائیں! آپ کے لیے پکا کر مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مجھے بہت جیادہ اچھا لگے گا۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

اس کا انداز بالکل سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے رویے میں کہیں کوئی ذرا سی آلائش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ سے بالکل ایسے ہی بات کرتی تھی جیسے اپنے گھر کے دیگر افراد سے کرتی ہوگی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے لیکن اب سو جاؤ۔ رات بہت زیادہ ہوچکی ہے۔''

وہ بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے فرشی بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی گردن پر کھرونچے کا سرخ نشان ابھی تک نظر آرہا تھا۔ یہ نشان انہی اوباش لڑکوں کی بدتمیزی کا نتیجہ تھا جو راستے میں ہم سے ٹکرائے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ صبح ناشتے کے بعد پہلا کام یہی کروں گا کہ ان سندھی فیملیز کا سراغ لگاؤں جو یہاں تہران میں موجود تھیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ مہرو جلد از جلد اپنے وارثوں کے پاس پہنچ جائے یا کم از کم ایسے قابل بھروسا لوگوں کے پاس پہنچ جائے جو اسے اس کے وارثوں تک پہنچا سکیں۔

صبح مہرو کو سمجھا بجھا کر میں ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ میں نے ہوٹل کا کارڈ جیب میں نہ رکھنے والی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ پاسپورٹ بھی میرے پاس ہی تھا۔ امین کا دیا ہوا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے دو بسیں بدلیں اور پھر قریباً تین کلومیٹر پیدل چل کر اس ایڈریس تک جا پہنچا۔ یہ ایک سرکاری دفتر کی عمارت تھی۔ یہ جان کر مجھے از حد حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی سندھی یا پاکستانی فیملی قیام پذیر نہیں تھی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا تھا۔ یہاں بس فرسٹ فلور پر بیرون ملک جانے والوں کو انجکشن وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ امین نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ اس سے امین کی نیت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ جاتے اور میں اسے اس کے حوالے کردیتا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

میں تھکا ہارا سہ پہر کے وقت واپس ہوٹل پہنچا۔ اس بات کا افسوس تو تھا کہ اس کے والی وارثوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا لیکن اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ ابھی وہ میری ہم سفر تھی اور کسی غیر یقینی صورتِ حال کا شکار نہیں تھی۔ ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی یہاں کسی سندھی فیملی کا سراغ نہیں ملا۔ وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

اس نے کمرے کو آئینے کی طرح صاف ستھرا کردیا تھا۔ ہر چیز قرینے سے اس کی جگہ پر رکھی تھی۔ میں ہوٹل آتے ہوئے مہرو کی بتائی ہوئی اشیا لے آیا تھا۔ یہ اسپیشل سندھی بریانی کی چیزیں تھیں۔ چاول، چکن، آئل، پیاز، لہسن اور مسالے وغیرہ۔ بریانی اس نے رات کو پکانی تھی، اس لیے دوپہر کی پیٹ پوجا کے لیے میں دو بڑے برگر اور لسی کی بوتلیں لے آیا تھا۔

کھانا کھاتے کھاتے وہ اچانک بولی۔ ''آپ کی شادی ہوئی ہے بابو سائیں؟''

''ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کتنے بچے ہیں؟''

''بچہ ابھی کوئی نہیں۔''

''آپ کی زال کیسی ہے سائیں؟'' (زال یعنی بیوی)

''بہت اچھی..... بہت نیک۔''

''آپ اسے چھوڑ کر روزی کمانے نکل آئے ہیں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہوگی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ہاں، بہت یاد کرتی ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں میں دلہن بنی عارفہ کا چہرہ گھوم گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی تک حجلۂ عروسی میں بیٹھی منتظر نظروں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ میرے قدموں کی چاپ کا انتظار کررہی ہے۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہاری شادی کب ہورہی ہے؟''

اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں ایک دم رنگ سے بکھر گئے۔ شرما کر بولی۔ ''مجھے کیا پتا جی..... میرے بڑوں کو پتا ہوگا یا پھر میرے پا کو پتا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تمہارا اپنا کوئی خیال نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے اردگرد کوئی ایسا نہیں جو تمہارے ساتھ شادی کے لیے مناسب ہو؟''

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نہیں بابو سائیں۔'' میں نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم ہنسی کیوں ہو؟''

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بس ایسے ہی ہنسی نکل گئی بابو سائیں۔''

''ہنسی ایسے ہی تو نہیں نکلتی۔ کوئی وجہ ہوتی ہے۔''

''بس نکلتی ہوگئی جی۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے اسے اس بارے میں تھوڑا سا کریدا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے تائے چاچے کے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا ہے جو اسے پسند کرتا ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے لیکن اسے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ویسے بھی مہرو کی معصومیت ایسے معاملوں میں حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

عصر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ بڑے عرصے بعد دل چاہا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔ میرے اندر جو جان لیوا ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی، وہ کسی روحانی سہارے کا تقاضا کرتی تھی اور مصیبت میں خدا سے بڑا سہارا اور کون ہوسکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ ساتھ مہرو کے لیے بھی دعا مانگنا چاہتا تھا کہ اس کا بھائی جلد سے جلد مل جائے اور وہ اس دیارِ غیر میں کسی بڑی مصیبت کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ اس سے بڑی مصیبت کیا تھی کہ اس کے پاس سفری کاغذات تک نہیں تھے۔ وہ کسی بھی وقت حوالات میں پہنچ سکتی تھی۔

مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگیا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرا تو میری نظر سب سے پہلے مہرو کے بھائی جعفر پر پڑی۔ جعفر کے ساتھ ہی سفید ڈاڑھی والا نور بخش نماز پڑھ رہا تھا۔ نور بخش کے ساتھ ہی ایک اور ادھیڑ عمر سندھی تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی کے بجائے بڑی سی پگڑی تھی۔ یہی لوگ مہرو کے وارث تھے۔ مجھے لگا کہ دعا مانگنے سے پہلے ہی دعا قبول ہوگئی ہے۔ سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ میں اٹھ کر اگلی صف تک پہنچا اور دراز قد جعفر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے..... آخری رنگ میں شدید حیرانی کے ساتھ ساتھ غصے کی جھلک بھی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ لنگڑاتا ہوا آٹھ دس قدم پیچھے آگیا۔ باقی دونوں افراد بھی ہمارے پیچھے آئے۔ جعفر تیز تیز کچھ بولنے لگا۔ مسجد کے صحن میں اس کی آواز بلند ہوتی چلی جارہی تھی۔

وہ یقیناً مہرو کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مہرو میرے پاس ہے اور خیریت سے ہے لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور چلانے لگا۔ وہ عربی میں کہیں کہیں اردو کے لفظ بھی بول جاتا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کروں۔

عمر رسیدہ نور بخش میرے اور جعفر کے درمیان آیا۔ اس نے جعفر کو بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ میں نے نور بخش سے کہا۔ ''تایا اس کو سنبھالو۔ میں اسے بتا بھی رہا ہوں کہ مہرو میرے پاس ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔''

نور بخش کی اردو بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ بہرحال وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے جعفر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''کہاں ہے ہماری دھی (بیٹی) ہمیں جلدی سے اس کے پاس لے جاؤ۔ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم دیوانہ ہوگیا ہے سائیں۔''

پگڑی والا سندھی مجھے زاہدان والی بس میں نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً یہ یہاں کا کوئی مقامی سندھی ہی تھا۔ میں ان تینوں افراد کو لے کر ہوٹل میں پہنچا۔ مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی تو مہرو نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی اور وہ بریانی کے لیے پیاز وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ اپنے سامنے اپنے بھائی کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور خوشی کی یورش ایک ساتھ نظر آئی۔ پھر وہ چلا کر اپنے بھائی جعفر سے لپٹ گئی۔ وہ بلند آواز میں رونے لگی تھی۔ عمر رسیدہ نور بخش مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

مہرو کے رونے سے دراز قد جعفر نے پتا نہیں کیا مطلب لیا۔ اس کے لمبوترے چہرے پر میرے لیے ایک بار پھر طیش کی لہر سی دکھائی دینے لگی۔ بہرحال اگلے چار پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہوگیا۔ مہرو نے جعفر اور نور بخش کو تفصیل سے بتایا کہ میں نے اس سے کیا سلوک کیا ہے اور اس کے لیے کس کس طرح خود کو مصیبت میں ڈالا ہے۔

دونوں بزرگ میرے بے حد شکر گزار نظر آنے لگے تھے۔ جعفر کی نظریں بھی کچھ جھکی جھکی تھیں۔ نور بخش نے مجھے بتایا کہ انہیں زاہدان میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ لڑکوں کے

حملے کے بعد میں اور مہرو اکٹھے ہی بھاگے تھے۔ وہ تین چار دن زاہدان میں ہر ممکنہ جگہ پر مجھے اور مہرو کو تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس مسافر سرائے میں بھی پہنچے جہاں میں نے اور مہرو نے دو دن قیام کیا تھا لیکن جعفر اور نور بخش کے پہنچنے تک ہم سرائے سے ہوٹل شفٹ ہو چکے تھے۔ بہرحال جعفر وغیرہ کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ہم زاہدان سے تہران روانہ ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ وہ ہم سے ایک دن پہلے ہی یہاں تہران پہنچے تھے۔

میں نے ان لوگوں کو چائے وغیرہ پلائی۔ میں انہیں کھانا بھی کھلانا چاہتا تھا لیکن انہیں جلدی تھی۔ وہ تہران کے مضافات میں ٹھہرے ہوئے تھے اور آخری بس روانہ ہونے سے پہلے بس اسٹینڈ پہنچنا چاہتے تھے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ مہرو سمیت مجھ سے رخصت ہو رہے تھے۔ دونوں بزرگوں نے مجھے بار بار گلے سے لگایا اور شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ جعفر کو بھی میرے ساتھ ہاتھ ملانا پڑا اور شکریے کا لفظ کہنا پڑا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا یا شاید مسکراتا ہی نہیں تھا۔ ایک طرح سے یہ دوسرا احسان تھا جو میں نے اس پر کیا تھا۔ پہلا احسان وہ تھا جب میں نے تفتان بارڈر پر، ریت میں دبے ہوئے شکنجے سے اس کی جان چھڑائی تھی، ورنہ عین ممکن تھا کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی ہی ٹوٹ جاتی۔ اس کا یہ زخم اب کافی حد تک بہتر تھا۔ دوسرے احسان کو میں احسان تو نہیں کہہ سکتا، یہ ایک اخلاقی فرض تھا جو میں نے پورا کیا اور مہرو کو بخیر و عافیت اس تک پہنچایا۔ اس میں اللہ نے بھی بہت مدد کی..... خانۂ خدا میں نماز ادا کرتے ہوئے ہمارا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

وقتِ رخصت مہرو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ بابو سائیں۔'' اس نے کہا اور نگاہیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہیں میرے پاؤں کو چھو رہی تھیں۔ وہ جیسے ایک خاموش ادا کے ساتھ خود بھی میرے پاؤں چھو رہی تھی۔ ایک عجیب عقیدت ایک انوکھا سا احترام تھا اس کے انداز میں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ میں گناہ گار سا بندہ اتنے احترام کے قابل تو نہیں تھا اور پھر وہ چلی گئی۔ زندگی کے سفر میں لوگ ایسے ہی ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ شب و روز کی مسافت کو اگر ریل گاڑی سے تشبیہہ دی جاتی ہے تو کچھ غلط نہیں دی جاتی۔

سامنے میز پر چنے ہوئے چاول پڑے تھے۔ کٹا ہوا پیاز اور لہسن وغیرہ پڑا تھا۔ میں نے یہ ساری چیزیں سمیٹ کر ایک شاپر میں ڈالیں اور ہوٹل کے ایک ملازم کو دے دیں۔

اگلے روز کچھ اداسی سی رہی۔ ویک اینڈ گزرنے کے بعد ہوٹل میں بھی بہت کم مہمان رہ گئے تھے۔ ہاں وہ امریکی وہیں تھا جو کل رات ہمیں سڑک پر ملا تھا اور ہم اس کی مدد سے اپنے ہوٹل کو پہچان سکے تھے۔ ناشتے کے بعد میں وقت گزاری کے لیے اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اینڈرسن نامی اس امریکن کو بتایا کہ میں آج کل شدید الجھن اور پریشانی کا شکار ہوں اور سکون حاصل کرنے کے لیے بغداد کے ایک بہت بڑے ولی اللہ کے روضے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اینڈرسن نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ قریباً اٹھارہ سال سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ وہ اردو بڑی روانی سے بولتا تھا۔ ہم تادیر لابی میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہے۔ میں نے اینڈرسن سے کہا۔ ''آپ نے قریباً ساری دنیا گھومی ہے۔ آپ کو سب سے اچھے لوگ کہاں کے لگے؟''

وہ بولا۔ ''ایک قوم کی حیثیت سے، میری رائے کے مطابق سب سے سخت مزاج لوگ ایرانی اور مصری ہیں۔ یہ اپنے خیالات کے حوالے سے بے حد کرخت اور کٹر محسوس ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پاکستانیوں کے بارے میں آپ جناب کا کیا خیال ہے؟''

وہ بولا۔ ''میری رائے میں یہ اچھی اور سادہ قوم ہے۔ خوش اخلاق بھی ہے..... لیکن کچھ پاکستانی مجھے شریر بھی محسوس ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

اینڈرسن کے ساتھ اچھی گپ شپ رہی۔ دوپہر کو میں کھانا کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں گیا۔ وہاں بھی سری پائے بڑے ذوق و شوق سے کھائے جا رہے تھے..... اور بغیر روٹی کے کھائے جا رہے تھے۔ یہاں پلیٹوں پر مختلف بزرگوں کی تصویریں بنی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ لوگ ان تصویروں والی پلیٹوں میں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا اور ایک خوانچے والے سے دال روٹی کھا کر پیٹ پوجا کر لی۔ تہران باغات اور پھولوں کا شہر تھا۔ گلی کوچے جنت کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اطراف کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والا شفاف پانی، آبی گزرگاہوں سے گزرتا تھا اور تہران کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ باشندے..... شہر سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آتے تھے۔ چاق و چوبند پولیس والے جدید بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکلز پر دندناتے پھرتے تھے اور کسی کو قانون شکنی کی

جرأت نہیں تھی۔ مجھے مہرو کا خیال آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ راستے میں ایک نہایت خوب صورت مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کر میں ہوٹل پہنچا تو امریکن اینڈرسن گھومنے پھرنے کے لیے باہر جارہا تھا۔ ہم نے دور ہی سے علیک سلیک کی۔

کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے اور ٹی وی دیکھنے کے بعد میں سوگیا۔ دوبارہ میری آنکھ ایک شور سے کھلی۔ گھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی کھول کر دیکھا۔ معمول کے مطابق ہوٹل کا مین دروازہ بند ہو چکا تھا۔ امریکن اینڈرسن باہر تھا اور شور مچا رہا تھا کہ دروازہ کھولا جائے۔ ایرانی گارڈ بضد تھا کہ ٹائم اوپر ہو چکا ہے اب وہ کسی صورت دروازہ نہیں کھولے گا۔ امریکن تقریباً آدھ گھنٹے تک شور مچاتا رہا اور انگریزی میں چلاتا رہا لیکن ایرانی گارڈ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ آخر گارڈ اپنے کیبن میں واپس چلا گیا اور امریکن بکتا جھکتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

صبح سات بجے کے لگ بھگ جب ہوٹل کا دروازہ کھلا تو امریکن کو اندر آنا نصیب ہوا۔ وہ ساری رات نہ جانے کہاں خجل خوار ہوتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں ایرانی گارڈ کی ثابت قدمی پر خوش ہوا۔ اس نے امریکی بہادر کی سنگین دھمکیاں سننے کے باوجود اپنے اصول سے انحراف نہیں کیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''مسٹر اینڈرسن! تم ٹھیک ہی کہتے ہو، ایرانی قوم دنیا کی ''سخت ترین مزاج'' والی قوموں میں سے ایک ہے۔''

☆☆☆

ٹھیک تین روز بعد میں بھرے پرے تہران کو اور اس کی رونقوں کو خیرآباد کہہ کر عراق کا رخ کررہا تھا۔ اپنے چند ہم سفروں کے ساتھ میں ایک آرام دہ بس میں سوار تھا۔ دو روز پہلے ہی ہمارے پاسپورٹس پر عراق کے ویزے... بہ آسانی لگ گئے تھے۔ ویزے لگنے کے بعد اور ٹکٹ خریدنے کے بعد اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اب ایک نیا سفر تھا، نئی سرزمین تھی، نئے لوگ، نیا جہاں۔ تاریخ اس خطے کے تذکروں سے بھری پڑی تھی۔ امیر معاویہ سے لے کر صلاح الدین ایوبی تک اور سلاطین عباسیہ سے لے کر سلاطین عثمانیہ تک نہ جانے کتنے فرماں روا یہاں آئے اور گئے۔ کتنی سلطنتیں آباد اور برباد ہوئیں.....

ہماری بس بڑی تیز رفتاری سے پہلے بلند وبالا پہاڑوں پر چڑھی اور ہمیں شدید سردی کا مزہ چکھایا..... پھر بتدریج نیچے اتری..... اور اترتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ریگستانی علاقہ شروع ہوگیا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ اب ہم عراق میں داخل ہونے والے ہیں۔ بلندی سے نشیب کا یہ سفر قریباً آٹھ دس گھنٹے پر مشتمل تھا۔ آخر بالکل خشک میدانی علاقہ آگیا..... آب وہوا یکسر بدل گئی۔ تھوڑے مزید سفر کے بعد ہم ایران عراق بارڈر پر پہنچے۔ بارڈر پر ایک طرف شاہ ایران کا بلند وبالا مجسمہ تھا اور دوسری طرف صدر صدام حسین کا۔ وہ جیسے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے..... ایک کہہ رہا تھا، میرے پاس زیادہ ''تیل'' ہے، دوسرا کہہ رہا تھا میرے پاس زیادہ ''ترقی'' ہے۔

گاڑی یہاں رک گئی۔ ہمارے کاغذات وغیرہ چیک ہوئے۔ تب ہم ایک عراقی بس میں سوار ہوئے اور عراق میں داخل ہوگئے۔ عراقی بس میں بیٹھ کر پاکستان کی کھٹارا بسوں کی یاد تازہ ہوگئی اور صرف بس ہی نہیں اردگرد کے سارے مناظر بھی تبدیل ہوگئے تھے۔ علاقہ خشک اور بنجر۔ بغیر فٹ پاتھ کے خستہ حال سڑکیں، بوسیدہ مکانات، کچھ یہی حال لوگوں کا بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عراقیوں کی اکثریت نے لنڈے کے کپڑے زیب تن کررکھے ہیں۔ ہماری بس چند گھنٹوں تک خشک میدانی علاقوں میں دھول اڑاتی رہی اور آخر بغداد پہنچ گئی۔ بغداد کہانیوں اور داستانوں کا شہر جو لاتعداد مرتبہ اجڑا اور پھر آباد ہوا۔ بغداد سے میرا پہلا تعارف بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں مثلاً بغداد کا چور اور الہ دین وغیرہ سے ہوا تھا۔ اب وہی تصوراتی شہر میرے سامنے تھا اور میں اسے اپنی آنکھوں سے جیتی جاگتی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ بغداد کی مساجد سے شام کی اذان بلند ہورہی تھی۔

ہماری بس شہر کے ایک مضافاتی اسٹینڈ پر رکی تھی۔ میں نے راہ گیروں سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کا پتا پوچھا اور پیدل ہی چل دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا لمبا ثابت ہوگا۔ میں گنجان علاقے میں داخل ہوا تو اصل راستے سے ہٹ گیا۔ پرانے شہر کی طرف نکل گیا۔ پرانے بازار، محرابی دروازے، قدیم بالکونیاں اور تنگ راستوں پر چلتے پھرتے لوگ۔ سب کچھ کہانیوں کے مناظر جیسا لگا۔

بہت زیادہ چلنے اور تھک کر چور ہونے کے بعد میں رات کوئی ساڑھے گیارہ بجے غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے پر پہنچا۔ ایک عجیب طرح کے روحانی احساس نے مجھے چاروں طرف سے گھیرلیا۔ میں یہ بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا کہ میں زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ نماز پڑھنے میں بھی باقاعدگی نہیں تھی اور اللہ والوں کے پاس یا ان کے مزارات

پر جانے کا تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا..... لیکن پچھلے دنوں میں جن سنگین حالات سے گزرا تھا اور میرے اندر جو ٹوٹ پھوٹ مچی تھی اس نے مجھے، اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ کیا تھا اور مجھے روحانی سہاروں کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقد مبارک کو دیکھ کر میرے دکھ یلغار کر کے میری آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ جیسے کوئی دکھوں کا مارا بچہ اپنے کسی شفیق بزرگ کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے، میں بھی رو دیا۔ ہچکیوں اور آہوں سے میرا سینہ دہلنے لگا۔ نہ جانے میں کتنی دیر اسی طرح اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑتا رہا۔ آخر دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، مزار کا دروازہ رات گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ بند دروازے کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میرے اندر کا وجدانی جوش مجھے اندر جانے کے لیے اکسا رہا تھا۔ میں نے آہنی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد ایک خادم نظر آیا۔ اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ بال منتشر تھے، اس نے عربی میں کچھ کہا۔ غالباً یہی پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟

میں نے اشاروں کی زبان اور انگلش کو ملا جلا کر اسے بتایا۔ ''میں ایک مسافر ہوں۔ یہاں رات گزارنا چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں یا پھر چوری کی نیت رکھتا ہوں۔ اس نے کرخت لہجے میں عربی بولی اور مجھے بتایا کہ وہ اس وقت میرے لیے دروازہ نہیں کھول سکتا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی واپس چلا گیا۔

میری دلی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ آنسو مسلسل آنکھوں سے رستے چلے جا رہے تھے۔ میں کسی دھتکارے ہوئے بھک منگے کی طرح باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ بدن تھکن سے چور تھا۔ رات تو کسی طرح گزارنا ہی تھی۔ اردگرد تاریکی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں مجھے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے آبائی قبرستان کا چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ اگر فٹ پاتھ پر ہی بیٹھا رہتا تو گشتی پولیس والے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر سکتے تھے۔ میں اٹھا اور غنودگی کی سی حالت میں چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا۔ رات کے اس پہر یہ شہر خموشاں کچھ اور بھی خاموش و سنسان نظر آ رہا تھا۔ قبروں کی طویل قطاریں تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں وہ قبریں نمایاں نظر آتی تھیں جن پر سنگِ مرمر لگا ہوا تھا۔ یہ ڈرانے والے مناظر تھے لیکن موت سے بڑا ڈر کس چیز کا ہوتا ہے..... اور میں تو جیسے زندگی اور موت کے احساس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ شاید میں اسی وقت مر گیا تھا جب اپنے گھر کی چھت پر میرے اندر کی ساری روشنیاں اچانک بجھی تھیں اور میں اپنی منتظر دلہن کو چھوڑ کر نکل آیا تھا۔

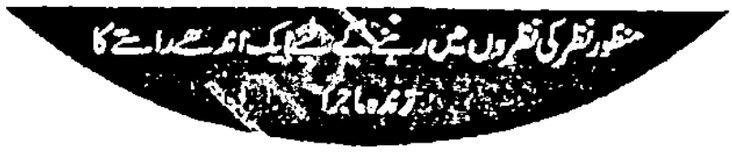
میری ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ میں ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر شیخ عبدالقادرؒ کے مزار کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں روشنی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو کھڑکی میں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر مبارک بھی نظر آئی۔ ایک بار پھر میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں پکار کر کہا۔ ''حضرت! دیکھیں آپ کا یہ فقیر کہاں کہاں سے دھکے کھاتا ہوا آپ تک پہنچا ہے۔ اس کا جسم تھکن سے چور ہے اور روح اس سے بڑھ کر زخمی ہے لیکن آپ کے محافظوں نے اسے دھتکار دیا ہے۔ اسے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دے رہے اور پتا نہیں کہ آئندہ بھی پہنچنے دیں گے یا نہیں.....''

میں روتا رہا اور پھر نڈھال سا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ نیند آ رہی ہے۔ میں کہیں بھی لیٹ کر سو جانا چاہتا تھا۔ سامنے ہی سنگِ مرمر کی دو قبریں ساتھ ساتھ نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ یہ قبریں اوپر سے اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ سائبان سا بن گیا تھا۔ اب قبرستان میں تھوڑی سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ان دونوں قبروں کے درمیان خلا میں گھس کر لیٹ گیا۔ اپنے بوٹ اتار کر میں نے تکیے کے طور پر اپنے سر کے نیچے رکھ لیے تھے۔ یہ عجیب رات تھی اور یہ سونا بھی عجیب سونا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے محسوس ہوا کہ دائیں طرف والی قبر سے کسی ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ نکلا ہے اور اس نے مجھے اپنی قبر کے اندر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بائیں طرف والی قبر میں پراسرار حرکت محسوس ہوئی اور میری سماعت سے کسی عورت کی مدھم ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ مجھے پتا تھا یہ سب میرے واہمے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد میں سو گیا لیکن میری یہ نیند زیادہ طویل نہیں تھی۔ شاید آدھ پون گھنٹا ہی گزرا ہو گا، اچانک میں جاگ گیا۔ مجھے پھر محسوس ہوا کہ کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس مرتبہ مجھے پہلو کی طرف سے نہیں بلکہ پاؤں کی طرف سے کھینچا جا رہا تھا..... اور یہ یقیناً وہم نہیں تھا۔ کوئی تھا وہاں..... جو مجھے کھینچ رہا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے یہی لگا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔

(جاری ہے)



بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جا رہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کے مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔



دوسرا حصہ

میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک صحت مند شخص کھڑا تھا۔ اسی نے مجھے گھسیٹ کر دونوں قبروں کے درمیانی خلا میں سے نکالا تھا۔ اب وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کون ہو آپ؟'' میں نے اردو میں اس سے پوچھا۔

اس نے عربی میں جواب دیا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے۔ تاہم اندازہ ہوا کہ وہ بے حد حیران ہے کہ میں یہاں رات کے دو بجے دو قبروں کے درمیان گھر کر لیٹا ہوا ہوں۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔ ''میں پردیسی ہوں، مزار کے خادم نے مجھے اندر نہیں گھسنے دیا تھا۔ اس لیے قبرستان کی طرف چلا آیا۔'' میرے لہجے میں لرزش تھی۔

معلوم نہیں کہ میری کوئی بات اس باریش شخص کی سمجھ میں آئی یا نہیں۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جوتے پہنے اور اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس کی عمر ساٹھ پینسٹھ سے کم نہیں تھی۔ اس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا اور چہرہ پُروقار تھا۔ وہ مجھے سیدھا غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر لے گیا۔ مزار کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا تو وہی خادم باہر نکلا جس نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی اور دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میں نے چغے والے کو اشاروں کنایوں میں بتایا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے قبروں میں لیٹنے پر مجبور کیا۔

چغے والا شخص سمجھ گیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے خادم سے بڑے بارعب انداز میں بات کی بلکہ یوں لگا کہ وہ اسے ڈانٹ رہا ہے۔ خادم سر جھکائے کھڑا تھا۔ چغے والا

www.pdfbooksfree.pk



www.pdfbooksfree.pk

باریش شخص مجھے اندر مزار کے احاطے میں لے آیا اور پھر ہم ایک برآمدے میں سے گزر کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اسی خادم خاص کا کمرا ہے جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بڑی سی الماری تھی جس میں کتابیں اور قرآن پاک کے نسخے رکھے تھے۔ بائیں جانب ایک پلنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ شیشے کی تپائی پر واٹر کولر پڑا تھا۔ دائیں طرف دیوار پر موٹے دانوں والی ایک بڑی تسبیح جھول رہی تھی۔

مجھے شدید حیرت ہوئی جب چغے والے شخص نے مجھے اپنے جوتے اتارنے اور خادم خاص کے بستر پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں پہلے تو جھجکتا رہا پھر اس ہدایت پر عمل کیا۔ خادم خاص شرمسار سا کھڑا تھا۔ مجھ پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ اس وقت ہوا جب پینتالیس پچاس سالہ خادم خاص نے اردو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم اردو جانتے ہو؟''

میں نے فوراً ''ہاں'' میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''حضرت کا حکم ہے کہ تم یہاں آرام سے لیٹو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔'' حضرت سے اس کی مراد وہی خاکی چغے والے بزرگ تھے۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، بزرگ نے شفقت سے میرا شانہ تھپکا۔ عربی میں تسلی تشفی کے بول بولے اور چل دیے لیکن باہر نکلنے کے فوراً بعد ہی دوبارہ اندر آ گئے۔ انہوں نے خادم خاص سے کچھ کہا۔ خادم خاص نے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہوئے اردو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے کھانا وغیرہ کھایا ہے؟''

میں نے سچ بولتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

چغے والے بزرگ فوراً باہر چلے گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد لوٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک گول ٹرے تھی اور اس میں میرے لیے کھانا تھا۔ چار مٹن تکے کی سیخیں، ایک خمیری روٹی اور کوئی پاؤ بھر کھجوریں۔ انہوں نے بڑی شفقت سے مجھے کھانا کھلایا۔ اسی دوران میں ایک خادم بغدادی قہوہ لے آیا۔ مجھے کھلا پلا کر وہ بزرگ رخصت ہو گئے۔ میں حیران پریشان بستر پر بیٹھا رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کہاں یہ کہ مجھے گیٹ سے اندر گھسنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی اور کہاں یہ کہ میں خادم خاص کے کمرے میں اسی کے بستر پر براجمان تھا۔

میں نے خادم خاص سے پوچھا۔ ''آپ اردو کس طرح جانتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہاں اکثر انڈیا اور پاکستان وغیرہ سے زائرین آتے ہیں۔ ان سے رابطے کے لیے ضروری تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کو اردو کی سمجھ بوجھ ہو۔ میں نے ڈھائی تین سال میں کافی محنت سے تھوڑی بہت سیکھی ہے۔'' اس کے لہجے میں عربی کی جھلک تھی اور اکثر الفاظ کی ادائیگی بھی درست نہیں تھی۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''چلو اب تم سو جاؤ۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں، مجھے یہ مناسب نہیں لگ رہا۔ آپ میرے لیے نیچے کوئی کپڑا بچھا دیں۔ میں وہاں لیٹ جاؤں گا۔'' میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خادم خاص نے مجھے زبردستی روکا اور مجبور کر دیا کہ میں بستر پر ہی لیٹوں..... میرے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے خود قالین پر ایک گدا بچھا لیا۔

میں اس کایا کلپ پر ششدر تھا۔ رات کے دو بجے اس نامعلوم شخص نے مجھے کھینچ کر دونوں قبروں کے درمیان میں سے نکالا تھا اور پھر کھلا پلا کر اس شاندار بستر پر سلا دیا تھا۔ کون تھا وہ؟ اور کیسے مجھ تک پہنچا تھا؟ شاید یہ اس خاموش گریہ وزاری کا نتیجہ تھا جو میں نے ایک قبر کے کنارے بیٹھ کر مزار کی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کی تھی.....

میں نے خادم خاص سے پوچھا۔ ''یہ بزرگ کون تھے؟''

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا۔ ''صبح سب کچھ بتاؤں گا۔ اب سو جاؤ۔'' میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ عجیب حالات کے باوجود جلد ہی سو گیا۔

میں اذانِ فجر کی دلکش آواز سے جاگا تھا۔ یہ اذان مزار سے ملحقہ مسجد سے بلند ہو رہی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے حرکت لیٹے لیٹے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ وہی خادم خاص جائے نماز پر بیٹھا رو رہا ہے۔ میں نے اس کے خشوع خضوع میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد ہم نے مزار کی وسیع و عریض مسجد میں نماز ادا کی اور دوبارہ کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرا ایک طرح سے اس خادم خاص کا حجرہ تھا۔ خادم خاص کا نام مجھے ابوسیاف معلوم ہوا۔ وہ عرصہ بیس سال سے خادم خاص کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کا تعلق بصرہ سے تھا۔ نماز کے بعد ابوسیاف نے باقاعدہ مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ اسے

www.pdfbooksfree.pk

اپنے رات والے سلوک پر افسوس ہے۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ آپ کو اللہ نے اتنا معتبر منصب دے رکھا ہے۔ آپ ایسی بات نہ کریں۔''

ابوسیاف نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ''دکھوں کے مارے معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے بہت مصیبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا لیکن آپ بھی مجھے بتایئے کہ رات والے بزرگ کون تھے؟ وہ مجھے نماز میں تو نظر نہیں آئے۔''

ابوسیاف نے کہا۔ ''وہ کبھی کبھار ہی یہاں آتے ہیں۔ یہاں کے سب سے بڑے تین چار بزرگان میں سے ایک ہیں۔ انہیں حضرت عالی مقام کہا جاتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو کچھ مزید آگے بڑھتی، طالب علموں کا ایک گروہ اجازت لے کر اندر آ گیا اور خادم خاص ابوسیاف ان سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

میں نے وہ سارا دن مزار اور ملحقہ مسجد میں گھومتے پھرتے گزارا۔ ایک عجیب سا سکون اور روحانیت کا احساس تھا جو میرے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ پردے اور ستر پوشی کا تصور کچھ اور طرح کا تھا۔ دن دس بجے کے قریب بہت سی عراقی خواتین مزار کے احاطے میں دکھائی دیں۔ اس وسیع احاطے میں اینٹوں کا فرش تھا۔ میں نے دو وقت کا کھانا خادم خاص ابوسیاف کے ساتھ ہی کھایا۔ بہرحال میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ آج میں اس کے بستر پر نہیں سوؤں گا۔ اگر مجھے زیادہ مجبور کیا گیا تو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے یہ کسی طور گوارا نہیں تھا کہ مجھ سے بڑی عمر کا ایک شخص میرے قریب زمین پر سوئے اور میں اس کے بستر پر قبضہ جما کر لیٹوں۔ میں نے کھلی ہوا کا بہانہ بھی کیا اور عشا کے بعد مزار کے اینٹوں والے احاطے میں ایک دری بچھالی اور تکیہ رکھ لیا۔ کئی اور افراد بھی وہاں شب بسری کے لیے موجود تھے۔

تاروں بھرے آسمان کے نیچے وہ رات سکون سے تو گزری لیکن یادیں بھی مسلسل حملہ آور ہوتی رہیں۔ ستاروں کو دیکھ کر میں نے سوچا یہی ستارے میرے گھر کے آسمان پر بھی چمک رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آج مجھے گھر سے نکلے کم و بیش پندرہ روز ہو چکے تھے لیکن لگتا تھا کہ یہ پندرہ سال کا وقت ہے۔ ان پندرہ دنوں یا پندرہ سالوں میں کون کون سے لوگ مجھ سے ملے اور بچھڑ گئے تھے... ان میں مہرو بھی تھی۔ وہ بھی اسی شہر بغداد میں کہیں رہنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ صحیح سلامت اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

اگلے روز میں مزار اور مسجد کے گرد و نواح میں گھومتا رہا اور لوگوں کے رہن سہن کو دیکھتا رہا۔ میں نماز بڑی باقاعدگی سے ادا کر رہا تھا اور اس میں مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔ میں نے ابوسیاف کو اپنے حالات سے تھوڑا بہت آگاہ تو کیا تھا لیکن تفصیل نہیں بتائی تھی۔

رات کو میں جب پھر دری اور چادر وغیرہ لے کر احاطے کی طرف جانے لگا تو ابوسیاف نے مجھے روکا اور کہا کہ آج بادل ہیں۔ رات کو بارش کا امکان ہے، میں کمرے میں ہی سو جاؤں لیکن مجھے باہر سونا ہی مناسب اور اچھا لگا۔ بہرحال رات کو وہی کچھ ہوا جس کا خطرہ ابوسیاف نے ظاہر کیا تھا۔ گیارہ بارہ بجے کا وقت ہوگا جب یکا یک تیز بارش

باتوں سے خوشبو آئے

☆ زیادہ مت ہنسو کیونکہ جس دل کا رشتہ اور تعلق اللہ سے بندھ جاتا ہے وہ ہمیشہ پُرسکون اور باوقار رہتا ہے۔

☆ سننے والے کی ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں گفتگو مت کرو کیونکہ یہ رعونت کا اظہار ہے۔

☆ دوست کا امتحان مصیبت میں، بیوی کا غربت میں اور مومن کا امتحان غصے میں ہوتا ہے۔

☆ آنکھ کا امتحان بازار میں، زبان کا محفل میں اور دل کا امتحان عشق میں ہوتا ہے۔

☆ ہاتھ کا امتحان کھانا کھانے میں اور انسان کا امتحان قبر میں ہوتا ہے۔

مرسلہ۔ عرفان جمی سیال اینڈ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

www.pdfbooksfree.pk

ہونے لگی۔ صحن میں سونے والے ہم سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور برآمدوں کی طرف بھاگے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے میں بری طرح بھیگ گیا اور بستر بھی گیلا ہوگیا۔ وہیں برآمدے کے ایک کونے میں اپنا گیلا بستر بچھایا اور گیلے کپڑوں کے ساتھ لیٹ گیا۔ اپنی حالتِ زار پر خود ہی ترس آیا اور ساتھ ہی ان لمحوں میں اپنی ماں بھی بے طرح یاد آئی۔ انہوں نے کبھی، چند منٹ بھی ہمیں گیلے کپڑوں کے ساتھ رہنے نہیں دیا تھا۔ دل بوجھل ہوگیا۔ یہ غریب الوطنی تھی اور اس غریب الوطنی نے ابھی پتا نہیں کیا کچھ دکھانا تھا۔

ہوا تیز تھی۔ بارش کی کوئی کوئی بوچھاڑ برآمدوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں ٹھٹھرتا رہا اور اونگھتا رہا۔ اچانک کسی نے میرا کندھا ہلایا اور اٹھنے کو کہا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہی پہلے روز والے بزرگ میرے قریب بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری کمر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھا کر خادمِ خاص کے حجرے میں لے آئے۔

خادمِ خاص ابوسیاف ایک بارعب شرمندہ شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔ بہرحال میں نے اسی کے ذریعے حضرت عالی مقام تک یہ بات پہنچائی کہ ابوسیاف نے بہت اصرار کیا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور اپنی مرضی سے صحن میں سو گیا۔

وہ بڑی طوفانی شب تھی۔ حجرے سے باہر مزار کا صحن بھی نظر آتا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ ابوسیاف نے مجھے اپنے کپڑے پہنا دیے تھے اور میں نے اپنے کپڑے حجرے میں ہی ایک طرف پھیلا دیے تھے۔ بادوباراں کی اس شب میں حجرے کی تنہائی کے اندر میرے اور حضرت عالی مقام کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس میں ابوسیاف نے ترجمان کے فرائض انجام دیے۔

یہ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔ جناب عالی مقام نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور اس دربدری کی حالت میں کیوں پھر رہا ہوں؟

ان کے شفقت بھرے لہجے نے میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ میں نے کہا۔ ''یا حضرت! آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو بیٹا۔'' انہوں نے میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے کہا۔ ''یا حضرت! کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ بندہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھے اور جاگتی آنکھوں کا وہ خواب اتنا واضح ہو کہ حقیقت اور تصور میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے؟''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''ایسا ناممکن نہیں ہے۔ انسان کا ذہن قدرت کے عظیم معجزوں میں سے ہے۔ ذہن کا پیدا کیا ہوا تخیل کبھی کبھی محسوس حقیقتوں سے بھی بڑھ کر حقیقی ہوجاتا ہے۔ یہ تخیل ہمیں ماضی یا مستقبل میں بہت دور تک لے کر چلا جاتا ہے لیکن تم تفصیل بتاؤ گے تو پھر بات کھلے گی۔''

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے، کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بجلی کی چمک میں بارش کی موسلا دھار بوچھاڑیں ایک سیکنڈ کو جھلک دکھا کر پھر تاریکی میں اوجھل ہوجاتی تھیں اور بغداد کے آسمان پر بادل دہاڑنے لگتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یا حضرت..... میری شادی ہو رہی تھی۔ وہ میری مہندی کی رات تھی۔ میں گھر میں اکیلا تھا..... اچانک میں نے اپنے کمرے میں کسی کو دیکھا..... جی حضرت! میں نے اسے جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ بالکل سفید کپڑوں میں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میں اٹھ کر ہاتھ بڑھاؤں تو اسے چھو سکتا ہوں۔ میں پھر کہوں گا حضرت کہ میں غنودگی کی حالت میں ضرور تھا لیکن جاگ رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کے الفاظ ایسے ہی میری سماعت سے ٹکرائے جس طرح میرے الفاظ اب آپ کی سماعت مبارک سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس نے میرا نام لیا اور کہا۔ ''کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلاتا تھا نا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی.....'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا لیکن اس کے یہ الفاظ جیسے میرے سینے میں پیوست ہوکر رہ گئے یا حضرت..... میرے دل کے اندر کہیں کھلبلی سی مچ گئی..... اور مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے، کچھ بہت برا، اور پھر میری شادی کی رات یہ ''بہت برا'' میرے سامنے آگیا یا حضرت!''

میری آواز بھرا گئی اور میں چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔

حضرت عالی مقام نے پھر میری پشت پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ پھیرا اور مجھے بات جاری رکھنے کی ہدایت کی..... میں نے آبدیدہ لہجے میں انہیں شادی کی رات کا وہ واقعہ بتایا جب میں نے شامیانے کے پاس سے گزرتے ہوئے محلے کی دو عورتوں کو اپنے بارے میں باتیں کرتے سنا اور پتا نہیں کیوں میرے اندر کی ساری روشنیاں ایک گھٹاٹوپ اندھیرے میں بدل گئی تھیں۔ میں بے حد کوشش کے باوجود اپنے لیے یا اپنی دلہن کے لیے اس اندھیرے میں سے روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ڈھونڈ سکا تھا اور سب

www.pdfbooksfree.pk

کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے جگمگاتے گھر میں سے نکل آیا تھا۔

میری پوری روداد سننے کے بعد حضرت عالی مقام خاموش ہو گئے۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور لمبی ڈاڑھی سینے کو چھو رہی تھی..... کافی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے ابو سیاف کی وساطت سے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا..... مجھے یہ صدقہ، خیرات اور خدا ترسی میں کمی کا کوئی معاملہ لگتا ہے۔ کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہے..... ہاں..... کہیں ہوئی ہے..... جس کی وجہ سے تم پر یہ مشکل آئی ہے۔''

وہ چند سیکنڈ خاموش رہے، پھر دوبارہ عربی میں بولے جس کا ترجمہ کرتے ہوئے ابو سیاف نے مجھ سے کہا۔ ''حضرت کہتے ہیں کہ کیا وہاں پاکستان میں تمہاری مالی حالت اچھی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں .. اللہ کا شکر ہے، آسانی سے گزر بسر ہوتی ہے۔''

حضرت عالی مقام نے کہا۔ ''کہیں تم صدقہ خیرات وغیرہ کی طرف سے غافل تو نہیں ہو؟''

میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں حضرت! ہمارا گھرانا الحمدللہ مذہبی ہے۔ ہم اپنی استطاعت کے مطابق ہمیشہ کچھ نہ کچھ خیر خیرات نکالتے ہیں۔ میرے پڑدادا تو اس سلسلے میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ہمارے پڑدادا کے گھر میں ہمیشہ لنگر کا اہتمام ہوتا تھا۔ مستحق افراد اس لنگر سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میرے دادا کا بھی ایسا ہی وتیرہ تھا۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ایک دوسرے علاقے میں رہتے تھے، دادا جی اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے، جب تک قریبی مسجد کے نابینا حافظ جی کو کھانا نہیں بھیج دیتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ پھر حافظ جی وفات پا گئے تو دادا جی نے ایک قریبی مدرسے میں کھانا بھجوانا شروع کر دیا۔ وہ تینوں وقت باقاعدگی سے وہاں کھانا بھیجتے تھے۔ دادا جی کے انتقال کے بعد والد صاحب نے یہ نیک سلسلہ جاری رکھا۔ ہر روز صبح دوپہر اور شام مدرسے میں کھانا بھجوایا جاتا تھا۔ بعد میں جب ہم نے رہائش تبدیل کر لی تو والد صاحب نے یہ کام میرے ذمے لگایا کہ میں ہر روز شام کو پکا ہوا کھانا مدرسے میں پہنچایا کروں۔''

''تم نے یہ کام جاری رکھا؟'' حضرت عالی مقام نے پوچھا۔

''جی حضرت! دو تین سال میں مسلسل ہر روز مدرسے جاتا رہا لیکن فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے میں نے والد صاحب کے مشورے سے مدرسے میں ماہانہ پیسے دینے شروع کر دیے۔''

''اب یہ پیسے دے رہے ہو؟'' حضرت عالی مقام نے پوچھا۔

''جی حضرت! اگر کسی ماہ کوتاہی ہو بھی جاتی ہے، تو اگلے ماہ یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یا والد صاحب، خود جا کر پیسے دے آتے ہیں..... یا کسی بااعتماد ملازم کو بھیج دیتے ہیں۔''

حضرت عالی مقام ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ وہ جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ تسبیح بڑے ہموار طریقے سے ان کی انگلیوں میں گردش کر رہی تھی۔ مزار کے صحن میں بارش کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ کئی منٹ کے بعد حضرت عالی مقام بولے۔ ''اچھا، اب تم دونوں سو جاؤ۔ فجر میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔''

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اٹھے اور بہت آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں اور ابو سیاف ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میرے ذہن میں عجیب کھد بدی شروع ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ کم از کم ایک بھوکے کو کھانا کھلانے والی بات اور میرے باپ دادا کے خیرات کرنے میں کوئی خاص تعلق ہے۔

اگلے روز عشا کے بعد میں، ابو سیاف اور حضرت عالی مقام پھر حجرے میں موجود تھے۔ آج بادل نہیں تھے لیکن موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہمارے سامنے خوشبودار بغدادی قہوے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ حضرت عالی مقام بول رہے تھے اور ابو سیاف اردو میں ان کی باتوں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ عالی مقام کہہ رہے تھے۔ ''تم نے بتایا ہے کہ جب تمہارا گھر مدرسے کے پاس تھا..... تم مدرسے کے بچوں کو تینوں وقت کھانا دینے کے لیے جاتے تھے؟''

''جی حضرت! ایسا ہی تھا۔''

''کیا کبھی تمہارے والد نے نہیں بتایا کہ وہ اتنی باقاعدگی کے ساتھ کھانا کیوں بھجواتے ہیں؟''

''وہ بس یہی کہتے تھے حضرت..... کہ دادا ایسا کرتے تھے، اس لیے وہ بھی کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ روٹین خراب ہو۔ ویسے بھی دادا کی طرح والد بھی نیکی کے کاموں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''لیکن بیٹا! جب یہ کام تمہارے سپرد ہوا تو پھر اس کی وہ اہمیت تو نہ رہی۔''

''مم..... میں سمجھا نہیں حضرت۔''

''تم نے خود ہی بتایا ہے کہ پہلے تم نے مدرسے میں ایک وقت کا کھانا پہنچانا شروع کیا..... پھر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے تم ماہانہ خرچہ بھجوانے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ کبھی کبھی ماہانہ خرچہ بھی نہ دیا گیا..... ایسا ہوا ہے نا؟''

میرے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے بلکہ اس سے زیادہ ہوا ہے جتنا میں نے حضرت عالی مقام کو بتایا ہے۔

عالی مقام ایک دم موضوع بدل کر بولے۔ ''کیا تمہارے پڑدادا اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے؟''

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جی حضرت! میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔''

''اور تمہارے دادا؟''

''جی حضرت! میری معلومات کے مطابق وہ بھی سب سے چھوٹے ہی تھے۔''

''اور والد؟''

میرے اندر حیرت بڑھتی چلی جارہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی حضرت! والد بھی دو بھائیوں میں چھوٹے ہیں..... اور..... اور میں بھی۔''

وہ ایک بار پھر جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ ماتھے پر نور سا چمک رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کا ماتھا لگتا تھا جو دور بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ بولے۔ ''غیب کا علم تو صرف خدائے ذوالجلال کو ہے لیکن اگر ہم ناچیز لوگ غور و فکر کریں تو وہ رب اپنی عظیم صفات میں سے ایک حقیر سا حصہ ہمیں بھی دے دیتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے..... بلکہ یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ تمہارے بزرگوں میں سے کسی نے ایک بہت اہم مقام پر کسی خاص کیفیت میں کوئی عہد کیا تھا..... اور اسے زندگی بھر..... بلکہ نسل در نسل نبھانے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ عین ممکن ہے..... عین ممکن ہے کہ تمہارے پڑدادا ہی وہ شخص ہوں، انہوں نے زندگی بھر وہ عہد نبھایا اور پھر وہ عہد اپنے سب سے چھوٹے بیٹے یعنی تمہارے دادا کو منتقل کر دیا۔ تمہارے دادا نے یہ عہد تمہارے والد تک منتقل کیا..... اور پھر یہ تم تک آیا لیکن تم تک پہنچتے پہنچتے اس عہد کی شکل و صورت بدل گئی اور اس پر عمل کرنے والے کا ارادہ اور جذبہ بھی وہ نہ رہا۔ اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ اس عہد کی خلاف ورزی ہوگئی تو غلط نہ ہوگا۔''

میں ''ہم'' ''ہم'' یہ باتیں سن رہا تھا۔ عالی مقام خاموش ہوئے تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''یا حضرت..... یہ کس قسم کا عہد ہو سکتا ہے؟''

''میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ گئے وقتوں میں کسی وقت شاید تمہارے پڑدادا نے کسی وجہ سے کسی متبرک مقام پر یہ منت مانی ہوگی کہ وہ زندگی بھر جب تک کسی ایک بھوکے کو کھانا نہیں کھلائیں گے خود کھانا نہیں کھائیں گے..... شاید تمہیں یہ بات اور یہ عہد معمولی لگے لیکن نہیں..... ایسے عہد معمولی نہیں ہوتے بیٹا! انسانی زندگی پر ان کے اثرات بہت گہرے اور طویل ہوتے ہیں۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیے گئے ایسے عہدوں کو توڑا جائے تو ان کا وبال آتا ہے۔''

یقیناً ہماری یہ گفتگو مزید جاری رہتی لیکن اسی دوران میں کوفے سے کچھ مہمان آگئے جو عالی مقام سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کی آمد کے بعد مجھے اور ابوسیاف کو حجرہ چھوڑنا پڑا۔ اس رات کو زیادہ تر حصہ میں نے بس جاگتے ہوئے گزارا۔ آنکھوں میں بار بار آنسو جمع ہوتے رہے۔ حضرت عالی مقام کی کچھ باتیں تو میری سمجھ میں آئی تھیں اور کچھ نہیں آئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اعلیٰ حضرت نے مجھے میرا مسئلہ تو بتا دیا ہے لیکن اس کا حل نہیں بتایا۔ اگر وہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا عالی مقام نے فرمایا تھا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا کوئی کفارہ تھا جس کو ادا کرنے کے بعد میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ختم ہو سکتی تھی؟

میں بڑی شدت سے اگلے دن کا انتظار کرتا رہا اور دل میں یہ امید پالتا رہا کہ کل پھر عالی مقام سے بات ہوگی اور وہ مجھے میری بے چینیوں کا کوئی حل بتائیں گے۔ کوئی ایسا راستہ جسے اختیار کرنے کے بعد میرے اندر پھیلی ہوئی گھٹا ٹوپ تاریکی میں روشنی اور زندگی کی رمق نمودار ہو سکے۔

پتا نہیں کیوں میرا دھیان بار بار اپنی روزمرہ زندگی اور مذہبی معاملات کی طرف بھی جاتا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے دادا، پڑدادا کے زمانے میں، ہمارے خاندان میں جتنی دین داری موجود تھی، وہ اب دکھائی نہیں دیتی تھی۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل تو کافی حد تک اپنے بزرگوں کے راستے سے ہٹی ہوئی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں بھی ان میں شامل تھا۔ نماز کبھی پڑھ لی، کبھی نہ

www.pdfbooksfree.pk

پڑھی..... روزے آسان لگے تو رکھ لیے ورنہ چھوڑ دیے۔ کبھی والدہ نے سختی سے کہا تو قرآن پاک پڑھنا شروع کیا لیکن کچھ دنوں بعد پھر چھوڑ دیا۔ پتا نہیں یہی غفلت تھی جس کی وجہ سے مجھ سے وہ غفلت بھی ہوئی جس کا ذکر کل رات عالی مقام نے فرمایا تھا۔ میں ایک عہد شکنی کا سبب بن گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کل عالی مقام نے جو کچھ کہا، وہ بچانوے فیصد سے زیادہ درست ہے۔ اب مجھے بھی تھوڑا تھوڑا یاد آرہا تھا کہ گھر میں ایک دو بار کوئی اس قسم کی بات ہوئی تھی۔ شاید والد صاحب نے والدہ کو کسی مستحق کے لیے کھانا پہنچانے کے حوالے سے تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے بڑوں کی روحوں کو تکلیف ہو.....

میں نے رات تک عالی مقام کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آئے..... اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا اور پھر اس سے اگلا دن بھی۔ رات کے وقت میں ابوسیاف کے سامنے بلک پڑا۔ میں نے کہا۔ ''عالی مقام کیوں نہیں آرہے؟ کہاں چلے گئے ہیں وہ؟''

ابوسیاف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا ہارون کہ ان کا یہاں آنا جانا ان کی مرضی پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کل ہی آجائیں، ہوسکتا ہے کہ اگلے پندرہ بیس روز یا مہینے دو مہینے تک نظر نہ آئیں۔ اگر تم مجھ سے ان کے ٹھکانے کا پوچھنا چاہو گے تو بھی تمہیں مایوسی ہوگی۔ مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔''

میں نے ابوسیاف کو چچا سیاف کہنا شروع کردیا تھا لیکن میں یہ لفظ عربی میں ادا کرتا تھا۔ یعنی عم سیاف..... یا پھر ''یاعم''۔''

میں نے کہا ''یاعم! آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھ سے ایک خاص گناہ سمیت جو گناہ ہوئے ہیں، ان کے ازالے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ابوسیاف نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو ایک بہت بڑے معالج نے تم کو تمہارا مرض بتایا ہے لیکن اس مرض کا علاج تم اس معالج کے بجائے مجھ جیسے معمولی شاگرد پیشہ طبیب سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا چاہیے۔''

میں انتظار کرتا رہا۔ عالی مقام تو پھر روضے یا مسجد میں تشریف نہیں لائے تاہم دوسرے یا تیسرے روز ابوسیاف نے مجھے ایک چھوٹی سی سفید پرچی دی۔ اس پر سبز روشنائی سے عربی کے چند الفاظ لکھے تھے۔ ابوسیاف نے مجھے بتایا۔ ''تمہارے لیے حضرت نے یہ پیغام بھیجا ہے۔''

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ابوسیاف نے ان الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے پڑھا۔ ''مصیبت اپنے وقت پر ٹلتی ہے۔ تمہاری مصیبت بھی انشاءاللہ ضرور ختم ہوگی۔ صبر کا دامن تھامے رکھو۔ معافی مانگو اور نیکی کے راستے سے دور نہ جاؤ۔''

یہ حوصلہ افزا تحریر تھی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو فوری طور پر میرے سکون کا باعث بنتی۔ اس تحریر میں حضرت نے ملاقات کی بھی کوئی نوید نہیں سنائی تھی۔ میں نے ابوسیاف سے یہ پرچی لے لی اور بڑے احترام سے اپنے کوٹ کی اوپری جیب میں رکھ لی۔ یاد رہے کہ چوبیس پچیس روز گزر جانے کے باوجود میرے جسم پر وہی میری شادی کی رات والا پینٹ کوٹ تھا۔ اب اس کی حالت ابتر ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اگلے کئی روز میں نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار اور مسجد کے اندر گزار دیے۔ میرے چہرے اور سر کے بال بڑھ چکے تھے۔ کوٹ پتلون مضحکہ خیز شکل اختیار کرچکے تھے۔ میں نے بوٹ اتار پھینکے تھے اور بازار سے ایک چپل خرید لی تھی۔ میں صبح سے ظہر کی اذان تک مزار کے گردونواح میں گھومتا رہتا۔ کبھی بازار سے روکھی سوکھی لے کر کھالیتا۔ کبھی مزار میں تقسیم کیے جانے والے کھانے سے پیٹ بھر لیتا۔ میرا حال فقیروں جیسا ہوتا چلا جارہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آرہی تھی کہ اگر واقعی مجھ پر کسی سنگین عہد شکنی کا وبال آیا ہے تو اس کا توڑ کیا ہوسکتا ہے۔ یہ وبال تو بدستور موجود تھا۔ میرے اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں اب بھی واپسی کا نہیں آگے جانے کا سوچ رہا تھا۔

میرے پاس جو رقم موجود تھی، وہ دن بدن کم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے سوچا مجھے کہیں کوئی کام ڈھونڈنا چاہیے۔ کام کی تلاش میں، میں دن بھر مزار کے اردگرد کے بازاروں میں گھومتا رہتا۔ یہیں پر ایک حیدرآبادی شخص کی دکان تھی۔ اس کا نام عطاءاللہ تھا۔ عطا کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ عرصہ پچیس سال سے یہیں بغداد میں مقیم تھا..... اور اسلحہ مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ بہت سی پرانی رائفلیں، توڑے دار بندوقیں، طمنچے اور جدید ریوالور پسٹل وغیرہ اس کی دکان کی دیواروں پر آویزاں تھے۔ وہ رائفلوں کے بیرل بنالیتا تھا اور لکڑی کے دستے وغیرہ بھی۔ میں چونکہ خود بھی ٹیکنیکل تھا، مجھے اس کے کام میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی اور میں اس کی دکان کے پاس کھڑا اس

www.pdfbooksfree.pk

کا کام دیکھتا رہتا تھا۔ پھر کبھی کبھی میں اس کی اجازت سے اس کے پاس بھی بیٹھنے لگا۔ اس نے دو چار بار میرے لیے کھانا منگوایا اور قہوہ بھی پلایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے مجھ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں نے یہ بات بڑی اچھی طرح نوٹ کی تھی کہ اجنبی لوگ بہت جلد مجھ سے ہمدردی محسوس کرنے لگتے تھے اور ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ کریں۔ ایک دن میں نے کہا۔ ''عطا صاحب! آپ مجھے کوئی کام دے دیں۔ میں ہر طرح کا کام کرلوں گا۔''

انہوں نے کہا۔ ''تم دیکھ ہی رہے ہو ہارون! ورکشاپ میں میرے ملازم پورے ہیں۔''

دو روز بعد عجیب اتفاق ہوا۔ میں عطا صاحب کے پاس بیٹھا انہیں کام کرتے دیکھ رہا تھا کہ اندر سے چلانے کی آوازیں آئیں، ہم بھاگم بھاگ اندر پہنچے۔ ایک ملازم کی قمیص کو آگ لگی ہوئی تھی۔ دھات کو گرم کرنے والا ایک اسٹوو پھٹ گیا تھا۔ ہم نے بہ مشکل آگ بجھائی، کاریگر لڑکے کی دونوں کلائیاں بری طرح زخمی ہوئی تھیں۔ لوگ اسے طبی امداد کے لیے فوراً اسپتال لے گئے۔

شام کو عطا صاحب کچھ دیر تک گم صم سے میری طرف دیکھتے رہے، پھر ہولے سے بولے۔ ''اگر تم کام کرنا چاہتے ہو تو کل سے آجانا۔''

میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''عطا صاحب! میں کام تو چاہتا تھا لیکن اس طرح سے نہیں۔ مجھے اس حادثے کا بڑا افسوس ہے۔''

''بس یہ اللہ کے کام ہوتے ہیں، وہی ان کی حکمت جانتا ہے۔'' عطا صاحب نے کہا اور مجھے اگلے روز آنے کی تاکید کی۔

اگلے روز میں غوث پاک کے مزار سے قریباً چار میل پیدل چلنے کے بعد عطا صاحب کی ورکشاپ پر پہنچا۔ عطا صاحب نے مجھے پہلے دن جو کام سونپا، وہ آری سے لوہا کاٹنے کا تھا۔ میں نے آری کے دندانے درست کیے اور دوپہر تک اتنی تیزی سے لوہا کاٹا کہ وہ حیران رہ گئے۔ نہ صرف وہ خود حیران ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے تین چار پڑوسی دکانداروں کو بھی بلا کر میرا کام دکھایا۔

شام کو میں خوشگوار موڈ میں واپس مزار پر پہنچا۔ وہاں پر موجود خادم خاص ابوسیاف تو میرا خیر خواہ تھا ہی، مزار کے کئی خدمت گار ملنگ بھی دوستوں کی طرح ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں جب خبر سنائی کہ مجھے کام مل گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں اپنے پہلے دن کی ''کمائی'' سے کچھ مٹھائی لے آیا تھا۔ انہوں نے چائے بنائی اور ابوسیاف سمیت ہم سب نے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی۔

عطا اللہ میرے کام سے بہت خوش تھا۔ ایک دن وہ مجھے اپنی بیوی سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔ سورج ڈوبتے ہی ورکشاپ بند ہو جاتی تھی۔ عطا اللہ نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور لے کر چل دیا۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد دریائے دجلہ کے کنارے پہنچے۔ شام نے رنگ بکھیر رکھے تھے اور دجلہ میں تفریحی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ہم کنارے کی ایک گنجان بستی میں پہنچے۔ یہ پرانا شہر تھا۔ تنگ گلیاں، اینٹوں اور مٹی کے گھر، کھجوروں کے جھنڈ۔ مجھے لگا کہ میں نسیم حجازی کے ناول آخری چٹان کے دور میں پہنچ گیا ہوں۔ خدا خدا کر کے عطا اللہ کا گھر آیا۔ یہ پانچ چھ مرلے کا گھر ڈبل اسٹوری تھا اور اردگرد کے مکانوں سے کافی اچھا تھا۔ یہ علاقہ بھی کچھ بہتر تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ اگر میرے سر پر ایک وزنی بم پھٹ جاتا تو شاید تب بھی مجھے اتنا شاک نہ لگتا، جتنا اپنے سامنے بیٹھے جعفر کو دیکھ کر لگا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، اس نے اپنی زخمی ٹانگ اٹھا کر ایک دوسری کرسی پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ واپس مڑ جاؤں لیکن اب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی دوران میں سیڑھیوں پر سے ایک کھنکتی ہوئی سی آواز آئی۔ یہ مہرو تھی، جو ایک چھوٹی ٹرے میں چائے لیے نیچے اتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر وہ بھی بری طرح ٹھٹک گئی۔ غالباً ٹرے اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔

''آپ ایک دوسرے کو پہچانتے ہو؟'' عطا صاحب نے پوچھا۔ ان کا اشارہ میرے اور جعفر کی طرف تھا۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلایا۔ مہرو جلدی سے واپس جا چکی تھی۔ جعفر نے خود کو حیرت کے شدید حملے سے سنبھال لیا تھا۔ اس نے عطا صاحب سے مخاطب ہو کر عربی میں کچھ پوچھا۔ غالباً میرے بارے میں ہی پوچھا تھا کہ میں یہاں کیسے ہوں؟ عطا صاحب نے جواب میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

پانچ دس منٹ بعد ساری صورتِ حال واضح ہو چکی تھی۔ جعفر جان چکا تھا کہ میں یہاں کیسے پہنچا ہوں اور میں بھی جان چکا تھا کہ یہ دراصل جعفر ہی کا گھر ہے۔ پچیس چھبیس برس پہلے عطا جب بالکل نوجوان تھے، وہ یہاں جعفر

www.pdfbooksfree.pk

اور مہرو کے والد کے شاگرد کے طور پر کام کرتے تھے۔ بعد میں جعفر اور مہرو کے والد تو مہرو سمیت پاکستان واپس چلے گئے لیکن عطا صاحب یہیں پر رہے۔ وہ مہرو کی والدہ حبیبہ بیگم کو اپنی ماں اور جعفر کو چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ اب عطا صاحب شادی شدہ تھے اور ان کی اپنی ماشاءاللہ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ وہ تینوں نوجوان تھیں اور اسی گھر میں اپنی مقامی والدہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ بالائی کمروں سے ان کے چہکارنے کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ میں کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے عطا صاحب کی ورکشاپ تک پہنچا..... اور پھر وہاں سے جعفر اور مہرو کے گھر آ گیا۔ شاید ہماری زندگی ایسے ہی خوشگوار اور ناخوشگوار اتفاقات کا مجموعہ ہے۔

جعفر کے چہرے پر حسب معمول گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے بتایا۔ ''میری پنڈلی کی ہڈی میں ایک باریک فریکچر ہے۔ اس کے علاوہ زخم بھی ہے۔ دونوں چیزوں کا علاج ہو رہا ہے۔ مجھے کل پھر سٹی سینٹر کے اسپتال میں چیک اپ کے لیے جانا ہے۔'' میں نے اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ اسی دوران میں عطا صاحب کی عراقی بیوی اور ان کی تینوں بچیاں بھی آ گئیں۔ لگتا تھا کہ وہ آزادی کے ماحول میں پلی بڑھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتی تھیں کیونکہ باپ اردو بولتا تھا۔ وہ بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کی والدہ بھی مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ عطا صاحب نے کہا۔ ''یہ ایک تو تمہارے قیمتی سوٹ کی خستہ حالی سے حیران ہے۔ دوسرے اس بات پر بھی حیران ہے کہ تم نے جتنا لوہا کاٹنے میں تین گھنٹے لگائے ہمارے کاریگر اتنا لوہا کاٹنے میں نو دس گھنٹے لگاتے ہیں۔''

پروگرام کے مطابق مجھے رات وہیں ٹھہرنا تھا۔ میرے لیے گھر کا بیٹھک نما کمرا کھلوا دیا گیا۔ اس ہوادار کمرے سے دریائے دجلہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ مجھے اچھا کھانا کھلایا گیا اور پوری مہمان نوازی کی گئی لیکن مہرو مجھے نظر نہیں آئی۔ شاید وہ اپنے بھائی جعفر سے ڈرتی تھی..... میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ اگلے روز جعفر صبح سویرے اپنے کسی دوست کے ساتھ اسپتال جانے کے لیے نکل گیا۔ اسے اب شام کو ہی واپس آنا تھا۔ ورکشاپ سے چونکہ آج چھٹی تھی اس لیے مجھے اور عطا صاحب کو گھر میں ہی رہنا تھا۔ میرا ناشتا مہرو ہی لے کر آئی۔ اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور ناشتا میز پر رکھ کر کسی خادمہ کی طرح ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

میں نے اسے ڈانٹا۔ ''یہ کیا حرکت ہے مہرو۔ مجھے اتنی عزت مت دو کہ مجھے مذاق لگنے لگے۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔''

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی اور اپنے معصوم انداز میں باتیں کرنے لگی۔ ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ اس نے پوچھا کہ میں نے بریانی پکائی تھی یا نہیں؟

میں نے کہا۔ ''پکا بھی لیتا تو تمہارے بغیر کیسے کھاتا؟''

وہ ہنس دی۔ ہنستے ہوئے اس کی ناک کی وزنی نتھلی بھی ہنستی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بولی۔ ''بابو سائیں! یہ آپ نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کیا آپ مزار کے ملنگ بننا چاہ رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''حالات تو ایسے ہی ہیں کہ مجھے ملنگ بن جانا چاہیے۔''

''اللہ سائیں نہ کرے کہ ایسا ہو۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ اتاریں یہ کپڑے۔ میں آپ کو دوسرے کپڑے دیتی ہوں۔ ان کو مشین سے دھو دیتی ہوں۔ ایک دم ٹھیک ہو جائیں گے۔''

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانی۔ اندر سے شاید عطا صاحب کا کوئی جوڑا لے آئی اور میرا پتلون کوٹ دھلوانے کے لیے لے گئی۔

عطا صاحب لمبی تان کر سو رہے تھے۔ ان کی تینوں تیز طرار بیٹیاں میرے اردگرد جمع تھیں۔ میں ان کے لیے جیسے کوئی تماشے کی چیز تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''باجی مہرو..... آپ کی بہت تعریفیں کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ آپ ایک لڑکے بھی ہیں اور بزرگ بھی ہیں یعنی لڑکے بزرگ۔ وہ ایسا کیوں کہتی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔''

ایک نے بے باکی سے کہا۔ ''ویسے اگر آپ کا کبھی دوسری شادی کا پروگرام بن جائے تو مہرو کو ضرور بتایئے گا۔ وہ فوراً تیار ہو جائے گی.....''

''جعفر ماموں روڑا اٹکا دیں تو اور بات ہے۔'' سب سے بڑی نے کہا۔ تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

شام تک مہرو نے میرا کوٹ پتلون بڑی اچھی حالت میں مجھے لوٹا دیا۔ اس نے خود استری کی تھی اور میری چپل تک پالش کر ڈالی تھی۔

شام کو جعفر واپس آ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح گہرے سنجیدہ موڈ میں تھا۔ میں نے ابھی تک اسے مسکراتے نہیں

www.pdfbooksfree.pk

دیکھا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور مجھے بھی وہاں بلالیا۔ میز پر قہوے کی دو پیالیاں رکھی تھیں۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا اور پہلی بار میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔ کہنے لگا۔ ''ہارون! میں نے زندگی میں کبھی کسی کا احسان خود پر نہیں رکھا..... اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھ پر دو بڑے احسان کر رکھے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں جعفر صاحب؟''

وہ عربی آمیز شکستہ اردو میں بولا۔ ''تفتان بارڈر پر تم نے بڑی سمجھ داری سے شنجے میں سے میرا پاؤں نکالا..... اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ایسا نہ کرتے تو میں اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھتا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ زیادہ خون بہنے سے کوئی مزید نقصان ہوجاتا۔''

میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے میری بہن کی حفاظت کی اور کئی دن تک بڑی نیک نیتی سے اسے اپنی پناہ میں رکھا۔ میں اس کے لیے بھی تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے میرے ساتھ محبت سے بات کی، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔ باقی میں نے جو کچھ کیا، وہ میرے اخلاقی فرائض کے.....''

''یہ تھکی پٹی باتیں چھوڑو۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''میں صاف سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں ہارون! اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ مجھے احسان اپنے سر پر رکھنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

وہ بڑا ٹیڑھا بندہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ کچھ دیر توقف کرکے میں نے کہا۔ ''جعفر صاحب! فی الحال تو میری کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو آپ کے اصرار کی وجہ سے میں آپ سے ضرور شیئر کروں گا۔''

''اور میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ میری پوری کوشش ہوگی کہ تمہارے کام آسکوں..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک اور بات بھی کہنا ہے۔''

''جی فرمائیں۔'' میں نے کہا۔

وہ اپنے گھنگرالے بالوں میں انگلیاں پھیر کر بولا۔ ''میں زیادہ میل جول پسند نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے اپنی فیملی کے ساتھ تنہا رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بے شک تم ایک قابلِ اعتبار شخص ہو لیکن میں اپنے مخصوص مزاج کی بات کر رہا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ آئندہ اگر ہماری کوئی ملاقات ہو تو وہ ورکشاپ پر ہو یا پھر کہیں بھی گھر سے باہر ہو۔''

''جعفر صاحب! یقین کریں، مجھے یہاں خود بھی ''آک ورڈ'' سا لگ رہا ہے۔ میں آپ کی بات سے پوری طرح متفق ہوں بلکہ اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح کے بجائے ابھی واپس جانا پسند کروں گا۔ ویسے بھی مزار پر ابوسیاف وغیرہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

جعفر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

میں نے سونے کے بجائے روانگی کا ارادہ کیا تو مہرو اور دیگر لڑکیاں حیران نظر آنے لگیں۔ بہرحال جعفر کی موجودگی میں کسی کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ مجھ سے کچھ پوچھتیں۔ مہرو واضح طور پر پریشان نظر آئی۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن بول نہیں سکی۔ وہ آئینے کی طرح شفاف لڑکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو مجھ سے جو لگاؤ ہے، اس میں ایک ذرا سی بھی آلائش نہیں ہے۔

رات کے دس بجے تھے۔ بغداد کے گلی کوچوں میں تاحال رونق تھی۔ کسی کسی چائے خانے سے عربی موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ میں روشن روشن دکانوں کے درمیان پیدل ہی چل پڑا۔ میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ ایک درمیانے قد کا شخص تھا۔ اس نے مقامی انداز کا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر عربی انداز کا سرخ ڈبی دار رومال تھا۔ اپنے شک کی حقیقت جانچنے کے لیے میں ایک دکان پر رکا۔ وہ شخص بھی مجھ سے چند قدم آگے جاکر ایک جنرل اسٹور پر رک گیا..... اور یونہی اشیا کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جوان سال ہی لگتا تھا۔ میں ابھی ٹھیک سے اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا تاہم مجھے محسوس ہوا تھا کہ شاید وہ عربی نہیں ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ وہ شخص میرے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ ذہن میں کئی اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کوئی جرائم پیشہ؟ خفیہ پولیس کا کوئی بندہ جو ایک اجنبی کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا؟ یا پھر کوئی ایسا شخص جسے جعفر نے میرے پیچھے لگا دیا تھا؟

میں مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا اب دریائے دجلہ کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ رات کافی ہوچکی تھی۔ دریا کے کنارے اب اِکّا دُکّا افراد ہی نظر آتے تھے۔ میں بے خوف آگے بڑھتا رہا اور نسبتاً الگ تھلگ کنارے پر چلا گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

یہاں پانی میں چند کشتیاں اور موٹر بوٹس کنارے سے بندھی ہوئی تھیں اور ڈول رہی تھیں۔ کئی بوٹس کے اگلے حصے پانی سے باہر ریت پر چڑھے ہوئے تھے۔ اردگرد کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ وہ شخص کچھ فاصلہ رکھ کر مسلسل میرے پیچھے آرہا تھا۔ میں ایک بڑی بوٹ کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد مدھم چاندنی میں اس شخص کا ہیولا نظر آیا۔ وہ پریشانی سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی شکل دیکھی..... وہ سندھی یا بلوچی نوجوان تھا۔

''میں یہاں ہوں۔'' میں نے اسے آواز دی۔

وہ جیسے اچھل پڑا۔ میں سائے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ چند سیکنڈ تک ہم یک ٹک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہو لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے کیا چاہیے تمہیں؟ کیوں پیچھے آرہے ہو میرے؟''

وہ اب سنبھل چکا تھا۔ حسب توقع اردو میں بولا۔ ''میں نے تم سے بات کرنی ہے۔''

''کرو بات۔''

اس نے اردگرد دیکھا۔ قریب ہی خشکی پر ایک پرانی موٹر بوٹ تھی۔ یہ نہ جانے کب سے دجلہ کی ریتیلی مٹی میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے اندر نیم تاریکی تھی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں۔ چلو آؤ اس کے اندر بیٹھ کر بات کرلیتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جنہیں اپنی قوتِ بازو اور ہمت پر بھروسا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ مضبوط اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے نشہ کیا ہوا ہے۔ بہرحال میں بھی ڈرنے والا نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھ کشتی کے اندر آگیا۔ یہاں جالے لگے ہوئے تھے اور مردہ مچھلیوں کی ہلکی سی بو بھی تھی۔ ہم کاٹھ کباڑ کے قریب لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی، میں نے ٹارچ کی روشنی میں نووارد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ چہرے کے نقوش موٹے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ ٹھیک ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ سندھی ہے۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ یہ نشے میں ہونے کی علامتیں تھیں۔ بہرحال بعد میں پتا چلا کہ وہ نشے میں نہیں بلکہ تیز بخار میں تھا۔

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''کیا بے وقوفی کرتے ہو۔ ٹارچ بجھادو۔ نہیں تو ابھی کوئی چوکیدار پہنچ جائے گا یہاں۔''

میں نے ٹارچ بجھادی۔ وہ ترت بولا۔ ''جعفر سائیں اور مہرو سے کیا تعلق ہے تمہارا؟''

''تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟'' میں نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

''صرف میری بات کا جواب دو۔ ورنہ میں یہاں تمہاری گردن بھی کاٹ سکتا ہوں۔'' وہ پھنکارا۔

میں نے کہا۔ ''تو پھر پہلے تم گردن ہی کاٹ لو۔ سوال جواب بعد میں کرلیں گے۔''

مجھے بے حد حیرت ہوئی جب اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے واقعی ایک تیز دھار چاقو نکال لیا۔ بہکے ہوئے لہجے میں دانت پیس کر بولا۔ ''میں جو کہتا ہوں وہ کر بھی دیتا ہوں۔ میرے سوال کا جواب دو۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں۔ اس کی یہ نیم دیوانگی میرے یا اس کے اپنے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے اپنے اندرونی طیش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''میں جعفر صاحب کی ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔''

اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ وہ بہکی آواز میں بولا۔ ''اچھا تو..... میرا اندازہ درست ہے..... مہرو کے رشتے کی بات تم سے ہی ہورہی ہے۔''

میں سٹپٹا گیا۔ ''پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔''

''لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آرہا ہے۔'' وہ پھنکارا۔ ''وہ تم ہی ہو جو میری مہرو پر ڈاکا ڈالنے والے ہو۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ کان کھول کر سن لو تم! وہ میری ہے۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'' دیوانگی کے عالم میں اس نے چاقو کی تیز نوک میری گردن سے لگادی۔

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہورہی ہے.....''

ابھی میرا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ اس نے مشتعل ہوکر الٹے ہاتھ کی ضرب میرے چہرے پر لگانی چاہی۔ وہ مجھے ''انڈر اسٹیمیٹ'' کررہا تھا اور اپنی طاقت کا بھی شاید غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر خود کو اس کے تھپڑ سے بچایا اور پھر ٹانگ کی ضرب سے اسے ایک دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ چوبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ پھر میری

www.pdfbooksfree.pk

طرف لڑھکا۔ تیز دھار لمبے پھل والا چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور یہی چیز زیادہ خطرناک تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کی کلائی تھامی اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں ہم کشتی کے فرش پر گر پڑے۔ وہ کافی زور آور تھا۔ شاید بخار کی مدہوشی نے اس کی طاقت اور جرأت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ تک میرے اور اس کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی۔ اس کے گھونسوں سے میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا اور میری ضربات نے اس کا جبڑا ہلا دیا۔ میرے جسم پر تو کوٹ تھا لیکن اس کا چغہ تار تار ہو گیا تھا۔ آخر مجھے ایک موقع مل ہی گیا۔ چہرے پر میرے سر کی زوردار ٹکر کھا کر وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ چاقو لکڑی کے فرش پر گرا اور واضح آواز آئی۔ چاقو گرنے کے بعد میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ قریباً ایک منٹ بعد وہ چاروں شانے چت میرے سامنے پڑا تھا۔ میرے گھونسوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے اس کا چاقو اٹھا لیا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچ کر لکڑی کے تختے پر بٹھا دیا۔ اس نے گردن ڈال رکھی تھی اور مسلسل خون تھوک رہا تھا۔

اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے میں نے ٹارچ روشن کی۔ اس کے سانولے چہرے پر دو تین جگہ گہری چوٹیں تھیں اور خون رس رہا تھا۔ نیچے والا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔

''کچھ اور ہاتھ پاؤں چلانے کی حسرت ہے تو نکال لو۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

وہ بس ہانپتا رہا۔ اس کا چغہ اس کے بالائی جسم سے علیٰحدہ ہو چکا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کی توانا چھاتی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ چھاتی کے علاوہ اس کے پورے جسم پر کئی چھوٹے چھوٹے نشان نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی گرم مہر سے جسم کو داغا گیا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا اور میری حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ ایک لفظ تھا جسے شاید گرم مہر سے جسم پر نقش کیا گیا تھا..... اور یہ لفظ تھا ''مہرو''۔ یہ صاف پڑھا جا رہا تھا۔

☆☆☆

قریباً دو گھنٹے بعد میں اس سندھی نوجوان کے ساتھ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار کے احاطے میں موجود تھا۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ رات کے ایک بجے کا عمل تھا، پہلی راتوں کا چاند مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا۔

اس نوجوان نے اپنا نام ابراہیم بتایا تھا۔ دجلہ کے کنارے سے ہم ایک چھوٹی ٹیکسی میں بیٹھ کر مزار پر پہنچے تھے۔ راستے میں، میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ''پائیوڈین'' لے کر ابراہیم کے چہرے کی چوٹوں پر لگائی تھی۔ ٹیکسی میں سفر کرنے کے لیے ابراہیم کے پھٹے ہوئے لبادے کو گرہیں دے کر باندھنا پڑا تھا۔

''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے ابراہیم سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔

میری نگاہوں میں ابھی تک وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے داغ گھوم رہے تھے جو ابراہیم کے برہنہ جسم پر نظر آئے تھے..... بہرحال ابھی میں یہ موضوع چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اس میں تمہاری ہی غلطی زیادہ تھی لیکن اب تم مجھے اپنا دشمن نہیں دوست سمجھو اور جو معاملہ بھی تمہارے ساتھ ہے وہ مجھے صاف صاف بتاؤ۔ میں تمہاری مدد نہ بھی کر سکوں تو تمہیں کوئی ایسا مشورہ ضرور دے سکتا ہوں جو تمہیں فائدہ دے۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''پہلے تم مجھے بتاؤ کہ اگر تم ورکشاپ کے وہ کاریگر نہیں ہو جس کے ساتھ جعفر اپنی بہن کی شادی کرنا چاہتا ہے..... تو پھر وہ کون ہے؟''

''میں ایک بار پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں..... تمہاری طرح مجھے بھی یہاں بغداد میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے اور ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے تو صرف دو تین دن ہوئے ہیں۔''

''وہ ورکشاپ میں ''فورمین'' کرتا ہے۔''

میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ''فورمین تو ایک عراقی ہے۔ چوبیس پچیس سال عمر ہوگی۔ زبیر نام ہے شاید اس کا۔''

ایک دم میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ ابراہیم نے طیش میں ہاتھ چلایا۔ سامنے رکھے ہوئے قہوے کے برتن دور تک لڑھک گئے۔ میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے اور سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر گھسا لیا۔ چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ مزار کے احاطے میں موجود اِکّا دُکّا افراد نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

''کیا ہوا ابراہیم؟'' میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''مجھے کچھ نہ بتاؤ، خدا کے لیے مجھے کچھ نہ بتاؤ اس کے بارے میں۔''

''کس کے بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''جس سے مہرو کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔ میں اس کا نام نہیں سننا چاہتا، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جاننا چاہتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔۔۔'' اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے اور فرطِ کرب سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

وہ جذباتی کیفیت میں تھا۔ میں نے کچھ دیر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس کی آنکھوں میں شاید آنسو امڈ آئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں اس سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت جو تمہارے خیال میں نہیں آسکتی۔ کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ میں اس کے لیے مرسکتا ہوں اور مار بھی سکتا ہوں۔ میرے لیے یہی دکھ کچھ کم نہیں تھا کہ وہ میرے گاؤں سے جا رہی تھی پھر جب مجھے یہ پتا چلا کہ اس کا بھائی اس کی شادی کرانے کے لیے لے کر جا رہا ہے، تو مجھے لگا میں جیتے جی مر گیا ہوں۔ میں مسلمان ہوں، اللہ کو مانتا ہوں۔ اپنی جان دینے کو جرم سمجھتا ہوں..... نہیں تو شاید پہلے مہینے ہی نواب شاہ کے اسٹیشن پر جا کر اپنا سر ریل کی پٹری پر رکھ دیتا۔'' وہ سسکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! اس طرح سے کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تم جو بتانا چاہتے ہو شروع سے بتاؤ اور ترتیب سے.....''

جواب میں ابراہیم نے رک رک کر جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے اپنے سوالوں کے ذریعے اس سے پوچھا، وہ کچھ اس طرح تھا۔

ابراہیم، مہرو کا چچازاد تھا، اس کے والد کا نام پیر بخش تھا۔ وہ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان سے بڑے بھائی کا نام غلام نبی تھا اور مہرو ان کی بیٹی تھی۔ سب سے بڑے بھائی فضل الٰہی تھے۔ وہ ابھی حیات تھے۔ باقی دونوں بھائی وفات پا چکے تھے، کوئی تیرہ چودہ سال پہلے جب مہرو اپنے والد غلام نبی کے ساتھ عراق سے پاکستان آئی اور نواب شاہ پہنچی تو اس کی عمر فقط چار پانچ سال تھی۔ ابراہیم اس وقت آٹھ نو سال کا ہوگا۔ اس نے اپنی ننھی منی تایازاد کو دیکھا اور وہ پیاری چنچل لڑکی اس کے دل میں کھب کر رہ گئی لیکن یہ بچپن کی پسندیدگی تھی۔ بالکل بھائی بہنوں اور قریبی کزنوں جیسی۔ دونوں کے گھر بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ بس ایک دیوار درمیان میں تھی۔ وہ اکٹھے کھیلتے کودتے رہے۔ اکٹھے ہی اسکول جاتے رہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابراہیم لڑکپن سے ہی مہرو کے عشق میں گرفتار ہونا شروع ہوگیا تھا لیکن وہ عام شکل وصورت کا تھا اور بہت کم گو بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس کی مالی حیثیت بھی چھوٹے تایا کی فیملی سے کم تھی۔ چھوٹے تایا عراق سے لوٹے تھے اور ان کے پاس کافی پیسے تھے۔ انہوں نے نواب شاہ میں ہی جستی پنیاں وغیرہ بنانے کا کام کرلیا تھا۔ ابراہیم ہمیشہ مہرو کے سامنے دبا ہوا رہا۔ اس سے لگاوٹ ظاہر کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اس سے کھل کر بات کرتے ہوئے بھی شرماتا تھا۔ میٹرک کرنے سے پہلے ہی ابراہیم اپنے بیمار باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک گودام پر ملازمت کرنے لگا جبکہ مہرو اسکول جاتی رہی۔ اسکول چھوڑنے کی وجہ سے مہرو کے ساتھ اس کی دوری کچھ اور بڑھ گئی۔ ویسے بھی اس نے چھوٹے تایا کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ابراہیم کا زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتے۔

مہرو سے دوری نے ابراہیم کے دل میں مہرو کی چاہت کچھ اور بڑھا دی۔ وہ ہر وقت اس کے خیالوں میں گم رہنے لگا۔ گھر کی چھت پر چلا جاتا اور اس کوشش میں رہتا کہ صحن میں گھومتی پھرتی مہرو کی جھلک نظر آجائے۔ تنہائی میں وہ مہرو کے بارے میں سوچتا اور دل میں پختہ ارادہ کرتا کہ وہ جب اکیلے میں اس سے ملے گا تو اس سے کہے گا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ ساری باتیں کرے گا جو اس کے دل میں چھپی ہوئی ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع ملتا، اس کو بالکل چپ لگ جاتی۔

خاموشی اس کے اندر ایک ابال پیدا کر رہی تھی۔ یہ ابال اس کی رگ رگ میں پھیل رہا تھا۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں میں طلب اور عشق کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ اس کے دن اور رات اب صرف اور صرف مہرو کی سوچوں کے گرد گھومنے لگے تھے۔ وہ ہتھیلی پر اس کا نام لکھ لکھ کر مٹاتا۔ اکیلے میں آنکھیں بند کرلیتا اور بغیر اپنے ہونٹ ہلائے ''مہرو..... مہرو'' پکارتا رہتا۔ ایک روز مہرو کے گھر میں سے مہرو کی ایک قمیص اڑ کر ان کے صحن میں آن گری۔ یہ قمیص شاید سوکھنے کے لیے دھوپ میں پھیلائی گئی تھی۔ ابراہیم نے یہ قمیص کسی کو بتائے بغیر اپنے پاس محفوظ کرلی۔ یہ قمیص ابراہیم کو مہرو کی قربت کا احساس دلاتی تھی۔ وہ بند کمرے میں پہروں اس قمیص کو اپنے سینے پر پھیلائے لیٹا رہتا اور اس میں سے مہرو کی خوشبو سونگھنے کی کوشش کرتا۔ پھر ایک مرتبہ مہرو کی ایک پرانی چپل اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اس

www.pdfbooksfree.pk

چپل کو بھی لے آیا اور محفوظ کرلیا۔ اس چپل پر ہاتھ پھیرتا اور اسے سہلاتا اسے اچھا لگنے لگا۔ ایک بار مہرو تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی تو اس نے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ اس کے چند بال برش میں اٹکے رہ گئے۔ ابراہیم نے وہ چند بال کسی قیمتی چیز کی طرح برش میں سے نکال لیے اور انہیں اپنی اشیا کے ''خزینے'' میں شامل کرلیا۔ اس کے پاس ایسی کئی چھوٹی چھوٹی اشیا جمع تھیں۔ مہرو کی قمیص کا ایک سرخ بٹن، اس کی ٹوٹی ہوئی دو چوڑیاں، اس کی پانچویں کلاس کی ایک کاپی جس میں اس کی ہینڈ رائٹنگ تھی..... اس کے لکھے ہوئے بچکانا شعر تھے۔ یہ سب اشیا اس کے لیے ایک خزینے کی طرح تھیں۔ وہ ان چیزوں میں اپنے محبوب کی قربت ڈھونڈتا اور اکثر کامیاب رہتا تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جارہا تھا۔ مہرو اب سولہ سترہ سال کی تھی۔ ابراہیم کی عمر بیس اکیس برس تھی۔ وہ سرتاپا اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا لیکن وہ اپنے عشق کا اظہار نہیں کرپاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ عشق اب تک یک طرفہ تھا۔ کم از کم ابراہیم کو تو یک طرفہ ہی نظر آتا تھا۔ مہرو کی طرف سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس کے سبب ابراہیم کو یہ پتا چلتا کہ وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ ہاں وہ اس سے بے تکلف ضرور تھی۔ کبھی موقع ملتا تو اسے لطیفے سناتی تھی۔ چنچل باتیں کرتی تھی اور کبھی کوئی چھوٹی موٹی شرارت بھی۔

ایک کزن کی حیثیت سے اس کے دل میں یقیناً ابراہیم کے لیے ہمدردی اور انسیت کا جذبہ بھی تھا۔ جب ابراہیم کے والد بہت زیادہ بیمار ہوئے تو اس کی مالی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ ان کے گھر میں فاقے رہنے لگے۔ انہی دنوں ابراہیم کی والدہ کو اس کی ایک پرانی سہیلی نے پانچ ہزار روپے ادھار دیے۔ ان روپوں سے ابراہیم کے والد کا علاج بھی شروع ہوا اور گھر میں چولہا بھی جلنے لگا۔ بعدازاں ابراہیم کے والد جانبر نہ ہوسکے تھے۔ بہرحال اس کے گھر کا خرچہ ان تین چار ہزار روپوں سے کئی ماہ تک چلتا رہا۔ جب ابراہیم کی مالی حالت تھوڑی سی بہتر ہوگئی تو ابراہیم نے ماں سے کہا کہ وہ اپنی سہیلی کو روپے واپس کردے۔ تب اس کی والدہ نے بتایا کہ وہ روپے کسی اور نے نہیں مہرو نے دیے تھے اور وہ واپس کبھی نہیں لے گی (یہ روپے مہرو نے اپنی پرانی بالیاں بیچ کر دیے تھے اور بعدازاں گھر والوں کو یہ بتایا تھا کہ بالیاں کہیں گم ہوگئی ہیں) پھر جب پکے فرش پر پھسل جانے سے ابراہیم کی والدہ کی ٹانگ فریکچر ہوگئی تھی تو ابراہیم کو گھر میں خود روٹیاں پکانا پڑیں۔ مہرو کو پتا چلا تو وہ چپکے سے اس کے اور ماں کے لیے کھانا بھجوانے لگی۔ موقع ملنے پر وہ ماں کی تیمارداری کے لیے بھی آجاتی تھی۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب ماں سوئی ہوئی تھی، ابراہیم نے بہت ہمت کی۔ وہ دونوں برآمدے میں پاس پاس بیٹھے تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ''مہرو! میں بہت غریب ہوں۔ اگر غریب نہ ہوتا تو تایا سے ضرور تمہیں مانگ لیتا۔''

''مانگ لیتا؟ کیا مطلب؟''

''تمہیں اپنے گھر لے آتا۔''

''وہ تو میں اب بھی آسکتی ہوں۔ چاچی کی خدمت کرسکتی ہوں۔ تم دونوں کے لیے روٹی بھی پکا سکتی ہوں۔ میرے خیال میں اگر چاچی خود کہے تو شاید ابا جی اجازت بھی دے دیں۔''

''میں اس طرح آنے کی بات نہیں کررہا مہرو! میں اور طرح آنے کی بات کررہا ہوں۔''

''کس طرح؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''میں..... تم سے..... شادی..... کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ''شادی.....؟ شادی تو میں نے کرنی ہی نہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''وہ کیوں مہرو؟''

''بس مجھے اچھی نہیں لگتی یہ شادی۔ میں اکیلی سوتی ہوں اور شادی کے بعد تو کمرے کے اندر اپنے بندے کے ساتھ سونا پڑتا ہے نا.....'' اس نے کہا اور پھر خود ہی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ شاید اسے کوئی بات یاد آگئی تھی۔

اس کی ایسی ہی معصوم ادائیں ابراہیم کو بھاتی تھیں اور اس کے اندر دور تک کھب جاتی تھیں۔

دن بہ دن اس کی حالت عجیب ہوتی جارہی تھی۔ وہ ایک سائیں پیر سے ملا اور ان سے اپنے دل کا حال بیان کیا۔ سائیں جی کوئی شعبدہ باز فقیر نہیں تھے، صحیح معنوں میں اللہ والے تھے۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ اسے عشق ہوچکا ہے اور یہ عشق بہت قربانی مانگتا ہے۔ اس میں پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنا پڑتا ہے اور بہت دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ وہ ان سب تکلیفوں کے لیے تیار ہوجائے..... اور اگر ایسا نہیں کرسکتا تو پھر اس لڑکی کا خیال دل سے نکال کر کہیں بھی فوراً شادی کرلے۔

اگلے چند مہینوں میں ابراہیم نے بہت کوشش کی۔ پیر سائیں کے بتائے ہوئے وظیفے بھی پڑھے مگر وہی بات تھی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

مہرو بہت شوخ تھی مگر کبھی کبھی وہ اداس بھی ہوجاتی

www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ وہ اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی تھی جو عراق میں رہ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو تو نہ دیکھ سکی لیکن ایک دن اپنے باپ کو بھی دیکھنے سے محروم ہوگئی۔ اس کے والد یعنی ابراہیم کے چھوٹے تایا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد مہرو اپنی دادی اور بڑے تایا فضل الٰہی کے پاس رہنے لگی۔ چھوٹے تایا کی وفات کے بعد ابراہیم کو تھوڑی سی امید پیدا ہوئی تھی کہ شاید اب مہرو سے اس کے رشتے کی بات آگے بڑھ سکے اور دادی جو ابراہیم سے بھی یکساں پیار کرتی تھی، اس کے اور مہرو کے رشتے پر آمادہ ہوجائے لیکن یہ خیال بھی خام ہی نکلا۔ بڑے تایا کا ایک اپنا بیٹا بھی شادی کے قابل تھا اور تایا نے اس کے لیے مہرو پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ دادی اس بارے میں غیر جانبدار ہی تھی۔ بڑے تایا کے گھر جانے کے بعد مہرو پر پابندیاں اور بڑھ گئیں۔ اب ابراہیم اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس گیا۔ کسی وقت اسے لگتا تھا کہ مہرو سے اس کی یہ دوری آہستہ آہستہ اس کو گوارا ہونا شروع ہوجائے گی۔ وہ اس سے دور رہنے کا عادی ہوجائے گا۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے اندر مہرو کی طلب کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہے۔ یہی دن تھے جب اپنے جنون میں اس نے پہلی بار اپنے جسم کو لوہے کی مہر سے داغا۔ یہ مہر اس نے خود ہی بنائی تھی اور اس پر اردو میں ''مہرو'' کندہ تھا۔ پہلی بار یہ مہر ابراہیم نے اپنے سینے پر عین دل کے مقام پر لگائی تھی۔ تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن اس تکلیف میں بھی لذت تھی۔ جب اس نے ایک بار یہ لذت حاصل کی تو پھر بار بار حاصل کرنے کو دل چاہا۔ وہ ہر دو تین ہفتے بعد اس مہر سے اپنا سینہ داغنے لگا۔ جب بھی اسے لگتا کہ مہرو کو یاد کرنے میں اس سے کوتاہی ہورہی ہے، وہ جیسے سزا کے طور پر اپنے جسم کو داغ لیتا۔ یہ عجیب لذت تھی..... عجیب سرور تھا۔ مہرو تایا کے بیٹے کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی، اس لیے کبھی کبھی ابراہیم کے دل میں یہ امید پیدا ہوتی تھی کہ شاید دادی کا فیصلہ اس کے حق میں ہوجائے اور وہ مہرو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کی توقع ابراہیم کو ہرگز نہیں تھی۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ تایا کے گھر میں ایک مہمان آیا ہے۔ اس نے اس دراز قد مہمان کو دیکھا، وہ مقامی نہیں لگتا تھا بلکہ پاکستانی بھی نہیں لگتا تھا۔ بعد میں ابراہیم کو پتا چلا کہ وہ عراق سے آیا ہے۔ اس کا نام جعفر ہے اور وہ مہرو کا سگا بھائی ہے۔ مہرو کبھی کبھی اپنی والدہ کے علاوہ اپنے بھائی کا ذکر بھی کیا کرتی تھی۔ اب وہ بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ دن بعد ابراہیم پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ مہرو کا بھائی جعفر اسے اپنے ساتھ بغداد لے جانا چاہتا ہے اور اس کا پاسپورٹ وغیرہ بنوا رہا ہے۔

ابراہیم دم بخود رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر مہرو یہاں سے چلی گئی تو وہ کس طرح جی پائے گا۔ اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ مہرو سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ ایک دن اس نے بہت کوشش کرکے تایا کے گھر کی چھت پر مہرو سے تھوڑی سی بات کی۔ وہ بہت لمبی چوڑی باتیں سوچ کر آیا تھا مگر جب مہرو سامنے آئی تو وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''مہرو! تم چھوڑ کر نہ جاؤ..... میں کیا کروں گا؟''

''کیوں؟ کیا تم اداس ہوجاؤ گے؟'' وہ سادگی سے بولی تھی۔

''ہاں..... بہت زیادہ۔''

''تو تم مجھ کو خط لکھا کرنا۔ یہاں سے سب کی تصویریں بھیجا کرنا اور میں بھی آیا کروں گی۔ زیادہ نہیں تو سال دو سال بعد تو چکر لگا کرے گا۔''

''تم بالکل نہیں سمجھ پا رہی ہو مہرو..... میں تم سے..... میں تم سے.....'' اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ وہ کھانسنے لگا۔

''پانی لاؤں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

یہی وقت تھا جب تایا اوپر آگئے۔ انہوں نے ابراہیم کو شعلہ بار نظروں سے گھورا اور مہرو کو ڈانٹ کر بولے۔

''یہاں کیا کر رہی ہو، چلو نیچے جاؤ۔''

مہرو چلی گئی اور ابراہیم بھی کنی کترا کر سیڑھیوں کی طرف آگیا۔

اس دن کے بعد تایا نے اپنے گھر میں ابراہیم کا داخلہ بالکل بند کردیا۔

چار پانچ دن بعد اپنی والدہ ہی کی زبانی ابراہیم کو پتا چلا کہ مہرو کا پاسپورٹ بن گیا ہے اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ جارہی ہے۔ والدہ نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بھائی جعفر نے بغداد میں کہیں مہرو کا رشتہ بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ وہ وہاں اس کی شادی کرائے گا۔

یہ خبریں ایسی تھیں جنہوں نے ابراہیم کو ہوش و حواس سے بیگانہ کردیا۔ وہ دو تین دن بخار میں بے ہوش پڑا رہا۔ اسی دوران میں اسے پتا چلا کہ مہرو اپنے بھائی اور اپنے ایک خالو نور بخش کے ساتھ نواب شاہ سے کوئٹہ کے لیے روانہ ہوگئی ہے۔ وہاں سے انہوں نے بس کے ذریعے ایران اور پھر بغداد شریف چلے جانا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

مہرو کے چلے جانے کے بعد قرب و جوار ابراہیم کے لیے سنسان ہوگئے۔ اسے لگا کہ اس کے اردگرد ایک ویرانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہاں زرد دھوپ میں خاک اڑتی ہے اور اداسیوں کے گدھ منڈلاتے ہیں۔ وہ ان خالی جگہوں کو دیکھتا جہاں جہاں اسے مہرو نظر آیا کرتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ ایک دن وہ چپکے سے پاسپورٹ کے دفتر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی محنت مزدوری کی کمائی میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی شادی کے لیے بچایا ہوا تھا۔ یہ کوئی چھ ہزار روپے تھے۔ اس نے ارجنٹ پاسپورٹ کے لیے درخواست جمع کرادی اور چپکے چپکے سفر کی تیاری میں مصروف ہوگیا..... وہ مہرو کے پیچھے جانا چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا اور پھر جب مرنا ہی تھا تو وہ کیوں نہ اپنی مہرو کے سامنے مرتا۔

جونہی اس کا پاسپورٹ بنا، وہ اپنی جمع پونجی لے کر اور اپنی ماں کو کراچی جانے کا بتا کر بغداد کے لیے روانہ ہوگیا۔

اب اسے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس کے پاس جعفر کا پتا موجود تھا۔ پھر بھی اسے جعفر کے ٹھکانے تک پہنچنے میں کافی کوشش کرنا پڑی۔ ایک مرتبہ تو وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔ اب وہ جعفر کے گھر کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ مہرو کو حاصل کرنا یا پھر اس کی شادی سے پہلے پہلے اس کے سامنے اپنی جان دے دینا..... اور یہ ثابت کردینا کہ وہ اس سے سچا عشق کرتا تھا۔

میں ابراہیم کی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ وہ مجھے جیتے جاگتے انسان کے بجائے کہانیوں کا کوئی کردار لگا۔ سرتاپا اپنے عشق میں ڈوبا ہوا اور اپنے محبوب کو پانے کے لیے ہر مشکل سے ٹکرانے کو تیار۔ اس کا دل ہی نہیں اس کا جسم بھی مہرو کی محبت میں داغ داغ تھا۔ یہ کیسا جذبہ تھا؟ یہ کیسی طلب تھی؟

اس کی گفتگو ختم ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم میرے پیچھے کس طرح لگ گئے ابراہیم؟''

وہ بولا۔ ''سائیں! میں نے پرسوں آپ کو مہرو کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ آپ ایک بندے کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اندر گئے تھے۔ مجھے لگا کہ شاید آپ ہی ورکشاپ کے وہ ملازم ہو جس کے ساتھ جعفر اپنی بہن کی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر وہ آپ کو اپنے گھر کیوں لایا اور کیوں رات کو وہاں رکھا۔ تو سائیں جب آج رات میں نے آپ کو مہرو کے گھر سے نکلتے دیکھا تو آپ کے پیچھے لگ گیا۔''

''تم نے بتایا ہے کہ جعفر اپنی بہن کی شادی کسی عراقی ملازم سے کررہا ہے۔ کیا میں تم کو عراقی لگ رہا تھا؟''

''نہیں سائیں! اسی لیے مجھے کچھ شک بھی ہوا تھا کہ شاید میں آپ کے بارے میں غلط اندازہ لگا رہا ہوں۔''

رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ دجلہ کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا کی آمد ہونے لگی تھی۔ احاطے میں لوگ یہاں وہاں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! محبت یک طرفہ تو نہیں ہوتی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مہرو بھی تم سے محبت کرتی ہے؟''

وہ عجیب انداز میں بولا۔ ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں سائیں! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اتنی..... جتنی کوئی کسی سے کرسکتا ہے۔ لیکن..... یہ بات بھی نہیں کہ وہ مجھے ناپسند کرتی ہے۔ اگر تایا اس کے ساتھ میری شادی کردیتے تو مجھے یقین ہے وہ بہت خوش ہوتی۔''

''کیا تم یہاں آنے کے بعد مہرو یا جعفر سے ملے ہو؟''

''نہیں سائیں! ابھی تک تو نہیں ملا لیکن آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں یہ ملاقات ہونی ہی ہے۔''

''تمہارے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟''

''کوئی پروگرام نہیں سائیں! پروگرام تو ان کے ہوتے ہیں، جن کی عقل سمجھ کام کررہی ہوتی ہے۔ میرا دماغ تو جیسے بند ہو چکا ہے سائیں۔ میں سچ کہتا ہوں سائیں! مجھے مہرو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور نہ سنائی دیتا ہے۔ میں تو..... جعفر سے یہ کہوں گا کہ میں اپنی ساری زندگی اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اس کے نام لکھ دیتا ہوں۔ وہ زندگی بھر کے لیے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ لے..... اور اگر اسے یہ غلامی قبول نہیں تو پھر مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے۔''

میں نے دل میں سوچا کہ جس طرح کا وہ بندہ ہے، وہ تمہیں گولی مار بھی سکتا ہے..... ابراہیم مجھے اپنی جیب سے کوئی کاغذ نکال کر دکھانا چاہ رہا تھا..... شاید کوئی خط تھا..... لیکن اسی دوران مجھے ابوسیاف اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ ابوسیاف نے آتے ہی کہا۔ ''ہارون! تمہیں پتا ہے، پاکستان سے تمہارے کچھ مہمان آئے ہیں۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ پتا نہیں، وہ کس کی بات کررہا تھا۔ ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ابوسیاف نے مجھے اور ابراہیم کو ساتھ لیا اور روضے

www.pdfbooksfree.pk

کے پہلو میں واقع ایک چھوٹے احاطے میں آ گیا۔ میں مہمانوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ پاکستان کی معروف گلوکارہ ریشماں اور اس کے ساتھی تھے۔ ان دنوں ریشماں جواں سال اور صحت مند تھی..... اور تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس سے ملا اور بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ وہ اور اس کے ساتھی گرمجوشی سے ملے۔ یہ پورا گروپ تھا جس میں سازندے وغیرہ بھی شامل تھے۔ ریشماں نے سیدھے سادے دیہاتی لہجے میں بتایا۔ ''باؤ جی! دیکھو ہم ہزاروں میل کا سفر کر کے یہاں آئے ہیں، غوث پاک کے مزار پر حاضری دینے کے لیے۔ لمبا سفر تھا پر یہاں پہنچ کر ساری تھکاوٹ منٹوں میں دور ہو گئی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہاں آپ کیا کریں گی؟''

وہ بولی۔ ''اپنی آواز کا نذرانہ دیں گے، کچھ پڑھیں گے یہاں۔''

''لیکن یہاں سختی بہت ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ گانا بجانا کریں اور یہ لوگ آپ کو پکڑ لیں۔''

''نہیں، ہم یہاں سے دور ہٹ کر بیٹھیں گے۔'' ریشماں نے کہا۔

ابوسیاف اور ایک پاکستانی منتظم نے گروپ کی خاطر مدارات کی۔ میں نے بھی ابوسیاف کا ہاتھ بٹایا۔ یہ لوگ بہت تھکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ صبح دس بجے کے قریب پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ ریشماں اور اس کے ساتھی احاطے سے باہر ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ ریشماں کے چہرے پر عقیدت اور نیازمندی کے تاثرات تھے۔ وہ دھیمی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ جیسے ریہرسل کر رہی ہو۔ یہ شاید کسی کافی کے بول تھے۔

دوپہر کو میں نے ابوسیاف سے اجازت لے لی کہ میں ابراہیم کو یہاں اپنے ساتھ مزار میں لے آؤں۔ ابراہیم دریائے دجلہ کے بڑے پل کے پاس ایک مسافر سرائے میں رہ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ مسافر سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس سے کچھ افراد کے گھناؤنے کردار پر روشنی پڑی۔ سچ کہتے ہیں کہ حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک انڈین ملا۔ اس کا نام سلیمان تھا اور میں نے اسے اکثر مزار کے خدمت گاروں میں دیکھا تھا (مزار کے اکثر خادم پاکستانی یا انڈین تھے) سلیمان کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بڑا سا بیگ تھا۔

سلیمان سے میری علیک سلیک ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ''عبدالغفور صاحب کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر جا رہا ہوں۔''

''کون عبدالغفور؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! وہی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے۔ وہ مزار کی انتظامیہ کے افسر ہیں۔''

''لیکن ان کے کھانے پینے کا سامان تم مزار میں لے کر کیوں نہیں جا رہے؟''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''یہ سامان مزار میں نہیں جا سکتا نا..... غفور صاحب کی اپنی رہائش گاہ بھی ہے یہاں۔ چھوٹے پل کے پاس۔''

جلد ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ بیگ میں خمیر شدہ مشروب ہے..... یعنی شراب ہے..... بوتلوں پر ''روح مسیح'' اور ''روح قدس'' جیسے الفاظ لکھے نظر آئے۔ سلیمان کی باتوں سے پتا چلا کہ نئی دہلی کا رہنے والا یہ شخص اکثر نشے میں غرق رہتا ہے اور اس نے نوجوان لڑکیوں کو نکاح میں لانے اور پھر طلاق دینے کا مذموم مشغلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ سلیمان نے یہ بھی بتایا کہ مزار کے نیک نام متولی ''عالی مقام'' اس سے بہت نالاں ہیں۔

عالی مقام کا ذکر آیا تو میرے سینے میں پھر بے چینی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ عالی مقام کا اصل نام تو شیخ ابوالحسن تھا۔ ''عالی مقام'' کی حیثیت لقب کی تھی۔ ابھی تک دوبارہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں سلیمان سے بھی سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اس کی معلومات کے مطابق حضرت آج کل بغداد سے باہر ہیں۔

سلیمان کے انکشافات پر چلتے کڑھتے ہم مسافر سرائے پہنچے تو تیز آندھی آ گئی۔ یہ یقینی ہوا تھی جو ہر چیز کو ڈھانپ رہی تھی اور دہلا رہی تھی۔ آندھی کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ ابراہیم نے مشورہ دیا کہ اس وقت مزار واپس جانے کے بجائے رات یہیں گزار لی جائے۔ مجھے یہ تجویز مناسب لگی۔ سرائے میں ہم رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنے بارے میں بھی ابراہیم کو تھوڑا بہت بتایا۔ بہرحال اسے اس بات سے آگاہ نہیں کیا کہ میں اپنی نئی نویلی دلہن کو سہاگ رات میں چھوڑ کر ہزاروں میل دور چلا آیا ہوں۔

ابراہیم سے باتیں کرتے ہوئے میرے زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ عارفہ کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ سے پوچھنے لگیں..... مجھے بتاؤ

www.pdfbooksfree.pk

میرا کیا قصور ہے؟ وہ سارے حالات میرے ذہن میں تازہ ہوگئے جنہوں نے میری شادی کی رات مجھے گھیرا تھا اور گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ سب کچھ بہت انوکھا تھا۔ اس انوکھے پن کا تھوڑا بہت جواب تو مجھے محترم عالی مقام نے دیا تھا لیکن ابھی مکمل جواب سے میں محروم تھا اور نہ ہی مجھے یہ پتا تھا کہ میں اس خوفناک صورتِ حال سے خود کو کیسے نکال سکتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں وہاں سرائے میں بیٹھے بیٹھے اور ابراہیم سے باتیں کرتے کرتے عارفہ اور اپنی ماں کی یاد نے بڑی شدت سے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑا..... اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں کم از کم ان لوگوں کو اپنی خیریت سے تو آگاہ کردوں۔ کچھ اور نہیں تو ایک خط ہی اپنی بدنصیب دلہن کے نام لکھ دوں۔

ہم اگلے روز دس بجے کے قریب واپس غوث پاک کے روضے پر پہنچ گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ریشماں اور ان کا طائفہ یہاں سے جاچکا ہے۔ ریشماں نے کل یہاں عارفانہ کلام پڑھا تھا اور پاکستانیوں اور انڈینز سے داد پائی تھی۔ اب وہ کسی اور جگہ کا رخ کرچکے تھے۔

فرصت ملتے ہی میں نے ایک کاغذ قلم لیا اور خط لکھنا شروع کیا۔ یہ خط والدہ اور عارفہ کے نام تھا۔ اس طویل خط میں، میں نے دل کے کئی پھپھولے پھوڑے اور انہیں بتایا کہ نامعلوم وجوہ سے میں ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوں۔ سکون حاصل کرنے کے لیے ایک اللہ والے کے در پر موجود ہوں اور دن رات دعا کررہا ہوں کہ آپ کے پاس واپس آنے کے قابل ہوسکوں۔ اب یہ خواہش پوری ہوتی ہے یا نہیں اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ بس میرے لیے بہت زیادہ دعا کریں۔

اس خط میں، میں نے اپنے پتے ٹھکانے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ بغداد میں اللہ والوں کے بہت سے مزارات ہیں۔ شام کے وقت میں خط پوسٹ کرنے کے لیے پوسٹ آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں یہ خط مرکزی پوسٹ آفس سے پوسٹ کرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے کافی فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جس وقت میں پوسٹ آفس کے قریب بس سے اترا، اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی اور دل دھڑک رہا تھا۔ ابھی میں پوسٹ آفس سے بیس تیس قدم دور تھا کہ یکایک مجھے رکنا پڑا..... مجھے لگا جیسے میں سر سے پاؤں تک پتھرا گیا ہوں۔ ایک منظر جسے میں بہت دنوں سے بھولا ہوا تھا، ایک دم پھر میرے سامنے آگیا تھا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں ہمیشہ توہمات اور بے معنی خیالات سے دور رہا ہوں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں لیکن اس وقت مجھے جو کچھ وہاں نظر آیا... یا میری نظر نے جو کچھ دکھایا، وہ سمجھ اور فہم سے بالاتر تھا۔ میں نے پوسٹ آفس کے مین دروازے کے عین سامنے وہی سفید ہیولا دیکھا۔ سر سے پاؤں تک لبادے میں لپٹا ہوا۔ بس کالی اور سفید ڈاڑھی کی ہلکی سی جھلک..... ہاں یہ وہی تھا۔ بالکل خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میری دھڑکن تھم گئی ہے اور میں کسی بھی وقت چکرا کر گر جاؤں گا۔

چند سیکنڈ اسی خوفناک کیفیت میں گزرے پھر پوسٹ آفس کی ایک لوڈر نما گاڑی میرے اور ہیولے کے درمیان آگئی۔ وہ ریورس ہورہی تھی۔ وہ ریورس ہوکر آگے گئی تو میں نے پھر مین گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ایک موٹی عراقی عورت اپنے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی..... سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ یہ ایک بارونق جگہ تھی۔ مرد و زن آجارہے تھے۔ چھوٹی بڑی گاڑیاں بھی حرکت کررہی تھیں۔

وہ کہیں نہیں تھا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے۔ مجھے دیکھ رہا ہے..... گھور رہا ہے، میں جونہی آگے بڑھوں گا وہ کسی تاریک کونے کھدرے سے نکلے گا اور میرے سامنے آجائے گا۔ میرا دل یہ گواہی بھی دے رہا تھا کہ وہ مجھے بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں اس کی وجہ سے اپنی زندگی کھو سکتا ہوں۔ قبر کی تاریکی میں اتر سکتا ہوں۔ وہی سفید کفن اور کافور کی بو۔ دل نے پکار کر کہا۔ ”مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

میں پلٹ گیا... بیس پچیس قدم چلنے کے بعد میں رکا۔ ایک بار پھر دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ سب میرا وہم تو نہیں..... میرے تصور کی کارستانی تو نہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دور پوسٹ آفس کے دروازے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک بار پھر وہیں موجود تھا۔ اس کے کپڑوں کی سفیدی ٹیوب لائٹ میں چمک رہی تھی۔ وہ بالکل بے حرکت تھا۔ اب مجھ میں اتنی تاب نہیں تھی کہ میں اسے مزید دیکھتا، اس کی طرف قدم بڑھاتا اور یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا ہے..... بلکہ اتنی تاب بھی نہیں تھی کہ میں وہاں رک سکتا۔ پورے جسم پر ایک لرزہ طاری ہوچکا تھا۔ میں مڑا اور بغداد کی ایک تنگ گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ یہ ایک پرانا بازار تھا۔ روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ عطر کی دکانوں سے خوشبو اڈ رہی تھی۔ قہوہ خانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ برقع پوش

www.pdfbooksfree.pk

عورتیں اور کھلے لبادوں والے مرد، زمانۂ قدیم کے کرداروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید کے دور کے واقعات پڑھیں تو ایسے ہی مناظر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ میں اس بازار میں تیز رفتاری سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرے ماتھے پر پسینا تھا اور خط والا لفافہ میں نے بڑی مضبوطی سے مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ مجھے لگا کہ آج کئی دنوں کے بعد وہی آواز پھر میرا تعاقب کرنے لگی ہے جس نے لاہور میں اور پھر ساہیوال کے ریلوے اسٹیشن پر میری سماعت میں ہلچل مچائی تھی..... مجھے سرتاپا دہلایا تھا۔ ہاں یہ وہی آواز تھی۔ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا..... اور ایسا نہیں ہوا..... اب اس کی قیمت چکانا ہوگی۔

کہاں سے آ رہی تھی یہ آواز؟ کیا وہ سفید پوش شخص میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا؟ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بے حد اضطراب کے عالم میں، میں نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا، پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دور تک اس سفید پوش کی جھلک دکھائی نہیں دی لیکن آواز..... آواز بدستور موجود تھی اور میرے کانوں میں سرگوشیوں کی صورت میں گونج رہی تھی۔ میں ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ سن رہا تھا..... کم از کم ایک بھوکے کو..... کم از کم ایک بھوکے کو.....

کیا بھوک اور بھوکے کا مطلب کچھ اور تھا؟ کیا مجھے کسی طرح کا کوئی اشارہ دیا جا رہا تھا؟ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے نہیں پتا میں نے پوسٹ آفس سے روضے تک کا طویل فاصلہ کیسے طے کیا۔ کہاں کہاں ٹھوکر کھائی۔ کہاں کہاں کسی سے ٹکرایا اور کتنی بار گرتے گرتے بچا۔ میں بس بڑھتا ہی چلا گیا اور مسجد میں پہنچ کر دم لیا۔ وہ خط جو میں نے گھر والوں کے نام لکھا تھا، راستے میں ہی پھاڑ کر اور پرزے کر کے پھینک دیا تھا۔ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ بس اس وقت مجھے یہی لگا تھا کہ مجھے یہ خط پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے کیونکہ میں اسے کبھی پوسٹ نہیں کر سکوں گا۔ میں جس وقت احاطے میں پہنچا عشا کی اذان ابھی ابھی ہوئی تھی۔ بس اِکا دُکا افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ میرے سینے میں جیسے خوف آمیز دکھ کا دریا بہہ رہا تھا۔ میں ایک گوشے میں چلا گیا، پھر سجدے میں گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا..... اے میرے اللہ! میری مدد کر۔ میں بڑا کمزور ہوں مزید دکھ نہیں جھیل سکتا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میرے مالک! یقیناً میں گناہ گار ہوں لیکن مجھے اپنے گناہوں کا پتا تو چلے۔ یہ تو معلوم ہو کہ میں کس طرح توبہ کر سکتا ہوں۔ کیسے کفارہ ادا کر سکتا ہوں۔ جو تیری منشا ہے، میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر یہ واقعی بھوکوں کو کھانا کھلانے والی بات ہے تو میں اپنی ساری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دوں گا۔ مالک! تو غفور الرحیم ہے۔ سننے والا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ دیکھ میں تیرے سامنے بلک بلک کر رو رہا ہوں۔ میری مدد کر میرے مولا! میرے حواس درست کام نہیں کر رہے۔ میں نامعلوم آوازیں سن رہا ہوں۔ مجھے انجانے خوف گھیرے ہوئے ہیں۔ میں بالکل بے دست و پا ہو گیا ہوں میرے مالک! میرا امتحان ختم کر دے..... میری آزمائش مختصر کر دے۔

میں سجدے میں گرا رہا اور روتا رہا۔

کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے، مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سجدے سے سر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ یہ ابوسیاف تھا۔ ابوسیاف مجھے کبھی ہارون اور کبھی پیار سے پپو کہہ کر بلاتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''پپو! کیا بات ہے۔ خیریت سے تو ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

ابوسیاف اپنی قبا سنبھالتا ہوا میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور ان پر اپنی پیشانی ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ، میں کب تک انتظار کروں، کب تک ان کی راہ دیکھوں؟ وہ کب دوبارہ آئیں گے؟''

''تم حضرت عالی مقام کی بات کر رہے ہو؟''

ابوسیاف نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، انہی کی بات کر رہا ہوں۔ میں ان کی راہ دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں۔ انہوں نے مجھے راستے میں چھوڑ دیا ہے۔ ایسی کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟''

ابوسیاف مجھ سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ میرے ساتھ ایسی کیا تازہ بات ہوئی ہے جس نے مجھے اتنا غمزدہ کیا ہے۔ میں نے اس بارے میں ابوسیاف کو کچھ نہیں بتایا۔ اسی دوران میں ابراہیم بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔ اس کے آنے کی وجہ سے ہماری گفتگو رک گئی۔ تاہم عشا کی نماز کے بعد جب میں نے ایک بار پھر ابوسیاف کے سامنے آہ و زاری کی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ حضرت امام کاظم کے روضے کے قریب ایک جامع مسجد ہے۔ کبھی کبھی عالی مقام ادھر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ اس نے

www.pdfbooksfree.pk

کہا کہ اگر وہ بغداد واپس آ گئے ہیں تو وہاں سے ان کا پتا چل سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود وہاں چلا جاتا ہوں۔''

ابوسیاف بولا۔ ''پہلے مجھے دیکھ لینے دو، پھر اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں بتا دوں گا۔''

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ابھی ابوسیاف ہمارے پاس سے اٹھ کر گیا ہی تھا کہ احاطے میں بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ دیکھا تو کچھ پولیس والے تیزی سے مسجد کے احاطے کی طرف لپک رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر پاکستانی اور انڈین زائرین کی ایک ٹولی اپنی جگہ سے اٹھی اور اندھا دھند بیرونی دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ان بھاگنے والوں میں سے ایک پاکستانی نے پکار کر ہم سے کہا۔ ''اوئے..... اوئے نس جاؤ (بھاگ جاؤ) نہیں تو مارے جاؤ گے۔''

ایک دم میں اور ابراہیم بھی خوف کے نرغے میں آ گئے۔ ہم اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگے۔ یقیناً ہم مسجد سے نکل کر بغداد کی گلیوں میں گم ہو جاتے لیکن اس دروازے کے باہر بھی پولیس کے دس پندرہ اہلکار موجود تھے۔ ہمارے عقب سے پولیس والوں کی سیٹیوں کی آوازیں آئیں اور پھر یہ تازہ دم پولیس والے بھی ہم پر جھپٹے۔ ہم اندھا دھند تنگ گلیوں میں گھس گئے۔ کچھ خبر نہیں تھی، کدھر جا رہے ہیں۔ بس یہی خیال تھا کہ یہاں کی ظالم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا۔ ہمیں سامنے ہی سڑک پر چند سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں اور ابراہیم بغیر سوچے سیڑھیاں چڑھ کر ایک کشادہ چھت پر آ گئے۔ یہ ایک ہوٹل کی دوسری منزل تھی۔ اردگرد اونچی عمارتیں بھی تھیں، چھت کی منڈیر ڈیڑھ دو فٹ سے اونچی نہیں تھی۔ ہمارا چھت پر چڑھنا ہمارے لیے سودمند ثابت ہوا۔ ہم نے بلندی سے گلی کا منظر دیکھا جو خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ پولیس والوں نے پانچ پاکستانی اور انڈینز کو گھیر لیا تھا اور ان کی خوب ٹھکائی کر کے انہیں سڑک پر ہی اوندھا لٹا دیا تھا۔ ایک شخص نے کچھ زیادہ مزاحمت کی تو اسے دبوچ کر کوئی نشہ آور انجکشن لگا دیا تھا۔ ہم پولیس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے چھت کی ایک چوکور چمنی کے پیچھے چھپ گئے اور اسی اوٹ سے گلی کا منظر بھی دیکھتے رہے۔ اردگرد کی بلند چھتوں پر بھی چند افراد موجود تھے اور ہمیں دیکھ رہے تھے، شکر کا مقام تھا کہ انہوں نے پولیس کو ہماری موجودگی سے آگاہ نہیں کیا۔

تاہم بکرے کی ماں نے زیادہ دیر تک خیر نہیں منائی۔ نیچے سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ پولیس والے اوپر آنا چاہ رہے ہیں۔ ''اب کیا کریں؟'' ابراہیم نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

ہم اٹھے اور پاس ہی ایک بند دروازے پر زور آزمائی کی۔ یہ اندر سے لاک تھا۔ پولیس والے اب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک قریبی دروازہ کھلا اور کوئی شخص ٹھیٹ پنجابی لہجے میں بولا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم تیزی سے اندر گھس گئے۔ دروازہ فوراً اندر سے لاک ہو گیا۔ میں نے مڑ کر اپنے مددگار کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ کوئی اور نہیں وہی رحیم یار خان کا رہائشی اور ایرانی بس کا مسافر امین تھا۔ اس کے حلیے پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند عراقی بھی تھا۔ شرٹ اور پتلون والا یہ عراقی ہمارے آگے آگے چلتا ہوا زینے اترنے لگا۔ اس کے پیچھے امین اور امین کے پیچھے ہم دونوں تھے۔ امین سے کوئی سوال جواب کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ ہم تیزی سے آگے پیچھے چلتے زینے اترے اور ہوٹل کی لابی میں پہنچے۔ اکا دکا افراد نے ہمیں دھیان سے دیکھا لیکن چونکہ ایک عراقی ہمارے ساتھ تھا اس لیے کسی نے ہمیں روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم ہوٹل کے عقبی دروازے سے نکلے اور ایک تنگ سڑک پر تیس چالیس قدم چلنے کے بعد ایک اور ہوٹل کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ جدید، آرام دہ ہوٹل لگتا تھا۔ لفٹ کے ذریعے ہم تیسری منزل پر پہنچے اور پھر چار پانچ کمروں پر مشتمل ایک شاندار سوئٹ میں داخل ہو گئے۔ اس لگژری اپارٹمنٹ میں انٹحل کے علاوہ نسوانی خوشبو بھی رچی بسی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی بار ذرا دھیان سے امین کو دیکھا۔ ان پندرہ بیس روز میں اس کا حلیہ مزید تبدیل ہو چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی فرنچ کٹ ڈاڑھی اور اچھے لباس نے اسے کافی مختلف روپ دے دیا تھا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے دو تین گہری سانسیں لیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں کیسے پھنس گئے ہارون بھائی!''

میں نے کہا۔ ''بس کچھ نہ پوچھو۔ پتا ہی نہیں چلا۔ مسجد کے اندر سے پاکستانی اور انڈینز بھاگے تو افراتفری میں ہم بھی بھاگ پڑے..... لیکن..... تم یہاں کیسے..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے ایسے ملاقات ہو گی۔''

وہ بولا۔ ''ہم اس ہوٹل کی چھت پر سے سب کچھ دیکھ

www.pdfbooksfree.pk

رہے تھے۔ جب آپ دونوں چمنی کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، میں نے آپ کو پہچان لیا اور پھر کمال صاحب کے ساتھ آپ کی مدد کو پہنچ گیا۔'' کمال یقیناً اس گھنگرالے بالوں والے تنومند عراقی کا نام تھا۔ وہ شکل سے سخت گیر نظر آتا تھا۔

امین نے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ کمال رشید اس کا نیا دوست ہے اور وہ اس سے ملنے یہاں ہوٹل میں آیا ہوا تھا۔

میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ پاکستان سے نکلنے کے بعد... امین کتنی شدت سے اور کتنی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ عراقی کمال باہر چلا گیا۔ شاید یہ دیکھنے گیا تھا کہ پولیس کی کارروائی کیسی جا رہی ہے۔ جاتے جاتے اس نے عربی میں تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں، ڈر والی کوئی بات نہیں۔ ایک لڑکی جس نے نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا، ہمارے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی اور پھر وہ بھدی سی ہپی لڑکی بھی دکھائی دی جو زاہدان میں دو تین مرتبہ امین کے ساتھ نظر آئی تھی۔ وہ آ کر بے تکلفی سے امین کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی مختصر لباس میں تھی۔ کسی پاس کے کمرے سے کسی لڑکی کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز آئی۔ وہ شاید کسی مرد سے جھگڑ رہی تھی۔ مرد نے بھی گرج کر کچھ کہا۔ لڑکی ہولے سے چلائی پھر ایک دروازہ جھٹکے سے کھلا اور لڑکی تیز قدموں سے چلتی ہوئی مخالف سمت میں گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس نے اپنے جسم کے گرد ایک سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ جواں سال مرد اس کے پیچھے گیا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔ لڑکی طیش سے اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ جب وہ راہداری کے آخری سرے پر پہنچی تو اسے رکنا پڑا۔ سامنے سے کمال رشید سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہا تھا۔

''واٹ از گوئنگ آن؟'' کمال رشید نے ڈانٹ کر لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی نے پتا نہیں کیا جواب دیا۔ اسی دوران میں لڑکی کے ساتھ کمرے سے نکلنے والا شخص بھی کمال رشید کے پاس پہنچ گیا۔ اس شخص نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ ان تینوں کے درمیان وہیں کھڑے کھڑے کچھ بحث ہوئی۔ الفاظ ہمارے کانوں تک نہیں پہنچے لیکن بات تقریباً سمجھ میں آ رہی تھی۔ اچانک بجلی سی چمکی۔ کمال رشید نے زناٹے کا تھپڑ لڑکی کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ اس کے بال چہرے پر بکھر گئے تھے۔ کمال رشید نے اپنی انگلی اٹھائی اور بڑے تحکم سے کچھ کہا۔ یقیناً وہ لڑکی کو واپس کمرے میں جانے کا حکم دے رہا تھا۔

لڑکی سر جھکائے واپس کمرے میں چلی گئی۔ جواں سال عراقی بھی اس کے پیچھے ہی گیا، کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

یہ وہی گھناؤنا کھیل تھا جو ازل سے حوا کی بیٹی کے ساتھ کھیلا جاتا رہا ہے۔ مقام اور کردار بدلتے رہتے ہیں لیکن کہانی وہی رہتی ہے۔

میرا دم جیسے گھٹنے لگا۔ ابراہیم کے چہرے پر بھی ناپسندیدگی کے آثار نظر آئے۔ میں نے امین سے کہا۔ ''کیا ہم کہیں اور نہیں بیٹھ سکتے؟''

''کیوں نہیں ہارون بھائی۔'' امین نے مسکرا کر کہا اور ہمارے ساتھ ایک ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔ بھدی سی ہپی لڑکی بھی اب ہمارے قریب نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''امین! یہ سب کیا ہو رہا ہے، لگتا ہے تم کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہو؟''

وہ پھر مسکرایا۔ ''یہ ساری دنیا ہی ایک چکر ہے ہارون بھائی! مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کس چکر میں چمنی کے پیچھے چھپنا پڑا؟''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنائی اور ابراہیم کا بھی تھوڑا سا تعارف کرایا۔ مسجد کے صحن سے ہم دونوں کے بھاگنے کا ذکر سن کر وہ ہنسنے لگا۔ ''ہارون بھائی! ویسے تو تم سیانے بیانے ہو لیکن لگتا ہے کہ پردیسی ہونے کی وجہ سے تم بہت گھبرائے ہوئے ہو۔ تمہیں بھاگنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ تمہارے پاس پاسپورٹ ہے ویزا ہے..... اور ابراہیم کے کاغذ بھی پورے ہیں۔ پولیس یہ چھاپے ان لوگوں کے لیے مارتی ہے جو غیر قانونی طور پر یہاں پڑے رہتے ہیں۔''

''بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں اب بہت سی ٹھیک باتیں کہنے لگا ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''اور سچی بات، یہ ہے کہ میں تم کو بھی ایک دو ٹھیک باتیں بتانا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو آگے بڑھتی تنومند کمال رشید واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ اب نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس نے مسجد اور مزار کے قریب سے تقریباً بیس ہندوستانی اور پاکستانیوں کو پکڑا ہے۔ اس کے علاوہ خاص خبر یہ ہے کہ مزار شریف میں سے سیکنڈ انچارج عبدالغفور کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس پر غیر اخلاقی سرگرمیوں کا الزام ہے۔ گرفتاری کے وقت مزاحمت کرنے پر پولیس نے اسے بے تحاشا مارا بھی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

میری نگاہوں میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب میں نے پوسٹ آفس کی طرف جاتے ہوئے بازار میں انڈین سلیمان کو دیکھا تھا اور اس نے مجھے عبدالغفور کی کارستانیاں بتائی تھیں۔ کیا پتا عالی مقام کی ناراضی ہی اسے لے ڈوبی ہو۔

وہ رات ہم نے بڑے آرام و آسائش میں ایک لگژری بیڈروم کے اندر گزاری۔ اکیلے میں امین نے مجھ سے کہا۔ ''ہارون بھائی! تم نے اس سندھی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ مہرو کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اسے آگاہ کیا کہ تہران کی ایک مسجد میں اس کے وارث مجھے مل گئے تھے اور اب وہ خیر خیریت سے ان کے پاس ہے۔ بہرحال میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ بغداد میں ہی ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ یہ جو ابراہیم میرے ساتھ ہے، وہ مہرو کے لیے ہی مارا مارا یہاں پھر رہا ہے۔

گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے میں نے امین سے اس مقامی لڑکی کے بارے میں پوچھا جسے کمال رشید کا تھپڑ پڑا تھا اور وہ روتی ہوئی کمرے میں واپس چلی گئی تھی۔ امین بے پروائی سے بولا۔ ''کچھ نہیں ہارون بھائی! یہ کوئی ایسی شریف زادی نہیں ہے۔ پیسے کی خاطر سب کچھ کرتی ہے۔ بس نخرے دکھا رہی تھی۔ فرح نام ہے اس کا۔ کمال رشید نے ایسی ایک دو لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے۔'' امین نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

''لیکن یار! کچھ بھی ہے۔ اس طرح سب کے سامنے کسی کی بے عزتی کرنا اچھی بات تو نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی عورت بھی بغیر مجبوری کے اس طرح کا پیشہ اختیار نہیں کرتی۔''

''ہارون بھائی! میں تمہیں کیا کیا بتاؤں، یہ عراق ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا نیا دوست کمال رشید کرتا کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''اسی ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر اس نے کچھ حصہ کرائے پر لیا ہوا ہے۔ وہاں ایک حمام کھولا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹا موٹا کام کرتا ہے۔''

''کیا چھوٹا موٹا کام؟''

''اچھا۔ صبح تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ اب سو جاتے ہیں۔''

اسی دوران میں ابراہیم بھی کمرے میں واپس آ گیا۔ ہمیں بات چیت روکنا پڑی۔

اگلی صبح بڑی کراری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ امین نے مجھ سے کہا۔ ''ہارون بھائی! فریش ہونا ہے تو نیچے کمال رشید کے حمام میں جا کر نہا لو۔''

میں اور ابراہیم غسل کے ذریعے نیچے پہنچے۔ حمام کے شاندار سلائڈنگ دروازے کے سامنے پہنچ کر ہمیں ٹھٹکنا پڑا۔ ایک طرف اسٹیل کی ایک چوڑی پلیٹ پر حمام کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ پتا چلا کہ ان باتھ رومز میں دو طرح کا غسل ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بندہ خود کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو کوئی خوش اندام لڑکی اسے کراتی ہے۔ اس کے علاوہ بھاپ والا غسل بھی یہاں دستیاب تھا۔ سب کے علیحدہ علیحدہ ریٹ درج تھے۔ اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ سنجیدہ چہرے والی ''فرح'' بازو پر ایک بڑا تولیا لٹکائے حمام سے نکلی اور ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم دونوں نے یہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی اور اوپر اپارٹمنٹ میں جا کر غسل کیا۔

فنی ایبریویشن

Math
M:Mantle
A:Attack
T:To
H:Handsome
:StudentS

College
C:Come
O:On
L:Let
L:Love
E:Eachs
G:girl
E:Equally

LOVE
L:Loss of money
O:Out of mind
V:vaste of time
E:ends of life

مرسلہ: اقصیٰ احمد، ذوالفقار احمد، کرک

www.pdfbooksfree.pk

ایک پُرتکلف ناشتے کے بعد امین کے ساتھ میری طویل گفتگو ہوئی۔ یہ علیحدہ کمرے میں دن نو دن ملاقات تھی۔ امین نے بڑی رازداری کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس نے یہاں پہنچتے ہی کرسٹی اور اس کے دو عراقی دوستوں کے ساتھ مل کر ایک نہایت منافع بخش کاروبار شروع کر دیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کویت پہنچنے میں لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کس طرح کی مدد؟''

''ہر طرح کی مدد۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس نے جو تفصیل بتائی، اس سے پتا چلا کہ کرسٹی اور اس کے دو تین ساتھی بذریعہ لانچ مسافروں کو کویت کے ساحل تک پہنچاتے ہیں اور ان سے معقول معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ کئی اور لوگ بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور یہ پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ اگر کبھی کبھار چھ مہینے میں ایک بار کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو بھی جاتا ہے تو یہ لوگ ساحلی پولیس کو دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرا لیتے ہیں۔ امین نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ اور اس کا ساتھی کمال کامیابی سے کویت کے دو پھیرے لگا بھی آئے ہیں۔ یہ کام اتنا آسان ہے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

امین نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے پیشکش کی کہ اگر میں بھی چاہوں تو اس نہایت آسان، دلچسپ اور منافع بخش کام میں اس کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں اور یوں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر سکتا ہوں۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بھئی۔ مجھے تو تم معاف ہی کرو۔ مجھے دن دوگنی رات چوگنی ترقی نہیں کرنی۔ میں سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ میری تو بس زیادہ سے زیادہ خواہش اتنی ہے کہ میں کسی طرح محنت مزدوری کر کے چار پیسے کمالوں اور عزت سے گھر واپس جا سکوں اور وہ بھی تب جب میرے دل کو سکون مل جائے۔ ابھی تو میں اس طرح کی ذہنی الجھنوں میں جکڑا ہوا ہوں کہ بس اپنے آپ میں ہی قید ہو کر رہ گیا ہوں..... ابھی تو.....''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری بات کاٹی۔ ''ہارون بھائی! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پیسا روپیا ہر درد کی دوا ہے۔ جب پیسا ہوگا تو سارے معاملے خود بخود ہی سیدھے ہوتے چلے جائیں گے۔ تم دیکھ لینا۔''

''لیکن میں ایسا پیسا نہیں چاہتا جس میں ذرا سی بھی کوئی آلائش ہو۔''

''اس میں کوئی آلائش نہیں ہارون بھائی!'' امین زور دے کر بولا۔ ''تم ایک بار یہ کام کر کے تو دیکھو..... تمہاری آنکھوں کے سامنے چانن ہو جائے گا ..... اور میں تمہیں کام بھی ایسا لے کر دوں گا جس میں کسی طرح کا کوئی رسک ہوگا ہی نہیں۔''

اس دن میرے اور امین کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس نے مجھے بڑے خوب صورت منظر دکھائے لیکن اس کی کوئی بات بھی میرے دل کو چھو نہیں سکی۔ آخر میں، میں نے بس اتنا کہا۔ ''اگر تم میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو اتنا کرو کہ کسی طرح قانونی طریقے سے کویت پہنچنے میں میری مدد کر دو..... بلکہ ..... ہو سکتا ہے کہ میرا ساتھی ابراہیم بھی میرے ساتھ جانا چاہے۔''

''قانونی طریقہ تو بہت لمبا ہے ہارون بھائی۔ سارا سال بھی لگے رہو گے تو کچھ نہیں بنے گا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں کرسٹی سے بھی بات کرتا ہوں بلکہ آج ہی کرتا ہوں..... ویسے یہ ابراہیم تمہارا کچھ لگتا بھی ہے، میرا مطلب ہے کہ دور نزدیک سے کوئی رشتہ وغیرہ؟''

''نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے یہ یہاں مجھے اتفاقاً ہی مل گیا ہے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں... بس تمہاری شکل کچھ کچھ ابراہیم سے ملتی ہے بلکہ شکل بھی نہیں بس تمہارا ماتھا اور آنکھیں وغیرہ اور شاید جب تم ہنستے ہو تو اس وقت بھی کچھ کچھ ابراہیم کی طرح لگنے لگتے ہو۔''

تھوڑی تھوڑی شکل ملنے والی بات اس سے پہلے ابو سیاف نے بھی کہی تھی۔ اس وقت میں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی تو نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ میں قبول صورت ہوں۔ دوسری طرف ابراہیم بالکل عام شکل وصورت کا تھا اور اس کا رنگ بھی کچھ سانولا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کی صورتوں میں کوئی جھلک ایک دوسرے سے ملتی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق ہی تھا اور ایسے اتفاق نظر آتے رہتے ہیں..... بالکل اجنبی اور غیر متعلق لوگوں میں تھوڑی بہت مشابہت دکھائی دے جاتی ہے۔

روضے پر واپس جاتے ہوئے ڈر تو لگ رہا تھا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر سوچا تو اندازہ ہوا کہ ایسا کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے سفری کاغذات پورے تھے اور ہم نے کسی طرح کا کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا۔ اسی شام ہم روضے پر واپس آ گئے۔ امین کا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ اب اس نے مجھے ایک فون نمبر بھی دے دیا تھا۔ وہ

www.pdfbooksfree.pk

چاہتا تھا کہ میں جلد از جلد اس سے رابطہ کروں۔

ابو سیاف اور روضے کے دیگر خدمت گار میرے لیے بہت پریشان تھے۔ مجھے صحیح سالم واپس دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ابو سیاف نے بھی یہی کہا کہ ہمیں خوامخواہ بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ اگر پکڑے جاتے تو کسی نہ کسی شبہے میں جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ ابو سیاف نے بتایا کہ یہ بڑی سختی کا دور ہے۔ صدر صدام کی خفیہ پولیس لوگوں کو پکڑتی ہے اور پھر کبھی ان کا کھوج کھرا نہیں ملتا۔

ابو سیاف کو دیکھتے ہی عالی مقام سے ملنے کی تڑپ پھر میرے اندر بیدار ہوگئی۔ وہ سب کچھ پوری شدت سے یاد آگیا جو مرلزی پوسٹ آفس کے قریب میرے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے کسی روحانی سہارے کی شدید ترین ضرورت تھی اور یہ سہارا، میرے قریب آکر مجھ سے دور چلا گیا تھا۔ میں نے ابو سیاف سے پوچھا۔ ''حضرت کا کچھ پتا چلا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لگتا ہے کہ وہ ابھی بغداد واپس ہی نہیں آئے لیکن جونہی وہ لوٹے ہمیں پتا چل جائے گا۔ میں نے ایک دو بندوں سے کہہ دیا ہے۔''

پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ حضرت مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے حالات کا مقابلہ خود ہی کروں۔ انہوں نے جو ایک چھوٹی سی چٹ میرے لیے لکھی تھی، وہ میں نے بڑی عقیدت سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ جب دل بہت پریشان ہوتا تو میں اس چھوٹے سے کاغذ کو نکال کر پڑھنے لگتا۔ اس پر عربی میں لکھے ہوئے الفاظ مجھے سہارا دیتے تھے۔

تیسرے روز ابراہیم کو روضے کے ساتھ والی مسجد میں چھوڑ کر میں پھر امین سے ملنے گیا۔ وہ ایک اچھے ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں اسی کرسٹی نامی لڑکی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے لیے منہ بولی بیوی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ ناپسند تھا اور میں نے کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا لیکن لگتا تھا کہ امین نے میری باتوں سے کچھ خاص اثر نہیں لیا۔ بس مسکرا کر اتنا کہا۔ ''اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت ہوتی ہے ہارون بھائی۔''

میں نے پوچھا۔ ''میرے کام کا کیا بنا؟''

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ہارون بھائی! قانونی طریقے سے جانے والی بات تو دل سے نکال دو۔ ہاں باس سے بات ہوئی ہے اور میں نے تم دونوں کے لیے ان سے خاص رعایت بھی لے لی ہے۔ سمجھو کہ کرائے میں 75 فیصد ڈسکاؤنٹ ہوگا لیکن اس کے لیے تھوڑا بہت کام تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''روضے میں اور آس پاس کے چھوٹے ہوٹلوں میں کئی ہندوستانی اور پاکستانی پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کویت جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے۔ تم کافی دنوں سے وہاں رہ رہے ہو۔ آسانی سے دو چار ایسے بندے ڈھونڈ سکتے ہو جو مناسب کرایہ دے کر کویت پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہوں بلکہ کوشش کرو تو زیادہ بندے بھی مل سکتے ہیں۔''

''لیکن مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے انکار کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے قائل کرنے میں لگا رہا۔ وہ خاصا باتونی تھا اور بندے کو قائل کرنا بھی جانتا تھا۔ میری ذہنی کیفیت بھی کچھ عجیب تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ آدھ پون گھنٹے میں امین نے مجھے نیم رضامند کرلیا۔ اس نے مجھے باور کرادیا کہ یہ بالکل محفوظ سفر ہے۔ روزانہ سیکڑوں لوگ اسی طرح سمندری راستے سے کویت میں آجا رہے ہیں۔ گورنمنٹ بھی اس سلسلے میں زیادہ سختی نہیں کرتی۔

اس نے مجھے طریقہ کار بتایا کہ میں کس طرح کویت جانے کے خواہش مند افراد کا رابطہ کمال رشید سے کرواسکتا ہوں۔ یہ رابطہ کمال رشید سے نہیں دراصل اس کے ایک کارندے باقر احمد سے ہونا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں ایک بات صاف بتا دوں۔ میں نے کسی کے لیے کسی طرح کی کوئی ذمے داری نہیں لینی ہے۔ اگر کوئی کویت جانے کا ارادہ رکھتا ہوگا تو میں اسے بتا دوں گا کہ وہ باقر احمد سے کس طرح مل سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاؤں گا کہ اگر وہ جانے کا ارادہ کرے گا اور کرایہ وغیرہ دے گا تو اپنی ذمے داری پر دے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' امین نے کہا۔

میں شام سے ذرا پہلے روضے والی مسجد میں پہنچا تو ابراہیم وہاں موجود نہیں تھا۔ پتا نہیں آج کل کہاں کہاں پھرتا رہتا تھا۔ ایک دو بار میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بازار گیا ہوا تھا۔ ابراہیم اب میرے سفر کے حالات کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس سفر کے دوران میں چند روز ایسے بھی آئے تھے جب مہرالنساء یعنی مہرو میری ہمسفر رہی تھی۔ وہ یہ سب کچھ جان کر

www.pdfbooksfree.pk

بہت حیران ہوا تھا۔ اچانک مجھے ایک بات یاد آئی۔ جب پہلے دن ابراہیم میرے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس نے مجھے اپنی روداد سنائی تھی تو باتوں کے دوران میں اس نے مجھے ایک کاغذ بھی اپنی جیب سے نکال کر دکھانا چاہا تھا لیکن اسی دوران میں ابو سیاف وہاں پہنچ گیا اور وہ بات وہیں کی وہیں رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج ابراہیم سے اس کاغذ کے بارے میں پوچھتا ہوں۔

ابراہیم کی واپسی عشا کی نماز کے بعد ہوئی۔ وہ حسب معمول بہت گم صم نظر آرہا تھا۔ آنکھیں جیسے سوجی سوجی تھیں، وہ ایک بھیدوں بھرا شخص تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کے جسم پر کیا تھا، یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے سینے، پیٹ اور بازوؤں پر کئی جگہ ''مہرو'' کے نام کی مہر تھی لیکن ان مہروں کو اس کے لباس نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک قریبی ہوٹل سے خمیری روٹی اور ترکاری کا کھانا کھانے کے بعد ہم واپس احاطے میں آگئے اور ایک کونے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ابراہیم مہرو کی باتیں کررہا تھا اور اس کی آنکھیں بار بار نم ہو جاتی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہ کاغذ کیا تھا جو تم اس روز جیب سے نکال کر مجھے دکھانے لگے تھے؟''

وہ ذرا چونکا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''ایک خط تھا..... میں نے مہرو کے لیے لکھا تھا۔''

''اب کہاں ہے وہ؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر ہمت کر کے بولا۔ ''وہ اس تک پہنچ گیا ہے ہارون بھائی۔''

''کیا مطلب..... کیا تم ..... پھر جعفر کی طرف گئے تھے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا..... اور جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ وہ مجھے بتائے بغیر جعفر کے گھر کے چکر لگا تا رہا ہے۔ جعفر کے گھر کی تیرہ چودہ سالہ ملازمہ لڑکی کے ذریعے اس نے اپنا لکھا ہوا خط مہرو تک پہنچایا ہے۔ نہ صرف خط پہنچایا ہے بلکہ اس کا جواب بھی حاصل کیا ہے۔

یہ سب کچھ حیران کر دینے والا تھا۔ شاید وہ جعفر کے غصے کو ٹھیک سے جانتا نہیں تھا۔ وہ آگ سے کھیل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا لکھا تھا تم نے اسے؟''

وہ اداسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''وہی جو تیرہ چودہ برس تک اس سے نہیں کہہ سکا۔ میں نے لکھ دیا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں اور اس سے زیادہ جتنا وہ سوچ سکتی ہے۔ اب میں اسے یہ بتانے کے لیے یہاں آگیا ہوں کہ واقعی اسے چاہتا ہوں اور واقعی اس کے لیے مر سکتا ہوں۔''

ابراہیم کی آنکھوں میں نمی تھی اور اس کے چہرے پر مضبوط ارادوں کی جھلک تھی۔ میں جیسے اندر سے لرز گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر سدباب نہ کیا گیا تو یہاں کچھ بہت برا ہو سکتا ہے۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''مہرو نے کیا لکھا ہے جواب میں؟''

وہ کچھ دیر ہچکچاتا رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے کہاں تک اپنا ہمراز بنائے۔ پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے اپنی قمیص کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا۔ یہ کاپی سائز کے دو صفحے تھے۔ لکھائی باریک تھی اور ورق کی دونوں جانب لکھا گیا تھا۔ یہ ایک مڈل پاس لڑکی کی شکستہ لکھائی تھی مگر جو کچھ وہ بتانا چاہ رہی تھی، وہ واضح طور پر سمجھ میں آرہا تھا۔

یہ خط چونکانے والا تھا۔ ابراہیم کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ مہرو اسے ناپسند نہیں کرتی..... بلکہ اس خط سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ ایک موقع تھا جب اس کے معصوم دل میں یہ خواہش موجود تھی کہ اس کی شادی ابراہیم سے ہو جائے۔ شاید وہ بہت عرصے تک اس بات کی منتظر بھی رہی کہ ابراہیم اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ حالات بھی مخالف ہوتے چلے گئے۔ مہرو کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ اس کے ابا جی اس کی شادی کہیں بھی کر دیں مگر اسٹور کیپر ابراہیم سے ہرگز نہیں کریں گے۔ ابا جی کی وفات کے بعد تو اس طرح کی امید بالکل ہی ختم ہو گئی۔ بڑے تایا کو ابراہیم کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ دادی بھی بہت حد تک بڑے تایا کی ہمنوا ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ مہرو نے بھی خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا اور تہیہ کر لیا کہ وہ وہیں شادی کرے گی جہاں اس کے بڑے چاہیں گے۔ اب وہ بے حد پریشان تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ابراہیم اس کے پیچھے ہزاروں میل دور یہاں بخدا آپہنچے گا اور اس سے اس طرح کا رابطہ کرے گا۔

خط میں ایک جگہ مہرو نے کچھ اس طرح کی بات لکھی تھی۔ ''میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنا ڈر رہی ہوں۔ تمہیں یا جعفر کا پتا نہیں۔ وہ میرا خون پی جائیں گے۔ اللہ کرے یہ خط صحیح سالم تم تک پہنچ جائے۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہی پھاڑ کر پھینک دینا یا جلا دینا۔ اس کے بعد تم سے کبھی رابطہ نہیں کر سکوں گی۔ یہ بس آخری باتیں

www.pdfbooksfree.pk

ہیں جو میں تم سے کر رہی ہوں۔ اب گزر جانے والے وقت کا ماتم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ابراہیم۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں تیرہ سال تمہارے پاس رہی ہوں۔ تم اتنی دیر چپ رہے ہو تو اب کیوں بول پڑے ہو۔ کیا تمہاری محبت یہی ہے کہ میں ذلیل وخوار ہوجاؤں اور میرا بھائی منہ چھپاتا پھرے۔ اب میرا اور اپنا مان رکھ لو ابراہیم۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ جیسے آئے ہو ویسے ہی واپس چلے جاؤ۔ اب یہی ہمارے حق میں اچھا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت دعا کروں گی۔ تمہیں بڑی اچھی بیوی ملے گی۔ وہ تمہارے ہر غم کی دوا بن جائے گی۔ تم بھی میرے لیے دعا کرنا۔''

خط میں کئی لفظ سندھی کے تھے اور کئی غلط بھی لکھے گئے تھے۔ بہرحال مضمون سمجھ میں آرہا تھا۔ میں نے سارا خط پڑھنے کے بعد کہا۔ ''اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟''

وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولا۔ ''اب بات کھل ہی گئی ہے سائیں تو میں آپ کو بھی صاف صاف بتادوں۔ میرے سامنے اب دو ہی راستے ہیں، کسی طرح مہرو کو اپنا بنالینا یا پھر یہیں اس شہر میں اپنی جان دے دینا۔ تیسرا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔''

''یہ لوگ ماردیں گے تمہیں یا ساری عمر کے لیے جیل میں سڑا دیں گے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے، یہاں کی پولیس کتنی سخت ہے۔ خاص طور سے غیر ملکیوں کے لیے۔''

''میں نے بتایا ہے نا۔ میرے پاس اب کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔''

''لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ تم..... مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔''

اس رات میں واقعی دیر تک سوچتا رہا۔ ہم چٹائیاں بچھائے احاطے میں ہی لیٹ رہے تھے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر وہی ستارے تھے جو مجھے اپنوں کی یاد دلاتے تھے اور پاکستان کے گلی کوچوں میں پہنچا دیتے تھے۔ بہرحال اس وقت میں ابراہیم کی انوکھی پیار کہانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ بات اب ثابت ہوچکی تھی کہ یہ محبت یک طرفہ نہیں۔ ہاں ابراہیم کی طرف سے اس محبت کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کے جسم پر ہی نہیں اس کی روح پر بھی مہرو کے نام کی بے شمار مہریں لگی ہوئی تھیں۔ مہرو نے تو خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا لیکن وہ بہت آگے نکل گیا تھا۔ غالباً مہرو کے پاکستان سے چلے آنے کے بعد ابراہیم کو اپنے عشق کی اصل گہرائی اور شدت کا علم ہوا تھا۔

سوچتے سوچتے ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے چند ہفتے پہلے کی ایک بات یاد آگئی۔ میں اور مہرو زاہدان سے چھپتے چھپاتے تہران پہنچے تھے۔ وہاں ہوٹل میں مہرو نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا تھا۔ ''سائیں! جب آپ ہنستے ہو تو مجھے ایک اور بندہ یاد آجاتا ہے۔ وہ آپ کی طرح ہی ہنستا تھا۔'' میں نے پوچھا تھا۔ ''کون ہے؟'' اس نے معصومیت سے کہا تھا۔ ''میرا پاہے'' (بھائی ہے)

میں نے تنگ کر کہا تھا۔ ''کیا میں تم کو اس لمبے چہرے والے جعفر کی طرح لگتا ہوں؟''

وہ بولی تھی۔ ''نہیں سائیں! میرا سگا پا، نہیں ہے۔ میرے چاچا کا پتر ہے۔''

آج پتا نہیں کیوں مجھے وہ بات یاد آگئی تھی۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ میری شکل صورت میں کسی زاویے سے تھوڑی بہت ابراہیم کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مہرو میرے لیے دل میں جو نرم گوشہ رکھتی تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مجھ میں ابراہیم کی شباہت موجود تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت ایک تہ در تہ کہانی ہے۔ کہاں یہ کہ مہرو اسے مکمل طور پر ٹھکرا رہی تھی اور چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد بغداد سے چلا جائے... اور کہاں یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کو بھی انسیت اور عزت دیتی رہی تھی جو اس کے محبوب سے تھوڑا بہت ملتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ابراہیم اور مہرو کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ میں تو خود پریشانیوں میں گھرا ہوا ایک ایسا شخص تھا جس سے آگے جایا جارہا تھا، نہ پیچھے ہٹا جارہا تھا۔ میں مہرو سے مل کر اسے کوئی اچھا مشورہ دینے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن مہرو سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ آخری ملاقات کے بعد جعفر نے مجھ سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں میرا آنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔

وہ رات میں نے تقریباً جاگتے ہوئے ہی گزاری، بس آخری پہر تھوڑی دیر کے لیے سو سکا۔ ابراہیم کی پریشانیوں کے علاوہ اپنی پریشانی بھی مجھے بدستور گھیرے ہوئے تھی۔ آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر وہ منظر آجاتا تھا جب میں خط پوسٹ کرنے کے لیے پوسٹ آفس گیا اور میں نے جاگتی آنکھوں سے اور پورے ہوش وحواس کے ساتھ سفید ہیولے کو اپنے قرب وجوار میں پایا۔ یہ سائنس کا دور ہے۔ اٹل حقیقتوں کا زمانہ ہے لیکن جو کچھ میرے ساتھ ہورہا تھا، وہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ کوئی نفسیاتی کج روی تھی، بصری واہمہ تھا یا کچھ اور؟ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حضرت عالی

www.pdfbooksfree.pk

مقام سے ملاقات کی ضرورت پھر بے حد شدت سے محسوس ہونے لگی۔

اگلے روز دوپہر کے قریب میں خود ہی حضرت امام کاظم کے روضے کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابوسیاف نے مجھے بتا رکھا تھا کہ حضرت عالی مقام کبھی بھی امام کاظم کے روضے کے پاس ایک جامع مسجد میں بھی نظر آتے ہیں۔ میرے لیے روضے پر جانے میں یوں بھی آسانی پیدا ہوئی کہ ہندوستانی زائرین کا ایک چھوٹا گروپ کیری ڈبے کے ذریعے امام کے روضے کی طرف جارہا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے پر تیار ہوگئے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم روضے پر پہنچے۔ روح پرور مناظر دیکھے۔ میں ایک شخص سے قریبی جامع مسجد کا پتا پوچھ رہا تھا، جب میری نگاہ ایک تیرہ چودہ سالہ دبلی پتلی لڑکی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں اس لڑکی کو جعفر کے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ یہ ان کی ملازمہ تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ ایک جواں سال لڑکی بھی دکھائی دی۔ وہ کھلے لبادے میں تھی اور آنکھوں کے سوا تمام چہرہ سیاہ حجاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر مجھے شک گزرا کہ یہ کوئی اور نہیں مہرو ہے۔

اگلے ایک دو منٹ میں یہ شک درست ثابت ہوا۔ یہ مہرو ہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ مجھ سے کنی کترا کر نکل جانا چاہتی ہے لیکن میں اس کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا۔ وہ ایسا نہیں کرسکی۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک کشادہ چھت پر موجود تھے۔ یہاں بس اِکا دُکا نمازی ہی دکھائی دے رہے تھے۔ مہرو نے چھوٹی عمر کی لڑکی کو نیچے مزار کے احاطے میں ہی رہنے دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت مہرو کی ہمراز کی سی ہے اور وہ مہرو کی ہر بات جانتی ہے۔ چھت پر ایک جانب ایک پرانی سی کرسی پڑی تھی۔ میں نے مہرو سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔ وہ لرز کر بولی۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے بابو سائیں۔ میں آپ سے اوپر کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔''

''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو..... بیٹھو۔'' میں نے ذرا غصے سے کہا۔

''نہیں بابو سائیں! مجھے گناہ گار نہ کریں۔'' اس نے کہا اور جلدی سے چھت کے فرش پر بیٹھ گئی۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ عجب نمونہ تھی۔ میں نے تماشا لگانا مناسب نہیں سمجھا اور خود بھی اس کے پاس گرد آلود فرش پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا تھا۔ اس کی چاندی کی نتھلی چمک دکھانے لگی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کی خوب صورت آنکھیں سرخ اور ورم زدہ تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک خوب روتی رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں اس طرح ملاقات ہوجائے گی۔''

وہ بولی۔ ''بابو سائیں! اس دن آپ کھانا کھائے بغیر ہی ہمارے گھر سے چلے گئے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے آپ کے لیے بڑے شوق سے سندھی بریانی بنائی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہاری بنائی ہوئی بریانی میرے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ چلو چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا پاجعفر تمہاری شادی کب کررہا ہے؟''

شادی کے نام پر اس کے چہرے پر شرم اور دکھ کے سائے ایک ساتھ لہرا گئے۔ سنبھل کر بولی۔ ''ابھی تو شاید منگنی ہوگی۔ شادی کو سال کے قریب لگ جائے گا۔ پاجی نے لڑکے سے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ رخصتی سے پہلے اپنا گھر بنالے۔''

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اپنی امی حبیبہ مائی کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ آج کل کچھ بیمار ہیں۔ چند دن پہلے جب میں مہرو کے گھر گیا تھا تو اس کی امی سے بھی مختصر بات ہوئی تھی۔ وہ پردہ کرتی تھیں اور الگ تھلگ رہنے کی عادی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہرو! مجھے لگتا ہے کہ تم تھوڑی دیر پہلے تک بہت روتی رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں.....''

وہ ذرا ٹھٹک کر بولی۔ ''ہاں جی..... جرا دعا مانگ رہی تھی۔''

''کس کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ گڑبڑا گئی۔ ''جج..... جی؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے مہرو تم کس کے لیے دعا مانگ رہی تھیں؟ تم ابراہیم کے لیے دعا مانگ رہی تھیں نا؟''

اس کا رنگ ایک دم ہلدی ہوگیا۔ چاندی کی نتھ لرز اٹھی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آ..... آپ..... اسے جانتے ہیں؟''

''جانتا ہوں تو نام لے رہا ہوں نا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ یہاں بغداد میں موجود ہے..... اور..... اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے آخری الفاظ ذرا مسکراتے ہوئے کہے۔

وہ بہت نروس نظر آرہی تھی لیکن میرا رویہ دیکھ کر اسے سنبھلنے میں مدد ملی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپک کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ میں دوست ہوں دشمن نہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور معصومیت سے بولی۔ ''آپ..... اور..... کیا جانتے ہیں بابو سائیں؟''

''بہت کچھ۔'' میں نے پھر مسکرا کر کہا۔ ''مثلاً یہ کہ تم نے زاہدان میں یہ کیوں کہا تھا کہ جب میں ہنستا ہوں تو تمہیں کوئی اپنا یاد آجاتا ہے۔''

''جج..... جی..... میں سمجھی نہیں بابو سائیں۔''

''بھئی تم نے کہا تھا نا کہ میں ہنستے ہوئے کسی کی طرح لگتا ہوں۔ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں کس کی طرح لگتا ہوں۔ تمہارے ابراہیم کو دیکھ لیا ہے میں نے۔''

''تمہارے ابراہیم'' کے الفاظ نے مہرو کے چہرے پر ایک بار پھر شرم آمیز دکھ کے سائے لہرا دیے۔ یہ گہرا دکھ تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پلکیں جھکائیں اور بولی۔ ''اس کا نام نہ لیں بابو سائیں۔ وہ اب میری زندگی سے نکل چکا ہے۔ میں اپنے پاسے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں۔ ان کو کوئی دکھ نہیں دے سکتی۔ اگر..... اگر وہ آپ سے ملتا ہے تو اس سے کہہ دیں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ نہیں تو اسے بہت ذلیل ہونا پڑے گا۔ میں اسے بالکل بھول چکی ہوں بابو سائیں..... وہ بھی مجھ کو بھول جائے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو کہ اسے بالکل بھول چکی ہو..... دیکھو..... دیکھو میری طرف۔''

وہ اسی طرح گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے، پھر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''مہرو! جھوٹی زندگی جینے سے بہتر ہے کہ دل بڑا کر کے سچ کا سامنا کرلیا جائے اور تمہیں بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہاری کون سی ابھی شادی ہو رہی ہے۔ ایک سال سے زیادہ کا وقت ہے۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارا بھائی جعفر بس یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شادی کسی برسرروزگار، کھاتے پیتے شخص سے ہو۔ کیا پتا کہ اس ایک ڈیڑھ سال میں ابراہیم ہی چار پیسے کمالے اور تمہارا ہاتھ مانگنے کے قابل ہوجائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری خاطر یہاں بغداد میں رہنے کے لیے بھی فوراً تیار ہوجائے گا۔''

مہرو نے اپنا سر بدستور گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس نے سر کو نفی میں حرکت دی اور اشک بار آواز میں بولی۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا بابو سائیں..... آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں..... مم..... میں آپ کو سچ بتاتی ہوں۔ میری شادی کہیں بھی ہوجائے..... مم..... میں خوش رہوں گی۔''

''تمہاری آواز، تمہارا ساتھ نہیں دے رہی مہرو..... یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو۔''

وہ اسی طرح سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔

پتا نہیں، میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے، میں اور ابراہیم کویت جارہے ہیں۔ ایک کمپنی میں کچھ نوکریاں نکلی ہیں۔ امید ہے کہ اچھی ملازمت مل جائے گی۔''

اس نے اپنی تر بتر آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں اور معصومیت سے بولی۔ ''یہ..... کویت کہاں ہے؟''

''یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں بہت پیسا ہے۔ بندہ محنت کرنے والا ہو تو بڑی جلدی اس کے حالات بدل جاتے ہیں۔''

مہرو کے چہرے پر امید کی ایک کرن سی چمکی لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے چہرے کو پھر مایوسی اور دکھ نے ڈھانپ لیا۔ اس نے ایک آہ بھر کر الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''بابو سائیں! اس سے کہہ دیں وہ میرے لیے اپنے آپ کو دربدر نہ کرے۔ اس کے گھر میں اس کی بیمار ماؤں کو اس کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی جو کام ہو ہی نہیں سکتا، اس کی آس نہیں رکھنی چاہیے۔''

''تم زیادہ سیانی نہ بنو۔'' میں نے ذرا جھڑک کر کہا۔ ''اللہ سے اچھے کی امید ضرور رکھنی چاہیے۔''

اس نے سر جھکالیا۔ ایسا کرتے ہوئے آنکھوں سے پھر چند آنسو گر گئے۔

اسی دوران میں ایک عراقی پہریدار اوپر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے چھت پر موجود لوگوں کو نیچے جانے کے لیے کہا۔ میں اور مہرو بھی نیچے آگئے۔

☆☆☆

اس روز شام تک میں امام کاظم کے روضے اور اردگرد کی مساجد میں حضرت عالی مقام کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ آج کل بغداد سے باہر کسی تبلیغی دورے پر ہیں۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے میں بس کے ذریعے رات نو بجے غوث پاک حضرت عبدالقادر جیلانی کے روضے پر واپس پہنچا۔ یہاں ابراہیم بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے مہرو سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا..... تاہم ہمارے درمیان کویت جانے کے بارے میں

www.pdfbooksfree.pk

تفصیل سے بات ہوئی۔ کل تک کویت جانے کے بارے میں ہمارا ارادہ ڈانواں ڈول تھا لیکن آج میں نے ابراہیم کے سامنے پختہ ارادے کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ اگر ہمیں ایک موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کیا پتا کہ حالات میں کوئی تبدیلی آجائے۔ یہ بات تو اب ابراہیم کو بھی معلوم ہو چکی تھی کہ مہرو کی شادی کو ابھی سال ڈیڑھ سال لگ جانا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی مالی حالت درست کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا لیتا تو بہتری کی امید کی جاسکتی تھی۔

ابراہیم نے مجھے خوش خبری والے انداز میں بتایا کہ اس نے دو ہندوستانیوں سے رابطہ کیا ہے اور وہ مطلوبہ کرایہ دے کر لانچ کے ذریعے کویت جانے کے لیے تیار ہیں۔

میں نے کہا۔ ''وہ تو تیار ہو گئے ہوں گے..... لیکن کیا تم بھی تیار ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہارون سائیں! میں نے سوچا ہے کہ جو آپ کہو گے، میں وہی کروں گا۔''

''تو پھر میں تو کہتا ہوں کہ ہم ایک بار قسمت آزما کر دیکھ لیں، کیا پتا اللہ تعالیٰ ہمارا ہاتھ پکڑ لے۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''لیکن میں جانے سے پہلے ایک بار مہرو سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ کم از کم اسے خبر تو دینا چاہتا ہوں کہ میں کچھ دیر کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''تمہارا رابطہ کرنا بہت خطرناک ہوگا ابراہیم۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''ہاں اطلاع دینے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔''

اسی دوران میں وہ دونوں افراد آتے دکھائی دیے جن سے ابراہیم نے کویت جانے کے بارے میں بات کی تھی۔ ان کے ساتھ ایک پٹھان جندل خاں بھی تھا۔ یہاں روضے میں قیام کے دوران میں جن لوگوں سے میری دوستی ہوئی تھی، ان میں سے یہ جندل خاں بھی شامل تھا۔ عمر پینتیس سال سے اوپر ہی ہوگی۔ وزیرستان کا رہنے والا تھا۔ نماز روزے کا پابند اور بڑے اچھے اخلاق کا مالک۔ گاؤں میں اس کی زمین قرضے کے بوجھ کی وجہ سے گروی پڑی ہوئی تھی۔ اس زمین کو چھڑانا جندل خاں کی زندگی کا سب سے خوب صورت سپنا تھا۔

جندل خاں نے آتے ساتھ ہی پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اوئے پپو یار! تم نے ام کو بتایا ہی نہیں۔ تم لوگوں کو کویت لے کر جانے والا ہے۔''

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا نام لو جندل خاں۔ میں کسی کو کویت کیسے لے جاسکتا ہوں۔ میں تو خود کسی آسرے کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔''

پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کویت لے جانے کی ہامی بھرنے والے کون لوگ ہیں اور وہ کیا کہتے ہیں۔ میں نے جندل خاں اور دونوں بھارتیوں کو اچھی طرح سمجھایا کہ میں ان لوگوں کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ لوگ ..... مسافروں کو کویت لے جانے کا کام کر رہے ہیں۔ باقی تم لوگ خود ان سے ملو اور فیصلہ کرو کہ ان پر بھروسا کرنا ہے یا نہیں۔

اگلے دو تین روز تک مشوروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ تین چار افراد ہوٹل جا کر کمال رشید کے نمائندے سے مل بھی آئے۔ پھر پتا چلا کہ کم از کم دس افراد بذریعہ لانچ کویت جانے کے لیے آمادہ ہو چکے ہیں۔ ان میں تین بھارتی مسلمان تھے۔ چار پنجابی اور سندھی بھائی تھے۔ دو پٹھان حضرات تھے۔ ان میں سے جندل خاں کے بارے میں تو میں نے بتایا ہے۔ دوسرے کا نام آفتاب گل تھا۔ یہ چالیس پینتالیس سالہ فربہ اندام شخص خیبر ایجنسی کا رہنے والا تھا۔ اس کا رنگ سرخ انگارے کی طرح تھا۔ بظاہر یہ شخص بھی خوش اخلاق نظر آیا تھا لیکن جندل خاں کا خیال تھا کہ شاید یہ شخص آزاد علاقے میں کوئی جرم کر کے بھاگا ہوا ہے۔

اس دوران میں ابراہیم بھی ذہنی طور پر کویت جانے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس نے چچا ابو سیاف کے کمرے میں بند ہو کر ایک طویل خط مہرو کے نام لکھا تھا۔ خط لکھ کر وہ باہر آیا تو میں نے چور نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ یہ خط لے کر چلا گیا اور اگلے روز دوپہر کو واپس آیا۔ اس دوران میں میں اس کی خیر خیریت کی دعائیں ہی مانگ سکتا تھا۔ بہرحال آکر اس نے بتایا کہ وہ جعفر کی تیرہ چودہ سالہ ملازمہ کے ذریعے وہ خط مہرو تک پہنچانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس نے مجھے خط کے مندرجات کے بارے میں نہیں بتایا لیکن مجھے پتا تھا کہ محبت کی آگ میں جلتے ہوئے اس شخص نے مہرو کو کیا کچھ لکھا ہوگا۔ وہ جس طرح خود انوکھا تھا، اس کی محبت بھی انوکھی تھی۔ میں نے اکثر اسے راتوں کو تنہائیوں میں سسکیاں لیتے سنا تھا۔

پتا نہیں کیوں ایک بار پھر میرے دل میں آئی کہ میں بھی اپنے گھر والوں کو کچھ لکھوں۔ میں نے جونہی ایسا سوچا، پھر وہی انجانا خوف دل و دماغ کو جکڑنے لگا جس نے چند دن پہلے مجھے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ میں نے ظہر کی نماز کے بعد دیر تک گڑگڑا کر دعا مانگی کہ میرے اندر کا خوف کم ہو۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد میں چچا ابوسیاف کے حجرے میں چلا گیا۔ وہ کھانے کے بعد سویا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ قلم لیا اور بیٹھ گیا۔ اچانک میری نگاہ سامنے دیوار پر لگے ایک لمبوترے سے آئینے پر پڑی۔ ابوسیاف سر اور ڈاڑھی وغیرہ میں کنگھی کرنے کے لیے یہ آئینہ استعمال کرتا تھا۔ میں نے آئینے میں دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ حقیقت پسند لوگ میری بات پر شک کا اظہار کر سکتے ہیں یا پھر اسے میری دیوانگی قرار دے سکتے ہیں لیکن میں وہی لکھ رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ مجھے آئینے میں اپنے پیچھے کوئی کھڑا نظر آیا۔ حالانکہ وہاں میرے اور چچا ابوسیاف کے سوا اور کوئی نہیں تھا..... اس کا فاصلہ مجھ سے سات آٹھ فٹ رہا ہوگا۔ اس کا ایک شانہ اندھیرے میں تھا لیکن دوسرا احاطے میں تھا اور اس پر سفید کپڑے کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دہشت زدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا..... میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ بس ایک کھونٹی پر ابوسیاف کا براؤن تولیا لٹک رہا تھا۔ میں نے پھر آئینے میں دیکھا۔ عقب میں کوئی کھڑا تھا۔ واضح نہیں تھا لیکن یہ وہی سفید پوش ہیولا تھا۔ میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے پھر پیچھے دیکھا..... بس خالی دیوار اور براؤن تولیا..... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک مہیب لرزا دینے والی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا.....

میں نہایت دہشت کے عالم میں اٹھا اور حجرے سے نکل آیا۔ مجھے لگا کہ میں اکیلا ہوا تو وہ مجھے دبوچ لے گا۔ میں ننگے پاؤں چلتا ہوا ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں بہت سے لوگ موجود تھے اور کسی بات پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

میرے شانے پر کسی نے عقب سے ہاتھ رکھا۔ میں اس بری طرح دہلا کہ پورا جسم سنسنا گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ یہ جندل خاں تھا۔ اس نے کہا۔ ''کیا ہوا پپو! خوتم ٹھیک تو ہے؟''

''ہاں..... ہاں..... کچھ نہیں۔'' میں نے بے ربط انداز میں کہا۔

''خو کسی سے جھگڑا مگڑا تو نہیں ہوا؟''

''نہیں خان! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور روضے کی لائبریری کی طرف چلا گیا۔ چچا سیاف نے ایک وظیفہ بتا رکھا تھا۔ میں اسے مسلسل پڑھنے لگا۔ پسینا میرے جسم کے ہر مسام سے نکل رہا تھا۔

اس رات بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ میرا دل اب گواہی دینے لگا تھا کہ میں کبھی اپنے گھر والوں سے رابطہ نہیں کر پاؤں گا۔ جب بھی ایسا سوچوں گا، میرے دل و دماغ میں قیامت برپا ہو جائے گی۔

کیوں ہو رہا تھا ایسا؟ کیا حل تھا اس کا؟ عالی مقام سے پھر ملاقات کیوں نہ ہو سکی تھی؟

اس رات ایک بار پھر اپنوں کی یاد بڑی شدت سے آئی۔ والد، والدہ، بڑے بھائی جان اسلم، چھوٹے بھائی جان فاروق، شعیب اور بہنیں..... اور ان کے ساتھ ساتھ عارفہ۔ سب کے چہرے ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آئے..... اور مجھے خون کے آنسو رلاتے رہے۔ مجھے لگا وہ سب کے سب ایک دھند میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔

اگلے روز میں آخری بار عطا صاحب کے پاس کام پر گیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں یہ کام چھوڑ رہا ہوں..... بہرحال میں نے انہیں اپنی کویت روانگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے زیادہ پوچھ گچھ بھی نہیں کی۔ بس یہی کہا کہ کبھی بھی ملتے رہنا۔ میری جو محنت بنی تھی وہ انہوں نے اسی وقت مجھے نقد دے دی اور میں انہیں سلام کر کے اور ان کی دعائیں لے کر ان سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز کمال رشید کا نمائندہ باقر خود روضے پر پہنچا۔ اس نے روضے کے سامنے واقع ایک قہوہ خانے میں، خواہش مند حضرات سے ملاقات کی۔ قریباً پندرہ افراد کے ساتھ معاملات طے ہو گئے۔ ہر شخص نے فی کس تقریباً تین ہزار پاکستانی روپے دینے تھے اور بذریعہ لانچ کویت کے ساحل پر اترنا تھا۔ ان پندرہ افراد میں میرے اور ابراہیم کے علاوہ جندل خاں اور آفتاب گل بھی شامل تھے۔ آفتاب گل ایک طرح سے ہمارا لیڈر بن گیا تھا۔ باقر سے زیادہ تر بات چیت اسی نے کی۔ باقر کا تعلق پتا نہیں کس ملک سے تھا۔ بہرحال وہ اردو اور بنگالی بھی کسی حد تک جانتا تھا۔

اس روز شام کو ہم سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا اور اپنے اپنے پیسے باقر کو دے دیے۔ جیسا کہ امین نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، میرے اور ابراہیم سے رعایتی کرایہ لیا گیا۔ ہم دونوں نے فی کس تقریباً نو سو پاکستانی روپے دیے۔

باقر نے پورے گروپ کو تیاری کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ ٹھیک چار دن بعد ہم سے پھر یہیں پر رابطہ کرے گا۔ باقر نے ہم دونوں سے بھی یہی کہا کہ ہم تیاری کریں، تاہم اس دوران میں کمال رشید صاحب یا امین سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی بات دو دن پہلے امین نے بھی مجھ

www.pdfbooksfree.pk

سے کہی تھی۔

اب ہمارا انتظار شروع ہوا جو بہت کٹھن تھا۔ دل میں کئی طرح کے وسوسے بھی اٹھ رہے تھے۔ اگر کمال رشید اور باقر وغیرہ کہیں اوجھل ہوجاتے تو ہمارا کیا ہوتا؟ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ آگے سفر میں پتا نہیں کس طرح کے حالات پیش آئیں گے۔ ان دیکھے حالات کی فکرمندی ہر وقت ہمیں گھیرے رہتی تھی۔ ہر شخص کے اپنے اپنے سپنے تھے۔ ایک شخص اپنی جواں سال بیوی کی زندگی بچانے کے لیے کویت میں محنت مزدوری کرنا چاہتا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر بھارتی کو اپنی تین بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے تھے۔ آفتاب گل اپنے خاندان اور قبیلے سے الرجک تھا۔ وہ کویت جانا چاہتا تھا اور پھر وہاں سے کسی طرح سعودی عرب میں داخل ہوکر اپنی باقی زندگی خانۂ خدا میں گزار دینے کا خواہش مند تھا۔ جندل خاں کی زمین پندرہ بیس برس سے گروی پڑی تھی۔ وہ یہ زمین چھڑا کر اپنی غربت کا جال توڑنا چاہتا تھا..... اپنے عزیز و اقارب کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی شادیاں کرے اور اپنی فاقہ زدہ بیوی کے چہرے پر کم از کم ایک بار تو خوش حالی کی چمک دیکھ سکے۔

ہاں..... ہر شخص کے اپنے سپنے تھے اور ہر دل کے اپنے ارمان تھے، ہر نگاہ کویت پر لگی تھی اور ہر دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ وہ بخیریت کویت پہنچیں اور دولت و خوش حالی کی اس سرزمین پر ان کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہو۔

ابوسیاف کو پتا چل چکا تھا کہ ہم یہاں سے کویت جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ابوسیاف کے ذریعے روضے کے دیگر خدمت گاروں کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ ان میں سے کئی میرے بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھ سے ایک بے نام ہمدردی رکھتے تھے اور میری بھلائی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ یہاں ہر اچھے برے وقت میں میرا سہارا بنے تھے۔ جن دنوں مجھے کوئی کام نہیں مل رہا تھا اور میری حالت بہت پتلی ہوتی جارہی تھی، یہ لوگ میری ڈھارس بندھاتے تھے۔ لنگر سے میرے لیے باقاعدہ کھانا لے کر آتے تھے۔ مجھے مفید مشورے دیتے تھے۔ ان میں سے ایک مشورہ یہ بھی ہوتا تھا کہ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ میرے دل و دماغ نے میرے لیے واپس جانا کتنا مشکل بنا دیا ہے۔ جب میں روضے کے گرد و نواح میں کام ڈھونڈ رہا تھا، کچھ دن ایسے بھی آئے تھے جب مجھے اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے وہ شب و روز بھی یاد تھے جب میرے جسم پر صرف ایک انڈرویئر ہوتا تھا اور میں نیم دیوانوں کی طرح روضے کے اردگرد گھومتا رہتا تھا۔ ان دنوں میری حالت بھک منگوں کی سی ہوگئی تھی۔ کسی نے کچھ دیا تو کھالیا ورنہ فاقہ کرلیا۔

بہرحال اب میں نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ ابوسیاف کا خیال تھا کہ کویت میں روزگار تو واقعی بہت اچھا مل سکتا ہے لیکن مجھے جو قدم اٹھانا ہے، سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ لوگ لانچ کے ذریعے کویت پہنچ بھی جاتے ہیں لیکن بعض کو بہت مشکل بھی ہوتی ہے۔ دیگر دوستوں نے بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا مشورہ دیا۔ بہرحال اب تو فیصلہ ہو چکا تھا۔ ہم رقم دے چکے تھے اور شدت سے باقر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ نماز کے بعد سب خشوع و خضوع سے دعا مانگتے۔ خاص طور سے جندل خاں کو میں نے کئی بار دعا میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ وہ پشتو میں گڑگڑاتا اور قدرت سے اپنے لیے آسانیاں مانگتا۔

انتظار کی گھڑیاں بڑی کٹھن تھیں۔ کمال رشید کے نمائندے نے منگل کی صبح آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم سب روضے کے صحن میں اکٹھے ہوگئے اور فجر کی نماز کے بعد اس کا انتظار شروع کردیا۔ ابوسیاف نے کہیں جانا تھا۔ میں نے کل شام کو ہی اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ دل میں جو سب سے بڑا دکھ تھا، وہ اس بات کا تھا کہ میں حضرت عالی مقام کو دوبارہ دیکھے بغیر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ کاش میں ان کو ایک بار پھر دیکھ سکتا۔ ان کی دید میرے اندر کے انجانے خوف کو شاید اتنا تکلیف دہ نہ ہونے دیتی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ میں ہر وقت ایک نادیدہ موت کے گھیرے میں ہوں جو کسی بھی وقت مجھے دبوچ سکتی ہے۔ ابوسیاف کے حجرے میں آئینے کے اندر جو عکس میں نے دیکھا تھا اس کی یاد..... دل کو خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزا دیتی تھی۔ میں اس دن کے بعد ابوسیاف کے حجرے میں گیا ہی نہیں تھا اور اب تو ویسے ہی اس جگہ کو خدا حافظ کہنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ میرا وہم تھا، تصور تھا، نظر کا دھوکا تھا یا پھر حقیقت تھی..... لیکن جو کچھ بھی تھا، میں اسے دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں خود کو اکیلا نہیں رہنے دیتا تھا۔ کم از کم ابراہیم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔

ہم صحن میں بیٹھے رہے، میری نگاہ غوث پاک کے روضے پر جمی رہی۔ آنکھیں نم رہیں اور دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ اس وقت سب سے اہم دعا تو یہی تھی کہ باقر احمد کی صورت نظر آجائے۔ سورج نکلا..... آٹھ بجے..... اور پھر

www.pdfbooksfree.pk

دس بج گئے۔ ہماری بے چینی عروج پر پہنچ گئی اور پھر باقر دروازے پر نظر آیا۔ اس وقت وہ ہمیں رحمت کا فرشتہ ہی لگا۔ ایسا فرشتہ جو ہمارے لیے آسانیوں اور خوش حالیوں کی طرف جانے والے راستے کھولنے والا تھا۔ ہم نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

اس نے عربی میں کہا۔ ''آپ سب لوگ اپنا سامان اٹھاؤ۔ ہم بس اڈے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔''

ہمارے گروپ میں احسان نامی ایک حافظ قرآن بھی تھا اور وہ تھوڑی بہت عربی جانتا تھا۔ اس نے ہمیں ترجمہ کر کے بتایا۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ ہم نے فوراً اپنا اپنا سامان اٹھایا اور باقر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ہم حضرت غوث پاک کے آبائی قبرستان کے پاس سے گزرے۔ مجھے وہ پہلی رات یاد آئی اور وہ دو قبریں بھی دکھائی دیں جن کے درمیان سے کسی نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا تھا۔ وہ سارے مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

قریباً آدھ گھنٹا پیدل چلنے کے بعد ہم بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ یہاں سے دس مسافر مزید ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ باقر نے ہمیں ایک ایسی بس میں بٹھایا جس نے پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں چلنے والے کھٹاروں کی یاد تازہ کر دی۔ سیٹیں پھٹی ہوئی، شیشے ٹوٹے ہوئے۔ دن کے بارہ بجے تھے جب بس روانہ ہوئی۔ بغداد سے نکلنے کے بعد کچھ دیر تک تو کہیں کہیں ہریالی نظر آتی رہی پھر لق ودق صحرائی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں ریت کے بگولے اڑتے پھرتے تھے اور گرم ہوائیں ہمارے جسم جھلسا رہی تھیں۔ سب پتھر کے مجسموں کی طرح خاموش بیٹھے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے..... بلکہ کہنا چاہیے کہ اندیشوں میں گم تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ''سائیں! کہیں رک کر کھانا وانا بھی کھلائیں گے یا اسی طرح چلا چلا کر بے ہوش کر دیں گے دیکھو تین بج چکے ہیں۔''

ابھی ابراہیم کی بات منہ میں ہی تھی کہ بس ایک ویران صحرائی ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ برا بھلا کھانا کھا کر ہم نے اپنے واٹر کولرز میں پانی بھرا اور پھر سے کھٹارا بس میں آ بیٹھے۔ جلد ہی سورج نے غروب ہونے کی تیاری کر لی۔ آسمان پر ایک طرف کچھ گدلا پن سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے باقر احمد سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

اس نے عربی میں بڑے کھردرے پن سے جواب دیا۔ اس کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے حافظ احسان نے بتایا۔ ''باقر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آندھی آ سکتی ہے۔''

واقعی کوئی ایک گھنٹے بعد آندھی آ گئی اور خوب آئی۔ یہ ریت کا طوفان تھا جس نے ہمیں سرتاپا ہلا دیا۔ ریت بس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر آئی اور برچھیوں کی طرح ہمارے جسم کے کھلے حصوں سے ٹکرانے لگی۔ بس رک گئی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا جیسے بس الٹ جائے گی۔

''باہر نکل جاؤ..... سب باہر نکل جاؤ۔'' ہمارے گروپ لیڈر آفتاب گل نے چلا کر کہا۔

ہم بس سے باہر نکل آئے اور منہ سر لپیٹ کر اوندھے منہ ریت پر لیٹ گئے۔ ریت نے بڑی تیزی سے ہمیں ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ایک دو منٹ بعد مجھے لگا کہ میں ریت میں زندہ دفن ہو رہا ہوں۔ چہرے سمیت میرا سارا جسم ریت میں جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر بہ مشکل ریت میں سے باہر نکالا لیکن چند ہی سیکنڈ بعد وہ پھر ریت میں دبنا شروع ہو گیا۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں اپنی نئی نویلی دلہن کا چہرہ پھر میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''عارفہ! تمہیں کیا پتا، میں کس مصیبت میں ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے معاف کر دینا..... ہاں، اپنے بدنصیب دیور کو معاف کر دینا۔''

وہ ایک قیامت تھی جو ہم پر گزری۔ قریباً پون گھنٹے بعد طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور ہم اٹھ کر بس میں گھسنے کے قابل ہوئے۔

قارئین! میرے ساتھ جو جو پیش آیا، میں وہ بلاکم وکاست لکھتا چلا جا رہا ہوں..... وہ مناظر بڑے ہولناک تھے۔ بس کی باڈی کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے ایک بھارتی بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اس آفت کے سدباب کے لیے بلند آواز میں اذانیں دے رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا مسلسل روتا چلا جا رہا تھا۔ بس کے اندر بھی ریت بھر گئی تھی اور لگتا تھا کہ ''صحرا'' بس کے اندر داخل ہو گیا ہے۔

ہم نے رات کا باقی حصہ بس کے اندر ہی گزارا۔ صبح جندل خاں نے اذان دی۔ اب موسم پُرسکون تھا۔ ہم نے ایک ٹیلے کے دامن میں تیمم کرنے کے بعد نماز پڑھی۔ اسی دوران میں باقر احمد نے کسی پاس کی صحرائی بستی سے چند مزدور بلوائے اور انہوں نے بس کے اندر کی ریت صاف کی۔ روکھا سوکھا ناشتا کر کے ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔

ریت سے اٹی ہوئی سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے ہم سہ پہر قریباً چار بجے بصرہ پہنچ گئے۔ اس قدیم شہر کے گلی کوچوں میں خستہ حال وسادہ لوح لوگ گھومتے پھرتے

www.pdfbooksfree.pk

نظر آتے تھے۔ در و دیوار پر بوسیدگی کی جھلک تھی۔ ہماری بس..... بس اسٹینڈ پر رکی تو ہم پچیس مسافر باقر احمد کی قیادت میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ کہیں کہیں سے ہمیں سمندر کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ابراہیم سے کہا۔ ''ہم بچپن سے لاہور شہر کے گلی کوچوں میں یہ آوازیں سنتے آئے ہیں..... ''بصرے کی کھجوریں'' لو آج ہم نے بصرہ بھی دیکھ لیا۔''

ابراہیم خاموش رہا۔ وہ سارا راستہ ہی تقریباً خاموش رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں صرف اور صرف مہرو کا خیال ہے۔

ہم سمندر کے کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک کشادہ کوٹھی نما مکان میں پہنچے۔ پتا نہیں کیوں مجھے امید تھی کہ یہاں امین سے ملاقات ہوگی۔ امین سے تو ملاقات نہیں ہوئی لیکن تنومند کمال رشید کا دیدار ضرور ہوگیا۔ وہ ایک سائبان کے نیچے صرف ایک نیکر پہنے اوندھا لیٹا تھا اور ایک لڑکی اس کی ٹانگوں کی مالش کر رہی تھی۔ لڑکی بھی مختصر لباس میں تھی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال آگے کی طرف جھول رہے تھے۔ جب اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے بال پیچھے ہٹائے تو میں حیران ہوا۔ یہ وہی خاموش آنکھوں والی فرح تھی۔ بغداد کے ہوٹل میں اس کی بے عزتی کا منظر میں ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

کمال رشید نے بس ایک طائرانہ نظر ہم پر ڈالی اور پھر اوندھا لیٹ گیا۔ باقر ہمیں مکان کے اندرونی حصے میں لے آیا۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔ ہمیں تین کمروں میں ٹھہرا دیا گیا۔ مکان کے ایک برآمدے میں ایک رائفل بردار عراقی بھی ٹہلتا نظر آیا۔ اس کی آٹومیٹک رائفل دیکھ کر ہم کچھ اور بھی نروس ہوئے۔

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم سو گئے اور کافی دیر بعد اٹھے۔ باقر پاس سے گزرا تو میں نے پوچھا۔ ''باقر صاحب! کیا امین بھی یہاں ہی ہے؟''

باقر ٹوٹی پھوٹی اردو میں نہایت بے رخی سے بولا۔ ''اپنے کام سے کام رکھو۔ فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔''

میں کٹ کر رہ گیا۔ آفتاب گل کا چہرہ انگارے کی طرح دہک گیا۔ شاید وہ باقر سے کچھ کہتا لیکن جندل خاں نے اس کا بازو دبا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اس نے ٹھیک ہی کیا۔ ہمیں کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ ہمارے ساتھ جو چاہے کر سکتے تھے۔ فی الوقت ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے مالک کا نوکروں سے ہوتا ہے..... بلکہ ادنیٰ نوکروں سے۔

احاطے میں ایک طرف کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں اور جندل خاں ان کھجوروں کے نیچے آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے جندل خاں سے کہا۔ ''آفتاب گل کو روک کر تم نے اچھا ہی کیا ورنہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔''

جندل خاں بولا۔ ''یہ آفتاب بڑا غصے والا ہے۔ اس غصے کی وجہ سے ہی تو اس کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

جندل خاں کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر اس نے مجھے آفتاب گل کی روداد سناتے ہوئے کہا۔ ''خو، جہاں تک ام جانتا ہے..... آزاد علاقے میں آفتاب سے دو بندوں کا قتل ہوا تھا۔ یہ دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔''

''ایسا کیوں ہوا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

جندل خاں نے رازداری کے انداز میں آفتاب گل کی کہانی سناتے ہوئے بتایا۔ ''آفتاب گل کا بس ایک ہی اولاد تھا۔ اس کا بیٹی زرغونہ۔ وہ شادی شدہ تھا لیکن اپنے سسرال میں خوش نہیں تھا۔ اس کا خاوند محنت مزدوری کے لیے مسقط گیا ہوا تھا۔ سسرال والا زرغونہ کو بہت تنگ کرتا تھا۔ خاص طور سے اس کا سسر۔ وہ بہت سخت طبیعت کا تھا۔ ایک روز اس نے زرغونہ کو دھکا دیا۔ وہ بری طرح گر گیا۔ اس کا حمل خراب ہوگیا۔ اس کو اسپتال لے جایا گیا لیکن اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیچارہ لڑکی ختم ہوگیا۔ اس کی موت کا اطلاع اتنا خوفناک تھا کہ اسے سنتے ہی آفتاب گل کا بیوی کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ ایک طرح سے آفتاب گل کا دنیا اندھیر ہوگیا..... بس یہی تو چھوٹا سا کنبہ تھا اس کا۔ وہ جی تھری رائفل لے کر بیٹی کے سسرال میں گھس گیا۔ اس نے بیٹی کے سسر کو گولیاں مار دیں۔ بیٹی کا جیٹھانی سامنے آیا تو آفتاب نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ یہی عورت زرغونہ کے ساس سسر کے کان بھرتا تھا۔ وہ دونوں موقع پر ہی ختم ہوگیا۔ آفتاب گل بھاگ گیا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دشمنوں نے غصہ اس کے مکان پر اور اس کی کپڑے کی دکان پر اتارا۔ دونوں جگہوں کو آگ لگا دیا۔ زبردست دشمنی چل نکلا تھا۔ آفتاب کچھ دیر خیبر ایجنسی میں چھپا رہا۔ پھر چھپتا چھپاتا کوئٹہ پہنچ گیا اور کوئٹہ سے ادھر نکل آیا۔''

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ آفتاب گل کی کہانی کچھ اس سے ملتی جلتی ہوگی۔ جہاں جہاں ناانصافی ہوتی ہے، وہاں

www.pdfbooksfree.pk

وہاں خون بھی بہتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلتا رہے گا۔

اسی دوران میں اندر سے ابراہیم نے ہمیں پکارا اور کہا کہ ہم کھانا کھالیں۔ ایک ہال کمرے میں دو بڑی بڑی چٹائیاں بچھی تھیں اور انہی پر ہمارے لیے کھانا لگایا جارہا تھا۔ کھانا لگانے والوں میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک وہی فرح نامی لڑکی تھی۔ ہمیں یہاں ایک دو اور لڑکیاں بھی نظر آئی تھیں۔ یقیناً وہ بھی فرح کی طرح ''خدمت گار'' ہی تھیں لیکن وہ مناسب لباس میں تھیں۔ صرف فرح ہی ایسی تھی جس کا لباس نازیبا تھا۔ اب بھی اس کے بالائی جسم پر برائے نام لباس تھا۔ زیریں جسم پر جینز کی ایک نیکر تھی۔ وہ اسی لباس میں ہمارے سامنے کھانا سرو کر رہی تھی۔

آفتاب گل سے نہیں رہا گیا۔ وہ بولا۔ ''ہارون! ام کو یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ امارا سر شرم سے جھک رہا ہے۔ آخر یہ لڑکی ٹھیک کپڑا کیوں نہیں پہنتا۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''سائیں! ہوسکتا ہے کہ یہ اس کی اپنی مرضی کے کپڑے نہ ہوں۔''

''کچھ بھی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں۔'' آفتاب نے کہا۔ ''اس کو کم از کم امارے سامنے تو اس طرح نہیں آنا چاہیے۔''

آفتاب اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اپنے کندھوں سے اپنی چادر اتاری اور لڑکی کے شانوں پر ڈال دی۔ بولا۔ ''تم امارا بیٹی کی طرح ہے، ام کو اس طرح اچھا نہیں لگتا۔''

لڑکی اردو نہیں جانتی تھی۔ بس حیرانی سے آفتاب گل کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی دوران میں ایک طرف سے باقر لپکتا ہوا آگیا۔ آفتاب سے مخاطب ہوکر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ''کیا بات ہے سرخ آدمی؟'' وہ آفتاب کو سرخ آدمی ہی کہتا تھا۔

آفتاب نے کہا۔ ''یہ بچی ایسے کپڑوں میں کیوں پھرتا ہے، ام کو یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

باقر نے چادر کو زور سے جھٹکا اور فرح کے کندھوں سے اتار پھینکا۔ پھنکار کر بولا۔ ''یہ ایسے ہی رہے گی، یہ باس کا حکم ہے۔''

''کیوں اس نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو سرخ آدمی۔ یہ ایسے ہی کپڑوں میں رہتی ہے۔''

آفتاب کا چہرہ انگارے کی طرح دہکنے لگا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تو پھر..... اس کو اماری طرف نہ بھیجو۔ کسی اور کام پر لگاؤ۔''

باقر پھنکارا۔ ''یہ ادھر ہی رہے گی۔ یہی کام کرے گی۔ تم اپنی یہ منحوس آنکھیں بند کرلو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے آفتاب کو گالی دے دی۔

آفتاب، باقر کی طرف جھپٹا لیکن میں نے اسے راستے میں روک لیا۔ میں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور دھکیل کر پیچھے لے گیا۔ ابراہیم نے آفتاب کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا تھا کہ کہیں وہ باقر کو جوابی گالی نہ دے دے۔ ہماری یہ تدبیر کامیاب رہی اور ہم نے صورتِ حال کو سنگین ہونے سے بچالیا۔ رائفل بردار عراقی بھی فوراً موقع پر پہنچ گیا تھا۔ بہرحال کچھ دیر گرجنے برسنے کے بعد باقر باہر چلا گیا۔ بعد میں جندل خاں نے آفتاب کی طرف سے اس سے معافی مانگی اور اسے ٹھنڈا کیا۔ ہم سب نے آفتاب گل کو بھی سمجھایا کہ وہ تو ہمارا لیڈر ہے اگر وہ اس طرح غصے میں آئے گا تو پھر ہم سب کا بہت نقصان ہوجائے گا۔

وہ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ صبح ناشتا لانے والوں میں فرح شامل تھی اور پھر اسی لباس میں تھی۔ آفتاب گل منہ پھیرے بیٹھا رہا۔

نو بجے کے لگ بھگ ہمیں فربہ اندام کمال رشید کی صورت نظر آئی۔ اسے دیکھ کر ہم سب مؤدب کھڑے ہوگئے۔ اس نے روکھے سوکھے لہجے میں ہمیں کچھ ہدایات دیں، جن کا ترجمہ حافظ احسان نے ہمیں کرکے سنایا۔ کمال رشید نے کہا تھا۔ ''تم لوگوں کے پاس آج کا سارا دن ہے۔ شہر میں گھوم پھر لو... اور کچھ خریداری کرنی ہے تو وہ بھی کرلو لیکن کسی اجنبی سے کسی طرح کی کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم رات کی وقت یہاں سے نکلیں گے۔''

کمال رشید نے شہر میں سیر کرنے کا کہا تھا لیکن سیر تو اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اطمینان اور خوشی ہو۔ ہم سب تو شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ پتا نہیں کہ آج رات کو کس طرح کے حالات پیش آنا تھے۔ ہم کو ٹرک کے ذریعے سفر کرنا تھا۔ اب خبر نہیں کہ یہ کس حد تک قانونی تھا۔ کمال رشید وغیرہ کا رویہ بھی زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ ابراہیم کو لے کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں لیکن یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے لیکن کیا ہونے والا ہے، اس کا اندازہ نہیں تھا۔

(جاری ہے)

www.pdfbooksfree.pk

SALMAN's CHOICE

رات کا مسافر

طاہر جاوید مغل

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جارہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا.... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کے مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظور نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا

زندہ ماجرا

تیسرا اور آخری حصہ

ہمیں کولانچ کے ذریعے سفر کرنا تھا اور یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ قانونی تھا یا غیر قانونی مگر ہم سب لوگ تین چار ٹولیوں میں نکل گئے۔ میں اور ابراہیم علیحدہ نکلے۔ ہم نے کچھ خشک راشن لیا جس میں بسکٹ، کھجوریں اور ملک پاؤڈر وغیرہ شامل تھے۔ میں نے خاص طور پر چند شاپرز لیے۔

''سائیں! ان کا کیا کرو گے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''یہ میرے اور تمہارے کام آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

''کس کام؟''

''بھئی یہ پلاسٹک کے شاپرز ہیں۔ ان میں رکھ کر ہم اپنی چیزوں کو واٹر پروف کرلیں گے۔ سمندر کا پانی بڑا ظالم ہوتا ہے۔''

''تو سائیں، تمہارا خیال ہے کہ ہمیں سمندر میں غوطہ



لگانا پڑے گا؟''

''کیا پتا ایسا ہی ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

غربت کے مارے ہوئے بصرہ شہر میں دو تین گھنٹے گھوم پھر کر ہم اپنے ڈیرے پر واپس پہنچ گئے۔ گروپ کے سارے لوگ ایک دوسرے کو اپنی شاپنگ دکھا رہے تھے۔ میرے پاس بڑے بڑے شاپرز دیکھ کر دیگر لوگوں کے ذہن میں بھی وہی سوال ابھرے جو ابراہیم نے مجھ سے کیے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی مغرب کی اذان ہوئی۔ باقر نے رات دس بجے کے قریب آنے کا کہا تھا۔ جوں جوں وقت نزدیک آرہا تھا ہماری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ہم سب نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور دیر تک نم آنکھوں کے ساتھ دعائیں مانگتے رہے۔ کئی ایک نے نمازِ حاجات بھی ادا کی۔ نماز کے بعد ہم نے اپنا اپنا سامان باندھ لیا۔ میں نے تین چار شاپرز ابراہیم کو بھی دیے۔ ایک شاپر میں، میں نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات رکھے اور اس کی کئی تہیں بنا کر اوپر سے باندھ دیا۔ ایک شاپر میں کھانے پینے کی اشیا اور ایک میں جوتے اور کپڑوں کا جوڑا رکھ لیا۔ ابراہیم نے بھی میری ہی طرح کیا..... میں نے پاسپورٹ والا لفافہ اپنی پنڈلی سے باندھا تھا۔ مکمل تیاری کے بعد ہم بڑی بے قراری سے روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کمال رشید اور باقر دونوں کوٹھی میں نہیں ہیں۔ اندیشے دل ودماغ کو گھیرنے لگے۔ نظریں بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہمیں باقر کی شکل نظر آئی اور ہمارے جسموں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ باقر کے ساتھ دو کمانڈو ٹائپ افراد تھے۔ باقر نے ہمیں اٹھنے اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

ہم کٹھ پتلیوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور اپنا اپنا سامان اٹھا کر اس کے ساتھ چل دیے۔ آفتاب گل سب سے آگے تھا۔ ہم ایک نیم تاریک گلی میں کھڑے ایک ٹرک تک پہنچے۔ اس کھٹارا ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ بھی نہیں تھی۔ مسافروں نے احتجاج کیا تو ایک عراقی نے گرج کر ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہم ٹرک کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔

دس پندرہ منٹ بعد ٹرک نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ٹوٹی پھوٹی نیم تاریک سڑکوں پر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم شہر سے دور بالکل تاریک راستے پر سفر کر رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹرک کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کی گئی تھیں۔ ہم سب پتھر کے مجسموں کی طرح بالکل گم صم بیٹھے تھے۔ حتیٰ کہ ہر وقت بولنے والا آفتاب گل بھی خاموش تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک ٹوٹی پھوٹی بدحال سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہمارا ٹرک ایک ویران ساحل پر پہنچ گیا۔ رات کے سناٹے میں لہروں کا مدھم شور سنائی دیتا تھا۔ ٹرک سے اتارا گیا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ٹرک کے اگلے کیبن میں سے دو لڑکیاں بھی نیچے اتریں۔ ان میں سے ایک وہی ادھورے لباس والی فرح تھی..... فی الوقت اس کا لباس کچھ مناسب ہی تھا۔ ہم سب اندھیرے میں چلتے ہوئے کچھ چٹانوں کی اوٹ میں پہنچ گئے۔ باقر نے کہا۔ ''سب چپ چاپ بیٹھ جائیں۔ کوئی کسی طرح کی لائٹ نہیں جلائے گا۔ کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرے گا۔''

ہم سب ڈرے سہمے چٹانوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ دونوں لڑکیاں بھی ایک طرف خاموش بیٹھی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کتنی دیر انتظار کرنا ہے اور آگے کیا پیش آنا ہے۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ باقر یا اس کے ساتھیوں سے کچھ پوچھ سکتے۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ دور کہیں سمندر کے سینے پر روشنیاں سی ٹمٹما رہی تھیں۔ غالباً یہ نامعلوم سمتوں میں سفر کرنے والے بحری جہاز تھے۔ ہمیں قریباً آدھ گھنٹا انتظار کرنا پڑا اور یہ انتظار، ناقابلِ بیان حد تک مشکل تھا۔ بالآخر لانچ کے انجن کی آواز آئی مگر روشنی پھر بھی دکھائی نہیں دی۔

''سب لوگ لانچ میں چلو۔'' باقر نے بڑے تحکم سے کہا۔

ہم سب روبوٹس کی طرح اٹھے اور بجلی کی سی تیزی سے لانچ میں جا بیٹھے۔ لانچ کافی بڑی تھی، بری بھلی نشستیں بھی موجود تھیں۔ کہیں سے ڈیزل کی بو آرہی تھی۔ دو مسلح محافظ لانچ میں موجود تھے۔ دونوں لڑکیاں لانچ کے چھوٹے سے کیبن میں چلی گئیں۔ ایک آواز تاریکی میں ابھری۔ ''سب آگئے؟''

میں چونک گیا۔ یہ امین کی آواز تھی۔ اس کے سوال کا جواب آفتاب گل نے دیا۔ ''ہاں سب آگئے۔''

لانچ روانہ ہوگئی۔ اس کی لائٹس اب بھی آف تھیں۔ سب خاموش اور خوفزدہ تھے۔ باقر اور اس کے ساتھی وہیں ساحل پر رہ گئے تھے۔ اب ہم نئے لوگوں کے حوالے تھے۔ بہرحال امین کی موجودگی سے مجھے کچھ تسلی ہو رہی تھی۔ امین کے ساتھ میری علیک سلیک ہوئی اور ہم لانچ کے پچھلے حصے میں کیبن کے پاس جا بیٹھے۔ ''تم کہاں تھے؟

اتنے دن نظر ہی نہیں آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس مصروفیت چل رہی تھی۔'' امین نے مختصر جواب دیا۔

''وہ تمہاری دوست کرسٹی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہوٹل میں ہی ہے۔'' امین نے پھر مختصر جواب دیا۔ وہ ٹینشن میں نظر آتا تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں، ان سے پتا چلا کہ ہمارا یہ سفر قریباً دو گھنٹے کا ہوگا۔ ایک محفوظ راستے سے کویت کے ساحل تک پہنچیں گے۔ کمال رشید بھی ساتھ تھا اور کیبن میں موجود تھا۔

لانچ درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس میں دو مسلح افراد موجود تھے اور وہ گاہے بگاہے ٹیلی اسکوپس کے ذریعے اردگرد کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ اب امین قدرے ''ریلیکسڈ'' نظر آنے لگا تھا۔ شاید ہم لوگ زیادہ خطرناک علاقے سے گزر گئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے فرح نظر آئی۔ وہ کیبن سے نکلی تھی اور ایک بار پھر مختصر لباس میں نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرے میں گلاس اور بیئر وغیرہ لے کر پھر کیبن میں چلی گئی۔

میں نے امین سے پوچھا۔ ''کمال رشید کے حمام میں اور لڑکیاں بھی ہیں لیکن یہ فرح ہمیشہ بیہودہ لباس میں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ اسپیشل سلوک کیوں ہو رہا ہے؟''

''بس، یہ اس کی اپنی بیوقوفی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''بندہ مجبور ہو اور اس میں اکڑ بھی ہو تو پھر وہ اسی طرح ذلیل ہوتا ہے۔ کمال رشید کی نوکری کرنا اس لڑکی کی مجبوری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اڑی (مزاحمت) بھی کرتی ہے۔ پچھلے مہینے کمال رشید کے کچھ مہمان انڈیا سے آئے تھے۔ اس نے ان کے سامنے تھوڑے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صرف حمام میں تھوڑے کپڑے (مختصر لباس) پہننے کی پابند ہے۔ کمال رشید اس پر چڑ گیا۔ اب دیکھو یہ نہ صرف حمام میں بلکہ اس کے علاوہ بھی یہی لباس پہننے پر مجبور ہے۔ باقی لڑکیوں نے اس سے نصیحت پکڑی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے امین سے پوچھا۔ ''اب یہ دو لڑکیاں کہاں جا رہی ہیں؟''

اس نے لوفر انداز میں آنکھ دبائی اور بولا۔ ''ذرا کویت میں ''مہمان نوازی'' کرنے کے لیے۔''

''مہمان نوازی؟''

''یہاں سب کچھ چلتا ہے ہارون بھائی! کویت کے کسی شیخ نے ایک دو ہفتوں کے لیے مانگا ہے ان دو لڑکیوں کو۔ مال شال اکٹھا کر کے واپس آجائیں گی۔ اس میں زیادہ حصہ کمال رشید کا ہوگا۔ تھوڑا بہت ان کو بھی ملے گا۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ بااختیار لوگ اور دولت کے پجاری، عورت کو کس کس طرح رسوا کرتے ہیں۔ یہ رسوائی ہر دور میں اور ہر خطے میں ہوتی رہی ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ جب تک عورت اپنا مقام نہیں پہچانے گی اور اپنی اصل طاقت و توانائی کا ادراک نہیں کرے گی، وہ ایسے ہی کچلی جاتی رہے گی۔ کبھی مذہب اور رسم و رواج کے نام پر۔ کبھی رشتوں ناتوں کے جال پھینک کر اور کبھی صرف اس کی جسمانی کمزوری کو جواز بنا کر اسے پامال کیا جاتا رہے گا۔

میں امین کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ کمال رشید جیسے شخص کے ساتھ نہ چلے..... اور اس گورکھ دھندے سے دور ہو جائے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مانے گا نہیں۔ وہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لانچ کے عملے میں بے چینی سی نظر آئی۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے اور بار بار ٹیلی اسکوپس کے ذریعے کچھ دیکھنے لگے تھے۔ امین بھی اٹھ کر مسلح گارڈز کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ لانچ کو ایک جگہ تاریکی میں روک دیا گیا اور انجن بند کر دیا گیا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا کمال رشید بھی کیبن میں سے نکل آیا۔ وہ واضح طور پر نشے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے واکی ٹاکی نکالا اور عربی میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔ ہم پچیس مسافر بالکل بچوں کی طرح ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ پتا نہیں یہاں کیا ہونے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لانچ پھر چل پڑی۔ اس مرتبہ اس کی

مشورہ

ایک سیاح ہوٹل میں گیا تو بیرے نے آکر آرڈر لیا۔ سیاح نے فرائی مچھلی منگوائی۔

بیرا مچھلی لے آیا اور پوچھا۔ ''اور کچھ؟''

سیاح نے کہا۔ ''ہمدردی کے دو بول۔''

بیرا اپنا منہ سیاح کے کان کے پاس کر کے بولا۔ ''مچھلی نہ کھانا دو دن کی باسی ہے۔''

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

اسپیڈ تیز تھی۔ امین ابھی تک مسلح گارڈز کے پاس ہی موجود تھا۔ اچانک ایک گارڈ نے زور زور سے چلانا شروع کردیا۔ کمال رشید پھر کیبن سے باہر نکل آیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے ہارون سائیں!'' ابراہیم نے پریشانی کے عالم میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''کچھ گڑبڑ ہی لگ رہی ہے۔''

ہمیں دو روشنیاں بڑی تیزی سے اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ کچھ ہی دیر میں یہ روشنیاں قریب پہنچ گئیں۔ یہ ایک بڑے سائز کی اسپیڈ بوٹ تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ سرکاری بوٹ ہے۔ سامنے ہی ڈیک پر دو باوردی افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں..... بوٹ میں سے کسی نے میگافون کے ذریعے لانچ چلانے والے کو لانچ روکنے کا حکم دیا۔ لانچ کی رفتار آہستہ ہوئی اور سرکاری بوٹ اس کے سامنے آکر رک گئی۔ ہماری حالت بہت بری تھی۔ گلے خشک ہو چکے تھے۔ ہم ڈری ڈری نظروں سے کمال رشید اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی پریشانی کی انتہا کو چھو رہے تھے۔

ہماری لانچ سرچ لائٹس کی روشنی میں نہا گئی۔ ساحلی محافظوں کا انچارج ڈیک پر آیا اور اس نے کرخت لہجے میں کچھ پوچھا۔ اس کی بات کا جواب کمال رشید نے دیا۔ دونوں میں سات آٹھ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ باوردی محافظوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کرلیں۔ کمال رشید کے دو مسلح گارڈز کیبن کے عقب میں تھے اور نظر نہیں آرہے تھے۔ اچانک باوردی انچارج کا لہجہ مزید تلخ ہوگیا۔ وہ بوٹ کو چلا کر آگے لے آیا۔ غالباً وہ لوگ لانچ پر اترنا چاہتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ نشے میں دھت کمال نے وہ غلطی کی جو شاید اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تیزی سے نیچے جھکا اور اس نے ایک ترپال کے نیچے رکھی ہوئی گن اٹھالی۔ یہ جی تھری ٹائپ کی گن تھی۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ باوردی انچارج پر فائر کیا..... لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ نشانہ خطا ہونے کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ اس ''وجہ'' کا نام فرح تھا۔ وہ کمال کے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بے دریغ کمال رشید کی طرف بڑھی اور اس کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ رائفل کا رخ بدلنے سے فائر خالی گیا۔

فرح رائفل سے چمٹ گئی تھی۔ کمال رشید نے رائفل کو زوردار جھٹکے دیے۔ پھر اپنی ٹانگ کی ضرب سے فرح کو دور پھینک دیا۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے فرح کو نشانہ بنانا چاہا لیکن تب میں نے جی دار پٹھان آفتاب گل کو دیکھا۔ وہ فرح کو بچانے کے لیے کمال رشید پر جھپٹ پڑا۔ ''نہیں استاد نہیں۔'' وہ پکارا۔

کمال رشید نے گولی چلا دی جو سیدھی آفتاب گل کی ران میں لگی۔ سرکاری کشتی میں موجود گارڈز شاید گولی چلاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ لانچ میں موجود مسافروں کو نقصان پہنچے گا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کمال رشید بے دریغ فائرنگ کر رہا ہے تو انہوں نے بھی گولی چلا دی۔ ان کی رائفلوں نے دھماکے سے شعلے اگلے۔ میں نے کمال رشید کو پہلو کے بل گرتے دیکھا۔ جی تھری ٹائپ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

کمال کو گرتے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے کیبن کے پیچھے سے سرکاری کشتی پر فائرنگ شروع کردی۔ ''لیٹ جاؤ..... فرش پر لیٹ جاؤ۔'' میں نے پکار کر ساتھیوں سے کہا۔

ہم سب اوندھے منہ لانچ کے فرش سے چپک گئے۔ یہی وقت تھا جب میں نے امین کو زخمی ہو کر پانی میں گرتے دیکھا۔ گولی شاید اس کے پیٹ میں کہیں لگی تھی۔ اکثر مسافر بلند آواز سے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی آوازیں دھماکوں کے شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔

یکا یک لانچ کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ لانچ ڈرائیور نے پوری رفتار سے لانچ بھگا دی تھی۔ جونہی لانچ بھاگی، کسی نے لانچ کے اندر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ یہ فرح تھی۔ میں نے سرچ لائٹ میں اس کے سرخ لباس کی جھلک صاف دیکھی۔ وہ مختصر لباس جو اس کے جسم کو چھپاتا کم اور دکھاتا زیادہ تھا۔

سرکاری بوٹ نے بھی اسٹارٹ لیا اور تیزی سے لانچ کے پیچھے آئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ سرکاری بوٹ سے بھی دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائی ہیں۔ انہوں نے لائف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ وہ یقیناً فرح کو پانی سے نکالنا چاہتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ زخمی امین بھی ان کے ہاتھ لگ جاتا۔

اب لانچ انتہائی رفتار سے نامعلوم سمت میں اڑی جا رہی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اچھل کر ہوا میں تیرنے لگی ہے۔ سرکاری بوٹ بھی پوری اسپیڈ سے پیچھے آرہی تھی۔ سرکاری بوٹ سے اب فائر نہیں ہو رہا تھا۔ وجہ یقیناً یہی تھی کہ وہ لوگ عام مسافروں کو نشانہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ مجھ سے چند فٹ کی دوری پر آفتاب گل لہولہان پڑا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ گولی اس کی ران میں نہیں بلکہ

ناف میں لگی ہے اور اس کی حالت اچھی نہیں۔ لانچ کو لگنے والے جھٹکوں کے سبب آفتاب کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکل جاتی تھیں۔ میں رینگتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس کا پیٹ اور دونوں ہاتھ خون میں لت پت تھے۔ ''یہ کیا ہوگیا آفتاب بھائی۔'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ ہمت کر کے بولا۔ ''تم سب تو ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں ہم ٹھیک ہیں لیکن.....''

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کسی نے مجھے دھکا دے کر آفتاب گل سے دور ہٹا دیا۔ یہ لانچ کے مسلح گارڈز میں سے ایک تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یہ مدراسی تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتا تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''پیچھے ہٹو، اس کتے کو گولی مار کر سمندر میں پھینکنا ہے۔''

اس نے رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنی چاہی تو میں نے ہمت کر کے اس کی رائفل پکڑ لی۔ ''نہیں، اس کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے صرف ایک لڑکی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔''

''ایک لڑکی نہیں..... ایک غدار لڑکی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کتیا کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسی حرامزادی نے مخبری کی ہے۔'' مدراسی دہاڑا۔ اس نے ایک بار پھر رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنا چاہی۔ اسی دوران میں ابراہیم اور جندل خاں وغیرہ بھی سامنے آگئے۔ ہمیں دیکھ کر دوسروں کو بھی ہمت ہوئی اور وہ گارڈز کی منتیں کرنے لگے کہ آفتاب گل پر گولی نہ چلائی جائے۔ پتا نہیں کہ یہ منت سماجت کا اثر تھا یا پھر گارڈز کو صورت حال کی سنگینی نظر آرہی تھی۔ وہ آفتاب گل کو نظر انداز کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ وہ بار بار ٹیلی اسکوپس کی مدد سے عقب میں دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ سرکاری بوٹ کی روشنی اب کچھ فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ سرکاری بوٹ، لانچ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اصل بات کیا تھی، اس کا پتا پانچ دس منٹ بعد لگا۔

لانچ لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آفتاب گل کی ناف سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ اس کے قریب لانچ کے فرش پر خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ میں نے ایک پرانا کپڑا آفتاب گل کے زخم پر رکھا اور اس کی کمر کے گرد کس کے پٹی باندھ دی۔ ''یارا پیاس لگ رہی ہے ام کو۔'' آفتاب گل نے کہا۔

جندل خاں جلدی سے کپ میں پانی لے کر آیا۔ جب میں اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا، لانچ نے ایک بار پھر تیزی سے موڑ کاٹا۔ پانی نیچے بہہ گیا اور میں آفتاب کے اوپر گرتے گرتے بچا۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ لانچ تیز رفتاری سے دوسری طرف مڑی۔ یہ موڑ پہلے موڑ سے بھی زیادہ کاٹ دار تھا۔ لانچ کی ایک سمت بہت اوپر اٹھ گئی۔ ایسا ہونے سے کوئی وزنی شے لڑھکتی ہوئی ہمارے قریب پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو یہ تنومند کمال رشید کی لاش تھی..... جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک گولی سیدھی کمال رشید کے منہ پر لگی تھی۔ دو گولیوں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا تھا۔ وہ مر چکا تھا مگر اس کے جسم سے اب بھی شراب کی بو اٹھ رہی تھی۔ کچھ ہی منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ گرج دار آواز میں باتیں کر رہا تھا اور کھا پی رہا تھا۔ کیبن کے اندر دو لڑکیاں اس کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں مگر اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہیں تھا۔ بس یہی ہے انسان کی حقیقت۔ شاید اسی لیے زندگی کو پانی کے بلبلے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

پھر ہم نے ایک اور عبرت ناک منظر دیکھا۔ مدراسی گارڈ آگے آیا۔ اب رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے لانچ کا جنگلا تھام رکھا تھا۔ وہ ابراہیم اور جندل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پکڑو اس کو۔ سمندر میں ڈالنا ہے۔'' اس کا اشارہ کمال کی لاش کی طرف تھا۔

اس نے ابراہیم اور جندل کے ساتھ مل کر بڑی..... بے پروائی سے لاش کو لانچ سے باہر پھینک دیا۔ چھپاکا سا ہوا۔ لاش ایک سیکنڈ کے لیے خلیج فارس کے جھاگ اڑاتے پانی پر نظر آئی پھر اوجھل ہوگئی۔ بیکراں سمندر میں گہری تاریکیوں نے اسے ڈھانپ لیا۔ ایک گھنٹا پہلے تک بھی اس شخص نے کہاں سوچا ہوگا کہ اس کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس نے ایک عورت کو ذلیل کیا اور اپنے اس عمل میں آخری حد تک چلا گیا۔ اس نے اسے مردوں کی نگاہوں کے سامنے ایک مستقل تماشا بنایا..... اور بھول گیا کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور یہ بھی بھول گیا کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق کبھی کبھی ایک کمزور سا جانور بھی جان بچانے کے لیے درندے پر حملہ کر دیتا ہے۔ شاید کچھ دیر پہلے مدراسی گارڈ نے ٹھیک ہی کہا تھا، آج اس لانچ اور لانچ کے مسافروں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے پیچھے فرح کا ہاتھ تھا۔ ''طمانچے کھانے والی'' نے آج ایک جوابی طمانچہ مارا تھا اور یہ کمال کے لیے موت کا طمانچہ ثابت ہوا تھا۔

لانچ اڑی جا رہی تھی اور ہم پچیس افراد سکتے کی سی حالت میں تھے۔ لانچ نے ایک بار پھر موڑ کاٹا اور ہم پھسلتے

ہوئے کیبن کی دیوار سے لگ گئے۔

''یہ کھلے پانی میں اس طرح موڑ کیوں کاٹ رہے ہیں۔'' ابراہیم نے مجھ سے پوچھا۔

بھارتی مسلمان ذکی احمد نے کہا۔ ''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔'' یہ ذکی احمد وہی تھا جو اپنی تین بچیوں کی شادیاں کرنے کے لیے پردیس کاٹنا چاہتا تھا۔

''کیا اندازہ ہو رہا ہے؟'' جندل خاں نے پوچھا۔

ذکی احمد لرزاں آواز میں بولا۔ ''یہاں سمندر زیادہ گہرا نہیں ہے اور نیچے چٹانیں وغیرہ ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ لوگ اس چور راستے کے بہت زیادہ بھیدی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس والوں کی بوٹ پیچھے رہ گئی ہے۔''

ذکی احمد کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن لانچ والے کو پتا تھا کہ اس نے کس طرف جانا ہے۔

یہ سب کچھ بہت خطرناک بھی تھا۔ اندھیرے میں اندازے کی تھوڑی سی غلطی تیز رفتار لانچ کو کسی پتھر سے ٹکرا کر تباہ کر سکتی تھی۔ یعنی پیچھے شیر اور آگے کنواں والی صورتِ حال تھی۔ میرا منہ بالکل خشک ہو رہا تھا۔ دل کی رفتار دُگنی تو ضرور ہو گئی ہو گی۔ یقیناً دوسروں کی حالت بھی یہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص جنگلے کو تھامے باقاعدہ رو رہا تھا اور بلند آواز سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ سرکاری کشتی کی روشنیاں اب نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن لانچ کی رفتار بدستور تیز تھی۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر مزید جاری رہنا تھا۔ ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ گارڈز سے کچھ پوچھ سکتا۔

قریباً آدھ گھنٹے کے نہایت خطرناک اور تیز رفتار سفر کے بعد ہمیں ایک ویران ساحل نظر آیا۔ لانچ والوں نے ساحل سے تقریباً ڈیڑھ سو میٹر دور ہی لانچ کھلے پانی میں روک دی۔ مدراسی گارڈ نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

''چلو بھئی۔ نیچے اترو سب..... جلدی کرو۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

گارڈ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہی ہے تمہاری ماں کویت..... اب چمٹ جاؤ اس سے اور دودھ پیو اس کا۔ چلو، جلدی اترو۔''

ہم نے ڈری ہوئی نظروں سے لہریں لیتے پانی کو دیکھا۔ ہم میں سے کئی ایسے تھے جو تیرنا نہیں جانتے تھے اور ان میں، میں بھی شامل تھا۔ میں نے ہمت کر کے مدراسی گارڈ سے کہا۔ ''یہاں پانی گہرا ہے۔ ہم میں سے کئی ڈوب جائیں گے۔ لانچ کو تھوڑا آگے لے جاؤ۔''

''بکواس بند کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' سیاہ فام مدراسی گرجا۔

''یہاں کتنا پانی ہو گا؟'' ذکی احمد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جتنا بھی ہے لیکن اترو۔ آگے جائیں گے تو یہ تمہاری بہن (لانچ) پھنس جائے گی ریت میں۔ جلدی اترو۔''

دونوں گارڈز نے اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لے لیں۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ کم از کم ان کے لیے تو قیامت ہی تھی جو تیرنا نہیں جانتے تھے۔ پانی میں ہلکے درجے کی طغیانی تھی اور لانچ ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہر ہچکولے پر آفتاب گل تکلیف سے کراہ اٹھتا تھا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور افق کی طرف ہلکی سی سفیدی نظر آنے لگی تھی۔

مسافروں نے اترنے سے انکار کیا تو گارڈز نے انہیں بے دریغ رائفلوں کے دستوں سے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے اور شوٹ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ مسافروں نے خوفزدہ ہو کر پانی میں چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ کچھ کو گارڈز نے خود دھکے دے دیے۔ وہ جلد از جلد لانچ خالی کر کے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتے تھے۔ ہم خالی ہاتھ تھے، کسی طرح کی مزاحمت بے سود تھی۔ وہ لوگ اتنے مشتعل تھے کہ کسی بھی لمحے گولی چلا سکتے تھے۔ میں نے ابراہیم کو پانی میں چھلانگ لگاتے دیکھا، پھر آفتاب گل کو دیکھا۔ وہ خود کو بہ مشکل گھسیٹ کر لانچ کے کونے تک پہنچا اور پانی میں لڑھک گیا۔ ایک رائفل میری طرف بھی سیدھی ہو چکی تھی۔ میں نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میرے کانوں میں دہشت زدہ آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان میں ''اللہ اکبر'' کے نعرے بھی شامل تھے۔ یہ وہ نعرے تھے جو پانی میں کودنے والے خوفزدہ لوگ لگا رہے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک فائر کی آواز بھی سنائی دی۔ مجھے شک گزرا کہ یہ فائر آفتاب گل پر کیا گیا ہے۔ بہرحال اس وقت کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں تیرنا نہیں جانتا تھا اور گہرے پانی میں کود چکا تھا۔ مجھے اپنے بالکل قریب ہی جندل خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اگر اس نے مجھے پکارا تھا تو غلطی کی تھی۔ مجھے تو خود مدد کی ضرورت تھی۔ پانی میں گرنے کے بعد ایک دفعہ تو

میں ڈوبتا چلا گیا پھر پانی نے مجھے اچھالا۔ میں نے لمبا سانس لیا۔ دوسرا سانس لینے کی کوشش کی تو سمندر کا نمکین پانی میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوگیا۔ مجھے لگا کہ سانس رک گیا ہے اور آخری وقت آگیا ہے۔ کیا یہ سمندر میری قبر بن جائے گا؟ کیا میں اب کبھی اپنے پیاروں کی شکلیں نہ دیکھ سکوں گا؟

جان بچانے کی فطری خواہش کے تحت میں نے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلانے شروع کیے۔ پیچھے سے ایک زوردار لہر آئی۔ میں اس لہر میں ڈوبتا ابھرتا غوطے کھاتا جانے کس طرح ساحل پر پہنچ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میں مسلسل الٹیاں کر رہا تھا۔ ساحل پر میں نے کئی مسافروں کو بڑی بری حالت میں دیکھا۔ ایک دو نیم بے ہوش پڑے تھے۔ جو تیر سکتے تھے، وہ قدرے بہتر حالت میں تھے۔

خود کو سنبھالنے کے بعد میں نے سب سے پہلے ابراہیم اور آفتاب گل کو تلاش کیا۔ ابراہیم تو میرے قریب ہی موجود تھا۔ آفتاب گل پندرہ بیس میٹر دور ریت پر چت پڑا تھا۔ چار پانچ مسافر اس کے گرد جمع تھے۔ مجھے فوراً اس فائر کا خیال آیا جو آخری وقت لانچ پر سے کیا گیا تھا۔ ''تو کیا آفتاب گل مر چکا ہے؟'' یہ سوال درد کی ایک ٹیس کی طرح دماغ میں ابھرا۔ میں اور ابراہیم لپکتے ہوئے آفتاب گل کے پاس پہنچے..... وہ زندہ تھا لیکن اس کے سینے پر دائیں جانب گولی کا ایک اور زخم نظر آرہا تھا..... تو یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا کہ سفاک گارڈز نے آخری فائر آفتاب گل پر ہی کیا تھا۔ انہوں نے آفتاب کی اس غلطی کو معاف نہیں کیا تھا کہ اس نے تصادم کے وقت فرح کی جان بچانے کی کوشش کی۔

لانچ کا اب دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ہمارے سامنے سمندر کی جھاگ اڑاتی لہریں تھیں اور ہمارے پیچھے ایک ویران ریتیلا ساحل تھا جس پر کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود آفتاب ابھی تک ہوش میں تھا اور سر ہلا کر ہمارے سوالوں کے جواب بھی دے رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ جندل خاں کے سامان میں ایک ٹارچ بھی تھی..... ''جندل خاں! کہاں ہو؟'' میں نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ ''جندل کہاں ہے؟'' میں نے ساتھیوں سے پوچھا۔ سب ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک وزیرستانی پٹھان آگے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''ہمارا خیال ہے کہ جندل خاں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں قریباً چلّا اٹھا۔

ہم سب نے بے تابی سے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ جندل کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

اتنے میں ذکی احمد نے ایک اور شخص کا نام لیا اور کہا کہ وہ بھی نظر نہیں آرہا۔ ہم نے افراتفری میں اپنی گنتی کی۔ پچیس میں سے چار افراد گنتی میں نہیں تھے اور ان میں جندل خاں بھی شامل تھا۔ ایک ہلکی سی امید اب بھی موجود تھی کہ شاید ان چار میں سے کچھ افراد ڈر کر ادھر ادھر بھاگ گئے ہوں۔

اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم ادھر ادھر پھیل گئے اور تلاش کرنے لگے لیکن کہیں کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اچانک مجھے کنارے کے بالکل پاس کوئی چیز ہچکولے کھاتی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ جندل خاں کی گٹھڑی تھی۔ ابراہیم گھٹنے گھٹنے پانی میں اترا اور یہ گٹھڑی نکال لایا۔ میں نے گٹھڑی کھولی۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ یہ جندل خاں کی چیزیں تھیں۔ اس کا رختِ سفر تھا۔ کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک چادر، مونگ پھلی، گڑ، نسوار کی ڈبیا، شیشہ، کنگھی۔ پلاسٹک کے ایک تہ کیے ہوئے لفافے میں دو تین تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں جندل خاں اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوسری تصویر میں یقیناً اس کے بچے اور بیوی تھی۔ بیوی سرتاپا چادر میں تھی، بس اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ ایک پھول سی بچی جندل خاں نے گود میں اٹھا رکھی تھی۔ تین لڑکے پاس پاس کھڑے تھے۔ ان کی عمریں تین اور آٹھ سال کے درمیان ہوں گی۔

کتنی محبت سے اس نے سنبھالی ہوئی تھیں یہ تصویریں۔ اب یہ تصویریں تو تھیں لیکن وہ خود نہیں تھا۔ اپنے بچوں کے لیے حق حلال کی روزی تلاش کرتے کرتے وہ خلیج فارس کے پانیوں میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کی آخری آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا..... ہاں وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنی پھول سی بچی کے لیے اور ان سب کے لیے جو اس سے پیار کرتے تھے اور اس کی راہ دیکھتے تھے۔

ہم سب حواس باختہ تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ ہم فوراً یہ جگہ چھوڑ دیں اور صحرا میں کچھ آگے چلے جائیں۔ کنارے پر کسی بھی وقت کوئی ہمیں دیکھ سکتا تھا اور ہم مزید مصیبت میں

گرفتار ہو سکتے تھے۔ آفتاب گل کے شدید زخمی ہونے کے بعد میری حیثیت ایک بار پھر گروپ لیڈر کی سی ہوگئی۔ مشورے کے بعد ہم نے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ حالت کسی کی بھی اچھی نہیں تھی۔ کئی مسافر ابھی تک قے کر رہے تھے۔ زیادہ تر کا کھانے پینے کا سامان لانچ کے اندر ہی رہ گیا تھا یا پھر چھلانگیں لگاتے ہوئے پانی میں گر گیا تھا۔ جو بچا کر لائے تھے، وہ بھی بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ جن مسافروں کے پاس سفری کاغذ..... پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے، وہ سب کے سب بھیگ کر بے کار ہو گئے تھے۔ میرے عین سامنے ایک جہلمی نوجوان سر پکڑ کر بیٹھا رو رہا تھا۔ اس کے پاسپورٹ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ پورے گروپ میں شاید صرف میں اور ابراہیم تھے جن کے سفری کاغذ محفوظ رہے تھے اور ایسا ان شاپرز کی وجہ سے ہوا تھا جو میں نے بازار سے خریدے تھے۔ ابراہیم کا باقی سارا سامان بھی پانی میں بہہ گیا تھا۔ وہ بس ایک چھوٹی سی تھیلی بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ریگزین کی بنی ہوئی اس براؤن تھیلی میں کیا ہے۔

سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے زخمی آفتاب گل کو اپنی کمر پر لادا۔ پیچھے سے ابراہیم نے سہارا دیا اور ہم درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔ چلتے چلتے میں دو لمحے کے لیے رک گیا۔ میں نے مڑ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ شاید دل میں ابھی یہ امید تھی کہ وہاں جندل خاں نظر آئے گا اور پکار کر کہے گا۔ ''ٹھہرو ہارون! ام آرہا ہے۔''

لیکن جندل کہیں نہیں تھا۔ سمندر کی لہروں پر، صحرا کی ریت اور کھجوروں کے نیچے کہیں اس کا نشان نہیں تھا۔ وہ تین دیگر افراد سمیت ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔

میں تھک گیا تو ابراہیم نے آفتاب کو اپنی پشت پر اٹھا لیا۔ ساحل سے قریباً دو کلومیٹر آگے ہم خشک درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچ گئے۔ عارضی طور پر خود کو چھپانے کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔ یہ کھجور کے آٹھ دس درخت تھے اور یہاں تھوڑا بہت سایہ بھی موجود تھا۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس ملک کی حد میں ہیں۔ ہر جگہ ریت ایک جیسی ہوتی ہے اور کھجوریں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہوا چلتی ہے اور آسمان کا رنگ بھی ایک سا دکھائی دیتا ہے..... ہاں لانچ والوں نے کہا تھا کہ یہ کویت ہے۔

آفتاب گل کی حالت بری تھی۔ پہلی گولی تو اس کی ناف میں شاید اپینڈیکس کے آس پاس کہیں لگی تھی۔ دوسری گولی سینے میں دائیں طرف لگی تھی اور شانہ چیر کر عقب سے نکل گئی تھی۔ دونوں زخم مسلسل خون اگل رہے تھے۔ ذکی احمد کے سامان میں سے مرہم پٹی کی کچھ اشیا نکل آئیں۔ ہم نے کوشش کر کے آفتاب گل کے زخموں سے خون کا اخراج بند کر دیا۔ بہرحال ناف والی گولی، اس کے جسم کے اندر ہی تھی اور یہی زیادہ خطرناک زخم تھا۔

کھانے پینے کی بہت معمولی سی چیزیں ہمارے پاس تھیں۔ خاص طور سے پانی تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آتا گیا، پیاس کی شدت بڑھتی گئی۔ گلے میں کانٹے سے پڑ گئے۔ اگلے دو ڈھائی گھنٹوں میں ہمارا گروپ مکمل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دونوں حصوں کی اپنی اپنی رائے تھی۔ ذکی احمد مجھے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ہارون! زیادہ ساتھیوں کا خیال یہی ہے کہ ہم آفتاب گل کو اپنے ساتھ لیے لیے نہیں پھر سکتے، بہتر ہے کہ اس کے پاس کچھ خوراک اور پانی وغیرہ چھوڑ دیا جائے اور اسے اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی اس کی مدد کے لیے آجائے۔''

''نہیں ذکی صاحب! کم از کم میرا ضمیر تو یہ گوارا نہیں کرتا۔'' میں نے صاف جواب دیا۔

ابراہیم نے بھی فوراً میری تائید کی۔

مصطفیٰ نامی جہلمی نوجوان بولا۔ ''ہم لکڑیوں سے ایک اسٹریچر سا بنا سکتے ہیں اور خان صاحب کو اس پر لٹا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

اس معاملے پر کچھ دیر چپکے چپکے بحث ہوئی، پھر کچھ اور لوگ بھی دوسرے گروپ کے ہمنوا بن گئے۔ آخر میں صرف میں، ابراہیم، مصطفیٰ اور ذکی احمد رہ گئے۔ ذکی احمد زیادہ عمر کا تھا اور کمزور بھی تھا۔ میں نے کہا۔ ''ذکی صاحب! آپ کی حمایت کا بہت شکریہ۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ خود کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ آپ ان لوگوں کے ساتھ چلے جائیں۔ ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔''

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد ہم نے ذکی احمد کو جانے پر آمادہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ علیحدہ ہونے والا گروپ بھی دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک ٹولی شمال کی طرف جانا چاہ رہی تھی، دوسری شمال مشرق کی طرف۔

یہ سب کچھ بس اندازے سے ہی ہو رہا تھا۔ رخصت کے

وقت ذکی احمد کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''خدا حافظ!'' اس نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

''خدا حافظ!'' ہم نے بھی جواب دیا۔ وہ لوگ دو ٹولیوں کی شکل میں ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ میری نگاہیں دیر تک ذکی احمد پر جمی رہیں۔ اس کا خاکی کرتہ پاجامہ دور سے بھی نظر آرہا تھا۔ اپنے جھکے ہوئے کندھوں پر تین جوان بیٹیوں کے مستقبل کا بوجھ اٹھائے وہ چلتا چلا جارہا تھا۔ پھر وہ اپنی ٹولی سمیت ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ زندگی کی ریل گاڑیاں ایسے ہی پٹریاں بدلتی ہیں اور مسافروں کی راہیں اور منزلیں تبدیل ہوتی ہیں۔

☆☆☆

درختوں کے اس جھنڈ میں آج ہمیں دوسرا روز تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا اور سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا۔ جو تھوڑا بہت خشک راشن ہمارے پاس تھا، وہ اب دو دن سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ پانی بھی بہت احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو مشکل سے ڈھائی تین دن گزر سکتے تھے۔ آفتاب گل کا ناف کا زخم خراب ہونا شروع ہوگیا تھا۔ وہ جگہ سرخ تھی اور اسے بخار بھی تھا۔ وہ بڑے صبر کا مظاہرہ کررہا تھا لیکن جب پیاس شدت پکڑ جاتی تو وہ مجبور نظروں سے ہماری طرف دیکھتا۔ ہم پانی کے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیتے۔ مصطفیٰ صبح سویرے کا نکلا ہوا تھا، میں نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ اردگرد کسی بستی یا گھر کا کھوج لگائے اور یہ پتا کرنے کی کوشش بھی کرے کہ کیا واقعی ہم کویتی علاقے میں ہیں؟

سہ پہر کے پانچ بجے تک گرمی اور پیاس کی وجہ سے ہمارا دم جیسے آنکھوں میں آگیا۔ آفتاب گل نے مجھے اشارے سے قریب بلایا اور بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ہارون! امارے لیے اپنا جان خطرے میں نہ ڈالو۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ اگر تم.....''

میں نے آفتاب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں آفتاب بھائی! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

ابراہیم بولا۔ ''سائیں! مجھ کو لگتا ہے کہ مصطفیٰ واپس آرہا ہے۔'' واقعی دور ایک مدھم ہیولا نظر آرہا تھا لیکن یہ کوئی بدّو بھی ہوسکتا تھا۔ بہرحال تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ پتلون شرٹ والا مصطفیٰ ہی ہے۔ ہم پُرامید نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تھکا ہارا اور ہانپتا کانپتا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس کا رنگ سیاہ ہورہا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر ہمارے اندازے کی تصدیق کی۔ ''نہیں جی..... اس طرف تو دور تک کسی بندے یا بستی کا نام ونشان نہیں۔ پانی بھی کہیں نظر نہیں آیا۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اسے ایک گھونٹ پانی دیا۔ وہ ہونٹوں کو تر کرکے بولا۔ ''اور مجھے تو لگتا ہے کہ..... شاید..... ہم کویتی علاقے میں بھی نہیں ہیں۔''

''کیسے لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کافی آگے ریت میں ایک پرانا بورڈ دبا ہوا نظر آیا ہے۔ اس کے لفظ مٹ چکے ہیں مگر دو چار پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ان میں بصرہ اور نصیریہ کا لفظ بھی پڑھا جاتا ہے۔ آگے شاید تیر کا نشان ہے۔''

مایوسی اور بے بسی کی ایک اور لہر سینے میں دوڑ گئی۔ تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ لانچ والوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ہمیں پھر عراقی علاقے میں اتار دیا..... یا پھر ہم ہی غلط سمت میں چل کر اس طرف آگئے؟ بہرحال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

پہاڑ جیسا دن گزرنے میں نہیں آرہا تھا۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی اور گرمی کی جگہ ہلکی ہلکی خنکی نے لے لی۔ ریت جتنی جلدی گرم ہوتی ہے، دھوپ کے بغیر اتنی ہی جلدی ٹھنڈی بھی ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیاس کی شدت بھی قدرے کم محسوس ہونے لگی۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مشرق کی طرف سے چاند کا سنہری گولا سمندر کے اندر سے نمودار ہوا اور دھیرے دھیرے افق پر بلند ہونے لگا۔ ہم نے چند کھجوریں کھائیں۔ دو دو بسکٹ لیے اور ایک ایک گھونٹ پانی پی کر آفتاب گل کے دائیں بائیں لیٹ گئے۔ میں آج سارا دن لکڑی کا ایک اسٹریچر تیار کرتا رہا تھا۔ اس کے لیے میں نے کھجور کی تین چار مضبوط شاخیں استعمال کی تھیں۔ اس کے علاوہ بدنصیب جندل خاں کی گٹھری سے برآمد ہونے والی ایک بڑی چادر بھی کام آئی تھی۔

ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوئی تو ہم پیاس اور تھکن کے ماروں کو نیند آنے لگی..... بہت دیر تک تکلیف میں کراہنے کے بعد اب آفتاب گل پر بھی غنودگی طاری ہورہی تھی۔ وہ سویا تو ابراہیم اور مصطفیٰ بھی سوگئے۔ میں جاگتا رہا اور عرب کے آسمان کے تارے گنتا رہا۔ دو دن پہلے کے خونی واقعات ایک ایک کرکے نگاہوں کے سامنے آئے۔ امین کا زخمی ہوکر پانی میں گرنا۔ کمال رشید کا گولیوں سے چھلنی ہونا

اور پھر گارڈز کی خوفناک دھمکیوں کے بعد ہمارا سمندر میں چھلانگیں لگانا۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل میں یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ہم زندہ سلامت اس ویرانے سے نکل نہیں سکیں گے۔ اسی صحرا میں چلتے چلتے ہم کہیں یکے بعد دیگرے گریں گے اور ہمارے اوپر ریت کی قبریں بن جائیں گی۔ ہمارے پیچھے بے رحم سمندر تھا اور آگے قاتل ریت تھی جس کا کوئی کنارہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات کے پونے نو بجے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق پاکستان میں یہی کوئی دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا۔ میرے گھر والے کھانا کھا چکے ہوں گے اور اب سونے سے پہلے شاید ٹی وی وغیرہ دیکھ رہے ہوں۔ امی بھیگی آنکھوں کے ساتھ نوافل پڑھ رہی ہوں گی۔ اسلم بھائی جان.... بے چینی سے گھر کے سامنے گراؤنڈ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ انہوں نے میری تلاش میں لوگوں کو دور دور دوڑا رکھا ہوگا۔ ابا جان وظائف میں مصروف ہوں گے۔ میری دلہن میرے ننھے بھتیجے ذوالفقار سے کھیل رہی ہوگی۔ اس کی شرارتوں میں اپنا دکھ بھلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوگی۔ مجھے اپنی دو چھوٹی بہنیں، جنہیں میں نے کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی، بری طرح یاد آئیں۔ میں نے تصور کی نظر سے دیکھا۔ میری چھوٹی بہن، ابا جان کے کہنے پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھائے میرے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ بڑوں کی طرح اس کا چہرہ بھی کملایا ہوا تھا۔ ''اللہ میاں میرے بھائی جان کو واپس لے آ۔ ہمیں پھر ان کی شکل دکھا دے۔'' پھر میری آنکھوں کے سامنے میرے دوستوں کی شکلیں آئیں۔ لاہور میں مزنگ چونگی کی رونقیں، ملتان روڈ کی گہما گہمی لکشمی چوک کی روشنیاں۔ ٹھنڈے مشروبات گردش کر رہے تھے، پکوان کھائے جا رہے تھے، خوشی سے بھرپور قہقہے گونج رہے تھے۔

کچھ اسی طرح کا ''احساس'' پیدا ہوا جو اعتبار ساجد کی یہ مشہور نظم دل میں جگاتی ہے

اے اس شہر کے پیارے لوگو!
تم نے کب یہ سوچا ہوگا
دور کہیں ایک صحرا ہوگا
جس میں سبز رُتوں کا شاعر
جنم جنم کا پیاسا ہوگا
کیسے ہر شب کٹتی ہوگی؟
کیسے ہر دن ڈھلتا ہوگا.....؟

آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ دوبارہ بیدار ہوا تو چاند نصف نہار پر چمک رہا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آفتاب گل نیند میں کراہ رہا تھا۔ مصطفیٰ بھی سویا ہوا تھا لیکن ابراہیم اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ آفتاب کو دیکھنے کے بعد میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاندنی میں دور تک نظر آ رہا تھا مگر ابراہیم کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید پیشاب وغیرہ کے لیے گیا ہے۔ اس کی ریگزین کی براؤن پوٹلی اس کے بچھونے کے نیچے سرہانے کی طرف پڑی تھی۔ وہ اپنے سارے سامان میں سے بس اس پوٹلی نما تھیلی کو ہی بچا سکا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس نے یہ تھیلی کیوں بچائی ہے۔ اس میں اس کا سب سے قیمتی سامان تھا۔ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی۔ اس میں مہرو کی نشانیاں تھیں۔ میں نے یونہی سرد ریت پر بیٹھ کر اس تھیلی کی زپ کھولی۔ اس میں کئی چیزیں تھیں، مجھے بس چند ہی یاد رہیں۔ ان یاد رہنے والی چیزوں کا تعلق مہرو سے ہی تھا۔ شاپر میں لپٹی ہوئی اس کی ایک پرانی جوتی۔ ایک پڑیا میں رکھے ہوئے اس کے چند بال، اس کی قمیص کا سرخ بٹن اور سبز نیلے رنگ کی کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ کیسی انوکھی محبت تھی اس کی؟ کیسے جنونی جذبے تھے اس کے سینے میں؟ اور اب وہ کہاں تھا؟ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اسے آ جانا چاہیے تھا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا نکلا۔ وہ مجھے خشک کھجوروں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے پیچھے نظر آیا۔ اس نے ایک سوکھے تنے سے ٹیک لگا رکھی تھی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں چند لمحے تو ساکت کھڑا رہا، پھر آگے بڑھ کر کہا۔ ''کیا بات ہے ابراہیم؟ کیا ہوا؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا، اسے تسلی دینے لگا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے۔

اس نے کہا۔ ''ہارون سائیں! آج بری رات ہے۔ بہت بری رات ہے۔''

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔'' میں نے اس کا تربتر چہرہ اپنی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''شاید تم کو یاد نہیں رہا سائیں! آج بغداد میں مہرو کی منگنی ہے۔ وہ چمکدار جوڑا پہنے، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، سج کر بیٹھی ہوگی اور وہ حرام زادہ..... وہ زبیر..... وہ اس کی انگلی میں مندری

پہنائے گا، اپنے ہاتھوں سے مندری پہنائے گا۔''
اس کی آواز غم کی شدت سے ٹوٹ گئی۔
ابراہیم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے بھی یاد آ گیا۔ چاند کی چودھویں رات کو جعفر کے گھر زبیر اور مہرو کی منگنی ہونا تھی۔
میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! حوصلہ کرو۔ یہ منگنی ہی ہے، خدانخواستہ شادی تو نہیں ہے۔''
''لیکن سائیں..... وہ میری مہرو کے پاس بیٹھے گا۔ اس کو چھوئے گا۔ اس کو ہاتھ لگائے گا۔''
''ہاتھ لگائے گا؟ وہ کیوں؟''
''جب لڑکا مندری پہناتا ہے تو لڑکی کے ہاتھوں کو ہاتھ تو لگتے ہیں نا..... میں یہ برداشت نہیں کرسکتا..... سائیں بالکل نہیں کرسکتا۔ وہ کیوں اسے ہاتھ لگائے..... کیوں؟''
اس نے شدید بے چینی کے عالم میں اپنا سر کھجور کے تنے سے رگڑا۔ میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ کی کھال بری طرح چھلی ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جنون کے عالم میں کھجور کے تنے پر مکے رسید کرتا رہا ہے۔
وہ دردناک آواز میں بولا۔ ''میں بھی جندل خاں کی طرح سمندر میں ہی کیوں نہ رہ گیا۔ کیوں میری جان ان عذابوں سے چھوٹ نہ گئی۔''
میں نے اسے جھڑکا۔ ''مایوسی گناہ ہے۔ خدا سے اچھے دنوں کی امید رکھنی چاہیے۔ ابھی کوشش کرنے کے لیے تمہارے پاس کافی وقت ہے ابراہیم۔''
''کافی وقت تو ہم کہہ رہے ہیں نا سائیں..... مجھے تو..... یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں اس کے پا جعفر نے منگنی کو اس کے نکاح میں ہی نہ بدل دیا ہو۔ اس کے گھر والے مشورہ دے رہے تھے کہ جب اتنا خرچہ کرنا ہے تو پھر کیوں نہ ساتھ ہی نکاح بھی کر دیا جائے۔''
''یہ سب تمہارے وہم ہیں ابراہیم۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری لگن سچی ہے تو تمہیں کامیابی ضرور ملے گی۔ خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔''
''لیکن ابھی تک تو ہر طرف اندھیرا ہی ہے..... کوئی بھی وسیلہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ جو تھوڑی بہت پونجی تھی میرے پاس وہ بھی پانی میں رہ گئی۔ کویت جانے..... اور کمائیاں کرنے کی سوچ بھی بس سوچ ہی رہی۔ نہ ہم کویت جاسکے ہیں، نہ بغداد میں ہیں۔ پتا نہیں کہاں پڑے ہوئے ہیں، اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو پتا نہیں کیا حشر ہوگا۔''
''ہمارا دین کہتا ہے ابراہیم کہ مایوسی گناہ ہے۔ امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔''
''لیکن سائیں! دین یہ بھی تو کہتا ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ اپنی حیثیت کو دیکھے بغیر، جاگتی آنکھوں سے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ میں نے اپنے خط میں کیا کیا نہیں لکھ دیا تھا مہرو کو..... اب وہ سب کچھ شرمندگی کا پہاڑ بن گیا ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا سائیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے دن بدل جائیں گے۔ ہم کیا سے کیا ہو جائیں گے۔''
میں سمجھ گیا کہ وہ اس طویل خط کی بات کر رہا ہے جو آٹھ دن پہلے بغداد چھوڑنے سے پیشتر اس نے مہرو کو لکھا تھا۔ یقیناً اس خط میں اس نے مہرو کو یہی لکھا ہوگا کہ وہ کویت جا رہا ہے اور بہت جلد اسے کچھ بن کے دکھا دے گا۔ اب وہ ساری باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔
میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے دیر تک سمجھاتا رہا اور تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ تسلی تو میرے اپنے پاس بھی نہیں تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ واپس درختوں میں لے آیا۔
اگلے روز صبح منہ اندھیرے پروگرام کے مطابق ہم نے زخمی آفتاب کو لکڑی کے اسٹریچر پر ڈالا اور روانہ ہوگئے۔ اس سے پہلے کہ آگ برساتا سورج طلوع ہوتا اور اس ویرانے کو جہنم زار بنا دیتا، ہم آٹھ دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اس سفر کے دوران میں ابراہیم کی سخت جانی اور ہمت کا صحیح اندازہ ہوا..... اس نے بہت کم ریسٹ کیا اور میرے یا مصطفیٰ کے ساتھ مل کر مسلسل اسٹریچر کو اٹھائے رکھا۔ شاید یہ جسمانی مشقت اس کی ذہنی اذیت کو کم کرنے میں بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ہر پل کسی ذی نفس کا کھوج لگانے میں لگی ہوئی تھیں لیکن ذی نفس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہم بس اندازے سے چلتے جا رہے تھے اور اندازہ یہی تھا کہ ہم عراقی علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ مصطفیٰ کے سوا ہم تینوں کے پاس سفری کاغذات ٹھیک حالت میں موجود تھے۔ اگر کہیں کسی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی سے آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو زیادہ خطرے کی بات نہیں تھی۔
وہ بڑا ہی مشکل دن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میلوں تک کہیں سائے کا نام و نشان نہیں۔ پیاس سے دم آنکھوں میں آ چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید ہم یکے بعد دیگرے چکرا کر گر جائیں گے اور کبھی اٹھ نہ سکیں گے۔ دور اوپر چمکیلے آسمان پر اڑتے ہوئے گدھ ایک ایک کر کے نیچے اتریں گے اور اپنی لمبی چونچوں سے ہمارا گوشت نوچنا

شروع کردیں گے۔ سورج ڈھلا اور تمازت کچھ کم ہوئی تو ہم جیسے موت کے منہ میں سے واپس آنا شروع ہوگئے۔ صحرا کی شام زندگی کی نوید کی طرح لگی۔ مگر یہ عارضی نوید تھی۔ کل پھر یہی آگ برساتا سورج ہونا تھا اور یہی جان لیوا راستہ ہونا تھا۔

آفتاب گل بار بار بے ہوشی میں بڑبڑانے لگتا تھا۔

''ام کو چھوڑ دو۔ یہاں بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ تم جاؤ.....''

زخم کے زہر نے شاید اس کے اعصاب کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا..... وہ رات بھی جیسے تیسے کٹی۔ صبح ابراہیم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ ''کیا ہوا؟'' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''مصطفیٰ نہیں ہے۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''کہیں ادھر ادھر نکلا ہوگا۔''

''نہیں، میں نے دیکھ لیا ہے، کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ چلا گیا ہے شاید۔''

میں تیزی سے اشیائے خورونوش کی طرف لپکا..... یعنی بسکٹ اور پانی..... دونوں چیزیں موجود تھیں لیکن وہ اپنے حصے کا پانی لے گیا تھا اور بسکٹ بھی۔ بہرحال یہ بھی اس کی مہربانی تھی۔ اگر وہ سارا راشن لے جاتا تو بھی ہم کیا کرلیتے۔ غالباً اس سے اسٹریچر اٹھانے کی مشقت برداشت نہیں ہوئی تھی اور اس نے اکیلے سفر کرنا مناسب سمجھا تھا۔

ایک بار پھر منہ اندھیرے ہم نے آفتاب والا اسٹریچر اٹھایا اور چل پڑے۔ آفتاب پر تھوڑا سایہ رکھنے کے لیے ہم نے جندل خاں کے ایک بڑے رومال کو سائبان کی طرح استعمال کیا ہوا تھا۔

ایک جگہ دو نیم خشک درختوں کا تھوڑا سا سایہ نظر آیا۔ یہ جگہ مشکل سے آدھی چارپائی جتنی ہوگی، پھر بھی ایک نعمت کی طرح لگی۔ ہم نے یہاں رک کر ایک ایک گھونٹ پانی سے اپنے گلے تر کیے اور کچھ پانی نیم بے ہوش آفتاب کے منہ میں ٹپکایا۔

ابراہیم..... مصطفیٰ کے چلے جانے پر اظہارِ افسوس کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! ہر کام میں اللہ نے کوئی نہ کوئی بہتری بھی چھپا رکھی ہوتی ہے۔''

''مثلاً کیا سائیں؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ہم تینوں کے پاس پاسپورٹ وغیرہ موجود ہیں۔ مصطفیٰ کا پاسپورٹ پانی میں خراب ہوچکا ہے بلکہ ختم ہی ہوگیا ہے۔ پاسپورٹ پر دخول والا صفحہ ہی غائب ہے۔ وہ ہمارا ہمسفر رہتا تو اس کی وجہ سے ہم بھی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔'' ابراہیم سوچ میں پڑ گیا۔

یکا یک مجھے اپنی بائیں جانب ریت کے ٹیلے کے پیچھے حرکت نظر آئی۔ پہلے تین چار سر نمودار ہوئے پھر باقی دھڑ نظر آئے۔ پتا چلا کہ پانچ کے قریب افراد تیزی سے ہماری طرف لپک رہے ہیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ ردعمل کا موقع ہی نہیں تھا۔ ان افراد کے کپڑے سیاہی مائل تھے۔ اپنے حلیے سے یہ بدو لگتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے کہ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی۔

میں اور ابراہیم ہراس کے عالم میں کھڑے ہوگئے۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی یہ لوگ ناقابل فہم زبان میں چلانے لگے۔ ان کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔ ان کے اشاروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہمیں ہاتھ کھڑے کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ ہم نے ہاتھ کھڑے کردیے۔ انہوں نے ہمیں اوندھے منہ ریت پر لیٹنے کو کہا۔ ہم نے ذرا تذبذب دکھایا تو ایک دراز قد بدو نے چلا کر کچھ کہا اور رائفل بردار شخص نے رائفل کا دستہ بے رحمی سے ابراہیم کی گردن پر رسید کیا۔ ابراہیم کے چہرے پر تپش کے آثار نظر آئے لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں لیٹنے کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا ہوں تو وہ بھی بیٹھ گیا۔ ہم لیٹ گئے تو انہوں نے بڑے غصیلے انداز میں ہماری جامہ تلاشی لی اور جو کچھ ہاتھ لگا، وہ نکال لیا۔ میری کلائی میں ابھی تک شادی والی گھڑی موجود تھی اور ایک انگلی میں چھوٹی طلائی انگوٹھی بھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں بھی ان کے قبضے میں چلی گئیں پھر وہ لکڑی کے اسٹریچر پر پڑے آفتاب گل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی جیب سے بھی نقدی وغیرہ نکال لی۔

وہ عربی سے ملتی جلتی زبان ہی بول رہے تھے اور ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صحرائی لٹیرے ہیں، ان کی خودرو داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح تھیں۔ تین افراد کے چہرے پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں اور ان بوسیدہ پگڑیوں کے پلو سے انہوں نے اپنے چہرے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔ ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھ میں مجھے ایک خم دار چھری بھی نظر آئی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں ابراہیم کو سمجھا دیا کہ ہمیں مزاحمت کرکے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔

ہمارے مختصر سامان کو بھی الٹ پلٹ کیا گیا اور اس میں سے جو چیز ان کو اپنے کام کی لگی، وہ انہوں نے نکال

لی۔ اب وہ ہمیں، ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس جانے کے لیے تیار نظر آتے تھے لیکن اس موقع پر ان میں سے ایک شخص سے ایک ایسا کام ہوگیا جس نے سارا نقشہ ہی بدل دیا۔ جاتے جاتے اس شخص کی نظر ریگزین کی اس براؤن تھیلی پر پڑی جو پلاسٹک کے ایک شاپر میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے تھیلی اٹھائی تو ابراہیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

لٹیرا تھیلی اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا تو ابراہیم بھی بے ساختہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ ''رک جاؤ..... چھوڑ دو اسے..... چھوڑ دو'' وہ پکارا۔

اس کی پکار میں موجود تڑپ سے لگتا تھا جیسے یہ لٹیرا اس کی ساری عمر کی پونجی لے کر بھاگ رہا ہے۔

لٹیروں نے جب ابراہیم کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ رک گئے۔ رائفل بردار نے ابراہیم کو ڈرانے کے لیے اس کے پاؤں کے قریب فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ بہت سی ریت اچھلی لیکن اگر فائر کرنے والا یہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم ڈر کر رک جائے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ تھیلی کی طرف لپکتا چلا گیا۔

''ٹھہرو ابراہیم۔'' میں بھی پکارا۔

لیکن وہ ٹھہرنے والا نہیں تھا۔ یہ تھیلی اس کا عشق تھی اور عشق انمول ہوتا ہے۔ رائفل بردار نے دوسرا فائر سیدھا ابراہیم پر کیا۔ گولی ابراہیم کے کندھے کے اوپر سے گزری۔ وہ چلاتا ہوا تھیلی بردار پر جا پڑا۔ تب تک میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ابراہیم کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ ان لوگوں کی ساری توجہ ابراہیم کی طرف تھی جو تھیلی بردار سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اندھا دھند رائفل والے بدو پر جا پڑا۔ میں نے اس کی رائفل کا بیرل نیچے جھکا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر کی بھرپور ضرب اس کے چہرے پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا پشت کے بل گرا۔

دراز قد شخص نے مجھے رائفل بردار کے اوپر سے کھینچ لیا اور میرے ساتھ لپٹ گیا۔ ایسی لڑائی بھڑائی میں کالج کے زمانے میں خوب کر چکا تھا۔ میں نے اس شخص کی ناف میں گھٹنے کی زوردار چوٹ لگائی اور پھر اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ابراہیم بھی اپنے دو حریفوں سے پوری پوری ٹکر لے رہا ہے۔ دراز قد شخص جب میرے نیچے آیا تو اس نے اپنے لبادے کے اندر سے خم دار چھری نکال لی۔ مجھے اپنا سر پیچھے ہٹانے میں ایک لحظے کی تاخیر بھی ہوتی تو شاید میں یہ روداد آپ کو سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتا۔

چھری میری گردن کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے دراز قد شخص کے چہرے پر مکوں کی بارش کر دی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے ہم دونوں سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔

یکا یک اوپر تلے تین چار فائر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹیلے کے عقب سے ایک جیپ برآمد ہوئی تھی اور تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ فائرنگ بھی اسی پر سے کی گئی تھی۔ جس وقت میں جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا، دراز قد شخص نے میرے نیچے سے نکل کر دوڑ لگا دی اور صرف وہی نہیں باقی افراد بھی ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ریتلے ٹیلے کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ انہوں نے جو چیزیں ہم سے چھینی تھیں، ان میں سے دو چار ریت پر ہی پڑی رہ گئی تھیں۔ ریگزین کی براؤن تھیلی بھی ان میں شامل تھی۔ اس میں مہرو کی نشانیاں تھیں اور یہ ابراہیم کی متاعِ حیات تھی۔

اس نے جلدی سے تھیلی اٹھا کر اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی۔ جیپ میں چار افراد سوار تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر دو ہوائی فائر کیے اور ہمارے پاس آ کر رک گئے۔ لٹیروں کی طرح ان لوگوں نے بھی اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے تھے تاہم ان کے لباس کچھ بہتر تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لوگ کھلی چھت والی جیپ میں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اترے۔ تب ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ نوجوان حافظ احسان تھا۔ یہ لانچ کے بدقسمت مسافروں میں سے ایک تھا اور ساحل پر اترنے کے بعد اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ بھی جندل خاں وغیرہ سمیت سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ حافظ احسان مقامی طرز کے لباس میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ہم سے لپٹ گیا۔ اسی دوران میں جیپ کے عربی سوار بھی اپنے چہروں سے ڈھاٹے کھول چکے تھے۔ وہ اپنی صورتوں سے صحرائی باشندے ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک رعب دار شخص کی پیشانی پر نماز کا محراب بہت نمایاں تھا۔

حافظ احسان نے پہلے اس رعب دار شخص سے عربی میں بات کی۔ پھر ہمیں بتایا کہ اب ہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔ اس نے رعب دار شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ان کا

نام شیخ حارث ہے۔ یہاں ان کا ایک احاطہ ہے جس میں یہ بھیڑیں وغیرہ پالتے ہیں۔ بہت نیک آدمی ہیں۔ اگر یہ نہ ملتے تو شاید میں اسی ویرانے میں گھوم گھوم کر مر جاتا۔''

پھر حافظ احسان نے مجھے اور ابراہیم کو سرتاپا دیکھا اور پوچھا کہ ہمیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک تھے۔ صرف ابراہیم کے سر سے تھوڑا سا خون رس رہا تھا۔ حافظ احسان نے کہا۔ ''یہ وہی لوگ تھے جن کو ہم اپنی زبان میں راہزن کہتے ہیں۔ اپنے علاقے میں کسی بھولے بھٹکے مسافر کو دیکھ کر اسے لوٹنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ شیخ حارث ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ شام تک ان کا پتا چل جائے گا۔''

پھر حافظ احسان، زخمی آفتاب گل کی طرف متوجہ ہوگیا اور اس کی حالت پر تشویش کا اظہار کیا۔ وہ گاہے بگاہے اپنے میزبان شیخ حارث کے سوالوں کا جواب بھی دے رہا تھا۔

کھلی چھت والی یہ جیپ پرانی تھی لیکن کافی کشادہ تھی۔ کچھ دیر بعد ہم نے زخمی آفتاب کو احتیاط سے جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر لٹایا اور خود بھی سوار ہوگئے۔ اب ہم ایک نئی منزل کی طرف جا رہے تھے اور ایک طرح سے یہ ہماری غیبی مدد ہی تھی۔

☆☆☆

شیخ حارث کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ یہاں سات آٹھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ اردگرد چند درخت موجود تھے۔ ٹیلوں کے اردگرد صحرائی جھاڑ جھنکاڑ نظر آرہا تھا۔ احاطے میں بھیڑوں کے دو علیحدہ علیحدہ ریوڑ تھے۔ بھیڑوں کی مجموعی تعداد تین سو سے کم نہیں ہوگی۔ ایک بیڈفورڈ ٹرک بھی یہاں موجود تھا جو جانوروں کے لیے چارا وغیرہ لانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ شیخ یہاں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ شیخ حارث کے گھر میں جس سب سے اہم اور دلچسپ ہستی سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ شیخ حارث کے والد محترم تھے۔ حافظ احسان کے مطابق ان کی تصدیق شدہ عمر ایک سو دس برس تھی۔ ان کی کمر جھک کر کمان بن چکی تھی اور لمبی سفید ڈاڑھی گھٹنوں سے چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں اونٹنی کے دودھ کا صرف آدھا گلاس پیتے تھے اور یہی ان کی کل خوراک تھی۔ ان کے دن اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نوے سال کے بعد ان کی ''اندر کی آنکھیں'' کھل گئی تھیں اور اب وہ ماضی اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے ہیں۔ میں نے ان کو جائے نماز پر دوزانو بیٹھے دیکھا اور مجھے ان کے چہرے پر وہی نورانی جھلک نظر آئی جو صرف ''اللہ والوں'' کا نصیب ہوتی ہے۔

شیخ حارث کے ٹھکانے پر پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے آفتاب گل کی نازک حالت پر توجہ دی۔ شیخ کا ایک آدمی کہیں سے ایک ہنرمند جراح کو لے آیا۔ اس نے دستیاب اوزاروں کی مدد سے آفتاب گل کی ناف میں ایک کٹ لگایا اور کسی نہ کسی طرح گولی نکالنے میں کامیاب ہوا۔ تب اس نے زخم کو سی کر بینڈیج کردی اور کھانے کے لیے کچھ ایلوپیتھک دوائیں بھی دیں لیکن وہ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ جیسے ہی مریض کی حالت کچھ بہتر ہو اسے بصرہ یا پھر بغداد لے جایا جائے۔

شیخ حارث اور حافظ احسان سے ملنے کے بعد اس بات کی مکمل تصدیق ہوچکی تھی کہ ہم عراق میں ہی ہیں..... اور یہ بڑی تکلیف دہ سچائی تھی۔ رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی ہم اسی جگہ موجود تھے جہاں سے چلے تھے۔ پچھلے چند دنوں کی صعوبتوں نے جسم اور ذہن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا وزن دس پندرہ دنوں میں کم و بیش دس پاؤنڈ کم ہوگیا تھا۔ میری پتلون کی بیلٹ بہت ڈھیلی ہوگئی تھی۔ بال منتشر اور ڈاڑھی بڑھ چکی تھی۔ حافظ احسان بھی پہلے سے بہت کمزور نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر مجھے چوٹوں کے نشان بھی نظر آئے۔ اس نے بتایا کہ سمندر کے نمکین پانی میں غوطے کھاتے ہوئے وہ ساحل کے قریب پہنچا تو اس نے جندل خاں کو ڈوبتے دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ کنارے پر پہنچتے ہی حافظ احسان کے ذہن میں خوف جاگا کہ ابھی پولیس کی موٹر بوٹ..... لانچ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے گی اور وہ سب پکڑے جائیں گے۔ وہ اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے کہا۔ ''ہارون بھائی! میں نے قریباً دس کلومیٹر تک سخت گرمی میں سفر کیا اور پھر پیاس سے بدحال ہوگیا۔ میرے پاس پینے کے لیے ایک قطرہ نہیں تھا اور دور دور تک کوئی مددگار نظر نہیں آتا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے بارڈر پولیس کے کچھ لوگوں نے مجھے پکڑا اور اپنی چوکی پر لے گئے۔ انہوں نے وہاں اڑتالیس گھنٹے تک مجھے بری طرح مارا اور مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کس چکر میں یہاں گھوم رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی بار بار پوچھا کہ میں صدام حسین

کے بارے میں کس طرح کے خیالات رکھتا ہوں۔ وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ بھیگا ہوا پاسپورٹ میرے پاس تھا، اگر وہ بھی نہ ہوتا تو وہ میری اور بری حالت کر دیتے۔ تیسرے روز انہیں کسی وجہ سے اچانک اپنی چوکی سے جانا پڑا۔ گاڑی میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ انہوں نے برا بھلا کہنے کے بعد مجھے چھوڑ دیا۔ کچھ پانی بھی انہوں نے مجھے دے دیا تھا لیکن میں ایک بار پھر راستہ بھول گیا۔ اگر شیخ حارث رحمت کا فرشتہ بن کر نہ آتے تو پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔''

ہم نے حافظ احسان کی پوری روداد سنی۔ روداد ختم ہوئی تو شیخ کا ایک ملازم ہمارے لیے دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے لے آیا۔ ہم نے شیو وغیرہ بنائی اور ٹھنڈے پانی سے پُرلطف غسل کیا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو ہم نے شیخ حارث کی امامت میں باجماعت نماز ادا کی۔ شیخ کے عمر رسیدہ والد ایک وہیل چیئر پر نماز میں شریک تھے۔ شیخ حارث نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ابراہیم میرا رشتے دار ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ شیخ حارث نے کہا کہ میری اور ابراہیم کی شکل میں تھوڑی سی مشابہت پائی جاتی ہے۔

شیخ حارث کی مالی حالت بہت بری تھی، نہ بہت اچھی تھی۔ بہرحال انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اصل عرب ہونے کا ثبوت دیا۔ ہم مسلسل آفتاب کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے۔ اسے دوا ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ کسی وقت قے بھی کر دیتا تھا۔ اس کی طرف سے دل بہت پریشان تھا۔ ابراہیم مسلسل اس کے سرہانے موجود رہتا تھا، وہ اٹھتا تھا تو میں بیٹھ جاتا تھا۔

اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد میں نے شیخ حارث کے والد محترم سے ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ اتنی عمر میں بھی ان کی قوت سماعت زبردست تھی اور بینائی بھی زیادہ کم نہیں ہوئی تھی۔ میں ان کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ میرے پہلو میں حافظ احسان تھا۔ بزرگوار نے اپنی گھنی سفید بھوؤں کے نیچے سے مجھے بغور دیکھا۔ پھر اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا۔ میں صرف پانچ دس منٹ ان کے پاس بیٹھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن میری خوش نصیبی کہ ان کے ساتھ میری ملاقات طویل ہوتی چلی گئی۔ یہ وہی اپنایت تھی جو عام لوگ بھی مجھ سے محسوس کرنے لگتے تھے۔ بزرگوار نے مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے ان کا جواب دیا اور حافظ احسان نے میرے جوابات کا عربی میں ترجمہ کر کے ان تک پہنچایا۔ ان کی اپنایت دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔ میں نے انہیں اپنی داستانِ غم سنائی اور ان پراسرار حالات کا ذکر بھی کر دیا جو اب تک وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے تھے۔

عصر کی نماز کے بعد بھی ہماری نشست جاری رہی۔ میں نے پوچھا۔ ''بزرگوار! کیا واقعی ہمارے اردگرد ایک ایسی دنیا موجود ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ جنات، ردھیں، نوری اور ناری ہیولے؟''

میرا سوال احسان نے ان تک عربی میں پہنچایا، پھر ان کا جواب عربی میں لے کر اردو میں مجھے بتایا۔ بزرگوار نے کہا۔ ''بہت کچھ برحق ہے لیکن ابھی ہم اس کی اصل حقیقت نہیں جانتے۔ سائنس بے چاری کوشش کر رہی ہے لیکن ابھی وہ ان منزلوں سے بہت دور ہے، جب اس کائنات میں موجود ایک دوسری کائنات کے راز ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ ہم پر کھل سکیں، ہم خدا کی ان مخلوقات سے مل سکیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے آس پاس موجود رہتی ہیں۔''

میں نے بزرگوار کو اس ہیولے کے بارے میں بتایا جو مجھے وقتاً فوقتاً نظر آتا تھا اور وہ ناقابلِ فہم الفاظ جو میرے کانوں میں گونجا کرتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان بزرگوار نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی جو کچھ عرصہ پہلے روضے کے درویش صفت بزرگ عالی مقام نے کہی تھی۔ بزرگوار کی شکن شکن پیشانی پر کچھ مزید شکنیں ابھریں اور انہوں نے احسان کی وساطت سے کہا۔ ''بیٹا، مجھے لگتا ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد دین سے جو رغبت رکھتے تھے، وہ تمہاری رغبت سے بہت زیادہ تھی۔ ہوسکتا ہے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے، اس کا تعلق تمہارے دادا، پڑدادا..... یا پھر اس سے بھی اگلی کسی پیڑھی کے ساتھ ہو۔''

''کس قسم کا تعلق بزرگوار۔'' میں نے عاجز لہجے میں کہا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ ان کی کمر اتنی جھکی ہوئی تھی کہ ان کا سر گود میں نظر آتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ماضی میں جھانک لیتے ہیں۔ شاید وہ اب بھی یہی کوشش کر رہے تھے۔ کتنی ہی دیر بعد انہوں نے اپنا سر تھوڑا سا اٹھایا اور بولے۔ ''آگے کچھ نظر نہیں آرہا ایک اندھیرا سا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر ایک دیوار سی سامنے آجاتی ہے۔ بہرحال تم اس کی

تفصیل میں زیادہ نہ جاؤ۔ اللہ رب العزت کی طرف دھیان دو اور جتنا بھی ہو سکے گناہوں کی معافی مانگو۔''

''مم..... مجھے کوئی وظیفہ بتائیں یا حضرت..... جو میری مشکلوں کو آسان کرنے میں میری مدد کرے۔ میرے لیے واپسی کی کوئی امید پیدا ہو۔''

''اللہ کے ذکر اور نیک بندوں کی صحبت سے بڑھ کر کوئی وظیفہ نہیں.....'' انہوں نے کہا اور پھر ذرا توقف کر کے بولے۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا بیٹا۔ اس ہیولے کے نظر آنے کو معمولی چیز نہ سمجھنا۔ یہ ہر وقت تمہارے آس پاس موجود ہے اور کسی وقت تمہاری جان بھی لے سکتا ہے۔ خاص طور سے جب یہ رات کو نظر آئے گا تو زیادہ خطرناک ہوگا۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میرے اصرار پر بزرگوار نے مجھے ایک وظیفہ بھی بتایا اور کہا کہ میں عشا کے بعد کثرت سے اس کا ورد کروں..... اور یہ بھی کوشش کروں کہ اندھیرا پھیلنے کے بعد تنہا نہ رہوں۔

اگلے روز شام کے فوراً بعد آفتاب گل کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ جراح آیا تاہم اس نے بھی یہی کہا کہ سفر کرنے کے لیے مریض کی حالت کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ایک بڑے لیمپ کی روشنی میں ابراہیم اور میں مسلسل آفتاب کے سرہانے بیٹھے رہے اور وہ سب کچھ کرتے رہے جو ہمارے بس میں تھا۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی حالت میں آفتاب کسی وقت بڑبڑانے لگتا تھا اور مکہ معظمہ کی باتیں کرتا تھا۔ شاید اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی منزل یعنی خدا کے گھر پہنچ چکا ہے۔

کسی وقت اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ تھا لیکن اب یہ انگارہ راکھ بن چکا تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے جب آفتاب گل ذرا ہوش میں آیا۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں اس کا سفری بیگ اس کے پاس لے کر آؤں۔ میں بیگ اس کے پاس لے گیا۔ بیگ تقریباً خالی تھا۔ اس میں جو بھی کوئی قابلِ استعمال چیز تھی، وہ لٹیرے نکال کر لے گئے تھے۔ اس بیگ کا پیندا لکڑی کا تھا۔ آفتاب نے پیندے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس پیندے کو دھیان سے دیکھوں۔

میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس پیندے کی دو پرتیں ہیں اور ان کے درمیان بھی شاید کچھ ہے۔ آفتاب کے کہنے پر ہم نے چاقو کی مدد سے پیندے کو کھولا تو اس میں سونے کے کچھ زیورات نظر آئے۔ اس کے علاوہ چند بڑے کرنسی نوٹ بھی تھے۔ ہم حیران رہ گئے۔ اگر لٹیرے یہ بیگ ہی اٹھا کر لے جاتے تو یقیناً فائدے میں رہتے۔ یہ کوئی دس ہزار پاکستانی روپیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق زیورات کی مالیت بھی ایک لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ یاد رہے کہ یہ 1973ء کی بات ہے۔ اس وقت کا ایک لاکھ آج کی بہت بڑی رقم ہے۔

آفتاب نے میرا اور ابراہیم کا ہاتھ ایک ساتھ پکڑا اور بہت نحیف آواز میں بولا۔ ''تم دونوں نے ہمارا بہت خدمت کیا۔ ہمارے سگے بیٹے یا بھائی بھی ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ اپنی جان تک کا پروا نہ کیا تم دونوں نے..... اب ہمارا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اب ہمارے پاس جو کچھ ہے، یہ ہم تم دونوں کو دیتا ہے۔ یہ تم آدھا آدھا لے لینا اور بس کبھی کبھی پڑھ کر ہم کو بخش دیا کرنا۔''

''نہیں آفتاب بھائی۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری طبیعت ذرا بہتر ہوتی ہے تو ہم شیخ صاحب کے ٹرک میں بستر بچھا کر تمہیں بصرہ لے جائیں گے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا کہ اس نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہے، اب وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔

.....اور وہ واقعی واپس نہیں آیا۔ قریباً دو گھنٹے بعد وہ مر گیا۔ اس کی سانس کی الجھی ہوئی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ دلیر تھا۔ اپنی پیاری بیٹی کی خاطر اس نے دو قتل کیے پھر ایک دوسری بیٹی کو بچانے کے لیے کمال رشید کی گولی سے جان لیوا طور پر زخمی ہوگیا۔ وہ اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرنے کے لیے خانۂ خدا جانا چاہتا تھا لیکن اس کی معافی شاید راستے میں ہی قبول ہوگئی تھی۔

شیخ حارث نے آفتاب گل کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ شیخ کے والد اور ملازمین نے بھی شرکت کی۔ ہم نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان اسے احاطے سے تھوڑی دور کھجوروں کے ایک جھنڈ کے نیچے دفن کر دیا۔ یہاں پہلے سے چار پانچ پرانی قبریں موجود تھیں۔

ایک دو روز بہت اداسی رہی۔ آفتاب گل کا سامان میرے پاس ہی تھا۔ میں نے ابراہیم سے کہا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لے مگر وہ بولا۔ ''نہیں سائیں! ابھی اسے پاس ہی رکھو۔''

ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ آفتاب گل مالی طور پر اتنا مضبوط شخص ہوگا اور جاتے جاتے وہ اپنا اثاثہ اس طرح ہم دونوں کو دے جائے گا۔ جس طرح لانچ کے دیگر مسافر اسے

چھوڑ کر نکل گئے تھے اگر ہم بھی نکل جاتے تو یقیناً آفتاب بہت تکلیف جھیل کر دنیا سے رخصت ہوتا۔ اب کم از کم یہ تو ہوا تھا کہ اسے ہمدردی، محبت اور مسلسل توجہ ملی تھی۔ اس کا آخری وقت نسبتاً آسان گزرا تھا۔

تیسرے روز ہمیں اس سامان میں سے کچھ واپس مل گیا جو صحرائی لٹیرے ہم سے چھین کر لے گئے تھے۔ اس میں میری کچھ نقدی بھی شامل تھی، بہرحال زیادہ تر اشیا ان کے پاس ہی رہ گئی تھیں۔ ان میں میری شادی کی انگوٹھی بھی تھی جس کا مجھے بہت افسوس تھا۔ معلوم ہوا کہ ان لٹیروں میں سے دو پکڑے گئے تھے۔

رات کو میں دیر تک جندل خاں اور آفتاب گل کی چھوڑی ہوئی اشیا دیکھتا رہا۔ خاص طور سے جندل خاں کی اشیا مجھے بہت دکھی کر دیتی تھیں۔ اس کی کنگھی، شیشہ، نسوار کی ڈبیا، کپڑے اور وہ دو تصویریں۔ ایک تصویر میں وہ اپنی پھول سی بچی کو گود میں اٹھائے کھڑا تھا۔ باقی بچے اس کے دائیں بائیں تھے۔ نہ جانے وہ کہاں تھے؟ کس حال میں تھے؟ میرے کانوں میں ایک گیت کے بول گونجنے لگے۔

سات سمندر پار سے۔ گڑیوں کے بازار سے
چھوٹی سی گڑیا لانا
گڑیا چاہے نہ لانا۔ پپا جلدی آجانا

.....لیکن اب پپا کو کبھی واپس نہیں جانا تھا۔ وہ سات سمندر پار ہی نہیں کر سکا تھا۔ اب کچھ نگاہوں کو ہر شام اس کے خط کا انتظار کرنا تھا مگر اب خط کو نہیں آنا تھا۔ نہ خط لکھنے والے کو خود آنا تھا۔ آہستہ آہستہ آسیں ٹوٹ جانی تھیں، رو رو کر آنسو خشک ہو جانا تھے مگر زخمی دل تو کسی کے لیے دھڑکتے رہنے تھے، یہ جانے بغیر کہ ان کی خاطر پردیس کی خاک چھاننے والا خلیج فارس کے پانیوں میں گم ہو چکا ہے اور یہ کسی ایک جندل خاں کی کہانی تو نہیں تھی۔ پتا نہیں ایسے کتنے پردیسی اسی طرح اپنے بچوں کے ماتھے چوم کر انجانے دیسوں کی طرف جاتے ہیں اور ان کی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے موت کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان کا سراغ نہیں ملتا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، جو مر جاتے ہیں ان کے لیے آخر قرار آجاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ تڑپاتے رہتے ہیں۔

کیا میرے گھر والے بھی اسی طرح ہمیشہ میرے لیے تڑپتے رہیں گے؟ میری ماں ہر صبح دروازہ کھول کر کھڑی رہے گی، میری دلہن ہر شام میرا انتظار کرتی رہے گی، میرے لیے ہر بدلتے موسم میں آہیں بھری جائیں گی، ہر تہوار پر آنسو بہائے جائیں گے؟ کیا اب میرے گھر کے در و دیوار کبھی مجھے دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گے؟ دل سے ایک شدید ٹیس اٹھی۔ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر وہم اور خوف کے جال کو توڑ دوں گا۔ میں واپس جاؤں گا۔ جیسے بھی ہوا واپس جاؤں گا۔ مجھے جندل خاں نہیں بننا۔ مجھے اپنے گھر والوں کو ہمیشہ کا دکھ نہیں دینا۔ کل شیخ حارث نے بھی یہی بات کہی تھی۔ میری ساری روداد سننے کے بعد اس نے کہا تھا..... ہارون! تم نے اپنی دلہن کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ یہاں رہو گے تو کسی دن کسی جگہ تم بھی جندل اور آفتاب کی طرح کھو جاؤ گے۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنی واپسی کے بارے میں سوچو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بغداد میں ان کے ایک دو جاننے والے ہیں۔ وہ واپسی کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے اس مختصر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ صحرا کی خشک اور سنسان رات نے قرب و جوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بس احاطے کی طرف سے کسی وقت کسی جانور کے بولنے کی آواز آتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں میں نے آئینے کے اندر اپنا چہرہ دیکھا۔ رنگ سانولا ہو چکا تھا، رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ سر کے بال جھاڑ جھنکار کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ کیا یہ وہی ہارون انور تھا..... وہی دُلہا تھا جو اپریل کی اس پراسرار رات کو خوشیوں اور روشنیوں سے بھرے ہوئے اس گھر کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔

آئینے میں دیکھتے دیکھتے اچانک میں چونک گیا۔ میرے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر غور سے دیکھا اور سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ یہ وہی تھا..... یہ وہی تھا جس نے ہر موڑ پر مجھے اپنی خطرناک موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ میں بے ساختہ گھوما۔ اپنے عقب میں دیکھا۔ عقب خالی تھا۔ سفید مٹی کی دیوار تھی اور لکڑی کی ایک تپائی تھی جس پر اونٹ کی کھال کا نمدہ بچھا ہوا تھا۔ میں نے پھر آئینے میں دیکھا، وہ تپائی کے ساتھ کھڑا نظر آرہا تھا۔ میرے کانوں میں وہی لرزا دینے والی آواز گونجی۔ کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا..... اور ایسا نہیں ہوا۔

اس مرتبہ اس آواز میں قہر تھا اور ایک ناقابلِ بیان حرارت تھی۔ ان ساعتوں میں اچانک مجھے شیخ حارث کے والدِ محترم کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں میرے لیے اندیشے ہیں۔ خاص طور سے اس وقت جب میں تنہا ہوں اور اب اندھیرا تھا اور تنہائی بھی تھی۔ میں کمرے سے نکلنے کے لیے پلٹا لیکن مجھے لگا کہ

کسی نے مجھے پیچھے سے جکڑ لیا ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے جکڑ لیا تھا بلکہ میرے منہ کو بھی مضبوطی سے ڈھانپ لیا تھا۔ میں چلانا چاہتا تھا لیکن چلا نہیں سکتا تھا۔ بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ چکے تھے۔ میں نے اپنا منہ کھولنا چاہا۔ مدد کے لیے پکارنا چاہا مگر ناکام رہا۔ مجھے لگا کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہوگیا ہے۔ مجھے جکڑنے والی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سانس سینے میں گھٹنے لگی۔ پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ باڑے کی طرف بہت سی بھیڑیں زور زور سے بول رہی تھیں۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے لگا میرا آخری وقت آگیا ہے۔ میرے پاؤں کے ساتھ لیمپ ٹکرایا اور گر گیا۔ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

میں کچھ بھی بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کر رہا۔ نہ اس میں اپنے احساسات شامل کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ سب میرا وہم تھا، میرے اندر کا خوف تھا۔ نہ ہی یہ کہوں گا کہ وہ سفید پوش ہیولا واقعی اس کمرے میں موجود تھا اور مجھے عقب سے دبوچ چکا تھا۔ بس وہی کہہ رہا ہوں جو مجھ پر بیتا۔ مجھے نہیں پتا میں نے کس طرح دروازے کی کنڈی کھولی، کس طرح باہر نکلا اور کس طرح اس کمرے تک پہنچا جہاں ابراہیم اور حافظ احسان سو رہے تھے۔ میں نے اندھا دھند ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے منہ سے اب بھی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کوئی اب بھی میرے پیچھے تھا اور مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کی سانسوں کی سرسراہٹ اور مشک وکافور کی بو میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھے اتنے زور سے دبا رہا تھا کہ سانس کی آمدورفت ختم ہوگئی تھی۔

پھر میں تیورا کر گر پڑا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر گھلتی چلی گئی۔ میں نے جو آخری آواز سنی وہ دروازہ کھلنے کی تھی۔

دوبارہ جب ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ حافظ احسان میرے سرہانے کی طرف بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ابراہیم میرے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا سارا جسم آگ میں جل رہا ہے۔ ابراہیم نے ایک دو بار کپڑے سے میری ناک صاف کی تو مجھے پتا چلا کہ میری ناک سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا ہے۔ ابراہیم بولا۔ ''خطرے کی بات نہیں سائیں۔ یہ نکسیر کی طرح کا خون ہے۔''

قریباً دو گھنٹے بعد میری طبیعت کچھ سنبھلی تو ابراہیم نے مجھ سے سوال جواب شروع کیے۔ دوسروں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ میں سوتے میں ڈر گیا ہوں اور کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہوں لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں جاگتے میں ڈرا ہوں اور جس چیز سے ڈرا ہوں، وہ ابھی نہیں بہت پہلے سے میرے پیچھے ہے۔

میں کوئی کمزور آدمی نہیں ہوں لیکن میرے دل میں ڈر بیٹھ چکا تھا۔ مجھے اب اس کمرے سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ وہی آئینہ تھا، وہی تپائی، وہی سفید دیواریں۔ میں نے حافظ احسان سے کہا کہ میں اس کمرے میں رہنا نہیں چاہتا۔ اس نے جا کر شیخ سے بات کی۔ شیخ نے مجھے ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا۔ میں نے ابراہیم سے بھی کہہ دیا کہ وہ میرے پاس سے ادھر ادھر نہ ہو۔ میں مسلسل بخار میں پھنک رہا تھا۔

ابراہیم مجھے مسلسل باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید میرے دل میں کچھ وہم بیٹھ گئے ہیں۔ میں خود کو بھی یہی سمجھانے اور یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس سے پہلے بھی یہی کرتا رہا تھا۔ فجر کی نماز میں نے وہیں کمرے میں ابراہیم کے ساتھ پڑھی۔ ٹانگوں میں سکت نہیں تھی، اس لیے بیٹھ کر پڑھی۔ سلام پھیرا تو اپنے کندھے پر سے مشک اور کافور کی خوشبو آئی۔ دل ایک بار پھر لرزنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے ابراہیم سے کہا۔ ''ذرا میرا یہ کندھا سونگھو۔''

اس نے دایاں کندھا سونگھا پھر بایاں..... کہنے لگا۔ ''ہارون سائیں! آپ کی قمیص سے خوشبو آرہی ہے۔''

''کس چیز کی؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شاید..... مشک کی..... کافور کی۔''

میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کرلیں۔ سر کے اندر جیسے دھماکے سے ہونے لگے۔ ''یا الٰہی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔''

رات تک طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں پھر شیخ کے عمر رسیدہ والد محترم کے پاس چلا گیا اور ان کے سامنے اپنا سارا رونا رویا۔ انہوں نے ایک تعویذ میرے بازو سے باندھا اور پڑھنے کے لیے ایک دو مزید وظیفے بتائے۔ اس کے علاوہ ایک بار پھر ہدایت کی کہ میں کچھ عرصے کے لیے رات کے وقت اکیلا نہ رہوں۔ میرے کمرے میں کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے۔ میری ناک سے رسنے والا خون بند کرنے کے لیے مجھے انہوں نے ایک سونگھنے والی دوا بھی دی۔ یہ کوئی قدیم عراقی نسخہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اخراجِ خون بند کرنے والی یہ دوا ایران اور ہندوستان کے بادشاہ تک استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ واقعی تیر بہ ہدف تھی۔

مجھے اب پورا پورا یقین ہو چکا تھا کہ میں کبھی پاکستان واپس نہیں جاسکوں گا۔ جو کچھ دو دن پہلے میرے ساتھ ہوا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ مجھے بالکل یہی لگا تھا کہ میں

موت کے منہ میں سے واپس آیا ہوں۔ مشک اور کافور والی بات بھی بری طرح ذہن میں جم چکی تھی۔ اگر وہ سب کچھ خیال تھا تو یہ خوشبو کہاں سے آئی تھی؟ ایک بات یہ سوچی جاسکتی ہے کہ اس واقعے سے صرف ایک دن پہلے ہم آفتاب گل کو دفن کر کے آئے تھے..... اس کے کفن پر بھی خوشبو وغیرہ لگائی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی خوشبو ہو لیکن اگر یہ وہی خوشبو تھی تو پھر ایک دن پہلے کیوں نہ آئی؟ اور یہ میری پوری قمیص پر کس طرح پھیلی؟ اور ابراہیم، احسان وغیرہ نے بھی تو میت کو کندھا دیا تھا۔ ان کے لباس خوشبو سے کیسے محفوظ رہ گئے؟ اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ یہ وہ ''خوشبو'' ہی نہیں لگتی تھی۔

☆☆☆

قریباً پانچ روز بعد ہم نے اپنے مہربان میزبان اور ان کے والد گرامی کو خدا حافظ کہا اور ان کی ہی گاڑی پر بصرہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیپ ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ شیخ حارث نے وقتِ رخصت ہمیں بہت سا سامانِ خورونوش دیا۔ اس میں ان کی بھیڑوں کا مکھن، مقامی طور پر تیار کی گئی مٹھائی اور کھجوریں وغیرہ شامل تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمیں دو دو چادریں بھی دیں، جن میں سے ایک چادر ٹھنڈی اور دوسری گرم تھی۔ ہمارے کپڑے دھو کر صاف ستھرے کر دیے گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں گھر سے ایسے رخصت کیا جیسے کوئی اپنے قریبی عزیزوں کو کرتا ہے۔ وہ ہمیں کافی کچھ دے کر بھیج رہے تھے لیکن اس میں سے جو سب سے اہم چیز تھی وہ محترم بزرگوار کی دعائیں تھیں۔ وہی جھکی ہوئی کمر والا ایک سو دس سالہ عرب..... جس کی بوڑھی آنکھوں میں روحانی چمک تھی۔ بصرہ وہاں سے کم و بیش آٹھ میل دور تھا۔ ہماری جیپ گمنام صحرائی راستوں پر چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ آفتاب گل اور اس کی قبر بہت پیچھے رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی مٹی اسے پکارتی ہے۔ خیبر ایجنسی کے آزاد علاقے میں رہنے والے آفتاب کو کسی ویرانے کی مٹی نے پکارا تھا۔

ابراہیم اور میں خستہ حال جیپ کی درمیانی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ابراہیم کی آنکھیں حسبِ معمول سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ راتوں کو روتا رہتا ہے۔ اس کے رونے کی وجہ مجھ سے بڑھ کر اور کون جانتا تھا۔ وہ سرتاپا مہرو کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہچکولے کھاتی ہوئی جیپ میں وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ مسلسل ریگزین کی براؤن تھیلی پر رکھا ہوا تھا جو اس کی گود میں تھی۔ یہ تھیلی اس کے لیے ہر شے سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر اس تھیلی کو اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنا چاہا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں عقب سے حافظ احسان کی آواز آئی۔ ''وہ دیکھو ہارون بھائی! سمندر نظر آرہا ہے۔''

واقعی بائیں جانب ٹیلوں کے پیچھے گاہے بگاہے سمندر کی جھلک نظر آتی تھی۔ سمندر دیکھ کر دل مزید آزردہ ہوگیا۔ اپنا وہ سفر یاد آگیا جو بڑی آسوں امیدوں کے ساتھ شروع ہوکر آہوں اور سسکیوں پر ختم ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر جندل خاں بھی یاد آگیا۔ پانی کی خاموش لہروں پر جیسے پھر ایک گیت گونجنے لگا۔ سات سمندر پار سے..... گڑیوں کے بازار سے..... چھوٹی سی گڑیا لانا.....

مجھے یاد آیا۔ ڈوبتے ہوئے جندل خاں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب تھا، جہاں میں نے اور بہت کچھ سیکھا تھا کاش تیرنا بھی سیکھا ہوتا۔

ہم سیدھا بصرہ کے بس اڈے پر پہنچے۔ وہی بوسیدہ شہر تھا، وہی دھول اڑاتی سڑکیں۔ شیخ حارث کے آدمیوں نے ہمارے ٹکٹ خود لیے اور بڑے احترام کے ساتھ ہمیں بس میں سوار کرایا۔ بس جب تک روانہ نہیں ہوگئی وہ وہیں کھڑے رہے۔ بس حرکت میں آئی تو انہوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے اور آخر تک ہلاتے رہے۔

جو کچھ ہمارے ساتھ بیت چکا تھا، اس کے بعد روضے میں واپس جانے کی ہمت تو ہم میں نہیں تھی۔ بغداد پہنچ کر ہم ایک مسافر سرائے میں ٹھہر گئے۔ یہ جگہ عباسیہ کہلاتی تھی اور حضرت عبدالقادر کے روضے اور مسجد سے کافی دور تھی۔ میں بھرے پرے اور جانے پہچانے شہر بغداد میں آچکا تھا لیکن میرا خوف ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ خاص طور سے سورج غروب ہوتے ہی میری بے چینی میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ ایسے میں میری کوشش ہوتی تھی کہ ابراہیم یا حافظ احسان میں سے کوئی میرے ساتھ رہے۔ ان دنوں مجھے آئینے کے سامنے جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں جب بھی آئینے کے سامنے جاؤں گا، وہ سفید پوش میرے پیچھے آن کھڑا ہوگا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں کوئی بزدل یا کمزور شخص نہیں ہوں لیکن میرے اندر کی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ میں ہر وقت اپنے اردگرد ایک جان لیوا خطرہ محسوس کرتا تھا۔

بغداد پہنچنے کے تیسرے روز صبح سویرے ابراہیم مجھے بتائے بغیر کہیں نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مہرو کے بارے میں سن گن لینے گیا ہے۔ میں شام تک سخت..... بے قرار رہا۔ شام کو ابراہیم واپس آیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ مہرو کے بارے میں معلومات لے کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ نہ صرف مقررہ پروگرام کے مطابق مہرو کی منگنی ہوگئی ہے بلکہ شادی کا مہینا بھی طے ہوگیا ہے۔ اب نئے پروگرام کے مطابق اس کی شادی صرف پانچ ماہ بعد ہونا تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم مجھے بتائے بغیر کیوں گئے؟''

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ بولا۔ ''سائیں! مجھ سے رہا نہیں گیا۔''

میں نے غصے سے کہا۔ ''اگر جعفر کو پتا چل گیا تو وہ ہڈیاں توڑ کر تمہیں کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دے گا..... یا مار کر لاش غائب کرا دے گا تمہاری۔''

''تو مار ڈالے۔ ایسے جینے سے تو مرنا چنگا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ جعفر کے گھر کے سامنے ایک انڈین حجام کی دکان پر گیا تھا اور اس نے وہیں سے سن گن لی ہے۔ مجھے شدید خطرات کا احساس ہوا..... ابراہیم کسی بھی وقت بدترین صورتِ حال کا شکار ہوسکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا اور جلد سے جلد کرنا ہوگا۔

اس رات مسافر سرائے کی میلی سی چٹائی پر میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میرے پاؤں کی طرف احسان اور دائیں طرف ابراہیم سو رہے تھے۔ اب میرے دل کے اندر سے یہ پراسرار گواہی آنا شروع ہوگئی تھی کہ میں مستقبل قریب میں پاکستان نہیں جاسکوں گا۔ میں جب بھی واپس جانے کا سوچوں گا، میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا بلکہ اب تو ایسا ہوگیا تھا کہ پاکستان کا تصور ذہن میں آتے ہی میرا دم گھٹنے لگتا تھا اور مجھے اپنے اردگرد کافور کی بو پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے سوچا میں نے اس روپے کا کیا کرنا ہے جو آفتاب گل مجھے اور ابراہیم کو آدھا آدھا سونپ گیا ہے۔ اگر میں اپنا حصہ بھی ابراہیم کو دے دوں تو شاید اس کے حالات کچھ بدل جائیں۔ ایک اندازے کے مطابق نقد اور زیور کی شکل میں میرا حصہ تقریباً ساٹھ ہزار روپے تھا۔ ان دنوں یہ ایک بڑی رقم تھی۔

میں جاگ رہا تھا اور مجھے پتا تھا کہ دکھ کا مارا ابراہیم بھی جاگ رہا ہے۔ میں نے اس کا شانہ ہلایا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں ہم دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے اپنا سارا پروگرام بتایا۔ اس پروگرام کے مطابق میں اپنے حصے سے دستبردار ہورہا تھا۔ اس دستبرداری کے بعد ابراہیم قریباً ایک لاکھ دس پندرہ ہزار روپے کا اکلوتا مالک تھا۔ جن دنوں میں عطا صاحب کی ورکشاپ میں کام کررہا تھا، مجھے پتا چلا تھا کہ بازار میں موٹر سائیکل کے اسپیئر پارٹس اور مرمت وغیرہ کی ایک دکان کی شدید ضرورت ہے۔ ٹیکنیکل کام میں اپنے تجربے کی بنیاد پر میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ بازار میں ایک ایسی دکان ہو تو فوراً چل پڑے گی۔ عطا صاحب کی ورکشاپ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دکان پگڑی پر مل بھی رہی تھی۔ پگڑی ادا کرکے بھی ابراہیم کے پاس یقیناً اتنی رقم بچ جاتی کہ وہ دکان میں اسپیئر پارٹس رکھ لیتا..... اگر کسی طرح جعفر کو آمادہ کرلیا جاتا اور وہ ابراہیم کی سرپرستی اور کفالت پر آمادہ ہوجاتا تو یقیناً ابراہیم کی مالی حیثیت مہرو کے منگیتر زبیر سے کہیں بہتر ہوجاتی۔

ابراہیم نے پوری بات سنی، اس کے بعد اس نے وہی کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے کسی بھی صورت میرا حصہ لینے سے انکار کردیا۔ اسے آمادہ کرنے میں مجھے قریباً ایک گھنٹا لگا اور درجنوں دلائل دینا پڑے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اسے قرضِ حسنہ سمجھ لے اور جب وہ مالی طور پر مستحکم ہوجائے..... اور وہ ضرور ہوگا..... تو پھر مجھے رقم لوٹا دے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ابراہیم جاکر جعفر سے یہ ساری بات کس طرح کرے؟ اور کس طرح اسے بتائے کہ وہ اور مہرو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اگر مہرو کی شادی زبیر سے ہوگئی تو یہ ایک جھوٹی زندگی کا آغاز ہوگا۔ ایک ایسی زندگی جس کی بنیاد صرف مجبوری اور سمجھوتے پر ہوگی۔

اس بارے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان دیر تک گفتگو ہوئی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ ابراہیم، خود جاکر جعفر سے یہ بات نہیں کرسکے گا اور اگر کرے گا بھی تو شاید اسے قائل نہ کرسکے۔ میں نے کچھ دیر سوچا پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے ابراہیم..... جعفر سے میں بات کروں گا۔''

''لیکن..... اگر سائیں! اس نے آپ سے کوئی

بدتمیزی کی تو.....''

''نہیں ابراہیم! انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں کل روضے پر جاؤں..... اور وہاں سے چچا سیاف کو بھی ساتھ لے لوں۔ چچا سیاف کی موجودگی سے جعفر اور اس کی فیملی پر اثر پڑے گا۔''

اگلے روز ہم نے سب کچھ طے کرلیا۔ شام کے فوراً بعد میں چچا سیاف سے ملنے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے بازار سے خریدا ہوا عربی لباس پہن لیا تھا اور سر پر عربی رومال بھی رکھ لیا تھا۔ اس سے مجھے اپنی شناخت چھپانے میں کافی مدد ملی۔ عراق آنے کے بعد عربی لباس میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی پہنا تھا۔ بذریعہ بس میں عشا سے تھوڑی دیر پہلے روضے پر پہنچا۔ آنکھیں ایک بار پھر نم ہوگئیں..... سارے بھولے بسرے منظر نگاہوں کے سامنے آگئے۔ میں صحن میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں امید سی تھی کہ شاید کہیں حضرت عالی مقام کی نورانی صورت دکھائی دے جائے لیکن وہ کہیں نہیں تھے۔ میں چچا سیاف کے حجرے پر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ توقع کے مطابق چچا سیاف نے ہی دروازہ کھولا۔ ماتھے پر تیوری تھی۔

''کیا بات ہے؟'' چچا نے عربی میں پوچھا۔

پھر غور سے مجھے دیکھا اور حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''اوئے پپوتم؟'' آواز کانپ رہی تھی۔

بے چارگی سے میرے آنسو چھلک پڑے۔ میں چچا سیاف کے گلے لگ گیا اور سسکیوں سے رونے لگا۔

''تم..... کویت نہیں گئے؟'' چچا سیاف نے مجھے گلے سے لگائے لگائے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں چچا..... ہمارے ساتھ وہی کچھ ہوا، جس سے تم نے ڈرایا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے بس اپنی جانیں ہی بچا سکے ہیں۔''

میرے اندر آنے کے بعد چچا سیاف نے جلدی سے حجرے کا دروازہ بند کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور چچا سیاف چٹائی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور میں اپنی دکھ بھری روداد بیان کررہا تھا۔ میں نے چچا سیاف کو بتایا کہ کس طرح ایک لڑکی کی مخبری پر ساحلی محافظوں نے لانچ کا پیچھا کیا۔ کس طرح فائرنگ کے تبادلے میں کمال نامی شخص ہلاک اور امین شدید زخمی ہوا اور کس طرح لانچ والوں نے راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد ہمیں گہرے سمندر میں چھلانگیں لگانے پر مجبور کیا۔ ہم نے ان واقعات پر کافی دیر تک بات کی۔

اس روداد نے سیاف کو بھی غمزدہ کردیا۔ اس نے کہا کہ پہلے بھی اس طرح کے کچھ واقعات پیش آچکے ہیں لیکن ان کے پیچھے طاقتور ٹولہ ہے۔ انتظامیہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد یہ لوگ پھر سرگرم ہوجاتے ہیں۔ کافی دیر ہم اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ میں نے ابوسیاف کو بتایا کہ ابراہیم بھی میری طرح جان بچانے میں کامیاب رہا ہے اور ہم دونوں عباسیہ کے ایک مسافر سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ابراہیم کا ذکر شروع ہوا تو میں نے اس کی پوری کہانی چچا سیاف کو سنا ڈالی۔ اس کی غیر معمولی لگن اور اس کے غیر متزلزل عزم نے چچا سیاف کو بھی متاثر کیا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوا کہ ابراہیم نے اپنے سینے اور بازوؤں کو جگہ جگہ سے مہرو کے نام کی مہر سے داغ رکھا ہے اور وہ اس کی خاطر اپنی جان کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے سیاف کو جعفر کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا اور کہا کہ میں اس سے ابراہیم کے لیے مہرو کا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔

''میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' چچا سیاف نے اپنی عربی نما اردو میں پوچھا۔

''چچا! میں بات کرنے کے لیے تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

چچا سیاف تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جیسا کہ تم نے بتایا ہے چودہ تاریخ کو لڑکی کی منگنی ہوگئی ہے۔ یہاں منگنی کی رسم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لڑکی کے گھر والوں کے لیے اپنی بات سے پھرنا کافی مشکل ہوجائے گا۔''

''لیکن یہاں دو زندگیوں کا سوال ہے چچا! میں سمجھتا ہوں کہ یہاں خاموشی گناہ ہے۔''

ہمارے درمیان تین چار منٹ تبادلہ خیال ہوا، آخر میں چچا سیاف کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ طے ہوا کہ ہم دونوں کل شام کو جعفر سے ملنے اس کے گھر جائیں گے۔

وہ رات کافی بے قراری میں گزری۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ ابراہیم کافی تناؤ میں نظر آتا تھا۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد میں چچا سیاف کی طرف روانہ ہوگیا۔ روضے سے چچا سیاف کو لینے کے بعد نو بجے کے قریب ہم دجلہ کنارے جعفر کے گھر پر پہنچ گئے۔ مجھے پتا تھا کہ جعفر کہیں بھی ہو، آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک گھر واپس آجاتا ہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دستک کے جواب میں تیرہ چودہ سالہ ملازمہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور پھر ایک منٹ

بعد دراز قد جعفر ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ''تم یہاں؟ خیریت تو ہے؟'' اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

''جی ہاں۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔''

جعفر نے ایک نگاہ چچا ابوسیاف پر ڈالی اور کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے بیٹھک نما کمرے کا دروازہ کھلوایا۔ ہم عربی طرز کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ چچا سیاف نے عربی میں اپنا تعارف خود کرایا اور جعفر کو بتایا کہ وہ روضے شریف کے خاص خادموں میں سے ہیں۔

''جی، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' جعفر نے پوچھا۔

اب بولنے کی باری میری تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بات کا آغاز کیا۔ میں نے اسے ابراہیم کے بارے میں بتایا۔ جعفر ابراہیم کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ جب وہ مہرو کو یہاں لانے کے لیے پاکستان گیا تھا اور نواب شاہ پہنچا تھا تو ابراہیم سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے بڑے محتاط لفظوں میں جعفر کو بتایا کہ ابراہیم اور مہرو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ابراہیم صرف مہرو کی خاطر نواب شاہ سے ہزاروں میل کا سفر کرکے یہاں بغداد پہنچا ہے۔

جعفر ان لوگوں میں سے تھا جن کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ جان کر کہ ابراہیم یہاں بغداد میں موجود ہے، اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ بہرحال وہ بولا کچھ نہیں۔

اس نے میری پوری بات خاموشی سے سنی۔ بس ایک دو جگہ سوال کیا۔ آخر میں میں نے دل کڑا کرکے کہا۔ ''میں جانتا ہوں جعفر بھائی! منگنی کے بعد آپ کے لیے یہ سب بہت مشکل ہوچکا ہے، اس کے باوجود میں کہوں گا کہ آپ بڑے پن کا ثبوت دیں۔ میں آپ کو اپنی اور چچا سیاف کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ مہرو بہت خوش رہے گی۔ بہت خوشی والی زندگی گزارے گی۔''

جعفر نے عربی ملی اردو میں کہا۔ ''میں ابھی تک تمہاری بات پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ تم کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جعفر بھائی! ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی خوشی اور ان کی بھلائی کی خاطر..... آپ مہرو کے لیے ابراہیم کا رشتہ قبول کرلیں۔''

جعفر خاموش رہا۔ اس کی نظریں میز پر جمی ہوئی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے ملازمہ چائے کی پیالیاں اور کھجور کے بنے ہوئے بسکٹ رکھ گئی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جعفر اٹھا اور اس نے ٹہلنے والے انداز میں کمرے کے اندر چند قدم اٹھائے۔ اس کی زخمی ٹانگ میں ابھی ہلکا سا لنگ باقی تھا۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ نوعمر ملازمہ گھبرائی ہوئی اندر آئی۔ جعفر نے شکستہ اردو میں اس سے کہا۔ ''یہ چائے اور بسکٹ اٹھاؤ اور واپس لے جاؤ۔''

ملازمہ پہلے ٹھٹکی پھر آقا کے حکم کے مطابق ٹرے اٹھا کر واپس لے گئی۔ میں اور چچا سیاف دم بخود بیٹھے تھے۔ جعفر نے میری طرف انگلی اٹھائی اور سرد لہجے میں بولا۔ ''تمہارے ساتھ روضے کے معزز خادم ہیں، ورنہ میں آج یہ تمہاری پتلون ضرور گیلی کر دیتا..... چلے جاؤ یہاں سے..... فوراً چلے جاؤ۔'' آخری الفاظ اس نے گرج کر کہے تھے۔

لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ لگا کہ پورے جسم کا خون سر کو چڑھ رہا ہے۔ شاید میں کچھ کہتا یا جعفر کو پکارتا لیکن اسی دوران میں چچا سیاف نے مضبوطی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں، بس اب چپ رہو۔'' چچا نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آئے۔

بے عزتی کے شدید احساس سے میرے جسم کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا تھا۔ مجھے خود سے زیادہ چچا سیاف کی توہین تکلیف دے رہی تھی۔ بہرحال چچا سیاف مجھے اپنے ساتھ لیتے چلے گئے۔ گلی میں مڑتے ہوئے میں نے ایک نظر جعفر کے گھر پر ڈالی۔ مجھے ایک کھڑکی میں مہرو کا چہرہ نظر آیا۔ جونہی میں نے دیکھا، چہرہ اوجھل ہوگیا۔ چاندی کی نتھ بھی اوجھل ہوگئی۔ کھڑکی بند ہوگئی۔ میں نے چہرے کی بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن وہ جھلک یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ مہرو بے حد اداس اور غمزدہ ہے۔ اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ دیا ہو..... میرے لیے پریشانیاں نہ اٹھاؤ بابو سائیں..... اور اس (ابراہیم) سے بھی کہہ دو، مجھے بھول جائے۔ جو کچھ ہماری تقدیر میں نہیں ہے، وہ ہم کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔

چچا سیاف کو روضے میں چھوڑ کر میں مسافر سرائے واپس پہنچا تو ابراہیم بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آس کے دیے جل رہے تھے۔ وہ میرے چہرے سے نتیجے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بھی کوشش کی کہ اس کو کچھ پتا نہ چلے اور اپنی کوشش میں

میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔

''کیا بنا ہارون سائیں؟'' ابراہیم نے بڑی امید سے پوچھا۔

''بن جائے گا یار! ایسے کام آہستہ آہستہ ہی بنتے ہیں نا۔''

''جعفر نے کوئی سخت بات تو نہیں کی؟''

''نہیں بھئی! اچھے طریقے سے ملا ہے۔ پوری بات سن کر تھوڑا سا ''شاک'' تو اسے لگا..... لیکن..... سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے اس نے۔''

ابراہیم نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''ہارون سائیں! کہیں میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو؟''

''مجھے پتا ہوتا کہ تم اس طرح شک کرو گے تو ایک ٹیپ ریکارڈر ساتھ لے جاتا۔'' میں نے ذرا غصے سے کہا۔

وہ ایک دم میرے گھٹنے دبانے لگا۔ ''نہیں ہارون سائیں! آپ پر شک کیوں کروں گا۔ آپ تو میرے لیے وہ کر رہے ہیں، جس کا قرض میں ساری عمر نہیں اتار سکتا۔ آپ نہ ہوتے تو شاید میں اب تک کہیں مرکھپ گیا ہوتا۔'' اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی آ گئی۔

وہ مجھ سے تفصیل پوچھنے لگا کہ کیا باتیں ہوئیں؟ انہوں نے مجھے کیا کھلایا پلایا..... اور کس کس سے ملاقات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے مختصر جواب دیے اور سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ رہ رہ کر مہرو کا خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں آج ہونے والی گفتگو کی وجہ سے مہرو کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو جائے۔ جعفر کا رویہ دل و دماغ میں چنگاریاں سی بکھیر رہا تھا۔ اس نے مجھے سرخ جھنڈی دکھائی تھی اور واضح کر دیا تھا کہ میں اس سے آگے بڑھوں گا تو خطرناک زون شروع ہو جائے گا لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اگر کرخت بغدادی تھا تو میں بھی کڑک لاہوری تھا اور پھر میں جس طرح کے حالات سے گزر رہا تھا، مجھے جینے مرنے کی زیادہ پروا رہی بھی نہیں تھی۔ دن بہ دن ایک عجیب طرح کی بے حسی مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے جعفر کے گھر فون کیا۔ یہ فون نمبر مجھے عطا صاحب سے ملا تھا۔ کم عمر ملازمہ نے فون اٹھایا۔ وہ اردو جانتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہاری مالکن مہرو سے بات ہو سکتی ہے؟''

اس سے پہلے کہ ملازمہ کوئی جواب دیتی، فون پر جعفر کی گرج دار آواز ابھری۔ اس نے عربی میں پوچھا۔ ''من انتا؟'' (کون ہے)

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''جعفر بھائی! میں ہارون بول رہا ہوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر جعفر پھنکارا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ میرے گھر میں فون کرو۔''

میں نے کہا۔ ''جعفر بھائی! میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے یہ بات ہم دونوں کے لیے بہت فائدہ مند ہوگی اور یہ آخری بات ہوگی۔ میرا وعدہ ہے اس کے بعد میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جعفر نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ بات فون پر مناسب نہیں ہوگی جعفر بھائی! آپ کسی بھی جگہ کا بتا دیں، میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔''

وہ پھر تھوڑی دیر خاموش رہا۔ شاید ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''کب آنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جب بھی آپ کہیں۔''

ڈیڑھ دو منٹ کی گفتگو کے بعد ہم میں طے ہو گیا کہ ہم دو گھنٹے بعد سینٹرل چلڈرن پارک میں ملیں گے۔

مقررہ وقت پر میں اکیلا ہی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ خوب صورت پارک تھا۔ جھولے وغیرہ تھے۔ چھوٹی سی مصنوعی جھیل میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ چونکہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا اس لیے یہاں اِکا دُکا لوگ ہی نظر آتے تھے۔ میں جھیل کے قریب لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی جعفر کی پرانے ماڈل کی ٹویوٹا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد اس نے مجھے دیکھ لیا اور سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بس اپنی انگلیوں کی پوریں میرے ہاتھ سے چھو کیں۔ ہم دونوں لکڑی کے بینچوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ گھڑی دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میں بھی زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ میں آپ سے مہرو کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ تم اپنی زبان سے اس کا نام لیتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم مجھے بتاؤ کیا خاص بات کہنا چاہتے ہو۔''

''یہ بات اسی بارے میں ہے جعفر بھائی۔ آپ میری بات حوصلے سے سنیں اور برا نہ مانیں۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''بکواس ہے یہ۔'' جعفر گرجا۔ ''میں نے رات کو بھی بات کی ہے اس سے۔ وہ ابراہیم کو بس ایک کزن سمجھتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے بس اسی خبیث کے ذہن کا فتور ہے۔''

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''اس ساری بات میں یہی پیچ ہے جعفر بھائی۔ وہ آپ سے بھی بہت پیار کرتی ہے۔ آپ کی ذرا سی ناراضی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ چپ ہے۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے کر سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ وہ آپ کی بات مان لے گی اور اپنی ہر خواہش آپ پر قربان کر دے گی۔ مگر وہ زندگی بھر خوش نہیں رہ سکے گی۔ ابراہیم کو بھول نہیں سکے گی اور مجھے یقین ہے ابراہیم بھی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ ضرور اپنے آپ کے ساتھ کچھ کر گزرے گا۔ وہ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے جعفر بھائی۔''

''تم کسی ڈرامے یا فلم کی کہانی نہیں لکھ رہے ہو۔ یہ جیتی جاگتی زندگی ہے۔'' جعفر پھنکارا۔ ''بڑے دیکھے ہیں ایسے محبت کرنے والے اور مرنے والے..... اور میں تمہیں بتا دوں میں بہت سن چکا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں سنوں گا۔ بہتر ہے کہ اس بات کو اب یہیں ختم کر دو۔ ہمیشہ کے لیے۔''

جعفر شکستہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے الفاظ بھی بول رہا تھا۔ میں اس کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

اس کے تیور خراب ہوتے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پینترا بدلا۔ میں نے دھیمے لب و لہجے میں کہا۔ ''جعفر بھائی! جب میں آپ کے گھر میں اس رات رہا تھا، آپ نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔''

''کون سی بات؟''

''جب میں رخصت ہو رہا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ میں نے آپ پر احسان کیے ہیں اور آپ کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھتے۔ آپ نے کہا تھا کہ میں کچھ مانگنا چاہوں تو مانگ سکتا ہوں۔ جعفر بھائی! میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کبھی آپ پر کوئی احسان کیا ہے۔ میں تہ دل سے کہتا ہوں کہ وہ جو بھی تھا میرا اخلاقی فرض تھا۔ لیکن اگر آپ مجھ ناچیز پر کوئی مہربانی کر سکتے ہیں تو پلیز..... آج کر دیں۔ میں اپنے دوست کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ اس کی زندگی بچا لیں۔'' میری آواز بھرا گئی۔ میں نے جعفر کے دونوں گھٹنے پکڑ لیے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ''پلیز جعفر بھائی! میں آپ کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ابراہیم بھی ہمیشہ آپ کی غلامی کرے گا۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے میرے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پیچھے ہٹائے اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے پتا نہیں کہ تمہارے ہاں، زبان سے پھرنے والے شخص کو کیا کہتے ہیں، لیکن ہمارے قبیلے میں اسے سور کا پیشاب پینے والا کہا جاتا ہے۔ تم میرے ساتھ یہی گندی کوشش کر رہے ہو اور ساتھ پلیز پلیز بھی کہہ رہے ہو۔ تمہارے صدقے واری جانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو گئی تھیں۔ اس نے تیزی سے میرا گریبان پکڑا اور زور سے جھنجوڑ کر زہریلی سرگوشی میں بولا۔ ''اگر تم دونوں کتے کی موت مرنا نہیں چاہتے..... تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے..... اور یہ بھی سن لو، میں اپنی بہن کا نکاح آج ہی کر رہا ہوں..... ابھی، تین گھنٹے کے اندر اندر..... اور اگر آج ظہر تک مجھے تم دونوں میں سے کوئی کمینہ دوبارہ اپنے اردگرد نظر آیا تو میں شوٹ کر دوں گا اسے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''خدا کے لیے جعفر صاحب! ایسا نہ کریں۔ ان کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی، وہ بے موت مر جائیں گے۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' وہ چنگھاڑا اور اس نے میرے منہ پر لات رسید کی۔ میں پیچھے کی طرف گر گیا۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلنے لگا۔ چوٹ کھا کر دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''جعفر صاحب! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

وہ ایک دم مزید بپھر گیا۔ ''تو کیا کرو گے تم؟ کیا کرو گے؟ لڑو گے مجھ سے؟ تو ٹھیک ہے آؤ لڑو..... آؤ۔''

اس نے طیش کے عالم میں اپنا نیلا کوٹ اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ آستینیں اڑس لیں اور کسی باکسر کی طرح میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا لمبوترا چہرہ دہک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ سے لڑنے کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔''

''تو پھر کیا کرو گے؟'' وہ دہاڑا اور طیش کے ریلے

میں بہہ کر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے دیوانہ وار مجھ پر ٹھوکریں اور مکے برسائے۔ جو چند افراد پارک میں موجود تھے، وہ دور دور کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک دیوار سے دے مارا۔ میرے اندر بھی ایک ضد نمودار ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے جتنا مرضی مار لیں..... لیکن میں آپ کو یہ سب کرنے نہیں دوں گا۔''

''تیرا تو باپ بھی کرنے دے گا۔'' وہ پھر گرجا اور مجھے گھما کر دور گھاس پر پھینک دیا۔

اس کے بعد وہ پھر تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ اندر بیٹھ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ انجن اسٹارٹ کرتا، میں ایک بار پھر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں جعفر صاحب! آپ ایسے نہیں جاسکتے..... یا پہلے مجھے ماردیں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے زور سے دھکا دیا اور گاڑی کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ میرا بازو دروازے کے اندر آگیا اور شدید چوٹ لگی لیکن میں نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔ اس نے ایک بار پھر وزنی دروازے کو زور سے بند کیا مگر ناکام رہا۔ کہنی سے نیچے میرا بازو چوٹ سے سنسنا گیا۔ وحشت کے عالم میں اس نے بار بار دروازہ بند کیا اور میرے بازو کو شدید ضرب پہنچائی۔ آخر ناکام ہوکر وہ باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے گاڑی کا وزنی ''اسٹیئرنگ لاک'' بھی نکال لیا تھا اور اسے کسی ڈنڈے کی طرح پکڑا ہوا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں اس نے اس آہنی راڈ کے ذریعے مجھے روئی کی طرح دھنک دیا۔ میرے ایک گھٹنے پر شدید چوٹ آئی۔ دو جگہ سے سر پھٹ گیا اور آنکھیں خون سے بھر گئیں..... میرے کانوں میں فاصلے سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ وہ لوگ تھے جو دور سے یہ مار پیٹ دیکھ کر شور مچا رہے تھے۔

میں بھی جعفر پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں اٹھایا۔ اس نے ملاقات کے شروع میں ہی مجھے مار پیٹ کا ڈراوا دیا تھا۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں تک جاسکتا ہے..... اور وہ کافی دور تک گیا۔ میری آنکھوں میں خون جمع ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک مجھے زوردار دھکا لگا اور مجھے پتا چلا کہ میں پانی میں گر گیا ہوں۔ یہ بہت گہرا پانی تھا اور مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ یہ وہی مصنوعی جھیل تھی جس کے کنارے پر ہم بیٹھے تھے۔ مجھے لگا کہ میری کہانی ختم ہوگئی ہے۔ میں نیم سرد پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر جان بچانے کے فطری عمل کے تحت میں نے اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلائے..... لیکن ہر بار تو قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ میں نے سانس لی اور ڈھیروں پانی میرے پھیپھڑوں میں چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے تھوڑی سی روشنی نظر آئی۔ شاید میں مرنے سے پہلے آخری بار سطح پر ابھرا تھا۔ کسی بطخ کی مدھم ''قیں قیں'' سنائی دی۔ دل میں امید جاگی کہ شاید کوئی مجھے تھام لے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں پھر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ سانس بند ہوچکی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ آخری وقت کیسا ہوتا ہے۔

☆☆☆

کیا میں مر چکا ہوں؟ کیا یہ دوسری دنیا تھی؟ میں کہاں تھا؟ میرے اردگرد کون لوگ تھے؟ میں نے بہت کوشش کرکے آنکھیں کھولیں۔ مجھے اپنے اردگرد متحرک سائے نظر آئے۔ نتھنوں میں کسی دوا کی تیز بو گھس گئی۔ میرا مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے لگا، میں بہت دیر تک..... بے ہوش رہا ہوں۔ میں نے ہمت کرکے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کسی لڑکی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور ملائمت سے بولی۔ ''تو..... نو..... پلیز۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پیشاب آرہا ہے۔''

اسی آواز نے کہا۔ ''یو کین ڈو اٹ ہیئر، یورین بیگ از اٹیچڈ ٹو یو۔''

مجھے پتا چلا کہ مجھے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ میرے ہونٹ سوجے ہوئے ہیں۔ میں نے ہونٹوں کو.. بہ مشکل حرکت دی اور کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟ جعفر کہاں ہے..... اور..... اور۔'' اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میرے سینے میں ایک شدید ٹیس اٹھی۔ جعفر نے کہا تھا کہ وہ دو تین گھنٹے کے اندر اندر مہرو کا نکاح کرنے کے لیے جارہا ہے۔ تو کیا وہ نکاح ہو چکا تھا؟ مہرو ہمیشہ کے لیے ابراہیم سے بچھڑ چکی تھی؟ میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سینے میں معدے کے قریب شدید ٹیس اٹھی اور میں بے حال ہوگیا۔ گھنگرالے بالوں والے ایک عراقی ڈاکٹر نے مجھے جھڑکا اور ہاتھوں سے دوبارہ لیٹنے کا اشارہ کیا۔ نرس نے میرے کندھے تھام کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے میری مدد کرو۔ مجھے ابراہیم سے ملاؤ..... یا ابوسیاف سے ملاؤ..... یہ بہت ضروری ہے۔ میں جلدی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

نرس نے عربی میں کچھ کہا اور پھر مجھے تسلی دیتی ہوئی

باہر نکل گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی اسپتال کے کمرے میں ہوں اور میری بائیں ٹانگ پٹیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ دواؤں کی وجہ سے ذہن پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے کیلنڈر پر پانچ تاریخ نظر آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا میں قریباً 72 گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ وال کلاک پر دن کے دس بجے کا وقت نظر آرہا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ معدے میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد کسی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا۔ ''کیسے ہو سائیں؟''

میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے ابراہیم کھڑا تھا۔ میں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر ابراہیم نے مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کردیا۔ ''نہیں سائیں! آپ کا آپریشن ہوا ہے۔ ٹانکے خراب ہوجائیں گے۔''

میں نے آپریشن والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مہرو کہاں ہے؟ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا تمہیں؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے سائیں! سب ٹھیک ہے۔ بس تم ٹھیک ہوجاؤ۔ اللہ سوہنے نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔'' ابراہیم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میں یہاں کیسے آیا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں ابراہیم نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ جب مجھے جھیل سے نکالا گیا تو میں تقریباً مردہ تھا۔ میری سانس رک چکی تھی اور نبض بھی ختم ہوچکی تھی۔ ایمبولینس والوں نے میرے پیٹ سے پانی نکالنے کے بعد میرے سینے کو بجلی کے شاک دیے تو میرے دل میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ مجھے فوراً قریبی اسپتال میں پہنچایا گیا۔ میرے جسم میں اندرونی اخراجِ خون بھی تھا۔ پتا چلا کہ کسی سخت ضرب کی وجہ سے معدے کے نیچے جانے والی نالی زخمی ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ میرے گھٹنے میں بھی فریکچر تھا۔ مجھے فوراً آپریشن تھیٹر لے جایا گیا اور سینہ چاک کرکے متاثرہ نالی کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹر میری مسلسل بے ہوشی کی وجہ سے بھی پریشان تھے۔ اس بے ہوشی کا سبب ''پانی میں ڈوبنا'' اور دماغ کو آکسیجن کا نہ ملنا تھا۔ خدا خدا کرکے آج صبح کے وقت میری حالت بہتر ہونا شروع ہوئی تھی۔

میں ابراہیم سے مہرو اور جعفر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں گھنگرالے بالوں والا سخت گیر ڈاکٹر کمرے میں واپس آگیا اور اس نے ابراہیم کو کمرے سے باہر نکال کر مجھے ہر طرح کی بات چیت سے منع کردیا۔

ابراہیم سے میری دوسری ملاقات رات آٹھ بجے کے قریب ہوئی۔ میری حالت قدرے بہتر ہوچکی تھی۔ بہرحال یہ سارا وقت میں نے سخت بے قراری میں گزارا تھا۔ ابراہیم کے ساتھ چچا سیاف بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں نے ابراہیم سے پھر پوچھا کہ مہرو کہاں اور کس حال میں ہے؟

وہ بولا۔ ''وہ ٹھیک ہے سائیں۔''

''ٹھیک تو ہے لیکن اس کا نکاح.....؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا سائیں.....جعفر پولیس کی حراست میں ہے۔''

ابھی ہم بات ہی کررہے تھے کہ انتظامیہ کا ایک بندہ اندر آگیا۔ اس نے چچا سیاف اور ابراہیم کو باہر نکلنے کا کہا.....اور مجھے بتایا کہ پولیس میرا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے آئی ہے۔

چند منٹ بعد تین پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک لمبے قد کا تھا اور اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ دو کافی ہٹے کٹے تھے۔ ان دونوں کے درمیان جعفر تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ایک رخسار پر چوٹ کا سرخ نشان نظر آرہا تھا۔ شاید یہ چوٹ گرفتاری کے وقت یا گرفتاری کے بعد اسے لگی تھی۔

عینک والا آفیسر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ باقی افراد کھڑے رہے۔ آفیسر نے کہا۔ ''کیا میں انگریزی میں بات کرسکتا ہوں؟''

''کسی حد تک۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

آفیسر نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور جعفر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''مسٹر ہارون! کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کیا یہی وہ شخص ہے جس نے تمہیں مارا اور پھر پانی میں پھینکا؟''

میں نے ایک نظر جعفر کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں۔ اس کا سر بدستور مجرمانہ انداز میں جھکا ہوا تھا۔ وہ سخت مصیبت میں لگتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بیان کی بے انتہا اہمیت ہے۔ اگر میں نے حقیقت بتا دی تو شاید..... وہ کئی برسوں کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ یہ آزمائش کی گھڑیاں تھیں اور پھر میں نے فیصلہ کرلیا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں آفیسر! میرا جھگڑا انہی کے ساتھ ہوا تھا لیکن یہ ہمارا نجی معاملہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں میری بھی غلطی تھی۔ ویسے بھی یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ مجھے جان سے بھی مار دیں تو یہ ان کا حق بنتا ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

جعفر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ آفیسر بھی حیران نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مسٹر ہارون! تم جانتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جی ہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں بہت شرمندگی بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میری وجہ سے بات اتنی بڑھی کہ میرا اور بڑے بھائی کا تماشا بنا۔ بہرحال بات یہاں تک نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔''

آفیسر بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑے بھائی کی طرح ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمہارا بڑا بھائی یہ بھی جانتا ہوگا کہ تم کو تیرنا نہیں آتا۔ اس نے تمہیں پانی میں پھینکا۔ یہ قتلِ عمد کا اقدام تھا۔''

''نہیں آفیسر! یہاں آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم میں لڑائی ضرور ہوئی لیکن پانی میں مجھے انہوں نے نہیں گرایا تھا۔ کنارے پر میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ یہ واپس مڑ گئے۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ پانی اتنا گہرا ہے۔ آپ جہاں بھی کہیں، میں یہ بیان دینے کو تیار ہوں۔''

جعفر کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔ آفیسر نے یکے بعد دیگرے مجھ سے کئی سوالات کیے لیکن میں جو فیصلہ کر چکا تھا، اس کے مطابق جواب دیے۔ آفیسر نے میرا بیان قلم بند کیا۔ مجھے تحریری بیان پڑھنے کے لیے کہا پھر اس پر میرے دستخط وغیرہ لیے۔ یہ ساری کارروائی ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ وہ لوگ جعفر سمیت واپس چلے گئے۔

رات گئے تک میں جاگتا رہا اور میری آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ دل سے دعا نکلتی رہی۔ یا خدا! جعفر کا دل نرم کر دے۔ تو دلوں کو پھیرنے والا ہے تو پھیر سکتا ہے۔ ہم ناچیز بندے تو بس حقیر کوششیں ہی کر سکتے ہیں۔ سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے۔

اگلے روز دوپہر کے بعد جب حافظ احسان میرے بستر کے قریب بیٹھا تھا، مجھے پتا چلا کہ جعفر مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر طیش آمیز سنجیدگی تھی۔ حافظ احسان باہر چلا گیا۔ جعفر میرے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ پھر بڑے طیش سے بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟''

''مم..... میں سمجھا نہیں جعفر بھائی؟''

''تم نے ٹھیکا لیا ہوا ہے کرم نوازیاں کرنے کا۔ تم کیا سمجھتے ہو تم احسان کرتے جاؤ گے اور میں لیتا جاؤں گا.....؟ لیتا جاؤں گا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔''

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے تو آپ کو ایک بہت بڑی مشکل میں ڈالا ہے۔ آپ میری جان بھی لے لو تو شاید یہ آپ کا حق بنتا ہے۔''

''تم اسے مشکل کہہ رہے ہو۔ یہ عذاب ہے، بہت بڑا عذاب ہے میرے لیے۔'' اس نے اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر رکھیں اور ذرا آگے جھک کر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جانے کیوں پہلی بار مجھے یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ یہ میری خوش فہمی تھی یا واقعی پتھر پگھل رہا تھا؟ دفعتاً وہ اٹھا اور میری طرف دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ ذہن میں کئی خدشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں وہ پھر طیش کے منہ زور ریلے میں نہ بہہ جائے..... کہیں اس کا غصہ ابراہیم یا پھر مہرو کو نقصان نہ پہنچا دے۔

میں نے حافظ احسان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ ابراہیم کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ غوث پاک کے روضے کے ساتھ والی مسجد میں جمعہ پڑھنے گیا ہے۔

میں نے شام تک بے چینی سے ابراہیم کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں نے حافظ احسان سے کہا کہ وہ چچا سیاف کو فون کرے۔ اس نے فون کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ ابراہیم نے عصر کی نماز مسجد میں پڑھی تھی۔ ابوسیاف کے ایک ساتھی نے بتایا کہ نماز کے بعد وہ ایک لمبے قد کے عراقی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔ قوی امکان تھا کہ وہ لمبے قد والا شخص جعفر ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟ میں نے سوچا کہ احسان سے کہوں، وہ جعفر کے گھر پر فون کرے..... لیکن اسی دوران میں ابراہیم آتا دکھائی دیا۔ میں نے فاصلے سے ہی دیکھ لیا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''کیا ہوا ابراہیم؟'' میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''ہم جیت گئے سائیں..... سب کچھ ٹھیک ہوگیا بلکہ..... میں تو کہوں گا، آپ جیت گئے۔ آپ نے سب کچھ ٹھیک کردیا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میرا دل یکبارگی دھڑک اٹھا تھا۔

وہ میرے ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''سائیں! جعفر بھائی مان گئے۔ انہوں نے میرے اور مہرو کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔ انہوں نے ہی مجھ کو بھیجا ہے کہ میں جا کر آپ کو بتاؤں۔''

میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ میں چند لمحے ابراہیم کی شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا سر سرہانے سے اٹھایا اور بیٹھے بیٹھے ابراہیم کو گلے سے لگالیا۔ آپریشن کی جگہ پر شدید ٹیسیں اٹھیں لیکن خوشی کی لہر اتنی شدید تھی کہ ان ٹیسوں کا پتا ہی نہیں چلا..... ہم کتنی ہی دیر ایک دوسرے کو گلے سے لگائے رہے، پھر ابراہیم نے بڑی احتیاط سے مجھے دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ اسی دوران میں دروازے پر حافظ احسان نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں عربی مٹھائی کا چھوٹا سا ڈبا تھا۔

☆☆☆

اگلے دس پندرہ روز میں کئی اہم کام ہوئے۔ میں نے اپنی مرضی سے خود کو کمرے سے وارڈ میں شفٹ کرالیا تھا۔ جعفر اور عطا صاحب کے تعاون سے ابراہیم، ورکشاپ والے بازار میں کرائے کی دکان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا..... اور میری توقع کے عین مطابق پہلے دوسرے دن سے ہی اس کی دکان چلنا بھی شروع ہوگئی۔ جعفر نے اس کے ویزے میں توسیع کے لیے ایمبیسی میں درخواست بھی جمع کرادی۔ اصل صورتِ حال جاننے کے بعد مہرو کے منگیتر نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور خود ہی راستے سے ہٹ گیا۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ جعفر کو خدا حافظ کہہ دیا۔ جعفر نے اسے کوفہ میں اپنے ایک واقف کار کے پاس بہتر ملازمت دلا دی۔ جس روز میں اسپتال سے فارغ ہوا اس سے تیسرے روز دریائے دجلہ کے کنارے کے علاقے میں جعفر کا دو منزلہ مکان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہ مہرو اور ابراہیم کی شادی کی رات تھی۔ میرے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع تھا۔ پروگرام کے مطابق مہرو کو فی الحال رخصت ہوکر اسی مکان کے نیچے والے پورشن میں رہنا تھا۔ شادی مقامی رسموں کے مطابق ہوئی۔ رخصتی کے وقت میں نے مہرو کے سر پر پیار دیا۔ وہ ایک دم رونے لگی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔ ''بابو سائیں! آپ نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوسکتا تھا۔''

اس نے سرگوشی کی۔

میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے پھر بھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔''

''جی؟''

''بھئی! ایک بریانی تک تو کھلائی نہیں تم نے۔''

وہ روتے روتے مسکرا دی۔ ''میں آپ کو جرور کھلاؤں گی..... بلکہ ہر روج کچھ نہ کچھ پکا کے کھلاؤں گی۔''

وہ دونوں اپنے حجلۂ عروسی میں چلے گئے لیکن میں پتا نہیں کیوں اردگرد ہی گھومتا رہا۔ دل میں اداسی تھی اور انجانے اندیشے تھے۔ ایک رات مجھ پر بھی تو ایسی آئی تھی، ایک رات میرے گھر میں بھی تو شادیانے بجے تھے اور روشنیاں جگمگائی تھیں۔ میری دلہن سیج پر بیٹھی انتظار کرتی رہی تھی اور میں ہزاروں میل دور آگیا تھا..... شاید کبھی واپس نہ جانے کے لیے۔ پتا نہیں کیوں آج بھی دھڑکا سا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے۔

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ صبح ابراہیم کو خوش وخرم دیکھ کر تسلی ہوئی۔

جعفر کا گھر کافی کشادہ تھا۔ اس نے زیریں منزل پر ایک کمرا مجھے اور حافظ احسان کو رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم جب تک چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں لیکن چوتھے پانچویں روز ہی میں نے جعفر اور عطا صاحب سے جانے کی اجازت مانگ لی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں روضے میں اپنے دوستوں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ جعفر اور عطا صاحب تیار نہیں تھے، عطا صاحب کی بیٹیاں بھی بڑی معصومیت کے ساتھ یہ زور دے رہی تھیں کہ میں ان کے گھر پر رہوں لیکن میں نے ان کو قائل کرلیا۔

روضے میں جانے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ حافظ احسان اب پاکستان واپس جارہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں کمرے میں تنہا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ بس ایک انجانا سا خوف تھا جو کسی صورت دل سے نکلتا نہیں تھا۔ درحقیقت میں نے اسپتال میں کمرا چھوڑ کر وارڈ میں جانا بھی اس لیے پسند کیا تھا کہ میں شیخ حارث کے والد کی ہدایت کے مطابق رات کو اکیلا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں پھر کہوں گا کہ میں کوئی کمزور دل شخص نہیں ہوں لیکن جو کچھ بار بار میرے ساتھ ہو چکا تھا اس کے بعد ایسی دلیری..... بے وقوفی کے زمرے میں ہی آتی تھی۔

میں اور حافظ احسان روضے میں واپس پہنچ گئے۔ سارے پرانے دوستوں نے خوش دلی سے میرا استقبال

کیا۔ ''پپو واپس آ گیا۔'' کی کئی آوازیں سنائی دیں۔ روضے میں آنے کے بعد ایک چھوٹا سا اندیشہ ضرور دل میں موجود رہا اور وہ یہ کہ کہیں کمال رشید کے کسی ساتھی سے دوبارہ ملاقات نہ ہو جائے۔ بہرحال ایسا کچھ نہیں ہوا۔

چھ سات روز بعد جب حافظ احسان پاکستان واپس جانے کے لیے روانہ ہوا تو میں بہت اداس ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ ایک ایسے دیس میں جا رہا ہے، جہاں میں اب کبھی قدم نہیں رکھ سکوں گا اور جب کبھی قدم رکھنے کا سوچوں گا نادیدہ حالات مجھے گھیر لیں گے۔

احسان کی فلائٹ رات دس بجے تھی۔ میں روضے کے احاطے میں سر کے نیچے تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ احسان کو بغداد ائرپورٹ سے کراچی لے جانے والا جہاز مجھے یہاں سے نظر آئے گا اور وہ واقعی نظر آیا۔ بغداد کے تاریک آسمان پر ایک پُرگونج آواز کے ساتھ یہ طیارہ مشرق کی سمت بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک روشنی بار بار چمک رہی تھی۔ وہ پاکستان جا رہا تھا۔ میرے بچھڑے ہوئے دیس میں، میری کھوئی ہوئی سرزمین کی طرف۔ میں اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے لیکن میں نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے اور اپنا دھیان کسی دوسری طرف لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے دل میں یہ خوف جاگزیں ہو چکا تھا کہ میں جب بھی اس رخ پر سوچوں گا، میرے اردگرد کچھ ہو جائے گا۔ کچھ ویسا ہی، جو شیخ حارث کے گھر میں ہوا تھا اور جس نے مجھے موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔

آنسو پونچھنے سے آنسو ختم تو نہیں ہو جاتے۔ یہ پانی تو جب امڈتا ہے، ہر رکاوٹ کو توڑ دیتا ہے۔ میں بھی منہ چھپا کر روتا رہا..... اور روتا رہا۔ ''یا اللہ میری مدد کر۔ میری خطائیں بخش دے۔'' میں بے بسی کے عالم میں بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ اچانک میرے سرہانے کی طرف آہٹ ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے حضرت عالی مقام کھڑے تھے۔ وہی، جن کو میں نے بغداد میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈا تھا۔ جن کی تلاش میں دور دور گیا تھا۔ آج وہ بغیر میری کسی کوشش کے میرے سامنے موجود تھے۔ انہوں نے خاکی جبہ پہن رکھا تھا اور سلیٹی رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ چہرے سے نور پھوٹ رہا تھا۔ پتا نہیں، میرے دل میں کیا آئی میں نے ایک دم ان کے پاؤں پکڑ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''یا حضرت! کہاں چلے گئے تھے آپ..... آپ نے کیوں مجھ سے منہ پھیر لیا..... کس غلطی کی سزا دی مجھ کو؟''

وہ بیٹھ گئے۔ میری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میری بلند آواز سن کر ابوسیاف بھی حجرے سے نکل آیا۔ حضرت عالی مقام نے مجھے کندھوں سے تھاما اور اپنے پاؤں سے جدا کر کے مجھے اپنے سامنے بٹھایا۔ میرے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ حضرت عالی مقام نے اپنا بازو بڑھایا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں ہچکیاں لینے لگا۔ انہوں نے کچھ کہا۔ چچا سیاف نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''حضرت پوچھ رہے ہیں، اپنے گھر جاؤ گے؟''

میں بلک پڑا۔ ''میں کیسے جا سکتا ہوں حضرت! وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کبھی جانے نہیں دے گا۔''

چچا سیاف نے میری بات کا ترجمہ حضرت عالی مقام تک پہنچایا۔ چچا سیاف کے ذریعے میرے اور عالی مقام کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح تھی۔

وہ بولے۔ ''کون جانے نہیں دے گا؟ تم جا سکتے ہو۔ تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہاں بچے! تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم نے کفارہ ادا کر دیا ہے۔ تم نے بھوکے کو کھانا کھلا دیا ہے۔ کھلا دیا ہے نا۔'' وہ عجیب لہجے میں بول رہے تھے۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، حضرت عالی مقام۔ آپ..... کس بھوکے کی بات کر رہے ہیں؟''

''تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔''

میرا سر چکرانے لگا۔ ''ابراہیم؟'' میں نے بھیگی آنکھوں میں حیرت لے کر عالی مقام کی طرف دیکھا۔ وہ دور خلا میں جیسے کسی نامعلوم چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بولے۔ ''وہ بھی ایک طرح کی بھوک ہی تھی نا۔ محبت کی بھوک..... کسی کو حاصل کرنے کی بے پناہ طلب۔ اس طلب کی وجہ سے وہ جیتے جی مر رہا تھا۔ قبر میں جا رہا تھا۔ تم نے اس کا تقاضا پورا کر دیا۔ اسے اس کی چاہت سے ملا دیا، اس کا عشق کامل کر دیا۔ تم نے کفارہ ادا کر دیا۔ بس یہی تھا تمہارے ذمے..... اور تم اس ذمے داری سے سبکدوش ہوئے.....''

''میری عقل آپ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے عالی مقام۔'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

وہ بہ دستور کھوئے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں لیکن وہ ہوتی ہیں۔ ان باتوں کی، ان واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ ان کو ویسے ویسے ہونا ہوتا ہے جیسے جیسے لوحِ محفوظ میں لکھا گیا ہوتا

ہے۔ اناج کہیں اگتا ہے..... مسافر کہیں سے چلتا ہے، روٹی کہیں پکتی ہے..... اور لقمہ مقررہ وقت پر منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ تم کہیں تھے، وہ لڑکی کہیں تھی، ابراہیم کہیں تھا لیکن تم تینوں نے ایک کہانی کو تکمیل دینا تھا اور تمہاری قربانی اور ہمت سے وہ کہانی مکمل ہوگئی ہے۔''

انہوں نے شاباش دینے والے انداز میں ایک بار پھر میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ حضرت عالی مقام نے شفیق لہجے میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے تم نے پاکستان میں اپنے گھر والوں کو ایک خط لکھا تھا اور پھر پھاڑ دیا تھا۔''

''جی حضرت۔'' میں نے کانپتی آواز میں اقرار کیا (میرا سر چکرا رہا تھا)

وہ بولے۔ ''وہ خط دوبارہ لکھو اور اگر چاہو تو ابھی لکھو۔''

انہوں نے چچا سیاف کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے حجرے میں گیا اور ایک کاغذ قلم لے آیا۔ عالی مقام نے کاغذ قلم میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ لکھو۔ میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ مجھے کافور کی بو آئی۔ مجھے لگا، ابھی کہیں سے وہ ہیولا نمودار ہونے والا ہے۔ عالی مقام نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''لکھو، اطمینان سے لکھو..... میں یہیں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔''

میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد میں کاغذ پر سر جھکائے، کانپتے ہاتھوں سے لکھ رہا تھا۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر عالی مقام تسبیح پکڑے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے میرے سب پیاروں کی صورتیں آگئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ لفظوں کے ذریعے ان سے لپٹ رہا ہوں۔ ان کو اپنے دکھڑے سنا رہا ہوں۔ میں نے یہ خط اس بار اپنے عزیز ترین دوست شیخ تنویر کے نام لکھا۔ یہ خط کیا تھا، بس آنسوؤں کا ایک دریا تھا۔ میں نے تنویر کو لکھا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے بعد وہاں لاہور میں کیا ہوا ہے لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہاں ایک بڑی قیامت گزری ہے۔ اس قیامت کی ہولناکی اور تپش میں یہاں تک محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے اس خط میں تنویر پر انکشاف کیا کہ میں یہاں لاہور اور پاکستان سے ہزاروں میل دور بغداد میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے پر موجود ہوں اور تقریباً تقریباً ملنگ کی شکل اختیار کر چکا ہوں۔ میں نے ان دردناک حالات کی بھی تھوڑی سی تصویر کھینچی جو مجھے یہاں پیش آئے تھے۔ آخر میں، میں نے لکھا..... میں شرمندگیوں اور ندامتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں تنویر۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے گھر والوں کا سامنا کرسکوں۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ اب جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔

خط لکھنے کے بعد اسے پوسٹ کرنے کا مرحلہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی نقشہ گھوم گیا جب مجھے پوسٹ آفس کے دروازے کے سامنے سے واپس آنا پڑا تھا اور خوف کے سبب میں دو دن تیز بخار میں مبتلا رہا تھا۔

عالی مقام نے جیسے میرے چہرے سے میرے خیالات پڑھ لیے۔ انہوں نے ابوسیاف سے کچھ کہا۔ ابوسیاف نے ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''حضرت کہہ رہے ہیں۔ کل جب خط پوسٹ کرنا ہوگا تو وہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

یہ بات سن کر میرے سینے میں اطمینان کی ایک بلند لہر دوڑ گئی۔

اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ میں مرکزی پوسٹ آفس پہنچا۔ عالی مقام میرے ساتھ تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک ایسے مضبوط حفاظتی حصار میں ہوں جس سے ٹکرا کر دنیا کی ہر مصیبت چکنا چور ہوسکتی ہے..... دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ اردگرد بھی کوئی نہیں تھا۔ کوئی دل دہلا دینے والی سرگوشی بھی نہیں تھی۔ کافور اور مشک کی بو بھی نہیں تھی۔ آج کچھ نہیں تھا۔ بس عالی مقام تھے اور ان کے چہرے سے پھوٹتی ہوئی روشنی تھی۔

میں خط پوسٹ کر کے واپس روضے پر پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک بہت بڑا پہاڑ میرے کندھوں پر سے ہٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب میری ساری سوچیں اس خط کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اس خط کو سفر کرتے دیکھا۔ وہ بحر ہند کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا، ریگستانوں اور پہاڑوں کو پھلانگتا ہوا پاکستان پہنچا اور پھر زندہ دلوں کے شہر لاہور پہنچ گیا۔ میں نے تصور کی نظر سے دیکھا..... میرا خط اچھرہ کی سردار مارکیٹ میں شیخ تنویر کی دکان پر ہے۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میرا خط کھول رہا ہے، پڑھ رہا ہے..... پھر وہ میرے گھر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں۔ وہ میرے گھر والوں کو میرے خط کے بارے مین بتاتا ہے، وہاں ایک تہلکہ سا مچ جاتا ہے۔ خط کو دل کی آنکھوں سے پڑھا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے چھینا جا رہا ہے (بعد ازاں ثابت ہوا کہ خط پہنچنے کے بعد لاہور میں وہی

کچھ ہوا جس کا میں نے تصور کیا تھا)

☆☆☆

خط پوسٹ ہوئے سات روز ہو چکے تھے۔ اب مجھے خط کے ردعمل کا انتظار تھا اور یہ بڑا کٹھن انتظار تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ردعمل کیا ہوا ہوگا بلکہ یہ خبر بھی نہیں تھی کہ خط منزل پر پہنچ سکا ہے یا نہیں۔

ہاں..... ان چار پانچ دنوں میں یہ بات ضرور ہوئی کہ میرے اندر کا خوف بتدریج ختم ہوگیا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی جس طرح بے چینی مجھے گھیرتی تھی اور تنہائی جس طرح مجھے ہراساں کرتی تھی، وہ سلسلہ بند ہوگیا تھا۔ عالی مقام آج کل روضے میں ہی تھے اور ان کی نورانی صورت گاہے بگاہے میری ڈھارس بندھاتی تھی۔ انہوں نے کتنے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے فضل و کرم سے بلا ٹل چکی ہے..... اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کفارہ ادا ہو چکا ہے۔

ان کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آتی تھیں، کچھ نہیں آتی تھیں لیکن ان کی ساری باتوں میں ایک خاص قسم کی روحانی مضبوطی ضرور ہوتی تھی اور شاید ان کی باتیں حقیقت کے عین مطابق بھی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا ہر مصیبت کے ٹلنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بندہ اپنے رب سے اپنا رشتہ مضبوط رکھے اور انتظار کرے۔

میرے گھٹنے کی چوٹ اب ٹھیک تھی لیکن آپریشن والی جگہ پر اب بھی کبھی کبھی درد ہوتا تھا۔ جسم کی دیگر چوٹیں بھی دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہی تھیں۔ ابراہیم ایک بار روضے میں آکر مجھ سے مل چکا تھا۔ ایک دن وہ پھر آگیا۔ وہ اچھے لباس میں تھا۔ چہرے پر خوشی کی چمک تھی۔ وہ پہلے بھی نماز روزے کا پابند تھا لیکن اب کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی جو اسے اچھی لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ جعفر بھائی اس پر بہت مہربان ہیں اور وہ سوچ رہا ہے کہ وہ کچھ عرصے تک اپنی والدہ کو بھی پاکستان سے یہاں بلا لے۔ اس کا کام بغیر کسی انتظار کے چل نکلا تھا۔ وہ میرے لیے کافی سارا پھل لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سائیں! مہرو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ جعفر بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکے، میں آپ کو گھر لے کر آؤں۔ زیادہ نہیں تو ایک رات تو ہمارے پاس رہیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری چھوٹی بہن سے کہنا میں جمعے کے دن آؤں گا..... وہ میرے لیے بریانی پکا کر رکھے۔''

''سائیں! جمعہ تو بہت دور ہے۔ آپ کل کا رکھ لیں۔ کل بھی تو چھٹی ہے۔''

تھوڑی سی تکرار کے بعد اس نے مجھے تیسرے دن آنے پر آمادہ کرلیا۔ مہرو کو حاصل کرنے کے بعد وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جو پھل لایا تھا وہ ہم سب نے مل کر کھایا۔

عشا کی نماز کے بعد میں دیر تک دعا مانگتا رہا۔ جندل خاں اور آفتاب گل کی بخشش کی دعا مانگی۔ اپنے لیے بھی التجائیں کیں۔ پھر وہیں احاطے میں مصلے پر لیٹے لیٹے سو گیا۔

کسی نے مجھے ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں بڑے بھائی جان اسلم میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کرلیں۔ غنودگی کی حالت میں مجھے بالکل یہی لگا کہ یہ میرا وہم ہے لیکن جب ''ہارون'' کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی چھٹنے لگی۔ بھائی جان میرے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہم نہیں تھا، نہ ہی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ وہ میرے سامنے تھے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں ان سے چمٹ گیا..... اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ بھی رونے لگے۔ ہماری آوازیں سن کر اردگرد موجود لوگ جاگ گئے۔ آنکھیں ملتے ہوئے ہمارے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ پتا نہیں میں نے کیا، کیا کہا اور بھائی جان نے کیا، کیا سنا۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور میری کمر پر ہاتھ پھیرے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا اور بہت رقت آمیز بھی۔ روضے کے کسی انڈین خادم کی اڑتی اڑتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہارون کے وارث آگئے۔''

کچھ ہی دیر بعد چچا ابوسیاف بھی موقع پر پہنچ گئے۔ سفر اور تھکن کے سبب بھائی کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میں ان سے بہت کچھ جاننا چاہتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن ابھی ہم دونوں کے لیے یہی کافی تھا کہ میں خیریت سے تھا اور میرے گھر میں بھی خیریت ہی تھی۔ یہ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ چچا سیاف نے کھانے کا پوچھا لیکن بھائی کو بھوک نہیں تھی یا شاید مجھے دیکھ کر ختم ہوگئی تھی۔ انہوں نے قہوے اور خشک میووں سے تواضع کی۔ پھر ہم دونوں بھائی نم آنکھوں کے ساتھ باہر احاطے میں آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے..... میرے گھر والوں کو صرف چار دن

پہلے میرا خط ملا تھا۔ بھائی جان نے اسی وقت ارجنٹ پاسپورٹ بنوایا اور کل سہ پہر چار بجے کی فلائٹ بغداد کے لیے پکڑلی۔ وہ رات قریباً ایک بجے بغداد ائرپورٹ پر اترے تھے۔ وہ اکیلے تھے، انجان لوگ تھے۔ انجان زبان تھی۔ سیکیورٹی کا ماحول بڑا سخت تھا۔ ایک نیک دل پاکستانی نے ان کی پریشانی دیکھ کر ان کی مدد کی تھی اور یوں وہ بذریعہ ٹیکسی روضے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

ہم نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ بہت باتیں کیں لیکن بھائی کی مہربانی کہ انہوں نے مجھ سے وہ سوال نہیں پوچھے جن کے جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا اور ان میں سے سب سے اہم سوال یہی تھا کہ میں اپنی سہاگ رات میں سب کو روتا چھوڑ کر اچانک غائب کیوں ہوگیا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا اور اگر میں جواب دیتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم نے قریبی بازار سے ناشتا کیا اور واپسی کے پروگرام پر بات کی..... میں اس سے آگے کی باتوں کو تفصیل سے لکھوں گا تو یہ روداد بہت طویل ہوجائے گی..... مختصر یہ کہ ہم دونوں اس روز روضے سے رخصت ہوکر ایک اچھے ہوٹل میں پہنچ گئے۔ وقتِ رخصت روضے کے بہت سے خادموں نے مجھے بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا اور دعائیں دیں۔ چچا سیاف نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا۔ میں حضرت عالی مقام کی قدم بوسی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے راستے آسان کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر کہیں اوجھل ہوچکے تھے لیکن وہ کہیں بھی ہوتے میرے دل میں تھے۔ ان کی باتیں میرے سینے کو روشن کررہی تھیں۔ میرے پاس تھوڑی سی رقم تھی جو میں نے برے بھلے وقت کے لیے بچا کر رکھی ہوئی تھی، وہ میں نے روضے کے تین غریب خادموں میں بانٹ دی۔ یہ کوئی پچاس کے قریب عراقی دینار تھے۔ میں نے اس مقام پر بہت سخت دن بھی گزارے تھے لیکن جب میں بھائی کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوا تو مسجد اور روضے کے در و دیوار کو دیکھ کر دل بھر آیا۔

میرے پاکستان روانہ ہونے میں ایک دو قانونی الجھنیں تھیں لیکن اسی نیک دل پاکستانی نے ایک بار پھر ہماری مدد کی جو ائرپورٹ پر بھائی جان کا واقف بنا تھا۔ سیکیورٹی اور نگرانی کافی سخت تھی۔ صرف چند دن پہلے اسلام آباد ائرپورٹ پر عراقی سفارت خانے کے سامان میں سے کچھ اسلحہ برآمد ہوا تھا جس کی وجہ سے سفارتی سرگرمیاں متاثر ہوئی تھیں اور دونوں طرف ذرا کشیدگی کا ماحول تھا۔

بھائی نے ہوٹل سے ہی اپنے اس پاکستانی مددگار کو فون کیا اور اس سے کافی دیر تک باتیں کیں۔ اس نے تسلی دی کہ پریشانی کی بات نہیں وہ صبح تک سب ٹھیک کرلے گا۔ یہ شخص ائرپورٹ کا ہی ملازم تھا۔

وہ رات ہم نے اس آرام دہ ہوٹل میں گزاری۔ بھائی جان ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئے۔ انہیں جیسے یہ اندیشہ تھا کہ میں پھر کہیں ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجاؤں۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آرہا تھا اور انہیں یقیناً میری حالت پر آرہا ہوگا۔ اگلے روز ہم دونوں نے تھوڑی دیر بغداد کی سیر بھی کی۔ سیر کیا ہونا تھی، ہر وقت یہی دھڑکا لگا تھا کہ ائرپورٹ سے کیسے گزریں گے۔ آئندہ چوبیس گھنٹے میں کیا میں واقعی پاکستان پہنچنے والا تھا؟ اپنے گھر والوں کو اور اپنی بیوی کو دیکھنے والا تھا؟ یہ سوال بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ہم ایک پاکستانی کی دکان کے قریب سے گزرے تو وہاں ٹیپ ریکارڈر پر ایک کافی کے بول گونج رہے تھے۔ آواز بھی ریشماں جیسی کسی لوگ گلوکارہ ہی کی تھی۔ بول کچھ اس طرح تھے کہ اے خدا میں اپنے وعدوں کا پاس نہ رکھ سکا، اب شرم کے سمندر میں غرق ہوں..... بقول عالی مقام میری کہانی بھی تو ایک وعدے کی خلاف ورزی کی کہانی ہی تھی۔ وہ وعدہ جو میرے آباؤ اجداد میں سے کسی نے کیا اور اسے نبھایا مگر مجھ تک پہنچتے پہنچتے اس وعدے کی اہمیت بہت کم ہوگئی اور نتیجے میں مجھے ایک سزا بھگتنا پڑی، میں دیر تک اس کافی کے بولوں میں گم رہا۔

ائرپورٹ پر ہونے والی کاغذی کارروائی کے دوران میں میرا دل بری طرح دھڑکتا رہا۔ کسی بھی وقت کوئی پریشانی سامنے آسکتی تھی۔ مجھ میں اب اور تکلیف جھیلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بھائی جان بھی سخت تناؤ میں تھے۔ خدا خدا کرکے وہ گھڑی آئی جب ہم بورڈنگ کارڈز لے کر ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے۔ ہم نے عشا کی نماز پڑھی۔ میں نے رو رو کر خدا کا شکر ادا کیا جس نے بالآخر میری مشکلیں آسان کی تھیں۔ ہمارا جہاز فضاؤں میں بلند ہوا تو نیچے روشنیوں کا سمندر نظر آیا۔ یہ بغداد تھا۔ میری نشست کھڑکی کی طرف تھی۔ میں نے نیچے دیکھنا شروع کیا۔ مجھے دریائے دجلہ اور اس میں رواں کشتیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس دجلہ کے کنارے پر کہیں جعفر کا گھر بھی تھا۔ اس گھر میں معصوم صورت والی مہرو اور ابراہیم بھی رہتے تھے۔ پچھلے دو روز میں کئی بار میرے دل میں آیا تھا کہ رخصت ہونے سے پہلے ایک بار ان سے مل لوں لیکن سفر کی تیاری کے لیے وقت

بہت کم تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں نے آسمان کی بلندیوں سے ہی ان دونوں کو خدا حافظ کہا اور ان کو پُرمسرت زندگی کی دعائیں دیں۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ مہرو کی پکائی ہوئی بریانی ایک بار پھر میرے ہونٹوں تک نہیں پہنچ سکی تھی (آج میں نے ان کے گھر کھانا کھانے کا وعدہ کیا ہوا تھا) سچ کہتے ہیں کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔

ہمارا جہاز کچھ دیر کے لیے کویت میں رکا اور پھر وہاں سے دوبارہ پرواز کر کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ جوں جوں منزل قریب آتی گئی میری حالت خراب ہوتی گئی۔ دل جیسے سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا، مجھے کیسی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ مجھ سے کیا، کیا سوال پوچھے جائیں گے؟ میں عارفہ کا سامنا کیسے کروں گا؟ اپنے والدین سے کیسے معافی مانگوں گا..... بھائی جان جہاز کے اندر مجھے مسلسل تسلی دے رہے تھے۔ جب لاہور کے در و دیوار نظر آئے تو میں اپنے دکھ کو ضبط نہ کر سکا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بھائی جان نے مجھے گلے سے لگا کر حوصلہ دیا۔ وہ بولے۔ ''تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ تم سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ بے شک ایک غلطی ہوئی ہے لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی کوئی اس غلطی کا ذکر تک نہ کرے گا۔ تم اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ کبھی نہیں پوچھیں گے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ تم پھر سے ہمارے پاس ہو۔''

بھائی جان کی باتوں نے میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو کافی حد تک کم کر دیا..... ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی جب ہم لاہور ائرپورٹ پر اترے۔ گھر میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہم لاہور میں لینڈ کر چکے ہیں۔ بھائی جان نے ائرپورٹ سے فون پر اپنی آمد کی خوش خبری سنائی۔ ائرپورٹ سے چوبرجی پارک تک میں نے ٹیکسی میں جو سفر کیا وہ ایک مشکل ترین سفر تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور لگتا تھا کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ٹیکسی گھر کے سامنے پہنچی تو وہاں اہلِ خانہ کے علاوہ خاندان کے کئی افراد بھی جمع تھے۔ میں ان مناظر کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا اور نہ اس کیفیت کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں جو وہاں موجود تھی۔ میں جیسے صدیوں کا سفر طے کر کے اپنے پیاروں تک پہنچا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ رہے تھے، مجھے چوم رہے تھے، دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور میں بھی رو رہا تھا۔ پورا گھر آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میں اپنی ماں کے قدموں میں گر گیا۔ ''مجھے معاف کر دیں..... میں نے آپ کو بہت دکھ دیے..... آپ کی خوشیوں کو غارت کیا..... میں آپ کا مجرم ہوں۔''

ہر طرف سے جیسے ایک ''خاموش آواز'' ابھر رہی تھی اور چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دُلہا واپس آ گیا..... دُلہا واپس آ گیا۔

لوگوں کے ہجوم میں، میں نے اپنی دلہن کو بھی دیکھا۔ وہ اللہ کی بندی خاموشی سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے..... یہ آنسو کہہ رہے تھے..... میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی..... نہ ہی کچھ پوچھوں گی، تم بھی کچھ نہ بتانا۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم آ گئے ہو۔

☆☆☆

قارئین! ان واقعات کو اب قریباً چالیس برس گزر چکے ہیں۔ میری عمر 67 سال کے لگ بھگ ہے۔ میرے ماشاءاللہ تین بچے ہیں اور ان کے بھی بچے ہیں۔ میں ایک خوش و خرم زندگی گزار کر ریٹائرمنٹ کے دور میں پہنچ چکا ہوں۔ کافی عرصے سے میں بہت تبدیل ہو چکا ہوں۔ نماز روزے کی پابندی کرتا ہوں۔ چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی ہے۔ اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق صدقہ خیرات بھی کرتا ہوں، خاص طور سے ضرورت مند، مستحق لوگوں کو کھانا کھلانے سے مجھے بہت راحت ملتی ہے۔ اپنے بڑوں کی ہدایت کے مطابق اپنی طویل گمشدگی کے سلسلے میں میں نے اپنی زبان تقریباً بند ہی رکھی ہے۔ اس زبان بندی کی وجہ سے مختلف افواہیں بھی پھیلتی رہی ہیں۔ کسی نے کہا ہارون کو ہوائی چیزیں اٹھا کر لے گئی تھیں، کسی نے کہا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بغداد وغیرہ نہیں گیا تھا، یہیں کہیں چھپا ہوا تھا۔ کسی نے خیال ظاہر کیا، یہ شادی سے بھاگا ہے اور کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے کہا کہ اس کے بھائی جان اسے کراچی سے لے کر آئے تھے اور شاید کسی نے اسے اغوا کیا تھا۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں۔ جب کوئی بہت پوچھتا تو میں یہی بتاتا کہ مجھے کسی نے کوئی نشہ آور چیز کھلا دی اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا، میں نے خود کو کراچی میں پایا..... اور پھر اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ واپس آنے کے بجائے آگے جانا بہتر سمجھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں حقیقت بتاؤں گا اور ان واقعات کا ذکر کروں گا جو پیش آئے تو کوئی یقین نہیں

کرے گا۔ اسے میری دیوانگی کہا جائے گا۔ بہرحال اپنے طور پر میں گئے برسوں میں بہت سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔ اللہ والوں سے ملا ہوں، سائیکالوجسٹ اور پیراسائیکالوجسٹ سے بھی رجوع کیا ہے۔ روحانیت کے دعوے دار لوگوں سے بھی تبادلہ خیال کیا ہے لیکن آج چالیس سال گزرنے کے باوجود کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ وہ سب کیا تھا؟ کیا واقعی اس کائنات میں کچھ ہیولے ہمارے اردگرد موجود رہتے ہیں؟ کیا ایسے ہی ایک ہیولے نے مجھے شادی کی رات لاہور سے اٹھایا اور میرا پیچھا کرتے کرتے مجھے بغداد تک پہنچایا؟ جہاں مجھے ایک کہانی کو مکمل کرنا تھا۔ ایک مجبور شخص کے بے پناہ دکھ کا مداوا کرکے اسے اس کی بچھڑی محبت سے ملانا تھا۔ شاید جس طرح خود کھانا کھانے سے پہلے ایک فاقہ زدہ کو کھانا کھلایا جاتا ہے، اسی طرح قدرت نے میرے ذمے بھی یہ لگا دیا تھا کہ میں خود ازدواجی خوشیاں حاصل کرنے سے پہلے کسی دوسرے کو ان خوشیوں سے ہمکنار کروں..... اور اگر نہ کروں تو خود بھی انجانی سرزمینوں پر بھٹکتا رہوں..... اوپر والے کے رمز او پروالا ہی جانتا ہے۔

میں چالیس سال پہلے کے ان واقعات کو اپنے دل ودماغ سے کھرچ دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں دوبارہ کبھی ان کرداروں سے نہیں ملا جن سے اس ہولناک سفر میں میرا واسطہ پڑا تھا۔ فیروز خاں، جعفر، من موہنی صورت والی مہرو سچی محبت کی آگ میں کندن بننے والا ابراہیم، عطا صاحب، چچا سیاف..... میں نے کبھی کسی سے ملنے یا اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بغداد سے پرواز کرتے ہی ان سب کرداروں کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ دیا تھا۔ وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ ان کرداروں میں سے بھی کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ کرتے بھی کیسے؟ صرف رحیم یار خان والے امین کے سوا کسی کے پاس میرا اتا پتا نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ امین اس ہولناک رات میں، لانچ پر ہونے والی خونی جھڑپ میں زندہ نہیں بچ پایا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس نے کبھی نہ کبھی رابطہ ضرور کرنا تھا۔

آخر میں پھر وہی سوال کہ اس سفید پوش ہیولے کی حقیقت کیا تھی؟ کیا وہ صرف میرے ذہن کی پیداوار تھا یا سچ مچ... اس کا کوئی وجود تھا۔ اگر میں ایک پڑھا لکھا، روشن خیال شخص نہ ہوتا تو میرے لیے اس کے وجود پر یقین کرنا بالکل مشکل نہیں تھا لیکن میں اپنی سوچ کے انداز اور اپنے سائنٹیفک مزاج کا کیا کروں جو مجھے ہمیشہ ایک کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں کینیڈا سے آئے ایک معروف مذہبی اسکالر سے ملا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''قدرت نے ہمارے ذہن میں اتنی طاقت رکھی ہے کہ وہ کسی بھی سوچ کو ایک جیتی جاگتی ٹھوس شکل دے کر ہمارے سامنے لاسکتا ہے اور کسی بھی ٹھوس شکل کو سچ مچ ناپید کرسکتا ہے۔'' تو کیا وہ ہیولا بھی حقیقت اور خیال کے درمیان کی ایک شکل تھا اور ان سچائیوں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں ہمیں آنے والے دور کی سائنس بتائے گی؟

میں آخر میں ایک بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات پڑھنے والوں کو ضرور چونکائے گی اور کچھ سوچنے کی دعوت دے گی۔ میری کہانی کا آغاز شادی کی رات ہوا تھا۔ میں نے شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی دو محلے دار عورتوں کی زہریلی گفتگو سنی تھی۔ یہ گفتگو میرے بارے میں تھی۔ اس گفتگو نے میرے اندر کی ساری روشنیاں ایک دم بجھا دیں اور مجھے تاریکیوں کے سفر پر روانہ کردیا۔ بغداد سے واپس آنے کے دو تین دن بعد میں نے باتوں باتوں میں والدہ سے پوچھا۔ اور مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ وہ دو عورتیں تو شادی میں آئی ہی نہیں تھیں (ان میں سے ایک کا نام استانی فوزیہ اور دوسری کا آنٹی ممتاز تھا) وہ دونوں پڑوسنیں تھیں اور عین میری شادی کے دن ان دونوں کو ایک فوتگی میں گجرات جانا پڑا تھا۔

مجھے یقین نہیں آیا..... مجھے لگا شاید والدہ کو کوئی مغالطہ ہورہا ہے لیکن جب دیگر اہلِ خانہ نے بھی یہی بات بتائی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے ان دونوں آنٹیوں کو نہ صرف سنا تھا بلکہ دو تین بار انہیں اپنی برات میں دیکھا بھی تھا۔ مجھے ان کے کپڑوں کے رنگ تک یاد تھے..... بہرحال میں نے اس بارے میں بھی کسی سے بحث نہیں کی۔

اور اس سے بھی زیادہ پراسرار بات یہ ہے کہ ان دونوں آنٹیوں کو میرے علاوہ میری دلہن عارفہ نے بھی دیکھا اور باقاعدہ ان سے بات کی تھی۔

تاہم جب بعد میں ان عورتوں سے بات ہوئی اور انہوں نے خود کہا کہ وہ اس دن لاہور میں نہیں گجرات میں تھیں تو پھر میری بیوی نے بھی یہی سمجھا کہ اسے دھوکا ہوا تھا میرے لیے اس سلسلے میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا اور میں خاموش ہی رہا۔

اب ان باتوں کو کیا کہا جائے' اتفاق..... وہم..... ماورا یا پھر انسانی ذہن کی بے بسی۔ فیصلہ آپ کریں۔

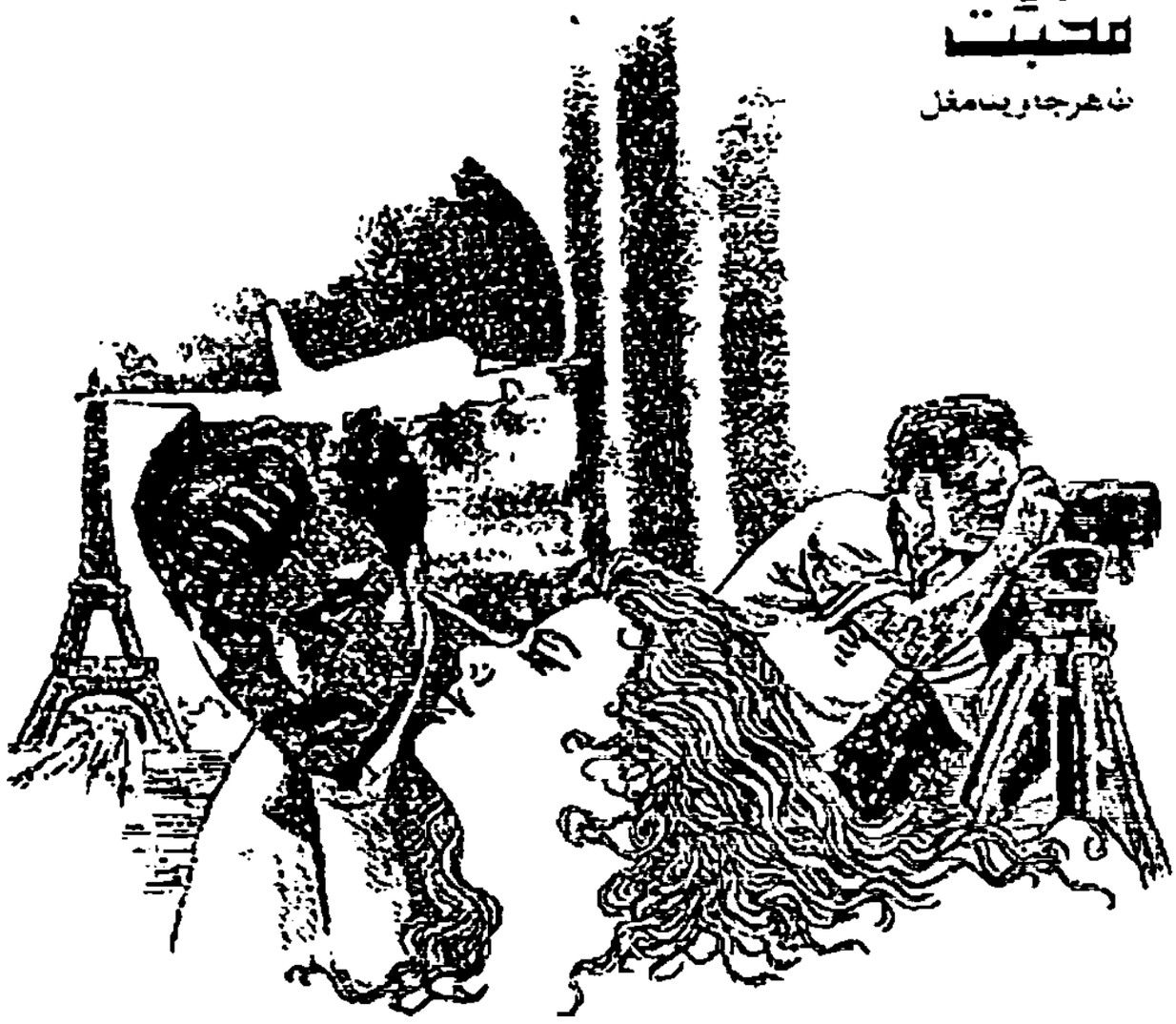
شہزادہ اعلیٰ نرمی پر بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شہزادہ اس شہر کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔
دیر اس کے سامنے تھا۔ محبتوں، خوشبوؤں، سرمستیوں اور شہزادہ اپنی محظر لیلیٰ کے ساتھ ابھی پہلی ہی
لازوال کہانیوں کا شہر — وہ اپنی سلیٹی آنکھیں رنگت کے آئی اے کی پرواز سے لاہور سے یہاں پہنچا تھا۔ سفر کیسا بھی
ساتھ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ہوٹل کی اس اونچی منزل سے ہو ہندے کوتھکاتا ضرور ہے۔ وہ سب بھی تھکے ہوئے تھے

جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان محبت

چاہت کے سہانے ہزم سفر اور تازک آبگینوں کی مانند ہوتے ہیں جنہیں ہمہ وقت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ہمیشہ کرچی کرچی ہو جاتے ہیں مگر یہاں تو حسد و رقابت کی ایسی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد و رقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی حاصل مراری کی لیے لوگ دنیا کیا گز نہ لینے ہیں اور کسی کو ذلت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کوئی کسر اٹھا رکھتے ہیں لیکن فطرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی اس نے بھی سوچا تھا کہ محبت کے جو سہانے اس کے ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسل چکے تھے ہوں انہیں دلکش صورتوں میں ڈھل کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوں گے — مگر جانتی کیوں اس بار اس کی آنکھیں شبنم کا نہ ہو سکیں۔ کہ یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہو سکیں۔ خوبصورتی کی سرزمین پیرس کی حسین وہ کہانیوں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان محبوب مصنف شاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی

شہرِ محبت

شاہر جاوید مغل





تھکن بھی جانے اور کچھ سستانے پھرنے سے پہلے وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتے تھے لیکن اس فسانوی شہر کی کشش اس قدر زیادہ تھی کہ شہزاد سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسے کھڑکی میں سے مشہور اعراف اور بے کے کنارے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ نیلے پانی پر چلتی ہوئی خوبصورت کشتیاں جو چھوٹوں سے لدی تھیں اور کناروں پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے لوگ اور ارد گرد کے سارے خوبصورت مناظر شہزاد کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اس کی بیوی کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔ "شہزاد ادھر آئیں ..... یہ دیکھیں۔"

وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس کی بیوی سوزم اور دونوں بچے کھڑکی سے لگے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

"وہ دیکھیں ابو..... وہ کیا ہے؟" شہزاد کے بڑے بیٹے بارہ سالہ سمیر نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہزاد نے اس طرف دھیان سے دیکھا۔ عمارتوں اور درختوں کے عقب سے ایک "چیز" نظر آ رہی تھی۔ ہاں یہ وہی عالمی مجسمہ تھا جو اس شہر کی رنگ کی پہچان ہے جسے دیکھنے کے لیے ہر سال دنیا سے لاکھوں کروڑوں لوگ دنیا بھر سے آتے ہیں۔ یہ ایفل ٹاور تھا۔ وہ ان سے قریباً آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ عمارتوں کے عقب سے بس اس کا بالائی حصہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چاروں مبہوت اسے دیکھتے رہے اور یہ یقین کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ایفل ٹاور واقعی ان کے سامنے ہے۔

اس کا چھوٹا بیٹا نو سالہ احسن مچل کر بولا۔ "ابو چلیں، ہمیں ٹاور پر لے کر چلیں۔"

شہزاد ہنسا۔ "بھئی یہ تو پیرس کا کافی مہنگا ٹکس ..... پہلے ہی دیکھ لیا تو باقی شہر کا کیا مزہ آئے گا۔ یہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں دیکھنے کی اتنی چیزیں ہیں کہ تم دیکھتے دیکھتے تھک جاؤ گے لیکن میرے بھائی! ابھی کھانا کھا کر ذرا آرام کر لیں پھر شام کو نکلیں گے اور رات گئے تک گھومیں گے۔"

"لیکن ہم تو بالکل تھکے ہوئے نہیں ہیں۔" سمیر نے کہا۔

"اس ہم میں تمہاری امی یقیناً شامل نہیں ہوں گی۔" شہزاد نے سوزم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سوزم مسکراتی ہوئی بیگ کے شیشے صاف کر کے بولی۔

"تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم لوگ جوان جہان ہو۔ دن اسنیپ چل سکتے ہیں۔ ہمیں رک رک کر چلنا پڑتا ہے۔ لنچ کر لو، تھوڑی دیر آرام کر کے دریا کی طرف نکلیں گے۔"

[illegible] سوزم سمیر اور احسن کو کھانے کا آرڈر دینے لگا اور شہزاد اکمل پھر کھڑکی کے سامنے آ بیٹھا۔ سمیر اور احسن اپنے کیمرے وغیرہ تیار کرنے لگے۔ شہزاد اکمل فائن آرٹ کا پروفیسر تھا۔ وہ پچھلے قریباً پندرہ سال سے پاکستان کی ایک نجی تکنیکی کمپنی سے منسلک تھا اور پرکشش مشاہرہ حاصل کر رہا تھا۔ پبلسٹی ڈیزائننگ کے شعبے میں شہزاد اکمل کا شمار ملک کے اچھے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف تھا اور اسے اپنے شعبے میں اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ ایک مقامی انسٹیٹیوشن کی خصوصی دعوت پر وہ پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ شروع میں فقط اسے ہی کانفرنس کا پروگرام تھا لیکن بعد میں بیوی اور دونوں بچے بھی اس پروگرام میں شامل ہو گئے اور یوں یہ پروگرام کام کے ساتھ ساتھ آرام اور تفریح کا پروگرام بھی بن گیا۔ بہرحال اس کے لیے شہزاد اکمل کو اپنے وسیع تعلقات کے باوجود کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ پاسپورٹ تو خیر پہلے سے بنے ہوئے تھے۔ ویزوں کے حصول میں کچھ دقت ہوئی تھی۔ ایک الجھن یہ بھی تھی کہ اتنے وقت پڑھائی کا حرج بچوں کی کرمائی تعطیلات سے بڑا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

بہرطور یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہوا تھا اور اب وہ دو ہفتے کے لیے پیرس میں قدم رنجہ فرما چکے تھے۔

کھانے کے سلسلے میں بیرونِ ملک قیام کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ شہر کا مسئلہ تھا کہ انہوں نے [illegible] قیام کیا تھا وہ ایک ترکش بستی تھی۔ انہوں نے سارا دن سفر اور آرام کے لیے بند کیے اور اب شام چھ بجے سے پہلے ان کی آنکھیں کھلنے والی تھیں۔ [illegible] احسن نے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ وہ [illegible] کے لیے تیار ہونے لگے۔ سوزم کی شکل دیکھتے ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آج اس کی آنکھوں میں پھر درد ہے اور شاید وہ ان کے ساتھ باہر بھی نہیں جا سکے گی۔ وہ خود بھی سوزم کے بغیر نہیں جانا چاہتے تھے لیکن بچوں کی خاطر [illegible] جانا تھا۔ شہزاد نے ہمیشہ کی طرح درمیانی راستہ اختیار کیا۔ سوزم کو دوائی وغیرہ کھلا کر اور ضروری ہدایات دے کر وہ بچوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

یہ پیرس کی ایک نہایت چمکیلی اور خوشگوار شام تھی۔ آسمان بالکل نیلا تھا، ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ یہ شہر کا وسطی حصہ نہیں تھا۔ دریائے سین کے کنارے یہ ایک طرح سے پیرس کا کشادہ اور پوش علاقہ تھا۔ شہر کی اصل آبادی ایفل ٹاور سمیت انہیں دور سے اپنی دائیں جانب نظر آتی تھی۔ وہ دریا کی ساتھ ساتھ چلتے گئے۔

دریائے سین کا تذکرہ شہزاد نے شاعری اور ادب میں

Scanned and Uploaded

ت پر تھا۔ انگریز کی تہذیب کے روحانی ماؤں میں بھی یہ
یا جگہ جگہ اپنی تمام خوبصورتی اور رومانیت کے ساتھ لہریں
انگڑائی لیتا تھا۔ آج وہ ایک حسین شام میں خود اس دریا کے
نارے موجود تھا۔ اس کے اندر کا رومانی شخص اس کے دل و
اغ میں خوبصورت مناظر کے تانے بانے بن رہا تھا مگر یہ
ب کچھ تصوراتی تھا۔ حقیقت ان تصورات سے بہت مختلف
ی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک اپاہج پچاس سالہ شخص تھا۔
ں کی تپشوں سے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کا جسم
ل رہا تھا۔ اس کے دو بچے تھے اور اس کی بیوی اپنی بانہوں
ے درد کے سبب چیریں آ کر کبھی ابھی تک چیریں سے دور تھی۔

اس نے گہری سانس لی۔ دریائے ٹیمز کی لہروں کو چھو
ر آنے والی بہت سی ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوئی۔

"اب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" عمیر نے شہزاد کے
ھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"یہی کچھ سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"جب آپ اس طرح لمبی سانس لیتے ہیں اور اپنی
کھوں کو تھوڑا سا سکیڑتے ہیں تو مجھے پتا چل جاتا ہے کہ
پ کچھ سوچ رہے ہیں۔"

"اور مجھے کیسے؟" احسن نے پنڈی کیم سے متعلق
چھتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں تو بڑے نفسیات دان ہو گئے ہو۔" شہزاد
نے کہا۔

"اچھا بتائیں آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"جو میں سوچ رہا ہوں وہ تمہیں نہیں بتا سکتا اور اگر
بتاؤں گا تو تمہیں پتہ نہیں چلے گا۔"

"لیکن پتا تو چلے آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"مستنصر حسین تارڑ کا نام سنا ہوا ہے آپ نے؟"

"وہ جو کرکٹ کے ریفری ہیں؟"

"دیکھو تمہاری دونوں باتیں غلط ہیں۔ ایک تو کرکٹ
میں ریفری نہیں ہوتا، دوسرے مستنصر حسین تارڑ ریفری و
امپائر وغیرہ نہیں ہیں۔"

"تو پھر کھلاڑی ہوں گے۔"

"کھلاڑی بھی نہیں۔ کم از کم ان معنوں میں نہیں جن
میں تم سمجھ رہے ہو۔"

"تو پھر کیا تھا انہوں نے جس کی وجہ سے آپ اب
انہیں یہاں یاد کر رہے ہیں؟"

"انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی "پیار کا پہلا شہر"
نہیں وہ پہلا تھا یا نہیں لیکن کتاب ضرور اچھی تھی۔ اس میں
دریائے سین کا ذکر تھا۔ اسی لیے ذہن اس طرف چلا گیا۔"

"لیکن ہو جان! شہر تو اینٹوں اور سیمنٹ وغیرہ سے بنتا
ہے ناں۔ پیار کے شہر کا کیا مطلب ہوا؟" عمیر نے نکتہ اٹھایا۔

"کچھ شہر اینٹوں اور سیمنٹ سے نہیں بنتے۔" شہزاد
نے عجیب لہجے میں کہا پھر عمیر کے اگلے سوال سے پہلے
لیے جلدی سے سامنے اشارہ کیا۔ "ارے وہ دیکھو۔۔۔ کیا
یزائن ہے۔"

واقعی پیارا تھا اور بڑی مناسب جگہ پر تھا۔ مذہب
یہ پر اس لیے کہ اس نے شہزاد کو عمیر کے اگلے کئی اتنے
یدھے سوالوں سے بچا لیا تھا۔ وہ پل پر پہنچے، یہاں سے
شہر کا دور دراز تک وسطی حصہ نظر آتا تھا۔ اس حصے میں بلند و
لا عمارتوں کی شان تھی جو نہایت بلند عمارتوں میں گھرا ہوا ہے۔
ابتدائی دور۔۔۔ کیسا فوٹو ہے ڈیم اور آزادی کے گیٹ کے
آثار بھی یہاں سے دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ چیریں میں آ کر بھی
ابھی چیریں کی اصل گہما گہمی سے دور تھے۔ ان کی حالت اس
دلہا کی سی تھی جو دلہن کو بیاہ کر گھر تو لا چکا ہو لیکن ابھی تک اس
کی صورت دیکھنے سے محروم ہو۔ وہ دریائے سین کے پل پر
گھومتے رہے۔ اردگرد کے مختلف علاقے دیکھتے
رہے۔ انہوں نے چیریں کی شام دیکھی تاہم چیریں اور شام
یک جا نہیں تھے۔ چیریں یا کہہ لیں کہ اصل چیریں ابھی ان سے
کافی فاصلے پر تھا۔

ایک مقامی فرانسیسی نے انگلش میں انہیں بتایا کہ یہ
علاقہ چیریں کے پوش علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ فرانسیسی صدر
کی رہائش گاہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

شہزاد نے مسکراتے ہوئے لہجے میں فرانسیسی سے کہا۔
"تو ٹھیک ہے جی پھر ہم ہوٹل واپس چلتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" فرانسیسی نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں قول ہے کہ بادشاہوں کے قریب

نئے افق

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی صرف آنے والی ڈاک صاف کر دی جاتی ہے تاکہ مشتہرین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں چاسوی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

دیتے ہیں بیشہ خطرات ہوتے ہیں۔"

فرانسیسی نے قہقہہ لگایا۔ "آپ نے اچھی بات کہی۔"

وہ دوبارہ پل پر سے گزرتے ہوئے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ پیرس کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ اردگرد کی عمارتوں سے پھوٹنے والی کرنیں دریا کے پانی میں منعکس ہو رہی تھیں۔ وہ ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شہزاد کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل میں کیا حیرت ناک صورت حال پیش آنے والی ہے۔

قریباً ایک گھنٹا پیدل چل کر وہ واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ اپنے سوئٹ میں داخل ہوئے۔ سوئم نے ان کا استقبال کیا۔ وہ بظاہر بالکل نارمل ہی نظر آئی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت چھپانے میں ہمیشہ کامیاب ہو جاتی تھی۔ شہزاد جانتا تھا کہ پچھلے دو گھنٹے میں وہ درجنوں بار فرزانہ دیکھ چکی ہے اور درجنوں بار کھڑکی میں آ کر ان کی واپسی کا انتظار کر چکی ہے۔

"میر جلدی سے ٹھنڈا پانی پلاؤ۔" شہزاد نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا۔

"میں لاتی ہوں۔"

"نہیں، تم بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی سیر کا حال سناتا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں سفرنامہ... یعنی دو گھنٹے کا سفرنامہ۔"

"جی..." وہ کچھ کھوئی کھوئی سی بولی۔ شال حسب معمول اس کی کمزور باہوں پر پھیلی ہوئی تھی اور جب پہلی بار شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ "معمول" کے مطابق نہیں ہے۔ شہزاد نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ آنکھیں جیسے کچھ چھپا نہ پا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ بتا بھی نہ پا رہی تھیں۔ شہزاد نے چونک کر اور گہری نگاہ دوڑائی۔ بظاہر سب کچھ "معمول" کے مطابق نظر آیا۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے؟" اس نے سوئم سے پوچھا۔

"ہاں جی۔" اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اور یہی وہ وقت تھا جب ایک دم بغلی دروازہ کھلا اور کئی افراد شور مچاتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں ایک مرد تھا، تین عورتیں اور ایک بچہ۔

"ویل کم ان دی ہوٹل۔" زبردست شور سے کمرا گونج اٹھا تھا۔

پھر ایک ستر، اٹھارہ سالہ لڑکی تیزی سے آگے آئی اور اس نے شہزاد کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ شہزاد اور دونوں بچے ہکا بکا تھے۔ ایک خاتون نے بڑھ کر اس میر کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ لڑکی نے احسن کو بازوؤں میں اٹھا لیا اور گول گول چکر لگانے لگی۔ تب شہزاد نے میر کو اپنے ساتھ لپٹائے والی خاتون کو غور سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ شہزاد نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ شہزاد کے بڑے ماموں کی بڑی بیٹی فرزانہ تھی۔ باقیوں میں سے کسی کا چہرہ اس کے لیے شناسا نہیں تھا لیکن یہ بات تو اب عیاں تھی کہ یہ سب فرزانہ کے فیملی ممبران تھے۔ فرزانہ کی فیملی سے شہزاد کی فیملی کے تعلقات عرصہ دراز سے اتار چڑھاؤ کا شکار چلے آ رہے تھے۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ فرزانہ اپنے میاں کے ساتھ یہیں کہیں ایسٹ پیرس میں مقیم ہے لیکن اس نے انہیں اپنی آمد کا بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا اور یہ یقین محکم تھا کہ پیرس میں دو ماہ رہنے کے باوجود وہ ان لوگوں سے ملے بغیر ہی واپس چلے جاتے لیکن جو کچھ آج ہوا یہ بالکل آناً فاناً تھا۔ ابھی انہیں پیرس میں اترے بمشکل چھ سات گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ ان لوگوں سے یہ پرتپاک دینے والی ملاقات ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ سلام کا بلا گما تھما تو سب لوگ ڈائننگ ٹیبل کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ شہزاد اپنی ماموں زاد فرزانہ کو آج قریباً آٹھ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر بھی اتنے سالوں کے قریب ہو چکی تھی تاہم جسم زیادہ موٹا نہیں ہوا تھا اور وہ اپنی عمر سے تین چار سال کم نظر آتی تھی۔ شہزاد کا تجربہ تھا کہ ترقی پذیر ملکوں کی بدباش عموماً لوگوں کی صحت پر اچھا اثر ہی ڈالتی ہے۔ وہ ماڈرن ازم کی رنگ خرافات سے محفوظ رہتی ہیں۔

فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شہزاد بھائی، آپ تو پیرس میں وارد ہوئے ہیں۔ آپ فرانس کے کسی... سراغ رساں قسم میں بھی ہوتے تو ہم پھر بھی آپ کو ڈھونڈ ہی لیتے۔"

"آپ لوگوں نے تو واقعی چکرا دیا۔" شہزاد حیرانی انداز میں ہنسا۔ "لیکن آپ کو پتا کیسے چلا؟"

"جیمز باغدہ وی سینٹ اور شراک ہو مر کو بھروں کا پتا کیسے چل جاتا ہے؟" فرزانہ کے ساتھ آنے والی تیسری نوجوان سانولی لڑکی نے بڑی ادا سے کہا اور سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

شہزاد نے لڑکی کو دیکھا اور تھوڑا تھوڑا پہچان لیا۔ یہ فرزانہ کی بیٹی تھی۔ "تم زارا ہو ناں؟" اس نے لڑکی کی طرف انگلی اٹھائی۔

"یس نیس انکل۔ اب میں زارا ریحان ہوں۔" وہ فرانسیسی لہجے میں اردو بول رہی تھی۔ "یہ میرے ہاؤس ہسبینڈ ریحان کاظمی۔"

شہزاد نے ایک بار پھر مسکراتے چہرے والے نوجوان سے ہاتھ ملایا۔ یقیناً وہ بھی پاکستانی تھا لیکن لب و لہجے اور اطوار سے اندازہ ہوتا تھا کہ طویل عرصے سے یہیں مقیم ہے۔

"اچھا، میں ایک ہی بار سب کا تعارف کرا دیتی ہوں

ہے۔" فرزانہ مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تو ہوں ہیں، یہ جنی تمہاری ماموں زاد جس کے ہاتھوں تم رنگے ہاتھوں لٹے گئے ہو۔ یہ ہے میری بڑی بیٹی زارا۔ یہ ہیں اس کے دیور ریحان کاظمی۔ انہوں نے یہاں ایم بی اے کیا ہے اور اب ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔ یہ ان کا بچہ ہے حمدان۔ ایک نمبر کا شریر ہے۔"

"اپنی خالہ کی طرح۔" زارا نے انیس، بیس سالہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر سب ہنسے۔ فرزانہ نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید اسے تم نے نہیں پہچانا۔ سات آٹھ سال پہلے یہ کافی چھوٹی تھی۔"

"اوہو، تو یہ آپ کی چھوٹی بیٹی ہے۔ کیا نام تھا اس کا۔" شہزاد نے پیشانی مسلی۔

"عینا۔" وہ خود ہی چہکی۔ "اور میرے نام کے ساتھ ابھی تک صرف پاپا جانی کا نام آتا ہے۔ میرا مطلب ہے ابھی تک صرف پاپا جانی ریحان، ڈیشنگ اور سلطان وغیرہ نہیں۔" وہ کمال بے تکلفی سے بولی۔ یہ وہی چنچل لڑکی تھی جس نے شہزاد کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

اب شہزاد نے پہلی بار پورے دھیان سے اس لڑکی کو دیکھا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے گہرے سیاہ تراشیدہ لبوں نے آگے کی طرف پھسل کر اس کا ایک تہائی چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ ہنستی اور مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اگر اس کے پان سارے چہرے کو چھپا بھی لیا جاتا اور صرف آنکھیں ہی دیکھی جاتیں تو کہا جا سکتا تھا کہ وہ بولنے اور مسکرانے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ان آنکھوں نے جیسے ایک ہی جھٹکے سے شہزاد کو کہیں کا نہیں پہنچایا۔ شہزاد وہاں ہر تو وہیں بیٹھا رہا لیکن حقیقت میں اب وہ وہاں نہیں رہا، کہیں اور پہنچ گیا۔ ایک عجیب سے دھند لکے میں۔ اس دھند لکے میں سے بہت سے جگنو لے بسرے مناظر برق کی طرح کوند کوند کر اپنی جھلک دکھانے لگے اور وہ عجیب ہونے لگے۔

فرزانہ بول رہی تھی اور شاید زارا بھی بول رہی تھی لیکن اب ان کی آوازیں غیر فیر لگ رہی تھیں اور یہ آوازیں شہزاد کو جیسے کچھ فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ فرزانہ اپنی چھوٹی بیٹی عینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اصل مجرم یہ تو نہیں ہے۔ ان نیٹ والی نے آپ لوگوں کا گھونٹ لگایا ہے اور پھر یہ کامیاب پتا بھی مارا ہے۔ اس کو اپنی کزن گوشی کی زبانی پتا چلا تھا کہ آپ لوگ پیرس آ رہے ہیں۔ بس اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ آپ سے ملنا ہے اور سرپرائز دینا ہے۔ دراصل پچھلے ایک مہینے سے اس کا رابطہ پاکستان میں گوشی سے تھا۔ گوشی کو آپ کے پروگرام کا پتا تھا پھر اس نے کسی طرح یہ بھی معلوم کر لیا کہ پیرس میں آپ کے ہوٹل کی بکنگ کون سی ہے۔ اس نے یہ اطلاع بذریعہ ای میل عینا کو پہنچا دی اور یوں جناب سر منڈواتے ہی آپ لوگوں کے سر پڑ لے یعنی ہم پڑ گئے۔"

"کمی! مجھے تو لگ رہا ہے کہ اصل مجرم فرار ہو گئے ہیں۔ ہم نے ڈمی لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" عینا چہکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" فرزانہ نے مصنوعی غصے سے بیٹی پر آنکھیں نکالیں۔

"اگلس شہزاد تو ہے نا پروفیسر ہیں ناں پر یہ صاحب جو سامنے بیٹھے ہیں کسی طرف سے بھی پروفیسر نہیں لگ رہے۔" پھر وہ شہزاد کی بیوی سے مخاطب ہوئی۔ "آنٹی جی، آپ کو یقین ہے ناں کہ یہ آپ کے شوہر ہی ہیں؟"

ایک بار پھر زوردار قہقہہ پڑا۔ سوئم پیشے ہوئے بولی۔ "تم نے تو مجھے بھی شک میں ڈال دیا ہے۔ اب تو رات ہو گئی ہے۔ سورج کی روشنی میں ذرا دھیان سے دیکھوں گی۔"

"تمہارے ذہن میں پروفیسر کا کیا Concept ہے بھئی؟" عینا کی بڑی بہن زارا نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو پاکستانی پروفیسر ایک اچھے اچھے سفید بالوں اور ڈھنگے ہوئے کندھوں والا بندہ ہونا چاہیے جس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی ہو۔ تھوڑی سی تو مدھم سی نظر آ رہی ہو۔۔۔ لیکن یہ تو بالکل الٹ دکھائی دیتے ہیں۔"

"یہ کیا دکھائی دیتے ہیں تمہیں؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے فلمی ہیرو آرٹسٹ لگ رہے ہیں۔ آپ نے کسی ڈرامے میں بھی کام کیا ہے انکل جی؟"

اس کی بات پر فرزانہ ہنس کر بولی۔ "اس کی باتوں کا برا نہ منانا شہزاد۔ یہ بڑی اوٹ پٹانگ ہے۔"

"ہاں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں اوٹ پٹانگ نہیں، میں صرف پٹانگ ہوں۔ اوٹ بانی ہیں۔ ہم دونوں اکیلی اکیلی کچھ بھی نہیں ہیں۔ ویسے آپ میری بات کو مذاق میں نہ لیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کسی پاکستانی یا انگلش فلمی سیریل میں دیکھا ہے۔ ہاں ہاں یاد آیا۔ ایک انگلش سیریل میں ایک بڑے اسمارٹ سے جج صاحب تھے۔ ان کو اس سیریل میں اتنی دھڑا دھڑ فلمیں آفر کی گئیں کہ ان کا کام ہی فلمیں کرنا رہ گیا حتیٰ کہ ان کے فیملی ممبرز بھی ان کو فلمی اداکار ہی

کہنے لگے۔"

شہزاد نے کہا۔ "کیا تمہارے بولنے کی عام رفتار یہی ہے یا تم نے آج کوئی خاص کیسٹ لگا رکھی ہے؟"

"او بھئی آپ تو شاید ناراض ہو گئے۔ ابو کے ساتھ میں تو ہر وقت ہی باتیں کرتا رہتا۔ عدالت کا وقت ختم ہوتا ہے تو میں گھر آ کر ان کی ایک ایک بات سنتا ہوں۔ ان کے بولنے کی ادا کاری کی اور دونوں پر انگلی رکھ کر فرزانہ کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ ہائر اسکول میں آخری گریڈ کی اسٹوڈنٹ ہے اور عنقریب یونیورسٹی کا سکون تباہ کرنے والی ہے۔

شہزاد نے ایک بار پھر اسے رحمان سے دیکھا۔ جسم میں پھر عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں حیران کن حد تک قاتل توجہ تھیں۔ اس کے چلبلے جسم پر یہ بولتی ہوئی آنکھیں بالکل علیحدہ سے دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اچھے قد اور جسم کی تھی مگر جب پاؤں صوفے کے اوپر رکھ کر اور سمٹ کر بیٹھی تو کمسن سی نظر آنے لگی۔

شہزاد، فرزانہ سے باتیں کرنے لگا اور وہ اسی طرح صوفے پر کہنی ٹکائے بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے کا انداز الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ یہ الجھن اس سنسنی خیزی کے علاوہ تھی جو اس لڑکی کو دیکھ کر شہزاد کے رگ و پے میں جاگی تھی۔ شہزاد کو اپنی کیفیت کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور منیر اور احسن کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف ہو گئی۔ وہ دونوں بھی جیسے تھوڑی ہی دیر میں اس کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ بچے تو دل کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وہ صرف دل کو دیکھتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ شہزاد کے بچوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں فیملیز میں کتنی دوریاں ہیں اور ماضی میں یہ دونوں گھرانے کس کس طرح ایک دوسرے سے دشمنی نبھاتے رہے ہیں۔

چھوٹا احسن اچانک بیٹا کے ریشمی بالوں سے کلپ کھینچ کر بھاگ گیا۔ وہ "اوئی ماں" کہتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔

فرزانہ مسکرائی۔ "بچوں کے ساتھ بالکل بچہ بن جاتی ہے، پر جب بھی سنجیدہ ہوتی ہے اور بڑوں میں بیٹھتی ہے تو بالکل اور طرح کی باتیں کرتی ہے۔ اگر یہ بھی میں بڑی اچھی اچھی کتابیں بھی پڑھتی ہے۔"

اس کی بڑی بہن زارا مسکرائی۔ "اور ہمیں یہ بڑی خوشی ہے کہ یہ انگریزی میں لکھتی ہے اگر یہ اردو شاعری کے پیچھے پڑ جاتی تو ہمارا کیا ہوتا لیتے۔"

سب ہنسنے لگے۔

"اس کے پاپا کیا کرتے ہیں؟"

"اب صبر شکر کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس نے جتنا بگڑنا تھا بگڑ چکی ہے۔" زارا نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"نہیں ان کا مطلب تھا کہ یہ کوئم کیا کرتے ہیں؟" شہزاد کی بیوی سونم نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

"دو سال پہلے دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔ اب جاب تو چھوڑ دی ہے۔ دو کال ٹاکسی خریدی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پارٹنر شپ ہے۔ اللہ کے فضل سے اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔" اچھی گزر بسر کہتے ہوئے فرزانہ کی گردن میں تھوڑا سا فاخرانہ تناؤ آ گیا۔

شہزاد کے اردگرد باتیں ہو رہی تھیں اور وہ یہ ساری باتیں سن بھی رہا تھا۔ کبھی کبھی اس گفتگو میں حصہ بھی لے رہا تھا لیکن ان سب لوگوں میں موجود ہونے کے باوجود وہ ان میں موجود نہیں تھا، وہ جیسے کہیں اور جا چکا تھا۔ وہ بہت پیچھے ماضی کے دھندلکوں میں۔ اس کے پردۂ تصور پر ایک فلم چلنے لگی تھی۔ کچھ مناظر ترتیب وار ابھرنے اور معدوم ہونے لگے تھے۔

وہ پلازا ٹاور تو وہیں تھا۔ بوٹل لوٹس کی چوتھی منزل پر اس سوئٹ نمبر 16 میں بیٹھا ہوا مگر حقیقت میں 28 سال پیچھے چلا گیا۔

لاہور میں نومبر کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ سب پنچھی آسمان پر کلیلیں بھرتے تھے اور رنگ برنگی پتنگیں فضا میں بھرتی تھیں۔ وہ اپنے ماموں جہانگیر کے گھر میں تھا۔ اپنی والدہ اور بہن عائشہ کے ساتھ وہ چار پانچ روز پہلے ہی بہاولپور سے یہاں پہنچا تھا۔ ان کا گھر بہاولپور کے ایک قریبی چک میں تھا۔ والد فرنیچر بنانے کا کام کرتے تھے۔ وہ اپنی دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور سب سے چھوٹا بھی۔ پڑھائی لکھائی کا شوق اسے بچپن سے تھا۔ ایک دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں رہنے اور غربت کے گھیرے میں ہونے کے باوجود اس نے ذہنی بھرپور کوشش کی تھی اور اپنی ایسی تیاری کی تھی لیکن حقیقت میں سائنس سے اس کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ وہ آرٹس کا طالب علم تھا۔ فوٹو گرافی اور ڈیزائننگ وغیرہ میں اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ انہی دنوں اس کی ملاقات نیشنل کالج آف فائن آرٹس کے ایک استاد سے ہوئی اور انہوں نے شہزاد کو مشورہ دیا کہ وہ یہ فن اختیار کرے۔

شہزاد کی کہانی کا لاہور میں آغاز ہی ہوتا تھا۔ ویسے بھی شہزاد کی والدہ بڑی خوددار خاتون تھیں۔ کئی دہائیاں مشکل

حالات کا شکار ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنے خوش حال بھائیوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اب بھی وہ شہزاد کے اصرار پر یہاں آئی تھیں۔ شہزاد اپنی تعلیم کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ملازمت کا خواہش مند بھی تھا تاکہ اپنے گھرانے پر معاشی بوجھ کم کر سکے اور یہ دونوں کام بہاولپور کے اس دور افتادہ پکٹ میں رہ کر نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ یہاں مرہون کے لیے آیا ہوا تھا۔ اسے دو تین ہفتے رہ کر واپس چلے جانا تھا۔

ماموں جہانگیر کی رہائش گاہ موسم ہاؤس کے احاطے سے ملحق تھی۔ ان کا تعلق کوں کے فریم وغیرہ بنانے کا کارخانہ تھا۔ شہزاد کے چھوٹے ماموں بھی اس کاروبار میں بڑے ماموں کے ساتھ شریک تھے۔ سب سے چھوٹے ماموں کسی دفتر میں ملازمت کرتے تھے اور الگ تھلگ رہتے تھے۔

بڑے ماموں جہانگیر کی منجھلی بیٹی نجمہ بچپن سے ہی شہزاد کو اچھی لگتی تھی۔ دونوں گھرانوں میں میل ملاقات چونکہ بہت کم تھی اس لیے یہ پسندیدگی بس پسندیدگی ہی رہی تھی۔ نجمہ اپنی تین بہنوں میں شکل و صورت کے لحاظ سے سب سے اچھی تھی۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے کی ملاحت اس کے لمبے گھنے بال اور آنکھوں کی چمک سب مل کر دیکھنے والوں کو مسحور کیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شہزاد نے نجمہ کو قریباً ڈھائی سال بعد دیکھا تھا۔ وہ شہزاد کو ایک دم بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔ اس کے بال پہلے سے لمبے اور گھنے ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی چمک میں ایک خاص طرح کی گہرائی آ گئی تھی۔ وہ ہلکے ہوئے کپڑے بھی اچھی لگتی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر ایسے رنگ بکھرتے تھے کہ نظر ہٹانا مشکل ہو جاتی تھی۔ اس کی عمر 20 سال کے قریب تھی جبکہ شہزاد 22 کا ہو چکا تھا۔ نومبر کی اس خوشگوار دوپہر میں وہ ماموں کے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور نیلے آسمان پر سفید کبوتر رنگ برنگی پتنگوں کے ساتھ مل کر اڑانیں بھر رہے تھے۔ وہ چار پانچ کزن مل کر لوڈو کھیل رہے تھے۔ نجمہ بھی ان میں شامل تھی۔ چاروں کھلاڑی اپنی اپنی باری کھیل رہے تھے لیکن نجمہ کی بار بار غیر محسوس طور پر شہزاد کے ساتھ تھی۔ شہزاد ایک گوٹی چلنے لگا تو وہ چلائی۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں ماموں کو رہنے دیں شہزاد۔ یہ تو گھر کے پاس پہنچ چکی ہے۔ آگے آئیں گے تو یہ پٹ ہو جائے گی۔"

فرزانہ خفگی سے بولی۔ "یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ تم خواہ مخواہ ہدایت کار کیوں بنی ہوئی ہو۔ اپنی اپنی چالیں کھیلو۔"

نجمہ اور فرزانہ کے چھوٹے بھائی سکندر نے جل کر کہا۔

"جب بھی کھیلتے ہیں ۔۔۔ یہ ایک دوسرے کے پارٹنر بن جاتے ہیں۔ یہ تو ظلم ہے۔"

"ہاں بھئی، پارٹنر بننا ہے تو پھر اعلانیہ بنو۔ ہم بھی پارٹنر بنتے ہیں۔" نجمہ کی منجھلی بہن نے کہا۔

"نہیں جی نہیں ۔۔۔ بس اب سے اپنی اپنی گیم۔" نجمہ نے حضرت کے انداز میں کہا اور کھیل پھر شروع ہو گیا۔

کچھ دیر بعد نجمہ کی ایک گوٹی شہزاد کے نشانے پر آ گئی۔ اس گوٹی کو پیٹ کر شہزاد کوئی فائدے میں رہتا لیکن نجمہ بے چاری کا بڑا نقصان ہوتا۔ اس نے نجمہ کی گوٹی کو نظر انداز کر کے ایک دوسری گوٹی چلنا چاہی تو گڈو خفا ہو کر بولی۔

"پھر بے ایمانی ۔۔۔ پھر بے ایمانی۔ نجمہ کی یہ گوٹی صاف پٹ رہی ہے۔ ہم آپ کو یہ دوسری گوٹی نہیں چلنے دیں گے۔"

"ہاں، ہاں نہیں چلنے دیں گے۔" سب نے ایک دم شور مچا دیا۔

شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو دوستو! اپنا نفع نقصان تم مجھ خود دیکھتے رہو۔ مجھے مناسب لگ رہا ہے کہ میں نجمہ کی گوٹی پٹنے کے چکر میں نہ پڑوں۔"

"نہیں، یہ بالکل فاؤل پلے ہے۔" گڈو نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ نجمہ کی گہری سہیلی تھی مگر ایسے معاملوں میں خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتی تھی۔

شہزاد نے بہت کوشش کی کہ اب نجمہ کی کوئی نہ پٹنے پڑے لیکن باقیوں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ مجبوراً شہزاد کو یہ ناپسندیدہ کام کرنا پڑا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر بعد اس نے بڑی خاموشی سے ایک بار پھر نجمہ کی قربانی کر دی۔ کھیل کی گرما گرمی میں کسی کو پتا نہیں چل سکا۔ نجمہ کی ایک پکی پکائی گوٹی شہزاد کی زد میں آ رہی تھی مگر شہزاد نے نظر بچا کر دوسری گوٹی چلا دی۔ نجمہ اور شہزاد کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ملیں۔ شہزاد کی اس چوری پر نجمہ کے چہرے پر خوبصورت رنگ بکھر گیا۔

کھیل کے دوران میں گوٹیاں چلاتے ہوئے اور دانے پکڑتے ہوئے کھلاڑیوں کی انگلیاں گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ شہزاد کی انگلیاں بھی ٹکرائی تھیں لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ نجمہ کو چھونے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ اب بھی جب وہ لوڈو کھیل رہے تھے شہزاد نجمہ کے ہاتھ سے دانے والی ڈبی پکڑتے ہوئے بہت محتاط رہتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی انگلیاں نجمہ کے ہاتھ سے نہ چھوئیں اور اگر کسی وقت ایسا ہو جاتا تو اس کے جسم میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بدلتی لہریں کی دوڑ جاتی تھیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا تھا؟ وہ اپنے اس رد عمل کو کبھی بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

وہ بڑے خوشگوار دن تھے۔ گھر میں ہر وقت ہی مذاق رہتا تھا۔ کوٹھی کے گراؤنڈ میں پر لطف کھیل ہوتے تھے۔ ہم شام کو ماموں جہانگیر کے گھر آتے ہی سب کو سامنے سوئمنگ پول میں دھکا دے دیتا تھا۔ وہ طبیعت کے سخت تھے، پیار بھی کرتے تھے لیکن ذرا سی بات پر بھڑک بھی اٹھتے تھے۔

انہی دنوں شب برات کا تہوار آ گیا۔ وہ یادگار تہوار تھا، چھٹیاں بھی تھیں۔ اس لیے کئی کزن جمع ہو گئے تھے۔ شہزاد کے یہ سارے چچیرے اور ممیرے بہن بھائی لاہور میں رہائش رکھتے تھے اور اس حوالے سے نسبتاً ماڈرن بھی تھے لیکن ان میں سے ایک دو کے سوا کوئی بھی تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا حتیٰ کہ ماموں جہانگیر کے چھ بچوں میں سے بھی کوئی گریجویٹ نہیں تھا۔ نجمہ بھی ان میں شامل تھی۔ اس نے ایف اے کیا تھا تاہم اپنے رکھ رکھاؤ اور اسٹائل سے وہ فیشن زیادہ پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ شہزاد بے شک ایک چھوٹے قصبے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اپنے اچھے تعلیمی کیریئر کے سبب اس نے کبھی بھی اپنے ان ماڈرن کزنز کے درمیان کسی طرح کا احساس کمتری محسوس نہیں کیا تھا۔ تعلیمی قابلیت کے علاوہ وہ شکل و صورت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ لمبا قد، سرخ و سپید رنگت، متوازن ناک نقشہ اور خوش لباس بھی تھا۔ کبھی کبھی جب سن گلاسز لگاتا تو ایک دم بہت رعب دار نظر آنے لگتا تھا۔

سب لڑکے لڑکیوں نے شب برات کو بڑے اچھے طریقے سے منانے کا پروگرام بنایا۔ بڑے اور منجھلے ماموں سے اس کی باقاعدہ اجازت لی گئی۔ شہزاد کے منجھلے ماموں بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ بالائی پورشن ان کے استعمال میں تھا۔ شب برات کے روز عزیز و اقارب کو ان پٹانے گئے، سب نے رنگ برنگ کپڑے پہنے، ہوائیاں چھوڑنے، انار اور پٹاخے وغیرہ چلانے کے لیے گھر کی چھت مخصوص کی گئی۔ جب سارے آتش بازی میں مصروف تھے اور چھت پر ہر طرف دھواں اور پٹاخوں کی پھلجھڑی ہو رہی تھی۔ نجمہ چھت کے دوسرے حصے میں موم بتیاں روشن کرنے میں مصروف تھی، وہ ایک بڑی موم بتیاں جلا کر چھت کی منڈیر پر ایستادہ کرتی جا رہی تھی۔ اس کی بولتی آنکھوں میں ان شمعوں کی روشنی منعکس ہوتی تھی تو لگتا تھا کہ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے ہیں۔ شہزاد خاموشی سے اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا اور موم بتیاں روشن کرنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

"تمہیں آتش بازی اچھی نہیں لگتی؟" شہزاد نے پوچھا۔

"نہیں شہزاد بھائی، یہ خطرناک کام ہے اور آپ کو؟"

"مجھے بھی نہیں لگتی۔"

"لیکن آپ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوائیاں چھوڑ رہے تھے۔"

"وہ تو بس ان سب کا ساتھ دے رہا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے یہ سب مجھے پیشہ ورانہ کا خطاب دینے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ اگر میں کسی کام میں نیچے رہ جاؤں تو فوراً ہتک آمیز باتیں شروع ہو جاتی ہے۔"

"ایسی باتوں کی پروا نہ کیا کریں۔ خوشبو کاغذ کے پھولوں سے نہیں آیا کرتی۔ انسان جو ہوتا ہے وہ نظر آتا ہے۔"

"میں تمہیں کیا نظر آتا ہوں۔" شہزاد نے کہا۔

نجمہ نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"تم مجھے مستقبل میں کیسا دیکھ رہی ہو؟"

"ایک دم کامیاب..... اور کسی اعلیٰ منصب پر۔ اپنی پڑھائی اور اپنے کام سے آپ کی جو لگن ہے وہ آپ کو ضرور اونچا لے جائے گی۔ یہ وقتی دشواریاں بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔"

گھروں کی منڈیروں پر دور تک شمعیں روشن تھیں۔ شہزاد کو لگا کہ یہ ساری امیدیں ہیں ایک دم ہی یہ شمعیں شہزاد کو زیادہ روشن لگنے لگیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی روشنی میں نجمہ کی نیک تمنائیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

اسی دوران میں اچانک ہی پٹاخے کی آوازیں سنائی دیں۔ برساتی کی طرف سے آگ کے شعلے نظر آئے۔ دراصل ایک بڑی ہوائی اوپر جانے کے بجائے افقی رخ پر چل گئی تھی اور سیدھی برساتی میں گھس گئی تھی۔ یہاں شہزاد کی چچیری بہنیں چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس ہی لالٹین وغیرہ پڑے تھے اور مٹی کے تیل کا چولہا بھی رکھا تھا۔ ہوائی برساتی میں گھسی تو ایک دم ہی برساتی کی اشیا نے آگ پکڑ لی۔ ان میں رسائی بھی تھیں، وہ ٹین سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان کے چارپائی سے اٹھتے اٹھتے ہی آگ نے انہیں لپیٹ میں لے لیا۔

یہ بڑے پُرخطر لمحات تھے۔ چند سیکنڈ کے لیے سب ہی ہکا بکا رہ گئے۔ یہی وقت تھا جب شہزاد چیختا ہوا برساتی کی طرف گیا۔ رسائی کی موٹی شال نے آگ پکڑ لی تھی اور وہ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں فرش پر گر گئی تھیں۔ شہزاد نے

Scanned

بلے مہانی کی شانیں کھینچ کر ان کے جسم سے علیحدہ کی پھر انہیں ہرا ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان لمحوں میں نجمہ کے بڑے بھائی ولید نے بھی دلیری کا ثبوت دیا اور ہمت ہار کی برساتی میں گھس آیا۔ انہوں نے مل کر مہانی کو باہر نکالا پھر باقی لوگ بھی مدد کو آ گئے۔ پانی وغیرہ پھینک کر برساتی کی آگ پر قابو پا لیا گیا۔ مہانی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ سوائے کپڑوں کی وجہ سے وہ بچ گئی تھیں۔ ہم انہیں باہر نکالنے کی کوشش میں شہزاد اور ولید کو زخم آئے تھے۔ شہزاد کا ایک بازو جل گیا تھا اور ولید کے ہاتھ بھی متاثر ہوئے تھے۔

مہانی جو کچھ دیر پہلے تک برساتی میں بیٹھی بڑے شوق سے آتش بازی دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔ اب آتش بازی کو اور آتش بازی کرنے والوں کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ ان کی یہ کایا پلٹ اتنی تیزی سے ہوئی تھی کہ سنگین صورت حال کے باوجود سارے لڑکے لڑکیاں چپکے چپکے مسکرانے لگے۔ مہانی کا خیال یہ بھی تھا کہ کسی بچے نے جان بوجھ کر ہوائی ان کی طرف چھوڑی ہے۔

یہ کچھ روز کی بات ہے۔ نجمہ کہیں سے ایک اسپورٹس میگزین لے آئی۔ یہ جلے پر لگانے کے لیے تھا۔ "اپنی آستین اوپر کرو شہزاد بھائی۔ میں آپ کو یہ آئنٹمنٹ لگا دوں۔" وہ کمرے میں ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

شہزاد نے آستین اوپر کی۔ وہ بڑی محویت سے مرہم لگانے میں مصروف ہوئی۔ اس کی انگلیوں کے لمس نے شہزاد کے رگ و پے میں پھر بجلی لہریں دوڑا دیں۔ نجمہ کے لمبے ریشمی بال بھسکل کو آگے آ گئے تھے کیونکہ وہ شہزاد کے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے یہ بال شہزاد کے دوسرے ہاتھ سے بس کرنے لگے۔ وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بھئی ساری ہمدردی مجھ پر ہی نچھاور نہ کر دو۔ ولید بھائی کا بھی تو ہاتھ جلا ہے۔"

"ان کو فرزانہ باجی نے لگا دی ہے اور ویسے بھی وہ تو گھر کے آدمی ہیں۔ ان کی خدمت میں کسر رہ جائے تو کوئی بات نہیں۔ آپ مہمان ہیں، کچھ ہاتھوں میں چلے جائیں گے۔ آپ نے کوئی بات محسوس کر لی تو ہم سوچتے ہی رہ جائیں گے۔"

"بڑا خیال ہے میرا۔"

"آپ کے اندازے سے بھی زیادہ، پوچھ سے پوچھیں۔ پچھلی مرتبہ جب آپ ان کے ساتھ نہیں آئے تھے تو میں نے کئی بار ان سے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟"

"بس یہی کہ آپ کیوں نہیں آئے؟ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔ آپ کتنے لمبے ہو گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

"تو بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی باتیں تھیں۔"

"تو پھر کیا پوچھتی؟" اس کی ساری توجہ شہزاد کے بازو کی طرف تھی۔

شہزاد چھیڑنے کے لہجے میں بولا۔ "یہ پوچھنا تھا کہ اس کی شادی وادی کب کر رہی ہیں، اس کے لیے کوئی لڑکی پسند کی یا نہیں؟ اور نہیں کی تو کیوں؟ وغیرہ وغیرہ۔"

وہ ایک دم اٹھی اور اس کے گالوں سے دانت دک گئے۔ وہ اپنے جھکے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ "یہ سوال پوچھ کے بجائے متعلقہ بندے سے بھی تو کیے جا سکتے ہیں۔"

شہزاد نے کچھ کہنا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح آواز اس کے ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے کہیں گم ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے کان تپ اٹھے ہیں۔

"بات تو، متعلقہ بندہ خاموش کیوں ہو گیا؟" وہ بدستور شوخ انداز میں بولی۔

شہزاد نے ہمت کر کے کہا۔ "متعلقہ بندے کے لیے اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے۔"

"اچھا، رہنے دیں۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ مہمانوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔" اس نے بڑی ادا سے موضوع بدلا اور بولی۔ "مرہم سے جلن تو نہیں ہو رہی؟"

"تھوڑی تھوڑی ہو رہی ہے۔"

"ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے کہا اور ہولے ہولے بازو پر پھونکیں مارنے لگی۔ اس کا ہاتھ نجمہ کے ہاتھ میں تھا اور یہ لمس اس کو بے حال کر رہا تھا۔

اتنی دیر میں ماموں جہانگیر وارد ہو گئے۔ ساتھ والے کمرے سے ان کی رعب دار آواز آئی۔

"نجمہ۔۔۔!"

شہزاد نے جلدی سے اپنا ہاتھ نجمہ کے ہاتھ سے علیحدہ کر لیا۔ نجمہ بھی ذرا ٹھٹک گئی۔ "یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" وہ ذرا غصے سے بولے۔ "باہر وہاں تمہاری ماں بلا رہی ہے تمہیں۔ ابھی تک آئے بھی نہیں کو ندھا ہے کسی نے۔"

"اچھا ابا جی۔" نجمہ نے کہا اور جلدی سے دوپٹا درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماموں نے شہزاد پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ ماتھے پر

ماموں کو ساتھ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا وجہ ہے تمہارے واپسی کی؟"

"کوشش کر رہا ہوں ماموں۔ دو چار دن میں پتا چل جائے گا۔"

"میں نے پہلے بھی پوچھا تھا، تم نے کہا تھا دو چار دن میں پتا چل جائے گا۔ شہروں کی زندگی بڑی تیز ہوتی ہے بھئی۔ اس کے ساتھ تیز رفتار سے چلنا پڑتا ہے بلکہ بھاگنا پڑتا ہے اور میں تو ویسے بھی یہی کہوں گا تم سے کہ وہیں بہاولپور یا ملتان وغیرہ میں تمہارا کام بن جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ملتان بھی سنا ہے کافی اچھا شہر ہے۔"

"لیکن ماموں وہاں اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے ماموں۔"

"چلو، جیسے بھی تم بہتر سمجھو۔" ماموں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا اور باہر چلے گئے۔

اگلے آٹھ دس روز بھی شہزاد کے لیے یادگار تھے۔ نجمہ اس کے اردگرد موجود تھی اور وہ اسے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ وقت تھے پروگرام بنتے تھے۔ شرارتیں ہوتی تھیں، کبھی کبھی کبھی پیٹ لوگ گھر، کبھی باہر کھانے کا پروگرام۔ شہزاد کی سنجیدگی کی وجہ سے چند ان چوکڑی کے دیگر اوقات اسے مزاحیہ انداز میں حضرت بھی کا خطاب دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی طنزیہ فقرہ بھی اس پر چسپاں کر دیا کرتے تھے لیکن وہ ان باتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔ وہ ہنسے دل کا مالک تھا۔ ان آٹھ دس دنوں میں اس نے غیر محسوس طور پر نجمہ کے ساتھ ایک عجیب سے تعلق کو پروان چڑھتے محسوس کیا۔ اب پتا نہیں تھا کہ نجمہ بھی اس تعلق کو محسوس کر رہی ہے یا نہیں۔

واپسی سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ شہزاد نے نجمہ کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

"دو منٹ کے لیے کمرے میں آؤ گی، تم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔"

"یہ لو، بھلا اس میں پوچھنے کی کیا آئی شہزاد بھائی۔" وہ بے تکلفی سے ہنسی اور احترا انداز میں میز صیاں پھلانگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ شہزاد اپنے کمرے میں اس کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ واپس آئی تو اس کی قریبی تھیلی گندہ آ دھمکی۔ اس نے نجمہ کو ایسا گھیرا کہ شہزاد دو گھنٹے تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا۔ گندہ جب بھی آتی تھی ایسے ہی لسوڑے کی طرح چمٹ جاتی تھی۔ جانے کا نام نہیں لیتی تھی اور نجمہ کے ساتھ تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ وہ دونوں کہیں کی سہیلیاں تھیں۔ گندہ کا گھر اسی لین میں بس ایک گھر چھوڑ کر تھا۔ وہ اپنی اپنی چھتوں سے بھی ایک دوسرے سے ہم کلام رہتی تھیں۔ جب بھی تو شہزاد کو نجمہ کی اس آفت جاں دوست سے رقابت محسوس ہونے لگتی تھی۔ سب سے پہلے ماموں کی بیٹی فاخرہ کو بھی گندہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی حالانکہ فاخرہ کی ہر لڑکی کے ساتھ دوستی تھی۔ (فاخرہ بچپن میں ایک حادثے کی وجہ سے جسمانی معذوری کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود سب کے ساتھ مل جل کر رہتی تھی) اس روز خدا خدا کر کے گندہ واپس اپنے گھر گئی اور نجمہ اپنے بالوں کو جھٹکے کی شکل میں باندھتی ہوئی شہزاد کے کمرے میں آئی۔

"جی جناب! کیا پوچھنا تھا آپ نے؟" وہ شوخی بھرے لہجے میں بولی۔

"پوچھنا تو کچھ اور تھا لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ گندہ جو ہے اس کا کوئی قرض وغیرہ تو نہیں دینا تمہیں؟"

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"بھئی ایسے تو پٹھان قرض خواہ اپنے قرض داروں کو ہم چھوڑتے ہیں۔ یہ تمہیں صرف دیکھنے کے لیے بھی آنے والے مہینے سے پہلے جان نہیں چھوڑنی۔"

"لیکن یہ یک طرفہ محبت نہیں ہے۔ میں بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔ ایک ہی تو سہیلی ہے میری۔" اس نے ادا سے کہا۔

"بڑی خوش قسمت ہے۔" شہزاد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ چونک کر شہزاد کی طرف دیکھنے لگی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "اچھا بھئی کیا پوچھنا تھا آپ نے؟"

"کچھ پوچھنا وچھنا کچھ نہیں تھا۔ بس شکریہ ادا کرنا تھا تمہارا۔"

"آئیں! کس بات کا شکر...؟"

"تم سب نے اور خاص طور سے تم نے اتنا خیال جو رکھا ہے میرا، اس کا۔"

"وہ آپ کی امی ہیں تو میری بھی پھوپھی ہیں اور آج آپ یہ غیروں والی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ آپ اپنے منہ سے شکریہ ادا نہیں کریں گے۔"

"اپنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" شہزاد نے جرأت کر کے اس کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھا۔

وہ گڑبڑا گئی۔ بات بدل کر بولی۔ "آپ نے الماری دیکھی ہے اپنی؟ یہ دیکھیں۔" اس نے الماری کے پٹ کھول دیے۔

الماری میں شہزاد کے سارے کپڑے استری شدہ

حالت میں جگمگا رہے تھے۔ انہیں اتنی محبت سے استعمال کیا گیا تھا کہ لگتا تھا ذرا سی کھینچ ہو کر آ جائے گی۔ شہزاد کے رومال، ٹائی اور جرابیں وغیرہ سب چھوٹا الماری میں موجود تھا۔ اس نے اپنے رخسار سے بالوں کی ریشمی لٹ ہٹا کر تعریف طلب نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔

شہزاد نے گہری سانس لی اور بولا۔ "اب پھر شکریہ ادا کروں گا تو تم اپنے پن کی بات کرو گی۔ بہتر ہے کہ پہلے میرے سوال کا جواب دے دو۔ اپنے پن سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

اس کے چہرے پر رنگ لہرائے۔ چور نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کھڑے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔ "میں آپ کے سوال کا جواب تب دوں گی جب آپ میرے سوال کا جواب دیں گے۔"

"کون سا سوال؟" شہزاد کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔

"یہی اس دن والا۔ متعلقہ بندے نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ان کے لیے کوئی لڑکی وغیرہ پسند ہوئی ہے یا نہیں۔ یا اس کو خود کوئی پسند آئی ہے یا نہیں۔" نجمہ کی بولتی آنکھوں میں غضب کی حیا آمیز شوخی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا اس کا جسم اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ایک خوش رنگ تصویر کے مانند نظر آتا تھا۔ وہ بے دھیانی میں اپنی ایک طویل لٹ کو بنائی بھی کیے کر رہی تھی۔

شہزاد کا جی چاہا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے کہہ ڈالے مگر اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی گونج میں اس کی بات کہیں دب جانے کا خدشہ تھا۔ اس نے کہا۔ "اچھا۔ میں شام کو بتاؤں گا جانے سے پہلے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"کل شام کو وہ منگنی کے لیے یہاں کمرے میں آؤ گی ناں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی دوران میں اس کے منجھلے بھائی شارق کی گونج دار آواز آئی۔ "نجمہ کہاں ہو؟"

"آئی بھائی۔" وہ ٹھٹک کر بولی اور جلدی سے باہر چلی گئی۔ ماں باپ جیسے تیسے کی طرح ان کے منجھلے بیٹے شارق کا بھی گھر میں کافی رعب داب تھا۔ شارق غیر معمولی حد تک سنجیدہ و متین تھا۔ گھر میں جو بھی ہنگامہ ہوتا تھا اور تفتیش جنتی تھیں، شارق ان سے دور ہی فاصلے پر رہتا تھا۔

اس روز نجمہ سے ملنے کے بعد شہزاد نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں جو دھیمی دھیمی آگ جل رہی ہے، اس کی حدت دوسری طرف بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ ایک بے نام کشش تھی جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے باندھ رہی تھی۔ ہاں یہ بات تھی کہ ابھی تک اقرار کا مرحلہ طے نہیں ہوا تھا۔

اس رات شہزاد نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ زیادہ دیر تک نجمہ سے بات نہیں کر سکے گا۔ آخر اس نے اسی ذریعہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، جو محبت کی آگ میں جلنے والے نوجوان مدتوں سے کرتے آئے ہیں۔ نامہ و پیام..... جس میں سب سے پہلی زبان ہو جاتا ہے اور روبرو ہونے کی نوبت بھی نہیں اٹھانا پڑتی۔ ان دنوں موبائل وغیرہ کا تو رواج نہیں تھا۔ لینڈ لائن بھی خال خال ہی ہوتے تھے۔ شہزاد نے دھڑکتے دل کے ساتھ نجمہ کے لیے ایک چھوٹا سا خط لکھا۔ یہ پانچ چھ سطروں کا "اظہار محبت" تھا۔

پروگرام کے مطابق شام کے وقت نجمہ کو اس کے کمرے میں آنا تھا۔ شہزاد کو بہت اچھا لگ رہا تھا کہ وہ اس سے زبانی کچھ کہنے کے بجائے یہ خط اس کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ لیکن شام کو جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ شہزاد کی ممانی کشور کی بڑی بیٹی اسید سے تھی۔ کسی بھی وقت کوئی خوشخبری آ سکتی تھی، یہ خوشخبری اس شام کو ہی "تشریف" لے آئی جب شہزاد وغیرہ کو یہاں سے واپس جانا تھا۔ بچے کی اطلاع کے ساتھ ہی ارد گرد کے رشتے دار یا فطار کر کے گھر میں آ گئے۔ ان میں زیادہ تر بچے کے ددھیالی تھے۔ شام سات بجے تک گھر کا نقشہ ہی بدل گیا جو شادی والے گھر کا ہوتا ہے۔ اب کہاں کی تنہائی اور کہاں کی ملاقات۔ شہزاد والے کمرے میں بھی بچوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے بار بار صحن اور برآمدے کی طرف دیکھتا تھا کہ شاید نجمہ چند لمحوں کا وقت نکال کر اس کی طرف آ جائے لیکن وہ بری طرح مصروفیات اور گہما گہمی میں گھری ہوئی تھی۔

ایک بار اس نے کوشش بھی کی۔ وہ مشائی والا تھال لیے شہزاد کے کمرے کی طرف آئی تو ہم راستے میں ہی کوئی ہر جن گھر بچوں نے اسے گھیر لیا پھر اس دوران میں شہزاد کی امی اور چچی ممانی بھی انوالی گفتگو کرتی ہوئی شہزاد والے کمرے میں آ گئیں۔

شہزاد دیکھتا رہا۔ اس کے سٹپٹائے ہوئے چہرے کو نجمہ نے ذرا شوخ نظروں سے دیکھا اور دوسری طرف چلی گئی۔

شہزاد و وغیرہ کی ٹرین کا وقت نو بجے تھا۔ ضروری تھا کہ وہ آٹھ بجے تک گھر سے نکل جائیں۔ شہزاد کا ماموں زاد سکندر خود اپنی گاڑی پر اسٹیشن چھوڑنے جا رہا تھا۔ انہیں

"خدا حافظ" کہنے لگے۔ بچوں کے اور گھر کی افراد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں نجمہ بھی تھی۔ آخری لمحوں میں ایک بار پھر ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ان بولتی ہوئی آنکھوں نے جیسے شہزاد کو کہا۔ تم نے کہہ لیا۔ لیکن جو تم کہنا چاہتے تھے وہ ابھی مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ ہم دعاؤں میں ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے اور ایک دوسرے کا انتظار کریں گے۔

☆☆☆

تقریباً پانچ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ گرمیوں کے آغاز میں شہزاد کو اس کی فیملی کو پھر بہاولپور سے لاہور آنا پڑا۔ اس مرتبہ وہ لوگ مستقل طور پر لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ شہزاد کی والدہ اور بہن کے علاوہ والد صاحب بھی آ گئے تھے۔ والد صاحب نے وہاں بہاولپور میں فرنیچر کا کارخانہ بند کر کے لاہور میں ایک چھوٹی سی دکان اور چند سو روپے ماہوار پر کرائے کا ایک مکان لے لیا۔ شہزاد کو لاہور کے ایک آرٹس کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ اس داخلے کے لیے مطلوبہ کوالیفکیشن ایف اے کی تھی لیکن اس نے بی اے پاس کر لیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ڈرائنگ کا شعبہ چن لیا تھا۔ یہ چار سال کا پروگرام تھا۔ ہم اس دوڑے سے بھی زیادہ خوش شہزاد کو اس بات کی تھی کہ والد کی وسیع القلبی کی بدولت وہ اپنے مطلب کے سوا تک اس کی رسائی بہ آسانی ہو سکتی تھی۔

شہزاد کو گھر بار سیٹ جمانے کے کرتے تین چار کھوسیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تاہم یہ تین چار کھوسیٹر تے تین چار قدم محسوس کرتے۔ وجہ یقیناً نجمہ ہی تھی۔ وہ کوئی بھی بہانہ یا موقع مجھ سے جانے نہیں دیتا تھا اور بتانا نہیں کی طرح اس کے گھر کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ نجمہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے ڈھیروں باتیں کرتے تھے مگر ابھی تک اظہار اور اقرار کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ (شاید ان دنوں پرائیویٹ بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی)

روزمرہ کی ایک سہانی شام تھی۔ وہی دھیمی دھیمی خنکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ سنہرے دھندلے حصوں کے ڈیرے پر دستے چائے کر کے فارغ ہوئے تھے۔ وہ سب لوگ جتنا کا دن ختم کر چکے تھے۔ دراصل بچھلے باسوں کا بیٹا چار تین سال بعد کویت سے آیا تھا۔ وہاں وہ ایک کمپنی کے ساتھ مل کر الیکٹریکل اسٹور چلاتا تھا۔ یہ پارٹی اس کے اعزاز میں دی جا رہی تھی۔ وہ ماں کو لمبی کار لے کر آیا تھا۔ بہت دیر تک بڑا گپ شپ کرنے کے بعد سب لوگ ٹولیوں کی شکل میں گھومنے پھرنے نکل گئے۔ شہزاد تھکا ہوا تھا، وہ وہیں سامان کے پاس بیٹھا رہا۔ فرائیڈ سٹرر ریڈیو پر ایک دلکش نغمہ چل رہا تھا۔ "بے کل رات گزاری ہے بے چین دن گزارا، جانے کس سے پریم نے تجھے ہارا۔"

موسیقی کی لہروں پر بہتے بہتے شہزاد اونگھنے لگا۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ ناک میں ہونے والی سرسراہٹ کے سبب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔ نجمہ اس کے سامنے دری پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں گھاس کا تنکا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ ہر طرف دھندلی روشنی ہو رہی تھی۔ تاہم وہ جس جگہ بیٹھے تھے وہاں ابھی تاریکی نہیں تھی۔

"تم واپس کیوں آ گئیں؟" شہزاد نے پوچھا۔

"نئی جوتی ہے، بڑی طرح کاٹنے لگی ہے۔" نجمہ نے اپنی گھائل ایڑی شہزاد کو دکھائی۔ ایک طرف سے ایڑی کا گوشت سرخ ہو رہا تھا۔

شہزاد کا دل بھر آیا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ شاید نجمہ کے واپس آنے کی وجہ وہ ہے۔ یہاں تو ایک معمولی سا واقعہ موجود تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"سوچ رہا ہوں، وہ سوال ابھی تک تمہارے ذہن میں اٹکا ہوا ہے جس کا جواب میں نے کہیں پچھلی دفعہ دیا تھا۔"

"نہیں، بالکل نہیں اٹکا ہوا۔ میں وہ ہوں پگلی ہوں۔"

"تین میں تو نہیں ہو؟"

"اگر ہو بھی تو پھر جواب دے دیجیے۔"

"تم بہانی ہو کہ مناسب وقت کی نہیں ہے۔"

"ہائے اللہ وہ کیسا مناسب وقت ہوگا، جو اس مناسب وقت کے لیے کوئی مہورت وغیرہ نکلوا رہے ہیں۔" وہ زور سے ہنسی اور اس کے ریشمی بالوں نے چہرے کی ایک طرف سے اس کا چہرہ چھپا لیا۔

شہزاد نے گہری سانس لی اور اپنے اعصاب کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "اچھا چلو بتاتا ہوں۔"

"فرمایئے۔" وہ بولی۔

"فرمائیں گا نہیں، سنوں گا۔"

"تو کہیے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی جذباتی لرزش تھی۔

دھندلکے پر ایک طرف سوچے کے بہت سے پھول پڑے تھے۔ شہزاد نے ان پھولوں کو گھاس پر ترتیب سے اس طرح ساتھ ساتھ رکھا کہ NAJMA لکھا گیا۔ ایسا کرتے

ہوئے اس نے خیال رکھا تھا کہ نجمہ دیکھ پائے۔ وہ نجمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے پوچھا تھا کہ میں نے شادی کے لیے کوئی لڑکی پسند کی ہے یا نہیں؟ اور کی ہے تو کون ہے؟ اس کا جواب میں نے لکھ دیا ہے۔"

"دکھائیں۔" اس کے لہجے میں حیا آمیز گھبراہٹ تھی۔

شہزاد نے تھوڑا سا پیچھے کھسک کر نجمہ کو خاص پرترتیب سے رکھے ہوئے پھول دیکھنے دیے۔

وہ گم صم ہی ہوگئی۔ شہزاد نے بہت غور کرکے اس کا چہرہ دیکھا۔ لیمپ تو کبھی کی بجھا دی گئی تھیں۔ چہرے پر شفق کے رنگ تھے جو تیرگی میں گھل مل گئے تھے۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ اس کی خاموشی ایک بہت وزنی بوجھ کی طرح شہزاد کو پیسنے لگی۔

"کوئی جواب نہیں دو گی؟" شہزاد نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"کیا جواب دوں؟" اس نے گہری سانس لی۔ آواز میں وہ لرزش بدستور موجود تھی جو جذبات کو ابھارتی تھی اور حوصلے کو بڑھاتی تھی۔

"کچھ بھی دو۔"

"میں بھی کچھ کردوں گی۔" وہ ایک دم نجمہ کی میں سے ابھری اور شوخ لہجے میں بولی۔

"اچھا کچھ کرتی دو۔"

"آپ کو... اسی طرح بیٹھے رہنا ہے۔ مڑ کر نہیں دیکھنا۔"

"کیا مطلب؟"

"بس کہا ہے ناں ایسی طرح بیٹھے رہیں۔"

وہ اٹھلا کر مکری ہوئی اور شہزاد کے عقب میں آئی۔ اس نے اپنی انگلی شہزاد کی کمر پر رکھی اور انگلی کے لمس سے شہزاد کو لکھنے لگی۔

شہزاد کے رگ و پے میں مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہا لیکن وہ الٹے قدموں اچھلتی ہوئی پیچھے جا چکی تھی۔ نیم تاریکی کے باوجود اس کے چہرے پر شفق کے شوخ رنگ دکھائی دیتے تھے پھر وہ تاریکی میں اوجھل ہوگئی۔

اس اظہار محبت کے بعد دونوں میں جھجک ہی پیدا ہوگئی۔ اب وہ سب کے سامنے بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ کسی نے اس تبدیلی کو جانچنے محسوس کیا یا نہیں مگر نجمہ کی بہت سی فرینڈ گڈ دے سمجھ گئی۔ اس نے نجمہ سے استفسار کیا اور نجمہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اب ایک طرح سے گڈ دان دونوں کی رازدار بھی بن گئی۔

نجمے ماموں طفیل کا نے پاکستان واپس آگیا تھا۔ اب وہ یہاں مستقل طور پر واپس آگیا تھا۔ اب وہ یہاں مستقل کے سائبان کی شاپ کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے ایف اے پاس کیا ہوا تھا یا شاید "الف اے" نے اسے پاس کیا ہوا تھا۔ بہرحال یہ تھوڑی بہت تعلیم بھی اس کو کچھ بنا نہیں سکی تھی۔ اچھے خاصے لباس اور بول چال سے خیر وہ نہ داری نظر آتا تھا۔ بڑے ماموں کا بیٹا شارق بھی چونکہ اسی مزاج کا تھا اس لیے اکثر دونوں اکٹھے ہی نظر آتے تھے۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ "الیکٹرک اسٹور" میں ساجھے دار بن رہے ہیں۔ شہزاد کو شک تھا کہ مجھلے ماموں اپنی دکان رشتہ نجمہ کی طرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک دن شہزاد نے اپنی والدہ سے اس بارے میں پوچھا۔ والدہ نے جو کچھ بتایا اس سے شہزاد کی فکرمندی ایک دم بڑھ گئی۔ والدہ نے کہا۔ "تمہیں ایک دفعہ بتایا تو تھا میں نے..... جس دن نجمہ پیدا ہوئی تھی، اس دن تیرنا ماموں کا فون نے کہا تھا کہ میں اسے اپنی بہو بناؤں گی۔"

"لیکن ایسی باتیں تو کبھی مذاق میں کہی جاتی ہیں امی۔ وہ کوئی وقت ہوتا ہے ایسی باتیں کرنے کا۔"

"ہاں وقت تو نہیں ہوتا لیکن کچھ لوگ بے وقت کہی ہوئی باتوں کو بھی گرہ میں باندھ کر رکھ لیتے ہیں۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ جب انہیں اس میں فائدہ بھی نظر آ رہا ہو۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ کیا وہ اب بارہ کا رشتہ نجمہ کی طرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"میں نے تو کہیں سنا ہے بلکہ مجھے تو یہ پتا چلا ہے کہ جاوید کو کویت سے بلایا ہی اس لیے گیا ہے تاکہ اس نام کو نبھا سکے۔"

شہزاد کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو یہ تو ظلم ہے جو زیادتی ہوں۔ جاوید انکل اور بک ڈھنگ کا لڑکا ہے، شکل صورت قد کاٹھ، پڑھائی لکھائی وہ کسی طرح بھی نجمہ کا ہم پلہ نہیں ہے۔"

"لیکن بیٹا! وقت یہ ہے کہ ایسے معاملوں میں سب سے خاص چیز جو دیکھی جاتی ہے وہ مرد کی خوشحالی ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی ہے لیکن جاوید کمارہا ہے اور پھر ایک بات یہ بھی ہے۔ تمہاری معلومات کی صورت بھی یہ رشتہ چھوڑ نہیں چاہتیں۔ قسمت ہی ہوگی وہ کسی سخت طبیعت کی ہے۔ جب کسی بات پر اڑ جائے تو پھر اڑ جاتی ہے۔ حقیقت میں تمہارے دونوں ماموں

ہی اس سے ڈرتے ہیں۔"

"یہ سب باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آرہا امی، جس رشتے کی بنیاد ہی ڈر اور خوف پر ہو اس میں سے کیا خیر برآمد ہو سکتی ہے اور..... اور اس کے علاوہ بھی کسی نے مجھ سے کبھی پوچھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟"

"لیکن شہزاد! تو اس معاملے میں کیوں اتنا پریشان ہو رہا ہے؟" ماں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"نہیں، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اگر ایک "بے اصولی" بندہ ہی ہو تو بندے کا دماغ سوچتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔"

والدہ کی نگاہیں ہر منظر بیٹے کے چہرے پر بھی رہیں۔

"شہزاد! تیرے اپنے دل میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے..... میرا مطلب ہے مجھ سے متعلق..... ؟"

"نن..... نہیں۔" وہ گڑبڑایا۔

"کسی ایسی بات کو دل میں جگہ بھی نہ دینا شہزاد۔ دوستی اور ان کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ہمیں ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ تیرے سامنے ابھی سارا راستہ ہے جینا۔ اپنی پڑھائی پوری کرنی ہے، ڈھنگ کی نوکری ڈھونڈنی ہے، سیٹل ہونا ہے، محبت کی فرصت داری ہے۔ دیکھنا جب وقت آئے گا میں تیرے لیے ایسی چاند سی لڑکی ڈھونڈ لاؤں گی کہ....."

"امی جی! آپ ہوتی کون ہیں مجھ سے کہنے والی ہیں۔" شہزاد نے بیزاری سے ان کی نصیحت کا دفاع کیا۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جس لڑکی کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہو کم از کم اس لڑکی سے تو پوچھ لینا چاہیے۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس کو پتا ہو؟"

"نہیں۔ اس کو کچھ پتا نہیں ہے امی۔" شہزاد نے زور دے کر کہا۔

والدہ نے ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا اور ہار مان گیا۔

اسی روز شام کو شہزاد، نجمہ کے گھر گیا۔ ابھی بچے، ماموں، شارق اور فیصل گھر نہیں آئے تھے۔ امتحانات ہو رہے تھے اس لیے باقی کزنز اور چھوٹے بچے بھی پڑھائی میں مصروف تھے۔ شہزاد چھت پر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری تھی۔ وہ اس کے ذریعے کزنز کے مرغیوں کو دانے ڈالنے لگا۔ اسی دوران میں نجمہ بھی اپنے بھتیجے کو اٹھائے چھت پر آگئی۔ وہ ایک چھوٹی سی چٹائی بچھانے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ شہزاد اور نجمہ باتیں بھی کرنے لگے۔ شہزاد اب تنہائی میں نجمہ کو پیار بھرے انداز میں سونم کہہ کر بلاتا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ نام کب اور کیسے پڑ گیا تھا۔ غالباً قربت کے لمحات میں اس نے نجمہ کو ایک دو بار سونو کہا تھا۔ پھر سونو سے سونم ہو گیا تھا۔ جس طرح شہزاد کو سونم کہہ کر اچھا لگتا تھا اسی طرح نجمہ کو سونم سن کر اچھا لگتا تھا۔ اس کے گال شبانی ہو جاتے تھے اور بولتی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھتے تھے۔

"سونم ایک بات بتاؤ گی سچی۔" شہزاد نے کہا۔

"پوچھیں۔" وہ بھی آج خلاف معمول سنجیدہ نظر آرہی تھی۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ..... چھوٹے ماموں، سہاگ کے لیے تمہاری بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں، کوئی گڑبڑ تو ہے۔" نجمہ نے ایک آہ کھینچی۔ "پرسوں بھی چچی ہماری طرف آئے ہوئے تھے۔ بند کمرے میں بات بھی ہوتی رہی ہے۔"

"تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"ابھی مجھے خود بھی ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔ ویسے بھی کئی دن سے آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"اگر کوئی ایسی بات سامنے آئی تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

"اس نے جھکی ہوئی پلکوں کے ساتھ کہا۔" میرے جواب کا آپ سے زیادہ کس کو پتا ہوگا..... چچی طبیعت کی بہت سخت ہیں۔ پتا نہیں وہ کیا کریں گی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے، کبھی کبھی چچا بھی ان کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن صرف اس وجہ سے کہ ممانی کلثوم سخت طبیعت کی ہیں اور وہ جھگڑا کریں گی تمہاری اور میری زندگی تو برباد نہیں کی جا سکتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے ایک دو بار امی سے چچا جانی کے بارے میں بات کی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کافی حد تک میری مرضی جان بھی گئی ہیں۔ وہ ابا جی سے اس بارے میں ضرور بات کریں گی۔"

"لگتا ہے کہ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہاری مرضی جلد از جلد ماموں ممانی پر واضح ہو جانی چاہیے۔"

"میں اندر سے بہت گھبرا رہی ہوں شہزاد۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ خاص طور سے ابا جی سے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

اس نے عجیب نظروں سے شہزاد کو دیکھا پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''آپ کو اس طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ کبھی موقع آیا تو بتادوں گی۔''

اسی دوران میں عرفی کی پتنگ نیچے گر گئی۔ وہ پتنگ لیے نیچے دوڑ گیا۔ اب چھت پر ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ شہزاد بڑے پیار بھرے انداز میں بولا۔ ''لو جی موقع آگیا ہے۔''

''کس چیز کا؟''

''پیار کی طاقت دکھانے کا۔'' اس کی نظروں میں تھوڑی سی شوخی در آئی۔

''آپ آرام سے بیٹھیں، برساتی کا دروازہ کھلا ہے۔''

''تو میں کون سا تمہارے ساتھ ''روگا'' گانا چاہتا ہوں۔ دو سیکنڈ کے لیے لیڈی تو ملی ہے۔''

اس کے چہرے پر شام کے سارے رنگ اتر آئے۔

''آرام سے رہیں... ابھی عید آنے میں ایک ہفتہ باقی ہے۔''

''بھئی پیشگی عید مبارک۔''

''یونہی کہا کرتے ہیں کہ پیشگی، ایڈوانس وغیرہ بالکل نہیں لینا چاہیے۔ یہ بڑی پریشانی والے کام ہوتے ہیں۔'' اس نے اٹھلا کر کہا اور ہاتھ جھٹک دیا۔

''چلو پیشگی نہ سہی، گزشتہ ہی سہی، چھوٹی عید پر بھی کب ملے تھے ہم۔'' شہزاد بھی آج خواب ''سول کھلنڈرے'' موڈ میں آگیا تھا۔

''وہ پرانی بات ہو چکی ہے۔'' وہ دور ہٹ کر ہنسی۔

شہزاد نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ وہ سمٹ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تاہم انداز میں نیم آمادگی تھی۔ بس یہی چھوٹی چھوٹی قربتیں تھیں، جو ان کی محبت کی گاڑی کو ایندھن فراہم کر رہی تھیں۔

شہزاد نے نجمہ کو کندھوں سے تھاما، واقعی جب اچانک اسے محسوس ہوا کہ میٹر جیسوں کی لیم تا... کمی میں کوئی مایہ سا بچا ہے۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ نجمہ بھی چونک گئی تھی۔ اسے عرفی ہوتا تو وہ سیدھا چھت پر ہی آتا۔

''پتا نہیں کون تھا؟'' نجمہ نے ہراساں انداز میں کہا۔

''چلو تم نیچے چلی جاؤ۔'' شہزاد نے اسے مشورہ دیا۔ وہ چلی گئی تو وہ ٹوٹے کی کرسی پر بیٹھ کر مرغیوں کو باری باری دانے ڈالنے لگا۔

دس پندرہ منٹ خیریت سے گزر گئے تو شہزاد کو بھی کچھ تسلی ہوگئی۔ اس دوران میں عرفی اپنی پتنگ لے کر واپس آگیا تھا وہ اسے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں شہزاد بھی اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔ یہی وقت تھا جب آہٹ ہوئی اور چھت کی نیم تاریکی میں شہزاد کو نجمہ کا منجھلا بھائی شارق نظر آیا۔ ''ہیلو۔ شارق بھائی کیسے ہو؟'' شہزاد نے کہا۔

''ٹھیک۔'' شارق کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔ پھر وہ عرفی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''عرفی تم نیچے جاؤ، ہمیں بات کرنی ہے۔'' شارق کے لب و لہجے نے شہزاد کو بری طرح کھٹکا دیا۔ تمام اندیشے پھر اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے۔

عرفی نیچے چلا گیا تو شارق نے برساتی کے دروازے کو چھت کی طرف سے کنڈی چڑھا دی... وہ گھوم کر شہزاد کی طرف آیا اور عین اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولا۔ ''کیا سمجھتے ہو تم؟ یہاں سب اندھے ہیں، کسی کو کچھ نظر نہیں آرہا۔''

''م... میں سمجھا نہیں شارق؟'' شہزاد ہکلایا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ شام کی گہری ہوتی تاریکی میں شارق کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

شارق نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک وحشیانہ جھٹکے کے ساتھ اسے دیوار سے لگا دیا۔ پھنکار کر بولا۔ ''گھٹیا بندہ گھٹیا ہی ہوتا ہے، اس سے کسی اچھے کام کی امید رکھنی ہی نہیں چاہیے۔ تم جنگلی ہو... تم سب جنگلی ہو۔''

''شارق! تم ہوش میں تو ہو؟'' شہزاد نے اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی۔

''دیکھ شہزاد! اگر اب تو مجھے اپنے گھر کے آس پاس بھی نظر آیا ناں، تو میں تیری بہنیں تو نہ کر اور تجھے چارپائی پر ڈال کر تیرے باپ کے پاس پہنچاؤں گا۔ بس اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔'' اس نے ایک جھٹکا دینے کے بعد شہزاد کا گریبان چھوڑا اور برساتی کا دروازہ کھول ہوا نیچے چلا گیا۔

شہزاد کچھ دیر وہیں چھت پر کھڑا اپنے کشیدہ اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ ہوا دو آج بڑی شدت کے ساتھ چلا ہے وہ کافی عرصے سے اندر ہی اندر شارق کے دل میں پک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سیڑھیاں اتر اور بیٹھک میں سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد گھر سے باہر نکل آیا... اسے لگ رہا تھا کہ شاید اب وہ کبھی اس دہلیز پر قدم نہ رکھ سکے۔ اس کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

گھر آکر وہ پورے چوبیس گھنٹے تک اپنے کمرے میں بند رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا ہے... وہ اپنے گریبان کو مسلسل شارق کے ہاتھ میں محسوس کر رہا تھا اور اس کے کانوں میں جنگلی کا لفظ گونج رہا تھا۔ یہ لفظ شارق کی زبان پر اب آیا

Scanned And Uploaded

تھا لیکن شارق اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں یہ لفظ بہت دیر سے موجود تھا۔ وہ اعلیٰ تہذیب اور اخلاق میں ان سے پیچھے نہیں تھا بلکہ شاید کچھ آگے ہی تھا مگر وہ اپنے رویوں میں اسے دیہاتی گردانتے تھے۔ اسے اپنے سے کم تر سمجھتا اور اس بات کو جتانا ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔

دوسرے روز والدہ کے بار بار پوچھنے پر اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے ماں کے سامنے اقرار کیا کہ وہ اور نجمہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ دو روز پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بھی اس نے سب کچھ ماں کے گوش گزار کر دیا۔ والدہ کافی دیر گم صم رہیں۔ آخر انہوں نے کہا۔ "میں اسی بات سے ڈر رہی تھی شہزاد..... تمہیں تھوڑا تھوڑا سمجھانی بھی رہتی تھی۔ ماؤں سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا بیٹے۔"

"آپ جا کر بڑے ماموں سے نجمہ کا ہاتھ مانگیں امی۔" شہزاد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"وہ تو اب کرنا ہی ہوگا..... لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوگا شہزاد۔ ہزار ولا پڑے گا، تمہارا ماموں طفیل اور مامی آسانی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اور اپنے بڑے ماموں کی سخت طبیعت کو بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"وہ کتنی بھی سخت طبیعت کے ہیں لیکن انہیں اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کرنا ہوگی، وہ گائے بھینس نہیں ہے کہ جہاں جی چاہا باندھ دیا۔"

"ہمارے خاندان میں جو کچھ ہوتا ہے تمہیں پتا ہی ہے شہزاد۔"

"پر یہ لوگ تو اب ماڈرن بلکہ بہت ماڈرن بن چکے ہیں، خود کو نئی روشنی کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ ہر روایت کو توڑ رہے ہیں، پھر ان فرسودہ روایتوں کو کیوں نہیں توڑتے..... پیدا ہوتے ہی بچے کا رشتہ طے کر دینا، ہوش سنبھالنے سے ایک عمر پہلے بیٹی کی مرضی پوچھنا اور جائیداد کی خاطر بے جوڑ رشتے کرنا یہ کہاں کی نئی روشنی ہے۔ اس کی اجازت تو نئی روشنی دیتی ہے نہ پرانی روشنی اور نہ ہمارا مذہب۔" شہزاد طیش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

والدہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں کچھ باتیں کہنی آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال میں کل جاؤں گی جہانگیر کی طرف۔"

والدہ، ماموں جہانگیر کی طرف گئیں اور دو دن وہاں رہیں۔ اس دوران میں شہزاد بڑی بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ تیسرے روز وہ پیر کو واپس آئیں تو ان کا چہرہ خوشہ دیوار کی طرح تھا۔ ان کی آنکھوں کی اداسی شہزاد کو غم والم کی ساری کہانی سنا رہی تھی۔ ماموں جہانگیر نہ صرف بے رخی سے پیش آئے تھے بلکہ انہوں نے صاف انکار بھی کر دیا تھا..... انہوں نے کہا تھا کہ کلثوم (شہزاد کی منجھلی بہن) نجمہ کا رشتہ بہت پہلے مانگ چکی ہے۔ اگر اب وہ اس رشتے سے انکار کریں گے تو سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔

اگلے روز والدہ ہی کی زبانی شہزاد کو یہ پتا بھی چل گیا کہ جہانگیر اور نجمہ کی منگنی کی تیاری ہو رہی ہے۔

شہزاد کا برا حال تھا، وہ کسی بھی طرح نجمہ سے ملنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ والدہ کے ساتھ بات چیت میں ماموں جہانگیر نے شارق اور شہزاد والی جھڑپ کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن یہ بات تو یقینی تھی کہ ماموں کو اس واقعے کا علم ہو چکا ہے اور نہ صرف وہ بلکہ پورا گھر بھی یقیناً آگاہ ہو چکا تھا۔ ایسی صورت حال میں نجمہ کے لیے گھر سے باہر نکلنا اور شہزاد سے ملنے کی کوشش کرنا نہایت دشوار کام تھا۔ نجمہ کے گھر فون موجود تھا۔ شہزاد نے "پی سی او" سے ایک دو بار ٹرائی کیا مگر ہر بار کسی اور نے ہی کال ریسیو کی۔ فون کامن روم میں ہوتا تھا اور گھر میں اتنے افراد اور اتنی چہل پہل تھی کہ نجمہ سے فون پر بات ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ بہرحال شہزاد نے اگلے تین چار روز میں کوشش جاری رکھی اور پھر ایک دن خوش قسمتی سے نجمہ کی آواز اس کے کانوں میں پڑ ہی گئی۔ اتفاقاً نجمہ کے اردگرد دو تین بچوں کے سوا کوئی اور موجود بھی نہیں تھا۔ شہزاد نے جلدی جلدی بات کی اور اسے بتایا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ بہت ہچکچائی ہوئی تھی، تاہم ان دونوں کے درمیان طے ہوا کہ وہ کل سہ پہر کو کینے میزان میں ملیں گے۔

شہزاد مقررہ وقت پر پہنچ گیا اور بے چینی سے نجمہ کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں کٹھن ہوتی ہیں اور شہزاد کے لیے کچھ زیادہ ہی کٹھن ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ ہر دو منٹ بعد گھڑی کی طرف دیکھتا تھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ سہ پہر، شام میں بدلی اور شام تاریکی میں لیکن نجمہ نہیں آئی، بڑی مایوسی کے عالم میں شہزاد نے اس کو فون کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سے بڑے ماموں کی بھاری بھرکم آواز آئی، "کون ہے؟" شہزاد نے فون بند کر دیا۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں، شاید نجمہ کے گھر میں کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ

وہ شہزاد سے ملنا چاہ رہی ہے۔ پھر کوئی اور بات ہو گئی تھی۔
وہ دو بجے تک فون پر کوشش کرتا رہا اور پھر دس بارہ روز بعد ایک دن پھر اپنے آفس میں اس کی بات نجمہ سے ہوئی۔ شکوے شکایات کا دور ہوا۔ شہزاد نے دکھی لہجے میں اسے بتایا کہ اس کے پچھلے دو ہفتے کس کرب کے عالم میں گزرے ہیں۔ وہ بھی رونے لگی۔ اس نے بتایا کہ سب لوگ ایک شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ وہ بیماری کا بہانہ کر کے نہیں گئی۔ وہ جس سے دل کی بات کرنی تھی کسی طرح فون پر اس سے بات ہو جاتی۔
"گھر میں اور کون ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔
"بس بھائی امید اور بھابی ہیں، لیکن وہ بھی اپنے کمرے میں ہیں۔"
"کیا تم کسی طرح باہر نکل سکتی ہو؟"
"یہ تو ناممکن ہے، ہاں ہم فون پر پندرہ بیس منٹ بات کر سکتے ہیں۔"
"ہاں اب کیا کر سکتے ہیں سوائے صبر کے۔" شہزاد کا لہجہ دکھی ہو گیا۔
"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میں آپ کے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" وہ سسک اٹھی۔
"تصور تو میں بھی نہیں کر سکتا لیکن کیا تصور نہ کرنے سے حقیقت بدل جائیں گے؟"
"تو پھر مجھے بتائیں میں کیا کروں، بھابی اور بھائی شارق وغیرہ سخت ہو گئے ہیں کہ میں آپ کو فون نہیں کر سکتی۔ خاص طور سے بھائی شارق۔ وہ اتنی بری باتیں کرتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ آپ کو۔۔۔ کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا دیں۔"
"تو یہ سب کچھ صرف چھت والے واقعے کی وجہ سے ہوا ہے، وہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں بس پاس پاس کھڑے تھے۔"
"نہیں شہزاد۔" اور وہ ہچکی دے کر بولی۔ "اندر ہی اندر یہ لاوا بہت دیر سے پک رہا تھا۔ ایک دو چھوٹی موٹی باتیں تب سے ہی تھیں لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ چکی ہے اب پتا چل رہا ہے کہ سجاد کو خاص طور پر اسی لیے کویت سے بلایا گیا ہے۔"
"تمہاری امی کیا کہتی ہیں؟"
"وہ بھی بڑی دکھی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ بھی سجاد کو پسند نہیں کرتیں لیکن ابا کے سامنے ان کی کوئی بات نہیں چل سکتی۔"
"اچھا تم اس دن وعدہ کرنے کے باوجود کیوں نہیں آئی تھیں؟"
"مجھے لگتا ہے شہزاد کہ کسی طرح بھائی شارق کو پتا چل گیا تھا یا شاید اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ دوپہر کو ہی گھر آ گئے۔ ممی اداسی سے کہانیاں خریدنے کے بہانے جا رہی تھیں انہوں نے مجھے خود ہی کہانیاں لانے کو دیں۔"
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا سونم کہ تم سجاد سے بات کرو اور اسے بتاؤ کہ تم دونوں خوش نہیں رہ سکتے ہو۔"
"شہزاد! آپ بھی اسے اچھی طرح جانتے ہیں، وہ اس نیچر کا بندہ نہیں ہے اور یہ کوئی اب کی بات نہیں، بچپن سے ہی ہر بات میں ضد کرنے کا ڈھیٹ ہے۔ آج کل اوٹ پٹانگ چیزیں کھا کر سیریس اور ڈرگز لیتا ہے اور سیریس کرنے کی کوشش کرتا ہے، کویت سے جو دوا وغیرہ لے کر آیا ہے اس کی بھی بڑی خوفناک ہے اس کو۔ کل امید بھائی کہہ رہے تھے، لگتا ہے کہ سجاد میں تو کسی شیطان کی روح گھس گئی ہے، ہر وقت وہ اور وہ چار کی باتیں کرتا رہتا ہے۔"
"امید بھائی کا کیا نظریہ ہے؟"
"وہ شارق بھائی سے بالکل مختلف سوچتے ہیں، مگر اپنی کے سامنے ان کا بس بھی نہیں چل سکتا۔ کل ابا نے اسی بات پر امی کو بھی بہت جھڑکا ہے۔ مجھے بند کمرے میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ امی نے مجھے بتایا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میری ہی بات ہو رہی تھی۔" نجمہ ایک بار پھر رو دی۔
"رونے سے مسئلہ نہیں بدلتی ہے سونم۔" شہزاد نے جذباتی لہجے میں کہا۔
"تو پھر میں کیا کروں۔ میں آپ کے سوا کسی اور کی دلہن نہیں بن سکتی۔ اس سے تو مجھے مرنا اچھا لگتا ہے۔"
"اگر ہماری محبت سچی ہے اور ہمارا ارادہ مضبوط ہے تو اوپر والا ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ بھی ضرور نکالے گا۔ حالات کا رخ دیکھو اور ساتھ ساتھ دعا کرو۔"
وہ بولی۔ "اگلے ہفتے کو امی اور شارق بھائی کو۔۔۔ دن کے لیے کراچی جانا ہے۔ سجاد بھی ساتھ ہوگا۔ وہ شاید جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے سامان وغیرہ لینے جا رہے ہیں۔ آپ مجھے کسی دوپہر کو فون کر سکتے ہیں۔"
اچانک نجمہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔ وہ بڑبڑائی۔ "میرا خیال ہے کہ سجاد اس طرف آ رہا ہے، اچھا ہفتے کو خدا حافظ۔" فون بند ہو گیا۔
شہزاد نے جمعے تک کا وقت بڑی مشکل سے کاٹا۔ یہ آخری دن اس کے لیے آٹھ دس مہینوں کی طرح تھے، آخر

فاصلہ اگر کے بیٹھ گئی دوپہر ہوئی اور شہزاد نے مختلف "پی سی او" سے نجمہ کو فون کرنا شروع کیا۔ فون لائن پر مسلسل انگیج کی ٹون جاری تھی۔ لگتا تھا کہ ریسیور ویسے ہی کریڈل سے ہٹا دیا گیا ہے۔ وہ ایک اور اذیت ناک شام تھی۔ جاں گسل انتظار کے بعد جب رات بھیگنے کی گھڑی آئی تھی تو ایک بار پھر سفاک نارسائی کا سامنا ہو گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شہزاد نے بڑے کرب سے سوچا۔ کیوں نجمہ جان بوجھ کر تو۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو خود ہی بڑی شدت سے رد کر دیا تو کیا پھر قدرت کوئی منظور نہیں تھا کہ ان کے لیے مناسب حالات پیدا ہوتیں۔ وہ ایک بار پھر غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔

اس واقعے کے صرف پانچ چھ روز بعد غم کے اس سمندر کی گہرائی کچھ اور بڑھ گئی۔ شہزاد کو پتا چلا کہ اتوار کے روز نجمہ اور سجاد کی منگنی ہو رہی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی گھریلو تقریب تھی جس میں چند افراد ہی مدعو تھے۔ شہزاد کی والدہ اور والد کو بھی بلایا گیا تھا۔ والد تو نہیں گئے، صرف والدہ گئیں اور زیادہ دیر نہ ہو، واپس آ گئیں۔ ان کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ واپسی پر راستے بھر روتی بھی رہی ہیں۔ ماں بیٹے میں بہت پیار تھا۔ ایک دوسرے کی چھوٹی سی تکلیف پر بھی دونوں تڑپ اٹھتے تھے۔ شہزاد کے والد صاحب الگ تھلگ اور خاموش طبع قسم کے شخص تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ ریٹائر ہو کر انہوں نے فرنیچر کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی تھی اور ایک کارپینٹر کو ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کی خاموش زندگی بس دکان سے گھر اور گھر سے دکان تک محدود تھی لیکن والدہ تو سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور محسوس کر رہی تھیں۔ بیٹے کے غم کا کوہِ گراں ان کے ناتواں جسم کو بھی پیستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

چند روز بعد ایک دن آخر شہزاد کو نجمہ سے ملنے کا موقع مل ہی گیا۔ پہلے فون پر ان کا رابطہ ہوا پھر ملاقات کی جگہ طے ہو گئی۔ وہ ایک نیم گرم شام کو کیفے میزان کے ایک سیلی کیبن میں تھے۔ آج شہزاد نے نجمہ کو تین چار ماہ بعد دیکھا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی اس کی طرح برابر دکھ کی آگ میں جلتی رہی ہے۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد تھا اور رخساروں کی ہڈیوں قدرے ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ہلکے رنگوں سے بنائی گئی ایک فسوں خیز پرکشش تصویر جیسی دکھائی دیتی تھی۔

وہ میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شہزاد نے ان کے دونوں سرد ہاتھ تھام لیے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی ہتھیلیوں کو کھینچ کر اپنے سینے کو لگا لے اور اپنے بازوؤں میں اس طرح چھپا لے کہ کوئی قیامت تک اسے ڈھونڈ نہ سکے۔ "شہزاد، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے بار بار انتظار کے زہر سے کیوں مار رہی ہو۔ پچھلی دفعہ کیا ہوا تھا۔ میں نے شام تک کوئی پچاس دفعہ تمہیں کال کی۔ تمہارا فون مسلسل انگیج جاتا رہا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس روز تم نے مجھے کتنی اذیت دی۔"

"کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا شہزاد۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ قدرت بھی ساتھ نہیں دے رہی۔ شارق بھائی کو... ابا جی اور سجاد کے ساتھ ہی کراچی جانا تھا لیکن وہ نہیں گئے۔ جمعہ کے روز وہ سارا دن گھر میں رہے۔ میں نے جان بوجھ کر فون کا تار نکال دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ بار بار فون کریں گے اور شارق بھائی کو شک ہو جائے گا۔ اس کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ ان کو کسی طرح کا شک ہو چکا تھا۔ اس روز شام کو انہوں نے مجھے اپنے پاس اٹھایا اور بڑے سخت لہجے میں اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے صاف کہا کہ میں ان کو بے خبر نہ سمجھوں۔ انہوں نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں نے آپ سے یا آپ نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ بات بڑی دور تک چلی جائے گی۔..."

اچانک شہزاد کو لگا کہ خون اس کی رگوں میں منجمد ہو رہا ہے۔ نجمہ سے بات کرتے کرتے اس کی نظر کیبن کے ریشمی پردے کی سائڈ سے گزر کر کیفے کی کھڑکی پر پڑی تھی۔ اس..... آدم کھڑکی کے پار سڑک کی چہل پہل نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ کار پارکنگ کا کچھ حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ شہزاد کو جو چیز نظر آئی تھی وہ بڑے سائز کی سرخ ٹویوٹا کار تھی۔ اس گاڑی میں شارق ایک اور شخص کے ساتھ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی کیفے کی پارکنگ میں گھڑی کر دی تھی اور اب وہ دروازے ان لاک کر رہے تھے۔

"کیا ہوا شہزاد؟" نجمہ نے شہزاد کی نظروں کا تعاقب کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"اٹھو نجمہ۔" شہزاد نے نجمہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میز پر بل کے پیسے رکھ کر کیبن سے باہر آ گیا۔

"بات کیا ہے شہزاد۔" نجمہ وحشت زدہ ہو کر بولی۔

شہزاد نے کوئی جواب نہیں دیا اور نجمہ کا ہاتھ پکڑے پکڑے ڈائننگ ہال کے شیشے کے دروازے کی طرف آ گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ دونوں ٹویوٹا سڑک پر تھے۔ "میرا خیال ہے کہ

شارق آرہا ہے، تم فوراً گھر چلی جاؤ۔'' شہزاد نے نجمہ کو ایک خفیہ راستا میں دھکیلتے ہوئے کہا۔

نجمہ کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ تاہم یہ بات تو وہ بھی سمجھ چکی تھی کہ یہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔ شہزاد کے اشارے پر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ نجمہ کے جانے کے بعد شہزاد بھی فوراً ایک ویگن میں سوار ہو گیا۔

اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کہ شارق کو کیسے خبر ہو گئی تھی۔ یہ امکان تو بعید از قیاس تھا کہ وہ اتفاقاً یہاں آیا ہوگا۔ گاڑی میں سے اس کے نکلنے کا عجلت آمیز انداز اور اس کے تاثرات سب گواہی دے رہے تھے کہ وہ ''بے خبری'' میں نہیں آیا ہے۔ کیا وہ نجمہ کا پیچھا کر رہا تھا؟ لیکن اگر پیچھا کر رہا ہوتا تو پھر نجمہ کے آنے کے فوراً بعد ہی آجاتا۔ وہ یہاں ویگن میں بیٹھے ہوئے دس پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ تو کیا پھر وہ پہلے سے جانتا تھا کہ نجمہ کہاں میدان میں جائے گی؟ شہزاد کو عجیب سنسنی سی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ کوئی ہے جسے نجمہ کے ساتھ اس کے رابطے کی پہلے سے خبر ہو چکی ہے اور وہ خبری کر رہا ہے۔ ایسا کون ہو سکتا ہے؟

تیزی سے چلتی ویگن میں شہزاد کا ذہن بھی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ یہ کوئی ہمراز ہی ہو سکتا تھا۔ شہزاد کا تو ایسا کوئی ہمراز نہیں تھا لیکن۔۔۔

اچانک شہزاد کے ذہن میں بجلی سی چمک گئی۔ اس کا دھیان نجمہ کی سب سے عزیز سہیلی گڈو کی طرف چلا گیا۔ شہزاد کو پتا تھا کہ نجمہ کچھ بھی گڈو سے چھپاتی نہیں ہے۔ تو کیا یہ سب کچھ۔۔۔ گڈو کر رہی تھی۔ اگر وہ کر رہی تھی تو کیوں؟

گھر آکر بھی شہزاد سخت پریشان رہا۔ دو تین بار دروازے پر دستک ہوئی اور ہر بار شہزاد کو یہی لگا کہ شارق تند بگولے کی طرح گھر میں داخل ہونے والا ہے اور سب کچھ تہس نہس کرنے والا ہے۔

دوسرے روز صبح تک تو خیریت ہی گزری۔ صبح دس بجے کے قریب جب شہزاد کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا تو بڑی سڑک تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گاڑی اس کے قریب رکی۔ یہ ایک ملیدڑا جیپ تھی۔ گاڑی کے اندر دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ شارق نہایت سرخ چہرے کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا کوئی دوست تھا۔

شارق نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''اندر بیٹھو، تم سے بات کرنی ہے۔''

شہزاد کو خطرے کا احساس تو ہوا لیکن نجانے کیوں وہ اندر بیٹھنے سے انکار نہ کر سکا۔ اپنے اندر صورتِ حال کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر کے وہ اندر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی شارق اگلی نشست سے اتر کر نیچے آیا اور شہزاد کے ساتھ ہی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

''چلو راجا۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص سے کہا۔

''کہاں جانا ہے شارق! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' شہزاد بولا۔

''مجھے پتا ہے، بڑے مصروف ہو تم۔ بس پانچ دس منٹ لوں گا۔'' شارق کا لہجہ زہر ناک تھا۔

گاڑی نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور گلشن کے نالے کے پل پر سے گزرتی ہوئی ایک چھوٹے سے پارک کی سنسان سڑک پر رک گئی۔ یہ دراصل ایک ویران ہاؤسنگ اسکیم تھی۔ ویران سڑکوں اور بجلی کے لیٹر ہے میٹر کے کھمبوں کے سوا یہاں اور کچھ نہیں تھا۔

شارق کا دوست راجا گاڑی سے باہر نکل کر۔ اندر پچھلی نشست پر شارق اور شہزاد بیٹھے رہ گئے۔ شارق کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر شہزاد کا گریبان پکڑ لیا اور وحشیانہ انداز میں جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''تجھے کہا تھا ناں، نجمہ کے آس پاس نظر نہ آ۔ تجھے کہا تھا ں؟''

''شارق، تم مجھ سے میری بات سنو۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ نہ ہی نجمہ۔۔۔''

''خبردار۔ خبردار۔۔۔ وہ پھٹکار۔۔۔ میری بہن کا نام اپنی گندی زبان پر نہ لانا۔ میں منہ توڑ دوں گا تمہارا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک زوردار گھونسہ شہزاد کے منہ پر مارا۔ شہزاد چکرا گیا اور اس کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔

ایک دم شہزاد میں اتنا حوصلہ نجانے کیسے پیدا ہو گیا۔ اس نے شارق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شارق! میں کوئی غلط نہیں کر رہا۔ میں نجمہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں۔۔۔''

''حرامزادے۔۔۔'' کہتے۔'' شارق پھر دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنی جیب کے نیچے گیا اور شہزاد نے اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول نکلتے دیکھا۔

شہزاد کا رنگ اڑ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ شارق اس حد تک چلا جائے گا۔ شارق نے پستول کی سرد نال شہزاد کی گردن میں گھسیڑ دی۔ وہ اس کے اوپر تقریباً سوار ہی ہو گیا

تھا..... ایک بار پھر زہریلا تک انداز میں پھنکارا۔ "میں نے تجھے کہا ہے میری بہن کا نام اپنی زبان پر نہ لانا۔ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ اسی جگہ خون کر دوں گا تیرا۔"

شہزاد کے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص جنون کا شکار ہے اور اس حالت میں یہ واقعی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس نے جواب دینے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ شارق نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔ "جنگلی! تو آخر باپ کی جنگلی اولاد ہے، پینٹ شرٹ پہننے اور کتابیں چاٹنے سے جانور انسان نہیں بن جاتا۔ میں تیرا وہ حال کروں گا کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔"

شہزاد نے اور تو بہت کچھ برداشت کیا تھا لیکن والد کی توہین برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے پستول کی پروا کیے بغیر اپنا پاؤں شارق کے پیٹ سے لگایا اور اسے ٹانگ کے زور سے اتنی شدت کے ساتھ دھکیلا کہ وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا گاڑی سے باہر جا گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شارق دوبارہ پستول پکڑ لیتا، شہزاد نے باہر نکل کر اسے جھپٹ لیا۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں اس کے اندر جتنی بھی تلخی و کڑواہٹ پیدا ہوئی تھی وہ ساری ایک دم غیظ و غضب میں ڈھل گئی۔ اسے چیلنج کا خطاب دینے والے طعنے کے جا بے کتنے بھی تیز تھے، جسمانی لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے چند سیکنڈ میں شارق کو دھنک کر رکھ دیا۔ "خبردار، میرے باپ کے بارے میں کچھ کہا تو... خبردار۔" وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

اس دوران میں شارق کا ساتھی عقب سے آیا۔ اس نے ایک اینٹ سے شہزاد کے سر پر ضرب لگائی۔ شہزاد گر گیا۔ وہ دونوں اس پر پل پڑے۔ شہزاد کے ناک منہ سے خون چھوٹنے لگا۔ اس دوران میں شہزاد نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر فاصلے سے کچھ افراد بھاگے ہوئے آ رہے ہیں۔ وہ غالباً شہزاد کی جان بچانا چاہتے تھے۔

یہ ہیرا ان کے پہنچنے سے پہلے ہی شارق اور راجا اسے دھکا مار کے پیچھے ہٹ گئے۔ شارق نے اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "اب چھوڑ رہا ہوں۔ اگلی بار نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے اور ہوا ہو گئے۔

چند راہگیر شہزاد کے پاس پہنچے۔ اسے اٹھنے میں مدد دی۔ "کیا ہوا تھا بھائی؟" کسی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس لین دین کا جھگڑا تھا۔" شہزاد نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔

ایک شخص اس کے کپڑے جھاڑنے لگا۔ دوسرے نے اس کا گرا ہوا عینک جو ٹوٹ گیا تھا، اٹھایا۔ وہ لوگوں کے سوالوں سے بچتا بچاتا بازار کی طرف چلا گیا۔ اس کے چہرے اور سر پر تو چوٹیں آئی ہی تھیں، کوئی بھاری چیز لگنے سے ایک کلائی پر بھی گہرا کٹ آیا تھا۔ یہاں اسپلنٹنگ وغیرہ کی ضرورت تھی۔ وہ رکشا میں بیٹھ کر قریبی کلینک کی طرف چلا گیا۔

وہ کالج سے فارغ ہو کر اپنے پارٹ ٹائم جاب پر جایا کرتا تھا اور وہاں سے اس کی واپسی رات کو نو دس بجے ہی ہوتی تھی، آج وہ دو گھنٹے بعد ہی گھر واپس آ گیا۔ والدہ ٹھٹک گئیں، پھر جب اس کا سوجا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ "ہائے میرا بچہ! یہ کیا ہوا ہائے میں مر گئی۔"

"کچھ نہیں امی! ان ویگن والوں کو آفت آئی ہوئی ہے۔ طوفان کی رفتار سے چلتے ہیں، سڑک کراس کر رہا تھا، یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہڈی پسلی بچ گئی۔"

سادہ لوح والدہ فوراً ہی ایکسیڈنٹ والی بات مان گئیں۔ ان کو دھیان پریشانی کے سبب کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ شہزاد کا ارادہ تھا کہ اگر شارق خود اس بات کو ظاہر نہیں کرے گا تو وہ بھی کسی کو نہیں بتائے گا لیکن شارق نے اس بات کو راز نہیں رکھا۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ واقعہ پورے خاندان میں مشہور ہو چکا تھا۔ بس اس میں سے یہ بات حذف کر دی گئی کہ شہزاد اور نجمہ کیفے میں ملے تھے۔ یہ کہا گیا کہ شہزاد بار بار نجمہ سے ملنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

شہزاد کو بھی سارا واقعہ گھر والوں کو بتانا پڑا۔ والدہ اور بہن عائشہ کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ شہزاد کے والد جو بہت خاموش طبع تھے یہ بات سن کر طیش میں آ گئے کہ شارق نے شہزاد کو اپنے دوست کے ساتھ مل کر مارا پیٹا ہے اور اس پر پستول تانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تھانے جا کر اس کی رپورٹ درج کرائیں گے۔ شہزاد اور اس کی والدہ اور بہن نے بڑی مشکل سے انہیں تھانے جانے سے روکا۔

دوسرے روز شام کو اطلاع ملی کہ نجمہ اسپتال میں ہے۔

اس خبر نے شہزاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ پہلا خیال تو اس کے ذہن میں یہی آیا کہ شاید اپنے دیوانے پن میں شارق نے اس کو بھی مارا پیٹا ہے یا کسی طرح نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال بعد ازاں یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ ایک دوسرے رشتے دار کی زبانی پتا چلا کہ نجمہ کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ اس کا بلڈ پریشر اچانک خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا جس کے بعد اسے ایمرجنسی میں لے جانا پڑا۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا ہوگا یہ کوئی بات سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے سے شدید تناؤ میں تھی جب اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے بھائی نے شہزاد پر پستول نکالا ہے اور اسے زدوکوب کیا ہے تو وہ غیر معمولی طور پر ہیجان زدہ ہوگئی تھی۔

شہزاد کے منع کرنے کے باوجود اس کی امی اگلے روز نجمہ کی عیادت کرنے اسپتال چلی گئیں۔ عائشہ بھی اصرار کرکے ان کے ساتھ گئی۔ وہی ہوا جس کا شہزاد کو اندیشہ تھا۔ کسی اور نے تو خیر کوئی بات نہیں کی لیکن اسپتال کی راہداری میں شہزاد کی والدہ کی ملاقات ممانی کلثوم سے ہوگئی۔ ممانی کلثوم نے ان کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال کیے۔ گھر آکر والدہ نے تو کچھ نہیں بتایا مگر ان کی روئی روئی آنکھوں نے شہزاد کو غم ناک اشارے دے دیے۔

رات کو جب والدہ اور والد سو گئے تو شہزاد نے گریہ کرتی عائشہ سے پوچھا۔ عائشہ نے آنکھوں میں نمی لے کر بتایا۔ ''ممانی نے بڑی بدتمیزی کی ہے، کہا ہے کہ ہم اوپن لوگ ہیں۔ کتوں کے سپنے دیکھتے ہیں، ہمارا مذہب صرف پیسا ہے۔''

''امی نے کوئی جواب نہیں دیا؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''امی کا آپ کو پتا ہی ہے کہ سختی سے بات کرہی نہیں سکتیں اور ممانی کلثوم تو ایسی عورت ہیں کہ بڑوں بڑوں کو چپ کرا دیتی ہیں۔ امی نے انہیں کل سے بات کرنے کو کہا تو وہ تڑخ کر بولیں۔ ''ہم میں تمیز نہیں ہے۔ جس کے گھر میں نقب لگائی جارہی ہو وہ کیسے کرے گی... یہ تحمل تو تمہارے جیسوں کا اثاثہ ہوتا ہے' جنہوں نے میٹھی چھری بن کر جڑیں کاٹنی ہوتی ہیں۔ تم جڑیں کاٹنے والی ہو... اور تمہاری میٹھی چھری تمہارا وہ بیٹا ہے۔'' ممانی کلثوم نے آپ کے بارے میں بھی غلط سلط باتیں کہیں۔'' عائشہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

شہزاد نے چھوٹی بہن کا سر اپنے دائیں کندھے سے لگا کر اسے تسلی دی۔

شہزاد کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ حالات کو خراب کرنے میں نجمہ کی بیٹی گڈو ضرور کردار ادا کررہی ہے۔ یہ لڑکی شہزاد کو آغاز میں ہی اچھی نہیں لگی تھی۔ بہرحال بہت سے لمحے ایسے میں بیت گئی تھی لیکن اس مماثلت کے اندر ہی تھی کڑواہٹ بھی چھپی رہتی تھی۔ بار بار شہزاد کا دل چاہ رہا تھا کہ گڈو سے ایک بار ضرور ملے۔ گڈو بھی کام کررہی تھی اور وہ جس کالج میں پڑھتی تھی اس کا بھی شہزاد کو پتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ایک دوست سے موٹر سائیکل مستعار لی اور گڈو کے کالج پہنچ گیا۔ جو کچھ بھی تھا مگر بظاہر تو گڈو نجمہ کی سہیلی ہی تھی۔ وہ اس سے مل کر نجمہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شاید گڈو کو سمجھانا بھی چاہتا تھا۔

پہلے دن تو گڈو سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ وہ کالج ہی نہیں آئی تھی لیکن دوسرے دن نہ صرف گڈو سے ملاقات ہوگئی بلکہ ایک اہم انکشاف بھی ہوگیا۔ یہ سب کچھ اتفاقیہ تھا۔ بڑا حیرت انگیز تھا۔ چھٹی کے وقت گڈو اپنی سہیلیوں کے ساتھ نکلی۔ وہ ذرا آگے گئی تھی کہ ایک قیمتی کار اس کے پاس رکی۔ اس میں ممانی کلثوم کی بیٹی صبروز ڈرائیونگ کررہی تھی۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ صبروز بھی ایک قریبی کالج میں پڑھتی ہے تاہم یہ پتا نہیں تھا کہ یہ دونوں آپس میں ملتی بھی ہیں۔ دونوں بڑی بے تکلفی سے گپ شپ کرتی آگے چل دیں۔ شہزاد نے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا پیچھا شروع کردیا۔ راستے میں ایک جگہ کار رکی۔ یہ ایک سگنل سینٹر تھا (ان دنوں سگنل سینٹر بہت کم ہوتے تھے) سگنل سینٹر میں سے کچھ دیر بعد تینوں ممانی کلثوم برآمد ہوئیں اور وہ بھی کار میں آبیٹھیں۔ کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی مال روڈ کے ایک جوس کارنر پر رک گئی۔ کار کے اندر بیٹھے بیٹھے تینوں عورتوں نے مشروب پیا۔ ممانی کا گھر ان کے حلقے کے مطابق اونچا تھا۔ وہ جتنا بھی موٹاپا کم کرنے پر صرف کرتی تھیں اس سے کہیں زیادہ وہ مرغن کھانے میں لگاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ معاملہ بنوں کا تو تھا۔ تجسس کیوں شہزاد کی نگاہوں میں کچھ عرصہ پہلے کا منظر گھوم گیا جب شب برات کے موقع پر ہوائی ممانی نے کپڑوں میں چھپائی تھی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی ناکام کوشش کررہی تھیں۔

شہزاد ایک گہرے تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا اور حیران ہورہا تھا۔ وہ تحمل سے باتیں کررہی تھیں اور گاہے بگاہے کھلکھلا کر ہنستی تھیں اور یہ وہ وقت تھا جب نجمہ ابھی اسپتال سے ڈسچارج نہیں ہوئی تھی۔ حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ شہزاد نے ماموں جہانگیر کے گھر میں بھی کبھی ممانی کلثوم، ان کی بیٹی اور گڈو کو اتنی بے تکلفی سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں ممانی گڈو کے ساتھ ایسے ہی ملتی تھیں جیسے ایک پڑوسن سے ملا جاتا ہے۔ گڈو کی نسبت وہ صبروز کے ساتھ ہی کبھی پائی گئی تھی۔

شہزاد کی چھٹی حس نے گواہی دی کہ یہاں کوئی گڑبڑ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ خیال مزید پختہ ہوگیا کہ اب تک نجمہ اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے اس میں گڈو کا ہاتھ تھا اور گڈو کا تعلق ممانی کلثوم سے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ممانی پس پردہ رہ کر مسلسل اپنا کام دکھا رہی

ہیں۔۔۔ اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ شارق کی آتش مزاجی کی وجہ سے ممانی کا کام مزید آسان ہوا تھا اور اب شہزاد اور نجمہ ایک دوسرے سے نا آشنا جہور قبیلے پر کھڑے تھے۔

اچانک ہی ایک موٹر سائیکل شہزاد کے قریب آکر رکی شہزاد ٹھٹک گیا۔ اس پر پھوپھی ممانی کلثوم کا بیٹا فردوس سوار تھا۔ غالباً وہ بھی کہیں جا رہا تھا اور اپنی فوکسی کو جوں کا توں پر کھڑے دیکھ کر اس طرف آگیا تھا لیکن فوکسی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی نگاہ شہزاد پر پڑ گئی تھی۔ عام حالات میں شہزاد اپنے اس ماموں زاد کو دیکھتا تو اسے کیا پریشانی ہو سکتی تھی لیکن یہ موقع ہر گز مناسب نہیں تھا۔

"آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں شہزاد بھائی؟ کیا آپ کو جوس پلانے سے انکار کر دیا گیا ہے؟"

"نن نہیں۔۔۔ میں تو بس یونہی۔۔۔ میں دراصل۔۔۔ ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔"

"اور دوست آگیا ہے۔ یعنی میں۔۔۔ چلیں اب ان لوگوں پر چھاپا مارتے ہیں۔" فردوس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ تاہم لہجے میں تھوڑی سی چبھن بھی تھی۔ شاید بات شہزاد پر کچھ شبہ ہوا تھا۔

"نہیں یار! اب مجھے واپس جانا پڑے گا۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" شہزاد نے کہا اور سٹپٹایا ہوا سا موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔

اس کے ذہن میں مختلف اندیشے چٹخارے لے رہے تھے۔ فردوس کا اسے یوں دیکھنا نیک شگون نہیں تھا۔ گندو اور ممانی کلثوم کے گوجر کے حوالے سے بھی شہزاد کے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نجمہ اس کے سامنے ہو۔ دو دن سے ممانی کلثوم کی اس بے رحم سازش کے بارے میں سب کچھ بتانے کو تھا لیکن نجمہ تو اس سے بہت دور جا چکی تھی۔۔۔ ہاں تھکا ہارا ماں پا ہی تھی، اس نے ماں کو بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ جس وقت شہزاد اپنی والدہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ بیرونی دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ دستک کے انداز نے شہزاد کو چونکا دیا تھا۔ عائشہ نے دروازہ کھولا تو ممانی کلثوم آندھی کی طرح اندر داخل ہو گئیں۔ ممانی کلثوم کی سخت طبیعت سارے خاندان میں مشہور تھی اس وقت تو وہ بالکل شعلہ جوالا بنی ہوئی تھیں۔

انہوں نے سلام دعا کے بغیر ہی آتے کے ساتھ ہی چٹخارے شروع کر دیا۔ ان کا پہلا ہدف شہزاد تھا۔ شہزاد کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "کیا چاہتا ہے تو۔ کن چکروں میں ہے؟ اب کیا نیا چاند چڑھانا ہے تو نے؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"تجھے نہیں پتا تو کیا کر رہا ہے؟ ہماری لڑکیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ ہماری جاسوسیاں، تجسسیاں کر رہا ہے۔ ہمارا جینا حرام کر رہا ہے۔"

"میں نے کسی کی جاسوسی نہیں کی۔ یہ آپ لوگ ہیں جو سازشیں کر رہے ہیں۔ ہمیں خاندان سے کاٹنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔"

"اچھا میں سازشی ہوں؟ سازشی ہوگا تو، سازشی ہوگی تیری ماں، تیرا باپ۔ تیری رگوں میں خون ہی گندا ہے۔"

"ممانی! زبان سنبھال کر بات کریں۔ آپ عورت نہ ہوتیں تو میں آپ کو جواب دیتا۔"

"کیا کرلے گا تو میرا۔ مجھے گولی مار دے گا، لے مار گولی، باپ کا ہے تو مار گولی۔" وہ بپھری ہوئی شہزاد کی طرف بڑھیں اور دوپٹا تار کر دور پھینک دیا۔

شہزاد کی والدہ تڑپ کر ان دونوں کے درمیان آگئیں۔ "کلثوم۔۔۔ کلثوم۔۔۔ خدا کے لیے نہیں۔" انہوں نے ممانی کو روکنے کی کوشش کی۔ کہاں شہزاد کی دھان پان والدہ، کہاں گرانڈیل ممانی۔ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر پیچھے آگئیں۔ اچانک شہزاد نے محسوس کیا کہ اس کی والدہ لڑکھڑا سی گئی ہیں۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے انہوں نے ممانی کی آستین کا سہارا لیا۔ "امی جان۔" شہزاد چیخا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے والدہ کو سنبھالا مگر وہ اس کے ہاتھوں میں جھولتی چلی گئیں۔ ان کا رنگ بلدی جیسا ہو رہا تھا۔

"نے کچھ مروڑ رہی ہے۔ مروڑ ہی ہے چھاپا مٹی۔" ممانی کلثوم نے برزدہ سی کی۔

شہزاد والدہ کو بازوؤں میں اٹھا کر چارپائی پر لایا۔ عائشہ پانی لینے کے لیے دوڑی۔ والدہ کی پیشانی پسینے سے تر بتر ہو رہی تھی۔ یہ بارٹ اٹیک تھا۔ شہزاد ان کو ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ وہ مخصوص انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے سینے کو بیل کے مقام پر پمپ کرنے لگا۔ عائشہ پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ کچھ دیر بعد والدہ کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ تاہم ان کی سانس مسلسل غیر ہموار تھی۔ جس وقت دونوں بہن بھائی والدہ کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے، ممانی کلثوم خاموشی سے کھسک گئی تھیں۔

والدہ کی طبیعت میں ذرا سی بہتری تو آئی تھی لیکن انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانے کی ضرورت تھی۔

شہزاد نے تین چار منٹ کے اندر ٹیکسی کا انتظام کیا اور انہیں لے گیا۔ چار روز بعد اسپتال کے سی سی یو میں شہزاد کی والدہ کی طبیعت ایک دم پھر بگڑی اور اس سے پہلے کہ ان کے لیے کچھ کیا جا سکتا وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی حسرت لیے وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئیں۔

یہ بڑا جانکاہ صدمہ تھا۔ شہزاد کی والدہ بیمار تو پہلے سے تھیں لیکن ان کی فوری موت کا سبب وہ شدید "مین شن" بنی تھی جو ممانی کشوم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اپنی پیاری ماں کے ساتھ شہزاد کی وابستگی غیر معمولی تھی۔ وہ تین چار ماہ تک اس واقعے کے صدمے سے نکل نہیں سکا تھا۔ اس المناک واقعے کے سبب بڑے ماموں جہانگیر کے رویے میں بھی انیس بیس کی تبدیلی واقع ہوئی۔ بڑی ممانی کا جھکاؤ بھی سجاد والے رشتے کی طرف نہیں تھا اور نجمہ تو ظاہر ہے کہ اس رشتے کے حق میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اس رشتے کا دکھ ہی تو تھا جو اسے جھوب تن دکھی برف کی طرح پگھلاتا رہتا تھا۔ اب اس سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ گڈو اس کی سگی نہیں تھی بلکہ آستین کا سانپ تھی۔ نجمہ کے ساتھ اس کی "کہنی دوستی" کے پیچھے ممانی کشوم اور ان کی بیٹی صبروز کا ہاتھ تھا۔ وہ بے غیر محسوس طریقے سے گڈو کے ذریعے نجمہ پر نگاہ رکھتی رہی تھیں اور یہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں تھی۔ قریباً تین چار سال سے یہ چکر چلتا رہا تھا۔ اب گڈو کے ساتھ وہ اکیلا آمنے سامنے کر چکی تھی۔ چادر یوں لگ رہا تھا کہ سجاد کے ساتھ نجمہ کے رشتے کا معاملہ بھی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ گھریلو معاملات پر غور تمیں کسی نہ کسی صورت میں اثر انداز ضرور ہوتی ہیں۔ بڑی ممانی بھی اپنے خاوند پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ خاندان میں کچھ ایسی باتیں بھی کہی سنی جا رہی تھیں کہ شادیوں میں بچیوں کی خوشی مقدم رکھنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

کسی وقت شہزاد کے سینے میں آس کی مدھم سی لو جاگ اٹھتی تھی۔ وہ سوچتا تھا، شاید کسی طور حالات ان دونوں کے لیے تبدیل ہو جائیں۔ سجاد اور شارق نے بارہا شب و روز کی تھی لیکن اس کام میں انہیں متوقع کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شارق نے گوجرانوالہ میں بینکوں کے فریم بنانے کا کاروبار شروع کر لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو بھی واپس نہیں آتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں نجمہ بھی کچھ کھچے کھچے سانس لے رہی تھی۔

ایک دن شہزاد نے ہمت کر کے ماموں جہانگیر کے گھر فون کیا۔ بیٹی ممانی نے فون اٹھایا۔ شہزاد نے حال چال پوچھا۔ شہزاد کو ہمدردی سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر اس نے دبے دبے لہجے میں ممانی سے کہا کہ وہ نجمہ کی بات اس سے کرا دیں۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ممانی نے ہامی بھر لی۔ کچھ ہی دیر بعد شہزاد نے ریسیور پر نجمہ کی بھولی بسری آواز سنی۔ آج اس کی آواز میں بھی شہزاد کو امید کی مدھم لہریں محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ چچی کشوم کا ان کے ہاں آنا جانا اب بہت کم ہو گیا ہے۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہیں۔ نجمہ نے کہا۔ "چند دن پہلے چچا نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اس عورت کی وجہ سے ہماری بیٹی کی جان گئی ہے۔"

شہزاد نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی ہے نجمہ! رشتے کے معاملے میں ممانی اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہیں۔ اگر وہ چپ ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ چھوٹے ماموں کی طرح ماموں جہانگیر کو بھی اپنا مخالف کرنا نہیں چاہتیں۔ تھوڑا سا وقت مزید گزر گیا تو وہ پھر سے حالات کو اپنی مٹھی میں کر لیں گی۔"

"ویسے شہزاد! امی اپنی سی کوشش تو کر رہی ہیں۔ دعا کریں کہ ان کی کوشش کا کوئی اچھا نتیجہ نکل آئے۔ میں آپ کے لیے بڑی دکھی رہتی ہوں شہزاد۔ عائشہ کا بھی دھیان رہتا ہے، میں آپ دونوں بھائی کا غم بڑی شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ دونوں کی دل جوئی کے لیے اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں لیکن کچھ بس نہیں چلتا۔ آپ بھی مجھے معاف کر دینا۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی اصل قصوروار تو میں ہی ہوں۔"

"کوئی قصوروار نہیں ہے سونم اور مجھے پوری امید ہے کہ ہم نے حوصلہ نہ چھوڑا تو ہمارے لیے کوئی اچھا راستہ نکل آئے گا۔"

"کوئی وائے اچھا راستہ تو نکل آوے ہے۔" نجمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"فاخرہ آ گئی ہے۔"

فاخرہ سب سے چھوٹے ماموں کی بیٹی تھی جو پاؤں سے معذور تھی۔ فاخرہ تین سب سے بڑا پیار کرتے تھے۔ فاخرہ پیدائشی ایسی نہیں تھی۔ وہ سات آٹھ سال کی تھی جب سڑک پر اس کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ اس حادثے کے سبب نہ صرف اس کی ٹانگ کی ہڈی بری طرح ٹوٹ گئی بلکہ کمر پر بھی سنگین چوٹ آئی۔ کمر کی یہی چوٹ تھی جس نے کم عمری میں ہی اس کی دونوں ٹانگوں کو متاثر کر دیا تھا۔ یہ نیم مفلوج ٹانگیں پوری طرح نشوونما بھی نہ پا سکیں۔ فاخرہ درمیانی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ اگر وہ ٹھیک رہتی تو یقیناً کسی نہ کسی کا گھر بسانی

اور ایک نارمل زندگی گزارتی، لیکن اس حادثے نے اس کے جسم کو ہی نہیں زندگی کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ویسے وہ خوش گفتار تھی۔ اس نے جیسے تیسے "بی ایس سی" بھی کر لیا تھا۔ وہ خاندان کے تقریباً سب ہی افراد کی طرح شہزاد اور نجمہ کی محبت کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی۔ اور وہ ان دونوں کی زبردست خیر خواہ بھی تھی۔

وہ سیدھی ٹیلی فون پر آئی اور ہیلو ہائے کے بعد بولی۔ "شہزاد بھائی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں برادری کے مارے لڑکے لڑکیوں کی ایک یونین بنا رہی ہوں۔ یونین کے مارے لوگ ..... نہیں ..... نہیں آدھے لوگ ماموں جہانگیر کے اس عالیشان گھر کے سامنے دھرنا دیں گے اور شور کر کر کے ماموں کے ..... چاندی کی دیوار کو توڑ دو ..... پیار بھرا دل نہ توڑو اور جب تک ماموں آپ کے اور نجمہ کے رشتے کے لیے مان نہیں جاتے یہ سارے لوگ اپنی جگہ ڈٹے رہیں گے۔ بھیے ہوئے چنے کھا کر ٹھنڈا پانی پیتے رہیں گے لیکن اپنی جگہ سے ہٹیں گے نہیں۔"

"اچھا آئیڈیا ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "لیکن پہلے تم نے یونین کے سارے ممبر کبابا پھر ممبر آدھے کر دیے۔ باقی آدھے ممبر کیا کریں گے؟"

"وہ ممانی کلثوم کے دروازے کے سامنے دھرنا دیں گے، یہ لوگ گانا گائیں گے، جھوٹ بولے کوا کاٹے، کالے کوے سے ڈریو۔"

"تم اگر یونین بنانے کے بجائے صرف سچے دل سے دعا کرو تو سارا کام ہو جائے گا۔"

"دعا کے ساتھ ساتھ دوا بھی ضروری ہوتی ہے۔" وہ ہنسی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے لیے بھی دعا کے ساتھ ساتھ دوا کرنی پڑے گی۔" شہزاد نے کہا۔

"کس سلسلے میں؟"

"تمہاری شادی کے سلسلے میں۔"

اپنی باتوں پر لڑکیوں شرما جاتی ہیں لیکن فاخرہ شرمائی نہیں گھبرائی۔ وہ اپنے لیے ایک دم سے رحم سی ہو جاتی تھی اور کوئی اللہ کا بندہ اب رحم دیتا تھی۔ اس بار بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ ہنس کر بولی۔ "میری شادی ہو چکی ہے شہزاد بھائی۔"

"اوہو، بڑی گوری ہو تم۔ مجھے بتایا ہی نہیں۔ کب ہوئی شادی اور کس سے؟"

"ان سے۔" فاخرہ نے کہہ کر اپنی گڑیا کی جیسا کھیوں کو آپس میں ٹکرا کر شہزاد کو ان کی آواز سنائی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے فاخرہ۔" شہزاد نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ "شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں ماموں جہانگیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔

نجمہ نے جلدی سے ریسیور فاخرہ کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا شہزاد بھائی جان آ گئے ہیں۔ خدا حافظ۔"

☆☆☆

بے شک حالات میں مثبت تبدیلی آئی تھی۔ بڑے ماموں ایک دو دفعہ ممانی کے امرود شہزاد کے گھر بھی آئے۔ ایک دفعہ اسے موٹر سائیکل کی سوار کروا دیے۔ دوسری مرتبہ ملازمت کی سوار کروا دیے۔ شہزاد کو ڈپلوما حاصل کرنے سے پہلے ہی ایک معروف ایڈورٹائزنگ فرم میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس سب کے باوجود ایک ڈر سا شہزاد کے دل میں بیٹھا رہتا اور یہ ڈر کلثوم ممانی کی طرف سے تھا اور کسی حد تک شارق کی طرف سے بھی۔

.....قریباً دو ماہ اسی طرح گزرے اور پھر ایک روز وہ ہو گیا جس کا ڈر کسی آسیب کی طرح شہزاد کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس روز شہزاد اور عائشہ اپنے سب سے چھوٹے ماموں الو کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ماموں الو کی بیٹی فاخرہ کی سالگرہ تھی۔ وہ بے چاری 29 فروری کو پیدا ہوئی تھی۔ اس کی سالگرہ چار سال بعد آتی تھی، اس لیے ذرا اہتمام سے بھی منائی جاتی تھی۔ اس حوالے سے فاخرہ کہا کرتی تھی۔ "میری تقدیر لکھتے ہوئے اوپر والے کے قلم میں شاید تھوڑی سیاہی کم پڑ گئی تھی۔ اس لیے خوشیوں کے خانے میں اس نے سب کچھ تھوڑا تھوڑا لکھا۔ تھوڑا سا دادی کا پیار، اس لیے وہ دو جلدی دنیا سے چلی گئیں، تھوڑا سا کھیل کود، اس لیے ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئیں، تھوڑا سا بناؤ سنگار، اس لیے چہرہ بگڑ گیا، تھوڑی سے پڑھائی، اس لیے 29 فروری کو پیدا کر دیا۔"

بہرحال جو کچھ بھی تھا، ایک بات سے فاخرہ انکار نہیں کر سکتی تھی، اپنی تمام تر جسمانی خامیوں کے باوجود وہ ہر دلعزیز تھی، سب اس سے پیار کرتے تھے۔ ممکن ہے اس پیار کی گہرائی میں کہیں ترحم کا جذبہ بھی شامل ہو۔

سالگرہ کی اس تقریب میں دونوں بڑے ماموں اور ان کی فیملیز بھی شامل تھیں۔ نجمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ بڑے ماموں ممانی شہزاد کے ساتھ بڑے اچھے طریقے سے ملے۔ بڑے ماموں نے شہزاد کو باقاعدہ گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ عائشہ اور نجمہ بھی مل کر باتیں کرتی رہیں۔ شہزاد جانتا تھا کہ ممانی کلثوم کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔

بہرحال تابعداری طور پر ممانی کلثوم نے غرور کو سنبھالے رکھا۔ آگے بڑھ کر عائشہ اور شہزاد کے سر پر پیار دیا اور دو چار باتیں بھی کیں۔ پھپھی اس تقریب میں شہزاد کو ایک اور ننھا سا چہرہ بھی نظر آیا۔ یہ جانی بے بے تھیں۔ جانی بے بے کی عمر ستر سال سے اوپر تھی۔ دور پرے کی رشتے دار تو نہیں تھیں لیکن اس خاندان کے ساتھ ایک عرصے سے تعلق تھا۔ اس لیے رشتے داروں ہی کی طرح آتی جاتی تھیں۔ عرصہ ہوا اپنے شوہر سے ان کی علیحدگی ہوگئی تھی، وہ اپنے ایک نواسے کے ساتھ رہتی تھیں۔ الحارد میں سال پہلے شہزاد کے تینوں ماموں اور اس کی والدہ وغیرہ اپنے بزرگوں کے ساتھ ننھال کے ایک گاؤں میں رہائش رکھتے تھے۔ یہ جانی بے بے وہاں ان کی پڑوسن تھیں، اب یہ سب لوگ لاہور نئی آباد ہو چکے تھے تاہم جانی بے بے کبھی کبھی ان سے ملنے آجاتی تھیں۔

جانی بے بے نے شہزاد کے سر پر بھی دونوں ہاتھوں سے پیار دیا۔ پھر شہزاد کی والدہ کی موت پر گہرے افسوس کا اظہار کیا اور رو دو کر آنسو بھی بہائے۔ نجانے کیوں شہزاد کو جانی بے بے کی یہ بے وقت آمد کچھ کھٹکی۔

ٹیک کتنے کے بعد کھانا کھایا گیا۔ پھر سب کپ شپ اور آئس کریم میں مصروف ہو گئے۔ لان میں نیوب لائٹس کی روشنی میں بیڈمنٹن کھیلا جانے لگا۔ شہزاد خاموشی سے چھت پر چلا گیا۔ اس کے دل میں یہ آس موجود تھی کہ شاید نجمہ بھی موقع دیکھ کر اوپر چلی آئے اور اس سے ایک دو باتیں ہو سکیں۔ آج دوپہر والی رنگ کے کامدار سوٹ میں اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے شہزاد کا دل مچل مچل جا رہا تھا۔ وہ فاصلے پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے بس دو چار لفظوں کا تبادلہ بھی کر لیتے تو یہ شہزاد کے لیے بڑی بات ہوتی۔

نجمہ تو اوپر نہیں آئی، تاہم نجمہ کی امی (بڑی ممانی) اسے ڈھونڈتی ہوئی اوپر آگئیں۔ ان کے ہاتھ میں آئس کریم کا کپ تھا۔ انہوں نے شہزاد کو آواز دی۔ "کہاں ہو شہزاد بیٹا!"

"یہاں ہوں مامی جی۔" شہزاد نے چھت کے ایک نیم تاریک گوشے سے انہیں جواب دیا۔

"سب تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، یہ آئس کریم... گرم ہو جائے گی۔"

شہزاد نے شکریے کے ساتھ کپ ممانی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ شاید نجمہ نے ہی والدہ کو اوپر بھیجا ہے۔ اس نے شہزاد کو چمچ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

شہزاد اور ممانی ادب آداب کی باتیں کرتے رہے۔ شہزاد نے دبے لفظوں میں نجمہ کا ذکر بھی کیا۔ ممانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں شہزاد۔ مجھے سب پتا ہے میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہی ہوں۔ باقی ہونا وہی ہے جو اللہ سوہنے کو منظور ہوگا اور مجھے امید ہے کہ اللہ اچھا ہی کرے گا۔"

اسی دوران میں سیڑھیوں پر قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ ممانی زینب شہزاد کے ہاتھ سے خالی کپ لیتی اوپر کی چھت پر آگئیں۔ کئی بچے دھما چوکڑی مچاتے ہوئے اوپر آگئے۔ وہ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بچوں کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے۔ تقریبات کے دوران میں وہ اپنا کھیل کود کا علیحدہ ہی ماحول بنا لیتے ہیں۔ ان کی بھاگ دوڑ دیکھ کر شہزاد کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا۔ کتنے سہانے دن تھے وہ۔ جب بھی وہ اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ بہاولپور سے یہاں آتا تھا۔ اسی طرح میرے اور چچیرے بھائی بہن مل کر اودھم مچایا کرتے تھے۔ اپنے دیہاتی رہن سہن کی وجہ سے شہزاد باقی بہن بھائیوں سے مختلف تھا اور بھاگ دوڑ میں بھی آگے تھا۔ اسی لیے وہ اکثر کھیلوں میں جیت جایا کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، اس کی جیت پر نجمہ دل ہی دل میں خوش ہوا کرتی تھی اور دوسرے اس سے جلتے تھے۔ ایسے کھیل جن میں ٹولیاں بنا کر کھیلا جاتا، نجمہ اسی ٹولی میں شامل ہونا پسند کرتی تھی جس میں شہزاد ہوتا تھا اور دھیرے دھیرے جیسے غیر شعوری طور پر سب کے ذہن میں یہ بات طے ہوگئی تھی کہ نجمہ اسی ٹولی میں شامل ہوگی جس میں شہزاد ہوگا۔ بہرحال وہ بھی بچپن کا زمانہ تھا۔ اس عمر میں باہم کھیلنے والے بچوں کے ذہن اس قابل نہیں ہوتے کہ انہی باتوں کو کسی خاص تناظر میں دیکھ سکیں۔

نیچے سے ہائے ہاؤ کا شور مسلسل بلند ہو رہا تھا۔ شہزاد واپس نیچے چلا گیا۔ کچھ مہمان واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ ابھی کپ شپ میں مصروف تھے۔ لڑکے لڑکیوں نے جانی بے بے کو گھیرا ہوا تھا اور ان سے کسی مذاق کی بات میں کر رہے تھے۔ نجمہ بھی وہیں موجود تھی۔ جانی بے بے نے ایک نظر نجمہ کو دیکھ پھر شہزاد سے مخاطب ہو کر بولی۔ "وے شہزادا ادھر آ۔ مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی ہے، آ تجھے تیری خالہ سے ملواؤں۔"

"کون سی خالہ جی بے بے۔" شہزاد نے جانی بے بے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ذرا تو خود اندازہ لگا۔ یہاں کون سی ہے تیری خالہ؟"

شہزاد نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاروں طرف

لڑکے لڑکیاں ہی تھے۔ بس ایک لاابالی عمر ماموں شرمیلی سی کالین پر بیٹھی تھی۔

"مجھے تو کچھ پتا نہیں چلا۔ تم ہی بتاؤ۔" شہزاد نے ناکامی کا اعتراف کیا۔

جانی بے بے نے اپنا بازو لمبا کر کے نجمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "یہ جو نجمہ ہے ناں، یہ تیری خالہ بھی ہے۔"

"ہائیں۔" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں، سب جانی بے بے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

جانی بے بے نے کہا۔ "ہاں بھئی مذاق نہیں ہے، میں چشم دید گواہ ہوں اس کی۔"

"چشم دید گواہ۔" صبور نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ مزہ لینے والے انداز میں بولی۔ "دراصل نجمہ نے اپنی دادی اللہ بخشے جنت بی بی کا دودھ پیا ہوا ہے۔ جب یہ بالکل چھوٹی تھی ناں تو بالکل گڑیا کی طرح ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں اس کی امی زینب بی بی کو موسمی بخار ہوا جو تین چار مہینے چلا۔ اس کا دودھ بھی سوکھ گیا۔ یہ بے چاری چارپائی پر پڑی روتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں چونیاں شوشنیاں نہیں ہوتی تھیں اور بچیوں میں تو رواج بالکل ہی نہیں تھا۔ جب یہ نجمہ روتی کراتی تھی تو اس کی دادی اسے اپنا دودھ پلا دیتی تھی۔ باقاعدہ پانچ مہینے بھی مشکل سے نجمہ بنت بی بی۔۔۔ ذرا سوچو اب اس حساب سے یہ نجمہ تم میں سے کئی ایک کی خالہ اور کئی ایک کی پھوپو ہوتی ہاں۔"

"خالہ۔۔۔ پھوپی؟" کئی حیرت زدہ آوازیں ابھریں۔

جانی بے بے نے تسلی کے ساتھ اور خبر مخبر نظر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ناں بچو، اب شہزاد کو ہی لو۔ جس عورت کا دودھ شہزاد کی ماں نے بچپن سے پیا، اس عورت کا دودھ نجمہ نے بھی پی لیا۔ اب اس حساب سے شہزاد کی ماں اور نجمہ دودھ شریک بہنیں ہو گئیں ناں؟ جب نجمہ اور شہزاد کی ماں بہنیں ہیں تو پھر نجمہ شہزاد کی خالہ ہی تو ہوئی ناں۔"

اس گفتگو کے دوران میں عمرانی کلثوم اور چھوٹی عمرانی بھی پاس آ کھڑی ہوئی تھیں، عمرانی کلثوم نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی۔۔۔ ویسے یہ بات تو ہم نے بھی سنی ہوئی ہے کہ نجمہ نے دادی کا دودھ پیا تھا۔"

"دودھ پینے سے کیا ہوتا ہے۔" تنویر نے کہا۔

"ہو کیوں نہیں جاتا۔" جانی بے بے ذرا چمک کر بولی۔ "کسی عالم فاضل سے پوچھ کر دیکھو، وہ سب کچھ بتا دے گا۔"

"ہاں، یہ ایسے ہے تو پوچھنے والا مسئلہ۔" عمرانی کلثوم نے کہا۔

جانی بے بے ایسا ہی ایک گاؤں کا واقعہ سنانے لگی۔ جس میں دودھ کی شراکت کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا اور پنچایت نے ایک بڑے مفتی صاحب کے ساتھ مشورہ کر کے لمبا چوڑا فیصلہ دیا تھا۔

شہزاد کے سینے میں بے چینی کی عجیب سی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ بہرحال وہاں ہونے والی گفتگو جاری رہی۔

اگلے روز شہزاد کو پتا چلا کہ جانی بے بے نے جو شوشا چھوڑا ہے اسے زبردست پذیرائی مل گئی ہے۔ اب ہر طرف دودھ میں شراکت والی بات ہو رہی تھی۔ ماموں جہانگیر جیسے بھی تھے لیکن مذہبی ذہن رکھتے تھے اور کچھ حالات میں بچے سے کر تھے۔ ان کی طبع کی خام پختگی بھی اس کنفیوژن کو بڑھا رہی تھی۔ بعد ازاں شہزاد کو پتا چلا کہ یہ دودھ میں شراکت والا معاملہ واقعی توجہ طلب بھی ہے۔

اگلے آٹھ دس روز میں ماموں جہانگیر صاحب نے کئی جگہ اہل فتویٰ حضرات سے مشورہ کیا۔ اسی سلسلے میں وہ ایک دو روز لاہور سے باہر بھی رہے۔ انہی دنوں میں شہزاد نے فون پر بڑی ممانی سے بات بھی کی۔ وہ بھی پریشان تھیں۔ انہوں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "شہزاد! پتا نہیں تم لوگوں کی قسمت میں کیا لکھا ہے، مجھے تو لگتا تھا کہ حالات بہتری کی طرف جا رہے ہیں مگر اب یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے، تمہارے ماموں بھی پریشان ہیں۔"

شہزاد نے کہا۔ "ممی جی، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب بھی بڑی کلثوم کا ہی کیا دھرا ہے، جب انہوں نے دیکھا ہے کہ بازی پلٹ رہی ہے تو جانی بے بے کو یہاں لا کر یہ بات اڑا دی ہے۔"

"ہاں اس بات کا تو مجھے بھی پتا چلا ہے کہ جانی بے بے کو یہاں بلانے والی کلثوم ہی ہے لیکن جو کچھ بھی ہے شہزاد مسئلہ تو اپنی جگہ موجود ہے ناں۔ یہ بات سچ ہے کہ نجمہ کی پیدائش کے بعد مجھے ٹائیفائیڈ ہوا تھا اور ان دنوں نجمہ کی دادی اسے کبھی کبھی چھاتی سے لگا لیا کرتی تھیں۔ اس وقت دیہات میں اکثر عورتیں ایسا کر لیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی اس بات کی گہرائی میں نہیں جاتا تھا۔"

"لیکن۔۔۔ اگر۔۔۔ ممی جی میرا مطلب ہے۔" شہزاد کو بڑا اکتر سا آ گیا۔ موضوع ایسا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

پریشانی کے عالم میں وہ خود بھی ایک دو مفتی صاحبان کے پاس پہنچا۔ اپنی مسجد کے "صاحب علم" امام صاحب سے بھی اس نے تفصیلی گفتگو کی۔ جو بتا چل رہا تھا، وہ یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آئے اور دودھ پلانے والی عورت کا دودھ جاری بھی ہو جائے تو پھر شرعی احکام لاگو ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس میں ابہام کے مواقع موجود تھے اور شک کے فائدے کی بات بھی کی جا سکتی تھی لیکن یہاں صورت حال نے عجیب رخ اختیار کر لیا۔ خاندان میں جو لوگ اس رشتے کے خلاف تھے ان کے ہاتھ ایک اچھا موضوع اور ایک زبردست دلیل آ گئی تھی۔

صرف تین ہفتے کی قلیل مدت میں سب کچھ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ نجمہ اور شہزاد کے لیے امید کی جو روشن کرنیں نمودار ہوئی تھیں وہ ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بدلیں کہ روشنی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہا اور یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ شہزاد بھونچکا رہ گیا۔ عائشہ پر بھی اس واقعے کا بہت اثر ہوا۔ شہزاد کے والد صاحب کئی روز بیمار رہے۔

اب شہزاد گلہ کرتا تو کس سے؟ زمین تو تھی ہی بے رحم، آسمان نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا۔ شاید قدرت کو ان کا ملاپ منظور ہی نہیں تھا۔ ماموں جہانگیر نے بھی اپنی طرف سے حتمی فیصلہ اپنے گھر والوں کو سنا دیا تھا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ انہی دنوں مامی کلثوم نے پھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ شہزاد کی والدہ کی وفات والے واقعے کے بعد ماموں جہانگیر مامی کلثوم سے کچھ دور ہو گئے تھے۔ اب مامی کلثوم نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس فاصلے کو کم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ماموں جہانگیر سے معافی وغیرہ بھی مانگی اور آنسو بہا کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش بھی کی۔ مامی کلثوم اور شارق وغیرہ کے ساتھ ساتھ وہ سارے دوسرے کردار بھی پھر سے متحرک ہو گئے جو سجاد اور نجمہ کی شادی کے حق میں تھے۔ سجاد چونکہ مجھلے ماموں شکیل کا لے پالک تھا اس لیے اس پر وہ "دودھ کی شراکت" والی صورت حال لاگو نہیں ہوتی تھی (وہ لے پالک نہ ہوتا تو پھر نجمہ اس کی چھوٹی کزن بھی جاتی)

رشتوں کا یہ الٹ پھیر اور معاملات کا گنجلک پن شہزاد کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ وہ نجمہ سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ نجمہ اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ماموں جہانگیر اب بالکل بند گلی میں پہنچ چکے تھے اور وہ اس حوالے سے کسی کی کوئی بات بھی سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔

اس دوران میں خاندان کے ہی کسی فرد نے ماموں جہانگیر کو بتایا کہ ان کے گھر میں اب کبھی کبھی شہزاد کا فون آتا ہے۔ ماموں اس پر بہت سیخ پا ہوئے۔ وہ ایک روز رات کو شہزاد کے گھر آ پہنچے۔ کال بیل پر شہزاد باہر آیا تو وہ اپنی نئے ماڈل کی بڑی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

"جی ماموں۔" شہزاد نے ادب سے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے رکھائی سے بولے۔ "شہزاد، تم میری مرحوم بہن کی نشانی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے لیکن تم جس طرح کے کام کر رہے ہو وہ تمہیں ضرور خوار کریں گے۔"

"م۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے ماموں؟"

"تم نے کچھ نہیں کیا، میں ہی الو کا پٹھا ہوں۔ مجھے ہی کچھ نظر نہیں آتا ہے۔" وہ حسب عادت کڑکے اور گرجتے چلے گئے۔

انہوں نے صاف لفظوں میں شہزاد سے کہا کہ کچھ دنوں تک نجمہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اب نجمہ سے اور اس گھر سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ان کی گاڑی پھنکار لی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

دودھ کی شراکت والا معاملہ اتنی تیزی سے ابھرا اور کچھ لوگوں کی وجہ سے اتنی تیزی کے ساتھ پھیلا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ ہی عرصے میں خاندان کے سارے بزرگ اس امر پر متفق تھے کہ نجمہ اور شہزاد کا رشتہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف نجمہ اور سجاد کے رشتے میں جو تھوڑی بہت رکاوٹیں پیدا ہوئی تھیں وہ جلد ہی دور کر لی گئیں۔ ان کی منگنی تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ چند ہفتوں بعد ان کی شادی کے دن بھی طے کر لیے گئے۔ حالات بتا رہے تھے کہ بالآخر مامی کلثوم جیت گئی ہیں۔۔۔ اور پھر وہ دن قریب پہنچ گیا جس سے بچنے کے لیے شہزاد نے ہزار جتن کیے تھے۔ وہ راتوں کو خون کے آنسو رویا تھا۔ دنوں میں دیوانوں کی طرح بے قرار پھرتا تھا اور ان گنت بیل کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزار دیے تھے۔

جوں جوں نجمہ کی شادی کا دن قریب آ رہا تھا شہزاد کے سینے میں دھواں سا بھرتا جا رہا تھا۔ کسی وقت تو اسے لگتا تھا کہ اس کا دم گھٹ جائے گا اور دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ شادی میں آخر دن رہ ہی کتنے گئے تھے جب شہزاد نے سوچا کہ وہ دونوں کے لیے کہیں دور نکل جائے۔ تب تو نے جب یہ سب کچھ انجام دیا تھا وہ بلکہ اس کی بہن عائشہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ بھائی کے غیر معمولی دکھ نے اسے بھی پاگل کر دیا تھا۔ وہ بھی کچھ دنوں کے لیے فرار چاہتی تھی مگر انہی دنوں میں ان

کے ابا جی پھر بیمار پڑ گئے، ان کے لیے کہیں بھی جانا ممکن نہیں رہا۔

پتا نہیں کیوں شہزاد کا دل کہتا تھا کہ شادی سے پہلے کم از کم ایک بار نجمہ کے ساتھ اس کی ملاقات ضرور ہوگی۔ کیسے ہوگی؟ کب ہوگی؟ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا۔ شاید وہ کوئی خط بھیجے گی جس میں اس سے ہمیشہ کے لیے اجازت چاہی جائے گی یا کوئی ٹیلی فون، یا کوئی پیغام۔ کسی وقت شہزاد کا دل چاہتا کہ وہ خود ماموں کے گھر فون کرے۔ ممانی سے کہے کہ وہ آخری بار اسے نجمہ سے بات کرنے دیں۔ آنسوؤں کی بارش میں اسے الوداع کہہ لینے دیں۔ بہرحال وہ کوشش کے باوجود اس کی ہمت نہیں کر سکا۔

انہونیوں کی خواہش کس کے دل میں نہیں ہوتی۔ شہزاد کے دل میں بھی تھی۔ شاید یہ وہی امید تھی جو پھانسی پانے والے بدنصیب قیدی کے دل میں اس وقت تک موجود رہتی ہے جب تک تختہ اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل نہیں جاتا۔

بچپن کی محبت اس سے جدا ہو رہی تھی۔ وہ تعلق جو شہزاد کے ساتھ ہی پلی پروان چڑھا تھا۔ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہا تھا۔ انسان جو کہتا اور سنتا ہے وہ زندگی بھر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ کچھ صدائیں شب و روز شہزاد کا بھی پیچھا کرتی تھیں .... اور بے شک ان میں نجمہ کی ایک صدا بھی شامل تھی، اس کے ایک جملے کی بازگشت اکثر اس کے کانوں میں رہتی تھی۔

"آپ کو میرے پیار کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ کبھی موقع آیا تو بتا دوں گی۔۔۔"

ہاں نجمہ نے یہ کہا تھا اور اب موقع بھی آیا تھا لیکن وہ کچھ کر نہیں سکی تھی اور وہ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ شہزاد کو اس سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک مشرقی لڑکی کی حدود کیا ہیں۔ وہ کہاں تک پھڑ پھڑا سکتی ہے۔

اور پھر ایک شام۔ تختہ شہزاد کے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا۔ اس کی محبت کی لاش اندھے کنویں میں لٹک گئی۔ شہنائیوں کی گونج میں وہ سجاد کی دلہن بن گئی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ قسمت میں جو کامیابی ہوں تو حالات کی کروٹ بھی کچھ بدل نہیں سکتی۔ حالات کی کروٹ نے نجمہ اور شہزاد کے لیے اس امید کے چند دیے روشن کیے تھے مگر تقدیر کی تیز ہوا نے انہیں پھر سے گل کر دیا تھا اور اس مرتبہ اندھیرا اتنا گھنا تھا کہ شہزاد کو اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس رات شہزاد نے نجمہ کی ساری نشانیاں جلا دی تھیں اور صبح کو والدہ کی قبر پر جا کر دیر تک روتا رہا تھا۔ جیسے ایک بچہ اپنی ماں کو اپنا دکھ بتاتا ہے، اس سے لپٹ کر آنسو بہاتا ہے۔

شہزاد کے گھر میں سے کوئی بھی شادی پر نہیں گیا تھا۔ ماموں ممانی نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ایک طرح سے اس شادی کے بعد دونوں گھرانوں میں تعلق بالکل ختم ہو گیا تھا۔ ممانی کشتی جیت گئی تھیں، شہزاد ہار گیا تھا۔ یہ ایک تکلیف دہ جوڑ شادی تھی۔ خاندان میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اس بے جوڑ شادی پر تنقید بھی کی تاہم ماموں جہانگیر کے رعب کی وجہ سے کسی کو کھلے عام بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

شادی کے آٹھ دس روز بعد شہزاد کے ایک کزن حسنات نے شہزاد کو بھی شادی کی ایک تصویر دکھائی۔ شہزاد دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر دلہن پر نگاہ پڑی تو بیحد تم گم ہو گئی۔ وہ اس کے خیال و خواب سے زیادہ حسین نظر آئی۔ یہ ایک ایسا حسن تھا جس کی تہ میں غم کی لاتعداد تہیں بھی محسوس کی جا سکتی تھیں۔ خاندان کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح حسنات بھی اس شادی سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ وہ شہزاد کا ہم راز تھا اور خواتین کے ایک رسالے میں کام کرتا تھا۔ کہنے لگا۔ "یہ شہزاد! میں یہ تصویر پرچے میں چھاپنا چاہتا ہوں۔ ساتھ میں کوئی کیپشن بھی ہونا چاہیے۔ پہلے تو خود تصویر والا فقرہ تو بڑا پرانا ہو چکا ہے، کوئی اور فقرہ ہے تمہارے ذہن میں۔"

پھر شہزاد کے چہرے کی گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "پتا نہیں شہزاد! تمہارے ماموں صاحب کو کیا فقرہ آیا تھا اپنے اس سوچنے میں۔ ٹھیک ہے کہ شادی لڑکی کی مرضی سے نہ ہوئی لیکن کم از کم ایسی جگہ تو ہوئی کہ ۔۔۔"

"حسنات!" شہزاد نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب ہمیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ ۔۔۔" شہزاد کی آواز غم کے بوجھ سے بھرا گئی۔ وہ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

اس کے بے پناہ دکھ کو محسوس کر کے حسنات کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس نے شہزاد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شہزاد۔۔۔ تائی جی کے جانے کے بعد یہ گھر ویران ہو گیا ہے۔ ایک آدھ سال میں عائشہ بہن کی شادی بھی ہو جائے گی، تب یہ ویرانی اور بڑھ جائے گی۔ اب اس بارے میں کچھ سوچو، زندگی کسی جامد شے کا نام نہیں ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ابھی زخم تازہ ہے، شاید یہ بات تمہیں بری لگے لیکن تمہیں بھی اب شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور کام وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ تم اب ماشاءاللہ برسرروزگار ہو، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو، بلڈنگ تمہارا اپنا مکان بھی ہوگا۔ خاندان میں اور خاندان سے باہر

اچھی سے اچھی لڑکی تمہیں مل سکتی ہے۔"

"میرا تو نہیں، میں شادی کروں گا..... اور ضرور کروں گا۔" شہزاد نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوئی نا اس بات۔ اب بتاؤ کوئی لڑکی نظر میں ہے یا نہیں؟"

"لڑکی... بھی... مل ہی جائے گی۔"

"نہیں... نہیں۔" حسنات نے انگلی لہرائی۔ "تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ کوئی ہے تمہاری نظر میں۔"

"شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"تو پھر بتاؤ۔" وہ جوش سے بولا۔

"وقت آنے پر بتاؤں گا۔"

حسنات نے بہت اصرار کیا لیکن شہزاد نے کہا کہ اسے سرپرائز ہی رہنے دو۔ آخر وہ بار مانتے ہوئے بولا۔ "سرپرائز خوبصورت تو ہے نا؟"

"ہاں بہت خوبصورت۔" شہزاد نے عجیب انداز میں کہا۔

نجمہ کی شادی کے تقریباً چھ ماہ بعد شہزاد کی شادی بھی ہوگئی۔ نجمہ کی شادی نے سب کو دل گرفتہ کیا تھا مگر شہزاد کی شادی نے پورے خاندان کو ہنگامہ اور گرد کے لوگوں کو بھی سنسنی زدہ کر دیا۔ شہزاد کی شادی ماموں انور کی اکلوتی بیٹی فاخرہ سے ہوئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فاخرہ بھی بیاہی جائے گی۔ بے شک سب اس سے پیار کرتے تھے مگر اسے اپنانے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خاندان کے اندر تو کجا، خاندان سے باہر بھی امید نہیں تھی کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامے گا لیکن شہزاد نے پورے خلوص اور بے حد اصرار کے ساتھ یہ ہاتھ تھاما تھا اور فاخرہ کو اپنا لیا تھا۔ اس حوالے سے خود فاخرہ کی ساری کوشش بھی ناکام رہی تھی اور شہزاد نے غیر متزلزل عزم کے ساتھ اپنے ارادے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

ماضی کی یادوں کو سینے میں دفن کر کے شہزاد نے فاخرہ کے ساتھ نئی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ فاخرہ کو کسی محرومی اور کمی کا احساس نہ ہو۔ اس نے اسے اپنی بساط کے مطابق ہر خوشی دینے کی کوشش کی لیکن کیا یادیں واقعی سینے میں دفن ہو جاتی ہیں۔ کیا انسان اپنے ماضی کو یکسر بھول سکتا ہے؟ تو لبنیٰ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اپنی تمام تر کوشش اور نیک نیتی کے باوجود شہزاد ماضی کو مکمل طور پر بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ اور نجمہ ایک ہی شہر میں رہتے تھے، ایک ہی خاندان کا حصہ تھے، زیادہ نہ سہی، کبھی کبھی لیکن ان کا آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ ہر بار جب کوئی ایسا واقعہ ہوتا تھا۔ شہزاد کے زخموں سے کئی دن تک خون رستا رہتا تھا۔

سجاد سخت طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ وہ احساس کمتری کا شکار بھی رہتا تھا۔ خاص طور سے اپنی کم تعلیم کے حوالے سے اس کا یہ احساس زیادہ شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بہرحال نجمہ نے ایک اچھی شریک حیات کی طرح خود کو شوہر کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش پورے خاندان کے لیے قابل تعریف تھی۔

دوسری طرف شہزاد نے بھی اپنی شریک حیات فاخرہ کو اپنا خلوص اور بھرپور پیار دینے کی کوشش کی۔ فاخرہ جب زندگی کے دھارے میں شامل ہوئی تو اس کے ٹوٹے ہوئے حوصلے بھی بندھ گئے۔ معذور ہونے کے باوجود اس نے پورے گھر کا کام کاج بخوبی اس انداز میں سنبھالا کہ شہزاد کو کسی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ وہ عائشہ کی شادی کی بھرپور تیاری بھی کر رہی تھی۔

عائشہ کی شادی کے فوراً بعد شہزاد نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اس نے لاہور کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا پروگرام بنا لیا۔ بقول شاعر ... میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔ اب وہ نجمہ اور نجمہ کی زندگی سے بہت دور چلے جانا چاہتا تھا۔ یہاں لاہور کی فضاؤں میں گم گشتہ صداؤں کی بازگشت تھی اور قدم قدم پر یادوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چاہتا تو وہ یہ تھا کہ پاکستان سے باہر کہیں نکل جائے، لیکن ابھی اس کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ لہٰذا وہ کراچی سدھار گیا۔ کراچی بہت وسیع شہر ہے۔ یہاں ایڈورٹائزنگ کا شعبہ بھی بڑا "پرامسنگ" ہے۔ شہزاد کو اب ڈپلومہ مل چکا تھا لیکن ڈپلومہ سے بھی زیادہ اس کی خداداد صلاحیت اسے ترقی کے زینے طے کرا رہی تھی۔ کراچی میں ہی فائن آرٹ کالج میں اسے درس و تدریس کا موقع بھی مل گیا۔ اس کام نے شہزاد کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ نہایت اعلیٰ درجے کی اسٹل فوٹو گرافی شہزاد کی پہچان بنتی جا رہی تھی۔

ایک روز کالج سے شہزاد شام کو گھر واپس آیا تو اپنے کمرے میں فاخرہ ویل چیئر پر خاموشی کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ شہزاد نے عقب سے جا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ بانہیں گلے میں ڈالنے کے سبب وہ قد میں بھی چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس کا سر بمشکل شہزاد کے سینے تک آ رہا تھا۔ شہزاد نے اسے آئینے کے سامنے سے ہٹانا چاہا لیکن وہ جمی کھڑی رہی۔

"حقیقت کا سامنا نہ کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں

جاتی۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

"حقیقت کو کیا ہوا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔" شہزاد نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

"میں بہت بری لگتی ہوں نا؟" اس نے آہ بھری۔

"کون کہتا ہے؟ تمہارے اندر کی خوبصورتی ہر شے پر حاوی ہوگئی ہے۔ تم تو میری سونم ہو۔" شہزاد نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے گرم جوش لہجے میں کہا۔

"سونم؟ یہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے مڑ کر شہزاد کی طرف دیکھا۔

"کس ... سونم ... سونم کا مطلب ہے ... سوہنا، خوبصورت۔" شہزاد نجانے کیوں تڑپ اٹھا گیا۔

"لفظ تو اچھا ہے، لیکن اچھی جگہ استعمال نہیں کیا گیا۔" اس نے اپنا سر اداسی کے ساتھ شہزاد کے سینے سے لگا دیا۔

بعد میں شہزاد دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے منہ سے فاخرہ کے لیے بے ساختہ سونم کا لفظ کیوں نکل گیا۔ یہ لفظ تو وہ کبھی نجمہ کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ ہاں ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ماضی کبھی مکمل طور پر سینے میں دفن نہیں ہوتا۔ وہ مختلف شکلوں میں سر ابھارتا ہی رہتا ہے۔ اگلے روز شہزاد نے فاخرہ کو دیکھا وہ بڑی منی سنوری ہوئی تھی اور واقعی جب وہ بنتی سنورتی تھی تو اپنی مجروح ناک کے باوجود قبول صورت لگنے لگتی تھی۔

"آج تو غضب ڈھا رہی ہو۔" شہزاد نے اس کے ریشمی بالوں کو چوما۔

"آپ نے سونم جو کہا تھا۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

سونم کا لفظ فاخرہ کو اچھا لگا تھا۔ وہ اسے اکثر سونم ہی کہنے لگا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ "فاخرہ" اسے ویسے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نام میں اسے کچھ عجیب سا تاثر محسوس ہوتا تھا۔ ان کی زندگی کی گاڑی اچھی چل رہی تھی۔ بس ایک کمی تھی۔ شادی کو دو سال بیت گئے تھے مگر ابھی تک کوئی بچہ نہیں تھا۔

دوسری طرف نجمہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ دوسرا بچہ اس کے شکم میں تھا۔ حمائی مختوم نے آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ نجمہ کے ساتھ اکثر جن کی نگران رہتی تھی۔ وہ نجمہ کے شوہر جاوید کو بھی مجرد کالی رنگت کھلا اور وہ تو پہلے سے ہی جڑ کا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نجمہ کو اپنی ضیم کا تحفظ ہے۔ حقیقت میں وہ خود کو ہر طرح سے نجمہ سے کم تر سمجھتا تھا اور اس کا یہ احساس کمتری مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ شہزاد کے کانوں تک یہ بات بھی پہنچی تھی کہ وہ نجمہ پر ہاتھ بھی اٹھاتا ہے۔ ماموں جہانگیر اور ممانی اس صورتحال پر پریشان تھے۔ یہاں تک کہ شارق بھی جو جاوید کا پکا یار بنا ہوا تھا۔ اب اس سے اختلاف رکھنے لگا تھا۔

اور پھر ایک روز شہزاد تک ایک روح فرسا اطلاع پہنچی۔ وہ اپنی کلاس میں لیکچر دے کر اسٹاف روم میں واپس آیا ہی تھا کہ گھر سے فاخرہ کا فون آ گیا۔ "شہزاد، لاہور سے ایک بری خبر ہے۔"

"کیا ہوا؟" شہزاد چونک گیا۔

"امی نے اطلاع دی ہے کہ باجی نجمہ سیڑھیوں سے گر گئی ہیں۔ انہیں کافی چوٹیں آئی ہیں وہ اسپتال میں ہیں۔"

شہزاد کے سینے میں جیسے کوئی شے پھنکار کے سے ٹوٹ گئی۔ اگلے بیس تیس منٹ میں اس واقعے کی مزید تفصیلات کا پتا چلا۔ نجمہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ سیڑھیوں سے اور آٹھ دس زینوں سے لڑھکتی ہوئی گری تھی۔ معلوم ہوا کہ سجاد نے نجمہ سے جھگڑا کیا تھا۔ گھریلو ملازمہ چھٹی پر تھی اور سجاد کی قمیص استری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے نہ شناسائی نہیں کیا اور خود استری کی قمیص پہن کر شاپ کے لیے روانہ ہو گیا۔ نجمہ جلدی جلدی قمیص استری کر کے اس کے پیچھے لپکی۔ وہ اسے آوازیں دیتی سیڑھیوں پر پہنچی تو پھسل گئی۔

نجمہ کا بچہ ضائع ہو گیا تھا۔ ابارشن کے بعد اس کی اپنی حالت بھی بگڑ گئی۔ شہزاد اور فاخرہ بائی ایئر لاہور پہنچے۔ شہزاد نے اسے ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں دیکھا۔ وہ سفید براق بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک تھا۔ جسم نلیوں کے حصار میں تھا۔ رنگ اتنا سفید تھا کہ وہ بستر کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ فاخرہ اور شہزاد بس چند منٹ کے لیے اس کے پاس کھڑے ہوئے۔ ایک نظر کے لیے نجمہ کی آنکھیں اس کی نگاہوں سے ملیں۔ وہ موت کے گھیرے میں تھی تاہم اس کی ہمیشہ مسکرانے اور بولنے والی آنکھیں آج بھی بولتی محسوس ہوئیں۔ ان آنکھوں نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ "ہم ہار گئے شہزاد، لیکن ہماری محبت نہیں ہاری۔ یہ محبت زندہ رہے گی۔ اس کو زندہ رہنا ہے۔ میں روپ بدل کر آپ سے ملوں گی۔ موسموں میں اور ہواؤں میں اور رنگ بدلنے والے پھولوں میں اور سورج کی روپہلی کرنوں میں۔"

اور وہ مر گئی۔ سفید براق بستر پر ایک زرد رنگ کا مکمل سفید تصویر کی طرح پڑی رہ گئی۔ اس کی ہمیشہ بولتی رہنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لیے پلکوں کا سایہ ہو گئیں۔

☆☆☆

اب شہزاد کو ملک چھوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جس کی وجہ سے ملک چھوڑنا چاہتا تھا وہ خود ہی دنیا چھوڑ گئی

Scanned And Uploaded

تھی۔ اس کی "الجھنوں کے راستے" صاف کر گئی تھی۔ اس کی موت کا غم ایک مہیب دھچکے کی طرح تھا۔ شہزاد قریباً دو سال تک اس دھچکے کے شدید ارتعاش کو محسوس کرتا رہا۔ پھر اس نے خود کو اور اپنی ساری سوچوں کو اپنے کام میں غرق کر دیا۔ اس نے خود کو اتنا مصروف کر لیا کہ اس کے پاس غم زدہ ہونے کا وقت ہی نہیں رہا۔

وہ لاہور سے اور اپنے خاندان سے تقریباً کٹ کر رہ گیا تھا اور یہ دوری اس کے لیے مفید ہی تھی۔ وہ یادوں کی شدید یلغار سے بچا ہوا تھا۔ اس کی گم آمیزی کو بعض رشتے دار اس کے گھمنڈ سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ خاص طور سے بڑے ماموں اور منجھلے ماموں کی فیملیاں، بہرحال شہزاد کو ان باتوں کی اب کوئی پروا نہیں تھی۔

درس و تدریس کے علاوہ شہزاد نے ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں بھی تیزی سے ترقی کی۔ پہلے وہ ایک بڑی کمپنی کا منیجر بنا پھر دو تین سال میں اس نے اپنی فرم کی بنیاد رکھ دی۔ ٹاپ کا اس کمرشل ایڈ بنانے میں شہزاد کو کمال حاصل تھا۔ اس کی بنائی ہوئی دو تین اشتہاری فلموں کو بیشتر ایوارڈ بھی ملے۔ اسٹل فوٹوگرافی میں بھی وہ بے مثال تھا۔ اس کی اتاری ہوئی تصویریں بین الاقوامی جرائد میں شائع ہوتی تھیں۔

جس روز شہزاد کی ذاتی فرم کو کانٹریکٹس بنانے والی ایک بڑی کمپنی کا کنٹریکٹ ملا، اسی روز شہزاد کی 36 ویں سالگرہ بھی تھی۔ اس روز شام کو فاخرہ نے کہا۔ "آج آپ کے لیے تین تین خوشیاں اکٹھی ہو گئی ہیں جناب۔"

"تین کون کون سی۔"

"آپ کو کنٹریکٹ ملا... آپ کی سالگرہ ہے... اور میں اسپتال سے گھر آئی ہوں۔"

"اسپتال گئی تھی؟ کیا مطلب؟"

فاخرہ کے چہرے پر رنگ سا لہرایا۔ ایک دم شہزاد... کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ اسے اپنے اور فاخرہ کی ہر شے مسکراتی محسوس ہوئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے فاخرہ کو دیکھتا چلا گیا۔ فاخرہ ایک بڑی اچھی لیڈی ڈاکٹر کے زیر علاج تھی اور پچھلے دو تین مہینوں سے ایک امید ان کے اندر پروان چڑھ رہی تھی... "تمہارا مطلب ہے... تمہارا مطلب ہے..." شہزاد کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

فاخرہ نے ایک بار پھر شرما کر اثبات میں سر ہلایا۔

"او... سوئم... او سوئم... یو آر گریٹ۔" شہزاد نے اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔

شادی کے تقریباً گیارہ سال بعد قدرت نے ان کی سن لی تھی۔

چند ماہ بعد شہزاد کے آنگن میں بچے کی چہکار گونجی۔ اپنے پہلے بیٹے کا نام انہوں نے عمیر رکھا۔ خوشی کے اس موقع پر ایک غم کی آمیزش یہ تھی کہ شہزاد کے والدین میں سے کوئی بھی پوتے کی صورت دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ صرف ایک سال پہلے اس کے خاموش طبع والد بھی ابدی خاموشی اختیار کر چکے تھے۔ عمیر کی پیدائش کے قریباً دو سال بعد احسن دنیا میں آیا۔ شہزاد نے زندگی میں اپنی محرومیوں کا مداوا اپنے بچوں کی محبت میں ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بچے اور کام، بس یہی اس کی دو بنیادی دلچسپیاں تھیں۔ فاخرہ کی محبت اور توجہ کا مرکز و محور تو بچے اب بھی تھے۔ ویسے بھی اب وہ کچھ بیمار رہنے لگی تھی۔ شہزاد کی، ایک اور بچے کی خواہش بھی اسی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔ اس کی کمر میں درد رہتا تھا اور کبھی کبھی یہ درد اس کی ٹانگوں تک بھی چلا جاتا تھا۔ خاص طور سے ٹھنڈے موسم میں وہ زیادہ تکلیف محسوس کرتی تھی۔ شہزاد اس کے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔ کسی وقت وہ زیادہ بیمار ہوتی تو وہ اپنی مصروفیات ترک کر دیتا اور اس کی دیکھ بھال میں لگ جاتا۔ فاخرہ کا مسئلہ آرتھوپیڈک تھا۔ کسی حد تک رگ پٹھے بھی اس میں involve تھے۔ اس صورت حال کا تعلق اسی پرانی چوٹ سے تھا۔ کراچی کے بہترین اسپیشلسٹس سے شہزاد کا رابطہ تھا۔

اس بیماری میں اکثر اتفاقیہ بھی آ جاتا تھا اور وہ کئی کئی ماہ دائمی درد سے محفوظ رہتی تھی تاہم اس دوران میں بھی دواؤں کا استعمال جاری رہتا تھا۔ ایک دو بار شہزاد نے اشاروں کنایوں میں اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے چہرے کے مجروح حصے کی پلاسٹک سرجری کروانا چاہے تو وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کر سکتا ہے لیکن اس معاملے میں وہ بہت حساس تھی اور بالکل مختلف سوچ رکھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے چہرے کو مصنوعی بنانا نہیں چاہتی۔ وہ جیسی ہے ٹھیک ہے۔ چند سال پہلے جب دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات میں دونوں بچے اپنے کمرے میں سو رہے تھے اور شہزاد فاخرہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ فاخرہ نے ہولے سے اپنا ہاتھ شہزاد کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور کمزور آواز میں بولی تھی۔ "شہزاد... میں نے آپ سے زندگی میں کسی بات پر اصرار نہیں کیا لیکن ایک بات پر اصرار کرنا چاہتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میری وہ بات مان لیں۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو۔" شہزاد نے چونک کر کہا۔

وہ چند ثانیے تک کہتی رہی پھر اس نے شہزاد کی طرف

دیکھے بغیر کہا۔ ''شہزاد! آپ شادی کرلیں۔''

شہزاد نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر اس کا سر دبا تھا اپنے ہاتھ پر ست ہٹاتے ہوئے دھیرے لہجے میں بولا۔ ''خبردار، اگر پھر کبھی ایسی بات کی تو۔''

''کیوں شہزاد کیوں نہ کروں۔'' وہ ٹی وی آف کرتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت عرصے سے سوچ رہی ہوں۔ آپ کو بیوی کی ضرورت ہے، ایسی بیوی جو آپ کے قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ آپ کی خدمت کر سکے، آپ کو خوشی دے سکے۔ میں دل کی گہرائی سے یہ بات کہہ رہی ہوں شہزاد۔ آپ نے اب تک مجھ پر بڑے احسان کیے ہیں شہزاد، اب ایک احسان اور کردیں۔ میری بات مان لیں۔''

''یہ نہیں ہوسکتا اور نہ کبھی ہوگا ہے۔ میں بالکل خوش اور مطمئن ہوں۔ ہاں اگر تم اس طرح کی باتیں کرتی رہو گی تو پھر میرا ذہنی سکون ضرور برباد ہو جائے گا۔''

اس رات دیر تک اس موضوع پر بات ہوئی۔ شہزاد نے فاخرہ کی ہر دلیل کو رد کردیا۔ درحقیقت اس کی زندگی میں اب ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اسے اب ایک پرجوش شریک حیات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سیر و تفریح کا شوق اسے ویسے ہی کم تھا۔ کالج سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی فرم کے آفس چلی جاتا تھا۔ وہاں رات گئے تک اتنی مصروفیت رہتی کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اس کا کام ہی اس کی تفریح بن گیا ہے۔

وہ ایک چھوٹی پبلسٹی اشتہاری فرم کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا۔ اس کے اردگرد خوش رنگ تتلیوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ کئی نامور حسین ماڈلز سے اس کو واسطہ پڑتا تھا تاہم اس کا پروفیشن ازم ایسے راستے پر تھا جہاں ایسی چیزوں کی زیادہ اہمیت نہیں رہتی۔ دیکھنے بھی ــــ کی بات یہ تھی کہ تجمل سے جدائی کے بعد اس کی زندگی میں عشق و محبت والا دروازہ مستقل طور پر بند ہو گیا تھا۔ بس کبھی کبھی رات میں ایسا ہوتا تھا جب فاخرہ اور بچے سو جاتے تھے، وہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر ایک کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اس کھڑکی کا رخ شمال کی طرف تھا، شمال ــ جہاں لاہور تھا، جہاں اس کا بچپن تمام خوبصورت یادوں کے ساتھ دفن تھا۔ اسی شہر کے ایک حسین باغ میں بہار نیز و خوشبو اور شام بھی آئی تھی جب کسی نے اس کی کمر پر اپنی انگلی سے اس کا نام لکھا تھا اور شرما کر بھاگ گیا تھا۔ کہاں گیا تھا وہ؟ اور کہاں گئے تھے باقی سب لوگ؟

شہزاد پروفیسر بنا۔ فائن آرٹ کے تجزیہ پر اس کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ نیویارک کے شیلے میں بھی اب اس کا نام تھا۔ وہ ایک معروف اور ہر دلعزیز شخص تھا۔ ٹی وی پر اس کے انٹرویوز آتے تھے اور اخباروں میں بڑی بڑی تصویریں شائع ہوتی تھیں۔ بے شک اس نے ماموں جہانگیر اور ماموں جمیل کی فیملیز پر یہ ثابت کردیا تھا کہ گاؤں سے اٹھ کر آنے والا شخص بھی اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے پر اونچا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ اب وہ مالی اعتبار سے ان فیملیز کا ہم پلہ تھا اور اگر اس کی شہرت اور ناموری کو بھی اس کے پلڑے میں رکھ دیا جاتا تو یہ پلڑا کافی بھاری ہو جاتا تھا۔ شہزاد کے چھوٹے ماموں انور عارضۂ قلب کے سبب فوت ہو چکے تھے۔ چھوٹی ممانی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ کراچی میں ''سیٹل'' ہو گئی تھیں ــــ ماں اور بھائی کے قریب آنے سے فاخرہ کو بھی راحت ملی تھی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ بھی تھا کہ لاہور سے اور لاہور کے رشتے داروں سے شہزاد کا رابطہ بالکل منقطع ہو گیا تھا۔

اور اب اپنی شادی کے تقریباً 24 سال بعد وہ پہلی بار اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ پیرس جا رہا تھا۔ فرانس آرٹ کے ایک فرنچ انسٹی ٹیوشن نے بڑی چاہت کے ساتھ اسے یہاں پیرس میں مدعو کیا تھا۔ یہ جون کی ایک پیاری شام تھی اور اس پہلی شام میں ہی ماموں جہانگیر کی بڑی بیٹی فرزانہ (یعنی تجمل کی بہن) اور اس کے بچوں نے پُرتپاک طور پر اسے آ دبوچا تھا۔ اب وہ سب لوگ اس کے مرد کرہ بنا گاڑی چلا رہے تھے اور وہ ان کے قریب بیٹھا بیٹھا تصورات کی کھڑکی کھول کر ماضی کے دھندلکے میں اتر گیا تھا۔ پورا ایک دور بس دو چار منٹ کے اندر ترتیب وار مناظر کی شکل میں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

''ہاں جی، اب آپ واقعی پروفیسر لگ رہے ہیں۔'' ایک چلبلی آواز نے اسے حسین خیالوں سے چونکایا۔ فرزانہ کی بیٹی مترہ، ٹھارہ سالہ بچی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔ فلیش چمکی اور شہزاد کی تصویر اتر گئی۔ مینا نے کیمرے کی پوکو اسکرین پر یہ تازہ تصویر دیکھی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا؟ بری آئی ہے؟'' شہزاد نے رسماً پوچھا۔

''نہیں، بہت اچھی۔ آپ تو بالکل مائی لارڈ لگ رہے ہیں۔'' وہ تصویر کو دیکھتے ہوئے شہزاد کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، وہ کمال بے تکلفی سے اس کے قدموں پر بیٹھی، گھٹنے پر ٹیک لگائی اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل پاس لا کر تازہ تصویر دکھانے لگی۔ اس کے لمبے بال ایک دم ہی شہزاد کی بھوؤں میں آن گرے تھے۔

شہزاد کا دماغ بھک سے پیچھے بنی تصویر میں شہزاد واقعی

خیالوں میں کھویا نظر آیا۔ وہ سگریٹ پینے کے لیے کھڑکی کے پاس آن بیٹھا تھا۔ تصویر میں وہ سگریٹ لیتے ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا اور اس کے سرخی مائل بالوں کی دو لٹیں اس کی پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ یہ سب کچھ تصویر میں محفوظ ہو گیا تھا۔

فرزانہ بھی تصویر دیکھنے کے لیے شہزاد کی طرف جھک آئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شہزاد بھائی اب تم پیرس میں آ کے ہو تو دو چیزوں سے خاص طور پر بچ کر رہنا ہے، پہلی چیز ہے فلامو ز کا ٹنا، یہاں کی بڑی سڑکیں اس طرح بنی ہیں کہ اگر آپ جناب نے کہیں غلط موڑ کاٹ لیا تو پھر دوبارہ سے صحیح موڑ پر پہنچنے کے لیے آپ کو تیس چالیس کلومیٹر تک کا سفر طے کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''اور دوسری چیز؟''

''دوسری چیز یہ لڑکی۔ اس سے بھی بچ کر رہنا ہے، بندے کی مت مار دیتی ہے۔''

''اور اگر خدانخواستہ آپ نے اس نے شاعری سنانے کی فرمائش کر دی تو پھر آپ کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس سے بہلا کر بھی شاعری کی 'فرمائش' نہ کیجیے گا، مینا سے بڑی زارا نے لقمہ دیا۔ مینا یعنی مینی نے پہلے زارا کو گھورا پھر بے پروائی سے بولی۔ ''اچھے کام فرمائش کے بغیر بھی کیے جا سکتے ہیں۔''

شہزاد نے ماموں زاد فرزانہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''یہ وہ مینی یہاں غلط موڑ.....''

''غلط موڑ اور صحیح موڑ کا یہاں کوئی سوال نہیں ہے مائی لارڈ۔'' مینی نے تیزی سے شہزاد کی بات کاٹی۔ ''غلط یا صحیح موڑ تو آپ تب کاٹیں گے جب ہم آپ کو گاڑی چلانے دیں گے، آپ کو... جہاں جانا ہوگا، ہم آپ کو خود لے کر جائیں گے، اپنی نگرانی میں۔''

''اپنی نگرانی میں کیوں؟'' شہزاد کی بیوی فاخرہ ہنسی۔

''آپ بھی بڑی سیدھی ہیں آنٹی، آپ کے ہسبینڈ ایک مشہور و معروف بندے ہیں، مینی ''سینیر مینی'' ہیں اور یہاں کی لڑکیاں تو ایک دم طوفان ہیں۔''

''ہاں وہ تو ہم دیکھ رہے ہیں۔'' فاخرہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

''اس کی کسی بات کا برا نہیں ماننا۔'' فرزانہ نے کہا۔

''بس، بات بری لگے تو اسے پیٹ دینا ہے۔'' زارا نے پھر لقمہ دیا۔ سب ہنسنے لگے۔

رات کو شہزاد دیر تک فرزانہ اور اس کی فیملی کے بارے میں سوچتا رہا۔ برسوں بعد ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی، بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فرزانہ کی چھوٹی بیٹی، مینی کی شکل بھی بار بار شہزاد کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ خاص طور سے مینی کی آنکھیں، یہ ہو بہو نجمہ کی آنکھیں تھیں، ویسی ہی بناوٹ، ویسا ہی رنگ، وہی گہرائی اور وہی بولتی ہوئی خاموشی۔

ان آنکھوں نے شہزاد کو بے طرح چونکا دیا تھا۔

صبح سویرے ہی ہوٹل کے کمرے میں فرزانہ کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ مینی آج کل اپنے فائنل ایگزیمز سے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی چھٹیاں ہیں، اس نے اور زارا نے پروگرام بنایا ہے کہ وہ تمہاری طرف آ رہی ہیں، تمہیں ساتھ لے کر ''نورمنڈی'' جائیں گی۔''

''فرزانہ، آپ لوگ خوامخواہ تکلف کر رہے ہیں، ویسے بھی میں ابھی ایک آدھ دن آرام کرنا چاہتا تھا۔'' شہزاد نے کہا۔

''تم آرام کرنا چاہتے ہو گے لیکن تمہارے بچے مچلے تو ایک دم بے قرار ہو رہے ہیں، بچوں کا دل نہیں توڑنا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ تم نے ہمیں ''آپ لوگ'' کیوں کہا۔ کیا اب ہم واقعی لوگ ہو گئے ہیں؟''

''نہیں نہیں فرزانہ! میں تو بڑا متاثر ہوا ہوں، آپ لوگوں کی گرمجوشی سے۔''

''واہ..... پھر آپ لوگوں۔ لگتا ہے کہ تم پرانی باتیں بھولنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو۔ بھئی اب ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ اب ہمیں کم از کم اپنی آنے والی نسل کے لیے تو ایک اچھا ماحول چھوڑ کر جانا چاہیے۔''

شہزاد نے گہری سانس لی۔ ''یہ ایک بڑا سچ ہے فرزانہ۔ اس پر پھر کبھی آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ سب تیار ہو جائیں۔ زارا اور مینی تقریباً ایک گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ رہی ہیں اور لنچ وہ ساتھ لے کر آئیں گی۔ انکار کی گنجائش نہیں۔''

ٹھیک ایک گھنٹے بعد کال بیل بجی۔ فاخرہ نے کہا۔ ''سنا تھا کہ یہاں ٹائم کی بہت پابندی کی جاتی ہے۔ غالباً ٹھیک ہی سنا تھا۔''

''اوہ، تم نے تو ابھی تک پی بھی نہیں لیبنی۔'' شہزاد نے کہا اور دراز میں سے وہ طویل لچک دار پٹیاں نکال لیں۔ فاخرہ کرسی پر بیٹھی تھی، وہ پاؤں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی پنڈلیوں پر لچک دار پٹی لپیٹنے لگا۔ اس پٹی کی وجہ سے فاخرہ کو چلنے پھرنے میں قدرے آسانی رہتی تھی۔

تھی اور زارا ایک سرخ Peugeot کار میں آئی تھی۔ بینی نے جینز پہن رکھی تھی، جبکہ زارا اسکرٹ میں تھی۔ بینی نے دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس کا چشمہ دیکھ کر نجانے کیوں شہزاد کو اطمینان سا محسوس ہوا۔ اس اطمینان کی وجہ بینی کی آنکھوں کا اوجھل ہو جانا تھا۔ شہزاد نے ان آنکھوں کو جتنی بار دیکھا تھا، اسے ایک شاک سا لگا تھا۔ وہ حسب سابق بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دور نیچے دریائے سین کو دیکھا اور چہک کر بولی۔ "دیکھو یک سٹر! کل والے دونوں اولڈ مین پھر وہیں پر بیٹھے ہیں۔"

زارا کے ساتھ شہزاد نے بھی کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک سے سیڑھیاں اتر کر دریا کے کنارے تک چلی گئی تھیں۔ وہاں کنارے پر شاہ بلوط کے درخت تھے اور صبح کی خوشگوار دھوپ تھی۔ پتھر کے ایک بنچ پر ترپالی اور اون کے دو فرانسیسی باسبے خاموش بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

بینی نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بوڑھے یقیناً اپنے گزرے دنوں کی باتیں کر رہے ہوں گے اور پرانے یار یاد آتے ہوں گے۔ جوانی کے دنوں میں ان کی کرن فرینڈز ہوں گی۔ وہ ان کے ساتھ دریا پر کشتی چلاتے ہوں گے، جاگنگ کرتے ہوں گے اور درختوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوں گے، کہیں کہیں کنارے پر دسترخوان بچھا کر انہوں نے اپنے سہانے دنوں میں بے شمار لنچ کیے ہوں گے اور دل کی دھن پر رقص کیا ہوگا۔ اب اس کنارے پر بیٹھے وہ ماضی کے سارے منظر ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہوں گے، بالکل جیسے کتابوں کے ورق الٹتے سے گئے موسموں کے پھول ملتے ہیں۔"

شہزاد نے تعجب سے اسے دیکھا، پھر زارا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بھئی! یہ تمہاری بہن تو واقعی شاعرہ ہے۔ دیکھو اس نے کھڑے کھڑے نظم کہہ دی۔"

"نظم تو بہت اونچی شے ہوتی ہے بائی لارڈ۔ یہ تو ایک معمولی سا تخیل ہے۔" وہ کھلکھلائی۔

وہ کمرے میں آکر دھوپ کا چشمہ اتارنا بھول گئی تھی اور اس کی یہ بھول شہزاد کے لیے اطمینان بخش تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے اور نوٹرے ڈیم کیتھیڈرل کی طرف روانہ ہو گئے جو دریا کے پل کے اوپر سے گزرے۔ دونوں اہم عمارتوں کے اس طرف مراقبے کی حالت میں بیٹھے تھے۔

وہ ایک قبرستان سنسان راستے سے ہوتے ہوئے اچانک ہی سڑکوں کے وسط سے نمودار ہو گئے یوں لگا جیسے وہ کسی طویل سرنگ سے گزر کر اچانک ہی "سٹی سینٹر" میں آگئے ہیں۔ پیرس اپنی تمام تر خوبصورتی اور گہما گہمی کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا۔ دلکش عمارتیں، چمکیلے بازار، سیاحوں کی ٹولیاں، زرق برق لباس اور روشن دمکتے چہرے، سائیکل سواروں کے گروپس، گشت پٹرل کرتی کاریں، صاف ستھری بسیں اور لینیں، ہر طرف ایک خوبصورت حرکت نظر آئی۔ وہ سب اس منظر میں محو ہو کر رہ گئے اور پھر ایفل ٹاور کے نوکیلے ڈیم کا گرجا اپنی پوری آن بان کے ساتھ ان کے سامنے جلوہ گر ہو گیا۔ بلند و بالا قدیم عبادت گاہ کے سامنے مختلف رنگ و نسل کے سیاحوں کا ہجوم تھا اور ان کے درمیان نوٹرے ڈیم کیتھیڈرل کی تمکنت سے کھڑا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں میں ہی ہوں جس کو تم نے بارہا تصویروں، فلموں اور تحریروں میں دیکھا ہے۔ میں تمہیں کی پہچان ہوں اور اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔"

پرشکوہ عمارت کو باہر سے ملاحظہ کرنے کے بعد اب وہ اندر جا رہے تھے۔ اندر جانے والوں کی ایک طویل قطار تھی۔ فائزہ تو اس نظارہ کو دیکھتے ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ "میں یہیں بیٹھا رہوں گی۔" اس نے ایک دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا اور اپنی لمبوترنیم کی بیساکھیاں اپنے سامنے رکھ لیں۔

"چلیں ٹھیک ہے، میں بھی آنٹی کے پاس ہی بیٹھتی ہوں۔" زارا بولی۔

شہزاد بچوں کو لے کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بینی بھی ساتھ تھی جبکہ زارا سب سے آگے تھی۔ ایک طرف انگلی اٹھا کر بولی۔ "وہ دیکھیں جی، میں ٹھیک کہہ رہی تھی ناں کہ رش نہیں ہوگا۔ رونکی ہوا ہے، انٹرنس فری۔"

شہزاد نے گہری سانس لی۔ "بھئی، انٹرنس تو فری ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ایگزٹ فری نہ ہو۔ وہ باہر نکلنے کے ڈھیر سارے پیسے مانگ لیں۔"

اور زور سے ہنسی اور اس کے بال چہرے پر پھیل گئے۔ ابیر بھی ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ "تو آپ بھی مذاق بھی کر لیتے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ۔۔۔ آپ بالکل ہی الرجن ویوالی سی شرح ہوں گے۔"

"ویوالی۔۔۔ وہ کیوں؟"

"آپ کے ساتھ بھی تو زیادتی ہوئی ہے ناں۔ مجھے سب پتا ہے، چچی بتاتی تھیں۔" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

شہرِ محبت

طاہر جاوید مغل

دوسرا حصہ

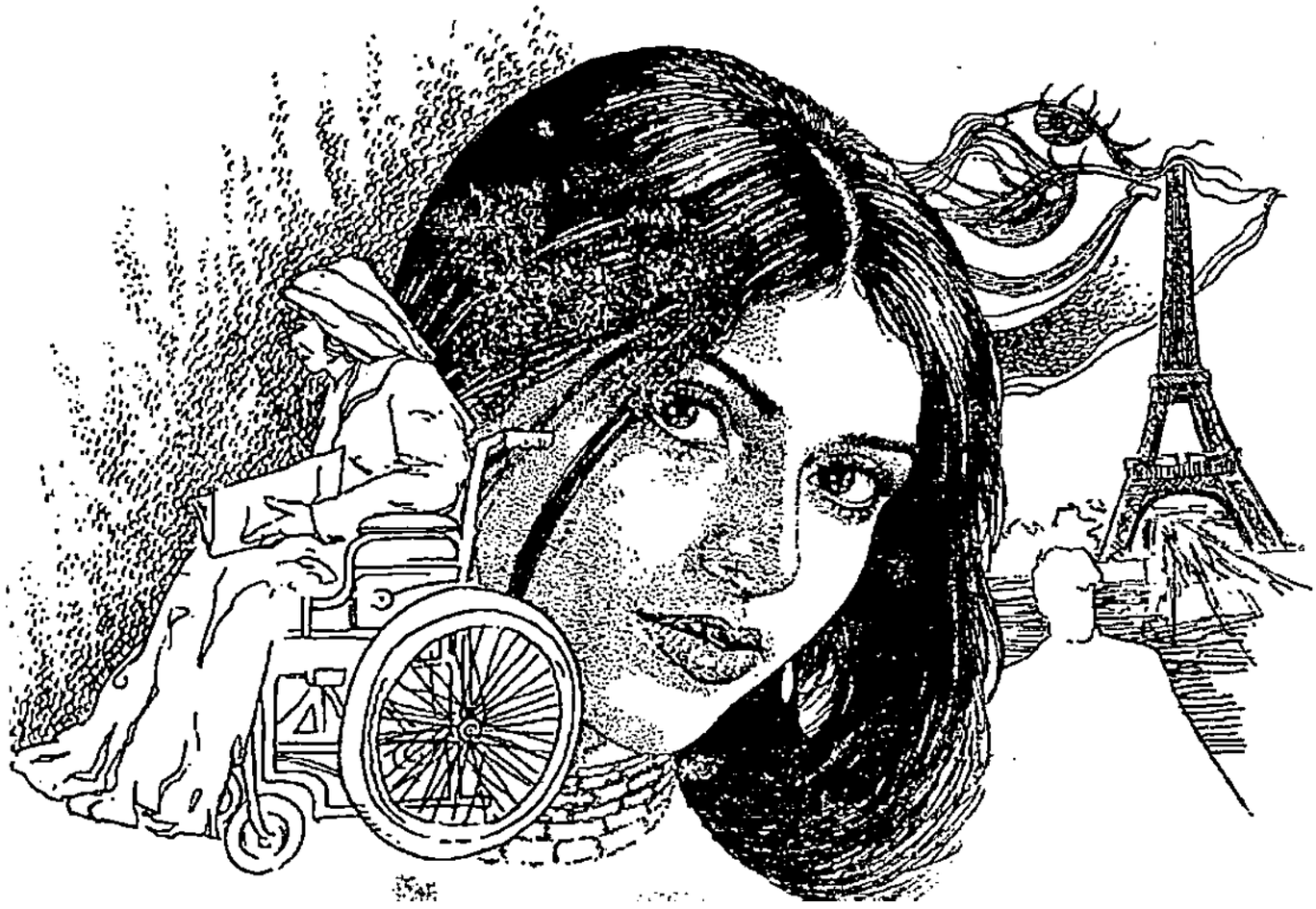
چاہت کے سپنے بڑے سُندر اور نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں مگر..... یہاں تو حسد ورقابت کی اتنی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد ورقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی مقصد برآری کے لیے لوگ کیا کیا گُر اپنا لیتے ہیں اور کسی کو ذلّت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کیسے کیسے ہنر آزماتے ہیں لیکن..... قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی..... اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کے جو لمحات اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکے ہیں یوں اتنے دلکش سراپا میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوں گے..... مگر جانے کیوں اس بار اس کی آنکھیں شہرِمحبت کا یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہوسکیں..... خوشبوئوں کی سرزمین پیرس کی حسین رہ گزاروں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان۔ محبوب مصنّف طاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی۔

جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان عشق

''میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔''

''اچھا چلیں چھوڑیں۔ کوئی اور بات کریں۔'' وہ بچوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

ایک دم شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ شاید اپنی خالہ نجمہ کا ذکر کرنے والی تھی۔ شہزاد کو یہ سب کچھ ناگوار محسوس ہوا۔ بہرحال اسی دوران میں وہ کلیسا کے اندر داخل ہوچکے تھے۔ یہی وقت تھا جب کلیسا کی گھنٹیاں زور شور سے بجنے لگیں۔ اندر سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کھوے سے کھوا چھل



رہا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں لوگوں کی سرگوشیاں، شمع کے جھلملاتے شعلے، خوبصورت کام والی طویل کھڑکیاں اور مرصع دیواریں، یہ سب کچھ قابل دید تھا۔ کیمروں کی فلیش گنز چمک رہی تھیں۔ وڈیو کیمرے بھی حرکت میں تھے۔ بلند و بالا چھت سے نیچے ایک آرچ میں سے گزرتے ہوئے عینی نے کہا۔ ''آپ کو ہالی وڈ کی مشہور فلم، ہنچ بیک آف دی نوٹرے ڈیم تو ضرور یاد آگئی ہوگی؟''

''میں نے سنا تو ہے لیکن فلم دیکھی نہیں۔'' شہزاد نے سادگی سے کہا۔

''عمیر! تم نے بھی نہیں دیکھی؟'' عینی نے عمیر سے پوچھا۔

اس نے بھی نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''آپ اور آپ کے ابو، دونوں بڑے نکمے ہیں یہ بھی کوئی نہ دیکھنے والی فلم تھی۔ اوہ مائی گاڈ، ایسا کام کیا ہے انتھونی کوئین نے کہ بس حد کر دی ہے اور ساتھ میں ہے جینا لولو بریجڈا۔ اتنی پیاری لگتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں اور پھر ان دونوں کا دھیما دھیما پیار۔ بائی گاڈ مزہ آجاتا ہے۔ یہ دیکھیں..... یہ جو رنگین پھول بوٹوں والی دو کھڑکیاں ہیں ناں، ان کے بالکل سامنے فائٹ ہوئی تھی انتھونی کوئین اور گارڈز کے درمیان۔ بڑی دھواں دھار فائٹ۔ ڈشوں ڈشوں دھڑام اور یہ اوپر جو گیلریاں نظر آرہی ہیں ناں آپ کو، یہیں پر ''ہنچ بیک'' رہتا تھا۔ اسے یہاں قید کر دیا گیا تھا۔ بے چارہ کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے پیرس کی گہما گہمی دیکھتا تھا اور آزادی کے لیے تڑپتا تھا..... اور ہاں مجھے یاد آیا فلم کا اصل نام نوٹرے ڈیم ڈی پیرس تھا۔'' وہ فلم کی پوری اسٹوری سنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شہزاد نے کہا۔

''اچھا آہستہ بولو، لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔''

''وہ تو میں نہ بھی بولوں گی تو دیکھتے رہیں گے۔'' وہ بے باکی سے بولی اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم کافی بگڑی ہوئی بچی ہو۔'' شہزاد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں مائی لارڈ۔ میں بگڑی ہوئی نہیں ہوں اور بچی بھی نہیں ہوں۔ آئی ایم اے ینگ گرل۔'' اس نے تن کر دکھایا اور ایڑیاں بھی اونچی کر لیں۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے، تماشا نہ بناؤ۔'' شہزاد نے گھبرا کر کہا۔

''چلیں آپ کے بارے میں میرا ایک اندازہ تو درست ثابت ہوا۔'' وہ بولی۔

''کیسا اندازہ؟''

''میں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی تھی مجھے لگتا تھا کہ آپ کافی محتاط ..... بلکہ..... بلکہ ڈرپوک واقع ہوئے ہوں گے۔''

''پتا نہیں، کیا بولتی چلی جارہی ہو۔'' شہزاد نے زچ ہو کر کہا اور شیشے کے شوکیس میں نوٹرے ڈیم کلیسا کا ماڈل دیکھنے لگا۔

''عمیر کہاں ہے؟'' اچانک عینی نے چونک کر پوچھا۔

انہوں نے اردگرد دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ''عمیر'' شہزاد نے دو تین بار پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اسے ڈھونڈنے لگے۔ لاتعداد ستونوں، محرابوں اور سیاحوں کے اندر، آخر وہ دکھائی دے گیا۔ وہ ایک کمپیوٹرائزڈ مشین کے سامنے کھڑا تھا۔ عینی نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سرزنش کی۔

''کیا کر رہے تھے یہاں؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''آٹو میٹک موم بتیاں نکال رہا تھا۔''

''اوئے یہ آٹو میٹک موم بتیاں کیا ہوتی ہیں؟'' عینی نے پوچھا۔

''یہ دیکھیں، اس مشین میں پانچ یورو ڈالیں تو موم بتیوں کا بنڈل خود بخود باہر نکل آتا ہے۔''

''تو الو بائے! یہ کہو ناں کہ آٹو میٹک مشین سے موم بتیاں نکال رہا تھا۔'' عینی نے کہا۔

پھر شہزاد کو دکھانے کے لیے اس نے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے پانچ یورو نکالے اور موم بتیوں کا بنڈل نکال کر دکھایا۔

لوگ بنڈل نکال نکال کر مختلف جگہوں پر شمعیں روشن کر رہے تھے۔ اگر گرجے کی لائٹس بجھا دی جاتیں تو ان شمعوں کی روشنی سے بھی گزارا ہو سکتا تھا۔

قدیم تصویروں، محرابوں اور راہداریوں میں قریباً ایک گھنٹا گھومنے کے بعد وہ باہر نکلے اور گرجے کو باہر سے دیکھنے کے لیے اس کے پہلو میں ایک چوبی بنچ پر جا بیٹھے۔ یہاں کبوتروں کی بھرمار تھی۔ عمیر اور احسن بسکٹ توڑ توڑ کر کبوتروں کو کھلانے لگے۔ کبوتروں کا جمگھٹا ہو گیا۔ شہزاد ان مناظر کی تصاویر اتارنے لگا۔ عینی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آپ تصویریں بہت اچھی بناتے ہیں۔ آخر پروفیشن ہے ناں آپ کا۔ آپ کے بنائے ہوئے کئی کمرشل بھی میں نے پاکستان کے ٹی وی چینلز پر دیکھے ہیں، دو تین تو کمال کے ہیں۔ خاص طور سے وہ بیوٹی سوپ والا اور پھر اس لڑکی والا جو سکٹ والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ آپ کے بنائے ہوئے

رہا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں لوگوں کی سرگوشیاں، شمع کے جھلملاتے شعلے، خوبصورت کام والی طویل کھڑکیاں اور مرصع دیواریں، یہ سب کچھ قابل دید تھا۔ کیمروں کی فلیش گنز چمک رہی تھیں۔ وڈیو کیمرے بھی حرکت میں تھے۔ بلند و بالا چھت سے نیچے ایک آرچ میں سے گزرتے ہوئے عینی نے کہا۔ ''آپ کو ہالی وڈ کی مشہور فلم، ہنچ بیک آف دی نوٹرے ڈیم تو ضرور یاد آگئی ہوگی؟''

''میں نے سنا تو ہے لیکن فلم دیکھی نہیں۔'' شہزاد نے سادگی سے کہا۔

''عمیر! تم نے بھی نہیں دیکھی؟'' عینی نے عمیر سے پوچھا۔

اس نے بھی نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''آپ اور آپ کے ابو، دونوں بڑے نکمے ہیں یہ بھی کوئی نہ دیکھنے والی فلم تھی۔ اوہ مائی گاڈ، ایسا کام کیا ہے انتھونی کوئین نے کہ بس حد کر دی ہے اور ساتھ میں ہے جینا لولو بریجڈا۔ اتنی پیاری لگتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں اور پھر ان دونوں کا دھیما دھیما پیار۔ بائی گاڈ مزہ آجاتا ہے۔ یہ دیکھیں..... یہ جو رنگین پھول بوٹوں والی دو کھڑکیاں ہیں ناں، ان کے بالکل سامنے فائٹ ہوئی تھی انتھونی کوئین اور گارڈز کے درمیان۔ بڑی دھواں دھار فائٹ۔ ڈشوں ڈشوں دھڑام اور یہ اوپر جو گیلریاں نظر آرہی ہیں ناں آپ کو، یہیں پر ''ہنچ بیک'' رہتا تھا۔ اسے یہاں قید کر دیا گیا تھا۔ بے چارہ کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے پیرس کی گہما گہمی دیکھتا تھا اور آزادی کے لیے تڑپتا تھا..... اور ہاں مجھے یاد آیا فلم کا اصل نام نوٹرے ڈیم ڈی پیرس تھا۔'' وہ فلم کی پوری اسٹوری سنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شہزاد نے کہا۔

''اچھا آہستہ بولو، لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔''

''وہ تو میں نہ بھی بولوں گی تو دیکھتے رہیں گے۔'' وہ بے باکی سے بولی اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم کافی بگڑی ہوئی بچی ہو۔'' شہزاد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں مائی لارڈ۔ میں بگڑی ہوئی نہیں ہوں اور بچی بھی نہیں ہوں۔ آئی ایم اے ینگ گرل۔'' اس نے تن کر دکھایا اور ایڑیاں بھی اونچی کر لیں۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے، تماشا نہ بناؤ۔'' شہزاد نے گھبرا کر کہا۔

''چلیں آپ کے بارے میں میرا ایک اندازہ تو درست ثابت ہوا۔'' وہ بولی۔

''کیسا اندازہ؟''

''میں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی تھی مجھے لگتا تھا کہ آپ کافی محتاط ..... بلکہ..... بلکہ ڈرپوک واقع ہوئے ہوں گے۔''

''پتا نہیں، کیا بولتی چلی جارہی ہو۔'' شہزاد نے زچ ہو کر کہا اور شیشے کے شوکیس میں نوٹرے ڈیم کلیسا کا ماڈل دیکھنے لگا۔

''عمیر کہاں ہے؟'' اچانک عینی نے چونک کر پوچھا۔

انہوں نے اردگرد دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ''عمیر'' شہزاد نے دو تین بار پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اسے ڈھونڈنے لگے۔ لاتعداد ستونوں، محرابوں اور سیاحوں کے اندر، آخر وہ دکھائی دے گیا۔ وہ ایک کمپیوٹرائزڈ مشین کے سامنے کھڑا تھا۔ عینی نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سرزنش کی۔

''کیا کر رہے تھے یہاں؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''آٹو میٹک موم بتیاں نکال رہا تھا۔''

''اوئے یہ آٹو میٹک موم بتیاں کیا ہوتی ہیں؟'' عینی نے پوچھا۔

''یہ دیکھیں، اس مشین میں پانچ یورو ڈالیں تو موم بتیوں کا بنڈل خود بخود باہر نکل آتا ہے۔''

''تو الو بائے! یہ کہو ناں کہ آٹو میٹک مشین سے موم بتیاں نکال رہا تھا۔'' عینی نے کہا۔

پھر شہزاد کو دکھانے کے لیے اس نے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے پانچ یورو نکالے اور موم بتیوں کا بنڈل نکال کر دکھایا۔

لوگ بنڈل نکال نکال کر مختلف جگہوں پر شمعیں روشن کر رہے تھے۔ اگر گرجے کی لائٹس بجھا دی جاتیں تو ان شمعوں کی روشنی سے بھی گزارا ہو سکتا تھا۔

قدیم تصویروں، محرابوں اور راہداریوں میں قریباً ایک گھنٹا گھومنے کے بعد وہ باہر نکلے اور گرجے کو باہر سے دیکھنے کے لیے اس کے پہلو میں ایک چوبی بنچ پر جا بیٹھے۔ یہاں کبوتروں کی بھرمار تھی۔ عمیر اور احسن بسکٹ توڑ توڑ کر کبوتروں کو کھلانے لگے۔ کبوتروں کا جمگھٹا ہو گیا۔ شہزاد ان مناظر کی تصاویر اتارنے لگا۔ عینی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آپ تصویریں بہت اچھی بناتے ہیں۔ آخر پروفیشن ہے ناں آپ کا۔ آپ کے بنائے ہوئے کئی کمرشل بھی میں نے پاکستان کے ٹی وی چینلز پر دیکھے ہیں، دو تین تو کمال کے ہیں۔ خاص طور سے وہ بیوٹی سوپ والا اور پھر اس لڑکی والا جو سکٹ والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ آپ کے بنائے ہوئے

''یہ پوچھ کر کیا کرنا ہے تم نے؟''

''جن چیزوں سے بندے کو دلچسپی ہوتی ہے وہ انہیں کھوجنا چاہتا ہے مائی لارڈ۔ ان کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ انہیں ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے۔''

''لگتا ہے کہ پوئٹری نے تمہارا کچھ زیادہ ہی بیڑا غرق کیا ہوا ہے۔ پڑھائی میں تمہارے گریڈز کیا آتے ہیں؟''

''میں وہاں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ ہوں۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو یا پھر تمہارے اسکول کا معیار ایویں ہے، چلو اٹھو اب وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' شہزاد کھڑا ہو گیا۔

''آب جیکشن مائی لارڈ۔ تصویر والی بات آپ نے پھر گول کر دی ہے۔''

شہزاد سنی ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

عینی اور زارا لنچ ساتھ ہی لے کر آئی ہوئی تھیں۔ بیف کے شاندار کباب تھے۔ ساتھ ہی ڈھیر ساری سلاد اور مایونیز، ایک بڑی ڈبل روٹی تھی جس کے ساتھ مزیدار سینڈوچ بنائے جا سکتے تھے۔ عینی، شہزاد اور بچوں کے آنے تک زارا اور فاخرہ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جگہ دری بچھائی اور سامان خورونوش رکھ لیا۔ بچے دری پر قلابازیاں کھانے لگے، شہزاد نے ایک بیف کباب چکھا۔ بہت مزیدار تھا۔ ''بڑا اسپیشل ٹیسٹ ہے۔'' شہزاد نے بے ساختہ کہا۔

''آپ کی اس فین نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں جی۔'' زارا بولی۔ ''ویسے بڑے خوش قسمت ہیں آپ کہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیز کھائیں گے۔ ورنہ یہ مہارانی تو کچن میں گھس کر نہیں دیتی۔''

''دیکھو بگ سسٹر اب اس بات پر لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کا مطلب ہے کہ میں کام نہیں کرتی۔''

''نہیں کام تو کرتی ہے جی۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے اس نے ایک دن ناشتے کے لیے انڈے فرائی کیے تھے۔'' زارا نے پکا منہ بنا کر کہا۔

''بگ سسٹر!'' وہ مکا تان کر اس کی طرف بڑھی۔ شہزاد نے راستے میں ہی اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''نہیں بھئی نہیں، لڑائی نہیں۔'' فاخرہ بولی۔ ''عینی نے کباب واقعی اچھے بنائے ہیں اور مجھے پتا چلا ہے کہ یہ مایونیز بھی گھر کی بنی ہوئی ہے اور عینی نے ہی بنائی ہے۔''

اب زارا بھی سنجیدہ ہو گئی۔ اثبات میں سر ہلا کر کہنے لگی۔ ''مذاق کی بات نہیں ہے انکل، حقیقت میں یہ عینی ہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب کی ملاقات ہو سکی ہے۔ ماما نے بتایا تھا ناں آپ کو کہ آپ کے یہاں آنے کی ساری مسٹری عینی نے ہی solve کی ہے۔ وہ بڑے دنوں سے اس چکر میں پڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ نے کہاں ہاتھ آنا تھا ہمارے۔''

''یہ بھی پتا نہیں کہ شہر میں گھومتے ہوئے کہیں ہمارے پاس سے گزر جاتے اور دیکھ کر بھی نہ دیکھتے۔'' عینی شکوہ کناں انداز میں بولی۔

''خیر اب ایسی بھی بات نہیں۔'' شہزاد نے کہا۔

''ایسی بات کیوں نہیں۔ جس چیز کے بارے میں علم نہ ہو اسے بندہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس نوٹرے ڈیم کے گرجا کو ہی لے لیں جس کو اس کی تاریخ جغرافیے کا پتا نہیں ہوگا وہ پیرس دیکھتا دیکھتا اس بے چارے کے پاس سے گزر جائے گا..... شوں کر کے۔''

''مثالیں واقعی خوب دیتی ہے۔'' شہزاد بولا۔

''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔'' زارا نے کہا۔

فاخرہ اور عینی باتیں کرنے لگیں۔ فاخرہ ٹانگوں پر شال ڈالے تیم دراز تھی جبکہ عینی بے تکلفی سے اس کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی۔ عینی کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ فنون لطیفہ خصوصاً پوئٹری اور فوٹو گرافی سے دلچسپی رکھتی ہے۔ حال ہی میں اس نے قریباً ڈھائی ہزار یورو میں Nikon کا کمرشل کیمرا اور لینسز وغیرہ خریدے تھے، پاکستانی کرنسی میں یہ قریباً پونے تین لاکھ روپیہ بنتا تھا۔ فوٹو گرافی میں عینی کی دلچسپی تب مزید بڑھ گئی تھی جب ڈھائی تین سال پہلے اس نے فوٹو گرافی پر ہی شہزاد کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اب اس کی اسٹڈی کا رخ فائن آرٹ کی طرف تھا اور وہ شہزاد کی فیلڈ یعنی ''پبلسٹی ڈیزائننگ'' کی طرف جانا چاہتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عینی بے تکلفی سے پھیل کر دری پر لیٹ گئی۔ احسن نے اس کے سن گلاسز اتار لیے اور اپنی آنکھوں پر ٹکانے کی کوشش کرنے لگا۔ کل رات کی طرح شہزاد کی نگاہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں پر پڑی اور پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی..... ان آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔ شاید یہ عینی کی آنکھیں ہی نہیں تھیں، یہ کسی اور کی تھیں۔

احسن، عینی کے گلاسز شہزاد کی آنکھوں پر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ شہزاد نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''احسن،

عینی کو واپس دو عینک۔''

''آپ کا رعب سے بولنے کا انداز وہی ہے جو انگلش سیریل میں برٹش اداکار مائی لارڈ کا تھا۔'' عینی ایک بار پھر کھلکھلائی۔ ''اور شاید آپ کو غصہ بھی اسی کریکٹر کے انداز میں فوراً آجاتا ہے، ذرا سی بات پر ڈانٹ دیا احسن کو۔''

اسی دوران میں احسن لپک کر گیا اور دری پر لیٹی عینی کو عینک واپس پہنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ زور سے عینی کے چہرے پر لگا۔ عینک کی ایک ڈنڈی عینی کی آنکھ میں چبھ گئی۔ ''اوہ گاڈ'' وہ کراہی اور اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے آنکھ دبالی۔

اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا۔ شہزاد جلدی سے عینی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھوں کو کھینچ کر آنکھ سے علیحدہ کیا۔ آنکھ دیکھی۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ سرخ ہوگئی تھی۔ عینک کی ڈنڈی سیدھی پتلی پر لگی تھی۔ ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں شہزاد کو لگا کہ یہ عینی کی نہیں نجمہ کی آنکھ ہے۔ یہ چوٹ شاید نجمہ کو لگی ہے۔ اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا اس نے جیب سے تہ شدہ رومال نکالا اور دیسی طریقے کے مطابق اسے عینی کی آنکھ پر رکھ کر زور زور سے پھونکیں مارنے لگا۔

''ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں؟'' زارا نے گھبرا کر پوچھا۔

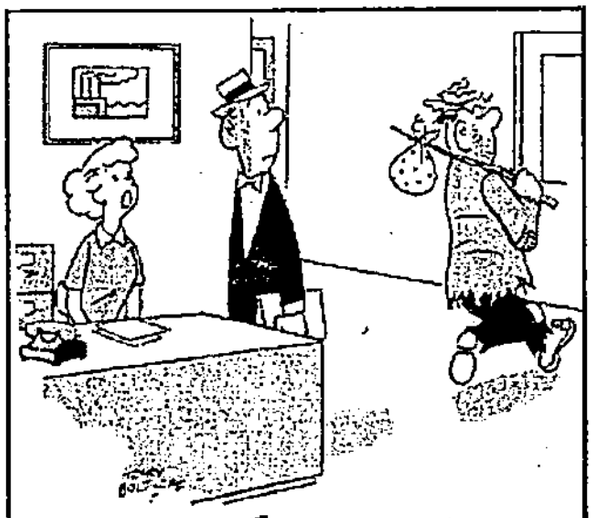
''نہیں ٹھیک ہوجائے گی۔'' شہزاد نے کہا اور اپنی طبی امداد جاری رکھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رومال ہٹایا۔ عینی نے آنکھیں جھپک جھپک کر اردگرد دیکھا۔ آنکھ کو ہولے سے ملا، پھر دوبارہ دیکھا۔

''ٹھیک ہو؟'' شہزاد نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ناک میں پانی آجانے کی وجہ سے اس نے سوں سوں کی آواز نکالی۔ شہزاد نے رومال دوبارہ اس کی آنکھ پر رکھا اور چند بار مزید اپنے سانس کی گرمی اس کی آنکھ تک پہنچائی۔ اس دفعہ رومال ہٹایا تو صورت حال قدرے بہتر تھی۔ عینی نے براہ راست شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا۔ دیکھنے کا یہ خاص انداز بھی عینی نے شاید..... اپنی خالہ نجمہ سے مستعار لیا تھا۔ شہزاد جلدی سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

دس سالہ احسن گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔ وہ اسے چپت رسید کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن عینی نے لپک کر احسن کو اپنی



''یہ ہمارے سیلز منیجر صاحب ہیں۔ یہ کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے سڑک کے راستے اپنے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔''

طرف کھینچ لیا اور اپنے ساتھ لپٹا کر رخ پھیر لیا۔ شہزاد احسن کے اردگرد گھوم کر رہ گیا۔

''نہیں جی نہیں۔ یہ تو ہمارا چھوٹا سا بچونگڑا ہے۔'' وہ احسن کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔

''میڈیکل اسٹور سے دوا وغیرہ کا پتا کرلو۔'' فاخرہ نے کہا۔

''نہیں آنٹی، یہاں عام طور پر اسٹور سے دوا نہیں ملتی۔ ویسے بھی اب میں ٹھیک ہوں۔'' عینی نے کہا۔

''دیکھ لو اگر تم بیمار ہوگئیں تو انکل اینڈ فیملی کو سیر کون کرائے گا۔'' زارا نے مسکراتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا۔

''کیا مطلب؟ آپ لوگ ہمیں اس آفت کے حوالے کردیں گے؟'' شہزاد کا اشارہ عینی کی طرف تھا۔

''جی تو چاہتا تھا کہ میں اور ماما بھی آپ کے ساتھ ہوں لیکن قرعہ فال اسی کے نام نکلا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فائنل ایگزیمز کے بعد دس پندرہ دن کے لیے آف ہے۔''

''بگ سسٹر! میں آف نہ بھی ہوتی تو انکل اور آنٹی کے لیے وقت ضرور نکالتی۔ آپ خوامخواہ مجھے ڈی گریڈ نہ کریں۔'' زارا اور عینی میں نوک جھوک پھر شروع ہوگئی۔

پیرس کا وہ دن واقعی بہت چمکیلا اور خوبصورت تھا۔ سب نے لطف اٹھایا اور شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

رات کو فرزانہ کا فون آگیا۔ اس نے شہزاد سے کہا۔ ''جمیل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آج کل وہ آب و ہوا

کی تبدیلی کے لیے زیورخ گئے ہوئے ہیں۔ اپنے ایک ترک دوست کے پاس۔ تھوڑی دیر میں آپ کو ان کا فون آئے گا۔''
جمیل فرزانہ کے شوہر کا نام تھا۔

چار پانچ منٹ بعد جمیل صاحب کی کال آہی گئی۔ جمیل احمد صاحب کا تعلق سیالکوٹ کی ایک صنعت کار فیملی سے تھا۔ ذاتی طور پر اچھے اور نفیس آدمی تھے۔ وہ عمر میں شہزاد سے چھ سات سال بڑے تھے۔ اپنے ڈیل ڈول کے سبب بھی بڑے لگتے تھے۔ شہزاد انہیں بھائی جان کہتا تھا۔ جمیل صاحب خوش اخلاقی سے ملے اور شہزاد سے اصرار کیا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر ان کے گھر شفٹ ہو جائیں۔ شہزاد نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بہرحال یہ بات تو شہزاد کے ساتھ ساتھ جمیل صاحب بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ عملی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ دونوں فیملیز میں عرصۂ دراز سے جو فاصلے موجود تھے وہ اس طرح کی قربت کی اجازت ہرگز نہیں دیتے تھے۔ اگر پاکستان میں فرزانہ کے گھر والوں کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ شہزاد، فرزانہ کے گھر ٹھہرا ہوا ہے تو یقیناً وہ بہت سیخ پا ہوتے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی عینی گاڑی پر آدھمکی۔ فاخرہ کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ موسم کی تبدیلی کے سبب ٹانگوں میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔ آج وہ کہیں جانا نہیں چاہتی تھی مگر عینی کے سامنے اس کی کوئی پس و پیش نہیں چلی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح فاخرہ کو آمادہ کر ہی لیا۔ اس کے لیے اس نے بڑی ہوشیاری سے عمیر اور بچو نگڑے یعنی احسن کی مدد بھی حاصل کی۔ آج پروگرام تھا پیرس کا مشہور و معروف عجائب گھر لوور دیکھنے کا۔

کل کی طرح آج بھی عینی لنچ کا انتظام گھر سے کر کے لائی تھی۔ سرخ رنگ کی چمکدار ''پی جو'' گاڑی میں دو فٹن، منرل واٹر اور کوک کی دو بڑی بوتلیں رکھی تھیں۔ بچے آگے عینی کے ساتھ وال سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شہزاد اور فاخرہ عقبی سیٹ پر تھے۔ کل والے دونوں بوڑھے آج بھی دریائے سین کے کنارے خاموش بیٹھے تھے۔ جلد ہی ان کی گاڑی پیرس کی صاف ستھری سڑکوں پر رواں تھی۔ پیرس کی کئی سڑکیں ہموار تارکول کی بجائے پتھروں کی تھیں۔ گاڑی ایسی سڑکوں پر ذرا تھرتھراتی ہوئی چلتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس معمولی تھرتھراہٹ سے بچنے کے لیے فرانسیسی اپنی قدیم روایات کو ملیامیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ ایسی ہی ایک شاندار سڑک سے گزرتے ہوئے عینی نے بتایا۔ ''یہ شانزالیزے ہے۔ اسے پیرس کا ہارٹ کہنا چاہیے۔ اس کے کناروں پر دنیا کے بہترین ریسٹورنٹ اور شاپنگ سینٹر موجود ہیں۔ اسے ہم بعد میں اطمینان سے دیکھیں گے۔''

''اطمینان سے کیوں دیکھیں گے؟'' احسن نے معصومیت سے پوچھا۔

''بھئی یہ پیرس کا ہارٹ جو ہوا اور ہارٹ کو بڑے اطمینان سے دیکھنا چاہیے۔ یہ بڑا نازک کام ہوتا ہے۔'' وہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنسی۔

آج اس نے کریم کلر کی پینٹ پہن رکھی تھی جس کے پائنچے اڑسے گئے تھے، مردانہ اسٹائل کی..... کالر والی آف وائٹ شرٹ تھی جس پر سرخ دھاریاں تھیں، بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو گاڑی میں داخل ہونے والی ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ آج اس نے ٹیکنی کلر فریم والے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ تصدیق شدہ اطلاع کے مطابق وہ بیسویں سال میں داخل ہو رہی تھی، تاہم اپنی عمر سے ایک دو سال چھوٹی لگتی تھی۔ شہزاد نے اسے پروفیشنل نظروں سے دیکھا اور اسے لگا کہ یہ لڑکی ڈیڑھ دو سال کے اندر جب تھوڑی سی اور بھر جائے گی تو یہ آسانی ماڈلنگ میں آسکتی ہے۔

لوور کا عجائب گھر ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ حد نگاہ تک اس معروف میوزیم کی بیرونی دیوار نظر آتی تھی۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت شہزاد کا خیال تھا کہ شاید لوور کا میوزیم پیرس سے باہر ہے اور درختوں سے گھری ہوئی کوئی جگہ ہے، لیکن یہ میوزیم ایک بارونق علاقے میں تھا۔ داخلے کا ٹکٹ نو یورو کا تھا یعنی پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً 1035 روپے فی کس۔ شہزاد کی کوشش کے باوجود عینی نے اسے ٹکٹ نہیں خریدنے دیا۔ عینی ٹکٹ لے کر آئی اور پھر انہیں لے کر اس عظیم الشان میوزیم میں داخل ہوگئی۔

''یہاں موم کے بنے ہوئے مجسمے ہیں؟'' احسن نے معصوم لہجے میں پوچھا۔

عینی نے ''پیار سے دانت پیس کر'' اس کے سرخ گال پر زور سے چٹکی لی اور بولی۔ ''موم کے مجسمے یہاں نہیں لندن کے میوزیم میں ہیں بچو نگڑے۔ یہاں اور بہت کچھ ہے اور سب سے بڑھ کر یہاں مونالیزا کی اصل پینٹنگ ہے۔ لوگ پوری دنیا سے اسے دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔''

''مونالیزا!! اس میں کوئی خاص بات ہے؟'' عمیر نے پوچھا۔

''مونالیزا بالکل میری طرح مسکراتی تھی۔ مجھ میں اور مونالیزا میں بس یہی ایک چیز ہے جو دیکھنے والوں کو پسند آتی ہے۔ یعنی ہماری مسکراہٹ۔''

Scanned And Upload

''لیکن تمہاری مسکراہٹ تو کچھ خاص نہیں ہے۔'' شہزاد نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ میری اور مونالیزا کی مسکراہٹ ایک جیسی ہے۔ اب آپ دوسرے لوگوں کا کیا کر سکتے ہیں مائی لارڈ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں مسکراہٹ پسند ہے تو بس پسند ہے۔ جن کو پسند نہیں وہ بھی خوردبین لگا لگا کر آنٹی مونالیزا کو دیکھتے ہیں اور پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مغزماری کے بعد انہیں بھی چاروناچار ماننا پڑتا ہے کہ ہاں کچھ نہ کچھ ہے اس مسکراہٹ میں۔''

شہزاد نے اندازہ لگایا کہ اس وسیع و عریض بے مثال میوزیم کو دیکھنے کے لیے ایک دو روز تو قطعی ناکافی ہیں۔ اگر ایک دو ہفتے دیے جاتے تو شاید میوزیم کا تھوڑا بہت حق ادا ہو جاتا۔ میوزیم کی طویل طویل گیلریوں میں آرٹ کے نادر شاہکار دیکھتے دیکھتے وہ ذرا تھک گئے تو ایک نہایت خوبصورت گیلری میں رکھے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ فاخرہ کچھ زیادہ ہی تھک گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں تو بس اس صوفے پر بیٹھی بیٹھی آس پاس کی تصویریں ہی دیکھوں گی۔ آپ لوگ گھوم پھر لیں۔''

احسن بھی ماں کے پاس ہی رہ گیا۔ عمیر کو مجسموں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ شہزاد عینی اور عمیر گیلریوں میں گھومنے لگے۔ اکثر تصاویر پر نمبروں کا اندراج تھا۔ تصویر کے بارے میں تفصیل معلوم کرنا ہوتی تو انتظامیہ کے فراہم کردہ ریسیور پر مطلوبہ نمبر دبایا جاتا۔ انگلش میں اس تصویر یا مجسمے کی ساری ہسٹری سنائی دینے لگ جاتی تھی۔ یہ تفصیل مختلف زبانوں میں منتخب کی جا سکتی تھی۔

جوں جوں وہ مونالیزا کی طرف بڑھ رہے تھے ان کے اشتیاق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں مقیم ہونے کے باوجود عینی بھی یہ پینٹنگ پہلی بار ہی دیکھ رہی تھی۔ راستے میں ایک رومانٹک پینٹنگ نے شہزاد کے قدم روکے۔ یہ وکٹوریہ دور کی ایک بالکونی تھی جس میں ایک لڑکی کھڑی اشک بھری آنکھوں سے اپنے محبوب کو الوداع کہہ رہی تھی۔ بڑی کلاس کی منظر نگاری تھی۔ تصویر کوئی تین سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ عینی بھی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ حسب عادت بالکل اچانک بولی۔ ''جناب عالی آپ نے آخری ملاقات کب کی تھی نجمہ خالہ سے؟''

شہزاد گڑبڑا گیا۔ ''یہ تم ایک دم کوئی بے موقع سوال کیوں کر دیتی ہو؟'' وہ ذرا تلخی سے بولا۔

''ہائیں ہائیں، یہ بے موقع تو نہیں ہے۔ یہ سامنے والی پینٹنگ دو محبت کرنے والوں کی آخری ملاقات کا منظر پیش کر رہی ہے۔ آخر نجمہ خالہ سے آپ کی بھی ایک آخری ملاقات تو ہوئی ہوگی۔''

''ہاں، ہوئی تھی تو پھر؟''

''اس کی کچھ تفصیل بتایئے ناں۔'' وہ لاڈلے انداز میں بولی۔

''لیکن کیوں؟''

''سچی بتاؤں..... مجھے آپ کی اس ساری کہانی میں بڑی دلچسپی ہے۔''

''کیوں دلچسپی ہے؟''

''اس کا تو مجھے خود بھی پتا نہیں۔'' وہ عجیب لہجے میں بولتے ہوئے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے دھوپ کا چشمہ اتار رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر شہزاد کو پھر نجمہ کی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ بے طرح گڑبڑا گیا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو عینی! میں تمہارا بڑا ہوں۔ گفتگو کرتے ہوئے تمہیں ذرا احتیاط رہنا چاہیے۔''

وہ ایک دم دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ انداز احتجاج کرنے والا ہی تھا۔ ''ایک تو مجھے یہ پتا نہیں چلتا کہ ہم ہر معاملے میں چھوٹے اور بڑے کا ذکر کیوں کرنے لگتے ہیں۔ انسان بس انسان ہوتا ہے۔ وہ عمر سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹا یا بڑا کرنے کے کچھ اور Elements ہوتے ہیں۔''

''چلو جو کچھ بھی ہے لیکن رشتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے کا کچھ احترام وغیرہ تو ہونا چاہیے۔''

''اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کا احترام نہیں کرتی تو یہ بالکل غلط ہے، میں آپ کا اتنا احترام کرتی ہوں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ پھر عجیب سا ہو گیا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر شخص کے ساتھ ہر موضوع پر کھلم کھلا بات نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کچھ حدیں ہوتی ہیں.....''

''یہ حدیں وغیرہ سب ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں مائی لارڈ اور ان میں سے زیادہ تر حدیں بالکل بے کار ہیں۔ ایک دم کچرا۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں جی کہ جو بھی چیز بندے کی نیچر کے خلاف ہے وہ بالکل کچرا ہے۔ اسے کچرے میں ہی جانا ہے۔ آج نہیں تو کل چلی جائے گی کل نہیں تو پانچ سو سال بعد چلی جائے گی..... یا پھر پانچ ہزار سال بعد چلی جائے گی۔''

شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یقین

نہیں آیا کہ یہ کم عمر اوٹ پٹانگ سی لڑکی ایسی بھاری بھرکم باتیں بھی کرسکتی ہے۔ عمیر آگے جاکر ایک بڑے مجسمے کے گرد گھومنے لگا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا یہ خیال ہے مائی لارڈ! کہ ہم ہر موضوع پر بہ آسانی بات نہیں کرسکتے، میں تو ماما پاپا سے بھی ہر ''سبجیکٹ'' پر کھل کر بات کرتی ہوں۔ کلچر، آرٹ، عشق، محبت کی فیلنگز سب کے بارے میں، آپ بھی کرسکتے ہیں، مجھ سے بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے یا نہیں۔ اسی طرح اپنے بارے میں بھی بتا سکتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

شہزاد کو اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شاید مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح یہ بھی ناقابل فہم تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا بتاؤ، کوئی بوائے فرینڈ ہے تمہارا یا نہیں؟''

''ہے'' اس نے بلاتکلف کہا۔ ''ایک پاکستانی ہے۔ آپ کو ملواؤں گی اس سے۔ بلکہ اس کی تصویر بھی دکھاؤں گی، اس کی تصویر ہے میرے پاس۔'' شہزاد اثبات میں سر ہلا کر چپ رہا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر حسب عادت اچانک بولی۔ ''آپ کو پتا ہے کہ ارینج میرج اور لو میرج میں کیا فرق ہے۔''

''مجھے نہیں پتا۔'' شہزاد کے لہجے میں بے تعلقی تھی۔

''لو میرج'' آپ اپنی گرل فرینڈ سے کرتے ہیں اور ارینج میرج کسی دوسرے کی گرل فرینڈ سے۔'' اس نے کہا اور ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ قریباً چار گھنٹے تک مسلسل گھومنے کے بعد وہ اس عظیم الشان میوزیم کا بس ایک مختصر حصہ ہی دیکھ سکے تھے۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا یہاں تک کہ مونا لیزا کی اصل پینٹنگ بھی۔ لہٰذا اگلے روز دوبارہ آنے کا پروگرام بنا۔

☆☆☆

اس روز فاخرہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ ہاں عمیر اور احسن اپنے کیمروں سمیت ہمراہ تھے۔ کل کی طرح آج بھی عینی نے اسٹائلش ڈرائیونگ کی اور آدھ پون گھنٹے میں انہیں میوزیم پہنچا دیا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ باہر نکلے۔ ایک دم عینی ٹھٹک گئی۔ ''اوہ آپ کو اپنے بوائے فرینڈ کی تصویر تو دکھائی ہی نہیں۔'' اس نے کہا اور پلٹ کر پھر کار کی طرف گئی، کار میں سے اس نے قریباً 12 انچ ضرب 9 انچ کا ایک کارڈ پیپر نکالا۔ اس پر ایک بلیک اینڈ وائٹ چہرہ تھا، یہ پین ورک سے بنایا گیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ چہرے پر نقوش نہیں تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شہزاد نے کہا۔

''بس یہی ہے جی میرا بوائے فرینڈ۔ دیکھ لیں پاکستانی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''کپڑوں سے زیادہ ناک کان آنکھیں ضروری ہوتی ہیں اور وہ ہیں نہیں۔ لگتا ہے کہ تم نے بوائے فرینڈ کو پکنے نہیں دیا، کچا کچا ہی پیڑ سے اتار لیا ہے۔'' آج شہزاد بھی قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔

''آپ تو خود آرٹسٹ ہیں مائی لارڈ، آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ مصور کے ذہن میں جتنی تصویر ہوتی ہے اتنی ہی کینوس پر یا کاغذ پر ٹرانسفر ہوتی ہے، باقی تو سب الٹی سیدھی لکیریں ہوتی ہیں۔''

پین ورک سے بنی ہوئی تصویر شہزاد کو دکھا کر اس نے دوبارہ گاڑی میں رکھ دی۔ وہ ایک بار پھر لوور میوزیم کے خزینوں میں غوطہ زن ہوگئے۔ مصری، یونانی، رومی، پتا نہیں کون کون سی تہذیبیں تھیں جن کے آثار بڑی خوبصورتی سے مختلف گیلریوں میں سجائے گئے تھے۔ بے شمار شاہکار دیکھنے کے قابل تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کا رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں مونا لیزا موجود تھی..... لوگ ایک دوسرے سے استفسار بھی کررہے تھے کہ مونا لیزا کس جگہ ہے۔

آخر مختلف بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد وہ بھی مونا لیزا کے روبرو پہنچ گئے۔ یہاں دیکھنے والوں کا جمگھٹا تھا اور ایک پُرتقدس خاموشی تھی۔ اس جگہ کو ''اسٹیٹ روم'' کا نام دیا گیا تھا۔ شیشے کے پیچھے مونا لیزا خاص اہتمام سے رکھی گئی تھی۔ یہ تصویر دنیا کی مشہور و معروف اشیا میں سے ایک تھی اور ہر مشہور و معروف شے کی طرح اس کے اندر بھی ایک بارعب شناسائی کی کرنیں ہی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''ہاں میں ہی مونا لیزا ہوں۔ میرے ہی ہونٹوں کو لیونارڈو کے برش نے لازوال و بے مثال مسکراہٹ بخشی ہے۔ مجھ پر ہی کتابیں لکھی گئی ہیں، کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں، میں جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں لیکن مصوری کی دنیا میں یکتا ہوں۔''

ایک عجیب سے سحر نے شہزاد کو گرفت میں لے لیا لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شاید مونا لیزا کا سحر نہیں ہے اس کی شہرت کا سحر ہے۔

مونا لیزا سے رخصت ہوکر وہ آگے بڑھ گئے۔ اچانک ایک دروازے میں سے عینی کو کچھ نظر آیا۔ اس نے ایک دم شہزاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتی ہوئی میوزیم کے اندرونی احاطے کی طرف لپکی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں احسن کا ہاتھ تھا۔ عمیر کا ہاتھ تو شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شہزاد

کو اسی طرح کھینچتی ہوئی ایک اہرام نما مقام کے قریب لے گئی۔ یہ اہرام شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اردگرد فوارے تھے۔ خوبصورت روشنی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ عینی نے شیشے کے قریباً چھ میٹر بلند اہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسے پیرس کا سینٹر کہا جاتا ہے۔ یہاں تصویر اتروا کر لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔''

''تو پھر تو ہمیں بھی خوش ہونا چاہیے۔'' شہزاد نے کہا۔

''چلیں آپ کھڑے ہو جائیں عمیر اور بچو نگڑے کے ساتھ ہو جائے ایک تصویر Paris Pyramios کے سامنے۔''

شہزاد نے عینی کو تصویر کھینچنے کے حوالے سے کچھ ہدایات دیں اور پھر دونوں بچوں کے ساتھ شیشے کی تکون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ عینی نے دو تین تصویریں اتار دیں۔ اس کے بعد عینی بچوں کے ہمراہ کھڑی ہوئی اور شہزاد نے تصویریں اتاریں۔ وہ پروفیشنل تھا، اس کی اتاری ہوئی تصویریں کمال کی تھیں۔ عینی بولی۔

''ایک تصویر مجھ اکیلی کی اتاریں مائی لارڈ۔''

''وہ کیوں؟''

''بس میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بڑا فنکار اپنے ہاتھوں سے مجھے ایکسپوز کرے۔ بعد میں، میں یہ تصویر دیکھا کروں گی اور اپنے دوستوں کو فخر سے بتایا کروں گی کہ یہ تصویر ایک عالمی شہرت یافتہ آرٹسٹ کی اتاری ہوئی ہے۔''

''زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال تصویر میں اتار دیتا ہوں۔''

دھوپ بائیں رخ سے آ رہی تھی۔ شہزاد نے عینی کو خاص اینگل سے کھڑا کیا۔ اس کو کالر درست کرنے کو کہا پھر Nikon کے کیمرے کو ایڈجسٹ کر کے اس کی دو تصویریں کھینچ لیں۔ ایک تصویر واقعی بہت زبردست آئی۔ اس کی شارپ نس قابل دید تھی۔ عینی نہال ہو گئی۔

''یو آر گریٹ سر، ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں یونہی آپ کا نام نہیں ہے۔''

وہ چاروں تھک گئے تھے۔ دھوپ میں گھاس پر بیٹھ کر آئس کریم وغیرہ کھانے کا خیال انہیں اچھا لگا لیکن جس گراسی گراؤنڈ کی طرف وہ جانا چاہ رہے تھے وہاں کا ماحول کچھ ابتر نظر آیا، پودوں اور چھوٹے موٹے پیڑوں کی اوٹ میں کئی جوڑے حالت مستی میں بیٹھے ہوئے تھے یا نیم دراز تھے۔ وہ دوسری طرف نکل گئے اور چھوٹے سے باغیچے میں جا بیٹھے۔

باغیچے میں آئس کریم کھاتے ہوئے عینی نے ایک کاغذ شہزاد کی طرف بڑھایا۔ اس پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میری تازہ نظم اور اس کا موضوع ہے اجنبی پیرس۔''

شہزاد نے نظم پڑھنی شروع کی۔ اس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

پیرس اجنبی نہیں
جانا پہچانا ہے اور دیکھا بھالا ہے
اس کے سارے راستے، سارے درخت اور ساری دھوپ چھاؤں
اس کا سب کچھ مجھے ازبر ہے اور میرے دل کے قریب بھی
ن کل ایک ایسا عجیب مہمان میرے ساتھ تھا
پہلی بار ملا تھا، لیکن
اس کی وجہ سے سارا پیرس اجنبی لگا
دریائے سین کے دونوں کناروں پر موجود ہر شے
پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آئی۔

''اجنبی مہمان سے کیا مراد ہے؟'' شہزاد نے نظم پڑھ کر پوچھا۔

''آپ سب اور خاص طور سے آپ۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

اس کے ساتھ وہ اٹھ کر ایک خوبصورت جرمن لڑکی کی طرف بھاگی، لڑکی کی عمر 25 سال کے قریب ہو گی۔ اس کی شرٹ پر سامنے کی طرف انگلش میں لکھا ہوا تھا۔ ''میں اکیلی ہوں۔''

ایسے فقروں والے پہناوے یہاں اکثر نظر آتے تھے۔ عینی اس قبول صورت لڑکی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ بات کرتے ہوئے وہ چند بار ہنس ہنس کر دہری ہوئی۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں شہزاد کی طرف بھی اشارہ کیا۔

جرمن لڑکی بھی ہنس رہی تھی پھر وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر اپنے راستے پر بڑھ گئی۔ عینی بھی واپس آ گئی۔ ''کیا گپ شپ ہو رہی تھی؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''اگر بتایا تو آپ ماریں گے۔'' وہ سرخ چہرے کے ساتھ شوخ لہجے میں بولی۔

''اچھا بتاؤ، کچھ نہیں کہتا۔''

''وعدہ؟'' شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ عینی نے بڑی ادا سے شہزاد کی بند چھتری اس کے پاس سے اٹھا کر دور رکھ دی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ شہزاد چھتری سے ہی اسے مارنا شروع کر دے گا۔

''چلو ایکٹنگ نہ کرو، بتاؤ۔'' شہزاد نے ذرا تحکم سے کہا۔

''نہیں آپ ماریں گے۔'' وہ پھر ٹھنکی۔

''بھئی، تم سے وعدہ کیا ہے ناں۔''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد کھٹاک سے بولی۔ ''اس جرمن دوشیزہ سے آپ کی شادی کی بات کر رہی تھی۔ بس ایک انچ کی کسر رہ گئی ورنہ ہوسکتا تھا کہ معاملہ فکس ہو ہی جاتا۔''

''کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔'' شہزاد کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔

''دیکھیں مائی لارڈ..... عدالت کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا۔ میں تو آنٹی فاخرہ کی خواہش پر عمل کر رہی ہوں یا کہہ لیں کہ عمل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''آنٹی فاخرہ نے کیا کہا تھا؟''

''مختصر بتاؤں یا تفصیل سے؟'' اس نے مودب نظر آنے کی اداکاری کی۔

''تمہارا مختصر بھی بڑا تفصیلی ہوگا۔ اس لیے مختصر ہی بتاؤ۔''

عمیر اور احسن کچھ فاصلے پر کشتی میں مصروف تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر بولی۔ ''آج صبح جب آپ واش روم میں تھے، میں آنٹی کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر رہی تھی۔ وہ انکار کرتی جا رہی تھیں۔ میں نے کہا، آنٹی فاخرہ ان مردوں کا کوئی بھروسا شروسا نہیں ہوتا۔ آپ اگر ان کے ساتھ یہاں آئی ہیں تو پھر ساتھ ساتھ ہی رہیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ یہاں کوئی گڑبڑ کر دیں۔ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ یہ کوئی ایسا کام کریں بلکہ بڑے عرصے سے چاہ رہی ہوں۔ یہ خود ہی اس طرف نہیں آتے۔ میں نے کہا آنٹی اگر آپ واقعی اس معاملے میں سنجیدہ ہیں تو پھر اس کے لیے پیرس سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔ یہاں آ کر تو سو سال کے بوڑھوں میں بھی رومانس کی حس جاگ جاتی ہے اور وہ شادی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ آنٹی میری باتوں پر ہنستی جا رہی تھیں، کہنے لگیں، تم ان معاملوں میں کافی تیز لگتی ہو، اپنے انکل کے لیے کوئی اچھی سی میم ڈھونڈو۔ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔ تو جناب! مائی لارڈ میں نے اسی سلسلے میں تھوڑی سی کوشش کی تھی۔''

''باتیں تو تم واقعی مار کھانے والی کر رہی ہو لیکن.....''

''لیکن میں وعدہ کر چکا ہوں اس لیے کیا ہوسکتا ہے۔''

اس نے شہزاد کا فقرہ جلدی سے مکمل کر دیا اور ہنستی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

شہزاد کو فاخرہ کی فکر لگی رہتی تھی۔ وہ سہ پہر ہوتے ہی واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ ٹانگوں کے درد کے ساتھ ساتھ فاخرہ کو ہلکا سا بخار ہو چکا تھا۔ ٹانگوں کے درد اور بخار کا تعلق تھا اور اکثر ایسا ہو جایا کرتا تھا۔ تمام ضروری دوائیں شہزاد ساتھ لے کر آیا تھا۔ انجکشن وغیرہ بھی وہ خود لگا لیتا تھا۔ لہٰذا وہ فاخرہ کی تیمارداری میں لگ گیا۔

اگلی صبح فرزانہ، اس کی دونوں بیٹیاں اور داماد ریحان فاخرہ کی تیمارداری کے لیے آئے تھے۔ وہ بہت سا پھل اور سامان خورونوش بھی ساتھ لائے تھے۔ فاخرہ کی تکلیف دیکھتے ہوئے فرزانہ نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ لوگ ہوٹل چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ گھر چلیں مگر شہزاد کے نزدیک یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کے قیام و طعام کا بیشتر خرچا اسے مدعو کرنے والا ادارہ اٹھا رہا تھا۔

فرزانہ نے شہزاد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اگر گھر نہیں جانا تو پھر عینی کو یہاں رکھو۔ یہ فاخرہ کی دیکھ بھال کر لے گی۔''

''میں اس سب کا عادی ہوں فرزانہ۔ میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''لیکن یہ پردیس ہے۔ دیس اور پردیس میں فرق ہوتا ہے۔'' فرزانہ نے جواب دیا۔

باقی سب چلے گئے مگر عینی وہیں رہی اور اس کی وجہ سے واقعی کئی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ فاخرہ کو جب یوں بخار ہوتا تو سات آٹھ دن ضرور چلتا تھا۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے بچوں پر افسردگی چھا جایا کرتی تھی تاہم اس دفعہ عینی نے فاخرہ سمیت کسی کو افسردہ نہیں ہونے دیا۔ تین چار دن کے اندر وہ گھر کا ایک فرد ہی نظر آنے لگی۔ کبھی فاخرہ کو دوا کھلا رہی ہے، کبھی بچوں کے کپڑے بدل رہی ہے۔ کبھی رات گئے شہزاد کو الیکٹرک کیتلی میں چائے بنا کر دے رہی ہے۔ رات گئے سے مراد دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مقامی دستور کے مطابق شام سات آٹھ بجے تک ڈنر کر لیا جاتا تھا۔ کبھی دس بجے کے قریب شہزاد کھڑکی سے باہر جھانکتا تو لگتا کہ سارا پیرس سویا پڑا ہے۔ تمام بازار سر شام ہی بند ہو جاتے تھے، بس کہیں کہیں ہوٹل ..... وغیرہ کھلے رہ جاتے تھے یا پھر مخصوص جگہوں پر نائٹ لائف کی سرگرمی ہوتی تھی اور یہ صورت حال کوئی پیرس کے ساتھ ہی خاص طور پر نہیں تھی، قریباً پورا یورپ جلدی سونے اور جلدی جاگنے کے فارمولے پر عمل کرتا نظر آتا ہے۔ صرف

ویک اینڈز پر لوگ دیر تک جاگتے ہیں لیکن یہ دیر تک جاگنا بھی بس رات بارہ ایک بجے تک ہی ہوتا ہے۔ شہزاد کو تو خیر یہ باتیں پہلے سے معلوم تھیں لیکن فاخرہ اور بچے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ غروب آفتاب کے وقت ہی لوگوں کو کینڈل ڈنر کرتے دیکھتے تو دانتوں میں انگلیاں داب لیتے۔ شروع میں تو عمیر کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ ڈنر نہیں بلکہ لیٹ لنچ کر رہے ہیں۔

ایک دن احسن نے فرمائش کی کہ وہ صبح ناشتے میں پائن ایپل کیک پیسٹری کھائے گا۔ یہ شام چھ ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا لیکن عینی اسی وقت بیکری جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہزاد نے کہا۔ ''بھئی ابھی تو ناشتے کا وقت ہونے میں تیرہ چودہ گھنٹے باقی ہیں۔ اتنی جلدی کیا ہے؟''

''ناشتے میں تیرہ چودہ گھنٹے ہیں لیکن دکانیں بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی ہے۔ یہاں ناشتا اسی وقت خریدا جاتا ہے مائی لارڈ۔''

وہ جانے کے لیے تیار ہوئی تو شہزاد اور احسن بھی چل پڑے۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک ذیلی سڑک پر وہ ترک مسجد کے پاس ہی تھا۔ وہ ایک نہایت صاف شفاف، ہر لحاظ سے نیم آلودہ شام تھی، چمکیلی کاریں چمکیلی سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ اکثر یورپی شہروں کی طرح پیرس میں بھی ٹریفک کا نظام بہترین ہے۔ چھوٹی چھوٹی اندرونی سڑکوں پر بھی سگنل اور زیبرا کراسنگ وغیرہ موجود ہیں۔ بیشتر زیبرا کراسنگ پر ٹریفک سگنل ہوتے ہیں پیدل چلنے والوں کے لیے لیکن کچھ پر نہیں بھی ہوتے۔ ایسے جونہی پیدل چلنے والے کا پاؤں زیبرا کراسنگ کو چھوتا ہے سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو روک لیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والوں کو بھی گاڑیوں کے حقوق کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شہزاد نے نوٹ کیا تھا کہ اگر پیدل چلنے والے روڈ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سڑک کراس کرنے کی کوشش کریں تو گاڑی سوار ان کو قطعاً رعایت نہیں دیتے۔ وہ بڑے زناٹے کے ساتھ سامنے سے یا پیچھے سے گزر جاتے ہیں۔

اس دن بھی شہزاد سے ایسی ہی غلطی ہوئی۔ وہ پانچ چھ سال کی ایک نہایت ہی خوبصورت سائیکل سوار بچی کو دیکھ رہا تھا، اس لیے ٹریفک سگنل پر غور نہ کر سکا۔ اس نے زیبرا کراسنگ پر دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ ایک کار کے پہیے چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ عین وقت پر شہزاد نے ایک جھٹکے سے اپنے قدم روکے اور خود کو پیچھے ہٹا لیا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' عینی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

عمیر بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ ''آج تو آپ واقعی پروفیسر لگے۔'' عینی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''پتا نہیں چلا۔'' شہزاد منمنایا۔ اس نے اپنی گردن عقب سے تھامی ہوئی تھی۔ ایک دم پیچھے ہٹنے کی کوشش میں اس کی گردن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ پیسٹریاں اور بسکٹ وغیرہ لے کر ہوٹل واپس پہنچے۔ شہزاد کی گردن میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا لیکن اس نے کسی کو بتایا نہیں۔ فاخرہ نے دوا کھائی تھی لہٰذا سر شام ہی سو گئی تھی۔ اس کی بوجھل سانسوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے بیڈ روم کا دروازہ ہولے سے بند کر دیا تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔

وہ چاروں کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے پھر کارڈ کھیلنے لگے۔ اسی دوران میں عمیر نے اپنی کیس میں سے لوڈو نکال لی۔ شہزاد کا خیال تھا کہ عینی کو لوڈو کھیلنا نہیں آتا ہوگا مگر اسے آتا تھا۔ عمیر احسن اور وہ کھیلنے لگی پھر انہوں نے زبردستی شہزاد کو بھی شریک کر لیا۔ عمیر بڑا تیز تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے برتری حاصل کر لی۔ شہزاد کی باری آئی تو عینی نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی انگلی شہزاد کے گھٹنے پر چبھوئی اور اسے اشارتاً بتایا کہ وہ اپنی تیسری گوٹی کو محفوظ خانے میں لے جائے ورنہ عمیر اسے پیٹ دے گا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اچانک شہزاد کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ایسا پہلے بھی تو ہوتا رہا تھا..... بالکل اسی انداز میں..... اسی ادا کے ساتھ..... کوئی اسی طرح..... کھیل میں بڑی ہمدردی سے اسے خاموش مشورے دیا کرتا تھا۔ مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔

وہ چونک کر عینی کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑی محویت سے اپنی باری لینے میں مصروف تھی۔ اچانک شہزاد اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''کیا ہوا ابو جی۔'' عمیر اور احسن ایک ساتھ بولے۔

''کچھ نہیں، تم کھیلو۔ میری گردن میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا آرام کرتا ہوں۔''

عینی بولی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں۔ یہ درد سڑک کو غلط طریقے سے پار کرنے کی وجہ سے ہے۔ میں اسی وقت سمجھ گئی تھی، چلیں آپ لیٹیں، میں پیچھے سے آپ کی گردن کے مسلز دباتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔ بس آرام

کرلوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

وہ انہیں کھیلتا چھوڑ کر چھوٹے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ عینی اور نجمہ کی آنکھوں کی حیرت انگیز مشابہت اس کے ذہن میں چکرانے لگی اور اب بات صرف آنکھوں کی نہیں تھی۔ عینی کی کئی اداؤں میں اسے نجمہ کی جھلک نظر آتی تھی اور وہ گاہے بگاہے نہ چاہنے کے باوجود نجمہ کو یاد کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو شہزاد کو لگا تھا جیسے اس کے گھٹنے کو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی انگلی سے چھونے والی عینی نہیں نجمہ تھی۔

وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا ورنہ جنموں وغیرہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا۔ جنموں کی بات تو دور کی تھی، وہ کسی بھی فرسودہ خیال کو ذہن میں جگہ دینے والا بندہ نہیں تھا۔ ہاں یہ بات اسے ضرور تسلیم تھی کہ کچھ چیزیں انسان کے خون میں نسل در نسل سفر کرتی ہیں۔ کچھ جذبے، کچھ خیال ایک پود سے دوسری اور پھر تیسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ عینی عجیب انداز میں اس سے وابستگی کا اظہار کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ اگلی پیڑھی سے تھی۔ کیا یہ بھی ایک نسل سے دوسری نسل تک خون میں سفر کرنے والا کوئی ایسا ہی بے نام جذبہ تھا۔

وہ بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ پھر اسے نیند آ گئی۔ وہ قریباً ایک گھنٹا سویا۔ آنکھ کھلی تو وہ اوندھا لیٹا تھا۔ کوئی ہولے ہولے اس کی گردن کے عقبی حصے کو دبا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا، یہ عینی تھا۔

''اوہو رہنے دو۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''آپ زیادہ باتکلف بننے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ تحکم سے بولی۔ ''خاموشی سے لیٹے رہیں۔'' اس کے دبانے سے شہزاد کو واقعی سکون مل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارے پٹھے کھنچ گئے ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی لگتی تھی۔

''لگتا ہے کہ اب بڑھاپا حاوی ہو رہا ہے۔'' شہزاد نے ہولے سے کہا۔ ''معمولی سا جھٹکا تھا مگر لگتا ہے کہ دوسری منزل سے چھلانگ لگائی ہے۔''

''بڑھاپا نہیں ہے مائی لارڈ، تین چار ہفتے پہلے میرے ساتھ ایسا ہو گیا تھا۔ سائیکل پر سے گری حالانکہ بالکل سوفٹ جگہ تھی، گھاس اگی ہوئی تھی پھر بھی گردن کو ایسا جھٹکا لگا کہ تین چار دن کلاسز ہی نہیں لے سکی۔ امی نے صبح شام دکس ملی پھر کچھ بہتری آئی۔''

''تو گھر والے تمہیں سائیکل چلانے دیتے ہیں؟''

''سائیکل کیا، میں ہوائی جہاز چلانے کا کہہ دوں تو بھی انہیں ماننا پڑے گا۔ میری بات کوئی ٹال نہیں سکتا جی۔ بڑی ضدی قسم کی لڑکی ہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک ویٹو پاور بھی ہے۔''

''ویٹو پاور..... وہ کیا؟''

''آپ خود اندازہ لگائیں۔''

''کیا مقامی قانون کے مطابق کوئی سہولت حاصل ہے؟''

وہ ہنسی۔ ''ایسی سہولتیں تو یہاں ہوتی ہی ہیں مائی لارڈ لیکن میں کوئی اور بات کر رہی ہوں۔''

''اچھا..... بتاؤ گی یا پہیلیاں بجھواؤ گی؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہ کر بولی۔ ''اچھا رہنے دیں پھر کبھی بتاؤں گی.....''

شہزاد نے بھی زیادہ استفسار نہیں کیا۔ وہ چونک کر بولی۔ ''اوہ..... آپ نے باتوں میں بات ہی بھلا دی۔ میں دکس کی بات کر رہی تھی۔ ادھر بھی ایک ایسی آئٹمنٹ پڑی ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں۔ تھوڑا سا ملوں گی تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

شہزاد اسے منع کرتا رہ گیا۔ وہ جلدی سے گئی اور مرہم لے آئی۔ شہزاد اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہلنے جلنے سے اسے پھر درد ہونے لگا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ تھوڑا سا مرہم لگوا ہی لے۔ وہ پھر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کی قمیص کو شانوں سے پیچھے ہٹا کر وہ بڑی مہارت اور نرمی سے گردن کا مساج کرنے لگی۔ اس کے بال آگے کو جھول کر بار بار شہزاد کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ شہزاد کو اس سے بیزاری ہو رہی تھی۔ ایک دو منٹ بعد شہزاد بولا۔

''اب بس کرو، تھک جاؤ گی۔''

''آپ کا کام کرتے ہوئے میں کبھی نہیں تھک سکتی، مائی لارڈ۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

شہزاد کو الجھن ہونے لگی۔ وہ ایسے لہجے میں کیوں بات کرتی تھی اس سے؟ قبل اس کے کہ شہزاد کچھ کہتا، اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے کندھوں پر مالش کرتے ہوئے بولی۔

''جناب عالی، جب آپ تصویر اتار رہے ہوتے ہیں ناں، میں آپ کو دیکھتی رہتی ہوں۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، آپ کی انگلیاں، آپ کا چہرہ..... اور پتا ہے مجھے کیا لگتا ہے؟ مجھے لگتا ہے کہ میں کسی لیجنڈ کو لائیو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے انٹرنیشنل میگزینز میں پرنٹ ہونے والے آپ کے معروف فوٹوگرافرز یاد آ جاتے ہیں۔''

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بڑا بڑا اچھا کام کرنے والوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔ ہم کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔''

''یہ تو آپ کی انکساری ہے۔''

''اچھا چلو چھوڑو اب۔ کافی ہوگیا۔'' شہزاد نے ایک بار پھر اٹھنے کا ارادہ کیا۔

وہ بولی۔ ''بس دو منٹ اور..... گھڑی دیکھ کر۔''

وہ مرہم گردن کے مساموں میں جذب کر رہی تھی اور اسے درد میں افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''اچھا، اگر میں آپ ہی کی طرح بننا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''سنجیدہ ہونا ہوگا، باتیں کم کرنی ہوں گی، پڑھائی کی طرف خیال رکھنا ہوگا اور..... محنت۔''

''ٹھیک ہے مائی لارڈ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی پھر جیسے ایک دم اس کے ذہن میں نیا خیال آیا اور وہ چہکی۔ ''کیا یہ نہیں ہوسکتا مائی لارڈ کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ پکا پکا شاگرد۔''

''یہ پکا پکا شاگرد کیا ہوتا ہے؟''

''مطلب یہ کہ میں ہر وقت آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ کو ہر لحاظ سے پورا پورا فالو کروں۔ آپ سے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھوں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہاں واقعی، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ قدرے اداسی سے بولی۔

پھر ایک دم نہ جانے کیا ہوا، اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ایک مرتبہ ہنسنا شروع ہوئی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ وہ ہنسی روکنے کی کوشش میں دہری ہوئی جا رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور بال آگے کو بکھر گئے۔

''کیا ہوا؟'' شہزاد نے اپنے سینے کو کہنیوں کے بل تھوڑا سا اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔ ''بس یونہی ایک خیال ذہن میں آگیا تھا۔''

''کیسا خیال؟''

''بس یونہی۔'' اور اس پر ایک بار پھر ہنسی کا اٹیک ہوگیا۔ ساتھ ساتھ وہ گردن کی مالش بھی کرتی جا رہی تھی۔

شہزاد اس سے ہنسی کی وجہ..... پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں دروازے پر کال بیل ہوگئی۔ نو بج چکے تھے۔ شہزاد نے خیال کیا کہ بیرا ہوگا۔ ساتھ والے کمرے میں عمیر اور احسن ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ شہزاد نے آواز دی۔

''عمیر، دروازے پر دیکھو۔''

''بھائی تو سو گیا۔'' احسن نے بتایا۔

''تو تم دیکھ لو بچو نگڑے۔'' عینی نے کہا۔ اب وہ اپنی ہنسی کو بریک لگانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ احسن دروازے پر گیا۔ چند لمحوں بعد شہزاد کو محسوس ہوا کہ کوئی اندر آگیا ہے۔ ایک دم عینی چہکی۔

''اوہ ماموں جان..... آپ؟''

شہزاد نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس وقت یہاں اس کمرے میں شارق کو دیکھے گا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو شارق آج کل انگلینڈ میں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور قمیص کے بٹن بند کرنے لگا۔ وہ آج شارق کو قریباً آٹھ نو سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے موٹا ہوگیا تھا۔ جبڑوں کے نیچے کافی گوشت آگیا تھا، کنپٹیاں سفید ہو چکی تھیں۔ ایک تہائی سر بالوں سے خالی ہوگیا تھا۔ بال اتر جانے سے سر پر لگی ہوئی ایک چوٹ بھی نمایاں ہوگئی تھی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اس نے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ سجانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''ہیلو پروفیسر صاحب۔''

شہزاد بغلگیر ہونا چاہ رہا تھا مگر شارق کا انداز دیکھتے ہوئے اس نے بھی مصافحے پر اکتفا کیا۔ فاخرہ کی کھانسی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی جاگ گئی ہے۔ عینی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''آنٹی، دیکھیں کون آیا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ سب فاخرہ کے بیڈ کے اردگرد بیٹھے تھے۔

شارق نے بتایا کہ وہ آج صبح ہی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں قریب ہی دو مقامی دوستوں نے ایک اوپن ایئر ریستوران میں پارٹی دے رکھی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ادھر آگیا ہے کیونکہ فرزانہ نے بتایا تھا کہ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

وہ سب وہاں بیٹھ کر وہی باتیں کرتے رہے جو آٹھ نو سال بعد ملنے والے قریبی رشتے دار آپس میں کر سکتے ہیں۔ فلاں کراچی میں کیا کر رہا ہے، فلاں کے بیٹے کی شادی کس کی بیٹی کے ساتھ ہونے والی ہے۔ فلاں کا کاروبار کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شہزاد واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ شارق کے لہجے میں سرد مہری ہے۔ وہ صرف خانہ پوری کے لیے گفتگو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کچھ چبھتی ہوئی سی باتیں بھی کیں۔

Scanned And Uploaded

شہزاد اس سے ایسی ہی توقع رکھ سکتا تھا۔ شارق کا یہ کہنا بھی غلط تھا کہ وہ خاص ان سے ملنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ وہ غالباً عینی کو لے جانے کے لیے آیا تھا۔

جلد ہی مدعا اس کی زبان پر آ گیا۔ وہ عینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو بھئی پھر چلیں، تمہاری ماما نے کہا تھا کہ آتے ہوئے اسے ساتھ ہی لے آنا۔ تمہارے پاپا کا بھی فون آیا تھا۔''

احسن بولا۔ ''نہیں نہیں انکل، ہم نہیں جانے دیں گے باجی کو۔ ہم نے تو صبح کیک پیسٹریوں کا بریک فاسٹ کرنا ہے اور دریا میں کشتی بھی چلانی ہے۔''

''ٹھیک ہے ماموں میں کل آجاؤں گی۔'' عینی نے کہا۔

''بھئی تمہاری ماما نے تاکید کی تھی۔'' شارق کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرا گئی۔

''ماما سے میں خود بات کر لیتی ہوں ماموں۔'' وہ ٹھنکی۔

''چلیں رہنے دیں شارق بھائی۔'' فاخرہ نے بھی لیے سفارش کی۔

شارق جز بز نظر آ رہا تھا۔ شہزاد کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ چلی جائے لیکن وہ اڑ گئی۔ آخر شارق اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے کل شام تک آجانا یا ہو سکتا ہے کہ میں خود ہی لینے آجاؤں۔''

''میں فون کر دوں گی۔''

شارق کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اسے فون والی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس میں امکان نظر آتا تھا کہ شاید وہ کل بھی نہیں آئے گی۔ بہر حال وہ کچھ بولا نہیں اور سنی ان سنی کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

شارق کی اس اچانک آمد نے شہزاد کے ذہن میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ کئی پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ اسے لگا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہے، جب نجمہ زندہ تھی۔ وقت کی تیز ہوا چل رہی تھی مگر ان کے دلوں میں آس امید کے چراغ بھی روشن تھے پھر ان چراغوں کو بجھانے کے لیے شارق پھنکارتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ اس کی ساری ستم ظریفیاں شہزاد کو یاد آ گئیں اور وہ منظر بھی یاد آیا جب نجمہ سے ملنے کی پاداش میں شارق نے اسے ایک ویران جگہ پر گھیر لیا تھا۔ اس کا ایک غنڈہ دوست راجا بھی اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے شہزاد کو دہشت زدہ کرنا چاہا تھا اور شاید وہ ہو بھی جاتا لیکن جب شارق نے اسے باپ کی گالی دی تو شہزاد سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی کی یادگار ایک زخم ابھی تک شہزاد کی کلائی پر ایک کٹ کی صورت میں موجود تھا۔ درست کہتے ہیں کہ ہاتھ سے لگائے گئے زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن زبان کے لگائے گئے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔

کچھ دن پہلے جب پیرس یاترا شروع ہوتے ہی فرزانہ شہزاد اور اس کے بچوں کے پاس آ دھمکی تھی تو شہزاد کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی جو آج سامنے آئی تھی۔ شہزاد جانتا تھا کہ بے شک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے لیکن نفرت اور عداوت کی سیاہ چٹانیں ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور آج یہاں شارق کی آمد اور اس کے رویے سے اس کا ثبوت مل بھی گیا تھا۔ شہزاد کو یاد آیا کہ جب شارق اندر آیا تو عینی بے تکلفی کے ساتھ اس کے کندھوں کی مالش کرنے میں مصروف تھی۔ شاید شارق نے یہ منظر بھی دیکھا تھا اور اسی منظر نے اس کے رویے کو مزید خشک کر دیا تھا۔

بے شک شہزاد بڑا نام کما چکا تھا۔ بڑی کامیابیاں حاصل کر چکا تھا۔ اس نے فاخرہ کو شریک حیات بنا کر ایثار کی ایک اعلیٰ مثال بھی قائم کی تھی لیکن شارق اور اس کے ہم خیالوں کے نزدیک تو وہ اب بھی گھٹیا..... پینڈو..... اور جنگلی ہی تھا۔ ایک ایسا گھٹیا، کمتر بندہ، عینی سے اپنی خدمت کرا رہا تھا یقیناً یہ صورت حال شارق جیسے بندے کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔

عینی ابھی جانا نہیں چاہتی تھی لیکن شہزاد نے اسے آمادہ کر لیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کسی طرح کا کوئی تناؤ پیدا ہو۔ ویسے بھی عینی کی یہاں موجودگی اسے خوامخواہ الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ شام کو شارق کے ساتھ فرزانہ اور عینی کی بڑی بہن زارا بھی چلی آئیں۔ وہ فاخرہ کی عیادت کرنے آئی تھیں۔ شہزاد نے صاف محسوس کیا کہ شارق کی موجودگی میں فرزانہ اور زارا وغیرہ زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ شہزاد نے روم سروس والوں کو کال کر کے کافی اور اسنیکس وغیرہ منگوائے۔ اسی دوران میں فاخرہ اٹھ کر فریج سے کولڈ ڈرنک کی بوتل نکالنے لگی۔ پتا نہیں کہ اس کا پاؤں رپٹا یا ویسے ہی چکر آیا، وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ شہزاد اور عینی اضطراری حرکت کے ساتھ اس کی طرف لپکے۔ عینی نے اسے پشت کی طرف سے تھامنے کی کوشش کی اگر وہ ایسا نہ کرتی تو فاخرہ کا سر بڑے زور سے تپائی کے ساتھ ٹکراتا پھر بھی اپنا وزن سہارنے کی کوشش میں فاخرہ کا سارا بوجھ اس کے دائیں ہاتھ پر

آ گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

انہوں نے اسے سنبھال کر دوبارہ بیڈ پر لٹایا۔ شہزاد اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''کتنی دفعہ کہا ہے سونم، خود نہ اٹھا کرو۔ کوئی مجبوری ہو تو پھر بھی الگ بات ہے۔ مجھے کہنا تھا میں نکال دیتا بوتل۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ شہزاد نے ہاتھ کو ہلا جلا کر دیکھا۔ ہڈی بچ گئی تھی تاہم کلائی مڑنے کی وجہ سے پورا بازو لرز رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تھوڑی سی سوزش بھی ہوگئی۔ عینی نے کل والی آئنمنٹ لگا کر تھوڑی سی مالش کی۔ شہزاد نے اس پر لچک دار پٹی باندھ دی۔

عینی واپس جانے کے لیے آمادہ ہو چکی تھی لیکن اس نئے واقعے کے بعد وہ تذبذب میں نظر آئی۔ اس نے فرزانہ سے کہا۔

''ماما! اگر آپ کہیں تو میں کل کا دن اور نہ رہ لوں؟''

فرزانہ نے چند لمحے سوچ کر کہا۔ ''یا پھر میں رہ لیتی ہوں۔''

''لیکن آپ نے تو کل ڈینٹسٹ سے ٹائم لیا ہوا ہے۔'' زارا نے یاد دلایا۔

''ویسے کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں ہے۔'' شارق جلدی سے بولا۔ ''پٹھے میں تھوڑا سا کھنچاؤ آیا ہے، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

شہزاد اور فاخرہ بھی کہنے لگے کہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ لوگ تسلی سے جائیں لیکن عینی نے کہا کہ نہیں وہ کم از کم کل کا دن یہاں رکے گی۔ اس نے فرزانہ کو بھی نیم رضامند کر لیا۔ فرزانہ نے بھی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے کل دوپہر تک آ جانا۔

شارق اس دوران میں خاموش بیٹھا رہا لیکن اس کے چہرے کی سرخی اس کے اندر کی اتھل پتھل کا موہوم سا سراغ دے رہی تھی پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گرج کر بولا۔

''اٹھو عینی! یہاں کوئی ایسا سیریس مسئلہ نہیں ہے۔ زیادہ پریشانی ہے تو کل آفٹرنون میں پھر چکر لگا لینا۔'' اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

یہ تحکمانہ لب و لہجہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ خاص طور سے عینی کو تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے پہلے ذرا تعجب سے ماموں کی طرف دیکھا پھر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ماموں کے ایک دم بھڑک اٹھنے پر حیران تھی۔ وہ ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی پھر بھی کم جانتی تھی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماموں، آپ کیوں بگڑ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کل شام تک آ جاؤں گی۔''

''نہیں، ابھی چلو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں یہاں رہنے کی۔'' شارق کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''ضرورت ہے ماموں۔'' عینی نے بھی فیصلہ کن لہجہ اختیار کر لیا۔

اس سے پہلے کہ شہزاد مداخلت کرتا۔ شارق بالکل آگ بگولا ہو گیا۔ وہ جنونی انداز میں بولا۔

''نہیں ہے ضرورت..... نہیں ہے..... تم کل کی بچی ہو۔ تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے ان لوگوں کا۔ کچھ پتا نہیں ہے۔''

''ماموں۔'' عینی کے لہجے میں احتجاج تھا اور حیرت تھی۔

''چپ رہو۔ تم کیا جانتی ہو اس بندے کے بارے میں۔'' وہ دھاڑا اور انگلی سے سیدھا شہزاد کی طرف اشارہ کیا پھر وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ یہ بندہ کیا ہے۔ مجھے پتا ہے..... مجھے پتا ہے۔'' اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ بارود کا کوئی ڈھیر تھا جو ایک دم ہی اس کے اندر پھٹ گیا تھا۔

''شارق، تم ہوش سے بات کرو۔'' شہزاد کہے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سناٹے میں تھے۔

''ہاں میں ہوش میں ہوں اور بڑے عرصے سے ہوش میں ہوں تمہیں..... شرم آنی چاہیے اپنے آپ پر۔ تم بدنیت ہو..... گندے ہو..... ہمیشہ کے ایسے ہو۔'' جو کچھ منہ میں آیا وہ جنونی انداز میں کہتا چلا جا رہا تھا۔

''شارق، منہ سنبھال بات کر۔'' شہزاد پھر پھنکارا۔

''کس کو کہہ رہا ہے گندا؟''

''اسی کو کہہ رہا ہوں جس کا ذہن گندا ہے، جس کا خون گندا ہے۔ جس نے ہمیشہ خاندان کی عزت اچھالی ہے۔''

شہزاد سے برداشت نہیں ہوا۔ اس نے شارق کا گریبان پکڑ لیا۔ فاخرہ، فرزانہ اور عینی چلائیں۔ بچے بھی دہشت زدہ ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات اتنی بڑھ جائے گی کسی کے خیال میں نہیں تھا۔ اپنے گریبان پر شہزاد کے ہاتھ پڑتے ہی شارق نے فون سیٹ اٹھا کر شہزاد کے چہرے پر دے مارا۔ شہزاد پشت کے بل ٹیبل لیمپ پر جا گرا۔ ٹیبل لیمپ کا بلب پٹاخ کے ساتھ پھٹا اور لکڑی کا لیمپ دو ٹکڑے ہو گیا۔ فرزانہ چلاتی ہوئی دونوں کے درمیان آ گئی۔

''خدا کے لیے نہیں..... خدا کے لیے نہیں۔''

اسی دوران میں شارق کے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے لیمپ کا قریباً تین فٹ لمبا چوبی ٹکڑا آ گیا۔ اس نے اس وزنی ٹکڑے سے بے دریغ شہزاد کے سر پر ضرب لگائی۔ پہلی ضرب پھر دوسری پھر تیسری۔ وہ اس وقت شاید جنون کی حالت میں تھا۔ مدتوں سے اس کے اندر اکٹھا ہونے والا زہر ایک زبردست اُبال کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ شہزاد تیورا کر گر پڑا۔ ساری عورتیں چلاتی ہوئی ان دونوں کے درمیان آ گئیں۔ اسی دوران میں باہر سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ وہ ہوٹل کے ملازمین تھے جو فرانسیسی میں پکارتے ہوئے آ رہے تھے.....

شہزاد تقریباً نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوٹل ملازمین اندر گھس آئے اور بپھرے ہوئے شارق کو شہزاد کے پاس سے ہٹا کر دور لے گئے۔ شارق اب بھی دھاڑ رہا تھا۔ ''میں تیرے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا، جان سے مار دوں گا تجھے۔ اپنی عمر دیکھ اپنے کرتوت دیکھ۔ ہاں تیرا خون گندا ہے، گندی نسل ہے تیری.....''

روم سروس کا انچارج بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ شہزاد کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ فرزانہ نے اپنی شال سے شہزاد کے سر کے زخموں کو دبا رکھا تھا۔ جو قالین پر نیم دراز تھا۔ روم سروس والے نے شہزاد کی حالت دیکھتے ہوئے فوراً اسپتال کی موبائل گاڑی کو فون کر دیا۔ فقط دو تین منٹ بعد ایمبولینس کا ہوٹر سنائی دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں دو باوردی افراد موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے شہزاد کا پاسپورٹ طلب کیا۔ فاخرہ نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا اور شہزاد کا پاسپورٹ اہلکاروں کو دکھایا۔ انہوں نے شہزاد کے زخموں کا سرسری معائنہ کیا۔ اس کے بعد اسے اسٹریچر پر باہر کھڑی گاڑی تک لے گئے۔ شارق اتنی دیر میں نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔

اہلکار صرف شہزاد کو لے جانا چاہتے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ قواعد کے مطابق وہ صرف مریض کو لے جا سکتے ہیں۔ لواحقین کو آنا ہو تو وہ اپنی گاڑی پر آئیں۔ بہرطور فرزانہ بحث کر کے کسی نہ کسی طور ایمبولینس میں سوار ہو گئی۔ شہزاد کی آنکھوں میں خون بھر گیا تھا۔ اسے اردگرد کی ہر شے سرخی مائل نظر آ رہی تھی۔ تاہم ایمبولینس میں آنے کے بعد اس کے دماغ میں چھایا ہوا اندھیرا تھوڑا سا چھٹ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں فاخرہ اور بچوں کو تسلی دی۔ ''میں ٹھیک ہوں..... خطرے کی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم کوئی فکر نہ کرو فاخرہ۔'' فرزانہ نے بھی فاخرہ کو تسلی دی۔ پھر اس نے زارا اور عینی سے کہا کہ وہ یہاں فاخرہ کے پاس ہی رہیں۔

شہزاد کو تیز رفتاری سے ایک قریبی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے زخموں سے بہنے والا لہو راستے میں ہی بند کر دیا گیا تھا۔ اہلکاروں نے اسے ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمرجنسی وارڈ میں انتظار کے لیے بٹھا دیا۔ فرزانہ اس کے پاس تھی اور عملے کے ارکان سے گاہے اور بگاہے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں بات کر رہی تھی۔ ایمرجنسی میں پہلے سے آٹھ دس مریض موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر عمر رسیدہ تھے جو باتھ روم میں یا سیڑھیوں وغیرہ سے گرے تھے۔

اسپتال کے ایک اہلکار نے آ کر انگلش میں شہزاد سے پوچھا۔ ''کیا یہ میڈیکو لیگل کیس ہے؟''

فرزانہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن شہزاد نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے روک دیا۔ وہ اہلکار سے بولا۔ ''جی نہیں، مجھے خود سے چوٹیں آئی ہیں، میں گر گیا تھا۔''

اہلکار نے سر کے زخموں کو دیکھا۔ یقیناً وہ شہزاد کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وہ چلا گیا۔

شہزاد کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی جو کچھ ہوا بالکل غیر متوقع تھا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ شارق اتنی سرعت سے بات کو اس قدر بڑھا دے گا۔ وہ جیسے اندر سے طیش کا آتش فشاں بنا ہوا تھا اور ایک معمولی تحریک سے پھٹ پڑا تھا۔ فرزانہ بار بار معذرت کے الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی ہی وجہ سے ہوا ہے۔ شہزاد نے اسے تسلی تشفی دی۔

پیرس کا یہ اسپتال جدید اور صاف ستھرا تو تھا مگر یہاں کی سروس کے بارے میں اس کی جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ مریض بڑی سست روی سے اندر جا رہے تھے۔ ایمبولینس میں دی جانے والی ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے ابھی تک کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

فرزانہ کے موبائل پر بار بار اس کی بڑی بیٹی زارا کا فون آ رہا تھا اور وہ شہزاد کا حال پوچھ رہی تھی۔ فرزانہ کے کہنے پر شہزاد نے فاخرہ اور دونوں بچوں سے بھی بات کی۔ ہاں عینی سے بات نہیں ہوئی۔ ''عینی کہاں ہے؟'' شہزاد نے فاخرہ سے پوچھا۔

''وہ چلی گئی ہے۔''

''کس کے ساتھ؟''

''پتا نہیں، شاید وہی لے کر گیا ہے اسے۔'' فاخرہ نے کہا۔ ''وہی'' سے اس کی مراد شارق تھا۔

باڈی۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

فاخرہ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''میرے کپڑے ہیں اور تولیا..... ٹوتھ پیسٹ، برش وغیرہ۔''

''کس لیے؟'' شہزاد نے ٹھٹک کر پوچھا۔

''میں دو چار دن یہیں رہوں گی آپ کے پاس۔ آپ دونوں کو میری ضرورت ہے۔'' وہ ٹھہرے سے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شہزاد نے تیوری چڑھائی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جو کر رہی ہوں سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں۔'' وہ بڑے اطمینان اور عزم سے گویا ہوئی۔

شہزاد کو اس کے لہجے میں عجیب سا باغیانہ پن محسوس ہوا۔ وہ اندر تک لرز گیا۔ فاخرہ نے دبے لہجے میں کہا۔ ''عینی! تمہیں پتا ہی ہے تمہارے ماموں نے کتنا غصہ کیا ہے، اگر.....''

''ماموں اگر ہوش میں نہیں ہیں تو کیا ہم بھی ہوش میں نہ رہیں۔'' اس نے تیزی سے فاخرہ کی بات کاٹی۔ ''ایک غلط بات کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اس غلطی میں شریک ہیں۔''

عینی کی آمد سے دونوں بچے ایک دم خوش ہو گئے تھے۔ وہ اس سے لپٹ گئے اور اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کرنے لگے۔

شہزاد نے عینی سے پوچھا۔ ''تمہاری ماما نے کیا کہا ہے اس بارے میں؟''

''وہ بھی آپ کی طرح ڈر رہی تھیں..... کہہ رہی تھیں کہ تمہارے جانے سے تمہارا ماموں بہت بگڑے گا۔ میں نے غصے سے کہا کہ ماموں کو بیچ میں سے نکال دیں۔ مجھے صرف یہ بتائیں کہ اس سچویشن میں ہم میں سے کسی کو ہوٹل میں موجود ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہ خاموش ہو گئیں۔''

''عینی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' شہزاد منمنایا۔

''کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں، یہ بحث بعد میں کر لیں گے، اب مجھے یہ بتائیں کہ صبح ناشتے میں آپ نے یا بچوں نے کوئی خاص چیز لینی ہے؟ اگر لینی ہے تو میں ابھی اسٹور سے لے آتی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی دوائیں بھی دیکھ لیں۔ اگر کوئی دوا لانی ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''نہیں، ابھی تو کوئی ضرورت نہیں۔'' فاخرہ نے کہا۔

اس نے کمرے کا فریج کھولا۔ وہاں موجود اشیا کا جائزہ لیا اور پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ لدی پھندی واپس آئی۔ بسکٹ، چاکلیٹس، جوسز، ٹن پیک فوڈ..... پتا نہیں کیا کچھ اٹھا رکھا تھا اس نے۔ شہزاد اور فاخرہ احتجاج کرتے ہی رہ گئے۔ اس نے سب کچھ فریج میں ٹھونس دیا۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور باتیں کرنے لگی۔ چند سیکنڈ میں ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا کہ فون پر دوسری طرف کون ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ شہزاد کی طرح فاخرہ نے بھی بھانپ لیا تھا اور اس کا رنگ زرد نظر آنے لگا تھا۔ وہ شارق سے بات کر رہی تھی۔

اس نے بڑی بے خوفی سے شارق کو بتایا کہ وہ ہوٹل میں فاخرہ، شہزاد اور بچوں کے پاس ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے دو چار دن یہیں رہنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے شارق نے گرجنا برسنا شروع کر دیا ہوگا۔ عینی کے تاثرات میں کسی طرح کی کمزوری نظر نہیں آئی، بلکہ ایک طرح کی طیش آمیز تمتماہٹ نے اس کے نقوش کو ڈھانپ لیا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''ماموں! میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں کہ آپ مجھے یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں اپنے نفع نقصان کی خود ذمے دار ہوں اور مجھے آپ کی کسی ایڈوائس کی ضرورت بھی نہیں ہے، آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں تو بہتر ہے۔''

دوسری جانب شارق بہت زور سے بولا۔ موبائل کی اسپیکر سے اس کی آواز نکل کر قریب بیٹھے شہزاد کے کانوں تک پہنچی۔ ''عینی! میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ جانتی ہو کہ تم کس سے بات کر رہی ہو۔ جانتی ہو تم؟''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں اور کہاں کر رہے ہیں۔ یہ لاہور نہیں پیرس ہے اور میں ایک بالغ لڑکی ہوں، میں اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں اور جب تک مناسب سمجھوں گی یہاں رہوں گی۔ میرے ساتھ زبردستی نہیں کی جا سکتی۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے رہتی ہو یہاں۔ میں آ رہا ہوں۔'' شارق کی نہایت دھمکی آمیز آواز سنائی دی۔

''یہ غلطی نہ کرنا ماموں۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔'' عینی نے کھٹاک سے جواب دیا۔ ''میں پولیس کو فون کر رہی ہوں۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے یہاں پولیس موجود

ہوگی۔''

''اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے، تم ہتھکڑیاں لگواؤ گی مجھے؟ ہتھکڑیاں لگواؤ گی؟''

''اگر آپ باز نہیں آئیں گے تو یہ بھی ہوگا۔ یہاں قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے۔'' عینی کا لہجہ اٹل تھا۔

شہزاد نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ بپھرے ہوئے رواں دواں لہجے میں بولتی چلی گئی۔

اندازہ ہوا کہ دوسری طرف شارق قدرے ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ وہ بہت شعلہ مزاج تھا۔ خاندان میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر آج اس کو ٹکر کے جواب ملے تھے۔ وہ قہر بار لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے عینی! میں پہلے تیرے باپ سے بات کرلوں، پھر دیکھ لیتا ہوں تجھے.....'' اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

''عینی یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔'' شہزاد نے کراہ کر کہا۔

''یہ نہ ہو کہ شارق کوئی ایسا ویسا قدم اٹھالے۔''

وہ بڑے سکون سے بولی۔ ''کچھ نہیں ہوگا مائی لارڈ۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ یہ فرانس ہے۔ یہاں کسی کے بنیادی حقوق سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا مطلب سیدھی سیدھی جیل ہے۔''

''لیکن ہمیں یہیں تو نہیں بیٹھے رہنا، پاکستان بھی تو جانا ہے اور شارق کو... بھی وہیں ہونا ہے۔ وہاں آکر تمہاری یہ فرانسیسی گورنمنٹ ہمارا کیا سنوار لے گی۔ بہتر ہے کہ ہم اس معاملے کو اور زیادہ خراب نہ کریں۔'' شہزاد کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

''دیکھیں، میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں ابھی پاپا سے بھی بات کر لیتی ہوں، آپ بالکل ''ریلیکس'' ہو جائیں۔''

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ عینی کا موبائل پھر جاگ اٹھا۔ اس مرتبہ اس کے پاپا یعنی جمیل صاحب کا ہی فون تھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے ''ہائے پاپا جانی'' کہا اور ان سے بات کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ بات کرتے کرتے باہر کوریڈور میں ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد شہزاد نے کھڑکی سے دیکھا۔ عینی کی آواز تو شہزاد کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی تاہم اس کے انداز اور ہاتھوں کی حرکات وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ بعد وہ بات ختم کر کے واپس سویٹ میں آگئی۔ اس کے گال ہلکے گلابی ہو رہے تھے اور بولتی آنکھوں میں اطمینان کی چمک تھی۔ ''کیا بات ہوئی؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''بس ہوگئی ناں آنٹی..... میں نے ان کو سمجھا دیا ہے۔ پاپا میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔ ہی از اے ویری ویری نائس گائے۔''

شہزاد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، بہرحال عینی کا اعتماد دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ غالباً فوری طور پر کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔

رات کو جب بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور فاخرہ ساتھ والے کمرے میں سوئی پڑی تھی، عینی نے خود ہی شہزاد کے سر کی پٹیاں بدلیں۔ بینڈیج کا یہ سامان ڈاکٹری نسخے کے مطابق وہ شام کو ہی میڈیکل اسٹور سے لے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے اور زارا نے فرسٹ ایڈ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے ان دونوں کے پاس کئی سرٹیفکیٹس بھی ہیں۔

جب وہ پٹی بدل رہی تھی۔ شہزاد نے پوچھا۔ ''پاپا سے کیا بات ہوئی تمہاری؟''

''کوئی خاص نہیں، بس میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں یہاں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، کیونکہ آپ کو میری ضرورت ہے۔''

''اور انہوں نے مان لیا؟ حالانکہ وہ جانتے بھی ہوں گے کہ شارق نے کیا ہنگامہ مچایا ہے۔''

''میں نے کہا ہے ناں کہ وہ میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔'' پھر ایکدم ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں تو یہ بھی کہہ دوں ناں کہ آنٹی میری گرل فرینڈ اور آپ میرے فرینڈ ہیں تو، انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

شہزاد سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ قد آدم ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی اس کے بائیں رخ کو روشن کر رہی تھی۔ لمبے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ماں باپ دونوں پاکستانی تھے لیکن وہ یہیں کی پیدائش تھی۔ اس کی رگوں میں تو فرنچ خون شامل نہیں تھا لیکن اس کے خدوخال اور انداز میں ''فرانسیسیت'' سرایت کر چکی تھی۔ اس کی اردو زبان میں بھی فرانسیسی آہنگ محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ شہزاد اس کی اوٹ پٹانگ بات کے بارے میں کچھ کہتا وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس دن میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ میرے پاس ایک ویٹو پاور ہے۔ اس پاور کے سامنے ماما..... بگ سسٹر..... برادران لاء وغیرہ کوئی نہیں ٹھہر

سکتا۔ یہ پاور پاپا جانی کی ہے۔ وہ میری ہر بات کھلے دل دماغ کے ساتھ سنتے ہیں اور مانتے ہیں۔ وہ بس ایک ہی بات کہتے ہیں..... تم جیسی سچی لڑکی کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتی۔ وہ مجھ پر بے حد ''کانفی ڈینس'' رکھتے ہیں۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے، تم ایک سچی لڑکی ہو؟''

''سچی کا تو پتا نہیں لیکن اسٹریٹ فارورڈ ضرور ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل دماغ میں ہے وہی کچھ میری زبان پر ہو اور وہی کچھ میرے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہو۔ میں نے اس خیال کو ایک جگہ نظم بھی کیا ہے۔ سناؤں آپ کو؟''

شہزاد نے دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اسے زارا کی سخت وارننگ یاد آ گئی تھی کہ عینی سے کچھ سنانے کی فرمائش نہ کیجیے گا ورنہ یہ گھنٹوں آپ کا دماغ چاٹے گی۔ وہ بھی بھانپ گئی اور بات کا رخ پھر اپنے پاپا جانی کی طرف پھیر لیا۔ ''میں نے اپنی ویٹو پاور کئی جگہ استعمال کی ہے اور ہر بار پوری طرح کامیاب ہوئی ہوں۔ آخری دفعہ تو اس پر یکس نے زبردست مزہ دیا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا تھا؟'' شہزاد نے مجبوراً پوچھ لیا۔

وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ''ایک لڑکا تھا نجیب واحدی نام کا۔ باپ پاکستانی تھا ماں فرنچ تھی۔ یہ لوگ کراچی کے قریب کاٹھیاواڑ میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے..... کاٹھیاواڑ ہی نام ہے ناں.....؟'' اس نے اپنی ہی قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہاں "Auxerre" میں بھی یہ لوگ بیس پچیس سال سے ''لیدر گارمنٹس'' کا کام ہی کر رہے ہیں۔ پکے کاروباری ہیں۔ لڑکا بھی باپ کے ساتھ بزنس میں شریک ہے۔ برادران لا (ریحان) سے ان کی جان پہچان تھی۔ بس وہ میرے گلے ڈالنے کے لیے اس لڑکے کو یہاں پیرس میں لے آئے۔ برادران لا یعنی ریحان بھائی نے ماما اور بگ سسٹر کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ لڑکا مستقبل میں میرے لیے اچھا شوہر ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں میں خود فیصلہ کروں گی۔ پہلے اس لڑکے کے ساتھ دوستی کروں گی، اس کے ساتھ گھوموں پھروں گی، پھر کسی رزلٹ پر پہنچوں گی۔ دیکھنے میں تو وہ اچھا لگتا تھا۔ ایک سال یونیورسٹی میں بھی گیا تھا..... مگر جب میں نے اس سے میل جول شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ بھائی صاحب خالص بزنس مائنڈ رکھتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کیا ہوتی، انہیں ٹھیک سے پتا ہی نہیں تھا کہ فنونِ لطیفہ کیا ہوتے ہیں۔ میری انگلش پوئٹری پر بغیر سمجھے واہ واہ کرتا رہتا تھا۔ کیٹس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی فٹ بال کا کھلاڑی ہے، شیکسپیئر کو ایکٹر سمجھتا تھا، شیلے اس کے نزدیک کسی آسٹریلین پھل کا نام تھا۔ اب بتائیں جی، میں کسی ایسے ڈفر کے ساتھ اپنی لائف تباہ کر سکتی تھی۔ بے شک اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ میرے حساب سے باذوق نہیں تھا۔ پوری فیملی نے انگیج منٹ کے لیے بڑا زور لگایا۔ مجھے منانے کے لیے پاکستان سے نانا جہانگیر کی خدمات بھی حاصل کی گئیں لیکن میں نے بالکل کورا سا جواب دے دیا۔ اس کے دیے ہوئے تحفے وغیرہ واپس کر دیے اور جو دو چار میں نے دیے تھے ان کی واپسی کا بھرپور مطالبہ کر دیا۔ معاملے نے کچھ طول کھینچا لیکن آخر جیت میری ہی ہوئی۔ پتا ہے کیسے؟''

''کیسے؟''

''پاپا کے ویٹو سے۔ پاپا کو جب میری بات سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے اس معاملے کو یکسر ختم کر دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں اس چمڑا فروش کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔''

''تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم میں لاابالی پن بہت ہے۔''

''آپ کی طرح آرٹسٹ جو ہوں۔ کیا آپ میں لاابالی پن نہیں؟''

''مجھ میں کیا ہے؟''

''آپ نے اسٹل فوٹو گرافی پر جو کتاب لکھی ہے اس کے دیباچے میں کیا لکھا ہے آپ نے..... شروع میں آپ کو کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کریں۔ جب آپ بہاولپور کے قریب ایک چھوٹے قصبے میں رہتے تھے تو آپ نے دو تین سال میں مستقبل کے درجنوں منصوبے بنائے اور بگاڑے۔ ایک دفعہ آپ نے وحید مراد سے متاثر ہو کر فلمی اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا اور ایک مرتبہ آپ کی ساری توجہ جدید انداز میں کاشتکاری کی طرف چلی گئی۔ اب دیکھیں کہاں اداکاری، کہاں ٹریکٹر چلانا اور کہاں ایڈورٹائزنگ.....''

''اچھا بھئی! میں ہارا۔ تم سے باتوں میں مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔''

''ہار جیت کی بات نہیں ہے مائی لارڈ! میں تو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ فن کار میں تھوڑی سی متلون مزاجی تو ہوتی ہی ہے۔''

''یعنی تم خود کو آرٹسٹ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔''

''نہیں مائی لارڈ۔ عدالت غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہے۔

میں خود کو آرٹسٹ کلیم نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو آرٹسٹ بننا چاہتی ہوں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنائیں..... بلکہ..... بلکہ پکا پکا شاگرد۔"

پکا پکا شاگرد کہنے کے بعد ایک دم اس کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ پھر یہی کوشش کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شہزاد کو ہنسی کے اس حملے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی اور یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ایک دن پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو منٹ تک ہنس ہنس کر دہری ہوتی رہی تھی۔ عجیب معمائی لڑکی تھی اور بے حد بولڈ بھی۔ شہزاد کو اس سے خوف آنے لگا تھا۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے میں عینی ان سب کو گھر کا ایک فرد ہی محسوس ہونے لگی۔ وہ فاخرہ کا اتنا خیال رکھ رہی تھی کہ شہزاد اس کی طرف سے تقریباً بے فکر ہی ہو گیا تھا۔ وہ خود ہی بازار سے ایک خاص قسم کی چپکنے والی میڈیکل پٹی لے کر آئی تھی۔ یہ پٹی اس نے بڑی چابکدستی سے فاخرہ کی مڑی ہوئی کلائی کے گرد لپیٹ دی تھی۔ اس سے فاخرہ کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ بے حد مانوس ہو گئے تھے۔

تیسرے روز شام کو عینی کے پاپا جمیل احمد صاحب کا فون ہوٹل کی لینڈ لائن پر آ گیا۔ شہزاد نے ان سے بات کی۔ جمیل احمد صاحب نے کہا کہ انہیں ہوٹل والے واقعے کا بڑا افسوس ہوا ہے۔ انہوں نے شارق کو بے حد غیر ذمے دار اور احمق قرار دیا۔ انہوں نے کہا۔ "عینی نے اس کے ساتھ جس طرح سے بات کی ہے اسے ایسی ہی کرنی چاہیے تھی۔ وہ اسی لائق ہے۔ اچھا ہے کہ جلدی دفع ہو گیا یہاں سے..... ورنہ اس پر مار پیٹ کا کیس بن سکتا تھا۔"

"کہاں گیا ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"سنا ہے واپس لندن چلا گیا ہے۔ وہاں سات آٹھ روز رہ کر پاکستان پہنچ جائے گا۔ اپنی بہن سے بھی تلخ کلامی کر کے گیا ہے۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ خود خوش ہو سکتا ہے نہ کسی کو دیکھ سکتا ہے۔"

شہزاد نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ڈرنک بھی کافی کرتا ہے، میرے ساتھ جھگڑے کے وقت بھی وہ نشے میں تھا۔"

"یہ تو تمہاری مہربانی ہے کہ تم نے اسپتال میں اس کا نام نہیں لیا ورنہ یہاں تو ایک وزیر بھی پچھلے دنوں بالکل اسی طرح کے واقعے میں جیل پہنچا ہے۔ یہاں رورعایت کسی کے لیے نہیں ہے۔ وزیر صاحب بھی عام قیدیوں کے ساتھ جیل میں پڑے ہیں۔"

"ہاں..... پچھلے دنوں میں نے یہ نیوز دیکھی تھی اور حیران بھی ہوا تھا۔"

"تمہیں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ عینی نے مشکل وقت میں تم لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ہوٹل کے کمرے کا جو تھوڑا بہت نقصان ہوا تھا اس کی ادائی میں نے اپنے اکاؤنٹ سے بذریعہ نیٹ کر دی ہے۔ یہ معاملہ "سیٹل" ہو گیا ہے اگر طبیعت اب بہتر ہے تو بے فکری سے گھومو پھرو اور انجوائے کرو، پیرس جیسے شہر میں آ کر کمرے میں بند ہو جانا بڑی زیادتی ہے۔ ذرا عینی کو فون دو۔ میں اسے بتا دیتا ہوں کہ آپ کو کہاں کہاں جانا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ شہزاد کوئی جواز پیش کرتا، عینی نے خود ہی ریسیور شہزاد کے ہاتھ سے لے لیا..... اور پاپا جانی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔

اگلے روز صبح سویرے عینی نے بچوں کو اکسایا اور انہوں نے ایک قریبی تفریحی پارک میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑی چابک دست تھی، اسے معلوم تھا کہ بچوں کا پروگرام بن جائے گا تو پھر فاخرہ اور شہزاد کو بھی تیار کرنا آسان ہوگا، اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس تفریحی پارک کے ان گنت فضائل بیان کر دیے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شانزالیزے روڈ یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور وہ بہ آسانی واک کرتے ہوئے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ فاخرہ نے حسب معمول جانے سے انکار کیا لیکن اس مرتبہ عینی بھی اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ اگر آنٹی فاخرہ نہیں جائیں گی تو پھر یہ پروگرام کینسل۔

پارک کے جو فضائل عینی نے بیان کیے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پروگرام کینسل ہونے کے آثار دیکھ کر بچوں نے ٹھنکنا اور منہ بسورنا شروع کر دیا۔ وہ بھی غالباً یہی چاہتی تھی۔ مجبوراً فاخرہ کو کمر ہمت باندھنی پڑی۔ عینی نے دو چار منٹ کے اندر فاخرہ کے لیے ہوٹل سے ہی وہیل چیئر کا انتظام کر لیا۔ استقبالیہ والوں نے کال کر کے ٹیکسی منگوا لی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بذریعہ لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچے اور پھر شاندار ٹیکسی کار میں سوار ہو گئے۔ پاکستان میں شہزاد جب بھی سنتا تھا کہ فلاں پاکستانی اٹلی، جرمنی، فرانس یا یورپ کے کسی اور ملک میں ٹیکسی چلاتا ہے تو ذہن میں ایک غریب مسکین ٹیکسی ڈرائیور کا تصور ابھرتا تھا مگر یہاں آ کر یہ تصور کافی حد تک دھندلا گیا۔ اول تو "ٹیکسیاں" جدید آلات سے لیس نہایت لگژری قسم کی گاڑیاں تھیں۔ دوسرے ڈرائیور خواتین و حضرات بھی ٹھاٹ

باٹ والے تھے۔ مسافر سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ مسافر کے سامان کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے اسے ہاتھ لگانا بھی وہ شاید توہین سمجھتے تھے۔ ٹیکسی کاروں کے بیش بہا کرائے بھی ٹیکسی ڈرائیوروں کی شان میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔

وہ لوگ ٹیکسی میں سوار ہوکر آٹھ دس منٹ کے اندر تفریحی پارک پہنچ گئے۔ اس آٹھ دس منٹ کے سفر کے عوض انہیں قریباً تین ہزار پاکستانی روپے ڈرائیور صاحب کی نذر کرنا پڑے۔ ایک مرتبہ پھر عینی نے شہزاد کی کوئی پیش نہیں چلنے دی اور کرایہ خود ادا کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فاخرہ اور شہزاد سے عہد بھی لیا کہ وہ ایک مہمان کی حیثیت سے اپنی حدود کا خیال رکھیں گے اور جب بھی اس کے ساتھ کہیں جائیں گے تو اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں کریں گے۔

یہ زیادہ بڑا تفریحی پارک نہیں تھا۔ بڑے تفریحی پارک ڈزنی لینڈ اور پارک ایس ٹیرکس وغیرہ شہر سے کافی باہر تھے۔ بہرحال یہاں بھی بچوں کے کھیل تماشے کا کافی سامان موجود تھا۔ پارک کا ٹکٹ ایک ہی دفعہ وصول کرلیا جاتا تھا، اندر داخل ہونے کے بعد ساری تفریحات اور جھولے وغیرہ فری تھے۔ فاخرہ اور شہزاد تو ایک جگہ چکیلی گھاس پر MAT بچھا کر بیٹھ گئے۔ عینی بھاگ بھاگ کر بچوں کو مختلف جھولوں پر سوار کرانے اور اتارنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور آواز میں چہکار تھی۔ بچے بھی اس کی کمپنی میں بے حد انجوائے کررہے تھے۔ وہ شہزاد اور فاخرہ کو جیسے بھول ہی گئے تھے۔

یہ بھی پیرس کا ایک نہایت چمک دار اور خوشگوار دن تھا۔ پارک میں قریباً دو گھنٹے گزارنے کے بعد وہ باہر آگئے..... اور پیدل ہی شانزالیزے روڈ کی طرف چل دیے۔ یہ ویک اینڈ تھا اس لیے ہر طرف رونق تھی۔ سیاحوں کی ٹولیاں گلی کوچوں میں چکرا رہی تھیں۔ اپنے سر کے زخم چھپانے کے لیے شہزاد نے ایک پی کیپ پہن رکھی تھی۔ عینی ہلکے پھلکے انداز میں اس پی کیپ کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنا رہی تھی۔

''آخر یہ تمہیں کیا تکلیف دے رہی ہے؟'' شہزاد نے کہا۔

''مجھے اس پر دو اعتراضات ہیں مائی لارڈ۔ پہلی بات تو یہ کہ بندہ جیسا ہے اسے ویسا ہی نظر آنا چاہیے۔ آپ کے سر پر ایک دو چوٹیں لگی ہوئی ہیں اور آپ اس کیپ کے ذریعے انہیں چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔ یعنی آپ جیسے ہیں ویسے نظر آنا نہیں چاہ رہے۔ میرے خیال میں تو یہ فیئر نہیں ہے۔''

''اور دوسری بات؟''

''دوسری بات یہ کہ آپ مائی لارڈ ہیں اور مائی لارڈ نے اس ٹی وی سیریل میں کہیں بھی اس طرح کی ٹوپی نہیں پہنی۔ اس ٹوپی کی وجہ سے میرا تصور درہم برہم ہورہا ہے۔''

''دیکھو بھئی، یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ اس ٹی وی سیریل میں کسی شخص نے مائی لارڈ کے سر پر ٹوٹے ہوئے لیمپ سے حملہ نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ بھی ٹوپی پہن لیتے اور میری ہی طرح نظر آتے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بچے بھی ہنسنے لگے۔

اس کے یوں ہنسنے سے شہزاد کو پھر اس کی ترسوں رات والی رواں دواں ہنسی یاد آگئی..... اس پر دو دفعہ ہنسی کا ایسا حملہ ہوا تھا اور دونوں مواقع وہ تھے جب اس نے شہزاد کی شاگرد بننے کی بات کی تھی۔ یہ تھی ابھی تک سنبھلی نہیں تھی۔

وہ پیرس کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے معروف مشہور روڈ شانزالیزے پر پہنچے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے آبی راستوں پر سفر کرتے کرتے اچانک ایک بہت بڑے لہریں مارتے دریا میں پہنچ گئے ہیں۔ اس سڑک کی وسعت، رونق اور خوبصورتی سب سے جدا نظر آئی..... بہت سی دیگر شاہراہوں کی طرح یہ بھی پتھر کے ہموار ٹکڑوں سے بنی ہوئی تھی۔ بسیں کاریں اور دیگر گاڑیاں اس پر سے کچھ تھرتھراتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ریستورانوں میں اور فٹ پاتھوں پر دوپہر کا کھانا کھانے والوں کا اژدھام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں پانی کم اور شراب زیادہ پی جاتی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ موازنہ کس طرح کیا جاتا ہے کیونکہ شہزاد کو تو کہیں پانی نظر ہی نہیں آیا۔

فاخرہ وہیل چیئر پر تھی اور وہیل چیئر مسلسل عینی نے ہی تھامی ہوئی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ فاخرہ کو مختلف مقامات کے بارے میں بتا بھی رہی تھی۔ فلاں رومانی ناول کی اطالوی ہیروئن اس ریستوران میں آکر بیٹھتی تھی۔ ہالی وڈ کی فلاں مشہور فلم کی شوٹنگ اس چوراہے پر ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔ پیرس جدید اور قدیم کا حسین امتزاج ہے اور اس وقت یہ امتزاج اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ بلند و بالا ماڈرن عمارتوں کے ساتھ ساتھ روم کی طرز کے آثار قدیمہ بھی جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اس شہر کی اور خاص طور سے شانزالیزے کی دلکشی کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب

Scanned And Uploaded

انہیں کچھ فاصلے پر ایک نہایت بلند و بالا دروازہ نظر آنے لگا تھا۔ عینی نے بتایا کہ یہی آزادی کی محراب ہے۔

ایک گراسی گراؤنڈ میں دھوپ بہت کھل کر برس رہی تھی۔ پھولوں کی رنگ برنگی کیاریاں اس جگہ کی خوبصورتی کو بڑھا رہی تھیں۔ اپنے تھکے ہوئے قدموں کو کچھ دیر آرام دینے کے لیے انہیں یہ جگہ بڑی مناسب لگی اور لوگ بھی یہاں وہاں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ ایک میوزیکل گروپ کے سیاہ فام ارکان موسیقی بکھیر رہے تھے اور لوگ ان کے سامنے رکھی ٹوپیوں میں سکے ڈال رہے تھے۔ شہزاد اور عینی نے بھی ایک جگہ چٹائی بچھائی اور ڈیرہ جما لیا۔ احسن ہینڈی کیم سے مووی بنانے لگا۔ عمیر نے فوٹو گرافی شروع کر دی۔

اسی دوران میں عمیر کی نگاہ چوراہے کی طرف گئی۔ وہاں لب سڑک ہجوم تھا اور کوئی کھیل تماشا ہو رہا تھا۔ دونوں بچے تماشا دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ عینی اور فاخرہ وہیں بیٹھی رہیں اور شہزاد بچوں کو لے کر ہجوم والی جگہ کی طرف چلا گیا۔ یہ جگہ آزادی کی محراب کے بالکل سامنے تھی۔ یہاں میلے کا سا سماں تھا۔ تین سیاہ فام لڑکے بریک ڈانس کر رہے تھے۔ درجنوں لوگ ان کے اردگرد کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ نوجوان رقص آمیز بازی گری میں مصروف تھے۔ ان میں دو خواتین بھی تھیں۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے انجوائے کر رہے تھے اور اپنا نذرانہ عقیدت سامنے رکھی ٹوپیوں میں ڈالتے جا رہے تھے۔ پھر تماشائیوں میں سے کچھ حوصلہ مند بچے بھی بریک ڈانس میں شریک ہو گئے۔ تماشائیوں کی دلچسپی بڑھ گئی۔ شانزالیزے کے اس نہایت وسیع اور پرشکوہ چوراہے میں یہ کھیل کود بے حد روایتی اور دلکش تھے شہزاد ان میں کھو گیا..... اور ان لمحوں میں اس سنگین معاملے کو تقریباً تقریباً بھول گیا جو صرف پانچ چھ دن پہلے اس کے اور شارق کے درمیان پیش آیا تھا اور جس کی ایک نشانی ''پی کیپ'' کی صورت میں اس کے سر پر موجود تھی۔

تماشے کے دوران وہ فاخرہ اور عینی کی طرف بھی گاہے بگاہے نگاہ دوڑا لیتا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سو میٹر دور سبز گھاس کے اوپر بچھی سرخ چٹائی پر بیٹھی تھیں عینی بڑی محبت سے فاخرہ کی پنڈلیاں دبا رہی تھی، ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھی۔ عینی کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہی ہے۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد وہ فاخرہ اور عینی کے پاس واپس لوٹے، تو عینی بڑی بے تکلفی سے آلتی مالتی مارے بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''کیا کوئی جوک سنایا گیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''جوک نہیں جی، بہت سنجیدہ بات ہے۔'' عینی چہکی۔ ''میں نے اور آنٹی فاخرہ نے آج ایک فیصلہ کر لیا ہے.....''

''کہ آج ہمیں کھانے کو کچھ نہیں دیں گی اور ایسے ہی باتیں بناتی رہیں گی۔'' عمیر نے اس کی بات اچکی۔

''الو بائے! تمہیں کھانے کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی۔ ہم ایک اہم مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ تم ذرا گراؤنڈ میں تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرو تاکہ بھوک اور اچھی طرح لگ جائے، پھر تمہیں بڑے شاندار سینڈوچ کھلاتے ہیں۔''

بچے واقعی بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ عینی کھلکھلاتے لہجے میں بولی۔ ''تو مائی لارڈ ہم نے طے کیا ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی پاکستان جاؤں گی۔ وہاں ہم سب اکٹھے رہیں گے، میں دن رات آنٹی کی خدمت کروں گی اور بدلے میں آنٹی مجھے اپنی محبت بھری باتوں سے خوش کریں گی۔ سچی خوشی وہ چیز ہے جو یہاں ہمارے یورپ میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں افراتفری کے سوا اور کچھ نہیں ہے می لارڈ! یوں لگتا ہے کہ ہم سب مشینیں ہیں اور ویک اینڈز کی تھوڑی سی فراغت کے لالچ میں دھڑا دھڑ چل رہی ہیں۔ بس ویک اینڈز..... اور کچھ نہیں۔ میں اب ذرا اور طرح سے جینا چاہ رہی ہوں می لارڈ.....'' اس نے کسی مقرر کی طرح ہاتھ لہرایا۔

''اور اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' شہزاد بھی زیرلب مسکرایا۔

''آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ ہم نے سب طے کر لیا ہے۔ بس آپ کو زیادہ سے زیادہ دو لفظ بولنے ہوں گے..... تین دفعہ۔''

''تین دفعہ؟ کیسے لفظ؟''

''قبول ہے..... قبول ہے..... قبول ہے۔''

''کس کے لیے؟'' شہزاد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میرے لیے اور کس کے لیے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''ہم دونوں کی میرج ہو جائے گی اور بس سارے راستے سیدھے ہو جائیں گے، ہم تینوں، دونوں بچو نگڑوں کو ساتھ لے کر سنڈے کے سنڈے کلفٹن پر پکنک منانے جایا کریں گے..... اور قیمے والے پراٹھے کھایا کریں گے۔ قیمہ اچھا لگتا ہے نا آپ کو؟''

شہزاد چکرا کر رہ گیا۔ ''یہ کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔'' وہ بے حد حیرت سے بولا۔ فاخرہ زیرلب مسکرائے جا رہی تھی۔

''الٹی سیدھی نہیں..... سیدھی سیدھی ہانک رہی ہوں یی لارڈ..... کیا آپ کو قیمہ اچھا نہیں لگتا۔ آپ کو میرے سر کی قسم..... سچ سچ بتائیں۔''

''مجھے تمہارے سر کی قسم، میں سچ سچ بتا رہا ہوں۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' شہزاد نے اسٹیل کا وزنی لفن اٹھایا تو وہ ''نونو'' کا شور مچاتی الٹے پاؤں پیچھے کو دوڑی اور بچوں کے پاس پہنچ گئی۔

''بڑی شرارتی ہے۔'' فاخرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور بے ہودہ بھی۔ یہ یہاں کے رہن سہن کا اثر ہے۔'' شہزاد نے برا سا منہ بنایا۔

''ویسے ایک بات ہے شہزاد! آپ کی دل سے عزت کرتی ہے، بڑا مانتی ہے آپ کو اور آپ کے کام کو۔ آپ کی بنائی ہوئی بہت سی تصویروں کے پرنٹ اس کے پاس موجود ہیں..... انہیں بڑے فخر سے اپنے دوستوں، عزیزوں کو دکھاتی ہے۔ ابھی پتا ہے کیا کہہ رہی تھی؟'' شہزاد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ فاخرہ بولی۔ ''ایک نیا نکتہ نکال رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ پچیس برس پہلے نانا جہانگیر نے اپنی مرضی کے لیے آپ کو نجمہ خالہ کا بھانجا بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اب آپ اس کے خالہ زاد بھائی ہیں اور خالہ زاد بھائی سے بے تکلف ہوا جا سکتا ہے۔''

وہ دونوں اس کی عجیب و غریب بے باک شخصیت کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ بچوں کو لے کر وہیں اس جگہ پر پہنچ گئی تھی جہاں کھیل تماشے ہو رہے تھے اور میوزک کی دھنا دھن گونج رہی تھی۔ عظیم الشان محراب پر چڑھے ہوئے لوگ نیچے سے بونوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یقیناً اوپر والوں کو نیچے والے بونے نظر آتے ہوں گے۔ شاید زیادہ پستی کی طرح زیادہ بلندی بھی انسان کے قد و قامت کو کم کر دیتی ہے۔

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے اس سارے معاملے سے ڈر سا لگ رہا ہے سونم! یہ یہاں کے ماحول میں پرورش پائی ہوئی لڑکی ہے۔ اس کے اور ہمارے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم نے دیکھا ہی تھا اس دن وہ خبیث شارق کس طرح کی بکواس کر کے گیا تھا۔ اب اگر یہ ہمارے ساتھ رہے گی تو ان لوگوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع ملے گا..... میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو آج شام تک یہ یہاں سے چلی جائے.....''

''آج شام تو یہ کسی صورت نہیں جائے گی۔''

''وہ کیوں؟''

''اسے پتا ہے کہ آج احسن کی سالگرہ ہے۔ یہ اس کے لیے گفٹ وغیرہ بھی لے کر آئی ہوئی ہے۔''

''بہرحال، اسے کل تک چلے جانا چاہیے سونم۔'' شہزاد کا لہجہ حتمی تھا۔

شام کو ہوٹل کے سویٹ میں ہی احسن کی سالگرہ منائی گئی۔ عینی بضد تھی کہ ماما، بگ سسٹر زارا اور ریحان وغیرہ کو بھی بلائے گی لیکن شہزاد نے منع کر دیا۔ یہاں شارق کی وجہ سے جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی اس کے بعد کسی ایسی ''گیدرنگ'' کا کوئی جواز نہیں تھا۔ احسن کی دسویں سالگرہ کا چھوٹا سا کیک کاٹا گیا اور مزیدار ترکش ڈنر کیا گیا۔ عینی نے احسن کو ایک زبردست وڈیو گیم کا تحفہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک آٹوگراف بک بھی تھی جو بہت قیمتی تھی۔ احسن اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ عینی نے کہا۔ ''اس بک پر سب سے پہلا آٹوگراف پتا ہے کس کا لینا ہے؟''

''کس کا؟'' احسن نے پوچھا۔

''اپنے ابو جان کا۔''

احسن ہنسا۔ ''لو ابو جان بھی کوئی مشہور کھلاڑی ہیں۔''

سب مسکرانے لگے۔ عینی بولی۔ ''لو جی اس کو کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر۔ بچونگڑے آپ کے ابو کوئی ایویں شیویں بندے نہیں ہیں۔ ایک دنیا جانتی مانتی ہے ان کو۔ انہوں نے یادگار تصویریں کھینچی ہوئی ہیں۔ یہاں پیرس میں ہی زیادہ نہیں تو، ڈیڑھ دو ہزار بندے ان کے پرستار ضرور ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم مجھے شدید قسم کی خوش فہمیوں کا شکار کر دو گی۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خود کو ''اوور اسٹیمیٹ'' کرنے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔''

''اور ''انڈر اسٹیمیٹ'' کرنے والا بھی۔'' اس نے برجستہ جواب دیا۔

کھانے کے بعد شہزاد اور فاخرہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ بچے اور عینی ٹی وی لاؤنج میں ہلا گلا کرتے رہے۔ میوزک آن تھا، پھر شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ رقص کر رہے ہیں..... شہزاد نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بنی ہوئی تھی۔ وہ شارٹس پہنے ہوئے تھی، پنڈلیاں دودھیائی عریاں تھیں، بالائی جسم پر بھی ہلکی پھلکی شرٹ تھی۔ اس شرٹ کے کشادہ گریبان میں سے اس کا جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا تاہم وہ ایسی باتوں سے قطعی غافل رہتی تھی اور یہ کوئی صرف عینی کی بات ہی نہیں تھی۔ یہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ شہزاد نے نوجوان لڑکیوں کو ایسی پتلونیں پہنے ہوئے

دیکھا تھا جو پیٹ کو انتہائی زیریں حد تک عریاں رکھتی تھیں، ان پتلونوں کے ساتھ جب انہیں جھکنا پڑتا تھا تو وہ عقب سے عریاں ہونے لگتی تھیں۔

پھر عینی نے رقص کرتے کرتے عمیر کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ وہ بھی الٹے سیدھے قدم اٹھانے لگا۔ رقص کی مشقت سے عینی کے گال شہابی ہونے لگے تھے۔ احسن تالیاں بجا رہا تھا۔ اس دوران میں عینی نے دیکھ لیا کہ شہزاد دروازے میں ہے۔ وہ شوخی سے بولی۔ ''آجائیں ناں آپ بھی۔'' اس نے تھوڑی دیر کے لیے میوزک بند کردیا تھا۔

''سوری مجھے ناچنا نہیں آتا۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا چلیں تالی ہی بجائیں۔''

''ابو بجائیں نا تالی..... پلیز بجائیں نا۔'' بچے ضد کرنے لگے۔

''مجھے تالی بجانی بھی نہیں آتی۔''

اس دوران میں فاخرہ بھی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی دروازے میں آگئی۔ ''اچھا میں بجاتی ہوں تالی۔'' اس نے کہا۔

عینی نے میوزک پھر آن کیا۔ وہ ایک پاؤں کو ہولے ہولے حرکت دیتی رہی۔ جب میوزک میں مطلوبہ مقام آیا اور گٹار کے ساتھ ڈرم کی سنگت ہوئی اس نے رقص شروع کر دیا۔ اس کا انداز دلکش تھا..... گاہے بگاہے وہ عمیر کو بھی اپنے ساتھ شامل کررہی تھی۔ احسن اور فاخرہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوٹل ''لینوٹا'' کی چوتھی منزل کی کھڑکیوں سے باہر پیرس کی جگمگاتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور دریائے سین پر دھیرے دھیرے چلنے والی روشن کشتیوں کی حرکت بھی کمرے کے اندر سے ہی محسوس کی جاسکتی تھی۔ رقص کے دوران میں تیز حرکات کی وجہ سے اس کے بال جو ربن سے بندھے ہوئے تھے بکھر گئے اور وہ بھی جیسے اس کے ساتھ ہی شریک رقص ہوگئے۔

پھر وہ بڑے انداز سے فاخرہ کی طرف مڑی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ ایک خاص ردھم کے ساتھ فاخرہ کے بازوؤں کو حرکت دینے لگی۔ فاخرہ کرسی پر ہی بیٹھی رہی لیکن یوں لگا کہ وہ بھی اس کے ساتھ رقص میں شریک ہوگئی ہے۔ بچے بھی اس صورتِ حال پر خوش نظر آرہے تھے۔ فاخرہ کی مضروب کلائی کو اس نے بڑی احتیاط سے کہنی کے پاس سے پکڑا ہوا تھا تاکہ اسے تکلیف نہ ہو۔ میوزک ختم ہوا تو رقص بھی ختم ہوگیا۔ عینی ہانپتی ہوئی ایک صوفے پر گر گئی۔

احسن اس کے اوپر چڑھ گیا اور شوخی میں اس کو گدگدانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اس کا لباس اور بھی بے ترتیب ہوگیا مگر وہ اس صورتحال سے قطعی لاعلم رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک ثانیے کے لیے اس کی نگاہ شہزاد کی نگاہ سے ملی۔ شہزاد کو وہی برقی جھٹکا محسوس ہوا جو اس سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ اسے عینی کی آنکھوں میں نجمہ کی آنکھیں دکھائی دیں۔ وہی رنگ، وہی گہرائی وہی معنی خیزی۔ وہ عموماً کوشش کرتا تھا کہ براہ راست عینی کی طرف نہ دیکھے لیکن کبھی کبھار ایسا ہو بھی جاتا تھا جیسے اب ہوا تھا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ غور تھی۔ عینی نے شروع میں دو چار بار شہزاد کو انکل کہا تھا، لیکن اب وہ اسے بڑے تواتر سے مائی لارڈ اور سر جی جیسے خطاب دیتی تھی مگر انکل نہیں کہتی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کررہی تھی۔

وہ ان لوگوں کو شور مچاتے چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں آگیا اور ایک کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔ اسے پرسوں ایک مقامی لائبریری میں جانا تھا اور ایک فرنچ پروفیسر کے ساتھ مل کر کچھ اسٹوڈنٹس کو ایک لیکچر دینا تھا۔ وہ دیر تک کتاب میں سر کھپاتا رہا لیکن ایک دو نوٹس ہی تیار کرسکا۔ ذہن میں یکسوئی نہیں تھی۔ پردہ تصور پر بار بار وہ دو آنکھیں ابھر آتی تھیں جنہوں نے اٹھائیس تیس سال پہلے اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس سال انہی آنکھوں کے سنہری طلسم میں گزرے تھے۔ وہ مسکراتی تھیں تو وہ بھی مسکراتا تھا، وہ کھلکھلاتی تھیں تو وہ بھی بھیگ جاتا تھا۔ وہ کچھ کہتی تھیں تو شہزاد چند لمحوں میں سمجھ جاتا تھا۔ ان آنکھوں نے شہزاد کی آنکھوں کے ساتھ مل کر گئے موسموں میں ان گنت سپنے دیکھے تھے..... لاتعداد امیدیں پالی تھیں..... اور پھر یہی آنکھیں تھیں جو دائمی ہجر کو اپنے روبرو دیکھ کر ٹوٹ کر برسی تھیں، خود جل تھل ہوئی تھیں اور شہزاد کو بھی کر گئی تھیں اور پھر یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے شہزاد کی آنکھوں سے دور ہوگئی تھیں..... لیکن نہیں..... شاید بعد میں ایک اور موقع ایسا آیا تھا جب یہ آنکھیں شہزاد کی آنکھوں سے ملی تھیں اور انہوں نے کچھ کہا تھا..... ہاں ایسا ہوا تھا..... اسٹریٹر شدہ بیس لے کر اپنے شوہر کے پیچھے لپکتی ہوئی نجمہ سیڑھیوں سے گری تھی اور بستر مرگ پر پہنچ گئی تھی۔ شہزاد نے اسے اسپتال کے سفید براق بستر پر ہی دیکھا تھا۔ کسی ستم گر کی گولی سے شکار ہونے والے سفید ہنس راج کی طرح وہ بے حرکت پڑی، سفید بستر کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ تب اس کی آنکھیں آخری بار شہزاد کی آنکھوں سے ملی تھیں۔ ان بولتی آنکھوں نے کہا تھا۔

''ہم ہار گئے شہزاد! لیکن ہماری محبت نہیں ہاری، یہ محبت زندہ رہے گی، میں روپ بدل کر آپ سے ملوں گی، نئے موسموں میں..... نئی ہواؤں میں اور نئے کھلنے والے پھولوں میں اور سورج کی روپہلی کرنوں میں.....

شہزاد نے کتاب ایک طرف پھینک دی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں، وہ کچھ دیر کے لیے غنودگی میں رہا پھر سوگیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس کے پہلو میں فاخرہ سو رہی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ بچے بھی ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو چکے تھے۔ دھیمی آواز میں کوئی کارٹون فلم اب بھی چل رہی تھی۔ شہزاد نوٹس تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی آف کیا اور وہیں ایک صوفے پر نیم دراز ہوکر کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ ساتھ والے کمرے میں عینی ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس نے درمیانی پردہ ہٹا کر دیکھا وہ ٹیبل لیمپ کے پاس قالین پر اوندھی لیٹی کچھ لکھ رہی تھی۔

''کیا ہورہا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''پوئٹری۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

شہزاد پھر اپنی کتاب میں مگن ہوگیا..... ''موجودہ دور میں ایڈورٹائزنگ کا اہم کردار اور اس کے منافع بخش پہلو'' یہ اس کے لیکچر کا موضوع تھا۔ وہ اس موضوع سے Related مواد تلاش کرتا رہا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ عینی اس کے سرہانے کھڑی ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیپر تھا۔ ''یہ دیکھیے مائی لارڈ، میری تازہ نظم۔''

شہزاد اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھنے لگا۔ وہ دوبارہ وہیں جاکر ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھ گئی۔ انگلش میں لکھی ہوئی نظم کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

مذاق کیا ہے؟
جھوٹ ہی تو ہے
آج آزادی کی محراب کے سامنے شاہِ بلوط کے
پیڑوں کے پاس
گھاس پر سنہری دھوپ کی چادر بچھی تھی
وہی طلسمی دھوپ جو زمین کے اندر
گل لالہ کی کونپل کو باہر آنے کی طاقت دیتی ہے
اس دھوپ سے میرے دل میں بھی شرارت کی ایک
کونپل پھوٹی
میں نے ایک مذاق کیا۔
اور مذاق کیا ہے؟ ایک جھوٹ ہی تو ہے
لیکن اب جبکہ رات آدھی گزر چکی ہے
پیرس کی روشن آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جارہی ہیں
میں سوچ رہی ہوں
پیرس کی طلسمی دھوپ سے تو صرف پھولوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں
خوشبو اور سچائی پھوٹتی ہے
اس دھوپ سے جھوٹ تو نہیں پھوٹ سکتا

..... وہ کچھ اور تھا..... ہاں وہ کچھ اور تھا۔ شاید گلِ لالہ کی کونپل تھی۔

نظم ختم کرتے کرتے شہزاد اس کے مفہوم تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے رگ وپے میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ غالباً عینی نے شاعری کا سہارا لے کر آج دوپہر والے واقعے کا ذکر کیا تھا۔ تب اس نے مذاق کے لہجے میں بڑی بے باکی سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جسے سن کر فاخرہ بھی ٹھٹک گئی تھی لیکن اب اس نے ڈھٹائی سے اپنے الفاظ کے ذریعے اس مذاق کو سچ کا پہناوا پہنانے کی کوشش کی تھی یعنی یہ صورت حال دوپہر کی صورت حال سے بھی زیادہ سنگین تھی۔

شہزاد نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔ وہ ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ روشنی اور آدھا تاریکی میں تھا۔ وہ عجیب انداز سے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی..... اس نے ایک ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ٹکایا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ یہ سویا سویا سا انداز بڑا انوکھا تھا۔

''ادھر آؤ عینی۔'' شہزاد نے تحکم سے کہا اور اس کے ساتھ ہی انگلی کی حرکت سے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی شہزاد کے سامنے آئی پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی..... ''یہ کیا ہے؟'' شہزاد نے بھنائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نظم ہے جی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ اس نے ابھی تک وہی شارٹس اور کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے کہ نظم ہے لیکن تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو۔'' شہزاد کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔

''مائی لارڈ! شاعری میں کچھ ثابت تو نہیں کیا جاتا، ثابت تو سائنس میں کیا جاتا ہے۔ شاعری تو خود مانتی ہے کہ اسے کسی چیز کا پتا نہیں۔ وہ تو خود حیران ہوتی ہے، ورڈز ورتھ ایک جگہ لکھتا ہے کہ.....''

Scanned And Uploaded

''ورڈز ورتھ کو گولی مارو۔'' شہزاد نے چیخ کر کہا۔
''مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کیوں کر رہی ہو، کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے؟''
شہزاد کے تلخ ترلہجے کو اس نے بڑی آسانی سے جھیلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ کچھ سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔
پہلے وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، پھر اس نے اپنے دونوں گھٹنے اٹھائے اور ان کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ سا قائم کرلیا۔ اس کی ٹھوڑی دائیں گھٹنے کے اوپر ٹک گئی۔ زیرلب مسکرا کر بولی۔ ''سچی سچی بتاؤں یا آپ کے ڈر سے گول مول بات کروں؟''
''مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔'' شہزاد کا انداز بدستور خشک تھا۔
''میں بھی آپ کے منہ سے یہی سننا چاہتی تھی۔ ویسے اگر آپ سچ نہ سننا چاہتے تو پھر میں نے آپ کو کچھ نہیں بتانا تھا کیونکہ جھوٹ بولنے سے تو خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔''
''اچھا..... کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' شہزاد نے دیوار سے ٹیک لگائی۔
''لیکن اس سے پہلے میری ایک چھوٹی سی شرط ہے می لارڈ۔'' وہ لجاجت سے بولی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بہت غصے میں ہونے کے باوجود شہزاد نے کوئی سخت بات نہیں کہی۔
''کیا شرط ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''آپ پریشان نہ ہوں۔ بس معمولی سی شرط..... آپ کو اپنا آٹوگراف دینا ہوگا۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔'' شہزاد کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی بیزاری چھپا نہیں پا رہا تھا۔
عینی نے گہری سانس لے کر قالین پر سوئے پڑے عمیر اور احسن کی طرف دیکھا۔ احسن اس کے قریب تھا۔ اس نے احسن کی ٹانگوں پر کمبل درست کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھ میں بے شمار خامیاں ہوں گی جی..... اور کچھ ایسی خامیاں ہیں جن کو میں خود بری طرح محسوس کرتی ہوں لیکن ایک بات میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بولتی اور کوشش کرتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی زبان پر بھی ہو اور وہی میرے کاموں سے بھی ظاہر ہو۔ اب مجھے نہیں پتا کہ جو کچھ میں آپ سے کہوں گی وہ آپ کو اچھا لگے گا یا برا لیکن یہ ہے سو فیصد سچ۔ آپ نے ابھی رشتے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ میں اپنے اور آپ کے رشتے کو نہیں پہچانتی۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے میں واقعی نہیں پہچانتی۔ میں جس رشتے کو پہچانتی ہوں وہ کوئی اور ہے۔''
''عینی جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ میں سن رہا ہوں۔'' شہزاد کی آواز سپاٹ تھی۔
''آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا، بولنا، ہر چیز..... اور اس سے بڑھ کر آپ کا کام۔ میں ان چند دنوں میں ہی آپ کو اپنے دل کے بے حد پاس محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی غصہ نہیں آیا لیکن جب شارق ماموں نے آپ کو یہاں اس کمرے میں چوٹیں لگائیں تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو شاید..... شاید.....'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوگئی۔
ٹشو پیپر سے آنکھوں کی نمی صاف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''گھر جا کر میں کئی گھنٹے تک روتی رہی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ آپ کی اور آنٹی کی دیکھ بھال کروں، آپ کی ہمت بندھاؤں لیکن ماما کو شارق ماموں کا ڈر تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میرے یہاں آنے سے کوئی بڑا فساد کھڑا ہو جائے۔ میں نے اگلے روز شام تک تو برداشت کیا مگر پھر نہ کرسکی۔ میں نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں یہاں آپ دونوں کے پاس چلی آئی۔''
شہزاد یکسر خاموش تھا۔ وہ بس عینی کے چہرے کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔
اس کے انداز کو محسوس کرکے وہ بولی۔ ''شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ایک جذباتی لڑکی ہوں، جو چند دن کی میل ملاقات کے بعد ایسی باتیں کرنے لگ گئی ہوں، ایسی باتیں جو ریت پر لکھی عارضی تحریر کی طرح ہوتی ہیں۔ یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گی۔ یہ سب کچھ عارضی نہیں ہے اور نہ ہی دو چار دن میں پروان چڑھا ہے۔ یہ سب کچھ کافی عرصے سے ہے، شاید تین چار سالوں سے۔ دراصل میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے وہ فن کا رشتہ ہے اور ذہنی ہم آہنگی کا رشتہ ہے اور میرے نزدیک یہی رشتہ زیادہ اہم ہے۔''
اس نے جملہ ختم کرکے ایک بار پھر شہزاد کی طرف دیکھا۔ جیسے توقع کر رہی ہو کہ وہ کچھ کہے گا مگر وہ خاموش رہا۔
نیند میں فاخرہ کی کھانسی کی آواز سنائی دی اور تب ایک بار پھر ہوٹل کے اس سویٹ میں گہری خاموشی چھا گئی۔ رات کے اس پہر پیرس کی جگمگاہٹیں قدرے ماند پڑ گئی تھیں۔ دور کئی کلومیٹر کے فاصلے پر ایفل ٹاور خاموش کھڑا تھا۔ وہ بھی جیسے شہر کے ساتھ ہی اونگھ رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''دیکھیں، میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ میں اپنی عمر کے ساتھ ساتھ، عقل سمجھ بوجھ اور شاید ''کامن سینس'' میں بھی آپ سے بہت پیچھے ہوں، میں یہیں پلی بڑھی ہوں۔ پاکستان سے میرا ناتا بہت کم رہا ہے۔ وہاں کے بارے میں میری جو بھی انفارمیشن ہیں وہ مجھے ماما اور پاپا کے ذریعے ہی ملی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہاں اس طرح کے سچ بولے جاتے ہیں یا نہیں اور اگر بولے جاتے ہیں تو انہیں کیا سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال جو کچھ میرے دل میں ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ میں آپ کو پسند کرتی ہوں، آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، آپ سے سیکھنا چاہتی ہوں اور ..... اگر..... ہمارے مستقل طور پر ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے کا کوئی رستہ نکلتا ہو تو میں اس پر بھی بخوشی قدم رکھنے کو تیار ہوں اور میں پھر کہوں گی، یہ محض جذباتی باتیں نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ میرے تعلق میں بڑی گہرائی ہے۔ یہ تو ایک اچھا اتفاق ہو گیا کہ آپ یہاں آ گئے اور مجھے آپ کے آنے کا پتا بھی چل گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اسی سال یا سال کے آخر میں، میں آپ سے ملنے پاکستان جاتی اور بہت دن تک آپ کی جان کھاتی۔ آپ کے بارے میں میری معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ اگر میں آپ کو بتانے پر آ جاؤں تو آپ خود حیران رہ جائیں گے اور ہاں یاد آیا، میں آپ کو ایک مزے کی بات اور بتاؤں.....'' ایک لمحہ توقف کر کے وہ دوبارہ بولی۔ ''میں دو تین دفعہ پاکستان میں آپ سے فون پر بات بھی کر چکی ہوں۔ ایک مرتبہ کا تو ماما پاپا کو بھی پتا ہے لیکن میں نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کو بتائیں گے نہیں کہ میں کون ہوں۔ اسی وقت ماما پاپا نے بھی آپ سے تھوڑی ''ہیلو ہیلو'' کی تھی۔ وہ شاید عید کا دن تھا۔ آپ حیدرآباد میں کسی مشترکہ عزیز کے گھر آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو دفعہ میں نے اکیلے میں آپ سے بات کی۔ بس آپ کی آواز سنی۔ آپ کی خیر خیریت پوچھی۔ آپ بس پوچھتے ہی رہ گئے کہ میں کون ہوں لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ شاید آپ یاد کریں تو آپ کو یاد آ جائے، یہ کوئی چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔''

اس کی بولتی آنکھوں میں شوخی تھی اور چہرے پر عجیب سی چمک۔ وہ بات ختم کر کے ایک بار پھر شہزاد کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بار بار توقع کر رہی تھی کہ شاید شہزاد کچھ بولے گا لیکن وہ پتھر کی طرح خاموش تھا۔

شہزاد کے اس انداز نے عینی کو گڑبڑا سا دیا۔ وہ کھسیانی ہو کر کوئی اور موضوع تلاش کرنے لگی۔ پھر ایک دم تیزی سے بولی۔ ''ارے ہاں..... اب آپ اپنی شرط تو پوری کیجیے ناں۔ میں نے تو سب کچھ بتا دیا۔''

شہزاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ جناب نے آٹوگراف دینا ہے۔'' وہ اٹھی اور اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک خاص قسم کا سرخ مارکر اٹھا لائی۔ اسپیشل PERMANENT INK والے ایسے مارکرز عام طور پر جلد پر ٹیٹو وغیرہ بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

''لیجیے جناب!'' اس نے مارکر شہزاد کو تھما دیا۔ پھر شرٹ کا بالائی بٹن کھول کر اپنی شرٹ شانے پر سے نیچے کھسکا دی۔ ''یہ نیا فیشن ہے جی۔ کالر بون (ہنسلی کی ہڈی) کے نیچے ٹیٹو بنانے کا۔ اسے ہم آج کل ''ہارٹ ٹاپ مارک'' کہتے ہیں۔ آپ ٹیٹو تو نہیں بنائیں گے آپ بس اپنے پیارے سے سائن کر دیجیے۔''

وہ خطرناک حد تک عریاں ہو رہی تھی اور اسے اس عریانی کی مطلق پروا نہیں تھی یا شاید..... وہ جان بوجھ کر پروا نہیں کر رہی تھی۔

شہزاد نے بہت درگزر کیا تھا۔

بہت تحمل کا ثبوت دیا تھا۔

لیکن اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کی رگوں میں جیسے لہو کی جگہ چنگاریاں چھوڑتا طیش دوڑ گیا۔

اس نے مارکر ایک طرف رکھا اور پھر..... ایک زناٹے کا تھپڑ عینی کے گال پر مارا۔ چٹاخ کی آواز ابھری۔ عینی کے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آئے اور وہ بیٹھی بیٹھی دو تین فٹ پیچھے لڑھک گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کا سمندر موجزن ہوا..... اور ہمیشہ بولتی آنکھیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ اس کا کندھا ابھی تک عریاں تھا اور کمرے کی روشنی میں بالکل دودھیا نظر آ رہا تھا۔

''اٹھو یہاں سے اٹھو۔'' شہزاد نے دھیمے لیکن نہایت سخت لہجے میں کہا۔

وہ لرز کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا۔ شہزاد اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا اس کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک نظر بیڈروم کے بند دروازے پر ڈالی۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ فاخرہ کہیں جاگ تو نہیں گئی۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ وہ عینی سے مخاطب ہو کر پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم انتہائی بے شرم ہو۔ تمہیں اپنی عزت کا پاس ہے نہ کسی اور کی عزت کا۔ تم جانتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو؟ میں تمہاری ماں کا پھوپی زاد ہوں۔ اپنی

عمر دیکھو، میری عمر دیکھو، خدا کا خوف نہیں تو کچھ دنیا کا خیال ہی کرو، میں حیران ہوں کہ تم نے کیا پڑھا ہے اور کیا تربیت حاصل کی ہے۔'' غصے کے سبب شہزاد کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

وہ پلکیں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ تاہم اب اس کے چہرے کی سفیدی ہلکی سی سرخی میں بدل گئی تھی۔

اس دوران میں بیڈروم سے فاخرہ کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔ ''شہزاد! کیا بات ہے، کیا ہوا ہے؟''

شہزاد نے عینی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اس سے مخاطب ہوکر دھیمی آواز میں بولا۔ ''صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔''

اس کے بعد اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور فاخرہ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''کچھ نہیں فاخرہ..... سو جاؤ تم۔''

مگر لگتا تھا کہ فاخرہ جاگ چکی ہے اور بیساکھیوں کے سہارے باہر آرہی ہے۔ عینی اپنے آنسو چھپاتی ہوئی جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فاخرہ باہر آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے ماحول کا جائزہ لیا اور اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں میں اندیشے کچھ اور بڑھ گئے۔

''کیا بات ہے عینی؟ کیا ہوا ہے؟'' فاخرہ نے عینی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔'' شہزاد نہایت کرخت لہجے میں بولا۔ ''اس سے کہو کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے۔ نہیں تو میں چلا جاؤں گا۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا بیڈروم میں آگیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ گردن میں پھر شدید درد ہونے لگا تھا۔ اس نے دو پین کلر کھائیں ساتھ میں ایک نسکون بخش ٹیبلیٹ بھی لے لی اور اپنے ذہن کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ فاخرہ دوسرے کمرے میں عینی کے پاس تھی۔ وہ بہت مدھم آواز میں بول رہی تھی۔ الفاظ شہزاد کی سماعت تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

وہ اضطراب کے عالم میں کچھ دیر تک اونگھتا رہا۔ فاخرہ کمرے میں واپس نہیں آئی، کچھ دیر بعد شہزاد کو بھی نیند آگئی۔

وہ زیادہ دیر نہیں سویا۔ آنکھ کھلی تو اجالا ہو رہا تھا۔ المونیم کی عجیب وضع کھڑکی سے دھوپ کی پہلی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ نیلے آسمان پر جہازوں کے چھوڑے ہوئے سفید دھوئیں کی آڑی ترچھی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ فاخرہ سامنے وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ اس کی بیمار آنکھوں میں گہری اداسی اور یاسیت کروٹیں لے رہی تھی۔

شہزاد کو اندازہ ہوا کہ عینی شاید بہت کچھ اسے بتا چکی ہے۔

''شہزاد! یہ کیا کیا آپ نے؟'' وہ نم ناک لہجے میں بولی۔

''جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔'' شہزاد کا لہجہ اٹل تھا۔ فاخرہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ''اسے کہو سونم! کہ بس ایک آدھ گھنٹے کے اندر یہاں سے چلی جائے۔'' شہزاد نے حکمیہ انداز اختیار کیا۔

''وہ جا چکی ہے۔'' فاخرہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''کب؟''

''دو گھنٹے ہو گئے ہیں، ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں روکتی رہی لیکن وہ نہیں رکی۔ بڑی دکھی ہوکر گئی ہے یہاں سے۔''

شہزاد خاموش رہا۔ اس کے ہونٹ مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔

''آپ نے اسے طمانچہ بھی مارا تھا؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''ہاں مارا تھا بلکہ اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔ وہ پرلے درجے کی احمق ہے..... وہ..... وہ فلرٹ کر رہی تھی مجھ سے..... اسے شرم نہیں آئی کہ میرا اور اس کا رشتہ کیا ہے۔ میں اس کے باپ کی عمر کا ہوں۔''

فاخرہ کچھ دیر خاموش رہی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو کچھ بھی ہے شہزاد..... آپ کو اس کے ساتھ ایسا رویہ تو اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ یہاں کے آزاد ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ بندہ جس ماحول میں ہوتا ہے اسی میں ڈھل جاتا ہے..... اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔''

''تم نہ کرو اس کی وکالت۔'' شہزاد گرجا۔ ''اگر لوگ یہاں ننگے پھرتے ہیں تو کیا ہم بھی ننگا پھرنا شروع کر دیں۔ وہ حد سے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے بھی ایک دو بار اشارے کنائے میں منع کیا تھا لیکن وہ ایک ضدی لڑکی ہے۔ یہاں کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی ہے۔ آج اسے جو سبق ملا ہے وہ کافی عرصے تک یاد رہے گا۔ آئندہ زندگی میں اس کے کام آئے گا۔'' شہزاد کا لہجہ جذبات کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ ''اور اب میں اس بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔'' شہزاد نے کمبل پھر اوڑھ لیا۔

''اگر اس نے باجی فرزانہ کو اس بارے میں بتایا تو پھر؟''

''بتا دے، سب کو بتا دے۔'' شہزاد نے کمبل کے اندر

Scanned And Uploaded !

سے ہی جواب دیا۔ ''آگے ان لوگوں کے ساتھ ہماری کون سی گاڑھی رشتے داریاں ہیں، جہاں دل آپس میں نہ ملتے ہوں وہاں ایک دوسرے سے دور ہی رہا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔''

فاخرہ خاموش ہوگئی لیکن اس کے بیباز چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے صاف محسوس کیے جاسکتے تھے۔

بعد میں شہزاد بھی دیر تک سوچتا رہا۔ کم از کم اسے تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا۔ یہ کام الٹا بھی پڑ سکتا تھا۔ وہ بھی طیش میں کوئی الٹا سیدھا کام کرسکتی تھی۔ کوئی بات کہہ کر اپنے گھر والوں کو بھڑکا سکتی تھی یا پھر پولیس کے پاس جاسکتی تھی۔ یہاں تو چھوٹا بچہ بھی اپنے ماں باپ کے خلاف مار پیٹ کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا۔ یہ تو پھر جوان تھی اور وہ اس کا خونی رشتے دار بھی نہیں تھا۔

دو دن خاموشی سے گزرے۔ اس دوران میں شہزاد کے سر کی چوٹیں قدرے بہتر ہوگئیں..... گردن کے درد میں بھی اب افاقہ تھا۔ وہ پی کیپ پہن کر لیکچر میں شرکت کے لیے بھی گیا۔ تصویروں کی ایک نمائش بھی دیکھی۔ یہ دونوں مصروفیات اس کے ''پیرس شیڈول'' میں شامل تھیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار فرزانہ کا فون آیا۔ اس نے فاخرہ سے حال چال پوچھا۔ عینی کے حوالے سے فرزانہ نے کوئی بات کی اور نہ عینی کی بڑی بہن زارا نے۔ یوں لگتا تھا کہ شاید عینی نے یہاں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں ان کو کچھ بتایا ہی نہیں۔

تیسرے دن کی بات ہے شہزاد، کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا تھا اور دریا کا منظر دیکھ رہا تھا۔ حسب معمول دونوں فرانسیسی بوڑھے آج بھی کنارے پر موجود تھے اور اپنے خیالات میں غلطاں نظر آتے تھے۔ وہ آپس میں بھی شاید بہت کم ہی بات کرتے تھے۔ اچانک کال بیل ہوئی۔ عمیر نے دروازہ کھولا پھر اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آخا..... دیکھو امی کون آیا؟''

''گڈ ایوننگ'' کی مدھم آواز سنائی دی اور شہزاد کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ عینی ہی تھی۔

عینی فاخرہ اور بچوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ شہزاد نے اٹھ کر بیڈ روم کا دروازہ بند کرلیا۔ اسے شدید الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اب کیا لینے آئی تھی یہاں؟

دس پندرہ منٹ گزر گئے، پھر ہولے سے دروازہ کھلا اور فاخرہ اندر آگئی۔ ''کیا بات ہے؟'' شہزاد کا لہجہ سخت تھا۔

فاخرہ نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ سے معافی مانگنے آئی ہے۔ بہت شرمندہ ہے۔ رو بھی رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے معاف کیا میں نے۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، بس وہ یہ مہربانی فرمائے کہ اپنے گھر میں رہے۔''

''چلیں..... کوئی بات نہیں۔ آپ ایک بار مل لیں اس سے۔'' فاخرہ نے التجا کی۔

اس سے پہلے کہ شہزاد جواب میں کچھ کہتا، وہ خود ہی اشک بار آنکھوں کے ساتھ اندر آگئی۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں جی میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی۔ اس کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے..... میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ..... بہت محتاط رہوں گی۔''

شہزاد خاموش رہا۔ ماتھے پر گہری شکنیں تھیں۔

''پلیز..... میں وعدہ کرتی ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں کروں گی جس سے آپ کی ناراضی کا پہلو نکلتا ہو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اپنے لباس کی طرف توجہ دو..... دیکھو اب بھی تم نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ گھروں میں پہننے کے لائق نہیں ہیں۔ اپنی بول چال پر غور کرو۔ مختلف عمر کے لوگوں سے بات کرتے ہوئے مختلف لہجہ اپنانا پڑتا ہے۔ حفظ مراتب اسی کو کہتے ہیں تم بہت کچھ بننا چاہتی ہو لیکن پڑھائی کی طرف تمہاری توجہ کتنی ہے؟ پچھلے آٹھ دس دنوں میں، میں نے تو شاید تمہاری زبان سے ایک بار بھی پڑھائی کی بات نہیں سنی.....''

شہزاد بولتا رہا اور وہ کسی اسٹوڈنٹ ہی کی طرح سر جھکائے سنتی رہی۔

''آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔'' اس نے آخر میں کہا۔

فاخرہ اسے باہر لے گئی۔

شہزاد چاہتا تھا کہ اب وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے لیکن وہ اور فاخرہ باتیں کر رہی تھیں۔ آدھ پون گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ شہزاد کو فاخرہ پر بھی غصہ آنے لگا کہ وہ اسے فارغ کیوں نہیں کر رہی۔ کچھ دیر بعد فاخرہ بیساکھیوں کے ساتھ اندر آئی اور ہولے سے بولی۔ ''وہ اب بھی پریشان ہے، کہہ رہی ہے کہ آپ نے اسے دل سے معاف نہیں کیا۔''

''تو کیا کروں اب؟''

''وہ آپ کے لیے چاکلیٹس لائی ہے، کہتی ہے کہ جب تک آپ اس کا چاکلیٹ نہیں کھائیں گے، وہ یہی سمجھے گی کہ آپ خفا ہیں۔''

یورپ امریکا وغیرہ میں چاکلیٹس شوق سے کھائے جاتے ہیں اور کئی حوالوں سے ان کی اہمیت بھی ہے، بے شمار جگہوں پر مختلف سوئٹس اور خاص طور... سے چاکلیٹس کا استعمال ہوتا ہے۔ کسی کو منانے کے لیے، تحفہ دینے کے لیے۔ Compliments پیش کرنے کے لیے، ہدیہ وغیرہ کے طور پر، اس کا استعمال ہمہ جہتی ہے۔ وہ بھی شہزاد کے لیے چاکلیٹس لائی تھی۔ طوعاً و کرہاً... شہزاد کو بیڈ روم سے باہر آنا پڑا۔ اس نے چاکلیٹ کے ایک دو ٹکڑے کھائے۔ فاخرہ نے چائے اور اسنیکس بھی منگوا لیے تھے۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی۔ شہزاد بھی کسی حد تک نارمل ہو گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بدلے ہوئے موڈ کی وجہ سے بچے بھی کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ عینی کے ساتھ ان کی خاصی ایسوسی ایشن ہو گئی تھی اور اب عینی کو آزردہ دیکھ کر وہ بھی آزردہ تھے۔

عینی کی خواہش تھی کہ پیرس کی باقی سیر بھی وہ لوگ ان کے ساتھ کریں، اگر ایسا نہ ہوا تو وہ ان کے جانے کے بعد بہت دکھی رہے گی۔ شہزاد ہامی بھرنے سے کترا رہا تھا مگر فاخرہ نے ہامی بھر لی۔

عینی نے اپنے گال پر پڑنے والے تھپڑ کے بارے میں گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ اس نے فاخرہ سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اس کے ماما پاپا یا زارا وغیرہ سے اس واقعے کا بالکل ذکر نہ کرے۔ وہ آٹھ بجے کے قریب گھر واپس چلی گئی۔ بچے موجودہ صورت حال سے خوش تھے۔ انہیں امید بندھ گئی تھی کہ اب پھر سیر کا موقع ملے گا۔ رات کو جب شہزاد سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو عینی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آ گیا۔ پہلی بار اسے عینی پر تھوڑا سا ترس آیا۔ اسے لگا کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس نے جس طرح ششدر ہو کر شہزاد کو دیکھا تھا اور اس کا رنگ زرد ہوا تھا وہ واقعی ترس ناک تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ بھی تھوڑا سا پھٹ گیا تھا اور فاخرہ نے بتایا تھا کہ اس رات وہ دیر تک ٹوپیپر سے ہونٹ کو دباتی رہی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، شہزاد کا دل اب بھی یہی چاہتا تھا کہ عینی کے ساتھ ان کی زیادہ میل ملاقات نہ ہو۔ شارق جس طرح کی بے ہودگی کر کے یہاں سے گیا تھا وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی..... عین ممکن تھا کہ اس نے عینی کے والد جمیل صاحب کے کانوں میں بھی کوئی الٹی سیدھی بات ڈال دی ہو۔ وہ شہزاد کی طرف سے محتاط ہو گئے ہوں۔ دو چار روز سے ان کی طرف سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ابھی شہزاد یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف جمیل احمد صاحب ہی تھے۔

سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔ ''شہزاد! عینی نے تمہاری ایک شکایت کی ہے۔''

شہزاد بری طرح چونک گیا۔ ''کک..... کیسی شکایت جی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ کہتی ہے کہ تم اس کی اور فاخرہ کی بار بار کی درخواست کے باوجود ہمارے گھر نہیں آئے ہو۔''

..... شہزاد نے ایک سرد آہ بھری۔ ''آپ نے دیکھا ہی ہے بھائی جان! کہ شارق یہاں کیا تماشا لگا کر گیا ہے، اس کے بعد ہماری میل ملاقات کی کم ہی گنجائش رہ جاتی ہے.....''

''شارق کو گولی مارو..... میں اس کے نہیں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں۔ میرے گھر کے معاملوں میں دخل دینے والا وہ کون ہوتا ہے اور ویسے بھی اس کی کیا حیثیت ہے۔ وہ موٹے دماغ کا بیکار شخص ہے۔ اپنے طور پر اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ انکل جہانگیر نے جو کچھ کمایا تھا اسی پر اتر رہا ہے اور وہ سب کچھ بھی کتنی دیر تک ساتھ رہے گا۔ ادھر جہانگیر صاحب کی آنکھیں بند ہوئیں، ادھر اس نے سب کچھ اپنی عیاشیوں میں برباد کر چھوڑنا ہے، خیر چھوڑو، وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔'' جمیل احمد صاحب شارق کے خلاف بھرے ہوئے تھے۔

انہوں نے آخر میں کہا۔ ''بھئی! عینی میری سب سے لاڈلی اولاد ہے اور میرا ایک مشورہ ہے تمہیں۔ اس کی کوئی بات ٹالنا نہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اس کی بات ٹالنے والا نقصان میں اور ماننے والا فائدے میں رہتا ہے اور یہ تجربہ میں نے کوئی دو چار دن میں حاصل نہیں کیا۔ اٹھارہ انیس سال کا دورانیہ ہے، میں جب بھی..... جب بھی اس کے کہنے پر چلتا ہوں مجھے فائدہ ہوتا ہے۔ چاہے کوئی گھریلو پریشانی ہو، چاہے کاروباری معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر کوئی خاص کرشماتی ٹائپ کی روح ہے۔ تمہیں پتا ہے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ تم نے وہ مکان گرنے والا واقعہ سنا ہوا ہے؟''

نہیں جی۔'' شہزاد نے کہا۔

''ان دنوں ہم سان فرانسسکو میں تھے۔ پیدائش کے تیسرے روز کی بات ہے۔ گھر آتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دادی اسے گود میں لے کر گھر میں چکراتی رہیں۔ یہ پورے گھر میں روتی رہی لیکن جب کچن کے ساتھ والے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچتی تھی تو رونا بند کر دیتی تھی۔ آخر ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کمرا نسبتاً زیادہ گرم ہے اس

Scanned And Uploaded

لیے یہ یہاں آکر جیب ہو جاتی ہے لہٰذا فرزانہ بھی اس کمرے میں شفٹ ہوگئی۔ اگلے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ شدید زلزلہ آیا۔ اس زلزلے میں علاقے کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ خاص طور سے ساحلی علاقے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ میں اس وقت آفس میں تھا۔ ہمارا گھر بھی تقریباً سارا ہی گر گیا تھا۔ صرف وہی کمرا بچا جہاں فرزانہ، زارا، عینی اور ان کی دادی موجود تھیں۔ امدادی کارکنوں نے انہیں بڑی مشکلوں کے ساتھ وہاں سے نکالا اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے بھئی۔ ہاں اسے تم پہلا واقعہ کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی کی بات مان لینے میں اکثر فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اب یہ آخری تجربہ ہی دیکھ لو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''اسی کے پرزور اصرار پر میں تبدیلی آب وہوا کے لیے یہاں سوئٹزرلینڈ میں موجود ہوں اور کافی افاقہ ہوا ہے، بے شک مہنگائی بہت ہے اور جیب ہلکی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ طبیعت بھی تو کافی ہلکی ہوئی ہے۔'' انہوں نے پھر قہقہہ لگایا۔

''ہاں آپ کی آواز سے تو لگ رہا ہے کہ آپ اچھا محسوس کر رہے ہیں۔''

''بالکل۔'' انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ''اس وقت میں سوئٹزرلینڈ کے کیپٹل ''زیورخ'' میں ہوں۔ زیورخ کا دل زیورخ کی جھیل ہے جسے ''زیورخ بے'' کہتے ہیں۔ میں نے اس وقت نیکر پہنی ہوئی ہے۔ ہیڈفون لگا کر ''ایس بی'' پر فریش میوزک سن رہا ہوں اور ہلکی پھلکی جاگنگ کر رہا ہوں۔ واقعی بھئی، کوئی بات ہے سوئٹزرلینڈ میں۔''

اگلے روز عینی اپنی ''پی جو'' گاڑی پر پھر ہوٹل پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔ ان کی چہکاریں لوٹ آئیں اور چہروں کی رونقیں بحال ہوگئیں۔ شہزاد نے نوٹ کیا۔ وہ حیران کن طور پر بڑا ''سوبر'' لباس پہنے ہوئے تھی۔ شلوار قمیص کے ساتھ ایک اسکارف ٹائپ کپڑا بھی تھا۔ لباس کے علاوہ اس کا چہرہ بھی سنجیدہ نظر آتا تھا تاہم یہ سنجیدگی ایسی نہیں تھی کہ تفریح کے موڈ کو خراب کرتی۔ حسب معمول اس نے اصرار کر کے فاخرہ کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کرلیا۔ فاخرہ کی طبیعت اب قدرے اچھی تھی۔ حسب معمول بچے عینی کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ فاخرہ اور شہزاد نے پچھلی نشست سنبھال لی۔ آج وہ دریائے سین کے ساتھ ساتھ نکلے اور راستے میں آنے والی مختلف قابلِ دید جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر رکتے گئے۔

وہ جو ذرا تناؤ کی کیفیت تھی وہ ایک دو گھنٹے کی سیر کے بعد دور ہوگئی۔ عمیر اور احسن عینی سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ بھی انہیں جواب دینے لگی۔ فاخرہ بھی عینی کو نارمل کرنے کے لیے مسلسل باتیں کر رہی تھی، حالانکہ وہ کم ہی بولتی تھی۔

راستے میں ایک ٹریفک سگنل پر ایک عمر رسیدہ فرنچ عورت کو دیکھ کر فاخرہ نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ تو بالکل تائی کلثوم لگتی ہے۔'' سب نے چونک کر عورت کی طرف دیکھا۔ لمبی ناک اور کرخت چہرے والی وہ عورت شاید کسی فلنگ اسٹیشن پر کام کرتی تھی۔ کم از کم اس کی وردی سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک سائیکل سوار لڑکے سے تکرار کرنے میں مصروف تھی جس نے شاید اس کا راستہ کاٹا تھا یا ہلکی پھلکی چوٹ پہنچائی تھی۔ گاڑی اس کے پاس سے گزر گئی۔

عینی نے چونک کر کہا۔ ''ہاں آنٹی! جن کو آپ نے تائی کلثوم کہا ہے یہ وہی ہیں ناں..... جنہوں نے..... میرا مطلب ہے جنہوں نے خالہ نجمہ کو بہو بنایا تھا۔''

''ہاں، وہی ہیں۔ آج کل اپنے بھائیوں کے پاس رہتی ہیں۔ کالے موتیے کی وجہ سے ان کی بینائی بالکل ختم ہو چکی ہے۔''

''ہاں..... ہاں کوئی ایسی بات تو میں نے بھی سنی تھی مگر وہ اپنے بھائیوں کے پاس کیوں ہیں؟'' عینی نے پوچھا۔ اس کے انداز میں گہرا تجسس تھا اور یہ وہی تجسس تھا جو شہزاد اور نجمہ کے حوالے سے اس میں شاید کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ممانی کلثوم بھی اس کہانی کا حصہ تھی۔

فاخرہ نے بتایا۔ ''تایا طفیل تو تیرہ چودہ برس پہلے فوت ہوگئے تھے۔ اس کے بعد تائی کے لے پالک سجاد نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ باجی نجمہ کے بعد اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی دوسری بیوی ایک نمبر کی خرانٹ ہے۔ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ تائی کے سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔ بیٹے اور بہو نے تائی کو نچا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ ساس بہو میں مار پیٹ تک کی نوبت آگئی۔ شاید قدرت نے تائی سے ان ناانصافیوں کا بدلہ لیا ہے جو انہوں نے باجی نجمہ سے روا رکھی تھیں۔''

''بالکل یہی ہوا ہوگا۔'' عینی نے ہنکارا بھرا۔ ''مجھے ماما نے بتایا تھا کہ شادی کے بعد نجمہ خالہ کو ساس اور شوہر نے بہت دکھی کیا تھا۔ اسی دکھ میں ان کی زندگی بھی چلی گئی۔''

''خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، کبھی کبھی انصاف میں دیر تو لگتی ہے لیکن انصاف ہوتا ضرور ہے عینی۔'' فاخرہ نے کہا۔ ''تائی کلثوم کے لے پالک سجاد نے کاروبار تو پہلے ہی تباہ کر چھوڑا تھا، اب ڈھائی تین سال پہلے اس نے مکان بھی تائی کلثوم سے ہتھیا لیا۔ حالانکہ تائی خود بھی بڑی چوکس عورت

ہیں لیکن پتا نہیں کیسے اس کے چکر میں آ گئیں۔ انہوں نے سجاد کو مختار نامہ دیا اور اس نے گھر بیچ کر بیوی کے ساتھ کوئٹہ کا ٹکٹ کٹا لیا۔ تائی اب بے گھر ہو کر چھوٹے بھائی کے پاس ہے۔ کوئی کیس وغیرہ بھی لڑ رہی ہے لیکن بننا بنانا کچھ نہیں۔ بہو کا بھائی خود بڑا خرانٹ وکیل ہے اور اب تو تائی ویسے بھی چل پھر نہیں سکتی۔ اس کی نظر بالکل ختم ہو چکی ہے۔''

عینی، فاخرہ سے کرید کرید کر سوال پوچھتی رہی اور اس کے سوالوں سے وہ گوناں گوں دلچسپی ظاہر ہوتی رہی جو وہ اس کہانی سے رکھتی تھی۔ اس کے چہرے مہرے سے صاف ظاہر تھا کہ ممانی کلثوم کی شامتِ اعمال کا سن کر وہ خوش ہوئی ہے۔

دریائے سین کے کنارے پر نرم نرم دھوپ کا بسیرا تھا۔ پھول کھلے تھے اور وہ اپنی چاروں طرف ہنستے مسکراتے چہروں کی بہار دیکھ رہے تھے۔ بچے کشتی کی سیر کو نکل گئے۔ شہزاد اور فاخرہ کا خیال تھا کہ کشتی کی سیر کے بجائے یہیں سبزہ زار میں ''میٹ'' بچھا کر بیٹھا جائے اور چائے پی جائے۔ ایک ہی خوبصورت مقام کو بچے اور انداز میں دیکھ رہے تھے جبکہ فاخرہ اور شہزاد اور انداز میں..... فاخرہ اور شہزاد کو ان کی ''تنہا کا وٹ'' کنارے پر رکھنا چاہتی تھی جبکہ بچوں کو ان کی ''وافر توانائی'' مچلتی لہروں کی طرف دھکیل رہی تھی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شہزاد بچوں کو لے کر کشتی میں بیٹھے گا جبکہ عینی کنارے پر فاخرہ کے ساتھ رہے گی۔

قریباً ایک گھنٹا کشتی میں سیر کے بعد جب وہ کنارے پر واپس آئے تو شام ہو چکی تھی، پیرس کی دوشیزہ..... ایک ریشمی شب کو اپنے سامنے دیکھ کر انگڑائی لے رہی تھی اور اس کے آنچل میں بے شمار ستارے جھلملانے لگے تھے۔ انہوں نے کنارے پر بیٹھ کر گرما گرم چائے پی اور بسکٹ کھائے۔ ایک تفریحی بجرے پر موجود کچھ منچلے بیئر پی رہے تھے اور میوزک پر مسلسل رقص کر رہے تھے، ان میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ غالباً یہ کوئی برتھ ڈے پارٹی تھی پھر ان لوگوں نے آتش بازی شروع کر دی۔ قوس قزح کے رنگوں والی ہوائیاں فضا میں روشنی بکھیرنے لگیں۔

عینی اس آتش بازی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ دور ایفل ٹاور کے روشن ہیولے کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں سیکڑوں ہزاروں قمقمے جل بجھ رہے تھے اور ٹاور کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔

''دیکھیں باجی! کتنی پیاری ہوائیاں ہیں۔'' عمیر نے عینی کو جھنجوڑتے ہوئے آتش بازی کی طرف متوجہ کیا۔

''ہوں۔'' عینی نے مختصر جواب دیا۔

''تمہیں آتش بازی اچھی نہیں لگتی؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''نہیں جی..... یہ خطرناک کام ہے اور آپ کو؟''

''مجھے بھی نہیں لگتی۔'' شہزاد نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''پر آپ تو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے؟''

''وہ تو یونہی، بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔''

''پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے پٹاخے، آگ، دھواں وغیرہ بالکل اچھے نہیں لگتے اور خاص طور پر اس کی بُو، جو فائر ورک کے ساتھ پھیلتی ہے۔''

ایکا ایکی شہزاد بری طرح چونک گیا، یہی الفاظ..... اسی انداز میں..... کسی موقعے پر کسی اور نے بھی کہے تھے۔

اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہاں بالکل یہی انداز تھا۔ برسوں پہلے ماموں جہانگیر کے گھر کی چھت پر، شبِ برات کے موقع پر سارے کزن مل کر ہلا گلا کر رہے تھے۔ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نجمہ اس آتش بازی سے بالکل لاتعلق ہو کر موم بتیاں روشن کرنے میں مصروف تھی۔ شہزاد اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا..... اور تب بالکل ایسی ہی باتیں نجمہ نے کہی تھیں۔

وہ گم صم ہو گیا۔ اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں سے بہت دور چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے نجمہ اور عینی میں گاہے بگاہے حیران کن مماثلتیں کیوں نظر آ رہی ہیں۔ وہ ان مماثلتوں سے صرفِ نظر کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا، کچھ کو اپنا وہم قرار دیتا تھا، کچھ کو اتفاق کے حوالے سے دیکھتا تھا، لیکن پھر بھی یہ مماثلتیں اور مشابہتیں مسلسل اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر رہی تھیں اور ان میں سب سے اہم مشابہت آنکھوں کی تھی۔ عینی کی آنکھوں میں شہزاد بہت کم دیکھتا تھا لیکن جب بھی دیکھتا تھا اسے ایک شاک کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ آنکھوں کی بناوٹ ایک جیسی ہونا اور بات ہوتی ہے..... لیکن یہ تو عینی کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ یہ نجمہ کی تھیں اور ان کے اندر بھی جو کچھ تھا وہ نجمہ کا تھا۔ وہ چوتھائی صدی سے زیادہ کا فاصلہ پھلانگ کر پیرس میں رہنے والی عینی کی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی، اب وہ اسے دیکھ رہی تھی، پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں لوٹ کر آؤں گی اور وہ شاید لوٹ آئی تھی۔

مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے



جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان عشق

طاہر جاوید مغل

شہرِ محبت

آخری حصہ

چاہت کے سپنے بڑے سُندر اور نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں مگر..... یہاں تو حسد ورقابت کی اتنی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد ورقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی مقصد برآری کے لیے لوگ کیا کیا گُر اپنا لیتے ہیں اور کسی کو ذلت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کیسے کیسے ہنر آزماتے ہیں لیکن..... قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی..... اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کے جو لمحات اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکے ہیں یوں اتنے دلکش سراپا میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوں گے..... مگر جانے کیوں اس بار اس کی آنکھیں شہرِمحبت کا یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہوسکیں..... خوشبوؤں کی سرزمین پیرس کی حسین رہ گزاروں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان۔ محبوب مصنّف طاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی۔





شہزاد کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سب کو وہیں گپ شپ کرتے چھوڑ کر دریا کے کنارے چلا گیا..... تاریکی میں خنکی شامل ہوگئی تھی، دن کی روشنی میں نہایت سرسبز نظر آنے والے شاہ بلوط اور بید کے پیڑ تیرگی کا حصہ بنتے جارہے تھے۔ عطر بیز ہوا میں ایک نشہ سا تیرتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا، گھٹن کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں دریا کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے اسے انجانا سا ڈر محسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ابھی یہاں کہیں سے شارق نمودار ہوجائے تو عینی کو ان کے ساتھ پکنک مناتے دیکھ کر اس کے اشتعال کا کیا عالم ہو۔ شکر کا مقام تھا کہ وہ انگلینڈ واپس لوٹ چکا تھا۔

اگلے روز شہزاد نے اپنے فرانسیسی دوستوں پروفیسر موشیل اور مسز شا کے ساتھ دو تین گیلریوں کا وزٹ کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کی یادگار اسٹل فوٹو گرافز کی ایک نمائش بھی دیکھی۔ تیسرا روز پھر پیرس کا تھا۔ یہ سنڈے تھا اور واقعی سن ڈے بھی تھا۔ بڑی خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ بچے باہر نکلنے کے لیے مچل رہے تھے۔ تاہم فاخرہ آج پھر ''فٹ'' نہیں تھی۔ وہ پرسوں کی طویل سیر کے بعد مسلسل ٹانگوں اور کمر میں درد کی شکایت کررہی تھی۔ آج چھٹی کی وجہ سے زارا اور اس کا گول مٹول بچہ حمدان بھی ساتھ آئے تھے۔ دونوں بہنوں نے زبردست لنچ کا انتظام بھی کردیا تھا۔ گھر میں بنائے گئے ''ڈونرز'' اور ایگ فرائیڈ رائس تھے۔ پروگرام تھا مشہور تفریح گاہ PARC ASTERIX جانے کا۔ یہ ڈزنی لینڈ طرز کی تفریح گاہ تھی اور شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔ عمیر اور احسن اس پارک کے حوالے سے بڑے پرجوش تھے۔

جب فاخرہ کے ساتھ جانے کا پروگرام نہیں بنا تو فیصلہ ہوا کہ آج کار کے بجائے میٹرو اور RTR ٹرینوں میں سفر کیا جائے۔ شہزاد کی توقع کے خلاف یہ نیا تجربہ بڑا دلچسپ اور آسان رہا۔ پیرس کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ شاید وہ اکیلے ہوتے تو یہ ٹرینوں والا تجربہ کبھی نہ کرتے لیکن عینی اور زارا یہاں ہر طرح کے سفر کی ماہر تھیں۔ خاص طور سے عینی کو تو جیسے ہر چیز ازبر تھی، آج وہ غیر متوقع طور پر ساڑی پہن کر آئی تھی، تاہم اس کے پاؤں میں سفید جوگر اور سر پر پی کیپ تھی۔ پی کیپ پہننے کے لیے اس نے بال، ٹائٹ جوڑے کی شکل میں باندھ لیے تھے۔ حسب معمول آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ بھی تھا۔ شروع میں شہزاد اور فاخرہ کا خیال تھا کہ شاید وہ شوق شوق میں ساڑی پہن آئی ہے اور گھومنے پھرنے میں دقت محسوس کرے گی لیکن جب وہ چل پڑے تو شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ اس سلسلے میں بھی تجربہ کار ہے۔ وہ بڑی پھرتی سے چھلانگیں لگاتی ہوئی ٹرینوں اور بسوں پر چڑھی بھی اور اتری بھی۔

سب سے پہلے وہ دو بسیں بدل کر ''مین اسٹیشن'' پہنچے۔ وہاں سے زمین دوز پلیٹ فارم پر گئے اور ایک ٹرین پکڑی جس کو ''لائن ون'' کہا جاتا تھا۔ اس شاندار ٹرین سے اترنے کے بعد انہوں نے ایک اور ٹرین لی۔ عینی نے بتایا کہ اسے RTR کہا جاتا ہے۔ یہ ٹرین بھی پہلی ٹرین کی طرح سیکنڈوں کے لحاظ سے درست وقت پر پہنچی اور رخصت ہوئی۔ یہ سب کچھ کمپیوٹرائزڈ نظام کے تحت تھا۔ یہ لمبے فاصلے تک جانے والی نسبتاً تیز رفتار ٹرین تھی۔ وہ جلد ہی پیرس سے نکل کر مضافات میں پہنچ گئی۔ پیرس کے مضافات پیرس کی طرح پرشکوہ نہیں تھے۔ یہ ویسے ہی تھے جیسے عام شہروں کے ہوتے ہیں۔ غالباً دنیا کے ہر بڑے شہر کی مضافاتی آبادیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ RTR کا رخ اب پیرس کے ایئرپورٹ کی طرف تھا۔

راستے کے مختلف اسٹاپس سے بہت سے سیاہ فام بھی ان کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ عمیر مسلسل چہک رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر گفتگو عینی کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ اس نے عینی سے مخاطب ہوکر اردو میں کہا۔ ''یہ اتنے سارے بلیک آگئے ہیں اندر، لگتا ہے کہ ٹرین میں اندھیرا ہوگیا ہے۔''

عینی نے اسے گھورا اور تنبیہ کے انداز میں بولی۔ ''یہ لوگ ایسی باتوں کا بڑی جلدی برا منا لیتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ تمہیں پیٹ ڈالیں۔''

''لیکن، میں نے تو اردو میں کہا ہے۔''

''الو بائے! ''بلیک'' تو انگلش میں کہا ہے ناں اور یہی لفظ انہیں زیادہ برا لگتا ہے۔''

''اوکے..... سوری آنٹی۔'' عمیر نے کہا۔

زارا بولی۔ ''اوئے عمیر! یہ کیا؟ کبھی تم اسے باجی کہتے ہو، کبھی آنٹی۔''

''یہ آج ذرا بڑی بڑی لگ رہی ہیں ناں۔ اس لیے غلطی لگ گئی۔'' عمیر نے ترت جواب دیا۔ غالباً وہ ساڑی کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

''اچھا، اس کا مطلب ہے جب میں ذرا بڑی لگوں گی تم مجھے آنٹی کہو گے جب چھوٹی لگوں گی تب باجی اور اگر زیادہ چھوٹی لگوں گی تو صرف عینی۔'' عینی نے اس کا کان مروڑا۔

''اچھا نہیں کہتا آنٹی..... نہیں کہتا۔'' وہ کان چھڑانے کی کوشش میں دہرا ہونے لگا اور احسن نے ہینڈی کیم سے فلم بندی شروع کردی۔

''چلو، پہلے کہو باجی۔'' شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''باجی..... باجی۔'' وہ بولا۔
عینی نے کان چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر ایک دم دور بھاگ گیا اور بولا۔ ''آنٹی..... آنٹی۔''
سب ہنسنے لگے، زارا نے کہا۔ ''بھئی! اس کا درمیانی راستہ نکال لیتے ہیں۔ تم اسے آنٹی باجی کہہ لیا کرو۔''
''ہاں یہ ٹھیک ہے، آنٹی باجی۔'' عمیر چہکا۔
''آنٹی باجی۔'' چھوٹے احسن نے بھی تائید کی۔
اسی طرح ہنستے، باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے پارک کے ٹکٹ لیے گئے، یہ خاصے مہنگے تھے، یعنی ایک ٹکٹ ساڑھے بتیس یورو کا۔ اس کے علاوہ پارک تک لے جانے والی شٹل بس سروس کا کرایہ ساڑھے سات یورو فی کس تھا۔ یعنی کل ملا کر تقریباً 40 یورو..... پاکستانی کرنسی کے حساب سے یہ کم و بیش 4400 روپے فی کس بنتا تھا۔ اس حساب سے انہیں خاصی رقم ادا کرنا پڑی لیکن یہاں بھی عینی نے شہزاد کی ایک نہیں چلنے دی اور سارے ٹکٹ خود ہی لیے۔
شٹل بس سروس کے ذریعے وہ لوگ Parc Asterix کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ نہایت صاف ستھری لیکن سنسان سڑکوں کا سفر تھا۔ چاروں طرف ہریالی تھی۔ وہ جوں جوں پارک کے نزدیک پہنچ رہے تھے، بچوں کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کا سفر بچوں کو آدھے دن کی طرح لگ رہا تھا۔
آخر وہ پارک میں داخل ہوئے، یہ ایک نئی دنیا تھی۔ انہیں یوں لگا جیسے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے ہوں۔ وہی گرد و پیش اور وہی مناظر تھے جو ڈزنی لینڈ کے داستانی کارٹونوں میں نظر آتے ہیں۔ پرانے قلعہ جات..... خوفناک قید خانے، خندقوں پر بنے ہوئے پل اور پھر قدیم غار، جنات اور پری زادوں کے بڑے بڑے مجسمے۔ کچھ تعمیرات کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ رومن دور کی کسی بستی میں آ پہنچے ہوں۔ اسی طرز کے مکان، ریستوران، گلیاں اور چوراہے۔ وہ جدھر نظر اٹھاتے تھے حیرت ان کی منتظر تھی۔ بچے گرد و پیش دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور عینی انہیں دیکھ کر۔ ان لمحوں میں وہ بڑی Caring نظر آئی، ہر لحظہ بچوں کا خیال رکھتی ہوئی۔
مختلف جھولوں اور تفریحات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شائقین کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں قطاریں چھوٹی تھیں، کہیں بہت لمبی، سب سے لمبی قطار جدید طرز کی رولر کوسٹر کے لیے تھی۔ عینی اور زارا کا خیال تھا کہ وہاں رش

کرشمہ

ہم نے کراچی کے ایک قدیم باشندے سے پوچھا کہ یہاں مانسون کا موسم کب آتا ہے؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بدھ کو آیا تھا!

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ کراچی میں بارش نہیں ہوتی۔ البتہ اس کا کوئی وقت اور پیمانہ معین نہیں ہے لیکن جب ہوتی ہے تو اس انداز سے گویا کسی مست ہاتھی کو زکام ہو گیا ہے۔ سال کے بیشتر حصے میں بادلوں سے ریت برستی رہتی ہے۔ لیکن جب چھٹے چھماہے دو چار چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو چٹیل میدانوں میں بیر بہوٹیاں اور بہو بیٹیاں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ اس قسم کا موسم بے تحاشا ''رش'' لیتا ہے۔

مغربی پاکستان میں برکھارت اور کراچی میں جولائی کا مہینا تھا۔ سمت کیماڑی سے مکھیوں کے دل بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے۔ چنانچہ میں مچھر دانی میں بیٹھا آم چوس رہا تھا کہ مرزا عبدالودود بیگ آ نکلے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی موسم ہے..... جیسے کسی اقبالی مجرم کو ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے ہوں! ادھر کمبخت مکھیاں اس قدر لدھڑ ہو گئی ہیں کہ اڑنے کا نام نہیں لیتیں! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ واقعہ ہے کہ صبح قسائی نے میرے سامنے آدھ سیر ران کا گوشت تول کر قیمہ کوٹا۔ میں برابر پنکھا جھلتا رہا لیکن گھر پر بیگم نے تولا تو پورا تین پاؤ نکلا!

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس

زیادہ ہے اس لیے رولر کوسٹر کی سواری بعد میں کی جائے گی۔
شہزاد جھولوں پر بیٹھنے سے کترا رہا تھا۔ تاہم عینی اور زارا کے مجبور کرنے پر اسے ایک دو جھولوں پر بیٹھنا پڑا۔ ہلکی سی گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شائقین کو گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے ان پر متحرک فواروں کے ذریعے پانی کی پھواریں پھینکی جا رہی تھیں۔ خاص طور پر جہاں دھوپ میں قطاریں لگی ہوئی تھیں وہاں کی فضا کو ٹھنڈا کیا جا رہا تھا۔ عینی ایک ایسے ہی فوارے کے عین سامنے کھڑی ہوگئی اور خود کو پوری طرح بھگو لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی عمیر اور احسن نے بھی ایسا ہی کیا۔
ماحول کی مستی ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے اپنی قمیص اتاری اور پھوار سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس فرانسیسی کی عمر پچپن ساٹھ سال رہی ہوگی، جسم ڈھلکا ہوا، تاہم چہرہ دلکش تھا۔ بہت سے لوگ اس کی طرف توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ زارا نے بتایا۔ ''یہ شخص یہاں کا پاپولر گلوکار ہے..... پال نام ہے اس کا۔ ہالی وڈ کی ایک دو فلموں میں بھی کردار ادا کر چکا ہے۔ پچھلے دنوں ایک جاپانی گلوکارہ سے اس کا معاشقہ بڑا مشہور ہوا تھا۔''
اسی دوران میں ایک دو خواتین نے اس سے بغلگیر ہو کر اس سے آٹوگراف لیے۔
زارا بولی۔ ''انکل جی! آپ بھی تو شوبز سے وابستہ ہیں۔ آپ کی بنائی ہوئی درجنوں کمرشلز پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بے حد پاپولر ہوئی ہیں۔ آپ کے اردگرد بھی تو ماڈلز کا ہجوم رہتا ہوگا اور ان میں بہت سی خواتین بھی ہوتی ہوں گی..... بلکہ میرا خیال ہے، زیادہ خواتین ہی ہوتی ہوں گی۔''
''ہاں بھئی، ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔''
''آپ جس مزاج کے ہیں، آپ کو تو اس ماحول میں بڑی مشکل پیش آتی ہوگی۔''
''دراصل اپنا ماحول بندہ خود بناتا ہے۔'' شہزاد نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور..... اچھا برا ماحول بھی ہر جگہ بنایا جا سکتا ہے۔ ابھی پرسوں کے اخبار میں، میں ایک چرچ کی خبر پڑھ رہا تھا۔ ایک نیم برہنہ لڑکی شدید زخمی حالت میں پائی گئی۔ عبادت گاہ سے مقدس جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے لیکن گمراہ لوگ ایسی جگہوں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔''
''یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔'' زارا نے ہنکارا بھرا۔ ''مگر.....'' وہ خاموش ہوگئی۔
''مگر کیا؟''
''پلیز، برا نہ مانیے گا۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری آنٹی تو ایک عرصے سے بیمار ہیں، کیا آپ کے ذہن میں کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا؟''
''بالکل نہیں زارا۔ میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔ سچ پوچھو تو میں اپنے کام میں اتنا مگن ہو چکا ہوں کہ اب میرے پاس ایسی باتوں کے متعلق سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے اور ویسے بھی اب تو زندگی کی شام ہو رہی ہے۔''
زارا نے ایک گہری سانس لی۔ ''شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے انکل! مشرق اور مغرب میں بڑا فرق ہے۔ دونوں جگہوں پر راحتوں اور تکلیفوں کے معنی مختلف ہیں..... اچھائی اور برائی..... مناسب اور غیر مناسب کے پیمانے بھی علیحدہ ہیں۔''
شہزاد نے گھڑی دیکھی۔ ''ڈھائی بج رہے تھے، اس نے ہوٹل میں فاخرہ کو فون کیا اور خیریت دریافت کی۔ اس کے لیے اس نے زارا کا موبائل استعمال کیا۔ سیر کے دوران میں وہ گاہے بہ گاہے فاخرہ سے رابطہ کرتا رہتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے عمیر بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ بڑی رولر کوسٹر جو کچھ دیر کے لیے خراب ہوگئی تھی یا روک دی گئی تھی پھر سے چلنے لگی ہے۔
یہ بڑا سنہری موقع تھا۔ کوسٹر کے رک جانے کی وجہ سے شائقین کی طویل قطار ٹوٹ چکی تھی۔ لوگ دوسری تفریحات میں مشغول ہو گئے تھے۔ اب کوسٹر دوبارہ چلی تو یقینی بات تھی کہ لوگ پھر اس کی طرف دوڑیں گے۔ شہزاد، زارا، عینی وغیرہ چونکہ اس وقت اتفاقاً کوسٹر کے قریب ہی تھے اس لیے انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے گئے اور قطار میں جا کھڑے ہوئے اور ایسا کرنا ان کے لیے مفید ہی ثابت ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوسٹر والی قطار طویل سے طویل ہونے لگی۔ بہرحال ان کے آگے ڈیڑھ دو سو سے زیادہ افراد نہیں تھے۔ قطار کو درست حالت میں رکھنے کے لیے دونوں طرف آہنی جنگلوں کا سلسلہ تھا۔ شہزاد نے محسوس کیا کہ ایسے جنگلوں اور باڑوں کی ضرورت پاکستان میں کہیں زیادہ ہے۔ اکثر یہ لوگ ان رکاوٹوں کے بغیر بھی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شہزاد نے یہاں ابھی تک کسی بس یا ٹرین میں ٹکٹ چیکنگ کی کارروائی نہیں دیکھی تھی۔ ٹریفک قوانین پر عمل درآمد کرانے کے لیے بھی کہیں پولیس اہلکاروں کے جمگھٹے نظر نہیں آئے۔ یہی صورت حال باقی شعبہ جات میں بھی تھی۔ سارے نظام، آپوں آپ ایک طے شدہ ہموار رفتار سے چلتے جاتے تھے۔ بے شک نگرانی کے لیے جدید الیکٹرانک آلات بھی ہر جگہ موجود تھے، تاہم ان کی حیثیت ثانوی محسوس ہوتی

تھی۔ یہاں رولر کوسٹر کے سامنے بھی شائقین کی قطار لگے بندھے اصول کے مطابق آگے کی جانب کھسکتی رہی۔ سب سے آگے عمیر اور احسن تھے، پھر زارا اور اس کا بچہ تھے۔ اس کے پیچھے شہزاد اور اس کے پیچھے عینی۔

دائیں طرف کوسٹر حیرت انگیز بلندیوں کو چھوتی، بل کھاتی، غوطہ لگاتی اور برق کی طرح کوندتی ہوئی لوگوں کو محظوظ کررہی تھی۔ کوسٹر میں موجود شائقین کے چلانے کی آوازیں اس تفریح کا ایک لازمی جز تھیں۔ آہنی لائنوں کے ساتھ کوسٹر کی رگڑ کی گونج دار آواز کے ساتھ ہی شائقین کے چلانے کی صدائیں بھی بلند ہونے لگتی تھیں۔

جن مقامات پر بے پناہ نظم وضبط کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہاں بھی کسی وقت تھوڑی بہت بدنظمی ہو ہی جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال رولر کوسٹر کے سامنے لگنے والی اس قطار میں بھی پیش آئی۔ ان کے عقب میں شائقین کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ سیاہ فام نوجوانوں کی ایک ٹولی آپس میں جھگڑ پڑی۔ اس جھگڑے کی وجہ سے قطار میں ایک لہر پیدا ہوئی۔ پیچھے سے ایک دم دباؤ آگے کی طرف آیا۔ شہزاد، زارا پر گرا۔ زارا کے آگے بچے تھے۔ شہزاد نے پوری طاقت سے جنگلا تھام لیا تاکہ زارا اور بچوں پر زیادہ دباؤ نہ پڑے۔ عقب سے عینی شہزاد کے اوپر ڈھے گئی۔ عینی کے پیچھے ایک موٹی تازی، میک اپ زدہ فرنچ خاتون تھی۔ اس کی سنہری مائل وگ اتر کر دور جا گری اور وہ واویلا کرنے لگی۔ پریشان کن صورتِ حال کے باوجود لوگ مسکرانے پر مجبور ہوگئے۔

عینی نے بلند آواز میں زارا کو مخاطب کرکے کہا۔ ”بگ سسٹر! تم اپنی وگ سنبھال کر رکھنا۔“

”میری وگ اصلی ہے، تم اپنی ساڑی کا خیال رکھو، کہیں وہ نہ نکل جائے۔“ زارا نے ترت جواب دیا۔

عینی عقب سے شہزاد کے ساتھ چپک گئی تھی۔ شہزاد نے اس کے پورے جسم کو اپنے عقب میں محسوس کیا۔ اس کے سیاہ بال شہزاد کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ اس کے دونوں بازو شہزاد کے بازوؤں کے نیچے سے گزر کر اس کے سینے پر تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی خود کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہزاد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور شاید یہ بھی اس کی غلطی تھی۔ اسے ان لمحوں میں اس طرح اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ وہاں نجمہ کی آنکھیں تھیں، وہ آنکھیں جو ہمیشہ بولتی تھیں۔ راز کی باتیں کہتی تھیں..... جن کے اندر گئے وقتوں کے فسانے چھپے رہتے تھے۔

ایک لحظے کے اندر جیسے شہزاد کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہ نکلا۔ اس کا دل چاہا وہ ایک سیکنڈ میں عینی سے دور چلا جائے۔ اس کے پاس سے، اس کے جسم کی حدت سے، اس کے لمس سے ہٹ جائے اور پھر ہٹتا چلا جائے۔ اتنی دور چلا جائے کہ اس کی سوچ بھی اسے چھو نہ سکے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ کم از کم ان لمحوں میں تو نہیں، دونوں طرف آہنی جنگلا تھا اور قطار کا دباؤ انہیں ایک دوسرے سے پیوست کرتا چلا جارہا تھا۔ یہ عجیب وغریب لمحے تھے۔

اسی دوران میں گارڈز پہنچ گئے۔ انہوں نے قطار میں موجود ابتری کو تیزی سے ختم کیا اور جھگڑنے والے تین چار نوجوانوں کو قطار سے نکال کر دوسری طرف لے گئے۔ یہ سب کچھ بس دو تین منٹ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ تاہم یہ جو کچھ ہوا تھا شہزاد کے دل ودماغ کے لیے ازحد تہلکہ خیز تھا۔

اسے لگا تھا کہ آج عینی نے نہیں نجمہ نے اسے چھوا ہے۔ ہاں یہ وہی جسم تھا، یہ وہی خوشبو تھی، سب کچھ وہی تھا۔ بس مقام اور وقت بدل گئے تھے۔ تقریباً اٹھائیس سال پہلے کی بات ہے، ایک ون ڈے کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے سب کزن لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں گئے تھے۔ شدید ترین رش تھا۔ انہیں ایک قطار میں اندر جانا پڑا تھا۔ وہاں بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہی ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب لائن کو لگنے والا دھکا پیچھے سے نہیں آگے سے آیا تھا۔ پولیس والوں نے لوگوں کو دروازے سے دور دھکیلا تھا۔ شہزاد کے آگے فرزانہ تھی، عقب میں نجمہ اس کے پیچھے نجمہ اور فرزانہ کا چھوٹا بھائی سکندر اور پھر حسنات۔ فرزانہ قطار میں ابھرنے والی لہر کے زور سے پیچھے ہٹی تھی تو شہزاد اور نجمہ باہم پیوست ہوگئے تھے۔

ہاں یہ وہی جسم تھا، یہ وہی آنکھیں تھیں لیکن اس ستم کو کیا کیا جاتا کہ درمیان میں پوری ایک نسل کا خلا تھا۔ جس جسم میں شہزاد نے نجمہ کے لمس اور خوشبو کو محسوس کیا تھا وہ عینی کا تھا۔ جو فرزانہ کی بیٹی تھی اور عمر میں اس سے بہت چھوٹی تھی۔

رولر کوسٹر کا سفر جو بس ایک ڈیڑھ منٹ کا تھا نہایت سنسنی خیز تھا۔ زمین وآسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے لیکن یہ شدید ترین سنسنی خیزی بھی شہزاد کو کم لگی، اس کے دل ودماغ میں تو کچھ اور طرح کا طوفان بپا تھا۔

جب دونوں بچے عینی کے ساتھ پارک کی سیر کررہے تھے، جھولوں پر چڑھ اور اتر رہے تھے، مصنوعی غاروں میں گھوم رہے تھے، بازی گری کے تماشے دیکھ رہے تھے اور آئندہ تفریحات کے پروگرام بنا رہے تھے..... شہزاد ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ وہ ایک اہم فیصلہ کرچکا تھا، اسے جلد

از جلد پیرس سے واپس چلے جانا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز بھی ہالیڈے تھا لہٰذا پارک سے واپسی پر زارا اور عینی کا پروگرام بنا کہ وہ رات کو شہزاد کی فیملی کے ساتھ ہوٹل میں ہی رہیں گی۔ ہوٹل کے ضوابط کے مطابق تو یہ غلط تھا بہرحال ..... ایسی چھوٹی موٹی بے اصولی تو کی ہی جاتی ہیں۔ رات کو انہوں نے ہوٹل کے لان میں باربی کیو ڈنر کیا۔ یہاں دو تین مقامی آرٹسٹوں کے ساتھ عینی نے بڑے فخر سے شہزاد کا تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ یہ پاکستان میں کیا کرتے ہیں۔ وہ لوگ خوش ہوئے، انہیں خوش دیکھ کر عینی کے چہرے کی چمک بڑھ گئی، وہ ان فرنچ حضرات کو اسٹل کیمرے پر شہزاد کی کھینچی ہوئی تصویریں دکھانے لگی۔ ان تصویروں کے حوالے سے دیر تک ٹیکنیکل باتیں ہوتی رہیں۔ ان لوگوں سے رخصت ہو کر شہزاد کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد زارا عینی اور بچے بھی آ گئے۔ رات کو وہ دیر تک جاگتے رہے۔ لطائف سنائے گئے، لوڈو اور مناپلی کھیلی گئی اور گپ شپ ہوتی رہی، تاہم ان ساری مصروفیات کے دوران میں شہزاد بالکل کھویا کھویا رہا۔ اسے عینی سے ایک جھجک آمیز خوف آنے لگا تھا، وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس کی آواز اور اس کی ہنسی سے کان بند کرنا چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے حواس میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔

زارا کی پرزور خواہش تھی کہ دو تین روز کے لیے پیرس کی کسی اچھی کیمپ سائٹ پر کیمپنگ بھی کی جائے۔ وہ بولی ''یہاں آگے دریا کے کنارے بھی ایک کیمپ سائٹ ہے، ہم چار پانچ دفعہ وہاں جا چکے ہیں۔ یقین کریں انکل مزہ آ جائے گا۔ چار جز بھی کوئی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ ایک خیمے کے لیے قریباً 25 یورو روزانہ اور ان 25 یورو میں واش روم، گرم ٹھنڈا پانی، ریسٹورنٹ اور سیکیورٹی وغیرہ کی ساری سہولتیں شامل تھیں۔''

''تو کیا ایک خیمے میں ہم سب آ جائیں گے؟'' فاخرہ نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں آنٹی! ہمارے پاس بڑا ٹینٹ ہے۔ اس کے دو پورشن ہیں، سمجھیں کہ ایک چھوٹا سا گھر ہے بلکہ میں تو کوشش کروں گی کہ ریحان بھی تیار ہو جائیں۔''

''ہاں ..... وہاں ایئرپورٹ پر ایک کیمپنگ سائٹ کی تصویر تو میں نے بھی دیکھی تھی۔ دریا کے ساتھ ساتھ بے شمار خیمے تھے اور بہت سے کاروینز (رہائشی ٹریلرز) بھی کھڑے تھے۔''

''اس کیمپ سائٹ کا بڑا مشکل سا نام ہے..... اوہ گاڈ'' عینی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''بہرحال جگہ اچھی ہے، آپ دیکھیں گی تو مزہ آ جائے گا۔''

بچے بھی اس معاملے میں زبردست دلچسپی ظاہر کرنے لگے۔ کیمپنگ کے لیے جمعے کی شام کا پروگرام بن گیا۔ اس سارے پروگرام کے دوران میں شہزاد بس ہوں ہاں پر اکتفا کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں بس ایک دم گھونٹنے والی دھند کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

دوسرے روز لنچ کے بعد عینی اور زارا وغیرہ گھر واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شہزاد نے اپنے فرانسیسی دوست مسٹر موشیل کو فون کیا۔ اگلے 36 گھنٹے میں اس نے مسٹر موشیل کے ساتھ مل کر وہ چند ضروری امور نمٹائے جو یہاں اس کے شیڈول کا حصہ تھے۔ اس کے بعد وہ سیدھا ایئر لائن کے دفتر پہنچا۔ اس نے واپسی کے لیے دستیاب پہلی پرواز پر نئی ریزرویشن کرالی۔ ریزرویشن کی تاریخ میں تبدیلی کے لیے اسے کچھ سرچارج بھی دینا پڑا جو اس نے بخوشی دے دیا۔ ایک دم ہی پیرس سے، پیرس کی گہما گہمی اور پیرس کے مکینوں سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

گھر آ کر جب اس نے فاخرہ اور بچوں کو یہ اطلاع دی کہ وہ پرسوں پاکستان واپس جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ بے شک فاخرہ کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ آناً فاناً یہاں سے روانگی کا قصد کر لیتے۔ بچوں کے چہرے بھی ایک دم اتر گئے۔

فاخرہ نے حیران ہو کر کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مذاق تو نہیں کر رہے؟''

''مذاق نہیں کر رہا ہوں۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''واپس جانا ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں دفتر میں ایک دو مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں۔ منیجر جمال انہیں حل نہیں کر پا رہے۔ نہ گئے تو کافی نقصان ہو جائے گا۔ کلائنٹس علیحدہ سے مصیبت میں پڑیں گے۔''

''لل..... لیکن اتنی جلدی شہزاد؟ کم از کم آٹھ دس دن تو.....''

''فاخرہ'' شہزاد نے تیزی سے کہا۔ ''جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہی ہو۔ پیرس ہم پھر بھی آ سکتے ہیں لیکن ادھر کام بگڑ گیا تو پھر نہیں سدھر سکے گا۔''

بچوں کے چہرے رونے والے ہو گئے۔ شہزاد کے دل میں بچوں کی مایوسی ایک تیز دھار خنجر کی طرح لگی۔ عام

حالات میں وہ ان کے ماتھے پر ذرا سی شکن بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اپنی موجودہ کیفیت میں وہ سب کچھ برداشت کر گیا۔

اس نے علیحدگی میں فاخرہ کو اچھی طرح سمجھایا کہ وہ رزانہ کی فیملی سے اپنی واپسی کا بالکل ذکر نہیں کرے گی اور نہ ہی بچے اس بارے میں کوئی بات کریں گے۔ شہزاد کا موڈ ایسا تھا کہ فاخرہ سہم کر رہ گئی۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شہزاد! چھپانا کیوں ضروری ہے، ہم ان کے پابند تو نہیں ہیں..... اگر واقعی وہاں کوئی کام ہے تو.....''

''بس، میں نے کہہ دیا ناں کہ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' شہزاد نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''میں یہاں تماشا لگانا نہیں چاہتا۔ ایئرپورٹ سے میں خود فون کر دوں گا ان کو۔ دیٹس آل۔'' شہزاد کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ فاخرہ اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔

جس نے کبھی ترش لہجے میں بھی بات نہ کی ہو، وہ اس قدر کرخت انداز میں بولے تو سننے والا گنگ ہو جاتا ہے۔ فاخرہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆

یہ سیر و تفریح کا سفر جتنے دلکش انداز میں شروع ہوا تھا، اتنے ہی دل گرفتہ اور ہنگامی انداز میں ختم ہوا۔ شہزاد نے اپنے مقامی فرنچ دوستوں سے رات کو ہی الوداعی ملاقاتیں کر لی تھیں۔ اس کے بعد پیکنگ کی گئی۔ صبح انہوں نے اپنے ہوٹل کا فون بند کر دیا تاکہ فرزانہ اینڈ فیملی کی طرف سے کوئی کال آئے بھی تو انہیں سننا نہ پڑے۔

گیارہ بجے کے قریب وہ ہوٹل ''لیونا'' سے چیک آؤٹ کر کے ایئرپورٹ روانہ ہو رہے تھے۔ مطلع ابر آلود تھا۔ مسٹر موشیل اپنی ذاتی اسٹیشن ویگن میں انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔ جب وہ ہوٹل سے سو ڈیڑھ سو میٹر آگے آئے، شہزاد کو وہی سرخ پی جو گاڑی نظر آئی جس پر عینی اور زارا ہوٹل آیا کرتی تھیں۔ کار راؤنڈ اباؤٹ سے ٹرن لے کر ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ شہزاد نے دیکھا۔ اس میں عینی اور زارا موجود تھیں۔ عینی نے گلابی ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ غالباً فون پر رابطے میں مسلسل ناکام ہونے کے بعد وہ خود ان سے ملنے ہوٹل آ گئی تھیں۔ شاید ان کا خیال ہو کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر کل کی کیمپنگ کے بارے میں پروگرام کو حتمی شکل دیں۔ شہزاد نے کن انکھیوں سے فاخرہ اور بچوں کی طرف دیکھا، وہ سرخ پی جو گاڑی کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

ایئرپورٹ پر کسٹم اور امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے تو فاخرہ نے اسے پھر یاد دلایا کہ وہ باجی فرزانہ یا عینی وغیرہ کو فون پر اپنے جانے کی اطلاع پہنچا دے۔

شہزاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ویسے وہ اب دیکھ رہا تھا کہ فاخرہ کے لب و لہجے میں حیرت کا عنصر زیادہ نہیں رہا تھا۔ شاید وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ فاخرہ نے ہولے سے کہا۔ ''سچ بتائیں شہزاد! معاملہ دفتر کا ہے یا اور کوئی بات ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں، ناراض نہیں ہونا۔ آپ جو کر رہے ہیں ٹھیک ہی کر رہے ہیں اور سوچ سمجھ کر کر رہے ہوں گے لیکن میں اپنی الجھن دور کرنا چاہ رہی ہوں، کیا شارق وغیرہ کی طرف سے پھر کوئی بات تو نہیں ہوئی ہے؟ یا پھر باجی فرزانہ کی فیملی کی طرف سے؟''

''نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔'' شہزاد نے گہری سانس لی۔ ''لیکن مجھے اس سارے میل جول میں اندیشے ہی نظر آ رہے ہیں۔ باقی دفتر والا معاملہ بھی اپنی جگہ موجود ہے۔'' شہزاد نے گول مول بات کی۔ پھر فرزانہ کو اطلاع دینے کے لیے فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔

ان لوگوں کو اس طرح اچانک اپنی آمد کی اطلاع دینا کافی ناخوشگوار کام تھا، بہرحال شہزاد کو یہ کرنا پڑا۔ ''ہیلو..... کون؟'' دوسری طرف سے فرزانہ کی آواز ابھری۔

''میں شہزاد بول رہا ہوں۔''

''اوہو، شہزاد، کہاں تھے تم لوگ۔ فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ عینی اور زارا اتنی پریشان تھیں۔ اب وہ تمہاری ہی طرف گئی ہیں۔ ابھی پہنچی نہیں؟'' اس نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولی۔ ''میرا خیال ہے سپر مارکیٹ میں رک گئی ہوں گی، عینی کہہ رہی تھی گل کے لیے کچھ سامان لینا ہے.....''

شہزاد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''سوری فرزانہ! میں تمہیں بروقت اطلاع نہیں دے سکا۔ میں اس وقت ایئرپورٹ سے بول رہا ہوں۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد یہاں سے ہماری فلائٹ ہے پاکستان کے لیے۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ تب فرزانہ کی حیرت زدہ آواز ابھری۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو شہزاد۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں ایک بار پھر بہت معذرت چاہتا ہوں فرزانہ۔ جو کچھ ہوا اتنی جلدی ہوا کہ کئی کام ادھورے رہ گئے۔ وہاں لاہور کے دفتر میں ایک دو ایسے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں کہ میرا

پہنچنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ فاخرہ اور بچے بھی بڑے پریشان ہیں۔ ہم سب یہاں رہنا چاہتے تھے خاص طور سے آپ سب کی محبت نے یہاں بہت دل لگا دیا تھا ہمارا..... لیکن اب اس مجبوری کو کیا کیا جائے..... میں کل رات بھی..... آپ کو فون کرتا رہا لیکن آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔''

آخر میں شہزاد کو تھوڑی سی غلط بیانی کا سہارا لینا پڑا۔

فرزانہ واقعی ششدر تھی، اگلے دو تین منٹ میں شہزاد نے اس کی حیرت اور پریشانی کو کم کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ پتا نہیں کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا۔ بہرحال فون پر فرزانہ کو اطلاع دینے کے بعد اس نے خود کو کسی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

کچھ دیر بعد جب ان کے جہاز نے پیرس کے نہایت مصروف ایئرپورٹ سے پرواز کی تو سارا پیرس ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اپنی تمام تر خوبصورتی اور وسعت کے ساتھ وہ حدِ نگاہ تک ان کے سامنے پھیل گیا۔ شہر کی رنگت میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ عمیر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بجھے بجھے سے لہجے میں ایک فقرہ ادا کیا اور اس فقرے سے شہزاد کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ دیکھو احسن..... ایفل ٹاور۔''

وہ پیرس آئے تھے اور ایفل ٹاور بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔

کیا وہ واقعی ایفل ٹاور نہیں دیکھ سکے تھے؟

شہزاد کو شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ وہ ایسی افراتفری میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے کہ بہت سے پروگرام درمیان میں ہی رہ گئے تھے اور ان میں ایفل ٹاور کا پروگرام بھی شامل تھا۔ افسوس آمیز مایوسی کی ایک لہر سی شہزاد کے سینے میں پھیلتی چلی گئی۔ کالج میں اس کے انگلش کے پروفیسر افضال قریشی صاحب کہا کرتے تھے..... زندگی میں جو خوشی جائز طریقے سے مل رہی ہو اسے جلدی سے حاصل کر لینا چاہیے۔ اس میں خوامخواہ کی تاخیر بھی کفرانِ نعمت کے زمرے میں آ جاتی ہے۔

ان کا کہا ہوا یہ جملہ آج اس صورتِ حال پر بالکل منطبق ہو رہا تھا۔ بیس پچیس روز پہلے جب وہ پیرس میں اترے تھے، بچوں نے کھڑکی میں سے ایفل ٹاور کی جھلک دیکھ کر شور مچایا تھا کہ چلیں ابھی ایفل ٹاور دیکھنے چلیں۔ تب شہزاد نے مزہ لیتے ہوئے کہا تھا..... بھئی ایفل ٹاور تو پیرس کی سیر کا کلائمکس ہے۔ کلائمکس ابھی دیکھ لیا تو باقی ''فلم'' کا خاک مزہ آئے گا اور اب بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ یہ کلائمکس بھی رہ گیا تھا۔

شہزاد نے دل گرفتہ ہو کر عمیر کے کندھوں پر بازو رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ڈونٹ وری بیٹا! ہم پھر آئیں گے پیرس اور تب بہت دنوں تک رہیں گے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس کھوئی کھوئی نظروں سے ایفل ٹاور کو دیکھتا رہا۔

نیچے پیرس کے درمیان سے گزرتا ہوا دریائے سین ایک خیالی پٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس میں کشتیوں اور بجروں کے سفید نکتے متحرک تھے۔ شہزاد نے سوچا اسی دریا کے کنارے کہیں وہ دونوں بوڑھے فرانسیسی بھی بیٹھے ہوں گے، جن کا کام ہی وہاں بیٹھنا اور گئے دنوں کے بارے میں سوچنا تھا۔ شہزاد کا ارادہ تھا کہ پیرس چھوڑنے سے پہلے وہ ایک بار ان دونوں بوڑھوں کے پاس ضرور جائے گا۔ ان کو قریب سے دیکھے گا اور ان سے دو چار باتیں کرنے کی کوشش کرے گا مگر یہ کام بھی اس عجیب و غریب افراتفری کی نذر ہو گیا تھا جو آناً فاناً شہزاد کے دل و دماغ میں سمائی تھی۔ وہ اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

اس نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے متحرک پیرس کو دیکھا جو دھیرے دھیرے بادلوں کے مرغولوں میں گم ہونے لگا تھا۔ ''خدا حافظ پیرس'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

وہ پیرس سے لوٹ آیا، لیکن اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا، ٹوٹ کر بری طرح بکھر گیا تھا، اس ''بکھرے ہوئے'' کی کرچیاں گاہے بہ گاہے شہزاد کے سینے کو چھیدتی تھیں۔

وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو دو آنکھیں اس کے تصور میں آ جاتیں۔ یہ آنکھیں اس سے کہتیں، شہزاد کہاں چلے گئے؟ کیوں ایک دم مجھے چھوڑ گئے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا، میں تمہارے لیے، پیرس کی گلیوں میں اور چوراہوں میں بھٹکتی رہوں گی۔ دریائے سین کے کناروں پر اور نوٹرے ڈیم کے آس پاس اور شانزالیزے کی فٹ پاتھوں پر تمہیں تلاش کرتی رہوں گی، تم کتنے سخت دل ہو شہزاد! میں برسوں کا فاصلہ طے کر کے اور جدائی کی لاتعداد گھڑیاں گزار کر تم تک پہنچی ہوں اور تم یوں ایک دم مجھ سے منہ موڑ کر چلے آئے ہو؟

وہ خود کو ملامت کرتا اور سوچتا کہ وہ اس طرح کیوں ''سوچ'' رہا ہے۔ کیوں اس کا ذہن ایک ہی رخ پر چلتا جا رہا ہے۔ وہ نجمہ جیسی آنکھیں ہوں گی..... چلیں مان لیں کہ وہ نجمہ کی آنکھیں ہی ہیں لیکن وہ عینی کے جسم پر ہیں اور عینی..... اس کی ماموں زاد کی بیٹی ہے۔ اس سے اٹھائیس سال چھوٹی ہے۔ اس کے بارے میں تو اس طرح سے سوچنا بھی قابل

ندامت ہے۔ وہ خود کو بہت سمجھاتا مگر..... ٹوٹی ہوئی شے کی کرچیاں مسلسل چبھتی رہتیں۔ اس کے اندر کوئی خلا پیدا ہو چکا تھا اور یہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی وقت اس کے ذہن میں عینی کا چہرہ آتا..... اور وہ زوردار تھپڑ بھی جو اس نے عینی کے گال پر رسید کیا تھا۔ اس تھپڑ کے نتیجے میں عینی کے نچلے ہونٹ پر ننھا سا زخم ہو گیا تھا۔ وہ زخم شہزاد کی نگاہوں کے سامنے آتا اور وہ یاسیت سے بھر جاتا۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا وہ اسے کسی اور طریقے سے نہیں سمجھا سکتا تھا اور اگر اس نے ایسا کر ہی دیا تھا تو کیا بعد میں اس سے سوری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی ایسی تھی کہ اس نے ایک حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لائی تھی۔ ایک ''ناراض نگاہ'' بھی اس پر نہیں ڈالی تھی۔

دن گزرتے رہے۔ پیرس میں فرزانہ کی فیملی کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا نہ انہوں نے کیا۔ شارق وغیرہ کی بھی کوئی خبر نہیں ملی۔ شہزاد کراچی میں آتے ہی ایک بار پھر اپنے کام میں غرق ہونے کی کوشش کرنے لگا اور واقعی پچیس تیس روز کے اندر ہی اس کے لیے کافی سارا کام اکٹھا ہو گیا تھا۔ تین چار کمرشلز کو ایک مہینے کے اندر شوٹ کرنا ضروری تھا۔ ایک کمرشل سری میں شوٹ ہونا تھا اور وہاں کئی ہفتوں کے بعد موسم بہتر ہوا تھا۔ شہزاد اپنے مختصر یونٹ کو لے کر مری روانہ ہو گیا۔ مری میں انہیں قریباً چھ روز ٹھہرنا تھا۔ فاخرہ کی طبیعت بدستور ڈانواں ڈول تھی۔ وہ مری سے بھی ہر روز دو تین دفعہ گھر فون کرتا تھا۔ آخری روز جب وہ اپنی دو ''فی میل'' ماڈلز کو آخری شاٹس کے بارے میں فائنل ہدایات دے رہا تھا، اسسٹنٹ نے اسے موبائل فون تھمایا۔ اس نے کال ریسیو کی، یہ کال ایک تشویش ناک خبر کے ساتھ آئی تھی۔ گھریلو ملازم طفیل نے اسے بتایا تھا کہ بیگم جی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر کو گھر بلایا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انہیں فوراً اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔ شہزاد نے باقی کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کیا اور خود بھاگم بھاگ مری سے واپس کراچی پہنچا۔ تب تک فاخرہ کو اسپتال میں ایڈمٹ ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

وہ پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اگلے دو ہفتے شہزاد کے لیے اذیت ناک تھے۔ فاخرہ کی حالت کبھی اچھی اور کبھی خراب ہو رہی تھی۔ اس کی دائیں ٹانگ تو شروع سے ہی نیم مفلوج تھی، اب پورا داہنا پہلو مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے جسم کے اس حصے کو حرکت دینے سے قاصر تھی۔

شہزاد ایک طرف بچوں کو سنبھال رہا تھا، دوسری طرف اسپتال کی بھاگ دوڑ تھی، تیسری طرف کام کا دباؤ بھی گاہے بہ گاہے اثر انداز ہو رہا تھا۔ شہزاد کو ڈر لگنے لگا کہ اس شدید تناؤ میں کہیں وہ خود بھی بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہو جائے..... بہرحال دو تین ہفتے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ شہزاد نے پانی کی طرح پیسا بہایا تھا۔ آخر اللہ نے کرم کیا اور فاخرہ اسپتال سے گھر منتقل ہو گئی۔ شہزاد جو گھر اور اسپتال کے درمیان شٹل کاک بنا ہوا تھا قدرے سکون محسوس کرنے لگا۔ فاخرہ کی زندگی تو بچ گئی تھی لیکن وہ مکمل طور پر بستر کی ہو گئی تھی۔ اس کی بہتر نگہداشت کے لیے شہزاد نے دو تجربہ کار نرسوں کا انتظام کیا۔ یوں کم از کم ایک نرس راؤنڈ دا کلاک فاخرہ کے بستر کے پاس موجود رہنے لگی۔ شہزاد خود بھی زیادہ سے زیادہ اسے وقت دینے کی کوشش کرتا تھا۔

قریباً دو ماہ بعد کی بات ہے، نرس اور بچے دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ رات کے وقت شہزاد اور فاخرہ کمرے میں اکیلے تھے۔ فاخرہ نے اپنا تندرست ہاتھ شہزاد کے ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ فاخرہ کہہ رہی تھی۔

''شہزاد! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں جواب دوں گا۔''

''کس بات کا جواب؟''

''وہی جو میں نے آپ سے پوچھی تھی۔''

شہزاد نے ایک طویل سانس لے کر ہاتھ سگریٹ کیس کی طرف بڑھایا لیکن پھر ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولا۔

''فاخرہ! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتا۔ میں بالکل مطمئن ہوں۔''

''لیکن میں مطمئن نہیں ہوں شہزاد۔ میں جانتی ہوں آپ کو ضرورت ہے، آپ کو دوسری شادی کی ضرورت ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں یہ کام اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے کر جاؤں۔ میں جب خود آپ کے لیے بیوی لاؤں گی تو وہ میرے بچوں کا بھی خیال رکھے گی۔ اور آپ دیکھ لینا شہزاد، میں جس کو لاؤں گی وہ آپ کی زندگی کو بہت خوبصورت بنا دے گی۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی تمہاری نظر میں ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''نظر میں تو نہیں لیکن جب میں تہیہ کر کے ڈھونڈوں گی تو مجھے مل جائے گی۔ ضرور مل جائے گی۔'' وہ فالج کے سبب ذرا سا اٹک کر بولتی تھی۔

''ٹھیک ہے، اگر تم ضرور ڈھونڈنا چاہتی ہو تو ڈھونڈو،

لیکن اگر وہ مل گئی تو اس سے شادی تم کو خود ہی کرنا پڑے گی۔ میں نہیں کروں گا۔"

"مذاق نہیں شہزاد۔ میں بہت سنجیدہ ہوں، میں جب آپ کی طرف دیکھتی ہوں تو میرا دل روتا ہے۔ میری روح زخمی ہوتی ہے، میں اندر سے مسمار ہونے لگتی ہوں شہزاد۔" فاخرہ کی آواز بھرا گئی۔

اس کی ایک آنکھ تو ویسے ہی نم رہتی تھی دوسری بھی نم ہوگئی۔ "میں نے ہمیشہ آپ سے لیا ہی لیا ہے شہزاد! اور آپ نے ہمیشہ دیا ہی دیا ہے۔ ایک زندگی بیت گئی ہے، میں آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبتی جارہی ہوں..... دبتی جارہی ہوں۔"

"کون سے احسان؟ اگر کوئی ایسی بات ہے تو پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے پر احسان کیے ہیں۔"

"غلط کہہ رہے ہیں آپ، بالکل غلط۔ باقی باتیں چھوڑیں، چلیں مجھے ایک بات ہی بتائیں، کتنا زمانہ گزر گیا ہے، جب سے میں آپ کو محسوس کیے جانے کی رفاقت دینے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ احسن کی پیدائش کو گیارہ سال ہونے والے ہیں۔ کیا احسن کی پیدائش کے بعد ہم ایک بار بھی میاں بیوی کی طرح وقت گزار سکے ہیں۔ مجھے بتائیں شہزاد! کیا ایک بار بھی ایسا ہوا ہے؟ دنیا نہیں جانتی، لیکن میں تو جانتی ہوں، میرا دل تو جانتا ہے..... نہیں شہزاد! میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات مانی ہے لیکن اب آپ میری یہ بات مان لیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی مگر ایک ہاتھ ہی اٹھا سکی۔ شہزاد نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ چوما اور اسے گلے سے لگالیا۔ "اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے، اب چپ ہوجاؤ۔ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ تمہیں زیادہ بولنا نہیں چاہیے اور پریشان تو بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

"لیکن شہزاد....."

"شی" شہزاد نے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔

پھر ایک روز شہزاد کو اپنے آفس کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ یہ عینی کا خط تھا۔ خوبصورت لیٹر پیڈ پر یہ خط، انگلش میں لکھا گیا تھا۔ عینی نے سلام اور رسمی کلمات کے بعد لکھا تھا۔ "مجھے پتا تھا، مائی لارڈ! آپ نے خود کبھی رابطہ نہیں کرنا۔ یہ مشکل کام بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت سوچتی رہتی ہوں، آپ اس طرح اچانک ہم سب کو دکھی کرکے کیوں چلے گئے آپ نے دفتری کام کا کہا لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ کیا کوئی اور بات تھی؟ کیا آپ مجھ سے ناراض تھے، یا پھر ہم میں سے کسی ایک سے؟

مائی لارڈ! جب آپ یہاں پیرس میں تھے تو پیرس ایک دم بدل گیا تھا۔ ہر چیز میں ایک نیا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ اب آپ جاچکے ہیں، وہ رنگ بھی جاچکے ہیں۔ اب پیرس کو اپنی اصلی حالت میں آجانا چاہیے تھا۔ پر پتا نہیں کیوں وہ پرانا پیرس بھی اب مجھے کہیں نظر نہیں آرہا۔ وہ سارے راستے، چوراہے، سبزہ زار اور گلیاں بازار بدل گئے ہیں جہاں جہاں ہم بیٹھ اکٹھے گئے تھے۔ میں بھی ان جگہوں کو دیکھتی ہوں تو ایک عجیب سی اداسی دل و دماغ کو گھیر لیتی ہے۔ میں نے ان سب جگہوں کو آپ کی نشانیوں کے طور پر سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور ہاں..... اس کے علاوہ آپ جناب کی ایک اور نشانی بھی ہے میرے پاس۔ وہ تو ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کون سی؟ یہ آپ خود ڈھونڈیں۔

اور کیا لکھوں مائی لارڈ! آپ کو یاد ہے ایک مرتبہ لوور میوزیم میں گھومتے ہوئے آپ نے عمر کا ذکر کیا تھا..... اور کہا تھا کہ آپ عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ لہٰذا مجھے بہت محتاط ہوکر بات کرنی چاہیے۔ اس وقت میں آپ کو مناسب جواب نہیں دے سکی تھی..... لیکن اب دیتی ہوں کیونکہ اب میرے اور آپ کے درمیان کافی فاصلہ ہے، کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ آپ اپنا ہاتھ گھما کر مجھے تھپڑ نہیں مار سکتے۔ ویسے پھر بھی میں احتیاطاً تھوڑا سا پیچھے ہٹ جاتی ہوں۔ تو جناب بات ہورہی تھی عمر کی۔ عمر کوئی چیز نہیں ہے مائی لارڈ، ایک دس سال کے ذہین بچے کو بھی ہم دانا اور بڑا کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک نوجوان کو بھی اس کی سوچ اور ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے بچہ کہا جاسکتا ہے۔ یہی مثالیں ہر عمر کے لیے دی جاسکتی ہیں۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ عمر انسان کے جسم سے ظاہر نہیں ہوتی اس کے ذہن سے ظاہر ہوتی ہے اور اس لحاظ سے میں سمجھتی ہوں کہ آپ جوان بلکہ نوجوان ہیں۔ میں آپ میں اور خود میں عمر کا کوئی تفاوت نہیں پاتی..... اور اگر جناب! ہو بھی تو یہ کوئی برائی تو نہیں۔ کسی چیز کے اچھے لگنے میں عمر شرط تو نہیں ہوتی۔ ہمیں پرانے چاول، شراب، درخت، دریا، آرٹ کے نمونے اچھے لگتے ہیں تو پھر عمر کو کسی شرط تو نہ ہوئی۔ اسی طرح کم عمر ہونا بھی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا معیار نہیں ہے۔ آپ حیران ہوں گے، پچھلے دنوں میں نے پاپا سے بھی اس بارے میں کھل کر ڈسکس کیا ہے۔ وہ بہت ہنسے، کہنے لگے او شیطان کی بچی، تجھے کسی پکی عمر کے سائنسدان یا گالف کے کھلاڑی سے تو پیار نہیں ہوگیا۔

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''پاپا! اگر ہو گیا تو پھر؟''
وہ میری گردن دبوچ کر بولے۔
''پھر بس اتنا دھیان رکھنا کہ مجھے اپنے کسی ہم عمر کو بیٹا جی نہ کہنا پڑے۔'' اس بات پر ہم دونوں خوب ہنستے رہے۔
ویسے پاپا بھی بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں مائی لارڈ! اب تو انہیں دل کی تکلیف ہو گئی ہے لیکن چھ سات سال پہلے تک وہ بڑے شوقین مزاج تھے۔ خوبصورت چہرے ان کی کمزوری رہے ہیں جی۔ ماما بھی اس بارے میں سب جانتی ہیں لیکن ایک بات ہے جی پاپا نے خواتین سے دوستیاں ضرور کیں لیکن ہمیشہ ایک حد کے اندر رہتے ہوئے اور ادب آداب کے ساتھ۔ میں ان پر پورا یقین رکھتی ہوں..... ہی از اے ویری جولی اینڈ ناکس گائے، مائی لارڈ۔ خیر یہ خط لمبا ہوتا جا رہا ہے۔
میں ایک بار پھر آپ سے کہوں گی کہ میں آپ کو پسند کرتی تھی، کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ آپ کا پکا پکا شاگرد بننے کی خواہش بھی ہمیشہ میرے دل میں موجود رہے گی۔ بہت دل چاہتا ہے، کاش وہ وقت ایک بار پھر سے لوٹ آئے۔ میں، آنٹی، آپ، عمیر اور بچونگڑے ایک بار پھر پیرس میں اکٹھے ہوں، ایک بار پھر ہماری مسکراہٹیں اور ہمارے قہقہے اس نیم مردہ پیرس کو زندہ کر سکیں۔ بچوں کو میری طرف سے بہت بہت پیار دیں۔ عمیر سے کہیں، تمہاری آنٹی باجی، تمہیں بہت بہت یاد کرتی ہے۔ آنٹی فاخرہ تک میرا اسلام پہنچائیں۔ خدا ان کو صحت دے (عینی کو معلوم نہیں تھا کہ پچھلے دنوں فاخرہ کو فالج ہو چکا ہے)
اور ہاں خط کے آخر میں آپ کا تجسس دور کر ہی دوں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک آپ کے ذہن میں آپ کی دی ہوئی وہ نشانی نہیں آئی ہو گی جو میں نے بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے تو جناب! وہ نشانی ہے..... وہ نشانی ہے..... میرے نیچے والے ہونٹ پر زخم کا وہ ننھا سا نشان جو آپ کے خوبصورت طمانچے سے بنا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ نشان کبھی مکمل طور پر ختم نہ ہو۔ آپ سے ایک ہی درخواست ہے کہ آپ مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ پھر ملنے کی آس کے ساتھ گڈ بائی۔''
خط ختم کر کے شہزاد دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ خط کے آخر میں عینی نے اپنا ای میل ایڈریس اور سیل فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ اس طرح اس نے جیسے خاموش درخواست کی تھی کہ وہ اس سے رابطہ کرے۔ عین ممکن تھا کہ اسے بھی شہزاد کا سیل نمبر اور ای میل ایڈریس وغیرہ معلوم ہو چکا ہو، تاہم اس نے ابھی تک دانستہ یا غیر دانستہ ان ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
شہزاد پر اس خط کو پڑھنے کے بعد عجیب سی جھلاہٹ سوار ہونے لگی، اس نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اپنی عزت کا ہمیشہ اسے بہت پاس رہا تھا اور اس عمر میں تو وہ اس طرح کی کوئی صورت حال برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں پیرس میں شارق نے جو کچھ کیا تھا وہ شہزاد کے سینے میں گہرے زخم لگا گیا تھا۔ پتا نہیں کہ شہزاد نے وہ سب کچھ کیسے جھیلا تھا۔ بہت مشکلوں سے اس نے اپنے دل و دماغ کو سمجھایا تھا کہ وہاں شارق نے جو کچھ کیا وہ نشے کی حالت میں کیا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا اور وہ سب کچھ کرنے کے بعد، وہ خود بھی پشیمانی کی لپیٹ میں آیا تھا، یہی وجہ تھی کہ پیرس سے فوراً لندن واپس چلا گیا تھا لیکن اب اگر اس لڑکی کی وجہ سے کوئی نیا فتنہ کھڑا ہوتا تو وہ ہرگز اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔
اس نے گھر میں فاخرہ کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چند دن بعد اس نے احتیاطاً اپنے گھر کی فون لینڈ لائن بھی تبدیل کر دی۔ اسے اندیشہ رہتا تھا کہ عینی یا پھر زارا، فرزانہ وغیرہ کی طرف سے پھر رابطے کی کوشش نہ ہو۔ دس پندرہ روز بعد ایک شام شہزاد کو اپنے موبائل فون پر عجیب سا میسج موصول ہوا۔ یہ عینی کی طرف سے تھا۔ میسج یوں تھا ''موت کی اطلاع بندے کو دکھ دیتی ہے لیکن میں جھوٹ نہیں بول سکتی، مجھے اس موت سے بالکل دکھ نہیں ہوا۔ بالکل بھی دکھ نہیں ہوا۔ آئی ایم ویری ساری۔'' یہ مبہم سا میسج تھا تاہم بہت جلد مبہم نہ رہا۔ لاہور سے اطلاع آئی کہ ممانی کلثوم کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ لے پالک بیٹے اور بہو کے ستم سہہ سہہ کر دل کی مریض بن چکی تھی۔ آج اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ شہزاد کو آخری رسومات میں شرکت کے لیے لاہور جانا پڑا۔ بہرحال اس کے بعد ڈھائی تین ماہ گزر گئے کسی طرح کا کوئی چھوٹا بڑا واقعہ پیش نہیں آیا۔ گرد و پیش میں ایک ہمواری خاموشی چھائی رہی، مگر یہ خاموشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ ایک دن ایک زوردار چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔
وہ اتوار کا دن تھا۔ فاخرہ کو ہلکا بخار تھا۔ وہ بستر پر لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ احسن نے اپنا ہینڈی کیمرا، ٹی وی سے اٹیچ کر رکھا تھا۔ پیرس کی سیر کی ریکارڈنگ چل رہی تھی..... نوٹرے ڈیم کلیسا کے پہلو میں عینی اور بچوں کی اٹکھیلیاں اسکرین پر نظر آ رہی تھیں۔ عمیر نے احسن کو کنکری ماری تھی۔ عمیر اور احسن جوشیلے انداز میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ وہ کھیل کے انداز میں ایک دوسرے کو گرانے اور رگیدنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عینی انہیں چھڑا رہی تھی۔ اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ ''اوئے الو بوائے! بس کرو، اس کا

سوئٹر پھٹ جائے گا..... اف گاڈ..... کتنا زور ہے ان دونوں میں۔ اوئے بچو لگڑے تم ہی چھوڑ دو.....''

احسن نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھائی جان نے مجھے پتھر مارا ہے۔''

''پتھر نہیں یار! چھوٹی سی کنکری تھی۔'' عینی بولی۔

''لیکن اب تم خود کو واقعی شیطان ثابت کر رہے ہو، چھوڑ دو..... چھوڑ دو۔'' اس کے لمبے بال بھی بچوں کی لڑائی کی لپیٹ میں آ گئے، جنہیں اس نے بڑی مشکل سے علیحدہ کیا۔

اچانک گھر کی کال بیل ہوئی۔ شہزاد ٹی وی کے سامنے سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے لان میں پہنچنے تک ملازم طفیل مین گیٹ کھول چکا تھا۔ گیٹ کی دوسری طرف شہزاد کو جس چہرے کی جھلک نظر آئی وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس چہرے کو دیکھ کر شہزاد کے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ بڑے ماموں جہانگیر تھے۔ ان کے عقب میں سڑک پر ان کی لمبی مرسڈیز کار کھڑی تھی۔ اندر باوردی ڈرائیور کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شہزاد نے آج ماموں جہانگیر کو پانچ چھ سال بعد دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کے ذہن نے خطرے کی ان گنت گھنٹیاں بجا دیں۔ بہرحال اس نے آگے بڑھ کر ماموں کا استقبال کیا اور انہیں اندر لے آیا۔ وہ انہیں گھر کے اندر لے جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے لیے دیے ہوئے انداز میں کہا کہ وہ ان کے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلوائے۔ شہزاد نے دروازہ کھلوایا اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

''آپ کیا لینا پسند کریں گے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میں یہاں کچھ کھانے پینے کے لیے نہیں آیا اور نہ ہی میرے پاس زیادہ وقت ہے۔ مجھے تم سے بس ایک مختصر سی بات کرنی ہے۔''

''جی فرمائیں۔''

''دیکھو شہزاد! پرانے زخموں کو چھیلا جائے اور وہ پھر تازہ ہو جائیں تو یہ بڑا خطرناک ہوتا ہے اور میں اب بھی امید کرتا ہوں کہ تم ان زخموں کو تازہ کرنے کی حماقت نہیں کرو گے۔''

''میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔'' شہزاد نے پریشان ہو کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اندازہ ہو چکا ہے، میں لمبی بات کرنا نہیں چاہتا۔ جو کچھ بھی ہے تمہاری رگوں میں میری بہن کا خون شامل ہے۔ میں خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم اس حد تک نہیں گر سکتے۔ جو باتیں سامنے آ رہی ہیں، وہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔''

''ماموں! آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میں اپنی نواسی اور فرزانہ کی بیٹی، عینی کی بات کر رہا ہوں۔'' ماموں نے شہزاد کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ ''وہ شادی سے انکار کر رہی ہے۔ اس نے ہم سب کے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا کیا ہوا ہے۔''

''مم..... ماموں! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ اگر ایسا ہے بھی تو میرا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے یا نہیں..... لیکن ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دوں شہزاد! بالکل صاف صاف.....'' انہوں نے عجیب ہیجانی انداز میں شہزاد کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''اگر..... کسی موقعے پر، مجھے ذرا سا..... ہاں ذرا سا شبہ بھی ہو گیا کہ تم اس حد تک گر چکے ہو اور عینی کی زندگی پر کسی بھی طرح تمہارا سایہ پڑا ہے..... تو میں اپنے مرحوم ہونے بزرگوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں، یہاں ایسا طوفان آئے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ گھنی، سفیدی مائل بھوؤں کے نیچے آنکھوں میں بجلیاں سی کوند گئیں، وہ ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے اور ایک لفظ مزید کہے بغیر شہزاد کے گھر سے نکل گئے۔ شہزاد اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

فاخرہ کو بھی ماموں جہانگیر کی آمد و رخصت کا پتا چل گیا تھا۔ شہزاد نے اسے کچھ نہیں بتایا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی سنگین معاملہ ہے۔ پیرس میں شارق نے جس طرح کی بیہودگی کی تھی، اس کے بعد کسی بھی واقعے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بہرحال شہزاد کا موڈ خراب دیکھتے ہوئے فاخرہ کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس سے تفصیل پوچھ سکے۔

دوسرے روز شہزاد نے فرزانہ کا فون نمبر ڈھونڈا اور وہ اسے مل گیا۔ اس نے اس فون نمبر پر رابطہ کیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ شہزاد کے اندازے کے مطابق پیرس میں دوپہر تھی۔ ہزاروں میل دور سے فرزانہ کی آواز ابھری اور شہزاد کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو کون؟''

''میں کراچی سے شہزاد بول رہا ہوں۔''

چند لمحے کے لیے سناٹا رہا پھر فرزانہ کی دبی دبی آواز آئی۔ ''السلام علیکم۔ آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں اور تم؟''

''ہاں جی، میں کچھ دیر میں آپ کو خود فون کروں گی..... آپ مصروف تو نہیں ہوں گے؟''

''نن..... نہیں.....''

''ٹھیک ہے۔ او کے بائے۔''

فون بند ہو گیا۔ شہزاد کو اندازہ ہوا کہ فرزانہ کے پاس کوئی موجود تھا جس کی وجہ سے وہ بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شہزاد کے سیل نمبر پر فرزانہ کی کال آ گئی۔ ''ہیلو شہزاد۔ میں فرزانہ بول رہی ہوں۔ تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں، اس وقت تم نے بڑی جلدی فون بند کر دیا؟''

''بس کچھ ایسی ہی بات تھی، دراصل..... شارق میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آج کل پھر پیرس میں ہے۔''

''کیوں؟ خیریت تو ہے ناں؟''

''خیریت سے ہے بھی اور نہیں بھی۔'' فرزانہ کی آواز بجھی بجھی تھی۔ ''یہاں عینی کی وجہ سے بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔''

''کیا کیا ہے اس نے؟''

''دراصل، ایک بڑا اچھا رشتہ آیا ہے اس کے لیے۔ ابا جان کے گہرے دوست رشید بٹ صاحب کا بیٹا ہے۔ یہاں پیرس میں ہی خاصا بڑا شوروم ہے اس کا۔ گارمنٹس کا کاروبار کر رہا ہے۔ ادھر سیالکوٹ سے چمڑے کی جیکٹس اور دیگر سامان منگواتا ہے۔ ہینڈسم بھی ہے، ابا جان کی بڑی دیر سے خواہش تھی کہ اس لڑکے کے رشتے کی بات عینی کے ساتھ بن جائے۔ پچھلے دنوں لڑکا اور اس کے والد پاکستان گئے تو ابا جان سے ان کی تفصیلی بات ہوئی پھر جب لڑکا واپس پیرس آیا تو میں اور جمیل بھی اسے دیکھ آئے۔ زارا بھی ساتھ تھی، ہمیں بھی لڑکا اور اس کے گھر والے اچھے لگے۔ ابا جان نے پاکستان سے مشورہ دیا کہ عینی سے پوچھ لو اور کم از کم منگنی تو فوری طور پر کر لو۔ ہم سب کا بھی یہی اندازہ تھا کہ اس بار عینی ضرور راضی ہو جائے گی، پر یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا ہے شہزاد۔ وہ بالکل مان کر نہیں دے رہی۔ ابا جان اس پر سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے فون پر بھی بہت دفعہ بات کی ہے عینی سے۔ اس کے ساتھ سر کھپا کھپا کر تھک چکے ہیں۔ میرے خیال میں اب وہ دو چار دن تک خود بھی یہاں پیرس آ رہے ہیں۔''

''مطلب کہ کافی سنگین معاملہ ہے۔''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات بن رہی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ابا جان غصے کے تیز ہیں۔ ایک بار جو بات ان کے منہ سے نکل جاتی ہے وہ نکل جاتی ہے۔ عینی سے پیار بھی بڑا کرتے ہیں اور اسی طرح اس پر اپنا حق بھی بہت زیادہ سمجھتے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ ہم سب بھی اس رشتے کے حق میں ہیں۔ یہ ہر طرح سے مناسب رشتہ ہے، ان لوگوں کو بھی شادی کی زیادہ جلدی نہیں۔ دو ڈھائی سال وہ آرام سے نکال لیں گے۔ ہماری پلاننگ بھی یہی ہے کہ دو ڈھائی سال تک شادی کر دی جائے۔ تمہیں پتا ہی ہے زارا کی شادی بھی میں نے بائیس تیئس سال کی عمر میں کر دی تھی۔ جیسا یہاں کا ماحول ہے، بچوں کی شادی میں زیادہ دیر بھی نہیں کی جا سکتی۔ پڑھائی تو یہاں بعد میں بھی چلتی رہتی ہے۔''

''فرزانہ! کل ماموں جہانگیر مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' شہزاد نے گمبھیر لہجے میں اطلاع دی۔ ''انہوں نے چند سخت باتیں کہی ہیں۔ یقین کرو کل سے میں اتنا پریشان ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی کہ مجھے اس سارے معاملے میں کس وجہ سے گھسیٹا جا رہا ہے۔ اس بارے میں سوچ کر مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔''

فرزانہ نے ایک لمبی آہ بھری، دبی دبی جھلاہٹ کے ساتھ بولی۔ ''یہ سارا شارق کا کیا دھرا ہے، اس نے ابا جان کے کانوں میں کچھ الٹی سیدھی باتیں ڈالی ہیں۔ اس نے اپنی بے وقوفی سے ایک ایسی چیز کو وجود دے دیا ہے، جو شاید تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو کبھی اس طرح واضح ہو کر سامنے نہیں آئی تھی، تم جانتے ہی ہو، عینی، شارق سے پہلے ہی بڑی الرجک تھی اب اور الرجک ہو گئی ہے۔ وہ اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ وہ تو اب اسے ماموں بھی نہیں کہتی۔ سیدھا نام لے کر بات کرتی ہے۔ دو تین دن پہلے شارق کے ساتھ اس کا باقاعدہ جھگڑا ہوا ہے اس نے شارق سے صاف کہا ہے کہ وہ ابھی شادی کا بالکل نہیں سوچ رہی۔ وہ پاکستان جا رہی ہے، وہاں وہ تمہارے اور فاخرہ کے ساتھ رہے گی۔ وہ تم سے پڑھنا اور بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس نے یہ باتیں دل سے کہی ہیں یا صرف شارق کو جلانے اور آگ بگولا کرنے کے لیے..... بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کا فیصلہ بھی تمہارے مشورے اور مرضی سے کرے گی۔''

شہزاد تھوڑی دیر سناٹے میں رہا۔ اسے ایسی توقع نہیں تھی۔ ''وہ ایسا کیوں کر رہی ہے فرزانہ! کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں پیرس گیا اور جب آپ لوگ مجھ سے ملنے آئے تو میں ملنے سے انکار نہ کر سکا۔ اس کے باوجود فرزانہ میں نے تمہیں ''وارن'' کر دیا تھا کہ اس میل جول کا انجام ٹھیک نہیں ہوگا۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر فرزانہ نے

نہیں آیا کہ یہ کم عمر اوٹ پٹانگ سی لڑکی ایسی بھاری بھر کم باتیں بھی کرسکتی ہے۔ عمیر آگے جا کر ایک بڑے مجسمے کے گرد گھومنے لگا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا یہ خیال ہے مائی لارڈ! کہ ہم ہر موضوع پر بہ آسانی بات نہیں کرسکتے، میں تو ماما پاپا سے بھی ہر ''سبجیکٹ'' پر کھل کر بات کرتی ہوں۔ کلچر، آرٹ، عشق، محبت کی فیلنگز سب کے بارے میں، آپ بھی کرسکتے ہیں، مجھ سے بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے یا نہیں۔ اسی طرح اپنے بارے میں بھی بتا سکتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

شہزاد کو اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شاید مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح یہ بھی ناقابل فہم تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا بتاؤ، کوئی بوائے فرینڈ ہے تمہارا یا نہیں؟''

''ہے'' اس نے بلا تکلف کہا۔ ''ایک پاکستانی ہے۔ آپ کو ملواؤں گی اس سے۔ بلکہ اس کی تصویر بھی دکھاؤں گی، اس کی تصویر ہے میرے پاس۔'' شہزاد اثبات میں سر ہلا کر چپ رہا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر حسب عادت اچانک بولی۔ ''آپ کو پتا ہے کہ ارینج میرج اور لو میرج میں کیا فرق ہے۔''

''مجھے نہیں پتا۔'' شہزاد کے لہجے میں بے تعلقی تھی۔

''لو میرج'' آپ اپنی گرل فرینڈ سے کرتے ہیں اور ارینج میرج کسی دوسرے کی گرل فرینڈ سے۔'' اس نے کہا اور ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ قریباً چار گھنٹے تک مسلسل گھومنے کے بعد وہ اس عظیم الشان میوزیم کا بس ایک مختصر حصہ ہی دیکھ سکے تھے۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا یہاں تک کہ مونا لیزا کی اصل پینٹنگ بھی۔ لہٰذا اگلے روز دوبارہ آنے کا پروگرام بنا۔

☆☆☆

اس روز فاخرہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ ہاں عمیر اور احسن اپنے کیمروں سمیت ہمراہ تھے۔ کل کی طرح آج بھی عینی نے اسٹائلش ڈرائیونگ کی اور آدھ پون گھنٹے میں انہیں میوزیم پہنچا دیا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ باہر نکلے۔ ایک دم عینی ٹھٹک گئی۔ ''اوہ آپ کو اپنے بوائے فرینڈ کی تصویر تو دکھائی ہی نہیں۔'' اس نے کہا اور پلٹ کر پھر کار کی طرف گئی، کار میں سے اس نے قریباً 12 انچ ضرب 9 انچ کا ایک کارڈ پیپر نکالا۔ اس پر ایک بلیک اینڈ وائٹ چہرہ تھا، یہ پین ورک سے بنایا گیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ چہرے پر نقوش نہیں تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شہزاد نے کہا۔

''بس یہی ہے جی میرا بوائے فرینڈ۔ دیکھ لیں پاکستانی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''کپڑوں سے زیادہ ناک کان آنکھیں ضروری ہوتی ہیں اور وہ ہیں نہیں۔ لگتا ہے کہ تم نے بوائے فرینڈ کو پکنے نہیں دیا، کچا کچا ہی پیڑ سے اتار لیا ہے۔'' آج شہزاد بھی قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔

''آپ تو خود آرٹسٹ ہیں مائی لارڈ، آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ مصور کے ذہن میں جتنی تصویر ہوتی ہے اتنی ہی کینوس پر یا کاغذ پر ٹرانسفر ہوتی ہے، باقی تو سب الٹی سیدھی لکیریں ہوتی ہیں۔''

پین ورک سے بنی ہوئی تصویر شہزاد کو دکھا کر اس نے دوبارہ گاڑی میں رکھ دی۔ وہ ایک بار پھر لوور میوزیم کے خزینوں میں غوطہ زن ہوگئے۔ مصری، یونانی، رومی، پتا نہیں کون کون سی تہذیبیں تھیں جن کے آثار بڑی خوبصورتی سے مختلف گیلریوں میں سجائے گئے تھے۔ بے شمار شاہکار دیکھنے کے قابل تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کا رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں مونا لیزا موجود تھی..... لوگ ایک دوسرے سے استفسار بھی کررہے تھے کہ مونا لیزا کس جگہ ہے۔

آخر مختلف بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد وہ بھی مونا لیزا کے روبرو پہنچ گئے۔ یہاں دیکھنے والوں کا جمگھٹا تھا اور ایک پُرتقدس خاموشی تھی۔ اس جگہ کو ''اسٹیٹ روم'' کا نام دیا گیا تھا۔ شیشے کے پیچھے مونا لیزا خاص اہتمام سے رکھی گئی تھی۔ یہ تصویر دنیا کی مشہور و معروف اشیا میں سے ایک تھی اور ہر مشہور و معروف شے کی طرح اس کے اندر بھی ایک بارعب شناسائی کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''ہاں میں ہی مونا لیزا ہوں۔ میرے ہی ہونٹوں کو لیونارڈو کے برش نے لازوال و بے مثال مسکراہٹ بخشی ہے۔ مجھ پر ہی کتابیں لکھی گئی ہیں، کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں، میں جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں لیکن مصوری کی دنیا میں یکتا ہوں۔''

ایک عجیب سے سحر نے شہزاد کو گرفت میں لے لیا لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شاید مونا لیزا کا سحر نہیں ہے اس کی شہرت کا سحر ہے۔

مونا لیزا سے رخصت ہو کر وہ آگے بڑھ گئے۔ اچانک ایک دروازے میں سے عینی کو کچھ نظر آیا۔ اس نے ایک دم شہزاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتی ہوئی میوزیم کے اندرونی احاطے کی طرف لپکی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں احسن کا ہاتھ تھا۔ عمیر کا ہاتھ تو شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شہزاد

ہے کہ میرے دل کے اندر سارے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو گئے ہیں۔ بس ایک دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور یہ دروازہ اس نگری کی طرف کھلتا ہے جہاں..... جہاں..... آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ ہاں ہاں، یقیناً سمجھ گئے ہیں۔ اسی لیے تو جناب کا رنگ غصے سے لال ہو گیا ہے۔ میں تصور کی نظر سے دیکھ سکتی ہوں۔ آپ مجھے تھپڑ مارنے کے لیے بے چین ہو گئے ہیں۔ سوری..... بڑی دور ہوں، آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ چلیں یہ سارے تھپڑ آپ سنبھال کر رکھ لیں۔ جب کبھی آپ سے ملاقات ہو گی تو میں اپنا گال پیش کر دوں گی۔ آپ سارا غصہ ایک ہی دفعہ نکال لیجیے گا۔

آنٹی کو سلام۔ عمیر اور بچو نگڑے کو بہت بہت پیار۔

آپ کی پرستار عینا۔"

شہزاد نے ای میل کو دوسری بار پڑھنے کے بعد Delete کر دیا اور دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ آج اس نے وہ بات بالکل واضح طور پر کہہ دی تھی جو تقریباً ایک سال سے ایک دھند میں لپٹی ہوئی شہزاد کے اردگرد چکرا رہی تھی۔ اس ای میل کے بعد شہزاد نے فیصلہ کیا کہ وہ فرزانہ کی بات مانتے ہوئے ایک بار عینی سے بات کرے گا اور اس کا مزاج درست کرنے کی اپنی سی کوشش کرے گا۔

ٹھیک دو روز بعد دوپہر کے وقت لینڈ لائن فون پر عینی کے ساتھ شہزاد کی بات ہوئی۔ اس بات کے لیے فرزانہ نے ایسا موقع چنا تھا جب ماموں جہانگیر اور شارق وغیرہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ فرزانہ نے شہزاد کو بتایا تھا کہ نانا جہانگیر کے ساتھ کل بھی عینی کا جھگڑا ہوا ہے۔ نانا اس پر بہت گرجے برسے ہیں۔ جس کے بعد سے وہ روٹھی ہوئی ہے۔ اس نے دو دن سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں اور نہ ہی اپنی کلاسز لینے گئی ہے۔

"ہیلو عینی کیسی ہو؟" شہزاد نے پوچھا۔

"بس طبیعت ذرا بوجھل ہو رہی تھی لیکن آپ کی آواز سننے کے بعد بوجھل کیسے ہو سکتی ہے۔ سچ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا، جب ماما نے کہا کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ تاہم اس کی آواز کی نقاہت شہزاد نے واضح طور پر محسوس کی۔

"تمہارا لہجہ کچھ دھیما لگ رہا ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے مائی لارڈ۔ میں اتنی زور سے بول سکتی ہوں کہ میری آواز بغیر فون لائن کے بھی آپ کے کراچی تک پہنچ جائے۔" اس نے شوخ ہونے کی کوشش کی۔

"اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟"

"بس ٹھیک ہی ہے جی لیکن پہلے آپ مجھے آنٹی جی کی طبیعت بتائیں، یقین کریں جب ان کے Paralysis کا پتا چلا کئی ہفتے میں بے حد پریشان رہی۔ جی چاہتا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ دن رات ان کی خدمت کروں، ان کی ساری تکلیف ان سے لے لوں۔ میں ان سے فون پر بات کرنا چاہتی تھی لیکن آپ کا لینڈ لائن نمبر شاید بدل گیا ہے۔"

"ہاں وہ تبدیل ہو گیا ہے۔"

"کیا آپ اب میری بات کرا سکتے ہیں ان سے؟"

"نہیں، اس وقت تو میں سیل فون سے بات کر رہا ہوں اور آفس میں ہوں۔"

وہ سمجھ گئی کہ وہ فی الحال بات کرانا ہی نہیں چاہتا۔ رسمی گفتگو کے بعد شہزاد اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے کہا۔ "عینی! مجھے پرسوں تمہارا ای میل ملا ہے۔"

اس کا خیال تھا کہ وہ اس بات پر جھجکے گی اور لڑکھڑاتے لہجے میں کوئی وضاحت کرے گی مگر وہ بالکل صاف، پراعتماد آواز میں بولی۔ "ہاں مائی لارڈ! جو کچھ میرے دل میں تھا میں نے لکھ دیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھ میں اور بے شمار برائیاں اور خامیاں ہوں گی لیکن جھوٹ ان میں شامل نہیں ہے۔"

شہزاد ایک لمبی آہ بھر کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن عینی! یہ بھی تو کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ جو جھگڑے فساد سے بچائے اس سچ سے بہتر ہے جو زندگیاں تلخ کر کے رکھ دے۔"

"مائی لارڈ! آپ کی سمجھ بوجھ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر دیکھیں، اگر ہم سچ جھوٹ کو ایسے پیمانوں سے ناپنے لگیں تو پھر ان دونوں چیزوں کا کوئی وجود ہی نہیں رہ جائے گا۔ ہم اپنے اپنے حساب سے جھوٹ سچ کی تشریح کرنے لگیں گے۔"

"لیکن جو سچ تم بول رہی ہو، جانتی ہو کتنا خطرناک ہے۔"

"لیکن..... وہ سچ ہے۔" وہ عجیب انداز سے بولی۔ اس انداز نے شہزاد کو لرزا دیا۔

چند سیکنڈ توقف کرنے کے بعد شہزاد نے کہا۔ "عینی! تم بہت اچھی لڑکی ہو، میں نے تم میں بہت سی خوبیاں دیکھی ہیں، میری دلی خواہش ہے کہ تم ایک ایسے راستے پر چلنے کی کوشش نہ کرو جس پر بدنامی اور رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر چلو گی تو مجھ سے بھی ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ گی۔"

"میں نے ایسا کون سا راستہ اختیار کر لیا ہے

ناب۔'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے صرف یہی کہا ہے ناں کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ یہ میری زندگی ہے، کیا اس پر میرا اتنا سا حق بھی نہیں۔ میں اچھے طریقے سے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی طرح کچھ بننا چاہتی ہوں اور کون سی بری بات کہہ دی ہے میں نے؟''

''دیکھو، تم بھی فوٹو گرافی کے آرٹ میں دلچسپی لیتی ہو۔ تصویر میں پس منظر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی منظر کی۔ اسی طرح کسی بھی بات سے زیادہ اس کا پس منظر اہمیت رکھتا ہے۔ تم شادی نہ کرنے والی بات جس پس منظر میں کہہ رہی ہو وہ تمہارے لیے ڈھکا چھپا نہیں اور شاید دوسرے بھی اس کو جان رہے ہیں۔''

''وہ جو سمجھتے ہیں، انہیں سمجھنے دیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی۔ میں ابھی منگنی، شادی وغیرہ کرنا نہیں چاہتی۔''

''دیکھو عینی! اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ اس طرح تم مستقبل میں حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکو گی تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا اور اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ میں خود ہوں، میں تمہیں بالکل صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں میرے لیے تم صرف فرزانہ کی بیٹی ہو۔ میں اس کے علاوہ کسی اور انداز میں تمہارے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہاری باتیں سن کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، میں شرمندگی کے پسینے میں ڈوب جاتا ہوں، تم..... نہ صرف مجھے تکلیف دے رہی ہو بلکہ میری زندگی کو بھی تلخ کرنے کی کوشش کر رہی ہو، میں تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔''

''مجھے آپ کی کسی اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' وہ تڑ سے بولی۔ ''میں کسی سے کچھ مانگ نہیں رہی، نہ کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دے رہی ہوں، نہ دینا چاہتی ہوں، اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آئندہ کبھی آپ کو فون یا ای میل بھی نہیں کروں گی۔ ذرا سا تعلق بھی نہیں رکھوں گی آپ سے لیکن جو تعلق میرے دل میں ہے..... وہ ہے اور اسے ہمیشہ رہنا ہے۔'' اس کا لہجہ گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔

شہزاد نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ ''عینی! سمجھنے کی کوشش کرو، اس میں جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہیں، میری طرف دیکھو، میں ایک.....''

''پلیز..... پلیز، آپ کچھ نہ کہیں۔'' اس نے تیزی سے شہزاد کی بات کاٹی۔ ''جو کچھ آپ کو... کہنا ہے میں جانتی ہوں، آپ کہیں گے میں ایک اڑتالیس پچاس سالہ شخص ہوں، میرا دماغ اور میرا جسم تھک گئے ہیں، میں اب ایک ٹھہری ہوئی زندگی گزارنا چاہتا ہوں، تم نوجوان ہو، تمہارے اندر جوش جذبہ ہے۔ پوری زندگی پڑی ہے تمہارے سامنے۔ تمہیں اچھے سے اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔ تمہاری پوری زندگی کو گل وگلزار بنا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں آپ کی ان ساری باتوں کے جواب میں بس ایک بات ہی کہوں گی۔ محبت دلیلوں کو نہیں مانتی۔ وہ وہیں سر پھوڑتی ہے جہاں اسے نہیں پھوڑنا چاہیے۔ ویسے محبت کے پاس ہر دلیل کا جواب بھی موجود ہوتا ہے اور آپ کی باتوں کا جواب میرے پاس یہ ہے جناب کہ میرے نزدیک بے محبت کی پچاس سالہ زندگی سے، محبت کی چار پانچ سالہ زندگی بھی ہزار درجے بہتر ہے۔''

وہ اس لڑکی کی باتوں سے دنگ رہ گیا۔ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ''مم..... مجھے تمہاری باتوں سے شرمندگی ہو رہی ہے عینی۔''

''اب آپ کو مزید شرمندگی نہیں ہوگی۔'' اس نے عجیب اشک بار لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔ وعدہ کرتی ہوں، آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی۔ آپ آخری بار میری آواز سن رہے ہیں اور آخری الفاظ یہ ہیں کہ میں آپ کو چاہتی ہوں، خدا حافظ..... آپ ہمیشہ خوش رہیں۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

شہزاد سٹپٹا کر رہ گیا۔ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔ رات کو بھی دیر تک اس نے بستر پر کروٹیں بدلیں۔ یہ کیسی لڑکی تھی؟ یہ کسی آسیب کی طرح شہزاد کے دل ودماغ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہ شہزاد کی بچھڑی ہوئی محبوبہ، نجمہ کی آنکھیں اور اس کی خو لے کر اس دنیا میں آئی تھی..... اور اب وہ سرتاپا نجمہ بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہنے کو تو شہزاد نے پورے وثوق سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے لیے صرف فرزانہ کی بیٹی ہے اور وہ اس کی ذات میں ذرا سی دلچسپی بھی نہیں رکھتا لیکن اب رات کی اس تاریک تنہائی میں وہ چپ چاپ لیٹا سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ایسا ہے۔ حقیقت کتنی بھی حیران کن ہو لیکن حقیقت یہی تھی کہ پیرس سے ایک دم چلے آنے کے بعد شہزاد نے اپنے اندر ایک خلا محسوس کیا تھا۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ خلا کم ہونے کے بجائے کچھ وسیع ہی ہوا تھا۔ کوئی بے نام کشش تھی جس کی وجہ سے پیرس اور پیرس میں گزرے ہوئے دن بار بار اس کے پردۂ تصور پر نمودار ہو جاتے تھے اور پھر وہ بے رحم تھپڑ جو اس نے کسی کے کومل گال پر رسید کیا تھا۔ وہ ان لمحوں سے دھیان ہٹانے کی بہت کوشش کرتا مگر دھیان ہٹتا نہیں تھا۔ وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔

اگر معروضی انداز میں دیکھا جاتا تو اس کے لیے کبھی نہایت خوبصورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں رہی تھی۔ وہ تتلیوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتی تھیں اور ان میں سے بہت سی ایسی تھیں، جو کسی بھی ''کام'' کے لیے اس کے ایک اشارے کو ہی کافی سمجھ سکتی تھیں، لیکن وہ کبھی ایسی صورت حال کی طرف راغب ہی نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے دل کا وہ حصہ جو صنف مخالف کی دلکشی کو محسوس کرسکتا تھا اور اسے حاصل کرنے کی چاہت کرسکتا تھا مردہ ہو چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اپنی موجودہ کیفیت اب اسے زیادہ پریشان کررہی تھی۔ وہ اپنی پریشانی فاخرہ سے شیئر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی بستر سے لگی ہوئی تھی۔

چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ شہزاد کو پیرس، فرزانہ اور عینی وغیرہ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ صرف ایک دن اتنا پتا چلا کہ ماموں جہانگیر پیرس سے واپس آگئے ہیں۔ اب شہزاد کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کسی روز ماموں جہانگیر یا شارق میں سے کوئی اس کا سکون تہ وبالا کرنے کے لیے اس کے دروازے پر دستک نہ دیدے۔ وہ اب تک بہت ضبط کررہا تھا۔ کسی وقت بھی اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوسکتا تھا۔ اگر ایسا ہوجاتا تو یہ تناؤ باقاعدہ فساد کی شکل اختیار کرسکتا تھا۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا جب شہزاد کمزور و ناتواں تھا۔ ایک خاموش طبع والد اور بوڑھی والدہ کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ اب وہ ایک تناور درخت تھا۔ اب یہاں شہر بے مثال کراچی میں اس کی گہری جڑیں تھیں۔ اس کے پاس پیسا تھا، تعلقات تھے، اگر اس کی عزت کو للکارا جاتا اور اسے دیوار کے ساتھ لگانے کی کوشش کی جاتی تو وہ منہ توڑ جواب دے سکتا تھا۔ وہ ماموں جہانگیر اور ان کے بیٹوں کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہوسکتا تھا۔

اس نے اپنے طور پر حسنات سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہاں پیرس میں کیا حالات ہیں۔ پہلے کئی دنوں سے حسنات کا رابطہ بھی فرزانہ یا جمیل صاحب سے نہیں ہوسکا تھا۔ اصل صورت حال سے وہ بھی بے خبر تھا۔ اسی طرح آٹھ دس روز گزر گئے۔ پھر ایک روز آدھی شب کو شہزاد کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف حسنات ہی تھا۔ شہزاد خاموشی کے ساتھ فاخرہ کے پہلو سے اٹھا اور باہر برآمدے میں آگیا۔

''کیا بات ہے حسنات! خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے یار! وہاں پیرس میں عینی پچھلے دس بارہ دن سے اسپتال میں ہے۔''

''اسپتال میں؟ اوہ گاڈ، کیا ہوا ہے؟''

''وہاں کئی روز بڑا سخت تناؤ رہا ہے، تایا جہانگیر اور شارق کے علاوہ عینی کے والد جمیل صاحب بھی پیرس میں ہی تھے۔ دس بارہ دن پہلے رات کے وقت عینی نے بیئر کے ساتھ بہت زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزرز لے لیں اور بے ہوش ہوگئی۔ اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کا معدہ واش ہوا اور وہ ہوش میں آگئی لیکن تب سے اس کی طبیعت سخت خراب ہے۔ اسے مسلسل اسپتال میں رکھا گیا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ۔'' شہزاد نے سر پکڑ لیا۔ ''پتا نہیں، یہ لڑکی کیا کرنے والی ہے۔''

حسنات نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو عینی نے کبھی الکحل وغیرہ نہیں لی لیکن اس رات اس نے جو بھی کیا انوکھا کیا اور اس کی اصل وجہ جہانگیر صاحب ہی تھے۔''

جہانگیر صاحب کا سخت رویہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ وہ وہاں پیرس میں اڑ کر بیٹھ گئے تھے کہ نواسی سے اپنی بات منوا کر ہی واپس جائیں گے۔ کسی حد تک عینی کی والدہ بھی ان کا ساتھ دینے لگی تھیں۔ انہی باتوں سے دل برداشتہ ہوکر عینی نے یہ حرکت کی۔ اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ اسی روز جہانگیر صاحب اور عینی کے والد جمیل صاحب میں جھڑپ بھی ہوئی۔ جمیل صاحب نے عینی کے نانا سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے گھریلو معاملے میں اس طرح دخل نہ دیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ہر کسی سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں خوامخواہ ان پر اور ان کے اہل خانہ پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔

اسی واقعے کے بعد جہانگیر صاحب نے پیرس سے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور بھنائے ہوئے واپس لاہور پہنچ گئے۔ سنا ہے کہ شارق بھی اب لندن واپس جاچکا ہے۔ شارق کے بارے میں تو عینی نے اسپتال میں صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے آس پاس اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ ان دونوں کے درمیان ماموں بھانجی والا احترام بالکل ختم ہوچکا تھا۔

حسنات سے ملنے والی یہ ساری معلومات بے حد پریشان کن تھیں۔ آہستہ آہستہ شہزاد کے بدترین اندیشے حقیقت میں ڈھلتے جارہے تھے۔ معاملہ بے طرح بگڑ رہا تھا۔ شہزاد کو ایک بار پھر ماموں جہانگیر اور شارق وغیرہ کی طرف سے اندیشہ محسوس ہوا۔ اسے ماموں کی وہ دھمکی بھی یاد آئی جو انہوں نے آخری ملاقات میں دی تھی۔ وہ سوچنے لگا، کیا وہ اس حد تک جاسکتے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرگزریں۔ کیا اسے اپنے وکیل سے پیشگی کوئی مشورہ کرنا چاہیے؟

بہرحال آئندہ دس پندرہ دن خیریت سے گزر گئے تو شہزاد کے اندیشے بھی زائل ہونے لگے۔ ماموں جہانگیر اور شارق وغیرہ کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف پیرس سے بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ انہی دنوں شہزاد کو اپنے کام کے سلسلے میں کاغان اور ناران وغیرہ کا رخ کرنا پڑا۔ اسے اپنے مختصر یونٹ کے ساتھ وہاں پندرہ بیس دن رہنا تھا پھر چند روز اسلام آباد میں قیام کے بعد واپس آنا تھا۔ اس کے ایسے دوروں کے دوران میں فاخرہ کا اکیلا پن دور کرنے کے لیے اس کی والدہ اور بھتیجا شکیل اس کے پاس آجایا کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی شہزاد نے انہیں بلالیا مگر جس روز رات کو شہزاد کو... ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہونا تھا اسے ایک اہم فون کال موصول ہوئی اور اس نے شہزاد کا ہر پروگرام درہم برہم کر ڈالا۔ یہ فون کال پیرس سے تھی اور عینی کے والد جمیل احمد صاحب نے کی تھی۔

جمیل صاحب کی آواز کی لرزش اور سنگینی محسوس کر کے شہزاد بری طرح چونک گیا تھا..... ''خیریت تو ہے بھائی جان؟'' اس نے بے حد تشویش سے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں جمیل صاحب نے اشک بار انداز میں جو کچھ بتایا وہ ہرگز اطمینان بخش نہیں تھا۔ عینی کی طبیعت بدستور خراب تھی اور وہ دوبارہ اسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ جمیل صاحب نے بتایا کہ یوں لگتا ہے، وہ ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتی۔ نہ دوا باقاعدگی سے کھاتی ہے نہ خوراک کا دھیان رکھتی ہے۔ اسے بخار رہتا ہے جو کبھی کم اور کبھی بہت تیز ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر بے شمار ٹیسٹ کروا چکے ہیں اور ابھی مزید کروا رہے ہیں۔ جمیل صاحب نے شہزاد سے کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رکھی۔ انہوں نے مناسب الفاظ میں شہزاد کو بتا دیا کہ وہ عینی کے اس جذبے سے باخبر ہیں جو وہ شہزاد کے بارے میں رکھتی ہے۔ اس جذبے کی بے پناہ شدت بھی ان کے علم میں ہے۔ انہوں نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''شہزاد! میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم اور صرف تم ہی ہو جو عینی کو سنبھالا دے سکتے ہو۔ اگر تم آگے نہ بڑھے تو..... وہ ہمارے ہاتھوں سے..... خشک ریت کی طرح پھسل جائے گی اور ایسا ہوا تو میں کبھی خود کو معاف کرسکوں گا نہ تمہیں۔''

انہوں نے التجا کا لہجہ اختیار کیا اور شہزاد سے کہا کہ جس طرح اور جیسے بھی ہوسکے وہ دو چار روز کے اندر پیرس پہنچ جائے۔ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاووں کے سوا اور کچھ نہیں بچے گا۔

شہزاد کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ جمیل صاحب اسے فوراً پیرس آنے کا کہہ رہے تھے اور یہ کام ایسا آسان بھی نہیں تھا پھر اس میں بہت سے اندیشے بھی موجود تھے۔ بے شک ماموں جہانگیر اور ان کی فیملی ابھی تک خاموش تھی، لیکن وہ کتنی دیر خاموش رہے گی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف جمیل صاحب جس انداز میں بات کر رہے تھے، اسے بھی ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا بھائی جان۔ میں تو آج رات اپنے کام سے کاغان وغیرہ کی طرف جارہا تھا۔ بہرحال، میں آپ کو شام کے بعد پھر فون کروں گا۔''

انہوں نے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد، ویزا وغیرہ کی کوئی فکر نہ کرنا۔ میں ابھی اسلام آباد میں کلیم کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ سارا کام ارجنٹ کروا دے گا بس..... تم کسی طرح پہنچ جاؤ یہاں۔''

کلیم کا نام شہزاد نے پہلے بھی سنا تھا، وہ جمیل صاحب کا سگا بھائی تھا اور یہاں فرانس کی ایمبیسی میں آفیسر کے طور پر کام کرتا تھا۔

وہ رات شہزاد کے لیے انتہائی بے چینی و اضطراب کی رات تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر کا رخ کرے۔ اسے معلوم تھا کہ جمیل صاحب نے جو کچھ کہا ہے انتہائی مجبوری کے عالم میں کہا ہے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لڑکی آخری حد تک جانے کو تیار تھی اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا صرف شہزاد کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

عینی کی آنکھیں پھر اس کے تصور پر چھا گئیں۔ وہ کسی سے عینی اور نجمہ کی مشابہتوں کے بارے میں بات کرتا تو اس کا مذاق اڑایا جاتا لیکن وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں ایسا کچھ تھا جو سمجھ سے بالاتر تھا۔ جس کی توضیح کرنا مشکل تھی..... نجمہ کی ہمیشہ بولتی آنکھوں نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا..... شہزاد! میرا انتظار کرنا میں لوٹ کر آؤں گی، میں پھر ملوں گی۔

اور وہ لوٹ آئی تھی لیکن اس مرتبہ اس کے جسم کے گرد بے بسی و مجبوری کی زنجیریں نہیں تھیں۔ اس مرتبہ اس کا سر معاشرے کی کہنہ قدروں کے سامنے... جھکوں بھی نہیں تھا۔ اس بار اس کے سینے میں چٹانی حوصلہ تھا، اس کی آنکھوں میں محبت کے دشمنوں کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں تھیں۔ اس کے لمبے بال پیرس کی مستانی ہواؤں میں سرکشی سے لہراتے تھے اور اب وہ اپنے جذبے کی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی

طرف بلا رہی تھی۔ شہزاد نے خود کو اس کے دیوانے پن کے سامنے بے بس محسوس کیا۔

رات قریباً دو بجے کے قریب اس نے کاغان ناران وغیرہ کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتا تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے اسے زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ حالات خود بخود ہی ایک خاص رخ پر چلتے چلے گئے..... اگلے روز فرزانہ کا فون بھی آ گیا۔ اس نے بھی جمیل صاحب کی باتوں سے ملتی جلتی باتیں ہی کیں۔ وہ بھی بے حد دل گرفتہ تھی۔ اس نے شہزاد کو یہ یقین بھی دلایا کہ اس کی یہاں پیرس میں آمد بالکل صیغۂ راز میں رہے گی بلکہ وہ بھی کسی کو بتائے بغیر ہی یہاں پہنچ جائے تو بہتر ہے۔

کچھ بھی تھا، شہزاد فاخرہ کو تو ان حالات سے بے خبر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے مناسب لفظوں میں سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ فاخرہ نے یہ سب کچھ بڑی ہمدردی و غمگساری کے ساتھ سنا۔ درحقیقت وہ پیرس کے قیام کے دوران میں ہی عینی کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ ان دونوں نے اس معاملے میں کھل کر بات تو نہیں کی تھی تاہم ڈھکے چھپے انداز میں اس کا ذکر ہوتا رہا تھا۔ اس معاملے میں شہزاد فاخرہ کے خیالات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ شہزاد کی ''دوسری شادی'' کے لیے ایک منٹ میں عینی کا انتخاب کر لیتی لیکن شہزاد کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ یہ ایک ناممکن کام ہے۔ سماجی اور شرعی لحاظ سے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر خاندانی سطح پر دلوں میں جو نفرتیں موجود تھیں وہ اس طرح کے کسی اقدام پر شعلہ جوالہ کا روپ دھار سکتی تھیں۔ بہرطور حالات کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کرنے کے بعد فاخرہ نے بھی شہزاد کو مشورہ دیا کہ وہ ایک بار باجی فرزانہ اور جمیل بھائی جان کی خاطر پیرس ضرور جائے۔

ویزا کے بارے میں جمیل صاحب نے جو کچھ کہا تھا ویسے ہی ہوا۔ ان کے بھائی کلیم اللہ نے چار پانچ روز کے اندر ویزا لگوا دیا۔ ایئرلائن کا ٹکٹ جمیل صاحب نے پیرس سے بذریعہ انٹرنیٹ ارسال کر دیا۔ سب کچھ ہنگامی بنیادوں پر لیکن بڑی خاموشی سے ہوا۔ فاخرہ کی امی یعنی شہزاد کی ممانی، ساس اور بھانجے کو بھی بس یہی پتا تھا کہ شہزاد اپنے کام کے سلسلے میں پندرہ بیس روز کے لیے کراچی سے باہر جا رہا ہے۔

☆☆☆

پیرس ایک بار پھر شہزاد کے سامنے تھا۔ رنگوں خوشبوؤں اور سرمست ہواؤں کا شہر۔ اپنی جدت اور قدامت کے حسین امتزاج کے ساتھ وہ حد نگاہ تک شہزاد کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں پیرس کے سوا ہے ہی کیا؟ شاید اسی لیے پیرس کو آدھا فرانس بھی کہا جاتا ہے۔

پیرس کی ہواؤں کو چھوتے ہی شہزاد کو وہ ساری خوشبوئیں، کمس اور ذائقے یاد آ گئے جن کا تعلق اس کی سابقہ آمد سے تھا۔ جمیل صاحب اور فرزانہ تو اسے گھر میں ٹھہرانا چاہتے تھے تاہم اس نے ہوٹل کو ہی ترجیح دی تھی۔ ہوٹل کا انتظام جمیل صاحب نے ہی کیا تھا اور یہ ان کی رہائش گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایئرپورٹ پر جمیل صاحب ہی اسے لینے آئے۔ شہزاد پچھلی مرتبہ ان سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں وہ کچھ فربہ ہو چکے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ کندھے جھکے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ ایئرپورٹ سے ہوٹل تک کے راستے میں انہوں نے شہزاد کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کیں اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے شہزاد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد! میں سب کچھ تم پر چھوڑتا ہوں مجھے بس میری بیٹی کی زندگی اور خوشی چاہیے.....''

''بھائی جان! میں آپ سے کیا کہوں، یقین کریں.....''

''پلیز شہزاد، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے شہزاد کی بات کاٹ دی۔ ''میں تم سے کوئی شکوہ شکایت رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں سب جانتا ہوں یہ جس جس طرح ہوا ہے، میں عینی کی ساری خوبیوں خامیوں سے آگاہ ہوں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''اس وقت ہمیں کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں شہزاد! اس وقت تو بس اسے زندگی کی طرف واپس لانا ہے، وہ دن بدن.....'' ان کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکے۔

اس شام شہزاد، پیرس کے وسط میں ایک جدید اسپتال کے اندر عینی کے روبرو تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ کافی کمزور ہو چکی تھی۔ رنگت کی سفیدی میں جو سرخی شامل تھی وہ اب ناپید نظر آتی تھی۔ اس کے سفیدی مائل ہونٹوں پر ہلکی ہلکی پپڑیاں تھیں اور ان پپڑیوں کے ایک طرف نچلے ہونٹ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا سرخی مائل نکتہ تھا۔ شہزاد کے طمانچے کی نشانی۔ یہ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ روم تھا۔ کھڑکیوں پر پردے کھنچے تھے۔ دواؤں کی ہلکی سی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ شہزاد کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ شہزاد نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ نیم دراز کر دیا۔ ''نہیں عینی! پلیز لیٹی رہو۔'' اس نے کہا۔

وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ فرزانہ نے تھوڑی دیر پہلے اسے بتادیا تھا کہ شہزاد پیرس پہنچ گیا ہے اور اس سے ملنے آرہا ہے۔ اس کے باوجود عینی کی آنکھوں میں حیرت کے ستارے چمک رہے تھے۔ پھر یہ ستارے آنسوؤں کی ہلکی ہلکی نمی میں ڈوب گئے۔

''آخر آپ کو خیال آہی گیا۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

''لیکن تمہیں خیال نہیں آیا۔ نہ میرا نہ کسی اور کا۔ دیکھو کیا حال بنالیا ہے اپنا، لگ رہا ہے کہ عینی کو نہیں اس کی چھوٹی بہن کو دیکھ رہا ہوں۔''

''میں نے تو آپ سے نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔'' وہ عجیب سادگی سے بولی۔

''چلو، اب کیا ہوسکتا ہے۔ ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔'' شہزاد اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا کومل ہاتھ بالکل سرد تھا۔

''سچ بتائیں، میرے لیے آئے ہیں یا اور بھی کوئی کام تھا؟''

''اور بھی کام تھا۔''

''کیا؟''

''پیرس میں رہنے والی ایک دیوانی سی لڑکی سے ملنا تھا۔ اس کی عقل کو ٹھکانے پر لانا تھا، اسے ٹھیک کرنا تھا۔''

''اگر وہ..... دیوانی سی لڑکی ٹھیک ہونا ہی نہ چاہتی ہو تو پھر؟''

''کبھی کوئی دیوانہ خود بھی ٹھیک ہونا چاہتا ہے؟ اسے ٹھیک کیا جاتا ہے۔''

''کچھ روگ لادوا بھی تو ہوتے ہیں جی۔'' اس نے کہا۔

''غلط بات ہے، کہا جاتا ہے کہ قدرت نے مرض بعد میں پیدا کیے تھے پہلے ان کی دوائیں پیدا کی تھیں۔''

''مجھے پتا ہے کہ میں آپ سب کو بہت دکھ دے رہی ہوں اور خاص طور سے آپ کو۔''

''اور یہ دکھ تم ختم کرسکتی ہو، خود کو ٹھیک کرکے۔''

وہ شہزاد سے پاکستان کا حال احوال پوچھنے لگی، اس نے فاخرہ، عمیر اور احسن کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا۔ اس دوران میں فرزانہ بھی اندر آگئی۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ کھڑکیوں سے باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی۔ گاہے بگاہے کسی ایمبولینس کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔

عینی کو باتیں کرتے دیکھ کر فرزانہ خوش ہورہی تھی۔ سات بجے کے قریب وہ چلی گئی تاکہ گھر کا ایک چکر لگا آئے اور کھانا بھی لے آئے۔

وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ زیادہ تر باتوں کا تعلق پچھلے سال کے پیرس ٹور سے ہی تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی خوش پوش نرس آئی اور عینی کو چند ٹیبلیٹس کھلا کر چلی گئی۔ وہ پھر گفتگو میں مشغول ہوگئے۔ شہزاد نے عینی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عینی نے کروٹ لی اور شہزاد کے ہاتھ کو اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیا۔ اس کی بیمار آنکھوں میں عجیب سرخوشی دکھائی دینے لگی۔ شاید دوا کا اثر تھا، باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی پلکیں بوجھل ہورہی تھیں۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ چہرے پر اطمینان کی عجیب کیفیت لیے ہوئے وہ سوگئی۔ شہزاد کا ہاتھ نہ صرف عینی کے ہاتھ میں تھا بلکہ اس کے رخسار کے نیچے بھی دبا ہوا تھا۔ شہزاد ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ جاگ جاتی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اپنے خالی ہاتھ سے ایک میگزین کی ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ تصویریں دیکھنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ یہ میگزین فرنچ زبان میں تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ شہزاد کا ہاتھ تو عینی کے نیم گرم رخسار کے نیچے دبا رہا۔ وہ عینی کے چہرے کی طرف دیکھنے سے کترا رہا تھا۔ وہ جب بھی ایسا کرتا تھا عینی کے چہرے میں نظر آنے والی ''نجمہ کی مشابہتیں'' ایک دم نمایاں ہوجاتی تھیں..... اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک عجیب سی لہر اٹھنا شروع ہوجاتی تھی۔

کچھ دیر بعد عینی کے جسم میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پلکیں بھی متحرک ہوگئیں، اس نے نیم وا آنکھوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں غنودگی کا خمار تھا..... شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک سوئی رہی ہے۔ اس نے شہزاد کا چہرہ دیکھا اور لڑکھڑاتے لہجے میں مدھم سرگوشی کی۔ ''سچ بتائیں، مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے تھے آپ۔ میں بڑا روئی تھی اس دن..... آپ نے کیوں کیا تھا ایسا؟''

''بس غلطی ہوگئی تھی، میں تم سے..... تم سب سے معافی چاہتا ہوں۔''

''جھوٹ بولا تھا ناں آپ نے؟ آپ کو آفس کا کوئی کام نہیں تھا ناں؟'' وہ سوئے سوئے انداز میں بولتی رہی۔

''آپ..... صرف مجھ سے دور ہونے کے لیے گئے تھے ناں..... سچ بتائیں ایسا ہی تھا ناں؟''

کھڑکیوں سے باہر بجلی زور سے چمکی اور شیشوں پر بارش کی تھاپ کچھ تیز ہوگئی۔ دور چند میل کے فاصلے پر ٹوٹرے ڈیم کلیسا کی بلند و بالا روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' اس نے پھر خمار آلود سرگوشی کی۔

''کیا جواب دوں..... مجھے..... خود..... اپنی سمجھ نہیں آرہی تھی۔''

''اب آرہی ہے؟''

''اب بھی نہیں آرہی۔''

''لیکن مجھے آرہی ہے، آپ نے اپنے اوپر تہ در تہ بہت سے خول چڑھا رکھے ہیں۔ ان خولوں میں سے کچھ بھی باہر نہیں آسکتا لیکن میرے اوپر کوئی خول نہیں ہے مائی لارڈ! اسی لیے میں بڑی آسانی کے ساتھ آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور اب سے نہیں، بہت پہلے سے۔ شاید تب سے جب..... جب میں نے پہلی دفعہ آپ کی اور نجمہ خالہ کی کہانی سنی تھی۔ آپ دونوں نے جو درد جھیلا تھا، وہ درد بچپن سے ہی میرے دل میں گھر بنانے لگا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی، آپ سے ملنا چاہتی تھی، کسی ایسی ہی بارش برساتی رات میں آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی زبان سے اس ٹریجڈی کے بارے میں سننا چاہتی تھی لیکن میں آپ سے بہت کم ملی تھی اور پھر یہاں پیرس میں ہوتے ہوئے تو آپ سے ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں آپ سے دور رہ کر آپ کو سوچتی رہی..... سوچتی رہی اور پھر یہی سوچ دھیرے دھیرے چاہت بن گئی اور محبت میں ڈھل گئی.....''

اس نے اپنے نرم رخسار کے نیچے دبے ہوئے شہزاد کے ہاتھ کو ہتھیلی کی طرف سے ہولے سے چوما اور اس کی آنکھ سے بہنے والے گرم آنسو شہزاد کی ہتھیلی پر ریںگ گئے۔

اس کے ہونٹ بدستور شہزاد کی ہتھیلی سے ٹکراتے رہے۔ وہ عجیب سوئی سوئی سی سرگوشیوں میں بولتی چلی گئی.....

''بہت درد ہوا تھا ناں؟ آپ کو بہت درد ہوا تھا ناں۔ جب نجمہ خالہ آپ سے بچھڑی تھیں۔ میں وہ سارا درد آپ سے لے لینا چاہتی ہوں۔ اس درد کے بدلے آپ کو اتنی محبت دینا چاہتی ہوں کہ آپ کو وہ سب کچھ بھول جائے۔ کاش آپ مجھے ایسا کرنے کی اجازت دے سکیں..... کاش۔''

''دیکھو عینی۔'' شہزاد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں یہاں رلانے کے لیے نہیں ہنسانے کے لیے آیا ہوں اور اگر تمہیں ایسے ہی رونا ہے تو پھر میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔''

چلے جانے کی بات پر، عینی کی گرفت شہزاد کے ہاتھ پر سخت ہوگئی۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں جی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پھر شہزاد کی نم ہتھیلی چومی۔

شہزاد نے بہ آہستگی اپنا ہاتھ عینی کے رخسار کے نیچے سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھی منطق ہے بھئی۔ ایک تو رو رہی ہو، دوسرے کہہ رہی ہو کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ کل کہو گی یہ خوشی کا بخار چڑھا ہوا ہے، یہ خوشی کی کھانسی ہو رہی ہے، وغیرہ وغیرہ.....''

وہ روتے روتے مسکرانے لگی۔ شہزاد کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ اس کا یہ انداز بھی ہو بہو نجمہ کے انداز سے ملتا تھا۔ روتے روتے ہنسنا، جیسے بادلوں میں دھوپ مسکرائے۔

اگلے پانچ چھ روز تک شہزاد نے روزانہ اوسطاً آٹھ دس گھنٹے عینی کے پاس گزارے، نتیجہ نہایت حوصلہ افزا رہا۔ وہ تیزی سے بہتر ہونے لگی۔ جمیل صاحب بھی گاہے بہ گاہے چکر لگا رہے تھے۔ ایک رات اسپتال کی انتظامیہ سے خصوصی اجازت لے کر شہزاد اور فرزانہ دونوں، اسپتال میں رہے۔ عینی سے گپ شپ کرتے رہے اور کارڈز وغیرہ کھیلتے رہے۔ ان پانچ چھ دنوں میں عینی تھوڑی بہت شاعری بھی کرتی رہی۔ شہزاد کمرے کے ڈسٹ بن میں اور اس کے بستر کے آس پاس مڑے تڑے کاغذ دیکھتا تھا جن پر انگلش پوئٹری کے ''آثار'' ہوتے تھے۔

ساتویں روز عینی اسپتال سے گھر شفٹ ہوگئی۔ وہ واقعی بہت بے باک تھی، کوئی بات بھی اپنے دل میں نہیں رکھتی تھی۔ وہ اب جمیل صاحب فرزانہ اور زارا کے سامنے صاف کہہ دیتی تھی..... میں مائی لارڈ کو پسند کرتی ہوں، ان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اب آگے ان کی اور آنٹی فاخرہ کی مرضی ہے کہ وہ اس زبردست آفر سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ میری طرف سے تو گرین سگنل ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا۔

شہزاد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ فرزانہ کسی حد تک بیٹی کے جذباتی پن سے ڈرتی بھی ہے۔ اس کے دل میں جیسے خوف بیٹھا رہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح پھر کوئی ایسی حرکت نہ کر جائے جس سے اس کی زندگی کو نقصان پہنچے۔ وہ اب بتدریج بیٹی کی ہاں میں ہاں ملانا سیکھ رہی تھی۔ جہاں تک جمیل صاحب کا تعلق تھا وہ بالکل اور طرز کے آدمی تھے۔ عرصہ دراز تک فرانس میں رہنے کے بعد وہ بالکل مقامی رہن سہن میں ڈھل چکے تھے۔ وہ اس سارے معاملے کو بے حد Lightly لے رہے تھے۔ ان کے نزدیک اگر ان کی بیٹی ایک بڑی عمر کے بندے کو پسند کر رہی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ایک بالغ لڑکی کا ذاتی معاملہ تھا اور اس حوالے سے اسے پوری آزادی حاصل

ہونی چاہیے تھی۔

عینی گھر شفٹ ہوگئی تو اس نے اصرار شروع کر دیا کہ شہزاد بھی ہوٹل چھوڑ کر ان کے گھر آجائے۔ شہزاد نے بڑی مشکل سے اسے روکا۔ بہرحال اس نے وعدہ کیا کہ وہ جتنے روز یہاں ہے سارا دن اس کے پاس گزارا کرے گا۔ جمیل اور فرزانہ دو منزلہ گھر میں رہتے تھے۔ یہ تقریباً 50 سال پرانا کلاسیکل ٹائپ فرنچ گھر تھا۔ یہاں بیشتر کام لکڑی کا تھا۔ عام گھروں کی طرح یہاں بھی گیراج موجود نہیں تھا اور گاڑی باہر سڑک پر کھڑی ہوتی تھی۔ ایک دن عینی نے فون پر فاخرہ سے بھی بات کی۔ جب وہ بات کر رہی تھی تو شہزاد بھی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے شہزاد کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ کہنے لگی..... ”یہ ہم دونوں کی ذاتی باتیں ہیں، میں آپ کو سننے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ جب شہزاد نے جانے سے انکار کیا وہ اس کو دھمکانے کے لیے چلانے لگی۔ ”پاپا..... پاپا۔“ شہزاد باہر نکل آیا۔

ایک روز عینی کے ماما پاپا کو ایک تقریب میں جانا تھا۔ زارا کے بچے کو فرزانہ اپنے ساتھ لے گئی تھی کیونکہ زارا آفس سے سات بجے کے قریب واپس آتی تھی۔ اس کے شوہر ریحان کے آنے کا وقت بھی تقریباً یہی تھا۔ عینی اور شہزاد گھر میں اکیلے تھے۔ عینی کو دوپہر اور شام کی دوا کھلانا بھی شہزاد ہی کی ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ اس کے کھانے کا دھیان بھی وہ ہی رکھتا تھا۔ بیمار ہونے کے بعد وہ گھر بھر کی بہت لاڈلی ہوگئی تھی۔ اس کی ذرا ذرا سی بات اور چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا بھی پورا خیال رکھا جا رہا تھا اور وہ اس صورتِ حال کو انجوائے بھی کر رہی تھی۔

اس روز وہ اڑ گئی کہ ہر صورت خالہ نجمہ کی پوری کہانی شہزاد کی اپنی زبان سے سنے گی۔ شہزاد نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ بڑی ”زبردست“ ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایزی موڈ میں صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عینی نے اپنی دونوں ٹانگیں سامنے شیشے کی منقش میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ شہزاد نے واقعات سنانا شروع کیے تو وہ پوری دلچسپی سے سننے لگی۔ وہ ہر واقعے کی پوری تفصیل جاننا چاہ رہی تھی۔ روداد سنتے سنتے اس نے اپنا سر شہزاد کے شانے سے ٹکا دیا اور اس کا ہاتھ اپنے کومل ہاتھ میں تھام لیا۔ گاہے بگاہے وہ اپنا سر شہزاد کے شانے سے ہٹاتی اور کوئی سوال پوچھتی تھی۔ مثلاً

نجمہ خالہ آپ کی امی جان کو کس طرح پکارتی تھیں؟

نجمہ خالہ نے آپ کو کتنی بار خط لکھا؟

پہلی بار آپ نے نجمہ خالہ کو کب پیار کیا؟

آپ کو اور نجمہ خالہ کو دھوکا دینے والی گڈو اب کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

شہزاد ان سارے سوالوں کے جواب اسے دیتا رہا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو تھوڑا سا نیچے کو کھسک کر نیم دراز ہوگئی اور اپنا سر کمال بے تکلفی سے شہزاد کی گود میں رکھ دیا..... وہ بہت حساس ہو چکی تھی۔ اپنی طبع کے خلاف ہونے والی ذرا ذرا سی بات کا بہت اثر لے لیتی تھی اور یہ اثر فوراً اس کے زرد چہرے سے ظاہر بھی ہونے لگتا۔ یہی وجہ تھی کہ شہزاد بھی اس کے سامنے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ وہ اسی طرح اپنے بال شہزاد کی گود میں بکھرائے لیٹی رہی۔

اسی دوران میں کال بیل ہوئی۔ شہزاد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے فرزانہ اور جمیل صاحب تھے، وہ توقع سے پہلے واپس آگئے تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، خاص طور سے فرزانہ بہت پریشان تھی۔ ”کیا ہوا فرزانہ؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”ہمیں پتا ہی نہیں تھا، ابا جان پاکستان سے آئے ہوئے ہیں، ابھی ان کا فون آیا تھا۔ وہ گھر پر آرہے ہیں..... اور..... میرا خیال ہے کہ انہیں پتا لگ گیا ہے کہ تم بھی یہاں پیرس میں ہو۔“

شہزاد کے سینے میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ تو گویا معاملہ خراب تر ہونے جا رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے ماما؟“ عینی نے باہر آکر پوچھا۔

فرزانہ پہلے تو تذبذب میں رہی، پھر اس نے صورت حال عینی کے بھی گوش گزار کر دی۔

شہزاد نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے فی الحال یہاں سے جانا چاہیے۔“

عینی تنک کر بولی۔ ”کیوں جانا چاہیے، ہم کوئی چور ہیں کہ اس طرح ڈریں۔ آپ یہیں رہیں گے۔“

جمیل نے بھی عینی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے شہزاد! انکل کوئی خاص تمہارے لیے ہی یہاں نہیں آئے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو یہاں ان کی پارٹنر شپ ہے، کام کے سلسلے میں وہ چار چھ مہینے بعد چکر لگاتے رہتے ہیں.....“

فرزانہ شوہر کی اس وضاحت سے مطمئن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے تھے۔

شہزاد نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بھائی جان..... لیکن مجھے تو اب ویسے بھی جانا تھا۔ ایک مقامی جرمن دوست سے ملنا تھا۔“

”آپ کہیں نہیں جائیں گے۔“ عینی نے شہزاد کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

دیں۔'' وہ دوبارہ نانا جہانگیر سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں نانا! اگر میں اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر کسی سے میرج کرنا چاہتی ہوں تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہے؟''

شہزاد نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے بولی۔ ''آپ ابھی چپ رہیں جی۔ میں نے نانا سے پوچھا ہے، انہیں جواب دینے دیں۔'' وہ سب پر حاوی نظر آرہی تھی۔

شہزاد کے ماموں جہانگیر کا چہرہ تپے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہوا۔ ایک بار پھر لگا کہ وہ سینے کی پوری طاقت سے چنگھاڑنا شروع کردیں گے مگر موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے بدستور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''عینی! لگتا ہے تو اپنے حواس میں نہیں ہے، تجھے پتا ہے تو کتنی بڑی بات کہہ رہی ہے؟''

''بڑی بات کہہ رہی ہوں، اس لیے بڑے حوصلے سے بھی کہہ رہی ہوں۔ میں جب شادی کروں گی، اپنی مرضی سے کروں گی اور میری مرضی آپ اچھی طرح جان گئے ہیں۔''

''یعنی تم شہزاد سے شادی کروگی؟'' ماموں جہانگیر نے سرخ آنکھیں جھپکائیں۔

''ہاں..... اگر اس شادی کو ہونا ہے تو پھر اس میں کون سی رکاوٹ ہے۔ مجھے بتائیں کون سی رکاوٹ ہے، ایک پڑھی لکھی، عاقل بالغ لڑکی اپنے لیے ایک شریک حیات چنے گی اور وہ شریک حیات ایک پڑھی لکھی لڑکی کو چنے گا۔ درمیان میں آپ کہاں سے آگئے جناب! اور کس ناتے سے آئے؟ مجھے بتائیں، کیا سوسائٹی اس کی اجازت نہیں دیتی؟ کیا قانون اس کی راہ میں رکاوٹ ہے، یا پھر مذہب کا کوئی معاملہ ہے؟''

''مذہب کو درمیان میں مت لاؤ عینی۔'' ماموں جہانگیر نے تنبیہ کی۔

''مذہب کو میں نہیں آپ جیسے ٹھیکیدار ہی ہر جگہ بیچ میں لاتے ہیں۔ میں آپ کو اس کا ثبوت دے سکتی ہوں بلکہ..... ثبوت ہے میرے پاس۔ میں لے کر آئی ہوں، اس نے ایک کاغذ نانا اور والدہ کے سامنے لہرایا، یہ ایک پرانا لیٹر پیڈ تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' نانا جہانگیر نے پوچھا۔

''یہ ایک خط ہے، پچیس چھبیس سال پرانا۔ آپ نے ماما کو لکھا تھا۔ ماما اس وقت شادی کے بعد سان فرانسسکو میں تھیں۔ اس خط میں آپ نے اس جھگڑے کا ذکر کیا ہے جو خالہ نجمہ کی شادی کے سلسلے میں پیدا ہوا تھا..... اور جس میں پڑنانی کا دودھ پینے کا کوئی معاملہ تھا، یہ دیکھیں..... یہ آپ ہی کا فقرے میں نے انڈر لائن کر رکھے ہیں، یہ پڑھیں.....

یہ آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔'' اس نے خط نانا کے سامنے لہرایا۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے، ان کا غضب بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''چلیں، میں خود آپ کو پڑھ کر سنا دیتی ہوں۔ آپ جناب نے بڑے عالمانہ انداز میں ارشاد فرمایا ہے، مجھے سوسائٹی کا کوئی ڈر ہے، نہ ہی میں اس کی پروا کرتا ہوں۔ قانون بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے لیے جو کچھ ہے میرا دین ہے اور دین کے احکام ہیں اور دین کا حکم یہ ہے کہ دودھ کی شراکت کی وجہ سے نجمہ کی حیثیت شہزاد کی خالہ کی ہو چکی ہے اس لیے یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

خط کے فقرے پڑھنے کے بعد عینی نے جلتی نظروں سے نانا کو دیکھا۔ ''تو جناب..... اب پچیس سال بعد آپ کا پیمانہ کیوں بدل رہا ہے؟ آپ اب بھی یہی کہیں کہ آپ سوسائٹی، اپنی ذاتی رائے اور اردگرد کے ماحول کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اب بھی کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے آپ کے نزدیک مذہب ہی اہم ترین معیار ہے۔ اب آپ مذہب کو درمیان میں نہ لانے کی بات کیوں فرما رہے ہیں؟''

''تم کیا جانتی ہو مذہب کے بارے میں؟'' ماموں جہانگیر بھڑکے۔ ''تمہارا کیا واسطہ ہے ان چیزوں سے؟''

''ہاں، میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس حوالے سے میری نالج آپ کی طرح نہیں لیکن اپنی زندگی اور اپنے موجودہ مسئلے کے بارے میں ضروری باتیں میں اب بھی جانتی ہوں جناب۔ میں آپ کے ساتھ پوری دلیل سے بات کر سکتی ہوں۔''

ماموں جہانگیر پھنکارے۔ ''مذہب تو یہ بھی کہتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے سامنے اف تک نہ کرو..... اور تم کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے پتا تھا، آپ کوئی اس طرح کا حوالہ ضرور دیں گے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں آپ نے اس طرح کے حوالے تب کیوں نہ ڈھونڈے جب آپ کا سارے کا سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے آپ نے نجمہ خالہ کی شادی ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہونے دینی۔ اس وقت کچھ ایسی Opinions بھی سامنے آئی تھیں جن میں ''شک کی رعایت'' دینے کی بات تھی۔ اس وقت آپ نے لچک کیوں نہ دکھائی؟ اس وقت تو آپ کا سارا زور ایسا فتویٰ ڈھونڈنے پر صرف ہو رہا تھا جو آپ کے ذہن کے عین مطابق ہو اور آپ نے دو چار نہیں، آٹھ دس نہیں، بیسیوں فتوے لے ڈالے۔ نہیں محترم نانا صاحب! بات یہ نہیں ہے، بات کبھی بھی یہ نہیں تھی۔ آپ جیسے لوگ مذہب، قانون اور معاشرے

کو صرف اپنے من پسند نتیجے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا دین ایمان صرف ''ضد'' ہوتی ہے..... صرف ''ضد''۔''

ماموں جہانگیر نے بہت برداشت کیا تھا۔ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ ان کا چہرہ دہکا اور وہ اپنے جانے پہچانے انداز میں دھاڑے۔ ''خاموش ہوجا..... اگر اب تو نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں زبان کھینچ لوں گا۔''

''تو کھینچ لیجیے زبان۔ آپ نے ہمیشہ زبانیں کھینچنے کے سوا اور کیا بھی کیا ہے لیکن یاد رکھیے میری آواز کو آپ زبان کھینچ کر بھی خاموش نہیں کرسکتے۔ میں پھر بھی بولتی رہوں گی۔''

''خاموش ہوجاؤ عینی۔'' شہزاد دھاڑا۔

''آپ چپ رہیں، آپ سب چپ رہیں۔'' وہ بھی جواباً دھاڑی۔ ''میں آج انہیں ان کے ہر سوال کا جواب دوں گی، میں دیکھتی ہوں آج ان کا غصہ کہاں تک پہنچتا ہے اور کون سی قیامت ڈھاتا ہے۔ یہ ہمیشہ چلاتے رہے ہیں اور آپ سب لوگ گنگ ہوکر سنتے رہے ہیں لیکن آج یہ چلائیں گے تو میں بھی چلاؤں گی۔ ہاں میں بھی چلاؤں گی۔''

اس کی آواز میں ان منہ زور پانیوں کا شور تھا جو مدتوں کسی پتھریلی دیوار سے سر پٹختے ہیں اور پھر ایک روز پتھروں میں شگاف ڈال کر طوفانی انداز میں بہہ نکلتے ہیں۔ شہزاد کو لگا کہ عینی کے لہجے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ کسی اور کی نارسائیاں، مجبوریاں اور بے زبانیاں ہیں جو آج ''مجسم آواز'' ہوکر عینی کے چنگھاڑتے الفاظ کا روپ دھار گئی ہیں۔

ماموں جہانگیر گرجے۔ ''الو کی پٹھی! تیری یہ مجال، میں تجھے جان سے مار دوں گا۔'' انہوں نے عینی کی طرف قدم بڑھائے۔

جمیل احمد درمیان میں آگئے۔ ''نہیں..... انکل..... پلیز ایسا نہ کریں، آپ کی آواز باہر تک جارہی ہے۔''

''اوئے تم ہٹ جاؤ پیچھے۔'' ماموں جہانگیر دھاڑے۔ ''تم کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو آج اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے، تم نے ہی اس بدبخت کو اتنی ڈھیل دی کہ آج یہ ہماری عزتوں کا جنازہ نکال رہی ہے۔''

''پلیز انکل، پلیز۔'' جمیل احمد نے انہیں سنبھالنا چاہا۔

فرزانہ نے پھنکار کر عینی سے کہا۔ ''عینی! کچھ حیا کر، دفع ہوجا یہاں سے۔''

''نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے آج یہ بات ختم کرنے دیں۔'' وہ سرتاپا مزاحمت، بن کر کھڑی تھی۔

ماموں جہانگیر ایک بار پھر اس کی طرف گئے لیکن عینی کو دبوچنے کے بجائے وہ سیدھا بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے لکڑی کا وزنی دروازہ کھولا اور زور سے آواز دی۔

''انوار..... انوار، اندر آؤ۔''

دو تین سیکنڈ میں بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گارڈ ٹائپ شخص اندر آگیا۔ وہ ہندوستانی یا پاکستانی تھا۔ اس نے پتلون قمیص پر سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ماموں جہانگیر نے عینی کو بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے پچھلے کمرے کی طرف بڑھے۔ ''میں تجھے تالے میں بند کروں گا..... آج ہی تیرا نکاح پڑھواؤں گا، آج ہی پڑھواؤں گا۔''

عینی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ بیماری نے اسے کمزور تو کر رکھا تھا۔ اس نے چلانا چاہا مگر ماموں جہانگیر نے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کھینچا تانی میں عینی کی قمیص پھٹی اور کہنی بھی زخمی ہوگئی۔ ماموں جہانگیر نے اسے ایک عقبی کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ صوفے پر گر گئی۔ ماموں جہانگیر نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔ پھر وہ گھومے اور خوفناک لہجے میں شہزاد کو مخاطب کیا۔ ''اگر تجھے بھی اپنی جان عزیز ہے ناں تو یہاں سے چلا جا۔ بس ایک دو دن کے اندر چلا جا۔ ورنہ وہ سب کچھ ہوگا جو تو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

عینی کمرے کے اندر چلا رہی تھی، وہ دروازے پر اور کھڑکیوں پر مکے برسا رہی تھی۔ جمیل احمد صاحب نے اپنے لرزتے کانپتے فربہ وجود کو سہارا دے کر آگے بڑھنا چاہا لیکن ماموں جہانگیر کے اشارے پر انوار نامی گارڈ نے انہیں روک دیا۔ ''آپ پیچھے ہٹ جائیں سر۔'' گارڈ نے بے لچک لہجے میں کہا۔ فرزانہ بھی گنگ کھڑی تھی۔

عینی کو کمرے میں بند کرتے ہوئے ماموں جہانگیر یہ بھول گئے تھے کہ اس کے پاس موبائل فون بھی ہے۔ بہ مشکل تین چار منٹ گزرے ہوں گے کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں فرزانہ کے گھر کے عین سامنے آرکیں۔ چند لمحے بعد کال بیل ہوئی اور دروازے پر زوردار دستک بھی۔

شہزاد نے دیکھا ماموں جہانگیر کا سرخ انگارہ چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا موچھیل گارڈ بھی پریشان نظر آیا۔ جمیل احمد صاحب نے دروازہ کھولا، فرنچ پولیس کے قریباً چار عدد باوردی اہلکار اندر گھس آئے۔ انہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، بند کمرے میں عینی کے چلانے کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک اہلکار نے ہولسٹر میں سے پستول برآمد کرلیا تھا۔ دوسرے دو اہلکاروں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ عینی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تیزی سے باہر آگئی۔ وہ فرنچ زبان میں تیزی سے کچھ کہنے لگی۔ وہ اپنی خون آلود کہنی بھی اہلکاروں کو دکھا رہی تھی۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں مزید پولیس بھی دروازے پر پہنچ گئی۔

یہ سب کچھ بس تین چار منٹ کے اندر وقوع پذیر ہوگیا۔ عینی کے ابتدائی بیانات سننے کے فوراً بعد پولیس اہلکاروں نے ماموں جہانگیر اور ان کے گرانڈیل گارڈ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ماموں کے چہرے کی دائمی سرخی ہلکی سی زردی میں بدل چکی تھی۔ انہیں جیسے حالات کی اس تیز رفتار تبدیلی پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ فرزانہ نے شکستہ فرنچ میں پولیس اہلکاروں سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ یقیناً وہ اپنے والد کے لیے کوئی رعایت حاصل کرنا چاہ رہی تھی لیکن رعایت یہاں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ماموں جہانگیر اور ان کے گارڈ کو دھکیل کر گاڑی میں بٹھایا گیا۔ عینی اور جمیل صاحب کو علیحدہ گاڑی میں بٹھایا گیا اور بٹھانے سے پہلے عینی کو کچھ طبی امداد بھی دی گئی، اس کے بعد گاڑیاں تیزی سے پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئیں۔ اردگرد کے گھروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں سے تماشائی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

شہزاد یہاں پردیسی تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔ فرزانہ بھی مسلسل رو رہی تھی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد عینی اور جمیل صاحب تو ٹیکسی کے ذریعے واپس آگئے۔ جہانگیر صاحب اور ان کے ملازم کو بلاتردد سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

شہزاد کے ماموں جہانگیر کو گرفتار ہوئے چودہ پندرہ روز ہو چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ "مقامی نظام انصاف" کے نہایت سخت شکنجے میں آگئے تھے۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک بالغ لڑکی پر تشدد کیا۔ اس کی شخصی آزادی میں سنگین مداخلت کی اور اپنی مرضی کی شادی کے لیے اسے حبس بے جا میں رکھا وغیرہ وغیرہ۔ کورٹ سے ان کی ضمانت مشکل نظر آرہی تھی۔ اس ضمانت کے لیے ضروری تھا کہ عینی اپنے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا کرے اور نرم بیانات دے۔

فرزانہ کا رو رو کر برا حال تھا کبھی وہ عینی کو کوستی، کبھی اس کی منت سماجت میں مصروف ہوجاتی تھی۔ گاہے بہ گاہے اسے اپنے والد کی آتش مزاجی پر بھی رنج ہوتا تھا۔ ماموں جہانگیر کے طیش کی وجہ سے بات نہ صرف کورٹ کچہری تک گئی تھی بلکہ اردگرد کے پڑوسیوں کے ہاتھ بھی ایک دلچسپ موضوع آگیا تھا۔

شہزاد تین چار دن تو ہوٹل میں ہی رہا تھا۔ وہ وہاں سے واپسی کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن پھر فرزانہ نے ہاتھ جوڑ کر اسے جانے سے روک لیا۔ اس نے شہزاد کی منت کی کہ وہ عینی کو اپنے بیانات بدلنے کے لیے آمادہ کرے، وہ کسی کی بات نہیں مان رہی ہے۔

اس حوالے سے ایک روز دریائے سین کے کنارے سبزے پر بچھی ہوئی سنہری دھوپ میں شہزاد اور عینی کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ عینی اب روبہ صحت تھی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں اب پھر سرخی مائل جلد کے نیچے چھپنا شروع ہوگئی تھیں..... اپنی گفتگو کے آخر میں شہزاد نے کہا۔

"عینی کچھ بھی ہے، ہمیں اس سنگین معاملے کو اب اور سنگین نہیں کرنا چاہیے۔ بہرطور ہمارے آپس میں خونی رشتے ہیں، ہمیں ایک ساتھ جینا ہے۔ اگر اب ماموں کے رویے میں نرمی پیدا ہوئی ہے تو ہمیں بھی کچھ نرمی پیدا کرلینی چاہیے۔ انہیں اس مصیبت سے نکالنا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ چھ سات روز بعد شارق اور سکندر (ماموں کا دوسرا بیٹا) بھی پاکستان سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں ان کی آمد سے پہلے ہی معاملے میں سدھار پیدا کرلینا چاہیے۔"

"آپ کا مطلب ہے ان دونوں سے ڈر کر؟"

"نہیں عینی! مجھے صرف اور صرف تمہاری ماما کا خیال آتا ہے، کچھ بھی ہے آخر وہ بیٹی ہے۔ جس طرح تمہارے لیے جمیل بھائی جان اہم ہیں، اس کے لیے ماموں جہانگیر ہیں۔"

اس نے دریائے سین کی بہت سی تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں اتاری اور بالوں کو پیچھے جھٹک کر بولی۔

"ٹھیک ہے مائی لارڈ! اگر آپ کی عدالت نرمی کا مظاہرہ کر رہی ہے تو میں بھی اس بارے میں سوچوں گی۔"

"سوچنا نہیں ہے عینی! یہ کرنا ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر لاڈ سے کہنے لگی۔ "اوکے..... لیکن میری دو شرطیں ہیں۔"

"وہ کیا کیا؟"

"پہلی یہ کہ پرسوں ہفتہ ہے، پرسوں کا سارا دن، آٹھ بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک آپ میرے ساتھ..... صرف میرے ساتھ، پیرس کی سیر کرتے ہوئے گزاریں گے۔"

"اور دوسری شرط؟"

وہ قدرے سنجیدہ ہوگئی۔ ''دوسری یہ جناب کہ آپ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتے ہوئے کسی دباؤ کے بغیر وچیں گے اور جو فیصلہ کریں گے اپنے دل کی آواز کے مطابق کریں گے۔'' وہ دونوں فٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''یہ دوسری شرط کافی کڑی ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''اور یہی زیادہ اہم ہے جی۔ اگر آپ نے یہ پوری کرنے کا وعدہ نہیں کیا تو پھر میں کچھ نہیں کروں گی۔''

''کچھ نہیں سے کیا مطلب؟''

''نہ کورٹ میں کوئی نرم بیان دوں گی..... نہ ٹھیک ہوں گی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ایک دم پھر بیمار پڑ جاؤں گی اور اس مرتبہ شاید آپ جناب بھی مجھے اسپتال سے نکال نہیں سکیں گے۔'' اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔

''خبردار، اب بیمار ہونے کی بات نہیں کرنا۔'' شہزاد نے بے چین ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا لیکن پھر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ لوگ ان دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس نے جلدی سے اپنا بازو اس کے کندھوں سے ہٹا لیا۔ اس کے اس طرح کرنے پر عینی نے چلتے چلتے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلکش احتجاج نظر آیا۔ بڑے ٹھسے سے اس نے شہزاد کا بازو پکڑ کر دوبارہ اپنے کندھوں پر رکھا اور شہزاد کے بالکل ساتھ لگ گئی۔ اس کا چہرہ شہزاد کے سینے میں دھنس رہا تھا..... اور وہ دونوں اسی طرح چلتے جا رہے تھے۔ شہزاد نے محسوس کیا کہ یہ اس کی غلط فہمی تھی، کوئی بھی ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنے حال میں مست، رواں دواں تھے۔

''کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔'' وہ شہزاد کی کمر میں بازو حمائل کر کے منمنائی۔

شہزاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سامنے ہی وہ بلند و بالا ہوٹل نظر آ رہا تھا جہاں شہزاد پچھلی مرتبہ آ کر ٹھہرا تھا۔ شہزاد نے چونک کر بائیں طرف دیکھا..... وہاں سڑک سے نیچے اترتی ہوئی چوڑی سیڑھیاں تھیں جو بالکل دریا کے کنارے تک جاتی تھیں۔ یہاں سبزہ تھا اور پتھر کے بینچ پڑے تھے، شہزاد کی نظر دائیں بائیں کچھ تلاش کرنے لگی۔

عینی بولی۔ ''ان دونوں بوڑھوں کو دیکھ رہے ہیں ناں جو یہاں نظر آیا کرتے تھے؟''

''ہاں..... وہ آج تو نظر نہیں آ رہے۔''

''اب وہ شاید کبھی نظر نہیں آئیں گے۔'' عینی کھوئی کھوئی سی بولی۔ ''آپ کے جانے کے تین چار ماہ بعد میں بھی یہاں آئی تھی۔ وہ دونوں اس وقت بھی نہیں تھے۔ پھر میں نے یہاں گھومنے والے دو تین بندوں سے پوچھا۔ ایک فرنچ لڑکی نے بتایا۔ ان میں سے ایک، تین ماہ پہلے نمونیے کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ دوسرا یہ جگہ چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید کسی دور دراز گاؤں کی طرف۔ وہ فرنچ لڑکی بھی ان دونوں کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ عرصۂ دراز سے یہاں نظر آتے تھے۔ کون تھے؟ کیا کرتے تھے۔ ان کا ماضی کیا تھا؟ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی آخری نشانی کی طرح وہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہتے تھے۔''

''یعنی، اب ہم ان کے بارے میں کبھی نہیں جان سکیں گے؟''

''ہاں، کبھی نہیں۔''

''تو ٹھیک ہے عینی! پرسوں ہم سیر کے لیے نکلیں گے تو سب سے پہلے ایفل ٹاور ہی چلیں گے۔ کہیں پھر یہ ٹاور بھی ایک تجسس ہی نہ رہ جائے۔''

وہ ہنسی۔ ''ہاں، ہر قسم کے تجسس کو جلد دور ہو جانا چاہیے کیونکہ وقت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔''

پتھر کی روش پر چلتے چلتے وہ کچھ اور بھی شہزاد کے ساتھ پیوست ہوگئی۔ شہزاد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے ایسا کرنے دیتا۔

☆☆☆

اور یہ ایفل ٹاور تھا۔ ایک ماورائی مقام، کہانیوں اور افسانوں کا محور، سپنوں کی تعبیر..... اور وہ ان کے سامنے تھا۔ نوٹرے ڈیم کلیسا اور مونا لیزا کی تصویر کی طرح وہ بھی کہہ رہا تھا..... ہاں میں ایفل ٹاور ہوں..... فرانس کی اہم ترین پہچانوں میں سے ایک پہچان۔ تم مجھے اور فرانس کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے .... میں سرتاپا آہن ہوں۔ 7300 ٹن لوہا اپنے اندر سموئے..... اپنے 984 فٹ بلند وجود کے ساتھ میں قریباً 120 سال سے پیرس کے وسط میں کھڑا ہوں اور زمانے کے سرد گرم کا سامنا کر رہا ہوں۔ میں نے دنیا کی دو عظیم جنگیں دیکھی ہیں۔ میں تاریخ کو تہ و بالا کرنے والے لاتعداد واقعات کا شاہد ہوں۔ دریائے سین کے ساتھ میری دوستی غیر متزلزل ہے۔ ہم دونوں نے یہاں اپنے سبزہ زاروں میں محبت کی لاتعداد کہانیاں شروع ہوتے، پروان چڑھتے اور انجام پاتے دیکھی ہیں۔ آج تم میرے روبرو ہو، کل کوئی اور ہوگا..... میں اپنے بے مثال

خالق انجینئر الیگزینڈر ایفل کی طرف سے تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔

یہ ہفتے کی صبح تھی۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ ہلکی پھوار کے بعد چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔ چاروں طرف سیاح.... انڈے پڑ رہے تھے۔ دریائے سین، ٹاور کے پاس سے گزرتا ہے اور قرب وجوار کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ ٹاور کے گرد سبزہ زاروں میں لوگ چادریں اور چٹائیاں وغیرہ بچھائے بیٹھے تھے۔ دریا پر ان گنت چھوٹی بڑی کشتیاں تیر رہی تھیں اور ان پر خوش باش لوگوں کا ہجوم بھی تھا۔ موسیقی کی دھنیں فضا میں بکھر رہی تھیں اور چاروں طرف خوشبوؤں کا بسیرا تھا۔ عینی بڑی بے باکی سے شہزاد کا ہاتھ پکڑے چل رہی تھی۔ اس کے بال ہوا کے زور سے بار بار جھومتے اور شہزاد کے چہرے سے ٹکراتے تھے۔ یہ بال جیسے اسے ''ان چاہی'' راہوں پر چلنے کے لیے اکساتے تھے..... اور وہ بتدریج اپنے اندر کی مزاحمت کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔ ایسا ہو رہا تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے ایک جگہ سے چیری لی اور گھومتے پھرتے، کھاتے رہے۔

ٹاور کے اوپر جانے کے لیے دو طرح کے ٹکٹ تھے۔ ایک تقریباً ساڑھے تو یورو کا دوسرا ساڑھے چودہ یورو کا۔ شہزاد کا خیال تھا کہ شاید سستا ٹکٹ لینے والے کو سیڑھیوں کے ذریعے ٹاور پر جانا ہوگا اور مہنگا لینے والے کو لفٹ کی سہولت مہیا کی جائے گی۔ عینی اس پر بہت ہنسی۔ ہنستے ہنستے اس نے شہزاد کو بتایا کہ سستا ٹکٹ ٹاور کی پہلی منزل تک لے جاتا ہے اور مہنگا ٹاور کے ٹاپ پر۔ دونوں ٹکٹ ہولڈرز لفٹ کے ذریعے ہی جاتے ہیں۔

ایفل ٹاور مکمل طور پر لوہے کا ہے جس پر موٹا خاکستری روغن چڑھا دیا گیا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر یہ شہزاد کو لوہے کے ہزار ہا چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک مجموعہ نظر آیا۔ جنہیں انجینئر حضرات لاکھوں بولٹس کے ذریعے آپس میں جوڑتے چلے گئے تھے۔ طویل قطار سے گزرنے کے بعد وہ لفٹ تک پہنچے۔ یہ لفٹ خاصی بڑی تھی۔ ایک وقت میں سو سے زیادہ افراد اس میں سما سکتے تھے۔ اس لفٹ نے انہیں ٹاور کی پہلی منزل تک پہنچایا۔ یہاں سے چھوٹے سائز کی پانچ چھ لفٹیں چلتی تھیں جو ٹاور کے ٹاپ تک پہنچاتی تھیں۔ اس جگہ انہیں بیچ در بیچ قطار میں بہت انتظار کرنا پڑا۔ یہاں جوڑے ایک دوسرے میں گم نظر آتے تھے اور بوس وکنار کے مناظر عام تھے۔ شاید یہ ماحول عینی پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے بے تکلفی سے شہزاد کی کمر کے گرد بازو حمائل کر دیتی تھی اور اس کے کندھے سے چپک جاتی تھی۔

اس طویل قطار میں کھڑے کھڑے شہزاد نے بے حد سنجیدگی سے سوچا۔ ''شہزاد! تم کدھر جا رہے ہو۔ تمہارے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی ہے اور یہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنے اندر کی تبدیلیوں پر اچھی طرح غور کر لو۔ کہیں تم بھی تو ان بڑی عمر کے مردوں میں شامل نہیں ہو رہے جو اوپر سے تو پارسا بنتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کسی نازنین کی نگاہوں کا مرکز بننے کی خواہش مچلا کرتی ہے اور جب اتفاقاً ایسی خواہش پوری ہونے کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں تو ان کا نفس خوشی سے پھول کر کپا ہو جاتا ہے۔ وہ اسے صنف مخالف پر ایک بڑی فتح سمجھتے ہیں۔ وہ بظاہر گریز کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر دبی ہوئی آرزوئیں، انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتی ہیں۔ ان آرزوؤں کی تکمیل کے پیش نظر وہ ان سارے مسائل کو فراموش کر دیتے ہیں جو ان کے بے جوڑ تعلق سے پیدا ہونے والے ہوتے ہیں..... ہاں سوچ لو شہزاد۔

وہ اپنے خیالوں میں غرق رہا اور خود ہی سے الجھتا رہا۔ اسی کیفیت میں وہ ٹاور کے ٹاپ پر پہنچ گئے۔ یہاں سے پیرس کا نظارہ نہایت دل آویز تھا۔ ٹاور کے دیوہیکل قدموں میں سبزہ زاروں کی رونق اور دریا کی لہروں پر کشتیوں اور بجروں کے جمگھٹے، یہ سب ہوشربا مناظر تھے۔ ان ہوشربا مناظر کو زیادہ وضاحت سے دیکھنے کے لیے ٹاور پر ٹیلی اسکوپس بھی نصب تھیں۔ ان میں ایک یورو کا سکہ ڈال کر کئی منٹ تک پیرس کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ عینی نے شہزاد کی گردن پر اپنی خوبصورت ناک رگڑی۔ ''کس سوچ میں کھو گئے ہیں مائی لارڈ؟''

''کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔''

''یہ تو کسی انڈین گانے کے بول ہیں؟ کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔ اچھا چلیں چھوڑیں اس بات کو۔ اپنے باکمال ہاتھوں سے میری ایک تصویر کھینچیں۔'' اس نے اپنے طویل بال، ہیئر کیچر میں سے نکالے اور بڑی بے باکی سے پوز بنا کر کھڑی ہو گئی۔ شہزاد نے تصویر کھینچی۔ شہزاد کی کھینچی ہوئی ہر تصویر پر وہ دل وجان سے فدا ہو جاتی تھی۔

کافی دیر تک ٹاور سے پیرس کا نظارہ کرنے کے بعد وہ آٹھ دس زینے اتر کر ذرا کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہاں کرسیاں وغیرہ بھی رکھی تھیں۔ ٹاور سے اتاری گئی پیرس کی بڑی بڑی تصویریں بھی یہاں آویزاں تھیں، عینی نے پتا نہیں کیسے اور کہاں سے دو آئس کریم کو نشر حاصل کر لیں۔ اس نے اصرار کر کے شہزاد کو آئس کریم کھلائی لیکن اپنی یونہی ہاتھ میں

پکڑے رکھی۔ جب شہزاد ایک چوتھائی کھا چکا تو اسی نے شہزاد والی آئس کریم لے کر اس کے ہاتھ میں اپنی تھما دی۔

"یہ کیا؟" شہزاد نے حیرت سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک محبت بھری شوخی ابھری۔ وہ کچھ کہے بغیر شہزاد والی آئس کریم کھانے لگی۔" میں آپ کو صرف خیالوں اور سپنوں میں دیکھتی تھی کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن آئے گا جب آپ اس طرح میرے ساتھ ہوں گے۔ آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوگا اور ہم پیرس میں گھوم رہے ہوں گے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ قریباً یہی وقت تھا جب شہزاد کی نگاہوں میں بجلی سی کوند گئی۔ کوئی شخص اندھا دھند اس پر جھپٹا۔ اضطراری طور پر شہزاد نے خود پیچھے ہٹایا، ایک اچٹتا ہوا سا ہاتھ، اس کی گردن پر پڑا۔ آئس کریم کون شہزاد کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا لیکن یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ شارق تھا اور ایک بار پھر دیوانہ وار اس پر جھپٹ رہا تھا۔ تب شہزاد نے دیکھا کہ ایک جسم اس کے اور شارق کے درمیان آ گیا ہے۔ یہ عینی تھی وہ زور سے چلائی اور اس نے پوری طاقت سے شارق کو روکا۔ شارق جیسے طیش کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے اسے کسی گڑیا کی طرح اچھال کر ایک طرف پھینک دیا.....

اردگرد تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ مرد و زن شور مچاتے گرتے پڑتے چاروں طرف بھاگے۔

شارق نے لوہے کی ایک کرسی اٹھائی اور پوری قوت سے شہزاد کو دے ماری۔ شہزاد کرسی کو اپنے ہاتھوں پر لیتا ہوا دور جا گرا۔

"حرامزادے..... جنگلی کی اولاد..... آج میں تیری جان لے لوں گا۔" شارق کا لہجہ خوفناک تھا۔ وہ بالکل جنونی دکھائی دے رہا تھا۔

پھر شہزاد نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ شارق کے ہاتھ میں کوئی سیاہ چیز نظر آئی، بلاشبہ یہ چھوٹے سائز کا جدید پستول تھا۔ ایک بپھرے ہوئے دشمن کے ہاتھ میں اس طرح پستول کو دیکھنا ایک خوفناک نظارہ تھا۔

اس سے پہلے کہ شارق پستول سیدھا کرتا اور شہزاد کو نشانہ بناتا، عینی کسی چیل کی طرح جھپٹی اور شارق سے لپٹ گئی۔ ساتھ ساتھ وہ پکار رہی تھی۔ "ہیلپ..... ہیلپ۔"

اس کی دلیری دیدنی تھی، اچانک فائر ہوا، یہ گولی شارق کے ہاتھوں سے بے ساختہ چلی تھی۔ شہزاد لپکا اور عینی کی مدد کرنے لگا۔ اس نے شارق کا پستول والا ہاتھ اس طرح مروڑا کہ پستول کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب دو تین پولیس اہلکار بھی شارق سے لپٹ گئے۔ انہوں نے شارق سے پستول چھین کر اسے اوندھا گرایا اور اس کے ہاتھ آہنی ہتھکڑی میں جکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے شارق کو بے بس کیا جا چکا تھا۔

اور تب شہزاد کو صورت حال کی ایک دوسری سنگینی کا پتا چلا۔ شارق کے پستول سے نکلنے والی اعشاریہ پچین کی گولی ایک دس بارہ سالہ خوبصورت لڑکے کے جبڑے میں لگی تھی، وہ زخمی حالت میں ایفل ٹاور کے جنگلے کے پاس پڑا تھا اور ایک عورت جو یقیناً اس کی ماں تھی دلدوز انداز میں چلا رہی تھی۔ لڑکے کا خون کنکریٹ کے فرش پر گل کاری کر رہا تھا۔

ایفل ٹاور پر سے پیرس بڑا خوبصورت نظر آتا تھا مگر ایک دم شہزاد کو لگا کہ پورے پیرس پر خون کے چھینٹے پڑ گئے ہیں۔ منظر اس کی نگاہ میں دھندلا رہے تھے۔ عینی روتی ہوئی اس کی بانہوں میں سما گئی۔

☆☆☆

یہ مکافات عمل تھا۔ شارق ایک ایسے سنگین مسئلے میں پھنس گیا تھا کہ اس کے مقابلے میں ماموں جہانگیر والا معاملہ بھی ہیچ تھا۔ اس کی گولی سے ایک معروف مقامی لیڈی ڈاکٹر کا بیٹا شدید زخمی ہوا تھا۔ جس پستول سے گولی چلائی گئی تھی وہ بھی ناجائز اسلحے کے زمرے میں آتا تھا۔ اس کیس میں شارق کو نو دس سال تک سزا ہو سکتی تھی۔ ماموں جہانگیر اور ان کی ساری فیملی ایک دم اپنے گھٹنوں پر آ گئی۔ وہ لوگ اب عینی اور اس کے والدین کی منت سماجت میں مصروف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اور کچھ نہیں تو خاندان کا سربراہ تو سلاخوں سے باہر آ جائے۔ درحقیقت شارق کی بدقسمتی ہی اسے وقت سے پہلے یہاں پیرس میں کھینچ لائی تھی۔ اسے دس تاریخ کو آنا تھا مگر وہ پانچ تاریخ کو ہی چلا آیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے معلوم کر لیا تھا کہ شہزاد کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے..... پھر ہفتے کی صبح اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شہزاد اور عینی گھومنے پھرنے کے لیے سرخ بس جو گاڑی پر کس طرف گئے ہیں۔ وہ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایفل ٹاور پہنچا اور وہاں وہ سنگین ترین واقعہ رونما ہو گیا۔

قریباً ڈیڑھ ماہ بعد لواحقین کی ان تھک کوششوں اور عینی کی مہربانیوں سے ماموں جہانگیر کی بیل ہو گئی مگر شارق کا معاملہ طویل اور سنگین تھا۔ آئندہ کئی برسوں تک اس کی جان چھوٹتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

شہزاد کا ویزا ختم ہونے میں ابھی آٹھ روز باقی تھے جب پاکستان میں اس کی بات فاخرہ سے ہوئی۔ وہ یہاں کے بیشتر حالات سے آگاہ ہو چکی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماموں جہانگیر اینڈ فیملی ان واقعات کے بعد مکمل طور پر پسپا ہو چکی ہے۔ کچھ لوگوں کے اصل دم خم کا پتا کڑی آزمائش کے وقت ہی چل پاتا ہے اور ماموں جہانگیر اینڈ فیملی کا بھی پتا چل گیا تھا۔ اس روز فاخرہ نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''شہزاد! میری زندگی کا اب کوئی پتا نہیں۔ زیادہ بھی جیوں گی تو دو تین سال سے زیادہ کیا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بات آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ کیا آپ میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟''

''کیا کوئی نئی بات کرنے جا رہی ہو؟''

''نہیں شہزاد! بات تو وہی پرانی ہے۔ کاش آپ کوئی نیا جواب دے دیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب آپ یہاں واپس آئیں تو عینی آپ کے ساتھ ہو؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کیسے آ سکتی ہے؟''

''آپ کی بیوی بن کر۔ میری بہن بن کر۔ مجھے آپ کی قسم ہے شہزاد! میں اتنا خوش ہوں گی کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ مجھے لگے گا کہ مجھے ہی نہیں آپ کو اور میرے بچوں کو بھی زندگی بھر کا تحفظ مل گیا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے شہزاد۔ وہ جیسی بھی ہے لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ آپ کی اور میرے بچوں کی ساری محرومیوں کو دور کر دے گی۔ وہ آپ ہی کو نہیں ہم سب کو بھی بہت چاہتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں شہزاد! میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے سیج سجاؤں گی، عینی کو دلہن بناؤں گی۔ پلیز شہزاد..... پلیز.....'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فون پر سسکیاں بھرنے لگی۔

فاخرہ نے بہت زور لگایا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر شہزاد چاہے تو وہ ان سات آٹھ روز کے اندر ہی عینی کو بڑی سادگی سے دلہن بنا کر پاکستان لا سکتا ہے..... اور یقیناً ایسا ہو سکتا تھا۔ عینی اور جمیل صاحب کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ فرزانہ بھی اچھی طرح جان چکی تھی کہ عینی کے کسی فیصلے سے اختلاف کرنا کتنا کٹھن ہو سکتا ہے لیکن شہزاد کا ذہن کسی طور اس طرف نہیں آ سکتا تھا۔ اپنی اور عینی کی عمر کا ''تفاوت'' اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا پھر ایک احساس یہ بھی تھا کہ وہ فرزانہ کی بیٹی ہے۔

اس نے اگلے قریباً اڑتالیس گھنٹے میں سیکڑوں ہی سگریٹ پھونک ڈالے۔ اپنے آپ سے الجھتا رہا اور اپنی سوچوں سے برسرِ پیکار رہا لیکن بدھ کی اس دھند آلود صبح کو جب وہ پیرس سے روانہ ہوا تو اکیلا ہی تھا۔ فرزانہ، جمیل اور عینی تینوں اسے ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کے لیے آئے۔ عینی بالکل خاموش تھی۔ وہ پچھلے تین چار دن سے تقریباً خاموش ہی رہی تھی۔ اسے جیسے آخر وقت تک توقع تھی کہ شہزاد کچھ بولے گا، کچھ کہے گا۔ یہاں تک کہ ایئرپورٹ پر آخری لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں میں آس کے دیے جل بجھ رہے تھے مگر وہ چپ رہا تھا، کسی پتھر کی طرح اور پھر جب جہاز نے ایئرپورٹ سے ٹیک آف کیا اور نیچے دور تک محبتوں کا شہر پیرس بجھا ہوا دکھائی دیا..... تو شہزاد کا پتھر سینہ پتھر نہ رہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی جاگی اور آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ وہ جو زندگی میں کبھی نہ رویا تھا، تمناک تھا اور وہ سخت حیران تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس نے نشست سے ٹیک لگا کر ٹشوز آنکھوں پر رکھ لیے اور خاموش پانی کو بہنے دیا۔

اس نے سوچا، کیا کہیں عینی بھی رو رہی ہے۔ اگر وہ رو رہی تھی تو اس کا مطلب تھا، نجمہ کی آنکھیں رو رہی ہیں۔ اس کا دل جیسے کسی مٹھی میں آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں کراہا..... مجھے معاف کر دینا نجمہ! میں نے تمہاری آنکھوں کو آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دیا، اٹھائیس سال پہلے بھی اور اب بھی۔ مجھے معاف کر دینا۔

انگلش میں اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ معزز خواتین و حضرات، ہم 36000 فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے قریباً آٹھ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے ''جنیوا'' کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جہاز سے باہر درجۂ حرارت ہے منفی 20 سینٹی گریڈ، ہماری فائنل ڈیسٹی نیشن کراچی ہے۔

☆☆☆

اور اب وہ پھر کراچی میں تھا۔ فاخرہ کو چپ سی لگ گئی تھی..... شہزاد نے اس کی ہر التجا رد کر دی تھی اور اس کا قلق اس کی آنکھوں سے صاف جھلکتا تھا۔ دھیرے دھیرے دو تین ہفتوں میں شہزاد کی مصروفیات معمول پر آنے لگیں۔ اس دوران میں ایک دو بار شہزاد نے پیرس میں فرزانہ سے رابطہ بھی کیا۔ وہاں ابھی تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ شہزاد کو زیادہ اندیشہ عینی کی طرف سے تھا۔ اگر وہ حالات کا زیادہ اثر لیتی تو پھر بیمار پڑ سکتی تھی۔ دو تین بار فرزانہ نے کہا بھی کہ وہ عینی سے بات کرے مگر شہزاد کنی کترا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عینی جلد از جلد خود کو نارمل کرے اور وہ کر سکتی تھی۔ اس میں قوتِ ارادی کی کمی نہیں تھی۔ دن گزرتے رہے، واقعات کی گرد میں پرانے

واقعات دہتے رہے۔ پیرس میں شارق پر کیس چل رہا تھا اور اسے سزا ہونا یقینی تھی، ڈھائی تین ماہ بعد پاکستان میں سردیاں شروع ہوگئیں۔ سردیوں کے آغاز میں ہی فاخرہ کی طبیعت پھر بگڑ گئی، یوں تو وہ بستر پر ہی رہتی تھی، اب اس کے لیے وہیل چیئر تک آنا بھی دشوار ہوگیا۔ اسے دس پندرہ روز اسپتال میں رکھا گیا..... کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اسپتال کی بھاگ دوڑ سے پریشان ہوکر وہ پھر گھر جانے پر مصر ہوگئی۔

شہزاد نے کوشش کرکے گھر میں ہی اسے اسپتال کی بیشتر سہولتیں مہیا کردیں۔ ایک نرس تو ویسے بھی ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔

کبھی کبھی شہزاد تنہائی میں بیٹھتا تو سوچتا کہ شاید اسے فاخرہ کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ اس نے کتنے درد کے ساتھ التجا کی تھی، بلکہ التجائیں کی تھیں۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہوگیا اور وہ یہ بات اپنے دل میں ہی لے کر چلی گئی تو وہ باقی زندگی خود کو کوستا رہے گا، لیکن اب دوسری طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ عینی نے بتدریج خود کو سنبھال لیا ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں صرف ایک مرتبہ فرزانہ کی موجودگی میں عینی کے ساتھ فون پر مختصر بات ہوئی تھی۔ وہ نارمل ہی محسوس ہوئی تھی۔ سب سے بڑا اندیشہ جو شہزاد کو اس کی بیماری کی طرف سے تھا وہ بھی غلط ہی ثابت ہوا تھا۔ اس نے کوئی اور الٹی سیدھی حرکت بھی نہیں کی تھی۔ تو کیا وہ آہستہ آہستہ اسے بھول رہی ہے؟ شہزاد سوچتا۔ اس کا کوئی واضح جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ کسی وقت وہ اپنے دل میں جھانکتا تو وہاں سے بھی کوئی واضح جواب نہ ملتا۔ وہاں جو ایک خلا سا پیدا ہوچکا تھا وہ موجود تھا۔ اس خلا میں عینی اپنے تمام تر بچپنے اور تمام تر دانائی کے ساتھ موجود تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی یادیں۔

ایک دن فون پر حسنات سے مختصر بات ہوئی۔ حسنات کو اپنے طور پر پیرس کی تھوڑی بہت خبر رہتی تھی۔ اس نے شہزاد کو بتایا کہ آج کل عینی یونیورسٹی کے ساتھیوں کے ساتھ آسٹریا کے سفر پر نکلی ہوئی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کا یہ گروپ کسی ''چیریٹی'' پروگرام کے لیے بھی کام کررہا ہے۔ اس گروپ سے کچھ ارکان اسٹیج پر بھی پرفارم کرتے ہیں۔

ہاں تو کیا وہ آہستہ آہستہ اسے بھول رہی ہے؟

ایک رات بستر پر چت لیٹے لیٹے ایک خیالی منظر شہزاد کے پردۂ تصور پر ابھرا اور اس کا دل بے نام درد سے بھر گیا۔ اس نے چشم تخیل سے دیکھا۔ عینی ساڑھی پہنے ہوئے ایفل ٹاور کے سبزہ زاروں میں بھاگ رہی ہے۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کا فرانسیسی بوائے فرینڈ ہے۔ ایک کسرتی جسم اور سنہری بالوں والا خوبرو نوجوان..... دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور بھاگتے بھاگتے گاہے بہ گاہے ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ ان کے کانوں پر ہیڈفونز ہیں جن سے ابھرنے والی موسیقی کی تیز لہریں ان کی مستی میں اضافہ کررہی ہیں۔ شہزاد دریا کے کنارے پر بیٹھا انہیں دیکھ رہا ہے۔ انہی دو بوڑھوں کی طرح جو شاہِ بلوط کے درختوں تلے گم صم بیٹھے رہتے تھے۔

عینی اور اس کے بوائے فرینڈ کی نظر شہزاد پر پڑتی ہے۔ عینی ہنستے ہوئے انگلش میں کہتی ہے۔ ''آؤ، پروفیسر شہزاد! آؤ ہمارے ساتھ بھاگو۔''

شہزاد خاموش رہتا ہے۔ اس کا بوائے فرینڈ قہقہہ لگاتا ہے، کہتا ہے ''انکل جی کو دھوپ سینکنے دو، یہ یہیں پر اچھے لگتے ہیں۔''

''ہاں، ایسی چیزیں..... ایسی جگہوں پر ہی اچھی لگتی ہیں۔'' عینی بھی تائید کرتی ہے، پھر دونوں ہنستے ہوئے اوجھل ہوجاتے ہیں۔

شہزاد نے اس تصور سے گھبرا کر آنکھیں بند کیں۔ جب آنکھیں بند ہوئیں تو اسے اندازہ ہوا کہ وہاں نمی تیر رہی تھی۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شہزاد ایک طویل کمرشل کی ریکارڈنگ سے فارغ ہوکر اور ایک اخباری نمائندے کو انٹرویو دینے کے بعد رات بارہ بجے گھر آیا۔ فاخرہ خلاف معمول جاگ رہی تھی۔ کامن روم میں دو اٹیچی کیس پڑے تھے جن پر امارات ایئرلائن کے اسٹیکر لگے ہوئے تھے۔

''یہ کون آیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''عینی۔'' فاخرہ نے عجیب انداز سے کہا۔

شہزاد کے سر پر جیسے بم پھٹ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فاخرہ کو دیکھتا چلا گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' دروازے کی طرف سے عینی کی آواز ابھری۔ وہ بڑے ٹھسے سے وہاں کھڑی تھی۔ اس نے گلابی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ آج پہلی بار اس کے پاؤں میں ساڑھی کے ساتھ جوگرز کے بجائے سینڈل نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

''کک..... کب آئی ہو تم یہاں؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں جی کہ یہ اکیلا سوال نہیں ہے۔ اس

ایمرجنسی میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ ان کی باری آ کر نہیں دے رہی تھی۔ فرزانہ سخت پریشان تھی۔ اسے شارق پر بھی بہت غصہ تھا۔ یہ غصہ اس کی آنکھوں کے علاوہ اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ شہزاد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''فرزانہ! میں اسی لیے تم سے کہتا تھا کہ ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ سوچو، اب تو ہم ہوٹل میں ہیں اگر ہم تمہارے گھر ٹھہرے ہوتے تو کیا قیامت آتی۔ ہمارے گھرانوں میں نفرت کی جڑیں کافی اندر تک جا چکی ہیں، یہ آسانی سے باہر نہیں نکلیں گی۔''

''مجھے شارق پر اتنا افسوس ہوا ہے شہزاد کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑا ہے لیکن اگر اس وقت وہ میرے سامنے ہوتا ناں تو میں نے..... اس کا منہ نوچ لینا تھا۔'' فرزانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اس سے کیا ہو جاتا، معاملہ اور سنگین ہو جانے کے علاوہ؟''

''معاملہ اور کیوں سنگین ہو جانا تھا۔ میں لاہور میں ابا جی کو فون کروں گی۔ انہیں بتاؤں گی کہ شارق نے یہاں کیا چاند چڑھایا ہے..... ابا جی اب بڑے بدل چکے ہیں شہزاد۔ وہ ہر معاملے میں بڑے نرم ہو گئے ہیں..... تم تو کافی عرصے سے ان سے ملے نہیں ہو ناں۔''

شہزاد کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہولے سے بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ بہت کچھ بدل چکا ہو لیکن..... فرزانہ..... مجھے پتا ہے میرے لیے کہیں کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماموں جہانگیر بھی جب کبھی میرے سامنے آئیں گے ان کی آنکھوں میں ایسے ہی خون اتر آئے گا۔''

''کیوں اتر آئے گا؟ کیا کیا ہے تم نے؟ تم نے بڑوں کی مرضی کے سامنے سر جھکایا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت ماحول کی گرما گرمی میں دونوں طرف سے کچھ باتیں ہوئی تھیں لیکن اب تو اس برے وقت کو گزرے ایک عرصہ گزر چکا ہے.....''

''کچھ بھی ہو فرزانہ! میں نہیں چاہتا کہ ہم ایک سوئی ہوئی آفت کو پھر سے جگانا شروع کر دیں۔ تم نے اور تمہارے بچوں نے ہمارے لیے جو کچھ کیا میں اس کے لیے تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ ہم تمہاری اس میزبانی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے..... لیکن..... اب میری خواہش ہے کہ ہم جتنے دن یہاں رہیں ہمارے درمیان کسی طرح کا کوئی رابطہ نہ ہو۔ اگر یہ رابطہ رہا تو مجھے یقین ہے کہ پھر کچھ بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''لیکن شہزاد بھائی تم.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں فرزانہ..... شارق تمہارا سگا بھائی ہے تو میرا بھی ماموں زاد ہے، میں اس کے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج مجھے چوٹیں آئی ہیں اور میں نے سہہ لی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کل میں نہ سہہ سکوں یا پھر جتنی چوٹیں مجھے آئی ہیں اتنی ہی اس کو بھی آ جائیں۔ پلیز فرزانہ..... اس سلسلے کو آج سے ختم کر دو۔ زندگی رہی اور حالات اچھے رہے تو ہم پھر رابطہ کریں گے۔''

''لیکن میں اس سلسلے کو ایسے ہی ختم نہیں کر سکتی۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''شارق کو تم سے معافی مانگنی ہوگی۔ تم میری میزبانی میں تھے، اس نے تم پر نہیں مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔''

''دیکھو، یہ سارے معاملے کو بڑھانے والی باتیں ہیں اور میں اسے بڑھانا نہیں چاہتا۔'' شہزاد کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

اسی دوران میں بالآخر شہزاد کی باری آ گئی اور وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سر کا ایکسرے کیا گیا۔ دو زخموں کی اسٹیچنگ ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد وہ اسپتال سے فارغ ہو کر واپس ہوٹل لوٹ آیا۔ واپسی پر فرزانہ نے ٹیکسی کا انتظام کیا تھا۔

اس رات فرزانہ ہوٹل میں ہی فاخرہ اور شہزاد کے پاس رہی۔ تاہم اگلے روز شہزاد کے پرزور اصرار پر گھر واپس چلی گئی۔ شہزاد کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ دوپہر کے وقت اس کے اصل میزبانوں میں سے کچھ لوگ اس سے ملنے پہنچ گئے۔ یہ اسی انسٹی ٹیوٹ کے افراد تھے جن کی دعوت پر وہ یہاں پیرس آیا تھا۔ یہ چار خواتین و حضرات تھے۔ شہزاد کی چوٹیں دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ ان لوگوں سے کچھ چھپانا فضول تھا کیونکہ بعد میں انہیں ہوٹل کی انتظامیہ سے معلوم ہو ہی جانا تھا۔ شہزاد نے مناسب الفاظ میں انہیں بتا دیا کہ یہ فیملی کے دو افراد کے درمیان ہونے والا ایک اتفاقیہ جھگڑا تھا۔ یہ لوگ چار بجے کی چائے تک شہزاد کے ساتھ رہے۔ انہوں نے شہزاد کو بتایا کہ یہاں پیرس میں بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔

درد میں افاقے کے لیے شہزاد مسلسل پین کلر کھا رہا تھا۔ اسے تکلیف تو تھی مگر وہ بیوی بچوں پر زیادہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ خاص طور سے عمیر اور احسن کے سامنے وہ بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت شہزاد اور فاخرہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شام سات بجے کے قریب عینی پھر ہوٹل آ پہنچی۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا بیگ بھی تھا۔ ''گڈ ایوننگ ایوری

شہزاد مفلوج سا ہوگیا تھا۔ کچھ بھی نہ کر سکا، کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس ایک میٹھا سا درد تھا جو اس کے ہونٹوں سے لے کر اس کے دل تک ایک لہر کی صورت دوڑ گیا۔ شہزاد کو بے حرکت بیٹھے دیکھ کر عینی کے چہرے پر خوف ماند پڑ گیا۔ اس کی بلوری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جاگی اور اس نے معافی مانگنے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ شہزاد کے سامنے جوڑ دیے، پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بڑی تیزی سے ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ عینی کو بہت جلدی ہے۔ اس کی جلدی کی وجہ شہزاد کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھی..... دس بارہ دن کے اندر فرزانہ، جمیل صاحب اور زارا خاموشی سے پاکستان پہنچ گئے۔ زارا تھوڑا انتظار کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے شوہر ریحان کو چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ زارا کی خواہش تھی کہ دس پندرہ روز تک وہ آجائے تو نکاح کی رسم ہو، مگر عینی نے زارا اور فرزانہ سے طویل تبادلۂ خیال کیا اور انہیں آمادہ کرلیا کہ ریحان سے معذرت کرلی جائے۔ جمیل صاحب کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی، وہ وہی کرتے تھے جو عینی کہتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ہمیشہ ٹھیک کہتی ہے۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوتی۔ انہیں عجیب بھروسا تھا بیٹی پر۔

فاخرہ نے حسبِ وعدہ اور حسبِ خواہش اس مختصر سی تقریب کی تیاری میں بھرپور حصہ لیا وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر بازار گئی۔ عینی کے لیے زیور اور کپڑے وغیرہ لے کر آئی اور پھر اس نے اپنی نگرانی میں عینی کا کمرا آراستہ کرایا۔ وہ اپنی ہمت طاقت سے بڑھ کر کام کر رہی تھی۔ اسے ہر آٹھ گھنٹے کے بعد انجکشن لگوانا پڑ رہا تھا اور چھاتی صاف رکھنے کے لیے گاہے بگاہے وینٹوجین کی بھاپ بذریعہ مشین دینا پڑتی تھی۔

ایک مختصر سی تقریب میں نہایت سادگی سے عینی اور شہزاد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ کراچی میں شہزاد اور فاخرہ کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور جو کراچی سے باہر تھے انہیں خبر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ شہزاد کو یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو پا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں اس کے لیے اطمینان کی صرف ایک ہی بات تھی۔ فاخرہ کے بیمار چہرے پر ایک ایسی آسودگی اور طمانیت نظر آتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شہزاد کے لیے ممکن نہیں تھا۔

شادی کی رات عمیر اور احسن، عینی کے ساتھ بیڈ پر موجود تھے۔ وہ اس سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور وہ ان سے کر رہی تھی۔ پھر وہ ان دونوں کو لے کر فاخرہ کے پاس چلی گئی، اس نے رات فاخرہ کے پاس اس کی تیمارداری میں ہی گزار دی۔

اگلے روز شام کو معلوم ہوا کہ عینی نے دونوں نرسوں میں سے ایک کی چھٹی کرادی ہے۔ یہ وہی نرس تھی جو رات کو ڈیوٹی دیتی تھی اور جس کی طرف سے شہزاد کو غفلت کی شکایات بھی تھیں۔ درحقیقت عینی نے فاخرہ کی تیمارداری کا بیشتر کام خود سنبھال لیا تھا اور دوسری نرس کو بھی بس کسی وقت ہی زحمت دیتی تھی۔ اس کا جو تھوڑا بہت وقت بچ رہا تھا وہ بچوں کو دے رہی تھی۔ شہزاد کی طرف سے وہ تقریباً غافل ہی ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کی شادی ہوئی ہی نہیں ہے۔ پندرہ روز شہزاد کے ساتھ رہنے کے بعد فرزانہ، جمیل اور زارا فرانس واپس چلے گئے۔ کچھ بھی تھا یہ ایک رقت آمیز منظر تھا۔ شہزاد اور عینی نے وعدہ کیا کہ جیسے ہی فاخرہ کی طبیعت سنبھلے گی وہ سب، بچوں سمیت پیرس آئیں گے اور ایک بار پھر وہی پر بہار محفلیں جمیں گی جو تین سال پہلے جمی تھیں۔

والدین کے جانے کے بعد عینی کچھ اور بھی فاخرہ کی دیکھ بھال میں مگن ہوگئی۔ ایک دن اس نے شہزاد سے کہا۔

''شہزاد! آپ ایک بات کا برا تو نہیں مانیں گے؟''

''نہیں..... کہو۔''

''ہم پیرس جانے کے لیے کیوں باجی فاخرہ کے صحت یاب ہونے کا انتظار کریں۔ کیوں نہ انہیں صحت یاب کرنے کے لیے پیرس لے جائیں، وہاں علاج معالجے کی سہولتیں کہیں بہتر ہیں شہزاد، پاپا کے کئی دوست ڈاکٹر بھی ہیں۔'' وہ بڑے متفکر انداز میں بول رہی تھی۔

عینی کی اس بات میں وزن تھا۔ فاخرہ کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اس کی ریڑھ کے پرانے زخم میں انفیکشن قرار دے رہے تھے اور ''اسپائنل کینال'' کے خطرناک ترین آپریشن کا امکان بیان کرتے تھے۔ شہزاد کے [illegible] بھی یہ بات گھر بنانے لگی کہ فاخرہ کے علاج کے لیے بیرونِ ملک کوشش کی جائے۔

ادھر یہ فیصلے ہو رہے تھے اور ادھر قدرت کی کتاب میں کوئی اور فیصلہ لکھا جا چکا تھا۔ ایک شام جب شہزاد اور عینی..... فاخرہ کو سہارا دے کر وہیل چیئر پر بٹھا رہے تھے تاکہ اسے اسپتال لے جایا جاسکے، اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کی سانس اٹک گئی۔ اسے وینٹوجین مہیا کرنے سے پہلے ہی اس کے ہونٹ نیلے ہوگئے۔ جب وہ سب مل کر اسے گاڑی میں ڈال رہے تھے، اس کی سانسیں پوری ہوگئیں۔ وہ دنیا کے سارے دکھوں سے آزاد ہوگئی۔

یہ ایک قیامت تھی جوان کے گھر پر گزری..... فاخرہ کی آخری رسومات میں بیشتر عزیزوں نے شرکت کی اور اس وقت بہت سے عزیزوں کو اس شادی کا علم بھی ہوا۔ ممکن تھا کہ در پردہ باتیں بھی بنائی گئی ہوں اور تمسخر بھی اڑایا گیا ہو مگر کسی کو بھی شہزاد کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب جانتے تھے کہ جب اس معاملے میں جہانگیر صاحب اور شارق جیسے لوگوں کو شکست ہوئی ہے اور وہ منہ چھپاتے پھر رہے ہیں تو وہ کس گنتی میں آتے ہیں۔ درحقیقت ایک لڑکی نے ایک پوری برادری کو مات دے دی تھی۔

فاخرہ کی موت کے بعد شہزاد کئی ہفتوں تک بالکل گم صم رہا۔ ایک آرٹسٹ ہونے کے ناتے وہ بے حد حساس طبع تھا۔ فاخرہ کی جدائی کے لیے بے شک وہ کئی مہینوں سے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر زبردست اتھل پتھل ہوئی تھی۔ جو ایک چیز اس کی ڈھارس بندھاتی تھی وہ یہی تھی کہ وقت رخصت فاخرہ اپنے گھر اور اپنے بچوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھی۔ شہزاد اور عینی کی شادی کے صرف دو ماہ بعد فاخرہ چلی گئی تھی..... پتا نہیں کیوں شہزاد کو لگتا تھا کہ عینی نے شادی کے لیے جو بے تابی دکھائی تھی اور شادی کے بعد وہ جس طرح اندھا دھند فاخرہ کی خدمت میں لگ گئی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ جانتی تھی..... فاخرہ کو جلد رخصت ہو جانا ہے۔ شہزاد کو لگتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ جمیل صاحب اکثر عینی کے بارے میں کہتے رہتے تھے کہ وہ درست فیصلے کرتی ہے اور اس میں حالات کو Predict کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔ اس حوالے سے جمیل صاحب اور کبھی کبھی فرزانہ بھی مختلف مثالیں دیتی تھی۔ اب شہزاد کا دل بھی گواہی دینے لگا تھا کہ ایسی ہی کوئی بات ہے۔ ایک دن اس نے فاخرہ کی موت کے بارے میں عینی سے بات کی اور اس ''جلدی'' کا ذکر کیا جو عینی نکاح کے لیے کر رہی تھی تو عینی نے کہا۔ ''ہاں شہزاد..... ان دنوں میرے اندر عجیب سی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ہمارے پاس وقت کم ہے، حالانکہ ان دنوں باجی کی طبیعت بہتر تھی مگر میرے دل میں عجیب سے اندیشے اترے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ دو ماہ، بس زیادہ سے زیادہ دو ماہ اور آپ نے دیکھا ایسا ہی ہوا۔''

دن گزرتے رہے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا..... شارق کو پیرس میں چھ سال قید کی سزا ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی فیملی کو بھاری ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑا تھا۔ فاخرہ کو جدا ہوئے اب قریباً چار ماہ گزر چکے تھے اور عینی شہزاد کی شادی ہوئے تقریباً چھ ماہ۔ لیکن وہ اب بھی شہزاد سے اتنی ہی دور تھی جتنی شادی سے پہلے۔ اس کا زیادہ تر وقت صرف اور صرف بچوں کی نگہداشت میں گزر رہا تھا۔ اس نے بچوں کے لیے ماں کا خلا حیران کن تیزی سے پر کیا تھا۔ وہ ہر وقت ان کے کاموں میں جتی رہتی تھی۔ جیسے ایک مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں سمیٹنے کی کوشش میں رہتی ہے۔ بچے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر رہے تھے۔ عینی کی شوخی، چنچناہٹ، الھڑپن سب کچھ ایک باوقار سنجیدگی میں چھپ گیا تھا۔ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتی، انہیں کھانا کھلاتی، بیڈ ٹائم اسٹوری سناتی وہ چھوٹی عمر میں بھی دانا بینا دکھائی دیتی تھی۔ بچے ابھی تک اسے ''آنٹی باجی'' ہی کہتے تھے تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد ہی اسے امی یا ماما کہنے لگیں گے۔

دو تین مہینے پہلے شہزاد کو عینی کے بارے میں ایک خاص بات بھی معلوم ہوئی تھی بلکہ یہ بات عینی نے ہی اسے بتائی تھی۔ اس نے شادی کے بعد فاخرہ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ عینی کی طرح اس کا وعدہ بھی بڑا انوکھا تھا۔ اس نے فاخرہ سے کہا تھا کہ جب تک عمیر انیس بیس سال کی عمر تک نہیں پہنچ جاتا اور احسن کالج اسٹوڈنٹ نہیں بن جاتا، وہ خود ماں نہیں بنے گی۔ اس کے اس ارادے سے فاخرہ نے اتفاق نہیں کیا تھا مگر اسے اپنے فیصلوں کے لیے کسی کی تائید یا توثیق کی ضرورت ہی کب ہوتی تھی۔

بہرحال یہ بات تو شہزاد بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عینی کی موجودہ ''دوری'' کا تعلق اس فیصلے سے ہرگز نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی بچوں میں اتنی مگن تھی کہ اسے شہزاد اور اس کی قربت بھولی ہوئی تھی۔ شہزاد کو بھی کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔ وہ بھی اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو مرمت کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جس طرح وہ بچوں کی طرف توجہ دے رہی ہے ایک دن اس کی طرف بھی متوجہ ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام اچانک ہی ہوتا تھا۔

اور پھر وہ شام آ گئی۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا، نومبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ عمیر اور احسن اسکول کے ساتھ تفریحی ٹور پر ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ شہزاد آفس سے واپس آ کر کپڑے بدلنے لگا تو وہ بولی۔ ''رہنے دیں، کہیں باہر چلتے ہیں، باہر ہی کھانا کھائیں گے۔''

اس نے چونک کر عینی کی طرف دیکھا۔ وہاں پھر نجمہ کی آنکھیں تھیں اور ان میں وہی امنگ ترنگ تھی جو ماضی قریب میں دریائے سین کے کنارے نظر آتی تھی، اس ترنگ میں خود سپردگی تھی، جوش تھا اور ان پانیوں کی طغیانی تھی جو اپنا راستہ

بنانے کے لیے پتھریلی دیواروں سے مدتوں سر ٹکراتی ہے۔
شہزاد نے ہامی بھری تو وہ ملازمہ کو چائے کا کہہ کر تیار ہونے چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ یہ پیرس کی شام نہیں تھی لیکن اس میں اس کا رنگ ڈھنگ موجود تھا۔ عینی ایک بڑی شال میں لپٹی ہوئی تھی۔ سرتاپا ایک مشرقی لڑکی نظر آتی تھی۔ ''کہاں چلیں؟''
''وہیں جہاں آپ اور نجمہ خالہ جایا کرتے تھے۔'' وہ ایک دم بولی۔ لہجے میں شوخی تھی۔
شہزاد نے گہری سانس لے کر ہنڈا اکارڈ کا رخ ہوٹل میزان کی طرف موڑ دیا۔ وہ ہوٹل میں داخل ہوئے، ایک نوجوان جوڑے نے شہزاد کو پہچان کر اس سے آٹوگراف لیے۔ ڈائننگ ہال کے ساتھ ایک طرف قطار میں فیملی کیبن بنے ہوئے تھے۔ یہ کل پانچ کیبن تھے۔ ابھی آٹھ بجے تھے۔ ڈائننگ ہال اور کیبن تقریباً خالی ہی تھے۔ وہ ہر چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔
''کیبن میں بیٹھیں؟'' اس نے پوچھا۔
''چلو ٹھیک ہے۔''
''کس کیبن میں؟'' وہ بولی۔
''جس میں مرضی۔''
''نہیں اس کیبن میں جہاں آپ اور خالہ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔''
شہزاد زیرلب مسکرایا۔ ''تم واقعی سنکی ہو۔ اچھا چلو، تم خود منتخب کرو، کون سے کیبن میں بیٹھنا چاہیے۔''
''میرا امتحان لے رہے ہیں مائی لارڈ؟''
''ایسا ہی سمجھ لو، دیکھتے ہیں تمہاری چھٹی حس کیا کرتی ہے۔''
وہ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی، پھر اس نے ایک دم کیبن نمبر چار کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کیبن میں پہنچ کر وہ مسکرائی اور اس نے سوالیہ نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔ شہزاد نے حیرانی سے بھویں اچکائیں..... ''تم واقعی، چھٹی حس رکھتی ہو بھئی۔ ایکسٹرا آرڈنری۔''
''تھینک یو..... تھینک یو۔'' اس نے مزاحیہ انداز میں جھک کر کہا۔ ''جب محبت سچی ہو تو اندازے اسی طرح درست ثابت ہوتے ہیں۔''
''بیٹھو۔'' شہزاد بولا، لیکن جان بوجھ کر کسی کرسی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔
اسے پھر حیرت ہوئی، جب عینی نے بے دھیانی میں چار کرسیوں میں سے وہی کرسی چنی جو اکثر نجمہ چنا کرتی تھی۔
پتا نہیں کہ یہ چھٹی حس کے کرشمے تھے یا اتفاقات تھے یا ان دونوں کے درمیان کوئی چیز تھی، کیبن کا پردہ برابر ہوگیا۔ ریسٹورنٹ کے نیم گرم ماحول میں پہنچ کر سردی کم ہوگئی۔ عینی نے اپنی لمبی شال کی بکل کھول دی۔ شہزاد دیکھ کر دنگ رہ گیا اسے لگا کہ وہ یکلخت اٹھائیس تیس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ عینی نے جو لباس پہن رکھا تھا اس نے شہزاد کے ذہن میں ہلچل سی مچا دی۔ یہ وہی اٹھائیس تیس سال پرانے فیشن کا لباس تھا اور وہ یہ لباس پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ایک دو بار نہیں کئی بار۔ ہاں یہ وہی لباس تھا ہلکے گلابی رنگ کی شلوار، سفید قمیص جس پر بڑے بڑے گلابی پھول تھے اور گلابی دوپٹا جس پر سفید لیس تھی۔ وہ ان کپڑوں کو پہچان گیا۔ یہ نجمہ کے کپڑے تھے ان کپڑوں میں اس کم نصیب کی مہک رچی بسی تھی۔
''تمہیں کہاں سے ملے یہ کپڑے؟'' شہزاد نے ششدر ہو کر پوچھا۔
''یہ ماما کے پرانے اٹیچی کیس میں تھے۔ ماما نے چھوٹی بہن کی نشانی کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ تین چار سال پہلے میں نے انہیں اٹیچی سے نکال کر سنبھال لیا تھا۔ ان میں سے مجھے تیس برس پہلے کی بھولی بسری کہانی کی خوشبو آتی تھی۔ میں انہیں پہننا چاہتی تھی لیکن کسی بہت اچھے موقعے پر۔ اس اچھے موقعے کے لیے مجھے تقریباً چار سال انتظار کرنا پڑا ہے۔''
شہزاد نے تعجب سے دیکھا۔ یہ لباس عینی کے جسم پر تقریباً پورا آیا تھا۔ اس نے بال بھی نجمہ کی طرز پر بنائے تھے۔ ان تبدیلیوں کے بعد وہ کافی حد تک نجمہ کے مشابہ نظر آنے لگی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس میں ساٹھ ستر فیصد نجمہ کی شباہت پائی جا رہی تھی۔ شہزاد نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ آج وہاں ملن کا موسم تھا۔ اس کی ہلکی براؤن پتلیوں میں محبت کا بستر بچھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شہزاد سمجھ گیا کہ آج رات وہ اس کے بہت قریب ہوگی۔
اس کی ہمیشہ بولتی آنکھوں نے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''شہزاد! میں نے کہا تھا ناں کہ میں لوٹ کر آؤں گی۔ میں آ گئی ہوں۔''
ڈائننگ ہال کے آڈیو سسٹم پر بڑے دھیمے سروں میں ایک غزل کے بول گونج رہے تھے۔

سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت چھوڑ آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں
گم بھی ہو سکتے ہیں تاریخ کے اوراق میں ہم
مل بھی سکتے ہیں مگر تازہ فسانوں میں کہیں

SCANNING

قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات واطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گردوپیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شادابیاں ہی نہیں تلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جائے...

ایک ایسے قاتل مسیحا کی جراحی جو انسانی جسم سے جان اور معاشرے میں انسانیت کے وجود کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا

یہ کہانی بڑے عجیب انداز سے شروع ہوئی۔ یہ ایک دھند آلود صبح تھی۔ عمران میرے ساتھ گاڑی میں تھا۔ عمران کے محلے ندیم ٹاؤن کا ایک عمر رسیدہ شخص اسپتال میں تھا۔ ہم اس کی عیادت کے لیے جا رہے تھے۔ وحدت روڈ پر پہنچے تو ٹریفک جام میں پھنس گئے۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ ہم بھی ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ گئے۔ اس دن مجھ پر عمران کے ایک انوکھے دعوے کی حقیقت کھلی۔ وہ کئی بار مجھے بتا چکا تھا کہ وہ "لپ ریڈنگ" کا فن جانتا ہے۔ شاید کچھ قارئین کے لیے "لپ ریڈنگ" کا لفظ نیا ہو۔ لپ ریڈنگ کوئی ماورائی یا خیالی اصطلاح نہیں۔ یہ ایک جدید تکنیک ہے۔ اس میں آپ کسی شخص کو بولتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اس کی آواز آپ تک نہیں پہنچ رہی ہوتی پھر بھی آپ اس کے الفاظ جان جاتے ہیں۔ وہ بولتے ہوئے جس طرح اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے، وہ انداز آپ کو بتاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں لیکن دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کمر ہمت باندھ کر اس فن کے حصول میں لگ گئے۔ ان میں سے کئی ماسٹر لپ ریڈر بنے اور انہوں نے اپنی مہارت سے دیکھنے والوں کو ششدر کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔

تو بات ہو رہی تھی عمران جونیئر کی۔ ٹریفک جام کی وجہ سے گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ ہمارے پہلو میں تین چار فٹ کے فاصلے پر ایک نئے ماڈل کی ٹیکسی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ اس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ ویگن کی عقبی نشست پر تراشیدہ سنہری بالوں والی ایک قبول صورت عورت امیرانہ لباس میں بیٹھی تھی۔ عمر بہ مشکل تیس سال رہی ہو گی۔ وہ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص سے کچھ کہہ رہی تھی۔ عمران کھوئے کھوئے


SCANNING

انداز میں اس عورت کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

"کیا لگی ہاتھ مارے ہوئے ہو۔" میں نے اسے سرزنش کی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

ٹیلی اسٹیشن وین تھوڑا سا ریورس کرکے آگے جا کھڑی ہوئی۔

عمران نے عجیب انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آپ کو بتاؤں یہ فیشن ایبل لیڈی اپنے ڈرائیور سے کیا کہہ رہی تھی؟"

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے ننانوے فیصد یقین ہے وہ قتل کی بات کررہی تھی۔"

"قتل کی بات؟" میں نے حیرت سے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش رہا۔ میں نے کہا۔ "اور اب تم فرماؤ گے کہ تم نے اس کی لپ ریڈنگ کی ہے۔"

"بالکل کی ہے۔" اس نے ذرا ہیجانی انداز میں جواب دیا۔ "اور چاچو! فی الحال میں آپ سے اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیڈی کے زیادہ تر الفاظ صاف سمجھ میں آئے ہیں۔ کچھ میں تھوڑا بہت کنفیوژن ہے۔ یہ عورت غالباً آٹھ بندوں کی بات کررہی ہے جن کو اسے اس اسٹیشن وین میں اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ آپ مجھے بتائیں یہاں آگے کوئی ویران ٹاؤن نام کی جگہ ہے؟ ویران ٹاؤن یا پھر ویران چوک..... یا اس طرح کا ملتا جلتا نام؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، آگے شان روڈ پر اموان ٹاؤن ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ اس نے یہی کہا ہوگا۔ یہ عورت وہیں جارہی ہے۔ ان سات آٹھ بندوں کو یا تو زبردستی گاڑی میں بٹھانا چاہتی ہے..... یا پھر انہیں کوئی لالچ دے کر لے جانا چاہتی ہے۔"

"..... اور انہیں قتل کرنا چاہتی ہے؟" میں نے بدستور غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"قتل کرنا نہیں چاہتی۔ وہ انہیں کسی وجہ سے دفن کرنے کی بات کررہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ قتل جیسا ہی ہوگا۔ وہ ان کی عمروں کی بات بھی کررہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ان کی عمریں چالیس سال سے کم نہیں ہونی چاہئیں۔"

عمران جس انداز سے اور جتنے یقین سے بول رہا تھا، مجھے الجھن سی ہونے لگی پھر ایک دم مجھے یاد آیا کہ صبح کے وقت اموان ٹاؤن نامی اسٹاپ پر مزدوروں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ لوگ تعمیراتی کام کے لیے وہاں سے دیہاڑی دار بندے لے کر جاتے ہیں۔ اگر عمران کی لپ ریڈنگ صحیح کام کررہی تھی تو شاید یہ انہی مزدوروں کے حوالے سے کوئی بات تھی۔ قتل والی بات تو اب بھی مجھے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، لپ ریڈنگ بہت باریک فن ہے اور ماہر ترین لوگ بھی اس میں غلطی کرتے ہیں۔

ٹیلی وین اب ایک بار پھر ہمارے پہلو میں آگئی تھی لیکن فیشن ایبل عورت اب خاموش تھی۔ وہ بڑی محویت سے اپنے اسمارٹ فون پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے خدوخال اچھے تھے لیکن عام خواتین سے کچھ مختلف محسوس ہوتے تھے۔ ان میں ایک عجیب طرح کی سرد مہری اور سختی پائی جاتی تھی۔ میں سوچنے پر مجبور ہوا۔ کہیں واقعی اس عورت کے حوالے سے کوئی غیر قانونی کام تو ہونے نہیں جارہا۔

ٹریفک آہستہ آہستہ رینگنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "تم کہہ رہے ہو کہ تم نے اس عورت کے ہونٹ پڑھے ہیں مگر جو بات تم بتا رہے ہو، وہ ٹکڑوں میں ہے۔"

"اس میں ایک دو خالی جگہیں ہیں لیکن چلیں میں آپ کو یہ جگہیں پر کرکے بتاتا ہوں۔" اس نے پوری سنجیدگی سے کہا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "عورت نے اپنے ڈرائیور یا کارندے سے کہا ہے۔ "اموان ٹاؤن سے آٹھ بندے لینے ہیں مگر ان میں سے کسی کی عمر چالیس سے کم نہ ہو ورنہ پہلے کی طرح مصیبت پڑے گی پھر ان میں سے ایک دو کو دفن کرنا پڑ جائے گا۔ سیدھا سیدھا معاملہ ہوگا یہ بھی۔"

عمران کے بیانیے میں میری دلچسپی بھی بڑھ رہی تھی۔ ایک دو بار پہلے بھی اس نے اسی طرح اپنی لپ ریڈنگ والی پٹاری چھوڑی تھی اور میں نے اس کو زیادہ سیریس نہیں لیا تھا۔ اب وہ ایک سنجیدہ بات کررہا تھا۔ ایک طرح سے یہ موقع بھی تھا کہ عمران کی اس صلاحیت کے ہونے یا نہ ہونے کو پرکھا جاسکتا۔

میں اور عمران اس ٹیلی اسٹیشن وین کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ پانچ دس منٹ میں ہم اموان ٹاؤن نامی جگہ پر پہنچ گئے۔ مجھے شدید حیرت محسوس ہوئی جب میں نے دیکھا کہ وین واقعی ایک جگہ رک گئی اور یہ وہی جگہ تھی جہاں بہت سے دیہاڑی دار مزدور روزگار کی تلاش میں موجود تھے۔ جونہی ٹیلی وین وہاں رکی، پندرہ بیس افراد بھرا مار کر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ اپنا دن بھر کا خون پسینا بیچنے کے لیے بے تاب تھے تاکہ شام کو اپنے بچوں کو منہ دکھا سکیں۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑ رہے تھے۔

عمران نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "اب کیا خیال ہے چاچو جانی؟"

میں واقعی حیرت کے ریلے میں تھا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا ڈرائیور نما شخص وین میں سے نکلا اور مزدور منتخب کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے حیرت کا دوسرا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ عمران کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔ اس کی کہی ہوئی بات نوے فیصد درست ثابت ہورہی تھی۔ ڈرائیور نما شخص نے جو مزدور منتخب کیے، وہ واقعی نوجوان نہیں بلکہ

درمیانی عمر کے تھے۔ یہ بات اچنبھے والی تھی۔ لوگ عام طور پر نوجوان یا جواں سال مزدور منتخب کرتے ہیں تاکہ زیادہ کام لے سکیں۔ مزدور منتخب کر کے اس نے وین کا عقبی دروازہ کھولا اور انہیں اندر بٹھا دیا۔ میں نے کہا ہے کہ عمران کی پیش گوئی نوّے فیصد درست ثابت ہوئی تھی۔ نوے فیصد اس لیے کہ عمران نے آٹھ بندے کہے تھے مگر یہ چار تھے۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی اور اس کا تعلق بھی "لپ ریڈنگ" سے ہی تھا۔ آٹھ اور چار دونوں الفاظ بولنے کے لیے منہ کو ایک ہی انداز میں کھولنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ وقت ان باریکیوں کو سوچنے کا نہیں تھا۔ ہم دونوں کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ان مزدوروں کے حوالے سے کوئی نہ کوئی غلط یا غیر قانونی کام ہونے والا ہے۔

"کیا خیال ہے عمران؟ پیچھا کیا جائے اس گاڑی کا؟"

وہ مسکرایا۔ "اگر آپ اب بھی اسے مذاق نہیں سمجھ رہے تو ضرور پیچھا کرنا چاہیے۔"

نیلی وین اپنی جگہ سے حرکت میں آچکی تھی۔ ہم معقول فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل دیے۔

عمران نے آج واقعی اپنی صلاحیت ثابت کی تھی۔ یہ سب کچھ بڑا افسانوی سا لگ رہا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، میرے سامنے تھا۔ عمران تعریف کا حق دار تھا مگر اس وقت موقع تعریف و توصیف کا نہیں تھا۔ سڑکوں پر رش تھا۔ دفاتر اور اسکولز وغیرہ جانے والے ہر طرف سے اُمڈ آئے تھے۔ میں نے توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی ہوئی تھی۔

اچانک وہ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ سامنے چوک میں سگنل کھل چکا تھا مگر بائیں جانب سے دو موٹر سائیکل سوار لڑکے سگنل توڑتے ہوئے پہلے ایک موٹر رکشا سے لگے پھر ہماری گاڑی سے ٹکرائے۔ موٹر سائیکل گاڑی کے نیچے آگئی مگر خوش قسمتی یہ ہوئی کہ دونوں اچھل کر دور جا گرے۔ موٹر سائیکل گاڑی کے نیچے پھنس کر رہ گئی تھی۔ عمران جلدی سے باہر نکلا اور لڑکوں کو اٹھنے میں مدد دی۔ وہ الٹا عمران پر جھپٹ پڑے۔ ان میں سے ایک زیادہ تگڑا تھا۔ اس نے عمران کو دبوچنے کی کوشش کی۔ عمران نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ دوسرے لڑکے کو راہ گیروں نے تھام لیا۔ عمران سے الجھنے والا بار بار اچھل رہا تھا مگر اس کی کلائیاں بدستور عمران کی گرفت میں تھیں۔ وہ ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ عمران کا شاید ایک مکا بھی برداشت نہ کر پائے۔ میں بھی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ ٹریفک وارڈنز نے مجھے پہچان لیا اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگے۔

بتا تگڑا لڑکا جو کافی بدتمیز بھی تھا، مجھ پر چنگھاڑا۔ "میری بائیک برباد ہوگئی ہے۔ میں تمہیں تھانے لے جاؤں گا۔"

عمران ذرا شوخی سے میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ "تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے، تھانہ خود ہی تمہارے پاس آگیا ہے۔"

اگلے ایک دو منٹ میں لڑکوں کو پتا چل گیا کہ آج کا دن ان کے لیے بُرا ثابت ہوا ہے۔ نہ صرف انہوں نے سگنل توڑا ہے بلکہ موٹر سائیکل بھی ایک سرکاری اہلکار کی گاڑی میں ٹھوکی ہے۔

یہ جو کچھ ہوا، وہ تو ہوا۔ مجھے اور عمران کو زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ نیلی وین جس کے اندر کسی مشکوک کہانی کے تانے بانے نظر آرہے تھے، ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ حسب توقع لڑکوں کے پاس ڈرائیونگ لائسنس تھا اور نہ بائیک کے درست کاغذات۔ انہیں بائیک سمیت تھانے بھیج دیا تھا اور ہم دونوں بزرگ کی عیادت کیے بغیر ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس آگئے۔ ویسے عمران نے ایک کام خوب کیا تھا۔ نیلی وین کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

گھر واپس پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے قابل اعتماد ساتھی انسپکٹر زبیر کو کال کی اور اسے نیلی وین کا نمبر نوٹ کرا کے فوراً اس کا پتا چلانے کو کہا۔

صرف دس منٹ بعد زبیر کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ یہ نمبر تو اسٹیشن وین کے بجائے ایک سوزوکی عمران کا ہے۔ ذہن میں پہلا خیال تو یہی آیا کہ نمبر پلیٹ جعلی ہوگی تاہم عمران کو ایک شک اور بھی تھا۔ چار ہندسوں والے اس نمبر میں اسے تیسرے ہندسے کے بارے میں شک تھا یا تو وہ پانچ تھا یا چھ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ نیلی وین کو تلاش کرنے میں وقت لگنا تھا۔ میرے اور عمران کے اندیشے کے مطابق اس دوران میں اگر ان چار غریب مزدوروں کے ساتھ کوئی الٹا سیدھا کام ہو جاتا تو کیا ہوتا؟

میں نے گہری نظروں سے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار! آج تو تم نے قائل کر لیا۔ یہ تو جادو جیسا ہے۔ بندشیشوں والی گاڑی میں بیٹھی اس عورت کے ہونٹوں کو دیکھ کر تم نے ٹھیک ٹھیک اندازے لگا لیے۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "صلاحیتیں تو بہت زیادہ ہیں چاچو جان! کوئی ماننے والا بھی تو ہو۔ کسی نے نہیں مانا..... کسی نے نہیں مانا..... چلو کوئی بھی نہ مانتا، یہ ماہین تو مان لیتی۔ اس طرح میرے دل کے ٹوٹے تو نہ کرتی۔"

"کوئی تمہارے دل کے ٹوٹے نہیں کرتا۔ تم خود ہی ایک ہاتھ میں اپنا دل اور دوسرے میں چھری لے کر پھر رہے ہو اور ٹوٹے کروانے کے شوق میں مبتلا ہو۔ یہ جو بار بار انڈیا واپس جانے کی بات کرتے ہو، یہ بھی اسی لیے ہے کہ تم خود اذیتی میں مبتلا ہو۔"

"چاچو جی! کم از کم آپ تو یہ بات نہ کریں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے ماہین کو کسی اور کی ہوتے دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"فی الحال وہ کسی کی نہیں ہو رہی۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "حشام سے اس کا رشتہ تقریباً ٹوٹ چکا ہے۔ ماہین کے گھر والے اسے کبھی داماد کے طور پر قبول نہیں کریں گے۔"

"آپ کی خام خیالی ہے۔ وہ بڑا گھنا بندہ ہے۔ مجھے لگتا ہے اور میری چھٹی حس بھی یہی کہتی ہے کہ ماہین کو منانے کے لیے اسے زمین پر ناک بھی رگڑنا پڑی تو وہ رگڑ لے گا۔ اسے اپنے شکنجے سے نکلنے نہیں دے گا۔"

"عمران! وہ بہت مایوس ہو چکی ہے اس سے۔"

"لیکن وہ تو مایوس نہیں ہوا نا۔ اسے پتا ہے کہ ماہین کے دل کے ہمارے دروازے بند ہو جائیں تو بھی ایک چھوٹی سی کھڑکی اس کے لیے ضرور کھلی رہے گی۔"

"یہ کس فلم کا ڈائیلاگ ہے؟" میں مسکرایا۔

"فلم..... عمران کی موت پارٹ ٹو۔" اس نے سراسر آہ بھری۔

"اچھا زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "آج تم نے مجھے واقعی حیران کیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ "لپ ریڈنگ" بھی تمہاری دوسری چھچھوریوں کی طرح ایک چھچھوڑی ہی ہے۔ اس حوالے سے تو تم مجھے باقاعدہ فنکار لگے ہو۔ یہ کب سیکھا تم نے..... اور کہاں سے؟"

وہ پھر بے پر کی اڑانے لگا۔ "دراصل انڈیا میں سلمان خان کو ایشور یا رائے اور ابھیشک بچن کے چکر کا پتا چلا تو اس نے ان کی ٹوہ لگانے کے لیے "لپ ریڈنگ" سیکھی اور دور دور سے ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا..... بعد ازاں ان کی شادی ہو گئی۔ سلمان خان بے چارہ بستر سے لگ گیا۔ میں پرانے یارانے کے سبب دن رات اس کی خدمت کرتا رہا لہٰذا مرتے مرتے وہ اپنا یہ سارا فن مجھے سونپ گیا....."

"اور وہ سلمان خان بفضلِ خدا ابھی زندہ ہے۔"

"اوہو چاچو! یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ کھوسہ مر چکا ہے وہ۔ ایشور یا رائے مار گئی ہے اسے۔ بس اسی طرح مجھے اس پاکستانی ایشور یا..... ماہین نے مارنا ہے اور آپ یاد رکھنا، یہ ایک نہیں دو قتل ہوں گے۔ اگر ہفتے کو میں مرا تو دیکھنا ایک دن بعد سوموار کو وہ بے چاری مہوش حیات بھی اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دے گی۔"

"تم ہفتے کو مرو گے تو وہ ایک دن بعد اتوار کو کیوں نہیں مرے گی؟"

"میں ورکنگ ڈیز کے بات کر رہا ہوں چاچو!" وہ بیزاری سے بولا۔

مجھے پتا تھا کہ اب وہ پٹڑی سے اتر گیا ہے۔ کچھ بتا کر نہیں دے گا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایف بی آئی کا ایک دوست آفیسر سراغ رسانی کے ایسے نئے رجحانات کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ میں نے اسے فون کیا اور لپ ریڈنگ کی تکنیک کے بارے میں دریافت کیا۔ حسبِ توقع اس نے کافی کچھ بتا دیا۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا۔ "اس تکنیک کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک کو لپ ریڈنگ اور دوسری کو اسپیچ ریڈنگ کہتے ہیں۔ لپ ریڈنگ میں فقط ہونٹوں کی حرکات نوٹ کی جاتی ہیں جبکہ اسپیچ ریڈنگ میں پورے چہرے کے تاثرات، رخساروں، آنکھوں اور زبان سے دانستہ حرکات بھی شامل ہوتی ہیں بلکہ ہاتھوں وغیرہ کو حرکت دینے کا انداز اور ساری باڈی لینگویج کا مشاہدہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔"

"یہ تکنیک کون لوگ استعمال کرتے ہیں اور کہاں کہاں استعمال ہوتی ہے؟" میں نے آفیسر سے پوچھا۔

آفیسر نے اس کا جواب بھی تفصیل سے دیا۔ اس نے بتایا کہ اکثر ترقی یافتہ ممالک میں پولیس اور دیگر جاسوسی ادارے اس تکنیک کو استعمال کر رہے ہیں۔ لائیو مناظر اور ویڈیوز ماہر لپ ریڈرز کو دکھائی جاتی ہیں اور کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے پھر شوبز اور اسپورٹس وغیرہ کی مشہور شخصیات کو دور سے دیکھ کر ان کی گفتگو کو جاننا اور نشریاتی اداروں تک پہنچانا بھی ان لپ ریڈرز اور اسپیچ ریڈرز کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔

یہ کافی دلچسپ انکشافات تھے اور مجھے اس لیے بھی زیادہ دلچسپ لگ رہے تھے کہ آج عمران کی یہ صلاحیت مجھ پر ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز بھی نیلی اسٹیشن وین کا کوئی کھوج نہ مل سکا۔ انسپکٹر زبیر تن دہی سے اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دو سادہ پوش اہلکار ٹاؤن اسٹاپ پر بھی لگا دیے تھے تاکہ اگر اسٹیشن وین دوبارہ وہاں نظر آئے تو اس کو پکڑا جا سکے۔ اہلکار ٹاؤن اسٹاپ پر موجود مزدوروں سے یہ پتا بھی چلا تھا کہ یہ وین دو دفعہ پہلے بھی یہاں آ چکی ہے اور کچھ مزدوروں کو لے کر جا چکی ہے۔

وین کا کھوج تو نہیں ملا تاہم اس روز ایک اور چیز سامنے آ گئی۔ عمران کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا کہ حشام روٹھی ہوئی ماہین کو ایک بار پھر منانے کی کوشش کرے گا۔ اس کوشش کا پتا مجھے ماہین کی بڑی بہن شاہین سے ہی لگا۔ وہ اکثر فون پر مجھ سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔ اس روز فون آیا تو وہ کافی الجھی ہوئی تھی، بولی۔

"ثاقب صاحب! مجھے تو اس حشام کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ پتا نہیں کس

مٹی کا بنا ہوا ہے۔ ماہین کا پیچھا چھوڑ کر نہیں دے رہا۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے استفسار کیا۔

"اتنا کچھ ہو گیا ہے لیکن پھر بھی ہماری چوکھٹ نہیں چھوڑ رہا۔ اتوار کے روز تو اس نے ماہین کو باقاعدہ خودکشی کی دھمکی دے دی اور پھر رات گئے گولیاں کھا بھی لیں۔ یہ بے ہوش ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ دو دن وہاں رہ کر کل ہی واپس آیا ہے۔ دوپہر سے مسلسل ماہین کو فون کر رہا تھا۔ وہ اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ موقع دیکھ کر گھر ہی آدھمکا۔ آیا بھی اس وقت جب چچا ثاقب اور ماموں شوکت گھر میں نہیں تھے۔ بند کمرے میں اس نے ماہین کے سامنے خوب رونا دھونا مچایا۔ اس کے پاؤں پر منہ تک رگڑا ہے اس نے۔"

"ہمیں بھی لگتا تھا کہ وہ ایسا ہی کچھ کرے گا۔" میں نے کہا۔

"کہتا ہے کہ ماضی میں اس نے جو کچھ بھی کیا، ماہین کی محبت میں کیا۔ جب ماہین کو کھونے یا پانے کی بات ہوتی ہے تو سب کچھ اس کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر نتیجہ کیا نکلا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ چچا ثاقب اور ماموں شوکت سے بھی غیر مشروط معافی مانگنا چاہ رہا ہے۔ ماہین نے بس اتنا کہا ہے کہ وہ ابھی اسے کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ اسے تھوڑا وقت چاہیے۔ یہ آئندہ حالات پر منحصر ہے کہ ان کا تعلق کیا رخ اختیار کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "شاہین! اس حوالے سے تمہارا تجزیہ کیا ہے؟"

"میں کیا کہوں تابش صاحب! کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہے۔ قبول صورت بھی ہے۔ لڑکی تو اسے اچھی سے اچھی مل سکتی ہے مگر جس طرح ماہین کے لیے بلک رہا ہے اور جان تک داؤ پر لگا رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ واقعی ماہین کے بنا رہنا اس کے لیے ناممکن ہو۔"

میں نے شاہین کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ بولی۔ "دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی بھی طرح اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہو اور پھر حسب رواج اپنا اصل روپ دکھانا شروع کر دے۔"

عمران کل رات سے میرے ہی گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں نے کہا۔ "اچھا شاہین! عمران آ رہا ہے۔ میں پھر بات کروں گا۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ وہ جھومتا ہوا اندر آ گیا۔ "دیکھ لیں چاچو جان! آج آپ نے صبح سویرے میرا منہ دیکھا تھا لہٰذا ایک اچھا دن اور ایک اچھی خوش خبری آپ کے حصے میں آئی ہے۔"

"کیا خوش خبری؟"

"پہلے آپ میرے منہ کی تعریف تو کریں۔"

"منہ تو میں نے سب سے پہلے ملازمہ کرن کا دیکھا تھا۔ تم تو گیارہ بجے تک خراٹے لے رہے تھے۔"

اس نے اپنی چمکیلی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں رات بارہ بج کر پانچ منٹ کی بات کر رہا ہوں۔ نیا دن اس وقت شروع ہو چکا تھا جب میں نے آپ کو شب بخیر کہا تھا۔"

بحث کا فائدہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "اچھا، خبر کیا ہے؟"

"آپ کا انسپکٹر زبیر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ اس نے نیلی اسٹیشن وین کا سراغ لگا لیا ہے۔"

خبر واقعی اہم تھی۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ انسپکٹر زبیر نے اٹھ کر سیلوٹ کیا اور تمتماتے چہرے کے ساتھ بتایا کہ آخر وین مل گئی ہے۔ اس وقت ماڈل ٹاؤن میں ایک زیر تعمیر پلازا کے سامنے کھڑی ہے۔"

"سنہری بالوں والی خاتون کا کوئی کھوج ملا؟"

"صرف اتنا پتا چلا ہے جی کہ وہی اس زیر تعمیر پلازا کی مالک ہے۔ انگلینڈ میں بھی اس کا کوئی بزنس ہے۔ وہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ کل شام کی فلائٹ سے وہ غالباً انگلینڈ ہی گئی ہے۔ پتا چلا ہے کہ اسے دو ڈھائی ہفتے بعد واپس آنا ہے۔"

"اس کے ساتھ جو لمبا تڑنگا بندہ ڈرائیونگ کر رہا تھا؟"

"وہ دراصل اس کا منیجر ٹائپ بندہ ہے۔ اس کا نام حارث خان ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھی ہی گیا ہے جی۔"

خوش خبری تو واقعی یہ تھی لیکن ادھوری تھی۔ جس خاتون اور ملازم سے ہم کچھ پوچھ سکتے تھے، وہ دونوں فی الوقت پاکستان میں نہیں تھے۔

"پلازا میں کتنی لیبر کام کر رہی ہے، زبیر صاحب؟" عمران نے دریافت کیا۔

"وہاں چوتھا لینٹل ڈال دیا گیا ہے اور اب تو کام تقریباً رکا ہوا ہے۔ نچلی منزلوں پر شاید پانچ چھ بندے نظر آتے تھے۔ ایک فورمین ٹائپ بندہ بھی وہاں موجود ہے لیکن وہ گونگا بہرا ہے۔"

میں نے انسپکٹر زبیر سے کہا کہ وہ بڑی احتیاط سے پلازا کے حالات جاننے کی کوشش کرے اور اس بات کا پتا کرے کہ دو تین روز پہلے تک یہاں کام کی کیا نوعیت تھی اور مزدوروں سے کیا کام لیا جا رہا تھا؟

اگلے تقریباً چوبیس گھنٹے گزر گئے۔ انسپکٹر زبیر کوئی بہت کارآمد بات دریافت نہ کر سکا۔ بس یہی معلوم ہوا کہ خاتون کا نام مائرہ خان ہے۔ اسے میم مائرہ کہا جاتا ہے۔ اردگرد کے لوگ اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ وہ

کسی سے ملتی جلتی نہیں ہے بلکہ اسے کسی حد تک پُراسرار بھی کہا جاسکتا ہے۔ گونگے بہرے فورمین کا نام جہانداں تھا اور وہ بھی ایک ناقابلِ فہم سا شخص تھا۔ انسپکٹر زبیر کی ایک بات چونکانے والی تھی۔ اس نے کہا۔ ''درحقیقت پلازا پر تعمیر کا کام پچھلے آٹھ دس روز سے تقریباً رکا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جس روز میم مائرہ اعوان ٹاؤن اسٹاپ سے چار پکی عمر کے مزدوروں کو لے کر گئی تھی، تب بھی یہاں کام بند تھا۔ وہ کہیں اور بھی کوئی تعمیراتی کام نہیں کرا رہی تھی۔''

''تو پھر ان مزدوروں کا اس نے کیا کیا تھا؟'' عمران نے بھویں اچکائیں اور سوچ میں کھو گیا۔

یہ معاملہ واقعی توجہ طلب تھا۔ اس پلازا میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا تھا جسے کھوجا جانا چاہیے تھا۔ رات کو بھی میں اور عمران اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ وہ اپنے ہلکے پھلکے اسٹائل میں بولا۔ ''چاچو! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ میم مائرہ کوئی گڑبڑ ٹائپ عورت ہو۔ میرا مطلب ہے عیش و عشرت کرنے والی۔ سنا ہے کہ ایسی عورتیں اپنا وقت رنگین بنانے کے لیے اس طرح کی حرکتیں بھی کر گزرتی ہیں۔ اڈوں سے محنت کشوں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔''

''بیکار کی نہ ہانکو۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''اگر کسی ایسی لوفر عورت نے اس طرح کا کام کرنا بھی ہو تو وہ تمہارے جیسے کسی جوان جہان کو لے جائے گی۔ وہ تو چن چن کر بڑی عمر کے بندے لے گئی ہے۔''

''چاچو جان! آپ بھی کبھی کبھی بھولی باتیں کرتے ہیں۔ یہ پھول پھول منڈلانے والی تتلیاں بڑے دکھرے ٹائپ کی ہوتی ہیں۔ کئی دفعہ صرف پکی عمر کے بندوں کو ہی پسند کرتی ہیں۔ یورپ میں نہیں دیکھا آپ نے؟''

''میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ تم ادھر ادھر کی نہ مارو۔ یہ سوچو اب کرنا کیا ہے؟''

وہ ایڈونچر کے موڈ میں تھا اور حقیقت میں میرا موڈ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد اچانک عمران کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی، بولا۔ ''چاچو! ایک کام کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا جب ہم چھانگا مانگا کے قریب ایک فارم ہاؤس میں گھٹنے کے لیے مزدور بنے تھے۔ وہ گیٹ اَپ واقعی آپ پر جچا تھا۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''اس پلازا میں اگر کسی مزدور کو نقصان پہنچایا گیا ہے یا پھر مار کر دفن کیا گیا ہے تو ہم وہاں ایک مزدور کی حیثیت سے جا کر کوئی اہم سراغ پا سکتے ہیں.....''

اس سے ملتی جلتی بات میرے ذہن میں بھی آ رہی تھی۔ کئی دفعہ جو کام تفتیش سے نہیں ہو پاتا، وہ تدبیر سے بہ آسانی ہوتا ہے اور بہت بہتر بھی۔ ''تو تم وہاں ایک مزدور کی حیثیت سے جانا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل، میں تیار ہوں..... لیکن.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے اور جو وہ کہنا چاہ رہا تھا، وہ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اعوان ٹاؤن کے اسٹاپ سے جو مزدور نیلی وین کے ذریعے اٹھائے جاتے رہے تھے، وہ نوجوان نہیں بلکہ چالیس سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ میں نے کہا۔ ''شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ مزدور کے بہروپ والا ایڈونچر میں کروں؟''

''نن..... نہیں..... کوئی ایسا ضروری بھی نہیں۔ آپ اپنے کسی بڑی عمر کے ماتحت کو بھی اس کام کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔''

''اگر جان کو خطرے میں ہی ڈالنا ہے تو پھر ماتحت کے بجائے اپنی جان کیوں نہ ڈالی جائے۔'' میں مسکرایا۔

''بس آپ کی یہی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ افسر ہونے کے باوجود آپ ہر وقت جوالا مکھی میں سر دینے کو تیار رہتے ہیں۔''

''جوالا مکھی نہیں، اوکھلی میں سر دیا جاتا ہے۔'' میں نے اسے درست کیا۔

واقعی گزرے ماہ و سال نے مجھے ایک عجیب سے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں ہر وقت کسی مشکل اور منفرد کام کی تلاش میں رہتا تھا۔

عمران بولا۔ ''لیکن میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ بطور مزدور آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔''

''وہ کیوں؟''

وہ پھر پٹڑی سے اُتر گیا۔ ''کیا پتا ہی کہ مجھے بھی آپ کے ساتھ ہی اغوا ہونے کا موقع مل جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میڈم بادری کی کوئی سہیلی بھی ہو جو پکی عمر کے مردوں کے بجائے مجھ جیسے نوشگفتہ پھولوں کو پسند کرتی ہو۔'' میڈم بادری سے اس کی مراد وہ سنہری بالوں والی میم مائرہ تھی۔

میں بھی خوشگوار موڈ میں تھا اس لیے اسے مجھ سے کوئی کڑوی کسیلی نہیں سننا پڑی۔ بہرحال وہ سنجیدہ ہو گیا اور ہم اگلے روز کا پروگرام فائنل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی بہت زیادہ امید تو نہیں تھی تاہم لگتا تھا کہ اس پلازا کے اندرونی حالات کا کچھ نہ کچھ علم ہمیں ہو جائے گا۔ شرط یہی تھی

کہ وہاں بطور مزدور ہمیں قبول کرلیا جاتا۔

میں نے اگلے روز صبح سویرے ہی انسپکٹر زبیر کو اپنے گھر پر بلا لیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ محکمے میں خاص اہلکاروں کو اکثر مخبری کے لیے بہروپ بھرنے پڑتے ہیں۔ چھابڑی فروش، ملنگ، قلی، ریڑھی بان، بھکاری اور ایسے دیگر لوگوں کے کاسٹیوم، اسٹور روم میں موجود ہوتے ہیں۔ میں نے زبیر سے اپنے اور عمران کے سائز کے عام مزدوروں والے دو لباس منگوا لیے تھے۔ سرد موسم کی مناسبت سے بوسیدہ سویٹر اور میلی کچیلی گرم چادریں بھی موجود تھیں۔ ہم تیار ہوگئے۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر عمران اپنی کلائی کی گھڑی کو بھولا ہوا تھا۔ وہ اس کے "گیٹ اپ" سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ میں نے نشان دہی کی تو اس نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا اور دیگر اشیا کی طرح گھڑی بھی جسم سے علیحدہ کردی۔ بغیر جرابوں کے ربر کی ٹوٹی پھوٹی جوتیاں پاؤں کو سن کررہی تھیں۔ ہم تاریک شیشوں والی ایک بلیو کار میں روانہ ہوئے اور دھند آلود سڑکوں سے گزر کر ماڈل ٹاؤن کے مطلوبہ پلازا تک پہنچ گئے۔ وہ ایک اچھا دن تھا شاید۔ ہم پلازا سے کچھ پہلے ہی گاڑی سے اتر گئے تھے۔ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہی ہوگیا۔ گونگے فورمین کا نام اشفاق جہاناں تھا۔ اس نے مستری خیاث نام کا ایک چاق چوبند بندہ اپنی معاونت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جب ہم نے ان سے بطور مزدور کام کرنے کے بارے میں پوچھا تو گونگے اشفاق نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہامی بھرلی۔ ہم سے شناختی کارڈ طلب کیے گئے۔ فیک شناختی کارڈ کی کاپیاں ہمارے پاس موجود تھیں۔ وہ فورمین کو دے دیں۔ گونگے فورمین کے معاون مستری خیاث نے مجھ سے پوچھا۔ "عمر کیا ہے تیری؟"

میں نے لجاجت سے کہا۔ "استاد جی! شناختی کارڈ پر لکھی ہوئی تو ہے۔ چالیس سے اوپر کا ہوں۔"

مستری خیاث تھوڑا سا شرمندہ ہوا کہ اس نے خود شناختی کارڈ پر عمر کیوں نہیں دیکھ لی۔ ہمارے ذمے جو ڈیوٹی لگائی گئی، وہ گراؤنڈ فلور کے دو کمروں میں روڑی بچھانے کی تھی۔ اس روڑی کو ساتھ ساتھ "دموسے" سے کوٹنا بھی تھا۔ مشقت طلب کام تھا۔ خاص طور سے عمران کے لیے۔ جیسے تیسے شام ہوئی۔ اس دوران میں ہم اردگرد کے حالات کا بغور جائزہ بھی لیتے رہے۔ دو بڑی گاڑیوں پر کچھ مشکوک افراد کی آمد و رفت بھی ہم نے دیکھی۔ شام کے بعد کچھ ایسا ہوا جو ہماری منشا و مرضی کے عین مطابق تھا۔ مستری خیاث اور فورمین نے باقی چھ سات مزدوروں کو تو دہاڑی دے کر واپس بھیج دیا مگر ہمیں مزدوری نہیں دی۔ سردیوں کی شام تیزی سے پر پھیلا رہی تھی۔ ہلکا سا کہرا بھی پڑنا شروع ہوگیا تھا۔

فورمین اور مستری خیاث مجھے سرتاپا دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ میرے کسرتی جسم سے بھی متاثر ہیں۔ مستری خیاث نے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"

"جی آفتاب اور یہ میرا بھتیجا ہے منظور....."

"آفتاب! اوور ٹائم لگا لے گا آج؟ ٹھیک ٹھاک پیسے ملیں گے۔"

"کرنا کیا ہے جی؟"

"کام بھی زیادہ سخت نہیں۔ یہ بول جاسکتا ہے کہ نہیں۔ سات آٹھ گھنٹے میں ڈھائی تین ہزار روپیا کمالے گا۔"

ذرا پس و پیش کے بعد میں مان گیا۔ مستری خیاث نے پوچھا کہ تمہارے گھر والے تو پریشان نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا۔ "میرا آگے پیچھے ہے ہی کوئی نہیں۔ یہ میرا بھتیجا منظور بھی ساہیوال سے کام کرنے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔ اس کا بھی کوئی مسئلہ نہیں لیکن میری چھوٹی سی عرضی ہے جی۔" میں نے تمہید نکال کر عاجزی سے کہا۔

"ہاں.... بتاؤ۔"

"ہم دونوں اکٹھے ہی کام کرتے ہیں جی۔ نہ یہ کہیں اکیلا جاتا ہے، نہ میں۔ آپ اس کا بھی اوور ٹائم لگوا دیں۔ مجھ سے بھی زیادہ کام کرے گا۔"

"مگر ضرورت ایک ہی بندے کی ہے اور وہاں ذرا بڑی عمر کا سمجھدار مزدور چاہیے جو عقل سے کام کرے۔"

میں نے مزدوروں والی خصوصی عاجزی کے ساتھ اصرار کیا۔ پہلے تو مستری خیاث پس و پیش سے کام لیتا رہا پھر گونگے فورمین سے اشاروں میں بات کرنے کے بعد اس نے میری بات مان لی۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ لاہور ہی میں ایک دوسری کوٹھی میں جانا ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ایک رکشا نما گاڑی آئی۔ یہ ویسی ہی گاڑی تھی جو اشیائے خورونوش منتقل کرنے کے لیے بیکریوں اور سوئٹس والے استعمال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ہمیں اندر بٹھایا گیا تو باہر کا ہر منظر اوجھل ہو گیا۔ سخت سردی میں تقریباً آدھ گھنٹا تک یہ رکشا گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی پھر ایک وسیع چار دیواری کے اندر پورچ میں رک گئی۔ میں اندازے لگانے کی کوشش کرتا

رہا تھا۔ یہ غالباً نہر کے پار شمالی لاہور کا کوئی علاقہ تھا۔ گرے رنگ کی وسیع کوٹھی تھی۔ آگے پیچھے بڑے بڑے لان تھے جہاں بلند درخت نظر آرہے تھے۔ کڑاکے کی سردی میں جب ہم عمارت کے اندر پہنچے تو خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔

مستری غیاث جس کو ماسٹر غیاث بھی کہا جاتا تھا، ہمارے ساتھ ہی رکشا گاڑی میں یہاں پہنچا تھا۔ وہ چوڑے شانوں اور مضبوط جسم والا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ رنگ گندمی تھا اور بال جیسے دھوپ میں رہ رہ کر بھورے ہو چکے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہاں کوئی گھڑاک شڑاک نہیں ہو رہا۔“

اس کی بات درست تھی۔ جن عمارتوں میں کوئی تعمیراتی کام ہو رہا ہو، وہاں ایسی خاموشی نہیں ہوتی۔

مستری یا ماسٹر غیاث نے ہمیں ایک ہال نما کمرے کے دروازے پر کھڑا کیا۔ عمران کو دوسری جانب بھیج دیا اور مجھے ہال کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ درمیانی عمر کے کوئی بیس مزدور نما اشخاص یہاں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر براؤن رنگ کی ایک جیسی شلوار قمیص میں تھے۔ وہ فرش پر بیٹھے یا صاف ستھرے گدوں پر لیٹے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ ایل ای ڈی کی اسکرین پر ”گرما گرم“ انڈین فلم دیکھ رہے تھے۔

غیاث نے کہا۔ ”یہاں آکر مجھے پتا چلا ہے کہ آج کام رکا ہوا ہے۔ صبح تمہیں کام پر لگا دیا جائے گا۔ تم جتنے دن چاہو یہاں کام کر سکو گے۔ مزدوری عام مزدوروں سے ڈبل سے بھی زیادہ ہوگی اور کام صبح دیکھ لینا کتنا آسان ہے۔“

”اور میرا بھتیجا؟“

”اس کا کام تھوڑا سخت ہوگا لیکن خوش وہ بھی بہت رہے گا۔ تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔“ ہال کمرے میں حرارت تھی پھر بھی ہر میٹرس کے ساتھ ایک کمبل موجود تھا۔ غیاث نے میرے میٹرس کی نشاندہی کی اور واپس چلا گیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں معمول سے ہٹ کر کچھ ہو رہا ہے۔ سب اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ انہیں میری آمد سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ میں اپنے میٹرس پر بیٹھا تو مضبوط ہاتھ پاؤں والا ایک پینتالیس پچاس سالہ مزدور میرے پاس آبیٹھا۔ اس نے خوشدلی سے میرا نام وغیرہ پوچھا اور دریافت کیا کہ کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے فیک شناختی کارڈ کے مطابق خانیوال کا نام لیا۔ اس نے بتایا کہ وہ لاہور کا ہی رہنے والا ہے۔ مراد نام ہے۔ چار بیٹیوں کی شادی کر چکا ہے اور اب پانچویں کے لیے محنت مزدوری کر رہا ہے۔ بیٹا کوئی نہیں جو ہاتھ بٹا سکے۔

میں نے کہا۔ ”مراد بھائی! یہاں کام کیا ہو رہا ہے؟“

”کام بڑا مزیدار ہے یارا سمجھ کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ریت صاف کرنا ہے۔ چل تجھے کل خود ہی پتا چل جائے گا اور دہاڑی پتا ہے کتنی ہے؟“

”کتنی؟“

”پورے تین ہزار۔ کھانا ناشتا بھی مالکوں کا ہے۔ بس اتنی پابندی ہے کہ گھر نہیں جا سکتے۔“

”کیا مطلب؟“

”مالکوں کا کہنا ہے کہ جتنے دن بھی کام کرنا ہے، یہاں ہی رہنا ہے۔ جو ایک بار کام چھوڑ دیتا ہے، اسے دوبارہ نہیں لیتے۔ میرے ایک گرائیں نے پچھلے سے پچھلے ہفتے کام چھوڑا تھا۔ پکی بات ہے کہ اب پچھتا رہا ہوگا۔“

”تم خود کتنے دن سے ہو یہاں؟“

”مجھے تو یہ چوتھا ہفتہ ہے۔ کئی ایسے ہیں جن کو دو تین مہینے ہو گئے ہیں یہاں۔“

”تمہارے گھر والوں کو کیا پتا ہے؟“

”مالک بڑے چنگے ہیں یارا! جو بندے یہاں کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، ان کے گھروں پر باقاعدہ اطلاع پہنچائی جاتی ہے اور ایڈوانس خرچہ بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا کہ تمہارے گھر اطلاع پہنچ گئی ہے اور خرچا بھی؟“

”جو خط لکھ سکتا ہے، وہ خط لکھ دیتا ہے۔ دوسروں کی آواز موبائل فون پر ریکارڈ کر کے گھر والوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان کی آواز بھی یہاں ہمیں پہنچا دیتے ہیں۔ میری چھوٹی بیٹی کا نام ثمینہ ہے۔ اس کی ماں کا نام رضیہ ہے۔ رضیہ نے پچھلے ہفتے اٹھارہ ہزار وصول کر کے اپنی آواز ریکارڈ کرائی تھی۔ وہ بڑی خوش ہے بلکہ سارے ہی خوش ہیں۔ جن مزدوروں نے رقم نہیں بھیجنا ہوتی، وہ ان کے پاس ہی جمع ہوتی رہتی ہے۔ دس بارہ تو ایسے ہیں جن کے پاس لاکھ لاکھ روپیا ہو گیا ہے۔“

”اتنے پیسے کیوں دے رہے ہیں یہ لوگ؟“ میں نے ذرا آواز دبا کر کہا۔

”یارا! تم سوال بڑے پوچھتے ہو۔ شکل سے بھی مزدور کم اور تھانیدار زیادہ لگتے ہو۔“ وہ ہنسا پھر دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ ”تمہیں بتایا ہے نا کہ بڑے کھلے دل کے شاہ خرچ لوگ

ہیں۔ کئی تو ایسے ہیں جو یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتے پر زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین مہینے بعد یہ پرانے مزدوروں کو چھٹی دے دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا مرادے! یہ تو بتا کہ ہم اس وقت ہیں کس جگہ پر؟"

مرادے نے جو جواب دیا، وہ میری توقع اور اندیشے کے عین مطابق تھا۔ "جگہ کا تو زیادہ پتا نہیں لیکن لاہور میں ہی ہیں۔ دراصل جب مجھے اور میرے محلے دار کو یہاں لایا گیا تو وہ ایک بند لوڈر گاڑی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا کہاں سے گھوم گھوم کر یہاں آئی ہے۔ کاروباری لوگوں کے کئی مسئلے ہوتے ہیں۔ ٹیکسوں والے بھی تو تنگ کرتے ہیں۔ شاید یہ اپنے اس کام کو ذرا... چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں۔"

میرا اگلا سوال یہی ہونا تھا کہ آخر یہ ریت چھاننے والا کام ہے کیا لیکن اسی دوران میں ہال کمرے میں موجود سارے مزدور الرٹ نظر آنے لگے۔ زیادہ تر مؤدب انداز میں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ وہ سب جہازی سائز کی دیوار گیر کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے وہاں وہی اٹھائیس تیس سالہ سرخ و سپید لیڈی نظر آئی جسے چند روز پہلے ہم نے نیلی اسٹیشن ویگن میں دیکھا تھا۔ وہ اب پتلون اور جرسی پہنے ہوئے تھی۔ تراشیدہ سنہری بال، بھرے رخساروں پر پھیلے لے رہے تھے۔ اس کے چھریرے جسم کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ خاصی چاق چوبند عورت ہے۔ دوسرا اندازہ مجھے یہ ہو رہا تھا کہ وہ مخلوط النسل کی ہے۔ غالباً برطانوی نژاد۔ اس کی بھویں کسی تنی ہوئی کمان کی طرح تھیں مگر فی الحال وہ ان مزدوروں کی طرف مسکراتے چہرے سے دیکھ رہی تھی۔ گونگا فورمین اور ماسٹر غیاث مؤدب انداز میں اس کے عقب میں تھے۔

وہ بلند آواز میں بولی۔ "چلو دوستو! شاباش! کھانا وغیرہ تو تم نے کھا لیا ہے، اب لائٹس آف کرو اور سو جاؤ۔"

مختلف ہدایات دیتی ہوئی وہ بڑی شان و شوکت سے آگے بڑھ گئی۔

میں حیران ہو رہا تھا۔ دو تین روز پہلے میرے ساتھی زبیر نے جو کھوج لگایا تھا، اس کے مطابق میم مائرہ اپنے منیجر کے ساتھ یورپ گئی ہوئی تھی لیکن وہ یہاں اس پُراسرار عمارت میں پائی جا رہی تھی۔ یہاں کے سارے معاملات ہی مشکوک نظر آتے تھے۔ مجھے عمران کی بھی فکر تھی۔ وہ بڑا منہ پھٹ تھا۔ اس دبنگ میم جی کے سامنے کچھ الٹا سیدھا کہہ دیتا تو مشکل پڑ سکتی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز ہال میں ہی وہی پراٹھا اور آملیٹ کے پُرتکلف ناشتے کے بعد ہم کام والی جگہ پر پہنچ گئے۔ درمیانی عمر کے ہم تقریباً بائیس "مزدور" تھے۔ یہ بھی ایک بڑا ہال ہی تھا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ ہوا کہ یہاں زردی مائل ریت کا ایک بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ یقیناً یہ ابھی ابھی کسی بڑے لوڈر سے اتارا گیا تھا۔ یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی چھلنیاں بھی پڑی تھیں۔ سارے مزدور ایک نیم دائرے کی شکل میں ریت کے اردگرد بیٹھ گئے۔

میرے دوست مرادے نے مجھے کام سمجھانے کے لیے کچھ زردی مائل ریت چھلنی میں ڈالی اور اسے چھاننا شروع کیا۔ ریت چھن گئی مگر رائی کے دانے جیسے آٹھ دس چھوٹے چھوٹے کنکر چھلنی میں باقی رہے۔ مراد بولا۔ "یہ دیکھو..... یہ باریک کنکر بھی اس ریت ہی کی طرح پیلے رنگ کے ہیں مگر ان میں سے یہ دو تین زیادہ پیلے ہیں۔ یہ زیادہ پیلے ہی ہمیں چن کر علیحدہ کرنا ہیں اور ان برتنوں میں ڈالنے ہیں۔"

اس نے شیشے کے چند بڑے بڑے جاروں کی طرف اشارہ کیا۔

"کام تو واقعی آسان لگ رہا ہے مرادے! بیٹھے رہو اور زنانیوں کی طرح دال چنتے رہو لیکن یہ چینی یا رائی جیسے باریک کنکر آخر کس کام آتے ہیں؟"

"ایک تو سوال بڑے پوچھتا ہے تُو۔ لگتا ہے تیرے اگلے پچھلوں میں کوئی ضرور پاس میں رہا ہوگا۔ تجھے کیا لوڑ ہے یہ سب جاننے کی؟ بس کام کر اور اپنے روپڑے جیب میں ڈال۔ سچ کہتا ہوں، اگر مجھے اپنی چھوٹی کے دیاہ کی فکر نہ ہوتی تو میں نے میم جی کا منت ترلا کر کے اور تین چار مہینے یہیں پر رہ جانا تھا۔"

"اچھا، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی مرادے! یہاں سارے مزدور پکی عمر کے کیوں ہیں؟"

وہ بیزاری سے بولا۔ "چھوٹی عمر کے بھی ہوں گے پر وہ کسی دوسرے کمرے میں کام کر رہے ہوں گے..... اور یہ دیکھ، میں تیرے سامنے ہتھ جوڑتا تھانیدار..... یہ پر چولیں (انگوٹھیاں) چھوڑ دے اور کام کر۔ یہ جو گونگا فورمین اشفاق خان ہے نا، ڈھاڈا بھی بڑا ہے۔"

میں آلتی پالتی مار کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا اور دوسروں کی طرح یہ زرد ریت چھاننے میں مصروف ہو گیا۔ یہ ریت یہاں کی نہیں تھی۔ شاید کہیں چولستان یا تھر کی طرف

سے آئی تھی۔ اس میں سے ایک طرح کی بساند سی بھی اٹھتی تھی۔ گہرے زرد رائی جیسے دانوں کی بھی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اچانک شور سا اٹھا۔ تین چار نرس نما لڑکیاں اپنی اونچی ایڑیوں پر ٹھک ٹھک کرتی اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے سائز کے میڈیکل باکسز تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا بلکہ میں نے دیکھا کہ دو چار مزدوروں نے اپنی آستینیں چڑھانا شروع کر دی تھیں جیسے انجکشن لگوانا چاہ رہے ہوں۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے مراد سے پوچھا۔

''ہفتے کے روز ٹیکے لگتے ہیں اور کبھی کبھی منگل وار کو بھی۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''کس چیز کے ٹیکے؟''

میرے بائیں جانب بیٹھا ہوا مزدور مجھے سمجھانے والے لہجے میں بولا۔ ''او بھائی! یہ جس ریت پر ہم کام کر رہے ہیں نا..... یہ عام نہیں ہے۔ اس میں سے ہوا (بو) سی اٹھ رہی ہے نا۔ یہ گلے، چھاتی کو نقصان پہنچا سکتی ہے اسی لیے احتیاط کے طور پر ٹیکا لگا دیا جاتا ہے۔''

بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی لیکن اس وقت انکار کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی ایسا معمولی انجکشن نہیں ہوگا، کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے بھی انجکشن لگوا لیا۔

سارا دن میں دوسرے ہم عمر مزدوروں کے ساتھ ریت چھاننے اور چننے کا کام کرتا رہا۔ دوپہر کے علاوہ رات کو بھی پرتکلف کھانا ملا۔ شام کے بعد سب مزدور اپنے رہائشی کمپاؤنڈ میں واپس آ گئے۔ گپ شپ اور تفریح وغیرہ ہوتی رہی۔ مجھے پتا چلا کہ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ لاہور میں کس جگہ موجود ہیں اور یہ لاہور ہے یا لاہور کا کوئی مضافاتی علاقہ ہے۔ عمران کی جھلک ابھی تک نظر نہیں آئی تھی تاہم مراد عرف مرادے کا کہنا تھا کہ وہ بھی خیر خیریت سے ہی ہوگا۔

دوسرے روز دوپہر تک تو خیریت رہی پھر مجھے بخار محسوس ہونے لگا جو تیز ہوتا چلا گیا۔ میں نے ماسٹر (مستری) غیاث کو اس سے آگاہ کیا۔ وہ جیسے پہلے سے کسی ایسی صورت حال کا منتظر تھا، فوراً اپنے گونگے فورمین کو بلا لیا۔ انہوں نے مجھ سے کام چھڑوایا اور اپنے ساتھ لے کر ایک صاف ستھری راہداری میں آ گئے۔ طویل راہداری سے گزر کر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جو کسی پرائیویٹ اسپتال کے وارڈ جیسی تھی۔ چودہ پندرہ بستر تھے۔ ان میں سے دو بستروں پر مریض موجود تھے۔ وہ بھی مزدور ٹائپ ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک بہ مشکل سترہ اٹھارہ سال کا ہوگا۔ دوسرا تین کے پیٹے میں تھا۔ دونوں کو ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ ایک کو نہایت شدید قسم کی کھانسی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے بھی بستر پر لٹا دیا گیا۔ ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر میرے اردگرد گھومنے لگی۔ اس نے میرا بی پی، ٹمپریچر وغیرہ چیک کیا۔ ایک انجکشن لگایا اور بخار کم کرنے والی دوا بھی دی۔ پتا نہیں کیوں اس ڈاکٹر کی شکل مجھے کچھ دیکھی ہوئی سی لگتی تھی۔ میں نے دبی دبی لب و لہجے میں پوچھا۔ ''ڈاکٹر نی جی! کیا مسئلہ ہوا ہے میرے ساتھ؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ ''اس ریت کی وجہ سے اکثر بخار اور چھاتی کی جکڑن وغیرہ ہو جاتی ہے۔''

''چھاتی کی جکڑن تو مجھے بھی بہت ہو رہی ہے جی۔'' میں نے کھینچ کر سانس لی۔

''ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دو دن کی بات ہے۔'' اس نے کہا اور نوجوان مریض کی طرف متوجہ ہو گئی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تو اپنے بخار کی وجہ وہ انجکشن لگ رہا تھا جو کل دوپہر مجھے لگا یا گیا تھا مگر وہ انجکشن دوسروں کو بھی تو لگا تھا۔ وہ سب بھلے چنگے رہے تھے۔ تو کیا میرا انجکشن کوئی دوسرا تھا؟

تقریباً 72 گھنٹے میں نے سخت تکلیف میں گزارے۔ بخار تو کسی وقت کم ہو جاتا تھا مگر چھاتی کی جکڑن برقرار تھی۔ تیسرے روز رات کو طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی اور بخار جاتا رہا مگر کمزوری اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ ہاتھ پاؤں ہلانا بھی کارِ دشوار لگتا تھا۔ اس دوران میں وارڈ میں اِکا دُکا مریضوں کی آمد جاری رہی۔ وہ سب غریب گھرانوں کے لگتے تھے یا پھر مزدور تھے۔ درمیانی عمر کے ایک پٹھان کی ناک سے گاہے بہ گاہے خون رسنے لگتا تھا۔ وارڈ میں موجود سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا بدستور وارڈ میں موجود تھا۔ وہ بھی پٹھان تھا اور کہیں خیبر ایجنسی کی طرف سے آیا تھا۔ اس کی آواز سریلی تھی۔ ایک رات وہ دھیمی آواز میں گنگنانے لگا۔ ''پہلے تو کبھی کبھی تم تھا..... اب تو ہر گھڑی تیری یاد ہی ستاتی ہے۔''

اس چھوٹی سی عمر میں پتا نہیں کس گاؤں سے روگ لگا کر یہاں آیا تھا اور یہاں لاہور میں اینٹیں پتھر ڈھو رہا تھا۔ عجیب درد محسوس ہوا اس کی آواز میں۔ رات گئے درمیانی عمر کے پٹھان کی حالت مزید خراب ہوئی تو وہ ڈاکٹر دیر تک اسے طبی امداد دیتے رہے۔ میری سماعت میں وہ فقرہ گونجے

لگا جو عمران کے بقول سنہری بالوں والی عورت نے بولا تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ بندوں (مزدوروں) کی عمر کا خاص خیال رہے۔ یہ نہ ہو کہ دو چار اور لوگوں کو دفن کرنا پڑ جائے.....

یہاں جو کچھ بھی چل رہا تھا، کافی پُراسرار نوعیت کا تھا۔ ماسٹر غیاث اور گونگا فورمین دو تین دفعہ وارڈ کا چکر لگا چکے تھے۔ میں نے ہر بار ان سے درخواست کی تھی کہ میں اپنے بھتیجے سے ملنا چاہتا ہوں۔ میری طبیعت کچھ سنبھلی تو انہوں نے مجھے عمران کے درشن کرا دیے۔

اب وہ بھی میری طرح خاکی شلوار قمیص میں نظر آ رہا تھا۔ ہشاش بشاش بھی لگتا تھا۔ "چاچو جی! یہ کیا ہو گیا آپ کو، ایک دم کمزور نظر آنے لگے ہو۔"

"ناہنجارا! مرتے مرتے بچا ہوں۔"

اس نے دائیں بائیں دیکھا اور قدرے شوخی سے بولا۔ "میں نے کہا تھا نا آپ سے، ضروری نہیں ہوتا کہ مس مائرہ جیسی لیڈیز نوجوان لڑکوں کو ہی پسند کریں، اب دیکھیں، مجھے کسی نامعقول نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

"اور تمہارا مطلب ہے کہ مجھے لگایا ہے؟"

"لگایا ہی ہے تو آپ کا منہ چوسے ہوئے آم جیسا ہو گیا ہے نا۔ اس کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے؟"

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "کمزوری بہت زیادہ ہے۔ میرا ایک کرارا تھپڑ تمہارے منہ پر ادھار رہا۔ یہ معاملہ بہت سیریس ہے اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں۔"

دائیں بائیں دیکھ کر اس نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے بھی انجکشن لگایا گیا تھا۔ طبیعت میری بھی کچھ خراب ہوئی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس زہر دربت کی وجہ سے الرجی وغیرہ ہوتی ہے جس کے سبب یہ انجکشن لگائے جاتے ہیں لیکن بات کچھ اور ہے۔"

"تم بھی ربت چھاننے والا کام کر رہے ہو؟"

"ہاں، کوئی نہیں بندے ہیں۔ سارے میری ہی عمر کے ہیں۔" اس نے آواز مزید دھیمی کی۔ "چاچو! مجھے تو لگتا ہے کہ انہوں نے ایج گروپ بنائے ہوئے ہیں۔ بوڑھے، درمیانی عمر کے اور بالکل نوجوان۔ ہر گروپ کو طے شدہ رکھا گیا ہے اور یہی ربت والا کام سونپا گیا ہے۔"

"ربت میں سے جو یہ زرد رنگ کے موتی جیسے دانے نکلتے ہیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کسی میڈیسن یا خاص کیمیکل میں استعمال ہوتے ہوں اور اگر....."

عمران کو خاموش ہونا پڑا کیونکہ وہی لیڈی ڈاکٹر ایک قریبی بستر پر آن موجود ہوئی تھی جس کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی لگتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا تو عمران بھی دھیان سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے بھی ڈاکٹر کے نقوش کچھ جانے پہچانے سے لگے تھے مگر کسی نتیجے پر وہ بھی نہیں پہنچا۔ جب ڈاکٹر میری طرف آئی تو اس نے خشک لہجے میں عمران کو باہر جانے کا کہہ دیا۔ وہ اٹھا، مزدوروں کے ہی انداز میں اپنا صافہ جھاڑ کر کندھے پر رکھا اور باہر چلا گیا۔ اداکاری میں ماسٹر تھا۔ ڈاکٹر مجھ سے حال احوال پوچھنے لگی۔ وہ بڑی باریک بینی سے جاننا چاہ رہی تھی کہ پچھلے دو روز میں میری کیفیت کیا رہی ہے اور کس طرح تبدیل ہوئی ہے؟

کسی وقت تو مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ یہ انجکشن کسی قسم کا تجربہ تھا جو مجھ پر اور دوسرے لوگوں پر کیا جا رہا تھا۔ لوگوں کا مختلف ایج گروپس میں ہونا بھی اسی طرف اشارہ کرتا تھا۔

اگلے روز سہ پہر تک طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اونچا لمبا ماسٹر غیاث میرے پاس آیا اور پنجابی نما اردو میں بولا۔ "میم جی تم سے ملنا چاہتی ہیں..... تم پیدل چل سکو گے یا تمہارے لیے پہیوں والی کرسی منگوا دوں؟"

"نہیں، میں چل لوں گا۔" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میم جی نے مجھ سے کیا کہنا ہے؟"

"یہ تو ان کو ہی پتا ہوگا۔" وہ بولا۔

چند منٹ بعد میں غیاث کے ساتھ ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک بڑے شاندار سے سجے سجائے آفس میں پہنچا۔ یہاں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ ایک بڑی میز کے پیچھے سوٹڈ بوٹڈ مس مائرہ بڑی نفاست سے براجمان تھی۔ ایک مزدور کی حیثیت سے میں دروازے کے پاس ہی قالین پر بیٹھ گیا۔ میلا کچیلا، پھول دار صافہ میں نے سر پر ڈالا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ "تم تو شکل سے کچھ پڑھے لکھے بھی لگتے ہو۔ آئے کہاں سے ہو؟"

"خانیوال سے مالکن! ویسے میں صرف پانچویں "جماعت" تک ہی اسکول میں گیا ہوں۔"

وہ میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "اس عمر میں بھی تمہارا جسم ورزشی ہے۔ لگتا ہے کہ سخت مشقت سے جی نہیں چراتے؟"

میں نے انکساری سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اٹھ کر میرے ہاتھوں کے ناخن دیکھے۔ میرا منہ کھلوا کر میری زبان چیک کی پھر وہی باتیں پوچھنے لگی جو کچھ دیر پہلے لیڈی

ڈاکٹر نے پوچھی تھیں۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لوگ مجھ پر اپنے انجکشنز کے اثرات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

اسی دوران میں مس مائرہ کے بیش قیمت سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کرسی پر جا بیٹھی اور انگلش میں باتیں کرنے لگی۔ شاید ایس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سمجھ رہا ہوں۔ اسپیکر کی آواز تیز تھی۔ دوسری طرف کی آواز بھی تقریباً سنائی دے رہی تھی۔ مائرہ غالباً وائس ایپ پر بیرونِ ملک بات کر رہی تھی۔ دوسری طرف اس کا کوئی مارک نامی جواں سال ساتھی تھا، مائرہ اسے اپنے کسی دوست کے بارے میں بتا رہی تھی جو اسپتال میں بہت بُری حالت میں تھا۔ وہ اسے بہترطبی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مارک سے باتیں کرتے ہوئے مائرہ کے لہجے میں رومانوی سی مٹھاس محسوس ہو رہی تھی۔

دوسری طرف سے اس مارک وان نامی شخص نے پوچھا۔ ''پراجیکٹ کی کیا پوزیشن ہے؟''

''ابھی تو کچھ زیادہ اچھی نہیں لیکن وہ صحت یاب ہو کر آ گیا تو سارے کام میں جان پڑ جائے گی۔ دیکھا جائے تو اس سارے کام کا اصل کرتا دھرتا وہی ہے۔''

''تم بھی تو کچھ کم جان نہیں مار رہی ہو مائرہ! بس افسوس یہی ہے کہ بڑے غلط وقت پر وہ اس حادثے کا شکار ہوا۔''

وہ دونوں گفتگو کرتے رہے۔ میں لاتعلق سا گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نہایت اہم گفتگو سے انکشاف ہوا کہ یہاں کوئی ویکسین قسم کی چیز تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر جس شخص نے اس ''نیک کام'' کا آغاز کیا تھا، وہ کچھ مخالفین کی وجہ سے ایک حادثے کا شکار ہوا اور اسپتال جا پہنچا۔ البتہ اب بہترین طبی سہولتوں کی وجہ سے وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا اور دو چار دن میں یہاں واپس آ سکتا تھا۔ میم مائرہ آج کل انگلینڈ میں رہائش پذیر تھی مگر اپنے اس دوست کو پیش آنے والے اس حادثے کی وجہ سے پاکستان آئی ہوئی تھی۔ اس گفتگو سے مجھے ایک اور شک بھی ہوا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ بیمار شخص کسی جرم میں شریک رہا ہے اور اسے بہترین طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے پولیس کو ڈی سے بزورِ بازو چھڑایا گیا ہے۔

فون پر میم مائرہ کی گفتگو لمبی ہوتی جا رہی تھی اس لیے اس نے اشارے سے مجھے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں باہر آ گیا۔

وہ کون تھا جس کا انتظار یہاں بڑی شدت سے کیا جا رہا تھا اور جو اس سارے مشکوک و پُراسرار کاروبار میں میم مائرہ کا اہم ترین ساتھی تھا؟ اس کا علم تین روز بعد ہوا۔

میں اب بہت بہتر تھا۔ میری دس روز کی پگار مبلغ تیس ہزار روپیہ کیش کی صورت میں مجھے دے دی گئی تھی۔ ہمارے رہائشی ہال کمرے میں ایک بڑی آہنی الماری میں چھوٹے چھوٹے درجنوں لاکرز بنے ہوئے تھے۔ ان پر نمبر درج تھے اور مزدوران میں نقدی سمیت اپنی ذاتی اشیا رکھتے تھے۔ میں الماری میں اپنا خانہ بند کرنے کے بعد اپنے ہم عمر مزدوروں کے ساتھ کام والی جگہ پر چلا گیا۔ مراد بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ آج اسے بھی پگار ملی تھی۔ اس نے فوری طور پر پچیس ہزار روپیا ایک خط سمیت اپنے گھر بھجوا دیا تھا اور اپنی لاڈلی بیٹی کے جہیز کی کچھ ضروری اشیا خریدنے کی ہدایت کی تھی۔ ایسی رقوم مالکوں کے کارندے ہی مختلف پتوں پر منی آرڈر کرتے تھے یا شاید خود بھی پہنچاتے تھے۔ ہم کام والی جگہ پر پہنچے اور زرد ریت چھان چھان کر حسبِ معمول گہرے زرد باریک کنکر بڑی احتیاط سے شیشے کے جاروں میں جمع کرتے رہے۔ اچانک کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیوں کی دوسری جانب ہم نے دیکھا تو چند مسلح گارڈز بالکل الرٹ نظر آئے۔ وہ راستہ صاف کر رہے تھے اور ان کے عقب میں کچھ لوگ تیزی سے راہداری میں داخل ہو رہے تھے۔ ان داخل ہونے والوں میں میم مائرہ کو میں نے سنہری بالوں کی وجہ سے فوراً پہچان لیا اور تب میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا ہی نہیں ہوا۔ پینٹ کوٹ والے ایک کوتاہ قد شخص کو بڑے احترام سے اندر لایا جا رہا تھا۔ قد پانچ فٹ سے شاید کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ سیاہی مائل رنگ، ناک غیر معمولی طور پر چپٹی اور آنکھیں..... آنکھیں اس قدر موٹی اور ابلی ہوئی کہ یوں لگتا تھا ابھی گر پڑیں گی۔ اس کے بدنما چہرے پر چند ہفتے پرانی چوٹوں کے نشان اسے مزید بدنما بنا رہے تھے۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا اور نہ ہی میں اسے بھول سکتا تھا۔ میرے پہلو میں کھڑا مراد عرف مرادے بھی یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے آگاہ کرنے والے انداز میں بولا۔ ''یہ یہاں کا بڑا مالک ہے۔ بہت ہی سخت اور غصے والا ہے۔ اسے جادو را سے کہتے ہیں۔ چند ہفتے پہلے اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بہت چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے ساتھ کوئی خوب صورت زنانی بھی تھی جو مر گئی تھی۔''

جو کچھ مرادے مجھے بتا رہا تھا، میں اس سے کہیں زیادہ

جانتا تھا۔ یہ شخص جعلی دواؤں کے دھندے کا سرخیل تھا۔ دواؤں کے نام پر زہر ہمارے گلی کوچوں اور خصوصاً دیہی علاقوں میں پھیلاتا تھا۔ ان گنت لوگوں کا خون اس منحوس شخص کے سر پر تھا۔ یہ قانون سے بھاگنے کی کوشش میں اپنی کار کا ایکسیڈنٹ کرا بیٹھا تھا۔ محبوبہ چاندنی ماری گئی تھی اور یہ حواس کھو کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اس کا مقدر پھانسی کا پھندا تھا مگر پھانسی کے پھندے کے بجائے یہ اب اس پُراسرار عمارت میں نظر آرہا تھا۔

بات یہی سمجھ میں آرہی تھی کہ یہاں اس پُراسرار عمارت میں جو ویکسین یا جعلی ویکسین قسم کی چیز تیار کی جارہی تھی، اس کے پیچھے بھی یہی مکروہ شخص تھا۔ غالباً میم مائرہ اس کی ساجھے دار تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ اگر اس بدبخت کی نظر مجھ پر پڑ جائے تو کیا ہوگا؟ میں نے اپنا صافہ اپنے سر پر اس طرح رکھا کہ "گھونگٹ" سا بن گیا۔ جادو راے اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ مجھ سے صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے گزرا۔ اس کے ہونٹ پان سے رنگے ہوئے تھے اور ایسی ہی سرخی اس کی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔ وہ گزر گیا تو یوں لگا جیسے ایک طوفان سا ہلچل مچا کر آگے نکل گیا ہے۔

مزدور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے پھر ماسٹر غیاث کی ہلکی سی ڈانٹ پر اپنے کام میں لگ گئے۔ میں بھی ایک بار پھر گول چھلنی میں ریت چھاننے لگا۔ میری سماعت میں میم مائرہ کی وہ انگلش گفتگو گونجنے لگی جو تین روز پہلے اس نے میری موجودگی میں فون پر کسی مارک نامی شخص سے کی تھی۔ مائرہ نے کہا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ پراجیکٹ کی صورتِ حال زیادہ اچھی نہیں لیکن وہ صحت یاب ہو کر آگیا تو بہت کچھ بہتر ہو جائے گا۔ اس گفتگو سے مجھے یہ تاثر بھی ملا تھا کہ جس شخص کی بات ہو رہی ہے، اسے زبردستی پولیس کی حراست سے نکالا گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ تو وہ شخص یہی جادو راے تھا۔ اس کی کم از کم سزا موت تھی۔ کچھ صحافیوں نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ اسے سرِعام پھانسی دی جانی چاہیے مگر طاقتور لوگوں کے لیے کیا ممکن نہیں ہوتا۔ دھن اور دھونس کی مدد سے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ پھانسی کی کوٹھری کی آہنی سلاخوں تک کو پگھلا لیتے ہیں۔ جادو راے بھی اب باہر تھا۔

اگلے روز ہفتہ وار چھٹی تھی۔ چھٹی کے روز ہر عمر کے مزدور ایک کھلی جگہ پر جمع ہو جاتے تھے۔ یہ جگہ ایک چھوٹے "لان ڈور" پلے گراؤنڈ کی طرح تھی مگر یہاں کوئی کھیل کود نہیں ہوتا تھا۔ ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق وقت گزارتا تھا۔ مجھے کئی دن سے اس ہفتہ وار چھٹی کا انتظار تھا کیونکہ میری ملاقات عمران سے ہو سکتی تھی اور یہ ملاقات ہوئی بھی۔ ہم دونوں ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم ایک بہت بڑی خبر سے بے خبر ہو۔"

"کیسی خبر؟"

"جعلی دواؤں والا ڈان! بدبخت جادو راے یہاں موجود ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس ویکسین یا جعلی ویکسین کے سارے کاروبار کو بھی وہی چلا رہا ہے، اس برطانوی نژاد مائرہ کے ساتھ مل کر۔"

عمران واقعی بہت حیران ہوا۔ میں نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو مجھے اب تک معلوم ہوا تھا۔ یہ امر عمران کے لیے بھی تشویش ناک تھا کہ ایک خطرناک ترین مجرم اور قاتل قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک بار پھر آزاد تھا۔ نہ صرف آزاد بلکہ ایک نہایت مشکوک قسم کی وسیع سرگرمی میں مصروف تھا۔

عمران کے ذہن میں بھی وہی بات آئی جو میرے ذہن میں آچکی تھی۔ وہ بولا۔ "چاچو محترم! اگر اس شخص نے یا اس کے کسی کارندے نے ہمارے چہرے پہچان لیے تو پھر ہمیں اپنے چہرے پہچاننے مشکل ہو جائیں گے اور کوئی بڑی بات نہیں کہ فوراً سے پہلے عدم آباد کے ٹکٹ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے جائیں۔"

یکایک میں چونک گیا۔ مجھے اپنی کلائی پر ہلکی سی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ یہ وہی بوسیدہ گھڑی تھی جو عمران نے پچھلے ماہ مجھے تحفے میں دی تھی اور ڈائل یہ دیا تھا کہ یہ عمران دانش مرحوم کی نشانی ہے۔ دراصل اس بوسیدہ گھڑی میں ایک نہایت قیمتی اور حساس ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ اس گھڑی کا لنک عمران کی گھڑی سے تھا تاہم عمران کی گھڑی میں نے اس وقت اتروا دی تھی جب ہم مزدوروں کا بھیس بدل رہے تھے۔

میرے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر عمران نے کہا۔ "کیا ہوا چاچو؟"

میں نے اسے گھڑی پر ہونے والے ارتعاش کا بتایا۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں۔ مزدوروں کا حلیہ اختیار کرتے وقت عمران نے اپنی گھڑی اتار کر میری ہی رہائش گاہ پر... ڈی لاؤنج کی الماری میں رکھ دی تھی (وہ ایک مہنگی گھڑی نظر آتی تھی) کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ گھڑی کسی کے ہاتھ آگئی ہے اور وہ ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میرے اور عمران کے علاوہ اس گھڑی کی اصلیت سے میرا ساتھی انسپکٹر زبیر، ایس ایس پی جمشید صاحب اور ماہین آگاہ تھے۔ گھڑی پر پھر ارتعاش ہوا۔ عمران سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''چاچو! ٹرانسمیٹر کا دائرہ تین میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی ہم سے رابطہ کر رہا ہے تو وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

ہمیں اس عمارت میں بند ہوئے اب بارہ دن ہونے کو آئے تھے۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ ہمارے پیچھے تشویش پائی جارہی ہوگی۔ حالانکہ میں انسپکٹر زبیر وغیرہ کو تسلی دے کر آیا تھا کہ ہمیں دو چار دن بھی لگ سکتے ہیں۔ دوسری طرف یقیناً ماہین اور شاہین کے علاوہ عمران کے قریبی ساتھی بھی تشویش کا شکار ہو سکتے تھے۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ جگہ تو ایسی نہیں کہ ہم سگنل دینے والے سے رابطہ کر سکیں۔''

''پیشاب وغیرہ کے بہانے تو ٹوائلٹس کی طرف جایا جاسکتا ہے۔''

''ٹوائلٹس ساتھ ساتھ ہیں۔ بات کرنا مشکوک ہو گا۔''

ابھی ہم اسے ادھیڑ بن میں تھے کہ ایک ایسا منظر دکھائی دیا جس نے چودہ طبق روشن کر دیے۔ عمارت کے مین دروازے کی طرف کچھ شور سنائی دیا پھر گارڈز کی ڈانٹ ڈپٹ کی آوازیں آئیں۔ وہ جیسے کسی کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ دو تین منٹ بعد گارڈز کی سیاہ وردیوں کی جھلک دکھائی دی۔ وہ کسی کو کھینچتے گھسیٹتے آرہے تھے اور یہ دو افراد تھے۔ ایک غالباً لڑکی تھی اور پھر ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ وہ لڑکی کوئی اور نہیں، ماہین تھی..... اس کا ساتھی نوجوان حشام تھا۔ اسے تھپڑ لگائے جارہے تھے اور بالوں سے گھسیٹا جارہا تھا۔ ماہین کی سرخ جرسی بھی کندھے سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے خوبصورت بالوں کا جوڑا کھل چکا تھا۔

''یہ کیا ہوا چاچو؟'' عمران کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

''یہ بہت غلط کیا ان دونوں نے۔ بُری جگہ آپھنسے ہیں۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

ماہین کو کسی مصیبت میں دیکھ کر عمران کی آنکھوں میں عجیب سا کرب کروٹ لینے لگتا تھا۔ وہ یک ٹک ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ عمران بے دم سا ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا ایڈونچر ماہین نے کیا ہے۔'' عمران نے افسردگی سے کہا۔ ''اس میں تجسس کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ اس نے اپنے طور پر ہمیں کھوجنے کی کوشش کی ہے اور یہاں آپھنسی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تھوڑی دیر پہلے میری گھڑی پر جو سگنل آئے، وہ بھی ماہین کی طرف سے ہی تھے۔ یقیناً وہ میرے گھر پہنچی ہے اور وہاں سے اس نے تمہاری گھڑی الماری میں سے ڈھونڈ لی ہے۔''

''یہی ہوا ہے۔'' عمران نے تلخی انداز میں سر ہلایا۔ ''وہ گاڑی میں حشام کے ساتھ لاہور میں چکراتی رہی ہے۔ آخر اس نے آپ کی گھڑی کے سگنل پکڑ لیے ہیں۔ وہ اس عمارت کے آس پاس پہنچی ہے اور پھر پکڑی گئی ہے۔''

''جو کچھ بھی ہوا ہے، بہت بُرا ہوا ہے۔ اب وہ باسٹرڈ جادوگر اسے اور اس کے قریبی ساتھی بھی یہاں موجود ہیں۔ وہ ان دونوں پر تشدد کر کے بہت کچھ اگلوا سکتے ہیں۔ ہماری یہاں موجودگی کا پتا بھی چل سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے چاچو! آپ کو سب سے پہلے اپنی یہ گھڑی کہیں اوجھل کر دینی چاہیے۔''

میں نے گھڑی اتار دی۔ اس نے گھڑی کے نیچے ایک باریک سا کھٹکا دبا کر اسے آف کر دیا۔ ہم نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک جانب سیاہ اور گرے رنگ کا ایک طویل صوفہ پڑا تھا۔ عمران نے گھڑی صوفے کی نشستوں کے درمیانی خلا میں اس طرح گھسیڑ دی کہ وہ ناپید ہو گئی۔ موقع پر موجود سب مزدور اور ملازم اپنے اپنے انداز میں اس واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اکثر کا خیال یہ تھا کہ یہ لڑکی لڑکا کوئی میڈیا والے ہیں جنہیں یہاں کے مالکان نے دھر لیا ہے۔ اس تاثر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماہین کے گلے میں چھوٹے سائز کا جدید کیمرا بھی نظر آرہا تھا۔

عمران بے حد پریشان تھا۔ وجہ ماہین کی یہاں موجودگی ہی تھی۔ یوں تو وہ بہت نڈر تھی۔ چھوٹے موٹے ڈرادے میں آنے والی نہیں تھی تاہم حشام کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس پر تشدد ہوتا تو وہ بہت کچھ اگل سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے ہماری یہاں موجودگی بھی افشا ہو سکتی تھی۔ وہ بولا۔ ''چاچو جی! اب ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''بالکل کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نہیں کرو گے۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نے سوچ لیا ہے۔''

''کیا کریں گے؟''

''جو بھی کروں گا مجھ پر چھوڑ دو۔'' میرا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔

''بس یہ اطمینان رکھو کہ ماہین کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ وہ بالکل محفوظ رہے گی اور امید ہے کہ حشام بھی.....''

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ اسی وقت ایک دو گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ گیٹ ٹو گیدر کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب سب ورکروں کو اپنی رہائشی جگہوں پر جانا ہوگا۔ عمران ہیجانی کیفیت میں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے تسلی دی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے رہائشی ہال کمرے کی طرف چلا گیا۔

دماغ جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ ایک یوٹیوبر کی حیثیت سے ماہین اکثر خطرے مول لیتی رہتی تھی مگر یہ خطرہ کافی مہنگا ثابت ہو سکتا تھا۔ عمران کی طرح مجھے بھی حشام کو ماہین کے ساتھ دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔ تاہم یہ حیرانی تادیر برقرار نہیں رہی۔ لگتا تھا حشام ایک بار پھر ماہین کے ساتھ صلح کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس معاملے میں اسے یہ یدطولیٰ حاصل تھا۔ شاید اس صلح میں یہ ''شق'' بھی شامل ہو گئی تھی کہ حشام ہر معاملے میں ماہین کے قدم سے قدم ملا کر چلے گا۔ اس صلح نامے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ہی وہ غالباً اس ''مہم'' میں ماہین کے ساتھ نکل کھڑا ہوا تھا..... اور پھر ماہین کے ساتھ ہی دھر لیا گیا تھا۔

شام ہونے والی تھی۔ مجھے بے چینی سے رات کا انتظار تھا۔ پچھلے دنوں اس عمارت کا میں نے جو جائزہ لیا تھا، اس سے پتا چلا تھا کہ اِن ڈور اسٹیڈیم کی عقبی جانب کچھ چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے ہیں۔ میں نے دو گارڈز کو دیکھا تھا جنہوں نے ایسے ہی ایک کیبن میں ایک روتے چلاتے نوعمر مزدور کو دھکا دے کر پھینکا تھا اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا تھا۔ وہ مزدور شاید یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا اور یہ لوگ غالباً اس پر اپنا انجکشنز کا کورس پورا کرنا چاہتے ہوں گے۔

نہ جانے کیوں مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ماہین اور حشام کو بھی کسی ایسے ہی کوٹھری نما کیبن میں پہنچایا گیا ہوگا۔ یہ جادو رائے جس قماش کا شخص تھا، مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ ماہین کا ایسے شخص یا اس کے ساتھیوں کی دسترس میں ہونا کسی طور خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مراد سمیت میرے سارے ساتھی مزدور تھکے ہارے سو گئے تو میں نیم تاریکی میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ہال کے دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ راہداری میں ایک تنومند مسلح گارڈ گشت کرتا رہتا تھا۔ اس کے گشت میں کوئی خاص چوکسی نہیں تھی۔ جونہی وہ دروازے کے سامنے سے گزر کر آگے گیا، میں احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور برق رفتاری سے ایک تنگ کوریڈور میں داخل ہو گیا۔ ایسے ہی ایک اور گارڈ کو چکما دینے کے بعد میں ان ڈور مینی گراؤنڈ کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس سارے ایریا میں بھی ائرکنڈیشننگ کی خوشگوار حرارت موجود تھی۔ یکایک میں ٹھٹک گیا۔ ایک کوٹھری نما کیبن میں سے کسی بندے کی آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ وہ کبھی بلند تحصیلی آواز میں بولنے لگتا، کبھی شاید منت سماجت کرنے لگتا۔ میں نے ذرا دھیان سے سنا تو اندیشہ درست ثابت ہو گیا۔ پچانوے فیصد امکان اسی بات کا تھا کہ یہ آج دوپہر پکڑے جانے والے حشام کی آواز ہی ہے۔ یقیناً اس سے پوچھ گچھ کا عمل جاری تھا۔ اس سے یہ اندیشہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ ہو سکتا ہے ماہین بھی کسی ایسے ہی عمل سے گزر رہی ہو۔ میری بے چینی بڑھ گئی۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ سات آٹھ کیبنوں کی اس قطار کے آخری کیبن کے سامنے کرسی پر ایک گارڈ موجود تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر چڑھا رکھی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ احتیاط سے چلتا کچھ اور آگے بڑھا تو انکشاف ہوا کہ یہ عمل نہیں بلکہ ایک تنومند فی میل گارڈ ہے۔

یہاں فی میل گارڈ کی موجودگی سے ایک اشارہ بھی مل رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کیبن نما کوٹھری میں ماہین کو رکھا گیا ہو۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگی تھیں۔ ماہین کے ساتھ کوئی بُرا سلوک ہوتے دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہاں ایک سوال یہ تھا کہ اگر ماہین یہاں موجود ہے اور میں اس تک پہنچ جاتا ہوں تو پھر کیا کروں گا؟ کیا مجھے ان لوگوں سے براہِ راست ٹکر لینا پڑے گی؟ کیا یہاں کے کسی اہم فرد کو یرغمال بنا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہوگی؟ ابھی کچھ بھی ذہن میں واضح نہیں تھا۔

میں دبے پاؤں جھک کر تیزی سے چلتا ہوا اس فی میل گارڈ کے بالکل عقب میں پہنچ گیا۔ اچانک اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کی جب تک میں اس کی توانا گردن کے گرد اپنا بازو حمائل کر چکا تھا۔ وہ آواز نہیں نکال سکی مگر مچھلی کی طرح تڑپی۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے پہلو تک پہنچانے کی کوشش کی جہاں ہولسٹر میں اس کا پستول موجود تھا مگر یہ پستول میں پہلے ہی نکال چکا تھا۔

''خبردار، ماری جاؤ گی۔'' میں نے دانت پیسے۔

چند ہی لمحوں میں وہ سمجھ گئی کہ میری گرفت سے نکلنا اس

کے بس میں نہیں ہے۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ''اس کیبن میں کون ہے؟'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

''تت..... تم کون ہو؟'' اس نے بیٹھی بیٹھی آواز میں جوابی سوال کیا۔

میں نے گردن کے گرد بازو کا شکنجہ کچھ اور کسا تو وہ کراہ اٹھی۔ ''میری بات کا جواب دو۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے جسے آج دوپہر پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بہ مشکل بولی۔ ''وہی ہے۔''

یہی وقت تھا جب تین گارڈز کی ایک ٹولی نیم تاریکی میں کچھ فاصلے سے گزرتی نظر آئی۔ انہیں دیکھ کر خوفناک گارڈ سے حماقت سرزد ہوئی۔ اس نے پورے زور سے چلانا شروع کیا اور ساتھ ساتھ انہیں پکارنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی چربی دار گردن پر میری گرفت مضبوط تھی۔ اس کے باوجود اس کی پھنسی پھنسی آواز بلند ہو رہی تھی۔ میں نے شدید خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے وارننگ دی۔ وہ باز نہیں آئی تو مجھے بھی سخت دلی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ یکدم میں نے بازو کا دباؤ بڑھایا اور اس کا منکا ٹوٹ گیا۔ وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ میں نے اس کی جیکٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور توقع کے عین مطابق ایک جیب سے چابیوں کا گچھا نکل آیا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ قریب ہی صاف پانی والا زیر زمین ٹینک نظر آ رہا تھا۔ میں نے آہنی ڈھکنا اٹھایا اور گارڈ کو اس کے یخ بستہ پانی میں پھینک کر ڈھکنا واپس رکھ دیا۔ امید یہی تھی کہ ایک دو روز تک تو اس کا کچھ پتا نہیں چل سکے گا۔ میں چابیاں لے کر کیبن کی طرف بڑھا۔ مضبوط دروازے میں اوپر کی طرف تقریباً ایک فٹ ضرب آدھ فٹ کی جالی سی لگی ہوئی تھی جس میں سے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔ میں نے جالی سے آنکھیں لگائیں۔ اندر ایک نرم گدیلے پر ماہین پہلو کے بل لیٹی تھی۔ مدھم لائٹ میں اس کے بائیں ہاتھ اور پیشانی پر بینڈیج نظر آ رہی تھی۔ یہ چوٹیں یقیناً اسی دھینگا مشتی کا نتیجہ تھیں جو کل دوپہر اسے پکڑتے وقت ہوئی تھی۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اس پر ابھی تک کوئی سختی نہیں کی گئی۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی مشکل تھا کہ فی الوقت وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے چابیوں کا گچھا دیکھا۔ یہ ٹوٹل چار چابیاں تھیں۔ میں نے ایک چابی لاک میں لگانے کی کوشش کی اور یہی وقت تھا جب تین مسلح گارڈز والی وہ ٹولی پھر نمودار ہوئی۔ اس مرتبہ ان کا رخ انہی کیبنوں کی طرف تھا۔ نیم تاریکی میں ان کے ہیولے واضح تھے۔ ان کے عقب میں شاید دو گارڈز اور بھی تھے۔ اب یہاں رکنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔ میں تیزی سے کیبنوں کی عقبی جانب چلا گیا۔ ایک کیبن میں سے دبی دبی کراہیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً یہ حشام ہی کی تھیں۔ شاید اسے مارنے پیٹنے والے وہاں سے جا چکے تھے یا اسے کچھ وقفہ دے رہے تھے۔ صورت حال ایسی تھی کہ فی الحال حشام کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں واپسی کے لیے چھوٹے سے ان ڈور اسٹیڈیم کی طرف گیا تو اب وہاں کی لائٹس آن تھیں اور اکا دکا گارڈز بھی نظر آ رہے تھے۔ میں متبادل راستہ اختیار کرتے ہوئے اس بڑے گودام کی جانب چلا گیا جہاں مجھے دو چار بار لوڈرز کے انجن کی آواز بھی آئی تھی۔ گودام کے ساتھ ساتھ جاتا ایک تنگ سا راستہ گھوم کر میرے رہائشی حصے کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں اس جانب پہلی بار آیا تھا۔ یہاں ائرکنڈیشننگ نہیں تھی۔ کڑاکے کی سردی محسوس ہو رہی تھی۔

گودام کی دیوار میں مجھے ایک جگہ ایک دو چھوٹے سوراخ نظر آئے۔ اندر جھانکا تو ایک اور فی میل گارڈ نظر آئی۔ چست گرے وردی میں وہ ایک دراز قد لڑکی ہی تھی۔ اپنے ساتھی گارڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ ''سنا ہے بڑا باس آ گیا ہے اور وہ بہت دل پھینک واقع ہوا ہے۔''

''کوئی ایسا ویسا۔'' نوجوان گارڈ نے جواب دیا۔ ''بلکہ دل پھینک بھی کیا، وہ تو جنسی بلا ہے۔ اگر تیرے نین نقش تھوڑے سے بھی اچھے ہوتے نا تو کسی دن اس نے بلا لینا تھا تجھے بھی۔'' وہ شیطانی انداز میں ہنسا۔

وہ بولی۔ ''پھر تو شکر ہے کہ میرے نین نقش ایسے اچھے نہیں۔ مجھے تو اس کی باہر کو نکلی آنکھیں دیکھ کر ہی الٹی آنے لگتی ہے۔''

وہ ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرتے آگے نکل گئے۔ میری نگاہ گودام کے وسطی حصے پر پڑی۔ یہاں اسی زرد ریت کے تین ڈھیر پڑے تھے جسے ہم سارا دن چھانتے اور پھر چنتے تھے۔ ایک طرف لوہے کی میز پر شیشے کے دو پندرہ بیس جار بھی نظر آ رہے تھے جن میں زیادہ زرد رنگ کے موٹی چینی یا رائی جیسے دانے بڑی احتیاط سے جمع کیے جاتے تھے۔ ابھی تک کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ان کا استعمال کیا ہے۔ عمران کا خیال یہی تھا کہ یہاں جو یکسین ٹائپ چیز بنائی جا رہی ہے، یہ گہرا زرد میٹریل اسی میں استعمال ہوتا ہوگا لیکن اگلے ایک دو منٹ میں جو منظر میں نے یہاں دیکھا اس نے دماغ بھک سے اڑا دیا۔ تمام اندازوں کی نفی ہو گئی۔ میں

نے دیکھا کہ یہاں کام کرنے والوں نے جاروں میں بھرے ہوئے گہری زرد چینی جیسے دانے ریت کی ڈھیریوں پر پھیکنے شروع کر دیے۔ جیسے ریت پر ان کا چھڑکاؤ سا کر دیا۔ پھر بیلچہ بردار ملازموں نے بے پروائی سے یہ ریت تین لوڈرز پر منتقل کرنا شروع کر دی۔ اس عمل کے دوران میں گہرا زرد میٹریل بھی زرد ریت میں مکس ہونے لگا۔

ذہن چکرا گیا۔ جو کچھ سارے دن کی مشقت اور عرق ریزی کے ساتھ کیا گیا تھا، اسے رات کی تاریکی میں یہاں "ریورس" کر دیا گیا تھا۔ گہرے زرد چینی جیسا سارا قیمتی میٹریل پھر سے ریت میں مکس کیا گیا تھا۔ اب یہی ریت کل پھر ہمارے سامنے آجانی تھی تاکہ اسے چھانا اور پھر چنا جا سکے۔ تو یہ سب ایک ڈراما تھا..... اور ڈراما تھا تو کیوں کیا جا رہا تھا؟

میں زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا اور پھر بچتا بچاتا واپس اپنے رہائشی کمپاؤنڈ میں پہنچ گیا۔ چابیوں کا گچھا میں نے راستے میں ہی ایک بڑے ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا تاہم فی میل گارڈ سے چھینا ہوا پسٹل میں نے اپنی شلوار کے نیفے میں پھنسایا ہوا تھا۔

لیٹنے کو تو میں بستر پر لیٹ گیا مگر میرے ذہن پر خیالوں کی یلغار تھی۔ رات کے اس پہر میں نے جو کچھ گودام میں دیکھا تھا، وہ ناقابل فہم تھا۔ باقی صورتِ حال یہ تھی کہ مائن ابھی تک خیر خیریت سے تھی مگر لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے حشام سے مار پیٹ ہوئی ہے۔ ان سے تفتیش کرنے والے یقیناً ان دونوں کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ یہاں صرف اس لیے دھر لیے گئے تھے کہ مشکوک انداز میں عمارت کے اردگرد پائے گئے تھے۔ ممکن تھا کہ حشام ثابت قدمی کا ثبوت دے جاتا۔ گھڑیوں کے بارے میں کچھ نہ بتاتا اور یوں ہم بھی یہاں محفوظ رہتے۔ تاہم عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ جادو رمے کی یہاں موجودگی ثابت کرتی تھی کہ یہ سب سفاک لوگ ہیں اور اپنی سیکیورٹی کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتے ہیں۔

.....اور یہی کچھ ہوا۔ ابھی مجھے کمپاؤنڈ میں واپس آ کر لیٹے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ شور سنائی دیا اور آناً فاناً سات آٹھ مسلح گارڈز ہال کمرے میں گھس آئے۔ ماسٹر غیاث اور گونگا فورمین جہاناں بھی ہمراہ تھے۔ ہال کی تمام لائٹس آن کر دی گئیں۔ گارڈز کا انچارج گرجا۔ "اب اٹھ جاؤ..... سب کھڑے ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔"

ماسٹر غیاث کڑک کر بولا۔ "دیوار کے ساتھ قطار بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

میرے سارے ہم عمر مزدور غنودگی کے حصار میں تھے اور رات گئے اس نادر شاہی حکم پر ہکا بکا تھے۔

میں بھی اٹھ بیٹھا اور تب میری نگاہ گارڈز کے درمیان کھڑے حشام پر پڑی۔ اس کے چہرے پر کئی نیل تھے اور حالت پتلی نظر آ رہی تھی۔

میں بھی باقی بیس بائیس مزدوروں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ انچارج گارڈ نے ایک زوردار جھانپڑ حشام کی گردن پر لگایا اور بولا۔ "بتاؤ، ان میں سے کون ہے تمہاری ماں کا یار۔"

حشام نے سر جھکا رکھا تھا۔ غالباً اس کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ میری نشاندہی کرتا۔

انچارج گارڈ نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی ناف پر لگائی اور چلایا۔ "بتاتے ہو یا یہیں سب کے سامنے ننگا کروں تجھے؟"

حشام تکلیف کے سبب دہرا ہو گیا۔ خاموش رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے مزید اذیت سے بچانے کے لیے میں آگے بڑھا۔ "میرا خیال ہے تم میری تلاش میں یہاں آئے ہو۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

انچارج گارڈ اور فورمین جہاناں نے سوالیہ نظروں سے زخمی حشام کی طرف دیکھا۔ حشام نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ آفت کے پرکالے میری طرف بڑھے۔ پستول میرے پاس موجود تھا لیکن جب پانچ چھ رائفلوں کے بیرل آپ کی طرف اٹھے ہوئے ہوں اور رائفل برداروں کو ٹریگرز دبانے میں کسی طرح کا تامل بھی نہ ہو تو فوراً خودکشی حرام والا مقولہ ذہن میں آ جاتا ہے اور پھر یہاں کوئی مہم جوئی کرنے میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ میرے ساتھی بے گناہ مزدوروں میں سے بھی کچھ نشانہ بن جاتے۔

"ہینڈز اَپ..... ہاتھ اوپر..... ہاتھ اوپر۔" کئی کڑک دار آوازیں ابھریں۔ میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔

انچارج گارڈ نے بڑے ماہرانہ انداز میں آگے بڑھ کر میری تلاشی لی۔ حیرت انگیز طور پر وہ میری شلوار کے نیفے میں اڑسے ہوئے پستول سے بے خبر رہا۔ اکثر تلاشی ایک رسمی کارروائی کے طور پر ہی ہوتی ہے اور تلاشی لینے والوں سے ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔

"گھٹنوں کے بل بیٹھو..... جلدی..... جلدی۔"

گرجدار آوازیں ابھریں۔

میں نے ذرا تامل کیا تو انچارج نے رائفل کا بٹ میری چھاتی پر رسید کیا۔ ''تمہارا حرامی ساتھی بھی پکڑا گیا ہے۔ کسی طرح کی کوئی امید نہ رکھو..... جلدی کرو۔''

وہ یقیناً عمران کا ذکر ہی کر رہا تھا۔ میں نے گھٹنے فرش پر ٹیکے تو میرے ہاتھ تیزی سے پشت پر جکڑ دیے گئے۔ اس کے لیے نائیلون کا بنا ہوا ''زپ ٹائی ہینڈ کف'' استعمال کیا گیا۔

''پولیس والے ہو تم؟'' انچارج نے میرے سینے پر ٹانگ رسید کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''پولیس والوں سے بڑا سا چوڑا حساب چکانا ہے ہمارے مالکوں کو۔''

میرے ساتھی مزدور ششدر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سب سے زیادہ حیران شاید مراد تھا۔ وہ تعجب سے منہ کھولے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ میرے سوالوں سے چڑ کر مجھے تھانیدار کے لقب سے نوازتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میرا تعلق واقعی پولیس سے ہے۔ بے شک میں فزیکل ٹریننگ تھا مگر تھا تو پولیس میں۔

''تمہاری گھڑی کہاں ہے؟'' انچارج شعلہ بار لہجے میں بولا۔

اب چھپانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے گھڑی کی نشاندہی کر دی۔ مجھ میں یہی آ رہا تھا کہ تشدد کے شکنجے میں کسے جانے کے بعد حشام کچھ بھی راز نہیں رکھ سکا۔ کالی وردیوں والے دو بندے گئے اور اس صوفے کے اندر سے وہ بوسیدہ گھڑی نکال لائے جو ایک دن پہلے میں نے وہاں چھپائی تھی۔

اسی اثنا میں کچھ گارڈز عمران کو بھی کھینچتے اور دھکیلتے ہوئے ہال کمرے میں لے آئے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر تازہ چوٹوں کے کئی نشان نظر آ رہے تھے۔ خاکی قمیص کا گریبان بھی دور تک پھٹا ہوا تھا۔ ایک خوفناک گارڈ نے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا مگر جب اس کا موڈ دیکھا تو یہ دکھ کافی حد تک کم ہو گیا۔

ہمارے قریب پہنچ کر وہ خود کو دبوچنے والے گارڈ سے مخاطب ہو کر کراہا۔ ''یار میری گردن کو اتنی زور سے نہ دباؤ۔ میرا گردہ فیس مار رہا ہے۔ گردے کا مریض ہوں۔''

انچارج گارڈ ہیروز زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ لوگوں کے گردے پیٹ میں ہوتے ہیں، تمہارا گردن میں ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ہے شک ایکسرے کر لو۔''

''غیر سے مرض کیا ہے؟'' انچارج نے اس کے سر کے بال بے دردی سے کھینچے۔

وہ کراہا۔ ''یہ مرض کیا کم ہے کہ گردہ گردن میں ہے۔''

انچارج نے اسے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ اس کے ہاتھ بھی میری طرح پشت پر بندھے تھے۔ وہ سینہ پھلا کر چلایا۔ ''کس نے مارا میرے چاچو کو..... میں پوچھتا ہوں کس نے مارا؟''

انچارج نے اطمینان سے کہا۔ ''یہ نیک کام بھی تم نے ہی کیا ہے۔''

''یہ بہت ناانصافی ہے۔ چاچو اتنا بڑا فائٹر اور اس پر ہاتھ اتنا ہولا رکھا تم نے۔ میں ملوکڑا سا نوجوان اور میرے منہ پر چھ آلو ڈال دیے تم نے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے چاچو کے منہ پر سات آلو ڈال دیں؟''

''میں اپنے منہ سے تو نہیں کہہ سکتا مگر انصاف کا تقاضا تو یہی ہے۔''

''ساری سختی نکل جائے گی ابھی تھوڑی دیر میں۔ اتنے آلو پڑیں گے کہ کتی بھول جاؤ گے تم دونوں۔''

انچارج نے... عمران کے منہ پر چند طمانچے رسید کیے پھر اسے کھینچ کر میرے برابر کھڑا کرنا چاہا۔ عمران نے ہلکے ہولے سے ''اوئی اللہ'' کہا پھر کسی گیت کے بول دہرائے..... ''پھول آہستہ پھینکو، پھول بڑے نازک ہوتے ہیں.....''

اسے میرے برابر کھڑا کر دیا گیا۔ انچارج ہیروز اور گونگا فورمین جہانیاں تیزی سے باہر نکل گئے۔ مسلح گارڈز ہمارے سامنے چوکس کھڑے رہے جیسے وہ فائرنگ اسکواڈ کے لوگ ہوں اور ہمیں سزائے موت دینا چاہتے ہوں۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی اور کن انکھیوں سے حشام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ چارے حشام کی کافی مرمت ہوئی ہے۔''

''اور اسی مرمت کے نتیجے میں ہم پکڑے بھی گئے ہیں۔ ماہین پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہے؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں ابھی اسے دیکھ کر آیا ہوں۔ یہ لوگ اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ماہین نظر آ گئی۔ وہ

میل گارڈز نے اسے دونوں طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ پینٹ اور سرخ جرسی میں تھی۔ پاؤں میں جاگرز تھے۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے لا رہے تھے۔ وہ پریشان تھی لیکن پھر مزدوروں کے درمیان میری اور عمران کی صورتیں پہچان کر وہ کچھ ریلیکسڈ ہو گئی۔ بے شک دلیر لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی زپ ٹائی ہینڈ کف ڈال کر ہمارے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ حشام پہلے ہی میرے پہلو میں موجود تھا۔ وہ واضح طور پر شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ شرمندگی کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ اس کی وجہ سے ہم پکڑے گئے تھے لیکن اس میں حشام کا قصور زیادہ نہیں تھا۔ اس پر جس طرح تشدد ہوا تھا، کوئی بھی عام شخص ہوتا تو زیادہ دیر زبان بند نہ رکھ سکتا۔

.....اور پھر وہ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انچارج بہروز اور گونگا فورمین جہاناں جو تیزی سے باہر نکل گئے تھے، واپس آئے۔ ان کے ساتھ کالی وردیوں والے تین چار گارڈز بھی تھے اور جو سب سے اہم شخص ان کے درمیان تھا، وہ جادو راے تھا۔ اس کا اصل نام تو شاکر تھا مگر شکل اور سیاہ رنگت کی وجہ سے اسے لوکین میں کالا جادو کہا جانے لگا اور اب وہ ایک خطرناک مجرم جادو راے تھا۔ اس کے عقب میں سنہرے بالوں والی چاق چوبند میم مائرہ بھی چلی آ رہی تھی۔ رات کے یہ سب لوگ یقیناً اپنے بستروں سے اٹھ کر آئے تھے۔

جادو راے کی ابلی ہوئی آنکھوں میں شعلے سے رقصاں تھے۔ وہ ہم سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ عمران پر ہی پڑی تھی۔ اس کے ماتھے کی سیاہ تمتماہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ سانپ جیسی پھنکار کے ساتھ بولا۔ ”تم نے یہاں پہنچ کر میری دلی مراد پوری کر دی۔ بہت خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر..... بہت زیادہ خوشی۔“

”مجھے بھی ہوئی۔“ عمران نے مختصراً کہا۔

”ابھی اور ہو گی۔ اتنی زیادہ کہ تم خوشی سے اچھلنا شروع کر دو گے، ناچنا شروع کر دو گے۔“ اس کے لہجے کی سلگی دل دہلانے والی تھی۔

میں نے دیکھا اس کی کمر کے ساتھ ہولسٹر لگا ہوا تھا اور اس میں پستول موجود تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ وہ فرطِ غضب میں پستول کھینچے گا اور سیدھا عمران کے سینے میں گولی اتار دے گا۔

اس کے غیظ و غضب کی وجہ سمجھ میں آنے والی تھی۔ درحقیقت یہ عمران ہی تھا جس نے جادو راے کے سارے سیٹ اپ کا دھڑن تختہ کیا تھا۔ جعلی ادویات کا کاروبار فنا ہونے کے بعد جادو راے کو اپنی محبوبہ نائینا چاندنی کے ساتھ موقع سے فرار ہونا پڑا تھا۔ بعد ازاں ایک دیہی علاقے میں پولیس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا وہ ایک سنگین ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا (یہ روداد پچھلی کہانی میں بیان کی جا چکی ہے)

اور تب جادو راے کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے اپنا ملگجا سا سر ہلایا۔ ”بہت خوب! تم بھی یہاں ہو..... پولیس میں ہو اور سنا ہے بہت بڑے افسر بھی رہے ہو۔ تمہارا بھی کافی سارا قرض ہے میرے اوپر۔ سارا اتاروں گا۔ سود سمیت اتاروں گا۔ سود سمیت..... سود سمیت.....“ وہ جنونی انداز میں کہتا چلا گیا۔

کوتاہ قد جادو راے کے عقب میں ایک ملازم پان کی منقش ڈبیا لیے کھڑا تھا۔ جادو راے کوئی خاص قسم کا پان بے تحاشا کھاتا تھا اور جو دوسری بات میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ پان کی پیک بھی نگل جاتا تھا۔

اس نے بیکاگی انداز میں اپنا ہاتھ پان کی ڈبیا کی طرف بڑھایا۔ ملازم نے مؤدب انداز میں ڈبیا کھول دی۔ اس نے گلوری نکال کر منہ میں رکھی اور استفہامیہ نگاہوں سے خورد مائین اور زخمی حشام کی طرف دیکھا۔

انچارج گارڈ مؤدب لہجے میں بولا۔ ”جناب! یہ ہیں وہ دونوں گھڑیاں جو ان سے برآمد ہوئی ہیں۔“ اس نے عمران والی چمکیلی گھڑی جادو راے کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”جناب! یہ گھڑی اس لڑکی کی کلائی میں تھی۔ اس کا نام مائین معلوم ہوا ہے۔“ تب اس نے میری طرف اشارہ کیا اور بتایا۔ ”یہ والی پرانی گھڑی اس بھائی صاحب کے پاس تھی۔ اس نے یہاں اپنا نام آفتاب بتا رکھا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپا ہے کہ درحقیقت یہ ایک پولیس آفیسر ہے۔“

جادو راے نے انچارج کو ایک غلیظ گالی دی۔ پان کی پیک کے کچھ چھینٹے انچارج کے کپڑوں تک گئے۔ جادو راے پھنکارا۔ ”اندھے ہو تم سب لوگ۔ کس نے مزدور کے طور پر بھرتی کیا تھا ان دونوں کو؟“

ماسٹر فیاض اور گونگا فورمین ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ ”یہ غلطی ہم سے ہوئی ہے جی۔“ فیاض نے کہا۔

”پیچھے ہٹو..... دونوں پیچھے ہٹو۔“ جادو راے دہاڑا۔

وہ اکڑوں بیٹھ گئے۔ کوتاہ قامت جادو راے نے دونوں کے منہ پر ایک ایک زوردار طمانچہ لگایا۔ ”حرامزادو! بس یہ نظر ہے تمہاری۔ یہ دونوں شکلوں سے کہیں لگتے ہیں مزدور..... لگتے ہیں؟“

”زبردست سمجھ دیے ہیں راے!“ مائرہ میم نے جادو

راے کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔ میری طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”مجھے اس بندے پر تھوڑا سا شک تو ہوا تھا مگر پوری پوری اداکاری کرتا رہا ہے یہ بھی۔“

”پھر پکڑے کیسے گئے ہیں..... ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“ جادو راے نے انچارج کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

اس نے ماہین اور حشام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ دونوں دو روز سے مشکوک انداز میں اس ایریا میں دیکھے جا رہے تھے۔ کل دوپہر ان کی گاڑی ہمارے بالکل آس پاس گھومنے لگی۔ ظاہر ہے کہ گھڑی کے سگنل ان کو راہ دکھا رہے تھے۔ جب یہ زیادہ قریب آ گئے تو ہم نے انہیں دھر لیا اور پکڑ کر اندر لے آئے۔“

مائرہ نے حشام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات مکمل کی۔ ”بعد میں اس لڑکے نے سب کچھ اگل دیا۔“

جادو راے کی بہت بڑی سیاہ پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ پان چباتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ دونوں باسٹرڈ بہروپیے یہاں کیسے پہنچے؟“ اس کا اشارہ میری اور عمران کی جانب ہی تھا۔

”آپ حکم کریں۔ ابھی دس منٹ میں ان سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔“ انچارج بہروز نے سینہ پھلا کر کہا۔

”دس منٹ نہیں۔ مجھے ابھی جواب چاہیے..... ابھی۔“ جادو راے چنگھاڑا۔ اپنے قد کاٹھ کی نسبت اس کی آواز بھاری تھی۔

سنہری بالوں والی میم مائرہ بولی۔ ”میں نے دیکھا ہے راے اسکیورٹی کے سلسلے میں یہاں بہت احتیاط کی جا رہی ہے۔ خاص طور سے انچارج بہروز کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ میرے دل میں تو ڈر پیدا ہو رہا ہے کہ ہمارے اندر سے ہی کوئی بندہ مخبری نہ کر رہا ہو۔“

جادو راے نے کوئی جواب نہیں دیا بس اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خلا میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر کسی وقت لگتا تھا کہ وہ ایک سیاہ رنگت والا ایک بہت بڑا مینڈک ہے۔ کار حادثے کے سبب اس کے چہرے پر جو چوٹیں آئی تھیں، وہ اس کی بدنمائی میں اضافہ کرتی تھیں۔

میم مائرہ نے دوبارہ کہا۔ ”کہیں یہ وہی عقل کی اندھی تو نہیں جس نے نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے اندر باغی روح ہے۔“

دونوں کچھ دیر تک آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ جادو راے شاید میم مائرہ سے متفق نہیں ہے۔ اب پتا نہیں کہ جس کو عقل کی اندھی کہا جا رہا تھا وہ کون تھی؟ اور اس پر یہ غلط شک کیوں کیا جا رہا تھا؟

جادو راے مزید جھنجلایا ہوا اور مشتعل نظر آنے لگا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔ ”قانون کی وردی پہن کر بہت بڑے بڑے کھلواڑ کرتے پھر رہے ہو تم۔ بتاؤ یہاں کیا کھلواڑ کیا ہے تمہارے اس بدبخت دماغ نے؟“

میں خاموش رہا۔ میری خاموشی نے اس کا پارا ایک دم ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ یکایک وہ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا۔ جیسے سیاہ بادل میں بجلی چمکتی ہے۔ اس نے تڑپ کر اپنے ہولسٹر میں سے پسٹل نکال لیا۔ یوں لگا جیسے ماضی کے سارے واقعات نے مل کر اس کے اندر کوئی بارودی دھماکا کر دیا ہے۔ وہ پسٹل میری طرف سیدھا کر کے چلایا۔

”بتاؤ..... بتاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے میری طرف سیدھا فائر کیا۔ پسٹل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ قسمت اچھی تھی۔ گولی جیسے میرے کان کو چھوتے ہوئے گزر گئی اور عقب میں حیران پریشان کھڑے مزدوروں میں سے کسی کو لگی۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ فرش بوس ہوا۔

جادو راے نے ہیجانی انداز میں مجھ پر دوسرا فائر کرنا چاہا مگر پاس کھڑی میم مائرہ نے اس کا پسٹل والا ہاتھ نیچے کر دیا۔ ”ٹھہرو راے..... ٹھہرو ایک منٹ۔“ اس نے بہ مشکل جادو راے کو فائر کرنے سے روکا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ جس مزدور کو گولی لگی تھی وہ گر کر تڑپ رہا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں، وہی مراد عرف مرادے تھا جو یہاں میرا دوست بنا تھا اور جو دن رات اپنی لاڈلی کی ڈولی اٹھانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ گولی اس کے رخسار میں گھس کر یقیناً سر کی طرف چلی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے خون آلود فرش پر دم توڑ دیا۔ اپنی دلہن بنی لاڈلی کا ماتھا چومنے کی حسرت دل میں لیے وہ راہی عدم ہو گیا تھا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے مرادے ہر روز اپنا خون پسینا ایک کرتے ہیں اور منزلوں تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔

ہال کمرے میں دہشت کا ماحول تھا اور مزدوروں کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ مائرہ نے ابھی تک جادو راے کا پسٹل والا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ گرج کر انچارج بہروز سے مخاطب ہوئی۔ ”ان کو باہر نکالو..... سب کو..... جلدی کرو۔“ مائرہ کا اشارہ مزدوروں کی طرف تھا۔

دو منٹ بعد ہی یہ ہال مزدوروں سے خالی تھا۔ انہیں غالباً کسی دوسرے ہال میں بھیج دیا گیا تھا۔ فرش پر سے بدنصیب مراد کی لاش اٹھائی جا چکی تھی اور خون آلود فرش جزوی طور پر صاف کیا جا چکا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کوئی جنگ

جاگتا انسان نہیں مرا، چیونٹی مسلی گئی ہے۔

میم مائرہ کے اشارے پر دو گارڈز نے مجھے میرے ساتھیوں سے علیحدہ کر کے ایک ستون کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

جادو رامے نے غضب ناک انداز میں ایک بار پھر پسٹل میری طرف سیدھا کیا اور بولا۔ ''میں اپنا سوال دہراؤں گا نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اپنا یہ لنگڑا تھوبڑا لے کر تم کیسے یہاں پہنچے..... اور یہاں اور کتنے لوگ ہیں تمہارے جیسے؟''

''اور کوئی نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''اگر کوئی اور نہیں ہے تو تم نے اپنی گندی ناک سے کیا سونگھا جو ذلت کی موت مرنے کے لیے یہاں چلے آئے؟ آخر کوئی نہ کوئی کلیو تو تمہیں ملا ہی ہوگا جو ہمارا سیکیورٹی حصار توڑ کر یہاں پہنچے؟''

میں مناسب جواب سوچ ہی رہا تھا جب جادو رامے نے اشتعال میں پھر فائر کر دیا۔ دھماکے سے ہال گونج اٹھا۔ اس مرتبہ اس نے مجھے نشانہ نہیں بنایا تھا بلکہ ڈرایا تھا۔ جنونی لہجے میں بولا۔ ''صرف دس سیکنڈ۔ اگلی گولی تمہارے سر میں۔''

یہی وقت تھا جب عمران بول اٹھا۔ ''ایک منٹ رکو رامے صاحب! میں تمہیں بتاتا ہوں ہم کیسے پہنچے۔ میم مائرہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہاں اندر سے کسی نے مخبری نہیں کی۔ اس حوالے سے خود کو حوصلے میں رکھو۔''

عمران کی شکل دیکھ کر جادو رامے کا پارا کچھ اور چڑھ جاتا تھا۔ غالباً اپنی محبوبہ چاندنی کی موت کا اصل ذمے دار وہ عمران کو ہی سمجھتا تھا۔ اس نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ عمران کو دونوں طرف سے تھام کر ایک دوسرے ستون کے سامنے لے آئے۔

''ہاں بکو۔'' جادو رامے تڑخ کر بولا۔ ''اور میں تمہیں بتا دوں، میں زیادہ صبر نہیں کر پاؤں گا۔ دو منٹ کے اندر اندر اگر میں مطمئن نہیں ہوا تو تمہارے اس منحوس پلیسے یار کی لاش تڑپتی نظر آئے گی۔''

جادو رامے نے عمران کو میری لاش بنانے کی دھمکی نہیں دی تھی۔ اپنی قاتل دھمکی کا رخ اب بھی میری طرف ہی رکھا تھا۔ اس کی وجہ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آئی لیکن بعد میں پتا چل گیا۔

عمران نے کہا۔ ''جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ اور بات ہے کہ مائی لارڈ کو یہ سب کچھ عجیب لگے گا مگر جو بھی ہے حقیقت ہے۔''

''آگے بکواس کرو۔'' مائرہ تیزی سے بولی۔

''آگے بکواس کرنے سے پہلے رامے صاحب کی ایک گرائمر کی غلطی درست کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ابھی فرمایا ہے کہ لاش تڑپتی نظر آئے گی..... تو مائی لارڈ لاش کبھی نہیں تڑپتی کیونکہ وہ تو پھر لاش ہو جاتی ہے۔ دراصل مقتول تڑپتا ہے۔''

''اور دو منٹ پورے ہونے میں صرف تیس سیکنڈ باقی ہیں۔'' رامے سفاک آہنگ میں بولا اور اپنا لوڈڈ پسٹل پھر میری طرف سیدھا کر لیا۔

موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے عمران جلدی سے بولا۔ ''لپ ریڈنگ کے بارے میں جانتے ہیں مائی لارڈ؟''

''لپ ریڈنگ؟ کیا مطلب؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''ہونٹوں کی حرکت پڑھ کر یہ جان لینا کہ بولنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ اس تکنیک کو اسپیچ ریڈنگ بھی کہا جاتا ہے۔'' عمران نے وضاحت کی۔

''ہاں، کچھ سن تو رکھا ہے لیکن تم سیدھی بات کرو۔ تم اور یہ ڈی ایس پی صاحب یہاں پہنچے کیسے؟'' مائرہ نے سخت لہجہ اختیار کیے رکھا۔

''اسی طرف آ رہا ہوں جی۔ میں ایک اسپیچ ریڈر ہوں۔ ایک دن اتفاقاً سرِراہ میں نے ایک ایسی اسپیچ پڑھ لی جس کا تعلق آپ لوگوں سے تھا۔ خدا گواہ ہے اس وقت مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے، اس کا تعلق مائی لارڈ رامے صاحب سے ہے۔ اگر پتا ہوتا تو شاید ہم اس مسئلے میں ٹانگ ہی نہ اڑاتے۔ مشہور شکاری جم کاربٹ نے اپنے سنگر مسعود رانا کے ساتھ مل کر جو پنجابی گیت گایا تھا اس کا لب لباب یہی تھا کہ زخمی شیر کا پیچھا کبھی نہ کرو کہ وہ بہت خطرناک ہوتا ہے..... اور مائی لارڈ رامے صاحب تو زخمی ہوئے بغیر بھی بہت خطرناک ہیں۔''

عمران کہیں بھی زبان چلانے سے باز نہیں آتا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ جادو رامے پھر غضب ناک ہو جائے گا۔

رامے کے بولنے سے پہلے ہی مائرہ بول اٹھی۔ ''دیکھو تم صرف ٹو دا پوائنٹ بات کرو۔ سمجھو کہ موت کا فرشتہ تمہارے ساتھی کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ تم نے کس کی لپ ریڈنگ کی اور تمہیں کیا معلوم ہوا؟''

عمران ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے آپ کی لپ ریڈنگ کی۔''

عمران کے انکشاف نے مائرہ کو ششدر کر دیا۔ ''کیا فضول بول رہے ہو تم۔ کب اور کہاں کی بات کر رہے ہو؟''

جواب میں عمران نے نپے تلے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر سب کچھ مائرہ اور جادو رائے کے گوش گزار کر دیا۔ ٹریفک جام میں دونوں گاڑیوں کا پہلو بہ پہلو رکنا، مائرہ کا اپنے ڈرائیور سے مخاطب ہونا، عمران کا اسے بولتے دیکھنا..... عمران نے وہ فقرے تک دہرا دیے جو تب مائرہ نے بولے تھے۔ ان فقروں میں مزدوروں کی تعداد اور ان کی عمر وغیرہ کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔

میم مائرہ ہکا بکا تھی لیکن عمران کی باتوں پر یقین نہ وہ کر رہی تھی، نہ کرسی پر بیٹھا جادو رائے کر رہا تھا۔ عمران کی بات ختم ہوئی تو میم مائرہ نے کرخت انداز میں کہا۔ ”تمہاری باتوں سے اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ تم لوگ ایک پلاننگ کے تحت ہمارے پیچھے تھے۔“ اس کا لہجہ مزید زہریلا ہو گیا۔ ”کھوج لگاتے پھرتے تھے نا..... لگ بھگ رہا ہے اس ٹیکی وین میں بھی تم نے کوئی ڈکٹافون ٹائپ چیز لگا رکھی تھی۔“

”ایسا کچھ نہیں محترمہ! یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اتفاقاً ہوا ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لپ ریڈنگ سے ملنے والا یہ سنسنی خیز ”کلیو“ ہمیں پھر سے جادو رائے صاحب کے سامنے لا کھڑا کرے گا تو ہم کبھی یہاں گھسنے کی حماقت نہ کرتے۔ ہم اب بھی ہاتھ پاؤں جوڑ کر یہاں سے جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔“

”اجازت تو تمہیں ضرور دوں گا لیکن باہر نہیں، اوپر جانے کی۔“ رائے آسمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ اپنے سانولے، چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں پنسل کو عجب بے قراری کے ساتھ حرکت دے رہا تھا۔

”آپ مجھ پر یقین نہیں کر رہے مائی لارڈ.....! میں آپ کو ثبوت دے سکتا ہوں۔ اپنی لپ ریڈنگ کا ثبوت.....“

یک بیک مائرہ کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نظر آئے۔ جادو رائے بھی الجھے ہوئے انداز میں عمران کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے مائی لارڈ! آپ میں سے کوئی ایک کچھ فاصلے پر چلا جائے۔ وہ اپنے ساتھی سے کچھ بولے۔ اس کی آواز مجھ تک نہ پہنچے، بس چہرہ نظر آتا رہے۔ میں بتا دوں گا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ اگر وہ تین فقرے بولتا ہے تو اس میں دو تین سے زیادہ غلطیاں نہیں کروں گا۔“

عمران کے تجویز نے ہال کمرے میں عجیب سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جادو رائے سمیت یہ سب لوگ عمران کی بات پر یقین تو نہیں کر رہے تھے مگر عمران کا اعتماد انہیں دلچسپی لینے پر مجبور کر رہا تھا۔

جادو رائے نیا پان کلے میں دباتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہارا دعویٰ غلط ثابت ہوا تو تمہارے اس بدبخت ڈی ایس پی کی گردن تو میں یقیناً ماردوں گا۔“

”مجھے منظور ہے لیکن اگر میں درست ثابت ہوا تو آپ ہاتھ ہم پر کچھ ہولا کریں گے۔ میں ایک بار پھر گوش ایام (گوش گزار) کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اتفاقاً آپ کے سامنے آ گئے ہیں۔“

جادو رائے نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کا بدن تھوڑا دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ”تم نے میری زندگی جہنم، میری چاندنی زندگی کی بازی ہاری اور تم ہاتھ ہولا رکھنے کی بات کر رہے ہو۔ کاش میں کوئی ایسی سزا ایجاد کر سکوں جو میرے کلیجے کو ٹھنڈا کر پائے۔“

عمران کا امتحان لینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ انچارج بہروز، مستری ضیاث کے ساتھ تیس چالیس فٹ دور ہال کی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ عمران کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ ستون کے ساتھ کھڑا بغور ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں تو عمران کی اس صلاحیت سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا لیکن حشام اور مائرہ کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ فہم تھا۔ مائرہ ڈری ڈری نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ صورتِ حال کی سنگینی کو بے طرح محسوس کر رہی تھی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

دیوار کے ساتھ کھڑے بہروز نے ضیاث کے ساتھ تین چار جملے بولے۔ عمران نے اپنی نگاہوں کو ان کے چہروں پر فوکس کیے رکھا۔ تب اس نے ایک بار پھر فقرے دہرانے کو کہا۔ انہوں نے فقرے دہرائے۔

عمران کے اشارے پر انہیں واپس بلا لیا گیا۔ عمران اعتماد سے بولا۔ ”ماسٹر ضیاث سے انچارج بہروز نے کہا ہے..... پچھلے ہفتے تم نے ایک فائٹو چھلی کی تھی۔ اس لیے اتوار کے روز تمہیں کام کرنا پڑے گا..... ضیاث نے جواب دیا ہے..... جناب! آپ کو پتا ہے، مجھے بخار تھا۔ اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوں..... انچارج نے کہا ہے..... چلو اس دفعہ چھٹی کر لو لیکن اگلے ہفتے تمہیں اتوار لگانا پڑے گا.....“

انچارج اور ضیاث حیرت زدہ نظر آئے۔ جادو رائے نے ان سے پوچھا۔ ”کیا یہی بات ہوئی ہے؟“

دونوں نے تقریباً ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ اب یہ حیرت باقی لوگوں میں بھی پھیل گئی۔ مائرہ کے سوال کے جواب میں انچارج بہروز نے کہا۔ ”نہیں جی..... کوئی غلطی نہیں کی ہے اس نے۔“

یہ تجربہ ایک بار پھر دہرایا گیا۔ ان دونوں نے فاصلے پر جا کر چند فقرے بولے۔ عمران نے اس مرتبہ بھی درست جواب دیا۔ صرف دو معمولی نوعیت کی غلطیاں ہوئیں۔ اب عمران کی تکنیک کا جادو کچھ کچھ جادو رامے پر بھی اثر کر رہا تھا۔

مائرہ نے اپنی اندرونی حیرت چھپاتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ "اگر گفتگو انگلش میں ہو تو پھر؟"

وہ دلکش انداز میں مسکرایا۔ "محترمہ! لپ ریڈنگ کے لیے اکثر ایشیائی زبانیں مشکل سمجھی جاتی ہیں جن میں اردو، ہندی اور تامل وغیرہ شامل ہیں۔ انگلش تو نسبتاً آسان ہے۔"

یہ سُن کر میم مائرہ اکیلی ہی دیوار کے پاس چلی گئی۔ وہاں جا کر اس نے دو تین جملے بولے۔ آواز بالکل نہیں آ رہی تھی۔ جملے بول کر وہ واپس آ گئی۔ عمران نے کہا۔ "آپ موسم کا ذکر فرما رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ..... بارش کے بعد سردی بہت زیادہ ہو گئی ہے لیکن اس سے دھند کی شدت کچھ کم ہوئی ہے۔ ایبٹ آباد کے علاوہ کاغان میں بھی کافی برف باری ہوئی ہے....."

مائرہ کے چہرے پر زبردست تحیر تھا۔ ان سارے جملوں میں عمران نے صرف ایک غلطی کی تھی اور وہ شہر کا نام تھا..... اور وہ بھی شاید اس لیے کہ دونوں ہم بولتے ہوئے ہونٹوں اور زبان کو تقریباً ایک ہی طرح حرکت دی جاتی ہے۔ عمران نے کاغان کہا تھا اور مائرہ نے غالباً ناران بولا تھا۔

میم مائرہ نے جھک کر جادو رامے کے کان میں کچھ خاص قسم کی کھسر پھسر کی۔ میں نے پہلی بار جادو رامے کی بدنما آنکھوں میں غضبناکی کی کچھ ماند پڑتی محسوس کی۔ ہال میں موجود تقریباً سب افراد عمران کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ان میں حشام اور ماہین بھی شامل تھے۔ ماہین کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ عمران کے لیے ایک طرح کے توصیفی جذبات بھی نظر آتے تھے۔ وہ اس کی صلاحیتوں کی معترف تھی اور ان صلاحیتوں میں یقیناً ایک اور اضافہ تھا۔

اس ہال کمرے میں صورتِ حال کافی بدل گئی تھی۔ عمران نے لپ ریڈنگ کا جو جھٹکا دکھایا تھا، سب کی توجہ اسی پر مرکوز ہو گئی تھی۔ سب جیسے بھول ہی گئے تھے کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے یہاں ایک جیتے جاگتے انسان کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ بس ماربل کے براؤن فرش پر اس مختصر سی کے خون کے ہلکے سے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا اسی لاہور کی کسی کچی پکی بستی میں ایک لڑکی اپنے پیارے "ابا جی" کی واپسی کے سپنے دیکھ رہی ہوگی۔

جادو رامے کے ہاتھ میں وہ دونوں گھڑیاں تھیں جو ہم سے برآمد ہوئی تھیں۔ اس نے میری اور عمران کی طرف ایک ساتھ دیکھا پھر ماہین سے مخاطب ہوا۔ "کیا نام ہے تیرا؟"

"ماہین۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تجھ پر اور تیرے سوشل میڈیا پر ایک ہزار بار لعنت..... ایسی اور کتنی گھڑیاں ہیں تم لوگوں کے پاس؟ اور دیکھو جھوٹ نہ بولنا ورنہ جو کچھ تمہارے ساتھ یہاں ہوگا، تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو۔"

"جھوٹ نہیں کہوں گی۔ یہ صرف دو ہی گھڑیاں تھیں۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے؟" رامے نے ایک ساتھ ہم دونوں سے پوچھا۔

"اگر جھوٹ ہو تو ہم ہر سزا بھگتنے کو تیار ہیں۔" عمران اعتماد سے بولا۔

"اور تم کیا کہتے ہو ڈپٹو صاحب؟" رامے نے ڈی ایس پی کو ڈپٹی بناتے ہوئے پوچھا۔

"میں بھی تصدیق کرتا ہوں کہ یہ دو گھڑیاں ہی تھیں۔"

جادو رامے نے دونوں گھڑیاں فرش پر پھینکیں پھر انچارج بہروز کو اشارہ کیا۔ رامے کی بات سمجھتے ہوئے بہروز نے ایک رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑا اور اس کا دستہ گھڑیوں پر مار مار کر انہیں چکنا چور کر دیا۔

وہ اور میم مائرہ ایک بار پھر کھسر پھسر کرنے لگے۔ مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ جو بھی گفتگو ہے، رامے کو کسی حد تک کول ڈاؤن کر رہی ہے اور ہمارے حق میں جا رہی ہے۔ لگتا تھا کہ یہ گفتگو عمران کی لپ ریڈنگ کے حوالے سے ہی ہے۔

مگر اچانک صورتِ حال میں ایک اور تبدیلی آئی۔ ماسٹر خیاث تیزی سے ہال کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے انچارج بہروز کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور پھر خشمگیں نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

بہروز نے مؤدب انداز میں رامے اور میم مائرہ کو مخاطب کیا اور بولا۔ "لاپتا گارڈ افروزہ کا پتا چل گیا ہے جناب..... وہ..... زندہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" مائرہ گرجی۔

"اس کی لاش ملی ہے جی..... پانی والے ٹینک سے۔"

چند لمحے کے لیے سناٹا سا رہا۔ "یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟" رامے بڑبڑایا۔

ماسٹر خیاث دونوں ہاتھ ناف پر باندھ کر تھوڑا سا جھکا

اور بولا۔ ”حضور! ایک کیمرے میں تصویر آئی ہے..... لیکن اندھیرے کی وجہ سے بہت مدھم ہے۔ لگتا یہی ہے کہ یہ کوئی مزدور ہے اور ان ہی دو ہال کمروں سے واردات کی جگہ کی طرف گیا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر ان دونوں میں سے ہی کوئی ہوگا۔“ جادو رام کا لہجہ پھر آتشیں ہوگیا۔ آنکھوں سے خون ٹپکا پڑ رہا تھا۔

میم مائرہ نے مجھے اور عمران کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤ..... تم دونوں میں سے کون تھا؟“

عمران نے میری طرف دیکھا پھر مسکی صورت بنا کر جواب دیا۔ ”مجھے تو ویسے ہی ڈاکٹر نے قتل مثل سے پرہیز بتایا ہوا ہے۔ بس مونگ کی دال کی کھچڑی اور ہلکی پھلکی مار پیٹ کی اجازت دی ہوئی ہے..... اور چاچو تو جب سے حج کر کے واپس آئے ہیں، انہوں نے نامحرم خواتین کو قتل کرنا چھوڑ دیا ہے۔“

”ان دونوں کو آگے لاؤ۔“ جادو رام نے خطرناک لہجہ اختیار کیا۔

گارڈز ہم دونوں کو دھکیل کر کچھ آگے لے آئے۔ ہمارے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے اور لوڈڈ رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

ماسٹر غیاث نے ادب سے کہا۔ ”حضور! افروزہ کا پستول بھی نہیں ملا۔ لگتا ہے کہ جس نے مارا ہے اسی کے پاس ہے۔“

”ایک بار پھر تلاشی لو ان کی۔“ رام نے حکم دیا۔

عمران نے ہولے سے کہا۔ ”لو چاچو! آپ تو گئے آنٹی ثروت کے پاس۔“

انچارج بہروز ہمارے پاس پہنچا۔ پہلے اس نے عمران کو اچھی طرح ٹٹولا پھر میری باری آئی۔ اس مرتبہ چھوٹے سائز کا یہ پستول بچا نہیں رہ سکا۔

انچارج بہروز شرمندہ نظر آیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے میری تلاشی لی تھی۔ جادو رام نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ فائر مار کر اس کی ٹانگ شانگ زخمی کر دے گا تاہم پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ بڑے غضب سے میری آنکھوں میں دیکھا اور گارڈز کو کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ یکایک چار پانچ گارڈز مجھ پر پل پڑے۔ وہ لاتوں، گھونسوں اور رائفل کے کندوں سے مجھے مارنے لگے۔ چوٹیں مجھے تکلیف تو دیتی تھیں لیکن بہت زیادہ نہیں۔ ایک عرصہ گزرا تھا۔ بہت موسم بیتے تھے جب میں نے باروندا جیکی کی ہدایات کے مطابق درد سہنا سیکھ لیا تھا۔ باروندا جیکی نے کہا تھا ہم جتنا درد محسوس کرتے ہیں، اصل میں اس کا پانچواں چھٹا حصہ بھی موجود نہیں ہوتا اور جب انسان اپنی برداشت کو بڑھا لیتا ہے تو چھوٹے موٹے درد اسے تکلیف کے بجائے لذت دینے لگتے ہیں۔

وہ مجھے مارتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی ہڈی وڈی نہ ٹوٹ جائے۔ جب رائفلوں کے کندے آزادانہ چلنے لگے تو واقعی امکان پیدا ہوگیا کہ کوئی ہڈی تڑخ جائے گی۔

ماہین نے باقاعدہ چلانا شروع کر دیا تھا۔

”رک جاؤ۔“ اچانک میم مائرہ کی تحکمانہ آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ مشتعل گارڈز نے ہاتھ روک لیے۔ میرے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہاتھ بدستور پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔

جادو رام کو مائرہ کا یہ حکم غالباً پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ذرا غصے سے مائرہ کی طرف دیکھا۔ مائرہ نے اپنے سنہری بالوں کو جھٹکا دے کر ایک بار پھر رام کے کان میں کچھ سرگوشیاں کیں۔ اس کی گیند جیسی آنکھوں میں شعلے کچھ ماند نظر آئے۔

وہ حکمیہ انداز میں مائرہ سے کچھ کہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے چوکس گارڈز کی ہمراہی میں اس رہائشی کمپاؤنڈ سے باہر چلا گیا۔ میں وہیں فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ میم مائرہ نے مجھ سے سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں ان کیبنوں کی طرف کیوں گیا اور وہاں میں نے افروزہ نامی گارڈ کی جان کیوں لی؟ اس موقع پر میں نے سچ بتانا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ماہین کی طرف سے اندیشہ تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ وہاں اس فی میل گارڈ سے مڈبھیڑ ہوئی اور حادثاتی طور پر اس کی جان چلی گئی۔

مائرہ طیش کے عالم میں سنتی رہی مگر کوئی ردعمل نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر مائرہ نے ماہین کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ لڑکا تمہارا کیا لگتا ہے؟“ اشارہ حشام کی طرف تھا۔

ماہین کے ہونٹ جیسے پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ ”یہ منگیتر ہیں۔“ ماہین کی مشکل آسان کرتے ہوئے عمران نے جواب دیا۔

”تم اپنے منگیتر کے ساتھ رہنا چاہو گی یا.....“ مائرہ نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں انکل کے ساتھ رہنا چاہوں گی..... یہ..... زخمی

ہیں..... ان کو دیکھ بھال کی ضرورت بھی ہے۔"

دیکھ بھال کرلیں گے ہم۔" وہ بھڑک کر بولی۔ "تم اپنی مرضی بتاؤ۔"

"اگر مجھے کسی ایک کے ساتھ رہنا ہے تو انکل کے ساتھ رہوں گی۔"

میم مائرہ کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں سپروز اور گونگے فورمین جہازیوں کو کچھ ہدایات دیں اور اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہمیں "ان ڈور پلے گراؤنڈ" کے پاس سے گزار کر ان کوٹھری نما کیبنوں کی طرف لایا گیا جو میں چند گھنٹے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اندازہ ہوا کہ ان میں سے بس دو تین کیبن ہی خالی ہیں۔ ایک میں مجھے اور ماہین کو، دوسرے میں عمران اور حشام کو بند کردیا گیا۔

☆☆☆

کہنے کو تو یہ کیبن تھے مگر ان کی مضبوطی کال کوٹھریوں جیسی تھی۔ دروازے پر سفید رنگ کیا گیا تھا اور یہ مضبوط لوہے کا تھا۔ چھت خاصی اونچی تھی اور اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ تاہم دیواریں مضبوط کنکریٹ کی تھیں۔ آہنی دروازے میں ایک چوکور خلا تھا جہاں سے کھانا وغیرہ اندر پہنچایا جاسکتا تھا۔ عقب میں مختصر سا واش روم تھا۔

ایک میڈیکل باکس کیبن میں رکھ دیا گیا تھا۔ مجھے ایک دو چوٹوں پر بینڈیج کرنا پڑی۔ اس کام میں ماہین نے درد مندی سے میری مدد کی۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ کیبن میں کوئی خفیہ کیمرا یا مائیک وغیرہ نہیں ہے۔ ہم گفتگو کرسکتے تھے۔ میں نے شکوہ کناں لہجے میں ماہین سے پوچھا کہ اس نے ایسا رسک کیوں لیا۔ نہ صرف خود یہاں گرفتار ہوئی بلکہ حشام کو بھی پھنسادیا۔

وہ روہانسی ہوکر بولی۔ "انکل! آپ اور عمران کی مسلسل گمشدگی نے ہم سب کو پریشان کررکھا تھا۔ اسی دوران میں اتفاقاً میری نظر آپ کے گھر کی الماری میں عمران کی رسٹ واچ پر پڑگئی۔ میں سمجھ گئی کہ اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کس ایریا میں ہیں لیکن ہمیں آپ کی رسٹ واچ والے سگنل تب موصول ہوئے جب ہم اس عمارت کے بالکل قریب چلے آئے تھے....."

میں نے گہری سانس لی۔ "چلو جو بھی ہوا لیکن یہ حشام تمہارے ساتھ کیسے چلا آیا؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔" اس کے گال کا ڈمپل زیادہ گہرا نظر آنے لگا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ خود آنا چاہتا تھا؟"

"جی ہاں..... وہ کہتا ہے میں بہت بدل چکا ہوں۔ اب ہر جگہ شانہ بشانہ تمہارے ساتھ رہوں گا اور واقعی اس میں کئی تبدیلیاں نظر آتی ہیں انکل..... میرے منع کرنے کے باوجود وہ میرے ساتھ چل پڑا۔"

"وہ امیر کبیر بااثر باپ کا بیٹا ہے۔ اس کی گمشدگی تہلکہ مچادے گی ماہین!"

"ہاں، یہ تو مجھے بھی لگ رہا ہے انکل!"

کیبن میں تین چارفٹ چوڑا بس ایک بیڈ موجود تھا۔ اب ایک گدا بھی وہاں ڈال دیا گیا تھا۔ میں گدے پر لیٹ گیا۔ جیسے تیسے باقی کی رات گزر گئی۔ اس رات کے سارے واقعات گاہے بہ گاہے دماغ میں گردش کرتے رہے۔ گودام میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ بھی حیران کن تھا۔ گہری زرد دھاتی جیسے میٹریل کو جسے ہم بہت قیمتی سمجھتے تھے، بکھرے ریت میں ملادیا گیا تھا۔ یہ ایک معما تھا مگر میرے نزدیک اس سے بھی اہم وہ کھسر پھسر تھی جو عمران کی حیران کن لپ ریڈنگ دیکھنے کے بعد مائرہ نے رامے کے کان میں کی تھی۔ وہ یقیناً کچھ اہم سرگوشیاں تھیں جنہوں نے جادو رامے کی آتش ناکی پر پانی کے کچھ چھینٹے ڈالے تھے۔

صبح ہمیں مناسب سا ناشتہ دیا گیا۔ آسکدہ کیا ہونے والا تھا، کچھ پتا نہیں تھا۔ میری طرح ماہین بھی حیران تھی کہ جادو رامے جیسا خطرناک مجرم کس طرح پھر سے رہا ہوکر یہاں پایا جارہا ہے۔ وہ آسکدہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا یہ بھی ایک تشویشناک سوال تھا۔ اس "آسکدہ" سے دھیان ہٹانے کے لیے ہم باتوں میں مصروف ہوگئے۔

ماہین بولی۔ "انکل! میں نے "لپ ریڈنگ" کے بارے میں تھوڑا بہت سنا ہوا ہے لیکن کل رات ہم نے جو کچھ دیکھا وہ واقعی لپ ریڈنگ تھی یا پھر..... یہ کوئی ٹرک وغیرہ تھی۔"

"لپ ریڈنگ ہی تھی ماہین.....! اور بہت کمال کی تھی۔ ماسٹر لپ ریڈر اور اسپیچ ریڈر ہی اس طرح کا نتیجہ دے سکتے ہیں۔"

"یہ تکنیک کہاں سے سیکھی عمران نے؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتا، باہر کچھ عجیب طرح کا شور سنائی دیا۔ میرے گھٹنے پر بھی کچھ چوٹ آئی تھی۔ میں دوسرے گھٹنے پر زور دے کر اٹھا اور دروازے کے اوپر والی جالی سے باہر جھانکا۔ دن کا وقت تھا مگر طویل برآمدے میں دودھیا لائٹس آن تھیں۔ میں نے وہ اسٹریچرز دیکھے جن پر

دوسرا مریض غالباً بے ہوشی کی حالت میں لیٹے تھے۔ اسپتال کے تین چار ملازم اسٹریچرز کو بھگاتے ہوئے ایک جانب لے جا رہے تھے۔ ایمرجنسی کی صورتِ حال نظر آتی تھی۔ تب مجھے ایک تنومند شخص دکھائی دیا۔ یہ کوئی اور نہیں، گونگا فورمین جہاناں تھا۔ وہ خاکی لباس والے ایک نیم بے ہوش مریض کو کندھے پر ڈالے عمارت کے میڈیکل سینٹر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک وہیل چیئر بھی آ رہی تھی۔ اس پر بھی ایک درمیانی عمر کا مزدور تھا۔ اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا اور ناک سے خون رس رہا تھا۔ وہ ہچکولوں کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے انکل تابی؟ حشام اور عمران تو خیریت سے ہیں؟" ماہین بے تاب ہو کر بولی۔

"وہ خیریت سے ہی ہوں گے لیکن یہاں کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ لگتا ہے کہ کچھ لوگ بہت بیمار ہو گئے ہیں۔"

رات کو میں اور ماہین یہاں بنائی جانے والی ویکسین کی باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ وہ بولی۔ "کہیں یہ وہی ویکسین والا معاملہ تو نہیں؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔"

دھچکے دھچکے سے بھگدڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند منٹ گزرے پھر کسی نے دروازے کا وہ چوکور خانہ کھولا جس میں سے دو بار ہمیں کھانا پہنچایا گیا تھا۔ انچارج گارڈ بہروز کی حواس باختہ صورت نظر آئی۔ اس کے عقب میں مسلح گارڈز تھے۔ وہ حکم سے بولا۔ "اپنا رخ دوسری طرف کر کے اپنے ہاتھ پشت کی طرف لاؤ تاکہ تمہیں زپ ٹائی ہینڈ کف لگایا جا سکے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہی ہم کا حکم ہے۔ تمہیں یہاں سے باہر لے جانا ہے۔ فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔"

"اسپتال کس لیے؟"

"دیکھو، سوال جواب میں وقت ضائع مت کرو۔ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ تمہیں جو انجکشن لگے تھے، ان کا ری ایکشن ہو رہا ہے۔ جلدی کرو۔"

اگر میں نے تھوڑی دیر پہلے کے مناظر نہ دیکھے ہوتے تو شاید آسانی سے بہروز کی بات کا یقین نہ کرتا۔ چند سیکنڈ سوچنے کے بعد میں نے انچارج بہروز کی ہدایت پر عمل کیا۔ تیزی سے میرے ہاتھ زپ ٹائی کف میں جکڑ دیے گئے۔

ماہین بہت پریشان نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کیبن سے باہر آ گیا۔ دروازہ دوبارہ لاک کر دیا گیا۔

باہر آ کر میں نے دو تین اور اسٹریچرز بھی دیکھے۔ کچھ مزدوروں کو دیکھا جنہیں گارڈز رائفلوں سے ہانکتے ہوئے میڈیکل سینٹر یا اسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت پر نہیں باندھے گئے تھے۔ یہ "خاص مہربانی" مجھ پر ہی کی گئی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ میں ان کے نزدیک خطرناک تھا۔ خاص طور سے فی میل گارڈ کے قتل والے واقعے کے بعد یہ تاثر مزید بڑھ گیا تھا۔

مجھے عمران کی فکر تھی۔ اگر واقعی یہاں میڈیکیشن کے حوالے سے کوئی گڑبڑ ہوئی تھی تو عمران کو بھی ایک دو انجکشن لگ چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں بہروز سے عمران کے بارے میں کچھ پوچھتا، میری نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ کافی فاصلے پر نظر آیا پھر بھی میں نے دیکھ لیا کہ اس کے ہاتھ میری ہی طرح پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں کالی وردیوں والے تین مسلح گارڈز تھے۔ وہ اسے لے کر تیزی سے ایک کوریڈور میں اوجھل ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد میں بھی اس عمارت کے اسپتال والے پورشن میں موجود تھا۔ یہ وہی وارڈ تھا جہاں مجھے پہلے بھی لایا گیا تھا لیکن آج یہاں سارے بستر بھرے ہوئے تھے۔ میں نے عجیب مناظر دیکھے۔ ڈاکٹروں اور دوسرے میڈیکل اسٹاف نے عجیب وضع کے ماسک لگائے ہوئے تھے۔ ان کے لباس بھی وہی تھے جو وائرل انفیکشن سے بچاؤ کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ ڈاکٹرز افراتفری کے عالم میں مختلف مریضوں کی ٹریٹ منٹ کر رہے تھے۔ کچھ کے غالباً ٹیسٹ وغیرہ کے لیے خون کے نمونے لیے جا رہے تھے۔

مجھے بھی ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔ فوری طور پر پانچ ملی کا ایک انجکشن میری کس میں لگایا گیا اور چھاتی پر بوجھ یا جکڑن کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ میرے منہ پر ماسک چڑھا دیا گیا۔ میں نے وارڈ میں دائیں بائیں دیکھا لیکن عمران مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ کسی دوسری جگہ تھا۔

میرے بستر کی دائیں جانب سبز رنگ کا ایک طویل پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک اور وارڈ نظر آ رہا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ اصل ہنگامی صورتِ حال اس دوسرے وارڈ میں ہے۔ مناظر ناقابلِ بیان تھے۔ مریض تڑپ رہے تھے۔ ان کے سینے ہچکولے کھا رہے تھے۔ کم از کم دس پندرہ مریض ایسے نظر آئے جن کی ناک یا منہ سے خون جاری تھا۔ ماسک پہنے ڈاکٹرز میڈیکل اسٹاف کے ساتھ بھاگے پھر رہے تھے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ دس پندرہ مریض ایکسپائر ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ ویسے ہی پڑے تھے، کچھ کو پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلوں میں لپیٹا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید یہی ان بدنصیبوں کے کفن ہیں اور آج ان کو اسی کفن میں عمارت کے اندر کہیں زمین برد کر دیا جائے گا۔

سنہری بالوں والی میم مائرہ کا کہا ہوا فقرہ میرے تصور میں گونجنے لگا۔ اس نے نیلی اسٹیشن ویگن کے اندر اپنے ملازم سے کہا تھا..... "یہ نہ ہو کہ ان مزدوروں میں سے پھر ایک دو کو دفن کرنا پڑ جائے....." اور یہ ایک دو نہیں تھے، یہ تو ڈیڑھ درجن کے قریب تھے اور معلوم نہیں تھا کہ ابھی اور ان میں کتنے شامل ہونا تھے۔

اور تب میری نگاہ ایک نوجوان کی لاش پر پڑی۔ اس نے بھی ابھی ابھی دم توڑا تھا۔ اس کے سفید تکیے پر خون کے تازہ داغ تھے اور گلوکوز کی ڈرپ ابھی اس کے بازو سے جدا نہیں کی گئی تھی۔ یہ وہی سترہ اٹھارہ سالہ پٹھان لڑکا تھا جو ایک رات وارڈ میں بڑے سوز سے گنگنا رہا تھا..... پہلے تو کبھی کبھی تم تھا..... اب تو ہر پل تیری یاد ستاتی ہے..... شاید اپنے دل میں کوئی موہوم آس لے کر اس نے گاؤں چھوڑا تھا اور آج دنیا ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس کی کہانی بھی ان لاتعداد ادھوری کہانیوں میں شامل ہو گئی تھی جن پر سے کبھی پردہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

میری نگاہوں میں جادو رات کے منحوس نقوش گھومنے لگے۔ وہ انسان کی شکل میں ایک شیطان تھا۔ اپنے لالچ میں وہ بے شمار انسانی زندگیوں کو داؤ پر لگا رہا تھا۔ ان کو اپنے مہلک تجربوں کی بھینٹ چڑھا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی ہوس زر اور شیطانیت کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔

رات نو بجے کے لگ بھگ میں تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا۔ دو تین گھنٹے بعد اٹھا تو وہ ڈاکٹر میرے قریب کھڑے میری رپورٹس وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ مطمئن نظر آتے تھے۔ مجھے خود بھی اپنی طبیعت میں کسی طرح کی خرابی یا تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس وارڈ کے تمام مریض نارمل ہی تھے۔ صرف دو تین جن کی طبیعت کچھ خراب محسوس ہوئی تھی، کسی دوسرے وارڈ میں منتقل کر دیے گئے تھے۔ ساتھ والے انتہائی نگہداشت کے وارڈ کا سبز پردہ اب برابر تھا۔ میں وہاں کے حالات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم اندازہ یہی ہوتا تھا کہ وہاں کافی جانی نقصان ہوا ہے۔

میری رپورٹس دیکھنے والوں میں وہ قدرے قریب جسم کی لیڈی ڈاکٹر بھی تھی جس کی شکل مجھے کسی سے مشابہ محسوس ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس مرتبہ کیوں مجھے لگا کہ وہ بھی گاہے بہ گاہے مجھے دھیان سے دیکھ رہی ہے۔

رات تقریباً ڈھائی تین بجے کا وقت ہوگا۔ وارڈ کے اکثر مریض سو رہے تھے یا اونگ رہے تھے۔ میرے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وارڈ کے دروازے پر دو مسلح گارڈز بھی موجود تھے اور مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے ایک صرف مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے ہے۔ میرا دھیان بار بار عمران کی سمت جاتا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔

اچانک قدرے فربہ جسم والی وہی لیڈی ڈاکٹر میرے بستر کے قریب آئی اور بولی۔ "تمہیں یہاں سے لے جایا جا رہا ہے۔ تمہارے ایک دو اہم ٹیسٹ ہونے ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ہم کب کہہ رہے ہیں کہ تم ٹھیک نہیں ہو لیکن ٹیسٹ ضروری ہیں۔" اس کے ساتھ ہی لیڈی ڈاکٹر نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دو بندوں کو اشارہ کیا۔ وہ عام کپڑوں میں تھے لیکن مسلح تھے۔ انہوں نے مجھے ساتھ لیا۔ وارڈ سے نکالا اور ایک طویل کوریڈور سے گزار کر ایک برآمدہ نما جگہ پر لائے پھر ایک بند کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرا اور اس کے ساتھ والا کمرا کسی ڈاکٹر یا پروفیسر کی رہائش گاہ ہی لگتا تھا۔ یہاں چند ایک میڈیکل آلات تو موجود تھے لیکن یہ لیبارٹری ہرگز نظر نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کرنے لگی تھی۔ ایک گارڈ مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا جبکہ دوسرا وہیں موجود رہا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ شلوار قمیص میں اس کی توند کسی مٹکے کی طرح نظر آتی تھی۔ رائفل مسلسل اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کمرے میں آخری گوشے میں رکھے ایک اسٹول پر خاموش بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے جسم میں ایک عجیب سی نقاہت محسوس ہونے لگی۔

چند لمحے بعد سفید کوٹ میں ملبوس وہی قدرے اندام ڈاکٹر دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ لاک کیا اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دیں۔ اس کے تیور بدلے نظر آتے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا، وہ تن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"میرا نام عامرہ مجید ہے۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں اسی ڈاکٹر شاہ بہ اکرام کی چھوٹی بہن ہوں جو تمہارے ہاتھوں قتل ہوئی۔"

میرا دماغ جھٹکے سے اڑ گیا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ مجھے اس کے نقوش کچھ جانے پہچانے کیوں لگ رہے

تھے۔ شاربہ اکرام نہایت کریٹ ڈاکٹر ماجد اکرام کی بیوی تھی۔ ایبٹ آباد کے اس سرد جہنم جیسے تہ خانے میں شاربہ نے مجھے اپنے خاوند کے قتل کا مجرم ٹھہرایا تھا اور بدلہ لینے کی سفاکانہ کوشش کی تھی۔ میری نگاہوں میں وہ منظر کسی فلم کے سین کی طرح گھوم گیا جب وہ میرے آگے برہنہ جسم تہ خانے کی سیڑھیوں پر بھاگتی ہوئی اوندھے منہ گری تھی اور جاں بحق ہوئی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اپنے سامنے سفید کوٹ میں کھڑی ڈاکٹر عامرہ کا چہرہ دیکھا۔ یقیناً وہ اس کی بہن ہی تھی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک آتشیں، گرسنہ چمک نظر آتی تھی۔

"تابش نام ہے نا تمہارا؟ میں نے تمہارے بارے میں ذرا دیر سے جانا لیکن جان لیا ہے۔ تم قاتل ہو میری بہن کے۔"

میں نے جواب دینا چاہا مگر مجھے اپنے جسم کے ساتھ ساتھ اپنی زبان بھی بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں، میں نے کہا۔ "پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہاری بہن کے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں تھی..... مگر....." آگے کے الفاظ میرے منہ کے اندر ہی گڈمڈ ہو گئے۔ ہونٹوں اور چہرے پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں لانے سے پہلے دارا میں نرس نے مجھے جو دو انجکشن لگائے تھے، وہ عام نہیں تھے۔ ان میں کچھ خاص تھا جو اب میرے ہاتھ پاؤں سن کر کے مجھے بے دم سا کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جسم مٹی کا ڈھیر بنتا جا رہا ہے۔ دماغ میں دھند سی تھی۔

"تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں بہ مشکل کہا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔ ویٹ اے منٹ۔" اس کا انداز خطرناک تھا۔

اس نے تونددالے گارڈ کی کمر سے چمڑے کی موٹی پیٹی اتاری اور مجھ پر پل پڑی۔ ساتھ ساتھ وہ جنونی انداز میں چلا رہی تھی۔ "تم نے مارا ہے میری بہن کو..... تم نے مارا..... تم نے مارا۔"

کل والی مار پیٹ کی چوٹیں بھی ابھی میرے جسم پر تازہ تھیں۔ اس نئی افتاد نے پکی چوٹوں میں بھی انگارے سے بھر دیے۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں فی الوقت کسی مزاحمت کے قابل نہیں ہوں۔ شواپ شواپ کی آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں اور بیلٹ کا دھاتی بکل مجھے اضافی تکلیف پہنچا رہا تھا۔ میں اب کرسی سے گر پڑا تھا اور فرش پر تھا۔ میری تکلیف شاید اسے لطف دے رہی تھی۔

وہ جیسے دیوانی سی ہو گئی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار پھینکا۔ میں نے دھندلائی ہوئی سی نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے تونددالے گارڈ کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ البتہ اس کے جانے سے پہلے اس کے ہولسٹر میں سے برٹا کا چھوٹا پسٹل نکال لیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے دروازے کو اندر سے چٹخنی (سلائڈنگ بولٹ) چڑھائی اور ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔

"تم نے میری بے لباس بہن کو اپنے آگے دوڑایا تھا۔ میں تمہارے جسم پر بھی کپڑے کا ایک تار نہیں رہنے دوں گی۔"

وہ جھپٹی اور میری قمیص پھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ناکامی پر جھنجلا گئی۔ بیلٹ زیادہ شدت اور تواتر سے میرے جسم پر برسنے لگی۔ وہ چہرے سمیت جسم کے نازک حصوں کو نشانہ بنا رہی تھی۔ "کپڑے اتارو..... کپڑے اتارو۔" وہ دہاڑی۔

دہشت کے ان لمحوں میں وہ شاید یہ بھی بھول گئی تھی کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ تب اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور میرا چہرہ اپنے پاؤں پر جھکاتے ہوئے پھنکاری۔ "چاٹو..... میں کہتی ہوں چاٹو اپنی اس منحوس زبان سے۔"

اس کے سفید ہینڈل میری آنکھوں سے فقط چند انچ کے فاصلے پر تھے اور وہ عالم دہشت میں انہیں چاٹنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ جنونی ہو رہی تھی اور اس بند کمرے میں اس کا غیظ و غضب کوئی بھی واہیات رخ اختیار کر سکتا تھا۔

میرا جسم نامعلوم انجکشن کے زیر اثر بے جان تھا اور میں اسے مزید بے جان ہونے سے روکنے کی سعی کر رہا تھا۔ اسی دوران میں عامرہ نے میرے سر سے برٹا پسٹل اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا۔ میرے بال پھر مٹھی میں جکڑے اور پورے زور سے میرا سر اپنے سفید سینڈلز کی طرف جھکاتے ہوئے بولی۔

"Lick it .... Lick it"

اب سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میں نے نیچے جھکے جھکے اپنا سر "ڈاکٹر صاحبہ" کی ٹانگوں میں پھنسایا اور اسے یوں اٹھا لیا جیسے نٹ کسی کو اپنے شانوں پر اٹھاتا ہے۔ دو قدم بھاگ کر میں نے اسے پوری شدت سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ وہ تکلیف سے چلائی۔ پسٹل اس کے ہاتھ

سے چھوٹ کر نہ جانے کہاں جا گرا۔ اتفاقاً وہ کمرے کے سوئچ بورڈ سے ٹکرائی تھی۔ بورڈ چکنا چور ہوا اور ایک جھماکے کے ساتھ کمرے میں نیم تاریکی ہوگئی۔ اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ اب وہ اذیت کے عالم میں فرش پر بل کھا رہی تھی۔ میں نے ایک نہایت کراری ٹھوکر اس کے کولھے پر رسید کی۔ نیم تاریکی میں اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ دلدوز انداز میں چلا رہی تھی۔ "سیکیورٹی..... سیکیورٹی..... ہیلپ۔"

میں نے الٹی ہوئی کرسی پر پاؤں رکھا اور اپنے دانتوں کی مدد سے دروازے کی سلائڈنگ بولٹ گرانے میں کامیاب رہا۔ جونہی دروازہ کھلا، میں لنگڑاتا ہوا دائیں جانب بھاگا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازہ کھلنے کے بعد تو عمدہ والے گارڈ نے اپنی مالکن کی آواز سن لی ہوگی اور اب وہ لوگ میرے پیچھے آئیں گے۔ جسم پر اب بھی منوں بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ تاہم اپنی قوتِ ارادی کے سبب میں دوڑتا چلا گیا۔ میرا اندیشہ سو فیصد درست تھا۔ مجھے اپنے عقب میں بھاگو، پکڑو کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک برآمدہ نما جگہ پر پہنچا تو نیم گرم ماحول کی جگہ یخ بستہ ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا۔ مطلع بھی غالباً ابر آلود تھا۔ صرف دس پندرہ قدم بھاگ کر میں عمارت کے جنوبی پورشن میں داخل ہوگیا۔ یہاں پھر خوشگوار حرارت تھی۔ یکایک ایک جانب سے ایک مسلح گارڈ برآمد ہوا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور بوکھلاہٹ کی کیفیت تھی۔ وہ غالباً مجھے روکنے کے لیے ہی رائفل کندھے سے اتار رہا تھا مگر اس سے پہلے ہی اس کے چہرے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرے سر کی اتنی شدید ضرب اسے لگی کہ وہ ہوا میں اڑتا ہوا سا ایک بلوری پارٹیشن توڑ کر تاریکی میں جا گرا۔ مجھے یہاں دواؤں کی تیز بو محسوس ہوئی۔

عقب میں بھاگنے والے میرے قریب پہنچ رہے تھے۔ پھر ایک فائر ہوا۔ یہ فائر میری ٹانگوں پر ہی کیا گیا تھا مگر خطا گیا۔ میں تیزی سے ایک تنگ کوریڈور میں گھس گیا۔ یقینی بات تھی کہ یہ لوگ اس عمارت میں مجھے زندہ ہی پکڑنا چاہتے تھے۔ یوں تو عامرہ مجید نے بھی دورانِ تشدد مجھ پر پسٹل تانا تھا لیکن مجھے جان سے مارنا شاید وہ بھی نہیں چاہتی تھی۔

کوریڈور میں عام کپڑوں میں ملبوس دو افراد اچانک میرے سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک مسلح تھا۔ بھاگو، پکڑو کی آوازیں اس تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ اپنی لمبی قمیص کے نیچے سے پستول نکال رہا تھا۔ ان دونوں سے بھڑنے کے بجائے میں ایک اور بغلی راہداری میں مڑ گیا۔ یہ راہداری آگے جا کر ایک کشادہ لابی میں بدل گئی۔ لابی سے چوڑے زینے اوپر جا رہے تھے۔ میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ زینے پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا۔ آہٹوں اور آوازوں سے اندازہ ہوا کہ اب سامنے سے بھی کچھ لوگ آ رہے ہیں۔

نازک صورت حال تھی۔ اچانک میرے پہلو میں ایک دروازہ کھلا اور کسی نے جیسے مجھے کھینچ کر اندر گھسیٹ لیا۔ انداز دوستانہ تھا لہٰذا میں نے مزاحمت نہیں کی۔ گھسیٹنے والے نے دروازہ فوراً بند کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور حیرت زدہ ہوا۔ یہ ایک جواں سال عورت تھی۔ دراز قد، بھرے بھرے جسم والی، لمبی گردن جو شاید دو چار سال پہلے صراحی دار بھی تھی۔ وہ بھڑکیلے لباس میں اچھی شکل صورت کی دکھائی دیتی تھی۔

اس نے اپنے لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے سے کان لگا لیے۔ کچھ ہی دیر بعد کوریڈور میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ "سیڑھیوں کی طرف دیکھو۔" کسی نے پکار کر کہا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ انچارج گارڈ بہروز کی آواز تھی۔

ایک دو منٹ ہلا گلا رہا پھر قدمے خاموشی ہوگئی۔ کمرے کی روشنی میں عورت نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک مردانہ قسم کی بے باکی تھی۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہ بھی خوب سجا سنورا تھا۔ ایک طرف دیوار پر بڑے سائز کی فریم شدہ تصویر نظر آ رہی تھی۔ اس میں یہی عورت بڑی بے تکلفی سے سانولے سلونے جادو رام کے پہلو میں بیٹھی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ گرمجوشی سے تھام رکھے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تصویر دو تین سال پرانی ہے۔

"کون ہو آپ؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو تم مجھے اپنی "زندگی" کہہ سکتے ہو کیونکہ میں نے تمہاری زندگی بچائی ہے۔" وہ کھلے ڈلے انداز میں بولی۔ "میں اوپر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب تم دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھے، میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہارے جیسے بندے کی مدد کرنا چاہیے۔"

"کیا تم مجھے پہلے سے جانتی ہو؟"

"بہت زیادہ پہلے سے نہیں مگر رات جب رائے صاحب نے تم پر اپنے گارڈ چھوڑے تھے تب میں نے تم کو پہلی واری دیکھا تھا۔ سچی گل یہ ہے کہ تم نے بڑے جگرے سے مار کھائی۔ واہ بلا کرنا تو کیا تمہارے منہ سے ہائے بھی نہ نکلی۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم ایویں شیویں نہیں ہو۔ کوئی وڈے چیمپئن ہے ہو مار کٹائی کے۔"

پھر اس نے زیادہ دھیان سے میرے سراپا... کا جائزہ

لیا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی نشہ وغیرہ کیا ہے تم نے..... یا شاید تمہیں کرایا گیا ہے، تمہاری مرضی کے بغیر..... کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں.....؟“

میں اقراری انداز میں خاموش رہا اور اپنے منتشر حواس کو یکجا کرتا رہا۔ میرے ہاتھ ابھی تک پشت پر ”ٹرپ ٹائی ویٹ کف“ میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ ذرا مردانہ سے لہجے میں بولی۔ ”ویسے مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی تازہ مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔“

”تم ٹھیک اندازے لگا رہی ہو..... لیکن مجھے ابھی تک تمہارا نام بھی معلوم نہیں ہوا۔ لگتا ہے کہ رائے صاحب سے تمہارا کوئی قریبی تعلق ہے؟“

”تعلق ہے تو تمہیں بچانے کا رسک لے لیا ہے نا۔“ وہ ادا سے بولی۔ اس مرتبہ مجھے اس کا انداز کچھ بازاری سا لگا۔ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ویسے میرا نام ہما عروج ہے۔ تم مجھے صرف ہما بھی کہہ سکتے ہو۔ باقی رہا عروج..... وہ تو میں کبھی دیکھ ہی نہیں سکی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا تعلق ٹی وی، فلم وغیرہ سے تو نہیں؟“

”بھئی بڑی تیز نظر ہے تمہاری۔“ وہ تعریفی انداز میں بولی۔ ”پر بات تم نے آدھی ٹھیک کی ہے۔ میرا تعلق ٹی وی فلم وغیرہ سے تھا..... اب نہیں..... اور یہ ہم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ تازہ تازہ چوٹیں کس نے لگائی ہیں تمہیں..... اور یہ تمہارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے رائے کے غنڈے؟“

مجھے لگا کہ اپنی اس مددگار کو مجھے کچھ نہ کچھ بتا دینا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر عامرہ مجید کا ذکر کیا اور اسے مختصراً بتایا کہ وہ مجھے کس طرح اسپتال سے نکال کر لائی اور کس طرح مجھ سے مار پیٹ کی۔

پوری بات سننے کے بعد وہ بولی۔ ”ایسی زنانی کو تو ڈاکٹر کہنا بھی ڈاکٹری کی بے عزتی ہے۔ بڑی گندی، خبیث زنانی ہے وہ۔ لگتا ہے کہ تمہاری اس کے ساتھ کوئی دشمنی چل رہی ہے۔“

”چل تو نہیں رہی۔ وہ خود ہی بنا رہی ہے۔“ میں نے گول مول سا جواب دیا۔ وہ شاید مزید کریدتی مگر اس سے پہلے ہی کسی قریبی کمرے سے ایک ساتھ کئی عورتوں یا لڑکیوں کے چیخنے کی مدھم آواز آئی۔ پھر کوئی لڑکی شوخ انداز میں چلائی اور جیسے مدد کے لیے پکارنے لگی۔ ”ہما جی..... ہما جی!“

ہما عروج کی چمکیلی پیشانی پر ایک سلوٹ ابھری۔ وہ اپنی کمادار سرخ شال سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”ایک منٹ..... میں ابھی آئی۔ تم کو یہیں رہنا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک دروازہ کھول کر اوجھل ہو گئی۔ میرے جسم میں ابھی تک عجیب سی نقاہت تھی۔ آنکھوں کے سامنے سے دھند بھی پوری طرح اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ یہ لگژری ٹائپ کا رہائشی اپارٹمنٹ تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہاں اسی سائز کے تین چار کمرے موجود ہیں۔

جہاں جہاں میرے جسم پر بیلٹ کے بکل کی ضرب لگی تھی وہاں جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس اپارٹمنٹ سے باہر اب تقریباً خاموشی تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ آئندہ کیا صورتِ حال پیش آنی ہے۔ میں نے محترمہ عامرہ مجید کو اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر نہایت تسلی بخش ضرب لگی ہے۔ اب میں ایک دم گارڈز کی نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا۔ ذہن میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری اس ”کارروائی“ کا اثر میرے ساتھیوں پر پڑے۔ ان پر کسی طرح کی سختی کی جائے۔ پھر عمران کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ تر نوالہ بننے والا شخص نہیں تھا۔ شدید خطرے کی حالت میں اس کا غضب ناک روپ میں تین چار بار سے زیادہ دیکھ چکا تھا اور پھر مابین کے لیے تو وہ کسی بھی وقت جان ہتھیلی پر رکھ سکتا تھا۔

ہما عروج ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ اپنے پریشان کن خیالات سے توجہ ہٹانے کے لیے میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بائیں جانب ایک کھڑکی کی جھری میں سے دوسری طرف جھانکنے کی کوشش کی۔ یہ ایک طویل کمرا تھا۔ کمرے کے آخری سرے پر مجھے جہازی سائز کی ایک نہایت قیمتی سنگار میز نظر آئی۔

میز کے سامنے درمیانی شکل و صورت کی ایک نوخیز لڑکی بیٹھی تھی۔ تیس پینتیس سالہ ایک عورت کسی ماہر آرٹسٹ کی طرح اس کے ناخنوں پر پالش کر رہی تھی۔ لڑکی کی پنڈلیوں اور بازوؤں پر کوئی انجن ٹائپ کی چیز لگی ہوئی تھی۔ مجھے ایک لمحے میں پتا چل گیا کہ یہ نوخیز لڑکی ناچنا ہے۔

وہ یہاں کیوں تھی؟ کیا اسے کسی کے لیے تیار کیا جا رہا تھا؟ ہما عروج یہاں کیا ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھی؟ اس لگژری اپارٹمنٹ میں اور اس کے اردگرد کیا ہو رہا تھا؟ کئی چبھتے سوالات ذہن میں سر اٹھانے لگے.....

عمران اور ٹابل کی ملاقات کا سنسنی خیز احوال اگلے ماہ پڑھیں

دوسری قسط

قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات و اطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہِ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گرد و پیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شاذ ایسی ہی نہیں دلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جائے...

طلسم ہوس میں مبتلا ایک وحشی مسیحا کی قاتلانہ جراحی

اسی دوران میں ہما واپس آ گئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ میرے گھٹنے سے خون رس رہا تھا اور اس کے کچھ نشانات لباس پر بھی نظر آ رہے تھے۔

میری چوٹیں دیکھ کر ہما کے چہرے پر تاسف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے انٹر کام اٹھا کر کہا۔ ''فرزانہ! ذرا میرے پاس آؤ۔''

چند لمحے بعد وہی عورت نمودار ہوئی جسے میں نے کچھ دیر پہلے نابینا لڑکی کو بناتے سنوارتے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ششدر ہوئی۔ ہما عروج نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''فرزانہ! میرے اور تمہارے سوا ان کی یہاں موجودگی کا کسی کو پتا نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے، کسی بھی صورت۔''

فرزانہ نامی اس عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہما عروج نے اسے میڈیسن اور بینڈیج وغیرہ لانے کو کہا۔ وہ جلدی سے یہ چیزیں لے آئی اور گھٹنے کے علاوہ دو اور چوٹوں کی ڈریسنگ کرنے میں مدد کی۔ وہ ہما کو بڑے ادب سے ہما جی کہہ کر بلا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد یہی فرزانہ نامی عورت ہمارے لیے چائے اور اسنیکس وغیرہ لے کر آ گئی۔ میں نے وال کلاک دیکھا۔ اب صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔

ہما نے بے تکلفی سے چائے کا کپ میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ میں نے ایک چسکی لی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے پشت پر بندھے ہاتھ نہیں کھولے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ رسی ہو گی۔



میں نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ رائے صاحب بے حد غصے میں ہوں گے۔ تم میری مدد کر کے کسی مصیبت میں نہ پھنس جانا۔“

”کوئی گل نہیں..... دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے کیک ٹشری کا ایک بائٹ دیا اور گویا ہوئی۔ ”اس باندری جاذبہ نے جو کچھ کیا ہے، اس کا جواب بھی تو اسے دینا پڑے گا رائے صاحب کو۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، یہ بغیر کسی اجازت کے تمہیں اسپتال سے اپنے چیمبر میں لے کر گئی ہے۔ اب کہے گی یہی کہ کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرنا تھا تمہارا۔ مگر اصل میں تو اس کے اندر بھانبھڑ سا بھڑ مچا ہوا تھا۔“

”ظاہر ہے کہ اپنی اس حرکت کے لیے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنالے گی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں، ایک نمبر کی فنے خانی ہے۔ کہے گی کہ تم نے بھاگنے کی کوشش کی اور جو تازہ چوٹیں تمہیں لگیں وہ اسی وجہ سے تھیں۔ بعد میں تم بھاگ گئے..... لیکن وڈا ڈاکٹر تو پوچھے گا نا کہ تم کس کی اجازت سے اتنے خاص مریض کو ٹیسٹوں کے لیے لے کر گئی تھیں..... اور کون سے ٹیسٹ تھے؟“

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ہما عروج دل گردے والی عورت ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ رائے کے غصے کو کافی حد تک ٹھنڈا کر لے گی۔ اسی اثنا میں ہما کے سیل فون پر میوزک ابھرا۔ طرز غالباً پنجابی گانے کی تھی..... اِک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنی ایں۔

ہما نے اپنے سرخ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور تھوڑا سا رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ پتا چلا کہ یہ ویڈیو کال ہے۔ چند سیکنڈ بعد جاذبہ رائے کی بارعب آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک گیا۔ اس کی صورت بے شک دل میں کراہیت ابھارتی تھی مگر آواز ٹھیک ہی تھی بلکہ کسی وقت تو آواز پر کسی ریڈیو اناؤنسر کی آواز جیسا گمان ہوتا تھا۔ میں نے گردن کو ذرا لمبا کر کے دیکھا۔ پان سے رنگے ہونٹوں والا اس کا بالکل گول سیاہ چہرہ پوری فون اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔

”ہاں بھئی، کیا بنا پھر؟“ اس نے ہما سے پوچھا۔

”جو تمہارا حکم رائے جی..... اسب تیار ہے..... کتنے بچے بھیجنا ہے؟“

”ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔ شام کو بتا دوں گا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہما نے کہا۔ ”وہ تین چار بچے کیا جھگڑسی بچ گئی تھی؟ ایک دو گولیوں کی آواز بھی آئی تھی۔

جواب میں رائے نے روکھے لہجے میں اسے مختصراً بتایا کہ جو پولیس والا یہاں پکڑا گیا تھا، اس نے ڈاکٹر جاذبہ کو زخمی کیا ہے اور بلڈنگ کے اندر ہی کہیں چھپ گیا ہے۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

رائے سے بات ختم ہوئی تو ہما معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ رائے صاحب سے تمہاری پرانی یاد اللہ ہے۔ پرسوں تمہارے ساتھ مارکٹائی سے پہلے رائے صاحب تم سے کہہ رہا تھا کہ میرے اوپر تمہارا قرض ہے جو میں بہت اچھی طرح اتاروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تو خود بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لگتا ہے شاید ہر پولیس والے نے ہی تمہارے رائے صاحب پر قرض چڑھا رکھا ہے۔“

وہ بدستور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ”اب رائے صاحب کیا فرما رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کس کو ان کے پاس بھیجنے کی بات ہو رہی تھی؟“

وہ ایک دم دوسرے موڈ میں آ گئی۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ”پولیس والے ہو۔ یہ تو تمہیں پتا ہی ہوگا کہ رائے صاحب عورتوں کا کتنا شوقین ہے۔“

”تھوڑا بہت پتا ہے۔“

”شاید تم جانتے ہو یا نہیں..... چند ہفتے پہلے رائے صاحب کا جو خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس میں ایک ایسی گڑبڑی ماری گئی تھی جس پر رائے صاحب سوجان سے بلکہ سوا سوجان سے فدا ہو چکا تھا۔ اس کی موت کے بعد سے وہ بہت..... بہت زیادہ اپ سیٹ ہے۔ اس کا دکھ مٹانے کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیل رہا ہے۔ اتنا تیز پان کھا رہا ہے کہ منہ اندر سے چیر و چیر ہو گیا ہے۔ دوسری طرح کی دل پشوری بھی کر رہا ہے پر کل (بات) نہیں بن رہی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہی لڑکی شوکی والا شکل۔ کل ایک بڑی سوہنی گڑبڑی بھیجی تھی اس کے پاس۔ دس پندرہ منٹ میں ہی اس کو دھکے مار کر نکال دیا بیڈ روم سے۔ کہتا ہے مجھے چڑی شڑی نہیں چاہیے۔ چڑی شڑی بہت درت (برت) لی ہے میں نے۔ مجھے محبت چاہیے۔ دیکی ہی محبت جو مرن والی مجھ سے کرتی تھی۔ وہ مجھے بالکل بدل گئی ہے۔“

”مرن والی کون؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہی جو ایکسیڈنٹ میں اللہ بیلی ہو گئی تھی۔ چاندنی نام تھا اُس کا۔ کہتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔“

''کیا واقعی کرتی تھی؟''

''کوئی بڑی بات نہیں کہ کرتی بھی ہو۔ اس بے چاری کو کون سا نظر آتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر کسی نابینا کو ہی بھیج دو اس کے پاس۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''واہ بھئی واہ..... پولیس والے ہو پھر بھی دماغ پنگا کام کرتا ہے تمہارا۔''

''کیا مطلب؟ مذاق کر رہی ہو؟''

''نہیں نہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کل رائے صاحب نے بھی اس سے ملتی جلتی بات ہی کی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہر طرح کی گل بات کر لیتا ہے۔ جب اس لڑکی کو دھکے مار کر نکال دیا تو خود ہی کہنے لگا..... کوئی چاندنی جیسی لاؤ جو مجھے نہ دیکھے۔ میرے اندر کے پیار کرنے والے مرد کو دیکھے۔ شاید وہ میرے زخم پر مرہم رکھ سکے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر مزے کی بات یہ ہے کہ پندرہ بیس گھنٹے میں ہم نے ایک ایسی لڑکی ڈھونڈ بھی لی ہے۔ روپے پیسے سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک ہفتے میں چار پانچ لاکھ کمانے کا موقع مل جائے تو دل اوپر نیچے ہو ہی جاتا ہے۔ یہ لڑکی بھی اپنی مرضی سے آئی ہے۔ اب دیکھیں رائے جی کو پسند آتی ہے یا نہیں۔''

''نابینا ہے؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''ہاں..... ابھی جو فرزانہ میرے ساتھ تمہاری مرہم پٹی کروا رہی تھی، یہ میک اپ آرٹسٹ بھی ہے۔ یہی اسے کل تیار کرے گی رائے صاحب کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''برا نہ منانا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم رائے صاحب کے لیے عیش و عشرت کا انتظام کرتی ہو۔''

اس نے چہرہ چھت کی طرف اٹھا کر ایک پُرلطف قہقہہ لگایا۔ ''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ..... کیا میں رائے کے لیے نائیکہ کا کام کر رہی ہوں.....؟ ہاں، میں کر رہی ہوں یہی کام..... اب میں یہی کر سکتی ہوں۔ جو سپنے شیشے الھڑ جوانی میں دیکھے تھے، وہ تو سارے سڑ کر سواہ ہو گئے اور میرے جیسی آرٹسٹوں کی جوانی ہوتی بھی کتنی دیر کی ہے؟ بس یہی کوئی چار پانچ سال۔ ان چار پانچ سالوں میں ہی نئی نئی تتلیاں میدان میں آ چکی ہوتی ہیں۔ میرے جیسیاں ان خبیث پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں کو ادھیڑ عمر لگنے لگتی ہیں پھر کہا جاتا ہے کہ ہیروئن کو بھول جاؤ۔ بہن یا بھابی کا رول کر لو۔ دو سال اور گزر جائیں تو ماں کے رول پیش ہونے لگتے ہیں۔ تھو..... تھو، ان فلموں، ڈراموں پر۔'' اس نے نفرت سے ایک جانب خیالی تھوک پھینکا۔ میں تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر اندرونی دکھ جھلک رہا تھا۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ''ذرا دھیان سے دیکھو میری طرف..... اور بالکل خدا لگتی کی بات کرنا۔ کیا میں واقعی وڈی عمر کی لگتی ہوں؟''

میں نے اس کے بھرے بھرے لیکن نہایت متناسب جسم اور چہرے کی طرف دیکھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ ایک جواں سال دلکش عورت تھی۔ اگر ذرا سی رعایت برت لی جاتی تو وہ ایک فلمی ہیروئن یا ڈرامے کے لیڈ کیریکٹر کے لیے بالکل موزوں تھی مگر جو بات وہ بتا رہی تھی، وہ بھی بالکل حقیقت تھی۔ شوبز میں ایک سے بڑھ کر ایک نوخیز لڑکیاں وارد ہوتی رہتی ہیں۔ مقابلہ غالباً اتنا سخت ہوتا ہے کہ چند برسوں میں ہی ہیروئن کے رتبے پر فائز اداکارہ کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔

''میں تمہاری باتوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں ہما!'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

☆☆☆

اگلے تقریباً سولہ گھنٹے بھی میں نے اسی اپارٹمنٹ میں گزار دیے۔ ہما اور فرزانہ کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ کمر کی چوٹ کی وجہ سے ڈاکٹر جاذبہ اسپتال میں تھی۔ میری تلاش بھی عمارت کے طول و عرض میں مسلسل جاری تھی۔

ہما عروج ایک مختلف عورت تھی۔ اس کا تعلق وسطی پنجاب سے تھا۔ وہ چند برس پہلے لاہور پہنچی تھی۔ فلموں اور ڈراموں میں کام حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ ایک پنجابی فلم میں اسے سیکنڈ ہیروئن کا رول بھی ملا تھا مگر وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکی اور مایوس ہو کر کنارہ کش ہو گئی۔ انہی دنوں جاور رائے ایک ''شریف کاروباری'' کی حیثیت سے اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی پر زور و شور سے کام کر رہا تھا۔ وہ وہاں ملازم ہو گئی۔ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو رائے کے پاس جاب کرنے والی ہر جوان خوبرو خاتون کے ساتھ ہوتا تھا۔ اسے کئی بار جاور رائے کی بے پناہ کراہت برداشت کرنا پڑی تھی۔ وہ کچھ عرصہ رائے کے دسترخوان پر ایک پسندیدہ ڈش کی طرح موجود رہی تھی پھر بتدریج نظر انداز کر دی گئی۔ بہرحال رائے کی رازدار اور مزاج شناس کے طور پر اس کی حیثیت اب بھی برقرار تھی۔

میں نے اسے مزید کُریدنے کی کوشش کی اور پوچھا۔
''ہما! یہ سب کیا چل رہا ہے یہاں؟''
''ڈپٹی صاحب! تم یہی کچھ معلوم کرنے کے لیے تو یہاں گھسے ہو۔ کیا اب تک کچھ پتا نہیں چلا؟ تمہاری اس ڈھیس پتاس کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوا ہوگا تمہیں؟''
''بس یہی پتا چلا ہے کہ تمہارا باس رائے یہاں کوئی میڈیسن بنوانے کی کوشش کر رہا ہے اور بدنصیب مزدوروں پر الٹے سیدھے تجربے کیے جا رہے ہیں۔''
''بدنصیب کیوں کہہ رہے ہو انہیں۔ ان کو اچھے خاصے روپے مل رہے ہیں۔''
''اور پرسوں جو کچھ ہوا ہے یہاں؟ قیامت مچی رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے درجنوں ہی جان سے چلے گئے ہوں گے؟''
اس نے لمبی سانس لی اور اپنے طویل بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے بولی۔ ''بس، یہ ایک واقعہ ہو گیا ہے۔ تم اسے حادثہ بھی کہہ سکتے ہو اور درجنوں بھی نہیں۔ میرے خیال میں بیس بائیس ہوں گے۔''
''اور یہ تھوڑے ہیں؟''
''میں کب کہہ رہی ہوں۔ بُری بات ہے، مجھے بھی افسوس ہوا ہے پر وہ کہتے ہیں نا کہ زندگی بچانے والی دوائیں ایسے ہی ایجاد ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے تجربوں میں جانوروں اور انسانوں کی جانوں کا بھی نقصان ہوتا ہے۔''
مجھے اس کے جواب پر غصہ تو بہت آیا مگر سچویشن ایسی تھی کہ میں اُس سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔
گفتگو کے دوران میں، میں نے اس سے ٹوہ لینے کی کوشش کی کہ یہاں ہم جس وسیع عمارت میں موجود ہیں، یہ لاہور میں کہاں واقع ہے؟
ہما کا جواب تھا کہ جادو رائے اور اُس کی ساتھی میم مائرہ ایسے معاملوں میں بے حد رازداری سے کام لیتے ہیں۔ یہاں موجود تمام تر لوگوں کو بڑی پلاننگ کے ساتھ اور بڑی احتیاط سے یہاں پہنچایا گیا ہے۔ ان دونوں کے اور ان کے چند قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ یہ عمارت کس جگہ واقع ہے؟
اب پتا نہیں کہ ہما واقعی لاعلم تھی یا چھپا رہی تھی۔ بہرطور اس نے مجموعی وقت میں میری مدد کی تھی اور میں اسے کسی بھی طرح چونکانا یا ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک دلیر عورت بھی تھی اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس نے رسک لیتے ہوئے دوپہر کے وقت کچھ دیر کے لیے میرے ہاتھ اس شرط پر کھولے تھے کہ میں ضروریات سے فارغ ہو کر انہیں دوبارہ اسی طرح بندھوا لوں گا۔
رات کے دس بجے کے لگ بھگ وہی ہوا جس کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا۔ جس طرح عام لوگ اپنا ڈپریشن دور کرنے کے لیے دوا لیتے ہیں یا کسی نیک عمل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جادو رائے جیسے خبیث اپنی خباثت میں مزید ڈوبنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوان سال نابینا لڑکی کو شب بسری کے لیے جادو رائے کی طرف بھیج دیا گیا۔ میرے تجزیے کے مطابق جادو رائے کا یہ رین بسیرا اس لگژری اپارٹمنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔
نابینا لڑکی کا نام ہما کی زبانی عنایہ معلوم ہوا۔ ابھی اسے جادو رائے کے بیڈروم میں گئے بہ مشکل آٹھ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہما عروج کے سیل فون پر کال کا میسج اُبھرا..... اِک پھول مو تیے دا مار کے جگا سوہنی اے.....
ہما نے چونک کر کال ریسیو کی۔ اس ویڈیو کال کی دوسری جانب سیاہ چہرہ جادو رائے ہی تھا۔ ہما نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور موبائل کا رخ تھوڑا ٹیڑھا کر لیا۔ ''ہاں رائے صاحب!'' وہ لہجے میں مٹھاس بھر کر بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا؟''
''تمہاری ماں کا سر ٹھیک ہوں۔'' دوسری طرف رائے چنگھاڑا اور ہما بدک کر رہ گئی۔ ''یہ کیا نمونہ بھیجا ہے میرے لیے۔ کیا تیری نظر میں یہی ٹیسٹ ہے میرا۔ کیا سمجھتی ہے مجھ کو؟''
''کیا ہوا ہے رائے صاحب.....؟ گُڑی پسند نہیں آئی؟'' ہما ذرا سنبھل کر بولی۔
جواب میں بپھرے ہوئے رائے نے عنایہ نامی اُس لڑکی کے لیے غلیظ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔
میں نے خود کو موبائل فون کے کیمرے سے دور رکھتے ہوئے موبائل کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ رائے کے چُرآسائش بیڈروم کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ نابینا لڑکی اس کے بیڈ کے ایک سرے پر ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹا فرش پر پڑا تھا... وہ بے بسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا، وہ عام سی شکل و صورت کی تھی اور غالباً یہی بات آتش مزاج رائے کو مشتعل کر گئی تھی۔
''دفع ہو جا یہاں سے۔'' رائے کی چنگھاڑ پھر سنائی دی اور اس نے عنایہ کو باقاعدہ دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر تین چار

ن آگے چلی گئی..... اور پھر بدحواسی میں دیوار ٹٹولتی ہوئی پہ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خوش رنگ دوپٹا وہیں پڑا رہ گیا۔

نابینا کی اس تذلیل پر دل لرز سا گیا۔ اس نے لڑکی کی صورت پر شرمناک ریمارکس دیے تھے۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ یہ ریمارکس رامے جیسے بدشکل و بدخصلت نے دیے تھے۔

اس کے ساتھ ہی رامے نے کال بھی منقطع کردی۔

ہما کا چہرہ بجھا ہوا نظر آیا۔ وہ پنجابی لہجے میں مجھے "ایکسکیوزمی" کہتی ہوئی بلوری دروازے کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔

دس پندرہ منٹ بعد واپس آئی تو کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ اس نے کمرے کے ایک گوشے میں جاکر اپنا سیل فون نکالا۔ وہ ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آنے لگی۔ اس نے رامے کو آڈیو کال کی۔ اسپیکر آن تھا۔ دوسری طرف کی غصیلی آواز بھی تقریباً مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ وہ رامے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ پہلے تو خود کو اور حالات کو گالیاں دیتا رہا پھر ہی رونا رونے لگا جو اس نے پہلے ہما مجھے بتا چکی تھی۔ اس کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ اب وہ کسی عورت کی نگاہوں میں اپنے لیے کراہت اور گریز نہیں دیکھ سکتا۔ اسے ویسی ہی خود سپردگی چاہیے جو اس نے اپنی مرجانے والی محبوبہ چاندنی میں دیکھی تھی۔

ہما نے کہا۔ "اچھا غصہ تھوکو رامے جی! میں کچھ اور کرتی ہوں۔"

رامے نے دانت پیسے۔ "اور کیا کروگی..... مجھے تو لگتا ہے کہ آج کل تمہاری عقل پر ویسے ہی پتھر پڑے ہوئے ہیں۔"

وہ لجاجت سے بولی۔ "دیکھو رامے جی! دو تین لڑکیاں اب بھی ہیں میرے پاس جو تمہیں بالکل نہیں جانتیں..... سوا نئی گڑیاں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو ریڈی کرتی ہوں..... اندھا کرکے بھیجتی ہوں تمہارے پاس۔"

"کیا بکواس ہے، اندھا کرکے بھیجتی ہوں؟ کیا تیزاب ڈالو گی اس کی آنکھوں میں؟" وہ زہرناک ہوکر پھنکارا۔ غالباً نشیلے پان نے اس کی رگوں میں انگارے بھر رکھے تھے۔

"اندھا کرنے کے اور کئی طریقے بھی تو ہوتے ہیں رامے جی.....! اور لڑکی بھی تمہیں پسند آئے گی۔ بلکہ ایک کیا، دو بھیج دیتی ہوں۔ جس کو چاہے رکھ لینا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے دوسری طرف گھاگ رامے کی سمجھ میں بات آگئی ہے۔ وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر فون بند کردیا۔

ہما مستی خیز انداز میں مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا گفتگو ہے؟ پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔"

اس نے ادا سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں ڈھانپ دیا۔ "آلے دوالے کچھ نظر آرہا ہے تمہیں؟"

"فی الحال تو نہیں۔"

"تو یہ بھی تو اندھا پن ہی ہے۔" اس نے کہا پھر اٹھی اور اپنے سڈول جسم کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عجیب جنونی شخص تھا یہ جادو رامے..... اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہما اس جنونی کو ہینڈل کرنے کا گر کسی حد تک جانتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے قریبی کمرے سے قدموں آہٹیں سنائی دیں۔ یہ وہی ڈریسنگ روم تھا جہاں کل میں نے نابینا عنایہ کے ہاتھوں پر پالش وغیرہ ہوتے دیکھی تھی۔ میں عام انداز میں چلتا ہوا اس "کرٹن" تک پہنچا اور جھری میں سے جھانکا۔ دو ماڈل نما لڑکیاں ہیجان خیز کپڑوں میں ہما عروج کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ تحکمانہ انداز میں انہیں کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ وہ مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھیں پھر میک اَپ آرٹسٹ فرزانہ ایک طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی چوڑی ریشمی پٹیاں تھیں جنہیں "آئی ماسک" بھی کہا جاتا ہے۔ فرزانہ نے جیسے ریہرسل کے طور پر ایک سیاہ پٹی لڑکی کی آنکھوں پر اچھی طرح باندھ دی اور اوپر نیچے ہوکر دیکھنے لگی کہ اسے کچھ نظر تو نہیں آرہا۔

سب کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ ایک مخبوط الحواس شخص کے جنون سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہاں معلوم نہیں اور کیا کچھ ہونا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر واپس اپنی جگہ آبیٹھا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے پتا چلا کہ دونوں لڑکیوں کو جادو رامے کی طرف بھیج دیا گیا تھا اور اس نے ان میں سے ایک کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

میں نے ہما سے کہا۔ "میں کب تک یہاں تمہارے پاس چھپا رہوں گا؟ کم و بیش 24 گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی پریشانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے حصے کا غصہ ان میں سے کسی پر اتارا جائے۔"

ہما نے ایک گہری سانس لی۔ "میں بھی یہی چاہتی

ہوں کہ اب تمہیں مزید یہاں نہ رہنا پڑے مگر اس سے پہلے کہ میں رامے جی سے بات کروں، مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے اور رامے جی کے درمیان کیا چل رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ اور خاص کل یہ کہ وہ باندری جاذبہ تمہاری دشمن کیوں بنی ہوئی ہے؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جاذبہ مجھے اپنی بہن کا قاتل سمجھتی ہے۔ حالانکہ میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ وہ بس ڈر کر بھاگی اور سیڑھیوں سے گر کر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ یہ سب لوگ جعلی دواؤں کے دھندے میں لگے ہوئے تھے۔"

"اور یہ واقعہ کب اور کہاں ہوا؟" ہما نے پوچھا۔

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ کس طرح ہم نے جادو رامے کی جعلی ادویات والا بڑا سیٹ اَپ پکڑا۔ کیسے وہاں پولیس کا چھاپا پڑا اور رامے مفرور ہوا۔

ساری بات سن کر اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ اپنے سرخی لگے ہونٹوں کو سکیڑ کر بولی۔ "یہ تو بڑی ڈھاڈی اور خطرناک باتیں بتا رہے ہو تم۔ اگر رامے کی زہریلی طبیعت کے حساب سے دیکھا جائے تو اب تک تم کو زندہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" چند لمحے توقف کر کے اس نے پرسوچ لہجے میں بات جاری رکھی۔ "میرا خیال ہے کہ اگر تم چاروں اب تک بچے ہوئے ہو تو اس کی وجہ تمہارا ساتھی وہی منڈا ہے..... وہی گورا چٹا، معصوم سی شکل والا۔ کیا نام تھا اس کا؟"

"عمران۔" نین نے کہا۔

"ہاں..... اس نے جادو رامے جی کو جو "جادو" دکھایا، وہ واقعی کمال کا تھا۔ بغیر آواز سنے اس نے بتا دیا کہ کس نے، کس سے کیا گل کی ہے۔"

"جادو شادو نہیں۔ بس یہ ایک طریقہ یا فن ہے۔ کچھ لوگ کوشش کر کے اس میں بہت مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔"

ہما کی چمکیلی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نظر آنے لگیں۔ "میرا اندازہ ہے اور شاید تمہیں بھی پتا چل گیا ہوگا کہ رامے جی اور میم مائرہ اس منڈے سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہیں....."

ابھی ہما کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ وہ کچھ چونکی۔ اس کے چونکنے کی وجہ کا پتا مجھے بھی چل گیا۔ یہ چلانے کی بہت مدھم سی آوازیں تھیں۔ یہ نسوانی آوازیں کسی قریبی کمرے یا اپارٹمنٹ سے آئی تھیں۔ کیا یہ اسی لڑکی کی آوازیں تھیں جسے آئی ماسک لگا کر "نابینا" بنایا گیا تھا اور رامے کے بیڈ روم میں بھیجا گیا تھا؟

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر تلے تین فائر سنائی دیے۔ یہ پسٹل کے فائر تھے۔ ہما عروج کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ مجھے وہیں چھوڑ کر تیزی سے بلوری دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

اگلے چند منٹ میں نے اُلجھن اور تشویش میں گزارے۔ اس لڑکی کے ساتھ کچھ ہوا تھا یا پھر رامے کے ساتھ؟ ماحول میں ایک اَن دیکھی سراسیمگی سی محسوس ہو رہی تھی تب مجھے میک اپ آرٹسٹ فرزانہ کی پریشان صورت نظر آئی۔ وہ الماری میں کچھ رکھنے کے لیے کمرے میں آئی تھی۔

"فرزانہ! رامے جی نے کیوں مارا اُسے؟" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

وہ پہلے تو حزبذب رہی پھر بولی۔ "وہ..... بہروپن تھی..... رامے صاحب اور میم مائرہ کے مخالفوں سے ملی ہوئی تھی۔ اس نے..... رامے صاحب پر..... حملہ کرنے کی کوشش کی..... لیکن خود ماری گئی۔"

"اس کے چلّانے کی آوازیں بھی آئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"ہممم..... بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔" فرزانہ نے کہا اور تولیے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی۔

پتا نہیں فرزانہ درست کہہ رہی تھی یا نہیں..... اور اگر درست کہہ رہی تھی تو کس حد تک؟

آدھ پون گھنٹے بعد ہما عروج بھی آن وارد ہوئی۔ اس کے چہرے پر گہرا تاسف تھا۔ اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے اس کی ملازمہ فرزانہ نے بتایا تھا۔ تاہم مجھے مسلسل دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔

وہ جاگ رہی تھی اور میں بھی مسلسل جاگ رہا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے دکھ بھرے انداز میں مجھے وہ سب بتا دیا جو میں پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ "بہت قصباں چلی نکلی یہ کنول..... قصباں چلی یا پھر بیوقوف۔"

"کون کنول؟"

"وہی جو ماری گئی ہے اور جس کے بارے میں تم لگاتار ٹوہ لینے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست ہے۔

اصل واقعہ وہ نہیں جو دوسروں کو بتایا گیا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر آنکھوں میں آئے والی نمی پونچھ کر گویا ہوئی۔ "اس نے رامے جی کو دیکھ لیا تھا۔ ڈر گئی اور رولا ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کی آوازیں ہمیں یہاں تک پہنچی تھیں۔"

"تم نے اُسے سمجھا بجھا کر نہیں بھیجا تھا؟"

"بہت مغز ماری کی تھی اُس سے پر اب یہ بھی تو پتا نہیں کہ اس نے خود آنکھوں سے پٹی ہٹائی یا وہ خود ہٹ گئی۔ چلو جو بھی ہوا تھا وہ کھوتی، ڈنگر خود کو سنبھال لیتی۔ وہ جب ڈری اور اس نے رونا چلانا شروع کیا تو رامے کا غصہ ساتویں آسمان تک پہنچ گیا۔"

"اور رامے نے اسے لاش بنا دیا۔" میں نے ہما کا فقرہ مکمل کیا۔

"جو ہوا، اس کے بعد تو یہی ہونا تھا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

"اور اب اس بدقسمت کو بھی اس عمارت کے پچھلے احاطے میں کہیں زمین کھود کر دبا دیا جائے گا..... دوسری لاشوں کی طرح۔" میں نے کہا۔

ہما نے ہونٹ بھینچے اور اثبات میں جواب دیا۔ ہما سے جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ رامے نے کنول نامی اس لڑکی کو اپنی خلوت کے لیے قبول کر لیا تھا مگر پھر خلوت اور رہت کے ان لمحوں میں کچھ ایسا ہوا کہ کنول نے اسے دیکھ لیا اور خوف کے مارے اپنے حواس میں نہ رہ سکی۔ رامے نے غضب ناک ہو کر اس پر تین فائر کیے تھے۔ ایک سیدھا آنکھ پر لگا، دوسرا بائیں آنکھ سے ذرا ہٹ کر پیشانی اور تیسرا ٹھیک دل کے مقام پر۔

ایک دلدوز احساس نے میرے رگ و پے میں دکھ اور یاسیت کا ریلا بہا دیا۔ کنول نامی یہ لڑکی بہ مشکل بیس بائیس سال کی رہی ہوگی۔ وہ انہی بدقسمت لڑکیوں میں سے تھی جو دولت اور شہرت کے سپنے آنکھوں میں سجا کر فلم اسٹوڈیوز اور پروڈکشن ہاؤسز کے چکر لگاتی رہتی ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنے گوہرِ عفت سے محروم ہوتی ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس سب کے باوجود وہ رہتی خالی ہاتھ ہی ہیں۔ ہما عروج خود بھی ان تمام حالات سے گزر چکی تھی۔ اب وہ اور انداز سے سوچنے لگی تھی۔ اسے پتا تھا کہ بہت کم ہی ایسی لڑکیاں اپنی منزل پاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے رولز کے لیے بستروں پر پامال ہوتی ہیں اور عموماً ان رولز کا معاوضہ تک ہڑپ کر لیا جاتا ہے۔

ہما عروج ایسی لڑکیوں کو جادو راے اور اس کے حواریوں تک پہنچاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہاں وہ کم از کم اپنی "محنت" کا ٹھیک ٹھاک صلہ تو پاتی ہیں۔

اپنی مجبوریوں کے تحت ایسے ہی "صلے" کی امید لے کر یہاں پہنچنے والی کنول ان نیم تاریک راہوں میں ماری گئی تھی۔ شاید اس کے والی وارثوں کو بھی خبر ہی نہ ہوتی کہ وہ کہاں اور کن حالات میں زندگی کی بازی ہاری اور کس مٹی کے نیچے ابدی نیند سوئی۔

میرے اندر سے جیسے کسی نے پکار کر کہا..... "جادو راے! اگر تقدیر نے مجھ پر کوئی مہلک وار نہ کر دیا تو میں تجھے چھوڑوں گا نہیں....." اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی آنکھوں میں ایک آتشیں نمی سی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

اب میں ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کے پاس تھا۔ مجھے عمران والی کیبن نما کوٹھری میں بند کیا گیا کیونکہ میری غیر موجودگی میں حشام کو مائین والی کوٹھری میں بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے صحیح سلامت واپس دیکھ کر عمران مطمئن اور خوش ہوا تاہم میری چوٹوں پر اس نے کچھ تشویش بھی محسوس کی۔ ہما عروج نے میری واپسی والا مسئلہ بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا تھا۔ کل صبح راے کا موڈ ٹھیک دیکھ کر اس نے راے کو بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر جاذبہ کو دیوار سے چٹنے کے بعد میں کہاں گیا تھا۔ ہما نے میرے بارے میں جو بیان دیا، اس کے مطابق میں جان بچا کر اس کے اپارٹمنٹ میں آگھسا اور چھپ گیا۔ پورے 48 گھنٹے میں نے ایک اسٹور روم میں چھپ کر گزارے پھر اتفاقاً میک اپ آرٹسٹ فرزانہ نے مجھے دیکھ لیا اور میں پکڑا گیا (ہما کا یہ سارا بیان اصل صورتِ حال پر پردہ ڈالنے کے لیے تھا)

ہما نے راے کے سامنے اس بہانہ تشدد کا ذکر بھی کیا تھا جو ڈاکٹر جاذبہ نے اپنے چیمبر میں مجھ پر کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ جاذبہ کا بے حد "ویک پوائنٹ" تھا۔ وہ ایک طرح سے حکم عدولی اور من مانی کی مرتکب ہوئی تھی۔ کمر کی چوٹ کے سبب وہ ابھی اسپتال میں تھی البتہ ہما کا خیال تھا کہ جاذبہ کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ "تمہارے یہ تین روز کیسے گزرے؟"

"بہت مشکل۔ زبان میں کھجلی ہوتی رہی۔ کوئی بات کرنے والا نہیں تھا لہٰذا کھجلی مٹانے کے لیے زبان کو دیوار

پر رگڑتا رہا۔"

"تم کو بھی میری طرح ہنگامی طور پر اسپتال لے جایا گیا تھا۔" "کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ لگتا ہے کہ ہمارے حوالے سے ان کے اندیشے غلط ثابت ہوئے لیکن بہت سے لوگوں کا تو بہت برا حال ہوا۔ میں نے درجنوں ایسے بندے دیکھے تھے جن کے ناک، منہ سے خون جاری تھا۔ بہت سے مرے، کئی ابھی تک زیرِ علاج ہیں۔ زیرِ علاج لوگوں میں ایک دو ڈاکٹر بھی شامل ہیں۔"

"عمران! اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، ہمارے اندیشوں سے زیادہ سنگین ہے۔"

"چاچو جان! وہ تو آپ کے حلیہ شریف سے بھی ظاہر ہے۔ پتا چل رہا ہے کہ آپ کو ٹھیک ٹھاک چوٹیں لگائی گئی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ خود کو چھڑا کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ یہ لوگ آپ کو اندھا دھند تلاش کرتے رہے ہیں۔"

میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو ڈاکٹر جاذبہ اور پھر ہما عروج کے حوالے سے پیش آیا تھا۔ ہما عروج کے کنڈری اپارٹمنٹ اور وہاں موجود لڑکیوں کے بارے میں بھی میں نے بتایا تاہم جادو راے کے بیڈ روم میں مرنے والی لڑکی سنول کا ذکر میں نے نہیں کیا۔ اس واقعے کو دہرانے سے مجھے اذیت کا سامنا ہوتا۔

عمران نے سب کچھ تعجب سے سنا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "ویسے چاچو! آپ نے یہاں سے جا کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھیں نا، آپ ماہین والے کیبن سے نکل کر چلے گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا.....؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکیلے میں ان ایزی محسوس کرنے لگی۔ اس کی کیفیت کو دیکھ کر میم مائرہ کے حکم پر حشام کو اس کے کیبن میں بھیج دیا گیا۔ اب وہ دونوں دو دن سے وہاں اکٹھے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں جل جل کر اور سڑ سڑ کر یہیں پر مر جاؤں۔ میرے انڈیا جا کر "دیوداس" بننے کی نوبت ہی نہ آئے۔"

"میرا اس میں کیا قصور؟ اگر وہ جاذبہ والا واقعہ نہ ہوتا تو میں بھی تمہاری طرح اگلے روز ہی اسپتال سے فارغ ہو کر یہاں واپس آ جاتا۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ آپ جان بوجھ کر جاذبہ کے ہتھے چڑھے ہیں۔ آپ نے ضرور آنکھ شانکھ مار کر اسے اشتعال دلایا ہوگا۔ شاید یہ بھی کہہ دیا ہو کہ ہاں میں نے تمہاری بہن کو جہنم واصل کیا تھا۔ آپ کا اصل مقصد صرف یہی تھا کہ ماہین اور حشام کو ایک ہی جگہ رہنے اور میرے بچے پر سونگ ڈالنے کا موقع مل جائے۔ حشام امیر کبیر باپ کا بچہ ہے۔ مجھے تو ..... مجھے تو یہ شک بھی ہے کہ اس نے آپ کو کوئی تگڑی رشوت وغیرہ دے دی ہے۔"

اس کی لایعنی گفتگو مزید آگے بڑھتی مگر کیبن نما کوٹھڑی کے دروازے پر ہونے والی آہٹ نے ہمیں چونکا دیا۔ جس چوکور خلا سے ہمیں کھانا پہنچایا جاتا تھا، وہاں انچارج بہروز کا لمبوترا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میم مائرہ کی طرف سے تمہارے لیے پیغام ہے۔"

"نہیں، مجھے ابھی کسی سے شادی نہیں کرنی۔" وہ آنکھیں پونچھ کر بولا۔ "جدھر بھی جاؤ، شادی کا پیغام شادی کا پیغام۔"

بہروز نے برا سا منہ بنایا۔ "پتا نہیں کیا اوٹ پٹانگ بولتے ہو۔ میم مائرہ نے کہا ہے کہ ویڈیو آ گئی ہے۔ ابھی آدھ گھنٹے بعد تمہیں بلایا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے کھٹاک سے خلا بند کیا اور اوجھل ہو گیا۔

"یہ کیا چکر ہے؟ کس ویڈیو کی بات ہو رہی تھی؟"

"یہ وہی چکر ہے جی جس کی وجہ سے اب تک آپ کی اور میری جان پکی ہوئی ہے..... اور ساتھ ساتھ ماہین اور حشام کی بھی۔" وہ اب سنجیدہ تھا۔

"کیا مطلب؟"

"لپ ریڈنگ..... جس کو شروع شروع میں آپ محض بکواسیات قرار دیتے تھے۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "یہ کوئی بہت خاص سی سی ٹی وی ٹائپ کی ویڈیو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آواز نہیں، کوئی فرد یا ایک سے زیادہ افراد بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اس ویڈیو میں کیا بولا گیا ہے۔ لپ ریڈنگ کے جو اور بہت سے استعمال ہیں، ان میں ایک استعمال یہ بھی ہے کہ خفیہ ایجنسیاں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے خاموش ویڈیوز کی تہ تک پہنچنے کے لیے لپ ریڈرز کو استعمال کرتے ہیں۔"

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ عمران کی یہ بات درست لگتی تھی کہ وہ کوئی بہت خاص ویڈیو ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی ایک اندیشہ بھی ذہن میں آنے لگا ہے کہ کہیں ایسا

پر رگڑتا رہا۔"

"تم کو بھی میری طرح ہنگامی طور پر اسپتال لے جایا گیا تھا۔" کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ لگتا ہے کہ ہمارے حوالے سے ان کے اندیشے غلط ثابت ہوئے لیکن بہت سے لوگوں کا تو بہت برا حال ہوا۔ میں نے درجنوں ایسے بندے دیکھے تھے جن کے ناک، منہ سے خون جاری تھا۔ بہت سے مرے، کئی ابھی تک زیر علاج ہیں۔ زیر علاج لوگوں میں ایک دو ڈاکٹر بھی شامل ہیں۔"

"عمران اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، ہمارے اندیشوں سے زیادہ سنگین ہے۔"

"چاچو جان! وہ تو آپ کے حلیہ شریف سے بھی ظاہر ہے۔ پتا چل رہا ہے کہ آپ کو ٹھیک ٹھاک چوٹیں لگائی گئی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ خود کو چھڑا کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ یہ لوگ آپ کو اندھا دھند تلاش کرتے رہے ہیں۔"

میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو ڈاکٹر جاذبہ اور پھر ہما عروج کے حوالے سے پیش آیا تھا۔ ہما عروج کے لگژری اپارٹمنٹ اور وہاں موجود لڑکیوں کے بارے میں بھی میں نے بتایا تاہم جادو رامے کے بیڈ روم میں مرنے والی لڑکی کنول کا ذکر میں نے نہیں کیا۔ اس واقعے کو دہرانے سے مجھے اذیت کا سامنا ہوتا۔

عمران نے سب کچھ تعجب سے سنا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "ویسے چاچو! آپ نے یہاں سے جا کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھیں نا، آپ ماہین والے کیبن سے نکل کر چلے گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا.....؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکیلے میں ان ایزی محسوس کرنے لگی۔ اس کی کیفیت کو دیکھ کر میم مائرہ کے حکم پر حشام کو اس کے کیبن میں بھیج دیا گیا۔ اب وہ دونوں دو دن سے وہاں اکٹھے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں جل جل کر اور سڑ سڑ کر یہیں پر مر جاؤں۔ میرے انڈیا جا کر "دیوداس" بننے کی نوبت ہی نہ آئے۔"

"میرا اس میں کیا قصور؟ اگر وہ جاذبہ والا واقعہ نہ ہوتا تو میں بھی تمہاری طرح اگلے روز ہی اسپتال سے فارغ ہو کر یہاں واپس آ جاتا۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ آپ جان بوجھ کر جاذبہ کے ہتھے چڑھے ہیں۔ آپ نے ضرور آنکھ شانکھ مار کر اسے اشتعال دلایا ہوگا۔ شاید یہ بھی کہہ دیا ہو کہ..... ہاں میں نے تمہاری بہن کو جہنم واصل کیا تھا۔ آپ کا اصل مقصد صرف یہی تھا کہ ماہین اور حشام کو ایک ہی جگہ رہنے اور میرے سر پر مونگ دلنے کا موقع مل جائے۔ حشام امیر کبیر باپ کا بیٹا ہے۔ مجھے تو..... مجھے تو یہ شک بھی ہے کہ اس نے آپ کو کوالٹی رشوت وغیرہ دے دی ہے۔"

اس کی لایعنی گفتگو مزید آگے بڑھتی مگر کیبن نما کوٹھڑی کے دروازے پر ہونے والی آہٹ نے ہمیں چونکا دیا۔ جس چوکور خلا سے ہمیں کھانا پہنچایا جاتا تھا، وہاں انچارج بہروز لمبوترا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میم مائرہ کی طرف سے تمہارے لیے پیغام ہے۔"

"نہیں، مجھے ابھی کسی سے شادی نہیں کرنی۔" وہ آنکھیں پونچھ کر بولا۔ "جدھر بھی جاؤ، شادی کا پیغام..... شادی کا پیغام۔"

بہروز نے برا سا منہ بنایا۔ "پتا نہیں کیا اوٹ پٹانگ بولتے ہو۔ میم مائرہ نے کہا ہے کہ ویڈیو آ گئی ہے۔ ابھی آدھ گھنٹے بعد تمہیں بلایا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے کھٹاک سے خلا بند کیا اور اوجھل ہو گیا۔

"یہ کیا چکر ہے؟ کس ویڈیو کی بات ہو رہی تھی؟"

"یہ وہی چکر ہے جی جس کی وجہ سے اب تک آپ اور میری جان بچی ہوئی ہے..... اور ساتھ ساتھ ماہین اور حشام کی بھی۔" وہ اب سنجیدہ تھا۔

"کیا مطلب؟"

"لپ ریڈنگ..... جس کو شروع شروع میں آپ محض بکواسیات قرار دیتے تھے۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "یہ کوئی بہت خاص سی سی ٹی وی ٹائپ کی ویڈیو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آواز نہیں، کوئی فرد یا ایک سے زیادہ افراد بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اس ویڈیو میں کیا بولا گیا ہے۔ لپ ریڈنگ کے جو اور بہت سے استعمال ہیں، ان میں ایک استعمال یہ بھی ہے کہ خفیہ ایجنسیاں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے خاموش ویڈیوز کی تہ تک پہنچنے کے لیے لپ ریڈرز کو استعمال کرتے ہیں۔"

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ عمران کی یہ بات درست لگتی تھی کہ وہ کوئی بہت خاص ویڈیو ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی ایک اندیشہ بھی ذہن میں آنے لگا ہے کہ کہیں ایسا

نہ ہو کہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد وہ خونی جانور رائے ہماری موت کا پروانہ جاری کردے۔ بہرحال، اس قسم کے رسک تو اب لینے ہی تھے۔

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ عمران کو لینے والے پہنچ گئے۔ آدھا گھنٹا بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ شاید ان لوگوں کو اس اہم ویڈیو کی حقیقت جاننے کی بہت جلدی تھی۔ حسب معمول عمران کے ہاتھ زپ ٹائی سے پشت پر باندھ دیے گئے۔ جب ہاتھ باندھے جارہے تھے تو عمران نے فرمائش کردی کہ میرے چاچو بھی ساتھ جائیں گے۔

''وہ کس لیے؟'' انچارج بہروز نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''کسی وقت مجھے ان سے مشورہ کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

جب وہ اپنی بات پر مُصر رہا تو بہروز نے سیل فون پر میم مائرہ سے رابطہ کیا اور اجازت لی۔ عمران کے بعد میرے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے گئے۔ اس کام کے لیے دروازے میں موجود چوکور خلا کو استعمال کیا جاتا تھا۔ گارڈز مجھے خاص معاندانہ نظروں سے گھورتے تھے۔ اس کی اہم وجہ ان کی ساتھی گارڈ فروزہ کی موت تھی جو میرے ہاتھوں ہوئی۔ مسلح گارڈز کی نگرانی میں ہم دو تین راہداریوں سے گزر کر ایک مستطیل کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک کانفرنس ہال لگتا تھا۔ کریہہ المنظر جادو رائے اور میم مائرہ بھی یہاں موجود تھے۔ سامنے ایک بڑی ایل ای ڈی پر کوئی ڈاکومینٹری فلم چل رہی تھی جس میں سفید رنگ کے مختلف سانپ نظر آتے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں سانپوں کے ساتھ بھی کچھ ہوتا ہے کیونکہ چند روز پہلے جب میں نے گودام میں ''زرد چیتی'' کو پھر سے ریت میں گم ہوتے دیکھا تھا تو وہاں باریک جال والے کچھ خالی پنجرے بھی دیکھے تھے۔ ایسے پنجرے عموماً سانپوں کو رکھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارے پہنچتے ہی وہ ڈاکومینٹری بند کردی گئی۔ اس کانفرنس ہال میں گہری سنجیدگی کا ماحول تھا۔ انچارج گارڈ بہروز اور گونگے فورمین جہانے کے سوا سب کو باہر نکال دیا گیا۔ عمران کو اسکرین کے سامنے ایک علیحدہ کرسی پر بٹھایا گیا۔ میں بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ میم نے بہروز کو مخاطب کرکے عمران کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''اس کے ہاتھ کھول دو۔ یہ کچھ نہیں کرے گا۔''

غالباً مائرہ کا مطلب یہی تھا کہ میری طرف سے زیادہ خطرہ ہے (اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ ماہین اور حشام ان لوگوں کے قبضے میں تھے۔ انہیں پتا تھا کہ کوئی بھی مہم جوئی کرنے سے پہلے ہم ان کی زندگیوں کا ضرور سوچیں گے)۔ عمران کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میم کے اشارے پر ایک ڈی وی ڈی آن کی گئی۔ لائٹس آف کردی گئیں۔ اسکرین پر وہ ویڈیو نمودار ہوئی جس کا انتظار تھا۔

یہ کسی محل نما ہوٹل یا پھر گھر کا منظر تھا۔ انتہائی بیش قیمت سامان اور فرنیچر سے بے تحاشا امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ نہایت نفیس تھری پیس سوٹ میں درمیانی عمر کا ایک نفیس اور اسمارٹ شخص کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے کافی فربہ جسم کی ایک گول چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ وہ شکل سے جاپانی یا کسی اردگرد کے ملک کی لگتی تھی۔ اس نے نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ بھی نہایت امیر، تعلیم یافتہ اور مہذب دکھائی دیتی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی اور وہ گفتگو میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔

پہلی نظر میں ہی ہمیں پتا چل گیا کہ یہ خاموش ویڈیو کسی خفیہ کیمرے سے بنائی گئی ہے۔ اس ویڈیو میں کسی طرح کی آواز ریکارڈ نہ ہو پائی تھی۔ کیمرے کا اینگل ایسا تھا کہ تھری پیس سوٹ والا شخص جب گردن اپنی مخاطب کی طرف ذرا موڑ کر بولتا تھا تو اس کے ہونٹ اور چہرے کے تاثرات وغیرہ وضاحت سے نظر نہ آتے تھے۔

''یہ صاحب امریکن ہیں؟'' عمران نے سوٹڈ بوٹڈ شخص کی طرف اشارہ کرکے میم مائرہ سے پوچھا۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' وہ بولی۔

''غالباً یہ دونوں انگلش ہی میں بول رہے ہیں؟'' عمران نے دوسرا سوال کیا۔

مائرہ نے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی جیسے جلد سے جلد اس گفتگو کے بارے میں عمران کی زبانی کچھ سننا چاہتی ہو۔

جادو رائے بھی بے حد متجسس نظر آتا تھا۔

عمران نے اپنی ساری توجہ ویڈیو پر اور دونوں کرداروں پر مرکوز کردی۔ یہ کوئی سات آٹھ منٹ کی ویڈیو تھی۔ عمران نے ایک دفعہ اسے شروع سے آخر تک دیکھا پھر ویڈیو کے کچھ حصوں کو دو تین بار ''ری پلے'' کروایا اور ان پر خصوصی توجہ دی۔

مجھے عمران کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نظر آرہے تھے اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ ویڈیو کے رزلٹ سے

زیادہ مطمئن نہیں ہے۔ دوسری طرف میم اور رامے کی بے قراری مسلسل بڑھتی جارہی تھی۔ وہ بار بار اس امید پر عمران کا چہرہ دیکھنے لگتے تھے کہ اب وہ کچھ بولے گا۔

بالآخر کئی منٹ بعد عمران نے اپنی چپ کا تسلسل توڑا۔ وہ میم مائرہ اور رامے کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولا۔ ''یہ تو جاپانی خاتون ہیں۔ ان کا نام یوزوکی ہے اور ان صاحب کا نام غالباً ڈیرن ہے..... ڈیرن فورڈ؟''

میم مائرہ کے چہرے پر چمک نظر آئی۔ ستائشی لہجے میں بولی۔ ''بالکل ٹھیک کہا تم نے..... ویل ڈن!''

عمران متانت سے بولا۔ ''آپ کے ''ویل ڈن'' کا بہت شکریہ..... مگر مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو زیادہ مطمئن نہیں کرسکوں گا۔''

مائرہ کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ عمران نے ڈی وی ڈی کا کنٹرول سنبھال کر ویڈیو کے تین چار پورشن مائرہ اور رامے کو دکھائے۔ ''آپ نے دیکھا ان میں کہیں بھی مسٹر ڈیرن کا چہرہ پوری طرح کیمرے کی طرف نہیں ہے اور آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ زیادہ تر گفتگو مسٹر ڈیرن نے ہی کی ہے۔''

بات مائرہ کی سمجھ میں آرہی تھی اور شاید کسی حد تک رامے کی سمجھ میں بھی۔

عمران نے ویڈیو کے حوالے سے میرے ساتھ ایک دو رسمی سرگوشیاں کیں اور ایک بار پھر پوری طرح ویڈیو کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف بولنے والے کے ہونٹ ہی نہیں دیکھ رہا، اس کے تاثرات اور اس کے ہاتھوں کی بے ساختہ حرکات کو بھی پوری طرح نوٹ کررہا ہے۔ دونوں کرداروں کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کسی خاص الخاص معاملے پر کلیدی قسم کی گفتگو کررہے ہیں۔ عینک والی جاپانی خاتون یوزوکی کے چہرے پر کسی وقت ایک پراسرار مسکراہٹ بھی دکھائی دیتی تھی۔ گفتگو کے آخر میں وہ ایک دو بار اپنی نہایت بیش قیمت رسٹ واچ پر بھی نظر ڈالتی تھی اور غالباً مجھ دو نائم کے حوالے سے کوئی فقرہ بھی بولتی تھی پھر وہ دونوں اٹھ کر کیمرے کے فریم سے نکل جاتے تھے۔

''کچھ بتاؤ..... کیا پتا چلا تمہیں؟'' بالآخر جادو رامے بے صبری سے بول اٹھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اب ڈانٹ ڈپٹ پر اتر آئے گا۔

اس موقع پر مائرہ نے مداخلت کی اور جلدی سے بولی۔ ''جتنا بھی تم سمجھ سکے ہو، اتنا تو بتاؤ۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلا کر ویڈیو کے آخری حصے کا ایک پورشن ری پلے کیا اور بولا۔ ''میں آپ کو کوئی ادھورا ناقص معلومات دینا نہیں چاہتا جو آپ کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچائے۔ سچی بات یہی ہے کہ میں اس ایک ڈیڑھ منٹ کے پورشن کے سوا کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ آپ بھی کیمرے کا زاویہ دیکھ ہی رہے ہیں۔''

میم مائرہ نے عمران کی بات پر مثبت ردعمل ظاہر کیا۔

عمران نے کہا۔ ''ویڈیو میں دو تین بار کسی بزرگ جاپانی اسکالر ڈاکٹر شاکا ذکر ہوا ہے اور اُن کے لکھے ہوئے پیپرز کا ذکر ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ جانتے ہوں ان ڈاکٹر شاکو اور ان کے پیپرز کو.....''

میم مائرہ اور رامے دونوں کے چہروں پر مثبت تاثرات نظر آئے۔ عمران کی بتائی ہوئی بات بہ خوبی ان کی سمجھ میں آئی تھی۔

میم مائرہ نے جوشیلے انداز میں عمران کو گریدنا شروع کردیا کہ ڈاکٹر شاناکی کردار کے حوالے سے اور کیا بات سمجھ میں آئی ہے۔

عمران نے پھر کہا۔ ''ویری سوری میم! میں آپ کو بالکل کچی قسم کی معلومات دینا نہیں چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں صرف اتنا ہی جان سکا ہوں..... ہاں تین چار فقرے اور ایسے ہیں جو اچھی طرح سمجھ میں آئے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ کسی طرح آپ کے مددگار ہوسکیں۔''

عمران نے ویڈیو کا آخری پورشن دوبارہ پلے کیا اور بولا۔ ''یہ دیکھیں جی۔ یہاں مسٹر ڈیرن اور محترمہ یوزوکی کی لپ ریڈنگ آسانی سے ہورہی ہے۔ مسٹر ڈیرن نے کہا ہے۔ ''اس مختصر وقت میں تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو پائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگلی میٹنگ اسلام آباد میں رکھ لیں۔''

عمران نے ویڈیو کو سلوموشن پر کیا اور کہا۔ ''یہ دیکھیں جی۔ اسلام آباد کا لفظ بھی بالکل صاف سمجھ میں آرہا ہے اور یہ آگے کا فقرہ دیکھیں۔ مسٹر ڈیرن کہہ رہے ہیں بلکہ پوچھ رہے، ہیلو! پانچ فروری کی شام ٹھیک رہے گی؟ جواب میں میڈم یوزوکی نے رسٹ واچ دیکھی ہے اور کہا ہے..... بالکل ٹھیک۔''

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ میم مائرہ اور گینڈے جادو رامے کے چہروں پر پھر دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔

عمران اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں ایک چھوٹا سا کنفیوژن ضرور ہے..... پانچ اور بارہ کہتے ہوئے بولنے والا ہونٹوں کو تقریباً ایک ہی طرح حرکت دیتا

ہے۔ یہ پانچ فروری بھی ہوسکتا ہے اور بارہ فروری بھی۔"

میم مائرہ کا دبا دبا جوش برقرار رہا، بولی۔ "یہ کوئی کنفیوژن نہیں..... ہم اس بات کو بہت حد تک سمجھ گئے ہیں..... کیوں رامے؟"

رامے نے اپنے پان رنگے ہونٹوں کو رومال سے پونچھا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔" اس نے گونج دار آواز میں جواب دیا۔

میم مائرہ نے ایک بار پھر عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کافی مدد کی ہے۔"

"شکریہ..... لیکن اس میں میرے چاچو جی کا بھی کافی کردار ہے۔" عمران نے میرے نمبر بنانے کی کوشش کی۔

"میری تعریف تم دونوں کے لیے ہے۔" میم مائرہ نے کہا پھر انچارج بہروز کو کوئی اشارہ کیا اور رامے کے ساتھ کھسر پھسر میں مصروف ہوگئی۔

انچارج بہروز نے ہمیں بتایا کہ اب ہمیں واپس اپنے کوٹھری نما کیبن میں جانا ہوگا۔ مسلح گارڈز کی نگرانی میں ہم کانفرنس ہال سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

ہمیں کوٹھری نما کیبنوں میں ہی لے جایا گیا تھا مگر صرف ایک گھنٹے بعد ہمیں عمارت کے اندر ہی ایک نہایت بہتر جگہ پر منتقل کر دیا گیا۔ نہ صرف منتقل کر دیا گیا بلکہ مجھے بھی بندھے ہاتھوں کی مصیبت سے آزادی مل گئی۔ یہ گراؤنڈ فلور پر ایک پُرآسائش اپارٹمنٹ تھا۔ تین چار کمرے تھے۔ ضروریات کی تمام اشیاء موجود تھیں۔ ماہین اور حشام بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس ساری مہربانی کی وجہ یہی سمجھ میں آتی تھی کہ عمران نے لپ ریڈنگ کے حوالے سے اچھی کارکردگی دکھائی تھی اور ان لوگوں کے لیے ایک نہایت اہم خاموش ویڈیو کو اپنے ہنر سے کسی حد تک زبان دی تھی۔ ایک اور اندازہ بھی ہو رہا تھا اور وہ یہ کہ غالباً آئندہ بھی یہ لوگ عمران سے کوئی خاص کام لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

حشام بہت بجھا بجھا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ اس قسم کے سنگین حالات سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا ہے۔ وہ ناز و نعم میں پلا ہوا اس قسم کی سختیوں کا عادی کہاں تھا۔ ثابت یہی ہو رہا تھا کہ ماہین سے صلح ہونے کے بعد ماہین کے دل میں اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنی ہمت طاقت سے بڑھ کر قدم اٹھایا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اوکھلی میں سر دیا تھا اور نتیجے میں یہاں آ پھنسا تھا۔ یہاں جو مار پیٹ اس سے ہوئی تھی، اس کے اثرات ابھی تک اس پر موجود تھے۔

ماہین یوں تو مضبوط لڑکی تھی مگر ان حالات میں وہ بھی کچھ ماند نظر آتی تھی اور اس کی ایک وجہ حشام بھی تھا۔

میں نے کہا۔ "عمران! محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری وجہ سے ان لوگوں کا رویہ ہم سے نرم پڑ رہا ہے۔ تمہیں میم مائرہ سے درخواست کرنی چاہیے کہ کم از کم ماہین اور حشام کو یہاں سے آزاد کر دیا جائے۔ یقینی بات ہے کہ ان دونوں کے گھروں میں حالات بہت خراب ہو چکے ہوں گے۔"

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں جی کہ یہاں ہم چاروں کا اکٹھے رہنا کسی کی صحت کے لیے بھی اچھا نہیں ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میری یہاں موجودگی حشام کو پریشان کرتی ہے۔ اس کی موجودگی میں ماہین سے بات کرتے ہوئے بھی مجھے جھجک محسوس ہوتی ہے اور یہی کیفیت شاید ماہین کی بھی ہے۔ دیکھ لیں وہ بے چاری اب بھی میری طرف سے رخ پھیر کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"ہاں، یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں نا کہ میم سے بات کرو۔ ہوسکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔"

"کبھی نہیں نکلے گا..... اور یہ بات آپ کو بھی پتا ہے۔ ماہین اور حشام اس عمارت کے قرب و جوار سے پکڑے گئے تھے۔ آزاد ہونے کے بعد وہ عمارت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہ بھی کر سکے تو ایریا تو پوائنٹ آؤٹ کر ہی سکتے ہیں پھر بھی آپ کہتے ہیں تو بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

ہمیں اس اپارٹمنٹ میں ایک ملازم اور ایک لیڈی شیف بھی مہیا کی گئی تھی۔ عمران نے ملازم کو پیغام دے کر میم کی طرف بھیجا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ چند منٹ بعد انٹر کام پر میم مائرہ سے اس کی بات ہوگئی۔ دس پندرہ منٹ کی اس گفتگو کا نتیجہ وہی نکلا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ میم مائرہ کی طرف سے فی الحال ماہین اور حشام کو کسی بھی طرح کی رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو ان کے اہل خانہ کو ان کی خیر خیریت کے پیغامات بھجوائے جا سکتے ہیں بلکہ اگر وہ چاہیں تو اپنا ویڈیو پیغام ریکارڈ کروا سکتے ہیں۔ یہی پیشکش میرے اور عمران کے لیے بھی تھی۔ دیکھا جائے تو ان لوگوں کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ فقط چھ دن پہلے یہاں وہ درجن کے قریب افراد پُراسرار طریقے سے ہلاک کر دیے گئے تھے۔ ابھی مزید نہ جانے کیا ہونا تھا مگر یہاں موجود لوگوں

کی خیر خیریت کے پیغامات باہر بھی بھجوائے جا رہے تھے۔

رات کو مجھے گلے میں خراش تھی۔ ساتھ میں کھانسی بھی ہو رہی تھی۔ شاید یہ ان ہی ادویات کے اثرات تھے جو ہمیں انجیکٹ کی گئی تھیں۔ ماہین بہت خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔ مجھے مسلسل کھانستے دیکھ کر بولی۔ ''میں آپ کے لیے اسپیشل جوشاندہ بناتی ہوں، شہد والا۔ آپ بہتر محسوس کریں گے۔''

میں نے کہا ملازمہ سے کہہ دو مگر وہ خود ہی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ عمران بھی گلے میں خراش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اچھا دو کپ بنا لینا۔''

وہ چند منٹ بعد بڑا خوشبودار جوشاندہ بنا کر ہم دونوں کے لیے لے آئی۔ وہ میرے گھٹنے کی چوٹ کے بارے میں بھی فکر مند تھی۔ میں اس وقت عمران کے کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔

اس واقعے کے قریباً ایک گھنٹے بعد مجھے ماہین والے کمرے کی طرف سے جھگڑے کی دبی دبی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ حشام، ماہین کے ساتھ تلخ کلامی کر رہا ہے۔ جب سے ہم اس اپارٹمنٹ میں پہنچے تھے، وہ بہت چڑچڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر ماہین کے کمرے کی طرف گیا۔ کھڑکی کا پردہ اندر سے کچھ سرکا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ماہین خاموش کھڑی تھی اور حشام اس پر بگڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ورم زدہ اور سوئی سوئی سی نظر آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ اس نے اپنا ڈپریشن کم کرنے کے لیے کوئی ٹرینکولائزر وغیرہ لیا ہوا ہے۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر ضرورت کیا تھی تمہیں؟''

ماہین دبی دبی آواز میں بولی۔ ''حشام! تمہیں بتایا ہے انکل کا گلا خراب.....''

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ پھنکارا۔ ''انکل کا صرف بہانہ ہے۔ تم نے اُس کے لیے کیا سب کچھ۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ دیکھتا ہوں سب کچھ..... محسوس کرتا ہوں۔''

''فار گاڈ سیک حشام.....! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟'' وہ جھنجلائی۔

''یہ باتیں چبھ رہی ہیں تمہیں۔ اس لیے کہ سچ ہیں۔ کیا ملازمہ مر گئی تھی جو تم نے اپنے ہاتھ سے جوشاندہ بنایا اور اس کے کمرے میں لے کر گئیں.....''

''خدا کے لیے آہستہ بولو حشام! آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''نہیں بولوں گا میں آہستہ..... نہیں بولوں گا..... اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ زور سے چنگھاڑا اور ساتھ ہی سامنے رکھی ہوئی تپائی کو زور سے ٹھوکر ماری شیشے کی چھوٹی سی تپائی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ وہ جیسے اپنے حواس کھو رہا تھا۔ ماہین کا رنگ زرد نظر آنے لگا۔

عمران کا کمرا اس کمرے کے سامنے ہی تھا۔ وہ شور سن کر جلدی سے ماہین اور حشام کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا حشام؟'' اس نے اندر آ کر پوچھا۔

حشام نشے کے زیر اثر تھا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر دہاڑا۔ ''یہ تم پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا؟ تمہیں معلوم نہیں تو کس کو معلوم ہو گا؟ یہ تم ہو جس نے یہاں آ کر میری زندگی جہنم بنائی ہے..... صرف تم ہو۔'' اس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ ''مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ میں مار دوں گا تمہیں.... باسٹرڈ.... باسٹرڈ!''

وہ دیوانہ وار عمران پر جھپٹا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ دوسرے ہاتھ کا مُکا عمران کے منہ پر رسید کرنا چاہتا تھا مگر ماہین نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''حشام! ہوش کرو۔'' وہ چلائی۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ۔'' حشام پھر گرجا اور جنونی انداز میں ماہین کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس تپائی پر گری جو چند لمحے پہلے چکنا چور ہوئی تھی۔ اس کا سر اور ایک بازو بُری طرح تپائی سے ٹکرائے۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ اس کا ہاتھ واضح طور پر زخمی ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر عمران دفاعی انداز برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس نے حشام کا ہاتھ شدت سے جھٹک کر اپنا گریبان چھڑایا اور ماہین کی طرف لپکا۔

میں بھی جلدی سے کمرے میں داخل ہو گیا اور بپھرے ہوئے حشام کو سنبھال لیا۔ ٹوٹا ہوا شیشہ لگنے سے ماہین کی ہتھیلی بُری طرح کٹی تھی اور خون تیزی سے نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ عمران نے اس کی زخمی ہاتھ والی کلائی تھامنا چاہی تو وہ جلدی سے ایک طرف سمٹ گئی۔

''رہنے دو..... کچھ نہ کرو تم..... جاؤ یہاں سے..... پلیز جاؤ۔'' وہ طیش آمیز لہجے میں بولی۔

عمران ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے بھی عمران کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ حشام کی آتشیں نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

حشام نے پھر کوئی تند و تیز جملہ کہنا چاہا مگر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ملازمہ کی حیران پریشان صورت دروازے پر نظر آئی۔ میں نے اسے دروازہ بند کرنے کا

کہا۔ شاید دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے حشام کچھ اور بھی تند و تیز بولتا مگر ماہین کے زخمی ہاتھ کو دیکھ کر ہمیں اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ قریباً تین انچ لمبا گہرا کٹ تھا۔ حشام نے اپنا رومال زخم پر رکھ کر اسے دبایا اور بلیڈنگ روکنے کی کوشش کی۔ ماہین کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

"میں فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ زحمت نہ کریں۔" حشام ذرا روکھے پن سے بولا۔ "یہاں باکس ہے۔ میں بینڈیج کرلوں گا۔"

میں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ماہین کو تسلی تشفی دے کر اور اس کے سر کی چوٹ دیکھنے کے بعد کمرے سے نکل آیا۔

یوں لگتا تھا کہ ماہین کے حوالے سے حشام کی برداشت بہت جلد جواب دے جاتی ہے۔ خاص طور سے عمران کا اس کے آس پاس ہونا اسے بالکل ہی برداشت نہیں ہوتا اور اتفاق یہ تھا کہ اس قسم کے مواقع مسلسل پیدا ہو رہے تھے۔

مجھے حشام کا یہ رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ شادی سے پہلے ہی ایک سخت گیر شوہر والا رویہ اپناتا جا رہا تھا۔ میرے خیال میں ماہین اور اس کے اہلِ خانہ کو حشام کی اس سیماب صفتی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

اگلے دو روز تک ماہین کی صورت نظر نہیں آئی۔ حشام خود ہی اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ حشام کے رویے نے عمران کو دکھ پہنچایا تھا۔ وہ دس بارہ گھنٹے تو گم صم رہا اور ایک بار پھر اپنی خاص طبع کے باعث ہنسنا بولنا شروع ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ شاید غصہ اترنے کے بعد حشام، عمران سے معافی مانگے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا..... ہاں دوسرے روز شام کو جب میں ماہین کی خیریت دریافت کرنے اس کے کمرے میں گیا تو وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

"اکمل تابی! پلیز میری طرف سے عمران سے سوری بول دیجیے گا۔ میں بہت شرمندہ ہوں اُس روز کے واقعے سے۔ حشام کے علاوہ خود میں بھی اُس سے کچھ سخت بول گئی۔"

"افسوس اس بات کا ہے کہ ایک معمولی سی بات کو اتنا بڑھایا گیا۔" میں نے تاسف سے کہا۔ "یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ ہم کتنے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں اور ہماری آپس کی کوآرڈینیشن کتنی ضروری ہے۔"

ملازمہ راشدہ کے قدموں کی چاپ پر میں خاموش ہو گیا۔ اس نے آ کر اطلاع دی کہ میڈم ہما مجھ سے ملنے آئی ہیں۔

مجھے قدرے حیرانی ہوئی۔ جس اپارٹمنٹ میں ہم رہ رہے تھے، یہ کڑی نگرانی میں تھا۔ یہاں صرف ایک دروازہ تھا جہاں کڑا پہرا رہتا تھا۔ ہمیں یہاں سے قدم باہر نکالنے کی اجازت نہیں تھی البتہ میم مائرہ کی اجازت سے باہر کے اکا دکا لوگ یہاں آ جاتے تھے۔ کل ایک اٹالین لپ ریڈر بھی آیا تھا۔ اس ایڈگر نامی لپ ریڈر کا شمار معروف ریڈرز میں ہوتا تھا۔ یہ شخص پیدائشی گونگا بہرا تھا اور گونگے بہرے لوگوں کی تربیت کے لیے ایک بڑا ادارہ بھی چلاتا تھا۔ اس نے اشاراتی زبان میں عمران سے طویل گفتگو کی تھی اور پھر بڑی فراخدلی سے عمران کی بہترین صلاحیت کا اعتراف بھی کیا تھا۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا ہما عروج کی آمد کی۔ وہ مجھ میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔ بہرحال یہ کوئی رومانی نوعیت کی دلچسپی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ایسے معاملات سے بہت اکتا چکی ہے۔ اس کی دلچسپی کا محور میری غیر معمولی جسمانی فٹنس تھی اور میرے ماضی کے وہ واقعات تھے جو مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نے سن رکھے تھے۔ اسے کسی طرح میرے رہنما و استاد "مہان" فائٹر باروندا جیکی کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا تھا اور وہ اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔

ہما کے ساتھ ایک ڈیڑھ گھنٹا اچھے ماحول میں بات چیت ہوئی۔ چند ہی ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ وہ کئی رازداری کی باتیں بھی مجھ سے کر جاتی تھی۔ اس حوالے سے وہ کافی بے خوف بھی تھی۔

میرے ذہن میں یہ سوال کافی دنوں سے اٹکا ہوا تھا کہ وہ مومی چینی جیسی زرد ریت کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے ہما سے اس ریت کا ذکر کیا اور کہا۔ "پہلے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ عام ریت میں سے نکالا جاتا ہے اور جاروں میں بند کیا جاتا ہے اور پھر سے ریت میں ملا دیا جاتا ہے۔"

ہما نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے یہ سب کچھ کہاں دیکھا؟

میں نے اُس رات کا واقعہ بتا دیا جب گارڈ افروزہ کو عدم آباد روانہ کرنے کے بعد میں گودام کے قریب سے گزرا تھا اور وہاں یہ منظر دیکھا تھا۔

وہ بولی۔ "تم تیز ناک رکھتے ہو۔ بہت سونگھا ساگی

کرلیتے ہو۔ یہ بھید خاص خاص لوگوں کو ہی معلوم ہے۔ بس سمجھو کہ ان بیچارے مزدوروں کو کام پر لگائے رکھنے کا ڈھکوسلا ہے۔"

"یعنی وہ موٹی چینی جیسی ریت کچھ بھی نہیں؟"

"پہلے تھی..... پر اب کچھ بھی نہیں۔" اس نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ "اصل میں گل یہ ہے کہ جو دوا یہاں بنائی جارہی ہے، اس کے اندر شروع میں یہ پیلی شے ورتی (استعمال کی) گئی تھی۔ اس ٹائم واقعی اس شے کی لوڑ ہوگی پر پھر یہ تجربہ ڈھیں پٹاس ہوگیا (ڈھیں پٹاس اس کا تکیہ کلام تھا) اب اس ریت چھاننے والے کام کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف مزدوروں کا ٹائم پاس کرایا جارہا ہے۔ ان مزدوروں سے جو اصلی کام لیا جارہا ہے، اس کا پتا تو تمہیں بھی چل گیا ہے۔"

"یعنی..... انجکشنز کے ذریعے دوا کا تجربہ ہورہا ہے؟" میں نے ہما ہی کی طرح دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے رازداری کے انداز میں سر کو اثباتی حرکت دی۔

"آخر یہ دوا..... علاج کس چیز کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ہما نے آواز مزید دھیمی کی۔ "رامے جی کوئی آسان بندہ نہیں ہے۔ سمجھو کہ دو ہزار فٹ ڈونگا کنواں ہے۔ کوئی اس کے اندر کا حال نہیں جان سکتا۔ تم بھی اتنا ہی جانو جتنا ہضم کرسکو۔"

"تمہیں رامے سے ڈر نہیں لگتا؟"

"میرا کیا بگاڑ لے گا۔ مار ہی دے گا نا..... اور ایک دو دن سے تو سچی سچی دل کرنے لگا ہے کہ کہیں دور نس (بھاگ) جاؤں اس بندے سے۔ اس کے کرتوت خراب سے خراب ہوتے جارہے ہیں۔" وہ آزردگی سے بولی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پہلی بار وہ رامے کا نام نمایاں نفرت سے لے رہی ہے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ پچھلے ایک دو روز میں کوئی نیا واقعہ ہوا ہے یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ رامے کے بیڈ روم میں ناگفتہ بہ حالت میں قتل ہونے والی بدنصیب کنول کی موت کا یہ ردعمل ہو۔ میں نے ہما کو تھوڑا سا مزید ٹٹولا تو اپنی افسردگی کے بہاؤ میں اس نے ایک اور لرزہ خیز انکشاف کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان پستی میں گرتا ہے تو اس کی رفتار کتنی تیز ہوجاتی ہے۔

جادو رامے اپنی محبوبہ چاندنی کی موت کا غم غلط کرنے کے لیے چاندنی جیسی لڑکی ہی مانگ رہا تھا۔ بہت خوبصورت لیکن نابینا۔ پیسے کے زور سے حسین لڑکی یہاں لانا کون سا مشکل تھا مگر دوسری شرط نے اس کام کو دشوار کردیا تھا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ کچھ اور نکل آیا تھا۔ مجھے ہما کے الفاظ پر یقین نہیں آیا۔ کیا انسان اتنا سفاک بھی ہوسکتا ہے؟ مگر وہ انسان تھا بھی کہاں۔ وہ تو ایک بدبودار جانور تھا جس نے اپنی بدنمائی کو ایک بیماری کی طرح خود پر طاری کیا ہوا تھا اور گرداب ہوس میں تھا۔ اس کے جنون کا شاخسانہ تھا کہ اس نے اتوار کے دن اپنے لیے دو خوش شکل لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نابینا نہیں تھیں لیکن انہیں اب زیادہ دیر "بینا" نہیں رہنا تھا۔ ہما کے لیے جادو رامے کا حکم تھا کہ وہ اس کی خلوت میں پہنچنے سے پہلے پہلے بینائی سے محروم ہوں..... اس کی چاندنی جیسی ہوجائیں۔

"تو کیا کرو گے تم لوگ؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے کیا کرنا ہے۔" ہما کا لہجہ بوجھل تھا۔ "جو کریں گے، یہاں کے ڈاکٹر ہی کریں گے۔ ان بیچاریوں کی آنکھوں میں دوا کے نام پر زہر ٹپکائیں گے۔ آنکھیں تو ویسی ہی رہیں گی اور نظریں دو تین ہفتوں میں ختم ہوجائیں گی۔ سمجھو بالکل ڈھیں پٹاس۔"

مجھے ہما کے دکھ اور مایوسی کی وجہ اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ جن لڑکیوں کا ذکر ہورہا تھا، یقیناً یہ ہما کے ذریعے ہی یہاں تک پہنچی تھیں۔ تب ہما کو معلوم نہیں تھا کہ جادو رامے کا دیوانہ پن اسے کس کام پر اکسا رہا ہے۔ اب رامے کا ارادہ جب اس پر کھلا تھا تو وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ رامے کے خلاف اس میں بغاوت کی چنگاریاں پیدا ہوئی تھیں۔ تاہم رامے کے جال سے نکلنا بھی اس کے لیے آسان نہیں لگتا تھا۔

اس نے اپنے موبائل پر مجھے ایک مختصر ویڈیو دکھائی جس نے دل مزید افسردہ کردیا۔ یہ ان دو... لڑکیوں کی ویڈیو ہی تھی۔ یقیناً یہ انہی کم عقلوں میں سے تھیں جو شوبز کی چکاچوند سے متاثر ہوکر گھروں سے نکلتی ہیں۔ ہزارہا نظروں کے تیر اپنے کومل جسموں پر سہتی ہیں اور منزل کی تلاش میں ایسے راستوں پر چلتی ہیں جو اُن کے تلوؤں کو لہولہان کرتا ہے۔ ان دو لڑکیوں کی بدقسمتی یقیناً دوسروں سے سوا تھی۔ آبرو کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان کے پاس موجود ہے یا نہیں مگر آنکھیں تو موجود تھیں..... جو اب نابود ہونے والی تھیں۔ میں نے دیکھا وہ ایک ڈریسنگ ٹیبل کے

سامنے بیٹھی تھیں۔ ایک ڈاکٹر ان کے قریب موجود تھا۔ میک اَپ آرٹسٹ فرزانہ کے ہاتھ میں ایک ڈراپر ٹائپ چیز تھی اور وہ ایک لڑکی کی آنکھوں پر جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کچھ ٹپکا رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنے انجام سے بے خبر ہنسی خوشی ایک سفاک عمل سے گزر رہی تھیں۔ کسی طاقتور کی بدصورتی کی سزا ان کی بینائی کو بھگتنا پڑ رہی تھی۔ چند ہفتوں بعد یہ دنیا ان کے لیے اندھیر ہو جانا تھی۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا ایک لگژری اسٹیشن ویگن کا۔ میری اور عمران کی آنکھوں پر آئی ماسک یعنی سیاہ پٹی تھی۔ ہمارے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور یقیناً ہمیں موٹر وے کے ذریعے کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ ویگن میں سامان کے گارڈز کے علاوہ ہیروز بھی موجود تھا۔ اس تاریک شیشوں والی ویگن میں ہمیں سفر کرتے کم و بیش دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ ہمیں لاہور سے اسلام آباد لے جایا جا رہا ہے۔ اسلام آباد کا ذکر اس اہم ویڈیو کلپ میں موجود تھا جسے عمران نے اپنے طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یقیناً یہ جزوی طور پر ایک کامیاب کوشش ہی تھی۔

بالآخر ہم کسی عمارت میں داخل ہوئے۔ یہاں آکر ہماری آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ عمران کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ یہ کسی صاحبِ ثروت شخص کی رہائش گاہ لگتی تھی مگر فی الحال یہاں رہائش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک لفٹ کے ذریعے ہمیں تیسرے فلور پر پہنچایا گیا۔ ہم ایک گیلری نما وسیع کمرے میں نمودار ہوئے۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے دور دور کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ ہاں یہ ہمارا اسلام آباد ہی تھا۔ دور کہیں مسجد فیصل کے مینار اور ان سے آگے مارگلہ کے درخت جھلک دکھا رہے تھے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ کمزور زرد دھوپ نشیب و فراز کو گرمانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''خوش آمدید!'' یہ آواز میم مائرہ کی تھی جو بند گلے کے کوٹ اور پینٹ میں ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے تعجب سے دیکھا۔ ایک کھڑکی کے پاس دو بڑے سائز کی ٹیلی اسکوپس رکھی تھیں۔ میم مائرہ کے عقب میں سیاہ وردیوں والے گارڈز کے علاوہ وہ اطالوی لیپ ریڈر یا اسپیچ ریڈر بھی موجود تھا جو پندرہ دن پہلے ہمیں خفیہ عمارت کے اپارٹمنٹ میں ملا تھا۔ وہ تیکھے نقوش اور پتلے پتلے ہونٹوں والا ایک ہوشیار شخص تھا۔ قوتِ گویائی اور سماعت سے محروم ہونے کے باوجود اس کا چہرہ ہر وقت بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ عمران کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ ایک لیپ ریڈر کی حیثیت سے وہ عمران کی عزت کرتا ہے۔

میرے کانوں میں ہیلی کاپٹر کی مدھم پھڑپھڑاہٹ گونجی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے کھڑکیوں کے پار دیکھا مگر ہیلی کاپٹر نظر نہیں آیا۔ ہاں تقریباً 200 میٹر کے فاصلے پر کسی شاندار عمارت کا وسیع و عریض عقبی لان دکھائی دیا۔ اس سبز لان کے بیچوں بیچ تین چار کرسیاں اور میز دکھائی دے رہی تھیں۔

میم نے عمران کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اس ہیلی کاپٹر پر ایک بہت اہم لیڈی یہاں پہنچی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کاروباری پارٹنر کے ساتھ اس سامنے والے لان میں آئے گی۔ ان دونوں کے درمیان نہایت اہم قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔ ہمیں اس گفتگو کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا ہے۔ فاصلہ زیادہ ہے۔ یہ دونوں ٹیلی اسکوپس بھی اسی لیے یہاں رکھی گئی ہیں۔''

عمران نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر میم مائرہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہیں یہ دونوں وہی بزنس پارٹنرز تو نہیں جو خاموش ویڈیو میں تھے؟''

''تم نے درست اندازہ لگایا ہے عمران! ہمارے لیے ان دونوں کی یہ آج کی گفتگو بہت اہم ہے۔ ہم جس لوکیشن پر موجود ہیں، ہم نے یہ بہت مشکل سے حاصل کی ہے۔ مقصد صرف یہی ہے کہ ہم آج کی گفتگو جان سکیں۔''

عمران نے اطالوی لیپ ریڈر ایڈگر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ایڈگر صاحب یہاں کس لیے ہیں؟''

''تم دونوں ایک دوسرے کی معاونت کر سکتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو یہ بھی اس فیلڈ کے ماسٹر ہیں۔''

''میری معاونت تو میرے یہ انکل تابش صاحب کرتے ہیں اور یہ میرے ساتھ ہیں۔''

''تو تم یوں سمجھ لو کہ مسٹر ایڈگر بھی اپنے طور پر وہی کچھ کریں گے جو تم کرو گے۔ تمہاری ''فائنڈنگ'' کو ہم ٹیلی کر سکتے ہیں۔ یہ دوسری ٹیلی اسکوپ اسی لیے رکھی گئی ہے۔''

میں نے مائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ ''میم! میری اور عمران کی سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی ہے کہ آپ عمران کی مدد سے کوئی بہت خاص قسم کی گفتگو جاننا چاہ رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بہت اہم راز ہی ہوگا جو آپ کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی آشکار ہو جائے گا۔

جب یہ راز ہم پر بھی کھل جائے گا تو پھر آپ لوگ ہمیں جیتا جاگتا چھوڑنا کب پسند کریں گے؟"

مائرہ کے چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ اس کی رنگت میں مقامی اور بدیشی آمیزش تھی۔ تقریباً تیس سال عمر کے باوجود وہ جسمانی طور پر بہت چوکس بلکہ کسی ایتھلیٹ کی طرح نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے طیش کو دبایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ "یہ بات تم دونوں بہت اچھی طرح سمجھ لو کہ تم فی الوقت کسی بھی طرح کی سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے، غیر مشروط طور پر کرنا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمیں ایک راہ تو سوجھ ہی گئی ہے۔ اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو کوئی اور کرلے گا۔ یہ سامنے تمہاری ہی فیلڈ کا بندہ ایڈگر کھڑا ہے۔ ایسے ہی اور لوگ ہمیں مل سکتے ہیں۔"

عمران اطمینان سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو پھر تمہاری مدد کرنے کے بعد اور تمہارے گناہوں میں حصہ دار بننے کے بعد کیوں مریں؟"

"یہاں کوئی گناہ نہیں ہو رہا۔" وہ دبنگ انداز میں بولی۔ "تم سمجھ ہی چکے ہو گے کہ ہم یہاں فارمیسی کے حوالے سے کام کر رہے ہیں اور مقصد انسانیت کی بھلائی ہی ہے۔"

عمران تقریر کرنے والے موڈ میں آ گیا۔ "یہ کیسی بھلائی ہے۔ آپ لوگوں نے بے شمار محنت کشوں کو دھوکے سے اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ چار ہفتے پہلے جو کچھ ہوا، وہ کون سی انسانیت کی بھلائی تھی۔ دو درجن کے قریب بے گناہ تمہارے کسی تجربے کے گھاٹ اتر گئے۔"

"وہ بس ایک حادثہ تھا۔" میم پھنکاری۔ "ہمیں بھی اس کا بے حد افسوس ہے مگر ہم نے مرنے والوں کے لواحقین کو بھلایا نہیں۔ انہیں اتنا معاوضہ دیا ہے کہ ان کی دو نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں اور ان کی جان ایک اچھے کام کے لیے ہی گئی ہے....."

عمران نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر میرا خفیف اشارہ پا کر ارادہ بدل دیا بس مایوس انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ معدوم ہو چکی تھی۔ سامنے وسیع خوبصورت لان میں اِکا دُکا باوردی ملازمین کے متحرک اجسام دکھائی دے رہے تھے۔

میم مائرہ نے گہری سانس لیتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "بہرحال تم دونوں کے اندیشے درست نہیں ہیں۔ اگر تم نے واقعی کارکردگی دکھائی تو میں تمہیں مناسب رعایت دلانے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔ کم از کم ہمارے تمہاری جان بخشی تو کر ہی دے گا۔"

دور فاصلے پر سرسبز لان میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی تھی اور یہ ہلچل لان سے باہر گل نما کوٹھی کے وسیع پورچ میں بھی تھی۔ کچھ لوگ ادھر سے بھی آ رہے تھے۔ تین چار بڑی بڑی لگژری گاڑیاں داخل ہوئیں۔ آگے پیچھے گارڈز کی نصف درجن گاڑیاں تھیں۔ دو موٹر سائیکل سوار محافظ اس "کانوائے" کے آگے آگے تھے۔ ٹیلی اسکوپ کے بغیر ہی مجھے اور عمران کو پتا چل گیا کہ اس جاٹ سے جاپانی لیڈی یوزوکی کا بزنس پارٹنر ڈیرن وارد ہوا ہے۔

انچارج گارڈ بہروز کے اشارے پر عمران ایک ٹیلی اسکوپ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، اطالوی ایڈگر نے بھی دوسری ٹیلی اسکوپ کے سامنے جگہ سنبھال لی۔ ایک جانب طاقتور لینس والا ایک ویڈیو کیمرا بھی حرکت میں تھا۔

چار پانچ منٹ بعد بھاری بھرکم جسم والی یوزوکی اور سوٹڈ بوٹڈ ڈیرن فورڈ گراؤنڈ میں موجود تھے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ یوزوکی کا نہایت قیمتی ارجنیو کتا بھی بغیر ٹیلی اسکوپ کے ہی دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً وہ ہیلی کاپٹر میں اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہوگا۔ مؤدب ملازم ان دونوں کے اردگرد گردش کرنے لگے۔ ان دونوں کے سامنے خورونوش کا کچھ سامان رکھا گیا۔ اسی اثنا میں ایک خوش قامت لڑکی بھی نظر آئی۔ وہ پینٹ اور جیکٹ میں تھی۔ بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی وہ اچھی صورت کی لگتی تھی۔ وہ غالباً ڈیرن فورڈ کے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ اسے دیکھ کر قریب اندام یوزوکی نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ چند فقروں کے تبادلے کے بعد وہ لان سے باہر چلی گئی۔ میرا قیافہ یہی تھا کہ وہ ادھیڑ عمر ڈیرن کی بیٹی ہے۔ اس کے جانے کے بعد ڈیرن اور یوزوکی لان میں کرسیوں پر تنہا رہ گئے۔ ان کے سامنے دو فائلز رکھ دی گئی تھیں۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ اب ان کے درمیان سنجیدہ نوعیت کی گفتگو شروع ہو چکی ہے۔ عمران اور اطالوی لپ ریڈر ایڈگر پوری طرح متوجہ تھے اور ٹیلی اسکوپس پر جھکے ہوئے تھے۔ ساعت اور گویائی سے محروم ایڈگر گاہے بہ گاہے اپنی نوٹ بک پر کچھ تحریر بھی کرتا تھا۔

تب عمران نے میم مائرہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اپنی ٹیلی اسکوپ کی پوزیشن بدلنا چاہتا ہے۔

میم مائرہ نے ٹیلی اسکوپ عمران کی مطلوبہ پوزیشن پر رکھوا دی۔ ایک دو منٹ بعد اطالوی ایڈگر نے بھی پوزیشن

بدلنے کی درخواست کی۔ عمران اور ایڈگر دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔ اسی دوران میں سبزہ زار میں بیٹھی ہوئی یوزو کی نے فون پر کسی سے بات بھی کی۔ بات کرتے ہوئے وہ سبزہ زار میں ٹہلنے لگی تھی اور اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ اس کا پارٹنر ڈیرن فورڈ انہماک سے کوئی کاغذ دیکھ رہا تھا۔

میم مائرہ نے عمران سے پوچھا۔ ''کچھ پلے پڑا؟''

''ابھی تک کچھ خاص نہیں۔'' عمران نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ ''ایک بار پھر بزرگ جاپانی اسکالر ڈاکٹر شا کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک دو فقرے جو سمجھ میں آئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر شا کے پیچ ادھورے ہیں..... اس ادھورے پن کی وجہ سے بہت مشکل ہو رہی ہے۔''

''اس کے علاوہ؟'' میم مائرہ نے بیتابی سے پوچھا۔

''میڈم یوزو کی کسی جانور یا کیڑے کا ذکر بھی کر رہی ہے شاید.....''

''ضرور..... ضرور کیا ہوگا اس نے یہ ذکر..... کہیں سانپ یا پھر زہر وغیرہ کی بات تو نہیں کی اس نے؟'' میم مائرہ کی آنکھوں میں ایک ہیجانی چمک نمودار ہو گئی۔

''زہر کی بات یوزو کی نے نہیں، شاید ڈیرن نے کی ہے لیکن فقرہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکا۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ضروری ہے..... بہت ضروری۔'' مائرہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

عمران دکھاوے کے لیے مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ اپنے معاون کی حیثیت سے مجھ سے تبادلۂ خیال کر رہا ہے۔ میرے کان میں بولا۔ ''چاچو جی! دل تو چاہ رہا ہے کہ اس بل جوڑی ناساں چوڑی جاپانی میڈم کے گریبان میں چھپکلی چھوڑ دوں۔ یہ اتنے زور سے چلائے کہ اس کا چھوٹا سا منہ چوڑا ہو جائے پھر کچھ تو پتا چلے کہ خبیث بول کیا رہی ہے۔''

میں نے بڑی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا جیسے عمران نے کوئی بہت اچھی بات کی ہو۔ ''بالکل منہ بند کر کے بول رہی ہے جتنی کی بکی۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس دوران میں میم مائرہ نے گونگے بہرے ایڈگر سے بھی تحریر شدہ رزلٹ لیا۔ مائرہ کے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہوا کہ گو عمران کا رزلٹ بھی اچھا نہیں تھا مگر ایڈگر سے بہت بہتر تھا۔ سبزہ زار میں جاپانی یوزو کی ایک بار پھر ڈیرن فورڈ کے پاس آبیٹھی تھی۔ دونوں کی گفتگو پھر شروع ہو گئی۔ عمران ایک بار پھر سراپا نگاہ بن گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ وہ مائرہ اور جادو راے کے لیے کوئی اہم انکشاف کر پائے گا مگر چند منٹ بعد کچھ ایسا ہوا جس نے امیدوں پر پانی سا پھیر دیا۔ جاپانی میڈم یوزو کی کا کتا شاید سردی کے باوجود رھوب پسند نہیں کر پا رہا تھا۔ دو ملازم بھاگے بھاگے لان میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے سائز کی ایک رنگدار چھتری تھی جسے برولی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بڑی چھتری کتے کے اوپر تان دی اور واپس چلے گئے۔ کتے کے ساتھ اس وی آئی پی سلوک کا نقصان یہ ہوا کہ ڈیرن اور یوزو کی دونوں ہی تقریباً عمران کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اطالوی ایڈگر تو ان کو بالکل ہی دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

میم مائرہ، بہروز اور ان کے ساتھی سٹپٹائے ہوئے نظر آنے لگے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں ٹیلی اسکوپس کی پوزیشن دو تین بار تبدیل کی گئی مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ یہ مایوس کن صورتِ حال تھی۔ لگ یہی رہا تھا کہ سبزہ زار میں اب دونوں پارٹنرز کی گفتگو شاید تادیر جاری نہیں رہے گی۔ محل نما کوٹھی کے پورچ میں اب گاڑیوں کو آگے پیچھے کیا جانے لگا تھا۔ وہ سفید فام لڑکی جو ڈیرن فورڈ کے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی، اب پورچ میں اس بیش قیمت ''روبی کون'' جیپ کے پاس موجود تھی جس میں ڈیرن فورڈ یہاں آیا تھا۔ وہ کسی مقامی خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ اس مقامی خاتون نے ابھی کچھ دیر پہلے نہایت مہنگی ''روبی کون'' جیپ میں کچھ پھول اور بکے وغیرہ رکھے تھے۔ یہ اسی نوعیت کے پھول تھے جو عموماً کرسچین اپنی قبروں پر رکھتے ہیں۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''یہ پورچ میں جو دو خواتین کھڑی باتیں کر رہی ہیں، ان کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

اب اصل کام تو ہو نہیں پا رہا تھا۔ عمران نے اپنی ٹیلی اسکوپ کو اسٹینڈ پر گھمایا اور اس کا رخ محل نما کوٹھی کے پورچ کی طرف کر دیا۔ وہ کچھ دیر تک ہمہ تن متوجہ رہا پھر بولا۔ ''یہ کسی قبرستان میں جانے اور پھول چڑھانے کی بات ہو رہی ہے۔ اس لڑکی کا یا اس کے ساتھی کا کوئی گرینڈ پا ہے جو غالباً یہاں کے قبرستان میں دفن ہے۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑنے لگی تھی۔ کچھ کر گزرنے کی امنگ اچانک سینے میں جاگی تھی اور توانائی بن کر جسم میں پھیل گئی تھی۔ میں نے مؤدب انداز میں میم مائرہ سے پوچھا۔ ''یہاں آس پاس کوئی گورا قبرستان ہے؟''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''پلیز! آپ میری بات کا جواب دیں۔ اس میں

آپ کا فائدہ ہے۔"

وہ چند سیکنڈ تک میری طرف دیکھتی رہی پھر شاید میرے غیر معمولی انداز نے ہی اسے سوچنے پر مجبور کیا۔ اس نے انچارج بہروز سے پوچھا۔ "کوئی گورا قبرستان ہے یہاں؟"

بہروز بولا۔ "جی نہیں، یہاں قریب تو کوئی نہیں۔ مری روڈ سے پنڈی کی طرف جائیں تو وہاں ایک ہے۔" اس نے قبرستان کا نام بھی بتایا (یہ نام اس لپ ریڈنگ سے ٹیلی کر رہا تھا جو عمران نے کی تھی)

ایک عجیب سا ولولہ میرے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ سبزہ زار میں جو دو بزنس پارٹنرز بیٹھے کوئی خاص گفتگو کر رہے ہیں، وہ بہت وسائل والے لوگ ہیں۔ اس قدر وسائل والے کہ مائرہ اور رامے جیسے ونگ بھی ان سے ٹکرا نہیں سکتے تھے نہ ہی ان کی سیکیورٹی کو توڑ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی جو وہ دور دور سے ان کی ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی کیمروں سے، کبھی ٹیلی اسکوپس کے ذریعے۔

ایسے ہی لوگوں سے ٹکرانے اور انہیں ششدر کر دینے میں مجھے اور عمران دانش کو مزہ آیا کرتا تھا۔ پندرہ برس گزر گئے تھے مگر ایسے مزے اور ایڈونچر کی طلب میرے اندر آج بھی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ میرے تجربے نے میری جسمانی فٹنس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مجھے اور بھی "کارگر" بنا دیا ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ اب عمران دانش کا عکس میرے ساتھ تھا۔ اس کے اندر اپنے باپ کی کئی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں لیکن اس کی اپنی انفرادی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ ایک مثال یہ لپ ریڈنگ والا جادوئی فن تھا۔

میں نے عمران کے کان میں چند سرگوشیاں کیں پھر بڑے اعتماد سے میم مائرہ کی طرف دیکھا۔ "میم! اگر آپ میرے ہاتھ کھلوا سکیں اور میرے اوپر بھروسا کر سکیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم آپ کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔"

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی معاملہ فہم نگاہیں میرے اندر تک اترنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کیا کرو گے تم؟ ان دونوں میں سے کسی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرو گے؟"

"آپ ایسا ہی سمجھ لیں مگر بھروسا رکھیں۔ ہم کچا ہاتھ ڈالنے والے نہیں ہیں۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ بے شک تم دونوں ایڈونچر کے شوقین ہو اور مار دھاڑ میں طاق ہو مگر یہ لوگ تمہارے بس کے نہیں ہیں۔ یہ کسی اور کیٹیگری کے لوگ ہیں۔ ان کی سیکیورٹی دیکھ رہے ہو؟"

عمران بولا۔ "میم ایسی ہی سیکیورٹیاں توڑنے میں تو مزہ آتا ہے۔ چھوٹے موٹے لوگوں سے ماتھا لگانے کے ہم بھی قائل نہیں۔"

"کیا کرو گے تم لوگ؟"

"یہ ہم پر چھوڑ دیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "اور آپ یہ بھی بخوبی جانتی ہیں کہ ہم کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ ہمارے ساتھی ماہین اور حشام آپ کے پاس ہیں۔"

اس حوالے سے میرے اور میم مائرہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک مدلل گفتگو ہوئی۔ آخر مائرہ کی آنکھوں میں ایک گرمجوشی چمک نظر آنے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے پاس بھی کسی "نتیجے" تک پہنچنے کے لیے وقت بہت کم ہے۔ اس نے ایک سمت جا کر فون پر کسی سے بات کی۔ غالباً عمران کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا رخ دوسری طرف رکھا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ جادو رامے سے مشورہ کر رہی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ فون بند کر کے میری طرف متوجہ ہوئی اور گہری سانس لے کر بولی۔ "میں تم دونوں کو بتا چکی ہوں۔ یہ دونوں بندے جو وہاں سبزہ زار میں بیٹھے ہیں، بے حد..... بے حد اہم ہیں۔ ان میں سے کسی کا جانی نقصان بہت بڑا طوفان کھڑا کر سکتا ہے۔ ہم یہ نقصان افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"نہیں ہوگا یہ نقصان۔" میں نے ایک بار پھر میم کو یقین دلایا۔

ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر سبزہ زار میں اب حرکت سی نظر آ رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ امریکن ڈیرن اور جاپانی یوزوکی کے درمیان میٹنگ اب برخاست ہونے والی ہے۔ میم مائرہ جیسے ایک جست کے ساتھ فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس نے انچارج بہروز کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کی زپ ٹائی کھول دی۔ میں نے اپنی کلائیوں کو مسلا اور میم مائرہ سے وہ بریٹا پستول وصول کیا جس کی میں نے ڈیمانڈ کی تھی۔ مسلح گارڈز کے درمیان سے گزر کر میں اور عمران لفٹ تک پہنچے۔ بہروز دو چوکس گارڈز سمیت ہمارے ہمراہ تھا البتہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے آئندہ کچھ دیر میں ہونے والی کارروائی میں کوئی

حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم ایک سفید اسٹیشن ویگن میں بیٹھے اور برق رفتاری سے مطلوبہ گورا قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

یہ بہت ہلکی زرد دھوپ والی ایک یخ بستہ دوپہر تھی۔ مارگلہ اور مری کی طرف سے آنے والی برفانی ہوائیں ہڈیوں میں گھس رہی تھیں۔ میں اور عمران اس شہرِ خموشاں کے اندر دو گھنے درختوں کے عقب میں موجود تھے۔ ہماری یہاں آمد کے دس منٹ بعد ہی قبرستان کے اردگرد ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ ہماری توقع کے عین مطابق امریکی ڈیرن فورڈ اور اس کی ساتھی خوش پوش لڑکی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یہاں پہنچ چکے تھے۔ درجنوں ہی گاڑیاں تھیں جو اس گورا قبرستان کے اطراف میں آ کر کھڑی ہوئی تھیں۔ اب ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ڈیرن جب قبرستان کے اندر آئے گا تو اس کے ساتھ محافظ ہوں گے یا نہیں اور اگر ہوں گے تو کتنے ہوں گے؟"

آخر ہمارے لیے یہ معما حل ہوا۔ گھنی شاخوں کے اندر سے ہم نے دراز قد ڈیرن اور اس کی ساتھی لڑکی کو دیکھا جسے ہم اس کی بیٹی سمجھ رہے تھے، ان دونوں نے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔ ان کے ساتھ صرف تین باوردی گارڈز قبرستان میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں پھول اور گلدستے وغیرہ تھے۔

ہم نے دیکھا ایک ہیلی کاپٹر فضا میں پھڑپھڑاتا کسی طرف نکل گیا۔ غالباً یہ وہی ہیلی کاپٹر تھا جس پر جاپانی لیڈر کی بزنس میٹنگ کے لیے اسلام آباد پہنچی تھی۔ ہم دم سادھے بیٹھے رہے۔ فضا میں آہستہ آہستہ کہر ابھرنا شروع ہو گیا تھا اور کمزور سی دھوپ بھی اوجھل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ڈیرن اور اس کی ساتھی لڑکی ہم دونوں سے تقریباً سو فٹ دور ایک قدیم سفید قبر پر جا کر رک گئے۔ اس گورا قبرستان کی زیادہ تر قبریں سفید پتھر ہی کی تھیں۔ اکثر پر صلیب یا پاک مریم کی مورتی نظر آتی تھی۔ ڈیرن اور لڑکی نے محافظ کے ہاتھوں سے پھول اور گلدستے لیے اور انہیں بڑے احترام سے قبر پر چڑھایا پھر محافظ تو پیچھے ہٹ گئے اور وہ دونوں اپنی آنکھیں بند کر کے دعا میں مصروف ہو گئے۔ محافظ پیچھے ہٹنے کے بعد ہمارے کافی قریب چلے آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو اتنا قریب تھا کہ اگر گھوم کر اپنے عقب میں درختوں کو دیکھتا تو شاید ہم اسے نظر آ جاتے۔ یہ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔

میں تیزی سے نکلا اور دو چار قدم چل کر اپنا دایاں بازو محافظ کے گلے میں حمائل کر دیا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ

حاصلِ مطالعہ

☆ بگ ایپل (BIG APPLE) نیویارک کو کہتے ہیں۔

☆ مصر کے فرعون توت کا اہرام 482 فٹ بلند اور 876 مربع فٹ پر مشتمل ہے۔

☆ ایئر فرانس کے کنکارڈ طیارے نے اگست 1995ء میں نیویارک سے پرواز کے بعد 31 گھنٹے 27 منٹ اور 49 سیکنڈ میں دنیا کا چکر لگا کر واپس نیویارک پہنچ کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

☆ 1812ء کی جنگ کے دوران امریکی صدر کی رہائش گاہ کو زبردست نقصان پہنچا۔ عمارت کے بدنما داغوں کو چھپانے کے لیے اس پر سفید رنگ کر دیا گیا جس کی وجہ سے لوگوں میں وائٹ ہاؤس کہنے کا رجحان ہوا۔ تاہم اس بات کی تصدیق سرکاری طور پر 1902ء میں ہوئی۔

☆ مسجد مرمریت المقدس کے احاطے میں تحریک پاکستان کی نامور شخصیت مولانا محمد علی جوہر دفن ہیں۔

☆ سونے کے پانی سے قرآن مجید سب سے پہلے جناب قطبہ نے لکھا۔

(محمد شاہان سعید کی عرق ریزی)

مریض ڈاکٹر سے: "ڈاکٹر صاحب میں بہت خوش رہتا ہوں۔ نیند سکون سے آتی ہے، زندگی میں امن ہی امن ہے۔ ہر کام میں دل بھی لگتا ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟"

ڈاکٹر: "میں آپ کی بیماری سمجھ گیا۔ آپ کی زندگی میں وٹامن شی (She) کی کمی ہے۔"

☆☆☆

ایک بوڑھے کسان نے اپنے بے گناہ بیٹے کو جیل میں خط لکھا۔

"پیارے بیٹے میں اس سال آلو کی فصل نہیں بو سکتا۔ مجھ سے کھیت میں کھدائی نہیں ہو سکتی۔ کاش تم میری مدد کر سکتے؟"

بیٹے نے جواب دیا: "بابا کھیت مت کھودنا کیونکہ وہاں میں نے اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔"

اگلے دن پولیس نے سارے کھیت کی کھدائی کر ڈالی لیکن انہیں کچھ نہ ملا۔ بیٹے نے پھر باپ کو خط لکھا۔

"بابا اب آپ آلو کی فصل بو سکتے ہیں۔ میں یہاں سے آپ کے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا۔"

(سحرش افضل، رتیڑہ)

ہلکی سی آواز بھی نہ نکال سکا اور ہوش سے بیگانہ ہو کر میرے بازوؤں میں جھنڈی توری کی طرح جھول گیا۔ میں نے آواز پیدا کیے بغیر اسے درختوں میں کھینچ لیا۔ اس کے ساتھی کو کچھ شک ہوا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ''راجر! کہاں ہو؟'' اور درختوں کی طرف آیا۔

عمران نے بے ہوش راجر کے پہلو سے تیز دھار خنجر نکال کر اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا لہٰذا جونہی مسلح محافظ قریب آیا، اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عمران پہلو سے اس پر جھپٹا اور تیز دھار خنجر دستے تک اس کے سینے میں اتار دیا۔ عمران نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ ڈھانپ لیا تھا لہٰذا مضروب کی کراہ دور تک نہیں گئی۔ تیسرا محافظ گن اپنے کندھے سے اتار رہا تھا جب میں اس پر جا پڑا۔ میں نے اپنے دائیں بازو میں اس کی توانا گردن جکڑ لی۔ یہ سڈول جسم والا مقامی محافظ تھا۔ اپنی رائفل پر اس کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی لہٰذا میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو چند روز پہلے لاہور کی نامعلوم عمارت میں فی میل گارڈ افروزہ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ ایک شکستہ قبر پر ڈھیر ہو گیا۔

بند آنکھوں کے ساتھ مناجات میں مصروف ڈیرن اور اس کی ساتھی لڑکی جب تک گھوم کر اپنے محافظوں کی طرف دیکھتے اور ان کے رنگ برف کی طرح سفید ہوتے، ہم ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔

''خبردار! آواز نہ نکلے۔'' میں نے برینا پسٹل کی یخ بستہ نال ڈیرن کی نیم سفید کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ہکا بکا تھا۔

عمران نے لڑکی کو عقب سے دبوچ لیا تھا اور خنجر کی ٹھنڈی ہوئی تیز دھار اس کی صراحی دار گردن پر رکھ دی تھی۔ قبرستان کی اونچی چار دیواری سے باہر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو چکا ہے۔

''یہ... کیا تماشا ہے؟'' ڈیرن نے بہ زبان انگلش لرزاں آواز میں پوچھا۔

''یہ کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تماشا تب ہوگا جب تم یا یہ لڑکی کسی کو مدد کے لیے پکار دو گے۔''

لڑکی اور ڈیرن نے سخت حواس باختہ نظروں سے ان درختوں کی جانب دیکھا جہاں کسی نامعلوم برکش کی نوکیلی پھونی قبر پر مقامی محافظ اوندھا پڑا تھا۔

عمران نے لڑکی کی گردن پر یخ بستہ دھار کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اُدھر کیا دیکھتی ہو۔ ان میں سے دو وفات پا چکے ہیں اور تیسرا اپاہج بے ہوش ہے۔ لہٰذا یہ جان لو کہ ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ جو کہا جا رہا ہے، چپ چاپ اس پر عمل کرو۔'' عمران نے اسے قبرستان کے عقبی دروازے کی طرف دھکیلا۔

''لیکن.....'' ڈیرن نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن کچھ نہیں۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم اپنی سلامتی کے حساب سے بہت غلط جگہ پر بہت غلط وقت پر پائے گئے ہو۔ تمہارے سارے محافظ ان کی ساری بے مثال مہارت اور ان کا سارا جدید اسلحہ بھی فی الوقت تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ لاش بننے کے بجائے چپ چاپ آگے بڑھو۔''

ڈیرن مناسب جسم کا دراز قد شخص تھا تاہم اُس کے طور اطوار بتاتے تھے کہ وہ اس قسم کی صورتِ حال سے بالکل ناآشنا صرف ایک بزنس مین ہے۔

میں اور عمران ان دونوں کو تیزی سے دھکیلتے ہوئے قبرستان کے عقبی چھوٹے دروازے تک لائے۔ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر مائرہ اور جادو رائے کا ہرکارہ بہروزہ سفید وین میں موجود تھا۔ وین جھاڑیوں کے عقب میں تقریباً کیموفلاج تھی۔ ایک دو راہگیروں نے حیرت زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھا لیکن تب تک ہم تاریک شیشوں والی اس وین میں سوار ہو چکے تھے۔ یہ سارا آپریشن نہایت تیز رفتاری سے صرف دو یا تین منٹ میں مکمل ہوا تھا۔ وین میں پہنچتے ہی لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈیرن کی ہلکی نیلی آنکھوں میں بھی حیرت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ غالباً اسے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے لاؤ لشکر کے باوجود دو افراد نے اسے یوں اچک کر اس گاڑی میں لا بٹھایا ہے۔

☆☆☆

14 گھنٹے بعد ہم پھر لاہور میں تھے اور اسی نامعلوم عمارت میں جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمیں واپس بھی اسی طرح لایا گیا، جیسے لے جایا گیا تھا۔ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں تھیں اور ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کن راستوں سے گزرے ہیں۔ مجھے اور عمران کو پھر اسی آرام دہ اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا جہاں سے ہم علی الصباح روانہ ہوئے تھے۔ مائرہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ حشام بھی فکرمند دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ جب ہم ناشتے سے

فارغ ہوئے تھے، انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف مائرہ قدرے ملائم آواز میں بول رہی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے کہا۔ ''مسٹر تابش! ڈاکٹر جاذبہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ ''ڈاکٹر جاذبہ؟ کیا وہ مزید مار پیٹ کا ارادہ رکھتی ہے؟''

''تابش! وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ رامے صاحب بھی اس پر بہت خفا ہوئے ہیں۔ اسے اجازت کے بغیر تمہیں اسپتال سے نکالنا نہیں چاہیے تھا۔ بعد میں اس نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، وہ بھی کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے..... لو تم بات کرو۔''

دوسری طرف مائرہ نے ریسیور یقیناً ڈاکٹر جاذبہ کو تھمادیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''میں نے..... جو کچھ کیا..... غلط تھا۔ میں اس وقت اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔ آئی ایم سوری!''

''سوری تو شاید مجھے بھی کہنا چاہیے۔ میں نے تمہیں اٹھا کر بُری طرح دیوار پر پٹخا تھا۔''

''غلطی میری ہی تھی۔'' وہ منمنائی۔

یقیناً مائرہ اس کے سر پر ہی کھڑی تھی۔ جاذبہ معذرت کے الفاظ تو بول رہی تھی مگر محسوس ہوتا تھا کہ یہ الفاظ بس اس کی زبان تک ہی ہیں، دل میں نہیں ہیں۔

جاذبہ سے بات ختم ہوئی تو میم مائرہ نے ریسیور دوبارہ تھام لیا۔ ''مسٹر تابش! کل جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اس سے ہمارے لیے کچھ مشکلات تو پیدا ہوں گی لیکن مثبت پہلو یہ ہے کہ ڈیرن اور اس کی ہونے والی بیوی اب ہمارے پاس ہیں۔ رامے صاحب ڈیرن سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔''

''ڈیرن کی بیوی؟ وہ کون؟''

''وہی لڑکی جو اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس کی ہونے والی بیوی ہے۔ ایلی نام ہے اس کا۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ ہم اسے ڈیرن کی بیٹی سمجھتے رہے تھے۔ درمیانی جسامت کی تھی مگر خوش شکل تھی اور بہت چست و چالاک نظر آتی تھی۔ میں نے ایک اور بات نوٹ کی۔ اس لڑکی یعنی ایلی کا ذکر کرتے ہوئے میم مائرہ کے لہجے میں عجب سی تلخی اتر آئی تھی۔

مائرہ واضح الفاظ میں اظہار تو نہیں کر رہی تھی تاہم وہ محسوس کی اور میری آج والی کارروائی سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ وہ اپارٹمنٹ میں ہمارے لیے کچھ مزید سہولتوں کا اضافہ کر رہی تھی۔ ڈاکٹر جاذبہ کی زبانی اس نے جو ''سوری'' کہلوایا تھا، اس کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی۔

میم مائرہ سے بات ختم ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پنجابی فلموں کی ہیروئن کے ڈیل ڈول والی ہما عروج ہمارے اپارٹمنٹ میں آدھمکی۔ وہ ہماری کل والی ساری کارروائی سے آگاہ ہو چکی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ڈیرن فورڈ اور اس کی گرل فرینڈ ایلی اب یہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہما کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ ایک بہت بڑی کارروائی ہے جو ہوئی ہے۔ نیوز پیپرز اور الیکٹرانک میڈیا پر یقیناً تہلکہ مچ چکا ہوگا۔ ایک ارب پتی شخص کے ایسے اغوا سے بے شمار لوگ سکتہ زدہ ہوں گے۔

میں نے کہا۔ ''ہما! اب آئندہ کیا ہوگا؟''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''ڈیرن صاحب اب رامے کے شکنجے میں آگئے ہیں۔ اب پکی بات ہے کہ ان کے ساتھ کافی ڈھیں پٹاس ہوگی۔ اب ڈیرن صاحب کی زبان کا تالا کھل کر رہے گا۔''

''کیا ہے اس تالے میں؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''وہی جس نے میم مائرہ اور رامے جی کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ پُٹھے سیدھے تجربے کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔''

''کیا یہ ڈاکٹر شادالا کوئی معاملہ ہے؟''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''تم نے میرے ساتھ بھی ضرور کوئی ڈھیں پٹاس کرا دینی ہے۔ خیر ڈرتی شرتی تو میں ہوں نہیں۔ جو دل میں آئے وہی کرتی ہوں۔''

''تو پھر کر دو نا دل کی۔''

اس نے اپنی آواز کچھ اور پست کر لی اور رازداری کے انداز میں بولی۔ ''تمہیں یہ سن کر ضرور بہت حیرانی ہوگی کہ یہ ڈیرن صاحب اور میم مائرہ، میاں بیوی رہے ہیں۔''

''اوہ..... یہ تو انکشاف ہے..... تو اب طلاق ہو چکی ہے؟''

''طلاق تو چھوٹی شے ہے..... باقاعدہ دشمنی ہو چکی ہے۔ اٹ کتے کاویر۔''

''وجہ؟''

''وجہ وہی جو تمہیں بتائی ہے۔ یہاں جو بھی چیز بن رہی ہے، وہ کوئی دوا ہے یا دو یکسین۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ اس دوا کی بنائی کا پورا طریقہ میم مائرہ اور رامے جی کے پاس نہیں ہے..... اور شاید ان کے پاس بھی نہیں ہے جن کو

پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے۔ یعنی ڈیرن صاحب اور وہ لڑکی۔ وہ لڑکی تو خیر ڈیرن صاحب کی وجہ سے اس رگڑے میں آ گئی ہے۔ ڈیرن صاحب کی اصل سا جھے دار تو وہ موٹو جاپانی ہے جو ہیلی کاپٹر پر ان سے ملنے آئی تھی۔ کہتے ہیں وہ بھی ارب پتی عورت ہے اور دوائیوں شوائیوں کے کاروبار میں ہے۔"

"کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہ رہی ہو کہ یہ دوا یا ویکسین بنانے کا کچھ طریقہ میم مائرہ اور رامے کے پاس تھا اور کچھ ڈیرن اور جاپانی بوزو کی کے پاس؟"

"کچھ ایسا ہی چکر چلا ہے یہاں..... میم مائرہ اور ڈیرن صاحب میں جب ناچاقی ہوئی اور ڈھیس پٹاس کے بعد گل بات علیحدگی تک پہنچنے لگی تو میم مائرہ کچھ خاص کاغذ وغیرہ لے کر ڈیرن صاحب کے گھر سے نکل آئی۔ وہ اپنی طرف سے پورے کاغذ لے کر آئی تھی پر عجلت اور افراتفری میں وہ کچھ کاغذ وہیں چھوڑ آئی۔ یہ سارا چکر یہی تھا۔"

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے طور پر ویکسین تیار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر پورا طریقہ یا فارمولا کسی کے پاس نہیں ہے.....؟"

"میری چھوٹی سی عقل میں تو یہی بات آ رہی ہے ڈیئر صاحب!"

"تم فلموں میں ضرور فیل ہوئی ہو مگر..... لیکن تمہاری عقل چھوٹی نہیں ہے۔ رنگ عقل اور رنگ طبیعت والی..... عورت ہو تم....."

"ہوں تو "عورت" نا۔" اس نے فوراً میری بات پکڑی۔ "یہی تو رونا ہے اس فلم ڈرامے کا۔ بائیس سال کی لڑکی اور پچیس چھبیس سال کی عورت۔ میں تو پھر کچھ زیادہ عمر کی ہی ہوں۔"

"اچھا، کوئی نئی تازی سناؤ۔" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نئی تازی یہ ہے کہ ایک اچھی خبر ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "وہ جن دو لڑکیوں کی شامت آنے والی تھی، ان کو رامے جی نے معاف کر دیا ہے یا یوں کہہ لو کہ فی الحال معاف کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہی جو نحس قسم کا چکر چلنے والا تھا۔ دونوں گڑیوں کو نابینا کرنے والا اور پھر ان کو رامے جی کے آگے ڈالنے والا۔ سچی کہتی ہوں، مجھے بہت زیادہ دکھ تھا اس کا۔"

"پر یہ چمتکار ہوا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"سچی گل ہے کہ اس کی مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید میم مائرہ نے ہی ان دونوں بیچاریوں پر ترس کھایا ہے اور رامے جی کو کچھ سمجھایا ہے۔"

"لیکن ان کی آنکھوں میں تو دوا ڈالنا شروع کر دی تھی تمہاری ملازمہ فرزانہ نے۔"

"فرزانہ تھوڑی ڈال رہی تھی۔ وہ تو جیسے ڈاکٹر کہہ رہا تھا، ویسے کر رہی تھی۔ شکر ہے کہ یہ کام بیچ میں ہی رک گیا نہیں تو پورا اوپراڈھیس پٹاس ہو جانا تھا دونوں کی آنکھوں کا۔ اب بھی دونوں بیچاریوں کو کچھ دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے۔ شاید کوئی عینک شینک لگانا پڑے گی۔"

میں نے دل میں سوچا..... میم مائرہ ایسی رحم دل لگتی تو نہیں ہے۔ سرخ بالوں کے نیچے اس کی پیشانی پر ہر وقت ایک سفاک چمک جھلک دکھاتی تھی۔ کوئی وجہ ہو گی جس کے سبب ان لڑکیوں کی آنکھوں کو بخشا گیا (یہ عقدہ دو روز بعد کھلا کہ اصل بات کیا ہوئی ہے)

☆☆☆

اس پُرآسائش اپارٹمنٹ میں ہم چاروں علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہائش پذیر تھے۔ بہرطور ہماری حیثیت قیدیوں کی سی تھی۔ دو دن پہلے میرے اور عمران کے علاوہ ماہین اور حشام کے ویڈیو بیان بھی ریکارڈ کیے گئے تھے جس میں ہم نے اپنے لواحقین کو بتایا تھا کہ ہم بالکل خیر خیریت سے ہیں اور اپنی مرضی سے کسی "اہم کام" کے لیے اپنے قریبی دوستوں میں موجود ہیں۔ جلد ہی ہماری واپسی ہو جائے گی۔ میم مائرہ کے بقول یہ پیغامات ہمارے اپنوں تک پہنچا دیے گئے تھے۔

مجھے زیادہ فکر ماہین کی طرف سے ہی تھی۔ کچھ بھی تھا، وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کی غیر موجودگی زیادہ مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ وہ اس صورتِ حال پر بہت فکرمند تھی۔ رہی سہی کسر حشام کے رویے نے پوری کر دی تھی۔ حقیقتاً ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ شادی سے پہلے ہی ایک شوہر کی طرح اس پر اپنا حق جتانا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے حشام کو اپنے پاس بلایا اور سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو حشام! ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ عمران کے ساتھ تمہاری اور ماہین کی کھٹ پٹ اس مصیبت میں اضافہ کرے گی۔"

وہ بوجھل لہجے میں بولا۔ "انکل تابش! میں نے قسم کھائی تھی کہ اب ماہین کو کسی بات پر ٹوکوں گا اور نہ کبھی اس سے بحث کروں گا۔ میں ہر طرح سے اسے خوش رکھنا چاہتا

تھا..... اور اب بھی یہی چاہتا ہوں..... لیکن.....'' وہ بات مکمل نہ کرسکا اور اس کی آنکھوں میں جھلاہٹ اور غصے کی سرخی سی دوڑ گئی۔

''شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ عمران کی موجودگی تمہیں پریشان کرتی ہے؟''

''یہ..... یہ میرے بس میں نہیں ہے انکل..... میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کسی کا سایہ بھی اس پر برداشت نہیں کرسکتا۔''

میں اس موقع پر حشام سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ بھی اسی طرح اس سے محبت کرتی ہے مگر یہ سوال حشام کو مزید بھڑکاتا۔ میرا اپنا تجزیہ یہی تھا کہ ماہین حشام کے سلسلے میں محبت سے زیادہ تعلق اور وفاداری کی اسیر تھی۔ حشام کے نامناسب اور سخت رویّوں کو بھی وہ فقط اس لیے برداشت کرتی تھی کہ وہ ایک عرصہ تک منگیتر رہے ہیں اور اس تعلق میں بڑوں کی مرضی بھی شامل تھی۔ دوسری طرف عمران تھا جو پانی کے ایک تند ریلے کی طرح اس کی ہستی سے ٹکرایا تھا اور اسے اندر سے لرزہ براندام کردیا تھا۔ وہ عمران کے لیے بہت خاص جذبات رکھنا شروع ہوگئی تھی۔ تو کیا ان جذبات کو محبت کہنا چاہیے تھا؟ اگر یہ محبت تھی تو پھر حشام کے ساتھ کیا تھا؟ کیا ایک عورت دو محبتیں کرسکتی ہے؟ پھر مجھے ماہین کی خالہ کی وہ باتیں یاد آئیں جو ایک روز اس نے بڑی اُلجھن کے عالم میں مجھ سے کی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''کسی وقت اسے لگتا ہے کہ ماہین کے اندر کوئی شدید قسم کی کشمکش چل رہی ہے۔ وہ جو شادی کے نام سے بھی بدکتی تھی، اب کہنے لگی ہے کہ حشام کے ساتھ اس کی شادی جلد سے جلد کردی جائے۔''

چند روز پہلے رامے نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کروائی تھی، اس کے سبب گھٹنے پر کچھ زیادہ ہی چوٹ آگئی تھی۔ یہ چوٹ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ اس کو ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ میم مائرہ کے کہنے پر مجھے عمارت کے اسپتال والے پورشن میں لے جایا گیا۔ میرے ہاتھ اب باندھے نہیں جارہے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ جب تک میرے ساتھی ان کی تحویل میں ہیں، میں کوئی مہم جوئی نہیں کرسکتا۔

مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں بٹھادیا گیا۔ ڈاکٹر کے آنے میں شاید ابھی کچھ دیر تھی۔ میں اس کا انتظار کررہا تھا جب کسی قریبی کمرے سے رونے چلّانے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں تدھم تھیں مگر سنی جارہی تھیں۔ کوئی لڑکی انگلش میں منت سماجت کررہی تھی۔ ''پلیز..... پلیز..... ایسا مت کریں..... یہ بالکل غلط ہے۔ اُف..... چھوڑیں مجھے..... فار گاڈ سیک.....'' وہ دہائی دے رہی تھی پھر اس نے مدد کے لیے کسی کو پکارا۔ میں نے غور سے سنا۔ وہ ڈیرن کا نام لے رہی تھی۔

اب میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ وہی خوب صورت امریکی لڑکی تھی جو اریب پتی بزنس مین ڈیرن فورڈ کے ساتھ پکڑ کر یہاں لائی گئی تھی۔

کیا پوچھ گچھ کے لیے اس پر تشدد ہورہا تھا یا پھر کوئی اس سے زور زبردستی میں مصروف تھا؟ لیکن کچھ بھی تھا، یہ اسپتال کا ایریا تھا۔ یہاں اس طرح کا کیا ہوسکتا تھا۔ لڑکی کی دہائی پھر سنائی دی۔ ''اسے پیچھے ہٹاؤ مجھ سے..... میرے قریب نہ لاؤ۔''

''یہ تو ہونا ہی ہے۔'' بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''آرام سے بھی ہوجائے گا اور شور شرابا کرنے سے بھی..... اور یہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے۔''

اسی دوران میں میرے گھٹنے کی مرہم پٹی کرنے والی لیڈی ڈاکٹر بھی آگئی۔ اس نے کپاؤنڈر کی مدد سے میرے زخم کو صاف کیا۔ اسپیشل بینڈیج کی اور ایک انجکشن بھی لگایا۔ یہ اینٹی بائیوٹک تھا۔ یہ مقامی ڈاکٹر مجھ سے کچھ ڈری ڈری نظر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''بھئی، آپ جیسے لوگوں سے ڈرنا تو چاہیے..... ڈاکٹر جاذبہ کی کمر کا کباڑا ہوگیا ہے۔ ٹھیک طرح سے بیٹھ بھی نہیں سکتی۔''

''اور جو کچھ اُس نے میرے ساتھ کیا تھا، وہ بھی آپ لوگوں کو پتا ہی ہوگا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے ادویات کے بارے میں ہدایات دے کر باہر چلی گئی۔

کسی قریبی کمرے سے اُبھرنے والی آوازیں اب تھم چکی تھیں تاہم میرا ذہن مسلسل ان میں اُلجھا ہوا تھا۔ ہلکی نیلی آنکھوں والی وہ ایلی نامی لڑکی بڑی تیز طرار لگتی تھی مگر یہاں آکر اس کی ساری طراری ہوا ہوچکی تھی۔ نہ جانے کس مصیبت میں تھی۔

میں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس آگیا۔ گارڈز نے اسٹیل کے سلائڈنگ ڈور کو ان لاک کرکے مجھے اندر پہنچایا اور دروازہ پھر مقفل کردیا۔ میں لنگڑاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تو وہاں ہما عروج پہلے سے آئی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بتارہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ رسمی

کلمات کے بعد وہ بولی۔ ''خدا جانے تمہیں پتا ہے یا نہیں..... یہاں کسی سفر کی تیاری ہو رہی ہے۔''

''کیسا سفر؟''

''یہ تو ابھی ٹھیک سے مجھے بھی نہیں پتا مگر کوئی لمبا چکر ہی لگتا ہے۔ کہیں دور جانے کا پروگرام ہے۔ میم مائرہ اور رامے جی میں کل چار پانچ گھنٹے گل بات ہوئی ہے پھر ایک ملازم سے نقشہ وغیرہ بھی منگوایا تھا انہوں نے۔''

''ہوسکتا ہے کہ ڈیرن فورڈ سے پوچھ گچھ میں انہیں کسی اہم بات کا پتا چلا ہو۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔''

اگر واقعی کہیں جانے کا پروگرام ہوا تو کون جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہری گل ہے، وڈے لوگ ہی جائیں گے..... یعنی میم مائرہ اور رامے جی۔'' پھر وہ ذرا ٹھٹکی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''رامے جی سے ایک اور گل یاد آگئی..... اور کوئی معمولی نہیں، بڑی ڈھیں پٹاس قسم کی گل ہے۔'' ہما کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔

''کیا ہوا رامے جی کو؟''

''رامے جی کو نہیں، کسی اور کو ہوا ہے..... میں کئی واری سوچتی تھی کہ میم مائرہ اور ڈیرن صاحب میں طلاق کیوں ہوئی؟ اتنا امیر کبیر بندہ میم مائرہ کے ہتھ سے نکل گیا..... اب اس گل کا پتا چل رہا ہے کہ اس کی وجہ یہی جالاک چلتر کڑی تھی جس کا نام ایلی ہے۔ اب یہ ایلی کے کرتوت بھی دیکھو۔ ڈیرن صاحب اس کے باپ کی عمر کا ہے اور وہ اس سے ویاہ رچاتے کے چکر میں تھی۔ بہرحال اب وہ میم مائرہ کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور میرا خیال ہے کہ میم مائرہ نے اس سے بڑا ڈھاڈا بدلہ لیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

ہما اپنی آواز مزید دھیمی کرکے بولی۔ ''جہاں تک میری سوچ کے گھوڑے دوڑتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ رامے جی کا دھیان اس کڑی ایلی کی طرف لانے میں کچھ نہ کچھ ہتھ میم مائرہ کا بھی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ رامے اس لڑکی ایلی کے پیچھے پڑ گیا ہے؟''

''پیچھے تو وہ کسی کے بھی پڑ سکتا ہے پر اب اس کا پیچھے پڑنا کچھ اور طرح کا ہو چکا ہے۔'' ہما نے ذرا توقف کیا اور دائیں بائیں دیکھ کر بولی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میری دونوں کڑیوں (لڑکیوں) کی جان رامے جی سے چھوٹ گئی ہے۔ اب ان کی آنکھوں میں دوا شوا نہیں ڈالی جائے گی۔''

''ہاں..... اور تمہیں حیرانی بھی تھی۔''

''اب وہی کام اس انگریز کڑی ایلی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بس اب آٹھ دس دن کی پروہنی (مہمان) ہیں۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ داد و فریاد بھی یاد آئی جو میں نے اسپتال کے کمرے میں سنی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ آج کل خوبرو ایلی کو اسی سفاک گل سے گزارا جا رہا ہے جس سے پندرہ بیس روز میں بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی بدنمائی کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے یہ شیطان صفت جادوگرنی کی ایسی اختراع تھی جس پر جتنی بھی لعنت بھیجی جاتی، کم تھی۔

ایک دن ہما عروج نے مجھے بتایا تھا کہ آنکھوں میں وہ مہلک ڈراپس ڈالنے سے کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی پھر ایلی کیوں چلا رہی تھی؟ وجہ غالباً یہی تھی کہ اسے پتا چل چکا تھا کہ یہ ڈراپس اس کی آنکھوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

کئی دن اور گزر گئے مگر سفر کے بارے میں کوئی نئی بات سننے میں نہیں آئی۔ میرے گھٹنے کی چوٹ کافی بہتر ہو گئی تھی۔ عمران زیادہ وقت اپنے کمرے میں بند رہ کر گزار رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حشام اسے دیکھ کر خوامخواہ ٹینشن میں چلا جاتا ہے۔ ہاں، کسی وقت وہ میرے کمرے میں ضرور چلا آتا اور اپنی باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ اندر ہی اندر کوئی پلان بن رہا ہے۔ میری طرح اس کے ذہن میں بھی یہ سوال بار بار اٹھتا تھا کہ یہ جاپانی اسکالر ڈاکٹر شاکون ہے؟ زندہ ہے یا مر چکا ہے اور اس سارے معاملے سے اس کا کیا تعلق ہے؟

حشام بہت سینٹی مینٹل ٹائپ کا بندہ تھا۔ کسی وقت اتنا اچھا لگتا کہ حیرانی ہوتی مگر کچھ ہی دیر بعد اتنے بُرے رویے کا مظاہرہ کرتا کہ طیش آنے لگتا۔ اب پھر وہ محبت سے ماہین کے آگے پیچھے گھومتا نظر آتا تھا۔ عمران کے ساتھ اس کی بس واجبی سی بات ہی ہوتی تھی البتہ میرے ساتھ کھل کر بات کر لیتا تھا۔ ایک روز میں اپنے بند کمرے میں مختلف ورزشیں کر رہا تھا کہ دروازے پر شائستہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے حشام اور ماہین کھڑے تھے۔

کچھ دیر تک عمومی گفتگو ہوتی رہی پھر حشام نے

انکشاف کیا۔ ”میں نے انٹرکام پر دو تین دفعہ میم مائرہ سے بات کی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ بات چیت آپ کی اجازت کے بغیر ہوئی۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ اور کون سے کام ہیں جو تم یہاں میری اجازت سے کرتے ہو۔

حشام نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اس نے میم مائرہ سے ہم چاروں کی رہائی کی بات کی ہے۔ اسے یقین دلایا ہے کہ ہماری رہائی ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ رہائی کے بدلے اس نے اپنی طرف سے میم مائرہ کو ایک خطیر رقم کی پیشکش بھی کی ہے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ایک احمقانہ حرکت کا مرتکب ہوا ہے پھر بھی میں نے پوچھا کہ اس کی اس ”سفارت کاری“ کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ وہ ماہین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں وہی بات بتاؤں گا جو ہوئی ہے۔ میم مائرہ نے آپ اور عمران کے بارے میں صاف جواب دے دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لوگ آپ دونوں سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہیں۔ شاید آپ کو اپنے ساتھ یہاں سے کہیں لے جانا چاہ رہے ہیں۔“

”اور تم دونوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”وہ کہتی ہے کہ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے مگر ابھی نہیں، بعد میں..... مگر جب اس نے آپ دونوں کے بارے میں صاف انکار کر دیا تو پھر میں نے اس بارے میں اس سے مزید کوئی بات نہیں کی۔“

میں نے دھیان سے حشام کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ پہلے تو نہیں لیکن اب وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنے اور ماہین کے حوالے سے میم مائرہ کی منت سماجت بھی کر ڈالی ہو۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا خواہاں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ہمارے لیے کئی طرح کے خطرات تھے۔ دوسرے عمران کی وجہ سے بھی ہر وقت اُس کی دم پر پاؤں آیا رہتا تھا۔

جو کچھ حشام بتا رہا تھا، وہ میرے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنی یہ بات اہم تھی کہ وہ میرے اور عمران کے متعلق میم مائرہ کے کنفیس بتا رہا تھا۔ کیا واقعی مائرہ اور جادو راے ہم سے کوئی کام لینا چاہ رہے تھے۔ ابھی تک اس بارے میں کوئی بات ہمارے سامنے تو نہیں آئی تھی۔

مزید چار پانچ روز گزرے اور پھر ایک دن وہ سب

نخریلی بیوی

جیک چوری کے الزام میں پکڑے جانے کے بعد جج کے پاس پیش ہوا۔

جج نے سوال کیا۔ ”اس بات کو تم قبول کرتے ہو کہ تم نے تین بار کپڑے کی دکان میں چوری کی؟“

”جی جناب میں قبول کرتا ہوں۔“ جیک نے جواب دیا۔

جج نے پھر سوال کیا۔ ”کیا تم بتانا گوارا کرو گے کیا چیز تم نے تین بار چوری کی؟“

جیک نے جواب دیا۔ ”عالی جناب! میں نے عورتوں کی ایک شرٹ چوری کی۔“

”صرف ایک شرٹ؟“ جج نے پوچھا۔ ”مگر تم نے تو تین بار ایک دکان میں چوری کی؟“

”جی جناب میں تین بار دکان میں داخل ہوا۔ دو بار میں دکان میں اس لیے گیا کہ چرائی ہوئی شرٹ واپس کر دوں۔“

”واپس شرٹ؟ میں سمجھا نہیں۔“ جج نے کہا۔

جس پر جیک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی میری بیوی گھوریا کو شرٹ کا ڈیزائن پسند نہیں آیا اسی لیے دوبار بدلنے گیا تھا کہ تیسری بار پکڑا گیا۔“

کچن کے اصول

حامد تازہ تازہ کالج کریڈٹ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بڑی کمپنی میں نوکری کی درخواست دی۔

انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو مالک نے حامد کو دیکھتے ہی کہا۔

”ہماری کمپنی کے اصولوں میں ایک اصول یہ ہے کہ کام کرنے والے کو صاف ستھرا رہنا ضروری ہے اور میں امید کرتا ہوں تم سے کہ جب تم میرے کمرے میں داخل ہوئے تو تم نے اپنے جوتے کو باہر رکھے پائدان پر اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لیا ہوگا؟“

”جی جناب میں نے ایسا ہی کیا۔“ حامد نے جواب دیا۔

”اس پر مالک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔“ ایک اور چیز میں بتاتا چلوں کمپنی کے اصولوں کے مطابق سچ بولنا بہت ضروری ہے۔ اور دروازے کے باہر کوئی پائدان نہیں ہے، تمہاری اطلاع کے لیے۔“

(جاوید کاظمی، کراچی)

کچھ سامنے آ گیا جس نے ہمیں زچ کر رکھا تھا۔ ہما عروج مجھ سے ملنے آئی۔ وہ چھوٹتے ہی سرگوشی کے لہجے میں بولی۔

''ڈپٹی جی! تم اور وہ منڈا عمران تیاری پکڑ لو۔ تم دونوں میم اور راے جی کے ساتھ کہیں جا رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب مہینا ڈیڑھ مہینا تم دونوں یہاں نظر نہیں آؤ گے۔''

''جا کہاں رہے ہیں؟''

''یہ تو مجھے چنگی طرح پتا نہیں چل سکا پر میم مائرہ اور راے جی کے درمیان ہونے والی بڑی خاص قسم کی گل بات میرے کانوں میں پڑی ہے۔ دونوں میں ٹھیک ٹھاک بحث ہو رہی تھی۔ میم مائرہ پر تم دونوں کا بہت رعب پڑ گیا ہے۔ وہ راے جی کو سمجھا رہی تھی کہ تم دونوں بہت کام کے بندے ہو۔ بہت فائدہ دے سکتے ہو آگے جا کر۔ راے جی کا دل تم دونوں کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم دونوں کی وجہ سے ان کے قریبی ساتھی ایبٹ آباد میں مارے گئے تھے..... جاذبہ کی بہن کا خون بھی ہوا تھا۔ وہ ان موتوں کو بھول نہیں سکتا۔ راے جی نے یہاں تک بھی کہا کہ تم دونوں کو زندہ سلامت چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے دیکھنا ان کے لیے ایک عذاب کی طرح ہے۔''

''تو پھر سوچ کیا رہا ہے۔ مار ڈالے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ میم مائرہ کا ہی جگرا ہے کہ اس نے کسی نہ کسی طرح راے جی کو رام کیا ہے۔ وہ تم دونوں اور خاص طور سے تمہاری دلیری سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ عمران کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ جو آواز سنے بغیر بات سمجھنے کا فن جانتا ہے، وہ ان کے لیے کہیں نہ کہیں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس بارے میں تو راے جی کا خیال بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔''

ہما عروج کی باتیں سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے ہما سے پھر دریافت کیا۔ ''تم نے اتنا کچھ سنا لیکن یہ اندازہ نہیں لگا سکی ہو کہ وہ کہاں جانے کی بات کر رہے ہیں؟''

''تمہیں بتایا تھا نا کہ چند دن پہلے ایک نقشہ ان دونوں کے سامنے تھا۔ سوچ کے گھوڑے تو یہی کہتے ہیں کہ یہ جگہ پاکستان سے باہر ہو گی شاید..... ہاں، ایک گل اور یاد آئی۔ ان دونوں کی باتوں میں گرم کپڑوں، خاص طرح کے دستانوں اور جرابوں وغیرہ کا ذکر بھی ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہت ٹھنڈی ٹھار قسم کی تھاں (جگہ) ہو۔''

ہما کی باتیں میری دھڑکن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ذہن بھی نسبتاً تیزی سے مصروفِ عمل تھا۔ میں نے دبے لہجے میں کہا۔ ''ہما! یہ سفید سانپوں کا کیا چکر ہے؟ یہاں پر اس رنگ کے سانپ موجود ہیں۔''

''مجھے اس بارے میں اتنا پتا نہیں..... ہاں، یہ کہا جاتا ہے کہ کئی دواؤں میں سانپ کا زہر استعمال ہوتا ہے۔ باقی اللہ دیاں، اللہ جانے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھی کوئی سانپ وغیرہ کا چکر ہی ہو۔ بہت ٹھنڈے علاقوں میں اس قسم کے سفید سانپ پائے جاتے ہیں۔''

''مجھے تو بس کالے سانپ کا پتا ہے جو اپنے آسے پاسے کی ہر سوہنی زنانی کو ڈس لیتا ہے۔'' وہ اداسی سے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں بولی جیسے موضوع بدلنا چاہ رہی ہو۔

''کہیں تم جادو راے کا ذکر تو نہیں کر رہیں؟''

''اور کس کا کروں گی۔ وہ ڈیرن صاحب کی ساتھی لڑکی..... کیا نام ہے اُس کا..... ایلی..... کل رات ڈسی گئی نا۔''

مجھے شاک محسوس ہوا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ ایلی کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی جو کچھ ہوا، اس کا دکھ تھا۔ پہلے پندرہ بیس روز میں بتدریج اس کی بینائی ختم کی گئی پھر اسے بدنما و بدنظر ت جادو راے کے آگے ڈال دیا گیا۔ بیوٹی اینڈ بیسٹ سے ملتی جلتی کہانی تھی یہ۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ہما! کیا تمہارا یہ جادو راے اس طرح اپنی بدصورتی چھپاتا ہو گا؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے ڈپٹی جی!.....! لیکن ایک گل تو ہے۔ راے کی آواز بہت سوہنی ہے۔ لگتا ہے محمد علی یا ایتا بھ بچن جیسا کوئی ایکٹر بول رہا ہو۔ کسی وقت تو نشیلے پان سے مست ہو کر گانا شانا بھی گنگنانے لگتا ہے۔ ایلی کی طرح جس کڑی نے بھی اس کو دیکھا نہ ہو، وہ تو اس کی آواز سن کر یہی سمجھے گی کہ پتا نہیں کتنا سوہنا بندہ ہے۔''

''تم نے بھی کبھی سنا ہو گا اس کا گانا؟'' میں نے روانی میں پوچھا۔

اس کے خوبصورت چہرے پر کراہت نمودار ہو گئی۔ ناک چڑھا کر بولی۔ ''کاش، صرف گانا ہی سنا ہوتا۔''

نوجوان خوبرو ایلی کا سراپا میری نگاہوں میں گھوما اور افسردگی بڑھ گئی۔ ''کیا وہ دوبارہ کبھی دیکھ پائے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو کوئی ڈاکٹر ہی بتائے گا۔ فی الحال تو وہ پوری پوری اندھی ہے۔ پچھلے اتوار کو رو رہی تھی۔ فرزانہ نے مجھے

بتایا انگریزی میں کہہ رہی ہے کہ نظر بالکل بند ہونے سے پہلے میں ایک بار کھلی تھاں (جگہ) پر جانا چاہتی ہوں۔ آسمان دیکھنا چاہتی ہوں..... پھل بوٹوں پر نظر ڈالنا چاہتی ہو....." کچھ توقف کرکے ہمانے دوبارہ کہا۔ "میم مائرہ نے ڈھاڈا بدلہ لیا ہے اُس سے۔ ڈیرن صاحب تو کیا ملتا تھا اسے، آنکھیں بھی گئیں..... اور عزت بھی۔"

اگلے تین چار روز میں وہی کچھ ہوا جس کا ہمیں اندازہ تھا (میں عمران کو بھی وہ سب کچھ بتا چکا تھا جو ہما عروج سے مجھے معلوم ہوا تھا) ایک روز میم مائرہ نے میرے اور عمران کے ساتھ طویل نشست کی۔ اس نے صاف لفظوں میں ہمیں بتایا کہ یوں تو اس کے اور رامے کے پاس بھی ایک سے بڑھ کر ایک جی دار اور جانباز بندے ہیں مگر ہم دونوں نے ڈیرن اور ایلی کو یہاں لانے میں جس طرح کی کارکردگی دکھائی ہے، وہ بہت متاثر کن ہے۔

اس تمہید کے بعد اس نے کہا۔ "میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھوں گی۔ صاف بات کروں گی۔ پچھلے دنوں تم دونوں نے رامے جی اور ان کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ رامے جی کے دل و دماغ پر نقش ہے۔ وہ تمہیں مارنے کا تہیہ کر چکے تھے اور موت بھی کوئی معمولی نہیں۔ یہ ایسی موت ہوتی جس میں بندہ خود موت کے لیے ترستا ہے اور فریادیں کرتا ہے۔ بہرحال میں تفصیل میں جاکر تمہیں ڈرانے دھمکانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ مختصر یہ ہے کہ میں رامے کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں کہ اگر تم ایک اہم ٹارگٹ کے حصول میں نیک نیتی سے ہمارا ساتھ دو تو رامے جی، ماہین سمیت تم چاروں کو مناسب وقت پر آزاد کردیں گے..... نہ صرف آزاد کریں گے بلکہ عداوت کا وہ مہلک رشتہ بھی ختم ہوجائے گا جو اس وقت بے حد خطرناکی کے ساتھ تمہارے درمیان موجود ہے۔"

میں نے کہا۔ "میم مائرہ! آپ اصل بات کی طرف آئیں گی تو ہم کچھ کہہ سکیں گے۔"

میری اس بات کے جواب میں مائرہ نے جو کچھ کہا۔ اور جو نتیجہ ہمیں نے اخذ کیا، وہ کچھ یوں تھا۔

.....میم مائرہ اور جادو رامے پوری تیاری کے ساتھ یہاں سے کہیں جانا چاہ رہے تھے۔ اس نے جگہ کی نشاندہی نہیں کی تاہم وہ کوئی بہت سرد جگہ تھی اور ہمیں وہاں پہنچنے میں نو دس دن لگتے۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ جگہ پاکستان میں ہے یا پاکستان سے باہر ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہا کہ یہ سفر اسی زندگی بخش ویکسین کے سلسلے میں ہے جس کی تکمیل یہاں اس نامعلوم عمارت اور یہاں کی لیبارٹری میں کی جارہی ہے۔ مائرہ کا کہنا تھا کہ طب کی تاریخ میں یہ ویکسین ایک بہت بڑا انقلاب ہوگی۔ لوگ ششدر رہ جائیں گے..... وغیرہ وغیرہ۔

مائرہ کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ویکسین کے فارمولے میں غالباً کوئی کمی ہے جس کو پورا کرنے کے لیے یہ سفر اختیار کیا جارہا ہے۔ کوئی خاص قسم کا زہر تھا یا پھر کوئی جڑی بوٹی تھی جو کسی مخصوص علاقے میں پائی جاتی تھی۔ یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ جو چیز بھی تھی، اس کے حصول میں سنگین قسم کا خطرہ پوشیدہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ کچھ لوگوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی ہو۔

دیکھا جاتا تو فی الوقت میں اور عمران کسی بھی طرح کی سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ خاص طور سے ماہین اور حشام کے یہاں ہوتے ہوئے ہمارے ہاتھ مکمل طور پر بندھے تھے۔ جادو رامے ایک خونخوار شخص کا نام تھا۔ وہ ماہین اور حشام کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا تھا۔

بہرطور ایک شرط ایسی تھی جو میں اور عمران، میم مائرہ سے منوانے میں کامیاب رہے۔ پہلے ہم دونوں نے ایک طرف جاکر مشورہ کیا پھر میم مائرہ سے کہا کہ اس کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس سفر سے واپسی میں ہمیں ڈیڑھ ماہ سے زائد لگ سکتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس عرصے میں ہمارے دونوں ساتھی ماہین اور حشام یہیں پر رہیں۔ انہیں آزاد کیا جائے یا ایسی صورت نکالی جائے کہ وہ ہمارے ساتھ جائیں۔

مائرہ عیاری سے مسکرائی۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ دونوں تو اس معاہدے کی ضمانت کے طور پر یہاں موجود ہیں اور یہیں رہیں گے۔"

اس بات پر کافی بحث ہوئی۔ آخر مائرہ نے دوسرے کمرے میں جاکر جادو رامے سے مشورہ کیا۔ کھڑکی میں سے وہ ہمیں نظر آرہی تھی تاہم اس کی ہوشیاری کی داد دینا پڑی۔ بات کرتے ہوئے اس نے اپنا رخ پھیر رکھا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ عمران لپ ریڈنگ کا غیر معمولی ہنر رکھتا ہے۔

ہمیں توقع نہیں تھی کہ جادو رامے سے میم مائرہ کی گفتگو سے ہمیں فائدہ پہنچے گا مگر ایسا ہوگیا۔ میم مائرہ نے واپس آکر ہمیں بتایا کہ وہ اس سلسلے میں رامے جی کو قائل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ہمارے دونوں ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے (وہ کیوں قائل ہوا اور کیسے ہوا؟

اس کا پتا ہمیں کافی آگے جا کر چلا اور تب ہی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ جادو رائے کس قدر بے رحم شخص ہے)

☆☆☆

جب دو روز بعد ہم اس نامعلوم پُراسرار عمارت سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ باہر کس قدر سردی ہے۔ بہرحال اردگرد کے مناظر ہم اب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہماری آنکھوں پر وہی آئی ماسک یعنی سیاہ پٹیاں تھیں۔ ماہین اور حشام بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں ایک بار پھر اسی نیم گرم اسٹیشن ویگن میں بٹھایا گیا جس میں ہم اسلام آباد سے واپس لاہور پہنچے تھے۔ اب رات کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم محسوس ہوتا تھا۔ میرے اور عمران کے ہاتھ ایک بار پھر پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ ویگن کی اگلی نشست پر میم مائرہ بھی موجود تھی اور اس کی قدرے مردانہ آہنگ والی آواز گاہے بہ گاہے ہمارے کانوں تک پہنچتی تھی۔ اس کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ کم از کم ایک اور گاڑی بھی اس وقت ہمارے ساتھ ساتھ آ رہی ہے۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس دوسری گاڑی میں جادو رائے بھی موجود ہے۔

ماہین اور حشام بالکل خاموش بیٹھے تھے البتہ عمران کی زبان میں وقفے وقفے سے کھجلی ہوتی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ بولنا شروع کر دیتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ سفر کافی طویل ثابت ہوگا مگر صرف ایک گھنٹے بعد کسی نیم پختہ راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد گاڑی رک گئی۔ ہمیں باہر نکالا گیا۔ سردی نے مزاج پوچھا۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”کوئی دیہاتی علاقہ لگتا ہے۔ ہریالی اور گوبر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔“

”ہریالی کی آ رہی ہے۔ گوبر کی شاید تمہارے دماغ میں ہوگی۔“

”پلیز..... پلیز!“ میم مائرہ کی تیز درشت آواز ایک سرگوشی کی طرح ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ ”کسی کی کوئی آواز نہیں آنا چاہیے۔“

ہم خاموش ہو گئے پھر ایک گارڈ نے میرا اور دوسرے نے عمران کا بازو پکڑ لیا۔ یقیناً ماہین اور حشام کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ ان کی آنکھوں پر بھی پٹیاں تھیں۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان بڑی خاموشی سے قریباً ایک فرلانگ چلے پھر دفعتاً یوں محسوس ہوا کہ سردی کم ہو گئی ہے۔ ہمیں تھوڑا سا جھک کر چلنے کو کہا گیا کیونکہ ہم جس جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں چھت بہت نیچی تھی۔

”مجھے یہ کوئی سرنگ لگ رہی ہے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

عمران بولا۔ ”اور مجھے بارودی سرنگ لگ رہی ہے۔ لگتا ہے کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔“

کسی خطرے کے حوالے سے عمران کا اندیشہ درست نہیں تھا۔ ہم خیر خیریت سے چلتے رہے۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے علاوہ کم و بیش آٹھ دس افراد مزید ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ اچانک کسی کا پاؤں رپٹا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سُریلی کراہ سنائی دی۔ ”اوہ مائی گاڈ!“

میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ اسی امریکی لڑکی ایلی کی آواز تھی جسے میم مائرہ کے مشورے پر جادو رائے نے پہلے نظر سے محروم کیا تھا پھر اپنے تصرف میں لے آیا تھا۔

فوراً ہی جادو رائے کی گرج دار آواز بھی کانوں میں پڑی۔ اس نے لڑکی سے کچھ کہا تھا یا شاید اسے سنبھالا دیا تھا۔

سرنگ نما راستہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم مسلسل جھک کر چل رہے تھے اور سر بار بار کھردری چھت سے ٹکرا جاتا تھا۔ بالآخر ایک بار پھر سرد ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم کھلی جگہ پر تھے۔ جھاڑ جھنکاڑ میں چلتے ہوئے میم مائرہ نے بہت سخت آواز میں سرگوشی کی۔ ”بہت احتیاط سے۔ کوئی آواز نہ نکلے۔“

عمران جوابی سرگوشی سے باز نہیں رہ سکا۔ ”لیکن میم کوئی قدرتی آواز نکل جائے تو.....؟ میرا مطلب ہے چھینک وغیرہ“

وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ یقیناً اسے گھور کر رہ گئی ہوگی۔ ایک ایک گارڈ نے بدستور ہمارے بازو تھام رکھے تھے۔ ہم کسی بڑی گاڑی کے پاس جا کر رکے تھے۔ یہ کوئی کنٹینر نما شے لگتی تھی۔ ہمیں عقبی دروازے سے کنٹینر پر چڑھایا گیا۔ باسمتی چاول کی تیز خوشبو ہمارے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یقیناً اس کنٹینر پر چاول کی بوریاں لوڈ تھیں۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈیڑھ سو کے قریب آٹے کے تھیلے بھی ہیں۔ اسی سامان کے درمیان قریباً پانچ ضرب چھ فٹ کی جگہ ہمارے بیٹھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ ہم سے میری مراد میں، عمران، حشام، انچارج بہروز تھے۔ بعد ازاں گونگا فورمین جہانداں بھی ہمارے ساتھ آ گیا۔ ماہین ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ روانگی سے

پہلے ہی میم مائرہ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ ہمارے بجائے اس کے ساتھ سفر کرے گی۔ ہمارے درمیان جو ایگریمنٹ ہوا تھا، اس کے مطابق مائرہ نے ہر طرح ماہین کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔

کنٹینر کے گھپ اندھیرے میں پہنچ کر ہماری آنکھوں سے نہ صرف پٹی ہٹا دی گئی بلکہ عمران اور حشام کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ صرف میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔

عمران نے بہروز سے پوچھا۔ ”یہ ہم کس جگہ پائے جا رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ہمیں کچھ بھی بتانے کی اجازت نہیں اور بہتر یہی ہے کہ آپ خاموشی سے سفر کرو ورنہ ہمیں آرڈر ہے کہ آپ کی آنکھیں دوبارہ باندھ دیں۔“

عمران نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”ملاحظہ کیا آپ نے؟ میں کہتا تھا نا کہ میں زبان سے کم بات کرتا ہوں، میری نگاہیں زیادہ بولتی ہیں۔ میری اسی ادا پر مہوش حیات مری تھی۔ اس نے بھی کہا تھا کہ تم بہت بولتے ہو عمو جی! تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دینی چاہیے۔“

یہ کنٹینر ایک بار چلنا شروع ہوا تو پھر چلتا ہی چلا گیا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ ہم پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی طرف جا رہے ہیں۔ کسی وقت افغانستان کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ باسمتی چاول کی خوشبو مسلسل ہمارے دماغ کو چڑھ رہی تھی مگر یہ کچے چاول تھے، ہماری بھوک نہیں مٹا سکتے تھے۔ سردی نے مجھے تو بہت عرصہ پہلے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن باقیوں کی حالت ابتر تھی۔ خاص طور سے حشام کی۔ وہ ناز و نعم میں پلا ہوا امیر زادہ، ماہین کی نگاہوں میں جی دار بنتے بنتے سخت مصیبت میں آ پھنسا تھا۔

خدا خدا کر کے ایک جگہ یہ کنٹینر رکا۔ بہروز نے اپنی گھڑی دیکھ کر بتایا کہ دن کے بارہ بجے ہیں۔ یہ کوئی بارونق جگہ ہی لگی۔ باہر سے مدھم آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں مگر اتنی مدھم تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ٹریفک کا ہلکا سا شور خاص طور سے گاڑیوں کے ہارن سنائی دیتے تھے۔ یکایک میں اور عمران بُری طرح چونکے۔ کہیں پاس سے ہی کسی لاؤڈ اسپیکر پر بلند آواز ابھری اور ہلکی ہو کر اندر تک پہنچی۔ یہ مکھوں کے گیت کرتن کی آواز تھی جو کسی گوردوارے سے ابھری تھی۔

”تو کیا ہم ننکانہ صاحب یا حسن ابدال کے آس پاس ہیں۔“ میں نے سوچا۔ یہی سوال میں بہروز سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کے چہرے کی خشونت دیکھ کر چپ رہا۔ اسی دوران میں کنٹینر کے عقبی حصے سے کسی کی آواز آئی۔ آگے کی دو تین سفید بوریاں ہمارے سامنے سے سرکائی گئیں۔ گرما گرم دال چاول اور مچھلی کی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچی۔ کسی نے دو بڑے شاپر اندر کھسکا دیے۔ کچھ دیر کے لیے جو غلام گردش ہوا اس میں سے میری نظر گزر کر سامنے ایک سڑک پر پڑی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ سرما کی زرد کمزور دھوپ تھی۔ سامنے ہی ایک دکان کا بڑا سا بورڈ نظر آ رہا تھا ”گلزار ریسٹورنٹ۔“ نیچے پتا لکھا تھا۔ ”اسٹریٹ نمبر 8 جیوا روڈ۔۔۔ پٹھان کوٹ۔“

”پٹھان کوٹ!“ میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔

شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ سڑک پر جس طرح کی گاڑیاں گزر رہی تھیں اور جو راہگیر نظر آ رہے تھے۔ وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ ہم پاکستان میں نہیں..... نہ ہی افغانستان میں بلکہ انڈیا میں ہیں۔ لاہور اور لائن آف کنٹرول سے بہت دور پٹھان کوٹ میں۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ تنگ راستہ آیا جس میں سے جھک کر چلتے ہوئے ہم کل رات گزرے تھے۔

تو کیا وہ بارڈر پر موجود ان خفیہ سرنگوں میں سے کوئی ایک تھی جو اسمگلرز اور دیگر جرائم پیشہ افراد غیر قانونی آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ جواب اثبات میں تھا۔ ہم لاہور سے نکل کر بڑے ڈرامائی اور خطرناک انداز میں انڈیا پہنچ گئے تھے۔ مائرہ اور رائے نے وہی کچھ کیا تھا جو اکثر کریمنل کرتے ہیں۔

میم مائرہ جو گفتگو کرتی رہی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سفر کسی سخت سرد علاقے میں ختم ہوگا۔ پٹھان کوٹ تو بہت زیادہ سرد نہیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی ہمیں کافی آگے جانا ہے۔ عمران میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی اہم بات معلوم ہوئی ہے۔

شام تک مزید سفر کرنے کے بعد ہم کسی عمارت کے احاطے میں رکے۔ ہمیں کنٹینر سے باہر نکالا گیا۔ یہاں بلند چار دیواری تھی اور چاروں طرف پہاڑی علاقوں والے درخت تھے۔ سردی بلا کی تھی۔ ہمارے سانس بھاپ کی صورت خارج ہو رہے تھے۔ یہاں احاطے میں ایک اور بڑا کنٹینر بھی ہمارے ساتھ ہی آ کر رکا تھا۔ یقیناً اس میں سے

جادو راے و دیگر افراد نکل کر عمارت کے اندرونی حصے میں جا چکے تھے۔ مجھے اور عمران کو دائیں بائیں دیکھتے پا کر میم مائرہ سردی سے سکڑی سمٹی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''ماہین کے بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ پوری حفاظت سے میرے پاس ہے۔''

میرے ہاتھ ابھی تک بندھے تھے۔ میں نے دوپہر کا کھانا بھی عمران کی مدد سے کھایا تھا۔ میں نے مائرہ سے کہا۔ ''یہ کیسا مشترکہ مشن ہے جس میں، میں ''ساتھی'' بھی ہوں اور ''قیدی'' بھی؟''

وہ کچھ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں راے سے مشورہ کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کل آگے روانگی سے پہلے، صبح تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں۔''

وہ برفیلی رات میں عمران اور حشام نے ..... ایک کمرے میں گزاری جہاں کوئلوں والی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ عمران اور حشام کو بھی اب یہ سمجھ آچکی تھی کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں ہیں۔ آگے کیا ہونے والا تھا اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔

صبح سویرے وعدے کے مطابق میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ رات سے اب تک ہم مسلسل چار مسلح گارڈز کی نگرانی میں تھے۔ یہ چاروں مقامی گارڈز تھے اور ان میں سے دو سکھ تھے۔ یقیناً یہ لوگ مائرہ اور راے کے لیے سہولت کاری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انچارج بہروز نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے سخت آہنگ میں کہا۔ ''میم کا آرڈر ہے کہ اپنی ضروریات سے اچھی طرح فارغ ہولو۔ اگلے اٹھارہ بیس گھنٹے تک ہم کہیں رکیں گے نہیں۔''

صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ اسی بند کنٹینر میں آٹے اور باسمتی کی خوشبو کے درمیان ہمارا انوکھا سفر پھر شروع ہوا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ کنٹینر جیسے برف کا غار بنتا گیا۔ حشام کے ہاتھ پاؤں نیلے ہونا شروع ہوگئے تھے۔ عمران کے لیے چپ رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ کراہتے ہوئے بہروز سے مخاطب ہوا۔ ''بہروز خان! مجھے لگتا ہے کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ کیا میں دل میں حسرت لیے ہی دنیا سے چلا جاؤں گا؟ مجھے آخری سانس تک پتا ہی نہ چل سکے گا کہ میں جا کہاں رہا تھا؟''

''لداخ!'' بہروز کھٹاک سے بولا۔ ''مگر لداخ میں سفر ختم نہیں ہوگا، وہاں سے آگے ہمیں پیدل جانا ہوگا۔''

''پ..... پیدل..... اور وہ بھی اتنی ٹھنڈی جگہ پر..... پھر تو بہتر ہے کہ میں راہی عدم ہونے میں زیادہ تاخیر نہ کروں۔'' وہ اسی مختصر جگہ پر گھٹنے اٹھا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے کچھ بڑبڑانے لگا جیسے کلمے کا ورد کر رہا ہو۔ حشام کے سوا سب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ حتیٰ کہ گونگے جہانے کے ہونٹ بھی بے ساختہ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ لداخ والے انکشاف نے مجھے بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔

یہ سفر واقعی بہت طویل، سرد اور صبر آزما تھا۔ لداخ کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ اس کا شمار ہندوستان کے سرد ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ کچھ ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں ٹمپریچر منفی 25 درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس ہلاکت خیز سردی میں یہ ٹولا کس چیز کی تلاش میں جا رہا تھا؟

بہروز نے اٹھارہ بیس گھنٹے کا کہا تھا مگر ہمارا یہ دشوار گزار سفر جو کہیں کہیں بہت سست بھی تھا، کم و بیش 24 گھنٹے جاری رہا۔ کنٹینر سے باہر نکلے تو دنیا ہی اور تھی۔ کنٹینر اگر برف کے غار کی طرح تھا تو باہر برف کے سمندر جیسا تھا۔ نہایت گرم کپڑوں کے باوجود ہڈیوں میں گودا جمنا شروع ہوگیا۔ دن کے بارے بجنے والے تھے۔ حدِ نگاہ تک برف کی سفیدی نظر آتی تھی۔ آسمان گہرا نیلا تھا جس پر کہیں کہیں بادلوں کی سفید لکیریاں تیرتی نظر آتی تھیں۔ دور شمال مغرب کی طرف کچھ برف پوش بلندیاں تھیں جن کے بارے میں بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ کارگل کی چوٹیاں تھیں۔

دوسرا کنٹینر بھی رک چکا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اس میں سے جادو راے کو برآمد ہوتے دیکھا۔ اپنے ٹھگنے قد، گول مٹول جسم اور سیاہ رنگت کے ساتھ اسے باہر آتے دیکھ کر ایسا ہی لگا جیسے کوئی شیطانی قوت اس برف زار پر قدم رنجہ فرما رہی ہے۔ اس کے عقب میں دراز قد ہما عروج تھی جو راے کی موجودہ منظورِ نظر ایلی کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ خوبرو ایلی کی ہلکی نیلی آنکھیں بظاہر بالکل بجھی بجھی تھیں مگر ان کی گہرائی جادو راے کی سفاکی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ راے کی سفاکی اور میم مائرہ کی خشم آلودگی۔ بظاہر یہی پتا چلتا تھا کہ ماضی قریب میں جب میم مائرہ نے دیکھا کہ نوجوان و خوبصورت ایلی اس کے شوہر ڈیرن کے قریب آچکی ہے تو میم اور ڈیرن میں طلاق ہوگئی۔ اب اسی طلاق کا خمیازہ ایلی کو یہ بھگتنا پڑ رہا تھا کہ وہ اپنی بینائی اور عزت دونوں سے محروم ہوئی تھی۔ عورت کے بغیر رہنا راے جیسے شخص کے لیے ممکن نہیں تھا لہٰذا ایلی یہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔

کنٹینرز سے بہت سا سامان اتارا جا رہا تھا جن میں خیمے، خوراک کی پیٹیاں، پانی کے کین اور پتا نہیں کیا کچھ شامل تھا۔ ایک جانب بہت سے خچر بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ پندرہ بیس مقامی پورٹرز بھی تھے۔ مقامی اور پاکستانی گارڈز کی تعداد آٹھ تھی جن میں سے زیادہ کے پاس چھوٹی نال کی آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

خچر مال برداری کے لیے تھے تاہم ان میں سے تین چار خچر بڑے سائز کے تھے اور خاص نسل کے لگتے تھے۔ پتا چلا کہ یہ جادو راے، میم مائرہ اور ٹیلی وغیرہ کی سواری کے لیے ہیں۔ بعد ازاں میم مائرہ کی طرف سے ماہین کو بھی ایک خچر پر سواری کی پیشکش کی گئی لیکن ماہین نے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا پسند کرے گی۔

جادو راے کی گونج دار آتشیں آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اپنے پان رنگے ہونٹوں کے ساتھ تڑخ کر بولا۔ ”یہ تمہاری والدہ کا آنگن نہیں ہے جہاں اپنی مرضی چلاؤ گی۔ تمہیں خچر پر بیٹھنا ہوگا اور ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ پھر وہ اپنے خطرناک انچارج گارڈ بہروز سے مخاطب ہوا۔ ”باندھ دو اس کی ٹانگ سے۔“

پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا باندھنے کا کہہ رہا ہے البتہ جلد ہی سمجھ میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد برفیلی لہر دوڑ گئی۔ یہ قریباً چھ انچ مربع کی براؤن ڈبیا تھی جو اونچائی میں چار انچ رہی ہوگی۔ اس پر سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی لائٹ اپ ارک کر رہی تھی۔ یقیناً یہ کوئی طاقتور بم تھا۔

بہروز، ہما عروج کے ساتھ آگے بڑھا۔ ہما عروج نے ایک قینچی کی مدد سے ماہین کی نیلی جینز کا پائنچہ تھوڑا سا کاٹا اور جینز کو گھٹنے سے اوپر تک چڑھا دیا۔ رائفل بدست گارڈز ہمارے اردگرد چوکس کھڑے تھے۔ ہما اور بہروز نے براؤن رنگ کی وزنی ڈبیا ماہین کے گھٹنے سے اوپر ایک لاسٹک بیلٹ اور بکل کے ذریعے یوں چسپاں کی کہ اسے اتارنا ممکن نہ رہا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس کے اوپر چوڑی پلاسٹک ٹیپ کے بہت سے بل دے دیے گئے۔

جادو راے نے مجھے اور عمران کو ایک ساتھ ایک چھوٹا سا سیاہ ریموٹ کنٹرول دکھایا اور بولا۔ ”یہ میرے پاس رہے گا۔ ایسا ہی ایک دوسرا بہروز خان کے پاس ہے۔ اس چھوکری کی زندگی بس اسی وقت تک ہے جب تک تم انسان کے بچے بن کر چلتے رہو گے۔“ راے کے لہجے میں ایک آتش رکھی تھی۔

ماہین بالکل گم صم سی ہم سے دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ یہ احساس بے حد اذیت ناک ہوتا ہے کہ ایک بارودی شے ہمارے جسم سے پیوست ہے اور کسی بھی وقت ایک ساعت شکن دھماکے سے ہمیں موت کے سفر پر روانہ کر سکتی ہے۔ ماہین کی زخمی ہتھیلی پر ابھی تک سفید پٹی نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ کمزور بھی دکھائی دیتی تھی۔

مجھے وہ گھڑی یاد آئی جب سفر پر روانگی سے پہلے ہم نے مائرہ سے کہا تھا کہ ہم ماہین اور حشام کو یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ مائرہ نے پہلے انکار کیا تھا لیکن پھر راے کے ساتھ مشورے کے بعد اچانک مان گئی تھی۔ اس آمادگی کی ہلاکت خیز وجہ اب سمجھ میں آ رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں بھی گہرا کرب کروٹ لے رہا تھا۔ ماہین کی کسی بھی تکلیف پر یہ بے پناہ کرب خود بخود اس کی آنکھوں میں جھلک دکھانے لگتا تھا۔

☆☆☆

انتہائی سرد موسم میں سفر کے وہ چار دن ناقابل فراموش تھے۔ یہاں برف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کہیں کوئی درخت نہ آبادی کا نشان۔ منجمد ڈھلوانیں تھیں یا ایسی چھوٹی چھوٹی جھیلیں تھیں جن کا پانی جم کر پتھر ہو چکا تھا۔ رات کے وقت تو درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بیس پچیس درجے نیچے تک گر جاتا تھا۔ ان خاص قسم کے خیموں اور ہمارے لباسوں کے باوجود کسی وقت جسم سردی سے اکڑتا محسوس ہوتا تھا۔ چوتھے دن سارا وقت ہم نے خچروں سمیت ایک برفیلی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے گزارا۔ اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ خچروں کی ہمت بھی جواب دیتی جا رہی ہے۔ جس خچر پر ماہین سوار تھی، ہماری نگاہ ہر وقت اسی پر لگی رہتی تھی۔ پیدل چلنے کی نسبت جانوروں پر سواری زیادہ مشکل تھی۔ دونوں طرف گہری کھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ماہین کی طرف سے ہمیں دوسرا اندیشہ اسی ”موت“ کا تھا جو ایک چوکور ڈبیا کی صورت اس کی ٹانگ سے چسپاں تھی۔ وہ چھوٹا ریموٹ میں نے دیکھا تھا جو ہر وقت بہروز خان کی جیب یا کٹ میں رہتا تھا۔ اس کے اوپر سلائڈ کرنے والا سیفٹی کور موجود تھا پھر بھی کسی اتفاقی بلاسٹ کا اندیشہ کلی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اسی شام وہ خچر ڈھلوان پر بری طرح پھسلا جس پر میم مائرہ سوار تھی۔ خچر کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور مائرہ کو بھی معمولی چوٹیں آئیں۔ اب واضح ہو رہا تھا کہ خچر زیادہ دیر ہمارا

نہیں دے سکیں گے۔

اگلے روز ایسا ہی ہوا۔ ہم اس طویل ڈھلوان کے نچلے سرے پر پہنچ چکے تھے جس پر پچھلے دو روز سفر کرتے رہے تھے۔ اب آگے نشیب تھا جس پر پھر وہ قدم نہیں چل سکتے تھے۔ برفانی ہواؤں میں رات وہیں پر کیمپنگ کی تھی۔ اگلے روز پروگرام کے مطابق نصف سے زائد پورٹرز ان کے تمام ٹھکانوں پر واپس چلے گئے۔ صرف سات آٹھ ماہر مین پورٹرز (مال بردار مزدور) اور گائیڈز ہمارے ساتھ تھے اور آگے کا پیدل سفر شروع ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھوں میں برف پر چلنے والی اسٹکس تھیں اور ہم بہت محتاط سنبھل کر اتر رہے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے یہ برفخت راستے ہمیں اسی طرح چلاتا چلاتا بحر منجمد شمالی تک لے جائے گا۔ اللہ کرے یہ یہیں کہیں پھسلے اور کسی ایسی کھائی میں گرے جہاں ایک بھوکا برفانی چیتا پہلے سے موجود ہو۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں ہمارے سوا کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔'' میں نے میلوں تک پھیلی برف کو دیکھ کر کہا۔

عمران سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ انڈیا کے سرد ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ ویرانی کے لحاظ سے بھی یہ کرۂ ارض پر شاید دوسرے نمبر پر ہے۔''

''اپنے وطن کے بارے میں تمہاری معلومات کافی ہیں۔''

''دیکھیں، آپ پھر میری دُم پر پاؤں رکھ رہے ہیں۔ میرا وطن یہ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو میں کترینہ کیف، عالیہ بھٹ اور پریانکا چوپڑا جیسی نازنینوں کی کرم فرمائیاں چھوڑ کر اور کروڑوں کے بزنس کو لات مار کر پاکستان کیوں آتا؟''

میں نے کہا۔ ''آہستہ بولو اور احتیاط سے بولو۔ یہ نہ ہو کہ اس قافلے میں تمہارے جیسا کوئی اور لپ ریڈر بھی موجود ہو اور وہ جان جائے کہ تم انڈیا کے ہو۔''

''تو آپ کیا سمجھتے ہیں، لپ ریڈر ایسے ہی یہاں وہاں پڑے مل جاتے ہیں۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے..... بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا..... ویسے اداکارہ نرگس نے اتنے سال روئے کے باوجود کوئی اچھا انتخاب نہ کیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے دور اُفق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ برف باری شروع ہونے والی ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔'' عمران نے اپنی اونی ٹوپی کانوں تک کھینچتے ہوئے کہا۔

دس پندرہ منٹ کے اندر ہلکی برف باری شروع ہو گئی پھر بتدریج اس میں اضافہ ہوا۔ اب قیام ضروری ہو گیا تھا۔ جادو راے اور میم مائرہ کے آرڈر پر ایک ہموار جگہ خیموں کے لیے منتخب کر لی گئی۔ نیچے ایستادہ ہوئے تو برف باری سے بچنے کے لیے سب خیموں میں جا گھسے۔ میم مائرہ اور راے کے ٹینٹ اسپیشل قسم کے تھے اور نسبتاً کشادہ بھی۔ ایلی، جادو راے کے ساتھ اس کے ٹینٹ میں ہوتی تھی۔ بے شک عورت کی قربت جادو راے کی مجبوری بلکہ ناگزیر مجبوری بن چکی تھی۔ وہ بغیر کسی جھجک کے اعلان کرتا تھا کہ اسے ہر وقت عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گئے برسوں میں اس نے اپنے پیشے کے دور پر ہر طرح کی عورتوں سے تعلق قائم رکھا تھا۔ اسے یہ فکر کبھی نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بدنمائی سے جنم لینے والی کراہت سے فریق ثانی پر کیا گزرتی ہے مگر پھر چند ماہ پہلے ناوینا چاندنی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اس کے ساتھ راے کا تعلق کسی کراہت کے بغیر پروان چڑھا تھا۔ چاندنی تو نہیں رہی تھی مگر اب راے کو اسی نوعیت کے تعلق کی ضرورت تھی جس میں فریق ثانی میں کراہت اور خوف نہ ہو بلکہ کسی نہ کسی درجے کی خود سپردگی ہو۔ یقیناً اب وہ یہی کچھ ایلی میں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمارے خیمے میں میرے ساتھ عمران اور شام کے علاوہ ایک سکھ گائیڈ منوہر سنگھ کو بھی جگہ ملی تھی۔ منوہر سنگھ تیس بتیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ بلا کا نشانے باز بھی تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تبتی زبان کے علاوہ ایک دو مقامی بولیاں بھی جانتا تھا۔ شاید اسے گائیڈز میں شامل کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

برف باری جاری تھی۔ شام کے فوراً بعد ہم نے ٹن پیک کھانے کو گیس اسٹوو پر خیمے کے اندر ہی گرم کیا۔ چکن قورمہ، حلیم اور چاول وغیرہ تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا کہ ابھی دس منٹ پہلے کسی ریسٹورنٹ سے کھانا لایا گیا ہے۔ نیند ابھی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ منوہر سنگھ ہمیں اس علاقے کے بارے میں مختلف باتیں بتانے لگا۔ وہ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا تھا اور اس کی تعیناتی انہی علاقوں میں تھی۔ بعد ازاں اپنی

گھریلو مجبوریوں کے سبب ایسے نوکری چھوڑنا پڑی تھی۔

منوہر کی باتیں دلچسپ تھیں۔ ایک موقع پر اس نے کہا کہ اس دور دراز علاقے میں ایک دو ایسی برادریاں آباد ہیں جن کے افراد یہاں سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ یہ لوگ اسکیموز کی طرز پر برف کے گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر دارومدار شکار پر ہی ہوتا ہے۔ سال میں صرف ایک مرتبہ کچھ لوگ یہاں سے باہر نکلتے ہیں اور اناج وغیرہ لاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ تکلیف بھی نہیں کرتے۔

''ایک اور بڑی دلچسپ بات بھی سنی جاتی ہے۔'' منوہر اپنی باریک مونچھوں کے نیچے مسکرا کر بولا۔ ''کہتے ہیں کہ یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہاں گنگا کہاں سے آگئی؟''

''محاورہ بول رہا ہوں بادشاہو!'' منوہر نے طویل ڈکار لے کر کہا۔ ''سنا ہے کہ اس برادری میں عورتوں کا زیادہ سکہ چلتا ہے۔ شکار اور اس طرح کے زیادہ سخت کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرد نسبتاً سست اور کاہل ہو گئے ہیں اور زیادہ تر ایسے ہیں جو عورتوں کے کہنے پر چلتے ہیں۔''

''تم نے بس سنا ہی ہے یا دیکھا بھی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''جب حاضر سروس تھا تب ایک دو ایسے بندوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم لوگوں سے کافی مختلف لگتے تھے۔'' منوہر نے چند لمحے توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شک پڑ رہا ہے کہ ہم اس علاقے سے زیادہ دور نہیں ہیں جہاں یہ ایک یا دو برادریاں آباد ہیں۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ میں نے عمران کو چونکتے دیکھا۔ پھر مجھے بھی چونکنا پڑا۔ کچھ دور افتادہ آوازیں ہماری سماعت تک پہنچی تھیں۔ جیسے ایک یا دو عورتیں چلائی ہوں اور پھر کسی نے بھاری مردانہ آواز میں کچھ کہا ہو۔ ہمارا خیمہ چونکہ ذرا ڈھلوان پر تھا اس لیے آوازیں ہم تک پہنچ گئی تھیں۔ ایک عورت کی آواز دوبارہ ابھری تو میں اور عمران خیمے سے باہر نکل آئے۔ برف کے گالے ہمارے چہروں سے ٹکرائے اور سردی کی لہریں جسم کے ننگے حصوں پر برچھیوں کی طرح لگیں۔ گارڈ منوہر سنگھ بھی ہمارے پیچھے آیا۔ ہماری طرح اس کے پاس بھی فی الحال کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بس ایک ٹارچ تھی جس کی وجہ سے ہم نشیب کی طرف راستہ دیکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اترائی میں ایک برفیلے تودے کی عقب میں ہمیں کچھ ہیولے نظر آئے جو ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ لوہا ٹکرانے کی آوازیں بھی آئیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ چھوٹے دستے والی کلہاڑیاں تھیں۔ بڑی ٹارچ کے روشن دائرے میں ہمیں فوراً علم ہو گیا کہ دو مرد، تین عورتوں پر حملہ آور ہیں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک مرد کی کلہاڑی ایک عورت کے سر میں دھنس گئی۔ وہ عورت ایک دلدوز کراہ کے ساتھ نشیب میں لڑھک گئی۔ مردوں میں سے ایک درمیانے قد کا تھا، دوسرا درمیانے قد کا۔ درمیانے قد والے نے اپنی عورت کو اڑنگا لگا کر گرایا اور اس کے سینے پر چڑھ کر گیا۔ کلہاڑی کے پے در پے وحشیانہ وار کر کے اس۔ چند سیکنڈ میں عورت کے چہرے کا بھرتا بنا دیا پھر وہ ساتھی کی مدد کو لپکا جو تیسری عورت سے گتھم گتھا تھا درمیانے قد والے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ قریب پہنچتے کلہاڑی کا وحشیانہ وار تیسری عورت کے سر پر کرے گا اور اس کا بھی خاتمہ بالخیر کر دے گا۔

میں لپک کر اس کے سامنے آیا مگر وہ تو ایسے جنون میں تھا کہ لگا اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، نہ ہی ٹارچ کی روشنی کو نوٹس کیا ہے جو اُن سب پر پڑ رہی ہے۔ مجھے جھکا دے کر اس نے اپنے ہدف کی طرف بڑھنا چاہا تو ہم اس بایاں بازو میری گرفت میں آگیا۔ میں نے گرفت نرم پڑنے دی اور اسے گھما کر دور پھینک دیا۔ دوسری طرف عمران تیسری عورت کی مدد کو پہنچ گیا تھا۔

درمیانے قد والا حملہ آور گرنے کے بعد مجھ پر یوں جھپٹا جیسے کوئی خونخوار درندہ معمولی زخمی ہونے کے بعد شکار پر آتا ہے۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ اس نے شاید تین چار سیکنڈ میں مجھ پر کلہاڑی کے درجن بھر مہلک وار کر ڈالے۔ میں نے جس طرح خود کو ان حملوں سے بچایا مجھے ہی معلوم تھا۔ ایک دو بار تو کلہاڑی کا تیز دھار پھل میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزرا۔ حملہ آور وار کرتے ہوئے چلا بھی رہا تھا اور ان لمحوں میں مجھے شک گزرا کہ شاید وہ عورت ہے..... اور پھر مجھے موقع مل گیا۔ میں ایک وار بچاتے ہوئے نیچے جھکا اور اس کے ساتھ ہی لات چلائی۔ یہ بڑا کارگر وار تھا۔ وہ عورت تھی یا مرد تھا، ہوا میں اڑتا ہوا کوئی پچیس فٹ نیچے ایک برفانی کھائی میں گرا۔

دائیں طرف دیکھا۔ عمران نے دراز قد حملہ آور کو جکڑ کر بے بس کر دیا تھا۔ تیسری عورت برف پر بے سدھ پڑی

تھی۔ ہمارے دیگر خیموں سے بھی لوگ نکل نکل کر ہماری طرف آرہے تھے۔

"ٹارچ لاؤ منوہر!" میں نے پکار کر کہا۔

منوہر نے ٹارچ کا روشن دائرہ نیچے کھائی میں ڈالا۔ گرتی ہوئی برف اس روشنی میں چمکی اس کے ساتھ ساتھ وہ بے جان جسم دکھائی دیا جو ایک ابھری ہوئی برفیلی چٹان سے ٹکرایا تھا اور بے سدھ پڑا تھا۔ خون کا ایک بڑا دھبا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے دستے والی کلہاڑی بھی پڑی تھی۔

"کیا ہے یہ سب؟ یہ سب کیا ہے؟" میم مائرہ کی چلاتی ہوئی حیران آواز میرے کانوں میں پڑی۔

اس کی طرح دیگر افراد بھی ششدر تھے۔ میں اور منوہر سنگھ احتیاط سے نیچے کھائی میں اترے۔ بے شک وہ عورت ہی تھی۔ عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ چہرے کے سوا اس کا سارا جسم موٹے سموری کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے خدوخال تبتی طرز کے تھے اور وہ نہایت مضبوط ہاتھ پاؤں کی دکھائی دیتی تھی۔ پشت کے بل گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے منوہر سنگھ کی طرف دیکھا۔

"کہیں یہ اس قبیلے سے ہی تو نہیں جس کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے۔"

"واہگرو جانے..... لیکن لگتا مجھے بھی ایسے ہی ہے۔"

کھائی سے اوپر اس سفاک عورت کا دراز قد ساتھی گارڈز کی گرفت میں واویلا کر رہا تھا۔ وہ نامعلوم زبان میں بول رہا تھا اور کسی وقت دہاڑیں مارنے لگتا تھا۔ برف باری جاری تھی.....

☆☆☆

دو عورتیں تو کلہاڑی کی ضربوں سے ماری جا چکی تھیں۔ تیسری بے ہوش تھی۔ عورتوں کو مارنے والی جنگجو عورت خود بھی کھائی میں مردہ پڑی تھی۔ برف باری اب ہلکی ہوگئی تھی۔ ہم گارڈز والے خیمے کے سامنے ناقابلِ بیان سردی میں موجود تھے۔ قاتل عورت کے جس جواں سال ساتھی کو پکڑا گیا تھا، وہ ایک تبتی خدوخال والا نوجوان تھا اور خوش شکل نظر آتا تھا۔ ابھرے ہوئے رخسار، چھوٹی ناک۔ اس کے گلے میں گھونگھے جیسی کوئی چمکیلی شے تھی۔ وہ کسی جانور کی کھال کے بھاری لبادے میں تھا۔ اسی کھال کا ٹراؤزر نما اس کے زیریں جسم پر تھا۔ میم مائرہ نے منوہر سنگھ سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

"منوہر بولا۔ "کھائی میں گر کر مرنے والی اس کی بیوی ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اسے مار ڈالا ہے تو مجھے بھی مار دو، مجھے زندہ کیوں رکھا ہے؟"

تھوڑی حیرت ہوئی۔ کھائی میں گر کر مرنے والی پچیس چھبیس سال سے کم عمر کی نہیں تھی جبکہ یہ جو خود کو اس کا شوہر بتا رہا تھا، بیس اکیس سال کا تھا۔ ایک چیز ہم نے یہ بھی نوٹ کی تھی کہ ہلاکت خیز لڑائی کے دوران میں اس کی بیوی نے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور جارحیت دکھائی تھی۔ شاید منوہر کا یہ اندازہ درست ہی تھا کہ یہ اسی برادری کے لوگ ہیں جہاں روزمرہ کے معاملات میں عورتیں زیادہ فعال کردار ادا کرتی ہیں۔

اچانک ہم سب کو چونکنا پڑا۔ تاریک برف پر کہیں دور سے کچھ ملی جلی آوازیں آئیں جیسے کچھ لوگ ہماری طرف آرہے ہوں۔ زیادہ چونکانے والی بات یہ تھی کہ انسانی آوازوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھیڑیوں کی دو چار آوازیں بھی سنائی دیں۔ میم مائرہ اور جادو راے سمیت سب ان آوازوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے دیکھا ٹارچوں کی روشنی میں منوہر سنگھ کا چہرہ زرد دکھائی دیا۔

وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ بھیڑیے کی آواز سن رہے ہیں نا۔ اس کو یہاں لال بھیڑیا کہتے ہیں۔" واہگرو کرپا کرے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہمارے لیے اور خاص طور پر آپ کے لیے مصیبت آنے والی ہے۔ وہ خطرناک زنانی آپ کے ہاتھوں ماری گئی ہے نا۔"

"اس کے مرنے سے بھیڑیے..... یا لال بھیڑیے کا کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

"تعلق ہے جی۔" وہ لرزاں آواز میں گویا ہوا۔ "جس برادری کا ہم ذکر کر رہے ہیں، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لال بھیڑیوں کو اسی طرح پالتے ہیں جیسے ہم کتوں وغیرہ کو پالتے ہیں۔ اگر یہ اسی برادری کے لوگ ہیں تو پھر ان کے نزدیک آپ ہتھیارے ہیں۔"

"مگر میں نے اپنے لیے تو کچھ نہیں کیا۔ ہم نے تو ان عورتوں کو بچانے کی کوشش کی جن پر حملہ ہو رہا تھا۔"

اس سے پہلے کہ منوہر سنگھ جواب میں کچھ کہتا، دو فائر ہوئے جو یقیناً ہوائی فائر تھے۔ ہم نے دیکھا، ڈھلوان پر سے کچھ روشنیاں تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھیں۔ یہ درجنوں روشنیاں تھیں۔

سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں

تیسری قسط

قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات واطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہِ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گردوپیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شادابیاں ہی نہیں تلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جاتے...

طلسمِ ہوس میں مبتلا ایک وحشی مسیحا کی قاتلانہ جراحی

وہ تین منٹ میں روشنیاں ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ یہ کوئی بیس کے قریب افراد تھے۔ سب کے سب بھاری سوری کپڑوں میں لپٹے ہوئے، سروں پر بڑی بڑی اونی ٹوپیاں تھیں۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھ میں گیس لیمپس تھے۔ مجھے چار عدد بھیڑیے نظر آئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ ان بھیڑیوں کے گلے میں زنجیریں تھیں۔ تاریکی میں ان کی آنکھوں میں ایک گرسنہ چمک لشکارے مار رہی تھی۔ آنے والوں میں سے زیادہ تر کلہاڑیوں اور کٹاروں سے مسلح تھے، صرف دو تین کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "مجھے لگتا ہے کہ ان میں زیادہ تر عورتیں ہیں۔"

مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا پھر ایک نہایت چوڑی چکلی عورت آگے بڑھی۔ اس نے اپنی آٹومیٹک رائفل ہماری طرف سونت رکھی تھی۔ اس نے برف پر پڑی ان دو عورتوں کی لاشیں دیکھ لی تھیں جو کھائی میں گری ہوئی جنگجو عورت کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھیں۔ وہ شعلہ نشاں لہجے میں گرجی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔

میم مائرہ نے سوالیہ نظروں سے میرے قریب کھڑے منوہر سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "میم جی! یہ ہمیں ان دونوں عورتوں کا قاتل سمجھ رہی ہے اور بہت زیادہ غصے میں ہے..... بلکہ یہ سب ہی بہت غصے میں ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"



میم مائرہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے میں بول پڑا۔ "منوہر، ان سے کہو، ہم نے کچھ نہیں کیا..... بلکہ انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں مارنے والی وہاں نیچے کھائی میں پڑی ہے۔"

منوہر سنگھ نے میری بات چوڑی چکلی عورت تک پہنچائی۔ وہ تیزی سے گھوم کر کھائی کی طرف گئی۔ گیس لیمپ والے دونوجوان بھی اس کے پیچھے گئے۔ میم مائرہ نے ٹارچ کی روشنی نیچے کھائی میں پھینکی۔ یکایک میں نے چوڑی چکلی عورت کے تاثرات بدلتے دیکھے۔ اونی ٹوپی میں بس اس کا چہرہ ہی نظر آتا تھا جس پر کلہاڑی کے کسی پرانے زخم کا نشان پیشانی سے شروع ہو کر بائیں آنکھ تک چلا گیا تھا۔ وہ تیزی سے کھائی میں اترنے لگی۔ یوں لگا کہ بھیڑیے بھی اپنی زنجیریں تڑانے کی کوشش کر رہے ہیں اور برفیلی کھائی میں اترنا چاہتے ہیں۔

چند منٹ بعد لاش کا معائنہ کرنے کے بعد چوڑی چکلی عورت باہر آئی تو اس کے غیظ و غضب کی جگہ ایک طرح کی حیرت اور سنسنی نے لے لی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے کچھ پوچھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ منوہر سنگھ سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا ساتھی کہاں ہے؟ میم کی اجازت سے منوہر سنگھ اس کو خیمے میں لے گیا، جہاں واویلا کرتے ہوئے بیس اکیس سالہ نوجوان کو رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر نوجوان کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا جبکہ چوڑی چکلی عورت بہت پُرجوش نظر آنے لگی۔

یکایک اس کا لہجہ منوہر سنگھ سے دوستانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی زبان میں منوہر سے پوچھا کہ کھائی میں پڑی ہوئی بدمعاش عورت کیسے مری..... اسے کس نے مارا؟

اس سے پہلے کے منوہر سنگھ کچھ کہتا یا میری طرف اشارہ کرتا، اس کے پہلو میں کھڑی میم مائرہ نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹ کر اسے خاموش رکھا..... اور سامنے کھڑے جادو رائے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "یہ حملہ آور عورت ان کے ہاتھوں ماری گئی ہے۔ یہ باس ہیں ہمارے۔"

منوہر سنگھ چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے میم مائرہ کی ترجمانی کرتے ہوئے وہی بات چوڑی چکلی عورت تک پہنچا دی۔ وہ پُرجوش انداز میں جادو رائے کی طرف مڑی..... اس کی بدنمائی دیکھ کر تھوڑا سا چونکی لیکن پھر دوستانہ انداز میں اس کا کندھا دبایا۔ تب وہ تیز تیز کچھ بولتی چلی گئی۔ وہ کچھ بتا رہی تھی اور غالباً کچھ سوال بھی کر رہی تھی۔

اس کے اور جادو رائے کے درمیان، منوہر سنگھ کے تعاون سے جو گفتگو ہوئی، اس سے یہ بات تصدیق پا گئی کہ یہ اسی برادری کے لوگ ہیں جن کے بارے میں ہم بات کرتے رہے ہیں۔ ان کو ترمادول کہا جاتا تھا۔ جو عورت ہم سے ہم کلام تھی، اس کی حیثیت اس گشتی پارٹی کے لیڈر کی تھی۔ اس کا نام "ڈولما" تھا۔ اس کی پارٹی میں بارہ کے قریب لڑاکا عورتیں اور سات آٹھ مرد تھے۔ ایسی ہی دو تین اور پارٹیاں بھی اس عورت کی تلاش میں نکلی ہوئی تھیں جو اب کھائی میں مری پڑی تھی اور تیزی سے اکڑتی جا رہی تھی۔ ڈولما کی باتوں سے صرف اتنا پتا چل سکا کہ ماری جانے والی ہریتی اس قبیلے کی سردار مایارانی کی مجرم تھی اور کسی سنگین غلطی کی مرتکب ہوئی تھی۔

ڈولما نے جو کچھ جادو رائے سے پوچھا، جادو رائے نے اس کا جواب منوہر کے ذریعے یہ دیا کہ ہمارا تعلق انگریزی دوائیں بنانے والی ایک بڑی کمپنی سے ہے اور ہم ایک خاص قسم کے زہر کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں۔ یہ زہر سفید رنگ کے کسی مقامی سانپ میں پایا جاتا ہے۔

جادو رائے کی اس بات پر ڈولما کے چہرے پر پہلی بار ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوئی۔ اس نے منوہر کے ذریعے کہا۔ "جسے آپ لوگ سانپ کہہ رہے ہیں، وہ سانپ نہیں کچھ اور ہے۔ بہرحال اس کی ساری تفصیل آپ کو مایارانی کی زبانی معلوم ہو سکے گی۔"

اس کے فوراً بعد ڈولما نے اپنے ساتھ آنے والی چاق چوبند عورتوں کو حکم دیا کہ وہ ہریتی کے مردہ جسم کو کھائی میں سے نکالیں۔ مرنے والی باقی دونوں عورتیں ڈولما ہی کی ساتھیوں میں سے تھیں، تیسری ابھی تک خیمے میں بے ہوش پڑی تھی۔

کھائی سے ہریتی نامی جنگجو عورت کا اکڑا ہوا جسم باہر نکالا گیا تو ڈولما اس کے چہرے پر جھکی۔ یوں لگا جیسے اس کی پیشانی کو بوسہ دینا چاہتی ہو مگر بوسے کے بجائے اس نے نہایت نزدیک سے اس کے چہرے پر تھوک دیا پھر رائے سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔

اس کا ترجمہ کرتے ہوئے منوہر بولا۔ "جناب! یہ کہہ رہی ہے کہ مرنے والی بے شرم بدمعاش عورت تھی، رانی صاحبہ نے اس کے سر پر انعام مقرر کر رکھا تھا جو یقیناً دیا جائے گا۔"

اس اطلاع پر جادو رائے اور میم مائرہ نے انکساری کے انداز میں سر جھکایا۔ آثار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب یہ لوگ ہمیں اپنی رہائش گاہوں کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

ہم سب تجسس کی ایک لہری محسوس کررہے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے ماہین کی طرف دیکھا۔ غضب ناک انداز میں گھومتے چمکراتے بھیڑیوں کی دید اسے سہا رہی تھی۔ وہ ہمارے پیچھے کھڑے ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے گال کا خوب صورت ڈمپل جو ہر نگاہ کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا، مرجھایا ہوا سا نظر آتا تھا۔

ہمیں مہمان نوازی کے انداز میں اپنے حصار میں لیا گیا اور گیس لیمپس کی روشنی میں ہم ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ برف باری تھم چکی تھی مگر اگلی ہوا نے سردی کو ناقابل برداشت کردیا تھا۔ ہمارے صرف چہرے ننگے تھے اور وہاں برچھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک جگہ ہمیں ایک طویل قطار کی صورت میں چلنا پڑا۔ منوہر سنگھ نے بتایا کہ یہ لوگ جانوروں کے شکار کے لیے برف کے اندر خاص طرز کے پھندے چھپاتے ہیں جو اوپر سے نظر نہیں آتے، اسی لیے ہم اس محفوظ راستے پر قطار کی صورت جارہے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد برفیلی ڈھلوان پر چند بڑے بڑے سیاہ سوراخ نظر آئے۔ یہ درحقیقت برفانی غاروں کے دہانے تھے۔ کہیں اندر مدھم روشنی بھی پھوٹ رہی تھی۔ بھاری سموری لبادوں میں لپٹی ہوئی چند پہریدار عورتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو یکدم سردی میں نمایاں کمی محسوس ہوئی۔ یہاں ایک اور ہی دنیا آباد تھی۔ غار کی چھوٹی چھوٹی ذیلی شاخیں تھیں اور ان کے اندر سے مزید شاخیں پھوٹتی تھیں۔

جگہ جگہ لیمپ روشن تھے، ان میں سے کچھ چربی کے تیل کے تھے اور فضا میں چربی کی باس محسوس ہوتی تھی۔ پہریداروں میں زیادہ تر عورتیں ہی تھیں مگر ان میں سے ایک آدھ کے سوا مجھے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار نظر نہیں آیا۔ ہاں کلہاڑیاں اور کٹاریں وغیرہ دکھائی دیتی تھیں۔ اب رات بہت ہوچکی تھی۔ بچے وغیرہ تو کہیں نظر نہیں آئے البتہ شور وغل سن کر بہت سے مرد وزن جاگ چکے تھے اور حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ یہ زیادہ تر تبتی خدوخال والے لوگ ہی تھے۔ ان کی زیادہ توجہ کا مرکز جادو رامے ہی تھا۔

عمران میرے پہلو میں چل رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ ”دیکھ لیں جی، آپ کے کارنامے کا کریڈٹ یہ مینڈک کی آنکھوں والا رامے لے گیا۔ یقیناً لوگ سمجھ رہے ہیں کہ جنگجو ہرتی کا شکار اسی نے کیا ہے۔ کتنی توجہ مل رہی ہے اس ڈڈو (مینڈک) کو۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے..... لیکن یہ بھی تو ہے کہ مخصوص شکل صورت کی وجہ سے ہر کوئی اسے توجہ سے ہی دیکھتا ہے۔ باقی رہی بات کریڈٹ والی تو مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ جس وقت آپ نے ہرتی کو جہنم واصل کیا اس کے شوہر کو میں نے دبوچ رکھا تھا اور اس کا رخ بھی دوسری طرف تھا۔ اسے بھی معلوم نہیں کہ ہرتی کو کس نے مارا؟“

ہرتی کے مبینہ شوہر کا نام ہمیں سکامر معلوم ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر چمڑے کی رسی سے بندھے تھے۔ اس کے گلے میں موجود گلوبند میں ایک زنجیر سی ڈال دی گئی تھی اور اسے کسی جانور کی طرح گھسیٹے ہوئے لایا جارہا تھا۔ اس کا سرخ وسپید چہرہ بتا رہا تھا کہ بیوی کے مرنے کا غم اب بتدریج خوف وہراس میں ڈھلتا جارہا ہے۔ یقیناً یہ جلد ہی پیش آنے والی صورت حال کا خوف تھا۔

برف کے ایک بڑے محرابی در پر چمڑے کا دبیز پردہ تھا۔ اس پردے کو ہٹا کر ہم ایک گول کشادہ جگہ پر داخل ہوئے۔ یہاں دو تین رنگوں کے لیمپس تھے اور ان کی روشنی برف پر منعکس ہوکر عجب دلکش منظر تخلیق کررہی تھی۔ اس ہال نما جگہ کی چھت بھی یہاں کی دیگر چھتوں کی طرح ہموار نہیں تھی۔ برف نے یہاں چھوٹے بڑے بے شمار ابھار سے بنا رکھے تھے۔ کہیں کہیں برف کی منجمد قلمیں بھی لٹکی نظر آتی تھیں۔ سب سے انوکھا منظر ایک برفیلے چبوترے کا تھا جس پر ایک قالین نما شے بچھی تھی اور عجیب وضع کی ایک کرسی پر ایک جوان تبتی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر اصلی شیر کی کھال کا لبادہ دور ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ اس کی گول ٹوپی بھی غالباً اسی کھال کی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال مینڈھیوں کی شکل میں تھے اور جھالر کی طرح گول ٹوپی کے اردگرد جھول رہے تھے۔ اس لڑکی کے اردگرد کوئی نصف درجن مزید عورتیں مؤدب کھڑی تھیں۔ ہمیں یہاں لانے والی چوڑی چکلی ڈولما بھی ان میں شامل ہوگئی۔ کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھی ہوئی لڑکی یقیناً وہی تھی جسے ڈولما نے مایا رانی کہا تھا۔ مایا رانی کے قریب کوئلوں کی جو انگیٹھی دہک رہی تھی، اس کی سرخ روشنی میں مایا کا چہرہ کچھ اور بھی پرتمکنت دکھائی دینے لگا تھا۔

ایک پہلوان نما عورت نے پکڑے جانے والے سکامر کے گلے کی زنجیر کو یکایک زور سے کھینچا، وہ اوندھے منہ برفیلے چبوترے کے پاس مایا کے قدموں میں جا گرا.....

اور مقامی زبان میں پتا نہیں کیا فریادیں کرنے لگا۔

منوہر سنگھ ہمارے قریب کھڑا غور سے سب کچھ سن رہا تھا۔ اسی دوران میں مایا کے پہلو میں کھڑی تنومند ڈولما نے جادو درامے کی طرف اشارہ کیا اور مایا سے مؤدب انداز میں مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ مایا اپنی عجیب وضع کی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور تکریم کے انداز میں کچھ کہہ کر جادو درامے کو اوپر چبوترے پر بلا لیا۔ بعد ازاں میم مائرہ کو بھی اوپر بلا لیا گیا۔ دو مزید کرسیاں مایا رانی کے قریب رکھ دی گئیں اور وہ دونوں ان پر بیٹھ گئے۔

چبوترے کے اردگرد جانوروں کی نرم گرم کھالیں اور غالیچے، تمدے وغیرہ بچھے تھے۔ ہمیں ان پر بیٹھنے کا کہا گیا۔

چبوترے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے سکامر کی فریادیں ایک بار پھر شروع ہو گئیں..... مایا کڑے لہجے میں اس سے سوالات کرنے لگی۔ ایک موقع ایسا آیا کہ سکامر تڑپ کر اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر مایا کے پاؤں چومنا چاہے، مایا نے اسے ٹھوکر مار کر دور ہٹا دیا۔

''یہ کیا ڈراما چل رہا ہے برادر؟'' عمران نے منوہر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی۔

منوہر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو گی..... یہ سکامر مایا رانی کے تین باکروں میں سے ایک ہے۔ باکر یہاں پتی کو کہتے ہیں۔ یہ سکامر سب سے چھوٹا باکر تھا اور مایا کو سب سے پیارا بھی..... لیکن کوئی ایک سال پہلے وہ عورت سکامر کو اپنے ساتھ بھگا کر لے گئی جس کا نام ہرتی ہے اور جو آج ماری گئی ہے۔''

یہ ایک سنسنی خیز صورتِ حال تھی، میں نے منوہر سے پوچھا۔ اب اس سکامر کا کیا ہو گا؟''

''لگتا تو یہی ہے کہ اچھا نہیں ہو گا۔ آگے واہگرو جانے۔''

ایک دراز قد محافظ ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی تھی لہٰذا ہمیں خاموش ہونا پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔ دو عورتیں اور ایک مرد، سکامر کو گلے کی زنجیر سے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ وہ آخر تک روتا اور فریادیں کرتا رہا۔

''کیا اسے ماردیں گے؟'' میں نے منوہر سے پوچھا۔

''ابھی شاید نہیں۔'' وہ بولا۔

کچھ ملازمین بڑی بڑی طشتریوں میں بھاپ دیتے ہوئے پیالے لیے اندر داخل ہوئے اور ہمارے سامنے چننے لگے۔ خوشبو سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مچھلی اور کسی قسم کے اناج کا سوپ ہے۔

ماہین چار پانچ روز سے ٹھیک سے کچھ کھا پی نہیں رہی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری بھوک بھی تقریباً اڑی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ وہی چھوٹا سا لیکن مہلک بم تھا جو مسلسل ماہین کی ران سے بندھا ہوا تھا..... اور کسی بھی وقت کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہمارے لیے قیامت برپا کر سکتا تھا۔ اب بھی ماہین میرے قریب بیٹھی سوپ کے پیالے میں بس چمچ ہلانے لگی۔

''کیا بات ہے ماہین، پریشان ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ زبردستی مسکرائی۔ ''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں انکل تابی۔''

''مجھے پتا ہے جو چیز تمہارے جسم سے باندھ دی گئی ہے وہ خطرناک ہے۔ اس کی جتنی تشویش تمہیں ہے، اتنی ہی ہم سب کو بھی ہے مگر زیادہ پریشانی کی بات اس لیے نہیں ہے کہ میں نے اس کے دونوں ریموٹ کنٹرول دیکھے ہیں۔ ان میں سیفٹی لاک لگے ہوئے ہیں اور بٹن کے اوپر حفاظتی Cover بھی ہے تاکہ غلطی سے بٹن نہ دب سکے پھر بھی ہماری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ کسی طرح میم اور رامے کو قائل کیا جائے کہ وہ یہ چیز تمہارے جسم سے علیحدہ کر دیں..... بلکہ میں آج ہی اس بارے میں میم سے بات کرتا ہوں۔''

ماہین نے خشک ہوتوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اپنی آواز کو مزید دباتے ہوئے بولی۔ ''انکل! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اکیلے میں، میں خود کوشش کروں کہ یہ میری ٹانگ سے علیحدہ ہو جائے۔''

''یہ غضب نہیں کرنا..... میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ ایسی ڈیوائسز کو اگر خود سے چھیڑا جائے تو یہ بلاسٹ ہو جاتے ہیں..... تم زیادہ اسٹریس نہ لو، میں چند گھنٹوں کے اندر ہی میم ماہرہ سے اس بارے میں بات کرتا ہوں۔''

وہ سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔ ہمیں وہیں ہال نما گول کمرے میں ہی ایک پُرتکلف کھانا کھلایا گیا۔ اس میں مچھلی اور بھیڑ وغیرہ کا گوشت تھا اور مقامی طرز کے چاول تھے۔ کھانا ''سرو'' کرنے والے زیادہ تر مرد ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کے جسم کے کھلے حصوں پر نیلے پیلے نقش و نگار نظر آتے تھے۔

میم مائرہ اور رامے کا کھانا چبوترے پر ہی ایک بڑی میز پر چنا گیا۔ کھانے کے بعد ہمیں شب بسری کے لیے چھوٹے چھوٹے حجرے نما کمروں میں بھجوا دیا گیا۔ یہ پتھر

جیسی برف کے..... بنے ہوئے گول چھتوں والے کمرے تھے۔ حیرت انگیز طور پر یہاں سردی بہت نہیں تھی۔ جانوروں کی کھالیں اور موٹے موٹے نرم گدے فرشوں پر بچھے تھے۔ گاہے بگاہے کہیں دور سے بھیڑیوں کی "ہاؤلنگ" بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ایک کمرے میں عمران اور میں تھے..... ایک میں میم مائرہ، ماہین اور ہما عروج..... اسی طرح باقی افراد بھی قریبی حجرے نما کمروں میں تھے۔ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح سب سے پہلے میں میم مائرہ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ہوا یہ کہ وہ خود ہی مجھ سے بات کرنے پہنچ گئی۔ اس کے تراشیدہ بال، اونی ٹوپی کے نیچے سے جھانک رہے تھے اور آنکھوں میں کچھ تشویش جھلک دکھائی دیتی تھی۔

وہ چھوٹتے ہی بولی۔ "دیکھو ڈپٹی تابش! ہمیں یہاں باہمی مشورے سے چلنا ہوگا۔ بالکل ایک جان ہو کر..... اسی صورت میں ہمیں کامیابی مل سکتی ہے اور ہم خیر خیریت سے واپس جا سکتے ہیں۔ یہ خطرناک لوگ ہیں، مگر شکر ہے کہ اس بھگوڑی عورت کے مرنے کی وجہ سے ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ دوستانہ ہے۔ ایک بات یاد رکھو کہ اس عورت کی موت کے حوالے سے ہم سب کا موقف وہی ہونا چاہیے جو میرا اور رائے کا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"سمجھ تو رہا ہوں مائرہ مگر ہمارا آپس کا یہ کیسا "مہربان" تعلق ہے کہ ہماری ایک ساتھی کے جسم سے تم نے بم باندھ رکھا ہے.....؟"

"میں اسی بارے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "جو ریموٹ کنٹرول بہروز کے پاس تھا، وہ ہم نے واپس لے لیا ہے۔ رائے صاحب والا ریموٹ کنٹرول بھی میں نے ان سے لے لیا ہے اور دونوں کنٹرول فی الحال آف بھی کر دیے ہیں۔ یہ تم لوگوں کو میری طرف سے پوری گارنٹی ہے کہ ماہین کے لیے اب کوئی خطرہ نہیں ہے، مگر شرط یہی ہے کہ تمہاری طرف سے بھی کسی طرح کی بدعہدی نہ ہو اور مشترکہ فیصلے کے مطابق چلا جائے۔"

مائرہ نے اپنے موٹے اونی کوٹ کی اندرونی جیب سے وہ دونوں چھوٹے ریموٹ کنٹرول مجھے نکال کر دکھائے، جن پر اب کوئی اسپارکنگ نہیں تھی۔

اسی دوران میں کہیں قریب سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ان آوازوں میں مصیبت میں پھنسے ہوئے گورے چٹے سکامر کی آواز بھی شامل ہے۔ اب تک اس بارے میں جو معلوم ہوا تھا، اس کے مطابق، مایا رانی کی سردار محافظ ہربی نے مایا کے نئے نویلے شوہر سکامر پر ڈورے ڈالے اور پھر کوئی ایک برس پہلے اسے بھگا کر لے گئی۔ سکامر غیر معمولی طور پر مایا کا منظورِ نظر تھا۔ اس کی بے وفائی نے مایا کو توڑ کر رکھ دیا۔ اب تو یوں لگتا تھا کہ اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ مایا کے دو اور باکر (شوہر) بھی موجود تھے مگر وہ ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ وہ ایک برس سے سکامر اور ہربی کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ یہ صرف پانچ چھ روز پہلے کی بات تھی جب یہاں سے کوئی دس پندرہ کلومیٹر دور ایک گلیشیئر کے دامن میں ان کا کھوج ملا مگر پکڑے جانے سے پہلے وہ دونوں بھاگ نکلے۔ مایا رانی کی جنگجو محافظوں کی ٹولیاں ان دونوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر کل رات ایک ٹولی کے ساتھ ان کا آمنا سامنا ہوا۔ ہم موقع پر نہ پہنچتے تو شاید ہربی نام کی وہ سردار محافظ ان تینوں عورتوں کو مار ڈالتی اور ایک بار پھر سکامر کے ساتھ غائب ہو جاتی۔

ہم روٹی، میٹھے پنیر اور قہوے کے ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ نئی سردار محافظ ڈولما وہاں پہنچ گئی۔ مترجم منوہر بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہمارے دیگر ساتھیوں کی طرح اس نے مجھے اور عمران کو بھی بتایا کہ ہمیں طامبورہ میں بلایا گیا ہے، جہاں ہمیں کچھ دکھایا جانا ہے (طامبورہ دراصل اس وسیع گول برفیلے چیمبر کو کہا جاتا تھا جہاں کل مایا سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی)

ہم گول کمرے طامبورہ میں پہنچے۔ وہاں پچاس سے زیادہ مرد و زن موجود تھے۔ ہمارے ساتھ ماہین، ہما عروج، حشام، جہاناں اور بہروز کے علاوہ دوسرے گارڈز بھی شامل تھے۔ طامبورہ میں چند منٹ ٹھہرنے کے بعد ہمیں ایک طویل برفیلی سرنگ سے گزار کر کھلی جگہ پر لایا گیا۔ ہلکی ٹھنڈ تھی، گرد و پیش پر برف کی نئی تہیں چڑھی ہوئی تھیں، ہلکی دھند بھی تھی لیکن مطلع صاف تھا۔ یہاں کھلی جگہ پر دو تین سو کے قریب مزید مرد و زن موجود تھے۔ سب بھاری لبادوں میں لپٹے ہوئے اور منہ سے بھاپ خارج کرتے ہوئے۔ تاہم اس ہجوم میں ہمیں کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔

کھلی جگہ کے بیچوں بیچ لوہے کے دو پول گڑے ہوئے تھے۔ ان کا قطر قریباً پانچ انچ اور بلندی سات فٹ ہوگی۔ ہمیں ایک جانب بھاری کپڑوں میں لپٹی ہوئی مایا رانی بھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ویسے ہی بھاری قیمتی کپڑوں میں ملبوس ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ عورت بھی تھی۔ اس کی شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس کی والدہ ہے۔ مائرہ اور رائے بھی مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے دائیں بائیں موجود

تھے۔

ایک جانب سے شور بلند ہوا۔ ہم نے دیکھا کچھ تنومند عورتیں سکامر کو گلے کی زنجیر سے گھسیٹتی ہوئی ہجوم کی طرف لا رہی تھیں۔ ایک درمیانی عمر کی عورت کو بھی اسی طرح گھسیٹ کر لایا جا رہا تھا۔

''لگتا ہے کوئی کڑی سزا دی جانے والی ہے ان کو۔'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''مگر یہ دوسری عورت؟''

''ٹھہریں میں منوہر سے پوچھتا ہوں۔'' عمران نے کہا اور منوہر کی طرف گیا جو کچھ فاصلے پر کھڑا سردار محافظ ڈولما اور دیگر مقامی افراد سے باتیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد عمران، منوہر کو ہمارے پاس لے آیا۔ منوہر نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''سکامر کو سزائے موت دی جانے والی ہے..... اور یہ دوسری عورت اس جرم میں سکامر کی سہولت کار رہی ہے، یہ بھی ماری جائے گی۔ بلکہ ایک عورت اور بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ عورت بھی شریک جرم ہونے کی وجہ سے موت کی حق دار ٹھہری ہے مگر وہ چونکہ سات ماہ کی حاملہ ہے اس لیے وقتی طور پر اسے مارا نہیں جا رہا۔ بچے کے جنم کے بعد اسے بھی مار دیا جائے گا۔''

پہریدار عورتیں روتے چلاتے سکامر کو آہنی پول کے قریب لے آئی تھیں۔ درمیانی عمر کی عورت بھی ہمراہ تھی۔ اس کے تپتی خدوخال پر برف کی سی سفیدی تھی۔ تاہم وہ خاموش تھی۔ جیسے جانتی ہو کہ جو کچھ ہونا ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

''ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟'' میں نے منوہر سے پوچھا۔

''اس کی ٹھیک جانکاری تو ابھی مجھے بھی نہیں لیکن لگتا ہے کہ یہاں کوئی آگنی وغیرہ جلائی جائے گی۔''

ہم سکامر اور درمیانی عمر کی عورت کی طرف دیکھ رہے تھے جب اچانک ہماری نظروں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ سکامر کی ساتھی مجرمہ نے تڑپ کر ایک پہریدار عورت کی کمر سے تیز دھار کٹار کھینچ لی۔ وہ بہت تیزی سے اس کٹار کو اپنی گردن کی طرف لے کر گئی جیسے اپنی شہ رگ کاٹنا چاہتی ہو مگر اس کے عقب میں کھڑی پہریدار نے اس کی کلائی دبوچ لی پھر دیگر عورتوں نے بھی اسے دبوچ لیا اور اس کی گرفت سے ''کٹار'' نکالنے کے بعد اسے ایک پول کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ شور مچاتے اور آہ و بکا کرتے سکامر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

جس طرح عورت نے خودکشی کی سرتوڑ کوشش کی تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کو کافی سخت سزا ملنے والی ہے۔

ایک جانب سے پانچ چھ مرد پہریدار نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں موٹی اور پتلی خشک لکڑیاں تھیں۔ وہ ان لکڑیوں کو بڑی ترتیب سے سکامر اور عورت کے اردگرد چننے لگے۔ اب صورت حال سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایسے برفستان میں خشک لکڑیوں اور نارنجی آگ کی دید بڑی خوشنما ہوتی ہے، مگر یہاں یہ خوشنمائی کسی اور شکل میں ڈھلنے والی تھی۔ جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو آہستہ آہستہ آگ میں جلنے، پگھلنے اور دم توڑتے دیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ تاہم لگتا تھا کہ یہاں کے لوگ ایسے مناظر کے عادی ہیں۔

لکڑیوں پر چربی کا تیل چھڑکا گیا۔ سکامر کی حالت دیدنی تھی۔ وہ اب تک مایا سے معافیاں مانگ رہا تھا اور التجائیں کر رہا تھا۔ مایا کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سی سختی تھی۔ باندھنے سے پہلے سکامر اور درمیانی عمر والی عورت کے کپڑے اتار دیے گئے تھے۔ عورت کے بالائی اور زیریں جسم پر نہایت مختصر لباس تھا جبکہ سکامر کے نوخیز، سڈول جسم پر فقط چمڑے کا ایک لنگوٹ نظر آ رہا تھا۔ کڑاکے کی سردی میں یہ نہایت ناکافی لباس تھا مگر ان نیم عریاں جسموں کو بہت جلد آگ کی حرارت ملنے والی تھی..... اور اتنی زیادہ حرارت کہ پھر ان کے ٹھٹھرے جسموں کو کسی شے کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ میں نے ایک اور چیز نوٹ کی۔ سکامر کے پورے جسم حتیٰ کہ ناف اور ٹانگوں پر بھی پختہ روشنائی سے بنائے گئے رنگین نقش و نگار نظر آ رہے تھے۔ ایسے نقش و نگار اکثر مردوں کے جسم پر موجود تھے۔

کچھ ہی دیر بعد عمر رسیدہ عورت کے حکم پر خشک لکڑیوں کو آگ لگا دی گئی۔ ان دونوں کے اجسام پہلے ہلکی آنچ پر تڑپے مچلے پھر آگ کے پھنکارتے ہوئے شعلے انہیں ڈھانپنے لگے۔

عمران نے کہا۔ ''مایا سے یہ سب برداشت نہیں ہو گا۔''

میں نے دیکھا، مایا نے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ دراز قد مایا عروج کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ میں نے ان دونوں کو ساتھ لیا اور موقع سے ہٹ گیا۔ مرنے والوں کی صدائیں

دل دوز تھیں۔ فضا میں سوختہ گوشت کی بدبو پھیلنے لگی تھی۔

غار کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہی شدید سردی میں کمی محسوس ہوئی۔ ہما اپنے ساتھیوں کی طرف چلی گئی۔ میں ماہین کو اپنے حجرے نما کمرے میں لے آیا۔ وہ سرتاپا، ہرے رنگ کے بھاری بھرکم کپڑوں میں تھی۔ بس چہرہ نظر آتا تھا اور وہ سفید گلاب کی طرح تھا۔ جیسے سبز پتوں میں گھرا ہوا سفید پھول۔

"بہت ظالم ہیں یہ لوگ۔" وہ منمنائی۔

میں نے کہا۔ "مجھے پتا ہے تم نے اپنے موبائل سے وڈیو بنائی ہے۔ سوشل میڈیا پر ڈالو گی تو تہلکہ مچ جائے گا۔"

"نہیں انکل، میں ڈیلیٹ کر دوں گی اسے۔ جب میں خود برداشت نہیں کر سکی تو میرے ویورز کیسے کریں گے۔ ایسی سستی اور دل خراش شہرت کی تمنا میں نے کبھی نہیں کی۔"

"مجھے تم سے ایسی ہی جواب کی توقع تھی۔" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "یہ ہم کن لوگوں میں آ پھنسے ہیں انکل۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لوگ بھی میم مائرہ اور رامے سے کچھ کم سفاک نہیں ہیں اور پھر ان کا یہ رہن سہن۔ کہانیوں اور فلموں وغیرہ سے یہ جانا تھا کہ کچھ گروہ یا قبیلے ایسے ہوتے ہیں جن میں مردوں پر عورتوں کا غلبہ ہوتا ہے اور روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وہی زیادہ جدوجہد کرتی ہیں۔ یہاں یہ سب کچھ حقیقت کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔"

"اور اس کا ہمیں ایک فائدہ بھی ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ فائدہ تمہاری نسبت سے ہے۔ لگتا ہے کہ یہاں کسی عورت پر ظلم کرنا کسی مرد کے لیے آسان نہیں ہے اور یہ بات یہاں آتے ہی جادو رامے نے بھی سمجھ لی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں انکل تابی؟"

"تمہاری سب سے بڑی پریشانی میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی ہے ماہین۔ جو دھماکا خیز ڈیوائس تمہاری ٹانگ سے باندھی گئی ہے، اس کے دونوں "ریموٹ کنٹرول" میم مائرہ نے اپنے پاس رکھ لیے ہیں اور فی الحال انہیں ڈس کونیکٹ بھی کر دیا ہے۔ اب تمہیں ایزی محسوس کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار دن میں عمران اور میں مائرہ کو قائل کر لیں کہ وہ ویسے ہی یہ منحوس شے تمہاری ٹانگ سے علیحدہ کر دے۔"

"اور آپ کا خیال ہے کہ یہ سب اس لیے ہوا ہے کہ رامے اور مائرہ یہاں کے ماحول سے ڈر گئے ہیں؟"

"سو فیصد یہی بات ہے۔ مائرہ نے ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ اسے مایا رانی کی ناراضگی کا ڈر ہے۔ شاید تم نے ایک اور بات نوٹ کی ہو۔ کل سے جادو رامے کا رویہ نایلی سے بھی بدلا ہوا ہے۔ وہ اسے کسی زرخرید کنیز کی طرح اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا..... اس پر تشدد بھی کرتا تھا۔ میں نے خود رات کے وقت اس کے خیمے سے ایلی کے رونے کی آوازیں سنی ہیں۔ لیکن آج صبح وہ بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر گھوم رہا تھا۔"

"انکل جی، کیا یہ سب کچھ یہاں کے لوگوں کو بتایا نہیں جا سکتا؟"

"ابھی نہیں ماہین..... لیکن آگے جا کر ایسا موقع آ بھی سکتا ہے۔"

ماہین جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ شاید اس کے تصور میں پھر تھوڑی دیر پہلے کا وہ دل دوز منظر آ گیا تھا جب اس نے نوجوان سکامر اور اس کی مددگار عورت کو زندہ جلتے دیکھا تھا۔

غالباً اپنا دھیان ہٹانے کے لیے اس نے موضوع بدلا۔ "انکل اس سردار محافظ ڈولما نے کیا بات کہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جس سفید سانپ کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ سانپ نہیں کوئی اور چیز ہے۔"

"ہاں اس کی بات سے تو یہی اشارہ ملتا ہے اور یہ بھی لگتا ہے کہ ماضی میں بھی اس شے کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ لوگ یہاں آئے تھے۔"

اسی دوران میں عمران بھی واپس پہنچ گیا۔ جو دل دوز منظر وہ دیکھ کر آیا تھا، اس کا حزن اس کے خوب صورت چہرے پر موجود تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہونے کو تھا مگر پھر ماہین کو میرے پاس دیکھ کر ٹھٹکا۔

"نہیں، نہیں..... آ جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ جھجکتا ہوا چلا آیا۔ "حشام کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ باہر ہی ہے، گونگے جہاناں کے ساتھ اشاروں میں باتیں کر رہا تھا۔ ایک مقامی عورت بھی اسی طرح اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

حشام کا دائیں بائیں ہونا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اندیشہ رہتا تھا کہ وہ کوئی ایسی الٹی سیدھی بات نہ کر دے جو ہمارے مفاد کے خلاف جاتی ہو۔ عمران نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔ "ابھی منوہر سنگھ نے بتایا ہے کہ پرسوں یہاں ایک تقریب میں آپ کو انعام دیا جائے گا۔"

"مجھے انعام؟ وہ کس بات کا؟"

"جناب! آپ نے یہاں کی کرتا دھرتا مایا رانی کی سب سے بڑی اور خطرناک رقیب ہریتی کو جہنم واصل کیا ہے۔ اس پر مایا کے شوہر سکامر کو بھگانے کا ہی نہیں، کم از کم چار افراد کو قتل کرنے کا الزام بھی تھا۔"

"لیکن یہ انعام تو اب ظاہر ہے جادو رامے کو ہی ملے گا۔"

"رامے صرف انعام وصول کرے گا۔ اصل حق دار تو آپ ہی ہیں۔ جب رامے انعام وصول فرمائے گا تو ہم یک زبان ہو کر نعرہ لگائیں گے۔ چور ہے جی چور ہے..... اصل بندہ ہور ہے۔ یہ خوامخواہ کا ہیرو ہے..... زیرو ہے بس زیرو ہے۔"

"تمہارے یہ اردو پنجابی نعرے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ یہی سمجھیں گے کہ تم رامے جی کی عزت افزائی پر خوش ہو رہے ہو۔"

"وہ منوہر سنگھ سے ترجمہ پوچھ لیں گے۔"

"اور منوہر کبھی صحیح ترجمہ نہیں کرے گا۔ اسے بھی رامے کے ہاتھوں اپنی جان نہیں گنوانی۔" میں مسکرایا۔

"مگر ایسا تو نہیں نا کہ یہاں صرف منوہر ہی ترجمانی کے فرائض انجام دے سکتا ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"جناب! ابھی کچھ دیر پہلے میں مایا رانی کی والدہ یوشال ماتا سے بات کر کے آیا ہوں۔ بہت اچھی عورت ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ ہندی، اردو سمجھ لیتی ہے۔ اس کی ایک ملازمہ بھی بری بھلی ہندی جانتی ہے۔ اس کے علاوہ مایا رانی بھی ہندی سے بالکل انجان نہیں ہے۔"

"بڑی جلدی بڑا کچھ جان لیا۔" میں نے کہا۔

"آپ کے اندازے سے زیادہ۔" وہ بولا۔ "یوشال ماتا اپنی بیٹی یعنی مایا رانی کے لیے بہت پریشان ہے۔ دراصل وہ اپنے تیسرے باکر یعنی تیسرے شوہر سکامر سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کی بے وفائی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ کہتی ہے اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ اپنے بقایا دونوں شوہروں کی طرف وہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتی، پورا ایک سال ہو گیا ہے۔" ہماری گفتگو کا رخ غیر ارادی طور پر نازک سمت میں مڑ گیا تھا۔ لہٰذا مابین نے ہمارے پاس سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ ویسے بھی حمام آنے والا تھا۔ وہ مابین کو میرے اور عمران کے پاس بیٹھے دیکھتا تو یقیناً اس کے موڈ پر منفی اثرات پڑتے۔

مابین کے جانے کے بعد عمران بولا۔ "میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا ہوں جی۔ سچی، میرا تو دل چاہنے لگا ہے کہ مایا رانی کے غم کا مداوا کروں۔ مرد ذات کے حوالے سے اس نے اپنے دل میں جو منفی جذبات پال لیے ہیں، ان کا قلع قمع کر دوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"اپنی توجہ سے، پیار سے، اور خود سپردگی سے۔"

"خود سپردگی کے بچے..... تم نے دیکھ ہی لیا ہے نا، یہاں بے وفائی کی سزا کتنی خوفناک ہے۔ اول تو وہ تجھے منہ ہی نہیں لگائے گی، اور اگر لگائے گی تو ایسا کہ تجھے نانی یاد آ جائے گی۔ اگر تو نے حسب عادت کہیں غلطی سے اس کے سامنے مہوش حیات اور کترینہ کیف وغیرہ کا نام بھی لے لیا تو تیری چربی پگھلا کر یہاں کے چراغوں میں ڈال دے گی۔"

"بات تو..... آپ..... ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں..... میں اپنے گوہر عفت کی قربانی تو دے سکتا ہوں۔ مگر یہ چربی پگھلانے والا کام....." اس نے سوچ میں پڑنے کی اداکاری کی، پھر لمبا سانس بھر کر بولا۔ "سچ کہتا ہوں جی۔ یوشال ماتا اپنی بیٹی کی موجودہ حالت کے لیے بہت زیادہ دکھی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ وہ کہیں بستر پر ہی نہ پڑ جائے۔ یہ جو پرسوں تقریب کا اہتمام کیا ہے یوشال ماتا نے وہ بھی اس لیے کہ مایا رانی کا دل کچھ بہل سکے۔"

دو روز بعد تقریب واقعی شاندار تھی۔ یہ اسی ہال نما جگہ پر تھی جسے یہاں طامبورہ کہا جاتا تھا۔ خاص قسم کی خوشبو نے قرب و جوار کو معطر کر دیا تھا اور چربی کے تیل کی ہلکی سی باس جو ہر وقت قرب و جوار میں محسوس ہوتی تھی، اس خوشبو میں دب کر رہ گئی تھی۔ طامبورہ میں مختلف رنگوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ یہ روشنیاں برف پر منعکس ہو کر اور ہی سماں باندھ رہی تھیں۔ پتھر کی طرح سخت برف کے چبوترے پر موٹے نمدے اور قالین بچھے ہوئے تھے۔ یوشال ماتا کے علاوہ وہاں جواں سال مایا رانی اور دو تین مقامی معزز خواتین کرسیوں پر موجود تھیں۔ ان میں میم مائرہ بھی شامل تھی۔ وہ عمر رسیدہ یوشال ماتا کے ساتھ بیٹھی تھی اور کسی وقت اس کے ساتھ سرگوشی بھی کر لیتی تھی۔

عمران کی لپ ریڈنگ والی صلاحیت اب ہر شک شبے سے بالاتر ہو چکی تھی۔ وہ گاہے گاہے اس کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اب بھی وہ مخصوص انداز میں میم مائرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "پتا ہے، یہ باگزیلی مائرہ کیا کہہ رہی ہے؟ یہ عزت مآب محترم رامے صاحب کی شان میں قصیدے پڑھ

رہی ہے۔ یوشال ماتا کو بتا رہی ہے کہ راے جی کا انڈیا اور پاکستان میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو سونا بنتی ہے۔ وہ یاروں کے یار ہیں اور اپنے چاہنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔"

اسی دوران میں میوزک ابھرا اور ڈھول کی دھماد ھم سنائی دینے لگی۔ پھر چبوترے کے سامنے کھلی جگہ پر رقص شروع ہو گیا۔ عورتیں اور مرد ناچنے لگے۔ سردی کے باوجود انہوں نے بھاری بھرکم کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ ان کے جسمانی خدوخال نمایاں تھے۔ مردوں کے جسموں کے جوڑے عریاں تھے ان پر خوب صورت نقش و نگار بنے تھے۔ کچھ عورتوں نے بے باکی سے اپنے ہم رقص مردوں کو اپنے ساتھ چپکایا ہوا تھا۔ ان میں ہمیں سردار محافظ ڈولما بھی نظر آئی۔ اس نے ورزشی جسم والے ایک توانا مرد کو اپنا ہم رقص بنایا ہوا تھا۔ ڈولما کے چہرے پر زخم کا اضافی نشان اس کے جنگجو ہونے کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ کئی دیگر عورتوں کے چہروں پر ایسے ہی چھوٹے بڑے نشان تھے۔ مردوں کے چہروں پر ایسے نشان نہ ہونے کے برابر تھے۔ دو تین خواتین واضح طور پر حاملہ تھیں مگر اسی جوش و خروش اور بے باکی سے ناچ رہی تھیں۔ قبول صورت مایا رانی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر نمایاں طور پر بیزار اور کھوئی کھوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی والدہ اس کوشش میں تھیں کہ مایا اس گہما گہمی میں دلچسپی لے۔ رقصاں افراد میں سے کچھ مردوں نے بازی گری کے کرتب دکھائے اور حاضرین کو محظوظ کیا۔

اس کے بعد دیدہ زیب پوشاکوں میں تین جنگجو ٹائپ عورتیں اندر داخل ہوئیں، منوہر نے بتایا۔ "یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے سکامر اور ہر یتی کی تلاش میں اہم کردار ادا کیا اور گھائل وغیرہ بھی ہوئیں۔" مایا رانی نے ان میں سے ہر ایک کو ایک خوب صورت پلیٹ تحفے میں دی۔ یہ زردی مائل پلیٹ کسی جانور کی کھال کی تھی۔

میں نے منوہر سنگھ سے کہا۔ "یہ شیر کی کھال کی ہے شاید؟"

"شیر کی نہیں..... شیرنی کی کھال کی۔" منوہر نے جواب دیا۔ "رانی نے جو لبادہ پہن رکھا ہے وہ بھی شیرنی کی کھال کا ہے۔ شیرنی کی کھال کا پہننا یہاں بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"اس کا کارن یہ ہے جی کہ شیروں کے پریوار (خاندان) میں شیرنیاں ہی شکار کرتی ہیں اور کرتا دھرتا ہوتی ہیں۔ نر شیر تو بس کبھی کبھار ہی اپنے شریر کو تکلیف دیتے ہیں۔ یہاں بھی مشقت اور خطرے والے سارے کام عورتیں کرتی ہیں۔"

تین خوش پوش عورتوں کے بعد جادو راے کی باری آئی۔ وہ چبوترے کی بائیں جانب سے نمودار ہوا۔ وہ کالے رنگ کا ایک گولا سا نظر آتا تھا جس کی آنکھیں اس کے چہرے کے اوپر دھری تھیں۔ یقیناً حاضرین نے اسے دیکھ کر ایک بے ساختہ کراہیت محسوس کی ہو گی۔ جادو راے نے نابینا ایلی کا سرخ و سپید ہاتھ بڑی محبت سے تھام رکھا تھا۔ اپنے رویے سے وہ لیڈیز فرسٹ..... لیڈیز فرسٹ کی تصویر نظر آ رہا تھا..... حالانکہ یہی راے تھا جس نے اپنی ہوس کی خاطر اسے بینائی سے محروم کیا تھا..... اور اس کے دکھ درد کی پروا کیے بغیر بیدردی سے اس کا جسمانی استحصال کرتا رہا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے میم مائرہ کی طرف دیکھا جو یوشال ماتا کے پہلو میں متمکن کرسی پر براجمان تھی۔ وہ جب بھی نابینا ایلی کو دیکھتی تھی، اس کے چہرے پر ایک نفرت انگیز لیکن مطمئن تاثر ابھر آتا تھا۔ ارب پتی ڈیرن نے مائرہ کو طلاق دی تھی اور نوجوان ایلی سے عہد و پیمان باندھے تھے۔ اس کی سزا ایلی کو یہ ملی تھی کہ وہ آنکھیں گنوا کر راے کے بوجھ تلے روندی جا رہی تھی۔

مایا رانی نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر راے کا استقبال کیا۔ اس کے کالے کلوٹے ہاتھ تھامے اور اپنی زبان میں تعریف کے چند جملے بولے..... پھر ایک خوشنما گلوبند، راے کی گردن میں پہنایا۔ دور ہی سے نظر آتا تھا کہ اس پر قیمتی پتھر جڑے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس "بہادری" کا تمغا تھا جو حقیقت میں راے نے دکھائی ہی نہیں تھی۔ تب ایک انگوٹھی، راے کی سب سے چھوٹی انگلی میں پہنائی گئی۔ حاضرین نے مقامی زبان میں نعرے لگائے اور خوشی کا اظہار کیا۔ تب جوابی کارروائی کے طور پر راے نے مایا رانی اور اس کی والدہ یوشال ماتا کو ایک ایک جدید پسٹل کا تحفہ پیش کیا۔ یہ پسٹل چھوٹی چھوٹی صندوقچیوں میں تھے۔ ان پسٹلوں کے کچھ حصے خالص سونے کے تھے۔ مقامی لوگوں کے پاس چونکہ آتشیں ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے لہٰذا ان چیزوں کی قدر تھی۔ مایا رانی خوش نظر آئی اور اس نے راے کا شکریہ ادا کیا۔

تب مایا رانی اپنی والدہ اور دونوں معزز مہمانوں یعنی

رامے اور مائرہ کے ساتھ اندرونی حصے میں چلی گئی اور طامبورہ میں کھانے پینے کا دور شروع ہوا۔ بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت، نمکین پنیر..... ساتھ مقامی طور پر بنائی گئی نارنجی رنگ کی شراب پی گئی اور اتنی پی گئی کہ سب بدمست ہو گئے۔ کئی عورتیں سرِعام اپنے باکروں (شوہروں) اور دوستوں کے ساتھ بوس و کنار میں مصروف رہیں۔ ایک جواں سال عورت نے اتنی پی کہ وہ ہنستے ہنستے شدتِ جذبات میں رونا شروع ہو گئی۔ تب وہ روتے روتے چبوترے پر چڑھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ''اِک تارا'' قسم کا ساز تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے تمتی زبان میں کوئی درد بھرا گیت گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز میں واقعی سوز تھا۔ اس کا گیت سن کر چند اور مرد و زن بھی اشکبار ہو گئے۔

منوہر کچھ دیر مزید سنتا رہا تب بولا۔ ''جوانی میں یہ بہت خوب صورت تھی۔ ایک لداخی نوجوان سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ بھی اسے چاہتا تھا۔ ایک عرصے تک وہ ایک دوسرے سے اظہارِ محبت نہ کر سکے۔ آخر ایک روز اس عورت نے جو تب لڑکی تھی، ہمت کی۔ اپنے محبوب کے پیچھے طویل سفر کر کے کارگل گئی۔ وہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ وہ نوجوان اس کی جدائی میں چند ماہ بیمار رہنے کے بعد صرف ایک روز پہلے آخری سانسیں لے چکا ہے۔ یہ اس کی یاد میں گاتی ہے۔ یہاں کے لوگ اسے شوق سے سنتے ہیں۔''

نجانے کیوں، عمران کی طرف دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ ایک دم چپ سا ہو گیا ہے۔ ایک گہرا کرب اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا تھا۔ مجھے عمران کے رازداں دوست ضیا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا..... کوئی نہیں جانتا کہ عمران، ماہین کو کتنی شدت سے چاہتا ہے.....

عمران نے مجھے خود کو گھورتے دیکھا تو ایک دم نارمل نظر آنے لگا۔ اپنے تاثرات چھپانا اسے خوب آتا تھا۔

کچھ دیر بعد تقریب تو ختم ہو گئی مگر اس کے اثرات جابجا نظر آتے رہے۔ مقامی شراب کے نشے میں دھت ہو کر مرد و زن اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ کچھ جسمانی تقاضوں سے مجبور ہو کر کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ الکحل جیسی تیز بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک قدرے فربہ عورت دو مردوں کے کندھوں پر سوار تھی اور وہ تینوں ہی ناچ رہے تھے۔ ایک جواں سال لڑکی مستی میں آ کر کپڑوں سے بالکل باہر ہو گئی تھی۔ چار پانچ مرد اس کے اردگرد تھے اور جنس زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ منتظر تھے کہ وہ اس ''حالتِ مستی'' میں کس پر اپنی نگاہِ التفات ڈالتی ہے۔

ہم اپنے برفانی گھروندا نما کمرے میں واپس آ گئے۔ میں اور عمران ایک ہی جگہ سوتے تھے۔ عمران کچھ گم صم سا تھا۔ پڑتے ہی سو گیا۔ میں برفیلی دیوار پر لگے ایک غالیچے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ ہلکی غنودگی بھی تھی۔ ایک بار پھر وہی ہوا جو پہلے بھی ہوتا آیا تھا۔ عمران دانش ایک دم میرے سامنے آن بیٹھا۔ کاڑائے کی گہری براؤن چتلون۔ آدھی آستینوں والی سفید شرٹ۔ کلیوں جیسے دانت نمودار کیے ہوئے۔ پچھلے پندرہ سولہ برسوں نے اس کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑا تھا۔

''کیسے ہو جگر؟'' اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔

میرے دل سے آہ سی نکلی۔ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں گئے تھے تم؟ نہ جاتے۔ زخمی ہو گئے تھے تو سنبھل جاتے۔ واپس آ جاتے..... کتنا اچھا ہوتا، ہم دونوں آج بھی کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہوتے۔ ایک ساتھ خطروں سے کھیل رہے ہوتے۔ اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا رہے ہوتے۔ جیت رہے ہوتے اور مسکرا رہے ہوتے۔''

''تو اسی لیے تو بھیجا ہے تمہارے پاس اپنے بیٹے کو۔ سمجھو میری ہی تصویر ہے میری ہی روح ہے۔''

''نہیں عمران! بہت فرق ہے تجھ میں اور اس میں۔ وہ تیرا بدل نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، بدل نہیں ہے لیکن بہت فرق بھی تو نہیں اور جو فرق ہے وہ بھی نکل جائے گا۔ دیکھنا ایک دن، تم اسے مجھ جیسا ہی پاؤ گے..... تمہیں یہی اعتراض ہے نا کہ وہ ضرورت سے زیادہ جوشیلا ہے۔ لڑائی بھڑائی میں بہت طاق نہیں ہے اور پھر عشق بھی فرمانے لگا ہے۔''

''تو کیا، یہ سب غلط ہے؟''

''نہیں، بالکل ٹھیک ہے مگر یہ ایسی خامیاں نہیں جو دور نہ ہو سکیں۔ تیرے ساتھ رہے گا تو جوشیلا پن کم ہو جائے گا۔ لڑائی بھڑائی کی کمی تم پوری نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا؟ پیارے! ویسے سے دیا جلتا ہے۔ تمہیں بارودنا جیکی نے شیشے سے فولاد بنا کر اس فن میں طاق کیا، تم اپنے اس بھتیجے کو کرو۔ وہ بھی تم سے میری ہی طرح محبت کرتا ہے۔ تمہارے پسینے پر خون گرا سکتا ہے۔ میں نے کہا ہے نا وہ میری ہی روح ہے، میرا ہی ڈی این اے ہے۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے اس عالم کو دیکھتا رہا جو میرے سامنے بیٹھا تھا لیکن درمیان میں لامحدود فاصلے حائل تھے۔

اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر ایک موہوم، اداس مسکراہٹ ابھری بولا۔ ”رہی بات اس کے عشق و محبت کی..... تو جگرا یہ کوئی عام جذبہ نہیں ہے، اور نہ ہی سطحی ہے..... سچ پوچھو تو یہ اسی انمول جذبے کا پرتو ہے جو برسوں پہلے شبانہ کی نسبت سے میرے اندر آناً فاناً نمودار ہوا تھا۔ تو جانتا ہے کہ مجھے کبھی بھی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی، ایک سے بڑھ کر ایک اردگرد گھومتی تھیں۔ ان میں سے کئی شبانہ سے کئی گنا بڑھ کر دلکش تھیں مگر جب شبانہ کو دیکھا تو یہی لگا کہ جنم جنم سے اس چہرے کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ من و عن یہی کچھ تیرے اس بھتیجے کے ساتھ ہوا ہے..... من و عن اور ہو بہو۔ بس دعا کر انجام ہو بہو نہ ہو۔“

میں نے موضوع بدلا۔ ”تجھے دنیا سے گئے برسوں بیت گئے مگر شاہین تجھے اب بھی یاد کرتی ہے۔ تیرے نام پر اس کے چہرے پر اداسیاں ڈیرے ڈالتی ہیں جس طرح مجھے ملتا ہے کیا کبھی اسے بھی ملا ہے؟“

وہ مسکرایا۔ کلیوں جیسے ہموار دانت چمک گئے۔ ”میں کوئی بھٹکی ہوئی روح نہیں ہوں کہ ہر جگہ چکراتا پھروں، یہ تو تیرے ساتھ ایک انوکھا تعلق ہے..... ایک غیر مرئی رشتہ ہے..... جو تیرے سامنے لے آتا ہے۔“

میں عجب اُلجھن کے عالم میں تھا۔ اس سے پوچھا۔ ”کیا تم..... جو میرے سامنے ہو، صرف میرا تصور ہو؟“

وہ بلند آواز میں ہنسا۔ ”تصور ہوتا تو وہی کچھ کہتا جو تمہارے ذہن میں ہے۔ کیا میں تمہارے خیالات بول رہا ہوں۔“

میرے دل سے ہوک اٹھی۔ وہ آخری لمحے یاد آئے جب وہ بند آنکھوں کے ساتھ، تابوت میں لیٹا تھا۔ میرا دل چاہا آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لوں۔ اپنے ساتھ بھینچ لوں۔ اپنے بے پناہ جذبے کی حدت سے اس شہزادے کو زندہ کر دوں۔ ”کیا میں تمہیں چھو سکتا ہوں؟“ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”یہ ممکن ہوتا تو میں کب کا تمہیں چھو چکا ہوتا۔“

میں جھلا کر اس کی طرف بڑھا..... وہ اوجھل ہو چکا تھا۔ میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دیر تک اس پہیلی کے بارے میں سوچتا رہا جو گاہے بگاہے عمران دانش کے روپ میں میرے سامنے آتی رہتی تھی..... سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

رات تیسرے پہر آنکھ کھلی۔ کہیں دور حسب معمول پالتو بھیڑیوں کی ہاؤلنگ سنائی دے رہی تھی، کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی میں مجھے لگا کہ عمران اپنی جگہ پر نہیں ہے۔

”عمران..... عمران.....“ میں نے دو تین بار آواز دی پھر اٹھ کر اسے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے اردگرد کے گھروندوں میں جھانکا۔ حشام، گونگا جہاناں، انچارج گارڈ بہروز، ہما عروج سب اپنی اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ یکایک مجھ پر انکشاف ہوا کہ ماہین، ہما عروج کے ساتھ موجود نہیں ہے۔

وہ کہاں تھی؟ کہیں وہ اور عمران دونوں باہر تو نہیں نکلے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ماہین تو عمران سے کھل کر بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اسے ہر وقت حشام کی ناراضگی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ عمران خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ حشام کو پھر سے بگڑنے اور بھڑکنے کا موقع ملے۔

میں نے اپنی بھاری بھرکم جیکٹ پہنی۔ اس کا ہڈ سر پر جمایا۔ دستانے چڑھائے اور باہر جانے کا سوچا۔ شراب نوشی کے اثرات غار کے تقریباً سب ہی مکینوں پر حاوی تھے۔ راہداریوں میں بھی مرد و زن آڑے ترچھے سو رہے تھے۔ شاید کچھ ابھی تک برفیلے کمروں کی نیم گرم تاریکی میں جاگ بھی رہے ہوں اور ایک دوسرے کو اپنی محبت کا یقین دلا رہے ہوں۔ اچانک مجھے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا برفیلی سرنگ نما راہداری میں کوئی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ وہ ایک دیوار گیر لیمپ کے قریب سے گزرا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ ماہین تھی اس کے جسم پر بھاری سرخ جیکٹ موجود تھی لیکن ٹوپی نہیں تھی سر پر..... اس کے لمبے بال لہرا رہے تھے۔ پاؤں میں برف پر چلنے والے بوٹ تھے جن کی دھمک عام بوٹوں سے مختلف تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میری طرف آئی۔ بے حد ہانپتی آواز میں بولی۔

”انکل تانی، وہ خطرے میں ہے۔ جلدی چلیں۔“

”کون؟ عمران؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نے..... بڑی مشکل سے اسے بچایا ہے..... لیکن پھر کوئی اور آ جائے گا..... اسے مار ڈالے گا۔“

ماہین کی آواز سن کر بہروز اور حشام وغیرہ بھی جاگ گئے تھے۔ ماہین کے ایک ہاتھ اور چہرے پر تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ سخت سردی کے سبب اس کی ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ ماہین سے سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ ہم اس کے عقب میں چلتے تیزی سے اس وسیع غار کے دہانے کی طرف لپکے۔ مدہوش مکینوں کے جسموں کو پھلانگتے ہم باہر آئے تو سردی کی برچھیوں نے جسم کے کھلے حصوں پر

بے رحم وار کیے۔ بے شک یہ وار بے رحم تھے مگر مجھ پر اتنا اثر نہیں کر رہے تھے جتنا دوسروں پر (بہت عرصہ پہلے میں نے سردی گرمی کو جھیلنا سیکھ لیا تھا) آسمان بالکل صاف تھا اور چاندنی میں اس برفستان کے نشیب و فراز دور دور تک صاف دکھائی دیتے تھے۔ دہانے کے پاس ہی ایک محافظ سوئی پڑی تھی۔ میں نے اس کی رائفل اور ٹارچ اٹھالی۔ ایک ڈھلوان پر چڑھ کر ہم دوسری طرف اتر گئے۔

بھاگتے بھاگتے ماہین بولی۔ ''وہ شکنجے میں ہے۔ اس کا پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ ورنہ شاید وہ اپنے ساتھ یہ سب نہ ہونے دیتا۔''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس پر حملہ کیا گیا ہے..... وہ زخمی ہے۔''

''کس نے کیا ہے؟''

''ٹھیک سے کچھ پتا نہیں.....'' وہ بھاگتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ قریباً ایک فرلانگ آگے آکر ہم ایک کھائی میں اترے اور پھر سنبھل سنبھل کر ایک کھوہ میں داخل ہو گئے۔ ماہین نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے لی اور احتیاط سے اپنے قدموں کے نشان دیکھنے لگی۔ ''انکل تابی! بڑے دھیان سے۔ آپ ان نشانوں کے اوپر ہی چلیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

ہم نے ماہین کی ہدایت پر عمل کیا۔ کچھ آگے گئے تو ٹارچ کی روشنی میں تھیر خیز منظر نظر آیا۔ یہاں عمران چت پڑا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون برف پر دکھائی دے رہا تھا۔ عمران کے قریب ہی پانچ چھ فٹ کی دوری پر ہمیں ایک چوڑی چکلی جثے کی عورت نظر آئی۔ وہ بے ہوش تھی اور اوندھی پڑی تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر گہری چوٹ اور خون کے نشانات تھے۔ کھوہ کے اندرونی حصے کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ یہاں کافی جدوجہد ہوئی ہے۔

میں عمران کی طرف لپکا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے جسم پر ڈالی۔ اس کا دایاں پاؤں لکڑی کے ایک وزنی شکنجے میں تھا۔ شکنجے کے ساتھ لوہے کی ایک زنگ آلود زنجیر بھی نظر آ رہی تھی۔ بہرحال پاؤں زیادہ زخمی نہیں تھا۔ اصل زخم اس کے سر پر تھا۔ یہاں غالباً اٹی کلہاڑی کا کند وار کیا گیا تھا۔ وہ چت پڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو دونوں اطراف میں آہنی میخوں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ ویسی ہی میخیں تھیں جو کوہ پیما برف میں گاڑتے ہیں۔ عمران کا لباس سامنے سے چاک کر دیا گیا تھا۔ بلا کی سردی میں اس کا سینہ ناف تک بالکل عریاں نظر آتا تھا۔

''عمران..... عمران.....'' میں نے اُسے پکارا اور اس کے گال تھپتھپائے۔

وہ کراہا۔ ''پریشان نہ ہوں..... میں ہوش میں ہوں۔ ہم..... ماہین کہاں ہے؟''

''یہ سامنے کھڑی ہے۔ یہی ہمیں یہاں لے کر آئی ہے۔''

عمران نے سر اٹھا کر ماہین کو دیکھنے کی کوشش کی مگر سر کی چوٹ کی وجہ سے کراہ کر رہ گیا۔ ''ماہین نے میری بڑی مدد کی ہے۔'' وہ بولا۔ ''ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' پھر حسب عادت اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری، کہنے لگا۔ ''یہ شکنجہ یقیناً کسی جانور کے لیے ہی لگایا گیا تھا۔ بڑی حق تلفی ہو گئی ہے اس بے چارے جانور کی۔''

''حق تلفی تو تمہاری ہوئی ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''مگر..... تم یہاں پائے کیسے جا رہے ہو، تم تو میرے ساتھ سوئے ہوئے تھے..... اور یہ سر کی چوٹ۔ اچھا بھلا زخم ہے.....''

میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے سر پر مرکوز کیا۔ بے پناہ سردی کی وجہ سے خون زیادہ نہیں بہا تھا اور نہ زخم اچھا خاصا تھا۔ میری نگاہ پہلو میں کھڑے حشام پر پڑی۔ اس کی نگاہوں میں عمران کے لیے ہمدردی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ حالانکہ باقی سب مضطرب نظر آتے تھے۔ غالباً وہ اس ساری صورتِ حال پر جھنجلایا ہوا تھا، کیونکہ اس صورتِ حال کے مرکزی کردار عمران اور ماہین تھے۔

ہمارے پیچھے ہی پیچھے سردار محافظ ڈولما بھی اپنی چند ساتھیوں کے ہمراہ پہنچ گئی تھی۔ اس نے منوہر سنگھ کو بتایا کہ لکڑی کی موٹی شاخوں کا بنا ہوا یہ شکنجہ یہاں تبتی بھیڑیے یا آئی بیکس کو پکڑنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ ٹانگ معمولی زخمی ہوئی ورنہ یہ ٹوٹ سکتی تھی۔ ڈولما نے اپنی دو ساتھیوں سے مل کر یہ خاص قسم کا چوبی شکنجہ عمران کے پاؤں سے علیحدہ کیا۔ اس کے ہاتھ کھولے گئے۔ اس دوران میں ماہین نے ہمیں بتایا کہ یہ سامنے پڑی عورت اس کے ہاتھوں بے ہوش ہوئی ہے۔ اس نے وزنی ڈنڈے کی دو شدید ضربیں اس کے سر پر لگائی تھیں۔ ماہین نے یہ بھی بتایا کہ ایک اور عورت تھی جو فرار ہو گئی ہے۔

ماہین نے اپنی سرخ جیکٹ کے اندر سے قریباً دو فٹ لمبی کٹار نکال کر ڈولما کو تھمائی اور اشاروں سے اسے بتایا کہ یہ اس عورت کی ہے جو سامنے بے ہوش پڑی ہے۔

پنڈلی سے عمران کی کھال چھل گئی تھی اور خون رِس رہا

تھا۔ ڈولما کے حکم پر دو پہلوان نما مرد محافظوں نے عمران کے لیے اپنے ہاتھوں کی کرسی بنائی تاکہ اسے اٹھا کر کھوہ سے باہر لے جایا جاسکے مگر عمران نے منع کر دیا۔

''ٹھہریں، میں ابھی یہاں کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہمت کر کے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا کھوہ کے آخری حصے کی طرف بڑھا۔ ہم اس کے پیچھے تھے۔ ایک جگہ کلہاڑی نظر آئی لیکن یہ پوری کلہاڑی نہیں تھی بلکہ صرف اس کا پھل تھا۔ ہم ایک خم سے گزرے۔ ٹارچوں کی روشنی میں ایک طرف کچھ کچی برف نظر آئی۔ جیسے وہاں سے پتھریلی برف کھودی گئی ہو۔ عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ان عورتوں نے یہاں کچھ دبایا ہے۔''

میں نے منوہر سے کہا۔ ''ڈولما کو بتاؤ کہ عمران کے خیال میں یہاں کچھ چھپایا گیا ہے۔''

منوہر کی بات سننے کے بعد چاق چوبند ڈولما نے دائیں بائیں ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ اسے برف کھودنے والی ایک چھوٹی کدال نظر آگئی۔ ڈولما کی ہدایت پر دو محافظ عورتوں نے تیزی سے کچی برف ہٹانی شروع کی اور پھر سب کی آنکھیں کھل رہ گئیں۔

جو سب سے پہلی شے نظر آئی وہ لوہے کا ایک صندوقچہ تھا۔ کدال کی ضرب سے اس کا کنڈل توڑا گیا۔ ڈھکنا کھلتے ہی سب سے اوپر دو شاندار پسٹل دکھائی دیا جس کا دستہ سونے کا تھا۔ یہ ان دو پسٹلوں میں سے ایک تھا جو آج شام کی تقریب میں جادو رائے نے مایا رانی اور اس کی والدہ کو پیش کیے تھے۔ لوہے کے اس صندوقچے میں جو دیگر اشیا تھیں۔ ان میں دو رسٹ واچ، چند زیور، کچھ انڈین نقدی، ولایتی شراب کی دو بہت قیمتی بوتلیں اور اس طرح کی دیگر اشیا شامل تھیں۔ پلاسٹک کے دو بڑے تھیلوں میں کچھ گندم بھی یہاں چھپائی گئی تھی (اس علاقے میں اناج کی بہت قدر و قیمت تھی)

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

عمران بولا۔ ''میں آپ کے پاس ہی لیٹا ہوا تھا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ میرے اردگرد سب ہی مدہوش پڑے تھے۔ حتیٰ کہ آپ بھی بن پیے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ مجھے یہ دو محافظ عورتیں مشکوک حالت میں نظر آئیں۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ ان میں سے ایک نے کوئی چیز اپنے لبادے میں چھپائی ہے۔ میں ان دونوں کا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہ سکا..... اور ان کے پیچھے ہی پیچھے یہاں تک پہنچ گیا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا ناگہانی آفت مجھ پر ٹوٹ پڑے گی۔ میرا پاؤں اس چوبی پھندے میں اس بری طرح پھنسا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ پھندے کے بند ہونے سے جو کھٹکا پیدا ہوا اس نے ان دونوں عورتوں کو بھی ہوشیار کر دیا۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے.....''

میں نے ٹارچ کی روشنی پھر عمران کے ٹخنے پر ڈالی۔ بہت بری طرح چھلا ہوا تھا مگر ہڈی یقیناً بچ گئی تھی۔ ڈولما نے اسے کندھے سے تھاما اور بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ ذرا کراہ کر بیٹھ گیا۔ ڈولما نے اس کے ٹخنے پر ایک پاؤڈر سا چھڑکا اور پٹی بندھوائی۔ ساتھ ساتھ عمران بتاتا بھی رہا کہ یہاں کیا ہوا.....

اس کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ نشے میں دُھت ان دونوں عورتوں کی نیت عمران کے لیے خراب ہو چکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ بعد ازاں وہ اسے مار ہی ڈالتیں یا پھر کسی ایسی نامعلوم جگہ پھینکتیں جہاں اس کا کھوج لگانا ناممکن ہو جاتا۔ عمران تر نوالہ ہرگز نہیں تھا لیکن یہاں اتفاقاً سچوئیشن ہی ایسی بن گئی تھی کہ وہ بے بس ہو گیا تھا۔ دونوں عورتیں جان گئی تھیں کہ عمران ان کی چوری سے آگاہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے عمران کو خیر کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس نے قریب سے گزرنے والی ایک عورت کی ٹانگ پکڑنا چاہی تو دوسری نے چھوٹے دستے والی کلہاڑی الٹی جانب سے اس کے سر پر ماری۔ یہ کند ضرب اتنی شدید تھی کہ کلہاڑی کا پھل اتر کر دور جا گرا اور عمران کی آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا۔ بعد کے حالات ہمیں یہاں کی زمینی شہادتوں سے ہی معلوم ہو رہے تھے۔ عمران کے بازو بھی باندھے گئے تھے، اسے بالائی لباس سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ان حیوان صفت برفانی عورتوں نے عمران کے جسم پر شراب انڈیل کر اسے چاٹا تھا اور اسے بھی زبردستی پلانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہی وقت تھا جب ماہین بے خودی کا مظاہرہ کرتی ہوئی عمران کے پیچھے ہی پیچھے یہاں پہنچی تھی۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس کی نگاہ پختہ لکڑی کے اس موٹے دستے پر پڑی جو کلہاڑی کے پھل سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس نے یہ دستہ اٹھایا اور عقب سے پوری قوت کے ساتھ ایک عورت کے سر پر دے مارا۔ وہ وہیں بے دم ہو کر گر پڑی۔ دوسری نشے میں چُور چنگھاڑ کر ماہین پر حملہ آور ہوئی اور یہیں پر ماہین کی وہ مہارت کام آئی جو وہ مارشل آرٹ میں رکھتی تھی اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی کر گزرتی تھی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ان سنگین لمحوں میں اس مہارت سے زیادہ ماہین کے اس

جذبے نے کام کیا جو اس کے اندر موجزن ہوا تھا اور جس کا مقصد عمران کو بچانا تھا۔ وہ دیوانہ وار اس جنگجو عورت سے بھڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کاری ضربیں لگائیں۔ جنگجو و سخت جان عورت کو یقیناً ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ بظاہر اسمارٹ اور نازک سی لڑکی اسے یوں "ٹف ٹائم" دے گی۔ اس کا تھوڑا لہولہان ہو چکا تھا اور نشہ بھی ہرن ہو رہا تھا..... تاہم وہ اندھا دھند مکے چلا رہی تھی۔ اس کا ایک مکا کھا کر ماہین بے ہوش عورت کے قریب گری تو اسے موقع مل گیا۔ ماہین نے بے ہوش عورت کے پہلو سے دو فٹ لمبی کٹار کھینچ لی۔

ماہین کے ہاتھ میں یہ تیز دھار ہتھیار اور ماہین کا اشتعال دیکھنے کے بعد وہ عورت یک دم بھاگ کھڑی ہوئی۔ ماہین نے پہلے خود عمران کا پاؤں پھندے سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ ناکام ہوئی تو دوڑتی ہوئی واپس آئی اور میرے پاس پہنچ گئی۔ یہ تھی اب تک کی تمام صورت حال۔

سردار محافظ ڈولما اور دوسری مسلح عورتیں بھی قدرے حیرت سے ماہین کو دیکھ رہی تھیں جیسے یقین نہ کر پا رہی ہوں کہ ماہین نے ہی ان دونوں چور عورتوں کو دھول چٹائی ہے یا یوں کہا جائے کہ برف چٹائی ہے۔ ماہین کو بھی معمولی مرہم پٹی کی ضرورت تھی مگر وہ ابھی غار میں واپس جانا چاہتی تھی۔ ڈولما نے مفرور مجرمہ کی تلاش میں مسلح عورتوں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ برف کے گڑھے میں سے مسروقہ اشیا سمیت بیش قیمت طلائی پسٹل کے، نکالی گئیں اور انہیں ایک بڑی گٹھری میں جمع کیا گیا۔

☆☆☆

صبح ہونے تک یہ خبر پورے قبیلے میں پھیل چکی تھی کہ رات کو کیا ہوا ہے (بے ہوش ہونے والی عورت چل بسی تھی) پتا چلا کہ مایا رانی سخت طیش میں ہے اور کثرت مے نوشی کے سبب فرائض میں غفلت برتنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے۔ چوری ہونے والا بیش قیمت پسٹل مایا کی والدہ والا تھا۔ معلوم ہوا کہ دوسری عورت پکڑی جا چکی ہے۔ اس نے نہ صرف چوری تسلیم کی ہے بلکہ یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ نشے نے ان دونوں کی عقل خبط کر رکھی تھی اور وہ عمران سے "بدسلوکی" کا ارادہ رکھتی تھیں۔ اس نے صرف بدسلوکی کے ارادے کا اعتراف کیا تھا لیکن مجھے اور ماہین کو یقین تھا کہ وہ عمران کو جانی نقصان بھی پہنچا سکتی تھیں۔ ان کی بے رحمی قابلِ ذکر تھی، پھندے میں پھنسے ہوئے اک زخمی کی مدد کے بجائے انہوں نے اس کے کپڑے چاک کیے، اسے زبردستی شراب پلانے کی کوشش کی اور اس سے بدسلوکی کا ارادہ کیا۔

میری اور عمران کی توقع کے عین مطابق، دوپہر سے ذرا پہلے ماہین کے لیے مایا رانی کا بلاوا آ گیا۔ یقیناً ماہین کے دلیرانہ رویے نے مایا کو بھی متاثر کیا تھا اور وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ ماہین قریباً دو گھنٹے تک وہاں رہی۔ ایک مترجم ملازمہ کے ذریعے اس نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ماہین سے دوستانہ گفتگو کی۔ پسٹل کی بازیابی پر خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔

یہ سب کچھ تو بہت اچھا ہوا لیکن اگلے ہی روز اس کا ایک برا پہلو بھی سامنے آ گیا۔ میں اپنے برفیلے گھروندے میں بیٹھا عمران کے ٹخنے کی چوٹ دیکھ رہا تھا۔ ٹخنا کافی بہتر تھا۔ سر پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ "تمہارے اندر تجسس کا مادہ ہے اور دلیری بھی بے شک ہے..... لیکن اپنے باپ جیسی چوکسی شاید نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے تمہاری جگہ وہ ہوتا تو اس طرح پھندے میں نہ پھنستا۔"

"اسے ناگہانی آفت کہتے ہیں چاچو جان، کسی کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کے ساتھ رہنے کا موقع ملتا رہا تو اپنی یہ کمی بھی پوری کر لوں گا۔"

"تو گویا کچھ اور کمیاں بھی ہیں تم میں؟"

"کوئی ایک کمی ہو تو بتاؤں بھی۔ دیکھیں، دل میں عجیب عجیب خواہشیں سر اٹھاتی ہیں۔ کبھی یہ چاہتا ہے کہ چار پانچ گول مٹول بچوں کی بیوہ ماں مجھ پر عاشق ہو جائے اور میں بغیر محنت کیے بچوں کا پاپا بن جاؤں۔"

"خدا کا خوف کرو۔ مہنگائی کا دور ہے..... اور شام کا وقت ہے۔ شام کے وقت ایسی باتیں نہیں کرتے پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ پہلے بھی تم نے ایک ایسی ہی بات کی تھی نا، دیکھو پوری ہو گئی۔"

"کون سی بات؟"

"لاہور میں تم نے بکواس فرمائی تھی نا کہ تمہارا دل چاہتا ہے کہ کسی دولت مند جوان عورت کے ہاتھوں اغوا ہو جاؤ۔ ہو گئے نا اغوا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اغوا کے ساتھ ساتھ مقتول بھی ہو جاتے۔"

عمران نے برا سا منہ بنایا۔ "وہ عورتیں کہاں تھیں جی، بھوتنیاں تھیں بھوتنیاں اور ان کی جو دولت تھی وہ بھی ظاہر ہے چوری کی تھی۔ اغوا ہونے کا سارا مزہ کرکرا کر دیا بدبختوں نے....."

اتنے میں ماہین آتی دکھائی دی۔ عمران جلدی سے اٹھ گیا۔ ”میرا خیال ہے جی، میں باہر کا ایک راؤنڈ لگا آؤں۔“

وہ اٹھا۔ ماہین سے سلام دعا کی اور لنگڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ماہین اندر آگئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔ چہرہ مکدر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ حشام کے ساتھ پھر کوئی بات ہوئی ہے۔

”کیا ہوا اب؟“

”کچھ بھی نہیں جی۔ بس حشام کچھ ناراض..... کچھ چپ سا لگ رہا ہے۔“

”وہی کل رات والی بات؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید.....“

”ویسے تم نے بھی غلطی کی ماہین، تمہیں کسی بھی مہم جوئی سے پہلے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ تمہاری ٹانگ کے ساتھ اب بھی بارودی مواد موجود ہے۔ بھاگ دوڑ اور مار ماری میں وہ خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اگر تمہیں عمران کے حوالے سے کوئی شک ہوا تھا تو مجھے جگا دیتیں۔ میں دیکھ لیتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”بس اُس وقت، ذہن اس طرف گیا ہی نہیں..... اور ایک طرح سے..... یہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا الکل ثانی۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

اس نے بانوں کی لٹ کان کے پیچھے اُڑسی۔ دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ”عمران کا ایک احسان تھا مجھ پر..... اور یقین کریں، میں اس کا بوجھ محسوس کرتی ہوں۔“

”کون سا احسان؟“

”ماشیر بروم کے پہاڑ پر جب میرے کمرے میں آگ بھڑکی تھی اور دروازہ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے میں پھنس گئی تھی..... عمران نے خود کو خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی تھی۔ ایک طرح سے کل رات حساب برابر ہو گیا۔ یقین کریں ایک بوجھ تھا میرے دل پر جو اتر گیا۔ میں نے یہی بات حشام کو بھی بتائی ہے، میرا خیال ہے کہ وہ سمجھ جائے گا۔“

..... ماہین کا خیال تھا کہ حشام سمجھ جائے گا..... بلکہ اچھا محسوس کرے گا کہ ماہین نے عمران کا کوئی احسان اپنے سر پر نہیں رکھا..... مگر ایسا ہوا نہیں۔ اگلے روز صبح سویرے اس کے بالکل الٹ ہوا۔

میں سویا ہوا تھا، عمران نے میرا کندھا ہلا کر مجھے جگایا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”حشام پھر ماہین سے جھگڑا کر رہا ہے۔“

اب میں نے بھی جھگڑے کی آوازیں سن لیں۔ جس کمرے میں ماہین اور ہما قیام پذیر تھیں، یہ آوازیں اسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ حشام گرج رہا تھا۔ ”تم نے خود کو سخت خطرے میں ڈالا۔ اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ کس لیے..... کس کے لیے؟ مجھ سے مشورہ تک کرنا ضروری نہ سمجھا تم نے..... بس منہ اٹھا کر چلی گئیں۔ اب میں کیا سمجھوں اس کو..... کیا سمجھوں؟“ آخری الفاظ اس نے اتنی بلند آواز میں کہے کہ برفیلے در و دیوار..... دور تک گونج گئے۔

”حشام میں نے تمہیں بتایا ہے.....“

”چپ ہو جاؤ۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ ”جب تمہیں پتا ہے کہ وہ ہم دونوں کے تعلق کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے، تم کیوں دن رات اس کے لیے ہمدردیاں پال رہی ہو؟ کیوں مجھے کانٹوں پر گھسیٹتی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ چلایا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ اس نے حسب سابق ماہین کو تھپڑ جڑ دیا ہے۔

عمران نے جیسے تڑپ کر اُن کی طرف جانا چاہا۔ میں نے اسے پکڑ کر روک لیا۔ ”نہیں عمران، مزید تماشا لگ جائے گا..... میں دیکھتا ہوں۔“

میں لپک کر وہاں پہنچا۔ حشام مسلسل چنگھاڑ رہا تھا۔ ہما عروج اس کے اور ماہین کے درمیان آگئی تھی۔ پھر حشام نے طیش کے عالم میں ماہین کا کیمرا دیوار پر پٹخ کر توڑنا چاہا، میں نے اسے روک لیا۔

”چھوڑ دیں مجھے۔“ وہ کراہ کر بولا۔ پھر اُس نے غصیلے انداز میں پتھریلی برف کی دیوار پر دو مُکّے برسائے اور اپنا ہاتھ چھیل کر رکھ لیا۔ تب وہ پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ ماہین کا گال سرخ ہو رہا تھا۔

اسی روز شام کو ماہین کو تیز بخار ہو گیا۔ ہما ساری رات اس کی پیشانی پر پٹیاں کرتی رہی۔ صبح مجھ سے کہنے لگی۔ ”ڈیڈی جی، مجھے ایک بات تو بتاؤ۔ یہ ماہین وچاری کس چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ کسی وقت لگتا ہے کہ وہ حشام سے پیار کرتی ہے اور عمران سے ہمدردی رکھتی ہے۔ پر کسی ویلے ایسا بھی لگتا ہے کہ وہ عمران سے پیار کرتی ہے اور حشام سے ہمدردی رکھتی ہے اور پھر اس حشام کو دیکھو۔ ابھی اس کا شوہر بنا نہیں ہے اور پہلے ہی اس کے سر پر چڑھ کر ناچنے لگ پڑا ہے۔“

''بس ایسے ہی رویے ہوتے ہیں نا جو آہستہ آہستہ رشتوں میں بھی تبدیلی لے آتے ہیں۔''

''یہ کل بالکل ٹھیک ہے، کسی ویلے تو مجھے لگتا ہے کہ خود ماہین کو بھی اپنے آپ کی سمجھ نہیں آرہی۔ اوپر سے حشام کا بھیڑا سلوک اسے اور بددل کررہا ہے۔ وہ بڑی پچل کڑی ہے۔ یہاں ہر کوئی اس کی تعریف کررہا ہے..... سوائے حشام کے۔''

جادو رامے اور میم مائرہ سفر کے لیے بہت سی ادویات بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے (ان کا کام ہی میڈیسن کا تھا) میم مائرہ کے مشورے پر دو روز ماہین کو دوا دی گئی مگر اس کا بخار ٹوٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ تیسرے روز مایا رانی نے ایک مقامی معالجہ کو ماہین کی طرف بھیجا۔ یہ پودوں کی جڑوں اور پتوں وغیرہ سے علاج کرتی تھی۔ اس کا نام گندھارا تھا۔ یہ چھ سات مہینے کی حاملہ نظر آتی تھی۔ بال بکھرے بکھرے تھے۔ عجیب چیز یہ نظر آئی کہ اس کے پاؤں میں بیڑی کی طرح کی ایک زنجیر تھی اور وہ بمشکل چل پاتی تھی۔

منوہر سنگھ نے بتایا۔ ''یہ وہ تیسری مجرمہ ہے جو سکامر کو بھگانے کے ارادہ میں ہر جیتی کے ساتھ شریک تھی۔ اسے زندہ جلانے کی سزا اس کا رن نہیں دی گئی کہ یہ پیٹ سے ہے۔ جب یہ بچے کو جنم دے لے گی تو قبیلے کے قانون کے مطابق اسے بھی مار دیا جائے گا۔''

میں نے جواں سال عورت کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔

منوہر بولا۔ ''بوڑھی ماتا اور رانی کے علاوہ یہ واحد ناری ہے جو کسی حد تک ہندی وغیرہ سمجھتی ہے۔''

ہمیں اندیشہ تھا کہ پتا نہیں یہ ماہین کو کیا الا بلا کھلائے گی۔ لیکن شام تک جب ماہین کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو ہمارے اندیشوں میں بھی کمی واقع ہوگئی۔ وہ دو دن تک ماہین کو کوئی سوپ قسم کی چیز پلاتی رہی۔ ساتھ ایلو پیتھک دوا بھی جاری رہی۔ ایک روز مایا رانی خود بھی ماہین کو دیکھنے آئی۔ گمشدہ اشیا بازیاب کرانے میں عمران اور ماہین نے جو کردار ادا کیا تھا، اس پر مایا رانی دونوں کی بہت مشکور نظر آتی تھی۔ خصوصاً ماہین کے لیے وہ انس محسوس کررہی تھی۔ اس کی دلیری نے بھی مایا کو متاثر کیا تھا۔

ماہین کی طبیعت بہتر ہوئی تو مایا رانی اسے اپنے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر ہی لے گئی۔ مایا رانی اور اس کی والدہ کا خیال تھا کہ وہاں ماہین کو بہتر سہولتیں میسر ہوں گی اور پروٹوکول ملے گا۔ میں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ ماہین چند روز حشام اور عمران سے دور ہی رہے تو بہتر ہے۔

چالاک جادو رامے نے چند ہی دنوں میں یہاں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بنائی تھی۔ اس نے نہ صرف مایا رانی اور اس کی ماتا کو قیمتی پٹل گفٹ کیے تھے بلکہ بعد ازاں کئی اور تحائف بھی ان دونوں کو اور دیگر معزز خواتین کو پیش کیے تھے۔ نابینا ایلی جس کے ساتھ وہ زر خرید لونڈی کا سا سلوک کرتا رہا تھا اب اس کے محبت بھرے رویے کی حق دار ٹھہری تھی۔ وہ اسے بڑے مہذب انداز میں پکارتا تھا اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اس سے باتیں کرتا تھا۔ وجہ صرف یہی تھی کہ وہ جانتا تھا یہاں کسی عورت سے بدسلوکی کرنے کا مطلب قبیلے کے غیظ و غضب کا شکار ہونا ہے۔

اگلے روز میم مائرہ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اسی پوائنٹ پر اس سے بات کی۔ میں نے کہا۔ ''مائرہ! تم نے دیکھا ہی ہے کہ مایا رانی ماہین کو ایک اچھی دوست کی حیثیت دینے لگی ہے اور اب وہ بھی تمہاری طرح خاص رہائشی حصے میں ہے..... لیکن تمہارے رامے صاحب نے جو ریموٹ کنٹرول بم اس کی ٹانگ سے بندھوایا تھا، وہ اب بھی بندھا ہوا ہے۔ اب سوچ لو کہ یہ راز کھل گیا تو تمہاری اور رامے کی ساکھ مایا کی نگاہوں میں کیا رہ جائے گی۔''

میم مائرہ نے اپنے سرخ بالوں میں انگلیاں چلا کر تھپکی انداز میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنی ساتھی کو سختی سے منع کردو کہ وہ اس بارے میں زبان نہ کھولے۔ میں موقع دیکھ کر ڈیوائس اس کی ٹانگ سے علیحدہ کروا دیتی ہوں۔''

''اوکے، اب ایک اور جسارت کرنا چاہتا ہوں..... بلکہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو میم مائرہ! ہم شریک سفر بھی ہیں، اور خطروں میں حصے دار بھی۔ لیکن ابھی تک ہمیں ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا کہ ہم کس مقصد سے یہاں موجود ہیں..... وہ سفید سانپ کیا چیز ہے جس کے لیے ہم برف کے اس دوزخ میں پائے جارہے ہیں؟''

وہ چند سیکنڈ توقف کر کے بولی۔ ''اس سوال کے جواب کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ سمجھو کہ ہم اپنے مقصد کے آس پاس پہنچ چکے ہیں۔''

''یعنی سفید سانپ کے.....؟''

''سانپ..... یا جو کچھ بھی وہ ہے۔''

''یہ تو پھر سسپنس میں رکھنے والی بات ہوئی نا..... شروع میں ڈولما نے بھی ایسی ہی بات کی تھی کہ جس کو سانپ کہا جارہا ہے، وہ سانپ نہیں ہے۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد ذرا دھیمی آواز میں بولی۔ ''وہ سانپ نہیں..... سانپ جیسا ایک کیڑا ہے۔ وہ پیٹ کے بل نہیں چلتا، اس کے سولہ کے لگ بھگ چھوٹے پاؤں ہوتے ہیں۔ اسے مقامی زبان میں زوب کے نام سے پکارا جاتا ہے بلکہ یوں کہو کہ پکارا جاتا تھا.....''

''پکارا جاتا تھا؟ کیا مطلب؟''

''دس پندرہ سال پہلے تک زوب اس علاقے میں موجود تھا مگر سخت موسم کی وجہ سے دھیرے دھیرے ختم ہو چکا ہے یا یوں سمجھو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''تو آپ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہو؟''

''بس یہی سمجھ لو۔'' میم مائرہ نے گول مول بات کی۔ ''جونہی ہمیں چار پانچ جوڑے مل جائیں گے، ہم یہاں سے واپس روانہ ہو جائیں گے۔''

صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ مائرہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سانپ نما اس کیڑے کو یہاں تلاش کیا جا رہا ہے مگر ہمیں کوئی ایسی سرگرمی نظر نہیں آئی تھی پھر ایسے خوفناک سرد موسم میں یہاں حشرات الارض کا پایا جانا یا ڈھونڈا جانا ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ میری معلومات تو یہ تھیں کہ ایسے سرد ترین علاقوں میں اگر سانپ یا ایسے دیگر حشرات الارض ہوں بھی تو زمین کی گہرائی میں چلے جاتے ہیں اور خود پر ''سرمائی نیند'' طاری کر لیتے ہیں۔

مجھے شک گزر رہا تھا کہ زوب نامی یہ خاص کیڑا یہاں موجود ہے مگر مایا رانی اور اس کی ماتا کی اجازت کے بغیر یہ لوگ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کی چاپلوسی اور خوشامد وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں اور اگر یہ حربہ ناکام ہوا تو وہ بزور بازو اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ظاہر تھا کہ اگر وہ مسلح گارڈز کے علاوہ خصوصی طور پر مجھے اور عمران کو بھی یہاں لے کر آئے ہیں تو کسی نہ کسی طور تصادم کا امکان یہاں موجود ہے (غالباً احتیاط کے طور پر جادوراے اور میم مائرہ نے فی الحال ہمیں اور گارڈز کو نہتا ہی رکھا ہوا تھا)

☆☆☆

عمران کے سر پر آنے والا زخم ایسا نہیں تھا کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس کے چہرے کی ایک سائڈ بھی کچھ سوج گئی تھی۔ اسے کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو نجانے کیوں میں خود کو عمران دانش کے سامنے شرمندہ محسوس کرنے لگتا تھا۔ بہرحال عمران کی طبع اس حوالے سے بڑی ڈھیٹ تھی۔ کہنے لگا۔ ''آپ کو دیکھ دیکھ کر مجھے بھی پریشانی اور تکلیف کو انجوائے کرنا آ گیا ہے۔ ہر حال میں مست رہنے کو دل کرتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے گال پر ورم آیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے ڈڈو کی آنکھوں والے راے سے میری دوستی ہو جائے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھیں نا، ایسے ہی لگتا ہے نا کہ میں نے گال میں پان کی گلوری دبا رکھی ہے۔ وہ بھی پان کھاتا ہے۔ مجھے اپنا ہم ذوق سمجھے گا۔ ویسے سچی بات ہے پان جیسی خوب صورت اور خوشبودار چیز بھی اس کے منہ میں جا کر اپنی دلکشی کھو دیتی ہے.....''

اسی اثنا میں کوئی اندر آ گیا۔ عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ یہ عمران کی دیسی معالج گندھارا تھی۔ اس کے پاؤں حسب معمول بیڑی میں تھے اور وہ چھوٹے قدم اٹھاتی آ رہی تھی۔ ماہین کی طرح عمران کا علاج بھی وہ خشک جڑی بوٹیوں سے کرنا چاہتی تھی..... اور ہمیں بھی یہ علاج ایلوپیتھک ہی کی طرح مؤثر لگا تھا۔

گندھارا اپنی نیچر کے حساب سے اچھی عورت لگتی تھی۔ یہاں کی زیادہ تر عورتوں کے برعکس اس کا صرف ایک ہی باکر تھا۔ عنقریب پیدا ہونے والا بچہ اسی باکر سے تھا اور وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ اسے ہونے والے بچے کے باپ کا علم ہے۔ گندھارا کی آنکھوں میں ہر وقت ایک اداسی سی کروٹ لیتی رہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ موت کی مسافر تھی۔ بچہ پیدا ہو جانے کے چھ سات روز بعد ہی اسے موت کی سزا ہو جانا تھی۔ یہاں کے دستور نرالے تھے اور پرانی برف کی طرح سرد اور ٹھوس بھی۔ یہ دستور انسانی فطرت سے بہت دور محسوس ہوتے تھے۔

کہیں پاس سے رونے کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک سے زیادہ مردوں کی آوازیں تھیں۔ جب گندھارا، عمران کے سر کا زخم نیم گرم محلول سے دھو رہی تھی، میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کون رو رہا ہے؟''

وہ عمران کی طرف اشارہ کر کے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولی۔ ''پرسوں ان پر جن دو عورتوں نے حملہ کیا تھا ان میں سے ایک ماری گئی تھی اور دوسری بھاگ گئی ہے۔ یہ جو مرد رو رہے ہیں ماری جانے والی کے باکر (شوہر) ہیں۔''

میں نے اور عمران نے حیرت سے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''اس کے دو باکر تھے اور دونوں سے ایک ہی جیسا پیار کرتی تھی۔ تبتی خرگوش کا گوشت یہاں

کسی کسی کو کھانا نصیب ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کے لیے اس کا شکار کرتی تھی۔ مگر کہتے ہیں نا کہ جب انسان کی مت ماری جاتی ہے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی ایک ساتھی محافظ کے ساتھ مل کر چوری چکاری کرنے لگی۔ یہاں سے کئی قیمتی چیزیں چوری ہوئیں جن کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ دونوں چوری کا سامان اس کھوہ میں چھپاتی تھیں اور پھر آپ لوگوں نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا۔"

عمران سر پر پٹی بندھوا کر باہر گیا اور دو منٹ بعد واپس آ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دو رنڈوے مردوں کو ہم آواز ہو کر روتے دیکھنا بڑا عجیب تجربہ ہے۔ آپ بھی جا کر دیکھیں۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنی چوٹ پر توجہ دو اور ذرا آرام فرماؤ..... یہ نہ ہو کہ یہ رنڈوے مرد تمہیں دیکھ کر مشتعل ہو جائیں اور کچھ کر گزریں۔"

"لیکن ان کی سرتاج کو میں نے نہیں مارنے چوٹ لگائی تھی جناب۔ اور مارنے تو اب یہاں نہیں..... تقریباً دی آئی پی بن گئی ہے۔ منوہر سنگھ بتا رہا تھا کہ مایا رانی اس کا بہت خیال رکھ رہی ہے۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک جانب سے مایا رانی نمودار ہو گئی۔ اس کے اردگرد محافظ عورتیں اور برچھی بردار مرد تھے۔ اس کے جسم پر زرد کھال کا لبادہ تھا جس پر کچھ چمکیلا کام بھی نظر آتا تھا۔ وہ تن کر چل رہی تھی۔ دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھ رکھے تھے۔ ہمارے پاس بیٹھی معالج گندھارا..... اپنی رانی کو دیکھ کر سہم سی گئی۔ رانی نے بھی اس پر بس ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے پر اکتفا کیا۔

مایا رانی کو دیکھ کر گندھارا کے علاوہ میں اور عمران بھی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ مایا رانی عمران کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے عمران کی صحت کے حوالے سے معالجہ گندھارا سے بھی دو چار سوال کیے۔ اس کے بعد اس گھروندے کی طرف چلی گئی جہاں حشام مقیم تھا۔ حشام بھی باہر نکل کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ میں نے دور سے دیکھا وہ مترجم گندھارا کے ذریعے حشام سے باتیں کر رہی تھی۔ عمران نے اپنی لپ ریڈنگ کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے بتایا کہ وہ حشام اور مارنے کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ یقیناً جھگڑے کی وجہ جاننا چاہ رہی ہے۔ ان کی جانب اس طرح گھورنا زیادہ مناسب نہیں تھا، میں اور عمران اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑ گئے۔

یکا یک بھاگنے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا جیسے پچاس ساٹھ قدم دور غار کے کسی حصے میں قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مایا رانی اور محافظوں سمیت سب گھوم کر شور کی طرف متوجہ ہو گئے پھر میرے کانوں سے ایک ایسی آواز ٹکرائی جس نے بدن میں پھریری دوڑا دی۔ یہ کسی درندے کی آواز تھی۔ بہت گمبھیر، تیکھی اور سماعت کو چیرتی ہوئی..... آواز قریب آ رہی تھی۔ تب اندھا دھند بھاگتا ہوا ایک شخص اوندھے منہ مایا رانی اور محافظوں کے قریب گرا۔ اس کی پشت لہولہان تھی۔ یکا یک نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ کسی جانور نے جست لگائی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ ایک برفانی شیر تھا، یعنی سنو لیپرڈ۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ جست لگاتے ہوئے وہ کچھ اور بھی لمبا نظر آیا۔ اس کے براؤن جسم پر چیتے جیسے داغ تھے اور نکیلے دانتوں والا منہ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ زخمی شخص پر جھپٹا اور پنجے سے اس کی گردن اُدھیڑ دی۔ یکا یک میں نے ایک اور خوفناک منظر دیکھا۔ مایا رانی نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے پہلو میں کھڑی ایک محافظ کے ہاتھ سے برچھی جھپٹی اور پلٹ کر لیپرڈ پر وار کیا۔ درندے کے جسم میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ وہ معمولی زخمی ہوا اور سیدھا مایا رانی پر آیا۔ مایا رانی نے کمال پھرتی سے خود کو بچایا۔ لیپرڈ معالجہ گندھارا کے قریب گرا۔ گندھارا چلائی اور بھاگنا چاہا۔ پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ دو قدم چل کر گر گئی۔ وہ لیپرڈ کا آسان شکار تھی مگر لیپرڈ پھر رانی پر حملہ آور ہوا۔ رانی کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں بے خوفی اور طیش کے شعلے رقصاں تھے۔ وہ شیرنی کی زرد کھال پہنتی تھی اور اس وقت شیرنی ہی نظر آ رہی تھی۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ لیپرڈ اس پر آیا۔ اس کا پنجہ رانی کے کندھے سے ٹکرایا اور وہ پشت کے بل گر گئی۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ برچھی اور کلہاڑی بردار محافظ عورتیں اور مرد بھی ان لمحات میں سکتہ زدہ تھے۔ میں کچھ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا جب مایا رانی نے اپنے اوپر چڑھے لیپرڈ پر پلٹ کر طوفانی وار کیا۔ اس نے چلا کر تیز دھار برچھی لیپرڈ کی پسلیوں میں گھونپی اور پھر لیپرڈ کو اپنی ٹانگوں کے ذریعے اچھال دیا۔ قریباً پچاس پچپن کلو وزنی درندہ برف کی ٹھوس دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے پہلو سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا مگر وہ اب بھی کسی حد تک خطرناک تھا۔ ایک جانب سے ڈولما بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے اپنے پسٹل کی تین گولیاں زخمی لیپرڈ

کے جسم میں اتار دیں۔ وہ پھڑک کر بے حرکت ہو گیا۔ اس کی قریباً چار فٹ لمبی دم کسی ناگ کی طرح اپنے ہی خون میں لت پت تھی۔

ہم زخمی شخص کی طرف لپکے۔ اس کا نرخرہ اس طرح اُدھڑا تھا کہ ہڈیاں تک نظر آ رہی تھیں۔ گندھارا نے اس کا خون روکنا چاہا مگر صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کے لیے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پتھرا گئیں۔

مایا رانی کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے، جنہیں اس کی محافظ عورتوں نے صاف کیا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ صرف اس لیے رانی نہیں ہے کہ یہ رتبہ اسے وراثت میں ملا ہے، وہ واقعی کسی ایسے مرتبے کی حق دار تھی۔

جانور کی لاش کو گھسیٹ کر غار کے کسی دوسرے حصے میں لے جایا گیا۔ ماحول میں ابھی تک سنسنی تھی۔ منوہر سنگھ نے بتایا کہ شدید موسم میں اسی طرح بھولے بھٹکے جانور کسی انسانی آبادی کی طرف نکل آتے ہیں..... ایسے خطرات یہاں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

☆☆☆

دو روز بعد برف باری شروع ہو گئی۔ یہ اتنی شدید تھی کہ یہاں کے مکین اپنے گھروندوں میں قید ہو کر رہ گئے۔ برف گرنے کی صدا کے سوا ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں تک کہ بھیڑیوں کی آوازیں بھی معدوم تھیں۔ بس دو تین دفعہ ایک مہیب آواز ضرور سنائی دی۔ عمران نے بیڑی میں جکڑی ہوئی گندھارا سے پوچھا تو پتا چلا کہ یہ برف ڈھلوانوں پر پھسلنے، یعنی "ایوا لانچس" کی آواز ہے۔ شب و روز کی مسلسل برف باری رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ سردی انتہا کی تھی تاہم ان لوگوں نے اپنے اس وسیع و عریض غار کو قدرے گرم رکھنے کے بہت سے طریقے ڈھونڈ رکھے تھے۔

ایک روز منوہر سنگھ ہمیں اس خاص الخاص کیڑے زوب کی شکل دکھانے میں کامیاب رہا جس کے زہر کے حصول کے لیے رامے اور مائرہ اپنے گینگ سمیت یہاں موجود تھے مگر یہ زوب زندہ نہیں، مردہ تھا۔ وہ نجانے کتنی مدت تک برف میں دبا رہنے کی وجہ سے لکڑی ہو چکا تھا۔ اس کی رنگت بالکل سفید نہیں بلکہ چھپکلی سے ملتی جلتی تھی۔ جو کیڑا منوہر نے ہمیں دکھایا، اس کی لمبائی ڈیڑھ فٹ کے قریب رہی ہو گی۔ یقیناً اگر اس کے ڈیڑھ درجن پاؤں نہ ہوتے تو وہ سانپ کے قریب ترین ہوتا۔

میں نے کہا۔ "اسے دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے کہ اس کی کھال بہت موٹی ہے اور یہ ایک نہایت سخت جان مخلوق ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" منوہر بولا۔ "جہاں تک میں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے، یہ سانپ کی طرح برف میں بالکل جم جانے کے باوجود اپنا جیون نہیں کھوتا اگر تین چار گھنٹے کے اندر اسے مناسب گرمی مل جائے تو یہ پھر حرکت میں آ جاتا ہے۔"

اسی اثنا میں ڈولما بھی اُدھر سے گزری۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ ہم نے منجمد کیڑے کو دم کی طرف سے پکڑ کر لٹکایا ہوا ہے تو اس کے چوڑے چہرے پر کچھ ناگواری ابھری۔ وہ کچھ بولی۔ منوہر نے اس کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ "ڈولما کہتی ہے کہ ہمارے اس قبیلے میں زوب کو عزت دی جاتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی منوہر نے برسوں سے منجمد زوب کو بڑی احتیاط سے اونی نمدے پر رکھ دیا۔

"اس عزت کی وجہ کیا ہے؟" میں نے منوہر کے ذریعے ڈولما سے پوچھا۔

ڈولما نے منوہر کے توسط سے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں مانا جاتا ہے کہ زوب کی وجہ سے مہلک برفانی طوفان نہیں آتے اور سردی حد سے نہیں گزرتی....."

ڈولما کے جانے کے بعد عمران نے کہا۔ "یہ اچھی بات کہی اس "فی میل ارسطو" نے۔ اس کیڑے کی وجہ سے ہلاکت خیز سردی نہیں پڑتی لیکن یہ خود ہلاکت خیز سردی ہی کی وجہ سے بتدریج ختم ہو چکا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا ہو۔" منوہر نے خیال ظاہر کیا۔ "ویسے بھی ایسے قبائل کے عقیدوں کو بدلنا بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔"

جب ہم بات کر رہے تھے، ایک تنومند عورت اپنے تین باکروں کے ساتھ ہمارے سامنے سے گزری۔ وہ بہت اکڑ کر چل رہی تھی۔ اس اکڑ کی وجہ بہت بڑے بڑے سینگوں والا وہ پہاڑی بکرا تھا جو وہ کہیں سے شکار کر کے لائی تھی۔ جانور کا سر عورت کے ہاتھ میں تھا اور اس کا جسم اس کے تین باکروں نے اٹھا رکھا تھا۔ اچانک بے دھیانی میں ایک باکر کا پاؤں رپٹا اور ذبح شدہ جانور اس طرح گرا کہ عورت کے ہاتھ سے بکرے کا سر بھی گر کر فرش پر لڑھک گیا۔ غالباً اس کا کوئی سینگ عورت کے پاؤں پر لگا اور وہ آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے گلے کے گلوبند سے پکڑ کر باکر کو تھپڑ مارے اور پھر دونوں بازو پھیلا کر اسے ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ وہ بے چارہ کھڑا ہو گیا۔ شاید

عورت کو پہلے بھی کسی بات کا غصہ تھا۔ وہ بڑبڑاتی اور پاؤں پٹختی باقی دو باکروں کے ساتھ بکرے سمیت آگے بڑھ گئی۔ وہ نوجوان وہیں بے بسی کی تصویر بنا ایک ٹانگ پر کھڑا رہا اور وہ پورے تین پہر تک وہاں کھڑا رہا۔ ایک اور عورت اس کی نگران رہی۔ جب وہ اپنی کانپتی ٹانگ کو سہارا دینے کے لیے دوسری ٹانگ کا پاؤں نیچے لگاتا تھا، وہ اس کی ٹانگ پر چھڑی مارتی تھی۔ آتے جاتے لوگ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے تھے۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے اور بھی کئی تماشے ہمیں یہاں نظر آئے تھے۔

عمران اب بہتر تھا اور قدرے اچھے موڈ میں تھا۔ وہ گونگے جہانداں کے ساتھ اکثر اشاروں کنائیوں میں بات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ ہونٹوں کی حرکت سے آواز کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے گندھارا کو بتا رکھا تھا کہ انڈین فلموں کا مشہور ہیرو دلیپ بھ بچپن اس کا سوتیلا بھائی ہے اور اس کے باپ کی پہلی بیوی سے ہے۔

وہ اب اکثر مقامی عورتوں کے ساتھ بھی گپ شپ کرنے لگا تھا۔ اشاروں کنائیوں میں ان سے بات کرتا۔ اچھی شکل صورت کی وجہ سے لڑکیاں اس میں دلچسپی لیتی تھیں، اسے دیکھ کر مسکراتیں اور اس کی ٹھوڑی کے گڑھے پر تبصرے کرتی تھیں۔

کہنے لگا۔ ''کبھی تو دل چاہتا ہے کہ ان میں سے کوئی چل چیں دیکھ کر اپنا آپ اس کے حوالے کر دوں۔ بھول جاؤں باقی سب کچھ۔''

میں نے کہا۔ ''بھول جاؤ مگر یہ مت بھولنا کے گلے میں پٹا باندھنا پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایک ٹانگ پر کھڑا بھی ہونا پڑے۔''

منوہر سنگھ بلند آواز میں ہنسنے لگا۔ ہم جانتے نہیں تھے کہ یہ جو تھوڑا بہت ہنسی مذاق ہے، ختم ہونے والا ہے، حالات بتدریج سنگین ہونے والے ہیں۔

☆☆☆

میں اپنے گھروندہ نما کمرے میں تھا۔ عمران بھی میرے قریب ہی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اندرونی حصے کی ایک راہداری نما جگہ پر جادو رامے کو دیکھا تھا، وہ ناہینا ایلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے، محبت سے اس کی طرف دیکھتا ہوا گزرا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ایلی کے ساتھ اس کا یہ رویہ دکھاوے کا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مایا رانی اور بوشال ماتا کی نگاہوں میں اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتا ہے..... ناہینا ایلی کا خیال آتے ہی اس کے ارب پتی منگیتر یا بوائے فرینڈ ڈیرن فورڈ کا خیال بھی آ گیا۔ ہم نے اسے راولپنڈی کے ایک گورا قبرستان سے اغوا کیا تھا اور اس کی زندگی کو ایک ایسا موڑ دے دیا تھا کہ اب وہ یقیناً لاہور کی اس نامعلوم عمارت میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ انسان کے کرم کسی نہ کسی صورت میں تو اس کے سامنے آتے ہی ہیں۔

اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ میں نے دیکھا معالجہ گندھارا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں مرہم پٹی والا چوبی باکس تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا پیٹ تھام رکھا تھا۔ اس کی مرہم پٹی کے سبب عمران کے سر کا زخم واقعی حیران کن تیزی سے مندمل ہوا تھا۔ ویسے عمران میم مائرہ کی ہدایت کے مطابق اینٹی بائیوٹک بھی کھا رہا تھا۔

مرہم پٹی کروا کر عمران ذرا لنگڑاتا ہوا غار کے دہانے کی طرف نکل گیا تو گندھارا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہاں سب میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ مایا رانی کی سہیلی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''سہیلی؟ کون سہیلی؟''

''وہی آپ کے ساتھ آنے والی..... کیا نام ہے اُس کا..... ماہیر۔''

''ماہیر..... نہیں ماہین۔ تم اسے رانی کی سہیلی کیوں کہہ رہی ہو؟''

''سہیلی کہہ لو یا ہم مزاج ساتھی کہہ لو۔ رانی صاحبہ اس کے بہت قریب ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ہر طرح کی بات کر لیتی ہیں۔''

''یہ شادی والی بات کیا کہی ہے تم نے؟''

''مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں۔'' گندھارا بولی۔ ''لیکن یہاں کہا یہی جا رہا ہے کہ وہ ماہیر..... میرا مطلب ہے ماہین ان دونوں کو ہی پسند کرتی ہے۔ یعنی یہ آپ کا زخمی ساتھی عمران اور دوسرا وہ ڈیزائن دار بالوں والا حشام۔ وہ ان دونوں سے ہی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے کہا۔ ''دونوں سے شادی کا کیا مطلب؟ تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ بہت بڑا جرم ہے اور اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔''

''آپ کسی اور جگہ کی بات کر رہے ہیں، لیکن میں یہاں کی بات کر رہی ہوں جہاں آپ موجود ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ جائز اور رواج کے عین مطابق ہے۔''

"لیکن تمہارے رواج ہم پر لاگو نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ہماری اس ساتھی پر۔ رواج لاگو ہونا تو دور کی بات ہے..... وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"مگر میری اطلاعات تو کچھ اور ہیں۔" وہ عجیب لہجے میں بولی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہ دونوں سے محبت کرتی ہے..... اور ان میں سے کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتی۔ مایا رانی نے اسے ہماری برادری کی سب سے بڑی پیشوا دیوی تورما سے ملایا ہے۔ دیوی تورما کے ساتھ دو تین بار اس کی تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ وہ کافی حد تک قائل ہو چکی ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ سورج مغرب سے نکل سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔"

وہ عجیب اداسی سے مسکرائی۔ "یہ طلسم نگری ہے صاحب جی، یہاں تو سورج نکلتا ہی نہیں۔ آپ سورج کی مثال کیسے دے سکتے ہو۔ جہاں تک بات ہے اس کے نہ ماننے کی، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت حد تک مان چکی ہے جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں لڑکے بہت جلد اس کے باکر بن جائیں گے۔ دونوں میں سے کسی کو اس کی جدائی برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔"

میرا جی چاہا کہ گندھارا کے منہ پر طمانچہ جڑ دوں مگر اس میں گندھارا کا بھی کیا قصور تھا۔ وہ غالباً وہی کچھ بتا رہی تھی جو یہاں کہا اور سنا جا رہا تھا۔

گونگا جہاناں ہمارے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ میم مائرہ کا بے دام کا غلام تھا اور ہر وقت اس کے حکم کا منتظر رہتا تھا۔ میرے خیال میں تو وہ مائرہ کے حکم پر پہاڑ سے بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اس سے کہا کہ میں میم مائرہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ اس تک میرا پیغام پہنچائے۔ گونگا جہاناں ہماری ٹیم میں واحد شخص تھا جو اس خصوصی رہائش گاہ میں جا سکتا تھا جو ہال نما جگہ طامبورہ کے عقب میں واقع تھی اور جہاں یوشال ماتا، مایا رانی اور قبیلے کی دیگر اہم عورتیں مقیم تھیں۔

جہاناں چلا گیا۔ میم مائرہ فوراً تو نہیں آئی۔ تاہم قریباً ایک گھنٹے بعد اس نے اپنی شکل دکھا دی۔ وہ بتاتی کچھ نہیں تھی لیکن میرا اور عمران کا اندازہ یہی تھا کہ وہ اور رامے شب و روز اپنے مقصد کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں، وہی زہر جو زدپ نامی کیڑے کے جسم میں ہے اور جس کا استعمال کسی ویکسین میں ہونا ہے..... کم از کم ہمارے علم میں تو یہی باتیں تھیں۔ اس حوالے سے جاپانی ریسرچ ڈاکٹر شا کا نام بھی بار بار ذہن میں گونج جاتا تھا جس نے چند برس پہلے حادثاتی طور پر کوئی وائرس بنا ڈالا تھا۔

"کیا بات ہے ڈپٹی صاحب!" مائرہ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کہنے کو تو بہت کچھ ہے میم مائرہ..... مگر فی الحال یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں یہ سب کیا چل رہا ہے۔ ماہین کے حوالے سے یہ کس قسم کی لایعنی باتیں یہاں ہو رہی ہیں؟"

"باتیں تو لایعنی ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "مگر یہاں کے ماحول کے مطابق غیر متعلقہ نہیں ہیں..... اور پھر میرا خیال ہے کہ اس لڑکی ماہین نے خود بھی کچھ اس قسم کا تاثر ابھارا ہے جس کی وجہ سے اس طرح کے بیانیے کو طاقت مل گئی ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا؟" میں نے تڑخ کر کہا۔

"سب کچھ تمہارے سامنے ہی تو ہوا ہے تابش ڈیئر..... حشام اس کا منگیتر ہے اور وہ اس کا بہت خیال بھی رکھتی ہے۔ دوسری طرف عمران ہے..... جس سے شاید وہ چپکے چپکے پیار کرنے لگی ہے۔ تاڑنے والے بھی تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں تابش۔ اور پھر جو کچھ اس دن کھوہ میں ہوا اور عمران کو بچانے کے لیے ماہین نے جس طرح خود کو خطرے میں ڈالا، اس سے بھی بہت سے اشارے مل رہے ہیں۔"

"یہ کیا فضول گفتگو ہے۔ ایک ساتھی کی حیثیت سے اس نے عمران کی مدد کی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ لوگ ایسے سستی انداز میں سوچ سکتے ہیں۔"

"بات میرے سوچنے کی ہوتی تو شاید میں تمہاری ہاں میں ہاں ملانے لگتی، مگر بات یہاں کے ماحول اور سوچ کی ہے۔ یہاں صرف مایا رانی کا حکم چلتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو مایا رانی اور یہاں کی مذہبی پیشوا دیوی تورما کہتی ہے۔"

"وٹ اے ربش، تو کیا ماہین ان کی باتیں مان کر حشام اور عمران کو اپنا شریکِ حیات بنانے پر رضامند ہو جائے گی؟"

"بظاہر تو یہ ناممکن نظر آتا ہے مگر یہاں اس ماحول میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ سنا ہے مایا رانی نے یہاں کی پیشوا دیوی تورما سے ماہین کو ملوایا ہے اور دیوی تورما نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر مرد دو شادیاں کر سکتا ہے تو عورت بھی کر سکتی ہے اور ایک سے زیادہ شادیاں بھی کر سکتی ہے۔ دنیا کے کئی خطوں میں اور تاریخ کے بہت سے

صفحات پر اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یونان اور افریقہ کے کئی حصوں میں یہ رواج موجود تھا۔ بلکہ..... آج بھی تبت، شمالی انڈیا، نائجیریا، جنوبی امریکا اور چائنا کے کچھ حصوں میں....."

"پلیز اسٹاپ کرو اس موضوع کو۔" میں نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔ "اور ایک بات میں آپ لوگوں کو صاف بتادوں، وہ مر جائے گی پر ایسا نہیں کرے گی۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

مائرہ نے اپنے کندھے اچکائے اور استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ "برین واشنگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ یہاں بھی ایسا کچھ ہو جائے۔ ویسے بھی یہاں حتمی فیصلہ تو مایا رانی کا ہی ہوتا ہے اور تم دیکھ ہی چکے ہو وہ یہاں کے دستوروں کے لیے کتنی سخت ہے۔"

اور پھر جیسے ایک دم اسے کچھ یاد آیا، بولی۔ "اور ہاں..... تمہارا وہ کام بھی میں نے کر دیا تھا..... ماہین کی ٹانگ پر اب کچھ نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اس طاقتور ریموٹ کنٹرول بم کی طرف تھا۔ جو کئی دنوں سے ماہین ساتھ ساتھ لیے پھرتی تھی۔ اس بم کے سبب ہم سب جیسے ایک تنے ہوئے رسے پر چلتے رہے تھے۔ بدخصلت جادوراے کے لیے ایک بار پھر میرا دل نفرت اور غم و غصے سے بھر گیا۔ وہ زر کا پجاری تھا۔ اپنے مقصد کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا..... اور وہ جاتا تھا..... لوگ سمجھتے تھے کہ اس کے ہاتھوں میں جادو ہے۔ مٹی کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں جادو نہیں تھا، شیطانیت اور سفاکی کی لامحدود طاقت تھی۔

ماہین کی شادی والی بات ایک بھونڈے اور کریہہ مذاق کی طرح لگتی تھی۔ میں نے مائرہ کو بلا کر اس لیے بات کی تھی کہ مجھے کچھ تسلی ہو اور بات کلیئر ہو سکے مگر وہ سرخ بالوں والی حرافہ تو مجھے کچھ اور الجھا کر چلی گئی تھی۔ بہرطور مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ چائے کی پیالی میں طوفان جیسا ہے..... اور جلد ہی یہ طوفان تھم جائے گا۔

مگر آنے والے دو چار دنوں میں میرا یہ خیال سراسر غلط ثابت ہوا۔ میں اور ٹیم کے دیگر ساتھی شدید حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔

ایک بار پھر احساس ہوا کہ مایا رانی اس کی دائندہ اور دیگر "معزز" عورتیں اپنے رسم و رواج کے حوالے سے کس قدر اٹل رویہ رکھتی ہیں۔ شدید برف باری قدرے تھم چکی تھی۔ غار کے طول و عرض میں کچھ چل رہا تھا، کچھ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے دو تین بار منوہر سنگھ کے ذریعے مایا رانی سے درخواست کی تھی کہ میں ماہین سے ملنا چاہتا ہوں مگر اس درخواست کو اہمیت نہیں دی گئی۔ مایا رانی کی طرف سے فقط اتنا کہا گیا تھا کہ ابھی چند دن تک ماہین سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ کل شام اتفاقاً فاصلے سے میری نظر ماہین پر پڑی تھی وہ گلابی ویلوٹ جیسے ایک کام دار چمکیلے لباس میں تھی اور چہل قدمی کے انداز میں مایا رانی کے ساتھ چلتی ایک سرنگ جیسی راہداری سے دوسری میں داخل ہو گئی تھی۔ گیس لیمپ کی روشنی میں، میں نے دیکھا تھا کہ مایا رانی کی طرح ماہین کے ہاتھ میں بھی کسی سرخی مائل مشروب کا گلاس تھا۔ تاہم منوہر کا کہنا تھا کہ وہ کوئی قہوہ قسم کی چیز ہے۔

اگلی صبح ایک اعلان نے ہمیں حیرت زدہ کر دیا..... اعلان ماہین کی شادی کا تھا اور یہ اسی طرح تھا جیسے کہا جا رہا تھا۔ ہم سکتے میں رہ گئے۔ عمران کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ دوسری طرف حشام بھی ہکا بکا تھا۔ جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ ہماری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں سوچنے کی بات تھی کہ کیا یہ سب کچھ ماہین کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ وہ اس طرح کی صورتِ حال کے لیے کس طرح راضی ہو سکتی تھی۔ کیا اس پر جبر کیا جا رہا تھا..... یا پھر یہ کوئی برین واشنگ قسم کا معاملہ تھا؟ پھر میرے ذہن میں یہاں کی مذہبی پیشوا دیوی تورما کا خیال آیا۔ اس کا پورا نام دیوی تورما چھائی لیا جاتا تھا۔ اس معاملے میں اس کا کیا کردار تھا؟

عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چاچو جی! یہ کیا دیوانگی ہے، لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں۔"

عمران کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر حشام بھی ہمارے پاس آ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ لوگ اپنے بے ہودہ رسم و رواج ہم پر کیسے ٹھونس سکتے ہیں؟ مجھے تو لگ رہا ہے کہ یہ ہمارا تماشا بنانا چاہتے ہیں۔ ہماری بے بسی کا مزہ لے رہے ہیں۔"

"آپ میم مائرہ سے بات کریں۔" عمران سخت اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم ماہین کے ساتھ اس طرح کا مذاق نہیں ہونے دیں گے۔"

یہ پہلا موقع تھا جب عمران اور حشام ہم آہنگ ہو کر ایک ہی بات کہہ رہے تھے ورنہ اس سے پہلے تو ان کا کسی بات پر متفق ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس ہم آہنگی کے باوجود میں حشام کی نگاہوں میں دبی دبی تپش دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ

خاموشی کی زبان میں عمران سے کہہ رہا ہو، یہ بھی جو کچھ ہوا ہے تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ تم میرے لیے نحوست کا دوسرا نام ہو۔ نہ تم ان چور عورتوں کے پیچھے اس کھوہ میں جاتے، نہ ماہین پریشان ہو کر وہاں پہنچتی اور نہ یہ سب کچھ ہوتا، جو اب ہو رہا ہے۔ یہ صرف تم ہو جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ شاید ماہین ایک تقسیم شدہ لڑکی ہے۔

عمران کی رائے ٹھیک تھی۔ مجھے میم مائرہ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ بے شک وہ بھی کوئی مثالی عورت نہیں تھی لیکن عورت تو تھی۔ یہاں کے قبیح رسم و رواج کو اس کا دل بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ بالفرض اگر خود اسے کسی ایسے عمل پر اور ایسی رسم کی پاسداری پر مجبور کیا جاتا تو وہ مان جاتی؟

گونگے جہاناں کے ذریعے میں نے میم سے ملنے کی درخواست کی۔ جہاناں ناکام لوٹ آیا۔ اس نے واپس آ کر اشاروں کنائیوں میں ہمیں جو کچھ بتایا، وہ حیران کن تھا۔ اس کے مطابق تو شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور مایا رانی کی خواہش پر ماہین کو شادی کی ابتدائی رسموں سے گزارا جا رہا تھا۔ جس میں ایک رسم یہ تھی کہ ماہین کے جسم کا وزن کر کے اس وزن کے مطابق اناج یعنی گندم ضرورت مندوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ گندم اور دیگر اناجوں کی یہاں گوشت اور پنیر وغیرہ سے کہیں زیادہ قدر و قیمت تھی۔ جہاناں کے اشاروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بالوں کے اونچے جوڑے اور بہت لمبوترے منہ والی مذہبی پیشوا دیوی تورما چھائی بھی موقع پر موجود ہے اور اس شادی کے سلسلے میں پُرجوش نظر آتی ہے۔

تنگ خدوخال والی تورما چھائی کو میں نے فقط ایک مرتبہ دور سے دیکھا تھا۔ وہ اتنی بوڑھی تھی کہ کُبڑی ہو چکی تھی۔ اس کے سر پر سفید بالوں کا بہت اونچا جوڑا نظر آتا تھا۔ اتنا اونچا جوڑا آسانی سے بنایا نہیں جا سکتا۔ یقیناً کوئی سریش یا اکڑنے والی اور چیز استعمال کی جاتی تھی جس سے اس کے بال سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کے گلے میں پتھروں کی بہت سی مالائیں دکھائی دیتی تھیں۔

اس مذہبی پیشوا کو جب یہ پتا چلا کہ ہم سب اس شادی کے مخالف ہیں اور وہ دونوں بھی مخالف ہیں جن سے ماہین کی شادی کی بات کی جا رہی ہے تو وہ غضب ناک ہو گئی۔ اسی غضب ناک کیفیت میں وہ سوکھی سڑی بوڑھی محافظ عورتوں کے جلو میں ہمارے پاس پہنچ گئی۔ پہلے وہ عمران اور حشام کو مخاطب کر کے پتا نہیں کیا کیا بولتی رہی۔ پھر ہم پر برسنے لگی۔

ہم سے میری مراد میں، منوہر سنگھ، بہروز، ہما عروج اور جہاناں وغیرہ ہیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید مسلح عورتوں کو ہم پر حملہ کرنے کا حکم دے دیتی۔

اس کے جانے کے بعد منوہر نے اس "بوڑھی بلی" کی کڑک دھڑک کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ کہتی ہے کہ اس کا کہا، یہاں پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ مایا رانی اور اس کی والدہ بھی اس کے کہے کے خلاف نہیں جا سکتیں۔ ماہین کی شادی ان ہی دو مردوں سے ہو گی جن کو وہ چاہتی ہے۔ اگر اپنی دنیا میں تم لوگ اپنی مرضی کر سکتے ہو، تو ہم بھی یہاں وہی کریں گے جو ہمارے نزدیک درست ہے۔ ہم اپنے دیوتاؤں کو ناراض نہیں کر سکتے۔ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ لڑکی ان دونوں لڑکوں کو چاہتی ہے، ان کو من سے پریم کرتی ہے تو پھر وہ اپنا بستر بھی ان دونوں کے ساتھ بانٹے گی۔"

یہ باتیں ہمارے تن بدن میں آگ لگا رہی تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ حالات ہمارے بس سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ میم مائرہ اور رامے کی طرف سے بھی کوئی ترنگل سامنے نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ بھی بس تماشا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ "شادی" یہاں ایک مذہبی فریضے یا رسم کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ دو روز بعد کی بات ہے، میں اور عمران بھاری کمبلوں میں لپٹے ہوئے اونگھ رہے تھے جب آہنی بیڑیوں کی کھن کھن سنائی دی۔ وہی گندھارا تھی۔ اس کا پیٹ اب پہلے سے زیادہ نمایاں ہو چکا تھا اور چہرے کی افسردگی بھی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ماں کے لیے بچے کا جنم خوشی کی نوید لاتا ہے مگر گندھارا کے لیے یہ جنم موت کا سندیسہ بھی تھا۔

میں نے گندھارا کو روک لیا اور پوچھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

گندھارا کی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بہت سے مقامی الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مایا رانی کی والدہ بوشال ماتا کی ایک دیرینہ خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ قبیلے سے باہر کی کوئی ایسی عورت یہاں پہنچے جس کی شادی دو یا اس سے زیادہ مردوں سے ہو سکے..... اور یوں ایک مثال قائم کی جا سکے۔

میں نے کہا۔ "گندھارا، تم ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ کریں گے تب بھی نہیں ہو سکے گا۔ ماہین یہاں کی نہیں باہر کی لڑکی ہے۔ وہ ایسا خیال بھی اپنے دماغ میں نہیں لا سکتی۔"

گندھارا کے میلے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ میرے خیال میں تو ایسا ہو چکا ہے۔ وہ لڑکی تقریباً مان چکی ہے..... وہ دیوی تو رما چھائی کے اثر میں ہے۔"

"وہ اثر میں ہے تو بھی یہ سب نہیں ہو سکے گا۔ وہ دونوں نوجوان اس پر رضامند نہیں ہیں۔ کیا کسی مرد کو زبردستی ازدواجی تعلق پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟"

"تم لوگوں کو کچھ پتا نہیں کہ یہاں کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہوگا۔" وہ عجیب انداز میں بولی۔ "مایا رانی نے سب انتظام کر رکھا ہے۔"

بات کچھ سمجھ میں آ رہی تھی، کچھ نہیں آ رہی تھی۔

یہ دوسرے روز رات نو دس بجے کی بات ہے۔ عمران رات کا کھانا کھا کر سو چکا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر گیس لیمپس کی روشنی میں کوئی مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ٹھگنا قد، گول مٹول سا جسم، وہ کچھ قریب آیا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ جادو رامے تھا۔ یہ پہلا یا دوسرا موقع تھا کہ میں یوں اسے خصوصی رہائشی پورشن سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پینٹ کے اوپر اس نے ایک بہت دبیز موٹی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اکیلا ہی تھا اور ڈولتا ہوا سا آ رہا تھا۔ راستے میں جو مقامی مرد و زن اسے دیکھتے تھے جھک کر سلام کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے؟ ان کے نزدیک وہ ہماری ٹیم کا سربراہ تھا اور یہی وہ "جانباز" تھا جس نے خود کو خطرے میں ڈال کر جنگجو ہریتی کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔

رامے گھروندے میں میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے مگر اس سے پہلے میں بول پڑا۔ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ "رامے جی! میں نے میم مائرہ کو کئی پیغام بھجوائے ہیں لیکن وہ ملنے نہیں آئی..... دیکھیں، میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں، یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ آپ کو یہاں دی آئی پی مہمان کی حیثیت حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مایا رانی سے بات کر کے اس بے ہودگی کو روکیں جو ماہین کی شادی کے نام پر کی جا رہی ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم نے کوشش نہیں کی ہوگی۔" وہ اپنی، ریڈیو آرلسٹ جیسی گونج دار آواز میں بولا۔ اس کی باہر اُبلی ہوئی آنکھیں قریب سے اور بھی کریہہ لگ رہی تھیں۔ میں خاموش رہا تو اس نے بات جاری رکھی۔ "یہ اپنے معاملوں میں بہت کٹر لوگ ہیں۔ خاص طور سے رسم و رواج کے سلسلے میں جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو ایک انچ پیچھے نہیں ہٹتے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ اپنے اس شرمناک ارادے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے؟ ٹھیک ہے اگر یہ نہیں ہٹیں گے تو ہم اپنے بازوؤں کے زور پر انہیں روکیں گے۔" میرا لہجہ آتشیں ہو گیا۔

رامے نے طویل سانس لیا۔ پان کی پیک گٹک کر اپنے رنگے ہونٹوں کو رومال سے پونچھا اور بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا میری طرف جھک گیا (میری معلومات کے مطابق وہ اپنے مخصوص پان کا وسیع اسٹاک ساتھ لے کر آیا تھا) ذرا دھیمی آواز میں بولا۔ "اس کا یہی حل ہے کہ اس خرافات سے پہلے پہلے ہم لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل جائیں۔" لڑکی سے اس کی مراد ماہین ہی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارا وہ "کام" مکمل ہو جائے دو چار دن میں..... جس کے لیے ہم یہاں آئے۔"

"اور وہ کیسے ہوگا؟ جو خاص زہر آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ تو اسی زوب نامی کیڑے میں ہے جو اب یہاں ناپید ہو گیا ہے۔"

"تمہاری معلومات ادھوری ہیں۔" وہ اپنے بڑے بڑے ڈیلے گھما کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "کیڑا ختم ہو گیا ہے لیکن ناپید نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اسی علاقے میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی تعداد میں موجود ہے۔ اگر کسی طرح ہمیں اس کے دو نر اور چار پانچ مادائیں مل جائیں تو بھی بہت ہے..... ویکسین کے لیے ہمارا کام چل سکتا ہے..... اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا..... ہمارا بھی اور عام انسانوں کا بھی....."

انسان اور انسانیت کی بات جادو رامے جیسے جانور کے منہ سے بہت بے محل لگتی تھی مگر وہ اپنے مطلب کے لیے کر رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جناب مجھ سے کوئی خاص بات کہنے کے لیے آئے ہیں۔" میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے کرخت لہجے کو حتی الامکان نرم رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ "ننانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ کچھ زوب کیڑے اسی غار کی کسی شاخ میں یا ملحقہ کھوہ میں موجود ہیں..... اور اس کا علم کسی اور کو ہو یا نہ ہو مگر ان کی پیشوا دیوی تو رما کو ضرور ہے۔"

"تو کیا آپ ان کی پیشوا پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں؟"

"ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں تقریباً دو مربع کلومیٹر میں پھیلے ہوئے اس غار میں قبیلے کے کم و

بیش ایک ہزار مرد و زن آباد ہیں اور ہماری تعداد کیا ہے۔ صرف 25 کے لگ بھگ۔ یہ غصے میں آ گئے تو خالی ہاتھوں سے ہی ہمارے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ بے شک ان کے پاس آتشیں ہتھیار بہت تھوڑے ہیں لیکن تیز دھار آلوں کی تو ان کو کوئی کمی نہیں۔ ہمیں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔" رامے نے چند لمحے توقف کر کے اپنی پھولی توند پر ہاتھ پھیرا اور گفتگو جاری رکھی۔ "اور میں صرف اس سانپ نما کیڑے زوب کی بات ہی نہیں کر رہا، اس لڑکی (ماہین) کی شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی ہمیں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، یہ بات تو دماغ میں بھی نہ لانا کہ اس سلسلے میں طاقت استعمال کی جائے....."

"تو آپ کا مطلب ہے کہ ہم یہ سب کچھ ہونے دیں؟" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اس شادی والے ٹیلے سے پہلے ہی اپنا کام ختم کر کے یہاں سے نکل جائیں۔ میں تمہیں دیوی تورما کی اس خاص کارندی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اکثر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ وہی لمبی تڑنگی عورت، بہت موٹی گردن والی، لگتا ہے کہ اس کا چہرہ اس کی گردن کے برابر ہے یا گردن سے کچھ چھوٹا ہے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ رامے کس کی بات کر رہا ہے۔ اس مردنما عورت کو میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ رامے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم اس عورت پر نظر رکھو، وہ یہاں سے باہر بھی آتی جاتی ہے۔ تم اس کا پیچھا کر کے اسے کہیں پر دبوچ سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ تمہارے لیے کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہوگا۔"

"اسے یوں پکڑنے کا کیا فائدہ ہوگا؟"

"مجھے اور مائرہ کو پورا یقین ہے کہ یہ عورت بھی وہ سب کچھ جانتی ہے جس کا علم دیوی تورما کو ہے۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ زوب کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی ہے۔ وہ اگر اس غار میں موجود ہیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھی اس نہال نامی عورت پر ہو..... میں یہ چاہتا ہوں کہ....."

بات کرتے کرتے جادو رامے یک دم رک گیا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور مجھے بھی چونکنا پڑا۔ کئی دفعہ بندہ کسی غیر موجود فرد کا ذکر کر رہا ہوتا ہے اور وہ بالکل غیر متوقع طور پر وہاں آن موجود ہوتا ہے۔ نہال نامی اس مردنما عورت کے حوالے سے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا، وہ ایک بھاری کمبل میں لپٹی لپٹائی ایک بغلی راہداری میں جا رہی تھی۔ یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اس کا رخ غار کے دہانے کی طرف ہی ہے۔

رات کے اس پہر جبکہ ہلکی ہلکی برف باری بھی شروع ہو چکی تھی، یہ عورت اگر باہر جا رہی تھی تو یقیناً وضاحت طلب بات تھی۔

جادو رامے نے اپنی گیند نما آنکھوں کو اشاراتی انداز میں حرکت دی۔ وہ مجھے اس نہال نامی عورت کے پیچھے جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ رامے سرگوشی میں بولا۔ "خطرناک ہے..... ذرا احتیاط سے..... اور اگر مارنا پڑے تو بے شک مار ڈالنا..... ہلکہ جانکاری کے بعد اس کو مارنا ہی بہتر ہوگا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رامے نے ایک بریٹا پستول مجھے تھما دیا۔

سرگوشی کرنے کے لیے جب رامے میرے قریب آتا تھا تو اس کے جسم سے دو طرح کی باس اٹھ کر مجھ تک پہنچتی تھی۔ ایک تو کڑوے پان کی اور دوسری اس کے چندے کی جس میں ایک حیوانی قسم کا مادہ موجود تھا۔ جنس کے حوالے سے جن چوپایوں کو بہت سرگرم سمجھا جاتا ہے ان میں ایک سؤر بھی ہے۔ یہ بو باس اسی جانور سے ملتی جلتی تھی۔ اپنے یار عمران دانش کے ساتھ انڈیا کے سفر میں میں نے سؤر کو کئی بار بہت قریب سے دیکھا تھا..... یہ زرد اور گلابی رنگ کے تھے۔ بلکہ گلابی رنگ کے تو کافی زیادہ تھے۔ عمران دانش نے بتایا تھا کہ یہ کالے رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ مجھے لگا کہ آج ایک طویل عرصے بعد میں کالا سؤر دیکھنے میں کامیاب رہا ہوں۔

میں نے جلدی سے ٹوپی اور دستانے پہنے اور اس نہال نامی مردنما عورت کے تعاقب میں چل دیا۔ جلد ہی وہ میری توقع کے مطابق غار سے باہر تھی۔ میں بھی ایک معقول فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے رہا۔ کھلے آسمان کے نیچے سردی ہڈیوں میں گودا جما رہی تھی۔ بہت ہلکی سی برف بھی گر رہی تھی جیسے آنے کی سفید دھول ہو۔ رات تاریک تھی مگر لمبی تڑنگی عورت کے ہاتھ میں چھوٹی ٹارچ تھی اور اس ٹارچ کی روشنی مجھے اس کا تعاقب جاری رکھنے میں مدد دے رہی تھی۔ کہیں دور سے بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

ایک ڈھلوان چڑھنے کے بعد عورت دوسری طرف اتر گئی۔ یہاں پہنچ کر وہ رکی اور پھر بیٹھ گئی۔ اس نے کسی چیز سے برف کھودنا شروع کی، ایک برف پوش چٹان نے مجھے

تھوڑی سی آڑ فراہم کر دی تھی اور میں عورت کی مضروفیت دیکھنے میں کامیاب تھا۔ تب عورت نے اپنے کمبل کے اندر سے کچھ نکالا اور اسے اپنے کھدے ہوئے گڑھے میں رکھ دیا۔ چند ہی منٹ بعد وہ گڑھا برابر کرنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ جائزہ لینے والے انداز میں چاروں طرف دیکھا، پھر برف پر رکھی ٹارچ اٹھائی اور واپس چل دی۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس قدم کی دوری سے گزری اور سنبھل سنبھل کر ڈھلوان پر اترتی واپس چل دی۔ اس کے طور اطوار کے علاوہ اس کی چال ڈھال بھی مردوں جیسی تھی۔

میں نے تقریباً پانچ منٹ انتظار کیا۔ اس کی ٹارچ کی جگنو جیسی روشنی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں محتاط انداز میں اس مقام کی طرف بڑھا جہاں نہال نے گڑھا کھودا تھا۔ یہاں پر تین چار جگہ لکڑی کے کوئی چھ فٹ اونچے پول کھڑے تھے۔ میں نے ایک پول پر ہاتھ پھیرا۔ اس پر کچھ الفاظ بھی کندہ کیے گئے تھے۔ یہ پول یا تنے بہت پرانے نہیں لگتے تھے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر دو سیکنڈ کے لیے ٹارچ آن کی اور اس برف کو دیکھا جو کھودی گئی تھی۔ ابھی وہ دوبارہ سخت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے دستانے پہن رکھے تھے اور اسے کھود سکتا تھا۔ میں نے اسے کھودا اور دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا وہ سفید سانپ نما کیڑا موجود تھا جسے یہاں زوب کہا جاتا تھا۔

اس سے پہلے جو زوب میں نے دیکھا تھا، وہ برسوں سے اکڑا ہوا تھا مگر یہ تازہ تازہ مرا تھا۔ اس کے جسم میں ابھی تک لچک محسوس ہوتی تھی۔ تو گویا یہ بات طے ہو گئی کہ اس زوب نامی کیڑے کی نسل مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی تھی۔ یہ ابھی تک موجود تھا، کم از کم اس غار میں کہیں موجود تھا۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں اوندھا گرا اور ٹارچ ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ گرتے ساتھ ہی میں نے تیزی سے کروٹ بدلی ورنہ سیدھی کلہاڑی کی ضرب یقیناً میرا کندھا توڑ ڈالتی۔ میرے سامنے وہی لمبی تڑنگی، موٹی گردن والی عورت کھڑی تھی جس کا نام رامے نے نہال بتایا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اڑنگا لگا کر اسے پہلو کے بل گرا دیا۔ میں جست لگا کر اس کے اوپر آنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی ایک اور محافظ عورت میرے راستے میں آ گئی۔ میرے سینے پر اس کے سر کی ٹکر زوردار تھی۔ میں پھر گرا مگر مکر مارنے والی کو بھی گردن سے دبوچ کر اپنے ساتھ ہی لے لیا۔ افقی رخ پر چلنے والے میرے طاقتور گھونسے نے اسے تقریباً بے ہوش کر ڈالا۔ میں اٹھ کر نہال کی طرف آنا چاہتا تھا مگر وہ اس سے پہلے ہی اٹھ چکی تھی اور سیدھی کلہاڑی سونت کر بلا کی طرح میری طرف آ رہی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا اور وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے پیچھے اب مجھے دو مزید محافظ عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے بریٹا پستول نکال لیا اور چند قدم پیچھے کی طرف لیے اور پستول دونوں ہاتھوں میں تھام کر چلایا۔ ”رک جاؤ شوٹ کر دوں گا۔“

نہال نامی وہ عورت نہیں رکی۔ اس کا غضب ناک وار میں نے جھک کر بچایا اور پاؤں کی سیدھی ضرب (فرنٹ کک) کے ذریعے اس کی کہنی توڑ ڈالی۔ کلہاڑی اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری۔ وہ چند ساعتوں کے لیے ساکت رہ گئی۔ شاید اسے مجھ سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اس کی اس لمحاتی غفلت کا فائدہ اٹھا کر میں نے اسے دبوچ لیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں اس کے عقب میں تھا اور پستول کی سرد نال اس کی کنپٹی پر رکھ چکا تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نہ صرف مرد نما نہال نے اپنی مزاحمت جاری رکھی بلکہ دیگر دونوں عورتیں بھی میری طرف لپکیں۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ اس اسٹیج پر میں اس پوزیشن میں تھا کہ نہ صرف نہال کو بلکہ دونوں عورتوں کو بھی بہ آسانی شوٹ کر سکتا تھا۔ عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا اور اس کی جان لینا میرے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا ہے۔ شاید ہی ایک دو مواقع ایسے آئے ہوں جب مجھے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا ہو۔ اب بھی میں نہال کو شوٹ نہیں کر سکا۔ دونوں عورتیں مجھ پر پل پڑیں اور نہال بھی ان میں شامل ہو گئی۔ میں نے پستول دور نشیب کی تاریکی میں پھینک دیا۔ اسی اثنا میں پالتو بھیڑیوں کی آوازیں اور تین چار متحرک روشنیاں تیزی سے قریب آنے لگیں۔ نہال کو مزید کمک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے میرے ہاتھ چمڑے کی مضبوط رسی کے ساتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس شور و غل کے سبب اور بھی کئی افراد غار کے دہانے سے نکل کر موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں ہمارے ساتھ پاکستان سے آنے والے تین چار گارڈز بھی تھے۔ دوسروں کی طرح انہوں نے بھی زوب کی لاش دیکھ لی۔ شاید مقامی لوگ مجھے مزید ضربیں لگاتے تاہم اسی دوران میں سردار محافظ ڈولما بھی وہاں پہنچ گئی۔ میرے لیے اس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔ ڈولما کی نگرانی میں مجھے واپس غار کی طرف لے جایا گیا۔ پالتو بھیڑیے، مضبوط آہنی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے پھر بھی بے قراری سے میرے اردگرد چکرا رہے تھے۔ ڈولما

نے حکم دیا کہ مشتعل جانوروں کو مجھ سے دور رکھا جائے۔

☆☆☆

مجھے سیدھا مایا رانی کے پاس لے جایا گیا۔ وہ چبوترے پر اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھی۔ سرخ و سپید چہرے پر اشتعال نظر آ رہا تھا۔ مایا رانی کی مدد کو پوشال ماتا بھی دوسری کرسی پر موجود تھی۔ قریب ہی جادو راے بھی بیٹھا تھا۔

مایا رانی نے تنک کر مجھ سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ یہاں کی عزت افزائی تمہیں راس نہیں آئی۔ تم نے نہال کا پیچھا کیوں کیا؟“

مایا رانی کا یہ سوال گندھارا نے ترجمہ کر کے مجھ تک پہنچایا۔ راے کی موجودگی میں مجھ سے یہ سوال کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راے نے یہ بلا مکمل طور پر میرے سر ڈال دی تھی۔ میں نے مترجم گندھارا کے ذریعے جواب دیا۔ ”میری کوئی غلط نیت نہیں تھی۔ میں ویسے ہی باہر نکلا تھا..... اس عورت کو دیکھا تو تجسس سے مجبور ہو کر پیچھے چل دیا۔“

”تمہاری نیت غلط نہیں تھی۔ اس کے باوجود تم اپنے ساتھ بھرا ہوا پستول لے کر گئے تھے؟“ مایا رانی نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

”لیکن یہ بھی تو دیکھیں رانی صاحبہ، پستول پاس ہونے کے باوجود..... اور اپنی جان کو شدید خطرہ ہونے کے باوجود میں نے فائر نہیں کیا۔ کسی کو زخمی تک نہیں کیا۔“

”اسی لیے تم زندہ بھی نظر آ رہے ہو۔“ رانی سرد لہجے میں بولی پھر سوالیہ نظروں سے جادو راے کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں راے سے پوچھ رہی ہو کہ اپنے اس کارندے کے اس خطرناک فعل کے بارے میں آپ کیا کہتے ہو؟

راے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سخت الفاظ استعمال کیے۔ خلاصہ یہی تھا کہ میں نے اپنی اوقات نہیں دیکھی اور حد سے تجاوز کیا ہے۔ میری قرار واقعی سزا تو یہی ہے کہ میری دو چار ہڈیاں توڑ کر مجھے بستر پر ڈال دیا جائے۔

ظاہر ہے راے یہ سب کچھ مایا رانی کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مگر وہ پوری طرح مطمئن ہو رہی تھی یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ رانی کے ذہن میں بھی یہ بات ہو کہ میں نے اپنے طور پر یہ سب کچھ نہیں کیا، کسی کے کہنے پر کیا ہے۔ یقیناً رانی اور دیگر ”معزز“ خواتین و حضرات کو اس بات کا بھی قلق رہا ہوگا کہ مقامی سانپ نما کیڑے زوب کے حوالے سے ان کا یہ موقف مشکوک ہو گیا ہے کہ وہ اب ناپید ہو چکا ہے۔ بہرطور میرے لیے مایا رانی اور اس کی ساتھی خواتین کے رویے میں اس لیے کچھ نرمی پائی جا رہی تھی کہ میں نے قدرت رکھنے کے باوجود حملہ آور عورتوں میں سے کسی پر فائر نہیں کیا۔ مایا رانی مترجم گندھارا کے ذریعے کچھ دیر تک جادو راے سے کچھ کھسر پھسر کرتی رہی پھر مجھے واپس بھیج دیا گیا۔

میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے البتہ اس سے پہلے میرے بھاری بھرکم لباس کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ مترجم گندھارا کے ذریعے مجھے بتایا گیا تھا کہ میں اب مشکل اجازت کے بغیر اپنے کمرے (گھروندے) سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔

راستے میں مجھے کئی جگہ برف کی دیواروں پر آرائشی چیزیں آویزاں نظر آئیں۔ ان میں رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کے فیتے، مصنوعی پھول اور جانوروں کے رنگین پر وغیرہ تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، یہ سب اس شادی کی تیاریاں تھیں جو یہاں اب کافی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ماہین کی شادی لیکن ایک ایسے طریقے سے ہو رہی تھی جو ہمارے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں تھی۔

ایک جگہ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ غار کے اندر ہی ایک چھوٹا سا غار نظر آتا تھا۔ اس کے اندر گدے اور ریشمی گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ کیروسین کے لیمپ بھی روشن تھے۔ چند مرد مزدور اس چھوٹے غار کے ساتھ آٹھ فٹ اونچے دہانے کے آگے ایک مہین ریشمی پردہ لٹکا رہے تھے۔ ہلکے براؤن رنگ کے اس پردے کی وجہ سے اندر جلتے ہوئے تین لیمپس دھندلے سے نظر آتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کس چیز کی تیاری تھی۔

مجھے واپس میرے گھروندے میں پہنچا دیا گیا۔ عمران یہاں بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے راے کی آمد سے لے کر میرے باہر جانے تک کی ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ وہ فوراً مجھ سے تفصیل پوچھنا چاہتا تھا مگر اب احتیاط کی ضرورت تھی۔ اب ہمارے گھروندے کے عین سامنے دو محافظ عورتیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ یقیناً یہ احتیاط میرے حوالے سے کی گئی تھی اور اس کی وجہ آج والا واقعہ ہی تھی۔

☆☆☆

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ لوگ ماہین کی عجیب و

غریب شادی پر تُل چکے ہیں اور اس میں اہم ترین کردار یہاں کی کٹڑی پیشوا دیوی تورما ہی ادا کر رہی تھی۔ دوسری طرف یہ معاملہ عمران اور حشام دونوں کی سوچ سے باہر تھا۔ عمران بار بار مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ "خرافات" سیدھی طرح نہیں رکتی، تو پھر ہمیں ان لوگوں سے ٹکر لے لینی چاہیے لیکن یہ بات تو عمران بھی سمجھتا تھا کہ اگر ہزار بارہ سو افراد ایک طرف ہو گئے تو ہم چند کیا کر سکیں گے؟

میں عمران پر یہ انکشاف بھی کر چکا تھا کہ راے اور میم مائرہ کا شک درست ہے۔ زوب نامی کیڑا بالکل ناپید نہیں ہوا۔ اب بھی وہ کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت تعداد میں موجود ہے اور اس کا ثبوت وہ بالکل تازہ مرا ہوا زوب تھا جسے نہال نے دفن کیا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ جہاں زوب کو دفن کیا گیا وہاں لکڑی کے پول کیوں لگے ہوئے تھے۔ یہ درحقیقت اس جگہ کی نشانی تھی جہاں کسی مرے ہوئے زوب کو دفن کیا جاتا تھا۔ ان پولوں پر مقامی زبان کے کچھ الفاظ بھی کندہ تھے۔ یقیناً یہ کوئی مذہبی تحریر رہی ہوگی۔ جیسا کہ ڈولما کی زبانی ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ اس برادری میں زوب نامی اس نایاب کیڑے کو برکت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہ اعتقاد رکھا جاتا تھا کہ زوب کی موجودگی کی وجہ سے شدید برفانی طوفان نہیں آتے اور مہلک سردی سے وابستہ مشکلات کم ہو جاتی ہیں۔

عمران نے میرے چہرے سے تاڑ لیا کہ میں اسی واقعے کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس کے بعد مجھے اس گھروندے میں پابند ہونا پڑا ہے۔ وہ بولا۔ "ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی جی۔ جب آپ نے زوب کی لاش دریافت کی تو وہ مرد نما نہال واپس کیسے لوٹ آئی؟"

"اس بارے میں، میں نے بھی سوچا ہے۔ ہوا دراصل یہ ہے کہ اس وقت ہلکی برف پڑ رہی تھی۔ ایسی برف پر قدموں کے مدھم نشان آ جاتے ہیں۔ نہال جب واپس جا رہی تھی، اسے ٹارچ کی روشنی میں تازہ برف پر کہیں میرے قدموں کے نشان بھی نظر آئے اور وہ چونک گئی۔"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں ہی مقامی معالجہ گندھارا عمران کے سر کی چوٹ دیکھنے کے لیے آ گئی۔ اس کے پاؤں میں آہنی بیڑی بدستور موجود تھی۔ وہ زچگی کے قریب تر ہو رہی تھی اور چلنا پھرنا اس کے لیے مزید مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

عمران کا زخم تقریباً مندمل ہو چکا تھا..... پنڈلی بھی اب ٹھیک تھی۔ گندھارا نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میں نے کہا گندھارا، تم واقعی ایک قابل معالج ہو۔ اگر بچے کی پیدائش کے بعد..... خدانخواستہ تمہیں واقعی موت کی سزا دے دی گئی تو یہ لوگ تمہارے اس خداداد فن سے محروم ہو جائیں گے۔"

وہ افسردگی سے بولی۔ "اس کا انتظام بھی ان لوگوں نے کر لیا ہے۔ میری ایک شاگرد کو تیار کیا جا رہا ہے کہ وہ میرے بعد میرے کام کو سنبھال سکے۔ چند اور عورتیں بھی ہیں جو اس کام کو کچھ نہ کچھ جانتی ہیں۔"

عمران بولا۔ "اگر راے اور میم مائرہ میں سے کوئی سفارش کرے..... یا ہم سب مل کر مایارانی سے درخواست کریں، تو کیا بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔"

"مشکل..... بلکہ ناممکن ہے۔" گندھارا نے گہری سانس لی۔ "ان معاملات میں مایارانی سے بھی زیادہ سخت دیوی تورما ہے۔ اس کے منہ سے جو بات نکل جائے، وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے اور اگر دیکھا جائے تو میں قصوروار بھی تو ہوں نا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے مایارانی کو دکھ پہنچانے والوں کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے چھوٹے باکرسکامر سے بے حد پریم کرتی تھیں۔ سکامر کی بے وفائی کی وجہ سے مایارانی کو اسے سزا دینا پڑی۔ اسے جان سے مارنا پڑا۔"

گفتگو گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "گندھارا! یہ ماہین کی شادی والا کیا مذاق ہے۔ کچھ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا اور پھر بات یہ بھی ہے کہ جب دونوں دولھا ہی راضی نہیں تو یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

وہ بولی۔ "یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ شادی ہوئی بھی تو بس دکھاوے کی ہوگی۔ کوئی اس کو دل سے نہیں مانے گا اور نہ ہی اس لڑکی ماہین کا کسی سے کوئی... ازدواجی تعلق بنے گا۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ کسی عورت سے تو زبردستی بھی ہو سکتی ہے لیکن....."

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن وہ سمجھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے زرد مرجھائے ہوئے سے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نظر آئی۔ یہ خوشی کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس میں بے حد کرب چھپا ہوا تھا۔ "یہ دیوی تورما ہٹ کی بہت پکی ہے۔" گندھارا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ "یہ اپنے عقیدے کے مطابق وہی کرے گی جو چاہتی ہے۔ ان تینوں کو ازدواجی بندھن میں باندھے گی اور اس بات کی بھی تسلی کرے گی کہ یہ ازدواجی تعلق قائم کریں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے بھنا کر کہا۔ عمران کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا۔

گندھارا نے پھر ایک عمیق سانس لی۔ "بات تو شرم کی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ قدیم رسم کے مطابق دیوی تورما چھائی ان کے حجلہ عروسی پر نظر رکھے گی۔ ایک خاص قسم کا پردہ وہاں لٹکایا جائے گا۔ وہ نہ تو اتنا باریک ہوگا کہ سب کچھ عیاں کردے اور نہ اتنا موٹا کہ سب کچھ چھپا لے۔ اس رات تورما چھائی پردے کی دوسری جانب موجود رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔"

میں اور عمران سخت تحیر کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "اور ایسا یہاں کوئی پہلی بار نہیں ہورہا..... اس سے پہلے بھی میرے ہوش سنبھالنے کے بعد کم از کم دو دفعہ ایسا ہوا ہے جب باہر سے آنے والے کچھ لوگوں کو ایسی ہی شادی پر مجبور کیا گیا۔ دوسری مرتبہ کوئی پندرہ سال پہلے ایسا ہوا تھا، جب ایک جاپانی ڈاکٹر کے ساتھ آنے والے لوگوں میں سے ایک بندی اور دو بندوں کو ایسی شادی پر مجبور کیا گیا تھا۔ بعدازاں وہ تینوں کافی عرصہ یہاں پر رہے پھر ان میں سے ایک بندہ نمونیے کا شکار ہوکر مر گیا اور دوسرا بندہ اور اس کی بیوی واپس چلے گئے۔ اب تو لوگوں کو ان کے نام بھی یاد نہیں رہے۔"

"وہ جاپانی ڈاکٹر کون تھا جس کی ٹیم میں وہ لوگ یہاں آئے تھے؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں ڈاکٹر جی کا نام یاد ہے۔ ان کو مسٹر شا کہا جاتا تھا۔ بہت ہی محنتی اور دماغ والے شخص تھے۔"

ڈاکٹر شا کے نام نے مجھے اور عمران کو چونکایا۔ یہ ڈاکٹر شا ہی تو تھا جس نے ریسرچ کے دوران میں حادثاتی طور پر ایک وائرس ایجاد کرلیا تھا اور پھر دن رات محنت کرکے اس وائرس کی ویکسین بھی بنائی تھی۔ اسی ویکسین کے فارمولے کے کاغذات ارب پتی ڈیرن اور اس کی بیوی میم مائرہ کے پاس موجود تھے مگر بعدازاں انا کی وجہ سے میاں بیوی میں شدید ناچاقی اور پھر طلاق ہوئی۔ میم مائرہ اپنے شوہر کے وہ کاغذات بھی لے اُڑی جس میں ویکسین کا سائنسی فارمولا تھا۔ وہ اپنی دانست میں مکمل کاغذات لائی تھی مگر وہ مکمل نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے جادوراے کے ساتھ مل کر یہ ویکسین بنانا چاہی تو انہیں شدید دشواریاں پیش آئیں۔ بالآخری میری اور عمران کی خطرناک کاوش کے سبب انا اور ڈیرن باقاعدہ طور پر اغوا ہوکر راے اور مائرہ کے قبضے میں آئے اور یوں ڈاکٹر شا کے کاغذات کا ادھورا پن مکمل ہوا۔

گندھارا کی زبانی ڈاکٹر شا کا نام سننے کے بعد یہ سارے خیالات چند ثانیے کے اندر میرے ذہن سے گزر گئے..... یقیناً عمران کے ذہن سے بھی گزر رہے ہوں گے۔

بہرحال ابھی ہم نے اس ڈاکٹر شا والے واقعے کو مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہماری تمام تر توجہ اس واقعے پر مرکوز تھی جو ابھی پیش نہیں آیا تھا لیکن پیش آنے والا تھا۔ ابھی ذرا دیر پہلے گندھارا نے حجلہ عروسی کی بات کی تھی، میرے ذہن میں فوراً ایک دن پہلے کا وہ منظر چمک گیا جو میں نے یہاں اس گھروندے میں پابند ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا غار، اس میں گیس لیمپس کی ملگوف روشنی اور چپلی ناکوں والے مزدور جو ایک مہین پردہ دہانے پر آویزاں کررہے تھے۔ سردی کے باوجود مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

شادی کی تیاری جاری تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عمران کا پارا چڑھتا چلا جارہا تھا۔ دوسری طرف حشام کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ یقیناً وہ مائین کو عمران کے ساتھ تقسیم کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ حشام کیا، کوئی بھی ہوتا اسے یہ صورتِ حال قبول نہ ہوتی۔ دور غار کے کسی اندرونی حصے میں نفیری اور اک تارا بجنے کی آواز آرہی تھی۔ گندھارا اور منوہر سنگھ کی زبانی پتا چلا تھا کہ یہ شادی کی رسموں میں سے کوئی رسم ہے جو مائین کے ساتھ ادا کی جارہی ہے۔ گندھارا نے ہی بتایا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کچھ عورتیں یہاں آئیں گی اور وہ مائین کے "محبوبوں" کی حیثیت سے عمران اور حشام کو قیمتی گلوبند پہنائیں گی۔ اس رسم کے دو دن بعد شادی کی رسم ادا ہوجائے گی۔

عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس بے ہودگی کو روکنے کے لیے ہمیں کوئی عملی قدم اٹھانا ہوگا۔"

"مثلاً کیا کروگے؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہ گلوبند ہرگز نہیں پہنوں گا۔ اس سے مایا رانی اور اس خبیث دیوی تورما کو یقین ہوجائے گا کہ یہ خرافات انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔"

"تمہارے یا حشام کے گلوبند نہ پہننے سے یہ شادی رک جائے گی؟"

"پھر بھی نہ رکے گی تو میں پہرا توڑ کر مایا رانی کے سامنے پہنچ جاؤں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ ہمیں یہ سب قبول

نہیں۔"

"یہاں مرد کی نہیں، عورت کی مرضی چلتی ہے۔"

"تو پھر عورت کی اصل مرضی معلوم کریں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مایا اس طرح کی شرمناک صورتِ حال کو قبول کرسکتی ہے؟"

"منوہر سنگھ بتاتا ہے کہ وہ برین واشنگ قسم کے عمل سے گزری ہے۔ وہ راضی ہے۔"

"سو فیصد غلط..... ایک سو دس فیصد غلط۔" عمران نے جھنجھلا کر کہا۔ اس کا چہرہ سرخ تر ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کرب کروٹ لے رہا تھا، وہ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ وہ مایا کے لیے محبت اور چاہت کے اعلیٰ ترین جذبات رکھتا ہے، اس کا عشق اس کے دل کی عبادت گاہ میں ایک چراغ کی طرح روشن ہے۔ شاید یہ ویسی ہی..... یا اس سے ملتی جلتی محبت تھی جو کبھی اس کے والد نے شبانہ سے کی تھی اور پھر درد کے سمندر میں ڈوب کر اسے کھویا تھا..... ہاں کہانیاں خود کو دہراتی ہیں۔

ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ فقیری، ڈھولک اور اک تارے کا شور نزدیک تر آ گیا۔ ہم نے دیکھا بہت سے مرد زرق برق لباس پہنے، ہاتھوں میں طشتریاں اٹھائے ہماری جانب آ رہے تھے۔ ان میں کچھ بچے بھی شامل تھے۔ طشتریوں میں مٹی کے دیے تھے اور بھنے ہوئے اناج (گندم) کی خوشبو تھی۔ چند عورتوں نے بھی ایسی ہی طشتریاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں کبڑی تورما چھائی، چمک دار لاٹھی ٹیکتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے اردگرد ڈولما اور دیگر محافظ عورتیں تھیں۔

کچھ دیر بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا، حشام اور عمران کو لکڑی کی بنی ہوئی دو خوب صورت کرسیوں پر بٹھایا گیا..... تورما چھائی کے اشارے پر جب ان دونوں کو گلوبند پہنانے کی کوشش کی گئی تو دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ عمران نے تو ہاتھ چلا کر گلوبند دور پھینک دیا۔ تورما چھائی کے جھریوں بھرے چہرے پر طیش کے سبب زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے زور سے چلّا کر مقامی زبان میں کچھ کہا۔ دو محافظائیں کٹاریں نکال کر عمران کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں..... جیسے تورما چھائی کے ایک اشارے پر اس کی گردن کاٹ سکتی ہوں۔ منوہر سنگھ کی "ترجمانی" کے ساتھ تورما اور عمران کے درمیان جو مکالمہ ہوا، وہ اس طرح تھا۔

"تم جانتے ہو تم نے جو حرکت کی ہے، وہ ہمارے خداؤں کے نزدیک کتنی غلط ہے اور اس کی کتنی بڑی سزا تمہیں مل سکتی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "جو سزا تم لوگ دے رہے ہو، اس سے بڑی اور کیا ہوگی۔ تم اپنے رسم و رواج ہم پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ ہمیں ہرگز قبول نہیں۔"

تورما چھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "دو مردوں کا ایک ہی عورت سے عشق کرنا جائز ہے۔ دن رات اس سے ملن کے سپنے دیکھنا جائز ہے..... مگر ملن جائز نہیں ہے۔"

"جسموں کا ملاپ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ کسی سے دور رہ کر بھی اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔"

"دور رہ کر صرف جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ ساری عمر اپنی ہی آگ میں جلا جا سکتا ہے یا پھر چوری چھپے والے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارا قانون مردوں کو بھی یہ موقع دیتا ہے کہ اگر دو مرد ایک ہی عورت پر مرمٹے ہیں تو اس کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ بالکل جس طرح تمہاری دنیا میں ایک مرد اپنی پسندیدہ دو یا اس سے زیادہ عورتوں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔"

"تم اور تمہاری مایا رانی فطرت کے خلاف جانا چاہ رہی ہو اور اس میں ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔"

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔" دیوی تورما گرجی۔ "مایا رانی، اس لڑکی کو اپنی سہیلی کا درجہ دے چکی ہے اور تم دونوں کے لیے حکم صادر کر چکی ہے۔ اب وہی ہوگا جو ہم چاہتے ہیں۔"

تب دیوی تورما نے اپنی جھکی ہوئی کمر کو سیدھا کر کے حشام کی جانب دیکھا۔ "کیا تم بھی یہی انکار والی حماقت کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

حشام کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا، تاہم اس کا جواب بھی انکار میں آیا۔

دیوی تورما یک دم بھڑک اٹھی۔ اس کے جسم پر طیش کے سبب لرزہ سا طاری ہو گیا۔ گرج کر بولی۔ "مقدس گلوبند پہناؤ ان دونوں احمقوں کو....."

اکا ایکی کئی مسلح عورتوں اور مردوں نے عمران اور حشام کو گھیر لیا۔ جب ڈولما نے عمران کو زبردستی گلوبند پہنانے کی کوشش کی تو اس نے دھکا دے کر ڈولما کو دور ہٹا دیا۔ عمران کے جذباتی پن کا نتیجہ خطرناک تصادم کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ ابھی اس کے سر کا زخم بھی بمشکل مندمل ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر عمران کو روکا۔ اسی اثنا میں وہ مرد نما عورت نہال کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ چکا تھا۔ یکا یک

کئی مسلح عورتوں مردوں نے عمران کو دبوچ لیا۔ اس کے گلے میں زبردستی گلوبند پہنا دیا گیا۔ دوسری طرف حشام نے بھی معمولی مزاحمت کی مگر اسے گلوبند پہننا پڑا۔

اب بہت سے لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے..... ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ چہروں پر اشتعال بھی نظر آتا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے منوہر سنگھ سے پوچھا۔

"حشام اور عمران صاحب کے انکار نے لوگوں کو غصہ دلایا ہے۔ خاص طور سے عمران صاحب کا، گلوبند فرش پر پھینک دینا سب کو بہت برا لگا ہے۔ وہ اسے ایک بڑا اپراد سمجھ رہے ہیں۔"

عمران اب بھی تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف کٹاریں اور برچھیاں چمک رہی تھیں۔ طاقت آزمائی خودکشی کے مترادف تھی۔ اسی دوران میں مایا رانی کی والدہ بوشال ماتا بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے حکم پر عمران کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ تیز دھار آلات کے نرغے میں عمران اور حشام کو غار کے اندرونی حصے کی جانب دھکیلا جانے لگا۔

☆☆☆

یہ کیا ہو رہا تھا؟ گمان نہیں کیا تھا کہ مقامی طرز کی شادی والی یہ صورتِ حال اتنی سنگین شکل اختیار کر جائے گی۔ رامے نے اس سے بچنے کا حل یہ بتایا تھا کہ ہم جلد از جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر یہاں سے نکل جائیں..... مگر یہ سوچ خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔ ہمارے "مطلوبہ زوب" تک پہنچنے کا فی الحال دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا..... اور شادی کے نام پر یہ خرافات، مجسم حقیقت بن کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ عمران اور حشام کو کہاں لے جایا گیا ہے اور وہ کس حال میں ہیں۔ رات کو اپنے برفیلے گھروندے میں اکیلا لیٹا میں دیر تک سوچتا رہا۔ یہ بات حقیقت تھی کہ عمران بڑی خاموشی سے ماہین کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ دوسری جانب اس حقیقت سے بھی انکار نہیں تھا کہ حشام کسی صورت ماہین کو کھونا نہیں چاہتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ماہین کی ملکیت کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دو تین سال سے منگیتر تھے۔ یقیناً حشام اور عمران دونوں نے نہ سوچا ہوگا کہ کسی وقت ایسی صورتِ حال بھی پیش آسکتی ہے۔

رات دوسرے پہر میری آنکھ لگ گئی۔ صبح کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ یہ پنجابی ٹچ والی اما عروج تھی۔ "ڈپٹی جی! آپ یہاں سوئے پڑے ہو وہاں بہت بڑا تماشا لگا ہوا ہے۔" اما کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے آنکھیں مل کر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

وہ بولی۔ "ان دونوں منڈوں نے کام بہت بگاڑ لیا ہے۔ لگتا ہے کہ دونوں نے ہی اس بیاہ سے انکار کیا ہے..... اور اس انکار کی وجہ سے مایا رانی اور دوسری زنانیاں آگ بگولا ہوگئی ہیں۔ دونوں منڈوں کو باندھ دیا ہے انہوں نے۔"

"کہاں باندھ دیا ہے؟"

اما عروج کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔ "اسی تھاں پر..... جہاں پر مایا کے بھاگ جانے والے خصم اور اس کی مدد کرنے والی زنانی کو آگ لگائی گئی تھی۔"

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یوں لگا جیسے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

اما ہراساں لہجے میں بولی۔ "سچی گل ہے ڈپٹی جی، میرا تو کلیجا نکل رہا ہے۔ مایا رانی کا غصہ وی رانیوں والا ہی ہے، کوئی بڑی ڈھیس پٹاس نہ ہو جائے۔"

میں جیکٹ پہن کر اٹھا اور اما کے ساتھ بھاگم بھاگ دہانے تک پہنچا۔ غار اور اس کی ساری شاخیں تقریباً خالی نظر آرہی تھیں۔ مسلح محافظ عورتیں بھی شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں بھی دہانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ میرے لیے تو مایا رانی کا حکم تھا کہ میں اپنی آرام گاہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

باہر کا منظر دیکھ کر میں کانپ گیا، یہ تقریباً وہی تھا جو سکامر اور عورت کو زندہ جلائے جانے کے موقع پر نظر آیا تھا۔ عمران اور حشام دونوں پتھر کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر چوٹیں تھیں۔ اردگرد سیکڑوں کا مجمع تھا۔ مایا رانی، کبڑی پیشوا دیوی تورما اور چند معزز عورتیں کرسی نما نشستوں پر براجمان تھیں۔

یکایک چند مسلح عورتیں مجھ پر جھپٹیں اور مجھے جکڑ لیا۔ ان میں ڈولما اور مرد نما نہال بھی شامل تھیں۔ میں مزاحمت کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اگر رکھتا بھی تو یہ کافی مشکل تھا۔ بڑی پھرتی سے میرے ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے۔ بلا کی سردی تھی اور برچھیوں کے تیز نوک پھل میری گردن کو چھو رہے تھے، مجھے ایک جانب لکڑی کے طویل بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ یہاں منوہر سنگھ کے علاوہ گونگا جہاناں، فورمین بہروز اور ہمارے ساتھ آنے والے چند نئے گارڈز بھی موجود تھے۔ بہرحال رامے

اور مائرہ خاص مہمانوں میں نظر نہیں آتے تھے۔

لوہے کی بیڑی میں جکڑی ہوئی حاملہ مترجم گندھارا کے ذریعے مایا رانی، عمران اور حشام سے جو گفتگو کر رہی تھی، وہ اس طرح تھی۔

مایا رانی نے کہا۔ ”نہیں، کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ یا تو تم دونوں کو شادی کرنا پڑے گی، یا پھر موت کو گلے لگانا ہوگا..... اور یہ شادی بھی بخوشی کرنا ہوگی۔“

یہ دیکھ کر میری رگوں میں لہو جمنے لگا کہ ان وحشیوں نے عمران اور حشام دونوں کے اردگرد خشک لکڑیاں چن دی تھیں..... جیسے دونوں پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتے ہوں کہ اگر بات نہیں مانی گئی تو سزا وہی ہوگی جو بتادی گئی ہے۔

عمران اور حشام دونوں انکاری رہے، عمران کا انکار زیادہ حتمی محسوس ہوتا تھا، مایا رانی نے ذرا نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے جیسے ایک اور کوشش کی۔ ”کیوں اس نوجوانی میں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو۔ تم دونوں کو ہی..... بلکہ تینوں کو ہی وہ سب کچھ مل رہا ہے جو تم چاہتے تھے۔ تم دونوں اپنی محبوب ماہین کے ساتھ من چاہی زندگی گزارو گے۔ یہاں ہمارے ہاں اپنا ایک خاندانی نظام ہے۔ کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوتا، عورت اور اس کے بالکروں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ بالکروں کے ازدواجی حقوق اور ان کی تقسیم کے لیے بھی ایک تفصیلی طریقہ طے ہوتا ہے۔“

حشام کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آئے۔ عمران بھی پھنکارا۔ ”ہم لعنت بھیجتے ہیں، تمہارے اس نظام اور طریقے پر، سو بار لعنت بھیجتے ہیں۔“ میں عمران کو پہلی بار اس قدر سنجیدہ اور کرب میں دیکھ رہا تھا۔

مایا رانی نے کہا۔ ”تم اس نظام پر لعنت نہیں بھیج رہے، یہاں کے دستور کے مطابق ایک خوب صورت اور دلکش زندگی پر لعنت بھیج رہے ہو، ان لاتعداد خوب صورت راتوں پر لعنت بھیج رہے ہو جو تمہارے حصے میں آنے والی ہیں۔ وہ ریشمی اندھیرے جو نوجوانوں کے لیے زندگی کا اصل جوہر ہوتے ہیں، تم ہر آمدہ خوشی پر نفرین بھیج کر تکلیف دہ موت کو گلے لگانا چاہتے ہو۔“

کبڑی دیوی تورما نے کرخت آواز میں کہا۔ ”اور مایا رانی کے نزدیک یہ ایک عورت سے بے وفائی بھی ہے اور تم جانتے ہو مایا رانی مرد کی بے وفائی کو معاف نہیں کرتیں۔“

اگلے دو چار منٹ میں یہ تکرار جاری رہی۔ حشام زیادہ خوف زدہ تھا، تاہم حشام اور عمران کو اب بھی یہی لگ رہا تھا کہ شاید یہ سب کچھ انہیں ڈرانے کے لیے کیا جا رہا ہے اور مایا رانی آخری حد تک نہیں جائے گی۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔

مگر پھر..... اچانک ہی صورتِ حال اتنی سنگین ہوگئی کہ مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تکرار اور اشتعال کی کیفیت اچانک ہی عروج پر پہنچ گئی۔ مایا رانی کا سرخ چہرہ آگ کی طرح دہک گیا۔ اس نے کوئی مخصوص اشارہ کیا اور مسلح عورتوں نے خشک لکڑیوں پر چربی کا تیل چھڑک دیا۔ حشام کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ عمران ایک مضبوط نوجوان تھا اور وہ ابھی تک غیر معمولی مضبوطی کا مظاہرہ کر رہا تھا..... لیکن ابھی تک شاید اسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی یہ سب کچھ ہونے جا رہا ہے۔

یہ کڑی آزمائش کے لمحے تھے۔ میں عمران کو اپنے سامنے ان لوگوں کی وحشت کی بھینٹ چڑھتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا، اب میں مزید نہیں رک سکوں گا، اپنے بندھے ہاتھوں کے باوجود مایا رانی اور دیوی تورما پر جا پڑوں گا اور وہ کچھ کر گزروں گا جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوگا۔ اس کے بعد جو بھی ہو جاتا، وہ قبول تھا۔

..... ہاں یہ سخت ترین آزمائش کے لمحے تھے۔ ایسی آزمائش جس میں فولاد بھی پگھلتا ہے اور پتھر پانی ہوتے ہیں۔ آزمائش کے ایسے لمحے ارادوں اور پندھاروں کو توڑ کر چکنا چور کرتے ہیں اور آہنی عزائم والے لوگ بھی تنکوں سے ہلکے ہو کر ہوا میں بکھرنے لگتے ہیں۔ مایا رانی کی للکار ایک حتمی آواز بن کر گونجی۔ ”آخری لمحوں میں یہ آخری موقع ہے۔ ہماری بات مانتی ہے، یا دیوتاؤں کی اس اگنی میں جلنا ہے.....“

مشتعل بردار عورتیں خشک لکڑیوں کے بالکل قریب کھڑی تھیں۔ حشام کی آواز جیسے کسی بہت گہرے کنویں کے اندر سے برآمد ہوئی اور بہت سے کانوں تک پہنچی۔ ”میں..... مرنا..... نہیں چاہتا۔“

”تو پھر کیا چاہتے ہو؟“ مایا رانی نے پکار کر پوچھا۔ ”کیا تمہیں منظور ہے؟“

حشام کے چہرے سے جیسے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا تھا۔ تحیر زدہ نگاہوں نے دیکھا کہ حشام نے اثبات میں سر ہلایا۔

”زبان سے بولو۔ جواب دو۔“ مایا رانی گرجی۔

”ہم..... مجھے..... منظور ہے۔“ اس نے کہا اور اس کے یہ الفاظ گندھارا نے ترجمہ کر کے مایا رانی اور دیگر عورتوں تک پہنچائے۔ فضا کا سکوت جیسے ایک مہیب چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ کوئی بہت تناہوا سا جیسے زبردست تڑاخے سے ٹوٹا تھا اور اس کے ساتھ بندھی ہوئی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ گئی

تھی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کا اصل ہدف بے شک حشام ہی تھا۔

مایا رانی نے ابرو سے کوئی اشارہ کیا۔ تیل میں بھیگی ہوئی خشک لکڑیوں کے قریب کھڑی مشعل بردار عورت پیچھے ہٹ گئی اور صرف وہی نہیں ہٹی جو حشام کے قریب تھی، وہ بھی ہٹ گئی جو عمران کے قریب تھی۔ مایا رانی نے مسکراتی نظر سے حاضرین کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی باقی خواتین بھی اٹھ گئیں۔

☆☆☆

مایا رانی نے بڑے عجیب انداز سے فیصلہ کیا تھا اور یہ ایسا فیصلہ تھا جسے کوئی جھٹلا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ فیصلہ عمران کے حق میں تھا، جو آخر تک ثابت قدم رہا تھا۔ آخری آٹھ دس منٹ میں اعصاب کی جو سخت ترین جنگ ہوئی تھی، وہ یادگار تھی۔ مایا رانی کے علاوہ شاید دو چار معزز عورتوں کو ہی یہ علم تھا کہ عمران یا حشام میں سے کسی کو جلایا نہیں جانا..... صرف اس بات کی جانچ کی جانی ہے کہ کون واقعی ماہین کی محبت کا حق دار ہے۔

اس واقعے کے بعد حشام تو ہکا بکا تھا ہی عمران بھی حیران تھا۔ وہ جیسے موت کو چھو کر واپس آیا تھا۔ اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ میں اور عمران پہلی بار اس وسیع غار کے اس خصوصی حصے میں موجود تھے جہاں مایا رانی اور دیگر معزز مرد و زن رہتے تھے۔ یہاں فرش کے علاوہ مجسمہ دیواروں پر بھی غالیچے وغیرہ موجود تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ اس خطرناک لیپرڈ کی کھال بھی نظر آ رہی تھی جو چند روز پہلے مایا رانی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ غار کے اس حصے میں سردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مایا رانی کافوری لیمپ کی روشنی میں بڑی تمکنت سے ہمارے سامنے قالین پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھی تھی۔ منوہر سنگھ مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

مایا رانی نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم مبارک باد کے مستحق ہو تم نے خود کو ماہین کا درست حق دار ثابت کیا ہے..... مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ حشام سے زیادہ ”تم“ اس کی زندگی کے لیے موزوں اور مناسب ہو۔“

مایا کی بات سننے کے بعد عمران نے منوہر کے ذریعے جواب دیا۔ ”مایا رانی! آپ ایک طرح سے یہاں کی فرمانروا ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے مگر میں اور میرے ساتھی ماہین کے حوالے سے سخت اُلجھن میں ہیں۔ میں..... اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ مسکرائی۔ ”غالباً تم ان باتوں کی وجہ سے اُلجھن میں ہو جو اس آزمائش سے پہلے پھیلائی گئی تھیں اور جن میں ماہین کی رضامندی بھی بتائی گئی تھی۔ وہ سب غلط ہے۔ دیوی تو رما چھائی بھی جو کچھ کہہ رہی تھی یا کر رہی تھی اس کے اپنا پر کر رہی تھی۔ ماہین اس سارے معاملے سے تقریباً بے خبر تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں یہ فیصلہ کس طرح سے کرنے جا رہی ہوں، ورنہ شاید وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتی۔“

”کیا وہ اب بھی لاعلم ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں۔“ مایا رانی پھر مسکرائی۔ ”وہ سب کچھ جان چکی ہے..... اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ خود بھی ایک بڑی اُلجھن سے نکلی ہے۔ آج کے واقعے سے پہلے ہی وہ حشام کے حوالے سے تذبذب کا شکار ہو چکی تھی۔ آج کے واقعے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہے کہ حشام اس کی زندگی سے نکل گیا ہے..... ہمیشہ کے لیے۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں رانی جی..... کہ میں اس کی زندگی میں داخل ہو گیا ہوں۔“ عمران نے کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ تم بہت عرصے سے اس کی زندگی میں ہو..... اور شاید..... وہ بھی تمہاری زندگی میں ہے۔ اب قدرت نے تم دونوں کو ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس سے ملو۔ تم دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول دو۔ دیوتا بھی یہی کہتے ہیں کہ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ شادی کے سارے انتظامات موجود ہیں۔ تم دونوں ایک روز بعد اٹوٹ بندھن میں بندھ سکتے ہو۔“

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”مایا رانی! ہم آپ کے جذبات کی بے حد قدر کرتے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں۔ سب سے پہلے تو ماہین اور عمران کا ملنا ضروری ہے۔ اگر یہ کوئی فیصلہ کرتے بھی ہیں تو اس سے پہلے ان کے بڑوں کی مرضی ضروری ہو گی اور.....“

مایا رانی نے ذرا تیکھی ہو کر ہاتھ اٹھایا۔ ”ماہین کے بڑوں کی مرضی تو میں کچھ نہ کچھ جانتی ہوں۔ تمہاری دنیا میں بڑوں کے فیصلے ٹھونسے جاتے ہیں اور اکثر ”محبت“ کو ذبح کیا جاتا ہے۔“ مایا کی آنکھوں میں پھر وحشت جھلکنے لگی۔

جوان مایا رانی ذرا غصے میں ہوتی تھی تو اس کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگتا تھا اور وہ صرف نام ہی کی رانی نہیں تھی۔ چند روز پہلے ہم نے بھٹکے ہوئے برفانی لیپرڈ کے ساتھ اس کی دلیرانہ لڑائی دیکھی تھی۔

میں نے دھیمے نرم لہجے میں کہا۔ ”آپ کی بات بجا ہے رانی! پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ اگر شادی ہونی ہے تو پھر ہمارے طریقوں سے ہو۔“

”یہاں بھی تمہارے طریقوں سے ہی ہو گی۔“ رانی نے کہا۔ ”ہم نے کبھی بھی باہر کے لوگوں کو یہاں کے رسم و

رواج پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کرتی۔ اب تک جو کچھ ہوا یہ ایک ناٹک تھا اور تم دونوں بھی یہ بات بخوبی سمجھ رہے ہو۔"

"آپ سے درخواست ہے مایا رانی کہ مجھے ایک بار ماہین سے ملنے کا موقع دیں۔" عمران نے کہا۔

عمران کے گداز لہجے نے مایا کے چہرے پر درشتگی کچھ کم کردی۔ (ویسے بھی اس کا رویہ عمران کی نسبت مجھ سے کچھ سخت تھا۔ یقیناً اس کی وجہ وہی نہال والا واقعہ تھا۔ میں نے نہال کا پیچھا کیا تھا اور اسے زوب کو دفن کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں نے رامے اور مائرہ کو یہی بتایا تھا کہ زوب اب ناپید ہو چکا ہے مگر نہال والے واقعے سے ثابت ہوا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔)

عمران نے مایا رانی سے درخواست کی تھی کہ وہ ماہین سے ملنا چاہتا ہے۔ مایا رانی آمادہ نظر آنے لگی مگر اسی دوران میں قریب ہی کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ پھر دو محافظ عورتیں زور سے چلائیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور آواز ابھری۔ مجھے شک گزرا کہ یہ مترجم گندھارا کی آواز ہے۔ دو سیکنڈ بعد گندھارا لڑکھڑاتی ہوئی اندر آ گئی۔ پاؤں میں آہنی بیڑی کے سبب وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور مایا رانی کے قدموں کے پاس گر گئی۔ اس کے چہرے پر تازہ چوٹیں تھیں اور جیسے دم گھٹنے کے سبب ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ وہ فریادی انداز میں مایا رانی سے مخاطب ہوئی اور رو رو کر کچھ بتانے لگی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوا کہ کسی نے اسے بند کر دیا تھا اور وہ خود کو چھڑا کر یہاں پہنچی ہے۔ وہ مقامی زبان میں بات کرتے ہوئے بار بار ہماری طرف بھی اشارہ کر رہی تھی، جیسے کوئی بڑا انکشاف کر رہی ہو۔ مایا رانی اور منوہر وغیرہ کی آنکھوں میں بھی حیرت کا ریلا سا بہنے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ گندھارا، جادو رامے اور مائرہ کا نام بھی لے رہی ہے۔

مایا رانی نے تسلی دینے والے انداز میں گندھارا سے کچھ کہا پھر میری طرف دیکھا۔ گندھارا اپنا پیٹ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ محافظ عورتوں نے اسے دونوں طرف سے تھاما اور دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ مایا رانی بھی پیچھے گئی۔ ہم وہیں قالین پر بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" عمران نے منوہر سے پوچھا۔

منوہر کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی، بولا۔ "گندھارا نے اتفاقاً جادو رامے اور مائرہ کی گفتگو سن لی ہے۔ اس گفتگو سے اس پر انکشاف ہوا ہے کہ وہ دونوں ہر صورت میں زوب تک پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گندھارا نے یہ بھی بتایا ہے کہ چند روز پہلے آپ نے نہال کا جو پیچھا کیا تھا، وہ بھی رامے کی ہدایت اور حکم پر کیا تھا..... وہ زوب کی ٹوہ لگانے میں مصروف ہے۔"

"بس، یا کچھ اور بھی؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ اور بھی جی۔" منوہر سنگھ نے کہا۔ "گندھارا نے بتایا ہے کہ رامے اور مائرہ ہر صورت زندہ زوب تک پہنچنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں، چاہے اس کے لیے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ گندھارا کو یہ بھی شک ہے کہ ان دونوں نے بھاری رشوت اور قیمتی تحائف دے کر یہاں کے کسی اہم فرد کو اپنے ساتھ بھی ملایا ہوا ہے۔ اندر خانے کچھ پک رہا ہے۔"

یہ باتیں واقعی انکشاف انگیز تھیں۔

میں نے منوہر سے کہا۔ "گندھارا بات کرتے ہوئے بار بار میری طرف بھی اشارہ کر رہی تھی؟"

"جی جناب! اس نے رامے کا ایک اور پول بھی کھولا ہے۔ وہ یہ کہ مایا رانی کی رقیب ہر تی سے لڑ کر اسے رامے نے نہیں آپ نے مارا تھا۔ رامے نے غلط طور پر اس کا کریڈٹ لیا اور تمغا وصول کیا۔ اس طرح کی کچھ اور باتیں بھی وہ بتا رہی ہے۔"

"گندھارا کو پکڑا کس نے تھا؟"

"دراصل رامے اور مائرہ کو پتا چل گیا کہ گندھارا نے چھپ کر ساری باتیں سن لی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک گارڈ کی مدد سے اسے دبوچ لیا اور گھسیٹ کر ایک تاریک کمرے میں لے گئے جہاں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پیر باندھ دیے۔ شاید وہ اس کی ہتھیا ہی کر دیتے مگر لگتا ہے کہ وہ اس سے یہاں اندر کی کچھ جانکاریاں بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ واہگرو نے کرپا کی کہ گندھارا بندھے ہوئے منہ کے ساتھ غوں غاں کی جو آوازیں نکال رہی تھی وہ کسی طرح اس کی ایک شاگرد لڑکی تک پہنچ گئیں۔ اس نے گندھارا کی بندشیں کھولیں اور وہ بھاگتی ہوئی یہاں مایا رانی کے پاس آ گئی۔"

ایکا ایکی مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں صورتِ حال سنگین تر ہونے والی ہے۔ رامے اور مائرہ کا بھید کھل گیا تھا۔ ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود تھے اور بقول گندھارا انہوں نے یہاں کے کسی اہم فرد کو اپنے ساتھ بھی ملا لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، ٹکراؤ ہونے والا ہے۔

برف کدے میں خطرناک لوگوں کے درمیان پھنسے تابش، عمران اور ماہین کی مشکلات کا احوال اگلے ماہ پڑھیے

آخری قسط

قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات و اطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہِ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گرد و پیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شادابیاں ہی نہیں تلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جائے...

طلسمِ ہوس میں مبتلا ایک وحشی مسیحا کی قاتلانہ جراحی

چند ہی سیکنڈ بعد مایا رانی کسی تند بگولے کی طرح ساتھ والے کمرے سے برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ عقب میں اس کی دو ذاتی گارڈز تھیں۔ مایا رانی ہمیں نظر انداز کر کے دندناتی ہوئی سامنے سے گزری اور اس ہال نما پورشن میں پہنچ گئی جسے یہاں طامبورہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے گئے۔ طامبورہ میں پہنچتے ہی اس نے چبوترے کے سامنے ایک گھڑیال پر ضرب لگائی اور آتشیں آواز میں چیخی۔ ''ڈولما..... ڈولما.....'' مایا رانی کی آواز دور تک گونجی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک جانب سے بہت سے قدموں کی چاپ اُبھری۔ سردار محافظ ڈولما لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہال نما جگہ پر پہنچ گئی۔

گھڑیال کی آواز سن کر کچھ اور مرد و زن طامبورہ کی طرف کھنچے آئے تھے پھر ان میں مجھے کوتاہ قامت جادو رامے اور مائرہ کی صورتیں نظر آئیں۔ یقیناً شور و غل کی آوازیں انہیں یہاں تک کھینچ لائی تھیں۔

مایا رانی نے جادو رامے اور میم مائرہ کی جانب دیکھا۔ اُس کا دہکا ہوا سرخ و سپید چہرہ کچھ اور دہک گیا۔

''مایا رانی کیا ہوا ہے؟'' میم مائرہ نے بھولے بھالے انداز میں پوچھا۔ یقیناً ابھی تک اسے اور رامے کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ گنگھارا ان کے جسم بیجا سے چھوٹ کر مایا رانی تک پہنچ چکی ہے اور سارا بھید کھول چکی ہے۔



مایارانی نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ ”تم دونوں کو نہیں تو اور کسے معلوم ہوگا کہ کیا ہوا ہے؟“

مایا کا مضحکہ خیز انداز دیکھ کر جادو رائے اور مائرہ ایک ساتھ چونکے۔ مائرہ کا رنگ کچھ پھیکا پڑا۔ ڈولما کی کچھ اور مسلح ساتھی بھی طامبورہ میں داخل ہو چکی تھیں۔ مایارانی نے کڑک کر ڈولما کو حکم دیا۔ ”گرفتار کرلو ان دونوں کو اور ان کے ساتھیوں کو بھی۔“ مایا رانی کا اشارہ رائے اور میم مائرہ کی طرف تھا۔

ڈولما ساکت کھڑی رہی۔ اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

یکا یک مایارانی کے عقب سے لمبی تڑنگی مرد نما نہال برآمد ہوئی اور اس نے ایک آٹومیٹک رائفل بڑی مہارت سے مایارانی کے سر سے لگا دی، اس کے ساتھ ہی اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ مایارانی اور یوشال ماتا (والدہ) کے چہرے حیرت کی تصویر بنے نظر آئے۔

یوشال ماتا، ڈولما سے مخاطب ہو کر گرجی۔ غالباً اس نے بھی پوچھا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ڈولما اپنا پستول نکال چکی تھی لیکن پھر بھی اطمینان سے کھڑی تھی۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ دفعتاً مایارانی کی ذاتی محافظوں میں سے ایک نے لمبی تڑنگی نہال پر حملہ کرنا چاہا۔ ڈولما نے فائر کیا۔ گولی سیدھی حملہ کرنے والی کے سر میں لگی، وہ لڑھک کر چبوترے سے گری۔ گولی کے دھماکے کے بعد طامبورہ میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔

اس سکوت میں جادو رائے نے مایارانی کی والدہ یوشال ماتا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بوڑھی گھوڑی، تیرا اور تیری بیٹی کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ایک اشارے پر تیری ہی محافظ عورتیں تیری گردنیں کاٹ سکتی ہیں۔“

میں نے دیکھا، ڈولما اور اس کے عقب میں کھڑی کئی درجن عورتیں باغی نگاہوں سے مایارانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے وہ کلہاڑیوں، کٹاروں اور برچھیوں سے مسلح ہوتی تھیں مگر آج ان میں سے کئی ایک کے پاس آتشیں ہتھیار بھی نظر آرہے تھے۔ یقیناً یہ آتشیں ہتھیار رائے اور میم مائرہ کے ہی مہیا کردہ تھے۔

یکا یک بجلی سی کوند گئی۔ مایارانی نے تڑپ کر وار کیا۔ اس کے عقب میں کھڑی لمبی تڑنگی نہال اس کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی چبوترے سے نیچے جا گری۔ اس کے ساتھ ہی مایارانی نے اپنے زردلبادے کے اندر سے پستول نکال لیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں چلائی اور جیسے ہوا میں اُڑتی ہوئی جادو رائے کی طرف گئی۔ لگتا یہی تھا کہ وہ اسے دبوچ کر اس کے سر پر پستول رکھ دینا چاہتی ہے مگر آدھے راستے میں ہی ڈولما اس سے جا ٹکرائی۔

دونوں اوپر سے نیچے گریں۔ مایارانی نے گرتے گرتے جادو رائے پر سیدھا فائر کیا۔ مایارانی کے پاس وہی طلائی پستول تھا جو چند روز پہلے رائے اور مائرہ نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ پستول سے گولی کا شعلہ نکلا مگر حیرت انگیز طور پر اس فائر نے رائے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ بظاہر یہی لگا کہ نشانہ خطا ہوا ہے۔ فائرنگ کے دھماکوں سے طامبورہ کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ایک دیوار کے عقب میں کھڑی دو گارڈز نے ڈولما اور اس کے ساتھیوں پر فائر کیے تھے۔ یہ دو گارڈز یقیناً مایارانی کے ذاتی دستے کی تھیں مگر دو تین درجن کے مقابلے میں دو کی کیا پیش چل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں آناً فاناً ماری گئیں۔ مایارانی کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ طامبورہ کے داخلی دروازے بند کر دیے گئے اور یہی وقت تھا جب اس مختصر جھڑپ کے اصل نقصان کا پتا چلا۔

عمران نے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھیں جی کیا ہوا ہے؟“

میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ایک مقامی عورت اوندھی پڑی نظر آئی۔ اس کا خون فرش پر کیاری کر رہا تھا..... اور یہ کوئی اور نہیں، مایارانی کی والدہ یوشال ماتا تھی۔

یہی وقت تھا جب مایارانی کی نگاہ بھی اپنی والدہ پر پڑ گئی۔ وہ غیظ و غضب سے دیوانی ہی ہو گئی۔ اس کی دہاڑوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ڈولما سمیت درجنوں گارڈز نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ جلد ہی مایا کو کھینچ گھسیٹ کر موقع سے ہٹا دیا گیا۔ جادو رائے اور مائرہ چبوترے پر چڑھ گئے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہاں کی مذہبی پیشوا دیوی تورما بھی ان دونوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر ویسی ہی خباثت تھی جو کچھ دیر پہلے ڈولما کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

عمران نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے کہ رائے اور مائرہ نے یہاں کی جس اہم شخصیت کو سب سے پہلے شیشے میں اتارا ہے، وہ یہی کبڑی خالہ ہے۔ اس کی عمر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں راجا داہر کے دربار میں بھی یہی جنتر منتر پڑھتی ہوگی۔“

منوہر سے یہ پتا چلا کہ آج کی خونی جھڑپ میں مرنے والوں میں مایارانی کا ایک باکر بھی شامل ہے۔ دو تین گھنٹوں کے اندر ہی پوری طرح کایا پلٹ گئی تھی۔ سب کو قید کر دیا گیا تھا۔

میں، عمران، منوہر سنگھ اور ہمارے دیگر ساتھی، اپنی گھر نما قیام گاہوں پر ہی موجود تھے۔ ہمیں سختی سے ہدایت تھی کہ فی الحال باہر نہ نکلیں۔ رات دس بجے کے لگ بھگ سردار محافظ ڈولما نے مضطراق کے ساتھ ہمارے پاس آئی۔ اس نے

بتایا کہ جادو رائے صاحب نے ہم سب کو خصوصی رہائشی پورشن میں بلایا ہے۔

پانچ منٹ بعد ہم پھر اسی جگہ پر تھے جہاں سہ پہر کے وقت مایا رانی سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ بے شک اب وہ سابق رانی تھی، اس کی والدہ اور قریبی جانباز ساتھی مارے گئے تھے اور یقیناً وہ دل خراش صدمے سے گزر رہی تھی۔

بجائے کمرے میں ایک آرام دہ کرسی پر جادو رائے بڑے طمطراق سے بیٹھا تھا۔ اس کی دائیں جانب میم مائرہ تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ سنہری مائل سرخ بال ایک لیمپ کی رنگین روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ ان دونوں کے عقب میں وہ مسلح گارڈز موجود تھے جو ہمارے ساتھ ہی یہاں اس الوکھی بستی میں پہنچے تھے۔ وہ سب آتشیں ہتھیاروں سے لیس تھے۔

ہمارے پہنچتے ہی جادو رائے نے تکلیے کا حکم دیا۔ ڈولما سمیت سب لوگ باہر نکل گئے۔ میم مائرہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "رائے جی کو یونہی تو جادو رائے نہیں کہا جاتا۔ جیت اور کامیابی ان کی عادت بن چکی ہے۔ جہاں جاتے ہیں، اپنا جھنڈا گاڑ دیتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے تائید کی۔

عمران، منوہر، جہانے اور بہروز وغیرہ بھی میری بات سے اتفاق کرتے دکھائی دیے۔ حشام سب سے آخر میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ کڑی آزمائش والے منفی خیز واقعے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ کسی سے آنکھ تک نہیں ملاتا تھا۔

"یہ کرشمہ کس طرح رونما ہوا رائے صاحب؟" عمران نے خوشامدی لہجے میں پوچھا۔

"یہ سب کچھ میری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا ہے۔ حربہ ہی پرانا تھا۔ ان میں سے ایک دو لالچ کے پتلے پتے گئے اور انہیں اپنے ڈھب پر لایا گیا۔ یہاں آتشیں ہتھیاروں کی بے حد قدر و قیمت ہے۔ ہم نے انہیں ہتھیاروں اور دیگر چھوٹے موٹے تحائف سے خرید لیا۔"

میں نے رائے سے مؤدب انداز میں پوچھا۔ "کیا ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جو ہتھیار دیے گئے ہیں، وہ اصلی ہیں؟"

مائرہ بلند آواز میں ہنسی۔ "میں تمہارے سوال کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ مایا رانی اور سورگ باشی پشال ماتا کے پستول میں اصل گولیاں نہیں تھیں لیکن جو ہتھیار ہم نے یہاں اپنے وفاداروں کو گفٹ کیے ہیں، وہ اصلی گولیوں کے ساتھ ہیں۔"

"کیا محترمہ مکرمہ دیوی تورما بھی ہمارے ساتھ ہیں؟" عمران نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

"بے شک۔" جادو رائے کے بجائے میم مائرہ نے جواب دیا۔ "ہمیں یہاں جو کامیابی ملی ہے، اس میں بزرگ رضا دیوی تورما کا بہت کردار ہے۔ وہ بہت تحمل ہے۔ اُسے شیشے میں اتارنا آسان نہیں تھا۔ تاہم چند دن پہلے یہاں جو کچھ ہوا تھا، اس سے ہمیں بہت مدد ملی۔"

میم مائرہ نے دو لمحے توقف کر کے اپنے سنہری مائل سرخ بالوں کو بڑی ادا سے سنوارا اور بولی۔ "دراصل شروع میں مایا رانی نے اپنے چہیتے شوہر کو بھگانے والی ہرنی کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا تھا، اس کا ہمیں فائدہ پہنچا۔ موت کی سزا پانے والی ہرنی اس دیوی تورما سے پڑپوتی کا رشتہ رکھتی تھی....."

یہ ساری گفتگو چونکہ اردو میں ہو رہی تھی لہٰذا اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ مقامی سن لیں گے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں کا "اقتدار" حاصل کرنے کے بعد جادو رائے اپنی دست راست مائرہ کے ساتھ مل کر کوئی پریس کانفرنس کر رہا ہے اور ہم اخبار نویسوں کی حیثیت سے سوالات کر رہے ہیں۔

ہما عروج نے رائے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "رائے جی! اس بندی کی ایک الجھن بھی تو دور کریں۔ اس سارے کھڑاگ کی لوڑ پڑی کیوں ہے؟ میم مائرہ نے تو کہا تھا کہ ان لوگوں سے معاملہ شانتہ طے ہو رہا ہے۔ یکمشت واسطے جو فیصلہ ہمیں چاہیے، وہ مل جائے گی۔"

"وہ نہیں ملی نا....." مائرہ نے جواب دیا۔ "یہ لوگ اڑ گئے تھے۔ اس بات سے ہی انکار کر رہے تھے کہ وہ کیڑا (زوب) یہاں موجود ہے۔ حالانکہ وہ موجود ہے اور اس کے ثبوت بھی ہمیں مل چکے ہیں۔"

"تو کیا اب اسے تلاش کر لیا جائے گا؟" ہما نے پوچھا۔

"تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دیوی تورما اب ہمارے ساتھ ہے۔ اور وہ سب جانتی ہے۔ قیمتی تحائف کی چمک سے اسے شرم و شرم سب بھول گیا ہے۔" مائرہ نے وضاحت کی۔

"بلکہ ابھی تم سب لوگ اپنی آنکھوں سے اس پاؤں والے سانپ کو دیکھو گے جسے یہ زوب کہتے ہیں اور کستوری کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔" جادو رائے نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں تبصرہ کیا۔

مائرہ نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "ان فیکٹ..... ان میں سے کچھ لوگوں کے دماغ میں یہ خناس گھسا ہوا ہے کہ زوب کی یہاں موجودگی ان کے لیے بابرکت ہے۔ وہ سچے کھرے جانوروں کی نسل ختم ہونے سے بچانا چاہتے ہیں، انہیں پال پوس رہے ہیں۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں کیڑی تورما اندر داخل ہوئی۔ اس کے عمر رسیدہ چہرے پر خباثت بھری چمک تھی۔ وہ صرف مقامی زبان بول سکتی تھی۔ منوہر سنگھ کی وساطت سے اس نے بڑی محبت کے ساتھ رامے کو مخاطب کیا اور بولی۔ ''آؤ نئے شہزادے! میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تمہاری من پسند چیز دکھاؤں۔''

من پسند چیز سے اس کی مراد یقیناً وہ زوب نامی کیڑا ہی تھا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''اللہ کی شان ہے یہ، رامے جیسے مکروہ کو شہزادہ کہہ رہی ہے۔ یہ اس لفظ ''شہزادے'' کی تاریخی توہین ہے۔ اگر کوئی سچ مچ کا شہزادہ یہاں ہوتا تو یقیناً خودکشی کر لیتا۔''

''یہ نیک کام تم بھی تو کر سکتے ہو۔ تم خود ہی تو کہتے ہو کہ مہوش حیات تمہیں شہزادہ کہہ کر بلاتی ہے۔''

''کہنے میں اور واقعی سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے چاچو جان۔''

جادو رامے اور مائرہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم بھی اٹھ گئے۔ میں نے پیچھے کھڑے حشام کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ ''کیا بات ہے حشام؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میری..... طبیعت کچھ خراب ہے۔ اگر میم مائرہ اجازت دیں تو میں آرام کرنا چاہوں گا۔'' وہ بولا۔

میں اس کی ذہنی حالت سمجھ رہا تھا بلکہ سارے ہی سمجھ رہے تھے۔ مائرہ نے اسے رکنے کی اجازت دے دی۔ ہم آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بوڑھی دیوی تورما اپنی چمکیلی لاٹھی ٹیکتی ہمارے آگے آگے چل دی۔ ہم سنگلاخ برف کی ایک طویل سرنگ سے گزرے۔ راستے میں ڈولما اور دیگر مسلح گارڈز بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم ایک ایسے مقام سے گزرے جہاں یہ سرنگ (یعنی غار کی شاخ) بے حد تنگ تھی۔ بمشکل ایک فرد پھنس کر گزر سکتا تھا۔

ہم سب باری باری اس تنگ راستے سے گزر گئے۔ ہمارا تجسس بتدریج بڑھ رہا تھا۔ ہم زندہ زوب کو دیکھنے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ جلتی لیمپس کی روشنی میں ہمیں کچھ پنجرے نظر آئے۔ سلاخوں کے علاوہ ان پر باریک جالی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہاں ہلکی سی حیوانی بو محسوس ہوتی تھی۔ خوفناک صورتوں والی دو پہرے دار عورتیں برچھیاں تھامے ساکت کھڑی تھیں۔ ہمیں ''چیں چیں'' کی مہین آوازیں سنائی دیں جیسے کہیں بہت سے چوہے ایک جگہ جمع ہوں۔ ہم چند قدم آگے بڑھے تو انہیں دیکھ بھی لیا۔ وہ درجنوں کی تعداد میں واقعی بہت چھوٹے چھوٹے برفانی چوہے تھے اور ایک پنجرے میں بند تھے۔ سفید رنگ کے ان چھوٹے چوہوں کو دیکھ کر منوہر سنگھ نے سرگوشی کی۔ ''میرا ادھار ہے کہ یہ چوہے، زوب کے بھوجن کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔''

ہم محسوس کر رہے تھے کہ اس ساری جگہ کو مصنوعی طریقے سے گرم رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے اور پھر چند قدم آگے ہمیں وہ نایاب جانور بھی نظر آ گیا جس کے لیے جادو رامے اور مائرہ سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے اس برفستان میں پہنچے تھے۔

سرنگ کے ایک بڑے حصے کو آہنی سلاخیں اور جالیاں لگا کر بند کیا گیا تھا۔ اس حصے کے تین پورشن بنائے گئے تھے۔ تینوں میں چالیس کے قریب وہ سانپ نما کیڑے موجود تھے جو زوب کہلاتے تھے۔ ہم دیکھتے رہ گئے۔ ان کی رنگت کو ''آف وائٹ'' کہا جا سکتا تھا۔ شکل و صورت بالکل سانپ جیسی تھی مگر ان کے قریباً ڈیڑھ درجن پاؤں انہیں سانپ سے مختلف کرتے تھے۔

ہم سب سنسنی کی ایک لہر محسوس کر رہے تھے۔ جادو رامے اور مائرہ کے چہرے جوش سے تمتمانے لگے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ڈولما اور دیگر محافظ عورتوں نے خود کو ان پنجروں کے سامنے تعظیم کے انداز میں جھکایا تھا۔

کیڑی تورما اور رامے وغیرہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ منوہر سنگھ ان کے لیے مترجم کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس سے پہلے یہ فرض گندھارا ادا کرتی تھی مگر موجودہ ''کایا پلٹ'' کے بعد بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی زیرِ عتاب آ گئی تھی اور فی الحال معلوم نہیں تھا کہ کہاں ہے۔

☆☆☆

زوب کی دید کے بعد ہم اپنی نئی پُرآسائش رہائش گاہ پر واپس پہنچ گئے۔ منوہر سنگھ نے ہمیں بتایا۔ ''یہ کیڑی بڑھیا، اس عمر میں بھی لالچ اور حرص کی پُڑیا ہے۔ کہنے کو تو یہ یہاں کی مذہبی پیشوا ہے لیکن ان لوگوں میں سے ہے جو دھن کے لیے دھرم کو بیچتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ یہاں پر اس ''مقدس'' زوب کی رکھوالی تھی مگر اب وہ اس ''پہرہ'' کیڑے کو رامے اور مائرہ کے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ بس ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے اس نے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''جو زوب ابھی بچے ہیں، ان کے بس پانچ جوڑے ان کے پاس رہیں گے، باقی سب رامے اور مائرہ یہاں سے پاکستان لے جائیں گے۔''

میں نے منوہر سے مایا رانی کے بارے میں پوچھا، اس نے بتایا۔ ''جو کچھ میں سن رہا ہوں، اس کے مطابق وہ زندہ ہے لیکن حراست میں ہے۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ پتا نہیں کیا ہوا

ہمارے یہاں سے جانے کے بعد ایک طرح یہاں کی کرتا دھرتا دیوی تورما ہی ہوگی۔ وہی اس بارے میں فیصلہ کرے گی..... ہو سکتا ہے کہ ڈولما کے مشورے کے ساتھ دیوی اپنے پریوار میں سے ہی کسی کو رانی بنادے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، ہم کب تک یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟" عمران نے استفسار کیا۔

"کہتے ہیں کہ برف باری کا نیا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ فوری طور پر تو ہم یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ آگے کی واہگرو جانے۔"

ابھی تک ہم مابین کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ میں اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں نے گونگے جہاناں کو بلایا اور اشارے کنایے میں اس سے کہا کہ وہ میم مائرہ تک میرا پیغام پہنچائے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

ابھی میں جہاناں کو سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک مقامی ملازم تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کچھ کہا۔ منوہر نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ "آپ کا ساتھی حشام ٹھیک نہیں ہے۔"

ہم تینوں تیزی سے حشام کے کمرے میں پہنچے۔ وہ بستر پر اوندھا پڑا تڑپ رہا تھا، پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

"حشام..... کیا ہوا؟" میں نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی، وہ پلٹ گیا اور پھر اپنا معدہ خالی کرنے لگا۔

"شاید کوئی زہریلی شے کھائی ہے اس نے۔" عمران پریشان ہو کر بولا۔

"یہ دیکھیں جی، یہ کیا پڑا ہے۔" منوہر نے ایک تپائی کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں سفید کاغذ پر کوئی نیلگوں شے دھری تھی۔ یہ نیلا تھوتھا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

جہاناں بھاگا ہوا گیا اور میم مائرہ کو بلا لایا۔ میم مائرہ باقاعدہ طور پر ڈاکٹر تو نہیں تھی لیکن میڈیکیشن کے بارے میں شاید ڈاکٹرز سے زیادہ جانتی تھی، اس نے حشام کا معائنہ کیا اور تسلی دی۔ "اصولی طور پر معدہ واش ہونا چاہیے لیکن شاید دواؤں سے بھی کام چل جائے۔" اس نے کہا۔

میم مائرہ کی ہدایت پر اس کے ایک ساتھی نے حشام کے مسل میں دو انجکشن لگائے اور کچھ منہ میں بھی ٹپکایا۔

تقریباً آدھ گھنٹے میں حشام کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ لگتا تھا اس نے نیلے تھوتھے کی زیادہ مقدار نہیں نگلی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑانے لگا۔ "میں اس قابل نہیں ہوں، مجھے مر جانا چاہیے..... میں تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا..... بس مجھے معاف کر دو..... اگر کر سکتی ہو تو....." وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

عمران نے مجھے ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں کہا۔ "یقیناً اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔ شاید مابین سے ملنا بھی چاہ رہا ہے۔ کیا ہم مابین کو یہاں بلا سکتے ہیں.....؟"

"تم واقعی اتنے بے وقوف ہو یا جان بوجھ کر بننے کی کوشش کرتے ہو؟"

"کیا مطلب جی؟"

"بس چپ رہو۔" میں نے جل کر کہا۔ "یہ آدمی حقیقت ہے لیکن آدھا ڈراما ہے۔ اب تک ہمیں حشام کی فطرت کو سمجھ جانا چاہیے اور اب تو اس بات کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی بھی اس کے بارے میں کوئی خوش فہمی رکھے۔"

کم و بیش ایک گھنٹے میں حشام کی طبیعت کچھ اور سنبھل گئی۔ حقیقی بات یہی تھی کہ اب میرے دل میں اس کے لیے کہیں کوئی چھوٹا سا نرم گوشہ بھی موجود نہیں رہا تھا۔ مابین کے حوالے سے گرو ش دوراں نے اسے اور عمران کو ایک سخت ترین آزمائش سے دوچار کیا تھا اور اس آزمائش میں حشام واضح طور پر ناکام ہوا تھا۔ قدموں کی چاپ ابھری اور منوہر سنگھ نے آ کر بتایا کہ میم مائرہ نے میری درخواست قبول کی ہے اور ہم مابین سے مل سکتے ہیں۔

کئی دنوں بعد آخر یہ موقع مل ہی گیا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ عمران بھی میرے ساتھ جانے کے لیے اٹھ رہا ہے مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

"آؤ نا تم بھی؟" میں نے کہا۔

اس نے گہری سانس لی۔ "نہیں جی..... فی الحال نہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ابھی نہیں جائے گا۔ میں باہر نکلا۔ اس پُراسائش حصے میں بھی سردی کچھ بڑھ گئی تھی۔ غار کے اس اندرونی حصے میں کئی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ فی میل اور میل محافظوں اور ملازموں کے بہت سے شناسا چہرے اوجھل ہو چکے تھے اب ان کی جگہ نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً جادو رائے نے دیوی تورما اور ڈولما کے ذریعے غلبہ حاصل کرنے کے بعد کافی تبدیلیاں کی تھیں۔ جو نئے فی میل اور میل محافظ تھے، ان میں سے اکثر کے پاس رائفلیں اور پستول وغیرہ نظر آتے تھے۔ یہ وہی اسلحہ تھا جو جادو رائے اپنے سامان کے ساتھ یہاں لایا تھا۔ غالباً اسے پہلے سے معلوم تھا کہ اسے تحفے تحائف کے طور پر آتشیں ہتھیاروں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ ایک جگہ مجھے رائے اور مائرہ کا انچارج گارڈ بہروز نظر آیا۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے کندھے سے جدید ساخت کی کلاشنکوف جھول رہی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے مقامی

افراد اسے تعظیم اور خوف کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ملازم کے عقب میں چلتا ہوا میں ماہین کے کمرے میں پہنچا۔ داخلی دروازے پر قالین کا بھاری پردہ تھا۔ وہ سموری لباس میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوگئی اور جیسے سسک کر گلے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

"انکل تابی! آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور تمہیں چاروں خانے فٹ دیکھ کر مزید ٹھیک ہوگیا ہوں۔" میں مسکرایا۔ میرے انداز نے اسے حوصلہ دیا۔ اس کے اشارے پر ایک ملازمہ گئی اور دو پیالوں میں بھاپ دیتا ہوا سوپ لے آئی۔ یہ مچھلی کا سوپ تھا، اس میں گندم بھی تھی۔ اناج کو یہاں بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا۔

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "مایا رانی کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ اس کی والدہ کو مار دیا گیا ہے، وہ خود قید میں ہے۔ کہیں جادو رامے مایا کو بھی تو.....؟"

"نہیں..... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اب بھی یہاں بہت سے لوگ مایا کے حمایتی ہوں گے۔ رامے اور میم مائرہ یہاں کسی طرح کا فساد نہیں چاہیں گے۔ انہوں نے اپنا مقصد تقریباً حاصل کرلیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ برف باری کے رکتے ساتھ ہی ہم یہاں سے چلے جائیں۔"

"لائف میں پہلی بار مجھے ڈر لگ رہا ہے انکل تابی، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کوئی مزید خون خرابا ہو جائے؟"

"نہیں اب کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "رامے ہماری توقع سے زیادہ عیار شخص ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ساری ڈوریاں اپنے ہاتھ میں کرلی ہیں۔ دیوی تورما اور ڈولما اس کے اشاروں پر چل رہی ہیں اور سب کچھ ان کے کنٹرول میں ہے۔"

"رامے کی اسی عیاری اور بے رحمی سے تو ڈر لگتا ہے جی۔ یہ معاف کرنے والا شخص نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب رامے اور میم مائرہ نے یہاں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں کیا، جھڑپ ہوئی تھی۔ اس جھڑپ میں مایا رانی نے رامے کو شوٹ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن پستول چلا نہیں۔"

"پستول تو چلا تھا ماہین مگر اس کی گولی اصلی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے، تم ڈر رہی ہو کہ رامے، مایا سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گا؟"

"یہ صرف میرا خوف نہیں ہے انکل ہم..... میں نے اپنی آنکھوں سے بھی کچھ دیکھا تھا۔"

ماہین تفصیل بتاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ بہرحال ڈھکے چھپے انداز میں اس نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ کنٹرول حاصل کرنے والی شب رامے اس بندی خانے میں پہنچا تھا جہاں مایا رانی کو بند کیا گیا ہے۔ یہ بندی خانہ جو ایک بڑے بیرک کی شکل میں تھا، یہاں پاس ہی واقع تھا۔ رامے نے طیش کے عالم میں مایا کو بری طرح نوچا کھسوٹا تھا اور تھپڑ مارے تھے پھر گندی گالیاں بکتا ہوا چلا گیا تھا۔

ماہین بولی۔ "آج کل وہ ہمیشہ سے زیادہ غصے میں اور جھنجلایا ہوا ہے۔ اس کی "وائف" ایلی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ جو خاص قسم کا سری لنکن پان کھاتا تھا، اس کا اسٹاک اب ختم ہو چکا ہے۔ وہ نشہ بھی یہاں دستیاب نہیں جو وہ اس پان میں استعمال کرتا تھا۔ اب وہ بن پانی کی مچھلی بنا ہوا ہے۔ انکل تابی، وہ بالکل جنونی، سائیکو بندہ ہے۔ مجھے بھی رات کو میں اس کے کمرے سے گرجنے برسنے کی آوازیں سنتی ہوں مگر ان آوازوں کے دوران میں ہی وہ کسی وقت گنگنانے بھی لگتا ہے۔ اس کی آواز اچھی ہے لیکن جو گنگناتا ہے، وہ کوئی بہت ڈراؤنی قسم کی چیز ہوتی ہے..... لگتا ہے کہ اس شخص کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں۔"

"ماہین! کیا تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ مایا رانی سے بدسلوکی کرے گا؟"

"خود شاید نہ بھی کرے مگر اس نے اپنا جو گماشتہ مایا رانی پر نگران مقرر کیا ہوا ہے، اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہی بہروز۔ ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے اور مایا رانی کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے۔"

میں حیران ہو رہا تھا۔ ہمیں گفتگو کرتے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی مگر ماہین نے ایک بار بھی اس دل دہلا دینے والے واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا۔ "ماہین! تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا، دو روز پہلے بدھ کے دن یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ مایا رانی نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق عمران اور حشام کی پرکھ کے لیے جو وحشیانہ طریقہ اختیار کیا، میں اس کی حمایت تو نہیں کرسکتا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا بہرحال وقوع پذیر ہوا..... اور اس کا نتیجہ بھی ہم نے دیکھا....."

میری بات سن کر ماہین کا خوب صورت چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایک عجیب سا گریز اس کی آنکھوں میں نمودار ہوا اور اس نے منہ پھیر لیا۔

اس کے گریز کے باوجود میں نے بات جاری رکھی۔ "ماہین! اس واقعے کے بعد سے حشام بہت گم صم تھا۔ کل اس نے چند بلی گرام نیلا تھوتھا کھالیا۔ طبیعت کافی خراب رہی لیکن اب کچھ سنبھل گیا ہے..... شاید..... تم سے ملنا بھی چاہتا ہے۔" میں

جان بوجھ کر ماہین کو ٹٹول رہا تھا۔

ماہین نے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس سر اپنے بھرائے ہوئے گھٹنوں پر جھکا کر چہرہ چھپا لیا۔ وہ بہت مضبوط لڑکی تھی اور چند روز پہلے وہ اپنی مضبوطی اور دلیری ثابت بھی کر چکی تھی، تاہم موجودہ لمحوں میں کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ وہ ایک دم سسک پڑی۔ بے قراری سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ چہرہ چھپائے چھپائے بولی۔ "پلیز بالکل! میں اس بارے میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی..... میں ان دونوں میں سے..... کسی کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی..... اور..... حشام کی تو بالکل بھی نہیں..... بالکل بھی نہیں۔"

وہ روتے روتے میرے بازو سے لگ گئی۔ میں نے اس کا سر تھپکا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً باہر زوروں کی برف باری ہو رہی تھی۔ ثبوت یہ تھا کہ اس اندرونی حصے میں بھی سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ دور غار کے کسی حصے سے پالتو بھیڑیوں کی مدھم ہاؤلنگ سنائی دے رہی تھی۔

یکا یک قدموں کی چاپ سنائی دی اور میم مائرہ بھاری پردہ اٹھاتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ ماہین میرے بازو سے علیحدہ ہوئی اور جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

"یہ رونے شونے کس لیے ہیں؟" وہ ماہین کو دیکھ کر ذرا تیکھے لہجے میں بولی پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کہیں اپنی پیاری فرینڈ مایا کے لیے تو یہ موتی نہیں لٹائے جا رہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔"

وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ماہین واقعی مایا کے لیے ازحد پریشان تھی۔ میم مائرہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "ڈپٹی جی! اگر کوئی ایسی بات ہے تو اس کو سمجھاؤ۔ اس کی ہمدردیاں ان وحشیوں کے بجائے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ ان کے طور طریقے ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ بڑے سفاک لوگ ہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ہم پہل نہ کرتے تو یہ لوگ ہم پر چڑھ دوڑتے۔ یہ سیکڑوں ہیں، ہماری ٹکا بوٹی ہو جاتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو میم مائرہ، یہ کسی اور بات پر پریشان ہے۔ اپنے گھر سے مسلسل دوری اسے پریشان کر رہی ہے۔"

"اگر واقعی ایسا ہے تو اچھی بات ہے۔ رامے صاحب کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اب یہ اس جنگلی مایا کے لیے کسی طرح کی ہمدردی رکھتی ہے۔" میم مائرہ، اشک بار ماہین کو تیز تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

ملازمہ مزید گرم سوپ لے آئی تھی۔ ہم پھر دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ماہین جاننا چاہتی تھی کہ ہم کب تک اس برف کے دوزخ سے نکل پائیں گے۔ وہ واقعی بے حد پریشان تھی۔

بے شک وہ پروفیشنل لڑکی تھی اور اپنے یوٹیوب چینل کے حوالے سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیر و سیاحت بھی کرتی رہتی تھی، مگر جس طرح وہ کئی محاذوں سے اوجھل تھی، یقینی بات تھی کہ اس کے اہل خانہ اور فیملی میں بہت بے چینی پائی جا رہی ہوگی۔

ماہین نے دوبارہ حشام یا عمران کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی میں نے یہ ذکر چھیڑا..... تاہم جب میں اٹھ کر جانے لگا اور دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے آواز دے کر مجھے روکا، میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے گال کا ڈمپل کیس لیمپ کی روشنی میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ذرا جھجک کر بولی۔ "عمران..... کے..... سر کی چوٹ کا اب کیا حال ہے.....؟"

"کافی زیادہ چوٹ تھی..... مرہم پٹی ہوتی رہی ہے..... اب ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا، پھر چند لمحے توقف کر کے کہا۔ "تم نے عین وقت پر جس طرح پہنچ کر اس کی مدد کی، وہ تمہارا بہت شکر گزار ہے۔"

وہ خاموش رہی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی بڑی بڑی، سیاہ آنکھوں میں نمی سی چمکی ہے۔ جیسے کچھ پگھل رہا تھا اس کے اندر۔

میں اپنے رہائشی کمرے میں واپس پہنچا تو عمران بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ماہین کی خیر خیریت دریافت کی..... پھر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ ماہین نے اور کیا بات کی۔ میں نے فی الحال خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ بس اتنا کہا۔ "وہ تمہارے سر کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھی۔ پوچھ رہی تھی۔"

☆☆☆

سردی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ تاہم معلوم ہوا تھا کہ باہر کچھ زیادہ برف باری بھی نہیں ہو رہی۔ لیپرڈ کا اس طرح گرنا غیر معمولی تھا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا، تیز ہوا کی وجہ سے سردی بڑھی ہوئی تھی۔ دائیں طرف لکڑی کا ایک بڑا سائبان تھا جس کے نیچے سے برفیلی ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی تھی۔ یہاں کئی برف پر پھسلنے والی گاڑیاں، کتوں سمیت کھڑی رہتی تھیں۔ ان گاڑیوں کو اسکیموبائل بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے تین چار رکھوالے بھی یہاں نظر آتے تھے۔ یہاں کی معالجہ گندھارا کا شوہر بھی ان رکھوالوں میں سے ایک تھا۔ ہوا کی کاٹ تیز تھی۔ میں غار میں واپس آ گیا۔ صبح سے ہی طامبورہ کی طرف سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عمران دیکھ کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ لکڑی کے خاص قسم کے بکس تیار کیے جا رہے ہیں، یہ بکس یہاں سے ذوب کو لے جانے کے لیے ہیں۔ اب دوپہر ہونے والی

تھی۔ میں ابھی ابھی اپنی روزمرہ کی جاں گسل ورزش سے فارغ ہوا تھا اور اب لیٹا ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں عمران، ہما عروج کی فرمائش پر اسے لپ ریڈنگ سکھانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔

اسی دوران میں گرجنے برسنے کی کچھ آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ بلاشبہ یہ جادو رائے کی ہی گونج دار آواز تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا اس کے شاندار رہائشی پورشن کی طرف گیا۔ برفانی غار کے اندر یہ آراستہ پورشن اس سے پہلے مایا رانی اور اس کی والدہ کے استعمال میں تھا۔ یہاں دیگر سہولتوں کے علاوہ باقاعدہ گرم پانی کی ٹینکی کا انتظام تھا اور یہ جگہ کافوری لیمپس اور شمعوں سے روشن رہتی تھی۔ قریب پہنچ کر پتا چلا کہ رائے اپنی ناپسندیدہ مہمل ایلی پر گرج رہا ہے..... ایلی نے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ جواب میں رائے گرجا۔ "بکواس مت کرو، میں جانتا ہوں وہ کنجر..... وہ سفید سور ڈیرن تمہارے دماغ سے نکل ہی نہیں پارہا۔ میرے ساتھ سوتی ہو اور ہوتی اس کے ساتھ ہو۔ لعنت ہے تم پر..... لعنت ہے۔"

اس کے ساتھ ہی تھپڑ کی آواز آئی جو یقیناً نوجوان ایلی کے رخسار پر پڑا تھا۔ بے شک ایلی سے چند دن کے پیار محبت کے بعد رائے اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا..... اور وہ چند دن کا بناوٹی پیار بھی صرف اس لیے تھا کہ رائے یہاں کے ماحول کے مطابق چلنا چاہتا تھا اور مایا وغیرہ کی نگاہوں میں خود کو معقول ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے کسی کا کیا ڈر ہوسکتا تھا؟

ایلی غالباً منت سماجت کررہی تھی اور وہ مسلسل پھنکار رہا تھا۔ ماہین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اپنے مخصوص نشے کی کمی کے سبب وہ نفسیاتی طور پر چڑچڑا اور غصیلا ہو چکا ہے۔

یکایک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ باہر کو ابلی ہوئی آنکھوں میں سرخی تھی۔ "یہاں کھڑے کیا سن رہے ہو؟" وہ پھنکارا۔ "اندر آجاؤ۔ مجھے کسی کا کوئی ڈر نہیں ہے، آجاؤ اندر۔"

میں تذبذب میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں میم مائرہ نے بھی کمرے سے جھانکا۔ "ہاں ہاں آجاؤ، کچھ صلاح مشورہ بھی کرنا ہے تم سے۔" وہ بولی۔

میں اندر چلا گیا۔ یہ ایک طرح سے اس پورشن کی نشست گاہ تھی۔ میرے اندر آتے ہی جادو رائے نے ایلی کو باہر جانے کی ہدایت کی۔ اس کا مرمریں رخسار طمانچے کی وجہ سے سرخ تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ دیوار کو ٹٹولتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے میم مائرہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت آمیز رقابت کی تپش تھی اور ایک طرح کی تسکین تھی۔ وہ جب بھی خوبرو ایلی کی بے بسی کا نظارہ کرتی تھی، یہ تسکین نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔

ایلی کے جانے کے بعد جادو رائے نے جلتی نظروں سے مجھے سرتاپا گھورا اور بولا۔ "ہوسکتا ہے کہ چار پانچ روز میں یہاں سے ہماری واپسی کا سفر شروع ہوجائے، میں چاہتا ہوں اس مرتبہ یہ سفر تناؤ بھرا نہ ہو اور یقیناً تم بھی یہی چاہتے ہوگے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں، مجھے تمہاری ساری ہسٹری معلوم ہے اور اسی جانکاری کی وجہ سے میں کبھی بھی مکمل طور پر تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوا....."

"اب تک کے سفر میں آپ دونوں کو مجھ سے کیا شکایت ہوئی ہے؟"

"نہیں ہوئی..... لیکن اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تمہاری اس ساتھی لڑکی ماہین کی ٹانگ سے بارود بندھا ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ ایسا نہ ہو۔ ہم اچھے ماحول میں سفر کریں اور منزل تک پہنچیں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں رائے صاحب۔ آپ بے فکر رہیں بلکہ میں آپ کو اپنی اور عمران کی طرف سے گارنٹی دیتا ہوں۔"

"مجھے اس لڑکی ماہین کی طرف سے بھی گارنٹی چاہیے۔ اس کمینی مایا رانی سے اس کا یارانہ رہا ہے اور وہ خود بھی کوئی اچھی شے یں چیز نہیں ہے۔ ہم نے چند روز پہلے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ کسی کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔ شاید وہ شاگرد ہے تمہاری؟"

"نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔ بہرحال میں اس کی طرف سے بھی آپ کو مکمل اطمینان دلاتا ہوں۔"

میم مائرہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگوں کا رویہ ٹھیک رہے گا تو واپس پہنچنے پر ہم تمہیں مناسب رعایتیں دے سکیں گے۔"

ابھی گفتگو جاری تھی کہ ایک محافظ نے باہر سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ جادو رائے نے اجازت دی۔ چند لمحے بعد لمبی تڑنگی مرد نما نہال ایک عورت اور مرد کو اندر لے آئی۔ عورت کے گلے میں وہی گلوبند تھا جو یہاں اکثر مردوں کے گلے میں ہوتا تھا۔ گلوبند سے ایک زنجیر منسلک تھی اور نہال عورت کو گھسیٹتی ہوئی اندر لارہی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی جواں سال عورت تھی جسے میں نے چند روز پہلے اس کے تین باکروں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے باکروں (شوہروں) نے ایک شکار کیا ہوا پہاڑی بکرا اٹھا رکھا تھا۔ ایک باکر کی غلطی سے بکرا نیچے گرا تھا اور عورت کے پاؤں پر بھی چوٹ آئی تھی۔ اس کی سزا باکر کو یہ بھگتنا پڑی تھی کہ وہ سب کے سامنے تین پہر تک ایک ٹانگ پر

کھڑا رہا تھا۔ اب وہی باکر اس کے ساتھ تھا۔

جادو رام نے غصیلے انداز میں عورت کی طرف دیکھا، پھر منوہر سنگھ کو بلایا اور اس کے ذریعے عورت کے مسکین صورت باکر سے کہا۔ "لعنت ہے تم لوگوں کی مردانگی پر۔ کم از کم مجھ سے تو تمہاری وہ ذلت برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اب یہاں میرا اختیار چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ تم بھی ویسا ہی سلوک کرو۔ بدلہ لو اس سے۔ بے لباس کر کے کھڑا کر دو اس کو چوراہے میں....."

باکر سرتا پا لرزنے لگا۔ انکار میں سر ہلانے لگا۔ اس نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ عورت اس کی بیوی ہے۔ عزت اور ادب کی جگہ پر ہے۔

رامے گرجا۔ "ڈرو مت، تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں یہاں جو کام بھی کر رہا ہوں، اس میں دیوی تورما چھائی کی آشیر باد شامل ہے۔ وہ بھی ایسی بے لگام عورتوں کو لگام ڈالنے کے حق میں ہے۔"

باکر باقاعدہ رونے لگا، ہاتھ جوڑنے لگا۔ کہنے لگا کہ یہ سب اس کے بس کا نہیں ہے۔ غصیلے رامے نے اٹھ کر اس کے منہ پر تھپڑ جڑا..... وہ طیش سے دیوانہ سا ہو رہا تھا۔ اس نے ڈری ہوئی عورت کو کئی غلیظ گالیاں دیں پھر اس کی گیند نما کریہہ آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ دروازے کی طرف منہ کر کے دہاڑا۔ "بہروز خان..... بہروز خان....."

چند ہی سیکنڈ بعد دراز قد بہروز سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ اندر آیا۔ رامے نے جواں سال عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس سورنی کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔ سارے کس بل نکال دو اس کے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

بہروز تو جیسے پہلے ہی تیار تھا۔ اپنے بگ باس کا مطلب سمجھ کر اس نے خوف زدہ عورت کو گلو بند سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

میں اور منوہر سکتہ زدہ کھڑے رہے۔ یقیناً رامے اپنے غصیلے پن میں اپنے اختیارات اور اپنی موجودہ پوزیشن کا غلط استعمال کر رہا تھا۔ جو کچھ چند روز پہلے اس عورت نے کیا، یقیناً وہ بھی غلط تھا لیکن جو اب رامے کر رہا تھا، وہ بھی کہاں کا درست تھا؟

ایک دن گزر گیا، دوسرے روز صبح سویرے ہما عروج میرے کمرے میں آئی۔ آج کل عمران سے اس کی گاڑھی چھن رہی تھی۔ دونوں ظلموں اور ڈراموں وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کسی وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور بلند آواز میں ہنستے تھے..... تاہم فی الوقت ہما کافی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ چھوٹتے ہی بولی۔ "ڈیشنگ، کچھ پتا چلا تمہیں رات کو کیا چن چڑھا ہے یہاں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ اپنے لمبے بالوں کو تھی انداز میں جھٹکتے ہوئے بولی۔ "وہ جس سانپ جیسی شے کو یہ لوگ زوب کہتے ہیں، اس نے کام دکھایا ہے۔ تین بندوں کو کاٹا ہے اس نے۔ دو تو ڈھیں پٹاس ہو گئے ہیں، ایک زخمی ہے۔"

"ڈھیں پٹاس؟ مطلب مر گئے ہیں؟"

"کچھ ایسے ویسے۔ دونوں کی لاشیں نیلی پڑ گئی تھیں۔ تیسرا جو زخمی ہوا ہے وہی ڈھکرا بہروز ہے۔ بچ تو جائے گا لیکن ابھی تو کراہیں نکل رہی ہیں اس کی، درد کی وجہ سے۔"

"پر یہ ہوا سب کچھ کیسے..... اور مرنے والے کون ہیں؟"

"دونوں گارڈ تھے رامے جی کے۔ ایک کا نام وارث تھا۔ دوسرے کا اچھو۔ دراصل زوب کے پنجروں کی نگرانی کے لیے رامے جی نے اپنا خاص بندہ جمال شاہ مقرر کر رکھا تھا۔ وہی جو میم مائرہ کے ساتھ رہتا ہے اور انجکشن وغیرہ بھی لگا لیتا ہے۔ اس سے غلطی ہوئی، ایک پنجرے کا دروازہ چٹخنی طرح بند نہ ہوا، رات کو تین بڑے کیڑے باہر نکل آئے۔ وہ تو خیر گزری کہ کوئی ہمارے کمروں کے پاس نہیں آ گیا....."

یہ تو میں نے سنا تھا کہ یہ بہت زہریلا کیڑا ہے مگر اتنی جلدی اس کی زہرناکی کا واقعہ دیکھنے کو ملے گا، اس کی توقع نہیں تھی۔ میں ہما عروج اور عمران کے ساتھ طامبورہ میں پہنچا۔ دونوں لاشیں ابھی ابھی وہاں سے اٹھائی گئی تھیں، البتہ زخمی ہونے والا گرانڈیل بہروز ایک چٹائی پر موجود تھا اور تکلیف کی وجہ سے بل کھا رہا تھا۔ میم مائرہ بھی پریشان صورت کے ساتھ وہیں موجود تھی۔ اس نے بہروز کے پاؤں پر نشتر سے چیرا دیا تھا اور ایک ملازم پاؤں دبا دبا کر خون نکال رہا تھا۔

مائرہ نے ہمیں مختصراً بتایا کہ یہ سب کیسے ہوا ہے، آخر میں بولی۔ "بہروز کی بچت یوں ہو گئی کہ اسے نسبتاً چھوٹے زوب نے آخر میں کاٹا، تب تک ویسے بھی اس کی بائٹ میں زہر کم ہو چکا تھا۔"

زہر کی خطرناکی کا اندازہ یوں ہوتا تھا کہ بالکل چھوٹے سے زخم کے باوجود بہروز ماہیِ بے آب کے مانند تڑپ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ مجھے وہ عورت یاد آئی جو رامے کے عتاب کا شکار ہوئی تھی اور جسے رامے نے بہروز کے حوالے کیا تھا، پرسوں شب وہ یقیناً بدمست بہروز کی بدسلوکی کا شکار ہوئی تھی۔ آج بہروز خود زہریلے ڈنگ کا شکار ہو گیا تھا۔ قدرت ایسے ہی چھوٹی بڑی سزاؤں اور جزاؤں کا توازن برقرار رکھتی ہے۔

طامبورہ کے ساتھ والے حصے سے رامے کی گن گرج

سنائی دی۔ وہ کسی کو تھپڑ رسید کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس کی آتش مزاجی آج کل عروج پر تھی۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔ کھلے دروازے میں سے لمبے بالوں اور داڑھی مونچھ والا وہی شخص نظر آیا جو ہمارے ساتھ ہی لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور جس کا نام جمال شاہ تھا۔ تھپڑ اسی کو پڑے تھے مگر بات صرف تھپڑوں تک ہی نہیں رہی تھی۔ اب گونگے جہانے اور ایک تنومند گارڈ نے جمال کو کندھوں سے دبوچا ہوا تھا اور رامے کا ایک ذاتی گارڈ استرے کی مدد سے جمال کا سر مونڈ رہا تھا۔ جادو رامے اس کی شان میں مسلسل "قصیدے" پڑھ رہا تھا اور گاہے گاہے اسے ٹھوکر بھی رسید کر دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمال کے سر کے علاوہ اس کی داڑھی مونچھ بھی صاف کر دی گئی۔ جمال کی پینٹ بری طرح پھٹی ہوئی تھی اور وہ نیم عریانی کی حالت میں تھا۔

ہمارے اب تک کے مشاہدے کے مطابق جمال، رامے کا بے حد وفادار کارندہ تھا اور بہت چوکس بھی تھا۔ غلطی کس سے نہیں ہو سکتی، اس سے بھی ہوئی تھی۔ وہ زہریلے کیڑوں کی درست نگرانی نہیں کر سکا تھا مگر اس کو جس بے دردی سے مارا پیٹا اور ذلیل کیا گیا تھا، وہ بھی قابلِ ذکر تھا۔ یقیناً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رامے کا نشہ کئی دن سے ٹوٹا ہوا تھا اور وہ سرتاپا شعلہ بنا ہوا تھا۔

اتنے دنوں بعد میں آج پہلی بار اس جمال نامی شخص کو بہت غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ گھنی داڑھی اور مونچھوں وغیرہ کے بغیر نجانے کیوں مجھے اس کی شکل کچھ دیکھی بھالی سی لگی مگر ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

جادو رامے اپنا غصہ نکال کر جا چکا تھا۔ گارڈ بھی باہر جا چکے تھے۔ جمال اپنے ہی عرقِ ندامت میں ڈوبا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ مجھے لاہور کے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال کا پیتھالوجسٹ کامران یاد آ گیا۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے کامران سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب ثروت جنگلی دوا کی وجہ سے سخت بیمار ہوئی اور اسے جان کے لالے پڑے۔ وہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی بیچ راستے میں مجھے چھوڑ کر جا رہی تھی اور میں اسے ہاروؤں میں سمیٹے ہوئے اسپتالوں اور لیبارٹریوں کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا۔ انہی دنوں ماہر پیتھالوجسٹ کامران نے ایک دو اہم ٹیسٹوں میں میری خصوصی مدد کی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ کسی حد تک یاد رہ گیا تھا۔ آج یہاں رامے کے اس جمال نامی کارندے کو گھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے بالوں کے بغیر دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا تھا کہ یہ وہی کامران ہے یا پھر..... اس کا کوئی قریبی عزیز؟

میں اُس کے قریب چلا گیا۔ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر میں نے اردگرد دیکھا اور مدھم لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟"

اس نے میرے سوال پر ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔

اس نے اپنا سر ہلا کر میرے سوال کا جواب نفی میں دیا۔

"کیا تمہارا کوئی قریبی عزیز لاہور کے اسپتال میں رہا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ پشیمانی و ذلت کے شدید ریلے میں تھا۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔

یہ دوسری رات کا واقعہ ہے۔ سردی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ پتا چلا تھا کہ اس وسیع غار سے باہر برفانی طوفان آیا ہوا ہے۔ بھاری بھرکم سلیپنگ بیگ اور کپڑوں کے باوجود ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہ ٹھنڈ میرے لیے نہیں تھی۔ ایک مدت ہوئی تھی کہ سردی گرمی نے مجھ پر اثر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ رات کا دوسرا پہر تھا، میں ابھی سویا نہیں تھا، یکایک مجھے محسوس ہوا کہ نیم تاریکی میں کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ چھوٹے لیمپ کی لو تھوڑی سی اونچی کی۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کلین شیوڈ اور صفاچٹ سر والا جمال میرے سامنے کھڑا تھا۔ پہلے مجھے خطرے کا احساس ہوا مگر پھر اندازہ ہوا کہ اس کا انداز دوستانہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

اس نے ٹھہرے لہجے میں سرگوشی کی۔ "میں..... آپ سے کچھ بہت خاص کہنا چاہتا ہوں، اگر ہو سکے تو اس کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر دیں۔"

میں کچھ دیر تک اس کا مغموم چہرہ دیکھتا رہا پھر اٹھ کر دروازے کو آہستگی کے ساتھ بولٹ کر دیا۔

دو تین رسمی کلمات کے بعد جمال نے انکشاف کیا۔ "کل آپ نے میرے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل درست ہے۔ میں جمال نہیں احمد کامران ہوں۔ میں نے ہی آپ کی بیمار بیگم کے اہم میڈیکل ٹیسٹوں میں آپ کی مدد کی تھی۔ میں نے کئی ہفتے پہلے لاہور ہی میں آپ کو پہچان لیا تھا مگر اپنے حالات کے سبب خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ میں سب سے پہلے تو آپ کی بیگم کی وفات پر افسوس کروں گا، وہ بڑی باہمت خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی بیماری کے ساتھ اپنی طاقت سے بڑھ کر لڑائی کی۔"

"تمہارے جذبات کے لیے شکریہ..... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کہاں اسپتال کا وہ میڈیکل پیتھالوجسٹ اور کہاں جادو رامے کا ایک وفادار کارندہ..... اور پھر تمہارا وہ بھیس جس نے تمہیں بالکل کیموفلاج کر رکھا تھا؟"

میرے اس سوال کا جو جواب احمد کامران نے دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے..... قریباً ایک سال پہلے کامران کے ایک دشمن آفیسر نے کامران کو ایک نوجوان مریضہ کے ریپ اور قتل کیس میں اس بری طرح پھنسا دیا کہ اسے پھانسی کا پھندا اپنے سامنے نظر آنے لگا۔ ان مشکل ترین حالات میں جادو راے نے اسے پناہ دی اور قانون کے لمبے ہاتھوں سے بچایا۔ تاہم جادو راے کی یہ عنایت، بے غرض نہیں تھی، کامران قتل کے جھوٹے کیس سے تو بچ گیا مگر جادو راے کے کالے دھندے میں اسے راے کے ساتھ شریک ہونا پڑا۔ جب وہ ایک بار جعلی ادویات کے کاروبار میں ملوث ہو گیا تو پھر دھیرے دھیرے اس نے خود کو راے کی مرضی و منشا کے مطابق ڈھال لیا۔ تاہم کل جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، اس نے اس کے دل و دماغ پر اتنی گہری چوٹ لگائی تھی کہ وہ خودکشی پر تقریباً آمادہ ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ مجھ پر کچھ اہم باتوں کا انکشاف کرے۔

اس دوران میں عمران بھی جاگ چکا تھا۔ کامران نے جو پہلا انکشاف کیا وہی دھماکا خیز تھا۔ وہ بولا۔ "آپ جانتے ہیں راے اور میم مائرہ یہ ساری جدوجہد کس لیے کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "وائرس کی ویکسین بنانے کے لیے، اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے اور پھر اسے منہ مانگے داموں پر فروخت کرنے کے لیے۔"

"لیکن..... ویکسین..... تو بن..... چکی ہے۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اور اسے بنے ہوئے قریباً ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔"

"تو پھر..... اب کیا بن رہا ہے؟"

اس نے ڈرامائی انداز میں ہماری طرف دیکھا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ "اب بیماری بن رہی ہے، یعنی وائرس مکمل کیا جا رہا ہے۔"

اس کے لہجے میں موجود بے پناہ سچائی نے ہمیں سرتاپا دہلا دیا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟" عمران نے دبی آواز میں پوچھا۔

"برادر..... کسی دوا کو تب ہی فروخت کیا جا سکتا ہے نا، جب اس کی ڈیمانڈ ہو، بیماری تو ابھی موجود ہی نہیں۔ اس "نایاب" ویکسین کا کیا کریں گے یہ لوگ؟ اب یہ بیماری..... میرا مطلب ہے وائرس بنانا چاہتے ہیں، اسے جنوبی ایشیا کے دو تین ملکوں میں پھیلانا چاہتے ہیں، جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔"

کامران کے لب و لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

اگلے آدھ گھنٹے میں ہمارے اور احمد کامران کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے تائید ہوئی کہ قریباً دس برس پہلے جاپانی ڈاکٹر شانے حادثاتی طور پر یہ وائرس بنا ڈالا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے، انسانی خون میں "کلاٹس" بننے سے روکنے والی ایک دوا پر کام کر رہا تھا۔ یہی دوا تھی جس میں اس نے زوب نامی اس کیڑے کا زہر استعمال کیا تھا۔ بعدازاں جب وائرس وجود میں آ گیا تو ڈاکٹر شانے دو تین برسوں میں اس کی موثر ویکسین بھی ایجاد کر ڈالی اور اپنا یہ سارا کام رائٹنگ فارم میں محفوظ کر دیا۔ ڈاکٹر شا کی وفات سے قبل یا بعد میں ڈاکٹر کے یہ سارے پیپرز ارب پتی ڈیرن فورڈ اور اس کی بیوی میم مائرہ کے پاس پہنچے۔ بعدازاں جب دونوں میں انا کی وجہ سے ناچاقی ہوئی تو کچھ پیپرز اور سی ڈیز میم مائرہ لے گئی اور کچھ سواد ڈیرن فورڈ کے پاس رہ گیا۔ اس ناچاقی اور پیپرز کی تقسیم سے پہلے میاں بیوی ویکسین تو تیار کر چکے تھے لیکن وائرس کا مکمل "ویرینٹ" تیار نہ ہو پاتا تھا۔

عمران نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور قدرے سرا سیمہ آہنگ میں بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ دنیا بھر میں بیماریوں کے لیے دوا ایجاد کی جاتی ہے۔ یہاں یہ دونوں مجرم پارٹیاں اپنی دوا کے لیے بیماری ایجاد کر رہی ہیں۔"

آدھ پون گھنٹے بعد بے حد دل گرفتہ اور آبدیدہ احمد کامران واپس چلا گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو یہ قول دیا تھا کہ اس یخ بستہ رات میں..... اس کمرے کے اندر جو بھی گفتگو ہوئی ہے، وہ صرف اور صرف ہم تینوں کے درمیان رہے گی۔

☆☆☆

کامران سے بات ہوئے کم و بیش پندرہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ اب تک ہم یہی سمجھتے آئے تھے کہ راے اور اس کا ٹولا ایک ایسے وائرس کی ویکسین تیار کر رہا ہے جو وجود میں آ چکا ہے..... دنیا میں کئی جگہ موجود ہے اور شاید پھیل بھی سکتا ہے۔ یہ لوگ اس کی ویکسین تیار کر کے دولت کمانا چاہ رہے ہیں مگر اب پتا چل رہا تھا کہ وائرس صرف ڈاکٹر شا کے پیپرز میں موجود تھا اور اب اسے جیتی جاگتی حقیقت بنا کر ان گنت لوگوں کی زندگیاں شدید خطرے میں ڈالی جا رہی ہیں۔

میں اور عمران اسی بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب منوہر سنگھ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا، بولا۔ "لو جی، گندھارا بے چاری کا آخری وقت آ گیا۔ اس کی انتھیا کی جا رہی ہے۔"

"کیا مطلب..... وہ تو امید سے ہے۔"

"ہمیں پتا نہیں چلا جی۔ چار دن پہلے بچے کا جنم ہو گیا ہے۔"

"لیکن..... اُسے یہ سزا تو مایا رانی نے سنائی تھی اور

گندھارا کی طرح مایا خود بھی بندی خانے میں ہے۔"

"لیکن اب یہ حکم دیوی تورما اور رائے صاحب نے دیا ہے۔ اسے اسی طرح پول سے باندھ کر اور تیل چھڑک کر جلا دیا جائے گا..... بلکہ سمجھو جلایا جا رہا ہے۔ سارا انتظام ہو چکا ہے۔"

رائے کے لیے ہمارا غم و غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ہر حد پار کر رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ برداشت جواب دے جائے گی۔

ہم منوہر سنگھ کے ساتھ تیز قدم اٹھاتے غار کے دہانے پر پہنچے۔ برفانی طوفان کا زور صبح سویرے ٹوٹ چکا تھا البتہ ہلکی برف باری جاری تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ دل دہلا دینے والا منظر وہی تھا جو ہم پہلے بھی دو بار دیکھ چکے تھے۔ برف باری کے باوجود یہاں تین چار سو مرد و زن جمع تھے، تاہم ان میں بچہ کوئی نہیں تھا۔ پتھر کے ایک پول کے ساتھ دہشت زدہ گندھارا کو زنجیروں سے باندھا جا رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا..... وہ جیسے جلنے سے پہلے ہی آدھی مر چکی تھی۔

گندھارا کے اُلجھے بالوں پر برف گر رہی تھی۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتی اور لاچار نظروں سے بائیں جانب دیکھتی تھی۔ شاید اسی جانب وہ اپنے بچے کو آخری بوسے کے بعد چھوڑ آئی تھی۔ گندھارا کا شوہر (باکر) مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ یہاں تھا ہی نہیں، کسی کونے میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ اسی دوران میں تین عورتیں آگے بڑھیں اور گندھارا کے گرد لکڑیاں چننے لگیں۔

یکایک میرے تپے ہوئے سینے کے اندر کچھ چل پڑا۔ ایک آتشیں لہر اٹھ کر پورے جسم میں پھیل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس عورت کو یوں بے بسی کی حالت میں مرنے دیا اور اس کے لیے کوئی کوشش نہ کی تو خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔ "عمران! ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

یکایک عمران کا چہرہ بھی تمتما اٹھا اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔ میں لمبے ڈگ بھرتا جادو رائے اور کیڑی دیوی تورما کے عین سامنے جا پہنچا۔ مسلح محافظ میں کچھ چونکی ہوئی نظر آنے لگیں۔ میں نے ٹھوس لہجے میں دیوی سے گندھارا کی جان بخشی کی درخواست کی اور کہا کہ گندھارا کے بارے میں مایا رانی کی رائے پوچھی جانی چاہیے۔

نتیجہ وہی نکلا جو مجھے معلوم تھا۔ دیوی تورما اپنی زبان ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلانے لگی۔ پتا نہیں، کیا کیا بول رہی تھی۔ رائے کی منحوس صورت پر بھی سفاکی اور کرختگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اب لکڑیوں پر تیل چھڑکا جا رہا تھا۔ لوگ آخری مناظر دیکھنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے بھی رائے اور دیوی تورما کے ساتھ آخری کوشش کی۔ جب نتیجہ صفر نکلا تو میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا۔ میں نے قریب کھڑی ایک محافظ کے ہاتھ سے رائفل جھپٹی اور تیل چھڑکنے والی عورت کو لات مار کر دور گرا دیا۔ ایک دم ہی جیسے چاروں طرف سنسنی کی ایک بلند لہر اچھلی اور پھیل گئی۔ میں جادو رائے کی طرف لپکا۔ مگر ہر دم چوکس ڈولما میرے راستے میں آئی۔ میں نے اس کے سر پر رائفل کے آہنی بیرل سے وار کیا، وہ جھک کر خود کو بچا گئی مگر اس کا جھکنا اسے میرے دائیں گھٹنے کے قریب تر لے آیا۔ گھٹنے کی طوفانی ضرب اس کے چوکھ چہرے پر لگی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی، نرم برف پر جا گری۔ ایک تنومند محافظ نے مجھے عقب سے دبوچنا چاہا مگر میرے اوپر سے ہوتا ہوا اس کرسی سے جا ٹکرایا جس پر تھوڑی دیر پہلے منحوس صورت جادو رائے براجمان تھا۔ کرسی کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ رائے جان بچانے والے انداز میں بھاگتا ہوا پندرہ بیس قدم دور جا چکا تھا۔ اب اس تک پہنچنا مشکل تھا کیونکہ درمیان میں کم از کم چار گارڈز موجود تھیں۔ دوسرا آپشن میرے لیے یہی تھا کہ دیوی تورما پر جا پڑوں، وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ میں تڑپ کر اس کی طرف آیا اور عقب سے اسے دبوچ لیا۔ اس کی چمک دار لاٹھی اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری۔ میں نے رائفل اس کی کھوپڑی سے لگائی اور وارننگ دیتے ہوئے گرجا۔

یقیناً میرے الفاظ کسی کی سمجھ میں نہیں آئے مگر انداز سب کی سمجھ میں آ گیا۔ میری انگلی طاقتور ٹریپل ٹو رائفل کے ٹریگر پر تھی اور میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ تورما ان لوگوں کے لیے ایک بوڑھی مقدس گائے کی طرح تھی۔ وہ سب کے سب جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ تب میری نگاہ عمران پر پڑی۔ وہ کسی ترنگی مرد نما نہال سے گتھم گتھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نہال نے عمران کی ناف میں گھٹنے کی شدید ضرب لگائی اور پھر ایک طوفانی گھونسے کے ساتھ اسے خود سے دور پھینکنا چاہا مگر عمران اس سے لپٹا رہا، وہ جانتا تھا کہ نہال اس سے علیحدہ ہو گئی تو اردگرد کھڑی مسلح گارڈز اسے چھلنی کر ڈالیں گی۔

اگلے بیس تیس سیکنڈ تک دونوں میں خوفناک معرکہ رہا۔ آخر نہال کی کنپٹی پر لگنے والی کہنی کی ضرب نے اسے ڈگمگایا اور عمران نے بلا کی پھرتی سے نہال کا ایک فٹ لمبا خنجر اس سے چھین کر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا، پتھریلے پول کے ساتھ جا لگا۔ اسی پول کے ساتھ والے پول پر گندھارا زنجیروں سے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے خون آلود چہرے والی ڈولما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگ دیوی کی تڑپتی ہوئی لاش دیکھنا نہیں چاہتے تو تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

ڈولما کچھ نہ کچھ اردو ہندی کے الفاظ سمجھتی تھی۔ اس نے میری بات لوگوں تک پہنچائی۔ نتیجہ میری اور عمران کی توقع سے کہیں زیادہ مثبت نکلا۔ یہ دو تین سو افراد تو ہوں گے سب کے سب بپھرا کر دوڑے۔

کبڑی بڑھیا میری گرفت میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہی تھی۔ میں نے راکھل کی بال بے دردی سے اس کی جھریوں بھری گردن میں گھسائی۔

جینے کی آرزو شاید اس میں جوانوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس نے مری مری آواز میں ڈولما کو حکم دیا کہ مجرسہ کی زنجیریں کھول دی جائیں۔

زنجیریں کھول دی گئیں۔ گندھارا کا چہرہ اب بھی برف کی طرح سفید تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ موت کے منہ سے بچ سکتی ہے۔ میں نے کہا۔ "گندھارا تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

وہ بلکی۔ "ایسا مت کریں آپ، میں نے تو مرنا ہی ہے۔ یہ میرے ساکر (شوہر) کو بھی مار ڈالیں گے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ آرہا ہے۔" عمران بلند آواز میں بولا۔

میں نے اُس جانب دیکھا جہاں پھسلنے والی کچی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک گاڑی جس کے آگے چھ تازہ دم کتے تھے، تیزی سے ہماری جانب آرہی تھی۔ اسے گندھارا کا شوہر جورم چلا رہا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ گاڑی کے پیچھے بھی کوئی تین درجن کتے بھاگے آرہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جورم نے خود ہی انہیں کھولا ہے تاکہ کسی دوسری گاڑی پر اس کا پیچھا نہ کیا جا سکے۔

چند سیکنڈ بعد جورم گاڑی سمیت ہمارے سامنے تھا۔ گندھارا کی طرح وہ بھی کسی حد تک ہندی اردو جانتا تھا۔ وہ میرے عین سامنے پہنچ کر بڑے اعتماد سے بولا۔ "جناب اگر آپ کا حکم ہو تو میں گندھارا کو بہت حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جا سکتا ہوں۔ میں یہاں کے خاص رستوں سے بڑی اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے صرف دس منٹ بھی مل گئے تو یہ لوگ مجھے پکڑ نہیں سکیں گے۔"

"ظاہر ہے۔ کیسے پکڑیں گے۔ تم سارے کتے تو ساتھ لے جا رہے ہو۔"

یکا یک اُسے جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ خیال نہیں رہا کہ آپ بھی یہاں سے نکلنا چاہیں گے۔ آ... آپ کی اجازت ہو تو میں دوسری گاڑی بھی تیار کرتا ہوں۔"

"نہیں جورم دوسری گاڑی تیار کرنے کا وقت نہیں ہے۔ تم ایک گاڑی کے کتے چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"لیکن جناب....."

"وقت کم ہے..... تم گندھارا کو لے کر بس نکلو یہاں سے۔"

ہانپتے ہوئے جورم نے اپنی سانس درست کر کے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ وہ ان ایسکیمو باکٹر یعنی برفانی گاڑیوں کا نگہبان بھی تھا حیرت انگیز طور پر چھ کتے ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے کے بعد باقی کتوں سے علیحدہ ہو گئے۔ جورم نے ماہرانہ انداز میں نہایت پھرتی کے ساتھ ان چھ جانوروں کو ایک ہی زنجیر میں پرویا اور ایک پتھریلے پول سے باندھ دیا۔ "چلو گندھارا گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

وہ ابھی تک سکتے میں تھی۔ شاید اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ جورم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے گاڑی میں بٹھایا۔ اس چھوٹے سائز کی گاڑی میں پانچ سے زیادہ سوار نہیں بیٹھ سکتے تھے اور یہاں مامتا کا وہ بے مثال جذبہ نمودار ہوا جو ہر حال میں ماں کے سینے میں موجزن رہتا ہے۔ گندھارا کا سکتہ ٹوٹا اور وہ بُری طرح چونک کر گاڑی سے اتر آئی۔ "میرا بچہ..... میرا بچہ" وہ مقامی زبان میں پکاری۔ اس نے واپس غار کی طرف لپکنا چاہا..... لیکن اسی وقت ایک مقامی لڑکی دبانے کی طرف سے نمودار ہوئی۔ یہ علاج معالجے کے کام میں گندھارا کی وہی شاگرد تھی جس نے گندھارا کو تب آزاد کرایا تھا جب رامے اور مائرہ نے اسے باندھ کر ایک تاریک گوشے میں ڈال دیا تھا۔ چست لڑکی ہلکی برف باری میں بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں بھاری گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا، گندھارا کا وہی نومولود بچہ تھا۔ وہ گندھارا کے قریب پہنچی، گندھارا نے تڑپ کر بچے کو سینے سے لگا لیا، کئی بار اس کا منہ چوما، پھر اس نے اپنی اشک بار شاگرد کی طرف توجہ دی۔ چند لمحے سوچ کر اس نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ ہی گاڑی میں بٹھا لیا۔

"جلدی کرو..... نکلو۔" میں نے پھر چلا کر کہا۔

گندھارا نے میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی یلغار تھی۔ ایک ہچکولے کے ساتھ گاڑی حرکت میں آئی اور چند ہی سیکنڈ میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"چاچو جان! مجھے مائین کی طرف سے خطرہ ہے۔" عمران نے کہا۔ ساڑھے چھ فٹ قد کی نہال ابھی تک اس کے شکنجے میں تھی۔

"مجھے بھی زیادہ خطرہ مائین کا ہے۔" میں نے بھی عمران کی طرح انگلش کا سہارا لیا۔

"رامے غار کے اندر جا چکا ہے، مائرہ پہلے ہی وہیں پر ہے۔ ایک ہی امید ہے کہ اس نے خود کو کہیں پر چھپا لیا ہو۔" عمران نے امید ظاہر کی۔

"اس حصے میں تو چھپنے کی جگہ کوئی نہیں....." میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

اسی اثنا میں منوہر سنگھ میرے سامنے آ گیا۔ بے شک وہ بھی رامے اور مائرہ کا ملازم تھا مگر ان دونوں کے بجائے وہ ہم سے زیادہ قریب ہو چکا تھا۔ موجودہ صورتِ حال نے اس کے چہرے پر بھی دباؤ جوش پیدا کر دیا تھا۔ اس کی نیلی پگڑی برف باری کے سبب سفید نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "منوہر! تم سات آٹھ سیٹوں والی ایک گاڑی دھکیل کر یہاں لا سکتے ہو؟"

"بالکل لا سکتا ہوں جی، بلکہ واہگرو کی کرپا سے کُتے بھی جوت سکتا ہوں۔"

"تو پھر جلدی کرو منوہر، ہم ان سب لوگوں کو زیادہ دیر نہیں سنبھال سکتے..... ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

یہی وقت تھا جب میں نے نہال کے لمبوترے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور خون رگوں میں اچھل کر رہ گیا۔ ہمارا بدترین اندیشہ، حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔ چالیس پچاس قدم کی دوری پر دہانے کے عین سامنے ماہین اکیلی اس حالت میں کھڑی تھی کہ اس کے خوب صورت چہرے پر تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ ایک برفیلے ابھار کے اوپر جادو رامے کھڑا تھا۔ اتنے فاصلے سے بھی میں اس کے مکروہ چہرے پر زہرناک مسکان دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو چھوٹی سی سیاہ چیز نظر آ رہی تھی، وہ بم کے ریموٹ کنٹرول کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ بھی مایوسی کی آماجگاہ نظر آنے لگا۔ بازی پلٹ گئی تھی۔ ہم مزید لڑنے سے پہلے ہی ہار گئے تھے۔

ڈولما نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ "دیوی..... چھوڑ..... ورنہ..... ہتھیا اس..... کی....."

اس کا مطلب تھا کہ میں دیوی تورما سے الگ ہو جاؤں ورنہ رامے، ماہین کو اُڑا دے گا..... کیونکہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔

رامے جس خوفناک جھنجلاہٹ اور طیش کا آج کل شکار تھا، اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے دیوی تورما کی زندگی موت سے کچھ زیادہ سروکار نہیں تھا.....

رامے اور اس کے دو ساتھی ماہین سمیت کچھ اور قریب چلے آئے تھے۔ میرے اور رامے کے درمیان چند تند و تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا پھر مجھے پسپا ہونا ہی درست فیصلہ لگا۔ بہرحال ایک حوالے سے مجھے اور عمران کو اطمینان تھا۔ گندھارا کے حوالے سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ یقیناً اب تک جورم اور وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ اس طرح کی برف میں پیدل تعاقب ناممکن تھا۔

میں نے کبڑی تورما کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ عمران نے بھی دراز قد نہال کو چھوڑ دیا۔ ہمیں کئی رائفلوں نے اپنے نشانے پر لے لیا۔ ہلکی برف مسلسل گر رہی تھی۔

☆☆☆

مجھے اور عمران کو یہاں کے بندی خانے میں ڈال دیا گیا۔ اب منوہر سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ منوہر سنگھ نے ہم پر انکشاف کیا کہ اس بندی خانے میں ان خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جن کو کڑی سزا دینا مقصود ہوتی ہے۔

قریباً دس ضرب پندرہ فٹ کے اس مستطیل خلا میں ایک بوسیدہ سے شکستہ قالین کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سامنے کی طرف زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں بُرا بھلا واش روم تھا جس کا دروازہ زنگ آلود لوہے کا تھا۔ برفیلا پانی قطروں کی صورت میں اس دروازے پر رینگتا رہتا تھا۔

قیدیوں کو کھانا پہنچانے کے لیے کوئی علیحدہ راستہ نہیں تھا۔ ایک پہریدار عورت جس نے شیر کی کھال والی بیلٹ پہنی ہوئی تھی سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کھانے پینے کی اشیا ہم تک پہنچاتی تھی بلکہ کسی وقت پھینک دیتی تھی۔ دروازے پر دو بھاری قفل لگے ہوئے تھے۔ جس مستطیل کمرے میں ہم بند تھے، ایسا ہی ایک چھوٹا چوکور کمرا ہمارے بالکل سامنے تھا۔ یہاں بھی ایک طرف آہنی سلاخیں لگی تھیں اور جہازی سائز کا قفل پڑا تھا۔ یہاں وہ جواں سال عورت بند تھی جو چند دن پہلے تک یہاں کی کرتا دھرتا تھی۔ یعنی مایا رانی۔ ان چند دنوں میں ہی اس کے چہرے کی آب و تاب بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ شیرنی کی کھال کا وہ زرد لباس بھی بدل چکا تھا جو اس کی پہچان تھا۔ اب اس کی جگہ وہ ایک بھدی سی موٹی صدری پہنے ہوئے تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے منوہر، مایا کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟" میں نے سرد دیوار سے ٹیک لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے جی کہ اگر مایا بچ گئی تو اس کے خلاف بغاوت کرنے والے نہیں بچیں گے جن میں ڈولما پیش پیش ہے۔" منوہر نے سرگوشی کی۔ "یا تو مایا رانی کی ہتھیا کر دی جائے گی..... یا پھر لمبے عرصے کے لیے بند کر دیا جائے گا۔"

ہمیں اس سرد بندی خانے میں قریباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے مگر مایا نے ہم سے ہم کلام ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس وہ ایک نمدے پر کمبل اوڑھے کروٹ لیے پڑی رہتی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت عمران کی بھی تھی۔ میں پہلی بار اسے اتنا افسردہ دیکھ رہا تھا۔

گندھارا کے بارے میں پچانوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ اپنے شوہر اور بچے سمیت موت کے گھیرے سے نکل گئی ہے۔

سفاک صورت پہریدار عورت کی ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اب اس کی جگہ دوسری عورت نے آنا تھا۔ یہ وہی لمبوترے چہرے والی ساڑھے چھ فٹ لمبی نہال تھی، جو کل دوپہر عمران کے ہاتھوں کچھ زخمی بھی ہوئی تھی۔

پہریدار عورت سلاخوں کے سامنے سے ہٹ کر باہر گئی تو میرا دل چاہا کہ مایا رانی کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کروں۔ وہ اسی طرح دہرا کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اسی اثنا میں میری نظر مایا رانی کے عقب میں گئی۔ یہاں دیوار میں پتھر کی ایک بڑی تختی نصب تھی۔ اس پر رنگوں سے کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دھیان سے دیکھنے پر میں چونک گیا۔ بے شک رنگ مدھم ہو چکے تھے مگر منظر سمجھ میں آتا تھا۔ یہ وہی پتھر کے تین پول تھے جن سے باندھ کر قیدیوں کو سزا دی جاتی تھی۔ ایک پول کے ساتھ ایک لاغر عمر نیم برہنہ شخص بندھا تھا اور اس کے سینے میں ایک توانا عورت برچھی گھونپ رہی تھی۔ دوسرے پول کے ساتھ ایک عورت بندھی ہوئی تھی اور آگ میں جل رہی تھی۔ تیسرے پول کے ساتھ بھی ایک مرد کی شبیہ تھی۔ وہ بھی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا مگر وہ آگ میں نہیں جل رہا تھا۔ اس پر بھوکے بھیڑیے جھپٹ رہے تھے اور اس کے جسم کو ادھیڑ رہے تھے۔ یہ منظر غیر معمولی طور پر دردناک تھا۔ تینوں تصویروں کے اوپر مقامی زبان میں کچھ لکھا بھی تھا۔

میری نظر کا تعاقب کر کے منوہر نے بھی اڑے اڑے رنگوں والی یہ پینٹنگ دیکھ لی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی جھلک دکھانے لگی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید ہمارا انجام۔" وہ ہولے سے بولا۔

"تصویروں پر لکھا کیا ہے؟"

"جو برچھی والی تصویر ہے اس پر لکھا ہے چھوٹی موت، جو آگ والی ہے اس پر صرف موت لکھا ہے اور بھیڑیوں والی پر بڑی موت درج ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ "بڑی موت، یعنی زندہ قیدی کی بھیڑیوں کے ذریعے چیر پھاڑ کرا دینا۔"

منوہر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "ہم نے دیکھا ہی ہے ان لوگوں نے تگی بھیڑیے باقاعدہ پال رکھے ہیں۔ شاید وہ ایسے ہی کاموں کے لیے ہیں۔" پھر وہ ایک دم چونکا۔ "میرا وچار ہے کہ ایسی ہی منحوس پینٹنگ ہمارے اس کمرے میں بھی رہی ہو گی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہم نے اپنے مستطیل کمرے میں غور کیا۔ یہاں بھی ایک برفیلی دیوار میں سفید پتھر کی سل نصب تھی تاہم کوئی پینٹنگ نظر نہیں آتی تھی۔ اب ہم نے موم بتی کی روشنی میں ذرا دھیان سے معائنہ کیا تو پتا چلا کہ وہاں بھی ایسی پینٹنگ سے بہت کم مدھم سے آثار موجود ہیں۔ گردشِ زمانہ نے ان دلدوز مناظر کے رنگ قریباً اڑا ڈالے تھے۔

عمران کل رات دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اب جیسے نڈھال ہو کر سو رہا تھا۔ میں نے منوہر سنگھ سے کہا۔ "ابھی اسے ان تصویروں کے بارے میں مت بتانا۔ پہلے ہی پریشان ہے۔"

"بات ہے بھی تو پریشانی کی..... میری نگاہوں میں تو کل سے وہ کالا ریموٹ کنٹرول گھوم رہا ہے جو اس کالے شیطان رامے نے پکڑا ہوا تھا۔ مطلب یہی ہوا نا کہ اگر غلطی سے بھی ریموٹ کا بٹن دب جائے تو وہ لڑکی ایک سیکنڈ میں اپنے پران گنوا بیٹھے گی..... یہ کوئی عمر ہے مرنے کی۔"

اسی اثنا میں سامنے والی کمرا نما برفیلی کوٹھری میں مایا رانی نے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے بجھی بجھی نظروں سے ہماری طرف دیکھا، پھر اپنے مینڈھیوں والے بال اپنے ہاتھوں سے سنوارنے لگی..... وہ کل سے جانتی تھی کہ ہم یہاں موجود ہیں مگر ہم سے مخاطب نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اس کی وجہ وہ خونخوار شکل والی دونوں پہریدار عورتیں تھیں جو باری باری سلاخوں کے سامنے موجود رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک نہال تھی۔ اب چونکہ ان میں سے کوئی نظر نہیں آ رہی تھی، مایا رانی اٹھ کر ہماری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں ہولے سے بولی۔ "مجھے لگتا تھا کہ تم دونوں کسی نہ کسی مشکل میں ضرور پڑو گے، کیا کر دیا ہے تم نے؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہی جو آپ کو کرنا چاہیے تھا..... بلکہ شاید آپ قید نہ ہوتیں تو کر بھی دیتیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بجھے بجھے لہجے میں بولی۔

"ہم نے گندھارا کو آگ میں جلنے سے بچایا ہے۔ یہ ظلم ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔"

مایا رانی کا چہرہ بظاہر سپاٹ رہا مگر میں نے محسوس کیا کہ

شاید یہ خبر اس کو بری نہیں لگی۔

"کیا اس کا کچھ پیدا ہو گیا تھا؟" مایا نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی۔ "اب کہاں ہے وہ؟"

مایا رانی کے سوال کا جواب میں نے پوری تفصیل سے دیا اور بتایا کہ ہم نے کس طرح گندھارا کو اس کے شوہر اور بچے سمیت فرار کرایا۔

مایا رانی گم صم سی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "مایا رانی! آپ ہم کو یہاں کی پرانی نسل کی عورتوں سے کچھ مختلف لگی ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے اپنے لوگوں کے لیے اس طرح کی سخت وحشیانہ سزائیں برقرار رکھی ہوئی ہیں؟..... یہ آپ کے پیچھے دیوار پر جو اگڑے اگڑے رنگوں والی تصویر ہے، کیا یہ آپ کے لیے قابلِ قبول ہے؟"

مایا رانی نے ایک گہری سانس لی۔ "میں چاہوں بھی تو یہ رسم و رواج اتنی جلدی نہیں بدل سکتے۔ اس میں بہت وقت لگے گا..... لیکن حقیقت یہی ہے کہ گندھارا کے بارے میں میرا ذہن بدل چکا تھا۔ میں اس کی موت کی سزا کو قید میں بدلنے والی تھی۔"

"مگر جب آپ کا اختیار تھا آپ نے سزا بدلی نہیں..... اب جن لوگوں کا اختیار ہے، وہ بھی آپ ہی کے انداز میں چل رہے ہیں۔ جن سزاؤں کی یہاں تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے کوئی ہمارے اور آپ کے حصے میں بھی آ جائے گی۔"

وہ کسی حد تک بے پروا نظر آئی۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں نے اپنے باکر (شوہر) سکامر کی جاں گسل بے وفائی دیکھی..... پھر اپنی ماں کو بے کسی سے جان دیتے دیکھا۔ ان دونوں دکھوں سے بڑا دکھ یا تکلیف میرے لیے اور کوئی نہیں۔ میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن ہم تو اس چیز کے لیے تیار نہیں۔ راے اور میم مائرہ ہمیں مجبور کر کے یہاں لائے تھے۔ آپ کو ماہین نے سب کچھ بتایا ہوگا۔ اس کی ٹانگ سے بم باندھا گیا تھا۔ ہم یہاں سے زندہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ آپ کے رواج کے مطابق زندہ جلنا نہیں چاہتے اور نہ ہی بھیڑیوں سے خود کو نچوانا چاہتے ہیں۔"

"اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "مجھے آشا ہے، تم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لو گے۔ تم ایک بہادر شخص ہو۔ مجھے آشا ہے کہ میں تمہاری بہادری اور صلاحیتوں کے بارے میں جان نہ سکی اور تمہارے بجائے ہم سب اس بدفطرت راے کے ناز اٹھاتے رہے۔"

"آپ شاید اپنی رقیب ہرتی کی بات کر رہی ہیں جو میرے ہاتھوں مری۔"

"ایسا ہی ہے۔ وہ بے حد خطرناک جنگجو تھی، جن دنوں وہ فرار تھی اس نے میرے کئی قریبی وفادار ساتھیوں کی جان لی۔ اسے تم نے جہنم واصل کر کے میرا کلیجا ٹھنڈا کیا..... میں جتنے دن زندہ ہوں تمہاری شکر گزار رہوں گی۔"

اسی اثنا میں قدموں کی چاپ ابھری۔ پہریدار واپس آ رہی تھی۔ مایا رانی خاموش ہو گئی اور دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ آنے والی دراز قد نہال ہی تھی۔ عمران نے کل اس کی کنپٹی پر اپنی کہنی کی جو کاری ضرب لگائی تھی، وہ ایک نیلگوں گومڑ کی شکل اختیار کیے ہوئے تھی۔ نہال کی ایک آنکھ بھی ورم زدہ نظر آتی تھی۔ وہ جب بھی پہرے کے لیے آتی تھی ہماری طرف کینہ توز نظروں سے دیکھتی تھی اور خاص طور سے عمران کو۔ وہی اس کی کنپٹی کی بدنما چوٹ کا ذمے دار تھا۔

اس بندی خانے میں تین چار ایسے ہی بیرک کی طرح کے کمرے میں موجود تھے، بے حد سرد، کھردرے اور بغیر کسی سہولت کے۔ شام کے وقت چار پانچ قیدی عورتوں کو رائفلوں سے دھکیل کر یہاں لایا گیا۔ نہال نے انہیں گالیاں دیں اور مقامی زبان میں سخت ترش باتیں کہیں۔

"کیا ماجرا ہے؟" میں نے اپنے ساتھی منوہر سے پوچھا۔

وہ بولا۔ "جب کسی سرکار کا تختہ الٹتا ہے تو اس طرح کی گرفتاریاں تو ہوتی ہی ہیں۔ یہ مایا رانی کی وفاداروں میں سے ہیں۔ ڈولما نے انہیں بند کرنے کا حکم دیا ہے۔"

بند کرنے سے پہلے ان چاروں پالچوں عورتوں کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ یہ جامہ تلاشی لینے والی خردماغ نہال ہی تھی۔ وہ بڑی سختی بلکہ بے حیائی کے ساتھ تلاشی لے رہی تھی۔ اس نے قیدی عورتوں کے جسموں پر اپنے چوڑے چکلے ہاتھ کو آزادانہ حرکت دی اور پھر گالیاں بکتے ہوئے انہیں برلبی بیرکوں میں دھکیل دیا۔

"کسی وقت تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ناری ہے ہی نہیں۔" منوہر سنگھ نے سرگوشی کی۔

"شاید پوری ناری نہ پورا مرد۔" میں نے کہا۔ (دو روز بعد یہ ثابت ہوا کہ نہال واقعی ایک درمیانی اور عجیب مخلوق تھی)

جب نہال عورتوں کو بند کر چکی تو کسی نے اسے بلایا اور وہ پھر باہر چلی گئی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ دیر باہر ہی رہے گی۔ اس کے جانے کے بعد مایا رانی نے کمبل ہٹایا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سخت سردی کے سبب اس کے سرخ گلابی ہونٹ قدرے نیلے ہو رہے تھے۔ اس نے عمران کی جانب دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں ابھی تک سو رہا تھا۔ کمبل میں سے بس اس کے سیاہ چمکیلے

بال اور روشن پیشانی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ مایا رانی ٹوٹی ہوئی زبان میں بولی۔ "پتا نہیں کہ جو میں نے کیا، وہ غلط تھا یا صحیح..... مگر ایسا کرنے سے تمہارے اس ساتھی عمران کا عشق ثابت ہوا ہے۔ یہ ماہین کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ پتا نہیں کہ تم لوگوں نے اس کے جذبے کی شدت محسوس کی ہے یا نہیں مگر میں نے کرلی ہے۔"

"ماہین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ..... بہت گہری لڑکی ہے۔ چٹان کی طرح سخت..... لیکن مجھے پتا ہے، وہ اندر سے چٹان نہیں رہی۔ کچھ اور ہو چکی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر مایا رانی نے جذباتی انداز میں کہا۔ "میں تو شاید اب زندہ نہ رہ پاؤں گی مگر میری خواہش ہے کہ اگر تقدیر تم لوگوں کا ساتھ دے اور تم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ، تو ان دونوں کو ملانے کی کوشش ضرور کرنا۔"

"ابھی تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، صاف پتا چل رہا ہے کہ وہ بہت لمبا جادو رائے تم دونوں کی طرف سے حد سے زیادہ ہوشیار ہے۔ مجھ سمیت دوسرے قیدیوں کو بیرک کے دروازے کھول کر کھانا دیا جاتا ہے مگر تمہارا کھانا تمہاری بیرک کی سلاخوں کے اندر سے ہی پہنچایا جاتا ہے یا پھینکا جاتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ڈر ان لوگوں کو تم سے ہے۔" اس نے میری جانب ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔

اس نے اپنی انگلی سے کوئی چیز اتاری اور سلاخوں کے اندر سے ہمارے بیرک نما مستطیل کمرے میں پھینکی۔ یہ ایک عام سی طلائی انگوٹھی تھی، وہ بولی۔ "میں نے سوچ رکھا تھا کہ جو کوئی بھی ہرتی کو زندہ یا مردہ میرے پاس لائے گا، اسے قیمتی تحفوں سے لاد دوں گی۔ شاشا اس بات کی ہے کہ ہم نے ان تحفوں کا حق دار اس راکھشس رائے کو سمجھا، اب میرے پاس اس انگوٹھی کے سوا اور کچھ نہیں۔"

میں نے انگوٹھی برابر کے فرش سے اٹھالی۔ "میرے لیے یہ ان سب تحائف سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو آپ نے رائے کو دیے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے کہا۔ "پرانی روایتوں اور کہانیوں کے مطابق، میں اس انگوٹھی کے حوالے سے آپ سے کچھ مانگنا چاہوں تو....."

اس کے نیلگوں ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "فی الحال تو میرے پاس کچھ نہیں..... اور شاید اب ایسا موقع بھی نہیں آئے گا کہ میرے پاس کچھ ہو۔"

پتلے چہرے اور بانس جیسے قد والی نہال لمبے ڈگ بھرتی اندر آ گئی۔ مایا رانی نے پھر سے کمبل اوڑھ لیا۔

اگلے دو تین روز بڑے تکلیف دہ اور پریشان کن تھے۔ ہمیں سب سے زیادہ فکر ماہین ہی کی تھی۔ عمران دانش کی خوبی یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ ہر حال میں خوش رہتا تھا۔ ہر حال میں خوش رہنے کی صلاحیت تو عمران جونیئر میں بھی تھی مگر ماہین کے معاملے میں اکثر اس کی خوش باشی ناپید ہو جاتی تھی۔ آج کل وہ زیادہ وقت چپ رہتا جیسے کچھ خاص سوچ رہا ہو۔

ارد گرد جو باتیں ہو رہی تھیں، وہ منوہر کے کانوں تک پہنچتی تھیں اور اس کی سمجھ میں بھی آتی تھیں اور ان سے پتا چلتا تھا کہ گندھارا کے سلسلے میں ہماری قربانی رائگاں نہیں گئی۔ وہ اپنے نومولود بچے اور شوہر سمیت کسی محفوظ مقام پر پہنچ گئی ہے۔

جب بھی موقع ملتا، مایا رانی اکثر مجھ سے اور عمران سے باتیں کرنے لگتی۔ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کی نگاہوں میں آپوں آپ ایک پسندیدگی کی سی کیفیت ابھر آتی۔ ایک دن عمران نے پوچھا۔ "اگر آپ آزاد ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

وہ بلاتوقف بولی۔ "سب سے پہلے تمہیں اور ماہین کو شادی پر مجبور کرتی۔ جیون بہت مختصر ہے۔ اس میں جو چیز مل رہی ہو، اسے پانے میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

عمران نے موضوع بدلا۔ "مایا رانی! ایک سوال پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

"میں اب مایا رانی نہیں صرف مایا ہوں۔ مجھ سے آگیا لینے کی ضرورت نہیں۔"

عمران بولا۔ "کہا جاتا ہے کہ سکاسر کی بے وفائی کے بعد آپ کو مرد ذات سے نفرت ہو چکی ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لیکن..... میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم..... ایک مرد کے لیے آپ کے جذبات تھوڑے سے مختلف ہیں۔" اس کے ساتھ ہی عمران نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ ان کی احسان مند ہوں۔ بس اتنا ہی ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے گفتگو کا رخ پھر ماہین کی طرف موڑ دیا اور اس کے لیے اپنی شدید تشویش اور فکرمندی کا اظہار کرنے لگی۔

اسی دوران میں میم مائرہ نمودار ہوئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پینٹ اور دبیز چرمی جیکٹ میں تھی۔ اس کے عقب میں گونگا جہاناں کسی سرکاری ملازم کی طرح چلا آ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر پستول کا سیاہ ہولسٹر تھا۔ مائرہ کے ہاتھوں میں چمڑے کا فولڈر تھا۔

اس نے بتایا کہ ان کاغذات کا تعلق میرے اور عمران کے مقدمے سے ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ کون سا مقدمہ تو وہ رواں انداز میں بولی۔ ”تم پر تین نہایت سنگین الزامات ہیں۔ جب تم پاکستان میں تھے تم نے ایبٹ آباد میں ڈاکٹر شاربہ کو اتنا دہشت زدہ کیا کہ وہ برہنگی کی حالت میں بھاگی اور سیڑھیوں سے گر کر جاں بحق ہوئی۔ اسی واقعے میں رامے جی کا دست راست چاولہ بھائی بھی تمہارے ہاتھوں جان سے گیا۔ دوسرا الزام تم نے لاہور میں ڈاکٹر شاربہ کی بہن ڈاکٹر عاصرہ کو دوران علاج اس بُری طرح دیوار سے پٹخا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی فریکچر ہو گئی اور وہ مفلوج ہو کر دائمی مریضہ بن گئی۔ تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لاہور میں ہی رامے صاحب کی وفادار ملازمہ افروزہ کو قتل کر کے پانی کے ٹینک میں پھینکا۔“

”کیا یہ صرف الزامات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کل تک تھے لیکن آج یہ ثابت ہو چکے ہیں اور جرم بن چکے ہیں۔“ ایک لمحہ توقف کر کے وہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”ان تینوں ثابت شدہ جرائم کے لیے رامے جی نے تمہیں سزائے موت سنائی ہے۔“

چند سیکنڈ تک ایک سناٹا سا رہا۔ میم مائرہ کے برطانوی نژاد چہرے پر ایسی سختی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تب وہ عمران کی طرف متوجہ ہوئی۔

”عمران! تم پر بھی اسی نوعیت کے تین چار الزامات ہیں..... بلکہ تھے..... جو اب ثابت ہو چکے ہیں، ہم تم دونوں کو صرف ان جرائم پر سزا دے رہے ہیں جو مکمل طور پر ثابت شدہ ہیں۔“

تب اس نے ان جرائم کی تفصیل بتائی۔ جس کے مطابق عمران کے ہاتھوں پر کم از کم پانچ افراد کا خون تھا اور پھر اس نے عمران کے لیے بھی سزائے موت کے الفاظ استعمال کیے۔

منوہر سنگھ پر الزام تھا کہ اس نے گندھارا کے فرار میں ہمارا ساتھ دیا۔ میم مائرہ کے مطابق منوہر سنگھ کا کیس زیر غور تھا اور اس کا حتمی فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ہم واقعی کسی خاتون جج کے روبرو کھڑے ہیں اور وہ ہمیں ہمارا انجام بتا رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ جادو رامے اور اس کا دست راست چاولہ ایسے ہی انداز میں اپنے مخالفین کی جان لیتے تھے۔ جیل جیسے ماحول میں سزائے موت کا سا منظر پیدا کرنا یقیناً رامے کا شوق تھا اور اپنے محتوب کو پل، پل موت کی طرف سرکتے دیکھ کر اس کے انتقامی جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ رامے کی ایک شکار انیلا آغا نامی جرنلسٹ کی سزائے موت میں ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

میم مائرہ سفاک لہجے میں بولی۔ ”اگر تم دونوں کسی اور جگہ ہوتے تو تمہیں سیدھے سادے انداز میں گولی ماری جاتی یا پھندا لگایا جاتا۔ مگر تم یہاں الدخ کے اس برف زار میں ہو۔ کہتے ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ تمہاری سزا یہاں کے رواج کے مطابق یہاں کے رگن ڈھنگ کی ہو گی۔“ اس کے ساتھ ہی میم مائرہ نے شیطانی نگاہوں سے پتھر کی ہی سل کی طرف دیکھا جہاں مقامی سزاؤں کی منظر کشی کی گئی تھی۔ تین پول اور تین مجرم۔ میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ زہرناک لہجے میں بولی۔ ”تمہیں انہی سزاؤں میں سے کوئی ایک سزا دی جائے گی۔ اس کا فیصلہ بھی رامے صاحب ہی کریں گے۔“

☆☆☆

جس روز رامے کی طرف سے میم مائرہ نے ہمیں سزا سنائی، اُس روز سے ہمارے لیے ایک دلدوز ماحول تخلیق کر دیا گیا۔ ہمیں یقین سا ہونے لگا کہ ہم سزائے موت کے مجرم ہیں۔ ہمارا کھانا قدرے بہتر کر دیا گیا۔ ہمیں ایک ایک اضافی کمبل بھی پہنچا دیا گیا۔ منوہر سنگھ کے لیے حالانکہ ابھی کوئی اعلان نہیں ہوا تھا مگر اس کے لیے بھی یہ سہولتیں فراہم کر دی گئیں۔ دوسرے روز چوکور چہرے والی تنومند ڈولما دو چھوٹے غالیچے لیے نمودار ہوئی اور انہیں تہ کر کے سلاخوں کے اندر سے ہم تک پہنچایا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہاری عبادت کے لیے..... تم اپنے دھرم کے مطابق اپنی بخشش کے لیے دعا وغیرہ مانگ سکتے ہو۔ تمہارے پاس اب تین چار دن سے زیادہ کا وقت نہیں ہے۔“

زمانے گزرے تھے جب میں نے اور میرے یار عمران دانش نے خوف کھانا چھوڑ دیا تھا..... ہمیں ڈرانے والے جانتے تھے کہ ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور کچھ ایسی ہی طبع عمران جونیئر کی بھی تھی۔ اس کا بھی یقین تھا کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ اگر عمران کو اس وقت ماہین کا غم لاحق نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے اور منوہر کو انڈین ایکٹروں کے لطیفے سنانے سے بھی باز نہ آتا۔ ماہین کی پریشانی نے اسے بے طرح جکڑا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے..... مسلسل..... اب بھی وہ ایسے ہی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرے سے تکلیف کے آثار ہویدا تھے۔

صبح کے وقت نہال کی ساتھی پہریدار ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ وہ بھی بہت کرخت چہرہ رکھتی تھی لیکن آج کچھ گم صم دکھائی دی۔

میں نے منوہر سے کہا۔ ”اس سے پوچھو، کوئی خاص بات ہے؟“

منوہر کے سوال کے جواب میں وہ بولی۔ ”تم دونوں کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔“

منوہر نے کہا۔ ”موت سے بُری خبر کیا ہوتی ہے اور وہ ہمیں مل چکی ہے۔“

”بڑی موت، زیادہ بُری خبر ہے۔ تم دونوں کے بارے میں بڑی موت کا فیصلہ ہوا ہے۔ پرسوں دوپہر سے پہلے اس فیصلے پر عمل ہو جائے گا۔“

میری نگاہ پتھر کی اس تختی کی طرف چلی گئی جس پر مٹے مٹے رنگوں والی قدیم تصویر موجود تھی۔ تیسرے پول کے ساتھ ایک بدنصیب شخص بندھا ہوا تھا اور بھوکے بھیڑیے اسے زندہ نوچ رہے تھے۔

پہریدار اور منوہر سنگھ کے درمیان ہونے والا مکالمہ سامنے والی کوٹھری میں مایا رانی نے بھی سن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اندوہ کے بادل چھا گئے تھے۔

مایا رانی نے پہریدار سے استفسار کیا۔ ”تمہیں یہ خبر کہاں سے ملی ہے؟“

وہ ذرا مؤدب انداز میں بولی۔ ”یہ خبر کئی لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے۔ باقاعدہ طور پر یہاں بھی پہنچ جائے گی۔“

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے میم مائرہ کو گنگے جہاناں کے ساتھ پھر نمودار ہوئی۔ اس نے ہمارے سامنے اقتباس کی صورت میں جو انگارے اگلے ان سے تصدیق ہوئی کہ شیطان صفت راجے نے ہمارے لیے ”بڑی موت“ کی سزا ہی چنی ہے۔

میم مائرہ نے مزید کہا۔ ”منوہر سنگھ کو بھی سزائے موت دی گئی ہے۔ لیکن اس سزا کو یہاں ”چھوٹی موت“ کہا جاتا ہے، یعنی سینے میں برچھی گھونپ کر سزا پر عمل درآمد کرنا..... بہرحال اس بُری خبر کے ساتھ منوہر سنگھ ولد دربار سنگھ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔ وہ اس سزا پر نظرثانی کی ایک اپیل کر سکتا ہے۔“

غالباً راجے ابھی سوچ رہا تھا کہ منوہر کو مارے یا نہیں۔ ہماری پارٹی میں واحد شخص منوہر ہی تھا جو مقامی زبان سمجھ سکتا تھا۔ وہ واپسی کے سفر میں بھی جادو راجے اور میم مائرہ کا مددگار ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اپنا مطلب نکالنے کے بعد راجے اسے بھی اپنے قاتلانہ غضب کا نشانہ بنا ڈالتا۔

میم مائرہ نے اپنے سنہری مائل سرخ بالوں کو لہرا دے کر پیشانی سے ہٹایا اور پتھریلے لہجے میں بولی۔ ”کل سہ پہر کو تمہاری آخری ملاقات ہے جس جس سے ملنا چاہتے ہو، رات تک آگاہ کر دو۔“ اس کے بعد وہ ایڑیوں پر گھوم کر باہر نکل گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جادو راجے کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی ایذا رسانی سے لذت کشید کرنے لگ گئی ہے۔

☆☆☆

ہمارے بندی خانے کی لڑی نگرانی جاری تھی۔ نہال اور ایک دوسری پہریدار دو شفٹوں میں ڈیوٹی دے رہی تھیں۔ تاہم درمیان میں کہیں گونگا جہاناں یا راجے کا کوئی اور کارندہ بھی ایک دو گھنٹوں کے لیے ان دونوں پہریدار عورتوں کی جگہ لے لیتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دو پہریدار عورتیں آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اور عمران کو دہرے استرے والی موٹی صدریاں (جیکٹس) دی تھیں تاکہ ”مرنے سے پہلے“ کی یہ راتیں ہم نسبتاً آسانی سے گزار سکیں۔ پرانی صدریاں جو بہت بوسیدہ بھی ہو گئی تھیں۔ ہم سے واپس لے لی گئی تھیں۔ بعد میں مایا رانی نے دل گرفتہ انداز میں انکشاف کیا کہ دستور کے مطابق یہ صدریاں بھیڑیوں کو سنگھائی جائیں گی تاکہ وہ اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکیں۔ مایا کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

شام کے کچھ ہی دیر بعد میں نے پہلی بار راجے کے انچارج گارڈ بہروز کو بھی دیکھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا آیا اور تضحیک آمیز نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ دردناک موت کو قریباً چالیس گھنٹے کی دوری پر دیکھ کر ہمارے ”حالات“ کیا ہیں۔

ہم پر نگاہِ غلط انداز ڈالنے کے بعد وہ مایا رانی کی کوٹھری کی جانب دیکھنے لگا۔ کچھ دن پہلے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بہروز کی طرف سے مایا رانی کے ساتھ کچھ غلط ہو سکتا ہے۔ غالباً جادو راجے اپنے اس اونچے لمبے ساتھ کو ایسے کاموں کے لیے استعمال کرتا رہتا تھا۔ اس کا ثبوت ہم دیکھ ہی چکے تھے۔ اپنے باکرہ نادر اسلوک کرنے والی عورت کو راجے نے سزا کے طور پر بہروز کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اس سے بھی زیادہ بُرے سلوک کا شکار ہو۔ انصاف کا یہ جاہلانہ طریقہ قابلِ صد لعنت تھا۔ بہرحال بہروز کو بھی اپنے کیے کی سزا فوراً ہی مل گئی تھی۔ اگلے روز ہی وہ زہریلے زوب کے ڈنک کا شکار ہوا تھا۔ وہ افراد مرے تھے۔ بہروز کی جان تو بچ گئی تھی مگر وہ دن تک اسے خوفناک اذیت برداشت کرنا پڑی تھی۔ میں اور عمران دیکھ رہے تھے اس کی آنکھیں کچھ اندر دھنس گئی تھیں اور گہری پیلی تھیں۔ اس کے جسم کے کھلے حصوں پر گہرے سرخی مائل زرد دھبے نظر آ رہے تھے۔ چند ہی دنوں میں وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔

اب بھی مایا رانی کی طرف دیکھتے ہوئے بہروز کی زرد آنکھوں میں حریصانہ چمک نظر آتی تھی، تاہم اب وہ جسمانی طور پر اس قابل ہی نہیں تھا کہ ٹھیک سے چل بھی سکے۔ دو منٹ کھڑے رہنے سے ہی اس کا سانس پھولنے لگا تھا، وہ واپس چلا گیا۔

عمران نے کہا۔ ”ہم زوب کے لیے سانپ نما کا لفظ

استعمال کرتے رہے ہیں مگر اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ سانپ بچھو وغیرہ سے کہیں زیادہ زہریلا ہے۔"

"رامے سے بڑھ کر تو نہیں ہوگا۔" منوہر نے برابر والی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں سامنے پتھر کی تختی پر تھیں جہاں بھوکے بھیڑیوں والی تصویر کے موہوم خدوخال دکھائی دیتے تھے۔

"کچھ نہیں ہوگا منوہر سنگھ۔" عمران نے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میں اپنے چاچو کو خدانخواستہ کسی ایسی حالت کا شکار ہوتے ہوئے دیکھوں۔" (آج اس کا موڈ کچھ بہتر تھا)

میں نے کہا۔ "میں بھی نہیں چاہتا کہ میرا بھتیجا اور عمران دانش کا بیٹا کسی ایسی اذیت کا شکار ہو لیکن تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ تم کیا کرسکتے ہو؟"

"دماغ میں ہانڈی پک رہی تھی جی..... تھوڑی بہت پک گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اچانک ذہن میں خیال آیا کہ عمران دانش کی طرح اس کے اس فرزند سے بھی جانور بہت جلد مانوس ہوتے تھے۔ میں پچھلے چند مہینوں میں ایسے ایک دو منظر دیکھ بھی چکا تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ عمران کی یہ خاص صلاحیت ویسی نہیں جیسی عمران دانش میں تھی۔ اس کو تو ہم نے شیر، چیتے تک کو مطیع کرتے دیکھا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" عمران کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے بھیڑیوں والی مٹی مٹی، مدھم تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیں تم کوئی خیالی پلاؤ تو نہیں پکا رہے؟"

"کیا مطلب؟"

"یہ خاص سدھائے ہوئے بھیڑیے ہیں۔ ایسا سوچنا بھی بے وقوفی ہوگی کہ وہ تم سے یا ہم سے کوئی رعایت کریں گے۔"

وہ ہولے سے مسکرایا۔ "یہ تو میں بھی دیکھ چکا ہوں کہ وہ سخت نافرمان قسم کی مخلوق ہے اور میں نے کوئی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میں انہیں یا کسی دوسرے خطرناک جانور کو روک سکتا ہوں۔"

"تو پھر کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟"

"بلپ ریڈنگ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "مجھے کچھ معلوم ہوا ہے۔"

میں اور منوہر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی بتانا ٹھیک نہیں ہے جی..... مجھے تھوڑا وقت دیں۔"

میرے اور عمران کے لیے جادو راے نے سزائے موت کا جو ماحول تخلیق کیا تھا، وہ لمحہ بہ لمحہ گمبھیر ہوتا چلا گیا۔ اگلے روز صبح کے وقت ہم سے ہماری من پسند غذا کے بارے میں پوچھا گیا اور یہ بھی یاد دلایا گیا کہ ہم دونوں اپنے جن ساتھیوں سے آخری ملاقات کرنا چاہتے ہیں، ان کے نام دیں..... تاکہ سہ پہر کے وقت ملاقات کرائی جاسکے۔ جس وقت یہ سوال پوچھا جا رہا تھا۔ عمران بڑے اطمینان سے ایک طرف بیٹھا تھا۔ زہریلے انداز میں سلاخوں کے پار دیکھ کر مجھ سے سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "آخری ملاقات کے لیے ایشور یا راے کا نام لکھ دوں تو کیسا رہے؟ نہ وہ کالا کلوٹا بھینسک اسے آنے دے گا، نہ ہمیں سزا ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "مذاق کرنے کی کوشش تو کر رہے ہو مگر چہرہ بتا رہا ہے کہ تشویش تمہاری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے پاس بس آج کا دن ہی ہے۔"

منوہر سنگھ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور دہرا کمبل لپیٹ کر سردی کو بھگانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

نہال آج ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اب گونگا جہاناں نگرانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ طاقتور اے کے 57 رائفل اس کی گود میں تھی اور وہ ہماری سلاخوں سے دور محفوظ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اونگھ بھی لیتا ہے۔ بابا رانی سامنے والی کوٹھری میں کمبل اوڑھے کروٹ لیے سو رہی تھی۔ اس کا رات والا کھانا بھی سلاخوں کے پاس ہی پڑا تھا۔

عمران اب کچھ بے چین نظر آنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب کچھ بتانے کے موڈ میں ہے۔ وہ کچھ دیر تک ہماری مستطیل بیرک نما کوٹھری کے نیم تاریک کونے میں کچھ ٹٹولتا رہا، پھر تیزی سے میری اور منوہر کی جانب آیا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔" وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" میں اور منوہر قریباً ایک ساتھ بولے۔

"وہاں راستہ ہے۔" اس نے نیم تاریک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک پتھر ہے جو ویسے ہی دھرا ہے۔ اسے کوشش کر کے اٹھایا جاسکتا ہے۔" عمران کی آواز میں جذباتی لرزش تھی۔

میں نے چونک کر سلاخوں کے پار دیکھا۔ لمبی تڑنگی نہال واپس نہیں آئی تھی۔ صرف گونگا بہرا جہاناں موجود تھا۔ اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے عمران کی بات پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

"وہاں زمین کے نیچے راستہ ہے..... لیکن..... آپ ابھی

بیٹھے رہیں۔" اس نے تیزی سے کہا..... اور منوہر کو بھی بٹھا دیا۔ گونگا جہاناں خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ دائیں طرف والی بیرک سے ان عورتوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں، جنہیں مایا رانی سے وفاداری کی پاداش میں پکڑا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب گونگا جہاناں اٹھ کر دوسری طرف گیا تو عمران نے مجھے اور منوہر کو اشارہ کیا، ہم اٹھ کر بیرک کے نیم تاریک گوشے کی طرف بڑھے۔ مجھے عمران کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ عمران بالکل کونے پر پہنچ کر رک گیا۔ ایک چوکور پتھر پر اپنا پاؤں مار کر بولا۔ "یہ ہے وہ پتھر..... لیکن اسے اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاسکتا۔"

"ہلایا کیوں نہیں جاسکتا۔" منوہر نے پوچھا۔

"کیونکہ اس کے نیچے کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے جھنجلا کر سرگوشی کی۔

عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انکشاف کیا۔ "جہاناں گونگا بہرا نہیں ہے..... وہ سب کچھ سن سکتا ہے۔"

یہ تہلکہ خیز انکشاف تھا..... مگر میری سمجھ میں آگیا اور جب سمجھ میں آگیا تو سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ میں نے عمران کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے ابھی تھوڑی دیر میں یہ لوگ ہماری اس بیرک میں داخل ہو جائیں گے۔"

"اور یہی وقت ہمارے لیے قسمت آزمانے کا ہوگا۔" عمران نے جواب دیا۔

اب بات کچھ کچھ منوہر کی سمجھ میں بھی آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ہیجان نظر آنے لگا۔ ہمارے ساتھ یہاں وہی سلوک ہونا تھا جو خطرناک ترین..... ان گھڑ درندوں سے ہوتا ہے۔ آہنی دروازے پر دو دو جہازی سائز کے قفل تھے۔ ہماری آہنی سلاخوں سے حتی الامکان دور رہا جاتا تھا اور کھانا بھی تقریباً پھینکا جاتا تھا لیکن اب حیران کن طور پر یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ بیرک کا دروازہ کھولا جاتا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ہم سوچ رہے تھے۔ یکایک بھاگتے قدموں کی آواز ابھری۔ آہنی کنی ڈولما تقریباً چھ دیگر مسلح اور مسلح گارڈز کے ساتھ دروازے پر نمودار ہوئی۔ پہریداروں کی دہاڑوں سے فضا گونج اٹھی۔ مایا رانی سمیت سب جاگ گئے اور سلاخوں سے لگ کر ہماری بیرک کی طرف دیکھنے لگے۔ بڑے بڑے آہنی قفل کھولنے سے پہلے، ہمیں گن پوائنٹس پر ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا اور گھٹنوں کے بل کرنے کے بعد اوندھا لیٹنے کا حکم دیا گیا۔ منوہر سنگھ نے بات نہیں مانی تو ڈولما نے بلا جھجک اس کے گھٹنوں کے بالکل پاس فائر کیے۔

میں نے اشارہ کیا اور منوہر بھی میری اور عمران کی طرح بستہ فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ دروازہ کھول کر ڈولما، اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ دندناتی ہوئی اندر گھسی اور یہی ایک موقع تھا ہمارے حرکت میں آنے کا..... اور ہم آگے۔ میں اور عمران ایک ساتھ اٹھے، میں سیدھا ڈولما پر آیا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کر گھمایا اور دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی رائفل کا بیرل تھام لیا۔ یہ سیکنڈ کے دسویں حصے کا کھیل تھا، ڈولما کی انگلی نے بے ساختہ ٹریگر دبا دیا..... تب تک بیرل کا رخ آہنی سلاخوں کی طرف ہو چکا تھا۔ سیون ایم ایم کی گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور ڈولما کے کئی ساتھیوں کو چاٹ گئی۔

ڈولما نے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر چوٹ لگانا چاہی مگر اس کا واسطہ ماضی کے مہان فائٹر جیکی ہارڈنگ کے شاگرد سے پڑا تھا۔ میں نے نہ صرف چہرہ بچایا بلکہ اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے سر کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ اب یقیناً ایک لاش تھی۔ میں نے اس لاش کو ڈھال کی صورت اپنے سامنے رکھا اور اس کی سیون ایم ایم کا رخ اس کے ساتھیوں کی طرف کر دیا۔ شعلے چمکے اور دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔

میں نے دیکھا عمران "گونگے" جہاناں سے برسرپیکار تھا۔ مجھے یکلخت ہار جانے کی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہوا۔ یکایک اس نے عمران کو اپنی ٹانگوں پر اچھالا اور وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا بیرک سے باہر جا گرا۔ یہ ایک لحاظ سے اس کے لیے اچھا ہی ہوا کہ ایک رائفل اس کے ہاتھ میں آگئی اور وہ ترپ کر ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ تجربہ کار ڈولما میری ڈھال تھی اور کئی مزید گولیاں اس کے جسم میں داخل ہو چکی تھیں۔ میں اسے گھسیٹتا اور فائر کرتا ہوا عمران کے پہلو میں آن بیٹھا۔

"منوہر کو گولی لگ گئی ہے۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ منوہر سنگھ لہولہان تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس کی پگڑی کھل چکی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ بھی دیوار کی اوٹ لیے ہوئے تھا۔ "منوہر ٹھیک ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

وہ زبردستی مسکرایا۔ "ابھی تک تو ٹھیک ہوں..... آگے دا اگر وہ جانے۔"

میں نے ڈولما کے بے جان جسم کو دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ ہم پر تین اطراف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ فائر کی کسی ترپتی شاخ میں بھیڑیوں کی آوازیں تہلکہ خیز تھیں۔

"عمران اس سے پہلے کہ مزید گارڈز آجائیں، یہاں

سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ماہین اور ہما کو محفوظ کرنا چاہیے۔"

منوہر نے بھی تائید کی۔ اس نے اپنے پیٹ کو ایک جانب سے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ماہین کو کہاں رکھا گیا ہے..... ایک طرح سے سب سے زیادہ خطرے میں وہی تھی۔ ریموٹ کنٹرول کے بٹن پر ایک ہلکا سا دباؤ اس کے کومل جسم کے چیتھڑے اُڑا سکتا تھا۔ یہ ریموٹ کنٹرول رامے، مائرہ یا بہروز کسی کے پاس بھی ہو سکتا تھا۔ میں اور عمران بھاگتے ہوئے اس گھروندے نما کمرے میں داخل ہوئے جہاں ماہین مقید تھی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ بستر خالی پڑا تھا۔ گھروندے کی گول چھت کے نیچے منظر کچھ ایسا تھا جس نے ہمیں بے طرح چونکا دیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے یہاں سخت قسم کی دھینگا مشتی ہوئی ہے..... نہال..... لمبی تڑنگی مرد نما عورت بستر کے قریب اس حالت میں پڑی تھی کہ اس کی شہ رگ کسی تیز دھار آلے سے کٹی ہوئی تھی اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ فرش کے نصف پر اس کا لہو دور تک پھیلا تھا۔ اس کے مردہ چہرے پر کئی ضربات بھی دکھائی دے رہی تھیں جو یہاں ہونے والی مار دھاڑ کا بین ثبوت تھیں۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے ماہین کچھ ہی دیر پہلے اس کو مار کر یہاں سے نکل گئی ہے۔"

"مگر وہ کہاں جا سکتی ہے۔ جہاں بھی ہوگی ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔" عمران نے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔

یہی وقت تھا جب ایک بار پھر ہم پر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ ہم بھی مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر جواب دینے لگے۔ تب میری نظر ساتھ والے کمرے میں گئی۔ یہ ایک طرح سے اس کمرے کا داخلی راستہ تھا۔ یہاں بھی ایک عورت زخمی حالت میں پڑی تھی۔ اس کے سینے پر بھی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ عمران نے اسے ٹانگ سے گھسیٹ کر گھروندے کے اندر کر لیا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس پر بھی ماہین نے ہی وار کیا ہو۔" عمران نے کہا۔

"منوہر اس سے کچھ پوچھو۔" میں نے سیون ایم ایم رائفل سے سنگل فائر کرتے ہوئے کہا۔

عمران بھی اپنی رائفل سے گاہے بگاہے فائر کر کے حملہ آوروں کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران کو جو رائفل ملی تھی، اس کے ساتھ ایمونیشن والا بیگ بھی تھا اور یہ بہت مثبت پوائنٹ تھا۔

منوہر سنگھ جو خود بھی زخمی تھا، زخمی عورت سے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا۔ وہ بس خون تھوک رہی تھی اور منہ میں منمنا رہی تھی۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ گولیاں اب خطرناک زاویوں سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم ان لمحوں میں بھی عمران کے چہرے کی طمانیت و بشاشت بڑی حد تک برقرار تھی اور مجھے عمران دانش کی یاد دلا رہی تھی۔

اسی دوران میں خطرناک زاویے سے آنے والی دو گولیاں اس زخمی عورت کو چاٹ گئیں جس سے منوہر کچھ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کچھ بتایا اس نے؟" عمران نے کھڑکی کے گول سوراخ میں سے ایک چھوٹا برسٹ چلاتے ہوئے پوچھا۔

منوہر نے جو جواب دیا، اس سے پتا چلا کہ وہ زیادہ کچھ تو نہیں جان سکا..... لیکن یہ اندازہ اسے ہو گیا ہے کہ مرد نما عورت..... یا عورت نما مرد نہال نے ماہین کے ساتھ بند کمرے میں دست درازی کی کوشش کی اور نتیجے میں ماہین اس سے بھڑ گئی اور اس کا گلا کاٹ کر نکل گئی۔ ابھی چند لمحے پہلے مرنے والی مقامی گارڈ بھی ماہین ہی کی زد میں آئی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ماہین نے کیا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جب جان اور آبرو پر بن جائے تو انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے۔

یہ کسی خیز صورتِ حال تھی۔ میں نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے سے شک تھا کہ یہ نہال نامی بلا، ماہین کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرے گی....."

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ "گندھارا کے فرار کے وقت اسے میرے ہاتھوں زک اٹھانا پڑی تھی۔ مجھے بھی یہی ڈر تھا۔"

عمران کا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ دو گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی عقبی دیوار میں پیوست ہو گئیں۔ بہت سی پتھریلی برف اچھل کر ہمارے چہروں سے ٹکرائی۔

"عمران!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ بھی دیدے گھما کر رہ گیا۔ زخمی منوہر سنگھ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا اور خاص طور سے مجھے..... جیسے سوچ رہا ہو کہ ان سنگین ترین حالات میں بھی میں اطمینان کے ساتھ عمران سے مکالمہ کر رہا ہوں۔ لڑنا مرنا میری ہابی بن چکا تھا اور اب ثروت کے دنیا سے جانے کے بعد تو مجھے کچھ اور بھی آزادی محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ موجودہ لڑائی تو مجھے کچھ اور بھی زیادہ کشش کر رہی تھی کیونکہ اس لڑائی سے ثروت کی بے وقت موت کے انتقام کا راستہ بھی نکلتا تھا۔ ثروت جو دوا کے نام پر قاتل زہر کا شکار ہوئی۔

☆☆☆

اب سہ پہر ہونے والی تھی..... ہمیں اس گنبد جیسی چھت والے برفانی کمرے میں محصور ہوئے چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہو چکا تھا مگر ہم نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی۔ ہم بڑی احتیاط اور کفایت شعاری کے ساتھ فائر کر رہے تھے۔ یقیناً ہمیں گھیرنے والے بھی جانتے تھے کہ ہمارے پاس محدود ایمونیشن ہے۔ وہ ہماری گولیاں ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

منوہر سنگھ کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا مگر وہ اپنی ہمت برقرار رکھے ہوئے تھا، کسی وقت لگتا تھا کہ اس کی سانس اکھڑنے لگی ہے مگر پھر سنبھل جاتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے شیطان صفت جادو رائے کسی قریبی گھروندے میں موجود تھا۔ وہ ہم پر بہت گرج برس کر گیا تھا اور ہمیں ہتھیار ڈالنے کی آخری وارننگز دی تھیں۔ بہرحال ایک بات بڑی اچھی طرح سمجھ میں آچکی تھی اور یہ بڑی مثبت بات تھی۔ ماہین ان لوگوں کے پاس نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو وہ اب تک اسے ہمارے سامنے لا چکے ہوتے اور بلیک میلنگ کا راستہ ہموار کر چکے ہوتے۔ غالب امکان یہی تھا کہ ہرد نما نہال کو جان سے مارنے کے بعد وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی ہے اور اب غالباً اتنے فاصلے پر ہے کہ دور ریموٹ کنٹرول جو اس کی جان لے سکتا تھا، بے کار ہو چکا ہے۔

عمران نے گولیاں گنتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس صرف تیس رہ گئی ہیں، چار پانچ میگزین میں ہیں۔"

"میرے پاس چھ ہیں۔" میں نے کہا۔

منوہر کا پستول کب کا خالی ہو چکا تھا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" عمران نے اپنی نگاہیں سامنے مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں نے ابھی تک حشام اور ہما کو یرغمالیوں کے طور پر استعمال نہیں کیا؟"

"میرے لیے بھی یہی بات زیادہ پریشانی کی ہے۔"

عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں کی خاموشی گمبھیر تھی۔ یہ خدشہ بلکہ شدید خدشہ اپنی جگہ موجود تھا کہ اس خونی ہنگامے اور بھاگ دوڑ میں ان دونوں کی جان جا چکی ہو..... یہ بہت اندوہناک خیال تھا مگر بے محل نہیں تھا۔

ایمونیشن کے لحاظ سے دیکھا جاتا تو ہم مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا نکال سکتے تھے، مگر منوہر سنگھ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، گھیرا بھی تنگ ہو رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کسی بھی وقت مشتعل میل اور فیل میل گارڈز ایک بھرپور حملہ کر دیں گے۔ ڈولما اور نہال کی موت نے انہیں غضب ناک کر دیا تھا۔

آگے کیا ہوگا؟ فی الحال کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ بات

سردار جی کی عقل مندی

ایک سردار ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ محلے والے ڈھول کی اونچی آواز سے تنگ ہو رہے تھے۔ ایک ہمسایہ بھنگڑا ڈالنے والے کے گھر گیا اور پوچھا۔

"سردار جی..... کیہہ گل اے، ایہہ بھنگڑا کس خوشی وچ پا رہے او؟"

سردار جی نے ناچتے ناچتے جواب دیا۔

"ساڈے بھائی بہادر سنگھ..... فوت ہو گئے نیں، ایس واسطے!"

ہمسائے نے حیران ہو کر کہا۔ "سردار جی..... اک تہاڈا بھرا مریا اے، اتوں تسی بھنگڑا پا رہے او؟ ایہہ کوئی خوشی دا ویلا اے؟"

سردار جی نے کہا۔ "بھرا جی..... ساڈے واسطے تے ایہہ خوشی دا موقع اے!"

ہمسائے نے حیرت سے پوچھا۔ "اوہ کس طراں؟"

دیکھو جی..... پوری دنیا کہندی اے سکھ بے وقوف ہوندے نیں او ہنا دا دماغی نئیں ہوندا..... بھائی صوری دماغ دے کینسر نال مرے نیں..... اج پہلی واری ثابت ہو گیا اے کہ سکھاں دا وی دماغ ہوندا اے..... ورنہ کینسر نہ ہوندا، تسی جاؤ سانوں بھنگڑا پاندیو!"

تھپ پار کرے سائیں دا دی شوخیاں

تو طے تھی کہ خود کو سرخ تتی بھیڑیوں سے زندہ بچانے کے بجائے مقابلہ کرتے ہوئے مرنا زیادہ سہل ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنی پروا نہ ہونے کے برابر تھی..... مگر جب عمران کی طرف دیکھتا تھا تو میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ عمران دانش کی صورت میرے سامنے آجاتی تھی۔ اس کی شیریں آواز اور اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے تھے..... اپنی کمی پوری کرنے کے لیے اسے تمہارے پاس بھیجا ہے..... بس تیری تھوڑی سی توجہ اور تربیت کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھنا یہ تیرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو جائے گا۔ ساری پرانی یادیں تازہ کر دے گا۔

مگر لگ رہا تھا کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میرے وہ بھیانک اندیشے ایک بار پھر پوری شدت

سے اُبھر آئے جو مجھے بتاتے رہتے تھے کہ عمران دانش نے اسے میرے پاس بھیج کر غلطی کی ہے۔ وہ بھی باپ کی طرح مجھے جدائی کا غم دینے والا ہے۔

آہ..... اگر ایسا ہو گیا تو میں یہ کیسے برداشت کر پاؤں گا..... کیسے؟ اگر واقعی اس برف زار میں اس شیطان کی آنت جیسے وسیع و عریض غار میں ان سفاک لوگوں کے درمیان موت ہی ہمارا مقدر ہے تو پھر مجھے پہلے مرنا چاہیے۔

اسی دوران میں قریب آتے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے عمران کو اوپر تلے دو برسٹ چلانا پڑے۔ ایک لاش تو گری مگر حملہ آور بالکل قریب آ گئے۔ تین گولیاں میں نے بھی چلائی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں ہمارا قیمتی ایمونیشن نصف کے قریب رہ گیا تھا۔ مخالف سمت آنے والا ایک پورا برسٹ اس بستر میں پیوست ہو گیا جس پر ماہین سوئی رہی تھی۔ آئل لیمپ چکنا چور ہو کر بستر پر گرا اور بستر دھوئیں کے ساتھ سلگنا شروع ہو گیا۔ منوہر کی سانس پہلے ہی اکھڑ رہی تھی، دھوئیں نے اسے تقریباً قریب المرگ کر دیا۔ حملہ آوروں کی وحشی چنگھاڑیں بتا رہی تھیں کہ اب یہ مزاحمت زیادہ دیر چلنے والی نہیں۔ میں نے سوچا۔ کاش ان لمحوں میں مجھے شیطان صفت جادو رائے کی شکل نظر آ جائے اور میں اپنی سیون ایم ایم کی آخری تین گولیاں اس کے ہانڈی جیسے کھوپڑے میں اتار دوں۔ وہ کھوپڑا جس میں دنیا کا نہایت سازشی اور عیار ترین مغز بھرا ہوا تھا۔

مگر وہ مجھ سے بہت دور تھا اور موت کی پرچھائیاں بہت قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ کیا ثروت کا انتقام بھی ادھورا رہ جائے گا..... میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا..... اور قریباً یہی لمحات تھے جب مجھے کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے اردگرد کچھ بدل رہا ہے..... کچھ بدلنے والا ہے۔ فائرنگ اچانک ہی نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ اور طرح کی آوازیں اور آہٹیں ابھرنے لگیں۔ اب فائرنگ کی آوازیں غار کے دہانے کی طرف سنائی دینے لگی تھیں اور یہ بہت شدید آوازیں تھیں۔

"لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے منوہر کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

بستر اور دیگر اشیا اب جلنا شروع ہو گئی تھیں۔ برف کی گول چھت سے پانی کے قطرے ٹپکنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی والی رائفل بھی عمران کو تھما دی۔ جھک کر منوہر کو کندھے پر اٹھایا اور ہم ایک سرنگ جیسی راہداری سے گزر کر طاہورہ والی کشادہ جگہ کی طرف آ گئے۔ ایسے میں ہمیں ایک دو لاشیں بھی پھلانگنا پڑی تھیں۔ یہی وقت تھا جب دستی بموں کے تین چار دھماکے سنائی دیے اور فائرنگ میں مزید شدت آ گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی دوسرا گروہ ہے جس نے یہاں ہلہا بولا ہے۔

مجھے ایک محافظ لاش کے پاس سے بھری ہوئی ٹرپل ٹو رائفل اور اس کے دو لوڈڈ میگزین مل گئے۔ ہم نے منوہر کو ایک نمدے پر لٹایا اور خود بڑی اچھی جگہ پر پوزیشن لے لی۔ منوہر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس کی جیکٹ خون سے تر بتر تھی۔

"کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟" عمران نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ کوئی باغی دھڑا....." مگر فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میری نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی تھی جس کے یہاں موجود ہونے کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ شخص ان حملہ آوروں میں سے تھا جو ابھی یہاں پہنچے تھے..... وہ ایک دیوار کی اوٹ سے نکلا تھا اور اس نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تھی..... میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ ارب پتی ڈیرن فورڈ کا ذاتی جاپانی گارڈ تھا۔ میں اسے بخوبی پہچانتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیرن فورڈ جسے رائے اور مائرہ لاہور کی نامعلوم عمارت میں مقید چھوڑ آئے تھے، کسی طرح وہاں سے رہائی پا گیا ہے اور سیکڑوں میل دور یہاں لداخ آن پہنچا ہے.....

میں نے عمران کو اس بارے میں بتایا۔ وہ بھی ششدر نظر آیا۔ اگلے قریباً پانچ منٹ میں وہاں گھمسان کا رن پڑا اور ہمارا یہ شک بھی بالکل درست ثابت ہو گیا کہ ارب پتی ڈیرن فورڈ جنس تھیس یہاں موجود ہے۔ یہاں جو تہلکہ خیز شوٹ آؤٹ ہوا اس میں ہم نے بھی ڈیرن اور اس کے ساتھیوں کا ساتھ ہی دیا۔ قریباً دس منٹ تک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجتی رہی۔ پھر صاف پتا چلا کہ نووارد غالب آ گئے ہیں۔ جادو رائے اور میم مائرہ کو شکست ہو گئی ہے..... اس شکست کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ یہاں کی سردار محافظ ڈولما یہ لڑائی شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ہلاک ہو چکی تھی۔

چند منٹ بعد فائرنگ بالکل تھم گئی۔ ڈیرن فورڈ کے جاپانی گارڈ سمیت اس کے کئی دیگر ساتھیوں نے بھی دیکھا تھا کہ ہم نے دس منٹ کی اس تابڑ توڑ فائرنگ میں جادو رائے کا نہیں بلکہ ان کا ساتھ دیا ہے۔ فائرنگ رکتے ہی ہم نے منوہر سنگھ کو فوراً ایک مقامی طرز کے چوبی اسٹریچر پر ڈالا اور غار کے اس حصے کی طرف لپکے جہاں میم مائرہ نے ضرورت کی ادویات کا اسٹاک کر رکھا تھا۔ احمد کامران بھی وہیں پر نظر آیا کرتا تھا۔ لیکن جب ہم اپنے مریض کو لے کر وہاں پہنچے تو کامران پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔ دو

گولیاں اس کی کمر میں لگی تھیں اور وہ ایک دس بارہ سالہ مقامی بچے کی لاش کے پاس ہی اوندھا پڑا تھا۔

ادویات بے شمار تھیں مگر ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ان میں سے کون سی دوا یا کون سے انجکشنز ہمارے ساتھی کی جان بچانے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

"کیا کیا جائے عمران؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

میں نے چونک کر فاس کھ منوہر سنگھ کی طرف دیکھا۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ جا چکا تھا۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ اس کی نبض ٹٹولی اور پھر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

"مجھے حشام اور ہما بھی کہیں نظر نہیں آ رہے؟" عمران نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"چلو ڈھونڈیں۔" میں نے جواب دیا۔

کہنے کو تو میں کہہ رہا تھا کہ "چلو ڈھونڈیں....." مگر پتا نہیں کیوں، یہ لگ رہا تھا کہ شاید ان کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً رامے اور مائرہ پہلے ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے اور عمران کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیتے۔ ہم دوبارہ غار کے مرکزی حصے کی طرف بڑھے تو میں نے خوش پوش ڈیرن فورڈ کو اپنے گارڈز کے جلو میں طامبورہ کی طرف آتے دیکھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ یہ سیاہ سوٹ اس کے لمبے قد پر جچتا تھا۔ درمیانی عمر میں بھی اس امریکی کا جسم چست تھا اور ہلکی نیلی آنکھوں میں ذہانت کی چمک انگارے مارتی تھی۔ وہ یک ٹک ہماری طرف دیکھنے لگا۔ یہ عمران اور میں ہی تھے جنہوں نے اسے راولپنڈی کے ایک گورا قبرستان سے خوبرو ایلی سمیت اغوا کیا تھا اور رامے کے پاس پہنچایا تھا۔

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر انگلش میں بولا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ اپنے اغوا کار سے میری ملاقات، ایسے اور ان حالات میں ہوگی۔"

"مجھے بھی امید نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "ایلی کہاں ہے؟"

"وہ یہیں پر ہوگی، لیکن ہمیں اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ ہم تو خود رامے اور مائرہ کے قبضے میں تھے۔ وہ ہمیں جان سے مارنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔"

اسی اثنا میں ایک جانب سے بلند آواز میں چلانے کی نسوانی آواز آئی۔ ہم نے گھوم کر دیکھا۔ یہ نابینا ایلی تھی۔ اسے ڈیرن کے ایک سفید فام گارڈ نے سہارا دے رکھا تھا۔ یقیناً وہ یہاں پر ڈیرن کی آمد سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ پکار رہی تھی۔

"ڈیرن..... ڈیرن" اور رو رہی تھی۔ ڈیرن اس کی طرف لپکا اور اسے گلے سے لگایا۔ غالباً ڈیرن کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ ایلی کو آنکھوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔

میں نے دیکھا طامبورہ کے آس پاس بھی کئی لاشیں موجود تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر ڈولما کے ساتھیوں اور رامے مائرہ کے گارڈز کی تھیں۔ ان لاشوں میں سے ایک لاش قابلِ ذکر تھی۔ یہ کیلی تورما چھائی کی لاش تھی۔ وہ لکڑی کے بنے ہوئے ایک جھوڑے چکلے دیوتا (بت) کے پیچھے جان بچانے کے لیے چھپ گئی تھی۔ وہ اسے کیسے بچاتا، وہ تو خود لکڑی کا تھا۔ لائٹ مشین گن کا ایک پورا برسٹ اس میں سے گزرا تھا اور چند گولیاں تورما چھائی کے جسم میں بھی آ گئی تھیں۔ تورما جس میں جینے کی خواہش نوجوانوں سے بھی زیادہ تھی، مر پڑی تھی۔ اسی اثنا میں ایک جانب سے خوش قامت مایا رانی نمودار ہوئی۔ دو سفید فام گارڈز اس کے دائیں بائیں تھے۔ وہ بھی بندی خانے سے باہر آ چکی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "ماہین کہاں ہے؟"

"اس کا کچھ پتا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لگتا یہی ہے کہ وہ شاید..... یہاں سے بھاگ نکلی ہے....."

"اور وہ تمہارے ساتھی، حشام وغیرہ.....؟"

"ان کا بھی ابھی کچھ پتا نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

مایا رانی بے قراری سے بولی۔ "معلوم ہوا ہے کہ وہ راکھشس رامے اور مائرہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہیں بچنا نہیں چاہیے۔"

عین اسی لمحے یہی بات ڈیرن فورڈ نے بھی انگلش میں کہی۔ "وہ باسٹرڈ رامے اور مائرہ یہاں نہیں ہیں۔ وہ فرار ہو گئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ساتھیوں کو ان کی تلاش کے لیے مختلف ہدایات دینے لگا۔

مایا رانی یقیناً ہم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے یہاں آ کر سارا پانسا پلٹا ہے۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے ڈیرن اور اس کے درجنوں مسلح ساتھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تاہم وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فی الوقت سب سے اہم کام مغرور جادو رامے کی تلاش ہے۔ اس نے فوراً اپنے ذاتی دستے کے ارکان کو حکم دیا کہ وہ تلاش کے سلسلے میں سفید فام گارڈز کی مدد کریں۔

اسی دوران میں طامبورہ کی جانب بھیڑیوں کی ہولناک آوازیں گونجنے لگیں۔ مایا رانی کے چار وفادار ملازم قریباً آٹھ عدد بھیڑیوں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ان جانوروں کے رنگ سرخی مائل تھے۔ ان کی زنجیریں ملازموں کے ہاتھوں میں

تھیں۔ مایا رانی کی ہدایت کے مطابق ایک اونی ٹوپی اور قدرے میلی جرابوں کے دو جوڑے بار بار بھیڑیوں کی تھوتھنیوں کے ساتھ لگائے گئے مبہم بھیڑیے کچھ اور بے چین ہونے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہ اشیا رامے کی ہیں اور ان کی بو باس اس کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے۔ یہ عمل کچھ دیر جاری رہا، پھر رکھوالے بھیڑیوں کو لے کر ایک جانب چلے گئے۔

وقتی طور پر حشام اور ہما کا خیال چھوڑ کر میں نے عمران کو ساتھ لیا اور دوڑتا ہوا غار کے دہانے کی طرف آیا۔ ہر طرف بارود کی بو محسوس ہوتی تھی۔ غار سے باہر مطلع ابر آلود تھا مگر شام کا اندھیرا ابھی کافی دور تھا۔ ہم اس چار دیواری کی طرف آئے جہاں دن کے وقت برف پر پھسلنے والی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان میں سے ایک بالکل ریڈی تھی۔ کتے بھی جتے ہوئے تھے۔ ہم کوئی وقت ضائع کیے بغیر ایک گاڑی پر چڑھے اور کتوں کو ہنکا کر احاطے سے باہر لے آئے۔

ایسی گاڑیوں کو چلانا عموماً زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ کتے اور رینڈیئرز وغیرہ سدھے ہوئے ہوتے ہیں اور مشاق بھی..... وہ راستوں سے بھی بڑی اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ عمران نے باگیں تھام کر منہ سے لخ لخ کی مخصوص آواز نکالی اور کتے حرکت میں آ گئے۔

اگلے قریباً دو ڈھائی گھنٹے سخت بھاگ دوڑ کے تھے۔ سردی رگوں میں خون جما رہی تھی اور ہم برف زار میں مفرور رامے اور اس کی عیار پارٹنر مائرہ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ یقیناً اور لوگ بھی ان کی تلاش میں تھے۔ اطلاع یہ تھی کہ وہ بھی ایک گاڑی پر ہی فرار ہوئے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہم غار سے سات آٹھ کلومیٹر دور آ چکے ہیں۔" عمران نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔

"اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے ہمیں پلٹنا ہوگا۔ ورنہ راستہ بھول سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

یکایک ایک برفیلے ٹیلے کے عقب میں دور تک گئی ہوئی برف کی سفید چادر کے اوپر مجھے ایک سیاہ نکتہ سا نظر آیا۔ میری نظر کا تعاقب کر کے عمران نے بھی یہ نکتہ دیکھا اور پھر لگام کو حرکت دی۔ چھ عدد تیز رفتار کتوں نے اشارہ پاتے ہی اپنا رخ موڑا اور اس جانب بڑھے۔ عمران کے ساتھ جانوروں کی لگاوٹ محسوس کی جانے والی چیز تھی۔ ہمیں ان کتوں کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے ہی بیتے تھے مگر ایسا لگنے لگا تھا کہ وہ مہینوں سے اس کے ساتھ مانوس ہیں۔ چند ہی منٹ میں ہم ایک سنسان نشیب میں موجود تھے۔ ہمیں یہاں جو چیز نظر آئی، وہ برف میں بری طرح پھنسی ہوئی ایک گاڑی تھی۔ اسے کھینچنے والے کتے بھی شاید زور لگا لگا کر تھک چکے تھے، اب خاموش کھڑے تھے۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہی رامے اور مائرہ والی گاڑی ہے۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھ کر ہی کہیں دائیں بائیں ہو گئے ہوں۔" میں نے خیال ظاہر کیا اور اس کے ساتھ ہی نشست کے نیچے سے ٹرپل ٹو رائفل نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔

عمران تیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک جگہ برف پر قدموں کے مدھم نشان نظر آئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گاڑی کو یہاں پھنسے ڈھائی تین گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ گاڑی میں ایک بڑی ٹارچ موجود تھی۔ عمران نے ٹارچ روشن کی اور ہم گاڑی سے اتر آئے۔ کتے بری طرح ہانپ رہے تھے۔ میں نے انگلی رائفل کے ٹریگر پر رکھ لی تھی اور عمران ٹارچ کے روشن دائرے کی مدد سے برف پر قدموں کے نشان ڈھونڈ رہا تھا۔ "یہ دیکھیں جی۔" اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ "یہ دو بندوں کے پاؤں کے نشان ہیں..... اور ان میں سے ایک بندی لگتی ہے۔"

"اگر یہ واقعی رامے اور مائرہ ہیں تو ممکن ہے کہ گاڑی پھنسنے کے بعد آس پاس ہی کہیں چھپ گئے ہوں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

ہم بڑی احتیاط سے پھنسی ہوئی گاڑی کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ یہی وقت تھا جب بلندی پر ایک شعلہ چمکا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر کر پھنسی ہوئی گاڑی کے ایک کتے کو لگی۔ وہ دردناک آواز نکال کر تڑپنے لگا۔ دوسرا فائر ہونے سے پہلے میں اور عمران برق رفتاری سے گاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔ کوئی چنگھاڑا اور اوپر تلے دو اور فائر ہوئے جو گاڑی کی باڈی میں لگے۔ یہ ماؤزر کے فائر تھے اور بلندی سے ہو رہے تھے۔ میں نے ٹرپل ٹو سے دو جوابی فائر کیے۔ مخالف سمت سے ایک اور فائر آیا۔ عمران کی قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بال بال بچا۔ پھر "ٹرچ ٹرچ" کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ گولی چلانے والے شخص کا ماؤزر خالی ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو عصیلی چنگھاڑ سنائی دی تھی، اس نے قریباً ثابت کر دیا تھا کہ گولی چلانے والا جادو رامے ہی ہے۔

اچانک ہمیں اس کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ خود کو ایک برفیلے ابھار کے پیچھے چھپا رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کے پاس صرف یہی چار گولیاں تھیں۔" میں نے عمران کے کان میں کہا۔

پھنسی ہوئی گاڑی کا ایک کتا مر چکا تھا، باقی خوف زدہ ہو کر اچھل کود رہے تھے۔ میں اور عمران ان کے پاس سے

گزرے اور جادو رائے کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب نیم تاریکی میں بلندی پر دو اور ہیولے دکھائی دیے۔ یہ دونوں عورتیں لگتی تھیں۔ عمران نے طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ ان ہیولوں کی طرف پھینکا۔ ہم ششدر کھڑے رہ گئے۔ بلندی پر میم مائرہ تو نظر آ ہی رہی تھی مگر جس کی موجودگی نے ہمیں حیران کیا، وہ مائین تھی۔ وہ میم مائرہ سے سات آٹھ قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ اب برفیلے ابھار کے قریب کوتاہ قد جادو رائے کا ہیولا بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس بس ایک پاؤر زری تھا جو خال ہو چکا ہے۔ اب اس کے ہاتھ خالی تھے..... لیکن نہیں..... اس کے پاس وہ مہلک ترین ہتھیار موجود تھا جو ہمارے ہر حوصلے کو زنجیر کر کے ہمیں بے دست و پا کر سکتا تھا۔

وہ بلندی پر کھڑے کھڑے گرجا۔ ”ریموٹ میرے ہاتھ میں ہے، ایک قدم بھی آگے بڑھاؤ گے تو اس حرامزادی کے ٹکڑے ہوا میں اچھال دوں گا۔“ اس کے لہجے میں وحشت اور دیوانگی تھی۔

میں اور عمران اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ ہمارے اور اس شیطان صفت شخص کے درمیان پچیس تیس قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا..... مگر جو دھمکی وہ دے رہا تھا، وہ ہماری روح کو چھلنی کر رہی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ تین چار گھنٹے پہلے یہاں ایک سنگین اتفاق ہوا تھا۔ جہاں دونوں بھگوڑوں یعنی رائے اور مائرہ کی گاڑی پھنسی تھی۔ مائین بھی وہاں کہیں آس پاس ہی موجود تھی اور چھپی ہوئی تھی۔ وہ نہتی تھی۔ اس کا اور رائے کا کسی طرح سامنا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے گن پوائنٹ پر کر لیا تھا۔

جادو رائے کی ریڈیو آر لسٹ جیسی خوب صورت آواز مکروہ الفاظ میں لپٹ کر گونجی۔ ”رائفل پھینک دو اور دس قدم پیچھے ہٹ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ، ورنہ یہ چھوکری جا رہی ہے۔“

پھر اچانک وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ مکروہ صورت والے رائے کی ساری توجہ ان لمحوں میں ہماری طرف تھی..... اچانک مائین بجلی کی طرح حرکت میں آئی اور دس پندرہ قدم کے فاصلے پر کھڑی میم مائرہ پر جا پڑی۔ دونوں اوپر نیچے گر پڑیں..... مائین نے مائرہ کو عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میم مائرہ جسمانی طور پر بہت توانا اور چوکس تھی..... لیکن مائین اس سے چمٹ کر رہ گئی۔ جادو رائے بوکھلایا ہوا نظر آیا۔ بے شک ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا لیکن یہ وہ لمحے تھے جب وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ کم از کم فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بلاسٹ کرتا تو اس کی پارٹنر مائرہ بھی ساتھ ہی جاتی۔ ایسے ہی لمحے جیت ہار کے لیے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ میں اپنی ٹانگوں میں موجود پوری طاقت کے ساتھ جادو رائے کی طرف لپکا..... اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی رائفل بھی سیدھی کر لی تھی۔ چھ سات قدم طے کرنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ گولی چلا دوں۔ گولی رائے کے پہلو میں لگی اور وہ پیچھے کی طرف گرا۔ عمران مجھ سے بھی پہلے رائے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ اس پر جا پڑا۔ پوری قوت سے رائے کا بازو مروڑ کر اس نے ”قاتل ریموٹ“ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا..... اور پھر اس کے منہ پر..... بڑی ہانڈی جیسے کھوپڑے پر مکوں کی بارش کر دی۔ چند لمحوں کے تذبذب نے رائے جیسے گھاگ شخص کو عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔

دوسری طرف مائین اور میم مائرہ گتھم گتھا تھیں۔ میم مائرہ کا جسم کسی ایتھلیٹ کی طرح ٹھوس اور طاقتور تھا۔ اب میم مائرہ نے پلٹ کر مائین کی دبلی پتلی گردن دبوچ لی تھی۔ یہ ایک خطرناک ”نیک لاک“ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک مائین نے اپنے بھاری لبادے کے اندر سے کوئی شے نکالی اور گھما کر میم مائرہ کے پہلو میں گھونپ دی (دراصل یہ وہی ہلالی خنجر تھا جو مائین نے فرار ہوتے وقت تہال پر اور ایک تبتی پہریدار عورت پر استعمال کیا تھا) میم مائرہ نے دردناک آواز میں چلا کر مائین کی گردن چھوڑ دی۔ مائین نے اپنی دونوں ٹانگوں کی ضرب سے اسے خود سے دور کر دیا۔ میں اب اسے گن پوائنٹ پر رکھ سکتا تھا مگر وہ اتنی بدحواس ہو چکی تھی کہ اس نے پھر اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ تاریکی کے سبب وہ ٹھیک سے دیکھ نہ پائی۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دائیں طرف جانے کے بجائے بائیں طرف پھسل گئی۔ اس طرف کوئی چالیس فٹ گہری تنگ برفانی کھائی تھی۔ وہ ہوا بازیاں کھاتی ہوئی گری۔ نیچے پتھر جیسی برف کے ساتھ اس کا جسم ٹکرانے کی صدا بڑی خوفناک تھی۔ یہ صدا بتا رہی تھی کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔

عمران نے فٹ بال جیسے گول اور گیند جیسے خطرناک جادو رائے کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ وہ آتش مزاج شخص اپنی مزاحمت ترک نہیں کر رہا تھا۔ عمران کے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش کے ساتھ ساتھ وہ غلیظ گالیاں بھی بک رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے ریموٹ کنٹرول کے سیل اس میں سے نکالے پھر ڈھلوان اتر کر گاڑی کے پاس پہنچا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس پر ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں اندر سے چمڑے کی ایک مل داررسی نکال لایا اور اوپر جا کر رائے کے ہاتھ پاؤں چلاتے جادو رائے کے ہاتھ موڑ کر پشت پر باندھ دیے۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں اور جسم سے خنزیر جیسی حیوانی بو اٹھتی تھی۔ وہ اب بھی اپنی ٹانگیں چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی کا زخم اس کے بائیں کندھے پر باہر کی طرف آیا تھا۔ تیزی سے خالی ہوتا چلنا شروع ہو گئی تھی جو ہمارے حسوں کو سن کر رہی تھی۔

یکا یک ہوا کے دوش پر تیر کر آنے والی ایک دور افتادہ آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ہانپی ہوئی ماہین بھی اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس آواز کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے جیسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے میم مائرہ کو پچھاڑ لیا ہے۔ جسم منجمد ہونے کے باوجود میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یہ خونخوار تیتی بھیڑیوں کی آواز تھی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف لپک رہے تھے۔

"یہ..... بھیڑیے؟" ماہین نے میری طرف دیکھ کر خوف زدہ آواز میں کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ رامے کی تلاش میں ہیں اور اسی کی طرف آرہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

بات عمران کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بھی میری طرح غار کا وہ منظر دیکھا تھا جب مایارانی نے ان پالتو بھیڑیوں کے غول کو ہمارے سامنے جادو رامے کی اونی ٹوپی اور جرابیں وغیرہ سنگھائی تھیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر لرزاں آواز میں بولا۔ "لیکن کچھ بھی ہے جی..... یہ درندے ہیں، ہماری طرف بھی تو آسکتے ہیں۔"

عمران کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ میں نے ماہین کا بازو پکڑا اور ہم ڈھلوان پر تقریباً پھسلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچ گئے۔ کتوں نے بھی شاید بھیڑیوں کی آمد محسوس کرلی تھی وہ سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ میں نے رائفل سونت کر گاڑی میں پوزیشن لے لی۔ آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ جادو رامے چند میٹر کی دوری پر برف کے اوپر پڑا تھا۔ وہ اب بھی ہم پر دہاڑ رہا تھا اور صلواتیں سنا رہا تھا اور پھر بالکل ویسا ہی ہوا جیسا ہمارے ذہنوں میں آرہا تھا۔ خونخوار بھیڑیے برق رفتاری سے قریب آتے گئے۔

"یہ اس کو مار دیں گے؟" ماہین نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"بہتر ہے کہ مار دیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اور پھر ہم نے رو نما رچوں کی روشنی میں وہ منظر دیکھا جسے دیکھنے کے لیے لوہے کا جگر درکار تھا..... اور وہ آگاہی بھی درکار تھی جو ہم "درندہ صفت رامے" کے حوالے سے رکھتے تھے۔ بھوکے بھیڑیے جو تعداد میں آٹھ سے کم نہیں تھے، جادو رامے پر جا پڑے۔ وہ اس کو زندہ نوچنے لگے..... اور بھیڑنے لگے..... ہاں یہی تو وہ سزا تھی جو رامے اور میم مائرہ نے ہم دونوں کے لیے تجویز کی تھی..... بڑی موت کی سزا۔ مقام بدل گیا تھا۔ سزا پانے والا بدل گیا تھا مگر "جلاد" وہی تھے اور سزا بھی وہی تھی۔ جادو رامے کی آہ و بکا فلک شگاف تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنے گوشت کے لوتھڑے خونی جانوروں کے منہ میں دیکھ رہا تھا۔ برف پر تڑپتا تھا اور دہائیاں دیتا تھا۔ اس کی ساری ذہانت، جادوگری اور عیاری، قدرت کے اس بے رحم انصاف کے آگے صفر تھی۔ میں رائفل استعمال کرسکتا تھا، دو تین جانوروں کو مار سکتا تھا باقی پسپا ہوسکتے تھے مگر میں کیوں کرتا ایسا؟ میری نگاہوں کے سامنے ان لاتعداد لوگوں کے چہرے تھے جنہوں نے دواؤں کے نام پر زہر پیا تھا اور سسک سسک کر جانیں دی تھیں اور ان میں سے ہی ایک ثروت بھی تھی۔ تیز طوفانی ہوا میں جلد ہی اس کی آخری پکاریں دم توڑ گئیں۔ ماہین نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ عمران نے بھی دھیان دوسری طرف کرلیا تھا، مگر میں آخر تک ٹارچ تھامے "بڑی موت" کا منظر دیکھتا رہا۔

ہوا کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ "شاید طوفان آرہا ہے۔" عمران نے کہا۔

اب برف کی تیز بوچھاڑیں بھی شروع ہوگئی تھیں۔ شاید موسم کی یہی کیفیت تھی جس کے سبب بھیڑیوں نے جادو رامے کو مارنے کے بعد کسی اور طرف توجہ نہیں دی۔ فلیش لائٹ جیسی ٹارچ کی روشنی میں بھیڑیوں کی تھوتھنیاں سرخ نظر آرہی تھیں۔ اگر وہ ہماری جانب آتے تو ٹریل ٹو رائفل بخوبی ہمارا دفاع کرسکتی تھی..... میں نے رائفل ان کی طرف سونت رکھی تھی۔ تاہم انہوں نے ہمیں کوئی ایسی زحمت نہیں دی۔ اور کچھ دیر بے قراری سے وہاں چکرانے اور جبڑے چلانے کے بعد اچانک ہی غار کی سمت میں واپس چل دیے۔

طوفان کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے اردگرد برف کی تہیں نظر آنے لگی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کے کتے اس صورتِ حال میں عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ "ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ پھنسی ہوئی گاڑی کے کتے؟" عمران نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"ان کی بندشیں کاٹ دیتے ہیں۔ یہ خود ہی ٹھکانا تلاش کرلیں گے۔"

ماہین والے ہالی مخبر سے ہم نے یکے بعد دیگرے وہ بندشیں کاٹ دیں جو کتوں کو گاڑی سے جوڑے ہوئے تھیں۔ بندشوں سے آزاد ہوتے ہی پانچوں کتے ایک جانب بھاگ نکلے۔ چھٹا جادو رامے کی چلائی ہوئی گولی سے ہلاک ہوچکا تھا۔ اس کا خون برف کی نئی پرتوں کے نیچے اوجھل ہوچکا تھا۔

ماہین کی کمزور آواز نے مجھے چونکایا۔ "انکل ٹائر الگ ہے یہ دوسری گاڑی بھی نکل نہیں سکے گی۔"

میں اور عمران اپنی گاڑی کی طرف پلٹے۔ ٹارچ کے روشن

دائروں میں نظر آیا کہ شاید مائین ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں ہم نے سر توڑ کوشش کی مگر ہم کچھ کر سکے اور نہ کہتے ہی گاڑی کو اس کی جگہ سے ہلا سکے۔ طوفان کے بے پناہ شور میں عمران کی جھنجھلائی ہوئی آواز ابھری۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے کہ گاڑی کچھ اور پھنس گئی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گاڑی اب واضح طور پر ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ برف بوچھاڑوں کی طرح تھی اور اس کی شدت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ”اب کیا کرنا ہے؟“ عمران نے ہوا کے بے پناہ شور میں چلا کر پوچھا۔

”گاڑی کو اس حالت میں یہاں نہیں چھوڑ سکتے..... کتے مر جائیں گے۔“ میں نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

”تو پھر ان کو بھی آزاد کر دیں؟“ عمران نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اگلے دو تین منٹ میں ہم نے ان کتوں کی بندشیں بھی کاٹ ڈالیں اور وہ چند لمحے چکرانے کے بعد ایک سمت میں بھاگ نکلے۔ یہاں کھوہ وغیرہ تو کہیں نظر نہیں آ رہی تھی..... مگر مائین نے بتایا کہ پاس ہی چھپنے کے لیے ایک جگہ موجود ہے۔ ہم نے بلندی کی جانب بے حد دشواری سے تیس چالیس قدم کا فاصلہ طے کیا اور برف میں موجود ایک ایسی دراڑ میں داخل ہو گئے جس کے اوپر قدرتی طور پر برف کا ہی ایک سائبان سا بن گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ پچھلے چند دن بھی مائین کی پناہ گاہ رہی ہے۔

ہم تینوں ہانپ گئے تھے مگر مائین کچھ زیادہ ہی ہانپ رہی تھی۔ وہ جب سانس اندر کھینچتی تھی تو ایک سیٹی جیسی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ دراڑ کے پیچھے تک آنے کے بعد ہم برف اور ہوا کی براہ راست کاٹ سے کسی حد تک محفوظ ہو گئے..... مگر سردی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرا ڈھیٹ جسم اتنی سردی محسوس کر رہا ہے تو عمران اور مائین کا کیا حال ہوگا؟

ہوائیں شور بپا کر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ عمران کی کپکپاتی آواز ابھری۔ ”لگتا ہے کہ آج یہ ہوائیں کرہ ارض کی ساری کی ساری برف یہیں پر گرا کر دم لیں گی۔“

اس آدھی چھت والی دراڑ میں آنے کے بعد طوفان کا شور قدرے کم محسوس ہونے لگا تھا۔ ہوا کی سیدھی مار بھی نہیں تھی۔ یہاں مائین کی بس ایک اونی شال موجود تھی۔ وہ آدھی شال نیچے بچھا کر آدھی اوڑھ لیتی تھی اور اس قاتل سردی سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ پورے پانچ دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ خالی پیٹ برفیلی سردی کا مقابلہ اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیمار ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”مائین! اس بدبخت رامے..... اور مائرہ سے تمہارا سامنا کیسے ہوا؟“

وہ قدرے نحیف آواز میں بولی۔ ”آج سہ پہر مجھے کچھ آہٹیں محسوس ہوئیں اور کتوں کی آوازیں آئیں۔ میں نے یہاں سے نکل کر بڑی احتیاط سے نیچے جھانکا۔ مگر بیڈ لک..... کہ میم مائرہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ تب ان کی گاڑی پھنس چکی تھی اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے.....“

مائین کی باقی کی بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ ظاہر ہے کہ مائین نہتی تھی اور بپھرے ہوئے جادو رامے کے پاس ماؤزر تھا..... اور صرف ماؤزر ہی نہیں تھا، وہ چھوٹا سا خونیں ریموٹ بھی تھا جو مائین کو اڑا سکتا تھا۔ وہ مائین پر غالب آ گئے جب اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم ان کی پھنسی ہوئی گاڑی تک پہنچے تو وہ دونوں اسی آدھی چھت والی دراڑ میں مائین کے ساتھ موجود تھے۔

مائین..... مایا رانی اور ہمارے دیگر ساتھیوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے مختصراً غار کا سارا احوال بتایا۔ بندی خانے سے ہمارے نکلنے سے لے کر ڈیرن فورڈ کی آمد تک..... اور خونریز لڑائی سے لے کر مایا رانی کی رہائی تک میں نے سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوئی کہ قوی ہیکل جہاناں جسے ہم آج تک گونگا سمجھتے رہے تھے، حقیقتاً گونگا بہرا نہیں تھا..... وہ دراصل ایک مخبر کے طور پر رامے کے گروہ میں موجود تھا۔ آخر میں عمران کی کامیاب چال کے سبب یہی جہاناں ہماری رہائی کا سبب بھی بنا تھا۔

”حشام اور ہما صاحبہ کا کچھ پتا نہیں؟“ مائین نے پوچھا۔

”نہیں ابھی تک تو نہیں..... لیکن عین ممکن ہے کہ انہوں نے خود کو کہیں غار میں ہی چھپا رکھا ہو۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

رامے کی موت کے مناظر بار بار ہماری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ شاید یہ حرص اور لالچ کا انجام تھا۔ کیا نہیں تھا اس شخص کے پاس مگر زیادہ سے زیادہ کی ہوس نے بالآخر اس شخص کو اذیت ناک موت سے دوچار کیا تھا۔ اس کی ساری دولت اور طاقت ایک طرف پڑی رہ گئی اور بھیڑیوں نے اسے زندہ چیر ڈالا۔ تاریخ گواہ ہے کہ رامے جیسے لوگوں کا مقدر یہی ہوتا ہے۔

مائین درمیان میں بیٹھی تھی، میں اور عمران اس کے دائیں بائیں تھے۔ ہوائیں شب و فراز سے سرخ رو تھیں اور برف کی یورش ناقابل بیان تھی۔ میں نے اپنی بھاری بھرکم جیکٹ اتاری اور زبردستی مائین کے کندھوں پر ڈال دی۔ حقیقت یہی تھی

کہ میں ان دونوں سے بہت کم سردی محسوس کر رہا تھا۔ ہم تینوں نے دراڑ کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

وقت کو آگے سرکانے کے لیے ماہین نے کہا۔ ”جب میں مایا رانی کے پاس تھی، مجھے اس امیر کبیر ڈیرن اور میم مائرہ کے بارے میں کافی باتیں پتا چلی تھیں۔ یہ باتیں مجھے ایک روز نابینا ایلی نے ہی بتائی تھیں۔ ڈیرن اور میم مائرہ کی میرج دراصل میم مائرہ ہی کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔ مائرہ اچھی عورت نہیں تھی۔ بے وفائی کی شروعات اسی کی طرف سے ہوئی تھی۔“

”وہ کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے مارک نامی ایک نوجوان سے ناجائز ریلیشن بنا لیا تھا۔ بات بگڑتی چلی گئی۔ انہی دنوں ڈیرن فورڈ نے ایلی کو اپنی گرل فرینڈ بنایا۔ بعد میں ڈیرن اور میم مائرہ کے درمیان طلاق ہوگئی اور میم مائرہ جاتے جاتے ڈاکٹر شاکے بہت سے کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اپنے طور پر سارے کاغذ لائی تھی لیکن قریباً آدھے ڈیرن فورڈ کے پاس ہی رہ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ویکسین نہ تو مائرہ اور رامے بنا سکے اور نہ ہی ڈیرن فورڈ....“

رات کا اندھیرا گہرا اور عالم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے ایک نارچ آن کر کے اپنے درمیان رکھی ہوئی تھی اور اپنے آپ میں سمٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ماہین ایک انکشاف ہمارے پاس بھی ہے۔“

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”یہ ساری بھاگ دوڑ ویکسین بنانے کے لیے نہیں ”بیماری“ بنانے کے لیے ہو رہی ہے..... یعنی وائرس، اس کی ویکسین تو بری بھلی بن ہی چکی ہے..... بلکہ ڈاکٹر شاکی بنا گیا تھا۔“

ماہین تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔

رشتوں کی یہ کیسی نگون تھی۔ اس نگون نے تین چار عالمی مجرموں کے گھناؤنے راز فاش کیے تھے۔ ڈیرن اور مائرہ کی شادی ٹوٹنے کا آغاز یقیناً مائرہ ہی کی طرف سے ہوا تھا۔ مائرہ کے جس بوائے فرینڈ مارک کا نام ابھی ماہین لے رہی تھی، اس کا نام میں لاہور میں مائرہ کی زبان سے بھی سن چکا تھا۔ جب میں ایک اَن پڑھ مزدور کی حیثیت سے مائرہ کے آفس میں فرش پر بیٹھا تھا اور وہ فون پر مارک نام کے اس بندے سے کھل کھلا کر انگلش میں باتیں کر رہی تھی۔ میم مائرہ کا یہ جرم یوں اور بھی سنگین ہو جاتا تھا کہ اس نے اپنی رقیب نوجوان ایلی سے بدلہ لینے کے لیے اسے اپنے جنونی پارٹنر رامے سے ہاتھوں اندھا کروایا اور اس کی رکھیل بنا ڈالا۔

اب وہی مائرہ اپنے تمام تر لعنتی ارادوں سمیت یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر برفیلی کھائی میں مردہ پڑی تھی اور طوفان اس پر برف کی پرتیں چڑھاتا چلا جا رہا تھا۔

ماہین کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بے شک ڈیرن اور ایلی بھی جرائم پیشہ لوگ ہی ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایلی، جادو رامے کے ہاتھے چڑھنے کے بعد سے مسلسل آنسوؤں میں غرق رہی ہے۔

میری دبیز جیکٹ کے باوجود ماہین اپنے آپ میں سکڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سانس بھی خراب تر ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کچھ دیر اور گزر جاتی تو شاید ہم منجمد ہو جاتے۔ میرے دل سے ماہین اور عمران کی سلامتی کے لیے دعا نکل رہی تھی..... مگر شاید یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہی نہیں تھا۔ پانچ دس منٹ مزید گزرے پھر ایک ایسی گڑگڑاہٹ سنائی دی جس نے ہمیں دہلا دیا۔ یہ طوفان کے شور سے بالکل مختلف آواز تھی۔ ایک شدید ارتعاش محسوس ہوا اور اچانک ہمیں لگا کہ ہم برف کی قبر میں دفن ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

ہمیں برف کی قبر میں اب قریباً آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ دراصل یہ ایک بڑا برف کا تودہ تھا جو ”ایوالانچ“ کی صورت میں پھسل کر نیچے آیا تھا اور اس دراڑ کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ برف کی جو تہ اس دراڑ پر چڑھی تھی، اس کی موٹائی کم و بیش پانچ فٹ تھی۔ یہ واقعی برف کی قبر تھی۔ اس میں بس دو تین شگاف رہ گئے تھے جہاں سے ہوا پُرہول آوازوں کے ساتھ برف کی بوچھاڑوں سمیت اندر آتی تھی۔ منوہر سنگھ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ علاقہ دنیا کے سرد ترین علاقوں میں شامل ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس کا ٹمپریچر منفی 25 درجے تک بھی پہنچ جاتا ہے مگر جو ٹمپریچر اس وقت اس برفیلی قبر کے اندر موجود تھا، وہ شاید اس سے بھی کم تھا۔

کمزور و بیمار ماہین تو رہی ایک طرف، عمران تک کا جسم نیلا پڑنے لگا تھا۔ میں حتی الامکان اپنی غیر معمولی برداشت کا امتحان لیتا رہا تھا مگر اب مجھے اپنی ہمت بھی کم پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

باہر نکلنے کی کوئی صورت بچی ہی نہیں تھی اور برفانی طوفان کسی خونخوار شکاری درندے کی طرح ہمارے سروں پر دہاڑ رہا تھا۔ اب باہر یقیناً صبح ہو چکی تھی مگر اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ دن رات میں کچھ خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ قریباً ایک دو گھنٹے پہلے طوفان کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہوئی تھی لیکن اب پھر برفانی ہوائیں شدت سے سر پٹخنے لگی تھیں۔

کیا کوئی ہماری مدد کو آ سکے گا..... یا پھر چند گھنٹوں کے اندر یکے بعد دیگرے ہمیں یہیں پر جان دینا ہوگی؟ یہ وہ سوال تھا

جو برف کی ہیبلی قلم کی طرح میرے ذہن میں پیوست تھا۔

ماہین قریباً نیم بے ہوش تھی۔ میں نے اس کا زرد سفید گال تھپتھپایا۔ "ماہی..... ماہی، ہمت کرو..... خود کو سنبھالو..... جلد ہی موسم بہتر ہو جائے گا۔"

وہ خشک ہونٹوں کے ساتھ کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ جیکٹ میں پہلے ہی اسے پہنا چکا تھا، اب بھاری اونی سویٹر بھی اتار کر اس کی مجمد ٹانگوں پر پھیلا دیا۔ عمران بھی اس کے پہلو میں بے سدھ لیٹا تھا، اس نے دوبارہ اپنی جیکٹ کی زپ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ یقیناً وہ بھی میری طرح ماہین کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ماہین کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر عمران کے چہرے پر کرب کے سائے گہرے ہونے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کیے کیے اپنی اونی ٹوپی اتاری، اپنے دستانے اتارے..... اور اشارے سے مجھے کہا کہ میں یہ ماہین کو پہنا دوں۔ وہ بے چاری منفی ٹمپریچر کے قاتل جبڑوں میں تھی۔ ان چھوٹی موٹی اشیا سے اس کی کچھ خاص مدد ہونے والی نہیں تھی۔ گاہے گاہے اس کی سانس سینے میں بے طرح اُلجھنے لگتی تھی۔ شگافوں سے آنے والی برف کی بوچھاڑیں گاہے بگاہے ہم پر آرہی تھیں۔ عمران نے اپنے نیلگوں ہاتھ سے ماہین کی دودھیا کلائی کو چھوا۔ اس کی نبض ٹٹولی۔ "ماہی..... ماہی..... ہوش کرو..... پلیز ہوش کرو۔" وہ غنودہ سرگوشی میں بولا۔

ماہین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دو منٹ ایسے ہی گزرے، پھر وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑائی۔ "تم کیوں آئے تھے یہاں..... تم وہیں رہتے..... جہاں کے تھے۔ تم نے..... تم نے کیوں میرا سکون برباد کیا..... کیوں..... کانٹوں میں گھسیٹا مجھے؟" ماہین کا مخاطب یقیناً عمران تھا..... اور وہ جیسے خود ہی بے پناہ سردی کی مہلک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ماہین..... اور اگر کیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔"

ماہین نے غالباً عمران کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح ساکت پڑی رہی۔ "تم کیوں ہو ایسے..... تم کیوں ہو.....؟ تم میری جان لے لوگے..... تم مجھے مار ڈالو گے..... تم چلے کیوں نہیں جاتے..... گم کیوں نہیں ہو جاتے؟"

"چلا جاؤں گا..... گم ہو جاؤں گا..... تم جیسا کہو گی۔" وہ تسلی دینے والے لہجے میں بولا۔

تاہم لگتا یہی تھا کہ وہ غشی کی سی حالت میں ہے..... صرف بول رہی ہے۔ سن کچھ نہیں رہی۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے گہرے زرد کومل رخسار پر ایک آنسو پھسل کر وہیں جم گیا تھا۔

طوفان کی دھاڑیں پھر بلند ہو گئی تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شگاف بھی بند ہونے جا رہے ہیں۔ ٹارچ کی روشنی ہماری نبضوں ہی کی طرح مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ماہین کی نحیف بڑبڑاہٹ پھر ابھری۔ "ایسا مت کرو..... ایسا مت کرو..... پلیز یہ ٹھیک نہیں..... وہاں بہت ٹھنڈ ہے..... اچھا..... اچھا رکو۔"

ایک طویل وقفے کے بعد وہ پھر بڑبڑائی۔ لہجہ کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ "مجھے لے چلو عمران..... بہت دور..... یہاں سے بہت دور..... جہاں کوئی نہ ہو..... بس کوئی نہ ہو....."

اس کی سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔ عمران نے اس کا سر چوما۔ میں نے اسے بانہوں میں بھینچ کر اپنے جسم کی بچی کھچی حرارت اس کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ٹارچ بجھ گئی۔ اندازہ ہوا کہ چھت کے شگاف بھی برف سے ڈھک چکے ہیں، کیونکہ اب تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ نیکیاں پلٹ کر انسان کی طرف آتی ہیں۔ کہتے ہیں بھلائی کبھی رائگاں نہیں جاتی..... اور یہ بھی کہتے ہیں کہ قدرت کا حساس ترازو کبھی غلط نہیں تولتا۔ ذرّے کے ہزارویں حصے کے وزن کا حساب بھی رکھتا ہے۔

میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایک ایسے برفاب کنویں میں ڈوبتا جا رہا تھا جہاں برف ہی کے اژدہے میرے جسم سے لپٹے تھے اور مجھے بھینچ رہے تھے اور کنویں کی تہ میں کہیں آگ جل رہی تھی، مگر وہ آگ بھی یا دھوکا تھا۔ کیا ریگزار میں پانی کے سراب کی طرح برف زار میں آگ اور حرارت کا سراب بھی ہوتا ہے؟ میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا، کیا میں مر رہا ہوں؟

پھر ایکا ایکی مجھے لگا کہ برفیلے کنویں کی تہ میں آگ روشن تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی روشنی کنویں میں پھیل رہی ہے۔ برف کے اژدہے اپنی جان لیوا گرفت ڈھیلی کر رہے ہیں۔

تب ایک انسانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ اس دنیا کی آواز تھی یا کسی اور دنیا کی؟ میں نے بے حد مشکل سے اپنے منوں وزنی پپوٹوں کو اٹھایا۔ یقیناً ان پپوٹوں پر بھی برف کی تہ تھی۔ دراڑ کی چھت پر ایک بڑا شگاف نظر آ رہا تھا۔ اس شگاف میں سے ہلکا نیلا آسمان دکھائی دیتا تھا اور ایک چہرہ بھی..... یہ کس کا چہرہ تھا؟ یہ گندھارا کا چہرہ تھا لداخ کی وہی قابلِ ترین معالجہ جسے ہم نے موت کے ستون سے علیحدہ کر کے زندگی کی جانب بھگایا تھا۔

کون کہتا ہے نیکیاں پلٹ کر نہیں آتیں۔ نیکیاں اور

بھلائیاں کسی نہ کسی صورت ہماری طرف ضرور لوٹتی ہیں..... اور ایک بھلائی..... ایک بھلائی، شاید لوٹ آئی تھی۔

میں نے ٹھٹک کر اپنے پہلو میں دیکھا۔ میرے دونوں پیارے ساکت و جامد پڑے تھے۔ برف میں ڈھکے ہوئے اور برف ہی کی طرح سفید۔ میں نے آخر تک ان دونوں کو ڈھانپے رکھا تھا۔

میں نے عمران کو بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ "عمران..... عمران..... ہوش کرو..... عمران....."

وہ ساکت رہا..... مگر اس کے جسم میں ہونے والی ایک خفیف حرکت نے مجھے آگاہ کیا کہ اس نے ابھی زندگی کی سرحد پار نہیں کی۔

تب میں نے دہشت زدہ نظروں سے مایا بن کو دیکھا۔ اس کا جسم اکڑ چکا تھا۔ میں نے اسے بھی جھنجوڑا۔ کئی بار پکارا..... مگر لگا کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ میں نے دستانہ اتار کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا..... وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ میں اسے جھنجوڑنے لگا۔

عمران نے بھی اپنی جسمانی قوت جمع کی تھی اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسی اثنا میں گندھارا اور اس کا شوہر، شگاف کے اندر سے پھسلتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ گندھارا جھپٹ کر مایا بن کی جانب گئی، اس کی نبض ٹٹولی۔

گندھارا کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی۔ تب وہ اپنی شکستہ اردو میں ہم پر گرجی۔ "تم..... تم دونوں باہر نکلو..... جلدی کرو۔"

اس کے ساتھ ہی وہ مایا بن کے بالائی جسم کے کپڑے اتارنے لگی۔ گندھارا کے کسی ساتھی نے لکڑی کی سیڑھی اندر لگا دی تھی۔ میں تو کسی نہ کسی صورت باہر نکل آیا مگر عمران کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اسے گندھارا کے شوہر جورم نے سہارا دے کر باہر نکالا اور برف پر بچھے نمدے پر لٹایا۔ دراڑ کے اردگرد گندھارا کے قریباً چار ساتھی موجود تھے۔ جن میں اس کی وہ نوعمر شاگرد بھی تھی جو اس کے ساتھ ہی رامے، مائرہ اور کبڑی دیوی تورما کے شکنجے سے بچ کر نکلی تھی۔

گندھارا کی ہدایت پر اس کی شاگرد نے گندھارا کا ادویات والا چمڑے کا تھیلا اٹھایا اور شتابی سے سیڑھی اتر کر دراڑ میں چلی گئی۔ وہ قیامت کے لمحے تھے۔ ایسے لمحے بہت گراں ہوتے ہیں..... گزرنے میں نہیں آتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، نتیجہ کیا نکلے گا؟ باہر کا طوفان تو تھم چکا تھا لیکن اندر جو طوفان تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ کل دوپہر ہم غار میں واپس پہنچ گئے تھے۔ عمران کی حالت ابھی اچھی نہیں تھی۔ اس کا زیریں جسم اب بھی سردی کی مار سے متاثر تھا۔ چلنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ہلکا بخار بھی چل رہا تھا۔ میم مائرہ کی لاش کھائی کی برف میں دفن ہو چکی تھی۔ اسے وہاں سے نکالنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ جادو رامے کی لاش کے کچھ حصے بجرے ضرور ملے تھے، جنہیں وہیں کہیں برف میں دفنا دیا گیا تھا۔ اس کی آخری پکاریں ابھی تک میرے کانوں میں گونجتی تھیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مرتے وقت بھی وہ گالیاں ہی دے رہا تھا۔ اس بدبخت نے اپنی بدصورتی کو ہر خوب صورتی کا دشمن بنا رکھا تھا جن میں عورتیں سرفہرست تھیں۔ آخر میں عورتوں سے اس کی یہ دشمنی "محبت کی طلب" میں بدل گئی تھی۔ لیکن یہاں بھی اس کے جنون نے سفاکی کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ صنفِ مخالف کی محبت اور خود سپردگی پانے کا جو "بہترین" راستہ اس کی سمجھ میں آیا وہ یہی تھا کہ اس کی ہم نشیں عورت اسے دیکھ ہی نہ پائے۔

(وہ غلط تھا اور گمراہی کے عروج پر بھی..... اور اس کا ثبوت اس کا وہ جڑواں بھائی تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ نوے فیصد رامے سے مشابہ ہے لیکن بیرونِ ملک بیوی بچوں کے ساتھ ایک نارمل بلکہ قابلِ رشک زندگی گزار رہا ہے)

یہاں واپس آ کر ہمیں جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس کے مطابق دونوں اسکیمو ہائکر گاڑیوں کے وہ گیارہ کے گیارہ کتے زندہ غار میں واپس آ گئے تھے جنہیں ہم نے مہیب طوفان سے رہائی دلائی تھی۔

طاسبورہ نامی کشادہ ہال میں مایا رانی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اسی شان اور دبدبے کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ "لاش کا کیا کرنا ہے؟" مایا نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں مجھ سے پوچھا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ بے شک سردی ہے لیکن اسے زیادہ دیر رکھا بھی تو نہیں جا سکتا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں بزرگ یہی کہتے ہیں کہ آتما بے چین رہتی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ سب کچھ انسان کی توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔ قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ لڑائی کے دوران میں ہم نے منوہر سنگھ کو بچانے کی کتنی کوشش کی تھی، مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ بے شک چند ہی دنوں میں وہ ہمارے بہت قریب آ گیا تھا۔ ایک نہایت ہمدرد اور مددگار دوست۔ اب ہمیں اس کے بے جان جسم کو اس کے دھرم کے مطابق رخصت کرنا تھا۔

اسی دوران میں طاسبورہ کے داخلی راستے کا پردہ ہلا اور

گندھارا، نحیف و نزار مایا ین کو سہارا دیتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ دائیں طرف سے اس کی شاگرد نے مایا ین کو تھام رکھا تھا۔ مایا ین کا رنگ ابھی تک کورے لٹھے جیسا تھا۔ آنکھوں کے گرد نیلگوں حلقے تھے۔ مگر اس کے رخسار کے خوب صورت ڈمپل نے ابھی تک اپنی دلکشی پوری طرح نہیں کھوئی تھی۔

گندھارا نے اسے بڑی احتیاط سے ایک آرام کرسی پر نیم دراز کر دیا۔ مایا رانی نے محبت سے اس کا ماتھا سہلایا۔ ہاتھ چوما اور اپنے عقیدے کے مطابق طامبورہ کی مقدس آگ میں سے چند انگارے ایک طشتری میں نکلوا کر اس کے قریب رکھوائے۔

اسی دوران میں خوش پوش دراز قد ڈیرن فورڈ اجازت لے کر اندر آ گیا اور مایا رانی کے پاس ہی ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ دلچسپی سے مایا ین کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگلش میں مجھ سے کہا۔ "یہ ایک کرشمہ ہے، سنا ہے کہ اس کا جسم منجمد ہو چکا تھا۔"

"تقریباً ایسا ہی تھا..... قدرت نے گندھارا کے وسیلے سے اسے بچایا ہے۔ یہ یہاں کی بہترین معالجہ ہے اور کئی نسلوں سے ان کا یہی پیشہ ہے۔"

"مگر یہ معالجہ تم لوگوں تک پہنچی کیسے؟"

میں نے کہا۔ "اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں غار میں پانسا مکمل طور پر پلٹ چکا ہے اور مایا رانی دوبارہ اختیار اپنے ہاتھ میں لے چکی ہے۔ یہ یہاں واپس آ گئی اور طوفان مکمل طور پر تھمنے سے پہلے ہی کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ہماری تلاش میں لگ گئی۔"

"سنا ہے، اس نے اس خوب صورت لڑکی کی جان بچانے کے لیے زوب کے خطرناک زہر کو دوا کے طور پر استعمال کیا ہے؟ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔"

"بے شک استعمال کیا ہے مسٹر ڈیرن۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن مایا ین کو زہر کھلایا نہیں گیا بلکہ اس زہر سے تیار کردہ ایک خاص قسم کے آئل کو مایا ین کے منجمد جسم پر اپلائی کیا گیا اور میرے خیال میں تو یہ ایک بہانہ تھا، قدرت کو اس بچی کی زندگی منظور تھی۔ ورنہ اس کی نبضیں تقریباً ڈوب چکی تھیں۔"

مایا رانی نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے حسب معمول شکستہ ہندی میں کہا۔ "زوب وہ عجیب جانور ہے جو برف میں مکمل جم جانے کے کئی گھنٹے بعد بھی حرارت ملنے پر زندہ ہو جاتا ہے..... اس کا زہر بے حد قاتل ہے مگر گندھارا کی مہارت نے اسے تریاق کی شکل دی۔"

میں نے ڈیرن کے لیے مایا رانی کی بات کا ترجمہ انگلش میں کیا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ مقامی رواج اور عقیدے کے مطابق "مقدس" آگ کی حرارت دینے کے بعد مایا رانی نے مایا ین کو واپس اس کے کمرے میں بھجوا دیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ مایا رانی یہاں دوبارہ بااختیار تھی، مگر اس کے باوجود جگہ جگہ ڈیرن کے مسلح عینک پوش سفید فام گارڈز اور انڈین شوٹرز نظر آتے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں، ان کے مطابق مایا رانی اور ڈیرن کے درمیان ایک ڈیل ہوئی تھی۔ اس ڈیل کے مطابق مایا رانی کو یہاں اپنا اختیار واپس مل گیا تھا۔ اس کے بدلے مایا کو اس بات پر راضی ہونا پڑا تھا کہ وہ زوب کے صرف دو جوڑے یہاں رکھ کر باقی سب ڈیرن کو دے دے گی۔

شام کے وقت منوہر سنگھ کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ اس کی باقاعدہ ارتھی جلائی گئی تھی۔ میں اور عمران خود کو کافی دل گرفتہ محسوس کر رہے تھے۔ اس موقع پر حشام بھی موجود تھا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ حشام کے بارے میں ہمارے بدترین خدشات غلط ثابت ہو گئے تھے۔ وہ زندہ سلامت تھا۔ جب میں اور عمران بندی خانے سے فرار ہوئے اور ہماری لڑائی شروع ہوئی تو حشام نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو غار کے عام باشندوں کی بستی کے اندر ایک قصاب کے خالی گھر میں چھپا لیا۔ وہ تقریباً چھ گھنٹے تک وہاں محفوظ رہا اور پانسا پلٹنے کے بعد باہر آیا۔

باقی رہ گئی ہما عروج تو اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ غار کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی جو کیروسین آئل کی وجہ سے مزید بھڑکی تھی۔ کئی لاشیں اس میں کوئلہ ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ غار سے بھاگنے کی کوشش میں، ہما ارد گرد کی کسی دراڑ یا کھائی میں جا گری ہو۔ بعد ازاں شدید برفانی طوفان نے اسے دفن کر دیا ہو۔ کئی امکانات تھے۔ بہرحال کچھ دیگر افراد کی طرح اس کی تلاش بھی جاری تھی۔

رات کو اکیلے میں میری اور ڈیرن فورڈ کی ملاقات ہوئی۔ ہم غار کے آراستہ حصے کے ایک نیم گرم کمرے میں موجود تھے۔ شمع دان روشن تھا۔ دور کہیں غار کے کسی حصے میں مقامی میوزک کی آواز تھی۔ ڈیرن وسکی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں بہت سی ان کہی باتیں تھیں۔ ابھی ابھی نابینا ایلی اس کے پہلو سے اٹھ کر گئی تھی۔ وہ اسی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ کچھ بھی خرید سکتا تھا..... شاید ایلی کی بینائی بھی..... بلکہ یقیناً وہ ایسا کر سکتا تھا۔ ڈیرن نے میرا شکریہ بھی ادا کیا کہ میرے توسط سے اسے اور ایلی کو یہ خبر ملی تھی کہ ایلی کی رقیب اور دشمن ہول میم مائر واب اس دنیا میں نہیں۔

لیکن جو کچھ بھی تھا، ڈیرن ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ اس کی بے پناہ دولت نے بھی جرائم کے بطن سے ہی جنم لیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر کھوئے کھوئے انداز میں گویا ہوا۔ "یقیناً تم جان چکے ہو کہ اب تک کی جو بھاگ دوڑ بھی تم نے دیکھی ہے..... وہ زوب کے لیے تھی..... اور یہ ویکسین بنانے کے لیے نہیں بلکہ وارس بنانے کے لیے تھی۔"

"مسٹر ڈیرن! تم "تھی" کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہو۔ یہ بھاگ دوڑ اب بھی ہے۔ تم یہاں سے زوب لے کر جا رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ویکسین بنانے کے لیے نہیں۔"

اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "نہیں مسٹر ناہش! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا..... پچھلے چند ماہ نے مجھے بہت زیادہ..... ہاں بہت زیادہ بدل دیا ہے۔ ایلی کی جدائی نے میری کایا کلپ کی ہے۔ میں اب یہ سب چھوڑ کر کسی خاموش جزیرے میں بسنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ شاید میری دس نسلوں کی ضرورتوں سے بھی زیادہ ہے۔"

میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے وہسکی کا ایک اور بدبودار گھونٹ بھرا اور شمع دان کو تکنے لگا۔ "مسٹر ڈیرن!" میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر یہ زوب کیوں لے جا رہے ہو اپنے ساتھ؟"

"میں جانتا تھا، تم یہ پوچھو گے۔" وہ مسکرایا۔ "یہ ایک نایاب کیڑا ہے..... فارماسوٹیکل کی دنیا میں اس کے اور بھی کئی حیران کن استعمال ممکن ہیں..... ہمیں اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے یہ بحث طلب موضوع بدلا۔ "سنا ہے پرسوں تم واپس جا رہے ہو۔ یہاں سے پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر تمہارے دو عدد "ایم آئی 10" ہیلی کاپٹر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یہاں سے لے جانے کے لیے کھڑے ہیں؟"

اس نے عجیب انداز میں کہا۔ "تم بھی تو ہمارے ساتھی ہی ہو۔ میں اپنا اور ایلی کا اغوا تمہیں معاف کر چکا ہوں۔ ظاہر ہے یہ سب اس باسٹرڈ مائرہ اور جادوراے کے سبب ہوا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے، میں اور میرے تینوں ساتھی تمہارے ساتھ جائیں گے؟"

"بالکل میں ایسا ہی چاہوں گا۔ ہمارے پاس ہیلی کاپٹرز میں پانچ چھ مزید افراد کی گنجائش موجود ہے۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ "ہماری آمد پر یہاں جو شوٹ آؤٹ ہوا تھا، اس میں تم نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ تم اس تعاون کے حق دار ہو۔ ویسے بھی میں جی دار لوگوں کی قدر کرتا ہوں..... اور وہ تمہارا نوجوان ساتھی، کیا نام ہے اس کا آمرین؟"

"آمرین نہیں عمران۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں، اس کی وہ لپ ریڈنگ والی صلاحیت بھی کمال ہے۔ اس صلاحیت کو بھی اچھے طریقے سے کام میں لایا جا سکتا ہے....."

ان موضوعات پر کچھ مزید گفتگو ہوئی پھر میں نے پوچھا۔ "کیا ہم فضائی راستے سے پاکستان جائیں گے؟"

"یہی سمجھ لو..... اس حوالے سے تمام قانونی تقاضے پورے ہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

☆☆☆

عمران اب چلنے پھرنے کے قابل تھا اور کچھ کھا پی بھی رہا تھا۔ مایا بھی قدرے بہتر تھی۔ مایا کی ٹانگ سے وہ چھوٹا سا طاقتور بم علیحدہ کرنا کوئی آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ مگر میں اور عمران کسی نہ کسی طور کر گزرے تھے۔ اب وہ منحوس بم اس کے روز و شب کو عذاب میں مبتلا نہیں رکھ سکتا تھا۔

ہما عروج کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ مجھے اس حوالے سے تشویش تھی۔

ہم اس برفیلے دوزخ سے واپسی کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ رات کو مایا رانی نے ہمیں ایک پُرتکلف ڈنر دیا۔ اس ڈنر کا سب سے اہم تکلف گندم کی روٹی اور یخنی والے چاول تھے اور یہ دونوں چیزیں یہاں تقریباً نایاب تھیں۔

ڈنر کے بعد مایا رانی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ہم نے دیر تک باتیں کیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنے بزرگوں کے فرسودہ عقائد سے باہر نکلے۔ کڑی وحشیانہ سزاؤں کو ختم کرنے کا راستہ اپنائے۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق میں توازن برقرار کرے۔ مقدس زوب اور مقدس اگنی جیسے بہت سے توہمات، حقائق کے خلاف ہیں۔ ان سے بتدریج چھٹکارا پایا جائے۔

اس کی مہربانی ہی تھی کہ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کچھ الفاظ اس کے پلے نہیں پڑتے تھے ان کے لیے مجھے متبادل لفظ استعمال کرنا پڑے۔

آخر میں، میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "مایا! تم سکاٹ کی بے وفائی کا بدلہ پوری مرد جاتی سے اور خود سے مت لو۔ اس حادثے کو ذہن سے نکال دو۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ مسکرائی۔ "چلو تمہارے کہنے پر نکال دیا۔" میں نے پہلی بار اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک مختلف کیفیت دیکھی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی جلدی مان گئی ہو؟"

"کیسے یقین آئے گا؟" وہ ہنسی۔ "کیا تمہیں اپنا بابا کرنے کی پیشکش کردوں؟" پھر ایک دم اس نے چونک کر کہا۔ "جب تم بندی خانے میں تھے، میں نے تمہیں ایک انگوٹھی دی تھی؟"

میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

"نہیں، میں یہ واپس نہیں لوں گی۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔ پھر ایک لمحے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری کہی ہوئی باتوں پر غور کروں اور ان کو سنجیدگی سے لوں تو پھر..... تم یہ انگوٹھی پہن لو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں بھی مسکرایا۔

"کچھ نہیں ہوگا..... کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن تم کبھی نہ کبھی ہم سب کو یاد تو کرلیا کرو گے۔"

اس کے ملیح چہرے پر پہلی بار ایک گداز سا نظر آرہا تھا۔ میں نے انگوٹھی پہن لی۔

"یہی وقت تھا جب ایک کھڑکی دھماکے سے کھلی..... ایک چنگھاڑ سنائی دی اور کوئی اندھا دھند مایا پر جھپٹا۔ یہ کوئی اور نہیں قوی ہیکل گونگا تھا..... جو دراصل گونگا نہیں تھا۔ یہ غدشہ درست نکلا تھا کہ یہ موذی یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔

اس کے ہاتھ میں کوئی دو فٹ لمبی چمکیلی کٹار تھی۔ اس کا وار طوفانی تھا۔ مایا رانی نے بمشکل سر جھکا کر اپنی گردن بچائی۔ جہانان نے اتنی ہی پھرتی سے دوسرا وار مجھ پر کیا جو میری موٹی جیکٹ کو چیرتا ہوا گزر گیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنون تھا۔ مرنا اور مار دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مایا پر دوسرا وار کرتا، میں نے اس کی کلائی تھامی اور اس کے پیٹ میں گھٹنے کی ضرب لگائی۔ اس نے مجھے جوابی گھٹنا رسید کیا۔ قریباً تیس چالیس سیکنڈ تک میرے اور اس کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ مایا سمجھ گئی تھی کہ میں حملہ آور کو خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔ وہ ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ ان تیس چالیس سیکنڈ میں اس آراستہ کمرے کا کباڑا ہو کر رہ گیا۔ لیکن آخر میں جہاناں کا بھی کباڑا ہوا۔ میرے سر کی ضربات نے اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا تھا۔ کٹار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ جیت نہیں سکتا تو اس کٹار کو اس نے بڑی وحشت کے ساتھ اپنا گلا کاٹنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی توانا گردن سے خون کا فوارہ نکلا اور وہ کٹے شہتیر کی طرح اوندھے منہ قالین پر گرا۔ کئی پہریدار عورتیں بھرّا مار کر کمرے میں گھس آئی تھیں مگر اب ان کے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ اوندھا پڑا تھا اور قالین اس کے خون کو جذب کر رہا تھا۔ بظاہر یہ شخص رامے کا گونگا فورمین تھا مگر حقیقت میں اس کا خاص الخاص مخبر تھا۔

مایا رانی کمرے کے ایک کونے میں ساکت کھڑی تھی..... عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

دو روز بعد ہم اس وسیع و عریض غار اور اس میں بسے ہوئے لوگوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ یہ نسبتاً ایک شفاف اور چمکیلا دن تھا۔ برف کے سفید نشیب و فراز کے اوپر نیلگوں آسمان جھکا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں پتھریلی برف پر منعکس ہو کر منظر کو مزید روشن کر رہی تھیں۔

رخصت ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہمیں ایک اور سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس سوال کا تعلق ہماری ساتھی ہما عروج سے تھا۔ ایک مقامی رازداں شخص نے انکشاف کیا تھا کہ ہما عروج نے یہاں ایک قبول صورت مقامی نوجوان زیارت سے روحانی تعلقات پیدا کرلیے تھے۔ وہ یہاں کے پالتو بھیڑیوں اور کتوں کے تین رکھوالوں میں سے ایک تھا۔ پچھلے ہفتے جب میں اور عمران بندی خانے سے فرار ہوئے اور لڑائی شروع ہوئی تو زیارت نے ہما کے لیے شدید خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے یہاں سے نکال لیا۔ وہ ہنگامی طور پر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ڈھیں پٹاس، ہما عروج کا تکیہ کلام تھا اور غار میں ہونے والی ڈھیں پٹاس کے عین موقع پر ہی وہ ہوشیاری کا مظاہرہ کر کے نکل گئی تھی۔ وہ اور اس کا مسلمان پریمی لداخ یا کارگل وغیرہ کی طرف نہیں بلکہ ویرانے کی طرف نکلے تھے۔

جب تک زندگی باقی رہتی ہے، گم ہو جانے والوں سے ملنے کی امید بھی باقی رہتی ہے۔ مجھے اور عمران کو بھی امید تھی کہ ہما عروج سے بھی نہ بھی پھر ملاقات ہوگی۔

وقتِ رخصت ڈیرن فورڈ اور ایلی سمیت ہم پانچ بڑی برفانی گاڑیوں پر سوار تھے۔ ایک علیحدہ گاڑی صرف ان مخصوص پنجروں کے لیے تھی جن میں زہریلے زوب اور ان کی خوراک سفید چوہے بڑی حفاظت سے بند تھے۔ حشام اور عمران ایک نشست پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میں اور ماہین تھے۔ ماہین نے ایک بار بھی حشام کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں تو میں نے مڑ کر غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ وہاں مایا رانی قبیلے کے درجنوں معزز باشندوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہ الوداعی انداز میں کچھ بول رہے تھے۔ مایا رانی کے پہلو میں اس کا لمبا تڑنگا نکونا باکر کھڑا تھا..... اور اس نے محبت سے باکر کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میں نے اور عمران نے مایا کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ہاتھ ہلانے کا رواج شاید یہاں نہیں تھا..... وہ بس مسکرا کر رہ گئی اور سر کو اثباتی انداز میں حرکت دی۔

اب ہمارا رخ کوئی پندرہ کلومیٹر دور اس مقام کی طرف تھا جہاں دو

"آئی ایم" ہیلی کاپٹر ہمارے منتظر تھے۔

☆☆☆

واپسی کے سفر کی مکمل رُوداد بتائی جائے تو یہ طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ دونوں ہیلی کاپٹرز نے لداخ کے اس برف زار سے پرواز کی جس ہیلی کاپٹر میں میرے علاوہ عمران، حشام اور ماہین تھے اسی میں ڈیرن، ایلی، ڈیرن کا جاپانی گارڈ اور کچھ دیگر قریبی ساتھی بھی موجود تھے۔ زوب کے پانچ بچے بھی بڑی احتیاط سے اسی ہیلی کے زیریں حصے میں رکھے گئے تھے۔ جو اسلحہ وغیرہ یہ لوگ لائے تھے، اس کا بیشتر حصہ بھی ہیلی کے لگیج پورشن میں رکھ دیا گیا تھا۔ دوسرا ہیلی کاپٹر کچھ آگے جا کر ہم سے علیحدہ ہو گیا، ہمارے والے ہیلی نے "تاجکستان" کے اوپر سے پرواز کی اور پھر افغانستان کی فضائی حدود استعمال کرتے ہوئے رات نو بجے کے لگ بھگ بالکل ویران پہاڑوں میں پاکستانی بارڈر کے قریب کہیں اتر گیا۔ چاروں طرف لق و دق بے آب و گیا بلندیاں تھیں۔ دور دور تک کہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک ہموار سطح پر اترنے کے بعد ہیلی کاپٹر کے انجن بند کر کے ساری لائٹس آف کر دی گئیں۔

پروگرام کے مطابق اب افغان بارڈر فورس کے تین ارکان نے ہمیں حفاظت کے ساتھ سرحد پار کرانا تھی۔ بارڈر کی دوسری طرف کچھ ہی فاصلے پر ایک لینڈ روور جیپ مع ڈرائیور ہمارے لیے موجود تھی اور اس نے ہمیں کہیں نل یا کوہاٹ کے علاقے میں ڈراپ کر دینا تھا۔ یقیناً امیر و کبیر ڈیرن نے ان سہولت کاروں کو منہ مانگے دام دیے تھے۔

ماہین کچھ ڈری ہوئی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اطمینان رکھو۔ ڈیرن کی حیثیت اس وقت ہمارے ساتھی اور دوست کی ہے۔"

"لیکن کیا واقعی وہ دوست ہے؟" عمران نے جوابی سرگوشی کی۔

ڈیرن کی نشست ہم سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے عمران کو زبان بندی کا اشارہ دیا۔

وقتِ رخصت ڈیرن نے مجھ سے باقاعدہ معانقہ کیا۔ ہولے سے بولا۔ "فی الوقت تمہارے ملک کی پولیس اور ایجنسیاں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ ابھی تو پاکستان نہیں آسکوں گا۔ مگر جلد ہی کہیں نہ کہیں ہماری ملاقات ضرور ہو گی۔ میں تم جیسے لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کسی وقت کوئی بھی ضرورت ہو تم فوراً مجھ سے "ہاٹ لائن" پر بات کر سکتے ہو۔"

ہاٹ لائن کا لفظ اس نے اس بیش قیمت سیٹلائٹ فون کے لیے استعمال کیا تھا جو لداخ سے روانگی سے پہلے اس نے مجھے تحفے میں دیا تھا اور صرف مجھے ہی نہیں، یہ فون اس نے عمران کو بھی گفٹ کیا تھا۔ الوداعی گفتگو کے بعد ہم نے ڈیرن اور ماہین ایلی سے ہاتھ ملائے جو ڈیرن کے کندھے سے لگی خاموش کھڑی تھی۔

تینوں سہولت کار پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے دو بارڈر فورس کی وردیوں میں تھے اور ایک شلوار قمیص اور پگڑی میں تھا۔ اس نے بھاری گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ ان تینوں نے ہمیں بخوبی وہ نادیدہ لائن عبور کرا دی جسے درمیانی سرحد کہا جا سکتا تھا۔ ہم ایک ڈھلوان پر چڑھے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک نیم پختہ راستہ اور اس پر کھڑی لینڈ روور جیپ دکھائی دی۔ دروازے کھلے تھے۔ ہم درمیانی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ شلوار قمیص والے سہولت کار نے بتایا تھا کہ ہم چونکہ ذرا جلدی پہنچ گئے ہیں اس لیے پٹھان ڈرائیور کے آنے میں بیس تیس منٹ لگیں گے۔

جیپ کے اندر داخل ہوتے ہی ہوا کی شدید کاٹ اور سردی میں کمی محسوس ہوئی۔ حشام مسلسل خاموش تھا۔ اس نے پورے سفر میں بس دو چار بار ہی زبان کھولی تھی۔ ماہین سے تو اس نے غالباً آنکھ تک نہیں ملائی تھی۔ لگتا تھا کہ مایا رانی کی انوکھی آزمائش نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

عمران بھی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس نے نشیب میں دور کھڑے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا جو اب غالباً دوبارہ پرواز کی تیاری میں تھا۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ "کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ ڈیرن فورڈ جو کہہ رہا ہے، وہ درست ہے۔ وہ اس نایاب جانور کو اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرے گا جس کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ میرا مطلب ہے وائرس کی تخلیق؟"

"نہیں عمران! مجھے مکمل یقین نہیں ہے۔ رائے، میم مائرہ، یوزدی اور ڈیرن جیسے سب لوگ دولت کو خدا مانتے ہیں۔ ڈیرن تھوڑا سا مختلف ضرور ہے مگر ہے وہ بھی اسی قبیل سے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

عمران اور ماہین نے ایک ساتھ حیرت سے میری طرف دیکھا۔ عمران بولا۔ "تو پھر آپ نے ایسا کیوں کیا..... میرا مطلب ہے کہ اس ساری بھاگ دوڑ اور خون خرابے کا کیا حاصل..... جب ڈیرن یہ زوب اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔"

"وہ ساتھ لے کر نہیں جا رہا عمران۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"م..... میں کچھ سمجھا نہیں؟"

اب عمران اور ماہین کے علاوہ حشام بھی میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے وہ سیاہ رنگ کا چھوٹا سا لیکن طاقتور ریموٹ نکالا جو اس سے پہلے رائے اور مائرہ کے

پاس تھا اور وہ اس کے "ڈراوے" سے ہر وقت ہمارا دم خشک رکھتے تھے۔ میں نے ریموٹ عمران کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ اس بات کی گارنٹی ہے کہ زوب والے پنجرے ڈیرن فورڈ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

"آ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ماہین کی ٹانگ سے جو طاقتور بارودی ڈیوائس اٹیچ کیا گیا تھا، وہ اس وقت سامنے اس ہیلی کاپٹر کے کارگو پورشن میں ہے۔ وہاں کافی ایموونیشن بھی ہے جس میں کوئی روڈرجن ویٹ گرینیڈز بھی ہیں..... اور تمہیں پتا ہی ہے زوب والے پانچوں پنجرے بھی کارگو پورشن میں ہی ہیں....."

عمران کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ کئی سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "تو کیا..... آپ..... بلاسٹ کرنے جا رہے ہیں؟"

"دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے؟" میں نے اطمینان سے کہا اور جیکٹ کی اندرونی جیب سے وہ قیمتی سیٹلائٹ فون نکال لیا جو ارب پتی ڈیرن فورڈ نے ہمیں تحفے میں دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے پر آہستہ آہستہ گھومنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے ڈیرن فورڈ کا نمبر ملایا۔ فوراً رابطہ ہوا۔ "ہیلو، خیریت ہے مسٹر تابش!" دوسری طرف سے امریکن لہجے میں پوچھا گیا۔

"ایسی کوئی خاص خیریت نہیں ہے مسٹر ڈیرن!" میں نے جواب دیا۔ "تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جب پھر ضرورت پڑے رابطہ کر لینا..... رابطے کی ضرورت جلدی پڑ گئی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تمہارے..... ہیلی..... میں بم ہے ڈیرن!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میرے دل میں تمہارے اور ایلی کے لیے تھوڑی سی ہمدردی موجود ہے۔ اس لیے میں تمہیں صرف تین منٹ دے رہا ہوں۔ اپنے ساتھیوں سمیت ہیلی سے نکل جاؤ..... صرف تین منٹ، اس کے بعد اپنی موت کے تم خود ذمے دار ہو گے۔"

"یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ ہکلایا۔ میرے لہجے نے اسے لرزا دیا تھا۔

"تمہارا ٹائم شروع ہوتا ہے اب..... تین منٹ مطلب 180 سیکنڈ۔" میں نے فون بند کر دیا۔

وہ بے حد سنسنی خیز لمحے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ "تم تاریں جوڑ کر جیپ اسٹارٹ کرو۔"

عمران اس کام میں کائیاں تھا۔ اس نے ایک منٹ میں جیپ اسٹارٹ کر لی۔ یہی وقت تھا جب ہم نے نیم تاریکی میں دیکھا کہ ڈیرن اور اس کے مسلح ساتھی افراتفری میں ہیلی کاپٹر سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ نہ صرف باہر نکلے بلکہ لڑکھڑاتے ہوئے سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ زوب نایاب حشرات الارض میں سے تھا، لیکن نہایت زہریلا اور خطرناک..... اور اس کی سب سے بڑی خطرناکی یہی تھی کہ وہ کسی ایسے وائرس کی تخلیق کے لیے استعمال ہو سکتا تھا جو ایک وبا کی صورت دنیا کو موت کی ایک نئی یلغار کے حوالے کر دیتا..... تین منٹ پورے ہوتے ہی میں نے سیاہ ریموٹ کا COVER ہٹا کر سرخ بٹن دبا دیا۔ ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ پہلے ایک چھوٹا بلاسٹ ہوا، پھر ایک فلک شگاف دھماکے نے نصف ہیلی کاپٹر کے پرخچے اڑا دیے اور باقی حصہ آگ کا گولا بن گیا..... میرے اشارے پر عمران نے جیپ کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ ہم نوے درجے کا موڑ کاٹ کر ٹھیک ٹھاک رفتار سے ڈیورنڈ لائن سے دور ہٹنے لگے۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے دور نکل جاتے، اتنا ہی بہتر تھا۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے کے ناہموار سفر کے بعد ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے اور پھر پختہ سڑک پر تیز رفتاری سے خرلاچی اور پارا چنار کی طرف بڑھنے لگے۔ عمران نے کہا۔ "ایک سوال مسلسل دماغ میں گھوم رہا ہے۔ آپ بتائیں گے؟"

"پوچھو۔" میں نے جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا جہاں اب چاند کی خمار ی ہوئی روشنی تھی۔

"ہم نے سب زوب ختم کر دیے۔ لیکن زوب کے دو جوڑے تو ابھی تک وہاں مایا رانی کے قبیلے کے پاس موجود ہیں۔"

"وہ نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "غار سے ہماری روانگی سے آدھ گھنٹا پہلے وہ دونوں جوڑے بھی ڈیرن کے پاس پہنچ چکے تھے۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے، ایک مقامی عورت نے بہت بھاری رشوت کے عوض یہ دو جوڑے عین وقت پر ڈیرن کو پہنچا دیے تھے۔"

عمران اور ماہین حیرت سے میری جانب دیکھنے لگے۔

"ڈیرن فورڈ جیسے لوگ اجارہ دار ہوتے ہیں عمران۔ ڈیرن کو بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ زوب کے یہ آخری دو جوڑے یہاں رہیں اور کوئی اور طلب گار ان تک پہنچ جائے۔"

"یعنی مایا رانی سے بھی دھوکا ہوا۔" ماہین منمنائی۔

"میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا ماہین..... ان لوگوں کو اپنے فرسودہ عقیدوں کے جال سے نکلنے میں مدد ملے گی۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زوب کی موجودگی میں ان کے علاقے میں کوئی بڑا برفانی طوفان نہیں آ سکتا۔ چند روز پہلے اس مفروضے کو ہم نے اپنی نگاہوں کے سامنے غلط ہوتے دیکھا تھا..... اور پتا نہیں ایسے کتنے توہم ہیں ان لوگوں کے۔"

"یعنی اب زوب ناپید ہے؟" عمران نے طویل سانس لی۔

"یقیناً ایسا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

یہی وقت تھا جب حسب توقع سیٹلائٹ فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف ڈیرن فورڈ ہی تھا۔ مجھے معلوم تھا اس نے بہت ماتم کرنا ہے۔ میں نے کال ریجیکٹ کی پھر ایک وائس میسج اس کے لیے ریکارڈ کروایا۔ "ڈیرن فورڈ! جو ہوا اسے بھولنے کی کوشش کرو، کیونکہ اس کو ریورس نہیں کیا جاسکتا..... اور ہاں دوسروں کو بے وقوف سمجھنا بھی چھوڑ دو۔ اور ایک وارننگ بھی تمہیں دینا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جلد یا بدیر تمہارا دل دوبارہ پاکستان میں گھسنے کو مچلے۔ یہ بھول نہ کرنا۔ صرف پولیس اور ایجنسیاں ہی نہیں، اس مرتبہ تم مجھے بھی اپنے راستے میں کھڑا پاؤ گے، گڈ نائٹ۔"

میسج بھیج کر میں نے فون آف کردیا۔

صبح کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی ہم آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ آٹھ دس میل آگے جاکر ہمیں لب سڑک ایک صاف ستھرا چھپر ہوٹل نظر آیا۔ بھوک شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور جیپ وہاں روک دی۔ "حشام! چلو آؤ کچھ کھا لیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں، میں یہاں ٹھیک ہوں۔" اس نے نخوت سے چھپر ہوٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اپنے بیگ میں سے اُن امپورٹڈ بسکٹس کا ایک ڈبا نکال لیا جو وہ ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ ہم تینوں ہوٹل کے سامنے بچھی چارپائیوں پر آبیٹھے۔ اب دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ قریب ہی ایک بڑی لگژری جیپ میں سے بڑے سے پگڑ والے کوئی پیر صاحب نکلے تھے۔ درجنوں لوگ ان کے اردگرد جمع تھے۔ ان کے ہاتھ چوم رہے تھے، انہیں ہار پہنا رہے تھے۔ میں نے سوچا، کوئی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا۔ کسی کو معلوم نہیں، ہم کن تکالیف اور مصائب کو جھیل کر یہاں تک پہنچے ہیں..... اور یہ سب کچھ ہم نے کیوں جھیلا ہے؟ وہ کون سی آفت تھی جو قدرت نے ہم ناچیز بندوں کے وسیلے سے ٹالی ہے۔ ٹروت، کمسن ندیم اور لاہور کے پٹھان لڑکے جیسے اَن گنت لوگ کس "قاتل مسیحا" سے محفوظ ہوئے ہیں۔ ہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا اور ہمیں اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ چھپر ہوٹل کے سامنے سے اٹھتے ہوئے سفید دھوئیں کے اوپر نیلا آسمان تھا..... ہاں نیلا آسمان تو تھا۔

چائے، پکھن کا پراٹھا اور ہوم میڈ بسکٹس ہمارے سامنے آئے تو ماہین نے ایک چھوٹے بسکٹ کے سوا اور کچھ نہ لیا۔ میں نے کہا۔ "اگر کچھ لینا نہیں ہے تو گاڑی سے نکل کر سردی میں کیوں آئی ہو؟"

"بس وہاں بیٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔" وہ عجیب انداز میں بولی۔

اس کا انداز ہمیں سب کچھ سمجھا رہا تھا۔

ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی، اس کے لمبے بال ہوا میں اُڑتے رہے۔ پھر وہ عمران کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولی۔ "عمران شکریہ۔"

"کس بات کا؟"

"کوئی ایک بات ہو تو کہوں۔"

"کچھ اور بھی کہنا ہے تو کہہ دو۔" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ "نہیں انکل تابی..... اور کچھ نہیں۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ آج پہلی بار ماہین کو اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ وہ میرے اور عمران کے ساتھ بیٹھی ہے اور حشام حمید دیکھ رہا ہے۔

خاموشی ذرا طویل ہوئی تو عمران کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اٹھ نہ جائے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "اچھا ماہین! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیونکہ لڑکیاں، لڑکیوں کی نفسیات اچھی طرح سمجھتی ہیں۔"

وہ سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "ایک لڑکی ہے جو سوتے میں بڑبڑاتی ہے..... اور میرے دوست سے محبت کا اظہار کرتی ہے، لیکن جاگتے میں ایک لفظ بھی بول کر نہیں دیتی۔ بالکل بیگانی بنی رہتی ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟"

"مم..... میں سمجھی نہیں۔" وہ اُلجھ کر بولی۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ میں کسی دن اس لڑکی سے تمہیں براہِ راست ملواؤں گا۔ آپ کا کیا خیال ہے چاچو جان؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

"جیسا تم مناسب سمجھو۔" میں نے کہا۔ اور ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر سڑک کی طرف نکل گیا۔ کھڑا ہوکر ان شمالی پہاڑوں کے پار دیکھنے لگا جہاں دور کہیں ایک برفستان میں سرخ بالوں والی میم مائر دفن تھی اور اس درندہ صفت کے چیتھڑے دفن تھے جس کا نام جادوراے تھا اور جس نے اپنی بدصورتی کا انتقام ساری دنیا سے لینے کا تہیہ کررکھا تھا۔

سکین بائی اظہار اختر شاہین

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کے سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... بہار مغربی ماحول میں گلابی جاڑوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضاؤں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور سازشوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پس پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے سنہرے جذبوں نے خود کو منوالیا۔

اجنبی لڑکیوں میں اپنا جیون ساتھی تلاش کرنے والے لڑکے
کی کتھا جنہوں نے اپنوں کے سیل روپ سے بے خبر رہ



جولائی کا مہینا تھا۔ لاہور میں تو موسم کافی گرم تھا مگر یہاں جرمنی میں بہار جیسی صورت حال تھی۔ ویسے بھی وہ سہ پہر بڑی چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ شامیر جب فرینکفرٹ کے انتہائی مصروف ائرپورٹ پر اترا تو تقریباً تین بجے کا وقت تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ائرپورٹ سے اسے ادارے کا ایک نمائندہ ریسیو کرلے گا۔ اس کی رہائش وغیرہ کا انتظام بھی اسی نمائندے نے کرنا تھا۔ پتا نہیں کیوں شامیر کے ذہن میں نمائندے کا تصور ایک ادھیڑ عمر، نیم گنجے، سرخ چہرے والے جرمنی کا تھا۔ تاہم جب شامیر امیگریشن سے فارغ ہوکر آگے بڑھا تو اس کا یہ خیال سو فیصد غلط ثابت ہوگیا۔ نمائندہ ادھیڑ عمر نہیں بلکہ جوان تھا۔ گنجا یا نیم گنجا بھی نہیں تھا..... اور جرمن بھی نہیں تھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ نمائندہ بھی نہیں تھا بلکہ "نمائندی" تھی، یعنی لڑکی۔

"ہیلو سر! میرا نام زویا ہے۔ آپ یقیناً شامیر ہیں۔ میں آپ کو ریسیو کرنے آئی ہوں۔" اس نے شامیر سے ہاتھ ملاتے ہوئے انگلش میں کہا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں شامیر کی کارڈ سائز تصویر تھی۔

"تھینک یو۔" شامیر نے مختصر جواب دیا۔

شامیر کا سامان بس ایک اٹیچی اور ایک لیپ ٹاپ پر مشتمل تھا۔ اس نے سامان ٹرالی پر رکھا اور ایک بار پھر اپنی میزبان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ چھریرے جسم کی بائیس تیئس سالہ قبول صورت لڑکی تھی۔ موسم کی مناسبت سے آدھی آستینوں والی پھولدار شرٹ اور کریم رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔

چند برقی زینوں سے اوپر نیچے آنے کے بعد وہ دونوں ائرپورٹ کی حدود سے باہر آگئے۔ مختصر سامان ٹرالی سے اتار لیا گیا۔ شامیر دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کرچکا تھا۔ تاہم یورپ میں اس کی یہ پہلی انٹری تھی۔ اپنی چاروں جانب گورے چٹے سرخ وسپید جرمن اور دیگر یورپی باشندوں کو دیکھ کر اسے اچھا لگا۔ زویا اسے لے کر ایک تیز رفتار سٹی ٹرین میں آن بیٹھی۔ فرینکفرٹ کا پہلا نظارہ شامیر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک خوبصورت جدید شہر، بلند و بالا عمارتوں اور تمام تر شہری سہولتوں سے مزین۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے قابل تھا مگر اس کے باوجود کوئی بات تھی جو شامیر کو دوبارہ بڑے دھیان سے زویا کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس دبلی پتلی خوش نما لڑکی میں ایک خاص قسم کی کشش تھی جو نگاہ کو اپنے اندر جذب کرتی تھی۔ شامیر جس نیوز چینل کے لیے کام کرتا تھا، زویا بھی اسی سے منسلک تھی اور اس کی حیثیت مقامی نمائندے کی تھی یعنی اس کا تعلق بھی شعبۂ صحافت سے تھا تاہم دیکھنے میں وہ کوئی لاابالی یا من موجی آرٹسٹ ہی لگتی تھی۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اردو بھی بول سکتی ہیں۔" شامیر نے انگلش میں کہا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "جو کچھ میں بولوں گی، وہ اردو تو نا ہی ہوگی، مگر آپ تھوڑا بہت انڈراسٹینڈ کرلیں گے۔"

"اس کو ہم اپنی زبان میں گلابی اردو کہتے ہیں۔" شامیر نے کہا۔ "مگر آپ نے یہ سیکھی کہاں سے؟"

"دراصل..... میرے فادر انڈین ہیں اور ماما جرمن۔ گھر میں پاپا اکثر اردو بولتا۔ کچھ کچھ ہم بہن بھائیوں کے کانوں میں پڑتا رہتا۔" وہ پھر مسکرائی اور اس کے ایک گال میں ہلکا سا گڑھا پڑا۔

سبک رفتار سٹی ٹرین مختلف اسٹاپس پر رکتی چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ شامیر نے زویا سے پوچھا۔ "آپ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہیں؟"

"نا ہیں۔" اس نے دائیں بائیں سر ہلایا اور اس کے لمبے شہد رنگ بال سرک کر اس کے دونوں رخساروں کو ڈھانپنے لگے۔ "میں اکیلا رہتی..... اور وہ ڈونوں (دونوں) بھی علیحدہ علیحدہ رہتے۔ یہ..... ایک لمبا کہانی۔"

زویا کے بتائے بغیر ہی شامیر اس "لمبا کہانی" کا سیاق و سباق سمجھ گیا۔ وہی سب کچھ جو مغربی معاشرے کا حصہ ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ زویا کے والدین کی علیحدگی ہوچکی تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ دونوں ایک اسٹاپ پر اترے۔ شامیر نے انگڑائی لے کر اردگرد نگاہ دوڑائی۔ شفاف سڑکیں، چمکتی دمکتی گاڑیاں، روشن روشن چہروں والے لوگ..... سبزہ اور آلودگی سے بالکل پاک ہوا جس میں اردگرد کا ہر منظر اجلا دکھائی دیتا تھا۔

ٹرالی اٹیچی کھینچتا ہوا شامیر اپنی میزبان زویا کے ساتھ ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے پہنچا۔ معلوم ہوا کہ زویا یہیں پر اپنی ایک لبنانی سہیلی خشامہ کے ساتھ رہتی ہے۔ خشامہ بھی زویا کی طرح اکیلی تھی اور ایک مقامی آفس میں جاب کرتی تھی۔ وہ فی الوقت آفس گئی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں طے کرکے وہ دونوں ایک مختصر فلیٹ میں پہنچے بلکہ فلیٹ بھی کیا یہ ایک ہی کشادہ کمرا تھا۔ اس مستطیل کمرے کے ایک حصے کو کچن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں دو مختصر لیکن آرام دہ بیڈ لگے ہوئے تھے۔ یہاں ایک اسٹور روم نما کمرا

اور بھی تھا لیکن یہ اتنا چھوٹا تھا کہ یہاں بستر نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ شامیر کو یہ جان کر زیادہ تعجب نہیں ہوا کہ اسے انہی دو لڑکیوں کے ساتھ بڑے کمرے میں رہنا ہوگا۔ مقامی معاشرے اور رہن سہن میں یہ سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ مغربی معاشروں میں ہر کوئی اپنے حال میں مگن نظر آتا ہے۔ شاید کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ اس قسم کی ''ذاتیات'' پر توجہ دے۔

کمرے کی دیواروں پر راک اسٹارز کی چند تصویریں نظر آئیں۔ آڈیو سسٹم، کمپیوٹر، گیمز کے لیے جوائے اسٹکس، ایک خوبصورت تپائی پر چند فیشن میگزینز..... یہ چیزیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کمرے کی دونوں رہائشی لڑکیاں یا پھر ان میں سے کم از کم ایک، خاصی آزاد خیال ہے۔ بہرحال شامیر کو ان معاملوں پر سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہاں ایک اہم آفیشل ٹاسک پر آیا تھا اور جلد از جلد اس کام کو نمٹا دینا چاہتا تھا۔ شامیر اپنے نیوز چینل کے ساتھ ایک محقق صحافی کے طور پر وابستہ تھا۔ پچھلے چند برسوں میں اس نے ''انویسٹی گیٹو جرنلزم'' میں کافی نام کمایا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تحقیق اور جستجو کا مادہ اس میں فطری طور پر موجود تھا۔ اس کے باس عظمت سلطان صاحب کہا کرتے تھے کہ شامیر اگر صحافی نہ ہوتا تو شاید کوئی کائیاں پولیس آفیسر ہوتا یا بال کی کھال اتارنے والا کوئی اور کریکٹر۔

یہاں فرینکفرٹ میں اس کی آمد کی وجہ بھی ایک اہم رپورٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ پاکستانی چینل جس اسٹوری پر کام کر رہا تھا، وہ ایک سیاستدان کی بیرون ملک خفیہ پراپرٹی کے متعلق تھی۔ اب تک جو کام ہوا تھا، اس کے مطابق یہ بات کنفرم ہوگئی تھی کہ یہ پراپرٹی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں کہیں ہے..... تاہم ابھی تک اسے ''ٹریس'' نہیں کیا جاسکا تھا۔

''آپ کس سوچ میں گم ہوگئے ہیں؟'' زویا کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

''اوہ، کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ ٹائم ضائع کرنے کے بجائے آج ہی کام شروع کردوں۔''

''اوئے ہوئے، اتنا بھی تیزی اچھا نہیں ہوگیں گا۔ آپ ابھی لمبے سفر سے آیا۔ کچھ کھائیں پئیں گا۔ ریسٹ کریں گا تو اچھا ہوگیں گا۔'' وہ گلابی اردو میں بولی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ریفریجریٹر میں سے ایک کنگ سائز کا ڈونر شامیر کے لیے نکال لیا۔ ساتھ ہی کچھ چپس اور کوک تھی۔ اس کے علاوہ بالکل سبز چکیلے سیب تھے۔ وہ غالباً پہلے سے انتظام کر کے ائرپورٹ گئی تھی۔ اس نے چکن اور سلاد سے بھرا ہوا ڈونر شامیر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو کر کھائیں، یہ ہنڈرڈ پرسنٹ حرام گوشت سے بنا ہے۔''

''حرام گوشت؟'' شامیر حیران ہوا۔

''سس..... سوری..... ہام کا مطلب..... حلال..... ہام خود بھی پکا پکا مسلمان۔ ہام کے گھر میں کبھی بھی حرام چیز نا ہیں پکا۔ پاپا اس بارے میں بہت سخت۔ ماما بھی ایسی غلطی کرتا تو بہت لڑائی ہوتا تھا.....''

شامیر کو واقعی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چار پانچ منٹ میں پورے ڈونر کو معدے کا راستہ دکھا دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ہام واپس آفس جاتا۔ شام آٹھ بجے تک آجائیں گا۔ ہوسکتا ہے کہ ہام سے پہلے خشامہ آجائے۔ بہت اچھا لڑکی۔ آپ کو ڈیکھنے کے لیے بہت بے چین۔ اس نے چینل کے لیے آپ کا وہ ونڈرفل رپورٹ دیکھا تھا جس میں گھروں کے اندر کام کرنے والی خواتین کا بہت سا پرابلمز ڈسکس کیا گیا تھا.....''

کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ شامیر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کچھ دیر واقعی آرام کر لینا چاہیے لیکن اس سے پہلے اس نے پاکستان میں خالہ کو فون کرنا ضروری سمجھا۔ وہ واقعی شدت سے اس کی کال کا انتظار کر رہی تھیں۔ اپنے والدین کی جدائی کے بعد شامیر کو خالہ نے ہی ماں بن کر پالا تھا۔ بے حد خیال رکھتی تھیں اس کا..... اپنے کام کے سلسلے میں شامیر کو اکثر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ خاص طور سے جب اسے کہیں بیرون ملک جانا ہوتا تو وہ بہت بے چین ہوجاتی تھیں۔ خالہ ثمینہ کو اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دے کر اور ان کی لمبی چوڑی ہدایات سن کر وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔

وہ کسی آہٹ کی وجہ سے جاگا تھا۔ کسمسا کر سامنے دیکھا تو ایک قیامت کھڑی تھی۔ نہایت چست پتلون اور بغیر آستین کی شرٹ میں ملبوس ایک سروقد لڑکی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے محویت سے شامیر کو دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' وہ انگلش میں بولی۔

''مجھے بھی۔'' شامیر نے کہا۔ ''آپ یقیناً زویا کی فرینڈ خشامہ ہیں؟''

''میں اس کی فرینڈ نہیں، وہ میری فرینڈ ہے..... کیونکہ اس فرینڈ شپ کا آغاز میں نے ہی کیا تھا۔ وہ تو ایک نمبر کی آدم

تو ادا کی ہے..... بالکل چپ اور اپنے آپ میں مگن۔"

"مجھے تو کوئی ایسی بات نہیں لگی۔ ہاں، شاید آپ کچھ زیادہ ہی سوچتی ہیں۔" شامیر نے اٹھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے تراشیدہ براؤن بالوں کو گردن موڑ کر جھٹکا دیا اور کھل کر مسکرائی۔ دونوں سہیلیاں ہی شوخ تھیں مگر یہ خشاء کچھ زیادہ ہی چنچل نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ نقوش کے اعتبار سے وہ کچھ زیادہ پرکشش نہیں تھی، تاہم مسکراتے ہوئے کچھ بہتر لگتی تھی۔ اس کا برانڈ لباس اس کی طبع کی عکاسی کرتا تھا۔

آٹھ بجے زویا واپس آگئی۔ وہ کھانا ایک ترک ہوٹل سے لے کر آئی تھی۔ روسٹ چکن، تلے ہوئے آلو اور چاول وغیرہ تھے۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سونے کا وقت ہوگیا۔ بیڈ دو ہی تھے تاہم زویا نے ایک صاف ستھرے میٹریس کا انتظام کرلیا تھا۔ خشاء نے تو پہلے ہی ایک بیڈ پر لیٹ کر اونگھنا شروع کردیا۔ شامیر چاہتا تھا کہ دوسرے بیڈ پر زویا سوئے لیکن وہ نہیں مانی۔ اس نے بہانہ بنایا کہ اس کی کمر میں دو تین روز سے درد ہے اور اسے نیچے سونا زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔ شاید وہ میزبانی کا حق ادا کررہی تھی۔ اس کا اصرار دیکھتے ہوئے شامیر بیڈ پر چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح ہی شامیر نے اپنا کام شروع کردیا۔ زویا ایک ٹریول ایجنسی میں ملازم تھی۔ کلینٹ کے لیے رپورٹنگ کا کام وہ پارٹ ٹائم جاب کے طور پر کرتی تھی۔ اپنے ایک اٹالین دوست کے ذریعے اس نے مذکورہ شخص کی پراپرٹی کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی اور اس میں اسے جزوی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس شخص کا نام سہراب درانی تھا۔ یہ پاکستانی سیاست کے سرگرم افراد میں سے تھا۔ شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کچھ دیگر سیاست دانوں کی طرح سہراب کے بارے میں بھی ایک خفیہ پراپرٹی رپورٹ ہوئی تھی۔ ٹھوس اطلاعات تھیں کہ یہ پراپرٹی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں کہیں ہے اور لاکھوں یورو کی یہ پراپرٹی، سہراب نے اپنے اثاثوں میں ڈکلیئر نہیں کی۔

زویا نے اس سلسلے میں جو "کام" کیا تھا، وہ اس نے شامیر کے سامنے رکھ دیا۔ یہ کام زیادہ تر "تصاویر" کی شکل میں تھا۔ یہ تمام تصویریں زویا کے اٹالین دوست ہیری نے چھوٹے کیمرے کی مدد سے اتاری تھیں۔ اس میں فربہ جسم اور گنجے سر والا سہراب درانی فرینکفرٹ کے مختلف مقامات پر دکھائی دیتا تھا۔ چند تصویروں میں اس کے ساتھ ایک مقامی خوش رنگ "مقلی" بھی نظر آتی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ یہ اس کی گرل فرینڈ رہی ہوگی۔ کسی جگہ سہراب شاپنگ کرتا نظر آتا تھا، کہیں سڑک پار کررہا تھا۔ کہیں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سیل فون پر بات کررہا تھا۔ ان تصویروں میں ایک تصویر اہم ترین تھی۔ اس میں وہی سہراب ولایتی لباس یعنی ہاف پینٹ اور رنگ برنگی شرٹ پہنے ایک سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تصویر کے عقب میں ہال پر ایک سے لکھا تھا۔ "مسٹر سہراب اپنی مبینہ رہائش گاہ کے سامنے۔"

سڑک کا بس چھوٹا سا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ تصویر سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ بندہ کس جگہ، کس علاقے میں کھڑا ہے۔

شامیر نے تمام تصویروں کا پیشہ ورانہ باریک بینی سے جائزہ لیا پھر گہری سانس لے کر پوچھا۔ "زویا..... ہیری کا کچھ پتا چلا؟"

"نا ہیں چلا..... یہی تو پرابلم ہے۔"

"کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔"

"نقصان سے زیادہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ کسی لاچ میں پڑ گیا ہوگیں گا..... اب تک جو شہادتیں ملا ہے ان سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ عین موقعے پر بک گیا ہے۔ ہی سولڈ ہم سیلف۔"

"یہ تصویریں تم کو کہاں سے ملیں؟"

"غائب ہونے سے پہلے ہیری سارے پروف اپنے ساتھ لے گیا مگر یہ چند فوٹو گراف اس کے کمرے کے ایک سیکرٹ خانے میں پڑا رہ گیا۔"

"ان تصویروں سے تم نے کیا اندازہ لگایا ہے زویا؟" شامیر نے پوچھا۔

"یہ بات تو کلیئر ہے شامیر صاحب کہ ان میں سے زیادہ تر فوٹو گراف، فرینکفرٹ کے ویسٹرن علاقے کا ہے۔ مگر ویسٹرن علاقہ بھی کوئی چھوٹا نا ہیں ہے۔ ہیری نے ایک فوٹو گراف کے سوا کسی میں بھی مسٹر سہراب کی رہائش گاہ کا ذکر نا ہیں کیا۔"

شامیر نے ایک بار پھر ان تصویروں کو کھنگالا۔ اگر یہاں کے مقامی نمائندے ان تصویروں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکے تھے تو شامیر کیسے کرسکتا تھا۔ یقیناً اس پراپرٹی کا سراغ لگانے کے لیے کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا ضروری تھا۔

شام کو کل کی طرح خشاء، آفس سے جلدی آگئی اور شامیر کو اپنے ساتھ قریبی دریائے مائنز کی سیر کے لیے لے گئی۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ دریا پر چھوٹی بڑی خوشنما

کشتیاں تیر رہی تھیں۔ سرسبز کناروں پر لوگ جاگنگ اور سائیکلنگ وغیرہ کر رہے تھے۔ یورپ کے دیگر ممالک کی طرح جرمنی میں بھی شام پانچ بجے تک ورکنگ ڈے کا اختتام ہوجاتا ہے۔ بیشتر بازار اور دکانیں بھی پانچ چھ بجے تک بند ہوجاتی ہیں۔ لوگ شام کا لطف اٹھانے کے لیے مختلف کھیلوں اور تفریحات میں لگ جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سب کچھ بڑے دلکش طریقے سے ہو رہا تھا۔ دریائے مائنز کے شفاف پانی میں شفق کی سرخی گھلی ہوئی تھی۔ خشامہ بڑی رواں انگلش میں باتیں کر رہی تھی مگر شامیر کی نگاہوں میں بار بار زویا کا سراپا گھوم جاتا تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو شاید وہ اس شام کو زیادہ انجوائے کرتا۔ زویا کی گفتگو اور نشست و برخاست میں بھی شوخی نظر آتی تھی مگر یہ شوخی ایک خاص طرح کی سادگی اور بے ساختگی میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے مزاج میں ایک طرح کا وقار بھی جھلک دکھاتا تھا۔

رات کو سونے کا طریقہ کار پھر وہی رہا۔ شامیر اور خشامہ بیڈز پر لیٹے اور دونوں کے بہت اصرار کے باوجود زویا نے میٹرس کا انتخاب کیا۔ شامیر کو یوں لگا کہ وہ جو فیصلہ کرلیتی ہے، اس پر اٹل ہوجاتی ہے اور اگر اسے فیصلہ بدلنے پر زیادہ مجبور کیا جائے تو وہ اپنے اندر ہی جھنجلانا شروع کردیتی ہے۔

شامیر دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن مسلسل سہراب درانی کی پراپرٹی میں الجھا ہوا تھا۔ شامیر جانتا تھا کہ ماضی میں سہراب نے کسی عورت کو طلاق دی تھی اور وہ بھی کہیں فرینکفرٹ میں ہی رہتی ہے۔ اگر اس عورت کا کھوج لگ جاتا تو سہراب کی پراپرٹی کے بارے میں کوئی کلیو ہاتھ آسکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس حوالے سے کس طرح پیش رفت ہوسکتی ہے۔ تاہم اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے مزید بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی اور کامیابی اس کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ بیڈ پر کروٹیں بدلتے بدلتے اسے ایک بار پھر ہیری کی لی ہوئی تصویروں کا خیال آیا۔ دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی تھی۔ وال کلاک رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ شامیر نے دیوار گیر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ سارا دن مصروف رہنے والی سڑک پر گیارہ بجے ہی سناٹے کی سی صورت حال تھی۔

شامیر نے سائڈ ٹیبل کا لیمپ آن کیا اور دراز میں سے وہ فوٹو گرافس نکال کر پھر انہیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ وہ اس تصویر پر رک گیا جس پر ہیری نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ''مسٹر سہراب، اپنی میموریز کیش گاہ کے سامنے۔''

تصویر سے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ بس سڑک کا ایک بالکل مختصر سا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ سہراب درانی کے عقب میں ایک نہایت چمکدار جیگوار کار کھڑی تھی۔ کار کا صرف پہلو ہی دکھائی دیتا تھا۔ اچانک شامیر چونک گیا۔ نیلے رنگ کی اس کار کی چمکدار سطح پر ایک بہت مدھم سا ہیولا سا نظر آتا تھا۔

بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بڑی سی ''شکل کا عکس'' کا سایہ ہو۔ یہ اتنا مدھم تھا کہ بڑے غور سے دیکھنے پر ہی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ شامیر نے اس تصویر کو مختلف زاویوں سے رکھ کر دیکھا۔ پھر کمرے کی لائٹ آن کردی اور زویا کو جگا دیا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھی، ذرا حیران ہوئی پھر اپنے بال سمیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ''کیا ہوا شومیر؟'' اس نے شامیر کے نام کا حلیہ بگاڑتے ہوئے پوچھا۔

''زویا! مجھے اس تصویر میں کچھ نظر آیا ہے۔ آپ اس نیلی کار کو دیکھ رہی ہیں نا۔ اس کی باڈی کو دھیان سے دیکھیں.....''

وہ اب اٹھ کر کرسی پر بیٹھ چکی تھی، اس نے اپنی آنکھیں سکوڑیں اور تصویر پر غور کرنے لگی۔ ''اس کار کی باڈی پر کوئی نشان ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے شامیر سے پوچھا۔

''نشان نہیں ہے۔ باڈی پر کچھ ریفلیکٹ ہو رہا ہے۔'' شامیر نے کہا۔

وہ ایک بار پھر تصویر کا جائزہ لینے لگی۔ شامیر نے اپنی انگلی سے اس ریفلیکشن کی نشان دہی کی جو اس نے دیکھا تھا۔

یکایک زویا کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے تیزی سے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور اس میں وہ فائل کھول لی جس میں اس کے ہیری نامی فرینڈ کی کھینچی ہوئی ساری تصویریں موجود تھیں۔ اس نے مطلوبہ تصویر نکالی اور پھر وہ اسے انلارج اور چھوٹا کرکے بار بار دیکھنے لگی۔ شامیر بھی اس معائنے میں اس کے ساتھ شامل تھا۔ زویا نے سنسنی خیز انداز میں شامیر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''شومیر! آپ نے بالکل ٹھیک پوائنٹ آؤٹ کیا۔ یہ ایک بلڈنگ کا شیڈو ہے جو اس جیگوار کار کی باڈی پر ریفلیکٹ ہوتا ہوگیا.....''

پھر زویا نے ایکدم ماتھا تھام لیا اور بڑے جذباتی انداز میں کچھ سوچنے لگی۔ ''ہام کو کچھ کچھ یاد آرہا۔ ہام نے یہ بلڈنگ کہیں ڈیکھا ہوا..... ہاں بالکل ڈیکھا ہوا.....''

وہ اپنے لیپ ٹاپ پر تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگی۔ شامیر ایک بار پھر ٹوگراف کی طرف متوجہ ہوگیا۔ خاص ڈیزائنوں والی ان ٹیڑھی میڑھی عمارتوں کو مغربی

ممالک میں لینڈ مارکس کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی شکل میں ہوسکتی ہیں۔ کسی زندہ یا بے جان شے سے مشابہ انگریزی یا کسی دوسری زبان کے حرف سے مشابہت رکھتی ہوئی۔ ایسی عمارتیں آرکیٹیکٹرز کی قوتِ تخلیق اور مالکان کی بے تحاشا ثروت کی نشاندہی بھی کرتی ہیں..... اور ان سے شہروں اور ملاقاتوں کی پہچان بھی ہوتی ہے۔

..... اگلا روز بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ لنچ ٹائم یعنی بارہ بجے سے پہلے پہلے زویا نے شہر کے مغربی علاقے میں اس عمارت کا پتا چلالیا۔ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں فون پر شامیر کو یہ اطلاع دی اور اس کی نگاہِ رسا کی داد بھی دی۔ اس سے آگے کا کام زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ کراچی میں بیٹھے، نیوز چینل کے کرتا دھرتا عظمت سلطان صاحب نے اپنی ڈوریوں کو حرکت دی..... برلن میں موجود دو نمائندے فرینکفرٹ پہنچ گئے۔ فقط 48 گھنٹے کے اندر مطلوبہ پراپرٹی کا سراغ لگالیا گیا۔ یہ ایک بڑے لگژری فلیٹ کی شکل میں تھی۔ اسے گرین ہائٹس کا نام دیا جاتا تھا۔

☆☆☆

شامیر کو بالکل توقع نہیں تھی کہ یہاں فرینکفرٹ میں اس کا کام اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی نمٹ جائے گا۔ اپنے اس ٹور کے پانچویں ہی روز وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ لبنانی خشامہ پہلے سے ہی اس کی فین تھی، اب وہ اس سے مزید متاثر نظر آتی تھی..... گاہے بگاہے اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کررہی تھی۔ خیالات تو غالباً زویا کے بھی ایسے ہی تھے مگر وہ دوسرے مزاج کی تھی۔ اس نے بس نپے تلے انداز میں شامیر کی تعریف کرنے پر اکتفا کیا تھا۔

جو چیز آسانی سے دستیاب نہ ہو عموماً اسی کو حاصل کرنے کو دل چاہتا ہے۔ خشامہ تو آفس سے جلدی آجاتی تھی اور ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی تھی، تاہم زویا دیر سے لوٹتی تھی اور کافی تھکی ماندی بھی ہوتی تھی۔ اس کے آتے ہی فلیٹ میں رونق سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک دو بار شامیر کا دل چاہا کہ وہ زویا کے ساتھ ذرا آؤٹنگ کو نکلے مگر آفس سے آکر وہ پندرہ بیس منٹ آرام کرتی اور پھر کھانا پکانے میں مصروف ہوجاتی۔ شیڈول کے مطابق تو ایک دن خشامہ کو اور دوسرے روز زویا کو کوکنگ کرنا ہوتی تھی مگر ان دنوں خشامہ چھٹی کررہی تھی۔ ورزش کے دوران میں اس کے بائیں بازو کا پٹھا بری طرح کھنچ گیا تھا اور وہ کوکنگ میں دشواری محسوس کرتی تھی۔ ویسے شامیر کا اندازہ تھا کہ وہ اپنی تکلیف کو کچھ بڑھا چڑھا بھی رہی ہے۔ دیگر معاملات کی طرح وہ شاید اپنے فرائض کی انجام دہی میں بھی زیادہ سنجیدگی نہیں دکھاتی تھی۔

لبنانی ہونے کے باوجود خشامہ مقامی لب و لہجے میں بڑی رواں انگلش بولتی تھی۔ ویک اینڈ پر شامیر سے کہنے لگی۔ ''تم نے لیونابرگ کا قصبہ دیکھا ہے؟ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ وہاں میری جرمن فرینڈ کرسٹی رہتی ہے۔ مجھے دو دن کے لیے بلا رہی ہے۔ تم بھی چلو، مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔'' اس کا انداز معنی خیز تھا۔

شامیر نے کہا۔ ''میرے پاس اتنے پیسے ہیں ہی نہیں کہ تمہیں دے سکوں۔ ویسے بھی مجھے یہ فرینکفرٹ کچھ کم پُرفضا نہیں لگ رہا۔''

''یہاں فرینکفرٹ میں سیمنٹ اور سریے سے بنی ہوئی عمارتوں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق آپ جناب نے یورپ کی قابلِ دید جگہیں دیکھی ہی نہیں۔ آپ کے پاس اب بھی تقریباً پچیس روز کا وقت ہے..... اور تقریباً اتنے ہی ملکوں کا سفر آپ اپنے اس ایک ویزے پر کرسکتے ہیں۔ کتوبیں کے مینڈک نہ بنو، فرینکفرٹ سے نکل کر دیکھو۔ دنیا کتنی حسین ہے۔'' اس کا لہجہ ایک بار پھر بے تکلف اور معنی خیز ہوگیا۔

خشامہ کے اصرار کے باوجود شامیر اس کے ساتھ نہیں گیا۔ اسے یہاں زویا کے آس پاس رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کوئی دل پھینک شخص نہیں تھا مگر نجانے کیوں زویا کی کمپنی اسے بھاتی تھی۔

خشامہ چلی گئی، شامیر نے سوچنا شروع کردیا۔ کیا اب زویا اس کے ساتھ اکیلی یہ کمرا شیئر کرے گی؟ اس کا خیال تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے کسی میل یا فیمیل دوست ..... یا پھر کولیگ کو دو تین روز کے لیے بلالے گی مگر عملی طور پر ایسا ہوا نہیں۔ جمعے کی رات ان دونوں نے اکیلے ہی اس بڑے کمرے میں گزاری۔ یہ صورت حال ایک طرح سے زویا کی خود اعتمادی اور خوش باطنی کو ظاہر کرتی تھی۔

صبح زویا کے جاگنے سے پہلے ہی شامیر نے اپنا اور اس کا ناشتا خود بنایا اور ایک طرح سے روزمرہ کی مصروفیات میں اپنا حصہ ڈالا۔ ''یہ تکلف کیوں کیا آپ نے؟'' زویا نے تیار ناشتا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ تکلف بے سبب نہیں ہے۔ بدلے میں آپ بھی تو کچھ نہ کچھ تکلف کریں گی ہی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے مسکرا کر بالوں کی لٹیں اپنے چہرے سے ہٹائیں۔

''یہی کہ بندہ اجنبی ہے اور یہاں اس شہر پُرپیچ میں آپ کا مہمان ہے۔ آپ یقیناً یہاں کی سیاحت میں اس کا ساتھ دیں گی۔''

وہ بولی۔ ''مگر یہاں سیر و سیاحت کے لیے زیادہ کچھ رکھا نہیں ہے۔ دو چار جگہیں ہی تو ہیں پھر آپ بور ہونا شروع ہو جائیں گے۔''

''بور ہونا تو میں ابھی شروع ہو گیا ہوں کیونکہ آپ نے صبح سویرے ہی انگلش بولنا شروع کر دی ہے۔ مجھے آپ کی وہی گلابی اردو اچھی لگتی ہے۔''

''اوئے ہوئے، آپ تو ایک ڈم ماکھن (مکھن) لگانا شروع کر دیتے ہیں۔'' وہ مسکرائی اور اس کے گال کا گڑھا نمایاں ہو گیا۔

اس روز وہ صبح دس بجے کے قریب شامیر کو فرینکفرٹ کی اسکائی لین دکھانے کے لیے لے گئی۔ اسکائی لین کا لفظ شہر کی بلند ترین عمارتوں کے جھرمٹ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اسٹاپ پر پہنچے تو پتا چلا کہ کسی وجہ سے شہر کی لوکل ٹرینیں بند ہیں۔ شامیر نے پہلی دفعہ فرینکفرٹ کی بس پر سفر کیا۔ راستے میں وہ زویا سے عمومی قسم کے سوالات کرتا رہا۔ زویا نے اسے بتایا کہ اس کے والدین نے پسند کی شادی کی تھی۔ زویا کی دو بہنیں اور بھی تھیں اور دونوں شادی شدہ تھیں۔ ایک برلن میں اور دوسری میونخ میں رہتی تھی۔ زویا سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی پیدائش کے تین چار سال بعد ہی والدین میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ بڑھتے بڑھتے یہ جھگڑے اتنے بڑھے کہ بالآخر دونوں میں طلاق ہو گئی۔ شادی کے وقت زویا کی والدہ نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر دل سے وہ شاید کبھی بھی مسلمان نہیں ہوئی۔ مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ، معاشرے اور رہن سہن کا اختلاف بھی ان دونوں کی علیحدگی کا سبب بنا۔ اس سانحے کے وقت زویا کی عمر فقط پندرہ برس تھی۔ وہ کچھ عرصہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہی اور جونہی اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچی، اس نے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ زویا کی والدہ نے طلاق کے صرف پانچ چھ ماہ بعد ہی ایک برٹش سے شادی کر لی تھی۔ ڈھائی تین سال بعد اس کے پاپا نے بھی ایک پاکستانی خاتون کے ساتھ اپنا گھر بسا لیا اور ہیمبرگ منتقل ہو گئے۔ اب کبھی کبھار اپنی ماما سے تو اس کی بات ہو جاتی تھی، مگر پاپا سے وہ تقریباً ''کٹ آف'' ہی تھی۔

اس گفتگو کے ختم ہوتے ہوتے وہ لوگ اپنی مطلوبہ لوکیشن پر پہنچ چکے تھے۔ ہفتہ وار چھٹی کی وجہ سے سڑکیں تقریباً خالی ہی تھیں۔ زیادہ تعداد پیدل چلنے والوں کی تھی۔ ان کی دونوں جانب بلند و بالا خوبصورت عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک انوکھے ڈیزائنز کی تھیں اور ان کی حیثیت لینڈ مارکس کی تھی۔

یہاں پہنچ کر زویا کا موڈ کافی حد تک بحال ہو گیا اور ماضی کے تذکرے نے اس کے چہرے پر جو تاریک سائے سے پھیلائے تھے، وہ سمٹ گئے۔ ویسے بھی یہ ویک اینڈ تھا اور زویا خود کو کافی ایزی محسوس کر رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''یہ جس سڑک پر ہم ڈولوں جا رہا، یہ اسکائی لین روڈ کہلاتا۔''

''اور یہ اسکائی لین روڈ کہاں جاتا؟'' شامیر نے اسی کے لہجے میں پوچھا۔

''جاتا تو کہیں نا ہیں..... سارا دن یہیں پڑا رہتا۔'' اس نے ایک پرانا لطیفہ دہرایا اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''شومیر! آپ کو ڈرنا ہیں لگتا کہ آپ نے ایک خطرناک کام کیا۔ ایک برے بندے کی سیکرٹ پراپرٹی کا کھوج لگایا۔''

''کیا مطلب؟'' شامیر نے پوچھا۔

''مطلب یہی کہ اگر ابھی سامنے والی گلی سے سہراب ڈرانی کا کوئی بندہ نکلے اور آپ پر اٹیک کر دے تو پھر؟''

شامیر بولا۔ ''یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہام کے ساتھ تو چھ فیٹ کا ایک باڈی گارڈ اور ڈلیر (دلیر) ساتھی موجود ہے۔ ڈرنا تو آپ کو چاہیے کہ اگر کوئی ایسا ویسا اٹیک ہو گیا تو ہام پہلے سیکنڈ میں بھاگ جائیں گا۔''

شامیر نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ بھاگنے والوں میں سے ہیں۔''

''یہ کس رے نفسی کیا ہوتا؟ ایسے مشکل ورڈز ہام کی سمجھ میں نا ہیں آتے۔''

شامیر مزاح کے موڈ میں تھا، بولا۔ ''کسر نفسی دراصل تحلیل نفسی کی بہن ہوتی ہے۔ نفسانفسی اس کی پھوپی اور بے نفسی اس کی بڑی بھاوج کو کہتے ہیں۔''

''بھاوج..... یہ کیا ہوتا؟'' زویا نے مزید الجھ کر کہا۔

''اس کو دودھ جلیبی میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ اب آپ کو دودھ جلیبی کا بھی پتا نہیں ہوگا۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ میرا سوال تو وہیں پر رہ گیا۔ یہ اسکائی لین روڈ جاتی کہاں ہے؟''

''یہ جرمنی کا سب سے لمبا ترین بلڈنگ کی طرف

جاتا۔ اس کو کامرس ڈینک ٹاور کہا جاتا۔ ہم اس کی چھت پر جائیں گا۔ پورا فرینکفرٹ سٹی وہاں سے نظر آئیں گا۔"

وہ بلڈنگ تک پہنچے۔ اس کی اونچائی دیکھ کر شامیر واقعی حیران ہوا۔ بلڈنگ کی چھت پر ایک بہت اونچا انٹینا بھی نصب تھا۔ کسی ماہر گائڈ کی طرح زویا نے شامیر کو بتایا کہ یہ عمارت 56 منزلہ ہے اور اگر انٹینا وغیرہ کو بھی اس کی اونچائی میں شامل کرلیا جائے تو اس کی اونچائی 300 میٹر سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔

آٹھ یورو فی کس کا ٹورسٹ ٹکٹ لے کر وہ دونوں ایک برق رفتار لفٹ کے ذریعے عمارت کی چھت پر پہنچ گئے۔ یہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ ہر عمر کے خوش وخرم جوڑے تصویر کشی اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہاں سے شہر کا نظارہ واقعی قابلِ دید تھا۔ فرینکفرٹ کا ائرپورٹ بھی دکھائی دے رہا تھا جو دنیا کے مصروف ترین ائرپورٹس میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دیکھا، یوں لگا کہ اترنے اور پرواز کرنے والے جہازوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔

چھت پر تیز ہوا تھی۔ وہ دونوں ایک آہنی جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر کھڑے ہوگئے اور دریائے مائنز کا نظارہ کرنے لگے۔ ہوا کے سبب زویا کے بال اچانک تیزی سے لہرائے اور دو تین سیکنڈ کے لیے انہوں نے شامیر کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

زویا نے جلدی سے اپنے بالوں کو سنبھالا۔ "سس..... سوری۔" اس نے کہا اور بالوں کو احتیاط سے جوڑے کی شکل میں باندھنے لگی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بال باندھتی ہوئی زویا کی جھلک جیسے اس کے دل ودماغ پر نقش ہوکر رہ گئی تھی۔

"کیا خیال ہے، اب چلیں یہاں سے؟" زویا نے اپنے شولڈر بیگ کو کندھے پر درست کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہ..... ٹھیک ہے..... بس چند تصویریں اور لے لوں۔" شامیر نے کندھے سے کیمرا اتارتے ہوئے جواب دیا۔

وہ زوم کرکے دریائے مائنز کے کناروں کو فوکس کرنے لگا۔ تصویریں اتارتے اتارتے اس کی نگاہ ایک منظر پر پڑی۔ ایک جگہ کافی سارا ہجوم تھا اور درمیان میں کچھ لڑکے لڑکیاں ڈانس اور جمناسٹک وغیرہ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ "وہ کیا ہے؟" شامیر نے انگلی سے دور نیچے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کو جرمن زبان میں ویک اینڈ کی موج مستی کہا جاتا ہے۔ کم آن..... ہم بھی ڈانس دیکھتے ہیں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

چند منٹ بعد وہ دونوں تیز رفتار لفٹ سے نیچے اترے اور پھر پیدل چلتے ہجوم تک پہنچ گئے۔ کافی رش تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایک بڑا راک اسٹار بھی انٹری دے گا گرم اس نے بڑی اچھی طرح دیکھ رکھے تھے۔

جب زویا نے بال باندھ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔ "کیا ہوا شومیر؟" اس نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں..... دراصل....." اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک جرمن لڑکی زور سے ہنسی۔ شاید اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کوئی شرارت کی تھی۔

بوائے فرینڈ بھی جرمن ہی لگتا تھا۔ وہ لڑکی کے پیچھے لپکا اور سب کے سامنے ہی اسے پکڑ کر ایک بھرپور Kiss کیا۔ دونوں جرمن زبان میں تیز تیز بولنے لگے۔

ٹاور کی اس چھت پر اس طرح کے مناظر ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ جوڑے خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مصروف تھے لیکن یہ منظر چونکہ کچھ زیادہ ہی چونکا دینے والا تھا، اس لیے کئی خواتین وحضرات مڑ کر اس بے تکلف جوڑے کو دیکھنے لگے۔ لڑکی نے ایک بار پھر کوئی شرارت کردی تھی اور لڑکا اس کے پیچھے بھاگتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

زویا کے چہرے پر شرم کی سرخی بکھر گئی، بولی۔ "سوری! آپ کو عجیب لگا ہوگیں گا..... کیونکہ اس طرح کا سین وہاں پاکستان میں تو نا ہیں ہوتا ہوگیں گا....."

"ہوتا تو ہے لیکن اس طرح کھلے عام نہیں۔" شامیر نے مختصر جواب دیا۔

وہ ابھی تک اس لمحے کے سحر میں تھا جو تھوڑی دیر قبل اس پر بیتا تھا۔ ہوا کے مقابل کھڑے ہوکر بال باندھتی ہوئی زویا کی جھلک جیسے اس کے دل ودماغ پر نقش ہوکر رہ گئی تھی۔

"کیا خیال ہے، اب چلیں یہاں سے؟" زویا نے اپنے شولڈر بیگ کو کندھے پر درست کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہ..... ٹھیک ہے..... بس چند تصویریں اور لے لوں۔" شامیر نے کندھے سے کیمرا اتارتے ہوئے جواب دیا۔

وہ زوم کرکے دریائے مائنز کے کناروں کو فوکس کرنے لگا۔ تصویریں اتارتے اتارتے اس کی نگاہ ایک منظر پر پڑی۔ ایک جگہ کافی سارا ہجوم تھا اور درمیان میں کچھ لڑکے لڑکیاں ڈانس اور جمناسٹک وغیرہ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ "وہ کیا ہے؟" شامیر نے انگلی سے دور نیچے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کو جرمن زبان میں ویک اینڈ کی موج مستی کہا جاتا ہے۔ کم آن..... ہم بھی ڈانس دیکھتے ہیں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

چند منٹ بعد وہ دونوں تیز رفتار لفٹ سے نیچے اترے اور پھر پیدل چلتے ہجوم تک پہنچ گئے۔ کافی رش تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایک بڑا راک اسٹار بھی انٹری دے گا

اور گانا دانا سنائے گا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ راستہ بنانے میں شامیر کو دشواری پیش آرہی تھی۔ زویا نے بے تکلفی سے اس کا بازو تھام لیا اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگی۔ اس سے پہلے بسوں پر اترتے چڑھتے بھی زویا نے دو چار دفعہ اس کا ہاتھ تھاما تھا مگر شامیر کو یہ ایک عام عمل ہی لگا تھا اور اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر ٹاور کی چھت پر اس کی زندگی میں جو ایک جذالمحہ آیا تھا، اس نے شامیر کے اندر ایک دم بہت کچھ بدل دیا تھا۔ زویا کا لمس اور اس کی قربت اس کے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑانے لگی۔ ہجوم میں سے پھنس پھنسا کر گزرتے ہوئے وہ دونوں کئی بار ایک دوسرے کے بالکل قریب آگئے۔ زویا تو غالباً اس قربت سے بے خبر ہی رہی مگر شامیر کے دل و دماغ پر کئی بار قیامت گزر گئی۔ آخر وہ دونوں تماشے کے لیے ایک مناسب جگہ پر پہنچ گئے۔

شوقیہ جمناسٹرز مختلف کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ ان میں مختصر لباسوں والی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ لوگ تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے۔ زویا نے سرخ چہرے اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شومیر! آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟“

”زبردست..... اور وہ وہاں سرخ قمیص والا بندہ کیا کر رہا ہے؟“

”وہ لوگوں کو جوک سنا رہا ہے۔ دیکھو وہاں اس کے پاس کھڑا لوگ کتنا ہنس رہا ہے۔ کیا وہاں پاکستان میں بھی اس طرح کا ہنسی مذاق ہوتا؟“

”بہت زیادہ ہوتا، بلکہ ہر روز رات کو ”ٹی وی“ پر یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہاں یہ لوگ بھانڈ کہلاتے ہیں۔ ان کی جگت بہت مزیدار ہوتی ہے۔“

”جوگت؟ یہ کیا ہوتا؟“

”..... یہ بھی..... دودھ جلیبی کی طرح کی ایک چیز ہوتی ہے بلکہ سمجھو کہ جلیبی ہی ہوتی ہے۔ جس طرح جلیبی کا آگا پیچھا کوئی نہیں ہوتا، اس طرح جگت کا بھی نہیں ہوتا۔“

”جالبی۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ”یہ نام ہام نے کہیں سنا ہوا ہے شاید۔ ہام کا خیال ہے کہ پاپا نے بولا تھا۔ اس کا پورا نام حبیب جالبی تو نا ہیں ہوتا۔“

شامیر سٹپٹا گیا۔ وہ نامور شاعر حبیب جالب کو حبیب جالبی کے ساتھ مکس کر رہی تھی۔

یکا یک وہ خوشی سے ایک قلقاری سی مار کر ایک جواں سال عورت کی طرف بڑھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئیں۔ چٹ چٹ ایک دوسرے کے گالوں کے بوسے لیے اور پھر بے تکان گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔ شامیر ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا دونوں کو باتیں کرتے دیکھتا رہا..... جواں سال عورت جرمن ہی تھی اور زویا سے کافی بے تکلف نظر آتی تھی۔ زویا اس کے ساتھ اپنی کسی نجی گفتگو میں مصروف تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو تواتر سے حرکت دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے خوبصورت سفید دانتوں کی نمائش بھی کر رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اس کے گال کا ڈمپل نمایاں تر ہو جاتا تھا۔ شامیر محویت سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ اردگرد کے سارے مناظر اس کی نگاہوں سے جیسے اوجھل ہوگئے۔

وہ اپنی اس ڈرامائی کیفیت پر بے حد حیران تھا۔ عورت اس کے لیے کوئی نئی اور انوکھی چیز نہیں تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے دور میں کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی تھی۔ ان میں سے کئی کافی خوبصورت بھی تھیں لیکن یہ سارے تعلق صرف دوستی تک ہی محدود رہے تھے۔ پروفیشنل لائف میں بھی الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھنے والی دو تین، خوش شکل لڑکیوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی مگر شامیر نے اپنے لیے کچھ حدود متعین کر رکھی تھیں اور وہ ان سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ تہیہ بھی کر رکھا تھا کہ وہ جب بھی شادی کرے گا، اپنی امو خالہ کی پسند اور مشورے سے کرے گا۔ خالہ ثمینہ کو وہ پیار سے امو خالہ کہتا تھا لیکن یہاں فرینکفرٹ میں پچھلے دو چار دنوں میں جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ یہ لڑکی کسی تیز رفتار شعاع کی طرح سیدھی اس کے دل و دماغ میں گھسی تھی اور وہاں سرایت کر کے ناپید ہوگئی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیات پر شامیر خود ہی سٹپٹانے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد فرہ اندام راک اسٹار بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آمد پر ہجوم نے خوب اودھم مچایا۔ اس نے چند پُرشور گانے گائے تاہم ان میں سے ایک گانا قدرے دھیما اور بامعنی تھا۔ یہ شامیر کو پسند آیا۔ انگلش کے اس گانے کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی
وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے..... میرے یار وہ محبت ہے

راک اسٹار آخری بولوں کو بار بار دہراتا تھا..... اور

سامعین اس کے ساتھ اچھلتے کودتے اور نعرہ زنی کرتے تھے۔
زویا بھی اس گیت کے روحم میں کھو سی گئی۔ شامیر نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ زیرلب بول دہرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں گداز دکھائی دیتا تھا..... شامیر کو اندازہ ہوا کہ اپنی نیچرل وروم میٹ خشام کے برعکس وہ حسِ لطیف رکھتی ہے اور پُراثر الفاظ اس پر اثر کرتے ہیں۔
شام کو ایک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کرا کے وہ فلیٹ میں واپس آ گئے۔ زویا سارا دن شامیر کو شہر میں گھماتی پھراتی رہی تھی اور کافی تھک چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ خود کھانا پکانا چاہ رہی تھی۔ یہ شامیر ہی تھا جس نے اصرار کر کے ترک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کروایا تھا۔ کھانے کے بعد ٹی وی پر مووی دیکھنے کا پروگرام تھا، تاہم اسی دوران میں لاہور سے اموخالہ کی ویڈیو کال آ گئی۔ شامیر کے لیے ان کی مختصر کال بھی آدھ پون گھنٹے سے کم نہیں ہوتی تھی اور آج کل تو وہ اس کے لیے زیادہ تر سی ہوئی تھیں۔ ان کی اولاد ایک بیٹے اور دو بیٹیوں پر مشتمل تھی۔ بیٹا تو شادی کر کے ساؤتھ افریقا آباد ہو چکا تھا۔ اب ان کے پاس صرف دو بیٹیاں ہی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شامیر کے ساتھ انہیں خاص انسیت محسوس ہوتی تھی..... اور یہ انسیت شامیر کے بچپن سے ہی موجود تھی۔ بعدازاں جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شامیر کے والدین اسے دائمی جدائی دے گئے تو اموخالہ کے ساتھ شامیر کا محبت بھرا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ اموخالہ کی ایک بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹی فارہ ابھی تیرہ چودہ سال کی تھی اور آٹھویں کی طالبہ تھی۔
.....شامیر نے اموخالہ کو پچھلی دو روز کی ساری کارگزاری سنائی پھر اس کے دل میں نجانے کیا آئی کہ اس نے کہا۔ ”اموخالہ! اب میری دونوں میزبانوں میں سے اہم میزبان سے بھی مل لیجیے..... میرا مطلب ہے زویا..... یہ میرے سامنے ہی بیٹھی ہیں۔“
زویا کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر ”نہ“ کہا لیکن تب تک شامیر نے فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
”ہیلو آنٹی جان۔“ زویا سنبھل کر بولی۔
فون کا اسپیکر آن تھا۔ اموخالہ کی شفقت بھری آواز ابھری۔ ”ہیلو بیٹی! کیا حال ہے تمہارا؟ شامیر نے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔“
”تعریف کے قابل تو یہ شمیر ہیں آنٹی۔ ان کے یہاں وزٹ کرنے سے ہم لوگوں کا ایک بہت بڑا پرابلم منٹوں میں حل ہو گیا۔ آپ کے بیٹے ماشاء اللہ بہت ذہین اور کین ہیں.....“
شامیر جلدی سے مائیک میں بولا۔ ”اموا یہ ذہین اور فطین کہنا چاہ رہی ہیں۔ ان کی اردو بس ایسی ہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی والدہ جرمن ہیں اور یہ یہیں پروان چڑھی ہیں مگر یہاں کی عام لڑکیوں سے یہ بالکل مختلف ہیں۔“
”مختلف تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ ماشاء اللہ پیاری بھی ہے۔ شادی وادی ہو چکی ہے بیٹی؟“ خالہ نے پوچھا۔
”ناہیں آنٹی جان! لیکن ہوپ فلی اس سال ہو جائیں گی۔“ اس نے بے جھجک جواب دیا۔
”کہیں بات چل رہی ہو گی؟“
”جج..... جی ہاں۔“ زویا نے کہا پھر جلدی سے بات بدلتے ہوئے بولی۔ ”آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ہام کے..... یعنی میرے مائنڈ میں مدر کا جو تصور ہے، آپ اس پر پورا اترتا۔ ویسا ہی وائٹ وائٹ بال..... ویسا ہی ڈریس..... ویسا ہی چہرہ روشن ان۔“
”اموا یہ روشن روشن کہنا چاہ رہی ہیں۔“ شامیر جلدی سے بولا۔ ”میرے ساتھ گلابی اردو بول بول کر ان کا جبڑا ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اس لیے ایسے الٹے پلٹے الفاظ بول رہی ہیں۔“
”تو تم اس سے انگلش میں بات کیوں نہیں کرتے۔ کیوں تکلیف دے رہے ہو اس کو؟“
”ایسی گلابی اردو پھر کہاں سننے کو ملے گی اموا! آپ یہاں ہوتیں تو خوب انجوائے کرتیں اور فارہ تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہی ہو جاتی۔“
”پلیز شٹ اپ۔“ زویا نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔
خالہ سے بات ختم ہوئی ہی تھی کہ باس سلطان صاحب کی کال آ گئی۔ وہ شامیر سے بہت خوش تھے۔ سہراب درانی کی خفیہ پراپرٹی کے حوالے سے چینل نے جو اسٹوری تمام ثبوتوں کے ساتھ بریک کی تھی، اسے بہت پذیرائی ملی تھی۔ عظمت سلطان صاحب نے زویا سے بھی بات کی اور اسے شاباش دی۔
آخر میں وہ شامیر سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”تم نے اپنا کام بڑی جلدی نمٹا لیا ہے۔ کیا تمہیں یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوا تھا کہ تمہیں کوئی اور کام سونپ دیا جائے گا؟“
”آپ جیسے باس کے حوالے سے اس طرح کے اندیشے رکھنا تو پھر کم ظرفی ہی کہلائے گا۔“
”گڈ..... اچھا جواب ہے۔ بونس کے طور پر کچھ مزید رقم تمہیں ٹرانسفر ہو جائے گی۔ گھومو پھرو..... تفریح کرو مگر اب

درانی والے اس معاملے سے بالکل الگ ہو جاؤ..... اور یہی ہدایت زویا کے لیے بھی ہے۔"

"اوکے سر!" زویا نے مستعدی سے کہا۔

اس رات وہ پھر اس فلیٹ میں اکیلے تھے مگر شامیر کے لیے آج کی رات اور کل کی رات میں بہت فرق تھا۔ آج وہ اس تنہائی میں زویا کے ساتھ عجیب سی الجھن اور سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ ایسا شاید اس وجہ سے تھا کہ آج زویا کے حوالے سے اس کے سارے خیالات و احساسات بدل چکے تھے۔ رات کے سناٹے میں اس کے کروٹ بدلنے کی آہٹ، اس کی سانسوں کی آواز، اس کے لباس کا سرکنا اور اس کی کلائیوں میں جینگلز کا آپس میں ٹکرانا..... سب کچھ جیسے سیدھا شامیر کے دل پر لگ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ ایکا ایکی یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے؟

اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ احساسات منتقل ہوتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں، اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں۔ کیا وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا اس کی کھنک زویا تک بھی پہنچ چکی تھی؟ یہ سوچ اس کے لیے مزید پریشانی کا باعث بنی۔ جیسے تیسے رات گزر گئی۔ آخری پہر وہ سو گیا۔ صبح جاگا تو زویا ناشتا تیار کر رہی تھی۔ وہ ابھی نہا دھو کر نکلی تھی اور بہت نکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اپنے نم بالوں کو اس نے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔

"گڈ مارننگ۔" اس نے شامیر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"گڈ مارننگ..... اور سوری۔ میں دیر تک سویا رہا۔"

"نا ہیں، کوئی ایسا ڈیر بھی نا ہیں۔"

"آج کیا پروگرام ہے؟"

"12 نمبر ٹرین پر بیٹھیں گے اور آخری اسٹاپ تک جائیں گے۔ وہاں خاصا بڑا پلنک اسپاٹ ہے۔ فرینکفرٹ کا سیر بھی ہو جائیں گا اور جھال بھی دیکھ لیں گے۔" وہ جھیل کو جھال کہہ رہی تھی۔

ناشتے میں انڈے اور چکن کے گوشت کی ڈش وغیرہ تھی۔ آج ٹرینیں بحال تھیں..... وہ پہلے اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں سے 12 نمبر پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ یہ خاصا طویل سفر تھا۔ شہر کا بیشتر حصہ انہوں نے دیکھ لیا اور مضافات میں پہنچ گئے۔ زویا جینز اور ٹی شرٹ میں تھی۔ اس نے بال مسلسل جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے بالوں کو کل کی حرکت کی سزا دے رہی تھی، جب وہ ٹاور کی ہوا میں دیوانہ وار جھومے تھے اور شامیر کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔

وہ 12 نمبر کے آخری اسٹاپ پر اترے۔ وہ شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ گہرے سبز درختوں میں گھری ہوئی ایک چمکیلی جھیل انہیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ آج بھی چھٹی کا دن تھا۔ یہاں تفریح کرنے والے کافی لوگ موجود تھے۔ ان میں بچے بوڑھے جوان سب شامل تھے۔ زویا ایک ماہر گائڈ کی طرح شامیر کو یہاں کی تاریخ اور موجودہ حیثیت سے آگاہ کرتی رہی۔ وہ اردو میں ہی بولنے کی کوشش کرتی مگر جہاں اٹک جاتی تھی، انگلش میں رواں ہو جاتی تھی۔ تاہم کل کے مقابلے میں وہ آج زیادہ کھلکھلاتے ہوئے موڈ میں نہیں تھی۔ جھیل کے اردگرد واقعی جنگل کا سا سماں تھا۔ کچھ آگے جا کر انہیں ایک مصنوعی پہاڑی سی نظر آئی۔ یہاں بھی لوگ چڑھ اتر رہے تھے۔ وہ بھی چڑھنے لگے۔ یہاں برے بھلے چوبی زینے بھی بنے ہوئے تھے مگر ایک جگہ چار پانچ زینے غائب تھے۔ شامیر تو پتھروں کو پکڑ کر چڑھ گیا مگر زویا کو دشواری پیش آئی۔ شامیر پہلے تو جھجکا پھر اس نے اپنا ہاتھ زویا کی طرف بڑھایا۔

زویا نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے گی مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ شامیر اپنا ہاتھ پھیلائے رہ گیا اور وہ تھوڑا سا گھوم کر اور ایک درخت کی جڑوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ آئی۔ شامیر کھسیانا سا ہوا۔ اس کی اس کھسیاہٹ کو قریب ہی موجود نوجوانوں کی ایک ٹولی نے دیکھا۔ ایک چلبلے لڑکے نے ہوٹنگ کے انداز میں "اوووشٹ" کا نعرہ بلند کیا۔

چٹائی پر بیٹھے دیگر لڑکے لڑکیاں بھی ہنسنے لگے۔ شامیر کی پیشانی پر پسینا سا آ گیا۔ اسے معلوم نہیں ہوا کہ زویا کو لڑکوں کی اس شرارت کا پتا چلا ہے یا نہیں۔ بہرحال وہ دونوں جلد ہی اس جگہ سے کافی آگے نکل گئے۔

شامیر کی باقی کی ساری سیر کچھ بے مزہ سی رہی۔ یوں تو وہ دونوں آپس میں ہنستے بولتے بھی رہے، تبصرے بھی کرتے رہے مگر خوشی دینے والا کوئی بٹن سا تھا جو شامیر کے اندر آف ہو گیا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ کل تو وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر بسوں پر اتر چڑھ رہی تھی اور اسے بازو سے کھینچ کر ہجوم کے اندر بھی گھس گئی تھی مگر آج یہ فاصلہ کیوں پیدا ہو گیا تھا؟ اس کے ذہن میں پھر وہی بات آئی کہ شاید زویا کے بارے میں جن منفی خیالات نے خود شامیر کے اندر جنم لیا تھا، انہوں نے زویا کے اندر جھجک اور گریز پیدا کر دیا ہے۔

رات کو کھانے کے بعد شامیر کو ایک ہلکا سا شاک اور لگا۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ آج پھر کمرے میں اکیلے ہوں گے۔ غیر متوقع طور پر گھنگرالے بالوں اور لمبی ناک والی ایک دبلی پتلی دراز قد لڑکی اندر آ گئی۔ یہ بھی زویا کی فرینڈ تھی اور جرمن تھی۔ زویا نے شامیر سے مخاطب ہوتے ہوئے انگلش میں کہا۔ ''آج اس کی روم میٹ بھی کہیں گئی ہوئی ہے۔ اکیلی بور ہو رہی تھی۔ میں نے کہا چلو آج ادھر آ جاؤ۔ ذرا کمپنی رہے گی۔''

کہنے کو تو زویا یہ بات کہہ رہی تھی تاہم شامیر کا دل کہتا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ اس لڑکی کی آمد کے پیچھے بھی زویا کی وہی جھجک ہے جو کل دوپہر کے بعد سے اس کے اندر اچانک نمودار ہوئی ہے۔

لڑکی نے شامیر کو کمپنی کیا دینا تھی۔ وہ تو سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے جرمن بول رہی تھی اور زویا بھی جرمن میں ہی اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ شامیر نے خود کو اس کمرے میں بالکل اجنبی اور اضافی محسوس کیا۔ سونے سے پہلے ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں باقی کے دن کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کرے گا۔ باس سلطان صاحب نے بونس کی نوید بھی سنا دی تھی۔ شامیر کو امید تھی کہ وہ ہوٹل کے قیام کو آسانی سے انور ڈ کرلے گا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سویرے شامیر کا پیک سامان دیکھ کر زویا حیران رہ گئی۔ ''یہ کیا ہے شومیر صاحب؟'' اس نے ہمیشہ کی طرح شامیر کے نام کا حلیہ بگاڑا۔

شامیر بولا۔ ''آج خشامہ واپس آجائے گی۔ میں آپ کو اور خشامہ کو مزید تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی باس سلطان صاحب بڑے اچھے موڈ میں ہیں۔ رات کو ان سے میری بات ہوئی ہے۔ انہوں نے کچھ رقم بھی ٹرانسفر کی ہے اور کہا ہے کہ میں ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤں۔''

''ہام کے خیال میں تو یہ ایکسٹرا خرچہ بالکل مناسب نہیں۔'' وہ جز بز ہو کر بولی۔

''لیکن اب تو یہ ہو چکا۔ سلطان صاحب نے رات کو ہی پیٹرزبرگ کے علاقے میں ایک ہوٹل میں بکنگ کرا دی تھی۔''

زویا کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

شامیر اسی روز ہوٹل منتقل ہو گیا۔ یہ درمیانے درجے کے ہوٹل کا سنگل بیڈ والا کمرا تھا۔ شامیر کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ یہاں سے دریائے مائنز زیادہ دور نہیں تھا۔ ہوٹل کی پانچویں منزل سے دیکھنے پر، بلند عمارتوں کے درمیان ایک جگہ سے دریائے مائنز کا چمکتا پانی نظر آتا تھا۔

اگلے تین چار گھنٹے شامیر نے ہوٹل کے کمرے میں ہی بند ہو کر گزارے۔ کہیں گھومنے پھرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت ایسی تھی کہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اچانک کسی نادیدہ شکنجے میں جکڑ گیا ہے۔ ایسی صورت حال تو اس نے صرف کتابوں میں پڑھی تھی یا خاص حسن و عشق کے موضوع پر بننے والی فلموں میں دیکھی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ زویا نام کی اس لڑکی کو اب سے نہیں، شاید کئی برسوں یا کئی زمانوں سے جانتا ہے۔ اس کی ہر ادا، اس کا ہر انداز، اس کے چہرے کے سارے اتار چڑھاؤ اور نقوش اس کے دیکھے بھالے تھے..... اور اس کا لہجہ، اس کی آواز..... ہاں، یہ لہجہ اور آواز بھی تو اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔

اسے یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور جوں جوں یہ یقین پختہ ہو رہا تھا، اس کی بے قراری اور جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس نے تو خود سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ''محبت کی شادی'' نہیں کرے گا اس کی محبت، شادی کے بعد ہوگی۔ وہ اپنی زندگی کا یہ باب اپنی اموخالہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ وہ اس پر جو لکھنا چاہیں گی، لکھ لیں گی۔ پھر یہ لڑکی کیوں ایک منہ زور ریلے کی طرح اس کے دل و دماغ میں گھس آئی تھی..... اور اب ہستی چلی آ رہی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ محبت ہمیشہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ ان لمحوں میں اچانک اسے راک اسٹار کا وہ گیت یاد آ گیا جو تین چار روز پہلے اس نے زویا کے ساتھ دریائے مائنز کے کنارے سنا تھا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انبوہ نیوں کی متلاشی.....

شام ہو چکی تھی۔ آج اسے ہوٹل میں شفٹ ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس کا فون نمبر زویا کے پاس موجود تھا مگر زویا نے اس کا حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ ہاں، بس ایک بار خشامہ کی کال آئی تھی اور اس نے قینچی کی طرح زبان چلا کر دس پندرہ منٹ تک اس کے کان کھائے تھے۔

شامیر نے ایک بار پھر اپنے فون کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ زویا کی طرف سے کوئی میسج یا مسڈ کال وغیرہ نہیں تھی۔ اس نے اسکائپ کے وڈیو لنک کے ذریعے اموخالہ

سے رابطہ کیا۔

"امو! وہ لڑکی کیسی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"پیاری تھی۔ شوخی اور معصومیت دونوں اس میں اکٹھی نظر آتی ہیں....." انہوں نے کہا اور سوالیہ نظروں سے شامیر کی طرف یعنی کیمرے کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ "امو! ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟"

وہ مسکرائیں۔ "میرا بیٹا شاید کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔"

"نن..... نہیں امو..... بالکل بھی نہیں۔"

"جب تم بالکل بھی نہیں کہتے ہو..... تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ تھوڑا بہت تو ہے۔" انہوں نے کہا اور مسکراتی نظروں سے شامیر کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں۔

وہ گلا صاف کر کے بولا۔ "ویسے کتنا اچھا ہوتا امو! آپ بھی یہاں ہوتیں اور اس کو دیکھتیں۔"

"تو ایسی کیا بات ہے..... میں اب بھی دیکھ سکتی ہوں۔ یہ جو تم لوگوں کا سیل فون ہے، یہ تو آئینہ جہاں نما بنا ہوا ہے۔ اس پر دو چار دفعہ میری بات کراؤ اس سے۔"

"لیکن..... امو..... آپ ہی تو کہا کرتی ہیں کہ یہ جو لڑکیاں مغربی ملکوں میں پلتی بڑھتی ہیں، یہ گھر گرہستی والی نہیں ہوتیں۔"

وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولیں۔ "ہاں..... یہ بات تو ہے شامیر..... مگر کیا کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں تو برابر نہیں ہوتیں۔ اچھوں میں برے اور بروں میں اچھے تو ہوتے ہیں۔ اگر تم....." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

"بولیں نا امو۔" شامیر نے کہا۔

"شامیر! زندگی بھر کا ناتا جوڑنے سے پہلے بندہ جتنا بھی سوچ سمجھ اور پرکھ لے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے..... ایسے معاملوں میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جاتی۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں امو! دو چار دن میں بھلا کسی کے بارے میں کیا پتا چل سکتا ہے۔ سوری! میں نے خوامخواہ یہ بات چھیڑ دی۔" پھر وہ بڑی صفائی سے گفتگو کا رخ موڑ کر جرمنی کی سیر و سیاحت کی طرف لے گیا۔ اسی دوران میں اس کی خالہ زاد بہن تیرہ سالہ فارہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئی اور اپنی فرمائشیں اگلنے لگی۔ شامیر نے امو خالہ اور فارہ سے وعدہ کیا کہ وہ ان دو تین ہفتوں میں جرمنی میں خوب گھومے پھرے گا۔

بات ختم کر کے وہ بستر پر چت لیٹ گیا۔ اس کے سینے میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ جرمنی میں خوب گھومے پھرے گا۔ باس سلطان صاحب بھی چاہتے تھے کہ وہ یہ دو تین ہفتے تفریح میں گزارے، مگر اس کے اندر خوشی کا جو بٹن آف ہو گیا تھا، وہ کسی طرح آن ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ جرمنی میں اس کا گھومنا پھرنا، زویا کے "ساتھ" سے مشروط ہو گیا ہے۔

اچانک ڈور بیل سنائی دی۔ لکڑی کے فرش پر ننگے پاؤں چلتا شامیر دروازے پر پہنچا۔ پہلے "پیپ ہول" سے باہر جھانکا، پھر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے زویا کھڑی تھی۔

"گڈ ایوننگ۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔ آسمانی رنگ کی شرٹ اور ٹراؤزر میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"گڈ ایوننگ۔" شامیر نے کہا اور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا اس کے ساتھ اندر آیا۔ شامیر کا دل ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک رسمی باتیں کرتے رہے، پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ کمرے کی خاموشی بوجھل ہونے لگی۔ وہ شامیر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "آپ کو..... مجھ سے..... ناراضگی ہو گیا؟"

"آپ کو کیسے لگا کہ میں ناراض ہوں؟"

"آپ ایک ڈم یہاں شفٹ ہو گیا..... آپ نے فون کرنا بھی پسند نا ہیں کیا۔"

"فون تو آپ نے بھی نہیں کیا۔ کیا آپ بھی ناراض ہیں؟"

"مجھے لگتا..... کہ آپ کو اس روز کا بات اچھا نا ہیں لگا۔"

"کون سی بات؟"

اس نے سر کو ذرا جھکا کر بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا اور بولی۔ "وہاں پکنک اسپاٹ پر آپ نے ہام کو (ہم کو) اوپر چڑھانے کے لیے اپنا ہینڈ آگے کیا..... ہام نے آپ کا ہینڈ نا ہیں پکڑا۔ وہاں بیٹھے لڑکوں نے آپ کو ہوٹ کیا....."

اس کا مطلب تھا اس نے وہ ساری صورتِ حال نوٹ کی تھی۔ شامیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں تھوڑا سا محسوس تو ہوا تھا، مگر مجھے اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ایسی بات پر آپ سے ناراض ہو جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ ..... مجھے بھی چاہیے تھا..... میں آپ کو فون کرتا....."

وہ مسکرائی۔ "یعنی ہام دونوں تھوڑا تھوڑا قصوروار۔"

"اور دونوں تھوڑا تھوڑا بے قصور۔" شامیر نے کہا۔

وہ ہنس دی اور اس کے گال کا گڑھا نمایاں ہو گیا۔

شامیر نے روم سروس کو کال کر کے سافٹ ڈرنکس

منگوائے۔ وہ ڈریس لینے کے ساتھ ساتھ نیم گرم موسم کے حوالے سے بات کرتے رہے..... زویا ایکدم اچھے موڈ میں نظر آنے لگی تھی۔ آنے والا ویک اینڈ ایک اضافی چھٹی کی وجہ سے "لونگ ویک اینڈ" تھا۔ زویا نے کہا کہ بندہ جرمنی آئے اور دیوار برلن نہ دیکھے تو یہ ایسا ہی ہے کہ دریا پر جائے اور منہ خشکی کی طرف کر کے بیٹھ جائے۔

گفتگو کے دوران میں ایک موقعے پر وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولی۔ "ہام کا دل ہوتا کہ آپ واپس فلیٹ میں آجائیں۔"

شامیر نے کہا۔ "آپ کی اردو پر کافی محنت کی ضرورت ہے۔ دل ہوتا نہیں..... دل چاہتا....."

وہ بولی۔ "چلیں..... ہام کا دل چاہتا کہ آپ....."

"لیکن ہام کا دل اور کچھ چاہتا۔" شامیر نے اسی کے انداز میں اس کی بات کاٹی۔

"کیا چاہتا؟"

"کہ آپ چھ سات روز کے لیے اس ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہو جائیں۔ یہاں کا کرایہ کافی مناسب ہے۔ افورڈ کیا جا سکتا ہے۔"

"خشامہ میرا سر پھاڑ دے گا۔ وہ اچھا لڑکی..... مگر جب کمرے میں اکیلا ہوتا تو ایک گھنٹے میں آبرو باختہ ہو جاتا۔"

"ایک گھنٹے میں آبرو باختہ۔" شامیر حیران ہوا، پھر ذرا رک کر بولا۔ "آبرو باختہ کا مطلب سمجھتی ہیں آپ؟"

"آبرو باختہ..... یعنی آبرو باختہ..... یعنی پریشان ہو جانا..... کچھ سمجھ میں نہ آنا....."

شامیر نے ماتھا پکڑ لیا۔ "محترمہ! اسے آبرو باختہ نہیں، حواس باختہ کہتے ہیں۔ آبرو باختہ کا مطلب، آپ کو پتا ہے کیا ہے؟"

"کیا؟"

"عزت لٹا دینا..... آپ کے فقرے کا مطلب ہوا کہ اگر خشامہ کمرے میں اکیلی ہو تو ایک گھنٹے میں....." شامیر نے جملہ ادھورا رہنے دیا..... اور زویا کی طرف دیکھنے لگا پھر کھنکھار کر بولا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی اردو میں مشکل لفظ استعمال نہ ہی کیا کریں۔"

وہ ہونٹوں کو بھینچ کر ذرا حیران نظروں سے شامیر کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی پھر جیسے پکا یک اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی مگر ناکام ہو گئی۔ ہنسی کی شدت سے وہ دہری ہونے لگی، چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان لمحوں میں وہ شامیر کو اتنی پیاری لگی کہ وہ ششدر رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ اس منظر کو لفظوں میں بیان کرنا چاہے، یا کسی بھی طریقے سے اس کا اظہار کرنا چاہے تو شاید نہ کر سکے۔

آخر اس نے بمشکل اپنی ہنسی کو بریک لگائے۔ ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ "شومیر! ہام بھی بہت حیران ہوتا تھا کہ ہام کی انڈین مسائی ہام سے بات کیوں نہ کرتا۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر ہے۔ ڈوئچے پہلے ہام نے اس کو بھی یہی لفظ بولا..... اس نے غلطی سے اپنے سائیکل کا پہیا ہام کے پاؤں پر چڑھایا۔ ہام نے کہا، آپ آبرو باختہ عورت ہو۔ اوہ گاڈ..... اوہ گاڈ..... اب تو ہام کو اس سے ملنا ہو گیں گا۔ اس کی مذمت کرنا ہو گیں گا۔"

"آپ پھر غلط فرما رہی ہیں۔" شامیر نے کہا۔

"آپ کو مذمت نہیں، معذرت کرنا ہو گی۔"

"یس..... یس! ہام یہی کہنا چاہتا۔"

اسی دوران میں شامیر کے آرڈر پر چائے آ گئی۔ زویا بولی۔ "ہام کو چائے سے پہلے چاکلیٹ کھانا بہت اچھا لگتا۔ بچپن میں پاپا سے ڈانٹ بھی پڑتا مگر ہام باز نا ہیں آتا۔"

اس نے اپنے پرس میں سے ایک بڑی چاکلیٹ نکالی۔ "اب آپ تو نا ہیں ڈانٹیں گے؟" اس نے کہا۔

"اتنی اچھی چاکلیٹ اگر آپ میرے ساتھ شیئر کریں گی تو میں دیوانہ ہوں جو آپ کو ڈانٹوں گا۔"

"یہ ڈراصل میں لائی ہی آپ کے لیے تھی۔ یہاں کا رواج ہے، کسی کو منانا ہو، ڈوسٹی (دوستی) کرنا ہو تو چاکلیٹ کو بیچ میں لایا جاتا ہے۔" اس نے چاکلیٹ شامیر کی طرف بڑھائی۔

"تھینک یو۔" شامیر نے کہا۔ اس کی دھڑکنوں میں ایک عجیب سنسناہٹ سی جاگ گئی تھی۔ وہ تحقیق کرنے والا ایک جواں سال صحافی تھا۔ ایک نہایت سنجیدہ پیشے سے تعلق رکھتا تھا مگر پتا نہیں کیا بات تھی، ان دنوں وہ خود کو ایک کالجیٹ نوجوان کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ کوئی سحر تھا اس لڑکی کی شخصیت میں۔

وہ چائے بنانے لگا تو اس نے شامیر کا ہاتھ روک دیا۔ "نا ہیں، ہام بنائے گا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹی ٹرالی پر ذرا سا جھک کر وہ پیالیوں میں بڑی نفاست سے قہوہ ڈالنے لگی۔ پھر اس نے شکر اور دودھ کا پوچھا۔ اس کے بال سرک کر اس کے رخساروں کو ڈھانپ رہے تھے۔ روم لائٹ نے اس کے نصف چہرے کو روشن کر کے ایک دلکش پینٹنگ سے مشابہ

کر دیا تھا۔

واقعی کچھ لمحے بڑے جدا ہوتے ہیں۔ گھڑیوں کے ڈائلز پر اور کیلنڈروں کے صفحات پر "عام" ہونے کے باوجود وہ عام نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ خاص ہوتا ہے اور وہ بندے کو کچھ خاص کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

شامیر کھوئے کھوئے سے انداز میں زویا کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی شامیر کی طرف بڑھائی۔ پیالی تھامنے کے بعد اس نے بڑی نرمی سے زویا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ تعجب سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

بالکل بے ساختہ..... شامیر کے منہ سے نکلا۔

"زویا..... کیا میں..... آپ کو پرپوز کر سکتا ہوں؟"

ایک دم جیسے چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹی اور اس کی کرچیاں پورے کمرے میں بکھر گئیں۔ زویا نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ یکا یک اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔

چائے زویا کے سامنے پڑی تھی مگر اب اس کی توجہ چائے سے یکسر ہٹ چکی تھی بلکہ وہ جیسے اچانک اس کمرے میں موجود ہر چیز سے اور شامیر سے بہت دور چلی گئی تھی.....

"کک..... کیا ہوا زویا؟" شامیر نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نا ہیں..... میں..... ویسے ہی....." وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے کے رنگ میں ایک طرح کی زردی شامل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکی۔ چائے بھی اس نے وہیں رہنے دی پھر اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے جانا ہوگا۔ ایک ضروری کال آ رہی ہے۔" اس نے انگلش میں کہا۔

شامیر گنگ سا ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس نے کوئی بڑی غلطی کر دی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زویا اس طرح ناراض ہو کر یہاں سے چلی جائے۔ "سنو زویا! بس چند سیکنڈ کے لیے میری بات سن جائیں....." اس نے اسے روکنے کے لیے بے ساختہ اس کا بازو تھاما۔

ردعمل شامیر کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ سخت جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی۔ "پلیز، چھوڑیں مجھے۔"

شامیر کو دھکیلتی ہوئی سی وہ باہر نکل گئی۔ شامیر جیسے لوکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر ختم ہو رہا تھا۔ شہر کی روشنیوں کے سوا ہر چیز جیسے سو رہی تھی۔ ساتھ والے بیڈ پر خشامہ کے مدھم خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ زویا دیوار گیر کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوئی..... شام کو جو کچھ ہوا اس کی زویا کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ عموماً انڈیا، پاکستان اور بنگلا دیش وغیرہ سے تعلق رکھنے والے مرد و زن سے دور ہی رہتی تھی۔ ایک عجیب سا کھنچاؤ محسوس ہونے لگتا تھا اسے مگر اسے شامیر دوسروں سے مختلف دکھائی دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ناراض ہوا تو زویا رنجیدہ ہو گئی۔ اس نے ہوٹل جا کر اسے منایا..... لیکن اس موقع پر وہ اس طرح کی بات کرے گا، زویا نے سوچا بھی نہ تھا۔ گھومنے پھرنے اور شاپنگ پارٹنر کی دوستی تک تو ٹھیک تھا لیکن جو بات شامیر نے کہی تھی، وہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے اپنی ماما کی کہی ہوئی بات یاد آنے لگی۔ وہ اکثر ایک فقرہ بولتی تھیں۔ "یہ ایشیائی مرد ایک دم دل پھینک ہوتے ہیں۔ جو عورت ہنس کر دو باتیں کر لے، یہ سمجھتے ہیں کہ اب اس کو بیوی بنا کر گھر میں ڈالنا ضروری ہو گیا ہے۔"

آج شام اسے اپنی ماما کے اس فقرے کی صحت کا اندازہ ہوا تھا۔ ابھی تین چار دن کی جان پہچان تھی اور شامیر نے اسے پرپوز کر ڈالا تھا۔ وہ اس کے پرپوزل پر ششدر رہ گئی تھی۔ پھر اس کا اچانک بازو پکڑ لیا۔ بے شک اس کی نیت صرف زویا کو روکنے کی تھی مگر پتا نہیں کیوں وہ دفعتاً سُن پا ہو گئی تھی۔ وہ شامیر کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

اس کے تصور میں کچھ بھولے بسرے مناظر ابھرے اور سماعت میں کچھ گمشدہ آوازوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے والدین یوں تو ہر وقت ہی جھگڑتے رہتے تھے مگر تہواروں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر وہ خصوصی اہتمام کے ساتھ اپنے بچوں کے لیے خوف اور دکھ کا ماحول بناتے تھے۔ زویا کو یاد تھا، تہواروں کی خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے ننھے دل میں ماما پاپا کے جھگڑے کا اندیشہ بھی براجمان رہتا تھا اور کچھ یہی کیفیت اس کی دونوں بڑی بہنوں کی ہوتی تھی۔

اگر جھگڑا تہوار سے ایک دو دن پہلے نہیں ہوتا تھا تو تہوار والے دن تو ضرور ہو جاتا تھا اور یہ کوئی معمولی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ پاپا کے دہاڑنے اور ماما کے چلانے کی آوازوں سے گھر کے در و دیوار گونجنے لگتے تھے۔ برتن ٹوٹتے تھے، چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکی جاتی تھیں۔ دونوں طرف سے سخت بدزبانی ہوتی تھی اور آخر میں پاپا..... ماما کو پیٹ ڈالتے تھے۔ وہ تینوں بہنیں ڈری سہمی، گھر کے کسی کونے میں دبک جاتی تھیں۔ جھگڑے کا اختتام بھی کسی

زویا کی آمد پر ہوتا تھا، کبھی پاپا گرجتے برستے دو چار گھنٹوں کے لیے گھر سے باہر چلے جاتے تھے..... اور چند بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ پولیس کی آمد ہوگئی تھی۔

ماما اور پاپا کی طلاق سے دو تین سال پہلے ایک بار زویا نے اپنی ماما سے پوچھا تھا۔ ''آپ دونوں کے جھگڑے کب اور کس بات سے شروع ہوئے؟''

ماما نے کہا تھا۔ ''جھگڑے شادی کے پانچ چھ ماہ بعد ہی شروع ہوگئے تھے، مگر کس بات پر ہوتے، اس کا تعین کرنا تھوڑا مشکل ہے، کم از کم تم شاید نہ سمجھ پاؤ گی۔''

زویا نے کہا تھا۔ ''کیا شادی کے بعد پاپا کی محبت میں کمی آگئی تھی؟''

''نہیں۔ میں یہ بالکل نہیں کہوں گی۔ راشد مجھ سے پیار کرتے تھے اور شاید اب بھی کرتے ہیں..... انہوں نے میری اور تم بچوں کی تمام ضروریات بھی اچھے طریقے سے پوری کی ہیں۔ اکثر پہلوؤں سے وہ ایک اچھے شوہر اور باپ ہیں..... مگر ان کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ مجھ سے غیر مشروط محبت چاہتے تھے۔''

''غیر مشروط؟'' زویا نے حیران ہوکر پوچھا تھا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ شاید تم ٹھیک سے سمجھ نہ پاؤ۔ تم اسے ایک نفسیاتی کج روی بھی کہہ سکتی ہو..... وراثتی عارضہ بھی..... یا ایسا ہی کوئی اور نام دے سکتی ہو۔ اس کی شروعات بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوئی تھی۔ میں تمہیں ایک مثال دیتی ہوں۔ مجھے بچپن سے سگریٹ کا دھواں بے حد ناپسند تھا۔ سگریٹ کی بو سے مجھے متلی ہونے لگتی تھی۔ راشد بھی سگریٹ پیتے تھے۔ شادی کے بعد میں نے ان سے مناسب لفظوں میں اس بات کا ذکر کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے لیے یہ بری لت چھوڑ دیں گے مگر یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ وہ بدستور سگریٹ پیتے رہے بلکہ پہلے سے زیادہ پینے لگے۔ مجھے لگا، جیسے وہ چاہتے ہیں کہ میں اس بو سمیت ہی انہیں قبول کروں اور ان کے پاس آؤں..... میں نے یہ سب قبول کرلیا تو پھر اس طرح کے کچھ اور سلسلے شروع ہوگئے۔ مجھے اچھا لباس اور خوشبو پسند تھی، راشد کا صاف ستھرا رہنا پسند تھا مگر جب انہیں اس کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے حلیے کی طرف سے بالکل بے پروا رہنا شروع کردیا۔ میں جب ان کے پاس ہوتی تو ان کے جسم سے پسینے کی بو اٹھ رہی ہوتی۔ پہلے اگر وہ ہفتے میں چار بار نہاتے تھے تو اب مہینے میں چار بار نہانے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میرے لیے خصوصی طور پر اپنے پسینے اور اپنی سانسوں کی بو کا اہتمام کرتے ہیں اور اس پر آسودگی محسوس کرتے ہیں کہ میں پھر بھی ان کی قربت کے لمحوں کی ساتھی بنتی ہوں۔ ایک موقع پر میں نے ان سے کہا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اچھی لگتی ہیں۔ انہوں نے مونچھیں صاف کرادیں..... اور شیو کی طرف سے بے پروائی برتنا شروع کردی۔ ایسی بے ڈھنگی اور تکلیف دہ باتوں کی فہرست بہت طویل ہے زویا۔ کیا کیا بتاؤں؟''

زویا نے ماما سے کہا تھا۔ ''ماما! آپ کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن پاپا بھی تو کئی ایسے شکوے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ صرف منہ زبانی مسلمان ہوئی ہیں۔ آپ کو اب بھی یہاں کا مذہب اور یہاں کا رہن سہن ہی پسند ہے۔ آپ جان بوجھ کر پاکستانی لباس پہننے سے گریز کرتی ہیں۔ خوشی کے موقعوں پر آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ مغربی طرز کی کوکنگ کی جائے۔ کئی موقعوں پر آپ حلال گوشت کو بھی نظر انداز کردیتی ہیں۔ آپ جان بوجھ کر مذہب کے حوالے سے اختلافات کو ہوا دیتی ہیں۔ اس طرح کے اور کئی اعتراضات کرتے ہیں پاپا۔''

زویا کی ماما سارہ نے اس موقعے پر ایک گہری سانس لی تھی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی تھیں۔ ''میں خود کو مکمل بے قصور نہیں ٹھہراتی۔ جو باتیں تم کہنا چاہ رہی ہو، وہ ساری غلط نہیں ہیں لیکن زویا! یہ ایک ردعمل کے طور پر ہوا ہے۔ شروع میں، میں ان کا رویہ اور ان کی زیادتیاں بچوں کی خاطر برداشت کرتی رہی لیکن پھر دھیرے دھیرے میرے اندر کی اذیت اور گھٹن کا اظہار بھی مختلف طریقوں سے ہونے لگا۔ ممکن ہے کہ کئی بار میری طرف سے بھی کچھ حدیں پار ہوئی ہوں..... لیکن اب یہ سب کچھ ہم دونوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ میں اپنے قدم روک سکتی ہوں اور نہ وہ۔ اب تو..... وہ ایک ہی حل ہے جو نوشتۂ دیوار کی طرح نظر آرہا ہے۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں ماما؟'' زویا نے روہانسی ہوکر کہا تھا۔

''یہ میں نہیں کہہ رہی..... یہ طویل زمانے اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جانے والا رویہ کہہ رہا ہے۔ ہر خطے اور ہر رنگ و نسل کے لوگ اپنا اپنا مزاج رکھتے ہیں۔ ان مزاجوں کی ہم آہنگی کا سپنا اکثر جھوٹا ہی ثابت ہوتا ہے زویا۔ تم لوگ ذرا بڑے ہوئے تو پھر سب سے بڑا اور اہم ترین مسئلہ ہمارے سامنے آگیا تھا اور وہ یہ تھا کہ اب بیٹیاں بڑی ہورہی ہیں۔ ہم یہاں رہیں کہ پاکستان چلے جائیں۔ راشد ہر صورت پاکستان جانا چاہتے تھے۔ وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ ان کا یہ فاصلہ بڑھتا چلا گیا..... اور اس کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی درمیانی خلیج بھی بڑھتی چلی گئی۔ میں کسی طور اپنا وطن چھوڑنے کو تیار نہیں تھی اور نہ کبھی ہوں گی....."

ماضی کی گمشدہ آوازیں زویا کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی فرینکفرٹ کی اونچی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ والے بستر پر خشامہ نے کسمسا کر کروٹ بدلی تو زویا اپنی سوچوں سے باہر آ گئی۔

شاید ماما نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مشرق اور مغرب کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صرف تین چار دن کی جان پہچان، گفتگو کی چند نشستیں، ذرا سی بے تکلفی اور شادی کی آفر.....

"اونہہ....." اس نے سر ہلایا اور بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستی ہوئی دوبارہ بستر پر آ گئی مگر ابھی نیند کے آثار نہیں تھے۔ اس کی نگاہوں میں شامیر کا چہرہ گھومنے لگا۔ شام کو وہ جب جھنجلاہٹ اور غصے کے عالم میں اس کے کمرے سے نکلی تھی تو اس کا چہرہ اس بجھی ہوئی راکھ جیسا تھا جو ہوا کے ایک جھونکے سے ناپید ہونے والی ہو۔ شرمندگی، بے چارگی، پچھتاوا سب کچھ غیر معمولی شدت کے ساتھ اس کے نقوش پر بکھرا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے زویا کو تھوڑا سا ترس آیا مگر پھر فوراً ہی غم و غصہ اس پر غالب آ گیا۔ آخر اس نے ایسی بے وقوفی کی ہی کیوں؟ کتنی بے موقع اور کتنی بے تکی بات کر دی تھی اس نے۔ ایک ہی جملے سے خود کو عرش سے فرش پر لے آیا تھا..... شاید..... ایشیائی مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون پر وائبریشن ہوئی۔ یہ اس کی ماما کا فون تھا۔ وہ کوئی ایک مہینے بعد رابطہ کر رہی تھیں۔ "ہیلو زویا! تم سو تو نہیں گئی تھیں؟"

"نہیں ماما! ابھی نیند نہیں آئی اور آپ بھی جاگ رہی ہیں۔"

"میں تو تمہارے لیے جاگ رہی ہوں..... تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"آپ کو میرے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے اب خود بھی سوچنا آ گیا ہے۔" وہ جرمن میں بولی۔ ماں بیٹی ہمیشہ جرمن میں ہی بات کرتی تھیں۔

"تمہیں کتنا بھی سوچنا آ جائے لیکن تم ایک ماں کو اپنے بارے میں سوچنے کے حق سے محروم نہیں رکھ سکتیں۔"

زویا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تو کیا سوچا آپ نے؟"

"بہت اچھا لڑکا۔ اوپن مائنڈڈ، ایجوکیٹڈ، اصل جرمن نسل، معزز خاندان..... بلڈ برانڈ کیلی سے تعلق ہے..... برسر روزگار ہے۔ اس سے اچھا رشتہ تمہیں نہیں ملنے والا۔ پچھلی دفعہ میں نے تمہیں اس کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل کو بھی ہو گی۔"

"ماما! آپ سے پچاس بار کہا ہے، ابھی میں اس جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے اپنا کیریئر بنانے کے لیے۔"

"اور یہ جو تمہارا کیریئر ہے نا، یہ بھی مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ نادان بچی! اگر جرنلزم میں ہی آنا تھا تو پھر کوئی مقامی اخبار یا چینل ہوتا، تم جا کر ایچ ہو گئی ہو اس بے کار پاکستانی چینل سے۔ تمہیں بے شمار مرتبہ بتا چکی ہوں، ان ایشیائی لوگوں میں کم ہی ہوتے ہیں جو بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ زیادہ دیر تک عافیت کے ساتھ چلا نہیں جا سکتا۔"

"اچھا ماما! اب بس بھی کریں، میں نے کون سا زندگی بھر کا معاہدہ کر لیا ہے۔ جب ٹھیک نہیں لگے گا چھوڑ دوں گی۔"

ذرا توقف کے بعد ماما کی آواز دوبارہ ابھری۔ "وہ جو لڑکا آیا تھا چینل والوں کی طرف سے..... چلا گیا یا یہیں پر ہے؟"

"چلا گیا ہے ماما! ہوٹل میں شفٹ ہو گیا ہے۔"

"چلو یہ تو اچھا ہوا۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنا ہی تعلق رکھنا چاہیے جتنا بہت ضروری ہو۔ ویسے تم لوگوں نے کہا یا خود ہی چلا گیا ہوٹل میں؟"

زویا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "خود ہی چلا گیا ماما! اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کی پرائیویسی متاثر ہو رہی ہے۔"

"اس سے کوئی رابطہ وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کو انگلی پکڑاؤ تو یہ پورا ہاتھ بلکہ بازو پکڑ لیتے ہیں۔ باہر سے کچھ ہوتے ہیں اندر سے کچھ۔ ویسے بھی جوان لڑکے لڑکی کا زیادہ دیر تک اکٹھے گھومتا پھرنا اور اکٹھے رہنا، کچھ اچھا نتیجہ نہیں نکالتا....." زویا کو ماما کے لہجے میں ایک تیز کاٹ محسوس ہوئی۔ اس نفرت آمیز کاٹ اور رویے کی وجہ وہ بخوبی جانتی تھی۔ وہی ماما اور پاپا کا ناکام ازدواجی تعلق۔ وہ اس ناکام تعلق اور تلخ زندگی کے لیے کسی ایک کو تصور وار نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ دونوں نے مل جل کر اس رشتے کو برباد کیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اسے ماما کی باتوں میں پاپا کی باتوں سے زیادہ وزن محسوس ہوتا تھا۔ اب جس طرح کی صورت حال شامیر کے حوالے سے پیش آئی تھی، وہ بھی ماما کے خدشات اور خیالات کے عین مطابق ہی تھی۔ صرف چند دن کا ساتھ، پوری طرح جان پہچان بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے سامنے

کمپاک سے شادی کی تجویز نہایت بھونڈے انداز میں رکھ دی گئی تھی۔

ماما سے فون پر بات ختم کرنے کے بعد وہ بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ پتا نہیں کیوں ایک بار پھر شامیر کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں شامیر کے کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے اسے تقریباً دھکیل ہی دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے گیا تھا اور ششدر زدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ چہرے پر بجھی ہوئی راکھ اور آنکھوں میں بوکھلاہٹ آمیز حیرت دکھائی دیتی تھی۔

دس گیارہ دن پہلے جب شامیر فرینکفرٹ کے ائرپورٹ پر اترا تھا تو زویا کو دوسرے لوگوں سے کافی مختلف دکھائی دیا تھا۔ مہذب اور شائستہ..... پھر ایک دو روز میں ہی اس نے خود کو کافی معاملہ فہم اور ذہین بھی ثابت کردیا تھا جگمگاتی گاڑی کی چمکیلی سطح پر اس نے جس طرح شمل کاک کے ڈیزائن والی عمارت کا شیڈ ڈھونڈا تھا وہ ایک ڈرامائی ٹچ رکھتا تھا..... اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تخلیقاتی صحافت میں اگر اس کا کوئی نام ہے تو یونہی نہیں ہے۔ خشامہ تو دل و جان سے اس کی فین ہوگئی تھی مگر اس کے بعد ہوٹل کے کمرے میں جو باتیں ہوئیں، انہوں نے زویا کو نہ صرف بے حد مایوس کیا بلکہ شامیر ایک دم دل سے اتر گیا۔

☆☆☆

پرسوں شام جو کچھ ہوا تھا، اس نے شامیر کو پشیمانی اور پچھتاوے کے سمندر میں ڈبو دیا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کیسے وہ فقرہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ جیسے کسی نے جادو کردیا ہو اور وہ چند سیکنڈ کے لیے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ دراصل پچھلے پانچ چھ دن میں جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ سب آناً فاناً اور غیر متوقع تھا۔ یہ سب کچھ پہلی نظر کی محبت تو نہیں تھی مگر پہلی نظر کی محبت جیسا ہی تھا۔ شامیر نے کامرس بینک کی چھت پر، تیز ہوا کی لہروں میں زویا کو اس انداز میں دیکھا تھا کہ وہ اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے بال باندھ رہی تھی۔ چمکیلے سورج کی روشنی اس کے ایک پہلو کو روشن تر کررہی تھی..... اور یہ منظر آنکھوں کے راستے سیدھا شامیر کے دل میں اترا تھا اور ایک ہی لمحے میں جیسے اس کی دنیا بدل گیا تھا۔ اس کے بعد اگلے پانچ چھ روز میں جو کچھ ہوا تھا، اسی کیفیت کے تحت ہوا تھا۔ یہ بات تو حقیقت تھی کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کے حوالے سے ایک صاف گو بندہ تھا۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا تھا، کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنی زبان پر لے آتا تھا۔ زویا کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا..... اور شاید غلط ہوا تھا۔ شامیر نے اس بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچا تو اس میں اسے سراسر اپنی ہی غلطی محسوس ہوئی۔ زویا کی جگہ شاید کوئی بھی لڑکی ہوتی، اس جذباتی بلکہ ہیجانی طرز کے عمل کو برداشت نہ کرتی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اس سلسلے میں زویا سے رابطہ کرے اور اس سے معافی مانگے۔ اس کا ذریعہ فون ہی ہوسکتا تھا مگر شامیر کو پتا نہیں تھا کہ وہ اس کی کال ریسیو کرے گی یا نہیں اور اگر کرے گی تو اس کا لب و لہجہ کیا ہوگا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ غصے کے عالم میں اس کے کمرے سے نکلی تھی۔ اس کے علاوہ زویا سے رابطہ کرنے میں تھوڑا سا انا کا مسئلہ بھی پیش آرہا تھا۔ بہرحال یہ کوئی ایسا دشوار مسئلہ نہیں تھا۔ محبت کی گہرائی میں سب سے پہلے انا ہی ڈوب کر مرتی ہے اور شامیر محسوس کرتا تھا کہ زویا کے حوالے سے اس کے دل میں جو کچھ بھی ہے، وہ خاصا گہرا ہے۔

آخر یہ سب کیوں ہوا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسے اپنا وہ عہد توڑنے کی سزا ملی ہو جو اس نے خود سے کر رکھا تھا؟ اس کا خود سے عہد تھا کہ وہ اپنی شریکِ زندگی کا انتخاب اپنی امو خالہ پر چھوڑے گا لیکن..... پرسوں شام ہونے والا واقعہ اتنا آناً فاناً تھا کہ اس کا یہ عہد بھی اظہار کے تند و تیز ریلے میں تنکے کی طرح بہہ گیا۔ ایک طرح کے احساسِ جرم نے اسے گھیر لیا۔ اس کا دل چاہا کہ امو خالہ کو کال کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ امو خالہ کی کال آگئی۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ امو نے اس کا حال احوال پوچھا اور پھر بڑی بے تابی سے ڈھیر ساری نصیحتیں اس کے پلے باندھ دیں۔

''کھانے پینے کا خاص خیال رکھو۔ پانی زیادہ پیو۔ تمہیں کبھی کبھی گردے کا درد ہو جاتا ہے۔ موسم وہاں اکثر اچانک خراب ہو جاتا ہے، چھتری لے کر نکلا کرو۔ ٹھنڈ ہو تو گرم کپڑوں کے بغیر نہ نکلو۔ غیر ضروری طور پر لوگوں سے ملنے جلنے کی ضرورت نہیں ہے..... سیر و تفریح میں بھی احتیاط ہونی چاہیے۔ رات کو دیر تک گھر سے باہر نہ رہو۔''

وہ شامیر کو یوں سمجھا رہی تھیں جیسے وہ اسکول کالج کا بچہ ہے۔ پھر انہوں نے زویا کے بارے میں پوچھا۔ ''تم نے اس سے میری بات نہیں کرائی؟''

''کیوں، کیا بات کریں گی؟''

''بھئی پیاری لڑکی ہے..... اور..... مجھے لگتا ہے کہ تھوڑی بہت تمہارے دل کو بھی لگی ہے۔ لگی ہے یا نہیں؟''

''آپ کی تھوڑی بہت والی بات تو صحیح ہے۔ مگر امو!

پکٹر فرینک تو نہیں ہوتی۔ اسے بھی تھوڑا بہت اچھا لگوں تو پھر ہے نا۔"

"ہوہائے۔ کیوں ایسے نہیں لگو گے تم اسے؟ لاکھوں میں ایک ہو..... آج کل چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتے ایسے لڑکے۔ آج کل کے زیادہ بچوں کے تو قد کاٹھ ہی اتنے نہیں ہیں..... اور یہ یورپین لڑکیاں ہوتی ہیں لمبی تڑنگی۔"

"امو! ساری لمبی تڑنگی نہیں ہوتیں۔ اب مارکیٹ میں درمیانے سائز کی بھی آرہی ہیں اور آپ مجھے دیکھتی ہیں ایک ماں کی نظر سے۔ سب تو ایسی نظروں سے نہیں دیکھتے نا....."

وہ گہری سانس لے کر بولیں۔ "شامی! اگر تیرے دل میں کچھ ہے ناں، تو پھر میری بات کرا اس سے۔"

شامیر کے حافظے میں وہ منظر چمک گیا جب وہ اسے جھکیلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ بلند آواز میں ہنسا۔ "امو! آپ تو سیریس لینے لگی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تو میں نے رواروی میں ایک بات آپ سے کہہ ڈالی تھی۔"

اسی دوران میں اس کی خالہ زاد فارہ بھی ویڈیو لنک پر آدھمکی۔ "شامی بھائی جان! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ہمیں کوئی بڑا سرپرائز دینے کے چکر میں ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ جب آپ واپس گھر تشریف لائیں تو آپ کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہو اور آپ ممی سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہیں..... امو! یہ ہے آپ کی بہو..... اس کے بعد آپ پانی لینے کے لیے کچن کی طرف دوڑ پڑیں....."

"پانی لینے کے لیے؟"

"ظاہر ہے بھائی جان! اس کے بعد ممی چکرا کر صوفے پر گریں گی اور آپ انہیں پانی وانی تو پلائیں گے۔"

امو خالہ نے فارہ کے سر پر ایک چپت لگائی۔ شامیر نے کہا۔ "لگتا ہے فارہ کہ اس بار تم نے مڈل کے امتحان میں ضرور شرمناک نمبر لیے ہیں۔ اتنی انڈین فلمیں..... اتنی انڈین فلمیں....."

☆☆☆

فرینکفرٹ میں زویا اکثر پبلک ٹرانسپورٹ ہی استعمال کرتی تھی تاہم اس کے پاس پرانے ماڈل کی ایک ٹوسیٹر کار بھی تھی۔ وہ اور خشامہ کبھی کبھار اس پر سواری کرتی تھیں۔ آج زویا اکیلی ہی نکلی ہوئی تھی۔ اس کا موڈ ابتر ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ آج کل مسلسل ایک "شٹ اپ سٹ" سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ بڑی کمپوزڈ شخصیت کی مالک تھی۔ اس طرح کا انتشار اس کی طبع میں کم ہی ہوتا تھا۔ آج شام اس کی فیملی کے ایک پرانے ملنے والے فادر جوناتھن اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ ان کی میزبانی کے لیے ہی کچھ اشیا خریدنے کے لیے نکلی تھی۔ ایک نوجوان سڑک کراس کرتا ہوا نظر آیا۔ پتا نہیں اسے عقب سے دیکھ کر زویا کو ایکدم کیوں ایسا لگا کہ وہ پاکستان سے آنے والا شامیر ہے مگر جب اس نے چہرہ ٹریفک سگنل کی طرف پھیرا تو وہ کوئی اور تھا۔ مگر تب تک زویا کو ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو چکی تھی۔ ٹریفک سگنل زرد ہو چکا تھا۔ اس نے گاڑی روکنے کے لیے بریک پیڈل دبایا جو ضرورت سے زیادہ دب گیا۔ ایک اوڈی کار عقب سے اس کی ٹوسیٹر کے ساتھ ٹکرائی، کافی سخت تصادم تھا۔ زویا اپنی نشست پر اچھل کر رہ گئی۔ اسے اپنی گاڑی کی ٹیل لائٹس ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ یہ بارونق علاقہ نہیں تھا۔ شام کے بعد سڑک تقریباً خالی ہی نظر آرہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتری ہی تھی کہ ایک اٹھی کٹی سیاہ فام عورت تیزی کے ساتھ دوسری گاڑی سے نکلتی نظر آئی۔ اس نے گفتگو کا آغاز ہی گالی سے کیا اور زویا پر جھپٹ پڑی۔ اس نے زویا کو طمانچہ مارا، جواب میں زویا کو بھی طمانچہ رسید کرنا پڑا۔ اس سے پہلے کہ زویا سنبھلتی، دو مزید عورتیں گاڑی سے نکل آئیں۔ وہ بھی شکلوں اور ڈیل ڈول سے غنڈا صفت ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے ایک سفید فام اور دوسری نیگرو تھی۔ زویا نے پہلے والی فربہ اندام عورت کو گھما کر فٹ ہاتھ پر پٹخ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دوسری سیاہ فام نے گاڑی میں سے لوہے کا جیک ہینڈل نکال لیا اور اپنی سفید فام ساتھی کے ساتھ زویا پر پل پڑی۔ "حرامزادی، چڑیل! گاڑی چلانا نہیں سکھائی تیری کسی..... والدہ نے تجھے۔" اس نے ایک جرمن گالی دے کر کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی زویا کی مدد کو پہنچتا۔ انہوں نے اسے اچھی خاصی چوٹیں لگا دیں۔ وہ چکرا کر گر پڑی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر اور گاڑی میں بیٹھ کر اوجھل ہو گئیں۔ وہ بمشکل گھٹنوں پر زور دے کر اٹھی۔ اس کا بایاں بازو کلائی سے اوپر چھل رہا تھا۔ ہونٹوں سے رسنے والے خون نے منہ کا ذائقہ نمکین کر رکھا تھا۔ سڑک کے اس حصے پر کوئی کیمرا وغیرہ بھی نہیں تھا..... شاید اسی لیے اوڈی گاڑی والی غنڈیاں زیادہ مشتعل ہوئی تھیں۔

زویا نہیں چاہتی تھی کہ پولیس اس معاملے میں انوالو ہو جائے۔ دو چار راہ گیر وہاں رک گئے تھے۔ وہ ان کے سہارے جلدی سے اپنی ٹوسیٹر میں بیٹھی اور کراہتی ہوئی

وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس کا بایاں بازو کہنی سے نیچے درد سے ٹیس رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بازو پر زیادہ چوٹ آئی ہے۔ کچھ آگے جا کر اس نے ٹو سیٹر پارکنگ ایریا میں گاڑی کی اور خشامہ کو فون کیا۔ ''ہیلو خشامہ! چھوٹا سا حادثہ ہوگیا ہے۔ مجھے چوٹ آئی ہے۔ لگتا ہے کہ اسپتال جانا پڑے گا۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے آسکتی ہو؟''

خشامہ کا آفس اس واقعے والی جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ فقط دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ اسپتال جانے کے بجائے انہوں نے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس جانا بہتر سمجھا۔ اس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ خشامہ کی جان پہچان بھی تھی۔ ملٹی پل ایکسریز اتارنے والی مشین نے مختلف زاویوں سے اس کی کلائی کے ایک درجن ایکسریز اتار ڈالے۔ اس کی کلائی کی بڑی ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر تھا۔ یہاں پلاسٹر کی ضرورت تھی..... تاہم دیگر چوٹیں عام مرہم پٹی سے ٹریٹ ہوسکتی تھیں۔

☆☆☆

شامیر نے دو تین بار زویا کو فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہمت نہیں پڑی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ کل وہ خود زویا کے فلیٹ جا کر اس سے ملے گا اور اس سے اپنے رویے کے لیے پُرخلوص معذرت کرے گا۔

ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ اس کے فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ لوکل کال تھی۔ دوسری طرف سے خشامہ کی آواز ابھری۔ وہ کسی شاپنگ سینٹر میں سے بول رہی تھی۔ ''گڈ ایوننگ مسٹر پاکستانی! کیسے ہو آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں..... اور تم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں..... لیکن..... آپ کی وہ کولیگ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید آپ کو ابھی تک خبر نہیں ملی۔''

''تت..... تم زویا کی بات کر رہی ہو؟..... کیا ہوا اسے؟'' شامیر نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''ہوا تو زیادہ کچھ نہیں۔ بس قتل ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ چھوٹا سا ایکسیڈنٹ تھا جس پر جھگڑا ہو گیا۔ مخالف پارٹی نے کوٹ ڈالا بے چاری کو۔ بازو ٹوٹ گیا ہے۔ چھوٹی بڑی اور چوٹیں بھی آئی ہیں۔ بستر سنبھال رکھا ہے محترمہ نے۔''

بیس منٹ کے اندر اندر شامیر بذریعہ ''سٹی ٹرین'' زویا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ شکر تھا کہ خشامہ ابھی شاپنگ سے لوٹی نہیں تھی۔ زویا بستر پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس نے فلیٹ کا آٹو لاک دروازہ بٹن دبا کر کھولا تھا۔ اس کے بازو پر پلاستر تھا اور ماتھے پر بھی بینڈیج دکھائی دے رہی تھی۔ شامیر کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ پلکیں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے شامیر کا یہاں آنا بالکل اچھا نہیں لگا۔

چند رسمی کلمات کے فوراً بعد شامیر اصل موضوع پر آگیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اصل بات سے پہلے ہی خشامہ یہاں آن دھمکے۔ وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی مزاج پرسی کے لیے میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا لیکن..... اگر آپ کو یہ چوٹیں وغیرہ نہ لگتیں تو بھی ایک بار..... کم از کم ایک بار تو مجھے آپ سے ملنا ہی تھا۔''

''کس سلسلے میں؟'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر انگلش میں بولی۔

''آپ سے معافی مانگنے کے سلسلے میں۔'' اس نے بڑے رسان سے کہا۔ ایک ہی لمحے میں وہ سرتاپا التجا نظر آنے لگا تھا۔

اس کے انداز نے زویا کو ٹھٹکا دیا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا پھر بمشکل بولی۔ ''مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں..... لیکن آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ دوبارہ مجھ سے نہ ملیں۔ جو کچھ بھی ہمارے درمیان ہوا، اس کو آپ یہیں پر ختم کردیں تو میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں گی۔''

شامیر نے کہا۔ ''لڑکے بہت جلدی لڑکیوں سے معافی مانگ لیتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد رومانی معاملات کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ میری معافی کے پیچھے اس طرح کی کوئی نیت نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں دوبارہ آپ سے نہ ملوں تو ایسا ہی ہوگا لیکن ایک بات میں آپ سے ضرور کہنا چاہتا ہوں۔''

زویا نے سوالیہ نظروں سے شامیر کی طرف دیکھا۔

شامیر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''آپ کے حوالے سے جو کچھ میرے دل میں ہے، اسے آپ نہیں نکال سکتیں اور نہ اسے نکالنا میرے بس میں ہے۔ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔''

شامیر کے معافی مانگنے کے بعد زویا کا تنا ہوا چہرہ کچھ نرم پڑ گیا تھا۔ وہ قدرے حیرت سے شامیر کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ وہ اس طرح اپنے رویے پر معذرت خواہ ہوسکتا ہے۔

شامیر نے اس سے ایکسیڈنٹ کا احوال پوچھا۔ زویا مختصر الفاظ میں بتانے لگی کہ یہ واقعہ کس طرح اور کیوں پیش آیا..... لیکن وہ اسے یہ ہرگز نہ بتا سکی کہ اس واقعے کی اصل وجہ خود شامیر ہی بنا ہے، ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے

سڑک پار کرنے والے ایک بندے کو دیکھا اور اسے خوامخواہ شک ہوا کہ وہ شامیر ہے۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے زویا کا نام پکارا۔ زویا نے بٹن دبا کر دروازہ کھولا۔ اندر آنے والے شخص کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ سفید بال، چمکتا ہوا چہرہ، اس نے سفید رنگ کا ایک لمبا سا چغہ اور سیاہ بوٹ پہن رکھے تھے.....

اسے دیکھ کر زویا نے تعظیماً اٹھنے کی کوشش کی مگر آنے والے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ نووارد سوالیہ نظروں سے شامیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

زویا نے جیسے مجبوراً تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''فادر! یہ شومیر ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ پاکستان سے آئے ہیں۔ ان کا تعلق بھی ڈبل اے چینل سے ہے۔''

پھر وہ شامیر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہ فادر جوناتھن ہیں۔ لیونا برگ قصبے کے ایک گرجے میں فرائض انجام دیتے ہیں۔ ہماری فیملی کے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔''

فادر جوناتھن نے شامیر سے ہاتھ ملایا پھر دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فادر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اصل کرم فرما تو خدا کی ذات ہے۔ ہم میں تو بس اس ذات کا تھوڑا تھوڑا عکس ہوتا ہے۔ کسی میں کرم فرمائی کا عکس، کسی میں رحم دلی اور محبت کا عکس، کسی میں ذہانت کا عکس.....''

وہ بات کرتے کرتے رک گئے پھر انہوں نے اپنی ہلکی نیلی، گہری آنکھوں کو شامیر کے چہرے پر جمایا اور بولے۔ ''خشامہ نے مجھے بتایا ہے..... تم نے آتے ساتھ ہی چینل والوں کا ایک بڑا مشکل مسئلہ حل کر ڈالا ہے۔ وہ تمہارے پیشے میں تمہاری سمجھ بوجھ کی بہت تعریف کر رہی تھی۔ زویا کا بھی یہی خیال ہے۔''

''تعریف کے لیے شکریہ..... ویسے میں اس قابل تو نہیں ہوں فادر! یونہی ایک نکتہ ہاتھ آ گیا تھا جس کی وجہ سے کام آگے بڑھ سکا۔''

فادر جوناتھن کی تیز نگاہیں بدستور شامیر کے سراپا پر دوڑ رہی تھیں۔ پھر شامیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے پاؤں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اچانک انہوں نے شامیر کی جرابوں کی طرف اشارہ کیا اور قدرے خفا لہجے میں بولے۔ ''مسٹر شامیر! یہ کیا ہے؟''

شامیر نے دھیان سے اپنی براؤن جرابوں کی طرف دیکھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن جب سفید بالوں اور بھاری پلکوں والے فادر نے دوبارہ انگلی سے اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی کراس کا نشان بنایا تو شامیر سمجھ گیا۔ جرابوں کی ایک سائڈ پر کچھ ایسا ڈیزائن تھا جس کے نچلے حصے کو صلیب سے مشابہ کہا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ صلیب نہیں بنائی گئی تھی مگر اسے باقی کے ڈیزائن سے جدا کر کے دیکھا جاتا تو صلیب دکھائی دیتی تھی۔

فادر جوناتھن کی بھاری آواز شامیر کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''یہ سب خدا کو ناراض کرنے والی باتیں ہیں۔ ایسی سرکشی، ایسی بے خوفی، بنانے والوں پر تو خدا کی لعنت ہونی ہی چاہیے، پہننے والوں کی بے احتیاطی بھی قابلِ سرزنش ہے۔''

''ویری سوری فادر! میرا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ ویسے بھی یہ ڈیزائن.....''

''پلیز چپ رہو۔'' فادر نے ذرا تیز لہجے میں شامیر کی بات کاٹی۔ ''گناہ کا عذر کئی دفعہ گناہ سے بھی برا ہوتا ہے..... تم مسلمان ہو۔ جس طرح تم اپنے مذہب کا احترام کرتے ہو اس طرح دوسروں کے مذہب کا بھی کرنا چاہیے۔ صلیب کے نشان کی توہین بے حد و بے شمار لوگوں کے لیے توہین اور تکلیف کا باعث بنتی ہے۔''

فادر جوناتھن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوشش کر کے خود پر ضبط کر رہے ہیں۔

شامیر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''فادر! اگر آپ کو برا لگا تو مجھے افسوس ہے مگر یہ جرابیں اور کچھ دیگر چیزیں میں نے یہیں فرینکفرٹ سے خریدی ہیں..... جیمز اینڈ جانسن اسٹور سے..... بہرحال میں انہیں اتار دیتا ہوں۔''

شامیر نے اسی وقت لیسے کھولے اور جرابیں اتار کر پینٹ کی جیب میں رکھ لیں..... یہ سن کر کہ شامیر نے یہ جرابیں یہیں سے خریدی ہیں، فادر جوناتھن کا غصہ کافی کم ہو گیا۔ رہی سہی کسر جرابوں کے اتر جانے سے پوری ہو گئی۔

اس کے بعد فادر نے نسبتاً نرم لہجے میں ایک لمبی چوڑی تقریر شامیر کے سامنے کر ڈالی۔ پند و نصائح سے بھری ہوئی یہ تقریر خالص مذہبی نوعیت کی تھی۔ اس کو کسی حد تک تبلیغی بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے عقیدے اور مسلک کی خوبیاں بڑے سلجھے انداز میں بیان کر رہے تھے۔ شامیر بڑے صبر و تحمل سے ان کی باتیں سنتا رہا..... جواب تو اس کے پاس بھی کئی تھے مگر اس نے صرف وہ جوابات دیے انداز میں دیے جن سے نزاع کی کیفیت پیدا نہ ہو۔

آخر وہ بولا۔ ''فادر! آپ سے تو ایک تفصیلی نشست ہونی چاہیے۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتے دروازے پر

پچھلی پر۔۔۔

"ہائی" ہوئی اور پھر خشامہ چھپاک سے اندر آ گئی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ کمرے میں صرف زویا اور شامیر ہوں گے۔ وہ بڑا بولڈ قسم کا ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ یہ نیلا ڈریس "میکسی" کی طرز کا تھا..... تاہم کندھے اور گردن سے نیچے کا جسم ڈھانپنے سے تقریباً قاصر تھا۔ بازو بھی عریاں تھے۔ اس نے پاؤں میں نیلے ہی رنگ کی اونچی ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی۔

فادر جوناتھن کو وہاں دیکھ کر وہ دفعتاً ٹھٹکی۔ "سوری۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ پلٹ کر باہر نکلنے لگی تو اس کا بھانڈا مزید پھوٹا۔ وہ "بیک لیس" لباس پہنے ہوئے تھی یعنی کمر دو تہائی سے زیادہ عریاں۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی سی باہر نکل گئی۔

فادر جوناتھن نے برا سا منہ بنایا اور کچھ بڑبڑائے۔ زویا بھی ذرا خجل نظر آئی۔

فادر، زویا سے مخاطب ہو کر بولے۔ "یہی بے راہ روی ہے جو ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ عورت کے لیے مرد اور مرد کے لیے عورت کا حصول اتنا آسان ہوتا جا رہا ہے کہ اب اس تعلق میں فطری دلچسپی ہی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے ہمارا بے راہ رو معاشرہ اور بے ڈھنگے طریقے ڈھونڈ رہا ہے۔"

انہوں نے ذرا توقف کیا پھر زویا کو مخاطب کر کے ذرا پست لہجے میں بولے۔ "اس کو سمجھاؤ بیٹی! مجھے اس کے طور طریقے اچھے نہیں لگتے۔ اگر سمجھانے سے بھی نہیں سنبھلتی تو پھر بے شک اس سے اپنی رہائش علیحدہ کر لو۔ صحبت کا اثر کسی نہ کسی طور پر انسان پر ضرور پڑتا ہے۔"

اسی دوران میں خشامہ واپس آ گئی۔ اس نے غالباً کسی پڑوسی سے ایک براؤن شال لے کر اپنے کندھوں اور کمر پر ڈال لی تھی۔

خشامہ، شامیر اور فادر میں چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد شامیر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ فادر کے تاثرات دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ اب خشامہ کی "کلاس" لگنے والی ہے۔ اس کا جانا ہی مناسب تھا۔ اس نے تینوں سے اجازت چاہی۔ فادر جوناتھن نے کہا۔ "شامیر! ابھی میں دو روز یہیں فرینکفرٹ میں ہوں۔ شاید کل دوپہر بھی یہاں زویا کی طرف آنا ہوگا۔ ہو سکے تو آ جانا۔"

شامیر صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے زویا سے وعدہ کیا تھا کہ اسے مزید ڈسٹرب نہیں کرے گا اور وہ واقعی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ عجیب دھندی بھری ہوئی تھی اس کے سینے میں۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ ایک بار مڑ کر زویا کے تاثرات دیکھے مگر پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

بازو کی چوٹ کی وجہ سے زویا کو آفس سے دو ہفتے کی چھٹی مل گئی تھی۔ اس کی گاڑی کو خشامہ مرمت کے لیے ورکشاپ چھوڑ آئی تھی۔ زویا زیادہ وقت فلیٹ میں ہی گزار رہی تھی۔ وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ شامیر کا خیال اکثر اس کے دماغ سے چمٹ جاتا تھا اور چھوڑنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ مضطر بار بار زویا کی نگاہوں میں گھومتا تھا جب زویا نے غصے میں اسے دھکیلا تھا اور اس کے چہرے پر راکھ بکھر کر رہ گئی تھی۔ شاید اس کی طرف سے کچھ زیادتی ہی ہو گئی تھی۔ اس پاکستانی ہم کار کے ساتھ۔ ایک دو بار اس کا دل چاہا کہ شامیر سے فون پر رابطہ کرے مگر پھر اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کو بری طرح تاڑ دیا۔ جس راہ پر چلنا ہی نہیں تھا، اس کے بارے میں سوچتے یا اس کے قریب سے گزرنے سے کیا مطلب؟ یہ خیال لڑکپن سے ہی اس کے ذہن میں راسخ ہو چکا تھا کہ وہ کسی ایشیائی مرد بالخصوص انڈین یا پاکستانی سے شادی نہیں کرے گی۔ شادی کرنا تو دور کی بات اسے عمومی زندگی میں بھی ان لوگوں سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر اس شخص کے حوالے سے پتا نہیں کیا تبدیلی آئی تھی، وہ اس کو دماغ سے نکال ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے خود پر طیش آنے لگا۔ فادر جوناتھن واپس جا چکے تھے ورنہ وہ سکونِ قلب کے لیے ان ہی سے کوئی نسخہ دریافت کرتی۔ پھر اس کا دل چاہا چند روز کے لیے میونخ میں ماما کے پاس چلی جائے لیکن پتا نہیں کیوں ماما کے موجودہ شوہر سے وہ عجیب سی ہچکچاہٹ اور گریز کی کیفیت محسوس کرتی تھی۔

اس نے بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیں اور خاموشی کی زبان میں اپنے آپ سے ایک سوال کیا۔ "پچھلے دو تین دنوں میں ایسا کیا ہوا ہے کہ تم اس شخص کے بارے میں اتنی ہمدردی سے سوچنے لگی ہو؟"

اس کا جواب بہ زبانِ خاموشی اس کے اندر سے ہی آیا۔ "اس کا جواب بڑا اہم ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ تم اس شخص کو اپنے پاپا سے بہت مختلف پا رہی ہو۔ یہ شخص تمہیں اپنے پاپا کے بالکل برعکس لگ رہا ہے۔ تم نے بچپن سے لے کر جوانی تک کبھی اپنے پاپا کو ماما سے معافی مانگتے یا

معذرت کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ شاید تم تینوں بہنیں اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں کہ پاپا اپنی کسی زیادتی پر شرمندہ ہوں گے یا ندامت کا اظہار کریں گے....."

اس نے خود ہی سوال کیا۔ "لیکن کیا اتنی سی بات پر کسی شخص کے بارے میں اپنی منفی رائے کو تبدیل کیا جاسکتا ہے؟"

اس کے اندر سے جواب آیا۔ "بات صرف یہی نہیں ہے۔ تم کئی پہلوؤں سے اس شخص کو انڈین اور پاکستانی لوگوں سے مختلف دیکھ رہی ہو۔ اس کے طور اطوار، اس کی بول چال، اس کے خیالات۔ تم شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی ہو مگر فادر جوناتھن والے واقعے نے تمہیں بہت متاثر کیا ہے۔ تم کتنا ڈر گئی تھیں جب فادر نے بڈھی تقریر شروع کی تھی مگر اس شخص نے فادر کی باتیں کتنے تحمل اور کتنی برداشت کے ساتھ سنیں۔ کیا یہ سب کچھ غیر اہم تھا؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا یہ سب کچھ غیر اہم تھا؟"

ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی پلاسٹر شدہ زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھاما اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے نیچے اس ذیلی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں رواں تھیں مگر شور نہیں تھا، کسی انجن کا، نہ ہارن وغیرہ کا۔ وہ بظاہر سڑک کو دیکھ رہی تھی مگر دراصل ماضی میں جھانک رہی تھی۔

اپنے بچپن میں ماما پاپا کا جو پہلا شدید جھگڑا زویا کے ذہن پر نقش ہوا تھا، اس کا تعلق فادر جوناتھن سے ہی تھا۔ فادر کی عمر اس وقت بھی پچاس پچپن کے قریب تھی۔ ماما کی فیملی کیتھولک تھی اور فادر جوناتھن سے بہت عقیدت رکھتی تھی۔ جب ماما نے اسلام قبول کرکے پاپا سے شادی کی تو فادر کو بہت رنج ہوا تھا تاہم دوسروں کی طرح انہیں بھی اس فیصلے کو قبول کرنا پڑا تھا۔ ایک روز زویا اپنی منجھلی بہن حولیہ کے ساتھ اسکول سے واپس آئی تو اس نے فادر جوناتھن کو کامن روم میں پاپا، ماما کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ فادر کا سفید لباس اور ان کا روشن، سودہ چہرہ فوراً دیکھنے والے کو متوجہ کرتا تھا۔ تینوں چائے پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے مگر پاپا کا چہرہ دیکھتے ہی بہنیں سمجھ گئی تھیں کہ وہ سخت غصے میں ہیں اور فی الحال خود پر ضبط کیے ہوئے ہیں۔ جونہی فادر چائے پی کر رخصت ہوئے، پاپا طیش کے عالم میں ماما پر پھٹ پڑے تھے۔ "وہ کیوں گڈ فرائیڈے کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ہزار بار کہا ہے، اگر وہ ملنے کے لیے آتا ہے تو صرف ملنے کے لیے آئے۔ ذاتی باتیں شروع نہ کرے اور اسے کیا ضرورت ہے بار بار یہاں آنے کی۔"

ماما نے کہا تھا۔ "راشد! وہ کہاں آتے ہیں بار بار۔ کوئی چھ مہینے پہلے نومبر میں ان کا چکر لگا تھا..... اور اگر فرائیڈے والی بات انہوں نے کردی تو کون سا ایسا گناہ کردیا۔ ہم بھی تو ان کے سامنے اپنے تہواروں کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہم عام انداز میں بات کر رہے تھے، اس نے جان بوجھ کر اور تبلیغی انداز میں بات کی۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے ہمارے گھر میں آکر ہمیں اور ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کا۔ اور تم بھی کس طرح مریدنیوں کی طرح اس کی بات پر ہاں..... ہاں کرتی چلی جارہی تھیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے اپنے رویے پر۔"

"پلیز راشد! خوامخواہ بات کو مت بڑھاؤ۔ بس تمہیں بہانہ چاہیے ہوتا ہے لڑنے کا۔ غصہ کسی اور بات کا ہوتا ہے اور گھر آکر نکال ہم پر دیتے ہو۔"

"تم پر اس لیے نکلتا ہے کہ تم آگے سے زبان چلاتی ہو۔ بک بک کرتی ہو۔" پاپا دہاڑ کر بولے تھے۔

"میں بک بک کرتی ہوں اور تمہارے منہ سے تو پھول جھڑتے ہیں..... شہد کے قطرے ٹپکتے ہیں۔" ماما بھی چلائی تھیں۔

"بند کرو بکواس۔" پاپا کی آواز سے گھر کے در و دیوار لرزے اور انہوں نے ماما کو زور سے دھکا دیتے ہوئے گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ ماما صوفے پر گریں اور ان کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ رونے لگیں۔ پاپا طیش میں کھولتے اور بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ دونوں بہنیں ماما کو سنبھالنے میں لگ گئیں مگر اسی رات اس سے بڑا جھگڑا ہوگیا تھا۔ اسکول کا کام ختم کرکے زویا کچھ دیر ٹی وی دیکھتی رہی تھی پھر اسے اونگھ آنے لگی۔ دونوں بڑی بہنیں پہلے ہی سو چکی تھیں۔ دفعتاً ماما پاپا کے بند بیڈ روم میں سے ماما کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ "مجھے ہاتھ مت لگائیں..... پیچھے ہٹیں مجھ سے..... پیچھے ہٹیں۔"

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک ڈیکوریشن پیس ٹوٹنے کی زوردار آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی پاپا کی دہاڑ سنائی دی۔ جواب میں ماما بھی دہاڑی تھیں پھر یہ دہاڑیں بڑھتی چلی گئیں۔ مختلف چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماما بھی طیش میں بے حد سخت بول رہی تھیں۔ دونوں بڑی بہنیں بھی جاگ گئیں اور ڈری سہمی سی بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھنے لگیں۔ پھر دروازہ ایک دھماکے سے کھلا تھا اور پاپا اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے اور گرجتے برستے باہر نکل گئے تھے۔ ماما بھی اندر چلا رہی تھیں اور بول رہی تھیں۔

زویا نے ایک جھرجھری سی لے کر اپنے سر کو دائیں بائیں ہلایا اور ماضی کے اس منظر سے نکل کر واپس حال میں آ گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر شامیر کا چہرہ گھومنے لگا۔ پرسوں وہ کس طرح ایک پُروقار خاموشی کے ساتھ فادر جون (جوناتھن) کے سامنے بیٹھا تھا اور ان کی کچھ ناپسندیدہ باتیں سننے کے ساتھ ساتھ مدلل انداز میں ان سے سوال بھی پوچھ رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک کشادگی اور معاملہ فہمی تھی جو قلب و نظر کو متاثر کرتی تھی۔

اگلے تقریباً دو روز بھی زویا نے اپنے ہی خیالات سے لڑتے ہوئے گزار دیے۔ شامیر کے ساتھ زندگی بھر کا ناتا جوڑنے کا تصور تو دور دور تک اس کے ذہن میں نہیں تھا، مگر اس سے معمول کے تعلقات دوستی کی حد تک تو بحال کیے جا سکتے تھے۔ جرمنی میں اس کے یہ چند روز اس کی وجہ سے ناخوشگوار نہیں رہنے چاہیے تھے۔ خشامہ کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ شامیر کے یوں اچانک ہوٹل میں شفٹ ہونے کی وجہ سے متعجب تھی۔ اسے اصل بات کا پتا نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ تینوں کہیں اکٹھے گھومنے پھرنے نکلیں۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے زویا سو گئی۔ رات دوسرے پہر وہ درد کی ایک ٹیس کی وجہ سے جاگی تھی۔ وہ بہت احتیاط کرتی تھی پھر بھی نیند میں کروٹ بدلتے ہوئے زخمی بازو کسی وقت کہیں ٹکرا جاتا تھا۔ وہ ہاتھ کو سہلانے کے بعد کروٹ بدل کر سونے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ایک بہت مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ خشامہ کی آواز تھی اور اس اسٹور روم نما چھوٹے سے کمرے سے ابھر رہی تھی جسے وہ لوگ ڈریس وغیرہ بدلنے کے لیے استعمال کرتے تھے.....

تجسس سے مجبور ہو کر زویا نے بیڈ چھوڑا اور لکڑی کے فرش پر بے آواز چلتی اسٹور روم کے دروازے کے عین سامنے پہنچی۔ خشامہ کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ زویا نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ خشامہ کا ایک پہلو نظر آنے لگا۔ اس نے وہی بے ہودہ لباس پہن رکھا تھا جو چار پانچ روز پہلے شامیر کی یہاں آمد پر پہنا تھا۔ اس دن تو فادر جون کو سامنے دیکھ کر وہ بوکھلاہٹ میں باہر نکل گئی تھی مگر آج بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اپنے براؤن بال ایک شانے پر بکھیر رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اسمارٹ فون تھا..... اور وہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

آواز بہت دھیمی تھی مگر پھر بھی زویا کے کانوں تک پہنچی۔ ''میں تو اس سے بہت کہتی ہوں کہ وہ بھی چلے..... لیکن شاید وہ ابھی اپنی چوٹ کو کچھ آرام دینا چاہتی ہے۔ چلیں میں تو ہوں۔ کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہوتا ہے۔'' وہ ذرا اٹھلا کر بولی اور اپنے بالوں کو ہلکا سا جھلکا دیا تاکہ پُراشتیاق ہی ان کے نیچے چھپ کر نہ رہ جائے۔

دوسری طرف سے فون پر کچھ کہا گیا جو زویا کے کانوں تک نہیں پہنچا۔

خشامہ نے منہ سے ''چ'' کی آواز نکالی اور ذرا مایوس لہجے میں بولی۔ ''شامیر! کیسی بات کرتے ہو۔ بندۂ خدا اگر یہاں آ کر کمرے میں ہی بند ہو کر بیٹھنا ہے تو پھر یہ کام پاکستان میں بھی بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ فون کے کیمرے کے سامنے اپنے تنے ہوئے جسم کو یوں حرکت دے رہی تھی جیسے کسی فوٹو سیشن میں حصہ لے رہی ہو۔ اس کی گفتگو کا انداز بھی معنی خیز اور اکسانے والا تھا۔ تاہم یہ بھی عیاں تھا کہ دوسری جانب سے اسے حوصلہ بخش جواب نہیں مل رہا..... کچھ دیر بعد اس نے کل دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر گفتگو ختم کر دی۔

اس کے باہر نکلنے سے پہلے ہی زویا جلدی سے آ کر بستر پر لیٹ گئی اور کروٹ بدل لی۔ وہ دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ اسے پہلے سے ہی خشامہ کے رویے پر شبہ تھا۔ ابھی جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس سے تصدیق بھی ہوئی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود زویا نے ایک بار پھر شامیر کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اپنے انڈین والد کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو بھی تصورات موجود تھے، شامیر ان سے یکسر مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی ماما کی کہی ہوئی یہ بات بھی کچھ ایسی درست نہیں لگ رہی تھی کہ یہ ایشیائی مرد پرلے درجے کے دل پھینک ہوتے ہیں۔

چہرہ..... چہرے پر بکھری ہوئی راکھ..... لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹنا اور پھر لاچاری سے زویا کی طرف دیکھنا..... یہ سب کچھ ایک بار پھر زویا کے پردۂ خیال پر ابھر آیا۔ اگلے روز دوپہر کے بعد وہ شامیر کو فون کر رہی تھی۔

پہلے تین چار سیکنڈز کے اندر ہی شامیر نے کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو۔'' اس کی آواز میں بے تابی تھی۔

''میں زویا بول رہی ہوں۔'' اس نے الجھن میں کہا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ نے فون کیا ہے۔ بڑی خوشی ہو رہی ہے آپ کی آواز سن کر۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''مجھے لگا..... کہ مجھے آپ کو فون کرنا چاہیے۔ اس دن..... ہوٹل میں جو واقعہ ہوا اس پر مجھے بھی افسوس ہے۔''

"پلیز..... وہ بات اب ختم ہوگئی۔ اسے نہ چھیڑیں۔" شامیر نے اپنایت سے کہا۔

وہ تقریباً پندرہ منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو میں زویا نے شامیر کو باور کرادیا کہ وہ اس کے حوالے سے رومانی انداز میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی اس کے رشتے کی بات چل رہی ہے اور عنقریب پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی ہے۔ ہاں، وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی ہے اور وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح کچھ وقت گزار سکتے ہیں۔ فرینکفرٹ میں گھوم پھر سکتے ہیں۔

☆☆☆

وہ شامیر کے لیے ایک نہایت پُرمسرت دن تھا۔ وہ آج زویا کے ساتھ فرینکفرٹ میں گھومنے پھرنے کے لیے نکل رہا تھا۔ اس نے صبح نو بجے کے قریب آنا تھا۔ وہ آٹھ بجے ہی تیار ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا..... فرینکفرٹ خوبصورت دکھائی دینے لگا تھا۔

زویا وقتِ مقررہ پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنا پلاسٹر والا بازو گلے میں لٹکا رکھا تھا مگر ویسے وہ چاق و چوبند اور خوشگوار موڈ میں تھی۔ براؤن شرٹ کے نیچے سفید پتلون کے ساتھ سفید جوگر اچھے لگ رہے تھے۔ انہوں نے "سٹی ٹرین" پر بیٹھ کر فرینکفرٹ کا ایک چکر کاٹا اور پھر ایٹمی بجلی گھر کا نظارہ کرتے ہوئے، پون چکیوں کے خوبصورت سلسلے کی طرف نکل گئے۔ زویا نے بتایا کہ یہاں کے شہروں اور خاص طور سے قصبوں میں پون چکیوں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ بہت عام ہوچکا ہے۔ اس نے کہا۔ "پاپا نے بھی جب پینتیس چالیس سال پہلے جرمنی میں قدم رکھا تو انہوں نے پون چکیاں اور پن چکیاں بنانے والی ایک فیکٹری میں ہی ملازمت کی۔ تاہم بعد میں انہوں نے ان چکیوں کے پرزہ جات کی فروخت کا کام ایک ترک باشندے کے ساتھ مل کر شروع کردیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔"

زویا بڑے خوشگوار بلکہ چنچل موڈ میں آگئی تھی۔ اپنے پلاسٹر شدہ بازو کی پروا کیے بغیر وہ شامیر کے ساتھ تیزی سے مختلف "ٹرینوں" پر اتر چڑھ رہی تھی۔ شامیر اسے بار بار احتیاط کرنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک لگژری بس کے ذریعے اسے شہر کے بارونق مرکز میں لے آئی۔ پختہ فرش والے ایک بہت وسیع میدان کے اندر بہت سے سنگی مجسمے استادہ تھے۔ یہ جرمنی کے ان مشاہیر کے مجسمے تھے جو نجانے کب کے اپنی اپنی قبروں میں اتر چکے تھے۔ زویا نے ایک بلند و بالا مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک نامور قائد ہیں۔ انہوں نے جرمنی کے لیے بہت سی قربانیاں دیں۔ ان پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔"

شامیر نے دیکھا ایک جنگلی کبوتر مجسمے کے کندھے پر بیٹھ کر اسے اپنی بیٹ سے داغدار کررہا تھا۔ شامیر نے اس کبوتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زویا! مجھے لگتا ہے کہ یہ ناہنجار پرندہ جرمنی کی تاریخ سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہے۔"

زویا اس بات پر ہنسی تو اس کے گال کا گڑھا نمایاں ہوگیا، بولی۔ "میری بڑی بہن ایمہ جب یہاں آئی تھی تو اس نے بھی اس سے ملتی جلتی بات ہی کہی تھی۔ یہ کبوتر یہاں ہر وقت گل کاریاں کرتے رہتے ہیں۔"

شامیر نے کہا۔ "تم نے بہن کا ذکر کیا ہے تو اس بارے میں تجسس پیدا ہورہا ہے۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے گھروں میں۔" زویا نے رسان سے کہا۔ "ان کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ مختلف شہروں میں رہتی ہیں۔"

"ظاہر ہے کہ آپ کی طرح وہ بھی مسلمان ہی ہوں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ شوہر بھی....."

"نہیں نہیں۔" زویا نے شامیر کی بات کاٹی۔ "شوہر مسلمان نہیں ہیں اور وہ دونوں خود بھی کچھ نہیں ہیں۔ نہ مسلمان..... نہ عیسائی۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ مذہب سے ویسے ہی دور ہوچکی ہیں شومیر! یعنی وہ کسی بھی مذہب کو... نہیں مانتیں۔" وہ تاسف سے بولی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جرمنی میں بلکہ یورپ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ انہیں Atheist کہا جاتا ہے۔"

"ہاں زویا! یہ تو مجھے بھی پتا ہے لیکن جب تمہارے ماما پاپا مسلمان ہیں، تم مسلمان ہو تو وہ دونوں....."

"ان دونوں کے مذہب سے باغی ہونے کی وجہ ماما پاپا کا رویہ ہی تو ہے شومیر! انہوں نے بچپن سے جوانی تک جو کچھ دیکھا اس نے ان پر اثر کیا۔ رہی سہی کسر ماما کی حوصلہ افزائیوں نے پوری کی۔ انہوں نے طے کررکھا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی شادیاں اپنی مرضی سے کریں گی اور اس سلسلے میں پاپا کی نہیں چلنے دیں گی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ پاپا اپنے خاندان میں سے کسی امیر کو میری کسی بہن کا دولہا بنادیں۔ اس کے لیے انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو کرسکتی تھیں اور میرا خیال ہے کہ....." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی اور سامنے استادہ مجسموں کو گھورنے لگی۔

''آپ نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا زویا؟''

وہ پتھریلے بنچ پر پہلو بدل کر بولی۔ ''ویسے دیکھا جائے شومیر، تو ماما نے بیٹیوں کی شادیوں کے بارے میں تو ٹھیک فیصلے ہی کیے۔ دونوں کے شوہر جرمن ہیں۔ برسرروزگار ہیں اور وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔''

''آپ کی..... شادی بھی..... آپ کی والدہ ہی کریں گی؟'' شامیر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... وہ لڑکا تقریباً دیکھ چکی ہیں۔ شاید کچھ دنوں تک اس کے ساتھ یہاں فرینکفرٹ بھی آئیں۔ میں نے بس ایک ہی شرط رکھی ہے۔ اس کو مسلمان ہونا پڑے گا اور سوچ سمجھ کر ہونا پڑے گا۔''

''کیسا ہے وہ؟ کوئی تصویر وغیرہ ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر تک ہچکچاتی رہی پھر اس نے اپنے موبائل فون میں موجود تصویر شامیر کو دکھا دی۔ وہ ہلکی نیلگوں آنکھوں والا دبلا پتلا ہینڈسم جرمن تو مگر نقوش سے تھوڑی سی سختی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ زویا نے بتایا کہ اس کا نام رابرٹ لوئیس ہے۔

پتا نہیں کیوں شامیر کا دل بجھ سا گیا تھا۔ تاہم وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہو۔ دل دیا بھی تو کہاں دیا..... اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ زویا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''شومیر! اس جگہ کو Roma Platz کہتے ہیں۔ چلیں آپ کو یہاں کی پری سے ملواؤں! اس کے ساتھ تصویریں بنوائیں گے۔''

''پری کے ساتھ تصویریں؟'' اس نے حیران ہو کر کہا۔ حالانکہ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ کیا یہاں اور بھی کوئی پری موجود ہے۔

وہ چنچل انداز میں اس کے ساتھ چل دی اور قریب ہی ایک مقام پر لے آئی۔ زویا کے مطابق اس جگہ کو ''ولی برانڈ پلاٹز'' کہا جاتا تھا۔ پری والا سین کچھ آگے جا کر دکھائی دیتا تھا۔ پھولوں سے گھری ہوئی ایک جگہ۔ زویا کو رکنے کے لیے کہہ کر آگے آئی۔ اس نے ایک پودے کے پاس صاف ستھری سیڑھیوں پر بیٹھنے کے لیے جگہ منتخب کی۔ بڑے پُرشوق انداز میں شامیر کو اپنے موبائل فون میں موجود اپنی نیلی کی تصاویر دکھانے لگی۔ اتفاق ان تصاویر میں اس کے پاپا کی کوئی واضح تصویر موجود نہیں تھی۔ ایک گروپ فوٹو میں وہ نظر آئے مگر دور سے۔ درمیانی عمر، چھریرے بدن اور مناسب نقوش کے لگتے تھے۔ والدہ فربہ اندام تھیں، کبھی خوش شکل بھی رہی ہوں گی۔ ہاں بہنیں تینوں پیاری تھیں..... اور زویا، ان تینوں میں سب سے زیادہ نفیس اور اسمارٹ تھی۔

ایک تصویر میں تینوں بہنیں دھینگا مشتی کرتی نظر آئیں۔ دونوں بڑی بہنوں نے پندرہ سولہ سالہ زویا کو دبوچ رکھا تھا۔ زویا نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر رکھے تھے۔ انہوں نے کوئی فرنی جیسی چیز زویا کے چہرے پر مل دی تھی۔ زویا ہنسنے لگی۔ اس نے شامیر کو تصویر کا پس منظر بتاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں بچپن سے ہی کسی کی جھوٹی چیز نہیں کھاتی تھی۔ بڑی بہنیں اسے میرا فقرہ کہتی تھیں اور چڑاتی تھیں۔ ایک دن بڑی بہن ایمہ نے زبردستی مجھے اپنی کھائی ہوئی آئس کریم کھلانے کی کوشش کی..... اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئی۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔''

ایک تصویر میں تینوں بہنیں ایک دوسری کے گلے میں بانہیں ڈالے ایک ٹرین پر سوار نظر آئیں۔ وہ ایک دوسرے کی آغوش میں بیٹھی تھیں۔ ان کے عقب میں رہائشی مکانوں کی پھولوں سے لدی ہوئی بالکونیاں نظر آتی تھیں۔ شامیر نے دیکھا تھا کہ جرمنی میں گھروں کی بالکونیوں کو پھولوں سے خوب خوب آراستہ کیا جاتا تھا۔ رہائشی مکانوں کے پس منظر میں کچھ بلند عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں اور ان میں شمل کاک سے مشابہ وہ لینڈ مارک اسٹائل کی عمارت بھی تھی جس نے یہاں ڈبل اے چینل والوں کا ایک اہم مسئلہ بذریعہ شامیر حل کیا تھا۔ زویا نے بھی تصویر میں عمارت کو دیکھا اور بولی۔ ''ہم جب بھی اس عمارت کو دیکھیں گے آپ یاد آجائیں گے۔ واقعی آپ کی کھوج لگانے کی حس بہت زبردست ہے۔ کیا پتا کس وقت مجھے بھی آپ کی ضرورت پڑ جائے۔''

''کیا مطلب؟''

''کسی دوسرے شہر میں گھومتے پھرتے میں اکثر گم ہو جاتی ہوں۔ کیا پتا کہ ایسا ہو جائے اور میرے گھر والے مجھے ڈھونڈنے کے لیے آپ کو بلا لیں۔''

''چیز جتنی اہم اور قیمتی ہوتی ہے اسے ڈھونڈنے کی فیس بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بھاری فیس لوں گا۔''

وہ بلند آواز میں ہنس دی۔ شامیر بھی مسکرا دیا۔ ان کے سروں پر ''چیری'' کی شاخوں سے بہت اوپر، گہرا نیلا آسمان اپنی بیحدوں بھری خاموشی کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ آگے چل دیے۔ تفریحی پارک کے ایک حصے میں کچھ افراد نے ڈیوکس اور کاؤنٹس وغیرہ کے بہروپ بھر رکھے تھے۔ کچھ افراد قدیم جنگجوؤں

کے لباس میں نظر آتے تھے۔ ایک خوبرو لڑکی نے پری کا روپ دھار رکھا تھا۔ دوسروں کی طرح زویا اور شامیر نے بھی اس کے ساتھ تصویر بنوائی۔ اس نے ان دونوں کو گرل اور بوائے فرینڈ سمجھ کر مقدر کا چھوٹا سا موتی دیا اور معاوضے میں انہوں نے پری کے سامنے رکھے ہوئے ڈبے میں چند سکے ڈال کر اپنے اچھے "آدم زاد" ہونے کا ثبوت دیا.....

وہ آگے بڑھے۔ زویا نے کہا۔ "آپ بات کریں، چپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟"

شامیر نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ "چپ چپ اس لیے ہو گیا ہوں کہ آپ مسلسل انگلش پر مہربانی فرما رہی ہیں۔ آپ کی اس مہربانی سے آپ کا وہ حکم زیادہ اچھا لگتا ہے جو آپ اردو پر ڈھاتی ہیں۔ میں تو وہی گلابی اردو سننے کے لیے آپ کے ساتھ آیا ہوں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "آپ کہتا تو ہم اسی طرح بولتا۔ اب بتائیں کدھر جانا ہے؟"

شامیر اردو میں بولا۔ "یہاں کے چڑیا گھر کی بہت تعریف سنی ہے۔ سنا ہے وہاں ایک قدیم بندر بھی موجود ہے، ہٹلر کے دادا جان کے زمانے کا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "خیر اتنا زیادہ اولڈ تو نا ہیں مگر ستر اسی سال کا تو ہو گیں گا۔ ویسے وہاں دیکھنے کو اور بھی بہت کچھ ملیں گا۔"

وہ دونوں ایک بار پھر سٹی ٹرین پر سوار ہوئے اور شہر کے "زو" میں پہنچ گئے۔ یہاں کی تفریح بھی اچھی رہی۔ شامیر نے پہلی بار بنگال ٹائیگر اور افریقن شیر جیسے درندوں کو آہنی پنجرے کے بجائے مضبوط شیشوں کے عقب میں دیکھا اور ان کی تصویریں بنائیں۔ آبی جانوروں والا شعبہ بے مثال تھا۔ یہاں ایک کیبن میں چھوٹے مگرمچھوں کو بالکل قدرتی ماحول فراہم کیا گیا تھا۔ ان پر مصنوعی بارش برس رہی تھی، بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔

ایک پنجرے میں برفانی ریچھ کا ایک جوڑا افزائش نسل کے لیے اپنی فطری تگ و دو میں مصروف تھا۔ سفید فام لڑکیوں کے ایک چنچل گروپ نے اس منظر کو دیکھ کر "ہوہا" کا ملک شگاف نعرہ بلند کیا۔ شامیر نے دیکھا زویا کے چہرے پر شرم کی سرخی سی لہرا گئی۔ وہ اس آزاد معاشرے میں پلنے بڑھنے کے باوجود یہاں کی نئی نسل سے قدرے مختلف تھی۔ پردے یا نماز روزے کی پابندی تو شامیر نے اس میں بھی نہیں دیکھی تھی مگر وہ حرام حلال کا خیال رکھتی تھی اور اخلاقیات کی پاسداری بھی اس میں نظر آتی تھی۔

اگلے دو تین روز شامیر اور زویا نے شہر کی سیر و سیاحت میں گزارے۔ خشامہ صرف ایک مرتبہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان کے ساتھ رہی پھر پتا چلا کہ اس کے آفس میں کوئی "ریلیز" ہے اور اسے اوور ٹائم لگانا پڑ رہا ہے۔ شامیر کے لیے یہ صورت حال، اس کی مرضی کے عین مطابق تھی۔ وہ اس تفریح میں خشامہ کا ساتھ کم سے کم چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ ایک فلرٹ لڑکی ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر ان یورپین لڑکیوں میں سے ہے جو مرد و زن کے میل جول میں کسی حد کو اپنے لیے حد نہیں سمجھتیں۔

ایک روز شہر کے جنوبی حصے میں گھومتے گھومتے وہ دونوں تھک سے گئے اور ایک پارک میں لکڑی کی ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ بے شک یہ سیر و سیاحت شروع کرنے سے پہلے زویا نے ایک حد مقرر کر دی تھی اور اسے دوستی کا نام دیا تھا..... مگر شامیر صاف محسوس کرتا تھا کہ اس کی طرح زویا کے اندر بھی ایک شدید قسم کی ہلچل مچل موجود ہے۔ ایک شدید قسم کی کشمکش..... ایک جسم و جاں کو پگھلا دینے والی، گھول دینے والی آتشیں الجھن۔ یہ کیا تھا؟ شامیر کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا..... اور شاید زویا کی سمجھ میں بھی نہیں آتا ہوگا۔

انڈین لباس والی ایک ادھیڑ عمر عورت سر پر ایک پٹاری سی رکھے ان کے پاس پہنچی۔ وہ پان چبا رہی تھی اور ساڑی کے پلو سے ہونٹ بھی پونچھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر زویا کے چہرے پر بیزاری سی نظر آئی۔ شاید اس بیزاری کی وجہ وہی کہنہ گریز تھا جو وہ برصغیر کے باشندوں سے رکھتی تھی۔ عورت نے پاس آ کر شامیر کو مخاطب کیا۔ "بھگوان تم دونوں کا پریم برقرار رکھے۔ اپنی دوست کے ہاتھوں پر مہندی لگواؤ گے؟"

شامیر نے کہا۔ "موسی! دیکھتی نہیں ہو بے چاری کے ہاتھ پر پلاستر چڑھا ہوا ہے۔"

"پر دوسرا تو ٹھیک ہے۔ اس پر لگوا لو..... اور بڑی شاندار چوڑیاں بھی ہیں میرے پاس۔ اصل لکھنؤ کی۔ پردیس میں دیس کی یاد تازہ ہو جائے گی۔"

زویا منع کرتی رہ گئی لیکن شامیر نے بھی چوڑی فروش کی حمایت کی۔ اس نے نہ صرف زویا کو ست رنگی چوڑیاں پہنائیں بلکہ اس کی ایک ہتھیلی پر "کون مہندی" کے ذریعے دلکش نقش و نگار بھی بنا دیے۔

وہ تو معاوضہ لے کر رخصت ہو گئی اور وہ دونوں مشرقی رسم و رواج کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے "تم" کہہ کر مخاطب کرنے لگے

تھے۔ ''بھوک لگ رہی ہے زویا۔'' شامیر نے کہا۔
''تھوڑا تھوڑا مجھ کو بھی۔'' زویا نے کہا۔
سامنے ہی ایک اسٹال پر چکن برگرز موجود تھے۔ یہ کسی ترکش کا اسٹال تھا۔ شامیر دو برگرز اور ڈرنک وغیرہ لے آیا لیکن جب کھانے کا وقت آیا تو زویا ''بے دست و پا'' نظر آئی۔ اس کا ایک ہاتھ پلاستر میں تھا اور دوسرے پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ اس نے مہندی اتارنا چاہی تو شامیر نے اسے منع کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنا برگر اور دوسرے میں زویا والا پکڑ لیا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ وہ پہلے تو شرمائی پھر چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگی۔
شامیر کا دل چاہا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو مگر برگر آخر برگر تھا، ختم ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں بڑے بے تکلف دوستانہ موڈ میں تھے۔ زویا کے منع کرنے کے باوجود شامیر نے کوک بھی اسے اپنے ہاتھ سے پلائی۔ وہ پی رہی تھی اور اس صورتِ حال پر ہنس بھی رہی تھی۔ بولی۔ ''بچپن یاد آ گیا۔ جب پاپا اس طرح کھلایا کرتے تھے۔''
''تو کیا میں تمہیں پاپا کی طرح لگ رہا ہوں؟''
''نو نو..... تم اپنی طرح ہی لگتے ہو اور یہی اچھا ہے۔''
بے دھیانی میں شامیر نے اس کوک میں سے بھی دو تین گھونٹ بھر لیے جو وہ زویا کو پلا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی کا جھوٹا نہیں کھاتی پیتی۔ ''اوہ سوری! میں تمہارے لیے اور لاتا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
''میں نے بس اتنا ہی پینا تھا۔'' زویا نے اسے اٹھنے سے روک دیا۔
شامیر دوبارہ بیٹھ گیا۔ وہ اپنا برگر اور کولڈ ڈرنک ختم کر چکا تھا۔ زویا کا تھوڑا سا برگر باقی تھا جو شامیر نے اسی طرح اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔
وہ کچھ چپ سا ہو گیا تھا۔ اپنے طور پر اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے بے خیالی میں زویا کو امتحان میں ڈال دیا۔ اب جھوٹی کوک اس کے سامنے پتھر کی میز پر پڑی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ اسے اور پینا ہی نہیں تھی۔
شاید زویا نے بھی اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ شامیر ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھ رہا تھا جب اس نے دل دھڑکا دینے والا منظر دیکھا۔ زویا نے ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی اور پھر خود کو تھوڑا سا جھکا کر اسی کوک کے اسٹرا سے منہ لگا لیا تھا جو جھوٹی ہو چکی تھی۔
شامیر کے لیے یہ بڑا دل آویز اشارہ تھا۔ زویا نے چند گھونٹ لے کر کوک ایک طرف رکھ دی۔ مسکراتی نظروں سے شامیر کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میز پر پڑی بوتل میں اب بھی ایک گھونٹ کوک باقی تھی۔ شامیر نے اس کا اسٹرا نکالا، اس پر کیپ چڑھائی اور اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔
''اوہو، تم اس کو کیوں سنبھالتا؟'' زویا نے چونک کر پوچھا۔
''میری مرضی۔'' شامیر نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔
دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دریائے مائنز کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے نے ان کے چہروں کو چھوا..... اوپر نیلا آسمان مسکرایا۔ شاخ پر بیٹھی ایک خوش رنگ چڑیا نے پُرمسرت آواز نکالی اور جیسے اعلان کیا کہ ایک نئی کہانی کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆☆☆

وہ سٹی ٹرین نمبر 21 کا آخری اسٹیشن تھا۔ یہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ یہاں ریلوے سے وابستہ کچھ عمارات رکھے تھے اور اردگرد جنگل کا سا سماں تھا۔ ایک قدیم انجن سے کچھ فاصلے پر وہ دونوں خوبانی کے ایک درخت تلے بیٹھے تھے۔ سامنے ایک طویل کیاری میں سرخ اور پیلے ٹیولپ کے بہت سے پھول کھلے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا مگر یوں لگ رہا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ موسم کی ادا دیکھتے ہوئے، زویا گھر سے چھتری لے کر نکلی تھی اور اب یہ چھتری واقعی کام آ رہی تھی۔ بارش شروع ہو گئی تھی اور وہ کچھ دیگر جوڑوں کی طرح اپنی چھتری کے نیچے سمٹے ہوئے تھے۔ جوں جوں بارش بڑھ رہی تھی وہ مزید سمٹ رہے تھے۔ سرد موسم کی دلکشی اور ایک دوسرے کے نیم گرم لمس نے انہیں دل گداز کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ زویا جب سنجیدہ ہوتی تھی تو انگلش میں بات کرتی تھی۔ اب بھی وہ انگلش بول رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں کہنے لگی۔ ''شومیر! یہ بڑا مشکل راستہ ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ م..... میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔''
''کیا نہیں سوچا تھا؟'' اس نے بھی انگلش میں پوچھا۔
''یہی کہ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔
''یہی کہ تم کسی غیر جرمن کی محبت کا جواب محبت سے دو گی۔'' شامیر نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔
''شاید تم ٹھیک کہتے ہو شومیر! جو کچھ بھی والد اور والدہ کے درمیان ہوا، اس نے ہم تینوں بہنوں کے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا۔ خاص طور سے میں نے تو اپنے طور پر طے کر رکھا تھا کہ بھول کر بھی اس راستے پر قدم نہیں رکھوں گی۔''

''یہی تو محبت کی خوبصورتی ہے زویا..... یہ مشکل ترین راستے چنتی ہے۔'' اس نے زویا کو ہولے سے اپنے ساتھ لگالیا۔

''کیا تم نے بھی اپنے لیے مشکل راستہ چنا ہے؟'' زویا نے پوچھا۔

''مشکل تو نہیں مگر حیران کن ضرور کہہ سکتی ہو۔ میرا بھی تہیہ تھا کہ میں پیار محبت کے چکر میں نہیں پڑوں گا..... کبھی نہیں پڑوں گا۔ جب بھی شادی کا وقت آئے گا تو میں اپنی زندگی کے اس باب کو اپنی اموخالہ کے لیے کھلا چھوڑ دوں گا مگر دیکھو..... اموخالہ ہزاروں میل دور بیٹھی ہیں۔ انہیں کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کیا کررہا ہوں۔ میں کس تیز دھارے میں بہہ گیا ہوں۔ فرینکفرٹ کی اس لڑکی نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ ذرا شریر ہوگیا۔

زویا نے زور سے شامیر کے بازو پر چٹکی کاٹی۔

''فرینکفرٹ کی اس لڑکی نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے..... خود امتحان میں پڑے ہو اور اسے بھی ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔''

''شاید تم اپنی ماما کی بات کررہی ہو؟''

''شومیر! ہمیں اب بھی سوچ لینا چاہیے..... وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ وہ تو دو چار ماہ میں میری شادی کا سوچ رہی ہیں۔''

''اب واپسی ممکن نہیں زویا۔ کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں۔'' اس نے زویا کے نم بالوں کو چوما۔

وہ اپنے آپ میں جیسے کچھ اور سمٹ گئی۔ ''یہ سب کیا ہے شومیر! ہمیں تو صرف دوستی کی حد تک رہنا تھا۔'' وہ جیسے ٹھٹک کر بولی تھی۔

شامیر نے سامنے کیاری میں بھیگتے ہوئے ''ٹیولپ'' کے خوشنما پھولوں کو دیکھا اور کہا۔ ''شاید ہم نے اپنے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔'' اس نے دوبارہ زویا کے بالوں کو چوما۔

زویا کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی نظر آئی۔ شامیر نے اپنے شولڈر بیگ سے وہی کل والی پکی ہوئی ایک گھونٹ کوک نکالی اور اسے ہونٹوں سے لگا کر خالی کردیا۔

''تم بہت عجیب ہو شومیر۔'' وہ کچھ شرما سی گئی۔

''تم نے عجیب کردیا ہے۔'' وہ ترت بولا۔

اس مرتبہ اس کے بازو پر زویا کی چٹکی زیادہ سخت تھی۔

اگلے روز ہوٹل کے کمرے میں شامیر ویڈیو لنک کے ذریعے پاکستان میں اپنی اموخالہ سے بات کررہا تھا۔ زویا بھی ساتھ تھی۔ زویا نے اموخالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خالہ! آپ کا بیٹا مجھ کو بہت زیادہ تنگ کرتا۔ ہر ٹائم ستاتا۔''

''کیا کہتا ہے؟'' خالہ ثمینہ نے پیار سے پوچھا۔

''پہلے مجھ کو فورس کرتا کہ میں اُردو بولوں۔ پھر میری اُردو کا مذاق اڑاتا۔''

''اڑاتا نہیں اُڑاتا۔'' شامیر نے تصحیح کی۔

خالہ نے کہا۔ ''شامیر! یہ کیا بات ہوئی۔ میری تو چلو مجبوری ہے کہ میں انگریزی نہیں سمجھتی لیکن تمہارے ساتھ تو یہ انگریزی میں بات کرسکتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے خالہ! مگر میں تھوڑی سی ہوشیاری دکھاتا ہوں۔ زویا انگلش میں بولے تو ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی ہے۔ اردو میں رفتار بیس پچیس میل فی گھنٹا رہ جاتی ہے۔ یوں مجھے بھی بات کرنے کا تھوڑا بہت موقع مل جاتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''خالہ! یہ مرڈ (مرد) لوگ ہم لیڈیز کو یونہی بدنام بناتا۔ بولنے میں یہ بھی کچھ کم نا ہیں۔ جب یہ آپس میں ہوتا تو بہت زیادہ بولتا اور صرف زیادہ ہی نہیں گندا بھی بولتا۔''

شامیر نے کہا۔ ''سوری زویا! مجھے لگتا ہے کہ تم ''اپنی'' فیملی کے مردوں کی بات کررہی ہو۔''

زویا نے شامیر کو مکا دکھایا۔

اموخالہ نے کہا۔ ''شامی! مجھے اپنی بیٹی سے بات کرنے دو۔ چلو تم تھوڑی دیر کے لیے دائیں بائیں ہوجاؤ..... چلو شاباش۔''

خالہ نے اصرار کیا تو شامیر سر کھجاتا ہوا کمرے سے نکلا اور لابی کی طرف چلا گیا۔ زویا اور خالہ ثمینہ بات کرتی رہیں پھر شامیر کی کزن فارہ بھی اس گفتگو میں شریک ہوگئی۔

زویا کے ہوٹل سے واپس جانے کے بعد شامیر نے دوبارہ ویڈیو لنک پر اموخالہ سے رابطہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی رائے جاننا چاہی۔ ''کتنے نمبر اموؤ؟'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ ہنسیں۔ ''ابھی تو ایک پیپر ہوا ہے۔ دو چار بار بات ہوگی تو پھر ٹوٹل نمبروں کا پتا چلے گا۔''

''چلیں..... اس پیپر کا رزلٹ تو بتائیں۔''

''اتنا اچھا نہیں۔'' وہ بولیں۔ شامیر ایک دم چپ ہوگیا۔ وہ زور سے ہنس کر کہنے لگیں۔ ''مذاق کررہی ہوں۔ بڑی اچھی، بڑی پیاری لڑکی ہے..... جی چاہتا ہے کہ خود وہاں آجاؤں۔ اس سے اچھی طرح ملوں۔''

''تو پھر آجائیں نا..... بلکہ فارہ کو بھی لے آئیں۔ میں ویزے کے لیے کوشش کرتا ہوں۔''

"تم ہوش میں تو ہو۔ تین چار لاکھ کا خرچہ ہے۔ یہی تین چار لاکھ تمہاری شادی پر نہ لگاؤں گی۔" اتنے میں فارہ بھی آگئی اور اسے چھیڑنا شروع ہوگئی۔

اگلے چھ سات روز شامیر کے لیے یادگار تھے۔ موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ وہ دونوں فرینکفرٹ اور اس کے گردونواح میں گھومتے رہے..... ایک بس یا ٹرین میں بیٹھتے اور اس کے آخری اسٹاپ پر پہنچ جاتے، پھر کوئی دوسری بس یا ٹرین پکڑتے اور شہر کے کسی اور حصے کی طرف چل نکلتے۔ ایک بے پناہ کشش تھی جو ہر لحظہ انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچتی تھی۔ رات کو جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تو یوں لگتا کہ درمیان میں برسوں کا فاصلہ ہے۔ رات کو ایک دو بار زویا کی کال آجاتی اور دو تین بار شامیر اس کا نمبر پریس کردیتا۔ زویا کی روم میٹ خشامہ سے اب کوئی پردہ نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ اس کھیل سے نکل چکی ہے اور یہ کھیل تو تھا بھی نہیں..... یہ تو سمندر کی طرح گہرا، پہاڑوں کی طرح بلند اور طوفانوں کی طرح سرکش ایک انوکھا جذبہ تھا جو برق رفتاری سے انہیں اپنے حصار میں لیتا جارہا تھا۔ اس تعلق میں بے پناہ شدت ہونے کے باوجود یہ بے لگام نہیں تھا۔ اس میں پھولوں کی نزاکت اور شبنم کی سی شفافیت تھی۔ ایک ایسی قربت جو نگاہوں کے ملاپ اور ہاتھوں کے لمس سے شاید ہی کبھی آگے بڑھی ہو۔

شامیر کے اصرار پر زویا اپنی والدہ سارہ کو شامیر کے بارے میں بتا چکی تھی۔ شروع میں تو وہ بہت سیخ پا ہوئی تھیں اور فون پر ہی زویا کو ان کے دو تین آتشیں لیکچر سننا پڑے تھے۔ تاہم اب وہ کسی حد تک دھیمی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک روز دریائے مائنز کے پرے پل پر دوپہر کے وقت زویا اور شامیر کی ملاقات طے تھی۔ وہ پل پر کھڑا نیچے سے گزرتی ہوئی تفریحی کشتیوں اور لانچوں وغیرہ کو دیکھ رہا تھا، جب عقب سے کسی نے آہستگی کے ساتھ اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ کچھ بولا نہیں لیکن اس کا تعارف کرانے کے لیے اس کی خوشبو اور اس کا دل گداز لمس ہی کافی تھا۔ یہ زویا تھی۔ وہی جو طوفان کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور اس کے دل و دماغ اور اس کی ساری حسیات پر پوری طرح قابض ہوچکی تھی۔

وہ اسی طرح اسے عقب سے بانہوں میں لیے کھڑی رہی۔ اس کے نرم رخسار کا لمس شامیر اپنی کمر پر شانوں کے درمیان محسوس کررہا تھا۔ "آئی لو یو شومیر۔" زویا نے اسی طرح اسے بانہوں میں جکڑے ہوئے کہا۔

بادشاہ کی فراخدلی

1751ء کا ذکر ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کردیا، پنجاب کے حاکم معین الملک نے شاہ کو وہ خراج ادا نہیں کیا تھا جو 1750ء کے معاہدے کی رو سے طے پایا تھا۔ ابدالی لشکر نے مختصر لڑائی کے بعد لاہور فتح کرلیا اور چار مہینے قابض رہنے کے بعد اس نے لاہور خالی کرنے کا فیصلہ کیا اور معین الملک کو صلح کی شرطیں طے کرنے کے لیے طلب کیا۔ معین الملک، شاہ کے سامنے حاضر ہوا تو احمد شاہ ابدالی نے پوچھا۔ "اگر تم مجھے قید کرلیتے تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟"

معین الملک نے جواب دیا۔ "میں آپ کا سر کاٹ کر شہنشاہ کو دلی بھیج دیتا۔"

اس پر شاہ نے کہا۔ "اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

نڈر اور دلیر معین الملک نے جواب دیا۔ "اگر آپ دکاندار ہیں تو تاوان کی غرض سے مجھے بیچ دیں۔ اگر آپ قصائی ہیں تو مجھے قتل کردیں اور اگر آپ بادشاہ ہیں تو مجھے معاف کردیں۔" احمد شاہ ابدالی اس جواب پر بہت خوش ہوا۔ اس نے نہ صرف معین الملک کو معاف کردیا بلکہ اسے اپنی دستار پہنا کر اسے دوبارہ لاہور کا حاکم بنادیا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

"یہ تو بہت پرانی بات ہوچکی زویا..... کچھ نیا کہو۔"

"شومیر! مجھ کو بہت زیادہ ڈر لگتا۔"

"کیوں؟"

زویا نے اسے کچھ اور اپنے ساتھ بھینچا۔ "ملا یہاں فرینکفرٹ آتا۔ وہ توم سے میٹنگ کرنا مانگتا..... کبھی کبھی وہ ایک دم بہت انگری وومن بن جاتا۔ غصے میں کچھ بھی بول دیتا۔ تو م کو "تجل" سے کام لینا ہوگیں گا۔"

"تجل؟ یہ کون ہے؟" پھر جیسے ایک دم شامیر کی سمجھ میں آگیا۔ "شاید تم تحمل کہنا چاہ رہی ہو؟"

"ہاں ہاں، وہی۔" اس نے کہا اور بازوؤں کی گرفت شامیر کے گرد ڈھیلی کردی۔

شامیر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے

ساتھ لگایا اور پہلی بار اس کے رخسار کو بوسہ دیا۔ اس نے اپنا سر شامیر کے چوڑے سینے سے لگا دیا۔ آدھی آستینوں والی ہلکی گلابی شرٹ میں وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ کریم کلر پتلون کے نیچے سفید جوگرز اسے کسی ٹین ایجر جیسی لک دے رہے تھے۔ شامیر اسی طرح اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے پل سے نیچے اتر آیا۔ دونوں مہکتے پھولوں کے درمیان لکڑی کی ایک سبز بینچ پر جا بیٹھے۔

''شومیر! میں نے اپنی سسٹرز سے بھی بات کیا۔ وہ بھی خوش نا ہیں۔ وہ بھی ماما کی حمایت میں ہی بولتا۔''

''اور پاپا؟''

''پاپا سے تو رابطہ ہی نا ہیں ہوتا۔ وہ اپنی وائف کے ساتھ سنگاپور کے ٹور پر گیا۔ اگر رابطہ ہو بھی جائیں گا تو کیا فائدہ ہوئیں گا۔ وہ تو اپنے حال میں مست ہے۔''

شامیر نے زویا کا شانہ سہلایا۔ ''جان! پریشان نہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں تمہاری ماما کو قیس کرلوں گا۔ ہاں، ماما سے بات چیت کے حوالے سے تم مجھے کچھ ٹپس دینا چاہو تو اور بات ہے۔''

''میں کیا ٹپس دوں شومیر! کچھ سمجھ میں نا ہیں آتا۔ دماغ تو بالکل..... بالکل..... کنجر ہو کر رہ گیا ہے۔'' اس نے منہ بسورا۔

''کنجر ہو کر رہ گیا ہے؟ کیا مطلب؟'' شامیر نے بے حد حیران ہو کر پوچھا۔

وہ اسی طرح سٹپٹائی ہوئی بیٹھی تھی۔ چند سیکنڈ بعد شامیر کے منہ سے بے ساختہ ہنسی کا فوارہ سا چھوٹ پڑا۔ وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زویا حیرت آمیز سادگی کے ساتھ اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر بولی۔

''کیا ہوا شومیر! واٹ از رانگ؟ میں نے کیا کہہ دیا؟''

وہ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''بس جو کہہ دیا اسے دوبارہ نہیں کہنا اور کسی دوسرے کے سامنے تو بالکل بھی نہیں کہنا۔ دماغ کنجر نہیں ہوتا، دماغ خبر ہوتا ہے۔''

''ہاں..... ہاں..... ہام بھی کہنا مانگتا تھا۔''

شامیر دوبارہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے وہ بینچ پر ہی لیٹ گیا۔ جب وہ لیٹا تو اس کا سر زویا کے زانو پر آ گیا۔ زویا نے اسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ خوشگوار چمکیلی دھوپ نے لالے اور ڈیزی کے پھولوں کی مہک کو دوچند کر کے ہوا کے جھونکوں میں فراوانی سے تقسیم کر دیا تھا۔ اردگرد بہت سے لوگ موجود تھے لیکن کسی نے خصوصی طور پر زویا اور شامیر کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہاں اور بھی کئی جوڑے موجود تھے اور کہیں زیادہ ''رومانیت'' کا شکار تھے۔ ان کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھتا تھا۔

''امو خالہ کا کیا فیلنگز ہے میرے بارے میں؟'' زویا نے پوچھا۔

''زبردست..... بس وہ ایک ہی بات کہتی ہیں۔ زویا کو جلد از جلد پاکستان لاؤ۔ میں اس کی پکائی ہوئی گلابی بریانی اور گلابی کوفتے کھانا چاہتی ہوں۔''

''گلابی کوفتے؟'' زویا نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں بھئی۔ جس طرح تم گلابی اردو بولتی ہو اس طرح پاکستانی کھانے بھی تو گلابی ہی پکاؤ گی نا۔''

''تو امو چاہتا کہ میں تمہارے ساتھ پاکستان آ جائے؟'' وہ اس کے مزاح کو نظر انداز کر کے بولی۔

''اس طرح نہیں بھئی، دلہن بن کر۔ اپنے ایک ہاتھ پر نہیں بلکہ دونوں پر مہندی لگوا کر۔ پوری طرح سج دھج کر۔''

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیلی تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہلکا سا تفکر بھی تھا۔

☆☆☆

زویا کی والدہ سارہ جیم کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ جوانی میں وہ خوبصورت رہی ہوں گی تاہم اب جسم بھدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کو فیشن اور لباس کے ذریعے چھپانے کی کوشش کر رکھی تھی اور اس میں کسی حد تک کامیاب نظر آتی تھیں۔ بوائے کٹ بال سرخ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسکرٹ کی آدھی آستینوں میں سے فربہ بازو نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ گلے میں چھوٹی سی چین تھی اور چہرے کے نقوش سے پتا چلتا تھا کہ وہ گاہے بگاہے سخت طیش میں بھی آتی ہیں۔

وہ جب فرینکفرٹ زویا اور خشامہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو زویا ابھی آفس سے نہیں لوٹی تھی۔ خشامہ واپس آ چکی تھی اور وہ نخیمت جان کر زویا کی والدہ سے گفتگو میں مصروف تھی۔ اس نے کہا۔ ''آنٹی! میں ایک بار پھر کہتی ہوں غصہ دکھانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ معاملہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ وہ مانے گی نہیں۔ اب اگر آپ اسے روکنا ہی چاہتی ہیں تو پھر برداشت اور تدبیر سے کام لینا ہوگا اور اس سے بہتر تدبیر کوئی نہیں جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔''

''لیکن اگر وہ یہ بات بھی مان گیا تو؟'' سارہ جیم

نے اپنی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے تو سے فیصد یقین ہے کہ وہ نہیں مانے گا۔ وہ اپنی اس خالہ سے بہت پیار کرتا ہے۔ ماں کا درجہ دیتا ہے اور وہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا بھانجا اس کے پاس پاکستان میں رہے۔ وہ اسے دور کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے گھر کا کفیل بھی یہی شامیر ہے۔ سنا ہے کہ تھوڑی بہت زمین بھی ہے جہاں سے اناج آتا ہے لیکن صرف اناج سے تو گھر نہیں چلتے نا۔''

سارہ جیم کے میک اپ زدہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ وہ بولیں۔ ''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب یہ بات بڑھے تو وہ عورت بھانجے کے ساتھ ہی یہاں شفٹ ہونے کا سوچ لے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا سویٹ آنٹی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ وہاں گھر کے علاوہ ان کی کچھ زمین بھی ہے۔ وہ اسے کیسے چھوڑیں گے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ اس عورت کی تیرہ چودہ سالہ بیٹی بھی ہے۔ یہ بدیسی لوگ جوان ہوتی بیٹیوں کے ساتھ ہمارے ملکوں میں رہنے کا سوچتے بھی نہیں بلکہ جو یہاں موجود ہوتے ہیں وہ بھی بیٹیوں کے ذرا بڑا ہونے پر یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ تب یہی ممالک جوان کے لیے جنت کا نمونہ ہوتے ہیں، خطرناک قرار پاجاتے ہیں۔'' خشامہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

سارہ جیم کی گدلی آنکھوں میں کدورت کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی دوران میں نیچے سیڑھیوں کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔

خشامہ نے جلدی سے رسٹ واچ دیکھی اور بولی۔ ''آنٹی! میرا خیال ہے کہ وہ آگئی ہے۔ آپ اس سے محبت سے ہی بات کیجیے اور یہ نکتہ اس کے ذہن میں ڈالیے..... اور میرا ذکر درمیان میں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔''

''میں بچی نہیں ہوں۔ تم بے فکر رہو۔'' سارہ جیم نے تیوری چڑھا کر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد زویا دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں شاپنگ کے تین چار بڑے لفافے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ماما آرہی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں۔ زویا کچھ ڈری ڈری نظر آتی تھی مگر ماما کے نسبتاً نرم رویے نے اسے کچھ مطمئن کیا۔ اس نے ماما کا رخسار چوما۔

''یہ کیا کر کے بیٹھ گئی ہو بازو کو۔'' سارہ نے بیٹی کے پلاسٹر شدہ بازو کو چھوا۔

''کچھ نہیں ماما! اب تو تین چار روز میں پلاستر بھی اتر جائے گا۔'' وہ ماما کو اپنے بازو کی تازہ صورتِ حال بتانے میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

آفس سے فارغ ہوکر زویا کسی مقناطیس کی طرح ٹرین کے مرکز میں اسٹیشن ہاف بانوف کی طرف لپکتی چلی گئی۔ شامیر سے دور رہ کر گزرنے والے چند گھنٹے اسے ایک طویل زمانے کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ کسی وقت وہ یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ خدانخواستہ..... خدانخواستہ اسے چند مہینوں کے لیے شامیر سے جدا ہونا پڑا تو وہ کیا کرے گی؟ آج اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ہر دھڑکن کے ساتھ جیسے ایک شادیانہ سا بھی بجتا تھا۔ اس نے صبح فون پر شامیر کو کچھ نہیں بتایا تھا وہ خود اس سے مل کر اسے بتانا چاہتی تھی۔ وہ بارونق پُرشور مرکزی اسٹیشن پر پہنچی تو اس نے دور ہی سے شامیر کو اپنا منتظر دیکھ لیا۔ وہ کسی وقت جان بوجھ کر اس کے عقب سے نمودار ہوتی تھی۔ اس مرتبہ بھی اس نے جان بوجھ کر ایسا ہی کیا۔ مین دروازے سے داخل ہونے کے بجائے وہ گلاوا کاٹ کر ایک بغلی راستے سے آئی اور اسٹیشن کے اندر ایک برگر شاپ کے پاس کھڑے شامیر کو عقب سے بانہوں میں لے لیا۔

''پورے پندرہ منٹ لیٹ ہوئی ہو۔'' وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

''پندرہ نا ہیں..... بارہ منٹ..... جو ٹائم توم سے دور گزرتا اس کے ہر ہر سیکنڈ کا حساب رکھتی ہوں۔'' وہ عجب جذباتی لہجے میں بولی۔ شامیر کے عقب میں رہنے کا ایک فائدہ اسے یہ بھی ہوتا تھا کہ دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے اسے زیادہ شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔

''اچھا مجھے چھوڑو تو سہی، اپنی شکل تو دیکھنے دو۔'' اس نے مڑنے کی کوشش کی۔

''پہلے آچھی نیوز نا ہیں سنو گے؟'' زویا نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

شامیر کے جسم میں جیسے ایک خوشگوار سی لرزش نمودار ہوئی۔ ''کیا نیوز؟''

''ماما..... تقریباً 80 پرسنٹ تک مان گئی ہیں۔'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔

اس بار شامیر [illegible] کر خود کو اس کی بانہوں

میں گھمایا..... اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ ''واقعی؟'' وہ خوشی سے ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولا۔

نم آنکھوں کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''بس ایک دو چھوٹی چھوٹی شرطیں ڈالا انہوں نے۔''

''شرطیں ڈالتے نہیں رکھتے ہیں..... چلو خیر..... ادھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ اگر اتنی فیصد مان گئی ہیں تو پھر باقی بھی مان جائیں گی۔''

وہ کولڈ ڈرنکس لے کر برگر شاپ کی ہی ایک میز پر جا بیٹھے۔ زویا نے ''سپ'' لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو شرطوں کا تو میں نے یونہی بول ڈیا۔ بس یہ ایک ہی شرط ہے اور آئی تھنک یہ زیادہ مشکل بھی نا ہیں۔''

''کچھ بتاؤ بھی؟''

زویا نے پہلے تھوڑی سی تمہید باندھی پھر مختصر الفاظ میں شامیر کو بتایا کہ ماما چاہتی ہیں کہ شادی کے بعد وہ ان سے دور نہ چلی جائے بلکہ یہیں جرمنی میں رہے۔

یہ بات سن کر شامیر کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ تاہم وہ اس بارے میں زیادہ کچھ بولا نہیں۔ اس قدرے کٹھن سی شرط کے باوجود اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ خوشی کا موقع ہے اور انہیں یہ موقع ''سلیبریٹ'' کرنا چاہیے۔

وہ بولا۔ ''چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمیں کچھ کھانا پینا چاہیے۔''

وہ انگلش میں بولی۔ ''شامیر! مجھے لگتا ہے کہ ماما نے خود کو بہت زیادہ ایڈجسٹ کیا۔ کمپرومائز کرنے کی یہ ایک زبردست مثال ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح مان جائیں گی۔''

''خدا کرے وہ باقی بھی مان جائیں۔'' شامیر نے کہا۔

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، اس کی نگاہ اپنے سامنے گئی اور وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دی تھی۔ ''ٹام..... ٹام!'' وہ پکار اٹھی۔

قریباً بائیس تیئس سال کا ایک جرمن نوجوان ٹھٹک کر رکا۔ اس کے گلے میں گٹار کے اندر لپٹا ہوا گٹار تھا۔ زویا کو دیکھ کر وہ بھی خوشی سے نہال نظر آیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ مسرت کے عالم میں نوجوان لڑکے نے زویا کو بانہوں میں بھر کر اس طرح اونچا کیا کہ زویا کے پاؤں فرش سے اٹھ گئے۔ اسی طرح زویا کو ایک بار گھما کر اس نے پھر فرش پر اتار دیا۔

زویا نے دانت پیس کر اس کو سر کے بالوں سے جھنجوڑا پھر اس کے دونوں گالوں پر دو زوردار چپکیاں بھریں۔ ''کہاں رفعان ہو گئے تھے۔'' وہ بلند آواز میں بولی۔ ''نہ نیٹ پر ملتے ہو، نہ فون پر تمہارا پتا چلتا ہے۔ پتا ہے ہم کتنا یاد کرتے رہے ہیں تمہیں۔''

ہاف پینٹ پہنے ہوئے ماڈرن لڑکے نے اپنے بازو زویا کی کمر کے گرد حائل کر دیے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ زویا بھی رطب اللسان تھی۔ قریباً دو منٹ بعد زویا کو احساس ہوا کہ شامیر بھی یہاں موجود ہے۔ وہ بری طرح چونکی اور پھر جرمن لڑکے کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی شامیر کے پاس لائی۔ ''شامیر! اس سے ملو۔ یہ ٹام ہے۔ ٹالنگ میں میرا پڑوسی۔ میری اور عشامہ کی اس سے بہت دوستی رہی ہے۔ اتنا اچھا میوزک پلے کرتا ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں۔''

پھر وہ نام سے مخاطب ہوئی۔ پہلے جوش سے بولنے لگی پھر اس کے چہرے پر جھجک کی سرخی سی پھیل گئی۔ ذرا دھیرج سے بولی۔ ''اور نام یہ ہیں شامیر۔ ڈنل ایے چینل کے سب سے ذہین رپورٹر۔ یہاں بھی رپورٹنگ کے سلسلے میں ہی آئے ہیں۔''

نام اور شامیر نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ زویا چہک کر بولی۔ ''شامیر! پچھلے دنوں ہم نے اسکائی لین میں ایک راک اسٹار کو سنا تھا نا۔ یہ نام بھی اسی کے بینڈ میں پرفارم کرتا تھا لیکن اب یہ ایک دوسرے بینڈ میں چلا گیا ہے۔ ایلی کے پاؤں میں چکر ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں بھاگا پھرتا ہے۔ بس کبھی کبھی اس کا کوئی گایا ہوا گانا ہمارے کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے اسے مکا دکھایا اور پھر بڑی بے تکلفی سے اس کے سر کے بال بکھیر دیے۔

گہرے سرخ ہونٹوں والا قبول صورت نام بس مسکراتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ تولنے والی نظروں سے شامیر کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ زویا نے فون پر عشامہ کو نام کے بارے میں بتایا۔ اب وہ ایک بار پھر جوشیلے انداز میں اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔

(جاری ہے)

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلا ہی جاڑوں کی طرح گلا ہی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضاؤں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو..... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

دوسرا حصہ





شامیر کھلے دل ودماغ کا شخص تھا، مگر زویا کے حوالے سے اس کے احساسات اتنے خاص الخاص ہو چکے تھے کہ اس میوزیشن ٹام کے ساتھ اس کی یہ غیر معمولی بے تکلفی اسے کھلنے لگی۔ اس نے عام تاثرات تو نارمل ہی رکھے مگر سینے میں جیسے مسلسل کچھ چبھ رہا تھا۔ وہ زویا کو اس ماحول اور اس مادر پدر آزاد معاشرے سے دور لے جانا چاہتا تھا۔ وہ شبنم کی طرح پاک اور پھولوں کی طرح عطر بیز تھی۔ وہ جیسے یہاں کی تھی ہی نہیں..... اس کا دل چاہا کہ وہ اسے کسی موتی کی طرح اپنی بانہوں کے سیپ میں سمیٹے اور کہیں بہت دور نکل جائے..... پاکستان کی فضاؤں میں پہنچ جائے مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے زویا نے جو بات کی تھی، وہ اس کے برعکس تھی۔

رات کو ویڈیو لنک کے ذریعے اموخالہ سے اس کی تفصیلی بات ہوئی۔ انہیں بھی زویا تقریباً پسند آچکی تھی مگر یہ بات تو ان کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں تھی کہ وہ شامیر کی شریک زندگی تو بن جائے مگر پاکستان نہ آئے۔ شامیر کی پریشانی دور کرنے کے لیے اموخالہ نے بڑی محبت سے کہا۔

''شامی! میرا دل کہتا ہے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اور جہاں سچی محبت ہوتی ہے، وہاں دیواریں خود بخود گر جاتی ہیں۔ تم جلد بازی نہ کرنا۔ طریقے سے کوشش کرو۔ وہ مان جائے گی۔ اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ایک دفعہ وہ پاکستان آگئی اور اس نے ہم سے مل لیا تو اس کے سارے خوف دور ہو جائیں گے۔''

قریباً یہی وقت تھا جب زویا کے فلیٹ میں اس کی ماما اسے سمجھا رہی تھیں۔ ''زویا! یہ لڑکا اپنے ہم قوم لوگوں سے کچھ مختلف لگتا ہے مگر کم از کم اپنی اس شرط سے ہرگز پیچھے نہ ہٹنا۔ اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو اتنی قربانی وہ تمہارے لیے ضرور دے گا۔ یہاں اس کی ترقی کے مواقع بھی پاکستان سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ وہ یہاں رہ کر اپنی خالہ کی کفالت بھی پہلے سے بہتر کرسکتا ہے اور پھر یہ جدید دور ہے۔ انٹرنیٹ نے دنیا کو گلوبل ویلیج بنا رکھا ہے، وہ یہاں رہ کر بھی ہر وقت اپنے اہلِ خانہ سے رابطے میں رہ سکتا ہے۔''

زویا نے کہا۔ ''ماما! شامیر کہتا ہے کہ خالہ کی کفالت والی تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دیہی علاقے میں ان کی کچھ زمین ہے جہاں سے معقول آمدنی بھی ہو جاتی ہے..... اصل بات یہ ہے کہ وہ خالہ سے بہت محبت کرتا ہے.....''

ماما بولیں۔ ''تم نے زمین والی بات کی ہے تو مجھے ایک اور بات یاد آگئی ہے۔ کوئی دو سال پہلے ہمارے پڑوس کی ایک لڑکی بھی ایک ایسے ہی پاکستانی زمیندار گھرانے میں شادی کرکے گئی تھی۔ یہ لوگ جن کا تعلق دیہاتی علاقے سے ہوتا ہے، ایک اور ہی مائنڈ سیٹ کے مالک ہوتے ہیں۔ خدانہ کرے کہ یہ لڑکا ایسا ہو مگر اس لڑکی کا تو پاکستان جاکر جو حشر ہوا وہ سن کر دل کانپ جاتا ہے۔ اسے پردے میں بٹھا دیا گیا، گھر جیل بن گیا اس کے لیے۔ ایسی ایسی پابندیاں لگیں جو تصور میں نہیں آسکتیں۔ شوہر نے اسے بچے پیدا کرنے والی مشین بنانا چاہا۔ اپنے دو بچوں سمیت وہ بڑی مشکل سے وہاں سے جان بچا کر نکلی تھی۔''

زویا اس واقعے کے بارے میں پہلے بھی تھوڑا بہت جانتی تھی۔ اب ماما نے اسے مزید تفصیل اور شدت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔

☆☆☆

زویا اور شامیر ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ یہاں حلال گوشت کا اہتمام بھی تھا مگر ان دونوں میں سے کسی نے بھی کھانا نہیں منگوایا تھا۔ بیٹھنے کے لیے بہانہ درکار تھا اس لیے شامیر نے آئس کریم منگوالی تھی۔ زویا کا دل شاید آئس کریم کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ یونہی آئس کریم کے کپ میں چمچ گھماتی جا رہی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ گال کا ڈمپل بھی کچھ ماند پڑا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر بیتابی لہجے میں بولی۔ ''شومیر! پلیز..... تم پاکستان کیوں نہیں جاتے؟ یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ بہت آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہاں بھی چینل کا سیٹ اپ موجود ہے۔ روزگار کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ ترقی کے مواقع پیدا ہو جائیں گے۔''

شامیر نے کہا۔ ''زویا! میرے لیے یہ کوئی ضد یا انا کا مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ مجبوریاں ہیں جو تمہارے سامنے ہیں۔''

وہ شامیر کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''ہم خالہ اور ان کی بیٹی کو بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔ بچے تعلیم کے لیے ویسے بھی تو لاکھوں خرچ کرکے یہاں آتے ہیں۔ فارہ کو بہترین اسکول میں داخلہ مل جائے گا۔ خالہ کے جوڑوں کی جو تھوڑی بہت تکلیف ہے، وہ بھی دیکھنا یہاں کتنی اچھی طرح ٹریٹ ہوگی..... تم نے خود بتایا ہے کہ تمہارا اور تو کوئی قریبی عزیز ایسا ہے نہیں جو پاکستان میں ہو۔''

وہ دیر تک شامیر کا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہی اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ شامیر جانتا تھا کہ زویا کا موقف یہاں رہنے کے حوالے سے اگر سخت ہوا ہے تو اس کے پیچھے اس کی ماما کا ہاتھ... بھی ہے۔ شامیر کی معاملہ فہمی

اسے خشامہ کے حوالے سے بھی شک میں مبتلا کر رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ بھی کوئی کردار ادا کر رہی ہو۔

اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''زویا! میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار براہِ راست تمہاری ماما سے ملوں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس کا کوئی درمیانی حل نکالنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

''اور اگر..... خدانخواستہ حل نہ نکلا تو؟'' وہ مزید زرد ہوکر بولی۔

''پھر میں..... وہی کروں گا جو تم کہو گی..... اور جس میں ہماری محبت کی آبرو ہوگی۔'' اس نے زویا کے ہاتھوں کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر اسے تسلی دی۔

''تو پھر کل ہی مل لو۔ کل ان کا موڈ بڑا اچھا ہوگا کیونکہ یہ ان کی سالگرہ کا دن بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کسی تحفے کا انتظام بھی کرتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

اگلے روز شام کو فلیٹ کے ایک قریبی ریستوران میں شامیر، زویا کی ماما شہارہ جیم کے روبرو بیٹھا تھا۔ وہ نہایت قیمتی شال کا تحفہ ان کو پیش کر چکا تھا جسے خوش اخلاقی سے قبول کرلیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد اب وہ اصل موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ شامیر کہہ رہا تھا۔ ''آنٹی سارہ! زویا کو وہاں اتنی محبت ملے گی جس کا وہ تصور نہیں کرسکتی۔ وہ ایک سال یا چند ماہ وہاں رہے، مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں رہنے کو ترجیح دے گی۔''

''اور اگر اس کے برعکس ہوا تو؟'' آنٹی سارہ نے گرین ٹی کی چسکی لیتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''فرضِ محال ایسا ہوا تو..... ہم..... یہاں آنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔''

''مقامی لڑکیوں کا وہاں جاکر آنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے کیس میرے علم میں ہیں۔ میں وہاں کے ماحول کو اچھی طرح جانتی ہوں..... کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارے ہیں جو وہیں کا پلا بڑھا تھا۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، آنٹی سارہ جلدی سے بولیں۔ ''شامیر! تم واقعی یہاں جرمنی میں آہی کیوں نہیں جاتے۔ ان ملکوں کے لوگ تو مرتے ہیں یہاں آنے کو۔''

شامیر کو ناگواری محسوس ہوئی مگر اس نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ متانت سے بولا۔ ''آنٹی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔''

آنٹی سارہ کی آنکھوں کا گدلا پن کچھ اور گہرا ہوگیا۔ وہ اپنے سرخی لگے ہونٹ بھینچ کر کچھ دیر گہری نظروں سے شامیر کو دیکھتی رہیں پھر کاٹ دار لہجے میں بولیں۔ ''مجھے پتا ہے تم خالہ بھانجے کی سب سے بڑی مجبوری کیا ہوگی۔ وہی فارہ نام کی لڑکی۔ وہ یہاں اس ناپاک ملک میں آئے گی تو ناپاک ہوجائے گی لیکن ناپاکی کا یہ خطرہ تو صرف عورتوں کے لیے ہے۔ وہاں تمہارے ملک کے مرد حضرات تو یہاں آکر ناپاک نہیں ہوتے۔ وہ تو مزید معزز اور شان و شوکت والے ہوجاتے ہیں۔''

''سوری ٹو سے، آنٹی سارہ! آپ سب کے بارے میں تو یہ بات نہیں کہہ سکتیں۔''

''میں کہہ سکتی ہوں۔'' وہ سخت لہجے میں بولیں۔

''ہاں، میں کہہ سکتی ہوں کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایک ایسے ہی کمینے کے ساتھ برباد کیا ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ ان ملکوں میں بس تب تک عیش و آرام سے رہا جاسکتا ہے جب تک بچیاں اسکول کی عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ پھر یہاں سے بھاگ جانا چاہیے..... ورنہ وہ بچیاں نہیں رہیں گی، بلائیں بن جائیں گی۔ اپنے پیدا کرنے والوں کا خون چوس لیں گی..... لہٰذا بھاگ جانا چاہیے۔'' آنٹی سارہ ہیجانی انداز میں بولی۔

شامیر نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی جان! یہ بات مکمل طور پر غلط بھی تو نہیں ہے۔ اس معاشرے کی بے راہ روی سے تو آپ لوگ خود بھی پریشان ہیں، کیا کچھ نہیں ہوجاتا یہاں۔''

''کیا کچھ ہوجاتا ہے؟'' وہ مزید بھڑک کر بولیں۔

''اور کیا کچھ ہے جو تمہارے ملک میں نہیں ہوتا۔ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں..... ایسی باتیں کرتے ہوئے تم لوگوں کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ نیکی اور بدی ہر بندے کے اندر ہوتی ہے۔ اب دیکھو میری بیٹیوں کو۔ یہیں پلی بڑھی ہیں نا۔ تمہیں کیا خرابی نظر آتی ہے میری زویا میں..... میری ایما اور حولیہ بھی اسی طرح ہیں اور وہ تمہارا ہم قوم..... وہ باسٹرڈ..... وہ باپ ان کا۔ انہیں لے کر بھاگ جانا چاہتا تھا وہاں انڈیا میں..... اگر میں اس کے سامنے دیوار نہ بنتی تو یہ برباد ہوچکی ہوتیں۔''

''پلیز آنٹی! آپ ذرا تحمل سے بات کریں۔ آپ سب کو ایک لاٹھی سے ہانک رہی ہیں۔''

''تو کیا غلط کر رہی ہوں۔ ایک جیسے ہو تم سب.....

ایک ہی خصلت ہے تم سب کی۔'' وہ مزید بھڑکتی جارہی تھیں۔ جیسے وہ ملے ہی یہ کرکے آئی تھیں کہ معاملے کو مزید بگاڑنا ہے۔

شامیر نے پھر کوشش کرکے اپنے طیش کو دبایا اور بولا۔ ''آنٹی جان! اونچا بولنے سے جھوٹ کو سچ نہیں بنایا جاسکتا۔ لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں۔''

''میں جھوٹی نہیں ہوں۔ تم جھوٹے ہو..... تم سب جھوٹے ہو..... تمہارا خمیر ہی جھوٹ سے اٹھا ہے۔ لعنت ہے تم سب پر۔'' انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر وہ باکس دور پھینک دیا جس میں شامیر قیمتی شال لے کر آیا تھا۔

دو قدم آگے بڑھ کر وہ شامیر پر گرجیں۔ ''اپنی کسی باسٹرڈ بہن یا بھتیجی کو تو کیوں نہیں بیاہتا یہاں کسی جرمن کے ساتھ۔ کیوں یہاں آجاتے ہو دولت کے پیچھے اور لڑکیوں کے پیچھے.....'' اس کے بعد وہ سیدھی سیدھی گالیوں پر اتر آئیں۔

اب شامیر سے مزید برداشت نہیں ہوا۔ اس نے جواب دیا تو وہ چیل کی طرح شامیر پر جھپٹ پڑیں۔ اپنا وزنی شولڈر بیگ گھما کر شامیر کے منہ پر دے مارا۔ انہوں نے دوبارہ مارنے کے لیے بیگ بلند کیا تو شامیر نے بیگ کو اسٹریپ سے پکڑ لیا اور پھر اسے زور سے کھینچ کر دور پھینک دیا۔ بیگ کے ساتھ ہی آنٹی سارہ بھی ریستوران کی کرسیوں پر لڑھک گئیں۔ انہوں نے ماتھا پکڑ لیا اور چلانا شروع کردیا۔ ایک دم بہت سے لوگ بیچ میں آگئے۔ کچھ شامیر پر برسنے لگے کہ اس نے اس طرح کیوں کیا ہے۔

ایک تنومند جرمن گرج کر بولا۔ ''پولیس کو کال کرو۔ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔''

اسی دوران میں شامیر نے خشامہ کو دیکھا۔ وہ شاید کہیں آس پاس ہی موجود تھی۔ وہ فوراً موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے کینہ توز نظروں سے شامیر کو دیکھا پھر آنٹی سارہ کو سنبھلنے میں مدد دی۔ ان کی پیشانی کے اوپر بالوں کے درمیان سے کچھ خون رس رہا تھا۔

دو تین منٹ تک خوب شور شرابا رہا، بہرحال پولیس تک نوبت نہیں پہنچی کیونکہ ریستوران کا مالک بھی اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ آنٹی سارہ بکتی جھکتی اور صلواتیں سناتی ہوئی خشامہ سمیت باہر چلی گئیں۔ خشامہ نے اپنا رومال ان کے ماتھے پر رکھا ہوا تھا.....

☆☆☆

زویا نے نماز روزے کی طرف شاید ہی کبھی توجہ دی ہو لیکن ان دنوں وہ جس طرح کے حالات سے گزر رہی تھی، اسے روحانی سہارے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ان دو تین ہفتوں میں جیسے سرتاپا بدل گئی تھی۔ کسی کی محبت نے ایسی بے پناہ شدت سے اسے جکڑا تھا کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کسی وقت وہ آنکھیں بند کرکے بہ زبانِ خاموشی خود ہی سے جھگڑنے لگتی..... اے نکمے، نادان دل تو نے رول ڈالا مجھے..... تنکے سے ہلکا کردیا۔ یہ کیا ہوگیا ہے تجھے؟ اب تک تو بڑی شرافت سے دھڑک رہا تھا تو..... تجھ سے ایسی امید تو ہرگز نہیں تھی۔ ایسی دیوانگی؟ طلب کی ایسی شدت؟ اتنی محبت کہاں چھپا رکھی تھی تو نے؟

اب بھی دل بڑے بے ڈھنگے طریقے سے دھڑک رہا تھا۔ گاہے بگاہے دھڑکن زیروزبر ہوجاتی تھی۔ ایک قریبی ریستوران میں ماما اور شامیر کی ملاقات تھی۔ وہ مسلسل دعا گو تھی کہ یہ ملاقات کامیاب ہوجائے اور کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔ وہ اب شامیر کو کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ جینز اور شرٹ میں تھی۔ تاہم اس نے اچھی طرح اسکارف اوڑھا اور مغرب کی نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔ خشامہ بھی ماما کے ساتھ گئی تھی تاہم جس دوران میں ماما اور شامیر کی ملاقات ہونا تھی اس نے ایک قریبی مارکیٹ میں شاپنگ کرنا تھی۔

زویا نماز سے فارغ ہوکر کچن میں آگئی۔ اس کے بازو کا پلاستر اب اتر چکا تھا۔ اسی اثنا میں اسے اندازہ ہوا کہ ماما اور خشامہ واپس آگئی ہیں۔ ''یا اللہ خیر۔'' اس نے اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

سیڑھیوں پر ماما اور خشامہ کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے بے تابی سے بڑھ کر دروازہ کھولا..... جو کچھ نظر آیا اس نے اسے سکتہ زدہ کردیا۔ ماما کی شرٹ پر خون کے چھینٹے تھے۔ خشامہ نے ان کے ماتھے پر رومال رکھا ہوا تھا اور وہ کراہتی ہوئی آرہی تھیں۔

''اوہ گاڈ۔'' زویا تقریباً چلا اٹھی۔ ''کیا ہوا ماما؟''

خشامہ، انہیں لے کر اندر آگئی اور بولی۔ ''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟ وہ پرلے درجے کا بدتمیز بلکہ جانور ہے۔ جھوٹی شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا خبیث نے۔'' زویا کو لگا جیسے ایک لمحے میں اس کا جسم خون سے خالی ہوگیا ہے اور دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔

''کس کی بات کر رہی ہو خشامہ؟'' وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔

''اسی شامیر کی..... غصے میں ہوش گم ہو رہے تھے

اس کے..... میں تو کہوں گی جانور ہے وہ..... اگر لوگ روک نہ لیتے تو پتا نہیں کیا کر جاتا..... یوں آنٹی پر جھپٹ رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔"

زویا کی ماما کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پیشانی سے ذرا اوپر بالوں کے درمیان زخم زیادہ گہرا نہیں تھا مگر چونکہ بینڈیج نہیں کرائی گئی تھی اس لیے خون کے کچھ چھینٹے رخسار اور شرٹ پر نظر آرہے تھے۔ خشامہ نے اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر یوں بیان کیا کہ زویا پتھرا سی گئی۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ ماما کی کوئی بڑی نیکی کام آگئی ہے جس کے سبب وہ شدید زخمی ہونے اور اسپتال وغیرہ پہنچنے سے بچ گئی ہیں۔

زویا کے پوچھنے پر ماما نے کراہتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی نہیں ہوا زویا! مجھے تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ اتنا کیوں بھڑکا ہے۔ میں نے اس آپشن کی بات کی تھی کہ کیوں نہ ہم اس کی خالہ زاد کی بیٹی کو بھی یہاں بلالیں۔ مجھے پتا ہے کہ اسے جو غصہ آیا ہے، وہ اسی کے ذکر پر ہی آیا ہے۔ اپنی جوان ہوتی بچیوں کو یہاں اکیلا یہاں رکھنا ان لوگوں کے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہوتی ہے..... وہی..... تمہارے باپ والا مائنڈ سیٹ۔"

"کیا کہا اس نے؟" زویا ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں نے بس اتنی ہی بات کی کہ شاید تم اس لیے یہاں شفٹ ہونا نہیں چاہتے ہو کہ خالہ کی بیٹی کو بھی ساتھ آنا پڑے گا۔ یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ بدزبانی پر اتر آیا۔ یہ لوگ ایسے معاملوں میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ شاید غلطی میری ہی تھی۔ مجھے یہ بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔" زویا کی ماما نے آزردہ لہجے میں کہا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔

زویا جیسے تڑپ کر رہ گئی۔ اس کا اپنا دل بھی گواہی دیتا تھا کہ شامیر اگر یہاں شفٹ ہونے کی بات پر چپ سا ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے کچھ ایسی ہی وجہ ہے۔

☆☆☆

وہ بڑے تکلیف دہ شب و روز تھے۔ شامیر نے زویا سے ملنے کی بڑی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ ہاں فون پر دو تین بار زویا سے طویل گفتگو ضرور ہوئی۔ شامیر نے ہزار صفائیاں پیش کیں..... اصل صورت حال بتائی..... آنٹی سارہ کی زیادتی اور اپنے صبر و تحمل کا ذکر کیا، مگر زویا پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ بس ایک ہی بات کہتی تھی۔ "شومیر! میں نے تم کو اپنے والد سے بہت مختلف سمجھا تھا۔ مجھے تم سے ایسے رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ تم نے میری ماما کی جو توہین کی ہے وہ میں بھول نہیں سکتی۔"

اس نے زویا سے معافی بھی مانگ لی مگر یوں لگتا تھا کہ اس کے دل میں جو گرہ پڑ گئی ہے، وہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی۔ ہوٹل کے کمرے میں تنہا بیٹھا وہ اپنے ہی پسینے میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ وہ تو اس کے بغیر ایک دن یا چند گھنٹوں کا وقت بھی گزار نہیں پاتا تھا۔ ہفتے اور مہینے کیسے گزار سکے گا اور اگر خدانخواستہ مستقل دوری کی صورت حال پیدا ہوگئی تو وہ زندہ کیونکر رہ پائے گا؟ یہ کوئی عام تعلق نہیں تھا..... یہ محبت بھی نہیں تھی..... یہ روح کی گہرائیوں سے ابھرنے والا عشق تھا شاید..... اور یہ ایک شدید عارضے کی طرح اسے لاحق ہو چکا تھا۔ فرینکفرٹ کے باغیچوں اور گھروں کی بالکونیوں میں ڈیزی اور گلاب کے سارے پھول بے رنگ ہو چکے تھے۔ در و دیوار پر زرد اداسی کے سائے گہرے ہوتے چلے جارہے تھے۔

اس کی واپسی کے دن قریب آرہے تھے بلکہ اب تو صرف تین چار روز باقی تھے۔ سیاحت کے بقایا سارے پروگرام دھرے رہ گئے تھے۔ تاریخی شہر ہیمبرگ کو دیکھنا، دیوار برلن کا نظارہ کرنا، بلیک فارسٹ میں جانا، کچھ بھی تو نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ اس طرح اس کہانی کو ادھورا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زویا سے کم از کم ایک ملاقات تو ضرور کرنا چاہتا تھا..... ایک فیصلہ کن ملاقات!

خشامہ سے تو کسی طرح کے تعاون کی توقع رکھنا..... بیکار تھا۔ شامیر نے اس دوسری دبلی پتلی دراز قد لڑکی جین سے رابطہ کیا جو زویا والی بلڈنگ میں ہی رہائش پذیر تھی اور اس کی عزیز دوست بھی تھی۔ جین نامی اس لڑکی نے ایک رات، زویا اور شامیر کے ساتھ زویا کے فلیٹ میں قیام بھی کیا تھا۔ بہت کوشش کے بعد شامیر اس لڑکی کے ذریعے زویا کو ایک بار ملنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

شامیر اور زویا کی یہ ملاقات ٹرین نمبر 21 کے اس آخری اسٹاپ پر ہونی جہاں وہ اس سے پہلے بھی ایک بار ملے تھے۔ گھنے سیاہی مائل درختوں کے نیچے یہ وہی جگہ تھی جہاں ریلوے کے کچھ عجائبات رکھے تھے اور پکنک اسپاٹ کا سا ماحول تھا۔ یہاں چند روز پہلے زویا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شامیر نے کوک کا بچا ہوا گھونٹ اپنے گلے میں اتارا تھا اور دونوں کے چہرے ایک بے ساختہ مسکراہٹ سے کھل اٹھے تھے مگر تب کے اور آج کے ماحول میں بہت فرق تھا۔ وہ دونوں گم صم سے پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ آج

بھی سہ پہر کا ہی وقت تھا مگر بارش نہیں تھی..... شامیر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چلو، یہ بحث چھوڑتے ہیں کہ زیادتی کس کی طرف سے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ میں جا کر تمہاری ماما سے غیر مشروط معافی مانگ لیتا ہوں اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ مجھے معاف کر دیں گی۔''

زویا بولی۔ ''شومیر! بات معافی کی نہیں ہے۔ اگر معافی کی ہے تو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ دل کی گہرائی سے تمہیں سوری بولتی ہوں۔''

اس نے واقعی پلکیں جھکا کر شامیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی آنکھوں سے دو موتی ڈھلک کر رخساروں پر پھسل گئے۔

شامیر نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھامے۔ ''زویا! ایسا مت کرو، مجھے تکلیف ہو رہی ہے..... مجھے یہ بتاؤ کہ ہم..... اس معاملے کو سدھارنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ میں بہت آگے نکل گیا ہوں زویا! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اس تھوڑے سے وقت میں، میں نے بہت لمبا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی اب مجھے محال لگتا ہے۔''

وہ شامیر کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے التجا میں بولی۔ ''پلیز..... پلیز..... شومیر! میری بات مان لو۔ یہاں جرمنی آ جاؤ۔ تم یقین کرو ہم بہت خوش رہیں گے۔ ہم سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ خالہ اور فارہ کے سلسلے میں تمہارے جو اندیشے ہیں وہ سارے کے سارے دور ہو جائیں گے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ یہاں آنا چاہیں گی تو ہم ان کو پھولوں کی طرح رکھیں گے۔ اتنا تحفظ اور اطمینان دیں گے کہ وہ پاکستان میں شاید تصور بھی نہ کر سکتی ہوں۔''

شامیر کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ پہلو بدل کر بولا۔ ''زویا! تم یہ بات سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ امو خالہ اور فارہ پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں انہیں کہہ تو سکتا ہوں لیکن انہیں مجبور کر کے یہاں جرمنی نہیں لا سکتا۔ اگر وہ نہ آنا چاہیں گی تو پھر میں انہیں چھوڑ کر یہاں کیسے آ سکتا ہوں؟''

زویا کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ''وہ کیوں آنا نہ چاہیں گی شومیر! مجھے بتاؤ نا... وہ کیوں آنا نہ چاہیں گی؟ دنیا کی کون سی سہولت ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔ ترقی کے مواقع ہیں۔ بہترین لائف اسٹائل ہے، ہر طرح کا تحفظ ہے۔''

''زویا! وہ جگہ امو خالہ کی جنم بھومی ہے۔ وہ اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہیں گی۔''

زویا کی گرفت شامیر کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ چہرے پر کرب نمودار ہوا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''شومیر! مجھے ایک بات بالکل سچ سچ بتاؤ۔ اگر تمہاری امو خالہ کے ساتھ ان کی بیٹی نہ ہوتی تو کیا وہ پھر بھی اسی طرح سوچتیں؟ اسی طرح یہاں آنے کے خیال سے خوفزدہ ہوتیں؟''

''زویا! تم بار بار فارہ کو بیچ میں کیوں لے آتی ہو؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔ ''میں تمہیں درجنوں مرتبہ بتا چکا ہوں، بات وہ نہیں ہے جو تمہارے پاپا کی سوچ میں تھی یا تمہاری ماما تمہارے ذہن میں ڈال رہی ہیں۔ بے شمار ایسے خاندان یہاں جرمنی میں موجود ہیں جن کی جوان بچیاں بھی ہیں بلکہ اب تو لڑکیاں پڑھنے کے لیے بھی پاکستان سے یہاں آ جاتی ہیں.....''

''تم دوسروں کی بات کیوں کرتے ہو شومیر! تم اپنی بات کرو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری امو خالہ اور فارہ یہاں آ سکتی ہیں؟ عزت اور تحفظ کے ساتھ رہ سکتی ہیں؟ تم..... ایسا نہیں سمجھتے ہو شومیر۔ تمہارے لیے ایک جوان لڑکی کو یہاں لانا ایسے ہی ہے جیسے بھیڑ کے کسی بچے کو شکاری جانوروں سے بھرے ہوئے جنگل میں لے آنا..... اسی لیے تم مجھے بھی یہاں سے نکالنا چاہتے ہو۔ اپنی دانست میں تم مجھے بھی اس نہایت گندی اور پُرخطر جگہ سے نکالنے کا شبھ کام کر رہے ہو۔''

''زویا..... زویا..... تمہیں کیا ہو جاتا ہے جب اس موضوع پر بات ہوتی ہے..... تمہارا ذہن ایسا نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ سب کچھ ڈالا جا رہا ہے..... تمہیں میرے حوالے سے میرے ملک کے حوالے سے بدظن کیا جا رہا ہے..... خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔''

''خوفزدہ میں نہیں ہوں..... تم ہو شومیر..... اور تمہارا یہ خوف مستقل نہیں ہے۔ یہ خوف صرف اس وقت تمہارے ذہنوں کو ڈھانپتا ہے جب بات تمہاری بہنوں، بیٹیوں کے یہاں آنے کی ہوتی ہے۔'' زویا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے لہجے میں بیگانگی آتی جا رہی تھی۔

شامیر نے جز بز ہو کر کہا۔ ''زویا..... دیکھو اب تم اپنی بہن اور اپنی ماما کی زبان بول رہی ہو..... اور یہی وہ پوائنٹ ہے جہاں.....''

زویا نے شامیر کی بات کاٹی۔ ''چلیں، ٹھیک ہے۔ میں اپنی ماما کی زبان ہی بول رہی ہوں۔ تم بھی تو اپنی امو

خالہ اور اپنی بہن کی زبان بول رہے ہو۔'' وہ جیسے کراہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شامیر کا رنگ زرد ہوگیا۔ وہ زویا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''زویا! دیکھو ہم یہاں کوئی درمیانی راہ ڈھونڈنے کے لیے آئے تھے۔ اگر پھر وہی باتیں چھیڑ دیں گے تو کوئی حل کیسے نکلے گا؟''

اس نے چہرہ جھکایا۔ دو قیمتی موتی پھر اس کی آنکھوں کی سیپیوں سے جھڑ کر نیچے گھاس میں گم ہوگئے۔ اس نے شامیر کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور ہولے سے بولی۔ ''مجھے کہیں لگتا کہ اس کا کوئی حل نکلے گا۔ شش..... شاید..... ہمیں ایک دوسرے کو بھولنا پڑے گا۔''

اس نے جھک کر سنگی بینچ سے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ایک بار بھرپور نظروں سے شامیر کی طرف دیکھنا چاہتی ہے لیکن وہ نہیں دیکھ سکی۔ ایکدم پلیٹ فارم کی طرف مڑ گئی۔

شامیر بے ساختہ دو یا تین قدم اس کے پیچھے گیا، پھر سکتہ زدہ سا رک گیا۔ ان لمحوں میں جیسے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کرے۔ ٹرین کو بھی عین اسی وقت آنا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ زویا جا رہی تھی۔ شامیر کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اب انا آڑے آرہی تھی۔ اسی دوران میں وہ دروازے میں داخل ہوگئی اور آٹومیٹک دروازے نے اسے شامیر کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

☆☆☆

جوں جوں جانے کا وقت قریب آرہا تھا، شامیر کی بے قراری اور تڑپ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یوں اپنا سب کچھ کھو کر وہ کس طرح واپس جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی ''انا'' کو زیر کیا اور ایک بار پھر زویا سے ٹیلی فونک رابطے کی کوشش کی۔ شروع میں ایک دو مرتبہ بیل گئی، مگر پھر فون مستقل طور پر آف ہوگیا۔ یہ بڑا سنگین اشارہ تھا۔ وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ رات کا بیشتر حصہ شامیر نے جاگتے اور سوچتے ہوئے گزارا۔ لاہور سے امو خالہ کی کال بھی آئی مگر شامیر نے زویا کے حوالے سے انہیں گول مول جواب ہی دیے۔ دوسرے روز اس نے فون پر جین سے رابطہ کیا۔ وہ ایک طرح سے اس کی رازدار کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

''پلیز جین! زویا سے کہو کہ وہ بس ایک آخری دفعہ مجھ سے فون پر بات کر لے۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے برادر! میں کوشش کرتی ہوں۔'' جین نے بجھے ہوئے سے انداز میں کہا۔

''لیکن میں کل واپس جا رہا ہوں جین! صبح گیارہ بجے میری فلائٹ ہے۔''

''اوکے۔ میں ابھی اس سے بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔''

شامیر کو تھوڑی بہت شاپنگ کرنا تھی۔ وہ بازار چلا گیا اور ساتھ ساتھ جین کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اس کی کال آئی۔ اس نے کہا کہ زویا کا فون بند جا رہا ہے۔ ہاں، اس کی ایک فرینڈ نے بتایا ہے کہ وہ اور خشامہ ویک اینڈ پر قریبی قصبے کوزے وان گئی ہیں۔ شاید انہوں نے رات وہیں رہنا ہے۔ ان کی واپسی کل دوپہر تک ہوگی۔

''پلیز جین! کسی بھی طرح اس سے کونٹیکٹ کرو۔ اس تک میرا پیغام پہنچاؤ۔''

''میں پوری کوشش کر رہی ہوں برادر۔ جیسے بھی بات ہوتی ہے..... اور جو بھی ہوتی ہے، میں تمہیں آگاہ کرتی ہوں۔''

شامیر پیکنگ کرتا رہا اور ساتھ ساتھ بے تابی سے جین کی کال کا انتظار بھی۔ تھک کر اس نے شام چھ بجے کے قریب پھر جین کا نمبر ملایا..... اس مرتبہ اس کے اندر جیسے ایک سرد اندھیرا سا اتر گیا۔ اب جین کا فون بھی بند جا رہا تھا۔

جو بھی صورتِ حال تھی، وہ سامنے دیوار پر لکھی نظر آرہی تھی۔ زویا اب اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

رات نو دس بجے تک کا وقت شامیر نے سخت بے قراری کے عالم میں گزارا۔ تب ایک بار پھر اپنے اندر انا کی دیوار کو ڈھایا اور جین سے ملنے اس کے فلیٹ کی طرف چل دیا۔ ٹیوب کے ذریعے دس منٹ کا فاصلہ طے کر کے وہ جین کے فلیٹ تک پہنچا۔ یہ وہی بلڈنگ تھی جس میں زویا کا فلیٹ بھی واقع تھا۔ وہی فلیٹ جس سے شامیر کی بہت سی یادیں نتھی ہوگئی تھیں۔

جین کا فون مسلسل بند تھا۔ وہ زینے طے کر کے فرسٹ فلور پر اس کے دروازے تک پہنچا۔ دھڑکتے دل سے اس نے کال بیل دی۔ اندر موجود روشنی اور آہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ فلیٹ خالی نہیں ہے۔ چار پانچ مرتبہ بیل دینے کے باوجود اندر خاموشی رہی۔ وہ ڈھیٹ بن کر کھڑا

رہا۔ آخر ایک سیاہ فام لڑکی باہر نکلی۔ اس نے ادھ کھلے دروازے سے شامیر کو آگاہ کیا کہ جین گھر میں نہیں ہے۔ اس کا لب ولہجہ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ شاید دروازے کے "پیپ ہول" سے شامیر کو دیکھا جا چکا تھا۔ وہ اس سے آگے اب نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا دل جیسے سو ٹکڑوں میں تقسیم تھا اور شیشے کی کرچیوں کی طرح سینے میں بکھرا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ فام لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ جھکے سر اور مرے مرے قدموں کے ساتھ وہ واپس پلٹ آیا۔

اور اگلے روز یہ منظر فرینکفرٹ کے بارونق ائرپورٹ کا تھا۔ چار پانچ ہفتے پہلے جب وہ اس ائرپورٹ پر اترا تھا تو اس کی زندگی کتنی مختلف تھی پھر سب کچھ کتنی تیز رفتاری سے بدلا۔ آج درد کی شدت سے اس کے دل کی رگیں ٹوٹ رہی تھیں۔ دکھ کا ایک ہالہ تھا جس کے بوجھ تلے اس کے جسم وجاں کچلے جا رہے تھے مگر آس تو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتی۔ معلوم نہیں کیوں اب بھی شامیر کی نگاہیں بار بار داخلی دروازوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ شاید وہ آ جائے..... شاید آخری وقت پر وہ اس کے بے پناہ کرب کو محسوس کر لے۔ اس کا حساس دل اس امر کو گوارا نہ کرے کہ شامیر یوں ٹوٹی پھوٹی حالت میں یہاں سے واپس جائے۔ نگاہیں ڈھونڈتی رہیں۔ جس کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آیا۔

منزلوں پہ آ کے لٹتے ہیں دلوں کے کارواں
کشتیاں ساحل پہ اکثر ڈوبتی ہیں پیار کی

شامیر کی آنکھیں خشک تھیں مگر سینے میں جیسے آنسوؤں کا آبشار گر رہا تھا۔ وہ اپنی سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا ائرپورٹ کی اندرونی حدود میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

شامیر کو جرمنی سے واپس پاکستان آئے دس بارہ روز ہو چکے تھے۔ وہ بہت اداس تھا۔ اس کی اموخالہ اس کی اداسی کی وجہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ وہ فرینکفرٹ سے ایک بڑا زخم لے کر لوٹا ہے لیکن اس میں کوئی کیا کر سکتا تھا؟ وہاں فرینکفرٹ میں شامیر اور زویا کا تعلق جتنی تیزی اور شدت سے پروان چڑھا تھا، اتنی ہی سرعت سے ختم بھی ہو گیا تھا۔ اس کا آغاز انوکھا تھا اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بھی انوکھا تھا۔

شامیر آج پہلے دن آفس گیا تھا۔ فارہ اسکول سے واپس آ چکی تھی اور ابھی تک اسکول یونیفارم میں تھی۔ ماں بیٹی مصروف گفتگو تھیں۔ فارہ بولی۔ "لیکن ماما! آپ نے بھی تو کوئی درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ نے بھی شامیر بھائی سے صاف کہہ دیا کہ زویا کو شادی کے بعد یہاں آنا چاہیے۔ ایسا ضروری تو نہیں ہوتا نا کہ لڑکی شادی کے بعد ضرور ہی اپنا گھر بار چھوڑے۔"

اموخالہ نے شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "ایسا ضروری ہوتا ہے بیٹا! تب ہی لڑکی پچھلی زندگی کے دکھ سکھ بھول کر نئی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہوتی ہے اور پھر زویا تو یہاں سے سات سمندر پار بیٹھی تھی۔ وہ شامیر کو اپنے ساتھ لے جاتی تو پھر ہم اس کی صورت دیکھنے کو ترس جاتے۔ وہ اگر شامیر سے سچی محبت کرتی ہے تو پھر اسے کم از کم اتنی قربانی تو دینی ہی چاہیے تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اس کی محبت سچی نہیں تھی؟"

"ہو سکتا ہے سچی ہو لیکن سچے جذبے، ثبوت اور قربانی مانگتے ہیں اور یہ تو کوئی ایسی بڑی قربانی بھی نہیں ہے۔ اسے شامیر کی بات مان لینی چاہیے تھی۔"

"کیا شامیر بھائی پھر اسے منانے کی کوشش کریں گے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ شامیر کی بھی ایک آن ہے، ایک انا ہے اور اس انا کو بری طرح ٹھیس پہنچی ہے۔ زویا کا رویہ بڑا سخت ہے۔ اگر وہ اب [illegible] طرح ہے تو پھر شادی کے بعد اس سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر کام میں اللہ کی کوئی بہتری ہوتی ہے۔" اموخالہ نے طویل سانس لی۔

"لیکن ماما! شامیر بھائی کب تک یوں اداس پھریں گے۔" فارہ ٹھنک کر بولی۔ "نہ خود کہیں باہر نکلتے ہیں، نہ ہمیں لے کر جاتے ہیں۔ نہ ہنستے بولتے ہیں۔ ایک دم بور کر دیا ہے انہوں نے۔"

"تو تم اسے بور نہ کرنے دو۔ آج شام گھر آئے تو اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ کہو کہ گھمانے کے لیے لے جائے تمہیں۔ بلکہ میں بھی چلی جاؤں گی۔ ذرا تفریح ہو جائے گی اور اس کا دل بھی بہل جائے گا۔"

شام کو شامیر گھر آیا تو فارہ واقعی اس کے درپے ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "شامیر بھائی! آج تو ہر صورت آپ کو جانا ہوگا۔ یوں لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ آئس کریم کھائے پورے ایک ہزار سال ہو گئے ہیں۔ شاید فرعون کے دور میں ہم آخری بار اکٹھے گئے تھے۔"

شامیر زبردستی مسکرایا..... تم غلط کہہ رہی ہو۔ فرعون کے دور کو زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ یہ ہزار سال تو کل کی بات ہے۔ میں ہر ہزار پانچ سو سال بعد تمہیں آئس کریم کھلانے نہیں لے جا سکتا۔"

''تو ٹھیک ہے۔ اگلے ڈھائی تین ہزار سال تک میں بھی آپ سے بات نہیں کروں گی۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم اپنے میٹرک کے امتحان کو بھی وقت کے اسی حساب کتاب کے ساتھ دیکھ رہی ہو۔ اس لیے یوں اڑتی پھرتی ہو۔ خدا کی بندی امتحان آنا فانا سر پر پہنچ جائے گا۔ کچھ کرلو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔''

اسی دوران میں امو خالہ بھی اندر داخل ہوگئیں۔ شامیر ان کا چہرہ دیکھ کر ہی ان کے دل کی بات جان جایا کرتا تھا۔ وہ بھی یہی چاہ رہی تھیں کہ شامیر آج کہیں گھومنے پھرنے نکلے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولا۔ ''امو! آپ بھی چلیں گی نا؟''

''میرا بیٹا کہہ رہا ہے تو ضرور چلوں گی۔'' وہ شامیر کے کندھے کو سہلا کر بولیں۔

☆☆☆

شامیر کو جرمنی سے واپس آئے اب تقریباً دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ ان دو ماہ کا ہر ہر پل اس نے جیسے ایک جانکاہ انتظار میں گزارا تھا۔ ہاں آسیں نوٹ کر بھی نہیں نوٹیں۔ اسے پتا تھا کہ زویا کے پاس... فون نمبر موجود ہے۔ اگر وہ چاہتی تو ایک پل میں اس سے رابطہ کرسکتی تھی مگر اس نے نہیں کیا تھا۔ اب ادھر شامیر بھی فیصلہ کرچکا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مزید نہیں گرائے گا۔ اس نے جیسے خود سے عہد کرلیا تھا کہ وہ خود زویا سے رابطہ نہیں کرے گا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا..... جس سے محبت ہو اسے کسی پرندے کی طرح آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر وہ واپس آئی ہمارے، ہمارے پاس پلٹ آئے گا۔ دوسری صورت میں یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ کبھی ہمارا تھا ہی نہیں۔

اسے زویا کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آتیں۔ اس کی ہنسی، اس کا چنچل پن، اس کی گفتگو کا انداز، اس کے گال کا گڑھا۔ اس کا، بلی کی چال چل کر عقب سے آنا اور شامیر کو اپنی بانہوں میں لے لینا۔ کسی وقت اسے بالکل یہی لگتا کہ ابھی قدموں کی مدھم چاپ سنائی دے گی۔ وہ عقب سے آکر اس کے ساتھ لگ جائے گی۔ اس کی گرم خوشبودار سانس اس کے کان سے ٹکرائے گی۔ وہ سرگوشی میں بولے گی اور اس کے نام کا حلیہ بگاڑ کر مخصوص انداز میں کہے گی۔ ''شومیر! تم نے کیا سمجھا تھا۔ تم اس طرح روٹھ کر چلے آؤ گے اور وہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا جو ہمارے درمیان اس ''حسین جولائی'' میں شروع ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے اتنی جلدی کیسے ختم ہوسکتا ہے شومیر۔''

تب اسے اس کی گلابی اردو یاد آتی اور اس اردو میں کہی اس کی دلنشین باتیں۔ آفس سے آکر شامیر اکثر خود کو کمرے میں بند کرلیتا۔ اپنا سیل فون سامنے رکھ کر دیر تک اس کی اسکرین کو گھورتا رہتا۔ ایک چھوٹے سے میسج کی صورت میں یا ایک کال میسوزک کی صورت میں یہ اسکرین اسے کتنی بڑی خوشی دے سکتی تھی۔ مگر اب اسکرین نے بھی جیسے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس کی نگاہوں کو کسی بھی خوش کن منظر سے محروم ہی رکھنا ہے۔ کسی وقت وہ سوچتا، کتنی عجیب بات ہے جن لوگوں کے بغیر کسی موقعے پر گھنٹے اور منٹ گزارنا مشکل ہوتا ہے، ان کے بغیر مہینے..... سال..... اور پھر پوری پوری زندگیاں گزارنا پڑ جاتی ہیں۔

امو خالہ اس کی حالت سے آگاہ تھیں..... اور اکثر کڑھتی رہتی تھیں لیکن اس معاملے میں وہ کیا کرسکتی تھیں۔ کوئی بھی کیا کرسکتا تھا؟ یہ رنج و الم کا ایک ایسا شکنجہ تھا جس سے صرف اور صرف زویا ہی اسے رہائی دلا سکتی تھی۔

انہی دنوں چینل کی دی ہوئی ایک اسٹوری پر کام کرنے کے لیے شامیر کو مری اور ایبٹ آباد وغیرہ جانا پڑا۔ یہاں بھی زویا کی یادوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ زویا نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی خوبصورتی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ فرینکفرٹ میں اس نے دو تین بار ان علاقوں کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ان خوبصورت جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہے۔

وہ بولی تھی۔ ''شومیر! میرا دل چاہتا کہ ہم اور تم دونوں کسی برفانی فل وادی کے کنارے کھڑے ہوں۔ تم میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے پکارو..... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے شادی بنانا چاہتا ہوں..... پھر تمہاری آواز وادی میں گونجے۔''

شامیر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''پاکستان میں ایسی باتوں کو اتنی اونچی آواز میں نہیں کہا جاتا..... میں کہوں گا تو میری بات کے جواب میں دس پندرہ خان صاحبان ڈنڈے سوٹے لے کر آجائیں گے اور میری مرمت کر ڈالیں گے۔''

''میں کہوں گی کہ تم نے یہ بات میرے لیے کہی تھی۔''

''تب تو وہ اور ماریں گے۔ ان کے غصے میں تھوڑی بہت رقابت بھی شامل ہوجائے گی۔''

''یہ رقابت کیا ہوتا؟''

''یہ ہوتا نہیں..... ہوتی ہے۔ مثلاً اب دیکھو..... تم نے گلے میں یہ گولڈ کی جو چھوٹی سی چین پہن رکھی ہے۔

مجھے اس سے بڑی رقابت محسوس ہو رہی ہے۔ اس پر غصہ آرہا ہے۔"

"غصہ آرہا ہے؟ وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ تمہارے بہت قریب ہے۔ اسی کو رقابت کہتے ہیں۔"

اس کے چہرے کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے شامیر کے بازو پر چٹکی کاٹی تھی، پھر دفعتاً موضوع بدلتے ہوئے بولی تھی۔ "میں نے سنا تھا کہ وہاں نتھیا گلی میں ایک بڑا ماؤنٹین ہے۔ اسے دور سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بیوٹی فل لڑکی لیٹ کر آسمان کو دیکھ رہا ہے۔"

"وہ پہاڑی نتھیا گلی میں نہیں کہیں بلوچستان میں ہے۔ شاید کوئٹہ کے آس پاس اور یہ بات پرانے دور میں کسی بیوقوف، نکمے انگریز نے کہی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جنہیں بادلوں میں، پہاڑوں میں اور قدرت کے دیگر مظاہر میں بس عورت ہی نظر آتی ہے۔ عرف عام میں یعنی عام زبان میں ایسے لوگوں کو "ٹھرکی" کہا جاتا ہے۔"

"ٹھر..... کی۔ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"اب تمہارے ساتھ چلوں گا تو ایک ڈکشنری ساتھ لے لیا کروں گا۔"

"پھر بھی بتاؤ نا۔ پلیز..... کیا یہ ٹھرکے کی کوئی قسم ہوتی؟"

شامیر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ "سمجھو کہ کسی عورت سے پیار کرنے والے کو یا اس کے پیار کی تلاش میں رہنے والے کو ٹھرکی کہتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد تب شامیر کو ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا جب زویا نے اپنے نانا کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بڑھاپے میں بھی اپنی بیوی سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے بلکہ سمجھو کہ..... وہ بھی ٹھرکی ہی تھے۔

شامیر کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے زویا کی ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آتی رہتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے پرلطف، معصوم جملے۔ وہ ایوبیہ سے واپس لاہور پہنچا تو نیو ایئر کی آمد آمد تھی۔ پتا نہیں کیوں ایک نئی طرح کی آس نے اس کے دل میں جگہ بنانا شروع کر دی۔ عین ممکن تھا کہ نئے سال کے اہم موقعے پر ہی وہ اسے کوئی میسج بھیج دیتی یا کسی طرح گڈ وشز کا اظہار کر دیتی۔ نیو ایئر کے موقع پر وہ دیوانوں کی طرح سارا دن اپنے سیل فون کی طرف متوجہ رہا تھا۔ بہت سے پیغامات آئے لیکن وہ نہیں آیا جس کا اسے انتظار تھا۔ شام کے بعد اسے لگا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے تڑپنے لگا..... یہ کیسی سزا تھی؟ یہ کیسا کڑا امتحان تھا؟ اس کے اندر بے پناہ مایوسی پھیلنے لگی۔ یہ مایوسی اب اس کی مستقل ساتھی تھی۔ مگر یہ مایوسی اکیلی نہیں تھی، اس کے اندر ایک طرح کا رنج و غم بھی تھا..... اور یہ رنج و غم شامیر کے اندر انا کی دیوار کو بلند کرتا جا رہا تھا..... ٹھیک ہے وہ رابطہ نہیں کرے گی تو میں بھی نہیں کروں گا۔ چاہے ساری زندگی اسی طرح گزر جائے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا..... گھڑی کی سوئیاں حرکت میں رہیں۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے..... تہوار آتے رہے اور جاتے رہے۔ کبھی بہار کا تعاقب گرمیوں نے کیا اور کبھی گلابی سردیوں نے غم کے ماروں کو طویل راتوں کے حوالے کیا۔ کبھی کبھی تو شامیر کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ جی نہیں رہا ایک کڑی سزا بھگت رہا ہے۔ محبت کی غلطی کی پاداش میں ایک بے رحم حاکم نے اسے تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر ننگے پاؤں کھڑا کر دیا ہے۔ اس کے تلوے جھلس رہے ہیں۔ وہ کبھی ایک پاؤں اٹھاتا ہے کبھی دوسرا لیکن یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس سزا سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس اذیت سے اسے صرف اور صرف ایک شخص ہی رہائی دلا سکتا ہے..... اور یہ وہی ہے جس نے یہ سزا تجویز کی ہے۔ کچھ گم گشتہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے.....

کسی وقت رات کو سوتے میں سچ مچ شامیر کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ یکایک جاگ جاتا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوتا۔ وہ لمبے سانس لیتا اور دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ موسم کی پروا کیے بغیر وہ گھر کی چھت پر چلا جاتا۔ وہ ہوا کو اپنے اندر کھینچنے کی کوشش کرتا۔ چھت پر سے اسے دور تک شہر لاہور کی جھلملاتی روشنیاں نظر آتیں۔ ان روشنیوں کے سلسلے مغربی افق تک چلے جاتے۔ وہ مغربی افق کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ ہاں یہی سمت تھی جہاں وہ آباد تھی، جہاں وہ سانس لیتی تھی، ہنستی بولتی تھی۔ شامیر کو ایک کڑی سزا دینے کے بعد وہ اس سزا کو برخاست کرنا بھول گئی تھی، اس کا دم گھٹتا تھا۔

اسی طرح اس جان لیوا گھٹن میں سانس لیتے ہوئے کبھی اپنے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ پر اور کبھی دوسری پر منتقل کرتے ہوئے..... اسی طرح اپنے سیل فون کی بے مہر

اسکرین کو دیکھتے ہوئے..... شامیر نے پورے چار سال گزار دیے۔

☆☆☆

عیدالفطر کا موقع تھا۔ ہر طرف خوشی کی ایک لہری پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ عید کی نماز پڑھ کر شامیر گھر واپس آیا تو اموخالہ نے اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما اور ہمیشہ کی طرح سو روپے کا ایک سرخ نوٹ اسے عیدی میں دیا۔ اموخالہ کو سو کے اس نوٹ تک شامیر نے ہی محدود کر رکھا تھا۔ اموخالہ سے یہ سرخ نوٹ وہ بچپن سے وصول کرتا آیا تھا اور اب بھی وہ یہ "سو" ہی وصول کرنا چاہتا تھا۔ اپنی سنہری یادوں کو اس طرح سنبھال کر رکھنا شامیر کی پرانی خو تھی۔

شامیر کو عیدی دے کر اموکچن کی طرف چلی گئیں جہاں سے فرنی کی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شامیر اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ادھ کھلے دروازے سے اس کی نگاہ فارہ پر پڑی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی سونے کی ایک زنجیر سے الجھ رہی تھی..... فارہ کی عمر اب سترہ سال تھی۔ وہ فرسٹ ایئر سے سیکنڈ ایئر میں جانے والی تھی..... اس نے اچھا قد کاٹھ نکالا تھا۔ آئینے میں ہی اس نے شامیر کو دیکھا اور زور سے ہانک لگائی۔ "ادھر آئیں پلیز۔ میری تھوڑی سی مدد کریں۔"

شامیر اس کے پاس چلا گیا، وہ جس چیز سے الجھ رہی تھی وہ اس کا لاکٹ تھا۔ اس کا کلپ اس سے بند نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شامیر کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "پلیز! ذرا اس کا کلپ بند کر دیں۔"

"یہ اپنے بے ہودہ بالوں کو تو گردن سے ہٹاؤ۔" شامیر نے کہا۔

وہ اس کی طرف رخ پھیرے بغیر بولی۔ "آپ انہیں بے ہودہ کہتے ہیں اور سارے کالج میں ان کی تعریف ہوتی ہے..... خیر چھوڑیں اس بات کو بحث لمبی ہو جائے گی۔ آپ بس ذرا یہ کلپ بند فرما دیجیے۔"

اس نے اپنے گھنے بالوں کو سمیٹ کر آگے کی طرف پھینک دیا، تھوڑی سی کوشش کے ساتھ وہ زنجیر کا کنکا بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سنہری زنجیر فارہ کے سینے پر چمک رہی تھی۔ یہ منظر ایک دم شامیر کو ماضی میں لے گیا۔ اسے وہ رقابت والی بات یاد آ گئی جو کبھی زویا سے کہی تھی۔ زویا نے رقابت کا مطلب پوچھا تھا اور شامیر نے کہا تھا۔ "اب اس جین کی مثال ہی لے لو۔ مجھے اس سے رقابت محسوس ہو رہی ہے۔"

"وہ کیوں؟" زویا نے بھولپن سے دریافت کیا تھا۔

"اس لیے کہ یہ سنہری چین تمہارے بہت قریب ہے....."

ایک دم فارہ کی آواز نے شامیر کو خیال سے چونکایا۔ "کہاں کھو گئے جناب؟" اس نے پوچھا۔

"کک..... کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔" وہ گڑبڑا سا گیا۔

فارہ بولی۔ "آج عید کا روز ہے جی..... کم از کم آج تو نارمل نظر آئیں۔"

"تو کیا میں ایب نارمل ہوں؟"

"نہیں..... لیکن کبھی کبھی لگنے لگتے ہیں..... بات کرتے کرتے کہیں کھو جاتے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں چلتا ہوگا لیکن دیکھنے والے کو تو پتا چل جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ شامیر جواب میں کچھ کہتا، کمرے میں رکھے اس کے سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ یہ اس کے دوست فہد کی کال تھی۔ وہ اسے ریسیو کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسی دوران میں اموفرنی کی پلیٹ لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ "کہاں چلا گیا؟" انہوں نے فارہ سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں گئے ہیں، کوئی کال سن رہے ہیں۔"

اموں نے عید کے سوٹ میں ملبوس خوبرو فارہ کو تعریفی نظروں سے دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ "شامی کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ تو کچھ نہیں کہہ رہے تھے، میں ہی کہہ رہی تھی۔ اتنا عرصہ گزر گیا پھر بھی، اس اسٹوپڈ لڑکی کو بھولے نہیں ہیں۔ بات کرتے کرتے، اچانک کہیں کھو جاتے ہیں، پتا نہیں کہ یہ اداسی کب ان کا پیچھا چھوڑے گی۔"

"پہلے سے بہت بہتر ہو چکا ہے فارہ..... وقت سے بہتر مرہم کوئی نہیں ہوتا اور یہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ ہم نے پوری کرنی ہے۔ خاص طور سے تم اس میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہو..... اس سے ہنسا بولا کرو۔ کہیں تفریح وغیرہ کا کوئی پروگرام بنا لیا کرو....."

فارہ چہکی۔ "ہاں..... تفریح سے یاد آیا، آپ نے کہا تھا کہ عید کے دوسرے روز کہیں سیر کو نکل جائیں گے۔ مری کی طرف۔"

"تو بھئی بنا لو نا... پروگرام۔ روکا کس نے ہے۔

یہاں بھی شہر میں کون سے رشتے دار بھرے پڑے ہیں جن سے ملنا ملانا ہے۔'' اموخالہ نے کہا اور ایک بار پھر تعریفی نظروں سے فارہ کو دیکھا۔

☆☆☆

سخت گرمی ہو اور عید بھی ہو تو سری میں میلا سا لگ جاتا ہے شامیر، فارہ اور اموخالہ کشمیر پوائنٹ کی طرف ایک چھوٹے سے خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ یہ گیسٹ ہاؤس اس چینل ہی کی ملکیت تھا جس میں شامیر کام کر رہا تھا۔ رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے وہ تھکا ہوا تھا اور صبح دس بجے کے باوجود سو رہا تھا۔ اسے جگانے کے لیے فارہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ کبھی اس کی ناک میں تنکا گھماتی، کبھی اس کے کان میں گدگدی کرتی، وہ غنودگی میں بڑبڑایا۔ ''فارہ کی بچی، سونے دے مجھے۔ بس ایک گھنٹا اور۔''

''ایک منٹ بھی اور نہیں۔ ہم یہاں سونے کے لیے نہیں آئے۔ دیکھیں باہر موسم کتنا پیارا ہے۔ دسمبر جیسی میٹھی میٹھی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔'' اس نے پھر شامیر کے ایک کان میں تنکا گھمایا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ وارننگ دینے والے لہجے میں بولی۔ ''اب بھی آپ نہیں اٹھے نا۔ تو میں آپ پر ٹھنڈے پانی کا جگ انڈیل دوں گی۔''

شامیر پڑا رہا۔ اسے معلوم تھا وہ صرف دھمکی دے رہی ہے لیکن جب یکا یک اسے اپنے چہرے اور سینے پر ایک سیال خنکی کا احساس ہوا تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ بیوقوف نے واقعی جگ اس پر الٹ دیا ہے۔ وہ بھنا کر اٹھا۔ وہ دروازے پر کھڑی ''کھی کھی'' کر رہی تھی۔ شامیر کچھ دیر تک تو حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہا پھر اسے واقعی غصہ آ گیا۔ قریب ہی درمیانے سائز کا واٹر کولر پڑا ہوا تھا۔ یہ آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ شامیر نے واٹر کولر اٹھایا اور اس کے پیچھے لپکا۔ وہ بھاگ کر اموکے کمرے کی طرف گئی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ پکاری ''ماما! بچاؤ..... بچاؤ۔''

شامیر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ باہر گراسی لان کی طرف لپکی۔ شامیر نے اسے گلاب اور ٹیولپ کے پودوں کے قریب دبوچ لیا اور کولر میں بھرا ہوا، چشمے کا پانی اس پر الٹ دیا۔ وہ دو سیکنڈ میں سر تا پا بھیگ گئی۔ کولر میں کچھ پانی ابھی باقی تھا۔ وہ زور لگانے لگی کہ باقی پانی شامیر پر الٹے۔ مگر شامیر نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس دھینگا مشتی کے دوران میں اچانک..... شامیر کو احساس ہوا کہ وہ اب کوئی بچی نہیں رہی۔ ایک بھرپور جوان لڑکی ہے۔ اس نے یکلخت اسے چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھ اس سے ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گرمیوں کے مہین لباس میں تھی، اس کے مکمل طور پر بھیگے سراپا نے شامیر کو نگاہیں پھیرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران میں اموخالہ بھی کمرے سے نکل آئیں۔ واٹر کولر اب فارہ کے ہاتھ میں تھا۔ شاید وہ بچا کھچا پانی شامیر پر الٹ دیتی مگر والدہ کو دیکھ کر رک گئی، پھر تکرار شروع ہو گئی۔ وہی تو، تو میں، میں..... پہل کس نے کی۔ زیادتی کس کی طرف سے ہوئی..... وغیرہ وغیرہ۔ اموخالہ پیار سے ان دونوں کو دیکھتی رہیں..... اور گاہے بگاہے فارہ کو تھوڑی بہت ڈانٹ بھی پلاتی رہیں۔

''بچوں جیسی حرکتیں چھوڑ دو فارہ! اب بڑی ہو گئی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''میں تو کہتا ہوں اموکہ اس کی شادی کر دیں..... کام نبٹائیں اس کا۔''

''مجھے شادی وادی کا کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ پہلے آپ کی شادی ہونی ہے پھر میری ہونی ہے اور آپ جناب کے ہاتھ پیلے ہونے کے ابھی دور دور تک کوئی آثار نہیں ہیں۔'' فارہ نے شامیر پر چوٹ کی۔

اگلے روز جاگنگ ٹریک پر جانے کا پروگرام تھا۔ اموخالہ نے بھی مقدور بھر شرکت کرنا تھی مگر عین موقع پر انہوں نے طبیعت کی کسلمندی کا کہہ کر صاف انکار کر دیا۔ شامیر کو فارہ کے ساتھ اکیلے جانا پڑا۔ وہ دونوں صبح نو بجے کے لگ بھگ نکل گئے۔ گھنے جنگل نما علاقے سے گزرتا ہوا یہ بڑا شاندار ٹریک تھا۔ یہ سوموار کا روز تھا شاید اسی وجہ سے ٹریک پر اکا دکا لوگ ہی نظر آتے تھے۔ وہ تصویریں اتارتے اور باتیں کرتے کافی آگے نکل گئے۔ انہوں نے وہیں پر لنچ بھی کیا اور لنچ کے فوراً بعد واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ فارہ ہمیشہ کی طرح چہک رہی تھی اور شامیر اس کی چہکاروں کا حتی المقدور جواب دے رہا تھا۔ وہ آدھے راستے میں تھے جب ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا۔ درخت کے ایک گرے ہوئے تنے کو فارہ نے پھلانگ کر گزرنے کی کوشش کی اور اس کا پاؤں بری طرح مڑ گیا۔ وہ بلند آواز میں کراہ کر رہ گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ شامیر نے جلدی سے اس کا جوگر اتارا۔ ٹخنے کے قریب سوزش نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہ موچ کی نشانی تھی۔ ''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ شامیر کے شانے سے

سر رگڑتے ہوئے بولی۔

''اٹھو اور آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کرو۔ پاؤں گرم رہے گا تو زیادہ پین نہیں ہوگا۔'' شامیر نے اس کے پاؤں پر اپنا مفلر باندھتے ہوئے کہا۔

وہ پہلے تو انکار کرتی رہی پھر شامیر کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامیر اسے آہستہ آہستہ چلاتا رہا۔ ٹریک پر درمیانی عمر کا صرف ایک جوڑا نظر آرہا تھا..... دونوں شاید میاں بیوی تھے۔ مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد فارہ پھر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ''مجھ سے نہیں چلا جاتا۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ ''آپ فون کرکے کوئی جیپ وغیرہ منگوالیں۔''

''جیپ یہاں نہیں آسکے گی بھئی۔''

''گھوڑا تو آسکتا ہے؟''

''گھوڑوں والوں کے پاس موبائل فون کہاں ہوتے ہیں اور اگر ہوں بھی تو میں ان سے کیسے رابطہ کروں..... چلو..... اٹھو شاباش..... ہمت کرو۔ تھوڑا سا چلو گی تو پاؤں رواں ہوجائے گا۔ کچھ آگے جاکر شاید کسی گاڑی کا انتظام بھی ہوجائے۔''

''نہیں اب نہیں چلا جاتا۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔

''دیکھو سائے لمبے ہورہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ راستے میں ہی شام ہوجائے چلو اٹھو جاؤ۔''

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ شامیر نے گہری سانس لے کر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر جھک کر اسے گود میں اٹھالیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا..... اپنا ایک جوگر اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا دایاں بازو شامیر کے کندھے پر رکھ دیا اور اپنا سر اس کے سینے پر ڈال دیا۔ وہ اسے اسی طرح اٹھائے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ وہ اس کے ساتھ جیسے پیوست سی ہوگئی تھی۔ پھر شامیر کو اپنے کھلے ہوئے گریبان کے قریب اس کے سانسوں کی حرارت محسوس ہوئی۔ اس کی ناک شامیر کے سینے کے بالوں سے رگڑ کھا رہی تھی۔ وہ جیسے کہیں گم سی ہوگئی تھی۔ اس کا انداز ٹھکا دینے والا تھا۔ ان لمحوں میں وہ شاید اپنی تکلیف کو بھی بھول گئی تھی۔

فارہ کے رویے میں کئی تبدیلیاں تو وہ پچھلے تقریباً ایک سال سے محسوس کررہا تھا۔ مثلاً وہ خود کو گھر میں کافی سنوار کر رکھتی تھی۔ اس نے اسے بھائی جان کہنا بھی بتدریج ختم کردیا تھا۔ ایک خاص قسم کی شوخی اس کے لہجے میں جھلک دکھانے لگی تھی..... مگر اس وقت جو کچھ شامیر نے محسوس کیا تھا وہ کافی واضح بلکہ واشگاف تھا۔

''فارہ! میرا خیال ہے تم کوشش کرو تو چل سکو گی۔''

اس نے اس کے سینے میں سر چھپائے چھپائے نفی میں ہلادیا۔

وہ بولا۔ ''میں تھک گیا ہوں بھئی اور نہیں چلا جارہا۔''

اس نے اسے زبردستی نیچے گھاس پر اتار دیا۔

فارہ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے مفلر کھول کر دیکھا۔ پاؤں کی سوزش کچھ بڑھ گئی تھی۔ شامیر کی گود سے اترنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ''اُف..... ہائے'' کی گردان شروع کردی۔ کچھ دیر سانس لینے کے بعد شامیر نے اسے پھر اٹھالیا۔ اس بار وہ زیادہ بے تکلفی اور سہولت کے ساتھ شامیر کے سینے سے پیوست ہوگئی۔

شامیر کے اندر ایک عجیب سی بے چین کردینے والی کھلبلی تھی، درحقیقت رویا کی جدائی نے اس کی زندگی کی کتاب میں سے رومانس والا صفحہ ہی پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ فارہ تو دور کی بات ہے۔ اس نے پچھلے تین چار برسوں میں کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ فارہ اور اس کی عمر میں تقریباً دس سال کا فرق تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اسے بڑے بھائی کا درجہ دیتی تھی لیکن اب لگتا تھا کہ اس کی سوچیں کسی اور سانچے میں ڈھل گئی ہیں۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا اموناکہ کو اس انہونی تبدیلی کا علم ہوا تو ان کا ردعمل کیا ہوگا؟ اسے کیا علم تھا کہ اس کی پیاری اموخالہ کو اس تبدیلی کا علم ہے۔ نہ صرف علم ہے بلکہ یہ سب کچھ ان کے ایما پر ہی ہورہا ہے..... اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ لوگ مری سے واپس لاہور آچکے تھے۔ شامیر دفتر گیا ہوا تھا۔ فارہ ابھی کالج سے لوٹی نہیں تھی۔ اموخالہ مضطرب سی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ابھی ابھی راولپنڈی سے ان کی بڑی بیٹی شائلہ کا فون آیا تھا۔ وہ اپنے سسرال میں خوش نہیں تھی۔ شادی کو تین سال ہوچکے تھے۔ ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود وہ ابھی تک سسرال میں قدم نہیں جما سکی تھی۔ شوہر ذیشان کے ساتھ اکثر اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ ایک دوبار اس نے شائلہ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ اب بھی ایک ایسے ہی جھگڑے کی خبر شائلہ نے بذریعہ فون ماں کو سنائی تھی۔ اموخالہ سسرال میں شائلہ کی پریشانی کی خبر جب بھی سنتی تھیں انہیں شائلہ کے شوہر سے زیادہ غصہ اس شخص پر آتا تھا جس کے سبب شائلہ کو اس گھر میں جانا پڑا تھا اور وہ شخص

کون تھا؟ وہ شامیر کا والد کمال احمد تھا۔ اموخالہ کی شدید خواہش رہی تھی کہ اس کی بڑی بیٹی شائلہ کی شادی شامیر سے ہوجائے لیکن کمال احمد اس شادی کے راستے میں اس طرح دیوار بنا تھا کہ وہ سب سر پھوڑ کر رہ گئے تھے۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ شائلہ، شامیر سے کم پڑھی لکھی ہے اور قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی ان دونوں کا جوڑ نہیں بنتا۔ شائلہ کا قد قدرے چھوٹا تھا اور شامیر چھ فٹ سے ایک دو سینٹی میٹر زیادہ ہی تھا۔ بہرحال اموخالہ جانتی تھیں کہ یہ سب ڈھکوسلے ہی تھے۔ کمال احمد نے اس کی بیٹی نہیں لینی تھی اور اس نے نہیں لی تھی۔ اموکی بہن یعنی شامیر کی ماں آسیہ نے بھی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام ہوئی تھی۔ اب کمال احمد اور آسیہ دونوں اس دنیا میں نہیں تھے۔ شائلہ کی شادی ہوئے بھی پانچ سال ہوچکے تھے لیکن اموخالہ ثمینہ کے دل میں جو گرہ لگ چکی تھی وہ کسی صورت کھلنے میں نہیں آتی تھی۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ شامیر کو اپنا داماد بنا کر رہیں گی۔ فارہ اور شامیر کی عمروں میں نو دس سال کا فرق تھا، یہ اس سے بہت زیادہ بھی ہوتا تو وہ اپنے ارادے سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے شامیر کو ہمیشہ محبت کی نظر سے دیکھا تھا اور یہ محبت ایک بھانجے کے لیے نہیں، ایک داماد کے لیے تھی۔ اگر وہ ان کا داماد نہیں تھا تو پھر کچھ بھی نہیں تھا۔

شاید وہ ایک بار پھر چھ سات سال پہلے کی ان تلخ یادوں میں کھو جاتیں جب ابھی کمال احمد اور آسیہ زندہ تھے اور شائلہ اور شامیر کی شادی کی بات چلی تھی..... مگر اس دوران میں ڈور بیل ہوئی۔ اموخالہ نے دروازہ کھولا۔ فارہ کالج سے لوٹ آئی تھی۔ حدت سے اس کا رنگ شہابی ہو رہا تھا۔ اموں نے اس کا ماتھا چوما اور بولیں۔ ”وین سے اتر کر تمہیں آدھا کلومیٹر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ گرمی بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ میں شامیر سے کہوں گی کہ واپسی پر وہ تمہیں چھوڑ دیا کرے۔ تب اس کا بھی تو لنچ ٹائم ہوتا ہے۔“

”اتنی آسانی سے نہیں مانیں گے وہ۔ سو عذر پیش کریں گے۔“ وہ اپنا شولڈر بیگ ایک طرف پھینکتے ہوئے بولی۔

”میری بات نہیں ٹالتا وہ..... اور نہ کبھی ٹالے گا۔ بس تم خوامخواہ اس سے چونچ نہ لڑایا کرو۔ زیادہ بحث کئی دفعہ مرد کو ہتھے سے اکھاڑ دیتی ہے۔“

فارہ منہ دبا کر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے آگے کو جھک گئی۔

”اب کس بات پر ہنسی چھوٹ رہی ہے۔“ اموں نے پوچھا۔

”چونچ لڑانے والی بات پر۔“ فارہ نے کہا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”بے شرم کہیں کی۔“ اموں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

کچھ دیر میں فارہ کچن میں سے پانی پی کر واپس آگئی۔ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”ویسے اموں! آپ ان کو کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھاتی جارہی ہیں۔ بہت نخرے دکھانے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے ان پر۔“

”وہ کیوں؟“

”اب دیکھیں نا..... اتنا لمبا ٹائم گزر گیا ہے وہ زویا والی بات کو..... پھر بھی اسے پوری طرح بھولے نہیں ہیں۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور یہ اب بھی بیٹھے بیٹھے گم ہوجاتے ہیں کہیں۔ میں ان کے چہرے پر سب کچھ لکھا ہوا پڑھ لیتی ہوں۔“

اموں نے کہا۔ ”پہلے سے بہت فرق پڑ گیا ہے فارہ..... جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ بھی وقت کے ساتھ نکل جائے گی۔ دیکھنا اس نے اتنا پیار کرنا ہے تجھ سے کہ تو حیران رہ جائے گی۔“

”مجھے تو نہیں لگتا..... وہ کیا مثال دیتے ہیں کسی جانور کی ٹیڑھی دم والی۔“ وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولی۔

”اچھا زیادہ زبان مت چلایا کرو۔ شام کو اس کے کپڑے استری کر دینا اور بڑے سلیقے سے ہینگروں میں لگا دینا۔ اسے کل شاید کراچی جانا ہے دو تین روز کے لیے۔“

کام کے ذکر پر فارہ نے تھوڑی سی ناک چڑھائی مگر کچھ بولی نہیں۔

☆☆☆

کراچی میں شامیر کو ہاکی کے ایک سابق کھلاڑی اور کوچ کا انٹرویو کرنا تھا۔ پورا ڈیڑھ دن تو بندے کو ڈھونڈنے میں ہی لگ گیا۔ بہرحال کام مکمل کرکے وہ اگلی رات ہی واپس آیا تھا اور... خود کو کافی تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بیڈ پر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چیف کے کرتا دھرتا عظمت صاحب کا فون آگیا۔

”جی سر!“ شامیر نے مستعد ہوکر کہا۔

”لو بھئی! تمہیں پھر جانا پڑے گا۔“

”کراچی؟“ اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”نہیں کراچی سے تھوڑا آگے.....“

”کراچی سے آگے تو پھر سمندر ہے جناب۔“ وہ ذرا بے تکلفی سے بولا۔

”سمندر سے بھی تھوڑا آگے..... تمہیں آسٹریا جانا

ہوگا۔ وہاں دیانا میں کچھ کام ہے۔''

''کام؟''

''ایک بڑے سرکاری افسر نے گورنمنٹ کے کھاتے سے اپنے برادر نسبتی کا علاج کروایا ہے وہاں۔ اس وی آئی پی علاج پر ڈیڑھ دو کروڑ روپیہ قومی خزانے سے خرچ ہوا ہے کافی ثبوت تو مل چکے ہیں، باقی تم موقع پر جا کر دیکھ لو۔ اچھی خاصی ''ایکسکلیوسو'' اسٹوری بن جائے گی۔''

آسٹریا کے نام پر شامیر یکا یک ٹھٹک سا گیا۔ ایک طویل عرصے بعد عظمت سلطان صاحب ایک بار پھر اسے یورپ بھیجنے کی بات کر رہے تھے..... وہی یورپ جہاں سے وہ ایک بہت گہرا زخم لے کر لوٹا تھا۔ وہ اب دوبارہ ادھر کا رخ کرنا نہیں چاہتا تھا، کسی صورت نہیں۔ اسے یوں لگا کہ اگر اس نے عظمت صاحب کی بات مان لی تو اس کا گہرا زخم بری طرح کریدا جائے گا اور بے تحاشا خون اگلنے لگے گا۔

''کس سوچ میں کھو گئے؟'' عظمت صاحب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کک..... کچھ نہیں سر! لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو..... لمبے سفر پر مجھے نہ ہی بھیجیں تو اچھا ہے۔ خالہ کی طبیعت بھی آج کل کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں ان کی دیکھ بھال مشکل ہو جائے گی اور.....''

''بھئی یہ کام تو تم ہی کو کرنا ہے۔'' عظمت صاحب نے ٹھہری ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سمجھیں۔ تم نے فوری روانہ نہیں ہونا۔ دو تین ہفتے کا ٹائم ابھی ہے ہمارے پاس۔ اس دوران میں انشاءاللہ تمہاری خالہ بہتر ہو جائیں گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا بھی تو اس کا حل میں نکال لوں گا۔''

اس بارے میں عظمت سلطان صاحب سے شامیر کی تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ کام عظمت صاحب بہرصورت اسی سے کرانا چاہتے ہیں۔ ایک اور بندہ تو اس کام کے لیے ان کے پاس موجود تھا مگر وہ شامیر پر ہی بھروسا کر رہے تھے۔ غالباً چار سال پہلے کی وہ رپورٹ بھی ان کے ذہن میں تھی جسے شامیر نے ہی جرمنی پہنچ کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ وہ ڈرامائی سچویشن بھی ان کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی جب شامیر نے ایک فوٹو گراف میں نظر آنے والے شیڈو سے ایک اہم سراغ تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ اکثر محافل میں شامیر کی خداداد صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

عظمت سلطان صاحب سے بات کرنے کے بعد وقتی طور پر شامیر کی نیند اڑ گئی۔ وہ بےقرار سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک درد تو پہلے ہی دل میں پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ اب ایک اور طرح کا میٹھا میٹھا درد بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس درد کا تعلق بھی اس بے وفا کے خیالوں سے ہی تھا۔ سنگدلی سی سنگدلی تھی کہ پچھلے چار سالوں میں اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، رابطہ کرنا اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننا کتنا آسان تھا مگر انا کی بلند و بالا دیوار نے اسے ناممکن بنا دیا تھا اور یہ دیوار شاید زویا کی طرف زیادہ بلند تھی۔ وہ کسی بند کمرے میں بیٹھ کر اپنے موبائل فون پر اسکائپ یا واٹس ایپ کا صرف ایک بٹن دبا کر اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اپنی انگلی کو بس ایک ذرا سی حرکت دے کر وہ درمیان میں حائل پہاڑوں، سمندروں اور ویرانوں کی طویل مسافتوں کو پھلانگ سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ عورت نے کوئی راہ نکالنی ہو تو ہزار مشکلات کے باوجود نکال لیتی ہے اور اگر نہ نکالنی ہو تو پھر ایک قدم کی مسافت بھی تا عمر طے نہیں کرتی۔

وہ کہاں ہوگی؟ کیا کرتی ہوگی؟ کیا سوچتی ہوگی؟ ایسے ان گنت سوال شامیر کے ذہن میں کلبلانے لگے۔

پتا نہیں کیوں، یہ اس کے دل کی گواہی تھی کہ ہے تو سارے ناتے ختم ہو چکے لیکن ناتے کا کوئی ایک تار کوئی دھاگا اب بھی باقی ہے۔ یہ نہیں ٹوٹا..... اور یہ نہیں ٹوٹے گا اور کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک تار..... یہ ایک دھاگا..... فولادی زنجیروں اور سخت ترین بندشوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ جس طرح اس مہین سے تار نے اس کی پوری ہستی کو لپیٹ رکھا ہے، اسی طرح زویا کی ہستی کو بھی لپیٹ رکھا ہوگا۔ معلوم نہیں کیوں شامیر کے اندر ایک وجدانی یقین سا تھا کہ زویا نے شادی نہیں کی ہوگی۔ اپنے اس یقین کی کوئی ظاہری وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر وہ اس یقین کو کسی بھی طرح رد نہیں کر پاتا تھا۔ پچھلے تقریباً چار سال اس نے زویا کے حوالے سے مکمل بے خبری میں ہی گزارے تھے۔ باس عظمت صاحب کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ چار سال پہلے شامیر کے جرمنی سے لوٹنے کے چند ہی ہفتوں بعد زویا نے چینل کی پارٹ ٹائم جاب چھوڑ دی تھی۔

یہ سب باتیں سوچتے سوچتے شامیر کو یوں لگا کہ اگر وہ پھر یورپ گیا تو شاید..... شاید خود کو جرمنی جانے سے باز نہ رکھ سکے اور اب وہ سبک سر ہو کر دوبارہ وہاں کا رخ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اس میں اپنے جذبے کی توہین و تحقیر محسوس

ہوتی تھی۔ اسے زویا سے ہمیشہ کی جدائی تو قبول تھی مگر محبت کا شرمسار ہونا گوارا نہیں تھا۔ اس نے سوچا وہ ایک بار پھر عظمت صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی جگہ کسی دوسرے کو یہ ٹاسک دے دیں۔

ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ جو ہونے واقعات شامیر کی زندگی میں آنے والے تھے انہیں ہر صورت آنا ہی آنا تھا۔ ہوا کا تیز رخ اس کی کشتی کے بادبانوں کو ایک ان چاہی لیکن جانی پہچانی سمت میں دھکیل رہا تھا اور کسی وقت اسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ صرف ہوا کی تندی ہی نہیں ہے..... جو اسے دھکیل رہی ہے بلکہ ایک ان دیکھی ڈور بھی ہے جو اسے کھینچ رہی ہے۔ شاید وہی بے نام سا ناتا جو سارے ناتے ٹوٹنے کے باوجود ابھی تک ٹوٹا نہیں۔ شاید وہی کچا دھاگا جس نے اب تک اپنا وجود برقرار رکھا ہوا ہے۔ جو کہنے کو تو کچا ہے لیکن کچا ہے نہیں۔ شامیر کی کوشش کے باوجود عظمت سلطان صاحب کا یہ اصرار برقرار رہا کہ رپورٹ کی تکمیل کے لیے [illegible] وہی جائے گا۔ انہوں نے صرف اتنی رعایت کی کہ اسے ایک دو ہفتے [illegible] دے دیے۔

شامیر عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس کو وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کیفیت میں شوق اور خوف، گریز اور چاہت، بیزاری اور طلب ایک ساتھ شامل تھے۔

☆☆☆

شامیر کو شملہ کی مرچ والا چکن کا قیمہ بہت پسند تھا۔ امو خالہ اس کی پسند و ناپسند کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ آج بھی انہوں نے یہی بنایا تھا۔ اکثر اوقات وہ کوئی ایسی ڈش خود ہی تیار کر لیتی تھیں اور بس فائنل ٹچ کے لیے فارہ کو بلا لیتی تھیں یوں وہ ڈش "فارہ کی پکائی ہوئی ڈش" بن جاتی تھی۔ اب بھی کوکنگ کے آخری مرحلے کے لیے وہ فارہ کو آواز دینے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ وہ خود ہی آ دھمکی۔

"امو! کچھ سنا آپ نے؟ آپ کے لاڈلے یورپ جا رہے ہیں اپنے کسی کام سے۔ مہینا ڈیڑھ مہینا وہاں رہیں گے۔"

"کب جانا ہے؟" امو نے چونک کر پوچھا۔

"اگلے مہینے..... آسٹریا جائیں گے۔ کوئی رپورٹ شپورٹ تیار کرنی ہے۔"

یکایک امو خالہ کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ آنکھوں میں پریشانی نظر آئی۔ "یہ آسٹریا کہاں ہے بھئی؟" انہوں نے چولہا بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی تو میں آپ کو بتانے آئی تھی۔" فارہ رازداری کے لہجے میں بولی۔ "یہ آسٹریا ہے بھی بالکل جرمنی کے پاس۔ ٹرین میں بیٹھو اور "ٹھک" سے جرمنی پہنچ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ..... آپ کے ان لاڈلے صاحب کا پرانا سوکھا ہوا عشق پھر سے ہرا ہو جائے اور یہ جا پہنچیں فرینکفرٹ۔"

امو خالہ چہرے پر تشویش لے کر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر بعد کہنے لگیں۔ "فارہ! ویسے تو شامی نے اب کبھی بھول کر بھی اس کا نام نہیں لیا۔ فون پر رابطے کرنے اب کتنے آسان ہیں لیکن پچھلے ساڑھے تین چار برسوں میں ان دونوں کے درمیان کبھی رابطہ بھی نہیں ہوا۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب وہ باسی کڑھی میں ابال دے گا..... اور اس کی طرف پلٹے گا۔"

"مگر امو اندیشہ تو اپنی جگہ موجود ہے نا...؟"

"ہاں وہ تو موجود ہے۔" انہوں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

ماں بیٹی کے درمیان اس "تشویشناک" موضوع پر دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی۔

اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ اگر ایک مہینے بعد واقعی شامیر کو آسٹریا جانا پڑتا ہے تو پھر فارہ اور امو بھی ساتھ جائیں گی۔ آسٹریا میں ویانا کے بالکل پاس ہی امو کی ایک کزن اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ انہوں نے کئی بار فارہ اور امو سے کہا تھا کہ وہ ان کے پاس آئیں۔ وقتاً فوقتاً اسکائپ پر بھی ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ گزرتے ہوئے کچھ پتا نہیں چلا تھا اور اب شامیر ایک بار پھر یورپ میں تھا۔ یورپ میں اس کی یہ آمد تقریباً چار سال بعد ہوئی تھی۔ وہ ویانا میں اترا تھا۔ سارے بھولے بسرے مناظر ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ امو خالہ اور فارہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ شامیر نے بہت کوشش کی تھی کہ ان دونوں کے ساتھ وہ یورپ کا سیاحتی ٹور پھر بھی لگا لے گا مگر پتا نہیں کیوں فارہ نے ضد پکڑ لی تھی۔ بہرحال اب وہ تینوں ہوٹل کے بجائے اس گھر میں قیام پذیر ہوئے تھے جہاں امو خالہ کی کزن اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں۔ ویانا کے پاس ہی یہ ایک "اسٹریٹ پولیشن" نامی قصبہ تھا۔

ویانا میں حسبِ عادت شامیر نے اپنا کام تیزی سے نمٹایا تھا..... آخری مرحلے میں اسے ایک بار سرحد پار کر کے جرمنی کے شہر "میونخ" میں بھی جانا پڑا۔ میونخ سے فرینکفرٹ کا فاصلہ بمشکل 300 کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔

اس کے باوجود اس نے فرینکفرٹ کی طرف رخ نہیں کیا اور جرمنی کے شہر ''میونخ'' میں اپنا کام نمٹا کر شام کو ہی بذریعہ ٹرین ویانا واپس آ گیا۔

بہرطور یہ بات وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ فرینکفرٹ جائے بغیر شاید رہ نہیں سکے گا۔ اس ''شہرِ محبت'' کے اتنا قریب آ کر وہ اسے دیکھے نہ، یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ نادیدہ ڈور کا کھچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس شہر کے در و دیوار اسے بلا رہے تھے..... اور وہ چہرہ بھی جو پچھلے کئی برسوں سے مکمل بے خبری کے اندھیرے میں گم تھا۔ ایک بے پناہ تجسس تھا اور ایک دکھ آمیز جستجو تھی جو ہر لمحے اس کے اندر شدید تر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ پتا نہیں کیوں اس کا یہ یقین بھی پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ وہ آج بھی اس سے پیار کرتی ہے، وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی.....

ایک سرمئی سی صبح کو شامیر کے قدم جیسے بے ساختہ مرکزی ریلوے اسٹیشن کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ اس کے پاس ''شینجین ویزا'' تھا۔ وہ آسٹریا سے جرمنی میں ایسے ہی داخل ہو سکتا تھا جیسے پاکستان میں ایک شہر سے دوسرے میں جایا جاتا ہے۔ وہ اموخالہ سے کچھ بھی چھپاتا نہیں تھا مگر اس خیال سے کہ وہ خوامخواہ پریشان نہ ہوں اس نے انہیں اور فارہ کو یہی بتایا تھا کہ وہ رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں ہی دوبارہ میونخ جا رہا ہے۔

شام چھ بجے کے قریب وہ پھر سے فرینکفرٹ میں تھا۔ ٹرین پر سوار وہ کامرس بینک کی اس 56 منزلہ عمارت کے پاس سے گزرا جس کی چھت پر ..... ایک اہم ترین لمحہ اس کی زندگی میں وارد ہوا تھا۔ وہ ہوا کے مقابل کھڑی تھی۔ اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے جھومتے بالوں کو باندھ رہی تھی..... اور شامیر پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی کو آج سے نہیں صدیوں سے جانتا ہے۔ اس کی محبت میں گرفتار ہے۔

ایک طویل سرد آہ شامیر کے سینے سے خارج ہوئی اور پھر قریباً چار برس بعد پہلی بار اس نے اپنے سیل فون پر زویا کا نمبر پریس کیا۔ کتنا آسان تھا یہ کام، کتنا مشکل ہو گیا تھا اور اب پھر..... آسان لگنے لگا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اگلے چند سیکنڈ میں زویا کی آواز سن سکتا۔ پھر ایک دم جیسے دھڑکنیں تھم گئیں۔ ایک دودھیا روشنی سی اس کے اندر بجھ گئی۔ آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''اس نمبر سے رابطہ ممکن نہیں ہے۔''

اتفاقاً اس دوسری لڑکی جین کا نمبر بھی شامیر کے فون میں محفوظ تھا جو زویا والی بلڈنگ میں ہی رہتی تھی اور ایک رات کے لیے اس نے زویا اور شامیر کے ساتھ زویا کے کمرے میں قیام کیا تھا۔ شامیر نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ دوسرا نمبر ٹرائی کیا..... مگر یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ یہ نمبر بھی اب کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ پچھلے برسوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے اس نے دونوں نمبرز پر کئی بار کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ اسی جانے پہچانے اسٹاپ پر اترا جہاں پچھلی آمد کے موقع پر زویا کے ساتھ اترا تھا۔ یہاں سے زویا کا فلیٹ قریباً ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ ڈرائی کلینر کی شاپ..... چھوٹا سا ترک ریستوران..... ایک میڈیکل اسٹور..... چھوٹے بڑے صاف ستھرے شوروم..... وہ اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھتا رہا..... اور پھر زینے طے کر کے زویا کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔

کال بیل پر جو شخص باہر آیا اسے شامیر نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ نیکر اور بنیان میں ملبوس اس ادھیڑ عمر ترک نے یہاں موجود کسی بھی زویا نامی لڑکی سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اور قدرے بے رخی سے دروازہ بند کر دیا۔ شامیر نے فرسٹ فلور پر ہی پندرہ بیس قدم کا فاصلہ طے کیا اور اس دوسرے فلیٹ پر پہنچا جہاں دراز قد جین ایک ساؤتھ افریقن لڑکی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ یہاں بھی ایک اجنبی نسوانی چہرے سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک جواں سال جرمن خاتون تھی اور انگلش روانی سے بولتی تھی۔ اس نے شامیر کی بات تحمل سے سنی اور جوابات بھی دیے۔

خلاصہ یہاں بھی وہی تھا..... پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اس بلڈنگ میں اب کوئی جین نہیں رہتی تھی اور نہ زویا۔ جرمن خاتون نے مزید مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم تفصیل سے جاننا چاہتے ہو تو پھر بلڈنگ کے اونر مسٹر فلیچر سے ملاقات کر لو۔ عین ممکن ہے کہ انہیں کچھ پتا ہو۔''

''مسٹر فلیچر کہاں ملیں گے؟'' شامیر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ آج کل گراؤنڈ فلور میں رہ رہے ہیں لیکن کسی کام سے آؤٹ آف سٹی ہیں۔ دو روز بعد ان سے ملاقات ہو سکے گی۔''

شامیر نے مسٹر فلیچر کا فون نمبر وغیرہ پوچھا مگر جواں

سال خاتون نے نمبر نہیں دیا یا پھر واقعی اسے معلوم نہیں تھا۔

شامیر نے اگلے دو روز اسی کوچے کی سیاحی میں گزارے۔ یہ سڑک، یہ عمارت اور اردگرد کا سارا علاقہ اس کے لیے جیسے ایک دلکش ''مونومینٹ'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس گردوپیش سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں کی ہوا، یہاں کی خوشبو، یہاں کے رنگ ڈھنگ..... سب کچھ جیسے شامیر کے حافظے پر نقش ہو چکا تھا۔ زویا یہاں نہیں تھی لیکن وہ ہر منظر میں نظر آرہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً زویا اور جین کے نمبروں پر کال بھی کر رہا تھا مگر جواب ایک ہی تھا..... رابطہ ممکن نہیں۔ انا کی دیوار تو یورپ میں داخل ہوتے ہی لرزہ براندام ہوگئی تھی۔ اب وہ گری تھی اور مزید گرتی چلی جارہی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا، وہ جو اس کی زندگی میں اہم ترین حیثیت اختیار کرچکی ہے..... کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟

وہ زویا کے فلیٹ کے قریب ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امو خالہ کا فون ہر پانچ چھ گھنٹے بعد آجاتا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ شامیر کا ابھی کتنا کام باقی ہے۔ وہ اس کی دوری پر بہت بے چین نظر آتی تھیں..... شامیر انہیں کی بے چینی کو ان کی محبت پر ہی محمول کرتا تھا۔

آخری کال کوئی ایک گھنٹا پہلے آئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''شامی! یہ فارہ بہت تنگ کر رہی ہے۔ پڑے پڑے بور ہوگئی ہے، اگر فرینکفرٹ میں اتنا ہی ٹائم لگنا تھا تو تم اس کو بھی ساتھ لے جاتے۔''

''امو! یہ بھاگ دوڑ کا کام ہے۔ میں اسے کہاں لیے لیے پھرتا۔ ذرا فارغ ہوجاؤں پھر ہم تینوں اکٹھے آئیں گے۔ انجوائے کریں گے۔''

''شامی! تم نے تو صرف میونخ کا نام لیا تھا۔ فرینکفرٹ جانے کا تو تم نے نہیں کہا تھا۔'' انہوں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

''بس امو! یہ انویسٹی گیشن کا کام ایسا ہی ہوتا ہے، ابھی شاید ایک دو شہروں کی خاک مزید چھاننا پڑے۔''

امو کے ساتھ گفتگو کا خاتمہ غیر تسلی بخش انداز میں ہی ہوا تھا۔ درحقیقت شامیر نے آج تک امو سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا، وہ اب بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا..... اس کا ارادہ تھا کہ اپنے دل کی ساری واردات سے امو کو آگاہ کردے گا اور انہیں بتادے گا کہ جس سے مجبور ہوکر وہ زویا..... کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔

شامیر کی معلومات کے مطابق مسٹر فلیچر کو رات نو بجے کے لگ بھگ فرینکفرٹ واپس پہنچنا تھا۔ ان کی آمد میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے اور شامیر بے چینی سے ان کا منتظر تھا لیکن اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے مسٹر فلیچر کے انتظار کو بے معنی کردیا۔

ہوٹل سے زویا کے فلیٹ کی جانب جاتے ہوئے شامیر ایک بغلی سڑک پر مڑا تو اچانک بے طرح ٹھٹک گیا۔ اس نے ایک لڑکی کو عقب سے دیکھا..... اور اسے یوں لگا جیسے وہ زویا کی لبنانی سہیلی خشامہ ہے۔ وہ سڑک کراس کر رہی تھی۔ شامیر بھاگ کر اس کی طرف جانا چاہتا تھا مگر پھر رک گیا۔ سڑک کراس کرنے کے بعد لڑکی کا رخ تھوڑا سا دائیں جانب ہوا تھا اور شامیر کا شبہ حقیقت میں بدل گیا تھا۔ وہ یقیناً خشامہ ہی تھی۔ اس نے بالوں کا رنگ ڈارک براؤن کرلیا تھا اور انہیں ڈیانا کٹ کی شکل دے دی تھی۔ باقی شکل صورت تقریباً وہی تھی۔ کندھے سے قیمتی شولڈر بیگ لٹکائے، منی اسکرٹ پہنے، اونچی ایڑی والے سینڈلز پر ٹھک ٹھک کرتی وہ ٹرین کے اسٹاپ کی طرف جارہی تھی۔

شامیر کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ چار سال پہلے شامیر کلین شیوڈ تھا مگر اب اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ بالوں اور لباس کا اسٹائل بھی مختلف تھا۔ اسے یقین تھا کہ خشامہ اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکے گی۔ خشامہ 12 نمبر ٹرین میں سوار ہوئی تو شامیر بھی سوار ہوگیا۔ اس کے سینے میں دل نے جیسے دھمال سا ڈالنا شروع کردیا تھا۔ اگر خشامہ نظر آگئی تھی تو پھر زویا کے ملنے کا قوی امکان بھی پیدا ہوگیا تھا۔

پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ فوراً خشامہ کے پاس پہنچ جائے لیکن پھر نہ جانے کیوں اس نے تھوڑا مزید انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ خشامہ بہت بنی ٹھنی ہوئی تھی، بار بار اپنی رسٹ واچ بھی دیکھ رہی تھی۔ جیسے مقررہ وقت پر کسی سے ملنے جارہی ہو۔ اس کے میک اپ اور لباس وغیرہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مالی حالت پہلے سے کافی اچھی ہے۔ چار یا پانچ اسٹاپ آگے جانے کے بعد وہ ٹرین سے اتر گئی، شامیر بھی اس کے ساتھ ہی اترا۔ وہ اترتے کے ساتھ ہی دائیں بائیں دیکھنے کے بعد تیزی سے ایک جانب بڑھ گئی۔ شامیر تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے گیا۔ اسٹاپ سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر ایک موٹا تازہ خوش پوش سفید فام اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ دونوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور ہٹا کٹا شخص بے

تکلفی سے خشامہ کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ خشامہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھ دیا تھا۔

اب شام کے سائے گہرے ہو کر تاریکی میں بدل گئے تھے۔ فرینکفرٹ کی ہزار ہا لائٹس آن ہو چکی تھیں۔ کسی قریبی ریستوران سے اطالوی موسیقی کی دھنیں بلند ہو کر فضا میں بکھر رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک بغلی سڑک سے گزرے، سامنے ایک بڑے پارک کے آثار دکھائی دیے۔ پارک کے ساتھ ساتھ سڑک پر بہت سی گاڑیاں پارک تھیں۔ ان میں چند ایک ''کاروینز'' بھی نظر آرہے تھے۔ وہی چھوٹے چھوٹے سفری گھر جنہیں ڈرائیو کر کے کہیں بھی لے جایا جاسکتا ہے۔

خشامہ اس ہیوی ویٹ بندے کے ساتھ ایک ایسے ہی ٹریلر نما گھر میں گھس گئی۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یہاں ''ڈیٹ'' پر آئی تھی..... بلکہ شامیر کو یہ ڈیٹ سے بھی آگے کی بات لگ رہی تھی۔ وہ دونوں جس طرح کچھ کھائے پیے بغیر بے تابی سے ٹریلر میں گھس گئے تھے، یوں لگتا تھا کہ وہ ایک ''کال گرل'' کے طور پر یہاں آئی ہے اور موٹا تازہ شخص اس کا خریدار تھا۔ قریباً دو گھنٹے بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

یہ ایک ڈیڑھ گھنٹا شامیر نے اس پارک کے آس پاس گھومتے ہی گزارا تھا۔ اسے یہ اندیشہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ چلتا پھرتا گھر یہاں سے روانہ ہو جائے اور وہ یہیں پر کھڑا منہ دیکھتا رہ جائے۔ ایسے میں فوری طور پر ٹیکسی کا ملنا یقینی نہیں تھا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب خشامہ ٹریلر سے برآمد ہوئی تو وہ دور سے ہی کچھ اجڑی بچڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے ڈیانا کٹ بال منتشر تھے۔ اسے سی آف کرنے کے لیے ایک نہیں بلکہ دو مرد موجود تھے۔ دونوں نشے میں لگتے تھے۔ اپنے شولڈر بیگ کو کندھے پر درست کرتے ہوئے خشامہ نے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گئی۔ شامیر ایک بار پھر اس کے پیچھے تھا۔ اب وہ مزید انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

قریباً دو منٹ بعد جب شامیر نے محسوس کیا کہ خشامہ محفوظ فاصلے پر پہنچ چکی ہے تو وہ فٹ پاتھ پر تیزی سے قدم اٹھا کر اس کے پاس آیا۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔

خشامہ نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ حالانکہ یہاں کافی روشنی موجود تھی۔

''جی فرمایئے۔'' وہ انگلش میں بولی۔

''اب فرمانا تو تمہیں چاہیے..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکی ہو۔''

اس نے ایک بار پھر بڑے دھیان سے شامیر کی طرف دیکھا اور تب اس کے چہرے کے تاثرات بدلنا شروع ہو گئے۔ وہ پوری کی پوری شامیر کی طرف مڑ گئی۔ ''او مائی گاڈ..... او مائی گاڈ..... یہ تم ہو..... مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔'' وہ جیسے چلا اٹھی۔

☆☆☆

شامیر اور خشامہ ایک کشادہ اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ یہ کافی سجا سجایا اپارٹمنٹ تھا۔ خشامہ کی اس بدلی ہوئی مالی حالت کی وجہ وہی تھی جس کا اندازہ شامیر پہلے لگا چکا تھا۔ خشامہ نے بے باکی سے اسے بتایا کہ وہ ایک ''سیکس ورکر'' کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس کے اظہار میں ایک ذرا سی بھی شرمندگی یا خجالت شامل نہیں تھی۔ شامیر نے جب اس سے پوچھا کہ اس کا آفس کا کام کیسے چھوٹا تو وہ بولی کہ باس کی مہربانی سے ہی اسے یہ جاب ملی تھی اور باس کی نامہربانی کے سبب ہی چھوٹ گئی۔ باس نے اسے ریپ کر دیا تھا اور جب وہ ریپ ہو ہی گئی تو اس نے سوچا کیوں نا اپنی مرضی سے اور اپنی شرطوں پر ریپ ہوا جائے۔

شامیر کے لیے خشامہ کے موجودہ حالات اہم نہیں تھے۔ اس کے لیے وہ سوال اہم تھا جو کسی بیتال کی طرح اس کے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

اس نے خشامہ سے پوچھا۔ ''زویا کہاں ہے؟''

وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ ''تو آخر تم اسے ڈھونڈتے ہوئے آ ہی گئے نا۔ زویا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ تم ایشیائی لوگ ہوتے ہی ایسے ہو۔ دل چھینک اور عورت کو ذہن پر سوار رکھنے والے۔ تین چار سال گزر گئے اور تمہاری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے؟''

شامیر بولا۔ ''تمہارے سوال کا جواب تمہارے سوال کے اندر ہی موجود ہے۔ چار سال گزر گئے اور میری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ کیا دل چھینک اور ہرجائی مرد ایسے ہوتے ہیں؟''

''اسے تم اپنے اندر کا خلل کہہ سکتے ہو۔'' خشامہ نے کہا پھر ذرا رک کر بولی۔ ''ویسے تم کیا سوچ کر یہاں آئے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اب بھی کسی ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی؟ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی؟''

شامیر نے گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔''

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟''

''اس لیے کہ میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ پچھلے چند برسوں میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل و دماغ سے اوجھل نہیں ہوئی۔''

''اور اب تم یہاں آ گئے ہو، نجات دہندہ بن کر۔ اسے کسی بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلانے کے لیے۔ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے اور پھر اسے اپنی بانہوں میں چھپا کر کہیں دور بہت دور سپنوں کے ایک سنہری دیس میں لے جانے کے لیے۔'' خشامہ کے لب و لہجے میں طنز کی شدید کاٹ تھی۔

''وہ کہاں ہے خشامہ..... اور اس کی والدہ؟''

''ان دونوں کے بارے میں میری جوتی کو بھی پتا نہیں۔ زویا سے میری آخری ملاقات ہوئے بھی کوئی تین ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان دنوں وہ ایک لوکل بی وی چینل پر پارٹ ٹائم جاب کر رہی تھی..... بہرحال مشرق اور مغرب میں بہت فرق ہے مسٹر شامیر! یہاں کی لڑکیاں مہینوں اور برسوں تک ادھ کھلی کھڑکیوں میں بیٹھ کر اپنے روٹھے ہوئے فرینڈز کا انتظار نہیں کرتیں۔ یہاں کی زندگی مختصر پسندانہ ہے..... اس کے علاوہ مشینی اور تیز رفتار ہے۔ یہاں بڑی رفتار سے بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے..... اور جو کچھ تبدیل ہو جاتا ہے، اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ تمہاری خوش فہمیوں کو دور کرنے کے لیے میرے پاس ایک مصدقہ اطلاع ہے..... زویا کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی اپنی مرضی سے ہوئی ہے۔''

خشامہ کا یقینی انداز دیکھ کر شامیر کے سر پر بم سا پھٹ گیا تھا۔ دل سینے میں بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''اور وہ کیسے ہو سکتا تھا جو تم سوچتے ہو؟'' خشامہ نے ترت جواب دیا۔ ''تمہارا کیا خیال تھا کہ زویا کی ماما جس کی زندگی ایک ہندوستانی شخص کی وجہ سے تباہ ہوئی، ایک اور ہندوستانی کو اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے کی اجازت دے دے گی؟ وہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ہوشیار اور چوکس عورت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وہی کرے گی جو اس نے کہا تھا۔''

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے خشامہ کہ اس کی شادی ہو گئی ہے؟''

''مجھے زیادہ کچھ پتا نہیں ان ماں بیٹی کے بارے میں لیکن ایک فرینڈ نے اس کی شادی کی تصویر ضرور بھیجی تھی۔ یہ شادی کوئی تین سال پہلے جرمنی میں ہی کہیں ہوئی تھی۔'' خشامہ نے کہا اور اپنے سیل فون میں کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

شامیر کا دل جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ دو تین منٹ بعد خشامہ موبائل کے کسی ''فولڈر'' میں وہ تصویر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔

شامیر نے سکتہ زدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سفید اور سرخ رنگ کا عروسی جوڑا پہنے اپنے جرمن دلہا کے پہلو میں بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ یہ ہلکی نیلی آنکھوں والا وہی دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی تصویر شامیر نے ایک دفعہ زویا کے موبائل فون میں دیکھی تھی۔ یہ تصویر زویا کو اس کی ماما نے بھجوائی تھی۔ زویا نے لڑکے کا نام رابرٹ بتایا تھا۔ شامیر سکتہ زدہ سا تصویر کو دیکھتا رہا۔ تصویر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اگر واقعی یہ شادی ہو چکی ہے تو پھر اسلامی طریقے کے مطابق ہوئی ہے۔ تصویر میں زویا کی تراشیدہ بالوں والی والدہ بھی دکھائی دے رہی تھیں مگر وہ وہیل چیئر پر نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف پادری جونا تھن بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیا یہ تصویر درست ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں ''فیک'' تصویر دکھانے کی؟ بہرحال میں تمہارے تفتیشی سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ یقین کرنا ہے تو کر لو۔ ورنہ بے شک اپنی، احمقوں کی جنت میں رہو۔'' وہ بے رخی سے بولی۔

شامیر نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اس تصویر میں زویا کی والدہ وہیل چیئر پر نظر آ رہی ہیں، کچھ کمزور بھی دکھائی دیتی ہیں۔''

وہ اپنے مصنوعی ناخن اتارتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ میں اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ بس اڑتی اڑتی ہوئی سی اتنی بات سنی تھی کہ ان کے گھر میں ڈکیتی وغیرہ کی واردات ہوئی تھی جس میں وہ بڑھیا زخمی ہوئی تھی۔''

شامیر کے کسی سوال کا انتظار کیے بغیر وہ قدآدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی..... اور اپنی گردن اور کندھے کے تازہ نشانوں کو ہلکے میک اپ میں اوجھل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ نشان تھوڑی دیر پہلے کی اسی ''مصروفیت'' کا نتیجہ تھے جسے خشامہ بڑی ڈھٹائی سے ''سیکس ورک'' کا نام دے رہی تھی۔ بیروت کی رہنے والی یہ عیسائی لڑکی اب نمک کی کان میں نمک بن چکی تھی یعنی پوری طرح مغرب زدہ

ہو چکی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ تو کیا زویا بھی یہاں کی تیز رفتار تبدیلیوں کی زد میں آ چکی تھی؟ یوں تو چار سال پہلے بھی خشامہ نے شامیر کو رجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر اب تو وہ سراپا دعوت تھی۔ بے شک وہ تھکی ماندی لوٹی تھی مگر شامیر کی ذرا سی آمادگی پر وہ اس رات کو رنگین بنانے کے لیے کمربستہ ہو سکتی تھی۔ شامیر اس کے اس لگژری اپارٹمنٹ سے چلے جانا چاہتا تھا مگر اس وجہ سے رکنے پر آمادہ ہو گیا کہ شاید خشامہ سے زویا کے بارے میں کچھ مزید معلوم ہو سکے۔ دوسرے وہ اس اپارٹمنٹ میں رات گزار کر اور خشامہ کی حشر سامانیوں کو یکسر نظر انداز کر کے اسے اس بات کا عملی جواب دینا چاہتا تھا کہ پاکستان وغیرہ سے آنے والے مردوں کے ذہن پر ہر وقت عورت سوار رہتی ہے اور وہ یورپی ممالک کے گلی کوچوں میں اپنا دل پلیٹ میں لیے پھرتے ہیں۔ تاہم اس نے شدید دانت درد کا بہانہ بنایا تھا اور خشامہ کے گھر سے کچھ بھی نہ کھانے کا معقول جواز پیدا کر لیا تھا۔

خشامہ کے اپارٹمنٹ میں رات گزار کر شامیر کو بس ایک چھوٹا سا کلیو ہی حاصل ہو سکا اور وہ یہ کہ شادی کے بعد زویا اپنے خاوند کے ساتھ پیڈربورن نامی شہر میں چلی گئی تھی۔ زویا کا خاوند رابرٹ وہاں ایک یونیورسٹی میں ملازم تھا۔ شاید لیکچرار وغیرہ تھا۔ جو دوسری خبر شامیر کو خشامہ کے ذریعے ملی، وہ زویا کے والد مسٹر راشد کے بارے میں تھی۔ وہ انتقال کر چکے تھے۔ قریباً تین سال پہلے انہیں برین ہیمبرج ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ شامیر نے اس شخص کو کبھی دیکھا نہیں تھا اس کے باوجود اس خبر نے اسے صدمہ پہنچایا۔

شامیر نے خشامہ سے زویا کی دوسری سہیلی طویل قامت جین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ جین نے دو سال پہلے باسکٹ بال کے اٹالین کھلاڑی سے شادی کی تھی۔ وہ کچھ عرصہ اٹلی میں رہی تھی، اب پھر شاید جرمنی میں ہی کہیں ہے۔ خشامہ کا اس سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یا شاید جین نے ہی اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا ہو۔ وہ جس طرح کے کاموں میں پڑ گئی تھی، بھلی مانس لڑکیوں کا اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔

☆☆☆

تقریباً 36 گھنٹے بعد انٹرسٹی ٹرین اور بس کا لمبا سفر طے کر کے شامیر اس پیڈربورن نامی شہر میں پہنچ چکا تھا۔ اس کو شہر کے بجائے ایک بڑا قصبہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ یورپ کے پُرسکون قصبوں والی ساری کشادگی اور اداسی یہاں موجود تھی۔ آبادی کم اور شہری سہولتیں زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں بھی شامیر نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا..... اور ہوٹل پہنچنے کے فوراً بعد ہی اپنے کام میں لگ گیا۔ اس قصبہ نما شہر میں چار یونیورسٹیاں ایسی تھیں جنہیں زیادہ اہم کہا جا سکتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں کے ملازمین یا لیکچررز میں سے کسی رابرٹ لوئیس نامی بندے کا سراغ لگانا زیادہ آسان نہیں تو بہت مشکل بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے شامیر اپنی صحافتی حیثیت کو بھی استعمال کر سکتا تھا۔ وہ یہ جواز پیش کر سکتا تھا کہ جرمنی کے ان تعلیمی اداروں کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ تیار کر رہا ہے جو بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پسماندہ ممالک کے طلبا کو تعلیمی سہولتیں دے رہے ہیں۔

شامیر کے اندر جوار بھاٹے کی سی کیفیت تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں نمی آ جاتی تھی اور کبھی کسی موہوم امید کے سہارے دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگتا تھا۔ پتا نہیں کیوں، اس کے دل میں رہ رہ کر یہ آس پیدا ہوتی تھی کہ زویا کی شادی والی اطلاع بالآخر غلط ثابت ہو گی..... یہ سب کچھ کسی ڈرامے کا حصہ نکلے گا..... اگر وہ اسے نہیں بھولا تھا تو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ ان دونوں کی محبت انا کا زہر پی کر کچھ عرصے کے لیے ادھ موئی تو ضرور ہوئی تھی مگر مری نہیں تھی۔

ادھر وہ رابرٹ نامی نوجوان کی تلاش میں تھا اور ادھر اموخالہ کال پر کال کر رہی تھیں۔ وہ شامیر کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی پریشان لگتی تھیں۔ شامیر کو کافی حد تک علم تھا کہ ان کی اضافی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟ اموخالہ کو معلوم تھا کہ چار سال پہلے جس جرمن نژاد لڑکی زویا سے شامیر کو رسم و راہ پیدا ہوئی تھی، وہ فرینکفرٹ کی ہی رہنے والی تھی۔ اب وہ اس اندیشے کے لیے حق بجانب تھیں کہ کہیں پھر سے وہ تکلیف دہ سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ بہرطور جب شامیر نے اموخالہ کو بتایا کہ وہ اب فرینکفرٹ میں نہیں بلکہ نارتھ رائن اسٹیٹ کے شہر پیڈربورن میں ہے تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔

جستجو اور تحقیق کا مادہ شامیر کی طبع میں شامل تھا۔ اگلے روز سہ پہر تک وہ نہ صرف رابرٹ کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اس نے اسے دیکھ بھی لیا..... وہ آئی ٹی کی اس مقامی یونیورسٹی میں بطور لیکچرار تعینات تھا۔ سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ رابرٹ اپنے کام سے فارغ ہو کر پیدل ہی یونیورسٹی کے کیمپس سے نکلا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔

وہ سفید شرٹ اور نیلی پتلون میں تھا۔ ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے دبلے پتلے جسم پر یہ لباس خوب جچ رہا تھا۔ کھوئے کھوئے انداز میں دھیمے قدموں سے چلتا ہوا یہ جرمن نوجوان اسے بظاہر شریف النفس اور کسی حد تک شرمیلا لگا۔ راستے میں جو اسٹوڈنٹس ملے انہوں نے بھی اسے احترام ہی دیا۔ کچھ آگے جا کر شامیر چونکا۔ رابرٹ ایک مسجد میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ عصر کی نماز کا وقت تھا۔ شامیر بھی اس کے پیچھے مسجد میں چلا گیا۔ باجماعت نماز تو ہو چکی تھی، بہرحال دونوں نے انفرادی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد رابرٹ دیر تک سر جھکائے دعا مانگتا رہا۔

اس ترک مسجد سے نکلنے کے بعد رابرٹ پھر پیدل چل پڑا۔ شامیر اس سے بات شروع کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سیاہ فام اسٹوڈنٹ اس کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ رابرٹ اور سیاہ فام اسٹوڈنٹ باتیں کرتے کرتے کوئی نصف کلومیٹر تک گئے، پھر سیاہ فام تو ادب سے جھک کر آگے ہو گیا اور رابرٹ ایک گرجے میں داخل ہو گیا۔ پہلے مسجد اور پھر گرجا؟ شامیر کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔

اس دفعہ شامیر باہر ہی ٹہلتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد رابرٹ افسردگی کی حالت میں باہر نکلا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس پر رقت طاری ہے اور وہ روتا رہا ہے۔ شامیر نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ سیدھا رابرٹ کے پاس چلا گیا۔ ''ہیلو مسٹر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی کہیں۔'' شائستگی سے پوچھا گیا۔

''میرا نام احمد ہے۔ میرا تعلق ایک پاکستانی ٹی وی چینل سے ہے۔ میں یہاں کے ان تعلیمی اداروں کے بارے میں ایک اسٹوری تیار کر رہا ہوں جو غیر ملکی طلبا کو آسان شرائط پر تعلیمی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔''

رابرٹ نے دھیان سے شامیر کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''آپ سے مل کر خوشی ہوئی لیکن میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

سامنے ہی ایک کیفے نما جگہ نظر آ رہی تھی۔ شامیر نے کہا۔ ''کیا ہم چند منٹ وہاں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

ذرا سے تذبذب کے بعد رابرٹ نے شامیر کی بات مان لی اور وہ دونوں اوپن ائر کیفے کی ایک میز پر آن بیٹھے۔ رابرٹ مسلسل گہری نظروں سے شامیر کو دیکھ رہا تھا۔

شامیر نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے عمومی نوعیت کے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے۔''

''میں ضرور کروں گا لیکن اس کے لیے آپ کو جھوٹ نہیں سچ بولنا ہوگا۔''

''مم..... میں سمجھا نہیں؟'' شامیر گڑبڑا گیا۔

''اگر میں غلط اندازہ نہیں لگا رہا تو آپ کا نام احمد نہیں شامیر ہے اور آپ جس پاکستانی چینل کی بات کر رہے ہیں اس کا نام شاید ڈبل اے ہے اور آپ یہاں کے تعلیمی اداروں کے بارے میں کوئی رپورٹ وغیرہ تیار کرنے نہیں آئے بلکہ..... غالباً کسی کو کھوجتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔''

شامیر ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ رابرٹ نامی نوجوان اتنی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جائے گا..... اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ شامیر کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔

شدید حیرت کے چند لمحے گزر گئے تو شامیر نے خود کو تیزی سے سنبھالا۔ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سب کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ فقط اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہاں پہنچا ہوں تو کسی بری نیت سے نہیں پہنچا۔ میں چینل کے ایک کام سے ہی یہاں آیا تھا۔ یہاں آ کر سارے پرانے مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ چار سال پہلے میں جن لوگوں سے یہاں مل چکا ہوں، وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ خاص طور سے مس زویا کے حوالے سے ایک تجسس سا تھا، ایک بار پھر اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے اس ''نوس ملجیا'' (ماضی پرستی) کو معاف کر دیں گے۔''

رابرٹ سر جھکا کر کچھ دیر تک خاموشی سے چائے کے کپ کو دیکھتا رہا پھر بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''شاید تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ زویا اسی طرح ہے جس طرح تم اسے چھوڑ کر گئے تھے، یا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہو۔ میرے ''نوس ملجیا'' میں یہ تجسس بھی شامل ہے۔''

رابرٹ نے ایک بار گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ٹھیک جگہ پر ہی پہنچے ہو۔ میں ہی زویا کا شوہر ہوں۔ ہماری شادی تین سال پہلے تقریباً انہی دنوں میں ہوئی تھی۔''

شامیر کے دل پر ایک زبردست گھونسا سا لگا۔ اس کی خوش فہمی کا بہت بڑا فانوس، پتھریلے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ حقیقتیں ایسی ہی زہریلی اور بے رحم ہوا کرتی ہیں۔ اس نے دل کڑا کر کے خود کو بولنے پر آمادہ کیا اور ہونٹوں پر

ایک پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ ''آپ کو یہ شادی شدہ زندگی مبارک ہو مسٹر رابرٹ۔''

رابرٹ نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ بدستور چائے کی پیالی کو گھور رہا تھا۔ خاموشی بوجھل ہونے لگی تو وہ بولا۔ ''زویا کے بارے میں کچھ اور جاننا نہیں چاہو گے؟''

''میرے خیال میں یہ کافی ہے مسٹر رابرٹ۔''

''شاید تم تکلف سے کام لے رہے ہو۔'' رابرٹ نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

شامیر نے اپنے ہوٹل کا نام بتایا۔

رابرٹ بولا۔ ''یہ میرے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تم کل ڈنر پر آجاؤ..... آرام سے بات کریں گے۔''

''نہیں رابرٹ! میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے.....''

''شاید تم زویا کے سامنے جانے سے کنی کترا رہے ہو۔'' رابرٹ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ آج کل گھر میں نہیں ہے۔ ہم تسلی سے گپ شپ کرسکیں گے۔''

شامیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کو بڑا گبھراہٹ ہونے لگا تھا اور وہ اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔ وہ شادی شدہ زویا کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا، دوسری طرف اس کے بارے میں جاننے کی منہ زور خواہش بھی سر اٹھا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ دھیمی طبع والا یہ نوجوان لیکچرار اپنی ازدواجی زندگی اور دیگر حالات سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔

ڈنر کے حوالے سے رابرٹ اور شامیر کے درمیان دو چار منٹ مزید بات ہوئی پھر شامیر نے آمادگی ظاہر کردی۔

☆☆☆

اسٹریٹ پولیشن میں اموخالہ اور فارہ سخت بے قرار تھیں۔ ماں بیٹی بند کمرے میں مصروفِ گفتگو تھیں۔ فارہ نے کہا۔ ''آخر وہی ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ آپ کا یہ لاڈلا اسی پرانی گرل فرینڈ کے چکر میں بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ ہمیں گولی دی جارہی ہے کہ رپورٹ پر کام کررہا ہوں۔''

''بھئی فارہ! بغیر ثبوت کے الزام نہیں لگانا چاہیے۔'' اموخالہ نے کہا۔

''اور ثبوت آپ کو کبھی ملنا ہی نہیں۔ آپ نے اسی طرح آنکھیں بند رکھنی ہیں اور مجھ سے دس سال بڑے اس بندے کے ساتھ میری زندگی برباد کردینی ہے۔ کسی وقت تو مجھے زہر لگنے لگتا ہے یہ شخص۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو۔'' اموخالہ نے دانت پیس کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تیری ایسی ہی باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں بنا بنایا کام بگڑ نہ جائے۔'' انہوں نے اپنی درمیانی شکل وصورت والی بیٹی کو سرتاپا دیکھا پھر سمجھانے والے انداز میں بولیں۔ ''میری ایک بات لکھ لے کہیں پر..... اس سے بہتر رشتہ تجھے کہیں ملے گا نہیں۔''

''مگر اموا! میں ایک بات آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ آپ کے لاڈلے کے نخرے دن بدن بڑھتے جارہے ہیں اور اب تو طور اطوار بھی ٹھیک نہیں ہیں، مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوگا۔''

اموخالہ نے بولے سے کہا۔ ''ایک بار شادی ہوجائے۔ ایک آدھ بچہ ہوجائے پھر سارے کس بل نکل جائیں گے۔''

''اور شادی ہوگی کیسے؟ وہ تو مارا مارا پھر رہا ہے اس پرانے افیئر کے پیچھے۔ آج چار روز ہوگئے ہیں۔ کسی نے مڑ کر ہماری خبر تک نہیں لی۔''

اموخالہ کی آنکھوں میں گہری سوچ ابھر آئی۔ کچھ دیر بعد وہ رازداری کے انداز میں بولیں۔ ''اچھا ایک کام کرو۔ شامیر کو فون کر۔ اسے بتا کہ اموکی طبیعت اچانک دم بیب ہوگئی ہے۔ بلڈ پریشر شوٹ کرگیا ہے۔ چل ابھی کر فون۔''

☆☆☆

شامیر نے اگلے روز دوپہر تک کا وقت بڑی بے چینی میں گزارا تھا۔ زویا کے حوالے سے جو ایک تاریک پردہ اس کے سامنے تنا ہوا تھا، وہ اب ہٹنے والا تھا۔ رابرٹ کے ساتھ اس کا ٹائم شام آٹھ بجے کا تھا۔ یہ چند گھنٹے گزارے نہیں گزر رہے تھے۔ دو بجے کے قریب اس نے ایک ترک ریسٹورنٹ میں ڈونر اور کوک کا لنچ کیا..... اور سلیٹ چھونکنے لگا لیکن غم اتنا بڑا تھا کہ دھوئیں میں غلط ہونے سے انکار کررہا تھا۔ زویا کی شادی ایک ٹھوس حقیقت بن کر اس کے سامنے آئی تھی اور ہر آس، امید کی بیخ کنی کرگئی تھی۔

اس نے ایک بار پھر بے تابی سے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی اور یہی وقت تھا جب اس کے سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف فارہ تھی۔ ''آپ کہاں ہیں؟'' وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

''فارہ! میں نے بتایا تو تھا یہاں پیڈر بورن آیا ہوا ہوں..... کیوں خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' فارہ کی روہانسی آواز ابھری۔

''اموکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اوہ گاڈ! کیا ہوا انہیں؟'' شامیر جیسے پوری جان سے تڑپ گیا۔

''بلڈ پریشر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ دوا بھی زیادہ اثر نہیں کر رہی۔ نیم بے ہوش سی پڑی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں ہونا چاہیے۔''

شامیر نے تیزی سے چند سوالات پوچھے اور پھر فارہ کو تسلی دی کہ وہ ابھی یہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ اس نے افراتفری میں رابرٹ کو اطلاع دے دی کہ وہ آج نہیں آسکے گا..... دو ٹرینیں بدل کر وہ آسٹریا کی حدود میں داخل ہوا اور پھر تیسری ''یوریل'' ٹرین پر ایک گھنٹے کا مزید سفر کر کے اسٹریٹ پولیشن پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے تک اموخالہ کی ''طبیعت'' کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ تاہم وہ کافی گم صم نظر آرہی تھیں۔ شامیر رات گئے تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ ان سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا، ان کی ٹانگیں دباتا رہا۔ اسے بہت برا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اموخالہ سے اصل بات چھپا رہا ہے۔ رات کو اس نے مناسب لفظوں میں رک رک کر تقریباً سب کچھ ہی اموخالہ کے گوش گزار کر دیا۔ اس نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ زویا کی شادی ہو چکی ہے..... بلکہ یہ بھی کہ شاید اس کی ازدواجی زندگی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے..... تین روز بعد اموخالہ کی ''طبیعت'' بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔ شامیر نے ایک مرتبہ پھر جرمنی کے اس شہر نما قصبے ''پیڈربورن'' کا رخ کیا جہاں اس کی ملاقات زویا کے شوہر سے ہوئی تھی، تاہم اس مرتبہ اموخالہ، فارہ اور فارہ کی مقامی کزن افشاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اموخالہ اور فارہ جرمنی کی چند قابل دید جگہیں دیکھنے کی خواہش رکھتی تھیں۔

پیڈربورن پہنچتے ہی شامیر نے دوبارہ رابرٹ سے رابطہ کیا۔ اس سے معذرت کی کہ اسے اپنی آنٹی کی خرابی صحت کی بنا پر اچانک واپس جانا پڑ گیا تھا۔ رابرٹ نے اپنی ڈنر والی دعوت کا اعادہ کیا اور اسی روز رات کو شامیر ''ہوٹل'' سے روانہ ہو کر رابرٹ اور زویا کے گھر پہنچ گیا۔ یورپ کے عام گھروں کی طرح یہ ڈھائی تین مرلے پر مشتمل ایک چھوٹا مگر خوشنما گھر تھا۔ شامیر کو یہاں کچھ ایسی تصویریں نظر آئیں جن سے اس پر انکشاف ہوا کہ زویا ایک نہایت خوبصورت پیاری بچی کی ماں بن چکی ہے۔ گھر میں کئی جگہ ریکس اور شوکیس وغیرہ میں رنگ برنگے کھلونے بھی جھلک دکھا رہے تھے۔ ایک بڑی تصویر کامن روم میں لگی تھی جس میں چند ماہ کی گڑیا سی بچی کو زویا ہوا میں اچھال رہی تھی۔ اس تصویر میں زویا کی صرف پشت ہی دکھائی دیتی تھی۔ زویا اسی طرح سیکسی جسم اور دلکش نظر آتی تھی۔ ایک تصویر میں اس نے بالکل ماڈرن انداز میں چست جینز اور بغیر آستینوں کی شرٹ بھی پہن رکھی تھی۔ ایک اور تصویر میں بھی وہ بولڈ لباس میں دکھائی دیتی تھی۔

رابرٹ نے کوئی ملازم نہیں رکھا ہوا تھا۔ ڈنر بھی اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ یہ ڈنر سوپ، مچھلی اور جرمنی کی اسپیشل سلاد پر مشتمل تھا۔ مقامی طرز پر تیار کی گئی مچھلی شامیر کو زیادہ تو نہیں بھائی لیکن اس میں چونکہ بنانے والے کا خلوص شامل تھا لہٰذا وہ شامیر کو بری بھی نہیں لگی۔ شامیر کے اندر بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔ مزیدار قہوہ پیتے ہوئے رابرٹ نے اچانک کہا۔ ''شامیر! شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ زویا مجھے بھی چھوڑ کر جا چکی ہے..... جاتے جاتے وہ میری بچی بھی ساتھ لے گئی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے رابرٹ کی آواز بھرا گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو رابرٹ؟'' شامیر کو جیسے یقین نہیں آیا۔

وہ کھوئے کھوئے افسردہ لہجے میں بولا۔ ''اس کے اندر اور باہر میں بہت فرق تھا مسٹر شامیر اور شاید وقت گزرنے کے ساتھ یہ فرق زیادہ ہوتا رہا ہے، یوں لگتا ہے کہ عیش و آرام اور دنیاوی لذتوں کی طلب اس کے اندر بتدریج بڑھتی چلی گئی ہے۔''

''اب..... وہ کہاں ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''یہی تو معلوم نہیں۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گئی اور سچی بات یہ ہے شامیر کہ مجھے اب اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں ہے۔ لیکن جو ظلم اس نے میرے ساتھ کیا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ وہ میری پیاری بچی کو میری مینی کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ وہ میری جان تھی شامیر! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا.....'' رابرٹ کا گلا ایک بار پھر رندھ گیا۔

زویا کے بارے میں جو انکشافات ہو رہے تھے، وہ شامیر کے لیے بے حد تکلیف دہ تھے۔ اس نے رابرٹ سے پوچھا۔ ''تم دونوں میں کوئی جھگڑا وغیرہ بھی تھا؟''

''چھوٹے موٹے جھگڑے تو ازدواجی زندگی میں چلتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری سچائی سے بتا رہا ہوں شامیر کہ میری طرف سے کبھی کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں اس نے مجھے کس جرم کی سزا دی ہے..... آج اسے گئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ اس نے کوئی رابطہ کیا ہے، نہ اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے۔''

''رابرٹ! کیا تم پورے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنی مرضی سے ہی کہیں گئی ہے؟''

''اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا ایک بوائے فرینڈ اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی گئی ہے۔'' آخری الفاظ رابرٹ نے عجیب شرمندگی کے عالم میں ادا کیے۔

یہ زویا کے بارے میں تیسرا انکشاف تھا جس نے شامیر کو سرتاپا ہلا دیا۔ وہ حیرت سے رابرٹ کی جانب دیکھتا رہا۔

وہ تاسف سے سر ہلا کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا، مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے لیکن..... وہ میری بیٹی کو تو مجھ سے جدا نہ کرتی۔''

کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی۔ قہوے کی پیالیاں ان کے سامنے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ شامیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''میں تم سے ذاتی نوعیت کے سوالات پوچھ رہا ہوں۔ آئی ایم سوری..... تمہیں برا تو نہیں لگ رہا؟''

''مجھے..... اب..... کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ کیونکہ جو کچھ میں جھیل رہا ہوں وہ بہت..... بہت زیادہ برا ہے۔'' اس کی نگاہیں اپنی نو دس ماہ کی گڑیا سی بچی کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

''رابرٹ! تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہی گئی ہے؟''

وہ کچھ دیر تک الجھن میں نظر آیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ ان معاملات کو شامیر کے ساتھ شیئر کرے یا نہیں۔ پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے کہا۔ ''اس لڑکے نے خود مجھے بتایا تھا کہ زویا اس کے ساتھ جا رہی ہے۔ میں ان دونوں کو ڈھونڈنے کی یا ان کے پیچھے آنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔''

پھر اس نے اپنی جیب میں سے اپنا سیل فون نکالا۔ اس میں سے ایک ویڈیو کلپ نکال کر اور پلے کر کے شامیر کے سامنے رکھ دیا۔ شامیر کو ایک اور دھچکا لگا۔ اس ویڈیو کلپ میں چوڑے شانوں والا جو جرمن نوجوان نظر آ رہا تھا، وہ شامیر کے لیے اجنبی نہیں تھا..... یہ وہی گٹارسٹ تھا جس سے زویا ایک دفعہ فرینکفرٹ کے مرکزی اسٹیشن پر ملی تھی۔ اس نے زویا کو بانہوں میں بھر کر چاروں طرف گھمایا تھا اور زویا نے بڑی بے تکلفی سے اس کے دونوں گالوں پر زوردار چٹکیاں لے کر شکوہ کیا تھا کہ وہ آج کل کہاں اوجھل ہے۔ وہ اور خشامہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہیں۔ زویا نے اس لڑکے کا نام ٹام بتایا تھا۔ اب یہی ٹام اس ویڈیو کلپ میں رابرٹ سے مخاطب تھا اور انگلی اٹھا اٹھا کر وارننگ کے انداز میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ جرمن بول رہا تھا لہٰذا شامیر کی سمجھ میں الفاظ نہیں آئے..... بہرحال انداز اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس ویڈیو کلپ کے بیک گراؤنڈ میں زویا بھی اپنی ایک سالہ بچی کے ساتھ کھڑی نظر آتی تھی اور جیسے بہ زبانِ خاموشی ٹام کی پوری تائید کر رہی تھی۔

شامیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکا شاید زویا سے کافی عرصہ پہلے بھی ملتا رہا ہے۔ پہلی بار میں چار سال پہلے یہاں آیا تھا۔ تب بھی اس لڑکے کو دیکھا تھا۔''

رابرٹ نے شامیر کو تیز نظروں سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''پتا نہیں وہ کس کس سے ملتی رہی ہے اور شاید اب بھی ملتی ہو یا رابطہ رکھتی ہو۔''

شامیر نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''سچ یہ ہے رابرٹ کہ جب میں یہاں سے واپس پاکستان گیا تھا تو زویا سے میری دوستی بھی وہیں پر ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں میں کبھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ میں نے بھی کبھی یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔''

''میں کوئی خاص تمہاری بات نہیں کر رہا ہوں شامیر۔ اس بات کا پتا مجھے شادی کے بعد چلا تھا کہ اس کا حلقہ احباب کافی وسیع رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں صرف زویا کی والدہ کی وجہ سے پھنسا ہوں۔ آنٹی سارہ کی شدید خواہش تھی کہ میں ان کی بیٹی کا رشتہ قبول کر لوں۔ تب تک زویا بھی اپنے اصل روپ میں نہیں آئی تھی۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا اور میں اس سے ناتا جوڑ بیٹھا۔''

''آنٹی سارہ اب کہاں ہیں؟'' شامیر نے پوچھا۔

''تین ساڑھے تین سال پہلے ان کے گھر چوری کی واردات ہوئی تھی، جس میں وہ زخمی ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنا آبائی شہر میونخ چھوڑ کر ''ایسن'' چلی گئیں اور اب بھی وہیں رہائش پذیر ہیں۔ ان کو بھی کچھ خبر نہیں کہ ان کی لاڈلی کہاں ہے۔ وہ خود بھی پریشان ہیں اور اسے کوستی رہتی ہیں۔''

''تم نے زویا کو ڈھونڈنے کی کوششیں کس طرح کی ہیں رابرٹ؟''

''تم یہ پوچھو کہ میں نے کس طرح کوششیں نہیں کی ہیں؟'' اس نے مختصر جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ شامیر نے موضوع بدل دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ زویا کے ساتھ شادی سے پہلے وہ مسلمان ہوا تھا یا نہیں؟

رابرٹ نے اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ وہ مسلمان تو ہوا تھا مگر ساتھ ساتھ اس نے زویا کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اسلام کو پوری طرح سمجھ کر اسے دل و جان سے قبول کرنا چاہتا ہے۔ وہ آج کل بھی انگلش زبان میں اسلامی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔

رابرٹ کے گھر سے شامیر دل پر ایک بہت بھاری بوجھ لے کر اوٹا تھا۔ ایک نہایت تکلیف دہ حیرت تھی جس نے اس کے حواس کو مختل کر رکھا تھا۔ چہرے کس طرح دھوکا دیتے ہیں۔ شخصیات کس طرح پردوں کے پیچھے اوجھل رہتی ہیں، یہ آج اس پر کھل رہا تھا۔ وہ کیا سوچ کر اپنے بچھڑے ہوئے فرینکفرٹ سے ملنے آیا تھا اور فرینکفرٹ نے اس پر کیا انکشافات کیے تھے۔ ساری کی ساری رومانیت کہیں دھندلی فضاؤں میں اوجھل ہو گئی تھی۔ اب ایک طرح کا رنج اور غصہ شامیر کے اندر پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار تو زویا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

.....علوج لگانا شامیر کا پروفیشن تھا۔ وہ دوسروں کی اسٹوریز کے پیچھے تو بھاگتا پھرتا رہتا تھا، اب اپنی اسٹوری کو بھی ایک انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے ہوٹل واپس آ کر ساری صورت حال امو خالہ کو بتا دی اور اس دکھ آمیز ہمدردی کا اظہار بھی کیا جو اس نے ایک بچی سے بچھڑے جو۔ ئہ باپ کے ساتھ محسوس کی تھی۔

امو خالہ نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ چار سال پہلے وہ زویا کے سلسلے میں ایک نہایت سنگین غلطی کرنے سے بچ گئے ہیں۔ امو خالہ نے شامیر کا کندھا سہلاتے ہوئے دلار سے کہا۔ ''شامی! تجھے اسی لیے کہتی تھی نا کہ پرائے لوگوں میں رشتہ ایک اندھے کنوئیں کی طرح ہوتا ہے۔ ایسے کاموں میں جتنی بھی چھان بین کر لی جائے اتنا ہی کم ہوتا ہے۔''

شام کو چائے کی چسکی لیتے ہوئے امو خالہ نے کہا۔ ''چلو، میں تمہاری بات مان بھی لیتی ہوں مگر اس کو ڈھونڈو گے کیسے؟ جو کام اس کا شوہر اور اس کے دیگر رشتے دار پچھلے سال سوا سال میں نہیں کر سکے وہ تم دو چار ہفتوں میں کیسے کر لو گے..... پھر یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہم یہاں اجنبی ہیں شامیر۔''

''مگر کچھ بھی ہے۔ میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کام کر جائے۔''

فارہ بھی وہاں موجود تھی۔ لطف لینے والے انداز میں بولی۔ ''اچھا، وہ مل جائے آپ کو... تو آپ کیا کریں گے اس کے ساتھ؟''

''کرنا کیا ہے؟ کم از کم یہ تسلی تو ہو جائے گی کہ اس کو اچھی طرح آئینہ دکھا دیا ہے..... پھر ایک پریشان حال باپ کو اس کی بچی مل جائے گی اور اگر اس پر کوئی جرم ثابت ہو گیا تو وہ سلاخوں کے پیچھے بھی جا سکتی ہے۔''

''کہیں ایسے چکروں میں پڑ کر آپ خود ہی سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچ جائیں۔'' فارہ نے فقرہ چسپاں کیا۔

امو خالہ نے فارہ کو جھڑکا۔ ''شام کا وقت ہے، ایسی بری باتیں منہ سے کیوں نکال رہی ہو۔''

پھر وہ شامیر کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔ ''کچھ بھی ہے شامیر! تم کہیں اکیلے نکلتے ہو تو میرا دل ہولتا ہے۔ میں تمہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گی۔''

شامیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کسی معاملے کی تحقیق کرنے کا اور سوچنے کا شامیر کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ رات کو دیر تک ہوٹل کی بالکونی میں چہل قدمی کرتا رہا اور غور و خوض میں مصروف رہا۔ رابرٹ کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ بچی کے ساتھ غائب ہونے کے بعد زویا کہیں بہت دور نہیں گئی۔ وہ مغربی جرمنی کے اس شمالی علاقے کے کسی چھوٹے شہر یا قصبے میں موجود ہے۔ اگر وہ واقعی اس گٹارسٹ لڑکے ٹام کے ساتھ نکلی تھی تو پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے ایک طریقہ اپنایا جا سکتا تھا۔ چار سال پہلے ''گٹارسٹ ٹام'' سے ملنے کے بعد شامیر کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ میوزک کے حوالے سے تقریباً جنونی ہے۔ شہرت کی بھوک بھی اس کے اندر کافی نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ شامیر کا تجزیہ تھا کہ ایسے لوگ جس طرح کے حالات میں بھی ہوں، اپنے ''پیشن'' سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہ سکتے۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ وہ اب بھی کسی نہ کسی طور میوزک سے اور علاقے میں ہونے والے ''کنسرٹس'' وغیرہ سے جڑا ہوا ہوگا۔ اسے ایسی جگہوں پر تلاش کیا جا سکتا تھا جہاں میوزک کی تقریبات کا انعقاد ہو۔

شامیر نے فارہ کے ساتھ مل کر نیٹ کے ذریعے ایسی تقریبات کا کھوج لگایا جو اس ایریا میں اگلے دو تین ہفتوں میں ہونے والی تھیں۔ اس سلسلے میں فارہ کی مقامی کزن افشاں نے بھی کردار ادا کیا۔ انہوں نے ان تقریبات کی ایک لسٹ بھی تیار کر لی۔ افشاں کے پاس ڈرائیونگ لائسنس

موجود تھا۔ اس نے کرائے کی ایک چھوٹی کار کا انتظام بھی کرلیا۔ اگلے تین روز میں انہوں نے قرب وجوار کے ایسے چار پانچ فنکشنز اٹینڈ کیے۔ یہ ایک طرح سے تفریح تھی اور کام بھی تھا۔ وہ تینوں گاڑی پر نکل جاتے تھے، اموخالہ ہوٹل میں ہی موجود رہتی تھیں اور گاہے بگاہے انہیں فون کرتی رہتی تھیں۔ میوزک کے ان فنکشنز میں وہ مختلف سنگرز اور موسیقاروں سے بھی مل رہے تھے اور گٹارسٹ ٹام کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کررہے تھے.....

زویا کے پریشان حال شوہر رابرٹ کا اداس چہرہ اکثر شامیر کی نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اپنی بیکی کے لیے اس کی تڑپ واقعی سمجھ میں آنے والی تھی۔ ایک روز وہ پھر اکیلا ہی رابرٹ سے ملنے نکل گیا۔ چند منٹ میں وہ ہوٹل سے پیدل ہی اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اسے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ رابرٹ اسے اس حال میں ملے گا۔ یہ شام تقریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ رہائشی کالونی کی اس اندرونی سڑک پر روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ اس نے کئی بار ڈور بیل کے بٹن پر انگلی رکھی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر اس نے رابرٹ کے سیل فون کا نمبر ملایا مگر وہاں بھی بس بیل ہی جاتی رہی۔ دفعتاً شامیر کو اندازہ ہوا کہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ اسے ہولے سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ گیرج میں رابرٹ کی سفید گاڑی موجود تھی۔ اچانک اسے لگا کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی ہے۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ لیونگ روم میں اس نے رابرٹ کو دیکھا۔ وہ فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے سر کے عقبی حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اس طرح الٹی تھی کہ رابرٹ کا نچلا دھڑ اس کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ الماری میں رکھے ہوئے رنگ برنگے کھلونے رابرٹ کے اردگرد بکھر گئے تھے۔ اس نے اپنا زخمی سر دونوں ہاتھوں میں تھامے تھامے شامیر کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا رابرٹ؟'' شامیر نے چلانے والے انداز میں کہا۔

''وہ ..... ابھی..... ادھر ہی ہے۔'' رابرٹ نے آنکھوں سے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بمشکل کہا۔

شامیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پہلے الماری کو رابرٹ کے اوپر سے ہٹائے یا پہلے اس جانب دیکھے جدھر رابرٹ نے اشارہ کیا تھا۔ جونہی وہ اس کے اشارے کی جانب بڑھا، ایک پرچھائیں سی کسی گوشے سے نکل کر اس پر جھپٹی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ شامیر اپنا دفاع کرسکتا۔ دھکا لگنے سے وہ صوفے پر جا گرا۔ تاہم اس نے حملہ آور کو دوسرا موقع نہیں دیا۔ یہ کوئی نوجوان ہی لگتا تھا۔ قد کافی لمبا تھا۔ مقامی غنڈوں اور اٹھائی گیروں کی طرح اس نے اپنا چہرہ دودھیا رنگ کے ایک اسکائی ماسک میں چھپا رکھا تھا۔ وہ دوبارہ شامیر پر جھپٹا تو شامیر نے دائیں ٹانگ سیدھی اس کے چہرے پر رسید کی۔

''یو باسٹرڈ.....'' حملہ آور نے شامیر پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور اس سے لپٹ گیا۔

پندرہ بیس سیکنڈ تک دونوں گتھم گتھا رہے۔ شامیر کوئی کمزور حریف نہیں تھا، حملہ آور کو جواب میں دو چار کراری ضربیں سہنا پڑیں۔ پھر اچانک شامیر پشت کے بل ایک دیوار سے ٹکرایا، کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور تاریکی چھا گئی۔ حملہ آور نے اس تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر کو دوڑ لگا دی..... شامیر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اس کے پیچھے لپکا مگر شامیر کے سڑک پر پہنچنے تک وہ کہیں اوجھل ہوچکا تھا۔ شامیر واپس رابرٹ کی طرف لپکا۔ موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا، رابرٹ الماری کے نیچے سے نکلنے میں تقریباً کامیاب ہوچکا تھا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ شامیر کی مدد سے پوری ہوگئی۔ شامیر کو یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ رابرٹ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا ہے۔ اس کے جسم پر اور بھی چوٹیں تھیں مگر سر کی چوٹ شدید تھی۔

لائٹ آف ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شامیر کے ٹکرانے سے بجلی کے مین سوئچ کو نقصان پہنچا تھا۔ رابرٹ نے بیٹری سے چلنے والا ایک بڑا لیمپ روشن کردیا۔ شامیر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا تھا مگر اس نے انکار کردیا۔ شامیر نے وہیں پر اسے فرسٹ ایڈ دی۔ اس کے سر کا خون بند کیا۔ شامیر کی اپنی کمر پر بھی کافی چوٹ آئی تھی اور اسے محسوس ہو رہی تھی مگر وہ فی الحال اسے نظرانداز کیے ہوئے تھا۔

''کیا تم پولیس کو اطلاع دینا چاہتے ہو؟'' شامیر نے پوچھا۔

''نہیں..... کوئی فائدہ نہیں۔ مزید پریشانی ہوگی۔ خدا کا شکر ہے جان بچ گئی ہے۔''

''لیکن یہ کون تھا؟ کیا چاہتا تھا؟''

''کون ہے..... کا تو ٹھیک سے پتا نہیں۔ مگر چاہتا یقیناً یہی تھا کہ مجھے مارا پیٹا جائے، ہراساں کیا جائے۔ شاید یہ زویا کا شوہر ہونے کی سزا ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟''

''ایک دو دفعہ چھوٹے موٹے واقعات ہوئے

ہیں۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"یہ لمبے قد کا شخص..... نام تو یقیناً نہیں تھا۔"

"نام نہیں تھا مگر اس کا کوئی ساتھی تو ہوسکتا ہے..... ویسے بھی..... صرف نام ہی کے ساتھ تو اس کا "ایفیز" نہیں تھا۔" اس نے کراہتے ہوئے عجب دل گرفتہ لہجے میں کہا..... اور بچی کے کھلونوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

شامیر نے اسے منع کیا اور خود کھلونے سمیٹ کر ایک الماری میں رکھے۔ رابرٹ کی ہلکی نیلی آنکھوں میں چبھتی ہوئی نمی نے اسے تڑپا دیا۔ رابرٹ نے اسے بتایا۔ "غلطی میری ہی تھی۔ میں اندرونی دروازہ لاک کرنا بھول گیا تھا۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ "میں آج کل ایک مسلمان عالم کی لکھی ہوئی دینی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ سات بجے کے قریب اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ اسی دوران میں وہ دیوار پھاند کر اندر آیا اور جونہی موقع ملا، مجھ پر پل پڑا۔ شاید وہ زیادہ نقصان پہنچاتا مگر اسی دوران میں تم نے فائرنگ بجادی۔"

شامیر نے تھوڑی سی کوشش سے گھر کی بجلی بحال کردی۔ رابرٹ کے ہاتھوں پر بھی گہرے زخم آئے تھے اور کئی چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ اس نے لنگڑاتے ہوئے پورے گھر کا چکر لگایا۔ شامیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بظاہر گھر سے کوئی چیز اٹھائی نہیں گئی تھی۔ ہاں توڑ پھوڑ ضرور ہوئی تھی۔

شامیر نے رابرٹ کی ایک دو مزید چوٹوں پر بینڈیج کی۔ بینڈیج کے لیے کاٹن لینے کے لیے وہ بالائی منزل پر گیا تو وہاں ایک کمرے میں اس کی نظر زویا کی ایک کافی بڑی فریم شدہ تصویر پر پڑی۔ یہاں بھی وہ پینٹ شرٹ میں تھی۔ اس کے گھنے اور غیر معمولی طور پر لمبے بال جو اس کی شخصیت کو بہت نکھارتے تھے، نئے فیشن کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں بدل چکے تھے۔ شامیر کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ دھیان سے اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کی شادابی وہی تھی۔ وہ مشرقی اور مغربی حسن کا دلنواز امتزاج تھی۔ سرخ و سپید رنگت میں ایک خوبصورت سا گندمی پن بھی شامل ہوگیا تھا۔ پتا نہیں کیوں شامیر کی سماعت میں زویا کا ایک بھولا بسرا فقرہ گونج گیا..... فرینکفرٹ کی سیر کے دوران میں یہ فقرہ اس نے اپنی مادری اردو میں کہا تھا۔ "شومیر! کبھی کبھی مجھ کو لگتا کہ میں ڈور کے بجائے نزدیک کی تصویر میں زیادہ آچھا تا ہیں لگتا۔"

شامیر نے فوراً اس کے خیال کو رد کیا تھا۔ اس نے ایک دراز

قارئین متوجہ ہوں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان میں کچھ عرصے سے مختلف مقامات سے یہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پر پرچا نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں قارئین کی مشکلات دور کرنے کے لیے ادارے کے پاس صرف دو طریقے ہیں۔

1۔ آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کرکے اپنا پرچہ بک کروالیں

یا

2۔ ادارے کو 1200 روپے بھیج کر سالانہ خریدار بن جائیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ گھر پر ہی وصول کریں۔

(رجسٹرڈ ڈاک سے ڈائجسٹ آپ کے پتے پہنچنے کا فرق 14 روپے ماہانہ ادا کرنا ہوگا)

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

فون نمبر (021)35895313-35804200

سے کان لی اور ایک آہ سی بھر کر پلٹ آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی نگاہ ایک سی سی ٹی وی کیمرے پر پڑی۔ بالکل چھوٹے سائز کا ایک ایسا کیمرا اسے گھر کے بیک یارڈ میں بھی نظر آیا تھا۔ مقامی طور پر گھروں اور شاپس میں ایسے کیمرے عام نظر آتے تھے۔

رابرٹ کی بینڈ ایج کرتے ہوئے شامیر نے ایک بار پھر اسے مشورہ دیا کہ وہ اگر مناسب سمجھتا ہے تو پولیس کو انفارم کردے۔ اس کے کیمروں میں فوٹیج وغیرہ بھی موجود ہوگی، بہرحال رابرٹ نہیں مانا۔ لگتا تھا کہ اسے حوصلہ نہیں ہو رہا۔

اس کی بینڈ ایج کے بعد شامیر نے اسے پین کلرز کھلائیں اور اس کے پاس بیٹھ کر اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اس نے رابرٹ کو بتایا کہ وہ اپنے طور پر کس طرح زویا کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شامیر کی باتوں اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں سن کر رابرٹ متاثر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک موہوم سی امید نظر آنے لگی۔ یوں لگا کہ وہ وقتی طور پر..... کچھ دیر پہلے پیش آنے والے سنگین واقعے کو بھی بھول گیا ہے۔

☆☆☆

شامیر ہوٹل میں آکر چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حملہ آور کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی کمر پر چوٹ آئی تھی۔ بنیان کی کھنچاہٹ سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ تھوڑا بہت خون بھی رسا ہے۔ وہ اموخالہ کو اس بارے میں بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں فارہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر چوٹ پر مرہم پٹی کی ضرورت ہوتی تو وہ کرسکتی تھی۔

فارہ ساتھ والے کمرے میں اموا اور انشاں کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ تین بیڈز کا کشادہ کمرا تھا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اموا دوا کھا کر سو چکی تھیں۔ انشاں اور فارہ جاگ رہی تھیں۔ شامیر نے فارہ کو ضروری بات کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں بلالیا۔ شامیر کی قمیص کا پھٹا ہوا گریبان دیکھ کر فارہ کچھ چونکی۔ شامیر نے اسے سارے واقعے سے آگاہ کردیا۔ نامعلوم حملہ آور سے دھینگا مشتی کا سن کر وہ کچھ خوفزدہ بھی ہوئی۔ اس نے اوپر تلے کئی سوال جڑ دیے۔

پھر وہ اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی۔ ''دیکھیں اب ہمیں پتا تو چل گیا ہے کہ وہ کس قماش کی لڑکی تھی۔ اب آپ دفع کیوں نہیں کردیتے اس سارے معاملے کو؟''

شامیر نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو ہے فارہ! اب مجھے زویا سے زیادہ تجسس اس بچی کے سلسلے میں ہے جسے اس کے باپ سے جدا کردیا گیا ہے۔ اس بے چارے کی حالت قابلِ رحم ہے۔''

شامیر نے اب اپنی قمیص اور بنیان اتار دی تھی۔ فارہ نے اس کی پشت کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چوٹ آئی ہے اور کٹ بھی لگا ہے محترم جیمز بانڈ صاحب۔''

اس نے پائیوڈین سے اس کا زخم صاف کیا اور بینڈ ایج میں مصروف ہوگئی..... ساتھ ساتھ وہ گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، گھر میں گھسنے والا کون ہوسکتا ہے؟''

''ابھی کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک بالکل ہی علیحدہ معاملہ ہو۔''

فارہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بڑی نرمی اور ملائمت سے شامیر کی کمر پر حرکت دے رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم کھنکھناہٹ شامیر کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ یہاں جرمنی پہنچ کر جب سے زویا کے بارے میں اوپر تلے منفی انکشافات ہونا شروع ہوئے تھے، شامیر کے دل کا موسم بھی کچھ بدل سا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب اپنے آس پاس فارہ کی موجودگی اسے اتنی بری نہیں لگتی تھی جتنی پہلے۔ وہ اب واضح طور پر جان چکا تھا کہ اس کے حوالے سے فارہ اپنے اندر رومانی جذبات رکھتی ہے..... اور یہ بھی اچھی طرح جان گیا تھا کہ اموخالہ اس معاملے سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ زندگی میں کبھی اموخالہ کی دل شکنی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اپنی اور فارہ کی عمروں کا فرق بھی اس کے سامنے تھا..... پھر دوسری بات زویا کی یاد کا کانٹا تھا جو اس کے دل میں اترکر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار تو اس کا سامنا ضرور کرنا چاہتا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے؟'' فارہ اس کی پشت پر کھڑے کھڑے بولی۔

''فارہ! کسی وقت سوچتا ہوں، کہیں ہمارے سامنے کوئی اسموک اسکرین ہی ہو۔ کیا پتا زویا کے سلسلے میں جو کچھ ہمارے سامنے آرہا ہے، وہ اس طرح نہ ہو جس طرح ہمیں لگ رہا ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ اس کی چوٹ پر میڈیکل ٹیپ چپکاتے ہوئے بولی۔

''کئی دفعہ چیزیں اس طرح نہیں ہوتیں جس طرح نظر آرہی ہوتی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''اور کئی دفعہ اس سے کہیں زیادہ بری ہوتی

ہیں جس طرح نظر آرہی ہوتی ہیں۔'' فارہ نے بظاہر نرم شائستہ لہجے میں کہا تھا لیکن وہ چونکہ شامیر کی پشت پر کھڑی تھی لہٰذا وہ اس کے نہایت کڑوے غصیلے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ یہ غصہ یقیناً زویا کے لیے ہی تھا جو اس بری طرح آشکار ہونے کے بعد بھی شامیر کے ذہن سے نکل نہیں پارہی تھی۔

''فارہ! ویسے کسی وقت میرے ذہن میں آتا ہے کہ اگر زویا.....''

''ارے، یہ دیکھیں۔'' فارہ نے موضوع بدلنے کے لیے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''کیا ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''آپ کے دائیں کندھے کے نیچے بالکل ساتھ ساتھ دو تل ہیں۔ بالکل..... بالکل اسی طرح جس طرح میرے ہیں۔'' اس نے ذرا رک کر کہا۔

''عجیب بات ہے۔'' شامیر نے کہا۔

''آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ ٹھہریں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ پیچھے موڑ کر تیزی سے اپنی ''بکنی'' کی ڈوری کھولی اور آگے آکر کمر شامیر کے سامنے کردی۔

اس کی کمر اور اس کا ایک پہلو آگے تک نظر آرہا تھا۔ زیریں لباس جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ بے باکی سے مڑ کر شامیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شامیر اس کے نیم بدن سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تل..... تو ہیں۔''

''تل ہیں اور بالکل آپ ہی کی طرح کے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں جذبات کو بھڑکانے والی شوخی دکھائی دے رہی تھی۔

شامیر نے جلدی سے منہ پھیرا اور الماری سے اپنے لیے دوسری قمیص نکالنے لگا۔

☆☆☆

شامیر ایک بار پھر فارہ کے ساتھ زویا کے ''تلاش مشن'' پر تھا۔ افشاں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی لہٰذا آج وہ شامیر اور فارہ کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس قسم کی صورتِ حال فارہ کو زیادہ بھاتی تھی کہ جب وہ اور شامیر کہیں اکیلے ہوتے تھے۔ حسبِ پروگرام انہوں نے ایک قریبی قصبے ''گوڈال مین'' میں منعقد ہونے والا ایک ورائٹی شو دیکھا جس میں میوزک کا تڑکا بھی تھا اور کئی علاقائی بینڈز پرفارم کر رہے تھے۔ یہ سنڈے کا دن تھا۔ ورائٹی شو دوپہر چار بجے کے قریب ختم ہوگیا۔ فارہ اصرار کر کے شامیر کو ایک سنیما میں لے گئی۔ یہاں ایک سنسنی خیز ہارر فلم تھری ڈی میں دکھائی جارہی تھی۔ ہال کی نیم تاریکی میں جب بھی کوئی خوفناک سین آتا وہ اپنی انگلیاں شامیر کے بازو کے گوشت میں پیوست کردیتی۔ کسی وقت اپنا سر اس کے کندھے پر ڈال دیتی۔ انٹرول کے وقت اس نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی۔ نشستوں کی پانچ چھ قطاریں چھوڑ کر اسے جو چہرہ نظر آیا، وہ اس کے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھا۔ وہ زویا کا چہرہ تھا، وہ نیچے جھک کر ایک چھوٹی بچی کے بوٹوں کے تسمے باندھ رہی تھی۔ شاید وہ فلم شروع ہونے کے بعد ہال میں داخل ہوئی تھی ورنہ عین ممکن تھا کہ اس سے پہلے ہی اس کی یا شامیر کی نظر اس پر پڑ جاتی۔

فارہ نے جلدی سے اپنا رخ اسکرین کی طرف کرلیا۔ چند سیکنڈ میں اس کے جسم کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا تھا۔ وہ کئی روز سے شامیر اور افشاں کے ساتھ مل کر زویا اور نام کو تلاش تو کر رہی تھی مگر ہر لحظہ خوفزدہ بھی تھی کہ کہیں ان میں سے کوئی مل ہی نہ جائے اور..... آج یہ ہوگیا تھا۔ شامیر پچھلے تین چار منٹ سے فون پر امو سے بات کرنے میں مصروف تھا..... اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک اور اچھا کام ہوا۔ ہال کی روشنیاں ایک بار پھر آف ہوگئیں۔ فلم شروع ہورہی تھی مگر جو فلم فارہ کے اندر شروع ہوئی تھی اس نے سب کچھ تہ و بالا کردیا تھا..... جس کی تلاش میں شامیر مارا مارا پھر رہا تھا، وہ اس کے عقب میں صرف چند میٹر کے فاصلے پر موجود تھی..... ہاں یہ وہی تھی۔

تین چار منٹ بعد فارہ، شامیر سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''میں ذرا واش روم تک جانا چاہ رہی ہوں۔''

''میں ساتھ آؤں؟'' شامیر نے کہا۔

''نہیں، آپ بیٹھیں۔ بس ایک منٹ میں آئی۔''

وہ تیزی سے واش روم تک پہنچی۔ اپنے عقب میں دیکھ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور بڑے ہراساں لہجے میں امو پر انکشاف کیا کہ اس نے ابھی چند منٹ پہلے کیا دیکھا ہے۔

امو کے لب و لہجے میں بھی شدید تشویش ابھر آئی۔ وہ کانپتی ہوئی سی آواز میں بولیں۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ وہی ہے؟''

''ون ہنڈرڈ اینڈ ون پرسینٹ امو! اس کی بچی بھی ساتھ ہے۔ کسی اور کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں چلا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ شو ختم ہونے پر بہت زیادہ امکان ہوگا کہ شامیر اسے دیکھ لے۔''

''ہاں امو! یہ زیادہ بڑا ہال نہیں ہے.....''

''اچھا ایک کام کرو۔'' امو نے تیزی سے اس کی

بات کاٹی۔ ''ابھی وہاں سے نکل آؤ۔ کوئی بھی بہانہ کردو..... کہہ دو کہ طبیعت خراب ہے۔''

''بس یہی بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' فارہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

دو منٹ بعد فارہ واپس شامیر کے پاس موجود تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پچھلی نشستوں پر کچھ دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی واضح نظر نہیں آیا تھا۔

شامیر نے اسکرین سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ متلی سی محسوس ہورہی ہے۔''

''تو پھر؟''

''میرا خیال ہے کہ..... چلتے ہیں۔''

شامیر کے لیے یہ جواب غیر متوقع تھا مگر فارہ کافی اکھڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس حالت میں فلم کیا دیکھی جاسکتی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''اوکے تو چلتے ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بائیں جانب والے دروازے کی طرف سے نکلنا چاہتا تھا لیکن فارہ دائیں جانب کے اگلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ شامیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ ایک دروازہ بند ہو تو ایک دروازہ کھل بھی جاتا ہے۔ فارہ اور امو نے شامیر کے لیے ایک دروازہ بند کیا تھا، تین چار روز بعد ایک اور راستہ شامیر کے لیے کھل گیا۔ وہ فیس بک پر زویا کی فرینڈ دراز قد جین کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ پیڈربورن سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ کیسل نام کے اس شہر کا فاصلہ پیڈربورن سے 80 کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ آدھا فاصلہ شامیر نے طے کیا اور آدھا جین نے..... اسی روز سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ وہ دونوں ایک خوبصورت جھیل کے کنارے ایک ٹہلنے سے جرمن گاؤں میں موجود تھے اور ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ریستوران کی بالکونی سے دور تک پون چکیوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔ جین کے لمبے گھنگرالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہوگئی تھی اور جسمانی لحاظ سے متوازن لگنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی نظر آرہی تھی۔ پچھلے دس پندرہ منٹ میں وہ دونوں بہت سی تمہیدی اور رسمی باتیں کرچکے تھے اور اب اصل موضوع پر آچکے تھے۔

جین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''وہ م سے محبت کرتی تھی شامیر..... بہت زیادہ لیکن جب تم دونوں میں اختلاف ہوا اور تم اسے چھوڑ کر چلے گئے تو..... وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو گے اور کچھ نہیں تو تمہارا کوئی میسج ہی آجائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسے بہت دکھ تھا کہ تم نے اس کی والدہ پر ہاتھ اٹھایا، انہیں زخمی کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کا غصہ کم ہوگیا تھا اور وہ تمہیں اس پر بھی معاف کرنے کو تیار تھی لیکن تم دونوں میں کبھی رابطہ ہی نہیں ہوسکا۔ میرے پاس بھی تمہارا کوئی کونٹیکٹ نہیں تھا ورنہ میں ہی تم سے بات کرنے کی کوشش کرتی۔'' پھر اس نے ذرا رک کر دھیان سے شامیر کو دیکھا اور بولی۔ ''ویسے تمہارے پاس تو میرا رابطہ نمبر موجود تھا۔ تم نے بھی کبھی رابطے کی کوشش نہیں کی۔''

''نہیں جین! میرے پاس تمہارا رابطہ نمبر نہیں تھا، ہوتا تو شاید.....''

وہ اسے غور سے دیکھ کر بولی۔ ''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ نہیں تھا۔''

نفی میں سر ہلاتے ہوئے شامیر نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''جین ڈیئر! گزری باتوں کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمیں موجودہ حالات پر بات کرنی چاہیے۔ میں..... یہاں آکر بے حد مایوس ہوا ہوں۔ جین کاش! میں یہاں نہ ہی آتا تو بہتر ہوتا، وہ جو ایک خوبصورت تصور تھا اس کے بارے میں وہ تو برقرار رہتا۔ وہ ساری دلگداز یادیں تو تہس نہس نہ ہوتیں۔''

جین نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ''شامیر! میں اس کے موجودہ حالات کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ تم سے بریک اپ ہونے کے بعد وہ کچھ الگ تھلگ سی ہوگئی تھی۔ رہی سہی کسر اس دوسرے واقعے نے پوری کردی جس میں اس کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی اور اس کی والدہ سلادہ سخت زخمی ہوئیں۔ اس واقعے کے بعد تو وہ اپنے فرینڈز اور دیگر ملنے جلنے والوں سے بالکل کٹ سی گئی تھی..... پھر وہ لوگ ویسے ہی میونخ سے نکل کر ایسن چلے گئے۔ پھر ایک دفعہ خشامہ کی زبانی مجھے اس کی شادی کی خبر ملی تھی..... اور مجھے صدمہ ہوا تھا۔ میں پھر کہوں گی اس نے پہلی بار جس شخص کو چاہا وہ تم تھے شامیر!''

''یہ کیسی چاہت تھی جین! جو ایک چھوٹی سی غلط فہمی دور نہ کرسکی، ایک چھوٹی سی قربانی نہ دے سکی اور ایک چھوٹا سا

رابطہ نہ کرسکی ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے کبھی اس کی محترم والدہ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا..... نہ ہی کبھی میں نے اپنے اندر یہ ضد پالی تھی کہ میں نے شادی کے بعد اسے پاکستان میں ہی رکھنا ہے۔ ایک بار ہم دونوں ایک ہو جاتے پھر سو راستے نکل سکتے تھے۔ ہین ممکن تھا کہ کچھ عرصہ پاکستان میں رہ کر میں امو خالہ اور فارہ سمیت یہاں آ کر ''سیٹل'' ہو جاتا..... لیکن خیر..... اب تو یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ اب یہاں کے حالات دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ جو ہوا شاید ٹھیک ہی ہوا۔''

شامیر نے جین کو زویا کے بارے میں ساری بات تو نہیں بتائی تھی تاہم اتنا بتا دیا تھا کہ اپنے شوہر، اعلیٰ خاندان کے رابرٹ لوئیس کے ساتھ بھی اس کی نہیں بنی..... اور وہ اس کی بچی کو لے کر غائب ہو چکی ہے۔

جین کتنی ہی دیر گم صم رہی۔ اس کی آنکھوں میں جھیل جیسی گہرائی تھی اور ذہانت و معاملہ فہمی کی غیر معمولی چمک تھی، وہ بولی۔ ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہم واقعات کو بھول جاتے ہیں لیکن واقعات ہم کو نہیں بھولتے..... جو ہم کہتے ہیں، سنتے ہیں اور کرتے ہیں، وہ بہت دیر تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور شامیر کی طرف دیکھ کر ڈرامائی لہجے میں کہنے لگی۔ ''برادر شامیر! تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے کسی پاکستانی سیاستدان کی خفیہ پراپرٹی والا معاملہ پیش آیا تھا۔ اس معاملے کی تحقیق زویا کی طرف سے ہی شروع ہوئی تھی اور تمہاری جرمنی آمد بھی اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔''

شامیر نے چونک کر جین کی طرف دیکھا۔ ''جین! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ اسی کھوئے کھوئے موڈ میں بیٹھی رہی اور کولڈ کافی کے مگ کے کنارے کو انگلی سے سہلاتی رہی۔ گمشدہ آواز میں بولی۔ ''پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہتی ہے کہ زویا اور اس کے گھر والوں نے بہت کچھ چھپایا ہے..... بہت زیادہ چھپایا ہے۔ یہ سب کچھ ویسے نہیں ہے جیسے نظر آتا ہے۔''

''کیا ویسے نہیں ہے؟''

''شاید بہت کچھ..... کم از کم ایک واقعہ تو ایسا ہے جس کے بارے میں، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اس طرح نہیں تھا جس طرح نظر آیا۔''

''کون سا واقعہ؟''

''بظاہر چھوٹا سا واقعہ ہے۔ یقیناً تمہیں یاد ہی ہوگا۔ چار سال پہلے جب تم یہاں تھے تو زویا کی کار کا کسی دوسری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ گاڑی سے نکلنے والی عورتوں نے زویا کو بے دردی سے زدوکوب کیا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ زویا کو مارنے والی سیاہ فام عورتوں میں سے ایک کو میں جانتی ہوں اور اسی بنا پر یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا تھا اور زویا کو سزا دی گئی تھی۔''

شامیر سناٹے کے عالم میں جین کی بات سن رہا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ''تم کہنا چاہ رہی ہو کہ اس واقعے کا تعلق پاکستانی سیاستدان کی پراپرٹی والے واقعے سے ہے؟''

''اس ''ایکسیڈنٹ'' کی حد تک تو میں یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں۔''

ایک عجیب سا سناٹا ان دونوں کے درمیان سنسناتا رہا۔ ہوا بہتی رہی اور تراشی ہوئی سرسبز پہاڑی ڈھلوانوں پر طویل قطار میں لگی ہوئی پون چکیاں حرکت کرتی رہیں۔

کئی سیکنڈ بعد شامیر نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ ''اور باقی واقعات کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟''

''ان کے بارے میں..... بس..... اتنا کہہ سکتی ہوں کہ..... زویا، اس کی والدہ اور دیگر گھر والے پورا سچ نہیں بتا رہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ باقی واقعات بھی سیاستدان والے واقعے سے منسلک ہوں گے..... مگر ان میں بھی کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

شامیر کے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اونچی ناک اور بھنگرالے بالوں والی جین کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ''میری معلومات کے مطابق زویا کی والدہ آج کل سرحدی شہر ایسن میں کہیں رہتی ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ..... مجھے ان سے ملنا پڑے گا۔''

''پتا نہیں کہ تمہارا ان سے ملنا ٹھیک رہے گا یا نہیں۔'' جین کے لہجے میں اندیشہ تھا۔

کچھ اندیشے تو شامیر کے ذہن میں بھی تھے مگر وہ اس حوالے سے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور جب وہ فیصلہ کر لیتا تھا تو پھر اندیشوں اور مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

☆☆☆

شامیر بذریعہ انٹرسٹی ٹرین، پیڈربورن سے ''ایسن'' کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ نہایت آرام دہ، برق رفتار ٹرین جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کھڑکیوں سے باہر سرسبز دیہات اور چھوٹے بڑے قصبوں کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے مگر شامیر اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ جین کی اس بات نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچادی تھی کہ جس روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں کچھ عورتوں نے زویا سے مار پیٹ کی تھی اور اس کا بازو توڑا تھا، وہ اتفاقیہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے وہ تکلیف تھی جو تفتیشی رپورٹ کے نتیجے میں پاکستانی سیاست دان سہراب درانی کو پہنچی تھی۔ جیسا کہ شامیر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تفتیشی رپورٹ کے منظرِ عام پر آنے کے دوران میں ہی سہراب درانی کے خلاف بہت سے مزید مقدمات کی بھرمار ہوگئی تھی اور پھر پاکستان میں اسے جیل جانا پڑ گیا تھا..... وہ اب تک جیل ہی بھگت رہا تھا۔ تو کیا اس نے وہاں پاکستانی جیل میں ہوتے ہوئے بھی ایک صحافی خاتون کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا تھا اور اگر اس نے واقعی بنایا تھا تو پھر شامیر کو کیوں چھوڑ دیا تھا جو وہیں پاکستان میں موجود تھا اور سہراب درانی کو آسانی سے دستیاب بھی تھا؟ دوسرا سوال شامیر کے ذہن میں یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر زویا یا اس کی فیملی کسی قسم کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنی تھی تو پھر انہوں نے کوئی قانونی کارروائی کیوں نہیں کی؟ زویا نے اس چینل سے مدد کیوں نہیں مانگی جس کے لیے وہ کام کر رہی تھی؟ بے شک بعد میں زویا نے چینل بدل لیا تھا لیکن یہ سہراب درانی والا معاملہ تو ڈبل اے چینل سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ ایسے ہی کئی سوالات اس کے ذہن میں مسلسل کلبلاتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ طویل سفر کر کے جرمنی کے اس سرحدی شہر ایسن میں پہنچ گیا۔

یہ دھواں دھار بارش والی ایک تاریک شام تھی۔ رہ رہ کر بجلی کڑکتی تھی اور آسمان سے چھاجوں پانی برسنے لگتا تھا۔ شامیر جانتا تھا کہ پیڈربورن میں اموخالہ اور فارہ بہت پریشان ہیں۔ اس نے فون پر ہی انہیں تسلی دی تھی اور بتایا تھا کہ اسے ضروری کام سے فوری طور پر ''ایسن'' جانا پڑ گیا ہے..... کل تک لوٹ آئے گا۔

زویا کی والدہ سارہ جیم کا مکمل ایڈریس اسے ان کے داماد رابرٹ لوئیس سے ہی معلوم ہوا تھا۔ رابرٹ سے ہی اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ زویا کی والدہ اور اس کے دوسرے شوہر میں باہمی رضامندی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور اب وہ اپنی منجھلی بیٹی کے ساتھ اکیلی ہی رہ رہی ہے۔

چھتری شامیر کے پاس موجود تھی مگر بارش ایسی تند و تیز تھی کہ وہ ٹیکسی سے اتر کر سارہ جیم کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے بری طرح بھیگ گیا۔ یہ ایک ڈھلوان پر بڑی سرسبز لیکن خاموش سی آبادی تھی۔ سارہ جیم کا مخروطی چھتوں والا گھر باقی آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ بالکونیوں میں ٹیولپ اور گلاب کے پھول بارش کی بوچھاڑوں میں بکھرتے محسوس ہوتے تھے۔ شامیر نے سوچا، یہی وہ گھر ہے جہاں سے ایک روز زویا دلہن بن کر رابرٹ کے ساتھ پیڈربورن روانہ ہوئی ہوگی۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ اس نے کال بیل دی۔ کچھ دیر بعد ایک کھڑکی میں روشنی ہوئی اور ایک سرو قد لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ دبلی پتلی اور کافی کمزور نظر آرہی تھی، اس کے باوجود اس میں زویا کی خاصی مشابہت موجود تھی۔ شامیر کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی زویا کی منجھلی بہن حولیہ ہے۔ پہلے لڑکی نے جرمن میں کچھ کہا لیکن جب یہ دیکھا کہ شامیر سمجھ نہیں پا رہا تو انگلش میں بولی۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

شامیر نے کہا۔ ''معاف کیجیے، ایسے موسم میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میں مسز سارہ جیم سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ان کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔''

اس سے پہلے کہ لڑکی کچھ کہتی یا مزید سوال پوچھتی، ایک وہیل چیئر دکھائی دی..... یہ چیئر کسی اندرونی کمرے سے نکل کر برآمدہ نما جگہ پر آئی تھی۔ اس پر فربہ اندام سارہ جیم موجود تھی۔ پچھلے چار سال میں وہ پہلے سے زیادہ فربہ اور شاید سخت گیر بھی ہوگئی تھیں۔

کڑے تیوروں کے ساتھ انہوں نے شامیر کی طرف دیکھا اور وہیں سے بولیں۔ ''کون ہو؟ کس سے ملنا ہے؟''

لڑکی نے اسے راستہ دیا تھا اور اب وہ گھر کے مختصر سے صحن میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''آنٹی جان! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں پاکستان سے شامیر ہوں۔ چینل کے ایک کام سے یہاں آیا ہوا ہوں۔ سوچا آپ سے ملتا جاؤں۔''

سارہ جیم جیسے دم بخود سی ہوگئیں۔ کئی سیکنڈ کے توقف کے بعد وہ بولیں۔ ''اب تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ کیا کوئی کسر رہ گئی تھی جسے پورا کرنا چاہتے ہو؟''

وہ ذرا آگے بڑھ کر بولا۔ ''میں آپ سے ایک گزارش کرنے آیا ہوں آنٹی جان! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ اپنی بیٹی مسز زویا لوئیس کے لیے کچھ پریشان ہیں..... اگر آپ.....''

(جاری ہے)

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بنی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بنی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بنی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلابی جازوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرت کی فضاؤں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھیرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپانے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

تیسرا حصہ



بے رخی سے بولی اور اس کا زرد چہرہ سرخی مائل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد شامیر کی شائستہ گفتگو سے اس کا موڈ کچھ بحال ہوا۔ تاہم لہجے کی بیزاری برقرار تھی۔ وہ بولی۔ "یہاں کے حالات میں تمہیں کیا بتاؤں۔ یہ ویسے ہی ہیں جیسے تم نے زویا کی فرینڈ جین سے سن لیے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ پہلے تم زویا کو اجاڑ پجاڑ کر چلے گئے۔ پھر میوخ میں ماما کے ہاں ڈکیتی کی واردات ہو گئی۔ اس میں ماما کی دونوں ٹانگوں میں چھ گولیاں لگیں۔ مالی نقصان کے علاوہ یہ جانی نقصان بھی بہت پریشان کن تھا۔ علاج پر پانی کی طرح پیسہ خرچ ہوئے۔ ایک وقت میں تو ہمارے لیے اپنے "بریڈ وِنر" کا انتظام بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں زویا کے شوہر رابرٹ نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ اس کا احسان ہم بھول نہیں سکتے۔"

شامیر نے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں لیکن جو کچھ مجھے پتا چلا ہے اس کے مطابق تو زویا اپنے شوہر کے ساتھ بھی خوش نہیں ہے۔"

"میاں بیوی میں ایسے تنازعات ہوتے ہی رہتے ہیں اور اس میں بھی زیادہ قصور شاید زویا کا ہی ہے۔ بہرحال یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ مجھے ان پر ڈسکس کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔"

شامیر نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اتنی بڑی واردات ہو گئی، آنٹی سارہ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی مگر آپ لوگوں نے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی بلکہ خاموشی سے میوخ چھوڑ کر یہاں اس دور دراز جگہ چلے آئے؟"

"کارروائی چل رہی ہے۔۔۔ یہاں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہو گی۔ جلد ہی انصاف ملے گا۔" زویا کی بہن نے مختصر جواب دیا۔

"ابھی تک کوئی مجرم پکڑا بھی گیا یا نہیں؟"

"ایک دو بندے پکڑے گئے ہیں۔ بڑا مجرم ملک سے باہر ہے مگر وہ بھی گرفتار ہو گا۔" حولیہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی تک پہنچ کر اس نے باہر جھانکا۔ نکی چمکی اور ٹیلوں پر بارش کی بوچھاڑیں دور تک نظر آئیں۔

وہ شامیر کی طرف گھوم کر بولی۔ "ریفریجریٹر میں کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں مگر کسی طرح کی آواز پیدا نہ کرنا اور لائٹ آف رکھنا۔ ماما ساتھ والے کمرے میں سو رہی ہیں۔ وہ جاگ گئیں اور انہیں پتا چل گیا کہ تم یہاں ہو تو ایک قیامت کھڑی کر دیں گی۔"

"بہت شکریہ۔۔۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"پلیز خاموش رہو۔" حولیہ نے بیزاری سے شامیر کی بات کاٹی۔ "اور میری بہت نہ تجزیہ انہ آج ہے کہ اب دوبارہ ادھر کا رخ کر کے ہماری مشکلوں میں اضافہ نہ کرنا۔ یہ ہمارے لیے اچھا ہو گا اور نہ تمہارے لیے۔ ماما آٹھ بجے اٹھتی ہیں۔ سات بجے تک تم ہر صورت یہاں سے نکل جانا۔"

وہ بے رخی سے باہر نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق شامیر نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ اب بس آتش دان کی مدھم روشنی تھی۔ وہ اس کے سامنے ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور موجودہ سچویشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ زویا کی والدہ سارہ جیم سے مل کر شامیر کو پہلے سے زیادہ محتاط اور چوکنی ہو چکی تھیں۔ غالباً وہ الکحل بھی بہت زیادہ لے رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ خاوند سے علیحدگی بھی ہو گی لیکن زیادہ اہم وجہ وہی زویا والے معاملات تھے۔ اب بھی برتن اور گلاس وغیرہ کے ٹکرانے کی مدھم آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ آوازیں اسی کمرے کی طرف سے آ رہی تھیں جس میں جیم موجود تھیں۔

کچھ دیر بعد یہ آوازیں تھم گئیں اور بارش کے شور کے علاوہ خاموشی چھا گئی۔ اندازہ ہوا کہ اپنے آپ میں کھولتی اور چیختی ہوئی وہ عورت دوبارہ سو گئی ہے۔

یورپ کے اکثر گھروں کی طرح یہ قدرے قدیم گھر بھی زیادہ تر لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ شامیر کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کسی طرح سے کچھ مزید معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھے بیٹھے شامیر کو اونگھ آئی اور پھر وہ سو گیا۔

وہ کندھے پر لگنے والی ایک شدید ضرب کی وجہ سے جاگا تھا۔ اس کے کانوں میں قیامت کا شور تھا۔

ایک طوفان گھر سے باہر بپا تھا اور ایک گھر کے اندر۔ اس نے اپنے سامنے سارہ جیم کو دیکھا۔ وہ وہیل چیئر پر تھیں اور ان کے ہاتھوں میں بیس بال کا ایک مضبوط بیٹ تھا۔ وہ جنونی انداز میں چلا رہی تھیں اور شامیر کو ضربات لگا رہی تھیں۔ حولیہ ان کو روکنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ چار پانچ چوٹیں کھانے کے بعد شامیر نے بیٹ پکڑ لیا اور اسے سارہ جیم کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہوئے وہیل چیئر بری طرح ڈگمگا گئی اور شامیر کو لگا کہ سارہ جیم اوندھے منہ گریں گی۔ اس نے بیٹ کو کھینچنا بند کر دیا مگر اسے چھوڑا نہیں۔

سارہ جیم چلا رہی تھیں۔ "تم گندے، منحوس ہندوستانی! تم نے ہمیں برباد کر دیا۔ تم سب ایک جیسے رذیل ہو۔ تم میرے خاوند سے بڑھ کر کمینے اور وہ کتا سہراب تم سے بڑھ کر کمینہ۔ تمہاری رگوں میں گندا گھٹیا خون ہے....." وہ گالیاں دینے لگی۔

شامیر جواباً گرجا۔ "آنٹی! ہوش کرو، کیا کیا ہے میں نے؟"

شامیر کے تند سوال نے جیسے جلتی پر تیل ڈال دیا۔ آنٹی سارہ کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ جنونی آواز میں دہاڑی۔ "تم پوچھتے ہو، تم نے کیا کیا ہے؟ یہ تم پوچھتے ہو.....؟" اس سے آگے گالیوں کی ایک بوچھاڑ تھی۔ وہ دیوانہ وار چلائی۔ "تمہاری وجہ سے..... صرف تمہاری وجہ سے ہم پر یہ قیامتیں گزریں..... صرف تمہاری وجہ سے اس سور کی اولاد سہراب درانی نے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کی..... صرف تمہاری وجہ سے میری حاملہ حولیہ کو رات بھر اس کے شرابی غنڈوں نے روندا..... اسے پامال کیا۔ صرف تمہاری وجہ سے ہم اپنا منہ چھپا کر اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے..... اور تم پوچھتے ہو تم نے کیا کیا۔ تم سب پھانسی کے لائق ہو۔ تمہیں قطاروں میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دینا چاہیے۔"

اس نے ایکدم کھینچ کر بیس بال کا بیٹ شامیر کے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور پھر ایک طوفانی ضرب اس کے سر پر لگانا چاہی۔ اس مرتبہ شامیر نے یہ وار ہاتھوں پر روکا اور بیٹ کا نچلا سرا پھر پکڑ لیا۔ "فار گاڈ سیک ماما..... چپ ہو جائیں۔ فار گاڈ سیک۔"

سارہ جیم نے اپنی دائیں ٹانگ سے حولیہ کو وحشیانہ انداز میں دھکیلا۔ وہ دبلی پتلی بیمار لڑکی لڑکھڑا کر آتش دان کے قریب جا گری۔ سارہ جیم گرجی۔ "میری رائفل لے کر آ..... میں زندہ نہیں چھوڑوں گی اس کو..... اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گی۔"

وہ بیٹ شامیر کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لیے بار بار زور مارنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خوفناک واویلا کر رہی تھی۔ اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی ہیجانی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ جیسے ڈکیتی کہہ کر چھپایا جاتا رہا ہے، وہ شاید ڈکیتی نہیں تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی آبروریزی کا ذکر بھی جنونی انداز میں کر رہی تھی اور کسی وقت دائیں ہاتھ سے اپنا سینہ کوٹنا شروع کر دیتی تھی۔ اچانک اس نے اپنے ہی زور سے وہیل چیئر الٹا دی اور پہلو کے بل فرش پر جا گری۔ حولیہ چلاتی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ شامیر بھی آگے بڑھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی.....

☆☆☆

بارش جاری تھی لیکن پہلے سے کچھ ہلکی ہو چکی تھیں۔ شامیر اور حولیہ نے اپنی کرسیاں آتش دان کے قریب گھسیٹ رکھی تھیں۔ آنٹی سارہ جیم کی بے ہوشی اب نیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی..... وہ غنودگی کے عالم میں بھی بہت کرخت باتیں کر رہی تھی۔ "میری زندگی برباد کر دی۔ میری حولیہ کی زندگی برباد کر دی..... اس کے بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے مار دیا ظالموں نے....." پھر وہ پتا نہیں کیا کیا اول فول بولنے لگ جاتی تھی۔ حولیہ نے ماں کی حالت دیکھتے ہوئے اسے کچھ ٹرنکولائزر دے دیے تھے لہٰذا اب وہ خاموشی سے سو رہی تھی۔

حولیہ کا مدقوق چہرہ دکھ اور خوف کی آماجگاہ تھا۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ "مسٹر شامیر! ماما تمہیں دیکھ کر خود کو سنبھال نہ سکی۔ اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اب تک کسی کو نہیں بتایا تھا۔ شش..... شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ ابھی یہ باتیں..... میرے شوہر کو بھی معلوم نہیں۔" اس نے سسکی لی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنا زرد چہرہ اس نے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

شامیر نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے دیا۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے پھر حولیہ نے اچانک شامیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "پلیز شامیر! ہم پر رحم کرنا۔ اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہم تینوں بہنوں اور ماما کے سوا کسی کو اس سانحے کی خبر نہیں ہے....."

"حولیہ! تم بے فکر رہو۔ کوئی بھی بات میرے سینے سے باہر نہیں نکلے گی۔"

حولیہ نے آنسو بہاتے بہاتے شامیر کی جانب دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو..... ہو تو تم وہی ایشیائی جس کی بات پر اعتبار کرنا دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے مگر مجبوری ہے۔ یہ رسک تو اب لینا پڑے گا۔ خدا تمہارے دل میں ہمارے لیے مہربانی پیدا کردے۔

حولیہ نے خود کو کچھ سنبھال لیا تو شامیر نے اس سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔

وہ بولی۔ "پتا نہیں کہ تمہیں معلوم ہے یا نہیں مگر چار سال پہلے ایک جھگڑے میں زویا کا بازو ٹوٹنے کا جو واقعہ ہوا تھا، وہ بھی اسی انتقامی کارروائی کی کڑی تھا..... لیکن..... سمجھو کہ وہ تو بس ایک نمونہ تھا۔ جو اصل قیامت تھی، وہ ہم پر کوئی تین ماہ بعد ٹوٹی..... مم..... میں آج بھی اس رات کا تصور کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ بے ہوش ہو جاؤں گی۔" حولیہ کا رنگ مزید زرد ہو گیا اور آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے۔

کچھ دیر بعد خود کو سنبھال کر بولی۔ "میں پہلی بار ایک لمبے انتظار کے بعد بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں میونخ میں ماما کے پاس چند ہفتوں کے لیے رہنے آئی ہوئی تھی۔ زویا بھی فرینکفرٹ سے آئی ہوئی تھی۔ تمہارے چھوڑ جانے کی وجہ سے وہ بہت "اپ سیٹ" تھی۔ میں اس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ بہت جلد خود مجھ پر غم کا ایک ایسا پہاڑ ٹوٹنے والا ہے جس کے لیے کوئی دلجوئی بھی کارگر نہیں ہوگی۔ اس شام آفس کے کام کے سلسلے میں زویا کو اچانک ایک قریبی قصبے میں جانا پڑ گیا تھا۔ رات کو میں اور ماما گھر میں اکیلی تھیں۔ آدھی رات کے وقت پانچ مسلح نقاب پوش تالے توڑ کر اور سیکیورٹی سسٹم ناکام بنا کر گھر میں گھس آئے۔ وہ بہت غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کے تیور دیکھ کر ماما نے اپنی لائسنسی رائفل نکال لی مگر انہوں نے رائفل استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ماما کو دو گولیاں ماریں اور وہ گر گئیں۔ اس کے بعد....."

حولیہ کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ اپنے آنسو روکنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

رک رک کر اور بار بار اپنی سانس بحال کر کے اس نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یوں تھا..... وہ لوگ آئے تو زویا کے لیے تھے، اس کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے حولیہ ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ انہوں نے زویا کے حصے کا ستم بھی حولیہ پر توڑا۔ بڑی بے رحمی سے اسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دوران میں اس کی ماں نے ایک بار پھر بیٹی کا دفاع کرنے کی کوشش کی تو اس پر مزید گولیاں چلائی گئیں۔ اس کی دونوں ٹانگیں شدید زخمی ہو گئیں اور وہ نیم بے ہوش ہو کر گر گئی۔ خوش قسمتی سے تو نہیں کہا جا سکتا، بدقسمتی سے حولیہ اس وقت تین ماہ کی حاملہ تھی۔ اس ستم کے بعد وہ اپنا بچہ "کیری" نہ کر سکی۔ اب ایک ستم بالائے ستم اور تھا..... اور وہ یہ کہ ڈاکٹروں کے مطابق حولیہ کا آئندہ ماں بننا ممکن نہیں رہا تھا۔ حولیہ اپنی روداد کا زیادہ تر حصہ بیان کر چکی تھی اور نڈھال سی نظر آ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر اب بھی کسی وقت بجلی چمکتی تھی اور مخروطی چھتوں پر بارش کی صدا سنائی دیتی تھی۔ شامیر نے کہا۔ "معاف کرنا، تم پر گزرنے والی قیامت کا سن کر دل خون کے آنسو رونے لگا ہے، لیکن ذہن میں بار بار ایک سوال بھی اٹھ رہا ہے۔ تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ یہ سب کچھ اس سہراب ورلی نام کے بندے کی وجہ سے ہوا ہے؟"

"اس میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے مسٹر شامیر۔ وہ لوگ اتنے نڈر تھے کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ تقریباً سات گھنٹے تک ہمارے گھر میں رہے تھے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا اور آپس میں جو گفتگو کی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سہراب اور نمرسی کے بندے ہی تھے۔"

"نمرسی..... یہ کون ہے؟"

"تم تحقیق کرنے والے صحافی ہو مسٹر شامیر! مگر

شاید تمہیں اس حوالے سے معلومات نہیں مل سکی ہیں۔ وہاں فریکفرٹ میں تمہارا ہم وطن سہراب اور نمری ایک دوسرے کے پارٹنر تھے۔ نمری ایک طوائف کا نام ہے۔ بظاہر تو اسے کاروباری سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ کسی ڈان سے کم نہیں ہے۔ اب تو خیر وہ اپنے گروپ سمیت جرمنی سے رفو چکر ہو چکا ہے، تاہم تین چار سال پہلے تک اس نے یہاں قانون سے پوری پوری ٹکر لے رکھی تھی۔ اب سنا ہے کہ وہ کہیں میکسیکو وغیرہ میں روپوش ہے۔"

شامیر نے کہا۔ "جب چار سال پہلے ہم سہراب کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے، میں نے اس کے کسی رونالڈو نامی پارٹنر کا نام تو سنا تھا، مگر یہ نمری؟"

حولیہ جلدی سے بولی۔ "یہی تو وہ بدبخت ہے، تم نمری کو اس کا نک نیم کہہ سکتے ہو۔ نمری بھی دراصل "نیمری" کی بگڑی ہوئی شکل ہے، یعنی رحم نہ کرنے والا۔ میں اور وانی تمہارے ہم وطن سہراب کے کہنے پر اس نے ہم پر کوئی رحم نہیں کیا۔"

شامیر سناٹے کی سی کیفیت میں حولیہ کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "سہراب اور نمری کے ہرکارے زویا کو بھی معاف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میری اور ماما کی بے پناہ منت سماجت پر وہ اس شرط پر ٹلے تھے کہ اس رات جو کچھ بھی ہوا، وہ ہم صرف اپنے تک محدود رکھیں گی، قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹائیں گی..... اور خاموشی کے ساتھ یہ علاقہ چھوڑ کر مشرقی جرمنی یا کسی دوسرے دور دراز علاقے میں چلی جائیں گی۔ اگر ہم ایسا کریں گی تو یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں بات بہت آگے تک جائے گی..... مسٹر شامیر..... ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دوسری صورت کے بارے میں سوچتیں..... ہم نے یہ شرط مان لی۔"

شامیر نے کہا۔ "حولیہ! تم نے بتایا ہے کہ واردات کے وقت تمہاری ماما زخمی ہو گئی تھیں اور اسی گھر میں موجود تھیں۔ کیا وہ چھ سات گھنٹے تک وہیں زخمی پڑی رہی۔"

"نہیں، ان کو ابتدائی طبی امداد وہیں گھر کے اندر دی گئی..... اور یہ میں نے خود ہی کی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں، میں کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہوں۔"

شامیر چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے تھوڑا تھوڑا یاد آیا کہ زویا نے ایک مرتبہ اس طرح کی کوئی بات کی تھی۔ حولیہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "بعد میں ہم نے اس سارے واقعے کو ڈکیتی کا رنگ دے دیا..... اور..... جو کچھ مجھ پر بیتا اسے بھی چھپا لیا۔ میں نے اپنی ابارشن کو بھی سیڑھیوں سے گرنے کا نتیجہ قرار دیا۔ ان ایک دو مہینوں میں ہم نے بہت زیادہ سختی جھیلی۔ اسی دوران میں ماما اور زویا خاموشی کے ساتھ یہاں ایسن کے اس علاقے میں چلے آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے شوہر کے ساتھ میرے تعلقات میں پہلے والی گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ مگر ابارشن کے بعد اور یہ طے ہونے کے بعد کہ اب میں کبھی ماں نہیں بن سکتی، میرے اور شوہر کے درمیان دوری پیدا ہو گئی جو اب تک برقرار ہے۔ ابھی تک میرے شوہر کو بھی علم نہیں کہ اصل میں میرے ساتھ کیا ہوا ہے، ورنہ شاید وہ طلاق جو کچھ عرصے بعد ہونی ہے، ابھی ہو جائے۔" وہ چپ ہو گئی، زرد چہرے پر دکھ کے تاریک سائے منڈلانے لگے۔

شامیر نے پہلو بدلا۔ "ہم نے تو یہی سن رکھا ہے کہ جرمنی جیسے ممالک میں قانون کا بول بالا ہے۔ مظلوم کی داد رسی ہوتی ہے پھر آپ لوگوں کا خاموش رہنا ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تم درست کہتے ہو مسٹر شامیر! ہم قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے، پھر تمہارے جس ٹی وی چینل کی وجہ سے یہ بلا ہمارے گلے پڑی تھی اسے بھی "انوالو" کیا جا سکتا تھا..... اور ایک موقعے پر ہم نے بے حد سنجیدگی سے یہ باتیں سوچی بھی تھیں لیکن پھر حتمی فیصلہ پسپائی کے حق میں ہی ہوا۔"

کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی۔ حولیہ اور شامیر اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے رہے۔ حولیہ کی والدہ مسلسل سو رہی تھیں۔ آتش دان میں آگ اب ادھ جلے کوئلوں کی شکل میں تھی۔ شامیر نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "زویا اور رابرٹ کا

کیا معاملہ ہے حولیہ؟"

"رابرٹ بہت اچھی نوبل جرمن فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہائی برانڈ فیملی کے لوگ بہت تعلیم یافتہ اور شائستہ ہوتے ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہے۔ وراثت میں اسے ایک فارم بھی ملا ہوا ہے جس سے آمدن ہوتی ہے۔ یہاں ماما اور زویا کے "ایسن" چلے آنے کے بعد ماما کی ٹانگوں کے علاج پر یورو پانی کی طرح خرچ ہوئے۔ چند ماہ میں ان کی ٹانگوں کے کوئی آٹھ آپریشن ہوئے۔ ماما کے ساتھ ساتھ ہم سب ہی سخت ترین مالی دشواریوں کا شکار ہو گئے۔ میرے شوہر کی نوکری چھوٹ چکی تھی۔ میرا اپنا گھر بھی میری کمائی سے بمشکل چل رہا تھا۔ ان حالات میں رابرٹ نے ماما اور زویا کے ساتھ بے حد تعاون کیا۔ یہاں تک کہ ان برے حالات میں بھی زویا کو اپنانے کی ہامی بھر لی۔ ہمارا خیال تھا کہ ان دونوں کی ازدواجی زندگی بہت اچھی گزرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ حالانکہ زویا میری بہن ہے مگر میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ زویا کے موجودہ گھریلو حالات میں زیادہ قصور اس کا ہی ہے۔ ماما کا خیال بھی یہی ہے۔ زویا نے کئی غلطیاں کی ہیں اور اب بھی کر رہی ہے۔ اب پچھلے تقریباً ایک سال سے..... وہ بغیر کسی کو کچھ بتائے کہیں جا چکی ہے۔ ڈیڑھ دو سال کی بچی بھی اس کے ساتھ ہے۔ رابرٹ کے علاوہ ہم بھی اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو چکے ہیں۔ اس ایک برس میں اس نے بس دو تین بار ہی کسی نامعلوم جگہ سے بات کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ خیریت سے ہے۔"

حولیہ اصل بات پر اب بھی پردہ ڈال رہی تھی اور زویا کی گمشدگی کے حوالے سے "گنار سٹ نام" کا نام نہیں لے رہی تھی۔

شامیر نے حولیہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "حولیہ! پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ میں زویا کو ڈھونڈ سکتا ہوں۔ کسی وقت تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں۔ میں چند روز پہلے پیڈربورن میں زویا کے شوہر رابرٹ سے بھی مل چکا ہوں۔ وہ مجھے اچھا بندہ لگا ہے اور اگر سچ پوچھو تو بچی کے حوالے سے مجھے اس پر ترس بھی آیا ہے۔"

شامیر کا مطمعِ نظر سمجھتے ہوئے حولیہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ ماتھے پر شکن ڈال کر بولی۔ "مسٹر شامیر! ہاتھ باندھ کر تم سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ اب تم اس معاملے سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔ یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے، ہم اسے کسی نہ کسی طور سدھار ہی لیں گے۔ ماما تمہیں اپنے آس پاس دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گی۔ وہ بہت "ہائپر" ہو جائیں گی بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گی کہ....."

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی، پھر چند سیکنڈ بعد خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی۔ "میرا مشورہ تو تمہارے لیے بھی یہی ہے کہ تم زیادہ دیر یہاں جرمنی میں نہ رکو۔ ہمیں جتنی سزا ملنا تھی وہ مل چکی ہے۔ اب یہ سہراب اور نمرسی والا معاملہ بالکل ختم ہے..... یہ نہ ہو کہ تمہاری یہاں موجودگی سے یہ پھر تازہ ہو جائے اور کوئی نئی مشکل کھڑی ہو جائے۔"

"تم پریشان نہ ہو حولیہ! میرا یہاں زیادہ دن رکنے کا ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تو صرف رابرٹ اور اس کی حالت پر ترس آ رہا ہے اور زویا کے موجودہ کردار پر افسوس ہو رہا ہے جس کی وجہ سے تم سب پریشانی میں ہو۔"

اب بارش تھم چکی تھی، حولیہ چاہتی تھی کہ اس کی ماما کے دوبارہ جاگنے سے پہلے پہلے شامیر یہاں سے نکل جائے۔ واش روم میں جانے کے لیے شامیر کو دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔ اس نے کمرے اور واش روم کا جائزہ لیا۔ ہر چیز سے تنگدستی ٹپکتی ہوئی نظر آ رہی تھی..... اور یہ ممکن تھا کہ کچھ عرصہ پہلے تک یہ تنگدستی اس سے بھی زیادہ ہو۔ ایسے حالات میں رابرٹ نے اس فیملی کو بہت سہارا دیا تھا..... اور شاید..... یہی وجہ تھی کہ بعد ازاں زویا، رابرٹ سے شادی پر بھی رضامند ہو گئی تھی۔

ایسن سے واپسی کا سفر پھر ٹرین میں طے ہوا۔ دورانِ سفر شامیر، زویا کے خیالوں میں ہی الجھا رہا۔ وہ زویا کے اس گھر سے ہو کر آ رہا تھا جہاں وہ شادی سے پہلے ایک عرصے تک قیام پذیر رہی تھی۔ وہ زویا کی اس

بہن سے مل کر آرہا تھا جو شکل میں کافی حد تک زویا سے مشابہ تھی اور ایک خوفناک واقعے کا شکار بھی ہوئی تھی۔ اس واقعے کو پاکستانی سیراب درانی سے منسوب کیا جارہا تھا۔ زویا کے حوالے سے شامیر کی بہت سی یادیں پھر تازہ ہو گئی تھیں، اس نے خود ہی اپنے آپ پر غور کرنا شروع کیا۔ کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ رہا تھا کہ اب اس کا دل زویا کی طرف سے اٹھ چکا ہے، اور اگر وہ زویا کے سلسلے میں کچھ جستجو کررہا ہے تو اس کی وجہ رابرٹ کی حالتِ زار ہے، جو اپنی بچی کی یاد میں تڑپ رہا ہے..... لیکن شاید دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ابھی کچھ اور بھی چل رہا تھا۔ ایک سوال تھا جو کسی آہنی میخ کی طرح اس کے اندر کہیں گڑا ہوا تھا۔ کیا وہ واقعی بے وفا تھی؟ کیا وہ واقعی کسی اور سانچے میں ڈھل چکی تھی؟ کیا کسی انسان میں اتنی بے حسی بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے جیسے ہی کسی انسان کو جانکاہ انتظار کی تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر ننگے پاؤں کھڑا کردے..... اور پھر اس سزا کو برخاست کرنا بھول جائے؟

پتا نہیں کیوں جولیہ سے ملنے کے بعد شامیر کے دل میں زویا کے لیے غم و غصے کی شدید کیفیت میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی..... اسے یوں لگا تھا کہ زویا نے رابرٹ کے ساتھ شادی کا جو فیصلہ کیا، اس کے پیچھے اس کی معاشی مجبوریاں بھی رہی ہیں۔ اس کی والدہ سارہ نیم کے علاج پر پیسا پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ قرض خواہ بینک دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ ایسے میں رابرٹ جس طرح اس زبوں حال فیملی کا ساتھ دے رہا تھا، یہ بہت بڑا احسان تھا۔ شاید اسی احسان کے زیر بار ہوکر زویا شادی کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ بعد میں اپنی ازدواجی زندگی اسے ایک مجبوری کا "قحط" لگی ہو اور یوں اس کے اندر تلخیاں پیدا ہونا شروع ہوگئی ہوں۔ اسے بہرصورت یہ سارا اسرار معلوم کرنا تھا۔ وہ چاہتا بھی تو اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

☆☆☆

شامیر بن بتائے کہیں چلا گیا تھا۔ اموخالہ بے قرار تھیں لیکن فارہ کی بے قراری اس سے بھی کچھ بڑھ کر تھی۔ وہ بولی۔ "اموا کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ آپ نے اپنی ضد کی وجہ سے میری زندگی خراب کرچھوڑی ہے۔ آپ کا وہ لاڈلا ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہے اور آپ اس کو لگام ڈالنے کی کوشش کررہی ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اب بھی ہمی پاسی کڑی کو ابالے دینے میں لگا ہوا ہے۔ کیا پتا اس نے کہیں ڈھونڈ ہی لیا ہوا سے۔"

فارہ کا یہ لب و لہجہ اس لب و لہجے سے بہت مختلف تھا جو وہ شامیر کے سامنے اختیار کیے رکھتی تھی۔ وہ نزاکت، وہ شیرینی، وہ دبی دبی سی شرماہٹ، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ چوکڑی مارے بیٹھی تھی اور بڑی بے باکی سے اپنی ماں کو لتاڑ رہی تھی۔

کزن افشاں دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ اموخالہ نے کھڑکی بند کرتے ہوئے تیز سرگوشی میں کہا۔ "تمہاری یہی کڑوی زبان ہے جسے چلا کر تم نے شامیر کو خود سے بدظن کرنا ہے۔ کچھ ہوش کر، عقل کو ہاتھ مار..... میں تو سمجھتی ہوں یہاں آنا ہمارے لیے اچھا ہی ثابت ہوا ہے۔ اس مال زادی کی شادی ہوچکی ہے..... اور پھر اس کا جس طرح کا کردار شامیر کے سامنے آیا ہے، وہ دل ہی دل میں اس پر لعنتیں ارسال کررہا ہوگا۔ اب اگر وہ اس کی کچھ جستجو کررہا ہے تو اس کی وجہ بس وہ ہمدردی ہے جو اسے اس کے بدنصیب شوہر اور اس کی گمشدہ بچی سے پیدا ہوگئی ہے۔"

"آپ جو بھی کہتی رہیں ماما! مجھے آثار کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔ کیا پتا اس کے ساتھ مل کر اس کا رویہ کیا ہوجائے..... آپ نے دیکھ ہی لیا ہے..... وہ چڑیل اسی ایریا میں موجود ہے۔ اس بات کا ٹھیک ٹھاک چانس موجود ہے کہ وہ اس کے بارے میں جان جائے گا۔ میں تو کہتی ہوں ہمیں جلد از جلد پیڈربورن سے نکل جانا چاہیے اور ہوسکے تو پاکستان واپسی کا پروگرام فائنل کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، وہ آتا ہے تو میں اس سے بات کرتی ہوں لیکن میں پھر کہتی ہوں، تو جب بھی مات کھائے گی اپنی زبان کی وجہ سے کھائے گی۔ اپنے غصے پر قابو پانا سیکھ۔ میں سمجھتی ہوں تیرے حوالے سے شامیر کا رویہ بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ ہم تھوڑی سی کوشش اور کریں گے تو وہ سو فیصد ٹھیک ہوجائے گا.....

فارہ! وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ دیکھنا اتنا پیار دے گا تجھے کہ تو دنگ رہ جائے گی....."

امو ایک بار پھر اسے سمجھانے بجھانے میں لگ گئیں۔ پھر شامیر کو ساتویں آٹھویں بار فون کرنے کے لیے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ فارہ دھڑام سے آڑھی ترچھی، بستر پر گر گئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک خشونت کے آثار تھے۔ سینے کا زیر و بم اندر کے تلاطم کی چغلی کھا رہا تھا۔ اسے بھی اب ایک طرح کی ضد سی ہو گئی تھی..... وہ شامیر کو زیر کرنا چاہتی تھی۔ شامیر کے سامنے وہ اپنا ایک بالکل جدا روپ لے کر آئی تھی اور ابھی تک یہ روپ کامیاب ہی تھا۔ بس اسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں کسی وقت وہ غصے میں شامیر سے کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ بے شک وہ نو عمر تھی لیکن ایک عورت تو تھی اور جانتی تھی کہ شامیر کے جسم اور دل میں اس کے لیے ایک کھڑکی کھل رہی ہے۔ اسے چند دن پہلے کا وہ منظر بھی اچھی طرح یاد تھا جب اس نے اپنی کمر کے تل دکھانے کے لیے اچانک خود کو شامیر کے سامنے کر دیا تھا اور اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔

اس نے ایک دو گہری سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی ناکام کوشش کی پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس نے وارڈ روب کھولی اور اس میں سے ایک بولڈ قسم کا لباس نکال کر اور اپنے ساتھ لگا کر آئینے میں دیکھنے لگی۔ وہ اب زیادہ دیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ شامیر اس کے جلتے شباب کے سامنے جلد ہتھیار پھینک کر اپنی شکست کا اعتراف کر لے۔ وہ اس پر اپنی مہر ثبت کرنا چاہتی تھی..... شامیر رات کو دیر سے گھر آیا اور امو کے اصرار پر چند لقمے لینے کے فوراً بعد سو گیا۔ وہ کافی تھکا ہوا تھا۔ امو نے بھی اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور یہ کام کل صبح پر چھوڑ دیا۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہوٹل کے تمام کمروں میں تقریباً خاموشی چھا چکی تھی۔ امو اور افشاں بھی سو چکی تھیں۔ فارہ جاگ رہی تھی۔ نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ خاموشی سے شامیر والے کمرے میں بھی چلی آئی تھی۔ اتفاقاً اسے دروازہ کھلا ہوا ہی مل گیا تھا۔ اب نائٹ بلب کی روشنی میں وہ شامیر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ وہ اپنی ہیئر پن کبھی اس کی ناک میں گھماتی، کبھی اس سے کان کو چھیڑتی۔ آخر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ غنودگی کی حالت میں وہ فارہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ وہ بغیر آستینوں والی ٹائٹی میں تھی۔ گلابی نائٹی کے کشادہ گریبان پر سلور رنگ کی کناری جگمگا رہی تھی۔

"کیوں تنگ کر رہی ہو؟" شامیر نے کسمسا کر پوچھا۔

"تنگ نہیں کر رہی۔ ہمدردی کر رہی ہوں آپ سے۔ آپ نے کمر کی چوٹ پر بس ایک دفعہ بینڈ ایڈ کروائی اور بھول گئے۔ جناب! بینڈ ایڈ کو کم از کم 48 گھنٹے بعد تو بدلنا چاہیے ورنہ جناب کی چوٹ "سیپٹک" ہو جائے گی۔"

"لیکن ابھی نہیں یار! میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ صبح دیکھ لیں گے۔"

"یعنی دس بارہ گھنٹے مزید۔۔۔! ٹھیک ہے..... میں امو کو جا کر بتا دیتی ہوں سب کچھ۔ آگے ہوپ کہ جب انہیں پتا چلے گا کہ آپ نہ صرف آوارہ گردی فرما رہے ہیں بلکہ دھینگا مشتیاں بھی کر رہے ہیں تو انہیں بے حد خوشی ہو گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامیر کی نیند کافور ہو گئی۔ اس نے جلدی سے فارہ کی کلائی تھام کر اسے روکا۔ پہلے اسے ٹالنے کی کوشش کی، جب وہ نہیں مانی تو وہ ہارے ہوئے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے اپنی شرٹ اتاری۔ پھر بنیان بھی اتار دی اور فارہ کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔

"بہت ضدی ہو تم۔" اس نے کہا۔

"آپ سے کچھ کم۔" وہ بولی پھر ذرا توقف سے کہا۔ "سچ بتائیں، کہاں گئے تھے آپ؟"

شامیر نے وہی مختصر بیان دہرا دیا جو اس سے پہلے فارہ، افشاں اور امو خالہ کے سامنے دیا تھا یعنی دفتری کام۔ اس کا ارادہ تھا کہ کل صبح امو خالہ کو مناسب الفاظ میں اصل حقیقت بھی بتا دے گا۔ وہ ان سے کچھ بھی چھپاتا تو لگتا تھا کوئی گناہ کر رہا ہو۔ والدین کو پیش آنے والے حادثے کے بعد وہی اس کا سب کچھ رہی تھیں۔ اسے تو آج تک اس بات کا بھی افسوس تھا کہ امو

کی خواہش کے مطابق فارہ کی بڑی بہن شائلہ سے اس کی شادی کیوں نہ ہو پائی۔ بے شک شامیر نے خود بھی کبھی شائلہ کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا اور وہ اس سے بڑی بھی تھی لیکن اپنے ابو کے دوٹوک انکار پر امو خالہ کو پہنچنے والے صدمے کا سوچ کر وہ آج بھی ملول ہو جاتا تھا۔

فارہ نے بڑی احتیاط سے اس کی کمر کی پرانی بینڈ تبدیل اتاری اور زخم صاف کر کے نئی بینڈ تبدیل چپکا دی۔ فارہ کا لمس اپنے اندر ایک عجیب سی ملائمت اور سنسناہٹ لیے ہوئے تھا۔ وہ اس کے نوخیز جسم کی خوشبو اور حرارت اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ یکا یک فارہ نے چونک کر کہا۔ ''ارے، یہ کیا ہے؟''

فارہ کی نگاہ سامنے کی طرف شامیر کے سینے پر پڑی تھی۔ اس کی چھاتی پر ہنسلی کی ہڈی سے نیچے ایک گہرا نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھاتی کے گھنے بالوں کی وجہ سے شاید فارہ کی نظر پہلے اس ابھار پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ایسا ہی ایک چھوٹا اور کم شدت کا ابھار اس کے بائیں بازو کی طرف بھی تھا۔

''اب یہ چوٹیں کہاں سے لگوا کر آئے ہیں آپ نے؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

اب شامیر اسے کیا بتاتا کہ کل رات ''ایسن'' میں اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ سارہ جیم نشے میں چور بالکل جنونی انداز میں اس پر جھپٹی تھی۔ اپنی ٹانگوں اور بالائی جسم پر شامیر کو بیس بال کے بیٹ کی کئی ضربیں سہنا پڑی تھیں۔ یہ دو نشان بھی اسی ''حملے'' کی نشانی تھے۔ اپنی گوناگوں پریشانیوں میں شامیر ان چوٹوں کو تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ اب یہ فارہ کے سامنے آ گئی تھیں۔

وہ بہت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سوال پر سوال پوچھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ شامیر کل پھر زویا کے شوہر رابرٹ کی طرف گیا ہے اور وہاں پھر اسکائی ماسک والے غنڈے کے ساتھ اس کی لڑائی ہوئی ہے۔ شامیر نے اسے بمشکل اس بات سے نیم قائل کیا کہ ''ایسن'' میں انٹرسٹی ٹرین سے اترتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ گر گیا تھا۔

اسے یقین آیا یا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا کہ وہ شامیر پر مزید چڑھ بیٹھی۔ وہ بولی۔ ''آپ کی یہ چوٹ ہنسلی کی ہڈی کے بالکل پاس ہے۔ ہنسلی کی ہڈی بڑی نازک ہوتی ہے۔ آپ کو ایکسرے کرانا چاہیے تھا..... دیکھیں کتنا زیادہ ابھار ہے..... میں آپ کو ٹکور کرتی ہوں۔ آپ لیٹ جائیں۔''

''کچھ نہیں یار! میری ہڈی ٹھیک ہے ورنہ میں بلبلا رہا ہوتا۔ بس ذرا سی چوٹ آئی ہے۔''

''یہ ذرا سی چوٹ نہیں ہے۔ آپ لیٹیں... فوراً لیٹیں..... اگر نہیں تو پھر میں بلاتی ہوں آپ کی امو خالہ کو۔''

چار و ناچار شامیر کو سیدھا لیٹنا پڑا۔ اس نے الیکٹرک استری گرم کی اور ایک کپڑے کی گدی بنا کر شامیر کی چھاتی پر ٹکور کرنے لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل بستر پر اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کی حرکت و سکنات سے اس کا نیم عریاں لباس مزید ہیجان خیز دکھائی دینے لگا تھا۔

شامیر نے اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس طرح کی نائی کیوں پہن رکھی ہے؟''

وہ بے باکی سے بولی۔ ''آپ جمع خاطر رکھیں۔ یہ میں نے کوئی آپ کو دکھانے کے لیے نہیں پہن رکھی۔ تقریباً روز ہی پہنتی ہوں۔ آپ کو پریشانی ہو رہی ہے تو اپنی آنکھیں بند فرما لیں۔'' پھر اس نے خود ہی اپنا ایک ہاتھ شامیر کی آنکھوں پر رکھ دیا..... اور دوسرے ہاتھ سے ٹکور کا عمل جاری رکھا۔

''یہ اچھی زبردستی ہے بھئی! میرا خیال ہے اب مجھے معاف کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔'' اس نے فارہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔

''چپ چاپ لیٹے رہیں ورنہ میں سے امو کو آواز دوں گی۔'' وہ شوخی سے بولی۔

شامیر سٹپٹا کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ بعد اچانک اسے اپنے ہونٹوں پر کسی نیم گرم نرم لمس کا احساس ہوا۔ اس کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ لمس فارہ کے ہونٹوں کا تھا..... وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف لپکی تھی اور اسے کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ وہ دم بخود سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اس کے اردگرد ابھی تک فارہ کے نوخیز جسم کی خوشبو موجود تھی..... اور اس کے ہونٹ جیسے سنسنا رہے تھے۔

جو کچھ ہو رہا تھا اور بتدریج آگے بڑھ رہا تھا، وہ تو شامیر کافی عرصے سے محسوس کر رہا تھا لیکن آج فارہ کی طرف سے ایک بہت واشگاف اور راست قدم اٹھایا گیا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ بتدریج تبدیل ہوئی ہے۔ اس کے طور اطوار سے لے کر اس کی چال ڈھال اور بول چال تک میں شامیر ایک طرح کی شائستگی اور لگاوٹ محسوس کرتا تھا۔ کسی وقت اس کے دل کے کسی حصے میں فارہ کے لیے ایک نرم گوشہ بھی پیدا ہونے لگتا تھا۔ اس گوشے میں اسے فارہ کے ساتھ ساتھ مہربان چہرے والی اپنی اسوخالہ کی شبیہ بھی نظر آتی تھی۔ دل کے اسی حصے میں ایک اور گوشہ بھی تھا۔ اس گوشے کی نیم تاریکی میں ایک لڑکی کی دھندلی سی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ لڑکی فرینکفرٹ کے کامرس بینک ٹاور کی چھت پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے سرکش بال سیٹ رہی تھی۔ اس تصویر کے رنگ بہت پھیکے پڑ چکے تھے مگر یہ پھر بھی ایک امر تصویر تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر فارہ یوں تو شامیر کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی رہی تاہم اس کے چہرے پر ایک شوخ تاثر موجود رہا۔ چکن آلو اور پنیر والے لذیذ سینڈوچ تقریباً فائنل پریسنٹ اسوخالہ نے خود ہی تیار کیے تھے مگر ان کو منسوب فارہ سے ہی کر دیا تھا۔ سینڈوچ کی پلیٹ شامیر کے سامنے کھسکاتے ہوئے بولیں۔ ”صبح سے گئی ہوئی تھی بنانے میں۔ تمہاری پسند بڑی جلدی سے اس کی پسند بن جاتی ہے یا شاید ویسے ہی تم دونوں کی پسند ایک ہے۔“

”آپ کی دوسری بات ٹھیک لگتی ہے۔“ قریب بیٹھی افشاں نے معنی خیز انداز میں لقمہ دیا۔

”کیا بات ہے۔ آج تم کچھ چپ چپ لگ رہی ہو؟“ اسوخالہ نے فارہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں، چپ رہنے پر کوئی پابندی ہے۔“ فارہ نے چائے کے کپ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں کمرے کے اندر فارہ کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور فون اٹینڈ کرنے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ افشاں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اسوخالہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”شامیر! میرا خیال ہے کہ اب زویا اور اس کے شوہر کو ان کے حال پر چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے۔ پکی سے پکڑے ہوئے شریف النفس باپ کی حالت پر دکھ تو ہوتا ہے لیکن ---- وقت کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ اس بے چارے کے مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔“

جواب میں شامیر نے کچھ نہیں کہا تو اسوخالہ کے لہجے میں مزید مضبوطی آگئی، بولیں۔ ”یہاں موسم کافی ٹھنڈا ہے۔ پرسوں سے میری طبیعت پھر کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔“

اسوخالہ کی بوجھل طبیعت کا سن کر شامیر ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ وہ ان کا حال احوال پوچھنے میں مگن ہو گیا۔ چار پانچ منٹ بعد اس کے فون پر کال کے میسج آئے۔ وہ اسکرین کی طرف دیکھ کر چونکا۔ یہ زویا کی ساتھ کام کرنے والی جین کی کال تھی۔ شامیر نے لان میں آکر اس کی کال سنی۔ وہ کسی لمبی تمہید کے بغیر بولی۔ ”شامیر! تم کہاں ہو؟“

”پیڈربورن میں اور تم؟“

”میں بھی پیڈربورن سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں آدھ گھنٹے میں یہاں پہنچ رہی ہوں۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ کہاں مل سکتے ہو؟“

”خیریت تو ہے جین؟“ شامیر نے چونک کر پوچھا۔

”ہے تو خیریت ہی تم مجھے جستجو ہے۔“ جین نے کہا۔

جین اسٹیشن سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اطالوی ریسٹورنٹ کا تعین ہوا۔

اسوخالہ نے پھر باز پرس شروع کر دی۔ شامیر نے انہیں ابھی تک پرسوں والے واقعے کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ان سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم تفصیل سے بات کرنے کے لیے مناسب موقعے کا انتظار کر رہا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد سنہرے بالوں والی دراز قد جین اور شامیر اس اطالوی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سوفٹ ڈرنکس رکھے تھے۔ شامیر

نے جین کو اپنی "ایس" یا تراکے بارے میں کافی کچھ بتادیا تھا۔ اور وہ زویا کی والدہ سارہ نیم کے حالات جان کر کافی حیران ہوئی تھی۔ بہرحال شامیر نے حولیہ سے کیے گئے وعدے کے مطابق اس سارے واقعے کو ڈکیتی تک ہی محدود رکھا تھا اور حولیہ پر ٹوٹنے والے ستم کا تذکرہ بھی حذف کردیا تھا۔

جین آج کچھ عجیب سے موڈ میں نظر آتی تھی۔ اورنج جوس کا سپ لے کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"میں اس ساری کہانی کو فراموش کردینا چاہتی تھی اور تقریباً کر ہی چکی تھی مگر تم نے مجھے فیس بک پر ڈھونڈ کر پھر سے ساری یادوں اور زخموں کو تازہ کردیا ہے....."

"یہاں پہنچ کر کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میں اسی لیے چار سال تک یہاں آنے سے پہلو تہی کرتا رہا۔"

جین نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "برادر شامیر! پچھلی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ وہ اہم سوال تھا مگر تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا تھا کہ تمہارے پاس میرا رابطہ نمبر موجود تھا پھر بھی تم نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔"

"میں سچ کہتا ہوں جین، میرے پاس تمہارا کوئی کونٹیکٹ نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے اپنا جو کونٹیکٹ تمہیں دیا، وہ تم تک پہنچا ہی نہیں۔"

"تم نے کب دیا؟"

"میں نے پاکستان آکر دیا۔"

شامیر حیرت زدہ سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جین نے آخری کش لے کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور بولی۔ "شامیر! میں اعتراف کرتی ہوں کہ تم سے دو روز پہلے ہونے والی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک اہم بات چھپائی..... شاید..... شاید لاشعوری طور پر میں نہیں چاہتی تھی کہ تم دوبارہ سے اس لاحاصل بکھیڑے میں پڑو۔"

"میں..... کچھ سمجھ نہیں پارہا جین؟"

"شامیر! مجھے نہیں پتا کہ تم سے یہ بات کیوں چھپائی گئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ زویا سے روٹھ کر جب تم پاکستان چلے گئے..... تو تقریباً پانچ ماہ بعد میں تمہارے پیچھے پاکستان آئی تھی۔ میں تمہارے گھر تک بھی پہنچی تھی۔ تم اس وقت چینل کے کسی کام سے پاکستان سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میری ملاقات تمہاری آنٹی سے بھی ہوئی تھی جن کو تم اموخالہ کہتے ہو۔"

شامیر سناٹے میں رہ گیا۔ تین چار سال گزر چکے تھے مگر اس کے علم میں ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "جین پلیز! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ وضاحت سے بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

جین پہلو بدل کر بولی۔ "شامیر! تم سے دو دن پہلے والی ملاقات کے بعد سے میرے دل پر ایک دم بوجھ سا پڑ گیا ہے۔ تمہاری اور زویا کی جدائی کا غم پھر سے تازہ ہوگیا ہے۔ مجھے یوں لگا ہے جیسے تم دونوں کے بچھڑنے میں کچھ اور لوگوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے..... اور شاید ان میں تمہارے گھر کا کوئی فرد بھی شامل ہے۔"

"یہ..... بات..... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" شامیر بمشکل بول پایا۔

جین نے نیا سگریٹ سلگا کر یوں اس کا کش لیا جس طرح سرد آہ بھری جاتی ہے..... پھر جیسے ماضی کی کھڑکی میں جھانکتے ہوئے وہ بولی۔ "شامیر! میں نے پچھلی ملاقات میں بھی تم سے یہی کہا تھا کہ تم زویا کی پہلی محبت تھے۔ اس نے تم سے بہت پیار کیا ہے شامیر..... شاید تمہاری توقع سے بھی زیادہ۔ اب میں تمہیں کیا کچھ بتاؤں۔ جب تم دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوگئے اور تم پاکستان واپس چلے گئے تو وہ جیسے ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ تم اس طرح اسے چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ پھر اس نے ڈبل اے چینل کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ بعد میں ان کے میوزک والے گھر میں ڈکیتی والا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد وہ مزید ٹوٹ پھوٹ گئی۔ وہ تمہیں یوں کھونا نہیں چاہتی تھی مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ارادے کی بہت پکی ہے۔ اس نے کوئی بہت بڑی قسم کھائی تھی کہ از خود

تم سے کوئی رابطہ نہیں کرے گی، چاہے ساری زندگی ایسے ہی گزر جائے۔ میں نے کئی بار اس سے تمہارا فون نمبر اور ای میل ایڈریس مانگا مگر اس نے نہیں دیا۔ ممکن تھا کہ اس نے فرسٹریشن کے عالم میں یہ کونٹیکٹس ویسے ہی ڈیلیٹ کر چھوڑے ہوں۔ انہی دنوں اتفاقاً میرا انڈیا اور پاکستان جانے کا پروگرام بنا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا شامیر! میرے شوہر باسکٹ بال کے جانے پہچانے کھلاڑی ہیں۔ میں ان ہی کے ساتھ تین چار ایشیائی ملکوں کے ٹور پر گئی تھی۔ جب میں پاکستان کے شہر لاہور پہنچی تو میں خود کو تم سے رابطہ کرنے سے روک نہ سکی۔ میں نے اس چینل سے رابطہ کیا جس میں تم کام کرتے تھے مگر وہاں سے کسی نے بھی مجھے مثبت جواب نہیں دیا۔ تمہاری کہی ہوئی ایک بات میرے ذہن میں کہیں اٹکی رہ گئی تھی کہ تمہاری رہائش لاہور کے سب سے پہلے میکڈونلڈ ریسٹورنٹ کی عقبی سڑک پر واقع ہے۔ اسی موہوم اشارے کے سہارے میں تمہارے گھر تک جا پہنچی تھی۔"

"تمہیں کون ملا وہاں؟" شامیر نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

"تمہاری آنٹی، جنہیں تم والدہ کہتے ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تم آفس کے کام سے پاکستان سے باہر گئے ہوئے ہو..... تین چار ہفتوں سے پہلے نہیں آؤ گے۔ شاید انہوں نے ملائیشیا کا نام لیا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے تمہارا رابطہ نمبر دے دیں مگر انہوں نے اس معاملے میں بڑی احتیاط دکھائی اور کہا کہ تمہاری اجازت کے بغیر وہ کسی کو تمہارا نمبر نہیں دے سکتیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنا نمبر انہیں دے دوں۔ وہ تم تک پہنچا دیں گی۔ ان کا بے لچک رویہ دیکھ کر میں نے انہیں اپنا فون نمبر اور ای میل ایڈریس وغیرہ دے دیا اور تاکید کی کہ وہ رابطے کے لیے میری درخواست تم تک پہنچا دیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا تعلق کسی نہ کسی طور زویا سے ہے اور میں تم سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ شاید..... شاید اسی لیے انہوں نے باقی باتوں میں مجھے یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ یہاں پاکستان میں تمہاری شادی کی بات فائنل اسٹیج پر ہے اور ڈیڑھ دو ماہ میں شادی متوقع ہے۔ میں نے پھر بھی ان سے درخواست کی تھی کہ شامیر ایک بار مجھ سے رابطہ ضرور کرے۔ میں لاہور میں مزید نہیں رک سکتی تھی۔ اگلے ہی روز میں اور میرا شوہر دبئی کے لیے پرواز کر گئے تھے۔"

☆☆☆

شامیر حیرت کے شدید ترین ریلے میں تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جب سے وہ جین سے مل کر آیا تھا، ہوٹل کے اپنے کمرے میں بند تھا۔ جین کے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجے تھے۔ اس نے انکشاف کیا تھا کہ تقریباً ساڑھے تین برس پہلے وہ نہ صرف پاکستان گئی تھی بلکہ اس کے گھر تک بھی پہنچی تھی۔ شامیر کو یاد تھا کہ ان دنوں وہ ایک سماجی رپورٹر کے ساتھ ملائیشیا میں تھا۔ وہاں وہ لوگ پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں رکے تھے۔ انہی دنوں میں وہ پاکستان پہنچی تھی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ امو خالہ نے اس سے یہ سب کچھ چھپایا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو کیوں؟ انہوں نے بعد میں بھی کبھی اس واقعے کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا تو شاید فارہ کو بھی معلوم تھا۔ اس نے بھی اس سلسلے میں زبان بند ہی رکھی تھی۔

وہ کمرے میں ٹہلتا رہا پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا، تقریباً ساڑھے تین سال پہلے وہی وہ دن تھے جب وہ کسی بھی معجزے کا نہایت شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ کسی بھی طرح یہ جمود ختم ہو..... کسی بھی طور یہ کفر ٹوٹے جس نے اسے اور زویا کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے..... اور جین کی بات پر یقین کیا جاتا تو پھر..... یہ کفر ٹوٹا تھا، یہ جمود ختم ہوا تھا۔ بقول جین، وہ زویا کی حالت زار بیان کرنے کے لیے شامیر کے پاس لاہور تک پہنچی تھی۔ وہ ان دونوں کی دوری ختم کرنے کے لیے کسی درمیانی راستے کی تلاش میں آئی تھی اور اگر وہ آئی تھی تو یہ راستہ نکل سکتا تھا۔ اسے نکل آنا تھا۔ مگر امو خالہ

اس کا دل چاہا کہ وہ امو خالہ کے پاس جائے، ان سے پوچھے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا نمبر یا ای میل جین کو کیوں نہ دیا؟ اور اگر جین نے وہ نا نمبر

نے جین کو اپنی "ایسن" یاترا کے بارے میں کافی کچھ بتادیا تھا ---- اور وہ زویا کی والدہ سارہ جیم کے حالات جان کر کافی حیران ہوئی تھی۔ بہرحال شامیر نے حولیہ سے کیے گئے وعدے کے مطابق اس سارے واقعے کو ڈکیتی تک ہی محدود رکھا تھا اور حولیہ پر ٹوٹنے والے ستم کا تذکرہ بھی حذف کردیا تھا۔

جین آج کچھ عجیب سے موڈ میں نظر آتی تھی۔ اورنج جوس کا سپ لے کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"میں اس ساری کہانی کو فراموش کردینا چاہتی تھی اور تقریباً کر ہی چکی تھی مگر تم نے مجھے فیس بک پر ڈھونڈ کر پھر سے ساری یادوں اور زخموں کو تازہ کردیا ہے----"

"یہاں پہنچ کر کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میں اسی لیے چار سال تک یہاں آنے سے پہلو تہی کرتا رہا۔"

جین نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "برادر شامیر! پچھلی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ وہ اہم سوال تھا مگر تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا تھا کہ تمہارے پاس میرا رابطہ نمبر موجود تھا پھر بھی تم نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔"

"میں سچ کہتا ہوں جین، میرے پاس تمہارا کوئی کونٹیکٹ نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے اپنا جو کونٹیکٹ تمہیں دیا، وہ تم تک پہنچا ہی نہیں۔"

"تم نے کب دیا؟"

"میں نے پاکستان آکر دیا۔"

شامیر حیرت زدہ سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جین نے آخری کش لے کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور بولی۔ "شامیر! میں اعتراف کرتی ہوں کہ تم سے دو روز پہلے ہونے والی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک اہم بات چھپائی..... شاید..... شاید لاشعوری طور پر میں نہیں چاہتی تھی کہ تم دوبارہ سے اس لاحاصل کھیڑے میں پڑو۔"

"میں..... کچھ سمجھ نہیں پارہا جین؟"

"شامیر! مجھے نہیں پتا کہ تم سے یہ بات کیوں چھپائی گئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ زویا سے روٹھ کر جب تم پاکستان چلے گئے..... تو تقریباً پانچ ماہ بعد میں تمہارے پیچھے پاکستان آئی تھی۔ میں تمہارے گھر تک بھی پہنچی تھی۔ تم اس وقت چیمل کے کسی کام سے پاکستان سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میری ملاقات تمہاری آنٹی سے بھی ہوئی تھی جن کو تم اموخالہ کہتے ہو۔"

شامیر سناٹے میں رہ گیا۔ تین چار سال گزر چکے تھے مگر اس کے علم میں ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "جین پلیز! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ وضاحت سے بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

جین پہلو بدل کر بولی۔ "شامیر! تم سے دو دن پہلے والی ملاقات کے بعد سے میرے دل پر ایک دم بوجھ سا پڑ گیا ہے۔ تمہاری اور زویا کی جدائی کا غم پھر سے تازہ ہوگیا ہے۔ مجھے یوں لگا ہے جیسے تم دونوں کے بچھڑنے میں کچھ اور لوگوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے..... اور شاید ان میں تمہارے گھر کا کوئی فرد بھی شامل ہے۔"

"یہ..... بات..... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" شامیر بمشکل بول پایا۔

جین نے نیا سگریٹ سلگا کر یوں اس کا کش لیا جس طرح سرد آہ بھری جاتی ہے..... پھر جیسے ماضی کی کھڑکی میں جھانکتے ہوئے وہ بولی۔ "شامیر! میں نے پچھلی ملاقات میں بھی تم سے یہی کہا تھا نا کہ تم زویا کی پہلی محبت تھے۔ اس نے تم سے بہت پیار کیا ہے شامیر---- شاید تمہاری توقع سے بھی زیادہ۔ اب میں تمہیں کیا کچھ بتاؤں۔ جب تم دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوگئے اور تم پاکستان واپس چلے گئے تو وہ جیسے ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ تم اس طرح اسے چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ پھر اس نے ڈبل اے چیمل کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ بعد میں ان کے میوزخ والے گھر میں ڈکیتی والا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد وہ جرمنی نوٹ لوٹ گئی۔ وہ تمہیں یوں کھونا نہیں چاہتی تھی مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ارادے کی بہت پکی ہے۔ اس نے کوئی بہت بڑی قسم کھالی تھی کہ از خود

نے جین کو اپنی "ایسن" یاترا کے بارے میں کافی کچھ بتادیا تھا ---- اور وہ زویا کی والدہ سارہ جیم کے حالات جان کر کافی حیران ہوئی تھی۔ بہرحال شامیر نے حولیہ سے کیے گئے وعدے کے مطابق اس سارے واقعے کو ڈکیتی تک ہی محدود رکھا تھا اور حولیہ پر ٹوٹنے والے ستم کا تذکرہ بھی حذف کردیا تھا۔

جین آج کچھ عجیب سے موڈ میں نظر آتی تھی۔ اورنج جوس کا سپ لے کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"میں اس ساری کہانی کو فراموش کردینا چاہتی تھی اور تقریباً کر ہی چکی تھی مگر تم نے مجھے فیس بک پر ڈھونڈ کر پھر سے ساری یادوں اور زخموں کو تازہ کردیا ہے----"

"یہاں پہنچ کر کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میں اسی لیے چار سال تک یہاں آنے سے پہلو تہی کرتا رہا۔"

جین نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "برادر شامیر! پچھلی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ وہ اہم سوال تھا مگر تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا تھا کہ تمہارے پاس میرا رابطہ نمبر موجود تھا پھر بھی تم نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔"

"میں سچ کہتا ہوں جین، میرے پاس تمہارا کوئی کونٹیکٹ نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے اپنا جو کونٹیکٹ تمہیں دیا، وہ تم تک پہنچا ہی نہیں۔"

"تم نے کب دیا؟"

"میں نے پاکستان آکر دیا۔"

شامیر حیرت زدہ سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جین نے آخری کش لے کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور بولی۔ "شامیر! میں اعتراف کرتی ہوں کہ تم سے دو روز پہلے ہونے والی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک اہم بات چھپائی..... شاید..... شاید لاشعوری طور پر میں نہیں چاہتی تھی کہ تم دوبارہ سے اس لاحاصل کھیڑے میں پڑو۔"

"میں..... کچھ سمجھ نہیں پارہا جین؟"

"شامیر! مجھے نہیں پتا کہ تم سے یہ بات کیوں چھپائی گئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ زویا سے روٹھ کر جب تم پاکستان چلے گئے..... تو تقریباً پانچ ماہ بعد میں تمہارے پیچھے پاکستان آئی تھی۔ میں تمہارے گھر تک بھی پہنچی تھی۔ تم اس وقت چیمل کے کسی کام سے پاکستان سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میری ملاقات تمہاری آنٹی سے بھی ہوئی تھی جن کو تم اموخالہ کہتے ہو۔"

شامیر سناٹے میں رہ گیا۔ تین چار سال گزر چکے تھے مگر اس کے علم میں ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "جین پلیز! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ وضاحت سے بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

جین پہلو بدل کر بولی۔ "شامیر! تم سے دو دن پہلے والی ملاقات کے بعد سے میرے دل پر ایک دم بوجھ سا پڑ گیا ہے۔ تمہاری اور زویا کی جدائی کا غم پھر سے تازہ ہوگیا ہے۔ مجھے یوں لگا ہے جیسے تم دونوں کے بچھڑنے میں کچھ اور لوگوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے..... اور شاید ان میں تمہارے گھر کا کوئی فرد بھی شامل ہے۔"

"یہ..... بات..... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" شامیر بمشکل بول پایا۔

جین نے نیا سگریٹ سلگا کر یوں اس کا کش لیا جس طرح سرد آہ بھری جاتی ہے..... پھر جیسے ماضی کی کھڑکی میں جھانکتے ہوئے وہ بولی۔ "شامیر! میں نے پچھلی ملاقات میں بھی تم سے یہی کہا تھا نا کہ تم زویا کی پہلی محبت تھے۔ اس نے تم سے بہت پیار کیا ہے شامیر---- شاید تمہاری توقع سے بھی زیادہ۔ اب میں تمہیں کیا کچھ بتاؤں۔ جب تم دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوگئے اور تم پاکستان واپس چلے گئے تو وہ جیسے ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ تم اس طرح اسے چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ پھر اس نے ڈبل اے چیمل کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ بعد میں ان کے میوزخ والے گھر میں ڈکیتی والا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد وہ جرمنی نوٹ لوٹ گئی۔ وہ تمہیں یوں کھونا نہیں چاہتی تھی مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ارادے کی بہت پکی ہے۔ اس نے کوئی بہت بڑی قسم کھالی تھی کہ از خود

جدائی نے مجھے تقریباً مار ڈالا ہے۔"

شامیر نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس کا دکھ کچھ ہلکا کیا۔

رابرٹ سے گفتگو کے بعد شامیر کے اندر کی اتھل پتھل میں مزید اضافہ ہوگیا۔ زویا کے کردار کے سلسلے میں وہ کوئی بھی رائے قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ زویا کے حوالے سے چند دن پہلے جو کچھ اس کی بہن حولیہ نے کہا تھا، وہ بھی شامیر کے دماغ میں مسلسل گونج رہا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ زویا اگر شامیر کی محبت کو بھول کر رابرٹ کی بیوی بننے پر آمادہ ہوئی تو اس کے پیچھے اس کی معاشی مجبوریاں بھی ہوں۔ اس کی ماں زخمی ہونے کے بعد شدید بیمار تھی۔ اس کے علاج پر بھی بھاری اخراجات اٹھ رہے تھے، ایسے میں اس نے سوچا ہو کہ وہ رابرٹ کی زندگی میں آکر اپنے گھر والوں کے لیے آسانیاں پیدا کرے..... لیکن پھر اس کے بعد وہ جس طرح ایک نئے روپ میں ڈھلتی گئی، وہ یقیناً ایک نہ سمجھ میں آنے والی صورتِ حال تھی۔ اب ایک دن پہلے جین کے ذریعے نیا انکشاف یہ ہوا تھا کہ شامیر کے پاکستان جانے کے بعد وہ بے طرح پریشان اور غمزدہ رہی تھی۔ اس کی غیر معمولی تڑپ دیکھ کر ہی جین دکھی ہوئی تھی اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کسی طرح شامیر سے ملے۔ اگر زویا، شامیر کے لیے اتنی چاہت رکھتی تھی اور اس کے جذبے میں اتنی گہرائی تھی تو پھر کیوں ان دونوں کے لیے کوئی راستہ نہ نکل سکا؟ شامیر کے ذہن میں سوالوں کی کلبلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح ایک بار، کم از کم ایک بار زویا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا اور اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ ٹوئل دو ماہ کا ویزا تھا اور آدھے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

☆☆☆

فارہ اور امو ثمینہ چوتھے فلور پر ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھی تھیں۔ افشاں اندر شاور لے رہی تھی۔ شامیر صبح سے کہیں نکلا ہوا تھا، اس کا موڈ کل سے کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ فارہ نے قہوہ کے گھونٹ میں موجود پیلے گلاب کی پتیوں کو بے خیالی میں نوچتے ہوئے کہا۔ "امو! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل اس وقت میں کچن میں تھی جب آپ کے لاڈلے نے ناشتے کے بعد فون پر کسی سے بات کی۔ مجھے یاد آرہا ہے کچن کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اس گفتگو میں جین کا لفظ صاف سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے..... خیریت تو ہے جین....." وہ ذرا توقف کر کے دوبارہ بولی۔ "امو! آپ مانیں یا نہ مانیں۔ یہ وہی جین ہے۔"

امو کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے تھے۔

فارہ بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ "کل تک تو مجھے صرف شک تھا لیکن اب آپ کے لاڈلے کا موڈ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ یہ وہی لڑکی جین ہے اور اس نے آپ کے بھانجے کو بتا دیا ہے کہ تین چار سال پہلے وہ اس سے ملنے ہمارے گھر تک پہنچی تھی۔"

امو ثمینہ نے اٹھ کر بالکونی کا ایک چکر لگایا پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

فارہ نے تیز سرگوشی میں کہا۔ "بتائیں، جب وہ پوچھے گا کہ اتنی اہم بات آپ نے اس سے کیوں چھپائی تو کیا جواب دیں گی؟"

امو ثمینہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ نہ ہی پوچھے..... اور اگر پوچھ بھی لے گا تو میں وہی کہوں گی جو مجھے کہنا چاہیے۔"

"اور آپ کو کیا کہنا چاہیے؟"

"فارہ! تم پولیس والیوں کی طرح مجھ سے سوال جواب نہ کرو۔ تم میری ماں نہیں ہو، میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔"

"آپ کو پتا تو ہے لیکن آپ سے ہوتا نہیں ہے۔ اگر آپ سے ہوتا تو آپی ثمائلہ کی شادی اس خرانٹ ذیشان سے ہونے ہی نہ دیتیں۔ اسی وقت آپ کا لاڈلا آپ کا داماد بن جاتا۔ اب تو کسی وقت مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ بس ایک ضد کے ساتھ جی رہی ہیں۔ ایک ایسی ضد جس کے نتیجے میں آپ کا بھانجا آپ کا داماد تو شاید بن جائے لیکن میری لائف ایک مسلسل مصیبت بن کر رہ جائے گی۔"

''یہی تو تیری غلط فہمی ہے فارہ۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں تیرے لیے شامیر جیسا تابعدار شوہر پورے جگ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ میں یونہی خود کو اس کام میں ہلکان نہیں کر رہی ہوں..... بس اب تو چپ ہو جا۔''

فارہ چند لمحے پیچ و تاب کھاتی رہی پھر واپس موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تھوڑا سا اضافہ میری عقل میں بھی فرمائیں۔ آپ کے بھانجے صاحب جب آپ سے پوچھیں گے کہ جین والی خبر آپ نے آج تک ان سے کیوں چھپائی تو کیا کہیں گی؟''

''اگر ایسا ہوا بھی تو..... بات بالکل سیدھی ہے فارہ! وہ لڑکی زویا شروع میں ہی زبردست تیور دکھا رہی تھی۔ وہ بیاہ کر پاکستان آنا نہیں چاہتی تھی۔ شامیر بمشکل اس کے چنگل سے نکلا تھا اور کسی حد تک نارمل ہوا تھا۔ تب یہ جین آ کر ہمارے منہ لگ گئی۔ میں شامیر سے بھی کہوں گی کہ میں اسے پھر سے اس تکلیف دہ چکر میں پھنستے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے جین کو سرد مہری دکھائی اور اس کے آنے کی اطلاع بھی شامیر کو نہیں دی۔''

فارہ نے برہم انداز میں اپنے رنگ شدہ بالوں کو چہرے سے ہٹا کر شانے پر پھینکا اور بولی۔ ''بال کی کھال اتارنے والا ہے وہ..... مجھے نہیں لگتا کہ آپ کی یہ بات اسے آسانی سے ہضم ہوگی۔''

''ہضم ہوتی ہے یا نہیں، تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم بس ایک بات ذہن میں رکھو۔ اگر وہ اس معاملے میں بات کرتا ہے تو تم نے خود کو بالکل لاعلم بتانا ہے۔ تم جین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو، سمجھیں؟''

☆☆☆

شامیر شام کو ہوٹل واپس آیا تو امو خالہ اپنے کمرے میں صوفے پر لیٹی تھیں۔ افشاں ان کا سر دبا رہی تھی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ امو خالہ نے اسے بتایا کہ دوپہر سے طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بلڈ پریشر شوٹ کر گیا ہے۔ شامیر نے فارہ کو بی پی آپریشن لانے کا کہا کہ بلڈ پریشر چیک ہو سکے۔ فارہ بولی۔ ''اب فائدہ نہیں۔ دوا کھائی ہے، کیپسول بھی زبان پر چھوڑ دیا تھا۔''

امو نے کہا۔ ''شامی! میرا خیال ہے کہ اب واپس ہی چلیں۔ یہ نہ ہو طبیعت زیادہ بگڑ جائے بلکہ.....'' وہ چند سیکنڈ رکیں پھر کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں اب واپس پاکستان ہی چلا جائے۔''

شامیر نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ واپس فرینکفرٹ پہنچ کر وہ ان کا چیک اپ کرائے گا۔ کچھ دیر تک امو کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ کل بھی باس عشرت سلطان صاحب سے رابطے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر رابطہ ہو نہیں پایا تھا۔ آج اسکائپ پر پہلی کوشش ہی کامیاب رہی۔ رسمی کلمات کے بعد شامیر بولا۔ ''سلطان صاحب! ایک ناخوشگوار اطلاع ہے آپ کے لیے۔ زویا راشد یاد ہے نا جو چار پانچ سال پہلے یہاں پیپل کے لیے کام کرتی تھی؟''

''ہاں ہاں..... اسے کیسے بھول سکتے ہیں۔''

''اس کے حالات آج کل بہت خراب ہیں اور جو کچھ میں آج تک معلوم کر سکا ہوں، اس کے مطابق حالات کی خرابی کی وجہ ہماری دی اسٹوری بنی ہے جس پر میں نے اور زویا نے کام کیا تھا۔''

''سہراب درانی والی؟'' سلطان صاحب نے تصدیق چاہی۔

شامیر نے اثبات میں جواب دیا اور بولا۔ ''سلطان صاحب! شہادتیں یہ بتا رہی ہیں کہ اس رپورٹ کی وجہ سے یہاں جرمنی میں زویا کے خلاف انتقامی کارروائی ہوئی۔ پہلے ایک ایکسیڈنٹ کی آڑ میں اسے بری طرح مارا پیٹا گیا..... بعد میں میونخ میں واقع ان کے گھر پر فائرنگ کی خوفناک واردات ہوئی جس میں زویا تو بچ گئی مگر اس کی والدہ شدید زخمی ہوئی اور زویا کی بہن کو بھی سخت جسمانی نقصان پہنچا۔ پتا چلا ہے کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی اور اس کا حمل ضائع ہو گیا۔'' شامیر نے اجتماعی زیادتی والی بات جان بوجھ کر گول رکھی۔

سلطان صاحب ساری بات سن کر سخت حیران ہوئے۔ ''شامیر! تو تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب سہراب درانی نے کیا؟''

''لگ تو یہی کچھ رہا ہے جی۔''

''لیکن تمہیں تو معلوم ہے شامی! وہ اس رپورٹ

کے منظرعام پر آنے کے کچھ ہی ہفتے بعد ایک اور مقدمے میں اریسٹ ہوگیا تھا..... اور پھر فوراً ہی دو تین اور مقدمے چل پڑے تھے۔ اسے باقاعدہ سزا ہوگئی تھی۔ وہ تب سے اب تک جیل سے نکلا ہی نہیں۔ اس کے سارے ساتھی تتر بتر ہو چکے ہیں۔ پورا سیٹ اپ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔"

"آپ کی بات درست ہے جی..... لیکن کہا یہ جارہا ہے کہ سہراب نے یہ سب کچھ اپنے ساتھی رونالڈو عرف نمرسی نامی مقامی بدمعاش کے ذریعے کروایا ہے۔"

"رونالڈو نمرسی....." سلطان صاحب نے شامیر کے الفاظ دہرائے..... کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "لیکن میری معلومات کے مطابق رونالڈو، سہراب درانی کا ساتھی نہیں بلکہ فنٹی فنٹی کا پارٹنر تھا اور ہماری رپورٹ منظرِعام پر آنے سے پہلے ہی ان دونوں میں شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔"

شامیر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "پھر اس کا مطلب تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ..... زویا کے اہلِ خانہ کے ساتھ ہونے والے ظلم میں سہراب کا ہاتھ نہ ہو..... یہ رونالڈو نمرسی کی ذاتی کارروائی ہو۔"

☆☆☆

رنگوں، خوشبوؤں اور قدرتی نظاروں سے مزین، جرمنی کا یہ خوبصورت قصبہ لیونابرگ، شامیر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ پچھلی مرتبہ بھی جب وہ جرمنی آیا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ یہ قصبہ دیکھے مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ شاید ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ شامیر کے یہاں آنے کی وجہ جین کی ایک فون کال بنی تھی جو اس نے کل دوپہر کی تھی۔ جین نے بتایا تھا کہ لیونابرگ میں ایک جرمن خاتون ایسی رہتی ہیں جن سے زویا کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہ خاتون چند برس پہلے مسلمان ہو چکی تھیں اور ان کا نام حامدہ رضوان تھا۔ جین جانتی تھی کہ حامدہ کی حیثیت زویا کی گہری رازدار کی تھی بلکہ شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتی تھیں۔ جین نے کوشش کرکے حامدہ کا پتا دریافت کیا تھا..... بلکہ یہ دو پتے تھے۔ جین کو امید تھی کہ حامدہ ان میں سے ایک پتے پر مل جائے گی اور اگر یہ نہ بھی ہوا تو ان دو پتوں سے اس کا کھوج ضرور مل جائے گا۔

ٹرین سے اترنے کے بعد شامیر پیدل ہی چل دیا۔ ایڈریس والی پرچی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے دو جگہوں پر راہ گیروں سے پوچھ کر اپنی سمت درست کی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ سورج کی الوداعی کرنیں پھولوں سے لدی ہوئی بالکونیوں اور گھروں کی سُرخ ٹیلی چھتوں کو بوسہ دے رہی تھیں۔ قصبے کی زندگی میں دلکشی کے ساتھ ساتھ عجیب سا ٹھہراؤ اور سکون محسوس ہوتا تھا۔

نہ جانے کیوں ایک بار پھر زویا کے کہے ہوئے الفاظ شامیر کے کانوں میں گونجنے لگے۔ فرینکفرٹ میں گھومتے ہوئے وہ دونوں ایک "پری" سے ملے اور اس کے ساتھ تصویریں کھنچوانے لگے تھے۔ شٹل کاک کی شکل والی اس عمارت کی بات چل نکلی تھی، جس کے ذریعے شامیر نے سہراب کی غیر قانونی پراپرٹی کا کھوج لگایا تھا۔ زویا نے کہا تھا۔ "شامیر! واقعی آپ کی کھوج لگانے کی حس بہت زبردست ہے۔ کیا پتا کسی وقت مجھے بھی آپ کی ضرورت پڑ جائے۔" جب شامیر نے اس فقرے کا مطلب پوچھا تو وہ بولی تھی۔ "کسی دوسرے شہر میں گھومتے پھرتے میں اکثر گم ہو جاتی ہوں۔ کیا پتا کہ کسی وقت ایسا ہو جائے اور میرے گھر والے مجھے ڈھونڈنے کے لیے آپ کو بلالیں۔"

زویا کی مذاق میں کہی ہوئی یہ بات آج کئی سال بعد سچ ثابت ہو رہی تھی۔ وہ واقعی کہیں گم ہو چکی تھی اور شامیر اسے کھوجنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ کہاں تھی؟ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اور وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر رہی تھی؟

قصبے کی نہایت شفاف نیم سرد ہوا میں گھنے درختوں کے نیچے خوبصورت سڑک پر چلتے چلتے نہ جانے کیوں اسی گیت کے الفاظ شامیر کو یاد آگئے جو ان دونوں نے کبھی دریائے ہائنز کے کنارے سنا تھا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں

اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی، وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے..... میرے یار وہ محبت ہے....

یہ گیت اکثر و بیشتر شامیر کی سماعت میں گونجتا تھا اور جب بھی ایسا ہوتا تھا اس کے اندر ایک عجیب سا گداز پیدا ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک یقین بھی جاگتا تھا..... ہاں، سب ڈوریاں ٹوٹ چکیں..... لیکن ایک ڈور اب بھی موجود ہے۔ ایک ناتا اب بھی برقرار ہے۔

قمقمے کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ پتھریلی سڑکوں اور گلیوں کی دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کیبن کلر کلر کرتے۔ جیسے خوبصورت کھلونے ترتیب سے رکھے ہوں۔ حامدہ رضوان نامی اس خاتون کو ڈھونڈنا کتنا آسان یا کتنا دشوار ثابت ہوگا؟ یہ سوال شامیر کے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بہت آسان ثابت ہونے والا ہے۔ اسے خوش قسمتی ہی کہا جائے گا کہ وہ جس پہلے ایڈریس پر پہنچا، وہی حامدہ کا ایڈریس ثابت ہوا۔ ڈور بیل پر جو خاتون باہر نکلیں، وہ حامدہ ہی تھیں۔ ان کی عمر 30 سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی۔ انہوں نے حجاب کیا ہوا تھا۔ نیچے ایک کھلا سا پھول دار لبادہ تھا۔ وہ شامیر کو پہلی نظر میں ہی اچھی اور خوش اخلاق لگیں پھر فوراً ہی شامیر کو یہ احساس بھی ہوگیا کہ اس نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں؟ یہ ٹھیک سے یاد نہیں آیا۔

''جی فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟'' خاتون نے شستہ انگلش میں پوچھا۔

شامیر نے دروازے پر کھڑے کھڑے اپنا مختصر تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ اپنے کسی کام سے پاکستان سے یہاں آیا تھا اور اب زویا کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

خاتون حامدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔ وہ شامیر کو گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یوں لگا کہ وہ شامیر کے بارے میں پہلے سے کافی کچھ جانتی ہیں۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد انہوں نے شامیر کو اندر بلالیا۔ نخروٹی چھت والا یہ چھوٹا سا دو منزلہ گھر باہر سے جتنا رنگ برنگا تھا، اندر سے بھی اتنا ہی خوبصورت اور سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پھول مہک رہے تھے۔ ایک کمرے میں لکڑی کی دیوار پر دل کی شکل میں سرخ گلاب اور لالے کی کلیاں بڑی نفاست سے سجائی گئی تھیں۔ کچن کی طرف سے کھانے کی خوشبو بھی اڈر رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج اس گھر میں کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہے۔ اس گھر میں حامدہ اپنے شوہر رضوان اور ڈھائی تین سالہ بچے عمر کے ساتھ رہتی تھی۔ گول مٹول بچہ بھی اپنی ماں ہی کی طرح خوش اخلاق اور خوبصورت تھا۔ اس نے بڑے نستعلیق لہجے میں شامیر کو السلام علیکم کہا۔ رضوان ملک کی عمر 35 کے لگ بھگ تھی۔ پیشانی پر ہلکا سا محراب کا نشان ان کے مذہبی ہونے کی نشاندہی کرتا تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔

شامیر پر انکشاف ہوا کہ آج یہ خوش و خرم جوڑا اپنی شادی کی چوتھی سالگرہ منا رہا ہے۔ شامیر نے ان سے اجازت چاہی اور معذرت بھی کی کہ وہ ان کی مصروفیت میں مخل ہوا۔ اس نے مسز حامدہ سے کہا کہ وہ کل کسی وقت حاضر ہوجائے گا۔ جب مسز حامدہ اور مسٹر رضوان کو معلوم ہوا کہ وہ یہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا تو انہوں نے اسے جانے نہیں دیا اور بالائی منزل کا ایک کمرا اس کے لیے کھول دیا۔

چائے پینے کے دوران میں شامیر نے ایک بار پھر زویا کا تذکرہ چھیڑا۔ ایک بار پھر مسز حامدہ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا تاہم انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس بارے میں اطمینان سے بات کریں گے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جو کچھ بھی مجھے معلوم ہے، میں ضرور بتاؤں گی۔''

اور یہی وقت تھا جب شامیر کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور اسے یاد آگیا کہ اس نے مہربان چہرے والی اس خاتون کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ پچھلی بار جب وہ یہاں آیا تھا، وہ اور زویا فرینکفرٹ کی اسکائی لین دیکھنے گئے تھے۔ وہیں دریا کے کنارے اس خاتون سے زویا کی ملاقات ہوئی تھی، دونوں بے تکلفی سے بغلگیر ہوئی تھیں اور چٹ چٹ ایک دوسرے کے گالوں کے بوسے لیے تھے۔ اس وقت بھی زویا نے

شامیر کو یہی بتایا تھا کہ یہ اس کی ایک بیسٹ فرینڈ ہیں۔

شامیر اپنے خیال سے چونکا۔ مسز حامدہ کہہ رہی تھیں۔ ''تم ہمارے لیے اجنبی نہیں ہو۔ میں نے تمہیں ایک دفعہ زویا کے ساتھ دیکھا تھا۔ بعد میں جب ایک دفعہ زویا سے ملاقات ہوئی تو اس نے تمہارا ذکر کیا تھا۔''

شامیر بولا۔ ''مجھے بھی آپ کی اور زویا کی ملاقات یاد آگئی ہے۔ آپ دونوں کامرس بینک کی بلڈنگ کے پاس ملی تھیں۔''

وہ ذرا شرما کر بولیں۔ ''ہاں، ان دنوں میری اور رضوان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہم گھومنے پھرنے نکلے ہوئے تھے.....''

نہ جانے کیوں مسز حامدہ کے اندازِ گفتگو سے شامیر کو اندازہ ہو رہا تھا جیسے مسز حامدہ اور زویا اب کافی دنوں سے نہیں ملیں۔

اس سجے سجائے گھر میں شامیر کو وہ ساری نشانیاں نظر آئیں جو اس مختصر گھرانے کے مذہبی رجحان، ان کی خوش اخلاقی اور کامیاب ازدواجی زندگی کی گواہی دیتی تھیں۔ شامیر کو معلوم ہوا کہ اس جرمن خاتون نے پاکستانی مسٹر رضوان سے صرف شادی کرنے کے لیے اسلام قبول نہیں کیا تھا..... بلکہ پہلے اس دینِ کامل کو اچھی طرح سمجھا تھا، اپنے اندر اتارا تھا اور پھر اسے قبول کیا تھا۔ مقاماتِ مقدسہ کی دو تین پینٹنگز بھی شامیر کو گھر کی دیواروں پر نظر آئیں۔ پھر ایک کمرے میں علامہ اقبال کی تصویر نے بھی شامیر کو حیران کیا۔ ایک بڑی سلجھی ہوئی، شفاف اور راست زندگی اس گھر کے در و دیوار پر اپنی چمک دکھا رہی تھی۔ شاید یہی فرق تھا اس جوڑے میں اور ان میاں بیوی میں جو زویا کے ممی پاپا کہلاتے تھے۔ وہاں صرف ضرورت کے تحت اسلام قبول کیا گیا تھا اور ضرورت کے تحت ہی ایک شوہر نے ایک ''تم مسلم'' بیوی کو قبول بھی کر لیا تھا۔ شامیر نے حامدہ اور رضوان کے ساتھ ہی ان کی سالگرہ کی تقریب میں حصہ لیا اور ایک پُرتکلف کھانا بھی کھایا جو روسٹ کی ہوئی ترکی اور پاکستانی طرز کے سیخ کبابوں پر مشتمل تھا۔ بہرطور اس ساری مصروفیت کے دوران میں شامیر محسوس کرتا رہا کہ مسز حامدہ کچھ الجھی ہوئی ہیں..... اس خوش کن گھریلو تقریب کے علاوہ بھی ان کے دماغ میں بہت کچھ چل رہا ہے۔

شامیر بالائی منزل پر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ لیونا برگ میں سردی نسبتاً زیادہ تھی۔ جرمن طرز کی کھڑکیوں میں سے قرب و جوار ہی نظر نہیں آتے تھے بلکہ آسمان کا کچھ حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ مسز حامدہ نے شاید مناسب نہیں سمجھا کہ شامیر ساری رات بے چینی اور تجسس میں گزارے۔ دس بجے کے لگ بھگ دروازے پر ناک ہوئی اور وہ اجازت لے کر اندر آگئیں۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ دیکھ کر احترام کا سا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ سنجیدہ موڈ میں نظر آ رہی تھیں۔

پہلے تو انہوں نے تفصیل سے پوچھا کہ وہ اب اتنے سالوں بعد زویا کو کیوں ڈھونڈ رہا ہے اور اسے یہاں لیونا برگ میں آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ شامیر نے جین کا نام لیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے تجسس سے مجبور ہو کر یہ بادہ پیمائی کر رہا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس سے ''بریک اپ'' ہونے کے بعد زویا اب کس طرح کی زندگی گزار رہی ہے۔ بہرحال وہ اس کی زندگی میں کسی بھی طرح کی مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتا۔

حامدہ نے پوچھا۔ ''تم زویا کے شوہر سے ملے ہو، اس سے مل کر تم نے کیا محسوس کیا؟''

''اس سے مل کر تو یہی محسوس ہوا کہ شاید اس سے کچھ زیادتی ہوئی ہے۔ بچے پر ماں اور باپ دونوں کا حق ہوتا ہے..... اور وہ بچی کسی کو لے کر کہیں اوجھل ہو چکی ہے۔ ایک سال سے زائد وقت گزر گیا ہے۔ رابرٹ کا بچی کے بغیر برا حال ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے شامیر! میاں بیوی کے اس جھگڑے میں زیادتی کس کی طرف سے ہے؟''

''بظاہر تو یہی لگتا ہے جی کہ زویا میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں اور اس کی ازدواجی زندگی کے متاثر ہونے میں شاید اس کی اپنی غلطیاں ہی اہم کردار ادا کر رہی ہیں..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت یہ شبہ بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ شاید حالات کی اصل تصویر وہ نہ ہو جو نظر آ رہی ہے..... زویا کی کچھ مجبوریوں نے

اسے اس راہ پر ڈال دیا ہو۔''

حامدہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر دکھی لہجے میں بولی۔ ''مسٹر شامیر! مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں زویا کے حق میں کچھ نہیں بول سکتی اور اگر بولوں گی تو یہ بددیانتی کہلائے گا۔ رائے اور مشورہ بھی تو ایک امانت کی طرح ہی ہوتا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''زویا کو مسلمان تھی مگر اسلامی شعائر کی پابند تو وہ پہلے بھی نہیں تھی..... گھر میں ڈکیتی والی واردات کے بعد جب اس کا گھرانا معاشی مسئلوں کا شکار ہوا تو وہ بھی بدلنا شروع ہوگئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہاری جدائی کا سوگ بھی اس نے بس وقتی طور پر منایا، پھر اپنے خیالات کے بہاؤ میں بہنے لگی۔ رابرٹ سے اس کی شادی بھی بس اپنے لیے معاشی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ہی تھی۔ بے شک اس نے شادی سے پہلے علامتی طور پر رابرٹ کو مسلمان بھی کرلیا تھا مگر شادی کے بعد اس نے خود بھی اسلامی شعائر کی پروا نہیں کی۔ اب کہنے والے تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ جس لڑکے کے نام کے ساتھ اوجھل ہوئی ہے، وہ بھی کچھ زیادہ مضبوط کردار کا لڑکا نہیں ہے، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ بغیر تصدیق کے کسی پر الزام لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔''

''آپ سے زویا کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟''

''میری شادی کے بعد وہ شاید دو دفعہ ہی مجھ سے مل سکی ہے، ایک تو فرینکفرٹ والی وہ ملاقات جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد اگلے ماہ شاید ایک یا دو بار مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ پھر وہ اپنے حال میں مگن اور میں اپنے میں مگن ہوگئی..... ایک دو جاننے والوں سے اس کے بارے میں خبریں ملتی رہیں۔ اس کی شادی بھی بڑی خاموشی سے ہوئی تھی۔ بس دونوں گھرانوں کے چند افراد ہی مدعو تھے۔''

''لیکن مسز حامدہ! میں نے تو سنا ہے کہ آپ دونوں میں گہری دوستی تھی اور آپ ایک دوسرے کی ہمراز بھی تھیں۔''

''میں نے کہا ہے نا کہ ڈکیتی والی واردات کے بعد وہ بڑی تیزی سے بدلنا شروع ہوگئی تھی اور اب تو جیسے اپنے ماضی سے کٹ آف ہی ہوگئی ہے۔'' مسز حامدہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

کمرے کے ساتھ ہی چھوٹی سی لابی بھی تھی۔ ایک دیوار پر بہت سی چھوٹی بڑی فریم شدہ تصویریں نظر آرہی تھیں۔ کچھ مسز حامدہ اور ان کی فیملی کی تھیں..... کچھ قریبی عزیزوں کی۔ ایک تصویر دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ اس میں زویا بھی ہے۔ حامدہ سے اجازت لے کر وہ لابی میں تھوڑا سا آگے گیا اور تقریباً نو انچ ضرب بارہ انچ کی اس تصویر کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ ہاں، وہ زویا ہی تھی۔ وہی من موہنی صورت، مانگ نکال کر بنائے گئے سلکی بال، گال میں ڈمپل اور پیشانی پر چاند سا چمکتا ہوا۔ وہ ایک ہاف سلیو، کڑھائی دار شوخ لباس میں ملبوس تھی۔ ایک اور جرمن لڑکی کے علاوہ حامدہ اور مسز رضوان بھی تصویر میں نظر آرہے تھے۔ شامیر کو لگا کہ یہ تصویر شاید ڈیڑھ دو سال پرانی ہے۔ اس میں زویا کے وزن میں انیس بیس کا فرق نظر آرہا تھا اور اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں بھی کچھ کم دکھائی دیتی تھیں۔

''یہ کب کی تصویر ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''یہ..... میری..... شادی کے موقع پر اتاری گئی تھی۔'' حامدہ نے جلدی سے کہا۔

''مجھے لگ رہا تھا، شاید یہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔'' شامیر بولا۔

''نہیں، چار سال تو ہوگئے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

پتا نہیں کیوں شامیر مطمئن نہیں ہو پایا۔ اسے یہی لگا کہ یہ تصویر اتنی پرانی نہیں جتنی مسز حامدہ بتا رہی ہیں..... کچھ تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے کی۔

پیچھے ہٹنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر تصویر کو دھیان سے دیکھا۔ یہ تصویر اتاری تو واقعی کسی فنکشن میں گئی تھی۔ یکایک شامیر چونک گیا۔ اسے تصویر میں زویا کے ایک بازو پر کہنی کے پاس ایک نشان نظر آیا۔ یہ وہ دو تین ٹانکے تھے جو تقریباً چار سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ والے جھگڑے کے بعد اس کے زخم پر لگائے گئے تھے۔ شامیر اس نشان کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ یہ

ہوئے کہا۔ ''شامیر! میرا اور تمہارا رشتہ صرف ایک باس اور ماتحت کا نہیں ہے، میں تمہیں گھر کے فرد کی طرح اہمیت دیتا ہوں۔ زویا تمہاری زندگی سے اسی دن نکل گئی تھی جس دن اس نے تمہارے ساتھ پاکستان آنے سے انکار کیا تھا اور اب تو وہ تمہاری اطلاعات کے مطابق کچھ اور ہی راستوں پر گامزن محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اگر کوئی سوچ تمہارے ذہن میں ہے تو اسے نکال دو۔ یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ نرسی کے حوالے سے بات کررہے ہیں۔''

''اس اندیشے سے تو تم بھی مکمل طور پر انکار نہیں کرسکو گے۔ بے شک نرسی اس وقت جرمنی میں نہیں ہے۔ اس کا وہ پہلے والا زور بھی ٹوٹ چکا ہے لیکن بدکردار کی بدکرداری اور عداوت کسی وقت بھی سامنے آسکتی ہے.....''

عظمت سلطان صاحب، شامیر کو سمجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس قسم کی ہی بات کچھ دن پہلے حولیہ نے بھی کہی تھی۔ وہ حولیہ اور سلطان صاحب کو کیسے بتاتا کہ وہ جس کو ''ماضی'' بتارہے ہیں، وہ ماضی نہیں ہے..... وہ حال ہے..... فرینکفرٹ کی وہ لڑکی آج بھی ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں اٹکی ہوئی ہے۔ اب وہ یہ کانٹا نکالے بغیر واپس نہیں جاسکتا..... نہ ہی کوئی اندیشہ اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے۔ اس کے اندر کی متلاشی روح اب پوری طرح بیدار ہوچکی تھی۔

☆☆☆

شامیر ہوٹل میں تھا اور بے قراری سے چینل کی رپورٹر مارگریٹ کا انتظار کررہا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق وہ فرینکفرٹ سے روانہ ہوچکی تھی۔ شامیر چاہتا تھا کہ مارگریٹ کو مسٹر رضوان اور مسز حامدہ کی چھان بین پر لگائے۔ اسے پوری امید تھی کہ تحقیقی صحافت سے تعلق رکھنے والی مارگریٹ یہ کام اچھی طرح کرلے گی۔

شامیر کے فون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف فارہ تھی۔ فارہ اور امو خالہ وغیرہ ابھی تک پیڈربورن میں تھے۔ شامیر نے ان سے کہا تھا کہ وہ ایک رات کے لیے چینل کے کام سے نکلا ہے، اگلے روز واپس پہنچ جائے گا۔

''کہاں ہیں جناب عالی! واپسی کے لیے نکلے یا نہیں؟'' فارہ نے لہجے کو شوخ بناتے ہوئے کہا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد شامیر بولا۔ ''سوری فارہ! میں فون کرنے ہی والا تھا۔ دراصل یہاں کام تھوڑا سا لمبا ہوگیا ہے۔ آج کی رات مجھے مزید رکنا پڑ جائے گا۔''

یہ بات سن کر فارہ پہلے تو چپ ہوئی، پھر ایکدم بھڑک اٹھی۔ یوں لگا جیسے وہ کئی دن سے جو غصہ اپنے اندر دبائے ہوئے تھی، وہ یکایک چنگاری پاکر شعلہ بن گیا ہے۔ نہایت تپے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ ٹھیک سے بتا کیوں نہیں دیتے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''کیا مطلب فارہ؟''

وہ مزید تلخ آہنگ میں بولی۔ ''آپ بتائیں، آپ کس کو بے وقوف بنارہے ہیں؟ کیا آپ کے سوا باقی سب کی عقل بند ہوچکی ہے۔ صرف آپ ہی روشن اور ہوشیار دماغ والے رہ گئے ہیں؟ آپ بتا کچھ رہے ہیں، کر کچھ رہے ہیں۔ ٹھیک سے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ اب تک وہی خبیث آپ کے دماغ میں گھسی ہوئی ہے اور آپ آئس ورک کی آڑ میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

شامیر کو فارہ سے ایسے لب و لہجے کی توقع نہیں تھی۔ فارہ کا یہ غصیلا انداز اس نے بہت عرصے بعد دیکھا تھا..... وہ جیسے ٹھٹک سا گیا۔ ''یہ تم کس ٹون میں بات کررہی ہو فارہ؟''

''میری ٹون آپ کی مسلسل غلط بیانیوں کی وجہ سے ایسی ہوئی ہے۔ آپ امو کو دھوکا دے سکتے ہیں، مجھے نہیں۔ آپ ہمارے حال پر رحم فرمائیں اور سچ بتا دیں۔ اگر وہ خبیث آپ کو مل گئی ہے یا ملنے والی ہے تو پھر ہمیں یہاں کیوں ٹانگ رکھا ہے ہوٹل میں..... ہمیں واپس پوزیشن بھیج دیں۔ کم از کم امو کو ٹھیک سے میڈیکل ایڈ مل سکے۔''

فارہ نے زویا کے لیے دوسری بار خبیث کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ طیش میں گویا ہوا۔ ''فارہ! تم اپنی زبان

سنبھال کر بات کرو۔ میں ایسے لہجے کا عادی نہیں ہوں۔"

"اگر آپ جھوٹ بولو گے..... مکاری دکھاؤ گے تو پھر ایسا لہجہ بھی سننا پڑے گا۔ آپ کو اتنا خیال بھی نہیں کہ اموبیمار ہیں اور....." فقرہ مکمل کیے بغیر اس نے یکلخت فون بند کردیا۔

شامیر سناٹے کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ ایسی بدتمیزی کی توقع اسے فارہ سے نہیں تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس سے ایک بناوٹی لہجے میں گفتگو کرتی ہے۔ آج اس نے جو لہجہ اپنایا ہے، وہی اس کا اصل ہے۔ یہ کیسا زہر تھا جو اس کے اندر جمع ہوتا جارہا تھا.....

قریباً ایک گھنٹے بعد اموخالہ کا فون آگیا۔ انہوں نے کہا۔ "شامی! پتا نہیں کہ وہ غصے میں تم سے کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ میں نے ٹھیک ٹھاک کلاس لی ہے اس کی۔ اب بیٹھی رو رہی ہے۔ میں نے بھی چپ نہیں کرایا۔"

"اموا! آج بڑا دکھ ہوا ہے اس کی باتیں سن کر..... اپنے آپ پر بھی غصہ آیا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب تھی تو میں یہاں کیوں چلا آیا۔ میں آج رات کو ہی واپس آرہا ہوں۔ آئی ایم ویری سوری اموخالہ۔"

"شامی! غلطی اس کی ہے۔ شرمندہ بھی اسی کو ہونا چاہیے اور مجھے لگتا ہے کہ اب وہ ہو بھی رہی ہے۔ کبھی کبھی اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں رہتا۔ جب تک یہ معافی نہیں مانگے گی تم سے، میں بھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ اگر کام کی نوعیت ایسی ہے تو بے شک آج کی رات یہاں رہ لو۔"

اموخالہ نے جس طرح کی باتیں کیں، ان سے شامیر کے غم و غصے میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔ بہرحال وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مارگریٹ وقت پر یہاں پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ اسے ضروری ہدایات دے کر آج رات ہی یہاں سے روانہ ہوجائے گا۔

مارگریٹ شام سات بجے کے قریب ہوٹل میں شامیر کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سرخ و سپید رنگت والی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ سرخ سویٹر اور جینز میں ملبوس تھی۔ یہاں کے اکثر لڑکے لڑکیوں کی طرح وہ اسموکنگ بھی کرتی تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ شامیر کو ولی اے چیگل کے ایک اہم "محقق صحافی" کی حیثیت سے اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے بڑے دھیان سے شامیر کی ساری باتیں سنیں اور فرمانبرداری سے اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ شامیر نے اسے مسز حامدہ کے بارے میں ساری ابتدائی معلومات فراہم کردی تھیں۔

مارگریٹ کے ساتھ ملاقات سے وہ کافی مطمئن ہوا اور تھوڑی ہی دیر بعد لیونا برگ کے اس نہایت دلکش قصبے سے واپس پیڈربورن روانہ ہوگیا۔ قریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد وہ رات بارہ بجے کے قریب پیڈربورن پہنچا۔ یہاں ہوٹل میں اموخالہ اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے خود کھانا گرم کیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی رہیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی تکلیف کا تذکرہ بھی کررہی تھیں۔ شامیر نے سوچ لیا تھا کہ وہ کل انہیں واپس اسٹریٹ پولیٹن لے جائے گا۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ شامیر تھکا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رہ رہ کر مسز حامدہ کا حجاب سے ڈھکا ہوا اجلا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آرہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ آخر انہوں نے اس تصویر کے حوالے سے غلط بیانی کیوں کی اور یہ کیوں ظاہر کیا کہ اب ان کا رابطہ زویا سے نہ ہونے کے برابر ہے، تین سازھے تین سال ہوگئے وہ اس سے ملی ہی نہیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے فارہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر شامیر کی پیشانی پر بے ساختہ ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ وہ منہ موڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ بھیڑ کر اندر آگئی۔ کچھ دیر اس کے سامنے خاموش بیٹھی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "سوری۔ میں کچھ سخت بول گئی۔ دراصل میں دوپہر سے بڑی شدت کے ساتھ آپ کا انتظار کررہی تھی۔"

شامیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولتا رہا۔

تھوڑے انتظار کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ "آپ کچھ زیادہ ہی ناراض لگ رہے ہیں..... دیکھیں، میں معافی مانگ رہی ہوں آپ سے۔"

اس مرتبہ شامیر نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں وہ پھر اسی ہیجان خیز نائٹی میں نظر آرہی تھی جس میں چند دن پہلے نظر آئی تھی بلکہ آج تو یہ لباس اپنے ڈھیلے ڈھالے انداز کی وجہ سے کچھ اور بھی حشر سامانی لیے ہوئے تھا۔ شامیر جلدی سے دوسری جانب دیکھنے لگا۔

فارہ نے اٹھ کر شامیر کے جوتے وارڈ روب کے نچلے خانے میں رکھے اور دوبارہ شامیر کے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔ چند سیکنڈ محویت سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اچانک اس کے پہلو میں آن بیٹھی اور اپنا رخسار اس کے کندھے سے لگا دیا۔

''پلیز..... پلیز۔'' اس نے کہا۔

''اچھا..... ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں احساس ہوگیا ہے تو.....'' شامیر نے اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ اسی طرح اس کے ساتھ چپکی رہی۔

''نہیں..... آپ دل سے نہیں کہہ رہے ہیں۔'' وہ ناک میں گنگنائی۔

پھر یکایک جیسے اسے کچھ یاد آیا..... ''ارے۔ وہ آپ کی اسکلی والی چوٹ کا کیا ہوا؟'' اس نے تیزی سے شامیر کا گریبان کھول کر اس کا کندھا عریاں کردیا۔ وہاں نیلگوں نشان اور ہلکا سا ابھار موجود تھا۔ وہ اسے پوروں سے سہلاتی رہی تب اچانک اس پر اپنا گال رکھ دیا اور شامیر سے چپک سی گئی۔

شامیر نے اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ ''نہیں، پہلے آپ مجھے معاف کریں۔''

''بھئی کرتو دیا ہے۔''

''اس کا عملی ثبوت دیں۔'' وہ پھر ناک میں گنگنائی۔

''وہ کس طرح؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے کہا اور کچھ اور بھی شامیر کے ساتھ لگ گئی۔

شامیر بوکھلا گیا۔ اس کی سانسیں زیروزبر ہونے لگیں۔ یہ تنہائی اور یہ خاموشی بڑی سنگین نوعیت کی تھی۔ وہ شامیر سے معافی مانگنے کے لیے آئی تھی مگر معافی مانگنے یا سوری کہنے کے لیے کیا ایسا لباس پہننا ضروری تھا؟ اگر وہ واقعی معافی مانگنے کے لیے آئی تھی تو پھر شاید معافی کے علاوہ ''تلافی'' بھی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ارادے پہلے بھی کچھ خطرناک ہی رہے تھے لیکن آج تو وہ سراپا خطرۂ ایمان بنی ہوئی تھی۔ کچھ بھی تھا، شامیر خاک کا پتلا تھا۔ بہک جانے کا امکان روزِ اول سے اس کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا ہے۔

دفعتاً سائڈ ٹیبل پر پڑے اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ ایک طرح سے تائید غیبی کی طرح تھا۔ اس نے خود کو سنبھال کر فارہ سے علیحدہ کیا اور فون کی اسکرین دیکھی۔ اسے تعجب ہوا، یہ مارگریٹ کی کال تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی رابطہ کرے گی۔ ابھی چھ سات گھنٹے ہی تو ہوئے تھے۔

اس نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا باہر بالکونی میں آگیا۔ ''کیا بات ہے مارگریٹ؟''

''محترم شامیر! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ سراغ مل گیا ہے۔''

''کس کا؟'' شامیر نے تڑپ کر پوچھا۔

''مس زویا کا۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

شامیر چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔

''یہ..... کیا..... کہہ رہی ہو تم؟'' وہ سخت حیرانی میں بولا۔

''میں پوری تصدیق کے بعد ہی آپ کو رپورٹ کررہی ہوں۔'' مارگریٹ نے اعتماد سے جواب دیا۔

یہی وقت تھا جب اندر کمرے میں فارہ چڑھی ہوئی سانسوں اور لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ صاف نظر آرہی تھی..... ''کہاں سے آگئی یہ منحوس کال۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

شامیر اب جلد از جلد لیونابرگ پہنچنا چاہتا تھا۔ تاہم اس سے پہلے اس نے اموخالہ، فارہ اور افشاں کو ٹرین پر چڑھا دیا تاکہ وہ واپس ''پاپلینز'' پہنچ سکیں۔ اموخالہ اور فارہ کو اس نے یہی بتایا کہ آفس کے کام کے لیے اسے ہنگامی طور پر پھر لیونابرگ جانا پڑ گیا ہے۔ اس نے کبھی کوئی بات اموسے راز نہیں رکھی تھی لیکن آج کل

اور وہ اس کا سامنا کس طرح کرے گی؟

مارگریٹ کی گاڑی شامیر خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اب مطلوبہ بلڈنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شامیر نے مارگریٹ سے پوچھا۔ ”تم نے کچھ اندازہ لگایا کہ کس زویا اس فلیٹ میں اکیلی ہے یا کسی کے ساتھ رہ رہی ہے؟“

”نہیں مسٹر شامیر! اس کا اندازہ تو مجھے نہیں ہو سکا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا، شاید آپ بھول گئے۔ جس وقت میں نے اوپر جا کر فلیٹ کا نمبر وغیرہ دیکھا، مجھے اندر کی صورتِ حال دکھائی نہیں دی تھی۔“

ایک درمیانے سائز کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے انہوں نے گاڑی پارک کی اور باہر نکل آئے۔ ایک قریبی ریستوران کے باہر دور تک میزیں لگی ہوئی تھیں۔ بے فکرے لوگ، کروپس اور جوڑوں کی صورت میں بیٹھے بیئر وغیرہ پی رہے تھے یا اسنیکس لے رہے تھے۔ سہ پہر کی چمکیلی دھوپ میں نئے نئے ماڈلز کی گاڑیاں شفاف سڑک پر تیزی سے گزر جاتی تھیں۔

پلاننگ کے مطابق مارگریٹ تو وہیں اپنی فیاٹ کار کے آس پاس رہی اور شامیر اتر کر رہائشی عمارت کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ عمارت سے چالیس پچاس قدم دور ہی تھا کہ اس کی نگاہ ایک بغلی سڑک کی طرف اٹھی اور اس کی ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ چند سیکنڈ کے لیے دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے سرخ اسکرٹ میں ملبوس زویا کو دیکھا۔ اس نے بال تراشے ہوئے تھے اور اس کے کندھے پر ایک بڑے سائز کا جدید شولڈر بیگ تھا۔

یوں لگا جیسے وہ دو تین سیکنڈ پہلے شامیر کو دیکھ چکی تھی اور اب بے طرح تھکی ہوئی تھی۔ یکایک تکلی سی کوند گئی۔ وہ مڑی اور اوجھل ہو گئی۔

شامیر خود کو سکتے کی سی کیفیت سے نکال کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو وہ دکھائی نہیں دی۔ خوش قسمتی سے شامیر کو اس کے سرخ اسکرٹ کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گھسی تھی۔

ایک زہریلا کراسنگ کو خطرناک طریقے سے پار کر کے شامیر برق رفتاری سے اسٹور تک پہنچا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ بدحواسی کے عالم میں شامیر کئی لوگوں سے ٹکرایا اور ان سے معذرت کی۔ یکایک اسے دوبارہ زویا کی جھلک نظر آئی۔ وہ اسٹور کے دوسرے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

شامیر چلایا۔ ”زویا..... زویا رکو۔“

تب تک وہ باہر نکل چکی تھی۔ شامیر اندھا دھند اس کے پیچھے لپکا۔ یہ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی عقبی سڑک تھی۔ اس سڑک کا رنگ ڈھنگ فوڈ اسٹریٹ کا سا تھا۔ یہاں کافی رش تھا۔ سرخ اسکرٹ کی جھلک اب کافی دور نظر آ رہی تھی۔ شامیر لوگوں سے ٹکراتا، انہیں دھکیلتا اور معذرت کے الفاظ بولتا ہوا اس کے پیچھے لپکتا چلا گیا۔ اس نے زویا کو ایک اور دروازے میں گھستے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی اس دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ لیڈیز اور چلڈرن گارمنٹس کا ایک بڑا ڈسپلے تھا۔ چاروں طرف... ہینگرز پر لباس نظر آ رہے تھے۔ وہ زویا کی تلاش میں اردگرد نگاہ دوڑانے لگا۔ اس ہال نما جگہ کا دوسرا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شامیر کو تسلی ہوئی کہ اگر وہ نکلے گی تو اسی ایک دروازے سے نکلے گی۔ وہ ہال کے مختلف گوشوں میں اسے ڈھونڈنے لگا۔ سینے میں اس کا دل شدت سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اس گارمنٹس اسٹور میں موجود لوگ ذرا تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً شامیر کی بیتابی اور عجلت دیکھ کر ان کے ذہنوں میں مختلف سوال اٹھ رہے ہوں گے۔

شامیر نے جونہی ایک کارنر میں ایک بڑے وارڈ روب کے پیچھے جھانکا، وہاں سے کوئی تیزی سے نکلا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ یہ سرخ اسکرٹ ہی تھا مگر اب شامیر اس ”سرخ اسکرٹ“ کو مزید موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جھپٹ کر سرخ اسکرٹ والی زویا کو بازو سے پکڑ لیا۔

وہ ہیجانی انداز میں پکاری۔ ”چھوڑ دو مجھے..... چھوڑ دو..... ہیلپ..... ہیلپ۔“

اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور مارا۔ ”ہوش کرو زویا..... تماشا نہ بناؤ۔ میری بات سنو۔“

''میں تمہیں نہیں جانتی..... چھوڑ دو مجھے۔'' وہ پھر چلائی۔

اسٹور میں موجود لوگ ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ چند افراد کے تیور خطرناک تھے..... یکا یک زویا کو اندازہ ہوا کہ بات بڑھ جائے گی۔ اس کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آیا۔ اس سے پہلے وہ شامیر کو پہچاننے سے ہی انکار کر رہی تھی مگر اب وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے جانے دو۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی اور یہ کیا طریقہ ہے اس طرح سرِراہ مجھے زبردستی روکنے کا.....''

''زویا! تم مجھے دیکھ کر گھبرا رہی ہو۔ تحمل سے کام لو۔ اس طرح تماشا بن جائے گا۔ ہم باہر جا کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

اس نے اب اپنی ہیجانی کیفیت سے نکلنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے دائیں بائیں دیکھا..... اور اپنے تاثرات سے اردگرد موجود لوگوں کو یہ باور کرایا کہ یہ ان دونوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ کھینچا تانی میں اس کا شولڈر بیگ پھسل کر فرش پر گر گیا تھا۔ شامیر نے بیگ اٹھا کر دوبارہ اس کے کندھے پر لٹکایا۔ شامیر نے محسوس کیا کہ وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔

قریباً پانچ منٹ بعد وہ دونوں اسی فیاٹ گاڑی میں بیٹھے تھے جو زویا کے فلیٹ کے قریب ہی ایک پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ مارگریٹ بھی یقیناً گاڑی کے آس پاس ہی موجود تھی..... بہرحال اس نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

زویا کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کا سمندر لہریں لے رہا تھا اور یہ حیرت آنسوؤں سے تر تھی۔ لباس اور حلیے کے اعتبار سے وہ کافی بدل چکی تھی۔ گلے میں اسکارف موجود تھا مگر اصل لباس تو اسکرٹ ہی تھا۔ بالوں کا کلر تبدیل تھا اور وہ پہلے سے کافی چھوٹے بھی نظر آ رہے تھے۔ کندھوں تک بھی نہیں پہنچ رہے تھے۔ یہی بال تھے جو کبھی اس کی کمر سے نیچے تک جاتے تھے اور جنہوں نے فرینکفرٹ میں کامرس بینک کی چھت پر دیوانہ وار جھوم کر ایک قاتل ادا سے شامیر کا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

''تت..... تم یہاں کیسے شومیر؟ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔'' وہ انگلش میں بولی۔

''بھروسا تو مجھے بھی نہیں ہو رہا کہ اتنے برسوں بعد تمہیں فرینکفرٹ سے اتنی دور اس چھوٹے سے قصبے کی اس گمنام اسٹریٹ میں دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے ایک بار سرتاپا شامیر کو دیکھا پھر گلوگیر آواز میں بولی۔ ''شومیر! میں تم سے نہیں پوچھوں گی کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور کیوں پہنچے؟ نہ ہی کوئی اور سوال کروں گی۔ بس اتنی بات کہوں گی کہ اگر تمہارے دل میں اب بھی میرے لیے کوئی تھوڑی بہت محبت ہے تو اس کے صدقے میری ایک بات مان لو۔ میں جہاں ہوں جیسی ہوں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

شامیر نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ بھی دوں تو وہ حالات کیسے چھوڑیں گے جو تم اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہو۔''

وہ اسکارف کے ایک کنارے سے اپنے آنسو پونچھ کر ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''شومیر! مجھے سچ سچ بتانا، تمہارے علاوہ ابھی تک اور کس کو معلوم ہوا ہے کہ میں یہاں لیونابرگ میں ہوں؟''

''ابھی تک تو صرف مجھے معلوم ہے۔''

وہ گہری نظروں سے شامیر کو دیکھتی رہی جیسے اس کی بات کی سچائی پرکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تب اچانک اس نے شامیر کی کلائی پکڑی اور اس کا داہنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ ''تمہیں میری قسم شومیر! میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا..... تم سمجھ لو تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی..... تو میرے ساتھ..... کچھ بہت برا ہو جانا ہے۔''

شامیر نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے ہٹایا اور رو کھے لہجے میں بولا۔ ''اس قسم کی جذباتی بلیک میلنگ کے بغیر بھی تم جو بات کہو گی وہ میں مان لوں گا لیکن میرے علاوہ بھی کوئی ایسا ہے جس کے ساتھ تمہاری وجہ سے بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں نا کہ حالات انسان کا تعاقب کرتے ہیں، وہ تمہارا بھی کریں گے۔''

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، اس

کے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون کا میوزک سنائی دیا۔ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے لرزاں ہاتھوں سے موبائل فون نکالا۔ شامیر کی تیز نگاہ نے اسکرین پر ابھرنے والے نام کو نوٹ کیا۔

''سویٹ نام۔''

دوسری طرف سے مردانہ آواز میں جو کچھ کہا گیا، وہ جرمن زبان میں کہا گیا تھا تاہم اس میں ''بینی'' کا نام شامیر نے صاف سنا۔ بولنے والا یقیناً زویا کا بوائے فرینڈ گنار سٹ نام تھا۔

مختصر کال ختم کرنے کے بعد زویا نے اپنی رسٹ واچ دیکھی پھر شامیر کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''شومیر! مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے..... میری بچی اکیلی ہے۔''

''اوہو..... تو تمہاری شادی ہو چکی ہے؟'' وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

اس نے ذرا چونک کر شامیر کو دیکھا، پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''تو..... تمہاری نہیں ہوئی؟''

''کیسے کرتا؟ کوئی کچھ بتا کر ہی نہیں گیا تھا..... سمجھو کہ، انتظار کی پتھریلی زمین پر تیز دھوپ میں ننگے پاؤں کھڑا کر گیا تھا..... پھر شاید بھول ہی گیا کہ مڑ کر دیکھنا بھی ہے۔''

زویا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ ''اب ان باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں شومیر! وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔'' شامیر نے زویا کے بالوں اور باقی سراپا پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

سرد موسم کے باوجود زویا کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ رسٹ واچ دیکھی۔ ''میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ میری بچی اکیلی ہے..... اگر تم مجھے بغیر کچھ کہے سنے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر کوئی اور ٹائم رکھ لو۔ ہم ایک ملاقات کر لیں گے۔ کسی بھی پبلک جگہ پر ایک آدھ گھنٹے کی ملاقات۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''میں تمہارے اس وعدے پر کیسے یقین کر لوں زویا؟ تم نے رابطہ موجود ہونے کے باوجود مجھ سے چار برس تک بات نہ کی۔ شاید دس، بیس یا تیس برس مزید بھی اسی طرح گزر جاتے اگر آج میں تمہیں یہاں نہ پا لیتا۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایک بار تم سے بات ضرور کروں گی۔'' اس نے بے چینی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

شامیر جلتے لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ بچی کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہو تم..... لیکن زویا..... یہ صرف تمہاری بچی ہی تو نہیں ہوگی، کوئی اور بھی تو ہوگا جو اس بچی کے لیے دن رات تڑپ رہا ہوگا۔''

وہ ایک بار پھر چونکی۔ ''تو تم مجھے ٹریس کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو؟''

''ٹریس کرنا تو میرا پروفیشن ہے اور ایک بار تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کسی وقت تم بھی کہیں گم ہو سکتی ہو اور مجھے..... تم کو ڈھونڈنا پڑ سکتا ہے۔''

''تت..... تمہیں رابرٹ نے یہاں بھیجا ہے؟''

''نہیں، اسے کچھ پتا نہیں کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ وہ خود بھی اس وقت پیڈر بورن میں ہے۔''

زویا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے شامیر کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ ''شومیر! اسے میری بھنک بھی نہ پڑنے دینا..... میرا بہت کچھ برباد ہو جائے گا۔ میں جب تم سے ملوں گی تو تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گی۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''پتا نہیں، تم تفصیل سے بتاؤ گی یا تفصیل سے چھپاؤ گی..... ابھی تک تو یہی لگا ہے کہ تم میرے سائے سے بھی دور رہنا چاہتی ہو۔ برسوں بھی تو یہی کچھ ہوا ہے۔''

''کک..... کیا مطلب؟''

''دیکھو زویا! سچ بولنے کا کہہ رہی ہو تو اب جھوٹ نہ بولنا..... تمہیں برسوں سے ہی معلوم تھا نا کہ میں یہاں لیونا برگ میں آیا ہوا ہوں۔ تمہاری دوست حامدہ رضوان نے تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا نا؟''

اس کی پلکیں بے ساختہ لرزیں اور وہ شامیر سے نظریں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ یہ ایک طرح سے اس کا اعتراف تھا۔ شامیر نے سانس کو ایک آہ کی طرح اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چھوڑو..... دفع کرو..... یہ بتاؤ کب ہوگی ہماری ملاقات؟''

''کل تو نہیں..... پرسوں..... میں تمہیں فون کروں گی..... یا پھر واٹس ایپ..... تمہارا نمبر؟''

''نمبر وہی ہے جو یہاں چار سال پہلے تھا۔'' شامیر نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

وہ کوئی الوداعی کلمہ کہے بغیر تیزی سے باہر نکلی اور لڑکھڑاتی ہوئی سی چیری کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

شامیر کا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ بے شمار سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ زویا واقعی بہت بدل چکی تھی۔ بے شک پہلے کی طرح دلکش تھی۔ اسی طرح نگاہوں کے رستے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر رہی تھی مگر بہت کچھ تبدیل بھی ہو چکا تھا اس کے اندر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے تسلیم کیا تھا کہ وہ دو دن پہلے اس بات سے آگاہ بھی کہ شامیر یہاں لیونا برگ آیا ہوا ہے اور یہ بات اسے یقیناً حامدہ نے ہی بتائی تھی۔ پرسوں رات شامیر سے تفصیلی بات کرنے سے پہلے حامدہ نے یقیناً زویا سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ پرسوں رات حامدہ نے زویا کے بارے میں جتنی بھی منفی باتیں بتائیں، وہ زویا کے مشورے سے ہی بتائیں۔ دوسرے لفظوں میں زویا، شامیر کو اپنی طرف سے بدظن کرنا بھی چاہتی تھی؟

اپنی سوچوں میں گم شامیر فیاٹ گاڑی کو پارکنگ سے نکال کر کچھ آگے لے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ مارگریٹ کہیں آس پاس ہی موجود ہوگی اور اپنی گاڑی کو بھی دیکھ رہی ہوگی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ ایک جگہ رکا تو مارگریٹ بھی وہاں پہنچ گئی اور جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''ملاقات ہوگئی جی؟'' اس نے شامیر سے پوچھا۔

''ہاں..... لیکن فی الحال کوئی خاص بات نہیں ہوسکی۔ تفصیلی ملاقات کے لیے پرسوں کا وقت ملا ہے۔''

''یعنی اب ہم پرسوں یہاں آئیں گے؟''

شامیر کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ''نہیں مارگریٹ! میں چاہتا ہوں کہ تم یہیں کہیں آس پاس موجود رہو۔''

وہ شامیر کو دیکھ کر کہنے لگی۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو اندیشہ ہے، مس زویا پھر کہیں اوجھل نہ ہو جائے؟''

''ہاں مارگریٹ! اس امکان کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔''

وہ چند لمحے توقف کرکے بولی۔ ''اوکے۔ یہ میرے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا..... میں نے یونہی معلومات کے لیے سامنے والے گیسٹ ہاؤس میں روم کا پتا کیا تھا۔ روم دستیاب ہیں۔ کرایہ بھی مناسب ہے۔ میں کل کا دن یہاں رک کر بڑے اچھے طریقے سے مس زویا کا خیال رکھ سکتی ہوں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' شامیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس پر کچھ اہم انکشافات ہونے والے ہیں۔ اب پرسوں تک کا وقت گزارنا اس کے لیے خاصا دشوار تھا۔

☆☆☆

لیونا برگ کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ شامیر قدیم طرز کے خوبصورت گھروں کے درمیان ایک تنگ سڑک سے گزرتا ہوا اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں آج زویا سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ شامیر نے لیونا برگ کے اس تاریخی قصبے کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا۔ آج اس کو پوری ''وضاحت'' سے دیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ لیکن کلر کلر خوشنما کھلونوں کی طرح تھے۔ ان میں سے اکثر ڈیڑھ دو سو سال تک پرانے تھے۔ کئی گھروں کی پیشانی پر ان کی ''تاریخ تعمیر'' بھی لکھی ہوئی تھی۔ مارگریٹ نے شامیر کو بتایا تھا کہ یہ یہاں کی روایت پسندی کی نشانیاں ہیں۔ ان گھروں میں زیادہ تر بڑی عمر کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ قدامت پسند لوگ جو اپنی یادوں سے جڑے رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ لیونا برگ کے کیتھولک ہال اور بڑے گرجا گھر کے سامنے سے گزر کر شامیر دریا کی جانب بڑھنے لگا۔ گرجا دیکھ کر اسے پادری جوناتھن یاد آگئے۔ زویا کی فیملی ان کی عقیدت مند تھی۔ فرینکفرٹ میں ہونے والی ملاقات میں اجلے چہرے والے پادری جوناتھن نے اسے بتایا تھا کہ وہ لیونا برگ کے مرکزی گرجے میں فرائض انجام دیتے ہیں۔ کیا وہ اب بھی یہیں کہیں تھے؟ وہ ان کے بارے میں سوچتے سوچتے

''ایلم ناؤ'' دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ یہ خوبصورت دریا قصبے کی گنجان آبادی کے بیچوں بیچ سے گزرتا تھا۔ یہاں ایک تہوار کا سا سماں تھا۔ شامیر کو یوں لگا جیسے پُرسکون قصبے لیونابرگ کی ساری رونق اور خرمستی یہیں دریا کے آس پاس سمٹ آئی ہے۔ ہر عمر کے خوش باش جوڑے، کھلے عام ایک دوسرے کو اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔ جام گردش کر رہے تھے اور موسیقی کی دھنادھن فضا میں ارتعاش پیدا کرتی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید شامیر ان مناظر سے لطف اٹھاتا مگر اس کے اندر تو ایک طوفان بپا تھا۔ چار سال کی گھٹن اکا ایکی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ بے شمار سوالات ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ دریائے ایلم ناؤ کے اندر بھی بہت سے تفریحی بجرے تیر رہے تھے۔ اس کے علاوہ پانی کے اوپر بنے ہوئے ریسٹورنٹ بھی تھے۔ ایسے ہی ایک ریسٹورنٹ ''فل مون'' میں زویا سے اس کی ملاقات طے تھی۔ ریسٹورنٹ کا نام شامیر کو دور ہی سے جگمگاتا نظر آ گیا۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا اور ڈائننگ ہال میں دائیں گوشے کی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک طویل میز پر سیاحوں کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ کھانے کے انتظار میں گائڈ ان سیاحوں کو لیونابرگ کے بارے میں مختلف باتیں بتا رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''دوسری جنگِ عظیم میں جب اتحادی فوج اور فضائیہ جرمنی پر شدید ترین بمباری کر رہی تھیں، قریبی شہر ہیمبرگ کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ شہر کا بڑا حصہ برباد ہو گیا۔ تاہم صرف 45 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود رنگوں اور خوشبوؤں کا یہ قصبہ لیونابرگ بالکل محفوظ رہا..... جنگ جیسے اسے چھوئے بغیر گزر گئی تھی.....''

گائڈ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولتا رہا۔ شامیر اٹھ کر کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ اس کی نگاہ بار بار گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔

وہ آئے گی؟ نہیں آئے گی؟..... وہ آئے گی؟ نہیں آئے گی؟ یہ سوال اس کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر رہا تھا۔ چار سال پہلے یہ دھڑکنیں اسی طرح زیر و زبر ہوئی تھیں جب بہ وقتِ روانگی اس نے فرینکفرٹ کے ائرپورٹ پر اس کی راہ دیکھی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد اس نے رسٹ واچ دیکھی اور اسے کال کرنے کے لیے اپنا ہاتھ موبائل فون کی طرف بڑھایا۔ یہی وقت تھا جب وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ آج وہ مشرقی لباس قمیص اور ٹراؤزر میں تھی۔ ایک کلابی اسکارف بھی اس کے کندھوں کو ڈھانپ رہی تھی۔ شامیر اٹھ کھڑا ہوا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

گزرنے والے وقت نے اس کے خدوخال اور جسمانی ساخت پر بہت تھوڑا اثر ڈالا تھا۔ بال چھوٹے ہو گئے تھے مگر اسی طرح گھنے تھے۔ صراحی دار گردن وہی تھی اور وہ گولڈن چین بھی وہی، جسے دیکھ کر شامیر نے ایک مرتبہ کہا تھا..... ''یہ چین خوش قسمت ہے جو تمہارے اس قدر نزدیک ہے.....'' اور اس گردن سے اوپر اس کی ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے اوپر چمکیلے رخسار جن کی ہڈیاں تھوڑی سی ابھری نظر آتی تھیں..... اور ایک رخسار پر وہ دلکش گڑھا جس نے اپنی اتھاہ گہرائیوں میں شامیر کو ہمیشہ کے لیے جذب کر لیا تھا۔ وہ شاید آج بھی اس گڑھے کو چھونے کی حسرت دل میں رکھتا تھا۔ لیکن نہیں..... اب بہت کچھ بدل چکا تھا..... اور شامیر یہی جاننے کے لیے یہاں موجود تھا کہ کیا کچھ بدل چکا ہے۔

سب سے پہلے شامیر نے زویا سے اس کے والد کی وفات پر تعزیت کی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''تمہاری بچی کہاں ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''نام کے پاس۔ میں اسے سلا آئی ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''نام کو پتا ہے کہ تم کہاں ہو؟''

''ہاں پتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ شامیر کچھ اور کہتا، وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''آج میں تم کو جو کچھ بتاؤں گی، سچ بتاؤں گی۔ چاہے اس سچ کو بتانے میں مجھے اور سننے میں تمہیں کتنی بھی تکلیف ہو۔''

''یہی بات مناسب ہے۔'' شامیر نے جواب دیا۔

''لیکن اس سے پہلے..... کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گے کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے؟''

''تمہاری سینئر دوست مسز حامدہ کی مدد سے۔''

''مگر انہوں نے تو تمہیں نہیں بتایا؟''

''تم شاید بھول رہی ہو میرا اور تمہارا تعلق ایسے پیشے سے ہے جہاں کسی کے کچھ بتائے بغیر بھی کافی کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔''

''پھر بھی؟''

شامیر۔ زویا کی اجازت سے سگریٹ سلگایا اور پھر وہ ''کلیو'' بتادیا جس کے سبب اسے حامدہ پر شک ہوا اور اسی شک کے نتیجے میں زویا کا سراغ لگ گیا۔

پوری بات سن کر وہ بے ساختہ اپنی کہنی کے اس مدھم نشان کو دیکھنے لگی جو چار سال پہلے کے واقعے کا نتیجہ تھا۔

اسی دوران میں کھانا آگیا۔ لذیذ کھانا تھا..... مگر شاید دونوں نے ہی بے دلی سے کھایا اور بات صرف کھانے کی ہی نہیں تھی، وہ دونوں جیسے اردگرد کے ماحول سے ہی کٹے ہوئے تھے۔ کھانے کے دوران میں زویا نے شامیر سے اموغال اور فارہ وغیرہ کے بارے میں پوچھا اور اس طرح کے دیگر چھوٹے موٹے سوالات کیے۔

آخر کھانا ختم ہوا..... شامیر نے نیا سگریٹ سلگا لیا تھا۔ زویا نے سوفٹ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ ''شومیر! تم ''ڈبل پرسنیلٹی'' کے بارے میں جانتے ہو؟''

اس اچانک سوال نے شامیر کو چونکایا۔ ''ڈبل پرسنیلٹی؟ یعنی دو رخی شخصیت..... لیکن..... یہ بات تم کیوں کر رہی ہو؟''

''جو میں تمہیں بتانے جارہی ہوں..... اس میں یہی بات مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ میں تمہیں ایک ایسے بندے کے بارے میں بتانے جارہی ہوں جو مکمل طور پر دو شخصیات میں بٹا ہوا ہے..... وہ بہت اعلیٰ جرمن خاندان سے تعلق رکھتا ہے، پڑھا لکھا ہے..... نفیس ہے۔ اپنے حلقۂ ارباب میں اس کی عزت ہے، مگر اس کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ ہے جو بالکل مختلف ہے۔''

شامیر گہری نظروں سے زویا کو دیکھ رہا تھا۔ ''کہیں تم اپنے شوہر کے بارے میں تو بات نہیں کر رہی ہو؟''

''اسی کے بارے میں کر رہی ہوں۔'' وہ عجیب دکھی اور گمبھیر انداز میں بولی۔

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان ایک سنسناتی ہوئی خاموشی حائل رہی پھر اس نے نشست پر پہلو بدلا۔ ''شومیر! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، اس ملاقات میں تم سے جو کہوں گی سچ کہوں گی..... جس شخص کو تم میرا شوہر کہہ رہے ہو اس کے دو روپ ہیں۔ ایک روپ میں وہ ہمدرد ہے، محبت کرنے والا ہے، اپنے اندر خدا خوفی رکھتا ہے مگر دوسرے روپ میں وہ انتہائی بدنما ہے، پرلے درجے کا شکی مزاج ہے، بے حد سنگدل ہے..... بلکہ خطرناک ہے۔ میں نے اس کا ساتھ نبھانے کی، اس کے ساتھ رہنے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام ہوگئی۔''

گفتگو میں ذرا سا وقفہ آیا تو شامیر بولا۔ ''زویا! میں رابرٹ سے مل چکا ہوں۔ اس سے بات چیت کر چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری بات مجھے حیرت زدہ کر رہی ہے۔''

''تمہاری بات تو دور کی ہے شومیر..... میرے اپنے بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر پاتے۔ خاص طور سے ماما تو اسے عام نوعیت کے ازدواجی اختلافات قرار دیتی ہیں۔''

''اپنی بچی کے ساتھ رابرٹ کا رویہ کیسا ہے؟''

''بہت اچھا..... بلکہ غیر معمولی طور پر اچھا لیکن یہاں بھی وہی دہرا روپ آجاتا ہے۔ جب وہ دوسرے روپ میں ہوتا ہے تو بچی کو بھی کوستا ہے۔ اسے اٹھا کر پٹخ دیتا ہے۔ اس کے حوالے سے گھناؤنے شکوک ظاہر کرتا ہے۔''

''ایسا کیوں ہے..... کیا مگر ہوا ہے؟''

زویا نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ دریا میں بے شمار روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ پانی اور پانی سے باہر رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ مگر ریسٹورنٹ کے اس گوشے میں نیم تاریکی اور کسی حد تک خاموشی تھی۔ خوشیوں کے سمندر میں یہ جیسے ایک علیحدہ ہی چھوٹا سا اداس جزیرہ تھا۔

زویا نے کہا۔ ''ماما جرمنی کے چند اعلیٰ نسب خاندانوں کے راگ الاپتی رہتی ہیں..... رابرٹ کی یہ بلڈ برانڈ لیبلی بھی تو ان ہی میں سے ایک ہے۔ رابرٹ

کی ماں کا شادی کے بعد ایک جرمن شخص سے ہی افیئر چلا تھا۔ وہ چھ سالہ رابرٹ اور اس کی چھوٹی دودھ پیتی بہن کو چھوڑ کر اس فوٹو گرافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ یہی واقعہ ہے شومیر! جو اس شخص کی جڑوں کو زہریلا کر چکا ہے۔ وہ انتہا درجے کا شکی اور بدگمان ہو چکا ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی۔ اس نے پیڈربورن والے اس گھر میں جگہ جگہ خفیہ کیمرے نصب کرا رکھے ہیں۔ یہ کیمرے کسی اور کے لیے نہیں، میرے لیے تھے۔ گھر کے واش روم تک ان کیمروں سے محفوظ نہیں تھے۔"

شامیر کو یاد آیا کہ اس گھر میں ایک دو جگہ اس کی نظریں خفیہ کیمرے کے لینس پر پڑی تھیں۔

زویا اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ "اس شخص کو ہر وقت شبہ رہتا تھا کہ میرے کسی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ کسی معمولی سے شک پر وہ مجھے غلیظ گالیاں دیتا تھا..... بری طرح پیٹ ڈالتا تھا..... جسمانی تکلیف پہنچاتا تھا..... لیکن صبح سویرے اس کا دوسرا روپ سامنے آتا تھا۔ وہ روتا تھا، مجھ سے معافیاں مانگتا تھا۔ ایک دو بار اس نے میرے پاؤں پر سر تک رکھ دیا۔ وہ وعدہ کرتا تھا کہ آئندہ مجھ سے ایسا برتاؤ نہیں کرے گا مگر چند روز بعد پھر وہی میں ہوتی تھی اور وہی اس کا اذیت ناک شک۔ وہ مجھ سے ملنے جلنے والے ہر "میل" پر شک کرتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے باس جن کی عمر اسی سال کے قریب ہے اور میرا ایک کزن جو صرف پندرہ سولہ سال کا ہے..... وہ بھی اس کے شک سے محفوظ نہیں تھے۔"

زویا کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اس نے آنسو تکیے سے صاف کیے اور کہا۔ "کبھی کبھی مجھے اس کی حالت پر ترس بھی آتا تھا مگر دھیرے دھیرے اس کی زیادتیاں بڑھتی گئیں اور میرا ترس کم ہوتا گیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ اسے پیڈربورن کے ایک نامور سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جاؤں۔ وہ ایک بار گیا بھی لیکن تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا، وہ اسی سائیکاٹرسٹ پر شک کرنا شروع ہو گیا۔ ایک رات اس نے مجھ پر الزام لگا دیا کہ میں اس سائیکاٹرسٹ سے جسمانی تعلق بنا چکی ہوں

انشاءاللہ اب کوئی بھی گھرانہ
بے اولاد نہیں رہیگا

رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہمارے ہاں صرف بے اولادی کے سلسلہ میں آزمودہ ایک خاص قسم کا کستوری عنبر والا آبائی ہربل علاج موجود ہے جس کے استعمال سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی علامات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک۔ وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔ ہمارے بے اولادی کورس سے انشاءاللہ آپ کے تولیدی جراثیم پورے ہو جائیں گے۔ آپ کو مردانہ اعصابی قوت ملے گی۔ انشاءاللہ آپکو خوبصورت بیٹے کی نعمت بھی نصیب ہوگی۔ ایک بار آزما کر تو دیکھ لیں

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

فون اوقات
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

اور اس کے گھر کی اینیکسی میں جا کر اس سے ملتی ہوں۔ اس نے مجھے مارا۔ قینچی سے میرے بال کاٹ ڈالے..... یہ..... یہ میرے بال دیکھ رہے ہو نا تم۔ یہ کتنے لمبے ہوا کرتے تھے؟ اب ان کا اتنا چھوٹا ہونا کسی فیشن کا نتیجہ نہیں ہے، یہ اس جانور کے ظلم کی زد میں آنے۔"

شامیر حیرت کے ریلے میں تھا۔ خود کو ذرا سنبھال کر بولا۔ "تمہارے یہ نئی طرز کے بال دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی لیکن..... زویا..... رابرٹ کے گھر میں، میں نے تمہاری کچھ تصویریں بھی دیکھی ہیں، ان میں تم مقامی طرز کے نیم عریاں لباس میں نظر آ رہی ہو اور خوش بھی دکھائی دے رہی ہو؟"

"یہ سب بھی اس کی خوشنودی کے لیے تھا۔ میں نے کہا ہے نا کہ وہ جب اچھے روپ میں ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ اس سے زیادہ محبت کرنے والا اور ہمدرد شوہر شاید پورے جرمنی میں نہ ہو۔ اسے میرا حجاب کرنا پسند نہیں تھا۔ میرا اسکارف لینا پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں گھر میں مقامی طرز کے بولڈ لباس میں نظر آؤں..... خود کو سنوار کر رکھوں۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کا دوسرا روپ اس سے دور ہو جائے لیکن وہ نہیں ہوا۔ وہ شاید ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علاج معالجے کی حدوں سے گزر چکا ہے شومیر!"

"جب تم نے گھر چھوڑا تو کوئی خاص واقعہ ہوا؟" شامیر نے پوچھا۔

"خاص واقعہ تو وہاں ہر روز ہی ہوتا تھا۔ آخری دنوں میں اس خبیث نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ عینی بھی شاید اس کی بیٹی نہیں ہے۔ وہ اسے میرے پرانے دوست میوزیشن نام سے منسوب کرنے لگا تھا۔ ایک رات اس نے روتی ہوئی بچی کو بستر سے اٹھا کر بے بی کارٹ میں پٹخ دیا۔ اس معصوم کی ناک سے خون بہنے لگا۔ صبح وہ اسے گود میں لے کر پھرتا رہا اور روتا رہا۔ میرے ساتھ ساتھ بچی سے بھی معافی مانگتا رہا، مگر چند روز بعد اس سے بھی بدتر کیفیت میں ہمارے سامنے آ گیا۔"

زویا کی آنکھوں میں پھر نمی آ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ تب اس نے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھولی اور اس میں سے موبائل فون نکالا۔ ونڈ فری بھی اس کے ساتھ اٹیچ تھا۔ اس نے موبائل کے وائس ریکارڈر پر جا کر موبائل شامیر کی طرف بڑھایا اور بولی۔ "اس شخص کی جنونی کیفیت کے میرے پاس کئی ثبوت ہیں۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا ثبوت تم خود سنو اور اس شخص کی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔"

شامیر نے ایئر فون کان میں لگایا۔ زویا نے ریکارڈنگ پلے کی۔ شامیر کی سماعت میں ایک طوفان سا بپا ہو گیا۔ کسی کمرے میں اٹھا پٹخ ہو رہی تھی اور چنگھاڑیں گونج رہی تھیں۔ رابرٹ کی آواز شامیر نے پہچانی..... وہ دہاڑ رہا تھا۔ جو فقرے شامیر کی سمجھ میں آئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ "بکواس کرتی ہو تم۔ ازل کی جھوٹی ہو۔ جھوٹے اور مکار خاندان سے تعلق رکھتی ہو..... تمہارے خون میں ملاوٹ ہے۔ تمہاری ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ یو باسٹرڈ..... یو ڈرٹی کریچر....."

زویا کی گھگیائی ہوئی آواز ابھری۔ "رابرٹ! تم ہوش میں نہیں ہو..... خدا کے لیے..... ایسی بے ہودہ بات مت کرو۔"

رابرٹ کی چنگھاڑ پھر سنائی دی۔ "اگر سچی ہو تو رکھو، اس مقدس کتاب پر ہاتھ..... رکھو ہاتھ اور کہو کہ یہ میری اور تمہاری بیٹی ہے..... یہ ہم دونوں کی بیٹی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ایک طمانچے کی آواز ابھری۔ زویا کی کراہ سنائی دی۔ کوئی چیز گر کر ٹوٹی۔ زویا روتے روتے بلند آواز میں بولنے لگی۔ رابرٹ اس سے بھی بلند آواز میں چلانے لگا۔ بچی بھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ایک شورِ قیامت بپا تھا۔ الفاظ اور فقرے سمجھ میں نہیں آ رہے تھے، پھر ریکارڈنگ ختم ہو گئی۔

شامیر نے ونڈ فری اتار دیا۔ وہ حیرت زدہ تھا۔ اس نے رابرٹ کی آواز صاف پہچانی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا دھیما، اتنا مہذب اور شائستہ نظر آنے والا شخص ایسے خوفناک لہجے میں بات کر سکتا ہے۔

یہ تھا ہائی برانڈ جیسے اعلیٰ جرمن خاندان کا ارفع نسل والا سپوت..... زویا کی ماما کو فخر تھا اپنے جرمن ہونے پر۔ وہ اس بات پر بھی شاد تھی کہ اس کی دو

بیٹیاں جرمن شوہروں کے ساتھ آسودہ زندگی گزار رہی تھیں۔ اس نے تیسری کے لیے بھی جرمن شوہر ڈھونڈا تھا — اور اس تیسرے نے اس کے سارے آدرش غلط ثابت کردیئے تھے۔ اچھے برے جیسے اور اچھے برے لوگ کس قوم میں موجود نہیں ہوتے۔

ایک وقفے کے بعد شامیر نے زویا سے پوچھا۔

"کیا یہ ریکارڈ تم نے اپنی ماما کو سنائی؟"

"بہت سی باتیں میں نے انہیں بتائیں اور بہت سی چھپا بھی لیں۔ ہم — میں ان معاملے کو حد سے زیادہ بھڑکانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اپنی اور بچی کی جان کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہوجاتا تھا اور جہاں تک ماما کی بات ہے، انہوں نے تو جیسے مستقل طور پر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ ان کا تعصب آج بھی یہی ہے کہ چونکہ اپنی دیگر بہنوں کے برعکس میں اپنے باپ کے مذہب سے ہی جڑی رہی ہوں اس لیے میری سوچ اور میرے عمل میں زبردست کھوٹ پیدا ہوچکا ہے۔ وہ میری تباہ حال ازدواجی زندگی کی زیادہ تر ذمے داری بھی مجھ پر ہی ڈالتی ہیں۔"

"اور دونوں بہنیں؟"

"حولیہ بھی ایسی ہی ہے۔ بڑی بہن ایرہ کسی وقت میری طرفداری کرتی تھی مگر اس کا جرمن شوہر کیونکہ خود بھی زبردست قسم کا نسل پرست ہے لہٰذا وہ کھل کر میری حمایت نہیں کرسکتی تھی اور —"

بات کرتے کرتے زویا ایک دم رک گئی۔ اس نے ذرا چونک کر شامیر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"شومیر! کیا تم یہاں آکر ماما یا حولیہ سے ملے ہو؟"

"ہاں ملا تھا۔" شامیر نے چند لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا۔ "وہ لوگ بھی تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے ہیں۔ تمہاری والدہ خاص طور سے پریشان ہیں۔"

زویا نے ایک آہ بھری۔ "شومیر! اگر تم ماما اور حولیہ سے مل چکے ہو تو پھر تمہیں دیگر حالات بھی معلوم ہوگئے ہوں گے۔ یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ میری شادی کیوں اور کن حالات میں ہوئی۔"

"نہیں، حولیہ نے زیادہ کچھ تو نہیں بتایا۔" شامیر انجوائے کرتے ہوئے بولا۔ "بس اس نے کسی ڈیتھ کا ذکر کیا تھا جس کے بعد تم لوگوں کی ماں سے بہت لڑائی ہوئی۔"

"اس واقعے نے ہمیں بہت ڈسٹرب کردیا تھا۔ وہ مزاحمت کرتے ہوئے سخت زخمی ہوگئی تھیں۔ بعد میں ان کے زخم بھر گئے۔ تم ہمیں کچھ سے شفٹ ہوکر ٹیکساس میں بس گئے۔ وہیں بھی ان کی زندگی بچانے کی کوششیں جاری رہیں۔ ماما کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا — ٹانگوں کے مسائل آخر تک پریشان ہوئے۔ اس موقعے پر رابرٹ بڑھ چڑھ کر ماما کا ساتھ دیتا رہا۔ ہم اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبتے رہے۔ کئی وقت تھا جب میں نے اپنے جذبات کو پس پشت رکھتے ہوئے اور ماما کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رابرٹ کو شوہر کے طور پر قبول کرلیا — بعد ازاں میرا یہ فیصلہ ایک بڑی غلطی ثابت ہوا جس کی سزا میں اب تک بھگت رہی ہوں۔" شامیر مسلسل گہری نظروں سے زویا کو گھور رہا تھا۔ اسے کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی کہ وہ زویا کی باتوں پر یقین نہ کرے۔

زویا نے اپنی اس روداد میں کہیں بھی نمرتی کا نام نہیں لیا — نہ ہی اس لرزہ خیز حقیقت کا ذکر کیا جو نمرتی کی مستقل الزامی کا بین ثبوت تھی۔ وہ بچہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی بات چھپا گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماما نشے اور غیش میں چور ہوکر نیم دیوانگی کے عالم میں شامیر کے سامنے سب کچھ اگل چکی تھیں — اس کا مطلب تھا کہ زویا اور اس کے اہل خانہ اب ماضی کے اس ورق کو پلٹنا ہی نہیں چاہتے اور شاید یہ سب ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھا مگر بعد میں جو کچھ ہوا تھا، وہ تو ماضی نہیں تھا..... اور وہ سب کچھ اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ زویا کے اردگرد موجود تھا۔ بقول زویا کے وہ ایک ایسے شوہر کے بستے چڑھ گئی تھی جو خطرناک قسم کی دہری شخصیت کا مالک تھا اور اس کی زندگی برباد کررہا تھا۔

لیکن کچھ سوال ایسے تھے جو اب بھی زویا کی طرف اشارہ کررہے تھے اور ان کے جواب زویا ہی دے سکتی تھی۔

شامیر نے پوچھا۔ "تم نے کہا ہے کہ آج مجھے جو

چوتھا حصہ

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلابی جاڑوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضاؤں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو..... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا



لیونا برگ سے ایک طول طویل فاصلے پر اٹلی کے شہر میلانو میں ایک پرشکوہ رہائشی عمارت کے اندر سوئمنگ پول کے کنارے گارڈن لائٹس کی روشنی میں ایک فربہ اندام شخص "بیٹ" پر اوندھا لیٹا تھا اور ایک پری پیکر لڑکی مختصر لباس میں اس کی کمر کا مساج کرنے میں مصروف تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر سوئمنگ پول کے اندر ایک ہٹے کٹے سردار صاحب بغیر کچھ کی شراکی کر رہے تھے۔ وہ نشے کی حالت میں گا ہے بگا ہے بھونڈی آواز میں گنگنانے لگتے تھے۔ چپا چپا چرخا چلے---

اسی دوران میں مساج کراتے ہوئے تنومند جرمن کے بیش قیمت سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ لڑکی نے بڑے ادب سے اسے فون پیش کیا۔ اسی طرح اوندھے لیٹے لیٹے .... ڈبل ٹھوڑی والے اس بارعب شخص نے بھاری آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں بولو.....نمری بات کر رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز ابھری۔ "باس! میں یہاں لیونا برگ آیا ہوا ہوں، دوستوں کے ساتھ۔ آپ کو ڈسٹرب نہ کرتا لیکن ایک اہم اطلاع ہے۔ کم از کم میرا خیال تو یہی ہے کہ یہ آپ کے لیے اہم ہوگی۔"

پس منظر میں موسیقی وغیرہ کا شور سنائی دے رہا تھا۔ نمری نے اندازہ لگایا کہ اس کا یہ سابق کارندہ ہیری حسبِ توقع کسی عیاشی والی جگہ پر موجود ہے۔

وہ بھاری آواز میں بولا۔ "اب جو کچھ کہنا ہے کہہ چکو۔"

ہیری نے کہا۔ "سر! میں کچھ دیر پہلے یہاں دریا کے کنارے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوا ہوں۔ یہاں میں نے اپنی پرانی مہربان زویا کو دیکھا ہے۔ زویا راشد نیوز چینل والی۔"

نمری تھوڑا سا چونکا ضرور تاہم اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا، روکھے لہجے میں بولا۔ "پتا نہیں کہ تم نے اسے ٹھیک سے دیکھا ہے یا نہیں لیکن..... اگر دیکھا بھی ہے تو لعنت بھیجو اس پر۔ اس سے حساب برابر ہو گیا تھا۔ کیے کی سزا مل گئی تھی اسے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں سر، لیکن سوری۔ میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ زویا کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے۔ وہی پاکستانی..... شومیر یا شامیر..... اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ بال بھی کچھ لمبے ہیں، مگر میں نے اسے ایک سو ایک فیصد پہچان لیا ہے۔ یہ وہی باسٹرڈ ہے۔"

اس بار نمری واقعی چونکا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خوبرو لڑکی نے جلدی سے تولیا اس کے بالوں بھرے شانوں پر ڈال دیا اور ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "تمہیں یقین ہے ہیری کہ یہ وہی ہے؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ ایک سو ایک فیصد۔"

نمری کی نگاہوں کے سامنے تقریباً چار سال پہلے کے وہ مناظر گھوم گئے جب انہیں فرینکفرٹ کے سٹی سینٹر میں اپنی ایک بڑی پراپرٹی سے ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے۔ یوں تو پاکستانی سہراب درانی اور وہ اس پراپرٹی میں ففٹی ففٹی کے پارٹنر تھے، لیکن یہ پراپرٹی جانے سے نمری کا نقصان یوں زیادہ ہوا تھا کہ اس پراپرٹی کے نتیجے میں فرینکفرٹ میں ہی اس کی ایک ذاتی پراپرٹی بھی زد میں آ گئی تھی۔ نمری کو یوں لگا کہ اس کا وہ زخم تازہ ہو گیا ہے، درحقیقت اس بڑے نقصان کے بعد وہ کبھی بھی ٹھیک سے سنبھل نہیں سکا تھا۔ آج کل وہ یہاں میلانو میں اپنے سکھ پارٹنر انوپ سنگھ کے ساتھ مل کر پراپرٹی کا کام کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ایک سائڈ بزنس انڈیا سے منشیات کی اسمگلنگ بھی تھی۔ ان دونوں کاموں میں وہ خود فیس پر نہیں تھا۔ یہ دونوں کام انوپ سنگھ نے سنبھال رکھے تھے۔ مستقل اداروں کے خیال میں وہ آج کل میکسیکو میں کہیں رو رہا تھا۔

اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ وہی باسٹرڈ صحافی ہے تو پھر اس پر نظر رکھو۔ اس سے کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔"

"جیسے آپ کا حکم سر۔" کارندے ہیری نے خوش ہو کر کہا۔

☆☆☆

زویا اور شامیر وہیں آبی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ بدمست سیاحوں کی ٹولی رخصت ہو چکی تھی۔ انہوں نے صرف کیک کاٹنے پر اکتفا نہیں کیا تھا، مشروبات بھی لیے تھے اور اس کے ساتھ موسیقی کی دھنا دھن بھی جاری رکھی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ڈائننگ ہال کا ماحول ایک بار پھر قابلِ قبول ہو گیا۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اس بار شامیر نے براہِ راست زویا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بلاتمہید پوچھا۔ "زویا! نام سے شادی کر چکی ہو؟"

وہ جیسے پہلے سے اس سوال کی توقع کر رہی تھی لہٰذا پزل نہیں ہوئی۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "اپنے بھائی سے شادی کون کر سکتا ہے۔ وہ میرا سگا بھائی نہیں ہے

لیکن سگے بھائیوں سے بڑھ کر اہمیت دیتی ہوں اسے۔"

شامیر بھونچکا سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے۔

وہ بدستور مطمئن لہجے میں بولی۔ "ویسے وہ ماہ پہلے ہی نام کی شادی ہو چکی ہے۔ اپنے ہی میوزک بینڈ کی ایک برٹش پرفارمر کرسٹینا کے ساتھ اس نے پسند کی شادی کی ہے۔ دونوں تین سال سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اب وہ میرے ساتھ والے فلیٹ میں رہتے ہیں اور بڑے خوش و خرم ہیں۔۔۔۔"

زویا نے اپنے موبائل فون کی اسکرین پر دو تین تصویریں اسے دکھائیں۔ ان میں نام اور اس کی نو بیاہتا برٹش بیوی دکھائی دے رہے تھے۔

شامیر نے کہیں سنا تھا کہ بعض اوقات سمندروں میں خشکی اور صحراؤں میں پانی کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ نگاہوں کے سراب ہوتے ہیں۔ اسی طرح "حالات" کے سراب بھی ہوتے ہیں۔ جو کچھ نظر آرہا ہوتا ہے اور جس کی تصدیق بھی ہو رہی ہوتی ہے۔۔۔ وہ ویسا ہوتا نہیں ہے۔ یہ ایک "الیوژن" ہوتا ہے۔ ایک بصری واہمہ، ایک اور اک کا دھوکا۔ پس پردہ حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔ شامیر کو یوں محسوس ہونے لگا کہ زویا کے حوالے سے بھی جو کچھ نظر آرہا تھا اور ثابت ہو رہا تھا۔۔۔ وہ غلط نظر آرہا تھا اور غلط ثابت ہو رہا تھا۔

چار سال پہلے زویا نے روتے ہوئے شامیر کو نہ بتایا اور اسے پاکستان جانے دیا، یہ ایک صدمے و سانحہ تھا۔۔۔ لیکن اس کے بعد بقول جیسن وہ بہت روئی اور پچھتاتی رہی۔ عرصے تک جیسن کا غم اسے ریزہ ریزہ کرتا رہا۔ اس کے بعد نئی والی سنگین واردات ہوئی اور وہ کچھ اور گرداپوں میں پھنس کر رہ گئی، اس کی بہن کی زندگی خراب ہوئی، بہن کا بچہ ضائع ہوا۔ اس کی ماں شدید زخمی ہوئی اور وہ لوگ گھر سے بے گھر ہو کر اس سرحدی شہر ایسن میں جا پہنچے۔ یہاں رابرٹ نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ بتدریج سامنے آرہا تھا۔۔۔ وہ ایک مسلسل عذاب سے گزری۔ اس نے رابرٹ کی بچی کو جنم دیا۔ رابرٹ کے مجبور کرنے پر ہی وہ گھر میں بھی تراش کے چوتڑ لباس پہنتی رہی۔ رابرٹ کی وجہ سے ہی وہ اپنے مشرقی طرز کے خوبصورت لمبے بالوں سے محروم ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ اس نے رابرٹ سے بے وفائی کی۔ اپنے دوست جیم کا سہارا لیا اور رابرٹ کی بچی کو لے کر جیم کے ساتھ بھاگ گئی اور ایک بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگی۔ اب یہ آخری الزام بھی درست ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی پوری تصدیق تو نہیں ہوئی تھی مگر شامیر کے دل کے اندر سے گواہی آرہی تھی کہ وہ اس معاملے میں بھی شاید جھوٹ نہیں بول رہی۔

اب ایک سب سے اہم سوال شامیر کے ذہن میں منڈلا رہا تھا۔ وہ سوال جو وہ تین ساڑھے تین برس سے اب تک ہزاروں بار خیالوں ہی خیالوں میں فرینکفرٹ کی اس لڑکی سے پوچھ چکا تھا۔ اس سوال کو پوچھنے کے لیے بے پناہ حوصلہ چاہیے تھا اور اس کا جواب سننے کے لیے آہنی کلیجے کی ضرورت تھی۔۔۔ یہ سوال محبت کے بارے میں تھا اور اس "آس" کے حوالے سے تھا جو مر کر بھی نہیں مرتی۔

شامیر کچھ دیر تک میز کی چمکیلی سطح کو گھورتا رہا، پھر میز پر ہی نظریں جمائے جمائے بولا۔ "زویا! ہم نے ایک دوسرے سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔۔۔ کیا تم اب بھی یہی سمجھتی ہو کہ پچھلی بار فرینکفرٹ چھوڑنے سے قبل میں نے تمہاری ماما پر ہاتھ اٹھایا تھا؟"

ایک لمبے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "شاید، اب میں ایسا نہیں سمجھتی۔۔۔ مگر شومیر! اب ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ سب کچھ ماضی کا حصہ ہے۔"

"ان دنوں میں۔۔۔ اس جوڑائی میں جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ وہ سب کچھ؟" شامیر نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں شومیر! وہ سب کچھ۔" زویا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ یوں لگا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے اپنے آپ کو کمپوز کر رہی ہے۔ تب اس نے غمزدہ ہوئی آواز میں کہا۔ "شومیر! یہ سچ ہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں غمزدہ رہی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ ہم منزل کے بالکل قریب آکر بچھڑے تھے۔ اس وقت شاید ہم دونوں میں سے کوئی ایک، تھوڑی سی کوشش کر کے قدم آگے بڑھا لیتا تو صورت حال مختلف ہو جاتی۔ بہرحال آہستہ آہستہ میں نے خود کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ پھر حالات ایسے ہوئے کہ سارے معاملات کسی اور طرف چل پڑے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں شومیر! جو کچھ میں نے سچ سمجھا ہے، وہی سچ ہے کہ وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب وہ ساری باتیں بہت دور کی لگتی ہیں اور کسی حد تک "لاسٹ اور فیٹ" بھی۔ میں اب کوئی اور ہوں، لڑکی اور ہوں۔ ایک بچی کی ماں ہوں۔ زمانے کا بہت سرد و گرم دیکھ چکی ہوں اور دیکھ رہی ہوں۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی بھی ہو کہ

پچھلے ڈیڑھ دو سال میں، میں نے شاید ہی گزرے دنوں کے بارے میں سوچا ہو۔ غالباً حال ہی اتنا کٹھن ہے کہ ماضی کے بارے میں سوچنا مشکل محسوس ہوتا ہے۔ میں خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اس نے مجھے کم از کم ماضی کی تلخیوں کے حوالے سے تو مکمل سکون دیا ہے۔ اب میں پرانے زخموں کو کریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

شامیر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ ایک سرد لہر سی پورے سراپا میں دوڑ رہی تھی۔ زویا کے روکھے پھیکے، سپاٹ لب و لہجے نے اس کے اندر بھی جیسے کئی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو گل کر دیا تھا۔

''تو یہ واقعی آخری ملاقات ہے؟'' اس نے بہ زبان خاموشی خود سے سوال کیا۔

وہ کمزور دھاگا بھی اب ٹوٹ چکا ہے جو ایک طرف ماضی کے اس جولائی سے اور دوسری طرف آس کی ایک شعاع سے بندھا ہوا تھا؟

کیا اب راکھ میں کوئی بھی چنگاری نہیں بچی ہے؟

زویا کی آواز نے شامیر کو خیالوں سے چونکایا۔ ''میں تم سے بس دو التجائیں کرنا چاہتی ہوں۔ ایک تو یہ کہ میری یہاں لیونابرگ میں موجودگی کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلے..... اور دوسری یہ کہ..... تمہارے لیے اور شاید میرے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ اب ہم کبھی ملنے کی کوشش نہ کریں۔ ایک دوسرے کو بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔''

شامیر نے ایک طویل سرد آہ کھینچی۔ ''کچھ اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ دو۔''

کئی سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں..... اور اگر ہو سکے تو پاکستان میں ہی رہنے والی کسی پیاری سی ہم وطن کو اپنی زندگی کی ساتھی بنا لو۔''

ریستوران کی کھڑکیوں سے باہر رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ دریائے ایلم ناؤ کے کنارے موسیقی گونج رہی تھی۔ کوئی مقامی گلوکارہ بلند آواز میں میڈونا کا معروف گانا الاپ رہی تھی۔ The Power of Good bye

تمہارا دل مجھے راستہ نہیں دے رہا۔
اس لیے مجھ کو جانا ہوگا
تم میرے لیے ایک سبق کی طرح تھے اور میں تمہیں
پڑھنے پر مجبور تھی
میں تمہارے لیے ایک قلعے کی طرح تھی اور تم نے
مجھے جلانا ہی چاہا تھا

☆☆☆

شامیر کو رخصت کرنا، اسے الوداع کہنا کافی کٹھن ثابت ہوا تھا۔ خاصے بوجھل لمحے تھے وہ۔ بہرحال اب زویا اپنے فلیٹ میں واپس آ چکی تھی۔ ٹام اور اس کی برٹش وائف کرسٹینا جانتے تھے کہ زویا کہاں گئی ہے اور کس سے مل کر آئی ہے۔ زویا کی دو سالہ بچی ان دونوں کے پاس ہی سو رہی تھی۔ زویا نے اسے سوتی حالت میں ہی اٹھایا۔ سینے سے لگا کر بھینچا۔ اس کا منہ چوما اور پھر اسے لے کر اپنے فلیٹ کی طرف بڑھی۔

''زویا اوہ چلا گیا؟'' ٹام نے عقب سے آواز دے کر پوچھا۔

''ہاں ٹام!'' زویا مڑے بغیر بولی۔

''تھینکس گاڈ!'' کرسٹینا کی آواز سنائی دی۔

زویا اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچی کو بڑی احتیاط سے اپنے پاس بستر پر لٹایا۔ وال کلاک دیکھا۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔ یوں تو اگلے روز چھٹی تھی تاہم وہ جس مقامی میگزین میں پروف ریڈنگ کا کام کر رہی تھی، وہاں دوپہر میں تھوڑا سا کام تھا اور اس کے لیے آفس جانا ضروری تھا۔

وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بری طرح جل رہے تھے۔ سینے میں دھواں سا تھا۔ سلیپنگ گاؤن کی ڈوری باندھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف گئی۔ اس کی سلائڈنگ بولٹ چیک کی۔ تب الماری کی طرف بڑھی۔ ایک اندرونی دراز سے اس نے کافی سائز کی ایک البم نکالی۔ اس پوری البم میں صرف شامیر اور زویا کی تصویریں تھیں۔ ایک پورے پیج پر شامیر کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ فرینکفرٹ میں دریائے مائنز کے کنارے، ایک فوارے کے پاس، اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑا تھا اور کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے اس تصویر کو دیکھتی رہی پھر اچانک اس نے البم کو اس تصویر سمیت اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... روتی چلی گئی..... ''شومیر..... شومیر!'' اس نے بے قراری سے کہا۔

اس کے سینے میں آنسوؤں کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ بہ زبانِ خاموشی وہ شامیر سے مخاطب ہوئی..... ''تمہیں کیا پتا، تم میرے لیے کیا ہو..... تمہیں کیا پتا، ہر پل ہر لمحہ کیسے گزرتا ہے تمہارے بغیر..... تمہیں چاہا تو پھر کچھ نہیں چاہا..... تمہیں

سوچا تو پھر کچھ نہیں سوچا..... تم میری زندگی کی پہلی اور آخری چاہ ہو شومیرا..... مجھے معاف کر دینا..... میری مجبوریوں کو بخش دینا..... میں تمہیں اور خود کو کانٹوں پر نہیں گھسیٹ سکتی..... مجھے یہاں میرے عذابوں میں رہنے دو۔ میرے لیے اپنی زندگی مصیبتوں میں نہ ڈالو۔ ویسے بھی میں اب کہاں ہوں تمہارے قابل؟ تم اپنے پیارے پاکستان کی محفوظ فضاؤں میں چلے جاؤ۔ ہر لمحے میری دعا ہے کہ چاہتیں، خوشیاں اور کامرانیاں تمہارے قدم چومیں.....''

آنسو اس کے رخساروں پر چل رہے تھے۔

.....اور قریباً یہی وقت تھا جب شامیر اپنے دل پر پہاڑ جیسا بوجھ لیے خوبصورت قصبے لیونا برگ سے واپس جا رہا تھا۔ داستانوں جیسی دلکشی والا یہ رنگ برنگ قصبہ اب اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ فلیٹ گاڑی مارگریٹ ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ گاڑی کے اندر ماحول بے حد بوجھل تھا۔ رات کے سناٹے میں گاڑی ہائی وے پر تیزی سے تیرتی چلی جا رہی تھی۔ شامیر کے سینے میں بھرا ہوا دھواں گاڑھا اور تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ روتا نہیں تھا مگر تیزابی آنسو تو روئے بغیر بھی آنکھوں سے نکل آتے ہیں اور اسے یہی خدشہ تھا۔ ہائی وے کے کنارے چند روشنیاں نظر آئیں۔ یہاں فلنگ اسٹیشن اور ایک دو اسٹورز تھے۔

''مارگریٹ! ذرا یہاں گاڑی روکو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

مارگریٹ نے گاڑی کی رفتار کم کی اور پھر اسے پارکنگ ایریا میں موڑ کر روک دیا۔

''کچھ اسنیکس لے آؤ..... اور سوفٹ ڈرنکس بھی۔'' اس نے مارگریٹ سے کہا۔

وہ ''او کے سر'' کہتی ہوئی چلی گئی۔ شامیر کے سینے کا دھواں گاڑھا ہوتا گیا..... اور رونا ضروری نہیں ہوتا، آنسو ویسے بھی تو آنکھوں سے ابل پڑتے ہیں۔ اس نے اپنا بازو موڑ کر ڈیش بورڈ پر رکھا اور اس پر اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ آنسو بہتے چلے گئے۔ آتشیں مگر بالکل خاموش آنسو۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ دو تین منٹ بعد اس نے گاڑی کا ایک دروازہ کھولا۔ پانی کی بوتل نکال کر اپنا منہ دھویا۔ اسی دوران میں مارگریٹ بھی واپس آتی دکھائی دی..... وہ دونوں ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔ شامیر کو اپنا آپ پہلے سے کچھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا لیکن سینے میں ہلکا ہلکا دھواں بھرتی ہوئی آگ تو اپنی جگہ تھی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے مارگریٹ بولی۔ ''کل آپ نے فادر جوناتھن کا ذکر کیا تھا نا۔ شام کے بعد میں لیونا برگ کے بڑے گرجے میں گئی۔ فادر جوناتھن اب وہاں نہیں ہیں..... وہ اب برج برگ نام کے ٹاؤن میں شفٹ ہو گئے ہیں..... یہ برج برگ یہاں راستے میں ہی آتا ہے۔ ویسے فادر جوناتھن کی نیک نامی تسلیم شدہ ہے۔ میں بھی انہیں جانتی ہوں۔ ایک دو بار ایک ٹی وی پروگرام میں بھی دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر لوگوں کو تقسیم نہیں ہونا چاہیے..... وہ عیسائیت سے زیادہ انسانیت کے پرچار پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقامی حلقوں میں مقبول ہیں۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:
مرزا تنویر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

''ہاں، یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی ان میں۔'' شامیر نے مختصر جواب دیا۔

شامیر، مارگریٹ کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہ عقب نما آئینے پر بھی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے شبہ ہو رہا تھا کہ ایک سفید رنگ کی ہائی روف گاڑی مسلسل ان کے پیچھے یا آگے دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ عقب میں تھی اور درمیان میں آجانے والی ایک اوڈی کار کو اوورٹیک کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

مارگریٹ اپنی رو میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھیں جی، دائیں طرف اس قصبے کی روشنیاں بھی نظر آ رہی ہیں..... اگر آپ فادر جوناتھن سے ملنا چاہیں تو ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ سکتے ہیں.....''

مارگریٹ نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی۔ رات کے اس پہر فادر جوناتھن کا دروازہ کھٹکھٹانے کی کوئی تک نہیں تھی مگر شامیر کو سفید رنگ کی ہائی روف کے حوالے سے جو شک ہو رہا تھا، اس کے سبب وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی پھر مارگریٹ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کتنی دور ہے انٹر چینج؟''

''دو کلومیٹر۔''

''تو چلو پھر..... ہمیں کون سا کہیں جلدی پہنچنا ہے۔''

مارگریٹ شاید خود بھی پادری جوناتھن کو اور اس برج برگ نامی قصبے کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے گاڑی انٹر چینج کی طرف موڑ دی۔ یہ دیکھ کر شامیر کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا کہ سفید گاڑی بھی ان کے پیچھے ہی آئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ اس چھوٹے سے پُرسکون قصبے میں تھے۔ قصبے کی شفاف سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس اونگھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں..... اور یہ لائٹس ہی نہیں پورا قصبہ نیند کی زد میں تھا۔ بس کہیں کہیں کوئی للنگ اسٹیشن، کوئی چھوٹا ریسٹورنٹ یا گروسری اسٹور کھلا نظر آتا تھا۔

''مارگریٹ! ایک گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔'' شامیر نے کہا تو وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

دو چار منٹ بعد اسے بھی یقین ہو گیا کہ ہائی روف ویگن واقعی ان کے پیچھے آ رہی ہے۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اس میں ایک سے زیادہ افراد سوار ہیں۔ ''کون ہو سکتے ہیں یہ؟'' مارگریٹ نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ بات اب یقینی ہے کہ یہ ہمارے تعاقب میں ہیں اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کو ہمارے ہوشیار ہونے کا پتا چل گیا ہے۔''

مارگریٹ نے پھرتی سے گاڑی ایک تنگ سڑک پر موڑ دی۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد سفید وین بھی اس سڑک پر آ گئی اور عقب نما میں نظر آنے لگی۔

''کک..... کہیں یہ زویا کے شوہر کے بھیجے ہوئے بندے تو نہیں؟'' مارگریٹ نے پوچھا۔

''مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔'' شامیر نے جواب دیا۔

اب صاف پتا چل رہا تھا کہ سفید گاڑی ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاید اس میں سوار لوگوں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ ایک گنجان قصبے کی بل کھاتی سڑکیں ہیں..... اور وہ جس فیاٹ کے پیچھے ہیں، وہ کسی بھی وقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔ رات کے ان پہروں میں سڑکوں پر کہیں کہیں پولیس کا گشت بھی نظر آیا کرتا ہے مگر شامیر اور مارگریٹ کو ایک پولیس موبائل کے سوا کہیں اور کوئی پولیس والا نظر نہیں آیا۔ ''کیا ہم ریڈیو پر پولیس سے مدد مانگنے کی کوشش کریں؟'' مارگریٹ نے ہراساں لہجے میں سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ شامیر جواب میں کچھ کہتا، سفید ویگن ان کے بالکل قریب آ گئی۔ دونوں گاڑیاں ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر پہلو بہ پہلو دوڑ رہی تھیں۔ شامیر نے ایک نظر وین کے اندر ڈالی۔ ڈرائیور کے علاوہ دو افراد مزید دکھائی دیے۔ وہ شکلوں سے ہی لڑائی بھڑائی والے لوگ نظر آتے تھے۔ مارگریٹ کو ڈر محسوس ہوا کہ وین اسے اوورٹیک کرے گی اور پھر اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے بڑی مشاقی سے دفعتاً فیاٹ کو پھر ایک بغلی سڑک پر موڑ دیا۔ وین اپنی جھونک میں آگے نکلتی چلی گئی مگر یوں تیزی کے ساتھ مڑنے کی وجہ سے مارگریٹ بھی گاڑی کو سنبھال نہ سکی۔ وہ بری طرح لہرائی۔ فٹ پاتھ پر چڑھی اور پھر ایک دیوار سے ٹکرا گئی۔ رات کے اس پہر سڑکیں اور گلیاں خالی تھیں ورنہ کار کا یوں آؤٹ آف کنٹرول ہونا کسی جانی نقصان کا باعث بن سکتا تھا۔

تصادم کے باوجود مارگریٹ نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے تیزی سے گاڑی ریورس کی، اسے دوبارہ سڑک پر چڑھایا اور پھر سے بھگا دیا۔ وین کو رکنے، مڑنے اور پھر اس بغلی سڑک پر آنے میں جو وقت لگا، اس نے مارگریٹ اور شامیر کو سوا ڈیڑھ سو میٹر دور پہنچا دیا۔

''بائیں موڑ لو۔'' شامیر نے چلا کر کہا۔

مارگریٹ نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ یہاں

دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ مخروطی چھتیں، پھولوں سے سجی ہوئی بالکونیاں۔ سڑک کی دونوں اطراف گاڑیاں پارک تھیں۔ ''وہ آرہے ہیں۔'' مارگریٹ نے عقب نما میں دیکھ کر ہراساں لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں شامیر کو تکلیف کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔

مارگریٹ نے پھر گاڑی کو ایک سڑک پر موڑا۔ اسے ایک گھر کا کھلا ہوا گیٹ نظر آیا۔ بڑی حاضر دماغی سے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے اس نے کار گیٹ کے اندر گھسا دی اور گھر کے احاطے میں ہی دائیں جانب موڑ کر یکا یک اس کی لائٹس آف کردیں۔

آٹھ دس سیکنڈ بعد باہر سڑک پر انجن کا شور ابھرا اور پتا چلا کہ سفید وین بڑے فراٹے کے ساتھ آگے نکل گئی ہے۔ کھلے گیٹ میں سے اس کی ایک جھلک شامیر کو نظر بھی آئی۔ اب اس احاطے میں مزید نہیں رکا جاسکتا تھا۔ گھر کے اندر ایک دو کھڑکیاں روشن ہوگئی تھیں۔ رکھوالی کا ایک کتا شور مچانے لگا تھا۔ ایک شخص جو غالباً چوکیدار یا گارڈ تھا، لپکتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی مارگریٹ نے اپنا یوٹرن مکمل کیا اور اس گھر سے باہر نکل آئی۔ سفید وین جنوب کی طرف گئی تھی، مارگریٹ اور شامیر کا رخ اب شمال کی طرف تھا۔ اس گھر کا کھلا ہوا گیٹ ان دونوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا تھا۔

''ویل ڈن مارگریٹ۔'' شامیر نے اس کا کندھا تھپکا۔ ''تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی ہے؟''

''نہیں سر! بس پاؤں میں کچھ موچ سی لگ رہی ہے۔''

''کہاں جاتا ہے یہ راستہ؟'' شامیر نے پوچھا۔

''یہ ایک بائی پاس کی طرح ہے جی..... پندرہ بیس کلومیٹر کا سفر کرکے ہم دوبارہ اپنے روٹ پر آسکتے ہیں۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

وہ دونوں سخت تناؤ میں تھے۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ وہ انہیں چکما دے کر نکل آئے ہیں مگر اندیشے ابھی باقی تھے۔ ''کون ہوسکتے تھے یہ لوگ؟'' یہ سوال بار بار شامیر کے ذہن میں ابھرتا تھا۔ ان کا پیچھے آنے کا انداز، پھر ان دونوں کو روکنے کی بے خوف کوشش، ان کے بگڑے ہوئے تیور..... یہ سب کچھ بتا رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔ اس بات کا امکان پچیس تیس فیصد سے زیادہ نہیں تھا کہ وہ راہزن یا مقامی وارداتیے ہوں..... تو پھر..... ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے بار بار شامیر کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا اور اوجھل ہو رہا تھا۔ کہیں..... یہ وہی معاملہ تو نہیں، جس کا اندیشہ پہلے جین نے اور پھر حولیہ نے اور پھر کسی حد تک زویا نے بھی ظاہر کیا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے زویا کی فیملی کے ساتھ بدترین بدمعاشی کی تھی، انہیں ذلیل کرکے گھر سے بے گھر کیا تھا..... اور نتیجے میں وہ سنگین تر مصائب کے حوالے ہوئے تھے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو کیسے ہوا ہے؟ اور اگر واقعی ایسا ہوگیا ہے..... اور لیونابرگ میں نمرسی گروپ کے کسی شخص نے شامیر کو دیکھ اور پہچان لیا ہے تو پھر..... پھر یہ عین ممکن تھا کہ زویا کو بھی دیکھ اور پہچان لیا ہو بلکہ قریب از قیاس یہ تھا کہ ان دونوں کو ریسٹورنٹ میں اکٹھے دیکھ لیا گیا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ زویا کی خبر لینا اور اسے خطرے سے آگاہ کرنا ضروری ہوگیا ہے۔

شامیر نے ہائی وے کے ایک پارکنگ ایریا میں کار رکوائی اور فون ہاتھ میں تھام کر سوچنے لگا۔ وہ لیونابرگ سے ایک بار پھر یہ عہد کرکے نکلا تھا کہ مڑ کر زویا کی طرف دیکھے گا اور نہ کبھی اس سے ازخود رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ زویا کے رویے میں جو اٹل کیفیت اسے نظر آئی تھی، اس کے دکھ کو لفظوں میں بیان کرنا شامیر کے بس سے باہر تھا مگر یہ وقت کی بے ثباتی تھی کہ وہ تین چار گھنٹے بعد ہی اس کو کال کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ زویا کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جانا شروع ہوئی اور پھر..... جاتی رہی..... اس نے کم از کم تین بار اسے کال ملانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ایک گہری دکھ بھری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ اب لیونابرگ سے کافی دور آچکے تھے۔ ان کی منزل یعنی پیڈربورن اب صرف اسی نوّے کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ شامیر کی ہدایت پر مارگریٹ نے گاڑی پھر ہائی وے پر چڑھا دی۔ شکر کا مقام تھا کہ تصادم کے سبب گاڑی کو ''زیادہ اور نمایاں'' نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ تیزی سے پیڈربورن کی طرف بڑھنے لگے۔ شامیر کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ یہ سوچ اس کے لیے سوہانِ روح تھی کہ کہیں اس کی یہاں آمد کی وجہ سے زویا کی پریشان زندگی مزید پریشانیوں اور خطروں کا شکار نہ ہوجائے۔ مارگریٹ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی تاہم اس کے دل و دماغ میں بھی تشویش کی بلند لہریں موجود تھیں۔

☆☆☆

زویا دیر سے سوئی تھی، پھر بھی صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اٹھ گئی۔ عینی ابھی تک اس کے پہلو میں سو رہی تھی۔ رات والی سنگین اور دلفگار ملاقات کے سارے مناظر ایک

بار پھر دس کی لگاہوں میں گھوم گئے۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا۔ رات کے آخری پہر چار بجے کے قریب اس کے نمبر پر شامیر کی تین کالز آئی تھیں۔ مسلسل ٹیل سے وہ جاگ گئی تھی مگر اس نے کال وصول نہیں کی تھی۔ پتا نہیں کہ اب وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ زویا کو یہی لگتا تھا کہ وہ جتنی بار اس کی آواز سنے گی، اتنی ہی بار اس کے زخموں سے خون رسے گا اور وہ بے حال ہوگی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ کچھ روز کے لیے فون بند ہی کر چھوڑے۔

فریش ہونے کے بعد اس نے ننھی عینی کو جگایا۔ اس کا ڈائپر بدلا اور اس کو فیڈ کرانے کا سوچنے لگی۔ وہ چھوٹی سی جان اس کے روز وشب کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ اچانک دروازے پر ناک ہوئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ ٹام کی بیوی کرسٹینا آئی ہے تاکہ وہ دونوں مل کر ناشتا بنا سکیں لیکن پھر سے یاد آیا کہ ٹام اور کرسٹینا کو تو صبح سویرے بذریعہ ٹرین ہیمبرگ جانا تھا۔ وہاں کرسٹینا کے والدین رہتے تھے..... اس کا مطلب تھا کہ اگر آج اسے آفس جانا پڑا تو وہ ننھی عینی کو "ڈے کیئر" والوں کے حوالے کر کے جائے گی..... اس نے دروازہ کھولا تو دو افراد اسے دھکیلتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے پیچھے ایک تیسرا بھی تھا جس نے آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھا رکھے تھے، ان تینوں کی صورتیں ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" زویا سرتاپا لرز کر ہراساں آواز میں بولی۔

"اس کو بدتمیزی نہیں "مہمانوں کی آمد" کہا جاتا ہے۔" سیاہ چشمے والے نے منہ ٹیڑھا کر کے جرمن زبان میں کہا۔

"کون ہو تم لوگ؟" وہ بلند آواز میں بولی۔

ایک شخص نے اسے دھکا دیا۔ وہ صوفے پر جا گری۔ پھر اس نے لپک کر عینی کو گود میں اٹھا لیا، جس نے اجنبیوں کو دیکھ کر منہ بسورنا شروع کر دیا تھا۔ ایک شخص نے فلیٹ کے مین دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔

"دیکھو، شور وغیرہ کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ورنہ یہاں تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" سیاہ چشمے والے لمبے تڑنگے جرمن نے کرخت انداز میں کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" وہ ہکلائی۔

"چاہتے تو یہی تھے کہ یہ معاملہ وہیں پر ختم ہو جائے، مگر لگتا ہے کہ تمہاری شامت اعمال نے تمہیں آواز دی ہے۔ تم نے پھر پرانے زخم ہرے کر دیے ہیں۔"

"تم کیا بکواس کر رہے ہو؟" اس نے عینی کو سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔ تب اس کی نگاہ سیاہ چشمے والے کے ایک ساتھی پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ یہ چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا..... ہاں، وہ جانتی تھی۔ یہ اس کا "ہم کار" وہی ہیری تھا جس نے چار سال پہلے سہراب اور نمرہ کی غیر قانونی پراپرٹی ڈھونڈنے کے سلسلے میں کچھ کام کیا تھا اور پھر سب کچھ ادھورا چھوڑ کر اچانک غائب ہو گیا تھا۔ تب بھی خیال یہی تھا کہ وہ لالچی بک گیا ہے۔ زویا کو ہیری کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اپنے لیے بیگانگی اور تضحیک صاف نظر آئی۔

زویا کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ اس خوبصورت صبح میں جن بدصورت لوگوں نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی، ان کا تعلق کسی نہ کسی طور رونالڈ و نمرہ سے تھا۔ وہ جانور جس نے تین ساڑھے تین سال پہلے اس پر اور اس کی فیملی پر عرصۂ حیات تنگ کیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا اور وہ اپنی بچی سمیت فرش پر گر کر ختم ہو جائے گی۔

"تت..... تم لوگ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بمشکل بول پائی۔

سیاہ چشمے والا صوفے کے ہتھے پر زویا کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اپنا سوال بدل دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم جان گئی ہو کہ ہم کون ہیں اور اگر جان گئی ہو تو پھر یہ بھی ضرور جان گئی ہو گی کہ ہم نے تمہارے آرام میں مخل ہونے کی جسارت کس لیے کی ہے۔ ہم یہاں تمہارے عاشق کے بارے میں جاننے کے لیے حاضر ہوئے ہیں اور یہ جاننے کے لیے حاضر ہوئے ہیں کہ یہ "گرما گرم" معاملات اب کہاں تک پہنچے ہیں۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس نے بڑے لوفر انداز میں زویا کے بالوں کو چھوا۔

وہ چلا اٹھی۔ "اپنے یہ گندے ہاتھ دور رکھو مجھ سے..... ورنہ..... ورنہ....."

"ورنہ کیا؟ پڑوسیوں کو آواز دو گی... پولیس کو بلا لو گی؟" وہ زویا کی بات کاٹ کر بولا۔

گفتگو کے دوران میں زویا کی گرفت اپنی بچی پر بالکل ڈھیلی ہو گئی تھی۔ سیاہ چشمے والے نے یکا یک جھپٹا مار کر بچی اس سے چھین لی۔ وہ بچی واپس لینے کے لیے لپکی، مگر ہیری نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ "خبردار! آواز نہ

نکالنا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔'' وہ خطرناک لہجے میں بولا۔

وہ جہاں کی تہاں ساکت کھڑی رہ گئی۔ سیاہ چشمے والے نے بچی کو چوما، اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے لے کر کھڑکی کے بالکل پاس جا کھڑا ہوا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اس نے نیچے جھانکا..... اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کافی اونچائی ہے۔''

''خدا کے لیے نہیں..... خدا کے لیے، اسے پیچھے ہٹاؤ۔'' وہ بلک اٹھی۔

وہ بچی کو پچکارتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھو، اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس تم اپنی آواز ذرا دھیمی رکھو اور آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

زویا نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ سیاہ چشمے والے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ غنڈا صحافی..... تمہارا عاشق نامدار؟''

''تم..... کس کی بات کر رہے ہو؟'' وہ کھوکھلی آواز میں بولی۔

''اسی کی..... جسے تمہاری کشش بار بار کھینچ کر جرمنی لا رہی ہے اور جس کے ساتھ تم کل رات فل مون ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھیں۔''

وہ کچھ دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر ہمت کر کے بولی۔ ''تم پاکستانی شومیر کی بات کر رہے ہو۔ میں کئی سال بعد کل رات اس سے ملی ہوں۔ وہ یہاں کسی اور کام سے آیا ہوا ہے۔ پتا نہیں کس طرح مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ ہمارے درمیان بس..... عام نوعیت..... کی بات چیت ہوئی۔ م..... میں قسم کھاتی ہوں اب میرے اور اس کے درمیان کچھ نہیں ہے۔''

''تمہارے اور اس کے درمیان اب کچھ نہیں ہے۔'' سیاہ چشمے والا تمسخر کے لہجے میں بولا۔ ''لیکن ہمارے اور اس کے درمیان تو اب بھی کافی کچھ ہے۔ نمری صاحب اس سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کہاں ہے وہ شہزادہ؟''

''م..... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ وہ رات کو ہی کہہ رہا تھا کہ میں واپس جا رہا ہوں۔ وہ چلا گیا ہوگا۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے دوغلی نسل کی دوغلی لڑکی۔ اتنا پرانا یارانہ..... اتنے پکے بندھن..... اور یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اچھا..... چلو چھوڑو..... نہیں پتا ہوگا لیکن اس شہزادے کا..... اس جانِ من کا فون نمبر تو تمہارے پاس ہوگا؟''

''میں سچ کہتی ہوں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ اس کا فون نمبر اور ای میل وغیرہ میں نے مدتوں پہلے ڈیلیٹ کر چھوڑا تھا۔'' اس نے ذرا توقف کیا۔ تب ایک بار پھر اپنی بچی کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ ''پلیز! اسے مجھے دے دو، دیکھو اس کا رنگ زرد ہو رہا ہے۔''

''کہاں زرد ہو رہا ہے، اتنے سکون سے تو بیٹھی ہے۔'' سیاہ چشمے والے نے ایک بار پھر اس کا ماتھا چوما..... اور کمرے کے اندر ہی ایک چھوٹا سا چکر لگانے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے مان لیتے ہیں کہ تمہارے پاس اپنے عاشق کا فون نمبر Save نہیں ہے۔ پر اس نے یہاں پہنچ کر تمہیں کوئی کال شال تو کی ہوگی نا۔ اس کا نمبر آ گیا ہوگا۔''

زویا کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس وہ آیا اور چلا گیا..... بلکہ میں نے ہی اسے بھیج دیا..... حقیقت میں، میں اس سے ملنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں تو.....''

زویا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ سیاہ چشمے والے کے فون پر کال کے سگنل آ رہے تھے۔ بچی اپنے ساتھی کو سونپ کر اس نے اسکرین دیکھی اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر یہ ویڈیو کال اٹینڈ کی۔ کچھ الفاظ زویا کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ یہ جان کر اس کی دھڑکنیں مزید بڑھ گئیں کہ وہ اپنے باس یعنی رونالڈو نمری سے ہی بات کر رہا ہے۔ اس کا اپنا نام مائیکل تھا اور اس کی حیثیت غالباً نمری کے دستِ راست کی تھی۔

دو چار منٹ بعد وہ موبائل فون سمیت زویا کے سامنے آ گیا..... اس نے موبائل زویا کے ہاتھ میں تھمایا۔ اسکرین پر جو شخص نظر آیا، وہ یقیناً نمری ہی تھا۔ اس کا بالوں سے بھرا ہوا بالائی جسم بالکل عریاں تھا۔ گلے میں سونے کی بنی ہوئی ایک صلیب لٹک رہی تھی۔ اس کا بہت بڑا چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایک لرزہ خیز سی مکاری کروٹیں لے رہی تھی۔ اس سے پہلے زویا نے بس ایک دو بار ہی نمری کو دیکھا تھا اور وہ بھی دور سے..... یا پھر اخبار وغیرہ میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک دبنگ شخص تھا۔ زویا نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ ہر اتوار کو باقاعدگی سے گرجا جاتا ہے اور خود کو مذہبی بھی سمجھتا ہے مگر اس کی شخصیت پر دور دور تک مذہب یا اخلاقیات کا سایہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کسی سینٹ کا پیروکار بھی کہلاتا تھا۔ شاید اس کا سینٹ بھی اسی کی طرح کا اخلاق باختہ تھا۔

وہ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ تم لوگوں نے پہلی سزا سے کچھ سبق نہیں سیکھا... اور اگر سیکھا ہے تو بھول گئے ہو۔ تمہارے اندر کا ملاوٹی خون پھر اچھالے مار رہا ہے اور تم اپنے اس پاکستانی عاشق کے ساتھ سونے کے لیے پھر سے تڑپنا شروع ہوگئی ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے سر! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں.....''

''اور میں بھی بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں کہ میں اپنا حساب کتاب ادھورا نہیں چھوڑتا.....اور پھر ایسی صورت میں کہ میرا مقروض دیدہ دلیری سے خود ہی چل کر آئے اور میری ناک کے عین نیچے خرمستیاں شروع کردے.....کہاں ہے وہ؟''

''میں سچ کہتی ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ اسے روتے دیکھ کر بینی نے بھی سسکیاں لینا شروع کردی تھیں۔

''تمہاری بچی بہت پیاری ہے۔ یسوع اسے لمبی عمر دے۔ میں تمہیں ایک دو گھنٹوں کا وقت دیتا ہوں۔ اپنا اچھا بُرا ٹھیک سے سوچ سمجھ لو۔'' پھر اسے جیسے ایک دم کچھ یاد آیا۔ وہ اپنے دستِ راست مائیکل سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''بے بی کا سیل فون اچھی طرح دیکھو، ہوسکتا ہے کہ اس میں عاشقِ باکمال کی کوئی کال وغیرہ موجود ہو۔''

''اوکے سر۔'' سیاہ چشمے والے مائیکل نے ادب سے جھک کر کہا۔

نرسی نے اپنی بالوں بھری کلائی گھما کر رسٹ واچ دیکھی اور زویا سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''بے بی! میں تمہیں دو گھنٹے دے رہا ہوں۔ اس وقت کے اندر اندر کوئی پیش رفت ہوجانی چاہیے۔'' اس کے ساتھ ہی اسکرین پر سے نرسی کی شبیہ اوجھل ہوگئی۔ اس نے کال منقطع کردی تھی۔

زویا نے منت سماجت کی تو مائیکل نے اس کی بچی واپس اس کی گود میں ڈال دی۔ ہیری بڑی توجہ سے زویا کے سیل فون کی چھان بین کرنے لگا۔ تیسرا شخص خود ہی فریج سے کچھ سوفٹ ڈرنکس اور فروٹ نکال کر لے آیا تھا۔ اگر کوئی اس فلیٹ میں آبھی جاتا تو یہی سمجھتا کہ یہ زویا کے مہمان یا ملنے جلنے والے ہیں۔

ہیری نے زویا کا فون مائیکل کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے 18 گھنٹوں میں یہ تین نمبرز ایسے ہیں جن سے کال آئی ہے اور وہ Save نہیں ہیں۔ مجھے اس نمبر پر شک ہورہا ہے۔ کل رات چار بجے اوپر تلے تین مسڈ کالز اس نمبر سے آئی ہیں۔'' ہیری نے ایک نمبر پر انگلی رکھی۔

زویا کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ یہی شامیر کا نمبر تھا۔

''کون ہے یہ؟'' مائیکل نے کرخت آواز میں زویا سے پوچھا۔

''مجھے.....ٹھیک سے معلوم نہیں۔ میں.....میں سو رہی تھی۔''

''چلو کال کرو اس پر۔'' مائیکل نے زویا کے تاثرات دیکھنے کے بعد تحکم سے کہا۔ ''اور خبردار کوئی ہوشیاری نہیں چلے گی۔ جو بھی ہے اس سے بالکل نارمل لہجے میں بات کرنی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی مائیکل نے زویا سے بچی واپس لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

زویا نے بے تابی سے بچی کو سینے سے چمٹالیا۔ وہ بلک کر بولی۔ ''نہیں.....تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔''

مائیکل چند لمحے اسے گھورتا رہا تب ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تو چلو.....کرو کال۔''

زویا کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شامیر کا نمبر ہے اور وہ فوراً اس کی کال ریسیو کرے گا۔ وہ خطرے میں تھا اور وہ اس کی وجہ سے خطرے میں تھا۔ کاش وہ یہاں نہ آیا ہوتا۔ کاش اس نے راکھ میں دبی ہوئی آگ کو دبا ہی رہنے دیا ہوتا.....اس نے لرزتے دل کے ساتھ نمبر پریس کیا۔ دوسری طرف سے جرمن زبان میں کہا گیا۔ ''رابطہ ممکن نہیں۔ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔'' یہ ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔

☆☆☆

پیڈربورن کے ٹرین اسٹیشن پر گھڑی کی سوئیاں ساڑھے نو کا وقت بتا رہی تھیں۔ ابھی آٹھ دس منٹ پہلے مارگریٹ کے مشورے پر شامیر نے اپنا موبائل فون آف کردیا تھا۔

مارگریٹ کا خیال تھا کہ چونکہ شامیر نے زویا کو کالز کی تھیں اس لیے اس کا نمبر زویا کے پاس موجود ہے۔ اگر شامیر کا تعاقب کرنے والے زویا تک پہنچ گئے تھے تو پھر وہ شامیر کے فون نمبر کے ذریعے اس کی موجودہ لوکیشن ٹریس بھی کرسکتے تھے۔ شامیر سخت بے چین تھا۔ اگر اسے اور زویا کو فل مون میں اکٹھے دیکھا گیا تھا تو عین ممکن تھا کہ زویا بھی کسی مشکل میں ہو۔

شامیر نے مارگریٹ سے کہا کہ وہ بذریعہ کار واپس فرینکفرٹ چلی جائے۔ ساتھ ہی اسے یہ ہدایت بھی کی کہ فی الحال وہ چیتل کے آفس نہ جائے بلکہ روپوش ہی رہے۔ اس نے کہا۔ ''میں باس عظمت سلطان صاحب سے بات کرلوں

گا۔ سمجھ لو کہ تم ان کی اگلی ہدایات تک رخصت پر ہی ہو۔ اپنے پاؤں کی موچ ٹھیک کرو اور گاڑی کی مرمت کے لیے بھی وہ تمہیں کچھ رقم بھجوائیں گے۔ میں اب اپنی خالہ اور کزن کے پاس واپس اسٹریٹ پولیشن ویانا جا رہا ہوں۔"

مارگریٹ واپس چلی گئی۔ شامیر ویانا والی ٹرین پر بیٹھ گیا۔ بے شک وہ جرمنی کی سرحد پار کر کے آسٹریا جا رہا تھا مگر یہ اتنا ہی آسان تھا جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانا۔ پورے یورپ میں یہی صورتِ حال تھی۔ یورپل (ٹرین) میں اکثر اوقات مسافروں کے پاسپورٹ تک چیک نہیں ہوتے تھے۔ ٹرین ویانا کی طرف رواں تھی اور شامیر کا دماغ گھڑدوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کسی وقت اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ اس نے یہاں آ کر اور زویا کے بارے میں جستجو کر کے زویا کے حق میں بُرا کیا ہے۔ اسے پرانے معاملوں کو ہوا دینا ہی نہیں چاہیے تھی۔ جو کچھ دل پر بیت رہی تھی، اسے خود ہی جھیلتے رہنا چاہیے تھا۔ زویا کی سرد مہری نے بھی اسے بہت شاک پہنچایا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گزرے وقت کے ساتھ وہ بہت کچھ بھول چکی ہے اور اب زندگی کے نئے مسائل، نئے غم اور نئی راحتیں اس کی ترجیح ہیں، پھر اسے بار بار اموخالہ کا خیال بھی آتا تھا۔ وہ اس صورتِ حال اور شامیر کی موجودہ مصروفیات سے ناخوش تھیں۔ جلد از جلد پاکستان واپس چلے جانا چاہتی تھیں..... تو کیا اسے ان کی بات مان لینی چاہیے؟ رختِ سفر باندھ لینا چاہیے؟ لیکن ایک بات طے تھی۔ وہ زویا کی خیر خیریت جانے بغیر پاکستان واپس نہیں جا سکتا تھا۔

اس نے ایک بار پھر سوچا کہ اپنا فون آن کر کے زویا سے رابطہ کرے۔ اس نے فون پاکٹ سے نکال بھی لیا، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ آرام دہ، ہائی اسپیڈ ٹرین جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی سرسبز میدانوں میں سے گزر رہی تھی..... یہ ٹرین اسے اموخالہ اور فارہ وغیرہ کی طرف لے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ فارہ بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ شامیر کو غائب ہوئے آج تیسرا روز تھا، وہ کال بھی اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اموبھی اس سے رابطہ نہیں کر پائی تھیں۔ شروع شروع میں فارہ صرف اموکی خوشنودی کے لیے شامیر کی طرف متوجہ ہوتی تھی اور اس سے قربت بڑھانے کی کوشش کرتی تھی، مگر اب یہ بتدریج اس کا اپنا مسئلہ بھی بن گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی انا مجروح ہوئی ہے۔ اس میں ایک ضدی پیدا ہو گئی تھی شامیر کو زیر کرنے کی.....

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

اسے اپنا اسیر بنانے کی..... اس نے کندھے سے دوپٹا اتار کر ایک طرف پھینکا اور خود کو قدآدم آئینے میں دیکھنے لگی۔ کمان کی طرح کسا ہوا بدن، دہکے ہوئے رخسار، نوخیز شباب اور گہری سیاہ آنکھیں، جن میں سے امنگ ترنگ چھلکتی تھی۔ کیا کمی تھی اس میں جو وہ اسے نظرانداز کر کے اس دوغلی نسل کی بے وفا، شادی شدہ زویا کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔

اسے پیڈر بورن کی وہ رات یاد آئی جب امو کی ہدایت کے مطابق اس نے شامیر سے معافی مانگی تھی۔ معافی مانگنے کی آڑ میں وہ اس کے بہت قریب چلی گئی تھی۔ ایک حسب منشا سا ماحول بن گیا تھا اور تب ہی وہ منحوس فون کال آ گئی جس کی وجہ سے شامیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ مناظر یاد آئے تو اندر کی مایوسی اور طیش کے سبب اس کا سینہ جلنے لگا..... اس نے اپنے لمبے ریشمی بالوں کو کھول دیا اور چند گہری سانسیں لے کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔ وہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ شامیر ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے لیونا برگ سے واپس لوٹا تھا۔ اس کا موقف وہی پہلے والا تھا..... وہ چینل کے کام کے لیے گیا ہوا تھا..... فارہ اچھی طرح جانتی تھی اور امو کو بھی یقین ہو چکا تھا کہ اس نے زویا کو ڈھونڈ لیا ہے اور اب اس کے چکر میں دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ فارہ نے ایک اور گہری آتشیں سانس لی۔ اس کے اندر کی اتھل پتھل ایک زلزلے کی سی صورت اختیار کر چکی تھی۔ وہ شامیر کو ''فتح'' کرنے کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ ایک ہیجان تھا جو اسے ہر مصلحت سے بیگانہ کر رہا تھا۔ شامیر اور امو ساتھ والے کمرے میں محو گفتگو تھے۔ فارہ نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ مقامی معمولات کے مطابق تو ڈنر کا وقت ہو چکا تھا مگر امو، شامیر اور فارہ کے مطابق ابھی ڈنر میں ایک ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

تین چار گھنٹے جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے۔ اب گھڑی کی سوئیاں رات ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھیں۔ ایک تیز سرد ہوا کے باعث گھر کی کھڑکیوں میں ہلکا سا ارتعاش موجود تھا۔ افشاں کے کمرے کی بالکونی کی طرف بس ایک لائٹ آن تھی، باقی سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اہل خانہ، دیر ہوئی سو چکے تھے۔ فارہ آہستگی کے ساتھ شامیر کے بیڈروم میں داخل ہوئی۔ اس نے بیڈ کی ایک طویل چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سفر کا تھکا ہارا شامیر سنگل پلائی والا کمبل لیے سو رہا تھا۔ اندرونی روشنی مدھم تھی۔ فارہ نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا۔ جو چادر لپیٹ رکھی تھی وہ اتار پھینکی۔ وہ نہایت مختصر بلکہ برائے نام لباس میں تھی۔ اسی طرح وہ شامیر کے قریب چلی گئی۔ وہ ہانپی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آتشیں لہر نظر آ رہی تھی۔

شامیر غنودگی کی کیفیت میں تھا..... یا شاید وہ نیند سے غنودگی کی کیفیت میں آیا تھا۔ اس کی سماعت ہوا کی دور افتادہ ''سائیں سائیں'' سن رہی تھی۔ اسے لگا کہ وہ کسی سمندر میں ہے، ایک خوبصورت تفریحی ''کروزر'' پر ہچکولے کھا رہا ہے۔ پوری رات کا چاند گہرے بادلوں کے پیچھے ڈوب اور ابھر رہا ہے۔ کوئی اس کے بہت قریب ہے۔ اس کی سانسیں اس کی گردن سے ٹکرا رہی ہیں۔ کون ہے یہ؟ شاید زویا ہی ہے۔ اس کے دل کا انمٹ داغ اس کے ارمانوں کی معراج، اس کی حسرتوں کا عروج۔ وہ اس سے پیوست تھی۔ وہ اس کے بالوں کو بوسے دینے لگا۔ اس کے چہرے کو محسوس کرنے لگا۔

''عینی کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی غنودہ آواز میں پوچھا۔

''کون عینی؟''

اسے عینی کا پتا نہیں تھا۔ یہ کون تھی؟ یہ یہاں کیسے چلی آئی تھی؟ اس نے اپنی پلکیں اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی پلکوں پر بہت بھاری بوجھ رکھا تھا۔ وہ انہیں اٹھا نہیں پا رہا تھا۔ ٹھیک سے کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ ہاں اس کا دھندلایا ہوا ذہن یہ تو جان گیا تھا کہ وہ کہیں اور نہیں، اپنے بیڈروم میں ہی ہے اور جس کو وہ اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھا، وہ زویا نہیں ہے۔

اس نے ایک دیوانی کوشش کی اور اپنے ذہن کو جگانے اور آنکھوں کو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ ''فارہ! یہ کیا حرکت ہے؟ یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ طیش میں بولا اور اسے دھکیل کر دور ہٹایا۔

پھر وہ کمبل سے نکل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کمرے کی روشنیاں آن کر دیں۔ اس دوران میں فارہ نے بیڈ سے اتر کر وہ چادر دوبارہ اپنے گرد لپیٹ لی تھی جسے لپیٹ کر وہ یہاں آئی تھی۔ چند سیکنڈ تک دونوں ساکت نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ فارہ کے چہرے پر اب شدید جھلاہٹ اور غصے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچے اور تیزی سے رخ پھیر لیا، ایسا کرتے ہوئے اس کے لمبے بالوں نے ایک غصیلا بلکورا لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر تھی۔

شامیر جیسے بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک حیرت آمیز طیش کے سبب اس کا سر چکرا رہا تھا۔ یہ سوچ کر

اس کا دل بیٹھنے لگا کہ کچھ دیر پہلے جیسے طرح کی مدہوشی کے عالم میں وہ کس طرح کے ''روئیے'' کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی اسی وقت امو خالہ کو جگائے اور انہیں بتائے کہ فارہ کس طرح اپنی حدوں کو پھلانگ رہی ہے..... مگر اس طرح خالہ کے سامنے جا کر، ان کی بیٹی کے بارے میں بات کرنا شامیر کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا جس سے خالہ کو تکلیف پہنچے۔ ''آہ!'' وہ ایک بات سوچ کر کراہ اٹھا۔ کیا فرق رہ گیا تھا اس لڑکی میں اور لبنانی خشامہ جیسی ''سیکس ورکر'' میں؟ بلکہ وہ تو بلانے پر آتی تھی، یہ بن بلائے ''اپنا آپ'' ہتھیلی پر لیے ہوئے تھی۔

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ماتھا پکڑ لیا۔ دماغ میں دھند سی بھری ہوئی تھی اور پلکوں پر تاحال بوجھ تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ڈنر کے دوران میں اس نے جو سوفٹ ڈرنک لیا تھا اس میں ایک چھوٹی سی نشہ آور گولی موجود تھی۔ شامیر کے لیے اس کیف کا انتظام فارہ نے ہی کیا تھا.....

☆☆☆

فارہ کمرے میں بند صبح سے رو رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا تھا اور آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ امو خالہ جانتی تھیں کہ یہ سب کیوں ہے؟ یہ سب شامیر ہی کی وجہ سے تھا۔ وہ مسلسل اسے دھتکار رہا تھا۔ کل رات بھی یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہوئی تھی جس کے سبب پچھلے اٹھارہ گھنٹے سے فارہ کمرے سے نکلی تھی اور نہ اس نے کچھ کھایا پیا تھا۔ شامیر کا موڈ بھی بگڑا بگڑا تھا۔

ثمینہ (امو خالہ) کو شامیر اچھا لگتا تھا مگر صرف ایک داماد کے طور پر۔ اگر وہ داماد نہیں تھا تو پھر کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ایسے میں ثمینہ کو شامیر کا مرحوم باپ یاد آجاتا تھا۔ اس نے جس طرح فارہ کی بڑی بہن شائلہ کو بہو بنانے سے انکار کیا تھا اور پھر اس انکار پر ڈٹ گیا تھا، وہ ثمینہ کبھی بھول نہیں سکی تھی..... اور بات صرف شائلہ کی ہی نہیں تھی..... ثمینہ خالہ کا خیال یہی تھا کہ شامیر کی پوری فیملی میں ایک خاص قسم کی اکڑ اور نخوت پائی جاتی تھی۔ اس فیملی میں ایک خاص قسم کی عادت تھی جو عموماً دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ لوگ قریبی عزیزوں کی لڑکیوں کو بہو نہیں بناتے تھے، ہاں اپنی لڑکیوں کو کھاتے پیتے رشتے داروں میں بیاہ ضرور دیتے تھے۔ پتا نہیں، یہ کیا سائیکی تھی؟ ثمینہ خالہ کا گمان تھا کہ یہ احساسِ کمتری ہے۔ وہ بیٹیوں کو فالتو چیز سمجھتے ہیں اور بیٹوں کے لیے برادری کے باہر سے بہتر لڑکیاں لانا چاہتے ہیں۔ بس یہی گمان یا پھر بدگمانی تھی جس کے سبب ثمینہ خالہ کی ضد اور نفرت کو مزید ہوا ملی تھی۔ انہوں نے جیسے تہیہ کر رکھا تھا کہ شامیر کو داماد بنا کر چھوڑنا ہے۔ بے شک فارہ عمر میں شامیر سے دس برس چھوٹی تھی، مگر انہوں نے بڑے تحمل کے ساتھ بتدریج اپنے منصوبے پر عمل کیا تھا..... یہاں یورپ آنے سے پہلے انہیں یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ستر اسی فیصد تک کامیاب ہو چکی ہیں، مگر پھر یہاں آنے والا یہ ''نحوس پروگرام'' آڑے آگیا تھا۔ ثمینہ خالہ کے خیال میں زویا ایک زہریلی ناگن تھی جو ایک بار پھر شامیر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ ثمینہ خالہ کو زویا سے بھی زیادہ غصہ شامیر پر تھا۔ وہ ان کی بیٹی کو مسلسل ریجیکٹ کر رہا تھا۔ آج کل کسی وقت تو ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لیں۔

''اپنے باپ پر ہی گیا ہے۔'' وہ فرسٹریشن کے عالم میں بے ساختہ بڑبڑائیں۔ ان کے سر میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ آج وہ شامیر سے حتمی بات کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''شامی! مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی، کبھی بھی نہیں تھی۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ پچھلے تین دن تم کہاں رہے ہو؟''

''امو! میں آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا، لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا..... لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر نظریں جھکائے جھکائے عاجزی سے بولا۔ ''اگر آپ کو محسوس نہ ہو تو ایک بات آپ بھی مجھے بتا دیں۔ یہ بات کافی عرصے سے میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ جیسی ہستی کے حوالے سے میں اپنے دل میں کوئی ''ان کہی'' رکھوں۔''

امو خالہ نے مضطرب انداز میں چونک کر شامیر کی طرف دیکھا، پھر سنبھل کر کہا۔ ''ہاں..... جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔''

وہ بدستور نظریں جھکائے ہوئے گویا ہوا۔ ''امو! تین ساڑھے تین سال پہلے جرمنی سے ایک جین نامی لڑکی پاکستان گئی تھی۔ وہ میرا پوچھتی ہوئی ہمارے گھر تک بھی پہنچی تھی..... اس نے آپ کو.....''

''بس.....'' امو خالہ نے تیزی سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ''آخر دل کی بات تمہاری زبان پر آ ہی گئی نا۔'' ان کا

چہرہ لال بھبوکا ہوگیا اور آنکھوں میں آتشیں لپٹ چمک گئی۔
''بس ایک یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا مجھے..... میرا بیٹا تھانیدار بن کر مجھ سے ہی سوال کرے گا، مجھے ہی کٹہرے میں کھڑا کرے گا۔ مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے اس سے دھوکا کیوں کیا؟ میں نے کیوں نہ اسے من چاہی راہوں پر چلنے دیا؟ کیوں نہ واپس جرمنی جانے دیا؟ اس عیار، ضدی لڑکی کا کھلونا بننے دیا۔ کیوں نہ اس کے گھر والوں کی سازشیں کامیاب ہونے دیں.....؟''
وہ غم و غصے کے عالم میں بولتی چلی گئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے چل رہے تھے۔ وہ بار بار حسرت کے عالم میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتی تھیں اور کبھی ہچکیاں لینے لگتی تھیں۔ شامیر ہکا بکا تھا۔ اسے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے پچھلے آٹھ دس برسوں میں کبھی اموخالہ کو ایسی کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔
روتے روتے انہوں نے شامیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''معاف کردے بیٹا، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں خود کو تیرا سرپرست سمجھ بیٹھی تھی۔ تیرے اچھے بُرے کا سوچنے لگی تھی۔ بس مجھے معاف کردے اور اب مجھے اور فارہ کو پاکستان واپس جانے دے۔ تیرا جب تک دل چاہے یہاں رہ۔ میں اب تجھ سے کچھ نہیں کہوں گی.....''
شامیر نے بے تاب ہوکر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ تو اب بس ایک ہی بات کہے جارہی تھیں..... ''مجھے اور فارہ کو اب واپس جانا ہے، کل ہی یہاں سے واپس جانا ہے۔''
شامیر کے دل پر چوٹ پڑ رہی تھی، اس نے بمشکل اموخالہ کو سنبھالا۔ ان کے آنسو پونچھے، ان سے جوابی معافی مانگی..... اور ان سے وعدہ کیا کہ اب وہ بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گا۔ ممکن ہے کہ دو تین دن میں وہ اکٹھے یہاں سے روانہ ہوجائیں۔
اموخالہ چپ ہوگئی تھیں مگر اپنا چہرہ انہوں نے اب بھی پلو میں چھپا رکھا تھا۔

☆☆☆

زویا اپنے فلیٹ کے اندر انہی تین افراد کے گھیرے میں تھی۔ اس مہلک گھیرے میں اب اسے 36 گھنٹے سے زیادہ ہوچکے تھے۔ شامیر کہاں ہوگا؟ اس کے ذہن سے بار بار یہ سوال اٹھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دعا نکلتی تھی کہ وہ یہاں سے جاچکا ہو۔ پاکستان روانہ ہوچکا ہو۔ پچھلے 36 گھنٹے میں سیاہ چشمے والے بدمعاش مائیکل کے حکم پر اس نے کم و بیش بیس دفعہ شامیر والا فون نمبر ملایا تھا۔ یہ نمبر ملاتے ہوئے ہر دفعہ اس کے دل کی گہرائی سے دعا نکلی تھی کہ نمبر بند ہو..... اور وہ بند ہی ملا تھا (ہر ٹرائی کے بعد زویا کا فون، مائیکل اس سے واپس لے لیتا تھا)
ان 36 گھنٹوں میں اس کی دوست حامدہ رضوان اور قریبی شہر ہیمبرگ سے نام کی کالز بھی آئی تھیں۔ مائیکل کی ہدایت کے مطابق اس نے نارمل انداز میں یہ کالز اٹینڈ کی تھیں۔ آج سہ پہر ایک پڑوسن ابلے ہوئے آلوؤں اور مشروم کی نمکین ڈش لے کر آئی تھی۔ زویا نے یہ ڈش دروازے پر ہی وصول کی تھی اور پڑوسن کو بتایا تھا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔
بھنی کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے زویا نے ایک بار پھر وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ اسے لگتا تھا کہ گزرنے والے ہر منٹ اور گھنٹے کے ساتھ شامیر کے لیے خطرہ کم ہوتا جارہا ہے، یہ امید بڑھتی جارہی ہے کہ وہ پاکستان روانہ ہوچکا ہوگا۔
''کیا سوچ رہی ہو؟'' مائیکل کی مکروہ آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ وہ قریب ہی صوفے پر ٹانگیں پسارے وہسکی سے دل بہلا رہا تھا۔
''میں اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ رہی کہ تم لوگوں سے میری اور میری بچی کی جان کیسے چھوٹ سکتی ہے۔''
مائیکل نے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''جان چھوٹنے کا بس یہی راستہ ہے کہ تمہارا عاشق اپنا فون آن کرلے اور تم اسے اپنے ساتھ کچھ ''رنگین وقت'' گزارنے کے لیے پھر یہاں بلالو۔ یا پھر کسی طرح وہ خود ہی تمہاری کشش سے مجبور ہوکر یہاں چلا آئے۔''
''تمہاری گندی زبان مجھے مسلسل تکلیف پہنچا رہی ہے اور تم لوگوں کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔
''حاصل کیے بغیر تو ہم یہاں سے جانے والے نہیں۔ چاہے مستقل طور پر تمہارے اس فلیٹ میں قیام کرنا کیوں نہ پڑ جائے..... ویسے ایک دوسرا امکان بھی ہے۔ ہم اپنے طور پر بھی اس لفنڈر کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کیا پتا کہ تمہاری مدد کے بغیر ہی اس کا کھوج لگ جائے۔''
زویا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ ان تینوں کی یہاں موجودگی اس کے ذہن میں مسلسل خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ بظاہر تو وہ شریفانہ لباس میں تھے اور مائیکل کے سوا ان کی شکل و صورت بھی عام ہی تھی لیکن حقیقت میں وہ کتنے خطرناک ہوسکتے تھے، یہ زویا ہی جانتی تھی۔ ابھی تک تو

پہلی پر۔۔۔

وہ اپنی حدود کے اندر ہی تھے مگر کب کس وقت ان کے اندر کا شیطان انہیں کسی شیطانیت پر اکسا دیتا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جو کچھ اس کی بہن کے ساتھ ہوا تھا، وہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتی تھی..... اس کی بہن سے انسانیت سوز سلوک کرنے والوں میں یہ خبیث مائیکل بھی شامل تھا۔ وہ جب اسے دیکھتی تھی، اس کا دماغ کھول کر رہ جاتا تھا..... اور پھر فوراً ہی خوف کی سرد لہری جسم میں دوڑتی تھی۔

نہ جانے کب، زویا کی باتوں میں ہی سو گئی تھی۔ مائیکل نے گردن لمبی کر کے اسے دیکھا اور بولا۔ ''یہ سو گئی ہے۔ چلو، اٹھو اب..... کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ تمہارے مہمان بھوکے ہیں۔''

کچن سامنے ہی تھا۔ وہ نینی کو کچن کے دروازے کے بالکل سامنے ہی بے بی کارٹ میں لٹا کر کچن میں چلی گئی۔ یہ تیسری مرتبہ تھا کہ اسے ان تینوں گھس بیٹھیوں کے لیے کھانا بنانا پڑ رہا تھا۔ یہ سب اسے قید بامشقت کی طرح لگ رہا تھا۔

اس نے آملیٹ کے لیے پیاز وغیرہ کاٹا۔ وہ جھلاہٹ میں پلیٹوں کو ادھر سے ادھر پٹخ رہی تھی۔ مائیکل کچن کے دروازے میں کھڑا تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''مہمانوں کی تعداد کی وجہ سے تو پریشان نہیں ہو؟''

زویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ''ویسے تو میں اکیلا بھی تمہاری نگہداشت کے لیے کافی تھا لیکن ہر چیز کے کچھ مثبت اور مثبت پوائنٹس ہوتے ہیں۔۔۔ ہمارے باس کے ایک گرو ہیں، ہم نے انہیں کبھی دیکھا نہیں لیکن وہ باتیں بہت پتے کی ہوئی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی چھت کے نیچے جوان ''عورت مرد'' اکیلے ہوں تو ان کے دماغوں کے اندر ایک ایسا پرزہ کام کرنا شروع کر دیتا ہے جو عام حالات میں نہیں کرتا اور اس پرزے کی کارکردگی بڑی رنگین و سنگین ہوتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم۔'' اس کے چہرے پر کریہہ مسکراہٹ تھی۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مجھے کام کرنے دو اور اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھو۔''

''بیٹھ جاتا ہوں، لیکن مجھے بات تو مکمل کرنے دو.....'' وہ دروازے کی چوکھٹ سے کندھا ٹکا کر بولا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی پتلون کی جیب تھوڑا سا مزید ابھر گئی۔ اس جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا اور یہ بات وہ کل صبح ہی جان گئی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اب میرے دوستوں کے ساتھ ہونے کا فائدہ تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ تنہائی سے مخل بہتر ہے..... ویسے اگر تمہیں تین مہمانوں کی خدمت گراں محسوس ہو رہی ہے تو تھوڑا سا بوجھ تمہارے اوپر سے کم کر دیتے ہیں۔ جونی کچھ دیر بعد چلا جاتا ہے۔ وہ ایک دو دن سامنے والے گیسٹ ہاؤس میں بھی رہ سکتا ہے۔ باقی بیری رہ گیا۔ وہ تو ویسے بھی تمہارا پرانا کرم فرما ہے۔ کسی وقت تمہارے ساتھ ایک ہی چینل میں کام کرتا رہا ہے۔ دوست تھا تمہارا۔''

''غدار تھا۔'' زویا نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ مائیکل جواب میں کچھ کہتا، اس کے اسمارٹ فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ اس کے باس نمری کی ویڈیو کال تھی۔ باس شیشے میں بھرا ہوا ایک بیش قیمت صوفے پر بیٹھا تھا۔ ایک نوخیز اطالین حسینہ اس کے مقتب میں موجود تھی اور اس کے کندھے دبا رہی تھی۔ شاید ابھی کچھ دیر پہلے نمری کی کسی سے جھڑپ ہوئی تھی۔ خشونت کے تاثرات ہنوز اس کے چہرے پر موجود تھے۔ وہ خشک لہجے میں مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس دوغلی نسل کی سورنی نے کچھ بکا یا نہیں؟''

''ابھی تک تو کچھ نہیں باس۔''

''تو تم وہاں صرف جھک مار رہے ہو؟''

''نہیں باس!'' مائیکل لرز کر بولا۔ ''یہ ابھی تک تو یہی کہہ رہی ہے کہ اسے کچھ پتا نہیں، بس میں چاہ رہا ہوں کہ کچھ سیدھی انگلیوں سے ہی نکل آئے۔''

''وہ کمینہ کسی بھی وقت نکل جائے گا یہاں سے۔ اور یہ تمہارے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہوگی۔''

''تو آپ کا کیا حکم ہے؟''

''حکم تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس باسٹرڈ کو ایک یادگار سبق ملنا چاہیے۔ کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ وہ جھک کر بلی کی طرح میرے جوتے چاٹے بلکہ۔۔۔'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ایک توقف کے بعد ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ویسے کل سہ پہر کی ٹرین سے میں خود بھی فرینکفرٹ آنے کا سوچ رہا ہوں۔ تھوڑا سا کام ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔''

کچن میں ڈبل روٹی سینکتے ہوئے زویا یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کا زرد رنگ کچھ اور زرد پڑ گیا۔

☆☆☆

اموخالہ کے آنسوؤں اور گریہ وزاری نے شامیر کے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ دوسری طرف زویا سے مل کر اور اس

کے سرد مہر رویے سے اسے جو مایوسی ہوئی، وہ بھی کام دکھا رہی تھی۔ یہ ایسی مایوسی تھی جس نے شامیر کو بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ اس نے اپنی بچی کا ذکر کیا تھا، اپنے بدلے ہوئے حالات کا ذکر کیا تھا اور بڑی بے رحمی سے شامیر کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ اب اس کے لیے ایک بیتی ہوئی کہانی ہے — اس کے سینے میں زویا کی محبت کا جو چراغ جلتا تھا، وہ تو کبھی بجھ نہیں سکتا تھا، مگر اب وہ یہی چاہ رہا تھا کہ اس چراغ کو بے مہری اور بے مروتی کی ہواؤں میں پھڑپھڑانے سے بچالے اور واپس چلا جائے۔

واپس جانے سے پہلے اسے ایک کام تو بہرصورت کرنا تھا اور وہ یہ کہ ایک دفعہ زویا کی موجودہ صورت حال معلوم کرنا تھی۔ پتا چل جاتا کہ وہ کسی مصیبت میں تو نہیں ہے؟

یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ وہ اپنا فون آن کرے یا پھر کسی اور کے فون سے زویا سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ اسے پھر اپنی دراز قد خیر خواہ جین یاد آئی، مگر اس سے رابطہ کرنے کے لیے بھی تو فون آن کرنا ضروری تھا اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ویانا کے ایک قریبی قصبے "وارسوتا" جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نکل کھڑا ہوا۔ دو ٹرینیں بدل کر وہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں "وارسوتا" پہنچ گیا۔ یہ "ونڈلز" یعنی پون چکیوں سے گھرا ہوا ایک دور افتادہ قصبہ تھا۔ چند اچھے ہوٹل بھی موجود تھے۔ ایک پارک میں بیٹھ کر اس نے اپنا نمبر آن کیا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ زویا پہلے کی طرح اس کی کال اٹینڈ نہیں کرے گی لہٰذا اس نے پہلے زویا کی قریبی دوست مسز حامدہ رضوان کا نمبر ملایا۔ حامدہ رضوان نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ دو تین رسمی جملوں کے بعد انہوں نے استفسار کیا کہ وہ ابھی تک پاکستان نہیں گیا؟ وہ بولا۔ "بس جانے ہی والا ہوں جی۔ دراصل میں ایک بار زویا کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟"

وہ اطمینان سے بولیں۔ "ہاں، ابھی آج صبح بھی ہوئی ہے۔ کیوں تم اس طرح کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"آپ خود اس کے پاس گئی تھیں؟"

"نہیں فون پر بات ہوئی تھی۔" وہ الجھن میں بولیں۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے بس بچی کو ہلکا سا بخار تھا۔ وہ بھی کل تک ٹھیک ہوجائے گی انشاءاللہ۔"

زویا کی خیریت جاننے کے بعد شامیر نے مسز حامدہ سے زیادہ بات چیت مناسب نہیں سمجھی۔ ویسے بھی مسز حامدہ کا لہجہ آج روکھا پھیکا سا تھا۔ اس کی وجہ یقیناً چار دن پہلے والی صورت حال میں پوشیدہ تھی (شامیر مسز حامدہ کے ذریعے ہی زویا کی نوواگانے میں کامیاب ہوا تھا)

شامیر نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے ساڑھے نو کا وقت تھا۔ اس نے سوچا وہاں اسٹریٹ پولیشن میں یقیناً اموخالہ اور قارہ نے پھر سے پریشان ہونا شروع کردیا ہوگا۔ اس نے فوراً ہی اموخالہ کا نمبر ملایا اور ان سے کہا کہ وہ اب بالکل فارغ ہورہا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں بینک کے آفس سے واپس روانہ ہورہا ہے۔ وہ لوگ پیکنگ وغیرہ کرلیں۔ وہ نکٹ ری کنفرم کراتا ہوا آئے گا۔ کل کسی وقت نکل چلیں گے۔

اموخالہ خوش ہوگئی تھیں۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی شامیر واپسی کی انٹرسٹی ٹرین میں سوار ہوگیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ فون کو دوبارہ آف کرنے سے پہلے کم از کم ایک بار زویا سے مختصر بات کرنے کی کوشش کرے مگر پھر اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔ ٹرین روانہ ہوچکی تھی۔ ابھی وہ فون آف کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کال کے سگنل آئے۔ وہ بے طرح چونک گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ یہ زویا کی کال تھی۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ "ہیلو کون..... ہیلو۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

"میں زویا بول رہی ہوں۔" چند سیکنڈ بعد ٹھہری ہوئی سی آواز آئی۔

"زویا! تم ٹھیک تو ہو نا؟ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے حامدہ صاحبہ کو بھی فون کیا تھا۔"

"تم کہاں ہو شومیر؟" دھیمی آواز میں پوچھا گیا۔

"ویانا کے آس پاس ہی ہوں..... اور تم کہاں ہو؟"

"میں اپنے فلیٹ میں۔"

"زویا! میں نے پرسوں رات تمہیں کئی بار فون کیا۔ بیل جاتی رہی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ میں بہت ضروری بات کرنا چاہتا تھا، ورنہ شاید فون نہ کرتا۔"

"کک..... کیسی بات؟"

"تمہارے اردگرد کوئی اور تو نہیں؟"

"نہیں....."

"زویا! تم سے ملاقات کے بعد میں پرسوں رات ہی لیونابرگ سے نکل آیا تھا۔ راستے میں ایک واقعہ ہوگیا بلکہ اسے سنگین واقعہ ہی کہنا چاہیے۔ کچھ لوگوں نے ایک وین میں میرا پیچھا کیا۔ میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ اسی رونالڈو نمری کے لوگ ہوں گے۔ اگر یہ وہی کمینے تھے اور انہوں نے ہم دونوں کو اکٹھے بھی دیکھا تھا تو پھر میرا

یہ اندیشہ بجا تھا کہ وہ تم تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں تمہیں بار بار کال کرتا رہا۔''

دوسری طرف خاموشی کا لمبا وقفہ آیا۔ شامیر کو لگا کہ کہیں وہ فون بند تو نہیں کر گئی یا رابطہ تو منقطع نہیں ہو گیا۔

''ہیلو زویا..... ہیلو۔'' اس نے کہا۔

تبھی سسکی کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ ابھی لائن پر ہی تھی۔

''ہیلو زویا! تم سن رہی ہو نا؟'' شامیر نے پوچھا۔

''ہاں سن رہی ہوں۔ مم..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اس کا مطلب تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے ہم دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ اس سفید ویگن میں تین یا چار بندے تھے۔ بڑے خراب تیور تھے ان کے۔ اگر وہ کوئی عام وارداتیے ہوتے تو اس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر مسلسل مجھے گھیرنے کی کوشش نہ کرتے۔ میں بمشکل ان سے جان چھڑا سکا تھا۔''

اس واقعے کے بارے میں دونوں کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔

تب زویا نے ایک توقف کے بعد دفعتاً پوچھا۔ ''کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟''

وہ ایک بار پھر حیران ہوا۔ سنبھل کر بولا۔ ''زویا! تم بالکل خیریت سے تو ہو نا؟''

''یہ بات کتنی بار بتاؤں؟'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''خاص ہی ہے نا جو تم کو بلا رہی ہوں..... کب تک پہنچ سکتے ہو؟''

شامیر سوچ میں پڑ گیا..... پرسوں رات کو زویا کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ یوں لگا تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ سخت مضطرب ہے۔ جلد از جلد شامیر کو خدا حافظ کہہ دینا چاہتی ہے مگر دو ہی دن بعد وہ اسے پھر اپنے پاس بلا رہی تھی۔

''کیا آنا بہت ضروری ہے زویا؟''

''آ جاؤ..... تو اچھا ہے..... ایک دو باتیں کہنی ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''او کے..... میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے میں تمہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کرتا ہوں۔''

چند فقروں کے تبادلے کے بعد کال اختتام پذیر ہو گئی۔ سبک رفتار جدید ٹرین ہوا کے دوش پر تھی۔ اپنا موبائل فون گود میں رکھے شامیر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ایک محقق صحافی تھا۔ جستجو کی صلاحیت اس میں فطری طور پر موجود تھی۔ زویا سے بات کر کے اس کے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے زویا اپنی زبان نہیں بول رہی۔

کیا وہ سچ مچ کسی مشکل میں گرفتار تھی؟ وہ اس سے کیا خاص بات کرنا چاہ رہی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے شامیر کے حوالے سے اپنے رویے پر نظر ثانی کی ہو..... یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے بدبخت شوہر کے حوالے سے ہی کوئی اہم بات کہنا چاہتی ہو؟ کئی طرح کے سوالات ذہن میں الجھ رہے تھے۔ بہر حال ایک بات تو واضح طور پر اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اگر زویا نے اسے لیونا برگ میں بلایا تھا تو اسے ہر صورت اس کے پاس جانا تھا۔

شامیر جس ٹرین پر سوار ہوا تھا، وہ اسپیشل ہائی اسپیڈ ٹرین نکلی۔ اس کی رفتار تقریباً 220 کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ ایک فائدہ شامیر کو یہ بھی ہوا تھا کہ اسے راستے میں ٹرین بدلنا نہیں پڑی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بجائے صرف 45 منٹ میں واپس اسٹریٹ پولٹن پہنچ گیا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ امو خالہ کو اعتماد میں لے کر ان سے گزارش کرے گا کہ واپسی کے پروگرام میں پھر تھوڑی سی تاخیر ہو جائے گی۔ اسے چھ سات گھنٹے کا سفر کر کے واپس لیونا برگ جانا پڑ رہا ہے۔ تاہم وہاں سے واپسی کے فوراً بعد وہ پاکستان روانہ ہو جائیں گے۔ خالہ کے ساتھ پھر سے خیر سگالی والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ خالہ اور فارہ کو اس نئے پروگرام پر شاک تو پہنچنا تھا مگر اسے امید تھی کہ خالہ اسے اتنی رعایت دے دیں گی۔

وہ اندازے سے قریباً پون گھنٹا پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ بیرونی دروازے کی چابی اس کے پاس موجود تھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اسے پتا تھا کہ کم از کم امو خالہ تو ابھی تک جاگ رہی ہوں گی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تو ایک کمرے سے امو خالہ کی آواز آئی۔ وہ فارہ سے بات کر رہی تھیں۔ لہجہ کچھ جھلایا ہوا تھا لہٰذا آواز قدرے بلند تھی۔

''فارہ! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے اپنی غلطی کو محسوس کیا ہے..... وہ اب فوراً واپس جانے کی بات کر رہا ہے۔''

فارہ کی غصیلی آواز ابھری۔ ''مائی فٹ..... یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ خبیث اس کی نس نس میں گھسی ہوئی ہے۔ آپ جتنا مرضی زور لگا لیں، وہ باہر نہیں نکلے گی.....''

''دیکھو فارہ! یہ سب وقتی ابال ہے۔ وہ یہاں سے چلا جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی مت بڑی حد تک ٹھکانے آ گئی ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ ہم وہاں جا کر پوری کر لیں گے۔ بس تو اپنا موڈ ٹھیک کر۔ اب وہ ایک آدھ گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔ ہمیں پیکنگ وغیرہ کی طرف دھیان دینا چاہیے۔''

چند لمحے کے توقف سے فارہ کی تلخ آواز ابھری۔ ''دیکھیں ماما! میں یہ سچویشن اب مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ نائٹ ایٹ آل۔ اس بے لگام کے گھوڑے کو اگر آپ نے لگام ڈالنی ہے تو ابھی ڈالیں..... بس دو تین ہفتے کے اندر..... پاکستان جاتے ہی اس سے انگیجمنٹ کی بات کریں اور پھر ایک مہینے کے اندر اس کام کو نمٹا دیں۔''

امو خالہ نے فارہ کو پچکارا۔ ''میری چندا! اب ایسا ہی ہوگا۔ میں بھی وہی سوچ رہی ہوں جو تو سوچ رہی ہے۔ تو اب فکر نہ کر۔ پاکستان جاتے ہی اسے انشاء اللہ سیدھا کر دوں گی۔ چل شاباش۔ اب آنسو پونچھ اپنے۔ چل میری رانی۔''

شامیر کی سماعت جیسے سنسنا اٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ اپنے کانوں سے سن رہا ہے۔ کچھ عرصے سے امو خالہ کے حوالے سے اسے ایک دو شکوے تو پیدا ہوئے تھے مگر وہ اپنے اندر اس طرح کی سوچ رکھتی ہیں، اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا اور کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بستر پر لیٹا رہا اور اس لب و لہجے کو اور ان باتوں کو جھیلنے کی کوشش کرتا رہا جو وہ ابھی سن کر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ ایک پرانا زخم بھی جیسے رسنے لگا تھا۔ چار سال پہلے امو خالہ نے کتنی سخت دلی کے ساتھ اس سے اس کی زندگی کا ایک دلکش ترین امکان چھینا تھا۔

وہ سر پکڑے بیٹھا رہا اور اس بے پناہ دکھ کو جھیلنے کی کوشش کرتا رہا۔ بتدریج یہ دکھ ایک طرح کے غم و غصے میں بدل گیا۔ اس نے ایک فیصلہ کیا۔ تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے الماری کی ایک دراز کھولی۔ اس میں سے امو خالہ اور فارہ کے پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ نکالے۔ انہیں ایک لفافے میں رکھا۔ اپنے کاغذات دوسرے لفافے میں رکھ کر اپنے بیگ میں رکھ لیے۔ تب اس نے کزن افشاں کو کال کی اور اس سے کہا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے اس کے کمرے میں چلی آئے۔

وہ حیران ہو کر بولی۔ ''خیریت تو ہے شامی بھائی۔ آپ کب پہنچے۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔ تم کسی کو بھی بتائے بغیر میرے کمرے میں آؤ۔ تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

دو منٹ بعد شامیر والے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور افشاں اندر آ گئی۔ شامیر کا گمبھیر موڈ دیکھ کر وہ ذرا سا چونکی۔ شامیر نے خالہ اور فارہ کے کاغذات والا لفافہ سامنے تپائی پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''افشاں! یہ خالہ اور فارہ کے پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ ہیں۔ میرے جانے کے بعد انہیں دے دینا اور بتا دینا کہ میں فی الحال نہیں جا سکتا۔ مجھے ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔ میں لیوناہرگ جا رہا ہوں۔''

افشاں کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''شامی بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ کی کسی بات کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ شام کو آپ جانے کے لیے پوری طرح تیار نظر آ رہے تھے..... اور اب؟''

''افشاں! پلیز مجھ سے سوال جواب مت کرو۔ بس میری اتنی سی مدد کر دو۔ میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔''

شامیر کے تاثرات دیکھ کر افشاں کو چپ سی لگ گئی۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''پلیز! میرے جانے تک کسی کو بتانا مت.....''

افشاں سے اقرار لینے کے بعد اس نے اپنا سفری بیگ تھاما اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا، اسی طرح باہر نکل گیا۔ اس کا رخ مین اسٹیشن کی طرف تھا۔

☆☆☆

شامیر کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد افشاں نے امو خالہ کو سب کچھ بتا دیا۔ فارہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ امو خالہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ کل تک تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ ابھی کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے اس نے واپس پاکستان چلنے کا بھی کہہ دیا تھا۔ شدید پریشانی اور غصے کے عالم میں انہوں نے شامیر کا نمبر ملایا مگر اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وہ شپٹا کر رہ گئیں۔ انہوں نے فارہ اور افشاں کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیوں کر رہا ہے اس طرح؟'' وہ جیسے چلا اٹھیں۔

ان کی بلند آواز سن کر افشاں کی والدہ اور پھر والد بھی پہنچ گئے۔ ''جب وہ نکلا تھا تو تم نے فوراً کیوں نہیں بتایا؟'' خالہ ثمینہ نے جھنجلا کر افشاں سے پوچھا۔

''انہوں نے قسم دے دی تھی مجھے۔ میں کیا کرتی؟''

افشاں کے والد نے بھی شامیر سے رابطے کی کوشش کی مگر اس کا فون ہی آف تھا۔ فارہ نے سب کچھ سن لیا تھا مگر

بول کچھ نہیں رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے کھولتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اتنی بے عزتی، ایسی توہین...؟ وہ کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا اور اس نے ان سے بات تک کرنا گوارا نہیں کی تھی۔ بس پاسپورٹ وغیرہ دیے تھے اور اسی حرافہ کے پیچھے لپک گیا تھا جو اسے مسلسل اپنے جال میں جکڑے ہوئے تھی، ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ چند روز پہلے کے اس واقعے نے فارہ پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے جب وہ اپنی ساری نسوانیت کو ایک طرف رکھ کر شامیر کے بہت قریب چلی گئی تھی۔ اس کے بستر پر جا پہنچی تھی مگر وہ صرف چکنا گھڑا ہی نہیں تھا، بے حد ڈھیٹ اور بے حس بھی تھا۔ غنودگی اور ایک طرح کے خمار میں ہونے کے باوجود وہ اپنے خول کے اندر ہی رہا تھا..... اور تب اس نے ایک بار پھر فارہ کو دھتکار دیا تھا۔

فارہ کو لگا جیسے طیش کے عالم میں اس کا پورا جسم چیخ رہا ہے..... ''نیچ باپ کا نیچ بیٹا، بددماغ..... باسٹرڈ..... پتا نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔'' وہ دل ہی دل میں جیسے چلا اٹھی۔ اس کے اندر کئی مہینوں بلکہ برسوں سے دھیرے دھیرے پروان چڑھنے والی ضد اور ٹھکرائے جانے کی اذیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی..... ''میں اسے نہیں بخشوں گی..... میں اسے اس طرح اس حرامزادی کی بانہوں میں نہیں جانے دوں گی۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔ وہ مجھے ذلیل کرتا رہا ہے، میں بھی اسے بدترین ذلت دوں گی.....'' وہ بہ زبانِ خاموشی پکار اٹھی۔

اسے پچاتوے فیصد یقین تھا کہ وہ زویا کے پیچھے لیونا برگ ہی روانہ ہوا ہے۔ اگر وہ بائی ٹرین جا رہا تھا تو پھر مین اسٹیشن کی طرف ہی گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے سیل فون پر مقامی ٹرینوں کا ٹائم ٹیبل دیکھا۔ سب سے پہلے جو ٹرین بارڈر پار کر کے لیونا برگ کی طرف جا رہی تھی، اس کا ٹائم رات ایک بج کر دس منٹ تھا۔ ابھی اس کے روانہ ہونے میں تقریباً 40 منٹ باقی تھے۔ یہاں سے اسٹیشن کا فاصلہ 20 منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ افشاں جو چھوٹی ٹوسیٹر کار استعمال کرتی تھی، اس کی چابی سامنے ہی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تھی۔ مصمم ارادے کے ساتھ فارہ نے وہ چابی اٹھائی۔ شولڈر بیگ لٹکایا اور کسی کو بتائے بغیر عقبی دروازے سے نکل کر اور چھوٹا گیٹ کھول کر باہر سڑک پر آ گئی۔ حسبِ رواج یہاں گاڑیاں گھروں کے بجائے سڑک کے کناروں پر ہی پارک کی جاتی تھیں۔ افشاں والی ٹوسیٹر بھی گھر کے سامنے ہی پارک تھی۔ وہ ایک دو بار افشاں کی موجودگی میں یہ کار ڈرائیو بھی کر چکی تھی۔ گاڑی کو کھولنے اور اسے اسٹارٹ کرنے میں فارہ کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ چند ہی لمحے بعد وہ اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔

فارہ کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ اگر شامیر اسے کہیں سڑک پر جاتا ہوا مل جاتا تو شاید وہ اس پر گاڑی چڑھانے سے بھی نہ چوکتی..... لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اسے سڑک پر نہیں ملے گا۔ وہ اب تک اسٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ رکے گا نہیں۔ اس کے بدن میں ایک الاؤ سا دہک رہا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی، ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ کو اپنی گلابی شال کے نیچے گھسایا۔ وحشت کے عالم میں اس نے اپنی گردن اور گردن سے نیچے کندھوں پر ناخنوں کی گہری خراشیں ڈال دیں۔ یقیناً خون رسنے لگا ہوگا، یہ ایک اذیت ناک فعل تھا مگر اسے نہ ہونے کے برابر تکلیف ہوئی۔ اس نے اپنی کلائی کو دو تین بار بڑے زور سے ونڈ بریک کے لیور پر مارا۔ کانچ کی چوڑیوں نے ٹوٹ کر اس کی کلائی کو لہولہان کر دیا۔ میٹل کے دو کڑے ٹیڑھے میڑھے ہو گئے۔ اس نے گلے کی مالا توڑ دی اور اپنے گریبان کو بھی کسی حد تک ادھیڑنے میں کامیاب رہی۔ وہ تہیہ کر چکی تھی کہ پلیٹ فارم نمبر 4 پر پہنچ کر شامیر کو ہنگامی طور پر اپنی گاڑی میں لائے گی۔ اسے کہے گی کہ وہ صرف دو منٹ کے لیے اس کی بات سن لے۔ جونہی وہ گاڑی کے اندر پہنچتا، وہ شال اتار کر شور مچائے گی اور دہائی دے گی کہ اس کے ساتھی نے اس پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں کے قوانین کتنے سخت ہیں اور کسی مرد پر لگنے والا اس طرح کا الزام اسے کن مصیبتوں سے دوچار کر سکتا ہے۔ وہ جنونی کیفیت میں تھی۔ ہر اندیشے اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ چکی تھی۔ اس کی مطلب پرست والدہ نے کئی برسوں میں جو قطرہ قطرہ زہر اس کے اندر بھرا تھا، وہ آج ایک دریا کی طرح اچھالے مار رہا تھا۔ وہ اس قدر غضب ناک تھی کہ اگر بالفرض شامیر اس کے کہنے پر گاڑی میں نہ بھی آتا تو وہ وہیں پلیٹ فارم پر شور مچا کر اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کا پکا انتظام کر سکتی تھی۔

اور وہ اپنے پلان کے مطابق بالکل درست سمت میں جا رہی تھی۔ تقریباً یہی وقت تھا، جب شامیر اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکائے پلیٹ فارم نمبر 4 پر بیٹھا لیونا برگ کو جانے والی ''کونیکلڈ'' ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے کچھ

معلوم نہیں تھا کہ کون، کس ارادے سے اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا — کار میں اس کی طرف آتی ہوئی فارہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ مگر جو ہونے والا تھا وہ نہ شامیر سوچ رہا تھا اور نہ فارہ سوچ رہی تھی۔ یہ تقدیر تھی جو لوح محفوظ کے مطابق طے شدہ وقت پر، طے شدہ جگہ پر، منتخب شدہ فرد کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ بے شک وہ بے حد مصروف ہو، اس کے پاس ایک لمحے کا وقت نہ ہو، مگر وہ ہونی کی زبان بولتی ہے۔ بے مروتی سے مسکراتی ہے اور کہتی ہے۔ بس، رک جاؤ۔ سارے پروگرام ایک طرف رکھ دو۔ تمہارے شیڈول میں وقت نہیں لیکن میرے شیڈول میں تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے — اور یہ تقدیر اس سڑک کے اگلے چوراہے پر کھڑی تھی جس پر فارہ ازی جارہی تھی۔ وہ بری ڈرائیور نہیں تھی لیکن ایک تو وہ بہت عجلت میں تھی دوسرے یہاں ''رائٹ ہینڈ ڈرائیو'' تھی۔ وہ چوراہے سے بائیں جانب مڑنے لگی تو اسے زبردست ''دھچکا'' لگا۔ ایک بڑی کار کو بچاتے بچاتے اس نے اپنی تیز رفتار نوسیئر، فٹ پاتھ پر چڑھا دی — اور ایک مجسمے کی پتھر لی فاؤنڈیشن سے جا ٹکرائی — کار کا اگلا حصہ چکنا چور ہوکر پچک گیا، گاڑی میں ائربیگ موجود نہیں تھا۔ فارہ کا سر سامنے والے حصے سے بری طرح ٹکرایا۔ وہ شدید زخمی ہوکر بے ہوش ہوگئی اور مڑے تڑے اسٹیئرنگ پر جھک گئی۔ چند ہی لمحے بعد پولیس کاروں کے ہوٹر سنائی دینے لگے۔

☆☆☆

شامیر اب لیونا برگ جانے والی ٹرین میں تھا۔ ٹرین ہوا کے دوش پر اڑی جارہی تھی۔ اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ جس رفتار سے یہ جدید ٹرین حرکت کررہی تھی، اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ اس کا دماغ بھی حرکت میں تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہاں لیونا برگ میں زویا کسی مشکل میں ہے۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ایک بار پھر زویا کی دوست نومسلم حامدہ سے بات کرے اور ان سے کہے کہ وہ خود زویا کے فلیٹ پر جائیں اور اس کی خیریت دریافت کریں، مگر اس میں بھی خطرات پوشیدہ تھے۔ اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔

شامیر کا فون مسلسل بند تھا۔ پتا نہیں کیوں زندگی میں پہلی بار اسے لگا تھا کہ وہ اموخالہ کی آواز سننا نہیں چاہتا، ان کے متوقع سوالوں کے جواب بھی وہ ہرگز دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے جیسے ایک پردہ سا اٹھ گیا تھا۔ اس پردے کے اٹھنے کے بعد اسے خالہ اور فارہ کی صورتیں صاف نظر آنے لگی تھیں اور یہ ان صورتوں سے بہت مختلف تھیں جو وہ دیکھتا آرہا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنا فون آن کیا اور آن ہوتے ہی زویا کا نمبر ملا دیا۔ فوراً ہی زویا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو —''

''ہیلو زویا! میں روانہ ہوگیا ہوں۔ راہلبرگ ٹرین سے اتر کر اب لیونا برگ والی ٹرین میں ہوں۔ امید ہے کہ گیارہ بارہ بجے تک لیونا برگ پہنچ جاؤں گا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ یہ ''آک ورڈ'' سی خاموشی تھی۔ تب زویا نے کہا۔ ''شامیر! م — میں بے چینی سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں بہت الجھن میں ہوں زویا۔ مجھے کوئی اشارہ تو دو۔'' پھر جیسے اچانک شامیر کے دماغ میں خیال آیا۔ وہ بولا۔ ''زویا! ہم ویڈیو کال بھی تو کرسکتے ہیں۔ میں تمہیں اور تمہاری بچی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے تھوڑا سا توقف کیا اور ہکلا کر بولی۔ ''میرے سیٹ کا کیمرا کام نہیں کررہا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں — تم — اس بات کی پریشانی بالکل چھوڑ دو۔''

وہ جو بھی کہہ رہی تھی، بہت سنبھل کر کہہ رہی تھی مگر اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ کیمرا کام نہ کرنے والی بات بھی شامیر کو بالکل غلط لگی تھی۔

''زویا پلیز — مجھے کچھ اشارہ تو دے دو — کہ کس طرح کی بات ہے۔ ورنہ میرا یہ سفر بہت دشوار گزرے گا —''

''شامیر! کہا ہے نا کہ کوئی بہت خاص بات نہیں ہے۔ بس تم سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے، اپنے رویے پر افسوس بھی ہے۔ بس غصے میں تمہیں طمانچہ مار دیا۔ اس کی بھی معافی مانگنی ہے۔ بس تم آجاؤ نا۔''

''طمانچہ؟'' شامیر نے کہا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔ ایک دم شامیر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ زویا سے یہ کج کلامی تو ہوئی تھی لیکن طمانچہ؟ وہ جلدی سے بولا۔ ''اوہ زویا! اب ان باتوں کو مت چھیڑو — جو ہوگیا سو ہوگیا — چلو — باقی باتیں پہنچ کر ہو جائیں گی..... میں آرہا ہوں۔'' وہ عجیب تذبذب میں بولا تھا۔

دو تین رکی جملوں کے بعد شامیر نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس نے زویا کو بتا دیا تھا کہ وہ اب بوجوہ اپنا فون آف کررہا ہے۔ فون آف کرنے کے بعد وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا اور دو رویہ نشستوں کے درمیانی خلا میں ٹہلنے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ زویا نے طمانچے

کی بات کی تھی اور اس نے کبھی طمانچہ نہیں مارا تھا۔ یہ واضح طور پر ایک اشارہ تھا..... وہ کسی مصیبت میں تھی۔ کسی بڑی مصیبت میں تھی۔ پچھلی کال کے دوران میں بھی پتا نہیں کیوں اسے یہ شک ہوا تھا کہ شاید زویا اپنی بیٹی کے ساتھ کمرے میں اکیلی نہیں ہے..... اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ پولیس کو انوالو کرنا چاہیے، یا کسی اور کی مدد طلب کرنا چاہیے؟ زویا نے خود کو اپنے جنونی شوہر سے بھی چھپا رکھا تھا اگر پولیس انوالو ہو جاتی تو پھر سب کچھ منظرِ عام پر آ جاتا ـــ عظمت سلطان صاحب مدد کر سکتے تھے اور وہ اس طرح کہ ایک دو بندوں کو مدد کے لیے اس کی طرف روانہ کر دیتے۔ شامیر کو یہ بھی کچھ مناسب نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ زویا کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی دوسرے کو انوالو نہ کرے۔

اس میں شبہے کی گنجائش کم ہی تھی کہ جن لوگوں نے لیونا برگ کے اس فلیٹ میں زویا کو چھاپ رکھا ہے، وہ نمرسی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہی میں سے کچھ لوگوں نے تین دن پہلے سفید وین میں اس کا اور مارگریٹ کا تعاقب کیا تھا۔ یہ خطرناک لوگ تھے۔ اگر وہ نمرسی کے لوگ نہیں تھے تو بھی ان کی خطرناکی میں کوئی شک نہیں تھا۔ تو کیا وہ خالی ہاتھ، تن تنہا ان لوگوں کے سامنے جا کر خم ٹھونکے گا؟

وہ کیا کرے؟ اس کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا فون پھر آن کیا۔ وہ عظمت سلطان صاحب کو کال ملانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی ایک اور کال آ گئی۔ یہ مارگریٹ کی آڈیو کال تھی۔ اس نے کہا۔ ''شامیر صاحب! قادر سے بات ہوئی ہے۔ وہ اس وقت بھی لائن پر ہی ہیں۔ آپ ان سے بات کر سکتے ہیں۔''

چند لمحے بعد لائن پر قادر جوناتھن کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ شستہ انگلش میں بولے۔ ''ہیلو شامیر! گریٹ جوب..... تم کیسے ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں قادر۔ عرصے بعد آپ کی آواز سن کر بڑا اچھا لگا۔''

''مجھے بھی بہت اچھا لگا۔ اس لڑکی مارگریٹ نے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں۔''

''یہ آپ کی بھی بہت تعریفیں کرتی ہے قادر ـــ اور صرف یہی نہیں، سب ہی آپ کی تعریف کرتے ہیں ـــ چند روز پہلے ہم دونوں آپ سے ملنے آپ کے پاس ''برج برگ'' آ رہے تھے ـــ مگر پھر آ نہ سکے۔''

''ہاں، مجھے مارگریٹ نے اس بارے میں بتایا ہے۔ یسوع نے تمہیں ان خطرناک لوگوں کے شر سے بچا لیا۔ وہ اپنے نیک بندوں کی ایسے ہی حفاظت کرتا ہے۔''

''ہمیں لگتا ہے قادر! وہ فرینکفرٹ کے بدنام شخص رونالڈو نمرسی کے بندے تھے۔ شاید یہ لوگ اب تک اس ناجائز پراپرٹی والے معاملے کو بھولے نہیں۔''

''بالکل، ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ کینہ پرور ہوتے ہیں۔''

قادر نے مہربان لہجے میں مارگریٹ اور شامیر کو بہت سی دعائیں دیں اور بولے۔ ''خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ حادثے ہماری زندگی میں قدم قدم پر گھات لگائے ہوتے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے ڈکیتی کی ایک واردات میں زویا کی والدہ سارہ جیم کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ بیچاری ابھی تک پوری طرح صحت مند نہیں ہے۔ اوپر سے اس کو گمشدہ زویا کا دکھ بھی ہے۔ اس لڑکی نے بڑی نادانی کی ہے کہ شوہر کا گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔''

قادر جوناتھن کی بات سے اندازہ ہوا کہ انہیں ابھی تک زویا کے حوالے سے نئی صورتِ حال کا علم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مارگریٹ نے شامیر کی ہدایت کے عین مطابق کسی کو زویا کی بازیابی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ قادر کو بھی نہیں۔ یہ ٹھیک ہی تھا۔

زویا کی والدہ کے ذکر پر قادر کو غالباً چار سال پہلے کے واقعات یاد آ گئے تھے، وہ چند لمحے توقف کر کے بولے۔ ''ان دنوں جو کچھ ہوا، وہ خدا کی مرضی تھی اور ہمیں اس کی مرضی کے سامنے اپنے سر خوش دلی سے جھکا دینے چاہئیں۔ ان دنوں یہ بات بھی مشہور ہوئی تھی کہ شاید تم نے زویا کی والدہ پر ہاتھ اٹھایا تھا لیکن میرا ماننا یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ قصور شاید دونوں طرف ہی تھا۔ باہمی تکرار میں بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے ناخوشگوار واقعات ہو جاتے ہیں.....''

''قادر! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ.....''

''پلیز شامیر! اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ـــ پلیز.....''

شامیر خاموش ہو گیا۔ اس موقعے پر اس ٹیلی فونک کانفرنس میں تھوڑی سی گفتگو مارگریٹ نے بھی کی۔

قادر جوناتھن نے اچانک پوچھا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو شامیر؟''

شامیر نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ ''محترم قادر! فی الوقت کہیں بھی نہیں ہوں۔ ویانا سے چلنے والی ٹرین میں

سوار ہوں۔ یہاں جرمنی میں ایک ضروری کام تھا۔ میونخ کے قریب سے گزر رہا ہوں۔ ابھی پتا نہیں کہ کہاں رکنا ہے اور کہاں پہنچنا ہے۔ اگر لیونا برگ کی طرف آنا ہوا تو آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی۔ چار سال پہلے بھی تم سے ملنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تم ان مسلم لوگوں میں سے ہو جو مذہبی شدت پسندی سے بہت دور ہوتے ہیں..... دوسروں کی بات تحمل اور توجہ سے سننے والے لوگ مجھے ہمیشہ سے بہت اچھے لگتے ہیں۔ دراصل یہ تنگ نظری اور تنگ ذہنی ہی ہے جس نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔" پھر انہوں نے ذرا توقف سے کہا۔ "میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو مجھے ضرور یاد کرنا۔ میں برج برگ میں تمہارا اور مارگریٹ کا انتظار بھی کروں گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ فادر۔" شامیر نے تہ دل سے کہا۔

مارگریٹ نے بھی شکریہ ادا کیا پھر یہ کال ختم ہوگئی۔

شامیر نے چیتل کے کرتا دھرتا عظمت سلطان صاحب سے بات کرنے کے لیے فون آن کیا تھا کہ درمیان میں مارگریٹ کی کال آگئی۔ اب شامیر نے دوبارہ عظمت سلطان صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے مختصر الفاظ میں تقریباً ساری صورتِ حال ان کے گوش گزار کردی۔ یہاں کے تشویش ناک حالات سن کر سلطان صاحب کے لب و لہجے سے تفکر جھلکنے لگا۔ وہ بولے۔ "آخر وہی ہو رہا ہے نا، جس کا ڈر تھا۔ اسی لیے میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ وہاں زیادہ دیر نہ رکو۔"

"آپ پریشان نہ ہوں جی۔ اگر مجھے کچھ کرنا ہی پڑا تو ہاتھ پاؤں بچا کر کروں گا۔ مجھے پتا ہے کہ میں پردیس میں ہوں اور کسی طرح کا بڑا پھڈا افورڈ نہیں کرسکتا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ بس میں چاہتا ہوں کہ احتیاطاً میرے پاس کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار ہو۔ کوئی ایسی صورتِ حال بن ہی جائے تو اپنا دفاع کرسکوں۔"

"تو یہ ناجائز ہتھیار ہی ہوگا نا۔"

"جناب! یہاں اسلحے کے حوالے سے قوانین زیادہ سخت نہیں ہیں اور میں کون سا کوئی کلاشنکوف چاہ رہا ہوں۔ بس ایک چھوٹا سا پسٹل مل جائے جسے لباس میں آسانی سے چھپایا جاسکے۔"

وہ کچھ دیر تک شامیر کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر جب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا تو انہوں نے اس سے کہا کہ وہ سیدھا لیونا برگ جانے کے بجائے فرینکفرٹ میں ہی اتر جائے۔ چیتل کی بے باک رپورٹر مارگریٹ بھی فرینکفرٹ میں ہی تھی۔ سلطان صاحب نے کہا۔ "میں مارگریٹ سے رابطہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ تمہاری ضرورت پوری کرسکے۔ مگر یہ سارا رسک تمہارا اپنا ہوگا۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں۔" شامیر نے کہا۔ "آپ اور چیتل اس سے بری الذمہ ہیں۔"

سلطان صاحب سے بات کرکے اس نے فون پھر بند کردیا۔ اس کا موڈ اتنا ابتر تھا کہ وہ اموخالہ یا فارہ کی کال سننا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے نشست سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ خود بھی اس ٹرین کے ذریعے سیدھا لیونا برگ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر نمری کے لوگ اسے ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ زویا کے فلیٹ میں ہی بیٹھ کر اس کی راہ تکتے رہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ لیونا برگ کے اسٹیشن پر پہنچتا اور وہ اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہاں موجود ہوتے۔ سلطان صاحب کے مشورے کے مطابق اس نے فرینکفرٹ میں ہی اترنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

جس وقت وہ فرینکفرٹ کے بڑے ریلوے اسٹیشن "ہاف بانوف" پر اترا، جولائی کی ایک چمکیلی سہ پہر نے اس شہرِ دل پذیر پر زندگی کی ساری رونقیں نچھاور کر رکھی تھیں۔ ہاں یہی جولائی تھا، یہی موسم تھا — اور قریباً یہی وقت تھا جب وہ قریباً چار سال قبل، پہلی بار یہاں اترا تھا۔ فرینکفرٹ کی خوش رنگ فضاؤں میں بسنے والی زویا نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ اس کے گال کا ڈمپل، فرینکفرٹ کے ایک دلکش لینڈ مارک کی طرح محسوس ہوا تھا اور وہ بولی تھی۔ "ہیلو سر! میرا نام زویا ہے۔ آپ یقیناً شومیر ہیں۔ میں آپ کو ریسیو کرنے آئی ہوں۔"

مگر آج اسے ریسیو کرنے کے لیے زویا نہیں مارگریٹ آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسٹیشن سے نکل کر ایک قریبی ریستوران میں جا بیٹھے۔ مارگریٹ ابھی تک کچھ تذبذب کا شکار چلی رہی تھی۔ یہ چوٹ اسی واقعے کی نشانی تھی جب سفید دین والوں نے برج برگ کی سڑکوں پر شامیر اور مارگریٹ کا پیچھا کیا تھا۔ ریستوران کی دیوار گیر کھڑکیوں میں سے شامیر کو فرینکفرٹ کی بلند ترین عمارت "کامرس بینک ٹاور" کی جھلک نظر آئی۔ کئی نہ بجھنے والے مناظر اس کے ذہن میں تازہ ہوئے اور دل کے درد کو بڑھا گئے۔ کامرس بینک کی چھت، جس پر موجودگی کے دوران میں اس نے اپنی زندگی کا سب

سے حسین تجربہ کیا تھا۔ زویا کا پیار کسی الہام کی طرح اس پر اترا تھا اور اس کے رگ و پے میں جذب ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جسم و جاں کا جزو لاینفک بن گیا تھا۔۔۔ اور اب آس، انتظار اور تڑپ کی بھٹی میں تپ کر یہ پیار نہیں رہا تھا، کندن بن گیا تھا اور شاید اسی کندن کا دوسرا نام عشق ہے۔

ہاں، یہ عشق ہی تھا جو اس کو غیر معمولی طاقت بخش رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو وہ کرنے جا رہا ہے، وہ آسان نہیں ہے۔ اس میں کئی خطرات ہیں، مگر اس نے سارے اندیشے بالائے طاق رکھ دیے تھے۔ یہ اندیشے بھی شاید اس نے خود بالائے طاق نہیں رکھے تھے، یہ عشق ہی تھا جو سب کچھ کر رہا تھا۔ اسے ایک بے خوف توانائی بخش رہا تھا۔ اس کا رویہ عظمت سلطان صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔۔۔ مارگریٹ کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ مگر جو سمجھ میں آ جائے وہ دیوانگی ہی کیا۔

اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا بہت چھوٹا سا مگر طاقتور پسٹل ''کولٹ مستنگ'' مارگریٹ کے شولڈر بیگ میں موجود تھا۔ اس نے یہ پسٹل میز کے نیچے سے شامیر کو تھما دیا اور اس نے اسے سنبھال لیا۔

☆☆☆

ایکسیڈنٹ کے بعد قارہ کو مکمل بے ہوشی کی حالت میں نزدیکی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا تھا۔ وارڈ کے سامنے کہرام سا مچا ہوا تھا۔ خالہ ثمینہ چلا رہی تھیں۔ اپنی رانیں پیٹ رہی تھیں۔ افشاں اور اس کے والدین انہیں سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قارہ کب گھر سے نکلی، اس نے کب گاڑی نکالی اور حادثے والی جگہ پر پہنچی۔ افشاں کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ہیجانی کیفیت میں یقیناً شامیر کے پیچھے اسٹیشن کی طرف ہی گئی تھی۔ یہ بات خالہ ثمینہ وغیرہ کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ اسی دوران میں میڈیکل اسٹاف کی ایک لڑکی باہر آئی۔ افشاں کے والد اختر صاحب نے آگے بڑھ کر بے تابی سے پوچھا۔ ''بچی کی حالت کیسی ہے؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سر کی چوٹ زیادہ شدید ہے۔ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپریشن کی ضرورت بھی پڑے۔ والدہ کو سائن کرنے ہوں گے۔''

خالہ ثمینہ نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک سینئر ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ جرمن ڈاکٹر اختر صاحب کو ایک جانب لے گیا اور انگلش میں بولا۔ ''مریضہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟''

''میری بھتیجی ہے۔'' اختر صاحب نے جواب دیا۔

''اس کے جسم پر کچھ ایسے نشان ہیں جن سے شک ہوتا ہے کہ شاید اس کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے یا پھر۔۔۔ اس سے زبردستی کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے پولیس کو بھی اطلاع کیا ہے۔۔۔ وہ لوگ ابھی آپ سے رابطہ کریں گے۔''

اختر صاحب حیران رہ گئے۔ یہ ڈاکٹر کیا بات کہہ رہا تھا۔ قارہ کی لڑائی کس سے ہوئی تھی۔۔۔ اور دوسری بات بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ گھر پر ہی موجود رہی تھی۔ اس حادثے سے تھوڑی دیر قبل شامیر گھر میں آیا تو تھا مگر وہ افشاں کے سوا کسی سے ملا نہیں تھا۔

یہ کیا معاملہ ہو سکتا تھا؟ وہ پُرتشویش انداز میں سوچنے لگے۔

دوسری طرف کونے میں کھڑی افشاں انداز اً بیسویں بار شامیر کے نمبر کو نرائی کر رہی تھی۔ پہلے فون بند جا رہا تھا، پھر کچھ دیر کے لیے انگیج گیا تھا اور اب پھر بند ہو گیا تھا۔ وہ جھلا کر رہ گئی۔

خالہ ثمینہ جانتی تھیں کہ وہ کس کو فون کر رہی ہے۔ وہ دہائی دینے والے انداز میں بولیں۔ ''وہ کیوں فون اٹھائے گا۔ وہ نہیں اٹھائے گا۔ میری بچی کو جان کے لالے ڈال کر وہ پھر رفوچکر ہو گیا ہے۔ پھر چلا گیا ہے اسی حرامزادی کے پیچھے۔'' وہ صدمے کے عالم میں اسے غائبانہ صلواتیں سنانا شروع ہو گئیں۔

ان کا رویہ افشاں اور اس کے گھر والوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ افشاں کے والد ڈاکٹر سے بات کرنے کے بعد ایک گوشے میں گم صم کھڑے تھے۔

☆☆☆

آج تیسرا دن تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ان تین دنوں کا ہر ہر پل زویا نے جیسے سولی پر لٹک کر گزارا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی سامنے والے گیسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو چکا تھا، مگر مائیکل اور ہیری وہیں تھے۔ رات کے سناٹے میں کسی وقت زویا کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دو خطرناک بھیڑیوں کے ساتھ ایک پنجرے میں بند ہے۔ وہ کسی بھی وقت حیوانیت پر اتر سکتے ہیں۔۔۔۔ کسی وقت زویا کے خشک ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلنے لگتے تھے اور وہ اپنی بچی کو کچھ اور بھی اپنے ساتھ پیوست کر لیتی تھی۔ کل رات وہ بات بھی ہو گئی تھی جس کا خوف اسے مسلسل ڈس رہا تھا۔ بالآخر شامیر سے کال مل گئی تھی اور ان بدمعاشوں کی ہدایت کے عین مطابق اس نے وہ سب کچھ بول دیا تھا جو وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ بہرحال دوسری کال کے موقع پر اس نے تھوڑی سی ذہانت دکھائی تھی اور طمانچے والی بات کر کے شامیر کو اشارہ

دینے کی کوشش کی تھی۔ شامیر نے بھی ذرا سا ''لڑکھڑانے'' کے بعد فراست کا مظاہرہ کیا اور زویا کو یوں لگا تھا جیسے اس نے زویا کا دیا ہوا سگنل پک کرلیا ہے۔ پھر بھی ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اگر شامیر کو خطرے کا احساس ہو چکا ہے تو پھر وہ کیا کرے گا؟ وہ کس طرح سے اس کی مدد کی کوشش کرے گا؟ یہ سوال بار بار اس کے خوفزدہ ذہن میں ابھرتا تھا اور اس کی دھڑکنوں کو زیروزبر کرتا تھا۔ اس کا اکیلا یہاں چلے آنا تو بہت بڑی حماقت ہوتی..... بلکہ کسی وقت تو لگتا تھا کہ لیونابرگ کے اسٹیشن پر اترتے ساتھ ہی اسے خطرات لاحق ہوسکتے تھے۔

ساتھ والے کمرے میں مائیکل اور ہیری کارڈز کھیل رہے تھے۔ الکحل اور تمباکو کے بھبکے بھی اس کمرے کی طرف سے اٹھ کر زویا کے نتھنوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے اپنا اسکارف، رومال کی طرح منہ کے آگے رکھ لیا۔ مائیکل اور ہیری وغیرہ یہاں شامیر کے استقبال کے لیے بالکل تیار نظر آتے تھے۔ باہر گرج چمک کے ساتھ ہلکی بارش جاری تھی۔ سرسبز لیونابرگ میں ٹھنڈ معمول سے زیادہ محسوس ہورہی تھی۔

آنے والی گھڑیوں میں کیا ہونا ہے، یہ سوچ زویا کے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ اتنے میں مائیکل لڑکھڑاتا ہوا سا کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ زویا، عینی کو سینے سے لگا کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے زویا کو پُرتپش نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''باس کے گرو کہتے ہیں کہ اتوار کے اتوار گرجے جاؤ..... پھر جو جی چاہے کرتے رہو۔''

''کیا مطلب؟'' زویا نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

مائیکل نے وال کلاک کی طرف دیکھا..... اور جلدی سے بات بدل کر بولا۔

''تیرے عاشق کی رونمائی نہیں ہوئی۔ جس ٹرین کا اس نے کہا تھا اس میں سے تو برآمد نہیں ہوا۔ اب کون سی شاہی سواری سے جس پر تشریف لا رہا ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ منمنائی۔

مائیکل نے کھڑے کھڑے زویا کا فون اس کی طرف پھینکا جو اس کے پہلو پر لگا۔ وہ تحکم سے بولا۔ ''فون کرو اور پوچھو اس سے۔ کہیں کسی اور کے بستر میں تو نہیں گھس گیا۔''

چار و ناچار زویا اٹھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ شامیر کا نمبر پریس کیا۔ دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ وہ یہاں نہ آئے..... اور اکیلا تو بالکل ہی نہ آئے۔

فون بند جارہا تھا۔ اسے اپنے سینے میں اطمینان کی لہر محسوس ہوئی۔ وہ اس کی پہلی اور آخری چاہ تھا۔ وہ اسے کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ اسے کہاں کہاں یاد آتا ہے اور وہ ہر روز کتنی بار اس کے واسطے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے۔ اس کے لیے تو وہ آج بھی فرینکفرٹ میں ٹرین نمبر 21 کے آخری اسٹیشن پر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا، ان دونوں نے اپنے اوپر چھتری تان رکھی تھی اور بارش کی پھواروں سے آگے ڈیزی اور گلاب کے پھولوں کو دیکھتا ہوا وہ کسی داستان کا کردار لگتا تھا۔ وہ دور دیس سے آیا تھا، شاید روز ازل سے اس کا آنا ٹھہرا ہوا تھا اور شاید جانا بھی۔

؎ تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی، بچھڑنا بھی ضروری تھا

''کیا ہے؟'' مائیکل کی کرخت آواز نے زویا کو خیالوں سے چونکایا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے فون مائیکل کی طرف بڑھا دیا جس کے اسپیکر میں سے آواز آرہی تھی..... آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔

''اوہ شٹ۔'' مائیکل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ہوا میں اٹھایا جیسے اسے پٹخ کر توڑ دینا چاہتا ہو مگر پھر رک گیا۔ غالباً اس خیال سے رکا کہ عینی جاگ جائے گی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے میں ہی تھوڑا سا ٹہل کر عینی کی طرف جھکا اور نسبتاً نرم لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تمہاری بچونگڑی اب سوگئی ہے۔ اسے آرام سے کارٹ میں لٹا دو..... اور اٹھ کر تھوڑا سا کام کرو۔''

''کیا؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

وہ مسکرایا۔ ''تمہارے یار کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر کمر ہی اکڑ گئی ہے۔ اپنے ان گلابی گلابی نرم ہاتھوں سے تھوڑا سا مساج ہی کردو۔''

''کیا بکواس ہے۔ دور رہو مجھ سے..... باہر نکل جاؤ کمرے سے۔'' وہ گرجی۔

''تمہاری بہن بھی اسی طرح تیز طرار تھی..... مگر پھر اس نے سمجھ داری اور تحمل کا ثبوت دیا تھا۔ لگتا ہے کہ تمہارے اندر یہ تیزی طراری والا ''فلیور'' تمہاری بہن سے کافی زیادہ ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی تمہارا رویہ ایسا ہی ہوتا ہو..... دور رہو مجھ سے..... باہر نکل جاؤ کمرے سے..... جس بندے کے پاس تم جیسی گلبدن کے حقوق محفوظ ہوں، وہ دور تو نہیں رہ سکتا نا۔ شاید اسی وجہ سے تم دونوں میں ناچاقی

ہوئی اور پھر تم اس کی بچی کو لے کر یہاں بھاگ آئیں..... اب وہ دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ہم یہاں سے ایک کال بھی کر دیں تو وہ اپنے سارے حقوق اور تمام غصے سمیت یہاں پہنچ جائے گا۔ تمہیں اس رازداری کے لیے ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے اور خاص طور سے میرا۔''

زویا کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی تیز دھار آلہ ہو اور وہ بے دریغ اس مکروہ شخص کے پیٹ میں گھونپ دے۔ بہرطور وہ کچھ بولی نہیں۔ بس غم و غصے کے عالم میں کانپتی رہی۔

وہ اسی طرح دونوں ہاتھ کمر پر رکھے رکھے پھر مسکرایا۔ ''تو مساج کے لیے لاؤں اولیو آئل؟''

''مجھ سے دور ہو جاؤ، ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔'' وہ پھر گرجی۔

اس کے تیور دیکھ کر مائیکل بلند آواز میں ہنسا۔ ''نہیں میری غصیلی حسینہ! میں مذاق کر رہا تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ان گلابی گلابی ہاتھوں سے کچھ کلاسک ٹائپ کی ادرک والی چائے بنا دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے..... اور کچھ لیمن بھی نچوڑ لینا اس کے اندر۔''

''سب کچھ نچوڑ لوں گی..... مگر دودھ نہیں ہے۔'' وہ جلے بھنے انداز میں بولی۔ ''تمہیں شام کو بھی بتایا تھا۔'' اس نے اپنے غصے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''دودھ منگوا لیتے ہیں۔'' وہ بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اندرونی کمرے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ''او ہیری! باہر آؤ بھئی، تھوڑی سی ہیلپ کرو اپنی خوبصورت میزبان کی۔ سامنے مارٹ سے دودھ پکڑ لاؤ۔''

ہیری کو بھی شاید اس خاص چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ اپنی پتلون چڑھاتے ہوئے فوراً نکل آیا۔ مائیکل ڈسٹ بن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''یہ بچو نگڑی کے گندے ڈائپر بھی باہر پھینک آنا۔''

وہ دونوں جانتے نہیں تھے کہ جس نے یہاں پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا ہے اور ان دونوں سے زیادہ فاصلے پر بھی نہیں ہے۔ وہ شامیر تھا اور وہ فرینکفرٹ سے بذریعہ بس سروس یہاں پہنچا تھا۔ عین اس وقت وہ زویا کے فلیٹ والی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر موجود تھا۔ زویا اور ٹام والے فلیٹ بھی اسی فلور پر موجود تھے۔ شامیر اس فلور کی لابی میں بیٹھا تھا۔ یہاں ٹی وی آن تھا اور دو تین بوڑھے جوڑے بیٹھے 1970ء کے زمانے کی فلم دیکھ رہے تھے۔ شامیر بھی ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے شام کا اخبار اپنے چہرے کے سامنے پھیلا رکھا تھا۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا، وہاں سے زویا والے فلیٹ کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹے سے اسی جگہ موجود تھا اور صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ چونکہ تھوڑی دیر پہلے تک بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ ایک برساتی میں یہاں پہنچا تھا۔ یہ سستی برساتی اس نے بس ٹرمینل سے نکلتے ہی لے لی تھی۔ برساتی کے Hood (ٹوپی) کی وجہ سے اسے اپنا آپ چھپانے میں کافی مدد ملی تھی، درحقیقت ان گھڑیوں میں شامیر ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ایک نامعلوم توانائی تھی جس نے اس کا ہر خوف دور کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بس زویا کی صورت بسی ہوئی تھی اور اس نے اس صورت کو بچانا تھا۔ آج تک اس نے بس سنا ہی تھا کہ سچی چاہت انسان میں ناممکنات کو ممکنات میں بدلنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے، آج وہ عملاً خود پر یہ سب کچھ وارد ہوتے دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔

اس کے دل کی گواہی تھی کہ فلیٹ کے اندر ایک دو بندوں سے زائد نہیں ہیں..... اس کے دماغ میں کھلبلی تھی اور وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے، گہرے سرخ چہرے والا ایک بندہ دو دفعہ فلیٹ سے باہر آیا تھا اور واپس گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کی دو ڈبیا تھیں، دوسری مرتبہ وہ سوڈے کی دو بوتلیں اندر لے کر گیا تھا۔ دونوں مرتبہ اس نے واپس اندر جاتے ہوئے دروازے پر مدھم دستک دی تھی۔ یہ دستک اس نے ہاتھ کے بجائے اپنی کسی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے دی تھی۔ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی یا ہاتھ میں پکڑی ہوئی چابی وغیرہ سے دستک دیتے ہیں۔ شامیر نے اس شخص کے دستک کے انداز کو عمومی انداز میں نوٹ کیا تھا۔

شامیر یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ گہرے سرخ چہرے والا یہ شخص تیسری مرتبہ باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، اس لفافے میں غالباً استعمال شدہ ڈائپرز تھے۔ یہ ڈائپرز زویا کی بچی کے سوا اور کس کے ہو سکتے تھے۔ ڈائپرز کو سڑک والے کوڑے دان میں ڈالنے کے لیے وہ شخص سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ شامیر اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ درمیانے قد کاٹھ کا یہ پچیس تیس سالہ شخص، ڈائپرز کوڑے دان میں ڈالنے کے بعد ایک قریبی مارٹ کی طرف بڑھ گیا۔

شامیر کے دل نے ایک بار پھر گواہی دی کہ فلیٹ میں اب زویا کے علاوہ ایک ہی شخص ہے۔ اس کے جسم میں بجلی سی

کوند گئی۔ صرف تین چار سیکنڈ سوچنے کے بعد وہ فلیٹ کے دروازے کی طرف گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک انگوٹھی موجود تھی۔ اس انگوٹھی میں کچھ اور نہیں مقدر کا وہی موتی لگا ... تھا جو ایک بار فرینکفرٹ کی ایک تفریح گاہ میں پری کا بھیس بدلنے والی لڑکی نے اسے اور زویا کو دیا تھا۔ یہ عام سا موتی شامیر کو کسی قیمتی نگینے سے بڑھ کر پیارا تھا۔ وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ فلیٹ کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے سرخ چہرے والے کے انداز میں انگوٹھی سے دروازے پر مدھم دستک دی۔ دروازے کی دوسری جانب نسوانی قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ ادھ کھلے دروازے کی دوسری جانب اسے زویا نظر آئی۔ غنودگی میں جھومتی ہوئی ننھی بچی اس کی بانہوں میں تھی۔ شامیر کے ذہن نے برق رفتاری سے فیصلہ کیا۔ زویا شدید حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ پاتی یا اسے کسی طرح کا ادراک ہوتا، شامیر نے ادھ کھلے دروازے کو مزید کھولا۔ زویا کو بچی سمیت باہر کھینچا اور دروازہ تیزی سے بند کر دیا۔ یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع طور پر ایک یا دو سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ اندر سے کسی کی دہاڑ سنائی دی۔ دروازے کو باہر سے لاک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دروازے کو اسی حالت میں چھوڑ کر شامیر نے زویا کا بازو کھینچا اور اسے لیتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ زویا سکتہ زدہ تھی اور کسی معمول کی طرح شامیر کے ساتھ کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ بچی نے پوری طرح بیدار ہو کر رونا چلانا شروع کر دیا تھا۔

''وہ آ رہا ہے۔'' زویا چلائی۔

شامیر نے مڑ کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے بالائی کنارے پر سیاہ گلاسز والے لمبے تڑنگے شخص کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ کئی کئی زینے پھلانگتا ہوا آ رہا تھا۔

شامیر اور زویا آخری زینوں پر تھے جب زویا بری طرح لڑکھڑائی۔ اس کے بازو پر سے شامیر کی گرفت ختم ہو گئی۔ وہ بچی سمیت لڑھکتی ہوئی فرش پر گری..... اس کے ٹکرانے سے شیشے کا ایک دروازہ ٹوٹ گیا۔ بچی پر بھی زویا کی پکڑ برقرار نہیں رہ سکی۔ وہ بھی دو تین پلٹیاں کھا کر ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ سیاہ عینک والا ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ زویا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو شامیر نے اس کے منہ پر بے دریغ گھونسا جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے گیا۔ پھر اس کا داہنا ہاتھ بے ساختہ پتلون کی جیب کی طرف بڑھا۔ زویا جانتی تھی کہ اس جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود ہے۔ وہ چار سیکنڈ کا جو وقت ملا تھا، اس میں زویا نے بچی کو اٹھانے کے بجائے شیشے کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا لیا تھا۔ یہ آٹھ ایم ایم کا مضبوط و وزنی شیشہ تھا۔ زویا دہاڑی اور قریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا پوری طاقت سے گھما کر، کنارے کی طرف سے مائیکل کے منہ پر دے مارا۔ مائیکل کا سیاہ چشمہ اتر کر دور جا گرا..... زویا کی یہ ضرب معمولی نہیں تھی۔ اس ضرب کے پیچھے بے پناہ رنج و غم، نفرت اور طیش یکجا ہو گئے تھے۔ یہ کاری ضرب کئی سوالوں کا جواب بھی تھی اور شاید اس درندگی کا جواب بھی تھی، جو قریباً ساڑھے تین برس پہلے اس کی بہن ڈاکٹر حولیہ کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔ مائیکل کے چہرے سے خون کا فوارہ سا ابلا اور وہ تیورا کر سب سے نچلی سیڑھی پر گرا۔ اس کی ''چیسٹ پاکٹ'' سے کچھ چیزیں اچھل کر فرش پر لڑھک گئیں۔ ان میں ایک چابی بھی تھی۔ جیسا کہ شامیر کو بعد میں معلوم ہوا، یہ زویا کی گاڑی کی چابی تھی جو باہر سڑک کے کنارے پارک تھی۔

زویا نے روتی چلاتی بچی کو اٹھا لیا اور وہ دونوں پھر باہر کی طرف لپکے۔ سڑک پر پہنچنے میں انہیں سات آٹھ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ زویا نے گاڑی کی چابی شامیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ نیلی گاڑی میری ہے۔ تم ڈرائیو کرو۔'' یہ بھی ایک کھلونا نما ٹو سیٹر کار تھی۔ وہ دونوں پھرتی سے سوار ہو گئے۔

''شومیرا نکلو یہاں سے۔'' زویا نے ہانپتی ہوئی گلوگیر آواز میں کہا۔

شامیر نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے یوٹرن دیا۔ یہی وقت تھا جب اسے سرخ چہرے والا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھا اور وہ دوڑتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا..... وہ ساتھ ساتھ کسی کو پکار بھی رہا تھا۔ پچاس ساٹھ میٹر آگے جانے کے بعد شامیر نے عقب نما آئینے میں دیکھا، سرخ چہرے والا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ سیاہ رنگ کی ایک ٹویوٹا کار میں گھس رہا تھا۔ یقیناً وہ ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ خوف کے سبب زویا کا برا حال تھا۔ وہ بچی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ خود بھی کانپ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ جس شیشے سے اس نے مائیکل کو کاری ضرب لگائی تھی وہ اس کے اپنے ہاتھ پر بھی کٹ لگا گیا تھا۔ خون روکنے کے لیے زویا نے اپنی مٹھی زور سے دبا رکھی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ بہت تہلکہ خیز تھے۔ وہ لیونا برگ سے نکل کر ہائی وے پر پہنچ گئے تھے۔ ہیڈ لائٹس سے

اندازہ ہوتا تھا کہ سیاہ گاڑی بڑی رفتار سے ان کے پیچھے آرہی ہے لیکن لیونا برگ کے آخری چوراہے پر شامیر اور زویا کو ایک فائدہ مل گیا۔ وہ سگنل کراس کر گئے مگر پیچھے آنے والوں کو سگنل بند ملا۔

دس پندرہ منٹ تک تو شامیر اور زویا اس خوش فہمی میں رہے کہ شاید وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن تب ایک بار پھر انہیں سیاہ ٹویوٹا کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے گئیں۔ زویا ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شومیر! یہاں سے دائیں مڑ جاؤ۔''

شامیر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا..... اسے اندازہ ہوا کہ یہ وہی ہائی وے ہے جو برج برگ کی طرف جاتی ہے۔ یکا یک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ فادر جوناتھن نے کہا تھا کہ اگر اسے کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو انہیں ضرور یاد کرے..... اس نے ٹوسیٹر گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ برج برگ کی آبادی میں تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ یہ رات قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ایک ہلکے سے کہرے نے گردوپیش کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سیاہ کار ایک بار پھر تیزی سے قریب آرہی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی سچویشن تھی جو کہ چند روز پہلے یہاں بنی تھی۔ تب بھی رات کا وقت تھا اور سفید وین میں چار افراد نے ان کا تعاقب کیا تھا۔ آج ایک سیاہ کار میں دو بندے ان کے پیچھے آرہے تھے۔ بہرحال یہ عین ممکن تھا کہ ان کے ساتھی کسی دوسری گاڑی میں بھی آرہے ہوں۔

شامیر ایک منجھا ہوا ڈرائیور تھا۔ یہاں رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ ہونے کے باوجود اس نے مشاقی سے گاڑی چلائی اور ٹاؤن کی پیچ در پیچ سڑکوں اور پتھریلی گلیوں میں سیاہ کار کو جل دینے کی کوشش کرتا رہا۔

''شومیر! لگتا ہے، وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔'' زویا لرزاں لہجے میں بولی۔ اس کی نگاہیں سائڈ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔

''مگر زویا! یہ زیادہ بڑا ٹاؤن نہیں۔ وہ ہمیں پھر ٹریس کر لیں گے۔''

''تو پھر؟''

''ایک پناہ گاہ ذہن میں ہے۔'' شامیر نے کہا۔ اس کی نظر ٹاؤن کے بلند گرجے پر جمی ہوئی تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔'' زویا نے خوفزدہ نظروں سے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' وہ بولا اور تیزی سے موڑ کاٹ کر ٹوسیٹر کا رخ گرجے کی عمارت کی طرف کر دیا۔ دو ہی منٹ بعد وہ گرجے کے اس گیٹ کے سامنے تھے جو پارکنگ لاٹ میں کھلتا تھا۔ زویا نے گاڑی سے اتر کر گیٹ کیپر سے ریکویسٹ کی اور اس نے چند لمحے تک تذبذب میں رہنے کے بعد گیٹ کھول دیا۔ شامیر سرعت سے گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔

''آپ لوگوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' گیٹ کیپر نے شامیر اور زویا سے ایک ساتھ پوچھا۔

''آپ مسئلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔'' شامیر بولا۔ ''فادر جوناتھن ہمیں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ہمیں ان تک پہنچا دیں۔''

''مگر اس وقت تو وہ رہائشی حصے میں آرام فرما رہے ہوں گے۔''

''تو پھر آپ ہم پر بھروسا کریں۔ ہمیں اندر لے جائیں۔ وہ جونہی بیدار ہوں انہیں ہمارے بارے میں بتائیں۔'' زویا نے کہا۔

☆☆☆

گرجا کی اس عمارت میں پارکنگ لاٹ، لائبریری اور ایک بڑا رہائشی پورشن بھی شامل تھا۔ شامیر، زویا اور نتھی عین اسی رہائشی حصے میں موجود تھے۔ قدیم طرزِ تعمیر کا یہ رہائشی پورشن بھی گرجے کا حصہ ہی لگتا تھا۔ جگہ جگہ مذہبی پینٹنگز آویزاں تھیں اور مجسمے استادہ تھے۔ جس کشادہ کمرے میں شامیر اور زویا موجود تھے، وہاں بھی ایک بڑے پیانو کے اوپر سونے کے خول والی لمبی صلیب آویزاں تھی۔ انہیں اس کمرے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا اور یہ وقت خیریت سے ہی گزر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ پناہ گاہ مفید ثابت ہوئی تھی اور نمرسی کے ہرکاروں سے ان کا پیچھا چھوٹ گیا تھا۔

فادر جوناتھن بھی جاگ چکے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ پچھلے چار سال میں ان کے بال پہلے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے اور بھوؤں میں بھی سفیدی چمکنے لگی تھی۔ بہرحال ان کی کمر بالکل سیدھی اور حرکات و سکنات میں توانائی تھی۔ وہ شامیر کے ساتھ زویا کو دیکھ کر ازحد حیران ہوئے تھے۔ انہیں جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر انہوں نے زویا اور شامیر کو باری باری گلے سے لگایا تھا اور ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔

زویا اور شامیر نے اپنی ساری روداد بے کم و کاست

قادر کے گوش گزار کردی تھی۔ خاص طور سے زویا کے حالات نے قادر کو ازحد حیران کیا۔ زویا کے شوہر کی ''دہری شخصیت'' کا سن کر وہ انگشت بدنداں ہوئے۔ بھرائے ہوئے دکھی لہجے میں بولے۔ ''بلڈ برانڈ جیسے اونچے خاندان کا چشم و چراغ اور اس طرح کی فطرت..... شرم کا مقام ہے.....'' پھر گفتگو کا رخ نمرہ اور اس کی کینہ پروری وعداوت کی طرف مڑ گیا۔ قادر بہت متفکر نظر آئے۔ بولے۔ ''قدرت نے تمہیں دوسری مرتبہ ان کی معاندانہ یلغار سے بچایا ہے۔ اصولی طور پر تو اس سلسلے میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے مگر پتا نہیں کہ زویا بیٹی اور تم سب لوگ یہ چاہو گے یا نہیں۔''

اس موقع پر شامیر کا دل چاہا کہ وہ قادر جونا تھن پر یہ انکشاف بھی کر ڈالے کہ ساڑھے تین برس پہلے کی جس خوفناک واردات کو ڈکیتی کہا جا رہا ہے، وہ ڈکیتی نہیں تھی، وہ اسی بدبخت نمرہ کی انتقامانہ کارروائی تھی۔ اس کارروائی میں نہایت سنگدلی کے ساتھ زویا کی بہن کو بے آبرو کیا گیا۔ اس کو بچے سے محروم کیا گیا اور ان کی والدہ سارہ جیم کو گولیوں سے چھلنی کر کے اپاہج بنایا گیا..... مگر جب زویا اور اس کی فیملی خود یہ سب کچھ سینۂ راز میں رکھ رہی تھی تو شامیر کیسے بتا سکتا تھا۔

اسی دوران میں زویا کی نگاہ ساتھ والے کمرے میں رکھی ایک وہیل چیئر پر پڑی تو وہ کچھ چونک سی گئی۔ ''قادر! یہ چیئر کس کی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

وہ مسکرائے اور نرم لہجے میں بولے۔ ''تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ میرے حساب سے تو یہ اچھی اطلاع ہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ تم اسے کس طرح لیتی ہو.....'' انہوں نے ذرا توقف کیا اور کہنے لگے۔ ''تمہاری ماما اور حولیہ بھی یہاں آئی ہوئی ہیں۔ ساتھ والے کمرے میں سوئی ہوئی ہیں۔''

شامیر نے دیکھا، زویا کے چہرے پر ایک رنگ سا گزر گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک گم صم رہنے کے بعد بولی۔ ''یہ لوگ کب آئے قادر؟''

''پرسوں شام۔ تمہاری ماما کی طبیعت خراب ہے۔ وہ روحانی طور پر بھی بہت بے سکون ہے۔ چند دن اس مذہبی ماحول میں گزارنا چاہتی ہے۔ کچھ وظائف وغیرہ بھی کر رہی ہے۔ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ دیکھو کہ خدا نے اس کی یہ دعا کس طرح قبول کی ہے۔ تم خود چل کر اس کے پاس آ گئی ہو۔''

زویا روہانسی ہو کر بولی۔ ''قادر! وہ میری ماں ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس
100 روپے
ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1200 روپے
بھیج کر سالانہ خریدار اور
600 روپے ادا کر کے 6 ماہ
کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں
اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

لیکن ـــــ اب مجھے ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ میں ان کی سوتیلی بیٹی ہوں ..... یا پھر ان کی بیٹی نہیں ہوں اور وہ ظالم رابرٹ ان کا داماد نہیں بیٹا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں سنتیں۔ سارا قصور میرا ہی گردانتی ہیں۔ وہ مجھے پھر رابرٹ کے حوالے کرنا چاہیں گی اور میری بچی کو بھی۔ پلیز فادر! ان کو نہ ہی پتا چلے تو اچھا ہے۔ اتفاقاً شومیر بھی میرے ساتھ ہیں۔ وہ اس قدر آگ بگولا ہوں گی کہ ہم سے سنبھالے نہیں سنبھلیں گی۔"

"تم گھبراؤ نہیں بیٹی۔ خدا نے مدد کی تو میں سب ٹھیک کرلوں گا۔" فادر جوناتھن نے کہا۔ شاید وہ کچھ اور کہتے لیکن یہی وقت تھا جب ذرا کھٹ پٹ ہوئی اور پھر زویا کی بہن ڈاکٹر حولیہ دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی اور بجی بجی نگاہوں کے ساتھ سب کو دیکھ رہی تھی۔ تب زویا اور شامیر کو دیکھ کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ تیزی سے آگے آئی اور زویا کو گلے سے لگالیا۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جس زویا کو وہ ایک سال سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہورہے ہیں، وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔

کتنی ہی دیر تک اس نے زویا کو گلے لگائے رکھا اور اس سے شکوے شکایت کرتی رہی۔ شامیر نے سن رکھا تھا کہ مجھلی بہن سے زویا کو گہری انسیت ہے، آج اس کا ثبوت بھی مل رہا تھا۔ حولیہ بھی جذباتی ہورہی تھی۔ تب اس کی نگاہیں شامیر پر جم کر رہ گئیں۔ اس کے چہرے پر گرج اور کدورت کے تاثرات شامیر نے صاف محسوس کیے۔ فادر جوناتھن نے حولیہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "حالات بڑے خدوش ہیں حولیہ۔ ہم سب کو بڑی فراست اور سمجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا۔ تمہاری ماما کہاں ہیں؟"

ڈاکٹر حولیہ بولی۔ "وہ جاگ گئی ہیں۔ انہوں نے ہی تو مجھے یہاں بھیجا ہے۔ کہہ رہی تھیں کہ مجھے لگتا ہے، زویا کی آواز آرہی ہے کہیں سے....."

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے سارہ جیم کی بھرائی ہوئی کرخت آواز ابھری۔ "حولیہ! تم کہاں ہو؟ کون ہے یہاں؟"

شامیر سمجھ گیا کہ اب سارہ جیم سے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں۔ وہ ہیجان کا شکار ہوچکی تھی اور وہیل چیئر کے بغیر ہی شاید فرش پر گھسٹتی ہوئی ان سب کی طرف آرہی تھی۔ اگلے دس منٹ بڑے سنسنی خیز تھے۔ سارہ جیم نے زویا کو دیکھ لیا تھا اور ساتھ ساتھ شامیر کو بھی۔ شامیر کو دیکھ کر وہ زویا سے ملنے کی راحت بھی فراموش کرگئی۔ اس کا ورم زدہ چہرہ طیش سے گھناؤنی دکھائی دینے لگا۔ ہونٹ جیسے نیلے پڑ گئے۔ وہ شامیر پر چلانے لگی۔ "مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہاری..... منحوس آمد یہاں ہمارے لیے اور مصیبتیں لے کر آئے گی۔ تم لعنتی انڈین ہو۔ تم جونک بن کر چمٹ گئے ہو ہم سے۔ تم نے برباد کردیا ہم سب کو۔ اب بھی تمہیں چین نہیں ہے۔ اب بھی میری شادی شدہ بیٹی کا گھر تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گی....."

فادر جوناتھن درمیان میں آئے اور انہوں نے سارہ جیم کو سنبھالنے کی کوشش کی..... وہ ان کی پروا بھی نہیں کررہی تھی۔ وہ بولتی چلی گئی۔ "تم کمینے لوگ اپنے ملک سے بھاگ کر یہاں آتے ہو۔ تمہاری لالچی نظر یہاں کی دولت پر ہوتی ہے، یہاں کی عورتوں پر ہوتی ہے۔ اپنی گندی خصلت کے مطابق یہاں جھوٹ بولتے ہو، دو نمبریاں کرتے ہو، ہماری لڑکیوں کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھانستے ہو لیکن اپنی جوان لڑکیوں کو ادھر کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ تم لوگ خودغرض اور پرلے درجے کے حریص ہو۔" طیش کے عالم میں اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

فادر جوناتھن نے اسے بمشکل سنبھالا اور وہیل چیئر پر بٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ حولیہ بھی لال بھبوکا چہرے کے ساتھ خاموش کھڑی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زویا کیسے ملی اور اس کے ساتھ شامیر کیونکر نظر آرہا ہے؟ تب حولیہ کی نظر زویا کی زخمی ہتھیلی پر پڑی جہاں اس نے عارضی پٹی لپیٹ رکھی تھی۔ "یہ کیا ہوا زویا؟" اس نے پوچھا۔

"بڑی مشکل سچویشن سے نکل کر یہاں پہنچے ہیں حولیہ۔ تمہیں بعد میں تفصیل سے بتاؤں گی۔"

ڈاکٹر حولیہ نے زویا کی ہتھیلی کا کٹ دیکھا، پھر اپنا شولڈر بیگ لے آئی۔ اس میں فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان موجود تھا۔ وہ زویا کی ہتھیلی کی بینڈیج کرنے لگی۔ وہ شامیر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی جیسے اس کی طرف دیکھنا بھی اسے گراں ہو۔ کچھ دیر بعد فادر جوناتھن دوبارہ زویا اور شامیر کے پاس آگئے۔ کسی قریبی کمرے سے سارہ جیم کے واویلا کرنے کی مدھم آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

فادر بولے۔ "وہ ابھی اپنے حواس میں نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فی الحال تم دونوں اس سے دور ہی رہو۔" فادر کا اشارہ زویا اور شامیر کی طرف تھا۔

(جاری ہے)

پانچواں حصہ

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلابی جاڑوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضائوں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو..... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

قادر نے زویا کو سارہ جیم سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور شامیر کے لیے بھی یہی حکم تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" زویا نے پژمردہ آواز میں کہا۔ اس کی ہچکی اب جاگ گئی تھی اور حسرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے بہت حد تک اپنی ماں پر گئی تھی۔ اپنے کال کا ننھا سا گز حابھی اس نے اپنی ماں سے ہی چرایا تھا۔

قادر جوناتھن نے وہ دروازہ لاک کر دیا جہاں سے گزر کر سارہ جیم اس کمرے میں پہنچی تھی۔ وہ بولے۔ "اگر سارہ یہ دروازہ کھٹکھٹائے بھی تو تم لوگوں نے نہیں کھولنا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی چلی جائے گی۔ میں تم لوگوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔"

اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ زویا اور شامیر کو اپنی یہ پناہ گاہ ہر طرح سے محفوظ لگ رہی تھی۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا جہاں قدیم طرز کا ڈبل بیڈ اور آبنوسی طرز کے نقش ونگار والے صوفے موجود تھے۔ کھڑکیاں طویل تھیں اور ان میں آہنی سلاخوں والی گرلیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کمرا گرجے کی عمارت سے ملحق تھا پھر بھی گرجے میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی مدھم آواز اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ یہ اتوار کا دن تھا اور گرجے میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک ملازمہ پرتکلف ناشتا لے کر آ گئی۔ ناشتے کی ٹرے میں بچی کے لیے دودھ اور دلیا وغیرہ بھی موجود تھا۔ زویا کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک تعاقب کرنے والوں کے خوف سے نکل نہیں سکی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ ابھی تک اسی قصبے میں موجود ہوں گے اور انہیں کھوج رہے ہوں گے۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شومیر۔" وہ منمنائی۔

"اللہ کا شکر ادا کرو زویا۔ اس نے ہمیں سخت ترین مرحلے سے بحفاظت نکال دیا ہے۔ آگے بھی اچھا ہی ہوگا۔ پلیز! تم چند نوالے لے لو۔"

وہ عجیب نظروں سے شامیر کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے شامیر کے چہرے سے نظریں پھیریں اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے بچی کو چوما۔

شامیر گہری سانس بھر کر بولا۔ "زویا! میں جانتا ہوں، میں نے لیونا برگ جا کر اور تمہیں ڈھونڈ کر تمہاری مشکلوں میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس کے لیے معذرت کے الفاظ کافی نہیں ہیں۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا شومیر! اب آگے کا سوچنا چاہیے۔ میرا خیال تو اب یہی ہے کہ تم یہاں سے نکل کر جلد از جلد پاکستان چلے جاؤ۔ اس سلسلے میں قادر جوناتھن تمہاری بہت مدد کر سکتے ہیں۔"

"اور تمہیں یہاں ان مہلک حالات میں چھوڑ جاؤں؟ ہم جس طرح فلیٹ سے نکلے ہیں اور جس طرح تم نے نرسری کے خاص کارندے کو گھائل کیا ہے..... یہ لوگ تمہیں آسانی سے معاف نہیں کریں گے..... اور میں سمجھتا ہوں زویا کہ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔"

"پلیز شومیر! اس طرح مت سوچو۔ مجھے مزید تکلیف مت دو۔ میں کسی نہ کسی طرح اس صورت حال کو ہینڈل کر لوں گی۔"

"کس طرح کرو گی ہینڈل؟ پہلے صرف ایک بندہ تمہارا دشمن تھا، تمہارا شوہر رابرٹ۔ اب یہ نرسری اپنے ٹولے سمیت تمہارے پیچھے ہے....."

"شومیر! میں نے کہا ہے نا کہ میں کسی نہ کسی طرح ہینڈل کر لوں گی۔ میرا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات میرے پاس آ چکے ہیں۔ میں بھی سمیت جرمنی سے نکل جاؤں گی۔ بہت جلد نکل جاؤں گی۔" اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "شومیر! تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ ہماری یہ مختصر سی دو ملاقاتیں بھی ہمارے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوئی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کریں کہ ایک دوسرے کو معاف کر دیں گے۔ پھر کبھی نہیں ملیں گے۔ بس ایک دوسرے کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔"

گہری دلچسپی سے شامیر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اس کی گود میں چڑھ آئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں انگلیاں چلانے لگی۔ شامیر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ہو بہو زویا کی تصویر تھی۔ شامیر کو لگا کہ اس کے وجود سے زویا کی مہک ہی پھوٹ رہی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے گال کے گڑھے کو چھوا۔ ایک معصوم مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

شامیر نے کھوئے کھوئے لہجے میں زویا کو مخاطب کر کے کہا۔ "ایسا کیوں ہے زویا؟ جذبے سچے ہوتے ہیں پھر بھی محبتیں پروان کیوں نہیں چڑھتیں؟ کیوں محبت کرنے والوں کو آخر میں ایسے ہی گھسے پٹے فقرے دہرانے پڑتے ہیں..... ہم ایک دوسرے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ ہم کیوں سچ کا سامنا نہیں کر پاتے؟"

"تم کس سچ کی بات کر رہے ہو؟" زویا کے لہجے میں

ایک بار پھر بیگانگی اتر آئی۔ اس نے عینی کو شامیر کی گود سے واپس اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ رابرٹ سے تمہاری شادی، تمہاری مالی مجبوریوں کی وجہ سے ہوئی..... اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس شخص نے تمہاری اور عینی کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے اور کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم ان حالات سے بچ کر جرمنی چھوڑ دینا چاہتی ہو، کسی اور ملک جانا چاہتی ہو؟''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو شومیر؟''

شامیر کی آنکھوں میں اچانک دنیا بھر کی التجائیں سمٹ آئیں۔ وہ بولا۔ ''زویا! جب تم نے کسی اور ملک ہی جانا ہے تو پھر پاکستان کیوں نہیں؟ ایک بار تم نے کہا تھا کہ پاکستان کے شمالی علاقے تمہیں بے حد محبوب ہیں۔ تم انہیں لائیو دیکھنا چاہتی ہو..... وہ سارے علاقے..... وہ ساری وادیاں اور سارے راستے اپنی بانہیں کھولے کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں تمہیں بہت کچھ مل سکتا ہے زویا..... اور وہ تحفظ بھی جس کی تمہیں اور تمہاری بچی کو اشد ضرورت ہے.....''

ایک لمحے کے لیے..... صرف ایک لمحے کے لیے شامیر کو یوں لگا جیسے اس کے اندر کچھ پگھلا ہے اور وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے شومیر!'' اس نے کہا اور بچی کا فیڈر واش کرنے لگی۔

..... کل ایک ٹیلی فونک گفتگو میں زویا نے نمرسی کے کارندوں کو ڈانج دینے کے لیے شامیر سے کہا تھا کہ وہ اسے طمانچہ مارنے پر شرمندہ ہے۔ آج شامیر کو لگا جیسے اس نے واقعی طمانچہ مارا ہے اور اس کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بے مثل سرد مہری تھی۔

''سوری شومیر!'' اس نے رخ پھیرے پھیرے کہا۔ ''لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہم اس موضوع پر بات نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے زویا، تم نہ کرو۔ میں بھی نہیں کروں گا..... لیکن میں خود کو یہ سب کچھ سوچنے سے روک نہیں سکتا اور نہ کبھی روک پاؤں گا۔ بے شک کئی موسم گزر چکے ہیں لیکن میں آج بھی 21 نمبر کے آخری اسٹیشن پر لکڑی کی بینچ کے پاس ڈیزی کے انہی پھولوں میں کھڑا ہوں۔ ٹھیک اسی جگہ پر جہاں تم مجھے چھوڑ کر گئی تھیں.....''

زویا کے چہرے پر ناگواری ابھری لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، دائیں طرف والے دروازے پر دستک ہوئی۔ سفید چولے اور سفید ٹوپی میں ملبوس فادر جوناتھن اندر آ گئے۔ انہوں نے اس بات پہ ناراضگی کا اظہار کیا کہ ناشتا ویسے کا ویسا ہی پڑا ہوا ہے۔

پھر انہوں نے کہا۔ ''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر لگتا یہی ہے کہ تمہارے پیچھے آنے والے لوگ ابھی ٹاؤن سے گئے نہیں ہیں۔ اگلے کم از کم چوبیس گھنٹے تک ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تم دونوں نے کسی بھی وجہ سے اس رہائشی پورشن سے باہر نہیں نکلنا۔''

زویا اور شامیر نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولے۔ ''سنڈے کی عبادت کے بعد مجھے چار پانچ گھنٹوں کے لیے ٹاؤن سے باہر جانا ہے، ایک ڈیوک کی شادی کی تقریب ہے۔ شام سے پہلے لوٹ آؤں گا۔''

زویا اور شامیر کو ضروری ہدایات دے کر وہ واپس چلے گئے۔

فادر نے اس امکان کا اظہار کیا تھا کہ شاید نمرسی کے لوگ ابھی تک ٹاؤن میں ہی ہیں۔ اس خبر نے زویا کے کملائے ہوئے چہرے کو کچھ اور کملا دیا تھا۔

کسی قریبی کمرے سے گاہے بگاہے سارہ جیم کے گرجتے برسنے کی مدھم آواز شامیر اور زویا کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ تعصب، نفرت اور طیش اس آواز کے اہم ترین عناصر تھے۔ شامیر نے آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی..... اسے یوں لگا کہ زویا سے اس کی جدائی میں دو کردار بہت اہم رہے ہیں۔ ایک زویا کی والدہ سارہ جیم اور دوسرے اس کی اپنی خالہ ثمینہ۔ دونوں پچھلی نسل کی عورتیں تھیں۔ شاید دونوں ہی اپنے اندر تعصب اور ضد رکھتی تھیں۔ دونوں دقیانوسی تھیں۔ دونوں نے ان کی راہوں میں کانٹے بوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ سارہ جیم نے کھلے عام یہ سب کچھ کیا تھا اور اموخالہ پس پردہ رہ کر یہی کچھ کرتی رہی تھیں۔ ایک بار پھر وہ الفاظ شامیر کی سماعت میں زہر گھولنے لگے جو اختر انکل کا گھر چھوڑتے وقت اس نے سنے تھے۔ وہ الفاظ اور وہ لب و لہجہ کبھی اس کے سان گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اب دوبارہ یہ آوازیں سننا نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا فون مسلسل بند تھا۔

گرجا کی سروس اب اختتام پذیر ہو چکی تھی کیونکہ دعائیہ کلمات کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید فادر اپنے کام سے نکل چکے تھے۔ شامیر کے لیے یہ تصور بڑا جانکاہ تھا کہ نمرسی کے بپھرے ہوئے کارندے ابھی اسی ٹاؤن کی سڑکوں پر موجود ہیں۔

☆☆☆

لمبا چوڑا دبنگ نمرسی اپنے سکھ پارٹنر کے ساتھ میلانو

کے ایک لگژری بنگلے میں موجود تھا۔ اس کی شاید کوئی شب ہی ایسی ہوتی ہوگی جو شراب اور شباب کے بغیر گزرتی ہو۔ آج کی شب بھی اس نے ایک انڈین دوشیزہ کی سیاہ زلفوں کے سائے میں گزاری تھی۔ لڑکی نے ناتجربہ کار ہونے کے باوجود اسے اچھی کمپنی دی تھی، شاید اس کی ناتجربہ کاری ہی اس کی خوبی ثابت ہوئی تھی۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں تھا اور فرینکفرٹ جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ بذریعہ یورپل ایک فرضی نام سے جرمنی میں داخل ہونے جا رہا تھا..... پچھلے تین سال میں وہ فقط ایک مرتبہ اسی طرح فرضی شناخت کے ساتھ جرمنی گیا تھا۔

وہ کپڑے تبدیل کر رہا تھا جب اسے فون پر ایک ایسی خبر ملی جس نے نہ صرف اس کا موڈ برباد کر دیا بلکہ وہ مشتعل ہو کر چنگھاڑنا شروع ہو گیا۔ یہ خبر لیونا برگ میں موجود اس کے کارندے ہیری نے دی تھی..... اور یہ ٹی وی رپورٹر شامیر اور سابقہ رپورٹر زویا راشد کے بارے میں تھی۔ ہیری نے بتایا کہ شامیر، زویا کے فلیٹ تک پہنچا لیکن پھر وہ دونوں چکما دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جاتے جاتے وہ مائیکل کو بھی شدید زخمی کر گئے تھے۔ زویا نے شیشے کے ایک بڑے ٹکڑے سے مائیکل کے چہرے پر وار کیا تھا۔ اس کا ایک گال، بائیں کان سے لے کر ہونٹوں تک بالکل چر کر رہ گیا تھا، دو دانت ٹوٹ گئے تھے اور خدشہ تھا کہ اس کی آنکھ بھی بچ نہیں سکے گی۔ وہ اسپتال میں تھا۔

نمرسی نے حسب عادت ہیری کو ماں بہن کی سنگین گالیاں دی تھیں اور ان تینوں کارندوں کی پچھلی کئی نسلوں سے نازیبا رشتے جوڑنے کے باوجود اس کا غصہ پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ آخر میں وہ گرجا۔ ''اب یہاں برج برگ میں کس ماں کی شادی کا ڈنر کرنے بیٹھے ہوئے ہو؟''

ہیری لرزاں آواز میں بولا۔ ''سر! آپ سے ہدایات لینے کے لیے ہی فون کیا تھا بلکہ میں نے تو رات کو بھی دو تین بار فون کیا مگر پی اے نے بتایا کہ آپ آرام کر رہے ہیں۔ دراصل جناب..... آج صبح تک ہمارا خیال یہی تھا کہ وہ دونوں اس قصبے سے نکلے نہیں مگر اب صورت حال مختلف محسوس ہو رہی ہے.....''

''تمہاری محسوسیت پر تو میں ایسا ڈنڈا چلاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔'' نمرسی دہاڑا اور فون بند کر دیا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ وہ بے قراری سے اس وسیع لگژری کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نیٹ وہسکی کا تین چوتھائی گلاس پی کر بھی اس کا سکون واپس نہیں آیا۔ زویا کی ماں کو زخمی اور بہن کو تاراج کرانے کے بعد وہ اس معاملے کو تقریباً بھول گیا تھا۔ شامیر کو سبق سکھانے کا خیال بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا مگر اس نے واپس یہاں آ کر اور زویا سے مل کر سارے پرانے زخم تازہ کر دیے تھے۔ ان غیر ملکی گھس بیٹھیوں کو اس نے اور اس کے گروپ نے کبھی بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ لوگ دولت، عورت اور آسائشوں کے شکاری تھے۔

کمرے میں لمبے تڑنگے نمرسی کی بے قرار چہل قدمی ایک فون کال کی وجہ سے رک گئی۔ اس نے جھلائے ہوئے انداز میں فون اٹھایا مگر پھر قدرے نارمل ہو گیا۔ دوسری طرف پادری جوناتھن تھے۔ رسمی کلمات کے بعد انہوں نے کہا۔ ''رونالڈو! تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔ جن کو ڈھونڈ رہے ہو، وہ خود چل کر تمہارے پاس پہنچ گئے ہیں۔''

''مم..... میں سمجھا نہیں فادر؟'' نمرسی ہکلایا۔

''کرامات کو سمجھنے کے لیے اور ان کو ظہور میں لانے کے لیے ایک علیحدہ قسم کی سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے رونالڈو۔ ہاں، زویا اور شامیر..... گناہ گاروں کی یہ جوڑی اس وقت برج برگ میں، میرے گھر میں ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں گرو، میں واقعی بے حد حیران ہوں۔''

''حیران ہونے میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً اپنے بندوں کو بھیجو بلکہ بہتر ہے کہ خود بھی پہنچ جاؤ۔ تم نے کہا تھا نا کہ جرمنی آ رہے ہو؟''

''جی ہاں..... وہ تو میں آ ہی رہا ہوں۔''

''لیکن یاد رہے۔ اس سارے معاملے میں کہیں بھی میرا نام نہیں آئے گا۔ تم جانتے ہی ہو، سارہ جیم سے میرے کتنے قریبی تعلقات ہیں۔ ویسے بھی ایک پادری کی حیثیت سے میں یہ سب کچھ افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''آپ..... کو یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے فادر! آپ کا یہ خادم آپ کے کہے بغیر ہی آپ کی ہر منشا سمجھ جاتا ہے۔''

''اب کیا سلوک کرنا چاہتے ہو گناہ گاروں کی اس جوڑی سے؟'' فادر جوناتھن نے ایک توقف کے بعد پوچھا۔

''مناسب سزا تو یہی ہے کہ جان سے مار دیا جائے دونوں کو۔'' نمرسی کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''نہیں..... میرے خیال میں سارہ کی بیٹی کے لیے یہ سزا کچھ زیادہ ہو گی۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ میری تو رائے ہے کہ اسے اس کے خاوند رابرٹ کے حوالے کر دیا

جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اسے بھاگنے نہیں دے گا۔ میں اس کے ایک بھائی کو جانتا ہوں۔ اوپر سے یہ لوگ جیسے بھی ہوں لیکن ان کے اندر ایک پکی جرمن روح ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، ان کا سلسلۂ نسب ایڈولف ہٹلر سے جا ملتا ہے۔ یہ نہ صرف بھاگ نہیں پائے گی بلکہ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے جائے گا جہاں یہ خود بھی اپنا پتا نہ پا سکے گی۔ چند برسوں میں چھ سات بچے اس میں سے پیدا کر لے گا۔ پھر یہ کہیں نہیں جائے گی۔''

''آپ..... جیسا کہیں گے۔'' نمرسی نے مختصر جواب دیا۔ نمرسی اب جلدی میں نظر آتا تھا۔

فادر نے کہا۔ ''اور میرے خیال میں تو موت کی سزا کوئی سزا ہی نہیں ہے۔ یہ نامراد، جھوٹا عاشق شامیر بھی مر گیا تو کیا سزا پائی؟ اس کو بھی عبرت ناک سزا ملنی چاہیے اور ''جیتے جی'' ملنی چاہیے۔''

فادر جوناتھن نے تھوڑی سی گفتگو مزید کی اور چند ہدایات دے کر کال ختم کر دی۔

نمرسی نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ہیری سے رابطہ کیا..... اور اسے بتایا کہ دونوں بھگوڑے یعنی زویا اور شامیر کہاں ہیں۔ ان کو پکڑنے اور سنبھالنے کے حوالے سے ضروری ہدایات دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کا فون آن تھا اور اس نے ہیری کو تاکید کی تھی کہ اسے ہر پل کی خبر دی جائے۔

وہ لباس تبدیل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کانوں میں اپنے گرو فادر جوناتھن کے الفاظ گونج رہے تھے..... اسے عبرت ناک سزا ملنی چاہیے اور ''جیتے جی'' ملنی چاہیے۔ نمرسی ان کا یہ اشارہ بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ تین سال پہلے دوسری لنکن لڑکوں کو اسی طرح ''جیتے جی'' والی سزا دی گئی تھی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے دو جرمن خواتین سے پہلے میرج کی مگر پھر ان سے جسمانی تعلق قائم کیا۔ ان جواں سال خواتین کا دعویٰ تھا کہ انہیں تصویروں کے ذریعے بلیک میل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ نمرسی کا خیال تھا کہ وہ قانون کی گرفت سے بچ جائیں گے لہٰذا ان دونوں لڑکوں کو ایک ''روڈ ایکسیڈنٹ'' میں اس بری طرح زخمی کیا گیا تھا کہ ان میں سے ایک ہمیشہ کے لیے مکمل اپاہج ہو گیا تھا اور دوسرا دو ماہ موت اور زندگی کے درمیان لٹک کر اور اذیت جھیل کر راہیِ عدم ہوا تھا۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بج گئے تھے۔ عینی، زویا کی گود میں پھر سو چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے چرچ کی ملازمہ نے بتایا تھا کہ فادر، شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جا چکے ہیں۔ وہ شام تک لوٹ آئیں گے۔ جب تک فادر یہاں موجود تھے، زویا مطمئن نظر آتی تھی مگر اب اسے شاید عدم تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ شام ابھی بہت دور تھی۔

اچانک وہ دروازہ دھڑا دھڑ بجنے لگا جس کو مقفل کیا گیا تھا تاکہ بپھری ہوئی سارہ جیم دوبارہ ادھر نہ آ سکے۔ زویا اور شامیر بری طرح چونک گئے۔ ''کون؟'' شامیر نے بلند و بالا ساگوانی دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

''میں ڈاکٹر حولیہ..... پلیز دروازہ کھولو جلدی کرو۔'' حولیہ کی ہیجانی آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا ہے؟'' شامیر نے دروازے کو کھولے بغیر پوچھا۔

''میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔'' حولیہ چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

حولیہ کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ شامیر کو دروازہ کھولتے ہی بنی۔ حولیہ سر تا پا لرز رہی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید تھا۔ وہ دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا۔ تم لوگ ضرور کسی کو پیچھے لگا کر لائے ہو..... اور وہ پہنچ گئے ہیں۔ وہ نمرسی کے لوگ ہیں۔ م..... میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' دہشت کے سبب حولیہ کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''کہاں دیکھا تم نے انہیں؟'' شامیر نے پوچھا۔

''وہ کھڑکی سے نظر آ رہے ہیں..... آؤ میرے ساتھ۔'' حولیہ نے کہا اور مختصر راہداری سے گزر کر اس کمرے کی طرف بھاگی جہاں وہ اور اس کی ماں سارہ جیم ٹھہری ہوئی تھیں۔ شامیر اور زویا بھی لپکتے ہوئے حولیہ کے پیچھے گئے۔ اس نے ایک بلند کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور سخت ہراس کے عالم میں بولی۔ ''وہ دیکھو..... وہ سفید وین..... دو بندے اب بھی اندر ہیں۔ باقی نیچے اتر چکے ہیں۔ وہ..... ب..... براؤن شرٹ والا..... جس کا چہرہ سرخ ہے۔ م..... میں اچھی طرح جانتی ہوں ان باسٹرڈز کو۔''

شامیر نے دیکھا، حولیہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی ہیری اور اس کے تقریباً نصف درجن ساتھیوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ شکلوں سے ہی خطرناک غنڈے لگتے تھے اور شاید انہی میں سے کچھ افراد تھے جنہوں نے تین چار سال پہلے سارہ جیم کے گھر میں گھس کر ڈاکٹر حولیہ کے ساتھ

بدترین سلوک کیا تھا۔ حولیہ کی جو حالت ہو رہی تھی، وہ اس امر کی تصدیق کر رہی تھی۔ حولیہ کو لگا کہ وہ چکرا کر گر جائے گی۔ زویا نے اسے سہارا دیا اور کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ شامیر کے دماغ میں کھلبلی تھی..... وہ جس جگہ کو محفوظ پناہ گاہ تصور کر رہے تھے، وہ محفوظ نہیں تھی۔ غیر متوقع طور پر انہیں ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ وہ چلایا۔

''زویا! پورشن کے سارے دروازے اندر سے بند کر دو۔''

زویا دائیں جانب والے دروازے چیک کرنے کے لیے دوڑی۔ شامیر نے سامنے والے دروازے بولٹ کر دیے۔ اسی دوران میں ایک اور چھوٹی جیپ موقع پر پہنچ گئی۔ اس میں سے بھی تین چار افراد دندناتے ہوئے اترے اور رہائشی پورشن کے عقب میں چلے گئے۔ ان میں سے ایک بغلی دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ اس جگہ کو گھیر رہے ہیں۔ بظاہر وہ ابھی تک خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے مگر وہ خالی ہاتھ یقیناً نہیں تھے۔ ان کے کپڑوں کے نیچے یقیناً آتشیں ہتھیار موجود رہے ہوں گے۔

دفعتاً سامنے والے مین دروازے پر دستک ہونے لگی.....

''کون ہے؟'' شامیر نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔ مہمان آئے ہیں۔'' کسی شخص نے شائستہ لہجے میں کہا۔

یقیناً یہ نمرسی کے کسی کارندے ہی کی آواز تھی۔ شاید انہیں معلوم نہیں تھا کہ کھڑکی میں سے انہیں اور ان کی گاڑیوں کو دیکھ لیا گیا ہے۔

زویا اور حولیہ کی ماما تو غالباً کسی ٹرنکولائزر کے زیر اثر سوئی پڑی تھی لہٰذا اس خطرناک صورتِ حال کے تناؤ سے محفوظ تھی مگر حولیہ اور زویا کی حالت بری ہونے لگی۔ خصوصاً حولیہ تو جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ آج کئی برس بعد اسے وہ ایک دو چہرے پھر نظر آئے تھے جنہوں نے ایک انتقامی شب میں اس کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ وہ شرابی غنڈے جنہوں نے اسے نوچا کھسوٹا تھا۔ اس کی ہر منت سماجت رد کی تھی۔ اس کی ماں کو زخم زخم کیا تھا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے، تاہم فی الوقت وہ ایک دو کو ہی پہچان پا رہی تھی۔ باقیوں نے تب چہروں پر اسکائی ماسکس چڑھا رکھے تھے۔

''زویا! تم فادر کو فون کرو..... جلدی کرو۔''

زویا اس کے کہنے سے پہلے ہی فادر کا نمبر پریس کر چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''نہیں شمیرا ان کا فون بند ہے۔''

اب اس رہائشی پورشن کے دو تین دروازے دھڑا دھڑ بجائے جانے لگے تھے۔ چرچ کی دو ملازمائیں بھی اس حصار میں آ گئی تھیں۔ وہ بتائے بغیر ہی جان گئی تھیں کہ صورتِ حال خطرناک ہے۔ ان کے رنگ بھی فق ہو رہے تھے۔

چرچ کی عمارت میں چونکہ سروس ختم ہو چکی تھی، اس لیے اردگرد زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ باہر سے کسی کو مدد کے لیے پکارنا بے فائدہ تھا۔ ہاں، پولیس کو فون کیا جا سکتا تھا۔ شاید اب اس کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ شامیر کے اشارے پر زویا نے ایک بار پھر فادر سے رابطہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تب شامیر سے مشورے کے بعد وہ پولیس کو کال کرنے لگی۔ فوری طور پر رابطہ نہیں ہوا۔ لائنیں مصروف تھیں۔

یکایک کسی عقبی کمرے کی کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شاید وہ لوگ کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کھڑکیوں میں قدیم طرز کی آہنی گرلز موجود تھیں۔ حولیہ کی حالت ابتر ہو گئی۔ اس کے ہونٹ بالکل سفید ہو کر بے جان نظر آنے لگے تھے۔ وہ بلک کر بولی۔ ''میں ان لوگوں کے ہتھے چڑھنے کے بجائے مر جانا پسند کروں گی۔ پلیز! فون کریں پولیس کو..... پلیز۔''

شامیر نے اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کی.....

''حولیہ! ممکن ہے کہ ان لوگوں کو تمہاری یہاں موجودگی کا پتا ہی نہ ہو..... وہ تمہارے پیچھے نہیں آئے ہیں۔''

''مگر وہ آئے تو ہیں نا اور جب وہ آ گئے ہیں تو پھر..... سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ مجھ سے بڑھ کر انہیں اور کون جانتا ہوگا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

وہ ننھا پسٹل ابھی تک شامیر کے لباس میں تھا جو سلطان صاحب نے بذریعہ جین اسے فراہم کیا تھا۔ اس پسٹل کی موجودگی اسے کچھ حوصلہ دے رہی تھی مگر اس کا اصل حوصلہ تو زویا تھی جو یہاں موجود تھی..... اور خطرے میں تھی۔

''دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔'' ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ سامنے والے قدیم چوبی دروازے سے زور آزمائی کی جا رہی ہے۔

''زویا پھر پولیس کو ٹرائی کرو۔'' شامیر نے بلند آواز میں کہا۔ تب ہی اس کی نظر سیڑھیوں کی طرف گئی۔

یہ سیڑھیاں اس ہال کمرے کے اندر ہی ایک گیلری تک جاتی تھیں۔ ڈاکٹر حولیہ شاید کہیں چھپنے کے لیے ہی اس گیلری کی طرف گئی تھی۔ یہاں چرچ اور گھر کے استعمال کا

بہت سا سامان پڑا تھا۔ گیلری کے عین نیچے بی بی مریم کا ایک دھاتی مجسمہ تھا جس کے سامنے بہت سی شمعیں جل رہی تھیں۔ جب حولیہ نے سخت بدحواسی کے عالم میں کسی چیز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی تو ایک سلنڈر اپنی جگہ سے لڑھکا اور گیلری سے نیچے ہال کمرے کے فرش پر آن گرا۔ زوردار آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی سلنڈر میں موجود گیس خارج ہونا شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ زویا اور شامیر وغیرہ کچھ کرتے یا سمجھتے، گیس روشن موم بتیوں تک پہنچ گئی۔ ایک خوفناک پھنکار کے ساتھ گیس نے آگ پکڑ لی اور گیلری کے چوبی ستون دھڑا دھڑ جلنے لگے۔

ملازمائیں بُری طرح چلائیں..... زویا اور شامیر بھی سکتہ زدہ سے رہ گئے تھے۔ یہ سب کچھ یوں آناً فاناً ہوا کہ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس رہائشی پورشن میں ستر اسی فیصد لکڑی ہی استعمال ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکیاں اور دروازے آگ کی زد میں آ گئے۔

اب زویا کی ماما سارہ جیم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اپنے اردگرد پھنکارتے شعلے دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ اپنے بھاری جسم کو تیزی سے ہلکورے دے کر وہیل چیئر پر آن بیٹھی۔ بدحواس حولیہ آگ کی لپیٹ میں آنے سے بال بال بچی تھی اور لکڑی کے زینے پھلانگتی ہوئی نیچے اتر آئی تھی۔ دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔ شامیر بولا۔ ''زویا! تم نینی کو دیکھو، تمہاری ماما کو میں یہاں سے نکالتا ہوں۔''

وہ سارہ جیم کی کرسی کو دھکیلتا ہوا اور بری طرح کھانستا ہوا پہلے والے کمرے میں آ گیا۔ زویا نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغلی دروازہ فوراً بند کر دیا۔ یوں یہ کمرا عارضی طور پر شعلوں اور دھوئیں سے محفوظ ہوگیا۔ اب باہر بھی موت تھی اور اندر بھی۔ لیکن باہر والا خطرہ کم سنگین لگ رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں گرم ہوتی جا رہی تھیں اور سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ سارہ جیم اس نازک حالت میں بھی شامیر کو کوسنے سے اور واویلا کرنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

زویا نے دہشت زدہ نظروں سے شامیر کو دیکھا۔ اس نے روتی ہوئی بچی کو سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ ''شومیر! اندر کا خطرہ باہر کے خطرے سے زیادہ جان لیوا ہے۔ ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔''

شامیر دائیں جانب والا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا تو اس پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ تیزی سے پھیلتی ہوئی آگ اس طرف بھی آ گئی ہے۔ دروازے سے باہر شعلے خونی درندوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ''اوہ میرے خدا!'' اس کے خشک لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

ان دیواروں سے باہر اب قیامت کا شور تھا۔ بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ دیوانہ وار چلا رہے تھے اور آگ بجھانے کی اپنی سی کوششیں کر رہے تھے۔ پھر اس بے پناہ شور میں فائر بریگیڈ اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن بھی شامل ہوگئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ نے چرچ کے ایک حصے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

دونوں ملازمائیں ان کے ساتھ اس کمرے میں نہیں پہنچی تھیں۔ شاید انہوں نے کسی دوسری جانب سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ کامیاب ہوئی تھیں یا نہیں۔

زویا چیخ پکاری۔ ''شومیر! مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دروازے کی طرف آگ ابھی نہیں گئی۔''

شامیر کھانستا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ بھی پیتل کی میخوں سے سجا ہوا مضبوط لکڑی کا بلند و بالا دروازہ تھا۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ یہ اندر کے علاوہ باہر سے بھی بند تھا۔ اندر والا سلائڈنگ بولٹ تو شامیر نے کھول دیا مگر اسے باہر سے کیسے کھولا جا سکتا تھا۔ زویا اور حولیہ بلند آواز میں مدد کے لیے پکارنے لگیں، دروازوں کو پیٹنے لگیں۔ اس شور محشر میں کسی نے ان کی فریاد پر توجہ نہیں دی۔

تو کیا یہ آخری لمحے ہیں؟

کیا اس کی زویا اپنی بچی سمیت اس کے سامنے جل مرے گی؟

کیا وہ سب یہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دیں گے؟

نہیں..... وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اسے بچائے گا۔ وہ ثابت کرے گا کہ اس کی محبت ہوس نہیں تھی، خودغرضی نہیں تھی۔

وہ سب بُری طرح کھانس رہے تھے۔ اس کا اپنا سانس بھی سینے میں اٹک رہا تھا۔ حدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے چودہ پندرہ فٹ کی بلندی پر واقع روشندان کو دیکھا۔ وہ ایک الماری پر چڑھ کر اور ایک کارنس پر پاؤں جما کر روشندان تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک دھاتی صلیب کی ضربوں سے روزن کا مستطیل شیشہ توڑا اور پھر اس میں سے رینگ کر اور اپنے جسم کو بل دے کر باہر کود گیا۔ تین اطراف میں پھنکارتے ہوئے شعلے تھے مگر یہ شعلے ابھی کمرے کے عقبی دروازے تک نہیں پہنچے تھے۔ اس نے باہر سے دروازے کا دہکا ہوا آہنی بولٹ کھولا اور پٹ وا کر دیے۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اسے زویا کی شبیہ نظر آئی۔ وہ بُری طرح کھانس رہی تھی اور گھٹنوں کے بل گری ہوئی تھی۔ اس

حال میں بھی اس نے اپنی معصوم بچی کو چھاتی سے چمٹا رکھا تھا۔ شامیر اسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے کر باہر آیا۔ اب وہ عقبی برآمدے میں تھے، مگر یہاں پھر آگ کی ایک دیوار ان کے سامنے تھی۔

شامیر نے زویا اور بچی کو ایک ترپال نما شیٹ میں لپیٹا اور بھاگتا ہوا آگ کے اندر سے گزر گیا۔ ترپال نما شیٹ کے ایک حصے کو آگ لگی تھی جسے لوگوں نے پانی ڈال کر فوراً بجھا دیا۔ شامیر نے دیکھا، یہاں سیکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ چرچ کے تقریباً نصف حصے کو تیزی سے پھیلتی ہوئی آگ نے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فائر بریگیڈ کی زیادہ تر توجہ چرچ کی جانب ہی تھی۔ صرف ایک گاڑی رہائشی پورشن کی طرف موجود تھی اور لگتا تھا کہ اس کا پانی بھی ختم ہو رہا ہے۔ فائر مین بدحواس تھے۔

زویا دلدوز لہجے میں بولی۔ ''شومیر..... ماما..... حولیہ۔'' پھر وہ ہجوم کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ''کوئی مدد کرو..... میری ماں اور بہن اندر ہیں۔ خدا کے لیے..... خدا کے لیے۔''

سیکڑوں مقامی لوگ موجود تھے۔ وہ اپنے طور پر آگ بجھانے کی کوششیں تو کر رہے تھے مگر اپنی جان خطرے میں ڈال کر اندر جانا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ یہ بس اس شخص کے بس میں تھا جو دور دیس سے آیا تھا، جو کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا..... جو سفید فام جرمن تو نہیں تھا مگر انسان تھا..... اور انسانیت کے سارے تقاضے بھی جانتا تھا۔

کسی دوسرے کا انتظار کیے بغیر شامیر نے پھر کینوس کی شیٹ اپنے گرد لپیٹی اور آگ میں گھس گیا۔ دھواں دھواں کمرے میں اس کی نگاہ زویا کی وا لدہ سارہ جیم پر پڑی۔ دہشت اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے اپنی وہیل چیئر الٹا لی تھی اور اوندھی پڑی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ آگ کی زد میں تھا۔ شامیر نے ترپال کی مدد سے اس آگ کو بجھانے کی جزوی کوشش کی پھر سارہ جیم کو کندھے پر لادا اور موت کے منہ سے نکال لایا۔ وہ کھانس رہی تھی، چلا رہی تھی اور حیرت میں ڈوبی ہوئی دہشت زدہ نگاہوں سے شامیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لوگ اسے لے کر ایمبولینس کی طرف لپک گئے۔ پولیس کاروں سے بار بار اعلانات کیے جا رہے تھے اور لوگوں کو دور ہٹنے کا کہا جا رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ رہائشی حصے کی عمارت کسی بھی وقت منہدم ہو جائے گی۔

مگر شامیر کا ابھی تھوڑا سا کام باقی تھا۔ زویا کے چلانے کی دردناک آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کی بہن ابھی اندر تھی۔ اب برآمدے کو لگنے والی آگ کی دیوار بہت بلند ہو چکی تھی۔ وہ نم ترپال کو اپنے گرد لپیٹ کر پھر آگ کی طرف بڑھا تو زویا نے تڑپ کر اس کا بازو تھام لیا..... ''نہیں شومیر..... اب نہیں..... اب نہیں۔'' وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ وہ اب اندر گیا تو واپس نہیں آئے گا۔

دیگر لوگ بھی شاید یہی دیکھ رہے تھے مگر شامیر کو یہ گوارا نہیں تھا۔ حولیہ کے لیے اس کے دل میں ایک ترس آمیز ہمدردی ہمیشہ موجود رہی تھی۔ حولیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا تعلق بالواسطہ خود شامیر سے بھی تو تھا۔ سہراب والی اسٹوری کی وجہ سے زویا، نمرسی کے نشانے پر آئی تھی اور پھر زویا کی جگہ حولیہ انتقام کی بھینٹ چڑھی تھی (اپنے بچے سمیت) زویا بہن کے لیے بھی نوحہ کناں تھی اور شامیر کے لیے بھی چلا رہی تھی۔ آخری فیصلہ شامیر نے ہی کرنا تھا..... اور اس نے کیا۔ اس نے ایک دم اپنا بازو زویا کی گرفت سے چھڑایا اور آگ میں داخل ہو گیا..... اندر داخل ہوتے ہی اس کی ترپال کو آگ لگ گئی تھی مگر وہ رکا نہیں۔ بری طرح کھانستا ہوا وہ دھوئیں اور شعلوں میں گھرے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ حولیہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ کمرے میں شعلوں کی پھنکار کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ چلانے لگا۔ ترپال اب مکمل طور پر آگ پکڑ چکی تھی۔ اس کا سانس رکنا شروع ہو گیا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے

پتا نہیں کب اس نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے حولیہ کے بے حرکت جسم کو محسوس کیا..... کب اسے اٹھایا، کب ایک ادھ جلے غالیچے میں جزوی طور پر لپیٹا..... اور کب باہر کی طرف لپکا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ ترپال نما شیٹ اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ وہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا ہے، اس کے سینے کے بال چرمرا رہے ہیں۔ اس کا گوشت جل رہا ہے اور وہ بھاگ رہا ہے..... وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ ہاں، حولیہ کو اٹھاتے ہوئے اس نے عقلمندی کا ایک کام ضرور کیا تھا۔ اپنی شرٹ کے نیچے سے کولٹ مستنگ پسٹل نکال کر وہیں آگ میں پھینک دیا تھا۔

☆☆☆

رونالڈو نمرسی، یوریل کے فرسٹ کلاس اپارٹمنٹ میں لگژری کوچ پر بڑے ایزی اسٹائل میں بیٹھا تھا۔ آج کل اس نے فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے بالوں کا رنگ بھی ہلکا سرخ کر لیا تھا۔ یہ حلیہ اس کے چار سال پہلے والے حلیے

سے بہت مختلف تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جرمنی میں آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا۔ وہ آرتھر کے فرضی نام سے سفر کر رہا تھا۔ اس کا سکھ پارٹنر انوپ سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ جرمنی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے جب نمرسی کو ہیری کے ذریعے برج برگ کے چرچ میں خوفناک آتشزدگی کی خبر ملی۔ ہیری نے اسے بتایا کہ آگ پھیلتے ہی فائر بریگیڈ اور پولیس کی درجنوں گاڑیاں موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ پولیس کی موجودگی میں ہیری اور اس کے ساتھی تتر بتر ہو گئے۔

ہیری نے بتایا تھا کہ شامیر شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکا تھا۔ زویا کی والدہ بھی جھلسنے سے زخمی ہوئی ہیں..... افراتفری اور ہجوم کا فائدہ اٹھا کر دونوں بہنیں یعنی زویا اور حولیہ موقع سے غائب ہو چکی تھیں۔

نمرسی نے ایک بار پھر ہیری پر گالیوں کی بارش کی تھی..... اور اسے الٹا ٹانگنے کے پختہ ارادے ظاہر کیے تھے۔ اب وہ بے حد طیش کے عالم میں تھا..... اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عین موقعے پر آگ کیسے اور کس طرح لگی ہے؟

اس نے فادر جوناتھن سے رابطہ کیا۔ گرجے کی تباہی نے فادر کو بدحواس و نیم جان کر رکھا تھا۔ اس سانحے میں فادر کی دو خاص ملازماؤں کے علاوہ ایک لاڈلا لے پالک بھانجا بھی موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ رو رو کر فادر کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ غمزدہ فادر ہی سے نمرسی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شامیر کو نازک حالت میں لیونا برگ کے اسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس کے جسم کا ستر فیصد حصہ جل چکا ہے.....

☆☆☆

زویا نے عقلمندی اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنی بچی اور بدحواس حولیہ سمیت وہاں سے نکل آئی تھی۔ اب وہ لیونا برگ کے ایک ہوٹل میں موجود تھی۔ اسے سب سے زیادہ تشویش شامیر کے حوالے سے ہی تھی۔ اسے بری حالت میں لیونا برگ کے مرکزی اسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ زویا کا دل رو رہا تھا۔ وہ شخص جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے شعلوں میں گھرا تھا اور بے دم ہوا تھا اور یہ سانحہ اس نے خود منتخب کیا تھا..... زویا کی خاطر اور اس کے پیاروں کی خاطر۔

حولیہ کے ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آج تو وہ

بھی شامیر کے لیے بہت پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے ابھی ابھی اسپتال فون کر کے تازہ صورتِ حال معلوم کی تھی۔

زویا نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟''

حولیہ دکھ بھری آواز میں بولی۔ ''وہ برن یونٹ میں ہے۔ ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے..... اس نے بار بار تمہارا نام لیا ہے..... اور تمہاری اور عینی کی خیریت کے بارے میں پوچھا ہے۔ یقیناً اسے اندیشہ ہے کہ نمرہ کے لوگ تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔''

زویا نے ایک سسکی لی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''ہم سے زیادہ خطرہ شاید اسے ہے حولیہ۔ وہ اسپتال میں ہے اور یہ بات بدمعاشوں کا وہ ٹولا بھی جانتا ہوگا۔''

پھر جیسے ایکدم زویا کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ اس نے اپنے سیل فون سے ٹام کا نمبر ملایا۔ چھٹیاں گزارنے کے بعد ٹام اپنی بیوی سمیت لیونا برگ واپس آ چکا تھا۔ میڈیا کے ذریعے اسے ساری صورتِ حال معلوم ہو چکی تھی۔ وہ زویا سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتا تھا تاہم زویا نے اسے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹام! اس وقت صرف میری بات سنو۔ مجھے شامیر کی طرف سے بہت اندیشہ ہے۔ اسے اسپتال میں بھی نقصان پہنچانے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ تم ابھی اسپتال چلے جاؤ اور شامیر کے اردگرد موجود رہو۔ اگر کوئی بھی مشکوک شخص یا سرگرمی نظر آئے تو پولیس کو انفارم کرو.....''

ٹام کو پوری بات سمجھا کر اس نے کال ختم کر دی۔ پتا نہیں کیوں آج اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی تھی۔ وہ بس گرتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اسے یاد تھا، اس نے آخری بار شامیر کو آگ میں جانے سے بہت منع کیا تھا..... دوسروں نے بھی روکا تھا۔ حتیٰ کہ فائر مین بھی فائر سوٹ کے بغیر آگے نہیں بڑھ پائے تھے مگر وہ تو جیسے حولیہ کی زندگی کے سوا ہر بات فراموش کر چکا تھا۔

عینی سو رہی تھی۔ زویا نے خود کو واش روم میں بند کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں دکھوں اور اذیتوں کے سوا کچھ نہ دے سکی.....'' وہ بہ زبانِ خاموشی پکارتی چلی گئی۔

☆☆☆

برن یونٹ میں شامیر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دواؤں کے زیرِ اثر وہ کسی وقت گہری غنودگی میں چلا جاتا تھا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوتے تو وہ زویا اور اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں پوچھتا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ زویا کی ماما سارہ جیم بھی اسی اسپتال میں ہیں۔ اگلے روز دوپہر کے وقت جب اسے اپنی حالت قدرے بہتر محسوس ہوئی تو اس نے اپنے قریب زویا کے گنارسٹ دوست ٹام کو کھڑے دیکھا۔ ٹام نے سرگوشیوں میں اسے بتایا کہ زویا اور حولیہ بالکل خیریت سے ہیں اور لیونا برگ میں ہی کسی محفوظ جگہ پر موجود ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر زویا سے اس کی بات بھی کرا دے گا۔

شامیر نے کہا۔ ''ٹام! میں ایک بار زویا کی ماما سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ یہاں آ سکتی ہیں وہیل چیئر پر۔''

''یہ بہت مشکل ہے شامیر بھائی۔''

''تو پھر مجھے ان کے پاس لے جاؤ۔''

''یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ آپ آئسولیشن ٹینٹ میں ہیں۔ ڈاکٹر آپ کو یہاں سے ہلنے کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔''

''تو پھر..... فون پر ہی.....'' شامیر کی بات ادھوری رہ گئی۔ سینے کی طرف سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ صرف ایک زیرجامہ پہنے ہوئے تھا جو کوارٹر پینٹ کی شکل میں تھا۔ اس کے دونوں پہلوؤں، سینے اور پیٹ کے بیشتر حصے پر ادویات کا لیپ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ادویات لگائی گئی تھیں مگر اسے لگتا تھا کہ چہرہ زیادہ جھلسنے سے محفوظ رہا ہے۔ اسی طرح بائیں بازو کا تھوڑا سا حصہ بھی آگ سے محفوظ رہا تھا۔

ٹام نے کوشش کی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد ویڈیو لنک کے ذریعے زویا کی ماما سارہ جیم سے اس کی بات کرا دی۔ سارہ جیم کی ٹانگوں اور ایک بازو پر آگ کے اثرات ہوئے تھے۔ دھوئیں میں رہنے کی وجہ سے انہیں سانس کی بھی شدید تکلیف ہو گئی تھی۔ بہرطور اب وہ بہتر تھیں اور بستر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔

''آپ کیسی ہیں آنٹی؟'' شامیر نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں اور تم؟'' انہوں نے مختصراً کہا۔

''میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔''

سارہ جیم نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

وہ بولا۔ ''اگر کبھی مجھ سے جانے انجانے میں کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نے ہمیشہ آپ کو عزت کے مقام پر جانا ہے۔''

پہلے لگا کہ وہ کچھ کہنے لگی ہیں، مگر پھر صرف کھنکھار کر اور گلا صاف کر کے رہ گئیں۔ شامیر کا خیال تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ تو بولیں گی مگر وہ اب دوسری جانب دیکھ رہی تھیں۔

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''چلیں..... اتنا تو کہہ دیں کہ میں اتنا مطلب پرست اور خودغرض نہیں ہوں جتنا آپ کو لگا کرتا تھا۔''

''تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے شکریہ۔'' سارہ جیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔ چہرے پر نرمی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

کہنہ اقدار اور تعصبات کی برف بہت سخت تھی بلکہ ایسی برف شاید ''برف'' رہتی ہی نہیں، پتھر بن جاتی ہے اور پتھر کو کون پگھلا سکتا ہے۔

اسی دوران میں سارہ جیم کی طرف ڈاکٹرز کی آمد ہوگئی اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

ٹام اسپتال کی لابی میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ وقتاً فوقتاً زویا سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار شامیر سے زویا کی بات کرادے مگر برن یونٹ میں آمدورفت آسان نہیں تھی۔ خصوصی اجازت کے ساتھ اور بعض اوقات خاص گاؤن وغیرہ پہن کر اندر جانا ہوتا تھا۔ فی الوقت ویسے بھی ایک سینئر ڈاکٹر مسلسل یونٹ کے اندر تھا۔ زویا کی ہدایت کے مطابق ٹام نے قرب وجوار پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ زویا کی طرح ٹام کے ذہن میں بھی یہ اندیشہ موجود تھا کہ نمرسی ٹولے کے لوگ اسپتال کے اندر بھی شامیر کو کسی طرح کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔

لابی میں موجود ٹی وی پر نیوز چل رہی تھیں۔ ان نیوز میں چرچ میں آتش زدگی والی خبر بھی موجود تھی۔ اس خبر سے جڑی ہوئی دو تین تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں۔ ایک تصویر سابقہ ٹی وی رپورٹر زویا کی تھی۔ دوسری باہمت شامیر کی تھی جس نے خود کو شدید خطرے میں ڈال کر چند افراد کی جان بچائی تھی۔ اس کے اقدام کو Heroic قرار دیا جا رہا تھا۔

ٹام نے ٹی وی سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھا اور اچانک بے طرح چونک گیا۔ بالآخر اسے ایک مشکوک شخص لابی میں نظر آ گیا مگر غیر متوقع طور پر اس شخص کا تعلق نمرسی کے ٹولے سے نہیں تھا۔ اس شخص کو ٹام بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ زویا کا شوہر رابرٹ تھا۔ وہی شریف صورت لیکن بدباطن شخص جس نے زویا کی زندگی کو اپنے بے بنیاد شبہات کی وجہ سے عذاب بنا دیا تھا۔ وہ ایک آسیب کی طرح اس کی زندگی کو جکڑ چکا تھا۔ یہاں یقیناً وہ شامیر سے ملنے ہی آیا تھا۔ وہ بہت شریفانہ لباس پینٹ کوٹ اور ٹائی میں تھا۔

یہی وقت تھا جب رابرٹ کی نگاہ بھی ٹام پر پڑ گئی۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے مبہوت کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے تیکھے نقوش کے اوپر طیش کا سرخ رنگ غالب آتا چلا گیا..... آنکھوں کے اندر شعلے رقص کرنے لگے۔ یہ رابرٹ کا وہی دوسرا روپ تھا جس کا ذکر زویا اکثر ڈرے ڈرے انداز میں کیا کرتی تھی۔

اپنے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ کر وہ سیدھا ٹام کی طرف آیا اور بلا تردد اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ جرمنی میں پھنکارا۔ ''باسٹرڈ گوتے! تو نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے جنونی کیفیت میں ٹام کو گھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ کرسیوں پر موجود لوگ خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رابرٹ پھر چنگھاڑا۔ ''تو نے میری بیوی کو..... میری بچی کو اغوا کیا۔ انہیں اپنے قبضے میں رکھا اور اب تیری اتنی جرأت ہوگئی ہے کہ میری چاردیواری پامال کرتا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے دو زوردار گھونسے ٹام کے چہرے پر رسید کیے۔ اب ٹام سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے دفاع میں ٹانگ چلائی۔ دبلا پتلا دراز قد رابرٹ اڑتا ہوا سا کئی قدم دور ایک میل نرس کے پاؤں میں جا گرا۔ ایک لمحے میں اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔ وحشت کے عالم میں وہ ایک میڈیکل ٹرالی پر جھپٹا۔ ٹرالی کے نچلے پورشن میں سرجری کے کچھ آلات پڑے تھے۔ اس نے ایک تیز دھار نشتر نکالا اور بے دریغ ٹام کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ دوسرا وار اس نے ٹام کی گردن پر کیا جو اچٹتا ہوا اس کے کندھے پر لگا۔ وہ ایک دم جیسے وحشی بن گیا۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر ٹام کے پیٹ کو نشانہ بنانا چاہا۔ جان بچانے کے فطری عمل کے تحت ٹام نے اس کی کلائی تھام لی۔ رابرٹ اسے وحشت کے عالم میں دھکیلتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ دو پولیس والے اس کی طرف جھپٹے۔ انہوں نے اپنے سروس پسٹل نکال لیے تھے۔ ''رک جاؤ..... رک جاؤ۔'' وہ گرجے۔

پھر ایک تنومند پولیس والے نے رابرٹ کی گردن میں بازو ڈال کر اسے ٹام سے پیچھے ہٹانا چاہا۔ وہ جیسے اندھا ہوگیا تھا۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے پلٹا اور پولیس مین پر بھی وار کیا۔ افقی رخ پر حرکت کرتا ہوا تیز دھار نشتر پولیس مین کی گردن پر کاری زخم لگا گیا۔ تب ایک فائر کی زوردار آواز آئی۔ دوسرے پولیس مین نے رابرٹ کے پاؤں پر گولی ماری تھی پھر اسے دبوچ لیا گیا۔ ٹام نے اپنا خون آلود پیٹ دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔ زخم سنگین تو تھا مگر بہت زیادہ

نہیں۔ وہ خود ہی دوڑتا ہوا ایمرجنسی وارڈ میں پہنچ گیا۔ زخمی گردن والا اہلکار فرش بوس ہو چکا تھا۔ اس کے لیے "اسٹریچر..... اسٹریچر" کی آوازیں بلند ہوئیں اور لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگے۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا، ویانا کے اس اسپتال کا جہاں فارہ ایڈمٹ تھی۔ ایکسیڈنٹ کے بعد سے وہ تقریباً مسلسل بے ہوش تھی۔ اس کے سر کا ایک آپریشن ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے..... لیکن اس کے جسم کے کچھ اعضا پوری طرح کام نہیں کر رہے۔

دوسرے روز شام کے وقت فارہ کی والدہ ثمینہ کو افشاں کی والدہ سے وہ خبر ملی جس نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ افشاں کی والدہ نے انہیں ان شکوک کے بارے میں بتایا تھا جو ڈاکٹروں نے اور پھر پولیس والوں نے ظاہر کیے تھے۔ ابتدائی اندازے کے مطابق جاوتے سے تھوڑی دیر قبل کسی نے فارہ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ غالباً اس سے زیادتی کی کوشش کی گئی تھی۔ بہرحال حتمی رائے میڈیکل رپورٹ کے بعد دی جا سکتی تھی۔ خالہ ثمینہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ بیس گھنٹے گزرنے کے باوجود یہ بات پوری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ فارہ ایکدم اٹھ کر شامیر کے پیچھے کیوں دوڑ گئی تھی۔ اب یہ کڑی مل گئی تھی۔ اس خبیث بدذات نے فارہ کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر شاید اسے کمرے میں بے ہوش چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔ انہوں نے خود ہی سارا تانا بانا بُن ڈالا۔

ایک نیلی آگ سی خالہ ثمینہ کے اندر روشن ہو گئی۔ انہوں نے اسپتال میں ہی واویلا شروع کر دیا۔ اپنی رائیں پیش اور تب ایک بار پھر شامیر سے رابطے کی کوشش کی۔ یہ وہی وقت تھا جب لیونابرگ میں شامیر نے زویا کی کال کے انتظار میں اپنا موبائل آن کیا ہوا تھا۔

"ہیلو کون؟" خالہ ثمینہ کے کانوں میں اس کی مدھم کمزور آواز ابھری۔

"کمینے..... بے فیض..... بدبخت..... حرامزادے....." وہ چھوٹتے ہی اس پر پھٹ پڑیں۔ "اس دن کے لیے تجھ پر ترس کھایا تھا..... اس دن کے لیے تیری یتیمی پر رحم کیا تھا۔ بے غیرت! تجھے ذرا شرم نہ آئی۔ جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ میری کومل سی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا..... تو اسی وقت زمین میں کیوں غرق نہ ہو گیا۔"

دوسری طرف شامیر جیسے سناٹے میں تھا۔ اس کی حالت پہلے ہی ابتر تھی۔ خالہ ثمینہ کی اس اچانک یلغار نے اسے ادھ موا سا کر دیا۔ وہ کراہ کر بولا۔ "خالہ..... خالہ! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں شامیر بول رہا ہوں۔"

"مجھے پتا ہے تو کون بول رہا ہے۔ تو بدبخت باپ کا بدذات بیٹا ہے..... کسی بڑی گندی نسل کا خون مل گیا ہے ہماری نسل میں..... کمینے..... تیری وجہ سے میری فارہ زخموں سے چُور ہو کر اسپتال میں پڑی ہے۔ پتا نہیں کہ بچتی ہے یا مرتی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ تجھے پھانسی لگواؤں گی....." وہ بولتی چلی جا رہی تھیں۔

دوسری طرف شامیر نے کراہتے ہوئے انداز میں کچھ کہا، پھر جیسے گھبراہٹ میں فون بند کر دیا تھا۔

"ہیلو..... ہیلو۔" خالہ ثمینہ فون کو ہونٹوں سے لگا کر دہاڑیں۔ تب انہوں نے فون صوفے پر پٹخ دیا۔

افشاں کی والدہ انہیں تسلی دینے کی ناکام کوششیں کرنے لگی۔ یہی وقت تھا جب افشاں کے والد اختر صاحب کچھ کاغذات لیے ایک کمرے سے نکلے اور تیز قدموں سے ثمینہ اور اپنی وائف کی طرف آئے۔ انہوں نے کاغذات پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "رپورٹ آ گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا اندیشہ غلط نکلا ہے۔ فارہ سے زیادتی یا زیادتی کی کوشش نہیں ہوئی۔ یہ مکمل رپورٹ ہے۔"

خالہ ثمینہ آنکھیں نکال کر بولیں۔ "تو پھر کس نے کپڑے پھاڑے اس کے؟ کس نے زخم زخم کیا؟ اس رپورٹ میں کوئی گھپلا ہو گا۔ وہ کیوں اس طرح بھاگی، اس کے پیچھے اسٹیشن کی طرف؟ وہ صحافی ہے، اس نے رپورٹ میں ضرور کوئی ہیرا پھیری کرائی ہو گی۔"

"نہیں آپا۔" اختر صاحب نے تحمل سے کہا۔ "یہ آسٹریا ہے، یہاں اس طرح کے گھپلے نہیں ہو سکتے۔ یہ بالکل درست رپورٹ ہے۔ میں نے پڑھا ہے اسے۔ ہمیں تو شکر کرنا چاہیے۔"

"مگر یہ سب کیوں ہوا؟ وہ خبیث کیوں ایک دم بغیر بتائے بھاگا؟"

اختر صاحب نے ثمینہ کے اس سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے ایک صفحے پر نگاہ جمائی۔ "یہ دیکھیں آپا! یہاں لکھا ہے فارہ کے ناخنوں میں سے جو گوشت نکلا ہے، وہ اس کا اپنا ہی ہے۔ اس نے خود ہی اپنے جسم پر خراشیں ڈالیں، خود ہی اپنے کپڑے پھاڑے، اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بھی کسی کمرے سے نہیں افشاں کی کار کے اندر سے ہی ملی ہیں....." وہ رپورٹ کے قابلِ ذکر حصوں کا ترجمہ

کر کے سنانے لگے۔

خالہ ثمینہ کا بے پناہ غیظ و غضب ماند تو پڑ گیا مگر وہ ابھی تک حقیقت کو پوری طرح تسلیم نہیں کر رہی تھیں۔ نہ ہی انہیں اس امر کا کوئی افسوس تھا کہ چند ہی منٹ پہلے انہوں نے شامیر سے کس طرح کی بدزبانی کی تھی۔ وہ بس ایک ہی بات کہتی جا رہی تھیں۔ ''آخر کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے نا میری فارہ کے ساتھ.....اور جو کچھ بھی ہوا ہے اس نے کیا ہے۔''

وہ جانتی نہیں تھیں کہ جو کچھ کیا ہے انہوں نے خود کیا ہے۔ یہ وہی تھیں جنہوں نے اپنے ذہن میں اس بات کی تلی پروان چڑھائی تھی کہ شامیر کے خاندان والے لڑکیاں دے تو دیتے ہیں لیکن اپنی برادری سے لڑکیاں لیتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک خواہش کو اپنی ضد بنایا.....اس ضد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے طویل پلاننگ کی۔ کچے ذہن کی فارہ کے اندر دھیرے دھیرے اپنے اٹل خیالات کو ''انجیکٹ'' کیا۔ بتدریج اسے بھی ہٹ دھرمی کی منزل تک پہنچا دیا.....اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

زویا کو سب سے پہلے ٹام کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی اور پھر یہ پتا چلا تھا کہ اسپتال میں اس کی کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہاں نمرسی کا کوئی ہرکارہ پہنچا ہے اور اس نے شامیر تک پہنچنے کی کوشش کی ہے.....مگر پھر ٹام کی بیوی کرسٹینا کی زبانی ایک بالکل دوسری ہی طرح کی اطلاع پہنچی اور اس نے زویا اور حولیہ کو ششدر کر دیا۔ جس کے ساتھ ٹام کا جھگڑا ہوا، وہ کوئی اور نہیں زویا کا شوہر رابرٹ تھا۔ وہ وہاں شامیر سے ملنے گیا تھا اور ٹام کو وہاں دیکھ کر اس پر جھپٹ پڑا۔

کرسٹینا اسپتال میں ہی تھی۔ اس کی زبانی یہ جان کر کہ ٹام کو ٹریٹمنٹ دے دی گئی ہے اور اب اس کے لیے خطرے والی کوئی بات نہیں، اسے تسلی ہوئی۔ پھر اسے کرسٹینا ہی کے ذریعے اس واقعے کی کچھ اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ پتا چلا کہ رابرٹ طیش میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اسی وحشت کے عالم میں اس نے ایک باوردی پولیس اہلکار پر بھی حملہ کر دیا اور تیز دھار نشتر سے اس کو شدید نقصان پہنچایا۔ پولیس اہلکار اسپتال میں ایڈمٹ تھا اور اس کی حالت مخدوش تھی۔ رابرٹ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

وہ ساری رات زویا نے سوتے جاگتے میں ہی گزاری۔ وہ اسپتال جانا چاہتی تھی، ٹام کو دیکھنا چاہتی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ شامیر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ شامیر جس نے اپنی جان داؤ پر لگا کر اس کی زندگی بچائی تھی اور اس کے اہل خانہ کو یقینی موت کے منہ سے نکالا تھا۔

اس کے اندر ایک عجیب سا ابال پیدا ہو رہا تھا۔ ایک نامعلوم توانائی تھی جو اس کے ہر اندیشے کو پس منظر میں دھکیل رہی تھی۔ وہ شامیر کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ دوپہر تک وہ تقریباً یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسپتال جائے گی۔

یکا یک حولیہ کی آوازوں نے اسے چونکایا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں اسے پکار رہی تھی۔ ''دیکھو زویا..... یہ دیکھو کیا ہو رہا ہے.....جلدی آؤ۔''

صبی کو گود میں اٹھائے، زویا لپکتی ہوئی حولیہ کے پاس پہنچی۔ ٹی وی پر ایک لائیو کرائم سین چل رہا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کی لگژری کار ٹریفک کے قوانین کو روندتی ہوئی بڑی رفتار سے سڑک پر جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیٹرولنگ پولیس کی گاڑیاں تھیں اور ان کے سائرنوں سے فضا گونج رہی تھی۔ ایک ہیلی کاپٹر بھی سیاہ کار کے اوپر پرواز کر رہا تھا اور اس تعاقب کا فضائی منظر اسکرین پر پیش کر رہا تھا۔ کمنٹری کرنے والا دہائی دے رہا تھا.....''اب تقریباً پندرہ منٹ ہونے کو آئے ہیں۔ ملزم ہار ماننے کو تیار نہیں۔ اب تک وہ درجن بھر گاڑیوں کو نقصان پہنچا چکا ہے۔ کم از کم دو راہ گیروں کو اس نے بے دردی سے کچلا ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مزید جانی نقصان ہو سکتا ہے.....''

حولیہ نے چینل تبدیل کیا۔ وہاں بھی اس سنگین تعاقب کو براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ اس چینل کا کمنٹیٹر کہہ رہا تھا۔ ''اب یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ یہ مفرور ملزم رونالڈو نمرسی ہی ہے۔ کئی برسوں سے وہ انٹرپول کے علاوہ جرمن انٹیلیجنس کو بھی شدت سے مطلوب تھا۔ اس کے زیادہ تر جرائم کا تعلق جرمنی سے ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تین چار سال تک جرمنی سے دور ہی رہا ہے۔ اس کا یہاں نظر آنا بالکل غیر متوقع تھا اور شاید اب بھی ہے مگر اب یہ تقریباً ثابت ہی ہے کہ یہ نمرسی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس گاڑی میں ایک بندہ اور بھی سوار ہے، یقیناً یہ نمرسی کا کوئی قریبی ساتھی ہو سکتا ہے۔''

دفعتاً ایک پولیس کار نے سیاہ کار کو اوورٹیک کیا اور سائڈ مار کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ سیاہ کار بری طرح لہرائی اور پھر ایک بغلی سڑک پر مڑ کر ہائی وے پر آ گئی۔ تیز رفتار تعاقب ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ یہ لیونا برگ کی

سرکیں نہیں۔

حولیہ اور زویا دونوں کے رنگ فق تھے۔ زویا نے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ خبیث یہاں پہنچے گا..... اور پہنچا ہے۔''

حولیہ نے حیران نظروں سے زویا کو دیکھ کر کہا۔ ''کیا... تم..... یہ کہنا چاہتی ہو کہ نمرسی، شامیر کے لیے یہاں پہنچا ہے؟''

''شاید اسے یہاں کوئی اور کام بھی تھا، مگر وہ شامیر کے لیے اپنے اندر بہت کینہ رکھتا ہے۔ مجھے اور شامیر کو ایک ساتھ دیکھنے کے بعد اس کی نفرت اور بڑھی تھی۔''

پولیس کاریں گائڈڈ میزائلوں کی طرح سیاہ کار کے پیچھے تھیں۔ زویا نے کہیں پڑھا تھا کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں..... اور جب گیدڑ نے مرنا ہوتا ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ شاید نمرسی کی شامت اعمال بھی اسے گھیر کر اس خوبصورت قصبے لیونا برگ تک لے آئی تھی..... اور اب یہ خوبصورت قصبہ اس کے لیے مکڑی کا جالا بن گیا تھا..... اس کا تعاقب اس اسپتال کے قریب سے ہی شروع ہوا تھا جہاں شامیر موجود تھا۔

ایک تبصرہ نگار جوشیلے لہجے میں بتا رہا تھا کہ کس طرح قریباً نصف گھنٹا پہلے اس سیاہ کار کو ایک چیکنگ اسپاٹ پر روکا گیا اور پھر کس طرح نمرسی کی شناخت ہوئی اور کس طرح وہ موقع سے فرار ہوا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ اب یہ تعاقب زیادہ طول نہیں پکڑے گا۔ تعاقب کرنے والی پولیس کاروں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اب وہ جارحانہ انداز اختیار کر رہے تھے۔ پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر اگلی دو پولیس کاروں نے سیاہ کار کو سائڈ کی طرف دھکیلا۔ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنی رفتار کم کر لیتا مگر اس نے اندھا دھند پولیس کار کو جوابی ٹکر رسید کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گاڑی خطرناک طریقے سے لہرائی اور پھر کئی قلابازیاں کھا گئی۔ اس کے پچھلے حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ گاڑی کی حالت دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ سواروں کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔ ان کے بچنے کے امکان نظر نہیں آ رہے تھے۔ نیوز کاسٹر اور کمنٹیٹر ہیجانی انداز میں چلا رہے تھے۔ زویا نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

اسپتال میں شامیر کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ یہاں بہترین طبی سہولتیں موجود تھیں..... شامیر کے اپنے اندر بھی زبردست ''ول پاور'' موجود تھی مگر اس کے جسم کا تقریباً ساٹھ فیصد حصہ آگ سے متاثر ہو چکا تھا۔ سینہ، پیٹ، ایک پہلو اور ٹانگوں کے نچلے حصوں کو زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ محفوظ رہا تھا۔ کسی وقت وہ سوچتا اگر اس کا چہرہ بھی جل جاتا اور اسے پلاسٹک سرجری وغیرہ کا سہارا لے کر زندہ رہنا پڑتا تو اس کی زندگی میں کس طرح کے خلا پیدا ہو جاتے۔ بہرطور وہ اپنی طرف سے زیادہ پُرامید بھی نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کہ جب جسم کا 50 فیصد سے زیادہ حصہ آگ سے متاثر ہو جائے تو پھر بندے کی حالت نازک ہی تصور کی جاتی ہے۔ وہ موت سے ڈرتا نہیں تھا۔ وہ کسی اور بات سے ڈرتا تھا۔ اگر اسے مرنے کی ''زحمت'' اٹھانا ہی پڑی تو کیا وہ یہ جانے بغیر مر جائے گا کہ اب زویا کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں؟ کیا واقعی اب اس کے دل میں عہد رفتہ کی ساری یادیں دھندلا چکی تھیں؟ کیا وہ پیار جو ایک روز ٹرین نمبر 21 کے آخری اسٹیشن پر کھو گیا تھا، اب اپنی اصلی حالت میں کبھی واپس نہیں ملے گا؟

تیز دواؤں کے زیر اثر وہ غنودگی کے عالم میں سوچتا، وہ کب آئے گی؟ اسے کم از کم ایک بار تو آنا ہی تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ اس سے کہنے کے لیے کہ اس نے اس کے اور اس کے اہل خانہ کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ بہت بہت شکریہ۔ وہ اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مگر کیا یہ کافی تھا؟ کیا یہ جملے اس گہرے زخم کا مداوا ہو سکتے تھے جو وہ کئی برسوں سے اپنے سینے میں لیے لیے پھرتا تھا..... اور جس زخم کو چند روز پہلے زویا نے مزید گہرا کر کے ایک گھاؤ بنا دیا تھا۔ فل مون ریسٹورنٹ میں اس نے شامیر کو صاف سیدھے لہجے میں بتا دیا تھا کہ اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ اب وہ ماضی کو تقریباً بھول چکی ہے۔

اور پھر ایک روز وہ واقعی اسپتال میں آ گئی۔ شامیر کی حالت بہتر تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر میز پر سر رکھے سو گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھال کر آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ گارڈن لائٹ میں، لیونا برگ کی بالکونیوں اور کیاریوں میں دکھنے والے ٹیولپ کے خوبصورت ترین پھول کچھ گملوں میں نظر آ رہے تھے۔ دھیمی بارش انہیں ہولے ہولے تھرکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ یکایک اسے اپنے عقب میں مدھم آہٹ محسوس ہوئی..... اور پھر کسی نے بڑی ہی آہستگی، بڑی ہی نرمی کے ساتھ اسے عقب سے تھام لیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے ساتھ لگ گیا اور وہ جانتا

تھا کہ وہ کون ہے؟ یہ اتنی تھی یہ وہی گداز تھا اور یہ وہی خوشبو تھی اور یہ وہی دلربا انداز تھا۔

"یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو۔" وہ اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔

اس نے اپنے مخصوص دلنشین لہجے میں کہا۔ "شمیر! تم کو بھی یقین نہیں آرہا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو۔ لگتا ہے کہ دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ شمیر! یو آونٹ لو۔ ان الفاظ میں (دعاؤں میں) تم نے بہت پاور کیا ہے تو تم کو۔"

"صرف پاور ہی کیا ہے؟"

"آبھی تو گئی۔ اب..... تم سے پوچھنا ہے..... کہ تم..... کیا چاہتا ہو گے۔"

"عینی کہاں ہے زویا؟"

"وہ ساتھ نہیں آئی۔ تم نے اسے باہر تو نکال لیا تھا۔ پر وہ آگ سے نہیں بچ سکی..... وہ گزر گئی ہے۔"

اچانک شمیر کو شدید دھچکا محسوس ہوا..... اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں۔ وہاں نہ کھڑکی تھی..... نہ زویا تھی، نہ اس کا خوشبودار گداز تھا۔ وہ اسی طرح سفید بستر پر چت لیٹا تھا..... اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی خبر گی کی حالت میں اس کے تصور نے اسے ایک ایسا منظر دکھایا تھا جو شاید اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ برن یونٹ کی سرمئی چھت، دواؤں کی بو، میڈیکل اسٹاف کی مدھم آوازیں، سب کچھ وہی تھا جو وہ پچھلے چھ سات روز سے دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔

"کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" نرس نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لا کر مدھم آواز میں کہا۔

اس کا دل ایک بار پھر دھڑک اٹھا..... شاید وہی آئی ہو؟

مگر دو منٹ بعد جو اس کے بستر کے قریب آکر بیٹھا وہ کوئی اور تھا۔ وہ افشاں کے والد، مہربان چہرے والے انکل اختر تھے۔ ان کا چہرہ غم کی تصویر تھا..... اور یہ غم یقیناً شمیر کی حالت کے حوالے سے ہی تھا۔

انہوں نے شمیر کا بایاں ہاتھ تھام لیا اور دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ تسلی تشفی کی باتیں، اس کی صحت یابی اور بحالی کی باتیں۔ انہوں نے کہا۔ "شمیر! تم نے بڑی ہمت کا کام کیا ہے۔ یہ گورے آسانی سے کسی کی تعریف نہیں کرتے لیکن یہ تمہارے حوصلے کی داد دے رہے ہیں۔ اب بھی اسپتال کی مین لابی میں تین چار فوٹو گرافرز اور صحافی پیچھے تھے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں مگر انتظامیہ کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ میں بھی بمشکل آپا پایا ہوں۔"

پھر انہوں نے اپنے اسمارٹ فون سے اتاری گئی ایک تازہ تصویر شمیر کے سامنے کی۔ "یہ دیکھو..... لیونا برگ اور برج برگ کے لوگ تمہیں کتنی محبت دے رہے ہیں۔"

شمیر نے دیکھا..... ایک بڑی سٹیل میز پر کئی درجن گلدستے رکھے تھے۔ "یہ سب تمہارے لیے ہیں۔ تمام اخباروں میں تمہاری تصویریں شائع ہوئی ہیں۔"

شمیر نے فون کی اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے نحیف آواز میں کہا۔ "انکل! خالہ اور فارہ کا کیا حال ہے؟ میں ان کے لیے بڑا پریشان ہوں۔"

انکل اختر نے ایک طویل سانس کھینچی اور بولے۔ "شکر ہے کہ وہ خیریت سے ہیں۔ فارہ کی حالت کو بھی اب خطرے سے باہر کہا جا سکتا ہے۔"

"لیکن ہوا کیا؟ مجھے تو کچھ پتا نہیں..... کچھ بھی پتا نہیں۔ میں جب آپ کے گھر سے نکلا تو فارہ بھی بالکل ٹھیک تھی۔" وہ جیسے کراہ اٹھا۔

جواب میں انکل اختر نے مختصر الفاظ میں سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ اسے بتا دیا کہ اس کے نکلنے کے بعد وہ بے حد جذباتی ہو گئی۔ افشاں کی کار لے کر نکلی اور ایکسیڈنٹ کرا بیٹھی۔

"اب وہ کہاں ہے؟" شمیر نے بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں ہے مگر آپا ثمینہ اس لے کر پرسوں واپس پاکستان جا رہی ہیں۔ میں نے بہت کہا ہے کہ وہ اپنا ویزا بڑھوا لیں۔ یہاں فارہ کا علاج بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے مگر وہ بہت ڈری ہوئی ہیں۔ جلد از جلد واپس جانا چاہتی ہیں۔"

"آ..... آپ کہہ رہے ہیں کہ فارہ اب ٹھیک ہے..... مگر علاج.....؟"

انکل اختر چند لمحے کے لیے گم صم ہو گئے، تب دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ "میں تمہاری مزاج پرسی کے لیے آیا ہوں، تمہیں پریشان کرنے کے لیے نہیں۔ یہ باتیں پھر کسی دن۔"

"نہیں انکل..... اس طرح میں مزید پریشان ہو جاؤں گا۔ تین چار دن پہلے مجھے خالہ ثمینہ کی طرف سے ایک کال ملی تھی۔ وہ کال میرے دماغ میں کھب کر رہ گئی ہے..... میری تکلیف میں اضافہ کر رہی ہے۔"

پھر شمیر نے اختصار کے ساتھ اس کال کے بارے میں بھی انکل اختر کو بتا دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر ٹھہری ہوئی آواز میں

بولے۔ ''فارہ کی جان تو بچ گئی ہے، مگر سر کی چوٹ بہت شدید تھی۔ اس کے جسم کا دایاں حصہ مکمل مفلوج ہو گیا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کے لیے طویل علاج معالجے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی فارہ مکمل طور پر کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گی۔''

شامیر کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ انکل اختر نے چند لمحے کے توقف سے کہا۔ ''اور جس کال کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ آپا ثمینہ کی غلط فہمی کا نتیجہ تھی بلکہ میں اسے ان کی بے وقوفی ہی کہوں گا..... فارہ کی مکمل رپورٹ آنے کے بعد یہ قیافہ بالکل غلط ثابت ہوا کہ شاید کسی نے اس پر دست درازی کی ہے..... اس نے اپنے ساتھ جو کچھ بھی کیا، اپنی ہی ہیجانی کیفیت کے زیر اثر کیا۔''

شامیر اور انکل اختر کے درمیان کتنی ہی دیر تک ایک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ لگتا تھا کہ انکل وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں جو شامیر زبان پر نہیں لا رہا تھا پھر شامیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''انکل! میری طرف سے خالہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کیجیے گا۔''

☆☆☆

ناشتے کے بس دو تین نوالے بمشکل لے کر زویا نے پلیٹ ایک طرف کھسکا دی اور اخبار پر نظر دوڑانے لگی۔ اندرونی صفحے پر ایک خبر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ اس شخص کے بارے میں تھی جس نے ازدواجی حقوق کی آڑ میں تین سال تک اس کا استحصال کیا تھا..... اس کی زندگی کو عذاب بنائے رکھا تھا..... وہ اب آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ خبر میں لکھا تھا کہ شوہر پر قاتلانہ حملے کے جرم میں اور باوردی پولیس اہلکار کو شدید زخمی کرنے کے جرم میں اسے مجموعی طور پر کم از کم آٹھ سال اور زیادہ سے زیادہ تیرہ سال سزا کا ہونا یقینی نظر آتا ہے۔

وہ اطمینان کی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ آخر مکافاتِ عمل نے ایک بے لگام شخص کو نہایت سخت لگام ڈال ہی دی تھی۔

زویا اپنی بچی اور بہن حولیہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ابھی وہ چند دن مزید منظرِ عام پر آنا نہیں چاہتی تھی مگر اب اسپتال سے دور رہنے کے حوالے سے تو اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ شامیر کا چہرہ ہر وقت نگاہوں میں گھومتا تھا۔ اسپتال میں اس کی حالت بدستور خراب تھی۔ وہ ہر صورت اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا ہر پل جیسے انگاروں پر گزر رہا تھا۔ عینی کو ڈائپر وغیرہ لگا کر اور اس کے فیڈرز تیار کر کے اس نے اسے حولیہ کے حوالے کر دیا اور حجاب اوڑھ کر اسپتال جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اسپتال پہنچنے کے بعد بھی اسے شامیر تک پہنچنے کے لیے مزید دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ''کئی ''فارمیلیٹیز'' سے گزر کر اور اینٹی بیکٹیریل اسپرے وغیرہ کے بعد بالآخر وہ اس مختصر وارڈ میں داخل ہوئی جہاں شامیر زخم زخم حالت میں موجود تھا۔ اسے بستر پر اس حالت میں دیکھ کر زویا کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے پاس رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ شامیر کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے جسم سے تین چار ڈرپس ٹیوبز لگی ہوئی تھیں۔ اس کا دل رونے لگا۔ اس نے چند ہی سیکنڈ میں اسے سرتاپا دیکھ لیا۔ یوں لگتا تھا کہ شامیر کا بایاں ہاتھ کہنی سے نیچے جلنے سے محفوظ رہا ہے۔

زویا نے ہولے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''شومیر.....'' وہ نرمی سے بولی۔

شامیر کو یہی لگتا تھا جیسے اس کا تصور اسے پھر بھٹکا رہا ہے۔ اس کی سماعت اسے ایک ایسی آواز سنا رہی ہے جس کا وجود ہی نہیں۔ مگر جب آواز دوبارہ اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ سچ مچ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک براؤن شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اپنے کریم کلر حجاب کو اب اس نے دوپٹے کی شکل دے دی تھی۔ اس کے گھنے ریشمی بال چہرے پر ڈھلک کر ایک ''دلکش گڑھے'' کو نظروں سے اوجھل کر رہے تھے۔ وہ مسکرایا۔ ''میرے بازو پر چٹکی کاٹو تاکہ مجھے یقین ہو سکے کہ تم واقعی میرے سامنے بیٹھی ہو۔''

وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''شومیر! اب کیسی ہے طبیعت؟''

''ایک دو منٹ پہلے تک تو زیادہ اچھی نہیں تھی۔'' وہ بھی انگلش میں بولا۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ انشاء اللہ چند دن تک سب کچھ اچھا ہو جائے گا۔ میں نے ابھی سینئر ڈاکٹر تھامسن سے بھی بات کی ہے۔''

وہ چند لمحے تک خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مژگاں پر چند ستارے اٹکے ہوئے تھے۔

''شکریہ ادا کرنے آئی ہو؟''

''جو کچھ تم نے کیا شومیر! وہ شکریے سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور نہ کبھی ہو سکیں گے۔'' وہ بمشکل بول پائی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''مجھے بہت افسوس ہے کہ میں اتنے دن یہاں نہ

آسکی۔ تمہیں دیکھ سکی نہ نام کو اور نہ ماما کو۔ تم جانتے ہی ہو شومیر! حالات کیسے تھے۔"

رابرٹ کے بارے میں تو شامیر کو نام کی زبانی سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ نمرسی کے انجام کے بارے میں اسے بس اڑتی اڑتی سی بات معلوم ہوئی تھی۔ زویا نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح جرمن پولیس کے ہتھے چڑھا ہے۔ وہ اب پولیس کسٹڈی میں تھا اور فرینکفرٹ کے اسپتال میں اس کی جان بچانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔

نرس کی آمد ہوئی اور چند منٹ کے لیے زویا اور شامیر کی گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد زویا نے کہا۔ "شومیر! میں کو حولیہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں، ورنہ حولیہ بھی یہاں آنا چاہتی تھی۔ وہ تمہارے لیے بہت فکرمند ہے۔"

شامیر کے خشک ہونٹوں پر پھر ایک موہوم سی مسکراہٹ ابھری۔ "اور کون کون فکرمند ہے میرے لیے؟"

"میں..... جانتی ہوں شومیر! تم صرف میرے اور میں کے لیے دوبارہ لیونا برگ آئے تھے۔ تم نے مجھے ان حیوان نما انسانوں کے شکنجے سے نکالا مگر قسمت میں یہ سب کچھ بھی لکھا تھا جو ہوا ہے۔ میں سمجھتی ہوں میری اور میرے گھر والوں کی زندگی تمہاری مرہونِ منت ہے۔ کاش..... میں تمہاری یہ ساری تکلیف خود لے کر تمہاری جگہ اس بستر پر لیٹ سکتی۔"

"تم بس میرے لیے دعا کرو زویا۔ میرے لیے جو دعا تم کرو گی، مجھے یقین ہے وہ میرے لیے کارگر ہو گی۔"

زویا نے شامیر سے اس کی خالہ اور کزن فارہ کا حال احوال پوچھا۔ اس نے مختصراً بتایا کہ وہ پاکستان واپس چلی گئی ہیں۔ (خالہ اور فارہ کے جرمنی سے ساتھ آنے والی بات، شامیر نے زویا کو برج برگ میں بتائی تھی)

وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکتی تھی..... ملاقات کے لیے ایک مخصوص وقت تھا۔ بہرطور وہ جتنی دیر بھی رہی، شامیر کا حوصلہ بڑھاتی رہی اور امید افزا باتیں کرتی رہی۔ اس نے اسے اپنے ہاتھ سے سوپ پلایا اور دوا بھی کھلائی۔ وہ جانے لگی تو وہ یکدم اداس ہو گیا۔ زویا نے وعدہ کیا کہ وہ پرسوں پھر آئے گی اور وہ جب تک یہاں رہے گا، وہ وقتاً فوقتاً آتی رہے گی۔ شامیر نے کہا۔ "میری طرف سے میں کو پیار دینا۔"

زویا کے جانے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تو خیریت سے گزرے تب پھر شامیر کے زخموں میں تکلیف بڑھ گئی۔ اس کی ٹانگوں پر سے بہت سی ناکارہ جلد کاٹی جا چکی تھی۔ ابھی اس طرح کی شاید مزید سرجری بھی ہونا تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور ناج رکھنے والا شخص تھا۔ میڈیکل کے حوالے سے بھی اسے کافی معلومات حاصل تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح جھلس جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی۔ اسے اپنی تکلیف سے لڑنے کے لیے اپنے اندر قوتِ مزاحمت پیدا کرنا تھی اور طویل علاج کے لیے بھی تیار رہنا تھا۔

☆☆☆

کار الٹتے وقت زیادہ چوٹ نمرسی کے سر پر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بازو میں فریکچر ہوا تھا اور گھٹنوں پر زخم آئے تھے۔ شروع میں اس کی حالت مخدوش نظر آئی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایکسیڈنٹ کے وقت وہ گہرے نشے میں تھا۔ اسپتال میں چوتھے روز وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کے بازو پر کہنی سے نیچے پلاستر چڑھا دیا گیا تھا اور باقی زخموں کو بھی ٹریٹ کیا گیا تھا۔ اس علاج معالجے کے دوران میں وہ پولیس کے سخت محاصرے میں رہا تھا۔ وہ کوئی عام مجرم نہیں تھا۔ ایک وقت تھا کہ جرمنی میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ بے شک اب اس کا گروہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور وہ خود بھی جرمنی میں شاذ و نادر ہی قدم رکھتا تھا، مگر اس کی دہشت تو اب بھی برقرار تھی۔ وہ دو روز مزید ٹرنکولائزرز کے اثر میں رہا۔ اسی دوران میں اسے فرینکفرٹ سے دوبارہ برج ٹاؤن میں منتقل کر دیا گیا۔ قانونی معاملات کے لیے یہ ضروری تھا۔ جیل کے اندر ایک "سیل" میں اسے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا قریبی دوست انوپ سنگھ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ بے شک یہ بھی نمرسی کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا مگر جو اصل آگ نمرسی کے سینے میں بھڑک رہی تھی، اس کا تعلق زویا سے تھا..... اور اس کے پاکستانی "عاشق" شامیر سے تھا۔ وہ ان دونوں کے خون کی پیاس اپنے اندر اتنی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ گلے میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ اب بھی وہ لاک اپ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس آگ کے شعلوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ جانتا تھا، اب ان دونوں تک پہنچنا اس کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ وہ قانون کے شکنجے میں کسا گیا تھا اور اب نکلنا آسان نہیں تھا۔ یہاں جرمنی میں اب اس کے چند گنے چنے ساتھی ہی تھے اور ان سے رابطہ بھی ناممکن تھا۔

ایک بھاری آواز نے اسے چونکایا۔ یہ پولیس آفیسر ڈیوڈ تھا۔ "اٹھو نمرسی..... کورٹ میں تمہاری پیشی ہے۔"

نمرسی نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے اسے یوں گھورا جیسے کچا چبا جائے گا۔ شاید ان کے درمیان آہنی سلاخیں نہ ہوتیں تو وہ پولیس آفیسر پر جھپٹ ہی پڑتا۔

''تمہارے پاس تیار ہونے کے لیے بیس منٹ ہیں۔'' آفیسر نے دوبارہ کہا..... اور نمرسی کے کسی غصیلے فقرے سے بچنے کے لیے جلد واپس چلا گیا۔

وہ برج برگ ٹاؤن کا ایک بارشی دن تھا۔ ہوا بھی چل رہی تھی مگر ظاہر ہے کہ کورٹ کچہری کے کام تو رکنے والے نہیں ہوتے۔ دن گیارہ بجے کے لگ بھگ نمرسی کو کڑے پہرے میں پولیس وین تک پہنچایا گیا۔ سفر کے وقت قیدیوں کے ہاتھ اکثر پشت پر جکڑ دیے جاتے ہیں، مگر نمرسی کے ایک بازو پر چونکہ پلاستر چڑھا ہوا تھا لہٰذا اس کی ایک کلائی میں ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ اس ہتھکڑی کو وین کے اندر لگے ہوئے ایک آہنی کڑے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ وین میں چار پولیس اہلکار تھے جن میں سے تین مسلح تھے۔ ڈرائیور اس کے علاوہ تھا۔ یہ لوگ جانتے نہیں تھے کہ آج، جیل سے کورٹ تک کا سفر ان کی زندگی کا کٹھن ترین سفر ثابت ہونے والا ہے۔ جو کچھ ہوا غلطی غیر متوقع تھا۔ جرمنی کے اکثر شہروں اور قصبوں کی طرح برج برگ میں بھی سی سی ٹی وی کیمروں کی بھرمار تھی۔ یہ ہر طرح سے ایک سیف ٹاؤن تھا، جرائم کی شرح بھی بہت کم تھی مگر اس ''شرح'' کو تہ وبالا کرنے والا ایک شخص اس ٹاؤن میں موجود تھا اور وہ ماضی کا خطرناک گینگسٹر رونالڈ نمرسی تھا۔

سخت سردی، بارش اور دھند کی شدت کے سبب شاید نگرانی ونگہبانی کا ''لیول'' وہ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ پولیس کی وین ایک نسبتاً کم آباد ایریا سے گزر رہی تھی۔ دھند کی وجہ سے رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ سڑک کی دونوں جانب درخت تھے۔ جونہی وین ایک موڑ کاٹنے کے لیے آہستہ ہوئی، درختوں کے اندر سے چند ہیولے نمودار ہوئے۔ ان کے چہروں پر اسکائی ماسک تھے اور ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے وین کی دائیں جانب والے دونوں ٹائر ہی برسٹ کیے۔ وین لہرا کر ایک فون بوتھ سے جا ٹکرائی۔ پولیس آفیسر ڈیوڈ نے اپنا سروس پسٹل نکالا اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''جوابی فائر کرو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی فائر کرنے لگا۔

اس نے ایک نقاب پوش کو عین اس کے سینے میں گولی ماری، مگر اگلے ہی لمحے وہ خود بھی ہٹ ہو گیا۔ مخالف سمت سے آنے والی گولی سیدھی ڈیوڈ کے سر میں لگی۔ وہ اوندھے منہ نمرسی کے اوپر گرا، اس کا پسٹل نمرسی کے پاؤں سے ٹکرایا۔

دونوں طرف سے اندھا دھند گولیاں چلیں۔ کم از کم تین پولیس اہلکار نشانہ بن کر گاڑی کے اندر ہی لڑھک گئے۔ ڈرائیور بھی نشست پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ نقاب پوشوں کی تعداد پانچ کے قریب تھی۔ وہ حاوی نظر آ رہے تھے۔ تاہم اسی دوران میں ایک اور پولیس کار شور مچاتی موقع پر پہنچ گئی۔ اس کار سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ سخت ابتری کا فائدہ اٹھا کر نمرسی نے ڈیوڈ کے پسٹل سے اپنی ہتھکڑی کی زنجیر پر دو تین فائر کیے۔ زنجیر ٹوٹتے ہی وہ وین میں سے نکلا اور درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ بارش اور دھند کی چادر نے اسے اپنے اندر چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

فادر جوناتھن بھی برج برگ میں ہی تھا۔ چند روز پہلے ہونے والی آتش زدگی میں اس کی رہائش گاہ تو تقریباً ساری ہی جل گئی تھی، چرچ کا ایک تہائی حصہ بھی نذرِ آتش ہو گیا تھا۔ رہائشی حصے میں دو سسٹرز لقمۂ اجل بنی تھیں اور کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔ اب چرچ کے متاثرہ حصے سے ملبا وغیرہ ہٹائے جانے کا کام ہو رہا تھا۔ فادر جوناتھن غم سے نڈھال تھا۔ یہ غم دو طرح کا تھا۔

ایک تو چرچ میں ہونے والی آتش زدگی کے سبب اس کا لاڈلا بھانجا چل بسا تھا۔ اس کی عمر فقط دس سال تھی۔ ایک اور بڑا نقصان فادر کا یہ ہوا تھا کہ اس کی جمع پونجی کا ایک بڑا حصہ خاکستر ہو گیا تھا۔ یہ پونجی کرنسی نوٹوں کی شکل میں تھی، کم از کم ایک لاکھ یورو تھے۔ یہ وہ خطیر رقم تھی جو فادر نے چرچ کی آمدن اور چندے وغیرہ میں سے مختلف طریقوں سے بچائی تھی۔ اکثر قدامت پسند لوگوں کی طرح فادر جوناتھن بھی بینک کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ یہ رقم اس نے اسی عمارت میں چھپا رکھی تھی جو چرچ سے ملحقہ تھی اور فادر کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ چرچ اور رہائشی حصے کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ موجود تھا۔ یہیں پر لکڑی کے ایک چھوٹے سائز کے خالی تابوت میں یہ پورو رکھے گئے تھے۔ آتش زدگی کے بعد جب فادر اپنی اس جمع پونجی تک پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا کہ وہاں اب نوٹوں کی راکھ اور کچھ ادھ جلے نوٹوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ فادر کا دل جیسے اس کے سینے میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگا تھا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہی ہو جاتا مگر پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا تہ خانے سے باہر نکلا تھا اور اس کے مددگار اسے طبی امداد کے

لیے اسپتال لے گئے تھے۔

اب ان واقعات کو آٹھ دس روز گزر چکے تھے مگر فادر کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی روانی دوبارہ، پوری طرح بحال نہیں ہو سکی تھی۔ ہارٹ کا مریض وہ پہلے ہی تھا، اب بھانجے کی موت اور جمع پونجی کی بربادی نے اسے موت کے مزید قریب کر دیا تھا۔ یوں تو وہ چل پھر رہا تھا، مددگاروں کے ذریعے چرچ کی بحالی کا کام بھی کروا رہا تھا مگر اس کی سانسیں بحال نہیں تھیں۔ وہ کھینچ کر سانس لیتا تھا اور ہر سانس کے ساتھ ایک آواز سی پیدا ہوتی تھی۔

اب بھی وہ چرچ کے ایک نیم تاریک گوشے میں لکڑی کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی ''نن'' نیم گرم پانی سے اس کے پاؤں دھو رہی تھی، اچانک اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسکرین دیکھی اور چونک گیا۔ کوئی نیا نمبر تھا۔ پہلے تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر ہاتھ کے اشارے سے اس نے نن کو باہر جانے کا کہا اور کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے نمرسی کی بھاری بھرکم لیکن کراہتی ہوئی سی آواز آئی۔

''فادر! میں پولیس کی حراست سے نکل آیا ہوں، لیکن مشکل میں ہوں۔ وہ باسٹرڈ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ مجھے فوری پناہ کی ضرورت ہے..... اور اس وقت آپ سے بڑھ کر مجھے کون پناہ دے سکتا ہے۔''

پادری جوناتھن کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا مگر پھر فوراً ہی اس کی گدلی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ ''تم..... کہاں ہو... رونالڈو اور یہ فون کس کا ہے؟''

''یہ فون اسی پولیس مین کا ہے جو میرے ایک ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ میں نے اسی کا فون اور پسٹل لے لیا تھا اور میں چرچ سے قریباً ایک کلومیٹر دور ہوں۔ یہاں ایک ناکارہ ٹرک میں چھپا ہوا ہوں۔ یہاں اندھیرا ہے، اسٹریٹ لائٹ بھی کچھ فاصلے پر ہے۔ اس لیے ابھی تک ان کمینوں کی نظر سے بچا ہوا ہوں میں یہ فون بھی پھینک دوں گا ابھی۔''

فادر نے رونالڈو نمرسی سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں پھر اس سے کہا کہ وہ اپنے ایک کارندے کو گاڑی کے ساتھ بھیج رہا ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد نمرسی، فادر کے ساتھ چرچ کے بیسمنٹ میں موجود تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سفید پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور ہتھکڑی کے ساتھ اسٹیل کی چمکیلی زنجیر کا کوئی ایک فٹ لمبا ٹکڑا تھا۔ فرار کے دوران میں بھی کچھ تازہ چوٹیں اور خراشیں نمرسی کے چوڑے چکلے جسم پر آئی تھیں مگر اسے ان کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ وہ فادر کو اپنے بچ نکلنے کے واقعے کے متعلق تفصیل سے بتا چکا تھا۔ کچھ تفصیل ٹی وی کے ذریعے بھی منظرِ عام پر آ چکی تھی۔ تین پولیس اہلکار ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے تھے جبکہ نمرسی کو بچانے کے لیے پولیس وین پر حملہ کرنے والے پانچوں افراد موقع پر ہلاک کر دیے گئے تھے۔ نمرسی کے علاوہ صرف ایک حملہ آور کے بارے میں شبہے کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔

زخموں کی مرہم پٹی کے بعد نمرسی اب چرچ میں موجود قدیم شراب کی چسکیاں لے رہا تھا اور فادر سے کچھ روز پہلے ہونے والی آتش زدگی کے بارے میں بات کر رہا تھا (اپنے پانچ بندوں کی ہلاکت کا، اس کے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر محسوس نہیں ہوتا تھا)

''فادر! مجھے آپ کے بھانجے کی موت کا بہت افسوس ہے۔ اس کے علاوہ بھی جو نقصانات ہوئے ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں۔ میں اس حرامزادی رپورٹر کو چھوڑوں گا نہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ وہ بھاگ کر یہاں چرچ میں چھپتی، نہ آپ مجھے اس کے بارے میں اطلاع دیتے..... نہ میرے بندے یہاں پہنچتے اور یہ آگ والا واقعہ بھی نہ ہوتا۔'' نمرسی کی آنکھوں میں جیسے شعلے پھنکار رہے تھے۔

فادر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''رونالڈو! جو ہونا ہوتا ہے وہ اپنے مقررہ وقت پر ہو جاتا ہے لیکن تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ ان سارے نقصانات کا اصل سبب وہ زویا ہی بنی ہے۔''

''وہ..... اور اس کا وہ پاکستانی عاشق بھی۔'' نمرسی نے لقمہ دیا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ لڑکی خدا اور یسوع کی بنائی ہوئی ساری حدوں کو عبور کر رہی ہے۔ اپنے باپ کے مذہب سے ابھی تک چمٹی ہوئی ہے۔ اپنے شوہر سے بے وفائی بلکہ غداری کی اس نے..... ایک مسلمان سے ناجائز تعلق قائم کیے۔ اپنی بوڑھی والدہ کی علی الاعلان نافرمانیاں کیں..... بلکہ دوسری بہنوں کو بھی اس کی ترغیب دیتی رہی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے شاید جن کی اصلاح ممکن نہیں ہوتی اور تو یہ کا دروازہ بھی جن کے لیے بند ہو چکا ہوتا ہے.....'' فادر جوناتھن بات کرتے ہوئے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔

آنکھوں میں طیش کی چنگاریاں تھیں۔

اپنے ''گرو'' کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر نمرسی کے غیظ وغضب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے آتشیں لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس کو چھوڑا نہیں ہے فادر..... اور نہ اس کے عاشق کو۔ میں اسپتال میں اسی عاشق نامراد کی طرف گیا تھا مگر پولیس سے سامنا ہوگیا اور پھر گرفتاری ہوگئی.....''

''مگر اب وہاں بہت پہرا ہے۔'' فادر نے اس کی بات کاٹی۔ ''شاید تمہیں پتا چل ہی چکا ہو۔ زویا کا شوہر رابرٹ اس پاکستانی سے ملنے اسپتال گیا تھا۔ وہیں پر زویا کے دوسرے بوائے فرینڈ ٹام سے اس کا سامنا ہوگیا۔''

''ہاں فادر! یہ نیوز میں بھی سن چکا ہوں لیکن اس لعنتی زویا کے گرد تو پہرا نہیں ہے نا۔ اس تک تو پہنچا جا ہی سکتا ہے۔''

''مگر وہ اب لیوناہرگ میں نہیں ہے۔ آگ لگنے کے بعد سے اس کا اور حولیہ کا کچھ پتا نہیں۔ نہ ہی ان کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونوں بچی سمیت یہاں کہیں برج برگ میں ہی ہوں.....'' یکا یک فادر جوناتھن کی گفتگو کو بریک لگ گیا۔ فادر اور نمرسی نے کہیں قریب ہی ایک آہٹ سنی تھی جیسے کوئی چیز فرش پر گری ہو۔ ''ایک سیکنڈ..... میں ذرا دیکھوں۔'' فادر نے کہا پھر گھٹنوں پر زور دے کر کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ یہ اس تہ خانے کا خاص الخاص حصہ تھا۔ کسی ملازم، نن یا سسٹر کو اس جانب آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر یہ آہٹ کیسی تھی؟ فادر نے کمرے سے باہر نکل کر دائیں اور بائیں والی مختصر راہداری میں نگاہ دوڑائی۔ اسے ایک ہیولا سا راہداری کے خم کے پاس اوجھل ہوتا نظر آیا۔

''کون؟'' فادر نے پکار کر پوچھا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ اپنی حالت کے پیش نظر فادر کے لیے تیز چلنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے چار پانچ قدم تیزی سے اٹھائے، پھر رک گیا۔ واپس کمرے کی طرف پلٹا تو اسے ایک طاق میں رکھے شمع دان میں سے ایک موم بتی گری ہوئی نظر آئی۔ دیگر موم بتیوں کی طرح یہ بھی بجھی ہوئی تھی۔ وہ الجھن سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے کوئی یقیناً یہاں موجود تھا۔

☆☆☆

زویا وہیں ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ٹام کو فون کر کے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ زویا کے خصیلے شوہر رابرٹ نے ٹام کو جو زخم دیا تھا، وہ تیزی سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ بچی بھی، سویٹ کے ساتھ والے کمرے میں حولیہ کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ زویا بستر کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کل والے مناظر گھوم رہے تھے۔ کل وہ اسپتال میں شامیر سے مل کر آئی تھی، تب سے اس کا دل مسلسل غم کے گھیرے میں تھا۔ کل کی ملاقات میں اس نے گاہے بگاہے شامیر کی آنکھوں میں ایک سوال تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کئی بار زویا سے پوچھا تھا..... زویا! کیا اب واقعی کچھ بھی باقی نہیں۔ کیا واقعی تمہاری محبت میں وہ شدت نہیں تھی جو میری محبت میں تھی؟ پلیز زویا! ایک بار، صرف ایک بار کہہ دو کہ اس رات تم نے لیوناہرگ کے ریستوران میں جو کچھ کہا، وہ غلط تھا.....

زویا سسک اٹھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا۔ سارے دن کی بارش اور دھند کے بعد رات کا آسمان بالکل صاف تھا۔ شاہ بلوط اور پائن کے اونچے پیڑوں کے اوپر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ انہی بلند پیڑوں کے پیچھے، تین چار کلومیٹر کی دوری پر وہ اسپتال تھا جہاں شامیر برن یونٹ میں پڑا تھا۔

زویا اسے کیسے بتاتی کہ پچھلے چار سال میں اس کے دل پر کیا بیتتی رہی ہے۔ اس نے کیسے کیسے خود کو تھاما ہے اور سنبھالا ہے۔ اس کا جذبہ سمندر سے گہرا اور وسیع تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی کھل کر شامیر سے اپنے اس جذبے کا اظہار نہ کر سکی۔ مغربی معاشرے میں پروان چڑھنے کے باوجود وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ جذبات کے اظہار کے لیے زبان کو ذریعہ بنانا اس کے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا اور یہ تو پھر محبت کے جذبات تھے۔ چار سال پہلے کے ان سنہرے دنوں میں اس نے جب بھی شامیر کے کسی محبت بھرے سوال کا جواب دینا ہوتا تھا، وہ اس کے عقب میں چلی جاتی تھی۔ اس کی کمر یا کندھے پر اپنی انگلی سے کوئی لفظ لکھ دیتی تھی۔ ایسے میں اس کے گال شرم سے دہک اٹھتے تھے۔ اپنی اس کیفیت پر اس کا کوئی بس نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اس کی لبنانی سہیلی خشامہ کہا کرتی تھی۔ ''تم رہتی فرینکفرٹ میں ہو مگر تمہاری ساری جڑیں انڈیا اور پاکستان میں ہیں۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگی کہ اس نے سب سے پہلے شامیر کی محبت کا اقرار کب اور کس طرح کیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت بھی اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا۔

بس ایک خوبصورت اشارہ تھا جس نے ان دونوں کو ایک دم اظہار اور اقرار کے مرحلے سے گزار دیا تھا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ بچپن سے کسی کو اپنا جھوٹا کھلاتی تھی اور نہ کسی کا کھاتی تھی لیکن اس روز اس نے تفریحی پارک میں شامیر کی چھوٹی سی چرخی کو ٹھنڈک تھامی تھی اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر ایک گھونٹ بھرا تھا..... اور اس ایک گھونٹ میں وہ سب کچھ سما گیا تھا جو شاید سیکڑوں جملوں میں بھی نہ سما سکتا۔ یکا یک حولیہ کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

''کیا سوچ رہی ہو زویا؟'' وہ پتا نہیں کب کمرے سے نکل کر اس کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔

''کک..... کچھ نہیں..... ویسے ہی۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

حولیہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''زویا! وہ تمہیں بھول نہیں پایا اور شاید نہ کبھی بھول پائے گا۔''

زویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی کلائی کے بینگل کو گھماتی رہی۔

''زویا! اس نے ہمارے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ کوئی کسی کے لیے خود کو اس طرح خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ یہ اس کی غیر معمولی محبت کا ثبوت ہے۔ میں، جو ہمیشہ اس کے لیے منفی انداز میں سوچتی رہی ہوں، اب اس کے لیے بہت دکھی ہو رہی ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''میں جانتی ہوں حولیہ۔''

''وہ بہت تکلیف میں ہوگا زویا۔ اسے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں تم نے لیونا برگ میں اس سے بڑا سخت رویہ اپنایا تھا۔ اس رویے کے زخم بھی اس کی تکلیف میں اضافہ کر رہے ہوں گے۔''

''یہ رویہ اپنانے میں جو تکلیف مجھے ہوئی ہے، تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو حولیہ۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا..... اور سوچو تو اب بھی کوئی چارہ نہیں۔ کیا تم گمان بھی کر سکتی ہو کہ ماما، شامیر کے حوالے سے کبھی اپنی سوچ بدلیں گی؟ وہ زمین آسمان ایک کر دیں گی، اپنی جان دے دیں گی۔ جس کو تم شامیر کی قربانی کہہ رہی ہو، وہ کتنی بھی بڑی ہو، ماما کی ضد اور نفرت سے بڑی نہیں ہو سکتی اور پھر..... وہ بے رحم جانور نمرسی۔ وہ گرفتار ہی ہوا ہے نا..... مرا تو نہیں۔ میں جانتی ہوں اسے شامیر سے پرانی عداوت ہے۔ وہ اس کے خون کا پیاسا ہے۔ شامیر اور اس کے گھر والوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، وہ جرمنی سے نکل جائیں۔''

حولیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''زویا! ابھی تو یہ دعا کرنی چاہیے کہ اس کی حالت بہتر ہو اور وہ اپنے زخموں سے ابھر سکے۔''

زویا کے لب بے ساختہ ''آمین'' کہنے والے انداز میں ہلے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں سے نمی پونچھی۔ حولیہ کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ میں بھی یہاں برج برگ میں زیادہ دیر سلامتی سے رہ سکوں گی۔ مجھے دو چار ہفتوں میں ہی کہیں نہ کہیں نکلنا پڑے گا۔''

حولیہ نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''زویا! اگر تم نے نکلنا ہی ہے تو پھر..... پاکستان کیوں نہیں نکل جاتیں؟''

بڑی بہن کی بات سمجھتے ہوئے زویا کے چہرے پر کرب کے سائے پھیل گئے۔ اس نے بے حد بے قراری میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں حولیہ! تم کچھ نہیں سمجھتی ہو۔ جس طرح یہاں ہماری ماما موجود ہیں، وہاں پاکستان میں بھی ایک ماما موجود ہیں۔ میں انہیں امو خالہ کے نام سے جانتی ہوں۔ انہوں نے.....''

فون کی بیل نے زویا کو فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ دراصل آتش زدگی والے واقعے کے بعد اس نے اپنی ''فون سم'' بدل دی تھی۔ حولیہ نے بھی فون بند رکھا ہوا تھا۔ اس نئی سم کا نمبر زویا کی قریبی دوست نومسلم مسز حامدہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ لیونا برگ سے یہ حامدہ ہی کی کال تھی۔

وہ چھوٹتے ہی جرمن زبان میں بولیں۔ ''شکر ہے اللہ کا، تمہاری آواز تو سننے کو ملی۔ میں بہت زیادہ پریشان تھی تمہارے لیے..... میری جان! کہاں ہو تم؟''

زویا نے کہا۔ ''فی الحال آپ یہ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ جونہی حالات ذرا ٹھیک ہوئے میں خود آپ سے ملنے آؤں گی۔''

حامدہ کو چرچ کی آتش زدگی کے بارے میں سب معلوم تھا اور یہ بھی اندازہ تھا کہ اس سانحے کے پیچھے ان لوگوں کا عمل دخل ہے جنہوں نے لیونا برگ میں زویا اور اس کی بچی کو کئی روز یرغمال بنائے رکھا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''زویا! نیوز میں اور تبصروں میں پاکستانی شامیر کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ اس نے واقعی بڑی ہمت کا کام کیا ہے۔ بغیر فائر سوٹ کے وہ آگ میں گھسا اور جانیں

بچائیں۔ اللہ پاک اس کو صحت دے۔"

"بس دعا کیجیے۔" زویا اتنا ہی کہہ سکی۔

حامدہ نے کہا۔ "فادر جوناتھن کے حوالے سے بھی بڑا دکھ ہوا ہے۔ سنا ہے کہ رہائشی پورشن کے علاوہ چرچ کا ایک حصہ بھی جل گیا ہے..... اور پھر فادر کا دس سالہ بھانجا۔ انسانی جان کا تو کوئی بدل ہی نہیں ہوتا۔ فادر سے بات ہوئی ہے تمہاری؟"

"نہیں حامدہ! ابھی تک تو کوئی بات نہیں ہوئی لیکن اب سوچ رہی ہوں۔ کم از کم ان کے بھانجے کی بے وقت موت کا افسوس تو کرنا چاہیے۔"

"ضرور زویا! فادر سے لازمی رابطہ کرو۔ ویسے بھی علاقے میں ان کا اثر رسوخ ہے۔ اگر کچھ لوگ تمہارے اور شامیر کے درپے ہیں تو فادر اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔"

زویا نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی حامدہ سے یہ درخواست بھی کی کہ فی الحال وہ اس کا یہ فون نمبر کسی کو بھی نہیں دیں گی۔

حامدہ سے گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے فادر جوناتھن سے رابطہ کرنے کا سوچا، وہ ہر طرح سے ان پر اعتماد کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ انہیں اپنے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں بتا بھی دے گی تو اس میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ بہتری کی شکل ہی نکلے گی۔ وہ ان سے یہ درخواست بھی کر سکتی تھی کہ وہ ماما کی خیریت کی طرف سے باخبر رہیں۔ اس کی ماما اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اپنی بڑی بیٹی ایمہ کے پاس "برلن" جا چکی تھیں۔

اس نے فادر کا نمبر پریس کرنے کے لیے موبائل فون ہاتھ میں لیا مگر پھر کچھ سوچ کر واپس رکھ دیا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور وہ جانتی تھی کہ فادر جلدی سونے کے عادی ہیں۔

☆☆☆

زویا کی لبنانی سہیلی خشامہ نے پچھلے ڈھائی تین سال میں اپنی ایک الگ دنیا ہی بسائے رکھی تھی۔ وہ پہلے روشن خیال بنی تھی، پھر آزاد خیال اور پھر مادر پدر آزاد..... وہ بڑے ٹھسّے سے خود کو سیکس ورکر کہتی تھی..... اور اپنے اس "ورک" کے لیے پورے فرینکفرٹ میں دندناتی پھرتی تھی۔

پانی جب نشیب کی طرف بہتا ہے تو پھر اس کی رفتار میں تیزی آتی چلی جاتی ہے۔ خشامہ کی بے راہ روی بھی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ رفتار پکڑتی گئی تھی۔ نائٹ کلب، پب، ڈانس، شراب، منشیات، کون سی برائی تھی جو اس کی من مانیوں کے ریلے میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ اپنے سارے پرانے رشتے ناتے اس نے توڑ دیے تھے۔ اس کا ناتا اجنبی مردوں کی خرمستیوں، پھنکارتی سانسوں اور آتش ناکیوں سے یوں استوار ہوا تھا کہ باقی سب کچھ ناقابل ذکر ہو گیا تھا۔ انہی ناقابل ذکر چیزوں میں زویا بھی شامل تھی۔

ہاں، نشیب کا سفر تیز رفتار ہوتا ہے۔ خشامہ بھی پست سے پست تر ہوتی گئی۔ ایک موقع پر اس کے ایک شرابی عاشق نے اس پر تیزاب پھینکنے کی ناکام کوشش کی جس سے اس کا کندھا جل گیا تھا۔ ایک مرتبہ خود اس نے نشے میں دھت ہو کر اپنے ایک دلال کا جبڑا توڑ دیا اور دو ماہ جیل میں کاٹے اور تین چار ماہ پہلے تو حد ہی ہو گئی تھی۔ ایک آئرش پھڈے باز نے اسے بغیر معاوضے کے مسلسل اپنی "خدمات" پر مجبور کیا تو وہ طیش سے پھٹ پڑی۔ ان میں جھگڑا ہوا۔ خشامہ نے اسے ایسا زوردار دھکا دیا کہ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی توڑتا ہوا نیچے سڑک پر گرا۔ اس کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ خشامہ وہاں سے بھاگ گئی۔ اس کی خوش قسمتی کہ بعد ازاں پولیس تفتیش کا رخ کسی اور طرف ہو گیا اور وہ صاف بچ گئی۔

اور پھر یکا یک خشامہ میں ایک تبدیلی آئی تھی..... ایک حیران کن تبدیلی۔ اس کا دل اپنی تمام تر مصروفیات سے یکدم اچاٹ ہو گیا۔ اپنے ماحول سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ پہلے تو اس کے دل میں آئی کہ خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے مگر پھر خیالات کا دھارا، روحانی سہارے کی طرف چل پڑا۔ ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب چھوڑ کر چرچ سے وابستہ ہو جائے گی اور باقی زندگی اسی ڈھنگ سے گزارے گی۔ زویا اور آنٹی سارہ کے حوالے سے وہ فادر جوناتھن کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے فادر کا پتا چلایا۔ پھر وہ فرینکفرٹ کے رنگا رنگ شہر سے نکلی اور سیدھی برج برگ کے اس خوبصورت، پُرسکون قصبے میں پہنچ گئی۔ اب پچھلے قریباً ایک ماہ سے وہ یہیں چرچ میں فادر جوناتھن کے ساتھ بطور "نن" موجود تھی۔ اس نے باہر کی دنیا سے اپنا ناتا بالکل توڑ لیا تھا۔ فادر نے بھی اس کی کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے اسے چرچ کے تہ خانے تک ہی محدود کر دیا تھا۔ وہ وہیں دو دوسری ننوں کے ساتھ رہتی تھی..... چند روز پہلے جب چرچ میں ہنگامہ ہوا اور آتش زدگی والا واقعہ پیش آیا، تب بھی وہ چرچ کے تہ خانوں میں ہی تھی۔ خوش قسمتی سے تہ

خانوں کا وہ حصہ آگ اور دھوئیں سے محفوظ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ آتش زدگی کے اثرات وہاں تک پہنچتے، فائر فائٹرز نے چرچ کے اس حصے کو "آئسولیٹ" کر دیا تھا۔

کل تک یہاں خشامہ کے لیے سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ سنڈے کی سروس میں شریک ہونے کے لیے دس پندرہ منٹ کے لیے ہسپٹ سے باہر بھی نکلی تھی..... اور ہمیشہ کی طرح فادر کی اسپیچ سے متاثر بھی ہوئی تھی، مگر کل رات ایک عجیب واقعہ ہوا جس کی پیدا کی ہوئی ہلچل ابھی تک اس کے دل و دماغ میں موجود تھی۔ جس کمرے میں خشامہ مقیم تھی، اس کا بلب ٹمٹمانا شروع ہو گیا۔ اندازہ یہی تھا کہ وہ ابھی فیوز ہو جائے گا۔ خشامہ نے مقدس انجیل ایک طرف رکھی اور موم بتی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ مجبوراً تہ خانوں کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں جانے کی پابندی تھی۔ سینئر سسٹر بھی خاص حالات میں ہی اس طرف جا سکتی تھی۔ خشامہ لکڑی کے فرش پر دبے پاؤں چلتی ہوئی ایک راہداری میں داخل ہوئی۔ یہاں چرچ کی مخصوص خوشبو کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔

اچانک کچھ مدھم آوازوں نے خشامہ کے قدم پکڑ لیے۔ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے ایک کھڑکی کی جھری سے اندر جھانکا اور..... پھر..... دم بخود رہ گئی۔ ایک بلب کی روشنی میں..... اس نے جس خطرناک صورت شخص کو فادر کے ساتھ بیٹھے دیکھا وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ کسی وقت جرمنی میں انڈر ورلڈ کے ایک خطرناک گروہ کا باس رہا تھا۔ اب بھی اس کی دہشت کچھ کم نہیں تھی۔ یہ شخص یہاں فادر کے ساتھ کیوں موجود تھا؟ اندر الیکٹرک ہیٹر روشن تھا۔ وہاں ہونے والی گفتگو کی مدھم آواز خشامہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔

مدقوق چہرہ فادر جوناتھن نے کھینچ کھینچ کر سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ ان لوگوں میں سے ہے شاید، جن کی اصلاح ممکن نہیں ہوتی اور..... توبہ کا دروازہ بھی جن کے لیے بند ہو چکا ہوتا ہے۔"

رونالڈو نمرسی..... ہاں، وہ رونالڈو نمرسی ہی تھا۔ وہ طیش میں پھنکارا۔ "میں نے اس کو چھوڑنا نہیں ہے فادر!..... اور نہ اس کے عاشق کو۔ میں اسپتال میں اسی عاشق نامراد کی طرف گیا تھا مگر پولیس سے سامنا ہو گیا اور پھر گرفتاری ہو گئی....."

"مگر اب وہاں سخت پہرا ہے۔" فادر نے اس کی بات کاٹی۔ "شاید تمہیں پتا چل ہی گیا ہو گا۔ زویا کا شوہر اس پاکستانی سے ملنے اسپتال گیا تھا، وہیں پر....."

فادر اپنی ہانپی ہوئی سانسوں کے ساتھ کھانسنے لگا۔ باقی کے الفاظ خشامہ کی سمجھ میں نہیں آئے۔ نمرسی کے ایک بازو پر سفید پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ کلائی میں اسٹیل کی چھوٹی سی زنجیر چمک رہی تھی، جو یقیناً ہینڈکف کی تھی۔ خشامہ کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی تھی۔ اس نے زویا کا نام سنا تھا اور اس کے شوہر رابرٹ کا بھی۔ یہ کس زویا اور رابرٹ کی بات ہو رہی تھی اور یہ کس پاکستانی کا ذکر تھا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے دراز قد، وجیہہ شامیر کا چہرہ گھوم گیا۔ کچھ ہی ہفتے پہلے فرینکفرٹ میں اس سے خشامہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں خشامہ نے زویا کی محبت کی جوت جلتے دیکھی تھی۔ وہ اسی کے لیے پھر یہاں آیا تھا..... اور اب..... نمرسی جیسا خطرناک قاتل اس کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟

مزید وضاحت سے سننے کے لیے خشامہ نے اپنا کان کھڑکی سے لگانا چاہا تو اس کے گلے میں جھولتی ہوئی دھاتی صلیب کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکرائی۔ ہلکی سی آہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اندر کمرے میں نمرسی اور فادر کو چونکتے دیکھا۔ پھر فادر گھٹنوں پر زور دے کر اٹھے۔ خشامہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے قریب ہی موجود شمع دان میں سے ایک شمع لی اور تیزی سے واپس آ گئی۔

اب وہ کل سے شدید الجھن میں تھی۔ ایسے یوں لگ رہا تھا کہ فادر پر جو اندھا دھند اعتماد وہ کر رہی تھی، وہ بھی ڈانوں ڈول سا ہو گیا ہے۔ زویا اور شامیر کا تصور بار بار اس کے ذہن کو اتھل پتھل کر دیتا تھا۔

اچانک ایک آواز پر وہ چونکی۔ یہ کراہتی ہوئی آواز فادر کی تھی۔ وہ اسے بلا رہے تھے۔ شاید سینئر سسٹر اور خدمت گار اگاتھا تہ خانے میں موجود نہیں تھی۔ (اگاتھا چونکہ باقاعدہ نن نہیں تھی، اس لیے وہ چرچ سے باہر بھی چلی جاتی تھی) خشامہ جلدی سے فادر کی آرام گاہ میں پہنچی۔ ان کی سانس بے حد الجھی ہوئی تھی۔ ہر سانس کے ساتھ ایک تکلیف دہ آواز کمرے میں گونجتی تھی۔ انہوں نے لرزاں ہاتھ سے دواؤں والے پلاسٹک بیگ کے لیے اشارہ کیا۔ خشامہ نے بیگ کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ فادر نے ہاتھ سے چھوٹے بغلی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کمرے میں پہنچی۔ فادر کے ذاتی استعمال کی اکثر اشیاء یہیں ایک منقش الماری میں رکھی رہتی تھیں۔ اس نے ایک دراز کھولی تو اس میں ریگزین کا ایک

تھیلا نظر آیا۔ اس میں بہت سے کرنسی نوٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ ہزاروں ہی پورو ہوں گے جو جل کر بیکار ہو چکے تھے۔ یہ آتش زدگی کے مختلف اثرات ہی تھے جنہوں نے فادر کو اس قابلِ رحم حالت تک پہنچایا تھا۔ ایک دراز میں سے اسے دواؤں والا چھوٹا پلاسٹک بیگ مل گیا۔ اس نے فادر کو دوا دی۔ ان ہیلر وغیرہ استعمال کرایا۔ چار پانچ منٹ بعد طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ خشامہ نے اپنا سفید لبادہ سمیٹا اور پلنگ کی پائینتی کی طرف بیٹھ کر فادر کی ٹانگیں دبانے لگی۔ پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فادر سے زویا وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھے اور اپنے شبہات رفع کرے۔ نمرسی کے حوالے سے کچھ پوچھنا تو اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

اچانک فادر کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ فادر نے لرزتے ہاتھوں سے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے جو آواز کانوں میں پڑی، اس نے فادر کے مدقوق چہرے پر ہیجانی کیفیت پیدا کردی۔

''تت..... تم..... کہاں تھی زویا..... تمہارا نمبر بھی بند جا رہا تھا..... میں..... بہت پریشان تھا۔''

خشامہ کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسی دوران میں فادر کو اپنے پاس خشامہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے خشامہ کو باہر نکلنے کا کہا۔ وہ فوراً باہر آ گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے ابھی فادر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھرتے دیکھی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس اعلان کر رہی تھی کہ فادر جوناتھن وہ نہیں ہیں، جو وہ اب تک انہیں سمجھتی رہی ہے..... اور فادر ہی کی وجہ سے زویا کو کوئی شدید قسم کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

کمرے سے نکل کر اس نے دروازے سے کان لگانے کی کوشش کی مگر باقی دونوں NUNS بھی آس پاس موجود تھیں۔ یہ کوشش خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ دھڑکن میں اس اضافے کی ایک وجہ یہاں ماضی کے خطرناک ڈان رونالڈو نمرسی کی موجودگی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چار سال پہلے میونخ میں زویا کی فیملی جس سنگین واردات کا شکار ہوئی، اس کے پیچھے رونالڈو کا ہاتھ ہی تھا۔ کیا فادر جوناتھن اور رونالڈو نمرسی، بے چاری زویا کو اس بات کی سزا دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے مذہب سے جڑی رہی..... اور اس نے ایک مسلمان نوجوان سے محبت کی؟

جب سے خشامہ کی کایا کلپ ہوئی تھی، اس کا زاویۂ نگاہ بھی پوری طرح بدل گیا تھا۔ جن لوگوں کے بارے میں وہ بہت منفی انداز میں سوچتی تھی، ان کے بارے میں مثبت انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اب اکثر اسے زویا کی یاد بھی آتی تھی۔ اس کی وہ ساری اچھی باتیں اور عادتیں جو ایک ''روم میٹ'' کے طور پر اس نے دیکھی اور سنی تھیں۔ زویا کی سحر انگیز شخصیت، اس کا ایثار، قربانی اور خدمات کا جذبہ، اس کا بے مثال تحمل اور پیار۔ باطنی کے علاوہ وہ ظاہری خوبیوں کے حوالے سے بھی منفرد تھی۔ دل میں اترتی ہوئی اس کی مسکراہٹ سب سے جدا تھی۔ اس مسکراہٹ کو اس کے گال میں پڑنے والا دلکش گڑھا اور حسین بنا دیتا تھا اور پھر بات کرتے ہوئے اس کا اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانتوں میں دبانا اور چھوڑنا، شرگیں لمحوں میں اس کے عارض کا سرخ ہونا اور حیا کے رنگ چہرے پر بکھرنا..... اسے سب کچھ یاد آنے لگا..... تو کیا وہی زویا، نمرسی کی وحشت کا شکار ہوتے تو نہیں جا رہی تھی؟ وہ کانپ گئی۔

☆☆☆

کل شام کے بعد زویا نے فادر جوناتھن کو فون کر کے اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا اور ان کے بھانجے کی حادثاتی موت پر دلی افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ حولیہ نے بھی فادر سے مختصراً بات کی تھی..... اور فادر کو بتایا تھا کہ حملہ آوروں کے خوف کی وجہ سے وہ دونوں، آتش زدگی کے بعد فوراً روپوش ہو گئیں۔

فادر جوناتھن نے دونوں بہنوں کو تسلی دی اور کہا کہ نمرسی اور زویا کا شوہر رابرٹ دونوں گرفتار ہو چکے ہیں پھر پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ زویا نے فادر کو اس ہوٹل کا بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا تھا، تاہم اتنی گزارش کی تھی کہ وہ ابھی دو چار دن یہیں پر رہنا چاہتی ہیں اور کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتیں۔

کہنے کو تو زویا نے فادر سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شامیر سے دور کیسے رہے۔ اسے اسپتال گئے دو روز ہو چکے تھے، وہ اب پھر جانا چاہ رہی تھی۔ شامیر کی حالت کا خیال کر کے اس کا دل کسی بے کل پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔

''کہاں کھو گئی ہو؟'' بڑی بہن ڈاکٹر حولیہ نے اپنے زخمی بازو کی بینڈیج خود ہی کرتے ہوئے کہا۔

زویا نے کھڑکیوں سے باہر دور تک پھیلے ہوئے برج

برگ ٹاؤن کو دیکھا۔ کل کے صاف موسم کے بعد آج پھر دھند اتر آئی تھی، سردی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ برج برگ کی خوبصورت سڑکوں پر ٹریفک ویسے ہی کم ہوتا تھا اور ابر آلود موسم میں مزید کم ہوجاتا تھا۔ دھندلی شام تیزی سے رات کی طرف بڑھ رہی تھی۔ روشنیاں، آن ہوکر دھند سے نبرد آزما ہوگئی تھیں۔

زویا کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''حولیہ! ہم کیوں کچھ لمحوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں..... اور پچھتاوے دے جاتے ہیں۔ چار سال پہلے ماما نے میرے اور شامیر کے درمیان ایک غلط فہمی کو جنم دیا اور وہ غلط فہمی بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھی کہ سب کچھ ہی نگل گئی۔ وہ یقین دلاتا رہا کہ اس نے ماما پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور میں مان کر بھی نہ مان سکی۔''

''محبت کی قسمت ایسی ہی ہے زویا! اور اس کی کہانی بھی تقریباً ایک ہی ہے..... محبت نے ''محبت کرنے والوں'' کا خون پینا ہی پینا ہوتا ہے۔ کوئی اداس دوپہر یا شام ایسی آنی ہی آنی ہوتی ہے جس میں بہتے آنسوؤں کے ساتھ الوداعی کلمے کہنا پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھنے کا وعدہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کی نشانیاں واپس کی جاتی ہیں اور نشانیاں بھی تو بس ملتی جلتی ہی ہوتی ہیں۔ کچھ کرسمس یا عید کارڈ..... ایک دوسرے کو دیے ہوئے Ring، کچھ تفریح گاہوں میں اتاری ہوئی تصویریں، کچھ ٹوٹے ہوئے بٹن اور کچھ چاکلیٹوں کے سنبھالے ہوئے ریپر.....''

''اچھا چپ کرو حولیہ!'' زویا نے جز بز ہوکر کہا۔ ''ایسی باتوں سے دل گھبرانا شروع ہوجاتا ہے۔ تم ذرا عینی کو دیکھ لو۔ میں اسپتال فون کرکے شامیر کی خیریت پوچھ لوں۔''

''کہتی ہو تو آج میں اسپتال کا چکر لگا لیتی ہوں۔ حجاب کی سہولت تو ہے ہی۔''

''نہیں حولیہ، کل چلی جانا۔'' زویا نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

رات بہت سرد تھی۔ تہ خانے میں تو پتا نہیں چلتا تھا تاہم سسٹر اگاتھا نے بتایا تھا کہ مطلع ابر آلود ہے اور دھند بھی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ دس بجے کا عمل تھا۔ نجانے آج کیوں خشامہ کی چھٹی حس خبردار کررہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے..... کچھ ایسا جو نہیں ہونا چاہیے..... ہرگز نہیں۔

وہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور اپنے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ چرچ کے گھنٹے نے ایک بار ''ٹن'' کی گونج دار آواز پیدا کی۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے دس بجے ہیں۔ چرچ کے ان تہ خانوں میں مکمل خاموشی تھی۔ سارا دن ٹھک ٹھک کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ یہ آوازیں اس تعمیری کام کا نتیجہ تھیں جو چرچ کی بحالی کے لیے کیا جارہا تھا، اب ان آوازوں کی غیر موجودگی میں یہاں کا سناٹا اور بھی گمبھیر محسوس ہوتا تھا۔ ایک قریبی کمرے سے سینئر سسٹر اگاتھا کے خراٹوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ خشامہ کی ساتھی نن بھی سو چکی تھی۔

دل کی بے چینی سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ خشامہ کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ عجیب چمک آجاتی تھی جو اس نے کل فادر جوناتھن کی آنکھوں میں کوندتے ہوئے دیکھی تھی۔ بالآخر خشامہ بستر کی حرارت کو ایک طرف دھکیل کر اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی بیسمنٹ کے ممنوعہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔ آہستگی سے ایک آبنوسی دروازہ کھول کر وہ ایک نیم روشن راہداری میں آگے بڑھی۔ بی بی مریم کے مجسموں کے پاس سے گزر کر وہ اس کمرے تک پہنچی جہاں اس نے دو دن پہلے نمرسی کو دیکھا تھا۔ یکا یک ایک آواز خشامہ کے کانوں تک پہنچی۔ یہ دبنگ آواز یقیناً نمرسی ہی کی تھی۔ ''آؤ..... آؤ خوش آمدید۔ میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔''

خشامہ سرتاپا لرز گئی لیکن پھر اس پر یہ کھلا کہ یہ ''ویلکم'' کے الفاظ کسی اور کے لیے کہے گئے ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو ابھی ابھی ایمرجنسی والے زینوں سے اس تہ خانے میں اترا ہے۔ ''معاف کرنا باس! تھوڑی دیر ہوگئی۔ دھند بہت تھی۔'' نووارد کی آواز ابھری۔

''کوئی بات نہیں۔ ابھی کافی وقت ہے۔'' نمرسی نے کہا، وہ نشے میں لگتا تھا۔

خشامہ اندر جھانکنے کی سعی کرنے لگی، مگر کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ وہ گھوم کر دوسری طرف گئی اور یہاں ایک کی ہول نے اس کی کچھ نہ کچھ مدد کردی۔

اس نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ چوڑے چکلے رونالڈو نمرسی کی پشت نظر آئی۔ وہ سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے سامنے جیکٹ میں ہی ملبوس ایک اور شخص کھڑا تھا۔ یہ بھی جرمن ہی تھا۔ یہ دراز قد شخص غالباً موٹر سائیکل پر یہاں پہنچا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہیلمٹ تھا۔ اس شخص کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز، چند روز پہلے کے زخم کا ایک بدنما نشان تھا۔ اس نشان نے نہ صرف اس کی ایک آنکھ کو بے

برگ ٹاؤن کو دیکھا۔ کل کے صاف موسم کے بعد آج پھر دھند اتر آئی تھی، سردی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ برج برگ کی خوبصورت سڑکوں پر ٹریفک ویسے ہی کم ہوتا تھا اور ابر آلود موسم میں مزید کم ہوجاتا تھا۔ دھندلی شام تیزی سے رات کی طرف بڑھ رہی تھی۔ روشنیاں، آن ہوکر دھند سے نبرد آزما ہوگئی تھیں۔

زویا کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''حولیہ! ہم کیوں کچھ لمحوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں..... اور پچھتاوے دے جاتے ہیں۔ چار سال پہلے ماما نے میرے اور شامیر کے درمیان ایک غلط فہمی کو جنم دیا اور وہ غلط فہمی بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھی کہ سب کچھ ہی نگل گئی۔ وہ یقین دلاتا رہا کہ اس نے ماما پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور میں مان کر بھی نہ مان سکی۔''

''محبت کی قسمت ایسی ہی ہے زویا! اور اس کی کہانی بھی تقریباً ایک ہی ہے..... محبت نے ''محبت کرنے والوں'' کا خون پینا ہی پیا ہوتا ہے۔ کوئی اداس دوپہر یا شام ایسی آنی ہی آنی ہوتی ہے جس میں بہتے آنسوؤں کے ساتھ الوداعی کلمے کہنا پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھنے کا وعدہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کی نشانیاں واپس کی جاتی ہیں اور نشانیاں بھی تو بس ملتی جلتی ہی ہوتی ہیں۔ کچھ کرسمس یا عید کارڈ..... ایک دوسرے کو دیے ہوئے Ring، کچھ تفریح گاہوں میں اتاری ہوئی تصویریں، کچھ ٹوٹے ہوئے بٹن اور کچھ چاکلیٹوں کے سنبھالے ہوئے ریپر.....''

''اچھا چپ کرو حولیہ!'' زویا نے جز بز ہوکر کہا۔ ''ایسی باتوں سے دل گھبرانا شروع ہوجاتا ہے۔ تم ذرا عینی کو دیکھ لو۔ میں اسپتال فون کرکے شامیر کی خیریت پوچھ لوں۔''

''کہتی ہو تو آج میں اسپتال کا چکر لگا لیتی ہوں۔ حجاب کی سہولت تو ہے ہی۔''

''نہیں حولیہ، کل چلی جانا۔'' زویا نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

رات بہت سرد تھی۔ تہ خانے میں تو پتا نہیں چلتا تھا تاہم سسٹر اگاتھا نے بتایا تھا کہ مطلع ابر آلود ہے اور دھند بھی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ دس بجے کا عمل تھا۔ نجانے آج کیوں خشامہ کی چھٹی حس خبردار کررہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے..... کچھ ایسا جو نہیں ہونا چاہیے..... ہرگز نہیں۔

وہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور اپنے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ چرچ کے گھنٹے نے ایک بار ''ٹن'' کی گونج دار آواز پیدا کی۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے دس بجے ہیں۔ چرچ کے ان تہ خانوں میں مکمل خاموشی تھی۔ سارا دن ٹھک ٹھک کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ یہ آوازیں اس تعمیری کام کا نتیجہ تھیں جو چرچ کی بحالی کے لیے کیا جارہا تھا، اب ان آوازوں کی غیر موجودگی میں یہاں کا سناٹا اور بھی گمبھیر محسوس ہوتا تھا۔ ایک قریبی کمرے سے سینئر سسٹر اگاتھا کے خراٹوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ خشامہ کی ساتھی نن بھی سو چکی تھی۔

دل کی بے چینی سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ خشامہ کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ عجیب چمک آجاتی تھی جو اس نے کل فادر جوناتھن کی آنکھوں میں کوندتے ہوئے دیکھی تھی۔ بالآخر خشامہ بستر کی حرارت کو ایک طرف دھکیل کر اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی بیسمنٹ کے ممنوعہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔ آہستگی سے ایک آبنوسی دروازہ کھول کر وہ ایک نیم روشن راہداری میں آگے بڑھی۔ بی بی مریم کے مجسموں کے پاس سے گزر کر وہ اس کمرے تک پہنچی جہاں اس نے دو دن پہلے نمرسی کو دیکھا تھا۔ یکا یک ایک آواز خشامہ کے کانوں تک پہنچی۔ یہ دبنگ آواز یقیناً نمرسی ہی کی تھی۔ ''آؤ..... آؤ خوش آمدید۔ میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔''

خشامہ سرتاپا لرز گئی لیکن پھر اس پر یہ کھلا کہ یہ ''ویلکم'' کے الفاظ کسی اور کے لیے کہے گئے ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو ابھی ابھی ایمرجنسی والے زینوں سے اس تہ خانے میں اترا ہے۔ ''معاف کرنا باس! تھوڑی دیر ہوگئی۔ دھند بہت تھی۔'' نووارد کی آواز ابھری۔

''کوئی بات نہیں۔ ابھی کافی وقت ہے۔'' نمرسی نے کہا، وہ نشے میں لگتا تھا۔

خشامہ اندر جھانکنے کی سعی کرنے لگی، مگر کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ وہ گھوم کر دوسری طرف گئی اور یہاں ایک کی ہول نے اس کی کچھ نہ کچھ مدد کردی۔

اس نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ چوڑے چکلے رونالڈو نمرسی کی پشت نظر آئی۔ وہ سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے سامنے جیکٹ میں ہی ملبوس ایک اور شخص کھڑا تھا۔ یہ بھی جرمن ہی تھا۔ یہ دراز قد شخص غالباً موٹر سائیکل پر یہاں پہنچا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہیلمٹ تھا۔ اس شخص کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز، چند روز پہلے کے زخم کا ایک بدنما نشان تھا۔ اس نشان نے نہ صرف اس کی ایک آنکھ کو بے

پہنچے۔ فادر کے سامنے گواہی دے۔ اسے بتائے کہ یہ لوگ کیا کرنے جا رہے تھے، کیوں کرنے جا رہے تھے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران میں نرسی اٹھا اور اس نے الماری میں سے، سیاہ کیپل والی شراب کی نئی بوتل نکال لی۔ غالباً باہر سخت سردی میں جانے سے پہلے وہ خود کو پوری طرح گرم کرنا چاہتا تھا۔ اندر گلاسوں کی کھن کھناہٹ سنائی دینے لگی۔ نرسی کی کلائی میں آج ہتھکڑی کی زنجیر کا ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا..... دفعتاً خشامہ اپنی جگہ سے پلٹی اور تیزی سے چلتی ہوئی تہ خانے کے اس خاص حصے سے نکل آئی۔ پھر ایک راہداری میں ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی وہ اس کمرے تک پہنچی جو فادر کی آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سخت بے تابی کے عالم میں اس نے دروازے پر دستک دی..... دو بار..... تین بار..... اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"فادر! دروازہ کھولیں..... فادر!" وہ کراہ اٹھی اور پھر دستک دینے لگی۔

اسی اثناء میں فربہ اندام سینئر سسٹر اگاتھا گھبرائی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ترش لہجے میں خشامہ سے پوچھا۔

"نف..... فادر سے بات کرنی ہے۔" وہ ہانپی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔

"کیا بات کرنی ہے اس وقت..... اور تم دیکھ نہیں رہی ہو، دروازہ باہر سے بند ہے۔"

خشامہ نے پہلی مرتبہ دھیان سے دیکھا اور اسے پتا چلا کہ دروازے کو باہر سے چٹخنی چڑھی ہوئی ہے۔

"کہاں ہیں فادر..... اور..... اس وقت کہاں گئے ہیں؟"

"تو انہیں تم سے پوچھ کر جانا چاہیے تھا؟" اگاتھا پھنکاری۔ پھر ذرا سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "صبح لیونا برگ میں کسی عقیدت مند کی تدفین ہے۔ انہیں وہاں جانا پڑا ہے، دوپہر تک لوٹیں گے۔ تمہیں ان سے کیا کام ہے؟"

خشامہ سے کوئی اور بات بن نہیں پڑی۔ اس نے سسٹر اگاتھا کو بتایا کہ اسے رات کو کمرے میں ڈر لگتا ہے۔ وہ فادر سے دعا کرانا چاہتی تھی۔

اگاتھا اس کے جواب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی۔ غصے سے بولی۔ "چلو جاؤ، اپنے کمرے میں..... اور تمہاری صلیب کہاں ہے، اسے گلے میں ڈالو۔"

ایک دو مزید ہدایات دینے کے بعد اس نے خشامہ کو واپس کمرے میں بھیج دیا۔

خشامہ کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ زویا اور اس کی بڑی بہن حولیہ یہیں قصبے کے کسی ہوٹل کے کمرے میں ہیں اور آج رات ان کے ساتھ کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔

اسے وہ سب کچھ یاد آ رہا تھا جو کبھی اس کے اور زویا کے درمیان ہوا تھا۔ وہ زویا کی خوبیوں کی ہمیشہ معترف رہی تھی مگر جہاں کہیں مفاد کی بات آئی تھی، اکثر اس کی طرف سے زویا کے ساتھ زیادتی ہی ہوئی تھی اور وہ خدا کی بندی ایسی تھی کہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کبھی شکوہ زبان پر نہیں لائی تھی۔ خشامہ کو وہ اہم ترین واقعہ بھی یاد تھا جس نے زویا اور شامیر کے درمیان فاصلے پیدا کیے تھے اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔ تقریباً چار برس پہلے کی وہ شام خشامہ کو یاد تھی جب زویا کی ماما نے شامیر پر الزام لگایا تھا کہ اس نے طیش میں آ کر ان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ تب خشامہ اس جھوٹے الزام کی گواہ بنی تھی اور اس نے بھی زویا کے سامنے کہا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔ ان لمحوں میں اسے زویا کے چہرے پر جو ایک جانکاہ زردی پھیلتے ہوئے نظر آئی تھی، وہ آج بھی اسے یاد تھی۔ چند ہی لمحوں میں ایسی بہت سی باتیں خشامہ کے ذہن میں کرب کی لہریں جگا کر گزر گئیں۔

کسی نے جیسے اس کے اندر سے پکار کر کہا۔ "خشامہ! تم نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہی اس نئی زندگی کو اپنایا ہے نا۔ اس سے بہتر کفارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس بے گناہ کو، اس شیشے جیسی شفاف اور نازک دوست کو ایک بدترین حادثے سے بچانے کی کوشش کرو۔ کسی بھی طرح، کسی بھی حیلے سے۔"

قریبی کمرے سے سسٹر اگاتھا کے مدھم خراٹے ایک بار پھر سنائی دینے لگے تھے۔ وہ اٹھی اور بے تابی کے ساتھ کمرے میں چکرانے لگی۔

سامنے ہی دیوار پر فادر جوناتھن کی فریم شدہ تصویر نظر آ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے یہ تصویر اسے گھور رہی ہے۔ فادر کی تصوراتی آواز اس کی سماعت میں گونجی..... یہ کیا سوچ رہی ہو..... یہ کیا کرنا چاہ رہی ہو؟ نافرمانی کر رہی ہو..... گناہ کی مرتکب ہو رہی ہو.....؟

خشامہ نے تصویر اتاری اور اوندھی کر کے کارنس پر رکھ دی۔

(جاری ہے)

چھٹا اور آخری حصہ

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلابی جاڑوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضائوں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو..... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل



خشامہ چرچ سے نکل کر سامنے کھڑی گاڑی میں گھس گئی تھی اور اب وہ گھٹری سی بنی گاڑی کی نشستوں کے عقبی خلا میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی تیز سانسیں اس کے اپنے ہی کانوں میں گونجتی رہیں۔ گاڑی کے اندر سردی تھی۔ شیشے دھندلائے ہوئے تھے۔ چرچ کا گھڑیال رات بارہ بجے کا وقت بتانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ بس کسی وقت کسی شب بیدار پرندے کی مدھم سی آواز گاڑی کے مختصر خلا تک پہنچ جاتی تھی۔

اچانک خشامہ کو اپنی کمر کے نیچے کسی سخت شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے تھوڑی سی کروٹ بدلی اور ہاتھ عقب میں لے جا کر اس چیز کو ٹٹولا..... وہ حیران ہوئی۔ یہ ایک رائفل تھی۔ اس نے دیکھا، چھوٹی نال والی یہ آٹومیٹک رائفل خالی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک خم دار میگزین اٹیچ تھا جو یقیناً لوڈڈ تھا۔ آوارہ بدمعاش مردوں کی صحبت میں رہ کر خشامہ کو اسلحے کی تھوڑی بہت پہچان بھی ہو گئی تھی۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ وہ موقع پڑنے پر اس رائفل کا ٹریگر دبا سکتی تھی۔ رائفل کی موجودگی سے اس کے دل میں جہاں ایک طرح کا خوف پیدا ہوا، وہیں اس نے ایک طرح کی تسلی بھی محسوس کی..... رائفل فلالین کے ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی لرزاں انگلی کے ساتھ ٹریگر پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ رائفل کا وہ کھٹکا دبا ہوا ہے جسے سیفٹی کیچ کہا جاتا ہے۔ اس نے اس سیفٹی کیچ کو چیک کیا۔ وہ یہ سب کچھ احتیاط کے طور پر کر رہی تھی۔ نمرسی یا اس کے ساتھی کے ساتھ الجھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ یہی تھی کہ وہ اس اسٹیٹ کار کے ذریعے نمرسی اور اس کے ساتھی کے ہمراہ ہی چرچ کے احاطے سے نکل جائے..... پھر آگے کہیں جا کر یہ کار جونہی آہستہ ہو، یا کسی سگنل پر رکے، وہ نکل بھاگے اور زویا وغیرہ کے لیے مدد طلب کرے۔

دھڑکنیں سرپٹ تھیں۔ خشامہ کی سماعت باہر کی آوازوں پر لگی ہوئی تھی۔ ابھی تک نمرسی اور اس کا ساتھی باہر نہیں آئے تھے۔ زویا کی من موہنی صورت ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہا کہ زویا اس کے سامنے ہو، وہ اس کی کلائی پکڑے اور اسے اپنے ساتھ سڑکوں اور تنگ گلیوں میں بھگاتی چلی جائے..... یہاں تک کہ اسے سب خطرات سے دور کر دے۔ پھر ہانپتی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اس کے قدموں میں گر جائے۔ اس سے کہے۔ ''مجھے معاف کر دو۔''

وہ پوچھے۔ ''کس بات پر؟''

وہ جواب دے۔ ''ہر بات پر۔''

یکا یک کچھ آہٹوں نے اسے چونکایا۔ یہ خشک پتوں پر متحرک قدموں کی آواز تھی شاید..... وہ کچھ اور بھی سمٹ گئی..... ساکت ہو گئی۔ کار کا دروازہ ایک دم کھلا۔ نمرسی کا دراز قد ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ تب دوسری جانب کا دروازہ وا ہوا۔ مزید سردی کا ایک جھونکا اندر آیا، اس کے ساتھ ہی نمرسی کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ ''چلو اسٹارٹ کرو۔''

اسٹیٹ کار اسٹارٹ ہوئی اور پچاس ساٹھ میٹر لمبے ڈرائیو وے کو طے کر کے چرچ کے چوبی پھاٹک کے سامنے پہنچ گئی۔ گیٹ کا قفل کھولے جانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ چرچ کا مسلح چوکیدار ہی تھا۔ گاڑی چرچ سے نکلی اور ایک ہموار سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ دھند کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ نمرسی اور مائیکل کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی میں الکحل کی تیز بو پھیل گئی تھی۔ خشامہ ڈری ہوئی ضرور تھی مگر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ نمرسی کی آواز سنتے ہی آٹومیٹک رائفل پر اس کی گرفت بے ساختہ مضبوط ہو گئی۔ رائفل کا دستہ اور بیرل کا بیشتر حصہ اب بھی فلالین کے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

نمرسی نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''یہاں سے دائیں مڑنا ہے۔ آگے سیدھا ہی جانا ہے۔ وہ ہوٹل میرا دیکھا ہوا ہے۔ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ سیکیورٹی بھی نہ ہونے کے برابر ہو گی۔''

''پھر بھی اس کے کمرے کا دروازہ تو کھلوانا ہی ہو گا جناب۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی ویٹر یا ویٹرس کی کنپٹی پر پستول آئے گا تو دروازہ بھی کھلے گا اور راستہ بھی مل جائے گا۔''

نمرسی کے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی۔

ذرا وقفے کے بعد مائیکل بولا۔ ''اور وہ باسٹرڈ؟''

''ابھی تو وہ اسپتال میں ہے۔ خاصی سیکیورٹی میں ہے۔ باہر نکل آیا تو اس کو بھی دیکھ لیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں، دوبارہ یہاں آ کر اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔''

مائیکل نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''اور دیکھا جائے باس تو چار سال پہلے اس منحوس کی آمد نے ہی ہماری مشکلات کا آغاز کیا تھا۔''

خشامہ سمجھ رہی تھی۔ مائیکل کا اشارہ یقیناً ڈبل اے چینل کی اسی انویسٹی گیشن کی طرف تھا جس کے نتیجے میں نمرسی اور سہراب کی ایک بڑی ناجائز پراپرٹی پکڑی گئی تھی۔

ان کی گفتگو جاری تھی۔ خشامہ جیسے ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک تنی ہوئی رسی پر کھڑی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا

کہ اس نے بلند آواز میں سانس بھی لی تو نمری اور مائیکل کو اس کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔ وہ بس اس انتظار میں تھی کہ کسی چوراہے پر گاڑی کسی ٹریفک سگنل پر رکے اور وہ دروازہ کھولی کر نکل بھاگے مگر یوں لگ رہا تھا کہ اس سرخ اسٹیٹ کار کو آج برج برگ کے سارے سگنل گرین ہی مل رہے ہیں یا پھر شاید رات کے اس پہر سگنلز کو "بلو بلنکنگ" پر کر دیا گیا تھا۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا اور خشامہ کا جسم پسینے میں نہانا شروع ہو گیا تھا۔

تب اسے ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا..... اور یہ شدید ترین خطرہ تھا۔ نمری یا مائیکل میں سے کسی نے اسموکنگ شروع کر دی تھی۔ الکحل کے ساتھ ساتھ تمباکو کی بو بھی خشامہ کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ خود بھی کبھار اسموکنگ کر لیتی تھی لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کھانسی آجائے گی۔

کھانسی کا مطلب ایک دردناک صورتِ حال کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں خشامہ نے محسوس کیا کہ شاید اس نے یوں اس کار میں گھس کر غلطی کی ہے۔ نمری جیسا خوفناک شخص اس سے بس چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور وہ دم سادھے پڑی تھی۔

"موبائل ٹھیک سے چارج ہے؟" نمری نے مائیکل سے پوچھا۔

"یس باس۔"

"کچھ یادگار قسم کے کلپس بھی ہونے چاہئیں۔ یہ بعد میں سارہ جیم اور اس کی فیملی کو دباؤ میں رکھنے کے کام آئیں گے....." نمری کے لہجے میں شیطنت لشکارے مار رہی تھی۔

ان دونوں کی گفتگو گواہ تھی کہ وہ زویا کو عزت اور زندگی دونوں سے محروم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حولیہ کو شاید زندگی کے حوالے سے رعایت مل جاتی۔

خشامہ نے ایک بار پھر اپنے پہلو کے ساتھ لگی ہوئی رائفل کو ٹٹولا اور اس کے اندر ایک طرح کی توانائی پیدا ہوئی۔

یہ سوال بھی اس کے ذہن میں ابھرا کہ یہ کس کی رائفل ہے؟

شاید یہ نمری نے ہی احتیاط کے طور پر یہاں رکھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ دو رائفل جیسے بڑے ہتھیار کے ساتھ تو ہوٹل میں نہیں گھس سکتے تھے۔ اس کے لیے ان کے پاس یقیناً پسٹل وغیرہ ہوں گے۔ چرچ کے تہ خانے میں وہ نمری کے پاس ایک ایسا پسٹل دیکھ بھی چکی تھی۔ پسٹل دیکھ کر اسے یہی لگا تھا کہ وہ شاید کسی پولیس والے سے چھینا گیا ہے۔

یہاں موجود رائفل کے حوالے سے یہ امکان بھی تھا کہ نمری وغیرہ کو اس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ جس طرح اس سرخ کار کا تعلق فادر سے تھا، اس رائفل کا تعلق بھی فادر یا چرچ کے کسی دوسرے ملازم سے ہو۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ شاید کوئی چیز سامنے سے گزری تھی اور مائیکل کو بریک لگانا پڑے تھے۔ یہ کافی سخت جھٹکا تھا۔ خشامہ خود کو ایک نشست کے آہنی فریم کے ساتھ ٹکرانے سے نہ روک سکی۔ اس کے سر پر کچھ چوٹ آئی۔ ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی۔ یقیناً کچھ تکلیف بھی ہوتی لیکن یہ تکلیف اس شدید خوف کے نیچے دب گئی جو آواز کے سبب اس کے دل میں جاگا تھا۔

کار نے پھر رفتار پکڑ لی تھی مگر وہ سکتہ زدہ اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ دل دھڑکنا بھول گیا تھا اور ردِعمل کا انتظار کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ جیسے گھنٹوں سے زیادہ طویل تھے..... کیا آواز نمری اور مائیکل کے کانوں تک پہنچی ہے..... کیا اس آواز نے انہیں چونکایا ہے؟ کیا انہوں نے اسے عام سمجھا ہے اور اہمیت نہیں دی؟ کیا ان دونوں میں سے کوئی عقب میں جھانکنے کی کوشش کرے گا؟ سوالوں کی تپش نے اس کی پیشانی کو مزید عرق آلود کر دیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بہت طویل محسوس ہوئے اور پھر اس کا خوف قدرے ماند پڑ گیا۔

نمری اور مائیکل بدستور باتوں میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد گاڑی نے بائیں جانب ٹرن لیا۔ اس کی رفتار اس موقع پر کچھ کم ہوئی مگر اتنی کم بھی نہیں تھی کہ وہ باہر چھلانگ لگانے کا سوچ سکتی۔ غالباً یہ سڑک ٹریفک سے خالی تھی۔ دھند کے باوجود مائیکل اسے تیزی سے چلانے لگا۔

ایکا ایکی خشامہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے نمری نے مائیکل سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ اب سیدھا ہی جانا ہے..... پھر یہ ٹرن کیوں لیا گیا تھا؟

کیا واقعی انہیں کوئی شبہ تو نہیں ہو گیا تھا؟

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی وجہ سے انہوں نے ہوٹل کے لیے متبادل راستہ اختیار کیا ہو۔ ایک بار پھر اندیشے اس کے دل کو بے طرح دھڑکانے لگے۔

گاڑی تین چار منٹ تک تیز رفتاری سے آگے بڑھی پھر یوں لگا کہ وہ قدرے ناہموار راستے پر ہے۔ پھر اچانک وہ جھٹکے سے رک گئی۔ خشامہ کے سارے اندیشے یکدم جوان ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی یا کرتی، گاڑی کا اگلا

دائیں جانب والا دروازہ تیزی سے کھلا اور خشامہ نے محسوس کیا کہ کوئی باہر نکلا ہے۔ اگلے ہی لمحے پچھلا دروازہ بھی جھٹکے سے کھلا اور خشامہ نے رونالڈو نمرسی کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پسٹل صاف نظر آرہا تھا۔ پسٹل کا رخ سیدھا خشامہ کے سر کی طرف تھا۔ نمرسی کی آنکھوں میں جھانک کر خشامہ کے سارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ دیکھی جا چکی تھی۔

یہی لمحے تھے جب دراز قد مائیکل بھی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جس کی ٹارچ کی تیز روشنی سیدھی خشامہ پر پڑ رہی تھی۔ مائیکل نے تحیر زدہ انداز میں سیٹی بجائی۔ ''اوہو..... یہ چرچ کی عبادت گزار فیسینہ یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''کون ہو تم؟'' نمرسی دل دہلا دینے والی آواز میں پھنکارا۔

''کوئی لمبا چکر لگ رہا ہے باس۔'' مائیکل نے کہا۔

''اٹھ کے بیٹھو۔'' نمرسی نے بے حد تحکم سے کہا اور اس کے ساتھ ہی سیاہ پسٹل کو حرکت دی۔

وہ اٹھ کر آڑھی بیٹھ گئی۔ کپڑے میں لپٹی رائفل اب بھی اس کے عقب میں تھی اور ان دونوں کی نظر سے اوجھل تھی۔ خشامہ نے دیکھا یہ ایک سنسان جگہ تھی۔ گنجان درخت دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ دائیں طرف نشیب میں کافی دور کچھ دھندلائی روشنیاں نظر آرہی تھیں جو یقیناً ٹاؤن کی کسی سڑک کی تھیں۔

نمرسی نے بڑے زور کے ساتھ اسے سر کے بالوں سے جکڑا اور بے رحمی سے آگے پیچھے جھلا کر بولا۔ ''کس چکر میں ہو تم یہاں؟''

''مم..... میں بس چرچ سے نکلنا چاہتی تھی۔'' وہ... بہ مشکل بول پائی۔

ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور نگاہوں میں تارے سے ناچ گئے۔

''بکواس بند کرو۔ جو سچ ہے وہ بتاؤ۔'' نمرسی دہاڑا۔

''کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں؟''

''میں قسم کھاتی ہوں۔''

''تم اس طرح نہیں مانو گی۔'' نمرسی نے وحشت بھرے لہجے میں کہا اور گاڑی کے اندر گھس آیا۔

مائیکل بھی جلدی سے اندر آگیا اور دروازے لاک کر لیے۔ دونوں کے تیور خطرناک تھے۔ خشامہ نے ایک کھڑکی میں سے دیکھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر دھند سے ایک سائن بورڈ جھانک رہا تھا جس پر ''کیمپ سائٹ'' کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ سڑک سے ہٹ کر درختوں میں گھری ہوئی کوئی ایسی جگہ تھی جہاں کیمپنگ وغیرہ کی جاتی تھی مگر اس موسم میں یہ ایریا بالکل سنسان پڑا تھا۔ یہاں اس ویرانے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

نمرسی اپنے بدبودار وزن کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑا۔ اس نے خشامہ کے گالوں کو اتنی شدت سے اپنے ہاتھ میں دبایا کہ خشامہ کو منہ کے اندر خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ مائیکل نے بڑی تیزی کے ساتھ اس کے پورے جسم پر ہاتھ چلایا۔ غالباً اس کا موبائل فون یا چھوٹا موٹا ہتھیار ڈھونڈ رہا تھا۔

اسے کچھ نہیں ملا۔ ''گرجے میں پولیس کی ٹاؤٹ ہے تو؟'' نمرسی نے پھر آتشیں لہجے میں پوچھا۔ خشامہ نے نفی میں سر ہلایا۔

نمرسی نے اسے پوری طرح اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس کا پلاستر والا بازو خشامہ کی گردن پر تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس بازو کی دھکیل سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ نمرسی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنا موبائل فون نکالا اور مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''فادر کو فون ملاؤ۔ پوچھو ان سے کہ نن کے لباس میں یہ لومڑی کون ہے۔''

مائیکل فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ نمرسی نے اسے بے رحمی سے نوچا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''خش..... شا..... مہ!'' وہ گردن پر دباؤ کے سبب بہ مشکل بول پائی۔

''پوچھو فادر سے..... یہ کون ہے؟'' نمرسی نے پھر پھنکارتی سرگوشی کی۔

چند سیکنڈ بعد مائیکل کی آواز ابھری۔ ''فادر کا فون آف ہے۔''

نمرسی نے ایک اور تھپڑ خشامہ کے گال پر جڑا۔ ''اگر نہیں جانتی ہو تو جان لو، میرا نام رونالڈو نمرسی ہے۔ میں پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔''

''میرا..... آپ سے..... کوئی لینا دینا نہیں۔ میں صرف چرچ سے نکلنا چاہتی تھی۔ چرچ کا ایک بدنیت بشپ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔''

نمرسی نے دانت پیسے۔ خشامہ نے NUNS والا بند گلے کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے کھینچا۔ گاؤن نیچے تک پھٹ گیا۔ نمرسی نے مائیکل کے ہونٹوں سے سلگتا ہوا سگریٹ علیحدہ کیا اور بے دریغ

خشامہ کے کندھے کو داغ دیا..... کرب کی ایک ناقابل برداشت لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بے طرح چلائی مگر اس کی آواز اس ویرانے میں کون سنتا، ویسے بھی وہ بند گاڑی کے اندر تھی۔ نمرسی کی سانسوں میں بدبو کے بھبکے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ ایک سفاک قاتل کی آنکھیں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ابھی چند سیکنڈ بعد وہ جھلا کر پسٹل کی گولی اس کی پیشانی میں اتار دیتا اور اس کی لاش کو اس ٹیلے کے دھندلے درختوں میں پھینک کر اپنے راستے پر چل پڑتا..... وہ بے شک جوانی کے دور سے گزر چکا تھا مگر اب بھی ایک درندہ تھا۔ جب اس نے دوسری بار خشامہ کے جسم کو سگریٹ سے داغا تو سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر اس نے اپنے نیچے دبی ہوئی رائفل کو سیدھا کیا اور بیرل کو نمرسی کی ناف کی طرف لے جا کر ٹریگر دبا دیا۔ سماعت شکن دھماکے سے نمرسی کا جسم اچھلا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت کی یلغار ہوئی۔ دوسرا فائر خشامہ نے اس کے سینے پر کیا اور یہ ایک کارگر فائر تھا۔ یہی وقت تھا جب خشامہ نے دیکھا کہ مائیکل اپنا ہاتھ سیاہ جیکٹ کے اندر گھسا چکا ہے، یقیناً وہ اپنا ہتھیار نکال رہا تھا۔ یہ بس ایک یا آدھے سیکنڈ کا کھیل تھا۔ خشامہ نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ رائفل اس کی گردن سے لگائی اور تیسری بار ٹریگر دبا دیا۔ دراز قد مائیکل اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اس کے خون کے چھینٹوں نے ونڈ اسکرین کو داغدار کر دیا تھا۔ رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ خشامہ کے بعد دیگرے ٹریگر دباتی چلی گئی۔ ایک دو فائر خالی بھی گئے ہوں گے تاہم کم و بیش چھ گولیاں مزید ان دونوں کے سر اور سینے میں اتر گئیں۔ نمرسی کی کھوپڑی ایک جانب سے اڑ چکی تھی، مائیکل بھی مکمل لاش کی صورت اختیار کر چکا تھا..... فائرنگ سے ایک جانب کی کھڑکی چکنا چور ہو گئی تھی۔ چھت میں بھی سوراخ تھے۔

خشامہ کے سینے میں جیسے دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر چکی ہے۔ وہ تو صرف اس لیے گاڑی میں گھسی تھی کہ موقع تاک کر نکل سکے اور کسی بھی طرح زویا کی مدد کر سکے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی اور کسی ردعمل کا انتظار کرتی رہی۔ فائرنگ "بند گاڑی" کے اندر ہی ہوئی تھی..... اور یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ اس کے باوجود اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ کوئی اس جانب متوجہ ہو جاتا اور اگر پٹرولنگ پولیس متوجہ ہوتی تو پھر خشامہ کے مسائل میں زبردست اضافہ ہو سکتا تھا۔ جزوی طور پر کپڑے میں لپٹی ہوئی رائفل اب بھی خشامہ کے ہاتھوں میں تھی۔

وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی اپنی دھڑکنیں گنتی رہی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو اس طرح گرہیں دیں کہ سامنے سے بدن ڈھک گیا۔ اس کا دایاں پاؤں جوتی سمیت نمرسی کے خون سے لتھڑ گیا تھا۔ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی گاڑی میں سے باہر نکل آئی۔ گہری دھند، سردی اور تاریکی کا ملا جلا تاثر اس ویران جگہ کے ماحول کو جداگانہ شکل دے رہا تھا۔ وہ کچھ لمحوں تک گاڑی کے قریب سکتہ زدہ حالت میں کھڑی رہی، پھر لڑکھڑاتی ہوئی سی نشیب کی طرف بڑھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر چکی ہے اور اب اس نے کیا کرنا ہے؟ کپڑے میں لپٹی ہوئی رائفل اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اسے پھینک دینا چاہتی تھی..... مگر کہاں؟

بے شک فائرنگ کے دوران میں بھی رائفل جزوی طور پر فلائین کے اس کپڑے میں ہی لپٹی رہی تھی مگر پھر بھی اس پر فنگر پرنٹس وغیرہ کی تلاش ہو سکتی تھی۔ وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئی تو اسے ڈھلوان پر ایک گڑھا نظر آیا۔ اسے بارشی تالاب بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس نے رائفل کو اچھی طرح کپڑے سے رگڑا اور پھر تالاب کی گہرائی میں پھینک دیا۔ تب اس نے اپنی جوتی اور اپنا خون آلود پاؤں اچھی طرح دھو لیا۔ سفید گاؤن کے ایک کنارے کو بھی خون کے چھینٹوں سے صاف کیا اور چند قدم ہٹ کر پائن کے ایک اونچے پیڑ کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ وہ بلندی پر تھی۔ دائیں جانب دھند کے اندر سے برج برگ کی کچھ دھندلائی ہوئی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ ان روشنیوں میں ہی کہیں وہ ہوٹل بھی تھا جہاں نمرسی اور مائیکل موت کے فرشتوں کا روپ دھار کر جا رہے تھے۔ اس زویا کے لیے جو ہوٹل کے کسی کمرے میں اپنی بچی اور بہن کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس نے تصور ہی تصور میں زویا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا..... اس کے بالوں کو سہلایا..... پیاری زویا! میں نے ایک بڑی مصیبت کو تم تک پہنچنے سے روکا ہے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے کیا ہے..... اب خدا تمہاری حفاظت کرے۔

تب اس کی نگاہ بائیں جانب اٹھ گئی۔ دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دھند کی اس دیوار کے پیچھے عظیم الشان شہر ہیمبرگ کی روشنیاں ہیں..... اور اس سے آگے نیو نسٹر ہے..... اور اس سے آگے "الٹینر برگ"..... الٹینر برگ کے نواحی قصبے اور

بستیاں۔ ایسے ہی کسی قصبے یا بستی کا گرجا گھر اس کی نئی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ وہ جس راستے پر چل پڑی تھی اب اس سے پلٹنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اسی راستے پر آسودہ تھی۔ اس نے اپنے لبادے کو ایک بار پھر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔ اسے اپنے بالائی جسم پر جلن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ انہی دو داغوں کی جلن تھی جو نمرسی نے دہکے ہوئے سگریٹ سے اسے لگائے تھے۔ اس جلن سے دھیان ہٹا کر وہ تیز قدموں سے نیچے اترنے لگی۔ وہ جلد از جلد اس سرخ کار سے دور چلے جانا چاہتی تھی جہاں دو "درندہ صفت" اپنے خون میں لت پت پڑے تھے۔

☆☆☆

زویا صبح سات بجے کے لگ بھگ جاگی۔ اس نے اپنے پہلو میں سوئی ہوئی ننھی بچی کا رخسار چوما پھر اٹھ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا۔ ہوٹل کا لان دکھائی دے رہا تھا اور سڑک کا کچھ حصہ بھی۔ دھندرات کے مقابلے میں کچھ کم تھی مگر موجود تھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ٹی وی کے ریموٹ کی طرف بڑھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ درحقیقت پچھلے تین چار روز سے اس نے ٹی وی تقریباً آف ہی رکھا تھا۔ اسے وحشت سی ہونے لگتی تھی نیوز وغیرہ سن کر۔

منہ ہاتھ دھو کر اور شال اوڑھ کر وہ بالکونی کی طرف آ گئی۔ حولیہ نیچے شاید لابی میں گئی ہوئی تھی۔ وہ بالکونی کے جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر خالی خالی نظروں سے سیب اور چیری کے خوش رنگ پودوں کو دیکھنے لگی۔

اسے معلوم نہیں تھا کل رات کتنا بڑا طوفان اس تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ طوفان کس وجہ سے اس تک پہنچ نہیں پایا..... اور نہ ہی اسے کبھی معلوم ہونا تھا۔ انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ اس کے اردگرد کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ کوئی اس کی خیریت و سلامتی پر حملہ آور ہو رہا ہوتا ہے اور کوئی اس کا دفاع کر رہا ہوتا ہے۔ نہ وہ حملہ آور کے بارے میں جان پاتا ہے، نہ اپنا دفاع کرنے والے کے بارے میں۔ زویا بھی نہیں جانتی تھی کہ کل ایک عفریت کی وحشت اس کو چھو کر گزر گئی تھی۔

کمرے کی جانب سے حولیہ کی آواز آئی۔ "زویا! کہاں ہو..... یہ دیکھو۔"

زویا بالکونی سے پلٹ کر اندر گئی۔ حولیہ کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا۔ وہ سنسنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" زویا نے چونک کر پوچھا۔

وہ دبے دبے جوش سے بولی۔ "ہمیں پچھلے دو تین روز کی صورت حال کا پتا ہی نہیں چلا۔ نمرسی کے حوالے سے کافی کچھ ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"محترمہ! تین روز پہلے وہ پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" زویا کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

"بالکل ایسا ہوا ہے لیکن یہ تین روز پہلے کی بات ہے۔ کل رات وہ اپنے ایک ساتھی سمیت "براڈ ہل" پر مارا گیا ہے..... یہ دیکھو۔" حولیہ نے لرزاں ہاتھوں سے اخبار زویا کی طرف بڑھایا۔

زویا نے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ نمرسی کے جہنم واصل ہونے کی خبر جلی حروف میں موجود تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور پڑھنے لگی۔ خبر کے ساتھ رونالڈ نمرسی کی ایک فائل فوٹو بھی موجود تھی۔ ساتھ میں ایک اور شخص بھی تھا، اس کو زویا کیسے بھول سکتی تھی۔ یہی خبیث مائیکل تھا جس نے اسے عینی سمیت لیونا برگ میں یرغمال بنائے رکھا تھا..... اور بڑی بے حیائی سے ہراساں کرتا رہا تھا۔ وہاں سے فرار ہوتے وقت زویا نے اس کے منہ پر شیشے کے ٹکڑے سے کاری وار کیا تھا اور رخسار چیر کر رکھ دیا تھا۔

خبر کی ہیڈ لائن تھی۔ "فرار کے قریباً 72 گھنٹے بعد رونالڈ نمرسی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔"

ذیلی سرخی تھی۔ "اپنے قریبی ساتھی مائیکل کی لاش سمیت اس کی لاش براڈ ہل کے ایریا میں ایک کار کے اندر پائی گئی ہے۔"

خبر کا متن کچھ یوں تھا۔ "ویران علاقے میں کھڑی کار کے اندر رونالڈ نمرسی مردہ حالت میں پایا گیا۔ اس کے سر اور سینے میں نہایت قریب سے چار گولیاں ماری گئی ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال دوسری لاش کی بھی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جس سرخ اسٹیٹ کار سے یہ لاشیں ملی ہیں، وہ چرچ کی ملکیت ہے اور واردات سے چند گھنٹے پہلے چوری ہو گئی تھی۔ اس کی رپورٹ بھی درج ہے۔ موقع سے جو شواہد اکٹھے ہوئے ہیں، ان سے یہی قیاس کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں قتل آپسی لڑائی کا نتیجہ ہیں۔ نمرسی ہی کے کسی مخالف گروپ نے اسے اور اس کے ساتھی کو ہلاک کیا ہے۔"

زویا کا دل بھر آیا۔ یہی جانور تھا جس نے اس پر اور اس کی فیملی پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا تھا۔ آج وہ اپنے منتی

انجام کو پہنچ گیا تھا۔ حولیہ کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

اتنے میں دو سالہ عینی بھی جاگ گئی اور ہولے ہولے چلتی زویا کے پاس پہنچ گئی۔ زویا نے اسے بازوؤں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک عرصے بعد آج ایک جانکاہ خوف سے آزاد ہوئی ہے۔ اس نے عینی کے بالوں کو چوما اور ایسا کرتے ہوئے اس کے رخساروں پر دو موتی ڈھلک آئے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی شامیر کا نمبر ملائے اور اس سے یہ خبر شیئر کرے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی بھی مگر پھر بیٹھ گئی۔ اسے سینئر ڈاکٹر کی بات یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ شامیر کو بار بار ڈسٹرب نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

اسی دوران میں ٹام کی کال آ گئی۔ ٹام واحد شخص تھا جسے فی الوقت زویا اور حولیہ کے ٹھکانے کا پتا تھا۔ وہ بھی نمرہ اور مائیکل کی ہلاکت کے بارے میں جان چکا تھا۔ اس کے لب و لہجے میں گہرے اطمینان کی جھلک تھی۔

زویا نے کہا۔ ''ٹام! شروع میں تو پتا چلا تھا کہ کار الٹنے کے بعد نمرہ سخت زخمی ہوا ہے اور شاید جانبر نہ ہو سکے، مگر لگتا ہے کہ وہ زیادہ سیریس نہیں تھا۔ اسی لیے تو ٹھیک بھی ہوا اور فرار بھی۔''

ٹام نے کہا۔ ''حادثے کے وقت وہ گہرے نشے میں تھا اور یوں لگتا تھا کہ بہت گہری بے ہوشی میں چلا گیا ہے، مگر پھر سنبھل گیا تھا۔''

ٹام نے مزید بتایا کہ اطلاعات کے مطابق یہاں پر نمرہ کے بچے کھچے ساتھیوں کا بھی تقریباً صفایا ہو گیا ہے۔ نمرہ سے کاروباری لنک رکھنے والے کچھ لوگ بھی گرفتار ہوئے ہیں۔

زویا اور اس کے منہ بولے بھائی ٹام میں کچھ دیر اسی حوالے سے بات ہوتی رہی پھر ٹام نے ذرا ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''زویا! ایک بات کہنا چاہ رہا ہوں تم سے..... بلکہ تین چار روز سے کہنا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ تمہیں ٹھیک لگے یا نہیں۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''ہفتے کے روز ٹاؤن کی ایک پولیس آفیسر ماریا سادہ لباس میں میرے پاس پہنچی تھی۔ وہ اسی جیل میں فرائض انجام دیتی ہے جہاں آج کل رابرٹ کو رکھا گیا ہے۔ وہ رابرٹ سے بہت متاثر نظر آتی ہے اور اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔''

رابرٹ کا نام سنتے ہی زویا کے جسم میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ وہ شوہر تو کیا، انسان کہلائے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جب سے اس نے ٹام پر حملہ کیا تھا، زویا کو اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔

وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا کہہ رہی ہے پولیس آفیسر؟''

''وہ کہتی ہے، رابرٹ اپنے کیے پر بہت نادم ہے۔ رات دن روتا ہے۔ جس کے ساتھ بھی اس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے اس سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''بہت خوب..... معافی۔'' زویا نے دکھی استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''ٹام! تم جانتے ہی ہو، اس شخص کی معافیاں تلافیاں کتنی دیرپا ہوتی ہیں..... میں بہت بھگت چکی ہوں اس کی یہ معافیاں..... وہ دو چہروں والا جانور صفت بندہ ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں زویا! مگر درمیانی عمر کی وہ آفیسر اس سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ میں تو اس آفیسر کو سادہ دل ہی کہوں گا۔ اس نے رابرٹ کا لکھا ہوا ایک خط بھی مجھے دیا ہے۔ اس خط میں رابرٹ نے مجھ سے بھی معافی مانگی ہے۔ مجھ پر حملہ کرنے کے حوالے سے بے حد ندامت اور پچھتاوے کا اظہار کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ طیش میں ہوش کھو بیٹھا تھا اور اپنے اس جرم کے لیے ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے۔''

''ٹام! یہ اس کا وہی دوسرا روپ ہے جو بندے کی مت مار دیتا ہے۔''

ٹام کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''آفیسر نے درخواست کی ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنی بچی کی اور تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہے۔ بہت منت کر رہا ہے کہ ایک بار تم دونوں اس سے مل لو۔''

''ہرگز نہیں ٹام! میں اس کا نام سننا بھی نہیں چاہتی۔'' وہ جیسے کانپ کر رہ گئی۔

''مگر زویا جو کچھ بھی ہے، وہ عینی کا باپ ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے، ہمارے قانون میں قیدیوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ایک مخصوص وقت کے بعد انہیں ان کی فیملیز سے ملایا جاتا ہے۔ آفیسر ماریا کہتی ہے کہ وہ اپنی بچی کے لیے تڑپ رہا ہے.....''

''مجھے اس کی تڑپ بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔'' زویا کا لہجہ زہر خند تھا۔

''آفیسر نے درخواست کی ہے کہ کم از کم ایک بار تم، رابرٹ سے فون پر بات کر لو۔ وہ اس ٹیلی فونک گفتگو کے لیے خصوصی رعایت حاصل کر سکتی ہے۔''

''نہیں ٹام! مجھے اس امتحان میں نہ ڈالو۔ اس کی آواز سننے کے خیال سے ہی میرا دل ہولنے لگا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم اس آفیسر کو بھی بتاؤ کہ یہ شخص کس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور اس کی باتوں میں کتنا وزن ہے۔''

ٹام نے زویا کو سمجھایا بجھایا اور اس سے کہا۔ ''کم از کم آفیسر ماریا کو مطمئن کرنے کے لیے ہی ایک بار رابرٹ سے بات کرلو۔ اس بات چیت سے کوئی درمیانی راستہ بھی نکل سکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم خود اس سے ملنے نہ جاؤ بلکہ کسی کے ذریعے عینی اس سے مل لے۔'' پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ویسے بھی تمہیں اور عینی کو چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو یہ نمرسی والا دبال ختم ہوگیا ہے۔ اس حوالے سے جو بھی اندیشے تھے، وہ اب نہیں رہے.....''

ٹام کے بہت مجبور کرنے پر رات کے وقت زویا نے خود پر جبر کرکے رابرٹ سے بات کی۔ رابرٹ کا لب ولہجہ اور اس کی گفتگو حسب توقع ہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بے پناہ ندامت کا اظہار کیا۔

بولا۔ ''زویا! ایک سال بعد تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا۔ نہ ہی یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تم سے کن الفاظ میں معافی مانگوں۔ اپنی نگاہوں میں اتنا گر گیا ہوں کہ کسی وقت خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے تم پر شک کیا۔ تمہارے اور ٹام کے تعلق کو غلط نظر سے دیکھا۔ کاش اس غلط روی سے پہلے مجھے موت آجاتی۔'' وہ اشک بار تھا۔

زویا خاموشی سے سن رہی تھی۔ ان باتوں کا اثر اس کے دل پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ ایسے مکالمے پہلے بھی بہت سن چکی تھی..... اور پھر ان مکالموں کے دو چار دن بعد ہی کیا ہوتا تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہی تمتمایا ہوا چہرہ، وہی آگ اگلتا لہجہ، وہی ملکیت اور حاکمیت کا جنون۔ اس کے بعد زویا کے حصے میں توہین وتذلیل اور جسم وروح کی پامالی ہی آتی تھی۔

وہ پھر گویا ہوا۔ ''میں نے ٹام سے تہ دل سے معافی مانگی ہے۔ میں شامیر کے پاؤں بھی پکڑنا چاہتا ہوں۔ میرا رویہ اس کے حوالے سے بھی شاید ٹھیک نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے تمہاری اور عینی کی جان بچی۔ میں مر کر بھی اس کا یہ احسان نہیں چکا سکتا۔ خدا اس کو زندگی اور صحت دے۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو رابرٹ؟'' زویا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صرف یہ کہ..... مجھے ایک موقع..... صرف ایک موقع اور دے دو..... میرے پچھلے سارے گناہ معاف کرکے صرف ایک بار مجھے بتا دو کہ مستقبل میں میرے لیے امید کی روشنی موجود ہے..... پھر میری سزا کتنی بھی لمبی ہوگی، میں تمہارے بخشے ہوئے حوصلے کی طاقت سے کاٹ لوں گا۔''

''کچھ چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں رابرٹ..... اور میں اتنی بار زخمی ہوئی ہوں کہ میرے اندر کے زخم ناقابلِ علاج ہوگئے ہیں۔ یہ اب مندمل نہیں ہوسکتے۔''

''پلیز..... میں صرف ایک موقع کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ گھگیایا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس رابرٹ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر درمیان میں عینی نہ ہوتی تو شاید وہ ابھی یہ فون کاٹ دیتی۔

اس نے کہا۔ ''زویا! تمہیں اور عینی کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں ترس گئی ہیں۔ بس ایک بار مجھے اپنی جھلک دکھا جاؤ۔ مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔''

''میں..... اپنے وکیل سے مشورہ کرکے ہی بتا سکتی ہوں۔''

وہ تڑپ اٹھا۔ ''نہیں، وکیل سے نہیں..... اپنے دل سے مشورہ کرو زویا۔ عینی کے لیے تمہارے دل میں جو ممتا ہے اس سے مشورہ کرو..... پلیز زویا۔''

''مم..... میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔'' زویا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

رابرٹ سے بات ختم کرکے وہ دیر تک ہوٹل کے اس کمرے میں ٹہلتی رہی۔ انسان، انسان میں کتنا فرق ہوتا ہے، اس نے سوچا۔ ایک طرف یہ رابرٹ لوئیس تھا۔ ایک اعلیٰ جرمن خاندان کا چشم وچراغ، مگر وہ دہری زندگی جی رہا تھا۔ ایک روپ میں وہ نہایت شریف النفس اور عبادت گزار تھا، دوسرے روپ میں اس نے اپنی بیوی اور معصوم بچی کو اپنے اندر کی آگ میں جلا جلا کر نیم جان کر دیا تھا۔ دوسری طرف دور دیس سے آنے والا شامیر تھا..... اپنے اندر بے لوث محبت، قربانی اور وفا کا جذبہ رکھنے والا۔ وہ جرمن نہیں تھا اور نہ ہی اپنے حسب نسب کے حوالے سے اسے کوئی غرور تھا لیکن جب وقت آیا تھا تو وہ بے خطر ایک آگ میں کود پڑا تھا اور اپنا حسب نسب ثابت کیا تھا۔

☆☆☆

زویا کا شوہر نامدار رابرٹ جیل میں تھا۔ اس نے ایک ڈیوٹی آفیسر سارجنٹ ماریا کو اپنی باتوں سے شیشے میں

اتارا تھا۔ اس کے اندر اپنے لیے اپنایت اور ترحم کے جذبات پیدا کیے تھے اور اس کے ذریعے بالآخر ٹام اور زویا سے رابطہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

ماریا نے کل پھر زویا سے اس کی بات بذریعہ موبائل فون کرائی تھی۔ اب رابرٹ کو امید تھی کہ آج کسی وقت وہ اس سے ملنے یہاں پہنچے گی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

وہ اس کی ضرورت بن چکی تھی۔ وہ ان وحشی پانیوں کا کنارہ تھی جو گاہے بگاہے اس کے اندر موجزن ہوتا تھا۔ اس کا استحصال اس کی خو بن چکا تھا۔ عینی کا تو بس بہانہ ہی تھا۔ اصل میں وہ عینی کے ذریعے زویا کو اپنی پہنچ میں رکھنا چاہتا تھا۔ حال میں نہ سہی، مستقبل میں سہی..... وہ اس کے جملہ حقوق کا مالک کہلا سکتا تھا۔ ویسے مقامی قوانین کے تحت دوران قید بھی ہر چند ماہ بعد بیوی اور شوہر کو تنہائی میں ملاقات کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ اس طرح کی ساری باتیں رابرٹ کے ذہن میں تھیں۔

وہ لاک اپ میں ٹہل رہا تھا اور بڑی بے چینی سے زویا اور عینی کی آمد کا منتظر تھا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی آن پہنچی۔ ایک اہلکار نے آہنی سلاخوں کے سامنے آ کر اسے اطلاع دی کہ اس کی فیملی آ گئی ہے۔ رابرٹ کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ چہرے پر ایک دکھ آمیز افسردگی لے کر وہ اسٹیل کی چمکیلی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار منٹ بعد سامنے والے کوریڈور میں اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ آ رہی تھی..... ہاں وہ آ رہی تھی۔

پھر دروازہ کھلا اور وہ عینی کے ساتھ اندر آ گئی..... مگر..... وہ زویا نہیں تھی۔ رابرٹ نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ وہ زویا کی بہن ڈاکٹر حولیہ تھی۔ اس نے زویا ہی کے انداز میں اسکارف لے رکھا تھا۔ اس کی گود میں عینی تھی جس نے دو پونی ٹیلو کر رکھی تھیں اور نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

رابرٹ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ پہلے مایوسی کی لہر اور پھر طیش کی چنگاریاں اس کے تن بدن میں پھیل گئیں۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ نہیں آئی تھی۔ اس نے وہی ڈھیٹ پن دکھایا تھا جس کا وسوسہ رابرٹ کے دماغ میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں آیا، شاید وہ بھی آئی ہو مگر سامنے آنے سے جھجک محسوس کر رہی ہو یا پھر..... سرپرائز دینا چاہتی ہو۔

"آپ..... اکیلی..... زویا کہاں ہے؟" رابرٹ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"وہ نہیں آ سکی..... اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔" حولیہ نے اس سے نگاہیں ملائے بغیر جواب دیا۔

"کیا ہوا اس کی طبیعت کو۔ کل تو وہ اچھی بھلی تھی۔ اس نے بات کی ہے مجھ سے؟"

حولیہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عینی سے کہا۔ "ڈیڈ کو ہیلو بولو۔ بات کروان سے؟"

دو سالہ عینی نے اجنبی نظروں سے رابرٹ کو دیکھا پھر توتلی زبان میں "ہیلو" کہہ کر جیسے اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

رابرٹ نے بس رکی انداز میں سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکالا اور عینی کے گالوں کو چھوا۔ اس کی ساری توجہ اپنے سوال کے جواب کی طرف تھی۔ وہ خشمگیں نظروں سے حولیہ کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے ڈاکٹر حولیہ۔" وہ اپنے لہجے کو حتی الامکان شائستہ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ وہ نہیں آ سکی۔"

"آ نہیں سکی، یا آنا نہیں چاہتی؟" رابرٹ کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔

"جو بھی تم سمجھ لو۔"

"کیا مطلب..... کیا مطلب ہے اس بات کا؟" رابرٹ کے لہجے میں دبی دبی آتش جھلک دکھانے لگی۔

حولیہ کے چہرے پر ناگواری تھی۔ اس نے رابرٹ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اچانک جیسے لاک اپ کے اس حصے میں زلزلہ سا آ گیا۔ عالم طیش میں رابرٹ اتنی زور سے گرجا کہ در و دیوار ہل گئے۔ اس نے جنونی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ سلاخوں میں سے نکالا اور حولیہ کا گریبان دبوچ لیا۔ وہ چنگھاڑا۔ "اس حرامزادی کی یہ جرأت؟ کیوں نہیں آئی وہ؟ کیوں نہیں آئی..... تم ساری بہنیں ایک جیسی ہو۔ ایک جیسی کمینی، ایک جیسی لعنتی اور نیچ..... میں مار چھوڑوں گا اس کو..... میں مار چھوڑوں گا۔"

کچھ فاصلے پر موجود سارجنٹ ماریا اور ایک گارڈ بھی ہکا بکا رہ گئے۔ شاید انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اتنا دھیما اور عاجز نظر آنے والا غمزدہ رابرٹ اچانک اس قدر آگ بگولا ہو جائے گا۔

رابرٹ نے حولیہ کا گریبان جکڑ رکھا تھا اور چلا رہا تھا۔ "وہ باسٹرڈ اپنے دو دو یاروں سے مل رہی ہے۔ یہاں اپنے شوہر کے پاس آتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے۔ اسے آنا پڑے گا یہاں..... آنا پڑے گا۔"

حولیہ اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ماریا اور اس کا ساتھی گارڈ بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ تب تک رابرٹ جنونی انداز میں ننھی عینی پر بھی جھپٹا مار چکا تھا۔ اس نے بچی کی گردن دبوچنا چاہی تھی مگر حولیہ بروقت بائیں جانب جھکی اور گردن کے بجائے بچی کے بال رابرٹ کے ہاتھ میں آئے۔ اس کے اندر ایک دم بھڑکنے والے شعلے اب بلند تر ہو گئے تھے۔ وہ وحشی نظر آنے لگا۔ ہیجانی انداز میں چنگھاڑا۔ ''میں مار دوں گا اس کو بھی۔ جان لے لوں گا۔'' وہ ننھی بچی کو بالوں سے جکڑے ہوئے غضب ناک انداز میں اپنی جانب کھینچنے لگا۔

حولیہ پکاری۔ ''بچاؤ..... خدا کے لیے بچاؤ۔''

سارجنٹ ماریا نے بچی کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''چھوڑ دو رابی..... چھوڑ دو اسے۔'' اس نے طاقت سے رابرٹ کو پیچھے دھکیلا۔

اس کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ بچی کے چلانے کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں۔ دو اور اہل کار بھی ماریا کی مدد کو پہنچ گئے۔ وہ بچی کو رابرٹ کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ بہ عین ایسا لگ رہا تھا کہ کسی چڑیا گھر میں کسی درندے نے پنجرے میں سے ہاتھ نکال کر ایک بچے کو دبوچ لیا ہو۔ ایک تنومند پولیس اہل کار نے ڈنڈے سے رابرٹ کے ہاتھ اور کلائی پر زوردار ضربیں لگائیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا..... سارجنٹ ماریا کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ رابرٹ کی عاجزی معاً یہ سفاک روپ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

تنومند اہل کار نے اپنے ڈھائی تین فٹ لمبے الیکٹرانک ڈنڈے کو نیزے کی طرح استعمال کرتے ہوئے رابرٹ کے چہرے پر شدید ضرب لگائی۔ جواب میں رابرٹ نے اس پر بھی گالیوں کی بوچھاڑ کی تاہم اسی نوعیت کی دوسری ضرب نے عینی کے بالوں پر اس کی گرفت کمزور کر دی..... اہل کاروں نے کھینچ کر روتی بلکتی بچی کو اس سے دور کر دیا۔ حولیہ اسے اپنے ساتھ چمٹا کر دور جا کھڑی ہوئی۔

اسی اثنا میں ایک سینئر پولیس آفیسر بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے حکم پر تین چار بادردی اہل کار لاک اپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے بپھرے ہوئے رابرٹ کو گھما کر فرش پر پٹخ دیا..... اور پھر اس کی ٹھکائی شروع کر دی۔ گھونسے اور ٹھڈے تواتر سے اس کے جسم پر برسنے لگے۔ پہلے تو وہ گالیاں بکتا رہا، پھر اس نے چلانا شروع کر دیا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سامنے کی طرف سے مخصوص ہتھکڑی میں جکڑے گئے۔ پھر اس ہتھکڑی کے دوسرے حصے کو اس کے دونوں پاؤں کے ساتھ یوں منسلک کر دیا گیا کہ وہ گٹھڑی سا بن گیا۔ تب اسی حالت میں اس کی ''مزاج پرسی'' کی جانے لگی۔ وہ دہائیاں دینے لگا۔

آج کے واقعے کے بعد اس نے یقیناً اپنی سزا میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

شامیر اسپتال میں تھا۔ تکلیف کبھی کم، کبھی زیادہ ہوتی تھی۔ زویا نے پرسوں آنے کا کہا تھا مگر اب چوتھا روز تھا، وہ آئی نہیں تھی۔ ہر آہٹ پر شامیر کی نگاہیں بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ظاہر ہے نگاہوں کو مایوس ہی لوٹنا پڑتا تھا۔ کل اس کے جی میں آئی تھی کہ اسے فون کرے مگر پھر سینئر ڈاکٹر تھامسن آ موجود ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے منع کر دیا تھا اور سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ آرام کرے۔

سہ پہر کو بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ وہ کیوں اتنی سخت دل ہو گئی تھی؟ کیوں اس کے لیے اپنے دل میں ذرا سی گنجائش بھی پیدا نہیں کر رہی تھی؟ اچانک اسے دروازے پر میوزیشن ٹام کی صورت نظر آئی۔ شامیر کو معلوم ہو چکا تھا کہ چند روز پہلے اسپتال کی انتظار گاہ میں کیا واقعہ رونما ہوا تھا اور رابرٹ کے ساتھ ٹام کی کتنی خطرناک جھڑپ ہوئی تھی۔

ٹام کی چال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پیٹ پر ابھی تک بینڈیج موجود ہے اور زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ بہرحال وہ چہرے سے ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے شامیر کی خیریت دریافت کی۔ پھر اس سے انگلش میں پوچھا۔ ''مسٹر شامیر! آپ کو نرسری کے بارے میں کوئی نیوز ملی ہے؟''

''کبھی پتا چلا تھا کہ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔''

''وہ ہلاک ہو گیا ہے مسٹر شامیر..... وہ کورٹ میں پیشی کے دوران میں پولیس کسٹڈی سے فرار ہو گیا تھا لیکن دو دن بعد اپنے قریبی ساتھی مائیکل سمیت مارا گیا۔ خیال یہی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ کسی مخالف گروپ کا نشانہ بنا ہے۔''

یہ خبر شامیر کے لیے جہاں بہت منفی خیز تھی، وہاں کسی حد تک اطمینان بخش بھی تھی۔ اس نے ٹام سے اس واقعے کی تفصیل دریافت کی۔

آخر میں اس نے ٹام سے مائیکل کے بارے میں

پوچھا۔ ''یہ وہی ہے نا جس نے لیونا برگ میں زویا اور اس کی بچی کو یرغمال بنائے رکھا تھا؟''

''بالکل وہی..... نمرسی کی طرح یہ شخص بھی پولیس اور انٹرپول کو ڈکیتی، قتل اور آبروریزی کے بہت سے مقدمات میں مطلوب تھا۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر شامیر نے زویا اور حولیہ کے بارے میں پوچھا۔

ٹام نے کہا۔ ''زویا سے کل فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کے لیے پریشان ہے۔ ڈاکٹر حولیہ بھی بہت فکرمند ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر حولیہ آج آپ سے ملنے بھی آئے۔ زویا بھی ایک دو روز تک آئے گی۔''

شامیر نے ایک طویل سانس لی پھر ٹام سے پوچھا۔ ''رابرٹ کی کیا صورت حال ہے؟''

''وہ جیل میں ہے۔ کافی سخت کیس بنے ہیں، اس پر..... اب تو قسمت سے ہی آزاد فضا میں سانس لے سکے گا۔''

ٹام جان بوجھ کر جیل میں پیش آنے والا واقعہ چھپا گیا۔ زویا اور حولیہ نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ وہ شامیر کو بتا کر خوامخواہ پریشانی میں مبتلا نہ کرے۔ ویسے بھی قانون کے شکنجے میں پوری طرح کسے جانے کے بعد رابرٹ کا ذکر بے معنی ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک دراز قد جرمن نرس آ گئی۔ اس نے شائستہ لہجے میں ٹام سے کہا کہ ڈاکٹرز راؤنڈ پر آنے والے ہیں، لہٰذا اب وہ اٹھ جائے۔

ٹام اسے خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اس کی نگاہوں میں شامیر کے لیے ایک خاموش ستائش تھی اور ایسی ہی ستائش، یہاں اپنے لیے، شامیر کو اکثر نگاہوں میں نظر آتی تھی۔

ڈاکٹرز راؤنڈ لگا کر چلے گئے تو شامیر ایک بار پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ درد دبانے والی میڈیسن کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ رگ و پے میں ایک جلن سی سرایت کر رہی تھی۔ اس جلن سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ نمرسی اور اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ ایک بہت مثبت خبر تھی جو ٹام کے ذریعے اسے ملی تھی..... پھر اس کا دھیان بھٹکتا ہوا زویا کی طرف چلا گیا۔ اسے اپنے اردگرد اس کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ کیسا جذبہ تھا؟ یہ کیسی کیفیت تھی؟ کبھی کبھی تو اسے اپنے آپ سے اس کی خوشبو آنے لگتی تھی۔ اس کی باتوں کی خوشبو، اس کے سانسوں کی مہک، اس کی مسکراہٹ اور پھر کلیوں جیسے سپید دانتوں تلے اس کا اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دبانا..... اس نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو پھر سوچتا چلا گیا۔ تب سوچ کی یہ گہرائی بھی ایک طرح کا درد پیدا کرنے لگی۔

اس نے شعوری طور پر سوچ کے گھوڑے کی باگیں موڑنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ اس کے خیالات کا رخ اموخالہ اور فارہ کی طرف ہو گیا۔ چند دن پہلے انکل اختر نے اسے فارہ کے دیوانے پن کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ اپنی سفلی خواہشات کا تعاقب کرتی ہوئی اتنی دور چلی جائے گی، یہ شامیر نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ انکل اختر کے مطابق اس نے خود اپنے جسم کو نوچ کھسوٹ کر اور اپنا لباس پھاڑ کر ایسا کرائم سین تخلیق کیا تھا جو شامیر کو بلارگاوٹ آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا تھا۔ یقیناً فارہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں اموخالہ بھی اتنی ہی قصوروار تھیں جتنی وہ خود تھی یا شاید خود اس سے بھی بڑھ کر۔

جس وقت شامیر اسپتال کے اس کمرے میں یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا، عین اس وقت ہزاروں میل دور..... لاہور میں اموخالہ کندھے سے شولڈر بیگ لٹکائے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ گھریلو ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا اور اموخالہ کو بتایا تھا کہ فارہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی ہے۔

''اس نے کچھ کھایا یا نہیں؟'' اموخالہ (ثمینہ بیگم) نے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' ملازمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بڑی مشکل سے دو تین گھونٹ دودھ پلایا ہے انہیں۔''

''ایک دم نکمی اور احمق ہو تم۔ ایک ٹکے کی عقل نہیں ہے تمہارے اندر۔ روٹیاں اور پلنگ توڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی ہو۔''

خالہ ثمینہ بکتی جھکتی اندر چلی گئیں۔ وہ سیدھی اس کمرے میں پہنچیں جہاں فارہ سفید بستر پر تکیے کے سہارے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ پیشانی کی ایک جانب زخم کا ایک نمایاں نشان تھا۔ ایک آنکھ ٹھیک لیکن دوسری ادھ کھلی تھی۔ اس وجہ سے پورا چہرہ ہی عجیب شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ کچھ دن پیشتر آسٹریا میں پیش آنے والے اس ٹریفک حادثے کے اثرات میں سے سب سے نمایاں اثر فارہ کے دائیں پہلو پر تھا۔ اوپر سے نیچے تک جسم کا یہ حصہ یکسر مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

ثمینہ بیگم جلدی سے بیٹی کے سرہانے پہنچیں۔ ٹشو پیپر کے ساتھ وہ پانی صاف کیا جو فارہ کی ایک بانچھ سے بہہ نکلا تھا۔ فارہ کی نگاہیں ماں کے چہرے پر جمی تھیں۔

ثمینہ جانتی تھیں کہ وہ یوں اس کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟

کل ایک پرائیویٹ اسپتال میں فارہ کے کئی ٹیسٹ ہوئے تھے۔ ان میں سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ بھی شامل تھے۔ آج نیوروفزیشن نے حتمی رپورٹ دینا تھی۔

ثمینہ کے چہرے پر طمانیت تھی۔ انہوں نے فارہ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' فارہ نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

جواب میں ثمینہ بیگم نے شولڈر بیگ میں سے ایک فولڈر نکال کر فارہ کے صحت مند ہاتھ میں دے دیا۔ ''تم خود پڑھ لو۔'' انہوں نے کہا۔

فارہ نے لیٹے لیٹے سرسری نظر سے رپورٹ کو دیکھنا شروع کیا۔ ثمینہ بیگم نے اس کا مفلوج ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''پروفیسر صاحب نے بہت امید دلائی ہے فارہ۔ وہ جو برین کے ایک چھوٹے سے حصے کے ''ڈیمیج'' ہونے کا خطرہ تھا، وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے، دواؤں اور فزیوتھراپی سے دو تین مہینے کے اندر بہت بہتری ہو جائے گی۔''

فارہ کی نگاہیں بدستور رپورٹ کے اوراق پر تھیں۔ اس نے شک کی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر لکنت زدہ لہجے میں کہا۔ ''..... یہ..... اصلی رپورٹ ہے نا؟''

''کیا مطلب..... میں تمہیں جعلی رپورٹ پڑھواؤں گی؟'' انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے کہا اور فارہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

فارہ نے رپورٹ ایک طرف رکھ دی۔ ''پتا نہیں ماما! کیوں..... مجھے لگتا ہے..... کہ میں جلدی ٹھیک نہیں ہوں گی..... اور ہو بھی گئی تو..... شاید مجھے زندہ رہنے سے مرنا زیادہ اچھا لگے.....'' وہ رک رک کر بولی۔

''مریں تیرے دشمن..... مرے وہ بدبخت، جس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا بدذات کہیں کا..... بڑے گندے خون کی ملاوٹ ہوئی ہے یہ ہماری نسل میں۔ اپنے باپ سے زیادہ بے فیض اور کمینہ نکلا ہے یہ، دیکھنا بڑی بری موت مرے گا۔ اسی حرامزادی، لفنگی نے وی رپورٹر کے لیے، اپنے پنڈے کو کوٹھا کر کے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ ہاں، کسی گندی بے فیض نسل کا سفید خون ہے اس کے اندر۔ جنہوں نے تیمی میں آسرا دیا، پال پوس کر کسی قابل بنایا ان کو دھکے اور پرائے دیس کے غیروں کے لیے جان بھی نچھاور۔''

فارہ نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ وہ ماں سے اس طرح کی باتیں پہلے بھی کئی دفعہ سن چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہ لڑائی ہار چکی ہے اور اتنے برے طریقے سے ہاری ہے کہ خود کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں ہے۔

اسی دوران میں ملازمہ ایک ٹرے میں چکن سوپ، چاول اور کسٹرڈ وغیرہ لے آئی۔ ابھی ٹرے فارہ کے سامنے بھی نہیں رکھی گئی تھی کہ وہ ناک منہ چڑھانے لگی۔

''نہیں..... میں نے نہیں لینا کچھ بھی۔'' اس نے منہ پھیرا۔ قابل سے اس کی آواز بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

''نہیں فارہ..... دو چار لقمے لے لو۔ پروفیسر صاحب کہتے تھے.....''

''نہیں..... میں نے کہا ہے نا۔'' وہ ماں کی بات کاٹ کر چڑچڑے انداز میں بولی اور ٹرے کو ہاتھ سے دھکیل کر خود سے دور کر دیا۔ پیالی میں سے کچھ سوپ اچھل کر کسٹرڈ میں گرا اور اسے بیکار کر گیا۔

''اچھا..... اچھا..... غصہ مت کرو۔'' ثمینہ بیگم نے کہا اور ملازمہ کو گھورتے ہوئے ٹرے اسے واپس تھما دی۔

فارہ نے پھر منہ پھیر لیا۔

ثمینہ بیگم اس کی ٹانگوں پر کمبل درست کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ فارہ کے کمرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ان کے چہرے سے مصنوعی بشاشت رخصت ہو گئی۔ انہوں نے شولڈر بیگ کھولا اور اس میں سے وہ اصل رپورٹ نکال لی جو آج سینئر نیوروفزیشن نے انہیں دی تھی۔ وہ عینک چڑھا کر رپورٹ کو دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں آتشیں آنسو امڈنے لگے۔

رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ وہ اس جعلی رپورٹ کے بالکل برعکس تھی جو فارہ کی تسلی کے لیے انہوں نے اصرار کر کے نیوروفزیشن سے بنوائی تھی۔ فارہ نے ابھی جس شبہے کا اظہار عام سے انداز میں کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ یہ اصل رپورٹ بتا رہی تھی کہ مریضہ کے دماغ کے کچھ ٹشوز مکمل طور پر ''ڈیمیج'' ہو گئے ہیں۔ اب ان کی بحالی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ میڈیکل کی مختلف اصطلاحات کے ذریعے فارہ کے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا، وہ کسی بھی پہلو

سے حوصلہ افزا نہیں تھا۔

ثمینہ بیگم کے آتشیں آنسو ان کی گود میں گرنے لگے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ طیش کے عالم میں انہوں نے شامیر کے کمرے کی ایک الماری کھولی۔ اس الماری میں اس کے اہم کاغذات، تعلیمی اسناد اور تصویریں وغیرہ تھیں۔ انہوں نے غصے کے عالم میں یہ سارے اہم سرٹیفکیٹ، اسناد اور کاغذات پھاڑ کر پرزے پرزے کردیے۔ پھر ایک البم ان کے ہتھے چڑھا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ انہوں نے تصویروں کے بے شمار ٹکڑے کیس بیٹر میں جھونک دیے۔

پھر الماری کے اندر ایک فریم پر ان کی نظر پڑی۔ اس یادگار فریم شدہ تصویر میں چھ سات سالہ شامیر اپنے والد کمال احمد کی گود میں نظر آرہا تھا۔ انہوں نے اس قیمتی فریم کو فرش پر پٹخ کر توڑا۔ ''جہنمی..... لعنتی..... جیسا باپ ویسا بیٹا۔'' وہ پھنکاریں اور فریم سے نکل آنے والی تصویر کو اپنے پاؤں سے روندنے لگیں۔ ملازمہ سہمی ہوئی تھی اور ایک کھڑکی کی جھری میں سے یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زویا، شامیر کی صحت کے سلسلے میں بے حد فکرمند تھی۔ وہ اشک بار ہو کر اس کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ اتنے میں اس کے موبائل فون کی بیل ہوئی۔ وہ جائے نماز سے اٹھی۔ یہ میسنج سے اس کی ماما کا فون تھا..... زویا نے کل ہی ماما کو فون کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ وہ اور حولیہ برج برگ کے کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ زویا نے ماما کو اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا جو دو دن پہلے مقامی جیل کے لاک اپ میں پیش آیا تھا..... رابرٹ نے جس طرح ننھی عینی کو بھنبھوڑنے کی کوشش کی تھی، اس نے ایک طرح سے زویا اور رابرٹ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی اور تو اور ماما بھی رابرٹ کے حق میں ایک لفظ نہیں بول سکی تھیں۔

''ہیلو ماما!'' زویا نے کال ریسیو کرتے ہوئے بجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''کہاں ہو تم اور حولیہ؟'' ماما نے حسبِ عادت خشک لہجے میں پوچھا۔

''وہیں ہوٹل میں ہیں۔''

''تو اب یہاں کب تک ٹکے رہنا ہے تم نے؟ لیونا برگ واپس جاؤ۔'' وہ حکم سے بولیں۔

''بس ماما..... دو چار دن میں چلی جاؤں گی۔''

''دو چار دن میں دو ڈھائی سو یورو کرایہ مزید بھر دو گی۔ ابھی کیوں نہیں جاتی ہو؟'' انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

زویا ان کی اس چبھن کی وجہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شامیر یہاں برج برگ کے اسپتال میں ہے لہٰذا وہ بھی برج برگ میں رکی ہوئی ہے اور یہ بات ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ وہ شامیر کو ایسی حالت میں چھوڑ کر یہاں سے کیسے چلی جاتی۔ حولیہ کا خیال بھی یہی تھا کہ انہیں رکنا چاہیے۔

ماما کی کرخت آواز پھر فون پر ابھری۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولیں۔ ''زیکھوز دیا! جو کچھ ہو چکا وہ بہت ہے۔ اب کچھ غلط نہیں ہونا چاہیے..... ورنہ میں تمہاری اپنی جان ایک کردوں گی۔'' ان کی آواز اندرونی ہیجان کے سبب لرز رہی تھی۔

زویا نے ماں کو بہ مشکل سنبھالا اور باور کرایا کہ نمری والے معاملے کی گرد ذرا بیٹھ جائے تو وہ دونوں بہنیں واپس لیونا برگ چلی جائیں گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

ماں سے گفتگو کرنے کے بعد زویا نے عینی کے لیے دودھ اور حولیہ کے لیے ناشتا تیار کیا۔ اس کے بعد حولیہ کو جگایا اور بتایا کہ وہ ''درس گاہ'' جانے کے لیے نکل رہی ہے۔ درس گاہ جانے کا پروگرام اس نے رات کو ہی بنا لیا تھا۔ حولیہ نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ درس گاہ کے منتظم، ایک ممتاز عالم دین بزرگ تھے۔ ان کا نام مولانا غلام قادر تھا اور وہ ٹاؤن کی واحد مسجد کی امامت بھی کرتے تھے۔ زویا ان سے شامیر کے لیے دعا کرانا چاہتی تھی۔

وہ بذریعہ ٹیکسی کار دس بجے کے لگ بھگ درس گاہ پہنچ گئی۔ اس نے حجاب پہن رکھا تھا اور ایک سفید کھلے لبادے میں تھی جو کندھوں سے پاؤں تک چلا گیا تھا۔ مولوی صاحب سے اس کی ملاقات درس گاہ کے ہی ایک کمرے میں ہوئی۔ نورانی صورت والی اس حلیم الطبع شخصیت سے مل کر زویا کو ایک طرح کا روحانی سکون محسوس ہوا۔ زویا کی درخواست پر انہوں نے شامیر کے لیے دعا کی..... انہوں نے زویا کو کئی ایسی باتیں بتائیں جو اس کے بے قرار دل کے لیے کسی حد تک راحت کا باعث بنیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہر مقام شکر کا مقام ہوتا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ کے مطابق کتنا بھی تکلیف دہ کیوں نہ ہو اور صدقہ و خیرات بلاؤں کو ٹالتا ہے۔ ہماری یہ نیکی، ہمارے لیے کسی نہ کسی شکل میں ضرور آسانیاں پیدا کرتی ہے۔''

زویا جب مولانا سے مل کر درس گاہ سے باہر نکلی تو مسجد کے سامنے ایک بوڑھی، سفید فام عورت خستہ حالت میں کھڑی تھی، یقیناً کسی مالی مدد کی منتظر تھی۔ زویا کے دل میں عجیب سا گداز بھرا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک سوچا، نقدی تو اس کے پاس تھوڑی ہی تھی..... اس کا کریڈٹ کارڈ بھی لیونا برگ میں ہی تھا..... اس نے اپنی انگلی سے سونے کا ایک Ring نکالا اور عورت کے لرزتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''گولڈ کا ہے مدر۔'' اس نے کہا۔

عورت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو امڈ آئے۔

زویا آگے بڑھ گئی۔ اس کی نگاہ دور ایک بلند صلیب پر پڑی۔ گھروں کی مخروطی چھتوں کے درمیان سے یہ صلیب ایک ٹاور کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ یہ ٹاؤن کے چرچ کی صلیب تھی۔ چرچ کا خیال آتے ہی زویا کو فادر جوناتھن کا خیال بھی آ گیا۔ اسے پتا چلا تھا کہ چند روز سے وہ سخت بیمار ہیں۔ اس نے ان کی عیادت کا سوچا پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ چرچ سے باہر بھی تو بہت سے ضرورت مند، محتاج اپنی آنکھوں میں انتظار لیے کھڑے ہوتے تھے۔

وہ چرچ کی طرف جانے کے بجائے قریبی مارکیٹ کی طرف مڑ گئی..... تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ مارکیٹ سے نکلی تو اپنی کلائی کی سوئس گھڑی مناسب قیمت پر بیچ چکی تھی۔ اس کے شولڈر بیگ میں اب کم و بیش تین سو یورو موجود تھے۔

وہ قریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل ہی طے کر کے چرچ پہنچی۔ وہاں ایک جانب تعمیر اور بحالی کا کام جاری تھا۔ چرچ کو دیکھتے ہی اس کے تصور میں وہ اندوہناک مناظر ابھر آئے جب یہاں آگ لگی تھی اور ایک تہلکہ مچا تھا۔ شعلے، دھواں، جان بچانے کی بھاگ دوڑ، کربناک آوازیں..... وہ سب کچھ زویا کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ کسی شیر کی طرح شعلوں کی طرف جھپٹا تھا اور ایک بار نہیں، کئی بار..... دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے تھے اور تو اور فائر مین بھی حیرت زدہ تھے۔

ایک آہ کھینچ کر زویا حال میں واپس آ گئی۔ وہ اب چرچ کے سامنے والے احاطے میں تھی۔ یہاں ایک مستطیل شیڈ کے نیچے بہت سے مفلوک الحال، سوالی موجود تھے۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھولی اور دو تین منٹ کے اندر سارے یوروان مستحق افراد میں تقسیم کر دیے۔

''ٹھیک ہو جاؤ شومیر..... ٹھیک ہو جاؤ..... اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ اور انہی قدموں پر چل کر یہاں سے..... اور یہاں کے خطرات سے دور چلے جاؤ۔ اپنے پیاروں میں پہنچ جاؤ.....'' ایک خاموش دعا اس کے ہونٹوں پر تھی۔

وہ اب چرچ کے مین دروازے پر کھڑی تھی۔ ''میں فادر سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک منتظم سے کہا۔

''فادر جوناتھن؟'' منتظم نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں۔''

''فادر تو نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب جناب؟''

''شاید تمہیں معلوم نہیں۔ کل شام انہیں سخت ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ ٹاؤن کے کارڈیک اسپتال میں ہیں۔''

''اوہ گاڈ!'' زویا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆☆☆

فادر جوناتھن اسپتال کے ''سی سی یو'' میں پڑا تھا۔ اس کے لیے پچھلے چار پانچ دن، زندگی کے کٹھن ترین دن ثابت ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر طرح کے مصائب نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے۔ نمرسی اور مائیکل کے قتل کی خبر سن کر وہ سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو ایک ''ناقابلِ اصلاح گناہ گار'' کو ختم کرنے کے لیے نکلے تھے۔ وہ صحیح سلامت رہی تھی اور وہ خود لاشوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کہا یہی جا رہا تھا کہ وہ کسی مخالف گروپ کی کارروائی کا نشانہ بنے ہیں۔

فادر کو خشامہ کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ جس رات نمرسی اور مائیکل والا واقعہ ہوا، اسی رات وہ بھی چرچ سے اچھل ہو گئی تھی۔ فادر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ خیال یہی تھا کہ وہ بطور نن، چرچ کے پابند ماحول کو برداشت نہیں کر سکی۔ خاص طور سے مستقل طور پر..... تہ خانوں میں رہنا اس کے لیے بیزار کن ثابت ہوا ہے اور وہ کہیں نکل گئی ہے۔ دوسرا اندیشہ جو زیادہ تشویشناک تھا..... یہ تھا کہ کہیں نمرسی نے ہی اس کے ساتھ کچھ کر نہ ڈالا ہو۔ نمرسی بھی دو روز تہ خانوں میں ہی موجود رہا تھا..... وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ عین ممکن تھا کہ نمرسی کی نگاہ اس پر پڑ گئی ہو اور وہ اپنی بدفطرت سے مجبور ہو گیا ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہاں چرچ میں ڈیڑھ دو سال پہلے بھی ہوا تھا۔ ایک جواں سال جرمن پادری کی نیت ایک اٹالین نن پر خراب ہو گئی تھی۔ وہ اسے تہ خانے کے ایک الگ تھلگ کمرے میں لے گیا تھا۔ وہاں اس کے

ساتھ زیادتی کی اور اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ اس بیس سالہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی چل بسی تھی۔ بعدازاں لاش کی بو پھیلنے پر اس کا سراغ لگا تھا۔

اسی طرح کے اندیشے کے تحت فادر جوناتھن نے دو روز پہلے تہ خانوں کے ہر کونے کھدرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ فادر جانتا نہیں تھا کہ وہ جس کے بارے میں فکرمند ہے اور سوچ رہا ہے کہ کہیں وہ نرسری کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو، وہ خود نرسری کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئی ہے..... وہ نرسری کے قتل اور خشامہ کی گمشدگی میں کوئی لنک نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔

اور پھر کل شام جب پولیس پارٹی اس سے "چوری ہونے والی کار" کے حوالے سے پوچھ گچھ کر کے واپس گئی تھی وہ سخت جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ ان لمحوں میں اس کا دھیان ایک بار پھر زویا کی طرف چلا گیا۔ اس کے اندر تپش کی لہریں ابھرنے لگیں۔ اس نے سوچا تھا، کاش اس کے جسم میں اتنی توانائی ہوتی کہ وہ خود زویا تک پہنچتا اور اپنے ہاتھوں سے اس نافرمان، منحرف لڑکی کی جان لے لیتا۔ اس نے ہر قدم پر اپنی قوم، اپنے وطن اور مذہب کے لیے ندامتوں کے اسباب پیدا کیے تھے۔

زویا اور دیگر حالات کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی اس کے سینے میں درد شروع ہوگیا تھا۔ سانس تو پچھلے کئی دنوں سے ابتر تھی، اس درد نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی اور وہ بیڈروم کے دروازے کے سامنے ہی چکرا کر گر گیا..... اس نے آج تقریباً 18 گھنٹے بعد یہاں اسپتال کے سی سی یو میں آنکھ کھولی تھی۔ اب وہ پچھلے تقریباً دو گھنٹے سے اسی طرح چت لیٹا سوچ رہا تھا۔ اس کے جسم سے نالیاں لگی تھیں اور منہ پر گیس ماسک تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں بار بار نمی جمع ہوجاتی تھی۔ ایک رقت سی طاری تھی اس پر۔

سبز لباس میں ملبوس نرس بڑے احترام سے اس کے سامنے جھکی اور اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے بولی۔ "فادر! آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔ مشکل وقت گزر گیا ہے۔"

وہ بہت نحیف آواز میں بولا۔ "مشکل وقت گزر گیا ہے مگر اس کے اثرات بھی تو کچھ کم مشکل نہیں ہیں۔ تمہاری جھوٹی تسلی کا شکریہ۔"

"جھوٹی تسلی نہیں فادر۔" وہ کھوکھلے لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ ٹھہری آواز میں کہنے لگا۔ "اب جتنا وقت بھی گزرنا ہے..... اس بستر پر ہی گزرنا ہے اور کتنا گزرنا ہے اس کا بھی کیا پتا؟ چند دن..... چند مہینے..... یا کیا پتا چند منٹ۔"

"پلیز فادر! ایسا مت کہیں۔ برج برگ میں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔"

فادر کی آنکھوں میں پھر نمی آگئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ نتھنوں میں دواؤں اور کیمیکلز کی بو تھی۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب کایا کلپ محسوس کر رہا تھا۔ ماضی بعید اور ماضی قریب کی ساری کوتاہیاں اور غلط رویاں اسے یاد آنے لگیں۔ نوجوانی کے کچھ کمزور لمحے، درمیانی عمر کی منافقت اور بڑھاپے کی ہوس زر..... وہ اپنے ہی اندر مسمار ہونے لگا تھا۔ آنسو آنکھوں کے گوشوں سے رسنے لگے اور کنپٹیوں کی طرف بہنے لگے۔

یہی وقت تھا جب اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ زویا اندر آرہی تھی..... ہاں، یہ سارہ کی بیٹی زویا ہی تھی۔ وہ ایک کھلے لبادے میں تھی۔ اس نے اسکارف لے رکھا تھا۔ اسکارف اور لبادہ سفید تھے۔ اس کے چہرے پر ملکوتی اجالا تھا جیسے جنت کی کوئی دوشیزہ ہو..... اور ہوا پر پاؤں رکھتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ وہ اس کے قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز جیسے کافی فاصلے سے جوناتھن تک پہنچ رہی تھی۔ "فادر! آپ کیسے ہیں؟"

فادر جوناتھن نے اثبات میں سر ہلایا۔

"فادر! آپ نے بہت زیادہ ٹینشن لی ہوئی تھی۔ پلیز آپ خود کو ریلیکس کریں۔ سب اچھا ہوجائے گا۔"

"خدا کرے سب اچھا ہوجائے۔" فادر نے نحیف آواز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "تم اور حولیہ ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں فادر! آپ کی دعا ہے۔ بس حولیہ کو ایک بازو پر کچھ زخم آئے تھے لیکن اب وہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اور..... وہ پاکستانی..... شامیر؟"

"وہ کافی زخمی ہے فادر..... آپ اس کے لیے دعا کرنا۔" زویا کی آواز بھرا گئی۔ فادر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بولی۔ "شامیر کو اس حال تک پہنچانے والے دو تو اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں..... اگر کوئی اور ہے تو اللہ کرے وہ بھی سزا پائے۔" زویا کا اشارہ نرسری اور مائیکل کی

طرف ہی تھا۔

فادر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ تازہ آنسو اس کی سفید براق کنپٹیوں کی طرف ڈھلک گئے۔

"آپ کی دعاؤں میں بہت اثر ہے فادر۔ چرچ میں ہمیں آپ کی پناہ میسر نہ آئی ہوتی تو نرسی کے کارندے دو ہفتے پہلے ہی ہماری جان لے چکے ہوتے۔ چرچ کی آگ میں سے بھی آپ ہی کی دعاؤں نے ہمیں زندہ نکالا۔ اب بھی یہ دعائیں درکار ہیں....."

فادر جوناتھن دھندلائی نظروں سے زویا کے چہرے کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے اندر لعنت وملامت کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ وہ چالیس سال سے کنفیشن باکس میں بیٹھ کر لوگوں کے اعترافاتِ گناہ وجرم سن رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا دل چاہا کہ وہ اس اجلی اجلی "فرشتہ صورت" لڑکی کو باکس کے اس حصے میں بٹھائے، جہاں وہ خود بیٹھتا رہا ہے اور خود پردے کی اس جانب کھڑا ہو جائے جہاں اعترافِ گناہ کیا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اس کے گوش گزار کر دے جو ایک گاڑھے سیاہ دھوئیں کی طرح اس کے سینے میں جمع ہو رہا ہے۔

یہ چرچ نہیں اسپتال تھا، یہاں کنفیشن باکس بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جوناتھن کو یہی لگا جیسے وہ باکس میں ہے اور پردے کی دوسری جانب سفید لباس میں زویا بیٹھی ہے۔ اس نے اپنے کمزور استخوانی ہاتھ میں زویا کا ہاتھ تھاما۔

"زویا....." اس نے بہ مشکل کہا۔ الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے۔

اس نے آنکھیں پھر موند لیں۔ کتنی ہی دیر، اپنے اندر طاقت جمع کرتا رہا..... مگر طاقت جمع نہیں ہوئی۔ اس نے آنسوؤں کا ایک گھونٹ بھرا اور زویا کی طرف دیکھے بغیر بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔"

وہ جیسے سرتاپا لرز گئی۔ "فادر! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ آپ کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں؟"

"ہر بات کی۔" فادر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔

"فادر..... پلیز مجھے شرمسار نہ کریں، آپ تو خدا کے برگزیدہ ہیں۔ بے شمار لوگوں کے لیے آپ کی زندگی ایک مثال ہے..... مذہب اور عقیدے سے قطع نظر آپ وسیع نظر رکھنے والے ایک مہربان شخص ہیں۔ اوپر والا آپ کے عقیدت مندوں کے سر پر آپ کا سایہ سلامت رکھے۔"

"زویا! تمہارے خیالات کے لیے شکریہ۔" فادر نے آنکھیں بند کیے کیے کہا پھر ہاتھ سے اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ اب جا سکتی ہے۔

فادر کا کندھا چھو کر وہ اٹھی۔ خدا حافظ کہہ کر چند قدم الٹے پاؤں چلی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کڑوی کسیلی دواؤں کی وجہ سے شامیر کی طبیعت ہر وقت مکدر رہتی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ تھوڑی سی راحت بھی محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ "ریلیف" کی کیفیت تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برج برگ کی فضا میں ایک خوشگوار سہ پہر کی چمک تھی۔ نیلے آسمان کا ایک شفاف ٹکڑا کھڑکی میں سے دکھائی دیتا تھا۔ سفید پرندوں کی ایک چھوٹی سی قطار، دو سیکنڈ کے لیے جھلک دکھا کر اوجھل ہو گئی۔ نیچے کیاریوں میں سن فلاور..... گیندے اور گلاب کے پھول رنگ بکھیر رہے تھے اور کسی وقت مدھر ہوا کا ہاتھ انہیں جھومنے پر اکساتا تھا۔

سامنے ہی پتھر کا ایک بینچ نظر آ رہا تھا۔ لمبے بالوں والا ایک ٹین ایجر لڑکا ہیڈ فون لگائے میوزک سن رہا تھا۔ غالباً کوئی رنجیدہ گانا ہی تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی دکھائی دیتی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے اپنی پینٹ کی جیب ٹٹولی..... اور سیل فون نکال لیا۔ کسی کی کال آئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کے کتابی چہرے پر خوشی اور مسرت کی یلغار سی ہو گئی۔ اس نے فون کو دو تین بوسے دیے۔ شاید اس کی کوئی گرل فرینڈ ہی تھی۔ وہ باتیں کرتا ہوا اٹھا اور دوسری طرف چلا گیا.....

شامیر، بستر پر نیم دراز سوچنے لگا۔ کبھی کبھی کوئی ای میل، کوئی فون کال، یا پھر پوسٹ مین کی دستک انسان کے لیے کس قدر جاں فزا ثابت ہوتی ہے..... اس کا دھیان بے ساختہ چار برس پہلے کے شب و روز کی طرف چلا گیا۔ ایک ایسی ہی دستک اس کے لیے بھی تو ہوئی تھی۔ یہ خوشی اور امید کی دستک تھی جو لاہور میں ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ زویا کی ہمراز دوست جین، زویا کی حالت سے غمزدہ ہو کر شامیر کو ڈھونڈتی ہوئی لاہور اس کے گھر پہنچی تھی۔ بدقسمتی سے وہ گھر پر نہیں تھا۔ اگر تب جین کے آنے کی اطلاع اس تک پہنچ جاتی تو شاید حالات وہ نہ ہوتے جو آج تھے۔ شاید بہت پہلے اس کی اور زویا کی دوریاں ختم ہو گئی ہوتیں۔ شاید وہ اپنی مراد پا چکا ہوتا۔ شاید..... شاید۔ ایسے بہت سے حسرت ناک "شاید" ہر انسان کی زندگی میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر

اس وقت اموخالہ کے دل میں رحم آ جاتا اور وہ جین کا رابطہ اس سے کرا دیتیں تو شاید.....

ہاں پھر وہی شاید۔

اموخالہ کی اس ''سخت دلی'' نے امید کی وہ کرن اندھیروں میں غرق کر دی تھی جو چار سال پہلے اس داستان کو ایک حسین موڑ دے سکتی تھی۔ اب وہ حسین موڑ رہا تھا، نہ وہ اموخالہ اور نہ وہ فارہ۔ وہ دونوں اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے عذاب میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ یہاں شامیر اپنی اذیتوں کے گھیرے میں تھا۔

شامیر نے دروازے کی جانب دیکھا اور یکبارگی دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ حولیہ اندر آ رہی تھی۔ آج زویا کی طرح وہ بھی حجاب میں تھی۔ اس نے اسپتال کا ''ملاقاتیوں والا گاؤن'' پہن رکھا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اس کے قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی۔ آج پہلی بار شامیر نے حولیہ کے چہرے پر اپنے لیے اپنایت اور ہمدردی کے تاثرات دیکھے۔

''شکر ہے، تم میں سے کسی کی شکل تو نظر آئی۔'' شامیر نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زویا پھر کیوں نہیں آئی؟''

''فون پر زویا اور میں یہاں کے میڈیکل اسٹاف سے مسلسل رابطے میں رہی ہیں۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی ہیں۔''

''بس فون پر ہی؟''

''شامیر! ویری سوری۔ میں نے کل ہی چکر لگانا تھا مگر پھر زویا کو کسی ضروری کام سے ڈاؤن ٹاؤن جانا پڑ گیا۔ راستے میں اسے پتا چلا کہ فادر جوناتھن کو اٹیک ہوا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔ مجبوراً وہ وہاں چلی گئی۔''

دونوں میں کچھ دیر تک فادر کی صحت کے بارے میں گفتگو ہوئی پھر شامیر نے زویا اور عینی کے بارے میں پوچھا۔ حولیہ بولی۔ ''زویا بھی کل ضرور آئے گی۔ وہ چار پانچ روز سے آنا چاہ رہی ہے مگر کسی حد تک نمرسی کا خوف ہی تھا جو ہمیں بار بار ہوٹل سے نکلنے سے روک رہا تھا..... خیر اب نمرسی تو اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ایسے شخص کے جانے پر تو خدا کا شکر ہی کرنا چاہیے۔''

نرس آئی اور شامیر کے سلامت بازو پر لگے کینولا میں ایک انجکشن دے کر چلی گئی۔

حولیہ، شامیر کی حالت سے پریشان تو تھی مگر اس نے پرخلوص انداز میں شامیر سے امید افزا گفتگو کی۔ وہ اپنے سابقہ رویے پر بھی بے حد شرمندہ تھی۔ اس شرمندگی کے نتیجے میں اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو جھلملاتے رہے..... ملاقات کا وقت محدود تھا، کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

اگلے روز کا انتظار شامیر نے بے حد شدت سے کیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ دس بارہ گھنٹے نہیں، دس بارہ مہینے ہیں۔ پچھلی بار زویا جب تک اس کے پاس رہی تھی، وہ اپنی ہر تکلیف بھول گیا تھا۔ اب بھی اسے یہی امید تھی۔ اس کی نگاہ بار بار بے ساختہ، وال کلاک کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ بالآخر وہ آ گئی۔ وہ لیونا برگ کی ایک بڑی چمکیلی سہ پہر تھی۔ آج شامیر کی طبیعت بھی قدرے بہتر تھی۔ یا شاید یہ زویا کا انتظار ہی تھا جس نے تکلیف کی طرف سے اس کا دھیان ہٹا دیا تھا۔ وہ ہلکے رنگ کے مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ اندر آنے کے بعد وہ حجاب کو ایک دوپٹے کی طرح اپنے سر پر اوڑھ لیتی تھی۔

''زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟'' وہ وال کلاک کو دیکھ کر بولی۔

''دیر تو یقیناً ہو گئی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لیکن جب آنے والا آ جائے تو شکوے بھول ہی جاتے ہیں۔''

''بس یہاں کی فارمیلٹیز میں دیر ہو جاتی ہے۔ ورنہ میں تو ایک بجے ہوٹل سے نکل آئی تھی۔''

دونوں نے تھوڑی دیر تک نمرسی کی موت کے بارے میں بات کی۔ نمرسی اور اس کی سفاکی کے بارے میں اب زویا اور شامیر کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ گیا تھا۔ فادر جوناتھن کے گھر قیام کے دوران میں ہی شامیر نے زویا کو بتا دیا تھا کہ وہ حولیہ پر ہونے والے ستم سے آگاہ ہو چکا ہے۔ زویا کی زندگی پر منڈلانے والا ایک اور بدکردار اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا اور یہ شامیر کے لیے بہت اطمینان بخش تھا۔ لیکن وہ انجام کو کیسے پہنچا، اصل میں اس کے پیچھے کس کا کردار تھا؟ یہ ان دونوں کے لیے راز تھا اور راز ہی رہنا تھا۔ وہ لڑکی جس کا نام خشامہ تھا، اب ایک الگ دنیا کی باسی تھی۔

زویا نے کہا۔ ''میں نے آج بھی سینئر ڈاکٹر تھامسن رے سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علاج اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جب انفیکشن رک جائے گا اور زخم مندمل ہونا شروع ہو جائیں گے تو پھر جسم کی اسکن گرافٹنگ کے بارے میں سوچا جائے گا۔ شکر ہے کہ تمہارا چہرہ محفوظ رہا ہے۔ انشاء اللہ پلاسٹک سرجری صرف جسم کے لیے ہو گی اور جب یہ ہو جائے گی تو باڈی بالکل پہلے کی طرح ہو جائے گی۔''

''لیکن یہ کام زیادہ جلدی بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' شامیر نے دبی دبی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟''

''لگتا ہے کہ تم نے تو مجھے چار ہفتوں میں کھڑا کر دینے کا پروگرام بنالیا ہے۔ ایسا ہوگیا تو پھر تو میں چلا جاؤں گا واپس۔ ایسی تسلی تشفی والی نایاب باتیں مجھ سے کون کرے گا؟''

جب بھی شامیر کوئی ایسی معنی خیز بات کرتا تھا، زویا موضوع بدل دیتی تھی۔ شاید وہ کسی ایسے رخ پر جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اب بھی اس نے شامیر کا تکیہ درست کرتے ہوئے بات بدلی۔ ''ماما سے پھر تو بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں۔''

''تمہیں بات کرنی بھی نہیں چاہیے شومیر! بات تو انہیں کرنی چاہیے..... بلکہ انہیں معافی مانگنی چاہیے تھی تم سے۔ حولیہ نے مجھے بتایا ہے، ایسن میں انہوں نے تم سے بہت برا سلوک کیا۔'' زویا کی آواز کرب میں ڈوب گئی۔

''میں وہ سب بھول چکا ہوں زویا! ویسے بھی وہ بڑی ہیں۔ وہ جو بھی کہہ لیں، ان کا حق بنتا ہے۔''

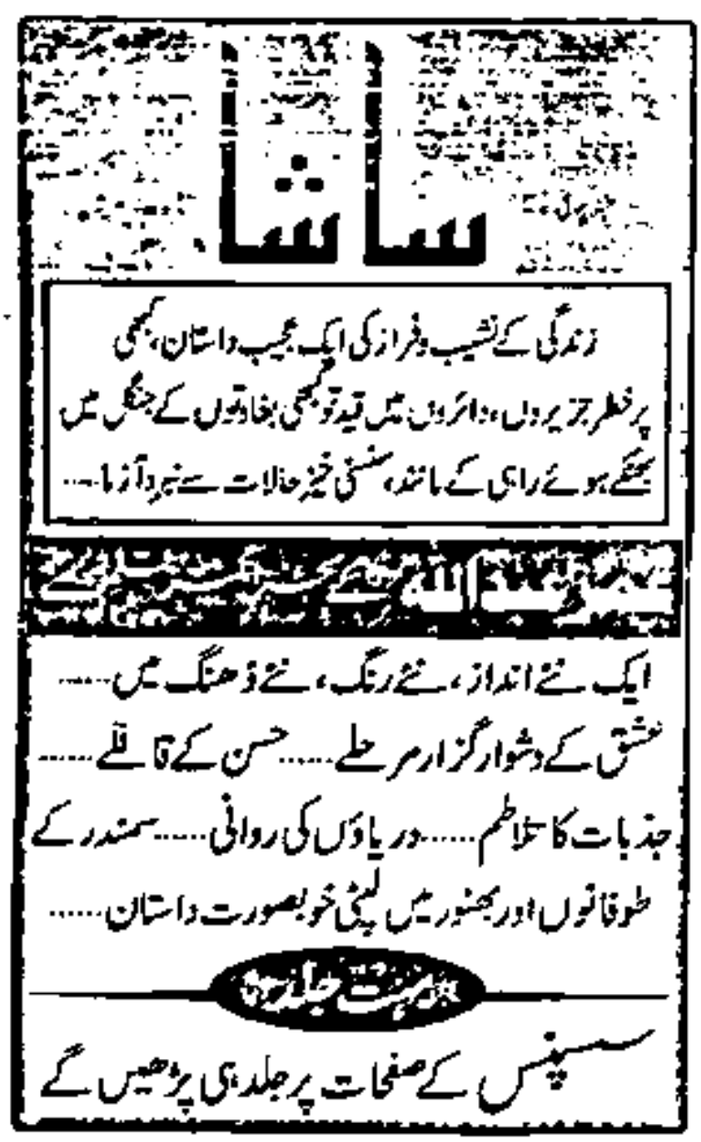
''لیکن..... انہوں نے جو بھی کہا، جو بھی سوچا وہ سب کا سب غلط تھا شومیر! ایک عمر رسیدہ تعصب نے انہیں اندھا بہرا کر چھوڑا ہے۔ وہ یہی سمجھتی رہیں کہ حولیہ پر ستم ڈھانے اور انہیں زخمی کرنے والا فعل پاکستانی سہراب درانی نے انجام دیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر نمرسی کی سفاکی تھی اور نمرسی جرمن تھا۔ میری زندگی کو مسلسل عذاب بنانے والا بھی کوئی اور نہیں ان کا چہیتا ہم قوم رابرٹ ہی تھا۔ بچہ نہ ہونے کے سبب حولیہ کو اپنی زندگی سے دور کرنے والا بھی ایک جرمن ہی ہے اور پھر جن لوگوں نے مجھے اور میری بچی کو کئی روز میرے ہی گھر میں یرغمال بنایا، وہ کون تھے؟ وہ بھی ایشیائی نہیں تھے، نہ ہی مسلمان تھے۔ وہ یہاں کے مہذب جرمن ہی تھے، ہاں مہذب جرمن اور مہذب سفید فام جو چرچ میں لگنے والی آگ کے موقع پر قطار اندر قطار کھڑے تھے اور بے بس نظر آرہے تھے۔ اندر میری بہن اور خود میری ماں موت کے دہانے پر تھیں۔ تہذیب تو انسانیت اور قربانی سکھاتی ہے۔ اس وقت انسانیت اور قربانی کسی جرمن میں نہیں غیر جرمن میں نظر آئی۔ تم نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈالی اور ان دونوں کو بھڑکتے شعلوں سے نکالا لیکن وہ میری ماما ہیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ان سب باتوں کو سمجھنے کے باوجود بھی نہیں سمجھیں گی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ان کو اپنی قوم سے غداری کی طرح لگے گا۔''

''زویا میرے خیال میں ان کے رویے کے پیچھے ان کی ازدواجی زندگی کا بھی کچھ عمل دخل رہا ہے۔'' شامیر نے نحیف آواز میں کہا۔

''شومیر! اگر میرے مرحوم والد میں کچھ خامیاں تھیں تو ان میں وہ اکیلے قصوروار نہیں تھے۔ یہ تالی دونوں ہاتھوں کے ساتھ بجتی رہی ہے مگر اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ کسی ایک فرد کی وجہ سے ایک پورے خطے یا اس خطے میں بسنے والے لوگوں کو ہی ملعون و مطعون کر دیا جائے۔''

''میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں زویا۔ ہر قوم اور خطے میں اچھے بُرے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا مجھے جرمنی میں اچھے دوست نہیں ملے؟ جین، نام، مارگریٹ یہ سب جرمن ہی تو ہیں..... اور پھر نومسلم مسز حامدہ جن کی آنکھوں میں، میں نے ہر کسی کے لیے بے لوث محبت کی جوت جلتے دیکھی ہے۔''

پیتھالوجسٹ کی آمد پر زویا کو باہر جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر تھامسن رے کی عنایت سے وہ پھر اندر آنے اور تسلی سے شامیر کے پاس بیٹھنے میں کامیاب ہوگئی۔ کھڑکیوں سے باہر پھولوں کے رنگ تھے اور ایک خوشبو دار ہوا تھی جو



صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔

شامیر نے کہا۔ ''زویا! ایک سوال عرصے سے ایک کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھا ہوا ہے اور شاید ہمیشہ چبھا رہے گا۔ کیا تم مجھے اس سوال کا جواب دے کر اس اذیت سے نکال سکو گی؟''

زویا کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ''کیسا سوال؟'' اس نے ذرا جھجک کر کہا۔

''ناراض تو نہیں ہو گی؟''

اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور نفی میں سر ہلایا۔

''زویا! کیا میرے یہاں سے جانے کے بعد تم واقعی اپنے مسائل میں گم ہو کر رہ گئی تھیں؟ کیا تم نے کبھی مجھے یاد نہیں کیا؟''

وہ شامیر کو دیکھے بغیر بولی۔ ''کیا، میں خاموش رہنے کا حق استعمال کر سکتی ہوں؟''

''یہ حق تو تم بہت عرصے سے استعمال کر رہی ہو۔'' اس نے کہا اور ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ آنکھیں بند کرے گا تو آنکھوں میں بند دو موتی باہر لڑھک آئیں گے۔ وہ شرمندہ ہو گیا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

ان دو آنسوؤں نے زویا کے دل پر عجیب سا اثر کیا۔ جیسے پانی سے لبالب بھری ہوئی ایک گاگر کو ٹھوکر لگ جائے۔ وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر سمجھ نہیں پائی کہ کیا کہے؟ شامیر بھی اسی طرح آنکھیں بند کیے چت لیٹا رہا۔ اس کے زخم زخم جسم کے خیال سے زویا کا دل بھر آیا۔

''ناراض ہو گئے ہو؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''یہ حق تو نہیں ہے مجھے۔''

''اچھا..... پوچھیں جناب۔''

زویا کے اس طرح مخاطب کرنے پر شامیر کے چہرے پر عجیب سی رونق امڈ آئی۔ جسمانی تکلیف کہیں دور پس منظر میں چلی گئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''کبھی یاد کیا مجھ کو؟''

زویا کے ہونٹ بے ساختہ لرزے مگر وہ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اچھے دنوں میں جب کوئی چاہت کی بات کرنا ہوتی تھی، وہ اس کی پشت کی طرف جا کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیتی تھی اور اس کے کان میں دلنشین سرگوشی کرتی تھی۔ آج بھی شاید وہ یہی جھجک محسوس کر رہی تھی۔

شامیر نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''چلو..... میں اس طرف دیکھ لیتا ہوں، اب جو جی میں آئے کہہ دو۔''

شامیر کا بایاں ہاتھ زویا کے گھٹنے کے بالکل پاس تھا۔ اس نے اسے تھاما اور اپنی شہادت کی انگلی سے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی ہتھیلی پر yes کے حروف لکھے۔ اس نے شامیر کے سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا یعنی وہ اسے یاد کرتی رہی ہے۔

اپنی ہتھیلی پر حروف کا لمس محسوس کر کے شامیر کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ ایک سخت برف تھی جو پگھل رہی ہے۔ اس نے مڑ کر زویا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گلاب ہو رہا تھا۔ ان لمحوں میں ایک نہایت دھیمی سی جھجک آمیز شوخی اسے زویا کی جھکی ہوئی پلکوں پر دکھائی دی۔

''کتنا یاد کیا؟'' اس نے پوچھا اور منہ پھر دوسری طرف پھیر لیا۔

''بہت زیادہ.....'' زویا نے پھر انگلی سے اس کی ہتھیلی پر لکھا۔

''کتنا زیادہ؟''

''بہت ہی زیادہ۔ ہر پل.....''

''تو پھر، میرا دل اتنا کیوں دکھایا..... کیوں کہا کہ اب سب کچھ بدل چکا ہے؟ کیوں مجھے لیونا برگ سے بھگانے کے لیے اتنی سرد مہری دکھائی؟'' وہ منہ پھیرے پھیرے بولا۔

''..... SORRY'' اس نے شامیر کی ہتھیلی پر لکھا۔ کتنا مختصر مگر جامع جواب تھا۔

شامیر نے منہ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ زویا کی آنکھوں میں گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے..... کسی بھی وقت آنسوؤں کی موسلا دھار بارش ہو سکتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ اچانک رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ کریم کلر کے اسکارف میں چھپا لیا تھا۔ شامیر کو فقط اس کی پیشانی نظر آ رہی تھی جس پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے آنسو بے آواز تھے۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔

''پلیز زویا! ایسا مت کرو۔'' اس نے کہا۔

وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ شاید لابی میں بیٹھ کر اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ اوس میں دھلے سرخ و سپید پھول کی طرح تھا۔ اسے دوبارہ اپنے

پاس دیکھ کر شامیر کی پنڈلیوں کی طرف سے اٹھنے والی درد کی شدید لہریں ماند پڑ گئیں۔

اس کا دل چاہا کہ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر زویا کو گلے سے لگا لے لیکن کیسے؟ وہ تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

''زویا! تم نے آج میرے لیے مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسپتال میں سب سے زیادہ ڈر تو موت کا ہی ہوتا ہے مگر مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہاں، اب لگ رہا ہے۔''

''پلیز شومیر! ایسی باتیں مت کرو۔ تم نے چند روز میں بالکل ٹھیک ہو جانا ہے۔''

''اب تو شاید ہونا ہی پڑے گا۔ گہری تاریکیوں میں کچھ روشنی سی نظر آنے لگی ہے۔''

''آپ صحافی ہو کر کبھی کبھی ادیبوں والے لفظ استعمال کرتے ہیں۔''

''اچھے لفظ استعمال کرنے میں تو تم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہو زویا..... اور ابھی تم نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ میری زندگی کا یادگار ترین لفظ بن گیا ہے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی خوبصورتی اور محبت کو میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔''

''کون سا لفظ؟''

''جو تم نے میری ہتھیلی پر آخر میں لکھا۔'' وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔

''وہ تو میں بہت دفعہ لکھ سکتی ہوں۔'' وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

عجب جذب کے عالم میں اس نے شامیر کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی ہتھیلی پر اپنی شہادت کی انگلی سے پھر sorry لکھ دیا۔

شامیر نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ادویات کا اثر شاید ختم ہو رہا تھا۔ پاؤں کے ناخنوں سے لے کر ہنسلی کی ہڈیوں تک درد کی شدید لہریں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں مگر زویا کی موجودگی میں یہ لہریں تکلیف نہیں دے رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے، ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''کچھ اور بھی لکھنا چاہو تو لکھ دو۔''

''اور کچھ نہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔

''کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔ لکھ دو۔ کہتے ہیں کہ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

اس کے چہرے پر پھر سرخی پھیل گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔ کن انکھیوں سے شامیر کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں بدستور بند کر رکھی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر لکھ دیا SORRY اور نیچے لکھا STILL LOVE YOU۔

اس کی پلکوں پر پھر دو موتی آن اٹکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بس اب چلتی ہوں۔'' وہ نظر چرا کر بولی۔ آنکھوں میں بادل پھر گہرے ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ شامیر اسے روکنے کے لیے کچھ کہتا، ایک مقامی بچی ایک لیڈی ڈاکٹر کی انگلی پکڑے ہوئے اندر آ گئی۔ پانچ چھ سالہ بچی کے ہاتھ میں سرخ گلاب کی ایک کلی تھی۔ اس نے یہ کلی شامیر کے سرہانے رکھی اور جرمن میں شکریے کے کچھ کلمات ادا کیے۔

ڈاکٹر نے انگلش میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سب 120 بچوں کی طرف سے جو لیونا برگ کے اسکولوں سے آئے ہیں اور آپ کی عیادت کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔ یہ سب بچے آپ کے لیے دعا گو ہیں۔''

''میں اس تعریف کے قابل نہیں ہوں۔ بہرحال ان معصوم ہستیوں کا بہت شکریہ۔'' شامیر نے کہا۔

چند فقروں کے تبادلے کے بعد بچی اور ڈاکٹر واپس چلے گئے۔ شامیر نے چونک کر دیکھا۔

زویا بھی جا چکی تھی۔ شامیر کی ہتھیلی پر جیسے نایاب قیمتی موتی رکھے ہوئے تھے۔ یہ چار لفظ نہیں، چار موتی ہی تھے۔ ''سوری..... اسٹل لو یو.....'' اس نے مٹھی بند کر لی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ یہ موتی گر جائیں گے یا کوئی ان کو دیکھ لے گا۔ انبساط کی لہریں اس کی ہتھیلی کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور پورے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ یہ لہریں اس بے پناہ تکلیف پر حاوی تھیں جو اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی..... کچھ وقت کے لیے کم ہو جاتی تھی مگر پھر پلٹ آتی تھی۔

یہی وقت تھا جب سینئر ڈاکٹر تھامسن رے اپنے آفس میں ایک جونیئر ڈاکٹر کے ساتھ موجود تھے۔ وہ شامیر کی تازہ میڈیکل رپورٹس دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش ابھر رہی تھی۔ کافی ساری جلد کاٹی جا چکی تھی پھر بھی انفیکشن رک نہیں پا رہا تھا۔ سینے اور پیٹ پر آگ کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ اندرونی عضلات، خاص طور سے جگر بھی متاثر ہوا تھا۔ کوئی کرشمہ ہی مریض کو بحالی کی طرف لا سکتا تھا۔ ڈاکٹر تھامسن رے روزانہ ہی آگ سے متاثرہ بیسیوں مریضوں کو دیکھتے تھے..... مگر اس پاکستانی مریض کے لیے

وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کی ہمدردی اور تشویش پاتے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، بہت کم لوگ کر پاتے تھے۔

☆☆☆

زویا اب تقریباً روزانہ ہی اسپتال آرہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اس کے پاس رہنے کی کوشش کرتی۔ تیز دواؤں کے زیر اثر شامیر پر کسی وقت غنودگی بھی طاری ہوتی لیکن وہ زویا کی باتیں سنتا رہتا اور حسب حال جواب بھی دیتا۔ وہ اس کا بایاں ہاتھ اپنے نرم ہاتھ میں تھام لیتی۔ کسی وقت اس کی ہتھیلی پر انگلی سے لکھ دیتی LOVE YOU وہ غنودگی میں بھی ہوتا تو اس کے چہرے پر ایک روشنی سی پھیل جاتی۔

ایک روز وہ آئی تو شامیر کی طبیعت نسبتاً بہتر تھی۔ زویا نے اپنے ہاتھ سے اسے تھوڑا سا جوس پلایا۔ ''بستر کی ٹیک تھوڑی سی اونچی کردوں؟'' زویا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

اس نے ٹیک اونچی کردی۔ وہ محویت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو شومیر؟''

''دیکھ نہیں رہا، سوچ رہا ہوں..... یہ زیادتی کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ؟''

''کون سی؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''یہی انگلش بولنے والی۔ تمہاری اس گلابی اردو کو میں ترس گیا ہوں۔''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''تو..... ٹھیک ہے۔ اردو ہی سہی لیکن کسی غلط لفظ پر تو تم کو میرا مذاق نا ہیں اڑانا ہوگیں گا۔''

''تمہیں لگتا ہے کہ میں مذاق اڑانے کے قابل ہوں؟''

''کیا مطلب؟''

''مذاق اڑاؤں گا، مگر ٹھیک ہونے کے بعد۔ جی چاہتا ہے کہ ہم وہ سب کچھ دہرائیں جو چار سال پہلے کے اس جولائی میں ہوا تھا اور جس کا ہر ہر منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔''

''بس..... فی الحال آپ اپنا سارا توجہ اپنی تندرستی پر دیں۔'' (وہ اب اکثر اسے 'آپ' کہہ کر بھی بلاتی تھی)

''جی چاہتا ہے زویا کہ وقت پلٹ آئے۔ ہم پھر اسی جگہ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ پر جا کھڑے ہوں۔ اس بار جب تم مجھے چھوڑ کر جاؤ تو..... میری آواز میرے گلے میں نہ پھنس جائے۔ میں تمہیں پکار سکوں..... ہلکہ کتنا اچھا ہو کہ تم جاؤ ہی نہ۔''

وہ بس ایک ''ہوں'' کر کے رہ گئی۔ آنکھوں میں گہرا کرب کروٹیں لے رہا تھا۔

''یہ انا ہمارے آڑے کیوں آجاتی ہے زویا۔ ہم ایک دوسرے کو پکار کیوں نہیں سکتے؟ کیوں واپس نہیں بلا سکتے؟''

''انا اور شاید کچھ دنیا کا ڈر بھی..... شاید اسی کو تقدیر کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم تقدیر سے نا ہیں لڑ سکتے اور نہ وقت کو واپس بلا سکتے ہیں۔ ہاں، آگے کے لیے سوچنا ہمارے بس میں ہوتا ہے۔''

''لیکن ہم تو فرض کر رہے ہیں نا.....'' وہ ذرا کراہ کر بولا۔ ''اگر وقت چار سال پیچھے چلا جائے..... تو کیا ہو..... ذرا تصور کرو..... تم مجھ سے ناراض ہو کر اپنے فون بند کر چکی ہو۔ میں بھی اپنی انا کا اسیر ہو کر پاکستان واپس جا چکا ہوں..... ہم ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے ہیں، مگر ایک دوسرے کی طرف سے پہل کا انتظار کر رہے ہیں..... بس فرض کرو..... اونلی امیجی نیشن۔''

وہ اپنی ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر کسی گہری سوچ میں کھو گئی پھر کھوئے کھوئے آہنگ میں بولی۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''میں اپنی ضد کو پاش پاش کردوں گا۔ تمہیں فون کروں گا۔ ایک بار نہیں، کئی بار..... شاید درجنوں بار..... تمہیں عاجز کر ڈالوں گا۔ تمہیں تمہارے خول سے نکلنے پر مجبور کردوں گا۔ اپنے سارے تحفظات ایک طرف رکھ دوں گا۔ زویا! جب محبت ہے تو پھر تحفظات کیسے؟ سبک سری اور توہین کا خیال کیسا؟ محبت تو نام ہی اپنی ہستی کو کسی دوسرے کے لیے فنا کر دینے کا ہے۔ اس میں دوسرے کی پہل کا انتظار کیوں کیا جائے؟ کیوں نہ سر جھکا کر محبت کو سربلند کر دیا جائے۔''

زویا کے گلابی ہونٹوں پر بے ساختہ ایک موہوم سی مسکراہٹ کھیلی۔ ''اس لیے ہم کہتا کہ آپ جرنلسٹ ہو کر ادیب بھی لگتے ہو۔''

''اچھا، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرتیں؟''

وہ ایک بار پھر گمشدہ موڈ میں چلی گئی۔ ہاتھ پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے ٹکائے بولی۔ ''ہام، آپ کو بالکل فون نا ہیں کرتا..... ہام شاید 21 نمبر ٹرین کے اسٹاپ پر ہی معاملے کو بگڑنے سے بچا لیتا۔ ہام کی سمجھ میں آج تک نا ہیں آیا کہ

اس ژن وہ سب کیا ہوا؟"

شامیر نے عجب دکھی انداز میں زویا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "زویا..... کیا یہ سلسلے وہیں سے جڑ سکیں گے جہاں سے ٹوٹے تھے؟"

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، دو تین ڈاکٹرز کا ایک پینل، میڈیکل اسٹاف کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ لوگ سیدھے شامیر کے بیڈ کی طرف ہی آئے۔ زویا سے کہا گیا کہ وہ باہر چلی جائے، مریض کا معائنہ ہونا ہے۔

شامیر کا ہاتھ دبا کر زویا باہر چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے گھیر لیا۔ ان میں مہربان چہرے والے سینئر ڈاکٹر تھامسن بھی شامل تھے۔ شامیر کے زخموں کا معائنہ کیا گیا۔ وائٹل سائنز دیکھے گئے، خون کے نمونے لیے گئے۔ ڈاکٹرز آپس میں بہ زبان جرمن گفتگو کر رہے تھے، تاہم اکا دکا الفاظ شامیر کے پلے بھی پڑ جاتے تھے۔ مثلاً..... انفیکشن..... خون کی کمی..... رگوں میں پانی کی زیادتی..... وغیرہ وغیرہ۔ گردوں کی ایک رپورٹ پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔

ڈاکٹرز کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد زویا پھر آ گئی۔ اسے دیکھ کر شامیر کی آنکھوں میں روشنی سی امڈ آئی تھی۔

وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔ "شومیر! آپ تو بہت مشہور ہو گئے۔ تین چار میگزین اور نیوز پیپرز میں آپ کا تصویر پرنٹ ہوا۔ اب بھی اسپتال سے باہر بہت سا لوگ ہے جو آپ کا خیریت دریافت کرتا..... آپ سے ملنا مانگتا..... لیونا برگ کے چرچ میں سنڈے کو آپ کے لیے خاص دعا ہوگیں گا۔"

"ان سب لوگوں کا بہت شکریہ زویا..... اور سب سے بڑھ کر تمہارا۔ یہ تم ہی ہو جو مجھے اس تکلیف سے لڑنے کی طاقت دے رہی ہو۔"

اس نے بے حد اپنایت سے شامیر کا ہاتھ دبایا..... "پلیز شومیر! بس جلدی سے اچھے ہو جائیں۔" اس نے کہا اور ایک آنسو شامیر کے ہاتھ پر گرا پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور خدا حافظ کہہ کر مڑ گئی۔

"کل جلدی آنا زویا۔" وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔

وہ جاتے جاتے مڑی، اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں اشک جمع ہو چکے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سنڈے کے روز شامیر بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا اور جب وہ زیادہ تکلیف محسوس کرتا تھا، اسے زویا کی کمی بھی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ سہ پہر تین بجے تک کا وقت اس نے کلاک کو دیکھ دیکھ کر گزارا..... زویا تو نہیں آئی، اس کا فون آ گیا۔ وہ کسی وجہ سے آج نہیں آ سکتی تھی۔ شامیر کے سینے سے ایک نہایت ٹھنڈی اور طویل سانس خارج ہوئی۔ اب پھر چوبیس گھنٹے کا انتظار تھا۔ اسے لگا کہ وہ پاکستان سے ہزاروں میل دور یہاں بالکل اکیلا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ خالہ ثمینہ اپنی مفلوج بیٹی کو لے کر پاکستان واپس جا چکی ہیں..... اور اگر وہ یہاں بھی ہوتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ کبھی اس کی تھیں ہی نہیں، وہ تو بس ایک ضرورت اور ایک ضد تھی جس نے اسے ان کا پیارا بھانجا بنا رکھا تھا..... ہاں، وہ اکیلا ہی تھا۔ اس دنیا میں کوئی نہیں تھا جسے وہ حقیقی معنوں میں اپنا کہہ سکتا۔ اس نے دکھی دل کے ساتھ سوچا، چلو اچھا ہی ہے..... اگر اسے واقعی مرنا ہی پڑ گیا تو کوئی رونے پیٹنے والا تو نہیں ہوگا لیکن پھر اس کا دھیان زویا کی طرف چلا گیا..... نہیں، کم از کم ایک تو ہے، جو روئے گا اور شاید بری طرح روئے گا۔ پتا نہیں کیوں اس کے رونے کا خیال کر کے اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ زندہ رہے۔ وہ اپنی اس تکلیف کو ایک یادگار مزاحمت پیش کرے۔

میڈیکل اسٹاف کے لوگ آئے۔ انہوں نے مسکراتے لہجے میں کچھ کہا اور شامیر کے بیڈ کو دھکیلتے ہوئے دوسری طرف لے گئے۔ وہ یہی سمجھا کہ شاید اسے روٹین کے کسی ٹیسٹ کے لیے لے جایا جا رہا ہے مگر ایک دیوار گیر کھڑکی کے قریب بیڈ روک دیا گیا۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے گئے۔ شیشوں کی دوسری جانب کا منظر دیکھ کر شامیر دنگ رہ گیا..... یہاں ایک سرسبز لان میں قطار اندر قطار بے شمار لوگ موجود تھے۔ ان میں بچے، جوان، بوڑھے ہر عمر کے مرد و زن شامل تھے۔ ٹی وی کے رپورٹرز اور کیمرا مین بھی تھے۔ ان کے چہروں پر شامیر کے لیے تعریف و تحسین تھی اور بہت سے ایسے تھے جن کے ہاتھوں میں گلدستے تھے۔ شامیر بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن ان مناظر نے اس کا دھیان کچھ دیر کے لیے بٹا دیا۔ اسے لگا کہ کچھ دیر پہلے وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، وہ عبث تھا۔ وہ اکیلا تو تھا مگر بالکل بھی اکیلا نہیں تھا۔ اس دیارِ غیر میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کے لیے دل میں جگہ رکھتے تھے اور اس کے لیے دعا گو تھے۔ اس کے دل میں آیا کاش زویا کی ماما بھی یہاں موجود ہوتیں اور دیکھ سکتیں کہ ہر مسلمان ان کا شوہر راشد احمد نہیں ہوتا..... اور دیکھ سکتیں کہ برسفیر میں ہی رہنے والے ایک پاکستانی نے کس طرح ان کے اہلِ خانہ اور ان کے ہم

وطنوں کے دل میں جگہ بنائی ہے۔

یہی وقت تھا، جب اسپتال کے ایک کمرے میں ڈاکٹرز کا ایک بورڈ شامیر کے کیس کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے کہا۔ ''جسم آکسیجن کو پوری طرح جذب نہیں کر پا رہا۔ گردوں کا فعل بھی متاثر ہو رہا ہے۔ یہی صورت حال رہی تو دو تین روز میں سانس کی دشواریاں بھی پیش آسکتی ہیں۔''

ایک دوسرے جرمن ڈاکٹر نے کہا۔ ''اصل مسئلہ تو انفیکشن ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مریض کو برلن یا فرینکفرٹ میں شفٹ کر دیا جائے؟''

ڈاکٹر تھامسن کے علاوہ ایک اور ڈاکٹر نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر تھامسن نے کہا۔ ''میری رائے میں تو اس اسٹیج پر سفر مزید پیچیدگی پیدا کر دے گا۔ ہمیں کم از کم دو تین روز بعد مزید دیکھنا پڑے گا۔'' پھر انہوں نے اپنے اسسٹنٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''لواحقین میں قریبی کون ہے؟''

''سر! بس وہی پاکستانی نژاد لڑکی زویا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، اسے کال کرو۔''

''میں نے آپ کے کہنے پر کر دی تھی سر۔ وہ آنے ہی والی ہوگی۔''

ابھی ڈاکٹرز کی ڈسکشن جاری تھی کہ زویا بھی حجاب لیے اور شولڈر بیگ لٹکائے پہنچ گئی۔ وہ پریشان تھی۔ سائڈ روم میں ڈاکٹر تھامسن نے اس سے اکیلے میں بات کی۔

''مسٹر شامیر آپ کے کیا لگتے ہیں؟''

''وہ میرے ہم کار تھے۔ ہم ڈبل اے چینل پر اکٹھے کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے علاج کے سارے معاملات یہاں میں ہی دیکھ رہی ہوں۔ پاکستان سے چینل کے مالک عشرت سلطان صاحب تعاون کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر تھامسن نے ایک توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر شامیر کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ سر جھکا کر شامیر کی رپورٹس کو دیکھتے رہے، تب بولے۔ ''دیکھو مس زویا! یہ جو ہماری جلد یعنی کھال ہوتی ہے، یہ ایک طرح کا قدرتی غلاف ہے جو ہمارے جسم کو ہر طرح کے انفیکشن سے محفوظ رکھتا ہے۔ جب یہ جلد جل جاتی ہے تو جسم ایک دم غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہر طرح کے بیکٹیریاز اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس تھرڈ ڈگری برننگ میں کچھ اسی طرح کی سچویشن ہے۔ فی الحال ہم مسٹر شامیر کو برلن یا ویانا میں منتقل بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے دو تین روز انتظار کرنا پڑے گا۔''

زویا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے شفقت سے اس کا کندھا تھپکا۔ ''آپ ہمت سے کام لیں اور دعا کریں۔''

زویا رو دی۔ ''اس نے ہمارے لیے خود کو ختم کر لیا ڈاکٹر۔ وہ کہاں سے آیا اور کہاں پہنچ کر ہمارے لیے زندگی کی ڈھال بن گیا.....''

ڈاکٹر تھامسن طویل سانس لے کر بولے۔ ''اس کی قربانی واقعی قابلِ ذکر ہے۔ لوگ اس طرح اپنی جان اس وقت خطرے میں ڈالتے ہیں جب ان کا کوئی بہت قریبی موت کے خطرے میں ہوتا ہے یا پھر کوئی بے حد جذباتی رشتہ۔''

زویا روتے ہوئے بھیگی لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر! آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ میں جانتی ہوں اسپتال کے رولز سخت ہیں لیکن آپ میرے لیے پلیز تھوڑی سی گنجائش پیدا کریں۔ میں زیادہ سے زیادہ دیر شامیر کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ وہ میری موجودگی میں سکون محسوس کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنی گھنی بھویں اٹھا کر معاملہ فہم نظروں سے زویا کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

قریباً دس منٹ بعد زویا، شامیر کے پاس موجود تھی۔ اس کو دو تین ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ آکسیجن ماسک بھی تھا لیکن لگایا نہیں گیا تھا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر نقاہت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ غیر متوقع طور پر زویا کو سامنے دیکھ کر وہ جیسے کھل اٹھا۔

''ارے..... یہ کرشمہ کیسے ہو گیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ آج نہیں آسکو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''پھر سوچا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جاؤ۔ آپ کی ناراضگی..... بہت بھگتی ہے میں نے۔''

''اور میں نے بھی۔''

زویا نے حسبِ معمول اس کا ہاتھ تھام لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اسے جوس پلانا چاہا مگر اس نے فقط ایک سپ لے کر سر نفی میں ہلا دیا۔ وہ مختلف موڈ میں تھا۔ تکلیف کے آثار چہرے پر نہیں آنے دے رہا تھا مگر ضبط بھی آسان نہیں تھا۔

زویا کا ہاتھ ہولے سے دبا کر بولا۔ ''موت کیسی ہوتی ہے زویا؟''

''آپ ایسے بے ڈھنگے سوال کریں گے تو میں اٹھ کر

چلی جاؤں گی۔"

"بھئی، یہ بے ڈھنگا سوال نہیں۔ موت وحیات پر غور کرنا تو دانشوروں کا وتیرہ ہے..... آنکھیں بند کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ موت ایک اندھیرے کی طرح ہوتی ہے۔ جب ہم زندگی سے بہت تنگ ہوتے ہیں تو دھیرے دھیرے اس اندھیرے میں اترنے سے زیادہ ڈر نہیں لگتا لیکن جب زندگی میں تمہارے جیسی کوئی روشن کرن موجود ہو تو پھر ڈر لگنے بھی لگتا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ کو خوب ڈرنا چاہیے اور ایسا کوئی خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، آپ بہت جلد اچھے ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اچھا کر کے چھوڑنا ہے۔"

"اور خیر سے مجھے اچھا کرنے کے لیے تم کیا کرو گی؟"

وہ خوش نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اگر میں مغلیہ دور کی کوئی شہزادی ہوتی تو آپ کے بستر کے گرد چکر کاٹتی اور اپنی جان آپ کے جسم میں ڈال دیتی۔ میں شہزادی تو نہیں ہوں مگر جان تو میں پھر بھی ڈال دوں گی۔ آپ کے پاس رہ کر، آپ کا حوصلہ بڑھا کر..... اور اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دن رات آپ کی خدمت کر کے۔" اس نے شامیر کے چھوڑے ہوئے جوس میں سے ایک "سپ" لیا اور دل گداز نظروں سے اسے دیکھا۔

اسی دوران میں شامیر کے دائیں پہلو میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ زویا پاس نہ ہوتی تو شاید یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہوتا لیکن اس کی موجودگی ایک ایسے تریاق کی طرح تھی جو ہر زہر کی تلخی کم کر دیتا تھا اور کبھی کبھی ناپید بھی۔

اس نے زویا کا نرم ہاتھ دبایا اور کھوئے کھوئے آہنگ میں بولا۔ "زویا! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کیا شومیر؟"

"وعدہ کرو کہ..... آخر تک میرا ہاتھ ایسے ہی تھامے رکھو گی۔"

"آ..... آخر تک؟ کیا مطلب؟"

اس نے بات بدلی۔ "جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا..... اسی طرح میرے پاس بیٹھی رہو گی..... میری ہتھیلی پر کچھ لکھتی رہو گی۔ بولو کرو گی نا؟"

"شومیر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ رو دینے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ "ایسی باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم پھر پنگلش بول رہی ہو۔ جب تم "ارڈو" بولو گی تو میرا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"شومیر! پلیز، آپ ایسا ڈکھ ڈینے والا باتیں کیوں کرتا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یہ دھوپ چھاؤں کا منظر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ اردو بھی بول رہی تھی اور دکھی بھی تھی۔

اتنے میں شامیر کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز نے ماسٹر مانیٹر پر یہ کیفیت دیکھ لی۔ ایک ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ فوراً موقع پر پہنچ گیا۔ زویا پھر باہر چلی گئی۔

شامیر کو انجکشن لگائے گئے۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تکلیف کی شدت دب گئی۔ جیسے شعلوں پر ریت ڈال دی جائے اور انگارے اندر ہی اندر سلگ رہے ہوں۔ کچھ بھولی بسری آوازیں اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔ ان آوازوں کا تعلق چار سال پہلے کے خوبصورت شب و روز سے تھا۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پیار کروں گی اور کسی پاکستانی یا انڈین وغیرہ سے تو بالکل بھی نہیں۔"

"زویا! تم پورے پندرہ منٹ لیٹ ہوئی ہو۔"

"بالکل غلط شومیر! پندرہ نہیں بارہ منٹ۔ جو ٹائم تو م سے دور گزرتا اس کے ہر ہر سیکنڈ کا حساب رکھتی ہوں۔"

"اگر کبھی مجھ سے بچھڑنا پڑا زویا تو کیا کرو گی؟"

"بچھڑنے والا صفحہ تو مجھے اپنی زندگی کی کتاب میں کہیں نظر ہی نہیں آتا....." آوازیں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

زویا، حولیہ، جبین، افشاں اس کی والدہ اور انکل اختر..... سینئر ڈاکٹر تھامسن کے روم میں ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر انہیں بتا رہا تھا کہ شامیر کی حالت سنبھل نہیں سکی۔ اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے بڑے مشکل ہیں۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

جب سب اٹھ کر باہر چلے گئے تو زویا پھر بھی کھڑی رہی۔ ڈاکٹر تھامسن بے حد سنجیدہ تھے اور سوالیہ نظروں سے زویا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زویا نے خود کو بمشکل بولنے کے لیے تیار کیا اور کہا۔ "ڈاکٹر! چوبیس مشکل گھنٹوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم اس سے پیار کرتی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو رخساروں پر لڑھک گئے۔

''اس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

الفاظ دہکے تیروں کی طرح زویا کے دل میں ترازو ہو گئے۔ اس نے اپنے ہونٹ بے حد مضبوطی سے بھینچ لیے۔ اسے لگا کہ اسے دیوار کا سہارا لینا پڑے گا مگر پتا نہیں وہ کیسے کھڑی رہی۔

ڈاکٹر تھامسن باہر جانے کے لیے مڑ گئے مگر دروازے کے پاس جا کر پھر رک گئے۔ زویا کے قریب آ کر بولے۔ ''سوختہ زخمی کے لیے آخری وقت بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہم ٹرنکولائزرز تو دیتے ہیں مگر اس کی ایک LIMIT ہوتی ہے۔ برین کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری موجودگی اسے بہت سکون دیتی ہے۔''

زویا کو وہ الفاظ یاد آئے جو شامیر نے تین دن پہلے کہے تھے..... ''زویا..... آخر تک..... میرا ہاتھ تھامے رکھنا..... میرے پاس رہنا۔''

وہ سسک اٹھی، پھر ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر تھامسن سے مخاطب ہوئی۔ ''ڈاکٹر! ایک التجا ہے آپ سے..... اگر ہو سکے تو اسے مان لیجیے گا۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''مم..... میں..... آخر تک ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں..... کتنا بھی بُرا وقت ہو، میں وہاں رکنا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر تھامسن کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر زویا کی حالت دیکھی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ باہر آ کر لابی میں آن بیٹھی۔ اس نے کمان کی طرح خم کھا کر اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھی اور چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھی مگر یہ جگہ ایسی نہیں تھی۔ مریضوں کے کئی لواحقین یہاں موجود تھے اور پھر وہ بھی تھے جن کا تعلق شامیر سے قریبی تھا۔ افشاں، اس کے والدین، اس کے باس عظمت سلطان، جورات کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے۔

وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی..... پکارتی رہی..... لوٹ آؤ شومیر..... واپس آ جاؤ..... تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گی..... تم جو کہو گے۔

☆☆☆

شامیر آئی سی یو میں تھا اور وینٹی لیٹر پر تھا۔ تکلیف بے انتہا تھی۔ پین کلرز کی ''ریت'' بھی درد کی اس نیلی آگ کو پوری طرح دبا نہیں پاتی تھی۔ پورے کا پورا جسم اذیت کے شکنجے میں تھا۔ اس کا ذہن تاریکی اور اجالے کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

کچھ تاریک سائے دھیرے دھیرے اس کی طرف سرک رہے تھے۔ کیا وہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے سوال کیا۔

وہ کہاں تھی؟ اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے پاس رہے گی۔ وہی تو تھی جو اس کے ہر سفر کو آسان بنا سکتی تھی۔ اس نے بس اسی کو چاہا تھا اور پھر اس کے بعد اور کسی کو نہیں چاہ سکا تھا۔ اب ان لمحوں میں اسے اس کے پاس ہونا چاہیے تھا، بالکل قریب۔ اس کی موجودگی ان گھپ اندھیروں میں اسے ایک ایسی روشنی سے نوازتی تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے خالی کرسی کی طرف دیکھا..... شاید اسے نہیں آنا تھا۔ شاید اسے اب باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ ساری رگوں میں جیسے آگ بھر گئی تھی۔ وہ چلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے

درد بیکراں ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں کہنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک اور انجکشن دو ڈاکٹر۔ اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔

دریائے مائنز کے کنارے ایک چمکیلی دوپہر میں مغنی اپنا نغمہ الاپتا جا رہا تھا۔

اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی
وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے..... میرے یار و محبت ہے

شامیر کے گرد میڈیکل ایڈ دینے والی مشینیں تھیں..... مانیٹرز تھے، ڈرپس کی سفید نالیاں تھیں۔ اسے تاریک سمندروں میں جیسے کسی زہریلے آکٹوپس نے جکڑ رکھا تھا..... اور اس کی مددگار کہاں تھی؟ وہ کہاں تھی جو اس کا ہر سفر آسان بنا سکتی تھی؟

ڈاکٹروں کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں دور افتادہ آوازوں کی طرح تھیں۔ تاریکی گہری ہو رہی تھی، تب اچانک اس نے اپنے ہاتھ پر کسی کا لمس محسوس کیا..... اس نے بڑی مشکل سے گردن پھیری اور دھندلائی ہوئی نظر سے

دیکھا۔ وہ آ گئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے کومل ہاتھ میں تھا اور کہتے ہیں کہ بایاں ہاتھ دل کے بہت قریب ہوتا ہے۔ اس ہاتھ سے اٹھنے والی لہریں سیدھی اس کے دل تک پہنچ رہی تھیں۔

جو تکلیف نیم بے ہوشی اور بے ہوشی بھی کم نہیں کر پا رہی تھیں، وہ کم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں پوری کھول کر اسے دیکھنا چاہا..... ہاں، وہی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں..... اور اس نے وعدہ لیا تھا کہ وہ آخر تک ہاتھ نہیں چھوڑے گی۔

.....زویا جب پہنچی اور اس نے شامیر کا ہاتھ تھاما تو وہ غشی کی سی کیفیت میں تھا مگر اس نے اس کی آمد کو محسوس کیا اور اس کے لمس کو بھی۔ وہ آنسوؤں کا ایک دریا سینے میں چھپائے اس کے قریب بیٹھی رہی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ نوشتۂ دیوار تھا، شامیر کی بند پلکوں پر لکھا تھا اور ڈاکٹرز کے چہروں پر بھی۔

اسے لگا کہ زویا کی گرفت میں شامیر نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی ہے۔ اسے کھولا ہے جیسے وہ ایک دستِ سوالی ہو۔ وہ اندر ہی اندر سسک اٹھی۔ اس نے اپنی انگشت شہادت سے اس کی ہتھیلی پر لکھا LOVE YOU۔

پھر وہ وقفے وقفے سے اس لفظ کو لکھتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ اس عمل نے نیم بے ہوش شامیر کو سکون دیا ہے۔ اس کی اذیت کے لیے کسی تیر بہ ہدف نسخے کا سا کام کیا ہے۔ وہ بے تکان بیٹھی رہی، اس کی انگلیوں کو ہولے ہولے دباتی رہی اور اس کی ہتھیلی پر اپنا اعترافِ محبت درج کرتی رہی۔

رات تک وہ اپنی جگہ سے ہلی اور نہ اس نے کچھ کھایا پیا۔ افشاں، انکل اختر، عظمت سلطان اور دیگر عزیزوں نے اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں ہٹی۔ اس نے کسی سے وعدہ کیا تھا..... کسی کے پاس رہنے کا عہد کیا تھا..... وہ ایک عمر تک روٹھا رہا تھا۔ اب وہ مانا تھا تو وہ اسے کیسے روٹھنے دیتی۔ کسی ایسے بچے کی طرح جسے سبق یاد نہ کرنے پر دہرائی کی سزا دے دی گئی ہو، وہ اپنی آنکھوں میں اشک لیے..... اس کی ہتھیلی پر لَو یو..... لَو یو لکھتی رہی..... اور یہ کوئی وہم نہیں تھا، نہ ہی بصری دھوکا تھا..... زویا کا یہ عمل شدید تکلیف کے عالم میں اسے راحت پہنچا رہا تھا..... اور یہ کیفیت صرف زویا ہی نہیں، ڈاکٹرز بھی دیکھ رہے تھے۔ شامیر جس صورتِ حال سے دوچار تھا، ایسی صورتِ حال میں مریضوں کی تکلیف بے پناہ ہو جاتی ہے، مگر برین کے متاثر ہونے کے ڈر سے انہیں مکمل بے ہوش بھی نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹرز جانتے تھے کہ شامیر بھی تکلیف میں ہوگا مگر جب سے یہ لڑکی اس کے قریب آ کر بیٹھی تھی، اس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی تھی۔

جب تک سانس ہوتی ہے، تب تک آس ہوتی ہے۔ امید تو آخر تک قائم رہتی ہے۔ نظامِ قدرت اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتا ہے۔ معجزوں کا آپشن خدائے بزرگ و برتر نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ کب اسے استعمال کرتا ہے، کب نہیں..... یہ اسی کی صوابدید پر ہے۔ یہ آپشن شامیر کے لیے حرکت میں نہیں آنے والا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد اس کے وائٹل سائنز نے خطرے کی نشاندہی شروع کر دی۔ اس کا تنفس بری طرح بگڑ رہا تھا۔

'کیا رخصت کا وقت قریب آ رہا ہے؟' زویا نے بے پناہ کرب سے سوچا۔

ایسا ہی تھا..... وہ جا رہا تھا اور اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسی کی وجہ سے تھا۔ وہی انا کی دیوار جسے وہ بھی ڈھا نہ سکی تھی۔ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ پر وہ اس کے پیچھے بھی آیا تھا۔ زویا نے اس کے لرزاں قدموں کی چاپ بھی محسوس کی تھی لیکن رکی نہیں تھی..... اور اب..... وہ نہیں رک رہا تھا۔

''لَو یو..... لَو یو'' تو وہ پہلے بھی لکھتی رہی تھی۔ اب اس نے تیسرا لفظ بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ''سوری..... لَو یو۔''

اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اپنی انگلی کی غیر محسوس حرکت سے وہ جو پیغام شامیر تک پہنچا رہی ہے، وہ اس تک پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی جاں بلب مریض کا چہرہ لگتا ہی نہیں تھا۔ وہاں اذیت کے المناک کھچاؤ کے بجائے، سکون اور آسودگی کی نرماہٹ دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ بیٹھی رہی، اس کی انگلیوں کو ہولے ہولے دباتی رہی..... آنسو گراتی رہی اور لکھتی رہی..... ''سوری..... لَو یو۔'' ڈاکٹرز اور میڈیکل اسٹاف اپنا کام کرتے رہے، وہ اپنا کام کرتی رہی۔

رات ایک بجے کے لگ بھگ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر پاکستانی مریض کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب بیس پچیس منٹ کا مہمان ہے۔ اس برن یونٹ میں اس نے ایسی کنڈیشن میں موت کا شکار ہونے والے سیکڑوں ہی مریض دیکھے تھے لیکن ایسا نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔ آسودگی کی چمک سی تھی اس کی پیشانی پر۔ وہ جیسے دن بھر کی تھکن کے بعد، بڑے اطمینان سے سارے کاموں سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی دلکش لیکن بہت سوگوار لڑکی

نے اس کا بایاں ہاتھ تھام رکھا تھا اور قرب وجوار سے بالکل بے خبر ہو کر اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلی کو حرکت دیتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کچھ لکھ رہی تھی یا یہ ویسے ہی اس کی عادت تھی۔

لیونا برگ کے اس اسپتال میں آئی سی یو کے اندر رات ایک بج کر چالیس منٹ پر شامیر نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اسپتال سے باہر موجود اس کے سیکڑوں مداح آنسوؤں میں ڈوب گئے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے

☆☆☆

شامیر چلا گیا۔ ایک نکتہ داں صحافی، ایک ایثار پیشہ شخص..... وہ بے شمار لوگوں کو سوگوار چھوڑ گیا۔ اگلے روز بیٹھے بیٹھے زویا کو نجانے کیوں لگا کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اس نے بندے اتار پھینکے، گلے میں چمکنے والی سونے کی چین توڑ کر ایک طرف ڈال دی۔ بینگلز اپنی کلائیوں سے علیحدہ کر دیے۔ وہ ایک بار پھر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

شامیر کی میت پاکستان کس کے پاس جاتی؟ وہ وہاں سے آیا تو اپنی پیاری اموخالہ کے ساتھ تھا مگر اصل میں اکیلا ہی آیا تھا۔ اموخالہ اپنی نیم دیوانی مفلوج بیٹی کے ساتھ پاکستان واپس جا چکی تھیں مگر پتا نہیں کہ کس جگہ تھیں۔ انکل اختر اور عظمت سلطان اس کے جسد خاکی کو اسٹریٹ پولیشن لے جانا چاہتے تھے مگر لیونا برگ اور گردونواح میں شامیر کے اتنے مداح تھے کہ اس کی تدفین کا فیصلہ لیونا برگ میں ہی ہوا۔ دریائے ایلم ناؤ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک مسلم قبرستان اس کی آخری آرام گاہ قرار پایا۔ اس کی میت کے اوپر پاکستانی پرچم ڈالا گیا تھا۔ زویا نہیں جان سکی کہ پرچم والا آئیڈیا کس کا تھا؟ شامیر کی آخری رسومات میں غیر متوقع طور پر بہت زیادہ لوگ شریک ہوئے..... ایک سیلاب سا امڈ آیا۔

تیسرے روز زویا کو اسپتال سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ یہ کال ایک انچارج نرس کی طرف سے تھی۔ وہ اکثر شامیر کے اردگرد نظر آیا کرتی تھی۔ وہ زویا سے ملنا چاہتی تھی۔ دوپہر کے وقت ان دونوں کی ملاقات ایک ترکی ترک ریستوران میں ہوئی۔ جرمن نرس بھی شامیر کے مداحوں میں شامل تھی۔ اس نے زویا کو ایک چھوٹا سا بند لفافہ دیا اور کہا۔ ''یہ آنجہانی محترم شامیر کی طرف سے ہے۔ انہوں نے اپنی ڈیتھ سے تین دن قبل مجھے دیا تھا اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو میں اسے رازداری سے آپ تک پہنچا دوں۔''

بند لفافہ زویا نے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔ انچارج نرس ہی کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستانی پرچم والی بات بھی شامیر نے خود ہی کہی تھی۔ یہ غالباً اس تعصب کا جواب تھا جو زویا کی ماما جیسے کچھ لوگ پاکستانیوں سے رکھتے تھے۔

نرس کے جانے کے بعد زویا نے ریستوران میں ہی بیٹھ کر لفافہ کھولا۔ اس میں ایک آرٹیفیشل موتی تھا۔ یہ مقدر کا وہی موتی تھا جو ان دونوں کو پری کے روپ والی لڑکی نے فرینکفرٹ میں دیا تھا۔ وہ شامیر نے آخر تک سنبھالے رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا خط بھی تھا۔ یہ شامیر نے یقیناً اپنے بائیں ہاتھ سے ذرا دشواری کے ساتھ لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ اب تمہارے اردگرد کوئی بڑا خطرہ موجود نہیں ہے (ویسے بھی اب تم جرمنی چھوڑ جانا چاہتی ہو) مجھے لگتا ہے کہ میں چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کا سوگ زیادہ دیر نہ منانا۔ ٹھہرے پانی خراب ہو جاتے ہیں، زندگی کی روانی برقرار رہنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے حصے کے غم تمہیں ملے ہیں تو تمہارے حصے کی خوشیاں بھی ضرور ملیں گی۔ تم شادی کر لینا۔ مجھے بھروسا ہے کہ کوئی نہ کوئی تمہاری زندگی میں ایسا ضرور آئے گا۔ جو تمہارے سارے دکھوں کا مداوا کر دے گا۔

زویا! ہم دونوں نے تو اپنی قسمت کا لکھا پا لیا، مگر ہم جیسے جو آئندہ آنے والے ہیں، ان کے لیے دل سے ایک دعا نکلتی ہے۔ سوچتا ہوں، کتنا اچھا ہو کہ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ جیسا اسٹاپ دنیا میں کہیں بھی نہ ہو اور اگر ہو تو وہاں پتھر کے بینچ والے اس گوشے میں، جدائیوں کی گفتگو نہ ہو..... اور اگر گفتگو ہو ہی جائے اور کوئی زویا کسی شامیر سے روٹھ کر چلی بھی جائے تو پھر ان دونوں کے درمیان انا کی دیوار حائل نہ ہو..... ہو سکے تو تم بھی ایسے ہی سوچنا..... ایسے ہی دعا کرنا۔

تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو..... تمہارا ''شومیر.....''

زویا نے خط دوبارہ شولڈر بیگ میں رکھ لیا اور کھڑکیوں سے باہر دریائے ایلم ناؤ کی طرف دیکھنے لگی..... ایلم ناؤ جس کی دوسری جانب شامیر سفیدے اور بلوط کے پیڑوں کے نیچے سو رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چل دی، ایک بار پھر اس سے ملنے کے لیے۔ وہ بالکل سفید لباس میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو موسم اس کے دل پر چھایا ہوا ہے، وہ بہت..... بہت طویل ہے۔

(ختم شد)

کبھی حبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں.....

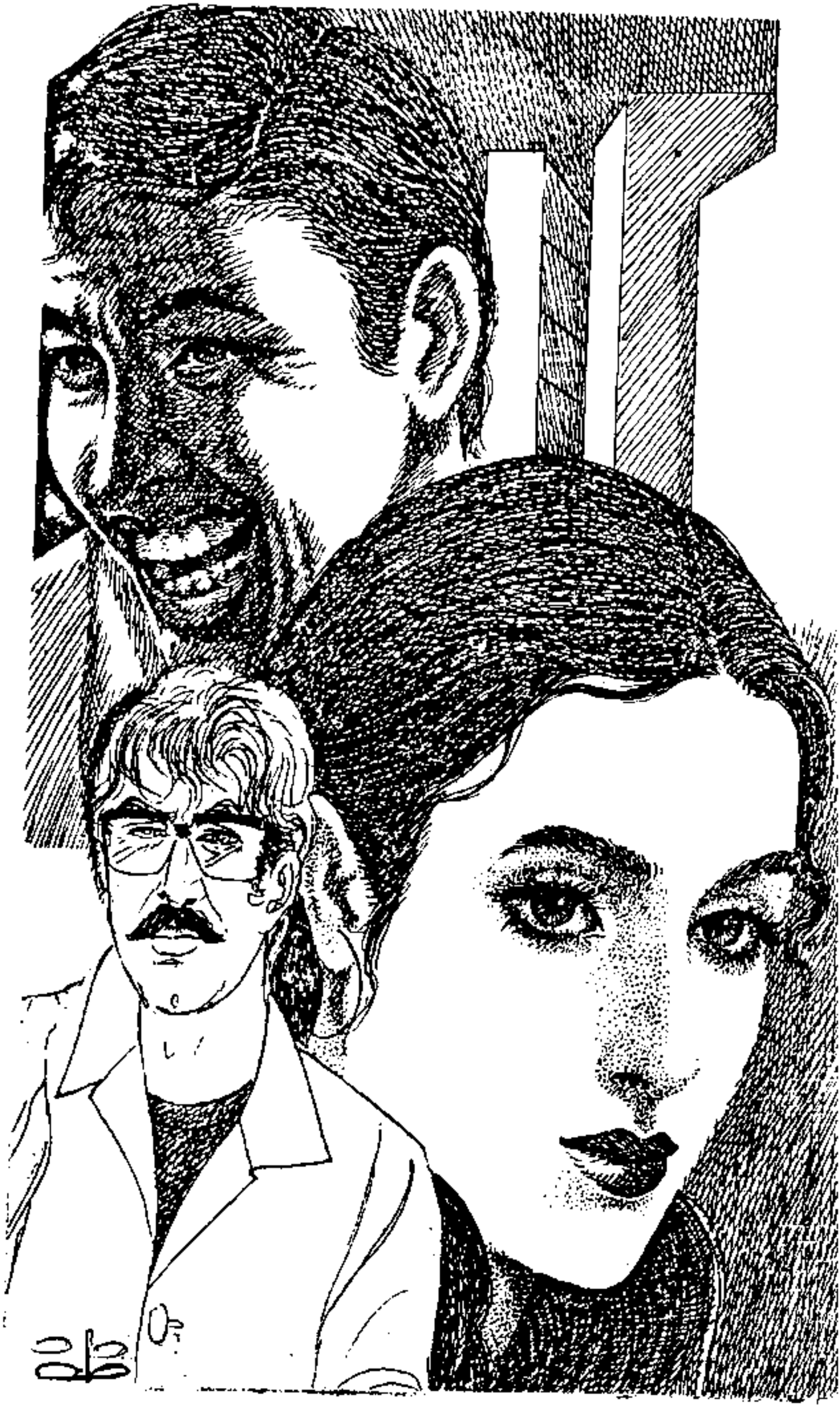
دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساست کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے اور آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کے احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

طاہر جاوید مغل

آخری شام سے پہلے





کراچی کی خوش رنگ شام تھی۔ وسیع و عریض کوٹھی کے بیکراں لان میں اکتوبر کی خوشگوار ہوا اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ بلند و بالا چار دیواری کے ساتھ ساتھ شاہ بلوط اور سفیدے کے درخت ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ سرسبز لان کے عین درمیان دیدہ زیب کرسیوں پر مخدوم شاہنواز رائے اپنے قریبی دوست سیف اللہ چودھری کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ایک باوردی ملازم بیس پچیس قدم کی دوری پر سر جھکائے دست بستہ کھڑا تھا اور کسی بھی اشارے کا منتظر تھا۔

شاہنواز صاحب بیالیس برس کے لگ بھگ تھے۔ اچھی کاٹھی کے مالک تھے۔ قد چھ انچ سے نکلتا ہوا، چہرہ گول، سرخی مائل اور دمکتا ہوا۔ چھوٹی چھوٹی تراشیدہ ڈاڑھی میں چند سفید بال دیکھے جاسکتے تھے۔ سیف اللہ ان کا ہم عمر ہونے کے باوجود تھوڑا کم عمر نظر آتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پینٹ شرٹ میں تھا اور کلین شیو بھی۔ مخدوم شاہنواز قیمتی کپڑے کی نیلی شلوار قمیص میں تھے۔

سیف ذرا شرارتی انداز میں مسکرایا۔ ''شاہنواز! میں تو کہتا ہوں تھوڑی سی روٹین بدلو۔ سرگودھا سے تو نکل ہی آئے ہو۔ چلو، چند دن کے لیے دبئی یا ابوظہبی نکل چلتے ہیں۔ امارات بھی تھوڑا یورپ ہی بن چکا ہے۔ کچھ دن وہاں موج میلا کر کے لوٹ آتے ہیں۔''

شاہنواز نے اپنا بڑا سا سر انکار میں ہلایا۔ ''نہیں یار! میرا جواب اس بار بھی ''نہ'' میں ہے۔'' اس کے ہاتھ ہی انہوں نے واسکٹ کی ایک جیب سے چھوٹی سی تسبیح نکالی اور ہاتھ میں گھمانے لگے۔

سیف اللہ نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''یعنی پھر وہی گھسا پٹا طریقہ کار؟''

''گھسا پٹا کیوں؟ ہر بار نیا ہی تو ہوتا ہے۔''

''ساتھی ہی نئی ہوتی ہے نا یار! باقی سب تو وہی..... وہی کمرے، وہی دیواریں، وہی تین چار کھڑوس ملازم۔ نہ کوئی سیر سپاٹا، نہ ہلا گلا۔''

''یہ سب کچھ سرگودھا اور لاہور میں ہوتا ہی ہے نا یار!'' شاہنواز رائے نے کہا۔

''پر وہاں ''ساتھی'' نہیں ہوتی تمہارے ساتھ اور وہ کیا فرمایا ہے میرے جیسے کسی حسن پرست شاعر نے..... وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔''

''اور یہ بھی تو کسی شاعر نے ہی فرمایا ہے نا..... کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔''

دونوں ہنسنے لگے۔

''اچھا، تو کب آرہے ہیں تمہارے نئے سسرالی؟'' سیف نے موضوع بدلا۔

''کل تمہیں بتایا تو تھا۔ رات کے کھانے پر۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تو دس بجے تک رک جاؤ۔ مل کر جانا۔''

''کون لوگ ہیں؟''

''ادھر لیاری میں ہی رہتے ہیں۔ لڑکی کسی پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی رہی ہے۔ تین بہنوں میں بڑی ہے۔''

''اور والد؟''

''والد بیمار ہے..... اور مجھے لگتا ہے کہ اس کی بیماری کے سلسلے میں وہ لوگ کچھ سوچ رہے ہوں گے۔''

''تو بات تو پھر وہی آگئی نا..... مجبوری..... اور مجبوری کا فائدہ۔'' سیف نے قیمتی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

شاہنواز رائے نے بڑی متانت سے اپنی تراشیدہ ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ مجبوری کا فائدہ نہیں..... یہ ہوتا ہے معاشرتی سمجھوتا۔ ایک ہاتھ کا دوسرے ہاتھ کو دھونا اور اگر تم اسے مجبوری کا فائدہ ہی کہنا چاہتے ہو تو پھر ایک ہوتا ہے مجبوری کا فائدہ اور ایک ہوتا ہے مجبوری کا ناجائز فائدہ۔ میں انہیں اس ناجائز فائدے سے بچا رہا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' سیف اللہ نے بھویں اچکائیں۔

''میری اطلاع کے مطابق پہلے سے شادی شدہ ایک ٹٹ پونجیا پراپرٹی ڈیلر ان لوگوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کنبے کے سارے دلدر دور کردے گا حالانکہ اس کے اپنے دلدر دور نہیں ہو رہے۔ خیام بتا رہا تھا کہ ایک رہائشی کالونی میں اس کے بس چار پانچ چھوٹے پلاٹ تھے اور وہ بھی کسی جھگڑے کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔''

سیف نے لمبا کش لے کر کہا۔ ''اگر یہ خیام کی اطلاع ہے تو درست ہی ہوگی۔ دور کی کوڑی اور اندر کی خبر لانے میں تو میں بھی اسے مانتا ہوں۔''

خیام، مخدوم شاہنواز کے ملازم خاص کا نام تھا۔ وہ کراچی میں شاہنواز کے لیے ہر طرح کی خدمات انجام دیتا تھا اور کچھ خدمات کے لیے ایسی زبردست رازداری برتتا تھا کہ کمال کر دیتا تھا۔

سیف اللہ نے رات تک شاہنواز کے ہاں رکنے والی بات مان لی۔ حسب توقع شاہنواز کے یہ نئے سسرالی دس بجے سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ شکلوں سے ہی ضرورت مند اور بے کس لوگ لگتے تھے۔ جو لڑکی شاہنواز کی دلہن بننے والی تھی، اس کا

نام سارہ تھا۔ شاہنواز کو دیکھنے کے لیے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ملنے کے لیے سارہ کی والدہ، ایک خالہ اور چچا آئے تھے۔ بیضوی چہرے اور عقابی آنکھوں والا خیام بھی ساتھ تھا۔ یوں تو خیام نے شاہنواز کو سارہ کی تصویر بھی دکھادی تھی تاہم سارہ کی والدہ کو دیکھنے کے بعد شاہنواز کو مزید تسلی ہوئی کہ اس کی ہونے والی بیوی خاصی خوش شکل ہوگی۔

بات تو تقریباً طے ہوچکی تھی۔ یہ تو بس رسمی سی کارروائی تھی۔ سارہ کے گھر والوں کو ایک امیر اور بااثر داماد چاہیے تھا اور شاہنواز کو اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ایک دلکش ساتھی۔ شاہنواز بیالیس برس سے اوپر کے ہوچکے تھے جبکہ سارہ بہ مشکل بیس بائیس کی تھی۔ عمروں میں کافی فرق تھا مگر رتبے میں فرق اس سے بھی زیادہ تھا اور اس فرق نے پہلے فرق کو بے معنی کردیا تھا۔

دو روز بعد ہفتے کی خوشگوار شام کو شاہنواز رائے کے دوست سیف کے فارم ہاؤس پر ایک مختصر سی تقریب ہوئی اور دلہن بنی خوبرو سارہ کو اس کے گھر والوں نے نکاح کے بعد شاہنواز کے سپرد کردیا۔ شاہنواز اسے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کی بیچ در بیچ راہداریوں سے گزار کر اپنے رہائشی پورشن میں لے آئے۔ منہ دکھائی کے طور پر انہوں نے اپنی دلہن کو سونے کی وزنی مالا پہنائی اور یک ٹک اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

''تم خوش ہو نا؟'' انہوں نے سکڑی سمٹی دلہن سے پوچھا۔

اور یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب نفی میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر یہ ایک بے معنی سوال تھا۔ شاہنواز نے بس رسماً پوچھا تھا۔

دلہن سارہ کی پلکیں بے ساختہ جھرائیں اور اثباتی انداز میں جھک گئیں۔ شاہنواز نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ بڑھا کر سارہ کا کومل ہاتھ تھاما اور ملائمت سے بولے۔ ''ہر طرح کی پریشانی ذہن سے نکال دو۔ سب اچھا ہوجائے گا۔''

سارہ نے اثباتی انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دی جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس نے جنبش نہ دی تو اس کا شوہر ناراض ہوجائے گا اور اس کی ناراضگی وہ کسی صورت مول نہیں لے سکتی تھی۔ وہ کیسے مول لیتی؟ اسے اپنے چھوٹے بھائی کو کالج میں داخل نہیں کروانا تھا؟ اس نے اپنے پیارے والد کے بیمار دل میں اسٹنٹ نہیں ڈلوانے تھے؟ اس نے اپنے اہلِ خانہ کے لیے اپنا پانچ مرلے کا گھر گروی سے نہیں چھڑوانا تھا؟ اسے سرتاپا اپنی خود سپردگی ظاہر کرنا تھی اور اس نے کی۔ شاہنواز اس کی آمادگی دیکھتے ہوئے مسرور ہوگئے۔ ان کی سانس بوجھل ہوتی چلی گئی اور آنکھوں کے ڈورے سرخ تر ہوگئے۔ شاہنواز رائے نے اپنی دلہن کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔

کراچی کی جس وسیع و عریض عمارت میں شاہنواز اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ قیام پذیر تھے، اس کا نام ''قیصر ولا'' تھا۔ یہ نام شاہنواز نے اپنے دادا مرحوم شوکت قیصر کے نام پر رکھا تھا۔ یہ لوگ خاندانی رئیس تھے۔ لاہور سے کم و بیش سو میل دور سرگودھا کی طرف ان کی وسیع و عریض زمینیں تھیں۔ یہیں پر پرکھوں کی وہ بلند و بالا حویلی بھی تھی جسے ''سرخاب منزل'' کہا جاتا تھا۔ یہیں پاس ہی ایک قدیم مزار سویرا سرکار کا تھا۔ سویرا سرکار جی کا تعلق شاہنواز کی ساتویں آٹھویں پیڑھی سے جاملتا تھا۔ اس حوالے سے پورے علاقے میں شاہنواز اور اس کے بزرگوں کو ہمیشہ بے حد عزت و توقیر ملی تھی۔ شروع میں تو شاہنواز رائے کے بڑوں نے شہروں کی طرف رخ نہ کیا تھا اور اپنی زمینوں کی زرخیزی اور مزارعوں کی فرمانبرداری سے ہی فیض یاب ہوتے رہے تھے مگر اب بیس پچیس سال سے شاہنواز رائے اور ان کے والد ارباب قیصر نے قریبی شہروں سرگودھا اور لاہور کے علاوہ کراچی میں بھی کاروباری ہاتھ پاؤں پھیلائے تھے۔ کاروبار تھا درآمدی لکڑی کی خرید و فروخت کا۔ اب کراچی اور لاہور میں اس کمپنی کے بڑے بڑے گودام اور سیل سینٹر موجود تھے۔

یہ مخدوم فیملی ہمیشہ سے کثیر الازدواج رہی تھی۔ شاہنواز کے والد ارباب قیصر نے تین شادیاں کی تھیں۔ اس سے پہلے دادا کی بھی چار پانچ شادیوں کا تذکرہ تھا۔ اس حوالے سے جو دلچسپ روایت موجود تھی، وہ شاہنواز کے پڑدادا کے پڑدادا شیر افگن رائے کے حوالے سے تھی۔ کہا جاتا تھا کہ انہوں نے بارہ شادیاں کیں۔ بچوں کی تعداد 70 تھی جو بارہ شادیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی کافی زیادہ تھی۔ شیر افگن روایت شکن اور آزاد منش قسم کے سردار تھے۔ خاندانی روایت کے برعکس انہوں نے خادماؤں اور داشتاؤں سے بھی جسمانی تعلقات قائم کیے۔ یوں ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے اصل بچوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے تجاوز کرتی تھی۔ یہ کثیر الازدواجی والا سلسلہ اس فیملی میں کسی نہ کسی طور اب بھی موجود تھا۔ شاہنواز رائے نے بھی تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی، دوسری بیوی کی آمد کے چند ماہ بعد ہی سوکن کا صدمہ نہ سہتے ہوئے بیمار ہوئی اور مرگئی۔ دوسری بیوی کو طلاق ہوئی۔ تیسری ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئی اور جانبر نہ ہوسکی۔ اس حادثے میں شاہنواز رائے کی ایک شیر خوار بچی بھی جاں بحق ہوئی تھی۔ اس وقت شاہنواز رائے

کی عمر 32 برس کے لگ بھگ تھی ... اس بیوی کا نام ثمینہ تھا۔ حادثے میں ثمینہ اور شاہنواز رائے کا ایک بچہ محفوظ رہا تھا۔ اس کا نام صالح تھا۔ اب قریباً 12 سالہ صالح، والد کے ساتھ سرگودھا کی اس نواحی جاگیر میں رہتا تھا جہاں پرکھوں کی حویلی سرخاب منزل واقع تھی۔

☆☆☆

نوجوان و دلکش سارہ سے شادی کے بعد شاہنواز اور سارہ نے کم و بیش چار روز اس کمرے میں بند رہ کر گزارے تھے پھر وہ صبح کے وقت قیصر ولا کی روشوں پر ٹہلتے نظر آنے لگے یا کبھی لان میں چائے پی لیتے۔ کسی وقت شاہنواز کا قریبی دوست سیف بھی انہیں کمپنی دینے کے لیے آجاتا۔ سیف کا کاروبار بھی درآمدی لکڑی کا ہی تھا۔ ایک طرح سے دوست ہونے کے علاوہ وہ ہم کار بھی تھے۔ کسی وقت سارہ، شاہنواز اور سیف مل کر ہوم تھیٹر پر کوئی فلم بھی دیکھ لیتے یا پھر بیٹھ کر باہمی دلچسپی کی باتیں کرتے۔ ایسی نشستوں میں سارہ کم ہی بولتی تھی۔ بس یہ دھیان رکھتی تھی کہ جہاں شاہنواز اس کے اثبات میں سر ہلانے کی توقع کرے، وہ اثبات میں سر ہلائے اور جہاں مسکرانے کی توقع ہو، وہ مسکرائے۔

بعض اوقات شاہنواز مختلف شہروں میں کمپنی کے ملازمین کو فون پر ہی کاروباری ہدایات بھی دیتے نظر آتے۔ تاہم سب کو معلوم تھا کہ رات گیارہ بجے کے بعد شاہنواز اپنی تمام تر مصروفیات ترک کردیں گے۔ گیارہ سوا گیارہ بجے وہ اپنی دلہن کے ساتھ اپنے بیڈروم میں گم ہوجاتے اور ملازمین کو اکثر اگلے روز گیارہ بجے سے پہلے ان کی صورت نظر نہ آتی۔ ملازمین چور نظروں سے دلہن کی اڑی ہوئی سی رنگت اور تھکے ہوئے سے چہرے کو دیکھتے اور قیاس لگاتے کہ میاں بیوی کی شب کتنی مصروف گزری ہوگی۔

کارندۂ خاص خیام ہمہ وقت خدمت گزاری کے لیے قیصر ولا میں موجود رہتا تھا۔ کراچی سے بہت دور سرگودھا کی اس نواحی جاگیر میں اکثر لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ تیسری بیوی کی وفات کے بعد مخدوم صاحب نے اپنے بچے کے لیے چوتھی شادی نہیں کی ہے۔ یہ بات کوئی اور جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر خیام کو اچھی طرح معلوم تھی کہ تیسری بیوی ثمینہ کی حادثاتی موت کے بعد شاہنواز رائے نے مزید شادیاں بھی کی ہیں اور یہ دو تین یا چار پانچ نہیں، قریباً بیس بائیس شادیاں تھیں۔ یہ تازہ شادی پندرہ بیس روز پہلے مفلس فیملی کی اسکول ٹیچر سارہ سے ہوئی تھی۔ حسب دستور یہ زندگی بھر کا نہیں، مہینے بھر کا ساتھ تھا۔ مہینے کے آخر میں طے شدہ معاملے کے مطابق یہ شادی ختم ہوجانا تھی۔

شاہنواز رائے جسمانی طور پر ایک نہایت مضبوط اور ازدواجی... طور پر نہایت سرگرم شخص کا نام تھا مگر آج رات انہیں ہلکا سا بخار تھا اور سارہ کو وہ سرخ ڈورے نظر نہیں آرہے تھے جو ہر شام ہی ان کی آنکھوں میں تیرنے لگتے تھے۔ وہ بھی خود کو کچھ ایزی محسوس کرنے لگی تھی۔ دونوں بستر کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ آج کئی دنوں کے بعد سارہ نے مخدوم شاہنواز رائے کی انگلیوں میں تسبیح کی گردش بھی دیکھی۔ دونوں اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہے۔

شاہنواز رائے نے بارعب لیکن نرم لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے ابو کا کیا حال ہے؟''

''بہت بہتر ہیں۔ اسٹنٹ بھی ڈل گئے ہیں مگر ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ابھی وہ چند دن اسپتال میں ہی رہیں تو اچھا ہے۔'' سارہ کے لہجے میں خوشی کی لرزش تھی۔

شاہنواز رائے اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ ''لگتا ہے کہ اپنے والد سے بہت پیار ہے تمہیں؟''

''جی، بہت زیادہ۔'' وہ نظر ملائے بغیر بولی۔

''زیادہ پیار بھی کبھی انسان کو دھوکا کھانے پر بھی مجبور کردیتا ہے۔ خیام نے اس پراپرٹی ڈیلر امین صادق کا سارا پتا کیا ہے جو تمہارا ہاتھ مانگ رہا تھا۔ وہ نہ صادق ہے اور نہ امین۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ آج کل جیل کی ہوا کھا رہا ہے، اپنے کسی کرتوت کی وجہ سے۔''

سارہ نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور پھر گہری سوچ میں گم ہوگئی۔

شاہنواز رائے نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''مجھے دلی خوشی ہے کہ تمہارے والد کا مناسب علاج ہوا ہے۔ امید ہے تمہارے بھائی کو بھی دو چار روز میں داخلہ مل جائے گا۔''

''داخلہ مل گیا ہے جی۔ ابھی شام کو ہی امی کا فون آیا تھا۔'' سارہ نے ممنون سی ہوکر شاہنواز رائے کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلانے لگے۔

☆☆☆

مہینا ختم ہونے میں ابھی دو روز باقی تھے مگر زمینوں (جاگیر) سے بیٹے صالح کی طبیعت ناساز ہونے کی خبر آئی اور انہوں نے اگلے روز واپس جانے کی ٹھان لی۔ شام کو انہوں نے کارِ خاص خیام کو بلایا اور اسے ہدایت کردی کہ سارہ کے گھر والوں کو بتادیا جائے کہ وہ کل کسی وقت اسے

قیصر ولا سے لے جائیں۔

''جی سرکار!'' خیام نے ادب سے سر جھکایا۔

وہ جانے لگا تو شاہنواز رائے نے اسے روکا اور ذرا دھیمے لہجے میں بولے۔ ''لڑکی کو بھی بتا دینا کہ کل اسے جانا ہے۔''

''جی سرکار!'' خیام نے دوبارہ کہا۔

پورے مہینے اسے سارہ کہا گیا تھا مگر اب ''لڑکی'' کہا جا رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

نومبر کی ٹھنڈی میں وہ ایک نیم گرم بھرپور شب تھی جو شاہنواز رائے نے گزاری۔ صبح نمازِ فجر کے کچھ دیر بعد وہ پھر اپنے وسیع بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ سارہ اوس میں نہائے ہوئے پھول کی طرح نظر آتی تھی۔ نم بال شانوں پر تھے۔ شاہنواز رائے کو دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو..... بیٹھو۔'' انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ''خیام!'' انہوں نے پاٹ دار آواز میں اسے پکارا۔

وہ فوراً آ گیا۔ ایک طشتری میں چند مخملی ڈبے تھے۔ طشتری رکھ کر خیام نظریں جھکائے باہر چلا گیا۔

''یہ تمہارے لیے ہیں۔'' شاہنواز رائے نے کہا۔

وہ ممنون انداز میں بیٹھی رہی۔

''کھول کر نہیں دیکھو گی؟''

اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے ڈبوں کے ڈھکن اٹھائے۔ ان میں قیمتی جڑاؤ زیورات اور دیگر تحائف تھے۔ ایک لفافہ بھی تھا۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے یہ چھوٹا لفافہ کھولا۔ اس میں ایک چیک تھا۔ چیک کی رقم سارہ کی توقعات سے کافی زیادہ تھی۔ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

''یہ..... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' وہ منمنائی۔

''جو اچھا وقت تم نے مجھے دیا، اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔''

وہ اس چیک کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ انعام ہے، تحفہ ہے، حق مہر کی شکل ہے، کیا ہے؟ 30 لاکھ اس کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔

ایک بار پھر ممنون انداز میں اس نے سر جھکایا اور اپنی ناک شاہنواز رائے کے شانے میں گاڑ دی۔ اس کے ہاتھ ان کے بازو پر تھے۔ شاہنواز نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے بدن کی مہک، پرفیوم کی ہلکی مہک کے ساتھ مل کر ان کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس کی قربت نے انہیں بے چین سا کر دیا۔ وہ جو اسے بس رخصت کرنے کے لیے کمرے میں آئے تھے، ایک بار پھر اس کے قریب تر ہو گئے۔

دروازہ بند کرتے ہوئے وہ مسہری تک آ گئے۔

شاہنواز رائے نے خیام سے کہا تھا کہ سہ پہر تک سارہ کے گھر والوں کو بلا لینا تاکہ وہ اسے لے جائیں مگر چونکہ وہ پھر مشغول ہو گئے تھے لہٰذا ایک بجے کے قریب انہوں نے فون پر ہی خیام کو نئی ہدایات جاری کیں اور کہا کہ سارہ رات یہیں رہے گی۔

وہ ایک بار پھر شدومد سے سارہ کی قربت سے حظ اٹھانے لگے تھے۔ صنفِ نازک کی وہی طلب جو اکثر بڑی شدت سے ان میں ابھرتی تھی اور ان کے ارادوں اور ضابطوں کو درہم برہم کر دیتی تھی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ جب وہ کمرے میں ہی مچھلی اور مشن کڑاہی کا پُرتکلف ڈنر کر رہے تھے، سرخاب منزل سے فیملی ڈاکٹر حمید کھوکھر نے بتایا کہ چھوٹے سرکار کا بخار اتر گیا ہے اور وہ کھیل رہے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد شاہنواز رائے نے پروگرام کچھ مزید تبدیل کر لیا۔ انہوں نے خیام کو فون پر بتایا کہ سارہ بیگم رات یہیں بسر کریں گی۔ ان کی واپسی کل دوپہر ہو گی۔

☆☆☆

سارہ واپس جا چکی تھی۔ اس کے جاتے ہی ملے شدہ پروگرام کے مطابق شاہنواز رائے نے طلاق کے پیپرز پر دستخط کر کے سارہ کے اہلِ خانہ کو بھیج دیے تھے۔ ملاپ اور جدائی کی یہ ساری کارروائی اور اس کے قانونی نکات اب خیام کو ازبر ہو چکے تھے۔ وہ اس عمل میں کسی طرح کی غلطی یا کوتاہی نہیں کرتا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ شاہنواز رائے نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ان کی لاہور والی کمپنی کا منیجر اشفاق تھا۔ اس نے بتایا کہ اگر وہ پروگرام کے مطابق کل لاہور پہنچ جاتے تو ان کی حریف پارٹی ایک بڑا ٹینڈر حاصل کرنے سے رہ جاتی۔ منیجر کے اندازے کے مطابق یہ کروڑ ڈیڑھ کروڑ کا نقصان تھا۔

تھوڑی سی تکلیف تو شاہنواز رائے کو ہوئی مگر وہ بڑے دل و دماغ کے مالک تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جس طرح زندگی میں کئی خوشی لازم و ملزوم ہیں، ایسے ہی کاروبار میں بھی نفع نقصان ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد انہوں نے قیمتی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگے کہ کل صبح کس طرح آناً فاناً ان کا پروگرام تبدیل ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس جسمانی کیفیت اور ''جذباتیت'' پر پریشان بھی ہو جایا کرتے تھے۔ بے شک یہ فطری تقاضے حضرتِ انسان سے

وابستہ ہیں تاہم کبھی کبھی صنفِ مخالف کی طلب ان کے اندر غیر معمولی شدت سے ابھرتی تھی۔ شاید کئی دوسری خصوصیات کی طرح یہ خصوصیت بھی ان کے خون میں شامل تھی۔ نسل در نسل ان کے ڈی این اے میں موجود تھی۔ کسی وقت تو ان کا دل چاہنے لگتا تھا کہ اپنے آپ کو خود احتسابی کے کڑے شکنجے میں جکڑیں اور اپنی طبع کو بے مہار نہ ہونے دیں۔ ایسی سوچ کے تحت وہ کئی کئی ماہ تک ایسی ''مصروفیات'' سے دور رہتے تھے مگر پھر کسی نہ کسی طور کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ انہیں کراچی کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ عموماً اس میں ان کے قریبی دوست سیف اللہ کا عمل دخل بھی ہوتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے انہیں کراچی کھینچ لیتا تھا۔ کراچی پہنچتے ہی مخدوم شاہنواز رائے اپنے اس نہایت سخت خول سے باہر آجاتے تھے جو سرگودھا میں اپنی جاگیر پر انہیں چھپائے رکھتا تھا۔ وہ معاشرتی اور مذہبی حدود میں رہتے ہوئے اپنے لیے کچھ رعایتیں تلاش کر لیتے تھے اور چند ہفتے یا ایک ڈیڑھ ماہ کراچی میں گزار لیتے تھے۔

☆☆☆

قریباً تین ایکڑ میں پھیلی ہوئی سرخاب منزل جدید اور قدیم کا خوبصورت امتزاج تھی۔ بلند محرابی دروازے، دبیز قالین، بیش قیمت فانوس، دیواروں پر قیمتی پینٹنگز اور مخدوم فیملی کے بزرگوں کی پُرشکوہ تصویریں۔ مردانے حصے میں درجنوں خدمت گار اور ملازم موجود رہتے تھے۔ البتہ زنانے حصے میں خدمت گاروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ زنانے میں سب کی سب خدمت گار عورتیں تھیں اور صرف ایک کے سوا وہ سب کی سب بڑی عمر کی تھیں۔ ان میں سے کسی کی عمر بھی پینتالیس سے کم نہیں ہوگی۔ رہائشی حصے میں مخدوم شاہنواز اپنے اکلوتے بچے 12 سالہ صالح کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں کا اہم ترین خدمت گار پچپن سالہ فضل کریم تھا۔ وہ دور نزدیک سے شاہنواز رائے کا رشتے دار بھی تھا لہٰذا سرخاب منزل میں ایک فیملی ممبر کی طرح رہتا تھا۔ شاہنواز رائے نے اسے بہت سے اختیارات دے رکھے تھے۔ جن دنوں کاروبار یا ''کارِ شوق'' کے سلسلے میں شاہنواز رائے سرگودھا اور سرخاب منزل سے دور ہوتے تھے، فضل کریم ہی ایک دادا، نانا کی طرح صالح کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ شاہنواز رائے کے سخت اصولوں، ضابطوں کو سرخاب منزل پر نافذ کرنا اور ان کی پابندی کرانا بھی فضل کریم کی ذمے داری میں شامل تھا۔

بارہ، ساڑھے بارہ سالہ صالح یعنی چھوٹے سرکار کا بخار اتر چکا تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز، بچوں کا اخبار دیکھ رہا تھا جب فضل کریم اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''بڑے سرکار آگئے ہیں۔ ابھی ڈیوڑھی میں ہیں۔ دو چار منٹ میں اندر آجائیں گے۔''

پھر انہوں نے دروازے کی طرف رخ کر کے بیڈ خادمہ صادقہ کو آواز دی۔ ''صادقہ! بڑے سرکار کراچی سے آگئے ہیں۔ ابھی اندر آنے والے ہیں۔ ان کا کمرا دیکھ لو اور باتھ روم پر بھی نظر ڈال لو۔''

قدرے بھاری جسم اور چوکور چہرے والی ادھیڑ عمر صادقہ نے ایک دوسری ملازمہ کو آواز دی، اپنا دوپٹا درست کیا اور جسم کو جھلاتی ہوئی اندرونی کمرے کی طرف بڑھی۔ بڑے سرکار کی آمد کی اطلاع نے جیسے زنانے میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ ملازمائیں تیزی سے اِدھر اُدھر حرکت کرتی نظر آئیں۔

فضل کریم باہر نکلنے لگے تو ان کی نظر بچوں کے اخبار پر پڑی جو صالح کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ چونک کر رک گئے۔

''صالح بیٹے! بڑے سرکار کو اچھا نہیں لگے گا۔ کہاں سے لیا ہے اخبار؟''

صالح معصومیت سے بولا۔ ''میں نے خود تو نہیں لیا۔ ادھر شاید ہوا سے اڑتا ہوا گراؤنڈ میں آگیا تھا دادا جے۔'' (وہ فضل کریم کو دادا جے کہتا تھا)۔

''چلو، دے دو مجھے۔'' فضل کریم نے ہاتھ بڑھایا۔

''پر دادا جے! یہ کوئی کہانیوں کی کتاب تو نہیں جو بابا جانی غصے ہوں گے۔''

''اوہو، لیکن کہانیاں شہانیاں بھی تو ہوتی ہیں نا اس میں۔ چھوڑو، وہ ناراض ہوں گے۔''

صالح نے اخبار ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے تہ کر کے ڈسکٹ میں ڈالا اور لان کی طرف بڑھ گئے۔

سب ملازمائیں اپنے دوپٹے وغیرہ درست کر رہی تھیں۔ صالح کی ٹیچر آئیں اور آتے ہی بولیں۔ ''تم اکثر بابا جانی کو سلام کرنا بھول جاتے ہو۔ انہیں اچھا نہیں لگتا، دھیان رکھنا۔ سبق کے بارے میں پوچھیں تو بتا دینا کہ روز ہی پڑھا ہے۔ پتا ہے پچھلی دفعہ بھی تم نے چار پانچ چھٹیاں کی تھیں اور سختی ڈانٹ پڑی تھی۔''

صالح نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد شاہنواز رائے طمطراق کے ساتھ صالح کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے صالح کو اپنے ساتھ لگا کر اس کا سر چوما۔

"بابا! آپ نے پانچ چھ دن سے فون بھی نہیں کیا۔" صالح نے پوچھا۔

"سوری، میرا پتر! زیادہ مصروف ہوگیا تھا۔ اب آگیا ہوں نا تمہارے پاس۔"

اسی دوران میں فضل کریم بھی آگئے۔ وہ صالح کے نگہبان ہی نہیں، استاد بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑے پرائیویٹ اسکول کی ٹیچر کو بھی شاہنواز رائے نے صالح کی تعلیم کے لیے سرخاب منزل میں رکھا ہوا تھا۔ دراصل وہ اس کے حق میں نہیں تھے کہ صالح کو کسی بھی غرض سے سرخاب منزل سے باہر بھیجا جائے۔ اس کی ساری ضروریات اور تفریح وغیرہ کا انتظام انہوں نے سرخاب منزل کے اندر ہی کر رکھا تھا۔ اس کے لیے وہ جواز یہ دیتے تھے کہ سرگودھا شہر کی بابڑا فیملی سے چونکہ دیرینہ دشمنی ہے لہٰذا وہ صالح کو سرخاب منزل میں ہی زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔

ممکن ہے کہ اس بات میں بیس تیس فیصد سچائی بھی ہو لیکن اصل بات یہی تھی کہ وہ صالح کو باہر کی ہوا سے بچانا چاہتے تھے۔ اس معاملے میں وہ جنون کی حد تک سخت واقع ہوئے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ کم از کم بلوغت تک پہنچنے سے پہلے صالح ہر طرح کی معاشرتی کج رویوں اور خرافات سے کوسوں دور رہے۔ وہ نہ صرف اسے جسمانی لحاظ سے بلکہ فکری اعتبار سے بھی بالکل پاک صاف اور معصوم دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے حوالے سے بہت فکرمند رہتے تھے۔ ان کے لاشعور میں جیسے یہ اندیشہ گھر کیے ہوئے تھا کہ وہ اس راستے پر نہ چل پڑے جس پر رائے فیملی کے آباؤ اجداد چلے اور کسی حد تک وہ خود بھی۔ ان کا ذاتی تجربہ تھا کہ اوائل عمری میں ہی غیر ضروری جلسی آگاہی بہت خرابیاں پیدا کرتی ہے۔

سرخاب منزل میں ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ اخبارات بھی صرف مردانے میں آتے تھے۔ پوری سرخاب منزل میں موبائل فون فقط شاہنواز رائے ہی کے پاس تھا۔ صالح پر ہم عمر دوست بنانے کی مکمل پابندی تھی۔ یہ پابندی نہ بھی ہوتی تو کوئی دوست بنانا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ سرخاب منزل سے باہر نکلتا ہی کب تھا۔ اگر کبھی نکلتا بھی تھا تو وہ بھی بابا جانی یا داجے فضل کریم کے ساتھ۔ زنانے کی ساری ملازمائیں ادھیڑ عمر تھیں۔ ان کو سختی سے ہدایت تھی کہ بچے کے سامنے کسی بھی شکل میں کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اس کی سوچوں پر منفی اثر پڑے۔ سرگودھا شہر میں مخدوم رائے فیملی کے کچھ عزیز موجود تھے مگر بہ وجوہ شاہنواز رائے نے ان سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔ لے دے کر شاہنواز رائے کی ایک بہن خدیجہ رائے تھی جو لاہور میں رہتی تھی۔ اس کے تینوں بچے شادی شدہ تھے اور گھر کا ماحول بھی سرخاب منزل کی طرح بے حد کنزرویٹو تھا۔ پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ ریڈیو، ٹی وی تو رہا ایک طرف، ان کے گھر میں فون کا بھی کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ شاہنواز رائے کی دوسری بہن شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں مقیم تھی اور بہت ہی کم پاکستان آتی تھی۔ مختصراً یہ کہ شاہنواز رائے نے صالح کے گرد ایک ایسا حصار قائم کر دیا تھا جس نے اسے ہر طرح کے مخدوش معاشرتی میل جول سے بہت دور رکھا ہوا تھا۔

سرخاب منزل میں واحد عورت ٹیچر ثمینہ جمال تھی جس کی عمر کچھ کم تھی۔ وہ پینتیس چھتیس کی تھی مگر اپنی عمر سے کچھ کم ہی دکھائی دیتی تھی۔ درمیانی شکل و صورت کی تھی۔ چینک بھی لگاتی تھی تاہم رنگ سرخ و سپید تھا۔ صالح کی دینی تعلیم کی ذمے داری فضل کریم پر تھی۔

شاہنواز رائے نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش کے مطابق سرسبز لان کی ایک جانب سبز رنگ کے خوبصورت سائبان کے نیچے ایک چھوٹا سوئمنگ پول بھی بنوا رکھا تھا۔ سبز رنگ کے فائبر گلاس جب پول کے پانی میں منعکس ہوتا تھا تو سارا پانی سبزی مائل محسوس ہوتا تھا۔ اس پانی کی زیادہ سے زیادہ گہرائی فقط چار فٹ تھی۔ فارغ وقت میں صالح دیر تک تالاب کے کنارے بیٹھا رہتا۔ اپنے پاؤں سے پانی کو ہلکورے دیتا رہتا اور لہروں پر تصوراتی ہیولے بناتا رہتا۔

شام کے وقت ٹیچر ثمینہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنا بھی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ رات کو ماماں بی اسے کہانیاں سناتی۔ ان کہانیوں کا ماخذ زیادہ تر اسلامی تاریخ ہی ہوتی تھی۔

وہ نومبر کی ایک خوش رنگ شام تھی۔ صالح، ٹیچر ثمینہ کے ساتھ گراسی لان پر بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔ ثمینہ جمال نے حسب معمول اپنا دوپٹا کمر سے باندھ رکھا تھا اور ورزش کے سبب اس کے گال شہابی ہو رہے تھے۔ پتا نہیں اس روز اچانک کیوں صالح کی نگاہیں ٹیچر ثمینہ کے سراپا سے الجھنے لگیں۔ صالح کی توجہ کھیل سے زیادہ ثمینہ کے ڈولتے، تھرکتے جسم پر ہوگئی۔ وہ گاہے بہ گاہے نیٹ کے اس پار ٹیچر ثمینہ کو دیکھتا اور اسے عجیب سی الجھن محسوس ہوتی۔ ایسی الجھن جو اسے بری بھی نہیں لگ رہی تھی۔

یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر جاری ہوگیا۔ اگلے چار پانچ روز بھی ایسے ہی گزرے۔ پھر ایک دن نوعمر صالح کی یہ

کیفیت راز نہ رہ سکی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے بابا جانی لان کے کنارے ڈرائنگ روم میں موجود ہیں اور رنگین شیشوں والی کھڑکی کے عقب سے بغور اسے دیکھ رہے ہیں۔

اگلے روز شام کو جب صالح بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے کشاں کشاں لان میں پہنچا تو وہاں ٹیچر ثمینہ کے بجائے ایک درمیانی عمر کا دبلا پتلا نیم گنجا شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے سفید شرٹ اور نیکر پہن رکھی تھی۔ داجے فضل کریم بھی پاس ہی کھڑے تھے۔

''ٹیچر کہاں ہیں؟'' صالح نے معصومیت سے پوچھا۔

''انہیں کوئی ضروری کام تھا۔ لاہور چلی گئی ہیں۔'' داجے فضل کریم نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''آج سے یہ منظور صاحب تمہارے ساتھ کھیلا کریں گے۔ بہت بڑے کھلاڑی ہیں۔ سمجھو کہ یہ تمہارے کوچ ہیں۔''

''کوچ؟'' صالح نے حیرانی سے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ٹیچر کب آئیں گی؟''

''ان کا کچھ پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آ ہی نہ سکیں۔''

صالح ایک دم بجھ سا گیا۔ کھیلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کوچ منظور صاحب نے اسے آمادہ کرنے کی مشفقانہ کوشش کی لیکن وہ واپس چلا گیا۔ وہ دیر تک سوچتا رہا کہ ٹیچر ثمینہ اچانک واپس کیوں چلی گئیں؟ انہوں نے اپنے جانے کا ذکر تک نہ کیا۔

دو تین روز اپ سیٹ رہنے کے بعد صالح نے منظور انکل کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنا شروع کر دیا۔ اس کی پڑھائی رکی ہوئی تھی لیکن پھر ایک دن اس کی پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ اس کی نئی ٹیچر آ گئی تھیں۔ یہ پچاس پچپن سال کی خاتون تھیں۔ بڑے دھیمے اور میٹھے لہجے میں بولتی تھیں، پیار سے پڑھاتی تھیں۔ صالح کو وہ کچھ ایسی بُری نہیں لگیں البتہ یہ سوال اب بھی اس کے ذہن میں موجود تھا کہ ٹیچر ثمینہ اچانک کیوں چلی گئیں؟ اس نے ایک روز بابا جانی سے پوچھا تھا تو انہوں نے بھی داجے فضل کریم کی طرح گول مول سا جواب ہی دیا تھا کہ اسے لاہور میں کچھ ضروری کام تھے اس لیے چلی گئی۔

اب نئی ٹیچر آنے کے بعد صالح کو پتا چل گیا کہ پرانی ٹیچر نہیں آئے گی۔ شام کے بعد جب داجے اسے سپارہ پڑھانے کے بعد اس سے باتیں کر رہے تھے، صالح نے جھلائے ہوئے انداز میں ان سے پوچھ ہی لیا کہ ٹیچر ثمینہ کیوں چلی گئی۔

داجے فضل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''دراصل اس کی شادی ہو رہی ہے..... بلکہ ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پچھلے ہفتے اس کی برات تھی۔''

''مگر داجے! شادیاں تو لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔ وہ تو لڑکی نہیں تھیں؟''

''مگر اتنی بڑی بھی تو نہیں تھی۔ اس کا پہلا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب دوسری شادی تو اس نے کرنا ہی تھی۔''

''کیا شادی کرنا بہت ضروری ہوتا ہے، داجے؟'' صالح نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں، صالح..... یہ اللہ کا حکم ہے۔ شادی کرنا چاہیے۔''

''مگر داجے! آپ بتاتے ہیں کہ جب میں صرف ایک دو سال کا تھا، میری امی اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد بابا جانی نے تو کوئی شادی نہیں کی۔''

''یہ ان کی مرضی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ تم ہی ہو۔ وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

صالح کچھ دیر سوچ میں گم رہنے کے بعد بھولپن سے بولا۔ ''داجے! اس شادی میں ہوتا کیا ہے؟''

اس اچانک سوال پر فضل کریم گڑبڑا سے گئے پھر ذرا سنبھل کر بولے۔ ''تم پچھلے سال لاہور گئے تو تھے اپنی پھپھو کے بیٹے عبداللہ کی شادی پر۔''

صالح کی آنکھوں میں چمک ابھری جیسے ایک خوش کن تصور میں کھو گیا۔ ''ہاں، وہاں سب نے رنگ برنگے کپڑے پہنے تھے۔ دو تین لڑکیوں نے ڈھولک بھی بجائی تھی پھر چھوہارے اور گری بادام بانٹے گئے تھے۔ تب بہت مزیدار کھانے سجائے گئے تھے۔ دلہن باجی تو بہت ہی زیادہ پیاری لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اتنے چمکدار کپڑے پہن رکھے تھے کہ مجھ سے دیکھا ہی نہیں جا رہا تھا پھر ہم پھپھو جی کے گھر آئے تھے اور عبداللہ بھائی، دلہن باجی کو لے کر کمرے میں چلے گئے تھے..... وہ کمرے میں کیوں چلے گئے تھے داجے؟'' بولتے بولتے صالح نے پھر ایک نازک سوال جڑ دیا۔

فضل کریم طویل سانس لے کر بولے۔ ''شادی کے بعد دلہا اور دلہن اکٹھے رہتے ہیں نا۔''

''اکٹھے کیوں رہتے ہیں؟ دوسرے لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ وہ کمرے میں کیا کرتے ہیں؟''

''بیٹا جی! یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد دلہا دلہن یعنی میاں بیوی اکٹھے رہیں۔ ان کے اکٹھے رہنے سے ہی دنیا کا یہ سارا نظام چلتا ہے۔ تمہارے جیسے پیارے پیارے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ گھروں کی رونق بڑھاتے ہیں۔''

"تو..... میں بھی ایسے ہی پیدا ہوا تھا؟"

"بالکل۔"

"لیکن کیسے پیدا ہو گیا تھا؟" وہ سخت الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

فضل کریم گڑبڑا گئے۔ "یہ تو مجھے بھی ٹھیک سے پتا نہیں۔" انہوں نے کہا۔

"ماں جی کہتی تھیں کہ بچوں کو فرشتے آسمانوں سے لے کر آتے ہیں اور جھولے میں ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ جب دلہا دلہن اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر بچے آجاتے ہیں۔"

صالح کے مسلسل سوالوں سے گھبرا کر فضل کریم نے اپنی چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی کھجائی اور بولے۔ "دیکھو، جب تم بڑے ہو گے تو یہ ساری باتیں خود ہی تمہاری سمجھ میں آجائیں گی۔ ابھی تم صرف اپنے پڑھنے لکھنے میں دھیان دو۔" پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ارے ہاں..... مجھے یاد آیا..... آج حجام چاچا کو بھی تو فون کرنا تھا۔ اس نے تمہارے بال بنانے آنا ہے۔" پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

یہ چھ سات روز بعد کی بات ہے۔ دوپہر فضل کریم کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد صالح برآمدے میں بیٹھا تھا کہ دادا جی نے اسے نئی بات بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ اس کے بابا جانی کے کسی دوست نے باہر کے ملک سے انہیں خاص نسل کی مرغیاں اور کچھ پرندے بھیجے ہیں۔ بابا جانی نے مردانے کے باہر والے لان میں ان کے لیے پنجرے وغیرہ بنائے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ اور پرندے بھی خریدیں۔

مردانے کی طرف صالح کا جانا بہت کم ہوتا تھا تاہم اس روز وہ اپنے بیڈمنٹن کے کوچ منظور صاحب کے ساتھ پنجرے دیکھنے کے لیے مردانے والے لان میں چلا گیا۔ دادا جی فضل بھی ٹہلتے ہوئے وہیں آگئے۔ واقعی یہ بہت خوبصورت اور رنگ برنگی مرغیاں تھیں۔ یہاں دو چھوٹے پنجروں میں کبوتر بھی تھے۔ ایک خالی پنجرے کے بارے میں دادا جی نے اسے بتایا کہ یہاں خاص نسل کے خرگوش رکھے جائیں گے۔ انہوں نے صالح اور منظور صاحب کو یہ بتا کر حیران کیا کہ مرغیوں میں سے کچھ مرغیاں ایسی ہیں کہ ایک مرغی کی قیمت میں بہ آسانی دو بڑی گائے آسکتی ہیں۔

صالح نے خوبصورت فاختائی رنگ کے کبوتروں میں خصوصی دلچسپی لی۔ ایک کبوتر جیسے رقص کرنے والے انداز میں دوسرے کبوتر کے گرد گھوم رہا تھا۔

منظور انکل نے صالح کو بتایا۔ "یہ نر کبوتر ہے۔ سمجھو کہ اپنی مادہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے اس کے گرد چکرا رہا ہے۔"

"یہ مادہ کیا ہوتی ہے؟" صالح نے معصومیت بھرا سوال کیا۔

"یوں سمجھو کہ کبوتر کی وائف۔" منظور صاحب نے جواب دیا۔

فضل کریم نے صالح کا ہاتھ پکڑا اور اسے رنگ برنگے طوطوں کے پنجرے کی طرف لے گئے۔

تین چار روز بعد صالح نے پھر مردانے کا دورہ کیا۔ اس روز بابا جانی کا موڈ بھی کچھ خوشگوار تھا۔ انہوں نے صالح کو پنجروں کے پاس دیکھا تو وہیں چلے آئے۔ وہ اور صالح رنگ برنگے چہکارتے طوطوں کی جانب دیکھ رہے تھے جب اچانک صالح نے دیکھا کہ مرغیوں کی جانب ایک مرغا اپنی مادہ کی طرف بھاگا اور اسے جھپٹ لیا۔

صالح گھبرا کر چلایا۔ "وہ دیکھیں بابا جانی! مرغیاں لڑ پڑیں۔ وہ مار رہی ہے اسے..... بچائیں اس کو۔"

شاہنواز رائے کا چہرہ اچانک سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر گم صم سے کھڑے رہے۔ مرغا اور مرغی زمین پر چونچیں مارتے اب دوسری طرف چلے گئے تھے۔ صالح ابھی تک سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ شپٹائے انداز میں بولے۔ "لڑ نہیں رہے تھے..... جھوٹ موٹ لگے ہوئے تھے۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ صالح کو زنانے کی طرف واپس لے گئے۔ اگلے روز سب کچھ ختم کر دیا گیا۔ پنجرے پرندوں سمیت سرخاب منزل سے باہر بھیج دیے گئے۔ تمام مرغیوں کو بھی مخصوص نوکروں میں بند کر کے کہیں روانہ کر دیا گیا۔ سارا "سیٹ اپ" توڑ پھوڑ دیا گیا۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

یہ دو دن بعد کی بات ہے۔ شاہنواز رائے اور فضل کریم تالاب کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شاہنواز رائے کی انگلیوں میں چھوٹی سی سیج گردش کر رہی تھی۔ فضل کریم نے ذرا جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاہنواز! میری بات کا برا نہ ماننا لیکن تم اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی سختی دکھا رہے ہو۔"

"کس معاملے میں؟"

"صالح کے معاملے میں..... ایک معمولی وجہ سے تم نے سب مرغیاں، پرندے سرگودھا والے گودام میں بھجوا دیے۔"

''یہ معمولی وجہ نہیں تھی فضل کریم! میں صالح کی تربیت جس انداز سے کرنا چاہتا ہوں، تم اسے پوری طرح نہیں سمجھ پا رہے۔ مجھے یہی محسوس ہوا ہے کہ کچی عمر میں بچے کے اردگرد پالتو جانوروں کی موجودگی، اس کے ذہن پر بُرے اثرات ڈالتی ہے جو آگے جا کر مزید پیچیدگیوں کی وجہ بنتے ہیں۔''

''تو تمہارے خیال میں بچوں کو کب تک انسانوں کے علاوہ جانوروں سے بھی دور رکھنا چاہیے؟'' فضل کریم نے کہا۔

شاہنواز رائے نے فضل کریم کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو بہ مشکل نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے خیال میں تو جب تک بچہ پوری طرح بالغ نہیں ہوتا، وہ کچی عمر میں ہی ہوتا ہے۔ اس دور میں اس کے ذہن کو بالکل پاک صاف رہنا چاہیے۔''

''لیکن شاہنواز..... یہ تو قدرت ہے اور یہ ہمارے اردگرد ہر جگہ بکھری ہوئی ہے۔ ہم کس کس طرف سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔ صالح اب بڑا ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اسے جواب چاہئیں۔ جب جواب نہیں ملتے تو وہ الجھن اور گھٹن کا شکار ہوتا ہے۔''

''بچوں کے کچے پکے ذہن میں فحاشی اور جنس بھرنے سے بہتر ہے کہ وہ تھوڑی بہت الجھن کا شکار ہو جائیں۔'' شاہنواز نے بے اعتنائی سے کہا۔

''معاف چاہتا ہوں شاہنواز! یہ فحاشی نہیں ہے۔ یہ تو فطرت ہے، قدرت کے مظاہر ہیں جو ہمارے اردگرد ہر جگہ موجود ہیں۔''

''صرف پالتو جانور ہی تو نہیں۔'' شاہنواز نے جل کر کہا۔ ''قدرت کے اور بھی تو بے شمار مظاہر ہیں۔ ہمارے اردگرد ان گنت دلچسپیاں بکھری ہوئی ہیں۔ میں صالح کی تفریح کے خلاف نہیں ہوں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہم اسے زیادہ سے زیادہ خوشی فراہم کریں۔ تم اسے صبح باغیچے میں سیر کے لیے لے جایا کرو۔ اسے کھیل کود میں بھی زیادہ مصروف کرو۔''

''شاہنواز! کھیل کود بھی تو اجنبیوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

''یار! ہم اتنے سارے لوگ مل کر ایک بچے کو دھیان میں نہیں لگا سکتے..... اسے ان خرافات سے دور نہیں رکھ سکتے؟'' شاہنواز نے زچ ہو کر کہا۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

فضل کریم ان کا مزاج شناس تھا۔ اس نے موضوع بدلنا بہتر سمجھا، بولا۔ ''تم نے صالح سے وعدہ کیا تھا کہ اسے کہانیوں کی دو چار کتابیں لا کر دو گے۔''

''ہاں، ڈھونڈ رہا ہوں میں۔ لاہور میں ایک دو پبلشر ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لیے بڑی صاف ستھری، اصلاحی کہانیاں شائع کرتے ہیں۔ میں منگوالوں گا۔''

☆☆☆

شاہنواز رائے اپنی مخصوص سوچ کے مطابق صالح کے گرد ایک حصار بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک ایسا حفاظتی گھیرا جو اسے موجودہ زمانے کی ساری خرافات اور کج روئیوں سے دور رکھے۔ اس کوشش میں وہ اتنا آگے چلے گئے تھے کہ فطرت سے بھی لڑنا شروع ہو گئے تھے۔ فطرت کے سدا رواں پانیوں کے آگے کون بند باندھ سکتا ہے۔ انہیں ایک طرف سے روکا جائے تو دوسری طرف سے بہہ نکلتے ہیں۔ وہ ناقابل مزاحمت ہوتے ہیں۔ خود کو روکنے والی رکاوٹوں میں سرایت کر جاتے ہیں اور مکمل طور پر روکا تو اس چیز کو جا سکتا ہے جو کسی ایک طرف سے آ رہی ہو۔ یہ منہ زور ریلے ہر سمت سے آتے ہیں اور انسان کے اندر سے بھی نمودار ہوتے ہیں۔ یہی نظام ہستی ہے۔

سرخاب منزل کا چڑیا گھر اجڑ گیا۔ جانور اور پرندے چلے گئے لیکن فطرت تو ہر جگہ موجود تھی اور صالح کو اکثر اس کی جھلکیاں نظر آتی رہتی تھیں۔ ایک روز صبح کے وقت صالح، دادا جی فضل کے ساتھ باغیچے کی سیر کے لیے گیا۔ سردیوں کے رنگ برنگ پھولوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ سنہری دھوپ میں گل داؤدی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ بہت محظوظ ہوا۔ ایک جگہ اس نے تتلیوں کو دیکھا۔ دو تتلیاں باہم پیوست تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس سے پہلے کہ وہ دادا جی فضل سے کچھ پوچھتا، انہوں نے اسے مالٹے کے خوش رنگ پودے کی طرف متوجہ کر دیا۔

سرخاب منزل میں صالح کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پیار کرنے والا باپ، مہربان استاد، بہت لاڈ کرنے والی اور کہانیاں سنانے والی ماماں بی..... کھیل کود کی تفریحات، بہترین کھانے..... مگر پھر بھی کوئی بہت بڑا خلا تھا جو اس کے اندر موجود تھا۔ وہ اس خلا کے حوالے سے کچھ سوالات اپنے بڑوں سے پوچھتا تھا مگر اسے تسلی بخش جوابات نہیں ملتے تھے۔ ایسے میں اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے ہمجولی ہوں جن کے ساتھ وہ بہت سی باتیں کرے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ دن اور رات..... ایک ہی جیسے دن اور رات ایک دوسرے کے تعاقب میں تھے۔ وہ صبح سات آٹھ بجے اٹھتا۔ دادا جی کی ہدایت کے مطابق فجر کی قضا نماز ادا کرتا۔ اس کے بعد عموماً باغیچے کی چہل قدمی ہوتی تھی پھر ٹھیک نو بجے ناشتے کی میز پر بابا جانی کے ساتھ ناشتا

کرتا۔ تب اپنی ادھیڑ عمر ٹیچر فرحت کے ساتھ قریباً پانچ گھنٹے کے لیے کمرے میں بند ہوجاتا۔ بابا جانی دوپہر کا کھانا مردانے میں کھاتے تھے لیکن جب صالح اصرار کرتا تو زنانے میں بھی کھالیتے تھے۔ بابا جانی کی ہدایت تھی کہ دوپہر کو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ہر صورت سونا ہے۔ نیند نہ بھی آتی تو ماماں بی اسے لیٹنے پر مجبور کردیتی تھی۔ عصر کے بعد کا وقت صالح کے لیے کافی خوش کن ہوتا تھا۔ وہ منصور انکل کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتا اور کبھی کبھی فٹ بال بھی۔ تین چار اور ملازم بھی انہیں کمپنی دینے کے لیے کھیل میں شامل ہوجاتے۔ شام کے بعد کا ایک گھنٹا دینی تعلیم کے لیے ہوتا تھا اور یہ ذمے داری داجے فضل پر تھی۔ اس کے بعد وہ بابا جانی کی فراہم کردہ کہانیوں والی کوئی کتاب پڑھنے بیٹھ جاتا یا پھر اپنی آپا ماماں بی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا۔ ہفتہ اور اتوار باقاعدہ چھٹی ہوتی تھی۔ ان دو دنوں میں وہ ٹھنڈے یا گرم پانی سے بھرے ہوئے تالاب میں تیراکی سے بھی لطف اندوز ہوتا اور کبھی کبھی بابا جانی اسے پولو گراؤنڈ میں پولو دکھانے لے جاتے۔

بہار کی آمد تھی۔ ایک روز دوپہر کے وقت اپنی پیاری آپا ماماں بی کے پہلو میں اداس لیٹے لیٹے صالح نے ایک بلی کو دیکھا جو اپنے چھوٹے چھوٹے دو بلونگڑوں کے ساتھ ایک جانب سے نکلی اور لان کی طرف اوجھل ہوگئی۔

داجے فضل نے ایک روز اسے بتایا تھا کہ بچے اس وقت دنیا میں آتے ہیں جب ماں اور باپ اکٹھے رہتے ہیں۔ تو اس کا مطلب تھا کہ یہ بچے بھی ایسے ہی دنیا میں آئے تھے۔ کتنے پیارے بچے تھے۔ پتا نہیں ان کے ابو کہاں تھے؟

اس نے ماماں بی سے سوال کرنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر چپ رہ گیا۔ تجربے سے اسے معلوم ہوچکا تھا کہ اس کے ایسے سوالوں کے جواب ماماں بی نہیں دیتیں بلکہ کوئی بھی نہیں دیتا۔

اسے اپنے جسم کا تو پتا تھا مگر کسی وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ چھپ کر دیکھے کہ عورتوں کا جسم کیسا ہوتا ہے۔ ایک دن سرخاب منزل کی عمر رسیدہ سینئر بادرچن مامی نصیبن کے کپڑوں پر سالن گر گیا تھا۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی کمرے میں گئی تھی تاکہ کپڑے بدل سکے۔ صالح نے بڑی معصومیت سے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی تھی اور تب شاید پہلی بار ماماں بی نے اسے بُری طرح جھڑکا تھا۔

بہار کی آمد نے صالح کی اداسی میں کچھ اضافہ کردیا۔ ہر طرف سبزہ نمودار ہورہا تھا۔ مست کردینے والی ہوا چلتی تھی۔ پھلواری کی طرف سے خوشبوئیں اڑتی تھیں۔ بابا جانی نے باغ میں ایک بلند درخت کے ساتھ بہت اُونچا جھولا لگوایا تھا۔ ساتھ میں دو تین سلائیڈز اور کئی سائیکلیں بھی تھیں۔ ایک طرح سے یہ سرخاب منزل کا گھریلو چلڈرن پارک تھا بلکہ شاید اس کو چائلڈ پارک کہنا چاہیے۔

ایک دوپہر وہ طویل جھولے پر بیٹھا تھا اور ہولے ہولے جھول رہا تھا۔ چند ماہ پہلے شاہنواز رائے نے سب جانور اور پرندے اپنی سخت گیری کے سبب سرخاب منزل سے نکال دیے تھے مگر فضل کریم نے ٹھیک کہا تھا... قدرت کے مظاہر تو ہر جگہ موجود ہیں۔ فطرت پانیوں میں جھانک دکھاتی ہے، ویرانوں میں نمودار ہوتی ہے اور شاخوں پر مسکراتی ہے۔ چڑیوں کا ایک جوڑا ایک شاخ پر نمودار ہوا۔ صالح اسے چپکے چپکے دیکھتا رہا..... اور دیکھتا رہا۔ ان کی حرکات وسکنات اسے کشش کررہی تھیں۔

کچھ دنوں بعد ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ سرخاب منزل کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں جیسے کسی نے ایک بڑا کنکر پھینک دیا تھا..... ہلچل پیدا کردی تھی۔ ان دنوں صالح کے بابا جانی پھر اپنے ''کراچی والے دورے'' پر گئے ہوئے تھے۔ صالح کی تمام تر ذمے داری فضل کریم اور ماماں بی پر تھی۔

ایک روز صالح ٹیلوئے کے بعد اٹھا تو باہر کچھ تلاطم سا محسوس ہوا۔ وہ ائرکنڈیشنڈ کمرے سے باہر آیا۔ بلند و بالا پورچ میں جولائی کی گرم ہوا تھی اور دو شاندار جیپیں کھڑی تھیں۔ دو تین خواتین اور دو بچے بھی نظر آرہے تھے۔ یہ دراصل صالح کی ملائیشیا والی پھپھو عاصمہ تھیں۔ وہ کئی برس بعد پاکستان آئی تھیں اور اچانک وارد ہوئی تھیں تاکہ اپنے بھائی شاہنواز کو زبردست سرپرائز دے سکیں لیکن بھائی تو یہاں موجود ہی نہیں تھے۔

پھپھو اور ان کے دونوں بچوں سے صالح کا معمولی سا تعارف ہی تھا۔ بس ایک دفعہ بڑی پھپھو خدیجہ کے بیٹے عبداللہ بھائی کی شادی پر انہیں دیکھا تھا یا شاید جب وہ تین چار سال کا تھا تو عید کے موقع پر وہ دو چار روز کے لیے سرخاب منزل آئے تھے۔

آنے والوں میں پھپھو عاصمہ کے علاوہ ان کا چودہ پندرہ سالہ بیٹا فرحان اور دس گیارہ سالہ بیٹی آفرین بھی شامل تھی۔ فرحان اور آفرین کی دو چار تصویریں بھی صالح نے دیکھ رکھی تھیں اس لیے انہیں فوراً پہچان لیا۔ وہ لپک کر باہر گیا اور سب سے ملا۔ پھپھو اسے گلے لگا کر بہت خوش نظر آئیں۔ ایک ملازمہ بھی پھپھو کے ساتھ ہی ملائیشیا سے آئی

تھی۔ پھپھو کے بارے میں صالح کو پتا تھا کہ وہ خود تو تنکا کبھی کر دہرا نہیں کرتی تھیں۔ یہ جواں سال ملازمہ ہی ان کے سارے کام کرتی تھی۔ اس کا نام بعد ازاں رتنا پتہ معلوم ہوا۔

سرخاب منزل کے خاموش در و دیوار میں سے اچانک جیسے رونق اور مسرت پھوٹ پڑی تھی۔ چند ہی گھنٹوں میں صالح پھوپی زاد فرحان اور آفرین سے یوں گھل مل گیا جیسے مدتوں سے انہیں جانتا ہو۔ آفرین کی بہ نسبت فرحان کچھ خاموش طبع تھا مگر مدت سے ہمجولیوں کے لیے ترسے ہوئے صالح نے اسے بھی کسی حد تک بولنے پر مجبور کر دیا۔

رات کو پھپھو عاصمہ اور داجے فضل دیر تک صالح کے بابا جانی سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر رابطہ نہیں ہوا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ وہ تو اس دفعہ کراچی میں ہیں ہی نہیں۔ کراچی سے آگے دبئی نکل گئے ہیں۔ کسی کاروباری سودے کے لیے انہیں دس پندرہ روز وہیں رکنا تھا۔

دل ہی دل میں صالح خوش بھی ہوا کہ چلو اگلے ایک دو ہفتے تک وہ آزادی سے فرحان اور آفرین کے ساتھ کھیل کود سکے گا۔ بابا یہاں موجود ہوتے تو وہ اپنے نگے بندھے معمولات میں تبدیلی کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ ویسے کبھی کبھی اس کا ننھا ذہن یہ ضرور سوچتا تھا کہ بابا بار بار کراچی کیوں جاتے ہیں اور کیوں اتنے دنوں تک وہاں ٹھہرتے ہیں۔ کیا کاروبار کے لیے اس طرح سرخاب منزل سے دور جانا بہت ضروری تھا؟

☆☆☆

شاہنواز رائے ابوظہبی کے ایک ہوٹل میں موجود تھے۔ یہاں انہوں نے ایک چھوٹا مگر آرام دہ اپارٹمنٹ ایک ماہ کے لیے بک کرا رکھا تھا۔ اس بار ان کی دلہن ایک عراقی لڑکی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش بول سکتی تھی۔ شاہنواز رائے بھی ضرورت کے کچھ الفاظ سیکھ کر لیتے تھے۔ بہرحال عفاف نامی وہ لڑکی حسن اور خود سپردگی کی زبان بولتی تھی اور یہ زبان شاہنواز رائے بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ متوسط عراقی گھرانے سے تعلق رکھنے والی یہ لڑکی اپنے ایک ہم وطن سے ہی دھوکا کھائے ہوئے تھی۔ وہ اس کے بہلاوے میں آکر اس سے شادی کے بندھن میں بندھی تھی مگر یہ شادی عارضی ثابت ہوئی تھی۔ وہ شخص چند ماہ بعد اسے چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔ جس شادی دفتر والے نے یہ رشتہ کروایا تھا، عفاف اپنی فریاد لے کر اس کے پاس پہنچی تھی۔ اس شخص نے کاغذات دکھاتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ اس کے شوہر نے اس کے ساتھ عارضی شادی کی تھی۔ وہ قانونی لحاظ سے گناہ گار نہیں ہے۔ پھر شادی دفتر والے نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ کچھ امیر کبیر لوگ سفر کے دوران میں یا دیگر وجوہات کے سبب عارضی شادی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

اور عفاف نے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ زبان کا مسئلہ ہونے کے باوجود شاہنواز رائے اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار رہے تھے۔ کسی وقت تو ان کا دل یہ بھی چاہنے لگتا تھا کہ عرصے بعد سرگودھا سے نکلے ہیں ... اس ایک ماہ کو کیوں نہ ڈیڑھ یا دو ماہ میں تبدیل کر دیں۔

شاہنواز رائے کا قریبی دوست سیف بھی کراچی سے ان کے ساتھ ہی ابوظہبی آیا تھا مگر اپنے طریقے کے مطابق دس پندرہ روز موج میلا کر کے واپس چلا گیا تھا۔ اب مہینے کے آخر میں اسے پھر ایک دو دن کے لیے یہاں آنا تھا پھر دونوں نے اکٹھے ہی واپس جانا تھا۔ شاہنواز چوتھی منزل پر واقع اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ دیوار گیر کھڑکی میں سے ساحل سمندر کی جھلک نظر آتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ امارات کا نہیں، یورپ کا کوئی شہر ہے۔ نہایت مختصر کپڑوں میں مرد و زن سمندر کے پانی اور ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

شاہنواز بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنا رخ ان منظر کی طرف سے تھوڑا سا پھیر رکھا تھا۔ عفاف ان کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ٹھوڑی ان کے چوڑے کندھے پر ٹکا رکھی تھی۔ بے تکلفی سے ان کے بازو کے مسلز میں اپنی انگلیاں چبھوتے ہوئے بولی۔ ''یو آر اسٹرانگ مین۔'' اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

اس کے فقرے میں معنی خیزی تھی لیکن اس معنی خیزی سے شاہنواز رائے نے کوئی لطف نہیں اٹھایا۔ وہ کل سے کافی پریشان تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی چھوٹی بہن عاصمہ ملائیشیا سے پاکستان پہنچی ہوئی ہے اور اپنے بچوں سمیت سرخاب منزل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ عاصمہ اور اس کے دونوں بچوں سے فون پر ان کی مختصر بات بھی ہوئی تھی۔

عاصمہ کی آمد قطعی غیر متوقع تھی اور اس لحاظ سے کچھ غیر پسندیدہ بھی تھی کہ اس کے دونوں بچے ساتھ تھے۔ شاہنواز اچھی طرح جانتے تھے کہ عاصمہ کے گھر کا ماحول اس ماحول سے بالکل مختلف ہے جس میں صالح رہ رہا تھا اور ان کا ماحول مختلف نہ بھی ہوتا تو بھی شاہنواز کو یہ پسند نہیں تھا کہ صالح اپنے ہم عمروں کے ساتھ گھلے ملے اور وہ سارے مسائل جنم لیں جن کا تعلق اوائل عمری کی بے مہار سوچوں سے ہوتا ہے اور جو ایک عارضے کی طرح بڑی خاموشی سے ایک کچے ذہن سے

دوسرے بچے ذہن میں منتقل ہوتے ہیں۔

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بستر سے اٹھے اور ٹہلتے ہوئے اپارٹمنٹ کی بالکونی کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے اپنے موبائل فون سے سرخاب منزل کی لینڈ لائن سے رابطہ کیا اور فضل کریم سے بات کرنے میں کامیاب رہے۔ وہ فضل سے ہر بات کھل کر کرلیا کرتے تھے۔

وہ بولے۔ ''فضل! تم صالح پر خاص دھیان رکھو۔ بچوں کو آپس میں بہت گھلنا ملنا نہیں چاہیے۔ تم جانتے ہی ہو، ان کا ماحول ہمارے ماحول سے بہت مختلف ہے۔'' پھر انہوں نے ذرا توقف کرکے پوچھا۔ ''موبائل فون تو نہیں ہے عاصمہ بہن کے پاس؟''

''موبائل تو ہے ان کے پاس لیکن بچوں کو تو شاید نہیں دیتیں۔''

''یہ جو ''شاید'' ہے نا فضل! یہی ہم بڑوں کی غفلت کی پہلی سیڑھی ہے۔ تم بچوں پر کڑی نظر رکھو۔ میں عاصمہ سے بھی اس بارے میں بات کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... اور..... تمہاری واپسی کب ہے شاہنواز؟''

''کام تو بہت زیادہ تھا لیکن اب میں کوشش کرتا ہوں کہ چار پانچ دن میں لوٹ آؤں۔''

جس وقت شاہنواز رائے ابوظہبی میں یہ الفاظ بول رہے تھے، سرگودھا کی اس نواحی جاگیر میں سرخاب منزل کے ایک اندرونی کمرے میں صالح اور آفرین صوفے پر اکٹھے بیٹھے تھے۔ آفرین کے ہاتھ میں اپنی ممی کا موبائل فون تھا۔ صالح اور آفرین چپکے چپکے اس پر انگلیاں چلا رہے تھے۔

آفرین بولی۔ ''دیکھو، یہ ہے وہ کارٹون..... پرنس، شہزادی کو گھوڑے پر بٹھا کر لے جا رہا ہے۔ اس نے اسے ڈاکوؤں سے بچایا ہے۔''

''وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟'' صالح نے حیرانی سے پوچھا۔

''اپنے محل میں..... وہ اسے پسند کرتا ہے نا۔''

''پسند کرتا ہے تو محل میں کیوں لے جا رہا ہے؟''

''صالح! تم بھی بالکل بدھو ہو۔ وہ اس سے شادی کرے گا نا۔''

''تو جس کو پسند کرتے ہیں، اس سے شادی کر لیتے ہیں؟''

''ہاں، فلموں اور کارٹونوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' آفرین نے جواب دیا۔

''تو پھر شادی کرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟''

آفرین کے چہرے پر معصومانہ الجھن نظر آئی۔ ''یہ تو ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں۔ بس ممی کہتی ہیں کہ شادی کرنے والے اکٹھے رہتے ہیں، محبت کے ساتھ۔''

''تو تم بھی مجھے اچھی لگتی ہو۔ کیا میں تم سے شادی کر سکتا ہوں؟''

آفرین نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''شادی بڑے ہو کر کرتے ہیں اور ممی یہ بھی کہتی ہیں کہ ایسی گندی باتیں نہیں کرتے۔''

صالح کو بھی یہ محسوس ہوا کہ یہ کچھ اس طرح کی باتیں ہیں جو ان کو نہیں کرنا چاہیے۔ وہ موبائل فون کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور آفرین سے موبائل کے متعلق مختلف سوالات پوچھنے لگا۔ آفرین اس بات پر بھی حیران تھی کہ صالح کو موبائل فون کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ نہ ہی وہ ٹی وی دیکھتا ہے، نہ ہی کبھی اپنے بابا کے ساتھ سینما گیا ہے۔

صالح نے یہ بتا کر آفرین کو مزید حیران کیا کہ سرخاب منزل کے زنان خانے میں کسی چھوٹے بڑے کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔ صرف بابا جانی کے پاس ہوتا ہے لیکن وہ بڑی حفاظت سے رکھتے ہیں۔

آفرین بولی۔ ''ممی کہہ رہی تھیں کہ ماموں شاہنواز کو بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جب وہ واپس آئیں تو مجھے اور تمہیں کھیلنے ہی نہ دیں۔''

''کیوں، تم میرے ساتھ کھیلنا چاہتی ہو؟''

''ہاں، مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''فرحان بھیا تو ہر وقت اپنے کمرے میں گھسے رہتے ہیں یا ویڈیو گیم کھیلتے رہتے ہیں۔ مجھے پتا ہے اب بھی گیم ہی کھیل رہے ہوں گے۔''

''مجھے بھی تمہارے ساتھ کھیلنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' صالح کو اپنے اندر گہرائی میں ایک اجلی سی خوشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

قدموں کی چاپ ابھری۔ صالح نے چونک کر دیکھا۔ داجے فضل کریم اندر داخل ہو رہے تھے۔ ''ارے، تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے چونک کر کہا۔

''کچھ نہیں داجے! بس باتیں کر رہے تھے۔'' صالح نے موبائل فون آہستہ سے کشن کے نیچے کر دیا۔

''چلو اٹھو، تمہاری پڑھائی کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہارے بابا نے آکر سب کچھ پوچھنا ہے۔ کتنے ناغے کیے اور کیوں؟'' وہ اسے لے کر چلے گئے۔

دو تین روز میں ہی صالح اور آفرین کی آپس میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ گرمی کی دوپہریں تھیں۔ قیلولہ وغیرہ بھول کر صالح، آفرین اور فرحان کے ساتھ باغ میں کھیلتا

رہتا۔ مالی بابا کے منع کرنے کے باوجود وہ بانس کی سیڑھی کے ساتھ درختوں پر چڑھ جاتے۔ کچے آم توڑتے، جامنوں سے ہاتھ منہ رنگتے۔ فرحان تو کچھ سنجیدہ ہی رہتا مگر صالح اور آفرین ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے۔ گھنی چھاؤں کے نیچے طویل جھولا جھولتے اور پختہ روشوں پر سائیکل چلاتے۔ فرحان کو ویڈیو گیم کا چسکا نشے کی طرح لگا ہوا تھا۔ وہ اندر چلا جاتا تو صالح اور آفرین کپڑوں سمیت پانی کے تالاب میں چھلانگیں لگا دیتے۔ خوب اودھم مچاتے۔ یہاں تک کہ فضل کریم آتا اور ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں اندر لے جاتا۔ وہ کچھ دیر کے لیے تو آرام کرتے مگر سائے لمبے ہوتے ہی پھر باہر نکل آتے۔

صالح کے لیے یہ چند دن بے حد مزے کے تھے۔ وہ جیسے اندر سے جی اٹھا تھا۔ ایک معصوم سی خوشی ہمہ وقت اس کے اندر رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتی رہتی تھی۔ کسی وقت وہ اچانک یہ سوچ کر خوفزدہ ہو جاتا کہ جب پھپھو، فرحان اور آفرین واپس چلے جائیں گے تو کیا ہوگا؟

وہ لوگ تو واپس نہیں گئے مگر بابا جانی جن کو دو ہفتے بعد آنا تھا، پانچویں چھٹے روز ہی سرخاب منزل واپس آ گئے۔ ان کے لوٹتے ہی جیسے سرخاب منزل کے سارے رنگ ڈھنگ بدل گئے۔ ہر جاندار و بے جان شے نے ایک سنجیدہ سی خاموشی اوڑھ لی۔

شومئی قسمت، جس وقت صالح کے بابا سرخاب منزل میں آئے اور اپنی بہن سے ان کی ملاقات ہوئی، اسی وقت آفرین نے اپنی ممی کی گود میں رکھا ہوا موبائل فون اٹھا لیا اور اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر صالح ٹھٹکا۔ اس نے دیکھا کہ بابا جانی کا سرخ چہرہ سرخ تر ہو گیا ہے۔

انہوں نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے صالح کی پھپھو سے کہا۔ "عاصمہ! مجھے بہت مایوسی ہوئی ہے یہ سب دیکھ کر۔ آپ بہت بے پروائی برت رہی ہو بچوں کی طرف سے۔ یہ ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ تو زہر ہیں بچوں کے لیے اور ہم اپنے ہاتھ سے انہیں یہ زہر کھلا رہے ہیں۔"

پھپھو عاصمہ کھسیانی سی ہو گئیں۔ انہوں نے آفرین کے ہاتھوں سے موبائل جھپٹ کر اپنے شولڈر بیگ میں ڈال لیا پھر وضاحت دیتے ہوئے کہا۔ "شاہنواز بھائی! مجھے پتا ہے کہ یہ چیزیں بچوں کے لیے ٹھیک نہیں۔ میں بہت احتیاط کرتی ہوں۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں..... لیکن معاف کرنا، مجھے نہیں لگتا کہ آپ ایسا کرتی ہو۔" پھر انہوں نے ذرا توقف کیا اور بولے۔ "میری درخواست ہے کہ آپ جتنے دن یہاں ہو، یہ موبائل اور ویڈیو گیمز وغیرہ اپنے بچوں سے بالکل دور رکھو۔"

صالح کی پھپھو نے اثبات میں سر ہلایا۔

تب بابا جانی، صالح کی طرف متوجہ ہوئے اور خشک لہجے میں بولے۔ "چلو صالح! مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ اٹھ جاؤ اور اپنے بھائی فرحان کو بھی لے جاؤ۔"

صالح کے لیے اگلے تین چار دن بہت کٹھن کے تھے۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنے دونوں ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع بالکل نہیں مل رہا اور خاص طور سے آفرین کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔ پھپھو اسے کمرے سے کم ہی نکلنے دیتی تھیں۔ دوسری طرف داجے فضل ہر وقت سائے کی طرح صالح کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ صالح کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ آفرین کو دیکھے، اس کے ساتھ کھیلے، کھانے پینے کی چیزیں اس کے ساتھ شیئر کرے، اس کی ہنسی کی آواز سنے۔ گرمی بھی بہت شدت کی پڑ رہی تھی۔ دن بہت لمبے اور سنسان تھے۔ شام کے وقت بھی کمرے سے باہر نکلنے پر پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ اس موسم نے صالح کو کچھ اور بھی بیزار کر دیا تھا۔

داجے فضل کی زبانی اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس سے اتنا ہی پتا چلا تھا کہ پھپھو کے نام پر کچھ زمین اور ایک بڑی حویلی آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ اسے بیچنے کے لیے ملائیشیا سے یہاں آئی ہیں۔ اسے بیچ کر واپس چلی جائیں گی۔ صالح کے دل سے فوراً دعا نکلی تھی کہ وہ جس مقصد کے لیے آئی ہیں، وہ پورا نہ ہو اور وہ تادیر یہاں رکیں۔

ایک دوپہر صالح کے علم میں یہ بات آئی کہ بابا جانی اپنے ڈرائیور اور دو گارڈز کے ساتھ جیپ پر بیٹھ کر کہیں گئے ہیں۔ شام کو ہی واپس آئیں گے۔ یہ شاید پھپھو کی حویلی بیچنے والا ہی کوئی معاملہ تھا۔ صالح کو تھوڑی سی آزادی محسوس ہوئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ پھپھو کی طرف جائے اور ان سے کہے کہ وہ آج اسے فرحان اور آفرین کے ساتھ باغ میں کھیلنے کی اجازت دیں۔

مگر جب اس کے ارادے کا پتا داجے فضل کو لگا تو انہوں نے ڈانٹ دیا اور بولے۔ "دیکھ نہیں رہے کہ کتنی گرم دوپہر ہے۔ آسمان آگ برسا رہا ہے۔ کچا چنا بھی زمین پر رکھو تو بھن جائے گا۔"

"مگر داجے! ہم تو باغ میں کھیلیں گے۔ وہاں تو چھاؤں ہوتی ہے۔"

"باغ میں تم لوگ کون سا چین سے بیٹھتے ہو۔ کل

فرحان گرا ہے نا آم کے پیڑ سے..... پاؤں میں موچ لے کر بیٹھا ہوا ہے۔"

"اوہ، مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ میں اس کا حال پوچھ آؤں؟"

"نہیں، میں نے ابھی دیکھا تھا۔ وہ سو رہا ہے۔"

"اور..... آفرین کیا کر رہی تھی؟" اس نے معصوم اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ بھی سو رہی تھی۔" داجے نے مختصر جواب دیا۔

سرخاب منزل مضافاتی علاقے میں واقع تھی۔ یہاں لوڈ شیڈنگ کا اثر بہت زیادہ تھا۔ اب بھی جنریٹر ہی بجلی فراہم کر رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ اے سی کی ٹھنڈک بھی فیل ہو کر رہ گئی ہے۔ صالح نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ لان میں اور چھوٹے باغیچے میں ہو کا عالم تھا۔ ملازمین کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے، پرندے پیاس سے ہانپ رہے تھے۔ اس طویل، بے مہر دوپہر میں جیسے نیلا آسمان بھی چیل کوؤں سے خالی تھا لیکن نہیں..... دائیں جانب مغرب کی طرف اسے بہت سی چیلیں ایک دائرے کی شکل میں چکراتی اور قریب آتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یکا یک صالح کو لگا کہ دھوپ کا رنگ بھی کچھ پھیکا پڑ گیا ہے۔ دو چار منٹ میں یہ پھیکا پن مزید بڑھ گیا۔

ایک طرف سے ماماں بی تیز تیز چلتی آئیں اور دیگر ملازماؤں پر چلانے لگیں۔ "اری کیا دیکھ رہی ہو۔ جلدی کرو۔ آندھی آ رہی ہے۔ دھلے کپڑے چھتوں پر سے اتارو۔ کھڑکیاں دروازے بند کرو۔"

اسی اثنا میں دھوپ نے اپنی رنگت بالکل کھو دی۔ صالح تیزی سے باہر نکلا۔ اس نے مغربی افق کی طرف دیکھا۔ آسمان پر سیاہ رنگ کی ایک چادر تھی جو تیزی سے پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے آگے آگے پرندوں کے جھنڈ تھے جو ہواؤں میں چکرا رہے تھے۔ تیز جھکڑوں کے ساتھ ہی سرخاب منزل کی کھڑکیاں دروازے دھڑ دھڑ بجنے لگے۔

"آندھی آ گئی..... آندھی آ گئی۔" ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

ان آوازوں میں خوف کم اور خوشی زیادہ تھی۔ کئی دنوں کی بے پناہ گھٹن اور حبس کا حصار ٹوٹ رہا تھا۔ لان میں چھت سے گرنے والے کپڑے اڑ رہے تھے اور ہلکے پھلکے برتن لڑھک رہے تھے۔ تین چار ملازمائیں انہیں پکڑنے کے لیے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ہیڈ مالی سلطان کے دونوں لڑکے بھی اپنے حبس زدہ کوارٹر سے نکل آئے تھے اور ہوا میں چھلانگیں لگاتے ہوئے باغ کی طرف جا رہے تھے۔

یقیناً انہیں امید تھی کہ اب آندھی آئی ہے تو باغ میں بہت سے پھل بھی گریں گے۔

تب صالح کی نگاہ آفرین پر پڑی۔ وہ برآمدے میں کھڑی اپنی والدہ سے ہاتھ چھڑا کر لان میں آ گئی تھی اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر جیسے خود کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب تو صالح سے بھی صبر نہیں ہوا۔ وہ بھی تیزی سے بھاگتا وسیع لان میں آ گیا۔

گرد و غبار اور تند جھکڑوں کی پروا کیے بغیر بازو پھیلا کر گول گول گھومنے لگا۔ آفرین بھی اس کے پاس چلی آئی۔ دونوں اودھم مچانے لگے۔ اسی دوران ہوا کے اندر کوئی کپڑا اڑتا ہوا آیا۔ صالح اور آفرین اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے لپکے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ایک ملازمہ نے وہ کپڑا پکڑ لیا اور اوڑھنی کے نیچے چھپا لیا۔

"کیا تھا؟ کیا تھا؟" صالح نے چلا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولی اور پھر پلاسٹک کی ایک بالٹی کے پیچھے لپکی جو ہوا میں گھومتی ہوئی جا رہی تھی۔

اسی اثنا میں تڑتڑ بوندیں گرنے لگیں۔ موٹی بوندیں جو سیاہی مائل فضا کے اندر سے چاندی کے سکوں کی طرح نمودار ہو رہی تھیں اور زمین سے ٹکرا رہی تھیں۔

کتنی پیاری آواز تھی ان بوندوں کی۔ روح میں اتر رہی تھی۔ "بارش..... بارش" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ یہ موسم کی ایک ایسی خوبصورت کروٹ تھی جس نے عام لوگوں کو تو سرشار کرنا ہی تھا، سرخاب منزل کی ادھیڑ عمر ملازمائیں بھی خود کو چھتوں کے نیچے نہ رکھ سکیں۔ ان میں سے کئی لان میں آ گئیں اور بکھری اشیا اکٹھی کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو تیز بارش میں بھگونے لگیں۔ اور تو اور، صالح کی پھپھو بھی برآمدے سے نکل کر ایک بون سیل کے پاس آن کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کی جواں سال ملازمہ رتا بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ اس کے لمبے بال بھیگ کر اس کی گردن سے چپک گئے تھے اور کپڑے بھی بھیگ گئے تھے۔ صالح نے اسے بس ایک بار کن انکھیوں سے دیکھ کر اپنا رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

اب صالح اور آفرین لان میں چکراتے پھر رہے تھے۔ پھر وہ باغ کی طرف آ گئے۔ زمین پر بے شمار کچے پکے آم اور جامن بکھرے ہوئے تھے۔ صالح پیلے رنگ کے نسبتاً پکے آم ڈھونڈنے لگا اور انہیں اٹھا اٹھا کر اپنی جھولی میں بھرنے لگا۔ اتنے میں آفرین عقب سے آئی اور اس نے بہت سے پکے ہوئے نرم نرم جامن صالح کے چہرے پر

مل دیے۔ شرارت کر کے وہ بھاگ گئی۔

''آفرین کی بچی!'' صالح نے دانت پیسے اور زمین سے کچھ جامن اٹھا کر اس کے پیچھے لپکا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اسے جالیا۔ اسے دبوچ کر اس کے منہ پر جامن مل دیے۔ وہ پھسل کر گری اور صالح اس کے ساتھ ہی گر گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کے منہ پر جامنی رنگ ملنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''صالح!'' یکا یک ایک گرج نے صالح کو لرزا دیا۔

اس نے گھبرا کر دائیں جانب دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ اس کے بابا جانی نہ جانے کب سرخاب منزل واپس آئے تھے اور کب پورچ سے نکل کر یہاں پہنچے تھے۔ اب وہ ایک چھتری پکڑے اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ انگارہ ہو رہا تھا۔

''یہ کیا تماشا ہو رہا تھا؟'' وہ دہاڑے اور آگے بڑھے۔

انہوں نے کبھی صالح کو مارا نہیں تھا مگر آج ان کا ہاتھ اٹھ گیا۔ ایک زور کا طمانچہ صالح کے گال پر پڑا اور ایک ایسا ہی ذرا کم شدت کا تھپڑ آفرین کو لگا۔ انہوں نے صالح کو زور سے زنان خانے کی جانب دھکیلا تو وہ پھسل کر گرتے گرتے بچا۔ آفرین بھی پتھرائی ہوئی سی کھڑی تھی۔

تب صالح کے بابا، ملازمہ رتابہ کی طرف مڑے۔ وہ نہ جانے کب یہاں پہنچی تھی اور صالح اور آفرین کی دھینگا مشتی دیکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ بابا شاہنواز نے جھک کر درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹہنی پکڑی اور طیش کے عالم میں ملازمہ پر پل پڑے۔ شڑاپ شڑاپ کی آوازوں سے چھڑی نما شاخ اس کے تر بتر جسم سے ٹکرائی اور وہ تڑپ کر کیچڑ میں جا گری۔

''خبیث، تو ان کے سر ہانے کھڑی ہنس رہی تھی۔ ان کو منع نہیں کر سکتی تھی؟'' وہ آتش بار لہجے میں گرجے۔

وہ خوفزدہ انداز میں سسکنا کر رہ گئی۔ وہ پھر چھڑی تان کر اس کی طرف گئے لیکن دو قدم بڑھ کر رک گئے۔ ''دفع ہو جا یہاں سے۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔ پتا نہیں کہاں سے آ گئی ہے مردود!''

انہوں نے چھڑی ایک طرف پھینکی اور پاؤں پٹختے ہوئے مردانے کی جانب چلے گئے۔ صالح نے گن انکھیوں سے پھپو کی ملازمہ رتابہ کی طرف دیکھا۔ وہ پانی اور کیچڑ میں تر بتر پڑی رو رہی تھی اور اپنے کولہے سہلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے زنانے کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

جو کچھ ہوا تھا، اچھا نہیں ہوا تھا۔ شام کو صالح نے پھپو والے کمرے کی طرف سے بابا جانی کے بلند آواز میں بولنے کی گونج سنی۔ پھپو بھی بوجھل لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ یقیناً بات آج دوپہر والے واقعے کی ہی ہو رہی تھی۔ پھپو کو دکھ ہوا ہوگا کہ ان کی ملازمہ رتابہ کو بابا جانی نے غصے میں پیٹ ڈالا تھا۔ الفاظ صالح کے کانوں تک نہیں پہنچ رہے تھے مگر اسے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی پھپو اور والد میں تلخ کلامی کی کیفیت ہے۔

اس دن کے بعد صالح کو پھپو تو کبھی کبھار نظر آتی رہیں مگر آفرین اور ملازمہ رتابہ کی صورت دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ یقیناً پھپو عاصمہ نے انہیں سرخاب منزل میں آزادانہ گھومنے پھرنے سے منع کر دیا تھا۔ پھپو، صالح سے بھی بس مختصر بات ہی کرتی تھیں۔ صالح کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہاں اپنا پرایا پن والا کام جلد نمٹانا چاہتی ہیں اور جلد سے جلد واپس جانے کے موڈ میں ہیں۔

صالح کو یہ سب کچھ بہت دکھ دے رہا تھا۔ وہ فرحان اور آفرین سے ملنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر آفرین سے ملنے کے لیے اس کا دل مچل رہا تھا۔ ایک روز جب اس نے دیکھا کہ پھپو ایک کالے کوٹ والے وکیل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں اور فرحان باتھ روم میں نہا رہا ہے، وہ عقبی باغیچے کی طرف سے ہو کر پھپو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے پھپو کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ آفرین اور فرحان کو کسی بات پر ڈانٹ رہی تھیں۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔

وہ عقبی کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس نے اندر جھانکا۔ آفرین سرخ فراک پہنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ صالح نے اسے دھیمی آواز میں بلایا۔ وہ پہلے چونکی پھر کھڑکی کا پٹ کھول کر اس کے سامنے آ گئی۔

''کیوں رو رہی ہو؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''ممی ہمیں باہر نہیں نکلنے دیتیں..... اور وہ یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ..... پانچ چھ دن میں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

صالح کے دل پر گھونسا سا لگا۔ ''اتنی جلدی کیوں آفری؟'' اس نے پوچھا۔

''ممی کہتی ہیں کہ ماموں جی بہت غصے میں رہتے ہیں۔ انہوں نے رتابہ کو چھڑیوں سے مارا ہے اور اور.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''انہوں نے مجھے بھی تو تھپڑ مارا تھا۔''

''وہ ایسے نہیں ہیں آفری..... لیکن پتا نہیں اس دن انہیں کیا ہوا تھا۔ چلو چھوڑو اس بات کو..... یہ دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' اس نے اپنی جیکٹ کی دونوں جیبوں سے بہت سی نرم نرم ٹافیاں نکالیں اور دونوں ہاتھوں میں لے کر آفرین کی طرف بڑھا دیں۔ وہ پہلے تو گریزاں نظر آئی لیکن پھر ٹافیوں کی چمک دمک دیکھ کر اس نے ہاتھ بڑھائے اور ٹافیاں لے لیں۔

''اب تو تم غصہ نہیں ہو نا؟'' صالح نے شفقی لہجے میں پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اس کے شفاف رخساروں پر ابھی تک آنسوؤں کی نمی تھی۔ صالح نے بے ساختہ اپنا ہاتھ بڑھایا اور آنسو پونچھ دیے۔ ''اب رونا نہیں ہے۔'' اس نے کسی بڑے بزرگ کی طرح کہا۔

''لیکن..... میں تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتی ہوں۔ ممی کھیلنے نہیں دیتیں۔ باہر ہی نہیں نکلنے دیتیں۔ اب بھی اسی بات پر مجھے اور فرحان بھائی کو ڈانٹ رہی تھیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' صالح نے اسے تسلی دی۔ ''کل دادے فضل اور بابا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ بابا نے تین چار دن کے لیے کہیں باہر جانا ہے۔ وہ جب نہیں ہوں گے تو میں پھپھو سے کہوں گا، وہ ہمیں ضرور کھیلنے دیں گی۔''

آفرین نے صالح کی طرف دیکھا اور خوش نظر آنے لگی۔ آفرین کے ایک رخسار پر ابھی تک آنسوؤں کی تھوڑی سی نمی باقی تھی۔ صالح کا دل چاہا کہ جاتے جاتے وہ یہ نمی بھی اپنی انگلیوں سے صاف کر دے مگر پھر ایک جھجک سی آڑے آگئی اور وہ ہاتھ ہلا کر باغیچے سے باہر چلا گیا۔

آفرین اسے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اور فرحان کے ساتھ بہت کھیلنا چاہتا تھا۔ اس کا دل بار بار چاہتا تھا کہ پھر ویسی ہی بارش ہو..... وہ تینوں اودھم مچائیں، جھولا جھولیں۔ آنکھ مچولی کھیلیں، دوڑ کی مشق کریں۔ پچھلی بار کی طرح وہ آفرین کو گدگدی کرے اور وہ ہنس ہنس کر دہری ہو کر بیرِ بہوٹی نظر آنے لگے۔

وہ رات کو دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آج اس نے آفرین کے رخساروں سے آنسو پونچھے تھے۔ کتنے ملائم اور چکنے رخسار تھے اس کے..... اور ذرا سے گرم بھی۔ انگلیاں بے ساختہ اس ملائمت پر پھسلتی چلی گئی تھیں۔

پھر اسے آفرین کے ریشمی چمکیلے بال بھی یاد آئے۔ اس کی ممی اس کے بال کاٹتی تھیں۔ وہ مشکل سے اس کے کندھوں تک ہی جاتے تھے۔ وہ اتنے گھنے اور اتنے پیارے تھے کہ انہیں چھونے کو دل چاہتا تھا۔ صالح نے سوچا کہ کل سہ پہر کو جب بابا جانی سرخاب منزل سے چلے جائیں گے اور وہ پھپھو سے کھیلنے کی اجازت لے لے گا تو ایک بار آفرین کے بالوں کو چھو کر ضرور دیکھے گا۔ ان کو ایک دم ہلائے گا اور اس کے چہرے پر بکھیر دے گا۔

دوپہر تک کنفرم ہو گیا کہ صالح کے بابا جانی سرخاب منزل سے کہیں جا رہے ہیں تاہم ایک آدھ گھنٹے بعد ایک اور چیز کنفرم ہوئی اور اس نے صالح کے سارے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ بابا جانی اکیلے نہیں جا رہے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا اور یہ بابا جانی کا نادر شاہی حکم تھا جسے ٹالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بابا سے سوال کیا۔ ''ہم نے کہاں جانا ہے؟''

''کسی اچھی جگہ ہی جائیں گے۔ تمہیں اچھا ہی لگے گا۔'' انہوں نے مختصر جواب دیا اور صالح کو تیار ہونے کی ہدایت کر کے مردانے کی طرف چلے گئے۔

صالح نے دادے سے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ ''تمہارے بابا کے گجرات میں کوئی مرید ہیں۔ ان سے ملنے جا رہے ہیں۔''

''ہم کب واپس آئیں گے؟'' صالح نے بے تابی سے پوچھا۔

''انہوں نے تمہارے سامان میں کپڑوں کے تین جوڑے بھی رکھوائے ہیں۔ دو تین دن تو لگیں گے ہی۔''

جانے کا سن کر صالح کے اندر مایوسی کی جو لہر سی اٹھی تھی، وہ مزید بلند ہو گئی۔

..... گجرات کے اس حویلی نما خوبصورت گھر میں صالح اور شاہنواز رائے کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ان کا مرید برکات احمد ان کے راستے میں بچھ بچھ جا رہا تھا۔ وہ ایک بڑا کارخانے دار تھا اور دو تین نسلوں سے مخدوم فیملی کا عقیدت مند بھی۔ صالح نے دیکھا کہ اس حویلی میں بھی مردانہ اور زنانہ علیحدہ علیحدہ تھا۔ خواتین سرتاپا چادر پوش نظر آتی تھیں۔ حویلی میں ہر وقت سرخاب منزل کی طرح لنگر جاری رہتا تھا اور دو تین فقیر نما افراد دھمال ڈالتے تھے۔ یہاں صالح اور اس کے بابا کی بے حد خاطر تواضع ہوئی۔ حویلی کے لوگ بابا جانی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے اور ان کے ہاتھ چومتے تھے اور کچھ ان کی عقیدت کا اظہار وہ صالح سے بھی کرتے تھے۔ دستر خوان اتنا وسیع کہ بندہ دیکھتا ہی رہ جائے۔ تاہم یہ سب کچھ صالح کو زہر لگ رہا تھا۔ اس کا دل تو

وہیں سرخاب منزل اور ان نہایت چمکتے رخساروں میں انکا ہوا تھا جو سنگِ مرمر سے کہیں بڑھ کر ملائم تھے۔

گجرات کی اسی حویلی میں صالح کی ملاقات بابا جانی کے کاروباری ساتھی دار انکل سیف اللہ اور ان کے ہلکی نیلی آنکھوں والے بیٹے وقار عرف وکی سے بھی ہوئی۔ وکی اس کا ہم عمر تھا اور پہلی ملاقات میں ہی صالح کو اچھا لگا۔

انکل سیف نے بابا جانی کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”کتنا اچھا ہو جیسے ہم دوست رہے ہیں، آگے چل کر یہ دونوں بھی دوستی کا رشتہ قائم کریں۔“

بابا جانی نے کوئی خاص جواب نہیں دیا تھا، بس سر ہلا کر رہ گئے۔ صالح بھی جانتا تھا کہ ایسا کہاں ممکن ہے۔ بابا اسے سب سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے۔

صالح کو معلوم نہیں تھا کہ آنے والے ماہ و سال میں یہ وکی اس کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرنے والا ہے۔

خدا خدا کر کے چوتھے روز گجرات سے صالح اور شاہنواز رائے کی واپسی ہوئی۔ صالح کے سینے میں ایک میٹھی میٹھی سی کسک تھی۔ وہ جلد از جلد آفرین کو دیکھنا چاہتا تھا، اس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم جب وہ رات کو واپس سرگودھا اور پھر سرخاب منزل پہنچا تو اسے پتا چلا کہ پھپھو عاصمہ تو کل رات اپنے ملک واپس جا چکی ہیں۔ ظاہر ہے فرحان اور آفرین بھی ساتھ ہی گئے تھے۔

صالح کو ایک دم محسوس ہوا کہ یہ تاریک رات پہلے سے زیادہ تاریک ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے آسمان پر چمکنے والے بے شمار ستارے اب ستارے نہیں رہے تھے، آنسو بن گئے تھے۔ یکا یک ہی سرخاب منزل بھائیں بھائیں کرنے لگی تھی۔

اسے بہت غصہ آیا کہ پھپھو جان ان کے آنے سے پہلے ہی واپس کیوں چلی گئیں۔ اس سے زیادہ غصہ اسے اپنے بابا پر آیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی گجرات کیوں لے گئے۔

دو چار روز وہ بالکل گم صم رہا پھر یوں ہوا کہ پھپھو کے یہاں آنے کے بعد اس کے جسم و جاں میں جو ایک خوشبو سی پھیل گئی تھی، وہ ایک دم اوجھل ہو گئی۔ اس خوشبو اور نرمی کی جگہ ایک طرح کی تھکن اور کثافت نے لے لی۔ وہ گرمیوں کی ایک اور تپتی سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ گھومتے گھومتے باغ میں چلا گیا۔ آندھی اور موسلا دھار بارش کے سارے مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ آہ..... کہاں گیا وہ جل تھل کر دینے والا یادگار دن؟ پہلے تو وہ اس سہانے دن کی یاد میں رنجور ہوا پھر اسے اردگرد کی ہر شے پر غصہ آنے لگا۔ اس نے سفیدے کے ایک ملائم شفاف تنے پر ہاتھ رکھا۔ نہ جانے کیوں ہر ملائم شے کو چھوتے ہی اسے آفرین کے رخسار یاد آجاتے تھے۔ اوپری چھلکا اتارنے کے بعد یہ تنا بھی نہایت ہموار اور ملائم تھا۔

اس کا طیش بڑھ گیا کہ پھپھو اور وہ سب ایک دم اس سے دور کیوں چلے گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی سے سفیدے کے اس نازک ملائم درخت کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شائیں شائیں کی آواز سے چھڑی سفیدے کے نیم سفید تنے پر برسنے لگی۔ بالکل جیسے برسات میں بابا جانی کی چھڑی رتابہ کے جسم پر برسی تھی۔ اسے درخت کو پیٹنا اچھا لگنے لگا..... چھڑی کی ضرب سے سفیدے کی شفاف و نازک جلد پر جو نشان پڑ رہے تھے، انہیں دیکھ کر صالح کے نہ جانے کس جذبے کی تسکین ہونے لگی۔ وہ اندھا دھند سفیدے کو پیٹتا رہا، یہاں تک کہ چھڑی ٹوٹ گئی۔

☆☆☆

دن بہ دن صالح کے اندر جسمانی اور ذہنی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ وہ ایک ڈیڑھ ماہ تک آفرین اور فرحان کے لیے بہت اداس رہا پھر سینے میں ایک تیز چبھن سی تو موجود رہی مگر وہ جو ہر وقت ایک ہی طرح کے خیالات یلغار کرتے تھے، ان کی شدت کم ہو گئی۔ البتہ ایک بات تھی، وہ جو ایک خوشبو سی پھپھو اور آفرین کے آنے کے بعد اس کی رگِ جاں میں پھیلی تھی، وہ ناپید ہو گئی۔ اس کے بجائے کچھ بھڑکیلے سفلی خیالات دل میں جگہ بنانے لگے۔ وہ اکثر اکیلا باغ میں چلا جاتا۔ درخت کی لچک دار چھڑی سے سفیدے کے پیڑ کو خوب پیٹتا۔ اس کے اندر ایک ہیجان سا پیدا ہوتا۔

وہ جن سوالوں کے جواب چاہ رہا تھا، وہ بالکل نظر انداز کیے جا رہے تھے۔ یہ بے خبری اسے اپنی من چاہی تصوراتی دنیا میں لے جا رہی تھی۔ اپنی اب تک کی زندگی میں صالح نے جو سب سے خوبصورت اور پسندیدہ سراپا دیکھا، وہ ایک دلہن کا ہی تھا۔ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا۔ شاید بابا جانی کے کسی دوست کے ہاں شادی کے موقع کا منظر اس کے ذہن میں کہیں اٹکا رہ گیا تھا۔ وہ زرق برق لباس والی ایک تصوراتی دلہن کے ساتھ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ اس سے وہی سوال پوچھتا جن کے جواب اسے نہیں دیے جا رہے تھے۔ اس دلہن کے ساتھ اپنی مرضی کی باتیں کرتا، مرضی کا وقت گزارتا..... ایسے ہی کسی موقع پر دائیں بائیں دروازہ بجانے لگتے۔ وہ سہم جاتا اور کچھ تاخیر سے دروازہ کھولتا۔ وہ اسے اس طرح کمرے میں بند ہونے سے

منع کرتے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے۔

پھر ایک روز بند کمرے میں اس نے اپنی تصوراتی دلہن کو بھی اسی طرح چھڑی سے پیٹ ڈالا جس طرح باغ میں سفیدے کے درخت کو پیٹتا تھا۔ ایک ہیجان سا اس کے اندر برپا تھا۔ وہ ہانپ گیا۔ اسے پسینا آنے لگا۔ چھڑی کی شائیں شائیں شاید باہر تک گئی تھی جو داجے نے دھڑدھڑ دروازہ کوٹنا شروع کردیا۔ اس کے آتشیں خیالات ایک دم ٹھنڈے یخ بستہ پانی میں ڈبکی کھا گئے۔ اس نے دروازہ کھولا۔

"یہ کیا کر رہے تھے صالح؟" داجے فضل کریم نے غصے سے پوچھا۔

"کک..... کچھ بھی نہیں۔"

"چھڑی کیوں چلا رہے تھے؟"

"وہ..... وہ بس یونہی..... جیسے تلوار چلاتے ہیں۔" وہ قدرے سنبھل کر بولا۔ "آپ نے وہ امیر تیمور والی کہانی سنائی تھی نا..... میرا بھی جی چاہتا ہے اسی طرح تلوار بازی سیکھوں۔"

"تم مہربانی کرکے اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔" انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "سمجھو یہ پڑھائی اور لیاقت ہی آج کے دور کی تلوار بازی ہے..... اور میں تمہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ہمیں تمہارا اس طرح کمرے میں بند رہنا بالکل پسند نہیں۔ یاد ہے، پچھلے اتوار شاہنواز نے بھی تمہیں کمرا بند کرکے بیٹھنے سے منع کیا تھا۔"

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔

..... دو تین روز گزر گئے۔ ایک دن پھر اس کا دل چاہا کہ کمرا بند کرکے بیٹھے اور اپنی تصوراتی دلہن کو اپنے پاس بلائے۔ اس طرح وقت گزارنے سے اس کا اندرونی ہیجان کم ہوتا تھا اور وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ ڈیرے پر کچھ نئی بھینسیں آئی ہوئی تھیں۔ داجے انہیں دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ماماں بی کچن میں ماسی حسین کا ہاتھ بٹا رہی تھیں کیونکہ ماسی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ صالح کمرے میں آگیا مگر جب اس نے دروازے کی چٹخنی چڑھانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو چٹخنی موجود ہی نہیں تھی۔ اس کی جگہ بس میخوں کے سوراخ نظر آرہے تھے۔ چٹخنی اکھاڑ لی گئی تھی۔

صالح کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یقیناً یہ کام داجے نے ہی کرایا تھا تاکہ وہ کمرے میں بند ہوکر نہ بیٹھا رہے۔ ایک عجیب طرح کی شرمندگی اور پشیمانی نے اسے گھیر لیا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر بعد یہ پشیمانی پھر جھنجلاہٹ اور غصے میں بدل گئی۔ وہ باغ میں گیا اور سفیدے کے ملائم شفاف پنڈے والے درخت کو چھڑی سے بری طرح پیٹ ڈالا۔ وقت گزر رہا تھا۔ وہ دن بہ دن چڑچڑا اور غصیلا ہوتا جا رہا تھا۔ پڑھائی میں تو اس کا دل پہلے بھی کچھ زیادہ نہیں لگتا تھا۔ اب بالکل ہی بیزاری محسوس ہوتی تھی۔ پھول پودے، پرندوں کی چہچہاہٹ، نیلا آسمان، کھیتوں پر پھیلی ہوئی نرم دھوپ، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ باغ میں جاتا تو اکثر کسی خوش رنگ پھول کو نوچ کر پھینک دیتا۔ ایک روز اس نے ایک خوبصورت تتلی کو اس زور سے چھڑی ماری کہ وہ دو ٹکڑے ہوگئی۔ بعد میں اسے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا اور وہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2400 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 25,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ظہیر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر محمد شہروز خان: 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

کتنی ہی دیر غمزدہ بیٹھا رہا۔ گرمیوں اور برسات کا موسم گزر چکا تھا۔ نومبر کے دن تھے۔ سردی آہستہ آہستہ گردو پیش پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی۔ شامیں مختصر اور راتیں طویل ہوگئی تھیں۔ کھلیانوں میں چاول کی فصل پک رہی تھی اور درختوں کے پتے زرد تر ہو رہے تھے۔ سردی کے سبب ماسی صمین کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو اس کا کام نمٹانے کے لیے مجبوراً ایک اور فرد کو عارضی طور پر سرخاب منزل آنا پڑا۔ یہ ماسی صمین ہی کی ایک بھتیجی تھی۔ عمر کوئی تیس سال رہی ہوگی۔ جسم قدرے فربہ تھا اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ بھی ایک اچھی باورچن تھی اور ایک قریبی زمیندار کی حویلی میں کام کرتی تھی۔ اس کا نام فرزانہ تھا۔

ایک رات جب وہ باورچی خانے میں اپنا کام وغیرہ نمٹا کر قریبی کمرے میں سونے پڑی تھی، صالح نے اسے ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکا۔ اس کا جسم بے ترتیب ہو رہا تھا اور جسمانی نشیب و فراز ہلکی روشنی میں نمایاں تھے۔ وہ اسے یک ٹک دیکھتا رہا اور پھر ہولے سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ کروٹ کے بل پڑی تھی۔ صالح کا دل چاہا کہ اس کے رخسار پر ہولے سے ہاتھ پھیرے مگر اس کا رخسار آفرین کے رخسار کی طرح شفاف اور دودھیا کہاں تھا۔ اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اس کے پورے جسم پر اپنی نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس کی سانسوں کی لے تیز ہوگئی، دھڑکن بڑھ گئی۔ پھر اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا۔ ایک انوکھا، بے مہار تجسس اس کے اندر سے ابھرا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ملازمہ کے گدرائے ہوئے جسم کو نوچ لیا۔

وہ شاید گہری نیند میں تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھی پھر زور سے چلائی۔ صالح تب تک پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر آچکا تھا۔ خالی راہداری میں بھاگتا ہوا وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ بابا جانی نے کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی میں سے اسے دیکھ لیا ہے۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر تیزی سے بستر پر گر پڑا اور لحاف اوڑھ لیا۔ اس کی سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کے قریب سوئی ماماں بی بھی شور سن کر اٹھ بیٹھی اور پھر چپل گھسیٹتی ہوئی باہر نکلی۔ سارے زنان خانے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ سانولی ملازمہ فرزانہ ابھی تک چلا رہی تھی۔

کئی آوازیں صالح کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

کون تھا؟

کہاں سے آیا؟

کہاں گیا؟

پھر کچھ دیر بعد شور مدھم ہوا اور تھم گیا۔ تاہم مختلف دروازے کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کسی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

چند منٹ بعد ماماں بی بھی واپس آگئیں۔ ''کیا ہوا تھا ماماں بی؟'' صالح نے چہرے سے لحاف ہٹا کر غنودہ آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں..... وہ جو گدھے کی بچی فرزانہ ہے..... الیویں واویلا کر رہی تھی۔ اسے کسی چور کا شبہ ہو رہا تھا۔''

''اس نے دیکھا تھا کچھ؟''

''کچھ بھی نہیں..... وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا..... چلو اب تم سو جاؤ..... صبح جلدی اٹھنا ہے۔ قاری صاحب نے ٹائم بدل دیا ہے۔ آٹھ بجے سے پہلے آئیں گے۔ ناشتا بعد میں کر لینا۔''

صبح سویرے اٹھنے سے صالح کو ہمیشہ بہت کوفت ہوتی تھی مگر مجبوری تھی۔ بابا جانی اور داجے کا بنایا ہوا ٹائم ٹیبل بے حد سخت تھا۔ وہ خود کو جیسے ہر وقت ایک شکنجے میں محسوس کرتا تھا۔ سونے اور جاگنے کا ٹائم فکس تھا۔ صبح کی سیر لازم تھی۔ شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں چلنا اور چلانا، بابا جانی کو بہت اچھا لگتا تھا۔ سیر کے بعد ناشتے تک اس کے پاس صرف بیس منٹ کا وقت ہوتا تھا جس میں اسے ضروریات سے فارغ ہونا ہوتا تھا۔ جس دن نہانا ہوتا تھا، اس دن یہ بیس منٹ بڑھ کر تیس منٹ ہو جاتے تھے۔ تیس منٹ سے دو منٹ بھی زیادہ ہو جاتے تو داجے یا بابا کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ دوپہر کو قیلولے کے وقت ماماں بی اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ رات کو بھی وہ اسے سلانے کے بعد ہی سوتی تھیں۔ ابھی سردی زیادہ نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس نے کمبل یا لحاف اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔

اب بھی اس نے سر تک لحاف اوڑھ لیا اور اس واقعے کو ذہن میں دہرانے کی کوشش کرنے لگا جو تھوڑی دیر پہلے پیش آیا تھا۔ ایک طرح سے نسوانیت کے ساتھ اس کا یہ پہلا لمسی تعارف تھا۔ وہ دیر تک ان لمحات کے بارے میں سوچتا رہا اور اس بات پر اطمینان بھی محسوس کرتا رہا کہ کوئی اسے دیکھ نہ پایا تھا۔

ماماں بی نے کہا۔ ''صالح! ابھی اتنی سردی تو نہیں۔ تم کیوں لحاف اوپر تک اوڑھ لیتے ہو؟ خود کو ہوا لگنے دیا کرو۔''

''نہیں ماماں بی..... مجھے ٹھنڈ لگتی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

وہ اسے کیسے بتاتا کہ کمبل یا لحاف اوڑھنے سے وہ

ست رنگی دلہن اس کے پاس آجاتی ہے جس کے ساتھ وہ اپنی مرضی کی باتیں کرسکتا ہے، اپنی مرضی کا وقت گزار سکتا ہے۔ وہ اس کے کہنے کے مطابق اٹھتی ہے، بیٹھتی ہے، گھومتی ہے، چلتی ہے۔ کالی کلوٹی فرزانہ کی طرح رولا بھی نہیں ڈالتی..... بس یہی تھوڑا سا وقت تو ہوتا تھا جس میں وہ اسے اپنے پاس بلا سکتا تھا۔

صبح سویرے وہ نیم گرم پانی سے نہا کر باہر نکلا تو داجے فضل گرم شال تھامے دروازے پر ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے براؤن شال سلیقے سے صالح کے کندھوں پر ڈالی۔ کروشیے والی سفید ٹوپی اس کے سر پر جمائی اور اسے بتایا کہ قاری صاحب آگئے ہیں۔

صالح نے داجے فضل کے پیچھے دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ لابی کی طرف سے اسے اپنے بابا جانی کی بھاری آواز سنائی دی۔

"صالح! میرے پاس آؤ۔ تم سے بات کرنا ہے۔"

ان کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ صالح اندر سے ڈر سا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بابا جانی کے پیچھے پیچھے چلتا ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔ بابا نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ انہوں نے گھوم کر صالح کی طرف دیکھا تو وہ چونک گیا۔ ان کا چہرہ انگارہ ہو رہا تھا۔

انہوں نے ایک کھلی کھڑکی بند کر کے اس کے سامنے پردہ تانا اور صالح کی جانب دیکھ کر گمبھیر آواز میں بولے۔

"کل رات کیا ہوا تھا؟"

"کک..... کل رات..... کچھ بھی نہیں۔" اس کا گلا خشک ہونے لگا۔

"دیکھو..... جھوٹ نہ بولنا۔ مجھے سچ بتاؤ۔"

"بابا.....! میں تو اپنے کمرے میں....." اس کی آواز بیٹھ گئی۔ وہ آگے نہیں بول سکا۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ گئے۔ ایک زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے چلا گیا۔

وہ دہاڑے۔ "کیا کمی رہ گئی ہے میری تربیت میں۔ بتاؤ، کیا نہیں کیا ہے تمہارے لیے..... اور تمہارے یہ کرتوت۔ عمر دیکھی ہے اپنی..... عمر دیکھی ہے؟"

ایک اور زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا اور دیوار سے جا لگا۔ انہوں نے پھر ہاتھ بلند کیا۔ لگتا تھا مزید تھپڑ ماریں گے مگر پھر رک گئے۔

"دور ہو جا میری نظروں سے..... دفع ہو جا۔" وہ گرجے۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کو بہ مشکل سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ گال جیسے جل رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا وہ کب راہداری سے گزر کر اپنے کمرے میں آیا اور کب لحاف اوڑھ کر سکتہ زدہ سا لیٹ گیا۔ ماماں بی ساتھ والے بیڈ پر نہیں تھیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ داجے فضل بھی اسے ڈھونڈتے ہوئے نہیں پہنچے جو لانکہ انہیں ڈھونڈنا چاہیے تھا۔ شاید انہیں بھی بھنک پڑ چکی تھی کہ کمرے میں کچھ ہوا ہے۔

سانولی رنگت والی فرزانہ کو اگلے ہی روز سرخاب منزل سے روانہ کر دیا گیا تھا۔ شدید شرمندگی کے احساس سے صالح بالکل گم صم سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ماماں بی بار بار لاڈ سے پوچھتی تھیں کہ میرے پتر کو کیا ہوا ہے؟ مگر وہ کچھ بتا کر نہیں دیتا تھا۔ دیگر لوگ بھی اس واقعے سے بے خبر تھے جو بند کمرے میں ہوا تھا اور جس کے بعد صالح اپنا سرخ گال اور سنسناتا کان لیے باہر نکلا تھا۔ ہاں، داجے فضل کو اس واقعے کی یقیناً خبر ہو چکی تھی مگر انہوں نے بھی اس سلسلے میں صالح سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

کئی دن گزر چکے تھے مگر بابا جانی اس سے بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ بھی ان سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ ایک عجیب سی شرمندگی اور جھنجلاہٹ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

☆☆☆

صالح کے "بابا جانی" شاہنواز رائے بے حد پریشان اور دل گرفتہ تھے۔ وہ اپنے اکلوتے بچے کو جن حالات سے بچانا چاہتے تھے، وہ انہی حالات کے نرغے میں آ رہا تھا۔ انہوں نے اس رات صالح کو کچن کے سائڈ والے کمرے سے افراتفری میں نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملازمہ کی آہ و پکار سنی تھی پھر سب کچھ انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

انہوں نے صالح کو دو تھپڑ مارے تھے اور یہ ان کے لیے بہت بڑا دکھ تھا۔ دو روز بعد وہ اسی دکھ اور غم کو غلط کرنے کے لیے سرخاب منزل سے نکل کر ایک بار پھر کراچی میں آ پہنچے تھے۔ اب وہ کراچی میں اپنے قیصر ولا میں تھے۔ ان کا یہ دورہ حسب معمول قریباً ایک ماہ پر مشتمل تھا۔ کراچی میں ان کے ملازم خاص خیام نے پہلے سے ہی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ ایک ضرورت مند فیملی کی قبول صورت لڑکی ان کے عقد میں آنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ خیام نے اس کے والدین سے تمام معاملات طے کر لیے تھے۔ اس لڑکی کا نام نسرین تھا۔ دو دن بعد نسرین اپنے رہائشی کوارٹر سے رخصت

ہو کر ان کے پاس آنے والی تھی۔

دوپہر کے وقت قیصر ولا سے باہر ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ تھوڑی دیر بعد لمبوترے چہرے اور تیکھی ناک والا خیام ناف پر ہاتھ باندھے اندر آیا اور مؤدبانہ انداز میں اطلاع دی۔

''سرکار! ایک برقع پوش عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

تھوڑے تذبذب کے بعد شاہنواز رائے نے اسے اندر بلا لیا۔ شاہنواز رائے اعضا شناس شخص تھے۔ برقعے کے اندر ہونے کے باوجود انہوں نے جان لیا کہ یہ عورت نہیں، جواں سال لڑکی ہے۔ بند کمرے میں جب لڑکی نے نقاب الٹا تو شاہنواز رائے کو بری طرح چونکنا پڑا۔ یہ وہی سارہ تھی جسے قریباً ڈھائی برس پہلے شاہنواز رائے نے اپنے عقد میں لیا تھا۔

''تم یہاں؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''کیا میرا آنا اچھا نہیں لگا؟'' وہ کھنک دار آواز میں بولی۔

انہوں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ''ہمارے درمیان طلاق ہو چکی ہے۔ تم میرے لیے نامحرم ہو۔''

اس کے احمریں لبوں پر پھیکی سی ہنسی ابھری۔ ''نامحرم ہوں لیکن ناآشنا تو نہیں ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''سچی بات تو یہ ہے مخدوم صاحب! میں آپ کو کبھی بھی بھول نہیں پائی۔''

''اس کے لیے شکریہ..... لیکن.....''

''مجھے پتا چلا تھا کہ آپ کراچی آئے ہوئے ہیں اور کسی فیملی کی ایک لڑکی سے نکاح کر رہے ہیں، اس لیے میں آ گئی۔'' اس نے کہا اور اپنے سر سے برقعے کا پرا اس طرح کھسکا دیا کہ اس کے گھنے اور خوبصورت بال شانوں پر بکھر گئے۔

شاہنواز رائے نے ایک بار دیکھ کر پھر نظر جھکا لی۔

''میں سمجھ نہیں پایا۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ ہمارے درمیان طلاق ہو چکی ہے۔'' انہوں نے بے اعتنائی سے کہا۔

''لیکن دوبارہ شادی بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''کیا فضول بول رہی ہو تم؟'' انہوں نے تیوری چڑھائی۔

''شرع میں حلالہ کے بعد شادی کی اجازت ہوتی ہے مخدوم صاحب!''

''کیا مطلب..... تمہاری کہیں اور شادی ہوئی تھی؟''

''کہیں اور نہیں۔'' وہ عجیب انداز میں بولی۔ ''اسی سے۔''

''کون اسی؟''

اس نے ذرا جھک کر کہا۔ ''وہی جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ پراپرٹی ڈیلر امین صادق!''

شاہنواز رائے کو ایک دم سب کچھ یاد آ گیا۔ جن دنوں انہوں نے سارہ سے نکاح کیا تھا، وہ چالباز پراپرٹی ڈیلر صادق کی نظروں میں آئی ہوئی تھی۔ وہ سارہ کے والدین کو سبز باغ دکھا کر اسے ہتھیانا چاہتا تھا اور انہی دنوں وہ کسی فراڈ میں ملوث ہو کر جیل بھی چلا گیا تھا۔ تعجب کی بات تھی کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود یہ لڑکی پھر اس کے دام میں چلی گئی تھی۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں، مجبوری بندے سے ہر کام کروا لیتی ہے۔ شاہنواز رائے نے سوچا۔

سارہ کی کہانی مختصراً وہی تھی جو اکثر سفید پوش طبقے کی ہوتی ہے۔ جو کچھ حق مہر وغیرہ کی شکل میں سارہ نے شاہنواز سے حاصل کیا تھا، وہ چند ہی ماہ بعد مکان کو گروی سے چھڑانے اور والد کی سنگین بیماری پر لگ گیا تھا۔ مجبوراً اسے ڈیلر صادق کا ہاتھ تھامنا پڑا تھا۔ بعد ازاں اس شخص کی بے تحاشا مار پیٹ اور نشے بازی سے عاجز آ کر اس نے اس سے خلع حاصل کر لیا تھا۔

اب شاید اس کی جھجک مکمل طور پر دور ہو چکی تھی۔ وہ غالباً اب مزید شادیاں کرنے اور تعلقات بنانے پر آمادہ تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح جوان اور دلکش تھی۔ شرعاً اسے دوبارہ اپنے تصرف میں لانا شاہنواز رائے کے نزدیک غلط بھی نہیں تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ جس طرح چوسے ہوئے آم کو کچھ دیر بعد دوبارہ زمین سے اٹھا کر منہ لگانا دشوار ہوتا ہے، اسی طرح شاہنواز بھی چھوڑی ہوئی عورت کی جانب دوبارہ راغب نہیں ہوتے تھے۔ یہ ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس حوالے سے ان کی کچھ عجیب فطرت تھی جس کی سمجھ شاید انہیں خود بھی نہیں آتی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ گریز ان کی فیملی کے ڈی این اے میں شامل ہو۔ فی الوقت تو ان کی تمام تر توجہ اس دوشیزہ کی طرف تھی جو قریباً چوبیس گھنٹے بعد ان کی آئندہ راتوں کو چمکانے والی تھی۔

وہ سارہ کی آمد کا مطلب سمجھ چکے تھے مگر جان بوجھ کر انجان بنے رہے۔ ہاں وہ اس کی ضرورت سے انجان نہیں بنے۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے خیام کو بلایا اور ایک بھاری رقم کے چیک کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔ وہ مشکور ہو کر چلی گئی۔ بہرحال..... کچھ بھی تھا، اس کے حالات اور اس کے مستقبل کے ارادے جان کر شاہنواز رائے کو ہلکی سی پشیمانی ضرور ہوئی (عارضی قسم کی ایسی پشیمانیوں کو وہ جلد ہی دل و دماغ سے نکال باہر کرتے تھے)۔

سارہ کو رخصت ہوئے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ کراچی سے سیکڑوں میل دور سرخاب منزل سے ان کے لیے

کال آئی۔ یہ کال فضل کریم کی تھی۔

''کیا ہوا فضل کریم؟'' انہوں نے فضل کریم کے لہجے کی غیر معمولی سنجیدگی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

ایک توقف کے بعد فضل کریم کی آواز ابھری۔

''معاف کرنا شاہنواز! لیکن میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو صالح بیٹے کے ساتھ؟

''کیوں، کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہماری سختیوں کی وجہ سے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔ کل دوپہر میں نے اس کی ایک عجیب حرکت دیکھی۔ دل پریشان ہو گیا ہے۔''

وہ کچھ دیر توقف کر کے دوبارہ بولے۔ ''باغیچے میں گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سفیدے کے پیڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ ایک سفیدے کو چھڑی سے بُری طرح پیٹ رہا تھا۔ چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی رہا تھا..... آج سویرے میں نے دیکھا تو اپنے بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر کالے رنگ کا شاپر چڑھایا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ پتر جی! ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کہنے لگا مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی۔''

شاہنواز رائے قدرے حیرت کے عالم میں خاموش رہے۔ فضل کریم نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''میں دیکھ رہا ہوں، تم نے جب سے اسے تھپڑ مارے ہیں، وہ بالکل گم صم سا ہو گیا ہے۔ بولتا ہے تو لگتا ہے کہ کسی سے لڑ رہا ہو۔ میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ وہ بڑی نازک طبیعت کا ہے۔ جس نے کبھی نہ مارا ہو، اس کا تو مارا پھول بھی پتھر کی طرح لگتا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اور جو کچھ اس نے کیا، تمہارے خیال میں اسے کرنا چاہیے تھا؟ اور یہ ہر وقت خیالوں میں گم رہنا، پڑھنے کے لیے الٹی سیدھی کہانیاں ڈھونڈنا، کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جانا، یہ سب کچھ ٹھیک ہے اس کے لیے؟''

''وہ کمرے میں بند ہوتا تھا تو تم نے دروازے کی چٹخنی اتروا دی..... پتا نہیں یہی چٹخنی اس نے اپنے دماغ کو لگائی ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ بے جا سختی کے کھاتے میں آتا ہے۔ میں اس بات کی حمایت نہیں کرتا کہ اس عمر میں بچے بند کمروں میں بیٹھیں لیکن کچھ بھی ہے، یہ سب قدرتی عمل ہے۔ معاف کرنا، میں، تم، ہم سب اس دور سے گزرے ہیں۔ گزرے ہیں کہ نہیں؟ ہاں، یہ ضرور ہے کہ کسی چیز میں بھی زیادتی ٹھیک نہیں۔ بچوں کو صحت مند سرگرمیوں کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ لگوا دو اسے چٹخنی اور دو چار درجن کالے شاپر بھی منگوا دو۔'' انہوں نے جھلا کر کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ پشت پر ہاتھ باندھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کئی نسلوں سے ان کے خاندان کے اندر جنسی رویوں میں شدت ہے۔ وہ خود بھی اس سے مبرا نہیں تھے مگر چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ آگے نہ چلے۔ وہ ٹہلتے رہے۔ ان کی انگلیوں میں چھوٹی تسبیح گردش کرتی رہی اور وہ اپنے آپ میں کھو لتے رہے۔ تاہم کچھ دیر بعد انہوں نے سب کچھ اپنے ذہن سے نکال باہر کیا۔ انٹرکام پر خیام کو اپنے لیے ایک تگڑے لنچ کا آرڈر دیا اور لگژری صوفے پر جا بیٹھے۔

بے خیالی میں ان کی نگاہ گاہے بہ گاہے اس جہازی بستر کی طرف اٹھ جاتی تھی جو آج خالی تھا مگر انہیں پتا تھا کہ وہ کل خالی نہیں رہے گا۔ ایک اَن چھوئی لڑکی اپنی تمام تر حیا، گھبراہٹ اور تجسس کے ساتھ ان کے پہلو میں ہو گی اور یہ سب کچھ کسی بھی لحاظ سے غلط یا غیر قانونی نہیں ہو گا۔

.....لیکن جو کچھ وہ سوچ رہے تھے، وہ ہونے والا نہیں تھا۔ اس مرتبہ کچھ اور ہونے والا تھا اور جو ہونے والا تھا، وہ دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رات کوئی ایک بجے کا عمل ہو گا۔ صبح پانچ بجے کا الارم لگانے کے بعد شاہنواز رائے سو چکے تھے لیکن ایک الارم انہیں چار بجے سے پہلے ہی جگانے والا تھا۔

ایک آہٹ سے ان کی آنکھ کھلی۔ انہوں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ٹیبل لیمپ کی طرف بڑھایا۔ ایک چھناکے سے کھڑکی ٹوٹ گئی اور ایک شخص دھم سے ان کے بیڈ روم میں کود آیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ عمر کوئی بائیس چوبیس سال ہی رہی ہو گی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ ریوالور شاہنواز رائے نے صاف دیکھا۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ نوجوان کا چہرہ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں نمایاں نظر آیا اور اس کی آنکھوں کی غضب ناک سرخی بھی۔

''کون ہو تم؟'' شاہنواز نے خود کو سنبھالتے ہوئے مستحکم لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''اس لڑکی کا منگیتر جو کل رات چند ہفتوں کی دلہن بن کر تمہاری اس کوٹھی میں آنے والی ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ یہاں کوئی نہیں آنے والا ..... اور تمہیں اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

وہ پھنکارا۔ ''میں تمہارے کرتوتوں کے بارے میں

سب جان چکا ہوں مخدوم صاحب! تم نے یہاں نکاح کو مذاق بنا رکھا ہے۔ عارضی شادیاں کرتے ہو۔ غریب گھرانے کی مجبور لڑکیوں کو ہوس کے بستر پر لٹاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تم نے قانون، مذہب اور معاشرے، سب کو دھوکا دے دیا۔ کیا کبھی سوچا تم نے کہ جن کو نکاح کے نام پر داغدار کر کے چند ہفتے بعد چھوڑ دیتے ہو، بعد میں ان پر کیا بیتتی ہے؟ کبھی سوچا تم نے؟ تم کچھ نہیں ہو۔ تم بس ایک بہروپیے ہو۔ میں آج تمہارا یہ کھیل ختم کر دوں گا۔'' اس کی آواز مزید بلند ہو گئی۔

''خیام!'' شاہنواز رائے نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی مسلح آدمی کا ریوالور والا ہاتھ پکڑنے جھپٹے مگر اس سے پہلے ہی اس نے گولی چلا دی جو شاہنواز کی ناف میں بائیں جانب لگی۔

گولی لگنے کے باوجود انہوں نے نوجوان کا ریوالور والا ہاتھ دبوچ لیا۔ وہ سڈول جسم کے مالک تھے اور بازوؤں میں طاقت تھی۔ دوسری طرف لڑکا منحنی سا تھا مگر پھرتیلا تھا۔ چند لمحے تک دونوں میں سخت کشمکش ہوئی۔ ریوالور لڑکے کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ اچانک اس نے زور مارا اور خود کو چھڑا کر کھڑکی پھلانگ گیا۔

گولی کے دھماکے اور شاہنواز رائے کی آواز کے سبب قیصر ولا میں شور سا مچ گیا تھا پھر بیڈ روم کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ شاہنواز رائے نے لنگڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ان کی سفید شلوار خون سے تر بتر ہو رہی تھی۔ خیام دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے پیچھے کئی اور ملازم اندر گھس آئے۔ شاہنواز رائے نے پہلو دبایا اور بے دم سے ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

سرخاب منزل میں صالح کو پتا تھا کہ اس کے والد اب کراچی گئے ہیں تو چار پانچ ہفتے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ وہ خود کو کافی ایزی محسوس کر رہا تھا حالانکہ امتحان سر پر تھے مگر پڑھائی میں اس کی توجہ نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ قاری صاحب نے اس کی عدم دلچسپی اور شرارتوں سے عاجز آ کر سرخاب منزل آنا چھوڑ دیا تھا اور بہانہ بیماری کا بتایا تھا۔ وہ اکثر اپنی عمر رسیدہ ٹیچر کا بھی ناک میں دم کیے رہتا تھا۔ لے دے کر داجے فضل تھے جو کسی حد تک اس سے اپنی بات منوا لیتے تھے۔ اب بھی وہ نہانا چاہ رہا تھا اور وہ اسے منع کر رہے تھے کہ سردی بڑھ گئی ہے۔ ابھی وہ کل ہی تو نہایا ہے۔ اتنے میں ایک ملازم آیا اور اس نے داجے فضل کے کان میں کچھ نہایت سنجیدہ قسم کی سرگوشیاں کیں۔

داجے اس ملازم کے ساتھ باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی صالح کو موقع مل گیا اور وہ نیم گرم پانی کا لگ اٹھانے کے لیے غسل خانے میں جا گھسا۔ کبھی کبھی غسل خانہ بھی اسے اپنے لحاف جیسا لگتا تھا۔ وہ باہر نکلا تو داجے فضل سامنے ہی بیٹھے تھے۔ صالح کو لگا کہ غسل خانے میں سے برآمد ہونے کے سبب اسے ڈانٹ پڑے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ داجے کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

''کیا ہوا داجے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارے بابا تین چار روز تک کراچی سے واپس آ رہے ہیں۔''

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''پر انہوں نے تو وہاں رہنا تھا۔''

''وہاں ان کے ساتھ ڈکیتی کی کوئی واردات ہوئی ہے۔ کافی رقم گئی ہے اور انہیں چوٹ بھی لگی ہے۔''

''چوٹ؟''

''ہاں، گولی لگی ہے۔ چار پانچ دن سے اسپتال میں تھے۔ اب کچھ ٹھیک ہیں۔ دو تین روز میں چھٹی ہو جائے گی۔''

ڈکیتی اور بابا کو گولی لگنے کی باتوں سے صالح کو پریشانی تو کافی ہوئی لیکن اس پریشانی کا ایک اور رخ بھی تھا۔ وہ واپس آ رہے تھے۔ اب روزمرہ کی مصروفیات یعنی ٹائم ٹیبل کے مطابق شروع ہونے والی تھیں۔

چار پانچ روز کے اندر ہی بابا جانی سرخاب منزل میں واپس آ گئے۔ چند روز میں ہی وہ کافی کمزور نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے صالح کو اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کیا اور حال احوال پوچھا پھر صالح کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ کس طرح ایک ڈاکو، گارڈ کو چکما دے کر ان کی رہائش گاہ میں داخل ہوا اور نقدی و قیمتی اشیا چھیننے کی کوشش کی۔ سرخاب منزل میں ہر ایک کی زبان پر اسی ڈکیتی کا چرچا تھا۔

مردانے میں عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اگلے ہی روز لاہور سے صالح کی بڑی پھپھو بھی آ گئیں۔ صدقے، خیرات کے طور پر وہ کئی دیگیں چڑھا کر آئی تھیں۔ یہاں سرخاب منزل میں بھی کئی بکرے ذبح ہوئے تھے اور لنگر خانے میں زبردست گہما گہمی تھی۔ البتہ صالح اس گہما گہمی سے کافی دور تھا۔ داجے فضل نے تہیہ کر رکھا تھا کہ مڈل بورڈ کے امتحان کی تیاری کے لیے اسے روزانہ کم از کم آٹھ گھنٹے پڑھائی کے لیے بیٹھنا ہوگا۔ بابا جانی کا زیادہ وقت بھی چونکہ زنان خانے میں اپنے بستر پر ہی گزر رہا تھا لہٰذا صالح

کے لیے آئیں بائیں شائیں کی گنجائش کم تھی۔ بڑے کٹھن دن تھے اور ٹھہری ہوئی اداس شامیں تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ چند روز بعد ایک ساتھ دو خوشیاں صالح کے روز و شب کو چمکا گئیں۔ ایک خوشی تو امتحانات ختم ہونے کی تھی اور دوسری چھوٹی پھپھو عاصمہ کی آمد کی تھی۔ خوش رنگ آفرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ معلوم ہوا کہ فرحان نے بھی آنا تھا مگر کوالالمپور میں اس کے اسکول ایگزام تھے لہٰذا وہ والد کے پاس رہا تھا۔

اس مرتبہ پھپھو اپنے بھائی کی عیادت کے لیے آئی تھیں جن کی حالت تین چار ہفتے گزرنے کے باوجود پوری طرح سنبھلی نہیں تھی بلکہ کسی وقت زیادہ بگڑی ہوئی لگتی تھی۔ وہ رات بھر درد سے کراہتے رہتے اور صبح سویرے سرگودھا سے تین چار ڈاکٹرز سرخاب منزل میں آدھمکتے۔ انہیں دو تین بار اسپتال بھی جانا پڑا تھا۔ اپنے کمرے سے باہر آنے کے لیے وہ وہیل چیئر استعمال کر رہے تھے۔

آفرین کو دیکھتے ہی صالح کے دل کی کلی جیسے کھل اٹھی تھی۔ وہ ڈھائی تین برس پہلے کی آفرین سے کافی مختلف نظر آرہی تھی۔ بال کچھ لمبے ہوگئے تھے، رنگ مزید سرخ و سپید اور رخسار ملائم تر..... اس کے جسم میں بھی معمولی سی تبدیلی نظر آتی تھی۔ وہ اب آٹھویں کلاس کے اسٹیٹس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ صالح اب ناٹنگھم میں تھا اور ملائیشیا میں فرحان اس سے ایک تعلیمی سال آگے تھا۔

ڈھائی تین سال بعد ملنے کی یہ خوشی صالح اور آفرین دونوں کے لیے بڑی مسحور کن تھی۔ خاص طور سے صالح کے لیے۔ دو دن تک تو ان کی باتیں ہی نہیں رکیں۔ کراچی میں کیسی کیسے ہوئی..... پاپا نے کیسے ڈاکو کو دبوچا..... کیسے اس کا ریوالور چھینا اور کیسے وہ دم دبا کر بھاگا۔ صالح نے سب کچھ آفرین کے گوش گزار کیا۔ وہ جب باتیں کر رہا تھا تو اس کی نگاہیں مسلسل آفرین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے سراپا کو آنکھوں کے راستے دل میں اتارتا چلا جارہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پچھلے ڈھائی تین برس میں وہ اپنی اس پیاری سی ہمجولی کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا۔ دل کی گہرائی میں کہیں اسے یاد کرتا رہا ہے۔

صالح جب باتیں کر رہا تھا، آفرین کی نگاہیں اس کی گردن پر جمی ہوئی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' صالح نے پوچھا۔

''یہ تمہاری گردن پر سامنے کی طرف سے ابھرا ہوا سا کیا ہے؟'' آفرین نے اس کی گردن پر انگلی چبھوتے ہوئے کہا۔

صالح ہنس دیا۔ ''ہاں، یہ بات میں نے بھی ماما بی سے پوچھی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اسے گنڈی کہتے ہیں۔ جب لڑکے ذرا بڑے ہونے لگتے ہیں تو یہ گنڈی نظر آنے لگتی ہے پھر اس سے آواز بھی تھوڑی سی بھاری ہوجاتی ہے۔''

''ہاں صالح! تم ٹھیک کہتے ہو۔ پہلے تمہاری آواز زیادہ پتلی تھی..... اور یہ تمہارے اوپر والے ہونٹ کے اوپر بالکل ہلکے ہلکے سے بال بھی تو نظر آتے ہیں۔''

''ماما بی کہتی ہیں کہ دو تین سال بعد یہ بال مونچھوں کی طرح ہوجائیں گے۔''

''تو تم مونچھیں رکھو گے؟''

''ہاں، شاید رکھوں گا۔''

''پر مجھے تو مونچھوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''تو پھر نہیں رکھوں گا۔'' وہ رواں رواں معصومیت کے ساتھ بولا۔

وہ ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے اس کے گال اور بھی خوبصورت ہوجاتے تھے۔ بے ساختہ صالح کا ہاتھ بڑھا اور اس نے آفرین کے گال کو چھو کر دیکھا..... بس ایک انگلی کے ساتھ ذرا سا۔ ''تمہارے گال کتنے ملائم ہیں آفری۔''

''لڑکیوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں..... لڑکوں کے زیادہ ملائم نہیں ہوتے، جیسے فرحان بھیا کے ہیں۔''

وہ بغور گالوں کو ہی دیکھتا چلا جارہا تھا۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ ''تمہارے گال کو ایک بار پھر چھو کر دیکھوں؟'' اس نے جیسے میکانکی انداز میں پوچھا۔

''ہاں ہاں، دیکھ لو۔'' اس نے خود صالح کا ہاتھ تھاما اور اپنے گرم ملائم رخسار پر رکھ کر اچھی طرح مل دیا۔ ''ملائم ہیں نا؟'' اس نے معصوم خوشی سے پوچھا۔

''ہاں، بہت زیادہ۔''

''ممی کے بھی بہت ملائم ہیں لیکن پاپا کے سخت ہیں، کانٹوں کی طرح۔ ممی کہتی ہیں کہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو ان کے گال اور بھی پیارے تھے، سرخ سیبوں کی طرح۔ پھر پاپا نے ان پر اپنی کانٹوں جیسی ڈاڑھی رگڑ رگڑ کر انہیں زیادہ پیارا نہ رہنے دیا۔'' وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

''تو پھوپا جان، پھپھو کے گالوں پر اپنی ڈاڑھی رگڑتے تھے؟''

وہ پھر زور سے ہنسنے لگی۔ ''بھئی ان کی شادی ہوچکی تھی۔ شادی کے بعد تو ایسا ہوتا ہی ہے نا۔''

اس کا دل چاہا کہ اس بارے میں آفرین سے مزید

بات کرے اور اس سے پوچھے کہ شادی کے بعد اور کیا کیا ہوتا ہے لیکن اتنا شعور تو اسے بہرحال آ ہی چکا تھا کہ ایسی باتیں کرنا بے شرمی کے زمرے میں آتا ہے۔ ویسے بھی اسے آفرین سے صاف ستھری، سیدھی سادی باتیں کرنا ہی اچھا لگتا تھا پھر ایک اور بات بھی تھی۔ جب سے آفرین دوبارہ سرخاب منزل میں آئی تھی، ایک بھیڑی ہوئی سی خوشبو پھر صالح سے آملی تھی۔ اس کے اندر کی ساری بیزاری، جھنجلاہٹ اور کرختگی ایک عجیب سی حلاوت اور لطافت میں ڈھل گئی تھی۔ اس نے کوئی پھول تو چا تھا، نہ کسی تتلی کے دو ٹکڑے کیے تھے، نہ کسی سفید ے کو پیٹا تھا۔ یہ سب چیزیں اسے اچھی لگنے لگی تھیں۔ اور تو اور وہ لحاف کے اندر تصوراتی دلہن بھی دو تین دنوں سے اس کے پاس نہیں آئی تھی۔

شاید صالح اور آفرین میں یہ باتیں مزید جاری رہتیں مگر پھر بابا جانی کے کمرے کی طرف سے ان کی بلند آواز سنائی دی۔ ''صالح! کہاں ہو...؟ ادھر آؤ۔''

''آتا ہوں بابا!'' اس نے گھبرا کر بلند آواز میں کہا اور بابا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھے۔

''کہاں تھے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کک... کمرے میں۔''

''ابھی پڑھنے کے لیے کیوں نہیں بیٹھے... اور... پھپھو اور آفری کہاں ہیں؟''

''وہ تو... شاید باغیچے کی طرف ہیں۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔

انہوں نے اسے نہایت کڑی نظروں سے گھورا اور حکم دیا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر وہ پڑھنے کے لیے داجے فضل کے پاس پہنچ جائے۔

وہ چلا گیا لیکن ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں پچھلی بار کی طرح پھر بابا اور پھپھو عاصمہ کی لڑائی نہ ہو جائے۔ اس پچھلی لڑائی کے فوراً بعد بابا اسے لے کر اپنے کسی چہیتے مرید کے پاس چلے گئے تھے اور جب وہ واپس آیا تھا تو آفرین اور اس سے وابستہ خوشبو، دونوں سرخاب منزل سے رخصت ہو چکی تھیں۔

دو روز بعد صبح سویرے داجے فضل نے اسے بتایا کہ اس کے بابا کو رات پھر سرگودھا کے پرائیویٹ اسپتال لے جانا پڑا ہے۔

''کتنے دن وہاں رہیں گے؟'' صالح نے کھٹاک سے پوچھا۔

داجے نے اسے گھور کر دیکھا اور بولے۔ ''دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

وہ دوسری طرف چلے گئے تو صالح کو خود پر افسوس ہونے لگا کہ بابا کے اسپتال جانے کی خبر سن کر اسے خوشی کیوں محسوس ہوئی؟ اسے تو بابا کی طبیعت کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔ اس کے بجائے یہ پوچھا کہ وہ کتنے دن رہیں گے۔

بابا کے بعد صالح خود کو کافی آزاد محسوس کرنے لگتا تھا۔ داجے فضل کی گرفت اب اس پر کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ فطرت اپنے راستے خود بنالیتی ہے۔ اردگرد کے ماحول سے ہی صالح کو جنس کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ نر مادہ کی خصوصیات اور ان کے ملاپ کو کافی حد تک سمجھتا تھا۔ کچھ سوال اس نے بے جھجک ہو کر داجے فضل سے بھی پوچھے تھے اور انہیں جو سوال مناسب لگے تھے، ان کا جواب بھی دیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ قدرت نے مرد اور عورت میں مختلف خصوصیات رکھی ہیں اور ایک دوسرے کی خصوصیات کے لیے ان میں دلچسپی پیدا کر دی ہے تاکہ انسانی نسل آگے چل سکے۔

سردیوں کی چمکیلی دھوپ سرخاب منزل کی وسیع چھت پر پھیلی ہوئی تھی۔ سنگِ مرمر کی ایک بالکونی میں صالح، پھپھو عاصمہ اور آفرین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفرین اسے سندر بلا کی کہانی سنا رہی تھی جس میں ایک شہزادے کو ایک غریب لیکن بہت خوبصورت لڑکی سے پیار ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور لڑکی کے چھوڑے ہوئے سینڈل کی وجہ سے اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

ماضی قریب میں بے حد خشک قسم کی اصلاحی کہانیاں جو بابا اسے لاکر دیا کرتے تھے، صالح اب ان سے بیزار ہو چکا تھا۔ اسے تو ایسی ہی کہانیاں گرفت کرتی تھیں اور اچھی لگتی تھیں جو آفرین اسے سنا رہی تھی یا کبھی کبھی مردان خانے کا ایک ملازم اسے سناتا تھا۔ وہ فلموں کا رسیا تھا اور ان گنت کہانیاں اسے ازبر تھیں۔

سندر بلا کی کہانی ختم ہوتے ہوتے پھپھو اٹھ کر نیچے چلی گئیں۔ وہ نہانے جا رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے آفرین نہائی تھی اور دھلا ہوا پھول نظر آ رہی تھی۔ پھپھو اسے کہہ گئی تھیں کہ وہ کچھ دیر مزید دھوپ میں بیٹھے۔ سنگِ مرمر کی بالکونی میں وہ دونوں اکیلے تھے۔ بھرے کھیتوں میں سے دور دور تک وہ سبز اور پیلے کھیت نظر آتے تھے جنہوں نے سرخاب منزل کو گھیرا ہوا تھا۔ دور کہیں کسی ڈیزل انجن کی ''کوہ، کوہ'' سنائی دیتی تھی یا ٹریکٹر چلنے کی آواز آتی تھی۔

صالح کی نگاہیں پھر آفرین کے گال پر جمی تھیں جو دھوپ کی تمازت سے سرخ تھا۔ پتا نہیں کیوں دو دن پہلے والی بات مسلسل اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنا رخسار اسی طرح آفرین کے رخسار کے ساتھ رگڑے جس طرح پھوپا اور پھوپی کرتے تھے۔ لیکن آفرین نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس قسم کی چیزیں شادی کے بعد ہوتی ہیں ... تو پھر صالح کا دھیان شادی کی طرف چلا گیا۔

اس نے بڑی سادگی اور روانی سے کہا۔ ''آفری! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

آفرین کے رخسار کچھ اور سرخ ہوئے۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ''ممی کہتی ہیں کہ شادی بڑے ہونے کے بعد ہوتی ہے۔''

''تو ہم کون سا ابھی کر رہے ہیں۔''

''لیکن ممی کہتی ہیں کہ چھوٹی عمر میں اس طرح کی باتیں بھی نہیں کرتے۔'' صالح کچھ جھینپ سا گیا۔ وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''تو تم مجھ سے شادی کرنا چاہو گے؟''

''بالکل!''

''اور اگر میں نہ کرنا چاہوں تو؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''مجھے پتا ہے تم ایسا کر ہی نہیں سکتیں۔ جس طرح تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، اس طرح میں بھی تمہیں اچھا لگتا ہوں۔ ہم کتنے اچھے دوست ہیں۔ ہمیں اکٹھے کھیلنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ میں تو ..... ابھی تک وہ دن نہیں بھولا جب سخت گرمی کے بعد بہت زور سے آندھی آئی تھی اور بہت زیادہ بارش ہوئی تھی۔ ہم تینوں کتنا کھیلے تھے۔ کتنا مزہ کیا تھا۔''

''ہاں، وہ دن تو مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے۔'' آفرین نے کہا۔

اس بارش کے بعد جو کچھ ہوا تھا، وہ فی الوقت ان دونوں کے ذہنوں سے نکلا ہوا تھا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ شاید اس سہانے دن کی یادوں میں کھو گئے۔ صالح آہستہ آہستہ سنگِ مرمر کے چھوٹے سے سفید ستون پر ہاتھ پھیر رہا تھا ... پھیرتا جا رہا تھا

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' آفرین نے پوچھا

وہ ایک دم چونک گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''یہ ... یہ تمہارے گالوں کی طرح ہی بالکل ملائم ہے۔''

وہ زور سے ہنسی۔ ''تو پھر میرے گال پر ہی ہاتھ پھیر لو نا۔''

اس نے صالح کا ہاتھ پکڑا اور اپنے تمتماتے ہوئے گال پر پھیرا۔ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ آفرین نے اس کے بال بکھیر دیے اور اس نے آفرین کے۔

اپنے ہاتھ سے آفرین کے تراشیدہ ریشمی بال بکھیر کر صالح کی جیسے ایک دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔

کتنی چھوٹی چھوٹی شرارتیں تھیں، کتنی بڑی بڑی خوشیاں۔

پھپھو عاصمہ اکثر ان دونوں کو بالکونی یا کمرے میں چھوڑ کر کسی کام سے باہر چلی جاتی تھیں۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ وہ ایک دوسرے سے خوب باتیں کریں، ان کا پیار بڑھے۔ وہ اکثر اس بات پر شاکی رہتی تھیں کہ ان کے بھائی یعنی صالح کے بابا نے اس پر ناروا پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ کبھی کبھی صالح کو محسوس ہوتا تھا کہ شاید پھپھو چاہتی ہیں کہ جب وہ دونوں بڑے ہو جائیں تو ان کی شادی ہو۔ شادی کے ساتھ آفرین کا تصور کرتے ہی صالح کے جسم میں نورانی پھلجھڑیاں سی چھوٹ جاتی تھیں اور اس کے مشامِ جاں میں ایک خوشبو سی بس جاتی تھی۔

وہ پڑھائی میں بہت اچھا نہیں تھا لیکن اب پڑھائی میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آفرین پڑھائی میں بہت اچھی ہے اور جب وہ بڑی ہو جائے گی تو پھپھو اس کی شادی اسی لڑکے سے کرنا چاہیں گی جو پڑھائی میں اچھا ہو۔

صالح اب نویں کی تیاری کر رہا تھا اور ملائیشیا کی اسٹڈی کے مطابق آفرین کی پڑھائی کا درجہ تقریباً آٹھویں جماعت کا تھا۔

پھپھو عاصمہ کے حصے کی پراپرٹی بکنے میں نہیں آ رہی تھی اسی لیے ان کا قیام بھی طویل ہوتا جا رہا تھا۔ صالح صاف دیکھ رہا تھا کہ بابا جانی اس تاخیر سے خوش نہیں ہیں۔ وہ خود تو بستر پر تھے لیکن واجے فضل کو ہر وقت صالح کے ساتھ لگائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ماماں بی بھی اسی نوعیت کی کوشش میں مصروف رہتی تھیں مگر صالح اب اتنا ہوشیار ہو چکا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے مطلب کا تھوڑا سا وقت چرا لے۔

وہ کسی وقت باغیچے کی جانب والی عقبی کھڑکی پھلانگ کر پھپھو کے کمرے میں چلا جاتا۔ پھپھو نے کوئی نہ کوئی پسندیدہ چیز صالح کے لیے فریج میں رکھی ہوتی تھی۔ وہ بڑے پیار سے اسے کھلاتیں۔ دونوں سے باتیں کرتیں پھر کسی وقت اٹھ کر باہر بھی چلی جاتیں۔ ایسے میں صالح اور آفرین کو آزادی سے باتیں کرنے کا موقع ملتا۔ اس کچی پکی عمر میں ہی انہوں نے ایک دوسرے سے پکا عہد کر لیا تھا کہ وہ شادی کریں گے تو ایک دوجے سے کریں گے۔ فی الحال خوب خوب پڑھیں لکھیں گے اور قابل بنیں گے۔

حالانکہ تنہائی میں انہیں ہر طرح کے مواقع میسر ہوتے تھے لیکن صالح کے ذہن میں کبھی بھول کر بھی الٹا سیدھا خیال نہیں آتا تھا۔ بس پیار کی ایک بے مثال پھواری تھی جو اسے بھگوئے رکھتی تھی اور ایک خوشبو تھی جو اس کی روح کو مہکاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ اتنا کرتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے کسی وقت آفرین کا ہاتھ تھام لیتا یا کھوئے کھوئے انداز میں اس کے بالوں کو چھیڑ دیتا۔ وہ بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے اس کے بال بکھیر دیتی۔

دسمبر کی بارش صالح کو بہت بھاتی تھی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی بارش والی رات تھی۔ دھیمی پھوار تواتر سے برس رہی تھی۔ گلابی جاڑا اپنے جوبن پر تھا۔ کھیت، کھلیان، باغ، باغیچے، در و دیوار سب بڑی خاموشی سے بھیگ رہے تھے۔ صالح کے پہلو میں ماماں بی کب کی سو چکی تھیں۔ تین چار روز سے صالح نے آفرین کو دیکھا نہیں تھا کیونکہ بابا جانی کی طبیعت اب کچھ بحال تھی اور جوں جوں طبیعت بحال ہو رہی تھی، صالح پر ان کی نگرانی اپنا پرانا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آفرین کو دیکھنے کے لیے صالح کی نگاہیں ترسی ہوئی تھیں۔ دید کی بیکراں پیاس رگ و پے میں پھیل رہی تھی۔ وہ لحاف ہٹا کر آہستگی سے باہر نکلا اور راہداری طے کر کے اس پورشن میں پہنچ گیا جہاں پھپھو قیام پذیر تھیں۔ اس نے دروازے پر احتیاط سے دباؤ ڈالا۔ وہ بے آواز کھل گیا۔ بارش کی وجہ سے لائٹ جا چکی تھی۔ کمرے میں کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ وہ کمرے کے قالین پر ننگے پاؤں چلتا اس ڈبل بیڈ کے قریب پہنچ گیا جہاں پھپھو اور آفرین سو رہی تھیں۔ پھپھو کی نہایت بوجھل سانسیں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں اور صالح کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔

آفرین کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ اس کا ایک رخسار لیمپ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے اس کے دماغ میں کیا آئی۔ اس نے سوچا شادی تو ابھی دور..... بہت دور ہے۔ وہ کب تک ایک حسرت دل میں پالتا رہے گا۔ اپنا رخسار آفرین کے رخسار کے ساتھ نہ ملا سکے گا۔ آفرین کی بتائی ہوئی بات اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ بڑے آرام سے جھکا اور ہولے سے اپنا رخسار آفرین کے بے مثال رخسار پر رکھ دیا۔ بہت آہستہ آہستہ وہ اپنے رخسار کو آفرین کے رخسار پر حرکت دینے لگا۔ ہفت اقلیم کی دولت اسے وہ خوشی نہ دے سکتی تھی جو اس لمس نے دی اور ان لمحوں نے دی۔

پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ آفرین کی سنائی ہوئی "سنو وائٹ" والی کہانی کی طرح وہ سوئی پڑی آفرین کے رخسار کو چوم لے۔ وہ ایک بار پھر جھکا لیکن اس سے آگے بڑھنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ نہیں نہیں اتنا ہی بہت ہے۔

وہ اپنے رخسار پر اس "بے مثال رخسار" کا لمس لیے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ایک سرشاری سی اسے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر بارش کی مسلسل آہٹ موجود تھی۔

اگلے روز پھپھو عاصمہ، راجے فضل اور ایک وکیل کے ساتھ اپنی پراپرٹی کے سلسلے میں سرگودھا گئی ہوئی تھیں۔ سہ پہر کو صالح اپنے کوچ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتا رہا اور آفرین بالکونی میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا یوں دیکھنا صالح کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آفرین خود بھی اس کے ساتھ کھیل میں شریک ہونا چاہتی ہے مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ بابا کو یہ بات کبھی بھی پسند نہیں آئے گی۔ وہ عورتوں اور لڑکیوں کی اچھل کود کے سخت خلاف تھے اور اسے بداخلاقی قرار دیتے تھے۔

کھیلنے کے بعد وہ کچھ ہانپتا ہوا سا اوپر بالکونی میں جا پہنچا۔ آفرین سر جھکائے بیٹھی تھی اور محویت سے اپنے ناخنوں پر پالش لگا رہی تھی۔ ایک لٹ رخسار پر جھول رہی تھی..... ہاں، وہی رخسار جس کے بے مثال لمس کا تجربہ کل رات صالح کو ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی اس کامیابی پر مسکرا دیا۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "میں نے آج ماموں جی سے بات کی ہے۔"

"کس بارے میں؟"

وہ اس سے نظر ملائے بغیر بولی۔ "اس بارے میں... جو تم نے کل رات کیا۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "میں..... کچھ سمجھا نہیں؟"

"کبھی تو میں بھی نہیں صالح..... مجھے یقین نہیں آیا کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ ممی پاس لیٹی تھیں اس وجہ سے میں چپ رہی۔"

صالح کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس نے بہ مشکل تھوک نگلا۔ "تم..... مذاق کر رہی ہو نا؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

صالح نے دروازہ بند اور بولٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بابا جانی کا سرخ انگارہ چہرہ گھومنے لگا پھر اسے ڈھائی تین سال پہلے کے تھپڑ یاد آئے جو اس کے دل و دماغ پر انمٹ نقوش بنا چکے تھے۔ اس کا گلا بالکل خشک ہوگیا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ عورتوں اور لڑکیوں کو سمجھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت وہ کیا کر گزریں۔ شاید یہ بات داجے فضل نے ہی اسے بتائی تھی۔

وہ مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ آفرین والے کمرے کی کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو کھڑکی ایک دم کھلی اور اسٹیل کی گرل کی دوسری جانب آفرین کا حسین چہرہ نظر آیا۔ وہ ہنس ہنس کر لال سرخ ہو رہی تھی۔ ''مذاق کر رہی تھی..... مذاق کر رہی تھی۔'' اس نے حیا آلود سے لہجے میں کہا اور کھڑکی جلدی سے بند کر دی۔

''آفری کی بچی!'' صالح نے دانت پیسے اور دوسری طرف جا کر دروازے کو دھکا دیا مگر وہ بدستور بند تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح اندر چلا جائے اور آفرین کو بری طرح جھنجوڑ ڈالے۔ اس سے دھینگا مشتی کرے۔ بالکل جیسے تین برس پہلے آندھی اور بارش کے اس یادگار دن میں اس نے کی تھی۔

لیکن نہیں..... اب شاید وہ کچھ بڑے ہو چکے تھے۔ اس کی جھنجلاہٹ پر بچ نکلنے کی خوشی غالب آگئی اور وہ ایک سرشاری کی سی کیفیت میں اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر گر گیا۔

اپنی بچکانہ سوچوں پر اسے خود بھی ہنسی آرہی تھی مگر یہ سوچیں لطف بھی دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جب کل رات وہ آفرین کو سویا ہوا سمجھ کر اس کے گال پر اپنے گال کو حرکت دے رہا تھا تو وہ جاگ رہی تھی۔ ایک میٹھی میٹھی سی دلفریب لہر صالح کے پورے سراپا میں دوڑ گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ 'اگر وہ ''سنو وائٹ'' والے انداز میں اسے ہولے سے چومنے کی ہمت بھی کر ڈالتا تو شاید یہ بھی غلط نہ ہوتا۔'

..... یہ بڑے سہانے دن تھے۔ سردیوں کی چمکیلی دھوپ، ہوا میں سنہری رنگ کی ایک خوشگوار خنکی، کھیتوں پر سرسوں کے رنگ اور باغیچوں میں گلاب اور گلِ داؤدی کی خوشبو۔

..... چھوٹی عید میں چند روز باقی تھے۔ سنگِ مرمر کی جالیوں والی بالکونی میں بید کی خوبصورت کرسیوں پر صالح، پھپھو اور آفرین دھوپ سینک رہے تھے۔ نیچے وسیع دالان میں ادھیڑ عمر ملازمائیں چمکیلے لحافوں میں ڈورے ڈال رہی تھیں اور چونکہ شاہنواز رائے مردانے میں تھے اس لیے وہ ہولے ہولے گنگنا بھی رہی تھیں۔ ایک طرف چاول چنے جا رہے تھے، دوسری طرف دو درزنیں کپڑوں کی سلائی میں مصروف تھیں۔

آفرین نے ٹھوڑی ماں کے کندھے پر ٹکا رکھی تھی اور تھوڑی سی جھجک کے ساتھ صالح کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حدت کے سبب اس کے گال قندھاری انار ہو جاتے تھے۔

پھپھو عاصمہ نے کہا۔ ''صالح! تمہاری ماں بی بتا رہی تھیں کہ تم مہندی بہت اچھی لگاتے ہو؟''

''ہاں، پھپھو! جو میری پہلی ٹیچر تھیں نا شمینہ جمال..... انہوں نے سکھائی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ لڑکے نہیں سیکھتے مگر میں نے زبردستی سیکھی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ عید پر مجھے لگا دینا۔'' انہوں نے کہا۔

''اور مجھے بھی۔'' آفرین جھٹ سے بولی۔

پھپھو نے کہا۔ ''ادھر طائیشیا میں تو یہ مہندی، چوڑیاں، ہار سنگھار وغیرہ ہوتے ہی نہیں۔ ان کے اپنے ہی ریت رواج ہیں۔''

''میں داجے سے کہہ کر سرگودھا سے اسپیشل کون مہندی منگواتا ہوں۔''

''اور میرے لیے چوڑیاں بھی۔'' آفرین چہکی۔

''ٹھیک ہے۔''

پھپھو نے اسے بتایا تھا کہ کوالالمپور میں فرحان کے ایگزام ختم ہو چکے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ عید سے دو تین دن پہلے اس کے پھوپا جاوید اور فرحان بھی یہاں پہنچ جائیں۔

یہ سب کچھ صالح اور آفرین کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ خاص طور سے صالح کو۔ اسے پتا تھا کہ بابا سرخاب منزل سے باہر تو جانے نہیں دیں گے لہٰذا اس نے چار دیواری کے اندر ہی تفریح کے چند پروگرام بنا لیے تھے۔ وہ اور فرحان دوپہر کے وقت تالاب میں نہا بھی سکتے تھے اور پرانی یادیں تازہ کر سکتے تھے مگر آفرین شاید اب نہیں نہا سکتی تھی۔ صالح کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آفرین کے اندر جو تھوڑی سی جسمانی تبدیلیاں آئی ہیں، اس کے بعد اس کا کپڑوں سمیت نہانا بھی مناسب نہیں ہوگا۔

تیسرے روز اس نے داجے سے فرمائش کر کے سرگودھا سے اسپیشل کون مہندی اور چوڑیاں بھی منگوائیں۔ ایک طرح سے داجے کی حیثیت اب صالح کے بزرگ کے علاوہ اس کے رازدار کی سی بھی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی اکثر باتیں اپنے تک محدود رکھتے تھے۔

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا مگر عید سے چھ سات دن پہلے ایک ایسا موڑ آیا جس نے بہت کچھ بدل کر رکھ دیا۔

کسی بات پر صالح کے بابا اور پھپو میں تلخ کلامی ہوئی جو بڑھتی چلی گئی اور گرجنے برسنے کی آوازیں صالح کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ یہ شام کا وقت تھا۔ صالح گھبرایا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور بابا کے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ راستے میں اس نے پھپو کے کمرے میں جھانکا۔ یقیناً آوازیں آفرین تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ گھٹنوں تک لحاف لیے بستر پر ساکت بیٹھی تھی۔

صالح دبے پاؤں بابا کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ آوازیں اس کی سماعت مجروح کرنے لگیں۔ بابا شاہنواز کہہ رہے تھے۔ ''تم صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتی ہو کہ تم نے جگہ پہنچی ہے یا نہیں۔ ساڑھے تین کروڑ کم نہیں ہیں۔ میں تمہیں لکھ کر دے دیتا ہوں کہ اس سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

''بھائی جان! آپ نے خود کہا تھا کہ پھینک بھی دیں گے تو پانچ چھ کروڑ کہیں نہیں گیا۔''

''تب کی بات اور تھی۔ تمہیں ہزار مرتبہ بتایا ہے کہ وہاں سے سڑک نکلنے کا پروگرام تھا جو اب نہیں نکل رہی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم سب سمجھتی ہو۔ اس کے باوجود معاملے کو جان بوجھ کر لٹکا رہی ہو۔ پورا ایک مہینا ہو گیا ہے تمہیں یہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے۔''

''اچھا جی ... ! تو آپ کو میرا یہ ایک مہینا ہی زیادہ تکلیف دے رہا ہے۔ آپ بھول رہے ہیں کہ کبھی یہ میرا بھی گھر تھا۔ یہاں کے چپے چپے پر ہم دونوں بہنوں کے قدموں کے نشان ہیں۔ اب آپ ....''

''بند کرو اپنی یہ بکواس۔'' بابا نے بات کاٹی۔ ''سن سن کر کان پک گئے ہیں میرے .... اور ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ بچوں کے بارے میں جو کھچڑی پک رہی ہے نا تمہارے اندر ... بند کر دو اس کو پکانا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو میری لاش پر ہوگا۔''

چند لمحے ایک سنگین سناٹا رہا پھر پھپو کی دل فگار آواز ابھری۔ ''ٹھیک ہے بھائی جان! ٹھیک ہے۔ آج مجھے یہ سب کچھ بھی سننا تھا اپنے بھائی کے منہ سے ... اور یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ بات صرف پراپرٹی کی نہیں ہے۔ آپ ویسے ہی جلد سے جلد مجھے یہاں سے دفع کرنا چاہتے ہیں ... ہو جاتی ہوں میں دفع ... کل ہی ہو جاتی ہوں ... اور یہ بھی قسم کھاتی ہوں کہ دوبارہ آپ کو اپنی منحوس شکل دکھانے کے لیے پاکستان نہیں آؤں گی ... کبھی نہیں آؤں گی۔ بس سمجھ لینا، ایک بہن مر گئی آپ کی۔''

دروازہ دھماکے سے کھلا اور صالح کی پھپو عاصمہ روتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ان کے کمرے سے ان کی مدھم مگر تلخ آواز سن رہا تھا۔ وہ آفرین سے ہی مخاطب تھیں۔ ''چل اٹھ، تیاری کر یہاں سے جانے کی۔ تجھے بھی بڑا شوق تھا ماموں کے گھر آنے کا۔''

صالح دیوار کے ساتھ سکتہ زدہ کھڑا تھا۔

☆☆☆

پوری سرخاب منزل پر ایک غمناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ وہ سرخاب منزل ہی نہیں ہے جہاں کل تک خوشی کی لہر تھی اور تہوار کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ رات کا بیشتر حصہ صالح نے جاگ کر ہی گزارا۔ کسی وقت اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھی امڈ آتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کل پھپو یہاں سے چلی جائیں گی۔

صبح ٹائم ٹیبل کے مطابق داجے فضل اسے جگانے آئے تاکہ وہ سیر کے لیے باغ میں جا سکے مگر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے انہیں صاف منع کر دیا۔ اس کے سینے میں دھواں سا پھیل رہا تھا۔ گھٹن جمع ہو رہی تھی۔ وہ بے نام خوشبو جس کا تعلق پھپو اور آفرین کی آمد سے تھا، اس گھر ڈوب ابھر رہی تھی جیسے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ اس اپنی سوجی سوجی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کپڑا کر کے پھپو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیسری یا چوتھی دستک پر پھپو نے دروازہ کھولا۔ ان کی آنکھیں بھی کچھ ورم زدہ تھیں اور چہرے پر سختی تھی۔

''السلام علیکم پھپو!''

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

''کیا ... آپ ... ناراض ہیں؟''

''ناراض اپنوں سے ہوا جاتا ہے۔ یہاں میرا کوئی نہیں۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔ ''اور تم بھی جاؤ یہاں سے جاؤ۔'' انہوں نے اسے باقاعدہ دھکیل دیا اور دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں موجود کوئی نہایت نازک شے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی ہے کبھی دوبارہ نہ جڑنے کے لیے۔

(جاری ہے)

کبھی جبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں...

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... ل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

آخری شام سے پہلے

طاہر جاوید مغل

دوسرا حصہ





بظاہر وہ بڑا ہی روشن اور خوشگوار دن تھا مگر صالح کے لیے بے حد تاریک اور غمناک تھا۔ سرما کی سنہری دھوپ ایسے جولائی کی چلچلاتی دوپہر کی طرح تکلیف دے رہی تھی۔ تہوار کی تیاریاں زہر لگ رہی تھیں اور کوئی بھی مسکراتا چہرہ دیکھ کر صالح کا جی چاہتا تھا کہ اس پر کچھ دے مارے۔ کیوں خوش تھے یہ لوگ..... کیوں آرہی تھی یہ عید..... کیوں خوشی کے شادیانے بجائے جارہے تھے؟

اس کا دل رو رہا تھا اور اس کے اندر جیسے صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ پھپھو واپس ملائیشیا جارہی تھیں اور ان کے ساتھ وہ بھی جارہی تھی جس کے بغیر اسے جینا محال لگ رہا تھا۔

سہ پہر کو داجے فضل کی زبانی صالح کو پتا چلا کہ اس کی پھپھو کل تک کے لیے رک گئی ہیں۔ شاید انہیں ایک دو کام نمٹانے ہیں۔ صالح کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ بابا جانی اور پھپھو میں صلح ہوجائے۔ بابا جانی انہیں جانے سے روک لیں۔ اس تہوار کے موقع پر انہیں یوں ناراض ہوکر نہ جانے دیں۔

رات تک اس کی امید برقرار رہی مگر پھر اس طرح ٹوٹی کہ دل کچھ اور بھی زخمی ہوگیا۔ رات نو دس بجے بابا جانی اور پھپھو عاصمہ میں پھر کسی بات پر شدید جھگڑا ہوا۔ اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بابا کے کمرے کی طرف جاکر ان کی آوازیں سن سکتا۔ بس چند اڑتے اڑتے سے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔

پھپھو نے پکار کر کہا تھا۔ ”رکھ لیں یہ سارے کاغذات۔ مجھے ایک پھوٹی کوڑی نہیں چاہیے اس پراپرٹی میں سے۔ یہاں بہنوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں اس سب پر۔“

”اپنی زبان کو لگام دے عاصمہ! میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ پھر کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ شاید بابا غصے میں آکر حسبِ عادت کچھ توڑ ڈالا تھا۔

صالح سہم کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اوپر تک لحاف اوڑھ لیا۔ لحاف جو اس کے لیے ایک پناہ گاہ کی طرح تھا۔

اگلے روز صبح سویرے وسیع و عریض پورچ میں ٹیکسی کار کھڑی تھی اور ڈرائیور، پھپھو اور آفرین کا مختصر سامان ڈکی میں رکھ رہا تھا۔ سرخاب منزل میں چار پانچ گاڑیاں تھیں مگر پھپھو نے گھر کی کسی گاڑی میں جانا پسند نہیں کیا۔ صالح کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے پھپھو کے عقب میں گم صم آفرین کو دیکھا۔ اس نے ٹراؤزر پر سرخ رنگ کا لمبا سوئیٹر پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک جاتا تھا۔ بال قدرے منتشر تھے اور پھپھو کی طرح اس کی آنکھیں بھی ورم زدہ تھیں۔ دونوں کی نگاہیں چند لمحوں کے لیے ملیں۔ کسی نے جیسے کند چھری سے صالح کا دل چیر ڈالا۔ آفرین کی خاموش نگاہوں نے کہا۔ ”اب میں کبھی نہیں آؤں گی..... کبھی نہیں۔“

اس کا دل چاہا کہ دوڑ کر جائے اور آفرین کا بازو پکڑ لے۔ اسے روک لے۔ وہ آفرین کا بازو تو نہ پکڑ سکا مگر آگے جاکر وہ پھپھو کے پاس ضرور کھڑا ہوگیا۔ تھوک نگل کر بہ مشکل بولا۔ ”آپ..... جارہی ہیں؟“

انہوں نے گھوم کر اسے دیکھا۔ پہلے تو لگا کہ پھر کل کی طرح اسے دھکا دے دیں گی مگر شاید انہوں نے خود کو سنبھالا۔ بوجھل دل کے ساتھ صالح کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک لفظ کہے بغیر آفرین کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔

ٹیکسی روانہ ہوئی۔ آفرین نے ایک بار پھر کھڑکی میں سے دیکھا۔ تب نہ جانے کیوں صالح کو محسوس ہوا کہ اس نے کچھ کہا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تب تک ٹیکسی کار کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆☆☆

صالح کے لیے وہ بڑی دلدوز عید تھی۔ کچھ لوگ عید مناتے ہیں، کچھ گزارتے ہیں مگر صالح نے وہ عید کاٹی تھی سزا کی طرح۔ اس روز اسے یہ پتا بھی چلا تھا کہ جب انسان دکھ اور تکلیف میں ہو تو اردگرد کی سرگرمیاں کتنی ہولناک ہوجاتی ہیں۔

داجے فضل جانتے تھے کہ صالح کس کرب سے گزر رہا ہے۔ کسی حد تک سفید بالوں اور تھکے تھکے چہرے والی آیا (ماماں بی) کو بھی اندازہ تھا۔ وہ دونوں اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے مگر بابا شاہنواز تو جیسے بالکل پتھر تھے۔ انہیں صالح کی بے قراری، اداسی اور اس کے دکھ سے کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔ انہیں تو صرف اور صرف اس ٹائم ٹیبل کی فکر تھی جو انہوں نے کئی برس سے صالح پر لاگو کر رکھا تھا۔ اتنے بجے سونا، اتنے بجے اٹھنا، اتنا وقت کھانے پینے اور تفریح میں گزارنا اور اتنے گھنٹے پڑھنا۔ وہ پڑھائی پر جتنا زور دے رہے تھے، صالح کا دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا جارہا تھا۔ کسی وقت تو اسے لگتا تھا کہ وہ میٹرک کا امتحان بھی پاس نہ کرسکے گا۔

ایک شام جب وہ بے دلی سے بیڈمنٹن کھیلنے کے بعد داجے فضل کے پاس بیٹھا تھا، انہوں نے اپنی چھوٹی سفید داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”پتا ہے، اگلے مہینے کی دو تاریخ کو تمہاری سالگرہ ہے۔“

"اوہ!" صالح نے بے دلی سے کہا۔ "میں تو بالکل بھولا ہوا تھا۔"

پھر یکلخت جیسے اس کے دماغ میں بجلی سی چھوٹ گئی۔ اسے یاد آیا کہ جب آفرین یہاں تھی تو سالگرہ والی بات اس نے بھی کی تھی۔ اسے اس کی ممی نے سالگرہ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اپنے نہایت ملائم، ریشم جیسے رخسار میں اپنی انگلی کھبو کر ادا سے بولی تھی۔ "وہ تاریخ کو تمہارا برتھ ڈے ہے نا؟ میں اور ممی تمہیں بہت اچھا سا گفٹ دیں گے۔"

صالح نے کہا۔ "مگر تم نے تو شاید اسی مہینے کی انیس یا بیس تاریخ تک چلے جانا ہے۔"

وہ کچھ لمحے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ "اگر چلی گئی تو پھر تمہیں ملائیشیا سے ہی برتھ ڈے کا کارڈ بھیجوں گی۔"

"وعدہ؟"

"ہاں، وعدہ۔"

.....اور وہ چلی گئی تھی۔ تو کیا اسے اپنا وعدہ یاد تھا؟ کیا وہ اسے کارڈ بھیجے گی؟ بھیج سکے گی؟

اس کے ساتھ ہی صالح کو آفرین کا وہ انداز یاد آ گیا جب وہ روانگی کے وقت ٹیکسی کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاید..... شاید تب خاموشی کی زبان میں اس نے یہی کہا ہو کہ وہ جا تو رہی ہے مگر یاد رکھے گی اور اس کی سالگرہ بھی نہیں بھولے گی۔

اگلے دو چار دن میں صالح نے اس بارے میں بہت سوچا اور اسے یقین سا ہونے لگا کہ برتھ ڈے کے موقع پر اس کے لیے آفرین کا کارڈ ضرور آئے گا۔

جوں جوں اس کا یقین پختہ ہوتا گیا، اسے یہ فکر لاحق ہوتی گئی کہ اگر ایسا ہوا اور آفرین نے اسے کارڈ بھیجا تو وہ اسے کیسے وصول کرے گا؟ اگر بابا یا داجے کو اس کی بھنک بھی پڑ جاتی تو ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔

زرد رنگ کا لیٹر باکس سرخاب منزل کے مردانے کے جانب مین گیٹ کے پاس تھا۔ وہ مردانے میں جاتا ہی کم تھا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ روزانہ ڈاک آنے کے وقت گیٹ کے قریب پہرا دیتا رہے۔

اچانک اس کے ذہن میں اپنے بدوگار ملازم اختر کا خیال آیا۔ اختر اس کے بھروسے کا شخص تھا اور کبھی کبھی تو اسے اپنے رازدار کی طرح لگتا تھا۔ صالح نے اس معاملے پر خوب غور کیا اور پھر چار پانچ روز بعد اختر سے اس سلسلے میں بات کی۔

سرگودھا سے ایک ڈاکٹر بابا کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ صالح چپکے سے باغ کی طرف کھسک گیا۔ وہاں اختر اگل مہر کے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ صالح نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور صدر برگ کی کیاریوں کے پار سفیدے کے درختوں کے پاس بیٹھ کر اپنا مطلب اس سے بیان کر دیا۔ اس نے آفرین وغیرہ کا نام نہیں لیا۔ بس اتنا بتایا کہ سات آٹھ روز تک باہر کے ملک سے ایک خط اس کے لیے آنے والا ہے۔ اس نے ملک کا نام بھی بتا دیا اور آخر میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ..... بلکہ ایسا ہی ہوگا کہ خط پر میرا نام بھی لکھا ہوگا۔ تم نے یہ خط یا کارڈ کسی کی نظر میں نہیں آنے دینا اور سیدھا مجھ تک پہنچانا ہے۔"

"جو حکم چھوٹے سرکار!" اختر نے فرمانبرداری کے انداز میں کہا۔

اختر نے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ کس کا خط ہے اور کس لیے آ رہا ہے مگر اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ سمجھ چکا ہے۔

☆☆☆

جوں جوں سالگرہ کا دن قریب آ رہا تھا، صالح کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاک عموماً سہ پہر کے وقت آتی تھی جب صالح گراؤنڈ میں ہوتا تھا اور بیڈمنٹن یا فٹ بال وغیرہ سے اپنا دل بہلانے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔ سمجھ دار اختر اس وقت گراؤنڈ کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ صالح کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں اور وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں صالح کو بتا دیتا تھا کہ فی الحال کوئی خط نہیں۔

صالح کی سالگرہ بھی ذرا مختلف انداز میں ہوتی تھی۔ خصوصی لنگر پکایا جاتا تھا۔ دو کالے بکرے ذبح ہوتے تھے۔ بابا شاہنواز کیک وغیرہ کاٹنے کو اچھا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن داجے فضل کے کہنے سننے پر اس حد تک آمادہ ہو گئے تھے کہ رسماً ایک چھوٹا کیک کاٹ لیا جائے اور ملازمین کا منہ میٹھا کرانے کے لیے زردے یا حلوے کی ایک دو دیگیں بنا لی جائیں۔ باہر کا مہمان تو کوئی ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہاں، ایک دو بار لاہور سے اس کی بڑی پھپھو خدیجہ اپنے بچوں کے ساتھ ضرور آئی تھیں۔ پھپھو خدیجہ چونکہ بابا جانی سے بڑی تھیں اور ان کی ہم مزاج بھی تھیں لہٰذا ان سے بابا جانی کی گاڑھی چھنتی تھی۔

.....سالگرہ میں اب بس تین روز رہ گئے تھے۔ صالح کی بے چینی عروج پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے انتظار کی ناقابلِ بیان کیفیت سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ سارا دن بے چینی سے سہ پہر کا انتظار کرتا پھر اختر کے خاموش

نگاہوں میں مایوسی کا سندیسہ پڑھتا اور اگلے چوبیس گھنٹوں کے لیے پھر انتظار کی سولی پر لٹک جاتا۔

دوسرا دن گزرا، تیسرا دن گزرا اور پھر سالگرہ سے ایک روز پہلے کی آخری سہ پہر بھی آ گئی۔ صالح کو مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ بس اپنے خیالوں میں ہوائی قلعے ہی تعمیر کرتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی کہ یہ سالگرہ بھی اس مرتبہ کی عید کی طرح مایوس کن اور دکھ بھری ہوگی۔

گراؤنڈ سے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور ریشمی لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے..... وہ کیوں کرے گی اسے یاد..... وہ کیوں بھیجے گی اسے کارڈ..... وہ ہزاروں میل دور بیٹھی اپنے ماحول میں گم ہوگی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ صالح نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے اختر اکھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سبزی کی وزنی ٹوکریاں تھیں۔ کبھی کبھی وہ بازار سے سودا سلف لے کر زنانے میں آ جاتا تھا۔ اس نے ایک ٹوکری نیچے رکھی اور اپنی واسکٹ کے اندر سے کوئی چیز نکال کر چپکے سے صالح کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ ایک لفافہ تھا۔

وہ سرگوشی میں بولا۔ ''یہ کل ہی آ گیا تھا مگر آپ کو دینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔'' پھر وہ جلدی سے آگے نکل گیا۔

خوشی کے سبب صالح جیسے رنگین فضا میں معلق ہو گیا اور اسے اپنے اردگرد کی ہر شے جھومتی اور ناچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا وہ کب کمرے میں آیا، کب دروازہ بند کیا اور کب لفافہ چاک کر کے کارڈ نکال لیا۔ بے شک یہ آفرین کی طرف سے ہی تھا۔ بڑا خوبصورت کارڈ تھا۔ تصویر میں ایک گھنگھور گھٹا افق پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک لڑکا پھولوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے اردگرد بہت سے بچے رنگ برنگی چھتریاں لیے کھڑے تھے۔ ہر چھتری پر ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' کے الفاظ لکھے تھے۔

کارڈ کے اندر آفرین نے لکھا تھا۔ ''ہم تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ممی تو اکثر رو بھی پڑتی ہیں اور ساتھ میں مجھے بھی رلا دیتی ہیں۔ ہماری عید بہت بُری گزری۔ پتا نہیں تمہاری کیسی گزری۔ ماموں جی کی صحت اب کیسی ہے؟ پاپا کام کے سلسلے میں انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ دو تین ہفتے وہاں رہیں گے۔ تم اگر مجھے جواب دینا چاہو تو میں ایڈریس بھی لکھ رہی ہوں۔''

تحریر کا ہر ہر لفظ صالح کی نگاہوں کے سامنے رقصاں تھا۔ اس نے یہ کارڈ کئی بار پڑھا اور پھر ماماں بی کے آنے سے پہلے بڑی احتیاط سے الماری کے پیچھے چھپا دیا۔

سالگرہ کا دن خوشی خوشی گزار کر صالح نے جو پہلا کام کیا، وہ آفرین اور پھپھو کو خط لکھنے کا ہی تھا۔ اس نے پچھلے ایک ماہ کی ساری تڑپ اپنے خط میں منتقل کر دی۔ انہیں بتایا کہ اس نے عید کا دن اور عید کے بعد کے دن کتنے کرب میں گزارے ہیں۔

دو روز بعد اس کے کہنے پر اختر سرگودھا گیا اور یہ خط پوسٹ کر آیا۔

ایک بار پھر جواب کے انتظار کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اختر کے کی طرف سے سرخاب منزل کے لیٹر باکس کی نگرانی بھی شروع ہو گئی۔ صالح نے آفرین کو لکھا تھا کہ وہ اسے جلد جواب لکھے۔

جواب جلدی تو نہیں آیا مگر آ گیا۔ یہ بھی ایک خوش کن خط تھا تاہم اس میں تین چار سطور ذرا مختلف بھی تھیں۔ آفرین نے لکھا تھا کہ اس نے ممی کو برتھ ڈے کارڈ اور خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ ابھی بہت صدمے میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے بعد ان کو اور بھائی فرحان کو بتا بھی دے۔

آفرین کا دوسرا خط آنے کے فوراً بعد صالح نے جواب لکھنا شروع کر دیا۔ اس نے آفرین اور پھپھو کی دوری کا ذکر کیا اور اس ویرانی کا ذکر کیا جو ان دونوں کے جانے کے بعد سرخاب منزل کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔

یہ بھی ایک دلگداز خط تھا مگر اسے پوسٹ کرنے سے پہلے صالح کو ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔ دو بار تو خیریت گزری تھی اور اختر نے لیٹر باکس کا خوب اچھی طرح دھیان رکھا تھا مگر کیا ہر بار ایسا ہو سکے گا؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو.....؟ صالح کانپ کر رہ گیا۔ اسے آج تک وہ دو زنانے کے تھپڑ بھولے نہیں تھے جو سانولی ملازمہ کی وجہ سے اسے پڑے تھے۔ آج بھی صالح وہ تھپڑ یاد کرتا تھا تو اس کا ایک کان سائیں سائیں کرنے لگتا تھا اور نگاہوں کے سامنے بابا جانی کا غضب ناک چہرہ گھوم جاتا تھا۔

صالح نے خط پوسٹ کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سے پہلے وہ ایک اور کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اگلے روز موقع دیکھ کر اختر سے باغ کے ایک گوشے میں مختصر ملاقات کی اور اس کو بتایا کہ وہ اپنے نام آنے والے خط یہاں گھر میں منگوانا نہیں چاہتا۔ اختر کوئی ایسا انتظام کرے کہ خط کسی اور پتے پر آ جائے۔

اختر اس کا کوئی تسلی بخش حل نہ نکال سکا۔ اس نے دبی آواز میں کہا۔ ''چھوٹے سرکار! آپ کو تو پتا ہے میرا گھر ملتان میں ہے۔ آس پاس کوئی رشتے دار بھی نہیں کہ جس کے پتے پر خط منگوا سکوں۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے؟'' صالح نے الجھن سے کہا۔ ''تم ہر وقت تو لیٹر باکس کا پہرا نہیں دے سکتے۔''

''آپ کا کوئی یار دوست بھی نہیں جو اس کام میں آپ کی مدد کر سکے؟'' اختر نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ہیڈ مالی سلطان آتا دکھائی دیا اور اس کے آنے سے پہلے ہی اختر اجلدی سے دوسری جانب نکل گیا۔

اختر تو نکل گیا مگر جاتے جاتے جو وہ ''دوست'' والی بات کہہ گیا تھا، وہ صالح کے دل میں ایک نیا خیال جگا گئی۔ اس کے ذہن میں بابا کے پارٹنر انکل سیف کے بیٹے وقار کا خیال آ گیا۔ وقار سے صالح کی پہلی ملاقات کافی عرصہ پہلے بابا کے مرید برکات احمد کے گھر میں اتفاقاً ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں ہی وقار احمد، صالح کو بھلا لگا تھا۔ ایسا لڑکا جس سے ملنے اور دوستی کرنے کو دل چاہے۔ اس کے بعد شاید ایک آدھ دفعہ ہی وقار سے ملنا ہو پایا تھا۔ تاہم پچھلے تین چار ماہ میں یہ صورتِ حال کچھ تبدیل ہوئی تھی۔ بابا جانی کے پارٹنر انکل سیف اکثر ان کی عیادت کے لیے سرخاب منزل آتے تھے۔ دو تین بار ایسا ہوا تھا کہ وقار بھی ان کے ساتھ تھا۔ بابا جانی کو اور ان کی ہدایت کے مطابق داجے فضل کو بھی بالکل پسند نہیں تھا کہ صالح اپنے ہم عمروں کے ساتھ میل جول رکھے۔ پھر بھی صالح اور وقار کو تھوڑی بہت گفتگو کا موقع ملتا رہا تھا۔ ان دونوں کا پسندیدہ موضوع کرکٹ تھا۔ وقار کی طرح صالح کو بھی کرکٹ پسند تھا مگر وہ کرکٹ کبھی نہیں کھیل پایا تھا کیونکہ یہ کھیل بابا جانی کو پسند نہیں تھا۔ شاید ان کے ذہن میں تھا کہ یہ عوامی اور گھٹیا کھیل ہے۔ مخدوم شاہنواز کے بیٹے کو کچھ مختلف کھیلنا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے صالح کو بچپن سے بیڈمنٹن اور فٹ بال کھلایا تھا اور اسے اپنے ساتھ پولو کے میچ دکھانے بھی لے جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو صالح کو یوں لگنے لگتا کہ بابا کی غیر معمولی محبت اور توجہ اس کے لیے ایک پھندے کی طرح ہے۔ گردن کے اس پھندے کے سبب وہ سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لے پاتا۔

صالح کو اندازہ تھا کہ اس اتوار کو انکل سیف کے ساتھ وقار بھی سرخاب منزل آئے گا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ اس خط والے مسئلے کے سلسلے میں وقار کو اعتماد میں لے سکتا ہے اور بات کر سکتا ہے۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ سرخاب منزل کی وسیع و عریض چھت کے ایک گوشے میں صالح اور وقار کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ انہیں اس طرح ملنے اور دو بدو بات کرنے کا موقع یوں بھی مل گیا تھا کہ بابا کی طبیعت کچھ خراب تھی اور انہیں ڈرپ وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ انکل سیف نیچے ان کے پاس تھے۔

صالح نے ذرا تذبذب کے ساتھ اور رک رک کر ساری بات وقار سے کہہ ڈالی تھی اور اس سے مدد کا طلب گار ہوا تھا۔ جب صالح اس طرح کھل گیا تو وقار کے لب و لہجے میں بھی بتدریج بے تکلفی آ گئی۔ اس نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ صالح کے نام آنے والے خط وہ اپنے گھر میں وصول کر لے گا اور سرگودھا آ کر صالح کا ملازم یہ خط لے آئے گا۔ سرگودھا شہر میں وقار کی رہائش سرخاب منزل سے چودہ پندرہ کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں تھی۔

اگلے ہی روز صالح نے اپنا لکھا ہوا خط اختر کو دیا اور وہ اسے شہر جا کر پوسٹ کر آیا۔ ایک بار پھر بڑی شدت سے جواب کا انتظار شروع ہو گیا۔ یہ انتظار خط پوسٹ کرنے کے سات آٹھ دن بعد شروع ہوا تھا اور پھر بتدریج اس کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ اختر کے سودا سلف لینے کے لیے ہر دوسرے تیسرے روز شہر جانا ہوتا تھا۔ وہ وقار سے بھی رابطہ کر لیتا تھا۔ اختر شہر سے واپس آتا تو صالح کی نگاہیں بے قراری سے اس کے سانولے چہرے کا طواف کرنے لگتیں۔

آخر اگلے ہفتے صالح کی مراد بر آئی۔ جواب آ گیا تھا۔ آفرین نے وہاں کا حال احوال لکھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ پاپا پھر انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ فرحان بھی ان کے ساتھ ہے۔ پاپا چاہتے ہیں کہ وہ انگلینڈ میں ہی کسی اچھے کالج میں داخل ہو اور وہاں اپنی پڑھائی مکمل کرے۔ آفرین نے بڑے معصوم انداز میں ان چوڑیوں اور مہندی وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا تھا جو عید کے موقع پر صالح نے بڑی چاہت سے خریدی تھیں مگر پھر آفرین اور اس کی ممی تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ آفرین نے میٹرک کے ایگزام کا ذکر بھی کیا تھا جو صالح کے سر پر تھے۔ اس نے لکھا تھا۔ ''میری طرح ممی بھی یہی چاہتی ہیں کہ تم بڑے اچھے نمبروں سے ایگزام پاس کرو اور ماموں جان تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔''

اس خط کا جواب بھی صالح نے فوراً لکھا۔ اس نے لکھا۔ ''میں نے وہ چوڑیاں اور مہندی کی اسپیشل کونز بڑی احتیاط سے سنبھال لی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گی پھر سردیوں کی چمکیلی دھوپ میں گھر

کی چھت پر بیٹھ کر میں تمہیں اور پھپھو کو اپنے ہاتھ سے مہندی لگاؤں گا۔"

اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ وہ توجہ سے انجینئرنگ کی تیاری کرے تو پھر اس خط کا جواب جلدی دے۔ جب وہ انتظار کر رہا ہوتا ہے تو پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگتا۔

اس مرتبہ خط کا جواب واقعی جلدی آیا۔ وہی نوعمری کی معصوم محبت کی خوشبو میں بسے ہوئے الفاظ تھے۔ بچپن اور لڑکپن کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کا تذکرہ اور اس امر کی شدید خواہش کہ کبھی پھر ان یادوں کو دہرانے کا موقع مل سکے۔

صالح کی ٹیچرز مس فرحت اور واجے فضل اس بات پر حیران تھے کہ صالح نے بڑی توجہ سے امتحان کی تیاری کی تھی اور اس کے پرچے بھی اچھے ہوئے تھے۔ بابا شاہنواز اس کی تعریف کم ہی کرتے تھے۔ بہرحال ان کا اتنا کہنا بھی بہت تھا کہ..... "ٹھیک جا رہے ہو صالح!"

اب سردیاں گزر گئی تھیں۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ باغ میں درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کیاریوں میں کلیاں چٹک رہی تھیں اور صالح کے دل میں بھی رنگ برنگے پھول کھلے رہتے تھے۔ امتحانات کے بعد آفرین اور صالح کے درمیان دو تین مزید خطوط کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ انہی خطوط کے ذریعے صالح کو معلوم ہوا کہ اس کا پھوپی زاد (آفرین کا بھائی) فرحان مستقل طور پر انگلینڈ شفٹ ہو گیا ہے۔ اسے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہاں ان نے اپنے ایک چچا کے پاس رہنا تھا۔ اپنے ایک خط میں آفرین نے اپنے سیدھے سادے انداز میں موبائل فون کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "مجھے معلوم ہے وہاں سرخاب منزل میں ماموں جان کی لگائی ہوئی پابندیاں بہت سخت ہیں۔ ان میں فون اور موبائل فون کی پابندی بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا کہ ہم موبائل فون پر ایک دوسرے سے بات کر سکتے، ایک دوسرے کو تصویریں بھیج سکتے لیکن اب تو ہمیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ مجھے ماموں جان اچھے لگتے ہیں کیونکہ وہ میرے ایک ہی ماموں ہیں لیکن ان کے غصے سے بہت ڈر بھی لگتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ ان کے غصے کی وجہ سے ہمارے "لیٹرز" کا آنا جانا بھی بند ہو جائے۔"

سرخاب منزل میں حالات جوں کے توں تھے۔ بابا جانی شاہنواز کی طبیعت بگڑتی، سنبھلتی رہتی تھی۔ ناف میں گولی کا زخم پوری طرح ٹھیک ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اس زخم کی وجہ سے پیٹ کے نچلے حصے میں گاہے بہ گاہے انفیکشن ہو جاتا تھا۔ بہرحال جیسے تیسے سردیاں گزر رہی تھیں، وہ کچھ بہتر محسوس کر رہے تھے۔ ان کی عیادت کے لیے انکل سیف بھی دو بار آ چکے تھے۔ ایک بار وقار بھی ان کے ساتھ تھا۔ وقار کی حیثیت اب صالح کے رازدار کی ہو چکی تھی۔ صالح کو محسوس ہوتا تھا کہ وقار کی شکل میں اسے ایک مددگار اور محبت کرنے والا دوست مل گیا ہے۔

آفرین کا اگلا خط کچھ تاخیر سے آیا مگر آخرکار آ گیا۔ ملازم اختر کے ذریعے جوں ہی خط صالح تک پہنچتا تھا، اس کے اردگرد کی اندھیر دنیا، روشن دنیا میں بدل جاتی تھی۔ وہ اس خط کو درجنوں بار پڑھتا اور پھر ست رنگے سپنوں میں کھو جاتا۔ ایک خوشبو سی مشامِ جاں میں پھیل جاتی۔ وہ ایک منظر بار بار تصور میں دیکھتا۔ آفرین کروٹ کے مل بستر پر لیٹی ہے۔ وہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا ہے۔ وہ اس ہاتھ کو اپنے نرم گرم رخسار اور تکیے کے درمیان رکھ لیتی ہے۔ صالح کی ہتھیلی دنیا کے خوبصورت ترین لمس سے آشنا ہو رہی ہے۔ جاگتی آنکھوں کے ساتھ صالح نے یہ منظر اتنی مرتبہ دیکھا تھا کہ اب اسے حقیقت کی طرح محسوس ہونے لگا تھا۔

..... اور پھر اچانک یوں ہوا کہ آفرین کے خط آنا بند ہو گئے۔ پہلے پہل تو صالح نے یہی سمجھا کہ شاید پچھلے خط کی طرح یہ بھی تاخیر کا شکار ہے مگر جب دو تین ہفتے کے جاں گسل انتظار کے بعد بھی خط نہیں آیا تو اس کی جان پر بن گئی۔ یہ کیوں ہوا تھا؟ کئی طرح کے اندیشے زہریلے سانپوں کی طرح اس کے دل و دماغ میں پھنکارنے اور اسے سہمانے لگے تھے۔ سب سے جانکاہ اندیشہ یہی تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پھوپا جان ماجد کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہو اور انہوں نے آفرین سے ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اس پر پابندی لگا دی ہو؟

پھر ایک اندیشہ اور بھی تھا۔ کہیں یہ تو نہیں ہوا تھا کہ کسی طرح بابا جانی کو اس خط کتابت کی بھنک پڑ گئی تھی۔ انہوں نے پھپھو عاصمہ سے یا پھوپا ماجد سے رابطہ کیا تھا اور سب کچھ ختم کر ڈالا تھا لیکن اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہاں سرخاب منزل میں بھی تو صالح کے لیے ایک طوفان کھڑا ہوتا۔

وہ جتنا سوچتا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ آفرین اور پھپھو اس سے ہزاروں میل دور بیٹھے تھے۔ وہ ان سے کیونکر رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں تھا کہ چند کلومیٹر دور سرگودھا میں جا کر اپنے دوست وقار سے ہی مل سکتا اور دکھ سکھ کی باتیں کر سکتا۔ اس نے آفرین کا آخری خط کئی بار پڑھا اور موجودہ صورتِ حال کی وجہ کھوجنے کی کوشش کی۔ خط میں

کسی طرح کا منفی اشارہ نظر نہیں آتا تھا۔ خط کے درمیان میں صرف تین چار سطور ایسی تھیں جن کے بارے میں اب اسے غور کرنا پڑ رہا تھا۔ آفرین نے لکھا تھا کہ کوالالمپور کے قریبی شہر سے اس کے چھوٹے چچا کی فیملی ان کے ہاں آئی ہوئی ہے۔ چچا کے دونوں بیٹے بھی ساتھ ہی تھے۔ ان میں سے ایک تو آٹھ دس سال ہی کا تھا مگر دوسرا جس کا نام عرفات تھا، آفرین کا ہم عمر تھا۔ تین چار سال پہلے صالح نے عرفات کو بس ایک بار بڑی پھپھو خدیجہ کے ہاں شادی پر ہی دیکھا تھا۔ وہ چمکیلی آنکھوں والا تیز طرار اور باتونی لڑکا تھا۔ ہر کسی سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ عرفات کی آفرین کے گھر موجودگی نے صورتِ حال میں کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہو اور.....

اس سے آگے صالح کے لیے سوچنا بھی محال تھا۔ نہیں..... ہرگز نہیں۔ آفرین ایسی نہیں تھی۔ جس طرح صالح اسے پسند کرتا تھا، وہ بھی اسے بہت پسند کرتی تھی اور ان کا یہ تعلق کوئی چار چھ ماہ سے نہیں تھا۔ برسوں بیت گئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو سوچتے تھے، ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ بچپن، لڑکپن کی ان گنت یادیں تھیں جو ان کے دلوں میں ایک معصوم گداز جگاتی تھیں۔ جیسے..... جیسے کالی گھنگھور گھٹاؤں اور بارش والا وہ یادگار دن جس کو صالح بھول کر بھی بھول نہیں پاتا تھا۔ جب انہوں نے آسمان سے برستے پانی میں دیوانہ وار رقص کیا تھا، کھیلے کودے تھے، دھینگا مشتی کی تھی، ایک دوسرے کے منہ پر نرم جامنوں کا گودا مل دیا تھا..... ایک دوسرے کو گدگدی کی تھی اور ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا تھا۔ کاش وہ ایک دن بھی دوبارہ آسکے..... کاش۔ صالح نے سیکڑوں ہی بار سوچا تھا۔

اور اب نہ جانے کیا ہوا تھا۔ تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ آفرین کی طرف سے مکمل خاموشی تھی اور پھپھو کی طرف سے بھی۔ وہ ہزاروں میل دور بیٹھے تھے اور نہ جانے وہاں کیا ہوا تھا؟ اگر کچھ ہوا ہی تھا تو آفرین چند سطریں لکھ دیتی۔ اسے یوں انتظار کی سولی پر تو نہ لٹکاتی۔

صالح بے شمار پابندیوں کے حصار میں تھا اور انتظار کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اختر اہر دوسرے تیسرے روز سرگودھا کا پھیرا لگاتا تھا۔ اس کی واپسی تک صالح سنگِ مرمر والی بالکونی میں بیٹھ کر امید بھری نظروں سے اس کی راہ تکتا رہتا تھا۔ جونہی اختر کی موٹر سائیکل سرخاب منزل کی حدود میں داخل ہوتی، صالح کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں پھر موٹر سائیکل مزید نزدیک آتی اور اختر کے تاثرات بھی نظر آنے لگتے۔ اس کے تاثرات ہی صالح کو سمجھا دیتے کہ اس دفعہ بھی وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں لوٹا۔

خزاں کی رُت کا آغاز تھا۔ درختوں سے زرد پتے گر رہے تھے۔ ایسے ہی زرد پتے صالح کے اندر بھی گرتے رہتے تھے۔ وہ بھری پُری سرخاب منزل میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کرتا تھا۔ کسی وقت اس کا جی بھر آتا۔ اس کا دل کرتا، اس کی ماں زندہ ہوتی۔ وہ ان کے زانو پر سر رکھ کر دیر تک روتا رہتا۔ ان سے کہتا۔ ”ماں! میرے دل میں بہت درد ہوتا ہے۔ وہ مجھے بہت یاد آتی ہے ماں! میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔“

اس نے سنا تھا کہ ماؤں کے سینے میں بے پناہ پیار ہوتا ہے۔ وہ اس پیار کی طاقت سے اپنی اولاد کے دکھوں کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ وہ اپنی پلکوں سے اپنے بچوں کے راستے کے کانٹے چن لیتی ہیں اور اپنی چاہت سے ان کے دامن خوشیوں سے بھر دیتی ہیں۔ اس نے بس سنا تھا، اسے کبھی اس چاہت کا تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے تو بس بابا کی شروط محبت ہی ملی تھی۔ وہ محبت جس میں محبت کم اور ولدیت زیادہ تھی۔ جو پابندیوں سے شروع ہو کر حکم پر ختم ہوتی تھی۔

بے شک آیا ماماں بی اس سے بہت پیار کرتی تھیں مگر ماں تو نہیں تھیں۔ بے شک واجے فضل کئی حوالوں سے اس پر مہربان تھے لیکن ماں تو نہیں تھے۔

صالح نے میٹرک مناسب نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ اب اصولی طور پر اسے کالج بھیجا جانا چاہیے تھا مگر بابا اس کی آگے کی اسٹڈی بھی سرخاب منزل میں ہی شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ان کے پاس ایک معقول بہانہ تھا کہ بابڑا فیملی سے ان کی مقدمہ بازی چل رہی ہے اور وہ اپنے اکلوتے بچے کے لیے کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتے۔ صالح جانتا تھا اور واجے فضل بھی سمجھتے تھے کہ یہ بس ایک عذرِ لنگ ہی ہے۔

انہی مایوسی بھرے دنوں میں اس کی ایک اور ملاقات وقار سے بھی ہوئی۔ دونوں کو دس پندرہ منٹ کے لیے چھت پر جا کر باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ صالح کی پریشانی کے سبب وقار بھی پریشان نظر آیا۔ اس نے حتی المقدور صالح کو تسلی دینے کی کوشش کی اور اسے امید دلائی کہ اس کی پھوپی زاد اچانک یوں اس کے ساتھ سب کچھ ختم نہیں کر سکتی۔ دیر ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک آدھ ہفتے میں کوئی اچھی خبر آجائے۔

پھر اس نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”یار صالح! تم کوئی

اور طریقہ کیوں نہیں اختیار کرتے؟ مثلاً تمہاری پھپھو خدیجہ تو کبھی کبھار یہاں آتی ہی رہتی ہیں۔ ان سے ہی سن گن لو کہ وہاں کوالالمپور میں کیا حالات ہیں؟"

صالح نے مایوس لہجے میں کہا۔ "دکی! تم ان پابندیوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکو گے جنہوں نے مجھے یہاں جکڑ رکھا ہے۔ بابا جانی جب نرم ہوتے ہیں تو بہت نرم ہوتے ہیں لیکن جب سخت ہوتے ہیں تو نظروں نظروں میں جان کھینچ لیتے ہیں۔ جب سے بیمار پڑے ہیں، کچھ اور بھی غصے والے ہو گئے ہیں۔"

یہی وقت تھا جب ماماں بی اسے ڈھونڈتے ہوئے چھت پر آ گئیں۔ انہوں نے صالح سے کہا۔ "بڑے سرکار تمہیں بلا رہے ہیں۔ کوئی کام ہے انہیں۔"

صالح اچھی طرح جانتا تھا کہ کام وام تو کوئی نہیں ہوگا۔ انہیں بس یہی پریشانی ہوگی کہ وہ اور وکی دونوں نظر نہیں آ رہے۔ وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا وقار کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

ہوا میں ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔ خزاں اپنے عروج پر تھی اور ایسا ہی موسم صالح کے اندر بھی تھا۔ انتظار تھک ہار کر نیم جان ہو گیا تھا اور امید کی ہر کرن بے مہر شاموں کی تیرگی میں ڈوب گئی تھی۔

ایک شام جب صالح باغ کے زرد، چُرمر کرتے پتوں پر گھوم رہا تھا، اسے اچانک یوں محسوس ہوا کہ آفرین کی آمد اور اس کے خطوں کی آمد کے بعد جو ایک خوشبو سی اس کی رگِ جاں میں بسی رہتی تھی، وہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی ہے۔ ایک بار پھر وہی بیزاری، جھنجلاہٹ اور غصے کی کیفیت اس پر حاوی ہو رہی ہے جو اس کے اندر ایک آتشیں جارحیت سی جگا دیتی تھی۔

اسے اپنے سامنے ہی سفیدے کا وہ ملائم، خم دار تنا نظر آ رہا تھا جس پر وہ چھریاں برسا کر اپنا دل ہلکا کیا کرتا تھا۔ آج پھر اس کا دل بہت بھاری تھا۔ اس نے زرد پتوں میں چھپی ہوئی ایک لمبی شاخ اٹھائی، اسے پاؤں کے نیچے دبا کر کچھ چھوٹا کیا اور پھر اسے سفیدے کے شفاف پنڈے پر برسانے لگا۔ پنڈے پر ہلکی ہلکی لائنیں نظر آنے لگیں اور پھر وہ بڑھتی چلی گئیں۔ وہ ہانپ گیا۔ بدن میں چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ آخر شاخ ٹوٹ گئی۔ اس نے اسے دور پھینک دیا اور اپنی سانسیں درست کرتا ہوا رہائشی حصے کی طرف چلا گیا۔

.....اب یوں ہونے لگا کہ کبھی کبھی پھر وہی دلہن اس کے لحاف میں آنے لگی جس کے ساتھ وہ بے تکلفانہ باتیں کرتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ اپنی مرضی کا وقت گزارتا تھا اور جس کی گھنی ریشمی زلفوں میں خود کو گم کر دیتا تھا۔

وقتی طور پر اس کے اندر کا تناؤ کم ہو جاتا تھا مگر یہ مصروفیت بعد ازاں اسے افسردہ بھی کر لیتی تھی۔ وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا تھا مگر چند دن بعد پھر وہی خیالی دلہن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے تصور میں آ دھمکتی تھی۔

وہ ایک بار پھر چڑچڑا، بدمزاج اور گوشہ نشین ہوتا جا رہا تھا۔ اکثر ماماں بی اور داجے فضل سے بھی کسی بات پر الجھ پڑتا تھا۔ وہ اپنے حصار سے نکلنا چاہتا تھا جہاں بس سرخاب منزل کی اونچی دیواریں تھیں، ادھیڑ عمر ملازمائیں تھیں، روکھا پھیکا بیڈمنٹن کا کھیل تھا یا پھر زور زبردستی کی پڑھائی تھی۔

ایک دن سیف انکل حسبِ معمول بابا شاہنواز کی عیادت کے لیے آئے تو وقار بھی ان کے ساتھ تھا۔ وقار کی آمد صالح کے لیے تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہوا کرتی تھی۔ دو تین روز سے بابا کی طبیعت پھر کچھ خراب تھی۔ وہ رات کو درد سے کراہتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وقار آیا تو صالح کو اس کے ساتھ تھوڑی دیر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ دونوں چھت کی سنہری دھوپ میں منڈیر سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ سرخاب منزل کی چار دیواری سے آگے دور تک کھیتوں کھلیانوں کے سبز اور سنہری مناظر دکھائی دیتے تھے۔ درختوں پر چہکارتے پرندے، آبی گزرگاہوں میں چمکتا ہوا پانی، اپنے اپنے کاموں میں مصروف کھیت مزدور، ٹیڑھے میڑھے راستوں پر گھنٹیاں بجاتے مویشی اور ان سب سے اوپر مضافات کا گہرا نیلا آسمان۔ صالح کو اچانک گھوں گھوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز وقار کے نیلے کوٹ کے اندر سے ابھری تھی۔ اس نے جلدی سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موبائل فون نکال لیا۔ اس نے فون کی اسکرین پر نظر دوڑائی اور پھر جلدی سے ایک جگہ پر اسکرین کو ٹچ کیا اور گھوں گھوں کی مدھم آواز بند ہو گئی۔

"دکی! تم موبائل فون ساتھ لے آئے ہو؟" صالح نے حیرانی سے کہا۔ "یہاں کسی کو پتا چل گیا تو میرے ساتھ ساتھ تمہاری شامت بھی آ سکتی ہے۔"

وقار بولا۔ "اسی لیے تو آواز بند کی ہوئی تھی۔ کوئی ضروری کال بھی تو آ سکتی ہے۔"

''مگر یہ گھوں گھوں کی آواز تو آ رہی تھی۔''

''یار! یہ وائبریشن کی آواز تھی یہ اس کا کسی کو کم ہی پتا چلتا ہے۔'' وقار نے جواب دیا اور پھر اسے بتایا کہ یہ اس کے ایک باتونی کلاس فیلو کی کال تھی اس لیے کاٹ دی۔

وہ دونوں اس گوشے میں سمٹے رہے اور موبائل کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ موبائل کے حوالے سے صالح کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یار وکی! ایک موبائل مجھے لا کر نہیں دے سکتے؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''کہتے ہو تو لا دیتا ہوں..... لیکن نہ ہی منگواؤ تو اچھا ہے۔ عام طور پر اس طرح کے کام چھپے نہیں رہتے۔ تمہارے بابا جانی یا داجے فضل کو پتا چل گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ انکل شاہنواز ویسے بھی آج کل غصے میں رہتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ہم دونوں کا ملنا جلنا بھی ختم ہو جائے۔''

صالح نے اس کے اندیشوں کو رد کر دیا اور وقار سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ملاقات میں اس کے لیے ایک موبائل فون، اس کی سم اور چارجر وغیرہ لے کر آئے گا۔

☆☆☆

نئے ماڈل کا ایک مہنگا اسمارٹ فون وقار نے اسے لا دیا تھا اور اس کے ابتدائی فنکشنز وغیرہ بھی سمجھا دیے تھے۔ موبائل فون کو چھپانے اور استعمال کرنے کے لیے صالح نے چھت کا ہی ایک چھوٹا پورشن استعمال کیا تھا۔ چھت کا یہ پورشن ایک دروازے کے ذریعے باقی کی چھت سے علیحدہ ہو سکتا تھا۔ یہاں ایک برساتی نما کمرا بھی تھا۔ صالح ''پڑھائی'' کے لیے کتابیں وغیرہ لے کر چھت پر چلا جاتا اور جب دسمبر، جنوری کی دھوپ کچھ چبھنے لگتی..... اور اکثر ہی اسے ''چبھنے'' لگتی تو برساتی نما کمرے کے اندر چلا جاتا۔

موبائل کے استعمال سے اس پر حیرتوں اور تجسس کے نئے نئے در وا ہونے لگے پھر اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس نے کب ''ریڈ لائن'' عبور کر لی اور جنسی مناظر کی اس ہوس ناک دنیا میں داخل ہو گیا جہاں ہر طرف ایک سرخ آندھی چل رہی تھی۔ کسی وقت تو وہ سکتہ زدہ سا رہ جاتا تھا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگتے، گلا خشک ہو جاتا، دل سینے میں ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے دھڑکنے لگتا۔

اب صالح کے پاس تصوراتی دلہن کی آمد و رفت بھی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کو اپنے پاس بلانے کے لیے صالح کو یہ چھت والا کمرا بہت موزوں لگتا تھا۔ اب اس دلہن کا تصور صالح کے ذہن میں اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ کسی وقت وہ گل بدن اسے جیتی جاگتی حقیقت لگتی تھی۔ وہ اسے نت نئے کپڑے پہناتا، نت نئے انداز سکھاتا اور وہ تو اس کے لیے موم کی ناک کی طرح تھی۔ جس طرف موڑتا، مڑ جاتی۔ صالح کی دلچسپیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

بابا جانی تو چھت پر آ ہی نہیں سکتے تھے۔ کسی وقت یہ ضرور ہوتا کہ داجے فضل یا ماماں بی یا کوئی اور ملازم چھت والا آہنی دروازہ کھٹکھٹاتا۔ ایسے میں صالح فوراً اندھیرے کمرے سے نکل کر چھت پر آ جاتا اور ظاہر یہی کرتا کہ وہ چھت پر تھا۔ اس کی کتابیں عموماً چھت پر رکھی میز پر ہی بکھری رہتی تھیں۔ یہ وہ کتابیں نہیں تھیں جن میں اب اسے بہت کم دلچسپی رہ گئی تھی۔

صالح اب زیادہ وقت چھت پر اور چھت والے کمرے میں بتانا چاہتا تھا مگر یہ کام ہو نہیں پاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بابا کو اس کا یوں دو دو گھنٹے غائب رہنا بالکل نہیں بھا رہا۔ وہ اس کی ٹیچر فرحت سے بھی باز پرس کرتے رہتے تھے۔ تاہم صالح کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی من مرضی کا زیادہ وقت ملنے والا ہے۔ بابا کی طبیعت اچھی نہیں ہو رہی تھی۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ شاید انہیں لاہور جانا پڑے اور وہاں ان کا ایک چھوٹا سا آپریشن بھی ہو۔ دو دن پہلے بھی ایک ڈاکٹر اور ایک سرجن سرگودھا سے آئے ہوئے تھے۔ آپریشن کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے بابا کے چند ٹیسٹ بھی ہوئے تھے۔ آج اس بارے میں حتمی فیصلہ ہونا تھا۔

شام کے وقت صالح، بابا کے کمرے میں گیا تو وہ بشاش بشاش بیٹھے تھے۔ ''کیا حال ہے بابا؟'' وہ ذرا چونک کر بولا۔

''کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ رپورٹس بھی آ گئی ہیں۔ ڈاکٹر کھوکھر کا کہنا ہے کہ فی الحال آپریشن کی بالکل ضرورت نہیں۔ دواؤں سے کام چل جائے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' صالح نے خوش نظر آنے کی کوشش کی۔

اسی دوران میں بابا کی کوئی کال آ گئی اور وہ فون سننے میں مصروف ہو گئے۔ صالح سر جھکا کر باہر نکل آیا۔

وہ ایک طرح کی مایوسی محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ بابا ایک دم بشاش بشاش نظر آنے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپریشن والا خطرہ ٹل گیا تھا لیکن خطرہ ٹلا ہی تو تھا، ختم تو نہیں ہوا تھا۔

سوچتے سوچتے وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ شدید دھچکا سا

محسوس ہوا۔ یہ وہ کس انداز میں سوچنا شروع ہوگیا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ بھی تھا، وہ اس کے بابا تھے۔ انہوں نے ماں اور باپ بن کر اسے پالا تھا۔ وہ دیر تک متضاد خیالوں میں الجھا رہا۔ فرسٹریشن بڑھتی جارہی تھی۔ وہ کیوں آزادی سے سانس نہیں لے سکتا تھا۔ وہ لحاف کو ایک طرف پھینک کر بستر سے اٹھ گیا۔ سردیوں کی مختصر شام کے سائے سرخاب منزل پر طویل ہورہے تھے۔ ایک اور لمبی بے کیف شب سرخاب منزل پر اور گرد کے کھیتوں پر اور دیہاتوں پر، راستوں پر اور پانیوں پر مسلط ہونے والی تھی۔ وہ باغ میں پہنچا۔ زرد پتوں کے نیچے سے بید کی چھڑی نکالی اور سفیدے کے خم دار درخت کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ اب بھی کبھی اسے یوں لگتا تھا کہ یہ درخت نہیں ہے، نہایت ریشمی رخساروں اور گھنے، چمکیلے بالوں والی آفرین ہے جو اسے دھوکا دے کر نہ جانے کن روشنیوں اور رنگوں میں گم ہوگئی ہے۔ وہ اس سے بدلہ لے رہا ہے۔ اسے اس کی بے وفائی کی سزا دے رہا ہے۔

اگلے روز وہ پھر چھت والے کمرے میں جانا چاہ رہا تھا اور موبائل کے ساتھ مصروف ہونا چاہ رہا تھا مگر ٹیچر فرحت نے اسے روک دیا۔ انہوں نے اپنی موٹے شیشوں والی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ ''آج تمہارے بیالوجی والے ٹیچر بھی آرہے ہیں۔ بڑے سرکار نے کہا ہے کہ تم نیچے ہی رہو گے۔''

☆☆☆

صالح کے بابا شاہنواز اپنے کمرے میں وہیل چیئر پر موجود تھے۔ انہوں نے جسم کے نچلے حصے پر کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ وہ صالح کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ بیٹے کے لچھن انہیں اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پڑھائی کے بہانے کافی وقت چھت کے چھوٹے پورشن پر اور وہاں کے کمرے میں گزارنے لگا ہے۔ انہوں نے آج ہی اس کمرے میں تالا لگوادیا تھا اور صالح کے تینوں ٹیچرز کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ پڑھائی میں مصروف رکھیں۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے انہوں نے دیوار گیر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مالی سلطان کی بیوی حسب معمول زنانے حصے کے گملوں اور پودوں کو پانی وغیرہ دینے آرہی تھی۔ اس کی آٹھ نو سالہ بچی بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج انہوں نے پہلی بار اس عورت کو ذرا دھیان سے دیکھا تھا۔ دیگر ملازماؤں کی طرح وہ بھی ادھیڑ عمر تھی مگر سینے سے ڈھلکے ہوئے دوپٹے کے ساتھ اپنی عمر سے نسبتاً کم نظر آرہی تھی۔

شاہنواز نے سوچا اگر ان کی اپنی نظر چند لمحوں کے لیے اس پر ٹکی ہے تو کسی کی بھی ٹک سکتی ہے۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بٹھائے سلطان کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ آئندہ وہ اس کی بیوی گملوں، کیاریوں میں پانی دینے نہیں آئے گی۔ اگر مجبوری ہے تو وہ چھوٹی بچی کو بھیج دیا کرے۔

مالی سلطان ادب سے سر جھکا کر نکلا ہی تھا کہ فضل کریم ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے اندر آگئے۔ وہ اکثر سفید لباس میں ہی ہوتے تھے۔ ان کی واسکٹ اور گرم چادر بھی عموماً سفید ہی ہوتی تھی۔ فضل کریم کے چہرے پر الجھن اور ناگواری تھی۔ دونوں دھیمی آواز میں بات کرنے لگے۔

فضل کریم نے کہا۔ ''مجھے تم سے سخت شکایت ہے شاہنواز! تم جس طرح کی پابندیاں صالح پتر پر لگا رہے ہو، وہ اسے سدھاریں گی نہیں۔ تم یہ بات لکھ لو۔''

''تو کیا کروں میں..... اس کا بیڑا غرق ہونے دوں؟ تم دیکھ ہی رہے ہو، وہ میری اور تمہاری ساری کوشش کے باوجود کس طرف جارہا ہے۔ نہ نماز روزہ، نہ صحت مند تفریح، نہ صحت مند مطالعہ۔ اب کیا کررہا ہے وہ؟ اسٹڈی کے بہانے چھت پر جاتا ہے اور گھنٹوں کمرے میں بند رہتا ہے۔ احمق سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔'' شاہنواز رائے کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

فضل کریم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شاہنواز! وہ کمرے میں بند اس لیے ہورہا ہے نا کہ یہاں کچھ بھی اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ وہ کھیل تک اپنی مرضی کا نہیں کھیل سکتا اور یہ جو کمرے میں بند ہونے کی بات ہے، یہ بھی تو کوئی بہت بڑا گناہ نہیں ہے۔ شاہنواز! معاف کرنا، اپنا اور میرا لڑکپن یاد کرو۔ کیا ہم پر یہ اوٹ پٹانگ وقت نہیں گزرا؟ یہ دور سب پر آتا ہے۔''

''تم اس کی بے جا حمایت کرتے ہو۔'' وہ دانت پیس کر بولے۔ ''اگر کل کلاں وہ کسی عورت پر جھپٹ پڑے گا تو بھی تم اس کی سائڈ لینے لگ جاؤ گے۔''

''وہ نہیں جھپٹے گا۔ اپنے خون پر بھروسا رکھو مگر جس طرح کی پابندیوں میں تم اسے جکڑ رہے ہو، ان میں پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ پریشر کُکر سے بھاپ نکلنے کے سب راستے بند کردو گے تو نقصان ہی ہوگا نا۔''

شاہنواز نے غضب ناک نظروں سے فضل کریم کو گھورا مگر فضل کریم بھی شاید آج سب کچھ کہہ دینا چاہتے تھے، بولے۔ ''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ صالح کا کمرے میں

بند ہو کر بیٹھنا کوئی اچھی بات ہے مگر سوچو کہ اس سے کہیں زیادہ بدعادتیں جوان لڑکوں میں پیدا ہو جاتی ہیں... ہوتی ہیں کہ نہیں؟"

"بہت خوب۔" شاہنواز رائے نے ہولے سے تالی بجائی۔ "قربان جانے کو دل چاہتا ہے تمہارے اس نئے فلسفے پر۔ کچھ خدا کا خوف کرو فضل! صورت دیکھی ہے تم نے اس کمبخت کی۔ یہ بند کمرے کی عادت کھا رہی ہے اس کو۔ چہرہ دیکھو، پیلا زرد ہو گیا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بن جائے گا جلد ہی۔"

"پھر معافی چاہتا ہوں شاہنواز! لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم اب ہر منظر اپنی ذاتی سوچ کی عینک سے دیکھنے لگے ہو۔ وہ چنگا بھلا ہے۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔ لڑکے جب قد نکالتے ہیں تو دبلے لگنے لگتے ہیں۔ ہم خوامخواہ ضرورت سے زیادہ ڈراوے ڈال کر انہیں نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں اس کا مسئلہ بند کمرا نہیں، یہ بند حویلی ہے، یہ سرخاب منزل ہے۔"

شاہنواز رائے کی آنکھوں میں اب شعلے رقصاں ہو گئے تھے۔ فضل کریم ان کے بولنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور منہ میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔

شاہنواز رائے نے گرج کر کہا۔ "بات سنو۔"

فضل کریم رک گئے۔

"مجھے لگتا ہے کہ اب صالح کے معاملے میں سب کچھ مجھے ہی سوچنا پڑے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" فضل کریم نے کہا اور باہر نکل گئے۔

☆☆☆

حالات صالح کے لیے سخت سے سخت تر ہوتے جا رہے تھے۔ بابا نے چھت والے کمرے کو تالا لگوا دیا تھا اور چھت والا دروازہ بھی بند کروا دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ چھت کے اس سارے حصے کو اگلی بارشوں سے پہلے مرمت وغیرہ کرانے کی ضرورت ہے۔ صالح کو ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ چھت والا کمرا مقفل ہونے سے پہلے وہ وہاں سے اپنا موبائل فون اور چارجر وغیرہ بھی نہیں نکال سکا تھا جو ایک الماری کے عقب میں چھپایا ہوا تھا۔

بابا کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ وہ کسی وقت کرسی سے اٹھ کروا کر کے ذریعے بھی چند قدم چل لیتے تھے۔ ان کی ہدایت پر تین ٹیچرز اور مسز فرحت نے اس پر پڑھائی کی یلغار کر رکھی تھی۔ بابا ہر روز شام کو خود ٹیچرز سے صالح کے بارے میں رپورٹ لیتے تھے۔ سہ پہر کو کھیل کود کے وقت بھی وہ گراؤنڈ میں آ جاتے تھے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ وہ اس پر جتنی توجہ دے رہے تھے، وہ اتنا ہی صورتِ حال سے بیزار ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اور بابا کے درمیان ایک خلیج حائل ہو کر وسیع تر ہو رہی ہے۔

دادی فضل چند روز کے لیے اپنے گاؤں گئے تھے اور اب واپس آ گئے تھے۔ تاہم صالح صاف محسوس کرتا تھا کہ اب وہ اس سے کچھ فاصلہ رکھ رہے ہیں۔ ان کی جگہ عقابی آنکھوں والا ملازم جالا نوری ہمہ وقت صالح کے دائیں بائیں رہنے لگا تھا۔ جالا بھی سرخاب منزل کا پرانا ملازم تھا۔ وہ صالح کے بابا جانی کا ڈرائیور اور ذاتی ملازم ہونے کے علاوہ کسی وقت گارڈ کے فرائض بھی انجام دے لیتا تھا۔ صالح کے رازداں جواں سال ملازم اختر کے خیالات جانے کے بارے میں کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔

پابندیوں کا دباؤ صالح پر بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی گھٹن بھی۔ کچھ معاملوں میں تو حد ہی ہو جاتی تھی۔ مثلاً بچپن کی بات اور تھی۔ اب وہ کمرے میں اکیلا سونا چاہتا تھا مگر بابا نے آیا ماں بی کو اس پر مسلط کیا ہوا تھا۔ وہ رات کا زیادہ تر حصہ جاگ کر ہی گزارتی تھیں۔ اٹھ اٹھ کر دیکھتی رہتی تھیں کہ صالح نے چادر یا لحاف ٹھیک سے لیا ہوا ہے یا نہیں۔ سہ پہر کے ٹیلے کے وقت بھی وہ صالح کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ ایک دن صالح نے چڑ کر کہہ دیا تھا۔ "بس آپ مجھے گود میں ہی بٹھا کر رکھا کریں۔"

اُس روز ماں بی اپنی بیٹی سے ملنے میانوالی گئی تھیں۔ اسے ڈلیوری ہوئی تھی۔ انہیں تین چار روز وہاں رہنا تھا۔ صالح اپنی گھٹن میں کچھ کمی محسوس کر رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے کی محرابی کھڑکی کے سامنے بیڈ پر دراز تھا۔ نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ مالی سلطان کی آٹھ نو سالہ بیٹی زری کیاریوں میں پانی دے رہی تھی۔ وہ کئی دن سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دو دن پہلے اس نے اسے چند ٹافیاں بھی دی تھیں جو اس نے ذرا ہچکچا کر قبول کر لی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس گندمی رنگت والی دبلی پتلی لڑکی کو دیکھ کر صالح کے اندر ایک حدت سی پیدا ہونے لگتی تھی۔ منہ خشک ہو جاتا تھا۔

آج پھر جب وہ پانی دیتی ہوئی کھڑکی کے قریب آئی تو صالح نے دائیں بائیں دیکھا پھر کھڑکی ذرا سی کھول کر بولا۔ "زری! اوئے ٹافی کھاؤ گی؟"

"ن... نہیں جی۔" وہ باریک آواز میں بولی۔ "ابا

منع کرتا ہے چیز لینے سے۔ وہ غصے ہوگا۔"

"غصے کیوں ہوگا؟ میں کوئی غیر ہوں؟ اور تم ٹافیاں اس کے پاس لے کر کیوں جاؤ گی۔ ادھر ہی کھالینا۔" اس نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھ کر اور کھڑکی کی گرل سے ہاتھ نکال کر چار پانچ نرم نرم ٹافیاں اس کی ننھی سی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ وہ ٹافیاں اپنی اوڑھنی میں لپیٹتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

نہ چاہنے کے باوجود صالح کے ذہن میں ناپسندیدہ و آتشیں خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ صالح کے کمرے کے فرش پر دو بڑے بڑے گل دان رکھے تھے۔ کبھی کبھی ان میں بھی موسمی پھول سجائے جاتے تھے۔ اگلے روز اس نے کھڑکی سے ہی زری کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس سے کہا کہ وہ گل دانوں کے لیے پھلواری سے چند پھول توڑ لائے۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھول لے آئی۔ صالح نے پھر اسے کچھ کاجو اور ٹافیاں دیں۔ چند ہلکی پھلکی باتیں بھی کیں۔ ماسی صبین نے اسے صالح کے کمرے میں دیکھا بھی مگر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ چھوٹی سی بچی ہی تو تھی۔

اگلے روز جب وہ صالح کے کمرے میں آئی تو کچھ بے تکلف ہو چکی تھی۔ صالح نے کہا۔ "تم گم صم کیوں رہتی ہو۔ ہنستی بولتی کیوں نہیں؟"

"جی بس....." وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

صالح نے اسے ہنسانے کے لیے تھوڑی سی گدگدی کی۔ وہ کسمسا کر مسکرائی تو صالح نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ اچانک ہی اس پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دم اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ وہ ایک بار پھر سہم گئی تھی۔ صالح کو یوں لگا جیسے کچھ بھی اس کے بس میں نہیں رہا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا تھا۔ وہ اس سے دست درازی کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کہہ رہا تھا۔ "کسی کو بتانا نہیں..... کسی کو بتانا نہیں۔"

وہ چپ تھی اور صالح اس چپ سے حوصلہ پکڑ رہا تھا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ صالح کی وحشت سے ٹکرا کر وہ معصوم ایک دم زور سے چلائی اور پھر چلاتی چلی گئی۔ ساتھ ساتھ وہ صالح کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھڑکی کے قریب رکھا ایک قیمتی گل دان چکنا چور ہو گیا۔

زری کی پکار سن کر کوئی دھڑا دھڑ کمرے کا بند دروازہ پیٹنے لگا۔ داجے فضل کی بھاری آواز صالح کے کانوں سے ٹکرائی۔ "صالح! دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو۔"

ایک دم ہی جیسے صالح کی آتش پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ ہر چیز اس کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ زری اس کے باہوں کے حصار سے نکل گئی۔ اس نے تالے کی پھرکی گھما کر دروازہ اَن لاک کر دیا۔ وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر داجے فضل نے اسے پکڑ لیا اور اندر لے آئے۔ داجے فضل کے ساتھ ہی ماماں بی اور ماسی صبین بھی اندر آ گئی تھیں۔ سب کے زرد چہروں پر حیرت اور خوف کی یلغار تھی۔

"دروازہ بند کر دو۔" داجے فضل نے تحکم سے ماسی صبین کو کہا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ داجے فضل کی قہر آلود نگاہیں جیسے صالح کے سینے کے پار ہو گئیں۔ "بس یہی کسر رہ گئی تھی۔ یہی رہ گئی تھی بدبختا!" وہ کرب ناک آواز میں کراہے۔

انہوں نے ننھی بچی کو اپنی بانہوں میں دبوچ رکھا تھا اور اس کا چہرہ یوں اپنے پیٹ کے ساتھ دبایا ہوا تھا کہ اس کی آہ و پکار دب کر رہ گئی تھی۔ وہ مسلسل "ابا..... ابا" پکار رہی تھی۔ شانے سے اس کا پھول دار فراک پھٹ چکا تھا اور بازوؤں پر خراشیں تھیں۔

ماماں بی اور صبین کے جسم بھی لرز رہے تھے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ داجے فضل نے کمرے کے بغلی دروازے کی طرف اشارہ کیا اور صالح سے مخاطب ہو کر آتشیں لہجے میں پھنکارے۔ "کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے خبیث! دفع ہو جا اب..... یہاں سے نکل جا۔"

صالح لڑکھڑاتا ہوا سا بغلی دروازے کی طرف بڑھا اور کھول کر برآمدے کی طرف نکل گیا۔

اس کا منہ بالکل خشک تھا اور دل تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ چند لمحوں کے لیے اس کا دل چاہا کہ مین گیٹ کی طرف جائے اور باہر نکل کر کھیتوں، کھلیانوں اور درختوں میں کہیں گم ہو جائے۔ مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بے شک وہ جوان ہو چکا ہے مگر سرخاب منزل کے مکینوں کے لیے اب بھی ایک بچہ ہی ہے۔ بابا کی اجازت کے بغیر وہ باہر نہیں نکل سکے گا۔ گارڈ اسے روک لے گا۔

تب اس کی نگاہ لمبے چوڑے جالا نوری پر پڑی۔ گرم چادر اس کے کندھوں پر تھی اور وہ تیزی سے مردانے کی طرف جا رہا تھا جہاں بابا موجود تھے۔ چلتے چلتے جالے نوری نے تیکھی نظروں سے صالح کی طرف دیکھا اور اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ اس کے انداز نے چند لمحوں میں صالح کو

سمجھا دیا کہ وہ ساری سچویشن جان چکا ہے اور اب بابا کو مطلع کرنے جا رہا ہے۔ صالح کے خوف میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنے قدم حویلی کی چھت کی طرف بڑھا دیے۔ دھندلائے ہوئے سے ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ اگر بابا آگ بگولا ہو کر اس کی طرف آئے اور اسے مارنا پیٹنا یا پھر جان سے مارنا چاہا تو وہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔ وہ ان کے غضب سے تو بچ جائے گا۔

☆☆☆

سرخاب منزل کے مرداتے حصے کے ایک اندرونی کمرے میں شاہنواز رائے کا پارا ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ ان کے بالوں بھرے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول تھا اور وہ اپنے واکر کے سہارے کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ داجے فضل نے انہیں بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ''نہیں شاہنواز، نہیں..... اس طرح تماشا نہ بناؤ۔ بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا..... بہت زیادہ۔''

''ہو جائے نقصان۔'' وہ غضب ناک مگر دھیمی، سرسراتی آواز میں بولے۔ ''ایسی اولاد سے بے اولاد ہونا اچھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔'' انہوں نے فضل کریم کو دھکیل کر راستہ بنانا چاہا مگر فضل کریم اپنی جگہ ڈٹے رہے۔

''ہوش کرو شاہنواز! بچوں سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس سے بھی بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ انہیں جان سے نہیں مارا جاتا۔ کیوں رسوا ہونا چاہتے ہو سارے زمانے میں۔ پورے رائے خاندان کو رسوا کرنا چاہتے ہو۔ جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا لیکن اب اس سے بھی برا ہوگا۔''

''تو ہو جائے اس سے بھی برا۔ میں اس جہنمی کو عبرت کا نشان بنا دوں گا۔ اس نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔''

''ابھی کچھ نہیں بگڑا شاہنواز!'' فضل کریم نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''ہم وقت پر پہنچ گئے۔ میرے اور دو تین ملازموں کے علاوہ ابھی کسی کو پتا نہیں چلا۔ میں نے انہیں منہ بند رکھنے کا حکم دے دیا ہے۔ باقی بھی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔ تم بس خود کو سنبھالو۔ خدا کے لیے یہ بے وقوفی نہ کرو۔'' انہوں نے شاہنواز رائے کو اپنے بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ واکر گھسیٹ کر ان سے دور کر دیا۔

شاہنواز رائے نے فرطِ رنج میں اپنا سر دیوار سے ٹکا۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ ''ایسی اولاد پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں جاتی۔ کیوں اپنے پالنے والوں کو عذاب دینے کے لیے زندہ رہتی ہے۔'' تب انہوں نے پستول ایک طرف پھینکا اور دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ ''میں خود تھانے جاؤں گا۔ خود پولیس کو اطلاع دوں گا۔ اسے ہتھکڑیاں لگواؤں گا۔ چڑی ادھڑوا دوں گا اس کی۔ غضبِ خدا کا، ایک چھوٹی سی بچی.....''

فضل کریم نے پھر انہیں اٹھنے سے روکا۔ ''میں نے کہا ہے نا شاہنواز! میں سب سنبھال لوں گا۔ کسی کو تھانے جانے کی ضرورت نہیں اور کوئی نہیں جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے پستول اٹھا کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ٹھونس لیا۔ زخمی اور بیمار ہونے کے سبب شاہنواز رائے کی مزاحمت کمزور پڑ رہی تھی۔ انہوں نے اپنا سر پھر دیوار سے ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دو آنسو بند پلکوں کے نیچے سے رینگ کر ان کے زرد رخساروں پر آ گئے۔

فضل کریم ان کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ ان کا کندھا سہلاتے رہے پھر مدھم آواز میں بولے۔ ''شاہنواز! اسی لیے میں کہتا تھا نا کہ اس پر اتنی پابندیاں نہ لگاؤ۔ سب جانتے ہیں اس عمر میں کیسے کیسے ابال دل و دماغ میں ہوتے ہیں۔ ابالوں کے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ چھوڑنا چاہیے۔ سب کچھ بند کر دیا جائے..... پھر اولاد سے رابطے بھی ختم کر دیے جائیں تو پھر کچھ ایسا نکل جاتا ہے جو ماں باپ کے لیے آفت لے آتا ہے۔''

''اس کے باپ کو پتا چل گیا ہے؟'' کچھ دیر بعد شاہنواز نے اٹک اٹک کر لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں نے خود بتایا ہے سلطان کو اور اسے منہ بند رکھنے کے لیے کہا ہے۔ میں کہہ رہا ہوں نا تم سے..... سلطان وغیرہ کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

''اور دوسرے لوگ؟''

''میرے علاوہ صرف صالح کی آپا کو..... نصیبن کو اور جالے کو پتا چلا ہے۔ وہ اپنا منہ بند رکھیں گے۔''

''کیا اردگرد سب گونگے بہرے تھے؟'' شاہنواز نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

''ان کو یہی پتا ہے کہ بچی اس کے کمرے میں گئی تھی گل دانوں میں پھول رکھنے کے لیے۔ بے احتیاطی سے اس نے نیلے والا بڑا گل دان توڑ دیا۔ اس پر صالح غصے میں آیا اور اسے تھپڑ مارے۔''

"یہ تمہاری خام خیالی ہے فضل کہ بات چھپی رہے گی۔"
"کوئی ثبوت نہیں ہے کسی کے پاس۔ خیالی گھوڑے تو لوگ پتا نہیں کیا کیا دوڑاتے رہتے ہیں۔"
مخدوم شاہنواز کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ فضل کریم کی بات سے پوری طرح متفق نہیں ہیں۔ انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ تھوڑا سا پانی پیا اور تپائی پر رکھی تسبیح اٹھا کر ہولے ہولے گردش دینے لگے۔ ان کی آنکھیں ابھی تک کبوتر کے خون کی طرح سرخ تھیں۔ آنکھوں کے پپوٹے نم تھے۔ وہ جیسے تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچ رہے تھے۔
فضل کریم کو اب شاہنواز کی طرف سے قدرے تسلی ہوئی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں ذرا باہر کی صورت حال دیکھ لوں۔ تم عصر کی نماز پڑھ لو، قضا نہ ہو جائے۔"
شاہنواز رائے نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "باہر کے معاملات دیکھ کر تم میرے پاس آؤ۔ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"
فضل کریم نے ذرا چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر چلے آئے۔ احتیاطاً انہوں نے پستول ابھی تک اپنے کوٹ کی جیب میں ہی رکھا تھا۔
.....قریباً ایک گھنٹے بعد شاہنواز رائے اور فضل کریم ایک بار پھر مردانے کے اس اندرونی کمرے میں اکٹھے تھے۔ شاہنواز رائے خود کو کافی حد تک سنبھال چکے تھے مگر آنکھیں ابھی تک سرخ تھیں۔
"کہاں ہے وہ؟" شاہنواز نے صالح کا نام لیے بغیر مہیب لہجے میں فضل کریم سے پوچھا۔
"اوپر چھت پر چلا گیا تھا۔ رو رو کر برا حال کر رکھا ہے۔"
شاہنواز نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "فضل کریم! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"
"کیسا فیصلہ؟"
"اس کی شادی کا فیصلہ۔ میں اس کی شادی کر رہا ہوں اور وہ بھی ایک دو ماہ کے اندر اندر۔"
مخدوم شاہنواز رائے کے مزاج شناس فضل کریم چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "شاہنواز! تمہاری اولاد ہے۔ تم اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق رکھتے ہو مگر..... ابھی عمر چھوٹی ہے اس کی..... اور پھر اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اس کی پڑھائی نامکمل ہے۔ وہ اپنے طور پر ابھی کچھ کرتا ہی نہیں۔"
"اسے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سب کچھ جو ہے، اسی کا تو ہے۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی کاٹ بھی تھی۔
"لیکن شاہنواز! ابھی وہ صرف اٹھارہ سال کا ہے۔ اٹھارہ کا بھی پورا نہیں ہوا۔ لڑکی اس سے کچھ چھوٹی ہی ہونی چاہیے نا۔ اس چھوٹی عمر میں کون اپنی بچی کی شادی....."
"یہ سب کچھ سوچ لیا ہے میں نے۔" شاہنواز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم بس ایک دو روز میں اس کے کانوں تک یہ بات پہنچا دو..... اور یاد رکھنا، ابھی اسے میرے سامنے نہ لانا ورنہ کچھ برا ہو جائے گا مجھ سے۔"
"ٹھیک ہے شاہنواز! نہیں لاؤں گا لیکن....."
"لیکن کچھ نہیں۔ اب اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سننا مجھے۔ اس کے اندر بدچلنی اور خباثت کی جو آگ بھڑکنے والی ہے نا، اس کا یہی ایک شریفانہ حل میری سمجھ میں آتا ہے۔" ان کی انگلیوں میں چھوٹی تسبیح تیزی سے گردش کرنے لگی تھی۔
ان کے مزاج آشنا فضل کریم بھی سمجھ گئے تھے کہ اس بارے میں بحث اب فضول ہے۔

☆☆☆

مالی سلطان کی بچی زری والا سانحہ ہوئے اب دو ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ صالح کی معلومات کے مطابق پانچ روز پہلے یہ دیرینہ ملازم سلطان اپنے بیوی بچوں سمیت سرخاب منزل سے چلا گیا تھا۔ صالح جانتا تھا کہ داجے فضل کریم نے اسے کافی کچھ دے دلا کر یہاں سے رخصت کر دیا ہے۔ زری والا واقعہ اچانک کیسے اور کیونکر رونما ہو گیا؟ صالح کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس واقعے کی جلن، کڑھن بدستور صالح کے دل و دماغ میں موجود تھی۔ اب اس کی کڑھن میں یوں اور اضافہ ہو گیا تھا کہ بابا شاہنواز نے اس کی شادی کا الوکھا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے مرید برکات احمد کی بیٹی منتخب کی تھی۔ اس کا نام حیا احمد تھا۔ عمر بہ مشکل سولہ سال رہی ہو گی۔ کچھ عرصہ پہلے جب صالح، بابا کے ساتھ چند روز کے لیے اٹک برکات کے گھر واقع گجرات گیا تھا تو اس نے ایک دو بار حیا کو دیکھا تھا مگر یہ دیکھنا ایسا ہی تھا جیسے آنکھیں بند کر کے کسی باغ بانیچے کو دیکھا جائے۔ تھوڑی بہت خوشبو اور پرندوں کی چہکاریں ہی بندے تک پہنچ سکتی ہیں۔ حیا بھی وہاں کی دوسری خواتین کی طرح پردہ کرتی تھی۔ اب اس لپٹی لپٹائی خاموش طبع لڑکی کو اس سے بیاہنے کی بات کی جا رہی تھی۔
صالح کے بابا نے صالح کے ساتھ بول چال بالکل بند کر رکھی تھی۔ عجب تناؤ کا ماحول تھا۔ پھر ایک روز صالح کی

بڑی پھپھو خدیجہ لاہور سے آگئیں۔ انہوں نے صالح کو بابا سے معافی مانگنے پر آمادہ کیا..... اور بابا کو بھی آمادہ کیا کہ وہ صالح سے قطع کلامی ختم کردیں۔ ان کی کوششوں سے قطع کلامی تو کسی حد تک ختم ہوگئی تھی مگر جو طلیج باپ بیٹے کے درمیان وسیع تر ہو چکی تھی، اسے کون ختم کرسکتا تھا۔

صالح نے محسوس کیا تھا کہ پھپھو خدیجہ کی خوش باشی اور خوش گفتاری بھی کچھ ماند پڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ بھی پراپرٹی کا وہ معاملہ ہی تھا جو بابا شاہنواز اور ان کی دونوں بہنوں کے درمیان چل رہا تھا۔

..... نہ جانے کیوں آج کل پھر صالح کو شدت سے آفرین کی یاد آنے لگی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ مگر یہ سب کچھ جاننا اس کے بس میں نہیں تھا اور جب کچھ بھی اس کے بس میں نہیں ہوتا تھا تو اس کے اندر کی تپش اور کثافت کچھ اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ وہ خوشبو اس سے کچھ اور بھی دور چلی جاتی تھی جو کبھی خوش رنگ آفرین اور پھپھو کی یہاں آمد سے اس کے دل و دماغ میں سماتی تھی۔

وہ اپنا کھویا ہوا کھلونا پھر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہی موبائل فون جو اوپر کمرے میں رہ گیا تھا اور بابا نے دروازہ مقفل کرا کے چابی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اب اس موبائل کو پانا تو اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ ہاں، یہ ہوسکتا تھا کہ اب وہ اسی طرح کا ایک اور موبائل وقار سے منگوائے۔ اس مرتبہ وقار تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے صالح نے اختر کو استعمال کیا۔ اگلے ہی روز وقار تک پیغام پہنچ گیا۔ تیسرے چوتھے روز سرگودھا سے وقار نے نیا موبائل اور چارجر اختر کے ہاتھ صالح کو بھجوا دیا۔ مگر یہ موبائل بھی صالح تک نہیں پہنچ سکا۔ اس موبائل کے سبب ایک اور آفت کھڑی ہوگئی۔

اختر کو موبائل لے کر شام پانچ بجے تک سرخاب منزل واپس آجانا تھا مگر وہ رات تک نہیں آیا پھر ایک ملازم کے ذریعے صالح کو اطلاع ملی کہ پانچ بجے کے قریب اختر سرگودھا سے واپس آگیا تھا۔ اگر آگیا تھا تو وہ اس کے پاس کیوں نہیں پہنچا تھا؟

رات گیارہ بجے تک اس نے بے چینی سے انتظار کیا پھر صبر نہ کرسکا۔ سخت سرد اور تاریک رات تھی۔ اسے مردانے کے عقبی حصے میں اس کوارٹر کا پتا تھا جہاں اختر ایک اور ملازم لڑکے کے ساتھ رہائش رکھتا تھا۔ وہ مردانے میں پہنچا اور چھپتا چھپاتا اختر کے کوارٹر تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ لائٹ آن تھی مگر کوارٹر میں کوئی نہیں تھا۔ ہاں اختر کی موٹر سائیکل وہاں کھڑی تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ مویشی خانے کی طرف سے اسے کچھ دبی دبی سی آوازیں آئیں۔ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے درمیانی باڑ پار کی اور مویشی خانے کی ایک بیرونی کھڑکی تک پہنچا۔ یہاں وہ بھینسیں تھیں جن کا دودھ سرخاب منزل میں استعمال ہوتا تھا۔ صالح وہاں پہنچا تو اندر سے گرج برس کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ اس کا تجسس بڑھا۔ مویشی خانے (باڑے) کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ احاطے سے گزر کر وہ ایک اندرونی سلاخ دار کھڑکی کے سامنے پہنچا۔ اندر کھلے پٹ سے اس نے اندر جھانکا اور ششدر رہ گیا۔ اختر اچھت کے ایک شہتیر کے ساتھ الٹا لٹکا تھا۔ اس کی شلوار کھسک کر اس کے گھٹنوں تک چلی گئی تھی۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور اس پر مار کے نشان نظر آرہے تھے۔ اس کے منہ پر کچھ بندھا ہوا تھا جس کے سبب اس کی آواز گلے میں سے گھٹ گھٹ کر نکل رہی تھی۔ صالح کی آنکھیں یہ دیکھ کر پھٹی رہ گئیں کہ جالا نوری اور بابا شاہنواز بھی وہاں موجود تھے۔ جالے نوری نے اپنی پشاوری چپل ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے چپل کی زوردار ضرب اختر کی پشت پر لگائی۔ وہ بُری طرح کراہا اور گھٹی گھٹی آواز میں کچھ بولنے لگا۔ اس کے منہ پر جو کچھ بندھا ہوا تھا، اس کے سبب اس کی آواز بلند نہیں ہو پاتی تھی۔

دو تین منٹ بعد صالح کے بابا نے جالے نوری کو کچھ اشارہ کیا اور اس نے اختر کے چہرے پر بندھا ہوا قدرے گیلا کپڑا ہٹا دیا۔ جیسا کہ صالح کو بعد میں معلوم ہوا یہ گدھے کی لید تھی جسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر اختر کے منہ پر باندھا گیا تھا۔

بابا اب باڑے سے باہر نکلنا چاہ رہے تھے۔ ان کا چہرہ انگارہ ہو رہا تھا۔ ان کے نکلنے سے پہلے ہی صالح تیزی سے باہر آگیا اور بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کا دل مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ ابھی کمرے کا دروازہ دھڑام سے اکھڑ کر کمرے میں آگرے گا اور بابا اندر آکر ویسے ہی اس پر گولیوں کی بارش کردیں گے جیسے انہوں نے ایک مرتبہ ملازمہ رتابہ پر کی تھی۔

وہ رات صالح نے جیسے کالی، بس اسے ہی پتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بابا کو پتا چل گیا ہے کہ اس نے اختر کے ذریعے موبائل فون منگوایا ہے اور عین ممکن ہے کہ اور بھی کئی باتوں کا پتا چلا ہو۔ اب وہ اپنے نافرمان بیٹے کے ساتھ جو

کچھ بھی کر گزرتے، کم تھا۔ صالح کا دل چاہنے لگا کہ اس کے پاس کوئی زہریلی شے ہو جسے کھا کر وہ سو رہے یا پھر سرخاب منزل کی سب سے اونچی چھت پر پہنچے اور نیچے چھلانگ لگا دے۔

غیر متوقع طور پر رات خیریت سے گزری۔ دوسرے روز دوپہر کو داجے فضل اس کے کمرے میں آن گھسے۔ آتے ساتھ ہی انہوں نے ماماں بی کو باہر نکال کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ داجے کا جسم لرز رہا تھا۔ اگلا آدھا گھنٹا صالح کے لیے سخت لعنت ملامت اور سرزنش کا تھا۔ داجے کی زبانی اس پر انکشاف ہوا کہ اخترے کی پکڑ جالے نوری کی وجہ سے ہوئی جسے کسی نے اطلاع دی تھی کہ اخترا حویلی میں نیا موبائل لے کر آیا ہے۔ بعد میں اخترے سے موبائل اور چارجر بھی برآمد ہو گیا۔ مویشی خانے میں انکا لگنے کے بعد جو کچھ اخترے نے بتایا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ موبائل صالح نے منگوایا تھا۔ پھر یہ حیرت ناک انکشاف بھی ہوا کہ صالح ملائیشیا میں آفرین کو خط لکھتا رہا ہے اور ان خطوں کا جواب پہلے سرگودھا میں وقار کے پاس اور پھر اخترے کے ذریعے صالح کے پاس پہنچتا رہا ہے۔

داجے فضل نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”صالح! مجھے لگتا ہے کہ تیرے باپ نے تجھے گولی مار دینی ہے یا خود کو مار لینی ہے۔ آج جس طرح میں نے اسے تجھ پر چڑھ دوڑنے سے روکا ہے، میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔ یہ دیکھ میرا پھٹا ہوا گریبان، یہ دیکھ میرے پنڈے کی خراشیں۔“ انہوں نے گرم چادر ہٹا کر اپنا سینہ صالح کو دکھایا پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

صالح پتھر کا بت بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ جواب میں کیا کہے؟ کتنی ہی دیر بعد داجے فضل نے اپنا تر بتر چہرہ اٹھایا اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ”دیکھ پتر! میں تیرا باپ نہیں ہوں پر میرے دل میں تیرے لیے باپ جیسی محبت ہے۔ جو کچھ تو سوچ رہا ہے، وہ کبھی نہیں ہونے والا۔ تو اپنی ضد چھوڑ کر اپنے باپ کی مان لے۔ اسی میں تیری اور ہم سب کی بھلائی ہے۔“

صالح نے بے چین ہو کر داجے کے بوڑھے ہاتھ تھام لیے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

قریباً یہی وہ وقت تھا جب سرخاب منزل کے ایک بند اندرونی کمرے میں غضب ناک شاہنواز رائے اپنی چھوٹی بہن عاصمہ کو فون کر رہے تھے۔ ان کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ ”عاصمہ! میں سچ کہتا ہوں، اپنی جان سے گئوں گا یا اس کو مار دوں گا۔ جو کھیل تم ماں بیٹی اس کے ساتھ کھیل رہی ہو نا، وہ ہم سب کو برباد کر ڈالے گا۔“

دوسری طرف عاصمہ بگڑے لہجے میں بولی۔ ”بھائی جان! مجھے ادب احترام کے دائرے میں رہنے دیں۔ بدتمیزی پر مجبور نہ کریں۔ آپ الزام تھوپ رہے ہیں میری بیٹی پر۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ اس نے کوئی خط لکھا ہے۔ آپ بہتان باندھ رہے ہیں۔“

”میرے پاس پورے ثبوت ہیں عاصمہ! گواہ ہیں۔ اگر تجھ میں ذرا سی بھی انسانیت ہے نا تو بٹھا کر اپنی اس معصوم بچی سے پوچھ۔ وہ بتا دے گی تجھے سب کچھ..... اور اگر بتا دے نا تو پھر تھوڑی سی غیرت ضرور دکھانا۔ روک لینا اس کو.....“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔

☆☆☆

اخترے اور فون والے واقعے کو اب تین چار ہفتے گزر چکے تھے۔ اخترے کو دوسرے روز ہی سرخاب منزل سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والے سلوک نے صالح کو سخت تکلیف دی تھی۔ صالح کو یقین تھا کہ سرگودھا میں وقار کی کمبختی بھی ضرور آئی ہوگی۔ اس کے علاوہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ بابا نے ملائیشیا میں پھپھو عاصمہ یا پھر پھوپا ماجد کو فون کیا ہوا اور ان پر گرج برس کر دل کی بھڑاس نکالی ہو۔

لیکن یہ جو کچھ ہوا تھا، یہ تو تین چار ہفتے پہلے ہوا تھا۔ آفرین نے تو کئی ماہ پہلے ہی اس کو خط لکھنا بند کر دیے تھے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کہیں اس کے پیچھے بھی تو بابا جانی کی شعلہ مزاجی کارفرما نہیں؟

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور طرح کی سوچیں صالح کے ذہن پر یلغار کرنے لگی تھیں۔ کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ فرار کے راستے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اسے بابا جانی کے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑ جائیں گے۔ اس سب کے باوجود وہ آفرین کو دل سے نکال نہیں پا رہا تھا۔ اس کے سینے کی گہرائی میں کچھ بہتا رہتا تھا، کچھ رستا رہتا تھا۔ انہی دنوں ایک ایسی بات ہوئی جس نے اس کے زخمی دل کو کچھ اور بھی خونچکاں کر دیا۔ بڑی پھپھو خدیجہ لاہور سے آئی ہوئی تھیں۔ ایک دن اس نے ڈرائنگ روم میں بابا اور پھپھو کو باتیں کرتے سنا۔ دو تین ایسے فقرے اس کے کانوں میں پڑے جنہوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

پھپھو نے پوچھا۔ ”کب ہوئی منگنی؟“

بابا بولے۔ ”یہ سنا ہے کہ پچھلے ہفتے کی بات ہے۔“

"کون لوگ ہیں؟"

"ملائیشیا میں ہی رہنے والی کوئی پاکستانی فیملی ہے۔"

"دیکھ بھال تو لیا ہوگا عاصمہ نے؟"

"جہنم میں جائیں وہ سب۔" بابا نے جھنجلا کر کہا۔

"آفرین کی عمر بھی کم ہے اور....." پھپھو خدیجہ نے کہا۔ شاید وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر بھائی کے تیور دیکھ کر موضوع بدل دیا۔

صالح کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آگیا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سردیوں میں لحاف اور گرمیوں میں چھت۔ یہ دو ہی تو اس کی پناہ گاہیں تھیں۔

اس کے اندر دکھ آمیز مایوسی کا ایک صحرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ حالات کے تھپیڑے اسے دھکیل دھکیل کر آفرین سے بہت دور لے گئے ہیں۔ کسی وقت اس کے غم و غصے کا رخ آفرین کی طرف مڑ جاتا۔ کتنی کٹھور نکلی تھی۔ کتنی سنگ دل۔ بے شک وہ بہت دور تھی مگر کسی نہ کسی طور تو اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ یقیناً وہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ہوا کے رخ کے ساتھ خود کو تبدیل کر لیا تھا۔ وہ اب "سمجھدار" ہو گئی تھی۔

مگر امید..... امید تو بڑی ظالم شے ہے۔ پھانسی کے پھندے اور قبر کی دیواروں تک بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ بھی آس امید کی چند ناتواں کرنوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔

ایک روز بابا اپنا چیک اپ کرانے لاہور گئے ہوئے تھے۔ صالح نے داجے فضل سے کھل کر بات کی۔ اس نے صاف لفظوں میں ان سے کہا کہ وہ آفرین کی منگنی کی تصدیق کرنا چاہتا ہے اور کسی بھی طرح جاننا چاہتا ہے کہ اس نے قطع تعلق کیوں کر لیا؟

داجے نے کہا۔ "صالح! میں تمہارے باپ کا مزید غصہ نہیں جھیل سکتا اور نہ ہی یہ کام میرے بس کا ہے، نہ ہی میں تجھے اس کا مشورہ دوں گا۔ یہ بچکانہ سوچیں اب ذہن سے نکال دے۔"

"آپ کچھ نہ کریں۔ آپ نے پہلے بھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ بس اتنا رحم کریں مجھ پر کہ ایک بار فون پر مجھے وقار سے بات کرنے دیں اور کچھ نہیں تو میرے دل کا بوجھ ہی ہلکا ہوگا۔"

اس روز داجے فضل نے اس لینڈ لائن فون سیٹ کا لاک کھول دیا جس کی چابی صرف داجے اور بابا کے پاس ہوتی تھی۔ وقار کا نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے وقار سے طویل بات کی اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ صالح کے اندیشے کے عین مطابق بابا جانی نے وقار کو خطوط والے واقعے کے حوالے سے سخت بُرا بھلا کہا تھا۔

اس نئی خبر نے وقار کو بھی افسردہ کیا کہ وہاں ملائیشیا میں بالآخر آفرین کی انگیجمنٹ ہو گئی ہے۔ صالح نے وقار سے کہا۔ "یار! تم میری طرح قیدی نہیں۔ ایک آزاد بندے ہو۔ تمہارے لنکس ہیں، یاریاں دوستیاں ہیں، ہر سہولت تمہارے پاس ہے۔ کیا کسی طرح یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ آخر آفرین نے یہ سب کچھ ایک دم ختم کیوں کیا اور کیا اپنے موجودہ حالات سے وہ اور پھپھو خوش ہیں؟"

وقار نے کہا۔ "پاکستان کے کسی شہر، قصبے کی بات ہوتی تو میں اڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔ اب وہاں ہزاروں میل دور کی خبر کون لائے؟"

"تم ایک مرتبہ سنگاپور گئے تو تھے۔ سنا ہے یہ ملائیشیا بھی پاس ہی ہے۔"

"اکیلا تھوڑا گیا تھا۔" وقار نے کہا۔ "ڈیڈی اور ممی ساتھ تھے اور ابھی تو خیر سے علیحدہ پاسپورٹ بھی نہیں میرا۔"

دونوں افسردگی کی دھند میں غلطاں رہے۔ حالات کی ستم ظریفی کی باتیں کرتے رہے۔ صالح نے اسے منگنی کی تفصیلات بتائیں۔ جب اس نے شہر کا نام لیا تو وقار چونکا۔

"کہاں رہتا ہے لڑکا؟"

"کسی "ملاکا" نام کے شہر کا ہی بتایا تھا بڑی پھپھو نے۔ کوالالمپور کے پاس ہی ہے۔"

وقار چند سیکنڈ خاموش رہا پھر اس نے خبر دی کہ اس کے ایک دوست کا دوست وہاں "ملاکا" میں اسٹڈی کے لیے گیا ہوا ہے۔ عاطر حسن نام ہے اس کا۔ اگر وہ اب تک وہیں ہے تو شاید وہ کوئی خبر دے سکے.....

صالح کے مرجھائے ہوئے دل میں امید کی کرن جاگی، بولا۔ "کچھ کرو یار! کچھ تو پتا چلے۔ نہیں تو میرا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔"

.....اب صالح کے لیے ایک نئی طرح کا انتظار شروع ہو گیا۔ ملائیشیا سے کسی طرح کی اطلاع کا مل جانا ہی کارِ دشوار تھا۔ اگر کسی طرح کی معلومات مل بھی جاتیں تو وہ صالح تک کیسے پہنچتیں۔ اختر الوحیٰ بذریعہ ہو چکا تھا۔ اس کے لیے صالح کو پھر انتظار کرنا تھا کہ بابا کو چیک اپ یا ٹریٹمنٹ کے لیے سرگودھا یا لاہور جانا پڑے۔ کسی وقت وہ یہ جان کر چونک جاتا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے بابا کی طبیعت بہتر

نہ ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت پر خود کو برا بھلا کہتا مگر کچھ دیر بعد پھر یہی صورت حال ہو جاتی۔

وہ تنہائی ملنے پر خیالات کے گھوڑے دوڑاتا رہتا۔ آفرین کا میڈیم منگیتر اسی شہر کا تھا جہاں وقار کے دوست کا دوست عاطر حسن رہتا تھا۔ وقار کا کہنا تھا کہ عاطر حسن بے حد سوشل اور خوش گفتار لڑکا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اجنبیوں کو دوست بنا لیتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر عاطر، ملاکا میں ہی ہے تو جلد ہی کسی اہم اطلاع تک پہنچ سکتا ہے۔

وقار نے ''جلد'' کا کہا تھا مگر دو ماہ گزر گئے۔ عاطر حسن کی طرف سے کوئی اہم خبر نہیں آئی حالانکہ اس دوران میں صالح کو دو بار وقار سے فون پر بات کرنے کا موقع بھی ملا۔ وقار نے بتایا کہ عاطر نے آفرین کے منگیتر سے جان پہچان تو پیدا کر لی ہے مگر ابھی یہ جان پہچان اس اسٹیج تک نہیں پہنچی کہ وہ اس سے نجی باتیں پوچھ سکے۔ بہرطور منگنی کنفرم تھی۔

اسی اوہیز بُن اور یاسیت کے شب و روز تھے جب بہار کا وہ دن بھی طلوع ہوا جو اپنے اندر کئی خزائیں سمیٹے ہوئے تھا۔ ایک دن دادے فضل نے ہی اس سے کہا تھا۔

''صالح! کب تک اپنے آپ سے اور اپنے باپ سے لڑتے رہو گے۔ اب تو شادی بھی ہو گئی ہے اس کی۔''

''کس کی؟'' وہ تڑپ کر بولا۔

''اسی کی جس کا..... اور جس کے خطوط کا انتظار کرتے رہے ہو۔ اب چھوڑ دو یہ بچپنا۔''

وہ سکتہ زدہ سا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''تمہارے بابا کو بھی کل ہی معلوم ہوا ہے۔ اپنی پھپھو عاصمہ کی بے حسی دیکھو۔ پوری فیملی میں کسی کو بتایا تک نہیں۔ چٹ منگنی، پٹ بیاہ والا معاملہ لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو تمہاری طرف سے بھی کوئی ڈر پیدا ہو گیا ہو۔''

''جھوٹ ہے، یہ بالکل جھوٹ ہے۔'' وہ جیسے چلا اٹھا۔ ''میں یہ نہیں مان سکتا۔ کس نے بتایا ہے بابا کو اس کی شادی کا؟''

''انہیں ہماری خدیجہ پھپھو سے پتا چلا ہے۔''

''یہ بالکل غلط ہے۔ خدیجہ پھپھو کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھ سے اپنی بات منوانے کے لیے مجھے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ کیا ثبوت ہے اس کی شادی کا؟ کیا ثبوت ہے؟''

''ثبوت تو فی الحال کوئی نہیں مگر صالح پتر! ذرا سوچو، اتنی بڑی بات ایسے ہی تو نہیں کر دی جاتی نا۔ ہو سکتا ہے کہ مختصر سا کام کیا گیا ہو۔ دھوم دھام کے بغیر نکاح کر کے رخصتی کر دی گئی ہو۔ تمہیں اپنے پھوپا ماجد کا تو پتا ہی ہے۔ ان کا ہر کام انگریزوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شادی بھی تو ایسے ہی کروائی تھی۔''

''جھوٹ ہے..... جھوٹ..... یہ سب جھوٹ ہے۔'' صالح نے دانت پیس کر کہا اور قریب رکھی کرسی کو ٹانگ مار کر دور پھینک دیا۔ پھر وہ پاؤں پٹختا ہوا چھت کے زینوں کی طرف چلا گیا۔

دوسرے روز دوپہر کے بعد جب دادے فضل کریم حسب معمول قیلولہ کر رہے تھے، صالح دندناتا ہوا دادے فضل کے کمرے میں چلا گیا۔ ''دادے! مجھے سرگودھا میں وقار سے بات کرنی ہے، ہر صورت۔''

اس کے تیور دیکھ کر فضل کریم چونکے۔ انہوں نے باپ کو دیکھا بھالا ہوا تھا۔ بیٹا بھی اس کا پرتو ہی تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ شدید کرب میں ہے۔ وہ عادات میں باپ پر اور شکل و صورت میں مرحومہ ماں پر گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر فضل کریم کو بھولے بسرے زمانے یاد آتے تھے۔

..... اس کا انداز دیکھ کر وہ اٹھے۔ انہوں نے اندرونی کمرے میں جا کر فون اس کے لیے کھول دیا۔

صالح نے وقار سے بات کی اور بھرائے ہوئے لہجے میں اسے بتایا کہ کل اس کے کانوں تک کیا خبر پہنچی ہے۔

وقار بھی گم صم سا ہو گیا۔ صالح نے کہا۔ ''وکی! مجھے ابھی تک اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ مجھ سے جھوٹ بولا جا رہا ہے یا پھر ملائیشیا میں حالات ویسے نہیں جیسے یہاں بتائے گئے ہیں۔ تم رابطہ کرو عاطر حسن سے۔ اس سے پوچھو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آج ہی کوشش کرتا ہوں۔''

''آج نہیں، ابھی۔ میں کل اسی وقت تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔''

اگلے دو روز شدید خواہش کے باوجود صالح اپنے ہمراز وقار کو فون نہ کر سکا۔ اتفاقاً لاہور سے اس کے بابا کے کچھ مہمان آ گئے تھے اور فون والا کمرا ان کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ یہ کافیاں گانے والے کوئی لوک فنکار تھے اور بابا کے عقیدت مند بھی تھے۔ دو روز بعد وہ گئے تو صالح کو وقار سے بات کرنے کا موقع ملا۔

''رابطہ ہوا؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں، ہوا۔'' وقار نے کہا۔

صالح کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ گلا

لمحوں میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

"کیا اطلاع ہے؟" صالح کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جو اطلاع مجھ تک عاطر حسن کے ذریعے پہنچی ہے، وہ تو زیادہ اچھی نہیں ہے۔" وقار کی گمبھیر آواز ابھری اور صالح کا دل جیسے برف کا گولا بن گیا۔

"تمہارا مطلب ہے..... شادی؟" صالح نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

ایک توقف کے بعد وقار کی آواز ابھری۔ "ہاں، صالح!"

"کیا بتایا تمہارے دوست عاطر نے؟" صالح کو اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"دو ہفتے پہلے ایک سادہ سی تقریب میں آفرین کی شادی ہوئی ہے۔"

"وکی..... ! میں نہیں مان سکتا..... نہیں مان سکتا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم..... کسی طرح..... میری بات کراؤ عاطر سے..... یا..... کوئی ثبوت دو مجھے۔"

"افسوس کی بات یہی ہے صالح..... کہ ثبوت بھی موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے پاس ان دونوں کی شادی کی تصویر موجود ہے۔ یہ عاطر نے واٹس ایپ سے مجھے بھیجی ہے۔" وقار نے دل گرفتہ لہجے میں بتایا۔

صالح کے لیے کچھ دیر کے لیے گردشِ دوراں تھم سی گئی تھی۔

☆☆☆

چار پانچ دنوں بعد اس نے وہ تصویر بھی دیکھ لی تھی۔ وہ نہ ہی دیکھتا تو اچھا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ دو سال بعد دوبارہ آفرین کو دیکھے گا تو اس روپ میں دیکھے گا۔ وہ دلہن بنی اپنے دُلہا کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی معصوم دلکشی، وہی جھیل آنکھیں، وہی بے مثل رخسار..... مگر یہ سب کچھ صالح سے لامتناہی فاصلے پر جا چکا تھا۔ اس کا دلہا قریباً اسی کے قد کا ہوگا۔ جسم تھوڑا سا فربہ بھی لگ رہا تھا۔ وہ پاکستانی رواج کے مطابق شیروانی، پگڑی اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ صالح چند لمحوں سے زیادہ اس دلخراش منظر پر نگاہیں نہ جما سکا تھا اور اس نے وقار کا موبائل فون وقار کو واپس کر دیا تھا۔

وہ دونوں سرخاب منزل میں ہی تھے۔ وقار کے ڈیڈی سیف اسے اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ وہ خطوط والے معاملے کے حوالے سے صالح کے بابا سے باقاعدہ معافی مانگ سکے اور اس نے مانگی بھی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ بابا نے اسے دل سے معاف کیا تھا یا نہیں۔ اس "وزٹ" کے سبب صالح اور وقار کو چند منٹ تنہائی کے مل گئے تھے جس میں اس نے صالح کو یہ تصویر اپنے موبائل پر دکھائی تھی۔

درحقیقت یہ تصویر دیکھنے سے پہلے ہی صالح کے دل نے گواہی دینا شروع کر دی تھی کہ وہ آفرین کو کھو چکا ہے۔

آفرین کو کھونے کے خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر کی تپش اور جارحیت نے اس کی سوچوں کو اور رخ پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ وقار سے ملنے کے فوراً بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بابا کی پسند کی ہوئی حیا احمد سے شادی کرے گا..... ٹھیک ہے آرزو کا خون ہو گیا تھا، محبت اسے نہیں مل رہی تھی مگر جسم تو مل رہا تھا۔ دلہن تو مل رہی تھی۔ اب تصور اتی نہیں، حقیقی دلہن۔ اسے اپنی ساری تپش، ساری جلن اور کڑھن کے نکاس کا راستہ مل رہا تھا۔ ٹھیک ہے، ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔

☆☆☆

اکتوبر کا آغاز تھا۔ موسم ایک خوشگوار کروٹ لے چکا تھا۔ گرمی اور پھر حبس کی طویل رُت کے بعد ہوا میں ہلکا پن اور خنکی آ گئی تھی۔ ٹھنڈے دیسوں سے ہجرت کرنے والے پرندے باغوں اور ٹرکوں میں نظر آنے لگے تھے۔ آسمان گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ سرخاب منزل کے وسیع دالان میں گندم اور چاولوں کو کھلے میں ہوا دلائی جا رہی تھی۔ لحافوں اور گدوں کی روئی دھنکوانے کے بعد ان میں نئے دھاگے ڈالے جا رہے تھے۔ سرخاب منزل کی بلند چار دیواری پر چڑھتی بیلوں پر سرما کے پھول کھلنے کو بے تاب تھے اور ساتھ ساتھ صالح کی شادی کی تیاری بھی ہو رہی تھی۔ عروسی جوڑوں اور زیورات کی خرید، مہندی وغیرہ کے لوازمات، سجائی کی تیاری، مینیو کا انتخاب۔ مخدوم شاہنواز رائے کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ کھانے کا انتظام لاہور کی ایک بڑی کیٹرنگ کمپنی کو دے دیا گیا۔ میوزک وغیرہ کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ سرخاب منزل کے پرانے ریت رواج کے مطابق لنگر اور قوالی وغیرہ کا اہتمام کیا جانا تھا۔

شاہنواز رائے آج کل واکر کے سہارے نسبتاً آسانی سے چل پھر رہے تھے۔ تیاریوں کے سلسلے میں وہ سرخاب منزل کے اندر ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آج کل ان کے لیے دنیا کا اہم ترین کام یہی ہے کہ صالح کی شادی بخیر و خوبی انجام کو پہنچے۔

شادی کے لیے صالح کی رضامندی کے بعد اور اس

کے دوست وقار کے معافی مانگنے کے بعد بابا نے صالح کو چند چھوٹی موٹی رعایتیں بھی دے دی تھیں۔ ان میں ایک رعایت وقار کے حوالے سے بھی تھی۔ وہ اب بوقتِ ضرورت سرخاب منزل میں آجاسکتا تھا۔

جس روز سرخاب منزل میں صالح کی مہندی کی تقریب تھی اور پوری حویلی رنگ و نور میں نہائی ہوئی تھی، سنگِ مرمر کی بالکونیوں کے محرابی دروازے جگمگا رہے تھے اور صالح کی ہتھیلی پر مہندی رکھی گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے، صرف ایک لمحے کے لیے مہندی کی چند کونپلیں اور ہفت رنگ چوڑیاں صالح کے تصور میں چمکی تھیں جو اس کی ایک الماری کے ایک تاریک خانے میں عرصے سے رکھی تھیں مگر پھر فوراً ہی یہ منظر رنگ و نور اور طرب کے ریلے میں بہہ گیا۔

..... اور پھر وہ شبِ عروس بھی آپہنچی جب سرخ لباس میں گہنوں سے لدی پھندی حیا احمد سمٹی سمٹائی ٹھٹری سی بیٹی صالح رائے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے لباس اور جسم سے اٹھنے والی مہک نے صالح کو مسحور کردیا۔ ان لمحوں میں اس کے ذہن میں دور دور تک آفرین کا خیال نہ تھا لیکن کیا وہ خیال واقعی اس کے دل و دماغ سے محو ہو چکا تھا یا پھر کسی دیرینہ روگ کی طرح گہرائی میں موجود تھا اور احساس کے دائرے سے باہر تھا۔

اس نے بستر پر بیٹھ کر گھونگٹ اٹھایا۔ آدھ کھلی کلی جیسی من موہنی حیا احمد اس کے سامنے تھی۔ اس کی لمبی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور سنسنی خیز لمحوں کے حصار میں لب بے ساختہ لرز رہے تھے۔ صالح نے اسے ہیرے کی انگوٹھی منہ دکھائی میں دی اور دھیرے دھیرے اسے بولنے پر آمادہ کرلیا۔ خود اس کی طرح اس کی آواز بھی نازک اور چھوئی موئی تھی۔ دھڑکتے دل اور جذبات کی شدت سے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے بھاری عروسی دوپٹا اس کے سر سے سرکایا تو وہ ایک دم آگے کو جھکی اور اس نے صالح کے پاؤں چھو لیے۔

"ارے یہ کیا؟" صالح نے پاؤں سمیٹ کر پوچھا۔

"ابا جان نے یہی کہا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ..... مخدوم ہیں..... ہمارے لیے عزت کی جگہ پر بھی تو ہیں۔" وہ بہ مشکل بول پائی۔

"بھئی، یہ باتیں میں نہیں مانتا۔"

"لیکن میں تو..... میرا مطلب ہے، ہم تو مانتے ہیں۔" اس نے ہولے سے کہا۔

کہنے کو تو صالح نے کہہ دیا تھا کہ میں یہ باتیں نہیں مانتا مگر اندر سے اس کا پرتپش اور من موجی مرد پھول کر اور بھی کپا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ بات ماننے والی لڑکی ہے۔ اس کی ہر طرح کی رومانی دست درازیوں اور ریشہ دوانیوں کو قبول کرلے گی۔

وقار نے اسے سمجھایا تو یہی تھا کہ وہ پہلی رات کو گفتگو اور چھوئی موئی رومانی پیشرفت تک ہی محدود رکھے گا تاکہ اچھا ماحول بن سکے مگر جب چھوئی موئی رومانی پیشرفت شروع ہوئی تو صالح کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ اپنے اندر کے سرکش اور تند و تیز صالح کو سنبھال سکے۔ رومانی پیشرفت بڑی تیزی سے "ازدواجی پیشرفت" میں بدلی۔ وہ شب ایک تند و تیز سرخ آندھی کی طرح تھی جو صالح کے حواس پر چھائی رہی۔ اس آندھی میں اسے صاف طور پر کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ سنائی۔ اس آندھی میں حیا ایک نودمیدہ پھول کی طرح سرگرداں اور منتشر تھی۔

اگلے روز صالح دن گیارہ بجے تک سویا پڑا رہا تھا۔

☆☆☆

..... یوں لگتا تھا کہ صالح کی شادی نہیں ہوئی بلکہ توڑنے پھوڑنے کے لیے ایک کھلونا اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ یہ کھلونا شب و روز اس کے ہاتھ میں تھا۔ صالح کے نقطۂ نظر سے ایک مثبت بات یہ بھی تھی کہ حیا اس کی کسی بات یا عمل کی مزاحمت نہیں کرتی تھی۔ اسے یہی سمجھایا گیا تھا کہ مخدوم رائے فیملی کا ہر فرد اس کے لیے عزت و احترام کی جگہ پر ہے اور اس حساب سے اس کا شوہر تو اعلیٰ ترین مرتبے کا حقدار تھا۔

بے شک کھلونا بے زبان ہوتا ہے، مگر ہوتا تو کھلونا ہی ہے۔ جب اسے بے پروائی سے استعمال کیا جائے، اس کا خیال نہ رکھا جائے، اِدھر اُدھر پھینک دیا جائے تو اس کے اثرات اس پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ باہر سے نہیں تو اندر سے ضرور ٹوٹنے پھوٹنے لگتا ہے۔ اس کی تابانی، اس کی روانی، اس کی آواز، بہت کچھ تھوڑا تھوڑا بدلنے لگتا ہے۔ صالح کے کھلونے کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ وہ اب بار بار اس کے پاؤں کو ہاتھ نہ لگاتی تھی، بار بار اس کے ہاتھ نہیں چومتی تھی۔ کسی وقت کسی بے محل گفتگو کی وجہ سے اس کی دلکش پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی شکن بھی دکھائی دے جاتی تھی۔

صالح کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا تھا۔ کسی وقت کسی بات پر حیا سے تھوڑا سخت بھی بول جاتا تھا۔ اسے یہی لگتا تھا کہ بابا کی وجہ سے اس کے اندر جتنی بھی فرسٹریشن ہے، اس کی نکاسی کا راستہ یہی حیا ہے۔

نومبر کی خنکی کے باوجود کسی رات وہ دیر تک چھت پر ٹہلتا رہتا اور اپنے کمرے میں نہ جاتا۔ کسی موقع پر بے وقت کھانا منگوالیتا یا ویسے ہی کھانے سے انکار کردیتا۔ حیا کو اس طرح پریشان کرکے بھی اس کو اچھا ہی لگتا تھا۔

ایک دن جب صالح کے بابا، ڈرائیور اور گارڈ جالے لوری کے ساتھ سرگودھا گئے ہوئے تھے تو صالح نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور راجے فضل کو اس کمرے کا تالا توڑنے پر مجبور کردیا جہاں چند ماہ پہلے اس کا موبائل فون پڑا رہ گیا تھا۔ موبائل اور چارجر وہیں الماری کے پیچھے موجود تھے۔ راجے فضل بس اتنا کہہ سکے۔ ''صالح پتر! یہ چیز اچھی بھی ہے اور بُری بھی۔ اس کا کوئی غلط استعمال نہیں ہونا چاہیے۔''

صالح نے غلط استعمال نہ کرنا ہوتا تو اسے نکالتا ہی کیوں۔ بعینہٖ اسی طرح کا چائنا لاک صالح نے پہلے ہی منگوالیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے تالے کی جگہ وہ دوسرا تالا لگا دیا گیا۔ بابا کے پاس جو چابی تھی اسے اس نئی چابی کے ساتھ بدلنے کی ذمے داری راجے فضل پر ڈال دی گئی۔ راجے فضل کے ساتھ اس کا تعلق عجیب تھا۔ اس میں بزرگی کے احترام اور ڈر کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی بے تکلفی اور انسیت بھی تھی۔ کسی وقت صالح کو لگتا تھا کہ راجے فضل اور بابا جانی کے تعلق کے پیچھے بھی کوئی دلچسپ کہانی موجود ہے۔

موبائل فون صالح کے ہاتھ میں آیا تو چند ماہ پہلے کی کئی یادیں اس کے ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ جب اس کی تصوراتی دلہن اس کے پاس آتی تھی، اس کے لیے نئے نئے روپ بدلتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ من مرضی کا وقت گزارتا تھا مگر جو کچھ بھی تھا وہ تصوراتی تھی۔ بعد میں وہ ایک طرح کی مایوسی و پشیمانی سی دے جاتی تھی۔ اب تو واقعی گوشت پوست کا جسم اس کے پاس تھا۔ شرم و حیا، نزاکت، گھبراہٹ اور پھر پُرحرارت آمادگی سب کچھ تو تھا اس کے پاس۔

.....ہاں تو اب وہ فون، وہ ''آئینہ جہاں نما'' پھر اس کے پاس تھا۔ درحقیقت اب صالح نے کئی طرح کے پرپرزے نکالنا شروع کردیے تھے۔ شادی کے بعد اٹھارہ سالہ صالح کو بابا شاہنواز نے جو چند رعایتیں دی تھیں، ان میں وقار کی آمدورفت بھی شامل تھی۔ اس آمدورفت سے بھی صالح نے کئی فائدے اٹھانا شروع کردیے۔ اس نے وقار سے انٹرنیٹ کا ایک بھاری بھرکم پیکیج منگوالیا اور ہر طرح کی ویڈیوز دیکھنا شروع کردیں۔ اس کام کے لیے وہ رات کو اکثر حویلی کی چھت پر چلا جاتا اور نیچے جانے میں جان بوجھ کر دیر لگاتا۔ حیا اس کے انتظار میں رہتی۔ پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ نومبر کے آخری دنوں کی رات تھی۔ چاندنی نے فسوں سا طاری کیا ہوا تھا۔ سرخاب منزل کی سرخ برجیوں کے کلس چمک رہے تھے۔ اردگرد کے کھیت کھلیان خاموشی سے چاندنی کی پھوار میں نہا رہے تھے۔ صالح نے حسب معمول وقار کو فون کیا۔

''یار، وکی! یہ وہسکی کیا ہوتی ہے۔ اکثر فلموں میں دکھاتے ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''ہوتی تو بڑی بُری شے ہے مگر کہتے ہیں سرور خوب ہوتا ہے۔''

''یار! کسی دن تجربہ تو کریں۔''

''اکمل شاہنواز مجھے کھڑے کھڑے زمین میں گاڑ دیں گے۔ نہ بابا نہ۔ میں بہت بھگت چکا ہوں..... اور اس شے کا ملنا بھی تو کوئی آسان نہیں ہوتا۔''

''یار، وکی! تم آزاد پنچھی ہو۔ تمہارے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔''

''یارا! مشکل تو بہت ہے لیکن.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

''لیکن کیا؟'' صالح نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ لمبے توقف کے بعد بولا۔ ''یارا تو نے مجھے مروا دینا ہے۔''

''مطلب یہ ہوا کہ بات بن سکتی ہے۔'' صالح نے خوش ہوکر کہا۔

وقار نے ذرا الجھے ہوئے لہجے میں بتایا کہ اس کے چھوٹے چچا مدثر اس چیز سے کبھی کبھی شغل کرلیا کرتے تھے۔ آج کل امپورٹڈ لکڑی کی کوئی بڑی کھیپ لینے کے لیے بیرون ملک مقیم تھے۔ وقار نے کہا کہ وہ ان کے کمرے سے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا۔ تاہم اس نے شرط رکھی کہ وہ خود نہیں پیے گا۔

''پر کیوں؟'' صالح نے پوچھا۔

''بس ہر بات پر کیوں، کیسے، کب، کیا کہتے رہا کرو۔'' وہ ہنسا۔ ''دراصل اکمل شاہنواز نے تمہیں بڑا ہونے ہی نہیں دیا۔ میں تو کبھی کبھی تمہاری وہ باتیں یاد کرکے ہنس پڑتا ہوں جو تم نے میری اور اپنی پہلی ملاقاتوں میں پوچھی تھیں۔ پتا ہے تم نے کیا پوچھا تھا؟''

''ہاں جی..... فرماؤ، کیا پوچھا تھا؟''

''یہ بالغ ہونا کیا ہوتا ہے..... اور یہ جو اخباروں میں لکھا ہوتا ہے ''زیادتی'' تو یہ کیا ہوتی ہے..... اور یہ مجرمانہ حملہ..... یہ کس کو کہتے ہیں اور یہ کیوں کردیا جاتا ہے؟ وغیرہ

وغیرہ۔'' وقار پھر ہنسنے لگا۔

''اچھا، یہ فضول کی بکواس چھوڑو۔ یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم نہیں ہو گے؟''

''یار! ایک ہوش میں ہو تو دوسرے کو سنبھال تو لیتا ہے۔ خیر چھوڑو، موقع محل دیکھ کر سوچ لیں گے۔ پہلے وہ چیز ملنے تو دو۔''

..... قریباً چار دن بعد وہ دونوں سرخاب منزل کے اس سجے سجائے کمرے میں بیٹھے تھے جہاں دو ماہ گزرنے کے باوجود ابھی تک شادی والی مسہری موجود تھی۔ حیا تین چار روز کے لیے اپنے میکے گجرات گئی ہوئی تھی۔ اب یہ صالح کا ذاتی کمرا تھا۔ یہاں کوئی ماما ں بی یا دا جے فضل اس کے نگران نہیں تھے۔ بابا شاہنواز ویسے ہی دواؤں کے زیر اثر سرِ شام سو جاتے تھے۔ دونوں نے ولایتی وہسکی کی کوارٹر بوتل کھولی۔ وقار نے کہا کہ وہ نہیں چکھے گا مگر ماحول بن گیا تو اس نے کچھ زیادہ مزاحمت بھی نہیں کی۔ دونوں نے بدبودار تیکھے محلول کے چند گھونٹ لیے اور کچھ سرور میں آ گئے۔ صالح، وقار کو اپنے ازدواجی تجربات سے آگاہ کرنے لگا۔ شاید نشے کے سبب ہی وقار بھی کھلی ڈلی باتیں کرنے لگا۔ دونوں نے موبائل نیٹ ڈیٹا سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا۔ وہ رات گئے تک جاگتے رہے۔

تین روز بعد حیا احمد میکے سے واپس آئی تو صالح شدت سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس انتظار میں محبت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس جسم کی طلب ہی تھی۔ لمس کا ایک ہوکا سا لگا ہوا تھا صالح کو۔

حیا بھی مناسب موڈ میں ہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کی خدمت کے لیے مستعد، آراستہ پیراستہ اور جی جی کرتی ہوئی۔ دبلا پتلا لیکن چست جسم، چھوٹا سا دہن، چھوٹی سی ناک، کمر سے نیچے تک جاتی ہوئی بھاری چوٹی، اسی چوٹی جیسی بھاری کامدار پوشاک اور بھاری گہنے۔

وقار کے ساتھ رازِ دنیاز والی رات گزارنے کے بعد صالح کا موڈ کچھ زیادہ ہی آشفتہ ہو رہا تھا۔ نئے تجربے کے طور پر اس نے رات کو کمرے میں جانے سے پہلے اس سیال آگ کے چند گھونٹ بھی لے لیے جس کا ذائقہ اس نے وقار کے ہمراہ چکھا تھا۔ اس ذائقے کی تجدید نے اسے دو آتشہ کر ڈالا۔ حیا بھولی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ کچھ بھی نہ سمجھتی۔

''آپ کے منہ سے..... یہ کس طرح کی ''اسمیل'' آ رہی ہے؟'' اس نے قدرے ناگواری سے کہا۔

''کچھ نہیں..... تھوڑی دیر پہلے کھانسی کی دوا پی تھی۔''

اس نے کمزور جواز پیش کیا اور ایک بار پھر اس کو تہ و بالا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ بھی تھا آخر گوشت پوست کا جسم رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ شاید اس سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ پڑھائی لکھائی اور عمومی شعور میں بھی اس سے آگے تھی۔ صالح کا بتدریج بگڑتا ہوا سلوک اسے عاجز کر گیا۔ اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے ٹانگ رسید کر کے صالح کو دور ہٹا دیا اور تکیے پر اوندھی گر کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

صالح چند لمحے تو ہکا بکا رہا۔ اسے یقین ہی نہیں آیا کہ چند ہفتے پہلے تک اس کے ہاتھ چومنے والی اور جی جی کرنے والی ایسا بھی کر سکتی ہے پھر وہ چنگھاڑا۔ ''خبیث، الو کی پٹھی، حرام زادی۔''

اس نے اسے کئی تھپڑ جڑ دیے۔ اپنا لباس درست کرتا ہوا اور پاؤں پٹختا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

کئی دنوں تک ان دونوں میں سخت کشیدگی والی کیفیت رہی۔ بہرطور اس کشیدگی کا اظہار حیا نے گھر والوں پر نہیں ہونے دیا۔ معاملہ طول پکڑ رہا تھا۔ بالآخر ایک روز اس نے صالح سے معافی مانگی اور ندامت کا اظہار کیا۔ صالح نے بھی بے دلی سے گھسا پٹا فقرہ ادا کیا۔ ''معافی تو مجھے مانگنا چاہیے کہ تمہیں اتنا غصہ دلا دیا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے حیا کو مزید ''بیک فٹ'' پر کرنے کے لیے داجے فضل سے سنا ہوا ایک اور فقرہ بھی گفتگو میں جڑ دیا۔ ''کہا جاتا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں، یعنی ایک دوسرے کے پردے کی طرح۔''

اشک بار حیا نے اسے خاموش نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ لباس اتنا بھاری بھی تو نہیں ہونا چاہیے کہ جسم بوجھ ہی نہ اٹھا سکے۔

بہرطور اس صلح صفائی کے بعد چند روز ہی ٹھیک گزرے۔ صالح کے منہ سے ''کھانسی کے الو کھے شربت'' کی بو بھی نہیں اٹھی پھر اس کی بے باکیوں اور کج رویوں کو بتدریج شدت ملنے لگی۔ مرد و زن کے تعلق میں جو ایک محبت اور لطیف خوشبو ہوتی ہے، اس کا تو دور دور تک پتا نہیں تھا۔ بس پسینے کی باس میں ڈوبا ہوا لمس تھا اور بے مہار جنس تھی۔ کبھی کبھی تو صالح کو لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے دور جا رہے ہیں۔ حیا کی غیر مشروط سپردگی کو محسوس کرتے ہوئے صالح نے ایک بار پھر بے دھڑک انگور کی بیٹی کے گھونٹ لگانا شروع کر دیے تھے اور اسمارٹ فون تو اس کے پاس تھا ہی۔

ایک روز داجے فضل نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح سفید بے داغ لباس میں تھے۔ ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔ ''حیا بیٹی کو زیادہ سخت ہاتھ نہ لگایا کر۔ بڑی نازک سی ہے۔''

اس نے چونک کر داجے کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''نہیں، ہوا تو کچھ نہیں۔ بس وہ مجھے کچھ کملائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ خیال رکھا کر اس کا۔''

وہ داجے کی بات کی گہرائی سمجھ رہا تھا۔ کچھ دیر ان کے سفید بالوں کے نیچے ان کے کشادہ ماتھے کی شکنیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ایک دن آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے دوستوں کی طرح کھل کر بات کرلیا کروں..... چاہے وہ..... شرم والی بھی ہو۔ کیا آپ سے کھل کر کچھ پوچھ سکتا ہوں؟''

''بالکل پوچھو، ہم سوال کرنے کے لیے بچوں میں جھجک پیدا کردیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مسئلے بنتے ہیں۔''

''آپ نے ایک دن پہلے بھی کہا تھا اپنی دلہن کے ساتھ اکیلے میں نرم رہا کرو۔ کہا تھا نا؟'' داجے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اور آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں قدرت کے اصولوں اور نیچر کے مطابق چلنا چاہیے۔'' داجے نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تو داجے! نیچر تو یہی ہے نا۔ نرمی سختی ہوتی ہے یا نہیں؟ آپ قدرت کے بنائے ہوئے کسی بھی جاندار کو دیکھ لیں۔ کسی بھی چرند پرند کو.....'' وہ معنی خیز نظروں سے داجے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ گہرے سکوت کے بعد بولے۔ ''ہم خود کو دوسرے جانداروں کے ساتھ نہیں ملا سکتے صالح پتر! ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ ہمارے لیے اللہ پاک نے کچھ حدیں مقرر کر رکھی ہیں اور انہی حدوں کی وجہ سے ہمیں کچھ اضافی خوشیاں اور راحتیں دی ہیں جو جانوروں کو میسر نہیں۔ ان راحتوں میں سے ایک راحت اپنی شریک حیات سے پیار اور اس پیار کے سبب ہماری روح میں کھلنے والے نایاب شگوفے ہیں اور.....''

''ایک منٹ داجے!'' صالح نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ پھر ان سے نظریں ملائے بغیر بولا۔ ''اگر میں کہوں کہ مجھے ایسے ہی اچھا لگتا ہے تو.....؟ ایسے ہی تسلی ہوتی ہے تو؟''

وہ ایک توقف کے بعد جواب دینے کے قابل ہوئے۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ تم محبت سے دور اور گوشت پوست کے جسم سے قریب ہو۔''

''تو کس نے کہا ہے مجھے محبت سے دور؟'' یہ فقرہ بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں سمجھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ داجے بھی نہیں سمجھ پائے۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے وضاحت چاہی۔

مگر اس سے پہلے ہی صالح کے بابا دا کر کے سہارے چلتے ہوئے دروازے پر نمودار ہوگئے۔ ان دونوں کی اس پیچیدہ گفتگو کو بریک لگ گئے۔ بابا کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ داجے فضل سے کوئی اہم بات کرنے آئے ہیں۔

☆☆☆

چند روز بعد ہی صالح کے بابا نے سرخاب منزل میں وسیع پیمانے پر تعمیراتی تبدیلی کا کام شروع کردیا۔ چھوٹی چھت والا سارا پورشن جو قریباً دو کنال رقبے پر تھا، مسمار کروا دیا گیا۔ دراصل اسے مرمت کی ضرورت تھی۔ سوچ بچار کے بعد اسے مکمل طور پر گرانے اور نئی طرز پر بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

سرخاب منزل کی بائیں جانب کا وہ حصہ بھی رینوویٹ کیا جانے لگا جہاں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ایک یادگار بالکونی واقع تھی۔ وہی بالکونی جہاں سردیوں کی ایک سہانی رُت میں کئی سنہری دھوپ میں آفرین اور صالح کے حصے میں آئی تھیں۔ وہ کبھی کبھی صالح کی خوشی کے لیے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بے مثال رخسار پر رکھ لیتی تھی۔ اسے رخسار پر دبائے رکھتی تھی۔ پھر ہولے ہولے حرکت دینے لگتی تھی۔ کیوں وہ بالکونی بھی فنا کے گھاٹ اتر رہی تھی اور اس باغ کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا جہاں کئی برس پہلے موسلا دھار بارش کے ایک یادگار دن نے ان دونوں کی روحوں کو چھوا تھا..... اور وہ دن ہمیشہ کے لیے صالح کے حافظے میں محفوظ ہوگیا تھا۔

گزرے ماہ و سال میں کتنی ہی مرتبہ یہ خواہش صالح کے دل کی گہرائی میں جاگی تھی کہ کیا کبھی ویسا ہی وہ دن پھر اس کی زندگی میں آسکے گا۔ اب واضح ہو چکا تھا کہ وہ دن کبھی نہ آئے گا، نہ ہی وہ کبھی آئے گی۔ پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی، جب بجلی کے دستی آروں کے ذریعے جامن، امرود اور آم کے درخت کاٹے جا رہے تھے اور گھاس ادھیڑی جا رہی تھی اور سنگِ سرخ کے تین فوارے توڑے جا رہے تھے تو صالح کے سینے میں دھواں بھر رہا تھا۔ وہ بابا سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کم از کم محبت کی ان یادگاروں کو تو ختم نہ کریں لیکن بابا نے اس کی کبھی سنی تھی جو اب سنتے اور یہ تو ویسے بھی ایک بے محل سی بات تھی۔ ان برباد ہونے والی چیزوں کی قدر سرخاب منزل میں صالح کے سوا اور کس کو ہو سکتی تھی۔

اس کی ہر فرسٹریشن کا رخ گھوم پھر کر حیا کی طرف ہو جاتا۔ جیسے سرخاب منزل کے ایک حصے کو توڑا پھوڑا جا رہا تھا، وہ حیا کو مسمار کرنا شروع کردیتا تھا اور وہ نوعمر چھوئی موئی لڑکی

واقعی مسمار ہو رہی تھی۔ باہر سے بھی اور اندر سے بھی۔ انسان اور حیوان کا فرق کہاں چلا گیا تھا؟ تب پھر ایک دن اس سٹپٹائی ہوئی لڑکی کا سخت ردِعمل سامنے آیا تھا۔ اس کا زوردار دھکا صالح کو کھانا پڑا تھا۔ پھر اس روز بیڈ روم میں دونوں میں خوب جھگڑا ہوا۔ وہ تھم دم نہ رہا تھا اور وہ بے زبان خادمہ نہیں رہی تھی۔ وہ چلا چلا کر بولی تھی، روئی تھی۔ اس نے شراب خانہ خراب کی بوتل باتھ روم کے فرش پر پٹخ دی تھی اور صبح ہوتے ہی چلی گئی تھی..... تادیر واپس نہ آنے کے لیے۔

☆☆☆

اندرون خانہ معاملات کا علم تو کسی کو نہیں تھا تاہم یہ بات تو عیاں تھی کہ صالح اور حیا میں بن نہیں پا رہی۔ دیگر معاملات کے علاوہ بچی کی عمر بھی ان کے اختلافات کو بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ شاید دونوں کی عمریں اتنی کم تھیں کہ اس رشتے کو سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ اس میں اتنی توتے فیصد قصور تو صالح کا ہی تھا۔

صالح کے بابا سمجھ پا تھے۔ صالح کے ساتھ کافی ڈانٹ ڈپٹ ہوئی پھر انہوں نے معاملات کو سلجھانے کی کوشش شروع کر دی۔ برکات احمد ان کا مرید اور عقیدت مند تھا۔ وہ ہر بات ماننے کو تیار تھا مگر مسئلہ کمسن بیٹی کا تھا۔ اس نے بصد عاجزی کچھ عرصے کی مہلت مانگ لی۔ حالات سے عیاں تھا کہ یہ مہلت ہفتوں کی نہیں، مہینوں کی ہے۔

صالح کو نسوانی لمس کی چاٹ لگ گئی تھی۔ جیسے شکاری جانور کے منہ کو خون لگ جاتا ہے۔ وہ حیا کے جانے کے بعد دیوانہ سا ہوا پھرتا تھا۔ موبائل فون اور تخیلاتی دلہن وغیرہ اس کے کچھ کام نہیں آتے تھے۔ خیالی دلہن، اصل دلہن کا بدل تو نہیں ہو سکتی تھی۔ خیالی دلہن سے مل کر صالح کو اب عجیب طرح کی پشیمانی اور خجالت آمیز افسردگی ہی ملتی تھی۔

ان ہی دنوں اسے وقار کی زبانی معلوم ہوا کہ دو تین ماہ پہلے آفرین اور اس کا شوہر اذلان، ملائیشیا سے شفٹ ہو کر فلپائن چلے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں اب کسی قسم کی معلومات ملنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف پھپھو عاصمہ اور پھوپا ماجد کا رابطہ بھی باقی خاندان سے بالکل کٹ چکا تھا۔ لگتا تھا کہ انہوں نے جینا مرنا ختم کر دیا ہے۔ پھپھو کی طرف سے... پراپرٹی والا معاملہ بھی شاید اللہ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

صالح انٹر کا امتحان کسی نہ کسی طرح پاس کر چکا تھا تاہم اس نے آگے پڑھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بابا نے بھی اس معاملے میں خوامخواہ سر پھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے وارے فضل کو ہدایت کر دی تھی کہ فی الحال اس کی اسٹڈی پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ انہوں نے فضل اور اپنے ایک برانچ منیجر افراسیاب کی ذمے داری لگائی کہ صالح کو لکڑی کی "سلی پر چیز" سے آشنا کیا جائے اور فرم کے معاملات سمجھائے جائیں۔ درحقیقت وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا دوست سیف اپنے بیٹے وقار کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ کاروبار کی سوجھ بوجھ بھی دے رہا ہے۔ وہ صالح کو بھی بزنس کی جانکاری دینے کے خواہاں تھے۔ بے شک شاہنواز رائے اور سیف اللہ میں دوستی تھی لیکن ساتھ ساتھ کاروباری مسابقت بھی تھی جو کسی وقت رقابت کی حدوں کو بھی چھو جاتی تھی۔

بابا شاہنواز رائے کی صحت اب کافی بہتر تھی۔ وہ کسی وقت واکر کے بغیر بھی چند قدم چل لیتے تھے البتہ ادویات کا استعمال جاری تھا۔ وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہ کر سرخاب منزل کا تعمیراتی کام کروا رہے تھے۔ کام اختتام کے قریب تھا۔

پھر چند ہی دن بعد انہیں اپنی ایک بھولی بسری مصروفیت یاد آ گئی۔ وہ عرصے بعد ایک بار پھر کراچی کے "کاروباری" دورے پر روانہ ہوئے۔ حالانکہ صحت پوری طرح اجازت نہیں دیتی تھی۔ حسب سابق یہ دورہ کم و بیش ایک ماہ پر محیط تھا۔ بابا کے سرخاب منزل سے جاتے ہی صالح کی بندشیں ڈھیلی ہو جاتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ سانس لینے کے لیے ہوا میں آکسیجن بہت بڑھ گئی ہے۔

اس کا لنگوٹیا دوست وقار اب بی ایس سی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ والد کے کاروبار میں بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ بابا اپنے دورے پر کراچی چلے گئے تو صالح نے اسے تین چار روز کے لیے سرخاب منزل ہی بلا لیا۔

سگریٹ تو صالح اب سرِعام بھی پی لیتا تھا تاہم الکوحل سے دل بہلانے کے لیے اسے اور وقار کو کمرے میں بند ہونا پڑتا تھا۔ دونوں دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ نئے ماڈلز کی گاڑیوں اور موبائل فونز کی باتیں، فلموں، ویڈیو گیمز اور لڑکیوں کی باتیں۔

رات کو وقار نے امپورٹڈ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "یار! عجیب بات ہے۔ میوزک سسٹم اور انٹرنیٹ وغیرہ تو دور کی بات ہے، تمہارے گھر میں تو اب تک ٹیلی ویژن کو داخلہ نہیں مل سکا۔"

"اور ملے گا بھی نہیں۔" صالح نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یار! لوگ تو لڑکیوں پر بھی اتنی پابندیاں نہیں لگاتے جتنی انکل نے تم پر لگا رکھی ہیں۔"

"بس، اپنی اپنی قسمت ہے۔"

"ویسے تمہیں ایک بات بتاؤں؟" وقار نے کہا۔
"ہاں، ہاں۔"
"اچھا..... چلو، رہنے دو۔" وقار نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "وکی! میں نے کسی دن سر توڑ دینا ہے تمہارا۔ اس طرح آدھی بات نہ کیا کرو۔"
پہلے تو وقار آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ جب صالح کا اصرار بڑھ گیا تو اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔ "یہ انکل شاہنواز جو کراچی جاتے ہیں نا..... اس کے پیچھے کوئی معاملہ ہے۔"
"کیسا معاملہ؟"
"دیکھو، مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا مگر تم نے مجبور کیا ہے تو بتا رہا ہوں..... یہ ان کا صرف کاروباری دورہ نہیں ہوتا۔"
"تو کیا ہوتا ہے؟"
"ساتھ کچھ اور بھی چلتا رہتا ہے۔"
یکا یک صالح کا تجسس بڑھ گیا۔ اس کی سوالیہ نظریں وقار کے چہرے پر تھیں۔
وقار نے کہا۔ "دیکھو، تمہیں پتا ہی ہے، جس طرح ہم دوست ہیں، انکل شاہنواز اور میرے ڈیڈی بھی دوست ہیں اور ہمارے بزنس بھی ایک جیسے ہیں۔ ان دونوں کی آپس میں گپ شپ چلتی رہتی ہے۔ پچھلے اتوار میں نے ڈیڈی کو انکل شاہنواز سے فون پر باتیں کرتے سنا۔ کراچی میں کسی لڑکی کی..... اور نکاح وغیرہ کی بات ہو رہی تھی۔ تمہیں سن کر برا تو لگے گا مگر جو کچھ مجھے پتا چلا ہے، وہ یہی ہے کہ انکل شاہنواز کراچی میں ایسے ہی کام کے لیے جایا کرتے ہیں۔"
صالح کو بھی کبھی کبھی کسی گڑبڑ کا شبہ تو ضرور ہوتا تھا مگر اب وکی کی زبانی اس طرح کی بات سن کر وہ حیران رہ گیا۔ سنبھل کر بولا۔ "وکی یار! بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بابا جو کچھ بھی ہیں مگر تمہیں پتا ہے کہ وہ پنج وقت کے نمازی، پرہیزگار ہیں۔ سیرا سائیں کے دربار سے جڑے ہوئے ہیں اور....."
"تمہاری بات ٹھیک ہے یار! مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں نا کہ وہاں نکاح کی بات ہو رہی تھی۔ کسی سے نکاح کرنا..... اور پھر بعد میں طلاق دے دینا تو ہو سکتا ہے نا..... اور کچھ لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ اس کو غلط بھی نہیں سمجھتے۔"
صالح حیران تھا اور بات کو کچھ کچھ سمجھ بھی رہا تھا۔ اسے اپنے بزرگوں کی ان بڑی بڑی پینٹنگز کا خیال آیا جو سرخاب منزل کی دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے پتا تھا کہ اس کے بڑوں نے کبھی بھی ایک دو عورتوں پر اکتفا نہیں کیا۔

lala

ایک آدمی بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک تصویر اسے بہت پسند آئی۔ تصویر کسی بہادر سپاہی کی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دکاندار سے پوچھا۔ "یہ تصویر کتنے کی ہے؟"
دکاندار نے کہا۔ "پچاس روپے کی۔"
اس آدمی کے پاس اڑتالیس روپے تھے۔ وہ واپس گھر چلا گیا اور دوسرے دن پھر اس دکان پر پہنچا تو وہ تصویر بک چکی تھی۔ ایک روز وہ اپنے دوست کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہی تصویر ہال میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے دوست سے پوچھا۔ "یہ تصویر کس کی ہے؟"
دوست نے کہا۔ "ہمارے دادا کی ہے۔"
اس پر اس آدمی نے کہا۔ "دو روپے کم پڑ گئے تھے ورنہ یہ ہمارے دادا ہوتے۔"
(انتخاب: محمد اسحاق انجم، کنگن پور، قصور)

بابا اتنے عرصے سے کیوں اکیلے زندگی گزار رہے تھے؟ کسی وقت صالح کے دل میں خیال آتا تھا کہ بابا نے سرخاب منزل میں صرف ادھیڑ عمر ملازمائیں ہی رکھی ہوئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ وہ صالح کو جوان عورتوں سے دور رکھنا چاہتے تھے مگر دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ انہیں خود پر بھی اعتماد نہ ہو اور وہ خود بھی حویلی کی حد تک جوان عورتوں سے دور رہنا چاہتے ہوں۔
وقار خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا تذبذب کے بعد بولا۔ "اور ایک بات اور بھی بتاؤں تجھے..... مجھے پکا یقین ہو گیا ہے جو یہ پیٹ میں گولی لگی تھی نا انکل شاہنواز کو، یہ بھی کوئی ڈکیتی وغیرہ نہیں تھی۔ یہ بھی کسی عورت وغیرہ ہی کا جھگڑا تھا۔"
پتا نہیں کیوں صالح کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ وقار غلط نہیں کہہ رہا۔ اسے کئی اور چھوٹی موٹی ایسی باتیں یاد آنے لگیں جن سے یہ شک تقویت پکڑا کرتا تھا کہ بابا کے کراچی کے دورے صرف کاروباری نہیں ہوتے۔
اس رات صالح کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر موجود بغاوت کی چنگاریاں کچھ اور بھی بھڑک اٹھی ہیں۔
شاید اسی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ اگلے ہی روز اس نے بابا کی لگائی ہوئی دیرینہ پابندیوں میں سے ایک پابندی توڑ

ڈالی۔ وہ خاص موقعوں پر اپنے بابا یا دادا جی فضل کے ساتھ تو سرخاب منزل سے باہر جا سکتا تھا، ویسے نہیں... مگر وہ چلا گیا۔ اس نے دادا جی فضل کو بتایا کہ سرگودھا میں فرنیچر کا وہ نیا شوروم دیکھنا چاہتا ہے جو انکل سیف نے حال ہی میں بنایا ہے۔ وقار بھی اس کے ساتھ ہے۔

دادا جی فضل اور منیجر افراسیاب زیادہ منع بھی نہ کر سکے تھے کہ شاہنواز رائے نے خود ان سے کہا تھا کہ اب صالح کا رخ کاروبار کی طرف موڑنا چاہیے۔ کاروبار کی پروا کسے تھی، وہ تو کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے نکلا تھا۔ اسے لگا کہ وہ سرگودھا شہر کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ وہ اور وقار، انکل سیف کی "ویگونر" جیپ پر خوب گھومے۔ ایک فرسٹ کلاس کرکٹ میچ ہو رہا تھا، وہ بھی انہوں نے دیکھا پھر ایک کلب میں گئے اور کھانا پیا۔ رات کو اسٹیج ڈراما دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ پہلی قطار میں بیٹھ کر نہایت عریاں، گالی نما جگتیں سنتے رہے اور ہوشربا ڈانس بھی دیکھے۔ یہیں پر پہلی بار صالح نے اپنے دشمن بابڑا فیملی کے ایک فرد کو بھی دیکھا۔ یہ ایم پی اے حاکم بابڑا کا سب سے چھوٹا بیٹا پرنس شاہد تھا۔ وہ بھی ڈراما دیکھنے آیا ہوا تھا۔ ساتھ میں دو ملازم بھی تھے جن میں سے ایک مسلح تھا۔ وقار نے صالح کو بتایا کہ آج کل علاقے میں پرنس شاہد کے بہت ٹھسکے ہیں۔ خیریت ہی گزری کہ یہ پرنس شاہد ڈراما ختم ہونے سے پہلے ہی نکل کر چلا گیا اور ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔

صالح رات گئے وقار اور ان کے ڈرائیور کے ساتھ جیپ پر ہی واپس آیا۔

اگلے چار پانچ روز میں اس نے دو مزید ایسے کام کیے جو اس کی باغیانہ روش کے عکاس تھے۔ ایک تو وہ سرگودھا سے نیا موبائل فون لے آیا تھا اور اسے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس نے دادا جی فضل سے صاف کہا تھا کہ اب وہ بچہ نہیں، شادی شدہ ہے۔ وہ حالات بہتر کرنے کے لیے اپنی بیوی سے رابطہ رکھنا چاہتا ہے اور بس یہی بات وہ بابا جانی کو بھی بتائے گا۔ اس کی دلیل میں کچھ وزن تھا لہٰذا دادا جی فضل نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔

دوسرا کام جو چند روز بعد ہوا، بس اچانک ہی ہو گیا تھا۔ ڈینگی کا دور دورہ تھا۔ مختلف ٹیمیں شہروں اور مضافاتی علاقوں میں بھی لاروے تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ ایک چھوٹی ٹیم سرخاب منزل بھی پہنچی تھی۔ نوجوان لڑکا اور لڑکی تھے۔ دادا جی فضل بھی موجود نہیں تھے۔ پہلے تو جالے نوری نے انہیں اندر ہی نہیں آنے دیا پھر کسی کے کہنے پر اجازت دے دی۔ وہ دونوں اپنی کارروائی پوری کرنے لگے۔ کونے کھدروں میں جھانکنے لگے، رہائشی حصے میں بھی آئے۔ صالح اپنے کمرے میں موجود کھڑکی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ لابی میں لگے واش بیسن کے پاس تھے جب اچانک صالح کو لگا کہ لڑکے نے واش بیسن کی شیلف پر سے کوئی چیز اٹھا کر بڑی صفائی سے چھپائی ہے۔ یکایک صالح کو کرنٹ سا لگا۔ اسے یاد آیا کہ کچھ دیر پہلے اس نے اپنی گھڑی اتار کر وہاں رکھی تھی۔ اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ بیش قیمت گھڑی کلائی پر موجود نہیں تھی اور نہ ہی اب واش بیسن کی شیلف پر تھی۔

وہ تیزی سے باہر آیا اور پینٹ قمیص والے اس دبلے پتلے نوجوان کو بازو سے پکڑ لیا۔ "گھڑی کہاں ہے؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

لڑکے کا رنگ ایک لمحے کے لیے زرد ہوا پھر سنبھل کر بولا۔ "کون سی گھڑی جی؟"

"وہی جو تمہاری والدہ صاحبہ نے تمہاری حرام زدگی کے انعام میں تمہیں تحفے میں دی ہوئی ہے۔" صالح نے زہریلے لہجے میں کہا اور ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس کی ساتھی لڑکی بھی کچھ فاصلے پر ہکا بکا کھڑی تھی۔

صالح، جالے نوری سے مخاطب ہوا۔ "گھڑی اس کمینے کے پاس ہے۔ تلاشی لو اس کی۔"

جالے نوری نے اسے گریبان سے دبوچا اور پانچ دس سیکنڈ میں اس کا سارا جسم ٹٹول ڈالا۔ گھڑی نہیں ملی۔ اس نے تین چار زوردار جھانپڑ لڑکے کو لگائے اور گھڑی کے بارے میں پوچھا۔

یکلخت صالح کا دھیان چند فٹ کی دوری پر کھڑی لڑکی کی طرف چلا گیا۔ اس کے ہونٹ بھی خشک ہو رہے تھے۔ صالح تاڑ گیا کہ لڑکے نے گھڑی اپنی اس ساتھی کو منتقل کر دی ہے۔ وہ لڑکی کی طرف جھپٹا۔ اس کی چادر اتار کر دور پھینکی۔ بے جھجک اس کے جسم کو ٹٹولا۔ گھڑی اس کے گریبان میں سے برآمد ہو گئی۔

صالح نے ایک کرارا طمانچہ رسید کیا۔ وہ لڑکا کر صوفے پر گری اور اس کا رجسٹر اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گرا۔

صالح نے گرج کر جالے نوری سے کہا۔ "انسپکٹر آغا کو فون کرو اور فوراً پولیس کو بلاؤ۔"

لڑکا اور لڑکی دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ لڑکی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "مم..... میرا کوئی قصور نہیں جی..... جو کچھ کیا ہے، اس نے کیا ہے۔ اس نے گھڑی میری طرف بڑھائی تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا..... اور....."

''تم نے اپنے گریبان میں گھسیڑلی۔'' صالح نے دانت پیس کر اس کا جملہ مکمل کیا۔

''معاف کردیں جی۔'' نوجوان لڑکا بھی اب گھگیانے لگا تھا۔

''اور کس کس گھر میں کام دکھایا ہے؟'' صالح نے لڑکی کے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔

وہ درد سے کراہی پھر ذرا احتجاجی لہجے میں بولی۔

''دیکھیں، آپ اس طرح مجھے ہاتھ نہ لگائیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

یکا یک صالح کا پارا بلندی کو چھو گیا۔ وہ پھنکارا۔

''اچھا، چوری اور سینہ زوری۔ تیری تو ایسی کی تیسی۔'' اس نے لڑکی کو کئی تھپڑ لگائے۔

واش بیسن کے پاس ہی ربڑ کا تین چار فٹ لمبا پائپ پڑا تھا۔ عالم طیش میں اس نے پائپ اٹھایا اور لڑکی کو بے طرح پیٹنے لگا۔ اسی دوران میں لڑکے نے خوفزدہ ہو کر دوڑ لگادی۔ جالا نوری اور دیگر ملازم اس کے پیچھے لپکے اور برآمدے کی جانب اسے دبوچ لیا۔ وہیں پر اس کی شامت بھی آگئی۔ صالح نے لڑکی کو گھسیٹ کر اپنے کمرے کے قالین پر پھینکا اور اس کے کچلتے جسم پر تواتر سے ربڑ کا پائپ برسانے لگا۔ وہ پہلے تو احتجاجی انداز میں چلاتی رہی پھر منت سماجت کرنے لگی مگر صالح پر تو ایک جنون سا طاری ہو چکا تھا۔ وہ اسے بڑی طرح مارتا رہا۔ اس کے دماغ میں ایک سرخ آندھی سی چلنے لگی تھی۔ اس کے اندر کی وحشت اسے اکسا رہی تھی کہ وہ اس کا لباس تار تار کر ڈالے۔ پتا نہیں وہ اس کے ساتھ کیا کر گزرتا کہ آیا ماں بی اور انچارج ملازمہ صادقہ اندر آگئیں۔ ماں بی اس لڑکی اور صالح کے درمیان آگئیں۔ ماں بی اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔ ''کیا کرتا ہے پتر! عورت ذات ہے..... چھوڑ دے اب۔''

وہ ہانپتا ہوا سا پیچھے ہٹ گیا۔ وہ قالین پر پڑی تھی۔ صالح کے گھسیٹنے سے اس کا گریبان دور تک پھٹ چکا تھا۔ کندھے، گردن اور بازوؤں پر پائپ کے سرخ سرخ نشان تھے۔ جسم کا شاید کوئی حصہ ہی ان نشانات سے خالی ہو۔ اس نے اپنی ناک قالین سے لگائی ہوئی تھی اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ صادقہ نے اس کا جسم چادر سے ڈھانپا اور ماں بی مشتعل صالح کو بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

لڑکی کے ساتھ نوجوان کی بھی اچھی خاصی مرمت ہوئی تھی۔ اسی دوران میں پتا نہیں کس طرح اس واقعے کی خبر سرخاب منزل سے باہر بھی پہنچ گئی۔ سروے ٹیم کے تین اور ممبر بھی آس پاس ہی موجود تھے۔ دس پندرہ منٹ میں وہ بھی سرخاب منزل کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ ان میں ٹیم کا انچارج ابدال خان نامی شخص بھی تھا۔ اسے لڑکی کے ساتھ ہونے والے بہیمانہ سلوک کی بھنک بھی پڑ گئی۔ وہ اشتعال میں نظر آنے لگا۔

صالح ڈرائنگ روم میں بیٹھا خود کو اعتدال پر لانے کی کوشش کر رہا تھا جب داجے فضل بگڑے تیوروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آتے ساتھ ہی غصے سے بولے۔

''یہ کیا کر دیا ہے تم نے اس لڑکی کے ساتھ۔ مار مار کر حشر کیا ہوا ہے..... بہت بڑی بے وقوفی کی ہے تم نے۔''

''داجے! وہ چوری کے ساتھ سینہ زوری کر رہی تھی۔ دھمکی دے رہی تھی۔''

''کچھ بھی ہے..... کچھ بھی ہے۔ تمہیں اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیے تھا۔ مجھے بتاتے..... ہم خود پولیس بلاتے۔ اب معاملہ الٹا پڑ رہا ہے۔ پولیس بلانے کی بات وہ کر رہے ہیں۔ عورت کی بات سنی جاتی ہے۔ وہ کوئی بھی الزام لگا سکتی ہے۔ کوئی بھی ٹیٹا کھڑا ہو سکتا ہے۔'' داجے فضل کی آنکھوں میں گہرے اندیشے تھے۔

''تو یہ تھانیدار آغا قادر کو کس لیے پالا ہوا ہے آپ لوگوں نے؟''

''آغا قادر کوئی اکیلا افسر نہیں ہے پولیس کے محکمے میں۔ اس طرح کے معاملے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔''

اسی اثنا میں جالا نوری ذرا پریشان صورت کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے فضل کریم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چاچا جی! وہ بندہ بڑا اودھا ہو رہا ہے۔ کہتا ہے کہ گھڑی کا الزام لگا کر ہماری لڑکی سے زیادتی کی گئی ہے۔ پولیس کو فون کرنا چاہ رہا ہے۔''

داجے فضل نے صالح کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

''اب یہاں سے باہر نہ نکلنا۔'' پھر وہ جالے کے ساتھ تیزی سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

حقیقتاً صالح پریشان ہو گیا تھا۔ معاملہ بگڑا ہوا لگ رہا تھا مگر یہ بھی وہ جانتا تھا کہ داجے فضل ایسے معاملوں کو اچھے طریقے سے ہینڈل کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر مالی معاملات جن کا تعلق زمینوں کی پیداوار سے تھا، داجے فضل کریم کے ہاتھ میں ہی ہوتے تھے۔ صالح کا اندازہ تھا کہ انہیں مناسب طریقے سے پیسا خرچ کرنا اور کام نکلوانا آتا تھا۔ شام تک انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو ٹھنڈا کر لیا۔ تھانیدار آغا اور ایک دوسرا پولیس افسر بھی پہنچ گئے تھے۔

بہر حال داجے نے اسے بتایا کہ اس حوالے سے ابھی پوری طرح بے فکر نہیں ہوا جاسکتا۔ اپنے طور پر داجے فضل نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ یہ بات کراچی میں صالح کے بابا کے کانوں تک نہ پہنچے۔

جو کچھ بھی تھا، صالح فکر مند ہو چکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بابا نے کراچی نے آجانا تھا اور وہ دو تین کام ایسے کر چکا تھا جن کے سبب وہ آگ بگولا ہو سکتے تھے۔ کسی وقت تو یہ عجیب سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوتی کہ بابا جلد نہ آئیں اور اگر آئیں تو پوری طرح صحت مند نہ ہوں۔ بیماری کی حالت میں ان کی سختی کافی کم ہو جاتی تھی اور وہ کچھ چیزوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

جس وقت سرخاب منزل میں صالح یہ سب کچھ سوچ رہا تھا، قریباً بارہ سو کلو میٹر دور کراچی کے قیصر ولا میں شاہنواز رائے ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ دادِ عیش دے رہے تھے یا یوں کہا جائے کہ دادِ عیش دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے پیٹ کے زیریں حصے اور اطراف میں درد رہتا تھا تاہم وصل کے ہیجان خیز لمحوں میں وہ درد کافی حد تک پس منظر میں چلا جاتا تھا۔ اس مرتبہ ان کی منکوحہ بیس بائیس سالہ حیدر آبادی دوشیزہ تھی۔ بے شک بحالتِ مجبوری ہی اس ناپائیدار شادی کے بندھن میں بندھی تھی، اس کے باوجود کافی شوخ و شنگ اور پُرحرارت ثابت ہوئی۔ وہ قرب کے لمحات میں شاہنواز رائے کی وارفتگی کا جواب دوگنا وارفتگی اور سرگرمی سے دے رہی تھی۔

پانچ چھ روز تو اس نے شاہنواز رائے کو ہواؤں میں اڑائے رکھا پھر شاہنواز کو جسم کے زیریں حصے میں کچھ درد اور نقاہت سی محسوس ہونے لگی۔ اس مرتبہ 25 برس سے شاہنواز رائے کا لنگوٹیا دوست سیف بھی ان کے ساتھ قیصر ولا میں ہی قیام پذیر تھا۔ پہلے تو سیف مادر پدر آزاد عیاشی کرتا تھا مگر عمر گزرنے کے ساتھ اس میں تھوڑی بہت تبدیلی آئی تھی۔ کچھ دباؤ شاہنواز رائے کا بھی پڑا تھا۔ اس مرتبہ سیف کے ساتھ بھی ایک "عارضی بیوی" ہی تھی۔

ایک دن دونوں باہر گراسی لان میں بیٹھے تھے۔ کیاریوں میں مہندی کے پھول مہک رہے تھے۔ "ملازم خاص" خیام نے دونوں کے سامنے سوفٹ ڈرنکس رکھ دیے تھے اور کافی فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سیف نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے نیم گنجے سر پر پی کیپ درست کی اور بولا۔ "شاہنواز! بندہ بڑا کھراڈھونڈا ہوا ہے تم نے۔ کھرا بھی اور زبردست چالو بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"کل مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے نئی کراچی میں ایک ایسی فیملی ڈھونڈی ہے جو کام ہی عارضی شادیوں کا کرتی ہے۔ چار پانچ بہنیں ہیں اور اکثر شادی شدہ رہتی ہیں۔ کام کافی بڑھ گیا ہے اس لیے انہوں نے اور عورتیں بھی ساتھ ملا لی ہیں۔"

"یار چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ لکڑی کہاں جا رہی ہے؟ امپورٹڈ پرزل کا بھاؤ کچھ نیچے آئے گا کہ نہیں۔ کل تو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ مجھے اس کے سبب پچھلے چھ مہینے میں کوئی 25 کروڑ کا ٹیکا لگ چکا ہے۔"

"ٹیکا نہیں پرزل کی وجہ سے نہیں، اپنی بیماری کی وجہ سے لگ رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، اب کچھ آرام کرو۔ صالح کو آگے لاؤ۔ میں بھی تو وقار کو لے ہی آیا ہوں۔"

"اس کو کوئی عقل سمجھ آئے تو تب ہے نا۔" شاہنواز رائے نے حسبِ عادت تسبیح گھماتے ہوئے سرد سانس لی۔

"میاں بیوی کا معاملہ کچھ ٹھیک ہوا یا نہیں؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں۔"

"بس بچی عمر میں تم نے پھانا گلے میں ڈال دیا ہے نا۔" سیف نے کہا۔ بظاہر سیف کے لہجے میں تاسف تھا مگر کوئی اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانکتا تو محسوس کرتا کہ اسے شاہنواز رائے کی افسردگی سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ کچھ عجیب دوستی تھی ان کی، جس میں کاروباری رقابت بھی ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اسی اثنا میں دو باوردی ملازم چائے اور لوازمات لان میں ہی لے آئے۔ ایک ملازم نے شاہنواز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "سرکار! یہ گاجر کا حلوا میم نے خود بنایا ہے۔ کہہ رہی تھیں ضرور چکھیے گا۔" میم سے مراد شاہنواز رائے کی نوخیز منکوحہ ہی تھی۔

مرغن و ثقیل چیزیں شاہنواز رائے کو منع تھیں مگر یہاں کراچی میں وہ پرہیز نہیں کر پا رہے تھے۔ مچھلی، سری پائے اور مٹن کڑاہی وغیرہ ان کی خوراک کا حصہ بن رہے تھے۔ جہاں یہ سب کچھ تھا تو گاجر کا حلوا بھی چکھا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک چمچ منہ میں رکھا اور بوکھلا گئے۔ وہ مرچوں والا حلوا تھا مگر چونکہ منہ میں جا چکا تھا اس لیے بہ مشکل اسے نگلا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔ دریچے کے عقب سے ایک شوخ ہنسی سنائی دی۔ یقیناً یہ ان کی دلہن کی شرارت ہی تھی۔

انہوں نے پانی پی کر تادیبی نظروں سے دریچے کی طرف دیکھا لیکن وہ اب اوجھل ہو چکی تھی۔ سیف اللہ نے

ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''بھئی اس مرتبہ تو پرابلم چائلڈ تمہارے پلے پڑا ہے۔'' پھر ذرا توقف کر کے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اکسار ہی ہے تمہیں سرگرمی دکھانے کے لیے۔''

اور اس رات شاہنواز رائے واقعی کافی سرگرم رہے۔

اس شوخ چنچل کی جوان قربت انہیں اپنے ساتھ کھینچتی اور بھگاتی چلی جارہی تھی۔ وہ آج اپنے زورِ بازو سے اس کی شوخیوں کو ماند کر دینا چاہتے تھے۔ وہ سبک بدن، آہو چشم، سراپا حرارت لڑکی ان کے بازوؤں کے حصار میں تھی۔ شاہنواز رائے کے اندر نسل در نسل چلنے والی مخصوص توانائی نے انہیں جیسے ان لمحوں میں پھر سے جوان کر دیا تھا۔ اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود ان کا بالوں بھرا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ لڑکی مدہوش تھی۔ یکا یک ایک شدید ٹیس شاہنواز رائے کی ناف والے زخم میں ابھری۔ وہ تڑپ کر ایک طرف ہو گئے۔ اگر ان کا خیال تھا کہ ٹیس رک جائے گی تو ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے جلدی سے اپنا لباس درست کیا اور بستر سے اترنا چاہا مگر ایسا ہو نہیں پایا۔ ٹیس ریڑھ کی ہڈی تک پھیل گئی اور پھر ایک دم ہی ان کی ٹانگوں نے ان کے قدرے بھاری جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ پہلو کے بل قالین پر گرے۔

منتشر بالوں والی لڑکی خود کو چادر میں ڈھانپتی ہوئی چلائی۔ ''کوئی ہے..... ہائے..... کوئی ہے۔''

شاہنواز رائے قالین پر تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ان کی ناف کا قدیمی درد پورے جسم میں اور خاص طور سے کمر میں منتقل ہو گیا ہے۔ وہ ٹانگوں کو حرکت نہیں دے پا رہے تھے۔ اب بیڈ روم سے باہر بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ شاہنواز رائے کو شدید ابکائی آئی۔ قے تو نہیں ہوئی مگر انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنا پیشاب روک نہیں پائے اور ان کے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

سرخاب منزل میں آج کل صالح پریشان تھا۔ بابا شاہنواز کے کراچی سے واپس آنے میں اب چار پانچ روز ہی رہ گئے تھے اور اسے ڈر تھا کہ جو ایک دو حرکتیں اس سے ہوئی ہیں، ان کی بھنک بابا کے کانوں تک ضرور جائے گی اور اس کے لیے لعنت ٹائم آجائے گا۔

تاہم اگلے ہی روز اس کو ایک ایسی خبر ملی جو چونکا دینے والی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ بابا کی طبیعت سخت خراب ہے اور وہ لاہور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل ہیں۔ یہ ایک تشویشناک خبر تھی مگر پتا نہیں کیوں صالح کو یہ زیادہ تشویشناک محسوس نہیں ہوئی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے صالح کی تشویش کو کم کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے دادے فضل سے بار بار بابا کی حالت کے بارے میں پوچھا۔ حالت ٹھیک نہیں تھی۔

اس اطلاع پر اسے دکھ ہونا چاہیے تھا مگر پتا نہیں کیوں دکھ نہیں ہو رہا تھا۔ اسے خود بھی یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کوشش کر کے اپنے چہرے پر غم و اندوہ طاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

.....آٹھویں دسویں روز بابا گھر آگئے۔ ان کا نچلا دھڑ قریباً مفلوج ہو چکا تھا۔ خوراک بالکل ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ بلڈ پریشر کنٹرول سے باہر تھا۔ دو ہفتوں میں ہی وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔

کچھ دیر کے لیے صالح کے دل میں ان کے لیے ہمدردی جاگی۔ وہ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے تسلی تشفی کی باتیں بھی کرتا رہا۔ تاہم اگلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ہمدردی والی کیفیت بتدریج ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دو روز بعد جب بابا کو اس کے موبائل فون کے بارے میں پتا چلا اور انہوں نے بستر پر لیٹے لیٹے ناگواری کا اظہار کیا تو ہمدردی کی وہ عارضی کیفیت بالکل ختم ہو گئی۔

دس پندرہ روز مزید گزر گئے۔ سرخاب منزل میں تین چار افراد کو ڈینگی ہوا تھا مگر اب سردی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ڈینگی کے اثرات کم ہوتے جا رہے تھے۔ ہاں، بڑھتی ہوئی سردی بابا شاہنواز کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ ان کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر کو مستقل طور پر سرخاب منزل میں ہی رکھ لیا گیا تھا۔ بابا زیادہ تر سوئے رہتے تھے۔ ان پر پین کلرز اور ٹرنکولائزرز کا اثر بھی تھا۔ اکثر انہیں اپنی پیشاب وغیرہ کی حاجات پر کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ سرخاب منزل کے معاملات پر ان کی گرفت مسلسل کمزور ہو رہی تھی۔ دادے فضل نے کئی اضافی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔

خزاں کے موسم نے صالح کو اداس کر رکھا تھا۔ وہ لان میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ سرخاب منزل کا بائیں جانب والا اور سامنے کا کچھ حصہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اس بدلی ہوئی سرخاب منزل کو دیکھ رہا تھا جب اچانک نہ جانے کیوں اسے آفرین کی یاد آگئی۔ پتا نہیں کہ اب وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی؟ اپنے شوہر کے ساتھ کس انداز میں رہ رہی تھی؟ آفرین نہیں رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سرخاب منزل کی وہ یادگاریں بھی نہیں رہی تھیں جن کا تعلق صالح اور آفرین کے معصوم بچپن اور شوخ لڑکپن سے تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ اسے لگا جیسے اس بچھڑی ہوئی لڑکی کے لیے اس کے اندر مسلسل ایک نفرت سی پروان چڑھتی رہی ہے۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ماسی نصیبن کراہتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"کیا بات ہے؟" صالح نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"چھوٹے سرکار! آج کل کام بالکل نہیں ہو رہا مجھ سے۔ بھاجی فضل کریم سے کہو نا کہ میرے ساتھ کوئی اور باورچن بھی لگا دے جو میرا ہاتھ وٹا سکے۔"

"تم خود دھونڈ لو نا ماسی!" صالح نے تیوری چڑھائی۔

"پتر جی.....! ہم..... میرا مطلب ہے چھوٹے سرکار! کوئی بڑی عمر کی مل نہیں رہی نا..... اور چھوٹی عمر کی ہم لا نہیں سکتے۔"

صالح کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کو سانولے رنگ کی گدرائے جسم والی وہ فرزانہ یاد آ گئی جو چند سال پہلے بطور ہیلپر ماسی نصیبن کے پاس آئی تھی اور جس کی وجہ سے صالح کو اپنے بابا جانی کے دو زوردار تھپڑ پڑے تھے۔

اس نے ماسی سے کہا۔ "وہ تیری جو ایک بھتیجی تھی، کیا نام تھا اس کا، فرزانہ..... وہ کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس ہی ہوتی ہے چھوٹے سرکار!"

"تو اسے کیوں نہیں لے آتی؟ میں واجے فضل سے خود بات کر لوں گا۔"

"پر..... پر چھوٹے سرکار! بڑے سرکار نہیں مانیں گے..... وہ تو....."

"جو کہا گیا ہے، وہ کر..... میں خود سنبھال لوں گا باقی باتیں۔" اس نے درشتی سے ماسی کی بات کاٹی۔

..... اور پھر تیسرے چوتھے روز وہ کچھ عرصہ پہلے والی فرزانہ دوبارہ سرخاب منزل میں تھی۔ وہ پہلے سے تھوڑی سی موٹی ہو گئی تھی لیکن مثبت پہلو یہ تھا کہ اس کا رنگ پہلے سے کچھ صاف ہو گیا تھا۔ اس کی شادی ہوئی تھی۔ بندہ نکھٹو اور نشئی نکلا تھا۔ طلاق ہو گئی تھی۔ واجے فضل نے فرزانہ کو یہاں لانے پر اعتراض کیا تھا مگر دو وجوہات تھیں جن کے سبب وہ مان گئے تھے۔ ایک تو فرزانہ اپنی چاچی کی طرح پکاتی بہت اچھا تھی، دوسرے یہ بات بھی واجے فضل اچھی طرح جانتے تھے کہ ماسی نصیبن ڈیمنشیا کا شکار ہونے کے بعد سے بہ مشکل کچن سنبھال پا رہی ہے۔ شاہنواز رائے جس حالت میں تھے، انہیں آج کل کم ہی پتا چلتا تھا کہ سرخاب منزل میں کیا اور کیسے ہو رہا ہے۔

دس پندرہ روز میں ہی صالح چوبیس پچیس سالہ فرزانہ کو نئے روپ میں پرکھ آیا۔ سرخاب منزل میں صالح کی حیثیت ایک نوجوان راجکمار کی تھی۔ کسی معمولی کنیز میں اتنی جرأت کہاں ہو سکتی تھی کہ اس کی پیش قدمی روک سکے..... اور وہ ضرورت مند بھی تھی۔

بے شک وہ معمولی شکل و صورت کی اور کسی حد تک عام سے جسم کی تھی مگر یہ عام سا جسم صالح کے لیے اس لیے عام سا نہیں تھا کہ اس کے سبب صالح کو ماضی میں اپنے باپ کے دو تھپڑ کھانے پڑے تھے۔ دو یادگار تھپڑ۔ بس ماضی کی یہی چوٹ تھی جس نے صالح کو فرزانہ جیسے معمولی شکار کی طرف متوجہ کیا تھا۔ ایسے ہی لگتا تھا کہ اس طرح وہ اپنے بابا کے ان دو تھپڑوں کی کسک مٹانا چاہتا ہے۔ ہاں وہی تھپڑ جو ایک جسم کو ذرا سا چھونے کی پاداش میں اس کے گال لال لال کر گئے تھے۔

پھر ایک رات وہ معمولی سی فرزانہ اس بستر پر تھی جس پر چند ماہ پہلے حیا احمد تھی۔ حیا احمد کو سرخاب منزل سے گئے اب چار ماہ ہونے کو آئے تھے اور اس بات کے آثار واضح تھے کہ یہ رشتہ اب طلاق پر ختم ہونے والا ہے۔

گداز بدن فرزانہ کے ساتھ ایک بار معاملہ شروع ہوا تو دراز ہوتا چلا گیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز وہ اسے اپنے کمرے میں بلانے لگا اور وہ خاموشی سے آنے لگی۔ ماسی نصیبن کو بھی اس معاملے کا علم ہو چکا تھا مگر وہ چشم پوشی سے کام لے رہی تھی۔ مستقبل قریب میں فرزانہ سے سوگنا اچھی لڑکیاں صالح کی دسترس میں آ سکتی تھیں مگر سانولی سلونی فرزانہ کو اپنے تصرف میں لانے کا ایک علیحدہ ہی احساس تھا۔ یہ احساس ان دو تھپڑوں پر حاوی ہو گیا تھا جو اکثر اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ تھپڑ کانوں میں گونجتے تو فرزانہ کی موجودگی میں اس کی وحشت فزوں تر ہو جاتی۔ کسی وقت تو وہ اسے درخت کا وہ تنا لگتی جس پر وہ اپنی جارحیت کے نشان چھوڑتا تھا۔

واجے فضل آج کل کڑی نظروں سے صالح کو گھور رہے تھے۔ شاید انہیں فرزانہ کے سلسلے میں کسی طرح کا شک ہو گیا تھا لہٰذا مہینا پورا ہونے سے پہلے ہی صالح نے ماسی نصیبن کو کچھ دے دلا کر فرزانہ کو سرخاب منزل سے واپس بھیج دیا۔ ویسے بھی صالح کا دل اب اس کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوتا تھا۔ اب اس کے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ کچھ نئی اڑانیں بھرنا چاہتا تھا۔ کچھ اور طرح کی من مرضیاں کرنا چاہتا تھا۔

(جاری ہے)

کبھی حبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں.....

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

آخری شام سے پہلے

طاہر جاوید مغل

تیسرا حصہ





آٹھ دس روز بعد صالح کے بابا کو پھر لاہور کے اسپتال جانا پڑ گیا۔ میڈیکل کے کئی مسائل پیدا ہو چکے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال یہی تھا کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے اسپتال ایڈمٹ ہونا پڑے گا۔ اس مرتبہ داجے فضل بھی ان کے ساتھ ہی لاہور چلے گئے۔ اپنی ذمے داریاں وہ منیجر افراسیاب کو سونپ گئے۔ افراسیاب میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ صالح کو کسی کام سے ٹوک سکتا۔ ویسے بھی وہ صالح سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ عنقریب صالح کو یہاں کافی اختیارات ملنے والے ہیں۔

بڑے سیف کی چابیاں بھی اب صالح کے پاس تھیں اور وہ بڑی حد تک اپنی مرضی سے خرچہ بھی کر سکتا تھا۔ موجودہ صورت حال میں صالح کو جو سب سے پہلا خیال آیا وہ اپنے ہمدرد و وفادار ملازم اختر عرف اخترے کو سرخاب منزل میں واپس لانے کا تھا۔ بابا کی طرف سے اس کے ساتھ کافی زیادتی ہوئی تھی اور صالح کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اخترے کو تلاش کرنے اور حویلی میں لانے کی ذمے داری صالح نے افراسیاب کو دی۔ وہ چھ سات روز کے اندر ہی اخترے کو میانوالی سے ڈھونڈ کر سرخاب منزل واپس لے آیا۔ وہ بہت دکھی اور افسردہ تھا۔ صالح نے اس کی تالیف قلب کے لیے چند اقدام کیے جن میں پہلا یہ تھا کہ اسے جالے لوری کی جگہ مروانے کے اہم ترین کام سونپ دیے۔ اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور کچھ نقد رقم بھی دی۔ صالح چاہتا تھا کہ جالے لوری کو دفع دور کر دے البتہ منیجر افراسیاب نے اسے سمجھایا کہ اس کے بابا کو یہ بہت برا لگے گا۔ افراسیاب کے کہنے پر صالح نے درمیانی راستہ اختیار کیا اور جالے کو سرخاب منزل سے نکال کر ڈیرے پر بھیج دیا۔

سرخاب منزل کی کم از کم چار ملازمائیں ایسی تھیں جو ضرورت سے زیادہ بوڑھی ہو چکی تھیں۔ ان میں ماسی صبیحن بھی شامل تھی۔ اب ان سے کام ہو نہیں پاتا تھا مگر وہ سرخاب منزل سے چمٹی ہوئی تھیں۔ داجے فضل کا خیال بھی یہی تھا کہ اب کچھ اور تازہ دم ملازمائیں آنی چاہئیں۔ یعنی اس حوالے سے صورت حال میں لچک موجود تھی۔ صالح نے اس لچک سے فائدہ اٹھایا۔ بوڑھی ملازماؤں کو دے دلا کر رخصت کر دیا پھر اس نے لاہور میں داجے کو فون کر کے رسماً بابا کا حال احوال پوچھا۔ تب انہیں بتایا کہ صادقہ کا خیال بھی یہی ہے کہ نئی ملازماؤں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ چند ملازمائیں رکھ رہا ہے۔

داجے فضل نے کہا۔ ”صالح! دیکھو تم نے اخترے کو حویلی میں واپس بلا لیا ہے۔ اب کوئی اور الٹا کام نہ کرنا۔ شاہنواز نے بہت ناراض ہونا ہے۔ تمہیں یہاں کے اصول کا پتا ہی ہے۔ کوئی ملازمہ بھی پینتالیس پچاس سے کم کی نہیں ہونی چاہیے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

وہ جل کر بولا۔ ”پینتالیس پچاس بھی کیا۔ ہم ساٹھ ستر والی رکھ لیتے ہیں۔ ان کی خدمت سیوا کر کے نیکیاں کمائیں گے۔“

صالح کا ارادہ تو واقعی یہی تھا کہ ذرا جوان اور نک سک سے درست ملازمائیں رکھی جائیں مگر داجے فضل کی وارننگ کے بعد وہ قدرے محتاط ہو گیا۔ اگلے ہفتے میں اس نے سرخاب منزل کی ہیڈ خادمہ صادقہ کے ساتھ مل کر کئی درجن عورتوں کے انٹرویوز لیے اور ان میں سے چار کو منتخب کیا۔ وہ درمیانی عمر کی تھیں یعنی پینتیس چالیس کے آس پاس۔ تاہم ان میں سے ایک تیس بتیس کی تھی۔ اس کے نین نقش، اس کی گوری رنگت اور گدرایا ہوا جسم صالح کو بہت بھلے لگے۔ وہ سخت ضرورت مند بھی تھی۔ اسے منتخب کرنے سے پہلے صالح نے ہیڈ خادمہ صادقہ کو بہانے سے باہر بھیج دیا۔ اس کا نام روزینہ تھا۔

”کیا کیا کر سکتی ہو؟“ صالح نے پوچھا۔

”چھوٹے سرکار! جو آپ کا حکم ہو۔ دہی رڑک کر مکھن نکال سکتی ہوں، بھینسوں بکریوں کا دودھ بلو سکتی ہوں۔ تندور میں روٹیاں لگا سکتی ہوں۔ محنت سے گھبرانے والی نہیں ہوں۔“

”پر تمہیں پتا ہے یہاں حویلی میں بڑی عمر کی نوکرانیاں ہوتی ہیں۔ تمہاری عمر کم ہے۔“

”نہیں جی..... اتنی کم بھی نہیں ہے۔“ اس نے جیسے خود پر جبر کر کے کہا۔

”جو کام تم نے بتائے ہیں، ان کے علاوہ کیا کیا کر سکتی ہو؟“ صالح نے اس کی چمکیلی سیاہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی..... وہ حویلی میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب کر سکتی ہوں۔“

”تمہیں کیا پتا کہ حویلی میں کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہوتا رہا ہے؟“

”ہم..... میرا مطلب ہے جی..... دیسی کھانے بنا لیتی ہوں، ہر طرح کے کپڑے بڑی اچھی طرح استری کر لیتی ہوں، نالے اور پراندے وغیرہ بنا لیتی ہوں.....“

”بیڈ مسٹن کھیل لیتی ہو؟“ صالح نے اسے سرتاپا

دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔
"بیڈ..... منٹن؟"
"جی..... چڑی چھکا۔" صالح نے وضاحت کی۔
"چڑی چھکا؟" وہ اس غیر متوقع سوال پر حیران ہوئی پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ "جی، چڑی چھکا بھی کھیلا تو نہیں..... پر..... بچپن میں تھوڑا بہت کھیلا بھی ہے۔" وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی کہ مجھ سے کیوں پوچھا جا رہا ہے۔
"ذرا کھڑی ہو جاؤ۔" وہ تحکم سے بولا۔
تھوڑا جھجک کر وہ کھڑی ہو گئی۔ صالح نے چاروں طرف گھوم کر اسے دیکھا۔ "چلو، ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ فی الحال میں تمہیں ایک مہینے کے لیے رکھ رہا ہوں۔ اگر ٹھیک چلو گی تو پکی ہو جاؤ گی۔"
وہ سر تا پا مشکور ہو کر چلی گئی۔ صالح کو اس کے سراپا اور چہرے مہرے میں ماضی کی اپنی ہی ٹیچر ثمینہ جمال کا عکس نظر آیا تھا جو صالح کے ساتھ بیڈ منٹن بھی کھیلا کرتی تھی اور پھر ایک روز بابا نے اسے سرخاب منزل سے نکال باہر کیا تھا۔
وقار اینڈ بروقار حسب معمول سرخاب منزل آ گیا۔ انہوں نے چار پانچ ملازمین کو ساتھ ملایا۔ اختر ابھی ان میں شامل تھا۔ انہوں نے کرکٹ کھیلی پھر صالح اور وقار نے گراؤنڈ کی دھوپ میں ہی بیٹھ کر گاجریں، مولیاں اور کینو وغیرہ کھائے۔ یہ سب کچھ سرخاب منزل کی اپنی زمینوں کی ہی پیداوار تھی۔
وقار نے گراؤنڈ کے درمیان میں لگے بیڈ منٹن کے نیٹ کو دیکھ کر کہا۔ "اب کرکٹ شروع کر دی ہے تو پھر یہ نیٹ بھی اکھڑوا دو۔ تمہیں تو ہمیشہ سے چڑ رہی ہے اس سے۔"
"اکھڑوا دوں گا..... لیکن کچھ دن بعد۔"
"وہ کیوں؟"
"یار! ایویں، بال کی کھال نہ اتارا کرو۔ چلو آؤ، کمرے میں چلتے ہیں۔ کچھ گلا ہی تر کر لیں۔"
تین چار دن کے بعد سہ پہر کے وقت صالح اسی روزینہ نامی ملازمہ کے ساتھ گراسی لان میں بیڈ منٹن کھیلتا نظر آیا۔ روزینہ نے صالح کی ہدایت کے مطابق دوپٹا کس کر اپنی کمر سے باندھا ہوا تھا اور الٹا سیدھا ریکٹ چلا رہی تھی۔ اسے ٹھیک سے کھیلنا کہاں آتا تھا لیکن صالح اس کا کھیل دیکھنا بھی کب چاہتا تھا۔ وہ تو اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے گدرائے ہوئے جسم کی ہلچل۔
سرخاب منزل میں سب ہی حیران تھے کہ چھوٹے سرکار اس ملازمہ کے ساتھ ہی کیوں کھیل رہے ہیں۔ کم از کم نصف درجن اور ایسے ملازم تھے جو اس کھیل میں ان کا ساتھ دے سکتے تھے مگر چھوٹے سرکار سے یہ سوال کر کون سکتا تھا۔ وہ سرخاب منزل کے "راج کمار" تھے۔
ڈیڑھ گھنٹے کے پریشان کن کھیل نے روزینہ کو تھکا ڈالا۔ وہ بے طرح ہانپ گئی۔ سردی میں بھی پسینا اس کی گردن پر دوڑنے لگا۔
صالح نے بید کی خوبصورت کرسی پر اسے اپنے پاس بٹھایا۔ اسے سیب کا جوس پلایا۔ وہ بہت پشیمان اور حیرت زدہ تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کھڑی رہنا چاہتی تھی مگر صالح نے اسے ٹوک دیا تھا۔ وہ صالح کی نظروں کو کچھ کچھ بھانپ رہی تھی۔
"تمہارا خاوند کب سے کویت میں ہے؟"
"کوئی..... ڈھائی سال ہو گئے ہیں جی۔"
"بچے کتنے ہیں تمہارے؟"
"بس ایک لڑکی ہے سرکار! دو سال کی۔ دادی کے پاس رہتی ہے۔"
"مطلب کہ تمہارے خاوند کے جانے کے بعد پیدا ہوئی؟"
"جی سرکار!"
"مکان اپنا ہے؟"
"نہیں جی۔ کرائے کے دو کمرے ہیں۔ مالکِ مکان وہ بھی چھڑانا چاہتا ہے۔"
"خوبصورت ہو..... جوان بھی ہو لیکن لگتا ہے بندہ پیسے کہیں اور بھی اڑاتا ہے۔ تمہارا تو اپنا مکان ہونا چاہیے۔ چلو مل جائے گا تمہیں مکان۔ ایک ڈیڑھ ماہ تک ہی مل جائے گا۔"
وہ حیرت سے صالح کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جھکی ماندی تھی مگر صالح اسے کمرے میں لے گیا۔ مکان والا وعدہ مزید پکا ہو گیا..... مگر کمرے سے باہر آتے ہوئے روزینہ وہ نہیں رہی جو کمرے میں جاتے وقت تھی۔ بال منتشر، مزید ہانپی ہوئی اور زرد۔
..... پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ بیڈ منٹن اور پھر نیم گرم کمرے کی خلوت۔ ایک دن صالح نے تنہائی میں روزینہ سے کہا۔ "ہم سرخاب منزل کے پچھواڑے چھوٹے چھوٹے گھر بنوا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گھر تمہارے نام الاٹ ہوگا۔ جب تک گھر نہیں بنتا، تم کرائے کے گھر کو دفع کرو اور بچی کے ساتھ یہاں آ جاؤ۔"
اسے سخی بچی اور اس کی دادی کو سرخاب منزل میں

بلانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بس یہ بھی اس کی ایک عجیب سنک ہی تھی۔ وہ روزینہ کو اس کی بچی کے ساتھ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ خوبصورت عورت ننھے بچے کے ساتھ مزید خوبصورت اور مکمل نظر آنے لگتی ہے۔ جیسے..... جیسے وہ سفید براؤن بلی جو اپنے بلونگڑے کے ہمراہ نہ جانے کہاں سے سرخاب منزل میں داخل ہو جاتی تھی اور برآمدے سے گزرا کرتی تھی۔ بعد ازاں داجے فضل نے اسے کہیں پھکوا دیا تھا۔ شاید وہیں کہیں بھیج دیا تھا جہاں سرخاب منزل کے دیگر جانور اور پرندے بھیجے تھے۔ مرغیاں، مرغے، رنگ برنگے طوطے اور فاختائی رنگ کے کبوتر وغیرہ۔

ان جانوروں کا خیال صالح کے ذہن میں آیا تو خیالات کی رو کسی اور طرف چل نکلی۔ بابا تو اب تادیر کے لیے اسپتال میں چلے گئے تھے۔ پتا نہیں کہ ان کی واپسی کب ہونا تھی اور ہونا بھی تو کس حال میں۔ اس نے چوبیس گھنٹے تک سوچ بچار کی اور پھر سرخاب منزل میں کچھ پالتو جانور لانے کا ارادہ کر لیا مگر وہ بتدریج آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ بے شک بابا اسپتال میں تھے اور داجے فضل بھی وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے پھر بھی یہ اندیشہ موجود تھا کہ بابا کے کانوں تک کوئی خبر پہنچے اور وہ بھڑک اٹھیں۔ سب سے پہلے اس نے مرغیاں مرغے لانے کا فیصلہ کیا۔ یہ پرندہ اسے کشش بھی زیادہ کرتا تھا۔

ہفتے دس روز میں ہی زنانے کے بغلی باغیچے میں تین بڑے بڑے دڑبے بن گئے اور مختلف نوع کی کوئی ساٹھ مرغیاں آ گئیں۔ صالح کی ہدایت کے مطابق اکثر صبح اور شام کے وقت مرغیوں کو احاطے میں کھلا چھوڑ دیا جاتا۔

روزینہ اپنی بچی کو بھی سرخاب منزل لے آئی تھی۔ دادی اپنے کسی دوسرے بیٹے کے پاس چلی گئی تھی۔ روزینہ کی نوکری بھی پکی ہو چکی تھی۔ صالح نے اس کی تنخواہ کافی گرم کی تھی۔ اب وہ ڈھنگ کے کپڑے پہن رہی تھی۔ اب بھی اس نے "ویلوٹ" کا عنابی جوڑا پہن رکھا تھا اور بچی کو گود میں اٹھائے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔ کتنی زبردست لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر صالح کو چوڑیاں فلم کی اونچی لمبی ہیروئن یاد آ جاتی تھی۔ یہ فلم اس نے حویلی سے اپنی دوسری اڑان بھرنے کے بعد وقار کے ہمراہ سرگودھا شہر میں دیکھی تھی۔ سنہری دھوپ میں روزینہ کا دودھیا رنگ گلابی نظر آ رہا تھا۔ نوخیز دلہن حیا احمد نے صالح کو لمس کا جو ہوکا لگایا تھا، وہ اب بہت بڑھ چکا تھا۔ تصوراتی دلہن کچھ مداوا نہیں کرتی تھی۔ اس شب ایک سایہ سا بڑی خاموشی کے ساتھ پھر صالح کے کمرے میں رینگ گیا تھا۔ یہ روزینہ ہی تھی۔ کمرے میں سے وہ عروسی مسہری نکل چکی تھی جو چند ماہ پہلے حیا کے ساتھ اس کمرے میں آئی تھی اور اب لگتا تھا کہ مسہری کی طرح حیا بھی سرخاب منزل سے نکلنے والی ہے۔ اس نے واپس آنے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں جب خوشنما روزینہ کا سایہ خاموشی سے صالح کے کمرے میں رینگتا تھا تو شیر خوار بچی بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی جسے وہ ہولے سے علیحدہ صوفے پر لٹا دیتی تھی۔ گاہے بہ گاہے وہ سوتی پڑی بچی کو دیکھتی بھی رہتی تھی۔ یہ سب کچھ صالح کو بہت بھلا لگتا تھا۔

سرخاب منزل کے مکین اندھے بہرے نہیں تھے۔ قریباً قریباً سب ہی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ "بادشاہ" کی بیماری کے بعد یہاں کا "راج کمار" کس خرمستی میں مصروف ہے۔ وہ اس خرمستی کی جڑ سے بے خبر تھے اس لیے اضافی طور پر بھی حیران تھے۔

ہیڈ منشن کا نیٹ اب ختم ہو چکا تھا۔ سیمنٹ کا کورٹ بھی صالح نے اکھڑوا دیا تھا۔ اب وہ یہاں کرکٹ کی پچ بنوانا چاہتا تھا مگر بابا کی طرف سے تھوڑا تھوڑا ڈر بھی موجود تھا۔ ایک ساتھ بہت سی نافرمانیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔

ایک دن لاہور سے داجے فضل کا نہایت طیش بھرا فون صالح کو موصول ہوا۔ وہ غصے سے پھٹے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے صالح کو بہت سخت سنائیں۔ اپنی تمکن گرج سے اسے بُری طرح لتاڑا۔ صالح کو اندازہ ہوا کہ کسی طرح ملازمہ روزینہ والا معاملہ ان کے کانوں تک پہنچ چکا ہے اور یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔

وہ کھل کر تو کچھ نہیں بولے مگر سب کچھ صالح کو سمجھا بھی دیا۔ آخر میں کہنے لگے۔ "صالح! میری ایک بات یاد رکھنا۔ کوئی نہ بھی دیکھ رہا ہو تو خدا ضرور دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی بھولتا نہیں ہے۔ ہماری ایک ایک سانس اور دھڑکن کا حساب اس کے پاس ہوتا ہے۔ آخرت میں تو جو ہوگا، وہ ہوگا ہی، وہ دنیا میں بھی سزا دے کر چھوڑتا ہے۔ کبھی یہ جلدی مل جاتی ہے، کبھی دیر سے۔ کچھ ڈر اللہ سے..... کچھ ڈر۔"

ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ انہوں نے فون بند کر دیا۔

داجے سے تلخ ترش سننے کے بعد صالح جھلایا ہوا سا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک حیا اس کے ساتھ ہوتی تھی مگر اب بھول کر بھی اس کا خیال نہیں آتا تھا۔ شاید اپنے والد مخدوم شاہنواز رائے کی طرح اس کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا جو چند دن کے لیے نشاط و طرب کی ساتھی بن کر

اس کے شب و روز سے نکل گئی، بس پھر وہ نکل گئی۔

وہ فریش ہونے کے لیے لگژری باتھ روم میں جا گھسا۔ فریش ہونے کے بعد بھی وہ وہیں ٹب کے اندر بیٹھا رہا اور ہیڈ فون لگا کر میوزک سنتا رہا۔ گئے وقت میں اس پر اتنی سختی تھی کہ باتھ روم میں اس کے گزرے ہوئے منٹ گنے جاتے تھے اور اکثر جب وہ نکلتا تھا تو آیا ماماں بی یا داجے فضل آس پاس ہی منتظر نظر آتے تھے اور یہ سب کچھ صالح کے بابا کے حکم پر ہی ہوتا تھا۔ شاید یہ اسی سختی کا ردِعمل تھا کہ اب وہ بے وجہ بھی واش روم میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایسا کرنا بھی اسے کئی دیگر ''من مرضیوں'' کی طرح اچھا لگتا تھا۔

موڈ کچھ بحال ہوا تو صالح نے لباس تبدیل کیا اور ٹہلنے کے لیے نکل گیا۔ سرخاب منزل قریباً تین ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ سرخاب منزل کی عقبی باؤنڈری کے پاس ہی وہ چھوٹا سا خاندانی قبرستان موجود تھا جہاں صالح کی ماں ثمینہ ارجمند بھی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہوش میں بس تین چار بار ہی قبر کے سرہانے وہ سفید کتبہ دیکھا ہوگا جس پر ثمینہ ارجمند زوجہ شاہنواز رائے لکھا تھا اور نیچے تاریخِ وفات درج تھی۔ یہ تاریخ صالح کی پیدائش کے قریباً دو سال بعد کی تھی۔ دو سالہ بچے کا حافظہ کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔ اسے اپنی ماں کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ان سے کچھ خاص وابستگی بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بس اسے اتنا پتا تھا کہ وہ بہت اچھی تھیں، خوبصورت تھیں اور یہ کہ اس کی اپنی صورت اپنی والدہ ثمینہ ارجمند سے بہت ملتی تھی۔ آخر الذکر بات کی تصدیق خاندانی البم کی ان چند تصویروں سے بھی ہوتی تھی جو اس نے دیکھ رکھی تھیں۔

وہ درختوں کے سائے سائے ٹہلتا کافی دور نکل گیا۔ قبرستان یہاں سے قریب ہی تھا مگر وہ آگے نہیں گیا۔ قبرستان میں جانا اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

بارشوں کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ خزاں دھیرے دھیرے اپنا زرد رنگ گہرا کر رہی تھی۔ صالح کے لیے یہ اداسی کا موسم ہوتا تھا مگر آج کل نہیں تھا۔ وہ سرتاپا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ روزینہ کو نوجوان تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا مگر تیس بتیس سال کی عمر میں بھی اس کا پنڈا للکارے مارتا تھا۔ جیسے ساز کا تنا ہوا تار جو تادیر سحر انگیز دھنیں بکھیرنے کے باجود ذرا ڈھیلا نہیں پڑتا۔

وہ ستمبر کی ایک چاندنی رات تھی۔ صالح کے کمرے میں اے سی ہلکی رفتار میں آن تھا۔ روزینہ صوفہ کم بیڈ پر بچی کو تھپک تھپک کر سلا چکی تھی اور اب صالح کے عقب میں کھڑی اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے کندھے دبا رہی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبی لٹیں گاہے بہ گاہے صالح کے چہرے کو چھو جاتی تھیں۔

''اتنا چپ چپ کیوں ہے؟'' صالح نے پوچھا۔

پہلے تو اس نے ٹالا پھر بولی۔ ''چھوٹے سرکار! میرا بندہ ایک دو ہفتے میں کویت سے واپس آ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے کانوں میں کسی طرح بھنک پڑ چکی ہے۔ چھوٹے سرکار! وہ بڑا ڈھاڈا بھی ہے۔ مجھے تو ڈر سا لگ رہا ہے۔''

''کتنا ڈھاڈا ہے..... ہم سے ڈھاڈا تو نہیں ہوگا نا۔'' صالح نے اس کے جھولتے ہوئے ریشمی بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''دیکھو، ڈھائی سال سے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا پھر اب کیوں بھاگا آ رہا ہے؟''

''مجھے اسی لیے شک پڑ رہا ہے جی کہ اس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہے۔''

''تم نے ایک دن بتایا تھا کہ وہاں اس نے کسی بنگالن کے ساتھ نکاح بھی کر لیا تھا؟''

''ہاں جی، مجھے تو پکا یقین ہے کہ وہ اب بھی اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ وہاں موٹر مکینکی کرتا ہے نا۔ اس کا کوئی بنگالی شاگرد تھا، اس کی بہن ہے۔''

''اس فراڈیے کا شناختی کارڈ یا نمبر وغیرہ ہے تمہارے پاس؟'' صالح نے پوچھا۔

روزینہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہاں جی، نمبر تو ہوگا۔ شاید شناختی کارڈ کی کاپی بھی ہو۔''

''چلو، پاکستان آتا ہے تو آ لینے دو۔ سارا کچھ اگلوا لیں گے اس سے۔'' صالح نے ذرا مخمور لہجے میں کہا اور پھر روزینہ کے جھولتے بالوں سے ہی اسے کھینچ کر اپنے سامنے گرا لیا۔

آٹھویں دسویں روز کی بات ہے۔ صالح سو کر اٹھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس سے پہلے بابا کے ٹائم ٹیبل کے مطابق اسے صبح آٹھ بجے سے پہلے جاگنا پڑتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آج کل وہ اپنی ساری ادھوری نیندوں کی کمی پوری کر رہا ہے اور بات صرف سونے جاگنے تک ہی نہیں تھی، اس نے اپنے سارے ''اوقات'' کو اس طرح تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا جیسے وہ آج کل اپنی منظورِ نظر کو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چڑچڑے پن اور بددماغی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جو سکون ملتا تھا، وہ وقتی ہوتا تھا اور

حصولِ سکون کا یہ عمل بھی عموماً آخر میں ایک غرق آلود، پشیمانی زدہ بُو باس اسے دے جاتا تھا۔

بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ پڑھنے والے بچے کو بھاری ناشتا نہیں کرنا چاہیے۔ اب وہ بچہ نہیں تھا۔ نہ ہی پڑھنے والا تھا اور نہ ہی مجبورِ محض تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ناشتے میں اس نے کاڑھنی کا نیم سرخ دودھ مولی ملائی کے ساتھ غٹا غٹ چڑھایا اور پھر روزینہ کے ہاتھ کا بنا چار تہوں والا دیسی گھی کا پراٹھا، تین دیسی انڈوں کے آملیٹ کے ساتھ کھایا۔ ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مردانے کی طرف سے ملازم اختر آتا دکھائی دیا۔ اس نے آکر بتایا کہ کوئی بندہ ملنے آیا ہے۔ اپنا نام غفور بتاتا ہے۔ کہتا ہے کویت سے آیا ہے۔

صالح سمجھ گیا کہ وہ کون ہے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ مردانے کی وسیع بیٹھک میں لگژری صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے تیس پینتیس سال کا ایک سانولا سا شخص شلوار قمیص میں ملبوس کھڑا تھا۔ کاٹھی مضبوط تھی، پیشانی کی طرف سے بال تھوڑے سے اڑے ہوئے تھے۔

صالح نے ایک فالتو ملازم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب نو وارد کے علاوہ صرف اختر ہی بیٹھک میں موجود تھا۔

''ہاں بھئی، کیسے تشریف لانا ہوا؟'' صالح نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر نو وارد سے پوچھا۔

''جی میں غفور احمد ہوں۔ میری گھر والی آپ کے پاس ملازم ہے۔ بچی بھی یہیں ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن وہ تو تم سے ملنا نہیں چاہتی۔''

غفور کا رنگ پھیکا پڑا۔ ''جج..... جی..... شاید تھوڑی بہت ناراضگی ہوگی۔ میاں بیوی میں ہو جاتی ہے۔''

''تھوڑی بہت نہیں، بہت زیادہ ہے۔ ڈھائی سال ہو گئے تمہیں بیوی بچی کی یاد نہیں آئی۔ اب اس کھوتے کی طرح بھاگے چلے آئے ہو جس کی دم میں مرچیں لگی ہوئی ہیں۔''

''آپ..... آپ کیا کہہ رہے ہو جی۔ وہ میرے نکاح میں ہے۔'' وہ ذرا دلیر ہو کر بولا۔

''افراسیاب! اندر آؤ۔'' صالح نے گرج کر کہا۔

منیجر افراسیاب ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے کاغذ سامنے میز پر رکھ دیے۔ صالح نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے ہزار کے نوٹوں کی تین گڈیاں نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں غفور سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یہ تین لاکھ ہیں۔ انہیں جیب میں ڈالو اور ان کاغذات پر دستخط انگوٹھا کرو۔''

''یہ..... یہ کیا ہے صاحب جی؟'' غفور نے بھویں اچکائیں۔

''یہ طلاق کے کاغذ ہیں۔ روزینہ تیرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔''

غفور کا رنگ پہلے فق ہوا پھر ذرا سرخی مائل ہو گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔

''میں بتاتا ہوں کیسے ہو سکتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' صالح صوفے سے اٹھ گیا اور نوٹوں کی گڈیاں دوبارہ جیب میں ٹھونس لیں۔

اختر نے غفور کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ غفور کو لے کر بغلی کمرے کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ صالح بھی افراسیاب کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بغلی کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

دو تین منٹ تک تو اندر سے تکرار کی آوازیں آئیں پھر رونے، گڑگڑانے کی صدائیں آنے لگیں۔ قریباً دس منٹ بعد جب تگڑی کاٹھی والا غفور کمرے سے باہر نکلا تو اس کے چہرے پر اختر کے طمانچوں اور نوازی گھونسوں کے نیلے نشان تھے۔ اس کے آنسو اور ناک کی رطوبت ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے۔ نوٹوں کی تینوں گڈیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔

اس کے عقب میں صالح سیاہ رنگ کا پسٹل اپنی جیکٹ میں ٹھونستا برآمد ہوا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ غفور نے طلاق نامے پر دستخط کیے اور رحم طلب نظروں سے صالح اور اختر کو دیکھنے لگا۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔

''دوبارہ یہاں نظر تو نہیں آؤ گے؟'' صالح نے اس کے کولہے پر ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں جی۔'' اس نے بڑی آسانی کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

صالح نے جیب سے کچھ مزید نوٹ نکالے اور اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ ''یہ تمہاری واپسی کے سفر کا خرچہ مرچہ۔''

پھر صالح نے منیجر افراسیاب اور اختر کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیٹھک سے باہر چلے گئے تاہم اختر اچند منٹ بعد روزینہ کو لے کر واپس آ گیا۔ وہ ایک لمبی چادر میں تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ خشک ہو رہے تھے لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کی ڈھارس کچھ بندھ گئی۔

صالح نے روزینہ سے کہا۔ ''یہ مانا ہے کہ اس نے وہاں کویت میں بنگلہ لگی ہوئی ہے۔'' پھر صالح نے ایک اور

ٹھوکر غفور کی پشت پر لگائی۔ ''چلو بولو، جو کچھ بولنے کو کہا تھا۔''

غفور نے قالین پر بیٹھے بیٹھے روزینہ کو دیکھا۔ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آج کے بعد تم میرے لیے حرام ہو۔''

''پھر بولو۔'' صالح پھنکارا۔

غفور نے فقرہ دہرایا۔ تین بار یہ فقرہ بولنے کے بعد غفور کی جان بخشی ہوئی۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، بیٹھک کی ایک ادھ کھلی کھڑکی کے پیچھے کوئی موجود تھا۔

☆☆☆

موسم بتدریج کروٹ لے رہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے مضافاتی علاقوں میں اکتوبر کے شروع میں ہی لحاف وغیرہ نکل آتے ہیں۔ آج صالح کا لنگوٹیا وقار کافی دنوں بعد اس سے ملنے سرخاب منزل آیا تھا۔ اس نے بی ایس سی کے ایگزام دیے تھے۔ اس کے علاوہ والد کے کاروبار کا بوجھ بھی اس کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ دونوں دوست حویلی کی وسیع چھت پر بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سفید پتھر کی چھت لشکارے مار رہی تھی۔ نیچے زنانے کے لان میں صالح کی پالتو مرغیاں اور مرغ ''کدکاڑے'' مارتے پھرتے تھے۔ کہیں کہیں ان میں سے کوئی جوڑا قانونِ فطرت کے مظاہرے میں مصروف ہو جاتا۔ اسی اثناء میں ایک طرف سے روزینہ بچی کو بازوؤں میں لیے نمودار ہوئی۔ دو تین بار زور سے گول مٹول بچی کو چوما۔ ہر بار بچی کو چومتے ہوئے اس کی ناک کا کوکا چکارا مار جاتا۔

وقار نے غور سے نیچے لان میں دیکھا پھر حیرت سے بولا۔ ''اوئے ہوئے، کافی ٹھیک ٹھاک چیز ہے..... اور تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ تمہارے بچپن کی اس ٹیچر ثمینہ جمال سے بھی ملتی جلتی ہے۔''

''بلکہ اس سے بڑھ کر ہے یار! ساتھ میں بچہ بھی تو ہے۔ بچے کے ساتھ ایسی عورتیں زیادہ سوہنی ہو جاتی ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی تصویر مکمل ہو گئی ہے۔''

''اور واقعی وہ قلم چوڑیاں والی ہیروئن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اس میں۔'' وکی نے ہنس کر کہا۔

ان کی باتوں کے دوران میں ہی روزینہ ایک دھریک کے نیچے بچھی رنگین پایوں والی نواڑی چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے بچی کو گود میں لے کر مخصوص انداز میں اپنے ساتھ لگایا اور اوپر گلابی چادر پھیلا دی۔

''یار! مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ انکل شاہنواز کے آنے کی دیر ہے۔'' وقار بولا۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''وہ سب سے پہلے اسی ''لشکارے مارتی'' کو چوٹی سے پکڑ کر سرخاب منزل سے باہر کریں گے۔''

''جب آئیں گے، تب دیکھا جائے گا۔'' صالح نے قدرے بے پروائی سے کہا اور یہی وقت تھا جب لمبا تڑنگا اختر ان خانے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی صالح کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔

وہ سیدھا چھت پر آیا اور اس نے صالح کو بتایا کہ لاہور میں اس کے بابا کو اسپتال سے چھٹی ہو گئی ہے اور وہ کل تک سرخاب منزل..... واپس آ رہے ہیں۔ داجے فضل کریم آج ہی واپس پہنچ رہے ہیں۔

صالح کا سارا موڈ غارت ہو کر رہ گیا۔ آج اس نے سارا دن وقار کے ساتھ بڑی آتشیں گفتگو کرتے ہوئے گزارا تھا اور اس کے جانے کے بعد وہ آج کی رات بھی بڑے آتشیں ماحول میں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ آتش جس کا تعلق سحر انگیز روزینہ سے تھا مگر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ تیسرے روز بابا جانی کے آنے کے بعد پوری ہونے والی تھی۔

تیسرے دن شام سے پہلے بابا دو ماہ بعد سرخاب منزل واپس پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر صالح کو دھچکا سا لگا کہ ان کی صحت پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ داجے فضل نے ایک دن پہلے آ کر جو سب سے پہلا کام کیا تھا، وہ یہ تھا کہ سب مرغیاں اور کبوتر وغیرہ وڑیوں سمیت سرخاب منزل کے پچھواڑے باؤنڈری کے پاس باغیچے میں پہنچا دیے تھے۔ ان کی نظر میں دوسرا کام اس سے بھی زیادہ ضروری تھا اور وہ تھا ملازمہ روزینہ کو منظر سے ہٹانا۔ وہ اسے نکال باہر کرنا چاہتے تھے مگر اس سلسلے میں صالح اڑ گیا تھا۔ درمیانی راستہ یہ نکالا گیا تھا کہ ہیڈ خادمہ صادقہ نے روزینہ کو بچی سمیت سرخاب منزل کے نئے تعمیر شدہ حصے میں بھیج دیا تھا۔

صالح پہلے دن بابا کے پاس دیر تک بیٹھا رہا۔ بڑی فکرمندی سے ان کی صحت کے بارے میں سوال جواب کرتا رہا۔ انہوں نے صالح سے مجموعی افراسیاب کی کارکردگی کے بارے میں جاننا چاہا۔ صالح نے کاروبار کے معاملات اور افراسیاب کی مصروفیت میں کوئی دلچسپی لی ہوتی تو باپ کو کچھ بتاتا۔ آنکھیں باہیں کر کے رہ گیا اور اگلے روز وہ کام ہو گیا جو صالح کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ اٹھا تو اختر اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے پُرتشویش لہجے میں بتایا کہ تھانیدار آغا بیٹھک میں آیا بیٹھا ہے اور داجے فضل سے

باتیں کر رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔

صالح کا دھیان پہلے تو اسی ڈینگی سروے والی لڑکی کی طرف گیا مگر جب وہ بیٹھک میں پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی سین کھڑا تھا۔ داجے فضل کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ انسپکٹر آغا امتیاز نے سنسنی خیز لہجے میں صالح کو بتایا کہ اس کے خلاف سرگودھا کے تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی ہے۔ عبدالغفور نام کے کویت پلٹ بندے نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی بیوی بچی کو اغوا کیا گیا ہے۔

صالح سناٹے میں رہ گیا۔ اسے اور منیجر افراسیاب وغیرہ کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ غفور ایسا کر سکتا ہے۔ وہ آیا تو سرخاب منزل میں گوشت پوست کے انسان کی طرح تھا مگر گیا پانی کی طرح بہتا ہوا تھا۔ اس نے یہ جرأت کیسے کر لی؟

تھانیدار آغا نے ٹوپی اتار کر اپنے مہندی رنگے چھدرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''اس نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ جب وہ سرخاب منزل میں بیوی کو واپس لینے گیا تو اسے بھی کئی گھنٹے حبس بیجا میں رکھ کر بری طرح مارا پیٹا گیا اور پستول تان کر قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ زبردستی کاغذوں پر دستخط کرائے گئے۔''

داجے فضل غضب ناک نظروں سے صالح کو گھورتے چلے جا رہے تھے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد فضل کریم نے انسپکٹر آغا سے پوچھا۔

''چاچا جی! کرنا تو اب ان لوگوں نے ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ وارنٹ لے کر آئیں گے اور صالح کو گرفتار کرنا چاہیں گے۔''

''تو پھر اب کیا رائے ہے تمہاری؟''

''میرے خیال میں تو صالح کو کہیں دائیں بائیں ہو جانا چاہیے۔'' انسپکٹر آغا نے اپنی گنجی چندیا سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس رن (عورت) کو بھی فوراً کہیں بھجوا دیا جائے۔''

''لیکن داجے! ایک ایویں سا بندہ ہمیں اس طرح کیسے دھمکا سکتا ہے؟'' صالح نے جھنجلا کر اعتراض کیا۔

''وہ ایویں سا ہو گا لیکن اس کے پیچھے جو کوئی بھی ہے، وہ خبیث ہے۔'' داجے فضل غصیلے لہجے میں بولے۔

''کون ہے وہ؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر یہ طے ہے کہ غفور جیسا بندہ کسی کی شہ کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔''

''اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔'' تھانیدار آغا نے لقمہ دیا۔ ''میڈیا والے بھی آلے دوالے چکراتے پھر رہے ہیں۔ یہ معاملہ اور زیادہ اوکھا ہو سکتا ہے۔''

داجے فضل کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں اور جھریاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب آغا باہر چلا گیا تو انہوں نے صالح سے کہا۔ ''دیکھ رہے ہو نا اپنی حرکتوں کا نتیجہ۔ آج پرچہ کٹا ہے، کل جیل بھی پہنچ سکتے ہو۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں، کتنا سر پھوڑا تھا تمہارے ساتھ۔ ابھی وہ ڈینگی والی گڑی کا معاملہ چل رہا تھا، اب یہ دوسرا سیاپا کھڑا ہو گیا ہے۔''

صالح نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ فضل کریم نے انگلی اٹھا کر اسے ڈانٹا۔ ''چپ رہو اب..... اور میری بات غور سے سنو۔ پولیس کسی وقت بھی یہاں آ سکتی ہے۔ تم دو تین روز کے لیے حویلی سے نکل جاؤ۔ میں اس حرام زادی کو بھی کہیں دائیں بائیں کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو..... تم سرگودھا چلے جاؤ۔ اسی اپنے یار وکی کے پاس۔ میں اس کے باپ سیف اللہ کو فون کر دیتا ہوں۔''

''پپ..... پر بابا..... آپ بابا کو کیا بتاؤ گے؟''

''کہہ دوں گا میں نے خود بھیجا ہے۔ سیف اللہ نے فرنیچر کی جو نئی ورکشاپ بنائی ہے، اس کی مشینیں آ رہی ہیں۔ انہیں دیکھنے گیا ہوا ہے۔''

..... قریباً ایک گھنٹے بعد صالح اپنے کارندۂ خاص اختر کے ساتھ ایک نئی لوڈر گاڑی پر سرخاب منزل سے سرگودھا روانہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

صالح جس وقت سرگودھا پہنچا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں لیکن صالح کا دل بجھا ہوا تھا اور اس بجھے دل میں کئی اندیشوں کی چنگاریاں تھیں۔ وہ ڈرائیونگ خود کر رہا تھا۔ اختر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ پُرسوچ لہجے میں کہنے لگا۔ ''چھوٹے سرکار! کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کھوتے کا پتر غفور ہمارے دشمنوں کے پاس جا پہنچا ہو یا ان کمینوں نے خود ہی اس کے بارے میں ٹوہ لگائی ہو؟''

''تمہارا مطلب ہے بابڑ اوالے؟''

''ہاں جی۔''

''لگتا تو ایسا نہیں، پر ہو بھی سکتا ہے۔'' صالح نے لوڈر کو اس سڑک پر موڑتے ہوئے کہا جو انکل سیف اور وکی کی رہائش گاہ کی طرف جاتی تھی۔

وہ دو کنال کی اس شاندار کوٹھی میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ نہ صرف انکل سیف لاہور میں ہیں بلکہ وکی بھی گھر میں موجود نہیں ہے۔ بہرحال، انکل سیف کی طرف سے

ملازمین کو کال آچکی تھی۔ انہوں نے صالح کو خوش آمدید کہا۔ اختر ے کو مہمان خانے میں ٹھہرا دیا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد صالح کے موبائل فون پر وقار کی کال بھی آگئی۔ اسے سارے معاملے کی خبر ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میں صالح کے لیے تشویش و پریشانی تھی۔ وہ ملتان میں تھا۔ اس نے صالح کو یقین دلایا کہ وہ کل شام سے پہلے پہلے بائی ائر سرگودھا پہنچ جائے گا۔ اس نے صالح سے کہا۔ ''یار! تم آرام سے کھاؤ پیو۔ بے شک میرے کمرے میں ہی آرام کرو۔ یہاں ڈیڈی کی اجازت کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مارے گی اور زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے تمہارے واجے فضل سب سنبھال لیں گے۔ ایسے بڑے پھڈے بھگتتے ہیں انہوں نے۔''

.... رات کو گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ اکتوبر کی سردی نومبر دسمبر کی سردی کی طرح محسوس ہونے لگی۔ وقار کا کشادہ بیڈ روم آراستہ و پیراستہ تھا۔ ایل ای ڈی، میوزک سسٹم، دبیز قالین، قیمتی فرنیچر، اداکاروں کی خوبصورت تصویریں، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ انگلش اداکاراؤں کی دو تصویریں تو ناکافی لباس میں تھیں۔ ایسے ناکافی لباس کو صالح کی نگاہِ تصور چند لمحوں میں ناپید کر دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا تصور اس حوالے سے ہر وقت بے لگام رہتا تھا مگر اب چونکہ وہ فکرمندی کے دور لپیٹے میں تھا، یہ دونوں انگلش ''بی بیاں'' لباس سے محروم نہ ہوئیں۔

بادہ باراں کے اس موسم میں اور فکرمندی کے عالم میں صالح مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا مگر اب بات سگریٹ سے آگے چلی گئی تھی۔ اسے اس آتشیں سیال کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو اس کا گلا چیر کر سینے تک پہنچتا تھا اور ایک آگ سی اس کے رگ و پے میں پھیل کر باقی ہر طرح کی جلن کو غائب کر دیتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وقار کے کمرے کے کسی کونے کھدرے میں اسے وہ آتشیں سیال مل جائے گا۔ کھڑکیوں کے دبیز پردے برابر کر کے وہ اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ پھر اس نے موبائل فون پر وقار سے رابطہ کرنا چاہا مگر شاید خراب موسم کے سبب ہی سگنل ناپید ہو گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر کمرے کے مختلف گوشوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے لکڑی کی ایک دیوار دوز الماری کو ٹھونک بجا کر دیکھا تو اچانک ہی اسے پتا چلا کہ یہاں کوئی چور خانہ موجود ہے۔ اس نے رکوع کے بل جھک کر اپنا ہاتھ فرش کے لیول تک پہنچایا اور لکڑی کے ایک چھوٹے تختے کو احتیاط سے اٹھایا تو نیچے واقعی ایک چوبی خانہ موجود تھا۔ اس میں انڈین شراب کی ایک سربمہر بوتل اور سوڈے کی دو تین لوکل بوتلیں موجود تھیں۔

اسے پتا تھا کہ اسے مایوسی نہیں ہوگی۔ اس نے بوتل نکالی پھر سوڈے کی ایک بوتل نکالنے کے لیے اپنا ہاتھ مزید گہرائی میں پہنچایا تو ایک کونے میں ایک چھوٹے پسٹل کے ساتھ ایک میلا سا سیاہ شاپر دکھائی دیا۔ اس پسٹل کا تو اسے پتا تھا کہ وقار کے پاس ہے تاہم سیاہ شاپر کے بارے میں کچھ تجسس محسوس ہوا۔ اس نے وہ شاپر بھی نکال لیا۔ اس میں کچھ کاغذات تھے۔ اس نے شاپر کھولا۔ یہ چھوٹے چھوٹے تہ شدہ کاغذ تھے۔ غالباً لیٹر پیڈ کے ہوں گے۔ ڈاک کے چند کھلے ہوئے لفافے بھی دکھائی دیے۔ وہ یونہی نظر دوڑانے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر کی سمت سفر کر گیا ہے۔ وہ پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے یہ کمرا اپنے اندر موجود ہر شے سمیت گھومتا چلا جا رہا ہے۔

کھڑکیوں سے باہر آسمانی بجلی زور سے چمکی اور صالح کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خط جیسے مزید روشن ہو گیا۔ اس خط پر لکھے الفاظ صالح پہچانتا تھا۔ یہ تحریر، یہ کاغذ، یہ لفافے، کچھ بھی تو اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

جو خط اس کے ہاتھ میں تھا، یہ اسی بھولی بسری آفرین کا لکھا ہوا تھا جس کی مہکتی محبت کبھی اس کے لیے زندگی کا دوسرا نام تھی۔ وہ وہیں قالین پر بیٹھ گیا، ڈھے سا گیا۔ آفرین کا لکھا ہوا یہ خط تین سال پیشتر مئی کے مہینے کا تھا۔ وہی کربناک دن رات جب اس کے خط کے انتظار میں صالح نیم جان تھا اور آس کا پنچھی اڑ اڑ کر نڈھال ہو رہا تھا۔

صالح کی نگاہیں الفاظ پر پھسلتی چلی گئیں..... ''کیا بات ہے صالح! پلیز مجھے بتاؤ نا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ کیوں اس طرح ستا رہے ہو مجھے۔ کم از کم ایک بار تو بتا دو نا..... پلیز..... میرا بس نہیں چلتا ورنہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ میں نے ممی کو بھی خطوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ممی کہتی ہیں تم ایسے نہیں ہو۔ ضرور ماموں نے تم پر بہت سختی کی ہے جس کی وجہ سے تم نے خطوں کا جواب دینا بند کر دیا ہے۔ وہ تو اب اور بھی بہت کچھ کہنے لگی ہیں..... لیکن میرا دل نہیں مانتا صالح..... ! تم ایسے نہیں ہو۔ پلیز، ایک بار جواب دے دو۔'' اس سے آگے اس نے ہاتھ سے دو آنکھوں کا اسکیچ بنایا تھا جن سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

صالح نے بوسیدہ شاپر قالین پر الٹ دیا اور زمین پر بیٹھ کر ان مڑے تڑے کاغذات کو دیکھنے لگا۔ ان میں سے کچھ پھٹے ہوئے تھے۔ کچھ کو جیسے خود پھاڑ دیا گیا تھا۔ کچھ خط

اور لفافے سلامت بھی نظر آتے تھے۔ صالح کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے لرزاں ہاتھوں سے ان تمام خطوں اور لفافوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ زیادہ تر پر تاریخیں بھی درج تھیں اس لیے کچھ آسانی رہی۔ جو خط سلامت تھے، پندرہ بیس منٹ بعد ان کی ترتیب مکمل ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی ایک دل شگاف روداد بھی مکمل ہوتی سی نظر آئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے صالح نے آفرین کا جو خط پڑھا تھا، وہ درمیان کا تھا، اب اس کا پہلا گمشدہ خط اس کے سامنے تھا۔ آفرین کا لکھا ہوا یہ خط کم وبیش ساڑھے تین سال پہلے کا تھا اور یہ سردیوں کے وہی دن تھے جب وہ شدت سے آفرین کے جواب کا انتظار کر رہا تھا اور جواب آ کر نہیں دے رہا تھا۔ جواب نہیں آیا تھا..... مگر جواب آیا تھا..... اور وہ ساڑھے تین سال بعد یہاں وکی کے کمرے میں قالین پر اس کے سامنے پڑا تھا۔ صالح نے دل کی آنکھوں سے وہ پہلا گمشدہ خط پڑھ ڈالا.....

اس سے اگلا خط کوئی ایک ماہ بعد کا تھا۔ آفرین نے لکھا۔ ''صالح! کیا بات ہے۔ تم نے جواب نہیں دیا۔ میں سمجھ گئی ہوں، فرسٹ ائر کے مڈٹرم ایگزام کی تیاری پورے زور وشور سے ہو رہی ہوگی۔ بھئی، بہت اچھی بات ہے۔ میں تمہیں بہت کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز..... پلیز، بہت اچھے نمبر لینا.....'' یہ بھی ایک طویل خط تھا۔

اس کے بعد والے ایک دو خط میں کچھ مایوسی اور پریشانی دکھائی دیتی تھی۔ آفرین نے اصرار کے ساتھ صالح سے پوچھا تھا کہ وہ خط کا جواب کیوں نہیں دے رہا۔ کیا کوئی مسئلہ ہے۔ کہیں ماموں جان کو تو پتا نہیں چل گیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

صالح یہ خط پڑھ رہا تھا اور اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ یہی وہ دن تھے جب اس نے دل کڑا کر کے آفرین کو ایک اور خط لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر یہ سوچ کر ترک کر دیا تھا کہ پتا نہیں وہاں کوالالمپور میں کیا حالات ہیں اور وہاں خط کس کے ہاتھ لگے؟

آفرین نے دکھ اور اضطراب کے عالم میں اگلے دو چار ماہ میں جو خط لکھے تھے، ان میں سے کچھ پھاڑ کر ضائع کر دیے گئے تھے، کچھ موجود تھے لیکن کٹے پھٹے تھے مگر جتنے بھی الفاظ، جتنے بھی جملے سمجھ میں آ رہے تھے، وہ بتا رہے تھے کہ روتی سسکتی آفرین کتنے بڑے دکھ سے گزر رہی ہے۔ ایک خط میں کچھ الفاظ کی روشنائی پھیلی ہوئی تھی۔ ان پر پانی کے قطرے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ قطرے گرے نہیں، گرائے گئے ہیں اور یہ وہ پانی تھا جو دل سے اٹھ کر سیدھا آنکھوں میں آتا ہے اور جدائی کی طویل راتوں میں ستارہ بن کر چمکتا ہے۔ کون نہیں جانتا اس پانی کو؟

ایک خط پرزوں کی شکل میں شاپر سے نکلا تھا۔ اس کو صالح نے تپائی پر رکھ کر بڑی مشکل اور احتیاط سے جوڑا تھا اور وہ کافی حد تک پڑھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس دریدہ خط کی تحریر نے صالح کو بُری طرح چونکایا تھا۔ یہ آفرین کی تحریر نہیں تھی۔ یہ اس کی تحریر بھی جو آستین کا سانپ ثابت ہوا تھا۔ ہاں، یہ اس کے ہمراز وقار، وکی کی تحریر تھی۔ کچھ چھوٹے پرزوں کی وجہ سے کئی الفاظ ضائع ہو چکے تھے پھر بھی جو تحریر سمجھ میں آتی تھی، وہ کچھ یوں تھی۔

''..... آفرین! آپ سوچ رہی ہوں گی کہ مجھے آپ کا نام کیسے معلوم ہوا..... آپ کا ایڈریس کس طرح ملا..... میں نے آپ کو کہاں دیکھا.....؟ ان ہی سب سوالوں کا جواب دینے کے لیے میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں۔ اللہ کرے یہ آپ تک پہنچ جائے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا نام مصباح عزیز ہے۔ میں بی ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرے والد کا سرگودھا اور لاہور وغیرہ میں بزنس ہے۔ ایک نہایت شریف فیملی سے ہوں۔ آج سے تقریباً پانچ چھ ماہ پہلے آپ اپنی والدہ کے ساتھ ایک ٹیکسی کار سے اتری تھیں اور پھر سرگودھا ائرپورٹ میں داخل ہو گئی تھیں۔ آپ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ آپ اور آپ کی والدہ بہت غمزدہ نظر آتی تھیں۔ میں بھی اپنے ڈیڈی کے ساتھ لاہور جا رہا تھا۔ آپ لاؤنج میں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کرنے لگیں۔ سب سے پہلے مجھے آپ کا نام معلوم ہوا۔ پھر آپ کے ایڈریس کا پتا چلا۔ دراصل اتفاقاً میری نظر آپ کے بیگیج پر لگے ایک اسٹیکر پر پڑ گئی جس میں آپ کا پورا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔

''آفرین! آپ مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں ان لڑکوں میں سے نہیں جو کسی بھی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر عشق محبت کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ یقین کریں، میں بہت مختلف ہوں اور میں نے آپ کے بارے میں سوچا بھی بالکل مختلف انداز میں۔ دل چاہا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں، آپ کو جان سکوں اور آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو مدد کر سکوں..... مگر ہمارا ساتھ تو بس پندرہ بیس منٹ کا ہی تھا پھر ہم اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ البتہ آپ کا یہ کوالالمپور کا ایڈریس میرے ذہن میں محفوظ رہا اور آپ کا چہرہ بھی۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو ہمیشہ

خوش اور سلامت رکھے۔ یہ چند الفاظ آپ کے لیے لکھ دیے ہیں۔ میں اپنا ایڈریس بھی لکھ رہا ہوں۔ کتنا اچھا ہو کہ یہ تحریر آپ تک پہنچے۔ آپ اس کا جواب بھی دیں اور میں آپ لوگوں کے بارے میں کچھ جان سکوں۔"

صالح کا پورا جسم کانپنے لگا۔ یہ وکی کا خط تھا جو اس نے مصباح عزیز کے فرضی نام سے آفرین کو لکھا تھا۔ نیچے جو ایڈریس تھا، وہ سرگودھا کا ہی تھا۔ شاید وکی کے کسی یار دوست کا۔

خط لکھنے کے بعد پھاڑ دیا گیا تھا۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہات ہو سکتی تھیں۔ قریب ترین وجہ یہی نظر آتی تھی کہ وہ یہ خط اپنی ہینڈ رائٹنگ میں نہیں بھیجنا چاہتا تھا کہ کسی وقت بھانڈا پھوٹنے کا خدشہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ بعد میں اس نے اپنی لکھائی بدل کر یا اپنے کسی دوست سے لکھوا کر خط بھیجا ہو اور اس پہلے خط کو پھاڑ ڈالا ہو۔

اس کے بعد کے آفرین کے جو دو تین خط تھے، ان سے یہ بات واضح ہوئی کہ مصباح یعنی وکی اور آفرین کے درمیان خط... کتابت شروع ہوئی تھی۔ ایک خط میں آفرین نے اسے مصباح بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا۔

"اللہ نے آپ کو بہت نرم اور ہمدرد دل دیا ہے جو اس طرح دوسروں کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے بار بار پوچھا ہے کہ آپ کس طرح میری مدد کر سکتے ہیں..... تو میں اب آپ سے کیا کہوں؟ آپ کو کسی مشکل میں بھی ڈالنا نہیں چاہتی لیکن دل چاہتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے سرخاب منزل کے حالات کا تو پتا چل جائے۔ یہ تو خبر ہو جائے کہ آخر صالح نے ایک دم سب ختم کیوں کر دیا ہے؟"

..... اس کے بعد کے دو تین خطوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ بد باطن وکی نے آفرین اور صالح کے درمیان بتدریج اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ عرفِ عام میں لائن مار رہا ہے۔

کمرے سے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سرگودھا کے آسمان پر جو بجلیاں کڑک رہی تھیں، وہ صالح کے دل میں بھی تڑپ رہی تھیں۔ پھر ایک مختصر خط نے صالح کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ آفرین نے لکھا تھا..... "کئی دن سے مسلسل رو رہی ہوں بھائی جان! یقین ہی نہیں ہو رہا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ سنا تھا لڑکے بڑی جلدی بدل جاتے ہیں۔ یہ لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو دلوں کو روگ لگا کر بیٹھی رہتی ہیں۔ خیر، جو ہونا تھا، ہو گیا۔ مجھے نہیں جاننا کہ صالح کی زندگی میں آنے والی لڑکی کون ہے، کیا کرتی ہے؟ بس اگر صالح اس کے ساتھ خوش ہے تو خوش رہے۔ میں ہی دیوانی تھی اور ساتھ ساتھ بدقسمت بھی۔

"آپ نے فون نمبر کی بات کی تھی بھائی جان! میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اب اس قصے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔ بہرحال، آپ نے جس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر سرخاب منزل کے اندر کے حالات جانے، میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں، بہت زیادہ۔ خدا حافظ۔"

صالح کافی دیر سلامت اور کٹے پھٹے کاغذوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا مگر اسے کوئی اور ایسا خط نہیں ملا جسے اس آخری خط کے بعد کا قرار دیا جا سکتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے بعد آفرین نے وکی سے خط کتابت بالکل بند کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس کے بعد بھی وکی نے اسے مصباح عزیز کے نام سے خط لکھے ہوں مگر ان کا جواب ہی نہ آیا ہو۔

صالح کا سارا جسم حدت سے پھنک رہا تھا۔ وکی کا ایسا روپ اس کے سامنے آیا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ صالح اس سے اپنی ہر بات شیئر کر دیتا تھا اور شاید یہی صالح کی سنگین غلطی بن گئی تھی۔ وکی "یارِ مار" ثابت ہوا تھا..... یا پھر آستین کا سانپ۔

صالح کا سر چکرانے لگا۔ اس نے چند خطوط کی تصاویر اپنے موبائل میں لیں اور پھر تمام خطوط اور لفافے وغیرہ اسی طرح بوسیدہ شاپر میں بند کر کے الماری کے فرش دوز خانے میں رکھے۔ شراب کی سربمہر بوتل بھی اسی طرح واپس رکھ کر چوبی تختہ اوپر برابر کر دیا۔

وہ بے چینی سے قالین پر ٹہلنے لگا۔ اسے وکی کے حوالے سے کئی اور باتیں یاد آنے لگیں۔ سب سے پہلے تو اسے یہی یاد آیا کہ جب شراب نوشی والا معاملہ شروع ہوا تھا تو وکی نے کس طرح اٹل لہجے میں کہا تھا کہ وہ اسے لاتوڑے گا مگر چکھے گا نہیں مگر پھر اس نے نہ صرف چکھی تھی بلکہ بڑھ چڑھ کر صالح کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ موبائل فون کے استعمال کے نت نئے طریقے بھی اسی نے صالح کو سکھائے تھے۔

پھر صالح کو یاد آیا کہ بابا جانی کے بارے میں سب سے پہلے وکی نے ہی اسے بتایا تھا کہ وہ کراچی میں صرف کاروباری دوروں کے لیے نہیں جاتے۔ وہاں لڑکیوں اور عارضی نکاح وغیرہ کا چکر چلتا ہے اور پھر یہ کہ بابا کو گولی کے زخم والا روگ ڈکیتی کے سبب نہیں بلکہ کسی عورت کے جھگڑے کے سبب لگا تھا پھر جب ایک بار بابا نے ناراض ہو کر وکی کا داخلہ سرخاب منزل میں بند کر دیا تھا تو وہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا اور بابا سے باقاعدہ معافی مانگی تھی۔

یوں لگتا تھا کہ وہ صالح کے ساتھ چمٹا رہنا چاہتا ہے..... چاہتا ہے کہ صالح اپنے گھر والوں سے دور سے دور ہوتا جائے۔

یہ کیا کھیل تھا؟ یہ کیا واردات تھی؟ صالح نے ایک دو بار دادے فضل سے بھی یہ بات سنی تھی کہ شاہنواز اور سیف اللہ کاروباری دوست تو ہیں مگر ان میں کاروباری رقابت بھی چلتی ہے۔ خاص طور سے سیف اللہ، شاہنواز کو اپنا کاروباری حریف سمجھتا ہے۔

تو کیا یہی دبی دبی رقابت اور عداوت انکل سیف اللہ کے بعد ان کے بیٹے وقار میں بھی آ گئی تھی۔

وہ سوچتا رہا اور اس کا خون کھولتا رہا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے مگر وہ جاگ رہا تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ کلیجا کٹنے لگا۔ ''وکی..... وکی! یہ تم نے کیا ظلم کیا میرے ساتھ؟ یہ تم نے کیا کر دیا؟'' اس کا جی چاہا کہ ''آفرین..... آفرین'' پکارتا ہوا باہر نکل جائے۔ بارش کی بوچھاڑ میں بھاگتا چلا جائے اور بھاگتا بھاگتا ہی اس سرزمین تک پہنچ جائے جہاں وہ رہتی تھی۔ جس شہر میں وہ بستی تھی۔ اسے بتائے، آفرین! میں ایسا نہیں تھا..... میں نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ دوست کے روپ میں ایک سفاک دشمن نے ہم پر قیامت توڑی ہے۔

وہ بے قرار ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ پتا نہیں اختر نے اسے کہاں سے دیکھ لیا۔ مہمان خانے سے چھتری لے کر نکلا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے گھنگرالے بال اس کی چوڑی گندمی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے صالح کا جائزہ لیا۔

''صالح سرکار! خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، خیریت ہی ہے۔'' صالح نے خود کو حتی الامکان سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''وکی یہاں ہوتا تو وقت اچھا کٹتا۔ وہ ملتان میں ہے۔ شاید کل تک آئے گا۔''

''جی، مجھے تو لگتا ہے شاید وہ کل بھی نہ آ سکیں۔ ان کا چھوٹا منیجر بتا رہا تھا کہ انہوں نے کل شام لاہور میں بھی تو رکنا ہے۔''

''لاہور میں کیا ہے؟''

''آپ کو نہیں پتا؟'' وہ ذرا حیرت سے بولا۔ ''آپ کا لاہور والا اسٹور خرید لیا ہے ان لوگوں نے۔ اب وہاں فرنیچر کا شوروم بنایا جا رہا ہے۔ اس کا کچھ کام ہے۔''

صالح حیران تھا۔ دادے فضل نے اسے کچھ عرصہ پہلے اتنا تو بتایا تھا کہ لاہور والے نمبر اسٹور پر کام ٹھپ پڑا ہے اور بابا اسے فروخت کرنے کا سوچ رہے ہیں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے انکل سیف نے خریدا ہے۔

صالح کی کنپٹیاں دباؤ سے پھٹنے لگیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ ایک عقدہ کشا رات ہے۔ آنکھیں کھولنے والی اور دل و دماغ کو بے طرح تہ و بالا کرنے والی۔

وہ واپس وقار کے کمرے میں آ گیا۔ اس کے اندر ایک آتش فروزاں تر ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کل یا پھر پرسوں جب وقار یہاں پہنچے گا تو وہ اس کے ساتھ کیا کرے گا۔ اختر کے پاس ایک بلا لائسنس پستول موجود تھا۔ اس نے سوچا وہ پستول اس سے لے لے گا پھر یہی پستول بند کمرے میں دغاباز وکی کی پیشانی پر رکھے گا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان دبوچے گا اور اس بدنسلے، دغاباز سے پوچھے گا..... یہ ظلم کیوں توڑا تم نے مجھ پر..... میں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟ پھر اسے مار دے گا یا اس کے ہاتھوں مر جائے گا۔

وہ سوچتا رہا اور قالین کو اپنے پاؤں تلے روندتا رہا۔ تین ساڑھے تین برس پرانے خطوط کا ایک ایک لفظ، ایک ایک زہر میں ڈوبے تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست تھا۔

..... علی الصباح صالح نے خود کو کچھ ٹھنڈا کیا۔ تمام حالات کا جائزہ لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنی آستین کے اس سانپ سے کس اور انداز میں نمٹے گا۔ ابھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کرے گا۔ نارمل رہے گا۔ ساتھ ساتھ آفرین کے خیال نے بھی اس کے دل و دماغ کی طنابیں بے پناہ شدت سے کھینچنا شروع کر دی تھیں۔ وہ کہاں تھی؟ وہ بچھڑ جانے والی، وہ روٹھ جانے والی، وہ نیم تاریک راہوں میں گم ہو جانے والی، وہ بے مثال چمکیلے رخساروں والی.....

☆☆☆

یہ اکتوبر کا ایک چمکیلا اور دھیمی ہوا والا دن تھا۔ صالح اور وقار کوٹھی کی چھت پر لگژری کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ سرگودھا شہر کے در و دیوار، مساجد کے مینار، اراضیں کی وسعتیں اور شاہراہوں کے نشان دور تک نظر آ رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سرخاب منزل کی لینڈ لائن سے دادے فضل کا فون آیا تھا۔ انہوں نے صالح کو بتایا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے لیکن وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی ایک دو روز تک وہ سرگودھا میں ہی رہے۔ روزینہ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اسے انہوں نے قریبی مسجد کے امام صاحب کے گھر منتقل کر دیا ہے۔

وقار نے امپورٹڈ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''یارم! تمہیں عجیب تو لگا ہوگا کہ میں نے تمہیں لاہور والے شوروم کے بارے میں بتایا ہی نہیں لیکن تم نے بھی بتانے کا موقع نہیں دیا۔ دراصل انکل شاہنواز کسی بھی طرح اس جگہ سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔ اندر ہی اندر ڈیڈی اور انکل میں بات ہوگئی۔ مجھے بھی پانچ چھ روز پہلے ہی پتا چلا۔''

''اچھا چھوڑو یار ان باتوں کو۔'' صالح نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''کوئی دل دکھانے والی بات کرو۔ کوئی پرانا قصہ چھیڑو۔''

''خیر ہے؟ آج بڑے شاعرانہ موڈ میں نظر آرہے ہو۔'' وکی مسکرایا۔

''یار! آج پھر یاد آرہی ہے وہ مرجانی!'' صالح نے لمبی آہ بھری۔ ''اب پتا نہیں کہاں ہوگی، کیسی لگ رہی ہوگی، کس کے پہلو سے لگ کر بیٹھی ہوگی؟''

''اب دفع کرو یار اسے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ایک در بند، سو در کھلا۔ تیرے لیے شہزادے اب در ہی در کھلنے والے ہیں۔ انکل شاہنواز کو تو اب تم ریٹائرڈ ہی سمجھو۔ اس جیسی کئی تیرے آگے پیچھے پھریں گی اور پھر بھی تو روتی ہیں۔ یہ روزینہ بھی تو کچے کوکونٹ جیسی ہے۔ دودھیا اور میٹھی میٹھی۔ دیکھ کر کچر کچر کھانے کو دل کرتا ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''پر ابھی تو وہی مصیبت بنی ہوئی ہے۔ گلے میں پھنس کر رہ گیا ہے یہ کچا کوکونٹ۔''

''چلو، ہو جائے گا اندر باہر۔ وہ کیا کہتے ہیں..... تُو نہیں اور سہی..... اور نہیں اور سہی۔''

''مگر وکی! وہ جو پرانی پھانس چبھی ہوئی ہے نا دل میں، وہ نہیں نکلتی۔ وہ جو تیرا یار تھا کوالالمپور میں، کیا نام تھا اس کا..... عاطر حسن..... اس نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ کہاں گئی وہ اپنے مجازی خدا کے ساتھ؟''

''اسے کچھ پتا ہوتا تو بتاتا۔ بس یہی معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں فلپائن چلے گئے تھے۔''

صالح بولا۔ ''پھر تو جی کرتا ہے کہ پاسپورٹ بنوا کر فلپائن چلا جاؤں۔ ڈھونڈتا پھروں اسے شہر شہر..... اور اگر وہ مل جائے تو اس کی گردن پکڑ لوں۔ پوچھوں اس سے کہ کیا قصور تھا میرا؟ کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ اپنی اس کی جان ایک کر ڈالوں۔''

اسی دوران نیچے سے وکی کے ڈیڈی کی آواز آئی۔ وہ اسے بتا رہے تھے کہ لینڈ لائن پر اس کے لیے کوئی فون ہے۔ وہ جلدی سے نیچے چلا گیا۔ اس کا موبائل فون وہیں سامنے تپائی پر پڑا رہ گیا۔ جب وکی کی واپسی میں تھوڑی دیر ہوئی تو صالح نے فون اٹھا لیا اور پھر تجسس سے مجبور ہو کر اسے چیک کرنے لگا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس پر ایک نیا انکشاف ہوا۔ وکی کا ایک لڑکی سے افیئر چل رہا تھا اور صالح اس سے بے خبر تھا۔ لڑکی، وکی کی ہم عمر ہی لگتی تھی یعنی بیس اکیس سال کی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کا تعلق ناچنے گانے والے طبقے سے تھا۔ تصویر میں وہ اپنے بوٹے سے قد اور گندمی رنگت کے ساتھ کافی خوبصورت نظر آتی تھی۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو تھے اور وہ طبلے کی تھاپ پر رقص کناں تھی۔ ایک دوسری تصویر میں وہ بڑے اسٹائل سے ایک سفید گھوڑی کی لگامیں پکڑے کھڑی تھی۔ اس نے پنجابی طرز کا کرتہ لاچا پہن رکھا تھا۔ اس تصویر میں اس کی ایک حیران کن خوبی عیاں ہو رہی تھی۔ اس کے نہایت گھنے بال غیر معمولی طور پر دراز تھے۔ اس کی پشت سے گزرتے ہوئے اس کی نصف پنڈلیوں سے بھی آگے تک جاتے تھے۔ وہ اپنے ان بالوں پر نازاں نظر آتی تھی۔

موبائل فون کے واٹس ایپ میں اس نازو نامی لڑکی کے ساتھ وکی کی مختصر چیٹ بھی صالح کو دکھائی دی۔ اس مختصر مکالمے سے ثابت تھا کہ وہ ہزار جان سے اس طوائف زادی پر فدا ہے اور بات آگے بڑھانا چاہتا ہے جبکہ وہ روایتی ناز نخرے دکھا رہی ہے۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وکی چھت پر واپس آرہا تھا۔ صالح نے فون واپس رکھ دیا۔ وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ چند منٹ بعد صالح نے اچانک گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''وکی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ یار ہو کر تم نے یار کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔''

وکی کا رنگ ایک دم بدلا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''میں سمجھا نہیں یارم؟''

''یارم کے بچے..... عشق کی پینگیں چڑھا رہا ہے اور اسی کو پتا نہیں جس کو سب سے پہلے پتا ہونا چاہیے تھا۔''

''کیا مطلب؟''

اس نے وکی کا فون اٹھایا اور گھوڑی والی تصویر اس کے سامنے کر دی۔

وکی ہنسنے لگا پھر دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ ''تجھے بتانے ہی والا تھا یارم! بس سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ بھلا کچھ چھپا سکتا ہوں تجھ سے۔''

''کسی کا دل چیر کر تو نہیں دیکھا ہوتا کسی نے؟''

''تجھے میرا دل چیرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تُو دل کے اندر ہی تو گھسا بیٹھا ہے۔''

پھر اس مہناز عرف نازو نامی لڑکی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ صالح پر انکشاف ہوا کہ یہ لڑکی جنوبی پنجاب کی ایک نامی گرامی طوائف گوہر بائی کی بھانجی ہے۔ حال ہی میں گوہر بائی کہیں ملتان کی طرف شفٹ ہوکر سرگودھا آئی ہے۔ اپنے زمانے میں گوہر بائی کے بھی بڑے چرچے تھے۔ اپنے لمبے، خوبصورت بالوں اور رقص میں مہارت کے سبب وہ معروف تھی مگر اس کی یہ بھانجی تو کئی ہاتھ آگے ہے۔ اس کے حیران کن لمبے بالوں اور ہوشربا رقص نے تماش بینوں کو بری طرح چونکایا ہے۔ وہ شہر کے وسطی حصے میں اپنی خالہ کے ساتھ ایک شاندار کوٹھی میں رہائش پذیر تھی۔ وکی اپنی ٹویوٹا جیپ پر چار پانچ دفعہ اس کے کوٹھے نما کوٹھی پر جا چکا تھا۔

''کہاں تک پہنچی بات؟'' صالح نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ابھی تو میل ملاقات تک ہی ہے۔'' وکی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اس سے آگے کا مشورہ تم سے کرنا ہے۔''

''تو کیا اس کے لیے سہرا باندھ کر بینڈ باجے کا انتظام کرو گے؟''

''سہرا وہرا نہیں باندھا جاتا ان لوگوں میں پیارے!''

''تو کیا ہوتا ہے؟''

''نتھ اتروائی۔'' وکی نے رازداری کے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا ہوتی ہے؟''

وہ ہنسا۔ ''انکل نے بھی بس تجھے ڈولے شاہ کا چوہا ہی بنائے رکھا ہے۔ آس پاس کی ہوا لگنے ہی نہیں دی۔ نتھ اتروائی کا مطلب ہوتا ہے کھلی آزادی، رستہ صاف..... جو دل چاہتا ہے کرو لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہوتا یارم!''

''کیا تکلیف ہوتی ہے اس میں؟''

''کام تو تکلیف کا ہی ہے لیکن اصل تکلیف نتھ اتروانے والے کو ہوتی ہے۔ پیسا خرچ کرنا پڑتا ہے اس میں اور ٹھیک ٹھاک پیسا..... اور یہ گوہر بائی بڑی خرانٹ کھوچل چیز ہے۔ آسانی سے یہ نگینہ کسی کے حوالے نہیں کرے گی۔''

''کیا کہتی ہے؟''

''میرا اندازہ ہے کہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی میں کم از کم دس مرلے کی ایک بنی بنائی کوٹھی مانگے گی اور بیس تیس لاکھ کیش بھی۔''

''تو تمہارے لیے کون سا مشکل ہے۔ آج کل تم بزنس میں ''ان'' ہو اور بزنس بھی زوروں پر جا رہا ہے۔ انکل سیف باہر کے دورے بھی تو کرتے رہتے ہیں۔ جس دن انہوں نے کوئی انٹرنیشنل فلائٹ پکڑی، تم اس چھمک چھلو کو پکڑ لینا۔''

''اتنا پکا پکایا حلوا نہیں ہے یارم! کافی کچھ سوچنا اور کرنا پڑے گا۔ قدم قدم پر تیرے مشورے کی ضرورت بھی رہے گی۔'' وکی نے دبے دبے جوش سے کہا۔

☆☆☆

تیسرے چوتھے روز داجے فضل نے اسے سرخاب منزل واپس بلا لیا۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے ابھی تک بابا کو کچھ خبر نہ ہونے دی تھی۔ بہرحال انہوں نے اسے بتایا کہ انہیں قانونی طریقہ کار تو پورا کرنا ہی پڑے گا کہ پرچہ درج ہو چکا ہے۔

اگلے دن سرگودھا کے متعلقہ تھانے میں اس کی گرفتاری ڈال دی گئی۔ اس نے ایک آرام دہ کمرے میں ٹھاٹ سے رات گزاری۔ صبح اسے کورٹ میں پیش کیا گیا۔ اس کی ضمانت ہوگئی اور وہ خراماں خراماں سہراب منزل واپس آ گیا۔

یہ جان کر اس کا سینہ سلگنے لگا تھا کہ داجے فضل اور اخترے کا اندازہ درست تھا۔ روزینہ کے کویت پلٹ شوہر غفور کی پشت پناہی بابڑا فیملی نے ہی کی تھی۔ ان کی ہلاشیری پر ہی روزینہ کے شوہر نے پرچہ درج کرایا تھا۔

صالح کی نگاہوں میں بابڑا فیملی کے سربراہ بدر بابڑا کے بیٹے پرنس شاہد بابڑا کا چہرہ گھوم گیا۔ چند ہفتے پہلے صالح نے اسے شہر کے ایک تھیٹر میں دیکھا تھا۔ صالح کو اس کی آنکھوں میں دور ہی سے خنزیر کا بال نظر آ گیا تھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ داجے فضل کی ساری ہدایات کو نظر انداز کر کے وہ اخترے کو لے کر بابڑوں کے پنڈ چلا جائے۔ دندناتا ہوا ان کی حویلی میں جا گھسے اور کم از کم کسی ایک بابڑ کو تو خون میں نہلا ڈالے۔

مگر سوچنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ صالح نے پر پرزے نکالے تو تھے مگر ابھی اس کے پر اتنے توانا نہیں ہوئے تھے کہ وہ کوئی زیادہ خطرناک اڑان بھر سکتا اور پھر ایک بات اور بھی تھی۔ اس کے ذہن میں ہمہ وقت ایک اور آندھی چلتی رہتی تھی۔ اس آندھی میں وہ بیس پچیس خط اڑتے رہتے تھے جو اس نے وقار کے بیڈروم کے خفیہ خانے میں دیکھے تھے۔ اس پر یہ تہلکہ خیز انکشاف ہوا تھا کہ آفرین اور آفرین سے متعلقہ مخصوص خوشبو اس سے جدا نہیں ہوئی تھی بلکہ ان دونوں چیزوں کو اس سے جدا کیا گیا تھا۔ اس خوشبو سے جدا کر کے اسے عریاں گوشت اور پسینے

کی بُو باس میں دھکیلا گیا تھا۔ اسے سگریٹ کے دھوئیں، الکحل اور ویڈیوز کی لت لگائی گئی تھی اور یہ سب کرنے والا کون تھا؟ اس کا اپنا جگری دوست وقار، وکی..... اور شاید کسی نہ کسی حوالے سے وکی کا باپ بھی۔ یہ سوچ اسے سب سے زیادہ تکلیف دیتی تھی کہ اس بدنیت وکی نے آفرین کے سامنے صالح کی کردار کشی بھی بے رحمی سے کی تھی۔ اسے بتایا تھا کہ وہ ہرجائی ہے۔ کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔

کبھی اس کا دل چاہتا کہ داجے فضل کو سب کچھ بتا دے۔ کبھی دل چاہتا کہ خود ہی سفری کاغذات بنوائے اور آفرین کی تلاش میں نکل جائے۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ پھپھو عاصمہ اور پھوپا ماجد وغیرہ آج کل کہاں پر ہیں۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی کھوج نہیں ملا۔ بڑی پھپھو خدیجہ تک لاعلم تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ پھپھو عاصمہ نے باقی فیملی سے رابطے بالکل منقطع کر دیے ہیں۔ آفرین کے بھائی فرحان کا بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اب آجا کے وکی کا وہ دوست عاطر حسن رہ جاتا تھا جو ملائیشیا کے شہر ملاکا میں مقیم تھا اور وہاں کی معلومات فراہم کرتا تھا مگر وکی کا کہنا تھا کہ اس سے بول چال بند ہو چکی ہے اور وہ بھی ملائیشیا سے جا چکا ہے۔ صالح کے لیے اب وکی کی کسی بات پر یقین کرنا ناممکن تھا۔

صالح پروگرام بنانے لگا کہ کسی طرح وہ خود آفرین کا سراغ لگانے فلپائن جا سکے مگر انہی دنوں ایک اور سیاپا کھڑا ہو گیا۔ صالح پر روزینہ کے اغوا کا جو کیس بنا تھا، وہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا۔ کب تک صالح کے بابا سے چھپا رہ سکتا تھا۔ ایک روز نہ جانے کس طرح انہیں علم ہو گیا۔ صالح کو شک تھا کہ یہ سب کچھ جالے نوری کی وجہ سے ہوا ہے۔

بابا نے اسے کمرے میں بلایا۔ وہ وہیل چیئر پر تھے۔ گھٹنوں تک کمبل تھا۔ صالح کو ہرگز علم نہیں تھا کہ اس پر کیا آفت ٹوٹنے والی ہے۔ بابا نے اسے قریب بلایا۔ وہ جھک کر ان کے پاس ہوا۔ اس کے رخسار پر پڑنے والا تھپڑ بہت زوردار تھا۔ آنکھوں میں ستارے ناچ گئے اور ایسی ہی ایک پرانی تلخ یاد بھی تازہ ہو گئی۔ بند کمرے میں بابا کربناک آواز میں گرجے۔ ''یہی ڈر تھا مجھے تجھ سے..... یہی ڈر تھا۔'' انہوں نے ہیجان کے عالم میں دو تین تھپڑ خود اپنے چہرے پر بھی لگائے اور پھر اپنا سر دیوار سے پٹخا۔

شور سن کر داجے فضل تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ہمیشہ صالح کے لیے ڈھال ثابت ہوئے تھے، آج بھی ہوئے۔ وہ بابا اور صالح کے درمیان آ گئے پھر دھکیلتے اور پھنکارتے ہوئے صالح کو کمرے سے باہر نکال دیا۔

صالح پر بننے والے اس سنگین کیس کی بات اب بالکل راز نہیں رہی تھی بلکہ اسے کئی مرچ مسالے بھی لگا دیے گئے تھے۔ پولیس کے دباؤ کی وجہ سے داجے فضل نے روزینہ کو عدالت میں پیش کر دیا۔ عدالت میں روزینہ نے موافق بیان دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے سرخاب منزل میں رہ رہی تھی۔ چھوٹے سرکار صالح سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ صادقہ (ہیڈ خادمہ) کی ماتحتی میں کام کرتی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے جابر خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

ان دنوں میں وہی کچھ ہوا جس کا خدشہ داجے فضل ظاہر کر رہے تھے اور کچھ کچھ صالح کو بھی اندازہ تھا کہ یہ کچھ ہوگا۔ صالح اور حیا احمد کی شادی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ حیا کے والد برکات صاحب بصد عاجزی صالح کے بابا شاہنواز کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''مخدوم صاحب! مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ کی چوکھٹ سے نا تا میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا مگر بیٹی کے آگے مجبور ہوں۔ وہ علیحدگی چاہتی ہے۔''

صالح دیکھ رہا تھا کہ بابا کی طبیعت جو اسپتال سے واپسی کے بعد کچھ سنبھلی ہوئی تھی، پھر ابتر ہو رہی ہے۔ اپنے پیشاب وغیرہ پر تو ان کا کنٹرول دیر ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب کھانسی بھی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آج کل وہ سخت غصے میں تھے۔ انہوں نے داجے فضل سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ صالح کو عاق کر دیں گے۔ اسے دھکے دے کر گھر سے نکلوا دیں گے۔ بتدریج انہیں صالح سے عجیب سی چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ خلیج کا پاٹ وسیع تر ہو رہا تھا۔

وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ ایسی شاموں میں صالح کو اضافی طور پر اداس کر دیتی تھیں۔ وہ کوئلوں والی انگیٹھی سلگائے داجے کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ دونوں یکسر خاموش تھے۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''داجے! میں آفرین کا پتا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح ملائیشیا کا ایک چکر لگا آؤں۔''

داجے نے حقے کا کش لیا۔ ''مجھے پتا تھا تم نے آج نہیں تو کل یہ بات کرنی ہی کرنی ہے لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ دیکھو، شاہنواز اس وقت سخت غصے میں ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے ابھی دو تین مہینے ٹھہر جاؤ۔''

''آپ دو تین مہینوں کی بات کرتے ہیں، مجھ سے دو تین دن صبر نہیں ہو رہا۔ مجھے شک ہے کہ وہاں آفرین اور

پھپھو کے ساتھ ضرور کوئی بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ میں یہ جان کر رہوں گا کہ آفرین نے میرے ساتھ تعلق ایک دم کیوں ختم کیا۔" صالح نے فضل کریم کو ابھی تک ان خطوں والی بات نہیں بتائی تھی جو لکھے گئے مگر صالح تک نہ پہنچ سکے۔

داجے فضل نے شاید اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ طویل کش لے کر بولے۔ "تمہیں تو میں کسی صورت جانے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ ہاں، ایک درمیانی راستہ نکل سکتا ہے۔ منیجر افراسیاب کو استعمال کرلو۔"

"کیا مطلب؟"

داجے نے اپنے سفید براق کپڑوں جیسی سفید ڈاڑھی پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "اختر کی طرح افراسیاب بھی مکمل طور پر تمہارے بھروسے کا بندہ ہے اور رازدار بھی ہے۔ اسے دو تین ہفتے کی چھٹی دلواؤ اور اپنی جگہ ملائیشیا بھیج دو۔ بڑا تیز طرار ہے۔ پورا کھوج لگالے گا۔"

یہ بات کچھ کچھ صالح کے دل کو لگی۔ ویسے بھی اسے ڈر تھا کہ اس پر کرائم کیس بن چکا ہے۔ پتا نہیں کہ ویزا بھی لگتا ہے یا نہیں۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد وہ راضی ہوگیا۔ کوالالمپور میں پھپھو عاصمہ کا مکمل ایڈریس تو اس کے پاس تھا ہی۔ اس نے افراسیاب کو ساری معلومات کے ساتھ کوالالمپور بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔

جالا نوری اب بری طرح صالح کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔ صالح کی طرح اختر کا خیال بھی یہی تھا کہ روزینہ والے کیس کے بارے میں صالح کے بابا کو خفیہ اطلاع دینے والا یہ جالا نوری ہی تھا۔ جس دن افراسیاب، پھپھو عاصمہ اور آفرین وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خاموشی سے کوالالمپور کے لیے روانہ ہوا، اسی دن صالح نے جالے کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔

اختر نے صالح کو بتا رکھا تھا کہ ڈیرے کے پاس ہی پڑی واسوں (خانہ بدوشوں) کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ وہاں سے کچھ عورتیں ڈیرے میں صفائی وغیرہ کے لیے آتی ہیں۔ ان میں شانو نامی ایک لڑکی سے جالے نے یارانہ لگا رکھا ہے مگر جالے کو کچھ کر گزرنے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ ڈیرے پر جالے کے علاوہ چار، پانچ بندے موجود ہوتے ہیں جن میں گھوڑیوں کا رکھوالا چاچا اکبر بھی ہے۔ اختر نے صالح کو یقین دلایا تھا کہ اگر کسی رات یہ چاروں پانچوں افراد ڈیرے پر نہ ہوں تو جالا اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائے گا اور شانو کو ڈیرے پر بلالے گا۔ اختر کا خیال تھا کہ اس کام کے لیے خاص طور پر ہفتے کا دن بڑا موزوں رہے گا کہ جالا اس رات کھن میں افیم کی گولیاں ملا کر کھاتا ہے اور بڑی ترنگ میں ہوتا ہے۔ صبح دیر تک سویا بھی رہتا ہے۔ اختر کے مطابق کافی ساری افیم اس کے پاس موجود تھی۔

وہ ہفتے کا ہی دن تھا، صالح نے اختر کو گرین سگنل دیا تو اس نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا دیا۔ سہ پہر کے بعد اس نے ڈیرے پر موجود پانچوں ملازموں کو اس بہانے سے سویرا شائیں کے مزار پر بھیج دیا کہ عرس کے موقع پر وہاں صفائی ستھرائی کی بہت ضرورت ہے۔

اب ڈیرا خالی تھا۔ وہاں رکھوالی کے لیے صرف جالا نوری تھا۔ ڈیرے سے صرف آدھ فرلانگ کی دوری پر ہی پڑی واسوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ صالح سرخاب منزل میں تھا۔ جوں جوں رات آگے سرک رہی تھی، صالح کے انتظار میں شدت آرہی تھی۔

اختر اڈیرے کے قریب ہی تاک میں موجود تھا۔ رات کے نو بجے، پھر دس، پھر گیارہ بج گئے۔ موبائل فون صالح نے سرہانے ہی رکھا تھا مگر اختر کی طرف سے متوقع کال نہیں آرہی تھی۔

بارہ بجے اس نے اختر کو خود فون کیا۔ اب اختر بھی مایوس ہورہا تھا۔ اپنی طرف سے جو جال اس نے بچھایا تھا، وہ تا حال مچھی سے خالی تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ صالح نے وہسکی کے دو پیگ چڑھائے۔ اس کے اندر سخت جھنجلاہٹ اور تپش پیدا ہورہی تھی۔ جالے نوری کی سانولی صورت اور بھید بھری آنکھیں مسلسل اس کے تصور میں گھوم رہی تھیں اور اسے کچوکے لگا رہی تھیں۔ بالآخر سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ اس نے زیر لب جالے کو دو تین گالیاں دیں اور سوچنے لگا کہ اس خبیث کا یہ قصور بھی تو کم نہیں کہ اس نے ڈیرے پر الیون کا اسٹاک رکھا ہوا ہے اور باقی ملازموں کی غیر موجودگی میں ڈیرے کی حفاظت کی ذمے داری نبھانے کے بجائے نشے کے ہلارے لیتا ہے۔

ایک بجے کے قریب وہ سرخاب منزل سے نکل کھڑا ہوا۔ اب اس کا اتنا اختیار تو ہو ہی گیا تھا کہ گارڈ نفاس کے آنے جانے پر روک نہیں لگا سکتے تھے۔ دسمبر کی کاٹ دار سردی کے ساتھ ہلکا سا کہرا بغلگیر ہورہا تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ ایک لمبی چادر اوڑھے وہ ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ چادر کے نیچے اس نے ربر کے پائپ کا وہ چار فٹ لمبا ٹکڑا چھپا لیا تھا جس سے کچھ عرصہ قبل ڈینٹی نیم والی لڑکی کو پیٹا تھا۔

آج یہ ربر کا ٹکڑا جالے نوری کی چمڑی ادھیڑنے والا تھا۔

ڈیرے سے کچھ ہی فاصلے پر اختر اس کے ساتھ آن ملا۔ اس نے بھی چادر کی بکل مار رکھی تھی اور منہ سے بھاپ چھوڑ رہا تھا۔ اختر بڑی احتیاط سے ڈیرے کے آہنی گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گیٹ کے چھوٹے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ وہ دونوں نیم تاریک احاطے میں داخل ہو گئے۔ گھوڑوں، بھینسوں اور بکریوں کے شیڈ علیحدہ علیحدہ تھے۔ وہ برآمدے میں پہنچے۔ وہ بالکل تاریک تھا۔ اندر ایک کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی اور جالے نوری کے گنگنانے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ چناں کتھے گزاری اے رات وے.....

واضح نہیں ہو رہا تھا کہ یہ آواز نیم روشن کمرے سے آ رہی ہے یا کسی دوسرے کمرے سے۔ ابھی صالح اور اختر اسن گن ہی لے رہے تھے کہ صورت حال نے ایک اور پلٹا کھایا۔ صورت حال کا یہ پلٹا اس کے اندازے کے عین مطابق تھا جو اختر نے لگا رکھا تھا۔ پھاٹک کی طرف کچھ آہٹیں سنائی دیں پھر جھانجروں کی مدھم آواز ابھری۔ وہ دونوں برآمدے کے تاریک ترین گوشے میں ہو گئے۔ یہ خانہ بدوشوں کی وہی لڑکی شانو تھی۔ وہ بلی کی چال چلتی ہوا کی طرح ایک کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔

اب صالح اور اختر کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ جالے نے اس تاریک رات میں گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا کیوں چھوڑ دیا تھا۔

اندر سے کھٹ پٹ اور بہت مدھم ہنسی کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ صالح بڑی احتیاط کے ساتھ تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ آوازیں نیم روشن کمرے کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔

''یہ لو اپنے روپڑے۔'' لڑکی شانو کی آواز آئی۔

''کتنے ہیں؟'' جالے نوری نے نشئی آواز میں پوچھا۔

''اٹھارہ ہزار۔ گن لے تا۔''

''کافی ہیں میری شہزادی۔ چل ان میں سے چار تو ہی رکھ لے۔ کیا یاد کرے گی۔''

لڑکی کی ہنسی سنائی دی پھر یوں لگا کہ افیم کی ترنگ کام دکھانے لگی ہے اور جالا لڑکی کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا ہے۔

اختر نے سوالیہ انداز میں صالح کی طرف دیکھا۔ صالح نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ذرا انتظار کرنے کو کہا۔ دو تین منٹ بعد جب اندر صورت حال مزید آتشیں ہو گئی تو صالح نے ٹانگ مار کر نیم روشن کمرے کا دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

لڑکی چلائی۔ اس نے لحاف کو اپنی گردن تک کھینچ لیا۔ دوسری طرف جالے نوری کی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی تھیں۔ اختر نے ایک جھٹکا دے کر لحاف لڑکی پر سے کھینچا۔ اس نے ساتھ والے تاریک کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر اختر نے اس کی کوشش ناکام بنا دی اور کھینچ کر دوبارہ کمرے میں پھینک دیا۔ اس کا بالائی جسم لباس سے بے نیاز تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں دونوں سکتہ زدہ نظر آئے۔ صالح کے اشارے پر اختر نے اپنے موبائل سے کھٹا کھٹ ان کی کئی تصویریں اتار لیں۔ لڑکی شانو نے خود کو قریب پڑی چادر سے ڈھانپ لیا۔

.....اگلے دس پندرہ منٹ جالے اور خانہ بدوش شانو کے لیے بڑے تہلکہ خیز تھے۔ جالے کے پھولے ہوئے کلوں اور کلف لگی گھنی مونچھوں کو دیکھ دیکھ کر صالح کے سینے میں الاؤ دہک گیا تھا۔ لڑکی بالکل ڈر سہم کر ادھ بجھی انگیٹھی کے پاس ایک کونے میں دبک چکی تھی۔ موٹا تازہ جالا نوری چھت کی شہتیری کے ساتھ الٹا لٹک رہا تھا۔ لباس کے نام پر وہ صرف قمیص اور سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ اسے الٹا لٹکانے کے لیے اختر نے بھینسوں وغیرہ کو باندھنے والی طویل سنگلی استعمال کی تھی۔ اس کام میں صالح نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ اپنے ہی بوجھ سے جالے کے ٹخنے چھل گئے تھے اور وہ عریانی کی حالت میں بے حد مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔

صالح پھنکارا۔ ''حرام زادے..... کالے سور..... تجھے یہاں افیم کھانے اور بستر گرم کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا یا ڈیرے کی ذمے داری نبھانے کے لیے۔'' اس کے ساتھ ہی ربر کے پائپ کی تگڑی ضرب جالے کے کولہوں پر پڑی اور وہ کراہ اٹھا۔

''چھوٹے سرکار!'' وہ بہ مشکل بولا۔ ''زیادتی مت کرو مجھ سے۔ میں آپ لوگوں کا وفادار ہوں۔ یہ پڑی واسوں کی لڑکی اپنے آپ آئی ہے میرے پاس۔''

''یہ اپنے آپ آئی ہے اور دروازہ اس کے لیے تیری بے بے نے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔'' صالح پھنکارا اور اس کے ساتھ ہی لچکیلے موٹے پائپ کی تین چار سخت ضربیں جالے کی ننگی ٹانگوں پر لگائیں۔ اس کا سانولا بدن سرخ نشانات سے بھر گیا تھا۔ لڑکی شانو گاہے بہ گاہے سسکنے اور منت سماجت کرنے لگتی تھی۔

صالح نے اختر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جا، کسی

پرانے کپڑے میں تھوڑا سا گوبر تولا..... بلکہ گوبر نہیں، لید ہی لے آ کھوتے یا گھوڑے کی۔''

جالا پھر صفائیاں پیش کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ایک دو بار اس نے بڑے سرکار شاہنواز رائے کا ڈرادا بھی دیا اور مزید کوڑے کھائے۔ اسی دوران میں اختر اگدھے کی لید لے کر حاضر ہوگیا۔ جالے کے ہاتھ اسی کی شلوار کے ازار بند سے پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ لید والا کپڑا بھی اس کے منہ پر باندھ دیا گیا۔ وہ مسلسل ابکائیاں لینے لگا۔ اس پر منتظر اور بر کے پائپ کی مار تھی۔

اچانک صالح کو کچھ یاد آیا۔ اس نے الٹے لٹکے جالے نوری سے پوچھا۔ ''اوئے کالے سور! یہ کیا چکر تھا؟ لوگ تو ایسی لڑکیوں کو رو پڑے دیتے ہیں۔ تو اس سے لے رہا تھا۔ اٹھارہ ہزار کس بات کا لیا تو نے؟''

وہ بس غوں غاں کر کے رہ گیا۔ لگتا تھا کہ کپڑے کے اندر ہی اس نے تھوڑی بہت قے بھی کر دی ہے جو اس کی پیشانی پر رینگ کر سر کے بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔

چند مزید ضربیں کھانے کے بعد وہ بلبلا اٹھا، بولا۔ ''اس..... کے..... گھٹو بھائی نے مجھ سے ادھار لیا ہوا تھا۔''

صالح کے دل سے گواہی آئی کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ معاملہ کچھ گمبھیر تھا۔ یکا یک لڑکی نے صالح اور اختر کو غافل سمجھا اور اٹھ کر بھاگی۔ صالح نے اسے دروازے سے نکلتے ہی بالوں سے پکڑ لیا اور کھینچ کر اندر لایا۔ لڑکی شانو نے خوف کے عالم میں خود کو چھڑانے کے لیے صالح کی کلائی پر کاٹ لیا۔ صالح تلملا اٹھا۔ اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر انگیٹھی کے قریب گرایا اور ربر کے پائپ سے بے دریغ پیٹنے لگا۔ اس دھینگا مشتی میں وہ چادر بھی نہ جانے کہاں گئی جو اسے ڈھانپے ہوئے تھی۔ صالح پر ایک بار پھر وہی وحشت سوار ہوئی جو سفید ے کے تنے کو پیٹتے ہوئے ہوتی تھی۔ لڑکی منتیں کر رہی تھی۔ اگر صالح کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ اس کے چلانے کی آواز باہر دور تک چلی جائے گی تو وہ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالتا۔ اس کی جان بخشی اس یقین دہانی پر ہوئی کہ وہ کونے میں خاموش بیٹھی رہے گی اور جو پوچھا جائے گا، اس کا درست جواب دے گی۔

ایک لحاظ سے اب وہ دونوں فرفر بولنے کی اسٹیج پر تھے۔ ڈیرے سے باہر رات یخ بستہ اور خاموش تھی۔ ویسی ہی رات جو ایک مرتبہ اختر پر بھی آئی تھی۔ الٹے لٹکے جالے نوری اور شانو نے جو کچھ بتایا، اس سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ جالے نوری کے رابطے بابڑ قبیلے کے ساتھ تھے۔ ایک طرح سے وہ یہاں بابڑوں کا مخبر بنا ہوا تھا۔ خانہ بدوش شانو کے گھر ڈالے سرکنڈوں اور داب وغیرہ کی تیلیوں سے مختلف کھلونے بناتے تھے۔ یہ لوگ کھلونے بیچنے کے لیے اردگرد کے دیہات میں جاتے تھے۔ ان میں بابڑوں کی حویلی والا دیہہ بھی شامل تھا۔ شانو وہاں سے جو اٹھارہ ہزار لائی تھی اس طرح کا معاوضہ جالے کی خفیہ خدمات کے صلے میں ملتا رہتا تھا۔ جالے اور بابڑوں کی حویلی میں رابطے کا کام زیادہ تر یہ شانو ہی کرتی تھی۔

پھر ایک انکشاف نے صالح کو مزید آگ لگائی۔ پتا چلا کہ چند ہفتے پہلے جب روزینہ کے خاوند غفورے کو صالح نے ڈانٹا پھٹکارا اور طلاق کے کاغذات پر دستخط کروا کر سرخاب منزل سے نکالا تو یہ جالا نوری ہی تھا جس نے بڑے بابڑ بدر دین کو اس واقعے کی اطلاع دی اور بابڑ بدر، غفورے کی مدد پر آمادہ ہوا۔ بابڑوں کی یہ مدد کھلے عام نہیں، پوشیدہ تھی۔

شروع میں صالح کو ڈر تھا کہ اپنے وفادار جالے نوری کی درگت بننے پر بابا جانی ناراض ہوں گے کیونکہ اس جرم والا جرم کوئی ایسا سنگین بھی نہیں تھا مگر اب تو جالے کی شامت اعمال نے کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ نہ صرف خانہ بدوش شانو کے ساتھ موقعے پر پکڑا گیا تھا بلکہ اس سے کہیں بڑا جرم یہ تھا کہ وہ پچھلے چار پانچ ماہ سے باقاعدہ بابڑوں کا مخبر بنا ہوا تھا۔

فوراً داجے فضل کو اطلاع دی گئی۔ لڑکی شانو بدستور منت ترلا کر رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کے باپ بھائی کو پتا چل گیا تو وہ اس کا حشر خراب کر دیں گے۔

صالح نے کہا۔ ''تیرا حشر خراب ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔''

اس نے صالح کے پاؤں پکڑ لیے۔ صالح نے کہا۔ ''چل پھر..... چپ کر کے نکل جا یہاں سے لیکن اگر کسی پوچھ گچھ یا گواہی کے لیے تجھے بلانا پڑا تو جس طرح خاموشی سے جا رہی ہے، اسی طرح آجائے گی اور خبردار اگر تو نے اپنی بستی سے قدم باہر نکالا تو۔''

اس نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اپنا لباس درست کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ صالح کی نظر چار ہزار کے ان کرنسی نوٹوں پر پڑی جو اس نے جالے سے لے کر بکسے کے نیچے رکھے تھے۔

''ٹھہر جا۔'' صالح نے کہا۔

وہ بری طرح ٹھٹک کر رک گئی۔ صالح کی ہدایت پر

اخترے نے چار ہزار روپے پھول دار تکیے کے نیچے سے نکال کر شانو کی طرف بڑھائے۔ ''چل لے جا یہ بھی۔'' صالح نے کہا۔

پہلے اس نے انکار کیا پھر کانپتے ہاتھوں سے نوٹ پکڑے اور نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد فضل کریم دو گارڈز اور تین چار ملازمین کے ساتھ ڈیرے پر پہنچ گئے۔

..... صبح تک صالح کے بابا جانی کو بھی صورت حال کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ ہمیشہ جالے نوری کی سائڈ لیتے تھے لیکن اب جو کچھ سامنے آ چکا تھا، اس کے بعد سائڈ لینے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ صالح کا خیال تو یہی تھا کہ جالے پر منشیات اور چوری، ڈکیتی وغیرہ کا پرچہ کرا کر انسپکٹر آغا کے حوالے کیا جائے مگر شاہنواز رائے کو اندیشہ تھا کہ اس طرح بابڑوں کے ساتھ عداوت کی آگ اور بھڑک اٹھے گی۔ انہوں نے کہا۔ ''جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے، وہ بھی کافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جائے کہ اس سے سادے اسٹامپ پر انگوٹھے وغیرہ لگوا کر چھوڑ دیا جائے۔

..... تو ایسا ہی کیا گیا تاہم اس سے پہلے صالح نے اپنے دل کی تھوڑی سی بھڑاس مزید نکالی۔ اس نے ڈیرے میں ہی گدھے کے پیشاب کے ساتھ جالے کا سر منڈوایا اور مونچھیں صاف کروائیں اس کے بعد بونس کے طور پر چند لتر (جوتے) بھی رسید کروائے گئے۔

☆☆☆

افراسیاب کو لاہور پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ قریباً روزانہ ہی اس کے ساتھ موبائل فون پر رابطہ ہو رہا تھا۔ اسے صالح کی پھپھو عاصمہ کا گھر ڈھونڈنے میں تھوڑی دشواری پیش آئی تھی۔

دوسری طرف صالح کے سینے میں بابڑا فیملی کے خلاف بھی غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بدر بابڑا کا چھوٹا بیٹا پرنس بابڑا اسے شکل سے ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ بال اسپائکس کی شکل میں، کانوں میں سونے کے ٹاپس، لباس شوخ شنگ..... ایک سکہ بند امیر زادہ۔ جالے نوری کے اعترافات سے پتا چلا تھا کہ اکثر جالے نوری کا اس سے بھی رابطہ ہوتا تھا۔

اب کبھی کبھی صالح کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ جایا کرتی تھیں۔ اخترا اسے ایک اچھا راز دار مل گیا تھا۔ نڈر تھا اور کافی حد تک اسلحہ شناس بھی۔ ایک رات تو صالح کا دل چاہا کہ اخترے کے ساتھ بابا کی لینڈ کروزر میں نکلے اور اس تھیٹر میں جا پہنچے جہاں پرنس شاہد بابڑا کو پہلی بار دیکھا تھا۔

صالح کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ تھیٹر بابڑا فیملی نے خرید لیا ہے اور اس کا انتظام و انصرام بھی پرنس شاہد کے ذمے ہے۔

سوچتے سوچتے ایک اور بات صالح کے ذہن میں آئی اور اس نے ایک نئے خیال کے تحت اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اخترے نے ہی اسے بتایا تھا کہ یہ پرنس شاہد زبردست قسم کا طوائف باز بھی ہے۔ اپنے اس شوق کے لیے لاہور اور ملتان تک کا سفر کرتا رہتا ہے۔

اب خبر نہیں کہ پرنس شاہد کو اس نازو نامی طوائف زادی کا پتا چلا تھا یا نہیں جو حال ہی میں سرگودھا میں وارد ہوئی تھی اور جسے وکی نے ایک ''سچل پیس'' قرار دیا تھا۔

صالح اپنے کمرے کے قالین پر ٹہلتا رہا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کے ذہن میں ایک پلاننگ پختہ ہو گئی۔ اگر یہ پلاننگ کامیاب ہوتی تو وہ نہ صرف ''یارِ مار'' وکی سے بدلہ لے سکتا تھا بلکہ اس شوخے پرنس کو بھی مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ صالح جانتا تھا کہ وکی اس دراز گیسو نازو پر ہزار جان سے فدا ہو رہا ہے۔ اگر کہیں پرنس اس کے راستے میں آ جاتا تو دنگا فساد لازمی تھا۔

صالح نے اخترے کو اسی وقت اپنے پاس بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ کل ڈراما تھیٹر جائے اور کسی بھی طرح پرنس شاہد کا موبائل نمبر حاصل کرے۔ اخترے کو کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے سرخاب منزل میں بیٹھے بیٹھے تھیٹر میں ایک دو جگہ پر فون کیا اور پرنس کا پرسنل نمبر حاصل کر لیا۔

اب سرخاب منزل میں موبائل فون کا استعمال آزادانہ ہو رہا تھا۔ راجے فضل بھی زیادہ روک ٹوک نہیں کر پا رہے تھے۔ اخترے کے پاس بھی دو فون تھے۔ اسی کے ایک فون سے صالح نے اس پرنس شاہد کو ایک پیغام واٹس ایپ کیا۔ نامعلوم شخص کی طرف سے یہ پیغام کچھ اس طرح تھا..... ''ایسی خوش آواز اور خوش اندام رقاصہ آپ کو ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ ہم کسی اچھے قدر دان کی تلاش میں آپ کے شہر میں موجود ہیں۔ آپ ہمیں میزبانی کا شرف بخشیں اور ایک نظر بچی کو بھی دیکھیں۔ آپ داد دیے بغیر نہ رہیں گے۔''

اس ٹیکسٹ میسج کے ساتھ ہی سہناز عرف نازو کی دو دو ہوشربا تصویریں بھی تھیں جو صالح نے وکی سے حاصل کی تھیں اور ایڈریس بھی۔

..... صالح نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اگر کہا جائے کہ یہ پہلا تیر ہی نشانے پر جا لگا تھا

تو غلط نہ ہوگا۔ چوتھے پانچویں روز ہی انکل سیف کے ذریعے یہ اطلاع سرخاب منزل پہنچی کہ شہر میں وقار کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے اور اسے چوٹیں آئی ہیں پھر کچھ دیر بعد جب ساری بات کھل کر سامنے آئی تو معاملہ زیادہ سنگین ثابت ہوا۔ وقار کی ٹانگ دو جگہ سے فریکچر ہوگئی تھی اور وہ اسپتال میں تھا۔ دوسری طرف پرنس شاہد اور اس کا ایک ساتھی گرفتار تھے کیونکہ پرنس کے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی سے معروف طوائف گوہر بائی کلاکیک طبلچی زخمی ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ اسی کوٹھی نما کوٹھے پر ہوا تھا جہاں وہ دراز گیسو، فتنہ ساماں اپنی حشر سامانیوں سمیت اتری ہوئی تھی۔ شاید کسی پلاننگ کی سپر کامیابی اسی کو کہتے ہیں۔

صالح کے لیے یہ خوشی اور اطمینان کا موقع تھا۔ ایک ہی چال سے اس نے اپنے دو دشمنوں کو کاری چوٹ لگائی تھی۔ تاہم صالح کے لیے خوشی اور اطمینان کا یہ دورانیہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ اگلے ہی روز دوپہر کو اسے کوالالمپور سے جو خبر ملی وہ تھی آفرین کے حوالے سے اور نہایت مایوس کن تھی۔ آفرین کا سراغ تو دور کی بات، اس کے اہلِ خانہ کا بھی کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ برانچ منیجر افراسیاب نے موبائل فون پر صالح کو بتایا کہ وہ اس گھر میں کھڑا ہے جہاں کوئی چار سال پیشتر صالح کی پھپھو عاصمہ اور پھوپا ماجد وغیرہ رہتے تھے۔ وہ اب یہاں نہیں ہیں۔

افراسیاب نے کہا۔ ”وہ لوگ ڈیڑھ دو سال قبل یہ مکان فروخت کر کے جا چکے ہیں۔ اب اس کی بالائی منزل پر کوئی تھائی فیملی بطور کرایہ دار رہتی ہے۔ نچلی منزل ایک افغانی کے پاس ہے۔ وہ مالکِ مکان ہے اور تھوڑی بہت اردو بول لیتا ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں ویڈیو لنک پر اس سے آپ کی بات کرواتا ہوں۔“

صالح نے مایوسی کے عالم میں بات کرانے کو کہا۔ چند ہی سیکنڈ بعد سیاہ ڈاڑھی اور ٹوپی والا ایک سرخ و سپید افغانی اسکرین پر اس کے سامنے تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد کہا۔ ”جی ام پہلے ماجد صاحب کا ہمسایہ تھا پھر ام نے ان کا یہ گھر خرید لیا۔ ماجد صاحب بہت اچھا بندہ تھا مگر قریباً دو سال پہلے ایک خدائی خوار ملائیشین نے ان پر ایک پلاٹ پر قبضے کا جھوٹا کیس بنوا دیا جس کے بعد وہ بددل ہوا اور خاموشی سے ملائیشیا چھوڑ گیا۔“

”کچھ پتا چلا کہ ماجد صاحب اب کدھر ہیں؟“ صالح نے پوچھا۔

”خو پہلے مالوم ہوا تھا کہ وہ فلپائن (فلپائن) میں ہے لیکن پھر وہاں سے بھی کہیں اور چلا گیا۔ اب ڈیڑھ دو سال سے اس کا کچھ اتا پتا نہیں۔“

”ان کی ایک بیٹی اور بیٹا بھی تھے۔“

”بیٹے کا تو کچھ مالوم نہیں مگر بیٹی آپرین (آفرین) بہت اچھا لڑکی تھا مگر لگتا ہے کہ وہ اپنی سنگنی پر زیادہ خوش نہیں تھا۔ کچھ چپ چپ رہنے لگا تھا پھر اس کا عمر بھی تو ابھی کافی چھوٹا تھا۔ مشکل سے سولہ سترہ کا ہوگا۔“

”بعد میں اس کی شادی بھی تو ہوگئی تھی خان صاحب؟“

”شادی کا ام کو کچھ زیادہ مالوم نہیں۔ ان دنوں ام اپنے بچہ لوگ کے ساتھ دبئی بھی کابل گیا ہوا تھا۔ امارا خیال ہے کہ اگر شادی ہوا تو خاموشی سے ہوا ہوگا۔“

صالح کو آفرین کی شادی کی تصویر یاد آئی۔ اس سے بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ شادی خاموشی سے ہوگئی۔

وہ کافی دیر خان صاحب سے سوال جواب کرتا رہا مگر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ یہ ویڈیو کال تھی۔ صالح کو اس گھر کے وہ در و دیوار نظر آرہے تھے جہاں آفرین رہتی تھی، جہاں اس کی چہکاریں گونجتی تھیں۔ جس چھت پر تلے بیٹھ کر وہ اسے خط لکھتی تھی اور اس کے خط کا انتظار کرتی تھی۔ وہ اس مکان کو دیکھتا رہا اور اس کا دل بوجھل ہوتا گیا۔ اس نے خان صاحب سے درخواست کی کہ اگر اس کی پھپھو اور پھوپا کے بارے میں انہیں کوئی اطلاع ملے تو اسے ضرور آگاہ کریں۔

☆☆☆

منیجر افراسیاب ایک ہفتہ مزید وہاں رہا اور پھر بالکل مایوس ہو کر واپس آگیا۔ چند دن یا دو تین ہفتوں کے لیے جو ایک امید سی بندھی تھی، اس نے پھر صالح کے دل میں دم توڑ دیا۔ دو تین ہفتے پہلے کی وہی جھنجلاہٹ، کرختگی اور جارحیت اس میں واپس آگئی جو اس کے مزاج کا حصہ بنتی جارہی تھی۔ الکحل کا استعمال بڑھ گیا۔ سگریٹ کا استعمال روزانہ دو تین پیکٹ سے بڑھ کر پانچ چھ پیکٹ ہوگیا۔ تصوراتی دلہن کی ضرورت اب اسے کہاں تھی۔ اب تو اسے جسم میسر ہو سکتے تھے اور ایک تو ہمہ وقت میسر بھی تھا۔ روزینہ اب امام مسجد کے گھر سے ایک بوڑھے مزارعے خوشی محمد کے گھر میں منتقل ہو چکی تھی۔ وہاں صرف خوشی محمد کی بیوی ہی ہوتی تھی۔

ایک رات جسم کی پکار سے مجبور ہو کر صالح اپنے کارندۂ خاص اخترے کے ساتھ خوشی محمد کے گھر جا پہنچا۔ خوشی محمد بے چارے میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ چھوٹے سرکار کو کسی من مانی سے باز رکھ سکے۔ اخترے نے اسے علیحدہ لے جا کر سمجھا دیا تھا کہ چھوٹے سرکار کی یہاں آمد کا پتا ان دونوں

میاں بیوی کے علاوہ کسی تیسرے فرد کو نہیں چلنا چاہیے۔

روزینہ کو بھی اچھی طرح پتا تھا کہ چھوٹے سرکار کو صرف اور صرف جسم کی بھوک ہی یہاں تک لائی ہے۔ اس نے دس پندرہ منٹ میں ہی خود کو کچھ سجا سنوار لیا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کی شیر خوار بچی کچھ بیمار تھی۔ گلے اور چھاتی میں مسلسل درد تھا۔ وہ اسے لیے لیے پھر رہی تھی۔ جس کمرے میں صالح نے رات گزارنا تھی، اس کا ماحول بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ صالح نے بادل ناخواستہ پروگرام ملتوی کر دیا۔ اس نے اختر سے کو ہدایت کی کہ فوراً بچی کا دوا دارو کیا جائے۔ اس کے علاوہ کل تک کمرے کی حالت بھی بہتر کی جائے۔

اگلی رات وہ پھر بڑی خاموشی سے مزارعے خوشی محمد کے گھر پہنچا۔ اختر اتو حکم کا غلام تھا۔ اس نے ایک دن میں ہی روزینہ والے کمرے کی کایا پلٹ دی تھی۔ بیڈ، دو کرسیاں اور صوفہ وغیرہ موجود تھے۔ تاہم صالح نے دیکھا کہ روزینہ آج پھر پریشان تھی۔ اس کے کوکے کی چمک بھی ماند پڑی محسوس ہوتی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ بچی کی طبیعت اب بھی خراب تھی۔ دوا کے باوجود وہ سو نہیں رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دم بلند آواز میں رونا شروع کر دیتی تھی۔ روزینہ نے دو تین بار اسے تھپک کر سلایا اور صالح کے پاس آئی مگر اسے پھر بچی کی چارپائی کی طرف جانا پڑ گیا۔

آج صالح کی جھنجلاہٹ کل سے زیادہ تھی۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا جسم جیسے پھنک رہا تھا اور الکحل نے اندر کی آگ کو دو آتشہ کر رکھا تھا مگر ماحول کسی بھی طرح سازگار نہیں ہو رہا تھا۔

روزینہ نے لجاجت سے کہا۔ ”میں اسے چاچی شریفاں (خوشی محمد کی بیوی) کے پاس سلا آتی ہوں۔“

”نہیں رہنے دو۔“ صالح بیزار لہجے میں بولا۔ ”تم اسے دھیان سے دوا کھلاؤ۔ میرا خیال ہے کل تک ٹھیک ہو جائے گی۔ میں پھر آؤں گا۔“

وہ سٹپٹایا ہوا سا واپس آ گیا۔ اگلی شب کے بجائے اس نے مزید صبر کیا اور اس سے اگلی شب روزینہ کے پاس پہنچا۔ خود روزینہ کے علاوہ روزینہ کے ہاتھ میں بھی ذائقہ تھا۔ صالح کی ہدایت کے مطابق اس نے دیسی مرغ بھون رکھا تھا اور ساتھ میں مکھن کے بل دار پراٹھے تھے۔ جب آتشیں سیال صالح کے گلے سے اتر جاتا تھا تو اس کی بھوک بھی کھل جاتی تھی۔ اس نے کھانا کھایا، لائٹ بند کی اور روزینہ کے ساتھ بستر پر آ گیا۔ ابھی وہ لیٹے ہی تھے کہ قریبی چارپائی پر سوئی بچی اتنے زور سے چلائی کہ پورا کمرا گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹانگیں چلانا اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ اس کو تو جیسے صالح سے بیر ہو گیا تھا۔ غالباً اس کی چھاتی کا درد جو کل سے کچھ ٹھیک تھا، پھر نمودار ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح کھانسنے بھی لگی تھی۔ روزینہ نے اسے دوا کھلائی، ہلکورے دیے، کچھ دیر اس کے پاس لیٹی بھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چپ ہو گئی۔ روزینہ دوبارہ صالح کے پاس آئی، لائٹ آف کی مگر دو تین منٹ بعد ہی بچی پھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے آواز بلند کرنے لگی۔

اس مرتبہ صالح سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ نشے میں جھومتا ہوا سا بستر سے اترا اور چارپائی تک پہنچ کر بچی کو بری طرح جھنجوڑ دیا۔ پھنکار کر بولا۔ ”چپ کر جا..... بدبخت چپ کر جا۔“

بچی اور زور سے چلانے لگی۔ روزینہ جلدی سے اس کے پاس آئی اور اسے بازوؤں میں لے کر جھلانے لگی۔ وہ چپ ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ صالح نے اسے روزینہ سے لے کر چارپائی پر تقریباً پھینک دیا۔ ”رہنے دے۔ چپ کر جائے گی خود ہی۔“ وہ بولا اور روزینہ کے ساتھ واپس بستر پر آ گیا۔

بچی کچھ دیر روتی رہی پھر چپ کر گئی۔ آٹھ دس منٹ بعد پھر زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔ اس روز صالح کے ذہن میں ننھے بچے والی عورت کے حوالے سے جو ایک رومانیت اور ”فیلنگس“ تھی، وہ بالکل ختم ہو گئی۔ وہ رات اس نے سخت سٹپٹائے ہوئے غصیلے موڈ میں گزاری۔ جسم کی طلب کچھ کم ہوئی۔ صبح دم جب وہ نڈھال سا روزینہ کے پہلو میں سو گیا، بچی بھی اطمینان سے سو گئی۔

اگلی رات پھر اس سے ملتے جلتے مناظر ہی تھے۔ بچی کا رونا گاہے بگاہے اس کی عشرت میں خلل ڈالتا رہا۔ تاہم لگتا تھا کہ اب صالح کو اس خلل کی کچھ زیادہ پروا نہیں۔ وہ بس اور جسم کی بھوک میں ہونکتا تھا اور اسے اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔ یہ خیال بھی ذہن سے نکل جاتا تھا کہ بالکل ساتھ والے کمرے میں خوشی محمد اور اس کی بیوی بھی موجود ہیں۔

اگلی رات صالح کو معلوم ہوا کہ بچی کو تے وغیرہ کی شکایت بھی ہو گئی ہے۔ غالباً تیز دوا کا اثر تھا۔ اس خیال سے کہ روزینہ بار بار ڈسٹرب ہو گی، اس نے بچی کو دوسرے کمرے میں عمر رسیدہ جوڑے کے پاس پہنچا دیا۔ وہاں سے بھی گاہے بگاہے بچی کے رونے کی صدا ان دونوں کے کانوں تک پہنچتی رہی۔

جھنجلاہٹ صالح کو بدسلوک بنا دیتی تھی اور یہ دیسی

ہی بدسلوکی تھی جو اس نے حیا احمد کے ساتھ بھی روا رکھی تھی اور اس کا نتیجہ بھی تقریباً وہی نکلا جو حیا احمد کے معاملے میں نکلا تھا۔ تھوڑی تاخیر ہوئی لیکن رزلٹ وہی رہا۔

دس بارہ سرگرم راتوں کے بعد ایک رات ایسی آئی کہ جب صالح خاموشی کے ساتھ سرخاب منزل سے نکل کر حسب معمول اپنے مزارعے خوشی محمد کے گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ روزینہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔

اس نے خوشی محمد سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ آج شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی نکل گئی ہے۔ دونوں میاں بیوی کو بھی تب پتا چلا جب وہ جا چکی تھی۔

''اندھے بہرے تھے تم لوگ۔'' صالح نشے کی حالت میں پھنکارا۔

''جی میری گھر والی باورچی خانے میں تھی۔ میں بچی کے لیے پانی دم کرانے سویرا سائیں کے مزار پر گیا تھا۔ اس نے ہمیں پتا ہی نہیں لگنے دیا۔ دراصل..... دراصل وہ.....''

''آگے بھی بکواس کرو۔'' صالح نے سفید ریش خوشی محمد کو ڈانٹا۔

''چھوٹے سرکار! لگتا ہے کہ وہ بچی کے لیے زیادہ پریشان تھی۔ آپ کو پتا ہے کل رات بھی بچی روتی ہی رہی تھی نا۔''

''تو تم دونوں میاں بیوی کس مرض کی دوا تھے۔ سنبھال لیتے اس کو۔ سوئے پڑے رہے ہو گے مرداروں کی طرح۔''

خوشی محمد کا رنگ پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی کھچڑی بالوں والی گھر والی بھی ادھ بجھے تندور کے قریب کھڑی کچھ سردی، کچھ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس کا نام صغراں تھا۔ صالح نے صغراں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تیرے پاس بیٹھ کر کالوں میں باتیں کرتی رہتی تھی، تجھے پتا نہیں تھا کیا ارادے ہیں اس کے۔''

صغراں لرز کر بولی۔ ''پپ..... پتر..... میرا مطلب ہے چھوٹے سرکار! وہ اپنی بچی کی طرف سے ہی زیادہ پریشان تھی۔''

''اور کم پریشان کس کی طرف سے تھی؟'' صالح نے صغراں کی بات پکڑی۔

''وہ اصل میں جی.....'' صغراں ہکلا کر رہ گئی۔

صالح کا پارہ اور اوپر چلا گیا۔ اس نے دونوں کو بہت سخت سنائیں پھر انہیں مجبور کیا کہ وہ ساری بات کھل کر بتائیں ورنہ ان کے لیے برا ہوگا۔

صغراں نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ صالح نے اسے بتانے پر مجبور کیا اس سے معلوم ہوا کہ بچی کے علاوہ وہ صالح سے بھی بہت تنگ آ گئی تھی۔ خاص طور سے پرسوں رات جب صالح نے روتی بچی کو تھپڑ مار کر چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بہت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ صالح اکثر نشے میں مدہوش ہوتا تھا اور وہ اپنے ساتھ صالح کے سلوک سے بھی بہت ناخوش تھی۔ اس نے خوشی محمد کی بیوی صغراں سے اس قسم کی بات بھی کی تھی کہ اس سے تو اس کا شوہر غفورا ہی اچھا تھا۔ خرچے سے تنگ رکھتا تھا، تھوڑا غصے والا بھی تھا مگر اس طرح کا برتاؤ تو نہیں کرتا تھا جیسا یہاں ہو رہا ہے۔

خوشی محمد اور صغراں کی باتیں سن کر صالح کو اندازہ ہوا کہ وہ شاید واپس غفورے کے پاس چلی گئی ہے۔ اسے یقیناً معلوم ہو چکا تھا کہ غفورا، بابڑوں کی پناہ میں ہے اور سچی بات تو یہ تھی کہ خود صالح کی دلچسپی بھی روزینہ سے کم ہوتی جا رہی تھی اور حقیقت میں یہ دلچسپی روزینہ سے تھی بھی نہیں۔ یہ تو اس کے جسم میں تھی..... اور اب مسئلہ آج کا تھا، آج رات کا۔ نشے نے اس کے اندر کی بھوک کو دو آتشہ کر رکھا تھا۔ اسے لمس درکار تھا اور وہ اس کے لیے کسی بھی دیوار سے سر پھوڑ سکتا تھا۔ حیوانیت عروج پر تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے صغراں کی طرف بھی دیکھا۔ اگر اس کی عمر چند سال بھی کم ہوتی تو کیا پتا کہ وہ اسی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا۔

اچانک اسے وہ میلی کچیلی خانہ بدوش لڑکی شانو یاد آئی جو کچھ ہفتے پہلے جالے نوری کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی اور پھر پتا چلا تھا کہ وہ مخبری میں جالے کی مدد بھی کرتی رہی ہے۔ خانہ بدوشوں کی بستی مزارعے خوشی محمد کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ مکئی کے کھیتوں کے پار تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر وہاں لالٹینوں کی مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ صالح نے خوشی محمد کو حکم دیا کہ وہ وہاں جائے اور خاموشی سے شانو کو بتائے کہ چھوٹے سرکار نے بلایا ہے۔

خوشی محمد گیا اور پندرہ بیس منٹ بعد ہی ایک سوتی کھیس میں لپٹی ہوئی معمولی صورت کی شانو اس کے سامنے تھی۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اسے گواہی وغیرہ کے لیے بلایا گیا ہے۔ یقیناً یہ بات بھی اس کے ذہن میں رہی ہوگی کہ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے چھوٹے سرکار کی کلائی پر کاٹ لیا تھا اور کھینچا تانی کی تھی۔

خوشی محمد اور صغراں بھی سمجھ گئے تھے کہ اس لڑکی کو مدہوش صالح نے یہاں کیوں بلایا ہے۔ وہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صالح نے شانو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ جالے

نوری کے بارے میں دو چار باتیں کرنا تھیں تجھ سے۔ ابھی کچھ دیر میں چلی جانا۔''

وہ گم صم کھڑی رہی۔ صالح نے کہا۔ ''وہ جو چار ہزار روپے تھے تجھے، ختم ہو گئے یا کچھ باقی ہیں؟''

''ہیں جی۔''

''چل اور دے دوں گا۔'' صالح نے اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ یقیناً لڑکی جس حالت میں تھی، ویسے ہی اٹھ کر چلی آئی تھی۔ اس کے لباس سے دھوئیں اور سرسے سرسوں کے تیل کی بساند آ رہی تھی۔ عام حالات میں وہ شاید اسے ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کرتا مگر یہ عام حالات نہیں تھے۔ اس کے اندر کی طلب اور طلب کی شدت کو ایڑ لگی ہوئی تھی..... اور شاید یہ وہی شدت تھی جو اس کے خانوادے کے مردوں میں نسل در نسل پائی جاتی تھی۔ اس کے بزرگ کثیر الازدواج تھے اور بات صرف ازدواج تک ہی نہیں رہی تھی..... اور بھی بہت کچھ ہوا تھا اور یہ روایت تو مسلمہ تھی کہ اس کے پڑ دادا کے پڑ دادا شیر افگن رائے نے بارہ شادیاں کیں اور ان کے بچوں کی تعداد 70 کے لگ بھگ تھی۔ دو بیویوں کو انہوں نے ایک ایک طلاق بھی دی۔ خیال تھا کہ دوبارہ رجوع کر لیں گے مگر انہوں نے نہیں کیا۔ ان کا مزاج بھی اسی طرح کا تھا کہ جس کو چھوڑ دیا، بس چھوڑ دیا۔

اس روایت میں ایک بات عموماً حذف کر دی جاتی تھی کہ اس کے یہ بزرگ صرف پچاس پچپن سال جی سکے تھے۔ آخری عمر میں وہ گوناگوں بیماریوں کا شکار ہوئے۔ ان کا منہ اور خوراک کی نالی اندر سے گلنا سڑنا شروع ہو گئی تھی اور یہی عارضہ جان لیوا ثابت ہوا۔

..... تو صالح نے میلی کچیلی شانو کو بغل میں لیا اور ڈگمگاتا ہوا سا بڑی بے تابی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

آج صالح سرگودھا میں وکی کی عالیشان کوٹھی میں بیٹھا تھا۔ وکی اسپتال سے گھر واپس آ چکا تھا۔ ٹانگ پر پلاستر چڑھا ہوا تھا جو نصف ران تک چلا گیا تھا۔ وہ بہت خبیث میں نظر آتا تھا۔ پرنس شاہد کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صالح بڑی اپنائیت کے ساتھ اسے دلیرج کا مشورہ دے رہا تھا۔

جو کچھ وکی نے بتایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ جھگڑا بالکل ویسے ہی ہوا جس طرح عموماً ایسے جھگڑے ہوتے ہیں یعنی طوائف کے کوٹھے پر۔ دراز گیسو والی کے لیے دونوں امیر زادوں میں پہلے تو تکرار ہوئی پھر دونوں باقاعدہ بھڑ گئے۔ دونوں کے ساتھ ایک ایک مسلح شخص موجود تھا۔ جھگڑتے جھگڑتے وکی اور پرنس کوٹھی کے گیٹ پر آ گئے تھے۔ یہاں دونوں باقاعدہ گتھم گتھا ہو گئے۔ وکی نے پرنس پر گھونسوں کی بارش کر دی جس سے اس کی ناک سے خون نکل آیا۔ پرنس کے گارڈ نے رائفل کے آہنی دستے سے وکی کو زوردار چوٹیں لگائیں جو ٹانگ کے نقصان کا باعث بنیں۔ وکی کا ساتھی گارڈ پر جھپٹا تو اس نے گولی داغ دی جو وہاں ایک شخص کو لگی اور وہ شدید زخمی ہوا۔

وکی کی روداد ختم ہوئی تو صالح نے پوچھا۔ ''اچھا، وہ فساد کی جڑ اب کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے نازو!''

''پرابلم یہ ہے یار کہ ہمارے ''بڑے'' اور طرح کے ہیں مگر یہ بابڑ، چھوٹے سے بڑے تک ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس کمینے پرنس کے باپ بدر بابڑ نے اگلے ہی روز نتھ اتروائی کی رقم گوہر ہائی کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔''

''مطلب یہ کہ..... وہ گئی؟''

''لگتا تو یہی ہے۔''

''لیکن وہ باسٹرڈ تو گرفتار ہے؟'' اس کا اشارہ پرنس بابڑ کی طرف تھا۔

''کیا پتا ایک دو ہفتے میں چھوٹ بھی جائے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ نتھ اتروائی کی رقم والد صاحب نے اپنے لیے دے دی ہو؟''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں۔'' وکی نے برا سا منہ بنایا۔

وکی کے لب و لہجے سے عیاں تھا کہ وہ خود کو نازو سے قریباً قریباً فارغ اور دستبردار ہی سمجھ رہا ہے۔

صالح نے تاسف کا اظہار کیا۔ البتہ دل کے نہاں خانوں میں کہیں اسے ایک آسودگی سی بھی محسوس ہوئی۔ اس آستین کے سانپ نے آفرین کے حوالے سے اس کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے سینے کا ناقابلِ علاج زخم بن کر رہ گیا تھا۔

کہاں تھی وہ..... کن پردوں میں جا چھپی تھی..... کس دنیا میں جا بسی تھی؟

منیجر افراسیاب ایک بار تو ملائیشیا سے ناکام ہو کر واپس آ گیا تھا لیکن صالح ایک بار پھر اسے بھیجنا چاہتا تھا۔ اس مرتبہ وہ چاہتا تھا کہ افراسیاب غلیائن جائے بلکہ یہ سوچ بھی اس کے ذہن میں آئی تھی کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ جائے۔

وکی کی تیمارداری کے بعد جب وہ رات گئے سرخاب

منزل واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے پولیس اس کے وفادار ساتھی اختر ے کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ معاملہ وہی روزینہ کے اغوا کے کیس والا ہے۔

صالح کے دادا جی فضل بے حد مشتعل نظر آ رہے تھے۔ بند کمرے میں ایک مرتبہ تو صالح کو یہی لگا جیسے وہ اسے تھپڑ ہی جڑ دیں گے۔ وہ غضب ناک سرسراتے لہجے میں بولے۔

"صالح! مجھے تو لگتا ہے کہ اب تم جیل جاؤ گے اور تمہارے کرتوتوں کے سبب تمہارے باپ کی جان تو جائے گی ہی۔"

"کک..... کیا ہوا ہے؟"

"جب پولیس آئی تو ان کا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہو گیا تھا کہ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اب بھی ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر کھوکھر کہتا ہے کہ لاہور لے جانا ہوگا۔"

"مگر اب ہوا کیا ہے؟"

"ہوا یہ ہے نیک ماں کے بدبخت بیٹے کہ وہ بدکار روزینہ اپنے خاوند کے پاس پہنچ گئی ہے۔ وہ تو شاید چپ ہی رہتی مگر بابڑوں نے اسے کہاں چپ رہنے دینا تھا۔ انہوں نے اس سے نیا بیان دلوایا ہے۔ اس بیان کے مطابق تم نے اور اختر ے نے اس کے شوہر کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں اور اسے بچی سمیت زبردستی سرخاب منزل میں روکا ہوا تھا۔ صالح! مجھے تو لگتا ہے کہ ایک دو روز میں تیری ضمانت کینسل ہو جانا ہے پھر گرفتار ہو جائے گا تو۔"

صالح نے سنبھل کر کہا۔ "دادا جی! لوگ تو چار چار قتل کر کے دندناتے پھرتے ہیں۔ پیسے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ افراسیاب کا ایک یار فیصل آباد کا بہت بڑا وکیل ہے۔ صمد بخاری نام ہے۔ میں بھی مل چکا ہوں اس سے۔ آپ اسے بلوائیں۔"

"اسی کو بلوایا ہے۔" دادا جی بدستور غصے میں بولے۔ "صبح تک پہنچ جائے گا وہ۔ قبل از گرفتاری کی ضمانت بھی شاید ہو جائے گی مگر معاملہ تو چل پڑا ہے نا اور سب سے بڑا نقصان یہی ہوا ہے تیرے باپ والا۔ جا دیکھ جا کر، کیا حالت ہوئی ہے اس کی۔" دادا جی فضل کی آواز بھرا گئی اور وہ جلدی سے باہر نکل گئے۔

صالح کے بابا کا بیڈ روم اب حویلی کے نئے پورشن میں تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو بابا نیم دراز تھے۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ آکسیجن کا ماسک ٹھوڑی پر دھرا تھا۔ ڈاکٹر کھوکھر اپنے ایک اسسٹنٹ سمیت ان کے اردگرد موجود تھے۔ بابا نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ چہرے پر طیش کے آثار نمودار ہوئے۔ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر انہوں نے بولنا شروع کر دیا مگر آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ الفاظ جیسے ان کے گلے کے اندر ہی گڈمڈ ہو رہے تھے پھر انہیں شدید کھانسی ہونے لگی۔

"پلیز مخدوم صاحب.....! پلیز، آپ خاموش رہیں۔ یہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔" ڈاکٹر کھوکھر نے انہیں روکا پھر صالح کو اشارہ کیا کہ وہ باہر چلا جائے۔

صالح چند سیکنڈ کھڑا رہا پھر سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ بابا کے کمرے سے ہر وقت ایک خاص طرح کی بو باس آتی رہتی تھی جسے ڈاکٹر کھوکھر اور اسسٹنٹ ارفریشر وغیرہ سے دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے مریض کے کپڑے اکثر خراب ہو جاتے ہیں۔

صالح کے دل میں اپنے بابا کے لیے ایک بار پھر ہمدردی کی لہر سی اٹھی۔ ایسی لہریں اٹھتی ضرور تھیں مگر تادیر ان کا وجود برقرار نہیں رہ پاتا تھا۔ اب بھی یہ لہر تادیر نہیں رہی۔ صالح کو بابا کے بولنے کا انداز یاد آیا۔ الفاظ تو ان کے گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئے تھے مگر کیا پتا وہ اب بھی اسے عاق کرنے کی بات ہی کر رہے ہوں۔

تیسرے روز بابا کو ایک بار پھر لاہور لے جانا پڑا۔ اس مرتبہ دادا جی فضل ان کے ساتھ نہیں جا سکے۔ وجہ یہی ملازمہ روزینہ والا پھڈا تھا۔ فیصل آباد سے آنے والے ایڈووکیٹ بخاری نے منہ مانگی فیس لی تھی مگر کافی حد تک حق بھی ادا کر دیا تھا۔ نہ صرف صالح کی ضمانت قبل از گرفتاری ہوئی تھی بلکہ ایک دن بعد اختر ا بھی جوڈیشل ہو گیا۔ بخاری کا کہنا تھا کہ وہ اگلی پیشی پر صالح کی ضمانت کنفرم کرا دے گا۔

اگلے کئی دن تھانے کچہری کے چکروں میں گزر گئے۔ ایڈووکیٹ بخاری نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا پھر اس نے دو تین ایسے سقم ڈھونڈے کہ اختر ے کی ضمانت کا قوی امکان بھی پیدا ہو گیا۔

اس معاملے سے کچھ فراغت پاتے ہی صالح کا دھیان ایک بار پھر سینے کے اس ہمیشہ لو دیتے زخم کی طرف چلا گیا جو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا۔ وکی نے اس کے اور آفرین کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار آفرین سے ضرور ملنا چاہتا تھا مگر وہ کیسے بتاتا، کیا کرتا؟

قریباً تین ہفتے لاہور میں رہنے کے بعد صالح کے بابا کچھ بہتر ہو گئے اور ڈاکٹر کھوکھر نے انہیں سرخاب منزل واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ لاہور میں بابا کی ٹانگ کا آپریشن بھی ہوا تھا۔ بابا کی واپسی اکثر سرخاب منزل میں کچھ پابندیوں کا باعث بنتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس مرتبہ بھی

ان کی واپسی نے صالح کو ناخوش کیا۔ کبھی کبھی ایک ایسی سوچ آپوں آپ دماغ کی اتھاہ گہرائی سے ابھرتی تھی جو خود صالح کو بھی پسند نہیں تھی مگر یہ سوچ موجود تھی ..... اور وہ یہ کہ کتنے سخت جان ہیں بابا..... اندر سے کتنے مضبوط ہیں۔ لوٹ پوٹ ہوکر پھر ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ یہ کب تک اسی طرح ٹھیک اور بیمار ہوتے رہیں گے۔ آخر کب تک؟

بابا پھر واپس آرہے تھے۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اسی باغ میں بیٹھا تھا جو اب بہت مختصر رہ گیا تھا۔ جامن، امرود اور آم کے وہ بیشتر پیڑ غائب ہوچکے تھے جن سے اس کے بچپن اور لڑکپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ سنگ سرخ کے وہ تین فوارے، سبز گھاس کے درمیان وہ پتھر کی روشیں، وہ دو بلند سرو کے درخت جن کے درمیان سے سنگ مرمر کی ایک بالکونی نظر آیا کرتی تھی۔ کچھ بھی تو باقی نہیں تھا اور جو کچھ ناپید ہوچکا تھا، اس کے ساتھ ہی ساون کی پہلی بارش کا وہ یادگار دن بھی کبھی لوٹ کر واپس نہیں آنا تھا جو کبھی صالح پر ایک انعام کی طرح اترا تھا اور امر ہوگیا تھا۔

اسی دوران میں بابا، ڈاکٹر کھوکھر سمیت سرخاب منزل واپس آگئے۔ اس سے پہلے وہ اسٹیٹ کار یا اسٹیشن ویگن پر آیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ ایمبولینس میں آئے۔ رسم نبھانے کے لیے وہ تیزی سے ایمبولینس کی طرف بڑھا۔ بابا غیر معمولی طور پر کمزور نظر آرہے تھے۔ ان کی بائیں مفلوج ٹانگ کولہے کے بالکل پاس سے کاٹی جاچکی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ یہ مفلوج ٹانگ ان کے پورے جسم میں زہر پھیلا سکتی ہے۔ وہ اتنے کمزور تھے کہ ان کی آواز بہ مشکل ہی سنی جاسکتی تھی۔

یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں صالح کو لگا کہ سرخاب منزل کی فضا میں آکسیجن کی مقدار ایک دم کافی بڑھ گئی ہے۔

☆☆☆

دو مہینے مزید بیت گئے۔ موسم اب آہستہ آہستہ گرم ہورہا تھا۔ صالح کے بابا جانی کی حالت بھی توں کی توں تھی۔ وہ دن میں قریباً اٹھارہ گھنٹے دواؤں کے زیر اثر سوئے ہی رہتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق انہیں کاروبار تو کجا، حویلی کے معاملات سے بھی یکسر بے خبر رکھا جارہا تھا کیونکہ اس سے ان کی حالت پر برا اثر پڑتا تھا۔ ان دو مہینوں میں کافی کچھ ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو منیجر افراسیاب ایک بار پھر ملائیشیا اور فلپائن گیا تھا۔ اس مرتبہ صالح بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں قریباً ایک ماہ وہاں رہے تھے اور آفرین کی تلاش میں سرگرداں ہوئے تھے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات تھا۔ کچھ پتا نہیں چلا سوائے اس کے کہ آفرین کے بھائی فرحان کے متعلق اتنی سن گن ملی کہ وہ آج کل انگلینڈ کے بجائے جنوبی افریقا میں کہیں ہے اور شاید صالح کی پھپھو اور پھوپا بھی وہیں ہیں۔

صالح ناکامی کا ایک اور زخم لے کر واپس آچکا تھا۔ اب ایک بار پھر اس پر وہی کیفیت طاری تھی جس کا محبت، انتظار کی خوشبو اور آس کی دھیمی دھیمی مہک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سراسر کثیف ہوگیا۔ ایک ایسے تند خو بچے کی طرح جس سے اس کا سب سے محبوب کھلونا چھین لیا جائے اور وہ باقی کھلونوں کو بے طرح توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہوجائے۔

پہلے تو اس نے سرگودھا اور فیصل آباد جاکر کئی دن تک

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2400 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 25,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188

سرکولیشن مینیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

خود کو شباب اور شراب میں ڈبویا پھر حوصلہ کچھ اور بڑھا اور سرگودھا کی ایک مہنگی کال گرل کو وہ اپنے ساتھ سرخاب منزل لے آیا۔ بہانہ یہ تھا کہ یہ انٹیریئر ڈیکوریشن کی ماہر ہے اور سرخاب منزل کے کمروں کو نئے انداز سے ڈیکوریٹ کرے گی۔ اصل میں تو اس کو ایک ہی کمرا خوشنما بنانا تھا اور وہ تھا صالح کا بیڈروم۔ یہ خوشنمائی اس نے اپنے حسن کی چمک دمک سے لانا تھی اور وہ لا رہی تھی۔ ہر شب، صبح تک وہ کمرا اس کے لودیے جسم کی حدت سے گرمایا رہتا۔

سرخاب منزل میں سب کو پتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اب یہ سرخاب منزل پہلے والی سرخاب منزل رہی ہی نہیں تھی۔ یہ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ صالح اسے تبدیل کر رہا تھا۔ جو جو کام وہ آج تک اپنے بابا کی سخت گیری کے سبب نہ کر پایا تھا، اب کر رہا تھا اور بڑھ چڑھ کر۔

مرغیاں، کبوتر، طوطے اور خرگوش وغیرہ سرخاب منزل میں آ گئے تھے۔ زنانے اور مردانے کے درمیانی باغ میں جہاں اب کئی درخت کٹ بھی چکے تھے، ان کے بہت سے پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ سب سے قابلِ توجہ پنجرہ بندروں کا تھا۔ کم از کم پچاس نر مادہ اور بچے تو ہوں گے۔ یہ ایسا جانور تھا جو ہر وقت ہی اپنی فطری اٹھکیلیوں میں مصروف رہتا تھا بلکہ اس حوالے سے تو مرغیاں وغیرہ بھی کسی گنتی میں نہیں تھیں۔ زنانے میں اب کئی جواں سال ملازمائیں آن موجود ہوئی تھیں۔ دوسرے مکینوں کی طرح ان ملازماؤں کی نگاہ بھی آتے جاتے ان سرگرم جانوروں پر پڑتی تھی اور ان کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مناظر صالح کے نہ جانے کن خفتہ جذبوں کی تسکین کرتے تھے۔

اب سرخاب منزل کے بہت سے کمروں میں ٹی وی کی آواز گونجتی تھی۔ سونے، جاگنے کے سب اوقات تبدیل ہو چکے تھے۔ شہوار نامی وہ کال گرل تو صالح کی تنہائیوں کو چمکا ہی رہی تھی، اب کئی اور قابلِ قبول چہرے اور جوان جسم بھی صالح کے اردگرد ملازماؤں کی صورت میں موجود تھے۔ وہ آتے جاتے ان ''کنیزوں'' کو ایک راج کمار کی طرح دیکھتا اور کبھی تھوڑی بہت چھیڑ بھی کر گزرتا۔ وہ راجا اندر بنتا جا رہا تھا۔

اس راجا اندر نے وہ دو عدد نہایت قیمتی خوبصورت گھوڑے اونے پونے بیچ ڈالے تھے جو اس کے باپ نے اس خیال سے منگوائے تھے کہ کبھی وہ صالح کو ان پر پولو کھلائیں گے۔ اب وہ شام کے وقت بڑے اہتمام سے حویلی کے پلے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتا تھا۔ کرکٹ جو بابا کے دور میں شجرِ ممنوعہ تھی۔

کال گرل شہوار کے حوالے سے اس کے رات دن برابر تھے۔ اس کی بدمستی کسی بھی وقت اسے شہوار کے ساتھ کمرے میں بند کر سکتی تھی۔ وہ اپریل کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ وہ شہوار کے حسن کی خوشہ چینی کے بعد ذرا مرجھایا ہوا سا کمرے سے نکلا تو داجے فضل کو دروازے کے سامنے کھڑا پایا۔ ایک بیگ ان کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ ایک اٹیچی کیس ان کے پیچھے کھڑے ملازم نے پکڑ رکھا تھا۔ صالح حیران ہوا۔

''یہ کیا داجے فضل؟''

''یہ وہی ہے جس کے لیے تم مجھے مجبور کر چکے ہو۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اب یہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہے۔''

''لیکن داجے! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ.....''

''چپ ہو جاؤ۔'' وہ دانت پیس کر بولے۔ ''دل نہیں مانتا کہ تم ارجمند جیسی عورت کے بیٹے ہو۔ اس کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہو۔ میں تمہاری بربادی اور نہیں دیکھ سکتا۔ اب مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''یعنی آپ مجھے برباد ہونے کی کھلی چھٹی دینا چاہتے ہیں کہ میں جو جی چاہے کروں..... جو تھوڑی بہت روک ٹوک مجھ پر باقی ہے، وہ بھی نہ رہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''بس، جو بھی تم سمجھ لو..... میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔''

کچھ دیر تک دونوں میں تکرار ہوئی پھر داجے فضل بے پناہ طیش کے عالم میں سامان اٹھا کر چلے گئے۔

وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ داجے فضل تادیر حویلی سے اور یہاں کے مسائل سے دور نہ رہ سکیں گے۔ گزرے ماہ و سال میں ان کا اس حویلی سے اور بابا شاہنواز سے ناتا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ ویسے بھی صالح کو انہیں واپس بلانے کا ڈھنگ آتا تھا۔

آج طیش کے عالم میں جو بات داجے نے اس سے کہی تھی، وہ پہلے بھی کئی بار کہی تھی۔ ''اتنی نیک ماں کے اتنے بُرے بیٹے کیسے بنتے جا رہے ہو؟''

صالح کو جو کچھ اپنی ماں کے بارے میں معلوم ہوا تھا، وہ یہی تھا کہ وہ جب تک زندہ رہیں، اس سرخاب منزل کی روح تھیں۔ ہر کوئی ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ تھا۔ ان کی تعریف ہی کرتا تھا مگر جب یہ تعریف داجے فضل کی زبان سے ہوتی تھی تو اس میں کچھ عجیب سا رنگ آ جاتا تھا۔ ان کا لہجہ کرب میں ڈوب جاتا تھا۔ صالح کا دل چاہتا تھا کہ

کسی وقت داجے فضل بڑے اچھے موڈ میں ہوں تو وہ ان سے ماضی کے ان شب و روز کے بارے میں پوچھے جو ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے۔

خیر، اب تو وہ واپس اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ ان کے واپس جانے سے صالح کو مزید کھل کھیلنے کا موقع مل رہا تھا اور اس نے کھیلنا شروع کر دیا۔

ایک مہینے کے اندر ہی اس کا دل کال گرل شہوار سے بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب کسی اور تازہ پھول کی تلاش میں تھا۔ میڈم نیلم نامی جس عورت نے اسے شہوار فراہم کی تھی، اس کے پاس کئی اور گوہر کیاب بھی موجود تھے۔ اس مرتبہ صالح نے ایک ساتھ دو کال گرلز کو سرگودھا سے سرخاب منزل میں بلا لیا۔ بہانہ تو وہی انٹیریئر ڈیکوریشن والا تھا مگر حویلی میں قریباً سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان لڑکیوں کو کمروں کی سجاوٹ کے بارے میں کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ اصل میں یہ کسی اور کام کے لیے یہاں لائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی اچھی ڈانسر بھی تھی۔ رات کو کسی وقت صالح کے کمرے سے رقص و موسیقی کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا کہ یہ دونوں لڑکیاں ایک ساتھ ہی صالح کے ساتھ بیڈ روم میں موجود ہوتیں۔ درحقیقت سرخاب منزل میں اب سب کچھ آؤٹ آف کنٹرول ہوتا جا رہا تھا۔ داجے فضل کی ذمے داریاں عارضی طور پر منیجر افراسیاب پوری کر رہا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ صالح کے لنگوٹیے وکی نے بھی سرخاب منزل آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کی ٹانگ تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔ بس تھوڑی سی لنگڑاہٹ باقی تھی۔ بظاہر صالح، وکی کے ساتھ بالکل نارمل تھا مگر اسے دیکھتے ہی اس کے سینے کی گہرائی میں جیسے ایک الاؤ بھڑک اٹھتا تھا۔

وقار عرف وکی شکل و صورت کا اچھا تھا البتہ اس کے نقوش میں تھوڑی سی کرختگی بھی پائی جاتی تھی۔ بازار میں پرنس شاہد کے ساتھ وکی کی جو بار ماری ہوئی تھی، اس میں وکی کی ایک ابرو پر بھی چوٹ آئی تھی۔ اس چوٹ کے نشان نے اس کی صورت کو تھوڑا اور کرخت کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے زخم کا ایک اور نشان اس کی گردن کے نچلے حصے پر بھی نظر آتا تھا جیسے کسی تیز دھار آلے کا کٹ ہو مگر اس کا تعلق اس بازار والی لڑائی سے نہیں تھا۔ وکی کا کہنا تھا کہ یہ کیمیکل ڈور کا نشان ہے جس نے پچھلی سردیوں میں اس کا مزاج پوچھا تھا۔ صالح اور وکی دونوں نے چھت پر جا کر خوب پتنگ اور تاش بھی کھیلتے رہے۔ گفتگو کے دوران میں صالح نے کہا۔ ”تمہارے فرنیچر شوروم کے انچارج مدثر نے تم سے کوئی بات کہی تھی..... میرا مطلب ہے بابڑوں کے بارے میں؟“

”نہیں..... مجھ سے تو نہیں کہی۔“

”مجھے لگتا ہے کہ اسے خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی گاؤدی سا ہے۔“

”نہیں، بات کیا ہے؟“ وکی نے ذرا ٹھٹک کر کہا۔

کچھ دیر تذبذب ظاہر کرنے کے بعد صالح بولا۔ ”یہ کمینہ پرنس جان بوجھ کر چھیڑ خانیاں کر رہا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ پچھلے جمعے کو تمہارے شوروم پر آیا تھا۔ ساتھ میں وہ باسٹرڈ بھی تھی، لمبے بالوں والی۔ کیا نام ہے اس کا، نازو! کچھ فرنیچر وغیرہ پسند کر کے لے گئے تھے۔“

وکی کے تیور بدل گئے۔ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”حیرانی کی بات ہے لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”پتا رکھنا پڑتا ہے وکی اوئے دشمن داری جو ہے۔ بابڑ اگر جالے نوری کی شکل میں اپنا مخبر ہمارے اندر رکھ سکتے ہیں تو ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا۔ پچھلے مہینے سے ایک بندے کو ”پلانٹ“ کر رکھا ہے میں نے وہاں۔ شکرال نام ہے۔ ڈرائیونگ کرتا ہے۔“

یہ وہی شکرال نامی ڈرائیور تھا جس نے چند دن پہلے صالح کو فرنیچر شوروم والی بات سے آگاہ کیا تھا۔

وکی نے سیال آگ کے کئی بدبودار گھونٹ حلق سے اتارے اور اس کا چہرہ مزید تمتمانے لگا۔ ”مطلب یہ کہ اس نے جان بوجھ کر ہمارا فرنیچر شوروم چنا مجھے دکھانے کے لیے۔ ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ کر لیں گے حساب برابر۔“

”ابھی ذرا تھم کے رہو یار! پہلے خود پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ۔ دیکھ لیں گے بعد میں۔“

شگوفے

”تمہیں اپنی تحریروں میں کون سی تحریر سب سے زیادہ اچھی لگی؟“ ایک مشہور افسانہ نگار سے اس کے دوست نے پوچھا۔

”گزشتہ برس کا انکم ٹیکس ریٹرن۔“ جواب ملا۔

☆☆☆

ایک سیلز مین نے اپنی محبوبہ کو شادی کی پیشکش کی اور چلتے وقت عادتاً بولا۔

”.....اور اس حیرت انگیز پیشکش پر غور کرنے کا یہ آخری دن ہے۔“

(مرسلہ: شاہین تبسم، ملتان)

☆☆☆

وکی کے ذہن میں صالح نے جو چنگاری چھوڑی تھی، اس نے دو تین ہفتے میں ہی کام دکھا دیا۔ ایک دن وکی سرخاب منزل میں صالح کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ ''جعلی پرنس'' سے حساب برابر کرنے کا ایک اچھا موقع ملا ہے۔

تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''وہ ماں کا پرنس آج کل جوڑا راما تھیٹر چلا رہا ہے، اس کا ایک پھڈا ہے۔ یہ تھیٹر گنجان علاقے میں ہے۔ علاقہ مکین نہیں چاہتے کہ یہاں ناچ گانا ہو اور تماش بینوں کے جمگھٹے لگیں۔''

''تو کیا کر رہے ہیں وہ؟''

''سخت احتجاج کر رہے ہیں۔ وہ تھیٹر بند کروانا چاہتے ہیں مگر بابڑوں نے علاقے کے ناظم کو ساتھ ملا رکھا ہے۔ وہ علاقے کے لوگوں کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے کو تھوڑا سا اٹھا کر رکھا جائے تو پرنس کا یہ کنجر خانہ بند ہو جائے گا۔''

دونوں اس بارے میں دیر تک بات کرتے رہے۔ وکی کے جانے کے بعد صالح نے اختر کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسے تفصیل بتانے کے بعد کہا کہ وہ خود شہر جائے اور تھیٹر کے بارے میں صورت حال دیکھ کر آئے۔

اختر ہر لحاظ سے معاملہ فہم اور کارگر ثابت ہو رہا تھا۔ ایک دن بعد اس نے صالح کو ایک اہم اطلاع دی۔ بولا۔ ''تھیٹر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چھوٹی مسجد بھی ہے۔ مسجد کے امام صاحب بھی تھیٹر کی وجہ سے خوش نہیں۔ اگر ان کی تھوڑی سی مدد کر کے انہیں ہلا شیری دی جائے تو تھیٹر کا معاملہ اور بھڑک سکتا ہے۔''

صالح نے سوچ بچار کی۔ اس کے لیے تو وکی اور پرنس برابر ہی تھے۔ دونوں نے ہی اس سے بیر کمایا تھا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی سزا ملتی، اس کے لیے باعث اطمینان تھا۔ اس نے اسی وقت وکی کو فون کیا اور مسجد والی بات سے آگاہ کر کے ایک دو مشورے بھی دیے۔

تناز عے کی یہ آگ صالح کی توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑکی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس آگ کے شعلے اپنی بلندی میں خاطر خواہ اضافہ کرنے لگے۔ بابڑوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ مسجد کمیٹی بھی جو پکا یک شدت سے اس معاملے میں شامل ہو گئی ہے تو اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ وکی کے والد انکل سیف بھی کچھ کم منتقم المزاج نہیں تھے۔ انہوں نے وکی کی ٹانگ توڑنے والوں کے خلاف اہل علاقہ کی بھرپور مدد کی۔ بے شک یہ مدد کافی حد تک در پردہ تھی مگر ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہتیں۔ تھیٹر والا معاملہ عدالت تک پہنچ گیا اور عدالت نے بجا طور پر فوراً اسٹے آرڈر دے دیا۔ تناز عے کے آغاز میں ہی یہ بات تقریباً واضح ہو گئی کہ یہاں تھیٹر نہیں چل سکے گا۔

افراسیاب، سرخاب منزل میں بے شک کئی ذمے داریاں نبھا رہا تھا مگر داجے فضل کریم کے بغیر سرخاب منزل بے آسرا محسوس ہوتی تھی۔ صالح جانتا تھا کہ ان کا غصہ اب کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ اس نے سوچا غصہ ٹھنڈا اور لوہا گرم..... اب ایک ضرب لگانی چاہیے۔ اس نے اپنی آپا ماماں بی سے مشورہ کرنے کے بعد داجے کو فون کیا۔ اپنی آواز میں نقاہت پیدا کرتے ہوئے ان سے سلام دعا کی اور پھر انہیں بتایا کہ چھ سات روز سے اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بخار ٹوٹنے میں نہیں آ رہا۔ ساتھ ہی اس نے کچھ ندامت کا اظہار بھی کیا کہ اس کی وجہ سے داجے کو غصہ آیا اور انہیں حویلی سے جانا پڑا۔ اس نے انہیں واپس آنے کا کہا۔ وہ انکار کرتے رہے مگر پھر اس شرط پر مان گئے کہ وہ اپنی خرمستیاں ختم کر دے گا اور آئندہ کوئی لڑکی یا عورت حویلی میں لے کر نہیں آئے گا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ ویسے بھی آج کل اس کا دل ان دونوں کالی گرلز سے قریباً بھر گیا تھا۔ یہ دونوں بھڑکیلے رنگوں والے پھول اس کے لیے بے رنگ ہوتے جا رہے تھے۔ رس چوسنے کے لیے اب اس کے ''بھونرے پن'' کو کسی تازہ پھول کی ضرورت تھی۔ اگر دیکھا جاتا تو یہ دونوں لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں۔ جنس کی آگ میں جلتے ہوئے نشے باز مردوں کا سلوک عموماً عورتوں کو برا ہی لگتا ہے اور صالح تو ایسے معاملوں میں کئی ہاتھ آگے تھا۔ ایک روز تو اس نے کسی ''گریز پائی'' سے جھلا کر ایک لڑکی کو بری طرح پیٹ ڈالا تھا۔

جس روز داجے واپس آئے، صالح کو لگا کہ سرخاب منزل پھر مکمل ہو گئی ہے۔ وہ سفید براق لباس میں چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی اور بالوں کے ساتھ سرتاپا سفید ہی نظر آتے تھے۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتے ڈیوڑھی سے احاطے میں داخل ہوئے تو صالح کو یوں محسوس ہوا کہ سرخاب منزل کا ہر خالی گوشہ بھر گیا ہے۔ اس نے کئی بار ان سے پوچھا تھا کہ وہ ہمیشہ ایک جیسے سفید لباس میں ہی کیوں نظر آتے ہیں۔ ان کا جواب ہمیشہ مختصر ہی ہوتا تھا۔ بس مجھے یہی اچھا لگتا ہے۔ ایک عید پر اس نے بہت کوشش کر کے انہیں نیلا جوڑا پہننے پر مجبور کیا تھا۔ جب تک رانہوں نے

کپڑے بدل نہیں لیے، وہ بے چین ہی رہے تھے۔ صالح کو داجے کے ساتھ کچھ عجیب سا تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ اس تعلق میں محبت، غصہ، ناراضگی، وابستگی سب کچھ ہی شامل تھا۔ کسی کسی وقت تو وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ وہ باتیں بھی ان کے ساتھ کر جاتا تھا جو اپنے لنگوٹیے وکی کے ساتھ بھی نہیں کیا کرتا تھا۔

شروع گرمیوں کی اس رات جب باغیچے میں موتیے، گلاب اور رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے اور نیم گرم ہوا میں بیتے دنوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں، وہ اور داجے فضل حویلی کی ایک بڑی آبشار کے قریب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ صالح نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''داجے! آج میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اس بات نے بہت دنوں سے میرے دل و دماغ میں بری طرح ہلچل مچائی ہوئی ہے۔'' داجے فضل نے سوالیہ نظروں سے صالح کی طرف دیکھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وکی کو آپ کیسا لڑکا سمجھتے ہیں؟''

داجے نے ذرا توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''میرے خیال میں تم میرا جواب جانتے ہو۔ تمہارے ساتھ اس کا میل جول مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ آخر وہ سیف اللہ کا بیٹا ہے اور میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ تمہارے باپ اور سیف اللہ کے درمیان دوستی کا رشتہ موجود ہے اور دشمنی کا بھی.....''

''مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آیا کرتا تھا مگر اب شاید میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں کہ یہ باپ بیٹا ہمارے لیے دوستوں کے بھیس میں چھپے ہوئے دشمن ہیں۔''

داجے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی ہلکی نیلی آنکھیں جو جوانی میں یقیناً خوبصورت رہی ہوں گی، سوالیہ انداز میں بڑی بے تابی کے ساتھ صالح کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''داجے! میں جو کچھ آپ کو بتا رہا ہوں، آپ نے صرف خود تک ہی رکھنا ہے۔ میں آپ کو وکی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں..... شاید..... آپ کو یہ سن کر یقین نہ آئے کہ پھپھو اور آفرین اگر مجھ سے جدا ہوئی ہیں تو اس میں سارا قصور اس خبیث وکی کا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' داجے کے چہرے پر حیرت امڈ آئی۔

''داجے! آپ کو پتا ہے، تقریباً چار سال پہلے ملائیشیا سے آفرین کے خط آنا اچانک بند ہو گئے تھے۔ خط آنا بند نہیں ہوئے تھے، وہ بس مجھ تک پہنچ نہیں سکے تھے۔ وہ اسی لعنتی وکی کے پاس جمع ہوتے رہے تھے۔ داجے! ایک طرف میں ان خطوں کے لیے تڑپتا رہا، دوسری طرف بے چاری آفرین میرے جواب کے لیے ترستی رہی۔ داجے! اس نے ایک ایسے ''یارِ مار'' کا کردار ادا کیا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم کو میں ساری زندگی بھول نہیں سکوں گا۔'' صالح کی آواز بھرا گئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ..... وہ تمہارے خط روکتا رہا؟''

''صرف خط روکتا ہی نہیں رہا داجے! وہ خود آفرین پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک فرضی نام سے اس کے ساتھ خط..... کتابت کرتا رہا۔''

داجے ہکا بکا تھے۔ صالح نے شروع سے آخر تک ساری روداد داجے فضل کریم کو تفصیل سے سنا دی۔ آخر میں بولا۔ ''داجے! اب تو کبھی کبھی مجھے یہ شک بھی پڑتا ہے کہ شاید وہ آفرین کے پیچھے ملائیشیا، میرا مطلب ہے کوالالمپور بھی پہنچا ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس کا اصل روپ دھیرے دھیرے میرے سامنے آ رہا ہے۔''

صالح اور داجے فضل کریم میں یہ حیرت انگیز گفتگو تادیر جاری رہی۔ داجے کی آنکھوں میں عجیب سی یاس انگیز کیفیت جھلک دکھا رہی تھی۔ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''صالح! مجھے پتا ہے تم نے آفرین کے سوا کسی سے محبت نہیں کی۔ تم اس سے محبت کرتے تھے۔ رات دن اسی کے خیالوں میں گم رہتے تھے مگر تم سے کچھ غلطیاں ہوئیں اور ان میں سے ایک ایسی غلطی بھی ہے جو اکثر نوجوانوں سے ہوتی ہے اور اب تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ یہی وہ غلطی ہے جس نے تمہیں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو داجے؟''

''ہمارے اسلام میں مرد و عورت کے تعلق کے بارے میں بہت سے احکامات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں آپس کے تعلق کی پردہ داری کا اہم حکم بھی ہے۔ کئی جگہ وضاحت سے کہا گیا ہے کہ میاں بیوی اپنے باہمی تعلق اور اپنی محبت کی باتوں کو دوسروں پر افشا نہ کریں۔ نہ مرد اپنے دوستوں میں یہ باتیں ظاہر کریں نہ عورتیں اپنی سہیلیوں وغیرہ میں..... مگر افسوس کہ ہم بے شمار دوسرے حکموں کی طرح اس پر بھی عمل نہیں کرتے اور اکثر ایسا ہی نقصان اٹھاتے ہیں جیسا تم نے اٹھایا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں آفرین کی باتیں وکی

سے کرتا تھا۔ اس راز و نیاز کی وجہ سے اس کے دل میں کھوٹ آ گیا؟''

وہ دل گرفتہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔ ''بالکل، ایسا ہی ہوا ہے اور میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ راز دار ہی رقیب بن جاتے ہیں اور یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ان کے لہجے میں عجیب سا کرب نمودار ہو گیا جیسے وہ ماضی کے کسی دھندلکے میں کھو گئے ہوں۔

داجے جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ صالح کے دل کو لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی بالکل ایسے ہی انداز میں سوچتا تھا۔ آفرین سے خط... کتابت کے دوران میں اور خط کتابت بند ہونے کے بعد وہ وکی سے آفرین کے بارے میں کھلی ڈلی باتیں کرتا تھا۔ وہ ایسے بات کرتی ہے، ایسے مسکراتی ہے، ایسے قریب آتی اور دور جاتی ہے۔ آفرین کی تصویریں تو اس نے شروع شروع میں ہی اس بدنیت کو دکھا دی تھیں۔ آفرین کے لکھے خوش رنگ خط بھی وہ اس کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔

ہلکی چاندنی جامن، سفیدے اور شیشم کے پیڑوں سے چھن چھن کر آبشار کے گنگناتے پانی تک پہنچ رہی تھی اور وہاں ستارے جھلملا رہے تھے۔ صالح کھوئی کھوئی نظروں سے داجے کا چہرہ تک رہا تھا۔ ان کے آخری الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونجتے تھے..... ''راز دار ہی رقیب بن جاتے ہیں اور یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔''

بہت دفعہ صالح کو لگا تھا کہ برسوں سے داجے فضل جو سراب منزل میں موجود ہیں اور بڑی خاموشی سے یہاں زندگی بتا رہے ہیں تو اس کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہے۔ جب وہ صالح کو پند و نصائح کر رہے ہوتے تھے تو اکثر یہ فقرہ بے ساختہ ان کی زبان سے ادا ہوا تھا..... ''تم ایک نیک ماں کے بیٹے ہو..... کیوں خود کو سنبھال نہیں پا رہے ہو۔''

ایک پریشان کن واقعے کے بعد انہوں نے بڑے کرب سے کہا تھا۔ ''کیوں بھول رہے ہو کہ تمہیں پیدا کرنے والی بھی اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ پچھواڑے کے قبرستان میں لیٹی ہوئی ہے۔ دیکھ رہی ہے اپنے بیٹے کے چلن۔''

اس کا دل چاہا کہ وہ داجے سے ان کے ماضی کے بارے میں کچھ پوچھے۔ داجے نے اپنی شادی کے صرف ایک سال بعد ہی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور پھر ساری عمر شادی نہ کی۔ قریبی عزیزوں میں ان کا صرف ایک چھوٹا بھائی اور بہن زندہ تھے۔ وہ بھی سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے تھے۔ داجے جب بھی کسی بات پر صالح کے بابا یا خود صالح سے خفا ہو جاتے تھے تو اپنے بھائی کے پاس چلے جاتے تھے۔

ہاں..... صالح، داجے سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر فی الوقت اس کا اپنا دل اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ کوئی اور ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر داجے کے ساتھ اسی نہج کی باتیں کرنے لگا جو صالح، وکی اور آفرین کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔

داجے گہری سانس لے کر بولے۔ ''میں بھی حیران تھا کہ تم اتنے عرصے بعد کیوں ایک بار پھر اتنے بے چین نظر آ رہے ہو۔ پہلے تم نے افراسیاب کو بھیجا پھر خود ملائیشیا سے آگے تک گئے۔ ایسی باتیں بے شک دل پر بہت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اب تم بتا رہے ہو کہ ابھی تک تم نے یہ سب کچھ وکی سے راز رکھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ مناسب ہی ہے۔ اس بات کو کھولنے سے اب کچھ حاصل تو ہونا نہیں۔ معاملات بگڑیں گے ہی۔''

''مجھے معاملات بگڑنے کا ڈر نہیں داجے!'' صالح اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں اس بہروپیے، دغاباز سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا ہوں۔''

''صالح! خدا کے لیے۔ تمہارے حالات پہلے ہی بہت خراب ہیں۔ اب اور نہ کر لینا۔ میرے خیال میں تو جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب اس پر مٹی ڈال دو۔ دیکھو، وہ شادی شدہ ہو چکی ہے۔ اس کی زندگی جم چکی ہوگی۔ اس کی جمی جمائی زندگی سے ہی تمہاری پھپھو اور پھوپا وغیرہ کا سکون و اطمینان بھی جڑا ہوا ہوگا۔''

''مگر..... مگر میں اس باسٹرڈ وکی کو کیسے معاف کر سکتا ہوں داجے! اس نے مجھے برباد کر دیا ہے۔ سمجھیں کہ زندہ دفن کر دیا ہے اور میرا تو یہ شک اب پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ آفرین کے پیچھے ملائیشیا اور فلپائن بھی گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اب وہ کہاں ہے۔''

''میرے پتر! وہ تمہیں بتا بھی دے گا تو کیا کرو گے؟''

''میں کم از کم ایک آخری بار اسے دیکھ تو لوں گا۔ اسے بتا تو دوں گا کہ میں بے وفا نہیں تھا، دغاباز نہیں تھا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا ہوں، تڑپتا رہا ہوں اس کے لیے اور اب بھی تڑپ رہا ہوں۔''

(جاری ہے)

کبھی حبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کاٹوں میں.....

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

آخری شام سے پہلے

طاہر جاوید مغل

چوتھا حصہ





اُچانک داجے فضل کریم نے جذباتی انداز میں صالح کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ان کی بوڑھی ہوتی ہوئی نیلگوں آنکھوں میں ایک التجا تھی، ایک تمنا ک سی خواہش تھی، بولے۔

"صالح پتر! مجھے اپنا بڑا اور اپنا ہمدرد سمجھ کر ایک بات مان لو۔ یہ سب جھمیلے چھوڑ کر اللہ کا حکم پورا کرو، تم شادی کرلو۔ تم دیکھنا سارے مسئلے تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔"

وہ زور سے ہنسا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ہیڈ ملازمہ صادقہ نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا پھر تندور کی طرف چلی گئی جہاں روٹیاں لگانے کی تیاری ہورہی تھی۔

صالح نے بہکے ہوئے سے انداز میں کہا۔ "آپ نے کیسی بات کردی ہے داجے! شادی میرے مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس شادی کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلی کا ہوا۔ شادی تو سالم بندے کی ہوتی ہے۔ میں سالم کہاں ہوں داجے.....! میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔ کوئی بیوی قسم کی چیز مجھے برداشت نہیں کرپائے گی۔ میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں وہ حیا سے بھی پہلے بھاگ جائے گی۔"

فضل کریم نے بڑے دکھ سے اس کی جانب دیکھا پھر آہ بھر کر بولے۔ "ضروری نہیں صالح کہ ہر مرتبہ ایسا ہو۔ میں تو اس شادی کے حق میں ہی نہیں تھا۔ حیا کی بلکہ تم دونوں کی عمریں بہت چھوٹی تھیں۔ پھر تم نے نشہ بھی شروع کردیا۔ جس طرح کا سلوک تم نے اس کے ساتھ روا رکھا، وہ کوشش کے باوجود تمہارے ساتھ نباہ نہ کرسکی۔"

"تو اب میں کون سا بدل گیا ہوں داجے! اور بھی بُرا ہوچکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کوئی عورت بھی میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔"

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

"تو پھر تم کیوں ہوا ایسے؟" وہ جیسے کراہ کر بولے۔ "کیوں عورتوں کو کھلونا سمجھتے ہو اور توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہو؟"

"میں نے تو خود آپ سے ایک بار یہ سوال پوچھا تھا کہ میں کیوں ہوں ایسا؟ کیوں ہر طرح کی محبت اور خوشبو مجھ سے دور ہوگئی ہے اور ہر طرح کی نفرت اور بُو میرے اندر بھر سی گئی ہے اور سچ کہتا ہوں داجے! اپنا یہ رویہ خود مجھے بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ میں جانتا ہوں..... اور آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ عورت کو اللہ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس سے پیار کیا جائے مگر میں نہیں کرسکتا پیار۔ اسے دکھ تکلیف دے کر ہی مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"اپنے اس سوال کا جواب تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے صالح! تم بس ایک سے ہی محبت کرسکتے تھے اور وہ تمہارے پاس نہیں رہی مگر کسی محرومی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اپنی ساری زندگی ہی آگ میں جھونک دی جائے۔ سیانے تو یہ بھی کہتے ہیں صالح کہ اگر پیار محبت کے معاملے میں کسی عورت ذات کی وجہ سے کسی مرد کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو قدرت اس دکھ کا مداوا کسی دوسری عورت سے اس طرح کرادیتی ہے کہ سب زخم بھر جاتے ہیں۔"

"تو ہورہا ہے نا میرا مداوا دوسری عورت سے..... بلکہ عورتوں سے۔ بس یہی مداوا ٹھیک ہے میرے لیے۔"

"خدا کے لیے صالح! کچھ سوچو، خود کو سنبھالو۔ دیکھو تمہاری صحت بھی خراب ہورہی ہے۔ ہڈیاں نکل رہی ہیں۔ کسی وقت رنگ پیلا پھٹک نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ....."

داجے کی بات ادھوری رہ گئی۔ صالح کے بابا شاہنواز کی طبیعت شاید پھر خراب ہورہی تھی۔ اندرونی کمرے سے ان کی "ہائے ہائے" کی گونجدار آواز ابھر رہی تھی۔ فضل کریم اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ڈاکٹر کھوکھر شاید بیٹھک میں ہے۔" انہوں نے کہا۔ "میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔"

ان کے جانے کے بعد صالح تنہا، گنگناتے آبشار کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ شادی کا لفظ اس کی سماعت پر ہمیشہ ایک ہتھوڑے کی طرح لگتا تھا اور اس ضرب سے خانۂ دل میں تادیر شور برپا رہتا تھا۔ اب بھی شور تھا۔ باپ کی ہائے ہائے کی مدھم آواز کانوں تک تو پہنچ رہی تھی، سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ جھنجلایا ہوا سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قمیص کی بغلی جیب سے ڈسکی کی کوارٹر بوتل نکال کر اس نے منہ سے لگائی اور تین چوتھائی خالی کرڈالی۔ سیال آگ ذرا سی دیر میں پورے جسم میں پھیل گئی۔ وہ رہائشی حصے کی طرف بڑھا۔ اسے سنہری بالوں والی کال گرل کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی مگر یکایک اسے یاد آیا کہ وہ دونوں پیشہ ور لڑکیاں تو نیلم بائی کے پاس واپس جاچکی ہیں۔ وہ کچھ اور جھنجلا گیا۔ اس نے رخ پھیرا اور باغ کی طرف بڑھا۔ لی کے ایک بچے سے اس کا پاؤں الجھا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ جھنجلا کر اس نے اتنے زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ بیچارہ اڑتا ہوا سا ایک پتھریلے گملے سے جاٹکرایا پھر کربناک انداز میں چلاتا ہوا ایک طرف گم ہوگیا۔ صالح باغ میں پہنچا، لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ گھنے درختوں کی دوسری جانب سفیدے کا ملائم پنڈے والا خمیدہ تنا تھا۔ اس نے

چھڑی اٹھائی اور اندھا دھند اسے پیٹنے لگا۔ درخت سسکیاں لینے لگا، روتے اور ہائے ہائے کرنے لگا مگر درخت تو روتے نہیں ہیں۔ ہائے وائے بھی نہیں کرتے تو پھر یہ کون تھا؟ صالح نے سوچا۔ شاید یہ وہی ملائیشیا سے آئی ہوئی ملازمہ رتابہ تھی جسے بابا نے اس بھری برسات میں اسی جگہ چھڑی سے بُری طرح پیٹا تھا۔

اخترے کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ مدھم چاندنی میں کھڑا ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے "صالح سرکار" کہہ کر پکارا تھا۔

صالح نے شرمندہ ہوئے بغیر چھڑی ایک طرف پھینکی اور بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"صالح سرکار! ایک بڑی خاص اور پکی خبر ہے آپ کے لیے۔" وہ بولا۔

صالح ڈگمگاتا ہوا سا اس کے ساتھ وہیں ایک پتھریلے بینچ پر بیٹھ گیا۔ اخترے نے سرگوشی میں کہا۔ "وکی صاحب..... اور پرنس شاہد بابڑ والی لینشن بڑے اُونچے لیول پر پہنچی ہوئی ہے۔"

"اوئے وہ تو پتا ہے..... آگے کی بات کر۔" صالح بدستور ابتر موڈ میں تھا۔

اخترے نے آواز کچھ مزید دھیمی کی۔ "آپ کو پتا ہی ہے پہلے ہفتے وکی بدلہ چکانے کے لیے پرنس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا..... اگر وہ چاہے تو آج بڑا اسپر موقع ہے اس کے لیے۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے پتا چلا ہے کہ پرنس نہر پار والے گاؤں "ڈھیرو" میں آیا ہوا ہے۔ گارڈ شارڈ بھی نہیں ہیں۔ بس ایک دوست ہے ساتھ۔ وہاں کسی پہلوان سے کوئی ڈاچی (اونٹنی) خریدنے آیا ہے۔"

"ڈاچی..... کوئی خاص ڈاچی ہے؟" صالح نے پوچھا۔

جواب میں اخترے نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ کوئی خوبصورت قیمتی ڈاچی ہے جو اس پہلوان کو بہاولپور کے کسی وڈیرے نے انعام میں دی ہے۔ وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔ وہ پہلوان بھی دراصل پہلوان نہیں، کبڈی کا ایک کھلاڑی تھا اور غالباً اس نے کسی مقابلے میں وڈیرے کو خوش کیا تھا۔

صالح جانتا تھا کہ وکی نے اپنی ٹانگ کے بدلے پرنس کی کم از کم ایک ٹانگ توڑنے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔ دو ہفتے پہلے سرِ بازار بھی دونوں میں کچھ مار ماری ہو چکی تھی۔

صالح نے ساری صورتِ حال جاننے کے فوراً بعد وکی کو سرگودھا میں فون کیا اور اسے "ڈھیرو" گاؤں میں پرنس شاہد کی خفیہ آمد کے بارے میں بتایا۔ وکی سر تا پا تپا ہوا تھا۔ اس نے اسی وقت مار دھاڑ کرنے والے تین ٹھکرے ساتھ لیے اور پرنس سے حساب برابر کرنے کے لیے اپنی ویگنور جیپ پر سرگودھا سے چل پڑا۔ صالح نے اسے بتایا کہ وہ بھی موقع پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

صالح سرخاب منزل سے بس میں پچیس منٹ میں ڈھیرو گاؤں پہنچ سکتا تھا مگر وہ اتنی جلدی پہنچنا نہیں چاہتا تھا کہ براہِ راست اس پھڈے میں ملوث ہو جائے۔ اس نے وہاں پہنچتے پہنچتے تقریباً ایک گھنٹا لگا دیا۔ اختر ابھی جیپ میں اس کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ ڈھیرو گاؤں سے دور ہی تھے کہ انہیں اوپر تلے آٹھ ایم ایم رائفل کے فائر سنائی دیے۔ یہ تین چار گولیاں ڈھیرو گاؤں میں ہی چلی تھیں۔ وہ دونوں وہیں پر رک گئے۔ دو تین منٹ بعد ہی انہیں کھیتوں کے درمیان نیم پختہ راستے پر دو گاڑیوں کی اچھلتی کودتی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہلکی چاندنی میں مناظر کافی دور تک نظر آ رہے تھے پھر یوں محسوس ہوا کہ ایک گاڑی نے دوسری کو سائڈ ماری ہے اور گاڑی درخت سے ٹکرا کر پہلو کی طرف الٹ گئی ہے۔

صالح نے چند لمحے سوچنے کے بعد اپنی جیپ کو آگے بڑھایا اور تقریباً ایک فرلانگ دور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ الٹی ہوئی کار پرنس شاہد کی تھی۔ وہ اس کے اندر زخمی حالت میں پھنسا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا دوسری گاڑی وقار (وکی) والی ویگنور جیپ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔

صالح کے اشارے پر اخترے نے احتیاطاً اپنا ماؤزر نکال لیا تھا۔ زخمی پرنس نے صالح اور اخترے کو پہچان لیا اور اخترے کے ہاتھ میں ماؤزر بھی دیکھ لیا۔ اس کے لہولہان چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے۔

صالح نے اخترے کو اشارہ کیا تو اس نے ماؤزر کی نال جھکا لی۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔" صالح نے پرنس کو مخاطب کر کے کہا۔ "ہم تمہیں نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

گاڑی کا دروازہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔ صالح اور اخترے نے سخت کوشش کر کے اسے کھولا اور پھر بہ مشکل کھینچ کر پرنس کو باہر نکالا۔ پیٹرول کی بو آ رہی تھی۔ کار میں آگ بھڑکنے کا اندیشہ بھی تھا۔ پرنس کا ایک پاؤں زمین پر نہیں لگ رہا تھا۔ صالح اور اخترے اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر کار سے دور لے گئے۔ اسی دوران میں دور سے کچھ

اور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ دو تین موٹر سائیکلیں اور ایک پک اپ تھی۔ یقیناً یہ لوگ ڈھیرو سے نکل کر وکی اور پرنس کے پیچھے آئے تھے۔

کار میں آگ بھڑکنا شروع ہوگئی تھی۔ آنے والوں میں سے کچھ نے اس تھوڑی سی آگ پر مٹی وغیرہ ڈال کر اسے بجھانے کی کوشش شروع کردی۔ کچھ لوگ زخمی پرنس اور صالح کی طرف آگئے۔ اگلے چند لمحوں میں صالح پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے وکی اور پرنس میں جو ٹاکرا ہوا ہے، اس میں ایک بندہ قتل ہوگیا ہے اور اس قتل کا ذمے دار وقار (وکی) موقع سے فرار ہوگیا ہے۔ صالح حیرت زدہ تھا۔ اسے ایسے سنگین نتیجے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

..... صالح نے پرنس کو یہی بتایا کہ ایک کارندے نے اسے اطلاع دی تھی کہ پرنس کوئی جانور خریدنے کے لیے ڈھیرو گاؤں میں موجود ہے اور وہاں وکی کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ہوسکتا ہے۔ وہ اس ٹکراؤ کو روکنے کی فکر میں یہاں آیا تھا۔

اختر نے صالح کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''صالح سرکار! کچھ بھی ہے، ہمیں زیادہ دیر یہاں رکنا نہیں چاہیے۔ مزید لوگ بھی آرہے ہیں۔''

اسی اثنا میں اچانک بھک بھک کی آوازوں کے ساتھ پرنس شاہد بابڑ کی پوری گاڑی آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ صالح اور اختر اپنی جیپ کے قریب ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے وہاں سے نکل آنا ہی مناسب سمجھا۔

☆☆☆

سارے کام انسان کے ارادے اور پروگرام کے مطابق ہی تو نہیں ہوتے۔ وکی وہاں ڈھیرو گاؤں میں پرنس شاہد کو سبق سکھانے آیا تھا۔ اسے کھل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر جب لڑائی بڑھی تو اسلحہ نکل آیا۔ آٹومیٹک رائفل کی کھینچا تانی میں گولی چل گئی اور ایک گولی پرنس شاہد کے ملازم کا تالو چیر کر دماغ میں گھس گئی۔

اب اس نہایت سنگین واقعے کو دو ہفتے گزر گئے تھے۔ وکی تا حال مفرور تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ وکی کے باپ سیف اللہ نے لمبی چوڑی رقم خرچ کرکے اسے فوری طور پر بیرونِ ملک نکال دیا ہے۔

اکمل سیف، ان کے اہلِ خانہ اور قریبی دوست پوری طرح زیرِ تفتیش تھے۔ پولیس تین چار مرتبہ سرخاب منزل بھی آچکی تھی اور صالح سے پوچھ گچھ کرچکی تھی۔ بظاہر اس جھگڑے میں صالح کسی طور ملوث نہیں پایا جاتا تھا بلکہ یہ بات اس کے حق میں بھی جاتی تھی کہ جھگڑے کے بعد وہ موقع پر پہنچا اور اس نے بابڑوں سے دشمنی کے باوجود زخمی شاہد بابڑ کی مدد کی۔

..... وکی اور اس کے پورے خاندان پر یہ ابتلا کے دن تھے۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا، بدنامی الگ ہورہی تھی۔ کاروبار کی چمک دمک بھی مسلسل ماند پڑتی جارہی تھی۔ یہ وہی کاروبار تھا جس کے لیے اکمل سیف اور کافی حد تک اس کے بیٹے نے بھی سرخاب منزل سے رقابت نبھائی تھی۔ یہ سب کچھ صالح کے اندر کی آگ بجھا تو نہیں سکتا تھا مگر اس آگ پر پانی کے تسلی بخش چھینٹے ضرور پڑ رہے تھے۔ وہ وکی کے باپ کو سخت پریشان حال دیکھ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنتے ہوئے کبھی بھی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہورہا تھا۔ وکی جو چند سال سے اس کا لنگوٹیا دوست اور رازدار تھا، صالح کے دل میں ایک بدترین دشمن اور رقیب کے طور پر جگہ بنا چکا تھا۔ دوسری طرف شاہد بابڑ جو دشمن قبیلے کا تھا، حیران کن طور پر اس کے قریب آرہا تھا۔ بے شک بابڑ قبیلے سے ان لوگوں کی دشمنی اتنی جلدی ختم نہ ہوسکتی تھی مگر کم از کم پرنس شاہد اور صالح رائے کی حد تک کافی برف پگھل گئی تھی۔ اس دن تو صالح کو خاصی حیرت ہوئی جب ایک دوپہر شاہد بابڑ نے فون کرکے اسے بڑی رازداری سے اپنے ڈیرے پر بلایا اور اس کی خاطر تواضع کی۔ وہ اس بات پر مشکور تھا کہ صالح نے مشکل لمحات میں اس کی مدد کی۔ وہ کافی حد تک صالح کی اس بات پر اعتماد کررہا تھا کہ صالح ڈھیرو گاؤں والے جھگڑے سے الگ تھلگ تھا۔

ڈیرے پر ہی وہ شاندار ڈاچی بھی کھڑی تھی جسے خریدنے کے لیے شاہد بابڑ اس چاندنی رات میں ڈھیرو گاؤں گیا تھا۔ سفید رنگ کا ایک نر اونٹ بھی وہاں موجود تھا۔ پرنس نے صالح کو بڑی دلچسپی سے خوبصورت ڈاچی کو دیکھتے ہوئے پایا تو بولا۔ ''لگتا ہے کہ اچھی لگی ہے تمہیں؟''

''چیز ہی اچھی لگنے والی ہے۔'' صالح نے کہا۔

ڈاچی کی اون کو تراش کر اس کے جسم پر دلکش نقش و نگار بنائے گئے تھے اور وہ آرائشی چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔

''اچھی لگ رہی ہے تو تم رکھ لو۔'' پرنس نے کہا۔

''اچھی تو لگ رہی ہے پر تم اتنے شوق سے لے کر آئے ہو۔ نہیں نہیں..... یہ ٹھیک نہیں۔''

"نورے..... اونورے!" شاہد بابڑ نے مخمور انداز میں اپنے کمدار کو آواز دی۔

سندھی ٹوپی پہنے ایک لمبا تڑنگا شخص جلدی سے اندر آ گیا۔ شاہد بابڑ نے کہا۔ "نورے! یہ ڈاچی ہمارے مہمان کو پسند آ گئی ہے۔ یہ مہمان کے ساتھ جائے گی۔"

"کیا کر رہے ہو شاہد!"

وہ مسکرایا۔ "جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔"

صالح نے بہت انکار کیا مگر پرنس شاہد اپنی سی کر کے رہا۔ ڈاچی، صالح کے ساتھ ہی سرخاب منزل آ گئی۔

.....اگلے دو تین ہفتے میں صالح اور شاہد بابڑ کی قربت مزید بڑھی۔ حاکم بدر دین بابڑ یعنی شاہد کا والد اس قربت سے خوش نہیں تھا مگر فی الحال اس نے کوئی زیادہ سخت موقف اختیار نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف صالح کے بابا تو اب اس قابل ہی نہیں تھے کہ ایسے معاملات میں کوئی دخل دے سکتے۔

ایک رات جب صالح بابڑوں کے گاؤں میں تھا اور شاہد بابڑ کے ساتھ پی پلا رہا تھا، شاہد نے نشے کی ترنگ میں صالح کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "وہ اس غنورے والے معاملے میں تو اب افسوس ہونے لگا ہے۔ ایویں خوامخواہ تم لوگوں کو مشکل میں ڈالا.... وہ کمینہ شاید قابل ہی نہیں تھا اس عورت کے۔" (عورت سے اس کی مراد روزینہ تھی)۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"بھاگ گیا ذلیل شوہر واپس کویت..... اسی بنگالن کی بغل میں جا گھسا ہوگا۔ تم بس اس کیس کو ختم ہی سمجھو۔ جب پیروی کرنے والا ہی بکری بن گیا ہے۔"

"اور وہ روزینہ..... وہ کہاں ہے؟"

"یہیں ہے حویلی میں، ہمارے پاس۔ جب تم سے بھاگی تو سیدھا یہاں پہنچی۔ پندرہ بیس دن غنورا ساتھ رہا اس کے۔ اس کے ساتھ ایک کمرے میں سوتا رہا پھر بھاگ گیا۔ جاتے جاتے دو لاکھ روپیہ لے گیا مجھ سے۔ یوں سمجھو کہ دو لاکھ میں دستبردار ہو گیا اس سے۔"

"تمہاری حویلی میں اب کیا کرتی ہے؟"

"کھانا شانا پکاتی ہے۔ اچھا پکا لیتی ہے۔"

"کھانا شانا پکاتی ہے..... یا کچھ اور بھی؟" صالح نے زیر لب مسکرا کر نیم باز آنکھوں سے شاہد بابڑ کو دیکھا۔

وہ سر پیچھے کی طرف پھینک کر بلند آواز میں ہنسا۔ مخمور آواز میں بولا۔ "عمر تھوڑی زیادہ ہے لیکن ہے چکھنے والی چیز.... ویسے ابھی چکھا نہیں۔ کوئی بات نہیں گھڑے کی مچھلی ہے۔" پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ "اوئے ہاں یار! تمہیں بھی تو چکما دے کر نکل گئی تھی۔ تھوڑی سزا تو ملنی چاہیے اسے۔ کہو تو حاضر کروں اسے؟"

صالح گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تب ایک اور تلخ بدبو دار گھونٹ بھر کر بولا۔ "آ جائے گی؟"

"اس کا باپ بھی آئے گا۔" وہ پھنکارا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے خاص ملازم کو آواز دی۔ "اوئے نورے!"

نورا انگوٹھی کے جن کی طرح حاضر تھا۔ شاہد بابڑ اسے بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

صرف ایک گھنٹے بعد ڈیرے کے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں جہازی سائز کے صوفے پر صالح پھیل کر بیٹھا تھا۔ شیشے کی تپائی پر سگریٹ، بوتل وغیرہ موجود تھے۔ اس کے سامنے روزینہ کھڑی تھی۔ پھولوں والی کالی قمیص، کالی شلوار اور لہریے دار دوپٹا، ناک میں کوکے کی چمک تھی۔ اس کی پلکیں جھکی تھیں اور بالوں کی لٹیں دودھیا چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ واضح طور پر ڈری سہمی تھی۔

"کیا سمجھا تھا تم نے..... بھاگ جاؤ گی..... ہماری مخالف فیملی کے پاس پناہ لے کر ہمیں تھانوں کچہریوں میں رولو گی اور غنورے کے ساتھ گھر بسا لو گی اپنا؟" روزینہ کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ کچھ بول نہ سکی۔

"تمہارے جیسی عورتوں کے گھر نہیں بستے۔ وہ در بدر رہتی ہیں۔ کبھی ایک بستر پر، کبھی دوسرے پر۔"

وہ پاؤں کے انگوٹھے سے پختہ فرش کو کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"بچی کہاں ہے تمہاری؟" صالح نے پوچھا۔

"اسے حویلی چھوڑ آئی ہوں، ماسی کے پاس۔"

"پھر اب کیا چاہتی ہو؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے معنی خیز انداز میں بولا۔

اس نے خاموشی سے دوپٹا اتار کر ایک طرف صوفے پر ڈال دیا۔ پھر ذرا توقف کے ساتھ قمیص کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" صالح نے پوچھا۔

"جج... جی!"

صالح اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

وہ حیران نظروں سے صالح کو دیکھنے لگی۔

اس نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "میں ایک بار جس سے منہ موڑتا ہوں پھر اسے منہ نہیں لگاتا۔ جو غارغ ہو گیا، وہ ہو گیا..... چلو اٹھاؤ اپنے کپڑے۔"

"مم... معاف کر دیں سرکار!" اس نے دونوں بازو موڑ کر اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔

"کردیا نا..... چلو پہنو کپڑے۔"

وہ رخ پھیر کر کھڑکی کے پاس گیا اور اس کا پردہ سرکایا۔ دور نیم تاریکی میں آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ پتا نہیں یہ وصف بھی اسے اپنے بڑوں سے ملا تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ اس کے بابا بھی کراچی میں جس عورت کے پاس ایک بار رہ لیتے تھے پھر دوسری مرتبہ نہیں رہتے تھے۔

نشے کے ہلکے سے سرور میں وہ بہت دھیمی آواز میں گنگنانے لگا۔

مغرور ہمیں کہتی ہے تو کہتی رہے دنیا
ہم مڑ کے کسی شخص کو دیکھا نہیں کرتے

☆☆☆

صالح ایک دن کے لیے بابڑ پورہ آیا تھا مگر بابڑوں کی حویلی کا ماحول اتنا مست تھا کہ وہ دو دن مزید رک گیا۔ حویلی سرخاب منزل جتنی بڑی تو نہیں تھی اور نہ ہی بابڑوں کی زمینیں رائے ونڈ جتنی تھیں پھر بھی اپنے علاقے میں ان کی چودھری کا شملہ اردگرد کی پگڑیوں سے اونچا تھا۔ شاہد بابڑ کو اگر پرنس کہا جاتا تھا تو اس کا باپ بدر دین کنگ سے کم نہیں تھا۔ حد درجہ آزاد خیال اور رنگ باز تھا۔ اپنے بچوں اور بھائیوں سے بھی کھلی ڈلی باتیں کرتا تھا۔ ادھیڑ عمر خاندانی بیوی تو بس نام کی بیوی تھی۔ اس کی اصل ضرورتیں دائیں بائیں کی عورتیں یا طوائفیں پورا کرتی تھیں۔

یوں تو ولایتی مشروبات بھی بابڑ حویلی میں آتے رہتے تھے مگر یہاں کے مکینوں کی اصل پیاس مقامی طور پر تیار کی گئی خاص شراب سے ہی بجھتی تھی۔ اس میں کیکر کی چھال اور گڑ وغیرہ کا استعمال خاص طریقے سے ہوتا تھا۔ بابڑوں کو گھوڑوں کے علاوہ اونٹ وغیرہ پالنے کا بھی خصوصی شوق تھا۔

وہ اتوار کا ایک روشن روشن دن تھا۔ پرنس شاہد اور صالح حویلی کے وسیع لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ موضوع وقار وکی ہی تھا جو ڈھیر وگاؤں والے قتل کے بعد منظر سے ایسے غائب ہوا تھا کہ بس اوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وقوعے کے فوراً بعد وہ بیرون ملک نکل گیا ہے۔ فی الوقت اس کا والد سیف اللہ بھی کہیں دائیں بائیں ہو چکا تھا۔ صالح، پرنس وغیرہ کے سامنے ظاہر یہی کرتا تھا کہ وہ وکی اور پرنس والے جھگڑے کے خاتمے کا خواہاں ہے مگر اندر سے وہ خوش تھا۔ اس جھگڑے کے سبب وکی کی فیملی اور ان کے کاروبار پر جو بداثرات پڑے تھے، وہ صالح کی خواہش کے عین مطابق تھے۔

گفتگو کے دوران میں پرنس کے والد کی کال آئی۔ انہوں نے اسے کسی کام سے حویلی کے اندر بلایا تھا۔ صالح وہیں بیٹھا اپنے موبائل کے اندر جھانکتا رہا۔

جو اونٹنی پرنس نے اسے دی تھی، اس کی درجنوں تصویریں صالح کے موبائل میں موجود تھیں۔ اسے کوئی جانور کم ہی اتنا پیارا لگا تھا جتنی وہ اونٹنی لگی تھی۔ اونٹنی کا نام اس نے سوہنی رکھا تھا اور وہ واقعی رنج کے سوہنی بھی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں صالح اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ سیکھی سکھائی رقاصہ تھی۔ جھانجریں وغیرہ پہن کر جب وہ سرخاب منزل کے مردانے میں ناچتی تھی تو دیکھنے والے مبہوت رہ جاتے تھے۔ چار پانچ ماہ بعد موسم بہار میں میانوالی کی ایک مویشی منڈی میں اونٹوں کی خوبصورتی اور رقص کا ایک بڑا مقابلہ ہونے والا تھا۔ صالح کا پکا ارادہ تھا کہ سوہنی کو وہاں لے کر جائے گا۔ اس کے لیے ابھی سے تیاری بھی شروع کر دی گئی تھی۔

موبائل پر تصویریں دیکھتے ہوئے صالح مگن تھا جب اسے چھن چھن کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور چند لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا۔ حویلی میں کھڑی ایک لینڈ کروزر جیپ کے عقب سے ایک حسینہ دلنواز لانگ کرتے میں ملبوس قلانچیں بھرتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ جس جانور کے پیچھے بھاگ رہی تھی، وہ بکری کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جو بھاگی آ رہی تھی، اس کی سب سے خاص بات اس کے غیر معمولی طور پر لمبے سیاہ بال تھے۔ وہ اس کے ٹخنوں تک جاتے محسوس ہوتے تھے۔ جسم یوں جیسے ہریالی کے پیش منظر میں بجلی سی چمک رہی ہو۔ یہ وہی آفت جاں طوائف زادی نازو تھی جس کی وجہ سے پرنس اور وقار عرف وکی میں ٹاکرا ہوا تھا اور اس ٹاکرے کے نتیجے میں بالآخر ایک قتل ہو گیا تھا۔

دراز گیسو والی لڑکی صالح کی نگاہوں سے بے خبر بکری کے بھیگے ہوئے بچے کے پیچھے لپکتی چلی گئی پھر اسے دبوچا اور واپس پلٹی۔ اپنے گیلے بال اس نے پلٹ کر اپنے سامنے کر لیے تھے جو بہ آسانی اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہے تھے۔ لڑکی کے دلکش جسمانی خطوط نے صالح کی بصارت کو چندھیا ڈالا تھا۔ وہ دور سے صالح پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتی ہوئی حویلی کی اندرونی دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

وہ اوجھل تو ہو گئی مگر صالح کے سینے میں ایک آگ سی بھڑکا گئی۔ اس نے نازو کے بارے میں پہلے وکی اور پھر پرنس شاہد سے بھی کافی کچھ سنا تھا۔ مگر آج اسے سرتاپا پہلی

بار دیکھ رہا تھا۔ ایکا ایکی اسے پرنس شاہد سے حسد محسوس ہونے لگا۔ ایسی توپہ شکن حسینہ شاہد کے پاس تھی..... اور بلاشرکت غیرے۔ شاہد کے باپ نے اپنے بیٹے کے لیے خود اس کی نتھ اتروائی تھی اور اب وہ پوری کی پوری پرنس شاہد کے تصرف میں تھی۔

☆☆☆

ایک رات مزید بابڑ حویلی میں رہ کر صالح واپس سرخاب منزل تو آ گیا مگر اس کی آنکھیں جیسے وہاں حویلی میں ہی رہ گئی تھیں۔ وہ کیسا لمحہ تھا جو تیر کی طرح صالح کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا تھا۔ بعدازاں پرنس سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ نازو اپنے اس میمنے کو تالاب میں نہلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھاگ نکلا تھا۔ لمحے اور وقت کے ٹکڑے ایسے ہی تیروں کا روپ اختیار کر کے نگاہوں کے راستے دل میں ترازو ہوتے ہیں۔ صالح کے اندر نرم گرم لمس کا وہی وسیع و عریض خلا پیدا ہو گیا تھا جو اسے اردگرد کی ہر شے سے بیگانہ کر دیتا تھا۔ چند ہی دنوں میں ان لمبے بالوں سے اسے بیر سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بال یا تو اس کے بستر پر منتشر ہوں یا پھر وہ انہیں قینچی کے ساتھ اتنے بھونڈے طریقے سے کاٹے کہ بس برباد کر کے رکھ دے۔ یہ نہ جانے کیسی تخریب نمو پا چکی تھی اس کے اندر۔ وہ ہر خوبصورتی اور موزونیت کو بے ترتیب اور برباد کرنے پر تل جاتا تھا۔ ہر دلکشی کو مشکل میں دیکھ کر راحت محسوس کرتا تھا۔

بابڑ حویلی سے سرخاب منزل واپس آ کر وہ نازو کے سراپا میں اتنا الجھا رہا کہ اپنے اس پسندیدہ ترین جانور کی خبر گیری بھی نہ کر سکا جو آج کل اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا بلکہ چھائی ہوئی تھی۔ سفید رنگت، کالی آنکھوں اور نازک لمبی گردن والی وہ لڑکی جو ناچتی تھی تو سب کچھ رقصاں اور مست حال ہو جاتا تھا۔ اصطبل کی طرف واپسی نے بھی شاید صالح کی آمد کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے مسلسل صالح کو پکارنا شروع کر دیا۔ مجبوراً اسے چند منٹ کے لیے اس کے پاس جانا پڑا۔

اگلے دس پندرہ روز صالح نے عجب کیفیت میں گزارے۔ لمبے نم بال اس کے اردگرد چکراتے رہے اور اسے اپنے حصار میں جکڑتے رہے۔ گٹھا ہوا سا چمکیلا بدن اسے اندر سے کاٹتا رہا۔

وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا جب اس نے اچانک اس آفتِ جاں کو دیکھ لیا تھا۔ اب اس کی قربت کی بے مہار طلب اسے بے حال کر رہی تھی۔ یہ تو وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ پرنس شاہد اس طوائف زادی کو صرف جسمانی تعلق کے لیے حویلی میں رکھے ہوئے ہے۔ کوئی بہت پائیدار رشتہ تو ان دونوں کے درمیان نہیں تھا۔ وہ کھلونا تھی اور کھلونے سے تو پرخلوص بچوں کا دل بھی جلد ہی بھر جاتا ہے۔

ایک روز صالح نے فیصلہ کیا اور اپنی نئی ٹویوٹا جیپ پر بابڑ حویلی جا پہنچا۔ نومبر کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پرنس شاہد اپنے پسندیدہ اونٹ ''لاڈلے'' کی ہیئر کٹنگ چولستان سے آئے ہوئے ایک اسپیشلسٹ کاریگر سے کروا رہا تھا۔ وہ صالح کو دیکھ کر خوش ہوا۔ دونوں حویلی کے ماڈرن انداز میں سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد دونوں کیکر کی چھال والی اوشیل شراب کی ترنگ میں آ گئے تو صالح اپنا مدعا زبان پر لے آیا۔ اس نے طوائف زادی نازو کی تعریف اس انداز میں کی کہ شاہد اس کا بین السطور سمجھ جائے مگر یا تو نشہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ سمجھا ہی نہیں یا پھر سمجھ کر بھی انجان بنا رہا۔ دونوں دیر تک مست ماحول میں رہے پھر پرنس کے باپ بدر نے دخل اندازی کی اور پرنس کو بتایا کہ تھیٹر والے کیس کے سلسلے میں سینئر وکیل حویلی آیا ہے، اس کے ساتھ ڈسکس کرنا ہے۔

صالح بھی سرخاب منزل واپس آ گیا۔ اس نے پہلی فرصت میں اپنے جہاندیدہ منیجر افراسیاب کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ کل بابڑ پورہ جائے اور پرنس شاہد بابڑ سے ملے۔ اس سے نازو کی حوالگی کے بارے میں بات کرے۔

افراسیاب نے پوری بات سننے کے بعد مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے صالح کو دیکھا اور بولا۔ ''چھوٹے سرکار! میں اس ساری صورتِ حال کو سمجھ گیا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ پرنس کے باپ نے ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اس لڑکی کے لیے کئی لاکھ روپے اور دس مربعے کا ایک گھر نتھ اتروائی میں دیا ہے۔ ابھی پرنس چھ مہینے سال تو اس کو اپنے پاس رکھنا چاہے گا۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔''

وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس معاملے میں کچھ لو، کچھ دو کے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے پیسے وغیرہ؟''

''نہیں جی۔ ایک ہیرا آپ اپنے دوست سے لے رہے ہیں، ایک ہیرا اسے دے دیں۔''

جلد ہی صالح سمجھ گیا کہ افراسیاب کیا کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ہفتے پہلے صالح نے سرگودھا میں جو پرتعیش شب و روز گزارے تھے، ان میں انجم شہزادی نامی ایک لوچ دار طوائف صالح کو بہت پسند آئی تھی۔ وہ ماڈل گرل بھی تھی۔ اس کے

لیے صالح نے نائیکا گوہر بائی کو منہ مانگے دام دیے تھے۔ پچاس لاکھ نقد اور دس پندرہ لاکھ کے تحائف کے عوض اسے چھ ماہ کے لیے اپنا پابند کرلیا تھا۔ ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے اور وہ ایک دو بار ہی اس کے پاس سرگودھا جاسکا تھا۔ منیجر افراسیاب کا مطلب یہ تھا کہ پرنس کے ساتھ اولا بدلی کی جائے۔

صالح جانتا تھا کہ لین دین اور سودے بازی کا ماہر افراسیاب اپنا مدعا بڑے اچھے طریقے سے شاہد کے سامنے رکھ سکے گا۔

افراسیاب کو بابڑ پورہ بھیجنے کے بعد اس نے بڑی بے قراری سے اس کی واپسی کا انتظار کیا۔ وہ بار بار اپنے جہازی سائز کے کمرے میں جہازی سائز کے بستر کو دیکھتا اور تصور میں وہاں دراز گیسوؤں والی آفت جاں کو رونق افروز پاتا رہا۔

افراسیاب رات گئے سرخاب منزل واپس آیا۔ اس نے مدعا بڑے اچھے طریقے سے شاہد کے سامنے بیان کردیا تھا تاہم اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا۔

''انجم شہزادی کی تصویریں وغیرہ تم نے دکھادیں اسے؟''

''ہاں جی! انہیں پسند آئی ہیں۔ وہ کسی کمرشل ایڈ میں اسے دیکھ بھی چکے ہیں مگر انہوں نے فوری طور پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔''

اگلے آٹھ دس روز عجیب بوجھل سی خاموشی میں گزر گئے۔ پرنس شاہد کی طرف سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ دوسری طرف یہاں صالح بے طرح تڑپ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ خوشبو آرہی ہو مگر کھانا دور ہو تو بھوک تو بڑھتی ہی ہے۔

لگتا تھا کہ پرنس تذبذب میں ہے۔ ایک طرف وہ طاقتور مخدوم رائے فیملی سے پیدا ہونے والے نوزائدہ تعلقات کا گلا گھونٹنا بھی نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف اپنی پسندیدہ ترین ڈش کو بھی اپنے ''دسترخوان'' سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔

خاموشی طویل ہوتی گئی اور سرخاب منزل میں صالح کی بیتابی بڑھتی گئی۔ کسی وقت وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا کہ شاید پرنس شاہد اپنی منظورِ نظر نازو کو سرخاب منزل بھیجنے سے پہلے کچھ دن اور اس کے ساتھ بسر کرنا چاہتا ہے۔ اپنی بے چینی کو کم کرنے کے لیے اس نے اپنی ڈاچی سوہنی کی طرف توجہ دینا شروع کردی۔ اونٹوں اور گھوڑوں کے مقابلۂ حسن کی تاریخ دن بدن قریب آرہی تھی۔ اس نے بھی پرنس کی طرح بھاری معاوضے پر چولستان سے ایک ماسٹر شتربان کو بلایا تاکہ وہ سوہنی کی دلکشی اور رقص میں اس کی مہارت میں اضافہ کرسکے۔ دیکھنے والے یہی کہہ رہے تھے کہ اس مقابلے میں سوہنی کوئی بڑی پوزیشن حاصل کرکے رہے گی۔ اس کی روزانہ ٹریننگ ہوتی تھی۔ بادام، گھی، مربا جات اور پتا نہیں کیا کیا کھلایا جاتا تھا۔

مسلسل خاموشی اور لمبے بالوں سے اپنی مسلسل دوری سے بے کل ہوکر صالح نے اپنے کارندۂ خاص اخترے کو بابڑ پورہ بھیجا۔ بابڑ حویلی میں اخترے کا ایک پرانا گرائیں صدیق شاہ نامی بھی رہتا تھا۔ اس سے ملنے کے بہانے اخترا وہاں جاسکتا تھا اور ایک دو دن رہ بھی سکتا تھا۔ صالح کے بابا کی مسلسل بیماری اور سرخاب منزل پر صالح کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد اخترے کے رنگ ڈھنگ بھی بدل چکے تھے۔ اب کھٹارا موٹر سائیکل کی جگہ اس کے پاس 125 ہنڈا تھی۔ اس کا لباس اچھا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پینٹ شرٹ بھی پہنتا تھا۔ تیل میں چپڑے رہنے والے بال ذرا اسٹائل میں آگئے تھے۔ بھرا ہوا لائسنس یافتہ ٹی ٹی پستول ہر وقت اس کے کپڑوں میں ہوتا تھا۔

حسبِ توقع اخترا دو دن بابڑ حویلی میں اپنے گرائیں صدیق شاہ کے پاس رہا۔ واپس آکر اس نے صالح کو مگر انقدر اطلاعات دیں۔ اس نے بتایا کہ بڑے بابڑ بدر صاحب، پرنس شاہد اور صالح کی دوستی سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں اور ایک طرح سے وہی ان دونوں کے درمیان فاصلہ بھی پیدا کررہے ہیں۔ اخترے نے بتایا کہ نازو اور ماڈل گرل انجم شہزادی کے تبادلے کی جو آفر سرخاب منزل سے بابڑ حویلی گئی تھی، اس سے بدر صاحب بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔

''کیا کہتا ہے بدر بابڑا؟'' صالح نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''صالح سرکار! جو کچھ مجھے ٹوہ لگی ہے اس کے مطابق پرنس شاہد کا خیال ہے کہ آپ نے اس سے ایک قیمتی چیز مانگی ہے اور جو کچھ آپ اسے بدلے میں دے رہے ہیں، وہ آپ کے لیے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ آپ نے تو ایک ڈیڑھ ماہ سے اس انجم شہزادی کو دیکھا بھی نہیں جبکہ پرنس نے نازو کو اپنے گھر رکھا ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے ... بلکہ یقین ہے کہ پرنس کے دماغ میں یہ باتیں اس کے باپ بدر صاحب نے ہی ڈالی ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے ان کے گھر کا ماحول بڑا کھلا ڈلا ہے۔''

اخترا چند سیکنڈ خاموش رہا پھر ٹھہرے لہجے میں گویا

ہوا۔ ”صالح سرکار! صدیق شاہ کے مطابق بدر صاحب نے ایک اور بات پرنس شاہد کے دماغ میں ڈالی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ یہی اس مسئلے کی کنجی ہے۔“

”کھل کر بات کرو۔“ صالح ذرا جھنجلایا۔

”آپ کو پتا ہی ہوگا پرنس شاہد کے پاس ایک اونٹ ”لاڈلا“ نام کا بھی ہے۔“

”ہاں، میں نے اسے دیکھا ہے۔“

”دراصل یہ جو ہماری اونٹنی سوہنی ہے، یہ پرنس نے اسی اونٹ کا جوڑا بنانے کے لیے خریدی تھی پھر یہ ہوا کہ یہ آپ کو پسند آگئی اور جوش میں آکر پرنس شاہد نے یہ آپ کو دے بھی دی۔ یہ جوڑا بنتے بنتے رہ گیا۔ اب کچھ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس اونٹ کا جوڑا کسی اور سے بن ہی نہیں رہا۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو وہ عجیب آواز میں بلبلاتا رہتا ہے۔ بدر صاحب نے بیٹے کو یہی پٹی پڑھائی ہے کہ اگر شاہنواز رائے کے بیٹے نے تم سے تمہاری کوئی قیمتی شے مانگی ہے تو تم بھی کوئی ایسی شے مانگو جو دینے میں اسے بھی تکلیف محسوس ہو۔ تم اس سے نازو کے بدلے میں سوہنی مانگو۔“

صالح حیرت سے اخترے کی باتیں سن رہا تھا۔

”تو..... اس بارے میں شاہد کیا کہتا ہے؟“

”ٹھیک ٹھیک تو پتا نہیں مگر صدیق کا خیال بھی یہی ہے کہ پرنس، سوہنی کی واپسی والی بات اپنی زبان پر نہیں لا رہا۔ یقیناً سوچتا ہوگا کہ ایک چیز خود آپ کو دے کر واپس کیسے مانگے۔“

تھوڑے ہی عرصے میں ڈاچی سوہنی اسے بہت عزیز ہو چکی تھی۔ وہ اس کی نگہداشت اور تربیت پر کافی روپیہ بھی خرچ کر چکا تھا۔ مزید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر دوسری طرف یہ بھی تھا کہ غیر معمولی دراز زلفیں اور تراشیدہ پیکر اس کے سینے میں کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ وہ دو دن ایک دوراہے پر رہا پھر پالتو جانور کی محبت پر ہم جنس کے پیکر کی دیوانی بھوک غالب آتی چلی گئی۔ دو مختلف جنس کے جاندار تھے مگر صورتِ حال شاید ایک جیسی ہی ہو گئی تھی۔ بابڑ حویلی میں پرنس کے اونٹ ”لاڈلے“ کو سوہنی چاہیے تھی اور یہاں صالح کو دراز گیسو نازو درکار تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بہار کی اس سرمئی شام کو جب سبز کھیتوں پر درختوں کے سائے طویل ہو رہے تھے، صالح بھی سجائی سوہنی کو لے کر خود بابڑ حویلی پہنچ گیا۔ جب سوہنی ٹرک سے اتر کر حویلی میں داخل ہوئی تو پرنس شاہد اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سوہنی اپنی طویل گردن کے آخری سرے پر اپنی کالی کالی آنکھیں گھما کر گرد و پیش کو دیکھ رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب شاید لاڈلے نے اس کی بو پالی تھی۔ کسی گوشے سے اس نے عجیب آواز میں بلبلانا شروع کر دیا تھا۔

”یہ..... یہ کیا ہے صالح؟“ پرنس نے ششدر لہجے میں کہا۔

”تمہاری ڈاچی..... تمہارے لاڈلے کی بچھڑی ہوئی مادہ!“ صالح مسکرایا۔

اس رات حویلی کے مہمان خانے میں صالح اور پرنس کے درمیان سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ صالح نے پرنس کو بتایا کہ اسے پتا چل چکا ہے کہ سوہنی کو لاڈلے کے ساتھ جوڑا بنانے کے لیے خریدا گیا تھا اور یہ جوڑا ٹوٹنے سے بابڑ حویلی میں پریشانی پائی جاتی ہے۔

صالح نے پرنس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”.....اور یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ اس معاملے کا نازو والے معاملے سے کوئی تعلق ہے۔ نازو کی جگہ اگر تمہیں وہ انجم شہزادی قبول ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس معاملے کو ختم ہی سمجھو۔“

پرنس نے وہسکی کا ایک چھوٹا گھونٹ لینے کے بعد کچھ کہنا چاہا مگر صالح نے فوراً اس کے الکحل زدہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس..... میں اب اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ سوہنی اب یہیں رہے گی۔“

”.....اور وہ جو تم نے مقابلے کے لیے اس کی تیاری کر رکھی تھی؟“

”تیری خوشی کے لیے ایسے سو مقابلے قربان..... اور بس اب اس بات کو فل اسٹاپ لگاؤ۔ اس سرائیکی گلوکار کو بلاؤ جس نے پچھلی مرتبہ میٹھی حیلوی والا گانا سنایا تھا۔“

دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں جب نیم گنجے سر اور کلف دار نیلی شلوار قمیص والا بدر بابڑا وارد ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے اور صالح کو اکٹھے بیٹھے دیکھا اور اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آگئی۔ وہ اونٹنی کی واپسی والی بات سے آگاہ ہو چکا تھا تاہم اس نے اس حوالے سے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رسمی انداز میں صالح کے والد کا حال احوال دریافت کیا۔

صالح نے کہا۔ ”ان کا ایک اور چھوٹا سا آپریشن ہونے والا ہے۔ اسی سلسلے میں لاہور گئے ہوئے ہیں۔“

”میرے خیال میں آٹھ دس آپریشن تو ہو چکے ہوں گے اس کے؟“ بدر بابڑا کے لہجے کی تہ میں ہلکا سا طنز تھا۔

”خیر، اتنے تو نہیں..... تین ہوئے ہیں، یہ چوتھا ہے۔“

”چلو، نیک بندہ ہے۔ اوپر والا اس کے لیے چنگا ہی کرے گا۔“ بدر نے کہا پھر ایک دم موضوع بدل کر اور بیٹے

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہد! اس خبیث سیف کے پتر کو کی کو ہلکا مت لینا۔ وہ مفرور تو ہے مگر ضروری نہیں کہ باہر ہی بھاگ گیا ہو۔ پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے وہ۔''

''بے فکر رہیں ابا جی!'' پرنس شاہد نے کہا۔ ''اس مرتبہ آیا تو لاش بن کر ہی جائے گا۔''

بدھ بابڑا نے بیٹے کے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا۔ اسی اثنا میں اس کے قیمتی موبائل پر کسی وکیل کی کال آ گئی اور وہ سنتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں سرائیکی گلوکار حاضر تھا اور گا رہا تھا..... تیں تیری کالی..... نی سوہنے پھلاں والی۔

موسیٰ خانے کے کسی گوشے سے گاہے بگاہے لاؤڈ کے کی آواز ابھرتی تھی۔ بہار کی اس رات میں وہ کافی مسرور محسوس ہوتا تھا۔

☆☆☆

ڈاچی بابڑ حویلی چلی گئی اور صرف تین روز بعد مہناز عرف نازو سرخاب منزل آ گئی۔ یہ چودھریوں، وڈیروں اور امیر زادوں کا وہی انداز تھا جس میں کبھی کبھی عورت کی حیثیت بھی پالتو اور زرخرید جانوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ نازو کی آمد اور اس کے غیر معمولی لیے گیسوؤں کے لہراؤ نے صالح کو سرشار کر ڈالا۔ اسی سرشاری اور خوشی میں اس نے فوراً اپنی سرگودھا والی رکھیل، ماڈل گرل انجم شہزادی کو بابڑ حویلی روانہ کر دیا۔ اسے بابڑ حویلی بھیجنے کے لیے صالح کو تقریباً دس لاکھ کا اضافی خرچہ بھی کرنا پڑا مگر اسے روپے پیسے کی پروا اب کہاں تھی۔ امپورٹڈ لکڑی کا کاروبار اب نارمل چل رہا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انکل سیف فی الحال کاروبار سے تقریباً آؤٹ تھے تاہم لکڑی کا کاروبار سرے سے نہ ہوتا تو بھی زمینوں سے اتنی آمدن آ رہی تھی کہ سرخاب منزل کے وارے نیارے تھے اور صالح یہاں کا اکلوتا ''راج کمار'' تھا۔

جس دن نازو سرخاب منزل پہنچی، داجے فضل بھی بابا جانی کے ساتھ لاہور میں تھے۔ صالح جانتا تھا کہ جب داجے، بابا کے آپریشن کے بعد سرخاب منزل پہنچیں گے تو نازو کو دیکھ کر ان کا پارا ساتویں آسمان کو چھو جائے گا۔ داجے فضل اس شرط پر سرخاب منزل واپس آئے تھے کہ صالح کم از کم حویلی میں کسی عورت کو لے کر نہیں آئے گا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر داجے زیادہ بگڑے تو وہ بی پلان پر عمل کرے گا اور نازو کو سرگودھا کی کسی کوٹھی میں رکھ لے گا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ صورتِ حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ بگڑنے والی ہے۔

وہ شب اس کے لیے بڑی دلنشین تھی۔ وہ دراز تر ریشمی سیاہ زلفیں جو کئی شب و روز سے اس کے دل و دماغ پر چھائی تھیں، اس کے بستر پر منتشر تھیں۔ جنس کا دیو اس کے اندر چنگھاڑتا تھا۔ اس کے ڈی این اے میں نسل در نسل سفر کرنے والی وحشت اس کے بالوں بھرے جسم میں سرسراتی تھی اور اسے ہوش سے بیگانہ کرتی تھی۔ برسوں پہلے ساون کی پہلی بارش میں معصوم اٹکھیلیاں کرتے ہوئے اس ''یادگار دن'' کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

کیا واقعی کہیں نام و نشان نہ تھا؟

تین دن بعد داجے فضل، صالح کے بابا کو لے کر سرخاب منزل واپس آ گئے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جونہی داجے فضل کو طوائف زادی کی موجودگی کا پتا چلا، وہ آگ بگولا ہو گئے مگر صالح کے نکتۂ نظر سے ایک بات اس سے بھی زیادہ تشویشناک تھی۔ اپنی سلامت ٹانگ کی ایک چھوٹی سی سرجری کے بعد بابا شاہنواز کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی نظر آئی۔ وہ نہ صرف ہوش میں تھے بلکہ نقاہت آمیز انداز میں تھوڑی بہت بات بھی کر رہے تھے۔

جونہی ان کی طبیعت کچھ بہتر ہوتی تھی، وہ سرخاب منزل کے معاملات پر گہری نظر ڈالنا شروع کر دیتے تھے۔ اس مرتبہ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اپنے کمرے کی ایک کھڑکی میں سے ان کی نظر نازو پر پڑ گئی جو اچھل اچھل کر سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ وہ سخت غصے میں نظر آئے۔ انہوں نے فوراً ہیڈ خادمہ صادقہ کو بلایا اور اس سے نازو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے ٹال مٹول کی کوشش کی تو شاہنواز رائے پھٹ پڑے۔ صادقہ ان کا غیظ و غضب نہ سہہ سکی۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں بتا دیا کہ یہ لڑکی چھوٹے سرکار کی وجہ سے حویلی میں موجود ہے۔

حویلی کے بدلے ہوئے حالات دیکھ کر جو انگارے مہینوں سے مخدوم شاہنواز رائے کے سینے میں دہک رہے تھے، وہ ایکا ایکی شعلوں کا روپ دھار گئے۔ انہوں نے فوراً صالح کی آیا ماماں بی اور ماسی کنیز کو بھی بلا لیا۔ جب تک داجے فضل پہنچے، شاہنواز رائے ملازماؤں سے تفتیش مکمل کر چکے تھے۔

حسبِ اندیشہ تھوڑی ہی دیر بعد صالح کو والد کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ فرطِ غضب سے ہونٹ کانپ رہے

تھے۔ داجے فضل ایک جانب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ''یقین نہیں آرہا کہ تم میرے بیٹے ہو..... یقین نہیں آرہا۔''

صالح نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ ہاتھ اٹھا کر گرجے۔ ''شام سے پہلے پہلے اس ناپاک لڑکی کو حویلی سے نکالو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''لیکن بابا جانی.....!''

''مت کہو اپنی گندی زبان سے مجھے بابا..... تمہارے پاس صرف اور صرف بارہ گھنٹے کی مہلت ہے۔'' انہوں نے دال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کھانسی کا دورہ پڑا۔ ایک دو منٹ بعد کچھ سنبھلے تو پھنسی پھنسی آواز میں دوبارہ دہاڑے۔

''میں مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں ابھی اور اندھا بھی نہیں ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں جو حرکتیں تم اس حویلی میں پھیلا رہے ہو۔ باز نہیں آؤ گے تو کوڑی کوڑی کو محتاج کردوں گا۔ اس جائداد کا ایک ایک انچ کسی ادارے کو دے دوں گا۔ آخرت سنوار لوں گا۔'' فرطِ طیش سے ان کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

صالح آج تک اپنے باپ کے سامنے بولا نہیں تھا۔ کوشش کر رہا تھا کہ آج بھی نہ بولے مگر وہ اس کی خاموشی کو بھی انکار ہی سمجھ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔ ''مرادے..... مرادے..... اندر آؤ۔''

چند سیکنڈ بعد لمبا تڑنگا مراد اندر آگیا۔ اس کے بال لمبے اور کانوں میں مُرکیاں تھیں۔ وہ بابا شاہنواز کا ذاتی گارڈ تھا۔ اس نے فارغ ہوجانے والے جالے نوری کی جگہ لی تھی۔ صالح دیکھ رہا تھا کہ حد درجہ نقاہت کے باوجود بابا کا رنگ مرغی مائل ہونے لگا ہے۔ انہوں نے انگلیوں میں گردش کرتی ہوئی چھوٹی تسبیح ایک طرف رکھی اور مرادے کو مخاطب کرکے فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ''اپنے ساتھیوں کو بلاؤ۔ ابھی اسی وقت اس حرامزادی کو بالوں سے گھسیٹ کر حویلی سے باہر پھینکو۔ اسی وقت، ابھی۔''

مسلح مراد نے سر جھکایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''رک جاؤ۔'' داجے فضل نے مداخلت کی۔

''میں کہہ رہا ہوں جاؤ۔'' شاہنواز دہاڑے۔

داجے فضل نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہنواز! تم نے شام تک کی مہلت دی ہے نا۔ شام سے پہلے ہی رفع ہوجائے گی وہ۔''

''میں ایک منٹ..... ایک منٹ اسے یہاں برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ گھر ہے میرا، کنجر خانہ نہیں ہے..... عیاشی کا اڈہ نہیں ہے۔''

انہوں نے پھر مراد کو ہدایت پر عمل کرنے کا کہا۔

صالح نے کہا۔ ''بابا جانی! آپ.....''

''بکواس بند کر۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے ساتھ ہی اپنا داہاں ہاتھ پنجے لٹکا کر اپنی اکلوتی جوتی اٹھائی اور صالح پر کھینچ ماری۔ جوتی اس کی ٹھوڑی پر لگ کر گردن سے ٹکرائی۔ صالح کے اندر ایک لہری اچھلی البتہ وہ بولا اب بھی کچھ نہیں۔ خود کو سنبھالتا ہوا گھوما اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ ناز واب یہیں رہے گی۔

..... شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو داجے فضل کا فون پھر آگیا۔ ''صالح! تمہارا باپ بہت غصے میں ہے۔ وہ تمہیں اور وقت نہیں دے گا۔ بات کو مت بڑھاؤ۔''

''نہیں بڑھا رہا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''بلکہ بات ختم کردی ہے۔ اب وہ یہیں رہے گی۔ میں اسے یہاں رکھنے کا حق دار ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''داجے! میں نے نازو سے باقاعدہ نکاح کرلیا ہے۔ اب وہ میری جائز بیوی ہے۔ میرے ساتھ رہ سکتی ہے۔''

''کک..... کیا بول رہے ہو تم..... کب ہوا ہے نکاح؟''

''ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے..... اور ہوا میں بات نہیں کررہا۔ نکاح نامے کی نقل اخترے کے ہاتھ مردانے میں بھجوادی ہے۔ آپ اسے دیکھ لیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔

حویلی میں ایک گمبھیر بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی جیسی تھی۔

..... ثریا ایک گھنٹے بعد لرزتی کانپتی آیا ماماں بی صالح کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے صالح کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، اس کا ہر دکھ سکھ دیکھا تھا۔ اس نے صالح کا ماتھا چوما پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''صالح! تیرے باپ نے تجھے بلایا ہے۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے ان کے غصے کا۔ اس وقت ان کے سامنے بولو گے تو بڑا نقصان ہوجائے گا۔ بس چپ ہی رہنا۔'' پھر آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''دیکھنا..... جب آندھیاں آتی ہیں تو درخت بھی جھک جاتے ہیں۔ ٹوٹنے سے بچ جاتے ہیں۔''

''ماماں بی! اب کسی کو مجھ پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اب کوئی گناہ نہیں ہے۔ دو بول پڑھوائے ہیں اس سے۔''

''جو بھی ہے۔ بس کہہ رہی ہوں نا۔ ابھی ان کے سامنے

کچھ نہ بولنا۔" ماماں بی نے پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

اتنے میں اختر ابھی آ گیا۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "صالح سرکار! بڑے سرکار آپ کو بلا رہے ہیں۔"

صالح، بابا کے کمرے میں پہنچا تو وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ دائے فضل بھی قریبی صوفے پر موجود تھے اور بالکل گم صم تھے۔

"جی بابا!" صالح نے جھکے سر کے ساتھ پوچھا۔

"یہ کیا ہے..... یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟" بابا شاہنواز کے لہجے میں شعلے لپک رہے تھے۔

"بابا! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے باقاعدہ نکاح کیا ہے اس سے۔ بڑے امام خدا بخش صاحب نے خود پڑھایا ہے نکاح....."

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ اپنے پھیپھڑوں میں موجود ساری طاقت صرف کر کے بولے۔ "تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ ہمارے سروں میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں نکاح..... اس طرح ہوتے ہیں؟"

زندگی میں شاید پہلی بار صالح نے سر اٹھا کر اپنے بابا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک دیرینہ چنگاری تھی جو بھک سے شعلہ بن گئی۔ وہ باغی لہجے میں بولا۔ "بالکل بابا..... ایسے بھی ہوتے ہیں نکاح..... لوگ کرتے ہیں..... کرتے ہیں لوگ پھر بعد میں ختم بھی کر دیتے ہیں۔"

یکا یک مخدوم شاہنواز رائے کے چہرے پر ہلدی کا رنگ پھیل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صالح کی طرف دیکھتے چلے گئے۔ جسم سکتہ زدہ تھا۔ وہ بات کی گہرائی تک پہنچ چکے تھے۔ اس گہرائی نے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گہری زردی کی جگہ ایک سانولی سی سرخی نے لے لی۔ ان کے بستر پر جیسے کانٹے نکل آئے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے پھر زور سے چلائے۔ "مرادے..... مرادے!"

مرادا انگوٹھی کے جن کی طرح حاضر ہوا۔ "جی سرکار!" اس نے ناف پر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"وکیل اکبر شیخ کو بلاؤ۔ فوراً..... اسی وقت، ابھی..... اور تھانیدار آغا کو بھی۔"

مرادے نے سوالیہ نظروں سے دائے فضل کریم کی طرف دیکھا۔

شاہنواز رائے پھر چنگھاڑے۔ "الو کے پٹھے! اس کی طرف کیا دیکھ رہا ہے۔ میری طرف دیکھ۔ بلا ان دونوں کو اسی وقت..... میں عاق کر رہا ہوں اس کو..... یہ کچھ نہیں لگتا میرا..... کچھ نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ جیسے نیچے اترتے ہی صالح پر تھپڑوں کی بارش کرنا چاہتے ہوں۔ دائے نے انہیں بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"چھوڑ دے مجھے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دے۔ تُو نے بھی اس کی بربادیوں میں حصہ ڈالا ہے۔ کیوں آیا تھا تُو یہاں؟ کیوں چمٹا ہوا ہے اس گھر سے؟" انہوں نے فرطِ غضب میں فضل کریم کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن پھر یکا یک وہ ایک طرف جھکتے چلے گئے۔ ان کا سرخی مائل رنگ لمحوں میں پھر زردی مائل ہو گیا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ گر رہے تھے۔

صالح لپک کر باہر گیا۔ ڈاکٹر کھوکھر کے لیے حویلی میں کمرا مخصوص تھا۔ وہ کمرے میں تھے۔ اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ "انکل کھوکھر..... باہر آؤ، جلدی کرو۔"

ڈاکٹر کھوکھر اور صالح جب واپس پہنچے، صالح کے بابا مکمل طور پر بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان پر فالج کا ایک اور شدید حملہ ہوا تھا۔ شاید اسی دوران میں ان کے کپڑے بھی خراب ہو گئے تھے۔ کمرے میں مخصوص بدبو تھی۔

☆☆☆

... گرمیاں اپنے جوبن پر آ رہی تھیں۔ کھیتوں کھلیانوں میں لو چلنا شروع ہو گئی تھی، گندم کٹ چکی تھی۔ نئی بوائی کی تیاری تھی۔ وکی اور اس کی فیملی بدستور مشکلات کا شکار تھی۔ وکی بیرونِ ملک مفرور تھا۔ کم از کم کہا تو یہی جا رہا تھا۔

شاہنواز رائے پر فالج کا دوسرا اٹیک ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ مسلسل لاہور کے اسپتال میں تھے۔ ڈاکٹروں نے اب ان کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا تاہم کسی نہ کسی طرح وہ جیے جا رہے تھے۔ صالح آٹھ دس روز لاہور میں ان کے پاس رہنے کے بعد واپس سرخاب منزل آ گیا تھا۔ یوں تو لاہور میں بھی اس کے لیے عیاشی کا سامان فراہم ہو سکتا تھا۔ بازارِ حسن کی ایک دو تتلیوں سے رابطہ ہو گیا تھا تاہم آج کل اسے لگ رہا تھا کہ وہ سرخاب منزل سے اور اپنے کمرے سے دور رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کمرے میں ناز داس کی تنہائیوں کو چمکاتی تھی۔ ہر روز سرِ شام ہی اسے اپنے جسم میں وسیع خلا محسوس ہونے لگتا تھا۔ جسم کے اس خلا کو ایک نازک اندام کا جسم ہی بھر سکتا تھا اور وہ شاندار زلفوں والی ناز کا جسم ہی تھا۔

وہ صبح دیر تک بیڈ روم میں رہتا اور رات کو بہت جلد بیڈ روم میں بند ہو جاتا۔ اس کے باوجود کسی وقت اسے تشنگی سی محسوس ہوتی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ ایک صحت مند، سرگرم مرد کے لیے کیا ایک عورت کافی ہے؟ اسے اپنے

کچھ نہ بولنا۔" ماماں بی نے پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

اتنے میں اختر ابھی آ گیا۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "صالح سرکار! بڑے سرکار آپ کو بلا رہے ہیں۔"

صالح، بابا کے کمرے میں پہنچا تو وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ داجے فضل بھی قریبی صوفے پر موجود تھے اور بالکل گم صم تھے۔

"جی بابا!" صالح نے جھکے سر کے ساتھ پوچھا۔

"یہ کیا ہے..... یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟" بابا شاہنواز کے لہجے میں شعلے لپک رہے تھے۔

"بابا! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے باقاعدہ نکاح کیا ہے اس سے۔ بڑے امام خدا بخش صاحب نے خود پڑھایا ہے نکاح....."

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ اپنے پھیپھڑوں میں موجود ساری طاقت صرف کر کے بولے۔ "تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ ہمارے سروں میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں نکاح..... اس طرح ہوتے ہیں؟"

زندگی میں شاید پہلی بار صالح نے سر اٹھا کر اپنے بابا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک دیرینہ چنگاری تھی جو بھک سے شعلہ بن گئی۔ وہ باغی لہجے میں بولا۔ "بالکل بابا..... ایسے بھی ہوتے ہیں نکاح..... لوگ کرتے ہیں..... کرتے ہیں لوگ پھر بعد میں ختم بھی کر دیتے ہیں۔"

یکا یک مخدوم شاہنواز رائے کے چہرے پر ہلدی کا رنگ پھیل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صالح کی طرف دیکھتے چلے گئے۔ جسم سکتہ زدہ تھا۔ وہ بات کی گہرائی تک پہنچ چکے تھے۔ اس گہرائی نے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گہری زردی کی جگہ ایک سانولی سی سرخی نے لے لی۔ ان کے بستر پر جیسے کانٹے نکل آئے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے پھر زور سے چلائے۔ "مرادے..... مرادے!"

مرادا انگوٹھی کے جن کی طرح حاضر ہوا۔ "جی سرکار!" اس نے ناف پر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"وکیل اکبر شیخ کو بلاؤ۔ فوراً..... اسی وقت، ابھی..... اور تھانیدار آغا کو بھی۔"

مرادے نے سوالیہ نظروں سے داجے فضل کریم کی طرف دیکھا۔

شاہنواز رائے پھر چنگھاڑے۔ "الو کے پٹھے! اس کی طرف کیا دیکھ رہا ہے۔ میری طرف دیکھ۔ بلا ان دونوں کو اسی وقت..... میں عاق کر رہا ہوں اس کو..... یہ کچھ نہیں لگتا میرا..... کچھ نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ جیسے نیچے اترتے ہی صالح پر تھپڑوں کی بارش کرنا چاہتے ہوں۔ داجے نے انہیں بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"چھوڑ دے مجھے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دے۔ تُو نے بھی اس کی بربادیوں میں حصہ ڈالا ہے۔ کیوں آیا تھا تُو یہاں؟ کیوں چمٹا ہوا ہے اس گھر سے؟" انہوں نے فرطِ غضب میں فضل کریم کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن پھر یکا یک وہ ایک طرف جھکتے چلے گئے۔ ان کا سرخی مائل رنگ لمحوں میں پھر زردی مائل ہو گیا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ گر رہے تھے۔

صالح لپک کر باہر گیا۔ ڈاکٹر کھوکھر کے لیے حویلی میں کمرا مخصوص تھا۔ وہ کمرے میں تھے۔ اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ "انکل کھوکھر..... باہر آؤ، جلدی کرو۔"

ڈاکٹر کھوکھر اور صالح جب واپس پہنچے، صالح کے بابا مکمل طور پر بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان پر فالج کا ایک اور شدید حملہ ہوا تھا۔ شاید اسی دوران میں ان کے کپڑے بھی خراب ہو گئے تھے۔ کمرے میں مخصوص بدبو تھی۔

☆☆☆

...گرمیاں اپنے جوبن پر آ رہی تھیں۔ کھیتوں کھلیانوں میں لو چلنا شروع ہو گئی تھی، گندم کٹ چکی تھی۔ نئی بوائی کی تیاری تھی۔ دکی اور اس کی فیملی بدستور مشکلات کا شکار تھی۔ دکی بیرونِ ملک مفرور تھا۔ کم از کم کہا تو یہی جا رہا تھا۔

شاہنواز رائے پر فالج کا دوسرا اٹیک ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ مسلسل لاہور کے اسپتال میں تھے۔ ڈاکٹروں نے اب ان کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا تاہم کسی نہ کسی طرح وہ جیے جا رہے تھے۔ صالح آٹھ دس روز لاہور میں ان کے پاس رہنے کے بعد واپس سرخاب منزل آ گیا تھا۔ یوں تو لاہور میں بھی اس کے لیے عیاشی کا سامان فراہم ہو سکتا تھا۔ بازارِ حسن کی ایک دو تتلیوں سے رابطہ ہو گیا تھا تاہم آج کل اسے لگ رہا تھا کہ وہ سرخاب منزل سے اور اپنے کمرے سے دور رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کمرے میں نازو اس کی تنہائیوں کو چمکاتی تھی۔ ہر روز سرِ شام ہی اسے اپنے جسم میں وسیع خلا محسوس ہونے لگتا تھا۔ جسم کے اس خلا کو ایک نازک اندام کا جسم ہی بھر سکتا تھا اور وہ شاندار زلفوں والی نازو کا جسم ہی تھا۔

وہ صبح دیر تک بیڈ روم میں رہتا اور رات کو بہت جلد بیڈ روم میں بند ہو جاتا۔ اس کے باوجود کسی وقت اسے تشنگی سی محسوس ہوتی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ ایک صحت مند، سرگرم مرد کے لیے کیا ایک عورت کافی ہے؟ اسے اپنے

بڑوں کی روایات یاد آتیں۔ وہ سب کے سب کثیر الازدواج تھے۔ اسے اپنے بڑے تایا کے بارے میں ایک دلچسپ بات یاد تھی۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی ازدواجی سرگرمی سے گھبرا کر ان کی چہیتی بیوی نے انہیں خوراک میں کچھ ایسی چیز دینا شروع کردی تھی جو ان کے مزاج کو معتدل رکھے۔ بعد ازاں یہ راز کھل گیا۔ نوبت طلاق تک پہنچنے لگی تو چہیتی بیوی نے ہتھیار ڈال دیے اور بڑے تایا کو ایک مزید شادی بلکہ شادیاں کرنے کی اجازت دے دی۔

سخت گرمی کے بعد آندھی کے ساتھ ہلکی بارش ہوئی تھی۔ موسم کچھ بہتر تھا۔ اس شب نازو کو بخار تھا۔ اس نے اپنے طویل بالوں کو لپیٹ لپاٹ کر جوڑے کی شکل میں کس کر باندھا ہوا تھا۔ دونوں بیڈروم میں تھے۔ وہ اپنی بیزاری کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے بولی۔ ''کیا آج چھٹی نہیں مل سکتی؟''

''کیوں ایسی بات کرکے ذبح کردیتی ہو۔'' وہ اس کے بالوں کی گھٹا میں چہرہ چھپاتے ہوئے بولا۔ ''کل کا دن اور ہے پھر مجھے دوبارہ لاہور جانا پڑے گا۔''

وہ حسب معمول اس میں اور الکحل میں گم ہوتا چلا گیا۔ دھیرے دھیرے سرکنے والی رات سرپٹ بھاگتی رہی۔

اگلے روز نازو کا بخار 104 کو چھونے لگا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ڈاکٹر کھوکھر حویلی کا مستقل مکین تھا ورنہ لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ سہ پہر تک وہ بہ مشکل نازو کو سنبھال سکا۔

داجے فضل سرخاب منزل کے ہر کونے کھدرے کی صورت حال سے باخبر رہتے تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ نازو کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ شام کو جب وہ سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں دعا مانگ کر واپس آئے تو صالح برآمدے میں بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔ اس نے انہیں دیکھ لیا اور پاس ہی بلالیا۔ داجے فضل نے اپنے لیے دودھ پتی منگوائی۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔

داجے فضل آج پھر اسے سمجھانے والے موڈ میں تھے۔ ''دیکھو صالح! میانہ روی اور اعتدال سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں اور مجھے لگتا ہے کہ تم ہر معاملے میں اعتدال سے دور ہوتے جارہے ہو۔''

وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''آپ میری خوش خوراکی کی بات کرتے ہیں تو میں کھانا پینا کم کردیتا ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔''

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ''آپ کو بھی پتا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکے گا۔ میں جانتا ہوں آپ بابا کو بھی روکتے رہے ہیں لیکن کیا ان سے یہ سب کچھ ہوسکا؟''

''تو..... اس کا حال بھی تو تم اب دیکھ رہے ہو نا۔'' وہ بڑے کرب سے بولے۔ کچھ دیر تک ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دکھ زدہ بیٹھے رہے پھر کہنے لگے۔ ''مجھے لگتا ہے صالح کہ تم ایک دلدل میں دھنستے جارہے ہو۔''

''اور مجھے اس دلدل میں گرانے والا کون ہے؟ آپ لوگ ہی تو ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے اور سب سے بڑھ کر بابا نے مجھ سے میرا ''پیار'' چھینا اور مجھے اس گندے گڑھے میں گرادیا جس کو آپ جیسے لوگ جنس کا گڑھا کہتے ہیں۔ اب میں گر چکا ہوں، باہر نہیں آسکتا۔'' اس نے بے خیالی میں گلاب کے ایک پھول کو بے طرح مسل کر کیاری میں پھینک دیا۔

''صالح! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ تمہارا احساس ہی مرتا جارہا ہے۔ دیکھو اس طوائف زادی کی وجہ سے کیا گزری تمہارے بیمار باپ پر..... اور وہ اب بھی اسی چھت کے نیچے موجود ہے۔''

''تو ٹھیک ہے داجے!'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''آپ کہتے ہیں تو ایک دو ہفتوں میں اسے نکال دیتا ہوں یہاں سے۔ طلاق دے دیتا ہوں۔''

''کچھ شرم کرو صالح! اپنے بڑوں کو کتنی ڈھٹائی سے بیوقوف بنا رہے ہو۔ وہ حرامزادی نکلے گی تو اس کی جگہ دوا اور آجائیں گی.....''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، ملازم مراد تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ چہرے پر اضطراب تھا۔ آتے ہی بولا۔ ''فضل صاحب! لاہور سے ڈاکٹر کھوکھر کے ساتھی فہد صاحب کا فون آیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رات سے بڑے سرکار کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہے۔ انہوں نے آپ کو اور چھوٹے سرکار کو بلایا ہے۔''

رات نو بجے کے لگ بھگ صالح اور اس کے داجے فضل لاہور کے ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں شاہنواز رائے کے بستر کے پاس موجود تھے۔ اسپتال سے باہر شاہنواز رائے کے بہت سے مریدین جمع تھے۔ شاہنواز رائے کی بڑی بہن اور صالح کی پھپھو خدیجہ اپنے بھائی کے قریب موجود تھیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرہ غم کی تصویر تھا۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے صالح کو بتایا کہ وہ لوگ ابھی سات کالے بکروں کی قربانی دے کر اور غرباء میں کھانا تقسیم کرکے یہاں پہنچے ہیں۔

اس ایک ڈیڑھ ماہ میں ہی صالح کے بابا شاہنواز

سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے۔ پتا نہیں کہ کس طرح ان کے سانس کی ڈور برقرار تھی۔ انہوں نے اپنی اندر دھنسی ہوئی سفید آنکھوں کو حرکت دی اور صالح کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ان کی منشا سمجھتے ہوئے پھپھو خدیجہ اور دادی نصل سمیت باقی لوگ باہر چلے گئے۔ صالح نے دیکھا اس کے بابا جانی کی آنکھوں سے نمی رس کر ان کے استخوانی رخساروں پر رینگ گئی تھی۔

صالح نے اپنا کان ان کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ ایک نحیف آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ وہی توانا آواز تھی جس کی گرج سے سرخاب منزل کے در و دیوار لرز جاتے تھے۔

"صالح! میری جان..... اس طرح..... نہیں نکلے گی..... مجھے اس سے معافی مانگنے دو۔ میں نے عاصمہ کا دل دکھایا..... اس کا حق مارا..... بلکہ دونوں بہنوں کا....." وہ فقرہ پورا نہ کر سکے۔ سانس الجھ گئی۔

کچھ دیر بعد سنبھلے تو اسی نحیف ٹوٹی ہوئی آواز میں بولے۔ "میں..... عاصمہ سے..... ملنا چاہتا ہوں..... اسے میرے پاس لے آؤ..... ابھی روانہ ہو جاؤ..... ابھی۔"

اس نے ذرا حیرت سے اپنے بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنے استخوانی ہاتھ کو حرکت دے کر اپنے تکیے کے نیچے بمشکل پہنچایا اور ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر صالح کو دیا۔ صالح نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کاغذ پر پھپھو عاصمہ کا ایڈریس درج تھا۔

"ہیون ونڈو آرٹ گیلری، ڈی لاس روڈ، بارنی پیرس....."

یہ ایڈریس بابا جانی کے پاس کیسے آیا..... کس نے دیا..... یہ کب سے ان کے پاس موجود ہے؟ ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا اور نہ ہی بابا جانی اس قابل تھے کہ جواب دے سکیں۔ صالح سکتہ زدہ نظروں سے ایڈریس کو دیکھتا رہا پھر اس نے لرزاں لہجے میں تسلی کے چند بول اپنے بابا کے کانوں تک پہنچائے اور ان کے اکلوتے پاؤں کو چھوتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اور یہ پیرس تھا۔ رنگوں، خوشبوؤں اور دلکش مناظر کا شہر..... اور یہ پیرس کی شام تھی جس کا شہرہ پوری دنیا میں ہے۔ البتہ اس شہر کی خوشنمائی اور مسحور کن کیفیت صالح سے کوسوں دور تھی۔ وہ ایک طویل اور ہیجان خیز سفر کے بعد آج سہ پہر ہی پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ ہیون ونڈو آرٹ گیلری ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اگلے چند منٹوں میں اس کی ملاقات اس ہستی سے ہو سکتی تھی جسے چھ سات سال پہلے اس نے کھویا تھا۔ اسے یاد رکھا تھا لیکن بھول گیا تھا۔ بھول گیا تھا لیکن یاد رکھا تھا۔

یہ زیادہ بڑی عمارت نہیں تھی تاہم بہت صاف ستھری تھی۔ وہ گرے نائٹ کی سیاہ سیڑھیاں چڑھ کر بلند چھت والے ایک آفس میں داخل ہوا۔ ایک کاؤنٹر کے عقب میں درمیانی عمر کی ایک نفیس سی عینک پوش پاکستانی خاتون بیٹھی تھی۔ صالح نے اس سے اپنا مختصر تعارف کرایا اور گیلری کے اونر کے بارے میں پوچھا۔ نوال نامی اس خاتون نے جو جواب دیا، اس نے صالح کی دھڑکنوں کو اور بھی سرپٹ کر دیا۔ وہ بولی۔ "میڈم عاصمہ ماجد ہیں مگر اس وقت وہ آؤٹ آف سٹی ہیں۔ وہ کنٹری سائڈ پر ہیں۔ وہاں انہیں کال بھی نہ ہو سکے گی۔"

"کوئی اور ذمے دار؟"

"ان کی بیٹی آفرین ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آجاتی ہیں۔"

یہ ایسا جواب تھا جسے سننے کے بعد صالح کو یوں لگا کہ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ کتنی ہی دیر کچھ نہ بول سکا۔ اس استقبالیہ کاؤنٹر کی ایک سائڈ پر ٹی وی آن تھا۔ یہ کورونا کے بالکل آغاز کا دور تھا اور ٹی وی پر آنے والی زیادہ تر خبریں اسی حوالے سے تھیں۔ شہر دیں کے اس شہر پیرس میں بھی بہت زیادہ رونق نظر نہیں آتی تھی۔ اکثر لوگ ماسک وغیرہ لگائے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے صالح نے خاتون نوال سے پوچھا۔ "آفرین صاحبہ کے ہسبینڈ بھی یہاں ان کے ساتھ ہی ہوتے ہیں؟"

"کیا؟" وہ عینک کے پیچھے اپنی آنکھیں پھاڑ کر بولی پھر ہنسنے لگی۔

"آ..... آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟"

"بھئی ایک عدد ہسبینڈ کے لیے ایک عدد شادی کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

وہ چکرا سا گیا۔ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکا۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔ "لگتا ہے کہ آپ قریبی رشتے دار ہونے کے باوجود کافی عرصے بعد میم اور مس آفرین سے ملنے آئے ہیں۔"

صالح کا گلا خشک اور کان سائیں سائیں کر رہے

تھے۔ صحیح کیا تھا، غلط کیا..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کیا اس نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھنا شروع کردیا تھا۔ قریباً پانچ برس پہلے آفرین کی شادی ہوچکی تھی۔ پھپھو خدیجہ، داجی فضل اور بابا جانی سب جانتے تھے۔ اس کی تصدیق ''ملاکا'' شہر میں رہنے والے عاطر حسن نے کی تھی اور شادی کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا یا پھر یہاں آفرین اور پھپھو وغیرہ ایک جھوٹ کے ساتھ رہ رہی تھیں؟ گزر جانے والے سات برسوں پر ایک تاریک پردہ پڑا ہوا تھا اور صالح کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کی لاعلمی میں کیا کچھ ہوچکا ہے اور ہورہا ہے۔

''کیا..... واقعی ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی؟'' صالح نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تک تو نہیں ہوئی لیکن ہوجائے تو پتا نہیں۔ ویسے اکثر بڑے آرٹسٹ یہی کہتے ہیں کہ ان کی شادی آرٹ سے ہوچکی ہے۔''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ... وہ خود بھی تصویریں بناتی ہیں؟''

''مسٹر صالح! لگتا ہے آپ تو بالکل ہی بے خبر ثابت ہورہے ہیں۔ جن مس آفرین کو آپ اپنی کزن بتارہے ہیں، وہ ایک معروف پینٹر ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی پیرس میں اور پیرس سے باہر بھی مانگ ہے۔ یہ دیکھیں، یہ میرے عقب میں جو انعام یافتہ پینٹنگ لگی ہے، یہ انہی کی بنائی ہوئی ہے۔''

صالح نے غور سے دیکھا۔ یہ ایک لینڈ اسکیپ تھا۔ تیز ہوا میں چند درخت رکوع کے سے انداز میں جھکے ہوئے تھے۔ تصویر کے رنگ نگاہ کو اپنے اندر جذب کرتے تھے۔

وہ تصویر پر نگاہ مرکوز کیے ہوئے تھا جب ہلکا سا شور سنائی دیا۔ اس نے رخ پھیر کر دیکھا... وہ آرہی تھی..... ہاں وہی جو برسوں پہلے گلابی جاڑے کی ایک عید سے چند دن پہلے اپنی آخری جھلک دکھا کر اوجھل ہوگئی تھی۔ وہ خوشنما لانگ جیکٹ اور جینز میں ملبوس اپنا موبائل فون کان سے لگائے تیزی سے چلی آرہی تھی۔ اس کے عقب میں تین چار مرد و زن مؤدب انداز میں آرہے تھے۔ اس کا چہرہ ہمیشہ سے دلکش تھا مگر بھرپور شباب نے اس کی دلکشی میں غیر معمولی اضافہ کردیا تھا۔ صالح کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اردگرد بے مثال کشش کا ایک روشن ہالہ سا ہے جو اس کے ساتھ ہی حرکت کرتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا ہے۔

قریب ہی بیٹھے صالح کو دیکھے بغیر وہ ریسپشنسٹ نوال سے مخاطب ہوئی اور اس سے فون وغیرہ کے بارے میں اپ ڈیٹس لیں۔ تب تیزی سے واپس جانے کے لیے مڑی اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ صالح پر پڑی۔ چند لمحوں کے لیے گردشِ دوراں جیسے تھم گئی تھی۔ صالح بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا تھا اور بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحے تھے مگر ان میں صدیوں جیسی طویل حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ تب اچانک وہ واپس مڑی اور اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی ہوئی ایک کوریڈور میں اوجھل ہوگئی۔ اردگرد موجود تمام افراد نے ان لمحات کی ڈرامائی کیفیت کو محسوس کیا تھا مگر خاموش تھے۔

دو تین منٹ کے توقف کے بعد صالح بھی اس کے پیچھے کوریڈور میں چلا گیا۔ نوال سے اسے معلوم ہوچکا تھا کہ مس آفرین کس روم میں گئی ہوگی۔ صالح کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ منہ خشک ہوچکا تھا۔ اس نے دروازے پر ناک کی۔ دو بار، تین بار پھر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔ وہ قالین پوش فرش پر سامنے ہی قدآدم لیمپ کے پاس کھڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ صالح اندر داخل ہوا۔ ڈور کلوزر نے دروازہ بند کردیا۔ صالح کی اپنی آنکھوں کے کنارے بھی جلنے لگے تھے۔ یکایک وہ تیزی سے آگے بڑھی اور صالح سے لپٹ گئی۔ اس کی سموری جیکٹ کی گرمی نے اسے ڈھانپ لیا۔ دونوں دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر رہے پھر آفرین کی بھیگی ہوئی آواز صالح کے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم کیسے آگئے یہاں؟ مجھے یقین نہیں آرہا..... بالکل نہیں آرہا۔'' پھر وہ صالح سے جدا ہوئی اور سر کو تھوڑا سا پیچھے ہٹا کر غور سے صالح کو دیکھنے لگی جیسے اپنی نگاہوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کررہی ہو کہ اس کے سامنے وہی برسوں پہلے والا صالح ہی ہے جو اب اسے بھول چکا تھا..... جواب کسی اور کا ہوچکا تھا۔

پیرس کی وہ اداس شام کسی اور ہی رنگ میں ڈھل چکی تھی۔ اسی کمرے میں ڈنر کرنے کے بعد آفرین اور صالح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بار بار کسی اندرونی جذبے کے تحت آفرین کی حسین آنکھوں میں نمی چمک جاتی تھی۔ صالح نے ابھی تک آفرین کو بس اتنا بتایا تھا کہ اتنے برسوں بعد اس کا ایڈریس صرف چار دن پہلے اسے اپنے بابا جانی سے ملا ہے۔ صالح نے ابھی آفرین کو بابا کی ناگفتہ بہ حالت کے بارے میں بھی تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ وہ بہت بیمار ہیں اور اپنی بہن سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھپھو عاصمہ کے بارے میں صالح کو آفرین سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ مقامی لوگوں کے ایک گروپ کے ساتھ کیمپنگ کے لیے پیرس

کے مضافات میں "پروونس" نامی علاقے میں گئی ہوئی ہیں۔ انہیں کل شام تک لوٹنا تھا۔

یکا یک صالح نے آفرین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دلگیر لہجے میں کہا۔ "یہ نہ پوچھوگی کہ میں نے ایک دم تمہیں خط لکھنے کیوں بند کردیے؟ کیوں اتنا بڑا دھوکا دیا تمہیں؟"

"جو بیت گیا، سو بیت گیا۔ اب دہرانے سے کیا حاصل۔ اس سے تکلیف ہی ہوگی۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے ہی تو میں نے اور گی نے سب ناتے توڑے تھے۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں آفری کہ تم پوچھو.....!"

"تمہاری زندگی کیسی جارہی ہے۔ تمہاری شادی تو ہوچکی ہوگی؟" آفرین نے پوچھا۔

"وہ بھی سب بتاؤں گا۔ پہلے..... مجھ سے پوچھو آفری..... کہ میں نے تمہیں خط لکھنے کیوں بند کردیے؟"

اس نے پلکیں جھکا کر اپنے بے پناہ کرب کو چھپایا اور پوچھا۔ "کیوں بند کردیے؟"

"اس لیے آفری..... کہ مجھے وہ تمہارے درجنوں خط ملے ہی نہیں جو تم نے لکھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ملا۔"

وہ بے پناہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے بعد صالح نے جو کچھ اسے بتایا، اس نے اسے حیرت اور دکھ کے سمندر میں ڈبو دیا۔ اس بے مہر بارشی رات کی ساری کتھا صالح نے کہہ ڈالی جو اس نے برسوں پہلے وکی کے گھر گزاری تھی اور اس کی الماری کے چور خانے سے اپنی بدنصیبی کے ثبوت نکالے تھے۔ صالح نے ان گمشدہ خطوط کے عکس بھی آفرین کو دکھائے جو اس نے اپنے موبائل میں محفوظ کرلیے تھے۔ یہ دوست نما دشمن کی دلدوز کتھا تھی۔

..... اور پھر ان دونوں پر ایک دوسرا انکشاف ہوا جو پہلے انکشاف سے بھی زیادہ تہلکہ خیز و کربناک تھا۔ خاص طور سے آفرین کے لیے۔ جب صالح نے آفرین کو اپنے موبائل کی اسکرین پر "آستین کے سانپ" وقار وکی کی تصویر دکھائی تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس پر عقدہ کھلا کہ یہ وقار وکی ہی تھا جو مصباح عزیز بن کر اسے پاکستان سے خطوط لکھتا تھا اور محبت کا اظہار کرتا تھا۔

جب آفرین اس کی تصویر دیکھ کر چونکی تو صالح اس سے زیادہ چونکا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا وہ شک بھی شاید درست تھا جو برسوں سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ بولا۔ "آفرین! کیا تم اسے صورت سے بھی پہچانتی ہو؟"

وہ ایک دم گم صم ہوگئی۔ اس کے دل و دماغ کے نازک ریشوں کو جیسے ایک بڑا پتھر کچلتا ہوا چلا جارہا تھا۔ ایک لمبے توقف کے بعد وہ جیسے کراہ کر کہنے لگی۔ "صالح! شاید تمہارے علم میں نہیں کہ تمہارا یہ دوست جسے دوست کہنا بھی نہیں چاہیے، میرے پیچھے وہاں کوالالمپور بھی پہنچا تھا۔ اس نے..... بھی مجھے شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ وہ تمہارا دوست ہے۔ جیسا کہ تمہیں اس کے لکھے ہوئے خط سے بھی معلوم ہوچکا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک ایک جھوٹ تھا۔ اس نے مجھے یہی باور کرا رکھا تھا کہ اس نے مجھے پہلی بار سرگودھا ائرپورٹ پر دیکھا اور وہیں پر اسے میرا نام اور ایڈریس وغیرہ معلوم ہوا۔" وہ ایک دم چپ ہوگئی پھر روہانسی سی ہوکر بولی۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں صالح کہ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ چکا تھا۔ اس کی نیت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اس سے خط کتابت ختم کردی تھی۔ میں اس وقت ہکا بکا رہ گئی تھی جب دو تین ماہ بعد وہ میرے پیچھے کوالالمپور جا پہنچا۔ جب کوالالمپور کی ایک سڑک پر وہ سرِراہ مجھے ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مصباح عزیز ہے تو میں پتھرا کر رہ گئی تھی۔"

کھڑکی سے باہر پیرس کی یخ بستہ رات تھی۔ روشنیاں چمکتی تھیں اور ٹریفک کا ہلکا سا شور تھا۔ کمرے کی خوشگوار حرارت میں آفرین اور صالح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایل ای ڈی کی روشنی میں آفرین کے رخساروں کا "سرخی مائل سنگِ مرمر" دمک رہا تھا۔ اس کے بال جو پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوچکے تھے، اس کے شانوں تک بکھر رہے تھے۔ وہ آج ایک نامور آرٹسٹ تھی، اس کے سامنے بیٹھی تھی اور ایک انکشاف انگیز رات نے انہیں اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

صالح نے اچانک دلفگار لہجے میں پوچھا۔ "آفری.....! اور تمہاری شادی؟"

وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی۔ "تم سے کس نے کہا تھا میری شادی ہوئی؟"

"پھپھو خدیجہ اور داجے فضل وغیرہ نے بتایا تھا۔"

اس نے صالح کی طرف دیکھے بغیر نفی میں سر ہلایا۔ "انہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ شادی ہونے والی تھی لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ میں اذلان کے ساتھ یہ رشتہ نہ نبھا سکوں گی۔ اذلان میرے منگیتر کا نام تھا۔"

"آفری! میں نے تمہاری شادی کی تصویر دیکھی تھی۔"

"جو شادی ہوئی ہی نہیں، تم نے اس کی تصویر کیسے دیکھ لی؟" وہ پیشانی پر ہلکا سا بل ڈال کر بولی۔

صالح نے ذرا توقف کے بعد اپنے موبائل میں موجود آفرین اور اذلان نامی اس لڑکے کی تصویر آفرین کو دکھائی۔

''کہیں یہ تصویر بھی تو تمہارے ''سچے دوست'' نے ہی تم تک نہیں پہنچائی تھی؟''

صالح اشتیاقی انداز میں خاموش رہا۔

''صالح! یہ میری شادی کی نہیں، منگنی کی تصویر ہے..... منگنی جو ٹوٹ گئی تھی۔''

صالح نے ایک بار پھر سوچا... کیا وہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہے؟ یہ کیسی حقیقتیں تھیں جو اس کے سامنے آ رہی تھیں۔

وہ کراہ کر بولا۔ ''اور وکی کا کیا ہوا آفرین..... وہ کوالالمپور میں کتنے عرصے رہا؟''

''وہ ایک بار نہیں، دو بار میرے پاس پہنچا۔ ایک بار کوالالمپور میں، دوسری بار فلپائن کے شہر دیگان میں۔ جب میں، ممی جان اور ڈیڈی وہاں ''دیگان'' نامی شہر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ وہ کسی طرح میرا پیچھا چھوڑنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت ہوشیار تھا صالح..... اس نے مجھے کبھی شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ وہ تمہارا دوست ہے۔''

''..... اور اسی نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے تم سے خط و کتابت اس لیے بند کر دی ہے کہ میں کسی اور لڑکی میں ''الو الو'' ہو چکا ہوں؟''

''ہاں، یہی کہنا تھا اس کا۔'' آفرین نے نم پلکیں جھکا لیں۔

''اور تم نے یقین کر لیا؟''

''میں تھک گئی تھی..... ہار گئی تھی تمہارے جواب کا انتظار کرتے کرتے..... اور تم نے بھی تو یقین کر لیا نا کہ میں نے سب کچھ ختم کر دیا ہے۔''

''اس موذی نے ہم دونوں کو لوٹا اور بری طرح لوٹا آفری! افسوس یہ ہے کہ میں نے بھی تب اس کو جانا جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میری معلومات کے مطابق تمہاری شادی ہو چکی تھی اور پھپھو سمیت تمہاری فیملی کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔''

''ممی، ماموں جان سے بہت زیادہ ناراض تھیں۔ وہ ماضی سے اپنا ہر ناتا توڑ لینا چاہتی تھیں اور مجھے بھی یہی بہتر لگتا تھا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ میں اس زمانے میں اس بہروپیے سے بھی کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔'' آفرین کا اشارہ وکی کی طرف تھا۔

وکی کے بارے میں جو مزید تفصیل آفرین نے افسردہ لہجے میں بتائی، اس سے پتا چلا کہ وکی واقعی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ چکا تھا۔ وہ اس سے عشق کا دعویدار بنا تھا۔ ملائیشیا پہنچ کر اس نے اپنے دوست کے دوست عاطر حسن کو

مقابلہ

الیکٹرک شیور فروخت کرنے والے دو دکانداروں میں قیمتیں کم کرنے کے لیے مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ قیمتیں کم ہوتے ہوتے ایک دن نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دکاندار نے قیمتِ خرید ہی پر الیکٹرک شیور فروخت کرنے کا بورڈ لگا دیا۔ اس طرح وہ ایک الیکٹرک شیور فقط 15 ڈالرز ہی میں فروخت کرنے لگا۔

اگلے دن اس نے دیکھا کہ دوسری دکان پر بورڈ لگا ہوا ہے۔

''15 ڈالر والے الیکٹرک شیور ہم سے ٹھیک کروائیے۔''

(مرسلہ: عاصم منیر، سرگودھا)

طفلیات

''امی! کیا ہم لوگ بندروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟''

''پتا نہیں۔ میں آج تک اپنے سسرال والوں سے نہیں ملی۔''

☆☆☆

''تم تاریخ میں بہت کمزور ہو۔'' استاد نے بچے سے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم پہ فقرہ بیس مرتبہ لکھو کہ ہمایوں کے باپ کا نام بابر تھا لیکن تم نے فقط دس مرتبہ لکھا ہے۔''

''سر! میں گنتی میں بھی کمزور ہوں۔'' بچے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

☆☆☆

''تم اپنا منہ کیوں نہیں دھوتے؟'' ٹیچر نے بچے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری شکل دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ تم نے ناشتے میں کیا کھایا تھا۔''

''اچھا، تو بتایئے آج میں نے کیا کھایا تھا؟'' بچہ بولا۔

''انڈا۔'' ٹیچر نے جواب دیا۔

''غلط۔'' بچہ بولا۔ ''انڈا تو میں نے کل کھایا تھا۔''

(مرسلہ: عاصم منیر، سرگودھا)

اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور ایک روز سرِراہ آفرین کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ پاکستان سے کچھ تحائف بھی آفرین کے لیے لے کر گیا تھا جنہیں آفرین نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اسے ایک بھائی اور اچھے دوست کی حیثیت سے دیکھتی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ وہی دن تھے جب وہاں آفرین کی منگنی ہونے والی تھی۔ وکی اپنے مقامی دوست سمیت کوالالمپور کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور مسلسل اس سے ملنے پر اصرار کر رہا تھا۔ آخر ایک روز وہ ہوٹل میں ہی اس سے ملی تھی اور صاف لفظوں میں اسے بتایا تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے، وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ واپس تو چلا گیا تھا مگر آفرین کو خدشہ تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی ختم نہیں ہوگا..... اور پھر یہی ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد جب آفرین کے انکار کے بعد اذلان کے ساتھ اس کا رشتہ ختم ہو گیا اور وہ اپنے ممی پاپا کے ساتھ فلپائن کے شہر دیگان میں شفٹ ہو گئی تو ایک روز وہ وہاں بھی آ دھمکا۔ درحقیقت اس نے اپنے مقامی دوست عاطر کو مسلسل اس کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔

اس مرتبہ وکی نے خود کو مکمل طور پر مجنوں ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی شیو بڑھا رکھی تھی اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ آفرین کے پاپا تو ان دنوں ان کے ساتھ نہیں تھے، وہ انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ اس نے آفرین کی ممی سے بھی رابطہ کر لیا اور انہیں بتایا کہ وہ صرف آفرین کے لیے دو بار پاکستان سے یہاں آ چکا ہے اور اس کو اپنانا چاہتا ہے۔ آفرین کی ممی کیسے مان سکتی تھیں۔ ویسے بھی وہ پاکستان سے اور ماضی سے ہر ناتا توڑ لینا چاہتی تھیں۔ ایک روز وہ پلٹا کر دوبارہ آفرین کے گھر میں گھس آیا۔ پہلے عاجزی دکھاتا رہا پھر آگ بگولا ہو گیا۔ ٹانگ مار کر ایک آئینہ توڑ دیا پھر اسی کے ٹکڑے کو گلے پر پھیرنے کی کوشش کی اور کچھ زخمی بھی ہوا۔ ایک دو روز بعد جب بات اسے پولیس تک پہنچتی محسوس ہوئی تو غائب ہو گیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ پاکستان لوٹ گیا ہے۔

صالح نے آفرین کی یہ ساری روداد عجب کرب کے عالم میں سنی۔ وکی کی دو چہروں والی شبیہہ بار بار اس کی نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ گلے پر شیشے کا ٹکڑا پھیرنے والی بات پر صالح کو وکی کے گلے پر کٹ کا وہ پرانا نشان بھی یاد آیا جس کے بارے میں اس نے وضاحت کی تھی کہ وہ کیمیکل ڈور کے سبب آیا ہے۔

آفرین کی آواز نے اسے خیالات سے چونکایا۔

"اب میرے سوال کا جواب بھی دے دو۔"

صالح دلگیر لہجے میں بولا۔ "آفری! کافی عرصہ پہلے بابا جانی اور داجی نے مجھے زبردستی شادی کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کی تھی اور میں بندھ بھی گیا تھا مگر یہ شادی تین چار ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی۔ حقیقت یہ ہے آفری کہ....." اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ ذرا توقف کر کے دوبارہ گویا ہوا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تمہارے بعد میں وہ صالح رہا ہی نہیں جو کبھی تھا۔ میں کسی کے ساتھ نباہ کیسے کر سکتا تھا۔ میں تو خود اپنے ساتھ نباہ نہیں کر پاتا۔" اس نے سر جھکا لیا اور قالین کے گل بوٹوں کی طرف بے وجہ دیکھتا چلا گیا۔ کھڑکیوں سے باہر سردی بڑھ چکی تھی اور پیرس دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں جا رہا تھا۔

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں آفرین کے موبائل پر کال آ گئی۔ آفرین کے گال دہک گئے۔ "ہیلو ممی! کہاں تھیں آپ؟ مسلسل ہی نہیں پہنچ رہے تھے۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جس کے بعد آفرین بولی۔ "چلیں ٹھیک ہے۔ شام سے پہلے پہنچ جایئے گا۔ یہاں آپ کے لیے ایک سرپرائز بھی ہے..... نہیں نہیں..... ایسے نہیں بتاؤں گی۔ بس آپ آ جائیں۔"

اس نے فون بند کر دیا اور صالح کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ جب یوں دیکھتی تھی تو صالح کے اندر ایک عجیب سنسناہٹ دوڑ جاتی تھی۔ کچھ بھولے بسرے سپنے نگاہوں کے سامنے ستاروں کی طرح جگمگا جاتے تھے ..... پھر ایک دم بابا کی ناگفتہ بہ حالت صالح کے تصور میں آ گئی۔ اس نے آفرین سے پوچھا۔ "وہ کل شام سے پہلے پہنچ جائیں گی نا؟"

"امید تو یہی ہے کہ آفٹر نون تک پہنچ جائیں۔" آفرین نے کہا۔

آفرین اسے اپنی خوش رنگ اسمارٹی کار پر اپنے گھر لے گئی جو گیلری سے زیادہ دور نہیں تھا۔ آفرین اسے بتا چکی تھی کہ پاپا کام کے سلسلے میں بھائی فرحان کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ فرحان آج کل ساؤتھ افریقا میں مقیم تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ آفرین کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر نہایت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ دو تین جگہ آفرین کی اپنی بنائی ہوئی شاندار پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔ یہ لینڈ اسکیپ ہی تھے اور زیادہ تر پاکستانی مناظر دکھیت کھلیان ہی دکھاتے تھے یا کچھ مناظر ملائیشیا کے ہوں گے۔

اس نیم گرم آرام دہ کمرے میں صالح دیر تک جاگتا رہا اور حالات کی اس کروٹ پر حیرانی سے غور کرتا رہا۔ اس

کے سینے کی گہرائی میں کہیں بے نام آس کے شگوفے سے کھلنے لگے تھے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی آفرین نے اسے جگا دیا۔ وہ سفید پتلون اور گرے جرسی میں تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ چمکدار دن کی روپہلی کرنوں میں وہ اتنی دلکش نظر آئی کہ صالح بہ مشکل اس سے نظر ہٹا پایا۔ وہ صالح کو اردگرد کے علاقے میں گھمانا چاہتی تھی۔ خاص طور پر قریب ہی واقع شانزے لیزے روڈ پر لے جانا چاہتی تھی لیکن پھر پتا چلا کہ کورونا کے پھیلاؤ کے سبب لاک ڈاؤن کا سین بن رہا ہے۔ پروگرام ملتوی ہوگیا۔

شام سے پہلے ہی صالح کی پھپھو عاصمہ گھر واپس پہنچ گئیں۔ شروع میں وہ صالح کو پہچان ہی نہ سکیں۔ وہ بھی پہچان نہ سکا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہوچکی تھیں۔ بال بھی اب زیادہ لمبے نہیں تھے اور سامنے سے سفید ہوگئے تھے۔ انہوں نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر اسکارف تھا۔

صالح کو پہچان لینے کے بعد وہ کتنی ہی دیر سکتہ زدہ سی رہیں پھر اسے گلے سے لگایا اور ہچکیوں سے رونے لگیں۔ صالح بھی آبدیدہ ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد جب وہ کچھ سنبھل گئیں تو وہ گھر کی نشست گاہ میں آن بیٹھے۔ آفرین کی طرح وہ بھی حیران ہوئی تھیں کہ صالح کو ان کی آرٹ گیلری کا کھوج کیسے ملا۔

صالح نے کہا۔ ''پھپھو! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، سال ڈیڑھ سال پہلے بابا جانی کے کسی کاروباری دوست نے یہاں آرٹ گیلری میں آفری کو دیکھا اور پہچانا۔ بعد میں اس نے بابا کو اطلاع کردیا۔''

''.....اور انہوں نے تمہیں سال ڈیڑھ سال تک بتانا ضروری ہی نہ سمجھا۔'' پھپھو نے عجب دل گرفتگی کے ساتھ کہا۔

اب صالح نے ضروری جانا کہ وہ پھپھو اور آفرین کو بابا کی اصل صورتِ حال سے آگاہ کردے۔ انہیں بتادے کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں اور کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔

.....بہن پھر بہن ہی ہوتی ہے۔ جب صالح کی پھپھو کو بھائی کی اصل حالت کا پتا چلا تو ان کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ انہوں نے کلیجا تھاما اور جسم میں لرزش نمودار ہوگئی۔

''پھپھو! آپ سمجھیں کہ وہ جان کنی کی حالت میں ہیں۔ آخری بار آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' صالح کے لہجے میں التجا تھی۔

صالح کی پھپھو نے رونا شروع کردیا۔ دیر تک آنسو بہاتی رہیں پھر صالح سے بولیں۔ ''تم ابھی پاکستان ویڈیو کال کرو۔ میں بھائی جان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

پھر وہ آفرین سے مخاطب ہوکر بولیں۔ ''آفرین! تم میرے ٹکٹ کا انتظام کرو..... بلکہ اپنا ٹکٹ بھی لو۔ تم بھی چلو۔''

صالح نے کہا۔ ''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یہ سب ہوجائے گا اور میں بابا سے آپ کی بات کرانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔''

اس نے موبائل پر پاکستان رابطہ کیا۔ یہ ویڈیو کال تھی تاہم اسے ڈاکٹر کھوکھر نے بتایا کہ فی الحال وہ غشی کی سی کیفیت میں ہیں۔ دو چار گھنٹے میں شاید کچھ سنبھل جائیں پھر بات کرسکیں گے۔

آفرین کا چہرہ بھی اب غم کی تصویر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے ایک دو جگہ فون کیا۔ پتا چلا کہ وہ فکٹ کے بارے میں بات کررہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے مایوسی کے عالم میں بتایا کہ لاک ڈاؤن ہوگیا ہے اور پروازیں فی الحال منسوخ ہیں۔

☆☆☆

جس رکاوٹ کو صالح اور آفرین وغیرہ عارضی سمجھ رہے تھے، وہ کافی سخت اور مستقل ثابت ہوئی۔ تین چار دن گزرنے کے باوجود بھی پروازیں بحال ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔

پھر ایک دن ویڈیو لنک پر بابا جانی سے پھپھو عاصمہ کی بات بھی ہوگئی۔ وہ ہوش کے وقفے میں تھے۔ اپنی روٹھی ہوئی بہن کے ساتھ ان کی گفتگو کافی طویل اور سسکیوں، آنسوؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔ بابا جانی کی حالت دیکھ کر صالح کا اپنا دل بھی رونے لگا تھا۔ ان کی جان جیسے ہڈیوں کے ایک شکستہ پنجر میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ سرپٹخ رہی تھی مگر ٹھہر پا رہی تھی نہ نکل پا رہی تھی۔ اسپتال کے اس کمرے میں ایک مائیک لیپ ٹاپ سے اٹیچ کرکے ان کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا گیا تھا تاکہ ان کی نہایت کمزور آواز سنی جاسکے۔ وہ بار بار اپنی بہن سے معافی مانگ رہے تھے پھر انہوں نے اپنے استخوانی ہاتھ کو حرکت دے کر کچھ کاغذات کی جھلک بہن کو دکھائی اور بولے۔

''عاصمہ! پتا نہیں کہ توبہ کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے۔ میں نے کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پراپرٹی میں تم دونوں بہنوں کا جو حصہ بنتا تھا، یہ اس سے کچھ زیادہ ہی

ہے۔تم میرے لیے بس بہتری کی دعا کرو۔"

پھپھو عاصمہ نے بلک کر کہا۔"آپ بھی مجھے معاف کردیں بھائی..... مجھے بس آپ کی صحت چاہیے۔ میں ایک بار پھر آپ کو ویسا ہی تندرست دیکھنا چاہتی ہوں جیسا چھوڑ کر آئی تھی۔"

"بس تم نے کہہ دیا نا..... اب سب اچھا ہوجائے گا۔" ان کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔

اور پھر واقعی سب کچھ اچھا ہوگیا۔ اگلے روز پھپھو اور آفرین کے اصرار پر جب صالح نے پاکستان میں آڈیو کال کی تو دوسری طرف سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آئیں۔ صالح کے بابا جانی صرف پندرہ بیس منٹ پہلے اپنی تکلیف دہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکے تھے۔

☆☆☆

صالح کے بابا جانی کو سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں ابدی نیند سوئے تین ہفتے ہوچکے تھے۔ صالح کو دکھ تھا کہ وہ پاکستان جاکر باپ کے جنازے کو کندھا نہ دے سکا۔ پھپھو عاصمہ اور آفرین بھی پاکستان نہ جاسکنے کی وجہ سے افسردہ تھیں۔ بس ان تینوں کو اس بات پر کچھ تسلی تھی کہ آنکھیں بند ہونے سے ایک دن پہلے انہوں نے تفصیل سے بات کرلی، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا اور شاید زندگی کا بوجھ بھی۔

مہلک وبا نے دیگر خطوں کی طرح یورپ کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ کہیں مکمل اور کہیں جزوی لاک ڈاؤن لگادیے گئے تھے۔ فضائی، زمینی اور آبی راستے بند تھے۔ جو جہاں تھا، وہیں پھنس کر رہ گیا تھا۔ آفرین اور پھپھو عاصمہ، صالح کی دلی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں۔ آفرین اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ کسی وقت وہ اصرار کرکے اسے باہر بھی لے جاتی تھی۔ پیرس کی صبحوں اور شاموں میں وہ پہلے جیسی رعنائی تو نہیں تھی پھر بھی اکتائے ہوئے لوگ حفاظتی تدابیر کے ساتھ گھروں سے نکلنا شروع ہوگئے تھے۔ خدشات کے مہیب سایوں کے باوجود نارمل زندگی اپنے راستے ڈھونڈنے کی کوشش کررہی تھی۔ وبا کے زیادہ اثرات بڑی عمر کے لوگوں پر تھے لہٰذا آفرین نے اپنی امی پر باہر نکلنے کے حوالے سے مکمل پابندی عائد کردی تھی۔

تفریح گاہوں میں صالح کے ساتھ گھومتے پھرتے آفرین کسی وقت ایک دم گم صم سی ہوجاتی تھی جیسے صالح سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ بھی نہ پارہی ہو۔ کسی وقت صالح بے خیالی میں ایک دم آفرین کا دلکش چہرہ دیکھنا شروع کردیتا جیسے کھوج لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ وہ پرانی محبت اب بھی اس کے دل کے نہاں خانوں میں موجود ہے یا پھر موسم بدل چکے ہیں۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پارہا تھا۔

ایک روز جب وہ مشہور زمانہ ایفل ٹاور کے نزدیک سبزہ زاروں میں گھوم رہے تھے، نوجوان مقامی لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی نے آفرین کو گھیرلیا۔ انہوں نے آفرین کو بطور مصور پہچان لیا تھا۔ انہوں نے آفرین کے ساتھ تصویریں بنوائیں اور آٹوگراف وغیرہ لیے۔ دو دن پہلے بھی شانزے لیزے روڈ پر اسی طرح ایک دو فینز نے آفرین کو پہچانا تھا۔ بطور آرٹسٹ آفرین کی یہ کامیابی صالح کے لیے متاثر کن تھی۔

ایک روز وہ گھوم پھر کر گھر کی خوشگوار حرارت میں پہنچے تو کچن کی طرف باربی کیو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مقامی لوگوں کی پسندیدہ ڈش ٹرکی روسٹ ہورہی تھی۔ ایک نوجوان کے علاوہ دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ یہ تینوں پاکستانی ہی تھے۔ نوجوان کا نام ایاز شیرازی معلوم ہوا۔ وہ بھی ایک پینٹر تھا۔ یہاں پاکستانی "ٹرک آرٹ" کو فروغ دے رہا تھا۔ اس آرٹ کے حوالے سے ایک تربیتی ادارہ بھی چلا رہا تھا۔ اچھی شکل وصورت کا خوش مزاج شخص تھا۔ ایک لڑکی اس کی بہن تھی دوسری کزن۔ یہ لوگ بھی پیرس کے اسی علاقے میں رہتے تھے۔ دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا اور بے تکلفی موجود تھی۔

سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ پہلے کورونا کے پھیلاؤ کی باتیں ہوتی رہیں پھر آرٹ کا موضوع شروع ہوگیا۔ یہ موضوع صالح کے لیے زیادہ دلچسپ نہیں تھا لہٰذا وہ خاموش ہی بیٹھا رہا۔

ایک دو بار صالح کی گفتگو اپنے پھوپی زاد فرحان سے بھی ہوچکی تھی۔ طویل عرصے بعد ایک دوسرے کی آواز سن کر دونوں کو ہی اچھا لگا تھا۔ اگلے روز اس نے پھر ساؤتھ افریقا کے شہر کیپ ٹاؤن سے ویڈیو لنک پر صالح سے بات کی۔ باتوں کے دوران فرحان نے کہا۔"صالح! تمہیں ایاز بھائی کیسے لگے؟"

"اچھے ہیں یار! ہینڈسم ہیں اور خوش باش بھی۔ پاکستانی ٹرک آرٹ میں کافی کامیاب جارہے ہیں۔"

"ان کے بارے میں تمہیں کچھ اور بھی بتایا ہے کسی نے... یا آفرین نے؟"

"نہیں تو۔" صالح ذرا چونکا۔

"یار! شادی ہورہی ہے ان کی آفرین سے..... کافی عرصے سے بات چل رہی تھی۔ خیر، اب تو سب کچھ طے

ہو چکا ہے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں فنکشن تھا مگر اب اس کورونا کی وجہ سے مختصر تقریب ہی کرنا پڑے گی۔''

وہ سکتہ زدہ رہ گیا۔ دوسری طرف سے ''ہیلو ہیلو'' کی آواز آتی رہی۔ آخر خود کو بہ مشکل سنبھال کر بولا۔ ''نن ... نہیں۔ مجھے تو نہیں بتایا کسی نے۔''

وہ ہنسا۔ ''آفرین تو شاید شرما رہی ہوگی۔ ویسے مجھے لگتا نہیں کہ تم اتنی جلدی پاکستان لوٹ سکو گے۔ ہوسکتا ہے کہ تم بھی آفرین کی شادی دیکھ لو۔''

کچھ دیر فرحان سے گفتگو تو ہوتی رہی مگر صالح ٹھیک سے کچھ بول پایا نہ سن سکا۔ کال ختم ہونے کے بعد اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ آس امید کا جو محل پچھلے چند روز میں کھڑا ہوا تھا اور صالح کے تصور میں جگمگایا تھا، دھڑام سے نیچے آگرا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے اپنے ہوش وحواس میں سنا ہے۔ نہ ہی یہ یقین آیا کہ قدرت اتنی نامہربان بھی ہوسکتی ہے۔ اتنے عرصے بعد ان دونوں کو ملایا گیا تھا اور پھر ایک لامتناہی فاصلے پر کھڑا کردیا گیا تھا۔

مگر جوں جوں وہ سوچتا گیا، اسے یقین ہوتا گیا کہ یہ حقیقت ہے اور حقائق ایسے ہی تلخ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے بچھڑنے اور دوبارہ ملنے میں کوئی چند ہفتوں یا مہینوں کا وقفہ نہیں تھا۔ یہ برسوں کا فاصلہ تھا۔ دونوں طرف سے سب کچھ ختم کیا جاچکا تھا اور زندگی تو اپنی ڈگر پر چلتی ہی رہتی ہے۔ رواں پانی کی طرح اپنے بہاؤ کے راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔ بالآخر آفرین کی زندگی نے بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ فرحان کی گفتگو سے صالح کو یہی اندازہ ہوا تھا کہ آفرین کی زندگی کو نئے راستے پر ڈالنے کے لیے اس کے اہلِ خانہ نے بھی کوشش کی اور آخر کار وہ اس راستے پر چل پڑی تھی۔ ایاز اور آفرین میں پہلے انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوئی پھر دوستی بڑھی اور بات شادی تک پہنچ گئی۔ اب وہ دونوں اس نئے سفر کے لیے تیار تھے۔

صالح سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ کیسے انکشاف انگیز شب و روز تھے۔ اس پر اوپر تلے کئی عقدے کھلے تھے۔ چند ہی روز پہلے معلوم ہوا تھا کہ وہ حقیقت، افسانہ تھی کہ پانچ برس پہلے آفرین کی شادی ہوچکی ہے اور اب یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ رہی ہے۔ صالح کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کمرے میں چکرانے لگا۔ نہیں، نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں آفرین کو دوسری بار نہیں بچھڑنے دوں گا۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ وہی میری زندگی کو مکمل بربادی سے بچا سکتی ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ میں آج بھی اس سے محبت کرتا ہوں اور یقیناً وہ بھی اس انمول جذبے کو بھولی نہیں ہوگی۔ اسے کہوں گا کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے۔ بعد میں صرف سمجھوتے ہوتے ہیں ... صرف سمجھوتے۔

وہ رات کو دیر تک جاگا تھا اس لیے اگلے روز دس گیارہ بجے تک سویا۔ اٹھ کر اس نے کھڑکی کے پردے وا کیے۔ ایک ٹھٹھری ہوئی سی دھوپ مختصر لان کو روشن کررہی تھی۔ اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جو جاگتے ساتھ ہی اس کو کچھ اور مجروح کرگیا۔ ایاز شاید ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا اور آفرین سے ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کی کتاب نما شے تھی۔ کچھ دیر بعد صالح کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک البم تھا جس میں جیولری وغیرہ کی تصویریں تھیں۔

آفرین دھیان سے دیکھنے لگی۔ وہ کسی کسی تصویر پر انگلی بھی رکھتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دلکش چہرے پر شرم کا ہلکا سا رنگ لہرا جاتا پھر ایاز نے کوئی بات کہی اور بلند آواز میں ہنسا۔ آفرین نے بھی اس ہنسی میں تھوڑا بہت اس کا ساتھ دیا۔

صالح کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ سب شادی کی تیاری کے سلسلے میں ہورہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کا دل چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے۔ اگر پاکستان واپس نہیں جاسکتا تو پیرس میں ہی کہیں گم ہوجائے۔ وہ دیر تک بہت سنجیدگی سے اس بارے میں سوچتا رہا مگر پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ وہ کم از کم ایک بار تو اس بارے میں آفرین سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ حیرت بھی ہورہی تھی کہ آفرین نے ابھی تک اسے اس نئی صورتِ حال کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ شاید وہ بھی تذبذب کے کسی دوراہے پر کھڑی تھی۔ یقیناً برسوں بعد صالح نے اچانک نمودار ہوکر اس کی زندگی کو اتھل پتھل کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں صالح کو یقین سا ہونے لگا کہ اب وہ آسانی سے اس اتھل پتھل کو نظر انداز نہیں کرپائے گی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ صالح نے دروازہ کھولا۔ سامنے آفرین کھڑی تھی۔ اسے ذرا ڈانٹ کر بولی۔ ''کل بھی اتنی دیر سوئے پڑے رہے۔ ناشتا مس کررہے ہو۔ اب دیکھو یہاں کے رواج کے مطابق لنچ کا ٹائم ہونے والا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، لنچ ہی سہی۔''

''یعنی برنچ ... تو چلو پھر جلدی سے فریش ہوجاؤ۔

ایاز بھی آئے ہوئے ہیں۔ تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہورہے ہیں۔ بہت تعریف کررہے تھے تمہاری۔'' آفرین نے آخری جملہ پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔

ایاز کے ساتھ صالح کی نشست بہت اچھی رہی۔ صالح کو پتا چلا کہ ایاز کافی پڑھا لکھا بھی ہے۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی تاہم اچھی صحت کے سبب اپنی عمر سے چار پانچ برس چھوٹا نظر آتا تھا۔ سات آٹھ برس پہلے اس کی شادی ایک فرنچ لڑکی سے ہی ہوئی تھی لیکن دونوں میں نبھ نہ سکی اور خوش اسلوبی سے ہی طلاق ہوگئی۔ اب پچھلے قریباً چھ سات برس سے وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں ایاز کی نگاہ جب بھی قریب بیٹھی آفرین پر پڑتی تھی، اس کی آنکھوں میں آفرین کے لیے رنگ سے بھر جاتے تھے۔

☆☆☆

آفرین اور اس کی ممی عاصمہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ باہر پھر ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی۔ ابھی شام ہوئی تھی مگر تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔ آفرین کا موبائل فون بار بار کال کے سگنل دے رہا تھا۔ آخر اس نے کال ریسیو کرلی۔ دوسری طرف ایک مقامی ٹی وی چینل کا نمائندہ تھا۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی مقبول آرٹسٹ کی حیثیت سے آفرین کا انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ آفرین عجیب سے موڈ میں تھی۔ اس نے مناسب الفاظ میں معذرت کرلی اور فون بند کردیا۔

گھٹنوں پر ٹھوڑی لگا کر اس نے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی اور پھر سوچ میں گم ہوگئی۔ عاصمہ نے بیٹی کے چہرے سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''قدرت کے کام ایسے ہی نرالے ہوتے ہیں۔ دیکھو، وہ آیا بھی تو کس وقت آیا۔ میں اس کی طرف دیکھتی ہوں تو دل کٹنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی بچپن کی یادیں بسی ہوئی ہیں۔ ہر ہر بات اس کے دل و دماغ پر نقش ہے۔ وہ کچھ بھی بھول نہیں پایا۔''

''چلیں اچھا ہی ہوا..... بھائی فرحان نے اسے حالات سے آگاہ کردیا ہے۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''مگر یہ سب کچھ جھیلنا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔'' عاصمہ نے کہا۔

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے ممی؟'' آفرین کی آواز بھرا گئی۔ ''آپ بھی جانتی ہیں کہ سب رابطے ختم ہوچکے تھے۔ رابطوں کے یوں ختم ہوجانے سے جو کچھ میرے دل پر گزرتی رہی ہے، وہ بھی آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے خود کو بہت مشکلوں سے سنبھالا اور جب میں کچھ سنبھل گئی تو آپ اور پاپا ہی تھے جنھوں نے مجھے نئے راستوں پر قدم رکھنے کے لیے مجبور کیا۔''

''تم نے اب تک صالح سے اس بارے میں کوئی بات کی؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب کروں گی۔''

''کیا کہو گی؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں ممی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مجھے لگتا ہے کہ اتنے برسوں بعد صالح سے مل کر میرا ذہن دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک حصے میں کچھ اور چل رہا ہے، دوسرے میں کچھ اور لیکن..... ایک بات تو میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں..... اور شاید آپ بھی سمجھ رہی ہیں۔ اب اس مرحلے میں ایاز جیسے اچھے انسان کو راستے میں چھوڑ دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اب واپسی کیسے ہوسکتی ہے؟''

☆☆☆

آج پھر وہ دونوں دریائے سین کے کنارے کنارے چلتے جارہے تھے۔ سہ پہر کی دھوپ چمکیلی برف سے منعکس ہوکر مرد و زن کے چہروں کو روشن کررہی تھی۔ لاک ڈاؤن میں تھوڑی سی نرمی ہوئی تھی۔ دریا کے کناروں پر قدرے رونق نظر آتی تھی۔ صالح اور آفرین دونوں کی آنکھوں میں غم کے سائے تھے۔

صالح نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''آفری! قصور ہم دونوں میں سے کسی کا نہیں۔ ہمیں بس حالات نے لوٹا ہے لیکن ایک بات پورے یقین کے ساتھ سن لو۔ میں آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں..... میں تمہیں دوبارہ کھونے کے تصور سے ہی کانپ جاتا ہوں آفری!''

''مگر میں کیا کروں صالح.....! دو ماہ بعد ہماری شادی ہے۔ ہم نے..... ہم نے عہد و پیماں کیے ہیں۔ نیوچر کے کچھ تصورات سجائے ہیں اپنی آنکھوں میں۔''

''اور جو تصورات ہم نے سجائے تھے آفری! کیا تم انہیں کبھی بھول سکتی ہو؟ کیا میں بھول سکتا ہوں؟ کیا ہم دونوں آئندہ جھوٹی زندگیاں جیتے رہیں گے؟ بولو نا۔''

''پلیز صالح! جب ہم ایسی باتیں کرتے ہیں تو میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ کیوں تکلیف دیتے ہو مجھے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اچھے دوست بنے رہیں۔ ایک دوسرے کے لیے اچھی خواہشات رکھیں اور.....''

''اس سوال کا جواب تم اپنے دل میں جھانک کر

پوچھو۔'' صالح نے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا ایسا ہو سکے گا؟ کیا شادی کے بندھن میں بندھ کر تم مجھ سے دوستی برقرار رکھ پاؤ گی؟ یہ سب کتابی باتیں ہیں آفری! پلیز..... پلیز! ایسا مت کرو آفری! قدرت نے اگر ہمیں اتنے برسوں بعد اس طرح ملایا ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

وہ ایک دم گم صم سی ہوگئی جیسے اس موضوع پر فی الحال کوئی بات نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں نم اور ناک کی چونچ سرخ نظر آئی۔ وہ بھی خاموش ہوگیا۔ دونوں پیرس کی برفیلی ہوا میں گہرے نیلے آسمان تلے دریا کے کنارے کنارے چلتے رہے مگر گفتگو کی قدم پیچھے وہیں رکی رہی جہاں رکی تھی۔

..... یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ پیرس میں موسم یخ بستہ ہونے کے باوجود قدرے صاف تھا۔ ہلکی دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ دو ڈھائی ماہ بعد موسم بہار میں یہاں کوئی تصویری مقابلہ تھا۔ اس کے لیے لینڈ اسکیپ بنانے کے لیے آفرین اپنے دو ہم کاروں کے ساتھ پیرس کے مضافات میں گئی ہوئی تھی۔ واپسی پر اسے اور ایاز کو کچھ شاپنگ بھی کرنا تھی۔ یہ سب شادی کی تیاری کے حوالے سے تھا۔ صالح کی پھپھو عاصمہ نے بھائی کی موت کا بہت غم کیا تھا اور کئی دن بیمار رہی تھیں۔ اب کچھ بہتر تھیں اور ایک پاکستانی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے قریبی کلینک گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں صالح اکیلا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ جیسے بھی ہو، پاکستان واپس چلا جائے۔ وہ آفرین کے بدل جانے والے رویے کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ اسے پاتے پاتے پھر کھو چکا ہے۔ حالات کی بساط پر وقت نے اسے مات دے دی تھی۔

زینے چڑھ کر وہ بالائی منزل پر چلا گیا۔ یہاں دور ایفل ٹاور کا بالائی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ محویت سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ محبتوں کے اس شہر میں نامہرباں وقت کتنا بڑا زخم دے رہا تھا اسے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام ملازمہ صفائی کے لیے آگئی۔ بالائی منزل پر تین کمرے تھے۔ ملازمہ نے صفائی کرنے کے لیے ایک کمرے کا قفل کھولا تو صالح یونہی کمرا دیکھنے کے لیے اندر چلا گیا۔ یہاں دیواروں پر آفرین کی بنائی ہوئی بہت سی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ سارے لینڈ اسکیپ تھے۔ پاکستانی کھیت کھلیانوں اور باغ باغیچوں کے مناظر۔ کچھ تصویروں کے پس منظر میں سرخاب منزل جیسی کوئی نہ کوئی عمارت بھی دکھائی دیتی تھی۔ ایک چیز ان سب پینٹنگز میں مشترک تھی اور بڑی حیران کن بھی۔ یہ سب بارش کے مناظر تھے۔ صالح نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بات کر کے سیاہ فام ملازمہ کو اس کمرے کی صفائی سے روک دیا اور کہا کہ وہ پہلے دوسرے کمروں کو دیکھ لے۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور عجیب کیفیت میں ان پینٹنگز کو دیکھنے لگا۔ صالح کو اندازہ ہوا کہ یہ پینٹنگز دو تین سال پہلے بنائی گئی ہوں گی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ بارش کے اسی یادگار دن کی عکاسی ہے جو بھی ان دونوں نے بتایا تھا..... اور وہ خوشیوں سے بھرا بے مثال دن ایک انمٹ یاد بن کر ان دونوں کے ذہنوں میں نقش ہوگیا تھا۔ چاہت، بے پایاں مسرت، معصوم مستی، دیوانگی، بے مثل آسودگی، سب کچھ ان رنگوں میں اور بارش میں سمویا گیا تھا۔ ایک دو تصویریں تو بالکل واضح تھیں۔ وہی سرخاب منزل کا باغ تھا جو اب تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ اس باغ میں گہرے سیاہ بادلوں کے نیچے فواروں کے قریب پانی کے موتی تابڑ توڑ برستے تھے اور دو سائے محو رقص تھے۔ یہ دو بچوں کے سائے تھے۔

نیگرو ملازمہ کی آواز نے صالح کو خیالوں سے چونکایا۔ وہ اب اس کمرے میں صفائی کرنا چاہ رہی تھی۔ صالح نے اپنی شکستہ انگلش میں ملازمہ سے پوچھا۔ ''یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''آپ کی میزبان نے۔ وہ بڑی آرٹسٹ ہیں۔ ان کی تصویریں منہ مانگے داموں بکتی ہیں۔''

''اور یہ کیوں نہیں بکیں؟'' صالح نے کہا۔

''یہ وہ بیچتی ہی نہیں ہیں۔ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں۔'' عورت نے مختصر جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

اس دن صالح نے سوچا کہ پیرس چھوڑنے سے پہلے اسے مزید ایک بار آفرین سے بات کرنی چاہیے۔ شاید.....

☆☆☆

کل رات شروع ہونے والی برف باری آج تھم چکی تھی تاہم ایفل ٹاور نے ہلکی سی سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ لاک ڈاؤن میں نرمی تھی۔ ماسک لگائے لوگ اِدھر اُدھر گھومتے نظر آرہے تھے۔ رومانی جوڑوں کی اٹھکیلیاں بھی کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان جوڑوں میں صالح اور آفرین بھی شامل تھے..... مگر وہ رومانس سے بہت دور تھے۔

صالح نے کہا۔ ''آفری! کئی دن سے سوچ رہا ہوں کاش..... کاش تم مجھے دوبارہ ملی ہی نہ ہوتیں۔ میری زندگی

کی سب سے بڑی امید اس طرح بندھ کر تو نہ ٹوٹتی۔"

"وقت پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوتا صالح! بس سمجھ لو کہ اس "وقت" نے ایک اور دکھ دیا جو جھیلنا پڑے گا۔" وہ نگاہیں جھکائے جھکائے بولی۔

چیرس کی یخ بستہ ہوا نے سوری ٹوپی کے نیچے سے آفرین کی لٹیں اس کے چہرے پر بکھیریں۔ اس نے اپنے اپلے ہاتھ فرنچ جیکٹ کی جیبوں میں گھسائے اور پتھریلی سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

"آفری! تمہیں پتا ہے، یہاں سے بہت دور سرخاب منزل کے در و دیوار تمہیں اب بھی یاد کرتے ہیں۔ وہاں کے کھیت کھلیان، پگڈنڈیاں، راستے، درخت، موسم اور وہ سب کچھ جو تم ایک خوشیوں بھری عید سے چند دن پہلے چھوڑ آئی تھیں۔"

وہ خاموشی سے سڑک کے کنارے کو دیکھتی رہی جہاں ایک فرانسیسی گٹار بجا رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں پھر بولا۔ "تمہیں تو وہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ مکھن کا پیڑا، چائی کی لسی، ساگ، مکئی کی روٹی، چاولوں کی پنیاں اور ہاداموں والا گڑ..... پھر لمبی راتیں اور آپا ماماں بی کی لمبی کہانیاں..... کیا تمہیں ان میں سے کچھ بھی یاد نہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں..... صالح.....! اب کچھ بھی یاد نہیں..... اور جو کچھ یاد ہے، وہ میرے دل کے اندر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بس اسے ویسا ہی رہنے دو پلیز!"

"میرا قصور تو بتا دو آفری!" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اور تم میرا قصور بتا دو صالح! میں نے بہت انتظار کیا تھا تمہارا..... تمہارے خطوط کا۔ مدت تک روتی رہی تھی تمہارے جواب کے لیے۔"

"اب تم جان چکی ہو کہ وہ سب کیوں ہوا۔"

"..... تو وہ تمہارا ہی دوست تھا نا..... میرا تو کچھ نہیں لگتا تھا صالح..... دیکھو، تمہارے گھر سے می اور میں کتنے دکھی ہو کر نکلے تھے۔ می کسی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں نے پھر بھی تم سے رابطہ کیا۔ اس رابطے کی سزا یہ ملی کہ تم اس بات کو بھی راز نہ رکھ پائے۔ مجھے آج بھی یاد ہے پاکستان سے ماموں جان نے فون پر می کو کتنا برا بھلا کہا تھا۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ "خیر، اب یہ باتیں پرانی ہو چکیں۔ کوئی فائدہ نہیں دہرانے کا۔"

"پلیز آفری..... پلیز..... میں تمہیں دوبارہ پا کر کھونا نہیں چاہتا۔" وہ سراپا عجز نظر آیا۔

"تم اسے دوبارہ پانا نہ کہو صالح!" آفرین کی پیشانی پر ہلکا سا بل آ گیا۔ "بس سمجھو کہ یہ بد۔ لے ہوئے حالات میں ایک ملاقات تھی ہماری جو ماموں جان کی بیماری کے سبب اتفاقاً ہو گئی۔"

آفرین کی خوبرو پیشانی پر نمودار ہونے والے بل نے صالح کے سینے میں کوئی چیز چھناکے سے توڑ ڈالی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بل کے پیچھے ایک مستحکم ارادہ ہے اور وہ تعلق ہے جو عنقریب ایاز شیرازی سے قائم ہونے جا رہا ہے۔ پیشانی کے اس بل کے پیچھے کھلا انکار، دو ٹوک الفاظ، مکمل بے رخی، بہت کچھ ہو سکتا تھا اور وہ یہ سب کچھ جھیلنا نہیں چاہتا تھا۔

صالح نے سامنے دیکھا۔ دریائے سین کے پہلو میں محبتوں کا علمبردار تقریباً 1080 فٹ بلند ایفل ٹاور برف کی ہلکی سی تہ اوڑھے کھڑا تھا۔ یہاں بچھڑے ہوئے ملتے تھے، ٹوٹے ہوئے دل جڑتے تھے مگر ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا۔ آنے والے اپنا اپنا نصیب لے کر آتے ہیں اور اگر نصیب خراب ہو تو پھر ایفل ٹاور، دریائے سین یا تاج محل، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

دس دن بعد صالح بڑی خاموشی سے پاکستان لوٹ آیا تھا۔ دبا کے باعث فلائٹ کے حصول کے لیے اسے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ پھپھو عاصمہ نے اسے چند روز مزید روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر جس نے کوشش کرنا تھی جب وہی نہیں کر رہی تھی تو پھر رکنے کا فائدہ۔ وہ اپنے آنسو پلکوں کے پیچھے چھپا کر انہیں الوداع کہہ آیا تھا۔

..... کئی روز تک وہ یکسر گم صم رہا۔ سرخاب منزل سے کہیں نکلا بھی نہیں۔ بس دو تین بار سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں بابا اور ماں کی قبر تک گیا جہاں ایک چھوٹی سی قبر اس کی بہن کی بھی تھی۔

ایک دن دادے فضل نے اسے بتایا کہ آج اسے لازماً تاریخ پر جانا ہے۔ یہ وہی "ڈانگی ٹیم" والی لڑکی کا کیس تھا جو اب تک لٹکا چلا آ رہا تھا۔

وہ جب اپنے ملازم خاص اختر اور دادے فضل کریم کے ساتھ عدالت میں پیش ہونے سرگودھا پہنچا تو اسی سڑک سے گزرا جس پر آگے جا کر انکل سیف اور دغا باز وکی کی رہائش گاہ تھی۔ ایک بار پھر اس کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ وکی کے حوالے سے اس کے بدترین اندیشے بھی حقیقت ہی نکلے تھے۔ وہ آفرین سے خط..... کتابت شروع کرنے کے بعد اس کے پیچھے گوالالمپور تک گیا تھا۔ کسی بھی

طرح آفرین کو اپنے شکنجے میں لانے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی..... اور اب ایک قاتل کی حیثیت سے وہ مفرور تھا۔

صالح نے اس بارے میں داجے فضل سے پوچھا تو انہوں نے بالکل غیر متوقع جواب دیا۔ ''شاید تمہیں نہیں معلوم کہ وہ پاکستان واپس آچکا ہے۔ لگتا ہے اس کے باپ نے ٹھیک ٹھاک پیسا لٹایا ہے اس پر..... وکیل بھی چوٹی کا کیا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''وہ صرف چار ہفتے ہی جیل میں رہا ہے۔ اب اس کی ضمانت ہوگئی ہے۔ کیس چلتا رہے گا اور قانونی ہتھکنڈے استعمال ہوتے رہیں گے۔''

صالح کے سینے کی چنگاریاں ایک دم بھڑک کر الاؤ بن گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اختر کے کو فوراً گاڑی کا رخ وکی کے گھر کی طرف موڑنے کو کہے مگر داجے فضل کریم ساتھ تھے اور وہ تاریخ پر جارہا تھا۔

تاریخ بھگت کر وہ واپس سرخاب منزل پہنچ گیا اور رات دیر تک جاگتا رہا۔ اس کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔ اختر کے کی معلومات کے مطابق وکی آج کل سرگودھا میں ہی تھا اور اس کا والد سیف کراچی میں اپنے تباہ شدہ کاروبار کو سنبھالا دینے کی کوششیں کررہا تھا۔

یہ اگلی شب کا ذکر ہے۔ صالح اپنے دستِ راست اختر کے ساتھ سرگودھا میں موجود تھا۔ بند کمرے میں صالح اور وکی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ صالح کا چہرہ تیز اثر وہسکی کے سبب تمتمایا ہوا تھا۔ وکی بھی اپنے گلاس سے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا۔ وکی کے بال ہمیشہ کی طرح اسپائکس کی شکل میں تھے۔ گلے میں سونے کی موٹی چین تھی۔ اس نے بس دو چار فقروں میں ہی صالح کے والد کی رحلت کا افسوس کیا تھا اور اب خاموش تھا۔

صالح نے اس کے گلے میں سونے کی زنجیر کو دیکھا۔ زنجیر سے ذرا اوپر گلے پر کٹ کا پرانا نشان تھا۔ ''تمہیں یہ زخم کیمیکل ڈور کی وجہ سے لگا تھا نا؟'' صالح نے اچانک سوال کیا۔

''کیوں، کوئی شک ہے یارم؟'' وکی نے ذرا چونک کر کہا۔

''شک تو ہے۔'' صالح نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''اور شک تو اور بھی بہت سے ہیں۔ جیسے مجھ بیوقوف کو ایک شک یہ بھی ہے کہ سات برس پہلے کوالالمپور سے آفرین کے خط آتے تو تھے لیکن مجھ تک پہنچ نہیں پاتے تھے..... اور ایک شک یہ بھی ہے کہ کسی ''بدنیت'' نے آفرین کو میری طرف سے بدظن کیا تھا اور کہا تھا کہ میں ایک اور لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوچکا ہوں اور پھر وہی بدنیت دغاباز میری آفرین کو تسلی دینے اور اس کے آنسو پونچھنے کے لیے خاموشی سے کوالالمپور جا پہنچا تھا۔''

وکی کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے صالح کو دیکھنے لگا۔ یقیناً یہ بات اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح صالح کی ملاقات آفرین یا اس کی والدہ وغیرہ سے ہوچکی ہے۔

''میں..... کچھ سمجھ نہیں پارہا یارم!'' وکی کی آواز میں لرزش تھی۔

''مت کہو مجھے یار..... اور یارم!'' صالح زور سے دہاڑا اور وہسکی کا گلاس وکی پر دے مارا۔ وہ اس کی ٹھوڑی سے ٹکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور چکنا چور ہوگیا۔ صالح نے اس کا گریبان دبوچ لیا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

''تم نے برباد کردیا مجھے۔ تم دوستی کے نام پر بدنما داغ ہو۔ لعنت ہے تم پر اور تمہارے پیدا کرنے والوں پر۔''

وکی اب سنبھل چکا تھا۔ انگلی اٹھا کر خطرناک لہجے میں بولا۔ ''زبان سنبھال کر بات کرو۔ میرے گھر میں ہو ورنہ ابھی تمہاری دو چار ہڈیاں تڑوا کر باہر پھنکوا دیتا۔''

''تو بلاؤ ہڈیاں توڑنے والوں کو..... بلاؤ اپنے..... بدمعاشوں کو۔''

''میں کہتا ہوں، میرا گریبان چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''جو جو بُرا تم نے کرنا ہے، آج کرگزرو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ اپنی کمینگی میں تم کہاں تک جاتے ہو۔''

''میں کمینہ ہوں تو تم بھی کمینگی اور حرامزدگی میں کچھ کم نہیں ہو۔'' وہ ایک جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے گرجا۔ ''تم سے بھی جو کچھ ہوسکا، تم نے کیا ہے میرے ساتھ۔ اب بھگت چکا ہوں میں۔ تم نے ہی اس کمینی نازو کی وجہ سے مجھے شاہد بابڑا کے ساتھ لڑایا۔ اب اسی کمینی کو اپنے گھر میں ڈالا ہوا ہے تم نے..... اور..... اور اگر میں قاتل بنا تو اس میں بھی تمہارا ہاتھ ہے۔ ڈھیر دیندے میں جب شاہد سے میری لڑائی ہوئی تو تم جان بوجھ کر موقع پر نہ پہنچے اور اس وقت پہنچے جب بندہ میرے ہاتھوں مارا جاچکا تھا۔ اب اسی شاہد بابڑا سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں تمہاری۔ کچھ چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے..... کچھ چھپا ہوا نہیں۔'' اس نے

ہاتھ ہوا میں نچایا۔

صالح نے ایک بار پھر جھپٹ کر اس کا گریبان دبوچ لیا اور گھما کر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ شور سن کر صورتِ حال کی نزاکت جانتے ہوئے وکی کا ایک مسلح گارڈ اندر گھس آیا۔ وکی کا گریبان بدستور صالح کی گرفت میں تھا۔ تنومند گارڈ نے زور لگا کر اپنے مالک کو چھڑایا اور دھکا دے کر صالح کو صوفے پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ریوالور گن صالح کی طرف سیدھی کرلی۔ انداز دھمکانے والا ہی تھا۔ جواباً مشتعل صالح نے بھی تاخیر نہیں کی اور واسکٹ کی اندرونی جیب سے نائن ایم ایم پسٹل نکال کر تان لیا۔

''چلاؤ گولی... چلاؤ گولی۔'' صالح غضب ناک ہوکر چلایا۔

اسی دوران میں قریبی کمرے میں بیٹھا اختر بھی دروازے کو ٹھوکر مارتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اندر کی پوزیشن دیکھتے ہی اس نے بھی ماؤزر نکال لیا۔ چند سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ گولی چل جائے گی ..... پھر سوسائٹی کے سیکیورٹی گارڈز کی گاڑی کا بلند ''ہوٹر'' سنائی دینے لگا۔ غالباً گھر کے کسی ملازم نے اندر کی دھماکا خیز صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے سیکیورٹی کو بلا لیا تھا۔

اختر نے بھی چونکہ ماؤزر تانا ہوا تھا لہٰذا صالح نے اپنا پستول پھر جیکٹ میں رکھ لیا۔ وکی کی طرف انگلی اٹھا کر، آتشیں لہجے میں بولا۔ ''یہ بات یہیں ختم نہیں ہوگی وکی .....! یاد رکھنا، میں تم سے اپنی بربادی کا بدلہ ضرور لوں گا۔''

''ضرور، ضرور۔ مجھے بھی دو چار حساب چکانے ہیں تم سے۔'' وکی پھنکارا۔

صالح، اختر کو لیتا ہوا تیزی سے باہر آگیا۔ اس کے اشارے پر اختر نے اپنا ماؤزر جیب میں چھپا لیا تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر ہاؤسنگ سوسائٹی کی سیکیورٹی کار موجود تھی۔ گارڈز نے ان دونوں سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر صالح نے انہیں ایک طرف دھکیل دیا اور اختر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نکل آیا۔

ابھی وہ سڑک کے موڑ تک نہیں پہنچے تھے کہ صالح کو ایک شخص موٹر بائیک پر وکی کی رہائش گاہ کی طرف جاتا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر صالح تھوڑا سا چونکا۔ سردی کے سبب اس شخص نے اپنا منہ سر ڈھانپنے میں لپیٹ رکھا تھا تاہم اس کے ڈیل ڈول اور اس کی کالی موٹر بائیک کو دیکھ کر صالح کو شک ہوا کہ وہ جالا نور کی ہے۔ وہی جالا جو سرخاب منزل میں مخبر کے فرائض انجام دیتا رہا تھا اور بعد ازاں صالح نے اسے جوتے رسید کر کے ڈیرے سے نکالا تھا۔ یہ شخص چند دنوں سے بابڑوں کے پاس رہا تھا پھر وہاں سے بھی اوجھل ہوگیا تھا۔ اب وہ یہاں وکی اور اس کے والد سیف کی رہائش گاہ کی طرف جاتا نظر آیا تھا۔

''گاڑی روکو اختر بے!'' صالح نے کہا۔

اختر نے حکم کی تعمیل کی۔ صالح عقب نما آئینے میں دیکھتا رہا۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ بائیک سوار وکی کے گھر میں گھسا ہے۔ آثار سے پتا چل رہا تھا کہ پوشیدہ دشمن وقار وکی اب کھلے دشمن کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

وکی کے حوالے سے صالح کے اندر جتنا غم و غصہ پیدا ہوا تھا، اس نے پیرس والے صدمے کو دوچند کر دیا تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ اگلی دو تین راتوں تک اس آگ کا رخ مکمل طور پر دراز زلف نازو کی طرف ہی رہا۔ مرد و زن کا خوبصورت تعلق اب صالح کے لیے مکمل طور پر دشمنی اور وحشت کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ شراب خانہ خراب اس وحشت کو اور بڑھاوا دیتی تھی۔ جب اس کے جنون کا چڑھا ہوا دریا اترتا تھا تو نازو کی نگاہوں میں بھی اسے دیگر عورتوں کی طرح ربی دبی نفرت اور حقارت ہی نظر آتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک اسے یہ منظر دیکھ کر کچھ خفت ہوتی تھی مگر اب یہ خفت بھی ختم ہو چکی تھی۔

ایک روز شام کو جب وہ نوشی شروع کرنے ہی والا تھا، داجے نے اسے اپنے پاس بلایا۔ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''صالح! شاہنواز دنیا سے چلا گیا۔ اس کا دور ختم ہوا، اب تمہارا دور شروع ہو رہا ہے۔ تم یہاں سیاہ سفید کے مالک ہو اور اس کے ساتھ ساتھ تم پر بہت سی ذمے داریاں بھی آرہی ہیں۔ اب تمہیں اپنا آپ بدلنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے داجے!'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اب مجھے بدلنا چاہیے۔ میں کل سے ہی کوشش شروع کرتا ہوں۔'' داجے اسے یہ نصیحت کر کے چند دن کے لیے اپنے بیمار بھائی کے پاس چلے گئے۔

اور واقعی اگلے دن سے اس نے سرخاب منزل میں تبدیلیوں کا عمل شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے وہ لنگر ختم کیا جو تیس چالیس برس سے یہاں جاری تھا اور بے شمار ضرورت مند مستفیض ہوتے تھے۔ آنے والے پانچ چھ روز میں اس نے سرخاب منزل کے وہ سارے ملازم چن

چن کر نکال دیے جو بابا شاہنواز کے قریب سمجھے جاتے تھے اور صالح کی شبانہ روز مصروفیات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آیا ماما نی کو بھی صاف کہہ دیا کہ اگر انہوں نے کسی بات پر اس سے روک ٹوک کرنی ہے یا ناک بھوں چڑھانی ہے تو وہ اپنا بوریا بستر گول کرلیں۔ وہ ان کے خرچے کے لیے ہر مہینے پیسے بھجواتا رہے گا۔ ماماں بی نے اسے بچوں کی طرح پالا تھا۔ بچہ کیسا بھی ہو، ماں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔

صالح نے سرخاب منزل کے ایک بڑے ہال میں باقاعدہ ایک بار بنوایا اور بڑی تیزی کے ساتھ ایک ڈانسنگ فلور بھی ریڈی کروادیا۔

فارغ ہوجانے والے ملازمین کی جگہ جو نئے ملازم رکھے گئے، ان میں چند شوخ و شنگ لڑکیاں بھی تھیں اور سب جانتے تھے کہ انہیں ملازمت کا پروانہ کیوں دیا گیا ہے۔

داجے فضل کریم اپنے بیمار بھائی کو دفنا کر پندرہ بیس روز بعد سرخاب منزل واپس پہنچے تو یہاں ''شاندار'' تبدیلیاں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

انہوں نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے صالح.....! اور یہ کیا ہونے والا ہے؟''

صالح نے واسکٹ کے نیچے نیکر پہن رکھی تھی اور ایک پالتو کتا اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا۔ اس کا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جو کچھ ہورہا ہے، آپ کے سامنے ہے لیکن جو وعدہ کیا تھا آپ سے، وہ ابھی تک برقرار ہے۔ جس عورت سے یہاں میرا تعلق ہے، وہ میری منکوحہ ہے۔ میرا مطلب نازو سے ہے۔''

داجے نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ہاں، وعدہ ابھی تک تو برقرار ہے صالح! لیکن لگتا ہے وہ بھی زیادہ دیر نہیں رہے گا۔''

''حالانکہ میں چاہتا تو ایسا کرکے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ نئے نکاح کرتا اور نئی طلاقیں دیتا رہتا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ جھوٹ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' وہ عجیب اکھڑپن سے بولا۔

داجے کی ہلکی نیلی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے تھکی تھکی انداز میں سر ہلایا۔

صالح نے کہا۔ ''اور داجے.. اب میں آپ کو روکوں گا بھی نہیں حالانکہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔''

''تمہاری نیک ماں نے تمہارا نام صالح رکھا تھا۔'' داجے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مگر افسوس تم ''صالح'' تو کیا عام انسان بھی نہیں رہے۔''

وہ گھٹنوں پر بوجھ ڈال کر اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے کمرے کی طرف چلے گئے۔

صالح جانتا تھا کہ صبح سویرے ہی داجے فضل سرخاب منزل سے نکل جائیں گے۔ رات کسی وقت وہ خاموشی سے ان کے کمرے میں گیا۔ اس نے پہلے ہی سارا انتظام کررکھا تھا۔ داجے فضل کریم کے آبائی گاؤں کے پاس کوئی پانچ مربع نہری زمین بھی مخدوم رائے فیملی کی ملکیت تھی۔ صالح نے منیجر افراسیاب سے کہہ کر اس میں سے تین مربع زمین داجے فضل کے نام منتقل کرادی تھی۔ یہ کاغذات پولی تھین کے ایک لفافے میں ڈال کر اس نے داجے فضل کریم کے سرہانے رکھ دیے۔ ساتھ میں ایک مختصر خط بھی تھا..... ''داجے! آپ کو میرے سر کی قسم ہے، اس کو ٹھکرایئے گا نہیں۔ یہ میرے لیے آپ کی انمول محبت کا حقیر سا نذرانہ ہے۔''

صبح سویرے شاید فجر کے بعد ہی داجے فضل سرخاب منزل سے نکل گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے صالح کو سرخاب منزل ایک دم خالی خالی نظر آئی۔ اس کا دل دیر تک جیسے کسی مٹھی میں جکڑا رہا۔ کیا واقعی وہ چلے گئے ہیں؟

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ کاغذ بدستور سرہانے کے نیچے موجود تھے۔ اس نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اس کے خط کے نیچے دو نئی سطور لکھی تھیں۔ ''اللہ کرے میری باقی کی عمر بھی تمہیں لگ جائے..... مگر یہ سب کچھ میرے لیے حرام ہے۔''

پھر کچھ دیر بعد صالح پر انکشاف ہوا کہ وہ سرخاب منزل سے چلے تو گئے ہیں لیکن زیادہ دور بھی نہیں گئے۔ شاید بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ اپنے مختصر سامان سمیت کوئی دو کلومیٹر دور سویرا سائیں کے مزار پر منتقل ہوگئے تھے۔ شاید وہ اب بھی اس خام خیالی میں تھے کہ کسی طور کسی موقع پر صالح کو سنبھال سکیں گے۔

سرخاب منزل سے بابا شاہنواز اور داجے فضل کے جانے کے بعد سرخاب منزل مکمل طور پر نئے شب و روز میں داخل ہوگئی۔ سارے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ یوں لگا کہ جیسے ساتوں شرعی عیب دھیرے دھیرے سرخاب منزل میں داخل ہوتے جارہے ہیں۔ صالح کی سرعام شراب نوشی تو بابا کے آخری دنوں میں ہی شروع ہوچکی تھی، اب آئے

دن حویلی میں راگ رنگ کی محفلیں بھی سجنے لگیں۔ کل کا دوست آج کا دشمن ثابت ہوا تھا اور کل کا دشمن یعنی پرنس شاہد اب صالح کے قریبی دوستوں میں شمار ہو رہا تھا۔ پرنس کے والد بدر بابڑا کا ایک انگریز دوست بھی پاکستان آیا ہوا تھا۔ بابڑوں کی طرح وہ بھی اونٹ اور گھوڑے پالنے اور خریدنے کا زبردست شوق رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے اور بیٹوں کے دوست بھی تھے۔ ان میں تین چار غیر ملکی لڑکیوں کی ایک ٹولی بھی تھی۔ اب یہ سب لوگ بھی سرخاب منزل کو رونق بخشنے لگے۔ مغربی اور مشرقی موسیقی کی دھنوں پر خوب ہلا گلا ہو رہا تھا۔

اپنے آتشیں جذبوں کی تسکین کے لیے مہناز عرف نازو اس کے پاس موجود تھی۔ وہ قانوناً اس کی بیوی تھی مگر صالح کے لیے وہ ایک ڈاچی ہی تھی جو ایک خوبصورت ڈاچی کے بدلے میں اس نے حاصل کی تھی۔ البتہ یہ ڈاچی بھی صحرائے وحشت کی برق رفتار جادہ پیمائی میں اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی اور بدحال ہو جاتی تھی۔ صالح کے پاؤں سے تو بگولے بندھے رہتے تھے۔ یہ ''بگولے'' اس کا خاندانی امتیاز تھے۔ ویسے بھی اب وہ اس کے دل سے اترتی جا رہی تھی۔

ایک روز وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا۔ اس نے نازو کے غیر معمولی لمبے بال کھینچ لے کر اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر بالکل مختصر کر دیے۔ عجیب سا ڈیزائن بنا دیا۔ وہ بہت روئی بلکی۔ اس کی اشک شوئی کے لیے اس نے پانچ ہزار والے نئے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی جھولی میں ڈال دی۔

''تمہارے بالوں کی قیمت۔'' صالح نے کہا۔

نازو کا غم آدھا رہ گیا اور جب ایسی ہی ایک اور گڈی دھپ سے اس کی جھولی میں گری تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ نے بتا دیا کہ اس کے جسم کا ہر حصہ برائے فروخت ہے۔

نازو کے مشہورِ زمانہ بال کھینچ کر کے صالح کو ایسے ہی لگا تھا جیسے وہ ایک ڈاچی ہے، اس کی ملکیت ہے اور اس نے اپنی مرضی سے اس کی اون تراش کر اپنی پسند کا ڈیزائن بنا دیا ہے۔

☆☆☆

وہاں پیرس سے دوبارہ کسی طرح کی کوئی خبر نہیں آئی تھی اور صالح چاہتا تھا کہ کوئی خبر اسے ملے بھی نہ۔ اسے فقط اتنا پتا چلا تھا کہ پھپھو عاصمہ، بھائی کی قبر پر آنا چاہتی ہیں مگر کورونا کے سبب سفر کی سختی بڑھتی پابندیاں آڑے آ رہی ہیں۔

صالح کے بابا جانی نے جو پراپرٹی حقِ وراثت کے تحت پھپھو عاصمہ کے نام کی تھی، اس کے کاغذات مکمل کرانے کے بعد صالح نے پھپھو کو بھجوا دیے تھے۔

دوسری طرف سرگودھا کی جانب بھی ابھی تک خاموشی ہی تھی۔ چند ہفتے پہلے وہاں صالح اور وکی میں جو سنگین جھڑپ ہوئی تھی، اس کے بعد فی الحال کوئی نیا ٹیٹا سامنے نہیں آیا تھا۔

صالح نے مہناز عرف نازو سے اپنا تعلق ختم کر دیا تھا۔ اسے صرف طلاق ہی نہیں دی تھی بلکہ اور بھی بہت کچھ دیا تھا اور یہ اتنا کچھ تھا کہ آئندہ پانچ چھ سال کے لیے اسے ہر طرح کی ''محنت و مشقت'' سے آزاد کر سکتا تھا مگر ایسے لوگ نچلے کب بیٹھتے ہیں۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ کبھی چار پانچ سال تو ہیں ''محنت و مشقت'' کے اور نتھ پہننے اتارنے کے۔

آج کل صالح کی سرمستی عروج پر تھی۔ غیر ملکیوں والے گروپ کی ایک خوشنما لڑکی جولی اس کی نگاہوں میں چڑھی ہوئی تھی۔ وہ مادر پدر آزاد لڑکی اسے قربت کے نئے نئے زاویوں سے آشنا کر رہی تھی اور یہ یک نہ شد دو شد والا معاملہ تھا۔ اس گروپ میں ہی موجود بوائے کٹ بالوں والی ایک روسی آفت جاں مارگریٹ بھی دو چار راتوں بعد اس کی رات کو گرما دیتی تھی۔ وہ صالح کے بالوں بھرے مضبوط جسم کی تعریف کرتی اور کہتی کہ اس کے تھکین جسم میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ اسے اپنے انداز میں سپر ہاٹ کہتی.....

ان دو لڑکیوں کے علاوہ وہ جوان ملازمائیں تو موجود ہی تھیں جنہیں صالح نے اپنے پرتعیش مقاصد کے لیے بھرتی کیا تھا۔ ان کی ملازمت تو دراصل ایک طرح کا ''کیموفلاج'' ہی تھا۔ صالح گاہے بگاہے ان کی اطاعت گزاری سے بھی اپنی تنہائیاں چمکا رہا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ سرخاب منزل کی حاکمیت ایک وسیع دسترخوان کی طرح ہے جس پر دلکش نسوانی اجسام مختلف ڈشز کی طرح چنے ہوئے ہیں۔ وہ کھا رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ کھانے کی لذت بھوک سے مشروط ہوتی ہے۔ کھانے کی زیادتی سے بھوک کم ہوتی ہے اور لذت بھی وہ پہلے جیسی نہیں رہتی۔ کسی وقت صالح بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا۔ ایسے میں وہ وہی کچھ کرتا جو کھانے کی لذت بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ مرچ مسالے ڈالے جاتے ہیں، انہیں زیادہ سجایا سنوارا جاتا ہے۔ پیشکش کے انداز بدلے جاتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا اور خود کو کامیاب محسوس کرتا تھا۔ بدمست شادمانی

کی ان لہروں میں اب تو وہ چمکیلے رخسازوں والا معصوم چہرہ بھی اپنی جھلک نہیں دکھاتا تھا جو پہلے دکھایا کرتا تھا۔ کیا وہ چہرہ واقعی گم ہو چکا تھا؟

صالح کے دادے فضل اپ سویرا سائیں کے مزار کے مستقل مقیم ہو گئے تھے۔ وہاں وہ اپنا زیادہ تر وقت ایک حجرہ نما کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ اختر کے کا کہنا تھا کہ اکثر روزے سے ہوتے ہیں۔

ایک روز جب صالح پر سے الکحل کا خمار اترا ہوا تھا اور حواس کچھ بحال تھے، وہ ان سے ملنے کے لیے سویرا سائیں کے مزار پر چلا گیا۔ مخدوم شاہنواز رائے جیسی عزت تو لوگ صالح کو نہیں دیتے تھے..... اور دے ہی نہیں سکتے تھے پھر بھی وہ مزار کے مرمریں احاطے میں صالح اور اس کے گارڈز کے گرد جمع ہو گئے۔ چند ایک "اندھے عقیدت مندوں" نے اس کے ہاتھ بھی چومے لیکن دادے فضل سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ مزار کے ایک مجاور نے بتایا کہ وہ تسبیح نماز پڑھنے میں مصروف ہیں۔ تسبیح نماز کا مفہوم صالح کو معلوم نہیں تھا لیکن جب اسے بتایا گیا کہ یہ ایک طویل نماز ہے اور دو گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہو گی تو وہ برا سا منہ بنا کر واپس آ گیا۔

سرخاب منزل میں ہر طرح کا ہلا گلا عروج پر تھا۔ پرنس شاہد کے علاوہ چند اور بگڑے نکھٹو نوجوان بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ عموماً غیر ملکی لڑکیاں بھی ماحول کو چار چاند لگانے پہنچ جاتی تھیں۔ قوالیوں یا صوفیانہ کلام وغیرہ کی آوازیں تو سرخاب منزل سے بہت دور جا چکی تھیں۔ اب یہاں پاپ سنگرز، میڈونا اور رولنگ اسٹونز وغیرہ کی آوازیں گونجتی تھیں، تاش کھیلے جاتے تھے، مے کے دور چلتے تھے اور ڈانسنگ فلور پر پاؤں بھی تھرکائے جاتے تھے۔ اس عالم نشاط میں اگر کسی وقت صالح کو کوکی پریشانی محسوس ہوتی تھی تو وہ ایک دو لیگل کیسوں کی ہی تھی۔ ان میں سے اہم کیس وہی ڈینگی والی لڑکی کا تھا۔ جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ تنگ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا اور اسے ایک مثالی کیس بنانا چاہ رہا تھا۔ ڈینگی ٹیم کا ہیڈ ابدال خاں جو ایک صحافی اور یوٹیوبر بھی تھا، کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

صالح نے مساجر کے طور پر بھی ایک پارلر کی جواں سال لڑکی ہی رکھ لی تھی۔ آج کل وہ ہر دوسرے تیسرے روز اپنا سر ریزر سے منڈوا لیتا تھا اور چہرہ بھی کلین شیو کر لیتا تھا۔ اب بھی نیم عریاں لباس والی وہی خوشبو میں بسی ہوئی لڑکی اپنے ملائم ہاتھوں سے اس کی ڈاڑھی مونڈ رہی تھی کہ محرابی دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ۔" صالح نے سگریٹ بدستور ہونٹوں میں دبائے دبائے کہا۔

منیجر افراسیاب تھری پیس سوٹ میں ملبوس پریشان چہرے کے ساتھ اندر آ گیا۔

"خیریت ہے؟" صالح نے چونک کر پوچھا۔

"اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں جی۔"

صالح نے ابرو کے اشارے سے پارلر گرل کو باہر جانے کی ہدایت کی اور اوھوری ڈاڑھی پر لگا ہوا جھاگ تولیے سے صاف کر ڈالا۔

"صالح سرکار! بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کے لیے..... اور ہم سب کے لیے مسئلہ بن رہا ہے۔" اس نے اپنا موبائل صالح کے سامنے کر دیا۔

"کیا ہے اس میں؟" صالح ذرا جھنجلایا۔

"کل رات ایک ویڈیو اپ لوڈ ہوئی ہے جی..... جو بہت وائرل ہو رہی ہے۔ آئی ایم ویری سوری جی..... اس ویڈیو میں آپ نظر آ رہے ہیں۔"

صالح کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ اس نے افراسیاب کے کہنے پر ویڈیو پلے کی اور دنگ رہ گیا۔ یہ کوئی تازہ ویڈیو نہیں تھی۔ کم و بیش چھ سال پرانی تھی لیکن یہ تھی صالح کی ہی۔ یہ وہی منظر تھا جب صالح نے مشتعل ہو کر ڈینگی والی لڑکی پر چڑھائی کی تھی، اسے تھپڑ مارے تھے، گھسیٹ کر اپنے کمرے کے قالین پر گرایا تھا اور ربر کے تین چار فٹ لمبے پائپ سے بے طرح پیٹا تھا۔ چند ایک مناظر میں صالح اور لڑکی رباب کا چہرہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔ سب سے سنگین منظر وہ تھا جب صالح نے اشتعال میں اس کا گریبان پھاڑ ڈالا تھا اور بدن نوچا تھا۔ یہاں پر منظر کو تھوڑا سا دھندلا کر دیا گیا تھا۔ ایک دو ملازمائیں بھی ویڈیو میں ہراساں کھڑی نظر آتی تھیں پھر آپا مابی نے آگے بڑھ کر منت سماجت کرتی لڑکی کو بہ مشکل صالح سے چھڑوایا تھا۔

صالح نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر افراسیاب کی طرف دیکھا۔ افراسیاب نے لرزاں آواز میں کہا۔

"صالح سرکار! یہ بہت خطرناک سازش ہے کسی کی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کی ضمانت کینسل ہو جائے گی۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟" صالح نے موبائل صوفے پر پٹختے ہوئے کہا۔ "اتنی پرانی ویڈیو اب یاد آئی ہے اس حرامزادے کو؟ اور سوال یہ کہ یہ..... بنائی کس نے؟"

(جاری ہے)

کبھی حبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں.....

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

آخری شام سے پہلے

طاہر جاوید مغل

پانچواں حصہ





افراسیاب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ تو ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ویڈیو کس نے بنائی لیکن میرے خیال میں اس کو پھیلایا سرگودھا والوں نے ہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کا پرانا دوست وقار وکی۔

صالح کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اس کی نگاہ کے سامنے جالے نوری کا گہرا سانولا چہرہ گھوما۔ اسے وہ منظر یاد تھا جب اس نے جالے کو موٹر بائیک پر وکی کی رہائش گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے ہراساں نظروں سے ایک بار پھر ویڈیو دیکھی۔ کچھ مناظر کافی صاف تھے۔ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ویڈیو واضح طور پر ایک ادھ کھلی کھڑکی سے بنائی گئی تھی۔ ایک پردہ بار بار کیمرے کے سامنے آتا تھا۔

صالح نے فوراً اپنے وکیل صمد بخاری کو کال ملائی۔ اتفاقاً وہ بھی یہ لیک ویڈیو دیکھ چکے تھے اور پریشان نظر آتے تھے۔

☆☆☆

صالح جس کے لیے آج کل ہر دن عید اور رات شب برات بنی ہوئی تھی، یکایک شدید پریشانیوں میں گھر گیا۔ سارے اللے تللے دھرے رہ گئے۔ غیر ملکیوں کی ٹولی بھی فوراً منظر سے غائب ہوگئی۔ اس ویڈیو کا وائرل ہونا سرخاب منزل اور مخدوم صالح رائے کے ماتھے پر ایک ایسا داغ تھا جس کی بدنمائی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ صالح رائے کی پذیرائی تو پہلے بھی کچھ ایسی قابلِ ذکر نہیں تھی مگر اس ویڈیو نے تو رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا ڈالی تھی۔

مخدوم نیلی کے طرفدار بہت سی تاویلیں کررہے تھے..... یہ جعلی ویڈیو ہے، اس میں ٹکڑے جوڑے گئے ہیں، یہ صالح رائے کا نہیں کسی اور کا چہرہ ہے وغیرہ وغیرہ..... مگر جب فرانزک وغیرہ کے بعد صالح کی ضمانت کینسل ہوئی اور نامی گرامی وکیل صمد بخاری کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اسے پانچ روزہ جسمانی ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کردیا گیا تو حمایتی آوازوں کے پاس خاموش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس کیس نے سوشل میڈیا کے علاوہ مین اسٹریم میڈیا پر بھی بہت ہائپ پکڑلی تھی۔

جسمانی ریمانڈ کے دوران میں صالح کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تفتیش کو لہا مال کھلایا گیا لہٰذا صالح پر تشدد تو نہیں ہوا تاہم کچھ اہلکاروں نے اسے ضرور آڑے ہاتھوں لیا اور گالی گلوچ تک کی۔ یہ اوپری دباؤ کی وجہ سے تھا۔

ایک رات حوالات میں نہ جانے کیوں صالح کو داجے فضل کے کہے ہوئے کچھ الفاظ یاد آگئے۔ وہ جب ایک بار بابا جانی کے پاس لاہور کے اسپتال میں تھے، صالح کی من مانیوں سے نپٹا کر انہوں نے کہا تھا..... ”مت سمجھو کہ گناہ پلٹ کر تمہاری طرف نہیں آئے گا۔ جو کروگے، وہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی صورت بھگتنا پڑے گا۔“

یہ حقیقت اب تقریباً واضح ہوچکی تھی کہ صالح کو اس پرانے کیس میں بے طرح پھنسانے والے وکی اور اس کا باپ سیف اللہ ہی ہیں۔ جالے نوری نے ان کے دستِ راست کا کردار ادا کیا تھا اور عرصے سے سنبھالی ہوئی وہ ویڈیو اپنے نئے مالکوں کے حوالے کی تھی۔ یوں صالح سے اس بے عزتی اور جوتم پیزار کا بدلہ لیا تھا جو ڈیرے پر اس سے کی گئی تھی۔

پانچ روزہ ریمانڈ ختم ہونے کے بعد پولیس نے دوبارہ ریمانڈ لینے کی کوشش کی مگر صمد بخاری کی سخت کوشش کے سبب صالح کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

پیسے کی فراوانی کے باوجود جیل میں ایسی بہت سی سختیاں صالح کے سامنے آئیں جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کا دل دکی اور اس کے باپ سیف اللہ کے خلاف غیظ و غضب سے بھرا ہوا تھا مگر وہ خود کو ہی کوسنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ گوگی نامی اس عام سی سرکاری ملازمہ سے کی جانے والی مار پیٹ اس بُری طرح اس کے گلے پڑ جائے گی۔ وکیل بخاری صاحب نے تو اسے یہاں تک مشورہ دیا تھا کہ مخالف پارٹی کے ساتھ مفاہمت یا معافی تلافی کی کوشش کی جائے۔

بخاری صاحب نے کہا۔ ”جو دفعات اس کیس میں شامل ہوگئی ہیں، ان کے بعد معاملہ اور مشکل ہوگیا ہے۔ اللہ نہ کرے، سات آٹھ سال تک کی قید ہوسکتی ہے۔“

اس موقع پر صالح کو پھر داجے فضل یاد آئے۔ اس نے کہا۔ ”بخاری انکل! آپ جانتے ہیں داجے فضل کی رائے ایسے معاملوں میں بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ان سے ملیں۔“

بخاری نے کہا۔ ”میں گیا تھا۔ ان کے ایک مرید نے کہا کہ وہ مراقبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابھی چار پانچ روز تک کسی سے مل نہیں سکتے۔“

صالح دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے توقع تھی کہ وہ حوالات میں تو نہیں آئے مگر جیل میں کم از کم ایک بار اس سے ملنے ضرور آئیں گے لیکن وہ نہیں آئے تھے۔

☆☆☆

چار پانچ ماہ تک جیل کے رگڑے کھانے اور پیشیاں بھگتنے کے بعد صالح کے وکیل ایک بار پھر اس کی ضمانت

کرانے میں کامیاب ہو گئے مگر کیس تو بہر حال چل پڑا تھا۔

جیلیں سزا کے طور پر ہوتی ہیں اور سزا دینے کے پیچھے مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرم اپنے معاملات پر نظر ثانی کرے اور بہتر انسان بن کر باہر نکلے مگر ہوتا اکثر اس کے الٹ ہے۔ صالح بھی زیادہ تخریبی ذہن کے ساتھ زیادہ زہریلا اور زیادہ ہوس کار بن کر جیل سے نکلا۔ بجائے اس کے کہ وہ خود احتسابی کا سوچتا، اس نے کئی دن تک خود کو شراب اور شباب کے نشے میں دھت رکھ کر آزادی کا جشن منایا۔ تب دل کا بوجھ کچھ اور ہلکا کرنے کے لیے اس نے جیل میں بننے والے اپنے ایک جرائم پیشہ دوست کے ذریعے سر راہ ایکسیڈنٹ کی آڑ میں جالے نوری کو یادگار پھینٹی لگوائی اور اسے اسپتال داخل ہونا پڑا۔ اصل حساب کتاب تو وکی کے ساتھ چل رہا تھا اور اس کھاتے کا قرض صالح پر کچھ اور چڑھ گیا تھا۔ تاہم وکی بھی اپنی جگہ پوری طرح قائم و دائم اور ہوشیار باش تھا۔

جب دشمنی کے شعلوں کو پھنکارنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ملا تو صالح نے ان کا رخ ایک بار پھر حسین چہروں اور مرمریں جسموں کی طرف موڑ دیا۔ کل کا دشمن پرلس شاہد اب اس کا ہم نوالہ و پیالہ بن چکا تھا۔ دونوں خاندانوں میں دشمنی کی شدت بھی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ ماضی کی یادوں کے زہریلے تیر کسی وقت صالح کے سینے میں پیوست ہوتے تو وہ تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا کہ اس آستین کے سانپ وکی سے قرار واقعی بدلہ کس طرح لے سکتا ہے؟

گندم کی کٹائی مکمل ہو چکی تھی۔ گرمی دھیرے دھیرے اپنا رنگ جما رہی تھی۔ حبس ہوئی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں مگر صالح کے اپنے اندر اتنی تپش اور جلن تھی کہ باہر کی گرمی اس پر کچھ خاص اثر نہ کرتی تھی۔ اس نے سرخاب منزل میں قریباً قریباً مغربی ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ طویل دوپہروں کا قیلولہ کیے اسے مدتیں گزر چکی تھیں۔ اب اس کی اکثر دوپہریں سرخاب منزل کے شیلڈ سوئمنگ پول میں گزرتی تھیں اور اکثر وہاں ایک دو مہ جبینوں کا ساتھ بھی اسے میسر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے دلنواز چہرے اور ہوشربا جسم اسے فیصل آباد اور لاہور وغیرہ سے بھی مہیا کر دیے جاتے تھے۔ لمبوترے چہرے والا وہی خیام نامی شخص جو کبھی مخدوم شاہنواز رائے کے لیے کراچی میں "عارضی" دلہنیں ڈھونڈتا تھا، اب صالح کے لیے "نائٹ پارٹنرز" ڈھونڈ لاتا تھا۔

ایک روز وہ سرگودھا سے ہی صالح کے لیے ایک لڑکی ڈھونڈ کر لایا۔ لڑکی اس بازار کی تو نہیں تھی لیکن مجبوریاں وہی تھیں جو اکثر ایسی برائے فروخت لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔

اسے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، باپ جہان فانی سے جا چکا تھا۔ ایک بوڑھی خالہ تھی جس نے اسے چھت مہیا کر رکھی تھی۔ لڑکی کا نام نتاشا تھا۔ وہ خاصی خوبصورت اور موزوں جسم کی تھی۔ اسے گلوکاری کا شوق تھا۔ اس میدان میں اس نے اپنا کیریئر بنانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام ہوئی اور خراب بھی ہوئی۔ دوسرے درجے کے ایک موسیقار سے اس کی شادی اور طلاق ہوئی۔ اس کی ایک پندرہ سولہ سالہ نابینا بہن تھی۔ یہ بینائی ایک حادثے میں ضائع ہوئی تھی اور ڈاکٹر کہتے تھے کہ یہ بحال ہو سکتی ہے۔ علاج پر کافی کچھ خرچ ہو چکا تھا اور وہ مقروض بھی تھی۔ اسے جنون تھا کہ کسی بھی طرح بہن کو دوبارہ دیکھنے کے قابل کرے گی۔ یہی جنون اسے بتدریج ان راہوں پر لے آیا تھا۔

نتاشا نامی اس لڑکی نے سات آٹھ روز تو صالح کو اپنے نشے میں مدہوش رکھا مگر پھر یہ مدہوشی کم ہونا شروع ہو گئی۔ درحقیقت اب صالح کا دل کسی بھی عورت سے بڑی جلدی بھر جاتا تھا۔ شاید یہاں پھر وہ حسن و شباب کے دستر خوان پر کھانے کی زیادتی والی مثال صادق آتی تھی۔ بھوک نہ ہو تو لذیذ ترین ڈش بھی چند لقموں بعد اپنا لطف کھو دیتی ہے پھر اضافی چٹنیاں، سلاد، مرچ مسالے بھی زیادہ کام نہیں کرتے۔ قدرت کی طرف سے ایک عجیب عذاب تھا جس میں صالح مبتلا ہو چکا تھا۔

ایک رات نتاشا کے موبائل فون پر اس نے نتاشا کی چھوٹی بہن کی تصویریں دیکھ لیں۔ وہ نتاشا سے کچھ کم خوبصورت نہیں تھی مگر ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی تھی۔ نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں صالح نے نتاشا سے کہا۔ "کیا اسے یہاں لا سکتی ہو؟"

نتاشا کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ "یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں..... پلیز..... پلیز! دوبارہ ایسی بات نہ کہیے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایک بچی ہے وہ....."

"خیر، اتنی بچی بھی نہیں ہے۔" صالح نے اس کی تصویر موبائل کی اسکرین پر انلارج کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بیان کے مطابق تم اس سے بس تھوڑی ہی بڑی تھیں جب اس موئے موسیقار کے ہتھے چڑھی تھیں۔ کیا ملا تمہیں اس سے۔ یہ اتنا کچھ حاصل کر لے گی کہ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ جتنے کا چیک کہو گی، لکھ دوں گا۔ کل شام لے آؤ اسے۔"

"پلیز سر..... ایسی بات نہ کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں..... میں حاضر ہوں۔ جو حکم مجھے دیں۔"

''تمہارے جادو سے کب انکار ہے لیکن جو میں نے کہہ دیا ہے، وہ کرو۔ بہت فائدے میں رہو گی۔'' صالح نے نشے میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ اس بار لہجے میں ہلکا سا تحکم بھی تھا۔

وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ منت سماجت کرنے لگی مگر صالح اپنی بات پر اڑا رہا۔ لالچ کے ساتھ اور کسی وقت تھوڑے سے ارادے کے ساتھ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ساری رات اسی طرح گزر گئی تاآنکہ ناشتا کی مزاحمت کمزور پڑتی محسوس ہوئی۔

صالح نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر ہر طرح کی تسلی دی تو وہ بولی۔ ''میں وعدہ نہیں کرتی مگر کوشش کرتی ہوں کہ..... اسے کسی طرح آمادہ کر سکوں۔ آپ مجھے چار پانچ دن کی مہلت دیں۔''

''چار پانچ دن بہت زیادہ ہیں۔ چلو دو دن لے لو۔ ہفتے کے روز اسے لے آؤ۔''

وہ اثباتی انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ صالح نے ایک بڑا پیگ لگایا اور بستر پر گر کر تصورات میں کھو گیا۔

ہفتے کی شام موسم بڑا سہانا تھا۔ گرمی کا زور توڑنے کے لیے ہلکی سی بوندا باندی سہ پہر سے جاری تھی۔ لمبوترے چہرے والا خیام دونوں بہنوں کو سرخاب منزل لانے کے لیے اختر کے ہمراہ سرگودھا شہر گیا ہوا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب خیام نے فون پر اسے بتایا کہ دونوں بہنیں اپنی بیوہ خالہ سمیت غائب ہیں۔ گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔ مالک مکان کے بقول وہ فیملی کل ہی گھر خالی کر کے کہیں چلی گئی تھی۔

صالح سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس نے شیشے کی میز کو زوردار ٹھوکر مار کر چکنا چور کر دیا۔ جو ملازم بھی اس کے سامنے آیا، اسے ماں بہن کی گالیاں سننا پڑیں۔ اس نے اندھا دھند شراب پی۔ اب وہ نشہ بڑھانے کے لیے کسی وقت الیون کا استعمال بھی کرتا تھا۔

یہ ایک تاریک رات تھی۔ بوندا باندی کی پروا کیے بغیر وہ نشے میں دھت باغ میں چلا گیا۔ چھڑی لے کر سفیدے کے درخت کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ ہر ضرب پر سفیدے کا درخت چلّا اٹھتا، دہائی دیتا، منت سماجت کرتا۔ اب یہ آوازیں صالح کو بالکل واضح اور صاف سنائی دیتی تھیں۔ کسی وقت تو اسے یقین ہونے لگتا تھا کہ یہ درخت ایک زندہ جسم رکھتا ہے اور یہی نہیں، جب وہ کسی رات اپنے بیڈروم میں اکیلا ہوتا تو اسے تاریکی میں سسکیاں اور کراہیں سنائی دیتیں۔ ان نسوانی سسکیوں اور کراہوں میں اس کے لیے واضح طور پر نفرت اور کراہت ہوتی۔ اس کا دماغ پھٹنے لگتا اور وہ اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دیا کرتا۔

اب بھی تاریک رات کی اس بوندا باندی میں وہ عجیب کیفیت کے زیر اثر تھا۔ واپس اس کمرے میں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا جہاں آج کی شب وہ عیش و طرب میں گزارنے کا پروگرام رکھتا تھا۔ وہ بارش میں ڈگمگاتا ہوا سرخاب منزل کے عقبی احاطے کی طرف گیا اور پھر ایک عقبی دروازے سے نکل کر اس چھوٹے سے قبرستان میں پہنچ گیا جو سرخاب منزل کے ساتھ ہی واقع تھا۔

بابا جانی اور ماں کی قبر کے قریب ایک سفید پوش کو بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ کہیں اس کی نگاہ دھوکا تو نہیں کھا رہی تھی۔ یہ دادے فضل تھے۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ آج کئی ماہ بعد انہیں دیکھا تھا۔

وہ آگے گیا اور عقب سے ان کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''دادے! کیوں چھوڑ گئے آپ بھی..... کیوں چھوڑ گئے مجھے۔''

☆☆☆

کچھ ہی دیر بعد دادے فضل اور صالح قبرستان کے چوکیدار کے صاف ستھرے کمرے میں آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ چوکیدار شربت گل نے چارپائیوں پر صاف اجلی چادریں بچھا دی تھیں اور ان کے سامنے چائے بھی لا کر رکھ دی تھی۔ صالح نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح دادے اس کے ساتھ حویلی کے اندر چلیں مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''بس پتر! میں اب جہاں ہوں، وہیں پر ٹھیک ہوں۔''

آج کی طرح پہلے بھی کئی بار ماضی میں صالح نے اسی طرح دادے فضل کو اس قبرستان میں خاموشی سے داخل ہوتے یا باہر آتے دیکھا تھا۔ آج بھی اس گہری تاریک بارش والی رات میں وہ مزار میں اپنے حجرے سے چل کر یہاں آئے تھے اور اس کے ماں باپ کی قبروں پر خاموش بیٹھے تھے۔ لڑکپن سے اب تک یہ سوال بے شمار مرتبہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا کہ اس قبرستان سے اور اس کی والدہ سے دادے فضل کریم کا کیا تعلق تھا؟

آج وہ دادے فضل سے اس سوال کا جواب حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ دادے فضل بھی یہ محسوس کر چکے تھے کہ وہ کیا چاہتا ہے..... پھر صالح کو یہ محسوس ہونے لگا کہ دادے خود بھی یہ بات سمجھ رہے ہیں کہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں۔ جو سوال مدت سے اس کی آنکھوں میں تڑپ رہا ہے،

اس کا جواب اسے مل جانا چاہیے۔

بارش کی بوندیں جنتر کے پتوں پر مسلسل گر کر مدھم آواز پیدا کر رہی تھیں۔ داجے نے کہنا شروع کیا۔

"صالح! تمہاری والدہ کا پورا نام ثمینہ ارجمند تھا۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہے۔ تمہارے بابا جانی بھی نہیں ہیں۔ میری زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں کہ کب چلتا بنوں اس لیے ہم تینوں کی کہانی تمہیں سنانے میں، میں کوئی ایسا عار نہیں سمجھتا۔"

انہوں نے ذرا توقف کیا اور کہنے لگے۔ "رشتے کے لحاظ سے تم مجھے اپنا دور کا تایا بھی کہہ سکتے ہو۔ پیال پورہ میرا آبائی گاؤں تھا اور تم جانتے ہی ہو وہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ تمہاری والدہ ارجمند بھی وہیں کی رہنے والی تھی۔ ہم دونوں گھروں کی دیواریں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ ہماری عمروں میں تو دس سال کا فرق تھا لیکن ہم ہمجولیوں کی طرح کھیلتے کودتے ہی بڑے ہوئے تھے۔ ہم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ تم نے اپنی ماں کی تصویریں دیکھی ہیں نا؟"

"ہاں داجے! وہ بہت خوبصورت تھیں۔"

"لیکن وہ اپنی تصویروں سے زیادہ خوبصورت تھی اور سمجھ دار بھی اتنی تھی کہ کچھ باتوں میں بڑی بوڑھیاں بھی اس سے مشورہ کر لیتی تھیں۔ اس زمانے میں اور پیال پورہ جیسے گاؤں میں اس نے میٹرک کیا تھا جو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے ایف اے کیا تھا لیکن والد کا کہنا تھا کہ شہر جانے کے بجائے میں گاؤں میں رہوں اور اپنی زمین پر کاشت کرواؤں۔ میں اپنے تین بھائیوں میں چونکہ سب سے بڑا تھا اس لیے اپنی تین بڑی بہنوں کی شادی بھی میری ہی ذمے داری تھی۔ میں نے کاشت کاری کے بارے میں والد کی بات مان لی۔ بھائیوں میں تقسیم ہونے سے پہلے ہماری کوئی آٹھ مربع زمین موجود تھی۔"

بات کرتے کرتے داجے رک گئے۔ صالح کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ایک دن میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ایک دوسرے سے پیار کرنے والے اکثر ایک غلطی کر جاتے ہیں۔ ویسی ہی غلطی جو تم سے وقار وکی کے سلسلے میں ہوئی۔"

"جی ہاں..... آپ نے کہا تھا کہ پیار کرنے والے اکثر کسی کو اپنا راز دار بنا لیتے ہیں۔ اپنی باتیں اس سے شیئر کرتے ہیں اور کبھی کبھی وہ راز دار ہی ان کے پیار کا دشمن بن جاتا ہے۔"

"بالکل صالح! ایسا ہی ہوتا ہے۔" فضل کریم کے لہجے میں بے حد کرب سمٹ آیا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "ارجمند کی ایک گہری سہیلی تھی۔ افشاں نام تھا اس کا۔ ارجمند میری اور اپنی ہر بات اس سے کر دیا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ یوں ہوا کہ یہ افشاں میرے چکر میں پڑ گئی۔ شروع شروع میں تو مجھے پتا ہی نہیں چلا پھر جب ایک شادی پر ارجمند اور اس کے گھر والے میانوالی گئے ہوئے تھے، افشاں کھل کر میرے سامنے آ گئی۔ اس کا گھر بھی ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ رات کو میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے بغیر وہ نہیں رہ سکتی۔ وہ ارجمند سے کہیں بڑھ کر مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں حیران تھا۔ ارجمند سے بے وفائی کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میری زندگی کی پہلی اور آخری چاہت تھی۔" فضل کریم کی آواز بھرا گئی۔

کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے بارش کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ داجے فضل کی نگاہیں دروازے سے گزر کر دور اس قبر کا طواف کرتی محسوس ہوتی تھیں جس پر ثمینہ ارجمند زوجہ شاہنواز رائے کا پتھریلا کتبہ اب شکستہ ہو چکا تھا۔

صالح نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔ "تو آپ کو اس افشاں سے شادی کرنا پڑ گئی؟"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا..... لیکن میری شادی ارجمند سے بھی نہ ہو سکی۔" داجے فضل کا لہجہ درد سے بھر گیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولے۔ "میری اور ارجمند کی منگنی ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اس منگنی میں شاہنواز اور تمہاری دادی بھی آئی تھیں۔ شاہنواز کی عمر اس وقت بیس اکیس برس اور میری تیس کے قریب تھی۔ میرے اور ارجمند کے بیاہ کی تاریخ تین ماہ بعد کی مقرر ہوئی تھی۔ میں اور ارجمند یہ دن گن گن کر گزار رہے تھے۔ دوسری طرف افشاں اپنے مطالبے پر اڑی ہوئی تھی۔ ایک روز وہ زہر کی پڑیا لے کر میرے پاس آئی اور دھمکی دی کہ میری شادی کے دن وہ زہر کھا لے گی۔ اس بدبخت نے زہر تو نہیں کھایا مگر ایک کام اور ایسا کر دیا جس نے میری اور ارجمند کی ساری خوشیاں برباد کر کے رکھ دیں۔ اگلے روز میری برات تھی۔ دونوں گھروں میں تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ارجمند کے گھر میں بھی مہمان موجود تھے۔ ان میں افشاں بھی تھی۔ آدھی رات کے بعد وہ دیوار ٹاپ کر کسی طرح میرے کمرے میں گھس آئی۔ اس نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور مجھ سے غلط سلط باتیں کرنے لگی پھر اس نے اپنے بال کھول دیے، کپڑے پھاڑ دیے، اپنی گردن پر ناخنوں سے خراشیں ڈالیں اور شور مچا دیا۔ چند ہی منٹ میں دونوں گھروں میں کھلبلی مچ گئی۔ میں نے بہت

صفائیاں پیش کیں مگر کسی نے نہیں سنی۔ وہ بدبخت دہائی دے رہی تھی کہ میں نے دھوکے سے اسے بلا کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ چند ہی گھنٹے میں یہ بات اتنی بڑھی کہ میرے ہونے والے سسر نے بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ معاملہ اتنی تیزی سے بگڑا تھا کہ بات تھانے کچہری کے رخ پر چلی گئی تھی۔ میں دن چڑھنے سے پہلے حوالات میں بند ہو گیا۔ شادی کی ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ براتیوں کی خاطر تواضع کے لیے مٹھائیاں تک بنائی جا چکی تھیں، شامیانے لگ چکے تھے۔ ارجمند کی ماں پر بار بار غشی طاری ہو رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب تمہارے بابا شاہنواز نے ارجمند اور اس کے گھر والوں کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے ارجمند سے نکاح کی ہامی بھری۔ سب کچھ اس طرح آناً فاناً ہوا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جب دس بارہ روز بعد میرے بھائیوں نے سخت بھاگ دوڑ کر کے میری ضمانت کرائی اور میں گاؤں لوٹا تو ارجمند سرخاب منزل کی ہو چکی تھی۔"

قبرستان سے ملحقہ اس کمرے میں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔ بارش کے ساتھ اب ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ تاریک قبروں پر درختوں کے ہیولے جھوم رہے تھے۔ آخر صالح نے اس بوجھل خاموشی کو توڑا۔

"واجے! ماں جانتی تھی کہ آپ نے اسے دھوکا نہیں دیا؟"

"وہ مجھ پر شک کر ہی نہیں سکتی تھی صالح! ایک دوسرے کے پیار پر ہمارا ایمان تھا۔ آخر میں وہ بڑی حد تک افشاں کی خصلت سے بھی واقف ہو گئی تھی مگر آناً فاناً جو آندھی چل پڑی تھی، اس کا مقابلہ وہ اکیلی لڑکی کیسے کر سکتی تھی۔ اسے ماں باپ کی عزت کا پاس تھا۔ اسے شاہنواز کی ڈولی میں بیٹھنا ہی پڑا۔"

"اس کے بعد آپ کی اور بابا کی دوستی کا کیا ہوا؟"

"مجھے شاہنواز سے کوئی گلہ نہیں تھا صالح!" واجے فضل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاہنواز نے اس موقع پر جو کچھ کیا، ٹھیک ہی کیا۔ وہ ارجمند کے سر پر چادر نہ ڈالتا تو کیا پتا اس کے سخت مزاج ابا جی اس کا ہاتھ کس کو تھما دیتے۔ بے شک شاہنواز پہلے سے بھی شادی شدہ تھا مگر سرخاب منزل کی اور شاہنواز کی ایک اپنی شان تھی۔ اس کے بعد بھی میں اور شاہنواز ایک دوسرے سے ملتے رہے مگر پھر....."

فضل کریم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ آخر کچھ حوصلہ جمع کر کے گویا ہوئے۔ "پھر میں نے محسوس کیا کہ اب تمہارے بابا کو مجھ سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا۔ خاص طور سے جب میں سرخاب منزل آتا تو وہ گم صم ہو جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے زنان خانے سے باہر ہی نہیں نکلے۔ میں سمجھ گیا کہ اب ہماری دوستی پہلے والی صورت میں برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس کے بعد ارجمند کی زندگی میں، میں کبھی سرخاب منزل میں نہیں آیا..... کبھی نہیں....."

"کیا آپ نے ان کو..... میرا مطلب ہے کہ..... میری والدہ کو بھی پھر نہیں دیکھا؟"

ان کی آنکھوں میں نمی چمک گئی، بولے۔ "بس ایک مرتبہ ایک شادی پر اتفاقاً ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس وقت تم اس کی گود میں تھے۔ شاید ایک سال عمر ہو گی تمہاری۔ میں تمہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ہو بہو تمہارے نقش اپنی ماں پر گئے تھے۔" وہ جیسے ماضی کے اس منظر میں کھو گئے۔

"اس خبیث کا کیا بنا واجے؟" صالح کا اشارہ افشاں کی طرف تھا۔

"تین چار سال بعد اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کارپینٹر خاوند کے ساتھ مسقط چلی گئی تھی۔"

"اور آپ..... آپ نے کب شادی کی؟"

واجے نے آہ بھری۔ "وہ بھی شادی کہاں تھی۔ ایک بہت کڑی اور تلخ مجبوری تھی۔ میری والدہ بستر سے لگی ہوئی تھیں۔ ان کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے میرے سر پر سہرا دیکھیں۔ وہ سہرا دیکھ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں لیکن ان کے بعد میرا قریباً ایک سال سخت عذاب میں گزرا۔ شاید ایک دن کے لیے بھی ہم میاں بیوی کی بن نہ پائی۔ وہ بہت زبان دراز تھی۔ بالآخر طلاق ہو گئی۔"

"اور وہ ایکسیڈنٹ جس میں میری ماں دنیا سے چلی گئی اور میری چھوٹی بہن بھی؟" صالح نے کہا۔

"میں اس وقت کراچی میں تھا۔ بہت رویا تھا۔ بہت دل چاہا تھا کہ ایک آخری بار ارجمند کا چہرہ دیکھ لوں مگر میں جانتا تھا کہ شاہنواز کو یہ بھی گوارا نہ ہو گا لہٰذا میں نہیں آیا۔ میں اس وقت آیا جب اسے دنیا سے گئے آدھا سال گزر چکا تھا۔ میں شاہنواز کے گلے لگ کر بہت رویا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ شاہنواز! اب تو تمہیں میرے سرخاب منزل آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا؟ اب میں دربدر بھٹکنا نہیں چاہتا۔ یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس۔ اس کا دل بھی پسیج گیا تھا۔" چند لمحے توقف کر کے واجے نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "صالح! مجھے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں زندگی میں اس سے مل نہ سکا لیکن مرنے کے بعد تو وہ میرے قریب ہی ہے نا۔ وہ دیکھو..... وہ سامنے مٹی اوڑھ کر لیٹی ہوئی ہے

وہاں۔ میں جب چاہوں اس کے پاس آجاتا ہوں۔ اس سے باتیں کرلیتا ہوں۔ وہ دیکھو، وہ سامنے جو دھریک کا درخت ہے، بیس بائیس سال پہلے میں نے ہی لگایا تھا۔ دیکھ رہے ہو کتنا بڑا ہو چکا ہے۔ بہار کے موسم میں جب اس پر بالکل چھوٹے چھوٹے پھول لگتے ہیں تو ان میں سے مجھے گئے دنوں کی خوشبو آتی ہے..... اور پھر..... اور پھر تم بھی تو ہو یہاں۔ تم اپنی ماں کا چہرہ لے کر دنیا میں آئے تھے اور یہ چہرہ بھی ہر وقت میرے آس پاس ہی رہا ہے۔ میں بچپن میں جب تمہیں چومتا تھا تو تمہارے منہ سے مجھے اس کی مہک آتی تھی۔ تمہاری آنکھوں میں، میں اسے مسکراتا دیکھتا تھا، تمہاری شوخیوں میں مجھے اس کے رنگ نظر آتے تھے۔ بہت اچھی گزرتی رہی ہے صالح..... بہت اچھی۔ اب یہ آخری دن بھی ان شاء اللہ کٹ ہی جائیں گے۔"

وہ سفید صافے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔ "بس ایک ہی دکھ ہے صالح! تم..... تم....." وہ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کرسکے اور جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جارہے ہو دادے؟"

"وہیں مزار پر۔ تہجد کا وقت ہونے والا ہے۔"

"گھر نہیں چلیں گے؟"

"نہیں..... اب نہیں۔"

صالح نے بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دور ہو کر بھی تو سرخاب منزل کے پاس ہی ہیں۔

پھر صالح بھی سمجھ گیا کہ اصرار فضول ہے۔ سرخاب منزل جو رنگ اختیار کرچکی تھی، دادے فضل وہاں داخل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

موسم گرما کی تپش بڑھتی چلی گئی۔ اس کے بعد آندھیاں آئیں پھر ساون کی جھڑیاں شروع ہوگئیں۔ بالآخر درختوں سے پتے گرنے کا موسم آگیا۔ سرخاب منزل میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جارہے تھے۔ لہو و لعب زوروں پر تھا۔ ویک اینڈ پر شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی اور جس کا دیو تو ہر وقت ہی آزاد رہتا تھا۔ صالح یہاں کا بدمست راج کمار تھا۔ وہ سرکاری سانڈ کی طرح سرخاب منزل کی آراستہ راہداریوں میں چکراتا تھا۔ کچھ پتا نہیں ہوتا تھا کس وقت کس "کیئر" پر اس کا دل آجائے اور وہ اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے جائے۔ روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ اور تو اور، صالح کا کارندۂ خاص اختر ابھی اب ٹویوٹا کار میں گھومتا تھا۔ منیجر افراسیاب کے اختیارات وسیع ہو چکے تھے۔ کراچی والا خیام نت نئے چاند سرخاب منزل میں اتارتا رہتا تھا۔

دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ اپنے من پسند دوستوں کے جھرمٹ میں صالح زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے لیکن یہ صالح ہی جانتا تھا کہ وہ اندر سے کتنا خالی ہوتا جارہا ہے۔ جس طرح اب دو چار پیگ اس کے لیے بیکار تھے اور آدھی بوتل چڑھانے سے ہی نشہ ہوتا تھا، اسی طرح بیڈ روم میں بھی اسے خاص الخاص حسن ہی درکار ہوتا تھا اور اس حسن کی کشش بھی دو چار شب سے زیادہ برقرار نہ رہتی تھی۔ اس کی دماغی صحت بھی ایسی اچھی نہیں تھی۔ کسی وقت غیر مرئی آوازیں کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ کبھی ہلکا سا شور بھی دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستا تھا۔ وہ ملازموں پر بے وجہ چلانا شروع کردیتا۔ تنہائی میں پارہ چڑھتا تو کسی وقت اپنے منہ پر بھی ایک دو تھپڑ جڑ دیتا تھا۔

وکی اور صالح کے کارندوں میں دو تین بار ٹکراؤ ہو چکا تھا البتہ دونوں ابھی دوبارہ براہ راست ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے تھے۔ وکی قتل کا کیس بھگت رہا تھا اور صالح کو ڈینگی لڑکی گوگی والا کیس جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ لیک ویڈیو کی وجہ سے یہ کیس کافی سخت ہو چکا تھا۔ کسی وقت تو صالح جھلا کر سوچتا کہ اس لڑکی اور اس کے سہانی ہمنواؤں کو قتل ہی کرڈالتا اور پھانسی پر چڑھ جاتا۔

سالم دنبے کے پیٹ میں چاول ڈال کر جو ڈش تیار کی جاتی ہے، وہ صالح کی پسندیدہ ڈش میں سے تھی۔ ایک رات اس نے جی بھر کر کھایا اور جی بھر کر پی۔ اپنی گرتی صحت کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ لڑکھڑاتا ہوا سا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور ٹن ہونے کے سبب دھڑام سے قالین پر گر پڑا۔ آج وہ جس تتلی کے پر نوچنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس تتلی نے بہ مشکل کھینچ تان کر اسے بیڈ تک پہنچایا۔ نشے کے سبب وہ بار بار پتلی ہلے رہا تھا پھر اس نے چت لیٹے لیٹے کروٹ لی اور گہری غنودگی میں چلا گیا۔ لڑکی نے حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی۔ تولیے سے اس کا سینہ صاف کیا اور منہ لپیٹ کر صوفے پر سو گئی۔

صالح کی داستان پستیوں کی انتہا کی طرف جارہی تھی مگر داستانوں میں کچھ غیر متوقع موڑ بھی آتے ہیں۔ ان موڑوں کو اپنے وقت پر بہر صورت آنا ہوتا ہے۔ آپس میں جڑے لوگوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ نکل آتا ہے اور کبھی بہت دور نظر آنے والے لوگوں کے درمیان رشتے کی باریک سی ڈور بندھی رہتی ہے۔ یہ نازک ڈور فولادی

بندھنوں سے بڑھ کر مضبوط ہوتی ہے۔ برف کے کروڑوں ٹن وزنی گلیشیئر اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے دھوپ کی ایک کرن کے منتظر ہوتے ہیں اور صدیوں سے منتظر ویران راستوں پر اچانک ایک گمشدہ چاپ نمودار ہوجاتی ہے۔

اس صبح اپنے چکرائے ہوئے بھاری سر کے ساتھ صالح بستر سے اٹھا تو سامنے صوفے پر آفرین بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ اسے یہی لگا کہ یہ رات والی لڑکی ہے اور اس کا چکرایا ہوا دماغ اس لڑکی کے بجائے اسے آفرین دکھا رہا ہے۔

وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں کو بند کرکے دوبارہ کھولا۔ منظر برقرار رہا۔ وہ آفرین ہی تھی۔ صالح کی حالتِ زار دیکھ کر اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں پر آنسو جھلملانے لگے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے چلے گئے۔ صالح جیسے ہواؤں میں معلق تھا۔ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اچانک ایک ایسی بات ہوئی جو صالح کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔ بغیر کسی آغاز کے..... بغیر کسی تمہید کے آفرین نے بہت عجیب لہجے میں کہا۔ ''صالح! مجھ سے شادی کرو گے؟''

گردشِ دوراں تھم سی گئی۔

کتنی ہی دیر بعد صالح خود کو بہ مشکل سنبھال سکا۔ متحیر لہجے میں بولا۔ ''آفرین.....! تم کب آئی ہو؟''

''رات کو..... تم اس وقت سو رہے تھے۔'' پھر اس نے ایک گہری سانس بھری اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے؟''

''میرا..... دماغ گھوم رہا ہے۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیا تم مذاق کر رہی ہو..... اور.....''

''مذاق نہیں کر رہی۔'' آفرین نے اٹک اٹک کر لہجے میں اس کی بات کاٹی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ انداز فیصلہ کن تھا۔

صالح نے گھبرا کر اپنا سر جھکایا اور دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ بار بار یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا کوئی واہمہ۔

کچھ دیر بعد اسے اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

صالح نے واش روم میں گھس کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا پھر اپنا لباس درست کرتا ہوا باہر آیا۔ نشست گاہ میں پھپھو عاصمہ موجود تھیں۔ آفرین بھی ان کے پاس بیٹھی تھی۔ ماماں بی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ ملازمہ صادقہ مؤدب انداز میں پاس کھڑی تھی۔ صالح کو دیکھ کر پھپھو اٹھیں اور اس کے گلے لگ کر رونے لگیں۔

''آپ نے آنے کی کوئی اطلاع ہی نہیں دی۔'' صالح نے پوچھا۔

''بس بیٹے! آخری وقت تک پتا نہیں تھا کہ فلائٹ پکڑ سکیں گے یا نہیں۔ فرحان بھی آنا چاہ رہا تھا مگر وہاں کیپ ٹاؤن میں تو فلائٹوں کے حالات ابھی تک خراب ہیں۔''

پھپھو عاصمہ سب سے پہلے بھائی کی قبر پر پہنچی تھیں۔ آفرین بھی ساتھ تھی۔ کافی دیر وہاں بیٹھی روتی رہیں پھر بھائی کے ایصالِ ثواب کے لیے بڑی مسجد میں قرآن خوانی کا وسیع انتظام کروایا۔

☆☆☆

یہ تیسری رات کا ذکر ہے۔ آفرین اور اس کی ممی سرخاب منزل کے کمرے میں موجود تھیں۔ یہ وہی کمرا تھا جس کی ایک کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ بچپن کے سہانے دنوں میں یہ کھڑکی آفرین اور صالح کے ملنے کا ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ گلاب اور گل داؤدی کی خوشبو پوری سرخاب منزل میں چکرایا کرتی تھی اور کسی وقت اسی خوشبو کے جھونکے کی طرح صالح کھڑکی سے کود کر کمرے میں آجایا کرتا تھا۔

آفرین نے ممی عاصمہ کے دونوں ہاتھ تھام رکھے تھے۔ وہ بے حد آزردہ لہجے میں بولیں۔ ''آفری! میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آرہیں اور یہاں آکر تو بالکل ہی نہیں آرہیں۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ سرخاب منزل کتنی بدل چکی ہے اور صالح بھی کتنا بدل چکا ہے۔''

''ممی! آپ نے تو ہمیشہ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھا ہے۔ اب ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟''

''اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اب یہ صالح مجھے پہلے والا صالح نظر ہی نہیں آتا۔ میں دوپہر کو ہی دیکھ کر آئی ہوں۔ مہمان خانے کے ساتھ والا جو بڑا ہال تھا، وہاں باقاعدہ بار بنا ہوا ہے۔ شراب کی بوتلیں سجی ہوئی ہیں، ڈانس والا چبوترا ہے۔ رات دن ناچ گانا ہوتا ہے یہاں..... یہ بتاتے ہوئے میرا دل کانپ رہا ہے کہ اس وقت بھی صالح کی دو تین رکھیلیں یہاں سرخاب منزل میں موجود ہیں۔ پتا نہیں فضل کریم نے بھی ان سارے معاملات سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔''

''ممی! راجے فضل اب حویلی میں رہتے ہی نہیں۔ وہ کافی عرصہ پہلے مزار پر شفٹ ہوگئے ہیں اور باقی جو باتیں

آپ مجھے بتا رہی ہیں، وہ سب مجھے بھی معلوم ہیں۔"

"اور اس کے باوجود تم یہ بات کہہ رہی ہو؟"

"ہاں ممی! اس کے باوجود کہہ رہی ہوں۔" وہ عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "اسے سنبھالنے کے لیے کسی کو تو آگے بڑھنا پڑے گا..... ورنہ..... یہ جو دلدل ہے نا ممی! یہ اسے نگل جائے گی۔"

"لیکن اگر اس دلدل نے تمہیں نگل لیا تو؟" وہ آنسو گرانے لگیں۔

"پتا نہیں کیوں ممی! مجھے لگتا ہے کہ اگر کوئی اسے سنبھال سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔"

"آفری! مرد جب ایسے بگڑ جاتا ہے تو پھر اسے سنبھالنا آسان نہیں رہتا۔"

"ممی! جو خدشے آپ ظاہر کر رہی ہیں، وہ میرے ذہن میں بھی ہیں لیکن میں اس راستے پر قدم تب ہی رکھوں گی جب ان خدشوں کا سدباب کرلوں گی۔"

انہوں نے الجھن زدہ انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا پھر آفرین کو دیکھ کر بولیں۔ "اور تمہارے ڈیڈی..... جو کچھ یہاں آکر ہم نے دیکھا ہے، جب ان کو معلوم ہوگا تو وہ کیا اس رشتے پر مان جائیں گے؟ نہیں آفری..... کبھی نہیں۔"

اس نے ماں کے سر کو بوسہ دیا۔ "ممی! آپ اپنی بیٹی پر بھروسا رکھیں۔ میں نے کہا ہے نا کہ میں اس راستے پر تب ہی قدم رکھوں گی جب ہمارے سارے خدشے دور ہو جائیں گے۔ صالح کو میری کچھ شرطیں ماننا پڑیں گی اور مجھے یقین ہے ممی، وہ ضرور مانے گا۔ میرا دل کہتا ہے وہ مانے گا۔"

"..... اور وہاں وہ ایاز شیرازی.....؟ اسے تو اب بھی امید ہے۔ اس کے دل پر کیا گزرے گی؟"

"ممی..... ممی! آپ کو کئی بار بتا چکی ہوں، وہ بہت کچھ سمجھ چکا ہے اور وہ بہت کھلے دل کا مالک ہے۔ حقیقت پسند شخص ہے۔ آپ دیکھ لینا، آپ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے بارے میں کوئی اچھی خبر سن لیں گی۔ اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

بیٹی کی دلیلیں عاصمہ سن تو رہی تھیں مگر چہرے سے عیاں تھا کہ اندیشوں نے بدستور ان کو گھیر رکھا ہے۔ انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کیا پتا وہ وقتی طور پر تیری باتیں مان بھی لے۔ بعد میں پھر یہ ڈگر اپنا لے..... اور پھر....." وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔ چند سیکنڈ بعد شال کے پلو سے آنسو پونچھ کر بولیں۔ "اور تمہیں ہمارے رائے خاندان کا اچھی طرح پتا ہے آفری! یہاں کبھی کسی مرد نے ایک شادی پر بس نہیں کی۔ پچھلی کئی نسلوں تک دیکھ لو۔ تین چار شادیاں تو تقریباً ہر ایک نے کی ہیں..... اور کچھ اس معاملے میں بہت آگے تک گئے ہیں۔ اگر کل کلاں تم پر....."

"پلیز ممی.....! آپ اپنی بیٹی پر اعتماد رکھیں۔ وہ کوئی قدم ایسا نہیں اٹھائے گی جو آپ کو اب یا بعد میں رنجیدہ کرے۔ بس آپ سے ایک درخواست ہے..... فی الحال ڈیڈی کو یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ نہ بتایئے گا۔"

وہ کچھ نہیں بولیں، بس آنکھوں سے اندیشوں کے موتی گراتی رہیں۔ آفرین نے ایک بار پھر ان کا سر چوما اور کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگئی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ حویلی کے در و بام پر ڈالی۔ نئی تعمیرات کے بعد حویلی کافی بدل چکی تھی اور جو کچھ حویلی کے "ماحول" میں بدلا تھا، وہ ناقابلِ یقین اور نہایت تکلیف دہ تھا۔ آفرین کے دل کی گہرائیوں سے کہیں یہ آواز ابھر رہی تھی۔ "آفرین..... وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہے..... ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی اسے پھر سے جوڑ سکتا ہے یا جوڑنے کی امید رکھ سکتا ہے تو وہ تم ہو..... صرف تم ہو۔" چند ماہ پہلے جب صالح خاموشی سے پیرس چھوڑ کر آگیا تھا، آفرین ہفتوں گم صم رہی تھی پھر اس کے دل کی گہرائی میں کچھ چل پڑا تھا۔ کچھ فیصلے ہونے لگے تھے۔ اس نے ایاز سے بھی کچھ چھپایا نہیں تھا۔ اسے یہاں پاکستان میں صالح کے دگرگوں حالات کا کچھ کچھ علم بھی ہوگیا تھا بلکہ اس وائرل ویڈیو کا بھی پتا چلا تھا جس میں صالح نے ایک سرکاری ملازم لڑکی کے کپڑے پھاڑے تھے اور بُری طرح پیٹا تھا۔ یہ ویڈیو اس کی ممی نے بھی دیکھی تھی لیکن یہ ویڈیو چونکہ کئی برس پرانی تھی اور صالح نے جو کچھ کیا، وہ شدید غصے کے عالم میں کیا لہٰذا اسے نظر انداز کیے جانے کی گنجائش نکلتی تھی..... پھر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ویڈیو کو زیادہ سنسنی خیز بنانے کے لیے اس میں ٹیمپرنگ بھی کی گئی ہے۔

پھر یوں ہوا تھا کہ وہ کچھ عجیب ارادوں کے ساتھ ممی سمیت یہاں سرخاب منزل آئی تھی۔ یہاں سرخاب منزل کی صورتِ حال دیکھ کر وہ بھی ممی کی طرح چونکی تھی مگر جو ارادے وہ کر چکی تھی، وہ متزلزل نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

آفرین اور صالح بند کمرے میں موجود تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر تاریکی کے ساتھ ہلکی سی دھند تھی اور زرد پتوں کے زمین پر گرنے کی مدھم سی صدا وہ کرسنائی دیتی تھی۔

آفرین سکڑی سمٹی ہوئی سی صوفے پر بیٹھی تھی۔ صالح قالین پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنا سر آفرین کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

''آفرین! جو روشنی تم نے مجھے دکھائی ہے، اسے دکھا کر پھر اندھیرا نہ کر دینا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے آفری..... اور اب نہیں، ہمیشہ سے گواہی دیتا رہا ہے..... اگر کوئی مجھے ان اندھیروں سے نکال سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ صرف تم ہو۔ پلیز، مجھ پر رحم کرو۔''

آفرین نے ایک بار پھر صالح کا سر اپنے گھٹنے سے اٹھانے کی ناکام کوشش کی پھر بولی۔ ''میں نے کہا ہے نا صالح! مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے ہوگا۔ میری بس کچھ شرطیں ہیں۔''

''آفری! میری محبت کی توہین نہ کرو۔ تمہیں پالینے کے بدلے مجھے تمہاری ہر شرط بغیر سنے منظور ہے۔''

''مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں دو ٹوک بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم کہو آفری! میں سن رہا ہوں اور سننے سے پہلے ہی انہیں قبول بھی کر رہا ہوں۔'' اس نے آفرین کے مرمریں ہاتھ کو بوسہ دیا۔

''پہلے اٹھ کر میرے ساتھ بیٹھو صالح!'' آفرین نے اس کا سر اپنے زانو سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی۔

اس بند کمرے میں اگلے آدھ پون گھنٹے میں جو گفتگو ہوئی، وہ بہت اہم تھی۔ آفرین اپنا تن من سب کچھ اسے سونپنے کے لیے دل کی گہرائیوں سے تیار تھی مگر اس کے بدلے صالح کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو اور سرخاب منزل کو ہر طرح کی خرافات سے پاک کر دے۔ وہ شراب، عورت، نشے بازی اور ہر طرح کی دشمن داری کو صالح سے کوسوں دور دیکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس سے حتمی عہد لینا چاہتی تھی۔

صالح نے وہی کہا جس کا اظہار وہ پہلے کر چکا تھا۔ وہ بولا۔ ''کاش تم مجھے اس سے زیادہ بڑے کسی امتحان میں ڈالتیں۔ آفری! تمہاری محبت پانے کے عوض میں اس سے دس گنا زیادہ پابندیاں بخوشی اپنے اوپر لگا سکتا ہوں اور اپنی آخری سانس تک لگا سکتا ہوں۔ تم جو کہہ رہی ہو، مجھے منظور ہے اور جو اس کے بعد کہو گی، وہ بھی منظور ہے۔ بس اب مجھے اکیلا نہ چھوڑنا۔''

''تم بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ایک دو دن اور سوچ لو صالح! ہر پہلو پر غور کر لو۔ میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے بھی جو قربانی دینا پڑے گی، وہ میں دوں گی۔''

اگلے روز شام کو بے قراری کے ساتھ صالح اپنے کمرے میں چکرا رہا تھا۔ نگاہ بار بار گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ آفرین نے اسے کل شام تک سوچنے کا کہا تھا۔ وہ کیا سوچتا، وہ تو بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ کل کی شام کب ہوگی، آج کی رات کیسے کٹے گی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ شاید آفرین بھی اس محبت کی گہرائی سے پوری طرح آگاہ نہیں جو وہ اس کے لیے ایک مدت سے رکھتا ہے۔ وہ بس ایک بار اپنی زبان سے کہہ دیتی، وہ شاید اپنی جان بھی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے حوالے کر دیتا۔

اسے کچھ اور تو نہیں سوجھا، وہ ٹیبل لیمپ کے قریب بیٹھ گیا۔ ٹیبل لیمپ کا مخروطی کور ہٹایا، بلب آگ کی طرح گرم تھا۔ اس نے بلا تردد اپنی ہتھیلی زرد بلب پر رکھی اور وہ عہد دہرانا شروع کیا جو اس کی آفری نے اس سے مانگا تھا۔ وہ آگ پر حلف دے رہا تھا کہ وہ وہی کچھ کرے گا جو وہ کہہ رہی ہے اور وہ کچھ بھی کرے گا جو وہ آئندہ اس کو کرنے کا کہے گی۔ ہتھیلی جل رہی تھی، گوشت کی سڑاند آنا شروع ہو گئی تھی، جلد شیشے کے ساتھ چپک گئی تھی، چربی پگھلنے لگی تھی مگر تکلیف نہیں ہو رہی تھی یا شاید اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں موبائل فون تھا جس کا کیمرا اس منظر کو قید کر رہا تھا اور آواز بھی ریکارڈ کر رہا تھا۔

جب اس نے اپنا ہاتھ بلب سے پیچھے ہٹایا تو وہ بہ مشکل ہٹ پایا۔ ہتھیلی کی جلد کا کچھ حصہ وہیں چپکا رہ گیا تھا۔ شیشے پر لہو کی مہر تھی۔ اس سے مزید صبر نہیں ہو رہا تھا لہٰذا اس نے وہ ویڈیو کلپ رات کو ہی آفرین کو بھیج دیا۔

شام کو جب وہ آفرین سے ملنے مقررہ وقت پر اس کے کمرے میں پہنچا تو اس کے زخمی ہاتھ پر سفید بینڈیج تھی۔ آفرین کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔

''اس طرح کیوں کیا تم نے؟'' وہ دو قدم آگے بڑھی اور اس کا زخمی ہاتھ تھام لیا۔ اس کے دو آنسو ہاتھ کی سفید پٹی میں جذب ہو گئے پھر وہ ایک دم صالح کے گلے لگ گئی۔ صالح نے اب تک بے شمار نسوانی جسموں کو گلے سے لگایا تھا..... ان کو بھنبھوڑا تھا..... ان کے لمس سے لطف حاصل کیا تھا مگر اسے یوں لگا جیسے وہ آج تک ''قریب'' کو ہی سینے سے لگاتا رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے انسانی گوشت کو نہیں، ایک انسانی جسم کو اپنے گلے لگایا ہے۔ وہ ایک

خوشبودار، لطیف اور محبت بھرے گداز میں ڈوبتا چلا گیا۔ کسی نے اپنی جان جیسے اس کی جان میں داخل کر دی تھی۔ صالح کا دل اس بے مثل رخسار کو چومنے کے لیے مچل گیا جسے لمحوں پہلے وہ چومتے چومتے رہ گیا تھا۔ اس نے آفرین کا سر تھوڑا سا پیچھے ہٹایا، وہ بھی جیسے کسی فطری اصول کے تحت سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے اپنا منہ تھوڑا سا پھیر لیا۔ وہ بے داغ چمکیلا رخسار، وہ ناقابلِ فراموش رخسار صالح کے سامنے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے صدیوں سے جلتے بھٹکتے ہونٹ اس کے رخسار کی طرف بڑھاتا، کمرے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آپا ماماں بی آ رہی تھیں۔ آفرین شرما کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئی پھر بغلی دروازے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

آفرین اور اس کی ممی کو چودہ پندرہ دن پاکستان رکنا تھا مگر آفرین کو چوتھے روز ہی پیرس واپس جانا پڑ گیا۔ وہاں ایک بڑی تصویری نمائش جو کورونا کے سبب التوا کا شکار تھی، اچانک ہی اناؤنس ہو گئی تھی۔ آفرین کے لیے اس میں شرکت لازمی بلکہ لازمی سے بھی بڑھ کر تھی۔ پہلے تو پھپھو بھی جانے کو تیار ہو گئیں مگر پھر انہوں نے رکنے اور مقررہ وقت پر ہی جانے کا فیصلہ کیا۔

آفرین کے آناً فاناً روانہ ہو جانے سے صالح کچھ آزردہ تو ہوا مگر اس کی روانگی سے پہلے جو فیصلے ہوئے تھے اور جو خوش آئند انقلاب اس کی زندگی میں آیا تھا، وہ سب اسی کا تو حاصل تھا۔ اس نے صالح کو جیسے آناً فاناً پاتال سے نکال کر حقیقی خوشی و شادمانی کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی اندر ہوتی مسرت کا اظہار کرنے کے لیے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔

اگلے آٹھ دس روز میں سرخاب منزل کے اندر بڑی دور رس تبدیلیاں بڑی تیزی سے آئیں۔ صالح کے حکم پر ملازمین نے شراب کی بے شمار بوتلیں گٹر میں بہا دیں، ناچ گانے کے لوازمات حویلی سے نکال باہر کیے گئے، رقص گاہ توڑ ڈالی گئی۔ حویلی میں صالح اور پرنس شاہد بابڑا کی پانچ رکھیلیں موجود تھیں۔ ان میں سے شاہد کی دو رکھیلوں کو صالح نے شاہد کے پاس بھجوا دیا، باقی کو ان کا ''مختانہ'' اور معقول بخششیں دے کر رخصت کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ صالح نے فوراً کچھ ایسے سلسلے بھی سرخاب منزل میں دوبارہ شروع کرا دیے جو بابا جانی کی وفات کے بعد ختم کر دیے گئے تھے۔ ان میں روزانہ کا لنگر اور ہفتہ وار خیر خیرات کا سلسلہ بھی تھا۔

حویلی کے مکین بلکہ اردگرد کا سارا علاقہ ان خوشگوار تبدیلیوں پر انگشت بدنداں تھا۔ ماماں بی اس کی بلائیں لیتے نہیں تھکتی تھیں۔ ایک دن اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر صالح کا کندھا چومتے ہوئے کہا۔ ''صالح پتر! جب اتنا کچھ کر لیا ہے تو مزار پر جا اور اپنے دادے فضل کو بھی گھر واپس لے آ۔ دیکھ، وہ مہینوں سے وہاں ناراض ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔''

اسی روز رات کو صالح، سویرا سائیں کے مزار پر پہنچا۔ دادے فضل حسبِ معمول اپنے حجرے میں تھے۔ سفید براق کپڑوں اور سفید پگڑی میں وہ کسی برگزیدہ ہستی کی طرح نظر آتے تھے۔ ان کے گرد عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ وہ انہیں وعظ و نصیحت میں مصروف تھے۔ انہیں بتا رہے تھے کہ عشقِ مجازی کی اپنی رعنائیاں ہیں اور عشقِ حقیقی کی اپنی دلکشیاں..... وہ بڑے آسان الفاظ میں اپنے خیالات عام لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔

وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو صالح نے انہیں بتایا کہ حویلی میں اور خود اس کے اندر کیا کایا پلٹ ہوئی ہے۔ آخر میں صالح نے بڑے اصرار کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا اور ان سے کہا کہ وہ سرخاب منزل واپس چلیں۔ صالح کی ساری کوشش اور منت سماجت بیکار جاتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے سرخاب منزل میں آنے والی تبدیلیوں پر اطمینان اور خوشی کا اظہار تو کیا مگر واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

جب صالح ایک بچے کی طرح روٹھا ہوا نظر آنے لگا تو انہوں نے اس کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔ اس کا سر چوما۔ ''صالح! جہاں میں آ گیا ہوں، مجھے بہت کچھ ملا ہے۔ اب میں اسے گنوانا نہیں چاہتا۔''

تب صالح نے ایک عجیب بات کہی۔ ''..... اگر ماں زندہ ہوتی اور وہ اس بات کے لیے آپ سے میری سفارش کرتی تو بھی آپ انکار ہی کرتے؟''

ان کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ بند پلکوں کے نیچے موتی سے چمک گئے مگر بولے کچھ نہیں۔

وہ اٹھ کر جانے لگا تو ان کی آواز آئی۔ ''ٹھہرو۔''

وہ رک گیا۔ وہ بولے۔ ''تمہاری ضد کے لیے میں بس اتنا کر سکتا ہوں کہ ہفتے میں ایک روز کے لیے تمہارے پاس آ جایا کروں گا۔ اگلے روز فجر کی نماز واپس یہاں آ کر پڑھا کروں گا۔''

فی الوقت صالح نے یہی غنیمت جانا اور ان کی بات مان لی۔

☆☆☆

یہ گلابی جاڑا تھا۔ راتیں کہر آلود تھیں۔ ٹھٹھری ہوئی دوپہریں جلدی سے یخ بستہ شاموں میں ڈھل جاتی تھیں۔ بچپن اور لڑکپن کی سردیوں کی ساری یادیں تقریب یادیں امڈ کر آئی تھیں اور صالح کے دل و دماغ پر چھا گئی تھیں۔ آج کل وہ خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ لگتا تھا ذرا تیز قدم اٹھائے گا تو ہواؤں میں اڑنے لگے گا۔ ایک بچھڑی ہوئی انمول خوشبو کے جھونکے فضاؤں میں تیر کر اس تک پہنچنے لگے تھے۔ پھپھو عاصمہ پیرس واپس چلی گئی تھیں تاہم اب تقریباً روزانہ ہی پھپھو اور آفرین کے ساتھ ویڈیو لنک پر صالح کی بات ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اسی طرح پھوپا ماجد سے بھی بات ہو جاتی تھی۔ ان کا رویہ صالح کے ساتھ مثبت تھا لیکن بہت اچھا بھی نہیں تھا۔ درحقیقت کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر وائرل ہو جانے والی ویڈیو نے صالح کی ساکھ کو بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ گو وہ کئی سال پرانی تھی پھر بھی تھی تو صالح کی۔ یقیناً یہ آفرین اور پھپھو عاصمہ کی کوششیں ہی تھیں جن کے سبب صالح کے پھوپا ماجد کا لب و لہجہ بتدریج نرم ہوتا جا رہا تھا۔

..... پھر ایک روز داجے فضل کریم اور صالح کی بڑی پھپھو خدیجہ نے ویڈیو لنک پر آفرین کے ممی ڈیڈی سے طویل گفتگو کی اور آفرین کے ساتھ صالح کی منگنی کی تاریخ طے ہو گئی۔ پروگرام کے مطابق ٹھیک دو ہفتے بعد آفرین سمیت ان سب کو پاکستان آنا تھا اور منگنی کی تقریب ہونا تھی پھر باقیوں کو تو پیرس واپس چلے جانا تھا جبکہ پھوپا ماجد کو دو چار ہفتے یہیں رکنا تھا اور اس قریبی حویلی کی لوک پلک سنوارنا تھی جو وراثتی تقسیم کے تحت اب مکمل طور پر صالح کی پھپھو عاصمہ کی ملکیت تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ اپریل کے آخر تک شادی ہو گی اور صالح کی برات اس دوسری حویلی میں اترے گی۔ غالباً عاصمہ، ماجد وغیرہ کا پروگرام یہی تھا کہ آفرین کی شادی کے بعد وہ بھی کبھی پاکستان آیا کریں گے۔

..... اور آخر فروری کا وہ حسین و جمیل دن بھی آ ہی گیا جب ایک جگمگاتی شام میں سرخاب منزل دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ ہر ہر گوشے سے خوشی کی کرنیں پھوٹتی تھیں، رنگین آنچل لہراتے تھے اور پُرمسرت قہقہے رنگین فضاؤں میں گونجتے تھے۔ آفرین جھلملاتے گلابی سوٹ میں اتنی دلکش نظر آتی تھی کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ یہ سوٹ خالص پنجابی رنگ ڈھنگ کا تھا۔ لڑکیاں اسے مہندی لگانے کی تیاری کر رہی تھیں جب صالح کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور لڑکیوں سے اجازت لے کر آفرین کو اپنے پاس بلایا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔ بڑے جذب سے اسے سرتاپا دیکھنے لگا۔

وہ فرانس پلٹ لڑکی کے بجائے سکہ بند پنجابی مٹیار نظر آتی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ”اب تو تم سمجھ گئے ہو گے کہ مجھے مکھن کا پیڑا، ساگ اور چاٹی کی لسی یاد ہیں۔ گلاب والی ریوڑیاں، مونگ پھلی، باداموں والا گڑ اور لحاف میں بیٹھ کر سنی جانے والی کہانیاں بھی مجھے نہیں بھولیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو..... لیکن ایک زیادتی تم کرنے جا رہی تھیں۔“

”ہائے..... وہ کیا؟“

”مہندی لگوانے لگی تھیں۔ کیا اس مہندی کو بھول گئی ہو جو ایک الماری میں پڑی برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ کئی موسم بدلے، کئی عیدیں آئیں اور گئیں۔ یہ مہندی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔“ اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی مہندی کی اسپیشل کونیں آفرین کے سامنے کر دیں۔

”آج کوئی اور نہیں، میں تمہیں مہندی لگاؤں گا اور اپنے ہاتھ سے لگاؤں گا۔“

آفرین کی آنکھوں میں آنسو مسکرانے لگے پھر ہولے سے بولی۔ ”بس مہندی ہی تھی یا کچھ اور بھی تھا؟“

”اور کیا تھا..... مہندی ہی تھی..... اور دیکھو کتنی احتیاط سے سنبھالی ہوئی تھی۔“

”اور کچھ نہیں تھا؟“

”نہیں تو۔“ وہ ذرا حیرت سے بولا۔

”اور تم کہہ رہے ہو کہ میں بھول گئی ہوں۔“ وہ ذرا افسردہ نظر آئی۔

صالح نے اپنی پھولی ہوئی جیکٹ کے اندر سے چوڑیوں والا خوشنما ڈبا نکالا اور مسکرا دیا۔ ”کیسے بھول سکتا ہوں۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا..... چلو، آگے کرو اپنی کلائی۔“

”نہیں صالح! یہ ٹھیک نہیں۔“ وہ شرمائی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ بس دو منٹ لگیں گے۔“ اس نے کلائی تھامی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ دروازے کے عقب سے لڑکیوں نے کورس کی شکل میں کہا۔ ”بس دو منٹ لگیں گے۔ ہم نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔“

آفرین سرخ ہو کر دوسرے کمرے کی طرف نکل گئی۔

منگنی کی تقریب بڑی شاندار اور باوقار تھی۔ صالح

کے دادے فضل اور بڑی پھپھو خدیجہ نے صالح کے سرپرستوں کا کردار ادا کیا تھا۔ اس خوشی کے موقع پر خوب خیر خیرات کی گئی۔ دادے فضل کی خواہش کے مطابق صالح نے قریباً دو ایکڑ زمین مزار اور ملحقہ مسجد کے لیے وقف کی۔ منگنی کے بعد صرف چھ سات روز ہی آفرین کو پاکستان میں رکنا تھا۔ پچھلی ملاقات میں تو آفرین کے ساتھ اس کی روبانی ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ آفرین کے بے مثل ریشمی رخسار اور صالح کے جلتے ہونٹوں کے درمیان بس ایک سانس کا فاصلہ تھا کہ ماماں بی کی مداخلت ہوگئی تھی۔ اب ''بعد از منگنی'' صالح بہرصورت وہ ادھورا بوسہ مکمل کرنا چاہتا تھا مگر خدا کی کرنی کیا ہوئی کہ یہ چھوٹی سی دیرینہ خواہش پھر پوری نہ ہو پائی۔

منگنی کے دوسرے روز صبح سویرے صالح کو ہلکا بخار اور گلے میں درد محسوس ہوا۔ ماماں بی چونک گئیں۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کھوکھر کو بلا بھیجا۔ منگنی کی تقریبات میں بہت احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں۔ تقریب کو محدود رکھا گیا تھا۔ سب نے ماسک وغیرہ لگائے تھے۔

ڈاکٹر کھوکھر نے علامات دیکھ کر ہی بتادیا کہ کورونا ہے۔ کورونا نے ہر جگہ پر پھیلا رکھے تھے۔ سرخاب منزل میں ہر ہفتے ایک دو کو مرض کی شکایت ہوجاتی تھی۔ ہیڈ خادمہ صادقہ کئی روز اسپتال میں بھی رہی تھی۔

صالح کے ٹیسٹ کے بعد پتا چلا کہ علامات زیادہ شدید نہیں مگر احتیاط ضروری ہے۔ اس احتیاط نے صالح کو تڑپا کر رکھ دیا۔ آفرین آس پاس موجود تھی مگر وہ اس کے قریب جانے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ بھی جتنے دن سرخاب منزل میں رہی، صالح کی طرف سے ازحد فکرمند رہی۔ پانچویں چھٹے دن صالح کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوگئی مگر تب تک آفرین، پھپھو عاصمہ اور فرحان واپسی کا سامان باندھ چکے تھے۔ صالح کو دادے فضل کی کہی ہوئی ایک پرانی بات یاد آنے لگی..... ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ ساری دنیا مل کر بھی اس وقت میں ایک پل کی کمی بیشی نہیں کرسکتی۔

☆☆☆

دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ صالح کے لیے ایک ایک دن کاٹنا مشکل تھا۔ اس کے پھوپا ماجد قریبی حویلی جس کو چھوٹی حویلی بھی کہا جاتا تھا، کی تزئین و آرائش شروع کروا کر واپس پیرس جاچکے تھے۔ اب انہیں باقی فیملی کے ساتھ شادی سے دو ہفتے قبل ہی واپس پاکستان آنا تھا۔

ادھر سرگودھا میں وقار وکی کو بھی آفرین اور صالح کی منگنی کا علم ہوچکا تھا۔ جب تک آفرین پاکستان میں رہی تھی، صالح کو اپنے اس خطرناک رقیب کی طرف سے خطرہ ہی رہا تھا۔ خود آفرین بھی یہ خطرہ محسوس کرتی رہی تھی۔ بہرحال خیریت گزری تھی البتہ خطرے کے یہ احساسات کلی طور پر غلط نہیں تھے۔ منگنی کے بعد اوپر تلے دو واقعات ایسے ہوئے جن سے پتا چلا کہ دشمنی اور رقابت کی آگ سینوں میں مسلسل سلگ رہی ہے۔ پہلے تو قریبی گاؤں کے ایک میلے میں صالح کے دست راست اختر اور وکی کے بیچ جالے نوری کے درمیان زوردار ٹاکرا ہوا۔ جالے نوری کے ساتھ ایک اور کن ٹٹا بھی تھا مگر اختر نے دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جالے نوری کو تو اچھی خاصی چوٹیں آئیں۔ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ایک دو شدید ضربات ایسی جگہ پر بھی آئیں جس سے ''امید'' پیدا ہوچلی کہ اب وہ خانہ بدوش محبوبہ شانو سے تعلقات استوار نہ رکھ پائے گا۔ دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے پر کیس کردیا۔

دوسرا واقعہ زیادہ سنگین تھا۔ صالح سرگودھا میں اپنے لکڑی کے گودام کا معائنہ کرنے کے لیے لینڈ کروزر پر جارہا تھا۔ منیجر افراسیاب کے علاوہ ایک گن مین بھی تھا۔ ڈرائیونگ اختر کررہا تھا۔ واپسی پر شام گہری ہوگئی۔ وہ ایک چھوٹی سڑک سے گزر رہے تھے جب رکنا پڑا۔ سڑک پر درخت گرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، اطراف کے درختوں سے چار پانچ ڈھاٹا پوش افراد گاڑی پر جھپٹے۔ اس موقع پر اختر نے کمال حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں ہی بڑی چابکدستی سے بھگاتا چلا گیا۔ ڈھاٹا پوشوں نے فائرنگ کردی۔ جواب میں صالح کا گن مین بھی اپنی اے کے 57 گن سے گولیاں چلانے لگا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی، صالح کی جانب والی کھڑکی بھی چکنا چور ہوگئی۔ صالح نے بھی اپنا پسٹل نکال کر چند فائر کیے۔ اختر نے ریورس میں بھاگتے بھاگتے اس مہارت سے بریک لگائے کہ جیپ کا رخ دوسری طرف ہوگیا۔ وہ جیپ دوڑا کر نکل جانے میں کامیاب ہوئے۔ اختر کی کوشش اس لیے بھی قابل تحسین تھی کہ فائرنگ شروع ہوتے ہی اسے پوری چار گولیاں لگ گئی تھیں۔ نہایت خوش قسمتی تھی کہ یہ چاروں گولیاں اس کے ایک بازو میں ہی لگی تھیں۔

اختر کو اسپتال ایڈمٹ کرنا پڑا۔ بظاہر یہ کارروائی ڈاکا زنی کی لگتی تھی مگر صالح کو پچانوے فیصد یقین

تھا کہ اس کے پیچھے جانی دشمن وقار وکی کا ہاتھ ہے۔ ایف آئی آر میں وقار وکی، اس کے باپ سیف اللہ اور جالے لوری کے علاوہ پانچ چھ مزید افراد نامزد کیے گئے۔ دونوں گھرانوں میں ایک اور کیس چل پڑا۔

صالح کے داجے فضل اب ان سارے معاملات سے الگ تھلگ ہو چکے تھے۔ وہ ہفتے میں صرف ایک روز کے لیے سرخاب منزل آتے۔ سب سے پہلے قبرستان میں فاتحہ خوانی کرتے، اس کے بعد صالح سے دیگر معاملوں پر مختصر گفتگو ہوتی۔ صالح کی شادی کی تیاری ایک ایسا موضوع تھا جس میں وہ واقعی دلچسپی محسوس کرتے تھے۔ شادی کی بات کرتے ہوئے ان کی نگاہیں بے ساختہ صالح کے چہرے پر جم جاتیں۔ وہ اس کے نقوش میں کسی کے نقوش تلاش کرتے۔ وہی جو ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں ان سے دور کر دی گئی تھی اور جس کی جدائی سینے سے لگا کر انہوں نے زندگی بتا دی تھی۔ صالح نے جب بھی اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا تھا، ان کی غلافی آنکھوں میں اسے ایک اداسی کی سی کیفیت کروٹ لیتی محسوس ہوئی تھی۔ اب اس کیفیت کی وجہ اس کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آ چکی تھی۔

شادی میں اب تقریباً ایک ماہ باقی تھا۔ سرخاب منزل کی ہلچل میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ہر گزرنے والا دن صالح کو آفرین سے قریب تر کر رہا تھا اور پھر ایک دن شام کو پیرس سے آنے والی ایک وائس ایپ کال بجلی بن کر گری۔ صالح کے پھوپا ماجد دنیا میں نہیں رہے تھے۔

چند روز پہلے ان کا کورونا ٹیسٹ مثبت آیا تھا۔ وہ سات آٹھ روز سے بیمار تھے پھر اچانک ان کی حالت بگڑی، انہیں اسپتال ایڈمٹ کیا گیا۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر سانس کی تکلیف اتنی بڑھی کہ ان کی جان لے گئی۔ وہی پھوپا ماجد جو چند ہفتے پہلے یہاں چھوٹی حویلی کی آرائش کروا رہے تھے اور بیٹی کے مستقبل کے سپنے دیکھ رہے تھے، منوں مٹی کے نیچے جا سوئے تھے۔

فضائی سروس پر بندشیں پھر بڑھ چکی تھیں لہٰذا صالح اور پھپھو خدیجہ وغیرہ شدید خواہش کے باوجود آخری رسومات میں شرکت نہ کر سکے۔ زندگی میں تکلیفیں اور خوشیاں ایسے ہی ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ سرخاب منزل بھی عین بہار کے موسم میں ایک بار پھر خزاں رسیدہ دکھائی دینے لگی۔

☆☆☆

وقت کا مرہم ہر تکلیف کی شدت کو کم کرتا ہے۔ صالح کے پھوپا ماجد کی ناگہانی وفات کو اب دو ڈھائی ماہ گزر چکے تھے۔ اس اثنا میں پھپھو عاصمہ بھی کورونا کا شکار ہوئی تھیں لیکن سنگین ترین صورت حال سے بچ گئی تھیں۔ بہت کوشش کے بعد صالح نے ایک فلائٹ پکڑی تھی اور غمزدہ فیملی کی ڈھارس بندھانے پیرس پہنچا۔ باپ کے صدمے سے آفرین اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی پھر بھی اس کے ہر وقت لودیتے رخسار ایک مستقل دھندلاہٹ تلے چلے گئے تھے۔ فرحان بھی ساؤتھ افریقا میں اپنا کام لپیٹ کر مستقل طور پر پیرس آ گیا تھا۔

چند دن ان کے پاس رہ کر اور دکھ بانٹ کر صالح واپس آ گیا۔ فی الوقت شادی وغیرہ کی بات کرنا قطعی بے محل تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ اب یہ معاملہ موسم سرما تک مؤخر ہو گیا ہے۔

☆☆☆

گرمیاں گزر گئیں اور پھر بارشوں کا موسم شروع ہو گیا۔ صالح کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی اداسی اور مایوسی کسی حد تک کم ہونے لگی۔ اب باغوں میں کوئل کوکتی تھی، درختوں پر جھولے ڈالے جا رہے تھے، پھول پتوں پر بادلوں کے کالے سائے لہراتے تھے اور سوکھی زمینوں پر پانی ٹوٹ کر برستا تھا۔ آج کل ہریالی نے سرخاب منزل کو چاروں طرف سے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کی پیداوار بڑی شاندار ہوئی تھی۔ داجے کی ہدایت پر صالح نے ٹوکریاں بھر بھر کر ارد گرد کے زمینداروں کو بھجوائی تھیں اور خوش آئند بات یہ تھی کہ اس مرتبہ بابڑوں کو بھی زبردست ''ڈالی'' بھجوائی گئی تھی اور وہاں سے بھی دوستانہ رویے کا اظہار ہوا تھا۔

کسی وقت موسم اچھا ہوتا تو دھیان بٹانے کے لیے صالح کرکٹ شروع کر دیتا۔ پرنس شاہد اور اس کے تین چار دوست بھی آ جاتے۔ وہ ان کے ساتھ سیمنٹ کی پچ پر کرکٹ کھیلتا۔ دو چار قریبی ملازم بھی اس کھیل میں شریک کر لیے جاتے۔ بیٹنگ سے بڑھ کر صالح کو ہمیشہ سے باؤلنگ کا شوق تھا اور وہ بھی تیز اور جارحانہ باؤلنگ۔ ایک دفعہ منیجر افراسیاب نے کہا تھا۔ ''صالح سرکار! اگر آپ کو چھوٹی عمر میں اچھا کوچ مل گیا ہوتا تو آپ چنگے بھلے باؤلر بن جاتے۔''

وہ سوچنے لگا کہ کوچ تو مجھے بڑا اچھا مل گیا تھا مگر وہ کرکٹ کا نہیں، بیڈمنٹن کا تھا۔

جو کچھ بھی تھا، آج کل وقت کی رفتار صالح کے لیے بہت سست ہو گئی تھی۔ لمبے اڑیل ٹٹوؤں کی طرح چل کر ہی نہیں دیتے تھے۔ کہاں یہ تھا کہ آفرین کو پانے کے لیے چار ہفتے نکالنا دشوار تھے اور کہاں یہ کہ مہینوں کا فاصلہ درمیان

میں آپڑا تھا۔ بہرطور اب اکثر فون پر یا ویڈیو لنک پر آفرین سے بلکی پھلکی گفتگو ہو جاتی تھی۔ کسی وقت وہ دونوں محبت کی بات بھی کر لیتے تھے۔ ویڈیو لنک پر وہ بولتی تو صالح بس اس کی صورت ہی دیکھتا رہتا مگر معاملہ اسی شعر جیسا تھا۔

ے جو بات تجھ میں ہے تیری تصویر میں نہیں

اسی دوران میں صالح کی سالگرہ بھی آئی اور آفرین نے اسے خوبصورت تحفہ پارسل کیا۔ یہ اسی کی بنائی ہوئی ایک انعام یافتہ پینٹنگ تھی جس میں بارش اور ہریالی کا منظر قید کیا گیا تھا۔ پس منظر میں گاؤں کے خدوخال تھے۔

..... ابر آلود راتوں کی تنہائی صالح کو بری طرح کاٹنے کو دوڑتی۔ اس کا بدن ٹوٹنے لگتا۔ پانی سے بوجھل ہوا کے جھونکے، جھینگروں اور مینڈکوں کی رک رک کر ابھرتی ہوئی آوازیں، باغ کی طرف سے پکے ہوئے آموں کی مہک۔ موسم کا رنگ اسے ساغر و مینا کی یاد دلاتا..... مگر شراب تو کیا، وہ سگریٹ تک چھوڑ چکا تھا۔ اس نے خود کو مکمل طور پر آفرین کے ساتھ کیے جانے والے عہد کا پابند کر لیا تھا۔ اپنی خواہشات کے آگے ایک ایسی مضبوط دیوار کھڑی کر دی تھی کہ اس کی اندرونی بے قراری سر ٹکرا ٹکرا کر ہار جاتی تھی مگر دیوار میں معمولی سی لرزش بھی نمودار نہ ہوتی تھی۔

ایک دن جب اس نے دو نوجوان ملازماؤں کو بارش میں جھولا جھولتے دیکھا اور اسے اپنے اندر کسی لہر کے سر پٹخنے کا احساس ہوا تو اس نے اگلے ہی روز وہ جھولے اتروا دیے اور ان دونوں لڑکیوں کو ان ملازماؤں میں شامل کر دیا جو مزار پر صفائی وغیرہ پر مامور تھیں۔

دو روز بعد کی بات ہے۔ صالح حویلی کے مردانے پورشن میں تھا۔ ساون کی تین روزہ جھڑی کے بعد آج چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ صالح اپنے آفس نما کمرے میں موجود تھا۔ اچھی گرمی محسوس ہو رہی تھی البتہ صالح نے اے سی نہیں چلوایا تھا۔ اس نے کھڑکیاں کھلوا کر پیڈسٹل فین چلوا دیا تھا۔ موسم برسات کی نم ہوا میں اسے پنکھا چلوانا بہت اچھا لگتا تھا۔ ململ کے ہلکے پھلکے کرتہ پاجامے میں وہ خود کو بہت ایزی محسوس کرنے لگتا تھا۔ کراچی اور لاہور کی برانچوں کا حساب کتاب دینے کے بعد منیجر افراسیاب باہر نکلا تو ایک ادھیڑ عمر خاتون اندر آ گئیں۔ ناف پر ہاتھ باندھ کر مؤدب انداز میں بولا۔ ''سرکار! ایک عورت سرگودھا سے آئی ہے۔ اس کی آواز بڑی اچھی ہے۔ کہتی ہے صوفیانہ کلام وغیرہ بھی گا سکتی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، بھیجو۔'' صالح نے کہا۔

چند منٹ بعد ایک چادر پوش عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر چادر کا ہی نقاب تھا، صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ عورت کو چھوڑ کر منشی باہر جا چکا تھا۔ صالح اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ کمرے میں تنہائی دیکھ کر عورت نے یکا یک اپنا نقاب سرکا دیا۔ صالح دنگ رہ گیا۔ یہ وہی نتاشا تھی جس نے گلوکاری کے شوق میں ایک ادھیڑ عمر موسیقار سے شادی کی، دھوکا کھایا اور طلاق یافتہ ہو کر جسم فروشی کی طرف مائل ہو گئی۔ اسے اپنی نومولود بیٹی بن کی پیدائش کو نہ پانے کا جنون تھا۔ نتاشا خاصی دبلی تھی مگر جب صالح نے اس کی بچی کا نام لیا تو وہ ایک دم روپوش ہو گئی تھی۔

آج نو دس ماہ بعد وہ پھر اس کے سامنے تھی۔ خوبصورت چہرہ تھوڑا سا کملا گیا تھا لیکن اب بھی کسی عورت باز کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔

وہ پلکیں جھکا کر آزردہ لہجے میں بولی۔ ''میری اتنی اوقات کہاں جی کہ صوفیانہ کلام پڑھ سکوں۔ سرتاپا گناہ میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ یہ تو بس آپ سے ملنے کا بہانہ تھا۔''

صالح خاموشی سے اس کے لرزتے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔

''معافی چاہتی ہوں کہ تب ایک دم آپ کو اطلاع دیے بغیر چلی گئی.....''

''اب کیا چاہتی ہو؟'' صالح نے اس کی بات کاٹی۔

چادر مکمل طور پر اس کے چہرے سے سرک چکی تھی۔ وہ گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ صالح کو لگا جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو..... اس وقت آپ مجھ سے اکتا گئے تھے، اب پھر اپنا آپ لے کر حاضر ہو گئی ہوں۔ وہ نروس انداز میں اپنی حنائی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔

صالح نے دل میں سوچا..... شاید اسے معلوم نہیں کہ ہم رائے حویلی کے مرد جب ایک بار کسی عورت کو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر اس کی طرف رخ نہیں کرتے اور اب تو ویسے بھی زندگی کی کتاب سے اس نے جنس پرستی کا ورق پھاڑ کر علیحدہ کر دیا ہے۔

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم نے یہاں آ کر صرف اپنا اور میرا وقت ضائع کیا ہے نتاشا! یہاں سے تمہیں اب کچھ نہیں ملے گا۔''

''میں..... اپنے لیے نہیں..... چھوٹی بہن عائزہ کے لیے آئی ہوں۔ وہ بھی..... ہم..... میرے ساتھ ہے۔ باہر انتظار گاہ میں بیٹھی ہے۔''

نتاشا نے جس لہجے میں بات کی تھی، اس نے صالح کا

دماغ بھک سے اڑا دیا۔ یقیناً وہ صالح کو یہ سمجھا رہی تھی کہ اس بار وہ خود کو نہیں بلکہ اپنی بہن کو پیش کرنے آئی ہے۔ وہی بہن جس کے ذکر پر پچھلی دفعہ وہ ایک دم حواس باختہ ہوگئی تھی اور مختلف بہانے بنانے شروع کر دیے تھے جن میں سے ایک بہانہ یہ بھی تھا کہ وہ ابھی چھوٹی ہے، نابالغ ہے۔ وہ تب پندرہ سولہ برس کی تھی اور لو دس ماہ میں بالغ تو نہیں ہوگئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ کیا مجبوری تھی جس کے سبب اس نے اپنے فیصلے پر نظرثانی کر لی تھی۔

''کیوں، اب کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

''ہم جیسوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے، کم ہی ہوتا ہے سرکار! میں تھک گئی ہوں جی۔ بالکل تھک گئی ہوں۔''

''تمہاری تھکاوٹ کا میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''اپنے پچھلے رویّے پر پھر معافی چاہتی ہوں۔ آپ جو کہیں گے، ہم کریں گے۔''

وہ ''ہم'' کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ دیگر لفظوں میں بتا رہی تھی کہ وہ اپنی بہن کو بھی نئی صورتِ حال کے لیے آمادہ کر چکی ہے۔

''میں اپنا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہارے رویّے میں یہ تبدیلی کیسے آئی ہے؟''

جواب میں رک رک کر نتاشا نے جو کچھ بتایا، اس کا لبِ لباب یہ تھا۔

صالح کے تقاضے کے بعد وہ اپنی بہن عائزہ کو لے کر سرگودھا سے نکل کر فیصل آباد پہنچ گئی تھی۔ خود کو اپنی مددگار خالہ سے بھی علیٰحدہ کر لیا تھا۔ وہاں اس نے ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور پھر وہی ''محنت مزدوری'' شروع کر دی تھی جو رات کے اندھیرے میں غیر مردوں کی ضرورت کے لیے کی جاتی ہے۔ اس نے کئی ماہ تک سر توڑ کوشش کی کہ عائزہ کے علاج کے لیے مطلوبہ رقم اکٹھی کر سکے مگر ہدف پورا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ رات کے بجائے صرف دن کے اوقات میں ''کام'' کرتی تھی۔ رات کے وقت وہ اپنی بہن کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ کچھ لوگوں کی مقروض بھی تھی۔ ایک دوپہر گھنٹا گھر کے قریب ان لوگوں نے اسے اتفاقاً دیکھ لیا اور اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں لے گئے۔ وہاں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نتاشا کے لیے جیسے روزمرہ کی مصروفیت تھی تاہم جب شام کو اس نے واپس جانا چاہا تو انہوں نے اس کے رکنے پر اصرار کیا۔ ان کے دو تین دوست بھی اس موج میلے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

دوسرے لفظوں میں وہ سارا قرضہ وصول کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جیسے تیسے نتاشا کو ان کے ساتھ رکنا پڑا۔

صبح سویرے جب وہ تھکی ہاری گھر واپس پہنچی تو ایک اور مصیبت اس کی منتظر تھی۔ گلی کے گارڈ نے رات کو گھر میں گھس کر عائزہ پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی۔ یعنی محافظ ہی غاصب بن گیا تھا۔ گارڈ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عائزہ گھر میں اکیلی ہے۔ اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد گارڈ نے چور مچائے شور والا رویّہ اپنایا۔ اس نے دو ہوائی فائر کیے اور محلے والوں کو بتایا کہ لڑکی نے گھر میں ایک غیر مرد کو گھسایا ہوا تھا جو بھاگ گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دوسری بہن بھی پیشہ کرنے کے لیے گھر سے گئی ہوئی ہے۔ محلے دار جو پہلے ہی شک کر رہے تھے، بالکل بھڑک گئے۔ انہوں نے محلہ چھوڑنے کے لیے انہیں صرف اڑتالیس گھنٹے کی مہلت دی۔ رات کو انہیں معلوم ہوا کہ گارڈ نے ایک اور الزام لگا دیا ہے۔ اس نے شک ظاہر کیا ہے کہ جو بندہ عائزہ نے گھر میں گھسایا ہوا تھا، وہ فلک شیر نام کا کوئی اشتہاری تھا۔ پولیس چھاپا مارنے کے لیے آنے والی تھی۔ خوفزدہ نتاشا، چھوٹی بہن کو لے کر رات کے اندھیرے میں وہاں سے نکل گئی۔ دونوں بہنیں آٹھ دس روز سرگودھا کے ہی ایک ہوٹل میں ٹھہری رہیں، معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑتا محسوس ہوا تو یہاں آ گئیں۔

نتاشا کی روداد میں کوئی خاص نئی بات نہیں تھی۔ گلی محلوں میں جو لڑکیاں اس طرح کے کام کرتی تھیں، ان کے ساتھ ایسے ہی معاملات پیش آتے تھے۔ صالح اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ کچھ دے دلا کر ان کو رخصت کر دے لیکن جب صالح نے یہ بات نتاشا سے کہی تو وہ رو دینے والی ہوگئی۔

''صالح سرکار! قربان علی نام کا ایس ایچ او ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ لوگ سرگودھا شہر میں ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ زیادہ نہیں تو ابھی پندرہ بیس روز آپ ہمیں اپنے پاس رہنے دیں پھر آپ جو کہیں گے، ہم کریں گے۔''

نتاشا نے اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک اخباری تراشہ نکال کر بھی صالح کو دکھایا۔ اس تراشے سے نتاشا کی باتوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔ کچھ سوچ بچار کے بعد صالح نے ہیڈ خادمہ صادقہ کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ان دونوں بہنوں کو چند روز کے لیے مہمان خانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا دے۔

☆☆☆

نتاشا اور اس کی بہن عائزہ کو سرخاب منزل میں آٹھ

دس روز گزر چکے تھے۔ اپنے بہی خواہ انسپکٹر امتیاز آغا کے ذریعے بھی صالح کو یہی معلوم ہوا تھا کہ نتاشا کی کہانی درست ہے۔ ان آٹھ دس دنوں میں نتاشا سے صرف دو بار ہی صالح کی سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ نتاشا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کی نگاہیں بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ نگاہیں جیسے کہتی تھیں۔ ''میں سمجھ چکی ہوں کہ انسانوں سے بھرے ہوئے اس جنگل میں، میں اپنی بہن کی دوشیزگی کو بچا نہیں سکوں گی اور جب یہ دوشیزگی لٹنی ہی ہے اور اس کے باوجود اس کو ناپنا ہی رہنا ہے تو پھر میں کیوں نہ کوئی فائدے کا سودا کروں۔''

اب صالح نے اس انداز سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کسی طرح اس کی بہن کا علاج کرا دے۔ جہاں تک دونوں بہنوں کے پیچھے پڑے پولیس والوں کا تعلق تھا تو وہ ان سے بھی دونوں بہنوں کا پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ ایک دو بار مہمان خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اتفاقاً عائزہ پر پڑی تھی۔ وہ اپنی تصویر سے بڑھ کر دلکش اور خواہش انگیز تھی۔

ایک رات دیر تک جوان خون صالح کے سر میں ٹھوکریں مارتا رہا۔ رگوں میں بچھڑے ہوئے نشاط انگیز لمحوں کی یادیں سرپٹ ڈاچیوں کی طرح دوڑتی رہیں۔ کسی وقت تو ایک دھندلی دماغ میں بھر جاتی۔ وہ سوچتا، رات کے اس سناٹے میں کون دیکھتا ہے۔ ادھ کھلی کلی جیسی وہ توبہ شکن لڑکی چند قدم کے فاصلے پر اپنے کمرے میں گداز بستر پر دراز ہے۔ اس کے ایک اشارے پر یہاں اس کے پاس پہنچ سکتی ہے۔

پھر اسے دیکھے شیشے پر رکھا ہوا اپنا ہاتھ یاد آتا اور وہ حلف یاد آتا جو اس نے آفرین کو دیا تھا۔ وہ بھٹکے ہوئے خیالات کو دھکے دے دے کر دماغ سے دفع دور کرتا اور دراز میں سے آفرین کی فریم شدہ تصویر نکال کر دیکھنے لگتا جیسے اس تصویر کو اپنے آتشیں خیالات اور سوئی پڑی زہد شکن لڑکی کے درمیان ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا ہو۔

نصف شب تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا لیکن پھر رگوں میں خون کی رفتار بڑھنے لگی۔ آفرین کی تصویر سامنے تھی مگر خود ابھی وہ بہت دور تھی اور جو نزدیک تھی، اتنی نزدیک کہ ایک قدم کی دیر تھی۔

وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ساون کی نم ہوا اس کے تپے ہوئے چہرے کو سہلانے لگی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر ایک درخت پر رسید کیں۔ ہاتھ چھل گئے، تکلیف نے آتش ناک خیالات کی تندی کو کم کیا۔

انسان

کبھی کبھار اچھے لوگوں سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ برے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی انسان ہیں۔

کہکشاں

☆ ستارے آسمان کی اور تعلیم یافتہ افراد زمین کی زینت ہیں۔

☆ علم کی پذیرائی اور سوچ کی گہرائی ہو تو کوئی سچا موتی ذہن کے دریچوں میں تخلیق ہو جاتا ہے۔

☆ فکر ہی سے فکر دور ہوتی ہے۔

☆ حریص کی آنکھوں کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

☆ آگے بڑھنے کے لیے چلنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

☆ رواداری انسانیت کی جان ہے۔

☆ آپ انسان سے سب کچھ چھین سکتے ہیں مگر اس کے جذبے نہیں۔

☆ انسان کی ہر خواہش کا پورا ہونا ضروری نہیں کیونکہ پھول کی کچھ پتیاں بکھر بھی جاتی ہیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، لودھراں)

شناسا

''بدقسمتی کبھی کبھی عجیب انداز میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہے۔''

''کیوں..... کیا ہوا؟''

''کل میں پانچ ہزار کا ایک چیک کیش کرانے بینک گیا۔ بینک والوں نے کہا کہ اپنی شناخت کے لیے ہمیں کسی سے گواہی دلوا دو کہ چیک پر جو نام لکھا ہے، وہ میرا ہی ہے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مجھے بینک میں کامل صاحب نظر آ گئے جو مجھے جانتے تھے۔''

''اس میں بدقسمتی کی کیا بات ہے؟''

''میں کامل صاحب کا پانچ ہزار کا قرض دار تھا اور پچھلے ایک سال سے ان سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔''

(مرسلہ: سنبل، مری)

برسوں پہلے لڑکپن میں جب وہ تصوراتی دلہن کے ساتھ وقت گزارتا تھا تو خود کو اس عمل سے روکنے کے لیے بار بار اسی طرح کوشش کرتا تھا۔ کمرے سے نکل کر کسی بگولے کی طرح یہاں وہاں چکرانے لگتا تھا۔ اپنے دماغ کو ٹھکانے پر لانے کے لیے کسی درخت یا دیوار پر مکا دے مارتا تھا۔ عہد کرتا تھا کہ اب کبھی اس کارِ لاحاصل میں نہیں الجھے گا مگر یہ عہد کبھی بھی آٹھ دس روز سے زیادہ برقرار نہیں رہا تھا۔ اب بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ بہرحال کمرے کی دعوتِ گناہ والی تنہائی سے اس کے لیے نکلنا سودمند ہی ثابت ہوا اور وہ خود کو نارمل کرنے میں کامیاب رہا۔

اگلے روز اس نے سوچا کہ ان دونوں لڑکیوں کو جو پناہ گزین کی حیثیت بھی رکھتی تھیں، مزارعے خوشی محمد کے گھر بھجوا دے۔ یہ وہی گھر تھا جہاں چمکیلے کو کے والی روزینہ اپنی بچی کے ساتھ کچھ عرصہ رہی تھی مگر سہ پہر کو اختر نے آکر بتایا کہ خوشی محمد اسپتال میں داخل ہے اور اس کی بیوی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس ہے۔

اگلی رات بھی صالح نے عجیب بے چینی کی کیفیت میں گزاری مگر اس سے اگلی رات عجب ڈھنگ سے آئی۔ واجے فضل کے مزار پر منتقل ہو جانے کے بعد زمینوں کے حساب کتاب کی بیشتر ذمے داری بھی صالح پر آگئی تھی۔ دو دن میں آبیانے کا پورا حساب کر کے سرکاری کھاتے میں جمع ہونا تھا۔ شام کے وقت صالح اپنے کمرے میں رجسٹرز اور کیلکولیٹر وغیرہ لیے بیٹھا تھا۔ اچانک دن میں ہی رات کا سماں ہو گیا۔ ایک گھنگھور گھٹا نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ زبردست گرج چمک بھی ہونے لگی تھی۔ پھر اچانک سرخاب منزل کی بجلی چلی گئی۔ بڑے جنریٹر میں بھی کل سے کچھ گڑبڑ تھی۔ صرف چھوٹا جنریٹر چل رہا تھا جس سے سرخاب منزل کے کچھ حصوں میں روشنی موجود تھی۔ روشن حصوں میں مہمان خانے کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔ بادوباراں کا زور بڑھتا چلا گیا۔ ظاہر ہو گیا کہ اب بجلی رات بھر نہیں آئے گی۔ برانچ منیجر کے مشورے پر صالح حساب کتاب لے کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ وہی مہمان خانہ جہاں ایک کمرے میں نتاشا اور عائزہ موجود تھیں۔

جب وہ کام کر رہا تھا، ایک بار نتاشا اور دوسری بار نتاشا اور عائزہ دونوں اس کے لیے چائے لے کر آئیں۔ صالح، عائزہ سے بہ مشکل نگاہ چرا پایا۔ وہ ایک نوخیز قیامت کی طرح تھی۔ دیکھ نہیں سکتی تھی مگر لگتا تھا کہ اپنے احساس سے ہر چیز کو چھو سکتی ہے۔

صالح کے لیے وہ رات کانٹا محال ہو گیا۔ کچھ وہی کیفیت طاری ہو گئی جو برسوں رات ہوئی تھی۔ کسی وقت دل انتہائی شدت سے دھڑکنا شروع کر دیتا اور دماغ میں دھند سی بھر جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ خود کو سنبھال لیتا۔ ایسے ہی ایک آتشیں دورانیے میں صالح اپنی جگہ سے اٹھا اور قالین پر ننگے پاؤں چلتا اس کمرے کی طرف گیا جہاں دونوں بہنیں استراحت کر رہی تھیں۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں ایک مجسم قیامت بستر پر نیم دراز تھی۔

صالح کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ ذہن کے اندر کچھ چل پڑا تھا، کچھ شروع ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کیا ایک بار..... ایک آخری بار وہ یہ سب کر سکتا ہے؟ ابھی..... ابھی آفرین اس کی منکوحہ تو نہیں بنی تھی۔ ابھی تو تھوڑی بہت گنجائش نکل سکتی تھی۔ پھر تو وہ..... اس طرح کی سوچ بھی ذہن میں نہیں لا سکتا تھا۔ وہ کچھ اس قسم کی کیفیت محسوس کرنے لگا۔

شاید ابھی پہنچی نہ ہو باپ قول تک
سائی ذرا سی اور کہ تو بہ سفر میں ہے

بارش مدھم ہونے کے بعد ایک بار پھر تیز ہو چکی تھی۔ گاہے بہ گاہے ایک بجلی آسمان پر اور ایک صالح کے اندر چمک جاتی تھی۔ اب یہ جنریٹر بھی جواب دیتا جا رہا تھا۔ مہمان خانے کے کمروں میں نیم تاریکی سی ہونے لگی تھی..... اور کہتے ہیں تاریکی گناہ کی خواہش کو مہمیز کرتی ہے۔ صالح کے اندر بھی وحشت کا گھوڑا بے لگام ہونے لگا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک عجیب ہیجانی کیفیت میں وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا اس کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا جہاں دونوں بہنیں موجود تھیں۔

عائزہ کے قریب نیم دراز نتاشا نے چونک کر صالح کی طرف دیکھا پھر جیسے ایک لمحے میں..... صرف ایک لمحے میں وہ سمجھ گئی کہ صالح کیا چاہتا ہے..... اور یہ بھی سمجھ گئی کہ خود اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ دوپٹا اپنے سینے پر پھیلا کر اٹھی۔ ایک نظر صالح کی طرف دیکھا اور کھڑکی کا پردہ برابر کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

دم بہ دم مدھم ہوتی روشنی میں صالح نے دیکھا، عائزہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سیانے یہی کہتے ہیں کہ عورت ذات ایسے موقعوں کو بہت جلد بھانپ لیتی ہے۔ یقیناً اس نوخیز کلی نے بھی جان لیا تھا کہ اس سحر انگیز شب میں کوئی خوشہ چیں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے والا ہے۔ اس کے حساس نتھنے پھڑپھڑانے لگے تھے۔ صالح بستر کے ایک پہلو پر بیٹھ گیا۔

''سلام جی!'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

اس کی حسین پیشانی پر ہلکی سی نمی تھی۔ یہ گھبراہٹ کی نشانی تھی..... لیکن یہ اشتیاق آمیز گھبراہٹ تھی۔ صالح کی دھڑکنیں سرپٹ ہوتی چلی گئیں..... اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور کسی تند بگولے کے مانند عائزہ کی طرف پلٹ آیا۔ آخری بار..... بس ایک آخری بار..... اس نے سوچا۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تابڑ توڑ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ضبط کا بند ایک دفعہ ٹوٹا تو پھر بری طرح ٹوٹ گیا۔ وہ جب ''ریشمی تاریکی'' میں مصروف کار تھا، سوچ رہا تھا کہ صبح ہوتے ہی کسی بھی طرح دونوں بہنوں کو سرخاب منزل سے روانہ کر دے گا مگر چند ہی گھنٹے بعد اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ جو نشاط اسے حاصل ہوا تھا، وہ اسے اتنی جلدی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جب قسم ٹوٹ ہی گئی تھی تو خود کو دوبارہ پابند کرنے سے پہلے ایک آدھ مدہوش شب اور گزاری جا سکتی تھی۔

دن چڑھ گیا تھا۔ تیز بارش اب بوندا باندی والی جھڑی میں بدل چکی تھی۔ اگلی شب تک طویل انتظار کون کرتا۔ صالح نے دن کا زیادہ تر وقت بھی بند کمرے میں عائزہ کے ساتھ ہی گزارا۔ اس کی رگوں میں جدی پشتی سفر کرنے والی حرارت کو ایڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ رات کو تو اس کے دل میں یہ بھی آیا کہ نشاط کو دوبالا کرنے کے لیے وہ اس کے ساتھ شراب بھی شامل کر لے مگر پھر کم از کم اس معاملے میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہا۔

عائزہ کے ساتھ وہ ایک شب کی توبہ شکنی تین شبوں پر محیط ہو گئی۔ اس سے اگلے دن جب صالح دونوں بہنوں کو سرخاب منزل سے نکال کر مزارِ خوشی محمد کے گھر پہنچا چکا تو بڑی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ وہی مخصوص پشیمانی اور ندامت اس کے جسم میں سرایت کر گئی تھی جو تصوراتی دلہن کے جانے کے بعد محسوس ہوئی تھی۔ اب اس پشیمانی کی شدت اس کے لیے کئی گنا زیادہ تھی کہ اس بار جو عہد ٹوٹا تھا، وہ تصوراتی نہیں تھا اور اس کا تعلق اس کی محبوب ترین ہستی سے تھا۔

سرخاب منزل میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ تین راتوں میں مہمان خانے میں کیا ہوتا رہا ہے۔ صالح نے اس حوالے سے خاص الخاص احتیاط برتی تھی لیکن وہ، خود تو جانتا تھا کہ کیا ہوا ہے اور یہ ''جانکاری'' اس کے دل و دماغ پر ہمالیہ کا وزن بن کر ٹھہری ہوئی تھی۔

پانچ چھ روز تو اس نے خود کو سنبھالنے میں صرف کیے۔ ضمیر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا مگر یہ مکمل طور پر ختم اس وقت ہو سکتا تھا جب وہ اس بارے میں آفرین سے تھوڑی بہت بات کر لیتا۔

آخر ایک دن اس نے فون پر آفرین سے کہا۔ ''میں نے تم سے جو عہد کیا ہے، اس پر زندگی بھر قائم رہنے کا عزم رکھتا ہوں لیکن..... بندے کی زندگی میں جب بہت بڑی تبدیلی آتی ہے تو شروع شروع میں کہیں غلطی کا امکان بھی ہوتا ہے۔''

''کیا غلطی ہو گئی؟'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''بس سمجھ لو کہ ایک غلطی ہو گئی..... اور مجھے یقین ہے کہ یہ آخری غلطی تھی۔ پلیز! اس کی تفصیل میں نہ جانا..... بس مجھے اس کے لیے معاف کر دو..... پلیز، پلیز، پلیز!''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر اس نے ایک دم کہا۔ ''کر دیا معاف۔''

''دل کی گہرائی سے، پورے یقین کے ساتھ؟'' صالح نے پوچھا۔

''دل کی گہرائی سے، پورے یقین کے ساتھ۔'' آفرین نے اس کے الفاظ دہرائے اور ہنس دی۔

☆☆☆

جوں جوں شادی کے دن نزدیک آ رہے تھے، صالح کی بے چینیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ دسمبر گلابی ہو گیا تھا۔ سرخاب منزل کی کیاریوں میں گل داؤدی اور گلاب رنگ دکھا رہا تھا۔ کھیتوں کھلیانوں پر سنہری دھوپ چمکتی تھی۔ شفق رنگ شاموں میں حویلی کے وسیع لان میں صالح چند بے تکلف ملازمین کے ساتھ کرکٹ کھیلتا یا انہیں کرکٹ کھیلتے دیکھتا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے کسی وقت وہ گارڈز کے ساتھ پیدل ہی زمینوں اور فصل کا معائنہ کرنے نکل جاتا۔

شام ہوتے ہی حویلی کی راہداریوں میں انگیٹھیاں دہک جاتیں، خشک میوہ جات کی تھالیاں چکراتیں۔ بڑے ہال کمرے میں جہاں چند ماہ پہلے تک رقص گاہ تھی، اب بڑے بڑے قالین بچھا دیے گئے تھے۔ ان قالینوں پر مخدوم فیملی کی عقیدت مند خواتین اور گھریلو ملازمائیں آلتی پالتی مار کر بیٹھتیں، چند رشتے دار خواتین بھی آ جاتیں، شادی کے گیت گاتیں یا پھر عروسی جوڑے ٹانکتیں۔ لڑکیوں کی کوئی ایک ٹولی ڈھولک اٹھا لاتی اور رات گئے تک شادی کے گیت ہال کی بلند و بالا چھت کے نیچے گونجتے۔ دیساں وا راجا میرے بابل دا پیارا..... اور لاکھ نخرے دکھاؤ سر جھکانا

پڑے گا، بن کے دلہن ہمارے گھر آنا پڑے گا..... وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب خدیجہ پھپھو لاہور سے آتی تھیں تو یہ گانا بجانا محدود کر دیا جاتا تھا۔ واجے فضل ہفتے میں ایک دن پابندی کے ساتھ سرخاب منزل میں گزارتے تھے۔ جس دن وہ آتے، مستحقین کے لیے خصوصی لنگر پکایا جاتا۔

صالح کے لیے گھڑی کی سوئیاں بڑی دقت سے حرکت کر رہی تھیں، مگر حرکت کر تو رہی تھیں۔ آخر..... آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب آسمان کی ساری کہکشائیں، سرخاب منزل میں اتر آئیں۔ یوں لگتا تھا کہ پورا علاقہ ہی ہالۂ نور بن گیا ہے۔ پھپھو عاصمہ کی حویلی بھی جسے چھوٹی حویلی کہا جاتا تھا، حسین رنگوں سے جگمگا رہی تھی۔

صالح کے دل کے کسی نہاں خانے میں اب بھی وقار وکی کی طرف سے اندیشے موجود تھے۔ واجے فضل اکثر کہا کرتے تھے کہ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور یہ دشمن کمزور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ عیاری اور دغابازی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مار دھاڑ کرنے والے ایک تند خو امیر زادے کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ مبینہ طور پر وہ ایک فرنیچر مارکیٹ کے صدر کے قتل میں بھی ملوث ہو چکا تھا۔

احتیاطاً صالح نے سرخاب منزل اور چھوٹی حویلی کی حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ پرائیویٹ گارڈز کے علاوہ پولیس بھی موجود تھی۔

بہرطور صالح اور آفرین کے نکاح کے بعد شادی کی یہ پُرشکوہ تقریب بہ خوبی و بہ خیریت اختتام کو پہنچ گئی۔

..... اور اب حجلۂ عروسی میں چاند اور سورج ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ رخساروں کے وہ دو بے مثل کنول صالح کے روبرو تھے جن کو ہونٹوں سے چھونے کے لیے وہ برسوں ترسا تھا۔ کئی بار ان کے قریب ہوتے ہوتے دور چلا گیا تھا..... اور وہ یاقوتی ہونٹ جو اس کے حسین ترین سپنوں کو عرصۂ دراز سے اپنی حرارت اور حلاوت سے ڈھانپ رہے تھے۔ اب وہ سب کچھ اس کے سامنے تھا اور ایک سانس کی دوری پر تھا۔

صالح کو اپنی پہلی شبِ عروسی یاد آئی۔ وہ شب جو کئی برس پہلے اس نے نوعمر حیا کے ساتھ گزاری تھی۔ کسی سمجھانے والے نے اسے سمجھایا تھا کہ ضروری نہیں ہوتا پہلی ہی شب میں وصل کے سارے مرحلے پار کر لیے جائیں۔ محبت کے راستے پر دھیرج سے قدم بڑھانا آئندہ ازدواجی تعلقات پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے مگر تب وہ کہاں مانا تھا۔ وہ جنس کے سرپٹ گھوڑے پر سوار تھا اور شبِ زفاف کے آغاز میں ہی اس نے ہراساں حیا کو اس گھوڑے کی ٹاپوں تلے روند ڈالا تھا۔

..... آج صورتِ حال بالکل برعکس تھی..... اور یہی ثبوت تھا اس محبت کا جو ایک چراغ کی طرح بچپن سے اس کے دل کے معبد میں روشن تھی۔ وہ بچھڑی خوشبو جو بچپن کے ایک تہوار سے چند روز پہلے اس سے چھن گئی تھی، واپس آ چکی تھی۔ آج اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ چند راتیں بس اسے دیکھنے اور محسوس کرنے میں ہی صرف کر دے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے لب اس کے ریشمی رخسار کی طرف بڑھائے..... اور..... زندگی میں پہلی بار وہ اپنے ترسے لبوں کو ان کی منزل تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ کتنے خوبصورت، کتنے جاں فزا لمحے تھے..... پہلے رخسار..... پھر پیشانی..... پھر ہونٹ..... پھر گرمجوش بازوؤں کے سنہری گھیرے جن میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ دھڑکن اپنی ہے یا اپنے ہم نشین کی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت وہ روئے زمین کے خوش قسمت ترین انسانوں میں سے ایک ہے۔

پھر وہ دونوں ہی رک گئے جیسے ایک معروف زمانہ گیت کی بازگشت ان کے کانوں میں گونجنے لگی..... کل کی حسیں ملاقات کے لیے، آج رات کے لیے، ہم تم جدا ہو جاتے ہیں.....

اور کل کی یہ حسیں ملاقات کل نہیں، تین چار روز بعد ہی ہونا تھی۔ کل ولیمے کی تقریب کے بعد آفرین کو واپس چھوٹی حویلی چلے جانا تھا اور اگلے ہی روز ان کی فلائٹ محبتوں کے شہر پیرس کے لیے تھی۔ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنا ہنی مون دریائے سین کے کنارے ایک دلکش اپارٹمنٹ میں منائیں گے۔ اپارٹمنٹ کی بکنگ بھی ہو چکی تھی۔ صالح ایک ماہ کی بکنگ کرانا چاہتا تھا مگر آفرین نے دانشمندانہ رائے دی تھی کہ پہلے ایک ہفتے کی بکنگ کراتے ہیں پھر حسبِ ضرورت بڑھا لیں گے۔

ولیمے کے روز دوپہر کے وقت صالح اور آفرین دونوں ایک بالکونی میں کھڑے سرخاب منزل کی وسعتوں کو دیکھ رہے تھے۔ نئی تعمیرات کے بعد سرخاب منزل کافی تبدیل ہو چکی تھی۔ صالح نے آفرین کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''آفری! جب بابا جانی نے حویلی میں تبدیلیاں کی تھیں تو میرا دل رو تا رہتا تھا۔ پتا ہے کیوں؟''

''کیوں؟'' آفرین نے کہا۔

پھر اس سے پہلے کہ صالح جواب میں کچھ کہتا، وہ بولی۔ ''میں بتاتی ہوں، تمہارا دل کیوں روتا تھا۔''

''بتاؤ۔''

وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''تمہیں بھی میری طرح بارش کا وہ دن یاد ہے جو ہم نے بچپن میں اکٹھے ہی اس حویلی میں گزارا تھا۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ایک بار، صرف ایک بار ہی ہم وہ مست کر دینے والا، خوشیوں بھرا دن دوبارہ گزار سکیں۔ اسی انداز میں، اسی رنگ رنگیلے موسم میں، اچھلیں کودیں، ناچیں..... خود کو کیچڑ میں اور جامنی رنگوں میں لت پت کر دیں..... ہے نا؟''

صالح نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر لرزاں آواز میں بولا۔ ''کمال ہے بھئی، لگتا ہے میرے لفظ ہیں جو تم اپنی زبان سے ادا کر رہی ہو..... یار! کیا چیز ہیں ہم دونوں بھی۔''

اس نے تعجب آمیز مسرت کے ساتھ اسے گلے سے لگا لیا۔

''صالح! کیا کرتے ہو؟'' وہ شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''نیچے لوگ دیکھ رہے ہوں گے۔''

وہ اپنا نچلا ہونٹ نرمی سے دانتوں میں دبا کر رہ گیا۔

سرخاب منزل میں خوش رنگ شامیانوں کا جہان آباد تھا۔ لاہور کی ایک بڑی کیٹرنگ کمپنی تھی جو سارے انتظامات کر رہی تھی۔

پکوانوں کی خوشبو سہ پہر کی سنہری دھوپ میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ سرخاب منزل کی راہداریوں اور دالانوں میں رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ ارد گرد کے کئی زمیندار مدعو تھے۔ آج صالح اور آفرین کا ولیمہ تھا۔

☆☆☆

اور یہ تھا پیرس..... ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ دبیز قالین، نہایت قیمتی فرنیچر، چھت پر دیدہ زیب فانوس اور ہیرے جیسے چمکدار گلدان میں پھول مہکتے ہوئے۔ صالح کی ہدایت پر روم سروس کے عملے نے ماسٹر بیڈ روم کو بہترین تازہ پھولوں سے یوں سجایا تھا کہ مہک دماغ کو ہواؤں میں اڑا رہی تھی..... اور تو اور، جہازی سائز کے بیڈ کو بھی پھولوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سلک کے بیش قیمت پردوں سے آگے کھڑکی کی دوسری جانب دریائے سین کی سطح پر برف کے پھول سے تیر رہے تھے۔ ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی اور لگتا تھا کہ موسم کا یہ رنگ ڈھنگ چار دن بعد کرسمس کے موقع تک جاری رہے گا۔

باہر یقیناً درجۂ حرارت منفی سے بہت نیچے تھا مگر اندر ایک میٹھی میٹھی دل گداز حرارت تھی۔ شام کا وقت تھا۔ پیرس کی روشنیاں جگمگانا شروع ہو گئی تھیں۔ آخر وہ مرادوں والی رات آ ہی گئی تھی جس کا صالح اور آفرین نے شب و روز انتظار کیا تھا۔ آج وہ ایک ہو رہے تھے۔ ہر فاصلہ مٹنے والا تھا۔ یوں تو وہ دونوں اپنا یہ اتی مون کہیں اور بھی منا سکتے تھے مگر یہ شاندار ہوٹل عرصے سے صالح کے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ ہوٹل اور دریائے سین کا یہ کنارا۔

نیچے ڈائننگ ہال میں ایک پُرتکلف ڈنر کرنے سے پہلے آفرین لباس تبدیل کر کے اس کے سامنے آئی۔ صالح کی فرمائش پر اس نے ایک گراں قیمت بنارسی ساڑی زیب تن کی تھی جس پر سونے کے تاروں کی دل آویز کشیدہ کاری تھی۔ وہ مبہوت اسے دیکھتا ہی رہ گیا پھر اس سے ضبط نہیں ہوا۔ اس نے تڑپ کر آفرین کو بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور اس کے چہرے پر محبت کی بارش کر دی۔

''ایک گیت کے بول سناؤں؟'' اس نے آفرین کے کان میں گرم سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر خود ہی بول اٹھا۔ ''کبھی کبھی من دھوپ کے کارن ترستا ہے..... کبھی کبھی پھر جھوم کے ساون برستا ہے..... پیاس کبھی مٹتی نہیں، اک بوند بھی ملتی نہیں..... اور کبھی رم جھم گھٹائیں پیچھا کرتی ہیں.....''

ان سرگوشیوں کے درمیان میں ہی وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو آفرین کے چہرے سے ہم کلام کر رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''یاد ہے نا، تم سوئی ہوئی تھیں اور میں نے ڈرتے ڈرتے انداز میں تمہارے کمرے میں قدم رکھا تھا..... تمہارے گال پر اپنا گال ملا رہا تھا۔ اس سے آگے مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ کیا کروں۔ تمہارے ہونٹوں کی طرف دیکھتا تھا اور ڈرتا تھا..... اور دیکھو، آج کتنے قریب ہیں.....''

آفرین نے صالح کی ہانپتی ہوئی سرگوشی کے درمیان میں کہا۔ ''کبھی بھولو گے تو نہیں مجھے؟''

''تم خود اپنے دل سے پوچھو، کیا بھول سکتا ہوں؟'' اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے کان کی لو کو چھوا اور کھڑے کھڑے کچھ اور بھی اسے اپنے ساتھ پیوست کیا۔

وہ ہنسی اور سرگوشی میں بولی۔ ''کہتے ہیں رائے قبیلے کے مرد جب ایک عورت سے منہ موڑ لیتے ہیں تو دوبارہ کبھی مڑ کر نہیں دیکھتے۔ تم تو ایسا نہ کرو گے؟''

''نہیں کروں گا۔ تم سے آگے میرے لیے اور کچھ نہیں۔ اگر چاہو تو دل چیر کر دیکھ لو۔''

''اگر کرو گے تو کر نہیں پاؤ گے۔'' وہ اس کے سینے پر ڈھے سی گئی۔ ''اگر تم بھول جانے میں یکتا ہو تو میں یاد آنے

میں یکتا ہوں۔" وہ عجیب لہجے میں بولی۔ اس کی گرم سانسیں صالح کی گردن سے ٹکرا رہی تھیں، اس کی روح میں اتر رہی تھیں۔

اور پھر وہ چلی گئی..... ہاں چلی گئی۔

نیچے ڈائننگ ہال میں جانے سے پہلے وہ پہلو والے کمرے کی طرف گئی تھی۔ صالح کا خیال تھا کہ وارڈ روب میں سے سینڈل اور شال وغیرہ لینے گئی ہے۔ اس نے پانچ دس منٹ انتظار کیا پھر سوچنے لگا شاید وہ نیچے جانے میں تذبذب کا شکار ہے۔ جہاں لوگ ہوتے تھے، وہاں اکثر کوئی نہ کوئی اسے بہ حیثیت آرٹسٹ پہچان لیتا تھا۔ اس نے وہیں کمرے میں پھولوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔ "کیا بات ہے آفری! اگر موڈ نہیں تو ڈنر یہیں منگوا لیتے ہیں۔"

جواب نہیں آیا تو وہ کچھ چونکا۔ دبیز قالین پر قدم رکھتا کمرے میں گیا تو وہ خالی تھا۔ واش روم میں بھی کوئی نہ تھا، ٹیرس کی طرف جانے والا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نیچے جاتے ہوئے قالین پوش زینے بھی خالی تھے۔ وہ اوپر نیچے دیکھنے لگا۔ پہلے تو اسے آفری کی کوئی شرارت سمجھتا رہا پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ صورت حال نے کوئی بہت سنگین کروٹ لی ہے۔ دفعتاً اس کے فون پر میسج کی سنگچر ٹون آئی۔ اس نے دیکھا، یہ میسج آفرین کی طرف سے ہی تھا۔ لکھا تھا۔

"صالح! ہمارے تکیے کے نیچے ایک خط ہے، وہ تمہارے لیے ہے۔"

صالح نے چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ آفرین کو کال کرنے کی کوشش کی مگر اب اس کا فون بند ہو چکا تھا۔ وہ خط لینے کے لیے لپکا۔

☆☆☆

خط یوں تھا۔ "..... صالح! تم نے مجھے اپنا تصور نہ بتایا اور معافی مانگی۔ میں نے معاف کر دیا۔ اگر تم بتاتے تو میں کبھی معاف نہ کر سکتی اور اب میں جان چکی ہوں لہٰذا اپنا راستہ جدا کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ کیسے جان گئی ہوں؟ یہ سوال تمہارے ذہن میں ضرور آئے گا مگر میں اس کا جواب نہیں دے سکتی اور یہ بات اہم بھی نہیں ہے۔ اہم بات یہی ہے کہ میں ایک حتمی نتیجے پر پہنچ چکی ہوں اور وہ یہ کہ یہ تمہاری پہلی غلطی نہیں تھی اور نہ آخری ہے۔

اس حوالے سے تم اپنے ہاتھوں مجبور ہو اور شاید..... ہمیشہ مجبور ہی رہو گے۔ میں اچھی طرح جان چکی ہوں، تم لاکھ قسمیں کھاؤ، جلتے شیشے پر حلف اٹھاؤ، عہد کرو، مگر ہو گا وہی جو پہلے ہوتا رہا ہے اور شاید ہمارے خاندان میں کئی نسلوں سے ہو رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے بہت شرمندہ ہوں صالح لیکن کم از کم میں اس صورت حال سے نبھا نہیں کر سکتی۔ تم میرے ہو یا پھر میرے نہیں ہو۔ میں تم سے اس لیے دور جا رہی ہوں صالح تاکہ تمہیں ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد کر جاؤں۔ تم اپنی خواہش کے مطابق جی سکو۔ زندگی میں میرے لیے یہ اعزاز ہی کافی ہے کہ میں تمہاری دلہن ہوں اور مجھے یہ بات کہنے دو صالح! مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں ایک کنواری سہاگن کی حیثیت سے زندگی گزار دوں۔"

صالح کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل رہا تھا۔ اس نے خط سے نگاہیں ہٹا کر سر پیچھے کی طرف پھینکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

"..... مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ میں ملوں گی نہیں۔ میں چند دنوں کے اندر ہی یورپ بھی چھوڑ رہی ہوں۔ میں نے ممی کے لیے بھی تفصیلی خط لکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی تحریر کے ذریعے میں انہیں بڑی حد تک مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔

میں چاہتی تو شادی کے بعد پاکستان سے ہی کہیں اوجھل ہو سکتی تھی مگر ایسے میں سراب منزل پر بہت بڑا حرف آتا۔ اب تو تم پاکستان جا کر کہہ سکتے ہو کہ میری اور تمہاری پلاننگ ہی یہ تھی کہ شادی کے بعد میں پیرس میں رہوں گی اور تم وہاں آتے جاتے رہو گے۔

صالح! تم سے یوں جدا ہونا میرے لیے بالکل زندہ درگور ہونے کی طرح ہے مگر اس لیے زندہ درگور ہو رہی ہوں کہ تم سے اپنا پیار بچا سکوں۔ یہ پیار میرے لیے دنیا جہان کی دولت سے بڑھ کر ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ تم جیسی بھی زندگی جیو گے، میں تم سے ایسے ہی پیار کرتی رہوں گی۔ ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ تم پر بھی کچھ عرصے کے لیے بہت بھاری گزرے گا۔ تم میری جان ہو صالح! میں تمہیں اس طرح تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میرے دل میں کئی بار آیا کہ تمہیں چھوڑنے سے پہلے کم از کم ایک تھوڑا سا وقت تو تمہاری مرضی کے مطابق گزار جاؤں۔ اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا آپ یوں تمہارے حوالے کر دوں کہ ہر فاصلہ مٹ جائے لیکن پھر ایک خیال سوہانِ روح ہو جاتا تھا۔ سوچتی تھی کہ اگر اس "وقتی قربت" کے نتیجے میں کوئی نئی زندگی وجود میں آ گئی تو اس کا کیا قصور ہو گا؟ وہ زندگی..... وہ بچہ کیوں ہمیشہ اپنے باپ کے نام سے محروم رہے۔ لہٰذا کل سے کئی بار تصور ہی تصور میں اپنا ماتھا تمہارے پاؤں پر ٹیکا ہے۔ اپنے

بدنصیب آنسوؤں سے تمہارے پاؤں کو دھویا ہے اور چلی آئی ہوں۔

مجھے نہیں معلوم میرے صالح! اب کبھی تمہیں دیکھ سکوں گی یا نہیں۔ تیز آندھیاں ہیں جو مجھے نامعلوم سمت میں اڑائے چلی جارہی ہیں لیکن ان آندھیوں میں ایک دیا روشن ہے۔ دیکھو کیسا الو کھا دیا ہے..... دیکھو نا۔"

☆☆☆

ایک مہینا گزر چکا تھا۔ پیرس اور گرد و نواح میں آفرین کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی گئی تھی۔ صالح کی پھپھو تو "یورپیل" کے ذریعے آسٹریا بھی ہو آئی تھیں جہاں آفرین کی دو ہم پیشہ فرینڈز قیام پذیر تھیں۔ کچھ سراغ ملا اور نہ ہی آفرین کی طرف سے کوئی پیغام آیا تھا۔

اب صالح پاکستان واپس آچکا تھا۔ یہاں داجے فضل کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پیرس میں اس پر کیا گزری ہے۔ یہاں ہر کسی کو یہی معلوم تھا کہ سرخاب منزل کی دلہن رانی فی الحال باہر ہی رہے گی۔

صالح کے ذہن میں جو سب سے اہم سوال ابھرتا تھا اور جو تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست تھا، یہی تھا کہ آفرین کو صالح کی اس بدعہدی کا پتا کیسے چلا جو یہاں سرخاب منزل میں ہوئی تھی اور جس کا تعلق نتاشا کی نوخیز بہن عائزہ سے تھا۔ صالح نے وہ دو تین راتیں بے حد پوشیدہ رکھی تھیں پھر ان کی خبر اڑ کر ہزاروں میل دور آفرین تک کیسے پہنچ گئی؟ پتا نہیں کیوں اس کا دماغ گھوم پھر کر اپنے رقیب روسیاہ وکی کی طرف ہی جاتا تھا۔ یہاں ایک طرح سے رواج بن گیا تھا کہ اپنی مخالف فیملی کے ملازمین یا ملنے جلنے والوں میں کوئی مخبر رکھ دیا جاتا تھا۔ جالے نوری اور شانو وغیرہ کی مثالیں سامنے تھیں۔ صالح کا دل گواہی دینے لگا کہ یہ وقار وکی کا کوئی مخبر ہی تھا جس نے اس کا راز فاش کیا اور بات آفرین تک پہنچی۔

پاکستان واپسی کے پانچویں چھٹے روز ہی صالح کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ اسے مسلسل یہ خبریں بھی مل رہی تھیں کہ وکی اور اس کا باپ کاروباری طور پر انہیں نقصان پہنچانے کی کوششیں کررہے ہیں۔ ان کے کئی بہترین اور وفادار ملازمین کو بھاری معاوضوں کے عوض ان سے توڑا گیا تھا۔ اب یہ سب کچھ صالح کی برداشت سے باہر ہورہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ بہت سا آتشیں سیال اپنے اندر انڈیلے اور اسلحہ لے کر دندناتا ہوا اس خبیث وکی کے گھر میں جا گھسے۔ اسے مار ڈالے یا خود مارا جائے۔ شدید ہیجانی کیفیت میں اس نے اختر سے شراب منگوائی بھی مگر اسے ہونٹوں تک نہ لے جاسکا۔ ہاں اپنی دوسری خواہش کی مزاحمت وہ نہیں کر پایا۔ اس نے ایک ماؤزر اپنی جیکٹ میں لگایا، اختر کو ساتھ لیا اور آتشیں جذبات کے دھارے میں بہتا ہوا سرگودھا جا پہنچا۔

یہ رات نو دس بجے کا وقت تھا۔ یخ بستہ کہر نے گرد و پیش کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی لینڈ کروزر ایک تنگ بگولے کی طرح وکی کی رہائش گاہ میں داخل ہوئی۔

وہ دہاڑا۔ "باہر نکل حرامزادے! آج تو نہیں یا میں نہیں۔"

اس کا یہ فقرہ ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ پہلے کوٹھی میں ہلچل مچی پھر وکی... اکڑی ہوئی گردن اور تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے آیا۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں صالح کے لیے ہمیشہ کی طرح دبا دبا تمسخر اور نفرت تھی۔ وہ بولا۔ "کیا ہوا ہے تجھے؟ دو ٹانگوں والے سؤر کی طرح چنگھاڑتا ہوا یہاں چلا آیا ہے۔"

"وکی! تو انسان کا نہیں، کسی کنجر کا تخم ہے۔ تیرے سینے میں دشمنی کا جو بھانبھڑ جل رہا ہے نا، آج اسے ٹھنڈا کرکے چھوڑوں گا۔"

اختر اپھر کر آگے بڑھا تو صالح نے ہاتھ سے اسے روک دیا۔ "نہیں اخترے! آج اس کمینے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال ہی لینے دے مجھے۔"

وہ وکی پر جھپٹا۔ دونوں برآمدے میں گتھم گتھا ہوگئے پھر ایک دروازے کا شیشہ توڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا گرے۔ صالح پہلے کی طرح دبلا پتلا تھا تاہم وکی کافی پھیل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بگڑے نگڑے امیر زادے کی چھاپ نمایاں تر ہوچکی تھی۔ ایک دو منٹ کے لیے دونوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ اپنی وحشت کے سبب صالح اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اس کے گھونسوں نے وکی کا چہرہ چھیل کر رکھ دیا۔ ساتھ ساتھ وہ چلّا رہا تھا۔ "گندی نسل..... تو انسان نہیں، مردار خور گدھ ہے۔ تو نے برباد کردیا مجھے، میری زندگی تباہ کرڈالی....."

اس نے وکی کو اتنے زور سے دیوار پر پٹخا کہ شیشے کا کارنس چکنا چور ہوگیا اور قیمتی ڈیکوریشن پیس ہوا میں اڑتے نظر آئے۔ وکی اب بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ ملازمین نے جب اپنے مالک کو مشکل میں دیکھا تو صالح پر ٹوٹ پڑے۔ اختر اب کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ وہ صالح کے دفاع کے لیے آگے بڑھا لیکن وہ تعداد میں کہیں زیادہ تھے۔ انہوں نے اختر کے پٹھے نکالنے کی کوشش ناکام

بنادی۔ صالح نے ماؤزر نکالنا چاہا تو دو کارندوں نے اس کا بازو دبوچ لیا اور مروڑ کر ماؤزر چھڑا لیا۔

اگلے ایک ڈیڑھ منٹ میں اختر ے اور صالح کو بُری طرح پیٹا گیا۔ وکی کا والد سیف اللہ سیڑھیوں کی طرف سے نمودار ہو چکا تھا مگر وہ بیچ بچاؤ کے لیے فوری طور پر آگے نہیں بڑھا۔ جب اس نے دیکھا کہ دونوں میں سے کسی کی جان جاسکتی ہے تو وہ لپکتا ہوا درمیان میں آ گیا۔ وکی کو دھکیلتے ہوئے بولا۔ ''کیا کرتے ہو، جان لوگے اس کی۔ پیچھے ہٹو۔''

وہ دوسرے ملازمین پر بھی دہاڑا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔

صالح کا چہرہ لہولہان تھا۔ آنکھیں بھی خون میں لتھڑ گئی تھیں۔ بالائی لباس تار تار ہو چکا تھا۔ وہ کراہتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''اکمل! بے غیرت ہے تیرا بچہ۔ اگر ہمت ہے اس میں تو آئے اکیلے کے ساتھ اکیلا۔ اب بھی آجائے۔''

پھر وہ جیسے تیورا کر اپنے گھٹنوں پر گر گیا۔

☆☆☆

صالح سات دن سے سرگودھا کے پرائیویٹ اسپتال میں تھا۔ اس کی پسلیوں پر شدید ضربات آئی تھیں۔ اب طبیعت کچھ بہتر تھی لیکن کھانسی اب بھی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تین دن پہلے تک تو وہ نیم بیہوش تھا تب ایک اور واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ غالباً اپنے باپ سیف اللہ کی شہ پر ہی وکی اور اس کے گماشتوں نے مخدوم رائے فیملی کے ایک فرنیچر ہاؤس پر یہ کہہ کر قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی کہ متنازعہ جگہ پر ہے اور اصل کاغذات میں یہ جگہ ان کی ملکیت ہے۔ صالح تو اسپتال میں پڑا تھا۔ وکی اور اس کے گماشتوں کی اس دیدہ دلیری کو پرنس شاہد بابر نے ناکام بنا دیا تھا۔ یعنی کل کے دشمن آج کے دوست کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور جس کو شروع شروع میں دوست سمجھا گیا تھا، وہ بدترین دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ صالح کو اب بھی یقین تھا کہ اس کی آخری بدنصیبی میں بھی اسی وکی کا ہاتھ ہے۔

اسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں داجے فضل نے صالح کا ہاتھ اپنے نرم مہربان ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے پھر اس پر پھونک کر بولے۔ ''جلدی سے بھلے چنگے ہو کر گھر آجاؤ پھر میں تم سے کچھ اہم باتیں کروں گا۔''

..... یہ دو ہفتے بعد کی بات ہے۔ صالح سرخاب منزل واپس آچکا تھا۔ داجے بھی مزار سے آئے ہوئے تھے۔ آج کی رات انہیں بھی سرخاب منزل میں ہی گزارنا تھی۔ کل دن کی رم جھم اور کڑاکے کی سردی کے بعد موسم نکھرا ہوا تھا۔ سہ پہر کی شفاف دھوپ سب جگہ پھیلی ہوئی تھی اور فضا میں نباتات کی ہلکی سی مہک تھی۔ سامنے گراؤنڈ میں ملازمین کے کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

داجے فضل نے تازہ اخبار کا ایک صفحہ صالح کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو، ہمارے سرگودھا کی ہی خبر ہے۔ کیسی دردناک خبریں آتی ہیں۔''

صالح نے پڑھا۔ ایک چوبیس سالہ نوجوان اسد نے ایک چھ سات سالہ بچی کو اغوا کر کے ایک دن اپنے پاس رکھا تھا، اس سے زیادتی کی تھی۔ معصوم بچی کو نازک حالت میں اسپتال داخل کروا دیا گیا، ملزم پکڑا گیا تھا۔ وہ رشتے میں بچی کا تایا زاد تھا۔

داجے نے کہا۔ ''پتا ہے یہ اسد محمود کس کا پتر ہے؟'' پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''میٹرک میں تمہارے ریاضی کے ماسٹر مولوی شمس دین کا۔ وہ پڑھائی میں تھوڑا کمزور ہے مگر ماسٹر صاحب تلے ہوئے تھے کہ اسے میتھ کا لیکچرار بنا کر چھوڑنا ہے۔ دیکھو لیکچرار بنتے بنتے وہ کیا بن گیا۔''

ان کی آنکھیں ایک بے ساختہ دکھ سے لبریز ہو گئیں۔

ایک لمبی سانس لے کر بولے۔ ''صالح! یہ جو جنسی جذبہ ہے نا، یہ ہمارے سب سے طاقتور جذبوں میں سے ایک ہے۔ پھر اللہ پاک کی قدرت ہے کہ کچھ لوگوں میں یہ زیادہ زور آور ہوتا ہے۔ ایک بے لگام گھوڑے جیسا۔ یہ قدرت کی طرف سے ایسے لوگوں کے لیے ایک امتحان بھی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اس جذبے کو اپنی حدود میں رکھتے ہیں اور کس طرح اس توانائی کا رخ دوسرے بہتر کاموں کی طرف موڑ دیتے ہیں۔''

وہ سامنے کرکٹ کھیلتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتے رہے پھر کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ ''پتا ہے جب پچھلے دنوں تم وہاں پیرس میں تھے، یہاں خوشاب میں کیا ہوا ہے؟''

وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔ ''وہ تمہارے جو ایک چھوٹے دادا سجاول رائے ہیں، انہوں نے کوئی پچھتر سال کی عمر میں نئی شادی کی ہے۔ تیس بتیس سالہ ایک بینک ملازمہ ہے۔ اس شادی کے بعد ان کی پہلی دو جائز بیویوں کے بیٹے بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ جان سے مارنے مرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

چند لمحے چپ رہ کر کہنے لگے۔ ''صالح! میں جانتا ہوں تمہارے خون میں یہ جو تپش ہے، یہ نسل در نسل چلتی ہوئی تم تک پہنچی ہے۔ تمہارے باپ نے اس کے آگے بند باندھنے اور خود کو سنبھالے رکھنے کی تھوڑی بہت کوشش کی

لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اب تم اس تپش کے گھیرے میں ہو..... اور مجھے کہنے دو کہ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے، اسی تپش اور اضافی خواہش کے سبب ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں داجے؟" وہ الجھن زدہ تھا۔

"اس اضافی خواہش اور طلب کو اپنا دشمن سمجھو گے تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ تم سے آفرین کے دور چلے جانے کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔"

اس نے چونک کر داجے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ شاید داجے اس غلط کاری کے بارے میں جانتے ہیں جو اس سے نتاشا کی بہن عائزہ کے حوالے سے سرزد ہوئی مگر داجے کے چہرے نے بتایا کہ وہ عمومی انداز میں بات کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "صالح! اگر تم آفرین کے حوالے سے اب بھی کوئی امید دل میں رکھنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی اس غالب طلب اور خواہش سے لڑنا ہوگا۔ اس کا رخ پھیرنا ہوگا۔"

نہ جانے ان لمحوں میں صالح کو کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ داجے جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اس کے اپنے دل کی گہرائی میں بھی کہیں موجود ہے۔

اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "داجے! میں کیا کروں؟ مجھے سمجھائیں..... مجھے بچائیں داجے! ورنہ میں نہیں رہوں گا، ختم ہو جاؤں گا۔"

انہوں نے عجب جذب سے اسے اپنے ساتھ لگایا، اس کا سر چوما۔ "تم کیوں نہ رہو..... تم پر میری جان واری۔ تم رہو گے۔"

پتا نہیں ایک دم اس کے دل میں کیا آیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے اس مہربان بزرگ کی مہربانیوں اور چاہتوں کو پوری طرح محسوس کیا اور یکدم ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ "ٹھیک ہے داجے! میں زندگی کی آخری سانس تک آفرین کی امید کھونا نہیں چاہتا۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں؟ اگر آپ چاہتے ہیں تو سب چھوڑ چھاڑ دیتا ہوں۔ آپ ہی کی طرح سفید کپڑے پہن کر درویشی رنگ میں رنگ جاتا ہوں۔"

ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ "نہیں صالح! ایک سرخاب منزل میں ایک ملنگ کافی ہے۔" پھر ایک دم سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔ "دنیا چھوڑنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ دنیا میں رہا جائے اور اپنے اصولوں کو جینے سے لگا کر رہا جائے..... اور میرے خیال میں تو سب سے بڑا اصول اعتدال ہی ہے۔ یہی اصول ہے جس کی تلقین

سیاست

☆ جو بات اخلاقی طور پر غلط ہے، وہ سیاسی طور پر کبھی درست نہیں ہوتی۔

☆ ہر سیاسی پارٹی بالآخر اپنے جھوٹ اگل کر ختم ہو جاتی ہے۔

☆ مدبر بھیڑیں موڑتے ہیں اور سیاستدان ان کی کھال کھینچتے ہیں۔

☆ سیاستدان، آنے والے الیکشن اور مدبر آنے والی نسلوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

مرسلہ: محمد فائز..... اردو بازار، کراچی

شاہی کروفر

ایک صحافی قید خانے میں نپولین بونا پارٹ سے ملنے گیا، چوتھائی دنیا کا مالک اس وقت ایک سیلن زدہ کوٹھری میں مقید تھا۔ صحافی نے پوچھا۔ "آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

نپولین نے مسکرا کر چھت کی طرف اشارہ کیا۔ صحافی نے اوپر دیکھا چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ شکست خوردہ بادشاہ نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ صحافی نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ ان کا پلستر اکھڑ چکا تھا۔ اینٹیں نمی سے بھربھری مٹی بن چکی تھیں۔ نپولین نے آخر میں فرش کی طرف اشارہ کیا۔ صحافی نے نیچے دیکھا، ٹائلیں غائب تھیں، فرش ناہموار تھا، پلنگ کے پائے آدھے آدھے فٹ تک زمین میں دھنس چکے تھے۔ وہ کوٹھری کے مشاہدے سے فارغ ہو چکا تو..... نپولین نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "خود بتاؤ کیا یہ جگہ بادشاہوں کی رہائش کے قابل ہے؟" صحافی نے تاسف سے گردن ہلا کر جواب دیا۔

"نہیں! یکسی لیسی ہرگز نہیں لیکن آپ اس سلوک پر احتجاج کیوں نہیں کرتے؟" نپولین نے قہقہہ لگایا اور نوجوان صحافی کا بازو تھپتھپا کر کہا۔

"بادشاہ حکم دیا کرتے ہیں۔ حکم نہ دے سکیں تو خاموش رہا کرتے ہیں۔ احتجاج نہیں کیا کرتے۔"

ہمارے اسلام نے بھی بار بار کی ہے۔"

"واجے! میں سب کرنے کو تیار ہوں۔ بس مجھے یقین دلادیں کہ..... میری آخری سانس سے پہلے پہلے وہ پلٹ آئے گی۔"

"صالح! کوئی دوسرا یقین نہیں دلاسکتا۔ دراصل انسان کا اپنا ارادہ ہی یقین ہوتا ہے مگر جو کچھ میں تمہیں بتاتے جارہا ہوں، اس پر چلو گے تو مجھے اپنے رب سے پوری امید ہے کہ سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق نہ بھی ہوا تو..... جو کچھ بھی ہوگا، بہت اچھا ہی ہوگا۔"

اس روز صالح اور واجے فضل کے درمیان ایک طویل نشست ہوئی۔ اس نشست کے دو تین روز بعد ہی صالح کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئیں۔

☆☆☆

صالح نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ خود کو تبدیل کرے گا اور واجے کی ہدایات کے عین مطابق کرے گا۔ وہ ہمیشہ سے مرغن غذاؤں کا عادی تھا۔ تبدیلی کا آغاز اس نے خوراک کی تبدیلی سے کیا۔ پُرتکلف دسترخوان کو نہایت سادہ اور مختصر کردیا۔ اس سے پہلے کھانے میں مرغ، مچھلی، سری پائے اور اکثر پرندوں کا گوشت بھی شامل ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا اور کھانے میں گوشت کا "ریشو" کم کردیا گیا۔ دن میں تین کے بجائے دو وقت کا کھانا اپنالیا گیا۔

اس انقلاب کی زد میں جو دوسری چیز آئی اس کا تعلق بصری تفریح یعنی سوشل میڈیا اور فلم بینی وغیرہ سے تھا۔ پورنو گرافی سے تعلق تو اس نے تب ہی ختم کردیا تھا جب آفرین سے عہد و پیماں ہوئے تھے۔ اب واجے کی ہدایت کے مطابق اس نے اپنا تعلق کتاب سے جوڑ لیا اور کتابیں بھی وہ جو سطحی جذبات ابھارنے کے بجائے معلومات اور اچھی تفریح فراہم کرتی تھیں۔

صالح کو تفصیلی ہدایات دیتے ہوئے واجے نے ایک ضمنی چیز کا بھی ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ سر اور چہرے کے بڑے بال عموماً مرد کی اندرونی تپش اور اضافی خواہش کو کم کرتے ہیں۔ وہ کم از کم سر منڈوانا تو چھوڑ دے (صالح گاہے بہ گاہے سر منڈوا دیتا تھا)۔ بظاہر یہ بات عجیب لگی تھی مگر صالح نے اس پر بھی عمل شروع کردیا تھا۔

تیسری اہم نصیحت جو واجے نے کی تھی، یہ تھی کہ وہ اپنے اندر کی فالتو جسمانی توانائی کے اخراج کا کوئی احسن طریقہ ڈھونڈے۔ اس کے لیے اسے اپنے پسندیدہ کھیل کرکٹ سے بہتر کوئی چیز نظر نہ آئی۔ وہ اپنا زیادہ فارغ وقت اس تفریح کے حوالے کرنے لگا..... اور تب ہی اس کو یہ اندازہ ہونا شروع ہوا کہ وہ اس کھیل میں کچھ نہ کچھ اضافی مہارت رکھتا ہے۔ اس کھیل میں بہت آگے نہیں تو کم از کم سرگودھا کی سطح پر تو نمایاں ہوسکتا ہے۔ کھیل میں اس کی دلچسپی کچھ اور بڑھ گئی اور یہ سب کچھ بھی پچھلے چند ہفتوں میں ہوا۔

اس انقلاب کا ایک وار اس کے غیظ و غضب اور جارح مزاجی پر بھی ہوا۔ وہ جو بات بات پر بھڑک اٹھتا تھا، خود کو بتدریج دھیما کرنے لگا۔ اس کے علاوہ بھی واجے کی کئی ہدایات تھیں۔ ان میں سے کچھ اس کی سمجھ میں آتی تھیں کچھ نہیں آتی تھیں لیکن وہ من و عن ان پر عمل کررہا تھا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ سب کچھ انسان کی مرضی اور منصوبہ بندی کے مطابق نہیں ہوتا۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ بہار کے ایک مست ہوا والے دن نے صالح پر پلٹ کروار کیا۔

واجے کی ہدایت پر نوجوان اور شوخ و شنگ خادماؤں کو سرخاب منزل سے فارغ کردیا گیا تھا مگر ہیڈ ملازمہ صادقہ کی ایک بھتیجی شبینہ ابھی تک حویلی میں ہی تھی۔ ایک روز صالح نے اسے بالکل عریاں حالت میں دیکھ لیا۔ ہوا یوں کہ صالح حویلی سے سرگودھا کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اسے شام کے بعد لوٹنا تھا۔ جیپ اختر اڈرائیو کررہا تھا۔ جن دنوں آفرین سے صالح کی شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں اور صالح کو وکی کی طرف سے اندیشہ رہتا تھا، اس نے سیکیورٹی کے لیے سرخاب منزل میں چار سی سی ٹی وی کیمرے لگائے تھے۔ ان میں سے ایک چھوٹا کیمرا اس کے بیڈ روم میں بھی تھا۔ یہ کیمرے نیٹ کے ذریعے صالح کے موبائل فون سے بھی منسلک تھے۔

صالح نے راستے میں یونہی کیمرے چیک کیے۔ بیڈ روم کے منظر نے اسے ذرا چونکایا۔ قبول صورت ملازمہ شبینہ کمرے کی صفائی کے لیے اندر آئی ہوئی تھی لیکن وہ اپنی موج میں تھی اور صفائی کے علاوہ کچھ اور بھی کررہی تھی۔ اسے کیمرے کا علم نہیں تھا۔ اس نے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کررکھا تھا۔ اس وارڈ روب کے سامنے کھڑی تھی جس میں آفرین کے کئی عروسی جوڑے ابھی تک موجود تھے اور حسرتناک منظر پیش کرتے تھے۔ شبینہ نے خود کو اپنے لباس کی قید سے آزاد کیا اور وارڈ روب میں سے ایک گلابی جوڑا نکال کر جلدی جلدی پہننے لگی پھر کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی پینترے بدلتی رہی۔ تب اوپر تلے دو جوڑے اور ٹرائی کیے پھر ایک نہایت قیمتی نائٹی پہن کر بستر پر دراز ہوگئی۔

رات کو صالح جب سرخاب منزل لوٹا تو بڑی طرح تپا ہوا تھا۔ چند گھنٹے پہلے دیکھے گئے مناظر بار بار اس کے دل و دماغ پر چابک رسید کررہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی اس نے شبینہ نامی اس لڑکی کو کمرے میں بلایا۔ ارادہ تو بس اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا ہی تھا مگر پھر اچانک ہی دل نے کسی اور انداز سے دھڑکنا شروع کردیا۔ جب صالح نے موبائل پر اسے اس کی خرمستی کے ثبوت دیے تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ منت سماجت کرنے لگی۔

صالح نے دانت پیس کر کہا۔ ”بڑا شوق چڑھا ہوا تھا تجھے نائٹی پہن کر بستر پر لیٹنے کا۔ لٹاؤں تجھے بستر پر؟“

وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ آئندہ نہ کرنے کی رٹ لگا رہی تھی اور بار بار دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی جہاں سے کسی وقت کوئی بھی اندر آسکتا تھا۔ صالح کے تصور میں اس کا وہ زرخیز سراپا چمک گیا جو اس نے آج صبح دیکھا تھا۔ لڑکی کی صورتِ حال دیکھ کر اسے صاف اندازہ ہورہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو وہ زیادہ چوں چراں نہیں کرے گی۔ چند لمحوں کے لیے صالح کو یوں لگا کہ کوئی بند سا اس کے اندر ٹوٹ گیا ہے اور پُرآشوب پانی بہہ نکلا ہے۔ اس کے بہکے ہوئے ذہن نے کہا..... وہ تو دور ہے، بہت دور ہے۔ کیا پتا کب ملے گی اور ملے گی بھی یا نہیں۔ یہ تو سامنے ہے، ایک ہاتھ کی دوری پر، ایک حکم کے فاصلے پر..... اور صرف یہی نہیں ہے..... اور بھی بہت سی ہیں..... اور بھی بہت کچھ ہے۔ مدہوش سانسیں، مدھ بھری راتیں، ریشمی گداز کے سرمہر تھنے، گرم لمس کی دل نشین سوغاتیں.....

پھر اسے ایک شدید دھچکا محسوس ہوا..... لیکن وہ کہاں ہے؟ اگر اس نے یہ سب کچھ پالیا تو اسے کھودے گا، ہمیشہ کے لیے گنوادے گا۔ ان صبر آزما لمحوں میں نہ جانے کیوں اس کے آخری خط کے چند الفاظ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے..... ”مجھے نہیں معلوم میرے صالح! اب کبھی تمہیں دیکھ سکوں گی یا نہیں۔ تیز آندھیاں ہیں جو مجھے نامعلوم سمت میں اڑائے چلی جارہی ہیں لیکن ان آندھیوں میں ایک دیا روشن ہے۔ دیکھو کیسا اُنوکھا دیا ہے..... دیکھو نا.....“

اسے لگا کہ وہ چند لمحے بھی اس کمرے میں مزید رہا تو سب کچھ کھودے گا..... سب کچھ..... اور اس دیے کو بھی جو کہیں تیز آندھیوں میں جل رہا ہے۔ وہ ہوا کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کوردنا کسی حد تک کنٹرول میں تھا۔ آفرین کو اوجھل ہوئے اب چار ماہ ہو چلے تھے۔ اس کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ اس دوران میں صالح ایک مرتبہ پیرس سے بھی ہو آیا تھا۔ بہت پریشان رہنے کے بعد صالح کی پھوپھو عاصمہ کو بھی جیسے ایک قرار سا آگیا تھا۔ وہ جانتی تھیں، ان کی بیٹی سمجھ دار اور جہاندیدہ ہے اور جہاں بھی ہوگی، اپنا مطلوبہ ماحول پیدا کرلے گی۔ ان کا کہنا تھا میں اس کی مزاج شناس ہوں۔ میں اس کی ماں نہیں، وہ میری ماں ہے۔ وہ آئے گی تب ہی جب اس کا اپنا ارادہ ہوگا۔

یہاں سرخاب منزل میں صالح خود کو مسلسل تبدیل کرتا چلا جارہا تھا۔ اس کے روز و شب مکمل طور پر بدل رہے تھے۔ اس نے کبھی اپنی خطا سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ اب بھی نماز سے دور ہی تھا مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ واجے کے مجبور کرنے پر روزانہ کم از کم ایک بار سربسجود ہونے لگا تھا۔ سادہ خوراک کے علاوہ واجے نے اسے ایک اور عادت ڈال دی تھی اور وہ تھی گاہے بہ گاہے روزہ رکھنے کی عادت۔ خود صالح نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا کہ روزہ اس کے اندر کی کثافت کو کم کرتا ہے..... اس کے اندر ایک خاص طرح کی خوشبو اور نرمی جگاتا ہے۔ اسے یہ مشق اچھی لگنے لگی تھی۔

روز و شب ایک دوسرے کے تعاقب میں تھے۔ اس دورانیے میں وقار وکی کی طرف سے ایک دو چھیڑ خانیاں ہوئی تھیں اور اختر ابہت بپھرا بھی تھا مگر صالح نے اسے نظر انداز کرنے کو کہا تھا۔

پتا نہیں کسی وقت صالح کو کیوں یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کے روز و شب کے بارے میں جانتی ہے اور کوئی نہ کوئی دن ایسا آئے گا جب صالح کی کایا کلپ دیکھ کر وہ پگھل جائے گی، اس کا پتھر دل موم ہوجائے گا، وہ مایوسیوں کے افق سے یوں نمودار ہوگی جیسے کسی قاتل رات کے بطن سے صبح کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

لیکن وہ نہیں ہوا جو صالح چاہتا تھا۔ ہاں صالح وہ کرتا رہا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ جس کا عزم اس کے سینے میں پختہ تر ہورہا تھا۔ کبھی کسی گھڑی اس کے ایمان میں لرزش نمودار ہوتی تو وہ بہ زبان خاموشی خود سے کہتا۔ ”نہیں..... اسے کھودو گے..... اسے کھودو گے..... ایسے مت کرنا۔“

ایک فقرہ اس کی نگاہوں کے سامنے چمکتا۔ ”ان آندھیوں میں ایک دیا روشن ہے۔ دیکھو کیسا اُنوکھا دیا ہے۔“ پھر صالح سے بغلگیر ہوکر اس کے سرگوشیوں میں کہے ہوئے الفاظ صالح کے کانوں میں گونجتے۔ ”تم اگر بھول

جانے میں یکتا ہو صالح! تو میں یاد آنے میں یکتا ہوں۔''
ہاں وہ ٹھیک ہی کہہ گئی تھی۔ وہ کہاں بھول سکتا تھا اسے۔ تب صالح کو اس کی کنواری سہاگن کی طرح زندگی گزار دینے والی بات یاد آتی اور اس کے دل سے ہوک سی اٹھتی۔ ان الفاظ میں طویل جدائیوں کا سندیسہ جھلک دکھاتا۔

ایک شام جب وہ حویلی کے اندر ہی بنائے گئے جاگنگ ٹریک پر بھاگ رہا تھا، ایک ملازم نے بتایا کہ مردانے میں کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ تولیے سے پسینا پونچھتے ہوئے مردانے میں پہنچا۔ یہ اس کے ریاضی کے پرانے استاد مولوی شمس دین تھے۔ ان کے ہی چوبیس پچیس سالہ فرزند ارجمند نے ایک پھول کی کلی کو یوں مسلا تھا کہ پتی پتی کر دیا تھا۔ اس بچی کی ماں نے صدمہ دل کو لگا لیا تھا اور اس سانحے کے چند ہی ہفتے بعد ہارٹ اٹیک سے چل بسی تھی۔ اب وہ شقی القلب جیل میں سڑ رہا تھا۔ سزائے موت ہو سکتی تھی۔

مولوی شمس صاحب صالح کو دیکھ کر رونے لگے۔
''مخدوم صالح! تمہیں میں نے اپنے بچوں کی طرح پڑھایا ہے۔ استاد روحانی باپ ہوتا ہے۔ دیکھو آج میں مصیبت میں ہوں۔ تمہارے ''بڑے'' لوگوں سے تعلقات ہیں۔ میری مدد کرو۔ کسی طرح میرے بچے کی مصیبت آسان ہو۔''
''جو ماں صدمے سے مر گئی، اس کی بھی ایک بچی تھی ماسٹر صاحب! جس کو تم نے برباد کر کے رکھ دیا۔ وہ آج تک زیر علاج ہے۔''
''وہ بھی اب زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہیں خودکشی ہی نہ کر لے۔''
''کر لے تو اچھا ہے..... اور ایک بات کہوں ماسٹر جی! آپ بھی اس کے گناہ سے بری الذمہ نہیں ہیں۔ آپ بہت بڑے مذہبی بنتے ہیں مگر دنیا داری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ آپ جیسے لوگوں نے دو کشتیوں میں پاؤں رکھا ہوتا ہے۔ نہ آپ اسلام میں پورے ہیں نہ دنیا داری میں۔ اگر پورے مسلمان بن کر بچوں پر سخت پابندیاں لگاتے ہیں تو پھر پورے مسلمان بن کر ان کی شادیاں بھی جلد کریں۔ انہیں چوبیس چوبیس اور تیس تیس سال تک کیریئر کے پیچھے نہ لگائیں یا پھر پورے دنیا دار ہی بن جائیں جس طرح مغرب میں ہوتا ہے۔ وہ چھوٹے بچوں کو عورت مرد کے بارے میں ہر بات بتا دیتے ہیں اور پھر دس بارہ سال کی عمر میں انہیں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ بنانے کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ کیا ہم لوگ ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں کر سکتے نا..... تو پھر کیوں آدھا تیتر، آدھا بٹیر بنے ہوئے ہیں۔ دو کشتیوں میں پاؤں ہمیں برباد کر چھوڑے گا۔'' وہ بڑبے کرب سے بولتا چلا گیا۔ اس کے اندر کا اپنا دکھ بھی شاید اس کے مکالمے میں شامل ہو گیا تھا۔

اس نے صاف لفظوں میں ماسٹر مولوی شمس صاحب سے کہہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہاں، ان کی کچھ مالی مدد کر دی کہ وہ بہتر وکیل کر سکیں۔

ماسٹر شمس دین کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا۔ آخر والدین اپنی مرضی اولاد پر کیوں ٹھونستے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے بیٹے میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ''میتھ'' جیسے خشک مضمون میں ماسٹرز کرے اور پروفیسر بنے مگر ماسٹر شمس دین اسے اپنی ضد بنائے بیٹھے رہے۔ بیٹا اپنی ناکامیوں سمیت بلوغت سے چھ سات سال آگے چلا گیا۔ اس کی فرسٹریشن ایک چھ سات سالہ معصوم بچی پر نکلی.....

☆☆☆

ہمیشہ سے حرکت میں رہنے والا وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ داجے فضل کریم اب مکمل طور پر ایک درویش کا سا رنگ ڈھنگ اختیار کر چکے تھے۔ وہ کم کھاتے اور کم سوتے تھے اس کے باوجود صحت اچھی تھی۔ لوگ ان کے نیاز حاصل کرنے دور دور سے آتے تھے۔ وہ زیادہ وقت عبادت میں گزارتے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور بہت دور تک دیکھتے ہیں۔ خود صالح نے بھی کئی بار محسوس کیا تھا کہ ان کی دانائی کبھی کبھی مستقبل بینی کے درجے تک پہنچتی ہے۔

ایک روز مردانے میں مزارعوں کے مسائل سننے کے بعد اور ان میں راشن وغیرہ تقسیم کرنے کے بعد صالح مزار پر پہنچا تو داجے عجب یاس انگیز موڈ میں دکھائی دیے۔ ان کے سفید چاندی جیسے بال اب ان کے شانوں تک جاتے تھے۔ روشن چہرے اور پیشانی پر چند لکیروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ آج چاند رات تھی۔ داجے فضل شام کے بعد اسے لے کر سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں پہنچے۔ مجاور نے قبروں پر درجنوں دیے روشن کر دیے تھے۔ داجے اور صالح نے سب قبروں پر گلاب کی پتیاں نچھاور کیں پھر دونوں ایک قبر کے سامنے خاموش بیٹھ گئے۔ یہ صالح کی والدہ ارجمند بیگم کی قبر تھی۔ دائیں جانب صالح کی نھی بہن اور بائیں جانب بابا جان ابدی نیند سو رہے تھے۔ داجے نے ان قبروں پر دیر تک دعا مانگی۔ صالح نے ان کا ساتھ دیا۔ داجے کی ہلکی نیلی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

گمشدہ آواز میں بولے۔ ''صالح! ارجمند کو چاند رات بہت پسند تھی۔ روزہ افطار کرتے ہی ہم دونوں اپنے اپنے گھر کی چھت پر چڑھ جاتے۔ کبھی چاند نظر آتا، کبھی نہ آتا لیکن ہم عجب سرشاری میں آسمان کو تکتے رہتے جیسے اصل مقصد چاند دیکھنا نہیں، بس اسے تلاش کرنا ہے۔''

ان کی آواز بھرا گئی۔ ''صالح! بڑی پاک روح تھی تیری ماں..... اس کے آلے دوالے ایک چاند سا رہا کرتا تھا۔ وہ جیسے پورے گاؤں کی بیٹی تھی۔ بہت عزت دی جاتی تھی اسے..... اور جسے زیادہ عزت ملتی ہے، اس کی ذمے داری بھی تو بڑھ جاتی ہے نا۔ شاید..... شاید یہی وجہ تھی کہ جب مجھ پر بہتان لگنے کے بعد اس کے والد نے اس کی شادی کا فیصلہ تیرے والد شاہنواز سے کیا تو اس نے اُف تک نہ کی۔ اپنی زبان کو تالا لگالیا۔ اپنی ساری حسرتیں اور مرادیں دل میں لے کر صدیوں پرانی ریت نبھائی۔ چپ چاپ ڈولی میں جا بیٹھی۔''

صالح نے آزردگی سے کہا۔ ''اس کے بعد امی سے کبھی آپ کی بات نہیں ہوئی؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم ''بات'' کہہ رہے ہو۔ اس نے تو کبھی آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں۔''

بات کرتے کرتے داجے ایک دم چپ ہو گئے۔ انہیں جیسے کچھ یاد آیا تھا۔ صالح کا بازو تھام کر اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر قبرستان میں بنے کمرے میں آ گئے۔ دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ داجے کچھ دیر مراقبے کی سی کیفیت میں رہنے کے بعد گویا ہوئے۔ ''صالح! بچپن میں تمہیں کہانی سنایا کرتا تھا نا۔ ایک بادشاہ نے اپنے خادم سے خوش ہو کر اسے اپنی نشانی کے طور پر اپنے ہار میں سے ایک موتی دیا تھا اور کہا تھا کہ زندگی میں جب بھی چاہو اور جو بھی چاہو، یہ موتی دکھا کر مجھ سے مانگ لینا۔''

صالح کو کہانی کے خدوخال یاد آ گئے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ صالح کی طرف دیکھ کر انکساری سے بولے۔ ''میں بھی تو اپنے شہزادے کا خادم ہی ہوں۔ اگر یہ خادم اپنے شہزادے سے کوئی وعدہ لے تو وہ مان جائے گا؟''

صالح نے جلدی سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''داجے! ایسی بات مت کریں۔ آپ میرے بزرگ میرے باپ کی جگہ پر ہیں۔'' پھر ذرا رک کر آبدیدہ ہو کر بولا۔ ''آپ حکم کریں، کیا مانگتے ہیں..... بلکہ حکم دیں۔''

''بس ایک وعدے کی ضمانت لینی ہے تم سے۔ ابھی خود بھی پورے یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا کہ کیا وعدہ ہے مگر وہ ہے..... وہ ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔ ان کی نگاہیں تاریک خلا میں دیکھ رہی تھیں۔

صالح نے بے ساختہ ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا پھر اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو آفرین کو پہنائی گئی تھی۔ یہ صالح کے لیے ایک مقدس تحفے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بولا۔ ''داجے! آپ ضمانت کی بات کر رہے ہیں تو میں اپنی سب سے عزیز ہستی کی قسم کھاتا ہوں، آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔''

ان کے سینے نے ایک ہچکی سی لی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے صالح کو گلے سے لگالیا۔ اپنے ہونٹ اس کے سر پر رکھ دیے۔

☆☆☆

وقت کا پہیہ رواں تھا۔ رات اور دن، خوشیاں اور غم، موسم اور تہوار ایک دوسرے کے تعاقب میں تھے۔

صالح کی آفرین کو اس سے جدا ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میں کئی طرح کی افواہیں بھی اڑی تھیں۔ ایک غیر مصدقہ خبر جس نے صالح کو شدید ترین تکلیف دی، یہ تھی کہ آفرین اب اس دنیا میں نہیں۔ کورونا کے زور کے دنوں میں وہ امریکا میں تھی اور جانبر نہیں ہو سکی۔

پھر اسی طرح کی ایک افواہ جو سرخاب منزل کے اردگرد گردش کرتی رہی، یہ تھی کہ صالح کو اپنی آرٹسٹ بیوی سے طلاق ہو چکی ہے۔ وہ بس دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے کبھی کبھی بیرونِ ملک کا چکر لگا آتا ہے۔ اس افواہ نے اس وجہ سے بھی زور پکڑا تھا کہ آفرین کبھی پاکستان ہی نہیں آئی تھی۔ صالح کو ثبوت مل گیا تھا کہ یہ افواہ پھیلانے میں وکی اور کسی حد تک اس کے والد کا ہاتھ ہے۔ وہ کاروباری طور پر بھی رائے فیملی سے کچھ پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی جلن بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جو افواہ انہوں نے پھیلائی تھی، اس کے حوالے سے سرگودھا کے ایک ہوٹل میں اختر اور وکی میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ وکی کے کارندے پہنچ گئے تھے اور انہوں نے نہ صرف اختر سے سخت مار ماری کی تھی بلکہ جانے لوری کے بھرے پن کا بدلہ لینے کے لیے اسے ''شدید'' زخمی کرنے کی کوشش بھی کر ڈالی تھی۔ اختر کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سرخاب منزل پہنچ کر اس نے صالح سے اجازت طلب کی تھی۔ وہ سخت کشمکش میں تھا۔ اپنی برادری کے پچاس ساٹھ بندے لے کر حریفوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا تھا۔ اگر پہلے والا صالح ہوتا تو یقیناً ٹھیک ٹھاک خون خرابا ہو جاتا مگر یہ نیا صالح تھا۔ وہ

بتدریج اشتعال کو دبانا اور سر کو جھکانا سیکھ رہا تھا۔ اس نے صرف کیس درج کرانے پر اکتفا کیا تھا۔

وہاں پیرس اور گردونواح میں بھی آفرین کو ڈھونڈنے کی بہت کوششیں کی گئی تھیں اور اب تک جاری تھیں۔ صالح کی پھپھو عاصمہ اور کزن فرحان اپنے طور پر تگ و دو جاری رکھے ہوئے تھے۔ پھپھو عاصمہ کا خیال تھا کہ پینٹنگ اس کا جنون ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، رنگوں سے دور نہیں ہوگی۔ وہ مصوری کی نمائشوں اور آرٹ گیلریز وغیرہ میں اس کی ٹوہ لگاتے رہتے تھے۔ ایسی اطلاعات بھی ملی تھیں کہ پیرس میں آفرین کے فن کے بے شمار مداح اسے بری طرح مس کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ فرضی نام سے اب بھی پینٹنگز بناتی ہے۔

صالح کے لیے تو ہر صبح امید بندھتی تھی اور ہر شام آس کا پنچھی ڈوبتا تھا۔ البتہ اب ایسے دورانیے بھی آنے لگے تھے جب آس کی شدت کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔ شدت کی یہ کمی بھی صالح کے اندر ایک طرح کا دکھ ہی جگاتی تھی پھر بھی کبھی صالح کو داجے کی وہ باتیں یاد آتیں جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے قبرستان والے کمرے میں صالح سے کہی تھیں اور ایک نامعلوم وعدہ لیا تھا۔ اس وعدے کا کیا مطلب تھا؟ کیا انہیں خود صالح کی طرف سے ہی کوئی خدشہ تھا؟

مایوسی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں کبھی ایک انجانی روشنی بھی نظر آتی۔ داجے فضل نے ایک بار اس سے کہا تھا....

"جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، اس پر چلو گے تو مجھے اپنے رب سے پوری امید ہے کہ سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق نہ بھی ہوا تو..... جو کچھ بھی ہوگا، بہت اچھا ہی ہوگا۔"

اور صالح اسی بہتری کی امید کی رسی مضبوطی سے تھامے اپنے راستے پر چل رہا تھا..... چلتا جا رہا تھا۔ بہت بدل چکا تھا وہ۔ جس نے بھی اسے چار پانچ سال پہلے دیکھا تھا، یقین ہی نہیں کر پاتا تھا کہ یہ وہی صالح ہے۔ اس کے اندر جو سب سے بڑی تبدیلی آئی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اپنی سب سے بڑی کمزوری پر غالب آ چکا تھا اور یہ کمزوری تھی جنس مخالف کی غیر معمولی طلب۔ کبھی کبھار تنہا راتوں میں ایک لہر سی تو اس کے اندر ضرور اٹھتی تھی مگر اب یہ لہر زور نہ پکڑتی تھی۔ آناً فاناً سطحِ آب پُرسکون ہو جاتی تھی۔ اب وہ بہت سی چیزوں سے دور ہو چکا تھا۔ بسیار خوری، شکم پروری، منشیات، راگ رنگ اور دیگر لہو و لعب اس کی زندگی سے نکل چکے تھے اور اس انخلا نے اس کے سفلی جذبات کو تہ تیغ کر ڈالا تھا۔ اس کامیابی میں کچھ کردار جسمانی مشقت کا بھی تھا۔ اس کا پسندیدہ گیم کرکٹ تو بس ایک وسیلہ تھا، اضافی توانائیوں کے اخراج کا۔ تاہم اس وسیلے نے اسے خوشی اور ہار جیت کا مزہ بھی دیا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس کرکٹ تک پہنچا تھا اور کبھی کبھی سرگودھا جا کر فرسٹ کلاس میچ میں شرکت بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کثیر رقم سے سرگودھا میں کرکٹ کا ایک کوچنگ سینٹر بھی بنوایا تھا جہاں سرگودھا، فیصل آباد اور گردونواح کے نوعمر بچے ماہر کوچز کی زیر نگرانی اپنی صلاحیتوں کو نکھارتے تھے۔

اول تو ایسے مواقع کم آتے تھے لیکن اگر کسی وقت کسی بھی حوالے سے اس کے فکری اور اخلاقی عزائم ذرا سا متزلزل ہوتے تھے تو وہی بھولا بسرا فقرہ اس کے دل و دماغ پر دستک دیتا تھا.....

صالح تصور کی نظر سے اس دیے کی لو کو دیکھتا۔ دیے کی لو بہت کم ہو چکی تھی مگر ایک نقطے کی طرح موجود تو تھی۔

پھر گرمیوں کی ایک شفق رنگ شام میں سرخاب منزل کی سفید چھت پر ٹہلتے ٹہلتے نہ جانے کیوں صالح کے ذہن میں پھر بارش کا وہی بھولا بسرا دن آ وارد ہوا جس کو دہرانے کی آس مدتوں تک صالح نے اپنے دل میں پالی تھی..... اور شاید آفرین نے بھی۔ وہ بھولا بسرا دن مکمل طور پر کیسے لوٹ سکتا تھا۔ لوٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو وہ سرخاب منزل ہی نہیں تھی جہاں وہ بے مثل دن خوشی میں ناچتے دو بچوں پر ایک آسمانی تحفے کی طرح اترا تھا۔ نہ وہ سنگِ مرمر کی بالکونی تھی، نہ سنگِ سرخ کے تین فوارے، نہ ہی وہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی چار نیم پختہ روشیں، نہ وہ لمبی چوڑی خستی دیوار جس پر بیلیں چڑھائی جاتی تھیں..... پھر وہ طویل برآمدہ بھی تو نہیں تھا جس کے ایک محرابی دروازے سے سہمی آفرین جھوم کر نکلی تھی اور بارش کو تکنے لگا یا تھا۔ ایک دوسرے محرابی دروازے سے صالح ماماں بی کا ہاتھ چھڑا کر بھاگا تھا اور مجورِ رقص ہو گیا تھا۔ سب کچھ ہی تو بدل چکا تھا۔

کیا اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا؟ کیا وہ سب بھی آفرین کی طرح ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا؟ یکایک اس کے اندر ایک عجیب خیال برق کی طرح لہرایا۔ بچپن کی یادیں ایک طاقتور "نوسٹلجیا" بن کر اس کے رگ و پے میں پھیل گئیں۔ اس نے وہیں شفق رنگ شام میں سفید چھت پر کھڑے کھڑے ایک فیصلہ کر لیا۔ ایک انوکھا تہیہ اس کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا۔

(جاری ہے)

کبھی حبس کے صحرا میں ... کبھی ہجر کے کاتوں میں...

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گہنی یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

آخری شام سے پہلے

طاہر جاوید مغل

چھٹا اور آخری حصہ





اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود میں سرخاب منزل کو آفرین تو نہیں لوٹا پایا مگر پرانے خدوخال تو سرخاب منزل کو لوٹا سکتا ہوں۔ میں اس کو ہو بہو ویسا بنا سکتا ہوں جیسی کبھی یہ تھی۔ وہی رنگ روپ، وہی در و دیوار، وہی دھوپ چھاؤں۔

ایک دن اس نے منیجر افراسیاب کو یہ کہہ کر حیران کر دیا۔ ''افراسیاب! میں اس حویلی کے نئے تعمیر شدہ حصوں کو گرانا چاہتا ہوں۔''

''صالح سرکار! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیران تھا۔

''میں اسے ویسا ہی بنانا چاہتا ہوں جیسی پہلے کبھی یہ تھی۔'' افراسیاب اور زیادہ حیران نظر آنے لگا۔ صالح نے کہا۔ ''میں کوئی انوکھی بات نہیں کر رہا ہوں افراسیاب! لوگ اپنی یادگاروں کو اسی پرانی شکل میں بحال کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے محکمے میں پورا ایک شعبہ اس کام کے لیے موجود ہوتا ہے۔''

افراسیاب حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

اگلے پانچ چھ ماہ میں سرخاب منزل کے اندر جو کچھ ہوا، وہ سب کے لیے تعجب خیز تھا۔ وکی وقار اور اس کے باپ سیف اللہ جیسے بدخواہ تو یہ کہنے لگے کہ صالح کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں رہی۔ وہ حواس کھو چکا ہے۔

اسے کسی کے کہنے کی کچھ پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک ہی دھن میں تھا، ایک ہی نشے میں گم۔ وہ تمام کام کی نگرانی خود کر رہا تھا، خاص طور سے مسماری کا کام مکمل ہونے کے بعد تو وہ ایک دن کے لیے بھی موقع سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔ مکمل بحالی کے لیے سرخاب منزل کی پرانی تصویروں سے مدد لی جا رہی تھی۔ کہیں مشکل پیش آتی تو وہ اپنے تصورات سے کام لیتا یا پھر داجے یا ماماں بی وغیرہ سے مشورہ کرتا۔ داجے شاید واحد شخص تھے جنہوں نے صالح کے اس انوکھے اقدام پر کوئی سوال اٹھایا اور نہ کسی حیرت کا اظہار کیا۔ شاید وہ اس عشق کی گہرائی کو سمجھتے تھے جو صالح کی ہر رگ میں بس چکا تھا اور جواب حال سے نکل کر ماضی کی طرف سفر کر رہا تھا.....

او کھے پینڈے لمیاں راہواں عشق دیاں.....

خاص سنگِ سرخ کے حصول کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ آخر کار وہ مل گیا۔ ٹیکسلا کے دو ماہر کاریگروں نے وہ تین فوارے پھر سے تیار کیے جو ہو بہو پہلے فواروں کی تصویر تھے۔ ایک دیدہ زیب لیبر کو تڑوا کر اس کی جگہ پرانی طرز کی وہی سفید بالکونی بنائی گئی تھی جس سے صالح کے بچپن کی بہت سی سنہری یادیں وابستہ تھیں۔ عین پرانے نقشے کے مطابق نیم پختہ روشیں تعمیر کی گئیں اور ان کے اردگرد گھاس بچھائی گئی۔ ایک بڑا پورشن جو کروڑوں کی لاگت سے چند ہی سال پہلے بنا تھا، مسمار کروا گیا۔ وہاں پر ناتک چندی اینٹوں کی وہی لمبی اونچی دیوار بالکل پہلے والے انداز میں تعمیر کی گئی اور اس پر وہی پرانی بیلیں چڑھائی گئیں جو کبھی سرخاب منزل میں بہار دکھایا کرتی تھیں۔

کسی وقت تو وہ بالکل خبطیوں کی طرح ہو جاتا تھا۔ کاریگروں سے الجھ پڑتا تھا..... نہیں، دیوار کا یہ کونا ایسے نہیں، ایسے تھا۔ اس فرش پر جپسم کے رنگوں کی ترتیب یوں نہیں، یوں تھی۔ یہ اینٹ ایسے نہیں، ایسے تھی اور اس کی محنت واقعی رنگ لا رہی تھی۔ دیکھنے والے ششدر تھے کہ جدید تعمیرات والے پورشن کے اندر سے وہی برسوں پرانی حویلی اسی مکمل صورت میں نمودار ہو رہی تھی۔ ماضی کی محبت اور روپے کی طاقت سے اس نے وہ کر دکھایا تھا جو بظاہر ناممکن تھا۔ وہی رنگ روپ، دھوپ چھاؤں کے وہی زاویے۔ ہوا کا وہی پرانا گزر۔ اپنے سپنے کو مکمل تعبیر دینے کے لیے وہ آخری حدوں تک چلا گیا اور کامیاب ہوا۔ اس نے کچھ منتخب پھل دار درخت منگوائے۔ دوسری جگہوں سے ان پلے پلائے درختوں کو منگوانے کے لیے پیشہ ور افراد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان درختوں کو گاچی کیا گیا۔ ان کے Soil Balls کو پٹ سن کے بڑے بڑے غلافوں میں لپیٹ کر لوڈرز پر بار کیا گیا پھر انہیں سرخاب منزل میں خاص تکنیک کے ساتھ ان ان جگہوں پر پلانٹ کیا گیا جن کی نشاندہی تصویروں نے اور خود صالح نے کی۔

دیکھنے والے حیران تھے۔ صالح نے وقت کی طنابیں کھینچ لی تھیں اور گھڑی کی سوئیوں کو الٹا چلا دیا تھا۔

☆☆☆

ساون آیا اور چلا گیا..... سردیاں آئیں اور رخصت ہو گئیں۔ ایک بار پھر پھولوں میں رنگ بھرے جانے لگے اور یادِ نو بہار کی آمد ہوئی۔ ایک یاس انگیز نغمے کی بازگشت صالح کے کانوں میں گونجا کرتی۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی

وہ اپنے بچپن اور لڑکپن کا نقشہ پھر سے سرخاب منزل کو دے چکا تھا مگر وہ ماضی کی صدائیں کہاں سے لاتا جو ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی تھیں۔ وہ بچپن کا ساتھی، وہ ہم نشین جو اپنا کوئی سراغ ہی چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ یہاں صرف وہی تصور دار تھا۔ اسی نے عہد توڑا تھا، اسی نے پیمان تاراج کیے تھے۔

سرخاب منزل میں جو حیران کن تبدیلیاں ہوئی تھیں، ان کا قرب و جوار میں چرچا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے صالح کا خبط قرار دیا تھا لیکن کچھ پڑھے لکھے لوگ ایسے بھی تھے جو اس عمل کو ماضی سے جڑے رہنے کی ایک قدرتی خواہش سمجھتے تھے جو ہر انسان میں کسی نہ کسی درجے میں موجود ہوتی ہے۔

صالح جیسے ایک بھٹکی ہوئی روح تھا جو سنسان دوپہروں، اداس شاموں اور لمبی قاتل راتوں میں سرخاب منزل کے اندر چکراتی تھی۔ ماضی کے یہ در و بام، اجالے اور تاریکی کے یہ زاویے اس کی یادوں کو ابھارتے تھے اور دل میں میٹھی میٹھی لہریں جگاتے تھے۔

..... مگر پھر بتدریج احساسات بدلنے لگے۔ جب وہی نہیں تھی تو اس حویلی کو اپنے بچپن کا نقشہ دے کر بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ دل و دماغ میں ایک اور انقلاب برپا ہونے لگا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ سرخاب منزل کو فروخت کر ڈالے۔ آہ..... ایسے بھی کیا سرخاب کے پر لگے تھے اس سرخاب منزل کو۔

وہ سوچنے لگا کہ سرخاب منزل کی ساری پرانی شامیں، دوپہریں اور راتیں، تہواروں اور موسموں سمیت سمیٹ کر ایک گٹھڑی کی صورت اپنے سر پر رکھے اور کہیں دور جا بسے۔ ان رستوں، ان کھیتوں کھلیانوں، باغ باغیچوں اور رواں پانیوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دے۔

..... اس نے کہا تھا۔ ''آندھیوں میں دیا جلتا ہے۔ دیکھو کیسا الو کھا دیا ہے۔ دیکھو نا۔''

ہاں، وہ الو کھا دیا تھا لیکن وہ آندھیوں میں کب تک جل سکتا تھا۔ شاید وہ بجھ چکا تھا۔

کہتے ہیں کہ صبح ہونے سے پہلے رات کی تاریکی بہت گہری ہو جاتی ہے۔ یہاں تاریکی بہت گہری تھی اور صبح بھی کہیں نہیں تھی۔ وہ فراق کی اس سرزمین سے ہجرت کرنے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اس حوالے سے اس نے اپنے وکیل صمد بخاری سے بھی ابتدائی مشورہ کیا۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب صالح سمجھ گیا کہ اب سب کچھ چھوڑنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ تفصیلی مشورہ کرنے کے لیے وہ مزار میں داجے فضل کے پاس پہنچا۔ وہ شام سے عشا تک مراقبہ کرتے تھے مگر اب تو عشا ہوئے بھی ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ وہ بدستور مراقبے میں تھے، اپنے حجرے میں چٹائی پر آلتی پالتی مارے جھکے ہوئے تھے، آنکھیں بند تھیں، دایاں کندھا دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔

''داجے..... داجے!'' اس نے پاس ہو کر آواز دی۔

انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے مگر چہرے پر الم کی جگہ ایک طرح کا سکون تھا جیسے بھادوں کی بارش میں دھوپ اور چھاؤں ہوتی ہے۔

وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انہوں نے حسبِ معمول اس کی پیشانی چومی۔ وہ اپنے دل کے دکھڑے سنانے لگا۔ دل ہلکا کرنے کے لیے وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''داجے! شروع شروع میں پتا نہیں مجھے کیوں لگا کرتا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، مجھے دیکھ رہی ہے۔ سرخاب منزل میں جھانک رہی ہے۔ وہ میری زندگی میں آنے والے ہر انقلاب اور امتحان سے واقف ہے..... اس نے مجھے طویل سزا تو دی ہے مگر..... اپنے مجرم کی حالت سے بے خبر نہیں ہے..... مگر اب.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''اب کیا؟'' انہوں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''داجے! اب لگتا ہے کہ وہ سب میرا وہم ہی تھا۔ بس میرے اپنے ہی ذہن کا فتور۔''

''وہ فتور نہیں تھا اور نہ وہم تھا۔ وہم والی بات تو تم اب کر رہے ہو۔''

''کیا مطلب داجے؟'' وہ پژمردہ آواز میں بولا۔

''وہ آ چکی ہے صالح!''

''کک..... کون آ چکی ہے؟ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''اسی کی جس کی بات تم کر رہے ہو۔'' وہ پُرسکون انداز میں ہولے سے بولے۔

صالح کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سکتہ زدہ سا داجے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا۔

''ہاں صالح..... وہ آ چکی ہے۔''

''کہاں..... کہاں ہے؟''

''جاؤ گھر۔ وہ پہنچ چکی ہو گی یا پہنچنے والی ہو گی۔''

''داجے! میرا دل پھٹ جائے گا۔ آپ..... آپ.....'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ داجے اس سے کیسے مذاق کر سکتے تھے۔

انہوں نے ایک بار پھر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

وہ حجرے سے نکلا اور جیپ میں بیٹھا۔ گارڈز نے لوگوں کو ہٹا کر اس کا راستہ صاف کیا۔ وہ اندھا دھند سرخاب منزل کی طرف لپکتا چلا گیا۔ جیپ کے پہیے پورچ میں چرچرائے۔ جیپ سے نکل کر اس نے ملازمہ صادقہ کو جھنجھوڑا۔ ''کوئی آیا ہے؟ کوئی آیا ہے؟''

''نن..... نہیں صالح سرکار!'' وہ حیرت سے بولی۔
اسے چھوڑ کر وہ دیوانہ وار رہائشی حصے میں گھس گیا۔ جو بھی سامنے آیا، اس سے پوچھا۔ ''کوئی آیا ہے؟'' کوئی نہیں آیا تھا۔
پھر داجے نے کیوں کہا..... کیوں کہا ایسا؟
وہ واپس پورچ میں آیا۔ وہ پھر داجے کی طرف لپک رہا تھا لیکن جب وہ مین گیٹ پر پہنچا، جیپ کی ہیڈ لائٹس کو جیسے ایک آفتاب نے دھندلا دیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ ابھی ایک پرائیویٹ ٹیکسی کار سے اتری تھی اور گارڈ سے گیٹ کھولنے کا کہہ رہی تھی۔
..... چند سیکنڈ بعد وہ سرخاب منزل کی ''دہلیز'' پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ لان کے کامدار سبز سوٹ میں تھی۔ دوپٹا بہار کی مدھم ہوا میں لہرا رہا تھا، بالوں کی ایک دو لٹیں چہرے پر جھول آئی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ چمکیلے شولڈر بیگ کے اسٹریپ پر تھا..... وقت جیسے تھم گیا تھا۔

☆☆☆

رات تھی، بہار تھی، چاند تھا اور مدھم ہوا بھی۔ کمرے میں صالح اور آفرین صوفے پر یوں بیٹھے تھے کہ آفرین، صالح کے بازوؤں کے نرم گھیرے میں تھی۔ اس کا سر صالح کے سینے پر ٹکا ہوا تھا۔ رو رو کر دونوں کے جی اب کچھ ہلکے ہو چکے تھے۔
صالح نے اشک بار آواز میں کہا۔ ''ایک بار پھر کہو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔''
''کر دیا..... اور تم نے صالح؟ تم نے معاف کیا؟''
''تم نے کوئی غلطی نہیں کی آفرین! تم نے تو غلطیوں کو سدھارا ہے۔''
''لیکن کتنی سنگدلی دکھائی، کتنی بے رحم بنی رہی۔ شاید کوئی سزا بھی میرے لیے زیادہ نہ ہو۔''
''ایسا مت کہو آفرین! تمہاری جس قربانی نے مجھے ایک نیا انسان بنا دیا ہے، اسے سنگدلی مت کہو۔''
پھر یکا یک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے آفرین کا سر اپنے سینے سے ہٹایا۔ ''آفرین! ہم نے بہت سی باتیں کر لیں لیکن ایک سوال..... ایک سوال ایسا ہے جو پچھلے چار سال سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے، پوچھوں؟''
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
''آفری..... ! میں نے اپنی غلطی بتائے بغیر تم سے معافی مانگی تھی..... اور تم نے انجانے میں معافی دے بھی دی تھی مگر پھر..... تمہیں اصل بات کا پتا کیسے چلا؟''
وہ دوبارہ اس کے سینے پر سر ٹکا کر بولی۔ ''تم بتاؤ صالح! تمہارا کیا خیال ہے، مجھے کیسے پتا چلا؟''
وہ ذرا توقف کر کے کہنے لگا۔ ''میرا اندازہ تو یہی ہے کہ یہ وکی کے چھوڑے ہوئے کسی مخبر کا کام تھا جو ملازم یا ملازمہ کے روپ میں حویلی میں موجود تھا لیکن ضروری نہیں کہ اس کے پیچھے وکی ہی ہو، کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔''
''تمہارے سوال کا جو جواب میں دوں گی، وہ تمہیں حیران کر دے گا لیکن یہ جواب میں تمہیں اس شخص کی اجازت سے ہی دے رہی ہوں۔ وہ کوئی اور نہیں صالح..... ہمارے داجے فضل تھے۔''
صالح کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو آفری؟''
''وہی کہہ رہی ہوں جو حقیقت ہے صالح! تمہیں پتا ہی ہے داجے ہفتے میں کم از کم ایک دن یہاں سرخاب منزل میں گزارتے ہیں۔ یہیں پر انہیں یہ سب معلوم ہوا اور انہوں نے وہ مجھے بتایا۔ کیوں بتایا اور ان کے بتانے سے ہم دونوں کے کیا فائدے یا نقصان ہوئے، اس کا جواب تم خود ڈھونڈ لو۔''
آفرین کا سر چوم کر صالح نے اسے خود سے جدا کیا۔ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اسے دیکھنے لگا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا۔ شاید داجے جان چکے تھے کہ اس کی وہ غلطی آخری نہیں ہے۔ اس کا علاج رسمی معافی سے نہ ہو سکے گا۔ یہ ایسا ہی ہوگا کہ کینسر یا ہیپاٹائٹس کا علاج ڈسپرین سے کیا جائے یا پھر کسی بڑے مجرم کو دو روز حوالات کی ہوا کھلا کر چھوڑ دیا جائے۔ اس کے لیے طویل سزا اور سخت تادیب کی ضرورت تھی..... اور انہوں نے آفرین کو آگاہ کر دیا تھا۔
آفرین نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔ ''شاید تم سوچ رہے ہو کہ داجے فضل میرے ساتھ رابطے میں تھے۔ نہیں صالح! اپنے اہل خانہ سمیت میں کسی کے ساتھ رابطے میں نہیں تھی۔ صرف ایک سال پہلے میں نے امریکا کے شہر اسٹاکٹن سے فرسٹ ٹائم داجے سے رابطہ کیا تھا۔ یہ ٹیلی فونک رابطہ داجے کے ایک مرید کے ذریعے ہوا تھا۔ میں نے سب کچھ داجے کے گوش گزار کیا تھا۔ تمہارے بارے میں سب کچھ پوچھا تھا اور ان سے راہنمائی چاہی تھی۔ پتا ہے انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟''
''کیا؟'' صالح نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔
انہوں نے کہا۔ ''اتنی آزمائش کاٹ چکی ہو تو دل پر جبر کر کے تھوڑی سی اور کاٹ لو۔ بہت کچھ بدل رہا ہے۔''

''پھر؟''

''اس کے بعد دو مرتبہ عزیدان سے رابطہ ہوا۔ انہوں نے تمہارے اندر آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ تم آج کل عجیب کیفیت میں ہو۔ ہر وقت ماضی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ آخر ایک گفتگو میں، میں نے ان سے کہا۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھ سے نہیں جھیلا جاتا، میں آنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا۔ ہاں، اب تمہارا آجانا بنتا ہے۔''

صالح حیرت سے گنگ سن رہا تھا۔

☆☆☆

سرخاب منزل میں خوشی کی لہر تھی۔ چار سال بعد حویلی کی دلہن نے پھر حویلی میں قدم رکھا تھا۔ ان تقریباً چار سالوں نے آفرین کو کچھ اور بھی نکھار دیا تھا، اس کے شباب میں کچھ اور رنگ بھر دیے تھے۔ ماماں بی اس کی بلائیں لیتے ہوئے نہیں تھکتی تھیں۔ صالح کو جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کے مطابق آفرین نے یہ تمام عرصہ امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر اسٹاکٹن میں ہی گزارا تھا۔ اس نے اپنے ذرائع سے اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں باخبر رہنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اب بھی وہ پیرس سے ہوتی ہوئی اور اپنی والدہ اور بھائی سے معافی تلافی کرتی ہوئی پاکستان پہنچی تھی۔ آفرین کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس سے شادی کے خواہشمند ایاز شیرازی کی شادی دو سال قبل ہو چکی ہے اور وہ خوش و خرم ہے۔

صبح دم جب آفرین نے صالح کے ساتھ بالکونی میں کھڑے ہو کر نیچے سرخاب منزل پر نظر دوڑائی تو حیران ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ''صالح! یہ کیا، یہ سب کچھ تو ویسا ہی ہے..... جبکہ مجھے پتا چلا تھا کہ ماموں شاہنواز نے حویلی میں بہت کچھ تبدیل کر دیا ہے۔ جب ہم کوالالمپور میں تھے تو ایک مرتبہ پھپھو خدیجہ نے ہمیں بدلی ہوئی سرخاب منزل کی کچھ تصویریں بھجوائی تھیں۔'' حیرت سے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''.....اور ان تصویروں کو دیکھ کر تمہیں کیسا لگا تھا؟''

''بہت برا لگا تھا صالح..... لیکن..... لیکن یہ سب کچھ..... پھر ویسا ہی.....؟''

''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے نا آفرین! جو سب کچھ تمہیں برا لگا تھا، وہ اسی طرح کیسے رہ سکتا تھا۔ دیکھ لو، میں نے سب کچھ بدل دیا۔''

وہ ڈبڈبائی سی نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔ ''بہت زیادہ پیار کرتے ہو مجھ سے؟''

''لفظ چھوٹے ہیں آفری! پیار زیادہ ہے۔ اب میں کیا کہوں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اسی طرح اس کے شانے سے سر ٹکائے ٹکائے بولی۔ ''داجے نے جو بات کہی تھی، وہ اب کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا..... یہاں سرخاب منزل میں بہت کچھ بدل رہا ہے۔ تم عجیب کیفیت میں ہو اور ماضی میں پہنچے ہوئے ہو۔ اب سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ اشارے تمہارے اندر کی تبدیلیوں کے علاوہ اس حویلی کی تبدیلیوں کی طرف بھی تھے۔ یقیناً تم اس وقت سرخاب منزل کو پھر سے پرانی حالت میں لا رہے تھے۔''

وہ سرخاب منزل کے خدوخال دیکھ رہی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں بے پناہ حیرت بھری ہوئی تھی۔ دن کی روشنی میں سرخاب منزل کا ہر گوشہ نمایاں تھا۔ تب اچانک وہ کچھ اور چونکی۔ صالح کے شانے سے سر ہٹا کر حیرت سے ان سرسبز درختوں کو دیکھنے لگی جو حویلی کے اوپن ایریاز کا حسن بڑھا رہے تھے۔

''صالح..... صالح! یہ درخت بھی یہاں کیسے آگئے، یہ تو کٹ گئے تھے نا؟'' وہ ششدر تھی۔

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''جذبوں میں طاقت ہو تو سب کچھ لوٹ سکتا ہے..... اپنی ناراضگی کو ساری عمر تک پھیلانے کا عزم رکھنے والے بھی واپس آسکتے ہیں، وقت الٹا چل سکتا ہے۔''

..... پھر صالح نے مختصراً آفرین کو بتایا کہ ان بڑے بڑے درختوں کو کس طرح ری پلانٹیشن کی تکنیک کے ذریعے یہاں لگایا گیا ہے۔

ماماں بی نے بالکونی میں آکر ان دونوں کو بتایا کہ ناشتا لگا دیا گیا ہے۔ آفرین نے سفید چاندی بالوں والی مہربان صورت ماماں بی کو اپنے ساتھ لگایا اور پھر وہ تینوں کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

آفرین کے واپس آنے سے وہ ساری افواہیں دم توڑ گئی تھیں جو وقتاً فوقتاً یہاں پھیلائی جاتی رہی تھیں جن میں سے ایک افواہ یہ بھی تھی کہ آفرین اور صالح میں طلاق ہو چکی ہے اور آفرین کہیں اور شادی کرنے والی ہے۔

چار سال پہلے جب شادی کے موقع پر اور اس سے پہلے منگنی کے موقع پر بھی جب آفرین سرخاب منزل میں آئی تھی تو صالح کو اپنے رقیب روسیاہ وکی کی طرف سے سنگین خدشات لاحق ہو جاتے تھے۔ اس مرتبہ ایسے خدشات موجود

تھے لیکن سنگین نہیں تھے اور جو تھے وہ بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وقار وڑائچ کو چھ ماہ پہلے چار سال کے لیے جیل جا چکا تھا۔ یہ وہی فرنیچر مارکیٹ کے صدر کے قتل والا کیس تھا جس میں وہ بجا طور پر ملوث ہو چکا تھا۔

..... بہار وہ موسم ہے جس میں دل میں پھول کھلتے ہیں، روحوں میں خوشبو پھیلتی ہے اور جسم و جاں میں ایک ترنگ جاگتی ہے۔ چرند پرند، ہر طرح کے جانور اور انسان کچھ بھی بہار کے سحر سے باہر نہیں رہتا۔ وہ بھی بہار کی ایک ایسی ہی گل رنگ شام تھی جب پیار کی کہانی وہیں سے شروع ہوئی جہاں رک گئی تھی۔ وہ سب کچھ صالح کو اب بھی یاد تھا۔ پھولوں سے مہکے ہوئے پیرس کے ایک اپارٹمنٹ میں گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک دھڑکنوں کو زیر و زبر کرتی تھی اور قریب آتے لمحوں کا نشاط رگ و پے میں سرایت کرتا تھا۔ ہر فاصلہ مٹنے والا تھا اور ہر پیاس سیراب ہونے والی تھی..... لیکن پھر اچانک ہی ایک بڑا صحرا درمیان میں آ گیا تھا۔ ایک تند و تیز ریتیلی آندھی چلی تھی اور سب کچھ تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس آندھی نے صالح اور آفرین کو ایک دوجے سے بہت دور پھینک دیا تھا۔ یہ ایسی آندھی تھی جو چار برس رکی نہیں تھی۔ ریت کے ذرّے ان کے جسموں کو لہولہو کرتے رہے تھے اور اسی آندھی..... ہاں اسی آندھی میں ایک انوکھا چراغ بھی روشن رہا تھا۔

آج پھر کہانی کو وہیں سے شروع کرنے کا وقت تھا جہاں وہ رک گئی تھی، پیرس کے اس اپارٹمنٹ سے اور اس میں مہکے پھولوں سے بچھڑ گئی تھی۔ نرگس اور لالہ کے وہ مسکراتے پھول یکایک جھلس کر سیاہ ہو گئے تھے۔

اور آج یہ کہانی جو دوبارہ شروع ہو رہی تھی پیرس میں نہیں، سرخاب منزل میں شروع ہو رہی تھی۔ وہی در و دیوار، وہی گرد و پیش جہاں قریباً چار برس پہلے صالح دولہا بنا تھا اور آفرین نے عروسی جوڑا پہنا تھا۔ آج پھر وہی حجلۂ عروسی نئے سرے سے سجایا گیا تھا، مہکایا گیا تھا اور محرابی کھڑکیوں کے آگے جھولنے والے ریشمی پردوں نے اسے ایک گوشۂ بہشت کی شکل دے دی تھی۔

آفرین ہلکے گلابی کامدار لباس میں تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس لباس نے آفرین کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے یا آفرین کے سبب یہ لباس زیادہ دلکش نظر آتا ہے۔ یہ من کی گھڑیاں تھیں۔ صالح نے آفرین کے کان میں بچپن کی وہی پرانی سرگوشی کی۔ ہولے سے بولا۔ ''آفری! تمہارے گال کو ایک بار چھو کر دیکھوں؟''

آفرین نے جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کے بجائے اپنا رخسار اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کیا جان لینے والی ادا تھی۔ صالح کو اپنے ہونٹوں کی قسمت پر بے ساختہ رشک آیا۔ اس نے آفرین کو بانہوں کے نرم گھیرے میں لے لیا۔

وہ شوق سا شوق تھا، وہ خود سپردگی سی خود سپردگی تھی۔ سانسوں کی مہک سانسوں میں رچ گئی، دھڑکن میں دھڑکن سمائی اور آنکھوں کی نمی آنکھوں میں منتقل ہو گئی۔ صالح جیسے عطر بیز ہواؤں میں بلند سے بلند ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''آفرین!''

''ہوں۔''

''آفرین!''

''ہوں۔''

اس سے آگے کچھ بولنے کو نہیں تھا اور شاید سننے کو بھی نہیں تھا۔ صالح نے سوچا، کبھی وہ دن تھے جب وہ صرف رخسار چھونے کی چاہ میں شب و روز جل رہتا تھا اور اب رخسار ہی نہیں، ہونٹ ہی نہیں، وہ سرتاپا اس کی تھی۔ وہ ایک دوجے میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار صالح کو پتا چلا کہ مرد و زن کی محبت کیا ہے اور دنیا کی دلفریب ترین خوشبو کن سرگوشیوں میں پنہاں ہوتی ہے۔

ہر رات کی صبح ہوتی ہے مگر کچھ راتوں کی صبح نہ بھی ہو تو فرق نہیں پڑتا۔ یہ راتیں ہزار ہا چاند، ستارے اور اجالے اپنے دامن میں سمیٹے ہوتی ہیں۔

بہرطور اس رات کی صبح بھی ہو گئی جب آفرین اوس میں نہایا ہوا گلاب نظر آتی تھی اور صالح بدستور اس کے چہرے سے نظر ہٹا نہ پاتا تھا۔ وہ اس پرندے کی طرح تھا جس کے بہت بڑے پنکھ اس کے ہلکے پھلکے جسم کو عطر بیز ہواؤں اور سنہری دھوپ میں بلند تر کرتے چلے جا رہے ہوں

اس روز داجے فضل بھی ان کے ساتھ تھے۔ بہت مدت بعد صالح آج ان کی آنکھوں میں سچی خوشی کی چمک دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار صالح کا چہرہ دیکھنے لگتے تھے جیسے صالح کی مسکراہٹ کے پیچھے کسی اور گمشدہ مسکراہٹ کو تلاش کر رہے ہوں۔ انہوں نے زرق برق کپڑوں والی آفرین کو گلے سے لگا کر خوب خوب دعائیں دیں۔

صالح کو محسوس ہوتا تھا کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ داجے فضل کی شخصیت میں کشش اور مقناطیسیت بڑھ رہی ہے۔ لوگوں کا دل ان کی طرف کھنچتا تھا۔ صالح اب خود بھی ان کی تقلید میں کبھی کبھی سفید کپڑے پہن لیتا تھا۔ اسے ان کپڑوں سے امن اور محبت کی خوشبو آتی تھی۔ ایک سکون

سا محسوس ہوتا تھا۔ اسے ماماں بی سے معلوم ہوا تھا کہ داجے نے اپنی ایک سفید شلوار قمیص بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ بس چھوٹی بڑی عید پر ہی اسے پہنتے ہیں۔ ایک روز جب داجے سرخاب منزل میں ہی تھے اور شوقیہ گلاب کی کیاریوں کی گوڈی کر رہے تھے، صالح ان کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے داجے سے ان کے خاص جوڑے کا ذکر کیا۔

"کون سا جوڑا؟" انہوں نے بات گول کرنا چاہی۔

"وہی سفید جوڑا۔"

"میرے تو سارے جوڑے سفید ہیں۔"

"وہ خاص جوڑا جو آپ صرف اور صرف عیدوں پر پہنتے ہیں۔"

انہوں نے صالح کو ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر آخر صالح نے جان ہی لیا کہ اس جوڑے کا تعلق ان کی منگیتر اور صالح کی والدہ ارجمند بیگم سے تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے سفید دھاگے کی کڑھائی کر کے یہ جوڑا داجے کو دیا تھا۔

.....کیسی کیسی یادیں، کیسے کیسے انوکھے نقش انسان کے سینے میں پنہاں ہوتے ہیں۔

اگلے روز دوپہر کو صالح نے آفرین کو ساتھ لیا۔ پہلے جیپ پر چھوٹی حویلی گئے۔ وہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد زمینوں کو دیکھنے چلے گئے۔ صالح جیپ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ یوں تو آج کل حالات معمول پر ہی تھے پھر بھی داجے کی ہدایت کے مطابق صالح دو تین گارڈز ساتھ ضرور رکھتا تھا۔ یہ گارڈز اب بھی دوسری جیپ میں چالیس پچاس میٹر پیچھے اس کے ساتھ آ رہے تھے۔ راستہ کچا پکا تھا۔ دو روز پہلے کی بارش کے سبب کہیں کہیں پانی بھی کھڑا تھا۔ عقب سے ایک ڈبل کیبن گاڑی آئی۔ گاڑی والے نے سخت بے احتیاطی بلکہ بدتمیزی سے اوورٹیک کیا۔ اس کا ایک پہیا گڑھے میں پڑا اور بہت سارا کیچڑ اچھل کر ونڈ اسکرین اور سائڈ کی کھڑکیوں کو لتھڑ گیا۔

آفرین "اف خدایا" کہہ کر رہ گئی۔

صالح نے پہچان لیا۔ یہ سیاہ رنگ کی ڈبل کیبن وکی کے والد سیف اللہ کی گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ اس کا دماغ چٹخ گیا۔ یکایک اس نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کا چہرہ دہک اٹھا تھا مگر پھر فوراً ہی اسے اپنے وعدے یاد آئے جو وہ داجے سے کر چکا تھا.....اور کسی حد تک آفرین سے بھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بھی اس نے کم کر دیا۔ اسی دوران میں آفرین نے بھی کہہ دیا۔ "چھوڑو صالح! دفع کرو۔ ہو سکتا ہے کوئی ایمرجنسی ہو۔"

وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ کن کی گاڑی ہے۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ ایمرجنسی نہیں ہے، یہ چھیڑ خانی اور اشتعال انگیزی ہے۔ صالح طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ کرتے کرتے ونڈ اسکرین پر پانی چھوڑا اور وائپر چلائے۔ صالح مسلسل سوچ رہا تھا کہ یہ گاڑی یہاں کیوں گھوم رہی ہے۔

اپنے اس سوال کا جواب اسے جلد ہی مل گیا۔ قریباً پندرہ منٹ بعد اسے اپنی جیپ روکنا پڑ گئی۔ عقب میں آنے والی جیپ میں تین گارڈز کے علاوہ ایک رائفل اور ایک پسٹل بھی موجود تھا۔ وہ لوگ بھی رک گئے۔ نہر کے ساتھ یہ دس مربع زمین سرخاب منزل کی ہی ملکیت تھی۔ یہ وہی زمین تھی جو صالح نے داجے فضل کریم کو دینے کی کوشش کی تھی اور انہوں نے فقیرانہ سیر چشمی کے ساتھ صاف انکار کر دیا تھا۔ جب صالح کے بابا جانی زندہ تھے اور وکی کے باپ سیف اللہ سے ان کی دوستی بھی تھی تو سیف اللہ نے یہاں ایک فارم ہاؤس بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس فارم ہاؤس کے لیے سیف اللہ نے دس بارہ ایکڑ زمین خریدی تھی اور اس میں قریباً دو ایکڑ زمین صالح کے بابا نے اپنی طرف سے شامل کر دی تھی۔ یہ ایک طرح سے فارم ہاؤس کے لیے گفٹ ہی تھا۔ سیف اللہ نے کوئی رجسٹری وغیرہ بھی نہیں کرائی تھی۔ اب اس ساری جگہ پر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ تین چار لگژری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں ایک ڈبل کیبن وہ بھی تھی جو کچھ دیر پہلے ان پر کیچڑ اچھالتے گزری تھی۔ ایک انجینئر اور اس کے دو تین ساتھی ہاتھوں میں فیتے لیے پیمائش وغیرہ کر رہے تھے اور چونے سے نشانات لگائے جا رہے تھے۔

ڈبل کیبن گاڑی کے قریب ہی کلف لگے بالوں والا سیف اللہ کھڑکھڑاتی نیلی شلوار قمیص پہنے اور سن گلاسز لگائے کھڑا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک گوری چٹی فیشن ایبل لڑکی بھی موجود تھی۔ اس نے ٹائٹس پہن رکھی تھیں اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ صالح جانتا تھا، اس کا نام سونیا تھا۔ یہ پہلے وکی کی گرل فرینڈ تھی اور اب اس کے نکل جانے کے بعد اس کے باپ کے پاس آ گئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ سیف اللہ کے ساتھ رہ رہی ہے۔

"یہ کون لوگ ہیں اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" آفرین نے ذرا ہراساں ہو کر پوچھا۔

اسے جواب دیے بغیر صالح آگے بڑھا اور پھر سیف اللہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ گارڈ بھی اس کے پیچھے آئے۔

''یہ کیا کر رہے ہو انکل؟'' صالح نے پوچھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو بھتیجا جی کہ یہاں فارم ہاؤس بن رہا ہے۔''

''ضرور بنے فارم ہاؤس..... مگر تمہاری اپنی زمین پر۔ ہماری دو ایکڑ اس میں شامل نہیں ہے۔ وہ میرے والد صاحب نے زبانی کلامی گفٹ کی تھی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ ''باپ بیٹے'' کی اصل خصلت والد صاحب کے سامنے نہیں آئی تھی۔''

''زبان سنبھال کر بات کر صالح..... ! تم اپنے کسی مزارعے سے نہیں، اس جگہ کے قانونی مالک سے بات کر رہے ہو۔''

''قانونی مالک تم اپنی جگہ کے ہو، ہمارے دو ایکڑ کے نہیں ہو۔'' صالح خم ٹھونک کر بولا۔

سیف اللہ نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ ''مجید! کاغذ لاؤ۔''

وہ شخص ڈبل کیبن کی طرف گیا اور ایک فائل لے کر آ گیا۔ اس فائل میں رائے فیملی کے دو ایکڑ والی رجسٹری بھی موجود تھی۔ صالح کو پہلے سے شک تھا کہ وکی اور اس کا باپ اس جگہ کے جعلی کاغذات بنوانے کی کوشش کریں گے، اب یہ ثابت ہو رہا تھا۔

دو ایکڑ کی کوئی بہت زیادہ اہمیت نہیں تھی، اصل بات زور زبردستی کی تھی جو یہ لوگ کر رہے تھے۔ صالح اور سیف اللہ میں تکرار ہوئی۔ بات بڑھتی چلی گئی۔ سیف اللہ کے پہلو میں بھڑی فتنہ ساماں چمک کر بولی۔ ''مخدوم بنتے ہو اور کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی تمہیں۔''

صالح نے بھڑک کر کہا۔ ''تمہارے بڑوں نے تو تمہیں جسم فروشی کے سارے ادب آداب سکھا دیے ہیں نا۔ پہلے بیٹے کے بستر پر رہی ہو، اب اس کے باپ کے ساتھ نظر آ رہی ہو۔ کچھ شرم کرو۔''

وہ پھنکاری۔ ''شرم وہ کرے جس کی بیوی چار سال یار انے نبھا کر پھر اس کی گود میں دھڑلے سے آ بیٹھی ہے۔''

صالح سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر اس کی توہین کیسے برداشت کرتا جو اس کے لیے زندگی کا دوسرا نام تھی۔ اس نے دلفشا سونیا نامی اس حرافہ کے چہرے پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ چکرا کر گر گئی۔ اس کا گال پھٹ گیا اور ایک ہی تھپڑ سے نیم بیہوش ہو گئی۔ سیف اللہ کے تین چار کارندے صالح پر ٹوٹ پڑے۔ صالح گر گیا۔ آفرین اسے بچانے کے لیے اس کی طرف لپکی مگر دو شکروں نے اسے جکڑ لیا اور دھکیل کر ڈبل کیبن گاڑی کے ساتھ لگا دیا۔ ان میں سے ایک وہی جالالوری تھا جو جسم کے نازک حصے پر چوٹ کے بعد ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی آختہ بکرے کی طرح وہ خوب موٹا ہو چکا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے۔ انہوں نے صالح کے تین گارڈز کو بھی اسلحہ نکالنے کی مہلت نہیں دی اور گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان تین گارڈز میں سے دو ویسے بھی اتنے تجربہ کار نہیں تھے۔

صالح چند ہی لمحوں میں لہولہان ہو گیا۔ سیف اللہ نے احسان کرنے والے لہجے میں اپنے کارندوں سے کہا۔ ''چھوڑ دو۔ مر جائے گا۔ اتنی کافی ہے اس کے لیے۔''

آفرین ابھی تک دونوں کارندوں کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ سیف اللہ نے آتشیں نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تجھے لوگ شاہنوازے کی بہو کہتے ہیں اس لیے تمہیں معاف کرتا ہوں۔ لے جاؤ اپنے اس رستم زماں شوہر کو۔ جا کر دوا دارو کرواس کا۔''

کارندوں نے آفرین کو چھوڑا۔ وہ لپکتی ہوئی صالح کے پاس آئی۔ صالح کے سر پر آنے والی چوٹوں نے اسے نیم بیہوش کر ڈالا تھا۔ اس کی نبض پھٹ گئی تھی۔

تینوں گارڈز جو اب نہتے تھے، زخمی صالح کی طرف لپکے اور اسے سہارا دیتے ہوئے لینڈ کروزر میں لے آئے۔

سیف اللہ نے بلند آواز میں صالح سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جاؤ، جا کر شکرانے کے نفل پڑھو کہ وکی یہاں نہیں تھا ورنہ چیر ڈالتا تھا اس نے تجھے۔''

پھر اس کے اشارے پر دو بندے سیاہ ڈبل کیبن گاڑی کے اندر سے ایک بڑا بورڈ اٹھا کر لے آئے۔ بورڈ پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا ''وکی فارمز۔''

سیف اللہ گرج کر بولا۔ ''یہ فارم بنے گا اور اسی جگہ پر بنے گا۔ تم سے جو ہوتا ہے کر لو۔''

آفرین سسک رہی تھی اور اپنی اوڑھنی سے وہ خون پونچھ رہی تھی جو صالح کے ناک، منہ سے رس رہا تھا۔ ایک کارندے نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''صالح سرکار! سرخاب منزل فون کر دیا ہے۔ اختر اصاحب چار گاڑیوں میں تیس پینتیس بندوں کے ساتھ پہنچ رہے ہیں۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بجے گی آج۔''

صالح کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا، بس اچانک ہی ہوا۔ وہ اب بھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران میں اس کے موبائل پر کال آئی۔ دوسری طرف داجے فضل تھے۔ یقیناً

انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اختر سرخاب منزل سے نکل پڑا ہے۔

"نہیں صالح پتر..... نہیں۔ ہم نے یہ نہیں کرنا۔ تم واپس حویلی میں آجاؤ۔ فوراً واپس آجاؤ۔"

"لیکن یہاں پر....."

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا صالح! تم نے مجھ سے اور آفرین سے بھی وعدہ کر رکھا ہے۔" انہوں نے صالح کی بات کاٹی۔

"مگر آفرین کے لیے غلط بولا اس بدکار عورت نے۔"

"تم نے بھی تو اسے ٹھیک ٹھاک جواب دے دیا نا۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ تم نے تھپڑ مار کر گال پھاڑ دیا ہے اس کا۔ یہ سزا کافی ہے..... اب ہم نے فساد نہیں پھیلانا۔ واپس آجاؤ۔"

کچھ دیر یہ مکالمہ چلا۔ دوسری طرف آفرین بھی بجھی نظروں سے صالح کو دیکھ رہی تھی۔ صالح نے اختر کے راستے میں ہی روک دیا۔ صالح کافی زخمی تھا۔ خاص طور سے پسلیوں کی پرانی چوٹ پھر تازہ ہو کر سخت تکلیف دے رہی تھی۔ صالح اور آفرین نے بہتر سمجھا کہ سرخاب منزل واپس جانے کے بجائے سرگودھا شہر کا رخ کیا جائے جو وہاں سے بس پانچ چھ کلومیٹر دور ہی تھا۔ صالح کو کسی کلینک میں طبی امداد کی فوری ضرورت تھی۔

☆☆☆

پرائیویٹ اسپتال سے تو صالح دوسرے ہی روز فارغ ہو گیا تھا تاہم سرخاب منزل میں وہ آٹھ دس روز بستر پر ہی رہا۔ ڈاکٹر کھوکھر نے شب و روز اس کی دیکھ بھال کی۔ آفرین تو بس اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی تھی۔ اپنا کھانا، پینا، سونا بھول گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے۔ اسی طرح جو عمل دل سے کیا جاتا ہے وہ بھی اپنی تاثیر ضرور ظاہر کرتا ہے۔ ان دنوں میں صالح کو حقیقی طور پر اندازہ ہوا کہ اس کے لیے آفرین کے جذبات میں کیسی اتھاہ گہرائی ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مرہم بن کر اس کے زخموں میں سرایت کر جائے یا اپنی جان اس کی جان میں داخل کر دے۔

آخر صالح پھر سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگا۔ ڈاکٹر نے بھی اسے بہت سمجھایا بجھایا تھا۔ دو ایکڑ معمولی بات تھی۔ بے شک زبانی کلامی ہی سہی مگر اپنی زندگی میں شاہنواز رائے نے کسی ایڈجسٹمنٹ کے طور پر یہ جگہ فارم میں شامل کرنے کی اجازت بھی دی تھی۔ حالانکہ یہ ان دنوں کی بات تھی جب سیف اللہ کی اصلیت پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال صالح نے اسے نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ بابڑا فیملی کے پرنس شاہد سے اب صالح کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اب دونوں گھرانوں کے لوگ ایک دوسرے کی تقریبات میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ پرنس شاہد سے ہی صالح کو معلوم ہوا کہ وکی کا بڑا بھائی ارباز کہیں باہر سے وکالت پاس کر کے پاکستان آیا ہے۔ اسی کی شہ پر یہ لوگ کچھ زیادہ اچھل رہے ہیں۔

دو تین ہفتے بعد وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا اور زندگی ایک بار پھر سرخاب منزل میں مسکرانے لگی۔ جولائی شروع ہو چکا تھا۔ صبحیں اور شامیں طویل اور نکھری ہوئی تھیں۔ کیاریوں میں گلاب، موتیا اور سمن وغیرہ مہکتے تھے۔ سبز درختوں کے اندر پیلے پیلے آموں کی جھلک خوش کن منظر پیش کرتی تھی۔ خربوزوں کے ساتھ دیسی شکر کا شربت، آموں کے ساتھ دودھ کی لسی اور دوپہروں میں بھنی ہوئی ترکاری یا میٹھی روٹی کے ساتھ نمکین چھاج..... ان سب چیزوں کا سرخاب منزل میں دور دورہ تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ساری زندگی کوالالمپور، فلپائن اور پیرس وغیرہ میں گزارنے والی نامور مصورہ آفرین بڑی تیزی کے ساتھ اس ماحول میں رچتی بستی جا رہی تھی۔

..... اور پھر ایک روز جب وہ دونوں صبح سویرے سرخاب منزل کے عقبی باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے، آفرین نے کہا۔ "صالح! پلیز..... تمہیں میری ایک بات ماننا پڑے گی۔"

وہ مسکرایا۔ "پلیز کا لفظ اب کم استعمال کرو تو بہتر ہے۔"

"صالح! بے شک یہاں ہر کام کے لیے ملازم موجود ہیں مگر میں تمہارے کام خود کرنا چاہتی ہوں، اپنے ہاتھ سے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ میرے جو کام تم اپنے ہاتھ کے بجائے اپنے دل سے کر رہی ہو، وہ میرے لیے بہت زیادہ اہم ہیں۔" اس کے معنی خیز انداز کے سبب آفرین کے رخسار گلنار ہو گئے۔

وہ اس کے کندھے پر مکا رسید کر کے بولی۔ "میں سنجیدہ بات کر رہی ہوں صالح! چلو، سب نہیں تو کچھ کام مجھے کرنے دو..... تمہارا ناشتا، تمہارا کھانا، تمہارے کپڑے دھونا، استری کرنا اور..... تمہارے اور اپنے بیڈروم کو سجانا، سنوارنا....."

"بس..... بس۔" صالح نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اس سب کے بعد تو وہی کام رہ جائے گا جو تم اپنے دل سے کرتی ہو اور وہ کام میں کسی اور

سے کیسے کہہ سکتا ہوں۔''

''صالح..... صالح!'' وہ بلی کی طرح پنجے نکال کر اس پر جھپٹی۔ صالح کا پاؤں رپٹا اور وہ پھول دار پودوں کے درمیان گرا۔ گرتے ساتھ ہی اس کے منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی۔ وہ وہیں دہرا ہو کر اپنی دائیں پسلیوں کو دبانے لگا۔ چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

آفرین پھرتی اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ کر اس کا کندھا تھام لیا۔

''صالح..... کیا ہوا..... صالح!'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔ اس کا گلابی رنگ لمحوں میں ہلدی ہو گیا تھا۔

''بہت درد ہو رہا ہے یہاں۔'' وہ اپنی پسلیاں دباتے ہوئے بولا۔

وہ اضطراب کے عالم میں اس کی پسلیاں سہلانے لگی۔ ''سوری یار، سوری! میں ایسا تو نہیں چاہ رہی تھی۔ پلیز، معاف کر دو۔ کیا زیادہ درد ہو رہا ہے؟''

صالح نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کہاں ہو رہا ہے؟''

صالح نے اس کا ہاتھ اپنی درمیانی پسلیوں پر رکھا۔ ''یہاں۔''

وہ اسے سہلانے لگی۔ تب صالح نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دل کے مقام پر رکھا۔ ''اور یہاں بھی۔'' پھر تھوڑا سا نیچے دائیں جانب جگر کے مقام پر رکھا۔ ''اور یہاں بھی۔''

اس کے بعد اس نے ایک آنکھ کھول کر آفرین کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ صالح نے اسے ڈرانے کے لیے ڈراما کیا ہے۔ اس کے چہرے کا گلابی پن لوٹ آیا اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں میں نمی بھی آ گئی۔ اس نے صالح کو اس کے سر کے لمبے بالوں سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجوڑا اور اس کے سینے پر ڈھے سی گئی۔ صالح نے لیٹے لیٹے اس کے سر کے نرم ریشمی بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

وہ اشکبار لہجے میں بولی۔ ''صالح! تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔''

..... سرخاب منزل کے روز و شب ایک نئے سانچے میں ڈھلتے چلے جا رہے تھے۔ صالح نے سنا تھا کہ یہ محبت اور ایثار کے جذبے سے معمور عورتیں ہی ہوتی ہیں جو اینٹ پتھر کے مکانوں کو گھر بناتی ہیں اور اپنے روشن وجود سے انہیں منور کرتی ہیں۔ اس سے پہلے بھی تو برسوں پہلے ایک عورت اس حویلی میں آئی تھی اور اس نے اپنے درد سینے کی گہرائی میں چھپا کر سرخاب منزل کو اپنے حسن سلوک سے گل و گلزار کیا تھا۔ یہاں کے مکینوں کے دلوں پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے تھے..... وہ اس کی والدہ تھیں۔ اب یہ آفرین تھی جس کی ہنسی کا جلترنگ یہاں گونجتا تھا، جس کی چوڑیاں یہاں چھنچھناتی تھیں اور جس کا اجلا وجود یہاں روشنیاں بکھیرتا تھا۔

یہاں کے زمانۂ جاہلیت میں بہت سی عورتیں صالح کی زندگی میں آ چکی تھیں مگر اسے لگ رہا تھا کہ وہ تو مرد و زن کی محبت کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہے۔ اس تعلق میں کچے گوشت، پسینے کی بو اور ہانپتی ہوئی سانسوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اب اسے معلوم ہو رہا تھا کہ راتوں کے ریشمی اندھیرے میں محبت کے نرم خوشبودار پھول کیسے کھلتے ہیں، کیسے دو محبت کرنے والے ایک دوسرے کی جان میں اپنی جان داخل کر دیتے ہیں۔

جنس اور وحشت کے خمیر سے جنم لینے والے وہ سارے تعلق ایک دو ماہ میں اپنی کشش کھو دیتے تھے مگر یہ تعلق ہر شب کے وصل کے بعد زیادہ دلکش اور مضبوط ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ان پرانے تعلقات میں صالح کی حیثیت طالب، فاعل اور کرخت مزاج کی ہوتی تھی۔ اب اس نئے تعلق میں وہ مطلوب بھی ہوتا تھا، مفعول بھی اور کسی وقت پھول کی پتی کی طرح نرم مزاج بھی۔ وہی نرمی جو کسی شور مچاتے آرے کے بجائے بڑی سہولت اور خوبصورتی سے ہیرے کا جگر کاٹتی ہے۔

آفرین کو صالح کے سارے کام خود کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ جو فارغ وقت ملتا، اس میں وہ اپنا پینٹنگ کا شوق بھی پورا کرتی۔ کسی وقت وہ بالکل تھک جاتی۔ صالح اس کو منع کرتا مگر وہ باز نہ آتی۔ ایک روز جب صالح ایک تاریخ پر لاہور ہائیکورٹ جا رہا تھا اور آفرین قالین پر بیٹھی بڑے جذب سے اس کے بوٹ پالش کرنے میں مصروف تھی، صالح نے اس کے سامنے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

''یار! اتنا مت چاہو کہ جان نکل جائے۔''

''صالح ڈیئر! آپ جناب نے خود فرمایا تھا کہ آپ کی جان میرے جسم میں ہے تو آپ کی جان آپ کے جسم سے خدانخواستہ کیسے نکل سکتی ہے؟''

''تم سے باتوں میں جیتنا مشکل ہے۔'' وہ اس کے سر پر ایک چپت لگا کر بولا۔ ''لیکن اگر تم بضد ہو تو پھر تمہیں ایک کام ضرور کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''ہفتے میں ایک دن وہ سارے کے سارے کام میں کروں گا جو تم کرتی ہو۔''

''اور جو تم کرتے ہو، وہ کون کرے گا؟''

"میں چھٹی کے دن کی بات کر رہا ہوں۔ تو بس آج سے طے ہے کہ اتوار کے روز خادمہ، مخدوم بن جایا کرے گی اور مخدوم، خادم۔"

کچھ دیر دونوں میں تکرار ہوئی۔ آخر میں آفرین بولی۔ "کم از کم اپنے جوتوں کو تو میں تمہیں ہاتھ نہ لگانے دوں گی۔"

"تمہارے ہوتے سوتے بھی لگانے دیں گے۔ یہ دہرا معیار میں نہیں چلنے دوں گا، نہیں تو..... ابھی میرے جوتے چھوڑ دو۔"

وہ جوتے پر جھپٹا۔ آفرین نے جوتا کسی قیمتی شے کی طرح سینے سے لگالیا۔ اس نے چھیننا چاہا تو وہ پکاری۔ "ماماں بی..... ماماں بی۔"

آیا ماماں بی کی آواز سنتے ہی کمرے سے ہی آرہی تھی۔ صالح پیچھے ہٹ گیا۔ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ "اچھا، اس وقت جلدی میں ہوں۔ آکر پوچھوں گا تم سے۔"

اس نے صالح کو انگوٹھا دکھایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

وہ بہت خوبصورت دن تھے۔ بس وہ ایک کیس (بیگی لڑکی "گوگی" والا تھا جو اب تک جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی صالح جھنجلا جاتا۔ وہ اس لمحے کو کوستا جب اس نے مشتعل ہو کر لڑکی کو نہ صرف پیٹا بلکہ دست درازی بھی کی تھی۔ اس معاملے کی ایک ویڈیو نے صالح کی ریپوٹیشن اور "مخدومیت" کو بھی کافی نقصان پہنچایا تھا۔ البتہ اب چونکہ وہ سرتاپا بدل چکا تھا لہٰذا دھیرے دھیرے اس واقعے کے بداثرات ختم ہو رہے تھے۔

شادی کے بعد بھی اس کے روز و شب اسی ڈگر پر تھے جس پر داجے فضل نے انہیں چلایا تھا۔ وہ سادہ کپڑے پہنتا تھا، زیادہ تر سادہ غذا کھاتا تھا۔ کبھی کبھار روزہ بھی رکھ لیتا تھا۔ اس نے بتدریج خود کو ان تمام لغویات سے دور کرلیا تھا جو کسی بھی طور بندے کو جنس کی طرف راغب کرتی ہیں یا جنسی اشتعال دلاتی ہیں اور ایسا کر کے وہ خود کو بہت پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ اس کے اندر ازدواجی تعلق قائم کرنے میں بھی ایک دل پذیر اعتدال آچکا تھا۔ وہی اعتدال جس کی بقول داجے فضل ہر عمل میں ضرورت ہوتی ہے اور جس کی تلقین ہمارا دین بھی بار بار کرتا ہے۔

صالح کو اپنے خاندان میں نسل در نسل چلنے والی اس اضافی طلب سے واسطہ پڑا تھا جس کا تعلق منفی خالف سے تھا۔ اس نے بچپن میں ایک مرتبہ اپنے والد (بابا جانی) کو کپڑے بدلتے دیکھا تھا۔ ان کے پورے بالائی جسم پر گھنے بال تھے۔ ایسے ہی بال اسے اپنے تایا مرحوم کے جسم پر بھی نظر آیا کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھی بابا جانی کی آنکھوں کی طرح سرخ ڈورے تیرتے رہتے تھے جو شاید بوقتِ شام مزید گہرے محسوس ہونے لگتے تھے۔ اسے اپنا تو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا مگر چمکیلے کوکے والی رکھیل روزینہ اکثر کہا کرتی تھی کہ رات کے وقت تنہائی میں اس کی آنکھیں مست اور گہری سرخ ہو جاتی تھیں۔

اب دل کے موسم بدل چکے تھے۔ اب وہ رات کو آئینے میں خود کو دیکھتا تھا تو اسے اپنی آنکھوں میں سرخی کی جگہ شبنم سی جگمگاتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ شبنم آفرین کو بہت پیاری تھی۔ وہ اس کی طالب رہتی تھی۔

ورزش صالح کا معمول بن چکی تھی۔ یہ عادت بھی اسے داجے سے ہی منتقل ہوئی تھی۔ داجے صبح سویرے کم از کم دو گھنٹے کی سیر کرتے تھے اور اب بھی کمر کو بالکل سیدھا رکھ کر چلتے تھے۔ ان کی عمومی صحت اپنی عمر کے بڑے لوگوں سے بہتر تھی۔ شاید روزمرہ ورزش میں صالح کی دلچسپی ہی تھی جو وہ اپنی قائم کردہ اکیڈمی کو بھی باقاعدگی سے وقت دیتا تھا۔ وہ اب خود کم کھیلتا تھا پھر بھی اپنے پسندیدہ کھیل کے حوالے سے خود کو تھکانا اور پسینا بہانا اسے اچھا لگتا تھا۔

ایک دن ایسے ہی ورزش کے بعد وہ ذرا ہانپتا ہوا سا اپنے کمرے میں پہنچا تو آفرین لمبا گلابی لبادہ پہنے بستر پر لیٹی نظر آئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ہلکے بادلوں کے سائے میں سرخاب منزل کے نشیب و فراز دور تک نظر آتے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"دیکھ نہیں رہی، انتظار کر رہی ہوں۔"

"کس کا؟"

"اپی کا جو آج تک نہیں آیا اور جس کی راہ ہم دونوں کی نگاہیں دیکھتی رہی ہیں۔"

صالح نے ایک لمبی سانس لی۔ "سمجھ گیا۔ وہی بارش کا دن جسے اسی طرح دہرانے کی خواہش ہم اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یار..... میرے یار! وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ جب سرخاب منزل پھر سے لوٹ آئی ہے..... ساون پھر سے لوٹ آیا ہے، تم آگئی ہو تو وہ دن بھی ضرور آئے گا۔ آج نہ سہی، ایک دن بعد سہی، ایک سال بعد سہی۔"

وہ مسکرائی۔ وہ بھی مسکراتا ہوا اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ جب سے ساون کی شروعات ہوئی تھی، وہ مسلسل ایک

بھرپور بارش کا انتظار کر رہے تھے بلکہ یہ انتظار انہوں نے ساون سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ اب تو ساون آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ ایک دو بار ہلکی بارش تو ہوئی تھی مگر وہ سماں نہ بندھ سکا تھا جو کبھی بندھا تھا اور جس نے صالح اور آفرین کو دیوانہ وار چھت کے نیچے سے نکالا تھا اور تیز ہوا میں چھاجوں برستے پانی کے نیچے جا کھڑا کیا تھا..... آہ، اس دن کی یادیں۔

☆☆☆

ساون تو سوکھا گزرا تھا لیکن دل میں ہریالی ہی ہریالی تھی۔ صالح کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے آج تک جو کچھ جھیلا ہے، اس کا ازالہ سوگنا اضافے کے ساتھ ہو رہا ہے۔

پھپھو عاصمہ اور فرحان دوبار پاکستان آ کر ان دونوں سے مل چکے تھے۔ وہ چھوٹی حویلی میں ٹھہرتے تھے اور ان دنوں چھوٹی حویلی آفرین کو اپنے میکے کی طرح لگتی تھی۔ آفرین کو صالح کے کاموں سے فرصت ہوتی تو وہ بھی رنگوں اور کینوس سے ناتا جوڑ لیتی۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں لاہور اور اسلام آباد کے شائقین میں بھی مقبولیت حاصل کرنے لگی تھیں۔ وہ پورٹریٹ نہیں بناتی تھی مگر ایک روز اس نے اس ہستی کی تصویر بنائی جس نے کبھی اس سرخاب منزل کو اپنے وجود سے جگمگایا تھا۔ یہ صالح کی والدہ ارجمند بیگم کی تصویر تھی۔ کمال کی تصویر تھی۔ صالح محویت سے دیکھتا رہا اور برسوں بعد شاید پہلی بار اسے اپنی ماں پر بہت سا پیار آیا۔ خاص طور سے ان کی آنکھوں پر۔ جن آنکھوں میں ایک گمشدہ درد کا عکس بھی پنہاں تھا۔

دادے فضل حسب وعدہ ہفتے میں ایک دن سرخاب منزل ضرور آتے تھے۔ قبرستان جانا تو ان کے مستقل معمولات میں شامل تھا۔ وہ جس دن سرخاب منزل آتے، اپنا ایک پرانا شوق ضرور پورا کرتے۔ اپنے ہاتھوں سے گلاب کی کیاریوں کی گوڈی کرتے اور پانی دیتے۔ کھرپے یا درانتی سے فالتو جڑی بوٹیوں کو کاٹتے۔ بعد ازاں وہ اکثر یہی پھول قبروں پر بھی چڑھاتے۔

وقت کا پہیا رواں تھا۔ اب گلابی جاڑے گزر گئے تھے۔ بہار بھی دھیرے دھیرے موسم گرما میں مدغم ہو رہی تھی۔ درجنوں ملازم ہونے کے باوجود آفرین بدستور صالح کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ صالح بہ مشکل ایک روز کے لیے اسے ان کاموں سے دور کرتا تھا اور اس روز اپنا اور آفرین کا ہر چھوٹا بڑا کام خود کرتا تھا۔ وہ احتجاج کرتی رہ جاتی۔ ''صالح! پلیز، کچھ خیال کرو۔ لوگ تمہیں زن مرید کہنا شروع کر دیں گے۔''

وہ کہتا۔ ''اگر تم چھ دن کے لیے شوہر پرستی کر سکتی ہو تو میں ایک دن کے لیے زن مریدی کیوں نہیں کر سکتا۔''

ان دونوں کے مابین اتنا پیارا تعلق تھا کہ سرخاب منزل کے مکین انگلیاں دانتوں تلے دباتے تھے۔

گرمیوں کی ایک شام جب شیشم کے فرنیچر کا ایک بڑا آرڈر حاصل کرنے کے بعد وہ سرگودھا سے واپس سرخاب منزل آیا تو بیڈ روم کی کھڑکی میں آفرین بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ بال تکیے پر منتشر تھے۔ اس نے گلابی رنگ کا کھلا لبادہ پہن رکھا تھا۔ وہ مصورہ تھی مگر اس وقت خود تصویر نظر آتی تھی۔ لگتا تھا کہ دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر تھوڑی دیر کے لیے سو گئی ہے۔ وہ صالح کو اتنی پیاری لگی کہ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بہت آہستہ سے اس کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکایا اور اپنا رخسار اس کے چمکیلے رخسار پر رکھ دیا۔ کیا لطیف احساس تھا۔

ایک مدھم آواز نے اسے چونکایا۔ ''میں آج بھی جاگ رہی ہوں۔''

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔ آفرین کے لبوں پر ہلکا تبسم تھا۔ وہ دوبارہ اس کے رخسار پر جھک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آفرین نے کون سی بات یاد دلائی ہے۔ بچپن کے موسم کی وہی سنسنی خیز رات جب وہ ننگے پاؤں پھپھو کے کمرے میں داخل ہوا تھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا رخسار اسی طرح آفرین کے رخسار پر رکھ دیا تھا۔ تب وہ اسے چومتے چومتے رک گیا تھا مگر اب تو ایسی کوئی بندش نہیں تھی۔

وہ گرم سانسوں کے درمیان بولی۔ ''صالح! آج دو خوشخبریاں ہیں تمہارے لیے۔''

''تمہارے بعد اور خوشخبری کیا ہوگی یار!'' اس نے اس کی زلفوں میں منہ چھپا کر کہا۔

''ہے نا... اور تمہیں اچھی بھی لگے گی... کتنا وقت ہو گیا ہمیں شادی کے بعد دوبارہ ملے ہوئے؟''

وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے ایک ہفتہ یا اس سے تھوڑا زیادہ۔''

''ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے صالح جی!'' وہ اپنے ہونٹوں کو ایک ادا کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے بچا کر بولی۔

''تو پھر؟''

''اب تک ہم دونوں اس کمرے میں اکیلے ہوتے تھے لیکن اب نہیں ہیں۔ کوئی اور یہاں آنے والا ہے....

بلکہ سمجھو کہ قدم رکھ چکا ہے۔"

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے دل میں سیکڑوں شادیانے ایک ساتھ بج اٹھے۔ اس نے اسے اپنی بانہوں کے پُرجوش حصار میں لے لیا اور اس کے چہرے پر پیار کی بارش کر دی۔

کتنی ہی دیر بعد جب وہ اس خوشی کو اچھی طرح سیلیبریٹ کر چکے تو صالح کو اچانک دوسری خوشخبری کا خیال آیا۔ اس نے آفرین سے پوچھا تو وہ بولی۔ "اس کا داجے فضل کو پتا ہے۔ مجھے انہوں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ صالح کے لیے ایک بہت اچھی خبر ہے۔ وہ آئے تو اسے کہنا، مجھے فون کر لے۔"

"چھپا تو نہیں رہی ہو؟"

"سچی، نہیں چھپا رہی۔ شاید کوئی کاروباری بات ہے۔"

فون کرنے کے بجائے کچھ دیر بعد صالح خود مزار پر پہنچ گیا۔ داجے مریدین کے حلقے میں تھے پھر اس کے ساتھ اٹھ کر حجرے میں آ گئے۔ خوشخبری واقعی موجود تھی لیکن یہ کاروباری نہیں تھی۔ اس کا تعلق اس دیرینہ مقدمے سے تھا جو کسی صورت صالح کی جان چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ وکیلوں نے تین چار سال تو کسی نہ کسی طرح اپیلوں، دلیلوں میں گزار دیے تھے مگر اب اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ بالآخر چند سال جیل ہو کر رہے گی۔

داجے نے صالح کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں صالح! مجھے پوری امید ہے اب ہماری جان اس کیس کے شکنجے سے نکل جائے گی۔"

وہ ششدر تھا۔ داجے نے جو تفصیل بتائی، اس سے معلوم ہوا کہ اس لڑکی گوگی کا ایک تایا جو اس خاندان کا کرتا دھرتا بھی ہے، داجے کے مریدین میں شامل ہو چکا ہے۔ اس کی کوششوں سے مدعی پارٹی نے اب کیس کی پیروی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے بعد کچھ قانونی تقاضے بھی پورے کر دیے گئے تھے اور اب دونوں پارٹیوں میں صلح کا قوی امکان پیدا ہو گیا تھا۔

اوائلِ عمری سے لے کر اب تک صالح کو داجے کی طرف سے ہمیشہ ٹھنڈی ہوا ہی آئی تھی۔ ان کا ہر قول و فعل کسی نہ کسی طور صالح کے حق میں ثابت ہوتا تھا۔ یہ کیا رشتہ تھا اور کیا دل گداز بلیا رشتے کی۔

اس رات داجے نے صالح کو اپنے پہلو میں کھڑا کیا اور صالح نے ان کے ساتھ مل کر شکرانے کے دو نفل

تاخیر

عدالت میں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا کیس پورے تین سال چلا۔ بالآخر عدالت میں میاں بیوی سے کاغذات پر دستخط کروائے گئے۔

دستخط کرنے کے بعد بیوی نے شوہر سے کہا۔ "میں تمہیں بتا ہی ہوں کہ اگر تم نے ماہانہ الاؤنس کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر کی تو میں علیحدگی منسوخ کر کے تمہارے گھر آ بیٹھوں گی۔"

مستقل مزاجی

کارلائل کہتا ہے کہ یکسو طبیعت سے کام شروع کر کے کمزور سے کمزور انسان بھی کچھ کر کے دکھا سکتا ہے مگر منتشر طبع شخص مضبوط اور طاقتور ہونے کے باوجود بہت سے اطراف میں اپنا دھیان بٹانے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا۔ پانی کا ایک قطرہ کسی جگہ لگاتار ٹپکتا رہے تو وہ آخرکار ایک مضبوط چٹان میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔

ازدواجی زندگی

جو لوگ کہتے ہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کا ففٹی ففٹی حصہ ہوتا ہے، وہ حساب نہیں جانتے یا پھر عورت کو نہیں جانتے۔

عورت کی تعریف

نفسیات کے ایک پروفیسر صاحب نے نوجوان امیدوار سے سوال کیا۔ "عورت کی تعریف کرو۔"

امیدوار نے جواب دیا۔ "وہ شخصیت جو دروازے میں کھڑی ہو کر بیس منٹ تک مسلسل باتیں کرتی رہے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے گھر کے اندر نہیں آ سکتی۔"

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دشمن کے حسنِ سلوک پر بھروسا مت کرو۔

☆ عورت کی پاکدامنی ہی اس کا بہترین سنگھار ہے۔

☆ مصیبت کو برداشت کرنے کے لیے صبر اور نماز کا سہارا پکڑو۔

☆ وقت کو بہتر طریقے سے صرف کرو، تجربہ کار ہو جاؤ گے۔

☆ ظلم اور خوف دونوں بزدلی کی علامت ہیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

ادا کیے۔

☆☆☆

آفرین والی خوشخبری کے بعد صالح کی پھپھو عاصمہ فوراً فلائٹ پکڑ کر پاکستان آئی تھیں۔ وہ آفرین کو لے کر چند ہفتوں کے لیے چھوٹی حویلی منتقل ہوگئیں۔ وہیں پر آفرین کی گود بھرائی کی رسم ادا کی گئی۔ دو روز بعد علاقے بھر کے غریب مستحق لوگوں کو کھانا کھلایا گیا، کئی روز شامیانے لگے رہے، لنگر چلتا رہا اور خیر خیرات کی اشیا تقسیم ہوتی رہیں۔ جن لوگوں نے کچھ عرصے بعد سرخاب منزل کو دیکھا تھا، وہ حیران تھے۔ سرخاب منزل کی وہ تعمیر جو شاہنواز رائے کے آخری دنوں میں ہوئی تھی، بالکل ناپید ہو چکی تھی اور اس کی جگہ وہی مدتوں پرانی سرخاب منزل اپنی بالکل اصل حالت میں موجود تھی جو یہاں کے لوگ کئی نسلوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک عجوبہ ہی تھا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ صالح نے اپنے بچپن کے دور کو اسی حالت میں زندہ کرنے کے لیے یہ انوکھا قدم اٹھایا ہے۔

صالح کی پھپھو اور فرحان نے ایک ڈیڑھ ماہ پاکستان میں رکنا تھا۔ اب صالح کے لیے پھر سرخاب منزل کے شب و روز تھے۔ آفرین سے دوری صالح کو بے قرار تو کرتی تھی مگر اس بے قراری میں جنس کا عمل دخل دور دور نہ ہوتا تھا..... اور اپنی اس کیفیت پر صالح خود بھی خوش ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اس سے پہلے تو صنف مخالف کی صحبت کے بغیر چند راتیں گزارنا بھی صالح کے لیے بے حد محال ہو جاتا تھا۔ آفرین نے اسے چار سالہ جدائی اور مجرد زندگی کا جو کٹھن چلہ کٹوایا تھا، اس نے صالح کی کیمسٹری ہی تبدیل کر ڈالی تھی۔

اب اسے پھول اچھے لگتے تھے۔ ان کے اوپر منڈلاتی تتلیاں، گھاس پر چمکتی اوس اور درختوں میں چہکارتے پرندے۔ کبھی کبھی تو وہ آفرین کی طرح رنگوں اور برشوں سے بھی کھیلنے لگ جاتا تھا۔ جون کا سورج جب اپنی شعاعیں سمیٹ لیتا اور مغربی افق پر شفق کا رنگ پھیلتا تو وہ ٹہلنے کے لیے سرخاب منزل کی مرمریں چھت پر چلا جاتا۔

اس کے بابا شاہنواز نے اپنی بیماری کے آخری دنوں میں سرخاب منزل کی باؤنڈری وال سے کوئی نصف فرلانگ کی دوری پر مزارعوں اور ضرورت مند ملازمین کے لیے ایک پکی بستی تعمیر کرا دی تھی۔ وہاں باقاعدہ پانی اور سیوریج کا انتظام تھا۔ چالیس پچاس کے قریب گھر تھے۔ وہاں تین چار ماہ سے ایک گھر کی چھت پر صالح کو سترہ اٹھارہ سال کا ایک دبلا پتلا لڑکا نظر آتا تھا۔ وہ ایک نیستاں اونچے گھر کی چھت پر بیٹھ کر کچھ دور ایک دوسرے گھر کے صحن یا چھت کو جھانکتا رہتا تھا۔ وہاں اکثر سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی نظر آتی تھی۔ یقیناً وہ کسی مزارعے کی ہی بیٹی تھی۔ لڑکا بس اسے دور دور سے دیکھتا۔ کبھی کسی وقت ہمت کر کے اسے کوئی اشارہ کرتا، ہاتھ ہلا دیتا، کوئی پھول دکھا دیتا یا بس ویسے ہی دیکھتا رہتا۔ نہ جانے اس لڑکے کو دیکھ کر صالح کو کیوں اپنا بچپن اور لڑکپن یاد آ جاتا تھا۔ وہ بھی تو ایسا ہی چپ چاپ اور گم آمیز تھا۔ ایسے ہی ایک لمس کے لیے ترسا ہوا سا، سہما ہوا سا۔ مزارعوں کی بستی میں ان دو ''لوعمروں'' کی تاکا جھانکی کو دیکھنا صالح کو اچھا لگتا تھا۔ کسی وقت وہ مرمریں چھت کی منڈیر کے روزنوں کو بھی استعمال کرتا، ٹیلی اسکوپ سے ان دونوں کی اس دور دور کی محبت کا مشاہدہ کرتا اور محظوظ ہوتا۔ دونوں ہی خاصے معصوم اور گم آمیز لگتے تھے۔ وہ ان کے معاملے میں کوئی مداخلت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس یہ دیکھتا تھا کہ معاملہ کیسے آگے بڑھتا ہے۔ لڑکی اکثر گیلے کپڑے پھیلانے یا بال وغیرہ سکھانے کے بہانے چھت پر آتی۔ لڑکے کے اشاروں پر کسی وقت لڑکی شرماتی اور چھپاک سے گم ہو جاتی۔ بعض اوقات لڑکی اس کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتی مگر وہ کسی وجہ سے چھت پر موجود نہ ہوتا۔

بیس پچیس روز سے وہ دیکھ رہا تھا کہ لڑکا بالکل غائب ہے اور لڑکی بے چینی سے چھت یا صحن میں سے اس کی چھت کی جانب دیکھتی ہے۔ پتا نہیں کیا معاملہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اخترے کو بھیج کر دس منٹ میں سب کچھ جان سکتا تھا مگر وہ ان کے معاملے میں کوئی دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر یہ بھی لگ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

جب اگلے کئی دن تک بھی نگاہوں اور اشاروں کا یہ سادہ سا دلکش کھیل رکا رہا تو آخر ایک روز صالح نے اخترے کو وہاں بھیج ہی دیا۔ وہ آدھے گھنٹے میں ساری معلومات لے آیا۔

اس نے بتایا۔ ''لڑکے کا نام وسیم ہے جی۔ وہ مزارعی انتظامیہ کے نائب صدر مصباح اللہ کا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ لڑکی مزارعے محمد شریف کی بیٹی ہے۔ اس کا نام عالیہ تھا۔''

''عالیہ تھا؟ کیا ہوا اسے؟'' صالح چونکا۔

''نہیں جی۔ ہوا تو کچھ نہیں۔ پرسوں اس کی شادی ہو گئی ہے۔ شادی بھی کیا جی، گھر میں ہی آٹھ دس بندوں کی موجودگی میں اس کے پھوپی زاد سے نکاح ہو گیا ہے۔ پھوپی زاد بھی دو گلیاں چھوڑ کر وہیں پر رہتا ہے۔''

صالح کو دھچکا سا لگا۔ کتنی جلدی ختم ہوئی تھی یہ کہانی۔

''اور وہ لڑکا وسیم؟'' صالح نے پوچھا۔

''اس کا بڑا بھائی مطیع اللہ بڑا ڈھاڈا ہے جی۔ اس نے پچھلے مہینے بھائی کو ڈنڈوں سے مارا تھا۔ نیل ڈنل کر دیا تھا۔ ایک بازو بھی ٹوٹ گیا تھا بیچارے کا۔ اس کا کہنا تھا کہ چھت پر چڑھ کر کڑیوں کو تاڑتا ہے، پڑھائی وغیرہ نہیں کرتا، کام کا ہے نہ کاج کا۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ بھائی اور بھابی کے پاس رہتا ہے۔''

وہی دلدوز کہانی۔ وہی جبر، قہر اور اولاد پر ناروا پابندیوں کی کہنہ روداد۔ جیسے زندگی میں اپنی ناکامیوں کا بدلہ اولاد سے اور اپنے چھوٹوں سے لیا جا رہا ہو۔ کردار بدل جاتے ہیں مگر اکثر کہانی وہی رہتی ہے۔ صالح کو افسوس تو ہوا مگر وہ ایسے معاملے میں کیا کر سکتا تھا اور وہ کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

اس کے بعد ایک دو بار ہی وہ لڑکا چھت پر نظر آیا۔ اس کا ایک بازو پلاستر میں جکڑا ہوتا تھا۔ اب اپنی نگاہیں سینکنے کے لیے اس کے اردگرد اس کا من پسند چہرہ موجود نہیں تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا سا اپنی کتابوں پر سر جھکائے رہتا پھر ویسے ہی اس نے چھت پر آنا بند کر دیا۔ گنجان آبادیوں کی کھڑکیوں، چھتوں، آنگنوں اور گلیوں میں ایسے ہی کہانیاں شروع اور ختم ہوتی ہیں۔ کہانی ختم ہوئی پر ایک پھانس سی صالح کے سینے میں ضرور چبھی رہی۔

..... ایک ڈیڑھ ماہ بعد آفرین چھوٹی حویلی سے سرخاب منزل واپس آ گئی۔ مستقبل میں ماں بننے کی امید پیدا ہوئی تھی تو وہ کچھ اور بھی مکمل اٹھی تھی۔ چہرے کی تابندگی میں اضافہ ہوا تھا اور ہونٹوں کے گلاب کچھ اور مہک گئے تھے۔ خود کو راحت اور شادمانی میں گھرا پا کر صالح کسی وقت اچانک پریشان سا ہو جاتا۔ دل میں وہم سا جاگتا کہ زیادہ خوشی اچھی نہیں ہوتی۔ کوئی دکھ آس پاس منڈلانے لگتا ہے۔ ایسے میں وہ خیر خیرات اور دیگر فلاحی کاموں میں اضافہ کر دیتا پھر کسی وقت بیٹھے بٹھائے اسے اچانک داجے فضل کا وہ وعدہ یاد آتا جو انہوں نے اس سے لیا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ لوگ کہتے تھے کہ وہ اپنی اندر کی آنکھ سے آنے والے حالات کو دیکھتے ہیں۔ وہ کیا حالات تھے جو وہ دیکھ رہے تھے۔ ایک دن صالح نے اس حوالے سے ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ وہ مسکرانے لگے۔ بولے۔ ''تمہارے لیے دن رات دعا مانگتا ہوں اور تمہیں پتا نہیں شاید دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں، مشکلیں راستے چھوڑ دیتی ہیں۔''

..... اور پھر ایک روز وہ ہوا جس کا انتظار صالح نے اور یقیناً آفرین نے بھی مدت تک کیا تھا۔ بچپن کی وہی فینٹسی ..... بارش کا وہ یادگار دن جس میں پانی سے زیادہ خوشیاں ان پر برسی تھیں ..... بے شک اب وہ بچپن تو نہیں تھا لیکن جسم کے اندر دل تو وہی تھا اور دل تو بچہ ہوتا ہے ..... بے شک بچہ ہوتا ہے۔

وہ اگست کی ایک حبس زدہ سہ پہر تھی۔ ساون کی آخری جمعرات تھی۔ ماماں بی کہا کرتی تھیں کہ ساون کی آخری جمعرات کو بھی اگر بڑی بارش نہ ہو تو پھر بھادوں کا کچھ لگ جاتا ہے (آغاز ہو جاتا ہے)۔ اور جل تھل ایک کرنے والی بارش ہوتی ہی نہیں ..... تو پھر اس لحاظ سے تو یہ موسلا دھار بارش لانے والی آخری شام ہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ ساون بھی قریب قریب سوکھا ہی گزر جائے گا مگر ایسا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 30,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ادریس بیگ 0334-5498977

مرزا عباس بیگ 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر محمد شہزاد خان 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

حیرانی

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا جو شمع روشن کیے جارہا تھا۔ میں نے اسے روک کر پوچھا۔ ''بیٹے تم بتا سکتے ہو یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟''

لڑکے نے میرا سوال سنتے ہی پھونک مار کر شمع بجھا دی اور کہا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ روشنی کہاں چلی گئی؟ تو میں بھی بتادوں گا کہ روشنی کہاں سے آرہی تھی۔''

خواجہ بصریؒ کہتے ہیں کہ میں اس لڑکے کا جواب سن کر لاجواب ہوگیا۔

(مراسلہ نگار: وزیر محمد خان..... بلہل ہزارہ)

ہونے والا نہیں تھا۔ شام ہونے میں کچھ دیر تھی جب ہلکے بادلوں نے دھوپ کو اوجھل کیا تھا اور پھر گھنگھور گھٹا امڈ کر آئی تھی۔ در و دیوار سیاہ نظر آنے لگے تھے۔ تب صالح نے دیکھا کہ گھٹا کے پیچھے ایک اور زیادہ گہری گھٹا چلی آرہی ہے۔ حبس میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ''آمدہ بارش'' کا سندیسہ دینے لگے۔

صالح نے چند روز پہلے ہی ہیڈ ملازمہ صادقہ سے کہہ دیا تھا کہ جب تیز بارش والا ماحول بنا، وہ حویلی کے زنان خانے کو بالکل خالی کردے گی۔ سب لوگ کچھ دیر کے لیے مہمان خانے کی طرف چلے جائیں گے کیونکہ آفرین آزادی سے بارش کو انجوائے کرنا اور نہانا چاہتی ہے۔

سیاہ بادلوں کے تیور دیکھ کر صادقہ خود ہی لپکتی ہوئی صالح کے پاس آگئی۔ صالح نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ سمجھ گئی۔ دس منٹ کے اندر اندر حویلی کا زنان خانہ اور سامنے کا سارا پورشن خالی تھا۔ اس دوران میں بارش کا تڑبڑا پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ صالح نے آفرین کا بازو تھاما اور دونوں جیسے جھوم کر وسیع احاطے میں آگئے۔ بارش نے لمحوں میں دونوں کو شرابور کردیا۔ صالح کے قدرے لمبے بال اس کے چہرے اور گردن سے چپک گئے۔ شلوار قمیص تربتر ہوگئے۔ آفرین کا لان کا مہین سوٹ بھی اس کے جسم کا حصہ بن گیا۔

احاطے کے سوئمنگ پول میں بارش کی بوچھاڑیں تھیں۔ برسوں پرانی یاد تازہ کرتے ہوئے صالح، آفرین کو لے کر پول میں اتر گیا۔ جو لوگ سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بارش میں تالاب وغیرہ کے اندر ہونا کتنا دلفریب ہوتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر خوب چھینٹے اڑائے پھر وہ جھومتے ہوئے آم کے پیڑوں کی طرف آگئے جہاں درختوں پر طویل جھولے ان کا انتظار کررہے تھے۔ جھولوں کی حرکت نے ان کے جسموں میں سردی کی خوش کن لہریں جگادیں۔ انہوں نے اپنے جسموں پر جیسے بچپن کے پنکھ لگالیے تھے۔ وہ دیر تک ہواؤں میں پرواز کرتے رہے۔ تب انہوں نے آم اور جامن کھائے اور جامنی رنگ ایک دوسرے کے چہروں پر یوں ملا کے بھبوت بنادیا۔ صالح سے بچنے کے لیے آفرین دوبارہ تالاب میں چلی گئی۔ صالح اس کے پیچھے گیا اور گدگدی کرکے اسے بیر بہوٹی بنا ڈالا۔

وہ اس خوبصورت بارش کو اسی طرح گزار رہے تھے جیسے کبھی گزاری تھی۔ ہر وہ کام کررہے تھے جو ان کی یادوں کا حصہ تھا۔ بے شک اب وہ بچوں کی طرح دیوانہ وار اچھل کود نہیں کرسکتے تھے لیکن جوانوں کی طرح ایک دوسرے کی بانہوں کے سہارے وقت کو آواز تو دے سکتے تھے اور وہ دے رہے تھے۔

وقت لوٹتا نہیں مگر ان دونوں کے لیے بڑی حد تک لوٹ آیا تھا۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ بارش کچھ دیر کے لیے دھیمی ہوکر پھر تابڑتوڑ ہوجاتی تھی۔ ان کے دل ایک بار پھر جوش سے بھر جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک دورانیے میں صالح نے پھولوں کے خودرو پودوں کے جھنڈ میں آفرین کو خوب پیار کیا.....

ہاں، ان کی چاہت پوری ہورہی تھی۔ وہ دن اسی طرح قریباً اسی انداز میں لوٹ آیا تھا مگر وہ ایک بات بھول رہے تھے۔ جب ہم ماضی کے کسی دورانیے سے پیار کرتے ہیں تو اس دورانیے کے ناپسندیدہ یا پریشان کن لمحات کو فراموش کردیتے ہیں۔ اسے دورانیے میں سے حذف کردیتے ہیں۔ وہ دونوں بھی بارش کے اس بیتے دن میں سے کچھ اندوہناک لمحات کو فراموش کیے ہوئے تھے لیکن اگر وہ دن لوٹ آیا تھا تو پھر ان لمحات کو بھی تو لوٹنا تھا۔

اچانک ایک گرج نے صالح کو بے طرح چونکا دیا۔

''صالح!''

ایک لمحے کے لیے صالح کو یہی لگا کہ آج پھر شادمانی کے بے مثال تسلسل کو بابا شاہنواز کی آواز نے توڑ دیا ہے۔ وہ ننھی آفرین اور صالح کو ستم گھٹا دیکھ کر شعلہ فشاں ہوگئے ہیں اور شاخ کی سخت ضربات سے نوجوان خادمہ رتابہ کی شامت لانے والے ہیں لیکن نہیں۔ اس دفعہ بابا شاہنواز نے نہیں، کسی اور نے صالح کو پکارا تھا۔ وہ سکتہ زدہ سا دیکھتا رہ گیا۔ بارش اور نیم تاریکی کے باوجود وہ پہچان گیا۔ وہ کوئی

اور نہیں، اس کا ازلی دشمن دلدار وکی تھا..... وہی آستین کا سانپ.....اس کے عقب میں ایک اور پہلوان نما غنڈا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک میں لپٹا ہوا بڑے سائز کا ماؤزر صاف نظر آرہا تھا۔

آفرین چلا کر صالح سے علیحدہ ہوئی اور برآمدے کی طرف لپکی مگر پہلوان نما غنڈے نے اسے بری طرح دبوچ لیا۔ صالح نے اس کی طرف بڑھنا چاہا تو وکی تیزی سے آگے بڑھا اور صالح کا گریبان دبوچ لیا۔

ان لمحوں میں صالح کو وکی کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آیا۔ وکی دانت پیس کر بولا۔ ''سور کی اولاد! کیا سمجھتا تھا تُو..... بھول گیا ہوں تجھے اور اپنی اس معشوقہ کو..... اس کو تو قبر کی دیواروں تک نہیں بھول سکتا۔''

صالح نے سنبھل کر کہا۔ ''اپنی زبان کو لگام دے وکی..... یہ میری بیوی ہے۔''

وہ زہریلے انداز میں بولا۔ ''ایک بار تُو نے ہی کہا تھا، یاروں کا سب کچھ سانجھا ہوتا ہے۔ اگر یہ تیری بیوی ہے تو میری بھی ہے۔''

صالح نے بھی اس کا گریبان پکڑا اور بری طرح جھنجوڑ کر چلایا۔ ''میں کہہ رہا ہوں اپنی اس گندی زبان کو لگام دے ورنہ کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

''اوہو، میرے باسٹرڈ کی دم پر پاؤں آگیا ہے۔ چلو، چلو..... کوئی بات نہیں۔ بیوی تمہاری ہی رہے گی۔ ہفتہ دس دن اپنے پاس رکھ کر چھوڑ جاؤں گا..... یہ تو چلے گا نا؟''

صالح کا دماغ گھوم رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ چار سال کے لیے جیل کاٹنے والا وکی اچانک مسلح ہو کر یہاں کیسے پہنچ گیا ہے۔ (یہ بات تو بعد میں معلوم ہوئی کہ ایک دن پہلے اس کی بیمار والدہ فوت ہو گئی تھی..... وہ پیرول پر رہا ہو کر جیل سے نکلا تھا اور اپنی والدہ کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی اس کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے سرخاب منزل پہنچ گیا تھا)۔

آفرین پکار رہی تھی۔ ''بچاؤ..... کوئی ہے..... بچاؤ۔''

مگر بچانے کون آتا۔ کچھ دیر پہلے صالح نے ہی تو پورا زنان خانہ اور حویلی کا یہ حصہ خالی کروایا تھا۔ ہدایت کی تھی کہ کوئی اس طرف نہ آئے گا۔ اب دہاڑتے برستے بادلوں کے طوفانی شور میں آفرین کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی تھی۔

بجلی چمکی اور تب پہلی بار صالح کو اندازہ ہوا کہ آفرین کو چڑیا کی طرح اپنے عقابی پنجوں میں دبوچ کر رکھنے والا پہلوان نما غنڈا جالانوری ہے۔ اس کے سیاہی مائل بھیگے چہرے پر قاتل چمک تھی۔ وہ جیسے ہر بدلہ چکانے پر تلا ہوا تھا۔

صالح نے وکی کی پستول والی کلائی تھام لی تھی اور وکی نے صالح کو دھکیل کر ایک درخت کے ساتھ لگا دیا تھا۔ صالح نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''وکی! اگر تیری دشمنی ہے تو میرے ساتھ ہے۔ عورتوں کو درمیان میں مت لاؤ۔''

''دشمن کو زیر کرنا اور اس کی عورت کو اپنے بستر پر لے جانا، یہ بہت بڑی خوشی ہوتی ہے.....!'' وہ ہانپتی آواز میں بولا۔

''وکی..... وکی! میری برداشت کا امتحان مت لو۔''

''برداشت کرنا پڑے گا یار! بلکہ میرے بس میں ہو تو تجھے بھی ساتھ لے جاؤں اس کی آہ و زاری سنانے کے لیے۔ بڑا تپا ہوا ہوں۔ جیل میں بہت دور رہا ہوں نرم و نازک ہڈیوں (جسموں) سے۔'' وکی کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے حالانکہ وہ اپنی ماں کی تدفین کے لیے جیل سے نکالا گیا تھا۔

''وکی!'' صالح پھر گرجا۔

وکی نے زور لگا کر پستول کا رخ صالح کی گردن کی طرف کر دیا اور پھنکارا۔ ''کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اب جو ہونا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ حویلی کی پچھلی دیوار کے ساتھ آٹھ دس بندے میرے ایک آرڈر کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک سیٹی بجاؤں گا، سب پھلانگ کر اندر آجائیں گے۔ مارے جاؤ گے اور اس سیکسی کو بھی بچا نہ سکو گے۔''

آفرین گھٹی گھٹی آواز میں پکاری۔ ''صالح..... بچاؤ..... صالح!'' اس کی آواز میں عجب کرب تھا۔ شاید نشے میں ٹن جالے نوری نے اسے نوچنا شروع کر دیا تھا۔

ایک ٹریگر سا صالح کے اندر دب گیا..... ایک بند سا ٹوٹ گیا۔ یکایک وہ دہاڑا اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ وکی کو دھکیلتا ہوا کئی قدم پیچھے لے گیا۔ وہ وکی سے پستول چھیننے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس کا پاؤں کیچڑ میں پھسلا۔ وہ دونوں ہی اوپر نیچے گرے۔ وکی اوپر تھا مگر صالح نے ابھی تک پستول پر گرفت قائم رکھی ہوئی تھی۔ بھنا کر وکی نے صالح کے چہرے پر دھائیں دھائیں مکریں مارنا شروع کر دیں۔ لمحوں میں صالح کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ پستول پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ گرفت کی کمزوری کو محسوس کر کے وکی نے زور مارا اور پستول کا رخ صالح کے سینے کی طرف کر دیا۔ یہ نازک ترین لمحے تھے۔ صالح پستول کا رخ دوبارہ بدلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وکی نے ٹریگر

دبا دیا..... ٹریگر دبا مگر گولی نہیں چلی۔ اب معلوم نہیں یہ خرابی موسلا دھار بارش کا نتیجہ تھی یا کوئی اور نقص پیدا ہو گیا تھا۔ پستول اب کند ہتھیار کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور یہ ہتھیار وکی نے اندھا دھند صالح کے سر پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بڑی درندگی تھی اس کے انداز میں۔ لوہے اور ہڈی کا ٹکراؤ بار بار ہو رہا تھا۔ سر کے ایک جانب کی کھال اتر کر کان کی سمت لٹک گئی۔ خون دھاروں کی صورت بہنے لگا۔ پتا نہیں کون سی طاقت تھی جو صالح کو اپنے پاؤں پر کھڑا رکھے ہوئے تھی۔ یہی وقت تھا جب بجلی چمکی اور صالح کو وہ شخص نظر آیا جو بچپن سے اب تک ہر مشکل وقت میں اس کی مدد کو پہنچا تھا۔ اب بھی وہی تھا..... ہاں اب بھی تھا۔ بارش کی بوچھاڑوں میں اس کا سفید لباس پہچانا جاتا تھا۔ اس کے شانوں تک جاتے سفید بال چہرے اور گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا کرکٹ بیٹ تھا جس سے اس نے جالے نوری کے کھوپڑے پر دو شدید ضربات لگائی تھیں اور اسے اوندھا گرا دیا تھا۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد صالح کا یہ خوف بھی دور ہو گیا کہ اس کی وجہ سے جالا نوری آفرین کو کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ سر سے بہنے والا خون صالح کی آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ اس کے باوجود اسے آسمانی بجلی کی چمک نے وہ دراڑ دکھا دی تھی جو ایک قریبی کیاری میں پڑی تھی۔ اپنے سر پر پستول کی ایک اور شدید ضرب سہنے اور گرنے کے بعد صالح نے اپنے ڈولتے ذہن کو بہ مشکل سہارا دیا اور اپنا ایک ہاتھ اس دراڑ تک پہنچا دیا۔ وہ خبیث و غضب کی فلک بوس لہر تھی۔ وکی کو جب پتا چلا جب وہ نے وار دراڑ تک گئی انچ تک اس کے پہلو میں دھنس چکی تھی۔

وہ کربناک انداز میں چلایا اور اٹھ کر حویلی کے عقبی حصے کی طرف بھاگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ بے ساختہ اس کے ہونٹوں کی طرف گیا تھا۔ صالح نے تاڑ لیا۔ وہ یقیناً سیٹی بجا کر اپنے مددگاروں کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ ابھی سیٹی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی کہ صالح ایک بار پھر اس پر جا پڑا۔ اس بار وار اتنا شدید تھا کہ خم دار دراڑ تقریباً دستے تک پیٹ کے بائیں حصے میں دھنس گئی۔ وہ بارش کی بوچھاڑوں میں اوندھے منہ سنگ سرخ کے فوارے سے ٹکرایا اور پھر کیچڑ میں گرا۔ صالح پر جیسے وحشت سوار ہو گئی تھی۔ وہ جنونی انداز میں وکی پر دراڑ کے وار کرتا چلا گیا۔ وکی کی بلند کراہیں بارش کے شور کو چیر رہی تھیں مگر دور تک نہ جا پاتی تھیں۔

"صالح..... صالح..... بس کر دے۔" داجے فضل بار بار پکار رہے تھے مگر صالح کی سماعت تو جیسے ہر آواز کے لیے بند ہو چکی تھی۔ داجے نے جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے خون آلود دراڑ چھین لی۔ تب تک وہ ایک درجن سے زائد وار کر چکا تھا۔ وکی کا خونچکاں جسم قریباً بے حرکت تھا۔ اس کے باوجود صالح اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا..... کر دیا صالح تم نے؟" داجے کی لرزاں آواز ابھری۔

آفرین بھی دوڑتی ہوئی آئی اور صالح سے لپٹ گئی۔

"صالح..... صالح!" وہ اس کے زخمی سر کو ٹٹول رہی تھی۔ پھر اس نے خوفزدہ انداز میں وکی کے کٹے پھٹے جسم کی طرف دیکھا۔ بجلی کی چمک میں اس کے کٹے ہوئے پیٹ کا منظر ہیبت ناک تھا۔

"صالح! یہ کیا ہوا؟ یہ مر گیا ہے۔ تم نے مار دیا اسے؟" وہ کراہی۔

"صالح..... تم..... یہاں سے نکل جاؤ۔" داجے کی آواز صالح کے کانوں سے ٹکرائی۔

اچانک صالح کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے اندازے سے کہیں زیادہ زخمی ہے۔ اس کے سر کے اندر تاریکی سی چھا رہی تھی۔ درد کی ایک ناقابل برداشت لہر اس کے سر کے بائیں حصے کی طرف سے اٹھی۔ آفرین اسے سنبھالنے کی کوشش ہی کرتی رہ گئی۔ جو آخری احساس صالح کو ہوا، وہ دو طرح کے درد کا تھا۔ ایک درد سر کی طرف اور دوسرا پہلو کی طرف تھا۔ شاید اس کی پہلے سے مضروب پسلی پھر زخمی ہو گئی تھی۔ اس کے دھندلاتے ہوئے حواس نے اسے اطلاع دی کہ بارش کی بوچھاڑوں میں وہ زمین کی طرف گر رہا ہے۔ اسے سنبھالنے کی کوشش میں آفرین کی چوڑیاں ٹوٹ رہی ہیں.....

☆☆☆

صالح کی آنکھ اسپتال میں کھلی۔ اس کا سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی کئی جگہ میڈیکل ٹیپس چپکی تھیں۔ پہلو پر نسبتاً بڑی بینڈیج تھی۔ صالح نے اس بڑی بینڈیج کو چھونے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا تو پتا چلا کہ وہ ہتھکڑی میں ہے۔ تب ہی اس کی نظر کمرے سے باہر دروازے پر پڑی۔ دو باوردی پولیس اہلکار اس کی نگرانی پر تھے۔

وہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔ بارش، رات اور خون کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے فلم کی طرح چل گئے۔ اس نے وکی کو سرخ فوارے کے قریب جان سے مار ڈالا تھا..... ہاں، اسے قتل کر دیا تھا۔ اس کا بھائی ایک جانا پہچانا بیرسٹر تھا۔ اس کے خاندان میں اور بھی دو تین لائر موجود تھے۔

کتنے سنگین لمحات تھے وہ۔ پلک جھپکتے میں انہوں نے زندگی کو کیا سے کیا کر ڈالا تھا۔ صالح نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے کو چھوا۔ اپنی بڑھی ہوئی شیو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ شاید تین چار دن کے بعد ہوش میں آیا ہے۔

اسے سب سے پہلے آفرین کا خیال آیا۔ وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی، داجے کہاں تھے؟ اس نے سسٹر کو آوازیں دینا شروع کر دیں تو سفید کوٹ میں ایک ڈاکٹر صاحب اندر آ گئے۔

''گڈ ایوننگ صالح رائے!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''میں کہاں ہوں ڈاکٹر صاحب..... کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

ڈاکٹر نے شستہ لہجے میں کہا۔ ''جو یہاں اسپتال میں تمہارے ساتھ ہوا ہے، وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں لیکن جو تم باہر کر کے آئے، وہ تمہیں پتا ہی ہے۔''

''میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں؟''

''قریباً 72 گھنٹے بعد۔ تمہارے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ سر میں خون کا ایک لوتھڑا جم گیا تھا جسے نکالا گیا ہے۔ پسلی کا چھوٹا سا آپریشن بھی ہوا ہے۔ اب تمہاری حالت خطرے سے باہر ہے لیکن شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔'' بڑی عمر کے ڈاکٹر نے ذرا توقف کیا اور کہا۔ ''اس کے علاوہ تمہارے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''جس جالے نوری نام کے بندے کو تم نے اپنے کرکٹ بیٹ سے زخمی کیا تھا، اس کی حالت اب بہتر ہے۔ ممکن ہے تمہاری ہتھکڑی کل تک کھل جائے۔''

صالح کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ڈاکٹر، جالے کا ذکر تو کر رہا تھا، اس ہر دو دو کی کا نہیں کر رہا تھا جو موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا اور پھر جالے کو تو داجے نے چوٹیں لگائی تھیں۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ بشیر افراسیاب، ڈاکٹر سے اجازت لے کر اندر چلا آیا۔ اس کے آنے کے بعد سرجن ڈاکٹر ضروری ہدایات دے کر باہر نکل گیا۔

افراسیاب کی آنکھوں میں نمی جمع ہو رہی تھی۔ ''آپ ٹھیک ہیں صالح سرکار؟''

''ہاں، میں تو بہتر ہوں مگر آفرین..... اور داجے؟''

''آفرین سرخاب منزل میں ہیں، انہیں معمولی چوٹیں آئی ہیں۔''

''اور داجے؟''

''داجے جیل میں ہیں..... م..... میرا مطلب ہے حوالات میں۔ پرسوں انہیں ریمانڈ کے لیے کورٹ میں پیش کیا گیا تھا۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔''

جواب دینے کے بجائے افراسیاب نے خاموشی سے ایک لفافہ صالح کے تکیے کے نیچے سرکا دیا۔ ''اسے پڑھ لیں۔ میں بعد میں واپس لے جاؤں گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

افراسیاب کے جانے کے بعد صالح سخت بے چینی محسوس کرنے لگا۔ چند گھنٹے اس نے بہ مشکل گزارے۔ رات تیسرے پہر اس نے باتھ روم میں جانے کی اجازت طلب کی جو کچھ بحث کے بعد اسے دے دی گئی۔ ہتھکڑی کو بستر سے علیحدہ کیا گیا اور وہ ایک مسلی نرس کا سہارا لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔

اس نے پہلی فرصت میں وہ لفافہ کھولا۔ اس میں کسی سخت چیز کی موجودگی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔ یہ وہی بھولی بسری انگوٹھی تھی جو کچھ عرصہ پہلے اس نے داجے کو اپنے عہد کی نشانی کے طور پر دی تھی اور عہد یہی تھا کہ زندگی میں کبھی بھی جب وہ اس انگوٹھی کا حوالہ دے کر بات کریں گے تو وہ ٹالے گا نہیں..... اور آج..... آج انہوں نے اس انگوٹھی کا حوالہ دیا تھا۔ اس کی قیمت وصول کی تھی صالح سے..... داجے فضل کا مختصر خط اس کے ہاتھوں میں لرزنے لگا۔ اس کی نگاہیں الفاظ پر پھسلتی گئیں۔

''میرے بیٹے..... میرے صالح..... میری آنکھوں کے تارے! زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگا ہے اور آخری بار بھی۔ اب انکار نہ کرنا۔ وکی کا قتل کسی اور نے نہیں میں نے کیا ہے۔ وہ میری بیٹیوں جیسی بھتیجی آفرین کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی نیت سے آیا تھا۔ میں نے ورانتی کے وار کر کے اسے ڈھیر کر دیا۔ پولیس نے مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ہے اور میں نے بھی اب اقبالِ جرم کرنا ہی مناسب سمجھا ہے۔ وکی کے ساتھی جالے نوری کو تم نے بلے سے چوٹیں لگائی تھیں۔ وہ بیہوش تو ہے مگر بچ جائے گا۔ مجھے اللہ پاک سے پوری امید ہے کہ جالے کے حوالے سے تم پر کوئی زد نہ آئے گی..... اپنا اور آفرین کا بہت خیال رکھنا میرے بچے۔ میں نے زندگی میں اپنی اولاد نہیں دیکھی مگر سوچتا ہوں وہ ہوتی بھی تو کیا مجھے تم سے زیادہ پیاری ہوتی۔ شاید نہیں..... ہرگز نہیں۔

مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ تمہاری چیز بھی تمہیں واپس بھیج دی۔ پوری امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو گے۔

اور ہاں، میری زیادہ فکر نہ کرنا۔ اللہ پاک سے

امید ہے کہ میری زندگی اب مجھے زیادہ دیر اپنے ساتھ نہ گھسیٹے گی۔

تمہارا داجے۔"

صالح کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ سینہ جل اٹھا۔ اس کا دل چاہا وہ داجے داجے پکارتا سرگودھا کے اس اسپتال سے باہر نکل آئے۔ اسپتال سے سڑک تک اور سڑک سے پولیس اسٹیشن تک بھاگتا چلا جائے۔ اس پولیس اسٹیشن تک جہاں وہ مجسم پیار و ایثار شخص آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ہے۔ اسے جھنجوڑ ڈالے..... اس سے کہے..... خبردار داجے! اگر آپ نے میرا گناہ اپنے سر لیا۔ آپ کے احسان پہلے کم ہیں؟ آپ نے اپنی پوری زندگی سرخاب منزل کے اور میرے نام کردی۔ احسان پر احسان..... احسان پر احسان کرتے چلے گئے۔ کیا اب یہ کسر رہ گئی تھی؟ نہیں داجے! میں اپنی جوان ہڈیوں کی جگہ آپ کی بوڑھی ہڈیوں کو جیل میں رلنے نہیں دوں گا.....

اس نے لرزاں ہاتھوں کے ساتھ خط کے کاغذ میں سے اللہ پاک کے الفاظ پھاڑ کر علیحدہ کیے اور باقی خط کے ٹکڑے کرکے فلش میں بہادیے پھر وہ جیسے انگاروں پر چلتا ہوا واش روم سے باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟

وہ دیر تک داجے اور ان کے اس انوکھے عمل کے بارے میں سوچتا رہا۔ بارش کی رات وہ خونی واقعہ ہونے سے بہت پہلے انہوں نے اس سے ایک ناقابل شکست عہد لیا تھا۔ اور پھر اس حوالے سے بالکل خاموش ہوگئے۔ کیا واقعی وہ اپنی ریاضت اور روحانیت کے سبب آنے والے وقت کے بارے میں درست قیافے لگا لیتے تھے؟

سب سے اہم اور نازک سوال یہ تھا کہ کیا وہ کسی طرح بے فضل کو جرم بے گناہی کا اعتراف کرنے سے باز رکھ سکتے تھے؟ جتنا وہ داجے کو جانتا تھا، اس سوال کا جواب یہی تھا کہ نہیں ہوسکے گا۔

پھر داجے کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا ذہن آفرین کی طرف چلا گیا۔ اسے اس کی آخری جھلک اور صدائیں یاد آگئیں۔ داجے نے اسے جالے نوری کے چنگل سے نکال لیا تھا اور وہ جیسے گھٹنوں کے بل گیلی گھاس پر گر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب ہی کرب تھا۔ وہ صالح کو خونخوار وحشی درندے کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

کہاں تھی آفرین؟ وہ جلد از جلد اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

.....دھوپ خوشگوار محسوس ہوتی تھی۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا اور ٹھنڈے دیسوں سے ہجرت کرکے آنے والے پرندے اس آسمان کے پیش منظر میں تیرتے نظر آتے تھے۔ وکی والے خونی واقعے کو ہوئے قریباً سات ماہ گزر چکے تھے۔

اس عرصے میں بہت کچھ ہوا تھا۔ وکی کے بڑے بھائی بیرسٹر ارباز نے اس کیس کو رائے فیملی کے لیے سنگین ترین بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ ایف آئی آر میں داجے فضل کا نام تو تھا ہی، ان کے علاوہ صالح، اختر، افراسیاب، پرنس شاہد اور پتا نہیں کن کن کو نامزد کردیا تھا۔ بہرحال قانون اندھا ہونے کے باوجود بہت کچھ دیکھتا بھی ہے۔ صالح اور اختر وغیرہ تفتیش میں شامل تو رہے تھے مگر ان کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ داجے فضل کے خلاف شہادتیں بہت واضح تھیں۔ وہ خون آلود کپڑوں کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے پھر انہوں نے وہ نیلی ڈرائنگ بھی پیش کردی تھی جو بقول ان کے، انہوں نے آلۂ قتل کے طور پر استعمال کی تھی۔ صالح چونکہ کچھ عرصہ پہلے تک کرکٹ بھی کھیلتا رہا تھا اور اب بھی دیکھنے کی حد تک یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا لہٰذا واردات میں اس کی طرف سے کرکٹ بیٹ کا استعمال سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

.....تمام واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے داجے فضل کو سیشن کورٹ سے دس سال قید کی سزا ہوئی تھی جس کے خلاف صالح کے وکلاء ہائی کورٹ میں اپیل کررہے تھے۔ داجے فضل اب سرگودھا کی ڈسٹرکٹ جیل میں تھے۔

اس دوران میں ایک اور اہم واقعہ ہوا تھا۔ اسے مکافاتِ عمل کے سوا اور کیا کہا جاسکتا تھا۔ وکی کا باپ سیف اللہ جوان بیٹے کی موت برداشت نہ کرسکا۔ سنا گیا تھا کہ وہ بہت ڈرنک کررہا ہے۔ ایک روز وہ اس فارم ہاؤس کا تعمیراتی کام دیکھنے آیا جس کا نام اس نے بڑے فخر سے "وکی فارمز" رکھا تھا۔ وہیں پر اپنے بیرسٹر بیٹے سے فون پر بات کرتے ہوئے اسے دل کا دورہ پڑا۔ اسے فارم ہاؤس سے اسپتال پہنچانے کی کوشش کی گئی مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔ اب اس فارم ہاؤس کی ادھوری دیواریں بربادی کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔ پچھلے ہی دنوں صالح نے سنا تھا کہ بیرسٹر ارباز نے وہ زمین فروخت کردی ہے۔

آج جیل میں داجے سے صالح کی ملاقات تھی۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹا ان کے ساتھ گزار کر اب واپس سرخاب منزل لوٹ رہا تھا۔ داجے کے کئی عقیدت مند بھی ملاقات کے لیے موجود تھے۔ ہر ملاقات میں چالیس پچاس افراد

ان کے دیدار کے متمنی ہوتے تھے۔ ان سب کے نزدیک واجے کی شان اور عظمت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ واجے نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایسے شخص کو جہنم واصل کیا جو بدنیت کے ساتھ سرخاب منزل میں داخل ہوا۔ کچھ ان کے عقیدت مندوں کا دباؤ اور کچھ صالح کی کوشش تھی کہ واجے فضل کو جیل میں بی کلاس دے دی گئی تھی..... اور تو اور جیل کے افسران میں بھی ایک دو ان کے نیاز مند نکل آئے تھے۔ واجے اپنا زیادہ وقت عبادت میں گزارتے تھے۔

پتا نہیں کیوں آج کل سرخاب منزل صالح کو خالی خالی محسوس ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دنوں اسے باہر گھومنا پھرنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ جیپ اختر اڈرائیو کر رہا تھا جس کی صرف دو روز پہلے ہی مرمت ہوئی تھی۔ صالح پسنجر سیٹ پر موجود تھا اور سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نہ جانے کیوں اچانک اسے بیٹھے بیٹھے وہ لڑکا وسیم یاد آ گیا جو مزار کمیٹی کے نائب صدر مطیع اللہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ وسیم بڑی چاہت سے جس لڑکی کو دیکھتا تھا، اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس سے پہلے مطیع اللہ نے چھوٹے بھائی کو بے دردی سے پیٹا تھا، بازو توڑ ڈالا تھا۔ نہ جانے کیوں صالح کے دل میں آیا کہ دیکھا جائے اب وہ لڑکا کہاں اور کس حال میں ہے۔

وہ اب سرخاب منزل کے قریب تھے۔ صالح نے اختر سے کہا۔ ''گاڑی دائیں موڑ لو۔''

اختر نے گاڑی موڑ لی اور سوالیہ نظروں سے صالح کی جانب دیکھنے لگا۔

صالح بولا۔ ''چلو، اس لڑکے کو دیکھتے ہیں جس کو صرف تاکا جھانکی کی سزا میں بری طرح مارا گیا تھا۔''

پندرہ منٹ بعد وہ دونوں اس بستی میں تھے۔ صالح کی جیپ کو بستی میں دیکھ کر درجنوں افراد جمع ہو گئے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ سب لوگ جھک کر سلام کرتے تھے۔ چند بڑی عمر کے لوگوں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔ ''صالح سرکار..... صالح سرکار'' کہتے ان کا منہ سوکھتا تھا۔ صالح میں آنے والی انقلابی تبدیلیوں نے اسے اب اپنے لوگوں کے لیے قابلِ قبول بنا دیا تھا۔

اسی دوران میں صالح کو بالکل گول چہرے، گول ٹوپی اور تنومند جسم والا وہ بندہ مطیع اللہ بھی نظر آ گیا جو لڑکے وسیم کا بڑا بھائی تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ صالح کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

''صالح سرکار ہماری خوش قسمتی کہ آپ ہماری بستی میں آئے۔''

صالح نے مطیع اللہ کو جیپ میں بٹھا لیا۔ اس کے گلے میں چاندی کا تعویذ نظر آتا تھا۔ بالکل چھوٹی چھوٹی تراشیدہ ڈاڑھی بھی تھی۔ صالح نے کہا۔ ''مطیع! سنا ہے ایک ایسی بات پر جو زیادہ بڑی بھی نہیں تھی، تم نے اپنے چھوٹے بھائی کو مارا اور بازو توڑ دیا ہے۔''

چھوٹے بھائی کے ذکر پر مطیع کے سرخ و سپید چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''جی، اس کے بارے میں اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اسے باپ بن کر پالا ہے۔ میری بیوی بھی اسے بچوں کی طرح ہی سمجھتی رہی ہے۔ اس بات کا مجھے بہت رنج ہوا کہ مجھے اس کو پیٹنا پڑا۔ وہ ہمسائے کی ایک غریب مسکین سی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا۔''

صالح نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''تمہیں اعتراض اس بات پر تھا کہ وہ لڑکی کے چکر میں پڑ رہا تھا یا اس بات پر کہ وہ غریب مسکین تھی؟''

''م..... میں سمجھا نہیں جی؟''

صالح طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ مزارے محمد شریف کی بیٹی نہ ہوتی، کسی کھاتے پیتے گھر کی ہوتی تو تمہیں اور تمہاری بیوی کو اتنا غصہ نہ آتا۔''

''نن..... نہیں صالح سرکار ایسی بات نہیں تھی۔ م..... مجھے بس اس کی پڑھائی لکھائی کی فکر تھی۔ میں اسے

فرمائش

ایک خاتون سبزی والے سے سبزی لیتے ہوئے۔

''دیکھو، بھیا اگر سبزی خراب ہوئی تو میں پکی پکائی واپس کر جاؤں گی۔''

سبزی والا۔ ''خاتون اگر ساتھ دو روٹیاں بھی لیتی آئیں تو مہربانی ہوگی۔''

تاریخ

باپ (استاد سے): ''میرا بیٹا تاریخ میں کیسا جا رہا ہے؟ یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب میں پڑھتا تھا تو تاریخ میں صفر تھا۔''

استاد: ''جناب آپ نے یہ تو ضرور سنا ہوگا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ضرور ہے۔''

ریاض بٹ، حسن ابدال

نیک بنانا چاہتا تھا.....''

''تو بنالیا تم نے نیک؟'' صالح نے اس کی بات کاٹی۔

مطیع اللہ کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔

''اب وسیم کہاں ہے؟''

اس سوال پر مطیع کا رنگ مزید سفید ہوا پھر ایک دم آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''وہ جی..... وہ جی.....'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''بولو، کیا بات ہے؟'' صالح نے سختی سے پوچھا۔

وہ لرزتے لہجے میں بولا۔ ''ب..... بات بڑی شرم کی ہے..... میں..... کیا بتاؤں آپ کو۔ متولیوں کے گھرانے سے ہو کر اس خبیث نے ایسا کام کیا۔ مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔''

''پہیلیاں مت بوجھواؤ۔'' صالح نے اسے ڈانٹا۔

جواب میں مطیع اللہ نے سٹپٹائے اور گھبرائے لہجے میں رک رک کر جو بتایا وہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ فطرت کے آگے جب بند باندھے جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی سانحے ہوتے ہیں۔ آج کل سوشل میڈیا اور ٹی وی پر ایسے واقعات کی تشہیر بھی عام ہے۔ یہ انکشاف تکلیف دہ تھا کہ وہ دبلا پتلا معصوم سا لڑکا جو شفق رنگ شاموں میں اپنی چھت پر آ کر اپنے پسندیدہ چہرے کو دیکھتا تھا، مسکراتا تھا، جھینپتا تھا اور ایک کہانی کی شروعات چاہتا تھا، کہانی ختم ہونے پر بے حد پستی میں گر گیا تھا۔ ایک روز ایک زیر تعمیر خالی گھر کے اندر اسے ایک آٹھ نو سالہ بچے کے ساتھ پکڑ لیا گیا تھا۔ لوگوں نے اس کی خوب دھنائی کی۔ گلی میں گھسیٹا، وہ نیم بیہوش ہو گیا۔ لوگ اسے تھانے لے جانا چاہتے تھے مگر آبادی کے ہی دو تین بڑوں نے درمیان میں پڑ کر اسے پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچایا۔ وہ ایک دھتکاری پھٹکاری مخلوق بن گیا تھا۔ اس کا ''بہت سیانا، بہت عقل علم'' والا بھائی اب اسے سرگودھا کی ایک مضافاتی بستی میں اپنے ایک چاچے کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ یہ چاچا نانبائی کا کام کرتا تھا۔

پوری روداد سننے کے بعد صالح کا سینہ جل اٹھا۔ اس نے اسی وقت مطیع اللہ کو ساتھ لیا..... ایک گھنٹے بعد وہ سرگودھا کے مضافات میں واقع اس گنجان آبادی میں تھے۔ صالح نے نان شاپ سے تھوڑا پہلے ہی جیپ رکوالی۔ تنور پر دو بندے کام کر رہے تھے۔ مطیع کا فربہ چہرے والا کرخت صورت چاچا کرسی پر بیٹھا تھا۔ پیسوں والا گلا اس کے سامنے تھا۔ تین چار گاہک بھی موجود تھے۔

''یہی ہے تیرا چاچا؟'' صالح نے پوچھا۔

مطیع نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب ہی صالح کی نظر لمبوتری دکان کے عقبی حصے میں گئی۔ اس نے اس دبلے پتلے وسیم کو پہچان لیا۔ اس کے سر کے لمبے بال بڑے بھونڈے طریقے سے کاٹ دیے گئے تھے۔ اس نے بوسیدہ سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور ایک بڑے ٹب کے اندر آٹا گوندھنے میں مصروف تھا۔ ٹھنڈے موسم کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی چمک تھی اور ہانپا ہوا نظر آتا تھا۔

کرسی پر بیٹھے نیم گنجے شخص نے کسی بات پر وسیم کو ڈانٹا۔ جواب میں وسیم نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ آوازیں تو صالح تک نہیں پہنچیں مگر بولنے والے کے سانولے چہرے پر سخت گیری کی جھلک صاف نظر آئی۔

صالح نے مطیع اللہ کو وہیں بیٹھنے کا حکم دیا اور اخترے کو لے کر نان شاپ پر پہنچا۔ گلے پر بیٹھے شخص نے بھی صالح کو پہچان لیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور مؤدب نظر آنے لگا۔

''سرکار! آپ یہاں؟'' وہ حیران ہوا۔

اسے جواب دیے بغیر صالح، اخترے کے ساتھ اندر گیا اور تب ہی لڑکے وسیم کی نظر اس پر پڑی۔ یقینی بات تھی کہ وہ بھی اسے پہچانتا تھا۔ صالح کو دیکھ کر اس کا ردعمل بڑا عجیب تھا۔ اس نے اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھ آٹے میں سے نکالے اور پورا گھوم کر صالح کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف جمع ہو رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اٹھارہ انیس سالہ لڑکا نہیں تھا، ایک بچہ بن گیا تھا جسے ہر لحظہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ابھی اس کے بڑے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا کہ پڑا۔

میکانکی انداز میں وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی بے بسی دیکھنے والی تھی۔ صالح اسے پچکارنے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''معاف کر دیں..... معاف کر دیں جی۔ غلطی ہو گئی تھی جی.....''

صالح کا دل بھر آیا۔ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ ہکا بکا نظر آنے لگا۔ پورا جسم کانپ رہا تھا۔ مطیع اللہ کا چاچا بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ موجود گاہکوں کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا تھا۔

''..... غلطی ہو گئی جی۔'' لڑکے نے پھر مری مری آواز میں کہا۔

صالح دل ہی دل میں بولا..... ''غلطی تمہاری نہیں، ہم سب کی ہے.....''

اسی اثناء میں مطیع اللہ بھی جیپ سے اتر کر نان شاپ

میں پہنچ گیا۔ اپنے ''گناہ گار'' چھوٹے بھائی کو دیکھ کر اس کا گول چہرہ تپنے لگا۔ کہنے لگا۔ ''صالح سرکار! یہ اس قابل نہیں کہ اس سے ہمدردی کی جائے۔ بہت کوشش کرلی اس کے ساتھ۔ یہ باتوں کا نہیں، لاتوں کا بھوت ہے۔ لاتوں سے ہی ٹھیک ہوگا۔''

''اور اگر میں کہوں کہ یہ نہیں، تم لاتوں کے بھوت ہو؟'' صالح نے اس کی طرف رخ کر کے کہا۔

وہ صالح کے بدلے رویے پر سکتہ زدہ رہ گیا۔

صالح نے مزید کڑے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ تم لاتوں کے بھوت ہو؟''

''جج..... جی..... وہ..... آپ.....'' وہ بری طرح گڑبڑایا۔

نہ جانے یکا یک صالح کو کیا ہوا۔ وہ ایک قدم بڑھا اور مطیع کے چہرے پر ایسا طمانچہ مارا کہ آواز دور تک گئی۔ اس کی گول چمکیلی ٹوپی اتر کر آٹے کے ٹب میں جا گری تھی۔

صالح دہاڑا۔ ''تم لوگ..... تم لوگ..... زندگی کو زندگی نہیں رہنے دیتے۔ اسے آگے بڑھنے نہیں دیتے، چلنے نہیں دیتے۔ اسے کھڑا ہوا بدبودار پانی بنا دیتے ہو۔''

وہ پھر ایک قدم آگے بڑھا۔ دوسرے طمانچے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو روک لیا۔ اختر کی طرف رخ کر کے دہاڑا۔ ''بٹھاؤ اس کو جیپ میں۔ اس سے سارا حساب کتاب کرتا ہوں میں۔''

تومند مطیع تھر تھر کانپنے لگا۔ اختر نے اسے بازو سے پکڑا اور لے کر جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ صالح نے زور رولڑ کے کو ایک بار پھر اپنے ساتھ لگایا۔ اس کے ہاتھ جو کہنیوں تک آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے، اچھی طرح دھلائے اور اسے لے کر جیپ میں آ بیٹھا۔ وہ ''ضم بکم'' ہو کر رہ گیا تھا جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

راستے میں جب صالح نے مطیع اللہ کو ''مژدہ'' سنایا کہ وہ اسے چھوٹے بھائی کا بازو توڑنے کے جرم میں انسپکٹر آغا کے حوالے کرنے جا رہا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع ہو گیا۔ صالح نے اسے دھکیل کر خود سے دور ہٹایا۔ ''اس لڑکے کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے، اس کے اصل قصوروار تم ہو۔ یہ بالغ تھا، تم نے کیوں اس سے مرضی نہ پوچھی؟''

سرخاب منزل کے قریب پہنچنے تک مطیع منت سماجت کر کر کے اور رو رو کر نڈھال ہو چکا تھا۔ صالح کے اندازے کے مطابق اسے یہ تشویش بھی تھی کہ ہزار کی رقوم میں وہ اور اس کا ایک ساتھی جو چھوٹے موٹے گھپلے کرتے رہے ہیں، وہ بھی سامنے آ جائیں گے۔ بالآخر اس کی ابتر حالت دیکھ کر صالح نے اسے جیپ سے اتار دیا اور کہا۔ ''میں سوچوں گا کہ مجھے تمہارے بارے میں کیا کرنا ہے۔''

وہ پھر صالح کے پاؤں میں گر پڑا۔ اختر نے اسے صالح کے پاؤں سے ہٹایا۔ ''جاؤ اب۔ صالح سرکار کہہ رہے ہیں نا کہ سوچیں گے اس بارے میں۔'' اختر اب سمجھ چکا تھا کہ صالح کا رویہ مطیع کے حوالے سے کچھ نرم پڑ گیا ہے۔

سرخاب منزل پہنچ کر لڑکا وسیم بھی رونے اور منت سماجت کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے شرمناک غلطی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ مسلسل صالح کے سامنے جوڑ رکھے تھے۔ بالآخر صالح نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو کھولا۔ پہلے اس سے تھوڑا سخت رویہ اختیار کیا پھر سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گیا۔

جب صالح اس سے باتیں کر رہا تھا، نہ جانے کیوں صالح کی نگاہوں کے سامنے وہ گم گشتہ منظر گھومنے لگا جب اسی نوخیزی کی عمر میں اس سے ملتی جلتی غلطی اس سے بھی ہوئی تھی۔ یہاں ایک بچہ تھا، وہاں کم سن زری تھی۔ واجے فضل کی دکھ بھری قہرناک آواز کی بازگشت آج بھی اس کے کانوں میں موجود تھی..... اور کبھی کبھی دل کو مجروح کرتی تھی۔ واجے نے جب بچی زری کو روتے اور ''ابا ابا'' پکارتے دیکھا تو گرج کر صالح سے کہا تھا..... ''کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے خبیث..... دفع ہو جا اب یہاں سے..... نکل جا۔''

☆☆☆

سرخاب منزل بہت خاموش اور سوئی تھی لیکن آج اس کا سونا پن ختم ہونے والا تھا۔ کوئی آنے والا تھا..... اور اس کے ساتھ ایک ننھی منی پری بھی آنے والی تھی۔

آفرین، ننھی کرن کی پیدائش کے چالیس روز بعد چھوٹی حویلی سے سرخاب منزل واپس آ رہی تھی..... اور پھر وہ آئی اور یوں آئی جیسے پیاسی زمینوں پر ساون آتا ہے، جیسے منجمد برف پر دھوپ اترتی ہے اور جیسے بقول فیض..... گلشن میں چپکے سے بہار آتی ہے۔

وہ گاڑی سے اتری تو ننھی پری کرن اس کی ریشمی بانہوں میں ہمک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بچی کے ساتھ آفرین کی خوبصورتی کامل ہو گئی ہے۔ برسوں پہلے اسی طرح کی خوبصورتی صالح نے شیر خوار بچی والی ملازمہ روزینہ میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر اس دور میں اس کے دل و دماغ پر جنس سوار تھی۔ نسوانی لمس کا ہوکا اس کے جسم میں ہر وقت آتش بھڑکائے رکھتا تھا اور آتش تو بھسم کرنے والی چیز کا نام ہے۔ اس آتش نے ایک رات ''عورت اور بچے'' والی

فیٹسی کو بھی بھسم کر دیا تھا اور اس نے روزینہ کے پہلو سے بچی کو اٹھا کر دوسرے بستر پر سُلا دیا تھا۔

ہاں، وہ دورِ جاہلیت تھا اس کا۔ آج جب وہ آفرین اور اپنی بچی سے ایک ساتھ گلے ملا تو اس کی روح میں جیسے جنت کی ہوائیں چلیں، دودھ اور شہد کی نہریں بہہ گئیں۔ وہ آفرین کو اپنے ساتھ ساتھ لگائے اس مرمریں بالکونی میں آبیٹھا جو ان کی بہترین یادوں کی امین تھی۔ بالکونی میں سردیوں کی سہ پہر کی سنہری دھوپ تھی۔ آفرین کے رخسار دہک رہے تھے۔

''مجھ سے پیار کرتی ہو؟''

''اوں ہوں۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا اور ننھی پری کو گلے سے لگا کر اپنا سر صالح کے کندھے پر ٹکا دیا۔

☆☆☆

..... قریباً پندرہ روز بعد صالح اور آفرین خصوصی اجازت نامے پر داجے سے ملاقات کے لیے جیل گئے۔ ننھی کرن بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کی شکل بڑی حد تک صالح سے ملتی تھی۔ داجے نے بڑی دیر اس سے پیار کیا، اس کا منہ سر چوما، آیات پڑھ کر اس پر پھونکیں۔

آفرین نے کہا۔ ''داجے! دیکھیں، اس کی شکل صالح سے کتنی ملتی ہے۔''

وہ بولے۔ ''صالح سے ملتی ہے اور صالح کی ماں سے بھی۔ جو لوگ..... ہم سے بچھڑ جاتے ہیں، اکثر وہ اسی طرح روپ بدل بدل کر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں تاکہ وہ ہمارے ذہنوں میں اور ہماری یادوں میں تازہ رہیں۔'' انہوں نے ایک بار پھر ہاتھ بڑھا کر بچی کو لیا۔ اس کا سر اور منہ چوما اور اسے آفرین کے حوالے کر دیا۔

پھر وہ صالح کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''سرخاب منزل نے بڑے دکھ دیکھے ہیں۔ اب تم سرخاب منزل کو ان دکھوں سے بہت دور رکھنا۔''

''ان شاء اللہ دکھ دور رہیں گے داجے! خوشیاں قریب آئیں گی اور آپ بھی آکر دیکھیں گے۔'' پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ ''میں نے آپ کو زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہنے دینا داجے۔ ہائی کورٹ میں ہمارا کیس لگ چکا ہے۔''

داجے نے سنی ان سنی کر دی جیسے جیل یا جیل سے باہر ..... وہ ہر حال میں خوش تھے۔

جب صالح اور آفرین سرخاب منزل واپس پہنچے تو حسب پروگرام منیجر افراسیاب تیار کھڑا تھا۔ وہ ایک کار کی ڈکی میں اپنی کیس وغیرہ رکھ رہا تھا۔ جس کا یہ سامان تھا وہ بھی پاس ہی موجود تھا۔ یہ وسیم تھا..... اب اس کا حلیہ کافی بہتر نظر آتا تھا۔ ہیئر کٹنگ ہو گئی تھی۔ اس نے سلیقے کی پینٹ شرٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ صالح نے اس کا ایڈمیشن لاہور کے ایک معروف پرائیویٹ کالج میں کرا دیا تھا۔ ہاسٹل میں اس کے رہن سہن کا بھی مکمل انتظام تھا۔

ڈرائیور ابھی گاڑی کا تیل پانی چیک کر رہا تھا۔ صالح نے نرمی سے وسیم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ٹہلنے والے انداز میں احاطے کے سبزہ زار میں لے گیا۔ پھر دور جنوب مشرق کی سمت دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''لاہور بڑا پیارا شہر ہے۔ جس طرح کراچی کو روشنیوں کا شہر کہتے ہیں..... اسے زندہ دلان کا شہر کہتے ہیں۔ وہاں تمہیں بڑے اچھے، خوبصورت لوگ ملیں گے پھر..... پھر ہو سکتا ہے کہ کسی ایسے ہی چمکیلے دن میں جب تم کالج کے کسی سبزہ زار میں گھوم رہے ہو گے یا کسی تفریح گاہ میں چہل قدمی کر رہے ہو گے، کوئی لڑکی تمہیں دیکھ کر مسکرائے..... اور تم بھی اسے دیکھ کر مسکراؤ۔ ہو سکتا ہے نا؟''''

وسیم بس سر کو بہت ہولے سے ہلا سکا۔

''..... تو پھر اس مسکراہٹ کو برقرار رکھنا۔ بے جا شرم اور جھجک کے بوجھ کے نیچے نہ دبانا..... پھر جب تم اسے اچھے سے جان جاؤ..... تو کسی دن پتا ہے کیا کرنا؟''

وسیم نے ایک سوالیہ نظر صالح پر ڈالی مگر بولا کچھ نہیں۔

''وہ بات کہہ دینا جو تم کسی سے کہہ ہی نہ پائے تھے۔ بولو، کیا کہو گے؟''

وہ صالح کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے چلتا رہا۔ اس کے پپڑی ہونٹ بس تھرا کر رہ گئے۔

''ہاں، ہاں۔ یہی بات جو تمہارے ہونٹوں پر نہیں آرہی..... تب پورے اعتماد سے کہہ دینا..... کہہ دینا..... آئی لو یو۔''

دفعتاً لڑکے کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے اپنے جھکے جھکے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

''گڈ..... ویری گڈ!'' صالح نے کہا اور اس کا سر چوما۔

..... کچھ ہی دیر بعد صالح اور آفرین، وسیم کو افراسیاب کے ساتھ ایک نئی منزل کی طرف جاتا دیکھ رہے تھے..... دیکھ رہے تھے اور ہاتھ ہلا رہے تھے۔

صدیوں سے جبس اور نفس پرستی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی سرخاب منزل پر ایک نیا خوشبودار موسم وارد ہو رہا تھا..... ننھی پری مسکرا رہی تھی۔

نصوم لڑکی''

نواز خان



''معصوم لڑکی''

نواز خان

''وہ ایک معصوم اور سادہ دل لڑکی کا متلاشی تھا۔ طویل انتظار کے بعد اُسے ایسی لڑکی مل گئی لیکن.....!''

یہ کہانی دلچسپ انداز میں شروع ہوئی میں امرتسر کے ایک دیہاتی علاقے میں کام کررہا تھا۔ گاؤں کا نام جاٹڑی پورا تھا۔ یہاں کے ماسٹر ریاض صاحب بڑی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ عمر پچاس پچپن کے قریب تھی تاہم صحت اچھی تھی روز صبح ورزش کرتے تھے۔ پکے نمازی اور خدا ترس شخص تھے۔ گاؤں میں ہر کوئی اُن کا نام عزت سے لیتا تھا۔ ماسٹر صاحب میں اگر کوئی خامی تھی تو اتنی کہ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ جوانی میں انہیں اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ عشق ہوا تھا۔ پھوپھی زاد کی شادی کہیں اور ہوگئی۔ ماسٹر صاحب نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ خاندان کی کئی دوسری لڑکیوں نے اُن کی یہ ضد توڑنی چاہی لیکن کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔

بہر طور اب اِن باتوں کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ماسٹر صاحب کی کنپٹیوں پر سفید بال آچکے تھے اور ان کے طور اطوار سے بزرگوں والی سنجیدگی جھلکنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اُن کی زندگی ایک ایسی ڈگر پر چل نکلی ہے جس پر آنے والے دنوں میں کسی عورت کے قدم نہیں پڑیں گے اور وہ ایک کنواری زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ لیکن ایک روز بلال شاہ نے مجھے ان کے بارے میں ایک اہم بات بتائی۔ گرمیوں کے دن تھے وہ چق اٹھا کر میرے کمرے میں چلا آیا۔ میرے کمرے میں پنکھا لگا ہوا تھا اور بلال شاہ اکثر بہانے بہانے سے ہوا لینے چلا آتا تھا۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ وہ پسینہ خشک کرنے کے چکر میں آیا ہے لیکن پھر اُس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کوئی اہم بات بھی اس نے کرنی ہے۔

اُس کے چہرے پر سرخی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چغل خوروں کی سی چمک تھی۔ کہنے لگا ''خان صاحب! کچھ دنوں سے میں ایک عجیب بات محسوس کررہا ہوں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ شاید مجھے غلط فہمی ہورہی ہے لیکن اب شک شبہ یقین میں بدلتا جارہا ہے''۔

میں نے کہا ''کہیں تیری گھر والی کا جی پھر سے خراب تو نہیں ہونے لگا''۔

''نہیں خاں صاحب'' وہ سر جھٹک کر بولا ''آپ کو تو بس ایک بات سوجھتی ہے۔ میں کچھ اور کہہ

رہا ہوں..... ماسٹر ریاض کو تو جانتے ہیں ناں آپ؟"
میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ بولا "پچھلے کچھ دنوں سے ماسٹر صاحب کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ بڑے بن ٹھن کر رہتے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی سرمہ بھی لگانے لگے ہیں۔ میں نے کئی بار انہیں خود ہی خود مسکراتے اور گنگناتے دیکھا ہے۔ میرے پڑوسی ہیں اس لیے اُن کی جتنی خبر مجھے ہے اور کسی کو نہیں ہوسکتی۔ مجھے تو لگتا ہے ماسٹر جی کا کہیں ٹانکا جڑ گیا ہے"۔

میں نے کہا "اگر جڑ گیا ہے تو اس میں بُرائی کی کون سی بات ہے، بندے کو کسی بھی وقت اپنا جنازہ جائز کرنے کا خیال آسکتا ہے"۔

وہ بولا "لیکن یہ تو زیادتی ہے ناں جی اس گاؤں میں میرے ہی ساتھ والے گھر میں کوئی چکر چلتا رہے اور مجھے خبر نہ ہو۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات ہوگئی"۔

میں نے کہا "تم کہنا چاہتے ہو کہ ماسٹر صاحب اپنے گھر میں کوئی چکر چلا رہے ہیں"۔

"بالکل" بلال شاہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"وہ تو گھر میں اکیلے رہتے ہیں" میں نے کہا۔

"لیکن اب اکیلے نہیں ہیں..... مجھے شبہ ہے خان صاحب کہ اُن کے گھر میں اُن کے علاوہ بھی کوئی رہ رہا ہے"۔

"اس شبے کی وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"وجہ کوئی نہیں جی، بس یہ میرے دل کی آواز ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ ہمارے کوٹھے سے ماسٹر صاحب کے صحن کا کچھ حصہ صاف نظر آتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا پانچ چھ روز پہلے رات کو بارش ہوئی تھی۔ اگلے دن صبح ماسٹر صاحب کے کچے صحن میں میری نظر پڑی تو وہاں مٹی پر کسی عورت کے قدموں کے نشان نظر آئے"۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "نشان اُلٹے تو نہیں تھے کیونکہ سنا ہے ہوائی چیزوں کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں"۔ وہ بولا "خان صاحب! آپ مذاق مت سمجھیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ اُس گھر میں کوئی نہ کوئی رہ رہا ہے۔ ابھی کل شام میں نے ماسٹر صاحب کے صحن میں دروازے کے پاس بالوں کا ایک گچھا دیکھا ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے عورتیں کنگھی کرنے کے بعد سر سے اُترے ہوئے بال اُنگلی پر لپیٹ کر گول کرتی ہیں اور کوڑے میں پھینک دیتی ہیں بعض اوقات یہ بال ہوا کی وجہ سے اِدھر اُدھر چکرانے لگتے ہیں۔ ایسے ہی بال مجھے ماسٹر صاحب کے صحن میں نظر آئے ہیں"۔

میں نے کہا "یار! مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کوئی وہم ہوگیا ہے اور اگر وہم نہیں ہے تو کسی طرح اس بات کی تصدیق کرلو۔ اپنی بیوی یا کسی دوسری عورت کو ماسٹر کے گھر میں بھیجو۔ وہ اندر کی ساری بات باہر نکال لائے گی۔

بلال بولا "یہی تو مصیبت ہے ماسٹر صاحب کسی کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ پہلے انہوں نے کھانا وغیرہ پکانے کے لیے بوڑھی ملازمہ حمیدن رکھی ہوئی تھی۔ حمیدن کو بھی انہوں نے اسی لیے چھٹی دے دی تھی کہ اُس کی وجہ سے عورتوں کا گھر میں آنا جانا تھا"۔

میں نے کہا "تو پھر خود چلے جاؤ تمہیں وہ کھا تو نہیں جائیں گے"۔

وہ بولا "خان صاحب! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ موڈی بندے ہیں کہیں کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو گھر والی کے سامنے بے عزتی ہوجائے گی۔" پھر ذرا سوچ کر کہنے لگا، ہاں ایک طریقہ ہے۔ ہمارے صحن میں دھریک کا ایک درخت ہے جو کافی پھیل چکا ہے۔ میں اُس کی چند ایک موٹی موٹی ٹہنیاں کاٹ دیتا ہوں۔ یہ ٹہنیاں ماسٹر صاحب کے صحن میں گریں

گی۔ ظاہر ہے ماسٹر صاحب خود تو ٹہنیاں اٹھا کر باہر نکالنے سے رہے۔ اس کام کے لیے مجھے ہی اُن کے گھر جانا پڑے گا۔ بات ختم کر کے وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "صرف ماسٹر صاحب کے گھر جانے کے لیے تم ایک سایہ دار درخت کٹوا دو گے"۔

وہ مسکرا کر بولا "اس میں دہرا فائدہ ہے جی، ایک تو ماسٹر صاحب کے گھر جانے کا موقعہ ملے گا' دوسرے میری گھر والی کی ایک بُری عادت بھی چھوٹ جائے گی"۔

میں نے کہا "تمہارے علاوہ بھی کوئی بُری عادت لگی ہوئی ہے اُسے"۔

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں جی۔ وہ بھی خوشگوار موڈ میں بولا "اب یہ دھریک والا معاملہ ہی لیں۔ اللہ کی بندی گیارہ بجے ہی چارپائی ڈال کر وہاں بیٹھ جاتی ہے۔ ساری دوپہر وہاں گزرتی ہے۔ اب مجھے کہیں آنا جانا ہوتا ہے وہ صحن میں ہوتی ہے اس لیے فوراً دیکھ لیتی ہے پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ نہ دھریک رہے گی اور نہ وہ میری چوکیداری کے لیے وہاں بیٹھے گی..... کیسا ہے؟" اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"بہت دُور کی سوچتے ہو شاہ جی" میں نے کہا۔

اگلے روز بلال شاہ نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا میں صبح تھانے کی طرف آتے ہوئے اُس کے گھر کے پاس سے گزرا تو وہ مجھے دھریک کی ایک بلند شاخ پر بیٹھا نظر آیا۔ تھانے آ کر میں بلال شاہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی دلچسپ خبر لے کر آئے گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ قریباً بارہ بجے تھانے آیا۔ سخت تھکا ہوا اور مایوس نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ تدبیر کامیاب ہوئی"۔

وہ بولا "کامیاب تو ہو گئی ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماسٹر صاحب پہلے سے تاڑ گئے تھے"۔

میں نے کہا "بات کیا ہوئی ہے ذرا کھل کر بتاؤ"

وہ کہنے لگا "کم از کم اس وقت تو ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے۔ میں نے گھر میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ کوئی ایسی نشانی بھی نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہو کہ یہاں کوئی عورت رہ رہی ہے یا رہ رہی تھی"۔

میں نے کہا "ہو سکتا ہے وہ سچ مچ کوئی ہوائی چیز ہو اگر وہ واقعی کوئی ہوائی شئے ہے تو پھر تمہیں اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ماسٹر صاحب کو چھوڑ کر تم پر عاشق ہو جائے....."۔

بلال شاہ ہوائی چیزوں سے بہت ڈرتا تھا۔ ذرا گھبرا کر بولا "میں نے آپ سے بہت دفعہ کہا ہے کہ مجھ سے ایسا مذاق مت کیا کریں کبھی کبھی مذاق میں منہ سے نکالی ہوئی بات سچ بھی ہو جاتی ہے"۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ بیس پچیس روز اور گزر گئے۔ بلال شاہ سے اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں ہوئی نہ ہی ماسٹر ریاض سے میرا آمنا سامنا ہوا۔ یہ مئی کی آخری تاریخیں تھیں۔ ان دنوں جانڈی پورا کے نواح میں پیر مست کا میلہ لگتا تھا۔ یہ بڑا بارونق میلہ ہوتا تھا۔ دُور دراز سے لوگ یہاں پہنچتے تھے۔ بڑا زبردست بازار لگتا تھا اس کے علاوہ کھیل تماشے' ناچ گانے' سرکس بہت کچھ ہوتا تھا۔ ایسے میلے ٹھیلوں میں اکثر جرائم پیشہ لوگ بھی گھس آتے ہیں۔ مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں پر نظر رکھے اور امن و امان کو خراب نہ ہونے دے۔

یہ میلے کے آخری دن کا واقعہ ہے۔ میں سادہ لباس میں گشت پر تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ منہ دوسری طرف کیے کھڑا تھا۔ مجھے وہ ماسٹر ریاض کی طرح لگا۔ میں چند قدم چل کر بائیں طرف آیا اور

اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ ماسٹر ریاض ہی ہے۔ وہ ایک عطاری والے کی دکان پر کھڑا تھا۔ بڑی جلدی جلدی اُس نے دکاندار سے ایک دو چیزیں خریدیں اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ ماسٹر ریاض کی خریداری دیکھ کر میرا ماتھا بُری طرح ٹھنکا۔ اس نے جو اشیاء خریدیں وہ زنانہ استعمال کی تھیں۔ میں تمام اشیاء تو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن سرخ رنگ کا ایک پراندہ اور دوپٹے کو لگانے والی ایک لیس مجھے دُور سے ہی نظر آگئی تھی۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ ماسٹر ریاض کا پیچھا کروں۔ میں مناسب فاصلہ رکھ کر ماسٹر کے پیچھے چل دیا۔ اُس کی چال ڈھال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی خریداری مکمل کر چکا ہے اور اب اُسے میلے کی گہما گہمی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میرا ایک حوالدار بھی میرے اردگرد موجود تھا۔ میرا انداز دیکھ کر بھانپ گیا کہ مجھے کوئی مشکوک بندہ نظر آگیا ہے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم ماسٹر ریاض کے پیچھے چلتے میلے کی گہما گہمی سے باہر نکل آئے۔ سائیکل سٹینڈ سے ماسٹر ریاض نے اپنی سائیکل نکالی اور روانہ ہوگیا۔ قریب ہی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ بان جانڈی پورا گاؤں ہی کا تھا۔ میں حوالدار کے ساتھ فوراً تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگہ بان سے کہا کہ ماسٹر ریاض کا پیچھا کرے تانگہ بان میرے اس حکم پہ حیران ہوا تاہم اس نے اپنی حیرت کا اظہار زبان سے نہیں کیا۔

جب ہم میلے سے نکلے شام ہونے والی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج غروب ہوگیا اور کھیت کھلیان تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں اور حوالدار تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے لہٰذا اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ ماسٹر ریاض ہمیں دیکھ سکے گا تاریکی پھیلنے کے بعد تو یہ امکان بالکل ختم ہوگیا تھا۔ ماسٹر ریاض کے رُخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہر پار کے گاؤں "سلطان کے" میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب مجھے بلال شاہ کی بات یاد آئی۔ ایک روز اُس نے کہا تھا کہ اُس نے ماسٹر ریاض کو سائیکل پر سوار "سلطان کے" کی طرف آتے دیکھا تھا۔

نجانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا کہ ماسٹر ریاض کے کسی اہم راز سے پردہ اُٹھنے والا ہے۔ تانگہ بان نے میری ہدایات کے مطابق ماسٹر ریاض کا تعاقب کامیابی سے جاری رکھا۔ ہم ایک گھنٹے کے اندر اندر نہر کا پل پار کر کے سلطان کے گاؤں پہنچ گئے۔ سلطان کے کو گاؤں سے زیادہ قصبہ کہنا مناسب رہے گا۔ یہاں کچے مکانوں کی نسبت پختہ اور نیم پختہ مکان زیادہ تھے۔ آبادی دو ڈھائی ہزار نفوس سے کم نہیں تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی فروٹ منڈی بھی تھی۔ اس منڈی کے پاس پہنچ کر ماسٹر ریاض اپنی سائیکل سے اُتر گیا۔ یہاں ایک طرف رہائشی مکانات بھی تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ماسٹر ریاض انہی مکانات میں سے کسی کے اندر جائے گا۔ منڈی کے ناکے پر بہت سے ریڑھے کھڑے تھے۔ سائیکل پر وہ بھاری بھرکم تھیلے لٹک رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ ان میں وہ سامان ہے جو میلے سے خریدا گیا ہے۔ ماسٹر ریاض نے اپنی سائیکل گلی کے پہلے مکان کے سامنے روک کر دو تین مرتبہ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا اور گلی میں جلتے بلب کی روشنی میں مجھے کسی عورت کا ہیولا نظر آیا۔ یقیناً وہ عورت ہی تھی۔ دروازہ کھلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ عورت ماسٹر ریاض کی [illegible] سائیکل کے ہینڈل سے بھاری بھرکم تھیلے اُتار کر عورت کو تھمائے۔ پھر سائیکل بغل میں دبائی اور تین چار سیڑھیاں چڑھ کر خود بھی دروازے میں داخل ہوگیا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا کہ ماسٹر ریاض کو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ حوالدار اور تانگہ بان میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا

کہ وہ دونوں یہاں میرا انتظار کریں اور میرے واپس آنے تک یہاں سے نہ جائیں۔ اس کے بعد میں اُس مکان کی طرف بڑھا جہاں چند لمحے پہلے ماسٹر ریاض داخل ہوا تھا میں نے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' تھوڑی دیر بعد ماسٹر ریاض کی ڈری ڈری آواز آئی۔

''دروازہ کھولو جی، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے'' میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے کی جھری میں سے جھانک کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں دروازے کے بالکل ساتھ لگ گیا تاکہ جھانکنے والا میری صورت نہ دیکھ سکے۔ میری دوسری دستک پر ماسٹر ریاض کو دروازہ کھولنا پڑا۔ جونہی ماسٹر ریاض کی شکل نظر آئی میں نے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟'' ماسٹر ریاض نے سخت گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُس کے دونوں ہاتھ میرے سینے پر تھے اور وہ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے پہچان لیا اس کے ساتھ ہی اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈر اور اندیشوں کے گہرے سائے سمٹ آئے۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے اطمینان سے کہا'' کیا بات ہے میرے جسم سے کرنٹ لگا ہے تمہیں؟'' وہ ہکلایا ''آ..... آپ یہاں..... انسپکٹر صاحب..... لیکن کیسے؟''

[illegible] دروازہ کھلا تھا وہ پردہ [illegible] اندر [illegible] یہاں سے [illegible] تھا۔ [illegible] کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی مٹھائی قسم کی شے تھی کیونکہ کاغذ پر چکنائی کے دھبے تھے۔ وہ ایک تصویر کی طرح برآمدے کے در میں کھڑی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ حسین و جمیل ہی نہیں معصوم صورت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا جسم تھا جیسے وہ جیتا جاگتا جسم نہ ہو کسی مصور کا حسین خیال ہو۔ اس کے لمبے سیاہ بال ایک شانے پر آبشار کی طرح گر رہے تھے اور آنکھوں میں کسی بچے کی سی حیرت اور دہشت تھی۔

میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماسٹر ریاض سے کہا 'میرا خیال ہے تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا میں اس لڑکی کے لیے یہاں آیا ہوں'۔

ماسٹر ریاض کا چہرہ ایک دم ہی زرد ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی چکرا کر گر جائے گا۔ لڑکی جلدی سے اندر بھاگ گئی تھی۔ ماسٹر ریاض کچھ دیر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ اُس کی زبان تک نہیں آ رہے تھے۔ پھر اُس نے بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

''آیئے..... انسپکٹر صاحب اندر آجایئے''۔ وہ حیرت انگیز طور پر ٹھہری ہوئی پرسکون آواز میں بولا۔

میں اُس کے عقب میں چلتا مکان کے برآمدے میں پہنچا اور ایک نیبل فین کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ویسے میں ماسٹر ریاض کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور گھبراہٹ کی زیادتی میں میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ وہ شریف تھا لیکن جو شریف گھر میں ایک خوبصورت جوان رکھیل پال سکتا ہے وہ اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے کیا بڑا جرم بھی کر سکتا ہے۔

[illegible] ...ام کی آواز آئی۔ یوں لگا کہ کوئی چیز [illegible] ورن سے ٹکرا کر نیم پختہ فرش پر گرا ہے۔ ماسٹر ریاض لپک کے اندر گیا۔ میں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کمرے کے عین وسط میں ایک میز تھی میز پر دو دو تھیلے رکھے تھے جو ماسٹر ریاض میلے سے بھر کر لایا تھا۔ سرخی پاؤڈر، چوڑیاں، چمکیلے گہنے، پراندے، دوپٹے

اور اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں' بہت سا سامان نکلا تھا اُن دو تھیلوں میں سے لیکن جس کے لیے یہ سامان لایا گیا تھا وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی، اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹھائی والا لفافہ گر گیا تھا اور جلیبیاں دُور تک بکھری ہوئی تھیں۔ ماسٹر ریاض نے جیسے تڑپ کر لڑکی کے شانے تھامے اور اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ ''تارا..... تارا'' وہ اُسے پکارتا جا رہا تھا۔ پھر نہایت بے تابی سے اُس نے لڑکی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ لڑکی کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور سارا جسم لرز رہا تھا۔ ہونٹ عجیب سے انداز میں بھینچ گئے تھے۔

ماسٹر ریاض ہانپتی ہوئی آواز میں بولا ''پھر دورہ پڑ گیا ہے''۔

''کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں دو دفعہ ہو چکا ہے''۔

''کیسے ٹھیک ہوئی تھی؟''

''بس خود بخود ہو گئی تھی'' ماسٹر ریاض نے کہا۔ پھر اُسے شانوں سے تھامتے ہوئے بولا ''آپ اس کی ٹانگیں پکڑیں پنکھے کے سامنے لے چلتے ہیں''۔

ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے ماسٹر ریاض نے اُسے اٹھایا۔ وہ کسی گڑیا ہی کی طرح ہلکی پھلکی اور لچکدار تھی۔ جب میں نے اس کی ٹانگیں پکڑیں میری نگاہ اُس کی جُوتی پر پڑی۔ یہ بالکل نئے فیشن کی جوتی تھی یوں لگتا تھا کہ پہننے والے نے جُوتی کی بجائے کسی مچھلی میں پاؤں گھسیڑا ہوا ہے۔ ہم نے اُسے برآمدے میں لا کر پنکھے کے عین سامنے چارپائی پر ڈال دیا۔ قمیص اُس کے پیٹ سے اوپر ہو گئی تھی۔ دودھیا بدن چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔ ماسٹر ریاض نے اس کی ہتھیلیاں ملنی شروع کیں جبکہ میں اپنے رومال سے اُس کے تلووں کی مالش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی پلکوں میں لرزش ہوئی اور اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ ماسٹر ریاض صراحی میں سے ٹھنڈا پانی لے کر آیا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ لینے کے بعد لڑکی کے حواس بحال ہوئے اس نے ایک اجنبی مرد کے سامنے اپنے جسم کو سمیٹنا اور ڈھانپنا شروع کر دیا۔

''نک..... کون ہیں یہ؟'' وہ اپنی انگلی میری طرف اٹھا کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ اُس کی آواز بھی اُسی کی طرح نازک اور سریلی تھی۔

''چلو تم اندر چلو'' ماسٹر ریاض سنی اَن سنی کر کے بولا۔ اُس نے شانوں سے تھام کر لڑکی کو اٹھایا اور پھر سہارا دے کر اندر لے گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی تھی۔ کسی قسم کی بیماری یا کمزوری کے آثار اُس میں نظر نہیں آتے تھے۔

ماسٹر ریاض کو واپس آنے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں گھر کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ تین چار مرلے کا نیم پختہ مکان تھا۔ دو کمرے ایک برآمدہ اور چھوٹا سا صحن۔ میں اس وقت برآمدے میں بیٹھا تھا۔ یہاں ٹیبل فین کے سامنے ساتھ ساتھ دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان چارپائیوں پر ماسٹر ریاض اور تارا نامی اُس لڑکی کو سونا تھا۔ ساتھ ساتھ بچھی ہوئی یہ چارپائیاں مجھے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

ماسٹر ریاض کمرے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا ''انسپکٹر صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ آپ میرے پیچھے کیوں لگے اور کیا سوچ رہے ہیں میرے بارے میں لیکن میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گا سچ بتاؤں گا' شاید آپ میرے گھر پر چھاپہ نہ مارتے تو بھی میں چند روز تک خود تھانے پہنچ کر آپ کو سب کچھ بتا دیتا اور میں یونہی خالی خولی بات نہیں کر رہا۔ جانڈی پورا کے رہنے والے جانتے ہیں کہ میں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی سچ بولا ہے''۔ اس

نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر گردن اور سینے سے پسینہ پونچھا اور بولا ''اُس لڑکی سے میری پہلی ملاقات کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے ہوئی تھی۔ آپ نے میرا گھر دیکھا ہی ہوا ہے۔ گھر کے پچھواڑے میں کھیت ہیں اور میں نے اس طرف بھی ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا ہوا ہے۔ اُس رات تیز آندھی کے بعد بارش ہوئی تھی اور میں چھت سے نیچے کمرے میں آکر سو گیا تھا۔ کوئی دو ڈھائی بجے کا وقت ہوگا۔ اس چھوٹے دروازے پر دستک ہوئی جو کھیتوں کی طرف کھلتا ہے۔ میں نے اُٹھ کر کنڈی اُتاری، میرے سامنے یہی تارا نامی لڑکی ہانپتی کانپتی کھڑی تھی۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا یہ تیزی سے اندر آگئی اور خود ہی دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی چڑھادی۔ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہنے لگی کہ میرے پیچھے غنڈے لگے ہوئے ہیں مجھے پناہ دو۔ میں نے کہا ''میں کیسے پناہ دے دُوں مجھے کیا معلوم کہ کہاں سے آئی ہو تم اور کون ہو؟'' وہ ہکلا کر بولی ''میں سچ کہتی ہوں کہ سخت مصیبت میں ہوں اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو صبح میری لاش کسی کھیت میں پڑی ملے گی''۔

میں نے کہا ''بس تمہیں مسجد میں لے جاسکتا ہوں یا امام مسجد کے گھر بس چھوڑ آتا ہوں۔ اس گھر میں میں اکیلا رہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا''۔

ایک دم اُس کی حالت غیر ہونے لگی اور اُسے دورہ پڑ گیا۔ میں بڑی مشکل اور کوشش سے اُسے ہوش میں لایا۔ وہ شکل وصورت سے گجراتی لگتی تھی لیکن لباس پنجابیوں والا تھا اور ٹوٹی پھوٹی پنجابی بھی بول لیتی تھی۔ وہ جتنی خوبصورت ہے اُس سے زیادہ بھولی اور معصوم ہے۔ اُس کی باتیں سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ اُسے کوئی بھی شخص آسانی سے ورغلا کر اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ میں نے اُس کا اتہ پتہ پوچھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی ہے وہ کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں تھی۔ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تھا تو رونے لگتی تھی۔ تین چار دن میں ہی وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئی کہ میرے لیے اُسے تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑنا مشکل ہوگیا۔ بس وہ بار بار ایک ہی بات کہتی تھی اور اب بھی کہہ رہی ہے میں آپ کے گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ زبردستی کریں گے تو اُسی وقت جان دے دوں گی۔ اُس کے پاس ایک پڑیا میں سنکھیا ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے لیا ہے اُس نے۔ پڑیا کو اپنے لباس کے اندرونی حصے میں چھپا کر رکھتی ہے کہتی ہے کہ فوراً یہ سنکھیا کھالوں گی۔

ماسٹر ریاض کے لب ولہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ لیکن تم تو نادان نہیں تھے۔ تمہیں پتہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ کتنا بڑا اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔ بجائے اس کے کہ تم پولیس کو اطلاع کرکے اپنا قانونی فرض پورا کرتے تم نے اسے دس بارہ روز گھر میں چھپائے رکھا اور جب تمہیں خطرہ محسوس ہوا کہ بھید کھل جائے گا تو اسے لے کر یہاں ''سلطان کے'' آگئے اور کرائے کا مکان لے لیا''۔

ماسٹر ریاض نے بے بسی سے سر ہلایا ''انسپکٹر نواز! تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ میرے لیے کتنی مشکل بنی ہوئی تھی۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ لڑکی وہی کرتی جو کہہ رہی ہے میں نے بتایا ہے ناں کہ یہ جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی نادان اور جذباتی بھی ہے۔ تم خود اُس سے بات چیت کرکے دیکھ لو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیا چیز ہے وہ''۔

میں نے کہا ''بات چیت تو میں کروں گا لیکن تم بھی بتاؤ ناں کہ اُس کے ساتھ کس حیثیت سے رہ رہے ہو؟''

میں نے پہلی بار ماسٹر ریاض کے چہرے پر رنگ سا لہراتے دیکھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا ''ابھی

تک تو کوئی حیثیت نہیں"۔

میں نے کہا" یہ کیسے ہوسکتا ہے آخر تم نے یہ مکان کرائے پر لیا ہے۔ مالک مکان یا محلے والوں کو کچھ تو بتایا ہوگا کہ یہ لڑکی تمہاری کون ہے"۔

ماسٹر ریاض نے کہا کہ" لوگوں کی نظر میں تو .....ہم میاں بیوی ہیں"۔

ماسٹر ریاض کے اعتراف کے بعد میں نے لڑکی سے گفتگو کی۔ اُسے دیکھ کر ایک چھوٹی سی ڈری سہمی ہوئی چڑیا کا خیال آتا تھا یا پھر کانچ کی ایک نازک گڑیا جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتی تھی۔ اُس نے اپنی ساری ڈوریں ماسٹر ریاض کے ہاتھ میں تھما رکھی تھیں اور اُس کی ہر بات پر"جی جی" کہنا اُس کی عادت ہوگئی تھی۔ ماسٹر ریاض نے کہا کہ"برآمدے میں آؤ" وہ آگئی۔ ماسٹر ریاض نے کہا"بیٹھ جاؤ" وہ بیٹھ گئی۔ ماسٹر ریاض نے کہا"سیدھی ہوکر آرام سے بیٹھو" وہ سیدھی ہوکر آرام سے بیٹھ گئی۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے میرے مختلف سوالوں کے جواب دیتی رہی لیکن جونہی میں نے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور اس کے وارث کون ہیں؟ وہ چپ ہوگئی۔ ماسٹر ریاض نے بتایا تھا کہ کوشش کے باوجود اس چپ کو نہیں توڑ سکا اور جب وہ نہیں توڑ سکا تو میں کس گنتی میں تھا۔ ہم اُس پر زیادہ دباؤ بھی نہیں ڈال سکتے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے [illegible]

[illegible] تھا کہ یہ [illegible] کی سفارش کررہا ہے اور [illegible] سفارش کی وجہ سے سنگدل سے سنگدل شخص بھی اس لڑکی پر سختی نہیں کرسکتا۔ کسی حد تک ماسٹر ریاض کی مجبوری بھی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ فطرتاً ایک رحمدل شخص تھا۔ اس کے لیے بے حد مشکل تھا کہ وہ ایک بے سہارا کمزور لڑکی کو گلی کوچوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ ماسٹر ریاض کی پناہ سے محروم ہوکر وہ خودکشی ہی کرلیتی۔

میں نے وقتی طور پر لڑکی کو اُس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ماسٹر ریاض سے کہا کہ وہ اگلے روز تھانے آکر مجھ سے ملے .....اگلے روز ماسٹر ریاض آیا تو میں نے اسے سمجھایا کہ وہ پیار محبت اور نرمی کے ساتھ تارا سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرے اور اس دوران اُن لوگوں سے بھی باخبر رہے جو بقول تارا اُس کا پیچھا کررہے تھے۔

بلال شاہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا ہے اور ماسٹر ریاض کے گھر سے بھڈا، نکل آیا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اپنی اس ذہانت کا ڈھنڈورا ہر کس و ناکس کے سامنے پیٹ ڈالے گا۔ میں نے اُسے تنہائی میں بٹھا کر اچھی طرح یہ بات سمجھادی کہ فی الحال ماسٹر ریاض اور لڑکی کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ یہی بات میں نے اپنے ساتھ جانے والے تانگہ بان اور حوالدار سے بھی کردی۔

قریباً ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ ماسٹر ریاض اکثر چھٹی پورا گاؤں سے غائب رہتا تھا۔ اس نے دوست احباب کو بتا رکھا تھا کہ وہ امرتسر میں اپنی بہن کے گھر رہتا ہے اور اس کی بچیوں کو ایف اے کی تیاری کروا رہا ہے۔ سچ میں چونکہ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں لہٰذا اس کا چھٹی پر رہنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ ماسٹر ریاض اکثر مجھ سے ملنے آتا رہتا تھا۔ میں نے اُس پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ماسٹر ریاض ایک زبردست امتحان سے گزر رہا ہے۔ ایک کشمکش سی تھی جس میں وہ دن رات مبتلا رہتا تھا۔ وہ ایک پچاس سالہ کنوارا تھا۔ اب تک زندگی کی رنگینیوں سے بہت دُور رہا تھا۔ اُس نے

دھیرے دھیرے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور خود کو ایک ایسی ڈگر پر لے گیا تھا جہاں شاید اُسے عورت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن اب ایک عورت اُس کی اجاڑ سنسان زندگی میں آئی تھی اور عورت بھی ایسی جسے دیکھ کر سو سالہ زاہد خشک بھی توبہ توڑنے پر مجبور ہو جائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ لڑکی ایک دھیمی دھیمی آگ کی طرح اُس برف کو پگھلا رہی ہے جو تیس سال سے ماسٹر ریاض کے سینے میں جمی ہوئی تھی۔ ماسٹر ریاض ایک بہت بڑے برفانی تودے کی طرح سخت اور اٹل تھا۔ بہت سی جوان اور نوجوان لڑکیوں نے اس تودے کو اپنے شباب کی کرنوں سے پگھلانا چاہا تھا۔ لیکن ناکام رہی تھیں لیکن اب اس تودے کے "قدم" اُکھڑ چکے تھے اور وہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ پانی بنتا جا رہا تھا۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ماسٹر ریاض کی سخت جانی تھی کہ وہ بھاپ بن کر اُڑ نہیں گیا تھا ورنہ تارا جیسی حسین لڑکی کے ساتھ ایک تنہا مکان میں رات گزارنا اُس کی چارپائی کے ساتھ چارپائی بچھا کر سونا اور صبح اپنا ایمان سلامت لے کر اُٹھ جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ آخر ساون کی ایک بڑی سہانی شام کو ماسٹر ریاض نے ہتھیار ڈال دیئے۔ رات سے بارش ہو رہی تھی۔ کھیتوں، کھلیانوں، ٹیلوں، مکانوں میں ہر طرف جل تھل نظر آ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ریاض چھتری لیے تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی فیشن دار مونچھیں بڑی خوبصورتی سے ترشی ہوئی تھیں۔ بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اُس نے کیچڑ سے بچنے کے لیے گم بوٹ پہن رکھے تھے۔

میں نے اس کے لیے گرما گرم چائے اور بسکٹ وغیرہ منگوائے۔ وہ بہت کھویا کھویا نظر آتا تھا، آنکھوں میں رتجگے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک طویل سانس لے کر بولا "انسپکٹر نواز! میں تارا سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

یہ فقرہ اُس کی شکست کا اعتراف تھا جس سے ماسٹر ریاض پچھلے تیس برس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ فقرہ جلد یا بدیر ماسٹر ریاض کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا ہے لہٰذا مجھے یہ فقرہ سن کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "لیکن ماسٹر ریاض! وہ تو تم سے تیس پینتیس برس چھوٹی ہے"۔

"وہ بولا" یہ بات میں اُس سے سینکڑوں مرتبہ کہہ چکا ہوں اور وہ باتیں بھی کہہ دی ہیں جو اس وقت تمہارے ذہن میں سر اٹھا رہی ہوں گی' یعنی یہ کہ اُس کا اتہ پتہ کیا ہے، اُس کا ماضی کیا ہے، اس کے والدین کہاں ہیں لیکن وہ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں بتا رہی کہ وہ مسلمان ہے، اُس کا نام طاہرہ عرف تارا ہے وہ غیر شادی شدہ ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے....." ماسٹر ریاض نے حسب عادت جیب سے سفید رومال نکال کر اپنے چہرے سے پانی پونچھا اور بولا "انسپکٹر صاحب! آخر میں بھی انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ مجھے خوف آ رہا ہے کہ مجھ سے بھی کوئی ایسی خطا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے مجھے ساری عمر آنسو بہانے پڑیں۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اُس لڑکی سے جان چھڑا لوں یا اُس سے شادی کر لوں"۔

میں نے کہا "ماسٹر ریاض، لڑکی بالغ اور ہوش مند ہے اگر تم سے شادی کرنا چاہتی ہے [illegible] بھی آ سکتا ہے جانے دو تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ ایک اچھی طرح سوچ سمجھ لو"۔

وہ بولا "سوچ سمجھ کر ہی بات کی ہے"۔

میں نے اپنی مسکراہٹ کو بمشکل ہونٹوں تک آنے سے روکا۔ ماسٹر ریاض جیسا پتھر دل مرد پچاس سال کی عمر میں ایک نازک سی لڑکی کے ہاتھوں چاروں

شانے چت، ہوگیا تھا۔ میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا ''ماسٹر ریاض ایک بات تو بتاؤ؟''۔

''پوچھو'' ماسٹر ریاض نے بھی جوابی طور پر سگریٹ سلگا لیا۔

میں نے کہا ''تم نے اپنی ساری جوانی عورت سے دور رہ کر گزار دی۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی''

وہ بولا ''کہانیاں تو لوگوں نے بہت سی گھڑ رکھی ہیں..... لیکن سچی اور مختصر بات یہی ہے کہ میں اپنی پھوپھی زاد سے شادی کرنا چاہتا تھا یہ شادی نہ ہوسکی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ شادی نہیں کروں گا''۔

''پھر اب کیوں کر رہے ہو؟''

''اس لڑکی میں مجھے وہ بات نظر آگئی ہے جسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس گئی تھیں''۔

''میں کچھ سمجھا نہیں''۔

ماسٹر ریاض نے ایک گہرا کش لے کر کہا ''نجمہ بے حد چالاک، ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی تھی اُس کی ماں یعنی میری پھوپھی میں بھی یہ ساری صفات موجود تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نجمہ سے میری شادی نہ ہونے میں صرف زمانے کا قصور نہیں اُس میں نجمہ بھی بڑی حد تک شریک تھی۔ وہ اپنی ماں کے کہے کو حکم کا درجہ دیتی تھی اور اُس کی ماں نے کہہ دیا تھا کہ ریاض جائیداد کا مقدمہ ہار جائے گا اور اُسے اپنے باپ کے ترکے میں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ اُس کی ماں بڑی جہاندیدہ عورت تھی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا مجھے جائیداد میں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملی لیکن جہاں بہت سوچ سمجھ کر اُس نے بیٹی کی شادی کی وہاں کوان سی دودھ کی نہریں بہہ نکلیں۔ نجمہ کا شوہر امرتسر میں کاروبار کرتا تھا۔ اُس کے کارخانے میں آگ، بجھانے والے آلات اور سلنڈر وغیرہ بنتے تھے۔ ایک روز اُسی کارخانے میں آگ لگ گئی۔ لاکھوں کا کاروبار جل کر خاک ہوگیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے وہ لوگ۔ میں نے جائیداد کھو کر بھی اپنا حوصلہ نہ کھویا اور اپنی محنت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔ سکول کی زمین میں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدی اور اسی کمائی سے عمارت کھڑی کی۔ اب تک ہزاروں بچے اس سکول سے علم کی روشنی حاصل کر چکے ہیں اور انشاء اللہ ہزاروں آئندہ کریں گے.....'' سگریٹ کو پاؤں تلے مسل کر ماسٹر ریاض نے کہا ''درحقیقت مجھے نجمہ اور خاص طور پر اُس کی ماں سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ نفرت میرے اندر جڑ پکڑ گئی مجھے عورت کی چالاکی، ہوشیاری اور دوغلے پن سے گھن آنے لگی۔ اگر مجھے کوئی سیدھی سادی عام عورت بھی ملتی تو میں اُس میں عقلمندی اور چالاکی کے جراثیم ڈھونڈ لیتا اور اُس سے نفرت کرنے لگتا اور میں سچ کہتا ہوں میں نے سیدھی سادی معصوم عورتیں دیکھی بھی بہت کم ہیں۔ جو نظر آتی ہیں وہ اکثر ایسی نہیں ہوتیں۔ عورت فطرتاً خرانٹ اور دُور اندیش ہے، مرد عام طور پر جذباتی اور نادان ہوتے ہیں..... میرے من کے مندر میں ایک معصوم اور حد سے زیادہ بھولی بھالی لڑکی کی مورت سجی تھی اور میں اُس کا پجاری ہوں''۔

ماسٹر ریاض بڑے جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔ اُس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے۔ وہ کہنے لگا ''میں نے بہت غور کیا ہے انسپکٹر نواز اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے قدرت کی طرف سے ہو رہا ہے اور اُسی کی دین ہے، ورنہ میں اس قابل کہاں تھا کہ تارا جیسی لڑکی مجھ جیسے بڈھے کو پسند کرتی، شادی پر اصرار کرتی، اور شادی نہ ہونے کی صورت میں خودکشی پر کمربستہ ہو جاتی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ قدرت نے اب میرے دل میں اُس لڑکی کی محبت ڈال دی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں انسپکٹر! کہ پچھلے تین ماہ میں میں نے اپنے

ساتھ ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ بہت زور مارا ہے لیکن تارا کی محبت کے جال سے نکل نہیں سکا"۔

.....

ایک ہفتے بعد ماسٹر ریاض اور تارا کی شادی نہایت خاموشی اور سادگی سے ہوگئی۔ ماسٹر ریاض کے چند قریبی دوستوں اور عزیزوں نے ہی اس شادی میں شرکت کی۔ اگلے روز ماسٹر ریاض نے چھوٹا سا ولیمہ کردیا۔ یوں، ایک نیا گھر آباد ہوگیا اور ماسٹر ریاض کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آگئی۔

میں نے اس شادی کے سلسلے میں ماسٹر ریاض سے ہر طرح کا تعاون کیا تھا۔ دیکھا دیکھی گاؤں کے چند معتبر لوگ بھی اس تقریب میں پیش پیش نظر آنے لگے تھے لیکن گاؤں کی اکثریت ماسٹر ریاض کو تمسخر اور طنز کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ کسی نے کہا "بوڑھا گھوڑا لال لگام" کوئی بولا "بیٹی سے چھوٹی عمر کی لڑکی سے شادی رچالی ہے" کسی نے طعنہ دیا کہ شادی سے پہلے ہی ماسٹر صاحب دل پشاوری کررہے تھے۔ بہرحال سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ ماسٹر ریاض نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تارا سے شادی کے لیے اُس نے تمام اخلاقی اور قانونی تقاضے پورے کیے تھے۔ اب "میاں بیوی" راضی تھے۔ اس لیے "قاضی" نے اور لوگوں نے کیا کرنا تھا۔ دھیرے، دھیرے خود ہی لوگوں کے منہ بند ہو گئے۔ جو چند ایک رہ گئے اُن کے منہ تارا کے حُسن اخلاق اور ماسٹر ریاض کی ملنساری نے بند کردیئے۔

عمروں میں بہت فرق ہونے کے باوجود وہ دونوں ایک مثالی جوڑا نظر آرہے تھے۔ بلال شاہ چونکہ اُن دونوں کا ہمسایہ تھا لہٰذا اس کی زبانی مجھے اکثر ماسٹر ریاض اور تارا کے حالات کا علم ہوتا تھا۔ تارا نے ماسٹر ریاض کا گھر آئینے کی طرح چمکا دیا تھا اور اس جگمگاتے گھر میں وہ کسی رنگین تتلی کی مانند لہراتی پھرتی تھی۔ محلے بھر کی عورتیں اُس گھر کی معصومیت اور سادگی کی گرویدہ تھیں اور ماسٹر ریاض تو جیسے اُس میں کھو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا اور ایسا سمجھ کر وہ کوئی غلطی نہیں کررہا تھا۔ اس عمر میں اتنی خوبصورت خوش اخلاق اور راہوں میں آنکھیں بچھانے والی بیوی کا مل جانا خوش بختی نہیں تو اور کیا تھا۔

بلال شاہ کا جل جل کر اور کُوہ کُوہ کر بُرا حال تھا۔ گھر والی سے اُس کے تعلقات پہلے بھی کچھ اتنے اچھے نہیں تھے اب اور کشیدہ ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ خوش باش پڑوسی ہی تھے۔ وہ بیوی کو ہر وقت پڑوسیوں کی مثالیں دیتا تھا جواب میں وہ بھی اُسے پڑوسیوں کی مثالیں دیتی تھی کبھی کبھی یہ لفظی جنگ خطرناک صورت اختیار کر جاتی تھی اور بلال ۱۵، ۱۵ دو تین دن تھانے میں یا مسجد میں سونا پڑتا تھا۔

وہ سنجیدگی سے غور کررہا تھا کہ ایک اور شادی کرلے۔ اگر ماسٹر ریاض کو اس عمر میں تارا جیسی بیوی مل سکتی تھی تو اُسے بھی کوئی "درمیانی" سی ہاتھ لگ سکتی تھی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگا "خان صاحب! آپ کے سر کی قسم میں بہت..... بہت سنجیدگی سے غور کررہا ہوں کہ دوسری شادی کرلوں۔ مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے اور یقین کریں یہ سکون مجھے اس گھر میں نہیں مل سکتا۔ پتہ نہیں کون سا گناہ آگے آیا ہے کہ یہ عورت میرے پلے پڑی ہے۔ نہ شکل نہ عقل، نہ موت، بات کرو تو کھانے کو دوڑتی ہے۔ ہر وقت سر پر دوپٹہ باندھے مُردار کی طرح پڑی رہتی ہے"۔

میں نے کہا "تم نے پھر بھی اُس میں سے درجن کے قریب بچے پیدا کرلیے ہیں"۔

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا "بچوں کا کیا ہے جی وہ تو

گائے بھینسوں کے بھی ہو جاتے ہیں اصل چیز ہوتی ہے آپس کی محبت، اور..... اور ذہنی سکون اب ماسٹر ریاض کو ہی دیکھیں....."۔

"بس، بس" میں نے اُس کی بات کاٹی "آدھے گھنٹے میں یہ تم دسویں دفعہ ماسٹر ریاض کی مثال دینے لگے ہو۔ بھائی میرے وہ نئی نئی شادی ہے اور پھر دونوں سمجھ دار ہیں تمہارا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں"۔

"دونوں سمجھ دار ہیں؟ کیا مطلب.....؟" بلال شاہ نے آنکھیں نکالیں "کیا آپ مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہیں"۔

میں نے کہا "نہیں تمہاری نہیں تمہاری گھر والی کی بات کر رہا ہوں"۔

بلال شاہ منہ بنا کر بولا "خان صاحب! آپ جان بوجھ کر ایسی بات کرتے ہیں جس کے دو مطلب نکلیں، بہرحال میں نے اپنے دل کی بات آپ کو بتادی ہے، میں بہت سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں"۔

.....

ڈیڑھ دو ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک کیس کے سلسلے میں میرا امرتسر جانا ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا بڑا خوشگوار موسم تھا۔ امرتسر مرکزی تھانے جانے کے لیے میں پیدل ہی کمپنی باغ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دفعتاً ایک عورت پر میری نگاہ پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ سیاہ ریشمی برقعے میں لپٹی تیزی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی سڑک پار کر رہی تھی۔ وہ کوئی نوجوان لڑکی نظر آتی تھی اسے دیکھ کر میرے چونکنے کی وجہ لڑکی کی باریک اونچی ایڑی والی سینڈل تھی۔ اس مچھلی نما سینڈل کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ چند ماہ پہلے جب "سلطان کے" کے مکان میں تارا بے ہوش ہوگئی تھی اور میں نے ماسٹر ریاض کے ساتھ مل کر اُسے بستر پر لٹایا تھا تو اس عجیب و غریب سینڈلوں پر میری نگاہ پڑی تھی پلک جھپکتے میں یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ برقعے میں لپٹی ہوئی لڑکی طاہرہ ریاض ہے۔ اگلا منظر دیکھ کر مجھے پھر چونکنا پڑا۔ طاہرہ عرف تارا سڑک پار کر کے ایک ریستوران کے سامنے پہنچی۔ یہاں سرخ و سپید رنگ کا ایک اُدھیڑ عمر شخص کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ تارا کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ اُس کے قریب پہنچ کر تارا نے کوئی بات کی۔ وہ مسکرایا اور تارا کو لے کر ریستوران کے اندر چلا گیا۔ یہ عام ریستوران تھا۔ باہر چولہوں پر بہت سے دیگچے رکھے تھے اور ایک طرف تندور پر گرم گرم روٹیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب میں ریستوران کے سامنے کھڑا رہا پھر محتاط انداز میں آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ میں چونکہ سادہ لباس میں تھا اس لیے کسی نے میری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ ریستوران کے ہال نما کمرے میں بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے لیکن تارا اور ادھیڑ عمر شخص کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ پھر میری نگاہ فیملی کیبنوں پر پڑی۔ ایک کیبن کے دروازے پر پردہ جھول رہا تھا۔ پردے کے نیچے سے مجھے کالے برقعے کا کچھ حصہ اور وہی جوتی نظر آئی جس نے مجھے شک میں مبتلا کیا تھا۔ تارا اور ادھیڑ عمر شخص فیملی کیبن میں موجود تھے۔ میں باہر آ کر ایک بس سٹاپ پر کھڑا ہوگیا اور اُن دونوں کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریباً ایک گھنٹے بعد فارغ ہوئے۔ پہلے ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا اُس نے سڑک کنارے کھڑے ہوکر ایک موٹر رکشا رکوایا۔ بعدازاں وہ اندر جا کر تارا کو لے آیا۔ اُسے رکشے میں سوار کرانے کے بعد وہ خود بس سٹاپ کی طرف چلا آیا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی اگر وہ بس پر سوار ہوتا تو اُس کا تعاقب کیا جاسکتا تھا لیکن اچانک بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اُس میں سوار ہوا ہوگیا۔

اُس روز جانڈی پورا واپس پہنچ کر میں نے تارا کا پتہ کروایا تو وہ گھر میں تھی لیکن یہ بھی پتہ چلا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کہیں سے آئی ہے۔ یہ معلومات مجھے بلال شاہ نے فراہم کی تھیں۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ مکمل تفصیل معلوم کرے اور پتہ چلائے کہ ماسٹر ریاض آج کہاں تھا اور تارا کہاں سے ہو کر آئی ہے۔ بلال شاہ ایسے کاموں میں بڑی پھرتی دکھایا کرتا تھا۔ اُس نے ایک گھنٹہ کے اندر اندر ساری بات معلوم کرلی۔ اس کی ''تفتیش'' کے مطابق ماسٹر ریاض اپنے سکول میں ایک بڑا جلسہ کررہا تھا۔ اس جلسے میں وہ ایک صوبائی وزیر کو مہمان خصوصی بنانا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ لاہور گیا ہوا تھا۔ لاہور جاتے جاتے وہ تارا کو امرتسر میں اپنی بہن صادقہ کے پاس چھوڑ گیا تھا اور اپنے بھانجے کو کہہ گیا تھا کہ اگر وہ اگلے دن سہ پہر تک واپس نہ آسکا تو وہ اپنی ممانی یعنی تارا کو جانڈی پورا چھوڑ آئے۔ اب تارا اپنے بھانجے کے ساتھ ہی واپس جانڈی پورا پہنچی تھی۔

اس ساری روداد میں کہیں اُس اُدھیڑ عمر شخص کا ذکر نہیں تھا جو آج دوپہر کمپنی باغ کے سامنے تارا سے ایک ریستوران میں ملا تھا اور ایک گھنٹہ تنہائی میں اُس کے ساتھ رہا۔ ایک دم مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے تارا وہ نہیں جو دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اپنی بھولی بھالی صورت کا فائدہ اٹھا رہی ہے ورنہ اس کے اندر ایک عورت چھپی ہوئی ہے یہ عورت، نظر آنے والی عورت سے بہت مختلف ہے۔

یہ بات تو میرے علاوہ ماسٹر ریاض بھی جانتا تھا.....اور سب لوگ جانتے تھے کہ تارا کا ماضی پردہ راز میں ہے لیکن تارا کی اصلیت اتنی جلدی ظاہر ہو جائے گی کم از کم مجھے اُمید نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تارا پر گہری نگاہ رکھی جائے۔ یہ نہ ہو کہ یہ پراسرار لڑکی ماسٹر ریاض کی سادگی سے بے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسا کام کر جائے جس کے لیے ہمیں دیر تک پچھتانا پڑے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ماسٹر ریاض کو ابھی کچھ نہ بتاؤں۔ اس مرحلے میں ابھی کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا اور جب تک میں خود حتمی نتیجے پر نہ پہنچ جاتا میں ماسٹر ریاض کے آنگن میں آئی ہوئی بہار کو خزاں میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔

تارا پر نگاہ رکھنے کے لیے بلال شاہ سے موزوں شخص اور کون ہوسکتا تھا۔ میں نے بلال شاہ کو بلا کر حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اُسے کہا کہ وہ تارا کے روزمرہ معمولات پر گہری نظر رکھے۔ حالات کی اس تبدیلی سے بلال شاہ کے ارادے بھی کچھ ڈانواں ڈول ہوگئے تھے اور وہ جو دوسری شادی کے سلسلے میں بڑا پُرجوش نظر آتا تھا کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ غالباً سوچنے لگا تھا کہ گھر والی جیسی بھی ہے بھلی مانس اور عزت کی رکھوالی تو ہے۔ یا پھر کوئی اور بات اُس کے ذہن میں آگئی تھی۔

ایک دن بلال شاہ تھانے میں آیا تو جوش سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی اُس نے بڑے دھڑلے سے سنتری کو دو گلاس ٹھنڈا دودھ لانے کا آرڈر دے دیا۔ اس دیدہ دلیری کا ایک ہی مطلب تھا اُس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ وہ پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر جب اُس نے دودھ پی لیا اور دودھ میں ڈوبی ہوئی مونچھوں کو اچھی طرح چوس لیا تو اصل موضوع پر آگیا۔ اُس نے اُٹھ کر دفتر کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بولا ''خان صاحب! مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ یہ جو اتنی خوبصورت جوان لڑکی پکے ہوئے پھل کی طرح ماسٹر کی جھولی میں آن گری ہے ضرور اس میں کوئی چکر ہے۔ توبہ.....توبہ۔ آج اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے میں نے جو کچھ دیکھا ہے آپ دیکھتے تو چکرا کر رہ جاتے۔ استغفار.....کوئی حد ہوتی ہے بے حیائی اور بے غیرتی کی'' وہ بار بار

اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

میں نے کہا" کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی سسپنس پیدا کرتے جاؤ گے"۔

وہ بولا" آج گارما ماسٹر ریاض گھر میں نہیں تھا اور آج پھر وہ کنجری ایک یار سے ملنے نکلی تھی.....آج تو شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی ہے جی تو پورا یقین ہوگیا ہے کہ ماسٹر کے گھر کا صفایا کرنے کے ارادے سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ جس روز اسے موقعہ ملا اور لمبا مال اس کے ہاتھ لگ گیا وہ ماسٹر کا صفایا کر کے یہاں سے بھاگ جائے گی"۔

"لیکن تم نے دیکھا کیا ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"اُس بے حیا کے چھن دیکھے ہیں اور کیا" بلال شاہ نے کہا "میں نے بتایا ہے ناں کہ ماسٹر ریاض آج گھر میں نہیں تھا وہ کسی دفتری کام سے لاہور گیا ہوا ہے۔ اس کے جانے کے دو گھنٹے بعد تارا ایک سہیلی کے ساتھ گھر سے نکلی۔ اُس کی سہیلی اُسے بس پر چڑھا کر واپس آگئی۔ یہ امرتسر جانے والی بس تھی۔ میں بھی نظر بچا کر بس پر سوار ہوگیا اور منہ سر لپیٹ کر ایک پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تارا امرتسر کے لاری اڈے پر اُتری۔ اڈے کے باہر ایک ہیرو ٹائپ نوجوان چم چم کرتی سرخ گاڑی میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ خوش قسمتی سے پاس ہی ایک ٹیکسی کار کھڑی تھی۔ میں اللہ کا نام لے کے، اس میں گھس گیا۔ میں نے ٹیکسی والے پر پولیس کا رُعب ڈالا اور اُس سے کہا کہ وہ کار کا پیچھا کرے۔ ٹیکسی کو زیادہ دیر کار کے پیچھے نہیں بھاگنا پڑا۔ کار والے، نہر کے بڑے پل کے پاس پہنچ کر رُک گئے۔ تارا نے اپنا برقعہ کار کے اندر ہی اُتار کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور بڑی بنی سنوری نظر آتی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا نہر کے بڑے پل کے پاس ہی ایک باغیچہ ہے۔ اُس میں بچوں کے لیے جھولے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ تارا اور وہ نوجوان باغیچے میں چلے گئے اور بڑی بے تکلفی سے بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومنے لگے۔ میں زیادہ دیر وہاں نہیں رُک سکا مجھے ڈر تھا کہ تارا کی نظر مجھ پر پڑ جائے گی۔ وہ بڑے معشوقانہ انداز میں نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اگر رات کا وقت ہوتا تو وہ اُس باغیچے میں نجانے کیا کچھ کر گزرتے۔ میں واپس آکر ٹیکسی کار میں بیٹھ گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ وہاں سے برآمد ہوئے اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک مارکیٹ سے انہوں نے کچھ خریداری کی۔ ایک شاپ سے سوڈا واٹر پیا اور بڑی آزادی سے کھڑے باتیں کرتے رہے۔ تارا بالکل بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا دہلی یا بمبئی کی کوئی فیشن ایبل کالجیٹ لڑکی ہے..... ہاں ایک بات میں بتانا بھول ہی گیا نوجوان جس گاڑی پر گھوم رہا تھا اُس پر دہلی کا نمبر تھا.....تھوڑی دیر مارکیٹ میں رُکنے کے بعد وہ پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور لاری اڈے پہنچ گئے۔ نوجوان نے تارا کو بس میں سوار کرایا۔ جب بس چل پڑی تو وہ بھی گاڑی لے کر روانہ ہوگیا۔ اس کا رُخ شہر کے بارونق حصے کی طرف تھا۔ اس مرتبہ اس کا تعاقب کامیابی سے جاری نہ رکھ سکا۔ بڑے ڈاک خانے کے قریب ٹیکسی کار کو ایک اشارے پر رُکنا پڑا اور نوجوان گاڑی سمیت اوجھل ہوگیا"۔

میں نے پوچھا" تارا اب کہاں ہے؟"

"وہ گھر واپس پہنچ چکی ہے۔ ابھی جب میں آیا ہوں تو وہ دوپٹہ کمر سے باندھے آستینیں چڑھائے بڑے زور وشور سے دیواروں کی لیپائی کر رہی تھی۔ میں نے اپنی گھر والی سے کہا کہ پوچھ کر آؤ تارا کہاں گئی ہوئی تھی۔ میری گھر والی نے آکر بتایا کہ اُس کا پاؤں بھاری ہے۔ امرتسر ہسپتال میں ایک لیڈی

ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی۔ اس سفید جھوٹ پر میں استغفار پڑھنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا"۔

بلال شاہ ویسے تو ڈینگیں مارتا رہتا تھا لیکن جب کوئی قانونی معاملہ ہوتا تھا، وہ اپنی رپورٹ پوری ایمانداری سے دیتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو کچھ بتا رہا ہے سچ بتا رہا ہے اور اس "سچ" کے بعد شک شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ تارا دہرے کردار کی مالک تھی۔ اُس کا اصل روپ اپنے اُس روپ سے بہت مختلف تھا جو وہ ماسٹر ریاض کے سامنے پیش کر رہی تھی۔

ابھی ہم اس معاملے پر غور وفکر کر ہی رہے تھے کہ ایک اور سنگین واقعہ رونما ہوگیا۔ یہ اگلے روز کی بات ہے، صبح سویرے بلال شاہ ایک اخبار تھامے ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس نے تہہ شدہ اخبار میرے سامنے پھینکا اور ایک خبر پر اُنگلی رکھ دی "یہ دیکھیں خان صاحب!" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

یہ قتل کی خبر تھی۔ تین کالمی سرخی میں لکھا تھا "امرتسر کے پیراڈائز ہوٹل میں پراسرار قتل۔ کمرہ نمبر 18 کے غسل خانے میں نامعلوم نوجوان کی لاش پائی گئی۔ لاش کی تصویر بھی ساتھ دی گئی تھی۔ ایسی ایک دو خبریں اخبار میں روزانہ ہوتی تھی۔ مجھے بلال شاہ کی پریشانی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا "جناب یہی وہ نوجوان ہے جس سے کل تارا ملی ہے"۔

چند لمحے کے لیے میں بھی سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کوئی بہت گہرا چکر چلا ہوا ہے۔ عین ممکن تھا کہ نوجوان کے قتل میں تارا کا ہاتھ ہو۔ اگر ایسا تھا تو وہ کسی بھی وقت ماسٹر ریاض کے گھر سے اُڑن چھو ہوسکتی تھی۔ میں نے فوری طور پر سادہ لباس میں دو پولیس والے ماسٹر ریاض کے گھر کی نگرانی پر لگا دیے اور خود ایک ہیڈ کانسٹیبل اور بلال شاہ کے ساتھ امرتسر روانہ ہوگیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب ہم امرتسر کے پیراڈائز ہوٹل میں پہنچے لاش موقعے سے اٹھائی جا چکی تھی اور مقامی پولیس کے اہلکار جائے واردات کا نقشہ تیار کرنے اور ثبوت اٹھانے میں مصروف تھے۔ مقتول کے کمرے میں اُس کا واحد سوٹ کیس کھلا پڑا تھا۔ اس سوٹ کیس میں روزمرہ کے استعمال کا سامان تھا۔ کپڑے کے چند جوڑے، موی لفافے میں لپٹی ہوئی چپل، صابن، تولیہ، ٹارچ اور گولڈن رنگ کی ایک ولائتی تھرماس۔ تفتیش کرنے والے سب انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور بڑی مروت سے پیش آیا۔ اس نے مجھے تمام ضروری تفصیلات سے آگاہ کیا.....

واردات کا پتہ سب سے پہلے ہوٹل کے بیرے بھوشن کمار کو چلا تھا۔ وہ شام سے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سن رہا تھا۔ اُس نے دروازے پر کئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر یوں ہوا کہ پانی کمرے میں پھیل گیا اور دروازے کی نچلی درز سے باہر بہنے لگا۔ اب بھوشن کمار کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ڈپلی کیٹ چابی استعمال کرکے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اُس نے غسل خانے میں امیت مکرجی نامی نوجوان کی برہنہ لاش دیکھی۔ اُس کے منہ اور ناک سے بہنے والا خون دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کی موت زہر خورانی کے سبب ہوئی ہے۔ لاش اس ڈھنگ سے گری تھی کہ غسل خانے سے پانی کی نکاسی کا راستہ جزوی طور پر بند ہوگیا۔ چونکہ شاور کھلا تھا اس لیے پانی پہلے غسل خانے میں جمع ہوتا رہا پھر کمرے کے قالین پر پھیلا اور آخر باہر بہہ نکلا۔

سب انسپکٹر نے بتایا کہ مقتول کی گاڑی نیچے ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اُس میں سے مقتول کا لائسنس بھی ملا ہے۔ لائسنس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق صوبہ گجرات سے ہے۔ یہ گاڑی اُس کی اپنی

نہیں ہے بلکہ اُس نے دہلی میں اپنے کسی جاننے والے سے حاصل کی ہے۔ لائسنس پر مقتول کا مکمل ایڈریس بھی موجود تھا اور پولیس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا کہ وہ اگلے چند گھنٹوں میں مقتول کے وارثوں سے رابطہ قائم کرسکتی۔ اس کیس میں میری دلچسپی اب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے مقامی ڈی ایس پی سے مشورہ کیا اور مشورے میں فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کی تحقیق کے لیے میں خود گجرات کے شہر بڑودہ جاؤں گا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ٹیلی فون پر مقتول کے وارثوں کو اطلاع بھی دے دی گئی تھی۔ ایک پولیس پارٹی دہلی روانہ ہوگئی تاکہ اُس شخص سے پوچھ گچھ کی جائے جس کی گاڑی پر مقتول امیت امرتسر پہنچا۔ دوسری پارٹی کے میں ساتھ بڑودہ روانہ ہوگیا۔

.....

امرتسر سے گجرات کے شہر بڑودہ تکریل کا ایک طویل اور کٹھن سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہم قریباً 48 گھنٹے بعد بڑودہ پہنچ سکے۔ بڑودہ کی ایک جانب بھڑوچ اور دوسری طرف احمد آباد کے مشہور شہر ہیں۔ بڑودہ خود بھی ایک بارونق اور اہم شہر ہے۔ ہم سب سے پہلے مقامی تھانے گئے، ایس ایچ او سے ملے اور اُس سے اپنا تعارف کرایا۔ اُسے ٹیلی فون پر ہماری آمد کی اطلاع ہوچکی تھی۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی مقتول کے بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل کرچکا تھا۔ مقتول کا اصل نام امیت نہیں وجے آنند تھا۔ وہ بڑودہ کے ایک مشہور سینما کا مالک تھا اور فلمیں وغیرہ خریدنے کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ قریباً دو ہفتے سے بڑودہ میں موجود تھا۔ اُس کے دوست احباب کی زبانی پتہ چلا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں دہلی گیا ہوا ہے۔ وجے آنند کے والدین روتے پیٹتے امرتسر کے لیے روانہ ہوچکے تھے اور یہاں بھی وجے آنند کی اچانک موت پر سخت حیرت کا اظہار کیا جارہا تھا۔

ایس ایچ او رزاق خاں نے کہا "کچھ لوگ وجے آنند کے قتل کے ڈانڈے گجراتی فلموں کی ایک خوبصورت ایکٹرس شیلا ٹنڈن کی گمشدگی سے ملا رہے ہیں۔ شیلا ٹنڈن پانچ چھ ماہ پہلے اچانک غائب ہوگئی تھی اور ابھی تک اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

یہ ذکر سُن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے رزاق خاں سے اس بارے میں تفصیلات پوچھیں۔ رزاق خاں نے بتایا۔ پچھلے دنوں یہاں کے مقامی اخباروں میں شیلا کی گمشدگی کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ نوخیز اداکارہ گجراتی فلموں کے مشہور ہدایت کار مہیش رامپوری کی پوتی تھی۔ اُس نے ایک دو گجراتی فلموں میں بڑے یادگار کردار ادا کیے ہیں اور بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ بہت جلد ممبئی کی ہندی فلموں تک پہنچ جائے گی لیکن ایک روز اچانک لاپتہ ہوگئی۔ اُس کے والدین تو فوت ہوچکے ہیں دادا ہی سرپرست ہے۔ اس نے پوتی کو بہت تلاش کرایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں میں نے ایک اخبار میں اُس کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ملک سے باہر جاچکی ہے"۔

نجانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہی شیلا ٹنڈن وہ لڑکی ہے جو تارا بن کر ماسٹر ریاض کے گھر میں رہ رہی ہے۔ میں نے رزاق خاں سے کہا "انسپکٹر صاحب! میں شیلا ٹنڈن کے دادا سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا نام بتایا ہے آپ نے اُس کے دادا کا؟"

"مہیش رامپوری" انسپکٹر رزاق نے جواب دیا' لیکن آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں اُس سے؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے انسپکٹر ریاض کہ وجے آنند کے قتل اور شیلا ٹنڈن کی گمشدگی میں واقعی گہرا ربط ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ اس وقت وہ شخص کہاں

مل سکتا ہے؟''

انسپکٹر رزاق نے دو تین جگہ ٹیلی فون کیا۔ سادے کاغذ پر ایک دو پتے لکھے پھر گہری سانس لے کر بولا ''مہیش صاحب اس وقت بڑودہ میں ہی ہیں۔ انہوں نے نہر کنارے ایک محل نما مکان بنا رکھا ہے۔ بعض اوقات فلموں کی شوٹنگ بھی وہاں کرتے ہیں۔ وہ محل دیکھنے کی چیز ہے۔ اس وقت وہ وہیں پر ہیں، میرا خیال ہے آپ چلے جائیں ملاقات ہو جائے گی اُن سے''۔

میں نے اُسی وقت انسپکٹر رزاق سے مکمل ایڈریس حاصل کیا اور اُس کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے کر مہیش رامپوری کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالرزاق نے اپنی گاڑی بھی خوش دلی سے میرے استعمال میں دے دی تھی۔ بڑودہ کی چند ایک بھری پری سڑکوں سے گزر کر ہم شفاف پانی والی ایک نہر پر پہنچے۔ یہاں باغات اور سبزے کی کثرت تھی (حالانکہ بڑودہ میں بہت کم سبزہ دیکھنے میں آیا تھا) درختوں کے درمیان ایک بلند و بالا عمارت دیکھ کر ہم ٹھٹھک گئے۔ وہ واقعی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ بلند برجیاں' محرابی دروازے' خوبصورت فوارے اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواریں، بہت بڑے گیٹ کے سامنے باوردی دربان موجود تھے ایک دربان میرا شناختی کارڈ لے کر اندر گیا اور پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ باریابی کی اجازت مل گئی تھی۔ ایک طویل اور خوشنما راستہ طے کر کے ہم عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ یہاں بھی آرائش و زیبائش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ایک وسیع کمرے میں بہت بڑے فانوس کے نیچے منقش کرسی پر ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر اُس نے اپنا رُخ پھیرا۔ میں سکتے میں رہ گیا یہ وہی شخص تھا جو تین چار ہفتے پہلے یہاں سے سینکڑوں میل دُور امرتسر کے کمپنی باغ کے سامنے ایک معمولی ریستوران میں تارا سے ملا تھا اور اُس کے ساتھ ایک گھنٹہ تک ایک کیبن فیملی میں بیٹھا رہا تھا۔ میں اُسے پہچانتا تھا لیکن اُس کے لیے میں اجنبی تھا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ تارا ہی شیلا ٹنڈن ہے۔

''آؤ انسپکٹر'' اُس نے مجھے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا ''وجے آنند کے قتل کی اطلاع مجھے ہو چکی ہے۔ مجھے توقع تھی کہ جلد ہی کسی پولیس اہلکار سے ملاقات ہو گی''۔

''اس نے اپنا چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیا اور بولا ''جس بات کا علم تم کو ایک آدھ روز میں ہو جانا ہے' بہتر ہے کہ وہ میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہو گا کہ وجے آنند ایک سینما کا مالک تھا اور فلم لائن سے اُس کا تھوڑا بہت تعلق موجود تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے میری پوتی شیلا ٹنڈن میں دلچسپی لے رہا تھا اور اُس سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری طرف سے اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وجے آنند سمارٹ اور نوجوان تھا، صاحب جائیداد بھی تھا لیکن شیلا اُس کے بارے میں تذبذب کا شکار تھی..... وہ دُور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا'' وہ عجیب لڑکی تھی انسپکٹر انسانوں کی بھیڑ میں سب سے جدا اور انوکھی۔ اُس کے اپنے نظریات اور زندگی گزارنے کا اپنا اسلوب تھا۔ نجانے کیوں کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اپنے والد کی طرح وہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ کسی اور دنیا میں جا بسے گی اُسے زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں سے نفرت تھی۔ بہت مشکل ڈھنگ سے جینا چاہتی تھی وہ''۔

مہیش رام پوری کے چہرے پر دنیا جہان کی اُداسی سمٹ آئی تھی اور آنکھیں جیسے دھندلا سی گئی تھیں۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ وہ صرف چند ہفتے پہلے اپنی پوتی سے مل چکا ہے اور کافی وقت اُس کے ساتھ گزار چکا

ہے تو میں واقعی اسے ایک "دکھی دادا" سمجھتا جس کی پوتی چھ ماہ سے لاپتہ ہے اور وہ اُس کی پریشانی کو دل کا روگ بنائے ہوئے ہے۔ وہ اداکاری کررہا تھا اور اچھی اداکاری کررہا تھا..... اور کیوں نہ کرتا وہ ایک کہنہ مشق فلم ڈائریکٹر تھا۔

میں نے کہا "کہیں آپ کی پوتی اس وجہ سے غائب تو نہیں ہوئی کہ آپ اُس کی شادی وجے آنند سے کرنا چاہتے تھے اور وہ اس شادی کے حق میں نہیں تھی"۔

مہیش رام پوری نے انکار میں سر ہلایا "ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو بَر چننے کی آزادی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں شیلا کے لاپتہ ہونے میں وجے آنند والے معاملے کا کوئی تعلق نہیں تھا"۔

میں نے کہا "پھر آپ نے یہ کیوں سوچا کہ وجے کی موت کے بعد پولیس آپ سے رابطہ کرے گی"۔

مہیش بولا "فلم لائن میں یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم تھی کہ وجے آنند، شیلا کو چاہتا ہے اور اُس کو اپنانے کی کوشش کررہا ہے۔ ظاہر ہے اس حوالے سے پولیس سوچ سکتی ہے کہ شیلا کی گمشدگی اور وجے کے قتل میں کوئی تعلق نہ ہو"۔

میں نے اچانک پینترا بدلتے ہوئے کہا "لیکن میرا خیال ہے کہ شیلا گم نہیں ہوئی"۔

"کیا مطلب؟" مہیش نے حیران ہوکر کہا۔

"یہی مطلب ہے کہ وہ گم نہیں ہوئی۔ وہ امرتسر میں ہے اور وہاں طاہرہ ریاض کے نام سے رہ رہی ہے"۔

مہیش رام پوری کے سر پر جیسے کسی نے دستی بم پھینک دیا تھا۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر قدرے سنبھل کر بولا "لل..... لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"جیسے آپ کو پتہ چلا اور آپ اُس سے ملنے امرتسر پہنچے"۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ مہیش کی حالت ایسی ہورہی تھی جیسے ابھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ ایک دربان ابھی تک دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ دربان خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اب میں اور مہیش ہال نما کمرے میں اکیلے تھے۔ مہیش نے مجھے پہلی بار غور سے دیکھا اور سرتاپا اچھی طرح گھورا "تم کو کس نے بھیجا ہے یہاں؟"

"میں خود آیا ہوں" میں نے اعتماد سے کہا "مجھے کسی سے ہدایات لینے کی ضرورت نہیں"۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں امرتسر گیا ہوں یا شیلا سے ملا ہوں"۔

"میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور اس بارے میں ٹھوس ثبوت فراہم کرسکتا ہوں"۔

ایک دم مہیش رام پوری ڈھیلا پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے عینک اٹھا کر اُس کے شیشے صاف کیے اور اُسے دوبارہ آنکھوں پر جمالیا "میں تمہارا مکمل تعارف حاصل کرسکتا ہوں" اُس نے پوچھا مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے مکمل تعارف کرادیا۔ جواب میں اُس نے بھی تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ گجراتی فلموں کا سب سے پرانا ہدایت کار تھا اور کئی ایک شہرت یافتہ فلمیں بنا چکا تھا۔ اُس کی عمر ستر سال سے اوپر تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے پچپن ساٹھ کا نظر آتا تھا۔ شیلا کا والد اور والدہ ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے اور مہیش نے شیلا کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔

مہیش نے میرے لیے چائے اور اپنے لیے بلیک کافی منگوائی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ بولا انسپکٹر نواز! آج میں تمہیں ایک ایسی بات بتانے جارہا ہوں جو اب تک صرف میرے اور بھگوان کے درمیان تھی۔ اس بات کا تعلق شیلا اور اس کی زندگی سے ہے۔ سب سے پہلے تو میں تمہاری ان معلومات کو درست قرار دیتا ہوں کہ میں نے پچیس روز پہلے

امرتسر گیا تھا اور وہاں شیلا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دوسری تمہاری یہ اطلاع بھی بالکل درست ہے کہ شیلا امرتسر میں طاہرہ بن کر رہ رہی ہے اور اس نے وہاں ماسٹر ریاض نامی شخص سے شادی کرلی ہے لیکن اس شادی کے پس پردہ کیا حالات ہیں ان کا علم میرے اور شیلا کے سوا اب تک کسی کو نہیں تھا۔ شاید تمہیں میری یہ باتیں کچھ عجیب سی لگیں کیونکہ ان کا تعلق فلم لائن سے ہے۔ بہرحال میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں وہ سو فیصد درست ہے۔ شیلا نہ تو گھر سے بھاگی تھی نہ اُسے کسی نے اسے اغوا کیا تھا اور نہ وہ لاپتہ ہوئی تھی۔ اسے میں اور میرا اسسٹنٹ انوار علی خود امرتسر چھوڑ کر آئے تھے۔ اب تم پوچھو گے کہ ایک نوجوان تنہا لڑکی کو امرتسر میں چھوڑ کر آنے کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ بہت اہم تھی لیکن شاید تمہیں زیادہ اہم نہ لگے۔ دراصل میں ایک فلم بنا رہا تھا۔ یہ میری ذاتی فلم تھی۔ اسکی کہانی میں نے مشہور گجراتی کہانی کار من موہن جی سے لکھوائی تھی۔ یہ فلم ایک لڑکی کے گرد گھومتی ہے اور اس میں مرکزی کردار خود شیلا ادا کر رہی تھی۔ شیلا ایک زبردست فن کارہ ہے اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہر قسم کے لوگ کر رہے ہیں اور کسی کی تعریف بے وجہ نہیں کی جاتی۔ شیلا نے واقعی اب تک اپنے ادا کیے ہوئے کرداروں میں جان ڈالی ہے اور فن کے پرستاروں کو اپنی تعریف پر مجبور کیا ہے۔ وہ فلم کے کردار میں ڈھل جاتی ہے۔ کہانی میں ڈوب کر کہانی کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک فلم میں مچھیرے کی بیٹی اور دوسری میں کلب ڈانسر بنی ہے۔ یہ دونوں کردار ٹھیک سے نبھانے کے لیے اُس نے بے حد محنت کی تھی۔ مچھیرن کا کردار ادا کرنے کے لیے وہ پورے دو ہفتے مچھیروں کی بستی میں رہی اور اُن کے رنگ ڈھنگ وطور اطوار دیکھے۔ کلب ڈانسر کا کردار ادا کرنے کے لیے وہ خاموشی سے بمبئی چلی گئی اور کسی کو بتائے بغیر وہاں کے ایک معروف کلب میں ایک مہینہ ملازمت کر آئی۔ جس ذاتی فلم کا میں تم سے ذکر کر رہا ہوں اس میں شیلا کا کردار ایک ایسی لڑکی کا تھا جو حیدرآباد سے لاہور جا رہی ہے۔ وہ ٹرین میں اپنے وارثوں سے بچھڑ جاتی ہے اور بھٹک کر ایک پنجابی سکول ماسٹر کے گھر میں پہنچ جاتی ہے یہ سکول ماسٹر اسے بیٹی بنالیتا ہے اور اُس کے وارثوں کی تلاش شروع کرتا ہے۔ لڑکی چونکہ بہت نوعمر اور سادہ لوح ہے، اُسے اپنا پتہ تو درکنار اس شہر یا گاؤں کا نام بھی معلوم نہیں جہاں سے وہ آئی ہے۔ وہ ماسٹر کے اپاہج بیٹے سے محبت کرنے لگتی ہے لیکن ماسٹر اس کی شادی بیٹے سے نہیں کرتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے اس طرح دنیا والے اس پر انگلیاں اٹھائیں گے اور اُسے خودغرض گردانیں گے۔ آخر میں لڑکی خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے اور یوں ماسٹر کے بیٹے سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہی کردار تھا جسے بہت اچھے طریقے سے ادا کرنے کے لیے اور اپنی اداکاری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے شیلا نے گجرات سے پنجاب کا رُخ کیا اور امرتسر کے ایک سکول ماسٹر کے گھر میں عین اُسی طرح وارد ہوئی جس طرح وہ فلم میں وارد ہوئی۔ اس مقصد کے لیے اُس نے ایک ایسا سکول ماسٹر منتخب کیا تھا جو عمر میں اس کا بزرگ لگتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں خبطی سی ہو جاتی تھی اور اس کا یہی خبط تمام تر اُس کے کرداروں کو زندگی بخش دیتا تھا۔ جب اُس نے امرتسر آنے کا ارادہ کیا تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ وہ اپنے فیصلے پر مضبوطی سے قائم ہے اور اگر میں نے اُس کا فیصلہ بدلنے کی کوشش جاری رکھی تو وہ فلم میں کام کرنے سے ہی انکار کردے گی تو اُس کی یہ ''فن کارانہ'' ضد قبول کرلی۔ شیلا تارا کے روپ میں ماسٹر

ریاض کے گھر چلی گئی۔ فلم میں بھی اُس کا نام تارا ہی تھا اور وہ اسی طرح غنڈوں سے بچتی ہوئی ماسٹر کے گھر میں پہنچتی ہے، لیکن اس سے آگے کی کہانی فلم کی کہانی سے بالکل مختلف ہوگئی۔ میرے اور میرے اسسٹنٹ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس گھر میں جانے کے بعد شیلا جیسی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ لڑکی اس تیزی اور اس انداز سے بدل جائے گی۔ میں تو کہوں گا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے کسی بھی سنسنی خیز فلم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور ڈرامائی ہے۔ پروگرام کے مطابق شیلا کو قریباً ایک ماہ ماسٹر ریاض کے گھر میں رہنا تھا اس کے بعد اُسے بتدریج ماسٹر صاحب کو سب کچھ بتا دینا تھا اور اُن کو دی جانے والی زحمت پر بہت بہت معذرت کرکے واپس آجانا تھا یہ بھی توقع تھی کہ وہ ہفتے دو ہفتے میں ہی لوٹ آئے۔ ہم اس بات کی پوری طرح تسلی کر چکے تھے کہ ماسٹر ریاض بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی شریف اور بے ضرر شخص بھی ہے لہٰذا اُسے چھوڑ کر میں بڑودہ واپس آگیا۔ صرف میرا اسسٹنٹ انوار علی کسی ہنگامی ضرورت کے لیے امرتسر میں موجود رہا۔

پورا ایک ماہ گزر گیا لیکن شیلا واپس نہیں آئی۔ پھر دو مہینے بھی گزر گئے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر ایک روز مجھے شیلا کی طرف سے ایک خط ملا وہ امرتسر بلا رہی تھی۔ ماسٹر ریاض کے گھر میں بلانے کی بجائے اُس نے مجھے کمپنی باغ کے سامنے ایک ریستوران کا ایڈریس دیا تھا اور ملاقات کا وقت بھی بتایا تھا۔ لاڈلی پوتی کی کال پر میں بھاگم بھاگ امرتسر پہنچا اور مقررہ مقام پر اس سے ملاقات کی مجھے معلوم نہیں تھا کہ جیسے ڈرامائی اور سنسنی خیز موڑ میں فلموں میں دیتا ہوں ایسا ہی ایک ناقابل گمان موڑ میری اپنی زندگی میں بھی آئے گا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ شیلا میرے سامنے زار وقطار رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''دادو! تم نے ہی تو مجھے محبت کرنا سکھایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ محبت دنیا کا سب سے انمول جذبہ ہے اور جب محبت ہو جائے تو سر جھکانا نہیں چاہیے۔ سر اٹھانا چاہیے کہ ہاں ہمیں محبت ہے..... مجھے بھی محبت ہوگئی ہے دادو! میں ماسٹر صاحب سے محبت کرنے لگی ہوں اور دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اُس سے شادی کرلی ہے''۔ میں سکتے کی حالت میں شیلا کے ساتھ رہا تھا۔ شیلا نے بتایا کہ ماسٹر ریاض اُسے ایک بھولی بھالی لاوارث اور غریب لڑکی کے روپ میں جانتے ہیں اور وہ چاہتی ہے کہ ماسٹر صاحب کے سامنے ہمیشہ اُس کا یہی روپ رہے۔ اُس نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر کبھی ماسٹر صاحب کو بھنک بھی پڑ گئی کہ شیلا وہ نہیں جو نظر آرہی تھی تو وہ ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی زندگی سے نکال دیں گے۔ انہیں دنیا میں جس چیز سے سب سے زیادہ نفرت ہے وہ عورت کی چالاکی اور ہوشیاری ہے اور سب سے پیاری چیز عورت کی سادگی اور معصومیت ہے۔ شیلا نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے درخواست کی میں اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر چلا جاؤں اور کم ازکم دو تین برس کے لیے اُسے بالکل بھول جاؤں۔ میں نے مختصر سے وقت میں ساری بات سمجھ لی تھی اور یہ بھی جان گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے صبر کرنا تھا اور خاموشی سے واپس لوٹ آنا تھا..... اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دل پر ایک بہت بھاری پتھر رکھا۔ میں نے شیلا کی جدائی قبول کرلی اور وہ ساری باتیں بھی سن لیں جو لوگوں نے اُس کے حوالے سے کیں۔ فلم لائن کے لوگوں میں ایسی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی لیکن شیلا چونکہ ایک سپر سٹار بننے والی تھی اور لوگ اُس سے بہت امیدیں رکھتے تھے۔ اس لیے

اُس کا اچانک فلمی دنیا چھوڑ کر منظر سے غائب ہو جانا انہیں شاک گزرا۔ کئی اخباری نمائندوں نے جستجو کی کہ وہ اچانک کہاں چلی گئی ہے۔ وہ اُسے بڑودہ اور احمد آباد غیرہ میں ڈھونڈتے رہے لیکن وہ تو سینکڑوں میل دُور امرتسر کے اُس چھوٹے سے گاؤں میں ماسٹر ریاض کے گھر میں تھی۔ دھیرے دھیرے لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ مثلاً گمشدگی کو بھی لوگ بھولنے لگے۔ میرے علاوہ اگر کوئی شخص اُس کی حیران کن گمشدگی کو نہیں بھولا تو وہ وجے آنند تھا۔ وہ امیرزادہ شیلا کو جنون کی حد تک چاہتا تھا اور اس کو اپنانا اس کی ضد بن چکا تھا.....'' ایک لمحے کے توقف کے بعد مہیش راپوری نے کہا'' لیکن ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں اگر تمہارے دماغ کے کسی بھی کونے کھدرے میں یہ خیال موجود ہے کہ وجے آنند کے قتل میں شیلا کا کوئی ہاتھ ہوسکتا ہے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں اپنی پوتی کو اتنا جانتا ہوں کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتی ہوگی۔ وہ..... کسی کا خون نہیں کرسکتی''۔ شیلا کے دادا نے آخری فقرے کے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

اگلے دس بارہ گھنٹوں میں ہم نے اس سلسلے میں کئی لوگوں سے بیانات قلمبند کیے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وجے آنند کے قتل کا تعلق شیلا کی گمشدگی سے ہو سکتا ہے تاہم فلم لائن کے ہی بعض لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ قتل کسی دشمنی وغیرہ کا شاخسانہ ہے۔ شیلا کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اگر بیان دینے والوں کو پتہ چل جاتا کہ شیلا، طاہرہ کے روپ میں امرتسر میں ہی ہے اور اپنے قتل سے صرف چند گھنٹے پہلے وجے آنند نے شیلا سے ملاقات کی تھی تو یقیناً وہ آنکھیں بند کر کے اس قتل میں شیلا کو ملوث کر دیتے۔ میرا اور ایس ایچ او رزاق خاں کا بھی یہی خیال تھا کہ شیلا اس قتل میں ملوث نہیں ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ وجے آنند نے شیلا کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کی ہو یا کسی طریقے سے اُسے بلیک میل کیا ہو اور شیلا نے اُسے زندگی کی سرحد پار کرادی ہو۔ لیکن یہ کوئی چھوٹا اقدام نہیں تھا کسی کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور وہ بھی کسی عورت کے لیے اور عورت بھی ایسی کہ جو محبت کر رہی تھی اور کسی کی زندگی میں بہار بن کر ٹھہرنا چاہتی تھی۔

.....

ضروری بیانات حاصل کرنے کے بعد میں ایک روز بعد بڑودہ سے روانہ ہوا اور ٹرین کا طویل سفر کرنے کے بعد امرتسر واپس پہنچ گیا۔ وجے آنند کے قتل کی تفتیش شروع ہوئی۔ میں نے شیلا کے دادا سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک مجھے شیلا کے خلاف کوئی بہت ٹھوس ثبوت نہیں مل جائے گا میں اسے اس معاملے سے الگ تھلگ رکھوں گا اور اس کی جمی جمائی زندگی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کروں گا۔

وجے آنند کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق اس کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ یہ زہر اُسے کسی مشروب غالباً گنے کے رس میں ملا کر دیا گیا تھا۔ رپورٹ میں اس زہر کا مشکل سا نام اور کیمیکل فارمولا لکھا تھا۔ یہ زہر دو تین گھنٹے کے بعد اثر کرنا شروع کرتا ہے اور تین چار گھنٹے کے دوران اپنے شکار کو راہی عدم کر دیتا ہے۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ شیلا نے باغ کی سیر کے دوران یا اُس کے بعد وجے آنند کو زہر پلا دیا۔ بعدازاں وہ اطمینان سے گھر آگئی اور وجے اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اُس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ تشنگی اور حرارت حد سے بڑھی تو وہ کپڑے اتار کر غسل خانے میں گھس گیا اور نہانے لگا۔ نہانے کے دوران ہی اُس نے خون کی قے کی

اور فرش پر گر کر دم توڑ گیا۔

شیلا عرف تارا کے خیال میں اس بات کا کوئی گواہ موجود نہیں تھا کہ وہ امرتسر میں وجے آنند سے ملی ہے بلکہ یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی لہٰذا وہ بالکل مطمئن ہو کر گھر آگئی تھی۔ بہرحال اس سارے معاملے میں ایک بات توجہ طلب بھی تھی۔ جو کچھ بلال شاہ نے دیکھا تھا اُس کے مطابق شیلا عرف تارا قریباً گیارہ بجے تک وجے آنند کے ساتھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر اُس نے زہر پلایا ہے تو اُس کا اثر دو ڈھائی بجے تک ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن زہر کا اثر پانچ بجے کے قریب ہوا تھا اور وجے کی موت اندازاً سات بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پولیس سرجن سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا ہو اور زہر خورانی کے بعد وہ زیادہ مشقت کا کام بھی نہ کرے تو زہریلے اثرات کے شروع ہونے میں دو سے تین گھنٹے کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

جو پارٹی وہاں بھیجی گئی وہ اُس شخص کو اپنے ساتھ ہی لے آئی جس کی کار میں مقتول امرتسر پہنچا تھا اور جو مقتول کا گہرا دوست بتایا جاتا تھا۔ اس شخص کا نام امر سنگھ تھا۔ امر سنگھ پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ پتہ چلا کہ امر سنگھ سے مقتول کا شدید قسم کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اور مقتول امر سنگھ سے کار مانگ کر نہیں بلکہ ایک طرح سے چھین کر لایا تھا۔ امر سنگھ نے مقتول کے چالیس پینتالیس ہزار روپے دینے تھے اور ادائیگی سے انکار کر رہا تھا۔ مقتول نے بڑودہ میں بھی اپنے ایک ہمراز دوست سے کہا تھا کہ اگر امر سنگھ نے رقم نہیں دی تو وہ اُس کی گاڑی ضرور لے آئے گا۔

ہم نے اس لائن پر تفتیش شروع کی تو چند ایک مزید انکشافات ہوئے لیکن قتل کا سرا پھر بھی ہاتھ نہیں آیا۔ اسی دوران میرے ہونہار مخبر بلال شاہ کی کوششوں سے تفتیش کا ایک اور راستہ کھلا۔ معلوم ہوا کہ اپنے قتل سے ایک روز قبل مقتول کا کچھ مقامی غنڈوں سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ یہ جھگڑا ایک کال گرل یعنی پیشہ ور لڑکی کی وجہ سے ہوا۔ مقتول نے اس لڑکی کو عیاشی کے لیے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر اس نے کوئی ایسی حرکت کی یا ایسی بات کہی کہ لڑکی بھڑک کر باہر نکل آئی۔ وہ اُسے واپس اندر کھینچنے لگا۔ اسی دوران لڑکی کا ایک ''نگران'' بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ وجے کی ہاتھا پائی ہو گئی۔ ہوٹل کے مالکوں نے اس معاملے کو فوری طور پر دبا دیا اور ''لڑکی والوں'' کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھیج دیا۔ میرے اے ایس آئی فرزند علی نے اس معاملے کی تفتیش کی اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا مقتول اور لڑکی والوں میں پھر بھی مڈھ بھیڑ ہوئی ہے یا نہیں۔

تین مختلف لائنوں پر دو ڈھائی ماہ اس کیس کی تفتیش جاری رہی لیکن کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں آیا۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ اگر مقتول کو گنے کے رس میں زہر ملا کر دیا گیا تو وہ رس اُس نے کہاں پیا۔ جس باغ میں اُس نے شیلا کے ساتھ چہل قدمی کی تھی وہاں آس پاس کوئی ''رس والا'' موجود نہیں تھا۔ راستے میں بھی بلال شاہ نے انہیں کہیں رس وغیرہ پیتے نہیں دیکھا۔ ہاں سوڈا واٹر انہوں نے ضرور پیا تھا..... تفتیش کے دوران ہی ایک دو دفعہ شیلا اور ماسٹر ریاض سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ شیلا عرف تارا کا پاؤں اب بھاری تھا۔ پھلدار شجر کی طرح وہ کچھ اور بھی خوشنما ہو گئی تھی۔ وہ پروانے کی طرح ماسٹر ریاض کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ اس کی ایک آواز پر ''آئی جی'' کہتی ہوئی لپکتی تھی''۔ آخری مہینوں کے باوجود وہ ماسٹر صاحب کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ میں اُسے دیکھ دیکھ کر سوچتا تھا کہ وہ واقعی ایک زبردست گجراتی فلموں کی ایک

کامیاب ہیروئن ہے اور اُس کی عقل مندی اور فن میں اُس کی سوجھ بوجھ کا ایک زمانہ اعتراف کرتا ہے۔ ایک عجیب، گورکھ دھندہ تھی یہ لڑکی۔

وجے آنند کو قتل ہوئے اب چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کوشش کے باوجود میں کوئی اہم سراغ نہیں پا سکا تھا اور اب مجھ پر ایک طرح کی مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ ایک روز میں کیس کی ادھوری فائل سامنے رکھے کمرے میں بیٹھا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دفعتاً ایک ایسی بات میرے ذہن میں آئی جو بہت پہلے آجانا چاہیے تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں اور میرا عملہ اب تک کیوں اس بات کو فراموش کیے ہوئے تھا..... تارا یعنی شیلا ٹھاکر جب مقتول وجے آنند سے ملنے چوری چھپے گاؤں سے روانہ ہوئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو اُسے بس پر چڑھا کر گاؤں واپس آگئی تھی عین ممکن تھا کہ وہ لڑکی تارا کی ہمراز ہو اور اُس سے کوئی اہم بات معلوم ہو سکے۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں جانڈی پورا گاؤں کے پٹواری کی بیٹی سیتا کا بیان لے رہا تھا یہی لڑکی تارا کو بس پر چڑھانے کے لیے پختہ سڑک تک گئی تھی۔ پٹواری پیارے لال بھی وہاں موجود تھے۔ سیتا کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور کچھ یہی حال پٹواری کا بھی تھا۔ صرف دو روز بعد سیتا کی شادی ہو رہی تھی۔ گھر میں مہمان آنا شروع ہو گئے تھے اور دلہن پولیس کے چکر میں پھنس گئی تھی۔ میں نے سیتا کی ''مجبوری'' سے بڑے مناسب طریقے سے فائدہ اٹھایا تھا اور پندرہ منٹ کے اندر اُسے سب کچھ اُگلنے پر راضی کر لیا تھا۔ پٹواری پیارے لال کو باہر بھیجنے کے بعد میں نے تارا کی ہمراز سیتا سے جو کچھ معلوم کیا وہ کچھ اس طرح تھا۔

''وجے آنند نے تارا کا کھوج لگانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ آخر ایک روز وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور اس حد تک کامیاب ہوا کہ ایک رات ماسٹر ریاض کے گھر پہنچ گیا۔ تارا اُسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر بے حد خوفزدہ ہوئی اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر بمشکل اُسے وہاں سے ٹالا۔ اگلی رات وجے پھر آدھمکا۔ اس نے نہ صرف تارا سے دست درازی کی بلکہ گھر سے باہر ملنے پر اصرار کیا۔ وہ دونوں برآمدے میں کھڑے تھے اور اندر کمرے میں تارا کا شوہر سو رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ شوہر کی آنکھ نہ کھل جائے تارا نے سب کچھ برداشت کیا اور وجے سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ کسی روز اُسے گھر سے باہر ملے گی۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ ماسٹر ریاض کو کسی کام سے لاہور جانا پڑا۔ اس کی روانگی سے صرف ایک رات پہلے وجے پھر دیوار پھاند کر ماسٹر ریاض کے گھر آیا۔ تارا نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کل نو بجے کے لگ بھگ اُسے امرتسر کے بس اڈے پر ملے گی۔ اگلے روز وہ وجے سے ملنے روانہ ہوئی۔ اس ملاقات کے لیے اُس نے خود کو بنایا سنوارا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی ایک تیاری کی تھی۔ زہر کی وہ پڑیا جو وہ اکثر اپنے ''اندرونی لباس'' میں رکھتی تھی اُس روز بھی اس کے لباس میں تھی۔ (ماسٹر ریاض کا اندازہ غلط تھا کہ وہ سنکھیا ہے۔ یہ وہی زہر تھا جس کی نشاندہی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہوئی تھی) یہ زہر تارا نے گنے کے اُس رس میں گھول دیا جو تھرماس میں بند وجے کی گاڑی میں پڑا تھا۔ اس رس کے چند گھونٹ وجے نے واپس ہوٹل میں جا کر لیے اور بعد میں تھرماس دھو کر اپنے سامان میں رکھ دیا۔ یہ تھرماس ہم نے دیکھی بھی تھی لیکن اُس وقت ہمارے ذہن میں نہیں آیا کہ یہ تھرماس اس کیس

میں ایک اہم ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے۔

.....دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی جو ماسٹر ریاض کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار بن کر آئی ہے قاتلہ ثابت ہو چکی تھی۔ اُسے گرفتار کر کے حوالات میں پہنچانا اور کیے کی سزا دلانا میرا اوّلین فرض تھا۔ تھانے آ کر میں تادیر سوچ میں غرق رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ماسٹر ریاض کے گھر جاؤں اور اُس سے کہوں کہ اُس کی بیوی وہ نہیں جو نظر آتی ہے..... اُسے معصومیت اور سادگی کا فریب دینے والی ایک 'قاتل اداکارہ' ہے اور میں اُسے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔

.....شام ۴ بجے تک مجھے اس کی گرفتاری کے لیے پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن چھ بج چکے تھے اور میں الجھنوں میں جکڑا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہر بار جب میں اٹھنے کا ارادہ کرتا تھا ایک دیواری میرے سامنے آ جاتی تھی۔ آخر میں نے ہمت کی اور دو ہیڈ کانسٹیبلوں اور ایک ہتھکڑی کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ ابھی میں گلی میں ہی پہنچا تھا کہ بلال شاہ قریباً بھاگتا ہوا آیا۔ اُس کی پگڑی گلے میں پڑی تھی اور رنگ فق تھا۔ ''خان صاحب! ماسٹر کی گھر والی مر گئی'' اُس نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں سکتے کی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ بلال شاہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا'' اُسے بچہ ہونے والا تھا۔ آج صبح سویرے ماسٹر ریاض اُسے تحصیل ہسپتال لے کر گیا تھا۔ سہ پہر ساڑھے تین بجے اُس نے دم دے دیئے''۔

میں نے کانسٹیبل بھگتو سنگھ کے ہاتھ میں جھولتی ہوئی ہتھکڑی کو دیکھا مجھے یوں لگا کہ یہ ہتھکڑی بے جان ہونے کے باوجود اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔

.....تارا مر گئی۔ اُسے مسلمانوں کی طرح نہلا دھلا کر اور کفن میں لپیٹ کر اُس کے مُردہ بچے سمیت منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ اُس کے دادا امیش رامپوری کو اُس کی موت کی خبر کر دی گئی تھی لیکن اُس نے اپنی لاڈلی پوتی سے کیا ہوا آخری وعدہ نبھایا۔ وہ پوتی کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوا۔ نہ ہی اُس نے اپنے داماد سے کسی طرح کا رابطہ کیا۔ جانڈی پورا میں میرے سوا کسی کو تارا کی کہانی کا علم نہیں تھا اور میں نے اپنے لبوں پر مہر لگا لی۔ بلال شاہ کو میں پہلے ہی رازداری کا پابند کر چکا تھا۔ اب میں نے پٹواری اور اس کی بیٹی سیتا کو بھی پابند کر دیا کہ وہ تارا کے سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں۔ وہ زبان کھولتے تو خود بھی پھنستے تھے لہٰذا انہوں نے زبان بند کر لی..... میں نے وجے آنند قتل کیس کی فائل بند کر دی.....اور یوں ماسٹر ریاض سمیت کسی کو علم نہ ہو سکا کہ وجے کی موت کی ذمے دار تارا تھی۔ شاید کبھی نہ کبھی یہ بات ماسٹر ریاض کے سامنے کھل ہی جاتی لیکن کچھ عرصے بعد وہ خود ہی جانڈی پورا چھوڑ گیا۔ تارا کی یادیں سینے میں بسائے اُس کے غم آنکھوں میں چھپائے وہ ایک روز یوں سر جھکا کر گاؤں سے نکلا جیسے کہیں سے جنازہ نکلتا ہے۔ پھر جانڈی پورا میں کبھی کسی نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ جاتے جاتے اُس نے اپنا سکول گاؤں کی پنچائیت کے سپرد کر دیا تھا اور سکول کی پیشانی پر ایک سبز رنگ کا بورڈ لگوا دیا تھا۔ اُس پر لکھا تھا ''طاہرہ ہائی سکول''۔

ماسٹر ریاض کو ہوشیار چالاک اور پڑھی لکھی عورتوں سے نفرت تھی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی واحد لڑکی ہوشیار بھی تھی' چالاک بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی تھی۔ ماسٹر ریاض پھر بھی اس سے پیار کرنے پر..... اور ساری زندگی اس کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور ہوا۔ شاید یہی قدرت کی کاریگری ہے۔

.....❁.....❁.....

عزت کا رکھوالا

ناز زمان

"اس معاشرے کی کہانی جس میں عورت کو وہ حیثیت نہیں دی جاتی، جس کی وہ حق دار ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس ظالم معاشرے میں وہ لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کی غیرت عورت کیساتھ یہ سلوک گوارا نہیں کرتی۔"

1945ء کی بات ہے میرا تبادلہ امرتسر سے اٹاری کے علاقے میں ہوا تھا۔ میرے یہاں قیام کے دوران ایک ایسی واردات ہوئی تھی جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میرے تھانے کے قریبی گاؤں برج میں شاید یہ پورا نام مجھے یہی یاد آتا ہے، قتل کی واردات ہوئی۔ زمیندار گورو بخشن سنگھ کی حویلی کی دیوار کے اندر کی طرف اس کے سوئے ہوئے دو بیٹے قتل کر دیئے گئے تھے۔ خنجروں سے ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ اطلاع ملنے پر میں موقع واردات پر پہنچا تو لاشوں کے گرد گھر والے چیخیں مار رہے تھے۔ لاشوں کے گلے سے لے کر چھاتیوں کے درمیان تک زخم کی گہری لکیر تھی۔ قاتل نے بہت ہی وحشت سے کام لیا تھا۔ گورو بخشن سنگھ بڑی پہنچ والا سکھ تھا۔ جیسے کہ دیہاتی علاقوں میں کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کو تحصیل جانے پر کرسی پیش کی جاتی ہے یعنی افسر اس کی قدر کرتے ہیں۔ اسی طرح گورو بخشن سنگھ بھی افسروں سے یاریاں رکھنے والا آدمی تھا۔ جس وقت میں لاشوں کا معائنہ کر رہا تھا وہ بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی رشتہ دار عورتوں کو سنبھال رہا تھا۔ اس کی پگڑی کھل کر گلے میں پڑی تھی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ اندر سے تو اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہوگا پر اوپر سے وہ برداشت والا آدمی نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ گورو بخشن سنگھ افسروں سے یاریاں رکھنے والا آدمی تھا اور اس علاقے میں آنے کے چند دنوں بعد ہی مجھے اس کے شجرے کا پتہ بتا دیا گیا تھا پر اس میں جاگیرداروں والی روایتی قسم کی اکڑ نہیں تھی۔ میں موقع واردات پر پہنچا تو اس نے اپنی عورتوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور خود زمین پر ہی بیٹھ گیا اس کے ہاتھ ایک لڑکے کی چارپائی کے پایوں پر رکھے ہوئے تھے اور گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے اس کے ساتھ افسوس کیا وہ دھاڑیں مارنے لگا۔ میں نے اسے بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی چارپائی تک لے گیا۔ فوری کام تو لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرانا تھا گورو بخشن سنگھ نے کورا جواب دے دیا "خان صاحب بنا شک کچھ نہ کرو۔ میں تاں مر مک گیا ہاں۔" وہ اس علاقے کی ٹھیٹھ پنجابی میں کہنے لگا۔ "آپاں خود وی کھلوواں گے۔"

وارث راضی نہ ہوں تو میں بھی پوسٹ مارٹم پر

زور نہیں دیتا تھا مگر وہ ہر قتل تھا کارروائی ضروری تھی۔ یہ بہت ضروری ہوتا ہے پھر میں نے تو اپنی تفتیش کرتا تھی میں تھوڑی دیر لاشوں کا معائنہ کر کے اور نقشہ بنوا کر وہاں سے نکل آیا۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں کے انگریز پولیس افسر قتل اور ڈاکے کی واردات پر بہت سخت نظر رکھتے تھے۔ آج کل ہر طرح کا اسحول جاتا ہے اس زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کارتوسی رائفلیں لوگوں کے پاس ہوتی تھیں۔ چاقو، خنجر، چھری اور ڈانگ یہی ہتھیار قتل ڈاکے میں ساتھ ہوتے تھے۔ دیہی علاقوں میں چوری چکاری، پانی کی تقسیم پر لڑائی ہوتی اور لاشیں گرتی تھیں۔ زمیندارہ کرنے والے سکھ بھوتر جاتے تو وہ ہیرے تبرے تک ہو جاتے۔ میلوں پر شراب پی رکیس کھول کر ناچنا، خرمستی اور دنگا فساد ہوتا تھا۔ سکھ نوجوان لڑائیاں اٹھانے میں کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ اسے مردانگی اور منڈے کے جوان ہونے کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ جس گھر کا نوجوان سکھ لڑکی نکال لاتا اسے گھر والے لعن طعن نہیں کرتے تھے گھبرو ہونے پر فخر کرنے لگ جاتے۔ دوسرا گھر لڑکی گرانے کی تیاریوں میں لگ جاتا۔ پنچایتی فیصلے وقتی طور پر کام آتے تھے دلوں کی نفرت ہر روز بڑھتی جاتی تھی۔ گور بخش سنگھ کے گھر سے تھانے واپسی پر میں نے بیٹھ کر اطمینان سے سوچنا شروع کر دیا۔ گور بخش سنگھ ایک باوقار سکھ تھا۔ اچھے گھریلو والا سر پر سفید پگڑی ہوتی حالانکہ زیادہ تر سکھ کانی پگڑیاں باندھتے تھے۔ اس طرح اس کی نفیس طبیعت ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا کسی سے جھگڑا تھا بھی تو اس کا چرچا نہیں ہوا تھا۔ سفید پگ خوبصورت تنی ہوئی سفید مونچھیں، سرخ چہرہ، پھریرا اور تھوڑا سا بھاری جسم، لمبا قد، پاٹ دار آواز، ایک بارعب آدمی تھا تین لڑکے تھے جن میں سے دو تو قتل ہو گئے تھے ایک باقی تھا۔ رگھوبیر سنگھ وہ بھی قد کاٹھ، مردانہ رعب والا باوقار تھیں پینتیس سالہ نوجوان تھا۔ مجھے اس تھانے میں آئے ایک سال ہو چلا تھا اور میں نے علاقے میں کافی جان پہچان حاصل کر لی تھی۔

بلاں شاہ میرے ساتھ ہی تھا۔ بیوی بچے اس کے امرتسر میں ہی تھے اور وہ ان سے مل کر آ جاتا تھا۔ میں نے اپنے مخبر بلائے اور ان میں سے ایک سے جو دوسروں سے زیادہ ہوشیار دکھائی دیتا تھا گور بخش سنگھ کے گھر کے بارے میں معلوم کیا۔ یہ کی کمین سکھ تھا جو گور بخش کی زمینوں پر فصلوں کی کٹائی بھی کرتا تھا اور گھر کے کام کاج کے لئے حویلی بھی جاتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ گور بخش سنگھ ہے تو کڑوے مزاج کا پر اس نے کبھی کسی کے ساتھ جبر زیادتی نہیں کی۔ البتہ اس کا بڑا بیٹا رگھوبیر سنگھ طبیعت کا سخت اور اُلٹے سیدھے کام بھی کر لیتا تھا۔ مزارعوں کو بے دریغ مارتا تھا اور اپنے جوان مرد ہونے کا ثبوت بھی دیتا رہتا تھا۔ انہی دنوں گاؤں کی ایک لڑکی بلوند کور کے ساتھ لمبے یارانے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ بلوند کور جب اس کے ہاتھ چڑھی تھی تو دلبر سنگھ ساندھوں کی منگیتر تھی۔ دلبر سنگھ چار سال ہوئے گھر سے غائب تھا جب بلوند کور اور رگھوبیر کے تعلقات چھپے نہ رہے تو دلبر سنگھ گھر سے غائب ہو گیا پتہ نہیں اسے منگیتر کے زمیندار کے بیٹے کے ساتھ تعلقات پر دکھ ہوا تھا یا وہ برداشت نہ کر سکا کیوں کہ گور بخش سنگھ کے گھرانے سے ٹکر لینا آسان نہ تھا۔ اس لئے بے عزتی برداشت نہ کرتے ہوئے دلبر علاقہ ہی چھوڑ گیا۔ رگھوبیر جیسے زمینداروں کے لڑکے تو شادیوں کے چکر میں نہیں پڑتے انہیں شادی کے بغیر ہی لڑکیاں مل جاتی ہوں تو وہ بدکاریوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ بلوند اس کے دل سے اتر گئی دلبر کا ماموں بھی گھبرو جوان تھا طبیعت کا اکھڑ اور ہتھ چھٹ تھا۔ اپنے بھانجے کی یہ خواری اور ذلت اس سے برداشت نہ ہوئی۔ اس

نے رگھوبیر سنگھ کو ایک دن موقع پا کر گھیر لیا۔ کرپان نکال کر رگھوبیر پر حملہ کر دیا۔ رگھوبیر بھی آپ نے دیکھ لیا ہے وہ بھی تگڑا آدمی ہے، اس نے اپنے ساتھ آنے والے بدمعاش قسم کے کامیوں کو ہاتھ اُٹھا کر حملے سے روک دیا اور اپنے نیفے میں اڑسا ہوا چاقو نکال کر حملہ آور کو وہیں ختم کر ڈالا۔ آپ سے پہلے یہاں کے تھانہ انچارج رگھوبیر کے دوست تھے ایک تو پولیس کا دبدبہ دوسرے گور بخشن سنگھ کی علاقے میں ٹوہر، اس معاملے پر مٹی ڈال دی گئی۔ سارے علاقے کو کان ہو گئے۔ اب تو گور بخشن سنگھ کے گھرانے کی عزت ایک اور وجہ سے بھی ہونے لگی۔ رگھوبیر سنگھ شریف باپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی دہشت کی علامت بن گیا تھا۔

دلبر سنگھ کو غائب ہوئے چار برس ہو گئے ہیں رگھوبیر کی دلچسپی کم ہوئی تو بلوند کور کو بھی ہوش آ گیا اور پھر وہ دن اور آج کا دن اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ گاؤں والے سارے یہ بات جانتے ہیں پر کسی کو کہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

میں نے اس مخبر سے کہا کہ وہ اردگرد نظر رکھے اور یہ معلوم کرے کہ اس قتل میں دلبر سنگھ کا کوئی ہاتھ ہے یا نہیں۔ مخبر کو فارغ کر کے میں ایک بار پھر گور بخش کی حویلی چلا گیا۔ جس جگہ چارپائیوں پر لاشیں پڑی تھیں وہاں زمین پر خون کے چھینٹے تھے۔ حویلی کی باہر والی دیوار پکی ضرور تھی لیکن اس پر گرد کی تہہ جم چکی تھی۔ اس پر دو جگہ ساتھ ساتھ پیروں کی رگڑ کے نشان تھے۔ پھر بھی ان میں اتنا فاصلہ ضرور تھا کہ دونوں ایک آدمی کے پیروں کے نشان نہیں ہو سکتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ حویلی کے اندر ایک نہیں دو آدمی اُترے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک نے یا پھر دونوں نے الگ الگ قتل کیا تھا۔ ان کی واپسی بھی اسی طریقے سے ہوئی تھی۔ میں نے گور بخشن سے چند سوال کیے اور اس کے بیٹے رگھوبیر سنگھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ گور بخشن نے ایک نوکر کو اشارہ کیا جو تھوڑی دیر بعد رگھوبیر کو بلا لایا۔ رگھوبیر نے اندر آ کر مجھے ایک نظر دیکھا اس کی آنکھوں میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی پر وہ غضب کا ایکٹر تھا۔ ایک دم میری طرف بڑے پیار سے جھکا یوں ظاہر کیا کہ اسے بھائیوں کے قتل کا بڑا دُکھ ہے اور میری مدد پر ہی بھروسہ کر رہا ہے۔ اس نے میرے گھٹنے چھونے چاہے میں نے اس آدھے جھکے ہوئے کو ہی کندھوں سے پکڑ لیا۔ میری ہی عمر کا جوان تھا مجھے شرم محسوس ہوئی رگھوبیر میرے گلے لگ گیا۔ اس کا باپ اپنے کُرتے کے ایک کونے سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ رگھوبیر نے میرے کان سے اپنا منہ لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔ انسپکٹر خان میں کل خود تھانے آ کر بات کروں گا اس وقت خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے ہٹایا اور اس کے بازوؤں پر دونوں ہاتھ رکھے رکھے اس کی آنکھوں میں بڑی سختی سے دیکھا جیسے بھی اس طرح کی بات میں نے جس منہ سے سنی تھی وہ منہ میرے مکوں کی وجہ سے شناخت کے قابل نہیں رہتا تھا۔ مگر میں نے پتہ نہیں کیوں اس نوجوان کا لحاظ کیا جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے وہ بڑا غضب کا ایکٹر لگتا تھا۔

ایک دم اس کے چہرے پر تیمی برسنے لگی۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ میں نے اس کے ساتھ تعزیتی رسمی جملے بولے اور تھانے واپس آ گیا۔ مجھے اس کی تھانے آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ میری طبیعت سخت اُلجھی ہوئی تھی میں نے اس مخبر کو بلوایا جو مجھے گور بخشن کے اس بیٹے کی کہانی سنا چکا تھا۔ اسی دوران محرر ایک ادھیڑ عمر آدمی کو اپنے کمرے سے نکال کر میری طرف لایا۔ محرر کے ہاتھ میں ایک بٹوہ تھا میرے پاس آ کر اس نے سلام کیا اور بتایا کہ یہ جیب کترا تانگوں والے اڈے سے کل پکڑا گیا ہے۔

پہلے کسی آدمی کی جیب کو کتر چکا تھا اور اب ایک دوسرے آدمی کو سلائیاں پھیرنے لگا تھا کہ مالک نے پکڑ کر اسے پولیس کے سپاہی کے حوالے کردیا جو اسے تھانے لے آیا۔ رات بھر اس نے حوالات میں رکھا تھا۔ یہ جیب تراش خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس فن میں عمر گالی ہوئی تھی۔

جیب تراشوں کی دنیا بڑی دلچسپ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ بڑے فنکاروں کا پیشہ تھا۔ وہ لوگ اس کام کے اتنے ماہر تھے کہ آدمی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ اس کے پاس کتنی رقم ہے۔ جیب کترا شکار کا پیچھا شروع کردیتا تھا اور شکار ہوشیار ہوتا تو یہ کام کرنے والا جیب کترا اسے اپنی حدود سے باہر نکلتا دیکھ کر اسے دوسرے جیب کترے کے ہاتھ فروخت کردیتا تھا جو اسے اپنی حدود کے اندر شکار کرلیتا تھا۔ بٹوا نکالنا بلیڈ سے بٹوا اور بیگ کی صفائی کرنا ہوتا ہے۔ جیب کترے اپنی ہاتھوں کی انگلیوں کو سلائیاں کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی جیب محفوظ نہیں ہوتی۔ قمیض کی سینہ والی جیب' کھیسہ' کوٹ کی اندرکی دائیں طرف والی جیب ان کے لئے بہت آسان ہوتی ہیں۔ جن آدمیوں کے کندھوں پر پٹکا اس طرح رکھا ہو کہ کرتے کی اوپر والی جیب ڈھکی ہو وہ بھی آسانی سے جیب کٹوا لیتے ہیں جس آدمی نے چادر اوڑھی ہو وہ بھی آسان شکار ہوجاتا ہے۔ جس آدمی نے رقم سوکے میں ڈالی ہو اور قمیض پہنی ہو اور قمیض کا پچھلا حصہ نیچے لے کر بیٹھا ہو اس کی سوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ بعض استاد تو نوٹ نکالنے کے بعد کاغذ بھی شکار کی جیب میں رکھ دیتے ہیں کہ اگر سفر کے دوران جیب کٹنے کا اسے احساس نہ ہو کہ جیب کٹ چکی ہے۔ سوکے کی جیب میں پیسے رکھ کر اوپر سے قمیض پہننے اور اس کا پچھلا حصہ نیچے لے کر بیٹھنے والے مسافر سے کہتے ہیں کہ میں بھی ذرا شیشہ کھول دیں یا اس کے پاؤں کے پاس پیسے گرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا مجھے میرے پیسے آپ کے پاؤں کے پاس سے اٹھا لوں۔ جب مسافر ذرا سا اٹھتا ہے تو اس کی جیب پیچھے سے نکال دیتے ہیں اور پھر اس کے سو کے تک مڑ بلیڈ لے جانا آسان ہوجاتا ہے۔ عام طور پر یہ بھیڑ والی جگہوں میں کام کرتے ہیں جہاں لوگ جلدی یا رش کی وجہ سے بوکھلائے ہوتے ہیں۔ میں آپ کو جیب کتروں کی باتیں سنانے لگ گیا ہوں۔ محرر جس جیب کترے کو پکڑ کر میرے پاس لایا اس کے پاس بٹوے میں کچھ نوٹ اور بڑی سی ایک تصویر بھی تھی۔ میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ جس مخبر کو بلوایا تھا وہ آگیا۔ میرے ہاتھوں میں تصویر دیکھ کر وہ چونک گیا۔ جناب یہ تصویر تو بلوندر کور کی ہے۔ اس نے بس اتنا ہی کہا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں جیسے گھنٹی بج گئی۔ میں نے جیب کترے کو گھورا "اوئے تم نے جس آدمی کی جیب سے یہ بٹوہ اڑایا ہے اس کا ذرا حلیہ بتاؤ اور وہ کہاں تھا؟"

جیب کترے نے پتہ نہیں میری اس بات کا کیا مطلب لیا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ جیب کٹوانے والا میرا یار دوست یا عزیز ہوگا وہ میرے پیروں پر گر گیا۔

"جناب معاف کریں غلطی ہوگئی ہے مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ ۔"

میں نے اٹھ کر اسے پرے دھکیلا۔ اگر یہ تصویر والا بٹوہ دیوندر سنگھ کا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی پراسرار گمشدگی کے بعد واپس آگیا ہے اور اس نے پنجاب پولیس کے خوار ہونے کا بدلہ لینے کی خاطر گھوبیر سنگھ کے بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ میں نے تھانے کے صحن میں کھڑے کھڑے محرر سے کہا کہ اس جیب کترے کے ساتھ وہ کانسٹیبل میرے ساتھ گھر چلے جو تانگوں کے اڈے کی طرف جاتا ہے۔ میں نے

جیب کترے کو جھنجھوڑا "بتاؤ تم نے کب نکالا تھا؟"

وہ بولا "کل صبح سویرے ہی۔ لیکن نکالا نہیں اور جس کا تھا بڑا ہوشیار تھا۔ میں نے اپنا حلیہ بدل رکھا ہے پر لگتا ہے کہ وہ مجھے پہچان چکا تھا اس لئے کہ میں بھی اسی کے گاؤں کا رہنے والا ہوں اور وہ بھی دیکھ بھال کر ہاتھ ڈال رہا تھا جان بوجھ کر مجھے موقع دے رہا تھا کہ میں کوئی جیب کاٹ لوں ایسا شکار دیکھ کر تو ہر ایک کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی ہے جو خود ہی موقع بھی دے رہا ہو۔ بہرحال مجھے شک نہیں تھا وہ دہر ہی ہے بس یقین ہو گیا تھا میں نے اسے پوچھ لیا کہ تم دہر ہو؟ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا بڑی دیر بعد ملے ہو گاؤں کا حال وغیرہ بتاؤ۔ وہ مجھے تانگوں والے اڈے تک چھوڑنے کے ہوٹل میں لے گیا اور کھانا کھانے کا کہا۔ جب ہم ہوٹل کے اندر جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ کونے کے ٹیبل پر ایک فوجی جیپ کھڑی ہے جس میں سفید چمڑوں میں دو آدمی بیٹھے جو کھانے سے کھا رہے تھے دلبیر نے ان دونوں کی طرف ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا اور ہوٹل کے دروازے پر رک گیا۔ دونوں جیپ سے اتر کر آگئے۔ دہر نے ان میں سے ایک کو کہا کہ صبح دن چڑھنے سے پہلے یہاں آ جانا۔ وہ آدمی سر ہلا کر جیپ کی طرف چلے گئے۔ دہر مجھے ہوٹل سے گیا اور پھر کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد میں پیسے دینے کا خیال کر کے جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا تھا کچھ دیر پہلے ہی میں نے ایک آدمی کی جیب صاف کی تھی دہر نے مجھے ... وہ نکال کر ... لگا۔ اور ہاتھ صاف کرو ... میں سے پیسے نکالو۔ میں جی وہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ وہ میں خانے میں جا رہا ہوں گا اور مجھے وہاں سے پکڑ ... ہے تھا۔ میں نے ہاتھ میں تھا لوگ جمع ہو گئے اور وہ مجھے ان سے ... کے وہاں سے نکل گیا۔ ... آدمیوں میں سے ایک سے میرا ...

پکڑا اور یہاں تھانے چھوڑ گئے۔ حیران ہوں کہ آخر دہر کو مجھ سے کیا دشمنی تھی اور مجھے اس نے اندر ہی کرانا تھا تو ہتھوڑا کیوں مجھے دے گیا؟ شاید وہ ثبوت میرے پاس رکھنا چاہتا تھا؟"

جو بات اس جیب کترے کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی میں سمجھ چکا تھا۔

دہر یہاں واردات کرنے آیا تھا۔ تانگوں کے اڈے پر اس جیب کترے نے اسے پہچان لیا دہر کو ڈر تھا کہ شاید یہ دشمنی جانتا ہے اس لئے رگھوبیر سنگھ کو نہ جا کر بتا دے اس لئے اس نے نہایت چالاکی سے اسے تھانے پھنسوا دیا اور رات کو وہ رات کر گیا۔ میں نے محرر سے کہا کہ جیب کترے کو حوالات میں بند کر دو۔

اگلے دن میں امرتسر چھاؤنی جا پہنچا جیب کترے کے بیان سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ دلبیر کے ساتھی ایک فوجی جیپ میں تھے۔ ان دنوں کی عام آدمی کے پاس جیپ کا ہونا؟ آج کل تو فوجی رنگ کی جیپیں بھی عام آدمیوں کے پاس نظر آ جاتی ہیں۔ ان دنوں اس کا سوال ہی نہ تھا۔ چھاؤنی میں کس یونٹ میں جانا ہے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بلال شاہ نے کہا کہ اس کا ایک واقف کار سپاہی ہے وہ اداری کا ہی رہنے والا ہے امرتسر چھاؤنی میں ہی پیدل فوج کی بارکوں میں رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس آ گئے۔ برچ میں اس کی ماں کی بہن رہتی تھی اور وہ رشتہ دار بن چکا تھا۔ ہم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ہم کس کام سے آئے ہیں۔ بس شاہ نے صرف اس سے ملنے کا بہانہ کیا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے خود ہی بتا دیا کہ اداری سے بہت سے جوان اس چھاؤنی میں ہیں اور برچ کا دہر سنگھ تو اس کی یونٹ کے میجر کا ذاتی ڈرائیور ہے۔ میں نے اس سے یونٹ کا اور میجر کا نام پوچھ کر باتوں باتوں میں معلوم کر لیا۔ میجر مہمان تھا۔ پوٹھوہار سے ملنے کا تھا بہت دیر مشہور تھا۔ اس سپاہی نے ہماری بڑی مہمان نوازی

کی اور باہر اڈے تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ ہم نے اسے اندھیرے میں رکھا۔ وہ اڈے سے گیا اور ہم واپس چھاؤنی پہنچ گئے۔ اس یونٹ کا دفتر بند تھا پتہ چلا کہ میجر صاحب ٹینس کورٹ میں ملیں گے۔ ایک سپاہی ہمیں راہ دکھاتے ساتھ ہو گیا۔ ٹینس کورٹ میں میجر سے ملاقات ہوئی میں نے اپنا تعارف کرایا اور پوری بات بتانے کے بعد شک ظاہر کیا کہ دبیر واردات کر کے دوبارہ ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہے۔ ٹینس کورٹ کے کنارے پڑی کرسیوں پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ بیرے نے میجر کے سامنے پانی لا رکھا اور پسینہ خشک کرنے کے لئے تولیہ دیا۔ میجر نے تولیہ ایک بار اپنے منہ پر پھیرا اور پھر یکایک غصے میں آ کر زمین پر دے مارا اور میری طرف چہرہ کر کے کہنے لگا، خان صاحب دبیر واردات کے لئے گیا تھا یا نہیں پر وہ مرد آدمی ہے اور مرد ہی یہ کام کرتے ہیں۔" میجر کا رویہ بڑا فرینڈلی قسم کا تھا۔ تقسیم سے قبل فوجی افسر خود کو بڑی اچھی طرح پولیس کے مقابلے میں اعلیٰ سمجھتے تھے۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا کہ میجر صاحب مجھے گزارش تو کرنے دیں اول تو مجھے چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر کے پاس جانا چاہئے تھا وہ خود ہی تحقیق کرتا پر میں نے سوچا کہ چلو آپ سے ہی بات کروں لیکن آپ سیدھی بات نہیں چاہتے تو میں کمانڈنگ افسر سے بات کرتا ہوں۔ میں نے اندھیرے میں ہی تیر پھینکا تھا کہ کمانڈنگ افسر کے پاس جانا ہوتا تو پہلے میں باقاعدہ ایف آئی آر درج کرتا پھر اپنے میں پتہ تب کاغذی کارروائی پہنچتا پھر فوجی افسر تک بات جاتی اور انکوائری کے بعد ہی دبیر کو اوپری تحویل میں دیا جاتا لیکن میجر بیرونی دنیا میں آ کر رہنے لگا تھا یہ آپ کا شک ہے۔ پتہ بھی نہیں کہ اس نے واقعی واردات کی ہے یہ وہ ظلم کرنے والے کو [illegible]

پھر بھی بحث کر لیں گے، مجھے دبیر سے ملوائیں۔ میجر نے اسی بیرے سے کہا کہ جاؤ ڈرائیور کو اس کے کوارٹر سے لاؤ۔ بیرہ چلا گیا اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ بیرہ کچھ دیر بعد ہی واپس آیا لیکن دبیر کے بغیر اس نے بتایا کہ دبیر کا کوارٹر خالی پڑا ہے ایسا لگتا ہے وہ یہاں سے بھاگ ہی گیا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ یہ لوگ ڈرامہ کر رہے ہیں۔ آج کل تو پتہ نہیں کیا حال ہے لیکن تقسیم سے پہلے کی بات یہ ہے کہ جن فوجی سپاہیوں کی اپنے علاقوں میں دشمنیاں ہوتی تھیں وہ خود یا ان کے گھر والے انہیں فوج میں بھرتی کروا دیتے تھے۔ تاکہ وہ علاقے سے نکل جائیں اور ان کی جان بھی محفوظ رہے جس طرح وہ میجر دبیر سنگھ کی طرف داری کر رہا تھا اس سے میرا یقین ہو گیا کہ دبیر سنگھ گاؤں سے غائب ہو کر فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔ اس میجر کا ڈرائیور تھا۔ اس نے میجر کو اپنی مظلومیت کی کہانی سنائی اور اس نے ہمدردی میں اس کا پورا ساتھ دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یونٹ میں اسے حاضر دکھایا ہو اور اسے وہاں سے کھسکا دیا ہو کہ جاؤ واردات کرنے واپس آ جاؤ۔ اس سے پہلے کئی ایسی وارداتیں ہو چکی تھیں کہ فوجی جوان رات کو بیرکوں سے نکل اور اپنے مخالفوں کو ٹھکانے لگا کر صبح یونٹ میں واپس آ گیا۔ اس کے ساتھی اور افسر اسے تحفظ دیتے تھے۔ فوجی سپاہی اور افسر ہوتے ہیں وہ قانونی چکر میں پڑ کر انصاف نہیں مانگتے ظلم کرنے والے کے اندر اپنے ہاتھ سے گولی اتارتے ہیں۔ حبیب خٹک نے بتایا تھا کہ وہ کے ساتھ فوجی جیپ میں دو اور آدمی تھے۔ وہ یقیناً اس کے ساتھی ہوں گے ہو سکتا ہے میجر کو بھی پتہ ہو لیکن میں کاغذی کارروائی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں [illegible]

بعد اس کے دفتر میں جانے کی اجازت ملی۔ ایس ایس پی رام سنگھ [illegible] افسر تھا۔ علاقے کے تھانیداروں کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور یہی اس کی اچھی افسری کا راز تھا۔

میں نے سلام کیا اس نے مسکرا کر جواب دیا اور رسمی باتوں کے بعد میں نے تمام کہانی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر فون اٹھا کر فوج کے ایریا کمانڈر سے بات کرنے لگا۔ تقسیم سے قبل فون کی یہ سہولت بڑے بڑے افسروں تک ہی محدود تھی۔

فون بند کرکے ایس ایس پی نے کہا کہ مجھے رپورٹ مل جائے گی تم اس کی پوری تفتیش کرو تم پر کوئی دباؤ ہو تو مجھے بتانا۔ پھر وہ مسکرایا "تم ویسے بھی ذمہ دار آدمی ہو مجھے پتا ہے کہ تم وہی کرتے ہو جو تمہارے دماغ میں آتی ہے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا، اسے سیلوٹ کیا اور ہم واپس اپنے تھانے آ گئے۔ مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ دبیر چھاؤنی میں نہیں اس نے جو کام کرنا تھا کرکے اب فرار ہو چکا ہے دیکھنا یہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اسے زمین کے اندر سے بھی نکال لاؤں گا۔ وہ پولیس کے لیے بھی مفرور تھا اور خود فوج کے لیے بھی بھگوڑا تھا۔ میں نے [illegible] سنگھ کے گھر سے [illegible] مخبر کا وسیلہ اور رکھوبیر اور جوندر کے عشق [illegible] راستے میں بتانے والے مخبر سے کہا کہ دبیر کے [illegible] رشتہ داروں کی ٹوہ لگائے۔ میرا تجربہ ہے کہ [illegible] مفرور ہونے والے مجرم اپنے کسی نہ کسی رشتہ دار [illegible] ضرور رابطہ کرتے ہیں اور کسی سے ملتے بھی ضرور ہیں۔ [illegible] سنگھ نے چھاؤنی سے بھاگنے کے بعد پہلا [illegible] چچا [illegible] کے ساتھ کیا۔ مخبر بہت چالاک [illegible] نے ملاقات کا وقت بھی جان لیا تھا۔ [illegible] وقت [illegible] کھوہ پر ہوگی [illegible] جس [illegible] مخبر [illegible] شام [illegible] وہاں شام [illegible] کھوہ [illegible] کے ساتھ [illegible] بیٹھ [illegible]

[illegible] فصل [illegible] نہیں ہوئی [illegible]

جیسے جو آدمی بھی نظر آتا ہے۔ اس لیے ہم فصل [illegible] راز تھے۔ کافی اندھیرا ہونے کے بعد ایک آدمی اس کھوہ [illegible] کی طرف بڑھا۔ مخبر کو میں نے اپنے مخالف سمت والے کھیت میں لٹایا ہوا تھا شناخت اس نے کرنا تھی۔ میں نے [illegible] اس کے پیچھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ آدمی [illegible] میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں کھوہ سے نکلنے والا پانی ایک [illegible] کے ذریعے [illegible] جاتا ہے چونکہ وہاں مرد عورتیں نہا لیتے ہیں اس لیے اندر [illegible] چھوٹی [illegible] بنی ہوتی ہیں۔ میں نے [illegible] کی طرف [illegible] تک اندر ایک ہی آدمی تھا جب تک دوسرا نہ آ جاتا ہم نے خاموش رہنا تھا۔ ہمیں [illegible] انتظار کرنا پڑا دوسرا آدمی بھی ادھر ادھر دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ [illegible] کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور [illegible] کی طرف ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھ کر ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ میں [illegible] پیچھے [illegible] دروازے میں [illegible] دونوں آدمی [illegible] ایک [illegible] تھے [illegible] ان میں [illegible] خوف [illegible]

[illegible] کا [illegible] مجھے مخبر [illegible] معلوم [illegible] ایک [illegible] [illegible]

Scanned By Amir

قوی ہیکل۔ میں نے سوچا رہا اور نگاہ بھر کر دیکھا تو اس کے پیچھے کئی اور دوست آ رہے تھے جو ہمارے دوستوں کو تھانے لے جا رہے تھے۔ حبیب کو دیکھ کر وہ سب نگاہ کر دیکھنے کے سامنے کھڑا ہو گیا تو وہ سب سر جھکائے ہوئے۔

تھانے میں دیکھ سے زیادہ ہوشیاری نہیں دکھائی۔ اسے کھوہ پر ہی پتا چل گیا کہ گاؤں کا کچھ ہو گیا ہے۔ اس نے مزید دیکھے بغیر بھاگنا شروع کر دیا۔ "میرے بچوں کی جان بلوندر کور میری منگ ہے۔ اسے پہلے میں بہت پسند کرتی تھی اس نے میرے ساتھ یہ دھوکا کیا ہے کہ اس کی شادی ہوگی تو صرف میرے ساتھ۔ چچا کے پاس زمین نہیں دوسروں کی زمینوں پر مزدوری کر کے گزارہ کرتا تھا۔ ایک دن چچا کی روٹی لے جاتے ہوئے رگھوبیر نے اسے دیکھا اور اس کے بعد اس نے میرے چچا کی مہربانیوں شروع کر دیں۔ اسے لالچ دیا کہ اپنی بیوی کو حویلی میں کام کے لئے بھیج دے۔ رگھوبیر کی نیت اچھی نہیں تھی۔ چچا نہ مانا پر رگھوبیر نے پیچھا نہ چھوڑا اور مجبور کرتا رہا۔ ایک سال تو یونہی ہوتا رہا۔ اسے کرتا موں کا آسرا تھا میں کے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا چھوٹی موٹی پوری چکارتی اور وہ سیری کرتے تھے۔ بچے مرنے کے بعد گھر کی حالت پتلی ہوئی تھی۔ بلوندر بھی رگھوبیر کی طرف سے سخت تنگ تھی۔ وہ اسے حل کرتے کہتے تھا کہ وہ اس کی حفاظت میں آجانے سے نوش رہے گا ویسے جیسے فتر جیتے ستاتے رہتے گا۔ آپ جو پیتے ہیں تی غریب آدمی مزدور ہوتا ہے۔ رگھوبیر کو میں تو کر سکتا تھا کی اور طرح اس سے گرفتیں سے سکتا تھا۔ تو اس سے نہ لیا کہ چچا کی بیٹ ہو گا۔ بلوند اور میں دونوں میں بڑا ہونے کی وجہ سے میں ہی بچھ بچھ نہ آتی تھی۔ رگھوبیر سے نکل ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کے آدمی تھا۔ اور وہ ہوشیار ہو گئے گاؤں سے آتا تھا۔ مجھے دیکھ کے رہنے سے بعد میں بچھ پر بہت شک کرنے لگے تھے اور ہوشیار رہتے تھے۔ میں نے اس حبیب کے پیچھا نہ چھوڑا

بن گئی تھی۔ حویلی ذات تھی کہاں تک میرا انتظار کرتی میں مزدور میں فوجی بھرتی کے افتتاح پہنچا۔ میری صحت اچھی تھی مجھے بھرتی کر لیا گیا۔ میں نے ڈرائیونگ کا کام سیکھا اور ان افسروں کے ساتھ ڈیوٹی پر رہا۔ ایک میجر صاحب مجھ پر مہربان ہو گئے میری صحت کی بڑی تعریف کرتے۔ میں دن رات انتظام کرتے میں بن رہا تھا میں نے میجر صاحب بلوندر سے بچھڑنے اپنے ماں باپ کے مویشیوں کے معاشیاں سب کچھ سنایا۔

گزرتے مجھے فوج سے واپس آنے کی بڑی نصیحت کی۔ اب میں وہ بھولا بھالا دیہاتی نہیں تھا۔ فوج کی روٹی تھی حبیب میں پلے تھے اس طرح انتظام سے اثر انداز نہیں تھا۔ جب سے جب نے دیکھا کہ میں بدلے بغیر نہیں رہ سکتا تو انہوں نے میری مدد کی ٹھانی اور وعدہ کیا کہ حبیب اور اسکے ساتھی گاؤں کے زیادہ میں تمہیں حاضر رکھوں گا۔ آگے تمہارا کام اور بندہ میرے پاس واپس آجاتا۔ کچھ روز بعد میجر صاحب نے حبیب اور دو جوان میرے ساتھ بھیجے میرے ساتھیوں سے پہلے دو تین بندوقیں تھیں، میں نے بندوق والا میجر صاحب سے لیا تھا۔ رگھوبیر سے میرے دوستوں پچھوتا تھا میں نے بھی چوتھی رگھوبیر کے گھر میں گزارتا تھا۔ حبیب میں ہمیشہ آگے ہاتھوں دوسرے اسے پر حبیب نوش میں اپنے ساتھیوں کو لے کر گاؤں میں گئے۔ میرے ساتھی حبیب کی طرف چلے گئے ہوئے گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ حبیب تلاش کرتا ہے مجھے نظر آگیا۔ اس نے پہلے بھیجا تھا میں نے اسے پیچھا کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا رگھوبیر کے آدمیوں کو پتا چلے اور وہ ہوشیار ہو جائیں۔ گاؤں سے نکلتے ہی بھاگنے لگے جب میں نے بہت شک کرنے لگے تھے اور ہوشیار رہتے تھے۔ میں نے حبیب کو پیچھا نہ چھوڑا

اور اسے روٹی کھانے کا کہہ کر ہوٹل میں لے گیا۔ میں کوئی بات سوچنا چاہتا تھا میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرکے پاس بلایا ان سے کہا کہ تم جاؤ اور صبح آجانا۔ وہ چلے گئے تو میں سوچنے لگا اس جیب کترے سے کس طرح جان چھڑاؤں۔ فوجی نوکری آدمی کو ہوشیار بنا دیتی ہے۔ روٹی کھانے کے بعد میں ہاتھ دھونے کے بہانے غسل خانے کی طرف گیا اور اپنا بٹوا اسے پکڑا دیا کہ اس میں سے پیسے نکالو میں نے غسل خانے کے دروازے میں سے دیکھا کہ وہ بٹوے میں پیسے گن رہا ہے میں تیزی سے باہر آیا اور اسے گردن سے پکڑ کر دو تین تھپڑ لگا دیئے اور ساتھ ہی شور مچا دیا کہ اس نے میری جیب کاٹی ہے لوگ جمع ہوگئے ایک آدمی بڑا جوشیلا تھا میں نے اسے کہا کہ اس آدمی کو تھانے لے چلتے ہیں بٹوہ جیب کترے کے ہاتھ میں ہی تھا کیونکہ وہ تو میرے وار سے ایک دم حیران رہ گیا تھا۔ اس کا دماغ ہی فیل ہوگیا تھا۔ ہجوم نے اسے آگے لگا لیا چند قدم چلنے کے بعد میں ہجوم میں سے نکل کر غائب ہوگیا مجھے امید تھی کہ اب یہ رات تھانے میں گزارے گا اور میرے کام میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔

میں وہاں سے سیدھا گوردوارہ کی حویلی پہنچا چاروں طرف پھر کر میں نے پہرے کا اندازہ لگایا ہر کوئی نہیں تھا اور شاید ہی کوئی پہریدار ہوتا۔ میں نے پچھواڑے کا رخ کیا اور وہاں سے حویلی کے اندر کودا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پھر کر اندازہ لگا رہا تھا کہ گھوبیر کس کمرے میں ہوسکتا ہے کہ اندھیرے میں ایک چارپائی سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چارپائی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا کہ دونوں چارپائیوں پر گھوبیر کے دونوں بھائیوں کی لاشیں تھیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس بات کا نہیں کہ وہ میرے ہاتھوں ہوئے بلکہ اس بات کا تھا کہ گھوبیر کے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں۔ اسے قتل کرنے کے

جاتا تو یہ قتل میرے کھاتے پڑ جانے تھے۔ میں وہاں سے کھسک گیا۔ واپس تانگوں والے اڈے پہنچا فجر ہونے والی تھی کہ میرے ساتھی جیپ لے کر آگئے چھاؤنی واپس گئے تو میں میجر صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے پوچھا کام ہوگیا؟ میں نے کہا ہاں صاحب۔ جاؤ آرام کرو۔ میں کوارٹر میں آکر لیٹ گیا میں اندر سے بہت شرمندہ تھا دشمن کے گھر جا کر بھی ناکام واپس آگیا؟ پھر سوچنے لگا گھوبیر کے بھائیوں کو میں نے قتل نہیں کیا تو وہ کون تھا؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ گھوبیر باہر سے شریف اندر سے چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ جس طرح بھوندر کو نکال لے گیا اسی طرح کسی اور کے ساتھ دغا کیا ہوگا۔ اس نے بدلہ لے لیا ہوگا۔ گھوبیر کے بھائیوں کی اپنی دشمنیاں ہوں گی مجھے تو اپنی ناکامی کا صدمہ تھا، رو رو کر بھوندر کا چہرہ آنکھوں کے آگے آجاتا جو گھوبیر کی وکیل بن گئی تھی ایک تو میرے اپنے اندر شرمندگی دوسرے میجر صاحب سے جھوٹ بولنے کی شرمندگی، میں نے وہاں سے سامان اٹھایا اور بھاگ نکلا۔ اڈے سے بس پکڑی اور گاؤں سے باہر آکر ویران کھوہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ پتہ نہیں کیسے مخبری ہوگئی ہے اور آپ نے مجھے اور بچی کو وہاں سے پکڑ لیا۔ جناب گھوبیر کے بھائی میں نے قتل نہیں کئے آپ سے کچھ نہیں چھپا رہا اب بھی آپ کے سامنے حلفاً کہتا ہوں کہ گھوبیر کو قتل کرنے آیا تھا وہ نہیں ملا زندگی میں اگر کہیں آمنا سامنا ہوگیا تو اسے مارنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ پر یہ دونوں قتل میں نے نہیں کئے۔

میں نے گھوم کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ تھپڑ کی شدت سے اس کا منہ بند ہوگیا۔ میں نے ایک ٹھڈا اس کے منہ اور ٹھوڑی پر رکھ دیا۔ میری ان حرکتوں کا مقصد تھا کہ وہ جھوٹ بولنا بند کردے اب تک اس طرح سے غصیلی اور جسمانی تشدد سے مجرم ڈھیر ہوجاتے ہیں کچھ خوف کھا کر بعد میں

نے اسے اپنے محرر کے حوالے کیا کہ اسے حوالات میں بند کردے۔ وہ اگرچہ قتل کے کیس میں زیرِ تفتیش تھا لیکن ایک فوجی سپاہی بھی تھا اور ابھی تک حاضر سروس تھا اگر وہ مجھے قتل کے کیس میں مطلوب تھا تو فوجیوں کو بھی مطلوب تھا ایسے بھگوڑوں کیخلاف کارروائی ہوتی ہے۔ میں اسے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے فوجی افسروں کو اطلاع دینا تھی کہ ان کا فوجی پکڑا گیا ہے۔ میں نے اپنے ایس ایس پی کو اطلاع کردی انہوں نے مجھے کہا کہ دلبر سنگھ کو میرے پاس پہنچا دو میں یہاں سے اسے فوجیوں کے حوالے کردوں گا۔ میں نے دلبر کو ایس ایس پی کے دفتر پہنچا دیا لیکن وہاں سے جانے سے پہلے تھانے میں اس سے اچھی طرح پوچھ گچھ کرلی۔ دلبر نے مجھے قائل کردیا کہ قتل اس نے نہیں کئے اگر رگھوبیر سنگھ مل جائے تو وہ اسے ضرور قتل کرے گا۔ پولیس کے سامنے اس طرح دھمکیاں دینا بھی ایک جرم ہے اور میں اس کیخلاف مقدمہ درج کرسکتا تھا لیکن چونکہ اسے فوج کے حوالے کرنا تھا اس لئے میں اس چکر میں نہیں پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے کہا کہ اس کے چچا ہری سنگھ پر رحم کروں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ میری محبت میں اندھا ہوگیا تھا۔

اب تک کے واقعات میں کسی کو ہوندر کا خیال آیا نہ آیا ہو مجھے شروع سے ہی دھیان تھا کہ چپ چاپ طریقے سے دیکھوں کہ ہوندر کیا کررہی ہے؟ مطلب یہ کہ اس کی سرگرمیاں کیا ہیں؟ میں نے کسی شبہ کو بلایا اور اسے نوواگاؤں کے لئے کہا۔ وہ اب تک بڑا کامیاب رہا تھا اس نے دو دن سے بعد مجھے رپورٹ دینی۔ ہوندر اپنے چچا ہری سنگھ کے ساتھ ہی رہتی تھی جس دن دلبر سنگھ فرار ہوا تھا اسی دن ہوندر اور اس کے چچا ہری سنگھ کی گھر میں دونوں کی غائب تھیں اب ہری سنگھ سے کچھ پوچھنے کا وقت تھا۔

[illegible] کے غائب ہوجانے نے اسے پریشان کررکھا تھا کئی سال تو روٹی پیٹتی رہی جب ہری سنگھ کے دبر کے ساتھ رابطے شروع ہوئے تو اسے سکون آگیا تھا کہ دلبر زندہ تو ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہری سنگھ بہت کچھ بتائے گا میں نے اسے حوالات سے نکالا اور پوچھ گچھ کرتا رہا ساتھ ہی میں نے تھانے کا پرانا ریکارڈ بھی نکلوالیا۔ اس کا قتل ہونے والا ماموں چور تھا۔ ایک آدھ ڈکیتی کی واردات اس کے کھاتے میں تھی۔ دلبر کے مقتول ماموں کے ساتھ ایک اور آدمی نتھو سنگھ کا بھی نام تھا وہ اس تھانے کا پرانا ہسٹری شیٹر تھا اور کم از کم دس بارہ سال سے اشتہاری تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ کم از کم پولیس کے ہاتھ کبھی نہیں چڑھا تھا۔ ہری سنگھ سے جب میں نے پوچھ گچھ شروع کی تو نتھو سنگھ کو بھی ذہن میں رکھا۔ ہری سنگھ روایتی قسم کا بدمعاش نہیں تھا کہ اس سے اگلوانا مشکل ہوتا میں نے اس سے پہلے اس قسم کے کمزور آدمیوں سے تفتیش میں دیکھا تھا کہ انہیں اپنی عزت اور پولیس سے بے عزتی کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ ہری سنگھ سے میں نے صاف کہا کہ وہ اپنی عزت چاہتا ہے تو مکمل کہانی بیان کرے ورنہ وہ حوالات کی مار چند منٹ بھی نہیں سہے گا۔ ہری سنگھ یہ بات سمجھ گیا مجھے کہنے لگا۔

"خان صاحب میں نے آپ کو کوئی قسم کا دھوکہ نہیں دیا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ دبر کا ماموں چور بھی تھا اور ڈکیت بھی پر رگھوبیر سنگھ نے اسے قتل کیا ہے۔ اور نتھو ٹھیک ہے مال دولت دبا کے بیٹھا ہے وہ سکھ بھی ہے اور سکھوں کے اصول بھی جانتا ہے۔ جب اس کے بھتیجے نے ہری سنگھ پر ہاتھ ڈالا تھا تو اسے اسی وقت دخل دے کر معاملہ ختم کرنا چاہیے تھا۔ وہ یہ نہیں کرتا تھا کہ ہم دونوں [illegible] نے دولت کی خاطر میں یہ سمجھ لیا ہے تو اب وہ سمجھتے بھی۔ ہوندر تو نہیں اپنے ساتھ لے جاتا چاہتا تھا۔ اب وہ [illegible] آپس میں [illegible] والا کام دبر سے

نہیں کیا اگر کر لیتا تو ہماری ناک بھی اونچی رہتی آپس میں چل گئی ہے تو شاید اور بھی چل چلاؤ ہوں گے میں نے تو زندگی دیکھ لی ہے چاہتا ہوں کہ دبیر اس کی لپیٹ میں نہ ہی آئے۔

دلبر کا چچا یہ کل اپنے سر لینے پر راضی تھا پر میں ایسا کس طرح ہونے دیتا مجھے تو اصل قاتل کو پکڑنا تھا۔ ہری سنگھ کے بیان کے بعد میں نے مقتولوں کے باپ گورمکھشن سے بات کرنا ضروری خیال کیا۔ بے چارہ بہت بری حالت میں تھا۔ بیٹوں کے قتل نے اس کی ہمت توڑ دی تھی۔ جس دن واردات ہوئی تھی اس دن میرے حویلی پہنچنے پر گورمکھشن نے کہا تھا کہ وہ تو مر گیا ہے اور وہ خود ہی اپنے بیٹوں کے قاتل یا قاتلوں کو دیکھ لے گا۔ اس وقت تو وہ غم اور تکلیف کی حالت میں تھا اس لئے میں نے اس سے کوئی اعتراض نہ کیا پر اب دوسری بات تھی۔ حویلی جا کر میں نے گورمکھشن سے کہا کہ وہ اگر بڑا زمیندار ہے تو مجھے اس سے سروکار نہیں میں نے قاتل پکڑنے ہیں اور خود تمہارا بھی فائدہ اسی میں ہے کہ میرے ساتھ تعاون کرو۔ اس دن تم نے کہا تھا کہ تم خود ہی قاتلوں سے نمٹ لو گے۔ اب بتاؤ تمہیں کس پر شک ہے یا واقعی تم کسی کو جانتے ہو۔ گورمکھشن منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بہت آہستہ سے کہنے لگا۔ ''خان صاحب آپ کی کرپا ہے کہ آپ اتنا کشٹ کر رہے ہو یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ گورمکھشن سنگھ یہ سب کچھ برداشت کر جائے گا میں نے آج تک علاقے میں خود کوئی جرم کیا نہ کرایا۔ رگھویر نے جو غلطی کی اس کا مجھے بھی احساس تھا ایک تو اسے اس لڑکی ... کیا نام ہے اس کا ... بوندر کو منہ نہیں لگانا چاہئے تھا دوسرے بات یہاں تک نہیں بڑھانی چاہئے تھی۔ اب تو اس بات کو کئی سال ہو گئے پر دشمن ہمیشہ سمجھ کر وار کرتا ہے سو اس نے کر دیا ہے۔''

میں نے گورمکھشن کو ٹوکا۔ ''گورمکھشن مجھے یہی معلوم کرنا ہے کہ تمہاری دشمنی کس کے ساتھ کس وجہ سے ہے۔'' میں بالکل انجان بنا رہا۔ اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ میں بوندر کے واقعہ سے آگاہ ہوں اور ہری سنگھ اور دبیر سنگھ میرے ہاتھ میں ہیں۔ گورمکھشن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''میرے ساتھ کسی نے دشمنی کیا کرنی ہے؟ بس اپنے آپ کو ہری سنگھ بھی بدمعاش سمجھنے لگ گیا ہے اور دبیر سنگھ بھی۔ دبیر تو خیر یہاں سے نکل ہی گیا ہے۔ اس کا سارا خمیر ہی بچے نقشوں کا ہے۔ مرنے والا ان کا ماما بھی اپنے بڑوں کی راہ پر چل نکلا تھا۔ چوری چکاری اور ڈاکہ کسی چیز سے دریغ نہیں کرتے تھے۔'' گورمکھشن کھل کر بات کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ''میں نے یہی دیکھا ہے کہ ہری سنگھ اور اس کے بھتیجے نے بھی نیکی کا کام نہیں کیا خود ہری سنگھ کا بڑا بھائی نتھو سنگھ تھا۔ اصل اسی کی بدمعاشی نے دوسرے گھر والوں کو اس راہ پر لگایا ہے۔'' ....گورمکھشن سنگھ نے مونی سی گالی دی۔''

''اگر یہ لوگ نتھو سنگھ کی بدمعاشی پر میرے ساتھ متھا لگا رہے ہیں تو میں اس کا بھی بندوبست کر رہا ہوں تھانیدار صاحب آپ ایک طرف ہو کر بس تماشا دیکھو بندے میں خود تمہارے پاس لے آؤں گا۔ بے شک کہہ دینا تم نے پکڑے ہیں پر میری راہ کھوٹی نہ کرو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔''

جب تک گورمکھشن راہ پر نہ آتا میرے لئے آگے بڑھنا مشکل تھا۔ میرے اندر کا نواز خان باہر آ گیا۔ میں چارپائی سے اٹھا اور گورمکھشن کو گھور کر کہا۔

''گورمکھشن تم مجھے اچھی طرح نہیں جانتے مجھے چودھراہٹ یا زمینداری کا رعب کبھی نہ دینا خطا کھا جاؤ گے۔ دوسرے میں ایک سرکاری افسر ہوں اور اس قتل کی تفتیش میں نے کرنی ہے مجھے سیدھی طرح بتا دو گے کہ معاملہ کیا ہے تو اچھی بات ورنہ نواز خان کے سامنے کسی کی زبان بند رہے یہ ممکن نہیں ہوتا۔''

گورنمنٹ نے میرے چہرے کی سختی دیکھی تو نرم
ہ گیا۔ مجھے کہنے لگا، "بیٹھو تم ناراض ہو گئے۔ میرا
سب تھا کہ نتھو سنگھ سے نبٹنا شاید تمہارے لئے ممکن
ہو۔ اس کے لئے بندوں کا انتظام بھی کر سکتا ہوں
لیکن یقین ہے کہ مجھ پر وار کرنے والا نتھو سنگھ ہی ہے
میں تھوڑی تحریر کر رہا ہوں کہ ان دنوں اس کا ٹھکانہ کہاں
ہے وا ہو روکی قسم خان صاحب تمہیں بتا دوں گا۔"

میں حویلی چلا آیا۔

گورنمنٹ سنگھ کی حویلی سے واپس آ کر میں نے
ری سنگھ کی اچھی طرح خاطر کی۔ میں خود حوالات
کے اندر گیا اور وہاں سے کانسٹیبلوں کو باہر نکال کر
ری سنگھ کو سامنے کھڑا کر لیا۔ ہار نے اس کے
مارے کس بل نکال دیئے تھے میں نے اسے کہا کہ
وہ ساری بات کھل کر بتائے۔ "وہ تو میں بتا چکا
ں"۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے
کہا۔ "بلوندر کہاں ہے؟" اس کے چہرے کا رنگ
یک دم بدل گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ
یا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک جھٹکا دیا۔ "نتھو سنگھ
کہاں ہے؟" ہری سنگھ کی ٹانگوں میں جیسے جان نہ
ہی۔ وہ لرزنے لگا، میں نے زوردار تھپڑ اس کے
نہ پر مارا۔ "نواز خان سے چھپاؤ گے تو جان عذاب
ں کر دوں گا۔ اب بک دو ورنہ بعد میں
چھتاؤ گے۔"

ہری سنگھ کے لئے شاید ایک تھپڑ کافی نہیں تھا۔
خاموش رہا میں نے حوالات کے باہر کھڑے ایک
انسٹیبل کو اشارہ کیا کہ بید پکڑاؤ' ہری سنگھ اب بھی
سیدھا کھڑا تھا پھر جب میں شروع ہوا تو ایک دو
نٹ ہی اس کے لئے کافی تھے۔ وہ فرش پر گر کر
چیخنے لگا اور ہاتھ اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا سر سے
پر نیچے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے بید ایک طرف
ونے میں پھینک دیا اور گھٹنوں کے بل اس کے
پاس بیٹھ گیا۔ میں نے ایک ایک کر نتھو سنگھ کے
بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

ہری سنگھ کا بیان بہت طویل تھا۔ اس نے کہانی
سنائی کہ کس کا بھائی نتھو سنگھ ڈاکو کیسے بنا۔

"نتھو سنگھ میرا بڑا بھائی ہے ہمارا باپ ہوش
سنبھالنے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ ماتا نے سوں بھیجن
شروع کر دیا۔ چھ جماعتوں تک سکول میں پڑھتے
رہے پھر سکول سے بھاگ گئے نتھو چودہ پندرہ سال
کی عمر میں ہی کافی جوان ہو گیا تھا۔ ہم ڈاکے ڈالنے
لگے۔ یہ صلاح نتھو نے ہی دی تھی ماتا کا جمع جتھہ
نکالا اور ایک قبائلی سے پرانی بندوق خریدی۔ ماموں
کے پاس مال ڈنگر میں تین گھوڑیاں تھیں دو ہم نے
نکالیں اور پہلا ڈاکہ ساتھ والے گاؤں میں مارا۔
جس گھر میں گئے تھے نتھو نے مجھے باہر کھڑا کیا،
بندوق مجھے دی اور کہا کہ جو اندر آئے سے گولی مار
دینا۔ نتھو اندر گیا گھر والوں نے بغیر جھگڑا کئے زیور
اور پیسے اس کے حوالے کر دیئے۔ نتھو باہر آیا ہم
گھوڑیوں پر چڑھے میں نے تین فائر کئے کہ اگر کوئی
پیچھے آنا چاہتا ہے تو ڈر جائے۔ زیور ہم نے سنیاروں
کے پاس بیچے اور رقم آزاد کی۔ ہمارا تیسرا بھائی بڑی
بہت میں مرا تھا اس کی بیوی بھی اس کے پیچھے ہی
چلی گئی پر ہم نے سنبھال لیا اس کا ایک ہی بیٹا ہے
دھرم سنگھ۔ نتھو کے ساتھ میں نے چار ڈاکے ڈالے۔
پولیس ہم تک پہنچ گئی نتھو اشتہاری ہو گیا میں پکڑا
گیا۔ دراصل نتھو مجھے ڈاکے والی جگہ پر گھر سے باہر
رکھتا تھا۔ کسی نے آج تک میری شناخت نہیں بتائی
تھی۔ پولیس کی وجہ سے نتھو کا اس علاقے میں رہنا
مشکل ہو گیا۔ وہ ہماچل کی طرف نکل گیا وہیں اس
نے شادی کی اور تین سال کی لڑکی میرے حوالے
کر گیا۔ بلوندر کور کی ماں ہماچل میں ہی کسی بیماری
سے مر گئی تھی۔ نتھو نے بلوندر کا بیاہ وہیں سے کرنا تھا نتھو
کبھی کبھار آ کر بلوندر کو دیکھ جاتا۔ اب جانے سے

تھا۔ میرے معاملے کا کس طرح پتہ چلا اس نے ایک رات مجھے مارا کہ میں اس کی بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا اور مجھے کو بھی مروا دیا۔

نلوہ نے مجھے کہا کہ تیار ہو جاؤ گورنخشن سنگھ کی جان خطرے میں ہے۔ کل والی رات وہ میرے پاس آیا۔ مجھے ساتھ لیا اور پہلے کی طرح مجھے گورنخشن کی حویلی کے باہر کھڑا کر دیا۔ نلوہ نے دیوار پھاندی اور اندر چلا گیا۔ اس بار میں باہر نہیں رکا۔ اندر نلوہ مارا جاتا تو میری زندگی حرام ہو جاتی یہ ڈر بھی تھا کہ گورنخشن نے کوئی انتظام نہ کر رکھا ہو۔ نلوہ اسے پیغام بھجوا چکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی بے عزتی کا بدلہ لینے ضرور آئے گا یہی اس کی غلطی تھی ورنہ کوئی ہم تک نہ پہنچ سکتا۔ میں بھی دیوار پھاند کر اندر پہنچ گیا نلوہ گھوم پھر کر اندر جانے کی راہ دیکھ رہا تھا مجھے دیکھ کر ناراض ہوا۔ ہم پھر رہے تھے کہ چارپائیوں پر گورنخشن کے بیٹے نظر آئے ہم نے خنجر نکالے اور دونوں کے گلے چیر دیئے جس طرف سے آئے تھے ادھر ہی نکل گئے۔ نلوہ نے گھر تک میرا ساتھ دیا پھر نکل گیا۔"

میں بڑی خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا۔ دونوں بھائی بڑے شاطر تھے۔ ان کا آگے بیٹا بھی بڑی دور کی ہانکے پر جرم سے مجھے نفرت ہے نلوہ کی باتیں سن کر میرے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ اس کی گردن دبوچ لوں۔ اسی لئے میں ہری سنگھ کو زیادہ بولنے کا موقع دے رہا تھا۔ ہری سنگھ بات ختم کر چکا تو میں نے اس سے نلوہ سنگھ کا پوچھا۔ اس نے وہ بھی بتانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے گورنخشن سنگھ کے بیٹوں کے قتل کا پرچہ کاٹا اور ہری سنگھ کو نامزد کر کے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ میں نے انیس ایس پی کو رپورٹ بھجوا کر درخواست کی کہ فوجی افسروں سے بچ جانے کہ دیپ سنگھ کی قتل کے کیس میں کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لئے جب ہم چاہیں اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے قتل کے بڑے ملزم کو پکڑنے کی خاطر دفتر سے چند دن کی چھٹی کی درخواست دی اور اے ایس آئی کو تھانے کا انتظام دے کر بلاں شاہ کے ساتھ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گیا جس کا مجھے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ انیس ایس پی نے میری مدد کے لئے کچھ انتظام بھی کر دیا تھا۔

امرتسر سے ہماچل کی طرف جانے کے لئے ایک طویل راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہری سنگھ نے نلوہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ مہینوں کے بعد اس علاقے کا چکر لگاتا ہے۔ اس کا ٹھکانہ ہماچل ریاست باجور پور کے جنگلوں میں ہے اور وہاں کے راجہ کا سرکاری شکاری بن چکا ہے۔ باجور پور پہنچنے میں ہمیں کئی دن لگ گئے بلاں شاہ کی عجیب طرح کی بے چینی تھی۔ میں نے اسے ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا کہ اسے جنگل میں رہنا ہے اور وہاں سے کی مجرم پکڑنا ہے۔ باجور پور کا داروغہ بجراج سنگھ موٹا سکھ تھا۔ پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا گوشت جیسے ہڈیوں نے چھوڑ رکھا ہو۔ اس کے جسم سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی میں بہت مضبوط اور تگڑا رہا ہوگا۔ ہونٹوں پر کمینی مسکراہٹ رہتی۔ نلوہ سنگھ کی بات سن کر جب میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم نے اتنے بڑے کام کو ہاتھ میں لے لیا ہے جس میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے ایک ماہر شکاری جنگل میں اپنی جان خطرے میں سمجھتا ہے۔ یہاں تمہارا واسطہ جس آدمی سے ہے وہ کسی جنگلی جانور سے کم نہیں اس کا نشانہ خطا نہیں جاتا اور پھر تم یہ نہ بھولو تم ملازم سرکار ہو تو وہ بھی اس راجیہ (تقسیم سے پہلے راجاؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں راج کہلاتی تھیں) کا سرکاری ملازم ہے۔ دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے علاقے میں اس طرح گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اول تو میرا ہی فرض ہے کہ تمہیں گرفتار کروں چونکہ تم سے رعایت بھی کروں تو یہ معاملہ راجہ کے نوٹس میں لاؤں گا۔ فیصلہ وہی دیں گے۔ رات کے لئے تمہارا انتظام سرکاری ریسٹ ہاؤس میں کر دیا گیا ہے۔ ریسٹ ہاؤس شہر سے باہر تھا شہر کی پرلی

گلیاں اور بازاروں سے گزر کر ہم راج محل کے باہر سامنے کی طرف ریسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ روشن جگمگاتا راج محل تھا۔ بہت اونچا پتھروں کی دیواریں باہر اخروٹ کے درختوں کے جھرمٹ محل کے باہر کم از کم سو آدمیوں کی گارڈ تھی۔ راجواڑوں کی شان کچھ اور تھی بہرحال ریسٹ ہاؤس میں رات کے وقت بلال اور میں نے سوچ بچار کیا ہم دونوں کی رائے یہی تھی کہ راجہ اور داروغہ دونوں ہی ہمیں نکوہ کو پکڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم نے ایک سکیم بنالی اور دن نکلنے سے پہلے ہی ریسٹ ہاؤس سے نکل گئے اس طرف آتے ہوئے دن میں ہم نے گلیاں بازار دیکھے تھے۔ وہاں پوچھتے پوچھتے ہم کھالوں کے کاروبار کرنے والی دکان پر جا پہنچے جس کا مالک گنجا چوٹی والا ہندو تھا۔ اس سے ہم نے کسی مقامی شکاری کا پتہ پوچھا پہلے تو ہندو سمجھا کہ ہم جانوروں کی کھالیں خریدنے والے ہیں وہ ہماری خوشامد کرنے لگا پھر مایوس ہوکر ہمیں ہردیال کے گھر کا راستہ دکھا دیا ہم نے دن وہیں گلیوں اور دکانوں پر گزارا۔ رات ہوتے ہی ہم اس گلی میں داخل ہوئے۔ داروغہ سے چھپ کر رہتا تھا ورنہ وہ ہمیں پکڑوا دیتا۔ گلی میں مکمل سناٹا تھا آخری سرے پر ہردیال شکاری کا مکان تھا میں نے دروازے کی باہر لٹکتی کنڈی کھڑکائی اور اندر سے کچھ برتنوں کے گرنے' چارپائی کی الٹ پلٹ اور آہستہ آہستہ پریشان سی آوازیں آئیں پھر خاموشی چھا گئی۔ چر کی آواز سے دروازہ کھلا ایک لمبا اور پلا ہوا آدمی باہر نکلا۔ "کون ہو؟ کیا بات ہے"۔

"تم ہردیال ہو" اس نے گردن ہلائی۔ "تم سے بات کرنا ہے۔" وہ شک کی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں ان پر بچے سو رہے تھے ایک طرف لکڑی کا ٹوٹا ہوا دیوان تھا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ "تمہارے لئے چائے بناؤں؟" میں نے اور بلال نے ایک ساتھ انکار کردیا۔ "تو اسے پیو۔" اس نے حقہ ہمارے آگے کردیا۔ ہمارے انکار پر خود ہی حقے کی نڑی منہ میں لے کر کش لگایا۔

"اب بولو کیا کہتے ہو۔"

میں نے اسے بہت مختصر طریقے سے بتایا کہ میں سرکاری شکاری نکوہ سنگھ کو پکڑنا چاہتا ہوں خود بھی سرکاری آدمی ہوں ساتھ ہی میں نے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا "اس کے ٹھکانے تک رہنمائی کرو تمہاری محنت دے رہا ہوں۔"

ہردیال نے دو تین گہرے کش لئے فضا میں تمباکو کا دھواں بھر گیا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں سے دبی ہوئی ایک تلخ آواز آئی "تم اس تک نہیں پہنچ سکتے وہ دوسرے راجہ کے علاقے میں ہے بھگوان نے اس علاقے میں اتنے بڑے جنگل اور پہاڑ بنائے ہیں نکوہ سنگھ اسی جنگل کا درندہ ہے"۔

"کیا تم شکاری نہیں ہو؟" میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ وہ تڑپ گیا۔ زور سے حقے کا کش لگایا۔ "درشنا اے درشنا" اس نے زور سے آواز لگائی۔ میرا رک سیک اور بندوق لاؤ ساتھ والے کمرے میں کھڑبڑ ہونے لگی۔ ہردیال اٹھ کر ادھر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بلال شاہ کی طرف دیکھا اس نے آنکھ مار کر خوشی کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہردیال واپس آ گیا۔ ایک ہاتھ میں بندوق کندھے پر تھیلا تھا۔

"تمہارے پاس ہتھیار ہے اس جنگل میں خالی ہاتھ کا مطلب ہے تم خود اپنی موت کے منہ میں چلے جاؤ۔" میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ میری جیب میں سروس ریوالور اور کافی گولیاں تھیں۔ بلال شاہ کے پاس دیسی ریوالور بھی تھا۔

پہاڑی پگڈنڈی پر چلتے چلتے دن چڑھنے والا تھا۔ ہردیال کسی بندر کی طرح چل رہا تھا۔ اگرچہ تھک میں بھی گیا تھا پر بلال جیسے گینڈے کے لئے یہ مشقت سخت تھی۔ اس کا سانس پھول چکا تھا

ہردیال نے ہماری طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ آرام کی ضرورت ہے۔ ایک پتھر پر ہم بیٹھ گئے ہمارے سامنے اوپر اٹھتی ہوئی گھاٹی تھی جس کے دوسری طرف ہردیال نے بتایا کہ کالی ہوڑہ کا ڈاک بنگلہ تھا جس پتھر پر ہم بیٹھے تھے وہ ہردیال کے حساب سے پہاڑ کے آخری حصے کے قریب تھا۔ جنگلی انگوروں کی بیلیں ہر طرف نظر آرہی تھیں باجور کا شہر میل پیچھے رہ گیا تھا تھوڑے آرام کے بعد ہم پھر اٹھے اور چل دیئے۔ اوپر پہنچے تو کالی ہوڑہ کا ڈاک بنگلہ نظر آیا ہم کالی ہوڑہ کے گاؤں کے اوپر چکر لگا کر گزرنے لگے۔ دو تین کوس کے بعد پتھر جنوبی راستے کی طرف پلٹے ہردیال کالی ہوڑہ گاؤں سے ہٹ کر نکلنا چاہتا تھا۔ راستہ اب بہت دشوار ہوگیا تھا خطرناک اونچائیاں جان لیوا ترائیاں' گہری کھڈیں' پرشور پہاڑی نالے جن پر کوئی پل نہیں ہوتا۔ بلال شاہ ایک قریبی پتھر پر بیٹھ گیا۔ اب آگے جانا اس کے بس کی بات نہ تھی ہردیال مسکرایا۔ اس نے اپنا تھیلا زمین پر رکھا اور اس میں سے ایک بوتل نکال کر اس میں شربت نما کوئی چیز گلاس میں ڈال کر بلال شاہ کو دی پھر گلاس میرے لئے بنایا کوئی دوا جیسا مگر بڑا مزیدار ذائقہ تھا۔ چند منٹ بعد ہی ہماری تھکن غائب ہوگئی۔ کالی ہوڑہ کا گاؤں اب پیچھے رہ گیا تھا۔ ہمارے مغرب کی طرف دور تک دیودار کے درختوں کا جنگل تھا۔ اس جنگل کے شروع میں ہی ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس علاقے کی تمام رکھوں' ڈاک بنگلوں اور شکار گاہوں کا ایک طرح سے ہیڈکوارٹر تھا۔ ہماری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوگئی تھیں۔ ہمارا رُخ اب اس گھر کی طرف تھا گھر کے اردگرد لکڑی کی مضبوط باڑ تھی جس کا دروازہ لکڑی کے ایک بڑے ہک کے ساتھ بند تھا مگر نیم بند کیونکہ ہک ٹوٹا ہوا تھا۔ باڑھ کے اندر سبزی کی بیلیں تھیں گیٹ سے برآمدے تک گھاس میں جگہ جگہ پتھر پڑے تھے۔ ہم بے آواز چلتے ہوئے برآمدے میں آئے جس میں جگہ جگہ لکڑی کے ستون تھے بائیں جانب کا برآمدہ خالی تھا۔ دائیں جانب کے برآمدے میں پرانی سوکھی بیلوں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پھٹوں کا ڈھیر تھا۔ اسی ڈھیر کے پیچھے سے ہوکر میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایسے لگا جیسے پہاڑی جنگل کی خاموشی میں کسی نے گرنیڈ کا دھماکہ کردیا ہو۔ پکی رائفل کی گولی ٹھائیں کی آواز سے نکلی اور میرے دائیں بازو کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے سوکھی بیلوں کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے جسم کو لڑھکاتا ہوا اس کے ڈھیر کے پیچھے ہوگیا۔ میں نے بلال شاہ کو آواز دی میری آواز پوری نہیں نکلی ہوگی کہ بلال شاہ نے اپنے دیسی پستول کا فائر کردیا۔ میں بیلوں کے ڈھیر کے پیچھے سے کھسکتا ہوا برآمدے کے ساتھ بنے لکڑیوں کے پھٹوں سے بنائی گئی چھوٹی سی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ میں فائر کرکے اپنے پر حملہ کرنے والے کو بھگانا نہیں چاہتا تھا۔ یکا یک ایک اور فائر کا کڑاکا ہوا۔ اور جتنی دیر میں کچھ سمجھ سکتا کوئی آدمی دھڑ دھڑ کرتا ٹوٹے ہک والے گیٹ کو جھٹکے سے کھول کر باہر نکلا۔ ہمارے دوڑ کر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ وادی کی ترائی میں غائب ہوگیا ہم اس گھر سے باہر نکل آئے ہری سنگھ کو یقین تھا کہ یہ نلوہ ہی تھا۔ ورنہ ان رکھوں کا کوئی سرکاری شکاری ہم پر حملہ نہیں کرسکتا تھا۔ اسے کیا خبر کہ ہم کون ہیں ہماری کسی سے کیا دشمنی تھی ہم پر گولی وہی چلا سکتا تھا جسے پتہ تھا کہ ہم کون ہیں یا تو وہ نلوہ ہوسکتا تھا یا داروغہ کا آدمی جو ہمارے پیچھے بھیج دیا گیا ہو۔ ہردیال نے کہا کہ اب دوسرے ڈاک بنگلے جانا ہوگا تین ایک میل کی چڑھائی تھی میں راتوں رات ہی یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ دن کے اجالے میں نلوہ پر قابو پانا مشکل ہوجاتا۔ یہ تین میل بلال شاہ نے منہ میں بڑبڑاتے اور نلوہ کو

گالیاں دیتے ہوئے گزارے۔ ایک اونچی کھائی کے پیچھے خودرو جھاڑیوں میں ہم رُک گئے۔ ہردیال نے ایک جھاڑی کے اندر گھس کر اس کی شاخیں توڑ کر دوربین نما سوراخ بنا لئے جن سے ہم سامنے دیکھ سکتے تھے۔ سامنے ہی اونچا اور بڑا عالی شان ڈاک بنگلہ تھا۔ اونچی چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا اس کے پیچھے چڑھ کے جنگل تھے ڈاک بنگلے کی ایک کھڑکی سے بڑی مدہم روشنی نکل رہی تھی باقی عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرے پیروں کے پاس سرسراہٹ ہوئی، خرگوش گزر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں لال انگارہ تھیں۔ ہردیال نے آسمان کی طرف دیکھا، وہ ستاروں کے ذریعے وقت معلوم کر رہا تھا۔ میرے پاس گھڑی تھی لیکن ہاجوڑ کے اس جنگل کے بے پناہ اندھیرے میں بالکل بے کار تھی۔ ہری سنگھ کے حساب سے رات ختم ہونے میں بس ایک دو گھنٹے باقی تھے۔ دن نکلنے سے پہلے ہمیں اس ڈاک بنگلے کے اندر ہونا تھا۔ ورنہ ٹلوہ نکل جاتا میرے خون نے جوش مارا میں اُٹھ کر بھاگنے لگا پتھر کھڈے' جھاڑیاں سب روند رہا تھا۔ بلال شاہ میرے پیچھے اور اس کے پیچھے ہردیال تھا۔ میں ڈاک بنگلے کے پیچھے پہنچ گیا اور جنگل سے نکل کر عمارت کے اندر آنے میں پانچ منٹ لگے۔ مجھے ایسے لگا جیسے ایک کھڑکی کے پیچھے سے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں ہوگیا اگر یہ ٹلوہ تھا تو مجھے آسانی سے گولی مار سکتا تھا میں نے عمارت کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے بلال شاہ اور ہردیال کو نیچے لیٹ جانے کا اشارہ کیا خود دبے پاؤں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہاں کوئی پہریدار نہیں تھا۔ کھڑکی کا اوپر والا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا میں نے کھڑکی کا دروازہ کھولا اور اندر کود گیا۔ بلال کو میں نے باہر رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ غسل خانے کی کھڑکی تھی۔ غسل خانے سے باہر ایک راہداری نکل رہی ہے کوریڈور کے آخری کونے میں کوئی زمین پر بیٹھا تھا اس کی پیٹھ دیوار کے ساتھ تھی۔ اس کے جسم کے پیچھے چھپی ہوئی لالٹین کی بڑی کمزور روشنی آ رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا اس کا چہرہ زرد اور کمزور سا لگ رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا میں نے واپس جا کر ہردیال کو اندر بلایا اس نے قریب سے اس آدمی کو دیکھا اور دانت نکال دیئے۔ یہ یہاں کا چوکیدار ہے انیمی ہے میں جواب دیئے بغیر غسل خانے کے راستے باہر نکلا۔ اس ستون کے پاس سدابہار کے اونچے اونچے پودوں کے پاس مجھے ایسے لگا کہ کوئی سایہ میرے پیچھے لہرایا ہے میں تیزی سے مڑا اسی ایک سیکنڈ میں میں نے ایک آدمی کو خود پر جھپٹتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا چاقو تھا۔ ریوالور نکالنے کا موقع ہی نہیں تھا مجھے یاد ہے کہ بالکل خواب کی طرح میرا دائیاں مکا اٹھا اور اس آدمی کا چہرا لگنے سے پہلے میرا مکا اس کے پیٹ کے اوپر والے حصے میں دب چکا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے اُچھلا اور وہ دوہرا ہوگیا۔ ہردیال نے رائفل گھما کر لاٹھی کی طرح ماری پر اس کا اندازہ غلط ہوگیا۔ رائفل اس دوہرے ہوتے ہوئے آدمی کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرے بائیں کندھے پر لگی اور میں چکرا کر زمین پر گرا۔ ہردیال میری طرف لپکا اور وہ آدمی آدھا دوہرا ہو کر پھر تیزی سے اٹھا اور باہر کی طرف بھاگا۔ بلال شاہ نے مجھے زمین پر گرتے دیکھا تو میری طرف بھاگا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو مجھ پر حملہ کرنے والا اس کے قابو آ سکتا تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور بلال شاہ کو پرے ہٹا کر اس آدمی کے پیچھے بھاگا۔ چڑھتے دن کی ہلکی سی روشنی میں وہ ڈاک بنگلے کے پورچ سے نکل کر نیچے ڈھلان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ہر درخت' چٹان یا کھڈ کی آڑ لے رہا تھا۔ ایک چانو کی طرح چوپائے کی طرح اس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے شمال کی طرف جنگل میں پناہ لے لی۔ ہردیال نے میرے

بازو پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ صاحب بہادر یہ جنگل ہے آپ جوان ہیں جی دار بھی ہر جنگل کے قانون اپنے ہیں اس قانون کو ماننے والا ہی یہاں زندہ رہتا ہے۔ تلوہ جہاں جائے گا مجھے معلوم ہے ہردیال فوراً واپس ریسٹ ہاؤس کے اندر چلا گیا اور ایک تھیلا لے آیا۔ ہم بھی ڈھلان سے اُترے جنگل کا یہ حصہ چھوٹا ہی تھا جھاڑیوں سے گزر کر باہر نکلے جھاڑیوں کے پار ویران میدان تھا۔ پتھروں کے ڈھیر ہی ڈھیر ہر طرف تھے شاید یہ کسی سوکھے ہوئے نالے کی گزرگاہ تھی دور ایک ہلکی سی پانی کی لکیر تھی اس لکیر کے کنارے اونچی چٹان تھی جس میں سیڑھیاں کاٹی گئی تھیں اوپر ایک شوالہ بنا ہوا تھا۔ شوالے مندروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہوتی تھیں جن میں مسافر ٹھہرتے تھے۔ یہ شوالہ جس میں ہم پہنچے پتہ نہیں کتنی سو سال پہلے بنایا گیا ہوگا۔ دیواریں کالی ہو چکی تھیں سیڑھیوں پر کائی تھی شاید برسات میں نالے کا پانی ان کے اوپر سے گزرتا ہو۔ ہردیال نے شوالے میں پہنچ کر رسد کا سامان رکھا تھیلے سے کھانے پینے کی چیزیں نکالیں بلال شاہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس دیو کو کھائے بغیر ایک دن ہو گیا ایک رات ہو گئے تھے ہم نے احتیاط سے کم خوراک استعمال کی۔ کھانے کے بعد جسم میں جان نہ رہی اور بے سدھ ہو کر ہم لیٹ گئے۔ بلال شاہ تو خراٹے لینے لگا مجھے بھی اونگھ آ گئی۔

کچھ دیر آرام کے بعد ہم اُٹھ بیٹھے۔ ہردیال کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ جس کام کو آسان سمجھا تھا وہ مشکل نکلا۔ خود مجھے بھی احساس تھا کہ داروغہ اب تک اپنی ریاستی پولیس ہمارے پیچھے لگا چکا ہوگا۔ اس وقت ہردیال بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اس خوف کا اظہار بھی کر دیا۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے یہ دوسالہ ہے یہاں سے چار راجواڑوں کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں یہ راجا اپنی پرجا کی رعایا کے لئے خواہ کچھ نہ کریں ایک دوسرے کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں اور ان کی حکومت چلانے والوں کا دوسرے راجیوں ریاستوں سے کھانا پینا اکٹھا ہوتا ہے۔ گجراج سنگھ کا مغرور ان سب کا مغرور ہوگا۔ گویا ہردیال مجھے ڈرا رہا تھا کہ شاید چار ریاستوں کی پولیس میرے پیچھے ہے اور میں تلوہ ڈاکو کے پیچھے جو یہاں کا سرکاری شکاری بنا بیٹھا ہے۔ ہم اس کھنڈر سے اب باہر نکلے۔ اب جنگل گھنا نہیں رہا تھا آخر یہ ختم ہو گیا اور سامنے پہاڑ جیسی چٹانیں کھڑی تھیں انہی چٹانوں کے پار تلوہ سنگھ ہو سکتا ہے۔ جس ریسٹ ہاؤس سے ہم نکلے ہیں اور تلوہ بھی نکلا ہے میرا وشواس ہے کہ وہ ابھی یہ چٹانیں عبور کر کے اپنے ٹھکانے پر نہیں پہنچا ہوگا۔ راستہ بڑا جان جوکھم کا ہے۔ رات سر پر آ رہی ہے تو یہیں گزار لیتے ہیں دن چڑھے نکل جائیں گے۔ وہ کھوہ تلاش کرنے لگا میں اور بلال شاہ مشورہ کرنے لگے ہماری آوازیں آہستہ تھیں کہ ہردیال سن نہ لے۔ میرا خیال تھا کہ اس شکاری نے شاید ہمیں الجھا دیا ہے۔ تھا وہ بھی اسی راجواڑے کا ملازم اپنے راجا کی حکومت سے کیوں غداری کر رہا ہے شاید پیسے کے لالچ نے اسے یہ کام کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

"خان صاحب تلوہ سنگھ آدمی ہے کہ چھلاوہ ہے کہ چند دن میں وہ اس قدر دشوار پہاڑی اور جنگل کا علاقہ عبور کر لیتا ہے۔ اڈے پر چلا جاتا ہے" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ مجھے ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی میرے ذہن نے فوراً اس طرح اس کا اندازہ کیا جس طرح دوست اور دشمن کی آہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے پنکھ پہنچنے سے وقت جتنے وقت میں پستول نکالا اور اس جھاڑی کی طرف کر لیا جہاں سے آواز آئی تھی تین اسی وقت کسی نے پیچھے سے گولی چلائی مجھے لگی تو نہیں ہاتھ بلکہ کی حرکت کا احساس ہوا تو اس وقت اچھی تھی گولی ٹانگ چھو کر گزر گئی تھی بلال شاہ اور میں نے تقریباً ایک ہی

وقت میں جھاڑیوں کی طرف چھلانگ لگائی۔ ہردیاں بھی شاید وہیں دبک گیا تھا مجھے اس کا تھیلا اور بندوق سامنے چٹان کے ساتھ رکھے دکھائی دیئے۔ ہم پر حملہ کرنے والے نے ڈاک بنگلے کے بعد دوسری کوشش کی تھی اس کا مطلب تھا کہ یہ تلوہ ہی تھا۔ اور وہ بھی ہمارے آس پاس ہی تھا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی یہ آدمی بہادر بھی تھا ہم پر حملہ بھی کررہا تھا اور پھر فرار ہوجاتا تھا شاید وہ نہیں چاہتا کہ ہم اس علاقے سے زندہ بچ کر نکل جائیں اسے داروغہ نے یقینی طور پر ساری بات سے آگاہ کردیا ہوگا۔ اسے علم ہوگا کہ اس کے پیچھے آنے والے کون ہیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کرلیا۔ میں نے تلوہ کو آواز دی تلوہ سنگھ اگر تم ہو تو سامنے آجاؤ اگر تم بڑے شیر بنتے ہو یاد رکھنا میرا نام بھی نواز خان ہے اگر میں یہاں تک تمہارے پیچھے آسکتا ہوں خود تمہارے علاقے میں تو یہاں سے جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے پیچھے ہوں گا۔ میری اس آواز پر بلال شاہ حیرانگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا آواز کی گونج چٹانوں میں تھی یہ گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ قریب سے ہی ایک اونچا قہقہہ لگا اور کوئی زور سے بولا مجھے پکڑ سکتے ہو تو پکڑ لو۔ اچھا تھا گورکھن کو ہی ساتھ لے آتے آواز سن کر میرا خون کھول گیا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ پھر گولی چلی۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا ہردیاں زمین پر گرا تڑپ رہا تھا پھر قہقہہ لگا تمہیں یہاں لانے والے کا دیکھ لو کیا حشر ہوا ہے۔ یہ قہقہہ میری برداشت سے باہر ہوگیا۔

میں نے ایک جھاڑی کا اندازہ لگا کر فائر کیا۔ ہلکی سی چیخ نکلی اور ایک لمبا چوڑا مضبوط آدمی جھاڑیوں سے نکل کر میری طرف آیا۔ ایک ہاتھ میں رائفل، رنگ سانولا بڑی بڑی مونچھیں، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس میں بلا کی پھرتی تھی بلال شاہ نے اس کے قریب آنے سے پہلے ہی اس پر چھلانگ لگائی لیکن وہ واقعی چھلاوہ تھا۔ مجھے دھوکہ دینے کے لئے میری طرف آیا تھا مقصد اس کا یہی تھا کہ قریب کی دوسری جھاڑیوں میں غائب ہوجائے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بلال کی چھلانگ ہوا میں ہی رہی اور تلوہ سانپ کی طرح دوسری طرف کی جھاڑیوں میں رینگ گیا۔ ہردیال ختم ہوچکا تھا اور اس علاقے میں ہم انجان تھے۔ ہمارا مقابلہ تلوہ سنگھ سے تھا جو اس علاقے کا چپہ چپہ جانتا تھا۔ میری طبیعت بے چین ہورہی تھی مجھ پر چلائی گئی گولی سے ہڈی نہیں ٹوٹی تھی البتہ گوشت پر ہلکا سا زخم آیا تھا۔ یہ وقت مرہم پٹی کا نہیں تھا۔ میں نے بلال کا ہاتھ پکڑا اور ہم بھی اندازے سے انہی جھاڑیوں میں رینگ گئے یہ جھاڑیاں صرف ایک فرلانگ تک ہی پھیلی ہوں گی۔ اس کے بعد ہم باہر تھے میں باہر نکل کر جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ سامنے نیچی جگہ تھی جیسے کسی نے زمین کو نیچے دبا دیا ہو اس کے بعد ٹیلا اونچائی زیادہ نہ تھی لیکن دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تلوہ ٹیلے کی آدھی بلندی طے کرکے نیم دائرے کی شکل میں پرلی طرف اتر رہا تھا دیکھتے دیکھتے وہ غائب ہوگیا۔ میں نے اور بلال شاہ نے دوڑ لگا دی اب اگر تلوہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر وہ غائب ہوجاتا۔ ہم اسے شاید تلاش نہ کرسکتے۔ ٹیلے کے پچھلی طرف پہنچے تو روح فنا ہوگئی۔ ایک گہری دراڑ یہاں موجود تھی۔ ہزاروں فٹ گہری اس میں درخت لٹکے ہوئے تھے ان کی جڑیں اس دراڑ کے کناروں میں تھیں کبھی کوئی چٹان کا ٹکڑا آکر دراڑ میں خوفناک آواز پیدا کرتا۔ نیچے گہرائی کی طرف جاتا سنائی دیتا تھا۔ اس پر ایک درخت کا تنا جھکا ہوا تھا تلوہ اس پر سے گزر کر دوسری طرف جاچکا تھا میں نے اس تنے پر چھلانگ لگائی اور بلال شاہ سے کہا کہ پیچھے آجاؤ کوئی ایک سو فٹ کا فاصلہ ہم نے پل صراط کی طرح طے کیا۔ پل سے نکل کر ترائی میں آئے تو سامنے ہی مکوی کے تختوں سے بنا شکاریوں

کا کیبن تھا۔ نلوہ اس میں گھس گیا تھا ہم ایک بڑے سے پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گئے اب میں نلوہ سنگھ کو مزید مہلت نہیں دے سکتا تھا میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ حملے کے لئے تیار ہو جائے۔ میں نے اپنا سروس ریوالور اور بلال شاہ نے اپنا دیسی پستول نکال لیا اور ہم کیبن کے دروازے کی طرف دوڑ پڑے دروازے سے دور ہی تھے کہ اندر سے نلوہ کا فائر آیا۔ میں نے اور بلال نے شاید اکٹھے فائر کئے گولیاں دروازے سے گزر گئیں میں نے پھر فائر کیا میری آواز میں بہت سخت غصہ تھا۔ "نلوے! باہر آ جاؤ میرا نام نواز خان ہے اور میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"میرا نام بھی نلوہ ہے! ادھر سو میل کے دائرے میں گجراج سنگھ کا راج ہے اور میں اس کا ملازم ہوں یہ سو میل گزارو گے تو اس حد سے باہر نکلو گے۔"

میں نے شدید غصے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی دو سو گز کی چڑھائی کے بعد جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں کی جھگیاں بنی ہوئی تھی آسمان نظر میں نہیں آتا تھا غصے کی حالت میں میرے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکل گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھا جائے گا اور اٹھ کر کیبن کی طرف آخری چھلانگیں لگانا شروع کر دیں اندر سے نلوے نے فائرنگ کھول دیا۔ صرف ایک گولی میرے بازو سے ٹکرائی وہ بھی خطرناک ثابت نہ ہوئی میرے ٹھڈے نے کیبن کا دروازہ دھڑاک سے کھول دیا اندر اندھیرا سا تھا ایک دو سیکنڈ میں نے بہت ہی خطرناک حالت میں گزارے نلوہ کافی دیر سے اندر تھا اور اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھ سکتی تھیں میں تازہ باہر سے آیا تھا اس لئے ایک دو سیکنڈ کچھ نظر نہیں آیا۔ اس عرصے میں نلوہ مجھے گولی مار سکتا تھا لیکن شاید اپنی وجہ سے نہ رہ سکا کہ میرے پیچھے ہی بلال شاہ اندر گھس آیا تھا میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگیں یہ کوئی پچاس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا لکڑی کا کمرہ تھا۔ لکڑی کے شہتیروں پر جھاڑیاں ڈال کر چھت بنائی گئی تھی لکڑی کی چارپائی تھی جس پر لکڑی کے تختے لگے ہوئے تھے۔ سامنے کی دیوار پر چیتے اور جنگلی جانوروں کے سر لگے ہوئے تھے۔ یہ مہاراجہ کے شکاریوں کے کیبنوں میں سے ایک تھا۔

ایک کونے میں تہہ کی ہوئی کھالیں تھیں۔ سارے کمرے میں وحشی جانوروں کی ان کھالوں کی بدبو تھی کیبن کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ شاید یہ کیبن اندر سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ نلوہ اس دروازے کی طرف کھسکا مگر میرے ٹھڈے نے اس کے پیٹ میں ہلچل مچا دی ہوگی میں اسے ٹھڈوں پر رکھنے ہی والا تھا کہ بلال شاہ نے اسے جھپٹے میں لے کر زمین پر دھڑام سے گرا دیا۔ مجھے تیرانی ہوئی چھلانگ یہ ڈاکو اور بلال کے ایک ہی رگڑے سے زمین پر جا گرا پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا ہم دونوں نے اسے وحشیوں کی طرح مارا۔ میں کسی عورت کی چیخوں سے ہوش میں آیا۔ نلوہ جس دروازے کی طرف لپکا تھا اس میں ایک نوجوان عورت نما لڑکی کھڑی تھی آنکھوں میں آنسو اور منہ پر ہاتھ رکھے وہ بری طرح رو رہی تھی۔ بلال کا ہاتھ رک گیا اور میں نے بھی ایک لمحہ بھر نلوے کی طرف سے دھیان ہٹایا اسی وقت ہی نلوہ اتنی مار کے باوجود کھسکا اور اس کی رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس عورت کو گھسیٹ لیا نلوہ مجھ پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار نکل رہی تھی بلال کے گھونسوں سے اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ اس کی نظر میرے چہرے پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔ بلوندر کو چھوڑ دو۔ اس نے زمین پر خون تھوک کر بڑی نفرت سے میری طرف اشارہ کیا۔ میں نے بلوندر کو

آگے کی طرف دھکا دیا نلوہ میری طرف بڑھا اس کی انگلی بندوق کے گھوڑے پر تھی اور یہ آدھا دب چکا تھا کہ بلال کی لات نے اس کا منہ نلوے کی طرف اٹھا دیا اور پھر گولی کے دھماکے کے ساتھ ہی نلوے کا منہ گوشت کا بڑا سا لوتھڑا نظر آنے لگا۔ وہ دائرے کی شکل میں گھوم کر زمین پر جا پڑا۔ بلوندر تیر کی طرح اس پر گری اور چیخیں مار کر رونے لگی اس کی چیخوں کے ساتھ ہی اس کمرے سے ایک اور عورت برآمد ہوئی اور نلوے کی لاش سے چمٹ گئی یہ ہری سنگھ کی بیوی تھی۔

نلوہ سنگھ مر چکا تھا۔

چند لمحے تو میں اور بلال اپنے حواس درست کرتے رہے جس قاتل کو میں پکڑنے آیا تھا وہ اپنی ہی گولی سے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے بلوندر کو اپنے چچا کی لاش پر جی بھر کر رونے دیا پھر ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا۔ یہاں آئے تو ہم دو تھے واپسی پر ہمارے ساتھ ایک جوان لڑکی اور اس کی چچی دو لاشیں بھی ہوتا تھیں۔ نلوہ سنگھ اور ہردیال کی لاشیں یہاں آتے ہوئے ہردیال ہمیں جس راستے لایا وہ تھوڑا بہت میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا ہم نے نلوہ کی لاش وہیں چھوڑی اور بڑی مشکل سے بلوندر کور اور چچی کو ساتھ لے کر واپس باجوڑ پہنچے۔ داروغہ جراج سنگھ ہماری تلاش میں تھا اور سخت غصے کی حالت میں تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کیا یہ اگر وہ کسی راجواڑے کا تنخواہ دار ہے تو میں انگریز حکومت کا ملازم ہوں اور اس کے خلاف وائسرائے کے دفتر میں شکایت بھی کی جا سکتی ہے۔ اسے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے ہردیال اور نلوہ کی لاشیں اٹھوانے کا کہا اور بلوندر اور اس کی چچی کو لے کر اپنے علاقے میں آ گئے۔

ہری سنگھ اپنے بھائی کی موت پر باؤلا سا ہو گیا۔ کیس کا چالان تیار کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی ہری سنگھ نے اقبالی بیان دے دیا اور عدالت میں بھی اپنے بیان پر قائم رہا چونکہ نلوہ مارا گیا تھا اس لئے اس کیس میں بڑے ملزم کی مدد کرنے پر اس کے بھائی کو عدالت نے عمر قید کی سزا دی بعد میں دلبر سنگھ نے اوپر والی عدالتوں میں اپیلیں کیں جس کے بعد یہ سزا سات سال میں تبدیل ہوئی۔

دلبر کے گھرانے میں سے اس کا ماما قتل ہو چکا تھا ایک چچا قتل ہو گیا دوسرا قید ہو گیا۔ ماں اور بلوندر کی دیکھ بھال اس پر آ پڑی تھی ایک دن وہ مجھ سے مشورہ کرنے تھانے آ گیا۔ وہ فوج چھوڑ کر کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا میں نے اسے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کرے۔ گورمکھن سنگھ کے گھر والوں نے اس کی زندگی حرام کر دینا تھی۔ فوج میں اسے حفاظت تو مل سکتی تھی میرے مشورے پر اس نے عمل کیا بلوندر سے شادی کر کے اسے اور ماں کو چھاؤنی ساتھ لے گیا گورمکھن سنگھ مجھ سے ناراض ہی رہا۔

وہ نلوہ کو قتل کرانا چاہتا تھا اور میری ڈیوٹی کو اپنے انتقام کی آگ میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ میں نے رگھوبیر سنگھ کو صاف کہہ دیا کہ اپنے باپ کی زمینداری کی دھونس چلانی چھوڑ دے اپنی بدمعاشیوں میں وہ دو بھائی مروا چکا ہے ایسا نہ ہو کہ اب باپ کو بھی مروا لے یا خود پار ہو جائے۔ میری ناراضی میں تعیناتی تک تو رگھوبیر اپنی حرکتوں سے باز ہی رہا۔ دلبر سنگھ کبھی کبھار مجھے ملنے آ جاتا تھا خدا جانے اب یہاں اور کس حال میں ہو گا۔ آج بھی کبھی کبھی مجھے نلوہ کے ساتھ مقابلہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

''لیکن یہ کہ ان دنوں سوچ رہا ہوں کہ اپنے خاندان کو بڑھالیا جائے۔'' انہوں نے بات مکمل کی۔

''خاندان تو بعد میں بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔ ابھی تو گھر بھی بنانا ہے، خود ہی سوچیں کہ اگر میں نے اس آفر کا فائدہ اُٹھالیا تو بہت جلد، اپنی توقع سے بھی پہلے، ہم اپنا گھر مکمل کر لیں گے۔ بعد میں خاندان بھی بڑھاتے رہیں گے۔'' اس کے لہجے میں خوشامد اور منت تھی۔ ''پلیز جان، پلیز، ہاں کر دیں۔''

''ہاں'' خاموش صاحب کے منہ سے یہ ہاں ایک لمبی آہ کی صورت میں نکلی۔

جب تین ماہ بعد فرزانہ دبئی سے واپس آئی تو خاموش صاحب کو گھر میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ پہلے بھی وہ گھر پر ہوتے ہوئے زیادہ تر دفتر سے متعلقہ خیالات میں کھوئی رہتی تھی۔ خاموش صاحب اور فرزانہ کے بیچ عجیب لاتعلقی سی در آئی تھی، شیشے کی ایک دیوار سی آ گئی تھی۔ پھر وہ پلاٹ کی تلاش اور خریداری میں بھی کچھ مصروف ہو گئے۔ آخر خدا خدا کر کے پلاٹ کی ادائیگی بھی کر دی گئی۔ اس روز خاموش صاحب بہت خوش تھے۔ پلاٹ ایک اچھی جگہ پر بہت اچھے داموں میں آسان اقساط پر مل گیا تھا۔ بہت جلد وہاں بنیادیں کھودی جانے لگیں۔ برسات ابھی دور تھی لیکن خاموش صاحب چاہتے تھے کہ برسات آنے سے پہلے دیواریں کھڑی کر دی جائیں کہ برسات میں پانی بنیادوں میں بھر جاتا ہے۔

اس دوران وہ تعمیر میں اتنے منہمک ہوئے کہ دفتری کام پر پوری توجہ نہ دے پائے۔ اس کے نتیجے میں ان کی کئی مرتبہ سرزنش کی گئی مگر وہ تو تعمیر کے نشے میں اس طرح چور تھے کہ ایسی کسی بھی سرزنش کو خاطر میں لانے کا مطلق کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ایک روز یہ حادثہ بھی ہو گیا کہ ان کو اس نوکری سے جو خدا خدا کر کے ملی تھی، فارغ کر دیا گیا۔ یہ حادثہ وہ ایک کڑوے گھونٹ کی طرح پی گئے مگر اس کو دل سے نہ لگایا اور نہ ہی اعصاب پر سوار کیا۔ بھلے ان کی نوکری چلی گئی تھی مگر فرزانہ کی نوکری تو برقرار تھی بلکہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔

ان کی نوکری سے برطرفی کی خبر سن کر فرزانہ نے ان کو بہت حوصلہ دیا اور ان کا دل بڑھایا اور ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ اب وہ اپنی تمام تر توانائیاں گھر کی تعمیر پر صرف کریں۔ اب تک اس کا لب و لہجہ معذرت خواہانہ اور مودبانہ ہونے کی بجائے تحکمانہ ہو گیا تھا۔

اس روز صبح سویرے ہی ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ ابھی ٹھیکیدار اور مزدور کام پر نہ آئے تھے۔ خاموش صاحب کچھ دیر ان کا انتظار کرتے رہے مگر پھر مایوس ہو کر گاڑی میں گھر کی طرف چل دیئے۔ یہ گاڑی فرزانہ نے ان کو قسطوں پر تحفتاً لے کر دی تھی جو اس روز کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے دوسرے شہر کا بتا کر گئی ہوئی تھی۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ انہیں خیال آیا کہ گھر جا کر بور ہونے کی بجائے کیوں نہ وہ قریب ہی واقع فائیو سٹار ہوٹل میں چائے پی لیں۔ ویسے بھی ان کے اعصاب کو سکون کی ضرورت تھی۔

ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے ان کی ایک سرسری نظر اوپر واقع رہائشی کمروں سے نیچے آتی شیشے کی کیپسول لفٹ پر جا پڑی۔

کچھ دیر کے لیے ان کی نظر لفٹ پر جم کر رہ گئی۔ اُترتی لفٹ کی جھلک میں فرزانہ اپنے بالوں کو درست کر رہی تھی۔ ساتھ میں ایک جوان مرد بھی تھا۔

خاموش صاحب نے گھبرا کر اپنی نگاہ دوسری جانب کر لی اور سوچا ''نظریں بھی کیسا دھوکہ دیتی ہیں۔''

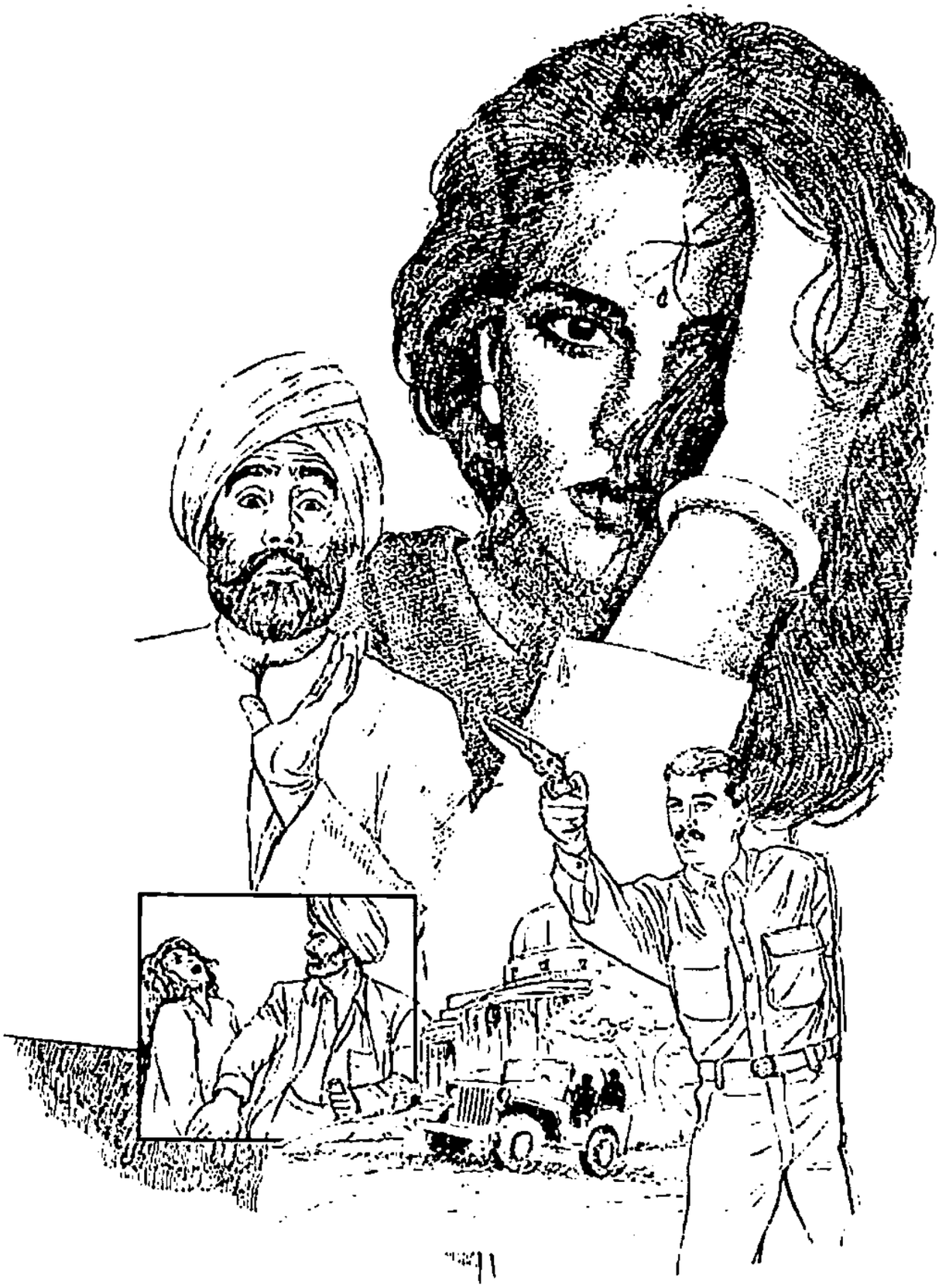
باہر بارش رُک چکی تھی۔

مزدور اب پلاٹ پر آ چکے تھے اور بیزاری سے خاموش صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔

❁ ..... ❁

بھگوڑا

نواز خان



آج میں نے سختی نہ کی تو شاید یہ اصل بات نہ بتائے اس لیے میں نے سخت لہجے میں اسے کہا کہ وہ گھر جائے اور کل اجیت کے ساتھ آ کر مجھے بتانا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ وہ میاں بیوی واقعی سٹیشن گئے تھے یا نہیں۔ وریام گاؤں سے ہی غائب ہو گیا ہو اور تم نے کہانی گھڑی ہو کہ تم خود اسے گاڑی پر چڑھا کر آئی تھی۔ اجیت اسے بازو سے پکڑ کر گھر لے گیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ کسی بھاگنے والے فوجی کا عام معاملہ نہیں بلکہ مجھے اس میں کسی جرم کی بو آ رہی تھی۔ سندھیا کو دیکھ کر میرا یہ احساس کیوں زیادہ ہو جاتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے جس میں یہ عورت بھی ملوث ہو سکتی ہے۔

دوسرے دن میں تھانے آیا سارا دن کاموں میں گزر گیا۔ شام کے وقت مجھے یاد آیا کہ اجیت اور سندھیا نے میرے پاس آنا تھا وہ نہیں آئے۔ میں نے محرر کو بلوایا اور کہا کہ اس فوجی کے گھر آدمی بھیجو اور اس کے بھائی کو بلاؤ وہ آیا نہیں۔ محرر نے آدمی بھیج دیا۔ میں انتظار کرتا رہا اور گھر جانے ہی والا تھا کہ سپاہی اجیت کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے اجیت سے پوچھا وہ اکیلا کیوں آیا ہے۔ اپنی بھرجائی کو ساتھ کیوں نہیں لایا۔ اس سے جو باتیں میں نے پوچھی تھیں ان کا جواب اس نے مجھے دینا تھا۔ اجیت نے آنکھیں نیچی کی ہوئی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے۔ پوچھنے پر کہنے لگا ''کل جب یہاں سے ہم گھر واپس گئے تو بھرجائی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے رات روٹی بھی نہیں کھائی۔ کہنے لگی اس کی طبیعت خراب ہے۔ پھر میں ایسا سو گیا کہ دیر سے اُٹھا۔ میں نے بھرجائی کی چارپائی خالی دیکھی۔ میں نے سمجھا کہ باہر گئی ہے ابھی آ جائے گی لیکن جب سورج کافی چڑھ آیا تو مجھے پریشانی ہوئی۔ باپو اور ماتا بھی پریشان ہو گئے۔ میں اسے تلاش کرنے باہر نکل گیا۔ گاؤں کے سارے ہی گھروں میں پتہ کیا۔ وہ کہیں نہیں ملی۔ میں اسی پریشانی میں آپ کے پاس نہیں آیا۔ بھرجائی کو ہی تلاش کرتا رہا ہوں۔''

اجیت نے جو بات بتائی تھی مجھے تو پہلے ہی اس عورت پر شک تھا۔ اگر وہ کسی غلط کام میں ملوث نہیں تھی تو اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب میرے پہلے والے شک پکے ہو گئے کہ اگر وریام خود غائب ہوا ہے تو اس عورت کو پتہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور اب یہ بھی اس کے پاس چلی گئی ہے اور اگر وریام خود غائب نہیں ہوا تو بھی اس عورت کو معلوم ہے اور کیا پتہ کہ اس کے غائب ہو جانے میں اس کا بھی ہاتھ ہو۔ میں نے اجیت سے کہا کہ تم نے اپنی بھرجائی کو تو تلاش کرنا ہی ہے لیکن یہ اب بہت ضروری ہو گیا ہے جب تک وہ نہیں ملتی مجھے آ کر بتاتے رہنا کہ تم کہاں کہاں گئے ہو۔

اجیت چلا گیا۔ وہ کب بھرجائی کو تلاش کر لاتا۔ اسے ملتی بھی یا نہیں لیکن یہ بات میرے دماغ پر سوار ہو گئی تھی کہ وریام کہاں چلا گیا۔ میرا ذہن بار بار بھٹک کر اس طرف چلا جاتا کہ اسے قتل نہ کر دیا گیا ہو۔ جب میں یہ بات سوچتا تو اسے تلاش کرنے کی دھن اور میرے ذہن پر سوار ہو جاتی۔ اجیت کو گئے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا ہو گا جب مجھے سخت بے چینی ہو گئی کہ اس طرح تو بات کھوہ کھاتے چلی گئی ہے۔ اگر اجیت واپس ہی نہیں آتا تو کیا یہ معاملہ ختم ہو گیا؟ اسی بے چینی میں میں نے خود اجیت کو بلوایا۔ وہ آ کر کہنے لگا کہ سندھیا کہیں نہیں ملی۔ کسی رشتہ دار کو معلوم نہیں۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ وہ مزید تلاش نہیں کر سکتا اس کے

کھیتوں کے کام میں حرج ہو رہا ہے۔ میں نے محرر سے پوچھا کہ اس کا کیا خیال ہے۔ ادھیڑ عمر کا یہ آدمی بہت سمجھدار تھا کہنے لگا اگر کسی بدمعاش کا معاملہ ہوتا تو میں کوئی مخبر لے آتا چونکہ یہ معاملہ عورت کا ہے اور ہمیں معلوم بھی نہیں کہ وہ کس طرح کی عورت ہے۔ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کا کردار اچھا نہیں کیونکہ اس کے خاوند کے گم ہو جانے کے بعد جس طرح واقعات ہوئے ہیں ان سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اس عورت کا بھی کوئی تعلق ہے۔ میرے نزدیک اس کا کردار مشکوک ہے۔ اس لیے میں وہ عورت آپ کے پاس یہاں لاؤں گا جسے گاؤں کی عورتیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں اور وہ ان کے گھروں میں لڑائیاں ہونے کی وجہ بن چکی ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کیسی عورت ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے اسے لے آؤ اور میری اس سے بات کرا دو۔ وہ اسی وقت چلا گیا۔

ایک دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ وہ عورت اس کے ساتھ تھی۔ درمیانی عمر کی اس عورت نے اپنا نام رکمنی بتایا تھا۔ اسی گاؤں میں بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ شادی نہیں کی تھی۔ محرر کے بقول اچھے کردار کی نہیں تھی شاید شادی نہ ہونے کی بھی یہی وجہ ہو۔ بہرحال مجھے اس کے کردار سے کیا لینا تھا مجھے تو سندھیا کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں۔ یہی بات میں نے اس سے پوچھی بھی۔ وہ کہنے لگی کہ وہ پتہ کر کے بتائے گی۔ بڑی باتونی عورت تھی۔ ایک بار شروع ہو جاتی تو چپ نہیں کرتی تھی۔ وہ مجھے گاؤں کی ایسی باتیں سنانے لگ گئی جو میں نے اس سے نہیں پوچھی تھیں۔ میں نے کہا کہ مجھے صرف سندھیا کے بارے میں جاننا ہے وہ کہاں نکل گئی ہے اور کیسی ہے؟

اس بات کو دو تین دن گزر گئے تھے کہ وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ یہ تو پتہ نہیں کہ سندھیا کہاں ہے لیکن جو بات مجھے معلوم ہے وہ بتانے آئی ہوں۔ جس آدمی کے ساتھ سندھیا کے تعلقات ہیں اسے جانتی ہوں۔ جس دن میں پہلے آپ کے پاس آئی تھی اسی دن بتانا چاہتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ہمت نہیں پڑی۔ گھر جا کر سوچا ہے تو مجھے کوئی ڈر نہیں لگا۔ ہمارے اسی گاؤں کا آدمی ہے جاکھر۔ سندھیا اس سے ملتی ہے۔ میں نے خود دیکھا بھی ہے اور جانتی بھی ہوں۔ جاکھر بڑا خراب آدمی ہے وہ جس عورت سے ملتا ہے سمجھ لیں کہ وہ خراب عورت.....'' وہ بولتے بولتے رُک گئی شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ خود بھی جاکھر کو جانتی ہے۔ ''آپ کو پتہ ہے کہ سندھیا نے اپنے گھر والے کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے جاکھر کے ساتھ دوستی بنا لی۔ وریام تو مہینوں کے بعد چھٹی پر آتا تھا اور سندھیا جاکھر کے ساتھ پھرتی تھی۔''

''وریام جانتا ہے کہ جاکھر اور سندھیا کے تعلقات ہیں؟''

''اس کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن جن دنوں وریام چھٹی آیا ہوتا سندھیا زیادہ عرصہ گھر میں ہی رہتی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تعلقات وریام نہیں جانتا ہوگا۔''

''تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ تعلقات ہیں؟''

''جس آدمی نے جرم کیا ہوتا ہے آپ اسے کس طرح پکڑ لیتے ہیں؟ آپ کو یہ کام آتا ہے۔ اسی طرح یہ باتیں ایک عورت کی نظروں سے کیسے چھپ سکتی ہیں؟

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ایسی باتیں تو چھپ نہیں سکتیں اور وہ بھی ایک ایسی عورت کی نگاہوں سے

جو چلتی پھرتی رہتی ہو۔ ایسی عورتوں کی نگاہیں گھروں کی دیواریں نہیں روک سکتیں۔ میں نے محرر کو بلا کر کہا کہ کوئی آدمی اس عورت کے ساتھ بھیج دو یہ اسے ایک آدمی کا گھر دکھا دے گی۔ وہ سپاہی صرف جا کر گھر دیکھ آئے۔ مجھے بعد میں اس کی ضرورت پڑے گی۔ محرر سمجھ گیا کہنے لگا میں آدمی بھیج دیتا ہوں اس نے اس عورت کو میرے پاس سے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

رکنی نے مجھے ایک نئی راہ پر لگا دیا تھا۔ میرا تجربہ کہتا تھا کہ رکنی کی دکھائی ہوئی یہ راہ بالکل ٹھیک جگہ جائے گی۔ جو آدمی غائب ہوا تھا وہ مخبر نہیں تھا نہ ہی اسے کوئی جیب میں ڈال کر لے گیا۔ وہ فوجی جوان تھا۔ اسے کوئی ورغلا کر تو غائب کر سکتا ہے مگر دوسری کوئی صورت نہیں اور اگر سندھیا کے کسی سے تعلقات تھے تو یہ ورغلانا ہی ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ورغلانے والا کون تھا؟ میں غور کرنے لگا۔ جاکھر کو میں چاہتا تو سیدھے سیدھے جا کر پکڑ کر تھانے لے آتا یا سپاہی بھیج کر منگوا لیتا لیکن اس طریقے کی بجائے چھپ کر دیکھنا اور رنگے ہاتھوں پکڑنا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح کروں گا۔ شام ہوئی تو میں نے سر پر پگڑی باندھی۔ حلیہ بدلا اور دیہاتیوں جیسے لباس میں گاؤں کی اس دکان پر چلا گیا جہاں سودا بھی بکتا تھا اور جس طرح آج کل ہوٹل ہوتے ہیں اسی طرح وہاں چوری چھپے دارو (شراب) بھی ملتی تھی۔ جاکھر کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا اس قماش کا آدمی ضرور ایسے اڈے پر جاتا ہوگا۔ میں دکان پر جا کر اس کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے بچھی بہت سی چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد دکان پر بیٹھے ہوئے لالے سے رازدارانہ انداز سے پوچھا کہ دارو مل جائے گی؟

''پردیسی ہو۔ میرا مطلب ہے مسافر ہو؟'' اس لالے نے اپنی پگڑی کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک رومال سا اپنی ٹنڈ پر پگڑی کی طرح باندھ رکھا تھا۔

میں نے اس کے سوال کے جواب میں سر ہلایا۔ لالے نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کسی کو آواز دی۔ ایک سوکھا سڑا لڑکا اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ لالے نے اس کی طرف ہاتھ اٹھایا اور کہنے لگا۔ ''جا کھر آیا ہے؟'' اس لڑکے نے انکار میں سر ہلایا۔ دکاندار لالے نے آہستہ سے ایک گالی دی۔ پھر مجھے دیکھنے لگا۔ ''میرے پاس جل پانی ختم ہو گیا ہے وہ آدمی نہیں ہے جس سے یہ ملتا ہے۔'' میں نے لالے کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے کوئی بات نہیں۔ میں جاتا ہوں اور میں وہاں سے چل پڑا۔ سیدھا تھانے واپس آیا۔ محرر سے کہا کہ وہ سپاہی میرے ساتھ کرو جو جاکھر کا گھر دیکھ کر آیا تھا۔ اس سپاہی کو ساتھ لے کر میں جاکھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں خود گھر کے باہر کھڑا رہا اور سپاہی سے کہا کہ اندر کود جاؤ اور دروازہ کھول دو۔ اگر کوئی اندر ہو تو اسے باہر لے آؤ۔ وہ دیوار سے اندر کود گیا اور دروازہ کھول دیا۔ اچھا خاصہ کھلا صحن نظر آ رہا تھا جس میں ایک طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ شاید تین چار درخت ایک ہی جگہ اُگے ہوئے تھے۔ باہر والے دروازے کے اندر کی طرف تین چار کچے کمرے تھے جن کے لکڑی کے دروازے بند تھے۔ یہ بہت بڑا مکان تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ جاکھر صاحب حیثیت آدمی تھا اور اس کے پیشے کا مجھے پتہ چل چکا تھا کہ شراب کا دھندا کرتا ہے۔ خیر میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھڑکایا۔ کسی کے

کھانسنے کی آواز آئی اور وہ دروازے کی طرف آیا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ اتنا بڑا گھر لیکن خاموشی تھی یا جاکھر کے اس گھر میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ کھانسی کی آواز دروازے تک آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ یہ کوئی دیہاتی آدمی تھا جس نے ہاتھ میں بتی پکڑ رکھی تھی۔ میں نے جاکھر کو دیکھا نہیں تھا لیکن یہ جو کوئی بھی تھا جاکھر نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ یہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بابا ہونے کے قریب تھا۔ سندھیا جیسی جوان عورت کے ساتھ اس کے تعلقات نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے آرام سے ایک طرف کیا اور اندر چلا گیا۔ سپاہی میرے پیچھے تھا۔ اندر جیسا کہ دیہات کے گھروں میں ہوتا ہے چارپائیاں تھیں میں ایک پر بیٹھ گیا۔ بابا بھی مڑ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اس نے بتی ایک طرف رکھ دی وہ ابھی تک چپ تھا۔ شاید اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ میں نے ہی اس سے بات کی ''جاکھر کہاں ہے؟''

''دو دن پہلے کہیں گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہیں جا رہا ہوں۔''

''تم کون ہو؟''

''مرحمدار۔ جاکھر کا زمینوں کا حساب کتاب رکھتا ہوں۔ اس نے مجھے چاچا بنایا ہوا ہے۔''

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ سندھیا بھی غائب ہوگئی اور اب یہ جاکھر بھی۔ اگر انہوں نے کچھ نہیں کیا بے گناہ ہیں اور ان کا وریام کے گم ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو غائب کیوں ہو گئے ہیں؟ مجھے رکمنی کی بات کا یقین ہو گیا۔ سندھیا اور جاکھر میں تعلق تھا۔

مجھے یاد نہیں کتنے دن گزرے تھے لیکن کافی دنوں کے بعد مجھے محرر نے ہی بتایا تھا کہ جاکھر گھر آ گیا ہے۔ اسے یہ بات گاؤں میں اپنے مخبروں سے معلوم ہوئی تھی۔ جاکھر کو گھر آ کر ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ اس کے پیچھے کیا ہوا ہے۔ کیونکہ اس بابا نے ہمارے وہاں آنے اور اسکا پوچھنے کے بارے میں بتادیا ہوگا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دوبارہ غائب ہو جاتا اس لیے میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے محرر کو کہا کہ تین چار آدمی اس کے گھر بھیج دو جو اسے پکڑ کر لے آئیں۔ بندے ہوشیار ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ جاکھر بھاگ جائے۔ محرر نے جو آدمی بھیجے وہ واقعی ہوشیار تھے۔ انہوں نے جاکھر کو میرے سامنے پیش کر دیا اور میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ لمبا قد، خوبصورت چہرہ، بھاری ڈیل ڈول۔ وہ اچھا خوبصورت مرد تھا۔ ہندو لگتا ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے پاس بٹھالیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اسے کہا کہ ''سندھیا کہاں ہے؟''

میری بات سن کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ شاید اسے یہ امید نہیں تھی کہ میں نے اسے اس لیے تھانے بلایا ہے۔ وہ واقعی حیران ہوا یا نہیں لیکن مجھے نظر ایسا ہی آیا کہ وہ میری بات سن کر پریشان سا ہو گیا ہے۔ اب یا تو وہ مکر کر رہا تھا یا بے گناہ تھا بہرحال میرا سوال سن کر وہ پہلے گڑبڑایا اور پھر سنبھل کر بولا ''کون سندھیا؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے اور آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

اسے سیدھی راہ پر ڈالنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے ہاتھ گھما کر ایک تھپڑ اسے دے مارا۔ اس کا سر گھوم گیا۔

''تم نہیں جانتے سندھیا کون ہے؟ اگر نہیں پتہ تو میں بتا دیتا ہوں وریام فوجی کی گھر والی جو.....''

میں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''وریام کو میں جانتا ہوں لیکن اس کی گھر والی

سے میرا کیا تعلق ہے۔"

"تم نہیں مانتے تو تمہاری مرضی لیکن مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تمہارا وریام کی بیوی سندھیا سے کیا تعلق ہے اور اس کے گھر والے بھی شک کر رہے ہیں کہ تم نے اسے کہیں غائب کر دیا ہے۔" میں نے اس کے ساتھ وریام کی بات کرنے کی بجائے یہ پتہ پھینکا کہ اس نے سندھیا غائب کر دی ہے۔

اس نے انکار میں سر ہلایا اور چپ کر کے بیٹھ گیا۔ گویا اس طرح ظاہر کرنے لگا کہ اسے کوئی پرواہ نہیں میں جو مرضی کہتا رہوں۔ اس کے اس انداز سے مجھے گرمی چڑھ گئی اور میں نے اسے کمرے میں لے جا کر اچھی طرح دھنک دیا۔ جس طرح کا خودسر وہ آدمی تھا ایسے لوگ اسی طریقے سے قابو آتے ہیں۔ دھلائی کے بعد اسے عقل آئی کہ وہ تھانے میں ہے اپنی حویلی میں نہیں۔ اب اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"وریام کی گھر والی سندھیا کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس کا گھر والا فوجی ہے، چھٹی پر آتا رہتا ہے، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اس کی میرے ساتھ دشمنی ہو گئی ہوتی لیکن آپ پورے گاؤں سے پوچھ لیں میرا اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ نہ میں کبھی وریام کے ہوتے ہوئے اس کے گھر گیا ہوں۔ میرا سندھیا سے کوئی تعلق نہیں اگر وہ کہیں غائب ہوئی ہے تو مجھے نہیں پتہ۔ اس گاؤں سے اگر کوئی عورت غائب ہوتی ہے تو میرا اس سے کیا تعلق۔ رہی یہ بات کہ اس کے گھر والے کہتے ہیں کہ میں نے اسے کہیں غائب کر دیا ہے تو بکواس کرتے ہیں۔ ابھی شاید وہ مجھ پر کرم کر رہے ہیں کہ صرف سندھیا کے ساتھ میرا نام لیا ہے کل کو کہیں گے کہ شاید وریام کو میں نے غائب کر دیا ہے۔ اس چھاؤنی سے اٹھا کر لے گیا ہوں۔ وریام اور سندھیا گڈی گڈا نہیں کہ میں انہیں اٹھا کر لے گیا ہوں۔ جناب وریام کے گھر والے بڑے ڈھونگی ہیں ذرا وریام کے بھائی کو چھتر لگائیں وہ بتا دے گا کہ سندھیا کہاں گئی ہے۔ مجھ غریب کو آپ نے خوامخواہ پکڑ لیا ہے۔"

جاکھر نے جس طرح بات کی اس سے میں بھی ڈول گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آدمی بے گناہ ہو۔ میں نے اسے صرف اس عورت کے کہنے پر پکڑا تھا جس کا اپنا کردار بہت مشکوک تھا۔ ہو سکتا ہے وہ جاکھر کے ساتھ اپنی کوئی دشمنی رکھتی ہو اور اس نے یہ موقع غنیمت جانا ہو بدلہ لینے کا۔ خیر میں نے جاکھر کو دو دن اپنے پاس رکھا اور مسلسل پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن اس سے کچھ نہیں نکلا۔ یا تو وہ بے گناہ تھا یا بڑا سخت آدمی تھا۔ میں نے اس پر وہ حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا جو اسی طرح کے سخت جان لوگوں پر آزماتا رہا ہوں اور یہ حربہ کامیاب ثابت ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اسے چھوڑ دوں جب وہ خود کو آزاد سمجھنے لگے گا اور غلط حرکت کرے گا تو اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لوں گا۔ اسی خیال سے میں نے جاکھر کو آزاد کر دیا۔

جاکھر کو چھوڑ کر میں نے وریام کے بھائی اجیت کو سامنے رکھا۔ کیا یہ شخص وریام کی گمشدگی کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ جائیداد وجہ ہو سکتی ہے یا گھریلو جھگڑا۔ اجیت غیر شادی شدہ تھا اسے دولت کی طلب بھی ہو سکتی تھی ایسے غیر شادی شدہ آدمی شراب جوئے کی لت میں پڑ جائیں تو جائیدادیں بیچ دیتے ہیں۔ ایسی ہی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی وریام نے مخالفت کی ہو گی اور اس نے وریام کو غائب ہی کر دیا ہو یا پھر سندھیا..... کے ساتھ تعلقات.....؟ میں نے ایسے سکھ گھرانے دیکھے تھے جہاں بھابی کو اس کے دیور وہ احترام نہیں دیتے تھے جو دوسرے

مذاہب میں اور معاشرے میں دیا جاتا ہے۔ سکھوں کی ایک الگ ہی معاشرت اور رواج ہیں۔ اپنے شک مٹانے کے لیے میں نے اجیت کے باپ بشن سنگھ کو بلا لیا اور پورے دو دن اس سے جرح کرتا رہا۔ مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی کہ اجیت اور وریام میں کوئی جھگڑا دشمنی رہی ہو۔ سندھیا کے ساتھ اس کا ہنسی مذاق ضرور تھا لیکن اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ وریام سنگھ کو میں نہ جانے کب تک تلاش کرتا رہتا لیکن اسی گاؤں کے موچی فوجا سنگھ نے میری مشکل دور کر دی۔ میں صبح صبح تھانے آیا ہی تھا کہ یہ آدمی میرا انتظار کر رہا تھا۔ محرر مجھے دیکھتے ہی آ گیا کہنے لگا یہ آدمی ایک لاش ملنے کی اطلاع لے کر آیا ہے۔ میں نے اس کی بات سنی۔ فوجا سنگھ نام کا یہ آدمی اپنے ایک رشتہ دار کو گاڑی پر سوار کرانے سٹیشن گیا۔ راستے میں واپسی پر وہ سٹیشن کے پاس ویران جگہ کنویں کے پاس تھک کر آرام کرنے بیٹھ گیا لیکن اسے بدبو سی محسوس ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید قریب ہی کوئی مرا ہوا جانور ہو گا لیکن انجانے احساس کے تحت اس نے کنویں میں جھانکا۔ بدبو اس جگہ سے آ رہی تھی اور یہ کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی لاش سے اُٹھ رہی تھی۔ فوجے موچی کو مرے ہوئے آدمی کی ٹانگیں صاف نظر آ رہی تھیں کیونکہ یہ ٹانگیں کنویں کی دیوار کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ فوجے نے دوبارہ وہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں سمجھا تھا اور بھاگم بھاگ گاؤں واپس آ گیا۔

وید تلسی رام نے اسے تھانے جانے کا کہا اور فوجا سنگھ میرے پاس آ گیا۔ میں نے فوجا سنگھ سے کہا کہ جاؤ بندے لے کر آؤ۔ اسے گاؤں نہیں جانا پڑا۔ تھانے سے باہر ہی گاؤں کے آٹھ دس آدمی کھڑے تھے جو فوجے کی وید کو سنائی ہوئی کہانی سن کر اس کے پیچھے تھانے چلے آئے تھے۔ میں نے وہی آدمی ساتھ لے کر فوجے کو آگے لگایا اور ویران کھوہ پر پہنچ گئے۔ یہ کھوہ کسی زمانے میں کسی عمارت کا حصہ رہا ہو گا کیونکہ اس عمارت کے کھنڈر ابھی تک موجود تھے۔

گاؤں کے آدمی بڑے ہوشیار تھے وہ سٹیشن سے جا کر قلیوں سے رسیوں کا بندوبست کر لائے۔ اس طریقے سے انہوں نے لاش کنویں سے نکال لی کہ میں حیران رہ گیا۔ دیہات میں اکثر جانور کنوؤں میں جا گرتے ہیں اور دیہاتی انہیں نکالنے کے ماہر ہوتے ہیں انہوں نے لاش بھی اس طریقے سے باہر نکال لی۔ اس سے سخت بدبو اُٹھ رہی تھی۔ چہرہ بگڑ کر عجیب طرح کا ہو گیا تھا۔ میں نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ شناخت کریں لیکن وہ نہیں کر سکے۔ پھر میں نے ان میں سے دو آدمی گاؤں بھجوا دیئے کہ وہ وہاں جا کر بتائیں کہ لاش ملی ہے جو چاہتا ہے آ کر شناخت کرے۔ اجیت بھی آ گیا۔ وہ لاش کو ادھر ادھر سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی گئی اور پھر یکا یک وہ رونے لگ گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تم نے پہچان لیا ہے یہ کون ہے؟ اس نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھا ہوا تھا دوسرے سے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا

''یہ پھاڑیا ہے جی۔''

گویا یہ مرنے والا وریام سنگھ تھا۔ جس آدمی کی مجھے اور فوجیوں کو تلاش تھی وہ مل گیا تھا لیکن مُردہ حالت میں اور حالت بھی ایسی کہ میں نے اجیت سے کہا کہ میں جاتا ہوں تم نے اس کا جو کرنا ہے کر کے فارغ ہو کر میرے پاس آنا۔ تھانے جا کر میں نے کاغذات بنائے۔ فوجی جو پتہ مجھے دے گئے تھے اس پر اطلاع کی۔ تلاش کا کام تو ختم ہو گیا لیکن اس

سے بڑا کام شروع ہو گیا۔ دریام خود تو اس کنویں میں جا کر نہیں سو گیا تھا۔ اسے کسی نے کنویں میں پہنچایا تھا۔ وہ قتل ہوا تھا اور اب مجھے اس کے قاتل کو بھی پکڑنا تھا۔ اگلے دو دن بڑے مصروف گزرے۔ فوجی بھی آ گئے تھے۔ وہ اجیت سے مل کر میرے پاس آئے۔ کاغذی کارروائی ہوئی۔ اجیت بھی کریا کرم سے فارغ ہو کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پرچہ درج کروائے۔ اس کے بعد آگے چلتے ہیں۔ اس نے پرچے میں سندھیا کو اپنے بھائی کی قاتلہ نامزد کر دیا۔

دریام کے قتل میں نامزد ملزمہ سندھیا غائب تھی اور اس کا عاشق جو میرے نزدیک ابھی تک مشتبہ تھا وہ بھی غائب ہو جاتا تو میرے پاس کیا بچتا۔ اس لیے میں نے جاکھر کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ دریام کے قتل میں ملوث تھا تو اب دریام کی لاش مل جانے کے بعد وہ ضرور کوئی حرکت کرے گا۔ اسی خیال سے میں نے رکنی کو بلا کر ہوشیار کر دیا اور اسے خاص تاکید کی کہ وہ جاکھر پر نظر رکھے۔ وہ جاکھر جیسے شوقین مزاج آدمی کے گھر بلا روک ٹوک جا نکلتی تھی اس لیے دوسری طرح کی نگرانی کے مقابلے میں اس کی نگرانی زیادہ موثر ہو سکتی تھی تاہم میں نے صرف رکنی پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ جاکھر کے گھر کے باہر اپنے سپاہیوں کا پہرہ بھی لگا دیا۔ چلتے پھرتے یہ سپاہی عام طور پر نظروں میں نہیں آتے۔ وہ چونکہ پیشہ ور ہوتے ہیں اس لیے اپنا کام بہتر طریقے پر کرتے ہیں لیکن کبھی وہ ناکام بھی ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ عام آدمی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ دریام کے معاملے میں وہ ناکام رہے اور رکنی کامیاب ہو گئی۔

دوپہر کا وقت تھا جب رکنی میرے پاس تھانے آ گئی۔ اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہی وقت ضائع نہیں کیا کہنے لگی ''سندھیا جاکھر کے گھر آئی ہے۔''

میرا دوران خون تیز ہو گیا۔ میں نے اسے ٹوکا نہیں بولنے دیا۔ ''اس نے کالی چادر سے جسم ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ اپنی چال کسی طرح نہیں چھپا سکتی تھی۔ کم از کم مجھ سے نہیں۔ میں جاکھر کے گھر سے دو گھر آگے تھی۔ میں جھٹ اس گھر کی ڈیوڑھی میں گھس گئی۔ سندھیا مجھے نہیں دیکھ سکی۔ وہ جاکھر کے گھر میں گئی اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لی۔ پہلے تو خیال آیا کہ اندر جاؤں لیکن پھر آپ کی طرف چلی آئی۔ میرا خیال ہے اس وقت موقع ہے چل کر دونوں کو پکڑ لیں۔''

میرا جو شک تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ اس خیال سے ہی میرے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ جاکھر کو چھوڑ کر میں نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ جاکھر نے مجھ سے آزاد ہوتے ہی کام شروع کر دیا تھا اور دریام کی لاش ملنے کے بعد سندھیا بھی جہاں کہیں تھی نکل آئی تھی۔ اسے لاش ملنے کی اطلاع کس نے دی؟ جاکھر نے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جاکھر کا اس دوران سندھیا سے پورا رابطہ تھا۔ یہاں تھانے بیٹھ کر سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے رکنی سے کہا کہ وہ یہیں تھانے میں بیٹھے میں آتا ہوں۔ میں نے جلدی سے دو سپاہی ساتھ لیے اور جاکھر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس بار ہم میں سے کسی کو دیوار کے راستے اندر نہیں جانا پڑا بلکہ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دروازہ کھڑکائے بغیر ہی سپاہیوں کے ساتھ اندر گھس گیا۔ صحن میں ہی جہاں درخت اکٹھے اُگے ہوئے تھے وہاں مجھے چارپائی پر مرحمدار بیٹھا نظر آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف آ گیا۔ قریب آتے ہی میں نے اس سے پوچھا کہ جاکھر کہاں ہے؟ ''وہ جی

کوٹھے کے اندر ہے۔'' میں نے اسے وہیں چھوڑا اور کچے کمروں کی طرف بڑھا۔ ایک چارپائی پر گاؤ تکیہ لگائے جاکھر نیم دراز تھا اور حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً چارپائی سے ٹانگیں نیچے کیں، جوتی پہنی اور کھڑا ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ میں اسے اسی طرح حیران چھوڑ کر باہر کی طرف آیا اور سپاہیوں کو آواز دی کہ باہر والا دروازہ بند کر کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لو اگر کوئی عورت ہو تو اسے باہر نہیں جانے دینا پکڑ کر اسے میرے پاس لے آؤ۔ جاکھر والا یہ کمرہ تو خالی تھا۔ جاکھر کہنے لگا ''جناب کسے تلاش کر رہے ہیں؟''

''سندھیا کو جو ابھی یہاں آئی تھی۔ تم نے اسے کہاں چھپا دیا ہے؟''

''آپ کو کسی نے غلط کہا ہوگا۔ سندھیا یہاں نہیں ہے اور نہ ہی میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔''

میرا خون کھول گیا۔ یہ رکنی مجھے بیوقوف بنا رہی ہے یا جاکھر بنا رہا ہے۔ مجھے تماشہ بنا رکھا ہے انہوں نے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے جاکھر کو گلے سے پکڑ لیا اور شروع ہوگیا۔ اتنی دیر میں سپاہی میرے پاس آگئے، کہنے لگے سارا گھر چھان مارا ہے کوئی عورت نہیں ہے یہاں۔ میں سوچنے لگا اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھیا تو یہاں آئی ہی نہیں یا پھر آ کر نکل گئی ہے۔ اب یہ جاکھر ہی بتا سکتا ہے کہ کیا ہوا اور اس سے پوچھنے کے لیے میں ایک بار پھر اسے تھانے لے گیا۔ جاکھر کو تھانے لا کر میں نے خود اس کا بھرکس نکالا۔ میں اس سے پوچھتا کہ اس نے سندھیا کو کہاں غائب کیا ہے۔ میرے تمہارے گھر جانے سے پہلے وہ تمہارے گھر میں موجود تھی۔ تم نے اسے غائب کیا ہے۔ تم اور سندھیا ملے ہوئے ہو اور تم لوگوں نے وریام کو مارا ہے۔ تم اس کے قتل کا اقرار کر لو۔

میری مار کے باوجود جاکھر مان نہیں رہا تھا کہ اس نے اور سندھیا نے مل کر وریام کو مارا ہے۔ جب اس نے حد سے زیادہ مار کھا لی اور اسے خود بھی معلوم ہوگیا کہ اب اس میں سکت نہیں رہ گئی تو کہنے لگا کہ واقعی جب آپ آئے اس سے تھوڑی دیر پہلے تک سندھیا اس کے پاس تھی لیکن وہ زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں آئی تھی اس نے میرے ساتھ صرف یہ بات کرنی تھی کہ میں اسے چھپنے کا کوئی اچھا ٹھکانہ دے دوں۔ گاؤں سے چھ سات میل پرے میری زمین ہے اور وہاں میرا چھوٹا سا ڈیرہ ہے جہاں میرے تین آدمی رہتے ہیں۔ سندھیا چاہتی تھی کہ میں اسے وہاں رہنے دوں لیکن میں نے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ آپ سے چھپتی پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ اس لیے میں اب اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ اس وقت تک وہ میرے یار کے گھر چھپی رہی ہے اور اس اجیت حرامی کو سب پتہ ہے کہ سندھیا کہاں تھی۔ میں نے سندھیا کو بتا دیا ہے کہ پولیس مجھے بھی پکڑ کر تھانے لے جا چکی ہے۔ اس لیے میرا اس سے تعلق ختم۔ میرے انکار کے بعد وہ فوراً ہی میرے گھر سے چلی گئی۔

''تمہارا اور سندھیا کا آخر تعلق کیا ہے؟''

میرے اس سوال پر وہ کہنے لگا کہ اصل میں سندھیا اجیت کے ساتھ خراب ہے اور مجھے اس کا پتہ چل گیا کیونکہ وہ فوجی تو بہت دیر سے گاؤں چھٹی پر آتا ہے اور میں نے کئی بار اجیت اور سندھیا کو زمینوں پر پکڑا ہے۔ اس لیے سندھیا اور اجیت میرے سامنے بول نہیں سکتے اور سندھیا مجھے خاموش رکھنے کے لیے میرے پاس بھی آتی رہتی ہے..... بس میں نے آپ کو سچی بات بتا دی ہے۔ اب آپ چاہیں تو مجھے

جان سے ماردیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔"

رکمنی نے جاکھر اور سندھیا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ سچ ہوتے ہوئے بھی سچ نہیں تھا اور اجیت کے بارے میں میرا جو شک تھا وہ صحیح نکلا تھا۔ میں نے جاکھر سے کہا کہ سندھیا ابھی تمہارے یار کے گھر ہوگی مجھے وہاں لے چلو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محرر سے کہا کہ اجیت کو پکڑ کر یہاں لے آؤ اور میرے آنے تک کہیں جانے نہ دینا۔

محرر کے نکلنے سے پہلے ہی میں اور جاکھر اس کے دوست کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سندھیا چھپی ہوئی تھی۔ جاکھر پہلے مجھے اپنے گھر لے گیا وہاں اس کے صحن کے درختوں کے پیچھے بنے ہوئے کمرے میں سے اس کا ملازم دو گھوڑے نکال لایا۔ یہ کمرہ اس کا اصطبل تھا۔ بڑے خوبصورت گھوڑے تھے۔ بالکل ہوا کی طرح دوڑتے تھے۔ جاکھر کہنے لگا کہ کافی وقت لگے گا۔ پر مجھے وقت کا احساس نہیں ہوا۔ اپنے علاقے میں ایسی ایسی خوبصورت جگہیں تھیں جہاں میں پہلے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے اس پر ہریالی بہت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے گہری گہری گھنی گھاس میں راستہ بنا دیا گیا ہو۔ پتہ نہیں یہاں کسی زمانے میں کھدائی ہوتی رہی ہوگی۔ اس لیے کافی دور تک دونوں طرف مٹی کے ٹیلوں کی شکل میں ڈھیر تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جم کر پہاڑیوں جیسی شکل اختیار کر گئے تھے اور ان پر جنگلی پھول اور جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ یہ راستہ زیادہ دور نہیں چلا۔ اس کے بعد ایک دم ایسے لگا جیسے ہم کسی پہاڑے علاقے سے نکل کر میدانی علاقے میں آ گئے ہوں کیونکہ میرے سامنے اب بھوری مٹی والی خشک زمین تھی جس میں کہیں کہیں کیکر اور ٹاہلی کے درخت نظر آتے تھے۔ کسی جگہ کوئی کھال ہمارے راستے میں آ جاتا۔ ادھر ادھر فصل بھی کہیں نظر آ جاتی تھی۔ بستی ابھی تک کوئی نظر نہیں آئی تھی۔ جاکھر کا کہنا صحیح تھا کہ کافی وقت لگے گا۔ جہاں تک ہم نے جانا تھا وہ تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ میں راستے کی خوبصورتی کی وجہ سے وقت کا احساس نہیں کر رہا تھا لیکن پھر مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ ہم کب کے چلے ہوئے ہیں۔ جاکھر میرے تھوڑا سا آگے تھا۔ میں نے اس سے وریام کی بات چھیڑ دی کہ اسے قتل کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ جاکھر کہنے لگا۔ میری وریام سے کیا دشمنی؟ اگر اس کی دشمنی ہو گی تو اجیت سے کیونکہ دونوں زمین کے مسئلے پر جھگڑ پڑے ہیں۔ میں نے جاکھر سے کہا کہ چلو میں مان لیتا ہوں کہ یہ دونوں بھائیوں کا جھگڑا ہے لیکن یہ سندھیا تمہارے پاس کیوں آتی ہے۔ اس کا جواب تم نہیں دے رہے۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر جاکھر کے خلاف شک اُبھرنے لگا اور پھر ایک دم میرے اعصاب ٹھنڈے ہو گئے۔

کہیں اس حرامی نے مجھے کسی جال میں تو نہیں پھنسا لیا۔ مجھے یہ اسی جال میں نہ لے جا رہا ہو۔ مجھے وہ ایک دم بڑا شاطر آدمی لگنے لگا۔ میری چھٹی حس ایک دم بیدار ہو گئی اور اتنی دور آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے کوئی غلطی کر دی ہے لیکن کیا غلطی کی ہے۔ ذہن اس کا اندازہ نہیں کر رہا تھا۔ اسی وقت میری حیوانی حس بیدار ہو گئی۔ جب کوئی جنگلی جانور کسی خطرے میں گھر جاتا ہے تو وہ زیادہ چوکس ہو جاتا ہے اور اس کی مزاحمت ایک دم سخت ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح یکا یک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں اس کے ساتھ جا کر غلط تو نہیں کر رہا اور میری حس کہہ رہی تھی کہ مجھے کوئی خطرہ ہے۔ ایسے حالات میں فوری فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کچھ دور کسی بستی کے

گھر نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے دل کو تھوڑی ڈھارس بندھی اور مجھے خیال آیا کہ میں بزدل تو نہیں ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے میرے جو احساسات تھے مجھے ان پر شرمندگی سی ہونے لگی۔ وہی جاکھر اب مجھے کمزور نظر آنے لگا۔ بہرحال بستی قریب آ گئی اور اس سے بہت پہلے ہی وہ مکان بھی آ گیا جہاں مجھے جاکھر لے جا رہا تھا۔

عام دیہاتی گھروں کی نسبت یہ پکا مکان تھا۔ میرا مطلب ہے گارے کی بجائے اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ جن کے اوپر ٹوٹے ہوئے شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہ شیشے اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ کوئی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرے تو اس کے ہاتھ زخمی ہو جائیں۔ مجھے احساس ہوا کہ ایسی دیوار کسی خاص مقصد سے تیار کی گئی ہے۔ اونچا ٹھوس لکڑی کا دروازہ جس کے سامنے جاکھر نے گھوڑا روک لیا۔ ہم گھوڑوں سے اُترے۔ جاکھر نے زور زور سے دستک دی۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

میری نظر اس پر پڑی تو مجھے پھر بے نام سی بے چینی ہونے لگی۔ پہلوان نما آدمی تھا یہ۔ ایک آنکھ سے کانا۔ سر پر بالوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا دوسرا کالا۔ وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ میں اندازہ کرنے لگا کہ اس کے ساتھ بھڑنے کی مجھ میں طاقت ہے یا نہیں۔ خیر اس نے جاکھر کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ جاکھر کہہ رہا تھا کہ یہ اس کے دوست کا گھر ہے لیکن وہ اس بے تکلفی سے اندر جا رہا تھا جیسے یہ خود اسی کا گھر ہو اور اس کانے نے اسے اس طرح اندر جانے دیا جیسے وہ اس کا ملازم ہو۔ میں اندر سے بالکل تیار ہو گیا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مکان کا صحن کم تھا اور کمرے زیادہ نظر آ رہے تھے۔ جاکھر آگے آگے چل رہا تھا اور کانا میرے ایک طرف۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر جاکھر دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ ایک برآمدہ تھا جو کمروں کے باہر چل رہا تھا۔ موڑ مڑتے ہی مجھے ٹھنڈی ہوا کا احساس ہوا۔ یہاں برآمدے کے آگے بہت کھلا صحن تھا جس میں گھاس تھی اور پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی تھیں۔ صحن درختوں سے بھرا پڑا تھا جس طرف سے ہم مکان کے اندر آئے تھے ادھر سے یہ نظر نہیں آتے تھے۔ جاکھر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں اس کی چال ڈھال بالکل ہی بدل گئی تھی۔ بالکل ایسے جیسے اسے میری کوئی پرواہ نہیں اور میں اس کے گھر میں ہوں۔ میں اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ کانا میرے پیچھے تھا۔ کمرے میں موٹے موٹے پائیوں والا تخت پوش پڑا تھا جس کی شکل مسہری جیسی تھی اور پاس لکڑی کی تین کرسیاں پڑی تھیں۔ اینٹوں کا پکا فرش تھا۔ یہ مکان کسی نے کافی پیسے خرچ کر کے بنایا ہو گا۔ جاکھر کی کمر میری طرف تھی اور منہ سامنے دیوار کی طرف۔ اسی حالت میں وہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور کسی نے چٹخنی چڑھا دی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ راستے میں مجھے جو وحشت ہوئی تھی اور جس چیز سے چھٹی حس نے خبردار کیا تھا وہ سامنے آنے ہی والی تھی۔ جاکھر نے اپنا دایاں ہاتھ ایسے جھٹکا جیسے اس نے کسی کو کوئی اشارہ کیا ہو اور ساتھ ہی تیزی سے میری طرف لپکا جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ خطرے کی حالت میں انسان کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹنے کے لیے حرکت کی لیکن شاید مجھے دیر ہو گئی تھی اس کانے نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور اس کی بھینسے جیسی ٹکر سے میرے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ میں

اڑتا ہوا مسہری پر جا گرا۔ ابھی کھڑا ہونا ہی چاہتا تھا کہ چھانٹے کی ہوا کو کاٹنے کی آواز آئی اور چھانٹا شڑاپ کی آواز کے ساتھ میرے منہ پر لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے استرا میرے منہ پر پھیر دیا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ درد کی لہر میرے اوپر والے سارے دھڑ میں پھیل گئی اور پھر مجھ پر چھانٹے برسنے لگے۔ پتہ نہیں چھانٹا کس کے پاس تھا۔ کانے نے یا پھر جاکھر نے رسی سے میرے ہاتھ باندھ دیئے۔ میرے کانوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی لیکن میں صاف طور پر آوازیں سن رہا تھا۔ جاکھر کمرے سے باہر جا رہا تھا اور اس نے کانے سے کہا کہ اسے وہیں بند رکھو میں ''اسے'' لے جا رہا ہوں دھیان سے رہنا باہر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں یہ کون ہے۔ کانا اور وہ باہر نکل گئے اور انہوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ان کے قدموں کی آوازیں آہستہ ہوتی ہوتی بند ہو گئیں اور گہری خاموشی چھا گئی۔ میں اس کمرے میں ایک چوہے کی طرح بند ہو چکا تھا اور میرے تھانے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں۔ جاکھر مجھے چکر دے گیا تھا اور اب میرا ذہن صاف ہو چکا تھا کہ جاکھر کیا چیز ہے۔ مجھے اب یہاں سے باہر نکلنا تھا۔

قید کی حالت سے فرار کے لیے ضروری تھا کہ میرا دماغ ٹھنڈا رہے تاکہ میں ٹھیک طرح سے سوچوں۔ کانے اور جاکھر کی شکل سامنے آتی تو خون کھول جاتا۔ جی چاہتا ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ بڑی مشکل سے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ باہر صحن میں لگے درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ مجھے اپنے قیدی ہونے کا احساس شدت سے ہوا۔ پرندوں کی آوازیں کم ہوتی گئیں اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید باہر شام ہوتی جا رہی ہے۔ کافی دیر بعد میرے دروازے کے باہر کوئی آیا۔ اس وقت کمرے میں گھپ اندھیرا تھا جس سے میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جو کوئی ہے جلدی اندر آئے اور پھر اس نے کنڈی کھولی اور اندر آ گیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا یہ کانا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی تھا جس نے ایک بڑی سی تھالی میں روٹیاں اور کوئی سالن رکھا ہوا تھا۔ اب آدمی نے تھالی میرے سامنے رکھ دی اور کانے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر مجھے کانے کی آواز پہلی بار سنائی دی۔ اس کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی پھٹی ہوئی تھی۔

''میں اس کے ہاتھ نہیں کھول سکتا تم ہی اسے روٹی کھلا دو۔'' وہ اپنے ساتھ آنے والے آدمی سے کہہ رہا تھا۔ میں نے یہ سن کر اسے سختی سے روک دیا اور کانے سے کہا کہ وہ دو آدمی ہیں اور میں کمرے میں بند ہوں میرے پاؤں بندھے ہوئے ہیں وہ کیسے مرد ہیں کہ مجھ سے ڈر رہے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کانے کو اشتعال دلانا چاہا تھا کیونکہ اس طرح وہ میرے ہاتھ کھولنے پر آمادہ ہو جاتا لیکن شاید میرا حربہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے گالیاں بھی دیں کہ وہ مشتعل ہو جائے لیکن کمال کا تھا اس کا ضبط۔ اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس نے ساتھ آنے والے کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے اور کانا اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئے جہاں پھر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے خود کو ٹھنڈا رکھنے اور سونے کی کوشش کی کہ اس طرح جسمانی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں لیکن مجھے بار بار غصہ آ جاتا کبھی خود پر کبھی جاکھر پر اور کبھی کانے پر۔ رات گئے تک میں اسی کشمکش میں رہا پھر پتہ نہیں مجھے کب نیند آ گئی اور میں بے خبر سو گیا۔ میں چونکہ فجر کے وقت اٹھنے کا عادی تھا اس لیے فجر سے پہلے ہی جاگ گیا۔ اب میری طبیعت قدرے بحال ہو

چکی تھی اور میرے سوچنے کی صلاحیت بہتر تھی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح تو جاکھر مجھے جب تک چاہے گا یہاں قید رکھے گا۔

مجھے آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے اور پھر سورج طلوع ہونے تک میرے دانت دکھنے لگے کیونکہ میں دانتوں سے ہاتھوں کے گرد بندھی رسی کھولتا رہا۔ میری کلائیاں رگڑ سے چھل گئیں اور ہونٹوں پر خراش آ گئی لیکن جب رسی سے میرے ہاتھ آزاد ہو گئے تو پھر پاؤں کھولتے دیر نہیں لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میں اس کانے کے ساتھ نمٹ سکتا تھا۔ پہلے تو آزاد ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ اس عمارت میں کانے کو تلاش کر کے اس کا قیمہ بنا دوں لیکن پھر ضبط کر لیا کہ انجان جگہ ہے کانا میرے باہر نکلنے سے ہوشیار ہو جائے گا۔ دن چڑھ آیا ہے وہ مجھے دیکھنے آئے گا پھر.....

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دروازے کے باہر قدموں کی آواز آئی۔ میں اسی طرح پاؤں جوڑ کر لیٹ گیا۔ دروازہ کھلا اور پھر کانا اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ وہی رات والا آدمی تھا۔ کانا میرے بستر کے پاس آ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں سپرنگ کی طرح اچھلا اور میری ٹکر سے اس دیو کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ دھب کی آواز کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گیا اس کے ساتھ جو آدمی اندر آیا تھا وہ بجلی کی طرح باہر نکل گیا۔ اسے روکنا ضروری تھا کہ وہ باہر جا کر اور لوگوں کو خبردار نہ کر دے لیکن کانے کو دیکھ کر میرا ضبط ختم ہو گیا اور میں کانے پر پل پڑا۔ پتہ نہیں میں اسے کب تک مارتا رہا کہ میرے دونوں بازو شل ہو گئے اور کانے کا منہ خون میں لتھڑ گیا تھا۔ میں بے دم ہو کر کافی دیر تک مسہری پر بیٹھا رہا۔ میرے حواس بحال ہوئے تو بھی کانا بیہوش تھا۔ جس رسی سے میرے ہاتھ پاؤں اس نے باندھے تھے اسی رسی سے میں نے اس کے بازو پیچھے کر کے باندھے اور باہر نکل کر کمرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور عمارت کے دوسرے کمرے میں اس دوسرے آدمی کو تلاش کرتا رہا لیکن اس پورے گھر میں کوئی زندہ چیز نظر نہیں آ رہی تھی سوائے اس گھوڑے کے جو جاکھر کا ہی تھا لیکن جس پر سوار ہو کر میں یہاں آیا تھا اور وہ اس گھر کے پچھلی طرف بنے ہوئے تھانوں پر بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا اور اسی کمرے کے دروازے پر لے آیا جہاں کانا بند تھا۔ میں نے بڑی کوشش اور ہمت کر کے اسے گھوڑے پر لادا اس طرح کہ اس کا سر گھوڑے کی کمر کے ایک طرف اور ٹانگیں دوسری طرف تھیں۔ پھر گھوڑے کی باگ پکڑی اور اسی قریبی بستی میں چلا گیا جو میں نے آتے وقت دیکھی تھی۔

وہاں نمبردار کو میں نے اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے گاؤں کے دو تین بندے میرے ساتھ گھوڑیوں پر روانہ کر دیئے اور وہ مجھے تھانے پہنچا کر واپس گئے۔ میں نے کانے کو حوالات میں ڈال دیا۔ اب اسی نے مجھے جاکھر تک پہنچانا تھا۔

کانے نے جس طرح ٹکر مار کر مجھے بے بس کیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر رات کمرے میں باندھ رکھا اسے یاد کر کے میرا خون کھول اُٹھتا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی اتنی زبردست دھلائی کی کہ وہاں بھی نہیں کی تھی جہاں اس نے مجھے قید رکھا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس سے جاکھر کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگا "جاکھر نے یہاں ایک عورت رکھی ہوئی تھی جسے اس نے اپنے اسی مکان میں رکھ لیا جہاں وہ آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ دن پہلے یہ عورت مجھے یہ کہہ کر گئی کہ وہ جاکھر کے پاس گاؤں جا رہی ہے اور جلد ہی واپس آ جائے گی۔ میں نے اسے اس نوکر کے ساتھ بھیج دیا جو مجھے مار کھاتا دیکھ کر بھاگ

گیا تھا۔ یہ گاؤں میں جا کھر سے مل کر آ گئی اور پھر جا کھر بھی آپ کے ساتھ آ گیا۔ جس وقت میں نے دروازہ کھولا تھا اس وقت جا کھر نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کر دیا تھا کہ آپ کو قابو کرنا ہے۔ جا کھر مجھ سے ایسے ہی کام لیتا ہے اور ہم اپنے ''مہمانوں'' کو اس کمرے میں رکھتے ہیں۔ اس لیے جب وہ آپ کو لے کر اس کمرے کی طرف چلا تو مجھے کوئی شک نہ رہا کہ آپ جا کھر کا شکار ہیں۔ کمرے میں اس نے مجھے آپ پر حملے کا اشارہ دے دیا اور پھر میں نے اپنا کام کر دیا۔''

میں نے کانے سے کہا کہ تم اپنا کام کر چکے ہو اب میرا کام یہ کرو کہ مجھے جا کھر کے پاس لے کر جاؤ ورنہ جا کھر پر قتل کا مقدمہ ہے۔ اگر تم مجھے اس تک نہیں لے جاؤ گے تو تم بھی اس میں پھنسو گے۔ تمہیں لازمی طور پر بتانا ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ مجھے یقین دلانے لگا کہ اسے پتہ نہیں جا کھر کہاں گیا ہے لیکن وہ دو دن بعد آنے کا کہہ کر گیا ہے اور وہ جو کہہ کر جاتا ہے اس پر عمل ضرور کرتا ہے۔ اس لیے اسے پکڑنا ہے تو آپ اسی جگہ چلے جائیں جہاں سے آئے ہیں۔ کانا گھبرا گیا کہ میں اسے قتل کے مقدمے میں پھنسا نہ دوں۔ مجھے خیال آیا کہ یہ دوبارہ مجھ سے دھوکہ ہونے لگا ہے لیکن میں اس بار صحیح انتظام کروں گا۔ میں نے تھانے سے تین آدمی ساتھ لیے اور کانے کو لے کر واپس اسی مکان میں چلا گیا۔ کانا اور میں اندر چلے گئے اور میں نے تین سپاہیوں میں سے دو باہر نگرانی پر لگا دیئے اور ایک اس عمارت کے اندر چھپا دیا جو اندر آنے والوں پر نظر رکھتا۔

پورا دن ہم انتظار میں رہے۔ کانے اور اس نوکر کو جو بھاگ گیا تھا میں نے بڑے دروازے کے پاس ہی چارپائی پر بٹھا دیا۔ باہر نگرانی والے سپاہی ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے۔ دوپہر ڈھل گئی تو باہر کا دروازہ کھڑکا۔ میں برآمدے میں ہی اوٹ میں ہو گیا اور کانے کو اشارہ کیا کہ دروازہ کھول دے۔ اندر آنے والے کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا اور اس کے انتظار میں تھا۔ جا کھر گھوڑے سمیت اندر آ گیا۔ اس نے باگ کانے کو پکڑا دی اور خود برآمدے کی طرف بڑھا۔ میں اوٹ سے نکلا اور جا کھر کو چھاپ لیا۔ کانا غداری کر چکا تھا۔

تھانے لا کر میں نے جا کھر کا جو حال کیا اس پر میرے سپاہی بھی توبہ توبہ کر اُٹھے۔ ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ جا کھر جیسے سخت جان مار کے بغیر نہیں مانتے۔ اس نے مجھے مکمل پتہ دیا کہ سندھیا کہاں ہے جسے میں نے تھانے سے سپاہی بھیج کر منگوایا۔ یہ سادے کپڑوں میں گئے اور سندھیا سے کہا کہ جا کھر نے انہیں بھیجا ہے۔ وہ ان کے ساتھ آ گئی اور وہ اسے تھانے لے آئے۔ سندھیا کو جب پتہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے تو وہ سٹپٹا گئی۔ میں اسے جا کھر کے پاس لے گیا اور کہا کہ اس کا حال دیکھ لو اگر تم زبان نہیں کھولو گی تو تمہارا بھی ایسا ہی حال ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ اب دریام کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بتا دو۔ اسے سٹیشن چھوڑنے تم گئی تھیں اسے گاڑی تو نہیں نگل گئی نہ ہی وہ راستے میں اُتر کر کہیں بھاگ گیا ہو گا۔ تم ہی جانتی ہو کہ وہ کہاں گیا۔ جا کھر کی حالت دیکھ کر واقعی سندھیا کو عقل آ گئی۔

میں نے جا کھر کو حوالات سے نکالا اور اسے اور سندھیا کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ محرر کو میں نے وہیں بلا لیا کہ وہ ان کا بیان لکھ لے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب لازمی بک دیں گے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے سندھیا سے کہا کہ وہ بتائے کیا ہوا تھا!

وریام چھاؤنی سے بہت کم چھٹی پر آتا تھا۔ جاکھر نے مجھے ورغلایا اور پھر جب وریام کو چھوڑ کر میں اور جاکھر ایک ہو گئے تو میں نے کئی بار اسے کہا تھا کہ اس گاؤں سے ہی بھاگ جاتے ہیں لیکن یہ مجھے نہیں رکھنا چاہتا تھا اور میں اس طرح اس کے ساتھ چوری ملاقاتوں سے تنگ آ گئی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اگر مجھے بھگا نہیں سکتے تو وریام کا کھاتہ صاف کر دو۔ وہ کہنے لگا کہ سوچیں گے۔ اس بار جب وریام چھٹی پر آیا تو میں نے جاکھر سے جھگڑا کیا کہ یہ بچ کر نہ جائے۔ جاکھر سے میں نے کہا کہ کوئی طریقہ سوچو۔ اس نے سوچ کر مجھے کہا کہ جب یہ واپس سٹیشن پر جائے تو صرف تم اس کے ساتھ جانا۔ اجیت یا اس کا باپ ساتھ نہ ہوں۔ میں اس ویران کھوہ کے قریب ہوں گا اور وہاں اس کا کام تمام کر دیں گے۔ وریام جب گھر سے واپس جانے کے لیے تیار ہوا تو اجیت اور چاچا بھی ساتھ جانے لگے لیکن میں نے دل چھل کر کے انہیں روک دیا۔

جب ہم پرانے کھوہ کے پاس پہنچے تو جاکھر اور کانا وہاں موجود تھے۔ دونوں نے وریام کو گھیر لیا۔ وریام آخری وقت پر سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے اسے جانے نہ دیا۔ جاکھر نے اسے گردن سے قابو کیا اور کانے نے ٹانگیں پکڑ لیں۔ جاکھر نے اسے گلا دبا کر مار دیا اور لاش کنویں میں پھینک دی۔ ہم وہاں ریل گاڑی کے آنے کا انتظار کرتے رہے اور اس کے آنے کے بعد میں گاؤں چلی گئی اور چاچے سے آ کر کہا کہ وریام کو گاڑی پر سوار کرا آئی ہوں۔ ہم بہت خوش تھے کہ وریام سے چھٹکارا مل گیا ہے لیکن اس کے پیچھے فوجی آنے شروع ہو گئے اور پھر آپ میرے پیچھے لگ گئے۔ جاکھر کہنے لگا کہ اس پر بھی شک ہو رہا ہے۔ اب ہم دونوں آپ کے پاس ہیں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری کرنی کی سزا مجھے ملے گی۔

سندھیا کی کرنی کی سزا تو اسے عدالت سے نہ مل سکی کہ یہ اعتراف جرم جو انہوں نے میرے سامنے کیا تھا وہ عدالت میں اس سے مکر گئے۔ سندھیا یہاں تک کہنے لگی کہ میں اسے خوامخواہ بدنام کر رہا ہوں چونکہ کوئی موقع کا گواہ نہیں تھا اور کانے کو میں نے جو گواہ بنایا تھا وہ حرامی بھی مکر گیا اس لیے وہ تینوں بری ہو گئے۔ مجھے اپنی اس ناکامی کا بہت ہی افسوس ہوا کہ مارنے والے سامنے تھے اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن پھر وہ سزا مل گئی جو ملنی چاہیے تھی۔ فیصلے کے ایک مہینے بعد مجھے محرر نے بتایا کہ سندھیا نے جاکھر سے شادی کر لی ہے اور وہ اس گاؤں میں جاکھر کے گھر میں ہے۔ مجھے اور افسوس ہوا اس خبر کے ہفتے بعد یا کچھ دیر بعد میں اور محرر کسی بارے میں تھانے میں بات چیت کر رہے تھے کہ یکا یک باہر شور سا ہوا جیسے بہت سارے آدمی ایک ساتھ تھانے کے اندر آ گئے ہوں۔ میں نے محرر کو باہر بھیجا کہ دیکھ کر آؤ کیا ہوا ہے؟ وہ باہر نکل گیا اور چند لمحے بعد واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو آدمی تھا اسے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

اجیت سنگھ تم نے یہ کیسے؟

"جناب جاکھر کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سندھیا اگر خراب نہ ہوتی تو جاکھر کیا کر سکتا تھا۔ میں نے جاکھر کے گھر میں ہی اسے..... اس کی لاش وہیں ہے۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میری طرف کر دیئے جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے ہتھکڑی لگا دو۔ میں نے اس کی طرف سے منہ موڑ کر محرر سے کہا کہ بندے بھیج کر جاکھر کے گھر سے سندھیا کی لاش اٹھوا کر لے آؤ۔

.....❁.....❁.....

پیار، باپ اور ...

انسپکٹر نواز خان



انسپکٹر نواز خان

پیار، پاپ اور پیٹ

وہ اُداس نوجوان کہیں دُور سے بھاگ کر آیا تھا مگر حالات اسے
پھر اسی آگ میں لے گئے جو اس کی زندگی کو آتش کدہ بنا چکی تھی!

انسپکٹر نواز خان کی زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ

میں صبح تھانے پہنچا ہی تھا کہ ایک سائل آ گیا۔ تھانے کے احاطے میں ایک سفید کار آ کر رُکی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر لحیم شحیم شخص برآمد ہوا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک غالباً گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ لحیم شحیم شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنا نام انوپ ٹینڈن بتایا۔ وہ ایک تاجر تھا۔ شہر کے ایک مصروف علاقے میں اس کی ریڈی میڈ کپڑوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ وہ باہر سے بھی بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے منگواتا تھا۔ شمالی امرتسر کے فیشن ایبل رہائشی علاقے میں اس کی کوٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ صبح سویرے اس کے بیٹے کی نئی موٹر سائیکل چوری ہو گئی ہے۔

اس کا بیٹا بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک خوبرو جوان تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ورزش کے شوق میں صبح سویرے اُٹھ جاتا ہے۔ آج اُٹھ کر باہر جانے لگا تو گیراج میں موٹر سائیکل موجود نہیں تھی۔ اس نے گھر والوں سے پوچھا۔ کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ پڑوسیوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ اس نے صبح پانچ بجے کے قریب موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ پانچ بجے ہمارا ہاکر اخبار پھینک کر جاتا ہے۔ وہ عام طور پر اخبار باہر سے ہی پھینک جاتا تھا۔ ان دنوں بارشیں ہو رہی ہیں اور اخبار اکثر بھیگ جاتا ہے اس لیے چاچی نے دادی جان سے کہا کہ وہ صبح پوجا کے لیے اُٹھتی ہیں تو دروازہ اندر سے کھول دیا کریں تاکہ ہاکر اخبار اندر آ کر برآمدے میں رکھ سکے۔ اب روزانہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ دادی ماں دروازہ کھول دیتی ہیں اور وہ لڑکا اخبار برآمدے میں رکھ جاتا ہے۔ آج بھی اخبار پڑا ہوا ملا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ بجے کے قریب وہی یار محمد نامی لڑکا اندر آیا تھا۔ میری بہن شمی کا کہنا

ہے کہ چند روز پہلے بھی وہ لڑکا موٹر سائیکل پر جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ شمی نے پوچھا کیا بات ہے تو کہنے لگا، جی پٹرول گر رہا تھا، بند کیا ہے۔ شمی نے سونگھ کر دیکھا۔ پٹرول کی بُو نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اخبار لے لیا اور لڑکے کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس دن اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ بھائی جان موٹر سائیکل نئی ہے اندر رکھا کریں مگر میں نے توجہ نہ دی۔

میں نے انوپ ٹینڈن کے بیان پر کچی رپورٹ لکھ لی اور دو سپاہیوں کو بھیجا کہ وہ مقامی نیوز ایجنسی والوں سے یار محمد نامی ہاکر کا پتہ کریں۔ میری توقع کے برخلاف دونوں سپاہی صرف آدھ گھنٹے بعد یار محمد کو لے کر تھانے پہنچ گئے۔ وہ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا تھا۔ پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی مگر چہرہ بیماروں جیسا تھا۔ شاید تھانے بلائے جانے کے خوف سے بیمار لگ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یا تو وہ چور تھا یا بہت ڈرا ہوا تھا۔ میں نے اس کا نام پتہ پوچھا۔ اس نے دہلی کے قریب کسی جام پور قصبے کا نام بتایا۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ یہاں امرتسر میں اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کے ہاں رہتا ہے۔ صبح کالج جاتا ہے، شام کو ٹیوشن پڑھاتا ہے اور صبح سویرے اخبار بیچتا ہے۔

میں نے کہا ''یار محمد! صبح جو موٹر سائیکل تم نے انوپ صاحب کی کوٹھی سے اُٹھائی ہے وہ کہاں ہے؟''

اس کا رنگ مٹی کی طرح زرد نظر آنے لگا۔ ہکلا کر بولا ''انسپکٹر صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ سراسر الزام ہے۔''

میں نے کہا ''تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو۔ ہر چور کو یہ فقرہ ازبر ہوتا ہے۔''

یار محمد واویلا کرنے لگا کہ وہ غریب آدمی ہے، محنت مزدوری سے روٹی کماتا ہے۔ اس کی سات پشتوں میں سے کوئی چور نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اتنے میں نیوز ایجنسی کا مالک اور وہ رشتہ دار بھی آ گیا جس کے پاس یار محمد رہتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ لڑکے کی خیریت چاہتے ہو تو مسروقہ مال برآمد کروا دو ورنہ سب کو رگڑا لگے گا..... میرے ڈرانے دھمکانے کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یار محمد نے اعتراف کیا کہ وہ پانچ بجے کے قریب کوٹھی میں اخبار رکھنے داخل ہوا تھا مگر اس نے موٹر سائیکل کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھائی۔ اس نے کہا کہ موٹر سائیکل اس وقت تک موجود تھی۔

یار محمد کے بارے میں جو چیز مجھے زیادہ شک میں مبتلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اخبار سائیکل پر لے کر آتا تھا مگر پچھلے چار پانچ روز سے وہ پیدل آ رہا تھا۔ سوچا جا سکتا تھا کہ ایسا اس نے چوری کے منصوبے کے پیش نظر کیا ہے جبکہ یار محمد اور اس کے رشتے دار کا کہنا تھا کہ سائیکل چند روز سے خراب پڑی ہے۔ میں اس واقعے کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا ورنہ اصل کہانی کے لیے صفحات کم پڑیں گے۔ قصہ مختصر میں نے حوالدار حشمت سے کہا کہ وہ یار محمد کو لے جا کر تھوڑی سی ''یاری'' نبھائے۔ حشمت نے حوالات میں لے جا کر دس پندرہ منٹ میں اس کے سارے کس بل نکال دیئے۔ وہ اسے دوبارہ میرے سامنے لایا تو یار محمد بُری طرح لرز رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے کہا ''ہاں بھئی! کچھ بتاتے ہو یا ابھی اور گلاب جامن کھانے ہیں۔'' مار پیٹ کو حوالدار حشمت گلاب جامن کہا کرتا تھا۔

یار محمد نے کہا ''انسپکٹر صاحب! میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مسکرانے لگی۔ میں نے کہا ''آپ پڑھی لکھی ہیں، آپ کو ایسا مذاق کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

اس نے کہا ''شرم تو ساری تم جیسے لڑکے لے گئے۔ ہم بیچاری لڑکیوں کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔''

میں اسے گھور کر واپس جانے لگا تو اس نے پیچھے سے قمیص پکڑ لی اور بولی ''نخرے بڑے ہیں تمہارے۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو اور اتنی چھوٹی سی تصویر نہیں چھپوا سکتے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

میں نے کہا ''ایسا کرو اپنے پتا جی کو دے دو، وہ بڑے آدمی ہیں کہیں نہ کہیں چھپوا دیں گے۔''

ایک دم اس کا رنگ بدل گیا، کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر بولی ''بڑی مرچیں لگ گئی ہیں تمہیں۔ تمہاری کسی لگتی کی تصویر تو نہیں؟''

میں نے کہا ''میری ایسی کوئی لگتی ہو تو کھڑے کھڑے گولی مار دوں۔''

اس نے مجھے ''بیہودہ، بدتمیز'' کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ مہینہ پورا ہوتے ہی یہاں اخبار دینا چھوڑ دوں گا لیکن مہینہ پورا ہونے سے پہلے یہ معاملہ ہو گیا۔''

میں نے یار محمد کی ساری رُوداد غور سے سُنی۔ کچھ سوالات بھی پوچھے۔ اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی باتوں میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہونے کے برابر ہے۔ قصور یقیناً اسی لڑکی کا تھا۔ وہ کم عمر ہونے کے علاوہ جذباتی اور بیوقوف بھی تھی۔ ٹین ایجرز سے ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ قارئین کے ذہن میں سوال اُٹھ سکتا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانے کی ایک لڑکی نے ایک ہاکر سے ہی نظر کیوں لڑائی۔ اس ''کیوں'' کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے اس کیوں کا معمہ حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی نہ ہو۔ ان آنکھوں کے معاملات باقی سارے جسم سے جُدا ہوتے ہیں۔ یہ وہیں لڑتی ہیں جہاں انہیں نہیں لڑنا چاہیے اور وہی دیکھتی ہیں جو دیکھنا ان کے لیے منع ہوتا ہے۔ یہ شمی نامی لڑکی بھی جو چال چلن کی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی تھی ہاکر یار محمد سے معاملہ بنا رہی تھی۔ یار محمد نے جس قدر بے رُخی دکھائی تھی وہ اتنا ہی بے چین ہو گئی تھی اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ یار محمد کی عزت کے لیے بھی خطرہ بن گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے واقعی اپنے بھائی کی موٹر سائیکل کسی دوسرے شناسا کے ہاتھوں چوری کروا دی ہو اور اگر ایسا نہیں ہوا تھا تو بھی اس نے موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا تھا اور موٹر سائیکل چوری ہونے پر شبہات کا رُخ یار محمد کی طرف موڑ دیا تھا۔ بیوقوف نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح بات اس کے اپنے اوپر بھی آ سکتی ہے۔

موقعۂ واردات دیکھنے کے بہانے میں اسی روز انوپ کمار ٹینڈن کی کوٹھی پر پہنچا۔ کوٹھی تین چار کنال میں تھی۔ لان کافی وسیع تھا، اصل عمارت مین گیٹ سے کافی ہٹ کر تھی۔ میں نے اہلخانہ سے سوالات کیے۔ شمی بھی وہاں موجود تھی۔ وہ خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ شباب اس کے لباس سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ وہ چہرے مہرے سے بہت چالاک نظر آتی تھی۔ اس پارے کی طرح مچلتی لڑکی کو دیکھ کر یار محمد کی پارسائی اور شرافت کی تعریف کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لڑکی نے وہی بیان دیا جو اس سے پہلے اس کا باپ اور بھائی دے چکے تھے۔ ابھی میں کوٹھی ہی میں تھا کہ موٹر سائیکل کا معمہ حل ہو گیا۔ تھانے سے ایک اے ایس آئی موٹر سائیکل پر آیا اور اس نے بتایا کہ چوری شدہ موٹر سائیکل نہر کے پاس سے مل گئی ہے۔ ملزم بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ ایک پرانا

وارداتیا تھا۔

.....

کہنے کو یہ کیس ختم ہو گیا لیکن حقیقت میں ہوا نہیں۔ تھانے واپس آ کر جب میں ملزم کو رہا کرنے کے لیے کاغذی کارروائی کر رہا تھا، ایک چیز دیکھ کر بُری طرح چونک گیا۔ میں نے یار محمد کو ایک جگہ دستخط کرنے کے لیے کہا۔ جب وہ دستخط کر رہا تھا میری نگاہ اس کی انگلیوں پر پڑی۔ اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ یہ انگوٹھی اس سے پہلے بھی میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ انگوٹھی سونے کی تھی۔ تین اطراف پتیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک پھول تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے دو سفید اور دو سرخ نگ تھے۔ اس انگوٹھی کا تعلق کسی سنگین واردات سے تھا؟ میں نے ذہن پر زور دیا اور اچانک سب کچھ یاد آ گیا۔ چند لمحوں کے لیے میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب سے کوئی چار سال پہلے جب میں سہارنپور میں تھا ایک الٰہ آبادی سیٹھ سچدیورائے کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ ڈاکو اہلخانہ کو باندھ کر سارا سامان لوٹ لے گئے تھے۔ سچدیو گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا اور بعدازاں ہسپتال میں چل بسا تھا۔ اس واردات میں قیمتی زیورات بچ گئے تھے کیونکہ یہ آہنی سیف کے ایک پوشیدہ خانے میں پڑے تھے۔ صرف وہی زیور گیا تھا جو سچدیو کی پتنی واردات کے وقت پہنے ہوئے تھی۔ اس میں طلائی چوڑیاں، ایک انگوٹھی اور جھمکے تھے۔ جو انگوٹھی گئی تھی وہ بالکل اسی ڈیزائن کی تھی کیونکہ اس طرح کی ایک اور انگوٹھی سیف میں موجود تھی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں زیورات سیٹ کی صورت میں بنائے جاتے ہیں اور ہر سیٹ کا ایک خاص ڈیزائن ہوتا ہے۔ سچدیو کی پتنی نے ہمیں وہ انگوٹھی خاص طور پر دکھائی تھی اور بتایا تھا کہ ڈاکو جو انگوٹھی لے گئے ہیں وہ اس ڈیزائن کی ہے۔ تفتیش کے لیے وہ انگوٹھی میں نے سچدیو کی پتنی سے لے لی تھی۔ کئی ماہ یہ انگوٹھی میری الماری کے دراز میں پڑی رہی تھی اور میں نے بارہا اسے دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بھولی بسری یاد ذہن میں تازہ ہو گئی تھی۔ اس کیس میں میں نے بڑی محنت کی تھی۔ دو تین افراد گرفتار بھی کیے تھے لیکن بعد میں انہیں چھوڑنا پڑا تھا۔ کوئی اہم سراغ نہ ملنے کے بعد کیس داخل دفتر ہو گیا تھا۔

میں نے انگوٹھی کو بغور دیکھنے کے بعد یار محمد سے پوچھا ''یہ انگوٹھی تم نے کیوں پہنی ہوئی ہے، یہ تو عورتوں والی ہے؟''

وہ ایک دم ٹھٹک گیا اور غیر ارادی طور پر انگوٹھی چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا ''یہ انگوٹھی تمہاری ہے؟''

''جی ہاں..... جی نہیں۔'' اس نے ہکلا کر جواب دیا۔

''کیا مطلب.....تمہاری نہیں ہے؟''

''نہیں جی..... یہ مجھے.....ملی تھی۔''

''کس سے ملی تھی؟''

''کسی سے نہیں جی۔ راستے میں ملی تھی۔''

''کس راستے سے؟''

اس نے بتایا کہ ڈھائی تین ماہ پہلے وہ سٹیشن سے اخبار کے دفتر کی طرف آ رہا تھا کہ باغ دامانند کے پاس ایک کانجی والے کی ریڑھی کے نیچے یہ انگوٹھی پڑی تھی۔ اس کی چمک دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ انگوٹھی اُٹھا کر گھر لے آیا۔ دھو کر دیکھا تو سونے کی نکلی۔

مجھے یار محمد کی بات پر صرف چالیس فیصد یقین آیا اور وہ بھی اس لیے کہ اس سے پہلے اس نے کوئی بات جھوٹ نہیں کہی تھی۔ میں نے اسے زیادہ کریدنا

بھی مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اگر چار سال پہلے کے اس جرم میں اس کا کوئی ہاتھ تھا تو وہ ہوشیار ہوسکتا تھا۔ بہتر تھا کہ یہ بات یہیں ختم کر دی جائے۔ میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے یہ انگوٹھی تمہارے پاس غیر قانونی ہے۔''

وہ گھبرا گیا۔ اس کا ہاتھ انگوٹھی کی طرف بڑھا۔ شاید وہ انگوٹھی اُتارنے لگا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''اب رہنے دو لیکن آئندہ احتیاط کرنا۔ گمشدہ چیز ملنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسے اپنے پاس رکھ لیا جائے۔ میں یہ رعایت تمہیں صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ تم نے اب تک سچ بولا ہے۔'' وہ سرتاپا مشکور و ممنون نظر آنے لگا۔ میں نے کہا ''لیکن یہ زنانہ انگوٹھی ہے کوئی بھی تم سے پوچھ سکتا ہے کہ کہاں سے لی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے ڈھلوا کر دوسری بنوالو۔''

وہ سعادت مندی سے سر ہلانے لگا۔ میں نے اسے شہر سے باہر نہ جانے کا پابند کر کے واپس بھیج دیا۔

اسی روز میں نے سہارنپور ٹرنک کال بک کرائی اور متعلقہ تھانے میں اپنے دوست ایس ایچ او گرودیو سنگھ سے رابطہ قائم کر کے اسے تمام کہانی سنائی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہرحال میں نے اسے کہا کہ وہ سورگ باسی سچدیورائے کے اہلخانہ سے رابطہ قائم کرے اور ان سے پوچھے کہ کیا وہ دوسری انگوٹھی ان کے پاس موجود ہے.....

تیسرے چوتھے روز ایس ایچ او گرودیو سنگھ کا ٹیلیفون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ سیٹھ کی پتنی سے خود جا کر ملا تھا۔ ان کے پاس وہ دوسری انگوٹھی ابھی تک موجود ہے۔ وہ ایک کانسٹیبل کے ہاتھ وہ انگوٹھی روانہ کر رہا ہے.....اس خبر سے مجھے خوشی ہوئی۔ اسی روز شام کو گرودیو کا بھیجا ہوا کانسٹیبل بمعہ انگوٹھی پہنچ گیا۔ انگوٹھی دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست ہے۔ بہرحال اگلے روز میں نے یار محمد کو تھانے بلایا اور اس کے ہاتھ کی انگوٹھی دیکھ کر تصدیق کر لی کہ یہ دونوں ایک ہی ڈیزائن اور وزن کی انگوٹھیاں ہیں۔

اس تصدیق کے بعد ضروری ہو گیا کہ میں یار محمد کی نگرانی کرواؤں۔ اگر اس نے جھوٹ بولا تھا اور وہ انگوٹھی اسے راستے سے نہیں ملی تھی تو وہ اس چار سال پرانی واردات کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ یار محمد کی نگرانی کے لیے میں نے پرانے پاپی بلال شاہ کا انتخاب کیا۔ ان دنوں وہ کھا کھا کر بہت موٹا ہو رہا تھا۔ مزاج تو اس کا ویسے بھی ہر وقت آسمان پر رہتا تھا لیکن اس کی ایک خوبی تھی۔ میں صرف اسے یہ بتا دیا کرتا تھا کہ بلال شاہ فلاں کام کرنا ہے۔ کام کرنے کا راستہ اور ڈھنگ وہ خود ڈھونڈ لیا کرتا تھا۔ اسے دوسرے مخبروں کی طرح صبح و شام لیکچر نہیں دینے پڑتے تھے۔ اس دفعہ بھی میں نے اسے بلا کر ساری بات سمجھا دی اور گائیڈڈ میزائل کی طرح یار محمد کے پیچھے لگا دیا۔

بلال شاہ نے چوتھے پانچویں روز مجھے پہلی رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ اس نے چھاپہ خانے میں واقفیت نکال کر ہاکری شروع کر دی ہے۔ روز صبح سویرے چھاپہ خانے جاتا ہے۔ دس روپے کے اخبار لاتا ہے۔ ان میں سے خود بخود کوئی بک جائے تو بک جائے ورنہ آدھے اخبار گھر میں رکھ لیتا ہے اور آدھے جا کر یار محمد کو بک سٹال پر دے آتا ہے۔ اس طرح یار محمد سے میل جول کا بہانہ ملا ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ بلال شاہ پانچ روپے روزانہ کا بل مجھ پر ڈال رہا ہے مگر مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ یہ بل جھوٹا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بلال شاہ پر اعتماد تھا۔

بلال شاہ نے یہ اہم اطلاع دی کہ یار محمد اور انوپ کی لڑکی شمی کا معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ کہنا چاہیے کہ اور بھڑک گیا ہے۔

میں نے پوچھا ''وہ کیسے؟''

بلال شاہ نے بتایا ''سچی بات چھپی نہیں رہتی جی۔ یار محمد نے انوپ کے گھر اخبار دینا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ اس علاقے میں ہی نہیں جاتا مگر دوسری پارٹی بڑی تیز نکلی ہے!''

''دوسری پارٹی کون؟''

''وہی انوپ کی لڑکی جی۔ پرسوں کی بات ہے وہ یار محمد کے ٹک سٹال پر جا پہنچی۔ ٹک سٹال پر یار محمد کا کوئی بزرگ رشتہ دار بیٹھتا ہے۔ اس کے سامنے ہی وہ یار محمد کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ ایک ہوٹل میں جا کر اس نے چائے وغیرہ منگوائی اور یار محمد کے سامنے رونے لگی۔ کہنے لگی کہ اس سے بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ وہ معافی مانگنا چاہتی ہے..... وہ کسی طرح یار محمد کی جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ یار محمد نے کہا 'اچھا بی بی! میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔' بڑی مشکل سے وہ رسہ تڑا کر وہاں سے نکلا مگر یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ شمی کے بھائی کے ایک دوست نے ان دونوں کو دیکھ لیا اور جا کر اس کے بھائی کو بتا دیا۔ بھائی آگ بگولا ہو گیا۔ وہ اسی وقت یار محمد کے ٹک سٹال پر پہنچا۔ اسے لے کر ایک پارک میں چلا گیا۔ وہاں ان دونوں میں خوب تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ شمی کے بھائی نے یار محمد کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور کہا کہ اگر وہ خیریت چاہتا ہے تو شہر چھوڑ کر چلا جائے۔''

میں نے بلال شاہ سے کہا کہ اسے یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔ وہ گردن اکڑا کر بولا ''ہزار بار کہا ہے مجھے ایویں شیویں شے نہ سمجھا کریں۔ بڑا تکھا ہوں میں۔ ورمے کی طرح گھس جاتا ہوں ہر طرح کی لکڑی میں۔ یار محمد اپنی پیدا کرنے والی پر اتنا بھروسہ نہیں کرے گا، جتنا آج کل مجھ پر کر رہا ہے۔''

میں نے کہا ''ہاں بھئی ماننا پڑتا ہے، مامتا تو بہت ہے تمہارے اندر، کتے پر بھی ہاتھ پھیرو تو تمہاری گود میں آ لیٹتا ہے۔'' بلال شاہ اس تعریف پر خوش ہو گیا۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ جو بھی کر رہے ہو پوری دلجمعی سے کرو۔ اپنے اس بچے سے یہ بھی پوچھو کہ انگوٹھی اس نے کہاں سے لی ہے اور کب سے اس کے پاس ہے؟''

بلال شاہ نے کہا ''پوچھا تو تھا لیکن وہ کنی کترا رہا ہے۔ کافی خچرا ہے۔''

میں نے کہا ''کبھی کبھی تو شک ہوتا ہے کہ شاید موٹر سائیکل کی چوری میں بھی اس کا ہاتھ تھا!''

بلال شاہ نے پوچھا ''چور کیا کہتا ہے؟''

میں نے بتایا کہ فی الحال تو کچھ نہیں کہتا مگر ہو سکتا ہے آگے چل کر بتا دے۔ ویسے وہ بھی اس محلے میں رہتا ہے جہاں یار محمد کا ٹک سٹال ہے۔''

بلال شاہ نے کہا ''خان صاحب! مجھے تو نہیں لگتا کہ یار محمد ایسا کام کر سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''لگنے کو تو یہ بھی نہیں لگتا کہ تم گیارہ بچوں کے باپ ہو اور اب بھی ہاتھ چالاکی سے باز نہیں آتے..... تم اپنے اندازوں کو چھوڑو۔ بس وہ کام کرو جو تمہیں کہا گیا ہے یعنی یار محمد کی نگرانی۔''

بلال شاہ نے پوری توجہ سے ذمہ داری نبھانے کا وعدہ کیا اور واقعی اتنے خشوع و خضوع سے نگرانی کی کہ تیسرے ہی روز یار محمد کو اغوا کرا دیا..... اس روز بلال شاہ ہانپا ہوا میرے پاس پہنچا۔ اس نے بتایا کہ یار محمد کو کچھ لوگ اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ ابھی بلال شاہ اس واقعے کی تفصیلات ہی بتا رہا تھا کہ یار محمد کے ورثاء بھی پہنچ

گئے۔ ایک تو وہی رشتے دار تھا جس کے گھر یار محمد رہتا تھا۔ اس کا نام معظم تھا۔ دوسرا معظم کا کوئی چچیرا پھوپھیرا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ محلے کی اصلاح کمیٹی کا چیئرمین اور دو تین معززین تھے۔ معظم نے بتایا کہ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے مغرب کی اذان کے وقت ایک شخص نے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ وہ یار محمد سے ملنا چاہتا ہے۔ یار محمد نے اس شخص سے مصافحہ کیا۔ دونوں کچھ دیر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر یار محمد نے کہا کہ وہ بازار تک جا رہا ہے ابھی واپس آ جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جائے۔ میں نے کہا جو بات کرنی ہے بیٹھک میں بیٹھ کر کر لو مگر وہ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بازار کے ایک دو آدمیوں نے آ کر اطلاع دی کہ یار محمد کو کچھ لوگ ٹیکسی میں ڈال کر لے گئے ہیں۔

معظم کے بیان کی تصدیق دوسرے افراد نے بھی کی۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیکسی والے تین آدمی تھے اور ان میں سے کسی کو بھی پہلے اس محلے میں نہیں دیکھا گیا۔ ایک سبزی فروش نے بتایا کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ یار محمد اپنی مرضی سے ان کے ساتھ گیا ہے۔ وہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے یار محمد کو دھکیل کر ٹیکسی میں پھینکا اور پلک جھپکتے میں گاڑی چلا کر بازار کے موڑ سے غائب ہو گئے..... اس اغواء کے سلسلے میں دھیان سیدھا شمی کے گھر والوں کی طرف جاتا تھا۔ چند روز پہلے بھی شمی کا بھائی اسی طرح یار محمد کو بک سٹال سے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور دھمکیاں وغیرہ دی تھیں لیکن دوران تفتیش کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عین ممکن تھا کہ یہ کوئی دوسرا ہی معاملہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یار محمد سرے سے اغوا ہی نہ ہوا ہو۔ لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے کوئی خدشہ ہو تو وہ معمولی واقعے کو بھی 'خطرناک' رنگ دے دیتے ہیں۔ ہو سکتا تھا وہ یونہی دوستوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا ہو۔

بہرحال اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہمارے بہت سے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ یار محمد واقعی اغوا ہو چکا تھا۔ میں نے شمی کے باپ، بھائی اور ایک دو عزیزوں سے پوچھ گچھ کی۔ شمی کا بھائی تو سات آٹھ گھنٹے تھانے میں بھی رہا لیکن ان ساری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یہ لوگ یار محمد کے اغوا سے بالکل انکاری تھے۔ شمی کے بھائی کا کہنا تھا کہ اس نے چند روز پہلے یار محمد کو گراؤنڈ میں لے جا کر اس سے بات چیت کی تھی اور یہ بھی درست ہے کہ اسے وارننگ دی تھی لیکن اس کے بعد کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا تو انہیں کیا مصیبت پڑی تھی اسے اغوا کرنے کی۔ میں نے بلال شاہ کو بلایا اور تنہائی میں اس سے بھی سوالات کئے۔ بلال شاہ نے کہا ''خان صاحب! میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے پچھلے دو تین دنوں میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا۔ پھر شمی کے گھر والوں کو کیا ضرورت تھی ایسا قدم اٹھانے کی۔''

میں نے کہا ''تم یار محمد کے اتنا قریب رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کے دل میں بھی شمی کا خیال تھا؟''

بلال شاہ بولا ''دل کے معاملے تو اللہ ہی جانتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یار محمد اور ٹائپ کا لڑکا ہے۔ وہ شمی کے اس کھیل میں شریک نہیں تھا۔''

میں سخت پریشانی میں تھا۔ لڑکے کا غائب ہونا معمولی بات نہیں تھی اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی تھی جو جلد یا بدیر مجھے اس چار سالہ پرانی واردات کا سراغ دے سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا کیا ہی اچھا ہوتا میں اس معاملے کو زیادہ طول نہ دیتا۔ نگرانی کی بجائے یار محمد سے براہ راست پوچھ گچھ بھی کی جا سکتی تھی۔

ضرورت پڑتی تو حوالدار حشمت سے بھی مدد لی جا سکتی تھی۔ بہرحال اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

مجھے ایک شک یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے اس واردات کا تعلق یار محمد کے ماضی سے ہو۔ میں نے یار محمد کے رشتے دار معظم سے کرید کرید کر سوال کئے اور یار محمد کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو میں جان ہی چکا تھا کہ یار محمد کسی وجہ سے ناراض ہو کر اپنا گھر چھوڑ چکا ہے اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ نہ ہی اس کے والدین میں سے کوئی بھی اس کی خیر خبر پوچھنے آیا تھا۔ بس کبھی کبھار اس کے چھوٹے بھائی کا خط آتا تھا جس کا جواب وہ کبھی دیتا تھا اور کبھی نہیں۔ معظم مجھے یہ بھی بتا چکا تھا کہ جام پور میں یار محمد کا والد ولی محمد ایک کلرک ہے اور وہ لوگ مشکل سے سفید پوشی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ معظم کو کچھ معلوم نہیں تھا یا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ولی محمد اور اس کے گھرانے سے ان کے تعلقات دیر ہوئی ختم ہو چکے ہیں لہٰذا ان کے بارے میں اسے زیادہ کچھ معلوم نہیں.....

اب یار محمد کے اغوا ہونے کے بعد میں نے اس پر زور دے کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ یار محمد کے گھر سے بھاگنے کی وجہ کوئی عورت تھی۔ وہ اس کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ یہ چکر کافی لمبا ہو گیا۔ یار محمد پر ہر طرف سے لعنت ملامت ہوئی تو وہ گھر بار چھوڑ کر جام پور سے یہاں امرتسر چلا آیا..... معظم سے بات چیت کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود دہلی جانا چاہیے تاکہ ٹھیک ٹھیک حالات معلوم ہو سکیں..... میں نے تھانے میں اپنے ضروری کام نمٹائے، سب انسپکٹر کو چارج دیا اور دو تین دن میں جانے کی تیاری مکمل کر لی۔ سب انسپکٹر حیران تھا کہ میں اغوا کے ایک عام کیس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ کسی اے ایس آئی کو اس کام پر بھیج دینا چاہیے تھا۔ اسے اس انگوٹھی کے بارے میں معلوم نہیں تھا جو میں یار محمد کی انگلی میں دیکھ چکا تھا اور جس نے میری نیند حرام کی ہوئی تھی۔

میں امرتسر سے براستہ انبالہ دہلی پہنچا اور وہاں ایک رات ٹھہرنے کے بعد جام پور نامی اس قصبے میں پہنچ گیا۔ یار محمد اس قصبے کا رہنے والا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ زیادہ تر عمارتیں قدیم طرز کی تھیں۔ ان نانک چندی عمارتوں کے آگے بوسیدہ چھجے تھے اور گلیاں تنگ و تاریک تھیں۔ قصبے کے گرد ایک ٹوٹی پھوٹی فصیل بھی تھی۔ میں سیدھا قصبے کے تھانے میں پہنچا۔ اتفاقاً ایس ایچ او مسلمان تھا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ملا اور ہر طرح سے تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے اس سے یار محمد کے باپ ولی محمد کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ولی محمد چھاتا گلی کا رہنے والا ہے اور وہ اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے فوری طور پر ایک آدمی کو بھیجا اور وہ چھاتا گلی کے ایک مخبر کو لے آیا۔ اس مخبر کا نام صادق تھا۔ کافی ہوشیار شخص تھا۔ علاقے کے ہر شخص کے بارے میں اسے معلومات حاصل تھیں..... ہم کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھ گئے اور صادق ہمیں ولی محمد اور اس کے گھرانے کے متعلق بتانے لگا۔

اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ ولی محمد پٹوار خانے میں کلرک ہے۔ اسے نشے کی بہت پرانی لت ہے، ہر طرح کا نشہ کرتا ہے اور بیوی کو مارتا پیٹتا ہے۔ اپنے بڑے بیٹے یار محمد سے وہ پیار کرتا تھا لیکن یار محمد نے کبھی اسے اچھا نہیں سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کھانے کمانے کے قابل ہو جائے تو ماں کو لے کر کہیں چلا جائے۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میٹرک

ثریا کے گھر کے گرد منڈلانے لگا۔ اس دفعہ اس کے باپ نے اسے بہت بُری طرح مارا اور وہ کئی دن ہسپتال میں رہا۔ انہی دنوں یہ اُڑتی اُڑتی خبر بھی سُنی گئی کہ عبدالستار کی بیوی نے اس سے علیحدگی مانگی ہے اور کہا ہے کہ وہ اس کے گھر رہنا نہیں چاہتی۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں جب ایک روز یار محمد خاموشی سے غائب ہو گیا..... کئی ہفتے گزر گئے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس کی حرکات کی وجہ سے اس کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ایک دن کسی نے بتایا کہ وہ امرتسر میں اپنے کسی ددھیالی رشتے دار کے ہاں رہنے لگا ہے۔

یہ تھی یار محمد کی اب تک کی کہانی جو مخبر صادق نے مجھے سنائی..... میں نے یہ سب کچھ سننے کے بعد صادق سے پہلا سوال یہ کیا کہ ستار اور اس کی بیوی اب کہاں ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ یہیں قصبے میں رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا ''اور اس کا باپ؟''

وہ بولا ''وہ بھی یہیں ہے۔ پچھلے دنوں اس کے گھر سے ناجائز شراب برآمد ہوئی تھی اور پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ چھ مہینے جیل کاٹنے کے بعد کچھ ہی روز پہلے واپس آیا ہے۔''

میں نے پوچھا ''صادق! تم اسی محلے میں رہتے ہو نا؟ میرا مطلب ہے چھاتہ گلی میں۔''

وہ بولا ''جی ہاں۔ میں دو برجی دروازے میں رہتا ہوں۔ دو برجی دروازہ اور چھاتا گلی ایک ہی محلے کے دو نام ہیں۔''

میں نے کہا ''اب ثریا اور ستار کے حالات کیسے ہیں؟''

اس نے جواب دیا ''ٹھیک ٹھاک ہیں۔ سات آٹھ روز ہوئے ستار کراچی سے آیا ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا ''میاں بیوی میں کوئی تازہ جھگڑا تو نہیں ہوا.....؟''

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا ''لیکن..... جھگڑے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

میں نے کہا ''تم میرے مطلب کو چھوڑو..... جو کچھ تمہیں پتہ ہے بتاؤ۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا ''پچھلے دنوں ڈاکیہ بھگت سنگھ مجھے ملا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ستار کے نام کہیں سے کچھ خط آتے ہیں۔ اس میں ستار اور اس کی بیوی کے نام گندی گالیاں لکھی ہوتی ہیں۔ ستار پریشان ہے کہ یہ خط کون لکھتا ہے۔''

میرے ذہن میں پھلجڑی سی پھوٹی۔ کہیں یہی خطوط تو نہیں تھے جن کی وجہ سے یار محمد اغوا ہوا۔ ظاہر ہے وہ خط کسی نے بھی لکھے ہوں ستار کا دھیان سب سے پہلے اپنے رقیب یار محمد کی طرف ہی گیا ہو گا۔ اسے یار محمد کا ایڈریس بھی معلوم تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے دوستوں یا کرائے کے غنڈوں کے ساتھ وہاں پہنچا ہو اور یار محمد کو اُٹھا لیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو یار محمد کی جان بھی جا سکتی تھی..... مخبر صادق بتا رہا تھا کہ ستار سات آٹھ روز سے جام پور آیا ہوا ہے۔ واردات کو چار پانچ روز ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا واردات کے دنوں میں ستار کراچی کی بجائے یہاں تھا اور خطوط کی وجہ سے پریشان بھی۔

میں نے پوچھا ''کیا وہ کراچی سے آنے کے بعد قصبے سے باہر گیا ہے؟''

صادق کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا ''میں ٹھیک سے بتا نہیں سکتا۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتا ہے یا کسی وقت وہ برجی دروازے اپنے دوست شاہ جہاں کے پاس آ جاتا ہے۔''

میں نے صادق سے کہا کہ میں اسی وقت ستار سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے سیلوٹ مارنے کے بعد ایس ایچ او سے کہا۔

''جناب! ادھر چھاتا گلی میں بڑا ہنگامہ ہو گیا ہے۔ وہ یار محمد زخمی حالت میں پڑا ہے اور چیخ و پکار کر رہا ہے۔''

یہ اطلاع ہمارے لیے دھماکہ خیز تھی۔ میں نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا۔ وہ بولا ''آیئے خان صاحب! چل کر دیکھتے ہیں۔''

ہم تھانے سے نکلے۔ چھاتا گلی زیادہ دُور نہیں تھی۔ تنگ بازاروں، بھری پری دکانوں اور چھوٹے چھوٹے احاطوں میں سے گزرتے ہوئے ہم چھاتا گلی پہنچ گئے۔ چھاتا گلی ایک کٹڑی کی طرح تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے ناتک چندی اینٹوں کا قدیم دروازہ تھا۔ چونا کچی دیواروں والے اونچے اونچے مکان افسردگی سے کھڑے تھے۔ جھروکوں اور بالکونیوں میں سے عورتیں اور بچے جھانک رہے تھے۔ ان سب کی آنکھیں نیچے احاطے کی طرف تھیں۔ احاطے میں ایک اونچے بانس پر میونسپل کمیٹی کی بڑی سی لالٹین جھول رہی تھی۔ دن کا وقت تھا اس لیے لالٹین بجھی ہوئی تھی مگر لگتا تھا رات کو بھی بجھی ہی رہتی ہو گی کیونکہ اس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ بانس کے بالائی سرے پر ایک شریف النفس کوّا بیٹھا حیرت سے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ احاطے میں مردوں کا ہجوم تھا۔ وہ کسی شخص کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ یار محمد تھا۔ اس کے دونوں ہونٹ سُوجے ہوئے تھے اور چہرے پر جابجا نیل تھے۔ اس کی قمیص بھی پھٹی ہوئی تھی۔

''نہیں جاؤں گا، میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے مر جانے دو۔'' وہ چلا رہا تھا۔

پولیس کو دیکھ کر لوگ کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ جن افراد نے یار محمد کو تھاما ہوا تھا وہ بھی پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے دیکھ کر یار محمد دہائی دینے لگا ''یہ دیکھو تھانیدار جی! میرا کیا حال ہوا ہے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟ کیوں یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیتے؟''

مقامی ایس ایچ او نے پوچھا ''کیا ہوا ہے، کہاں سے آئے ہو تم؟''

یار محمد روتے ہوئے بولا ''مجھے ستار اور اس کے غنڈوں نے اُٹھا لیا تھا۔ پانچ دن انہوں نے مجھے بھوکا پیاسا باندھ کر رکھا۔ دیکھیں مار مار کر میرا کیا حال کر دیا ہے۔'' اس نے اپنا بایاں ہاتھ دکھایا۔ اس کی تین انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ''یہ دیکھیں۔'' اس نے شلوار کے پائنچے اٹھائے، پنڈلیوں پر چھڑیوں کے گہرے نشان تھے اور خون رس کر جم گیا تھا۔

ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر زور کا تھپڑ یار محمد کے منہ پر مارا اور چیخ کر بولا ''خاموش رہ بد ذات۔ تجھے تو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے۔ ایک شادی شدہ عورت کو بدنام کرتا ہے، چوری کرتا ہے اور سینہ زوری بھی کرتا ہے۔ تھانیدار صاحب! یہ بدمعاش ہے، ہم سب اس کے کرتوت جانتے ہیں۔''

یار محمد چیخ کر بولا ''ہاں میں بدمعاش ہوں۔ جو کرنا ہے کر لو میرا۔ پھانسی چڑھا دو مجھے۔ کتے چھوڑ دو مجھ پر۔ میری بوٹی بوٹی کر دو۔''

میں نے یار محمد کو جھڑک کر خاموش کرایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر تماشائیوں کے ہجوم سے نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم جام پور کے تھانے میں بیٹھے یار محمد سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ یار محمد کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

''انسپکٹر! میں نے کسی کو بدنام نہیں کیا۔ ان لوگوں نے خود اپنی بدزبانی کا سامان کیا ہے۔ مجھے کیوں اُٹھا کر لائے ہیں امرتسر سے۔ کیوں پانچ دن میری ہڈیاں توڑتے رہے ہیں۔ اب میں بھی وہی کہوں گا جو میری زبان پر آئے گا۔ میں ثریا کے بغیر

نہیں رہ سکتا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں مل سکتی تو پھر میرا جینا بھی فضول ہے۔ اگر آپ مجھے پھانسی نہ بھی دیں گے تو میں اس کے دروازے کے سامنے خودکشی کرلوں گا اور یہ کوئی زبانی کلامی بات نہیں۔ آپ دیکھیں گے، میں ایسا ہی کروں گا۔"

ایس ایچ او نے غصّے میں بھڑک کر اسے ایک گالی دی اور بولا "تیرا عشق تو ہم ایسا نکالیں گے کہ تیری سات پشتوں تک کوئی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔"

پھر اس نے ایک سپاہی کو آواز دی کہ وہ چھتر لے کر آئے۔ میں نے ایس ایچ او کو آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں اس معاملے کو احتیاط سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی یار محمد اس وقت مدعی تھا۔ اسے اغوا کیا گیا تھا اور حبس بے جا میں رکھا گیا تھا۔ میں نے اسے موقع دیا کہ وہ اس بارے میں بتا سکے۔ اس نے تمام واقعہ تفصیل سے بتایا۔ اس نے کہا کہ اسے ٹیکسی میں ڈال کر امرتسر سے اغوا لے پہنچایا گیا اور ایک رات رکھنے کے بعد جام پور لا کر ایک تاریک مکان میں بند کر دیا گیا۔ اسے رسیوں سے باندھ کر بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ ستار اور اس کے دوست شاہجہاں نے اس پر بے پناہ تشدد کیا۔ ایک دن وہ اس کے جسم کے حصے کاٹنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس نے ان کے گھر شرمناک خط لکھے تھے۔ شاید وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتے مگر آج صبح وہ کمرے کی ایک کھڑکی کو بند کرنا بھول گئے۔ یار محمد نے لوہے کی جالی توڑی اور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا.....!"

پوری روئیداد سننے کے بعد ہم یار محمد کو لے کر اسی وقت اس مکان تک پہنچے۔ یہ ستار کے دوست شاہجہاں کا مکان تھا۔ واقعی ایک کمرے کی جالی ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں ایسے آثار تھے جن سے ثابت ہوا کہ یار محمد کو یہاں رکھا گیا ہے۔ شاہجہاں اور ستار دونوں غائب تھے۔ میری ہدایت پر ایس ایچ او رحمان نے ان کی تلاش شروع کرائی۔ قصبے میں دو تین جگہوں پر چھاپہ مارا گیا۔ ان دونوں کے ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی لیکن فوری طور پر نتیجہ نہیں نکلا۔ تاہم شام تقریباً سات بجے وہ دونوں خود تھانے پیش ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک سرکاری افسر بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ ستار اور شاہجہاں خوف کی وجہ سے تھانے نہیں پہنچے تھے ورنہ ان کے بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ خود حاضر ہو کر اپنا مؤقف پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ستار سے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے جیب سے کچھ خطوط نکالے اور ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ان کی تعداد تقریباً دس تھی۔ نیلی روشنائی کے ساتھ ہولڈر سے لکھی ہوئی تحریر تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ تحریر کو بگاڑ کر لکھا گیا ہے تاکہ پہچانی نہ جا سکے۔ یہ خط گالیوں اور فحش نگاری کا پلندہ تھے۔ لکھنے والے نے کوشش کی تھی کہ تحریر کے ذریعے ستار کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کیا جائے۔ ستار نے روہانسا ہو کر کہا "جناب! ان میں سے کچھ خط جو میری برداشت سے باہر تھے، میں نے پھاڑ دیئے ہیں۔"

ان خطوط کو پڑھ کر کسی بھی شریف انسان کا دماغ آؤٹ ہو سکتا تھا۔ ستار نے کہا "جناب! یہ گندگی تین ماہ سے میرے گھر میں پھینک رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ یار محمد کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ میں نے چاہا کہ یار محمد کے بڑوں سے بات کروں لیکن باپ کے سوا یہاں اس کا بڑا کوئی نہیں اور یہ بڑا بھی بچوں سے بدتر ہے، ہر وقت نشے میں رہتا ہے۔ پچھلے ہی دنوں جیل کاٹ کر آیا ہے..... مجبور ہو کر میں امرتسر پہنچا اور یار محمد سے مل کر اسے سمجھانے کی

کوشش کی لیکن وہ اُلٹا ہمیں ڈرانے دھمکانے لگا۔ میرا بھی دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے ٹیکسی میں ڈالا اور باندھ کر یہاں لے آیا۔ یہ میرا قصور ہے کہ میں نے اسے چار پانچ دن شاہجہاں کے گھر میں رکھا مگر اس کے سوا میں کرتا بھی کیا۔ پہلے ہی میری بدنامی کے بہت اشتہار لگ چکے ہیں۔ پولیس تک آتا تو اور بات پھیلتی۔ میں نے سوچا اسے گھر ہی رکھوں اور حیلے بہانے سے یا ڈرا دھمکا کر کسی طرح راہ راست پر لانے کی کوشش کروں۔ ہوسکتا ہے مجھ سے کچھ زیادتی بھی ہوگئی ہو لیکن خدا گواہ ہے میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ وہ ہم میاں بیوی کی زندگی سے نکل جائے۔

ستار کے ساتھ آئے ہوئے سرکاری افسر نے بھی تصدیق کی کہ ستار فطرتاً ایک شریف آدمی ہے۔ خدا خوف والا اور ہمدرد ہے۔ اگر یار محمد اس کی عزت کو نہ للکارتا تو کبھی یہ واقعہ نہ ہوتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یار محمد کو بگاڑنے میں اس کے باپ کا بہت ہاتھ ہے۔ وہ ساری زندگی اللے تللوں میں مصروف رہا اور نشہ اس کی گھٹی میں شامل ہے۔ باپ کا اثر اولاد پر تو پڑنا ہی تھا۔ اب وہ بھی بیٹے کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے اور اس سے کوئی باز پرس نہیں کرتا۔

یار محمد کے باپ کا جو کردار میرے سامنے آ رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بے راہرو شخص ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے دو باتیں کر لینی چاہئیں..... سرکاری افسر کی مداخلت پر میں نے ستار اور شاہجہاں کو گرفتار نہیں کیا تاہم انہیں زیرِ تفتیش رکھا۔ یار محمد کا حوالات میں رہنا ضروری تھا کیونکہ ابھی اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی اور عین ممکن تھا کہ اسے چھوڑا جاتا تو وہ پھر ستار کے گھر کے سامنے جا کر چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ اس کے علاوہ اس کے خطوط کے بارے بھی پوچھ گچھ کرنا باقی تھی۔

یار محمد کو حوالات چھوڑ کر میں اس کے گھر پہنچا اور ولی محمد سے ملاقات کی۔ ولی محمد کے چھوٹے بیٹے نے مجھے باپ کے کمرے تک پہنچایا۔ گھر میں ولی کی دو بیٹیاں اور ایک رشتہ دار عورت بھی تھی مگر وہ سب کونے کھدروں میں لگی ہوئی تھیں اور لگتا تھا گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں نے دیکھا ولی ایک چٹائی پر چت پڑا تھا۔ اس نے دھوتی بنیان پہن رکھی تھی۔ قریب ہی ایک تھالی میں کچھ مٹھائی پڑی تھی اور شراب کی بوتل لڑھکی ہوئی تھی۔ ہر طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس شخص کو پتہ ہی نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کا بیٹا گلی میں چیخ و پکار کر رہا تھا اور اب وہ تھانے میں ہے۔ وہ گھوڑے بیچ کر مدہوش پڑا تھا۔ اس کے لڑکے نے ایک دو بار ہلایا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سرخ آنکھوں سے ہمارے چہرے دیکھتا رہا پھر اپنے حواس میں آ گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا اس لیے وہ میری آمد کا مقصد نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ عجیب لاپرواہی سے مسکرانے لگا۔

''مجھے پتہ چل گیا ہے تم کیوں آئے ہو؟'' وہ ہچکی لے کر بولا۔ ''اس بدمعاش کے بچے کے لیے آئے ہو نا! وہ عورت اسے لے ڈوبی ہے، لے ڈوبی ہے وہ اسے۔'' اس نے بوتل اُٹھا کر بچا کھچا سیال حلق میں انڈیلا اور فلسفیوں کی طرح چھت کو گھور کر بولا ''تھانیدار صاحب! یہ عورت بڑی ظالم چیز ہے۔ بڑا بُرا نشہ ہے یہ۔ شراب کے نشے میں اور عورت کے نشے میں بدنامی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے..... میں نے..... شراب سے شادی کر رکھی ہے۔'' اس نے جھوم کر خالی بوتل پر ہاتھ پھیرا اور بولا ''تمہیں تمہارے ڈنڈے کی قسم تھانیدار صاحب! ذرا سچ بتاؤ یہ بوتل کوئی عورت سے کم ہے! ادھر لاؤ اپنا ہاتھ.....

یہ دیکھو، اس پر پھیر کر دیکھو۔ کتنی خوبصورت ہے۔ کچھ پتہ چلا اور پھر..... جب بلاؤ پاس آ جاتی ہے۔ اس کا کوئی نخرا نہیں۔ کوئی حیلہ بہانہ نہیں۔ یہ رہنے کے لیے مکان نہیں چاہتی، نہ پہننے کے لیے کپڑا نہ بچوں کے لیے فیسیں مانگتی ہے۔ نہ بیمار ہوتی ہے نہ اُداس ہوتی ہے۔ ہر دم تازہ دم۔ اس اُلو کے پٹھے سے کہو تھانیدار، اگر عشق کے بنا نہیں رہ سکتا تو اس بوتل کو محبوبہ بنا لے۔ چھوڑ دے اس عورت کا پیچھا۔ وہ اسے موت کے سوا کچھ نہ دے گی۔''

ولی محمد نشے میں تھا۔ میں نے سوچا شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ میں نے کہا ''ولی محمد! یہ عورت تیرے بیٹے کے پیچھے کیسے پڑ گئی۔''

وہ بولا ''تم نے..... تم نے سائنس پڑھی ہے؟ نہیں پڑھی ہو گی۔ تھانیدار سائنس نہیں پڑھتے۔ میں نے سائنس پڑھی ہے تھوڑی بہت۔ سائنس بتاتی ہے کہ خلاؤں میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے رہتے ہیں جو ٹکڑا جس سیارے کے پاس ہوتا ہے اس کی کشش انہیں کھینچ لیتی ہے۔ ثریا بھی ایک سیارہ ہے۔ اس نے اپنے مقناطیس سے یار محمد کو کھینچ لیا ہے۔ اب وہ ساری عمر ایک ہی چکر میں رہے گا۔ کبھی پاس چلا جائے گا کبھی دُور لیکن اس چکر سے نہیں نکلے گا۔''

میں کافی دیر ولی محمد سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتیں ایسی ہی تھیں۔ نشے میں ڈوبی ہوئی اور چاند ستاروں کی خبر لاتی ہوئی۔ میں اس کے پاس سے اُٹھنے ہی والا تھا کہ دروازے کے پیچھے چوڑیوں کی چھم چھم سنائی دی اور کوئی جلدی سے اندر گیا۔ وہ ایک جوان عورت تھی بلکہ اسے لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ اس نے ہلکا زرد رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ کا دوپٹہ سلیقے سے سر پر لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا لفافہ تھا۔ وہ بے دھیانی میں اندر آ گئی تھی لیکن مجھے وہاں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آگے آئے یا واپس چلی جائے۔ پھر وہ ہمت کر کے آگے آئی۔ کھنکتی آواز میں بولی ''چچا ولی! یہ دوائی کھا لو بس دو دن اور کھانی ہے۔''

ولی محمد نے گھور کر اسے دیکھا اور بولا ''ثریا! تجھے کتنی بار کہا ہے مت آیا کرو یہاں۔ دوائی کی بات ہے تو مجھے ایک ہی بار لا دے میں خود کھا لیا کروں گا۔ خوامخواہ کی رشتہ داری نہ بنا ہم سے۔ ہمیں نہیں چاہیے یہ رشتہ داری۔''

لڑکی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ناراضگی کے آثار اُبھرے۔ اس نے دوائی والا لفافہ ولی محمد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا ''اچھا اب تو کھا لو۔ کل بھجواؤں گی باقی کی دوائی۔''

ولی محمد نے دوائی لے لی اور بیزاری سے بولا ''جا پانی لے کر آ۔'' وہ مجھے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں یہ جان کر حیران ہو رہا تھا کہ یہی ثریا ہے۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، آنکھیں بھی کچھ بجھی بجھی تھیں۔ بہرحال اس میں ایک کشش تھی اور جسم بھی متناسب تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ولی محمد بولا ''پاگل ہے یہ لڑکی اور ہم سب کو بھی پاگل کر رکھا ہے اس نے۔ بلکہ دونوں اُلو کے پٹھے ہی پاگل ہیں۔'' اس کا اشارہ اپنے بیٹے کی طرف تھا۔ گہری سانس لے کر بولا ''اب بہانے سے آئی ہے کہ شاید یار محمد بھی گھر میں ہو۔ ایک طرف اس کو تھپڑ مارتی ہے اور دوسری طرف اس کے لیے دیوانی بھی ہوئی پھرتی ہے۔ پتہ نہیں کیا چاہتی ہے.....''

میں نے پوچھا ''لیکن یہ آئی کیسے؟''

وہ بولا ''کچھ نہ پوچھو جی۔ اس محلے کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ دیواروں سے دیواریں اور چھتوں سے

باتوں سے خوشبو آئے.....!

☆.....بارش کا قطرہ سیپ اور سانپ دونوں کے منہ میں گرتا ہے۔ سیپ اسے موتی جبکہ سانپ اسے زہر بنا دیتا ہے۔

☆.....حاسد تمہاری خوشی سے غمگین ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے کافی ہے۔ تمہیں انتقام لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی آگ میں خود جل رہا ہوتا ہے۔

☆.....زندگی کے آدھے غم انسان دوسروں سے توقعات وابستہ کر کے خریدتا ہے۔

☆.....اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور حسن سلوک میں ہی بڑھ جاؤ۔

☆.....زندگی کی کامیابی سچائی میں ہے۔

☆.....وقت کی قدر کرنے والے کبھی نہیں پچھتاتے۔

☆.....جو لوگ دُکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں، خدا ان کے دُکھ دور کرتا ہے۔

☆.....حقیقت پسند لوگ کبھی شرمندہ نہیں ہوتے۔

☆.....مخلص دوست اگر مل جائے تو اس کی قدر کرو۔

☆.....جو دشمن کو بھول جاتا ہے وہ دوسروں پر کرنے والا احسان بھی یاد نہیں رکھتا۔

(مرتب: ایس۔ امتیاز احمد، کراچی)

☆☆☆

چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ گھروں کے درمیان کھڑکیاں بھی ہیں جہاں سے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہمارے گھروں کے درمیان بھی ایک کھڑکی ہے۔ بس وہیں سے آ جاتی ہے چھپاک کر کے۔ کوئی منہ نہیں لگاتا پھر بھی گھسی چلی آتی ہے..... میں تو.....''

اچانک وہ چپ ہو گیا کیونکہ ثریا ہاتھ میں گلاس لیے اندر آ رہی تھی۔ ولی محمد کو دوائی کھلا کر جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر روکا۔ وہ ٹھہر گئی۔ ولی محمد نے کہا ''یہ انسپکٹر نواز ہے، تھانے سے آیا ہے۔''

میرا تعارف سن کر وہ ایک دم خوفزدہ نظر آئی پھر سنبھل کر بولی ''جی فرمایئے۔''

میں نے کہا ''میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا خاوند گھر ہی ہے؟''

وہ بولی ''نہیں جی..... شاہجہاں کے ساتھ آپ کی طرف گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک منٹ کے لیے آئے تھے اور پھر چلے گئے تھے۔''

میں نے کہا ''چلو ٹھیک ہے اسی گھر میں بات کر لیتے ہیں۔'' پھر میں نے ولی محمد سے کہا ''ولی صاحب! آپ ہمیں چند منٹ دیں گے؟''

وہ میری بات سمجھتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر کھڑا شرابیوں کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھ کر بولا ''انسپکٹر صاحب! خدا کے لیے اس کو سمجھائیں۔ اس کے دماغ سے خناس نکال دیں۔ اسے سمجھائیں کہ نہ اپنا گھر اجاڑے نہ ہمیں برباد کرے۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا تو میں نے ثریا کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ولی محمد کا چھوٹا بیٹا اندر جھانکنے کے لیے آیا تو میں نے اسے کہا کہ دو منٹ کے لیے دروازہ بند کر دو۔''

میں نے غور سے ثریا کو دیکھا۔ غالباً چار پانچ سال پہلے وہ بہت خوبصورت تھی۔ اب بھی اس کا چہرہ دیکھنے والوں کی نظر کو خود پر روک سکتا تھا۔ اگر یار محمد نے اس کو دل میں بسایا ہوا تھا اور اس کے دھیان میں رہتے ہوئے شمی جیسی لڑکی کو ٹھکرایا تھا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

میں نے اس سے پوچھا ''بی بی! تم جانتی ہو کہ تمہاری وجہ سے کتنا ہنگامہ ہو رہا ہے لیکن تم پھر بھی

اپنی ہی لائن پر چلتی جا رہی ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ کیسی عورت ہو تم؟''

اس نے سر جھکایا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے کہا ''تمہارا شوہر شریف ہے، کماؤ ہے، تم سے محبت کرتا ہے۔ پھر تم یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہو۔ کیوں شرم نہیں آتی تمہیں؟''

اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنے دل کی بات بتائے لیکن وہ ہر بار ہونٹوں کو بھینچ گئی۔ آخر میں نے جھلا کر کہا ''کچھ تو بولو، خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ مت بھولو کہ تمہارا رویہ تمہیں عدالت کے کٹہرے میں بھی پہنچا سکتا ہے۔''

اس نے روتے روتے صرف اتنا کہا ''میں بے قصور ہوں، میرا کوئی گناہ نہیں۔''

''بے گناہی ثابت کرنی پڑتی ہے بی بی۔ الزامات کا جواب دینا پڑتا ہے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بس نگاہیں جھکا کر آنسو گراتی رہی۔ صاف ظاہر تھا وہ کوئی خاص بات چھپا رہی ہے۔ ماتھے پر آنے والی بالوں کی لٹ کو اس نے ہاتھ سے بڑھا کر کان پر چڑھایا تو زرد اوڑھنی اس کے رخسار سے ہٹ گئی۔ اس وقت میری نگاہ اس کے جھمکے پر پڑی۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ اس جھمکے کا ڈیزائن چیخ چیخ کر ایک اعلان کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غور سے جھمکے کو دیکھا۔ ثریا نے میرے اس انداز کو محسوس کیا اور ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اوڑھنی نے اس کے کان کو پھر ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا ''بی بی! یہ اوڑھنی پیچھے ہٹاؤ.....'' وہ پہلے تو میری بات سمجھ نہ سکی۔ جب میں نے دوسری بار وضاحت سے کہا تو اس نے اپنا کان ننگا کیا۔ میں نے آگے جھک کر جھمکے کا معائنہ کیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اس انگوٹھی کے ساتھ کا جھمکا تھا۔ میں نے کہا ''بی بی! یہ جھمکا تجھے کہاں سے ملا؟''

وہ بولی ''میری شادی کا ہے۔''

''والدین کی طرف سے؟''

''نہیں سسرال کی طرف سے۔''

''اس کے ساتھ کا کوئی اور زیور بھی ہے؟''

''نہیں۔ بس یہ جھمکے ہی ہیں۔''

میں نے کہا ''دیکھو بی بی! جو میں پوچھوں سچ بتانا ورنہ تم سب ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔''

ثریا میری حرکات سے پہلے ہی پریشان نظر آ رہی تھی۔ جب میں نے ''بڑی مصیبت'' کا ذکر کیا تو وہ اور ہراساں ہو گئی۔ کہنے لگی ''پتہ نہیں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ بہتر ہے آپ میرے شوہر سے بات کر لیں۔''

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لے کر کہا ''گھبرانے کی بات نہیں۔ سچ بولو گی تو میں ہر طرح کا تعاون کروں گا لیکن جھوٹے کو قانون کبھی معاف نہیں کرتا۔''

اس کے اُبھرے ہوئے رخساروں کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے اوڑھنی کو سینے کے سامنے مٹھی میں جکڑا اور اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ میں نے کہا ''اس جھمکے کے ساتھ کی ایک انگوٹھی میں نے یار محمد کی انگلی میں دیکھی ہے۔ وہاں کہاں سے آئی ہے؟''

''کون سی انگوٹھی؟'' ثریا نے پوچھا۔

میں نے سختی سے کہا ''ثریا! انجان نہ بنو اور نہ ہی میرا ٹائم ضائع کرو۔ معلوم تو سب کچھ ہو جانا ہے، بہتر ہے اپنی زبان سے بتا دو۔''

اس نے سر جھکا کر کہا ''وہ..... میں نے اسے

دی تھی۔"

میں نے پوچھا "تمہارے شوہر کو معلوم ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔ میں نے کہا "تم جانتی ہو تمہارے شوہر کے پاس یہ زیور کہاں سے آیا تھا؟"

وہ سادگی سے بولی "یہ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے ثریا سے چند سوالات مزید کیے۔ پھر اسے گھر جانے کی اجازت دے دی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ گھر سے نہیں نکلے گی اور نہ ہی اس گفتگو کے بارے میں کسی کو بتائے گی۔ میری ان ہدایات نے ثریا کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔

ولی محمد سے رخصت ہو کر میں فوراً تھانے پہنچا۔ ایس ایچ او سے کہا کہ وہ ایک کانسٹیبل فوراً ستار کے گھر بھیج دے اور اگر ستار وہاں پہنچے تو اسے لے کر تھانے آ جائے۔ اس کے بعد ایک سب انسپکٹر کو میں نے ستار کی تلاش میں بھیجا اور اسے کہا کہ وہ ستار کو ہر ممکنہ ٹھکانے پر ڈھونڈے۔

سب انسپکٹر کوئی آدھ گھنٹے بعد ستار کو تلاش کر لایا..... ستار اس اچانک طلبی پر حیران تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے تو وہ تھانے سے فارغ ہو کر گیا تھا۔ میں حوالات میں جا کر یار محمد کی انگوٹھی اُتروا لایا۔ یہ انگوٹھی میں نے ستار کے سامنے رکھ کر پوچھا "یہ کس کی انگوٹھی ہے؟"

ستار نے بغور انگوٹھی کو دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہکلا کر بولا "جناب یہ میری بیوی کی انگوٹھی ہے، ثریا کی۔"

"تمہیں کہاں سے ملی؟"

"جی وہ..... جی میں..... جی وہ میں نے..... اللہ بخشے میری والدہ نے بنوائی تھی یا شاید..... بنی بنوائی لی تھی۔"

میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا "والدہ نے بنوائی تھی یا تم نے ڈاکے میں چھینی تھی؟"

ستار کا منہ کھلا رہ گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب..... ڈاکہ..... کیسا ڈاکہ؟"

میں نے کہا "وہ ڈاکہ جو تم نے پانچ سال پہلے سہارنپور کے سچدیو رائے کے گھر مارا تھا۔"

"کون سچدیو رائے؟"

"ہاں..... کہاں یاد ہو گا تمہیں۔ پتہ نہیں کس کس کو لوٹ چکے ہو۔ کوئی ایک نام تھوڑا ہی ہے تمہارے کھاتے میں۔"

ایس ایچ او رحمان اور دوسرا عملہ بھی حیران نظر آ رہا تھا۔ ان کے خیال میں ستار ایک شریف، محنتی اور دیندار شخص تھا۔ وہ اس کے ڈاکو ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن میں اب پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص ڈاکے مارتا رہا ہے۔ اس کی بے پناہ گھبراہٹ سارا پول کھول رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کی داہنی کلائی پر گولی کا ایک پرانا زخم بھی دیکھ چکا تھا۔ زخم کی حالت سے ظاہر تھا کہ گولی ڈاکٹر نے نہیں نکالی بلکہ کلائی کو خود ہی چیرا پھاڑا گیا ہے۔ ایسے مخصوص زخم صرف ڈاکوؤں اور مفرور مجرموں کے جسم پر ہی دیکھے جاتے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر میں اس زخم کو بہت اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ میں نے قریب کھڑے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا "نادر خاں! عبدالستار صاحب کو ہتھکڑی لگاؤ۔"

میرے منہ سے یہ فقرہ ادا ہوا ہی تھا کہ ستار سپرنگ کی طرح کرسی سے اُچھلا اور ایک سپاہی کو دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ اس کی پھرتی دیدنی تھی۔ میں چونکہ میز کے پیچھے تھا اس لیے کچھ نہ کر سکا مگر ایک کانسٹیبل نے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا۔ جتنی تیزی سے مجرم بھاگا اس سے دوگنی رفتار سے وہ اس کے پیچھے لپکا۔ تھانے کے احاطے میں

اس نے مجرم کو زوردار دھکا دیا اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا گملوں کی ایک قطار پر جا گرا پھر اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر بھاگتا۔ کانسٹیبل نے اسے جھاپ لیا۔ اتنے میں باقی عملہ بھی اس پر ٹوٹ پڑا۔

ملزم کو کڑی ہتھکڑی لگا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد سہارنپور سے ایک ڈی ایس پی کو جام پور بلایا گیا۔ ڈی ایس پی صاحب اگلے روز صبح سویرے پہنچے۔ ان کے آنے تک ہم نے ملزم سے پوچھ گچھ جاری رکھی..... ڈی ایس پی صاحب ستار کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ اس کا نام ستار نہیں بلکہ ابدال شاہ ہے اور یہ کچھ عرصہ پہلے سرگرم مجرم رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شخص اتر پردیش اور مہاراشٹر میں چوری اور ڈکیتی کی کئی وارداتیں کر چکا ہے۔ اپنی آخری واردات اس نے کوئی چار سال پہلے اجمیر میں ایک بس لوٹ کر کی تھی۔ اس واردات کے بعد پولیس بہت سرگرمی سے اس کے پیچھے پڑ گئی لہٰذا اس نے کچھ عرصہ امن سکون سے گزارنے کا فیصلہ کیا اور روپوش ہو گیا تھا..... ستار کے یہ کوائف بے حد حیران کن اور آنکھیں کھول دینے والے تھے۔ ایک شخص جو ستار کے نام سے ایک شریف شہری کی طرح جام پور کے محلے میں رہتا تھا، جرائم کی بساط کا ایک اہم مہرہ تھا..... ڈی ایس پی صاحب اس کی گرفتاری پر جتنے خوش نظر آ رہے تھے اتنے ہی حیران بھی تھے۔ انہوں نے فرداً فرداً ہماری کارکردگی کی تعریف کی۔

ہم اس وقت دفتر میں بیٹھے ڈی ایس پی صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دبلا پتلا سپاہی گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے اشارے سے ایس ایچ او صاحب کو باہر بلایا۔ رحمان کے پیچھے ہی پیچھے میں بھی باہر آ گیا۔ سپاہی نے بتایا کہ حوالاتی ستار کی بیوی کی جان سخت خطرے میں ہے۔ ہم نے پوچھا ''اسے کیا ہوا ہے؟''

وہ بولا ''ہوا تو کچھ نہیں جناب..... لیکن ہونے والا ہے۔''

اس نے بتایا کہ حوالاتی ستار نے ایک سپاہی رام دھرم کو رشوت دی ہے اور وہ ستار کا ایک رقعہ لے کر اس کے دوست شاہجہاں کے پاس گیا ہے۔ ستار نے شاہجہاں کو لکھا ہے کہ وہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کی بیوی کا کام تمام کر ڈالے۔

رحمان نے پوچھا ''شاہجہاں کہاں ہے؟''

سپاہی نے بتایا ''مجھے نہیں پتہ لیکن رام دھرم کو پتہ ہے جو رقعہ لے کر گیا ہے۔''

ایس ایچ او رحمان نے دانت پیس کر کہا ''تجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

سپاہی نے کانپتے ہوئے کہا ''جناب! پہلے ملزم نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگوں کے درمیان کچھ روپے چھپا رکھے ہیں۔ پہلے مجھے لالچ دیتا رہا کہ یہ دو سو روپے لے لو۔ میں نہیں مانا تو رام دھرم کو منا لیا۔''

ایس ایچ او نے کہا ''اس حرامی کو لاک اپ میں کاغذ قلم کس نے دیا؟''

سپاہی بولا ''یہ سب رام دھرم کا کام ہے۔''

سپاہی کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ میں نے کہا ''رحمان! ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا..... تم ڈی ایس پی صاحب کے پاس بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔'' رحمان کے روکتے ہی روکتے میں باہر نکل آیا۔ مخبری کرنے والا سپاہی اور ایک رائفل مین بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے چھاتا گلی پہنچے (اس گلی کے اوپر چھت تھی) گلی کے موڑ پر رُک کر میں نے دیکھا ستار کا تین منزلہ مکان سامنے نظر آ رہا تھا مگر مکان کے اردگرد کوئی ہلچل نہیں تھی۔ میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایک قریبی دکان

میں جا گھسا۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ کس چیز کی دکان تھی۔ اتنا معلوم ہے کہ دکاندار نے ہمارے لیے کرسیاں رکھوائیں اور چائے منگوائی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہم ستار کے مکان کی طرف دیکھتے رہے۔ میں اس سے پہلے مکان کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا اور مجھے تسلی تھی کہ مکان میں داخل ہونے کے لیے ملزم کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہوگا۔

قریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب ہم مایوس ہو رہے تھے اچانک ایک تیز رفتار ٹم ٹم گلی میں داخل ہوئی اور سیدھی ستار کے دروازے کے سامنے رُکی۔ ہم ہوشیار ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ فیصلہ کن لمحہ آ گیا ہے اور ہماری گھات کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ ٹم ٹم میں سے شاہ جہاں نکلا۔ اس نے جسم کے گرد ایک سوتی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ سر جھکائے جھکائے وہ تیزی سے تین منزلہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ بازار کے لوگ پہلے سے چوکنا ہو چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا ہم دکان کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے بھاگتے دیکھ کر سب گلی میں جمع ہونے لگے۔ میں تیزی سے چوبارے کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ یہ گہری تاریک ڈیوڑھی تھی۔ دن کے وقت بھی اندر بلب جل رہا تھا۔ سامنے تنگ زینہ تھا جو تیسری منزل پر ثریا کی رہائش گاہ تک جاتا تھا۔ میں دو دو زینے پھلانگتا تیسری منزل پر پہنچا تو شاہجہاں بے تابی سے ثریا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں اس نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''خبردار۔'' میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اپنی لمبی ٹانگ اس نے یوں گھمائی کہ میرا پستول والا ہاتھ تو میرے اپنے ہی سر سے آ ٹکرایا۔ گولی کی آواز تنگ زینوں میں بم کے دھماکے کی طرح گونجی۔ اس کے بعد میں نے شاہجہاں کو خود پر جھپٹتے دیکھا (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، شاہجہاں بھی ایک نامی گرامی وارداتیا تھا۔ اس کا اصل نام رانا سنگھ تھا۔ وہ بھی جام پور کے اس قصبے کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہا تھا)۔ ہم اوپر نیچے زینوں پر گرے اور آٹھ دس فٹ نیچے لڑھک گئے۔ میرے سر کے پچھلے حصے اور کمر پر چوٹ لگی تاہم گرتے گرتے میں اپنے حواس بحال کر چکا تھا جونہی لڑھکنے کا سلسلہ ختم ہوا میں نے ایک زوردار مکہ شاہجہاں کی ناک پر مارا۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھا۔ میں نے اسے ٹانگوں پر لے کر پورے زور سے دیوار کی طرف اُچھال دیا۔ دیوار کے ساتھ تصادم زوردار تھا مگر وہ ڈھیٹ نکلا۔ ایک بھڑک سی مار کر اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھوں سے گلا دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اثناء میں اوپر والے دروازے سے ثریا برآمد ہو چکی تھی اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھے زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نچلی منزلوں سے بھی شور وغل کی صدا آ رہی تھی۔ شاہجہاں بڑے جوش سے میرا گلا دبا رہا تھا۔ میں نے اتنے ہی زور سے اس کی ناف پر گھٹنا مارا۔ اس ضرب نے اسے مچھلی کی طرح تڑپا دیا۔ پھر ایک طوفانی مکہ یعنی بلال شاہ کی زبان میں ''باچیاں سیکنے والا مکہ'' اس کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دوسری منزل پر پہنچ گیا..... اسے زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی جامہ تلاشی کے دوران ایک بھرے ہوئے ریوالور کے علاوہ وہ رقعہ بھی ملا جو ستار نے اسے حوالات سے بھیجا تھا۔ اس رقعے میں لکھا تھا:

''رانا! میں پکڑا گیا ہوں، پولیس تجھے ڈھونڈ رہی ہے بہتر ہے کہ تُو یہاں سے بھاگ جا لیکن بھاگنے سے پہلے تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ میں

نہیں چاہتا کہ میرے بعد ثریا زندہ رہے۔ تُو اس کا کام تمام کر دے۔ وہ اس وقت گھر میں ہی ہے۔ میرا پستول تخت پوش کے نیچے پڑا ہے۔ وہی لے جا مگر گولی نہ چلائے تو بہتر ہے۔ اگر خود یہ کام نہ کر سکے تو بشیرے یا لطیف میں سے کسی کو کہہ کہ وہ یہ کام کر دیں۔ مگر یہ کام کرنا ضرور ہے۔ رب راکھا۔ تمہارا یار.....''

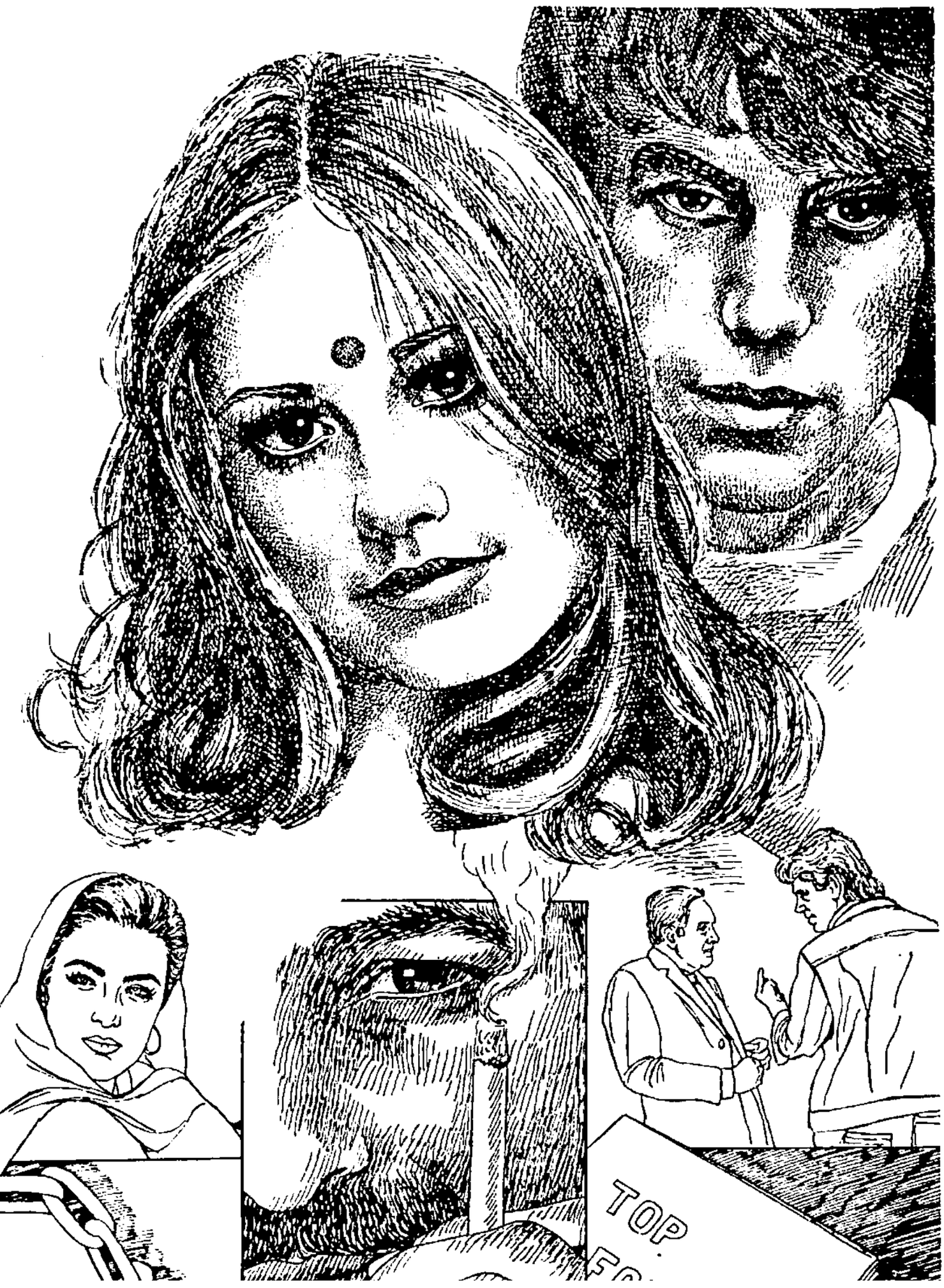
.....

شاہجہاں کے علاوہ اس کے ساتھی بشیرا اور لطیف وغیرہ بھی گرفتار ہوئے..... اس کے بعد تفتیش اور عدالتی کارروائی کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ یار محمد کو میں نے رہا کر دیا۔ اس پر کوئی الزام ہی نہیں تھا۔ اس کہانی کا سب سے اہم کردار ثریا تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو بیک وقت دو مختلف سمتوں میں سفر کر رہی تھی۔ اس کا دل و دماغ، اس کی سوچیں سب کچھ بٹ چکا تھا۔ اس کے سیدھے سادے والدین نے اس کا ہاتھ ایک ایسے شخص کو سونپ دیا جو باہر سے کچھ اور اور اندر سے کچھ اور تھا۔ ایک بیوی ہونے کی حیثیت سے ثریا اپنے شوہر کو بہت حد تک سمجھ چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا شوہر جرائم کی تاریک دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر جلتی اور کڑھتی تھی لیکن شوہر کی بدکرداری کا ذکر کبھی اس کے لبوں تک نہ آیا۔ وہ سب کچھ اندر ہی اندر پی گئی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ پانی اپنا راستہ خود تلاش کر لیتا ہے، جذبے بھی اپنے اظہار کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ثریا کے دبے ہوئے جذبات نے بھی اپنے اظہار کا ایک راستہ تلاش کر لیا۔ یہ راستہ معاشرے کو قبول نہیں تھا اور لوگ اس پر اُنگلیاں اٹھاتے تھے مگر وہ جانتے بوجھتے انجان اور ڈھیٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یار محمد سے محبت کرتی تھی اور اس محبت کو خود بھی کوئی مناسب نام نہیں دے سکتی تھی۔ یار محمد کی بے راہروی پر اسے تھپڑ بھی مارتی تھی اور اسے دیکھنے کے لیے بے چین بھی رہتی تھی۔ وہ ہمارے معاشرے کا ایک مجبور اور بے بس کردار تھی۔ ہر زمانے میں اس کردار پر ترس کھایا گیا ہے لیکن کسی زمانے میں اس کی مدد نہیں کی جا سکی۔

یقینی بات تھی کہ ستار کو اس کے گھناؤنے جرائم کی پاداش میں کم از کم..... کم از کم عمر قید کی سزا ہو گی۔ لہٰذا ثریا کی درخواست پر میاں بیوی کے درمیان طلاق عمل میں آ گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یار محمد اور ثریا کی کہانی کا انجام نہ دیکھ سکا کیونکہ اس واقعے کے کچھ ہی عرصہ بعد میرا پنجاب کے ایک دُور دراز تھانے میں ٹرانسفر ہو گیا اور پھر کبھی جام پور کی طرف جانا نہیں ہوا تاہم جو حالات میں اس نانک چندی اینٹوں والے قدیم قصبے میں چھوڑ آیا تھا ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاید کچھ عرصہ بعد یار محمد اور ثریا نے شادی کر لی ہو اور وہ قصبہ چھوڑ کر کسی اور بستی میں جا آباد ہوئے ہوں۔ بہرحال یہ ایک قیافہ ہے۔ اس اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے معاملات پر کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کبھی کبھی میں تنہا بیٹھا سوچتا ہوں۔ معمولی معمولی واقعات سے کس طرح زندگیوں کے رُخ تبدیل ہوتے ہیں۔ کس طرح کڑیوں سے کڑیاں ملتی ہیں اور سلسلہ بن جاتا ہے۔ اگر اخبار بیچنے والا یار محمد اس طوفانی دھانے جیسی لڑکی شمی کی ''دعوتوں'' کو نہ ٹھکراتا اور اس پر چوری کا الزام نہ لگتا اور نتیجے میں اس کے ہاتھ کی انگوٹھی سے میں آگاہ نہ ہوتا تو شاید عبدالستار کے گھناؤنے چہرے پر ہمیشہ پردا پڑا رہتا اور ثریا ایک بٹی ہوئی گنہگار زندگی جیتی رہتی۔

.....❁.....❁.....


TOP

محبوب، محبوبہ اور شوہر

نواز خان

محبوب، محبوبہ اور شوہر

نواز خان

"وہ ایک ضدی لڑکی تھی، اس نے ایک شخص سے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے اپنی زندگی جہنم بنالی"

پچھلی دفعہ میں نے گوبند سنگھ نامی نوجوان کا ذکر کیا تھا۔ ارائیں گھرانے کا یہ لڑکا ایک دوڑ کے دوران گم ہوگیا تھا اور کوشش کے باوجود مل نہیں سکا تھا۔ گوبند کے ساتھ "شاہی" نام کے غنڈے کا ذکر بھی آیا تھا۔ شاہی ایک بھگوڑا فوجی تھا اور خود کو ڈوگر بتاتا تھا۔ اس کے پاس ہر وقت ایک تلوار رہتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ تلوار کے مقابلے میں اپنے سامنے کسی کو ٹکنے نہیں دیتا تھا۔

گوبند کو گم ہوئے قریباً آٹھ مہینے ہوچکے تھے۔ ایک روز علاقے کا ایک مشہور جیب کترا جیکی میرے پاس آیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ عیسائی تھا۔ ڈلہوزی کے بدقماش افراد میں اُس کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اور ارد گرد کا ہر بدنام اڈہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جیکی جیسے لوگ اپنی مرضی سے تھانوں کا رُخ کم ہی کرتے ہیں اور جب کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے ضرور کوئی اہم بات ہے۔ جیکی بھی ایک اہم معاملہ لے کر تھانے آیا تھا۔ رسمی بات چیت کے فوراً بعد وہ اصل موضوع پر آگیا۔ کہنے لگا "جناب عالی! میں ایک بڑی خاص خبر لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے۔ اگر یہ خبر خاص نہ ہوتی تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتا"۔

ایک لمحے کے لیے رُک کر اُس نے گلا صاف کیا اور میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا "جناب کل ہفتہ تھا ہر ہفتے کی شام "صدر" کے ایک چائے خانے میں ناچ گانے کی محفل جمتی ہے۔ چائے خانے کے مالک کا نام گلزار خاں ہے میرا خیال ہے آپ اُسے جانتے ہی ہوں گے"۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں..... ہاں، تم آگے بولو"۔

وہ کہنے لگا "کل رات وہاں شاہی بھی موجود تھا ناچ گانے کے بعد تاش کی بازی ہونے لگی۔ شاہی بھی کھیل رہا تھا۔ اس نے رم کے کئی گلاس چڑھائے ہوئے تھے اور نشے میں دھت تھا۔ کھیل کے دوران اس کا مہیش نامی ایک پٹھان کوٹی سے جھگڑا ہوگیا۔ دراصل مہیش نے کھیل میں بے ایمانی کی کوشش کی تھی۔ شاہی آگ بگولا ہوگیا اس نے

اُٹھ کر میز اُلٹادی اور مہیش کو گالیاں دینے لگا۔ گرما گرمی میں اس کے منہ سے ایک عجیب بات نکل گئی کہنے لگا ''یہ جوا ہے اور جوئے میں دھوکا کرنے والے کا منہ توڑ دیتا ہوں۔ اس حرامی گوبند کا نام سنا ہوگا تم نے اس نے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کتے کے پلے کا نشان مٹادیا میں نے'' نشے کی وجہ سے اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا کہہ گیا ہے۔ موقعے پر موجود جن لوگوں کو اس کی بات سمجھ میں آئی وہ حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ حیران ہونے والوں میں میں بھی شامل تھا جناب عالی .....کل سے سوچ رہا تھا کہ اس بات کی اطلاع آپ کو ملنی چاہئے گوبند ہمارے محلے کا لڑکا تھا۔ زیادہ میل جول نہ سہی ، علیک سلیک تو تھی۔ ہمیں اس کے نہ ملنے کا دُکھ ہے۔ اس کی بوڑھی ماں کو دیکھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

جیکی اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگیا اور میں ذہن میں زبردست ہلچل محسوس کرنے لگا۔ یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی اور جیکی کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجرم کوئی جرم کرتا ہے اور جب جرم کرنے کے کافی عرصے بعد تک بھی اسے کوئی سزا نہیں ملتی تو وہ اپنے جرم کے بارے میں لاپرواہ ہو جاتا ہے اور کسی وقت شیخی میں آکر جرم کا اعلان بھی کردیتا ہے۔ میں نے جیکی سے کچھ تفصیلات پوچھیں اور اس کے فوراً بعد شاہی پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ جیسا کہ میں نے پچھلی کہانی میں بتایا تھا شاہی نے تیمور والے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری کرائی تھی لیکن یہ ایک بالکل دوسرا معاملہ تھا۔ اور اس میں میں بلاروک ٹوک شاہی کو ہتھکڑی لگا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا شاہی ایک خطرناک غنڈہ ہے اور آسانی سے گرفتاری نہیں دے گا۔ لہٰذا میں نے خود اس کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل لے کر میں اس کی طرف روانہ ہوا۔ جیکی کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا کہ شاہی اس وقت اپنے ڈیرے پر ہوگا۔ اس کا ڈیرہ ''ست دھارا'' کے راستے میں پیر توکل کے مزار کے قریب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیرے پر ہر وقت لوفروں کا مجمع لگا رہتا ہے اور ان لوفروں میں بعض اوقات خطرناک غنڈے بھی اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ڈیرے میں گھس کر شاہی پر ہاتھ ڈالنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے شاہی کو کسی بہانے ڈیرے سے باہر بلایا جائے اور پھر موقع دیکھ کر ہتھکڑی ڈال دی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہیڈ کانسٹیبل قادری کو استعمال کیا جاسکتا تھا۔ قادری صرف دو روز پہلے میرے تھانے میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اسے سادہ کپڑوں میں لایا تھا۔ وہ اندر جا کر شاہی کو بہانے سے باہر لاسکتا تھا۔ قادری کو پوری بات سمجھا کر میں نے شاہی کے ڈیرے پر بھیج دیا اور خود قریبی درختوں کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ حوالدار پربت سنگھ اور ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل اور میرے پاس 38 بور کا ریوالور تھا۔ گاڑی ہم نے قریب ایک فرلانگ پیچھے ہی کھڑی کردی تھی اور امید نہیں تھی کہ وہ شاہی یا کسی دوسرے شخص کی نظر میں آسکے گی۔

ہیڈ کانسٹبل قادری اندر چلا گیا اور ہم پوری طرح چوکس ہو کر شاہی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ قریباً پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ شاہی نکلا نہ قادری کی صورت نظر آئی اور نہ ہی کوئی تیسرا شخص دکھائی دیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو سمجھایا تھا کہ وہ اندر پہنچتے ہی شاہی سے بات کرے اور اُسے بتائے کہ پشاور سے دو آدمی اسے ملنے آئے ہیں۔ وہ ڈیرے پر آنا نہیں چاہتے اس لیے باہر کھڑے

ہیں۔ پشاور میں کچھ جرائم پیشہ لوگوں سے شاہی کے تعلقات تھے اور مجھے امید تھی کہ پشاور کے مہمانوں کا ذکر سن کر وہ افراتفری میں باہر آجائے گا، میرا خیال تھا کہ شاہی کے باہر آنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے..... لیکن اب آٹھ منٹ ہونے کو آئے تھے۔ گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ ہماری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ یقیناً اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اچانک ڈیرے کا بیرونی پھاٹک ایک جھٹکے سے کھلا اور کوئی شخص لڑھکتا ہوا باہر آگرا۔ میں نے سفید لباس سے پہچانا۔ وہ قادری کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یوں لگا جیسے قادری نے بھاگ کر پھاٹک سے گزرنے کی کوشش کی اور کسی نے زور دار طریقے سے اُسے دھکا دے دیا۔ جونہی قادری دوبارہ اُٹھا تین افراد بھوکے کتوں کی طرح اس سے لپٹ گئے۔ وہ اسے مار رہے تھے اور کھینچ کر پھر اندر لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں شاہی بھی تھا۔ اپنے لمبے قد اور چمکتی ٹنڈ کی وجہ سے وہ صاف پہچانا جارہا تھا۔

قادری کی مار پٹائی کا منظر دیکھ کر ہمارے لیے خاموش کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی سوچنے کا وقت تھا کہ اس مار پٹائی تک نوبت کیونکر اور کیسے پہنچی۔ میں نے ریوالور ہولسٹر سے باہر کیا اور تیزی سے لپک کر شاہی وغیرہ کے سر پر پہنچ گیا۔ رائفل بدست ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار میرے پیچھے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شاہی طیش سے سرخ ہوگیا۔ وہ ایک سر پھرا خطرناک غنڈہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان سنگین لمحات میں وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ریوالور کی لبلبی پر میری اُنگلی پوری طرح تیار تھی۔

''خبردار شاہی! پیچھے ہٹ جاؤ'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ شاہی رُخ پھیر کر بھاگ نکلے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ ڈلہوزی کا ''بہرام شاہ'' تھا۔ وہ یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا تو کیا ''عزت'' رہ جاتی اس کی .....اُس نے بھاگنے کی بجائے مجھے بھگانے کا فیصلہ کیا اور ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنے پہلو سے بندھی ہوئی تلوار بے نیام کرلی۔ وہ کوئی تین فٹ لمبی خم دار تلوار تھی۔ میں نے شاہی کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی دیوانگی دیکھی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی چلادی۔ دھماکے کے ساتھ آدھ انچ لمبا سکہ شاہی کی کلائی میں گھس گیا۔ اس نے تڑپ کر تلوار دوسرے ہاتھ میں تھامنی چاہی لیکن عین اُس لمحے میں جب تلوار پر کسی ہاتھ کی گرفت بھی مضبوط نہیں تھی ہیڈ کانسٹیبل نے ٹانگ چلائی اور اُس کی ٹھوکر سے تلوار ہوا میں اُڑ گئی۔ میں نے جست لگا کر شاہی کو دبوچ لیا اور پھر فوراً ہی ایک فٹ زمین سے اوپر اٹھا کر پٹخ دیا۔ شاہی کے ایک ساتھی نے ہیڈ کانسٹیبل پر چاقو سے وار کرنا چاہا لیکن رائفل کی دھمکی کام آئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ میرا گھٹنا شاہی کی گردن پر تھا اور ریوالور اُس کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ اپنے سرغنہ کو اس حالت میں دیکھ کر کسی چمچے چانٹھے کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پولیس پارٹی پر حملہ کرسکتا۔ میرے گرانڈیل حوالدار نے شاہی کا ایک بازو مروڑ کر اپنے گھٹنے کے نیچے دبایا اور اُسے جھکڑی لگادی۔ شاہی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ کشمیری کے علاوہ اُردو اور ہندی میں بھی گالیاں بک رہا تھا۔

شاہی جیسے غنڈوں کو سیدھا کرنے کے لیے پولیس کے پاس بہت ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے شاہی پر کوئی ایسا ہتھکنڈا

استعمال نہ کرنا پڑے لیکن جب وہ کسی طور قابو میں نہیں آیا تو میں نے حوالات میں اُسے حوالدار پربت سنگھ اور اس کے تین ماتحتوں کے حوالے کردیا۔ پربت سنگھ حوالاتیوں کے لیے عزرائیل سمجھا جاتا تھا۔ میری ماتحتی میں آکر وہ ایک عرصے سے بیکار ہی تھا۔ مدت بعد جب اُسے کام ملا تو اُس نے خوب دل لگا کر کیا۔ شاہی کو ایسی فنکارانہ پھینٹی لگائی گئی کہ 48 گھنٹے کے اندر اندر اُس کی ساری اکڑفوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور وہ اپنی جان حوالدار کے پنجے سے چھڑانے کے لیے سب کچھ اُگلنے پر راضی ہوگیا۔ حوالدار کا کمال یہ تھا کہ اُس کی لگائی ہوئی پھینٹی کا نشان تک حوالاتی کے جسم پر نہیں ملتا تھا یعنی بقول شاعر ''تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو'' میں شاہی کو دیکھ کر حیران ہوگیا۔ نہ اُس کے چہرے پر کوئی نشان تھا نہ ہاتھ پاؤں پر نہ جسم کے کسی اور حصے پر لیکن وہ چوٹوں سے چور نظر آتا تھا۔ شاہی کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ 48 گھنٹے حوالات میں مار کھاتا رہا ہے اس کے باوجود اس کے مالکوں میں سے کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ جیسا کہ قارئین پچھلی کہانی میں پڑھ چکے ہیں کہ شاہی کے مالک سردار اشوک وغیرہ تھے۔ لیکن یہ لوگ شاہی کے غیر قانونی کاموں میں اُس کا بچاؤ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سردار اشوک ایک بھلا مانس آدمی تھا اور وہ صاف طور پر مجھ سے کہہ چکا تھا کہ اگر ''شاہی'' مجرم ہے تو اُسے کیے کی سزا ملنی چاہیے اور اب حسن اتفاق سے شاہی کے جرم کا انکشاف اُس کی اپنی زبان سے ہوگیا تھا۔ بھری محفل میں اس نے کہا تھا کہ گوبند سنگھ کے ساتھ اُس نے ''کچھ کیا'' ہے۔ سردار اب اس کی مدد کو کیسے آسکتے تھے؟

اپنے دفتر میں میں نے شاہی سے پوچھ گچھ کی۔ اسے بدستور ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ ایک خاص قسم کی دھوتی ہوتی ہے جس کے ایک پلو کو ٹانگوں کے درمیان سے گزار کر پیچھے کمر میں اڑس لیا جاتا ہے۔ اس دھوتی کے اوپر شاہی نے کھلی آستین والا ایک کڑھائی دار کُرتہ پہنا تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ اکثر اسی لباس میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ میں نے شاہی سے کہا ''حوالدار پربت سنگھ بتا رہا تھا کہ تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو''۔

اُس نے کینہ پرور نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا ''انسپکٹر نواز! تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اُس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا''۔

میں نے کہا ''بے شک بُرے کام کا نتیجہ بُرا ہی نکلتا ہے۔ اگر میں نے کوئی بُرا کام کیا ہے تو اس کی سزا مجھے ضرور ملے گی..... جیسے تمہیں ملی ہے''۔

وہ غصے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولا ''میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں کہ مجھے تم پر ترس آرہا ہے''۔

میں نے کہا ''ترس تو مجھے بھی تم پر آرہا ہے لیکن اگر تم اسی طرح میرا وقت ضائع کرتے رہے تو مجھے پھر تمہیں حوالدار پربت سنگھ کے حوالے کرنا پڑے گا''۔

اُس نے ایک بہت گہری سانس لی اور ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولا ''اس وقت کو یاد رکھنا انسپکٹر اس وقت کو بھولنا مت''۔

وہ مجھے ایک خوفناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں ایسی بہت سی دھمکیاں سن چکا تھا اور ان سے نبٹ چکا تھا لہٰذا میں نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ پولیس کے پیشے میں بندہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے لگے تو پھر اسے ٹریفک پولیس میں چلے جانا چاہیے یا چھٹی کرکے گھر بیٹھ جانا چاہیے۔ خاص طور پر ایماندار ملازموں کے لیے یہ پولیس لائن ضرورت

سے کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ میں نے بے مروت انداز میں کہا" شاہی! تم بیان دے رہے ہو یا میں تمہیں باہر بھیج دوں"۔

وہ بولا" بیان دینے کے لیے ہی تو آیا ہوں صاحب.....لو.....لکھو بیان"۔

"ہاں بولو" میں نے کہا۔

وہ کہنے لگا" گوبند کے گم ہونے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا"۔

"کب ہوا تھا یہ جھگڑا اور کیوں؟"

"یہ جھگڑا مارچ کی کسی تاریخ کو ریس والے دن ہوا تھا اور اس لیے ہوا تھا کہ گوبند نے زبان دے کر بے ایمانی کی تھی۔ تم میرے منہ سے ایمان داری اور بے ایمانی کی بات سن کر حیران ہو رہے ہو انسپکٹر لیکن اتنا تو تم بھی جانتے ہو گے کہ بے ایمانی کے کام بھی ایمانداری سے ہی کیے جائیں تو کام چلتا ہے۔ غنڈوں بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور بے اصول غنڈہ.....!"

"مجھے لیکچر مت دو" میں نے اس کی بات کاٹی "سیدھی بات بتا۔ گوبند سے جھگڑا کیوں ہوا؟"

شاہی نے جبڑے زور سے بھینچ کر اپنی تلخی پر قابو پایا اور بولا" گوبند کے اور میرے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ گوبند یہ ریس ہارے گا اور زیادہ سے زیادہ تیسرے نمبر پر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈلہوزی کے دو بڑے سیٹھوں.....میاں شاہنواز اور سیٹھ کرم چند میں ایک بڑی شرط لگی ہوئی تھی۔ شرط یہ تھی کہ اگر گوبند اُس ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر آتا تو سیٹھ کرم چند نے میاں شاہنواز کو دس ہزار روپے دینا تھے۔ دوسری صورت میں یہ رقم میاں شاہنواز نے ادا کرنا تھی۔ سیٹھ کرم چند کو دس ہزار روپیہ جانے کا فکر نہیں تھا وہ ہر صورت میاں شاہنواز کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ دراصل یہ شرط اچانک ہی بحث بحثی میں لگ گئی تھی اور دونوں سیٹھوں نے اسے عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ سیٹھ کرم چند نے یہ ہوشیاری دکھائی کہ اس نے شرط کا دس ہزار روپیہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میں نے اسے ضمانت دے دی کہ گوبند اس ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر نہیں آئے گا۔ گوبند کو اس ریس میں ہرانے کے میرے پاس بہت سے طریقے تھے لیکن میں نے کوئی غلط طریقہ استعمال نہیں کیا اور نہ ہی میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بغیر کسی ہیر پھیر کے گوبند سے بات کی اور اسے کہا۔ ریس میں اس کا ہارنا یقینی ہے۔ شیکھر اور تیمور جیسے لڑکوں کے ہوتے ہوئے وہ پہلے نمبر پر کیسے آسکتا ہے.....ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ قسمت اُس کا ساتھ دے اور وہ دوسرے یا تیسرے نمبر پر آجائے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ ریس میں تیسرے نمبر سے آگے نہ جائے تو میں پانچ ہزار روپیہ یکمشت اُسے ادا کردوں گا۔ بات گوبند کی سمجھ میں آگئی۔ اس ریس میں ایسے گھپلے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسے پیسوں کی ضرورت بھی تھی اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ریس جیتنا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔ اس نے یہ سودا قبول کرلیا۔ میں نے اُس کے کہنے پر ڈھائی ہزار روپیہ اسے پہلے دے دیا بقایا ڈھائی ہزار ریس کے بعد دینا قرار پایا۔ گوبند نے مجھ سے وعدہ کرلیا وہ ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر نہیں آئے گا لیکن وہ تیسرے چوتھے نمبر پر آکر اپنی ہتک کروانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ریس سے ویسے ہی آؤٹ ہو جائے گا کوئی مناسب موقع دیکھ کر وہ راستے سے ہٹ جائے گا اور بعد میں کوئی ناٹک رچا دے گا جس سے پتہ چلے گا کہ چوٹ وغیرہ لگنے سے وہ ریس میں آخر تک حصہ نہیں لے سکا.....اس

نے اپنے منصوبے کے مطابق کام کیا۔ سندر گاؤں تک وہ تیمور کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا لیکن سندر گاؤں اور ٹیکرا گلی کے درمیان پشمال موڑ پر وہ ریس سے نکل گیا اور ڈھائی تین فرلانگ نیچے سیدھا میرے ڈیرے پر آ گیا۔ میں اس وقت ڈیرے پر اکیلا تھا۔ گوبند کے پہنچتے ہی میں نے وعدے کے مطابق بقایا ڈھائی ہزار روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے یہ ڈھائی ہزار روپیہ دُور پھینک دیا۔ کہنے لگا تم نے سیٹھ کرم چند سے پندرہ ہزار روپیہ وصول کیا ہے اور اس رقم میں سے کم از کم دس ہزار اسے ملنا چاہیے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ پندرہ ہزار نہیں صرف دس ہزار روپے میں بات طے ہوئی تھی۔ جس میں سے ہم دونوں آدھے کے حقدار ہیں۔ وہ میری بات سننے پر تیار نہیں تھا اسے کسی نے خوب بھڑکا رکھا تھا۔ کہنے لگا میں دس ہزار سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔ وہ مجھے جانتا نہیں تھا اگر ٹھیک طرح جانتا ہوتا تو ایسی بات نہ کرتا۔ دنیا جانتی ہے کہ شاہی بدمعاش ضرور ہے بے اصول نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ خوانخوہ اوکھلی میں سر نہ دے۔ اُسے پتہ نہیں کہ وہ کس سے ٹکر لے رہا ہے..... وہ تو کسی طور پر قابو ہی نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسی ہوا اُس کے دماغ کو چڑھی ہوئی تھی ..... انسپکٹر! میں تمہیں ہر بات صاف سیدھی بتا رہا ہوں اب یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ میں بہت ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا میٹر گھوم گیا تو یہ حرامی میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا لیکن لگتا تھا کہ وہ آتما ہتھیا کا پروگرام بنا کر آیا ہوا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ لال پیلا ہونے لگا پھر ایک دم اُس نے میرے ہاتھوں سے ساڑھے چھ ہزار کے نوٹ چھین لیے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ وہ دوڑ کا چیمپئن ہے اُسے کون پکڑ سکتا ہے لیکن جنہوں نے پکڑنا ہوتا ہے وہ پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ چکر دار رستے پر بھاگا تھا میں ناک کی سیدھ میں گیا اور تھوڑا نیچے جا کر اسے چھاپ لیا۔ وہ دست بدست لڑائی پر اُتر آیا۔ اس نے بنیان کے نیچے نیکر میں چاقو چھپا رکھا تھا۔ جب چاقو اس نے ہاتھ میں لیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس کا وار بچا کر ناک پر ٹکر جو ماری تو وہ کوئی تیس فٹ نیچے ایک گڑھے میں جا گرا۔ اُس کے سر پر چوٹ آئی اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میں نیچے پہنچا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے نوٹ نکالے اور ڈھلوان چڑھ کر واپس ڈیرے پر آ گیا۔ اس وقت میرا خون بُری طرح کھولا ہوا تھا ..... لیکن آدھ پون گھنٹے بعد جب دماغ ذرا ٹھنڈا ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اتنی سردی میں اسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں نے ڈیرے سے ایک کارندے دولورام کو بھیجا کہ وہ نیچے جا کر گوبند کو اٹھا لائے۔ دولورام دو اور لڑکوں کو ساتھ لے گیا۔ پون گھنٹے بعد انہوں نے آ کر مجھے بتایا کہ گوبند وہاں نہیں ہے۔ میں سمجھا کہ وہ ہوش میں آ کر چلا گیا ہوگا لیکن دوپہر کو پتہ چلا کہ گوبند مل نہیں رہا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی میرے دماغ میں آیا کہ ہو نہ ہو وہ کسی ہسپتال میں ہے۔ شاید کسی نے اسے زخمی حالت میں دیکھا ہو اور ہسپتال پہنچا دیا ہو۔ میں نے اگلے روز ڈلہوزی کے سارے ہسپتالوں اور دواخانوں میں پتہ کروایا لیکن گوبند کا کہیں سراغ نہیں ملا..... بعد میں بھی دو تین ہفتے تک میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی"۔

شاہی جو کہانی سنا رہا تھا دلچسپ تھی لیکن میرے لیے اس پر فوراً یقین کر لینا ممکن نہیں تھا۔ شاہی نے اتنا اعتراف تو کر لیا تھا کہ رقم کے معاملے پر گوبند

سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اور وہ اسے مار کر کھائی میں پھینک آیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد شاہی کے خلاف ایک مضبوط کیس بن سکتا تھا۔ گوبند کو گم ہوئے اب آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ اگر وہ زندہ تھا تو اب تک ملا کیوں نہیں تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ کھائی میں گرنے سے اس کی موت واقع ہوگئی ہو اور شاہی کے آدمیوں نے اسے ادھر ہی کہیں جنگل میں گاڑ دیا ہو۔

درحقیقت شاہی کو معلوم ہو چکا تھا کہ نشے کی حالت میں اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل چکی ہے جو اس کی گردن کا پھندا بن سکتی ہے اور اس بات کے نصف درجن گواہ بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گوبند سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ شاہی کی گرفتاری کے وقت جو دھینگا مشتی ہوئی تھی وہ ہمارے ایک غلط اندازے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مین نے قادری کو سادے لباس میں شاہی کے ڈیرے پر بھیجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاہی وغیرہ اس کو پہچان نہیں سکیں گے لیکن اُن کی سی آئی ڈی خاصی تیز تھی۔ وہ قادری کو ہیڈ کانسٹیبل کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ خیر ..... یہ تو وہ باتیں تھیں جو ہو چکی تھیں اب ہمیں ان باتوں کے بارے میں سوچنا تھا جو ہونی تھیں۔ شاہی نے اس معاملے کو ایک پراسرار رنگ دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھنے درختوں کے اندر گوبند کا جسم آناً فاناً غائب ہوگیا۔ نہ وہ کسی ہسپتال میں پہنچا نہ کسی کے گھر گیا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ جنگلی جانور اسے چیر پھاڑ گئے ہوں۔ اوّل تو کوئی ایسا بڑا جانور اس علاقے میں تھا ہی نہیں جو ایک جوان مرد کی لاش کو کھینچ کر موقع سے دُور لے جاتا اور فرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو قرب و جوار سے انسانی جسم کے بچے کھچے حصے ملنے چاہئے تھے۔

وہ ڈلہوزی کی ایک دھواں دھواں شام تھی سردی اپنے جوبن پر تھی۔ چیڑ اخروٹ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں میں نمناک بدلیاں چکرا رہی تھیں۔ دُور کہیں نشیب میں گاہے گاہے بندر چیختے تھے اور ان کی آواز پورے جنگل میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں اور بلال شاہ اس مقام پر کھڑے تھے جہاں آٹھ مہینے پہلے گوبند زخمی ہوکر گرا تھا اور بقول شاہی آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر غائب ہوگیا تھا۔ یہ ڈھلوان پر واقع ایک تنگ سی گھاٹی تھی۔ گہرائی پچیس تیس فٹ کے قریب ہوگی۔ یہ ساری جگہ گھنے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ گھاٹی کی تہہ میں چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں اور ایک چھوٹی سی آب جو گزرتی تھی۔ گھاٹی کے کنارے سے تہہ میں گرنے والا یقینی طور پر زخمی ہوسکتا تھا۔ دس پندرہ منٹ موقع کا جائزہ لینے کے بعد ہم واپس روانہ ہوگئے۔ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا اور کسی بھی وقت نشیب و فراز گہری تاریکی میں گم ہوسکتے تھے۔ میں اور بلال شاہ ابھی گھاٹی سے چالیس پچاس گز دُور ہی آئے تھے کہ ایک آواز سن کر چونک گئے۔ کوئی آرہا تھا ہم غیر ارادی طور پر اپنی جگہ رُک گئے۔ دیودار کے ایک تناور درخت نے ہمیں اپنی اوٹ میں لے رکھا تھا لہٰذا اودر کوٹ والا وہ چوڑا چکلا شخص ہمیں دیکھ نہیں سکا جو ایکدم بلندی سے نمودار ہوا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور پہچان گیا۔ وہ شاہی کا ملازم خاص اور قریبی ساتھی دولورام تھا۔ دولورام اس وقت کہاں جارہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے خوامخواہ شک سا ہونے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بلال شاہ کی

طرف دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا" بلال! تم تھانے جاؤ..... میں ذرا اس کی ٹوہ لگاتا ہوں" میرا اشارہ دولورام کی طرف تھا۔

بلال شاہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا دولورام کے پیچھے چل دیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے ناہموار راستے پر کسی کا تعاقب آسان کام نہیں ہوتا۔ شاخوں کے ہلنے اور پتوں کے ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ آگے جانے والے کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اگر دولورام سے میرا فاصلہ کم ہوتا تو وہ ہوشیار سکتا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی صورت میں اُس کے کھو جانے کا اندیشہ تھا۔ بہرطور کسی نہ کسی طرح میں نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ آگے جا کر قدرت نے میری مدد کی۔ اندھیرا گہرا ہو جانے کی وجہ سے دولورام نے ٹارچ روشن کر لی۔ روشنی کا پیچھا خاصے فاصلے سے بھی کیا جا سکتا ہے لہٰذا میرے لیے آسانی پیدا ہو گئی۔ دولورام کا تعاقب میری توقع سے کہیں طویل ثابت ہوا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے قریباً دو میل کا فاصلہ طے کیا اور "گورا پہاڑ" کی ڈھلوان پر پہنچ گیا۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ دولورام اُن خوبصورت بنگلوں میں جا رہا ہے جو گورا پہاڑ کی ڈھلوان پر وادی کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ جہاں چمبا اور پٹھانکوٹ کی خوش حال فیملیاں تفریح کے لیے آتی ہیں۔ ان بنگلوں اور کوٹھیوں کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب کوٹھیاں مالکوں نے ذاتی استعمال کے لیے رکھی تھیں۔ پرسکون تفریح کے خواہش مندوں کے لیے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کی اس خوبصورت کالونی میں پہنچ کر دولورام ایک بڑے سیاہ گیٹ کے سامنے رُک گیا۔ اس بنگلے کا نمبر چودہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بنگلہ تھیٹر کے ایک مشہور بنگالی اداکار چاکرانی کا تھا۔ چاکرانی بڑی گرج دار آواز والا ایکٹر تھا۔ مشہور تھا کہ تھیٹر کی آخری قطار میں بیٹھا ہوا بہرا تماشائی بھی چاکرانی کی بھڑک سن کر لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ چاکرانی کی مادری زبان بنگالی تھی لیکن وہ اُردو، ہندی، گجراتی ہر طرح کے ڈراموں میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں بولتی فلمیں تو شروع ہو چکی تھیں لیکن سینما ہال ہر جگہ نہیں ہوتے تھے لہٰذا تھیٹر میں کمائی بھی تھی اور نام بھی۔ چاکرانی نے بھی تھیٹر سے کافی پیسہ کما رکھا تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ خوبصورت بنگلہ بھی تھا۔

دولورام جب چاکرانی کے بنگلے میں داخل ہو گیا تو میں "گورا پہاڑ" سے واپس لوٹ آیا۔ اگلے روز میں نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر چودہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کر کے مجھے آگاہ کرے۔ بلال شاہ نے حسب معمول یہ کام بڑی تندہی سے کیا اور ایک مقامی مخبر کو ساتھ ملا کر دو روز میں اپنی رپورٹ مکمل کر لی۔ اس رپورٹ کے مطابق بنگلے کے مالک کا پورا نام رابندر ناتھ چاکرانی تھا۔ اس کی مستقل رہائش دہلی میں تھی۔ ان دنوں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ یہاں تفریح کے لیے آیا ہوا تھا۔ اہل خانہ سے مراد اس کی بیوی تھی۔ بیوی کا نام روپ وتی تھا اور وہ بھی تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ بلال شاہ نے مجھے روپ وتی کی ایک تصویر بھی دکھائی اور بتایا کہ یہ چاکرانی کی دوسری شادی ہے۔

میں نے روپ وتی کی تصویر دیکھی۔ یہ ایک اخباری تراشہ تھا اور زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ روپ وتی کی عمر بیس بائیس برس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔ دبلی پتلی تیکھے نقوش والی یہ لڑکی تھیٹر اور فلم کی

اکثر ایکٹریسوں کی طرح خوبصورت تھی۔ میں نے چاکرانی کو بھی دیکھا ہوا تھا وہ بھی خوبصورت تھا لیکن روپ وتی کے جوڑ کا ہرگز نہیں تھا۔ روپ وتی کے مقابلے میں اس کی عمر تھوڑی سی زیادہ تھی اور جسم بھی بھاری تھا۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کا ایک دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ جبکہ روپ وتی ایک پڑھی لکھی نازک مزاج اداکارہ دکھائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے ایک دوسرے کو کیسے پسند کرلیا تھا۔ بہرحال مجھے ان کی پسند ناپسند سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ شاہی کا ملازم خاص دولورام چاکرانی کے بنگلے میں کیا کرنے گیا تھا اور اُن دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ بلال شاہ اس بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کرسکا۔ اس نے بتایا کہ اس سے پہلے دولورام کو کسی نے چاکرانی کے بنگلے میں گورا پہاڑ کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ نہ ہی کبھی اسے چاکرانی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ ویسے بھی وہ پچھلے تین چار ماہ سے ڈلہوزی میں نہیں تھا۔ بلال شاہ نے اپنی رپورٹ میں ایک بڑی خاص بات بھی بتائی۔ اس نے کہا کہ پچھلے ایک مہینے میں تین چار موقع ایسے آئے ہیں کہ چاکرانی کے بنگلے سے کسی عورت کی چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں چاکرانی کا بنگلہ خود دیکھ کر آیا تھا۔ یہ بنگلہ دوسری عمارتوں سے کچھ ہٹ کر تھا اور گھنے درختوں کی وجہ سے کچھ الگ تھلگ بھی نظر آتا۔ ایسی چار دیواریاں کسی بھی طرح کے غیرقانونی کاموں کے لیے بہت مناسب ہوتی ہیں۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا کہ یہ چیخوں والی بات اسے کس نے بتائی ہے۔ وہ حسب عادت مونچھوں کو مروڑا دے کر بولا ''خان صاحب! شاید آپ نے دیکھا نہیں چودہ نمبر بنگلے کے پیچھے لکڑی کا ایک گودام ہے۔ گودام بھی کیا ہے بس کھلے احاطے میں شہتیروں کے ڈھیر لگا کر آلے دوالے کانٹے دار تار لگادی گئی ہے۔ یہاں دو چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ دونوں آپس میں داماد سسر ہیں۔ انہوں نے ہی بتایا ہے کہ چودہ نمبر بنگلے میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ صرف دو دن پہلے بھی رات کے وقت انہوں نے چیخیں سنی ہیں چیخیں بہت مدھم ہوتی ہیں اور اکثر وقفے وقفے سے آدھ گھنٹے تک سنائی دیتی رہتی ہیں''۔

میں نے بلال شاہ سے اس بارے میں کچھ اور تفصیل پوچھی اور پھر چاکرانی سے ملنے کا پختہ فیصلہ کرلیا۔

''گورا پہاڑ'' تک جانے کے لیے جیپ کو طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ میں ایک گھنٹے میں چاکرانی کے بنگلے تک پہنچ سکا۔ میں وردی میں تھا مجھے دیکھ کر چاکرانی کا ملازم پریشان نظر آنے لگا۔ وہ اطلاع دینے اندر گیا اور چار پانچ منٹ بعد میں چاکرانی کے سامنے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ شکل وصورت سے قد کاٹھ کے لحاظ سے چاکرانی کسی طرح بھی بنگالی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اچھا بھلا گبھرو شخص تھا کسی حد تک خاموش طبع بھی نظر آتا تھا۔ اس نے بڑے اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔

میں نے کہا ''وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے چاکرانی صاحب! بس آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا''۔

وہ مسکرا کر اُردو میں بولا ''ہم آپ کے خادم ہیں جی ہمیں حکم کردیا ہوتا، فرمائیں کیا خدمت کروں آپ کی؟''

میں نے کہا ''بس تھوڑا سا وقت لینا ہے آپ کا' دراصل ہم نے ایک مقامی غنڈے شاہی کو گرفتار کیا ہے۔ اُس پر ایک ارائیں لڑکے کے قتل کا الزام ہے ہم شاہی کے ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ گچھ کررہے ہیں۔ شاہی کے دوست احباب میں ایک

دولورام نامی شخص بھی ہے.....''۔

''میں سمجھ گیا ہوں'' چاکرانی میری بات کاٹ کر بولا'' آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دولورام نامی یہ شخص میرے بنگلے میں آمدورفت رکھتا ہے.....اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل صحیح ہے۔ یہ دولورام تین چار دفعہ بنگلے میں آچکا ہے لیکن اس کے آنے کی وجہ شاید آپ کو معلوم نہ ہو''۔ چاکرانی نے دروازے کی طرف رُخ پھیر کر اپنے کسی ملازم ''دینو'' کو آواز دی۔ چند لمحے بعد چالیس پچاس برس کا ایک باریش شخص ہاتھ سینے پر باندھے اندر داخل ہوا اور ادب سے سر جھکا کر خاموش کھڑا ہوگیا۔ چاکرانی نے اپنی بے حد پاٹ دار آواز میں کہا''دینو! انسپکٹر صاحب کو بتاؤ دولورام یہاں کیوں آتا رہا ہے''۔

اس سے پہلے کہ دینو بولتا میں نے کہا ''چاکرانی صاحب! آپ کے ملازم کی زبان سے آپ کی زبان میرے لیے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ جو کچھ کہنا ہے آپ خود فرمایئے، میں ہمہ تن گوش ہوں''۔

چاکرانی نے مسکرا کر ملازم کو باہر بھیج دیا۔ پھر چاندی کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر بڑے سٹائلش انداز میں ہونٹوں سے لگایا اور بولا''بالکل معمولی سی بات ہے..... کم ازکم آپ کے لیے تو بالکل غیر اہم ہے۔ دولورام کی دھرم پتنی مالتی میرے بنگلے میں ملازم تھی۔ میرے آنے سے پہلے میرے منیجر نے اسے ملازم رکھا تھا۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ مالتی کا شوہر کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ دنگا فساد کرتا ہے اور اکثر اسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے میں نے مالتی کی چھٹی کرادی۔ دولورام نے منیجر سے درخواست کی کہ اس کی بیوی کو کام سے نہ نکالا جائے۔ منیجر نے بے وقوفی کی اور اسے میری طرف بھیج دیا۔ دو دفعہ تو میں نے اسے ملنے سے ہی انکار کردیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ جائے گا لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ آدمی نکلا۔ دو تین روز پہلے پھر آدھمکا میں نے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی اور کورا جواب دے کر واپس بھیج دیا۔ دراصل.....''۔

اچانک چاکرانی کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ مجھے بھی چونک کر قالین پوش زینوں کی طرف دیکھنا پڑا۔ بالائی منزل پر کوئی چیز دھم سے گری تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ اُبھری تھی۔ میں نے دیکھا چاکرانی کا سرخ و سپید چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے چاکرانی کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر کہنے لگا''میری نوکرانی فرش دھوتے ہوئے گر گئی ہے شاید۔ وہ سیڑھیوں تک گیا اور کچھ دیر بالائی منزل کے دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد واپس گیا۔ وہ صاف طور پر پریشان تھا اور میری توجہ اس واقعے کی طرف سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے خبریں سنانے کے بہانے ریڈیو آن کردیا اور سیاست کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بااخلاق شخص نظر آتا تھا اور اس کی باتوں میں رکھ رکھاؤ تھا۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے وہ یہ کوشش کررہا تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جاؤں لیکن تقدیر چاکرانی پر مہربان نظر نہیں آئی تھی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر بالائی منزل سے دھماچوکڑی کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک مرد دبے دبے لہجے میں غرایا اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے رونے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس دفعہ یہ سب کچھ نہایت واضح تھا۔ چاکرانی پریشان ہوکر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پریشانی کے علاوہ اس کے چہرے پر غصہ اور شرمندگی بھی تھی وہ کچھ دیر سیدھا کھڑا بالائی منزل کے دروازے کو دیکھتا رہا۔

''میں ابھی آتا ہوں انسپکٹر'' اس نے کہا اور تیزی سے

سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

آٹھ دس منٹ بعد چاکرانی واپس آیا تو سردی میں بھی پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی کچھ بکھرے بکھرے نظر آتے تھے۔ میرے سامنے بیٹھ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور چند گہرے کش لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا:۔

''یہ میری بیوی ہے انسپکٹر..... جو پہلی آواز آئی وہ بھی اسی کی تھی۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا''۔

''کیا وہ بیمار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بیمار ہوتی تو اس کا علاج کرالیتا۔ بھگوان کی کرپا سے دھن دولت کی کمی نہیں ہے مجھے۔ بڑے بڑے ہسپتال میں لے جاسکتا ہوں اُسے مگر وہ تو اپنی دشمن خود بنی ہوئی ہے..... اب کیا بتاؤں آپ کو۔ کُرتا اُٹھانے سے اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے.....وہ نشہ کرنے لگی ہے۔ دن رات دھت رہتی ہے۔ شراب بند کردوں تو مارنے کو دوڑتی ہے۔ گھر کی چیزیں توڑتی ہے اور سر دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ پھر مجبوری یہ ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ نہ اسے مار پیٹ سکتا ہوں اور.....اور نہ طلاق دے سکتا ہوں۔.....میں اسے دہلی سے یہاں اسی لیے لایا تھا کہ شاید کھلی آب وہوا میں شور ہنگامے سے دُور رہ کر وہ کچھ بہتر محسوس کرے لیکن اُلٹا اثر ہو رہا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ واپس ہی چلا جاؤں''۔

میں نے دیکھا چاکرانی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور آواز اندرونی کرب کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا ''چاکرانی صاحب عام طور پر عورتیں شراب نہیں پیتیں۔ اگر آپ کی پتنی اس لت میں گرفتار ہوگئی ہے تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہوگی''۔

وہ پیشانی مسل کر بولا ''میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی، اس کی دوستوں میں سے ایک دو بہت ایڈوانس قسم کی تھیں۔ شراب کے علاوہ حشیش وغیرہ کے نشے بھی کرتی تھیں۔ بس انہی سے یہ چھوت مرض اسے لگا ہوگا''۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی ایک بار پھر اوپر والی منزل سے دھما دھم کی آوازیں آئیں پھر ایک طویل کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا اور مجھے کھڑکی کے خالی فریم میں ایک وجیہہ صورت نظر آئی۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ وہ روپ وتی کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔ میں چند روز پہلے اس کی تصویر اخباری تراشے میں دیکھ چکا تھا۔ تصویر میں روپ وتی جتنا سجی سنوری نظر آتی تھی کھڑکی میں اتنا ہی اجڑی بگڑی کھڑی تھی۔ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشیں اتنی دُور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں اسے عقب سے ایک عورت اور ایک توانا مرد نے دبوچ رکھا تھا۔ دونوں روپ وتی کو اندر کی طرف کھینچ رہے تھے اور روپ وتی چیخ رہی تھی۔ اس نے چیختے ہوئے دو یا تین جملے کہے مگر ان جملوں میں سے مجھے صرف ''تھانیدار صاحب'' کے الفاظ سمجھ میں آئے۔ بعض اوقات الفاظ سنے بغیر بھی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ میرے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ عورت مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ چاکرانی کی بات درست ہی تھی۔ وہ نشے میں نظر آتی تھی اور کچھ جنونی سی ہو رہی تھی۔ مرد اور عورت جو غالباً اس بنگلے میں نوکر تھے۔ روپ وتی کو بمشکل کھڑکی سے ہٹا کر اندر لے گئے۔

چاکرانی اب سخت بیزار نظر آتا تھا۔ اٹھتے ہوئے بولا ''آیئے تھانیدار صاحب باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں''۔

میں نے کہا ''نہیں.....بس اب میں چلتا ہوں، بہت وقت ضائع کرلیا آپ کا''۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اُس نے کھانے کی دعوت دی لیکن میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

چاکرانی کے بنگلے سے میں کئی اُلجھنیں لے کر واپس لوٹا۔ سب سے بڑی اُلجھن روپ وتی ہی تھی۔ چاکرانی یوں تو بھلا مانس شخص نظر آتا تھا لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اچھے ڈاکٹر سے بیوی کا علاج کرانے کی بجائے وہ اسے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا روپ وتی نے بنگلے کی کسی کھڑکی سے میری جیپ دیکھ لی تھی اور یہ جیپ دیکھنے کے بعد ہی اس نے بالائی منزل پر اودھم مچانا شروع کیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح مجھ پر اپنا آپ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی پہلی دو کوششیں ناکام رہیں لیکن تیسری کوشش میں وہ کھڑکی کا شیشہ توڑنے اور میرے سامنے آنے میں کامیاب رہی۔

گوبند کے سوالیہ نشان کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ ایک اور سوالیہ نشان سامنے آ گیا تھا۔ روپ وتی کون تھی؟ اگر واقعی اسے شراب نے پاگل کر رکھا تھا تو وہ کیوں شراب پیتی تھی اور اپنی پھول جیسی جوانی کو کیوں زہر سے سینچ رہی تھی؟ میں نے بلال شاہ کے علاوہ اپنے دو تین مزید مخبروں کو اکٹھا کیا اور ان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چاکرانی اور روپ وتی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کریں اور بڑی احتیاط کے ساتھ چاکرانی کی نقل وحرکت پر بھی نگاہ رکھیں۔ مخبروں نے تین چار روز بھاگ دوڑ میں مختلف ذریعوں سے جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ یوں ہے۔ چاکرانی کی یہ دوسری اور روپ وتی کی پہلی شادی تھی۔ چاکرانی کی طرح روپ وتی کا تعلق بھی دہلی کے ایک آزاد خیال گھرانے سے تھا۔ وہ تھیٹر میں اداکاری کے علاوہ رقص بھی پیش کرتی تھی اور بعض اوقات گانا بھی گاتی تھی۔ تھیٹر دیکھنے والے شائقین کی بڑی تعداد روپ وتی کی دیوانی تھی اور نوجوان اُس کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چاکرانی کے ساتھ شادی سے پہلے روپ وتی کا ایک اجیت نامی نوجوان سے معاشقہ بھی چلا تھا۔ نوجوان بھی تھیٹر کا اداکار تھا اور بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں روپ وتی نے اس نوجوان سے تعلق توڑ لیا اور چاکرانی کو اپنی مرضی سے جیون ساتھی چن لیا تھا۔ مخبروں نے گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر 14 کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں۔ چاکرانی نے یہ بنا بنایا بنگلہ کوئی تین سال پہلے خریدا تھا۔ سارا سال یہ بنگلہ بند رہتا تھا صرف جون جولائی کے مہینوں میں چاکرانی دس پندرہ روز کے لیے یہاں آتا تھا۔ چاکرانی کے ساتھ منیجر ہوتا تھا یا ایک عدد باورچی۔ باورچی عموماً چاکرانی کے ساتھ ہی ڈلہوزی پہنچتا تھا۔ اس دفعہ بھی منیجر اور باورچی اُس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے لیکن اس دفعہ دو باتیں معمول سے ہٹ کر ہوئی تھیں۔ ایک تو چاکرانی گرمیوں کی بجائے سردیوں میں آیا تھا۔ دوسرے اس کے ساتھ روپ وتی بھی تھی جسے وہ اپنی بیوی بتا رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم بنگلے سے نکلتا تھا اور اس کی پتنی کی تو کسی نے جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اردگرد کے لوگ اب اس بنگلے کو پراسرار خیال کرنے لگے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بنگلے کی چاردیواری کے اندر ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ یہاں کوئی غیر قانونی کام ہوتا ہے یا پھر کسی روح وغیرہ نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔

دیہی علاقوں میں ایسی باتوں کے پھیلنے کے لیے بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ اشارہ موجود تھا یعنی بنگلے کے پچھواڑے ''لکڑی گودام'' کے چوکیدار نے چیخوں کی آوازیں سنی تھیں جو اکثر رات کے وقت آتی تھیں۔ میں اب ان

چیخوں کا سبب سمجھ گیا تھا لیکن ان کی اصل بنیاد کا مجھے بھی پتہ نہیں تھا نجانے کیوں رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ ان چیخوں کے اصل بنیاد اس کہانی کے ملبے میں چھپی ہوئی ہے۔ جس میں چاکرانی کے علاوہ کسی اجیت نامی اداکار کا ذکر بھی آتا ہے اور جس کا آغاز دہلی کے کسی رومان پرور گوشے سے ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ گتھی سلجھانے کے لئے مجھے یا میرے سب انسپکٹر کو دہلی جانا پڑے گا..... دو تین روز سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے خود دہلی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں چند کیسوں کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی دہلی جاچکا تھا۔ آپ اُن میں سے ایک دو کیسوں کی روداد بھی پڑھ چکے ہیں۔ دہلی میرے لیے کوئی نیا مقام تھا نہ ہی وہاں کے رہنے والے میرے لیے اجنبی تھے۔ ڈلہوزی سے دہلی تک جانے کا مطلب ہے بذریعہ ٹرین یا بس ایک طویل سفر۔ گوبند کی آٹھ نو ماہ پرانی گمشدگی کا معمہ حل کرنے کے لیے میرے لیے ضروری تھا کہ یہ طویل سفر کروں۔ میں نے بس پر ٹرین کو ترجیح دی۔ میں اور بلال شاہ پہلے سرکاری گاڑی پر پٹھانکوٹ پہنچے۔ پٹھانکوٹ سٹیشن سے ہم ٹرین میں بیٹھے اور پھر چل سو چل۔ سفر طویل ضرور تھا لیکن جب بلال شاہ جیسا لچسپ ہمسفر ہو تو سفر کٹنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں بلال شاہ ایک بوتل خون عطیے میں دے بیٹھا تھا۔ اب وہ ہر وقت خون کی کمی کا رونا روتا رہتا تھا۔ کہتا تھا اُٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہوجاتی ہیں۔ ہر وقت ناخنوں کو دیکھتا رہتا تھا کہ ان میں گلابی پن نہیں رہا۔ ایک بوتل خون کی کمی پوری کرنے کے لیے اُس نے میری جیب سے جتنا پھل فروٹ کھایا تھا اس سے پانچ چھ بوتل خون اس کے جسم میں مزید پیدا ہو چکا تھا مگر ''کمی'' تھی کہ پوری ہونے میں نہیں آتی تھی..... ہم پٹھانکوٹ سے لدھیانہ پہنچے اور لدھیانہ سے براستہ پٹیالہ دہلی پہنچ گئے۔ یہ ساڑھے چار سو میل سے زائد سفر تھا۔

دہلی میں ہمارا قیام عیدگاہ کے علاقے میں انسپکٹر نذیر احمد کے مکان میں تھا۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی نذیر احمد کے پاس ٹھہر چکا تھا۔ وہ بڑا ہمدرد اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ نذیر احمد کے ذریعے اجیت کمار کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی گمنام شخص نہیں تھا تھیٹر کا معروف اداکار تھا۔ نئی آبادی میں اس کی دوکنال کی شاندار کوٹھی تھی لیکن وہ خود دہلی میں موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی شو میں حصہ لینے کے لیے میرٹھ گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی دو روز بعد متوقع تھی ہم نے یہ وقت دہلی دیکھنے میں گزارا۔ شہر دیکھنے کا شوق بلال شاہ کو تھا مجھے نہیں مگر اس کے ساتھ تو جانا تھا (آخر اُس نے میرے کہنے پر خون دے رکھا تھا۔ گاہے گاہے چکر وغیرہ آتے تھے، نصیب دشمناں کچھ ہو جاتا تو مصیبت پڑ جاتی)۔

یہ تیسرے روز دوپہر کا واقعہ ہے ہم جنرل پوسٹ آفس سے عیدگاہ کی طرف آرہے تھے۔ یونہی میرے جی میں آئی کہ نئی آبادی کی طرف نکل چلتے ہیں۔ گزرتے گزرتے ایک نگاہ اجیت کی رہائش گاہ پر بھی ڈال جائیں گے۔ اگر وہ واپس آچکا ہے تو اس کی گاڑی پورچ وغیرہ میں کھڑی نظر آجائے گی۔ ہم چھوٹی جیپ میں سوار تھے یہ پرائیویٹ جیپ تھی اور نذیر احمد کے چھوٹے بھائی شجاع نے ہمیں ذاتی استعمال کے لیے دے رکھی تھی۔ نئی آبادی کی طرف جاتے ہوئے جونہی ہم مجسمے والے چوک سے گزرے۔ بلال شاہ کی نگاہ ایک بس سٹاپ پر کھڑے نوجوان پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گیا ''رُکیے خان صاحب'' وہ تقریباً چیخ اُٹھا۔ اس

کی انگلی بس سٹاپ کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ غیرارادی طور پر میں نے بریک پیڈل دبا دیا اور مختصر سی جیپ لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے رُک گئی۔ ''یہ گوبند ہے.....'' بلال شاہ نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں نے غور سے دیکھا انیس بیس سالہ وہ لڑکا ابھی ایک بس سے اُترا ہی تھا اور سٹاپ کے سامنے کھڑا اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیپ ایک دم رُکی تھی اس لیے کچھ دوسروں لوگوں کی طرح وہ بھی ہماری طرف دیکھنے لگا تھا۔ یکا یک میں نے اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار محسوس کیے۔ یہ آثار مجھے اور بلال شاہ کو پہچاننے کے بعد نمودار ہوئے تھے۔ اس کا منہ کھلا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ بھاگ اُٹھا'' پکڑیں اسے'' بلال شاہ نے چلا کر کہا۔ میں نے تیزی سے جیپ کو یوٹرن دیا اور وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح لڑکے کی طرف لپکی۔ لڑکے نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے سڑک کراس کی اور ایک بغلی راستے سے داخل ہوگیا۔ یہ ون وے کی خلاف ورزی تھی مگر اس خلاف ورزی کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے لڑکے کا تعاقب جاری رکھا۔ کئی گاڑیوں کے پہیے چرچرائے اور اُن کے ڈرائیور خشمگیں نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔ جونہی میں نے لڑکے کو ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے دیکھا جیپ روک کر نیچے چھلانگ لگادی۔ یہ اینٹوں کے فرش والی پختہ گلی تھی۔ دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ لڑکا جس کا نام بلال شاہ نے گوبند بتایا تھا تیزی سے بھاگا چلا جارہا تھا۔ وہ گوبند ہی تھا کیونکہ اسی طرح بھاگ رہا تھا جس طرح ایک دوڑنے والے کھلاڑی کو بھاگنا چاہیے۔ اپنی تمام تر تیز رفتاری کے باوجود شاید میں اُسے پکڑ نہ سکتا لیکن ایک ریڑھی بان فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ وہ اچھے ڈیل ڈول کا ایک سبزی فروش تھا۔ میں وردی میں تھا لہٰذا میرے آگے لگ کر بھاگنے والے کو مشکوک جان کر وہ اس کے راستے میں آگیا۔ اس نے اپنی ریڑھی اس طرح گوبند کی ٹانگوں میں ماری کہ وہ ریڑھی کے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کے بعد دوبارہ رفتار پکڑتا میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ اُٹھتا اُٹھتا ایک بار پھر زمین بوس ہوگیا۔ میں نے اس کے جبڑے پر دو زوردار مکے رسید کرکے اس کی ساری تن فن ختم کردی۔ ایک دم وہاں مجمع لگ گیا۔ ان میں عورتیں' بچے' مرد سب شامل تھے۔ بلال شاہ بھی ہانپتا کانپتا موقع پر پہنچ چکا تھا اور حیرت سے گوبند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بات بھی بھی حیرت کی۔ یہ لڑکا پچھلے آٹھ نو ماہ سے غائب تھا ہم سب کا خیال تھا کہ وہ قتل ہو چکا ہے یا کسی کی حبس بیجا میں ہے۔ ہم اس کا کھوج لگانے نکلے ہوئے تھے لیکن وہ ہمیں دیکھ کر یوں بھاگا جیسے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہو۔ موقع پر موجود لوگ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہے اور اس نے کیا کیا ہے ہم کیا کہہ سکتے تھے ہمیں خود معلوم نہیں تھا۔ اس نے کیا کیا ہے؟ جان چھڑانے کے لیے ہم نے لوگوں سے گول مول بات کی اور گوبند کو لے کر جیپ میں آبیٹھے۔

منظر انسپکٹر نذیر احمد کے گھر کا تھا۔ نذیر احمد بھی گھر ہی موجود تھا۔ گوبند مجرموں کی سی صورت بنائے ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے مکے سے اس کا زیریں ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون اُس کی ٹھوڑی کو رنگین کررہا تھا وہ لرزاں آواز میں بولا:۔

''میں بے گناہ ہوں انسپکٹر صاحب! مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی تھی۔ ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتا''۔

گوبند کے لب و لہجے سے اُس کا اناڑی پن ظاہر ہو رہا تھا۔ کوئی پختہ کار مجرم ہوتا تو بغیر ہمارے پوچھے ایسی بات زبان پر نہ لاتا بلکہ گدھے کی طرح مار کھا کر بھی چپ رہتا۔ جو بات گوبند نے کہی تھی اس سے صاف نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ کسی شخص کو زخمی یا ہلاک کر چکا ہے اور ہم سے ڈر کر بھاگنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا ''ریوالور اب کہاں ہے؟''۔

وہ بولا ''وہ میں نے وہیں بنگلے کے پچھواڑے پھینک دیا تھا''۔

ایک اور بات کا پتہ چل گیا۔ گوبند کے ہاتھوں کسی کے ہلاک یا زخمی ہونے کا واقعہ گورا پہاڑ پر ہوا تھا اور عین ممکن تھا کہ اسی بنگلے میں ہوا ہو جہاں چاکرانی رہائش پذیر تھا۔ یعنی 14 نمبر کا وہ الگ تھلگ بنگلہ جہاں مخبوط الحواس روپ وتی سے میرا سامنا ہوا تھا۔ میرا یہ قیافہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ شاہی' رابندر ناتھ چاکرانی' بنگلہ نمبر 14 اور گوبند میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ میں نے اپنی گفتگو سے گوبند کو یہ باور کرایا کہ اس کے جرم کی بیشتر تفصیلات مجھے معلوم ہیں اور میں اُس کی گرفتاری کے لیے ہی یہاں دہلی میں آیا ہوا ہوں۔ گوبند پوری طرح اس گفتگو کے جال میں پھنس گیا اور اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر وہ سب کچھ مجھے بتا دیا جو شاید ہم کئی دنوں میں نہ پوچھ سکتے۔ گوبند نے میرے اور انسپکٹر نذیر کے سامنے ایک طویل بیان دیا۔ اس بیان میں اس نے اپنی گمشدگی اور گزشتہ نو ماہ کے حالات کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

گوبند کے بیان کے پہلے حصے میں کافی حد تک شاہی کے بیان کی تصدیق تھی یعنی ان دونوں کے درمیان ایک سودا ہوا تھا جس کے مطابق دوڑ میں پہلے دو نمبر چھوڑ دینے پر شاہی نے گوبند کو کچھ رقم دینا تھی۔ اب اس رقم کے بارے میں اختلاف تھا۔ شاہی نے بیان دیا تھا کہ اس سودے میں گوبند سے پانچ ہزار طے ہوا تھا جب کہ گوبند کا کہنا تھا کہ شاہی نے سیٹھ سے کم از کم پندرہ ہزار روپیہ لیا تھا اور اس میں سے دس ہزار اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ اُن دنوں ایک بہت بڑی رقم تھی اور اس کے سلسلے میں بڑے سے بڑا تنازعہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ گوبند نے اعتراف کیا کہ وہ شاہی سے نوٹ چھین کر بھاگا تھا اور بعد ازاں اُن دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ شاہی نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا اور جب وہ بے ہوش ہو کر کھائی میں گر گیا تو اُس کی مٹھی سے رقم نکال کر چلتا بنا۔ گوبند نے بتایا کہ وہ تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون لوتھڑوں کی صورت میں اس کے چہرے اور سینے پر جما ہوا تھا۔ وہ بمشکل اُٹھ کر بیٹھ سکا تھا۔ چاروں طرف سنسان درخت تھے جن سے ٹھنڈی ہوئی ہوا سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں جیسے بے جان ہو چکی تھیں۔ وہ بڑی دشواری سے گھسٹتا ہوا برفاب کھائی سے باہر نکلا اور اپنی بنیان پھاڑ کر سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً اُسے بُری طرح چونکنا پڑا۔ ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی اس کے ساتھ ہی کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ اُبھری تھی۔ وہ ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے قریباً سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ وہ سرخ ریشمی لباس میں تھی اور کسی سے بچنے کے لیے تیزی سے بھاگی جا رہی تھی پھر گوبند کو وہ لوگ بھی نظر آ گئے جن سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی۔ وہ چار افراد تھے ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی تھیں۔ بھاگنے والوں میں سب سے

آگے ایک خوش پوش توانا شخص تھا۔ وہ بھاگنے کے ساتھ ساتھ دھمکی آمیز لہجے میں لڑکی کو رُکنے کا حکم بھی دے رہا تھا گوبند اسے دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سٹیج کا بنگالی اداکار چاکرانی تھا۔ چاکرانی ایک معروف شخص تھا اور اسے بہت سے لوگ جانتے تھے۔ گوبند کو معلوم تھا کہ نیچے گورا پہاڑ کی طرف چاکرانی کا ذاتی بنگلہ ہے اور وہ کبھی کبھار وہاں رہنے کے لیے آتا ہے۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ چاکرانی اس لڑکی کے پیچھے کیوں ہے اور کیوں غصے میں اس قدر بھڑکا ہوا ہے۔ کھائی سے قریباً چالیس گز کی دُوری پر چاکرانی نے خوبصورت لڑکی کو جالیا اور بالوں سے پکڑ کر اس زور کا جھٹکا دیا کہ وہ چلا کر ڈھیر ہوگئی۔ چاکرانی بھوکے جانور کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے روتی چلاتی لڑکی کو بُری طرح پیٹا اور سخت سردی میں اس کے کپڑے تار تار کردیئے۔ بعدازاں وہ اُسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا ڈھلوان سے نیچے لے جانے لگا۔ گوبند اب لڑکی کو بھی پہچان چکا تھا۔ وہ سٹیج کی ساحرہ اور بے شمار دلوں کی دھڑکن نوجوان اداکارہ روپ وتی تھی۔ دفعتاً چاکرانی کے کارندوں نے گوبند کو دیکھ لیا۔ اس ویرانے میں گوبند کی موجودگی اُن کے لیے جہاں تعجب خیز تھی وہاں تشویش ناک بھی تھی۔ گوبند یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یقینی طور پر تھیٹر کے ایک مشہور اداکار کو پہچان بھی چکا تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد چاکرانی کے کارندے تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے گوبند کو دبوچ لیا۔ گوبند نے اُن کی منت سماجت کی اور قسمیں کھائیں کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ وہ کسی کو بتائے گا لیکن اُسے پکڑنے والے کچی گولیاں نہیں کھیلتے تھے۔ انہوں نے اسے بے بس کیا اور گھسیٹتے ہوئے نیچے نیم پختہ راستے پر لے گئے جہاں اُن کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

یوں گوبند ایک چشم دید گواہ ہونے کے سبب اغوا ہوا اور چاکرانی کی حبس بے جا میں چلا گیا۔ چاکرانی کے بنگلے میں اُسے ملازمین کی ایک کوٹھڑی میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ ایک مسلح چوکیدار ہر وقت اس کے اردگرد رہتا تھا اور خاص ضرورت کے تحت ہی گوبند کو کوٹھڑی سے باہر نکالا جاتا تھا۔ غالباً چاکرانی کو سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس کا کیا کرے۔ گوبند کو قتل کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی اور وہ اسے آزاد بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس کی قید کو طول دیتا چلا گیا۔ اس قید میں رہتے ہوئے گوبند کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روپ وتی بنگالی اداکار چاکرانی کی پتنی ہے۔ میاں بیوی میں کوئی تنازعہ چل رہا ہے اور وہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ گوبند مارچ میں قید ہوا تھا۔ مئی کے آخر میں چاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ دہلی واپس چلا گیا اور اس ویران بنگلے میں گوبند دو چوکیداروں کی نگرانی میں قید کے دن کاٹنے لگا۔ وہ ہر وقت روتا تھا اور اپنی بوڑھی ماں کو یاد کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ اسے اپنے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔ اس نے فریب کاری سے پیسہ کمانا چاہا تھا نتیجے میں وہ شاہی کے ہاتھوں جان لیوا طور پر زخمی ہوا اور پھر اس قید خانے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے طور پر فرار ہونے کی ایک دو کوششیں بھی کیں لیکن بُری طرح ناکام ہوا۔ نہ صرف یہ کہ اسے مارا پیٹا گیا بلکہ نگرانی بھی سخت کردی گئی۔ اسی طرح روتے پیٹتے تین ساڑھے تین مہینے اور گزر گئے۔ اب سردیاں آچکی تھی..... ایک روز چاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ پھر بنگلے میں آدھمکا۔ ان تین چار مہینوں کے دوران میاں بیوی کی ناچاقی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ روپ وتی کثرت سے شراب نوشی کرنے لگی تھی اور

ہفتے میں کئی بار چاکرانی سے پٹتی تھی۔ بنگلے کے اندرونی کمرے سے بلند ہونے والی یہ آوازیں گوبند کی کوٹھڑی تک بھی پہنچتی تھی۔ نشے میں دھت ہونے کے بعد روپ وتی چاکرانی پر چیخنے چلانے لگتی تھی یہاں تک کہ چاکرانی تشدد پر اُتر آتا تھا۔ میاں بیوی میں خوب جمتی تھی اور کبھی کبھی اس ہنگامے کی آوازیں بنگلے سے باہر تک جاتی تھیں۔ سردیوں کی وجہ سے یہ مختصر کالونی سنسان ہوچکی تھی ورنہ ہر رات کا یہ ہنگامہ اڑوس پڑوس والوں کا جینا حرام کردیتا۔ قریباً ہفتے پہلے کی بات تھی ایک رات گوبند اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تقدیر کے لکھے پر آنسو بہا رہا تھا کہ دروازے کی بالائی درز سے ایک لفافہ دھپ سے فرش پر آن گرا۔ گوبند نے جلدی سے لالٹین روشن کرکے لفافہ کھولا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس میں سو سو کے دس نوٹ ہیں۔ نوٹوں کے علاوہ ایک مختصر خط بھی تھا۔ یہ خط چاکرانی کی بیوی روپ وتی کی طرف سے تھا، اُس نے لکھا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ میری طرح تم بھی چاکرانی کے ایک بدنصیب قیدی ہو، اگر تھوڑی سی ہمت کرو تو آزادی تمہارا نصیب ہوسکتی ہے کل رات تمہیں اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ملے گا۔ تمہارا چوکیدار بھی نشے میں دھت پڑا ہوگا۔ تم دیوار پھاند کر باہر نکل جانا مجھے پوری آشا ہے کہ بھگوان تمہیں کامیاب کرے گا۔ اگر کامیاب ہوجاؤ تو میرا ایک کام کردینا۔ اس خط کے آخر میں میں اجیت نام کے ایک شخص کا پتہ لکھ رہی ہوں۔ یہ شخص دہلی کا رہنے والا ہے، تم یہ دوسرا خط اُس تک پہنچا دینا۔ اس لفافے میں جو رقم ہے وہ تمہارے اخراجات کے لیے ہے۔ میں اس کام کے لیے ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی..... فقط ایک مجبور"۔

خط کے عین مطابق اگلی شب گوبند کو اپنی منحوس کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ برآمدے میں دس بارہ قدم کے فاصلے پر مسلح چوکیدار بھی نشے میں چت پڑا تھا۔ گوبند جب اس کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ روپ وتی کا دوسرا دعویٰ غلط ثابت ہوا تھا۔ چوکیدار نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ جاگ رہا تھا۔ گوبند کے پاس اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا وہ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا تاکہ کسی مناسب مقام سے دیوار پھاند سکے۔ چوکیدار نے چلّا کر دوسرے چوکیدار کو خبردار کیا لیکن وہ اپنی کرسی پر نیم دراز رہا اور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھڑی کے چوکیدار کی بجائے یہ گیٹ والا چوکیدار اتنا غفیل ہوگیا ہے یا پھر یہ ایک اتفاق تھا کہ چوکیداروں نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کرلی تھی۔ بے ہوش چوکیدار کے قریب ہی پختہ کیبن کی دیوار سے ریوالور لٹک رہا تھا۔ گوبند نے لپک کر یہ ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔ عقب میں آنے والا چوکیدار اب اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی رائفل تھی جس کا رُخ گوبند کی طرف تھا۔ گوبند نے جب دیکھا کہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تو لبلبی دبادی۔ گولی سیدھی چوکیدار کی چھاتی پر لگی اور وہ رائفل سمیت پہلو کے بل گر گیا۔ کرسی پر نیم دراز چوکیدار پھر بھی بیدار نہیں ہوا۔ گوبند نے چھوٹے دروازے کی کنڈی گرائی اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔

بنگلے سے فرار ہونے کے بعد وہ کئی روز مختلف جگہوں پر چھپتا رہا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ چوکیدار زندہ بچا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اب وہ ایک خونی تھا۔ وہ آزاد ہوکر بھی اپنے اہل خانہ اور عزیز واقارب میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس خیال سے خوفزدہ تھا کہ پولیس اور چاکرانی کے ہرکارے ہر جگہ اسے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے۔ اخراجات کے لیے رقم اس کے پاس موجود تھی اس نے سیدھا

دہلی کا رُخ کیا ..... بنگلے سے فرار ہونے کے بعد گوبند سے ایک گڑبڑ ہو چکی تھی۔ ایک رات کئی گھنٹے تک اسے بارش میں بھیگنا پڑا تھا۔ اس کا لباس شرابور ہو گیا تھا اور جیب میں پڑے ہوئے وہ دونوں خط بھی بھیگ کر اور گل کر بیکار ہو گئے تھے۔

اس موقع پر گوبند اپنی رُوداد سُناتے سُناتے رُکا اور اس نے مجھے ان دونوں خطوں کے چند ٹکڑے دکھائے۔ ان ٹکڑوں سے صرف دو باتیں معلوم ہوتی تھیں ایک تو اجیت کمار کا نامکمل پتہ اور دوسرے یہ حقیقت کے روپ وتی نے اپنے پرانے شناسا اجیت کمار کو مدد کے لیے بلایا تھا کہ وہ اس تک پہنچے اور اسے اس کے ظالم شوہر سے رہائی دلائے ..... اب گوبند اجیت کمار تک پہنچنے کے لیے اس کی کوٹھی کے چکر لگا رہا تھا۔ پہلے دو تین روز تو اسے اجیت کا چوکیدار ہی ٹرخاتا رہا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا تھا کہ اجیت کسی شو میں حصہ لینے میرٹھ گیا ہوا ہے ..... آج بھی گوبند اجیت کا پتہ کرنے ہی نئی آبادی آیا تھا۔ وہ چاندنی چوک سے سوار ہو کر پہنچا تھا۔ ابھی بس سے اُتر ہی رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بدک اُٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

گوبند کے بارے میں اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ کیسے گم ہوا، اب تک کہاں رہا اور ڈلہوزی سے یہاں دہلی میں کیونکر پہنچا؟ سب کچھ سامنے آ چکا تھا۔ میری اصل جستجو گوبند کے لیے تھی اور گوبند کا کھوج لگ چکا تھا۔ لیکن گوبند کی وجہ سے جو ایک نیا کیس کھل گیا تھا اس کو انجام تک پہنچانا بھی میری ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ چاکرانی کو سزا بھی اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ اپنی بیوی سے ناروا سلوک کرتا تھا اور اس سلوک کو چھپانے کے لیے اس نے گوبند کو نو ماہ تک حبس بیجا میں رکھا اور ذہنی و جسمانی اذیتیں دیں۔

اگلے روز اجیت کمار میرٹھ سے واپس آ گیا اور ہم نے اس سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات اجیت کے گھر میں ہوئی۔ میرے ساتھ مقامی تھانے کا انسپکٹر اصغر علی اور انسپکٹر نذیر محمد بھی تھے۔ شروع کی گفتگو میں وہ میرے ساتھ تھے تاہم بعد میں اُٹھ کر چلے گئے۔ اجیت کمار مردانہ جاہت کا شاہکار تھا۔ روپ وتی جیسی حسین و جمیل لڑکی کا ایسے مرد پر مرمٹنا سمجھ میں آتا تھا۔ محاورے کے مطابق چاند سورج کی جوڑی بن سکتی تھی۔ روپ وتی میں اگر نسوانی خوبیاں یکجا نظر آتی تھیں تو اجیت مردانہ صفات میں کسی سے کم نہیں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے اجیت کمار کو اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ میں روپ وتی کے ساتھ اس کے معاشقے اور پھر دُوری کی کہانی اسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے میں مجھے دیر تو لگی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے جب اجیت کو روپ وتی کے خط کے ٹکڑے دکھائے تو وہ ایک دم ہکا بکا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے کوئی دبیز پردہ ہٹ رہا تھا۔ وہ پوچھنے لگا کہ یہ خط مجھے کہاں سے اور کیسے ملا؟ میں نے اسے گوبند کے بارے میں بتایا اور اس سلسلے میں دیگر ضروری باتوں سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا ''روپ کی شراب نوشی کا تو مجھے پتہ تھا نواز صاحب ..... مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ پتی پتنی میں ناچاقی اتنی بڑھ چکی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ یہ سب کیسے ہوا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے تو اُن دونوں کے تعلقات ایسے خراب نہیں تھے؟''

میں نے کہا ''اجیت صاحب! جیسے بھی ہوا ہے بہرحال یہ سب کچھ ہو چکا ہے میں خود اس بات کا گواہ ہوں۔ روپ وتی خود کو چاکرانی کے گھر میں ''قیدی'' محسوس کر رہی ہے اور کسی بھی قیمت پر اس کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے ..... اور ہم انشاء

اللہ اسے آزاد کرائیں گے بھی لیکن اس کے لیے آپ کو بھی ہم سے تعاون کرنا ہوگا اور وہ حالات بتانے ہوں گے جن کے نتیجے میں روپ وتی چاکرانی جیسے شخص کے جال میں پھنسی ہے''۔

اجیت کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور سگریٹ سلگا کر بولا ''انسپکٹر صاحب! اس سلسلے میں بہت کچھ اخباروں رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے بے وفا ٹھہرایا ہے اور کچھ نے روپ کو دغا بازی کا تمغہ دیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ میری نظر روپ کی دولت پر تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ میں اس کی جوانی سے کھیل کر اسے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں پریس میں آئی ہیں لیکن حقیقت سے ان کا دُور کا بھی تعلق نہیں''۔

میں نے کہا'' لیکن یہ تو حقیقت ہے ناں کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ کر دُور گئے ہیں..... بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک موقع پر روپ وتی سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا اور آپ نے اسے تھپڑ مارا تھا''۔

اجیت نے کش کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا'' ہاں..... یہ جھگڑے والی بات کسی حد تک درست ہے۔ درحقیقت یہی جھگڑا اس کش مکش کا انجام ثابت ہوا جو پچھلے دو برسوں سے میرے اور روپ میں جاری تھی''۔

''کیسی کش مکش؟'' میں نے پوچھا۔

''بس یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے''۔ اجیت نے درد ناک انداز میں مسکرا کر کہا'' ہماری کش مکش کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی، یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بیکار کی اکڑ تھی جو ہمیں ایک دوسرے سے دُور رکھے ہوئے تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنہیں ہم نے خوامخواہ اپنے لیے مسئلہ بنا لیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے کے باوجود کھچے کھچے رہتے تھے۔ معمولی باتوں پر روٹھ جاتے تھے اور مہینوں ایک دوجے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ کبھی میں کسی بات کو اپنی ہتک سمجھ لیتا تھا کبھی وہ رائی کے دانے کو پہاڑ بنا لیتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ آتا ہے کہ ہم دونوں میں بچپنا تھا۔ یہ بچپنا ہم سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں کراتا رہا یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ یہ جُدائی اس لیے زیادہ افسوس ناک تھی کہ ہم منزل کے قریب پہنچ کر راستہ بھٹکے تھے۔ ہماری شادی کی بات چل نکلی تھی۔ میری والدہ راضی تھیں والد بھی رضامندی ظاہر کر چکے تھے۔ دوسری طرف روپ وتی کی والدہ اور بہنیں بھی خوش تھیں مگر اچانک سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے ایک معمولی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا۔ میرے ایک گہرے دوست نے سٹیج شو کا انتظام کیا تھا۔ اس شو میں روپ وتی بھی حصہ لے رہی تھی۔ شو کی ساری ٹکٹیں بک چکی تھیں۔ رات آٹھ بجے شو ہونا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے روپ وتی نے شو میں شرکت سے انکار کر دیا۔ شو کے منتظمین کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور چاہا کہ میں روپ وتی سے سفارش کروں۔ میں روپ وتی کو منانے کے لیے پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی بڑی بہن کو انگلینڈ جانا ہے اور وہ اسے ''سی آف'' کرنے کے لیے ہوائی اڈے جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ شو میں شرکت اس کے لیے زیادہ ضروری ہے، مالک کو بہت نقصان اُٹھانا پڑے گا اور بدنامی الگ ہو گی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ کسی طور نہیں مانی۔ اپنی بات پر اڑ جانے کی اس کی یہی عادت ہمیشہ جھگڑے کا سبب بنتی تھی۔ اس دن معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا اور میں نے بھنا کر اسے تھپڑ دے مارا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس

واقعے کو دو ڈھائی برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کبھی ہماری بات نہیں ہوئی۔ دونوں گھرانوں نے بھی قطع تعلق کرلیا۔ جھگڑے کے چار ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک روز میں نے بے پناہ صدمے سے یہ خبر سنی کہ روپ وتی نے ایک رنڈوے سے شادی کرلی ہے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری مراد رابندر ناتھ چاکرانی سے ہے۔ میں اسے بُرا آدمی تو نہیں کہہ سکتا لیکن وہ بالکل اوباش ٹائپ کا آدمی ہے۔ تعلیم غالباً اُس کی میٹرک تک ہے۔ باپ پہلوانی کرتا تھا اور اپنے حریفوں کی ہڈی پسلی توڑنے میں مشہور تھا۔ چاکرانی خود بھی جنگجو قسم کا آدمی ہے۔ میری اُس سے بہت کم ملاقات ہوتی ہے اور اس کے گھریلو حالات کے بارے میں تو میری معلومات صفر ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ اُس کے قریبی دوست بھی اس کے گھریلو حالات کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو اپنی ذاتی زندگی کو کاروباری زندگی سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد اس نے روپ وتی کو ڈراموں میں حصہ لینے سے منع کردیا تھا۔ وہ عام تقریبات میں بھی کم ہی نظر آتی تھی..... میں تو خط کے یہ ٹکڑے دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں ان فقروں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ..... کسی قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔ روپ وتی جیسی پڑھی لکھی نازک مزاج لڑکی کی چاکرانی جیسے شوہر سے نبھ ہی نہیں سکتی تھی"۔

میں نے کہا" چاکرانی آپ کی اور ہماری توقع سے بہت آگے کی چیز ہے اجیت کمار صاحب، اگر روپ وتی کچھ روز مزید اس کے پاس رہ گئی تو وہ ضرور اُسے پاگل کردے گا۔ میں آپ کی بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ روپ وتی نے چاکرانی جیسے شخص سے شادی کرکے غلطی کی تھی لیکن عورت کو تو ہمیشہ سے کم عقل سمجھا جاتا ہے کیا آپ کی ذمے داری نہیں تھی کہ اُسے اس گڑھے میں گرنے سے بچاتے۔ آخر آپ مرد تھے۔ مرد کی ہمت اور برداشت عورت سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ ضد میں آگئی تھی تو آپ ہی ضد چھوڑ کر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے"۔

وہ بولا" آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں نواز صاحب لیکن وہ کوئی بے آسرا لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی نابالغ تھی۔ اپنا اچھا بُرا خوب ٹھیک طرح سمجھتی تھی اور سمجھانے بجھانے کے لیے اس کے بزرگ بھی موجود تھے اور پھر مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ آناً فاناً خبر ملی کہ روپ کی شادی چاکرانی سے ہورہی ہے۔ دو روز بعد اس شادی کی تصویر بھی اخبار میں چھپ گئی"۔

میں نے پوچھا" اب اس کے بزرگان کہاں ہیں انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ کیا ہورہا ہے"۔

اجیت نے کہا" اس کی بڑی بہن شادی کرکے انگلینڈ چلی گئی تھی، اس کی ماں کو بلایا پھر بھائی بھی چلے گئے۔ اب ایک خالہ کے سوا اُس کا کوئی قریبی عزیز دہلی میں نہیں ہے۔ وہ خالہ بھی اکثر شہر سے باہر رہتی ہے۔ اس کا خاوند سرکاری ملازم ہے اور یہ ملازمت گھومنے پھرنے کی ہے"۔

اجیت کے بیان سے بات پوری طرح واضح ہوگئی تھی۔ روپ وتی اگر رابندر ناتھ چاکرانی کے چنگل میں پھنسی تھی تو اس میں زیادہ قصور روپ وتی کا اپنا تھا۔ درحقیقت اس نے اجیت سے انتقام لینے کے لیے چاکرانی سے شادی کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چاکرانی تھیٹر کی دنیا میں اجیت کا حریف ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس نے اپنا آپ چاکرانی کی جھولی میں ڈال کر اجیت کے دل پر آرے چلائے تھے۔

شب و روز اسے تڑپایا تھا اور رقابت کی آگ میں جلایا تھا لیکن پھر اس آگ میں وہ خود بھی جلنے لگی تھی جسے اس نے شوہر بنایا تھا وہ بھی کاٹھ کا الو نہیں تھا۔ یقیناً اسے بھی اندازہ ہو گا کہ روپ وتی نے اپنا نوخیز جوبن اس کی بانہوں میں پھینکا ہے تو کیوں پھینکا ہے۔ وہ روپ وتی اور اجیت کے قصے سے پوری طرح آگاہ تھا لہٰذا شادی کے پہلے روز سے اُن دونوں میں وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکا جسے محبت کا رشتہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ روپ وتی نے چاکرانی کو بیوی کی محبت دینے کی کوشش کی ہو لیکن چاکرانی اسے شوہر کا اعتماد نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ خوبصورت چڑیا ایک بے مقصد رشتے کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور پھڑپھڑا رہی تھی..... اب اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تھا اور وہ مدد کے لیے اپنے ناراض محبوب کو پکار رہی تھی..... بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ میں تو اسے بھی اجیت کی مہربانی ہی کہوں گا کہ وہ روپ وتی کی مصیبت کا سن کر یوں بے قرار نظر آنے لگا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو سوچتا ایک بے وفا عورت کے لیے اسے کیا ضرورت پڑی ہے چاکرانی جیسے بااثر شخص سے ٹکرانے کی ..... خط کے ٹکڑے دیکھنے اور مجھ سے دیگر حالات جاننے کے بعد اُس کی خوبصورت آنکھوں میں کسی بے نام جذبے کی آگ سی جلنے لگی تھی اور یوں لگتا تھا وہ اُڑ کر ڈلہوزی پہنچ جانا چاہتا ہے۔ سارے پرانے شکوے بھول کر ہر نفع نقصان فراموش کر کے اور دل کے سارے داغ چھپا کر وہ ایک بار پھر روپ وتی کو گلے لگا لینا چاہتا ہے۔ عشق ایسا ہی اوٹ پٹانگ ہوا کرتا ہے۔ اونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ آنے والے لمحے کی طرح کوئی اس کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ جب اجیت اور روپ وتی کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی انہوں نے خود اپنے درمیان فاصلے پیدا کر لیے تھے اور اب جب کہ اُن کے درمیان رشتے کی ایک بہت بڑی دیوار حائل تھی وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے..... لیکن وقت گزر چکا تھا اور گزرا ہوا وقت شاذ و نادر ہی کسی کے لیے واپس لوٹا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وقت روپ وتی اور اجیت کے لیے واپس لوٹے گا یا نہیں۔

تین چار روز بعد یہ کیس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گیا۔ میرے اور بلال شاہ کے علاوہ گوبند اور اجیت کمار بھی ڈلہوزی پہنچ چکے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ گورا پہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ جیپ کے ذریعے ایک طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا لہٰذا ایک گھنٹے بعد جب ہم گورا پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ بلندی پر واقع بنگلوں میں صرف چودہ نمبر بنگلے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جیپ سے اُتر کر ہم بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچے اور چوکیدار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوکیدار واپس آ گیا وہ ہماری آمد سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ اُس نے ہمیں سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈرائی فروٹ کی طشتری سامنے رکھ کر چلا گیا۔ رابندر ناتھ چاکرانی قریباً پندرہ منٹ بعد آیا۔ اُس نے معذرت کی اور کہا کہ وہ پوجا کے کمرے میں تھا۔ بڑی زبردست اداکاری کر رہا تھا کم بخت ..... آنکھوں میں ویرانی تھی اور چہرے پر مظلومیت کے سائے۔ ایک بدنصیب شوہر کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا وہ۔ میں اس کی اداکاری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

میں نے پوچھا ”اب آپ کی مسز کی طبیعت

کیسی ہے؟"

"بس جی بھگوان کی مرضی ہے" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا" وہ جس حال میں رکھے خوش رہنا چاہیے"۔

"یعنی کچھ افاقہ نہیں ہوا"۔

"انسپکٹر صاحب! افاقہ اُس وقت ہوتا ہے جب مریض خود بھی صحت یاب ہونا چاہے لیکن جو مریض خود کو تباہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہو اُسے کون روک سکتا ہے۔ پہلے وہ دن بھر میں ایک بوتل پیتی تھی اب اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔ نشہ نہ ملے تو ہنگامہ کرتی ہے۔ خودکشی کی دھمکیاں دیتی ہے۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ آدمی بے شک بہت بُرا تھا لیکن اداکار اچھا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے ایک عورت کو ڈیڑھ برس سے جھوٹی انا کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ اُس کے علاوہ وہ اغوا' حبس بیجا اور ایذا رسانی جیسے جرائم میں ملوث ہے۔ میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بچ بچ بہت ترس آرہا ہے آپ پر، اور آپ کی ہمت پر داد دینے کو بھی جی چاہ رہا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کا صحیح حق ادا کر رہے ہیں آپ۔ بیمار بیوی کی تیمار داری کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں بیٹھے ہیں آپ کو..... تو وکٹوریہ کراس ملنا چاہیے بلکہ کوئی اس سے بھی بڑا ایوارڈ ہونا چاہیے"۔

"جی؟" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جی" میں نے اثبات میں سر ہلایا" کتنا خیال ہے آپ کو اپنی پتنی کا، اس کی بیماری کو راز رکھنے کے لیے بندے تک اغوا کر لیتے ہیں آپ اور کئی کئی ماہ تک اُن کے لیے طعام قیام کی سہولتیں فراہم کرتے ہین۔ کون پتی ایسا مائی کا لال ہوگا جو اس حد تک جائے گا، ونڈرفل..... رئیلی ایکسٹرا آرڈنیری"۔

چاکرانی کا ماتھا اب پوری طرح ٹھنک چکا تھا۔ وہ منمنا کر بولا" میں..... کچھ سمجھ نہیں پا رہا آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔

میں نے کہا" سمجھ تو تمہیں ساری آرہی ہے لیکن تم تسلیم نہیں کر رہے ہو"۔

میں ایک دم آپ سے "تم" پر اُتر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا" انسپکٹر! کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو کچھ پی کر تو نہیں آگئے ہو" میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اُس نے چرمی بیگ میں رکھی ہوئی ہتھکڑی نکال لی۔ ڈرائنگ روم کی خاموشی میں ہتھکڑی کی کھڑکھڑاہٹ بڑی دھماکہ خیز محسوس ہوئی۔ چاکرانی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ میں نے اس موقعے پر مناسب سمجھا کہ ریوالور نکال لیا جائے۔ ابھی میرا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ پہلو میں ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے لحیم شحیم شاہی کو تیر کی طرح اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی مانند مجھ سے ٹکرایا اور مجھے لیتا ہوا فرش پر دُور تک پھسل گیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے چند لمحے کے لیے دھندسی پھیل گئی۔ دھند صاف ہوئی تو میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کھڑکی سے کود کر بھاگتے دیکھا۔ یہ ہندو کانسٹیبل تھا اور اس "قوم کے لوگ" ایسے موقعوں پر اکثر بھاگا ہی کرتے ہیں۔ دوسرا کانسٹیبل سکھ تھا شاہی کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل کو ایسی پوزیشن میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہی پر گولی چلا سکے لیکن اس سے پہلے کے رائفل ایسی پوزیشن میں آتی یا میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کانسٹیبل کی مدد کر سکتا۔ ایک برق سی میری نگاہوں میں کوند گئی۔ میں نے شاہی کی تلوار کو کانسٹیبل کے پیٹ میں گھستے اور باہر نکلتے دیکھا۔

کانسٹیبل کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ تڑپ کر فرش پر جا گرا۔ یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ کے مختصر وقت میں رونما ہوگیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہوا تو شاہی دونوں ہاتھوں میں خون آلود تلوار سونت کر میرے سامنے آچکا تھا۔ وہ مناظر میری زندگی کی چند ناقابل فراموش یادوں کا حصہ ہیں۔ آج بھی تصور کرتا ہوں تو سب کچھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے۔ شاہی کا صفاچٹ چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھوں میں جنون کا رقص تھا۔ وہ بڑی خوفناک آواز میں غرایا، ''تھانیدار تجھے کہا تھا ناں۔ اس وقت کو بھولنا مت..... اس وقت کو یاد رکھنا۔ بول ..... کہا تھا ناں تجھے؟'' وہ ہوش وحواس سے بیگانہ تھا اور میرے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا۔ میں اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا رہا ہونا بعید از قیاس تھا۔ یقیناً وہ جیل توڑ کر آیا تھا۔ بہرحال یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ یہ وقت تھا شاہی کی قاتل تلوار پر نگاہ رکھنے کا اور خود کو اس تلوار کی ظالم کاٹ سے بچانے کا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس وقت میرے قدموں میں زخمی کانسٹیبل کا جسم پھڑک رہا تھا اور میں دیوار سے پشت لگائے شاہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید چاکرانی نے شاہی کو روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن شاہی کہنے سننے کی حد سے گزر چکا تھا ''میرے قتل'' سے کم وہ کسی بات پر راضی نہیں تھا، غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے پہلے دو وار میں نے صاف بچائے لیکن تیسرا وار میرے کندھے پر پڑا اور تلوار کی دھار جرسی قمیص اور بنیان کاٹ کر کندھے میں پیوست ہوگئی ..... ایک بار مجھے نشانہ بنانے کے بعد شاہی کی درندگی کچھ اور بڑھ گئی وہ اندھا دھند مجھ پر وار کرنے لگا۔ میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے وار بچا رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی بار شاہی کی تلوار میرے جسم کو چھو کر گزری۔ کتنے چرکے لگے اور کتنے زخم آئے۔ مجھے وہ مناظر ''دھندلے دھندلے'' سے یاد ہیں۔ بنگلے کے نوکر ڈرے سہمے دیواروں سے لگے تھے۔ چاکرانی کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا اور وہ چلا چلا کر شاہی سے کچھ کہہ رہا تھا میرا لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور تلوار چھیننے کی کوشش میں ایک ہاتھ بُری طرح سے زخمی تھا جونہی میں ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر پہنچا میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بنگلہ چونکہ ڈھلوان پر تھا لہٰذا کھڑکی سے چھلانگ لگا کر میں قریباً بیس فٹ نیچے پتھریلی زمین پر گرا۔ دونوں پاؤں پر چوٹ آئی تاہم ایسی چوٹ نہیں تھی کہ میں کھڑا نہ ہوسکتا۔ جیپ قریباً چالیس گز کی دُوری پر موجود تھی اور اس میں ایک بھری ہوئی شاٹ گن رکھی تھی۔ میں دوڑ کر جیپ تک پہنچ سکتا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے امید تھی کہ جیپ تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی اور پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا غضب میں پھنکارتے ہوئے شاہی نے اپنے ڈیل ڈول کی پرواہ کیے بغیر کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ترچھا ہوکر زمین پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر پھر گر گیا۔ میں نے اسے دوسری کوشش کرنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر دبوچ لیا۔ جونہی اس کی تلوار والی کلائی میری گرفت میں آئی میں نے بے پناہ نفرت سے کلائی کو مروڑا اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گرادی۔ اس نے اپنے استرا پھرے ہوئے سر سے ٹکر مار کر مجھے گوبند کی طرح کسی کھائی میں پھینکنا چاہا لیکن اس دفعہ اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ٹکر میرے چہرے کی بجائے سر پر لگی یہ آخری وار تھا جو اس

نے کیا۔ اس کے بعد وہ صرف دفاع کرتا رہا اور آخر دفاع کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اردگرد کے بہت سے مقامی لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ یہ میرے حق میں بہت بہتر ہوا کیونکہ مجمع لگنے کے بعد چاکرانی یا اُس کے نوکروں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ کسی بھی طرح شاہی کی مدد کر سکتے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یہ سارا کھیل ختم ہو گیا۔ شاہی لہولہان فرش خاک پر پڑا تھا۔

شاہی اور چاکرانی گرفتار ہوئے (شاہی کے کارندے دولورام کو بعد میں، میں نے پٹھانکوٹ سے پکڑ لیا) تھوڑ دیر بعد ڈلہوزی سے پولیس کی مزید نفری گورا پہاڑ پہنچ گئی۔ اس نفری کے ساتھ دو ڈاکٹر اور ابتدائی طبی امداد کا سامان بھی تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل کے پیٹ میں تلوار کا گہرا زخم آیا تھا اور آنتوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے چاکرانی کے بنگلے میں ہی طبی امداد پہنچائی اور پھر مزید علاج معالجے کے لیے جیپ میں ڈال کر ڈلہوزی لے گئے۔ پولیس کی مزید نفری آنے کے بعد ہم نے چاکرانی کے وسیع بنگلے کی تلاشی لی۔ چاکرانی کے بیڈروم سے عیاشی کے دیگر سامان کے علاوہ ایک نوعمر طوائف بھی برآمد ہوئی جس وقت میں بنگلے میں پہنچا چاکرانی اسی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ نتیجے میں میں پندرہ بیس منٹ اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ آکر چاکرانی نے بتایا تھا کہ وہ ''پوجا پاٹ کے کمرے'' میں تھا..... (اچھی پوجا پاٹ تھی) روپ وتی کو بالائی منزل کے ایک تنگ تاریک کمرے سے برآمد کیا گیا۔ شراب نوشی نے اس کی حالت بہت پتلی کر دی تھی پھر بھی وہ خوبصورت نظر آتی تھی ۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت رہی ہوگی۔ ڈلہوزی سے پولیس پارٹی کے ساتھ اجیت کمار بھی آیا تھا۔ اجیت کو دیکھ کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ اجیت نے اسے کندھے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے لگا۔

ڈلہوزی کے تھانے میں پہنچ کر روپ وتی نے جو طویل بیان دیا اس میں اہم بات یہی تھی کہ چاکرانی نے اسے حبس بیجا میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ ''یہ میرا شریک حیات نہیں جلاد ہے۔ اس نے ڈیڑھ برس سے مجھے قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ میں دن رات اس کی گالیاں سنتی اور

جوش میں کھوگئے ہوش

کہتے ہیں کہ جوش میں کبھی بھی ہوش نہیں کھونے چاہئیں ورنہ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ امریکہ کے ایک صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جو اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ چھٹی منانے مچھلی کے شکار پر جا پہنچے اور جیسے ہی مچھلی کانٹے میں آئی یہ ایسے جوش میں آئے کہ ہوش ہی کھو بیٹھے۔ مچھلی کے کانٹے میں پھنستے ہی یہ بھی بھول گئے کہ وہ کشتی میں ہیں اور دھڑام سے پانی میں جا گرے۔ مچھلی ہاتھ میں کیا آنی تھی اُلٹا اسی کے پاس پانی میں پہنچ گئے۔

(مرسلہ: نورین سفیر۔ لالہ موسیٰ)

جادوئی گاڑی

گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا محاورہ ایک کار پر بالکل صادق آتا ہے جو پل بھر میں رنگ، منظر اور شکلیں بدل کر دلفریب مناظر پیش کرتی ہے۔ جرمنی میں ایک شو کے دوران پیش کی گئی یہ کار مختلف لائٹوں کے ذریعے انتہائی تیزی سے یہ انوکھے کرتب دکھاتی ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ کار خود کرتب نہیں دکھا رہی بلکہ یہ صرف آنکھوں کا حسین دھوکہ اور جدید ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔

(مرسلہ: ناجیہ خالد۔ راولپنڈی)

ٹھوکریں کھاتی رہی ہوں۔ بھگوان جانتا ہے مجھے شراب کی عادت ڈالنے والا شخص بھی یہی ہے۔ یہ پرلے درجے کا شکی مزاج اور مکار شخص ہے۔ یہ میری پاک دامنی پر شبہ کر کے مجھے بے وفائی کے طعنے دیتا تھا اور خود بازاری عورتوں کے ساتھ سوتا تھا۔ اس نے مجھے قتل نہیں کیا باقی ہر وہ ظلم کیا ہے جو یہ کرسکتا تھا.....''۔

روپ وتی کے سخت ترین بیان کے بعد چاکرانی کے خلاف کیس مزید مضبوط ہو گیا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ شاہی کی وجہ سے پوری ہوگئی۔ شاہی کے ساتھ چاکرانی کا تعلق اب ثابت ہو چکا تھا۔ اس تعلق کی مختصر کہانی یہ ہے کہ کھائی سے گوبند کے غائب ہوجانے کے بعد شاہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ مسلسل اس کی تلاش میں رہا تھا۔ آخر اُسے شک ہو گیا تھا کہ گوبند گورا پہاڑ پر اداکار چاکرانی کے بنگلے میں ہے۔ وہ چاکرانی کے بنگلے تک جا پہنچا تھا۔ چند دن کے تعلق کے بعد اُن دونوں میں ''انڈر سٹینڈنگ'' ہوگئی تھی شاہی نہ صرف چاکرانی کا راز دار بن گیا تھا بلکہ چاکرانی کی راتوں کو ''چمکانے'' کے لیے اُس کے واسطے شہر سے بازارِ حسن کے ''تحفے'' بھی لاتا تھا۔ جب شاہی میرے ہاتھوں پکڑا گیا تو یہ کام اس کے کارندے دولورام نے سنبھال لیا۔ ان لوگوں کی بدقسمتی اور روپ وتی کی خوش قسمتی کہ دولورام میری نگاہ میں آگیا اور میں اس کا پیچھا کر کے چاکرانی کے بنگلے تک جا پہنچا۔

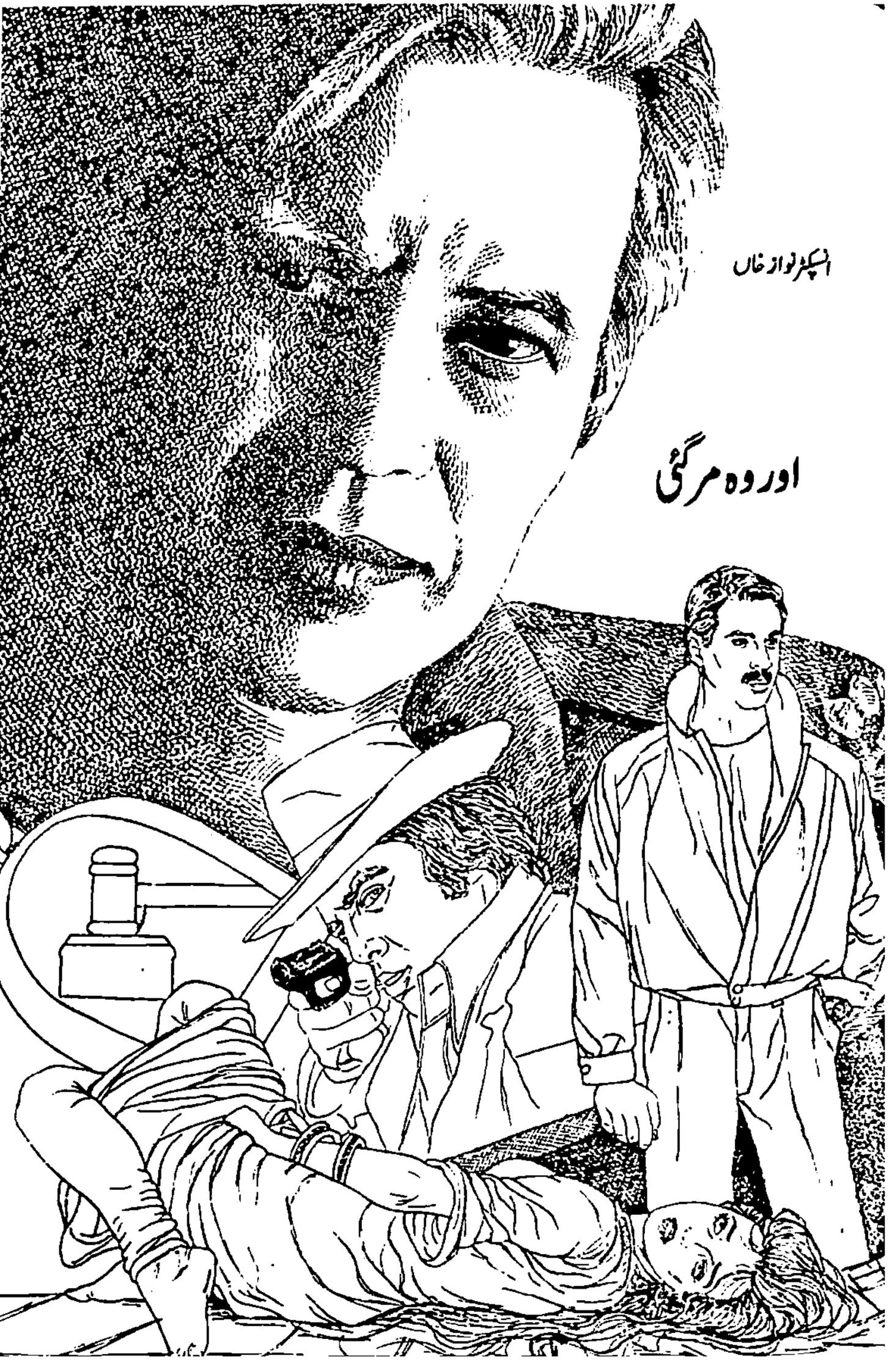
شاہی کو گرفتار کرنے کی کوشش میں مجھے کافی زخم آئے تھے لیکن خوش قسمتی سے کندھے کے علاوہ کوئی زخم سنگین نہیں تھا۔ تین چار روز کی مرہم پٹی سے یہ زخم ٹھیک ہوگئے۔ اس کہانی کا اہم ترین کردار گوبند ہے.....نو مہینے کی پراسرار گمشدگی کے بعد جب وہ ڈلہوزی پہنچا اور اپنے اہل خانہ سے ملا تو ایک دیدنی منظر دیکھنے میں آیا۔ اس موقع پر اس کے کئی پرستار بھی جمع ہو چکے تھے۔ پرستار..... پرستار ہی ہوتا ہے۔ ان پرستاروں کو بھی یہ معلوم تھا کہ ان کے ''ہیرو'' نے سالانہ ریس میں اپنی فتح کا سودا کیا تھا پھر بھی وہ اُس کے استقبال کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ اس موقع پر گوبند اپنے کیے پر بہت نادم نظر آرہا تھا.....بہرحال اس ندامت میں ایک نئی زندگی مل جانے کی خوشی بھی شامل تھی۔ زندگی..... جو انسان کو میسر ہو تو غلطیوں کی تلافی کے ہزار ہا موقعے مل جاتے ہیں۔ گوبند کے لیے ایک اور خوش کن بات یہ تھی کہ وہ قتل کے الزام سے بچ گیا۔ چاکرانی کے بنگلے سے فرار ہوتے وقت اس کے ہاتھوں جس چوکیدار کو گولی لگی تھی وہ مرا نہیں تھا صرف زخمی ہوا تھا۔ یہ جسمانی ضرر کا کیس تھا اور حفاظت خود اختیاری کے ضمن میں آکر زیادہ سنگین نہیں رہتا تھا۔

اس کیس کے بڑے مجرموں شاہی اور چاکرانی کو بالترتیب بارہ اور آٹھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی جبکہ دولورام کو مختلف دفعات کے تحت پانچ سال قید بھگتنا پڑی..... ان واقعات کے قریباً ایک سال بعد اجیت کمار اور روپ وتی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ واقعی بہت خوب جوڑی تھی وہ۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ میاں بیوی تھیٹر کے لوگ ہیں۔ زیادہ دیر یہ ساتھ نبھا نہیں سکیں گے لیکن اس جوڑے نے ان تمام دعوؤں کو غلط ثابت کردیا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد بھی مجھے ان دونوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔ گو اُن کی نرینہ اولاد نہیں تھی مگر وہ دہلی میں بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے.....!

.....❁.....❁.....

انسپکٹر نواز خاں

اور وہ مر گئی



انسپکٹر نواز خاں

اور وہ مر گئی

جس وقت فائر ہوا متوفیہ اپنے بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی.....
جس زاویے سے گولی جسم میں داخل ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوتا
تھا کہ قاتل زیادہ لمبے قد کا نہیں تھا یا اس نے بیٹھ کر گولی چلائی تھی

انسپکٹر نواز خاں کی زندگی کا ایک یادگار تجربہ

صبح کوئی دس بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کا نمبردار امداد علی دو دوسرے افراد کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھیوں میں ایک تو اس کا کارندہ تھا جبکہ دوسرا گاؤں ہی کا ایک شخص تھا۔ میں اس کے چہرے سے تو واقف تھا لیکن نام معلوم نہیں تھا۔ تینوں افراد گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے اور سلام کر کے میرے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لے کر آئے ہیں۔

آخر نمبردار امداد علی نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "تھانیدار صاحب..... ق..... ق..... قتل ہو گیا ہے۔"

"کس کا قتل؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نور محمد کی بیوہ کا۔"

میں نے کہا "امداد علی! تمہیں پتہ ہے مجھے ادھوری بات سے نفرت ہے۔ پورا واقعہ بتاؤ۔"

امداد علی ایک نوجوان چوہدری تھا۔ ایسے چوہدری اور نمبردار تھانیداروں سے دب کر رہنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ امداد علی میں بھی بڑی اکڑ فوں تھی لیکن پانچ چھ مہینے پہلے یہ اکڑفوں ایک واقعے میں نکل گئی تھی..... بہرحال میرے کہنے پر امداد علی نے فوراً اپنی بات کی وضاحت شروع کر دی۔ اس نے کہا۔

"تھانیدار صاحب! آپ کو پتہ ہی ہو گا چار سال پہلے گاؤں میں تہرے قتل کی ایک واردات ہوئی تھی۔ ذیلداروں کا لڑکا نور محمد بھی قتل ہونے والوں میں شامل تھا۔ ہاجرہ، نور محمد کی بیوہ کا نام ہے۔ یہ محمد اشفاق جو میرے ساتھ آیا ہے، ہاجرہ کا پڑوسی ہے۔"

میں نے محمد اشفاق کی طرف دیکھا۔ اس نے

عام کاشتکاروں والا لباس پہن رکھا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

امداد علی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''آج صبح سویرے محمد اشفاق کی گھر والی آگ لینے کے لیے ہاجرہ کے گھر گئی۔ اس نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اشفاق کی بیوی پہلے ہاجرہ کو اور پھر اس کے بیٹے امتیازی کو آوازیں دیتی رہی..... آخر مایوس ہو کر اس نے اشفاق کو بتایا۔ اشفاق بھی کچھ دیر آوازیں دیتا رہا پھر دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا.....''

میں نے نمبردار کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ جب اشفاق یہاں موجود ہے تو پھر وہ کیوں بول رہا ہے۔ میں نے اشفاق سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں میاں تم بتاؤ۔ تم اکیلے ہی اندر گئے تھے یا کوئی اور بھی تھا؟''

وہ تھوک نگل کر بولا ''جناب! اکیلا ہی تھا میں..... میں نے امتیازی اور اس کی ماں کو آوازیں دیں پر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں کمرے میں گیا تو چارپائی پر بہن ہاجرہ کی لاش پڑی تھی۔ میں بھاگ کر صحن میں آیا اور باہر والا دروازہ کھول کر شور مچا دیا۔ پوری گلی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بہن ہاجرہ کے پتر امتیازی کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید قتل کرنے والے اسے ساتھ ہی لے گئے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد وہ گھر کے اندر سے ہی مل گیا۔ وہ اناج والی کوٹھڑی میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کی ماں کو کالے کپڑوں والے ڈاکو نے گولی مار دی ہے اور اگر وہ یہاں نہ چھپ جاتا تو ڈاکو اسے بھی مار ڈالتا.....''

میں نے نمبردار امداد علی سے پوچھا ''تم کہہ رہے ہو کہ اشفاق کی بیوی صبح سویرے آگ لینے ہاجرہ کے گھر گئی تھی اور..... اس وقت خیر سے دس بج رہے ہیں۔ تم لوگ اتنی دیر سے اطلاع کیوں پہنچا رہے ہو؟''

امداد علی کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ میرے اس سوال کے بارے میں پہلے سے جانتا ہے۔ اس نے کہا ''جناب بات دراصل یہ ہے کہ واردات کا پتہ تقریباً سات بجے ہی چل گیا تھا۔ آدھ پون گھنٹہ تو یہ سوچتے سوچتے گزر گیا کہ پولیس کو اطلاع کون دے۔ پھر اشفاق میری حویلی پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر آپ کے پاس آئے لیکن میں فصلوں پر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے آیا ہوں تو ہم سیدھے آپ کے پاس حاضر ہو گئے ہیں۔''

یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں تھی۔ لوگ رپورٹ کرنے میں عموماً دیر کر دیتے ہیں۔ آج کل بھی کرتے ہیں اور اس دور میں بھی کرتے تھے لیکن مجھے مقتولہ کے ہمسائے پر شک سا ہونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے گلی میں جا کر شور مچایا اور بہت سے لوگوں کو واردات کے بارے میں بتا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ تقریباً تین گھنٹے پہلے واردات کی خبر گاؤں میں عام ہو چکی تھی۔ یہ گاؤں بڑا تھا لیکن بہت زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ اگر تین گھنٹے پہلے عام لوگوں کو قتل کا پتہ لگ گیا تھا تو تھانے تک خبر کیوں نہیں پہنچی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اشفاق کے بیان میں گڑبڑ ہے..... بہرحال میں نے فوراً ان لوگوں کو ساتھ لیا اور موقعۂ واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر کے اندر اور باہر کافی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ میرے عملے نے انہیں ذرا دھمکا کر پیچھے ہٹایا۔ میں اس کمرے میں پہنچا جہاں خون ہوا تھا۔ مقتولہ کی لاش ابھی تک چارپائی پر پڑی تھی۔ بستر کی چادر خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ کھدر کے پھولدار لحاف پر بھی دھبے تھے۔ نمبردار اور اشفاق وغیرہ کا

بیان تھا کہ لاش کو اس کی جگہ سے ہلایا نہیں گیا۔ میں نے قریب سے دیکھا، لاش اکڑ چکی تھی۔ مقتولہ پر رائفل سے فائر کیا گیا تھا۔ گولی اس کی چھاتی پر لگی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مقتولہ کی عمر تیس بتیس کے قریب تھی تاہم وہ دیکھنے میں جوان نظر آتی تھی۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں۔

نمبردار ایک روتے منہ بسورتے لڑکے کو میرے پاس لے آیا اور بتایا کہ یہ امتیازی ہے۔ لڑکے کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ وہ ایک گورا چٹا صحت مند لڑکا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ ایک طرح سے یہ لڑکا اس کیس کا سب سے اہم گواہ تھا۔ میں نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے دلاسہ دیا۔ اس دوران میرا سب انسپکٹر موقع کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کمرے میں جدوجہد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ یوں لگتا تھا قاتل اندر آیا اور گولی مار کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ گھر سے کوئی چیز چوری ہوئی تھی اور نہ سامان اُلٹ پلٹ کیا گیا تھا۔

میں لڑکے کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے عام دیہاتی لڑکوں کی طرح دھوتی کُرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں چمڑے کا تعویز تھا۔ کچھ دیر تسلی تشفی کی باتیں کرنے کے بعد میں نے لڑکے سے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ اس نے اشکبار آنکھوں سے بتایا کہ وہ ماں کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹا تھا (وہ رمضان کے دن تھے) اس کی ماں سحری کے لیے چاول بھگونے کے بعد آئی اور اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے ماں سے کہا کہ وہ صبح روزہ رکھے گا اس لیے وہ اسے ضرور جگا دے۔ ماں نے وعدہ کر لیا لیکن امتیازی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید اسی بے یقینی کی وجہ سے نیند اس کی آنکھوں سے اُڑ گئی۔ ماں سو گئی لیکن وہ کروٹیں لیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پیشاب آ گیا۔ وہ پیشاب کرنے باہر نکلا۔ واپس آیا تو کمرے میں ایک سایہ سا گھستا نظر آیا۔ اس کے فوراً بعد دھماکے کی آواز اور ماں کی مدھم چیخ سنائی دی۔ امتیازی نے برآمدے کے اندر سے دیکھا۔ اس کی ماں بستر پر تڑپ رہی تھی اور کالے کپڑوں والا ایک شخص اس دوسری چارپائی پر جھکا ہوا تھا جہاں ایک منٹ پہلے امتیازی خود سو رہا تھا۔ وہ شخص اب امتیازی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ موت امتیازی کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف لپکنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کالے کپڑوں والا باہر نکل آیا۔ امتیازی گھبرا کر اناج والی کوٹھڑی میں چھپ گیا..... اور صبح تک چھپا رہا۔

میں نے لڑکے سے مختلف سوال بھی پوچھے۔ اس نے بڑی اچھی طرح جواب دیئے۔ حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سمجھداری کی باتیں کرتا تھا۔ شاید یہ اس یتیمی کا اثر تھا جو چار سال پہلے اس کے حصے میں آ چکی تھی۔ باپ کے بعد اب ماں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب ایک بن ماں باپ کا بچہ تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ ماں بیٹا گھر میں اکیلے ہوتے تھے۔ باہر کے دروازے اور کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر سوتے تھے۔ لالٹین بھی ساری رات جلتی رہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ حملہ آور کی شکل ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کالی پگڑی میں چھپا رکھا تھا تاہم اس کی پیشانی اور آنکھوں کو دیکھ کر شک پڑتا تھا کہ وہ سرداروں کا آدمی ہے۔

میں نے لڑکے سے پوچھا ''یہ سردار کون ہیں؟''

لڑکے نے کہا ''وہی جی جنہوں نے میرے

اپنے کو قتل کیا تھا۔ سرداروں کا بڑا لڑکا ماکھا بھی کالے رنگ کا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور ماتھا اونچا ہے۔ کیا پتہ اسی نے میری ماں کو گولی ماری ہو۔"

اس موقع پر میں نے ضروری سمجھا کہ نمبردار امداد علی اور لڑکے کے سرپرست اس کے تایا رمضان سے کچھ بات چیت کروں۔ میں نے لڑکے کو بھیج کر ان دونوں کو اندر بلایا اور ان سے پوچھا کہ یہ سرداروں کا کیا چکر ہے اور نور محمد کے قتل کی کیا وجہ تھی۔ میرے اس سوال کے جواب میں نمبردار نے کہا.....

"جناب! یہ کوئی چار سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت آپ اس تھانے میں نہیں پہنچے تھے۔ ان دنوں سردار چھمن سنگھ کا بڑا زور تھا۔ اردگرد کے دیہات میں سب اس سے ڈرتے تھے۔ اس کی زمین بھی کافی تھی اور اولاد بھی جوان تھی۔ اس نے گاؤں سے باہر ایک بڑا شاندار ڈیرہ بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھی دیسی یا ولایتی افسر شیر تیتر کا شکار کھیلنے آتے تھے تو اس کے ڈیرے پر ٹھہرتے تھے۔ اس ڈیرے کو سرداروں کا ڈیرہ کہا جاتا تھا۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے "سرداروں" کا زور ٹوٹ گیا۔ چھمن سنگھ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے بیٹے زمین کی تقسیم پر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ چھمن سنگھ کے ایک بیٹے ماکھا سنگھ کے کھیت نور محمد کے کھیت کی حد سے ملتے تھے۔ پٹواری نے پیسے کھا کر حد کی غلط نشاندہی کر دی۔ ماکھا سنگھ اور نور محمد میں جھگڑا ہو گیا جس کا نتیجہ مسلح لڑائی کی صورت میں نکلا۔ اس لڑائی میں سرداروں کا ایک اور ہمارے دو بندے قتل ہوئے جن میں ایک نور محمد بھی تھا۔ اس کی موت کا سب کو سخت صدمہ ہوا۔ کیس چلا..... لیکن ماکھا رہا ہو کر گھر آ گیا....."

اب میں سمجھ گیا کہ لڑکے امتیازی نے جس "ماکھے" کا ذکر کیا ہے وہ کون ہے۔ میں نے نمبردار سے پوچھا.....

"جس دشمنی کی تم بات کر رہے ہو اس کا اس قتل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"بہت گہرا تعلق ہے جی۔" لڑکے کے تایا رمضان نے جواب دیا۔ "یہ دشمنی کوئی ختم نہیں ہو گئی۔ چل رہی ہے اور پتہ نہیں کب تک چلتی رہے گی۔ امتیازی کی ماں نے سارے گاؤں کے سامنے کہا تھا کہ میں اپنے پُتر کو صرف اس لیے پال پوس رہی ہوں کہ وہ بڑا ہو کر اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے۔ دشمنوں کو پتہ تھا کہ ایک روز انہیں خون کا حساب دینا پڑے گا۔ اس لیے انہوں نے نور محمد کی نسل ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ماکھا سنگھ یا اس کے کسی ساتھی کا کام ہے۔ ہمارا پرچہ ماکھا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ہے۔"

امتیازی کا تایا بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "بھلے مانس! اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔ جب تک ٹھوس ثبوت نہ مل جائے کوئی بات بھی آخری نہیں ہوتی۔ تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟"

امتیازی کا تایا بولا "جناب اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو گا۔ ہمارے کاکے نے اسے صاف پہچان لیا ہے۔ وہ ماکھے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جی۔"

میں نے کہا "کاکا تمہارا تو صرف اتنا کہہ رہا ہے کہ گولی چلانے والے کا چہرہ پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں صرف بندے کی آنکھیں دیکھ کر اسے پہچانا نہیں جا سکتا۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ ماکھے کے علاوہ تم اور کس پر شک کر سکتے ہو؟"

وہ ڈھٹائی سے بولا کہ جی ہمیں کسی اور پر شک نہیں۔

میں نے پوچھا کہ مقتولہ کا ہمسایہ اشفاق کیسا آدمی ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں نمبردار اور رمضان نے اسے اچھا آدمی قرار دیا۔

میں نے کہا ''تمہارے اس اچھے آدمی نے غلط بیان کیوں دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قتل کی خبر سات ساڑھے سات بجے تک لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ آخر ہم بھی گاؤں میں رہتے ہیں۔ اگر یہ خبر ساڑھے سات بجے گاؤں میں گردش کر رہی تھی تو مجھ تک کیوں نہیں پہنچی۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ کم از کم ساڑھے آٹھ بجے تک اس خبر کو راز رکھا گیا ہے اور اشفاق کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ اس نے لاش دیکھنے کے بعد سات بجے ہی گلی میں نکل کر شور مچا دیا تھا۔''

نمبردار کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ کچھ دیر سر کے بال کھجانے کے بعد بولا ''تھانیدار جی! دائی سے پیٹ نہیں چھپایا جاتا۔ میں بھی آپ کو ساری بات سچ سچ بتا دینا چاہتا ہوں..... آپ کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نو بجے تک اس واقعے کی خبر گاؤں میں کسی کو نہیں تھی۔ صرف اشفاق اور اس کی بیوی کو معلوم تھا کہ ہاجرہ قتل ہو چکی ہے اور کمرے میں اس کی لاش پڑی ہے۔ وہ امتیازی کو بھی اناج والی کوٹھڑی سے ڈھونڈ چکے تھے اور وہ ان کے گھر میں تھا۔ یہ خبر اشفاق نے کسی بدنیتی کی وجہ سے نہیں چھپائی۔ وہ صرف تھانے اور پولیس کے چکر سے ڈر رہا تھا۔ ساڑھے سات سے لے کر ساڑھے آٹھ بجے تک وہ میری حویلی میں بیٹھا رہا ہے تاکہ میں آؤں اور وہ مجھے ساتھ لے کر آپ کی طرف آئے۔ وہ پولیس سے بہت ڈرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی تھانے نہیں آ رہا تھا۔''

نمبردار کی باتوں میں مجھے سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی مگر کچھ بھی تھا اشفاق نے جھوٹ بول کر خود کو میری نظروں میں مشکوک کر لیا تھا..... ایک دو گھنٹے میں، میں نے بہت سے لوگوں کے بیان قلمبند کیے۔ ان میں پہریداروں کے علاوہ مقتولہ کے ہمسائے اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ قتل اسی دشمنی کا نتیجہ ہے جس کے سبب چار سال پہلے امتیاز کے باپ نے جان سے ہاتھ دھوئے تھے۔ صرف ایک شخص اللہ رکھے نے ذرا مختلف بیان دیا تھا۔ اس نے کہا کہ رات پچھلے پہر وہ اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ کوئی ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ اس نے دو گھڑ سواروں کو دیکھا جو گاؤں کی طرف سے آ رہے تھے۔ وہ کافی جلدی میں لگتے تھے کیونکہ کچی سڑک پر پہنچنے کے لیے انہوں نے اصل راستہ چھوڑ کر گھوڑے کھیتوں میں ڈال دیئے۔ گھوڑے جب اللہ رکھا کے کھیت میں سے گزرنے لگے تو اس نے انہیں للکارا۔ جواب میں ایک گھڑ سوار نے اسے بڑی ناقابل برداشت گالی دی۔ گالی سن کر اللہ رکھا آگ بگولا ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی لے کر گھڑ سواروں کے پیچھے لپکتا اس کے ایک ساتھی نے اسے پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولا ''رہنے دے یار! یہ تو مجھے شاہیا لگتا ہے۔'' شاہیے کا نام سن کر اللہ رکھا بھی کانپ گیا کیونکہ شاہیا علاقے کا مشہور نقب زن تھا۔ چور ہونے کے علاوہ غنڈہ گرد بھی تھا اور کئی لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا تھا..... وہ گالی کھا کر خاموش ہو گیا اور دونوں گھڑ سوار اس کے کھیت سے گھوڑے بھگاتے نکل گئے۔ بعد میں اللہ رکھا اپنے ساتھی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ دونوں کا خیال تھا کہ اگر یہ شاہیا تھا تو ضرور کوئی واردات کر کے آیا تھا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ واردات انہی کے گاؤں میں کی گئی ہو..... اللہ رکھا کو فکر لگ گئی۔ وہ اسی وقت گاؤں آیا اور اپنے بیوی بچوں کو دیکھ کر گیا..... بعد ازاں صبح نو دس بجے انہیں خبر ملی کہ

نور محمد کی بیوہ قتل ہوگئی ہے۔

اللہ رکھا نامی اس شخص کا بیان بے حد اہم تھا۔ میرا اپنا اندازہ بھی کہتا تھا اور مقتولہ کے بیٹے نے بھی بیان دیا تھا کہ قتل آدھی رات کے بعد ہوا۔ پراسرار گھڑسوار بھی رات کے اسی حصے میں دکھائی دیئے۔ عین ممکن تھا کہ ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق ہو۔ میں نے اللہ رکھا اور اس کے ساتھی سے پوچھا کہ گھڑسواروں کے کپڑے کیسے تھے۔ وہ دونوں اس سوال کا ٹھیک جواب نہ دے سکے۔ اللہ رکھا نے کہا کہ ان دونوں نے کھیس یا چادر کی بکلیں مار رکھی تھیں، اور ان میں سے ایک کی شلوار کسی گہرے رنگ کی یا کالے رنگ کی تھی۔

اللہ رکھا کے بیان کے بعد میں نے مقتولہ کے وارثوں سے شاہیے کا ذکر کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا یہ لوگ شاہیے کے بارے میں پہلے سے جانتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اسے خاص طور پر نہیں جانتا تھا..... ہاں نام سب نے سُن رکھا تھا..... سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر شاہیا یا کوئی اور جرائم پیشہ شخص گھر میں داخل ہوا ہے تو اس نے صرف ہاجرہ کو قتل کرنے پر بس کیوں کی۔ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ کیوں نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ مقتولہ کے کانوں کی بالیاں بھی محفوظ رہیں۔ اسے موقع نہیں مل سکا یا وہ چوری کی نیت سے آیا ہی نہیں تھا۔ بہت سے سوال ذہن میں سر اُٹھانے لگے..... میں نے مقتولہ کے ہمسایوں اور پہریداروں سے ایک سوال خاص طور پر پوچھا تھا اور وہ یہ کہ کیا انہوں نے رات کے کسی حصے میں دھماکے کی آواز سُنی۔ اتفاقاً ان میں سے کوئی بھی یہ آواز نہیں سُن سکا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ سردیوں کا موسم تھا اور سب لوگ بند کمروں میں لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ نیند میں آدمی ویسے بھی معمولی بات پر توجہ نہیں دیتا۔

.....

تفتیش کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے ماکھا سنگھ سے رابطہ قائم کیا۔ ہاجرہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجواتے ہی میں نے ایک اے ایس آئی کو ساتھ والے گاؤں ''سوپور'' روانہ کر دیا تھا۔ ماکھا سنگھ اور اس کے بھائی سوپور میں رہتے تھے۔ تقریباً تین بجے سہ پہر اے ایس آئی ماکھا سنگھ کو لے کر تھانے آ گیا۔ ماکھا ایک اونچا لمبا سکھ تھا۔ ماتھے پر کلہاڑی یا کسی اور آلے کا نشان تھا۔ اس کے کندھوں سے پستول لٹک رہا تھا۔ ظاہر ہے لائسنس یافتہ ہوگا ورنہ وہ اسے تھانے لانے کی جرأت نہ کرتا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی دی۔ میں نے ماکھے سے پوچھا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''جناب! میں اپنے گاؤں میں تھا۔''

میں نے پوچھا ''رات گیارہ اور تین بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟''

وہ بولا ''میں ساری رات گاؤں کے دائرے میں تھا۔ وہاں ہم نے ''بولی والے'' کو بلایا ہوا تھا۔ گاؤں کے سارے مرد وہاں موجود تھے۔''

میں نے پوچھا ''یہ ''بولی والا'' کون ہے؟''

ماکھا میری بے خبری پر حیران ہوا۔ بولا ''بولی والا بڑا زبردست گویا ہے جی..... آلے دوالے کے سارے گاؤں اسے جانتے ہیں۔ مرزا صاحباں پڑھتا ہے۔ سننے والے مست ہو جاتے ہیں۔ رات وہ ہمارے گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ میں بھی اسے سننے کے لیے گیا تھا۔ گیا تو صبح ہی واپس آ سکا۔''

میں نے پوچھا ''تم کہنا چاہتے ہو کہ کل ساری رات تم دائرے میں رہے تھے؟''

''بالکل جناب!'' ماکھے نے جواب دیا۔ ''ایک درجن بندے اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں۔''

"تو پھر ہاجرہ کیسے قتل ہوگئی؟"

میرے سوال نے ماکھے کو گڑبڑانے پر مجبور کر دیا..... اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور بولا "مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے تھانیدار صاحب۔ پر اگر آپ کے دماغ میں ہے کہ اس موت میں میرا ہاتھ ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ میں نورمحمد کی بیوی کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ جو ہوا وہ بھی اچانک ہوا اور اس میں میرا ہاتھ نہیں تھا۔ نورمحمد نے طیش میں آکر میرے ایک چاچے کو کلہاڑی ماردی تھی۔ بس اسی بات سے لڑائی شروع ہوگئی۔ دونوں طرف سے کلہاڑیاں اور لاٹھیاں نکل آئیں اور آپ کو پتہ ہی ہے کہ جب ایک بار لڑائی شروع ہو جائے تو....."

"دیکھو! مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے تیزی سے ماکھے کی بات کاٹی۔ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیوں نہ تمہیں اس قتل کے شبے میں گرفتار کر لیا جائے۔"

چند لمحوں کے لیے ماکھے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مجھے نہیں پتہ جی آپ یہ بات کیوں کر رہے ہیں لیکن میرا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نورمحمد کے گھر سے اب تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"دشمنی تو تھی جی۔ اور نورمحمد کی بیوی بڑی بڑی باتیں بھی کرتی رہتی تھی، لیکن میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اب پہل ہماری طرف سے نہیں ہوگی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے نورمحمد کے وارثوں سے صلح کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے نورمحمد کے ایک رشتے دار سے کہا تھا کہ میں زمین کا معاملہ گل بات سے طے کرنے کے لیے تیار ہوں اور اگر نورمحمد کی بیوہ چاہے تو نورمحمد کی موت کا ہرجانہ بھی بھر دوں گا لیکن ان لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میری اس کوشش کو بزدلی سمجھا۔ نورمحمد کی بیوہ نے کہا کہ میں پتر کو صرف اس لیے پال پوس رہی ہوں کہ وہ ماکھے کی گردن پر چھری چلائے گا۔

میں نے کہا "اور تم نے یہ سوچ کر کہ کل کو میری گردن پر چھری چلے گی، ہاجرہ اور اس کے بیٹے کا ٹینٹا ختم کرنے کی کوشش کی۔"

ماکھا بولا "آپ کو حق ہے جی..... آپ شک کر سکتے ہیں لیکن جو سچ ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔"

میں نے ماکھے کو تو تھانے میں بٹھایا اور اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ واپس "سوپور" روانہ ہو جائے۔ وہ روانہ ہوا ہی تھا کہ سوپور سے ماکھے کا چاچا دو تین تگڑی سفارشیں لے کر پہنچ گیا۔ یہ لوگ ہر صورت ماکھے کو چھڑانا چاہتے تھے۔ ماکھے کے چاچے کا کہنا تھا کہ کل رات ماکھا صبح تک دائرے میں رہا ہے اور اس بات کی گواہی آدھا گاؤں دے سکتا ہے۔

وہ لوگ دائرے والی بات پر جتنا زور دے رہے تھے میرے دل میں اتنا ہی شک پیدا ہو رہا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض مجرم موقع سے عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے جان بوجھ کر خود کو گواہوں کے درمیان رکھتے ہیں۔ میں نے سفارشیوں سے صاف کہہ دیا کہ فی الحال میں ماکھے کو نہیں چھوڑ سکتا، ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سے مار پیٹ نہیں ہوگی..... ابھی ماکھے کے حمایتی تھانے میں ہی بیٹھے تھے کہ میرا اے ایس آئی سوپور سے ہو کر واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔ میں نے اس سے تنہائی میں جا کر بات کی۔ اے ایس آئی نے بتایا کہ یہ بات تو صحیح ہے کہ کل رات گاؤں میں گانے بجانے کی محفل

تھی اور ماکھا بھی وہاں موجود تھا لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ ساری رات گاؤں سے باہر نہیں نکلا۔ اس محفل میں زیادہ تر سکھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رات بارہ بجے ایک شخص شراب کے بھرے ہوئے دو مٹکے لے آیا۔ سب نے پیالے بھر بھر کر نشہ کیا اور مستی میں بھنگڑا ڈالنے لگے اور غل غپاڑہ کرنے لگے پھر دو ٹولیاں آپس میں لڑ پڑیں اور صبح تک گاؤں کی گلیوں میں شور شرابہ ہوتا رہا۔ ایسے میں اگر ماکھا سنگھ اکیلا یا اپنے کسی ساتھی کے ساتھ قتل کی نیت سے ہمارے گاؤں آ گیا ہو تو کسی کو کیا پتہ چلا ہوگا۔

اے ایس آئی کی بات قابل غور تھی۔ نشہ تو ویسے بھی بُری چیز ہے پھر سکھ نے کیا ہو تو سونے پر سہاگہ۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ نشے میں دھت ہو کر ماکھے کو کوئی پرانا زخم یاد آ گیا ہو اور وہ رائفل لے کر ہاجرہ اور اس کے بیٹے پر چڑھ دوڑا ہو۔

اے ایس آئی نے کہا "جناب! ایک اور بڑی خاص بات معلوم ہوئی ہے۔ اس بات کی تصدیق گاؤں کے دو آدمیوں نے کی ہے۔ ان میں ماکھے کا ایک رشتے دار بھی شامل ہے۔ ان لوگوں سے پتہ چلا ہے کہ رات کی محفل میں مشہور نقب زن شاہیا بھی موجود تھا۔ شاہیا ماکھے کا لنگوٹیا رہا ہے لیکن جب سے شاہیے نے رسہ گیری اور چوری چکاری شروع کی ہے وہ دونوں سرعام زیادہ نہیں ملتے۔ رات گاؤں کے لوگوں نے بہت دنوں بعد دونوں کو اکٹھے دیکھا تھا۔ وہ پاس پاس بیٹھے بولیاں سنتے رہے پھر جب بھنگڑے کا دور چلا تو دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بھنگڑا ڈالا اور نشے میں للکارے مارتے رہے....."

اے ایس آئی کی یہ آخری اطلاع واقعی اہم تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کاشتکار اللہ رکھا نے جو بیان دیا وہ سو فیصد درست تھا۔ رات پچھلے پہر اس کے کھیت میں سے گزرنے والے گھڑسواروں میں سے ایک شاہیا تھا.....اور دوسرا..... عین ممکن تھا کہ ماکھا سنگھ ہو۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ کیس بہت جلد حل ہو جائے گا۔ اگر کھیت سے گزرنے والے واقعی ماکھا اور شاہیا تھے تو نوے فیصد امکان تھا کہ یہ قتل انہوں نے ہی کیا ہے۔ وہ نہ صرف ہمارے گاؤں کی طرف سے آئے تھے بلکہ وقت بھی وہی تھا۔ وہ دونوں اتنی جلدی میں تھے کہ انہوں نے اللہ رکھا کے کھیت میں سے اپنے گھوڑے گزار دیئے..... اے ایس آئی کی اطلاع کے بعد میں نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے کسی کی سفارش بھی آ جائے میں نے ماکھا سنگھ کو نہیں چھوڑنا۔ اس کے علاوہ میں نے شاہیے کی تلاش کے لیے بھی اے ایس آئی کو مشورے کے لیے بلا لیا۔

.....

پہلے ماکھا سنگھ کو نرمی سے سمجھایا بجھایا گیا لیکن اس نے شاہیا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ مجبوراً اسے پھینٹی لگانا پڑی۔ کافی مار کھانے کے باوجود وہ یہی کہتا رہا کہ اسے شاہیے کے ٹھکانے کا کچھ پتہ نہیں اور نہ ہی وہ اس رات شاہیے کے ساتھ کہیں گیا تھا۔

پوچھ گچھ کے دوران ماکھے نے یہ بھی کہا کہ اس قتل میں بجن پیر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بجن پیر کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ علاقے میں لوگ اس نوجوان پیر کو بہت مانتے تھے اور اسے دم درود اور جھاڑ پھونک کا ماہر سمجھتے تھے۔ میں نے ماکھے کا گریبان پکڑ کر اور جھنجھوڑ کر پوچھا "بجن پیر کا اس قصے سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق ہے جی۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اور نور محمد کی بیوہ کو آپ اتنی..... شریف عورت بھی نہ سمجھیں۔ ہم سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ خود

ہی چپ رہیں تو دوسری بات ہے۔"

ملزم اپنی جان بچانے کے لیے عموماً اُلٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہیں۔ مجھے شک ہوا کہ ماکھا سنگھ تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے بے پر کی اُڑا رہا ہے پھر بھی اس کی بات سننا ضروری تھا۔

میں نے پوچھا "ہاں..... بتاؤ کیا بُرائی دیکھی تھی تم نے مقتولہ میں؟"

وہ بولا "یہ بات میں زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا اور ویسے بھی مرنے والے کی بُرائی نہیں کرنی چاہیے لیکن ہاجرہ کے وارثوں نے میرے خلاف پرچہ کٹا کر کھلی جنگ شروع کر دی ہے۔ وہ میری گردن پھانسی کے پھندے میں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس میں انہیں کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "ماکھے! میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ کیا بُرائی نظر آئی تھی تمہیں ہاجرہ میں؟"

ماکھے نے جواب دیا "آپ یہ نہ سمجھیں جی کہ میں الزام لگا رہا ہوں۔ آپ اپنے طور پر تصدیق کرا سکتے ہیں۔ گاؤں کے کئی لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی اور کوئی نہ کوئی ضرور سچی بات آپ کو بتا دے گا..... شوہر کی موت کے بعد ہاجرہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اس نے جھاڑ پھونک کے لیے انت نگر، بجن پیر کے پاس جانا شروع کر دیا۔ پانچ چھ مہینے بعد وہ تندرست ہوگئی لیکن بجن پیر کے پاس آنا جانا جاری رہا۔ یہ معاملہ بڑھتا گیا اور کبھی کبھی بجن پیر نے بھی ہاجرہ کے گھر آنا اور رات رہنا شروع کر دیا۔ ایک جوان بیوہ عورت کے گھر ایک جوان مرد کا رات رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے جی۔ سمجھدار لوگ اُنگلیاں اٹھانے لگے تو ہاجرہ کے وارثوں نے اسے سختی سے سمجھایا اور ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس کے بعد ہاجرہ نے پیر کے پاس آنا جانا بند کر دیا..... لیکن مجھے پورا وشواس ہے جی کہ یہ معاملہ ختم نہیں ہوا تھا اور اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہاجرہ کو گولی مارنے والا بجن پیر ہی ہو....."

ماکھے نے بڑی ہوشیاری سے میرے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے اس شک کو رفع کیا جائے۔ میں نے اس کام کے لیے اپنے مخبر بلال شاہ کو مقرر کیا اور اسے کہا کہ وہ بجن پیر اور مقتولہ ہاجرہ کے معاملے کا پتہ چلائے..... بلال شاہ نے طوفانی انداز میں کام کیا اور بارہ گھنٹے کے اندر اندر اس بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ شام کے پانچ بجے جب میں تھانے میں بیٹھا بلال شاہ کی راہ ہی دیکھ رہا تھا وہ جھومتا جھومتا تھانے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی..... عورت کچھ خوفزدہ تھی۔ بلال شاہ نے بڑی محبت سے کہا "ماسی ادھر بیٹھو کرسی پر۔ یہ تھانیدار صاحب بڑے بھلے بندے ہیں۔ بالکل مکھن کی طرح ملائم ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ان سے ڈرنے کی۔"

اس نے عورت کو کندھوں سے سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور سنتری کو حکم دیا کہ سامنے حلوائی کی دکان سے دو پاؤ گرم گرم دودھ لے کر آئے۔

میں نے کہا "کیا بات ہے اماں کہیں گر گئی ہے جو اسے گرم دودھ پلا رہے ہو؟"

وہ بولا "نہیں جی۔ دودھ تو میں نے اپنے لیے منگوایا ہے ماسی کے گھر تھوڑی سی جلیبیاں کھا لی تھیں، گلے میں کھرکھری سی لگی ہوئی ہے۔"

میں صبر کا گھونٹ بھرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ آخر وہ "کام" کر کے آیا تھا۔ اس نے اماں کے بارے میں بتایا کہ "ماسی" رشتے کرانے والی عورت ہے۔ گاؤں کے ہر گھر کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ ہاجرہ کے گھر اس کا کافی آنا جانا تھا۔

میں نے اماں کی شکل دیکھی۔ اپنی طرح کی

دوسری عورتوں کے برعکس وہ خاصی بھلی مانس اور معقول لگتی تھی۔ اس نے چادر سے سر کے بال اچھی طرح ڈھانپ رکھے تھے۔ بات چیت میں بھی اس نے دھیما لہجہ اختیار کیا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ آج سے ایک ڈیڑھ برس پہلے تک ہاجرہ کا بجن پیر کی طرف آنا جانا تھا اور ایک مرتبہ بجن پیر بھی اس کے گھر مہمان ٹھہرا تھا مگر اس کے بعد جب گاؤں میں باتیں نکلیں تو ہاجرہ نے بجن پیر کے پاس جانا بند کر دیا اور اس کے بعد کبھی وہ انت نگر نہیں گئی اور نہ ہی بجن پیر اس گاؤں میں نظر آیا۔ اماں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"پتر جی! اللہ کو جان دینی ہے۔ کسی کی بہو بیٹی کے بارے غلط بات کر کے میں اپنے لیے آگ اکٹھی نہیں کر سکتی۔ مجھے تو اللہ بخشے ہاجرہ میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئی۔ وہ صرف اپنے علاج کے لیے پیر کے پاس جاتی تھی اور دل سے اس کی عزت کرتی تھی۔ اگر پیر کے دل میں کوئی غلط بات آ گئی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دلوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے مجھے اتنا پتہ ہے کہ وہ لاج شرم والی تھی۔ اور جب اس نے سنا کہ لوگوں نے باتیں کی ہیں تو وہ بڑی شرمندہ ہوئی اور اس نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ اب وہ مرتی مر جائے گی لیکن پیر کے پاس علاج کے لیے نہیں جائے گی۔"

ماکھے نے کچھ اور بتایا تھا اور اماں کی بات اس واقعے کا دوسرا رُخ پیش کر رہی تھی۔ میں نے اماں سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ بجن پیر کیسا آدمی ہے؟"

میرے اس سوال نے مائی کو گڑبڑا دیا۔ وہ سر پر چادر درست کر کے بولی "وہ دیکھنے میں تو ٹھیک ہی لگتا ہے پر کسی کے دل کا کیا پتہ....."

میں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی، اور اس کے پاس عورتیں بہت آتی ہیں۔"

اماں بولی "ہاں۔ عورتیں تو اسے بہت مانتی ہیں۔"

عورت کے جوابات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی بجن پیر کے کردار پر شک کرتی ہے تاہم وہ یہ بات کھل کر زبان پر نہیں لا رہی تھی..... میں اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ حالات میں میرا بجن پیر سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

بوڑھی عورت کو میں نے رازداری کا پابند کر کے واپس بھیج دیا اور بلال شاہ سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ کل پچھلے ٹائم ہم دونوں اس "بجن پیر" سے ملنے انت نگر جائیں گے۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ شہر سے مقتولہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ یہ بڑی تفصیلی رپورٹ تھی۔ پولیس سرجن کوئی قابل آدمی لگتا تھا۔ اس نے ایک ایک بات پر وضاحت سے روشنی ڈالی تھی۔ خاص طور پر گولی کے زخم کا اس نے بہت تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ زخم کی پوری پیمائش، رُخ، گہرائی اور نوعیت، ہر چیز بیان کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ گولی تقریباً آٹھ دس فٹ کی دُوری سے چلائی گئی۔ اس کا مطلب ہے گولی چلانے والا کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ جس وقت فائر ہوا متوفیہ اپنے بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ جس زاویے سے گولی متوفیہ کے جسم میں داخل ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حملہ آور زیادہ لمبے قد کا نہیں تھا یا پھر اس نے بیٹھ کر گولی چلائی ہے۔ یہی بات اس دوسری گولی کے سوراخ سے ثابت ہوئی ہے جو دیوار میں لگی تھی۔ اس سوراخ کا زاویہ میرے اندازے کے مطابق ۳۰ درجے سے کم نہیں ہونا چاہیے تھا.....

اس کے علاوہ انگریز سرجن نے اور بھی بہت سی

تفصیلات لکھی تھیں۔ وقوعہ کا وقت اس نے رات گیارہ اور تین بجے کے درمیان بتایا تھا۔ اس کے معائنے کے مطابق بارہ بور کی گولی متوفیہ کی چھاتی کے بائیں جانب نیچے سے سینے میں داخل ہوئی تھی اور پھیپھڑا پھاڑ کر پچھلی پسلی میں جا اٹکی تھی۔ یہ ایک مہلک زخم تھا اور اس سے دو تین منٹ کے اندر موت واقع ہوگئی تھی۔ اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا۔ ماکھا سنگھ اور شاہیے میں سے کوئی بھی چھوٹے قد کا نہیں تھا۔ دونوں دراز قد اور چوڑے چکلے تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی نے گولی چلائی تھی تو پھر پولیس سرجن کی رپورٹ کیا معنی رکھتی تھی۔ اچانک میرا دھیان اشفاق کی طرف چلا گیا۔ مقتولہ کا ہمسایہ مشتاق چھوٹے قد کا تھا۔ مشکل سے سوا پانچ فٹ کا ہوگا پھر اس نے بیان بھی بڑا اُلٹا پلٹا دے رکھا تھا۔ میں سوچنے لگا کہیں پولیس سرجن کی رپورٹ اشفاق کی طرف تو اشارہ نہیں کر رہی۔ بہرحال اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس خیال سے سوچ بچار ترک کر دی کہ پہلے اس کہانی کے ایک اہم کردار بجن پیر سے ملاقات کر لی جائے۔

.....

بجن پیر کا ڈیرا انت نگر گاؤں سے باہر ہی تھا۔ نیم اور جامن کے درختوں سے گھرا ہوا ایک جھونپڑا نما کچا مکان تھا۔ مکان کے آگے ایک وسیع احاطہ تھا جس میں قطار اندر قطار بہت سے مٹکے رکھے ہوئے تھے اور عقیدت مندوں کے بیٹھنے کے لیے چبوترہ سا بنا ہوا تھا تاہم جب میں اور بلال شاہ پہنچے احاطہ ویران نظر آیا صرف مکان کے دروازے پر دو بوڑھی عورتیں سر جھکائے بیٹھی تھیں اور ایک لمبا تڑنگا شخص لاٹھی لیے پہرہ دے رہا تھا۔ میں اور بلال شاہ بھاتیوں کے لباس میں تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے دونوں نے گرم چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں۔ چہروں کا بس تھوڑا سا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ لاٹھی بردار شخص کے قریب پہنچ کر میں نے بلال شاہ کو آگے کر دیا۔ بلال شاہ نے لاٹھی بردار سے کہا کہ ہم پیر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔

اس نے گردن اکڑا کر کہا ''اللہ لوکو! آج ملاقات کی چھٹی ہے کل دوپہر کے بعد ملاقات کھلے گی۔''

بلال شاہ منت کرنے لگا کہ ہم بہت دُور سے آئے ہیں۔ ہمارا ملنا بہت ضروری ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ شخص اپنا سر مسلسل دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بھی آ گیا تھا اور اب وہ دونوں ہمیں دھکے دینے کی فکر میں تھے۔ اتنے میں ایک جوان لڑکی آئی۔ اس نے بوسکی کی چادر سے کانا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ چال ڈھال سے وہ بڑی تیز لگتی تھی۔ آتے ساتھ ہی اس نے سُریلی آواز میں پوچھا ''پیر جی ہیں؟''

لاٹھی بردار نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فوراً اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ چادر کے اندر کولہے مٹکاتی خراماں خراماں اندر چلی گئی۔

بلال شاہ نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

''چھٹی ہے تو اس کو کیوں اندر جانے دیا ہے؟''

ایک لاٹھی بردار نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''اس کی بات چھوڑو۔ وہ جا سکتی ہے۔''

دونوں لاٹھی بردار ایک دوجے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کا یہ انداز بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

بلال شاہ کو تاؤ آ گیا۔ کڑک کر بولا ''ہم نہیں جا سکتے تو وہ کیوں جا سکتی ہے۔ پھوپھی لگتی ہے تمہاری؟''

ایک لاٹھی بردار نے بلال شاہ کا گریبان پکڑ لیا..... ''اوئے منہ سنبھال کر بات کر نہیں تو دانت

ہتھیلی پر رکھ دُوں گا۔"

بلال شاہ کا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اب وہ ایک شاندار گالی پہریدار کی خدمت میں پیش کرے گا اور اس سے لپٹ جائے گا۔ ایسا ہی ہونا تھا کیونکہ میں ایسا ہوتے بارہا دیکھ چکا تھا۔ میں لپک کر ان دونوں کے درمیان آ گیا اور سر سے چادر اُتار کر اپنا تعارف کروایا کہ میں رام پورہ تھانے کا ایس ایچ او ہوں۔ پہریداروں میں سے ایک مجھے پہچان گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر دوسرے پہریدار نے بھی بلال شاہ کا گریبان چھوڑ دیا..... چند منٹ بعد ہم مکان کے ایک کمرے میں بجن پیر کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ مناسب قد کاٹھ کا ایک پرکشش شخص تھا۔ اگر خدا لگتی بات کی جائے تو وہ ایک شاندار شخص تھا۔ سرخ و سفید رنگت، حسین چہرہ، کالی ڈاڑھی، شانوں پر لہراتی ہوئی چمکیلی زلفیں، اس نے سیاہ تہبند پر سیاہ قمیص پہن رکھی تھی اور گلے میں بڑی خوبصورت سی مالا تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر کچھ زیادہ گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بڑے اطمینان سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے کہا "پیر جی! تمہاری ایک پرانی مریدنی کا قتل ہو گیا ہے۔ تمہارا "علم" کیا کہتا ہے اس قتل کے بارے میں؟"

وہ بولا "مجھے کل ہی پتہ چلا ہے۔ بڑا دُکھ ہوا ہے سُن کر۔ لڑکا بے چارہ بے سہارا ہو گیا۔"

میں نے کہا "مجھے پتہ چلا ہے کہ آج کل تمہاری اور ہاجرہ کی بول چال بند تھی؟"

"بول چال؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "میری تو اس سے کبھی بول چال نہیں تھی۔ بس پیری مریدی کا رشتہ تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر مجھ سے دم کرانے آیا کرتی تھی۔"

بلال شاہ نے کہا "لیکن لوگ تو کچھ اور بھی کہتے ہیں۔"

بجن پیر کا رنگ بدل گیا۔ "لوگوں کا تو کام ہی کہنا ہے جی۔ آپ کیوں یقین کرتے ہیں ایسی باتوں پر۔ اللہ نے میرے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ میرے پاس دُکھی لوگ آتے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں....."

بجن پیر کافی دیر اپنی صفائی میں بولتا رہا۔ اس کی کچھ باتوں میں وزن بھی تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے اپنی آنکھوں سے جو ایک "ٹھوس ثبوت" اس کے گھر میں جاتے دیکھا تھا اس نے ہمیں کسی بات پر یقین نہیں کرنے دیا..... میں نے بجن پیر سے مختلف سوالات پوچھے۔ ابھی سوا جواب کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ باہر سے شور و غل کی آواز سُنائی دی۔ پھر ایک ڈاڑھی والا آدمی بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں بجن پیر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"پیر جی! گٹو پہلوان کی لڑائی ہو گئی ہے۔ جلدی آئیں جی۔"

بجن پیر پہلے تو حیران ہوا پھر اس نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ غالباً ہماری موجودگی میں اسے یہ اطلاع کچھ زیادہ ہی بُری لگی تھی۔ "میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔"

اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں کہاں رُکنے والے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی باہر آئے۔ سو ڈیڑھ سو گز آگے درختوں کے جھنڈ میں ہلچل نظر آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ پانچ چھ افراد آپس میں دست و گریباں ہیں۔ ان میں کچھ بجن پیر کے آدمی تھے اور کچھ کاشتکار ٹائپ لوگ۔ ان لڑنے جھگڑنے والوں میں

ایک لمبا تڑنگا سا گنجا شخص پیش پیش تھا۔ اس نے ایک لمبے دیہاتی کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور کسی صورت چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بجن پیر جھگڑے والوں کے درمیان آ گیا اور اس نے اپنے چمٹے سے دھکیل دھکیل کر لڑنے والوں کو پیچھے ہٹایا۔ گنجا اُچھل اُچھل پڑ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ دیہاتیوں کو للکار رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''میں تمہاری زبانیں کھینچ کر کتوں کو کھلا دُوں گا۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی پیر جی کی شان میں گستاخی کرنے کی۔'' بجن پیر کے آدمیوں نے بڑی مشکل سے گنجے کو قابو کیا اور بڑی صفائی کے ساتھ اس کے ہاتھ کا چاقو غائب کر دیا۔ ہم بجن پیر کے ساتھ واپس مکان میں آ گئے۔ میرے پوچھنے پر بجن پیر نے بتایا کہ آج ملاقات کا ناغہ ہے لیکن کچھ اجڈ دیہاتی من مانی پر اُتر آتے ہیں اور میرے آدمیوں سے جھگڑنے لگ جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی کوئی ایسی ہی بات کی تھی جس کی وجہ سے جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

میں نے دل میں سوچا، اپنے مریدوں پر غنڈے چھوڑ کر تم اچھا ہی کرتے ہو۔ ایسے بیوقوفوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد ہم بجن پیر سے رخصت ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت جب میں نے بجن پیر سے کہا کہ وہ شاملِ تفتیش ہے اور تھانے میں اطلاع دیئے بغیر وہ اس گاؤں سے باہر نہیں جائے گا تو اس کا جھاڑ جیسا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے احتجاج کے طور پر کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بلال شاہ کے ساتھ باہر آ گیا۔

گاؤں کی طرف ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا۔ راستے میں بلال شاہ نے مجھے ایک اہم بات بتلائی۔ اس نے کہا ''خان صاحب! آپ نے اس بوسکی کی چادر والی کو پہچانا تھا؟'' بلال شاہ کا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو بجن پیر سے ملنے اس کے مکان میں گئی تھی۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ بلال شاہ بولا.....

''جناب وہ رحمت لوہار کی چھوٹی دھی پروین ہے۔ وہی جو شادی کے تین مہینے بعد طلاق لے کر گھر آ گئی تھی۔ اس کا باپ آپ کے پاس دعویٰ کرنے بھی آیا تھا۔''

بلال شاہ کی بات پر مجھے اس لڑکی کا نام یاد آ گیا۔ وہ ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کا گھر تھانے سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اس کے باپ کو نشے کی لت تھی اور میرے سپاہی اسے ایک دو بار پکڑ کر تھانے بھی لا چکے تھے..... جس طرح یہ لڑکی دندناتی ہوئی بجن پیر کے گھر میں گھس گئی تھی اس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ پیر جی سے اسے ''گہری عقیدت'' ہے۔ اس لڑکی سے ہمیں پیر کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

.....

اگلے روز میں تھانے میں بیٹھا اسی کیس کی بھول بھلیوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک ذہن میں اس شخص کا خیال آیا جسے بجن پیر نے گٹو پہلوان کے نام سے یاد کیا تھا اور جو کل دیہاتیوں سے مرنے مارنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز سرجن کی رپورٹ کے الفاظ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس نے صاف طور پر لکھا تھا کہ گولی چلانے والا لمبے قد کا شخص نہیں..... کہیں ہاجرہ کو قتل کرنے والے ہاتھ گٹو پہلوان کے تو نہیں تھے؟ یہ سوال پوری شدت سے میرے ذہن میں اُبھرا۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے واقعے کے چشم دید گواہ یعنی مقتولہ کے بیٹے امتیازی سے اس بارے میں پوچھنا چاہیے۔ ماں کی موت کے بعد سے لڑکے کی ذہنی

حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بالکل گم صم رہتا تھا اور کبھی زور زور سے رونے لگتا تھا۔ اسے اس کے تایا نے ایک قریبی قصبے کے ہسپتال میں داخل کرا رکھا تھا۔

میں امتیازی سے ملنے ہسپتال پہنچا تو اسے تیز بخار ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے زیادہ بات چیت مناسب نہ سمجھی۔ میں صرف ایک ہی سوال کا جواب چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا.....

''امتیازی بیٹا! جب کالے کپڑوں والے نے تمہاری ماں کو گولی ماری تو تم برآمدے میں تھے۔ وہاں سے تم نے اس شخص کو کمرے میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ تم یہ بات ذہن سے نکال دو کہ وہ تمہارے ابا کا قاتل ماکھا تھا۔ میں تمہیں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ماکھا سنگھ نہیں تھا..... مجھے صرف یہ بتاؤ کہ وہ لمبے قد کا آدمی تھا یا چھوٹے قد کا۔''

لڑکے کی آنکھوں میں خوف و ہراس نظر آ رہا تھا، جیسے ماں کی موت کا منظر پھر اس کی نظروں کے سامنے ہو۔ کچھ دیر اس کے ہونٹ لرزتے رہے پھر اس نے کہا..... ''وہ..... وہ چھوٹے قد کا نہیں تھا..... لیکن اتنا لمبا بھی نہیں تھا۔ اس کی گردن موٹی سی تھی.....''

لڑکے کا جواب میرے لیے بیکار تھا۔ اس سے کوئی بات بھی ثابت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے چند اور سوال پوچھ کر لڑکے اور اس کے تایا سے اجازت لی اور ہسپتال سے واپس آ گیا۔

اب میرا رُخ گاؤں کی طرف تھا۔ میں سب سے پہلے رحمت لوہار کی بیٹی سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ جب میں گاؤں میں داخل ہوا، بارش ہو رہی تھی۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ رحمت لوہار کے گھر جانے کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ کسی شریف آدمی کے گھر جا کر پوچھ گچھ کروں تو کم سے کم لوگوں کو اس بات کا پتہ چلے.....

میں نے رحمت کے دروازے پر دستک دی تو اس کی بیٹی نے ہی دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔ میں نے نرم لہجے میں اسے بتایا کہ اس سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ معمولی ہچکچاہٹ کے بعد وہ مجھے اندر لے گئی۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ کل بجن پیر نے اسے ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ میری آمد سے خاصی حیران ہو رہی تھی۔ اس کا باپ گھر ہی میں تھا لیکن افیم کھا کر ایک کمرے کے فرش پر لڑھکا ہوا تھا۔ میں نے پروین سے کہا کہ وہ باپ کو جگائے۔ پروین کافی دیر کوشش کرتی رہی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں نے کہا ''اچھا چلو رہنے دو۔'' میں اس کے ساتھ برآمدے میں چارپائی پر آ بیٹھا۔ میں نے دو تین منٹ میں اس پر یہ واضح کر دیا کہ مجھے اس کے اور بجن پیر کے تعلق کا پتہ ہے اور اگر وہ بجن پیر کے بارے میں کچھ چھپانے کی کوشش کرے گی تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ پروین خوفزدہ نظر آنے لگی۔ وہ شکل و صورت سے چالاک نظر آتی تھی۔ شکل بھی اچھی تھی اور جسم میں تو جیسے پارہ بھرا ہوا تھا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ لڑکی فتنے کھڑے کرنے میں ماہر ہوگی۔

میری توقع کے مطابق پروین نے بجن پیر کے ساتھ کسی بھی تعلق سے انکار کیا اور بتایا کہ ان کے درمیان صرف پیری مریدی کا واسطہ ہے۔ میں پروین کی اس بات پر کیسے یقین کر سکتا تھا۔ کل میں نے اس سلسلے میں کافی تحقیق کی تھی اور چند اور لوگوں کی زبانی بھی پتہ چلا تھا کہ رحمت لوہار کی بیٹی ہر دوسرے تیسرے دن انت نگر جاتی ہے اور اس کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔

میں نے کہا ''پروین بی بی، چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور بتانے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں

ہوگا۔ صرف میرا کچھ کام آسان ہو جائے گا۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی "پتہ نہیں کس نے آپ کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ کہیں یہ..... یہ ہاجرہ کا کام تو نہیں؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے اس کے شبے کی تصدیق کر دی۔ اندھیرے میں چھوڑا ہوا میرا یہ تیر کارگر رہا۔ ہاجرہ کا نام سن کر پروین کی آنکھوں میں ایک آگ سی روشن ہو گئی۔ وہ غصے سے بولی.....

"تھانیدار صاحب! مرے ہوئے کی بُرائی نہیں کرنی چاہیے لیکن ہاجرہ کیا تھی یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر اس میں کچھ عقل ہوتی تو میرے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتی۔ چور کو سارے ہی چور نظر آتے ہیں۔ شاید آپ کو پتہ نہیں وہ پیر جی کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ ننگے پاؤں چل چل کر ان سے ملنے جاتی تھی۔ اپنے بالوں سے ان کے جوتے صاف کرتی تھی اور فرش پر جھاڑو دیتی تھی۔ اس نے کئی بار پیر جی سے کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کر لیں یا اپنی داسی بنا کر اسے پاس رکھ لیں۔ اگر پیر جی نے اسے منہ لگایا ہوتا تو وہ اب تک ان کے کئی بچوں کی ماں ہوتی۔ میں سب کچھ جانتی ہوں جی وہ کیا چیز تھی۔ اوپر سے تسبیح اندر سے کسبی۔ ایسی ایسی باتیں سنی ہیں میں نے اس کے بارے میں کہ آپ کو بتا نہیں سکتی....."

پروین جب ایک بار شروع ہوئی تو پھر دیر تک بولتی رہی۔ عورت کا صدیوں پرانا کینہ اور حسد اس میں بھی موجود تھا۔ اس نے ہاجرہ اور بجن پیر کے بارے میں بہت سچی اور جھوٹی باتیں میرے کانوں تک پہنچا دیں۔

قارئین! آپ نے دیکھا ہوگا اس کیس کے حوالے سے مختلف لوگوں کے بیانات مختلف تھے۔ پولیس کے سامنے بیان دیتے ہوئے ہر شخص اپنے فائدے کو سامنے رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی تفتیش بے حد مشکل ہو جاتی ہے۔ اب بجن پیر اور ہاجرہ کا معاملہ ہی لیں۔ ہاجرہ کے وارثوں کا خیال تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔ رشتے کرانے والی مائی کا خیال تھا کہ ہاجرہ بے قصور تھی۔ ہو سکتا ہے بجن پیر کی نیت میں کوئی فرق ہو۔ ماکھا سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے چکر میں تھے اور بجن پیر ہاجرہ کے گھر راتیں بسر کرتا تھا۔ بجن پیر کا کہنا تھا کہ ہاجرہ صرف اس کی مریدنی تھی اور وہ صرف ایک بار اس کے گھر میں رات رہا تھا اور اب بجن پیر کی دوسری معشوقہ کا کہنا تھا کہ ہاجرہ پیر کی دیوانی تھی اور اس کی آغوش میں سمانے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ ان سارے مختلف بیانوں کے درمیان کہیں ہاجرہ پر فائر ہونے والی گولیوں کا مسئلہ بھی اٹکا ہوا تھا۔ یہ گولیاں چلانے والا کون تھا؟ شامل تفتیش سارے افراد پر شک کیا جا سکتا تھا اور سب کو بے قصور بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔ ضرورت ایک ٹھوس ثبوت کی تھی۔ جو قاتل کا چہرہ روشنی میں لائے اور قانون کی نظر اسے پہچان سکے۔ مجھے معلوم تھا، قاتل کہیں باہر سے نہیں آیا۔ وہ انہی لوگوں میں کہیں موجود ہے۔ ہمارے اردگرد کہیں گھوم رہا ہے مگر مسئلہ اسے شناخت کرنے کا تھا..... جہاں تک بجن پیر اور ہاجرہ کا تعلق ہے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان کے بارے میں کسی کا بیان بھی درست نہیں ہے۔ ان میں نہ تو بہت گہرا تعلق تھا اور نہ وہ صرف پیر مریدنی تھے۔ ان کا معاملہ ان دونوں کے درمیان درمیان تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہوں اور ان کی ملاقاتوں میں محبت کا رنگ آ گیا ہو۔ اگر ایسا تھا تو ایک اور بات بھی سوچی جا سکتی تھی اور وہ یہ کہ تقریباً ڈیڑھ سال سے ہاجرہ نے بجن پیر کے پاس آنا جانا

بالکل بند کر رکھا تھا۔ ممکن تھا کہ بجن پیر کو اس قطع تعلق کا رنج ہو۔ اس نے ہاجرہ کو پرانی ڈگر پر لانے کی کوشش کی ہو اور ناکام ہو کر قتل کر دیا ہو (اس مقصد کے لیے وہ اپنے ٹھگنے پہلوان کو بھی استعمال کر سکتا تھا۔ میں دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ ایک غصیلا اور خطرناک شخص تھا۔ اس کے علاوہ وہ بجن پیر کا وفادار بھی ضرورت سے زیادہ ہی نظر آتا تھا) میں بہت دیر اس بارے میں غور کرتا رہا۔ آخر سب انسپکٹر اور بلال شاہ وغیرہ سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ بجن پیر کو تفتیش کے لیے تھانے لایا جائے۔ یہ ایک خاصا مشکل کام تھا۔ اردگرد کے موضعات میں بجن پیر کے بہت سے عقیدت مند موجود تھے۔ کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔ ویسے اس کے دشمن بھی کم نہیں تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان مردوں کی تھی جن کی بیبیاں بجن پیر کے چکر میں پڑی ہوئی تھیں اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ غرض، اسی رات نو بجے کے قریب میرا سب انسپکٹر امداد خان گاؤں انت نگر پہنچا اور بجن پیر کو اس کے گٹو پہلوان سمیت پکڑ کر تھانے لے آیا۔

.....

اگلے روز تقریباً نو بجے صبح میں اپنے دو ہیڈ کانسٹیبلو کے ساتھ نزدیکی قصبے سوادر کا رُخ کر رہا تھا۔ میں ایک آخری نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور میری یہ روانگی مجرم کی گرفتاری کے لیے تھی۔ مجرم ایک ایسا شخص نکلا تھا جس پر میں نے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر شبہ کیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم اس ہسپتال میں پہنچ گئے جہاں ہاجرہ کا بیٹا امتیازی زیرِعلاج تھا اور اس کا تایا اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ ابھی ہم برآمدے میں ہی پہنچے تھے کہ میری نظر ہاجرہ کے ہمسائے اشفاق پر پڑی۔ وہ غالباً امتیازی کی مزاج پرسی کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بُری طرح ٹھٹکا اور تیز قدموں سے واپس مُڑ گیا۔ وہ سیدھا اس وارڈ میں داخل ہوا جہاں امتیازی کا بستر تھا، لیکن پھر فوراً باہر آ گیا اور تیزی سے ایک دوسری گلی میں مُڑ گیا۔ یقیناً بدحواسی میں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے اچانک بھاگنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اس کا پیچھا کرو اور پکڑ کر لاؤ۔ وہ اس کے پیچھے لپکے تو بھاری بوٹوں کی گونج سے ہسپتال کا برآمدہ گونج اُٹھا۔ لوگ کھڑکیوں سے منہ نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ میں ایک سپاہی کے ساتھ امتیازی والی وارڈ میں چلا گیا۔ امتیازی اور اس کا تایا بھی حیرت سے یہ ہنگامہ دیکھ رہے تھے۔ امتیازی کی حالت اب پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ اس نے آج منہ ہاتھ دھویا تھا اور لباس بھی نیا پہنا ہوا تھا۔ امتیازی کے تایا نے پوچھا۔

''تھانیدار جی! یہ کیا ہوا ہے۔ آپ کا عملہ کس کے پیچھے گیا ہے؟''

''اشفاق کے پیچھے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''وہ ہمیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا، لیکن کتنا بھاگے گا؟''

امتیازی اور اس کا تایا حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ امتیازی نے پوچھا ''تھانیدار جی، وہ کیوں بھاگا ہے۔ کیا وہ..... مجرم ہے؟''

میں نے نرمی سے کہا ''نہیں امتیازی۔ وہ مجرم نہیں ہے صرف ڈرپوک ہے۔ پولیس سے خوف کھاتا ہے۔ اس نے سمجھا کہ شاید ہم اسے پکڑنے آئے ہیں۔''

''تو پھر کون ہے مجرم؟'' امتیازی نے پوچھا۔

''تم مجرم ہو۔'' میں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''تم نے قتل کیا ہے اپنی ماں کو۔''

امتیازی نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن اگلے ہی لمحے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کی خاموشی نے بڑی سادگی سے اس کی پیشانی پر 'اعترافِ جرم' لکھ دیا..... وہ کوئی گھاگ مجرم نہیں تھا۔ ایک بارہ سالہ لڑکا تھا۔ یتیمی اور زمانے کی سختیوں نے اسے اپنی عمر سے زیادہ شعور ضرور دے دیا تھا لیکن وہ ''چالبازی'' نہیں دی تھی جو سچائیوں کو چھپا لیتی ہے۔ وہ خاموش بیٹھا تھا اس کا تایا حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی بھتیجے کو دیکھتا تھا۔

''تھانیدار جی..... یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس کا تایا ہکلایا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں خوشی محمد۔'' میں نے جواب دیا۔ ہاجرہ پر گولی چلانے والا خود امتیازی ہے۔''

مجھے لگا جیسے امتیازی کا تایا بیہوش ہو کر گر جائے گا۔

.....

تھانے میں میرا سارا عملہ بلال شاہ سمیت موجود تھا۔ مقتولہ کے دو تین رشتہ دار بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انہیں اس کیس کی تفتیش سے آگاہ کر رہا تھا۔ مقتولہ کے بارے میں بتانے سے پہلے میں نے اس کے رشتہ داروں سے کہا کہ وہ اُٹھ کر باہر چلے جائیں۔ ورنہ انہیں کچھ باتیں بہت بُری لگیں گی۔ دو آدمی تو چلے گئے لیکن ایک وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا..... یہ حقیقت ہے کہ ماکھا سنگھ وغیرہ کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں ماکھا سنگھ اور شاہیا پر شک ضرور ہوا تھا کیونکہ ایک گواہی کے مطابق واردات کی رات شاہیا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ہمارے پاس موجود تھا۔ بعد میں ہمیں شبہ ہوا کہ شاید شاہیے کا ساتھی گھڑسوار ماکھا سنگھ تھا۔ اب یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ وہ ماکھا سنگھ نہیں تھا۔ وہ شاہیے کا ایک ساتھی تجمل حسین شاہ تھا جو میزبانی کے شوق میں اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا..... خیر یہ بات تو ختم ہوئی۔ اب ہم ہاجرہ اور بجن پیر کی طرف آتے ہیں۔ شروع میں ہاجرہ علاج کی غرض سے بجن پیر کے پاس جاتی رہی لیکن جُوں جُوں اس کا جسم ٹھیک ہوتا گیا اس کے دل کو روگ لگتا گیا۔ وہ بجن پیر کی مردانہ کشش کے جال میں پھنس گئی۔ بجن پیر بھی اسے پسند کرنے لگا۔ ایک عرصے تک ان کی محبت بے زبان رہی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں چاہتے رہے لیکن محبت ایک جگہ رُکنے والی چیز نہیں۔ یہ یا تو گھٹتی ہے..... یا بڑھتی ہے۔ ہاجرہ اور بجن پیر کی محبت بھی چپکے چپکے پروان چڑھتی رہی۔ وہ عورت جو نیک نام اور شریف سمجھی جاتی تھی جس کا ایک بیٹا بھی تھا اور جو اپنے بیٹے سے محبت بھی کرتی تھی..... جب سیدھے راستے سے پھسلی تو پھر پھسلتی چلی گئی۔ پہلے آنکھوں سے باتیں ہوتی تھیں، اب آنکھوں کی جگہ زبان نے لے لی۔ وہ دونوں ایک دوجے سے ملنے کے لیے بے قرار رہنے لگے۔ انہی دنوں ایک دو بار بجن پیر ہاجرہ کے گھر بھی ٹھہرا۔ معاملہ بڑھا تو لوگوں کی انگلیاں بھی اُٹھنے لگیں۔ بات ہاجرہ کے بڑوں تک جا پہنچی اور ایک روز ہاجرہ کو بڑی سختی کے ساتھ اس بارے میں سمجھایا گیا..... معلوم نہیں ہاجرہ نے اس سمجھانے بجھانے سے کیا اثر لیا اور لیا بھی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس نے بجن پیر سے ملنا بالکل چھوڑ دیا۔ پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے پھر بجن پیر نے ہمارے ہی گاؤں کی لڑکی پروین کو شیشے میں اُتارنا شروع کر دیا۔ یہ لڑکی بھی جلد ہی بجن پیر کے جال میں آ گئی۔ عشق و محبت کی جو آنکھ مچولی پہلے ہاجرہ کے ساتھ کھیلی جا رہی تھی اب پروین کے ساتھ کھیلی جانے لگی۔ درحقیقت بجن پیر نے صرف ہاجرہ کو جلانے اور ستانے کے لیے یہ کھیل شروع

تھا۔ وہ ہاجرہ میں رقابت کا جذبہ جگا کر اس کے دل میں اپنی محبت زندہ رکھنا چاہتا تھا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ ہاجرہ جو پہلے بھی بجن پیر کو بھلا نہیں سکی تھی اب اور تڑپنے لگی۔ وہ دیکھتی کہ پروین بن ٹھن کر انت نگر کا رُخ کر رہی ہے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ وہ پروین کی ساری ادائیں اچھی طرح سمجھ رہی تھی.....

یہ کشمکش ایک عرصہ جاری رہی۔ آخر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہاجرہ نے پھر انت نگر کا رُخ کیا۔ بجن پیر اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پردے کی اوٹ میں ہاجرہ کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر بجن پیر کو اپنی جیت کا یقین ہو گیا۔ دونوں بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ شکوے گلے ہوئے۔ شکایتیں سنی اور سنائی گئیں۔ بجن پیر نے ہاجرہ سے وعدہ کیا کہ وہ چند دن بعد ایک مقررہ وقت پر اسے اپنے گاؤں سے باہر ملے گا۔ بجن پیر کی کشش نے ہاجرہ کی مت مار رکھی تھی۔ وہ وعدے کے دن بجن پیر سے ملنے چلی گئی۔

گاؤں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک جوہڑ کے کنارے سرکنڈوں میں ان کی ملاقات ہوئی۔ شکست تو ہاجرہ کو اسی روز ہو چکی تھی جب وہ شرم کی چادر اُتار کر بجن پیر سے ملنے انت نگر گئی تھی۔ آج اس شکست کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ بجن پیر نے اپنی فتح کا خراج ہاجرہ کے جسم سے وصول کیا۔ وہ شریف عورت جو ایک بیٹے کی ماں تھی اور خدا نے جس کے قدموں میں جنت رکھی تھی، ایک مرد کی مسکراہٹ کے عوض اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی..... گناہ کے راستے پر پہلا قدم ہی مشکل ہوتا ہے اور ہاجرہ یہ قدم اُٹھا چکی تھی۔

نہایت رازداری کے ساتھ وہ ہر دس پندرہ روز بعد بجن پیر سے ملنے کے لیے جانے لگی۔ جوہڑ کے کنارے سرکنڈوں کی تاریکی میں شیطان نے اپنا شیطانی کھیل جاری رکھا۔ ہاجرہ بالکل بھول گئی کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے جو گو کہ جوان نہیں لیکن ایسا کم سن بھی نہیں۔ امتیازی نہایت خاموشی سے اپنی ماں کے طور اطوار دیکھ رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ کچھ عرصہ پہلے لوگوں نے بجن پیر کا نام لے کر اس کی ماں کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ اسے شک ہوا کہ کہیں ماں پھر اسی شخص سے ملنے تو نہیں جاتی۔ ایک شام اس نے بڑی دلیری سے ماں کا پیچھا کیا اور انہی سرکنڈوں میں جا پہنچا جہاں شیطان بجن پیر کے روپ میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دیر سرکنڈوں کے کنارے حیران کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کرے.....

پھر اس نے ہمت کی اور بے آواز چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اپنی ماں اور بجن پیر کو شرمناک حالت میں پایا..... وہ چند لمحے ہکا بکا دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے واپس آ گیا..... اسی رات اس نے ٹرنک کے اندر سے اپنے باپ کی بندوق نکالی اور سوئی ہوئی ماں پر دو فائر کر کے اسے ابدی نیند سُلا دیا۔

یہ میری زندگی کا ایک یادگار کیس ہے۔ میری نگاہوں میں آج بھی اس بارہ سالہ بچے کا غیور چہرہ گھوم رہا ہے جس نے بے غیرتی کا زہر پینے سے انکار کیا اور اپنی زندگی کے آخری سہارے کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ماں کی موت کے بعد اس کا ڈرنا اور سہم جانا..... اور سہم کر اناج والی کوٹھڑی میں چھپ جانا مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس کے وہ آنسو بھی یاد ہیں جو لاوارثی کے پہلے روز اس کے تر و تازہ رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں دو دُکھ تھے۔ ایک ماں کی موت کا..... اور دوسرا اس کی بے وفائی کا۔

.....✹.....✹.....

لڑکا، لڑکی اور لوگ

نواز خاں



لڑکا، لڑکی اور لوگ

نواز خاں

لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی پٹھان دوشیزہ اور
لکڑیوں کے ٹال پر محنت مزدوری کرنے والے ایک دلیر قبائلی
نوجوان کے پیار کی امر کہانی..... ریٹائرڈ انسپکٹر نواز کی زبانی

اسے بیک وقت اپنے شوہر اور اپنے محبوب کو موت کے منہ سے بچانا تھا

سردیوں کی رات تھی۔ تقریباً گیارہ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا۔ رات کے اس پہر تھانے میں بیٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میرے تھانے کی حدود میں اوپر تلے پانچ چھ سنگین وارداتیں ہوئی تھیں۔ ایک قتل تھا۔ دو چوریاں تھیں۔ دو اغواء تھے اور ایک رسہ گیری کی زبردست واردات تھی۔ ان وارداتوں کی وجہ سے کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ دو دن پہلے علاقے کے ایس پی صاحب نے تھانے کا دورہ کیا تھا اور وارداتوں کی رفتار پر سخت تشویش ظاہر کی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً وقت جھاڑ کھاتا لیکن ایس پی صاحب مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور میری کارکردگی سے بھی آگاہ تھے۔ اس لیے انہوں نے میرے لیے کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔

ایس پی صاحب کے دورہ کے بعد میں نے تہیہ کیا تھا کہ اپنے تھانے کی کارکردگی کو بہتر بناؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں رات کے گیارہ بجے اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ کیسوں کی جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ دفعتاً ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"میں نے پی شراب تو نے کیا پیا، آدمی کا خون....."

کوئی شخص تھانے کے سامنے سے گاتا ہوا گزر رہا تھا۔ آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف گا ہی نہیں رہا بلکہ اس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ دس منٹ میں یہ تیسری بار تھا کہ میں نے یہ آواز سنی۔ اس دفعہ مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے فائل بند کی اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں تھانے کا محرر جان محمد کمبل لپیٹے اپنی کرسی پر سو رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ باتوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ شاید حوالدار محمد حسین

ہیڈ کانسٹیبل کو اپنی تیسری شادی کی داستان سنا رہا تھا۔ میں تھانے کے صحن میں پہنچ کر سڑک پر جھانکنے لگا۔ یہ جہلم شہر کا تھانہ تھا۔ جہلم ان دنوں کوئی زیادہ بارونق شہر نہیں تھا۔ رات نو ساڑھے نو بجے سڑکیں سنسان ہو جاتی تھیں۔ گیارہ بجے شراب کے نشے میں دھت آوارہ گردی کرنے والا شخص یقیناً کوئی شریف شہری نہیں تھا۔ میں نے دیکھا وہ جھومتا ہوا دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر اس نے ایک بار پھر ہانک لگائی۔

''میں نے پی شراب تو نے کیا پیا.....''

اگر محرر جاگ رہا ہوتا یا کوئی کانسٹیبل برآمدے میں موجود ہوتا تو اب تک اس کمبخت کو گدی سے پکڑ کر تھانے میں لا چکا ہوتا لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب تک بچا ہوا تھا۔ میں جب دروازے پر پہنچا، وہ کوئی بیس گز آگے نکل چکا تھا۔ پہلے تو میں نے اسے آواز دینے کی ٹھانی لیکن پھر نجانے کیا دل میں آئی کہ میں خاموش رہا۔ پہلے ہی کام سر پر چڑھا ہوا تھا، خوامخواہ کی مصیبت مول لینے سے کیا فائدہ تھا۔ میں نے دل میں اس نامعلوم شخص سے کہا ''جا چلا جا۔ شاید تیری کوئی نیکی سامنے آگئی ہے۔''

لیکن ابھی میں واپس مڑ کر برآمدے ہی میں پہنچا تھا کہ شرابی کی آواز پھر قریب آتی محسوس ہوئی۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ شاید آج اس نے گرفتار ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میں پھر دروازے پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے اب عین دروازے کے سامنے بجلی کے پول سے ٹیک لگا لی تھی اور اوٹ پٹانگ تانیں لگا رہا تھا۔ اس کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ وہ یا تو پاگل تھا یا بالکل مدہوش ہو رہا تھا۔ اب اسے پکڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے وہاں کھڑے کھڑے حوالدار محمد حسین کو آواز دی۔ وہ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بھاگا بھاگا باہر آیا۔ میں نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس الو کے پٹھے کو پکڑ کر اندر لے آؤ۔ شراب پی رکھی ہے اور تھانے کے سامنے ماں بہن کو یاد کر رہا ہے۔''

حوالدار محمد حسین نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور کانسٹیبلوں کے ساتھ سڑک کی طرف بڑھا۔ پولیس کو دیکھ کر وہ شخص جلدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا اور شرابیوں کے انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔ حوالدار نے اس کی گرم چادر اس کے گلے میں پھندے کی طرح کس دی اور کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ بلب کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ شخص تھا۔ شلوار قمیص کے نیچے اس نے پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ صوبہ سرحد سے آیا ہوا لگتا تھا۔ اس کی شخصیت کی سب سے اہم چیز اس کا قد تھا۔ وہ بمشکل پانچ، پونے پانچ فٹ کا ہوگا۔ جسم گٹھا ہوا تھا اور شکل سے سخت گیر دکھائی دیتا تھا۔ آنکھوں سے نشہ صاف جھلک رہا تھا لیکن وہ زیادہ مدہوش بھی نہیں تھا۔ میں نے نام پوچھا تو اس نے گل حسن بتایا۔

میں نے پوچھا ''اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟'' اس نے اونگی بونگی مارنی شروع کر دی۔ کبھی کہتا کہ فلم دیکھنے گیا تھا، کبھی کہتا کہ گھر کا راستہ بھول گیا ہے۔ ویسے ایک بات تھی کہ وہ خوفزدہ بالکل نہیں تھا جبکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تھانہ اور پولیس دیکھ کر بڑے بڑے گہرے نشے باز ہوش میں آ جاتے ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے بکواس کیے جا رہا تھا اور پھنستا جا رہا تھا۔ میں نے اسے دو زناٹے کے تھپڑ مارے اور حوالدار سے کہا کہ ''اس ''تان سین'' کی اولاد کو حوالات میں بند کر دو۔ جب کوئی والی وارث آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

اس کا بندوبست کرنے کے بعد میں دوبارہ کمرے میں آ بیٹھا لیکن ذہن سخت اُلجھا ہوا تھا۔ آخ

مجھے بھی پولیس کی نوکری میں برسوں گزرے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ شخص جان بوجھ کر حوالات میں آیا ہو۔ اس کا بار بار تھانے کے سامنے سے گزرنا پھر تھانے کے سامنے کھڑے ہو جانا اور بعد میں اُلٹ پلٹ بیان یہ سب کچھ کسی سازش کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت زیادہ مدہوش بھی نہیں تھا اور نہ بالکل چست تھا پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک شبہ سر اُبھارنے لگا کہ یہ شخص کسی جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا تو نہیں چاہتا تھا؟ بعض ہوشیار مجرم قانون کو دھوکہ دینے کے لیے ایسے ہتھکنڈے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اگر میرا یہ شبہ درست تھا تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ کسی جگہ عنقریب کوئی سنگین واردات ہونے والی ہے۔ ڈاکہ زنی، آبروریزی یا پھر قتل۔ میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ حالات ایسے تھے کہ ان دنوں میں کسی نئی واردات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے ہی ایس پی صاحب پریشان تھے۔ جوں جوں میں سوچ رہا تھا میرا شک بڑھتا جا رہا تھا۔ میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے غور کرنے لگا۔ اگر کوئی واردات ہونے والی ہے تو اس کا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ میں نے حوالدار محمد حسین کو بلایا اور اسے بتایا کہ مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔ اس آوارہ گرد کا نشہ ہرن کر کے ذرا میرے کمرے میں لے آؤ۔

محمد حسین نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ پانچ منٹ بعد شرابی گل حسن پانی میں تربتر میرے سامنے کھڑا تھا۔ شاید محمد حسین نے ٹھنڈے پانی کی پوری بالٹی اس پر انڈیل دی تھی۔ میں نے گل حسن سے کہا "بیٹا! اب ذرا صاف صاف بتا دو اصل چکر کیا ہے۔ تم نے رات حوالات میں گزارنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

میری اس بات پر گل حسن کے چہرے نے جس طرح رنگ بدلا مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا کہ گل حسن کی گرفتاری کے پیچھے کوئی سازش ہے۔ گل حسن نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کھڑے کھڑے بھرپور ٹانگ اس کے سینے پر جمائی۔ وہ اُلٹ کر کرسیوں پر جا گرا۔ پھر حوالدار محمد حسین اور کانسٹیبلوں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ زمین پر لٹا کر انہوں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ بُری طرح چلانے لگا۔ دفعتاً اس کی آواز رُک گئی۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا۔

"ٹھہرو" میں چیخا۔

دونوں کانسٹیبل رُک گئے۔ گل حسن اوندھے منہ ساکت پڑا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر جلدی سے اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں سے خون کی لکیر بہہ کر کانوں تک آ رہی تھی۔ میں نے نبض ٹٹولی، رفتار بہت دھیمی تھی۔ کوئی ضرب کسی نازک جگہ پر لگ گئی تھی۔ ہم نے اسے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ساکت رہا۔ اچانک بیہوشی کے عالم میں ہی اس نے خون کی قے کی۔ یہ قے صورتحال کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے قمیص اٹھا کر اس کا پیٹ چیک کیا۔ پہلو پر ایک گہرا نیلا داغ نظر آ رہا تھا جیسا کہ بعدازاں پتہ چلا کہ یہ کسی ٹھوکر کا نشان نہیں تھا۔ کرسیوں پر گرتے ہوئے ایک چوبی کونہ یہاں لگ گیا تھا۔ بہرحال خونی قے کے بعد ملزم کا ہسپتال پہنچنا ضروری ہو گیا۔

گل حسن کو ہسپتال پہنچانے کے بعد میں نے اندرون شہر کا رُخ کیا۔ ہسپتال میں ایک مریض نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ شخص اس کا محلے دار ہے۔ تانگہ چلاتا ہے اور ان کے گھر کے

قریب ہی کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ اس مریض سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گل حسن جھگڑالو طبیعت کا مالک ہے۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی ہے۔ گھر سے مار پیٹ کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ محلے کے لوگ ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ اں اتنا معلوم ہے کہ وہ کسی نواحی گاؤں کے رہنے الے ہیں۔

یہ کوائف مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں گل حسن کے متعلق مزید چھان بین کروں۔ وہ بدستور بیہوش تا لیکن ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ زیادہ خطرے کی بات نہیں۔ مریض کے بتائے ہوئے پتے پر میں اندرون ہر پہنچا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں نے نی موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑی کی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ ں نے دستک دی۔ تیسری دستک پر ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا۔ حلیے کے مطابق وہ گل حسن باپ تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے یل گئیں۔

''کیا بات ہے بھائی؟'' وہ سخت پریشانی سے ا۔

''تمہارا بیٹا ہسپتال میں ہے۔ تم سے کچھ پوچھنا تا ہوں۔''

کوتاہ قد بڈھے نے پہلے تو بدحواسی میں اِدھر ر دیکھا پھر مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ نیچی چھت لے ایک کمرے میں اس کی چارپائی بچھی تھی۔ ٹی چلم والا حقہ قریب پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ھے نے اخروٹ توڑ توڑ کر کمرے میں چھلکوں کا لگا رکھا تھا۔ ایک طرف اخباری کاغذ پر اخروٹ نز رکھا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ا شہر میں خشک میوہ بیچتا ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ

اس کی چھوٹی سی دکان ہے۔ اس کا بیٹا تانگہ چلاتا ہے۔ اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ اس کی بیوی، بیٹی اور بہو رہتی ہیں۔ تینوں عورتیں ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھیں اور انہیں ابھی تک میری آمد کا پتہ نہیں چلا تھا۔

بڈھے کے ساتھ میری بات ہو رہی تھی کہ اچانک کسی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھی۔ رونے والی کوئی عورت تھی۔ رات کے تاریک سناٹے میں یہ دردناک آوازوں و دماغ پر عجیب اثر کر رہی تھی۔ یہ آواز نہیں تھی، ایک نوحہ تھا، ایک بین تھا جو خاموشی کی لہروں میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔ میں نے بڈھے کی طرف دیکھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہے یہ عورت؟'' میں نے بڈھے سے پوچھا۔

''کک کوئی نہیں۔'' بڈھا گڑبڑا گیا۔ ''مم..... میری بیٹی ہے۔ اس کے سر میں سخت درد رہتا تھا۔ کئی بار رات کو رونے لگتی ہے۔''

''بڈھے کا چہرہ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں خاموشی سے یہ آواز سننے لگا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کسی انتہائی دُکھی اور مجبور عورت کے دل کی پکار ہے۔ یہ کسی مریض کی آہ و زاری نہیں تھی۔ میں نے بڈھے سے کہا ''میں گھر کی عورتوں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

بڈھا بولا ''تھانیدار صاحب! ہم عزت دار لوگ ہیں ہماری عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آتیں۔''

میں نے رُعب سے کہا ''بابا! خوامخواہ اپنا کیس خراب نہ کر۔ یہ نہ ہو تجھے اور تیری پردہ دار عورتوں کو تھانے میں بیٹھ کر چیخ و پکار کرنی پڑے۔ چل

جلدی انہیں اس کمرے میں لے آ۔ اس میں تیری عزت ہے۔"

بڈھا میرے لہجے کی تبدیلی پر حیران رہ گیا۔ جہاندیدہ آدمی تھا سمجھ گیا کہ بات بڑھانا ٹھیک نہیں۔ اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد اتفاقاً میری نظر صحن کی طرف اُٹھی تو میں نے دیکھا کہ ایک ہیولا سا بھاگتا ہوا دروازے کی طرف لپک رہا ہے۔ انداز نہایت مشکوک تھا۔ پہلی بات تو میری سمجھ میں یہی آئی کہ بڈھا فرار ہو رہا ہے۔ میں تیزی سے اُٹھ کر صحن میں آیا۔ سایہ اب دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ قد کاٹھ سے وہ گل حسن کا باپ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولنا چاہا لیکن بڈھے نے مجھے اندر لانے کے بعد کنڈی چڑھا دی تھی۔ دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اتنے میں میں ان کے سر پر پہنچ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ریوالور نکالتا یا اسے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کرتا، وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ مجھے زور سے دھکا دے کر وہ مخالف سمت میں بھاگا۔

"رُک جاؤ۔" میں چلایا۔

پھر میں نے بھاگ کر اس کا پیچھا کیا۔ میرا زوردار دھکا کھا کر وہ لڑکھڑاتا ہوا صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے ٹکرایا اور اُلٹ کر گرا لیکن گرتے ساتھ ہی پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک زوردار مکہ اس کی ٹھوڑی پر جمایا۔ اگر مکہ ٹھکانے پر لگ جاتا تو یہ بھاگ دوڑ ختم ہو جاتی لیکن ٹھوڑی کی بجائے یہ مکہ اس کی گردن پر لگا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور سنبھل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ گھر کے عقب میں چار دیواری خاصی نیچی تھی۔ اس نے اُچھل کر دیوار پھاندی اور باہر نکل گیا۔ جب تک میں نے دیوار تک پہنچ کر دوسری طرف جھانکا وہ گہری تاریکی میں روپوش ہو چکا تھا۔

دھما چوکڑی کی آوازوں سے گھر والے جاگ گئے تھے۔ عورتیں چلا چلا کر اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی تھیں۔ غنیمت تھی کہ اردگرد کے مکان دُور دُور تھے ورنہ ہمسائے بھی اکٹھے ہو جاتے۔ میں نے عورتوں کو ڈانٹ کر خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ بڈھا ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا "بابا تُو تو کہتا تھا گھر..... میں عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ اب یہ چھ فٹ کا بندہ کہاں سے نکل آیا؟"

بڈھا گھبرا کر بولا "قسم لے لو تھانیدار مجھے کچھ پتہ نہیں یہ کون ہے۔ شاید کوئی چور آ چکا تھا۔"

"اچھا تو سارے کام آج کی رات ہی ہونے ہیں؟" میں نے سر ہلا کر کہا "آج ہی تیرا بیٹا پکڑا گیا۔ آج ہی تیری بیٹی کو سر درد کا دورہ پڑا۔ آج ہی تیرے گھر میں چور گھسا..... مجھے سچ سچ بتا دے یہ چکر کیا ہے ورنہ سارا گھر تھانے میں جائے گا۔"

بوڑھا سنبھل کر بولا "تھانیدار! تُو بار بار مجھے یہی دھمکی دے رہا ہے۔ قسم خدا کی میں خود کو بھی گولی مار لوں گا اور اپنی عورتوں کو بھی۔ ہم شریف لوگ ہیں اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔"

پہلے تو جی میں آئی کہ بڈھے کا دماغ درست کر دوں لیکن پھر میں نے برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا "بابا تیری بیٹی کہاں ہے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ہے میری بیٹی۔" بوڑھے نے ایک چھوٹے قد کی اٹھارہ بیس سالہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ باپ اور بھائی کی طرح وہ بھی کوہ تاقد تھی۔ میری طرف دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ رونے والی لڑکی یہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں تو ابھی تک نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں

نے وہیں کھڑے کھڑے لڑکی سے پوچھا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم کیوں رو رہی تھیں؟''

لڑکی کا لہجہ اپنے باپ اور بھائی کی طرح پٹھانوں جیسا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا ''میں کب رو رہی تھی؟''

بڈھا بے قراری سے ہاتھ مل رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''بابا! یہ پانچواں جھوٹ ہے جو اس تھوڑی سی دیر میں تُو نے مجھ سے بولا ہے۔ پھر بھی تُو کہتا ہے کہ میں عزت دار آدمی ہوں۔''

بڈھا اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھنستا جا رہا ہے۔ اس نے جھلا کر کہا ''تھانیدار! تُو چاہتا کیا ہے؟ اگر میرے بیٹے نے نشہ کیا ہے تو اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ میرے گھر کی کون سی عورت رو رہی تھی اور کون نہیں؟''

میں نے کہا ''بابا! گھبرا مت سب کچھ تجھے بتا دوں گا۔ پہلے تو مجھے یہ بتا کہ رونے والی عورت کون ہے؟''

بڈھا خاموش رہا۔ لگتا تھا اندر ہی اندر کھول رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ صبر کا دامن چھوڑ دیتا اور اندر گھس کر اپنی بندوق نکال لاتا۔ اس کے تیوروں سے تو ایسا لگتا تھا لیکن اس موقع پر اگر میں کسی کمزوری کا اظہار کرتا تو ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے گرج کر کہا ''گھورتا کیا ہے سیدھی طرح مجھے بتا کون عورت رو رہی تھی؟''

اتنے میں پھر رونے کی ویسی ہی ذبی ذبی آواز آئی۔ یہ آواز دائیں طرف کھڑی عورت کی تھی۔ میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ کمرے میں یہی عورت رو رہی تھی۔ غالباً یہ بڈھے کی بہو اور گل حسن کی بیوی تھی۔ گھرانے کے دوسرے افراد کی نسبت اس کا قد کافی لمبا تھا۔ میں نے بڈھے سے کہا

''میں تمہاری بہو سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

بڈھے کی تیوری پھر چڑھ گئی۔ غرا کر بولا ''میں غریب ضرور ہوں بزدل نہیں۔ اگر مجھے اتنا دباؤ گے تو کچھ کر گزروں گا.....''

میں جانتا تھا کہ پردہ داری کا تو بڈھا صرف ڈھونگ رچا رہا ہے۔ اصل مقصد مجھ سے کچھ چھپانا ہے۔ میں نے اس کی تیوری کو نظر انداز کرتے ہوئے اطمینان سے کہا ''تو ٹھیک ہے میں چلتا ہوں لیکن یاد رکھو دو گھنٹے کے اندر تمہیں بہو کو لے کر تھانے آنا پڑے گا۔''

میرے لہجے کی دھمکی نے قریب کھڑی بوڑھی عورت کو لرزا دیا۔ وہ کچھ سمجھدار لگتی تھی۔ پشتو میں اپنے شوہر سے کچھ کہنے لگی۔ شاید اسے سمجھا رہی تھی۔ کچھ دیر دونوں میں فقروں کا تبادلہ ہوا پھر بڈھے نے پشتو میں ہی اپنی بہو سے کچھ کہا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسے دھمکا رہا ہے۔ بہرحال انہوں نے مجھے بہو سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسے علیحدہ کمرے میں بٹھا کر کہا ''دیکھو بہن! تمہارا سُسر مجھے سٹھیایا ہوا لگتا ہے اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی مشکل آسان ہو تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تمہارا شوہر حراست میں ہے اور اس نے بہت سی باتیں مجھے پہلے ہی بتا دی ہیں۔''

جواب میں عورت پھر اسی پُردرد آواز میں رونے لگی۔ اس نے گھونگھٹ نکال رکھا تھا اور سارا جسم چادر میں چھپا ہوا تھا لیکن ہاتھ ننگے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، ہاتھوں پر سرخی مائل نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ کلائی پر بھی ایک میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس گھر میں اس عورت پر کوئی ناقابل برداشت ظلم ہو رہا ہے..... لیکن وہ کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ بمشکل میں نے اسے چپ کرایا اور اپنا سوال

دہرایا۔ اس نے گلوگیر آواز میں اتنا کہا،

''تھانیدار صاحب! آپ کو دھوکہ ہوا ہے۔ اس گھر کے رہنے والوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میری ساس اور سُسر بہت اچھے ہیں۔ میرے شوہر کو بھی اس کے دوستوں نے نشہ کرایا ہوگا ورنہ وہ ایسا نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''تمہارے گھر سے ابھی جو آدمی فرار ہوا ہے وہ کون تھا؟''

لڑکی نے روتے ہوئے کہا ''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرے سُسر نے جو کچھ بتایا ہے وہی ہوگا۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ لڑکی میرے اندازوں سے بڑھ کر خوفزدہ ہے۔ خاص طور پر اپنے سُسر سے وہ بہت مرعوب نظر آتی تھی۔ میں بہت آسانی سے اسے بیانوں میں اُلجھا کر جھوٹا ثابت کر سکتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ خود کچھ بتانے پر آمادہ ہوتی تو بات بن سکتی تھی۔ میں نے کہا ''دیکھو بہن! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے تیرا شوہر کسی نہایت سنگین جرم میں ملوث ہونے والا ہے۔ یہ جرم کسی کا قتل بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تُو میرے ساتھ تعاون نہیں کرے گی تو میں اس جرم کو ہونے سے روک نہیں سکوں گا۔ مجھ سے دل کی بات چھپا کر تُو ایک طرح اپنے شوہر کو پھانسی کے تختے تک پہنچا رہی ہے۔''

یہ تیر نشانے پر لگا۔ لڑکی نے تھوڑا سا گھونگھٹ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک لمحے کے لیے مجھ سے ٹکرائیں۔ یہ آنکھیں اس ادھیڑ پن کو دور کر رہی تھیں کہ وہ عورت ہے یا لڑکی۔ وہ نوجوان لڑکی تھی اور اپنی آواز ہی کی طرح خوبصورت بھی۔ وہ سخت شش و پنج میں دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہ دروازے کی طرف اُٹھ گئی۔ دفعتاً اس نے گھونگھٹ کھینچ لیا اور دوبارہ رونے لگی۔ چادر کے اندر اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔ کبھی اردو اور کبھی پشتو میں وہ بار بار کہہ رہی تھی ''مجھے کچھ معلوم نہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں۔'' میں نے تیزی سے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت اسے دروازے پر اپنا سُسر نظر آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس عورت کا اتنی جلدی اپنے خول سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ وہ خوف اور بے یقینی میں بُری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ارادوں سے واقف ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر کسی جرم میں ملوث ہونے سے باز رہے لیکن پھر بھی وہ میری مدد نہیں کر رہی تھی۔ میرے خیال میں اس کی تین وجوہات تھیں۔ وہ خوفزدہ تھی، اسے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ اس کی فراہم کردہ اطلاعات سے اس کے شوہر کو فائدہ پہنچے گا یا پھر شوہر کے بچانے سے کسی اور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

کچھ باز پرس کے بعد میں گل حسن کے گھر سے واپس چلا آیا۔ میں بڈھے کو گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ اگر ہسپتال میں گل حسن کی حالت بہتر تھی تو مطلوبہ معلومات اس سے بآسانی حاصل ہو سکتی تھیں۔ بڈھا ایک تو ''بڈھا'' تھا دوسرا خاصا ڈھیٹ اور واویلا کرنے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ایسے لوگوں کے سامنے بعض اوقات پولیس بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ زیادہ مارو پیٹو تو جان جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ پیار محبت سے یہ جہاندیدہ لوگ قابو میں نہیں آتے۔ پھر عمر رسیدہ شخص چاہے کیسا بھی قابل نفرت مجرم ہو اس کی بزرگی کا خیال بہرحال رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے سوچا اگر گل حسن بات چیت کے قابل نہ ہوا تو پھر بڈھے کو پکڑ کر لے جاؤں گا۔ اس بات کا تو مجھے قریب قریب یقین ہو چکا تھا کہ گل حسن اور اس کا باپ کوئی گل کھلانے والے ہیں۔ میں ایسا بچہ نہیں تھا کہ بڈھے کی اس بات پر

یقین کر لیتا کہ گھر سے فرار ہونے والا شخص کوئی چور اچکا تھا۔ وہ یقیناً میری آمد سے پہلے گھر میں موجود تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کوئی کرائے کا قاتل ہو یا گل حسن کا کوئی دوست ہو لیکن وہ کوئی بھی تھا اس کے ارادے اچھے نہیں تھے ورنہ میری آمد سے خوفزدہ ہو کر وہ بھاگ نہ نکلتا۔ پھر جس طرح اس نے مجھ سے ہاتھاپائی کی تھی یہ بات صاف ظاہر ہوتی تھی کہ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس قسم کے کاموں کا اسے خاصا تجربہ ہے۔ بہرحال ایک بات کا مجھے اطمینان تھا۔ اگر آج رات ان لوگوں نے کوئی واردات کرنا تھی تو وہ اب نہیں کرنے والے تھے۔ حالات سے ظاہر تھا کہ گل حسن موقع سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا چاہتا تھا تاکہ اس پر کوئی الزام نہ آئے لیکن اس کا یہ منصوبہ بُری طرح ناکام ہو چکا تھا۔

بڈھے کی دھاڑیں سارے تھانے میں گونج رہی تھیں۔ اس نے مجھے اور میرے عملے کو ہر معروف اور غیر معروف گالی دے ڈالی تھی۔ اس کی عمر اسّی سال کے قریب تھی لیکن آواز اب بھی چالیس سال کی لگتی تھی۔ میرے تین کانسٹیبلوں نے اسے بمشکل قابو کر رکھا تھا۔ آخر میری ہدایت پر انہوں نے بوڑھے کا منہ کھول کر اس کے اندر کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے ایک پٹی باندھ دی۔ اُلٹی ہتھکڑی لگا کر اسے حوالات میں دھکیل دیا۔ وہ پھر بھی اُچھل کود کر رہا تھا اور حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ اسے بڑی حکمت عملی سے تھانے لایا گیا تھا ورنہ وہ ایسا تماشا لگاتا کہ اس کے پیچھے پیچھے لوگوں کا پورا جلوس تھانے پہنچتا۔ اس کا نام احمد علی خان تھا۔ جس بازار میں اس کی دکان تھی وہاں اسے عجب خان اور بابا گولی جیسے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ میں نے علی الصبح اس کے گھر ایک اے ایس آئی کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بھیجا۔ وہ تینوں سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ گل حسن کے دوست ہیں اور انہوں نے تھانے سے اس کی ضمانت کروالی ہے۔ بس ایک کاغذ پر آپ کا انگوٹھا ضروری ہے۔ چل کر لگا دیں۔ بڈھے نے پہلے تو تھانے آنے سے انکار کر دیا لیکن اے ایس آئی بہلا پھسلا کر اسے لے آیا۔ یہاں آ کر جب اس نے نقشہ اور دیکھا تو واویلا شروع کر دیا۔

بہرحال احمد علی خان عرف عجب خان و بابا گولی کو حوالات میں بند کرنے کے بعد میں اس کے گھر پہنچا۔ بڑھیا اور اس کی بیٹی نے تُو تُو میں میں کی کوشش کی لیکن میں نے جلد ہی انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ احمد علی کی بہو کو علیحدہ بلا کر میں نے پھر اس سے بات چیت شروع کی۔ سب سے پہلے میں نے اسے یہ بتایا کہ تمہارا سُسر اس وقت حوالات میں ہے اور اگر میں چاہوں تو وہ چار پانچ سال اس گھر کی دہلیز پار نہیں کر سکتا۔ یہ اطلاع لڑکی کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ رات کی طرح ایک بار پھر اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے جھانکا اور اس کا لرزہ بھی قدرے کم ہو گیا۔ میں نے دوسری اطلاع اسے یہ دی کہ اس کا شوہر جو ہسپتال میں تھا وہاں سے فرار ہو گیا ہے اور جاتے جاتے چہرے پر موجود ایک کانسٹیبل کی رائفل بھی چھین لے گیا ہے۔ اس اطلاع نے لڑکی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا (حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ گل حسن ابھی تک ہسپتال میں تھا لیکن اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں پوچھ گچھ کر سکتا) لڑکی نے پرتشویش نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا کہ پھولدار اوڑھنی کی دوسری جانب اس کے نازک ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ میرے جال میں پھنس چکی تھی۔ میں نے آخری حملہ کرتے ہوئے کہا ”دیکھ بہن! میں پھر تجھ سے کہہ رہا ہوں اگر تُو چاہے تو اپنے شوہر کو پھانسی کے پھندے تک پہنچنے سے بچا

سکتی ہے۔ تُو بتا سکتی ہے کہ بندوق لے کر اس نے کس طرف رُخ کیا ہے اور وہ کہاں جائے گا۔ میں بروقت پہنچ کر اسے اس جرم سے روک لوں گا۔ شراب پینے اور ہسپتال سے بھاگنے کے جرم میں اسے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو برس کی قید ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ پھر تمہارے پاس آ جائے گا..... اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا چاہتی ہو۔ شوہر یا شوہر کی لاش؟''

ایک مشرقی عورت کے انداز میں وہ سسک اُٹھی۔ ''نہیں تھانیدار صاحب! وہ کیسا بھی ہے میرا مجازی خدا ہے، اسے مرنے سے بچالو۔''

''لیکن کیسے؟'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''مجھے کیا خبر وہ کہاں گیا ہے؟''

''وہ بخت خاں کو مارنے گیا ہے۔'' وہ چلّا کر بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی بارش کی طرح برسنے لگے۔

''کون بخت خاں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی ''بڑے ڈاکخانے کے سامنے پکی گلی میں وہ لکڑیوں کے ٹال پر کام کرتا ہے۔'' اس کے انداز میں بے تابی تھی جیسے مجھے فوراً بخت خاں کی طرف روانہ کرنا چاہتی ہو لیکن مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ گل حسن ابھی ہسپتال میں پڑا تھا۔ میں نے فوراً بات بنائی۔

''اچھا وہ بخت خاں، لیکن وہاں تو میں نے پہلے ہی پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ اب تم مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا دو تا کہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔''

لڑکی نے چادر کا پلو درست کیا پھر سسکیوں کے درمیان دھیمی آواز سے بولنے لگی۔ اس نے جو پہلا فقرہ کہا وہ یہ تھا ''پتہ نہیں میرے اس بیان کے بعد میرے باپ اور بھائیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا لیکن اپنے شوہر کو بچانے کے لیے میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا رہی ہوں۔'' اس تمہید کے بعد اس کا طویل بیان شروع ہوا۔ درمیان میں میں نے کہیں کہیں سوال بھی کیے۔ لڑکی کا نام یاسمین تھا۔ یاسمین سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

وہ شہر سے بیس پچیس میل دور جہلم کے کنارے واقع ایک خوبصورت موضع راہوال کی رہنے والی تھی لیکن یہ اس کا آبائی گاؤں نہیں تھا۔ اس کے باپ دادا آزاد قبائلی علاقے کے باسی تھے۔ وہاں ان کی کسی کے ساتھ پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس دشمنی کی وجہ سے ان کے خاندان کو نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہونا پڑا۔ نقل مکانی کرنے والوں میں دو اور خاندان بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے یہاں مختلف کام شروع کر دیئے۔ کچھ دیواریں بنانے لگے، کچھ شہر میں چوکیداری کرنے لگے اور کچھ نے کھیتی باڑی شروع کر دی۔ غرض وہ یہاں مستقل آباد ہو گئے۔ یاسمین اسی سرسبز گاؤں کے اونچے نیچے ٹیلوں اور گنگناتے چشموں میں پروان چڑھی۔ اس کا باپ غلام خان اور دو بھائی کاشتکاری کرتے تھے۔ زندگی کی گاڑی بڑی اچھی چل رہی تھی..... لیکن پھر ایک طوفان اُٹھا۔ شیشم کا ایک درخت ان کی پرسکون زندگیوں کو تہہ و بالا کر گیا۔ یہ درخت یاسمین کے باپ کے کھیت میں تھا لیکن ساتھ والے کھیت کا مالک اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ وہ اسے کاٹنا چاہتا تھا اور یاسمین کا باپ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جھگڑا بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا۔ تمام مصالحتی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ جھگڑا دو ایسے گھرانوں کے درمیان تھا جو ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور اکٹھے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ ماضی میں ان کے دشمن اور دوست ایک تھے لیکن اب وہ آپس میں

سر کاٹنے پر تل گئے تھے۔ مخالف فریق کا سربراہ احمد علی خاں تھا (وہی احمد علی خاں جو اب یاسمین کا سُسر تھا) اس نے ایک روز غلام خاں کو للکار کر کہا کہ آج رات وہ درخت کاٹ لے گا۔ اگر وہ روک سکتا ہے تو روک لے۔

اس روز یاسمین بہت روئی تھی، وہ جانتی تھی آج رات جھگڑا ہوگا اور اس کے باپ یا بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کی ماں نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر ایک تاریک کوٹھڑی میں بیٹھ کر وہ دونوں دیر تک روتی رہی تھیں اور وہ یہی کر سکتی تھیں۔ مردوں کو روکنے کی نہ ان میں ہمت تھی اور نہ ہی ان کے رسم و رواج اجازت دیتے تھے۔ اس رات یاسمین مصلّٰی بچھائے دیر تک اپنے باپ اور بھائیوں کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اگر اس وقت اسے معلوم ہوتا تو وہ صرف بھائیوں کی سلامتی کی دعا ہی نہ مانگتی، ان کے دشمنوں کی خیر بھی مانگتی لیکن اس کی سوچ اتنی دُور کیسے پہنچ سکتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز اسے اپنے باپ اور بھائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس کے زخمی جسم کو ناکردہ گناہوں کی سزا میں کانٹوں پر گھسیٹا جائے گا۔ وہ عورت تھی، اس لیے اس کی سوچ اتنی بلند پرواز نہیں تھی یا شاید اس کی سوچ کے پر پیدائش کے روز ہی کاٹ دیئے گئے تھے۔ وہ صرف اپنے باپ اور بھائیوں کی سلامتی مانگتی رہی اور اس کے کنوارے ہونٹوں سے نکلی ہوئی معصوم دعا قبول ہوئی۔ اس کا باپ اور بھائی زندہ سلامت واپس آ گئے۔ بھنوہ کتنا خوش ہوئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کا چوڑا سینہ دیکھا تھا۔ بھائیوں کے مضبوط بازو دیکھے تھے اور نظروں نظروں میں ان کی بلائیں لے لی تھیں۔ اس نے اور اس کی ماں نے سمجھا تھا کہ شاید جھگڑا ٹل گیا لیکن جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں مخالف فریق کا ایک نوجوان سینے پر گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

.....دشمنی کی جڑیں مزید گہرائی میں اُتر گئی تھیں۔ اس کا پھل اور کڑوا ہو گیا تھا لیکن معصوم یاسمین ان حقیقتوں سے بے خبر وادی کے نشیب و فراز میں اپنی زندگی کا حسین ترین گیت گنگنا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شہزادہ بسا ہوا تھا اور اس کی الہڑ دھڑکنوں میں ایک ہی نام کی گونج تھی "بخت خاں..... بخت خاں" وہ اس کا چچازاد بھائی تھا۔ بادامی آنکھوں، سرخ ہونٹوں اور لمبے قد والا غیور بخت خاں۔ وہ اسے اپنی زندگی کی طرح چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یاسمین کی پلکیں جھک جاتی تھیں اور دوبارہ اٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ یاسمین کو دیکھتے ہی بخت خاں کے قدم رُک جاتے تھے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیتے تھے۔ جہلم کے گنگناتے پانی نے بارہا ان کی بے آواز سرگوشیاں سنی تھیں..... لیکن پھر ایک روز سب خواب ٹوٹ گئے۔ جدائی کا وہی صدیوں پرانا قصہ دہرایا گیا۔

غلام خاں اور احمد علی خاں کی دشمنی جو ایک شخص کی موت کے بعد اور بڑھ گئی تھی، فیصلہ مانگ رہی تھی۔ قتل کے بعد دو تین بار دونوں پارٹیں کے افراد جھگڑ چکے تھے۔ خدشہ تھا کہ مزید خون خرابہ ہوگا۔ کچھ لوگوں کا مشورہ تھا کہ پولیس کو اطلاع دی جائے لیکن دونوں فریق پولیس تک پہنچنا بزدلی سمجھتے تھے۔ احمد علی خاں نے تو اپنے آدمی کے قتل کو بھی پولیس سے پوشیدہ رکھا تھا بلکہ گاؤں میں بھی بہت سوں کو خبر نہیں تھی کہ احمد علی کا آدمی غلام خاں اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔ دراصل ان لوگوں میں پولیس تک پہنچنے کا رواج ہی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے اپنے فیصلے بندوق کی گولی سے کرتے آئے تھے۔

..... لیکن اس دفعہ گولی نہیں چلی۔ ان کے بزرگوں نے اپنے قدیم رواج کے مطابق "ننواتے" (مصالحت) کی کوشش شروع کر دی۔ بالآخر ان کی

کوشش کامیاب ہوئی۔ غلام خاں اور احمد علی خاں میں صلح ہوگئی۔ صلح کی شرائط کے مطابق غلام خاں نے احمد علی خاں کی کھیتی مناسب داموں میں خرید لی۔ اس کے علاوہ اس نے ''سورہ'' پر بھی آمادگی ظاہر کی..... یہاں میں ''سورہ'' کے بارے میں آپ کو کچھ بتا دوں۔ یہ رسم ہمارے شمالی اور قبائلی علاقوں میں قدیم زمانے سے رائج ہے۔ لڑائی جھگڑے کے دوران جب کوئی شخص اپنے مخالف فریق کا کوئی آدمی قتل کر دیتا ہے یا اتفاقاً اس سے ایسا ہو جاتا ہے تو مقتول کے ورثاء اس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ انتقام لیے بنا انہیں چین نہیں آتا۔ قاتل اگر اپنے جرم پر پشیمان ہو اور خون خرابے کا یہ سلسلہ ختم کرنا چاہتا ہو تو وہ مقتول کے وارثوں سے معافی کا طلبگار ہوتا ہے۔ معافی مانگنے کے مختلف طریقے ہیں جن میں قاتل اپنی عاجزی اور ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ مصالحت کی مختلف کوششوں میں ایک یہ سورہ کی رسم بھی ہے۔ اس میں قاتل اپنی نیک خواہشات کے اظہار کے لیے اپنی بیٹی، بہن یا کسی اور قریبی عزیزہ کا رشتہ مقتول کے خاندان کے کسی فرد سے کر دیتا ہے۔ اس سے رشتہ داری وجود میں آتی ہے اور عموماً قتل و غارت کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔ سورہ کا اصل مقصد مقتول کے خاندان کی تالیف قلب ہوتی ہے لیکن بعض صورتوں میں اس کے نتائج توقع کے خلاف بھی نکلتے ہیں..... بہرحال باہمی صلاح و مشورہ سے غلام خاں نے اپنی بیٹی یاسمین کا رشتہ مقتول کے ورثاء کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بخت خاں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ یاسمین اپنی معصوم محبت کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ رات کی تاریکی نے ان دونوں کی بے آواز فریادیں سنیں۔ وہ تڑپے مچلے لیکن نامہرباں وقت اپنا وار کر کے رہا۔

یاسمین کی شادی احمد علی کے بیٹے گل حسن سے کر دی گئی۔ وہ ''گل'' جو خار سے بڑھ کر نوکیلا اور تکلیف دہ تھا۔ وہ کسی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ نکھٹو، آوارہ، ٹھگنا اور بلا کا نشہ باز۔ گاؤں کی کوئی لڑکی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہ کرتی تھی لیکن رسم و رواج کی رسی نے گاؤں کی سب سے حسین لڑکی کو باندھ کر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کرتا کم تھا لیکن اس نے اس ہیرے کی قدر نہ کی۔

شادی کے بعد احمد علی خاں زمین کی رقم لے کر بیٹے کے ساتھ شہر آ گیا۔ یہاں ایک دو ماہ تو خیریت سے گزرے پھر یاسمین کا شوہر اپنی ماں اور بہن کی باتوں میں آنے لگا۔ وہ دونوں ہر وقت یاسمین پر طعنہ زنی کرتی رہتیں۔ اسے خونی کی بیٹی اور قاتلوں کی بہن قرار دیتیں۔ مرنے والا یاسمین کی ساس کا بھانجا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یاسمین کو دیکھتے ہی اس کی ساس اپنے دل کی نفرت کو چھپا نہ سکتی۔ کوئی نہ کوئی بات اس کے منہ سے ایسی نکل جاتی جو یاسمین کو پہروں رونے پر مجبور کرتی۔ آہستہ آہستہ نند اور ساس کی زیادتیاں بڑھتی گئیں۔ شوہر نے پہلے پہل معمولی سی مزاحمت کی پھر وہ بھی ماں اور بہن کا طرفدار ہو گیا۔ گاؤں تو وہ لوگ چھوڑ ہی چکے تھے اب انہیں کس بات کا ڈر تھا۔ یاسمین پر مظالم کی بارش کر دی گئی۔ روکھی سوکھی کھا کر وہ سارا دن گدھے کی طرح کام کرتی پھر شوہر کی مار کھا کر سو رہتی۔ سُسر کا سلوک تو پہلے دن ہی سے اچھا نہ تھا۔ جب اس نے دوسروں کو بھی ہمنوا دیکھا تو اور شیر ہو گیا۔ وہ ظالم بڈھا شوہر کے سامنے یاسمین کو پیٹتا اور گالیاں دیتا۔ ماں باپ کی عزت پر چپ چاپ قربان ہو جانے والی انمول بیٹی کو سُسرال والوں نے جہنم میں جھونک دیا۔

کچھ عرصہ یوں ہی گزرا پھر حالات نے ایک اور کروٹ بدلی۔ ایک روز یاسمین کو اس کے شوہر نے

اتنا مارا کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ یہ گھر والوں کے لیے پریشانی کی بات تھی۔ اب گھر کا کام کاج کون کرتا! اس خیال کے پیش نظر اس کا شوہر اسے اپنے تانگے پر بٹھا کر ہڈیاں جوڑنے والے کے پاس لے گیا۔ ہاتھ بندھوا کر جب وہ واپس آ رہی تھی تو دفعتاً اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ بخت خاں تھا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ، اس کے بچپن کا ہمجولی۔ گرد میں اٹا ہوا وہ سڑک پار کر رہا تھا۔ یاسمین تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں اور کائنات کی حرکت جیسے تھم گئی۔ دوسرے ہی لمحے یاسمین نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا..... لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بخت خاں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور تانگے کے پیچھے ہو لیا۔ اس کی نگاہیں یاسمین کے سراپا پر جم کر رہ گئی تھیں اور وہ مقناطیس کی طرح تانگے کے ساتھ کھنچا چلا آ رہا تھا..... کبھی تیز چلتے اور کبھی بھاگتے ہوئے اس نے تعاقب جاری رکھا اور آخر یاسمین کا گھر دیکھ لیا۔

یہاں سے کہانی نے ایک نیا موڑ لیا۔ بخت خاں نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ اس گھر میں یاسمین کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ وہ اکثر ان کے گھر کے گرد منڈلاتا رہتا۔ یاسمین اسے اپنی چھت پر سے دیکھتی اور کانپ جاتی۔ وہ جانتی تھی بخت خاں کی یہاں موجودگی اس کے گھر والوں سے زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکے گی اور ایک روز ایسا ہی ہوا..... یاسمین کی ساس نے اپنی بیٹی سے کہا میں نے آج منشی مرجان کے بیٹے بخت خاں کو گلی میں کھڑے دیکھا ہے۔ بیٹی نے جواب دیا کہ اسے بھی کل یہی شک ہوا تھا جیسے بخت خاں گلی میں کھڑا ہے۔ وہ دن تو یاسمین کے لیے قیامت ہی ثابت ہوا۔ ساس اور نند نے اسے مل کر اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہو گئی۔ اسے ہوش آیا تو اس کی ساس تانگے کے اڈے پر اپنے بیٹے کو اطلاع دینے جا چکی تھی۔ یاسمین جانتی تھی کہ بخت خاں ابھی گلی میں ہوگا (وہاں اس نے ایک کریانہ فروش سے دوستی گانٹھ رکھی تھی) وہ جانتی تھی اس کے شوہر گل حسن کو پتہ چلا تو وہ آگ بگولا ہو کر یہاں پہنچ جائے گا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح بخت خاں کو خبردار کر دے لیکن اس کی نند نے اسے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس سے بدترین مجرموں کا سلوک کیا جا رہا تھا حالانکہ وہ بخت خاں کو ہوشیار کرنا نہیں چاہتی تھی صرف اپنے شوہر کو بچانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گل حسن اسے مار کر سلاخوں کے پیچھے چلا جائے یا پھانسی کے تختے پر جا کھڑا ہو۔ آخر وہ اس کا شوہر تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔

بعد ازاں جب وہ ہوش میں آئی تو اسے پتہ چلا کہ گلی میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے شوہر نے اپنے کچھ تانگہ بان ساتھیوں کے ساتھ مل کر بخت خاں کو بُری طرح مارا تھا۔ وہ تو شاید اسے جان سے ہی مار ڈالتے لیکن عین اس وقت جب گل حسن اس کو بندوق کے بٹ مار رہا تھا، بندوق چل گئی اور گولیاں نیچے گر گئیں۔ اس سے پہلے کہ گل حسن بندوق دوبارہ لوڈ کرتا، کچھ محلہ داروں نے ہمت سے کام لیا اور نیچے گرے ہوئے بخت خاں کو موقع سے بھگا دیا۔

اس روز یاسمین کو کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ اگر شوہر اسے مارتا تو محلے دار سمجھتے کہ اس معاملے میں وہ بھی قصوروار ہے۔ بس سارے گھر والے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے رہے۔ چند روز بعد شوہر اور سُسر نے مل کر دل کی بھڑاس نکالی اور یاسمین کے ٹوٹے بازو کی پرواہ کیے بغیر اسے خوب پیٹا گیا.....

اس رات مار کھا کر وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے بخت خاں کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر

بھونچکا رہ گئی۔ بخت خاں دلیری سے اندر گھس آیا۔ اس نے کہا "یاسمین میں دیکھ رہا ہوں اس گھر میں تیرا کیا حشر ہو رہا ہے۔ تمہارا باپ اور تمہارے بھائی یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہوں گے، میں نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں اس قید سے رہائی دلانے آیا ہوں۔" جواب میں یاسمین نے اسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ اس نے کہا "اگر اس کے دل میں اس کے لیے تھوڑی سی بھی ہمدردی ہے تو وہ یہاں سے چلا جائے اور کبھی واپس نہ آئے" لیکن وہ کوئی فلمی ہیرو نہیں تھا اور نہ یہ فلمی کہانی تھی۔ بخت خاں نے کہا "یاسمین! میں تمہیں اس دوزخ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم میرے ساتھ جاؤ گی یا میں تمہارے ساتھ مروں گا۔"

یاسمین نے اس کے بہت ہاتھ جوڑے، منتیں کیں اور بمشکل اسے واپس بھیجا۔ بخت خاں نے یاسمین کی حالت زار گاؤں جا کر اس کے والدین سے بیان کی۔ اس کی نیت بھلائی کی تھی لیکن بدنامی اس کے حصے میں آئی۔ یاسمین کا والد اور بڑا بھائی اسے دیکھنے کے لیے یہاں شہر پہنچے۔ یاسمین کے سُسرال والے ان سے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ ایک رات انہیں مہمان رکھا اور اگلے روز یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ آئندہ وہ یہاں نہ آئیں کیونکہ ان کے رشتہ دار اس میل جول کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ زخم ابھی تازہ ہیں کہیں کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل جائے۔ اس ایک رات میں یاسمین کے سُسرال والوں نے اس کے والد کے کان اتنی مہارت سے بھرے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے ہی پرایا ہو گیا۔ اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا گیا کہ بخت خاں نے ابھی تک یاسمین کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ اسے ورغلا کر اس کا گھر برباد کرنے کے چکر میں ہے۔ بخت خاں کا حوالہ ایسا تھا کہ یاسمین کے والد اور بھائی کو فوراً یقین آ گیا۔ انہوں نے یاسمین سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا اور اسے روتا چھوڑ کر علی الصبح واپس چلے گئے۔

یاسمین کے گرد کھنچی ہوئی دیواریں اور بلند اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ وہ ان دیواروں کے اندر ہر روز جیتی اور ہر روز مرتی تھی اور ان دیواروں سے باہر بخت خاں موجود تھا۔ اس کی حوصلہ مند نگاہیں اور توانا بازو کچھ کر گزرنے کو بے قرار تھے۔ اس نے شہر ہی میں لکڑیوں کے ایک ٹال پر مزدوری شروع کر دی تھی۔ وہ جوان اور دلیر تھا بہت جلد اس نے شہر میں قدم جما لیے..... ایک روز وہ ایک کوٹھی میں لکڑیاں ڈالنے گیا تو کوٹھی کے سیٹھ سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ بخت خاں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر بدتمیز سیٹھ کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ اس کے دو ملازم آگے بڑھے تو ان کی بھی ٹھکائی کر دی۔ اس واقع نے بخت خاں کو گلی محلے میں مشہور کر دیا۔ کئی نوجوان اس کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ بخت خاں اب گاؤں تو جا نہیں سکتا تھا۔ وہاں یاسمین کے والدین ہی اس کے دشمن نہیں تھے بلکہ پورا گاؤں اس پر تھوتھو کر رہا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گاؤں جا کر لوگوں کی ملامتی نظروں کا سامنا کرنے کی بجائے وہ یہیں چھپا رہے۔

دوسری طرف یاسمین کا شوہر بھی اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ بخت خاں اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ یاسمین ہر صبح یہ دھڑکا لے کر جاگتی تھی کہ آج کا سورج بخت خاں کو قبر اور اس کے شوہر کو جیل میں پہنچا دے گا.....

قارئین یہ وہ حالات تھے جو یاسمین نے مجھے بتائے اور انہی حالات میں گل حسن شراب کے نشے میں دھت تھانے کے سامنے سے گاتا گاتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ اگر معاملے کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ گھریلو پریشانی نے گل حسن کو نشہ اور آوارہ گردی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ

بخت خاں چونکہ دوبارہ گل حسن کے محلے میں نہیں آیا تھا اس لیے یہ صرف یاسمین کا شبہ تھا کہ گل حسن بخت خاں کو قتل کرنا چاہتا ہے..... لیکن میں اس معاملے کو گہری نظر سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ میں اس شخص کو کیسے فراموش کر سکتا تھا جو ایک رات پہلے مجھ سے زور آزمائی کر کے فرار ہو گیا تھا۔ حالات صاف طور پر ایک واردات کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور وہ واردات تھی بخت خاں کا قتل۔ جہلم کنارے کے خوبصورت گاؤں سے شروع ہونے والی اس طویل کہانی کا انجام سمجھ میں آ رہا تھا۔ بکھری ہوئی کڑیاں خود بخود مربوط ہو رہی تھیں۔ احمد علی اور اس کا بیٹا بخت خاں کا قصہ ختم کر دینا چاہتے تھے لیکن چند ہفتے قبل گل حسن محلے میں اس سے دست و گریباں ہو چکا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ گل حسن بخت خاں کا جانی دشمن ہے۔ اس نے بیسیوں افراد کے سامنے بخت خاں کو کتے کی موت مارنے کی قسم کھائی تھی۔ اب اگر بخت خاں قتل ہو جاتا تو سب سے پہلے گل حسن پر ہی شک کیا جاتا۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ بخت خاں کو قتل کرنے کا کام اس نے اپنے کسی جگری دوست یا کرائے کے بدمعاش کو سونپا۔ جس وقت گل حسن تھانے میں گرفتار ہوا وہ بدمعاش اس کے گھر میں موجود تھا اور اپنے مشن پر روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ روانہ ہوتا میں وہاں جا پہنچا۔ چونکہ وہ مجرم تھا اس لیے مجھے دیکھ کر اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

میں لڑکی سے کافی دیر مختلف پہلوؤں پر بات کرتا رہا۔ واپس آنے سے پہلے میں نے آخری سوال پوچھتے ہوئے اس سے کہا۔

"جہاں مجھے یہ سب کچھ بتایا ہے اب یہ بھی بتا دو کہ کل رات تمہارے گھر سے فرار ہونے والا شخص کون تھا؟"

یاسمین نے کہا "تھانیدار جی! میں اس کا نام صحیح نہیں جانتی لیکن وہ ہمارے گاؤں کا ہی رہنے والا ہے۔ اس کے چہرے پر ناک کے قریب چاقو کا ایک گہرا زخم ہے جو آنکھ تک چلا گیا ہے۔ وہ صرف ایک آنکھ سے ہی دیکھ سکتا ہے۔ وہ بڑا خطرناک شخص ہے۔ گاؤں میں لوگ اس سے بہت دبتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا گل حسن سے اس کی دوستی ہے؟"

یاسمین نے کہا "بالکل نہیں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ وہ پرسوں یہاں آیا تھا اور تب سے ہمارے گھر میں ہے۔ میرا شوہر اور وہ چپکے چپکے باتیں کرتے رہے ہیں۔ کل میں نے دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی۔ وہ بار بار کسی سیٹھ کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے بخت خاں کا نام بھی لیا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بخت خاں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں رونے دھونے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی..... اور وہ میں اب تک کر رہی ہوں۔"

جب میں تھانے پہنچا، دوپہر ہو چکی تھی۔ احمد علی خاں عرف بابا گولی حوالات کے فرش پر منہ کھولے سو رہا تھا۔ اس کی بہو نے گراں قدر معلومات فراہم کی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے بخت خاں کو تھانے بلانے کا فیصلہ کیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں اس کا مضبوط جسم سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ایک دراز قد خوبصورت پٹھان تھا۔ میں نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ ایک سچا کھرا، بے خوف شخص ہے۔

اس نے اب تک کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ ہاں جرم کا نشانہ ضرور بننے والا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے حالات سے باخبر کر کے ہوشیار رہنے کا مشورہ دوں

لیکن پوچھ گچھ کے دوران ایک ایسی بات معلوم ہوئی جس نے مجھے چوکنا کر دیا اور مجھے انداز ہوا کہ بخت خاں کو صرف ہوشیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ وہ میری توقع سے زیادہ خطرے میں تھا۔

پوچھ تاچھ کے دوران اچانک میرے ذہن میں ایک سوال آیا تھا اور بڑا اچھا ہوا کہ یہ سوال میرے ذہن میں آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ''تمہارے گاؤں کا وہ شخص کون ہے جس کی ایک آنکھ چاقو کے وار سے ضائع ہو چکی ہے؟'' اس ذکر پر بخت خاں بُری طرح چونک گیا۔ اُلٹا مجھ سے پوچھنے لگا۔

''جناب! آپ کو وہ کہاں ملا ہے؟''

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا ''صرف میرے سوال کا جواب دو۔''

اس نے کہا ''اس کا نام دلاور ہے جی۔ نہایت غصیلا اور کینہ پرور شخص ہے۔ کسی کے خلاف دل میں کوئی بات بٹھا لے تو نکالتا نہیں، بدلہ لے کر چھوڑتا ہے۔ آج سے کوئی ایک سال پہلے گاؤں میں اس نے ایک راہ چلتی لڑکی کے ساتھ مذاق کیا۔ لڑکی نے اسے تھپڑ دے مارا۔ دلاور نے بدتمیزی کی کوشش کی، میں موقع پر موجود تھا خاموش نہ رہ سکا۔ آگے بڑھ کر میں نے دلاور کا گریبان پکڑ لیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ دلاور نہایت خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ میرے بعض دوستوں نے کہا کہ اب اس شخص سے ہوشیار رہنا، تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دلاور بعد میں کئی بار مجھ سے ملا۔ لگتا تھا وہ اس دن کا واقعہ بھول چکا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھوں میں نفرت کی جھلک نظر آتی تھی۔ میں سوچتا تھا شاید یہ میرا وہم ہے۔ کوئی چار ماہ پہلے کی بات ہے اس نے اسی لڑکی کے گھر کی دیوار پھاندی، رات کا وقت تھا۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ اس نے لڑکی کو خنجر دکھایا اور اس کی عزت لوٹ لی۔ صبح لڑکی کے گھر والوں نے اسے چارپائی پر بیہوش پایا۔ دلاور گاؤں سے فرار ہو گیا اور کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں ملا۔ اب آپ کی زبانی اس کا نام سن کر مجھے خیال آ رہا ہے کہ کوئی خاص بات ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا ''بہت خاص بات ہے۔ وہ شخص تمہیں جان سے مارنے کے لیے یہاں پہنچ چکا ہے۔ اب اپنا انتظام کر لو۔''

بخت خاں حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا..... کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ ذہن ایک بار پھر اس کیس کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ اس سے پہلے میں مطمئن تھا کہ گل حسن کی گرفتاری کے بعد واردات ٹل جائے گی کیونکہ اس کی منصوبہ بندی ناکام ہو چکی تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ گل حسن نے جس شخص کو استعمال کیا ہے وہ اس کا کوئی دوست یا کرائے کا قاتل ہے لیکن اب یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ شخص خود بھی بخت خاں کا دیرینہ دشمن ہے اور اسے قتل کرنے کی شدید خواہش اس کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطلب تھا، گل حسن کی گرفتاری کے باوجود اس پر کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ بعد میں پتہ چلا، گل حسن جانتا تھا کہ دلاور خان کی بخت خان سے پرانی عداوت ہے اور موقع ملنے پر وہ اس کی جان سے کھیل جائے گا۔ اتفاقاً اسے دلاور خاں کا وہ ٹھکانہ بھی معلوم تھا جہاں وہ لڑکی کی آبروریزی کے بعد چھپا ہوا تھا۔ ایک روز گل حسن اس کے ٹھکانے پر پہنچا اور اسے بتایا کہ بخت خاں آج کل شہر میں موجود ہے۔ اس نے دلاور سے کہا کہ تمہارے لیے اپنے دشمن سے بدلہ لینے کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔ وہ شہر میں لکڑی کے ایک ٹال پر

کام کرتا ہے اور رات کو تنہا وہاں سوتا ہے۔

دلاور خود بھی بخت خاں سے اپنا حساب چکانا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ایک دو ہفتے میں ملک چھوڑ کر جا رہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لوگ کویت، دبئی وغیرہ جانے کی بجائے محنت مزدوری کے لیے ایران کا رُخ کیا کرتے تھے۔ دلاور کے کچھ دوست ''ابادان'' میں موجود تھے۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ دلاور نے سوچا بخت خاں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ چکانے کا یہ آخری موقع ہے کیوں نہ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے..... وہ فوراً گل حسن کے ساتھ شہر چلا آیا اور دونوں دو روز تک اس منصوبے کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ گل حسن چاہتا تھا کہ قتل اس طرح کیا جائے کہ کسی اور شخص کا کام نظر آئے۔ اتفاقاً کچھ روز پہلے بخت خاں کا ایک کوٹھی کے سیٹھ سے جھگڑا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس نے سیٹھ اور سیٹھ کے آدمیوں کو بُری طرح پیٹا تھا۔ یہ واقعہ قتل کی تفتیش کو غلط راستے پر ڈال سکتا تھا۔ گل حسن چاہتا تھا کہ بخت خاں کو بندوق یا ریوالور کی بجائے کلہاڑی سے قتل کیا جائے۔ دراصل اس سیٹھ کا ایک موالی ملازم تھا جو ہر وقت کندھے پر کلہاڑی رکھتا تھا۔ بخت خاں کے ساتھ لڑائی میں بھی وہ موالی پیش پیش رہا تھا۔ لاش پر کلہاڑی کے زخم پائے جاتے تو یقیناً پولیس کا دھیان سیٹھ اور اس کے ملازمین کی طرف جاتا۔ مزید احتیاط کی خاطر گل حسن نے فیصلہ کیا کہ قتل سے ایک دن پہلے یا قتل کی رات وہ کسی بہانے پولیس کو اپنی گرفتاری دے دے گا۔ یوں اس پر شک پڑنے کا امکان بالکل ختم ہو جائے گا..... اور یہی احتیاط گل حسن کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

میں نے اس کی ناقص اداکاری پہچان لی اور شک میں پڑ گیا (یہاں میں یہ بتا دوں کہ یاسمین نے دلاور اور اپنے شوہر کی گفتگو میں جس سیٹھ کا ذکر سنا تھا، یہ وہی سیٹھ تھا جس سے بخت خاں کا جھگڑا ہوا تھا)۔

اب حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک آنکھ والا خطرناک شخص دلاور کہاں تھا۔ جب تک وہ آزاد تھا بخت خاں کسی بھی لمحے جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسی شام گل حسن کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں اس سے مختصر بات کر سکتا ہوں۔ میں گل حسن سے ملا اور سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے اسے بتایا کہ اس کے والدین بہن اور بیوی سب تھانے میں ہیں۔ اگر وہ نہیں چاہتا کہ ان سے بھی اس کی طرح سلوک ہو تو وہ دلاور کا پتہ بتا دے۔ میرے تیوروں سے گل حسن مجھے کوئی نہایت سفاک قسم کا خردماغ تھانیدار سمجھ رہا تھا۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ میری مار نے اسے جان کے لالے ڈال دیئے تھے (حالانکہ یہ سب کچھ حادثاتی طور پر ہوا تھا) اس نے جلد ہی میرے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یوں بھی بیمار شخص میں قوت مزاحمت کم ہو جاتی ہے۔ اس نے مجھے دلاور کا پتہ لکھوایا اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی طرف روانہ ہو گیا لیکن اس سے پہلے میں نے سادہ کپڑوں میں ملبوس دو مسلح ہیڈ کانسٹیبلوں کو..... دلاور کا حلیہ بتا دیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ اس قسم کے کسی بھی شخص کو وہاں دیکھ کر فوراً گرفتار کر لیں۔

جہلم سے چند میل دور ''دینے'' کا قصبہ ہے۔ یہاں ان دنوں مسز اقبال نامی ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر تھی۔ گل حسن کی اطلاع کے مطابق دلاور اسی ڈاکٹر کی کوٹھی میں ملازم تھا۔ میں مسز اقبال کی بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ یہاں مجھے ہر چہرہ پریشان دکھائی دیا۔ مسز اقبال سے گفتگو کے بعد مجھے پتہ چلا کہ دلاور خاں جو رحمت خاں کے فرضی نام سے اس کوٹھی میں ملازمت کر رہا تھا کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اپنی مالکہ کی ''مورس'' گاڑی لے کر

فرار ہو گیا ہے۔ پتہ چلا کہ مسز اقبال کا ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ رحمت نے مسز اقبال سے چابی مانگی کہ وہ گاڑی کو گیراج میں کھڑا کر دیتا ہے چونکہ وہ ایک دو دفعہ پہلے بھی ایسا کر چکا تھا مسز اقبال نے چابی دے دی۔ دلاور گاڑی لے کر نکل گیا۔ مجھے جس خبر نے زیادہ چونکایا وہ ایک خانساماں نے دی۔ اس نے بتایا کہ جاتے وقت رحمت (دلاور) نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی (یہ پرانی پتلون قمیص اسے صاحب نے دی تھی) اور اس کے پاس ریوالور بھی تھا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک جگہ پھڈا ہے۔ بس ذرا رعب وغیرہ ڈالنا ہے۔

صورتحال پریشان کن تھی۔ اگر دلاور بخت خاں کا قصہ تمام کرنے گیا تھا تو اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہو سکتی تھی۔ وہ جس حلیے میں روانہ ہوا تھا وہ بالکل نیا تھا۔ وہاں پر موجود میرے کانسٹیبل کار سے اُترنے والے ایک خوش پوش شخص کو ٹال کر اندر داخل ہونے سے کیونکر روک سکتے تھے۔ خطرے کا شدید احساس مجھے ہوا اور میں بھاگتا ہوا مسز اقبال کی کوٹھی سے باہر آیا۔ موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور حتی الامکان رفتار سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹھیک پچیس منٹ بعد میں موٹر سائیکل بڑے ڈاکخانے کی سڑک پر موڑ رہا تھا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ یہ متوسط علاقہ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سردی بھی کچھ زیادہ تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے سو رہے تھے۔ ڈاکخانے کے سامنے پکی گلی میں ایک کمزور سی سٹریٹ لائٹ اندھیرا دُور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ گلی میں کوئی کار موجود نہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ دلاور ادھر نہیں آیا۔ جونہی موٹر سائیکل رُکی مونگ پھلی والی ایک ریڑھی کے قریب کھڑا میرا کانسٹیبل تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ اس نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ سب ٹھیک ہے، پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ بولا "بس ابھی آپ کے آگے آگے عینک والے ایک بابو صاحب گلی میں گئے تھے....."

اس سے آگے میں نے کچھ نہیں سنا اور ریوالور نکال کر ٹال کی طرف بھاگا۔ یقیناً دلاور خاں نے احتیاط کے طور پر اپنی کار کسی دوسری گلی میں کھڑی کر دی تھی۔ میں بھاگتا ہوا خود کو ملامت کر رہا تھا کہ میرا ذہن پہلے اس طرف کیوں نہیں گیا۔ میں اطمینان کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل سے رپورٹ لیتا رہا تھا۔ یہ چند لمحوں کی تاخیر بخت خاں کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ جب میں ٹال کے سامنے پہنچا، دونوں کانسٹیبل بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ٹال کا دروازہ کوئی نہیں تھا۔ میں دبے پاؤں اندر چلا گیا۔ اس وقت مجھے دستک کی مدھم آواز سنائی دی۔ جواب میں ایک جھلائی ہوئی آواز آئی۔

"میں کہتا ہوں جب تک بولو گے نہیں میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ کون ہو تم؟"

میں نے پہچان لیا کہ یہ آواز بخت خاں کی تھی۔

"میں دشمن نہیں دوست ہوں۔" جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" بخت خان نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔ جواب میں ٹھک ٹھک کی تیز آواز آنے لگی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باہر والا شخص غصے میں دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ شخص یقیناً دلاور خاں تھا۔ وہ غالباً اس چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر زور آزمائی کر رہا تھا جو لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے نظر آ رہا تھا۔ میں لکڑیوں کی آڑ لیتا تیزی سے کمرے کے سامنے پہنچا۔ وہ دلاور خاں ہی تھا اور غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وزنی لکڑی تھی اور وہ پے در پے اسے دروازے کے بالائی تختوں پر مار رہا تھا۔

''ہینڈز اپ!'' میں ریوالور سیدھا کر کے گرجا۔

دلاور نے تیزی سے گھوم کر مجھے دیکھا پھر حسب سابق وہ تیر کی طرح میری طرف آیا، میری انگلی لبلبی پر تھی لیکن میں اسے گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ گولی اس کی پنڈلی کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس نے لکڑی کا بھرپور وار میرے سر پر کیا۔ میں تیزی سے نیچے جھکا۔ پھر میری زوردار لات اس کے سینے پر پڑی وہ اچھل کر لکڑی تولنے والے ترازو پر گرا۔ قریب ہی لکڑیاں پھاڑنے والا بڑا ہتھوڑا پڑا تھا۔ اس نے لپک کر وہ ہتھوڑا اُٹھا لیا مگر وہ اس کی توقع سے زیادہ وزنی ثابت ہوا۔ وہ پھرتی سے مجھ پر حملہ نہ کر سکا۔ اس کے ہتھوڑا اُٹھاتے اُٹھاتے میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کی پھر میرا بھرپور مکہ اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس نے چہرہ بچانے کی کوشش کی لیکن یہ گل حسن کے گھر کا صحن نہیں تھا۔ اس دفعہ نشانہ خطا نہیں گیا۔ ضرب عین اس کی ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ سر جھٹکے سے دائیں طرف گھوما، عینک جو اس نے آنکھ کا نقص چھپانے کے لیے پہن رکھی تھی، اُچھل کر دور جا گری۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

اس سے پہلے کہ وہ پھر اُٹھنے کی کوشش کرتا میرے دونوں کانسٹیبلوں نے اسے جکڑ لیا۔ بخت خاں ہاتھ میں لاٹھی تھامے چند گز کے فاصلے پر حیران کھڑا تھا۔ کمرے سے باہر نہ آ کر اس نے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا، یہ اس کی بزدلی ہرگز نہیں تھی۔ سمجھدار شخص کو اس موقع پر ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اسے ہوشیار رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کمرے سے باہر ایک شخص ہے یا ایک..... درجن۔

بخت خاں بچ گیا..... اور گل حسن مر گیا مگر وہ تھانے میں لگنے والی چوٹ سے نہیں مرا۔ ہسپتال میں ہی ایک روز اسے اس کے کسی تانگہ بان دوست نے نشے کی گولیاں لا کر دیں۔ اس نے نشہ کیا اور سگریٹ پینے لگا۔ مدہوشی میں سگریٹ بستر پر جا گرا۔ بستر کے ساتھ ہی گل حسن بھی جل گیا۔ اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال کے شعبۂ حادثات میں پہنچایا گیا جہاں اس نے دم توڑ دیا۔

گل حسن کے غصیلے باپ کو اعانتِ جرم کے الزام میں جیل جانا پڑا۔ دلاور خاں پر اغوا، آبروریزی اور اقدام قتل کی دفعات کے تحت مقدمے چلے.....

اس کہانی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ یاسمین نے پولیس کو اس لیے بیان دیا تھا تاکہ اس کا شوہر ارتکاب جرم سے بچ جائے لیکن اس بیان نے اس کے باپ اور دونوں بھائیوں کو بھی قتل کے مقدمہ میں پھنسوا دیا۔ جس شوہر کے لیے اس نے اتنی بڑی قربانی دی تھی وہ تو مر ہی گیا تھا اب اس کے باپ اور بھائی بھی اس کے دشمن تھے۔ ان کے لیے وہ جیتے جی مر گئی تھی۔ شاید وہ جیل سے باہر ہوتے تو اسے قتل ہی کر ڈالتے۔ وہ اس دنیا میں بے سہارا اور تنہا ہو گئی۔ اس نے سب کو چاہا تھا لیکن اسے سب نے نفرت دی تھی۔ نفرتوں کی ماری ہوئی یہ بے سہارا عورت شاید کسی کنویں میں کود جاتی لیکن بخت خاں کے مضبوط بازو اس کے ارادوں میں حائل ہو گئے۔ اس نے اسے شہر ہی میں ایک کوٹھی میں ملازمت دلا دی۔

.....یاسمین نے کسی امیر گھر کے برتن مانجھنے شروع کر دیئے اور بخت خاں ٹال پر لکڑیاں پھاڑتا رہا..... پھر ایک صبح کوٹھی والے اپنی منحنی ملازمہ سے محروم ہو گئے اور ٹال والا اپنے جفاکش مزدور سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ دونوں ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

.....❁.....❁.....

برقعہ اور جُرم

نواز خان



نواز خان

برقعہ اور جُرم

انسپکٹر نواز کے لیے ایک کڑی آزمائش کا لمحہ..... جب وہ اصل مجرم کو تلاش کرتے کرتے اپنے ہی گھر کے دروازے پر پہنچ گیا!

جرم و سزا پر مبنی ایک دلگداز سچی کہانی

حجام کی دکان میں ہونے والی لڑائی عموماً خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی لڑائی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا ڈاڑھی منڈوا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ایک دوست سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان گفتگو کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی کہ بال کٹوانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص مشتعل ہو گیا۔ دراصل دونوں نوجوان جس لڑکی کے بارے میں بات کر رہے تھے وہ اس ادھیڑ عمر شخص کی کچھ لگتی تھی۔ اس نے طیش میں آ کر ڈاڑھی منڈوانے والے لڑکے کا گریبان پکڑ لیا اور دو تین تھپڑ لگائے۔ بات بڑھ گئی۔ لڑکا بھی گرمی کھا گیا۔ اس نے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا استرا پکڑا اور ادھیڑ عمر شخص پر پل پڑا۔ چھڑانے کی کوشش میں نائی اور اس کا ایک ملازم زخمی ہو گئے۔ لڑکے نے استرے کا ایک وار ادھیڑ عمر شخص پر کیا لیکن خوش قسمتی سے اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ کندھے پر معمولی زخم آنے کے علاوہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہاں بے چارے نائی کی دو اُنگلیاں کٹ گئیں۔

یہ ایک شہری تھانے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں میں نیا نیا انسپکٹر ہوا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں روانگی لکھوا کر ایک تفتیش پر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ چار پانچ افراد تھانے میں داخل ہوئے۔ ان کی صورتیں اور پھٹے ہوئے لباس یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ لڑ جھگڑ کر آئے ہیں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ معاملہ سب انسپکٹر کے حوالے کر کے اپنے کام پر چلا جاؤں لیکن پھر مجھے ان میں ایک ایسی صورت نظر آئی جسے دیکھ کر میں رُک گیا۔ میں نے فریقین کی بات سنی۔ لڑکا جس نے استرا چلایا تھا درزیوں کا کام کرتا تھا۔ شہر کے ایک کاروباری علاقے میں اس کے باپ کی دکان تھی۔ اس کا نام غفور تھا۔ لڑکے کا چال چلن کچھ مشکوک تھا۔ صحبت بھی اچھی نہیں تھی۔ میں یہ باتیں اس لیے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکا اسی محلے میں رہتا تھا جہاں میری رہائش تھی۔ میں نے اکثر اسے گلی کے موڑ پر کھڑے دیکھا تھا۔ اسی لڑکے کو دیکھ کر میں تھانے سے جاتے جاتے رُک گیا تھا۔

مجھے کوئی ایک ماہ پہلے کی بات یاد آ رہی تھی۔ میری بیوی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا ہمارے مالک مکان

کی بیٹی پر نظر رکھتا ہے۔ دراصل ان دنوں میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کچھ اس طرح کا تھا کہ مالک مکان کا اور ہمارا صحن ایک ہی تھا۔ ایک دوسرے کے گھر میں عام آنا جانا رہتا تھا۔ تعلقات کافی قریبی ہو گئے تھے۔ مالک مکان کی چار بیٹیاں تھیں۔ بڑی لڑکی فرزانہ کی عمر کوئی پندرہ سال رہی ہوگی۔ وہ دسویں یا نویں میں پڑھتی تھی۔ میری بیوی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا فرزانہ کے چکر میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کا گھر چند گھر چھوڑ کر تھا لیکن اتنا اونچا تھا کہ وہاں سے باآسانی ہمارے صحن میں نظر پڑ سکتی تھی۔ میری بیوی کا کہنا تھا کہ لڑکا اکثر چھت پر کھڑا ادھر دیکھتا رہتا ہے۔ گلی میں بھی ہمارے گھر کے سامنے گھومتا ہے۔ بہرحال مجھے اس سلسلے میں تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مالک مکان کا معاملہ تھا اور جب اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا تو میں اس پھڈے میں ٹانگ کیوں اُڑاتا تاہم اب اس لڑکے کو تھانے میں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ اسی لڑکی کا معاملہ ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں بات کھل گئی۔ ادھیڑ عمر شخص (جس کا نام شریف تھا) نے بتایا کہ یہ لڑکا نائی کی دکان میں اس کی بھتیجی کے خلاف نازیبا کلمات ادا کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ برداشت کرتا رہا پھر اس نے لڑکے کو منع کیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے استرا پکڑ لیا اور بے دریغ گھمانے لگا۔ یہ شخص جس بھتیجی کا ذکر کر رہا تھا وہ میرے مالک مکان کی بیٹی ہی تھی۔

لڑکے نے کہا "تھانیدار صاحب! یہ شخص بات بدل رہا ہے۔ اسے صرف اس بات پر غصہ تھا کہ میں پہلے کیوں ڈاڑھی منڈوانے لگا ہوں۔ باقی ساری باتیں اس نے اپنی طرف سے گھڑی ہیں۔"

میں نے نائی، اس کے ملازم اور ساتھ آنے والے دو آدمیوں سے پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بھی لڑکے کے بیان کی تصدیق کی۔ انہوں نے کہا کہ جھگڑا باری کا تھا بہرحال مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نائی اور اس کے دونوں گاہک دراصل غفورے کے دوست ہیں۔ اس لیے اس کی تائید کر رہے ہیں ورنہ اس سمجھدار شخص کو کیا ضرورت تھی اپنی بھتیجی کے بارے میں ایسی بات اُچھالنے کی۔

اسی دوران میرا مالک مکان بھی تھانے پہنچ گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ سب اسے حاجی حاجی کہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے حج نہیں کیا تھا۔ حاجی کا لقب پیدائش کے پہلے روز سے اس کے ساتھ تھا۔ دراصل وہ حج کے دن پیدا ہوا تھا۔ ماں باپ اسے حاجی کہنے لگے۔ اب یہ لقب اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ کسی کو اس کا نام بھی یاد نہیں تھا۔ شہر کے معروف بازار میں اس کے سلے سلائے کپڑوں کی دکان تھی۔ کافی کھاتا پیتا شخص تھا لیکن ایک کھٹارہ سائیکل پر سفر کرتا تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبع اور امن پسند شخص تھا۔ شاید بیٹیوں کی کثرت نے اس کے مزاج میں عاجزی پیدا کر دی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ اس مصیبت پر خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے علیحدہ کمرے میں اس سے اس جھگڑے کی بابت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ شریف اس کا دور کا عزیز ہے اور یہیں قریب ہی رہتا ہے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

میں نے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ یہ لڑکا واقعی فرزانہ پر....."

"ہاں.....ہاں" حاجی امین نے بے چینی سے کہا "میں ایک دو دفعہ اسے سختی سے منع بھی کر چکا ہوں لیکن یہ باز نہیں آیا۔ کچھ عرصہ پہلے فرزانہ نے بھی شکایت کی تھی کہ یہ سکول جاتے وقت اس کا پیچھا کرتا ہے۔"

حاجی امین یہ بات کہتے کہتے بُری طرح لرز رہا تھا۔ شریف آدمی کے دل پر ایسے مواقع پر جو بیتتی ہے وہی جانتا ہے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا "حاجی صاحب! آپ بے فکر رہیں۔ اس لڑکے کے کس بل اب میں نکالوں گا۔ یا تو محلہ چھوڑ جائے گا یا انسان کا بچہ بن جائے گا۔"

میں نے حاجی امین اور اس کے عزیز کو واپس بھیج دیا۔ غفور اور اس کے دوست جن میں نائی بھی شامل تھا رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے غفورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب انسپکٹر کو کہا کہ اس "رانجھے" کو اُلٹا لٹکا کر ایسی مرلی پھیرو کہ سارے سُر ٹھیک ہو جائیں۔ سب انسپکٹر میرا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے غفورے کو پکڑا اور برآمدے میں لے گیا۔ یہاں چھت سے ایک رسہ لٹک رہا تھا۔ اس نے غفورے کو اُلٹا لٹکایا اور بید کی چھڑی سے شروع ہو گیا۔

ابھی تین چار چیخیں ہی میرے کانوں تک پہنچی تھیں کہ میں باہر آ گیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کیا۔ اُلٹا لٹکنے سے غفورے کی پنڈلیوں پر سے شلوار کھسک گئی تھی اور وہاں بیدوں کے سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل چھڑی سونتے میرے اگلے حکم کا منتظر تھا لیکن میں نے اسے غفورے کو اُتارنے کی ہدایت کی۔ نجانے کیوں مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کا تھا۔ یہ عمر ہوتی ہی بڑی ظالم ہے۔ ذہن ناپختہ، جذبات کی فراوانی اور اندھی خواہشیں، یہ سب کچھ مل کر نوجوان کو عجیب عجیب حرکات پر اُکساتا رہتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد غفورے کے وارث بھی پہنچ گئے۔ میری منت سماجت کرنے لگے۔ میں نے حاجی امین وغیرہ کو بھی بلا لیا۔ لڑکے نے معافی مانگی۔ اس کے ورثاء نے اس کے آئندہ چال چلن کی ضمانت دی۔ قصہ مختصر فریقین میں صلح نامہ ہو گیا۔

یہ واقعہ چوتھے یا پانچویں روز کا ہے۔ میں صبح کے وقت اُٹھا۔ میری بیوی چارپائی پر نظر نہیں آئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"کچھ سنا آپ نے؟" اس نے ہراساں لہجے میں کہا "درزیوں کا غفورا مر گیا..... اس کی لاش ملی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس دوران شکیل بھی اندر آ گیا۔ شکیل میری بیوی کا چھوٹا بھائی ان دنوں ہمارے پاس ہی رہتا تھا۔ اس نے بھی گھبرائے ہوئے انداز میں اس خبر کی تصدیق کی۔ وہ بولا "میں کالج جانے کے لیے نکلا تھا۔ غفورے کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے اور عورتیں بین کر رہی ہیں۔"

اب شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور موقع کی طرف چل دیا۔

.....

غفور کی لاش ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑی تھی۔ یہ الگ تھلگ کمرہ محلے کے منچلے لڑکوں کی آماجگاہ تھا۔ وہ اکثر رات گئے تک یہاں بیٹھے گپیں ہانکتے اور تاش کھیلتے تھے۔ فرش پر دری بچھی تھی، کونے میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ لاش اسی چارپائی پر تھی۔ ایک دو معزز افراد کمرے کے اندر تھے۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کو باضابطہ طور پر اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے موقع کا معائنہ کیا۔ دری شکن شکن تھی۔ سگریٹوں کے ٹوٹے، خالی پیکٹ، پان کی پچکاریاں جابجا دکھائی دے رہی تھیں۔ لاش اکڑ چکی تھی اور رنگ سیاہی مائل نیلا تھا۔ ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی لکیر نکل

کر کان کے اندر چلی گئی تھی۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ متوفی کو زہر دیا گیا ہے۔ میں نے موقع پر موجود افراد سے پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرہ ''شاہ'' نامی ایک نوجوان کا ہے۔

وہ یہاں شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوست اس کمرے میں محفل جماتے تھے۔ کمرے کی چابی متوفی کے پاس ہی ہوتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل رات بھی یہاں چار پانچ لڑکے موجود تھے۔

متوفی کے والد نے روتے ہوئے کہا ''صبح مجھے اس کی ماں نے کہا کہ غفور رات بھر گھر نہیں آیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ رات نو بجے تک گھر آ جاتا تھا۔ میں نے پہلے اس کے چھوٹے بھائی کو بھیجا پھر خود تلاش کرنے نکلا۔ یہاں بیٹھک میں پہنچا تو دروازہ بند تھا لیکن میں نے دباؤ ڈالا تو کھل گیا۔ میرا بیٹا چارپائی پر مُردہ پڑا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ میں یہ منظر برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو کر دہلیز ہی میں گر گیا۔ ہوش آئی تو دوسرے لوگ جمع ہو چکے تھے۔''

موقع کے معائنے کے دوران ہی میرا سب انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ میں نے اسے ضروری ہدایات دیں اور تھانے چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سب انسپکٹر متوفی کے تین دوستوں کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ یہ تینوں بیس سال سے کم عمر تھے۔ ایک پڑھتا تھا اور دو کام کرتے تھے۔ میں نے ان تینوں کو ایک ساتھ کھڑا کر کے کہا ''دیکھو! میں تم سے علیحدہ علیحدہ سوال کروں گا۔ کوشش کرنا کہ جھوٹ نہ بولو۔ اگر تمہارے جوابات ایک دوسرے سے نہ ملے تو تینوں کو اندر کر دوں گا۔'' لڑکے کم عمر تھے اس لیے کافی خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا بمشکل پندرہ سولہ سال کا رہا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا ''غفورے کی موت سے قبل تم تینوں اس کے ساتھ موجود تھے۔ ظاہر ہے تم تینوں میں سے ہی کسی نے اسے زہر دیا ہے۔ اب اگر تم مجھے صاف صاف سب کچھ بتا دو گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہاری مشکل بھی آسان ہو جائے۔ دوسری صورت میں قاتل کا پتہ تو مجھے چلانا ہی ہے۔''

لڑکے نے کہا ''تھانیدار صاحب! میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے میں سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ میں کل رات سات بجے کے قریب بیٹھک میں گیا تھا۔ یونس اور منظور پہلے سے وہاں موجود تھے۔ تینوں تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ میں بھی شریک ہو گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ غفورے نے ایک دو دفعہ اُٹھ کر پانی پیا۔''

میں نے کہا ''مجھے یہ بتاؤ اس دوران تم میں سے کسی نے اسے کوئی چیز کھلائی؟''

لڑکے نے فوراً نفی میں جواب دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا ''ہاں..... یاد آیا، یونس ایک دفعہ اُٹھ کر گیا تھا اور گلی کے پان والے سے سگریٹ اور پان لے کر آیا تھا۔''

''غفورے نے بھی پان کھایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جج جی ہاں۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''تم کہتے ہو کہ تاش کھیلنے کے دوران وہ دو تین دفعہ اُٹھ کر پانی پینے گیا تھا۔ ایسا پان کھانے سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں؟''

لڑکا ذہن پر زور دیتا ہوا بولا ''جناب میرا خیال ہے پان کھانے کے بعد ایسا ہوا تھا..... اور ہاں،

مجھے لگ رہا تھا کہ کھیل میں بھی اسے مزہ نہیں آرہا۔"

لڑکے کی آنکھیں حیرت سے پھیل رہی تھیں۔ شاید اسے بھی یونس کے کردار پر شبہ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دو باتیں کر کے اس کے شبے کو اُبھارا۔ میں نے پوچھا کیا اس سے پہلے یونس اور غفورے میں کوئی تنازعہ موجود تھا۔

لڑکے نے ذہن پر زور دیا لیکن کوئی ایسی بڑی وجہ دریافت نہ کر سکا جو غفورے کے قتل کا سبب بن سکتی تھی۔

میں نے اس سے کہا "جو سوال میں اب پوچھ رہا ہوں اس کا جواب نہایت سوچ سمجھ کر دینا۔ مجھے یہ بتاؤ فرزانہ والے چکر کا غفورے کے قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟"

لڑکے نے پریشانی سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا "مجھے اس بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں جناب..... لیکن اگر یہ کام یونس کا ہے تو..... یہ کوئی اور ہی چکر ہوگا۔" میں غور سے لڑکے کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور آنکھوں میں سخت حیرت دکھائی دینے لگی۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر بولا "جناب! مجھے جو کچھ معلوم ہے میں آپ کو بتا دیتا ہوں..... لیکن آپ وعدہ کریں کہ مجھے چھوڑ دیں گے۔"

میں بھانپ چکا تھا کہ لڑکا کسی اہم نتیجے پر پہنچا ہے۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا "برخوردار! میں کہہ چکا ہوں کہ اگر میرے لیے آسانی پیدا کرو گے تو تمہارے لیے بھی آسانی ہو گی۔ اگر تم بے قصور ہو تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

لڑکا بولا "تھانیدار صاحب! ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی بات درست ہی ہو۔ غفورے کا قتل..... اس لڑکی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو پتہ ہو گا کہ اس لڑکی کے چچا سے غفورے کا کچھ روز پہلے جھگڑا ہوا تھا۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ یونس کا اس شخص کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہے۔ پرسوں ہی میں نے ان دونوں کو اکٹھے سائیکل پر جاتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ یونس سے اس بارے میں پوچھوں گا لیکن پھر مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ اس وقت یونس مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ میں نے ان دونوں کو سینما ہال میں دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ یونس اس شخص کے کہنے پر غفورے کو زہر کھلا سکتا ہے؟"

لڑکا گڑبڑا کر بولا "میں یہ نہیں کہہ رہا لیکن..... لیکن ہو سکتا ہے کہ غفورے کی موت اس لڑکی کی وجہ سے ہوئی ہو۔"

میری اگلی گفتگو یونس عرف یونی سے ہوئی۔ وہ بھی درزیوں کا کام کرتا تھا۔ غفورے کے ساتھ اس کی دوستی پرانی تھی۔ میں نے شکل و شباہت سے اندازہ لگایا کہ وہ ہوشیار اور گہرا لڑکا ہے۔ اس نے بھی کم و بیش وہی باتیں دہرائیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ گلی کی دکان سے چار الائچی سپاری پان لے کر آیا تھا۔ اس سے فرزانہ کے بارے میں بھی کچھ مزید باتیں معلوم ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ غفورا اس کا دیوانہ تھا۔ تھانے کی ہوا کھا کر اس کا عشق کچھ اور بھڑک گیا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا اور اس پریشانی کا سبب فرزانہ ہی تھی۔ اس نے مزید بتایا کہ فرزانہ کے بارے میں اس کی زیادہ تر گفتگو منظور سے ہوا کرتی تھی۔ وہ اس سے فرزانہ کو خط بھی لکھوایا کرتا تھا۔ یونس نے جو ایک نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ فرزانہ نے غفورے کو خطوط بھی لکھے تھے۔ میں نے یونس عرف یونی پر پولیس والوں

کا مخصوص داؤ آزمانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے کہا کہ (فدا حسین اس کے پہلے دوست) نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے اور اگر وہ ساری بات سچ سچ نہیں بتائے گا تو اس کا کیس اور خراب ہو جائے گا۔ وہ خوفزدہ ہو کر قسمیں کھانے لگا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ پچھلے دو تین دن سے فرزانہ کے چچا سے ملاقاتیں کر رہا ہے، آخر کیوں؟ وہ پہلے تو گھبرایا پھر بولا

"جناب! چاچے شریف سے میری پرانی سلام دعا ہے۔ ہمارے گھر قریب قریب ہی ہیں۔ راہ میں آتے جاتے آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔"

غرض میں نے اسے کئی طرح سے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ڈھب پر نہیں آیا۔ میں نے اسے باہر بھیج کر منظور کو اندر بلایا۔ یہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ عمر کوئی اٹھارہ سال رہی ہو گی۔ دونوں رخسار غیر معمولی طور پر اُبھرے ہوئے تھے۔ میٹرک پاس تھا اور اب پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ غفورے کا رازدان تھا اور غفورے نے ایک دو بار اس سے فرزانہ کو خط بھی لکھوائے تھے۔ اس نے اپنے پہلے دو ساتھیوں کے بیانات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ رات تقریباً سات بجے وہ تینوں غفورے کے ساتھ موجود تھے۔ پھر نو ساڑھے نو کے درمیان فدا حسین اور یونس گھروں کو چلے گئے اور وہ غفورے کے ساتھ رہا لیکن دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔ اس نے کہا

"انسپکٹر صاحب! میں آپ کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ ایسی بات جو فدا حسین اور یونس کو بالکل معلوم نہیں....." پھر کچھ دیر سوچ کر بولا "انسپکٹر صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ آپ اس بات پر یقین نہیں کریں گے..... اور ہو سکتا ہے آپ کو مجھ پر غصہ آ جائے....."

میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "دیکھو لڑکے! میرے پاس پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں جو کچھ معلوم ہے صاف صاف بتا دو۔ ہو سکتا ہے جو تم بتانے جا رہے ہو مجھے پہلے سے معلوم ہو۔"

منظور نے تھوک نگلا اور ڈرامائی لہجے میں بولا "انسپکٹر صاحب! کل رات منا غفورے سے ملنے آیا تھا۔"

یہ اطلاع میری سماجت کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے ان دنوں میری بیوی کا چھوٹا بھائی یعنی میرا سالا میرے گھر میں رہ رہا تھا اس کا نام شکیل تھا لیکن سب اسے منا منا کہتے تھے۔ اس نے مقامی کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کافی ہونہار لڑکا تھا۔ مجھے اس میں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ میری بیوی تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔ یوں بھی اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ میری شادی کو تقریباً دو سال ہوئے تھے اور ان دو سالوں میں وہ ہمارے پاس ہی رہا تھا۔ مجھے بہنوئی سے زیادہ وہ بڑے بھائی کی طرح سمجھتا تھا اور اسی طرح عزت کرتا تھا..... چند لمحے میں سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا پھر میرا ہاتھ بڑھا اور میں نے منظور کا گریبان پکڑ لیا "کیا بکتے ہو؟" میں زور سے دھاڑا۔

منظور نے اپنے حواس درست کیے اور بولا "جناب! میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ اگر میری بات جھوٹ نکلے تو جو جی چاہے سزا دیں۔"

میں نے کہا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ غفورے کے قتل میں منے کا ہاتھ ہے..... لیکن کیوں؟ وہ کیوں قتل کرنے لگا اسے؟"

منظور نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور جھجک کر بولا "انسپکٹر صاحب! وہ ..... وہ بھی

فرزانہ سے..... محبت کرتا ہے۔" یہ میرے لیے دوسرا ذہنی جھٹکا تھا۔ میرے گھر کے اندر یہ کھیل ہو رہا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا..... نہیں یقیناً یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اسے گریبان سے جھنجھوڑا۔

"دیکھو! اگر تمہارے یہ الزامات غلط ثابت ہوئے تو برا حشر ہوگا تمہارا۔"

"جناب! میں آپ کو ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ میرے پاس فرزانہ کے خطوط ہیں جو اس نے غفورے کو لکھے تھے اور جن میں منے کا ذکر بھی ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن ایک بات یقینی تھی کہ منظور جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور تھی۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑتے ہوئے خود پر قابو پایا اور اسے اپنے الزامات کی وضاحت کرنے کو کہا۔ اس نے کہا "جناب! یہ چکر کوئی ایک سال سے چل رہا ہے۔ پہلے منے اور فرزانہ کا چکر شروع ہوا۔ یہ دونوں کافی عرصہ پہلے چپکے چپکے ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے پھر غفورا بھی فرزانہ سے دل لگا بیٹھا۔ منا شروع شروع میں ذرا خاموش طبع اور شرمیلا تھا۔ اس کے مقابلے میں غفورا تیز طرار اور بے باک تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک ہی لڑکی سے محبت کر رہے ہیں اور وہ ان دونوں کو دھوکہ دے رہی ہے۔ اس کے باوجود دونوں مجبور تھے۔ جہاں تک فرزانہ کا تعلق ہے وہ دونوں کی محبت کا جواب محبت سے دے رہی تھی لیکن ملتی کسی سے بھی نہیں تھی۔ اپنے خطوط میں اس نے غفورے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ظاہر ہے منے کی بھی کی ہو گی۔ دونوں اس کے عشق میں دیوانے تھے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں منے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ فرزانہ اس کے ساتھ ساتھ غفورے سے بھی تعلق رکھے۔ کوئی ایک ماہ پہلے وہ غفورے سے ملا بھی تھا۔ دونوں نے اس معاملے میں کھل کر بات کی تھی۔ اس ملاقات کے بعد وہ اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ میں نے دو تین بار انہیں اکٹھے دیکھا لیکن کبھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن یا رقیب ہیں..... کل رات بھی منا غفورے سے ملنے آ رہا تھا۔ غفورے نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے غفورے سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں لیکن وہ کہنے لگا کہ نہیں ہم تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی منا پسند نہیں کرتا تھا کہ ان دونوں کی گفتگو میں کوئی تیسرا شخص شریک ہو۔ میں نے غفورے کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور ساڑھے نو بجے کے قریب بیٹھک سے گھر چلا آیا۔ اس کے بعد کیا پیش آیا مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں وہ کیا بات ہو سکتی ہے جو منا اس سے کرنا چاہتا تھا۔"

منظور نے تھوڑی دیر توقف کیا پھر بولا "انسپکٹر صاحب! وہ تینوں..... میرا مطلب ہے کہ غفورا، منا اور فرزانہ عجیب و غریب حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ پچھلے دنوں مجھے غفورے نے بتایا تھا کہ کشمکش کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کون سی کشمکش کا کیا فیصلہ ہونے والا ہے؟ غفورے نے بتایا کہ اگلے ہفتے فرزانہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو گھر سے باہر ملے گی۔ جو بھی اس سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوا وہ دوسرے کو لڈو کھلائے گا اور لڈو کھانے والا ہمیشہ کے لیے فرزانہ کے راستے سے ہٹ جائے گا..... میرا خیال ہے کہ یہ کوئی ایسا ہی معاملہ تھا۔ ہو سکتا ہے منا فرزانہ سے ملاقات میں کامیاب ہو گیا ہو اور وہ کامیابی کے لڈو لے کر غفورے کے پاس آیا ہو۔ میں اس بارے میں جاننے کے لیے بہت بے چین تھا لیکن صبح ہوئی تو

غفورا مجھے یہ سب کچھ بتانے کے لیے زندہ نہیں تھا۔"

منظور کی باتیں بظاہر عجیب سی تھیں لیکن مجھے یہ ناقابل یقین اس لیے نہیں لگیں کہ منا اور غفورا وغیرہ جس عمر سے تعلق رکھتے تھے اس میں ایسی بیوقوفیاں عام سرزد ہوتی ہیں۔ اوائل شباب میں کسی پر عشق کا بھوت سوار ہو جائے تو بڑی مضحکہ خیز حرکات دیکھنے میں آتی ہیں..... لیکن یہاں جو حرکت سرزد ہوئی تھی وہ مضحکہ خیز نہیں نہایت سنگین تھی۔ ایک نوجوان ہلاک ہو چکا تھا اور مجھے اس کی موت کا سبب ڈھونڈنا تھا۔ اگر اسے کسی نے قتل کیا تھا تو قاتل کی تلاش ضروری تھی۔ یہ سوچ کر میں لرز گیا کہ اس قتل کا ذمہ دار اگر واقعی منا ہوا تو؟"

ابتدائی تفتیش اور رپورٹ کے بعد لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔ دوپہر کے وقت میں تھانے سے گھر پہنچا۔ منا گھر ہی میں تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور میری بیوی دوپٹے کا پلو ہلا ہلا کر مکھیاں دور ہٹا رہی تھی۔ میرے تیور دیکھ کر وہ کچھ چونکا اور لقمہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا "بسم اللہ، بسم اللہ" میری بیوی نے جلدی سے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میری بیوی بھی اب میرا چہرہ تک رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ لڑکا قاتل ہے..... لیکن حالات کی انگلی دھیرے دھیرے جس شخص کی طرف اٹھ رہی تھی وہ یہی تھا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں اسے کہا کہ وہ کھانا کھا کر فوراً میرے کمرے میں آئے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ذرا دیر بعد میری بیوی اندر داخل ہوئی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی "کیا بات ہے۔ آپ کچھ غصے میں ہیں۔ منے سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟"

میں نے کہا "تم باہر جاؤ اور اسے میرے پاس بھیجو۔ ابھی تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔" بیوی میرے لہجے پر اور بھی ڈر گئی۔ اس دوران منا کپڑے سے ہاتھ پونچھتا اندر آ گیا۔ میں نے بیوی کو باہر بھیج کر دروازہ بند کر لیا۔ جب وہ میری ہدایت پر چارپائی پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا "کل رات ساڑھے نو اور گیارہ بجے کے درمیان تُو کہاں تھا؟"

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ہکلا کر بولا "میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا۔"

"بکواس بند کر۔" میں دھاڑا "تُو اپنے کمرے میں پڑھ نہیں رہا تھا بلکہ شاہ کی بیٹھک میں غفورے کے پاس تھا۔"

"یہ..... یہ غلط ہے بھائی صاحب۔" میرا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔ میں نے غصے سے کہا "..... اور یہ بھی غلط ہے کہ تُو نے حاجی کی لڑکی سے یارانہ لگا رکھا ہے..... اور یہ بھی غلط ہے کہ تُو اسے خط لکھتا ہے اور ملاقاتیں کرتا ہے..... دیکھ مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دے کل رات تُو کہاں تھا اور کیا گل کھلایا ہے۔"

وہ قدرے تیزی سے بولا "تو آپ کا خیال ہے غفورے کو میں نے مارا ہے۔ حیرانگی ہے آپ اتنی آسانی سے مجھ پر یہ الزام لگا رہے ہیں۔"

میں نے چلا کر کہا "اگر یہ الزام ہے تو بتا کل رات کہاں تھا تُو؟ میں نے خود ان آنکھوں سے تجھے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"میں صرف ایک بار پیشاب کرنے باہر نکلا تھا۔"

"پھر وہی جھوٹ۔" مجھے طیش آ گیا۔ میں نے اس پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ اس دوران میری بیوی دروازہ پیٹنے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ "ہائے میرا لال" کہتی ہوئی بھائی سے لپٹ گئی۔

میں نے کہا "اسے اچھی طرح گلے سے لگا کر چوم چاٹ لے۔ ہوسکتا ہے کل تک یہ سلاخوں کے پیچھے پلا جائے۔"

"کیوں کیا کیا ہے اس نے؟" وہ ڈر کر بولی۔

"اللہ کرے اس نے کچھ نہ کیا ہو..... لیکن مجھے ایسا لگتا نہیں۔" میں یہ کہتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے اپنا کمرہ بند کیا اور نہایت پریشانی کے عالم میں سوچ بچار کرنے لگا۔ حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا تھا کہ تفتیش صرف تین راستوں پر چل سکتی ہے۔ پہلا راستہ اس واقعے سے نکلتا تھا جو چند روز پہلے نائی کی دکان پر پیش آیا تھا اور جس میں غفور نے امتیاز کے وار سے شریف نامی شخص کو زخمی کیا تھا۔ دوسرا راستہ خود میرے اپنے گھر سے شروع ہوتا تھا اور اگر یہ راستہ درست تھا تو اس کے دوسرے سرے پر میں اپنے سالے کو پھانسی کے تختے پر لٹکا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ متوفی نے کسی واقعے سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کی ہو لیکن اس کا فیصلہ پوسٹمارٹم رپورٹ اور دوسری شہادتوں کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرا دل چاہ رہا تھا کہ تفتیش کا پہلا راستہ ہی درست ثابت ہو اور میں اس طوفان سے بچ جاؤں جو میرے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا..... لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اوپر تلے ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے میرے گھر کا سکون درہم برہم کر دیا۔

موجودہ حالات میں فرزانہ سے پوچھ گچھ ضروری ہو چکی تھی۔ اگلے روز میں نے اس کے باپ کو بلایا اور تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ وہ بھلا مانس شخص پیش آنے والے حالات کے تصور سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے حتی المقدور اس کی ڈھارس بندھائی اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ میرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ کافی پرکشش اور شوخ لڑکی تھی لیکن اس وقت بے حد سہمی ہوئی تھی۔ چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا باپ نے اسے میرے پاس بھیجنے سے پہلے بُری طرح پیٹا ہے۔ وہ مجھے چچا کہہ کر بلاتی تھی۔ میں نے بڑے پیار محبت سے اس کا خوف دُور کیا اور دھیرے دھیرے اسے بولنے کے لیے تیار کر لیا۔ مشکل میں اس کو ڈھارس بندھانے والا ملا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک نیم پختہ ذہن کی بچی تھی۔ اس سے غلطیاں ہوئی تھیں اور نہایت سنگین ہوئی تھیں لیکن اس میں جہاں وہ قصوروار تھی وہاں اس کے اردگرد کا ماحول اور والدین بھی قصوروار تھے۔ اس کا باپ صبح کا گیا رات گئے گھر آتا تھا۔ ماں کو گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں تھی۔ نہ مناسب روک ٹوک اور نہ ضروری آزادی۔ ایسے میں کچا ذہن ادھر ادھر نہیں بھٹکے گا تو کیا ہوگا۔ بہرحال میں نے لڑکی کا ہمدرد بن کر اس کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ جھجکتی رہی لیکن جب میں نے اسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ ذہن کی گرہیں کھولنے لگی۔ اس کی طویل گفتگو کا لب لباب یہ ہے۔

"منظور کی کہی ہوئی زیادہ تر باتیں درست تھیں۔ لڑکی منے اور غفورے دونوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس نے شغل کے طور پر شروع کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ معاملہ سنجیدہ ہوتا گیا تھا۔ وہ دونوں اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ پچھلے چند دن سے یہ دوڑ اور بھی شدید ہوگئی تھی۔ منے اور غفور نے اسے کئی خط لکھے تھے جن میں اس سے گھر سے باہر ملنے کی

درخواست کی گئی تھی۔ فرزانہ یہ سمجھتی تھی کہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے جہاں اسے دونوں دوستوں میں سے ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ کئی روز فیصلے کی سولی پر لٹکنے کے بعد اس نے دو دن پیشتر منے سے ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات ایک معروف تاریخی سیرگاہ میں ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کو اس معاہدے کا کوئی علم نہیں جس میں دونوں لڑکوں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا تھا کہ جو فرزانہ سے ملنے میں کامیاب ہوا وہ اس کھیل کا تنہا کھلاڑی تسلیم ہوگا۔

فرزانہ سے پوچھ گچھ کے بعد منے کے متعلق میرے شبہات کو تقویت ملی..... ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا تو بہت سی کڑیاں آپس میں مربوط ہونے لگیں۔ اگر فرزانہ چند روز پہلے منے سے ملی تھی تو منظور کا لگایا ہوا اندازہ درست ثابت ہوتا تھا۔ فرزانہ سے ملنے کے بعد منا اس رات غفورے سے ملا تھا..... وہ شرط جیت گیا تھا اور شرط کے مطابق اس کے پاس لڈوؤں کا لفافہ تھا لیکن یہ لڈو دراصل قتل کا ہتھیار تھے۔ منے نے زہریلے لڈو کھلا کر غفورے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا لیکن یہاں سوچنے کی بات تھی کہ اگر منا شرط جیت گیا تھا تو پھر اسے زہریلے لڈو کھلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے راستے کی رکاوٹ تو خود بخود دُور ہو رہی تھی۔ غفورا ان دونوں کے درمیان سے نکل رہا تھا۔ پھر ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور امید کی ایک روشن کرن دکھائی دی۔ اگر منا اس کھیل میں کامیاب رہا تھا تو زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ غفورے نے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش کی ہو..... میں نے اس پہلو سے غور کیا تو گتھی سلجھی ہوئی محسوس ہوئی۔ غفورا یقیناً خودکشی کا مرتکب ہوا تھا۔ منے نے اسے اپنی کامیابی کی اطلاع دی تھی اور یہ اطلاع اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر گئی تھی۔ منے کے جانے کے بعد وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اس نے بیٹھک کا دروازہ بند کر کے زہر کھایا تھا اور وہیں چارپائی پر لیٹ رہا تھا۔

اسی روز شام کے وقت پوسٹمارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ میں موت کی وجہ زہرخورانی بتائی گئی تھی۔ زہر رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان دیا گیا تھا۔ موت کوئی بارہ بجے ہوئی تھی۔ معدے سے ملنے والے مواد میں پان، لڈو اور چائے کے اجزاء موجود تھے۔ میری سابقہ معلومات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ منا اس رات متوفی سے ملا تھا اور اس نے اسے لڈو کھلائے تھے۔ کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ یہ بتانے سے قاصر نظر آتی تھی کہ متوفی کے معدے اور انتڑیوں میں پایا جانے والا زہر کس چیز میں ملا کر کھلایا گیا تھا۔

.....

میں چونکہ خودکشی کی لائن پر سوچ رہا تھا اس لیے میں نے اگلے روز غفورے کے کچھ دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے ملاقات کی اور مذکورہ شک ذہن میں رکھتے ہوئے ان سے سوالات کیے۔ اس مغز کھپائی سے پتہ چلا کہ غفورا اس سے پہلے بھی خودکشی کی ایک کوشش کر چکا تھا۔ یہ واقعہ جس طرح میرے کانوں تک پہنچا میں من و عن آپ کو بتا دیتا ہوں۔

پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے غفورے نے اپنے بڑے بھائی کی بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا بڑا بھائی دوسرے شہر میں کام کرتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں یہ شاخسانہ شروع ہو گیا۔ ایک رات غفورے نے مبینہ طور پر گھر کے تمام افراد کو کوئی نشہ آور چیز پلا دی۔ رات گئے جب وہ بری نیت سے بھائی کی بیوی کے پاس پہنچا تو اس نے غفورے کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ شور سن کر گھر کے کچھ اور افراد بھی جاگ گئے۔ اس واقعے کی خبر گھر سے باہر بھی نکلی تھی اور محلے میں خوب چرچا ہوا

تھا۔ غفورے کو سخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔ یقیناً اسی واقعہ سے متاثر ہو کر اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس نے نیلا تھوتھا کھا لیا تھا لیکن بروقت طبی امداد سے جان بچ گئی۔ اس شہادت سے دو باتیں سامنے آئیں۔ غفورا ڈھیلے کردار کا لڑکا تھا اور اس سے پہلے بھی اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

میں نے منے سے ایک بار پھر تفصیلی بات چیت کی۔ اس روز میں نے اسے تھانے ہی بلا لیا۔ وہ اب تک سخت خوفزدہ تھا۔ ایک روز پہلے اس نے اپنی بہن کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ رات کو غفورے کے پاس گیا تھا اور اسے لڈو بھی کھلائے تھے لیکن اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی بہن یعنی میری بیوی بھی بڑی بڑی قسمیں کھا رہی تھی کہ اس کا بھائی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے منے سے کہا کہ اگر غفورے کی ہلاکت میں اس کا ہاتھ نہیں تو پھر اس کی موت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ منے نے جو جواب دیا وہ میری توقع کے عین مطابق تھا اور اس سے میری کافی تسلی بھی ہوئی۔ اس نے کہا

"بھائی صاحب! میں سوچتا ہوں اس نے خودکشی کی ہے۔ مجھ سے ملنے کے بعد وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اپنی جان لینے کی کوشش کرے گا۔ کاش مجھے اس وقت اس کے ارادے کا علم ہو جاتا۔" منے نے یہ بھی بتایا کہ اس کے آنے کے بعد غفورا بیٹھک ہی میں رہا تھا اور اس نے اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔

بہرحال غفورے کی ہلاکت کے بعد چوتھے دن کی شام تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے لیکن پھر جیسا کہ میں نے بتایا ہے، اوپر تلے چند واقعات ہوئے جنہوں نے میری تفتیش کی عمارت دھڑام سے نیچے گرا دی اور ایک بار پھر میری نظریں منے پر جم گئیں..... اس روز شام کے وقت تھانے کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ پتے کے ساتھ میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ یہ ایک گمنام خط تھا لیکن مفصل اور حیرت انگیز حد تک مدلل۔ لکھنے والے نے اپنے خیالات نہایت مؤثر طریقے سے بیان کئے تھے۔ مضمون کچھ یوں تھا

"انسپکٹر صاحب! غفورے کو قتل کیا گیا ہے۔ قاتل آپ کے گھر میں ہے۔ میں آپ کو اس بات کا ثبوت فراہم کر سکتی ہوں۔ بدھ کی دوپہر یعنی غفورے کے قتل سے ایک روز پہلے ایک برقعہ پوش عورت شہر سے باہر کچی آبادی میں پہنچی تھی۔ وہاں "راول" نامی ایک جوگی سے اس نے زہر خریدا تھا۔ یہ برقعہ پوش عورت دراصل آپ کا برادر نسبتی شکیل عرف منا تھا۔ اس نے جو زہر خریدا تھا اس کا کچھ حصہ اب بھی اس کے پاس موجود ہے۔ اگر آپ کوشش کریں تو منے کے سائیکل کی گدی کے نیچے ایک چھوٹی سی پڑیا آپ کو مل جائے گی لیکن ہو سکتا ہے وہ پڑیا آپ کو نہ ملے۔ میں ایک دوسرا ثبوت فراہم کرتی ہوں۔ وہی برقعہ پوش عورت آپ کے محلے میں مختار نامی حلوائی کے پاس بھی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اسے لڈو چاہئیں۔ حلوائی کے پاس موٹی بوندی کے سخت لڈو تھے۔ اس عورت نے کہا تھا کہ اسے موتی چور کے نرم لڈو چاہئیں۔ حلوائی نے کہا تھا کہ وہ موتی چور لڈو نہیں بناتا لیکن موٹی بوندی کے تازہ لڈو بننے والے ہیں۔ عورت تازہ لڈوؤں کے انتظار میں آدھ گھنٹہ دکان پر کھڑی رہی تھی۔ تازہ لڈو نرم ہوتے ہیں اور توڑ کر باسانی بنائے جا سکتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ ایک تیسرا ثبوت اب میں آپ کو فراہم کرتی ہوں اور آپ اسے جھٹلا نہیں سکیں گے۔ آپ ایک ذہین پولیس والے ہیں لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے آپ کا برادر نسبتی دو یا تین لڈو لے کر تو مقتول کے پاس نہیں گیا تھا۔

اس کے پاس کم از کم ایک آدھ سیر لڈو ہوں گے۔ مقتول نے تمام لڈو تو نہیں کھائے ہوں گے۔ پھر باقی لڈو کدھر گئے۔ جی ہاں..... وہ لڈو موقع سے اُٹھا لیے گئے تھے۔ اس لیے کہ وہ زہریلے تھے۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے وہ لڈو کہاں ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ آپ کے گھر کے پچھواڑے کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا گڑھا ہے۔ یہ لڈو لفافے میں بند اسی کوڑے میں پڑے ہیں۔ اب ایک ایسا ثبوت میں آپ کو فراہم کرتی ہوں جو اس قتل کا معمہ صاف صاف حل کر دے گا۔ ''محلہ سادھونگر'' میں ایک دوائیوں کی دکان ہے۔ ڈاکٹر مہتا وہاں بیٹھتے ہیں۔ قتل کی رات وہ آپ کے محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر سائیکل پر سوار واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے شکیل عرف منے کو دیکھا۔ وہ ایک گلی سے نکلا اور گھبراہٹ میں ان کی سائیکل سے ٹکرایا۔ ڈاکٹر مہتاب سے ایک دو بار اس نے دوائی لی تھی۔ وہ اسے پہچان گئے۔ انہوں نے اسے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اس کے ہاتھ وہی لفافہ تھا جو اس وقت آپ کے گھر کے پچھواڑے پڑا ہے اور جس میں سے اس نے غفور کو لڈو کھلائے تھے۔ سائیکل سے ٹکرانے کے بعد یہ لڈو گر گئے تھے اور ڈاکٹر مہتا نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ لفافے میں ڈالے تھے۔ وہ اس لفافے اور ان لڈوؤں کو بآسانی پہچان سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ شہادتیں جرم کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

.....آپ سوچتے ہوں گے میں کون ہوں اور مجھے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں۔ ممکن ہے آپ یہ بھی سوچتے ہوں کہ میں یہ سب کچھ منے کو پھنسوانے کے لیے کسی کی ایماء پر لکھ رہی ہوں۔ یقین جانیں میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنی مرضی سے لکھا ہے۔ آپ کے ذہن میں اُٹھنے والے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ منے سے میرا قریبی تعلق رہا ہے..... اور میں ایک مظلوم لڑکی ہوں اور یہی مظلومیت میرے قلم اُٹھانے کا سبب بنی ہے.....''

یہ خط ایک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ میں فوراً تھانے سے اُٹھا اور خط کے الزامات کی تصدیق کے لیے چل دیا۔ مختصراً سب سے پہلے میں کچی آبادی میں پہنچا۔ وہاں سے حلوائی مختار کی دکان پر آیا اور وہاں سے اپنے گھر کا پچھواڑہ دیکھا۔ تینوں اطلاعات بالترتیب درست ثابت ہوئیں۔ یقیناً چوتھی اطلاع بھی درست تھی۔ منے کی سائیکل کے نیچے گدی میں ایک پڑیا موجود تھی لیکن وہ پھٹ گئی تھی اور سپرنگوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا لگا رہ گیا تھا۔ آخری ثبوت کے لیے میں قریبی محلے سادھونگر پہنچا۔ ڈاکٹر مہتا کھچڑی ڈاڑھی والا ایک شریف النفس سکھ تھا۔ وہ محض ایک کمپاؤنڈر تھا مگر خاصا قابل معالج تھا۔ اس لیے گاؤں والے اسے ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔ میں نے اسے کوڑے سے برآمد ہونے والا لفافہ دکھایا اور تفصیلی گفتگو کی۔ جب میں اس کی دکان سے نکلا تو میرے ذہن سے منے کے قاتل نہ ہونے کا ہر امکان دُور ہو چکا تھا۔

تھانے آ کر میں بے دم سا ہو کر کرسی پر گر گیا۔ میرا سب انسپکٹر میری ہدایت کے مطابق غفورے کے تمام خطوط جمع کر چکا تھا۔ ان میں سے کچھ خطوط منظور کے پاس تھے اور کچھ اس کے اپنے سامان میں۔ میں خالی خالی نظروں سے یہ خطوط دیکھتا رہا۔ آخر میں ایک ایسا خط نظر سے گزرا جس سے یہ بات مزید یقینی ہو گئی کہ غفورے نے خودکشی نہیں کی۔ یہ خط غفورے نے اپنی موت کے روز صبح کے وقت لکھا تھا۔ یہ خط اس کی اپنی لکھائی میں تھا۔ غفورا خود بھی لکھ سکتا تھا لیکن شکستہ ہینڈ رائٹنگ کے علاوہ اردو بھی واجبی سی آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فرزانہ کے لیے خط اپنے دوست منظور سے لکھواتا تھا۔ مذکورہ خط اس نے اپنے

جگری یار "شاہ" کو لکھا تھا۔ یہ وہی شاہ ہے جس کے کمرے میں وہ مُردہ پایا گیا۔ خط کا مضمون یہ تھا

"فرزانہ کا قصہ انجام کی طرف بڑھ رہا ہے میرا خیال ہے کہ وہ منے سے ملی ہے۔ آج رات منا مجھ سے ملنے آ رہا ہے بہرحال کچھ بھی ہے میں ہار ماننے والا نہیں۔ شرط ہار بھی گیا تو فرزانہ کو نہیں ہاروں گا....."

موت سے چند گھنٹے قبل لکھا گیا یہ خط صاف بتا رہا تھا کہ غفورے کا ارادہ خودکشی کا بالکل نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ منا فرزانہ سے ملا ہے۔ لہٰذا اس کے دل برداشتہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس خط سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا تھا کہ فرزانہ کی محبت جیت کر بھی منے نے غفورے کو قتل کیوں کیا تھا۔ درحقیقت وہ جان چکا تھا کہ غفورا ان دونوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ شدید رقیبانہ جذبات کے تحت اس نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اب انتظار فضول تھا۔ شواہد چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ منا مجرم ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جس لڑکی نے منے کا بھانڈا پھوڑا ہے وہ نہ صرف اس کی گہری رازداں تھی بلکہ دلی طور پر اس سے متنفر بھی تھی۔ اس نے اپنے خط میں واضح طور پر اشارہ دیا تھا کہ اگر میں نے اپنی بیوی کے بھائی کے خلاف کارروائی سے دریغ کیا تو وہ اس خط کی ایک نقل میرے اعلیٰ افسران کو بھیجے گی۔ اگر اس کے خط میں یہ دھمکی نہ بھی ہوتی تو بھی میں مجرم کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یہ میرے کردار کی کڑی آزمائش تھی اور مجھے اس آزمائش سے گزرنا تھا۔ میں تھانے سے فوراً گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ منا غائب ہے۔ میری بیوی نے بتایا کہ وہ سہ پہر کا گیا واپس نہیں آیا لیکن میں جانتا تھا وہ واپس آیا ہوگا۔ دراصل میری بیوی بھانپ چکی تھی کہ میں اس کے بھائی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والا ہوں۔ اس نے اسے مطلع کر دیا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔ میرے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نجانے میرے منہ سے کیا کیا نکلا۔ وہ سنتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک اکلوتے بھائی کی بہن تھی لیکن وہ جذبات میں اپنا دوسرا رشتہ فراموش کر رہی تھی۔ اس کا یہ رشتہ ایک ذمہ دار پولیس اہلکار سے تھا۔

یہ میرا خانگی جھگڑا تھا اور شاید قارئین کو اس سے دلچسپی بھی نہ ہو لہٰذا میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بہرحال میرے سسرال والے اس معاملے میں کود پڑے اور انہوں نے جھگڑے کو سنگین تر بنا دیا۔ ایک سسرالی رشتہ دار جو خود پولیس میں تھا اور میرا ہم منصب بھی، اس معاملے کو بگاڑنے کا خاص سبب بنا۔ اس نے کہا کہ نواز خاں جان بوجھ کر کیس خراب کر رہا ہے۔ وہ بآسانی منے کو مشکوک افراد کی فہرست سے خارج کر سکتا ہے..... اس پر صرف دیانتداری کا بھوت سوار ہے۔ اس نے کچھ ایسے نقطے بیان کیے جن سے منا بالکل بری الذمہ ہو جاتا تھا۔

اسی دوران اس گمنام لڑکی نے حسب تنبیہ ایک خط افسران بالا تک پہنچا دیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، گمنام ہونے کے باوجود وہ ایسا مدلل خط تھا کہ اگر کسی اور انسپکٹر کے خلاف ہوتا تو اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر لائن حاضر کر دیا جاتا لیکن افسران بالا میرے بارے میں بڑے اچھے خیالات رکھتے تھے۔ ایس پی صاحب نے مجھے ہیڈکوارٹر بلایا اور بڑی نرمی سے بتایا کہ بھئی تمہارے خلاف ایک چٹھی آئی ہے۔ میرا ہمدرد سب انسپکٹر بھی وہیں موجود تھا۔ میری آمد سے قبل اس سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ وہ ایک کینہ پرور شخص تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اس نے میرا دفاع کرنے کی بجائے، ایک آدھ بات زیادہ ہی لگائی ہو گی۔ وہاں جو گفتگو ہوئی وہ تکنیکی بحث کے زمرے

میں آتی ہے۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے واقعہ کو طول نہیں دوں گا۔ مختصراً یہ کہ ایس پی صاحب نے کہا "انسپکٹر نواز! مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملزم کے تمہارے رشتے دار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنا فرض پوری دیانتداری اور مہارت سے انجام دو گے۔ بہرحال میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کی بھنک اوپر تک پہنچ چکی ہے۔"

میں ایس پی صاحب کی بات سمجھ رہا تھا۔ ہر پیشے اور شعبے میں خیرخواہ اور بدخواہ موجود ہوتے ہیں۔ میرے وہ ساتھی جو میری فرض شناسی کا ذکر تلخ الفاظ میں کیا کرتے تھے، افواہ سازی کے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی عنایات سے یہ خبر افسران بالا کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور اب..... ایس پی صاحب مجھے تنبیہ کر رہے تھے کہ "نواز خان! ذرا سنبھل کے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر اُٹھا اور ایس پی صاحب سے کہا "سر! آپ کو یہ وردی کبھی دھوکہ نہیں دے گی۔" پھر سیلوٹ کر کے میں تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

.....

میری بیوی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی میں اس کے پاس کیوں آیا ہوں۔ میں اس سے شکیل عرف منے کا پتہ پوچھنے آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ منے کو اس نے بھیجا ہے اور وہی اس کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ ایک عورت کے لیے یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ ایک طرف اس کا بھائی تھا جو مجرم تھا لیکن جسے وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھی، جس کے پسینے پر وہ خون بہانے کو تیار رہتی تھی اور دوسری طرف اس کا شوہر تھا جس کے چہرے پر ہمدردی اور رحم کا شائبہ تک نہ تھا۔ جسے صرف اپنے فرض سے غرض تھی..... اور جو اس کے بھائی کو پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان کافی دیر ایک بوجھل خاموشی حائل رہی۔ پھر میں نے سنبھل سنبھل کر کہا "منے کا ملنا بہت ضروری ہے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم میری مدد کرو گی یا مجھے اپنے طور پر اس کا پتہ چلانا ہوگا۔"

"کیا کوئی تیسرا راستہ نہیں۔" میری بیوی نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میری بیوی نے اس وقت منے کے بارے میں کچھ نہایت جذباتی باتیں کیں لیکن میرے پایۂ استقامت میں لغزش نہ آئی۔ میں نے اسے کہا "یوں آنسو بہانے اور گریہ زاری سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ ملزم ہے اور اگر مجرم ثابت ہوتا ہے تو اسے کیے کی سزا ملے گی۔"

"چاہے وہ پھانسی ہو؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"ہاں چاہے وہ پھانسی ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان نظروں میں دنیا جہان کی عورتوں کا دُکھ سمٹ آیا تھا۔ ان تمام عورتوں کا دُکھ جو مردوں سے پیار کرتی ہیں۔ سخت گیر باپوں سے، خودغرض بھائیوں سے، پینے والے شوہروں سے اور..... رات دیر سے لوٹنے والے بیٹوں سے۔ وہ سب انہیں دُکھ دیتے ہیں۔ کوئی کسی طرح اور کوئی کسی طرح۔ ہاں ان تمام عورتوں کا دُکھ اس کی آنکھوں میں تھا۔ پھر اس نے کہا

"میں آپ کو اس کا پتہ دیتی ہوں..... لیکن اس کے بعد میں کبھی آپ کو شکل نہیں دکھاؤں گی۔"

میں نے بیوی سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھا اور ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

.....

ملزم کو ایک گاؤں سے گرفتار کر لیا گیا۔ میری

بیوی نے اسے اپنی ایک منہ بولی بہن کے پاس بھیج دیا تھا۔ گرفتاری کے دوران کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ جب ہم منے کو گرفتار کرنے گھر میں داخل ہوئے تو ایک پہلوان نما شخص نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا بہرحال تھوڑی سی کوشش سے اسے قابو کر لیا گیا۔ یہ شخص اس عورت کا خاوند تھا جس نے منے کو پناہ دے رکھی تھی۔

منے کو عدالت میں پیش کر کے میں نے ریمانڈ لے لیا۔ بعدازاں تین چار روز میں چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ اپنی طرف سے میں نے فرض نبھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ملزم کے خلاف شہادتیں کافی مضبوط تھیں۔ سیشن سے اسے سزائے موت ہوئی۔ ان لوگوں نے ہائیکورٹ میں اپیل کر دی۔ مقتول پارٹی بھی پورا زور لگا رہی تھی۔ امید نہیں تھی کہ سزا میں تخفیف ہو سکے گی۔

میری بیوی اسی روز اپنے گھر واپس چلی گئی تھی جس روز میں نے ملزم کا چالان مکمل کیا تھا۔ سسرالی عزیزوں کی طرف سے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی گئیں لیکن میں اپنے کام میں جتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ سچ پر ہوں اور سچ کو آنچ نہیں۔

اس واقعہ کو تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ حالات جوں کے توں رہے۔ وہ گرمیوں کی ایک تاریک رات تھی۔ اُداس اور حبس زدہ۔ میں نو بجے کے قریب گھر آیا..... ہوٹل کے پکے ہوئے کھانے کو دوبارہ گرم کیا۔ چند لقمے لیے پھر خود ہی چارپائی بچھائی اور لیٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے سے آواز دے کر کہا "دروازہ کھلا ہے آ جاؤ۔" آنے والا ایک درمیانی عمر کا سکھ تھا۔ کسی گھر کا نوکر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ست سری اکال کر کے کہا

"تھانیدار صاحب! آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے..... ڈاکٹر مہتا نے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔"

میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ آج شام سائیکل پر آتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ انہیں سخت چوٹیں آئی ہیں..... وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں اور تاکید کی ہے کہ آپ کو لے کر آؤں۔ میں تھکا ماندہ آیا تھا لیکن نجانے جی میں کیا آئی کہ اس کے ساتھ چل دیا۔

ہسپتال، مہتا کے پاس پہنچا تو وہ پٹیوں میں جکڑا پڑا تھا۔ لاری نے ٹکر ماری تھی۔ ٹانگوں اور چھاتی پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ خون اور گلوکوز لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت بار بار خراب ہو جاتی ہے۔ آپ جلدی بات کر لیں۔ میں مہتا کے پاس پہنچا تو وہ پہچان کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ کہنے لگا

"انسپکٹر صاحب! کرسچین لوگ اعتراف کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کے سامنے آج ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی آواز دھیمی تھی۔ میں سٹول پر بیٹھ کر آگے کو جھک گیا۔ وہ دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ میں اسی طرح جھکا رہا اور وہ بولتا رہا۔ قریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ بیچ بیچ میں میں نے کچھ سوالات بھی کیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے۔

"آج سے ڈیڑھ برس پہلے مہتا سنگھ نے غفورے کے قتل میں جو گواہی دی تھی وہ جھوٹی تھی۔ ایسے معتبر شخص نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اسے اس گواہی پر مجبور کیا گیا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ غفورے کے قتل سے کوئی دو ماہ پہلے ڈاکٹر مہتا ایک نوجوان لڑکی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ یہ برقعہ پوش لڑکی ایک گرم اور سنسان دوپہر کو اس سے

دوائی لینے آئی۔ مہتا سنگھ اکیلا تھا۔ وہ لاکھ بھلا مانس اور ادھیڑ عمر سہی بہرحال ایک مرد تھا۔ لڑکی نے اسے ایسے ناز نخرے دکھائے کہ وہ طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے لڑکی کے جسم کو ہاتھ لگایا تو وہ برا مان گئی اور اُٹھ کر چل دی۔ ڈاکٹر مہتا کچھ دن اپنے کئے پر پشیمان رہا۔ پھر ایک روز اسے لڑکی کا خط ملا۔ اس حوصلہ افزا خط نے ڈاکٹر مہتا کے شوق کو بھڑکایا۔ ان دونوں کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ آخر ایک روز وہ لڑکی پھر مہتا کی دکان پر آئی۔ تنہائی کے چند لمحے میسر ہوئے اور ڈاکٹر مہتا اس کے قریب پہنچا۔ اس لمحے اس پر انکشاف ہوا کہ برقعے میں عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ وہ بُری طرح چونک کر پیچھے ہٹا۔ ایک مردانہ قہقہہ سنائی دیا اور برقعہ پوش، ڈاکٹر مہتا کو حیران و پریشان چھوڑ کر دکان سے نکل گیا۔ اس کے بعد مہتا کو جو خط ملا وہ سراسر ایک بلیک میلر کا خط تھا۔ اس میں ڈاکٹر کا مذاق اُڑایا گیا تھا اور بھانڈا پھوڑنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے اپنے طور پر بلیک میلر کا کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ جس پتے پر وہ خط لکھتا تھا وہاں کوئی بنگالی کرایہ دار رہتے تھے جو مکان چھوڑ کر جا چکے تھے..... پھر ایک دن ڈاکٹر کو برقعہ پوش لڑکے کا طویل خط پہنچا۔ اس میں اسے مذکورہ گواہی پر مجبور کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بال بچے دار آدمی تھا۔ گلی محلے میں اس کی عزت تھی۔ وہ بدنامی کے خوف سے کانپ گیا۔ بلیک میلر نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد اسے تنگ نہیں کرے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ڈاکٹر کا پورا بیان غور سے سنا۔ حالات ایک پراسرار رنگ اختیار کر گئے تھے۔ اس پورے واقعہ میں ایک برقعہ پوش ملوث دکھائی دیتا تھا اور پھر وہ لڑکی جس نے مجھے گمنام خط لکھا تھا کہیں وہ بھی تو لڑکا نہیں تھا؟ میرا ذہن آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ مجھے منظم طریقے سے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بے قراری سی میرے رگ و پے میں اُتر گئی۔ میں نے ڈاکٹر مہتا سے چند اور ضروری سوال پوچھے اور ہسپتال سے نکل آیا۔

.....

میں نے ڈاکٹر مہتا کو موصول ہونے والے خطوط کی تحریر کا گمنام لڑکی کے خط سے موازنہ کیا اور انکشاف ہوا کہ دونوں تحریریں ایک ہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس برقعہ پوش لڑکے کا سراغ کیونکر لگے جس نے پہلے ڈاکٹر مہتا کو اپنے دام میں پھنسایا تھا اور پھر مجھے خط لکھ کر منے کے خلاف شہادتیں فراہم کی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔

غفورے کے تمام دوستوں سے فرداً فرداً پوچھ گچھ کی (شاید میں بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر مہتا زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا۔)

میں نے اپنے سب انسپکٹر کو ہدایت کی کہ وہ علاقے میں کسی ایسے نوجوان کا سراغ لگائے جسے عورتوں جیسا حلیہ بنانے کا شوق ہو اور خاص طور پر غفورے کے ملنے جلنے والوں میں ایسے لڑکے تلاش کرے۔ میں نے ان بنگالی کرایہ داروں کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی جن کے پتہ پر برقعہ پوش لڑکے کے خطوط آتے تھے۔ اس سلسلے میں چند بنگالیوں کو گرفتار بھی کیا گیا لیکن مطلوبہ لوگ ہاتھ نہیں آئے۔ آپ میری بے قراری کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ میری تفتیش کی بنیاد پر ایک بے گناہ کو پھانسی ہونے کا خدشہ تھا اور وہ بے گناہ میرا نہایت قریبی عزیز تھا۔ ان دنوں مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اس گتھی کا کوئی سراغ ہاتھ آ جائے۔

تلاش بسیار اور سخت کوشش کے باوجود میری تفتیش کی کشتی کسی کنارے پر نہیں لگی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر مایوسی غالب آنے لگی۔ پھر شاید میں ہمت ہار کر کوشش ترک ہی کر دیتا کہ ایک صبح میرے لیے کامیابی کی نوید لے آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ستمبر کی پہلی تاریخ تھی۔ رات کی موسلا دھار بارش کے بعد نرم دھوپ گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں دو سپاہیوں کے ساتھ پیدل ہی تھانے کی طرف جا رہا تھا۔ دفعتاً ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے سیاہ برقعہ پہن رکھا تھا اور تیزی سے سڑک کے کنارے جا رہی تھی۔ اس کی چال میں مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نسوانیت اور لچک محسوس ہوئی جیسی آپ نے بھی ہیجڑوں میں دیکھی ہوگی۔ موہوم شک کے تحت میں نے لڑکی کا پیچھا شروع کر دیا۔ وہ اپنے تعاقب سے بے خبر چلتی رہی اور آخر لڑکیوں کے سکول کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکیاں اپنی مخصوص یونیفارم کی بجائے رنگ برنگے کپڑوں میں نظر آ رہی ہیں۔ دراصل اس دن سکول کے اندر کوئی میلہ وغیرہ تھا۔ لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ میں گیٹ پر پہنچا۔ چوکیدار مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سکول کے وسیع احاطے میں شامیانے لگے تھے۔ لڑکیاں، عورتیں، بچے اور بچیاں کثیر تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے مطلوبہ لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ہجوم میں گم ہو چکی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی۔ اتنے میں سکول کی ہیڈ مسٹریس بھی دروازے پر آ گئی۔ میں نے اس پر اپنا شک ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ان لڑکیوں میں کوئی برقعہ پوش مرد گھس گیا ہے۔ فربہ اندام ہیڈ مسٹریس کے چہرے پر ہراس دکھائی دینے لگا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر احاطے میں آ گئی۔ سکول کی لڑکیوں نے بادردی پولیس والے کو اپنے قریب دیکھا تو شوخی پر اُتر آئیں۔ بڑی عمر کی کچھ تیز طرار لڑکیوں نے آوازے بھی کسے۔ ایک آواز آئی "فلاں استانی کا شوہر ہے۔" ایک نے کہا "یہ چوری کی گائے ڈھونڈنے آئے ہیں۔" دوسری بولی "بہن راستہ بھول گئے ہیں۔" ہیڈ مسٹریس نے لڑکیوں کو ڈانٹا۔ میں نے غور سے لڑکیوں کے چہرے دیکھے۔ کچھ اندازہ نہ ہوا۔ ہیڈ مسٹریس نے تمام لڑکیوں کو حکم دیا کہ ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں۔ لڑکیاں اکٹھی ہوگئیں۔ عورتیں اور بچے بھی ان میں موجود تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرا شک غلط نکلا اور ان میں کوئی برقعہ پوش مرد نہ نکلا تو یہ میرا مذاق اُڑانے سے باز نہیں آئیں گی۔

دفعتاً میری نظر ایک شامیانے کی طرف اُٹھ گئی۔ ایک سٹال کے عقب میں سیاہ برقعے کی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں نے انگلی سے اس طرف اشارہ کر کے ایک استانی کو اطلاع دی۔ میری انگلی اُٹھنے کی دیر تھی کہ سٹال کے عقب سے ایک برقعہ پوش برآمد ہوا۔ اس نے چھلانگ لگا کر کاؤنٹر پار کیا اور تیزی سے مخالف سمت میں بھاگا۔ لڑکیوں کی چیخیں کورس کی صورت میں بلند ہوئیں۔ میں ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے مجرم کی طرف لپکا۔ وہ برقعے سمیت سرپٹ دوڑتا ہوا بیرونی دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے کسی چمگادڑ کی طرح چھلانگ لگائی اور منڈھیر تھام لی لیکن اس سے پہلے کہ وہ زور لگا کر اوپر چڑھتا میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میں اسے فرار نہیں ہونے دوں گا تو اس نے منڈھیر چھوڑ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے برقعے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک گراری دار چاقو نکال لیا۔ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے چاقو کھولا۔ چاقو کی آواز سن کر

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لڑکیوں اور عورتوں کی دبی دبی چیخیں بھی سنائی دیں۔ اتفاقاً اس وقت میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ لمبے پھل کا چاقو ہاتھ میں لیے برقعہ پوش نہایت خوفناک بھی لگ رہا تھا اور کچھ مضحکہ خیز بھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے نقاب اُلٹا اور اپنی ہراساں نگاہیں میرے چہرے پر جما دیں۔ میں اس چہرے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ آپ بھی جانتے ہوں گے لیکن یقین کریں اس وقت میں بالکل نہ پہچان سکا۔ وہ ہو بہو ایک بنی سنوری دوشیزہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف بغور دیکھنے سے ہی اس کی ڈاڑھی کی نیلاہٹ محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس شخص نے شامیانے میں گھس کر غلطی کی تھی۔ اگر یہ لڑکیوں کے درمیان رہتا تو بھی شاید اسے مشکل سے ہی پہچانا جاتا۔

میں نے نہایت محتاط انداز میں برقعہ پوش کے چاقو پر نگاہیں جما دیں۔ دست بدست لڑائی کا ایک اصول ہوتا ہے کہ مدمقابل کے پاس تیز دھار آلہ ہو تو اس سے فاصلے پر رہنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر وہ آتشیں اسلحہ ہو تو پھر اس سے گتھم گتھا ہونے میں فائدہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جوڈو کراٹے اور اس قسم کی دوسری باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں لیکن تجربہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے مثلاً مجھے معلوم تھا کہ چاقو زن سے سابقہ پڑنے پر اس انداز سے کھڑا ہونا چاہیے کہ اس کا چاقو والا ہاتھ آپ کے اسی ہاتھ کے سامنے ہو مثلاً اگر اس کے دائیں ہاتھ میں چاقو ہے تو آپ کا دایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ کی سیدھ میں ہو۔ اس طرح ذرا سا پہلو بدل کر وار سے صاف بچا جا سکتا ہے..... میں بالکل اسی انداز میں کھڑا تھا۔ مدمقابل کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی ایسا ماہر چاقو زن نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس گھڑی اس نے مجھ پر وار کیا وہی گھڑی اس کی گرفتاری کی ہو گی لیکن وہ ایک چالاکی دکھا گیا۔ مجھ پر حملہ آور ہونے کی بجائے اس نے اچانک دوڑ لگا دی۔ لڑکیوں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو چیخیں چلاتی چاروں طرف بھاگیں۔ میں پوری رفتار سے اس کے تعاقب میں تھا۔ میں اس کا ارادہ سمجھ گیا تھا۔ وہ بیرونی دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس دوڑ کو آپ سو میٹر کی دوڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بیرونی دروازے سے چند گز ادھر میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ میرے ہاتھ اس کی کمر پر پڑے اور وہ میرے بوجھ تلے دور تک گھسٹتا چلا گیا لیکن پھر بے حد پھرتی سے اس نے کروٹ بدلی اور چاقو کا وار میرے چہرے پر کیا۔ اضطراری طور پر میری گردن پیچھے کی طرف جھکی اور ایک برق سی آنکھوں کے سامنے لہرا گئی۔ چاقو میری آنکھوں سے ایک انچ کے فاصلے سے گزر گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ وہ بنی سنوری برقعہ پوش "جعلی" حسینہ چاروں شانے چت زمین پر پڑی تھی۔ میں اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کی دونوں کلائیاں میری گرفت میں زمین سے لگی تھیں۔ وہ اب بھی پیٹ کے زور سے مجھے اچھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پھر سکول کا پٹھان چوکیدار "خانہ خراب کا بچی..... خانہ خراب کا بچی" پکارتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے لاٹھی کا بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ لڑکا کراہا۔ چاقو پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور میں نے ایک جھٹکے سے اسے غیر مسلح کر دیا۔

.....

آپ یہ سننے کے لیے بے چین ہوں گے کہ سکول میں گرفتار ہونے والا ملزم کون تھا۔ تو قارئین وہ ملزم تھا اُبھرے ہوئے رخساروں والا منظور۔ وہی منظور جو غفورے کا رازداں تھا اور جس سے غفورا فرزانہ کو خط لکھواتا تھا۔ اپنی تفتیش کے دوران مجھے

سب سے کم شک اسی لڑکے پر پڑا تھا لیکن آخر میں وہی اصل مجرم نکلا۔

اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ ابھی تک اس نے اقبال جرم نہیں کیا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ غفورے کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کی ہے اور وہ اس حقیقت کا ایک ٹھوس ثبوت فراہم کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا..... تھوڑی دیر بعد غفورے کا درزی باپ وہ ثبوت لے کر تھانے پہنچ گیا۔ ایک دو معزز افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ ثبوت ایک کاغذ کی صورت میں تھا اور ان لوگوں نے منظور کی نشاندہی پر حاصل کیا تھا۔ اس کاغذ پر مقتول غفورے کی اپنی تحریر میں چند سطور لکھی تھیں۔ وہ کچھ یوں تھیں۔

''یہ رقعہ میں پورے ہوش کے ساتھ اپنی مرضی سے لکھ رہا ہوں۔ اپنی موت کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ میرے بعد کسی پر یہ الزام نہ آئے..... کسی کی محبت نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ بے وفائی کا دُکھ اور برداشت نہیں ہوتا۔'' نیچے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ آخر میں لکھنے والے کا نام تھا ''غفور احمد بقلم خود۔'' تاریخ بھی درج تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ رقعہ غفورے نے موت سے تھوڑی دیر پہلے لکھا تھا۔ تحریر ہو بہو غفورے کی دوسری تحریر سے ملتی تھی۔

اگر دیکھا جائے تو اس رقعہ کی موجودگی میں غفورے کی خودکشی ثابت ہو جاتی تھی۔ واقعی منظور نے ایک اہم ثبوت مہیا کر دیا تھا لیکن میرے لیے اس ثبوت کی کوئی اہمیت نہیں تھی..... میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ نہایت لاپروائی سے میں نے کاغذ کا ٹکڑا میز پر پھینک دیا۔ منظور کے وارثوں کے چہرے تاریک ہو گئے۔ منظور بھی پریشانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا ''منظور! تم ایک میٹرک پاس ذہین لڑکے ہو لیکن تم نے اپنی ذہانت کا استعمال نہایت غلط طریقے سے کیا..... مجھے اس وقت ایک شعر یاد آ رہا ہے جس میں شاعر کچھ اس قسم کی بات کہتا ہے کہ ایک تو میرا انداز بیان اور اوپر سے اس پری چہرہ کا ذکر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو میرا رازداں تھا وہی رقیب بن گیا..... منظور! تم دراصل فرزانہ کے تیسرے عاشق ہو۔ غفورے کے خط لکھتے لکھتے تم خود بھی فرزانہ کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ تمہاری محبت دوسرے دونوں دوستوں کی نسبت خاموش لیکن شدید تھی۔ تم دل ہی دل میں فرزانہ کو حاصل کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ فرزانہ تمہیں بھائی جان کہتی تھی اور اپنے خطوط میں تمہاری خیر خیریت بھی دریافت کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تمہیں شک ہوتا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن تمہاری یہ محبت منے اور غفورے کی موجودگی میں پروان نہیں چڑھ سکتی تھی..... آخر قدرت نے تمہیں ایک سنہری موقعہ دیا۔ غفورے اور منے کے درمیان فرزانہ سے ملاقات کی شرط لگی اور تمہیں پتہ چلا کہ منا شرط جیت گیا ہے۔ تم نے ایک منصوبہ بنایا۔ تمہیں معلوم تھا کہ آج یا کل منا لڈو لے کر غفورے کے پاس آئے گا اور غفورے کو کامیابی کی خبر سنا کر دل گیر کر لے گا۔ تم نے غفورے کا رازداں بن کر اسے مشورہ دیا کہ کیوں نہ وہ اپنی خودکشی کا ڈرامہ رچائے۔ تم نے اسے کہا کہ میں تمہیں ایک ہلکا سا زہر لا دیتا ہوں۔ تم تھوڑی مقدار میں کھا لینا۔ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع دوں گا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔ تمہاری خودکشی کا ڈرامہ بھی کامیاب رہے گا اور تمہیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ فرزانہ کو جب تمہاری محبت کی شدت کا علم ہو گا تو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائے گی۔ غفورا تمہاری باتوں میں آ گیا۔ تم نے اچھی طرح سوچی سمجھی سکیم کے تحت اپنی بہن کے سیاہ برقعے میں سجی بستی کا رُخ کیا۔ دراصل تمہیں لڑکیوں

کا بھیس بدلنے کی عادت ہے۔ ڈاکٹری زبان میں اسے ذہنی مرض بھی کہا جا سکتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم جو اچھے بھلے مرد ہو، بند کمرے میں گھس کر عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار بھی کرتے ہو۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے..... تم بہن کا برقعہ پہن کر کچی بستی پہنچے۔ وہاں سے زہر خریدا پھر حلوائی مختار سے لڈو خریدے اور ان میں زہر ملایا۔ اس کے بعد تم رات کا انتظار کرنے لگے۔ حسب توقع اس رات تمہارے جانے کے بعد منا غفورے سے ملنے آیا۔ کچھ دیر غفورے کے پاس بیٹھ کر وہ چلا گیا۔ تم دوبارہ غفورے کے پاس پہنچے تاکہ خودکشی کے ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دیا جائے۔ دراصل تم انتہائی مہلک زہر خرید کر لائے تھے اور تمہارا منصوبہ غفورے کو قتل کرنے کا تھا۔ سب سے پہلے تم نے غفورے سے خودکشی کی تحریر لکھوائی جو تم اب میرے سامنے پیش کر رہے ہو۔ اگر منا غفورے کے قتل کا ملزم نہ بھی ٹھہرتا تو بھی تم اس قتل میں نہیں پھنس سکتے تھے کیونکہ تحریر تمہارے پاس تھی اور تم کسی بھی مناسب وقت پر اسے پولیس کی نظروں میں لا سکتے تھے۔ اس وقت بھی تمہارے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوگا کہ یہ تحریر تم نے اب تک کیوں چھپائی۔

بہرحال تحریر لکھوانے کے بعد نہایت سفاکی سے تم نے غفورے کو وہ زہریلے لڈو کھلا دیئے۔ غفورے پر غشی طاری ہونے لگی تو اس نے تمہاری منتیں کیں کہ کسی کو بلواؤ۔ تم بیٹھک سے نکل آئے اور باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ غفورا اندر ہی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ جب تمہیں یقین ہو گیا کہ جگری دوست تم سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے زندہ نہیں رہا ہوگا تو تم دوبارہ اندر داخل ہوئے۔ وہاں سے زہریلے لڈو اُٹھائے اور اس کے ساتھ ساتھ منے کے لائے ہوئے لڈو بھی اُٹھا لیے۔ منے کے لائے ہوئے لڈو تم اپنے گھر لے گئے جبکہ اپنے زہریلے لڈو تم نے میرے گھر کے پچھواڑے پھینک دیئے۔ اس سے اگلے روز تم نے ''لکھائی'' بدل کر دو خط لکھے۔ ایک مجھے اور دوسرا ڈاکٹر مہتا کو۔ تم نے ڈاکٹر مہتا کو مجبور کیا کہ وہ منے کے خلاف گواہی دے۔

اس طرح تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے..... منا جیل پہنچ گیا اور غفورا قبر میں..... تمہارا منصوبہ بہت کامیاب تھا منظور۔ اگر تین ہفتے پہلے کچہری روڈ پر ایک حادثہ نہ ہوتا اور ڈاکٹر مہتا ہسپتال میں نزاعی بیان نہ دیتا تو قانون کے ہاتھ کبھی تمہاری گردن تک نہ پہنچ سکتے۔''

میری تقریر ختم ہوئی تو منظور کے اُبھرواں رخساروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی اور اس کے لواحقین کے چہرے لٹک رہے تھے۔

میں اب اس کہانی کو مختصر کرتا ہوں۔ ہائیکورٹ نے میرے برادر نسبتی شکیل عرف منے کو باعزت بری کر دیا۔ منظور کے خلاف، دوسرے الزامات کے علاوہ ۳۰۲ کے تحت کیس درج ہوا۔ سیشن کورٹ سے اسے سزائے موت ہوئی لیکن بعد ازاں ہائیکورٹ نے اس کی کم عمری کے پیش نظر سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا حالانکہ اس نے خواہش کی تھی کہ اس کی سزا برقرار رہتی۔ اس کہانی کا ایک کردار فرزانہ تھی۔ وہ ایک نہایت حسین اور پرکشش لڑکی تھی لیکن خراب کردار کی وجہ سے اسے اچھا رشتہ نہیں ملا۔ اپنے ہی خاندان کے ایک سانولے سے لڑکے سے اس کی شادی ہو گئی۔ منا دوبارہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ اس کہانی کا ایک کردار میری بیوی تھی..... اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی مجھے اپنی شکل نہیں دکھائے گی لیکن اپنے زندہ سلامت بھائی کی صورت دیکھ کر جہاں اس کے آنسوؤں نے ضبط کے بند توڑے وہاں اس کا عہد بھی ٹوٹ گیا۔

.....❁.....

لاڈو

نواز خان



لاڈو

نواز خان

گندی گلیوں میں کیڑے کی طرح رینگنے والا وہ شخص کون تھا؟ ایک نوجوان کی کہانی جو زندہ لاش تھا۔ پھر وہ زندہ ہوا۔ پھر وہ انسان بن کر سب کو مات دے گیا.....!

جرم و سزا پر مبنی انسپکٹر نواز کا ایک حیرتناک تجربہ

یہ میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ یقین جانیں کہ محبت و نفرت اور جرم و سزا کی یہ داستان بیان کرتے ہوئے خود مجھے بھی مزا آ رہا ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار اب بھی زندہ ہے اور کبھی کبھار اس سے میری ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان دنوں میں ایک خالص دیہاتی تھانے میں فرائض ادا کر رہا تھا۔ ''خالص'' اس لحاظ سے کہ اس گاؤں کے نزدیک ترین پختہ سڑک بھی کوئی ۲۵ میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل ڈسکہ کا ایک گاؤں تھا۔ آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی اور آبادی کی اکثریت خوشحالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

وہ ایک بڑی سہانی شام تھی۔ مغرب میں جھکا ہوا سورج گندم کی پکی فصل پر چمک رہا تھا۔ ایک روز پہلے ہلکی بارش ہوئی تھی اور گرمی زیادہ نہیں تھی۔ ایک قریبی موضع میں ''سرقہ بالجبر'' یا کہہ لیں کہ ڈاکہ زنی کی واردات ہوئی۔ میں عموماً گھوڑے پر موقعہ واردات دیکھنے کے لیے جایا کرتا تھا لیکن اس روز میں ایک حوالدار کے ساتھ پیدل ہی چلا گیا۔ واپسی پر حوالدار تو ایک اور شخص کی طرف چلا گیا اور میں موسم کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ دفعتاً ایک کھیت کی دوسری جانب سے ایک مدھم کراہ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی نسوانی قہقہے گونجے۔ میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ تھوڑی دیر بعد کراہ دوبارہ سنائی دی۔ یوں لگتا تھا کوئی نحیف و کمزور شخص درد سے بے تاب ہو کر چیخا ہے۔ کراہ کے بعد پہلے کی طرح قہقہوں کا شور سنائی دیا۔ میں محتاط قدموں سے چلتا کھیت میں داخل ہو گیا۔ کھیت کی دوسری جانب ایک کچا راستہ تھا جو آگے جا کر بڑے راستے سے مل جاتا تھا۔ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ گاؤں کی کئی لڑکیاں ایک عجیب و غریب شخص کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ یہ شخص زمین پر گرا ہوا تھا لیکن کیا واقعی وہ ایک شخص تھا۔ خدا کی پناہ..... اس کا حلیہ ناقابل بیان تھا۔ جسم پر لباس کے نام پر ایک پتلون تھی جو شاید کبھی پتلون رہی ہو گی لیکن اب بوسیدہ کپڑے کے چند ٹکڑے تھے جو بمشکل اس کی ستر پوشی کر رہے تھے۔ جسم سوکھ

کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ سر کے بال جھڑ چکے تھے۔ اس کے تمام جسم پر بڑے بڑے پھوڑے تھے۔ گردن، بغلوں اور پاؤں پر یہ پھوڑے زخموں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ان زخموں سے گندا مواد بہہ رہا تھا۔ موجودہ حالت میں اس شخص کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ نوجوان ہے، بوڑھا ہے یا قریب المرگ۔ اس کا چہرہ مٹی میں لتھڑا ہوا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ جس جگہ وہ گرا پڑا تھا وہیں زمین میں مکوڑوں کا ایک سوراخ تھا۔ لمبی لمبی ٹانگوں والے مکوڑے نکل کر اس کے جسم سے چپک رہے تھے۔ تکلیف کی شدت سے بے تاب ہو کر وہ کمزور و لاغر شخص زمین سے اُٹھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن دوبارہ گر جاتا تھا اور جب وہ گرتا تھا، گاؤں کی لڑکیاں زور سے ہنس دیتی تھیں۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ میں کھیت سے نکلا اور لڑکیوں کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر بھی لڑکیوں کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر نہیں آئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ لاڈو بھی تھی۔ لاڈو گاؤں کے سب سے بااثر زمیندار کی بیٹی تھی اور اتنی لاڈلی اور سرچڑھی کہ گاؤں بھر کا ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ اس نے لڑکیوں کا ایک ٹولہ بنا رکھا تھا اور سارا دن اودھم مچاتی رہتی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ یا زبان روکے۔ پچھلے برس اس نے ایک راہگیر کو نہر میں دھکا دے دیا تھا۔ وہ بیچارا کنارے پر بیٹھا منہ دھو رہا تھا کہ لاڈو اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ آئی اور اسے نہر میں پھینک دیا۔ وہ بھی سر پھرا شخص تھا۔ اس نے پانی سے باہر نکل کر لاڈو کو دو تھپڑ جڑ دیئے۔ ان تھپڑوں نے ایک قیامت برپا کر دی۔ لاڈو کے شور پر کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کچھ مزارعے موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے زمیندار نواب دین کی لاڈلی بیٹی کو آنسو بہاتے دیکھا تو اجنبی کو پکڑ لیا۔ وہ نوجوان تحصیل پسرور کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وارثوں کو خبر پہنچی تو وہ اسے چھڑانے آئے۔ دونوں پارٹیوں میں تصادم ہو گیا۔ دو تھپڑوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان کو اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے وارثوں میں سے دو افراد قتل ہو گئے۔

یہ میرے اس تھانے میں آنے سے پہلے کا واقعہ تھا۔ اس واقعے کے بعد نواب دین کا اثر و رسوخ اور بڑھ گیا اور اس کی بیٹی کی من مانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ نواب دین کا گھرانہ پورے گاؤں پر چھا گیا تھا۔ اردگرد کے دیہات میں بھی ''نوابوں'' کی دہشت تھی۔ چھوٹے موٹے جرائم تو یہ لوگ کرتے ہی رہتے تھے۔ بعض اوقات ان کے بڑے جرائم پر بھی لوگ خاموش رہ جاتے تھے اور پرچہ درج کرانے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ صرف چند ماہ پہلے کی بات تھی کہ مجھے پتہ چلا نواب دین کے لڑکے ایک غریب مزارعے کی بیوی کو چھین کر ڈیرے پر لے گئے اور اس کی بے حرمتی کرتے رہے..... لیکن اس واقعہ کی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی نہ ہی کسی نے تھانے کے دروازے کو پار کیا۔

..... ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا لاڈو کا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑی شان سے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے غصے سے کہا ''لاڈو! تمہیں شرم آنی چاہیے، ایک مجبور شخص کی مدد کرنے کی بجائے اس کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ ڈرو خدا کے قہر سے۔''

اس نے اپنے بالوں کو خوبصورت پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور تنک کر بولی ''اتنا ہمدرد ہے تو ٹوکرے مدد اس کی۔ لے جا اسے اُٹھا کر گاؤں میں اور دوا دارو کر۔ ہو سکتا ہے بھلا چنگا ہو جائے۔ بھلا چنگا ہو جائے تو اسے کہنا کہ جا لاڈو کی گردن دبا دے۔ اس نے تجھ سے مذاق کیا تھا۔''

لاڈو نے یہ تمام باتیں مذاق سے کہی تھیں لیکن ان باتوں نے میرے دل میں ایک خلش جگا دی۔ میں نے زمین پر پڑی ہوئی اس انسان نما چیز کو غور سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ اسے گاؤں لے جاؤں گا۔ لڑکیاں اب ٹھٹھہ مذاق کرتی ہوئی آگے روانہ ہو چکی تھیں۔ میں نے نیچے بیٹھ کر احتیاط سے اجنبی کا معائنہ کیا۔ اس کی حالت نہایت پتلی تھی۔ لگتا تھا کہ ایک آدھ روز کا مہمان ہے۔ اس کے زخموں سے ایک ناقابل برداشت بُو بھی اُٹھ رہی تھی۔ اس کے کریہہ جسم کو ہاتھ لگانے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت تھی وہ میں اپنے اندر پیدا کر رہا تھا۔ میں نے عقب میں دیکھا، کچے راستے پر دُور تک گھسٹنے کا نشان تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں تک گھسٹتا ہوا پہنچا ہے۔ یہاں پہنچ کر شاید وہ بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ میں نے گندم کی ایک ڈالی سے اس کے زخموں پر چپکے ہوئے کیڑے ہٹائے۔ پھر نیچے جھکا اور اللہ کا نام لے کر اسے کندھے پر اُٹھا لیا۔ اس کا وزن بمشکل پندرہ بیس سیر رہا ہوگا۔ میرے کندھے پر وہ کسی بے جان چیز کی طرح پڑا تھا۔ سوکھی ٹہنیوں جیسی دونوں بانہیں میری پشت پر جھول رہی تھیں۔ اس کے جسم سے اُٹھنے والی بُو ناقابل برداشت تھی۔

میں گاؤں میں داخل ہوا تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ میں نے اسے مسجد کے سامنے ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ شخص پہلے بھی ایک دو بار گاؤں میں نظر آیا ہے لیکن اس وقت اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ جسم پر پھوڑے موجود تھے لیکن زیادہ زخم نہیں تھے۔ یہ کسی گلی میں ایک کپڑا لئے لیٹا رہتا تھا اور لوگ خیر خیرات دے جاتے تھے۔

میں نے ایک شخص کو ہدایت کی اور وہ ڈاکٹر اشوک کو لے آیا۔ ڈاکٹر اشوک علاقے کا مشہور معالج تھا۔ ان دنوں دیہات میں کسی ایم بی بی ایس ڈاکٹر کا پایا جانا معجزے سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا اور تھوڑا غصے والا بھی۔ اس کے غصے کی وجہ کوئی اور سمجھتا ہو یا نہیں لیکن میں ضرور سمجھتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک نہایت لائق اور محنتی ڈاکٹر تھا لیکن گاؤں والے اس کی محنت اور لیاقت کی قدر نہیں کرتے تھے۔ جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈوں کا زور تھا۔ مریض عموماً اس وقت اس کے پاس پہنچتے تھے جب قریب المرگ ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص ڈاکٹری علاج کراتا بھی تھا تو ساتھ ساتھ جھاڑ پھونک بھی جاری رکھتا تھا۔ پھر شفایابی کا سہرا عموماً جھاڑ پھونک کے سر ہی باندھا جاتا تھا لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ دوستی کا تھا۔

اشوک آیا تو میں نے اسے مریض کا معائنہ کرنے کو کہا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے مایوسی عیاں تھی۔ کہنے لگا ''مشکل ہے نواز صاحب! بیماری دُور تک اثر کر چکی ہے۔ اب تو یہی دعا کرنی چاہیے کہ بیچارے کی مشکل آسان ہو جائے۔''

میرے کانوں میں ایک بار پھر لاڈو کے تیکھے الفاظ گونجنے لگے۔ ''اتنا ہمدرد ہے تو تُو کر لے مدد اس کی۔ لے جا اسے اُٹھا کر گاؤں میں اور دوا دارو کر۔ ہو سکتا ہے بھلا چنگا ہی ہو جائے۔ بھلا چنگا ہو جائے تو اسے کہنا جا لاڈو کی گردن دبا دے اس نے تجھے مذاق کیا تھا۔''

اس نے جو انہونیاں بتائی تھیں ان میں سے ایک کو تو میں ہونی کر چکا تھا یعنی اجنبی کو اپنے کندھے پر اُٹھا کر گاؤں لے آیا تھا۔ اب میرے دماغ میں اس کے علاج کا سودا سمایا ہوا تھا۔ ویسے تھی یہ جذباتی سی بات۔ اجنبی کی حالت دیکھ کر یہ کہنا بہت آسان تھا کہ وہ دوا شفا کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ پھر بھی ایک اُمید کے سہارے میں

ڈاکٹر اشوک کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس شخص کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔ کیا اسے شہر لے جایا جا سکتا ہے۔

اشوک نے میری دلچسپی دیکھی تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اسے شہر لے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے راستے ہی میں دم توڑ جائے..... لیکن اگر تم کہتے ہو تو میں یہاں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ ممکن ہے اس کی حالت کچھ بہتر ہو جائے۔ پھر اسے شہر لے جایا جا سکتا ہے۔

اب مسئلہ مریض کے قیام کا تھا۔ میں چاہتا تو گاؤں کے کسی بھی شخص کو ہدایت کر سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر کا ایک کمرہ یا ایک حصہ خالی کر دے لیکن اس معاملے میں میں کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے چند آدمیوں کو حکم دیا اور وہ مریض کی چارپائی اُٹھا کر میرے گھر لے گئے۔

ڈاکٹر اشوک روز مریض کو دیکھنے آنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس شخص کو کوئی جلدی بیماری ہے جو بے احتیاطی کی وجہ سے آخری درجے تک بگڑ چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا خیال تھا کہ مریض کوئی نشہ بھی کثرت سے استعمال کرتا رہا ہے۔ تین چار دن کی سر توڑ کوشش کے باوجود مریض کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں بند رہیں اور منہ سے رال بہتی رہی۔ کبھی کبھی اس کا سانس بھی اُلجھنے لگتا تھا۔

ساتویں آٹھویں روز اس کی حالت میں معمولی سا فرق پڑا۔ اس کے حلق سے غوں غوں کی آواز نکلنے لگی اور نچلا جبڑا حرکت کرنے لگا۔ ڈاکٹر اشوک پرامید نظر آنے لگا۔ اس نے شہر سے کچھ دوائیاں منگوائیں اور تن دہی سے علاج میں مصروف ہو گیا۔ سات آٹھ روز اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز میں تھانے میں بیٹھا دو پارٹیوں میں صلح کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر اشوک کا کمپاؤنڈر ایک بُری خبر کے ساتھ پہنچا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا کہ مریض کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔ میں فوراً پہنچوں۔

میرے گھر پہنچنے تک ڈاکٹر اشوک ایک کار کا انتظام کر چکا تھا۔ مریض کو بڑی احتیاط سے کار کی پچھلی نشست پر لٹایا گیا اور اسے لے کر ہم ڈسکہ روانہ ہو گئے۔ ڈسکہ کے ڈاکٹروں نے لاہور کا راستہ دکھا دیا۔ اس رات کوئی گیارہ بجے ہم مریض کو لے کر میو ہسپتال پہنچے۔ یہاں اتفاقاً ڈاکٹر اشوک کی اپنے انگریز استاد ڈاکٹر رابنسن سے ملاقات ہوئی۔ یہ اتفاق بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رابنسن نے اسی وقت نہایت احتیاط اور توجہ سے مریض کا معائنہ کیا۔ بعد میں ڈاکٹر اشوک نے مجھے بتایا کہ انہوں نے مریض کی زندگی کے امکانات پچیس فیصد بتائے ہیں لیکن وہ بھی اس وقت جب لاہور میں علاج کیا جائے اور چند مطلوبہ دوائیں ولایت سے منگوائی جائیں۔

..... میں نے بے نام اجنبی کے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ باہر سے دوائیں بھی منگوائی گئیں اور ڈاکٹروں نے بھرپور توجہ دی۔ دس پندرہ روز بعد ڈاکٹروں نے کہا کہ اسے آپ لے جائیں اور ڈاکٹر اشوک کو بتا دیا کہ وہ فلاں فلاں دوائیں استعمال کرائے۔ اس سے زیادہ مریض کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس نے ٹھیک ہونا ہو گا تو ہو جائے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب ڈاکٹر اشوک کو بھی اس کیس سے دلچسپی ہو گئی ہے۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ مریض کو واپس لے جائے اور پوری توجہ سے اس کا علاج کرے۔

ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق ہم ہڈیوں کے اس نیم جان کریہہ ڈھانچے کو واپس لے آئے۔

دھیرے دھیرے مریض کی حالت بہتر ہونے لگی۔ پہلے اس کے زخم خشک ہوئے پھر پھوڑوں سے رطوبت بہنا بند ہوئی۔ پھر ایک روز اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور پہلی بار اردگرد دیکھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ ہونٹ ہلا رہا ہے۔ شاید کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا..... ہڈیوں کے ڈھانچے سے ایک نوجوان کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ تیسرے چوتھے ہفتے وہ اپنی گردن کو دائیں بائیں حرکت دینے لگا اور اس کی نگاہیں ہمیں دیکھنے اور پہچاننے لگیں۔ اس کے جسم سے اُٹھنے والی بُو بھی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ گھر میں اس کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک مائی رکھی ہوئی تھی۔ ایک روز مائی نے بتایا کہ وہ بستر سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اشوک اسے دن میں دو بار دیکھنے کے لیے آتا تھا۔ ایک روز میں اور ڈاکٹر اشوک اس کے پاس بیٹھے تھے جب اس نے پہلی بار زبان سے کوئی لفظ بولا۔ اس نے پانی مانگا تھا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد اجنبی تکیے سے ٹیک لگائے نحیف آواز میں مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنا نام جمال بتایا۔ وہ خانیوال کے ایک نواحی قصبے کا رہنے والا ہے۔ باپ زمیندار تھا، حویلی تھی، نوکر چاکر تھے لیکن وہ باپ سے کسی بات پر جھگڑ کر چلا آیا۔ کافی عرصہ لاہور میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ یہیں پر اسے نشے کی لت پڑی۔ وہ ایک دن میں چرس سے بھرے ہوئے بیس بیس سگریٹ پینے لگا۔ خارش کی معمولی تکلیف اسے پہلے سے تھی لیکن لاہور آ کر اس تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ ایک عطائی کی دوائی نے اس کا بالکل ستیاناس کر دیا (اس عطائی کی ہدایت کے مطابق وہ ہفتے میں دو بار گندے نالے کے غلیظ پانی سے نہاتا تھا) بداحتیاطیوں سے اس کی تکلیف بہت بڑھ گئی اور دھیرے دھیرے ایک قابل نفرت چیز بن کر زمین پر گھسٹنے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ کئی مہینے لاہور سٹیشن کے قریب دو موریہ پل کے نیچے سڑک پر پڑا رہا۔ دن بھر اس پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں اور رات کو کتے اسے سونگھتے تھے۔

میں نے اس کی کہانی پوری توجہ اور ہمدردی سے سنی۔ میں نے کہا "جمال! اگر تم کہو تو میں تمہارے والدین کو یہاں بلا لوں۔"

میری اس بات پر اس کی آنکھوں میں غصے اور پریشانی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے اپنی نحیف گردن کو دائیں بائیں ہلا کر صاف انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں کا پتہ ہی بتا دے لیکن اس کے ہونٹوں کو چپ لگ گئی۔ میں نے اس پر زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ پریشانی کا سامنا کر سکتا۔

علاج ہوتا رہا۔ موت سے زندگی کی طرف جمال کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ جاری رہا۔ اس کا وزن بڑھنے لگا۔ جلد صاف ہونے لگی۔ سر کے جھڑے ہوئے بالوں نے پھر اپنی جگہ لے لی۔ آنکھیں روشن اور آواز بھاری ہونے لگی۔ پہلے اس نے بستر سے پاؤں اُتارنا شروع کیا۔ پھر وہ چند قدم میرے گھر کے صحن میں چلنے لگا۔ اس کی بھوک میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ جس روز اس نے تین روٹیاں کھا کر ایک صحت مند ڈکار لی۔ ڈاکٹر اشوک کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا "نواز خاں! میرے خیال میں اب تم جمال کی صحت کا جشن منا سکتے ہو۔"

گاؤں میں مشہور ہو چکا تھا کہ انسپکٹر نواز خاں نے اس نوجوان کو سگے بھائی کی طرح رکھا ہوا ہے اور لوگ کچھ ایسا غلط بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔ اس کے علاج معالجے اور دیکھ بھال پر میں نے جو توجہ دی تھی اس نے مجھے جمال کے بہت قریب کر دیا

نا۔ جمال سے محبت کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ں نے اس کا رُخ موت سے زندگی کی طرف پھیرا نا۔ کہتے ہیں کہ مجسمہ ساز کو اپنے مجسمے سے، کہانی کار کو اپنی کہانی سے اور مصور کو اپنی تصویر سے محبت ہوتی ہے۔ شاید میری محبت بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ صحت اور زندگی دینے والی ذات تو خدا کی ہے لیکن میں نے ایک عزم کے ساتھ ناممکن کو ممکن کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لمبا تڑنگا خوبصورت نوجوان جمال وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے جو چند ماہ پہلے گلیوں میں رینگتا تھا اور لوگ اس کی طرف سے منہ پھیر کر گزر جاتے تھے۔ میں نے جمال کی صحتیابی پر خوشی منائی اور کھانا پکوا کر غریبوں میں تقسیم کیا۔

ایک روز کی بات ہے، میں، ڈاکٹر اشوک اور جمال گھر سے باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ لاڈو چند لڑکیوں کے ساتھ گلی سے گزرتی نظر آئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھڑی پکڑ رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح اٹھکیلیاں کرتی جا رہی تھی۔ میں نے جمال سے کہا ”یہ جو لڑکی سرخ لباس والی سامنے سے آ رہی ہے اسے غور سے دیکھو، میں اس کے بارے میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔“

جمال نے لاڈو کو دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گلی کے موڑ پر اوجھل ہو گئی۔ جمال اشتیاق سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آج سے چھ مہینے پہلے جب تم بڑی خراب حالت میں یہاں پہنچے تھے، اس لڑکی سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ تمہیں کچھ یاد ہے؟“ جمال نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا ”یہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں گھوم رہی تھی اور تم نڈھال ہو کر ایک پگڈنڈی پر پڑے تھے۔ لڑکیاں تمہیں دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے انہیں منع کیا تو یہ بولی کہ اس نے کون سا بھلا چنگا ہو جانا ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔“ جمال نے اپنے مسل ٹٹولے اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں اور ڈاکٹر اشوک بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔

دن گزرتے رہے۔ جمال میرے پاس ہی رہا۔ وہ سارا دن گاؤں میں گھومتا۔ اس نے چند ایک دوست بھی بنا لیے تھے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس نئی زندگی سے بہت خوش ہے اور اب اسے اور کچھ نہیں چاہیے لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ وہ کسی گھر کا چشم و چراغ تھا۔ کوئی ماں اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ کسی باپ کو اس کے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح جمال اپنے گھر کا پتہ بتا دے تاکہ میں اس کے والدین کو یہاں بلا سکوں۔ ممکن تھا کہ اس طرح اکٹھے ہونے سے ان کی رنجشیں دُور ہو جائیں اور وہ خوش و خرم یہاں سے واپس جائیں۔ بالآخر ایک روز میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ جمال نے مجھے اپنے والدین کے متعلق بتا دیا۔ میں نے اسی روز اس پتے پر ایک خط لکھا۔ خط کا جواب تو نہیں آیا لیکن ٹھیک چھٹے روز اس کے والدین گاؤں پہنچ گئے۔

مجھے تھانے میں اطلاع ملی کہ کچھ لوگ گھر میں مہمان آئے ہیں۔ میں گھر پہنچا تو ایک لمبی گرد آلود کار دروازے پر کھڑی تھی۔ جمال صحن میں اپنے والدین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں آنسو بہاتی ہوئی مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کا باپ سیاہ شیروانی اور پگڑی والا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ چہرے سے خاندانی رعب جھلکتا تھا لیکن اس وقت وہ بھی بڑا عاجز دکھائی دیتا تھا۔

گھریلو ملازمہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تھانیدار صاحب آ گئے۔“

اس کے باپ نے جلدی سے اُٹھ کر مصافحہ کیا اور بغلگیر ہو گیا۔ جمال کی ماں بھی میری بلائیں لینے

گئی۔ جمال کا باپ بولا ''انسپکٹر صاحب! ہم کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے ہمیں برباد ہونے سے بچالیا ہے۔''

ایک تیسرا شخص جس پر میری نظر نہیں پڑی تھی بائیں طرف کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے بھی اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ اس کا نام سلیمان ہے اور یہ جمال کا بڑا بھائی ہے۔ جمال کے والد نے گلوگیر آواز میں کہا کہ ہم تو اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مایوس ہو چکے تھے۔ ہر صبح آس بندھتی تھی اور ہر شام ٹوٹ جاتی تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا یہ ایک چھوٹی سی غلطی کی ہمیں اتنی بڑی سزا دے گا۔''

میں نے کہا ''جناب گھروں میں معمولی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، آدمی کو اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ یہ آپ کی نہیں اس کی غلطی ہے۔'' جمال ندامت سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں بار بار اس کا ماتھا چوم رہی تھی۔

''ہائے میرا بچہ کتنا دبلا ہو گیا ہے۔ پہچانا بھی نہیں جاتا۔''

میں سوچنے لگا کہ اگر یہ اسے آج سے تین چار ماہ قبل دیکھ لیتی تو شاید صدمے سے ہوش و حواس کھو بیٹھتی۔ جمال کا بھائی سلیمان ایک خاموش طبع شخص تھا۔ اس نے بات چیت میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔

اگلے روز مجھے چھٹی تھی۔ سہ پہر کے وقت تھوڑی دیر جمال کے والدین کے پاس بیٹھ کر میں باہر گھومنے چلا گیا۔ نومبر یا دسمبر کا مہینہ تھا۔ سرما کا ڈوبتا سورج کھیتوں پر الوداعی نگاہ ڈال رہا تھا۔ گاؤں سے کوئی چار فرلانگ دُور جب میں گنے کے ایک کھیت کے قریب سے گزر رہا تھا، کوئی لڑکی تیزی سے میرے سامنے آ گئی..... وہ لاڈو تھی لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لاڈو اور آنسو دو جدا چیزیں تھیں مگر میں اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس تنہا پگڈنڈی پر جو لڑکی زرد ریشمی لباس پہنے کھڑی تھی وہ لاڈو ہی تھی اور اس کی ہرنی جیسی خوبصورت آنکھوں میں جو پانی تھا وہ یقیناً آنسو تھے۔ ہاں وہ نہایت خاموشی سے سر جھکائے رو رہی تھی۔ اس کی تیزی، طراری، شوخی اور شرارت سب رخصت ہو چکی تھی۔

میں حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کیا جذبہ ہے جو اس لڑکی کو اس ویران جگہ میں میرے سامنے لے آیا ہے۔ وہ مجھ سے کیا چاہ رہی تھی؟ چند لمحوں میں کئی سوال میرے ذہن میں آئے اور گئے۔ پھر لاڈو کی لرزاں آواز سنائی دی۔

''تھانیدار جی! اسے روک لیجئے، وہ جا رہا ہے..... میں اس کے بغیر..... زندہ نہیں رہ سکتی۔''

میں سناٹے میں کھڑا سوچنے لگا۔ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ ''کون جا رہا ہے؟ کسے روک لوں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

لاڈو کا سر کچھ اور جھک گیا ''جمال'' اس نے ہچکی لے کر کہا۔ ''میں آپ کو بتا رہی ہوں اگر وہ مجھے چھوڑ گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔'' اتنا کہہ کر لاڈو تیزی سے مڑی اور کھیت میں غائب ہو گئی۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اب مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ جمال سارا سارا دن گھر سے کہاں غائب رہتا تھا۔ وہ لاڈو سے محبت کی پینگیں بڑھاتا رہا تھا اور اب لاڈو اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی..... جمال نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیا اس روز میں نے جو بات کی تھی وہ اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی؟ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے وہ بات اس نیت سے نہیں کی تھی کہ جمال لاڈو سے کوئی ایسی ویسی حرکت کرے یا اسے کسی طرح کے انتقام کا نشانہ بنائے۔ وہ تو اچانک اسے گلی سے گزرتے دیکھ

کر پرانی بات میرے ذہن میں آ گئی تھی۔

میں گھر پہنچا تو جمال اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا بڑا بھائی سلیمان اور باپ دوسرے کمرے میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں بھی چلی گئی۔ میں نے جمال سے لاڈو کا ذکر کیا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے کہا ''جمال یہ ہنسنے والی بات نہیں۔ مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ تم نے لاڈو سے کیا کہا تھا؟'' وہ مسکراتا ہوا بولا

''کچھ بھی نہیں نواز صاحب! بس ایک دو دفعہ راستے میں ملاقات ہوئی تھی۔ خوامخواہ ہی پیچھے پڑ گئی ہے۔''

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''جمال! میں کل کا بچہ نہیں ہوں۔ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تم اس لڑکی سے کھیل رہے ہو۔''

جمال پھر لاپرواہی سے ہنسنے لگا، اتنے میں اس کی والدہ، والد اور بھائی آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ جمال کو واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بڑی خوشی سے لے جاؤ لیکن پہلے ڈاکٹر اشوک سے مشورہ کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹر اشوک کو بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ جمال کو کم از کم ایک مہینہ اور یہیں گاؤں میں رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر کی بات بھی ٹھیک تھی۔ وہ بڑی توجہ سے جمال کا علاج کر رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد ہو سکتا تھا کہ مرض میں پھر کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی۔ یوں بھی گاؤں کی کھلی آب و ہوا اس کے لیے سازگار تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جمال بیس پچیس روز اور گاؤں میں رہے گا۔ اس کا بڑا بھائی سلیمان بھی اس کے ساتھ رہے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اشوک دوائیں لکھ دیں گے اور جمال کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

اگلے روز جمال کے ماں باپ واپس چلے گئے۔ میں نے سلیمان کے لیے گھر کا ایک کمرہ کھلوا دیا۔ یوں بھی ان دنوں میں پانچ چھ کمروں کے اس حویلی نما گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ ایک ملازمہ تھی جو صبح آتی تھی اور رات کا کھانا کھلا کر واپس چلی جاتی تھی۔ جمال جب زیادہ بیمار تھا تو اس کے لیے میں نے ایک اور خادمہ رکھی تھی لیکن اب وہ نہیں آتی تھی۔ رات کو میں اور جمال گھر میں تنہا ہوتے تھے۔ اب اس کا بڑا بھائی سلیمان بھی آ گیا تھا۔ اس رات آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار بوندا باندی بھی ہو جاتی تھی۔ میں رات دیر سے گھر آیا۔ جمال اور سلیمان سو چکے تھے۔ بارش کی وجہ سے ملازمہ میری چارپائی برآمدے میں بچھا گئی تھی لیکن چونکہ میرے سونے تک بوندا باندی تھم چکی تھی، میں نے حبس کے خیال سے چارپائی اُٹھائی اور چھت پر چلا آیا۔ چھت پر سے برآمدے میں بچھی ہوئی جمال کی چارپائی نظر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی کھانسی کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ کھانسی کی یہ آواز آج سے تین چار ماہ پہلے بھی سنائی دیتی تھی لیکن اس وقت یہ آواز نہایت باریک اور کمزور ہوتی تھی۔ اب اس کھانسی میں بھی صحت اور تندرستی کی جھلک تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کی تھپکیوں نے مجھے گہری نیند سلا دیا۔ رات کے آخری پہر ایک کھٹکے کی آواز سُن کر میں جاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ کروٹ بدل کر میں پھر سو جاتا، کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ آواز سے بے انتہا تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو۔ میں چونک کر اُٹھ گیا۔ پھر تیزی سے سیڑھیاں اُترتا نیچے صحن میں آیا۔ بادلوں نے ایک بار پھر آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ ستون سے لٹکتی لالٹین تھام کر میں جلدی سے جمال کی

چارپائی پر آیا اور میری نگاہیں پتھرا کر رہ گئیں۔ جمال بستر پر خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک خنجر پیوست تھا۔ اس کا سر چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور ایک ہاتھ زمین کو چھو رہا تھا۔

''جمال'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

یہ آواز سن کر ساتھ والی چارپائی سے سلیمان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ''کیا ہوا..... کیا ہوا'' اس نے بوکھلاہٹ میں پوچھا۔ میں نے لالٹین نیچے رکھ کر جلدی سے جمال کا سر تکیے پر ٹکایا۔ پھر اس کی نبض ٹٹولی۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ بستر کی چادر ہاتھ پر لپیٹ کر میں نے بڑی احتیاط سے خنجر جمال کے سینے سے کھینچا۔ اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور زخم تیزی سے خون اُگلنے لگا۔ میں نے اپنے ہمسائے کو آوازیں دیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور بھاگتا ہوا ہمارے صحن میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے فوراً ڈاکٹر اشوک کی طرف بھگایا اور خود جمال کا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

قریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر اشوک بھاگم بھاگ موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے جمال کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے تسلی دی۔ اس نے بتایا کہ خنجر ترچھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے پھیپھڑا زخمی ہوا ہو لیکن بچ گیا ہے۔ ڈاکٹر اشوک نے اس دُور دراز گاؤں میں بھی اپنے دواخانے میں ایک چھوٹا سا آپریشن تھیٹر تیار کر رکھا تھا۔ مرہم پٹی کے علاوہ ہڈیاں جوڑنے، رسولیاں نکالنے اور زچہ بچہ کی جان بچانے کے لیے معمولی آپریشن بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ جمال کو اسی وقت دواخانے منتقل کر دیا جائے۔

اس کی ہدایت پر عمل کیا گیا اور بیہوش جمال کو دواخانے پہنچا دیا گیا۔ وہ پہلے ہی بہت کمزور تھا۔ خون کے اخراج نے اسے جاں بلب کر دیا۔ ادھر ڈاکٹر اشوک اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور ادھر میں حملہ آور کی کھوج میں تھا۔ مجھے سب سے پہلا شک لاڈو اور اس کے بھائیوں پر تھا۔ صرف چار روز پیشتر لاڈو نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ خاصہ توجہ طلب تھا۔ میرے دوسرے شک کے متعلق سن کر آپ شاید حیران ہوں لیکن کچھ شواہد ایسے تھے جو میرے ذہن میں اس شک کو جنم دے رہے تھے.....

میرا دوسرا شبہ سلیمان پر تھا۔ نجانے کیوں میرا ذہن بار بار اس شخص کی طرف جا رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ یہ ایک نہایت کم گو شخص تھا۔ عمر کوئی اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ اپنے تیسرے شک کے متعلق میں آپ کو آگے چل کر بتاتا ہوں..... تو سب سے پہلے میں نے لاڈو کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا۔ نواب دین کے گھرانے کو کسی کیس میں شامل تفتیش کرنا آسان کام نہیں تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ اس میں نواب دین کی اکلوتی بیٹی کا بھی نام آتا ہو۔ نواب دین کے دو بیٹے اکبر اور اصغر زیادہ ہوشیار اور لڑاکا تھے۔ اس قسم کے کاموں میں وہی پیش پیش ہوتے تھے۔ میں نے اپنے دو خاص مخبروں سے ان کا پتہ کروایا کہ رات وہ دونوں کہاں تھے اور خود نواب دین نے رات کہاں گزاری۔ میرے ہوشیار مخبروں نے جن میں ایک نواب دین کی گھریلو ملازمہ تھی، مجھے دوپہر تک پوری رپورٹ دے دی۔ گھریلو ملازمہ سے دو نہایت کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ نواب دین رات گھر میں تھا۔ کوئی آدھی رات کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک مزارعہ بڑا گھبرایا ہوا آیا اور نواب دین کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ اس کے کوئی دو گھنٹے کے بعد نواب دین اپنے بیٹے اصغر کے ساتھ واپس آیا۔ ملازمہ نے بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اصغر کی قمیص پر خون کے چھینٹے تھے۔ اکبر کے متعلق ملازمہ نے بتایا کہ وہ کسی

پیشی کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا ہے۔ ملازمہ کی اطلاع چونکا دینے والی تھی۔ یوں تو نواب دین کے بیٹے غیر قانونی حرکات کرتے ہی رہتے تھے لیکن عین اس وقت جب جمال میرے گھر میں چارپائی پر پڑا زخمی حالت میں سسک رہا تھا، نواب دین کا گھبرایا ہوا مزارعہ کوئی خبر لے کر پہنچا تھا۔ کیا یہ صرف ایک اتفاق تھا یا اصغر واقعی جمال پر قاتلانہ حملے کا مجرم تھا۔ مخبر کی اطلاع نہایت اہم تھی لہٰذا پہلے میں نے اسی رُخ پر تفتیش کا فیصلہ کیا۔

دوپہر کے وقت میں نے نواب دین سے اس کی حویلی میں ملاقات کی۔ وہ بڑے احترام سے مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ خوش قسمتی سے اصغر بھی وہیں موجود تھا۔ وہ ایک صحت مند بلکہ پہلوان نما نوجوان تھا۔ چہرہ بھرا ہوا اور بال گھونگھریالے تھے۔ گلے میں سونے کا ایک بڑا کینٹھا تھا تاہم اس کی آواز اس کے جسم کے مقابلے میں نہایت باریک اور زنانہ قسم کی تھی۔ پہلی بار تو یہ آواز سن کر ہنسی آ جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اصغر باپ کی موجودگی کے باوجود گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی گھبراہٹ مجھے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔ چھوٹے موٹے جرم کر کے ڈرنے والے یہ لوگ نہیں تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، صرف ایک سال پہلے ان لوگوں نے دو قتل کر دیئے تھے۔ ابھی تک یہ مقدمہ چل رہا تھا۔ اصغر کا ڈرا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے یقیناً کوئی سنگین جرم کیا ہے اور یہ جرم جمال پر قاتلانہ حملے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

میں نے بڑے محتاط طریقے سے بات شروع کی۔ جلد ہی نواب دین کو اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے بیٹے پر قاتلانہ حملے کا شک کر رہا ہوں۔ پہلے تو نواب دین نے آگ بگولا ہونے کی کوشش کی لیکن ایک جہاندیدہ شخص کی طرح جلد ہی غصے پر قابو پا لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک نہایت معتبر گواہی اس کے بیٹے کے خلاف ہے۔ ایک شخص نے اسے واردات کے فوراً بعد میرے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔

نواب دین نے مجھ سے جو پہلا سوال پوچھا وہ یہ تھا کہ اصغر کو میرے مہمان پر قاتلانہ حملے کی کیا ضرورت تھی؟ یقیناً اسے یہی سوال پوچھنا چاہیے تھا۔ ان دونوں میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا۔ تنازعہ نہیں تھا۔ عداوت نہیں تھی۔ اگر لاڈو کو نکال دیا جائے تو شاید وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں..... لیکن لاڈو کو کیسے نکالا جا سکتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ نواب دین اور اس کے بیٹوں کو ابھی تک لاڈو اور جمال کے تعلق کا پتہ نہ ہو۔ شاید یہی بات تھی ورنہ نواب دین اتنی آسانی سے یہ سوال نہ پوچھ سکتا۔ میں نے فی الحال اس ذکر کو گول کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا ''نواب دین! وجہ تھی..... تمہارے بیٹے کے پاس وجہ تھی اور میں وقت آنے پر بتا بھی دوں گا لیکن اگر تم لوگ تعاون کرو تو بہت سی مشکلوں سے بچ سکتے ہو۔''

میں نے محسوس کیا کہ نواب دین میں کوئی خاص دم خم نظر نہیں آ رہا۔ میرے نزدیک اس کے دو سبب تھے۔ پہلا تو یہ کہ اصغر واقعی مجرم تھا اور دوسرا یہ کہ قتل کے پہلے مقدمے نے نواب دین کے کس بل کچھ کچھ نکال دیئے تھے۔ ابھی کچھ ہی روز پہلے نواب دین نے اپنی کوئی دو مربع زمین فروخت کی تھی۔ ظاہر ہے یہ ساری رقم اب تک وکیلوں کی جیب میں پہنچ چکی ہو گی۔ اب اگر یہ نیا مقدمہ شروع ہو جاتا تو اس کی حالت اور پتلی ہو جاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے ساتھ محتاط رویہ رکھنے پر مجبور ہے۔ میں نے جاتے وقت واضح الفاظ میں کہا ''نواب دین! میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو کل تک کا وقت دیتا ہوں۔ اپنا اچھا بُرا خوب سوچ سمجھ لو۔''

نواب دین سے مل کر واپس آیا تو ذہن بہت اُلجھا ہوا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ اگر نواب دین

وغیرہ لاؤ اور جمال کے معاملے سے بے خبر ہیں تو انہیں جمال کو مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بے خبر بن رہے ہوں۔ بہت سے سوال تھے۔ بہرحال حویلی سے میں یہ نتیجہ لے کر واپس آیا کہ کل رات اصغر سے کوئی سنگین جرم سرزد ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے جمال پر قاتلانہ حملہ کیا ہو..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور گل کھلایا ہو۔

میرا دوسرا شک سلیمان پر تھا۔ یہ شخص مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ گم صم اور پراسرار سا۔ جس وقت سے یہاں آیا تھا چند فقروں سے زیادہ نہیں بولا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ جمال پر ہونے والے حملے سے بے خبر کیوں رہا۔ میں نے چھت پر سے جمال کی کراہیں سنیں اور بھاگتا ہوا نیچے پہنچا۔ وہ اس سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر موجود تھا لیکن لمبی تان کر سویا رہا۔ آدمی کیسا بھی بے خبر سوئے اتنی آواز سے تو جاگ ہی جاتا ہے۔ جب میں موقع پر پہنچا تو جمال کی ایک ٹانگ سلیمان کی چارپائی پر پڑی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جمال کا تڑپنا مچلنا بھی اسے نہ جگا سکا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ نیند کا ڈرامہ رچا رہا ہو۔

میں نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں اس سے پوچھ گچھ کی۔ میرے پہلے چند سوالوں سے سلیمان کو بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں لیکن ان سوالوں کے جوابات نے میرے شک کو مزید پختہ کر دیا۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ جمال کا سگا بھائی نہیں ہے۔ جمال کے والدین کے ہاں ایک عرصہ کوئی اولاد نہ ہوئی تو انہوں نے سلیمان کو گود لے لیا۔ کوئی سات آٹھ برس بعد جمال پیدا ہوا۔ یہ ان کا پہلا اور آخری بچہ ثابت ہوا۔ دونوں میاں بیوی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

میں نے اپنے طور پر سوچنا شروع کیا۔ ظاہر تھا اپنے بچے کی پیدائش کے بعد جمال کے والدین کی محبت سلیمان کے ساتھ پہلی سی نہیں رہی ہوگی۔ یا ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی میں سے کسی ایک کی محبت میں فرق آ گیا ہو۔ سلیمان اور جمال میں رقابت قدرتی بات تھی۔ یہ بھی امکان تھا کہ جائیداد کی وراثت کا کوئی معاملہ ہو۔ جب میں نے وراثت کی بات چھیڑی تو سلیمان کو اندازہ ہونے لگا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ وہ بہت گھبرا شخص دکھائی دیتا تھا لیکن خوف اس کے چہرے پر ظاہر ہو کر رہا۔ وہ کہنے لگا "جناب! ایک تو میں بھائی کی مصیبت پر غم سے نڈھال ہوں اوپر سے آپ مجھے مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔ یہی آپ کی مہمان نوازی ہے کہ ایک بھائی قبر میں پہنچ جائے اور دوسرا جیل میں؟"

غصے یا شاید خوف سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنی گردن پیچھے سے تھام لی اور جھومنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گرا۔ گرتے ساتھ ہی اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا داہنا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر اسے سنبھالا۔ اس کی جیب دیکھی۔ اندر گولیوں کی ایک چھوٹی سی شیشی موجود تھی۔ سلیمان نے لرزتے ہاتھ سے یہ شیشی جھپٹ لی اور کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا "کیا یہ خودکشی کی کوشش کر رہا ہے؟" میں نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عین اس وقت ڈاکٹر اشوک دروازہ کھول کر تیز قدموں سے اندر آ گیا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سلیمان کا سر میری گود میں تھا اور میں اس سے شیشی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اشوک تیزی سے

آگے بڑھا۔ اس نے ایک نظر سلیمان کا زرد چہرہ دیکھا پھر میرے ہاتھ سے شیشی لے کر دیکھنے لگا۔ چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ پھر اس نے شیشی کی چھوٹی چھوٹی آٹھ دس گولیاں اپنی ہتھیلی پر نکالیں اور سلیمان کے ادھ کھلے منہ میں پہنچا دیں۔

.....دراصل سلیمان کو مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ یہ دورہ اسے عموماً پڑ جاتا تھا۔ احتیاطاً اس نے جیب میں گولیوں کی شیشی رکھ چھوڑی تھی۔ بروقت دوا ملنے سے دورے کی شدت کم ہو گئی۔ ڈاکٹر اشوک نے مسکراتے ہوئے کہا ''آج تم نے دیہاتی تھانیداروں والا کام کیا ہے۔ وہ دوا کھا رہا تھا اور تم اسے پکڑے بیٹھے تھے۔''

میں نے کہا ''بھائی میرے! صورتحال ہی ایسی تھی۔ تم نے بھی تو دوا میرے ہاتھ سے چھین لی تھی۔''

وہ بولا ''وہ تو میں نے نام دیکھنے کے لیے لی تھی۔''

میں نے کہا ''تو میں نام دیکھے بغیر اسے دوا کھانے کی اجازت کیسے دے دیتا!''

میرے جواب نے اسے لاجواب کر دیا۔ اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر لایا ہے.....اور وہ اچھی خبر یہ تھی کہ جمال کی حالت اب تسلی بخش تھی۔ وہ ایک طرح موت کے منہ سے بچ کر نکل آیا تھا۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے آ کر اطلاع دی کہ کھوجی نہر کے پل پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کھرا پھر اُٹھا لیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے آپ سے تیسرے شک کا ذکر کیا تھا۔ تیسرا شک مجھے ایک گاڑی پر تھا۔ یہ نامعلوم گاڑی واردات کی رات گاؤں سے باہر ایک کنویں تک آئی تھی۔ اس کی اطلاع سب سے پہلے مجھے تھانے کے ہی ایک سپاہی نے دی تھی۔ وہ علی الصبح نہانے کے لیے کنویں پر پہنچا تھا۔ ٹائروں کے مدھم نشان کوئی نصف فرلانگ تک چلے گئے تھے۔ رات کے آخری پہر چونکہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی لہٰذا یہ نشان اوجھل ہو چکے تھے۔ میری ہدایت پر گاؤں کے دو کھوجی پوری کوشش کر رہے تھے اور اب وہ گاؤں سے کوئی دو میل دُور نہر کے پار یہ نشان ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یوں تو گاؤں میں دو تین کھاتے پیتے زمیندار تھے اور ان کے ہاں کبھی کبھار شہر سے کوئی گاڑی یا جیپ آ جاتی تھی لیکن گاڑی کا آنا اور پھر کنویں سے واپس چلے جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل کی اطلاع پر میں فوراً نہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پل سے کوئی نصف فرلانگ دُور کھوجی اور میرے دو کانسٹیبل بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کنویں سے آنے والی گاڑی یہاں پہنچ کر کھیتوں میں داخل ہو گئی ہے۔ بات حیرانی کی تھی لیکن وہ پورے یقین سے کہہ رہے تھے۔ میں نے کھیتوں میں نگاہ دوڑائی۔ دُور تک فصل کٹی ہوئی تھی۔ کھوجیوں کے مطابق گاڑی چاول کے ان کٹے ہوئے کھیتوں میں گئی تھی۔ یہاں سے کوئی تین فرلانگ دُور ایک دوسری سڑک تھی۔ اینٹوں کی بنی ہوئی اس خستہ حال سڑک پر بہت کم لوگ سفر کرتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ مجرموں نے پولیس کی ناکہ بندی کے ڈر سے وہ سڑک استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔

میں نے کھوجیوں سے کہا کہ وہ کھرے کا پیچھا کریں۔ وہ کھیتوں میں داخل ہوئے اور بڑے ماہرانہ انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ میں گھوڑے پر

سوار ان کے عقب میں تھا۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہم نواب دین کی زمینوں میں داخل ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ مشکوک گاڑی کا نواب دین کی زمین میں آنا کیا معنی رکھتا تھا۔ جب ہم کماد کے ایک کھیت کے قریب سے گزر رہے تھے، نواب دین اور اس کے ساتھی اچانک سامنے آ گئے۔ پہلے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ پولیس پارٹی پر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ نواب دین آگے بڑھا اور تپاک سے مصافحہ کر کے مجھے اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ اس کے بیٹے اصغر اور اکبر بھی موجود تھے۔ لسی وغیرہ سے تواضع کرنے کے بعد وہ مجھے علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ کوئی اعتراف کرنے والا ہے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس موقع پر میرے منہ سے نکلی ہوئی کوئی بات کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کھیتوں میں میری آمد سے کیا سمجھ رہا تھا۔ آخر وہ بولا ''نواز خاں! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رات ہمارے ڈیرے پر لڑائی ہوئی تھی جس میں میرے ایک مزارعے کی گولی لگنے سے ایک شخص ہلاک ہو گیا ہے۔''

میں نے کہا ''نواب دین میں یہ سب کچھ جانتا ہوں بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ گولی تمہارے مزارعے نے نہیں تمہارے بیٹے اصغر نے چلائی تھی بہرحال تم آگے بات کرو۔''

نواب دین نے قدرے سراسیمہ ہو کر پہلے تو اس بات سے انکار کیا کہ گولی اصغر نے چلائی تھی پھر اس واقع کی تفصیل بتانے لگا۔ اس نے کہا ''رات کوئی ایک ڈیڑھ بجے ایک جیپ کی آواز آئی۔ میرے کچھ آدمی ڈیرے پر سو رہے تھے۔ وہ حیران ہو کر اُٹھ بیٹھے۔ چارے کے کھیت میں ایک جیپ بھاگی جا رہی تھی۔ انہوں نے جیپ والوں کو للکارا اور روک لیا۔ اس میں دو آدمی تھے۔ دونوں پھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔ میرے آدمیوں نے پوچھا کہ وہ پکا راستہ چھوڑ کر کھیت کیوں برباد کر رہے ہیں؟ اس پر وہ میرے آدمیوں سے بھڑ گئے۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ بھی کی۔ میرے آدمیوں نے جان بچانے کے لیے جوابی فائرنگ کی جس سے ایک شخص تو ڈھیر ہو گیا اور دوسرا جیپ لے کر بھاگ گیا۔''

نواب دین نے واقعہ اپنے انداز میں سنایا تھا۔ بہرحال اس کی یہ بات بعد میں صحیح ثابت ہوئی کہ جیپ رو کے جانے پر اس کے دونوں سوار طیش میں آ گئے تھے (دراصل ان کے سر پر خون سوار تھا کیونکہ وہ ہنی دانست میں جمال کو قتل کر کے آئے تھے) انہوں نے شراب بھی چڑھا رکھی تھی۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ اصغر اور اس کے ساتھیوں پر پل پڑے۔ اصغر بھاگ کر ڈیرے پر گیا اور وہاں سے اپنی کاربین لے آیا۔ اس کی ایک گولی ایک جیپ والے کو لگی اور وہ وہیں دم توڑ گیا۔ دوسرا شخص جیپ بھگا کر لے گیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک مزارعے کو گاؤں بھیجا گیا تا کہ وہ نواب دین کو بلا لائے۔ نواب دین گھبرایا ہوا پہنچا۔ باپ بیٹے نے مل کر فیصلہ کیا کہ لاش کو یہیں کھیت میں گڑھا کھود کر دبا دیا جائے۔

.....اب وہ لاش گنے کے ایک کھیت میں دفن تھی۔ شام ہونے سے پہلے نواب دین کی نشاندہی پر میں نے وہ لاش کھیت سے نکلوا لی۔ یہ ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ خاکی رنگ کی شلوار قمیص اور سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ چہرے مہرے سے سخت مزاج، جرائم پیشہ شخص دکھائی دیتا تھا۔ کاربین کی گولی اس کے سر میں لگی تھی اور کنپٹی پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کا منہ خوفناک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ لاش کو ایک ریڑھے پر ڈال کر گاؤں میں لایا گیا۔ تھانے کے سامنے لاش دیکھنے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ میں تھانے

میں بیٹھ کر کاغذات مکمل کر رہا تھا کہ ایک سنتری نے آ کر بتایا کہ لاش پہچان لی گئی ہے۔ یہ خبر میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں بھاگتا ہوا باہر آیا۔ لاش کے سرہانے سلیمان کھڑا تھا اسی نے لاش شناخت کی تھی۔ اس نے کہا ''تھانیدار صاحب! اس کا نام نیاز ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میں سلیمان کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ان لوگوں سے ان کی پرانی دشمنی ہے۔ ویسے یہ لوگ ان کی برادری کے ہیں۔ جمال کی ایک پھوپھی کو اس گھرانے کے ایک نوجوان نے اغوا کر لیا تھا۔ کوشش کے باوجود جب اس نے مغویہ واپس نہیں کی تو جمال کے ایک چچا نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر اس کے بھائیوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ جمال کو زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن پھر ایسا ہوا کہ وہ آپس کی لڑائیوں میں اُلجھ گئے۔ کچھ قتل ہو گئے اور کچھ جیلوں میں سڑ گئے۔ اب یہ صرف دو بھائی نیاز اور نواز بچے تھے۔ ان میں سے نیاز باہر چارپائی پر پڑا تھا اور نواز شاید وہی تھا جو جیپ بھگا کر لے گیا تھا۔

نواب دین کے بیٹے اصغر کو میں نے کل ہی گرفتار کر لیا تھا۔ اب نواز کی گرفتاری کا مسئلہ تھا۔ دوسری طرف مقتول نیاز کا پوسٹمارٹم بھی ضروری تھا۔ میں لاش کے ساتھ ہی لاہور آ گیا۔ یہاں سے بذریعہ ٹرین میں اور میرے دو کانسٹیبل خانیوال پہنچے۔ جمال کی طبیعت اب چونکہ کافی سنبھل چکی تھی اس لیے سلیمان بھی ہمارے ساتھ چلا آیا تھا۔ خانیوال ہم کوئی رات گیارہ بجے پہنچے۔ سلیمان نے بتایا تھا کہ نواز شہر کے مضافات میں رہتا ہے لیکن اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے متعلقہ تھانے سے رابطہ قائم کرنا ضروری تھا۔ ہم ایک تانگے پر بیٹھ کر تھانے کی طرف روانہ ہوئے۔ بڑی سڑک سے ہم ایک تنگ سی سڑک پر مڑے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ سنسان سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اچانک کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ گاڑی والا تانگے سے راستہ مانگنے کے لیے مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ دفعتاً سلیمان بُری طرح چونک گیا۔

''تھانیدار صاحب!'' وہ حیرت زدہ آواز میں بولا ''یہ نواز کی جیپ ہے۔''

میں نے غور سے دیکھا۔ سامنے جیپ ہی تھی۔ اس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ سلیمان نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''جناب! جیپ نواز چلا رہا ہے۔''

میرے اعصاب تن گئے۔ مجرم بہت جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کہیں فرار ہونے کا ہی سوچ رہا ہو..... میں نے کوچوان سے کہا کہ اس جیپ کو راستہ نہیں دینا۔ تانگہ درمیان میں رکھو اور آہستہ کرتے جاؤ۔

کوچوان پہلے تو حیرت زدہ ہوا پھر اس نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ جیپ اب بالکل قریب آ چکی تھی۔ ڈرائیور مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ جب تانگے کی رفتار بالکل کم ہو گئی تو میں چھلانگ لگا کر نیچے اُترا۔ ریوالور میں ہاتھ میں لے چکا تھا۔ میں نے بھاگ کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور ریوالور دونوں افراد کی طرف سیدھا کر لیا۔

''خبردار! انجن بند کر دو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر یقیناً نواز بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آئے۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ میں پائیدان پر کھڑا ہو گیا۔ جیپ گولی کی رفتار سے تانگے کی طرف بڑھی۔ راستہ اتنا نہیں تھا کہ جیپ گزر سکتی لیکن اگر کسی طرح گزر بھی جاتی تو میں اس بُری طرح تانگے سے ٹکراتا کہ شاید پھر اُٹھ نہ

سکتا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے جیپ چھوڑنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ یہ ایک کھلی جیپ تھی۔ میں نے جسم کو اُچھالا اور لوہے کے پائپ پر سے ہوتا ہوا پچھلے حصے میں گرا۔ جیپ دائیں طرف ریوالور سے رگڑ کھاتی ہوئی بری طرح اچھلی لیکن تانگے سے آگے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ نواز کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی بجلی کی تیزی سے اُٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بندوق لاٹھی کی طرح استعمال کی تھی۔ میں نیچے جھکا، بندوق کا وزنی دستہ سیٹ کی پشت سے ٹکرایا۔ میں نے نیچے جھکے جھکے حملہ آور کو اٹھایا اور سر کے اوپر سے گزار کر جیپ سے نیچے پھینک دیا۔ وہ بھیانک چیخ کے ساتھ دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ نواز نے جیپ کچے میں اُتاری لیکن بدحواسی کی وجہ سے اس پر قابو نہ رکھ سکا۔ چند گز آگے جا کر وہ اُلٹ گئی۔ خوش قسمتی سے جیپ پہلو کے بل گری یعنی اس نے قلابازی نہیں کھائی۔ میں لڑھک کر کچی زمین پر گرا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو نواز لنگڑاتا ہوا ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے گر چکا تھا تو اس کے ہاتھ بھی خالی تھے۔ مقابلہ برابر کا تھا۔ میں نے بھاگ کر چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا نیچے گرا۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ گری ہوئی جیپ کی لائٹیں ابھی تک روشن تھیں اور ان کی روشنی میں میرا ہم نام نواز ہاتھ میں ایک خوفناک چاقو لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ نجانے کس وقت اس نے شلوار کے نیفے میں ہاتھ ڈال کر یہ چاقو نکال لیا تھا۔ اگر جیپ کی روشنی نہ پڑتی تو شاید میں اس کے ہتھیار سے بے خبر ہی رہتا اور وہ بے خبری میں میری آنتیں نکال کر رکھ دیتا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے میرے سینے پر وار کیا۔ ایک طرف جھک کر میں نے یہ وار بچایا لیکن اس نے اتنی ہی پھرتی سے دوبارہ چاقو گھمایا۔ اس دفعہ چمکدار پھل میری آنکھوں سے ایک انچ کی دُوری سے گزر گیا۔ میں نے گھوم کر ایک زوردار مکہ اس کی ٹھوڑی پر جمایا۔ وہ اُلٹ کر جیپ کے عین سامنے جا گرا۔ میں نے اپنا ہاتھ ہولسٹر پر رکھا اور فوراً خود کو روشنی کی زد سے نکال لیا تھا۔

''خبردار'' میری آواز سناٹے میں گونجی۔ ''چاقو پھینک دو ورنہ گولی مار دوں گا۔'' میرے ہاتھ خالی تھے لیکن لہجہ پُراعتماد تھا۔ نواز نے چندھیائی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے بہنے والا خون اس کی ٹھوڑی کو بھگو رہا تھا۔ ایک لمحہ سوچ کر اس نے چاقو نیچے پھینک دیا۔ میں نے لپک کر چاقو اُٹھایا۔ مجرم کے بال مٹھی میں جکڑے اور ٹھنڈا ہوا پھل اس کی گردن پر رکھ دیا۔ تھوڑے فاصلے پر چند مکان موجود تھے۔ ایک چوکیدار لالٹین اُٹھائے میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ سڑک پر بھی ایک کار اُلٹی ہوئی جیپ کو دیکھ کر رُک گئی تھی۔ پھر میرے کانوں میں سرپٹ دوڑتے گھوڑے کی ٹاپیں گونجیں.....اور میں سمجھ گیا کہ میرا عملہ پہنچ گیا ہے۔

نواز کو گرفتار کرلیا گیا۔ دونوں بھائی ہسٹری شیٹر تھے۔ نیاز کچھ روز پہلے پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا اور آج کل اشتہاری تھا۔ دراصل جب جمال کے والدین گاؤں میں جمال کو زندہ سلامت دیکھ کر واپس آئے تو انہوں نے اپنے گھر میں جشن کا انتظام کیا اور خوب خوشی منائی۔ نیاز، نواز وغیرہ کو اپنے دشمنوں کی یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے اس جشن مسرت کو صف ماتم میں بدلنے کا فیصلہ کیا۔ جمال کے والدین کی طرح وہ بھی دو ڈھائی سال سے اسے تلاش کر رہے تھے لیکن اب یہ سوچ کر مطمئن ہو چکے تھے کہ وہ کہیں مرکھپ گیا ہوگا لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ وہ زندہ ہے تو ان کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا۔ انہوں نے کسی طرح جمال کا پتہ

لگایا اور اسے جان سے مارنے کے لیے پہنچ گئے۔ جمال کے والدین کو اپنی دشمنی کا علم تھا لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کے بیٹے کی جان کے دشمن سیالکوٹ کے اس دُوردراز گاؤں میں پہنچ جائیں گے۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر انہوں نے سلیمان کو وہاں چھوڑ دیا تھا لیکن ہوا یہ کہ جس رات جمال پر قاتلانہ حملہ ہوا سلیمان اسی سکون بخش دوا کی چند گولیاں کھائے ہوئے تھا جس کی شیشی اس کی جیب میں پڑی رہتی تھی۔ گہری نیند کی وجہ سے وہ اس قاتلانہ حملے سے بالکل بے خبر رہا جس کے سبب مجھے اس پر کچھ شک بھی ہوا۔

نواز کی گرفتاری کے بعد میں پھر گاؤں واپس آ گیا۔ نواب دین کے بیٹے اصغر کا چالان تیار کیا..... لیکن کیس اتنا مضبوط نہیں تھا۔ ایک تو مقتول خود ہسٹری شیٹر اور مفرور تھا۔ دوسرے قتل کا واقعہ نواب دین کی زمینوں پر ہوا تھا جہاں مقتول نے بلاوجہ جھگڑا کیا تھا۔ میں نے نواب دین اور اس کے بیٹے سے اتنی رعایت کی کہ لاش کھیت میں گاڑنے کا قصہ گول کر دیا۔ امید تھی کہ اصغر کو سال ڈیڑھ سال قید سے زیادہ سزا نہیں ہوگی۔

اب ہم پھر جمال اور لاڈو کی طرف آتے ہیں۔ سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام کو جب بوندا باندی نے گاؤں کی گلیاں سنسان کر رکھی تھیں، ایک عورت چادر میں منہ سر لپیٹے تھانے میں داخل ہوئی۔ جب اس نے اپنا چہرہ کھولا تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لاڈو تھی۔ ایک ماہ میں یہ دوسری مرتبہ تھا جب وہ اس طرح اچانک میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس دفعہ اس کی حالت پہلے سے بھی پتلی تھی۔ چہرہ زرد تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں شفاف پانی چمک رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا لیکن اس نے کھڑے کھڑے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور روتے ہوئے بولی ''تھانیدار صاحب! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو مجھے معاف کر دیں لیکن..... خدا کے لیے جمال کو روک لیں۔ میں اس کے بعد زندہ نہیں رہوں گی۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی.....''

اس کے لہجے کی مایوسی اور بے بسی نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جمال کے پیار میں اتنی دُور نکل چکی ہے کہ واپسی اس کے لیے ممکن نہیں۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ چادر کا ڈھلکا ہوا پلو اس کے سر پر رکھا اور کہا ''لاڈو! جاؤ اپنے گھر جا۔ جمال تجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔'' میرے فیصلہ کن لہجے پر لاڈو نے بھیگی پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔

میں گھر پہنچا تو جمال جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آج یا کل کسی وقت اس کے والدین اسے لینے آ رہے تھے۔ گھر واپس جانے کی خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا تو وہ گڑبڑا گیا۔

''کیا بات ہے بھائی جان؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''جمال! تم نے کئی بار ڈاکٹر اشوک سے کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں آپ کو کیا فیس ادا کروں؟ ڈاکٹر اشوک نے تمہیں اپنی فیس نہیں بتائی۔ تم نے مجھ سے بھی کئی بار کہا ہے کہ بھائی جان آپ نے مجھے موت سے رہائی دلائی ہے، میں آپ کے احسانوں کا بدلہ کس طرح چکاؤں؟'' میں نے بھی ڈاکٹر کی طرح تمہیں اپنی خواہش نہیں بتائی لیکن جس طرح ڈاکٹر اشوک اپنی فیس چاہتا ہے اس طرح میں بھی اپنا بدلہ چاہتا ہوں.....''

جمال نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور

بولا ''کہیں کیا چاہتے ہیں آپ؟''

میں نے کہا ''جمال! لاڈو سے شادی کرلو۔''

جمال کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر پریشانی کے آثار نظر آئے۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے تھرائے مگر وہ بولا نہیں اور جب بولا تو اس کی آواز کہیں دُور سے آرہی تھی۔ اس نے پرسکون لہجے میں کہا ''.....آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں تیار ہوں۔''

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

جمال کی ہدایت پر اس کے والدین نے نواب دین سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا۔ نواب دین اگر بہت بڑا زمیندار تھا تو جمال کا والد بھی کچھ کم مالدار نہیں تھا۔ خانیوال کے نواح میں اس کی بہت سی زمینیں اور باغ تھے۔ اثر و رسوخ بھی بہت تھا۔ میں نے جمال کے والدین کو نواب دین کے مزاج اور اس کے حالات کے متعلق بہت کچھ بتا دیا تھا جس کی وجہ سے انہیں بات کرنے میں آسانی رہی۔ آخر نواب دین اس رشتے پر رضامند ہو گیا۔ نہایت دھوم دھام سے یہ شادی انجام پائی۔ کئی روز جشن برپا رہا۔ تیسرے روز بارات نئی نویلی دلہن کو لے کر واپس چلی گئی۔

.....اس شادی سے کوئی چھ ماہ بعد کی بات ہے مجھے اپنے پتے پر ایک دعوتی کارڈ موصول ہوا۔ خانیوال سے آیا تھا۔ جمال کے بڑے بھائی سلیمان کی شادی تھی۔ جمال نے بے حد اصرار کے ساتھ مجھے شرکت کے لیے کہا تھا۔ اتفاقاً انہی دنوں مجھے لاہور بھی جانا تھا۔ میں نے پروگرام بنالیا۔

میں ولیمے کے روز شادی والے گھر پہنچا۔ خوب گہما گہمی تھی۔ جمال اور سلیمان بڑے تپاک سے ملے۔ لاڈو سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش و خرم تھی۔ جمال اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی ازدواجی زندگی خاصی خوشگوار ہے..... قریب بیٹھے ہوئے ایک دوسرے مہمان سے باتیں ہونے لگیں۔ یہ شخص میرا ایک پرانا جاننے والا نکل آیا۔ وہ یہیں کا رہنے والا تھا اور سلیمان، جمال وغیرہ کے متعلق کافی کچھ جانتا تھا۔ اس نے جمال کا تذکرہ چھیڑ دیا اور بتانے لگا کہ کس طرح وہ باپ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا اور پھر ڈھائی سال بعد اس کا پتہ چلا۔

میں نے کہا ''میرا خیال ہے میں اس بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔''

وہ کہنے لگا ''لیکن ایک بات تم نہیں جانتے ہو گے۔''

میں نے تجسس سے پوچھا ''وہ کیا؟''

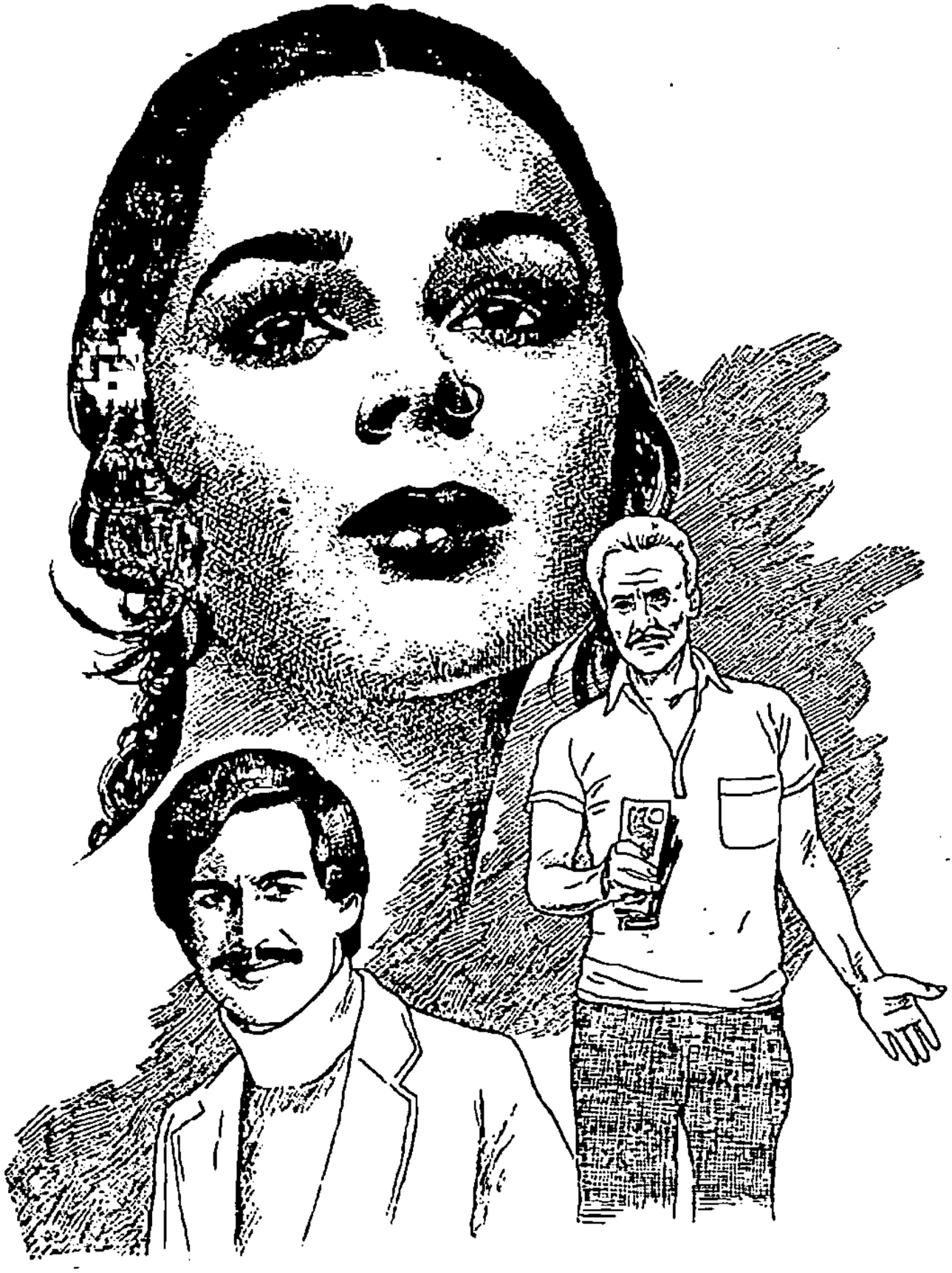
وہ کہنے لگا ''تم نہیں جانتے ہو گے کہ وہ کس بات پر ناراض ہو کر گھر سے نکلا تھا..... دراصل اسے ایک لڑکی سے شدید محبت تھی۔ وہ ہر قیمت پر اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا باپ راضی نہیں ہوتا تھا۔ یہی جھگڑا اس کے گھر سے نکلنے کا سبب بنا۔ ڈھائی سال بعد جب یہ دوبارہ ملا تو ماں باپ نے جہاں خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا وہیں فوراً اس کی ضد بھی مان لی۔ باپ اس کی پسند کی شادی پر راضی ہو گیا..... لیکن پھر نجانے کیا بات ہوئی کہ جمال نے وہاں شادی کرنے سے انکار کر دیا اور موجودہ بیوی سے شادی کر لی.....''

میں حیرت سے گنگ یہ باتیں سن رہا تھا۔ میری آنکھیں جمال پر لگی تھیں جو مہمانوں کے درمیان خوش خوش گھوم رہا تھا..... میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ''کہیں ڈاکٹر اشوک نے اپنی فیس اور میں نے اپنے احسانوں کا بدلہ زیادہ تو نہیں لے لیا۔'' آج بھی کبھی یہ سوال مجھے پریشان کر دیتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ میں نے جمال کو کھیت سے اُٹھا کر بڑا کام کیا تھا یا اس نے لاڈو سے شادی کر کے؟؟

.....❁.....❁.....

انسپکٹر نواز خان

دولت



انسپکٹر نواز خان

دولت

اس نے اپنے خیال میں اچھا سودا کیا تھا، لیکن اسے
پتہ نہیں تھا کہ یہ اسے بہت مہنگا پڑے گا۔

دولت انسانوں کا دماغ خراب کرتے دیر نہیں لگاتی۔ اگر یہ دولت کسی ایسے آدمی کے پاس ہو جس کا دماغ پہلے ہی خراب ہو تو پھر فساد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے بہت سے ایسے کیس دیکھے ہیں جن میں انسانی دماغ کی اس خرابی اور دولت نے بہت سے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو دولت ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت نہیں کرتے۔ میں جو واقعہ آپ کو سنانے لگا ہوں اس میں بھی میں نے ایسی چیز ایک بار پھر دیکھی کہ دولت اور دماغ کی خرابی کیا گل کھلاتی ہے۔

ان دنوں میں جہاں تعینات تھا وہاں علاقے میں ذیل داروں کے دو تین گھر تھے۔ آبادی کے اردگرد کافی دور تک ان گھروں کی زمینیں تھیں۔ یہ ذیل دار آپس میں رشتہ دار تھے اور اس طرح اس علاقے میں ایک ہی خاندان بہت اثر و رسوخ والا اور طاقتور خاندان تھا۔ ان کے پاس پیسہ بھی تھا۔ مرد بھی کافی تھے۔ زمین بھی کافی تھی۔ ان گھروں میں سے ایک گھر کے آدمی کا دماغ خراب ہونا شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں یہ جب نوعمر تھا تو ماں باپ نے ضرورت سے زیادہ لاڈ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی گاؤں کے کسی آدمی کے جانور زخمی کر دیتا۔ کبھی کسی مزارع کا سر پھاڑ دیتا اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ انہی حرکتوں کے ساتھ وہ جوان ہو گیا۔ اب اس کے گرد آوارہ گرد اور اوباش لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اب وہ باقاعدہ بدمعاش بن گیا۔ ڈیرے پر اسلحہ بھی رکھ لیا اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے کیسوں میں ہوتا ہے وہ اپنے کسی جرم کی وجہ سے جیل کی ہوا

کھا آیا۔ جیل جا کر بدمعاشوں میں جو کمی ہوتی ہے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے اور وہ وہاں سے استاد بن کر نکلتے ہیں۔ جیل سے فارغ ہوا تو جسونت بھی استاد بن چکا تھا۔

اب اس کے حالی موالی اور چمچے اسے ذیل داروں کی نسبت سے نہیں بلکہ استاد کہہ کر بلاتے تھے اور اس نام سے میں بھی اسے جاننے لگا۔ میں جب اس علاقے میں آیا تو میرے محرر نے بدمعاشوں کا تعارف کرانا شروع کیا اور جو کہانی میں نے آپ کو سنائی ہے وہ مجھے محرر نے ہی بتائی تھی۔ مجھے بڑا شوق ہوا کہ اس جوان کو دیکھوں جس نے بچپن سے ہی بدمعاشی کا باقاعدہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

میں نے محرر سے کہا کہ کسی دن استاد جسونت کو میرے پاس لانا۔ ایک دن وہ اسے لے آیا۔ جسونت چہرے مہرے سے بھی بدمعاش ہی لگتا تھا۔ بچپن کی لڑائیوں کے نشان اس کے چہرے پر تھے۔ چھ فٹ کے قریب قد خوب گٹھا ہوا جسم۔ اس کا ڈیل ڈول کسی ہندو کی بجائے مسلمان کا نظر آتا تھا ورنہ زیادہ تر ہندو مریل سے ہوتے تھے۔ میں اسے باتوں باتوں میں استاد کہتا تو وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔ وہ تھا تو بدمعاش لیکن اس نے ابھی تک مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے میں نے اسے صرف یہ تنبیہ کی کہ وہ میرے علاقے میں نہ میرے لیے اور نہ اپنے لیے مشکل پیدا کرے۔

وہ چلا گیا اور میں سوچتا رہ گیا۔ اتنا خوبصورت جوان آدمی ہے لیکن کس غلط کام میں لگا ہوا ہے۔ لیکن دولت کچھ نہ کچھ تو خرابی ضرور کرتی ہے۔ اس آدمی کے خاندان کے پاس روپے کی ریل پیل تھی۔ خود اس کا باپ اچھی خاصی زمین کا مالک تھا اور یہ جسونت اور ایک لڑکی اس کی اولاد تھے۔ اس کے پاس روپیہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اب وہ اس طرح کچہریوں میں ضائع ہوتا تھا۔ خیر استاد جسونت کا نام میرے ذہن سے نکلتا چلا گیا۔

ایک دن محرر نے مجھے آ کر بتایا کہ ذیل داروں کے خاندان کا ایک آدمی جو ان کا نوکر ہے ایک قتل کی اطلاع دینے آیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے لاؤ۔ میں نے اس آدمی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے میرے سامنے آ کر خالص ہندوانہ انداز میں پرنام کیا۔ اپنا نام پریتم بتایا اور کہنے لگا کہ اس کے مالک ذیل دار تپار و سنگھ کے بیٹے جسونت کا قتل ہو گیا ہے اور وہ مجھے لینے آیا ہے۔ جسونت کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں نے اسے کہا، جسونت استاد؟ اس آدمی نے اقرار میں سر ہلا دیا اور میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

وہ خوبصورت جوان جسونت استاد آخر اس راہ پر چلتا ہوا مارا گیا جس پر چل کر کسی نے آرام سکون نہیں پایا۔

میں نے تھانے سے دو تین آدمی ساتھ لیے اور پریتم کو چلنے کا اشارہ کیا۔ تھانے سے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ پریتم نے ہمیں اس میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پریتم ہمیں لے کر اس قصبے میں ایک بڑے سے گھر کے سامنے رُک گیا۔ ہم اُتر کر اندر جانے لگے تو اس نے اشارے سے ہمیں روک دیا اور خود تیزی سے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک بارعب سکھ باہر آ گیا۔ اس نے تانگے کے پاس آ کر پرنام کیا اور اوپر چڑھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میرا نام تپار و سنگھ ہے جی! میرے نوکر پریتم نے بتایا ہو گا کہ میرے لڑکے جسونت کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ بڑے صبر کرنے والے آدمی کی طرح اس کا رویہ تھا۔ پریتم بھی تانگے

میں بیٹھ چکا تھا اور تانگہ پھر چل پڑا۔ میں نے تپارو سے پوچھا یہ وقوعہ کس جگہ ہوا ہے؟

ہماری زمین پر۔ وہیں جسونت نے ڈیرہ بنا رکھا ہے۔ وہ اس گھر میں نہیں رہتا (اس نے اپنے پیچھے اس مکان کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ہم چلے تھے) آج صبح میں نے پریتم کو گھر سے پراٹھے اور حلوہ بنوا کر جسونت کے ڈیرے پر لے جانے کے لیے کہا تھا۔ اس کو روانہ کر کے میں کاموں میں لگ گیا۔ کچھ کام گھر سے باہر تھے لیکن میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں گھر پر ہی تھا کہ پریتم واپس آ گیا لیکن روتا پیٹتا۔ اس نے بتایا کہ کسی نے جسونت کو قتل کر دیا ہے۔ جسونت کی ماں اور میں فوراً وہاں پہنچے۔ جسونت کی ماں ابھی تک وہیں ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا میں پریتم کو لے کر اس گھر واپس آیا اور اسے آپ کی طرف بھیج دیا۔ باقی آپ چل کر دیکھ لیں۔

وہ جس انداز سے باتیں کر رہا تھا اس سے وہ مجھے بڑے حوصلے والا معلوم ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ جب میں تفتیش شروع کروں گا یہ آدمی بڑے کام کا ثابت ہوگا۔ کیونکہ ایسے اعتماد والے لوگ ہر چیز پر نظر رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں بڑے یقین سے کہتے ہیں۔

جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ذیل دار کے قتل کا سن کر بھی لوگ جمع ہو گئے ہوں گے۔ ہم تانگے سے اُترے۔ پریتم ہمارے آگے آگے تھا۔ تپارو دھریک سے نیچے بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس سے صحیح طرح چلا نہیں جا رہا تھا۔ پریتم ہمیں (مجھے اور سپاہیوں کو) ایک کمرے کی طرف لے جانے لگا۔ ہم اس میں داخل ہوئے تو اندر چند عورتیں بین کر کے رو رہی تھیں ان میں سے ایک عورت خاصی عمر کی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید جسونت کی ماں ہوگی۔

جسونت کی لاش چارپائی پر پڑی تھی جس پر ایک خاکی رنگ کا کھیس بچھا ہوا تھا لیکن اکٹھا ہو چکا تھا۔ جیسے اس پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے کشتی کرتے رہے ہوں۔ جسونت کے کپڑے اس کے اپنے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک خون تھا۔ اس طرح کا قتل ایک ہی طریقے سے ہوتا ہے یعنی ٹوکے سے یا کلہاڑی سے۔ میں نے قریب ہو کر لاش کا معائنہ کیا اور میرے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ جسونت کو ٹوکے یا کلہاڑی کے واروں سے قتل کیا گیا تھا۔ قاتل شاید ایک سے زیادہ تھے کیونکہ ایسے شواہد بھی مل رہے تھے کہ قتل کے بعد لاش کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈالا گیا ہو بلکہ لگتا یہ تھا کہ جسونت جیسے چارپائی پر لیٹے لیٹے قتل ہو گیا ہے۔ وہ جوان آدمی تھا اور مرتے ہوئے تو مریل آدمی بھی مزاحمت کرتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مارنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ انہوں نے جسونت کو لیٹے لیٹے ہی قابو کر لیا۔ جسونت مرتے ہوئے تڑپا ہوگا اس لیے اس کے نیچے کھیس اکٹھا ہوا تھا۔

میں نے پریتم سے کہا کہ تپارو کو میرے پاس لاؤ۔ وہ اسے لینے باہر چلا گیا۔ میں نے لاش پر چادر ڈلوا دی۔ تپارو آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں لاش ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دوں۔ اس نے میری بات سن کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ مرنے والا تو مر گیا۔ چیر پھاڑ کر وہی معلوم ہوگا کہ یہ قتل ہوا ہے؟ یہ تو کسی کو بھی نظر آ رہا ہے کہ اسے ٹوکے مارے گئے ہیں۔ تھانیدار صاحب یہ کام رہنے ہی دو تم یہ تلاش کرو کہ

یہ کام کیا کس نے ہے؟

تپارو پوسٹ مارٹم پر رضامند نہیں تھا۔ میں سپاہیوں کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا اور ہم ڈیرے پر بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ عورتیں پھر کمرے میں رونے دھونے لگ گئیں۔ میں نے تپارو سے افسوس کیا۔ اس کے ساتھ قانونی کارروائی کی بات کی اور کہا کہ جب تم آخری رسوم سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں تمہارے پاس آؤں گا۔ میں نے وہاں نقشہ وغیرہ بنایا اور تھانے آ کر کاغذات مکمل کیے۔

پریتم ہمارے ساتھ اپنی طرف سے رپورٹ درج کروانے آ گیا تھا۔ اسے فارغ کر دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ یہ کام کیسے ہو گا؟ میں نے مخبر کو بلایا۔ یہ درمیانی عمر کا آدمی تھا بہت سیانا تھا اور تجربہ کار۔ ستیش اس کا نام تھا۔ ایسے تجربہ کار لوگ تھانے داروں کے بہت کام آتے ہیں۔ ستیش بھی میرے ساتھ سر کھپاتا رہا پھر کہنے لگا کہ میں کوئی مخبر لاتا ہوں۔ اس طرح کی وارداتوں میں کئی چیزیں سامنے ہوتی ہیں۔ عورت، دولت، زمین، دشمنی اور جسونت جیسے بدمعاش کے معاملے میں ان میں سے کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بعض چیزوں کے معاملے میں پریتم سے زیادہ اچھا مخبر کون ہوتا؟ میں نے محرر سے کہا کہ وہ پریتم کو جا کر لے آئے۔ کافی دیر بعد وہ آیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ جسونت کی آخری رسوم ادا کر کے تم میرے پاس آ جانا۔ محرر تھانے سے چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا کہ وہ مخبر لے کر آئے گا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ محرر بہت سیانا آدمی تھا۔ وہ ذیل داروں کا ہی ایک آدمی پکڑ لایا۔ یہ آدمی اس امیر خاندان کا فرد ہونے کے باوجود غریب تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ اچھے اچھے گھرانوں میں بھی ایک آدھ آدمی ایسا ہوتا ہے جس کی حالت کمزور ہوتی ہے۔ یہ آدمی شنکر بھی مالی لحاظ سے کمزور تھا۔ چونکہ اس کا ہر گھر میں آنا جانا تھا اور رشتہ داری بھی تھی اس لیے وہ گھر کا بھیدی تھا۔ پولیس کے لیے اس طرح مخبری نہیں کرتا تھا جس طرح دوسرے مخبر کرتے ہیں لیکن پولیس کے کام آ جاتا تھا۔ اس میں جاگیردارانہ اکڑ والی بات نہیں تھی۔

میں اسے تھانے سے گھر لے گیا تاکہ ذرا دوستانہ ماحول میں وہ کھل کر بات کرے۔ میں نے اس سے صرف تپارو کے گھر کے حالات معلوم کرنے پر ہی زور نہ دیا تھا بلکہ جسونت کی یاری دوستیاں، دشمنیاں، لین دین وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھتا رہا۔ وہ جب جسونت کے بارے میں شروع ہو گیا تو میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اسی کی زبانی جسونت کے حالات سنتا رہا۔

تھانے دار صاحب اس علاقے میں ہم ذیل داروں کی زمین بہت جگہ ہے۔ ہمارے لڑکے اس وجہ سے بھوتر جاتے ہیں۔ یہ جسونت جسے ہم جسا کہتے تھے شروع سے ہی اکھڑ مزاج آدمی تھا۔ داڑھی مونچھ پھوٹی تو برے کاموں میں پڑ گیا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بس کھانا پینا اور آوارگی کرنا ہی اس کا کام تھا۔ انہی کاموں میں ایک بار جیل بھی ہو گئی۔ تپارو کی یاریاں دوستیاں بھی اس کے لڑکے کو جیل جانے سے بچا نہ سکیں۔ جب ایک بار جیل ہو کر آیا تو وہاں اس نے جو سنگی بیلی بنائے تھے وہ بھی یہاں ہمارے گاؤں میں جسے کے ڈیرے پر آنے لگے اور اس کی دہشت زیادہ ہو گئی۔ جسا جیل سے پکا مجرم بن کر نکلا تھا۔ اپنے گھر یعنی باپ کے گھر کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔ اپنے ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ میں بھی کئی بار اس کے ڈیرے پر گیا ہوں۔

میری اس کے ساتھ رشتہ داری تھی۔ اس لیے

وہ میرے آنے پر اعتراض نہیں کرتا تھا ورنہ ہر کوئی اس کے ڈیرے کی طرف جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ میں نے جب بھی وہاں کوئی آدمی دیکھا ہے وہ شکل صورت سے ہی بدمعاش نظر آتا تھا اور اس علاقے کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ادھر ادھر سے جرائم پیشہ یا بدمعاش لوگ اس ڈیرے پر یاری دوستی کے لیے یا پھر چھپنے چھپانے کے لیے آتے تھے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جسونت کی بدمعاشوں سے یاری دوستی تھیں۔

بہرحال جو بھی ہو جسونت کی اپنی بیوی سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ اس کی بیوی اس کی ماں کی بہن کی بیٹی تھی اس لیے وہ گھر سے جا بھی نہیں سکتی تھی بلکہ اپنی خالہ کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ جسونت کا اپنی بیوی سے کیا جھگڑا تھا میں نے اس بارے میں چاچی (جسونت کی ماں) سے کھوج کی تھی۔ چاچی کہتی ہے جسو دولت کا پجاری بن چکا ہے اور اپنی بیوی نیتو سے جس کا باپ زمیندار ہی ہے اچھی کمائی کرتا ہے ہر وقت یہی کہتا ہے کہ جاؤ اپنے باپ سے پیسے لے کر آؤ حالانکہ جسونت کا باپ تپارو اچھا خاصا امیر آدمی ہے۔ ان کے گھر دولت بھری ہوئی ہے اور جسونت ہی اس ساری جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے باوجود وہ ایسی نیچ حرکت کرتا تھا کہ اپنی بیوی کو تنگ کرتا کہ جاؤ باپ سے پیسے لے کر آؤ۔ چاچی کا تو یہ خیال تھا لیکن میرا نہیں خیال کہ اصل بات یہی ہوگی۔ اگر جسونت کی نیتو جیسی خوبصورت بیوی سے لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ چاچی بھی مجھ سے چھپا رہی ہو۔ خیر بات کر رہا تھا جسو کی حرکتوں کی۔ وہ ڈیرے پر چارپائی پر پڑا رہتا تھا یا بندوق لے کر شکار کو نکل جاتا تھا۔ روٹی پانی کے لیے ڈیرے پر بھی انتظام تھا اور پریتم گھر سے روٹی لے کر آتا تھا۔ میں وہاں ڈیرے پر رہ کر دیکھ چکا ہوں۔ روپے پیسے کی جسو کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ رہی کسی سے دشمنی کی بات تو ہوسکتا ہے کہ دشمنی رہی ہو اور پھر نیتو کے بھائی بھی بہت اکھڑے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ بہن کے ساتھ زیادتی پر قابو سے باہر ہو گئے ہوں اور انہوں نے جسونت کو پار کر دیا ہو۔

شنکر نے جسونت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ تقریباً میں اس کے بتانے سے پہلے ہی جانتا تھا۔ صرف اس نے نئی بات یہ بتائی تھی کہ جسونت کا اپنی بیوی سے جھگڑا رہتا تھا اور ہوسکتا ہے کہ اس کی بیوی نے اپنے بھائیوں دلبیر اور شمیر سے اس کا ذکر کیا ہو جنہوں نے اشتعال میں آکر اسے ختم کر دیا ہو۔

مجھے اب نیتو سے ملنا ضروری تھا۔ یہی سوچ کر میں تپارو کے گھر چلا گیا۔ وہ لوگ اب جسونت کی آخری رسوم سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تپارو کے ساتھ میں اس کے بیٹے کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے کہا کہ ایک بیوی سے زیادہ اپنے خاوند کے بارے میں کون جان سکتا ہے؟ اس لیے میں نیتو سے ملنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اکیلے شاید وہ تمہارے سامنے زبان نہ کھولے۔ تپارو سیانا آدمی تھا وہ سمجھ گیا اور اس نے نیتو کو بلا کر میرے پاس بٹھایا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس عورت کی اپنے خاوند سے لڑائی رہتی تھی اور میں اسی بات کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی۔

نیتو مرنے والا تو چلا گیا لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے تمہیں دکھی ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتا دو۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ جس کے بارے میں اس نے اپنے باپ کو بھی نہ بتایا ہو؟

نیتو میرا سوال سن کر کافی دیر خاموش رہی پھر

کہنے لگی کہ مرنے والے کے ساتھ اس کے دوہرے رشتے تھے اس لیے وہ اس کی زیادتیاں بھی برداشت کر لیتی تھی۔ دشمنی کے بارے میں اس نے کبھی بتایا نہیں اور نہ ہی وہ میرے پاس زیادہ دیر رہتا تھا۔ اس لیے میں کچھ نہیں جانتی۔ نیتو کے ساتھ کافی دیر کی باتوں کے باوجود مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اسے اندر جانے کا کہہ دیا اور تپارو کے آنے پر اسے بتایا کہ اس کی بہو کو کچھ بھی علم نہیں یا وہ بتانا نہیں چاہتی۔ تپارو کہنے لگا کہ وہ خود اپنی بہو سے معلوم کرے گا اور اگر کوئی کام کی بات ہوئی تو مجھے بتا دے گا۔ پریتم بھی گھر میں ہی تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تم میرے پاس تھانے آ جاؤ لیکن تپارو یا نیتو کو بتائے بغیر۔

پریتم کے ساتھ گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے صحیح آدمی پر نظر رکھی ہے۔ پریتم سے پہلے شنکر نے مجھے بڑے کام کی بات بتائی تھی اور دوسرا کام کا آدمی پریتم نکلا۔ گھر کا یہ نوکر گھر کے ہر راز سے واقف تھا۔ میں نے اس کے ساتھ یہی بات چھیڑی تھی کہ نیتو کا جسونت کے ساتھ کیا جھگڑا تھا۔ دولت یا کوئی اور بات۔ پریتم کا کہنا تھا کہ دولت کوئی بڑی بات نہیں جسونت کے باپ کے پاس بہت روپیہ ہے جس کا وہ واحد وارث تھا۔ اس کے اپنے پاس بہت پیسے تھے۔ کہاں سے آتے تھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کے ڈیرے پر میں نے خود کئی بار ڈھیر سارے پیسے چارپائی پر پڑے دیکھے تھے۔ بات یہ نہیں کہ وہ اپنے سسر سے پیسے لانے کی خاطر بیوی سے لڑتا تھا۔ نیتو کو اصل شکایت یہ تھی کہ وہ گھر کیوں نہیں رہتا۔ ڈیرے پر کیا رکھا ہے؟

ڈیرے پر کیا تھا جسے چھوڑ کر جسونت گھر نہیں جاتا تھا۔ اس بارے میں پریتم جانتا بھی تھا لیکن فی الحال مجھے نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے پریتم اور شنکر کے بعد نیتو کے دونوں بھائیوں دلمیر اور شمیر سے بات کی۔ دونوں کو کوئی علم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے خاص طور پر اس طرح پوچھ گچھ کی کہ کہیں انہوں نے تو جسونت کو ٹھکانے نہیں لگایا لیکن وہ دونوں تو سرے سے اس بات سے ہی ناواقف تھے کہ ان کی بہن اور بہنوئی کے درمیان کوئی جھگڑا ہے بھی یا نہیں۔ اب یا تو پریتم ہی اصل بات بتاتا یا شنکر کوئی ٹوہ لیتا۔ نیتو خود بڑی پکی تھی۔ اگر اسے کچھ معلوم تھا تو وہ زبان بند کر چکی تھی یا اسے پتہ ہی نہیں تھا۔ بہرحال میں نے پریتم کے ساتھ پھر سر کھپانا ضروری خیال کیا اور جسونت کے سالوں سے بات کر کے جب تھانے واپس گیا تو کچھ دیر آرام کر کے میں نے پریتم کو بلوا لیا۔ اپنے سامنے بٹھا کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ آ گیا۔ اس ہندو کی شکل ہی مجھے مکار لگنے لگی۔

''پریتم! میں تم سے بڑی رعایت کر رہا ہوں۔ تم مجھے وہ باتیں سناتے ہو جو سارے لوگ جانتے نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جسونت اور نیتو کے جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی۔ تم بھی اسی گھر میں رہتے ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم نے کوئی بات نہ سنی ہو۔ رات گئے تک سر کھپانے کے باوجود پریتم نے کوئی خاص بات نہ بتائی۔ مجھے پتہ نہیں کیوں یہ شک ہونے لگا کہ یہ خود بھی اس قتل میں ملوث ہو سکتا ہے۔ فی الحال میرے پاس میرے شک کی کوئی خاص گواہی نہیں تھی۔ صرف میرا دل کہتا تھا اور میرا احساس کبھی غلط نہیں ہوتا۔ پریتم سے مایوس ہو کر میں نے پھر شنکر سے رابطہ کیا اور اسے اپنے گھر بلایا۔ میں گھر میں اکیلا تھا اور ہم تقریباً ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ اب شنکر اور کھل چکا تھا۔ خان صاحب جس دن سے جسونت قتل ہوا ہے یقین جانوں میں اس کھوج میں رہا ہوں کہ اسے مارا کس

نے؟ چونکہ رشتہ داری ہے اس لیے ان کے (تپارو) کے گھر بے دھڑک جاتا ہوں۔ برسوں میں گیا تو چاچی (جسونت کی ماں) اور نیتو اکٹھی بیٹھی تھیں اور کسی عورت کو کوس رہی تھیں جس کا نام وہ نندہ لے رہی تھیں۔ اس عورت یا لڑکی نندہ کا نام سن کر میں وہاں ٹک گیا۔ اس نام پر چونکنے کی میری وجہ یہ تھی کہ میں جس نندہ نام کی لڑکی کو جانتا ہوں وہ ہمارے ہی خاندان کی ایک لڑکی ہے اور تپارو کے شریکے برادری کی ہے۔ اس کا باپ اور اس کے بھائی بہت ہی اتھرے ہیں۔ ان کی ایک ہی بہن ہے اور وہ ہے بہت شکل صورت والی۔ چاچی اور نیتو نندہ کو اس لیے کوس رہی تھیں کہ ان کے کہنے کے مطابق جسونت اب نندہ کا کھلے عام نام بھی لینے لگا تھا اور انہیں کسی نے بتایا تھا کہ نندہ ڈیرے پر بھی دیکھی گئی ہے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ نندہ کے بھائیوں باپ میں سے کسی نے اسے جسونت کے ڈیرے پر جاتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ انہوں نے اپنی دھی بہن کو کچھ نہیں کہا لیکن جسونت کو پار کر دیا۔

شنکر کا یہ کہنا میرے لیے ایک نئی راہ ثابت ہوا کیونکہ اس کی بات میرے بھی دل کو لگی۔ جسونت کی ماں اور اس کی بیوی اگر کسی لڑکی کو کوستی ہیں اور اس کا تعلق جسونت سے جوڑتی ہیں تو پھر ضرور کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی اور جیسا کہ شنکر کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کے باپ بھائی اتھرے آدمی ہیں تو ایسی صورت میں قتل ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی اور ماجھے کے علاقے میں سکھوں کے خاندانوں میں تو یہ بہت معمولی بات تھی۔ شنکر نے جو بات سنی تھی وہ تو اُڑتی اُڑتی ہی ہوگی کیونکہ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک دن اچانک تپارو کے گھر گیا تو چاچی اور نیتو باتیں کر رہی تھیں۔ اس لیے پوری بات کا علم اگر ہوگا تو پریتم کو کیونکہ نوکر چلتے پھرتے باتیں سنتے بھی ہیں اور گھر کے مالک انہیں وفادار سمجھ کر ان سے دل کی بات بھی کر لیتے ہیں۔ شنکر کی بات سن کر میں نے اسے فارغ کر دیا اور کہا کہ وہ یہی بات زیادہ تفصیل سے معلوم کر کے آئے۔ میں نے دوسرے دن ہی پریتم کو قابو کر لیا۔ میں نے اسے کہا کہ اتنے دن ہو گئے ہیں تم نے ابھی تک کام کی بات نہیں کی مجھے چکر نہ دو اور جو کچھ تمہیں پتا ہے بتا دو۔ پھر وقت ضائع کرو گے تو مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

پریتم ضرورت سے زیادہ ہی ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں اُلجھانے لگ گیا۔ میں نے مجبوراً نندہ کا نام لیا۔ پریتم کو ایسے لگا جیسے اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ اس کی یہ حالت بہت تھوڑی دیر رہی اور وہ سنبھل گیا لیکن اس کی حالت میں تبدیلی میں نے نوٹ کر لی تھی۔ میں نے اب اسے ایک اور جھٹکا دیا۔

پریتم! تم نوکروں میں ایک خرابی یہی ہوتی ہے کہ تم بات کو سمجھنے میں بہت دیر کر دیتے ہو۔ اتنے دن تم نے نندہ کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ گھر میں تمہاری مالکن اور نیتو دونوں ہی اسے کوسنے دیتی ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا ہے لیکن تم نے انہیں کوستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ نندہ تپارو کے شریکے برادری کی لڑکی ہے اور اس کا باپ اور بھائی بہت اتھرے ہیں۔ انہوں نے نندہ کو جسونت کے ڈیرے پر جاتے دیکھ کر جسو کو اس دنیا سے ہی بھیج دیا۔

میری اتنی لمبی بات کے شروع میں پریتم کے چہرے پر جو رنگ آ کر گزر گیا تھا اب اس کا نشان بھی باقی نہیں تھا بلکہ اب اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا تھا۔ مجھے اس کی تبدیلی پر بڑی حیرانگی ہو رہی تھی لیکن اس وقت مجھے اس تبدیلی کی سمجھ نہیں آئی

تھی۔ بعد میں جا کر اس کا پتہ چلا۔

پریتم میری بات سن کر صاف مکر گیا کہ اسے کسی چیز کا پتہ نہیں۔ اس نے کبھی مالکن یا نیتو کے منہ سے نندہ والی کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی اسے یہ پتہ ہے کہ تپارو کی کون سی شریکے برادری میں نندہ نامی لڑکی ہے جو جسونت کے ڈیرے پر جاتی رہی ہے۔ وہ کہنے لگا: ''سرکار! مجھے ان باتوں کا پتہ نہیں جو آپ کر رہے ہیں لیکن میں معلوم کروں گا۔'' پریتم کے اس جواب نے اسے میرے نظروں میں مشتبہ نمبر ایک بنا دیا۔ یا تو یہ نوکر قتل میں ملوث تھا یا شنکر مجھے چکر دے رہا تھا لیکن دل شنکر کی طرف سے مطمئن تھا۔ مجھے بار بار شک اسی پریتم پر ہوتا تھا لیکن ابھی وقت نہیں تھا کہ اسے حوالات میں ڈال دیتا اور پھر اس کا باپ بھی مجھ سے جھوٹ نہ بولتا۔

میں ایک بار پھر تپارو کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ تمہاری شریکے برادری میں نندہ نام کی کسی لڑکی کے جسو سے تعلقات تھے؟ وہ کہنے لگا کہ اسے پتہ نہیں لیکن اگر تھے تو ایسی باتیں عورتوں کو زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ آپ میری بیوی یا بہو سے پوچھ لیں۔

نیتو اس سے پہلے میرے ساتھ بے کار باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجھے اس سے کوئی خاص بات معلوم ہونے کی کم ہی امید تھی۔ اس لیے میں نے تپارو سے کہا کہ میں اس کی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ چونکہ ماں تھی اور اس کا بیٹا قتل ہوا تھا اس لیے اگر اسے کچھ معلوم تھا تو وہ فوراً اُگل دیتی۔

تپارو نے اپنی بیوی کو بلا لیا اور میں نے اس سے اظہار ہمدردی کے بعد پوچھا کہ اس کو اپنے بیٹے کے بارے میں کیا کیا معلوم ہے۔ بیٹوں کو اگر کوئی مسئلہ ہو تو وہ ماں سے ذکر ضرور کرتے ہیں یا بیوی کے ساتھ جھگڑا ان کی ماں کے علم میں آ جاتا ہے۔ تپارو کی بیوی کہنے لگی کہ اس کی بہو کے ساتھ دوہری رشتہ داری ہے۔ وہ بہت اچھی ہے صرف جسو میں خرابی تھی اور وہ اس حرام کی جنی کے عشق میں پھنس گیا تھا۔

''نندہ'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

میرے منہ سے نندہ کا نام سنتے ہی وہ ٹھٹھک کر میری طرف دیکھنے لگی اور تپارو بھی منہ کھولے کبھی میری طرف دیکھتا کبھی اپنی بیوی کی طرف۔ شاید اسے پہلی بار علم ہوا تھا کہ جسونت کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں نے تپارو کی بیوی سے کہا کہ وہ بات کرتی رہے۔

''ہاں نندہ ہی اس لڑکی کا نام ہے۔ ہمیں نام اس لیے معلوم ہوا ہے کہ جسو اب اُٹھتے بیٹھتے اس کا نام لینے لگا تھا اور نیتو کے ساتھ اس لڑکی کی وجہ سے ہی جھگڑا رہنے لگا تھا۔''

''یہ نندہ تمہارے شریکے برادری والی لڑکی ہے ناں!''

''اس کا مجھے پتہ نہیں۔ صرف نام جانتی ہوں۔''

''تم نے کبھی جسو سے پوچھا تھا کہ یہ نندہ کون ہے؟''

جسو کی ماں چپ ہو گئی پھر بولی۔

''میں نے تو جسو سے نہیں پوچھا کہ یہ نندہ کون ہے۔ ہمارے شریکے برادری والی یا کوئی دوسری لیکن وہ جو ہماری رشتے دار نندہ ہے وہ تو شکل صورت کی واجبی سی ہے اور مجھے نہیں یقین کہ اس نے (جسو نے) کبھی اس کے ساتھ شادی کا سوچا بھی ہو۔ ویسے بھی اس کے باپ بھائی اچھی فطرت والے نہیں اور ہم انہیں پسند نہیں کرتے۔ میں نے اپنی بہو سے ایک بار پوچھا تھا کہ یہ وہی نندہ تو

نہیں؟ لیکن اس کا بھی وہی خیال تھا جو میرا خیال تھا یہ نندہ وہ نہیں بلکہ مہیشوری کی بیٹی ہے جو ہمارے اس گاؤں میں رہتے ہیں جہاں ہماری زیادہ زمین ہے اور وہیں جسو نے ڈیرہ بنایا ہوا ہے۔

''یہ مہیشوری کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''مہیشوری کا گھر والا فوج میں صوبے دار تھا۔ وہ کسی چھاؤنی میں مر گیا۔ یہ ودھوا ہو گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی بجائے سسرال میں ہی رہی۔ اس کے ساس سسر بھی دنیا سے چلے گئے۔ ان کی جو زمین گھر تھا وہ اسی کے حصے میں آیا کیونکہ صوبے دار کا نہ بھائی تھا نہ بہن۔ مہیشوری کی ایک ہی بچی تھی وہ اب جوان ہو چکی ہے۔ اسی کا نندہ نام ہے۔''

میں نے جسو کی ماں سے پوچھا کیا واقعی انہیں یقین ہو گیا ہے کہ جسو کے نندہ سے تعلقات تھے۔

''اس کا تو پتہ نہیں لیکن وہ میری نیتو پر سوکن لانے کی باتیں بہت کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اسے گالیاں دی تھیں کہ میری بہو میں کیا خرابی ہے لیکن پتہ نہیں اس لڑکی نے اس پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ جسو سارے رشتے ختم کرنے پر تل گیا تھا۔''

میں نے دل میں سوچا کہ ان عورتوں کو جتنا معلوم تھا وہ میں جان چکا ہوں۔ اب یہ کھوج شنکر لگائے گا کہ نندہ والا پورا چکر کیا تھا۔

میں یہی سوچ کر تپارو کے گھر سے تھانے آیا اور شنکر کو بلوا لیا۔ میں نے اسے بلانے کے لیے آدمی بھیجا لیکن وہ آدمی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد خود ہی آ گیا۔ کہنے لگا۔

''میں تھانے کے دو تین چکر مار چکا ہوں۔ آپ پتہ نہیں کہاں تھے۔ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں تپارو کے گھر اس کی بیوی سے بات کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ کرو لیکن جو نندہ تم سمجھ رہے ہو وہ جسونت والی نندہ نہیں! میری بات سے شنکر بہت حیران ہوا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وہ ہماری برادری والی نندہ نہیں جس کے ساتھ جسو کے تعلقات تھے تو پھر کون سی نندہ ہے یہ؟''

''یہی جاننا تمہارا کام ہے۔'' میں نے اس کا امتحان لینا شروع کر دیا اور وہ سوچنے لگ گیا۔

''شنکر جو بات تم نے معلوم کرنا تھی وہ نہیں کر سکے۔ وہ میں نے معلوم کر لی ہے۔ یہ نندہ صوبے دار کی بیٹی ہے۔ مہیشوری کی بیٹی۔ سمجھ گئے؟'' مہیشوری کی بیٹی کا نام سن کر شنکر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے دور کسی چیز کو دیکھنے لگیں۔

''لعنت میری یادداشت پر۔ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔ یہ نندہ تو میں نے ایک بار جسو کے ڈیرے کے قریب دیکھی تھی۔ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ڈیرے پر گئی تھی یا ادھر سے گزر رہی تھی۔ آپ کو کس نے یہ بات بتائی ہے؟''

''چلو اب تم جان تو گئے ہو کہ یہ نندہ کون سی ہے تو جاؤ جا کر اس کی پوری کھوج لاؤ۔ کیا خیال ہے ایک دو دن میں آ جاؤ گے؟'' شنکر نے سر ہلایا اور وہ اس قدر حیران تھا کہ مجھ سے مزید بات کیے بغیر چلا گیا۔

شنکر واقعی کھوج لگا لایا تھا اور اس بار میری توقع سے بڑھ کر اس نے کھوج لگائی تھی۔ میرے بھیجنے کے تیسرے دن وہ واپس مجھے تھانے نہیں بلکہ اپنے گھر آ کر ملا۔ جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''خان صاحب آپ نے ٹھیک کہا تھا یہ وہی مہیشوری والی نندہ ہے لیکن اس کی تو شادی ہو چکی ہے۔ وہ یہاں سے دو تین گاؤں آگے ایک گھر میں بیاہی گئی ہے۔ یہ صوبے دار کے دور پار کے

رشتہ دار ہیں۔''

''کب بیاہی گئی ہے؟ جسو کے ساتھ تعلقات سے پہلے یا بعد میں؟'' میرے سوال کے جواب میں شنکر نے بتایا کہ جب جسو قتل ہوا ہے اس سے ایک آدھ دن پہلے کی بات ہے۔ ''خان صاحب اس بات کو چھوڑیں جو بات میں معلوم کر کے آیا ہوں وہ بڑی زبردست ہے۔ میں نے گاؤں کی ایک عورت سے معلوم کیا ہے۔ اس عورت کے بارے میں آپ نہ ہی پوچھیں۔ ایسی عورتیں ہر گاؤں میں ہوتی ہیں جو آج میرے ساتھ کل دوسرے کے ساتھ۔ ایک ایسی ہی عورت ہے وہ جس کو میں نے کھوج کے کام پر لگایا۔ وہ بہت کچھ جانتی تھی اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ جسو نندہ کا رشتہ چاہتا تھا اور اس نے نندہ کی ماں مہیشوری سے بات کی۔ اس دوران اس نے نندہ سے تعلق بھی بنا لیا۔ وہ اس کے ڈیرے پر بھی آنے لگی لیکن مہیشوری خواہ غریب عورت تھی لیکن وہ جسو کو اس کی دولت کے باوجود اچھا آدمی خیال نہیں کرتی تھی۔ اس نے جسو کو صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے نندہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، کل کو اسے کوئی اور عورت پھر پسند آ گئی تو وہ نندہ کو چھوڑ کر اس سے بیاہ کر لے گا۔ اس لیے وہ اسے رشتہ نہیں دے سکتی۔ اس انکار پر جسو کو آگ لگ گئی کہ ایک نچلے گھرانے کی عورت نے اسے جواب دے دیا ہے۔ اس نے شاید نندہ سے بھی بات کی ہو گی لیکن شاید وہ بھی ماں کی مرضی کے بغیر شادی پر تیار نہیں تھی اس لیے اس نے جسو کے ڈیرے کی طرف جانا بند کر دیا۔ مہیشوری کے انکار پر جسو نے اسے دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ اس کی لڑکی کو اٹھا لے گا لیکن مہیشوری پتہ نہیں کیوں چپ تھی نہ ہی وہ خوفزدہ تھی۔ مجھے ایک دن مہیشوری کنویں پر مل گئی۔ میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو وہ پھٹ پڑی اور رونے لگ گئی۔ روتے روتے اس نے بتایا کہ نندہ کا باپ زندہ ہوتا تو یہ بکھیڑے نہ ہوتے۔ اس نے بتایا کہ وہ نندہ کا رشتہ صوبے دار کے رشتہ داروں میں کر رہی ہے۔ وہ تگڑے لوگ ہیں۔ نندہ ان میں بیاہی گئی تو وہ خود ہی اس کی حفاظت کر لیں گے۔ اس ملاقات کے بعد کافی دن تک مہیشوری نظر نہیں آئی نہ ہی اس کی بیٹی نندہ۔ ان کے گھر پر تالہ لگ گیا۔ کوئی چھ سات دن بعد مہیشوری پھر گاؤں میں نظر آئی۔ اس نے اپنا گھر کھول لیا تھا اور وہیں اکیلی رہ رہی تھی۔ میں نے گھر کھلا دیکھا تو اس کے پاس گئی۔ میں نے پوچھا کہ نندہ کہاں ہے تو کہنے لگی کہ میں نے تمہیں بتایا تھا میں اس کی شادی کر رہی ہوں۔ میں نے اسے صوبے دار کے رشتہ داروں میں بیاہ دیا ہے۔ وہ اپنے سسرال میں ہے۔ میں نے اسے یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ اگر ملنا ہو گا تو میں خود جا کر اس سے مل لیا کروں گی۔ میرا داماد کہتا ہے کہ میں ان کے گھر میں آ جاؤں۔ اتنی بڑی حویلی میں مجھے بھی ایک کمرہ مل جائے گا لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں اپنے اسی گھر میں رہوں گی جو صوبے دار نے خود بنایا تھا۔ نندہ کے بیاہے جانے کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے مہیشوری سے کہا کہ میں اس کے پاس آتی جاتی رہوں گی لیکن پھر مجھے مہیشوری سے ملنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ چند دن بعد میں اس کے گھر گئی تو پھر تالہ لگا ہوا تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی ہو گی۔ وہ دن اور آج کا دن اس کے گھر تالہ لگا ہوا ہے۔''

شنکر اس عورت کی بات سنا کر کہنے لگا ''خان صاحب مجھے تو پکا یقین ہو چلا ہے کہ جسو کے قتل میں اسی نندہ کا چکر ہے۔'' شنکر نے جو نئی بات سنائی تھی

اس کے بعد تو مجھے بھی شک ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں نندہ والا چکر ہے۔ میں نے شنکر سے کہا کہ مجھے نندہ کے گھر جانا ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ مہیشوری وہاں ہے کہ نہیں۔ اس لیے تم اس عورت سے جس نے تمہیں یہ باتیں بتائی ہیں یہ معلوم کرو کہ نندہ کا گھر ہے کہاں۔ مہیشوری نے ضرور اسے بتایا ہوگا ورنہ مجھے بتاؤ وہ عورت کون ہے میں خود پوچھ لوں گا۔ شنکر گھبرا گیا کہنے لگا آپ رہنے دیں میں معلوم کر کے آتا ہوں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد شنکر واپس آ گیا۔ وہ نندہ کے گھر کا پتہ معلوم کر کے آیا تھا۔ ہم نے گھوڑے لیے اور شام ہونے سے پہلے صوبے دار کے رشتہ داروں کی حویلی پہنچ گئے۔ ہمیں مہیشوری کے داماد کا نام معلوم نہیں تھا جب ہم نے نندہ کے بارے میں پوچھا تو ایک آدمی گرم ہو کر ہم سے پوچھنے لگا کہ ہم کون ہیں اور کیا بات ہے نندہ میری بیوی ہے۔ ہم اسے ایک طرف لے گئے اور اپنا تعارف کرایا جس پر وہ نرم پڑ گیا۔ اس نے بتایا کہ صرف نندہ یہاں ہے۔ اس کی ماں مہیشوری کافی دنوں سے نہیں آئی بلکہ نندہ کہہ رہی ہے کہ اس نے ماں سے ملنا ہے میں اسے خود کسی دن لے کر آنے والا تھا۔

مہیشوری کی گمشدگی کا سن کر اس کا داماد پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو اور یہ بات اپنی بیوی کو نہیں بتائے۔ میں خود مہیشوری کو تلاش کر رہا ہوں اور جب تک میں نہ کہوں تم نے نندہ کو نہیں بتانا۔ اس کے بعد ہم تھانے واپس آ گئے۔ راستے میں میں نے شنکر سے کہا کہ جسو مارا گیا ہے اور مہیشوری غائب ہے۔ اب تم کیا کہتے ہو؟ شنکر کہنے لگا چکر واقعی گھمبیر ہے۔ مجھے جانے دیں میں اور کھوج کرتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ مہیشوری کے بھائیوں کے گھر چلیں وہ وہاں نہ ہو۔ ہم اس کے بھائیوں کے گھر چلے گئے۔ ان کا گھر بھی بند پڑا تھا۔ مہیشوری کے بھائی بھی غائب تھے۔

شنکر کے جانے کے بعد میں بھی گھر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے محرر کے کمرے سے آدمیوں کے اونچا اونچا باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے ایک سپاہی کو آواز دی کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا بات ہے وہ مجھے آ کر بتانے لگا کہ گاؤں کے دو آدمی لڑ پڑے ہیں۔ پہلے ان کے بچے آپس میں لڑے ہیں اور پھر یہ لڑ پڑے ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو زخم لگائے ہیں۔ ایک کا سر پھٹ گیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے پاس شکایت کرنے آ رہا تھا کہ دوسرا بھی آ گیا ہے۔ دونوں میں سے ایک کا بچہ بھی ساتھ ہے۔ میں نے اسے کہا کہ دونوں کو یہاں لے آؤ۔ دونوں آ گئے تو میں نے انہیں اچھی طرح ڈانٹ ڈپٹ کی کہ بچوں کی لڑائی میں تم بھی بچے بن ہو گئے ہو۔ جس آدمی کا سر پھٹا تھا وہ دوسرے کے بارے کہنے لگا کہ اسے زیادتی کرنے کی عادت ہے کیونکہ اس کا بچہ جسونت کے ڈیرے پر بھی کام کرنے چلا جاتا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو جسو کا رعب رہتا تھا۔ آج جب ہمارے بچے لڑ پڑے اور میں نے ان کی زیادتی کی اس سے شکایت کی تو اس نے بجائے انصاف کرنے کے مجھے اور میرے بچے کو مارا ہے اور اُلٹا شکایت کرنے یہاں چلا آیا۔ میں بھی آ گیا کہ صحیح بات بتاؤں۔ سر پھاڑنے والے اور اس کے بچے کی طرف میں نے نظر اُٹھائی اگر یہ بچہ جسو کے ڈیرے پر جاتا تھا تو اسے بہت کچھ معلوم ہوگا۔ اس ڈیرے پر جو لوگ آتے تھے وہ بچے کے سامنے ایسی باتیں بھی کرتے ہوں گے جو دوسروں کے آگے نہیں کرتے۔

میں نے جس آدمی کا سر پھٹا تھا اسے کہا کہ

جائے۔ دوسرے کو اور اس کے بچے کو میں نے وہاں بٹھا لیا۔ کافی دیر بٹھانے کے بعد جب میں نے اندازہ کیا کہ وہ آدمی اب اُکتا گیا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں اسے ضرور سزا دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تمہارے بچے سے باتیں کرنا ہیں تم گھر جاؤ۔ میں اسے سپاہی کے ساتھ گھر بھیج دوں گا۔ وہ پہلے تو ہچکچایا پھر چلا گیا۔ میں نے بچے کو پچکارا اور اس کا حوصلہ قائم کیا کہ میرا اسے ماروں گا نہیں۔ اس کے بعد اس سے پوچھنے لگا کہ وہ ڈیرے پر کیا کرتا ہے؟ ''میں ڈیرے پر بھینسوں کو پانی اور چارہ دیتا ہوں اور چھوٹے موٹے کام کرتا ہوں۔'' دس بارہ سال کے اس لڑکے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کافی کچھ دیکھ چکا ہے کیونکہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بول رہا تھا۔

''کیا اس ڈیرے پر تم نے کبھی کوئی عورت دیکھی ہے؟'' میرا سوال سن کر وہ چپ ہو گیا۔ میں نے اس سے ادھر ادھر کی کافی باتیں کر کے پھر وہی بات پوچھی تو وہ چپ ہی رہا۔ شاید وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا جبکہ مجھے اس سے اسی سوال کا جواب لینا تھا۔ میں نے اسے پچکارا کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اب جسو تو مر گیا ہے اور میں بھی اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ لڑکا میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری بات کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ پھر جب اسے یقین آ گیا تو کہنے لگا: ''وہ ۔ ۔ ۔ صوبے دارنی۔ ۔ کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''کونسی صوبے دارنی؟''

''وہ جی نندو کی ماں وہ ایک دن وہاں آئی تھی اور اس نے جسو سے کہا تھا کہ جو کرنا ہے کر لو۔ اس کے اگلے دن جسو نے مجھے نندو کے گھر بھیجا تھا کہ مہیشوری کو بلا کر لاؤ۔ میں اسے بلا کر لے آیا تھا۔ ڈیرے پر جسو کا اس کے ساتھ بہت جھگڑا ہوا۔ وہ دونوں جھگڑ رہے تھے اور مہیشوری کہہ رہی تھی کہ نندو پر تم ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ میں کھڑا ہو کر باتیں سننے لگا اور جسو نے مجھے وہاں سے بھگا دیا کہ گھر چلے جاؤ۔ میں ڈرتا ہوا گھر آ گیا۔ میں نے ان کی لڑائی کی بات گھر بھی نہیں بتائی۔ صبح میں ڈیرے گیا تو جسو نے مجھے پھر بھگا دیا اور کہا کہ تم گھر جا کر کھیلو۔ بھینسوں کو چارہ دینے کی ضرورت نہیں وہ خود دے لے گا۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو چھٹی مل گئی۔ اس سے اگلے دن ہم گاؤں کے لڑکے ڈیرے کے آس پاس کھیلتے رہے۔ جسونت نے مجھے کہا تھا کہ ایک دو دن ڈیرے پر نہ آنا لیکن میں اس دن چھٹی ملنے پر بھی کھیلتا ہوا وہاں چلا گیا تھا۔ کھیل کے دوران میں ڈیرے پر چلا گیا کیونکہ مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔ بیری کے نیچے ہم نے گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں جو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں وہاں جسونت کے دوست جیتو اور گامی بیٹھے ہوئے تھے۔ جسونت ان کے پاس ٹہل رہا تھا اور وہ ہنس رہے تھے۔ گامی جسونت کو کہہ رہا تھا کہ تم نے سودا اچھا کیا ہے۔ وہ نہیں تو اس کی ماں لے آؤ۔ مجھے وہاں دیکھ کر جسونت نے مجھے گالی دی کہ میں ڈیرے پر کیوں آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ پانی پینا ہے پھر چلا جاتا ہوں اور پانی پی کر دوسرے بچوں کے ساتھ گاؤں بھاگ آیا۔ رات کو سوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مجھے جسونت ڈیرے پر کیوں نہیں جانے دیتا اور گامی کس کی ماں کی بات کر کے ہنس رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صبح جا کر دیکھوں گا۔ میں نے صبح اُٹھ کر روٹی کھائی۔ کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ ڈیرے سے ادھر مجھے باجرے میں چھپ جانا پڑا کیونکہ ادھر سے جسونت گھوڑی لے کر کہیں جا رہا تھا۔ میں خوش ہوا کہ چلو اچھا ہو گیا ہے۔ اب میں ڈیرے پر چلا جاؤں گا مجھے دیکھے گا کوئی نہیں۔ میں

جب ڈیرے کی بیری کے نیچے آیا تو مجھے اس کے ساتھ والے کمرے سے گامی کی آواز آئی۔ وہ پتہ نہیں کس کے ساتھ بول رہا تھا۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے اس کمرے کی طرف بھاگا جس میں ہم توڑی اور دوسرا سامان رکھتے ہیں۔ اس کے دروازے کی کنڈی اُتری ہوئی تھی میں جھٹ دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ میں آگے ہوا تو مجھے نظر آیا کہ چارپائی پر ایک عورت لیٹی ہوئی ہے۔ میں اسے دیکھ کر اُلٹے پاؤں باہر بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ اس کی سرگوشی جیسی آواز سے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ چوری مجھے بلا رہی ہے۔ میں جب اس کے قریب گیا تو یہ تو صوبے دارنی تھی۔ اس کے ہاتھ چارپائی سے بندھے ہوئے تھے۔ پیروں سے گردن تک ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ ڈر کے مارے میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ صوبے دارنی کہنے لگی کہ یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو جا کر میرے بھائیوں کو بتا دینا۔ میں اس قدر ڈر گیا تھا کہ مجھے سے زیادہ دیر وہاں کھڑا نہیں ہوا گیا۔ میں بھاگ آیا اور سیدھا اپنے گھر گیا۔ دوپہر تک گھر سے نکلا ہی نہیں۔ کبھی خیال آتا کہ صوبے دارنی نے جو کہا ہے اس کے بھائیوں کو جا کر بتا دوں۔ کبھی خیال آتا کہ اپنی ماں کو بتا دوں۔ دوپہر کے وقت میرے سنگی کھیلنے کے لیے آ گئے اور ہم باہر چلے گئے۔ کھیلتے کھیلتے پتہ نہیں مجھے کیا خیال آیا کہ میں صوبے دارنی کے بھائیوں کے گھر چلا گیا اور اس کے بھائیوں رگھوبیر اور پرکاش میں سے ایک رگھوبیر مجھے مل گیا۔ وہ روٹی کھا رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے اسے ساری بات سنا دی اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے بھاگ گیا۔ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ کئی دن سے میں ڈیرے پر نہیں گیا اور پھر مجھے آپ نے بتایا ہے کہ کسی نے جسونت کو مار دیا ہے۔'' اس لڑکے کا بیان میرے لیے بہت بڑی مخبری تھی۔ میں نے اسے سپاہی کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیا اور خود شنکر کو بلوا لیا۔

شام کا اندھیرا اس وقت گہرا ہو چکا تھا جب میں اور شنکر گھوڑوں پر تھانے سے نکلے۔ ہم نے مہیشوری کے بھائیوں کے گھر چھاپہ مارنا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے جو بات بتائی تھی اس کے بعد میں نے شنکر کو گھر سے بلوا کر اسے ساری بات سنائی اور اس سے کہا کہ مہیشوری کے بھائیوں کا ٹھکانہ معلوم کرو۔ شنکر نے اسی عورت سے سن گن لی اور اب ہم اسی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تھانے سے کوئی لاؤلشکر نہیں لیا تھا بلکہ تین سپاہی لیے۔ شنکر نے جو جگہ معلوم کی تھی وہ بارہ میل دور تھی۔ اس زمانے میں جب سڑکیں زیادہ تھیں نہ دیہات میں بجلی تھی۔ رات کے وقت دس بارہ میل کا سفر بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے چونکہ اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی تھی نہ ہی کوفت بلکہ شنکر کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی رات کو گھڑسواری نہیں کی تھی۔ راستہ دیکھا بھالا ہو تو اچھے گھوڑے پر کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ جگہ یعنی راستہ انجان ہو تو وقت زیادہ لگتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگنے لگا کہ ہم پتہ نہیں کب کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ گاؤں پر گاؤں نکلتے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں گھروں کے ہیولے، بھونکتے کتے، چوکیداروں کی لالٹین اور آوازیں۔ اس وقت یہ سب کچھ نظر آتا یا آواز آتی جب ہم کسی گاؤں کے پاس سے گزرتے۔ شنکر کہنے لگا کہ اس نے یہ گاؤں صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ کئی سال پہلے دوا لینے کے لیے اس گاؤں میں حکیم کے پاس آیا تھا۔ گاؤں کی ایک نشانی اسے یاد ہے کہ ایک بہت چوڑا پایا

(راستہ۔ کچی سڑک جو گاؤں کے اندر جاتی ہے)

جس کے شروع میں پیپل کے تین بہت بڑے بڑے درخت ایک دائرے کی شکل میں اُگے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک جتنے گاؤں سے ہم گزرے تھے ان میں کسی جگہ ایسی نشانی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم راستہ بھول گئے تھے۔ گھوڑوں کو تھکانے کی بجائے میں نے سفر روک دیا اور سب سے کہا کہ نیچے اُتر آؤ۔

ہم اس وقت ایک بستی کے قریب ہی تھے۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر بالکل دیے کی طرح ایک روشنی نظر آ رہی تھی جو چل رہی تھی۔ گیدڑوں کی آواز کے ساتھ نہایت ہلکی انسانی آواز آ جاتی تھی جیسے کوئی چوکیدار بول رہا ہو۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ اگر یہ کوئی چوکیدار ہے تو جا کر اس سے پتہ کر کے آؤ کہ وہ گاؤں کس طرف ہے جہاں ہم نے جانا ہے۔ شنکر بھی اس آدمی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ وہ گھوڑوں پر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آ گئے۔ شنکر کہنے لگا کہ ہم دو گاؤں آگے نکل آئے ہیں۔ پیچھے جانا ہوگا۔ ہم نے اس طرف رُخ کر لیا جدھر سے آئے تھے۔ ایک بستی گزرنے کے بعد دوسری آئی تو مجھے وہ درخت نظر آ گئے جو میرے دائیں طرف تھے۔ میں نے گھوڑا ان کے پاس لا کھڑا کیا۔ یہ دائرے میں اُگے ہوئے پیپل کے تین درخت تھے۔ جن کے ساتھ وہ چوڑا راستہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی مہیشوری کے بھائیوں کا گاؤں نہیں دیکھا ہوا تھا اس لیے کسی کو ان کے گھر کا پتہ نہیں تھا۔ اس وقت ہم کسی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ جس گھر میں ہم نے جانا ہے وہ کون سا ہے۔ اس کے لیے چوکیدار ہی مدد کر سکتا تھا اور اسی امید کے ساتھ ہم گاؤں میں داخل ہو گئے۔ یہاں چوکیدارے کا انتظام بہت اچھا تھا۔ ہم گاؤں کے پہلے گھر کے پاس ہی پہنچے تھے کہ چوکیدار لالٹین لے کر چکر لگاتا ہوا ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ ایک سپاہی نے آگے ہو کر اپنا اور ہم سب کا بتایا اور میری طرف اشارہ کیا۔ چوکیدار نے پاس آ کر پرنام کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ میں نے اسے اپنی مشکل بتائی۔ وہ سر کھجانے لگا اور سوچ کر بولا کہ یہاں رگھوبیر اور پرکاش رہتے ہیں جن کا ایک بہنوئی فوج میں تھا۔ میں آپ کو ان کا گھر دکھا دیتا ہوں۔ آپ خود ان سے پوچھ لیں۔ وہ ہمیں گاؤں کی طرف لے گیا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے خیال آیا کہ گھوڑے یہیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن گھوڑے یہاں کہاں رکھے جائیں۔ میں نے شنکر اور ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور ہم چوکیدار کے ساتھ چل پڑے۔ گلیوں میں سے گھومتا گھماتا چوکیدار ہمیں ایک مکان کے سامنے لے گیا اور اس نے خود دروازے کو کھڑکایا۔ کافی دیر بعد ایک آدمی دروازے کی طرف آتا سنائی دیا۔ اس نے اندر سے کنڈی گرائی اور ایک پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے چوکیدار تھا جس کے پیچھے ہم کھڑے تھے۔ وہ پوچھنے لگا ''مہنتا کیا بات ہے۔ یہ کون آدمی ہیں؟'' مہنتا چوکیدار کہنے لگا کہ تم سے ہی ملنا ہے انہوں نے۔ ان کو اندر لے جاؤ۔ گھبراؤ نہیں رگھوبیر۔

''مہنتا پتہ نہیں تم کن آدمیوں کو میرے پاس لے آئے ہو؟'' اس نے دروازہ بند کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے چوکیدار کو ایک طرف ہٹایا اور رگھوبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ میرے پیچھے شنکر اور سپاہی بھی آ گئے۔ مہنتا بھی اپنے چکر پر جانے کی بجائے میرے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔

اندر صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر

چادریں لیے دو آدمی پڑے تھے۔ ہماری آواز سن کر ان میں سے ایک اُٹھ بیٹھا اور اونچی آواز میں بولا ''رگھوبیرے کیا بات ہے کون ہیں یہ آدمی؟'' رگھوبیر نے جواب نہیں دیا بلکہ چوکیدار کہنے لگا ''پرکاش کوئی نہیں خیر ہے۔'' پر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سرہانے رکھی ہوئی ڈانگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے اس کا ارادہ اچھا نہیں لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈانگ پر ہاتھ ڈالتا میں چھلانگیں مار کر اس کے سر پر جا پہنچا اور میرے زوردار مکے سے وہ گھوم گیا۔ اسے مکا پڑتا دیکھ کر رگھوبیر شنکر سے لپٹ گیا اور اسے مارنے لگا۔ چوکیدار نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور چھڑانے لگ گیا۔ میں نے پرکاش کو مکوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیا۔ سپاہی نے رگھوبیر کی طبیعت صاف کر دی۔ اب دونوں زمین پر پڑے ہانپ رہے تھے۔ اب تیسرا آدمی بھی اُٹھ کر چادر لپیٹے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن پاس جا کر رُک گیا کیونکہ یہ ایک عورت تھی۔ شنکر میرے پاس آ کھڑا ہوا اور اس نے حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے حیرانگی سے مہیشوری کا نام نکلا۔ اچانک رگھوبیر نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے پر جا لیا۔ سپاہی نے پھرتی دکھائی اور پرکاش کو پکڑ لیا۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ مجھے رسی دو ان کی مشکیں باندھنا ہیں۔ اس نے کندھے پر پڑی چادر میری طرف پھینک دی۔ میں نے شنکر سے کہا کہ رگھوبیر کو باندھ لو۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے پرکاش کو باندھا لیکن انہیں تھانے لے جانا ضروری تھا۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ کسی سواری کا انتظام کرو۔ وہ جا کر نمبردار کو بھی لے آیا اور سواری کو بھی۔ میں تینوں کو تھانے لے آیا۔

تھانے میں ایک رات اور دن رکھنے کے بعد پہلے رگھوبیر سے پوچھ گچھ کی تو وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ پرکاش اور رگھوبیر بہت چالاک ثابت ہوئے۔ نہ ان پر مار اثر کرتی اور نہ ہی وہ میری کسی بات میں آتے تھے لیکن انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ میرے پاس کیا ہتھیار ہے۔ میں نے تنگ آ کر اس لڑکے کو بلا لیا جس نے انہیں مہیشوری کے توڑے والے کمرے میں ہونے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے رگھوبیر کو حوالات سے نکال کر اپنے کمرے میں بٹھایا اور اس لڑکے کو اس کے سامنے کر دیا۔ وہ اسے دیکھ کر پیلا زرد پڑ گیا اور سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کے سامنے لڑکے سے پوچھا ''یہی مہیشوری کا بھائی ہے ناں؟ اور تم نے اسی کو جا کر بتایا تھا ناں کہ مہیشوری جسونت کے ڈیرے پر توڑی والے کمرے میں قید کی ہوئی ہے؟'' لڑکا رگھوبیر کے سامنے کہنے لگا کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ میں نے اس آدمی کو مہیشوری کی بات جا کر بتائی تھی اور اس نے مجھے کہا تھا کہ میں جاؤں۔ یہ مہیشوری کا بھائی ہے اور مہیشوری نے مجھے اسی کے پاس بھیجا تھا۔

میں نے لڑکے کے اتنا کہنے کے بعد اسے وہاں سے بھیج دیا اور رگھوبیر سے کہا کہ اب چھپانے کا فائدہ نہیں۔ مہیشوری مجھے بتا چکی ہے کہ تم نے اور پرکاش نے مل کر جسو کو مارا ہے۔ میرا یہ وار رگھوبیر نے بیکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ مہیشوری جھوٹ بولتی ہے اور لڑکا بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ رگھوبیر سخت جان تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس طرح نہیں مانے گا۔ میں نے اس پر توجہ ختم کر دی اور مہیشوری کو پکڑ لیا۔ مہیشوری نے بڑی دردناک بات بتائی۔

''یہ جسونت سنگھ میری بیٹی نندہ پر عاشق ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کیے

لیکن نندہ نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میری ماں کو منا لو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر جسونت نے مجھے پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اس بدمعاش کو رشتہ نہیں دے سکتی تھی۔ میرے انکار پر جسونت نے مجھے جان سے مارنے اور نندہ کو اٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں۔ میں نے یہ بات اپنے بھائیوں کو نہیں بتائی تھی۔ میں نے خاموشی سے نندہ بیاہ دی۔ جب جسو کو معلوم ہوا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے ایک رات مجھے اُٹھا لیا اور ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں اس نے۔۔۔ میں بتا نہیں سکتی۔۔۔ سمجھ لیں میں اسی رات مر گئی تھی۔ صرف جسو ہی نہیں اس کا کوئی یار بھی جسے وہ گامی کہتا تھا۔۔۔ پتہ نہیں میں کتنے دن اور سولی پر چڑھتی کہ گاؤں کا ایک لڑکا اس کمرے تک آ گیا جہاں میں قید تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ بھائیوں کو پیغام دیا۔ اسی رات میرے دونوں بھائی مجھے نکالنے آ گئے۔ جسو اور گامی دوسرے کوٹھے میں شراب پی رہے تھے۔ میرے بھائی مجھے نکال کر لے گئے اور اس گاؤں لے گئے جہاں میرے چچا کا مکان ہے اور جہاں سے آپ نے میرے بھائیوں کو پکڑا ہے۔ جب ہم وہاں چلے گئے تو میرے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب جسو کو اس دنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں انہیں منع کرتی رہی لیکن ایک دن جسو کے قتل کی خبر میں نے بھی سن لی۔

مہیشوری کے بیان کے بعد کوئی شک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ پرکاش مجھے کمزور لگ رہا تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح مروایا۔ اس کی برداشت سے زیادہ اور پھر اس نے بتا دیا کہ جسونت کو انہوں نے کیسے قتل کیا۔

''ہماری بہن کے ساتھ جسونت نے جو کچھ کیا اس کی کم سے کم سزا اس کا خون ہی ہو سکتی تھی۔ مہیشوری کو اس کے ڈیرے سے نکال لانے کے بعد میں نے اور رگھوبیر نے جسونت کے قتل کی بات پوری کر لی۔ اس کے پاس بدمعاشوں کا ٹھکانہ ہوتا تھا اس لیے ہمیں گھر کے بھیدی کی ضرورت تھی۔ پریتم سے بڑا بھیدی اور کون ہو سکتا تھا۔ اس آدمی کی ایک ہی کمزوری ہے وہ ہے پیسہ۔ ہم نے جسو کے گاؤں میں اپنی تین کلے زمین بیچ دی اور پیسہ پریتم کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ یہ سودا ہوا تھا کہ جسو کے کھانے میں دھتورا ملا دے اس کے بعد ہم سنبھال لیں گے۔ دھتورا رگھوبیر لے کر آیا تھا۔ پریتم انتظار کرنے لگا کہ گامی وغیرہ ڈیرے سے جائیں اور جسو اکیلا ہو۔ وہ کھانا لے کر ڈیرے پر جاتا تو ہم ذرا فاصلے پر اس کے ساتھ ہوتے۔ ایک دن جسو اکیلا ہی تھا۔ پریتم کو بھی موقع مل گیا اور ہمیں بھی۔ دھتورا کھا کر جسو بے جان ہو رہا تھا کہ ہم اس کے سر پر نازل ہو گئے۔ میرے پاس کلہاڑی اور رگھوبیر کے پاس ٹوکا تھا اور پھر ہم جیسے پاگل ہو گئے۔ پریتم برداشت نہیں کر سکا اور بھاگ گیا۔

پرکاش کا بیان سن کر میں نے سپاہی ساتھ لیے اور تپارو کے گھر جا کر پریتم کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد کی کارروائی ساری کی ساری تھانے میں ہوئی۔ میں نے پرکاش کے ساتھ جا کر وہ کلہاڑی اور ٹوکا برآمد کیا جو انہوں نے جسو کے ڈیرے پر ہی ایک روڑی (کوڑے اور گوبر کا ڈھیر) پر پھینک دیئے تھے۔ رگھوبیر اور پرکاش جسونت کے قتل میں اور پریتم جرم میں مدد دینے پر سزا پا گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کو عمر قید ہو گئی تھی۔ تپارو انتظار کرتا رہا کہ دونوں باہر آئیں تو اپنے بیٹے کا بدلہ لے۔ پتہ نہیں اس کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں کیونکہ میں کچھ دیر بعد وہاں سے تبدیل ہو گیا تھا۔

کے مطابق اب وہ لڑکی اپنی والدہ کے ساتھ انگلینڈ شفٹ ہو چکی تھی، وہاں وہ ایک لمبے اور مشکل علاج کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ مصیبت زدہ والد بھی اپنی سیاست اور کاروبار سمیٹ کر بیرونِ ملک جانے والا تھا اور یہ تو صرف ایک واقعہ تھا۔ یقین نہیں تھا کہ "باپ" کی طرح بیٹے کے کردار پر بھی اس طرح کے کئی شرمناک داغ ہوں..... اور اب ایک خطرناک موروثی بیماری والا یہ بدمعاش نوجوان کی ہیبر بے چینی الہام کا شوہر بننے جا رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ عدیل کا دل اس کے سینے میں خون ہونے لگا۔

جونی اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تو لمبوترے چہرے والے جمشید خاں کے پتلے پتلے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہوئی نظر آئی۔ "سمجھی جی۔ کیسا لگا اپنا ہونے والا داماد؟"

عدیل نے تکلیف محسوس کرتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر لیا۔ وہ ذرا تاسف کے ساتھ عدیل کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ "مجھے پتا ہے چیمپ! تم میرے خلاف بھرے بیٹھے ہو۔ میں نے تمہیں باکسنگ رنگ میں اترنے پر مجبور کیا اور نتیجے میں تم وہیل چیئر پر آ گئے..... لیکن تم بھی جانتے ہو یہ سب عارضی ہے۔ کچھ عرصے میں تمہیں بھلے چنگے ہو جانا ہے اور اگر کوئی تھوڑی بہت پیچیدگی ہوئی بھی تو کیا مسئلہ ہے۔ تمہاری جیب نوٹوں سے فل گرم ہے۔ چھوٹی موٹی ٹریٹ منٹ کے لیے ایک اور چکر یو ایس اے کا لگا لینا..... اور اگر نہ بھی لگانا ہوا تو تمہیں کون سی کمی ہے۔ یہاں پاکستان میں بھی تمہیں غیر ملکی علاج جیسی سہولت اسٹار سہولت ملی ہوئی ہے۔"

اس کے معنی خیز لہجے پر عدیل نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ "میں تمہاری اس حسین پڑوسن کا ذکر کر رہا ہوں جو تمہاری ٹاپ فین بھی ہے۔ سنا ہے کہ وہ اکثر بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں سے تمہارا مساج کرتی ہے اور تمہارے اندر نئی روح پھونکتی ہے۔ بند کمرے میں دو چار ہفتے اس سے تھراپی کراؤ گے تو سارے مردہ رگ پٹھے زندہ ہو جائیں گے۔"

عدیل حیران ہوا کہ اس شخص کو تابانہ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا ہے اور وہ یہاں اس کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔ وہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر مستقبل میں تمہارے مردہ رگ پٹھے زندہ ہو جائیں تو بڑا فائدہ ہو سکتا ہے تمہارا۔ مقابلے چاہے نہ کر سکو مگر کوچنگ اور ٹریننگ سے تو پیسا کما ہی سکتے ہو۔ مجھے پتا ہے کہ بہت سے قدرداں ہیں تمہارے۔"

جمشید خاں کی یہ ساری باتیں عدیل کو زہر لگ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی برچھی جیسی کٹیلی آواز سے اس کے کان زخمی ہو رہے ہیں۔ وہ اس کی گفتگو سے لاتعلق ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "جمشید! الہام کو بلاؤ۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور دیکھو میرے چیمپ! لیکن دیکھنا ہی نہیں، اسے سمجھانا بھی ہے۔ اچھے بُرے کا بتانا بھی ہے۔ محبت کا یہ کام محبت سے ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ میرا بیٹا تمہاری بیٹی پر فدا ہے..... اور وہ فدا ہی رہے تو ہم سب کے لیے بہتر ہو گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھیج رہا ہوں اُسے، تم دونوں اکیلے میں بات کر سکتے ہو۔"

وہ باہر چلا گیا۔ عدیل کا سینہ دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ جمشید خاں کے ساتھ ہی دونوں چوکس لڑکیاں بھی باہر چلی گئی تھیں۔ تاہم اندازہ یہی ہوتا تھا کہ وہ دروازے کے پاس موجود ہیں۔ وہ صرف ڈیکوریشن پیس نہیں تھیں، ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جمشید خاں کے گارڈز کی سی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

چند منٹ گزرے پھر بلند دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور الہام نظر آئی۔ سہمی سہمائی ہوئی کسی ڈری سہمی چڑیا جیسی۔ اس نے حیرت سے عدیل کو وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھا اور پھر جیسے تڑپ کر اندر آ گئی۔ "پاپا..... پاپا۔"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور اس کا بازو تھام کر اُس سے لپٹ گئی۔ "پاپا! یہ کیا ہوا آپ کو؟ آپ چیئر پر کیوں ہیں؟ آپ زخمی ہیں؟" وہ رو رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں الہامی! بس تھوڑی سی تکلیف ہوئی ہے۔" اس نے کہا پھر الہام کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی اور سر کو بار بار چوما۔ "میری بچی..... میری جان....." اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ سٹیل کی اس آخری نشانی کو ابھی اپنے سینے میں چھپا لیتا اور ان ستم گر در و دیوار سے کہیں دور نکل جاتا۔

کمرے کا بلند دروازہ ڈور کلوزر کے ذریعے بند ہو چکا تھا اور وہ اکیلے تھے۔ آنسو عدیل کی آنکھوں میں بھی امڈ کر آنا چاہتے تھے لیکن اگر وہ خود رونے لگتا تو الہام کو کیسے سنبھالتا۔ اس نے خود پر ضبط کیا۔ الہام کے گال اور بال سہلانے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر چھپکنے اور پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ (اس نے اسے سمجھایا کہ سیڑھیوں پر پھسلنے کی وجہ سے کمر پر کچھ ضرب آئی ہے)

وہ بولی۔ "پاپا! مجھے یہاں سے لے جائیں۔ اب مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جایئے گا۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ

بانو کے عشق میں

امرتسر سے براستہ سڑک جالندھر جائیں تو راستے میں "دھنسر" نامی ایک قصبہ آتا ہے۔ ان دنوں میں اسی قصبے میں تعینات تھا۔ یہ ایک صاف ستھرا قصبہ تھا اس کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ قصبے میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ چودہری برکت صاحب علاقے کی با اثر شخصیت اور ایک دین دار آدمی تھے۔ ان کی زمین قصبے سے باہر دور تک پھیلی ہوئی تھی اس کے علاوہ امرتسر میں ایک تیل کی ایجنسی بھی ان کی ملکیت تھی۔ چودھری صاحب کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا افتخار گاؤں میں رہتا تھا۔ جب کہ چھوٹا شہر میں پڑھتا تھا۔ چودھری صاحب اپنے لڑکوں سے کوئی خاص خوش نہیں تھے۔ میرے ساتھ ان کی خاصی میل ملاقات رہتی تھی۔ وہ اپنے گھریلو معاملات پر بھی مجھ سے بے تکلفی سے بات کر لیا کرتے تھے۔ انہی دنون چودہری صاحب نے اپنی بیٹی "بانو" کی شادی ساتھ والے گاؤں میں حاجی فقیر محمد کے بڑے لڑکے "انوار" کے ساتھ طے کی۔ انوار شہر سے ڈاکٹری کر کے آیا تھا اور چند ہی دنوں میں ارد گرد کے تمام دیہات بلکہ کبھی کبھی تو امرتسر سے بھی اس کے پاس مریض آنے لگے تھے۔ وہ واقعی ایک قابل ڈ[illegible] بھی اس کی فرمانبرداری تھی کہ اس نے والدین کا کہنا مانتے ہو[illegible] شہر کی بجائے گاؤں میں پریکٹس کو ترجیح دی تھی۔ وہ اپنے والد کی

طرح نہایت شریف اور نیک لڑکا تھا۔ سچ پوچھیں تو پہلی ملاقات میں ہی اس نے مجھ کو متاثر کیا تھا حالانکہ مشہور ہے کہ ہم پولیس والے کسی سے کم ہی متاثر ہوتے ہیں۔

جب مجھے چودہری صاحب نے بتایا کہ میں لڑکی کی منگنی فقیر محمد کے لڑکے انوار کے ساتھ کر رہا ہوں تو مجھ کو بہت خوشی ہوئی۔ مجھ کو پتہ تھا یہ سلسلہ کافی دیر سے چل رہا ہے۔ چودہری برکت نے مجھ کو بھی منگنی کی رسم میں شرکت ہونے کے لیے کہا۔ لیکن مصروفیت کی وجہ سے میں نے معذرت کر لی۔ تیسرے روز کا واقعہ ہے میں تھانے کے صحن میں چارپائی دھوپ میں ڈالے اپنی ٹانگ کی مالش کروا رہا تھا کہ دور سے دو افراد آتے دکھائی دیے' ایک شخص کو تو میں اس کی گرم چادر اور طرے دار پگڑی سے فوراً" پہچان گیا وہ چوہدری صاحب کو کمرے میں بٹھاؤ۔ اور تھوڑی دیر بعد ٹھیک ٹھاک ہو کر کمرے میں آگیا۔

چودھری برکت نے اٹھ کر مصافحہ کیا' دوسرے شخص کو بھی میں پہچان گیا۔ وہ چودھری برکت کا نیا رشتے دار فقیر محمد تھا۔ میں نے دونوں کو بیٹھنے کا کہا۔ چائے پانی کا پوچھا۔ پھر میں نے ڈاکٹر انوار کے بارے میں اس کے والد سے پوچھا۔ فقیر محمد اچانک خاموش ہو گیا اور چودھری برکت کی طرف دیکھنے لگا۔ چودھری برکت نے کھنکار کا گلا صاف کیا اور بولا۔

"خان صاحب (وہ مجھ کو ہمیشہ خاں صاحب ہی کہتا تھا) اس وقت ہم ڈاکٹر انوار کے بارے میں ہی بات کرنے کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں"

"کیوں خیر ہے؟" میں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب کو کیا ہوا؟"

چودھری برکت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "خاں صاحب آپ کو پتہ ہے پرسوں منگنی تھی۔ اس رات سے انوار غائب ہے پہلے تو فقر محمد خود سر کھپاتا رہا ہے۔ پھر کل اس نے مجھے بتایا۔ ہم نے اسے ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

میں نے دیکھا کہ انوار کا والد چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کر

رہا ہے۔

"یہ تو آپ نے بری خبر سنائی لیکن اس میں زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ آخر جوان آدمی ہے آپ حوصلہ رکھیں۔" میں نے ان کو حوصلہ دیا اور وہ مجھ کو بتانے لگے کہ انہوں نے انوار کو ڈھونڈنے کے لیے کیا کیا کوششیں کی ہیں۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر انوار جیسا نیک اور فرمانبردار لڑکا جان بوجھ کر کیونکر ایسا قدم اٹھا سکتا ہے اور وہ بھی ایسے اہم موقع پر دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اس کے غائب ہونے میں کسی دوسرے کا ہاتھ ہو۔ لیکن وہ تو بہت تعلیم یافتہ اور کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا..... پھر

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال پوچھتا چودھری برکت کہنے لگا

"اچھا خاں صاحب اب ہم چلتے ہیں۔ دعا کریں ہمارے گھروں کا سکون لوٹ آئے۔"

میں نے موقع پڑنے پر انہیں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا اور وہ دونوں مجھ سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ شام تک کئی ملنے والوں کی زبانی مجھے یہ تازہ ترین' اطلاع ملتی رہی کہ ڈاکٹر انوار منگنی کی رات کہیں غائب ہو گیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لوگ مختلف قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ شام کے وقت چودھری برکت پھر میرے پاس آیا۔ کچھ دیر انوار کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں پھر اس نے مجھ کو کہا۔

"خاں صاحب! میں نے صبح آپ سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا مجھ کو ایک لڑکے پر شک ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ حرکت اس نے کی ہے۔

میں نے کہا "چودھری صاحب کھل کر بتائیں۔ ہم آپس میں بات کر رہے ہیں؟"

چودھری برکت نے کہا "میری بیوی کی بہن کا لڑکا 'الیاسا' مجھے شروع ہی سے اس پر شک تھا۔ وہ ٹھیک لڑکا نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے کو اسی نے غائب کروایا ہے"

"اچھا وہی گورا سا لمبے قد والا۔" مجھے کچھ یاد آیا۔

"ہاں وہی گھونگھریالے بال ہیں جس کے مجھے اس کی نظر کبھی ٹھیک نہیں لگی۔ جوان بیٹی ہے جی گھر میں۔ میں نے اس کا گھر میں داخلہ بھی بند کر رکھا تھا۔ پھر بھی وہ ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ میرے دل کو پورا یقین ہے کہ یہ 'الیاسا' کا کام ہے۔ میں نے کل اسے گھر بلایا تھا اور صاف صاف کہا تھا کہ انوار کے گم ہونے میں اس کا ہاتھ ہے۔ اس کی بہتری اس میں ہے کہ اگر کل تک اس سے انوار نہیں ملا تو تھانے میں اس کی وہ چھترول ہو گی کہ زمانہ دیکھے گا۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے چودھری صاحب" میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے صبح تک دیکھنے دیں خاں صاحب' صبح میں اس کے خلاف پرچہ کٹاؤں گا۔"

اس کے بعد چودھری برکت نے اس معاملے میں مجھ سے بازداری برتنے کی درخواست کی وہ نہیں چاہتا تھا کہ بانو کے سسرال والوں کو فی الحال ان واقعات کا علم ہو۔

لڑکی کے عاشق کو بلا لیا

دوسرے روز چودھری برکت نے الیاسے کے خلاف پرچہ چاک کروا دیا۔ میں نے ایک اے ایس آئی کو تین سپاہی دے کر بھیجا کہ وہ ملزم کو تھانے میں لے آئیں لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ملزم غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے ماں باپ کو تھانے میں بلایا۔ لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا' وہی منتیں سماجتیں اور حلفیہ بیان کہ ان کا بیٹا تو فرشتہ ہے۔ اللہ میاں کی گائے ہے۔ یہ لوگ بھی کھاتے پیتے تھے۔ الیاسے نے ایک بہت بڑا مچھلی فارم کھول رکھا تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے نزدیک والی زرخیز زمین میں بھی ان کا کافی حصہ تھا۔

شام کو دو تین معززین اور اس معاملے میں کود پڑے۔ وہ ضمانت قبل

ازگرفتاری کے چکر میں تھے۔ لیکن میں نے ان کو صاف بتا دیا کہ اس قسم کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ ملزم کو ایک دفعہ ضرور پیش ہونا پڑے گا۔ آخر مار پیٹ کی پیشگی معافی کے وعدے پر انہوں نے ملزم کو حاضر کر دیا مجھے اس پر سخت طیش تھا اور ہو سکتا تھا کہ اس کی ٹھکائی تک نوبت آجاتی لیکن چند منٹ اس سے بات کرنے کے بعد میرے خیالات تبدیل ہو گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ چہروں پر بہت زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ بعض بہت شریفانہ چہروں والے لوگ اندر سی چھٹے ہوئے بدمعاش نکلتے ہیں اور بعض سخت گیر چہرے اندر سے موم کی طرح نرم ہوتے ہیں۔ اس نوجوان کے خدو خال میں درشتگی کی حد تک مردانگی پائی جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑا آکڑ خاں قسم کا شخص ہو گا لیکن اس کے برعکس وہ کافی نرم اور کم گو نکلا۔ اس نے وہی باتیں دہرائیں جو اس سے پہلے چودھری برکت بتا چکے تھے۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ بانو سے محبت کرتا ہے لیکن اس کے ہونے والے خاوند کو اغواء کرانے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

میں نے اس سے کہا "کاکا! تو ایک رات حوالات میں نہیں کاٹ سکتا۔ جو کچھ مار کھانے کے بعد بتانا ہے وہ ابھی بتا دے۔ میں نے اگر گاؤں کے شریف آدمیوں سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو تجھ کو ابھی آٹے دال کا بھاؤ سمجھا دیتا۔"

اس نے مجھ کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "تھانیدار صاحب! میں مار سے ڈرنے والا نہیں۔ تم اپنا شوق پورا کر لو لیکن میرا جواب یہی ہے۔"

میں نے کافی دیر اس سے پوچھ گچھ کی اسے ہر طرح ڈرایا دھمکایا لیکن اس کے اندر سے کچھ نہ نکال سکا۔ اگر چودھری صاحب سے صرف دشمنی کی بات ہوتی تو میں اس پر کوئی بھی دفعہ لگا سکتا تھا لیکن مسئلہ چودھری صاحب کے داماد کے ملنے کا تھا میں نے فی الحال اس کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

سچی بات ہے کہ ڈاکٹر انوار جیسے شخص کے غائب ہو جانے کا مجھ کو دلی

صدمہ ہوا تھا۔ پھر یہ کیس میرے تھانے کا تھا اور اس کی شہرت بھی بہت پھیل چکی تھی۔ اس کے علاوہ چودھری برکت سے بھی میرے نہایت برادرانہ تعلقات تھے۔ اس معاملے میں دونوں فریقین معزز تھے کسی سے بھی زیادتی میری لیے نقصان دہ ثابت ہو جاتی۔ منگنی کے روز انوار کا روپوش ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ گمشدگی کا رشتے سے کوئی تعلق تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ لڑکی اسے پسند نہ ہو' اور کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی وجوہات ہو سکتی تھیں۔

میں نے مشتبہ افراد کی فہرست تیار کرنے کے لیے چودھری برکت اور فقیر حسین کو تھانے بلوایا اور ان سے بات چیت شروع کی۔ رشتے کے حوالے سے پہلے تو وہ لوگ مشکوک تھے جن کو اس رشتے سے کسی قسم کا نقصان پہنچنا تھا یا وہ اس رشتے کے مخالف تھے۔ اس سلسلے میں چودھری برکت نے بتایا کہ شروع میں بانو کی والدہ نے اس رشتے کی مخالفت کی تھی لیکن بعد میں اس نے خوشی سے اجازت دے دی تھی۔ بانو کے بڑے بھائی افتخار نے بھی کچھ مخالفت کی تھی لیکن پھر وہ بھی تیار ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے افتخار یا اس کی والدہ ایسی سنگین غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی مخالفتیں تو ہر رشتے کے موقع پر سامنے آتی ہیں۔ میں نے فقیر حسین سے یہی سوال پوچھا۔ فقیر حسین کچھ کہتا کہتا خاموش ہو گیا لیکن چودھری برکت نے کہا۔

"بھائی فقیر حسین نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ ان کے رشتہ داروں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ انہوں نے محلے کے ایک گھر کا ذکر کیا ہے۔ وہ کافی جھگڑالو قسم کے لوگ ہیں۔ ان کی جوان لڑکی عموماً" ڈاکٹر انوار کی دوکان پر دوائی لینے کے لیے آیا کرتی تھی وہ کوئی ہیں۔ اچھی لڑکی نہیں تھی۔ ایک دو دفعہ اس کے بارے میں اڑتی اڑتی باتیں بھی گاؤں میں سنی گئیں۔ چند دن کے بعد اس لڑکی کی ماں فقیر حسین کے گھر آئی اور ان سے ڈاکٹر انوار کا رشتہ مانگا۔ ان لوگوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد لڑکی کے بھائیوں نے ڈاکٹر انوار کو دھمکیاں دی تھیں کہ وہ اس کی دوکان کو تالا لگا

دیں گے۔ سارا گاؤں انوار کی نیک چلنی اور حسن اخلاق کا معترف تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ لڑکی خود انوار کے پیچھے پڑی ہوئی ہے بہر حال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اب بھائی فقیر محمد کا خیال ہے کہ ان لوگوں کو ضرور شامل تفتیش کیا جائے۔ ممکن ہے انہی لوگوں میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہو۔"

میں خاموشی سے چودھری برکت کی بات سنتا رہا۔ مثل مشہور ہے کہ جس کی چیز گم ہو جاتی ہے اس کے لیے ہر کوئی چور ہوتا ہے یہ تفتیش کرنے والے کا کام ہوتا ہے کہ پہلے وہ تمام شکوک کو اکٹھا کرے اور پھر مفروضوں کے اس ڈھیر میں سے حقیقت کو ڈھونڈ نکالے۔ دوسرے روز میں نے ڈاکٹر انوار کے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا۔

وہ مشتبہ تھا لیکن.....

گاؤں وہاں سے کوئی ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ دو گھوڑوں پر سوار میں اور اے ایس آئی پیارے لال دوپہر کے وقت فقیر حسین کی حویلی میں پہنچے۔ فقیر حسین نے بڑے احترام سے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا۔ ان کے ایک دو رشتے دار بھی وہاں موجود تھے۔ میں انوار کی والدہ سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ پتہ چلا کہ اس نے مصلہ سنبھال رکھا ہے اور قسم کھائی ہے کہ جب تک انوار نہیں ملے گا وہ مصلہ نہیں چھوڑے گی۔ میں اس سے گھر کے اندر جا کر ملا۔ وہ پرانے زمانے کی سیدھی سادھی عورت تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"میرے لال نے تو کبھی مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ تو کبھی ایک رات بھی بغیر پوچھے گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ آج چھٹی رات ہے۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے؟" اتنا کہتے کہتے بوڑھی عورت کی آنکھیں الٹ گئیں اور وہ مصلے پر غش کھا کر گر پڑی۔

بڑی مشکل سے اس کو ہوش میں لایا گیا۔ گھر میں موجود دوسری عورتیں بھی سسکیاں لے کر رو رہی تھیں۔ عجیب رقت آمیز منظر تھا۔ فقیر حسین نے بتایا کہ کل رات ہم لاہور میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ کے پاس

گئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ انوار بڑی مشکل میں ہے۔ اس کے دشمنوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ابھی تو وہ زمین کے اوپر ہے لیکن بہت جلد زمین کے نیچے چلا جائے گا۔ کپور تھلہ میں بھی ایک سنیاسی نے اسی طرح کی بات بتائی ہے۔ بس اس وقت سے اس کی ماں کی یہ حالت ہے۔ کچھ نفل پڑھتی ہے اور غش کھا کر گر پڑتی ہے۔

میں نے فقیر حسین سے پوچھا انوار سے آخری بار کون ملا تھا۔ اس نے انوار کی ہمشیرہ کا بتایا۔ میں نے اس کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ بارہ تیرہ سال کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھ کو بتایا۔

بھائی جان کو میں نے آخری بار عشاء کے بعد دیکھا تھا۔ سونے سے پہلے وہ تھوڑا سا پیدل ضرور چلا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ کو کہا کہ میں ان کی چارپائی پر دھوتی کرتا رکھ دوں وہ ابھی آکر بدل لیں گے۔ اس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔ کوئی سامان یا پیسہ انہوں نے ساتھ نہیں لیا ان کی چابیوں کا گچھا بھی میز پر پڑا رہا" لڑکی سسکیاں لے کر رونے لگی۔

میں نے اس کو تسلی دی اور پوچھا "تمہارے بھائی جان کچھ پریشان تو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یا اور کوئی نئی بات جو تم نے ان میں دیکھی ہو؟"

لڑکی تو چپ رہی لیکن فقیر حسین بولا "اس دن کافی ہنگامہ تھا۔ ہم نے بہت زیادہ انتظام کر رکھا تھا۔ مجھے اب یاد آرہا ہے۔ صبح کے وقت اس نے کہا تھا ابا جان آپ سے ایک بات کرنی ہے لیکن مصروفیت کی وجہ سے نہ تو مجھ کو ہی یاد رہا اور نہ ہی اس نے پھر یاد کرایا۔ وہ کچھ خاموش سا تھا۔ لیکن کوئی غیر معمولی بات مجھ کو یاد نہیں آرہی"۔

میں نے انوار کے ایک دو شہری دوستوں کو بھی بلا رکھا تھا ان سے میں نے علیحدگی میں گفتگو کی۔ وہ دونوں اس کے بہت قریبی دوست تھے۔ انہوں نے مجھ کو وہی کچھ بتایا جو پورا گاؤں اور ارد گرد کے لوگ جانتے تھے۔ انوار نہایت نیک لڑکا تھا۔ ارد گرد کے چالیس پچاس مسلمانوں کے

دیہاتوں میں وہ اکیلا مسلمان ڈاکٹر تھا اور پڑھائی کے دوران میں بھی اس کا کردار بالکل صاف رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"کبھی اس نے تم لوگوں سے اپنی کسی جسمانی خامی کا ذکر کیا ہو۔ جس کو تم ڈاکٹر لوگ سیکس پرابلم کہتے ہو۔" انہوں نے بالاتفاق اس امکان کو رد کیا۔ پھر میں نے اپنے طور پر ان کو تاکید کی کہ اگر کسی وقت اس کی طرف سے انہیں کوئی اطلاع ملے یا وہ خود ان سے رابطہ قائم کرے تو وہ پولیس سے تعاون کریں۔ دونوں میں سے ایک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے ذرا ہمت دلائی تو کہنے لگا'

"جناب گاؤں سے ایک دفعہ ایک بڑا ہوشیار اور گھاگ سا شخص شہر آیا تھا۔ ان دنوں کالج میں چھٹیاں تھیں انوار گاؤں آیا ہوا تھا۔ ہم لوگ ہاسٹل میں تھے۔ اس شخص نے بتایا کہ وہ انوار کا کوئی بچپن کا دوست ہے۔ یہ شخص وہاں مختلف حیلوں بہانوں سے انوار کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ہم کو شک پڑا کہ یہ شخص انوار کا خیر خواہ نہیں۔ ہم نے اس کو زیادہ کچھ نہیں بتایا اور وہ گھوم پھر کر واپس چلا گیا۔ جب بعد میں ہم نے انوار سے اس کے بارے میں ذکر کیا تو اس نے کہا وہ اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا"

انوار کے دوست کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی شخص منصوبے کے تحت کافی عرصے سے انوار کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔ پھر میرا خیال "الیاسے" کی طرف چلا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انوار پر ڈورے ڈالنے والی لڑکی کے بھائیوں میں سے کسی نے یہ کام کیا ہو۔ یوں تو اس لڑکی کا چکر انوار کے مستقل طور پر گاؤں آنے کے بعد شروع ہوا تھا لیکن اس سے پہلے بھی تو وہ گاؤں آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے دونوں کو کہا کہ وہ اگلے دن تھانے میں آئیں۔ میں مزید پوچھ گچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں یہاں سے سیدھا تھانے آگیا اور گاؤں کے نمبردار کو طلب کر لیا۔ یہ نمبردار پرانا مخبر تھا اسے ساری کہانی بتا کر میں نے کہا کہ میرے ساتھ تعاون

کرو۔ اس نے کہا خاں صاحب! ہماری جان بھی حاضر ہے۔ میں نے کہا مجھ کو جان کی نہیں ملزم کی ضرورت ہے اور واپس تھانے آگیا۔

ان سے اگلے روز دوپہر کا وقت ملاقات کے لیے مقرر ہوا تھا۔ میں نے اگلے دن اس لڑکی بالی کے تینوں بھائیوں کو تھانے بلا بھیجا۔ اس کے علاوہ ایک سپاہی کے ذریعے الیاسے کو بھی بلا لیا۔

بالی کے بھائی یوں تو کافی غنڈہ ٹائپ تھے لیکن ان کی مالی حیثیت بس یونہی تھی۔ مجھ کو معلوم تھا ان کے پیچھے کوئی تگڑی سامی نہیں آنے لگی۔ میں نے پولیس کی مخصوص زبان استعمال کرتی ہوئے انہیں چند ہی منٹ میں ٹھنڈا کر دیا۔ اب وہ گردنیں جھکائے ہوئے سامنے فرش پر بیٹھے تھے۔ الیاسے کے ساتھ اتنی رعایت کی تھی کہ اس کو چارپائی پر بٹھایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انوار کے دونوں دوست بھی تھانے پہنچ گئے۔ میں نے ان چاروں کی شناخت پریڈ کروائی لیکن انوار کے دوست کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکے۔ اتنی دیر میں چودھری برکت اپنے بڑے بیٹے افتخار اور فقیر حسین کے ساتھ آگیا۔ میں نے بالی کے بھائیوں اور الیاس کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کافی دیر بات چیت ہوتی رہی۔ چودھری برکت نے بتایا کہ میں نے امرتسر میں اپنے ایک دوست کو گاڑی کے لیے کہا تھا۔ بیچارے نے گاڑی بمعہ ڈرائیور ہمارے سپرد کر دی ہے۔ افتخار اور اس کے دوست چھ روز سے مختلف جگہوں پر مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ جہاں جہاں کسی نے بھنک ڈالی ہے۔ یہ وہاں وہاں پہنچے ہیں کچھ پتہ نہیں چلا۔ افتخار نے ایک اخبار دکھاتے ہوئے کہا کہ انہوں نے انوار کی تصویر کے ساتھ اخباروں میں اشتہار بھی دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے کئی آدمی گھوم پھر کر اس کی تلاش کر رہے ہیں۔ وہ سخت تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چودھری برکت کے ہاں سے دوپہر کا کھانا آگیا۔ کھانے کے بعد انوار کے دوستوں نے مجھ سے اجازت مانگی۔ میں اور فقیر حسین انہیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ دونوں میں سے ایک نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔

"جناب یہی لڑکا ہے جو اندر بیٹھا ہے جسے آپ افتخار کہہ کر بلا رہے تھے۔ اس نے ہمیں نہیں پہچانا لیکن ہم نے پہچان لیا ہے۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کے میں اندر آگیا۔ افتخار وہیں موجود تھا۔ مجھ کو سمجھ نہیں آرہی تھی میں اس سے کیا پوچھوں۔ بلد بازی سے بچنے کے لیے میں اس معاملے کو کل پر ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران مجھے امید تھی کہ مخبر کی طرف سے بھی کوئی اطلاع مل جائے گی۔ لیکن شام کو وہ منہ لٹکائے آگیا اور بولا کہ خان صاحب سمجھ نہیں آرہی معاملہ بڑا گہرا ہے۔" میں نے اس کو کہا کہ وہ ہمت نہ ہارے اور لگا رہے۔

دوسرے روز میں نے افتخار کو بلا بھیجا۔ ایک سپاہی اس کو اطلاع دینے چلا گیا۔ میں کرسی کی پشت سے سر لگا کر سوچنے لگا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اپنے والد کے برخلاف افتخار کوئی زیادہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ چودھری برکت عموماً" اس سے ناراض رہتا تھا۔ نہ تو والد کے کاروبار اور زمینوں میں اس کو دلچسپی تھی اور نہ ہی گھریلو معاملات میں۔ چھوٹے موٹے کئی کاروبار اس نے اپنے طور پر شروع کئے تھے لیکن ناکام رہا تھا۔ اس کی دلچسپیاں اس کے چند دوستوں تک محدود تھیں وہ ہر وقت ان کے ساتھ مگن رہتا تھا۔ میں نے سوچا اس نے رشتے کی بھی مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ چوری چھپے وہ انوار کی ٹوہ بھی لگاتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے دونوں کے درمیان اندرونی طور پر کوئی ان بن رہی ہو جس کے نتیجے میں آکر انوار اغوا ہو گیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد افتخار تھانے میں آگیا۔ میرے ساتھ اس کی ملاقات کم ہی ہوئی تھی شاید اس وجہ سے وہ کچھ حیران سا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس سے انوار کی تلاشی کے بارے میں پوچھتا رہا پھر میں نے اس سے سوال کیا۔

"افتخار میاں یہ جو رشتہ ہوا ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے تھی؟"

افتخار نے مجھے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "بس جی ٹھیک ہی ہوا ہے۔ سب کی صلاح سے ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا "انوار کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بس جی کچھ خاص نہیں۔ منگنی سے پہلے صرف ایک دفعہ اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

میں نے تیسرا سوال کیا "بالی کے بھائیوں جھنگو، منگو وغیرہ سے تمہاری جان پہچان کیسے ہوئی؟"

اس نے چونکتے ہوئے میری طرف دیکھا پھر قدرے خشک لہجے میں بولا "خان صاحب! آپ مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ مجھ کو انوار کا دشمن سمجھتے ہیں۔"

میں نے اپنا لہجہ قابو میں رکھتے ہوئے کہا "دیکھو چودھری افتخار! میں پولیس والا ہوں۔ ہمیں معاملے پر ہر پہلو سے غور کرنا پڑتا ہے۔ میں تم پر کوئی شک نہیں کر رہا ہوں۔ دراصل سارے کیس کو سمجھنے کے لیے مجھے معلومات کی ضرورت ہے۔ اب اگر تم لوگ ہی درست معلومات نہیں دو گے تو مسئلہ کس حل ہو گا۔ تم نے کہا ہے کہ میں اس رشتے پر راضی تھا۔ جبکہ تمہارا والد کہتا ہے کہ تم نے رشتے کی مخالفت کی تھی۔ تم نے کہا ہے کہ انوار سے تمہارے تعلقات یونہی سے تھے لیکن تم بھیس بدل کر اس کے پیچھے شہر جاتے رہے ہو اور اس کے ملنے والوں سے اس کے بارے میں کھوج لگاتے رہے ہو۔ یہ سب باتیں اس کیس کی ساتھ تعلق رکھتی ہیں پھر تم یہ مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو۔"

افتخار کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "تو ٹھیک ہے خاں صاحب! اتاریئے میرے کپڑے اور شروع ہو جایئے۔ غضب خدا کا آپ ہمارے اوپر ہی شک کر رہے ہیں۔ بھلا اپنے گھر میں بھی کوئی ڈاکہ ڈالتا ہے۔"

اس کا سارا وجود غصے سے کپکپا رہا تھا۔ مجھ کو ایسی باتیں سننے کی عادت نہیں تھی۔ لیکن یہ معاملہ تھا ہی بڑا نازک _ میرے سامنے اس طرح بولنے والا پھر مہینوں زبان نہ نہیں ہلا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے بڑی

مشکل سے خود پر قابو پایا اور اپنے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے اس کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ کو معلوم تھا ایک دفعہ وہ گرمی ضرور کھائے گا لیکن پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ دس منٹ بعد وہ مجھ کو بتا رہا تھا۔"

خاں صاحب ٹھیک ہے میں نے وقتی طور پر رشتے کی مخالفت کی تھی لیکن پھر میں نے سب کی صلاح کے ساتھ اپنی صلاح بھی شامل کر دی تھی۔ باقی یہ بھی درست ہے کہ میں ڈاکٹر انوار کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے شہر گیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کوئی بھائی اپنی بہن کی بھلائی کے لیے اس کے ہونے والے شوہر کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اللہ گواہ ہے میں صرف اسی نظریے سے گیا تھا اور جو بالی کے بھائیوں سے تعلقات کی بات کر رہے ہیں آپ' تو وہ اتنے ہی ہیں جتنے انہوں نے آپ کو بتائے ہیں۔ میں ایک دو بار ان کے گھر گیا ہوں لیکن وہ بھی اس نظریے سے کہ اس معاملے کو اپنے طور پر جاننے کی کوشش کروں۔ اس کے سوا میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اگر کوئی مقصد تھا تو پھر بالی کے بھائیوں نے آپ کو کیوں نہیں بتایا۔"

میں اس نقطے کی کمزوری کو سمجھتا تھا۔ کوشش کے باوجود مجھے بالی کے بھائیوں سے اس کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ افتخار ایک دوبار ان کے گھر آیا ہے اور اس نے جھگڑے کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے۔ افتخار نے اپنے بارے میں اٹھائے سوالوں کے مناسب جواب دے دیے تھے۔ اب یہاں سوچنے کی بات تھی کہ ڈاکٹر انوار کو اغوا کر لیا گیا ہے یا پھر قتل کر دیا گیا ہے۔ کیا کوئی ایسی وجہ تھی جس کی بنا پر افتخار اس سنگین جرم کا مرتکب بنا ہے۔ حالات اور واقعات سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایسی کوئی وجہ نہیں تھی زر اور زمین کے علاوہ ذاتی رنجشیں بھی اس قسم کے واقعات کا سبب بنتی ہیں لیکن افتخار کے معاملے میں ایسی کوئی چیز سامنے نہیں آئی تھی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص نہیں ہے صرف آکڑ خاں ہے لیکن یہ بھی میرا مشاہدہ تھا کہ ایک آکڑ خان شخص کسی بھی وقت آکڑ خانی

چھوڑ کر بدمعاشی اختیار کر سکتا ہے میں تھوڑی دیر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اسے رخصت کر دیا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے؟

میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے سپاہی سریندر کو کہا کہ ایک گھنٹے تک کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ میں یکسوئی سے اس کیس پر غور کرنا چاہتا تھا۔ انوار کو گم ہوئے آج پندھرواں دن تھا انوار علاقے بلکہ شہر کی بھی ایک جانی پہچانی شخصیت تھا کہ چودھری برکت اور فقیر دونوں کو مجھ پر اعتماد تھا ورنہ ہو سکتا تھا اعلیٰ افسران کی طرف سے طلبی کی نوبت آ جاتی۔ دونوں خاندان اور ان کے رشتے دار کھاتے پیتے اور پہنچ والے تھے۔ الیاسے کے سوا دونوں خاندانوں کے اندر کسی پر شبہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ وہی انوار کی طرف سے کسی قسم کی کوئی اطلاع موصول ہوئی تھی بہرحال جن کا لخت جگر گم ہوا تھا وہ آرام سے تو نہیں بیٹھ سکتے۔ اپنے طور پر انہوں نے بھاگ دوڑ جاری رکھی ہوئی تھی۔

میں روز اس خوف کے ساتھ اخبار کھولتا تھا کہ کہیں کسی لاوارث لاش کے برآمد ہونے کی خبر نہ چھپی ہو۔ معاملہ خاصا الجھا ہوا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت جاوید یہاں ہوتا تو کوئی اچھا سا مشورہ دیتا جاوید کا ذکر شاید میں نے آپ سے پہلے نہیں کیا۔ جاوید میرے بڑے لڑکے کے کالج میں پڑھتا تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے اس لڑکے میں میں نے سراغ رسانی اور معاملہ فہمی کی خدا داد صلاحیت کا کھوج لگایا تھا۔ اس کے مشورے بعض اوقات میرے لیے بڑے مفید ثابت ہوتے تھے جب بھی میرے بیٹے کا خط آتا تھا ایک چھوٹا رقعہ اس کی طرف سے بھی ہوتا تھا۔ بڑا ذہین لڑکا تھا۔ کچھ دن پہلے ولائت میں ایک محکمے نے اس کو کسی تعلیمی کورس میں شریک کی دعوت دی تھی وہاں گیا ہوا تھا۔

میرے چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں

جانتا تھا کہ اغوا شدگان کی برآمدگی میں تاخیر بعض اوقات ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے لیکن کوئی راستہ بھی تو ملتا۔ میں کافی دیر بیٹھا سوچتا رہا بائیں ٹانگ میں پھر شدید درد اٹھ رہا تھا۔ میں نے ٹانگ کو اٹھا کر سامنے میز پر رکھ دیا اگر ڈاکٹر انوار موجود ہوتا تو آج میں ضرور اس کے پاس جاتا۔ مجھ کو معلوم تھا اگر شام تک میں نے کوئی دوائی نہ کھائی تو رات کاٹنی مشکل ہو جائے گی۔ تین مہینے پہلے ایک پولیس مقابلے میں مجھے یہ گولی لگی تھی یوں تو زخم منہ مل ہو چکا تھا لیکن گاہے بگاہے شدید دور اٹھتا تھا۔ ارد گرد کوئی اور ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ صرف پار کے گاؤں میں ایک عطائی قسم کا کمپاؤنڈر تھا۔ کیوں نہ اس کے پاس جایا جائے میں نے سوچا اور پھر اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا نہیں ..... ؟ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کاروباری رقابت بھی بعض اوقات اس قسم کے واقعات کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن پہلے میرا دھیان اس طرف کیوں نہ گیا؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ گمشدگی کا واقعہ منگنی کے روز پیش آیا تھا اور اس طرح یہ ایک دوسری نوعیت کا معاملہ بن گیا تھا۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجرم نے تفتیش کو غلط رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہو..... میں اسی وقت اس کمپاؤنڈر کے پاس جانے کا ارادہ کیا

مانع حمل دوائی لی تھی

یہ گاؤں بھی نزدیک ہی واقع تھا۔ میں عام کپڑوں میں کمپاؤنڈر کے پاس پہنچا لیکن وہ مجھے فوراً" پہچان گیا۔ اس کے سامنے مریضوں کا کافی بڑا ہجوم تھا لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے لیے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کا تنومند شخص تھا۔ اس سے پہلے اس کا والد مریضوں کو دیکھتا تھا لیکن اب اس نے گدی سنبھال لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر کسی ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر بھی نہیں رہا تھا۔ بس اپنے باپ کے ساتھ رہ کر اسے دوائیوں کے نام اور استعمال کا پتہ چل

گیا تھا۔ اس کا باپ جوانی میں کسی ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر رہا تھا لیکن وہ صرف انگریزی دوائیاں دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ حسب ضرورت اپنی خود ساختہ دیسی دوائیاں بھی آزماتا تھا۔ بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور انگریزی و دیسی دوائیوں کے اشتراک سے مریضوں کو خبر لیتا تھا۔

وہ کافی ہوشیار قسم کا شخص تھا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید میرے دیکھنے کے انداز کے گھبرا کر مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ اس سے ٹانگ کے درد کی دوائی لینے آیا ہوں۔

وہ باتیں کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رک کر میری طرف دیکھتا لیکن مجھے مسلسل خاموش پا کر پھر باتیں کرنے لگتا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بتدریج اڑتا جا رہا ہے ایک پولیس افیسر کی حیثیت سے اس قسم کے بہت افراد سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ میرا مشاہدہ تھا کہ اس قسم کے لوگوں کو اگر خاموشی کی مار ماری جائے تو وہ بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں مسلسل اس کے چہرے پر جمائے رکھیں اب وہ میری ٹانگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ بغیر میرے کچھ کہے وہ خود ہی ڈاکٹر انوار کی بات کرنے لگا۔

"بہت اچھے ڈاکٹر تھے جی وہ میں تو ان کا مداح ہوں جی بہت تعریفیں سنی ہیں ان کی"

"پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی میں ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔ تیر اندھیرے میں چلایا تھا لیکن نشانے پر لگا اس کے چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا"

"کیا کہہ رہے ہیں جی آپ"

میں سخت جھنجلایا ہوا تھا اور دس منٹ سے میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی تھی۔ میرا ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر پڑا اور الٹ کر زمین پر جا گرا۔ میں نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک بھرپور ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ اس اچانک مار سے وہ بوکھلا گیا اور ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگنے

لگا۔ میں نے اپنی زخمی ٹانگ اس کے پیٹ میں ماری اور ایک دو ہنٹر مار کر اس کو زمین پر گرا دیا۔ مجھ کو اس کی آنکھوں میں جرم کا سایہ نظر آرہا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص اس معاملے میں کسی نہ کسی طرح ضرور ملوث ہے۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ پھر آدھ گھنٹے بعد وہ تھانے میں میرے سامنے فرش پر بیٹھا تھا۔

میں نے اس کو آخری وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ اگر گیدڑوں والی مار سے بچنا چاہتے ہو تو جو کچھ تمہارے ذہن میں ہے کھول کر بیان کر دو۔ لیکن اس نے کسی قسم کا جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں عام طور پر مار پیٹ سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اس وقت میں سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ میں نے ایک سپاہی اور اے ایس آئی پیارے لال کو اشارہ کیا اور وہ اسے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ دس منٹ انہوں نے اس پر صرف کئے اور پھر میرے سامنے حاضر کر دیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ آنکھیں نیم وا تھیں اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ میں نے اس کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے جو طویل بیان دیا اس میں دو کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو اس نے یہ انکشاف کیا کہ چودھری برکت کے بیٹے افتخار نے وقوعہ سے ایک روز قبل اس سے بے ہوش کرنے والی ایک دوائی خاصی مقدار میں حاصل کی تھی اور دوسری یہ کہ افتخار کی ایک محبوبہ بھی تھی جس کے لیے وہ ایک دوبار اس سے مانع حمل دیسی دوائی لے کر گیا تھا۔ کمپاؤنڈر کے بیان سے میں نے اندازہ لگایا کہ افتخار اس کے پاس اکثر آتا جاتا تھا ہو سکتا ہے وہ اندرونی طور پر ڈاکٹر انوار سے کوئی رنجش رکھتا ہو لیکن اس کی باتوں سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بے ہوش ہونے والی دوائی اس نے کس مقصد کے لیے حاصل کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اور اس کے دوست آج کل ایک نئے طریقے سے چکور کا شکار کھیل رہے ہیں' وہ چوری چھپے سرکاری شکار گاہ میں چلے جاتے ہیں انگوروں یا منکوں کے اندر وہ بے ہوش کرنے

والا سفوف بھر دیتے ہیں۔ پھر یہ منکے زمین پر پھیلا دیتے ہیں۔ چکور چونکہ منکوں (خشک انگور) کے بہت شوقین ہوتے ہیں اس لیے وہ ان کو رغبت سے کھاتے ہیں اور شاخوں سے الٹ الٹ کر زمین پر آگرتے ہیں۔ میں خود بھی اس بارے میں کہیں پڑھا یا سنا تھا۔ ہو سکتا ہے افتخار نے ٹھیک ہی کہا ہو ایک سب سے بڑی بات افتخار کے حق میں جاتی تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا محرک نظر نہیں آتا تھا جو اس میں جاتی تھی جو اس کی اس واردات پر اکسا سکتا ہو لے دے کے صرف یہ جواز رہ جاتا تھا کہ اس نے رشتے کی مخالفت کی تھی لیکن میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ گھریلو معاملات سے الگ تھلگ اور لاپرواہ شخص صرف مخالفت کی وجہ سے اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا تھا۔ پھر بالی کے بھائی تھے ان کو ڈاکٹر انوار سے پرانی عداوت تھی اور یہ کمپاؤنڈر تھا جو کاروباری رقابت کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ یقیناً ان تینوں میں سے ہی کوئی انوار کی گمشدگی کا ذمہ دار ہے _____ لیکن افتخار کی محبوبہ ہو سکتا ہے اس جانب سے کوئی راستہ نکل آئے میں نے سوچا۔

لڑکی نے کہا جی ہاں!

اس لڑکی کا نام کمپاؤنڈر گورو چرن نے "سرنوں" بتایا تھا۔ اس کا گھر اس کے گاؤں میں تھا۔ کمپاؤنڈر نے بتایا تھا کہ افتخار اور سرنوں کے عشق کے بارے میں شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ گوروچرن کو بھی اس بارے میں صرف اس لیے پتہ چلا تھا کہ افتخار نے اس سے ایک دو دفعہ دوائی لی تھی۔ افتخار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کو اس کے بارے میں بھنک نہیں پڑنے دے گا۔ میں نے سوچا کہ کل اس لڑکی سے ملاقات کی جائے پھر نجانے کس خیال کے تحت میں نے اگلے روز کی بجائے اسی وقت اس معاملے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس دن سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ شام نہیں ہوئی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے روشنی بہت کم ہو چکی تھی۔

میں نے جلدی جلدی گھوڑے پر کاٹھی ڈلوائی اور نکل کھڑا ہوا۔ ابھی

میں آدھے راستے میں ہی تھا کہ چھوٹی بوندیں گرنے لگیں۔ سامنے سے بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میری جگہ کوئی اور تھانیدار ہوتا تو شاید کبھی اس وقت اپنے آرام کو حرام نہ کرتا۔ ایک بار تو میرا بھی دل چاہا کہ واپس لوٹ جاؤں صبح دیکھا جائے گا۔ لیکن پھر دل کڑا کر کے میں آگے بڑھتا رہا۔ جب میں گاؤں میں پہنچا گہرا اندھیرا چھا چکا تھا۔ گلیاں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ میں سیدھا کمپاؤنڈر گوروچرن کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک عمر رسیدہ شخص کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ میں وردی میں تھا۔

مجھ کو دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرایا پھر فوراً" باہر نکل آیا۔ وہ بڑی حیرانگی سے مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔

"بزرگوار! میں آپ سے کچھ پوچھنے حاضر ہوا ہوں۔"

"ضرور ضرور سرکار! میں حاضر ہوں!" بوڑھے نے جلدی سے کہا۔

اتنے میں اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ "کون ہے چاچا" اور پھر ایک شخص باہر نکلا۔ میں اس کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ الیاسا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر بولا "خاں صاحب! آپ یہاں۔ آپ نے مجھے کہا ہوتا میں خود تھانے میں حاضر ہو جاتا"

میں نے کہا "میں اس وقت تم سے ملنے نہیں آیا تھا بہرحال اچھا ہوا جو تم سے ملاقات ہو گئی۔"

الیاسے نے کہا "چاچا میں دروازہ کھولتا ہوں۔ خاں صاحب کو اندر بٹھاؤ۔"

چند لمحے بعد ساتھ والے دروازے میں حرکت پیدا ہوئی الیاسا بولا " آجائیں خاں صاحب"

میں ٹوپی سے پانی کے قطری جھاڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک چارپائی اور دو تین کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیوں پر جھالروں والا بوسیدہ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا مجھ سے کافی ہٹ کر چارپائی پر بیٹھا تھا۔ الیاسا دودھ کا کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے ایک نظر

بوڑھے کے چہرے پر ڈالی پھر اچانک اس سے پوچھا۔

"الیاسے سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔"

بوڑھے نے کہا "سرکار الیاسا ہمارا دور کا رشتے دار ہے۔ میری بیٹی سرنوں اس کی بچپن کی منگ ہے۔" یہ ایک نیا انکشاف تھا۔

میں نے پوچھا "تم نے اب تک ان کی شادی کیوں نہیں کی؟"

"بس جی غریب لوگ ہیں چار کپڑے تیار کرتے کرتے دیر ہو گئی اور پھر الیاسا بھی جلدی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے اپنے کاروبار کو چلانا چاہتا تھا۔ بہرحال جی اب امید ہے کہ ہم جلدی شاید کر دیں گے۔"

میرے ذہن میں جیسے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ کانوں میں یہ فقرہ گونج رہا تھا۔ "میری بیٹی سرنوں الیاسے کی منگ ہے؟" عجیب کھچڑی سی پکی ہوئی تھی لیکن کوئی گمشدہ کڑی اچانک مل گئی تھی اور اب حالات و واقعات کی پوری زنجیر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میں نے اندرونی جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بزرگوار میں آپ کی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور جناب ضرور" بوڑھا فورا" اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے معلوم تھا اس کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے لیکن وہ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد "الیاس" چائے لے کر آگیا۔ اتنے میں بوڑھا بھی بیٹی کو لے آیا۔ لڑکی نے گردن جھکائی ہوئی تھی اور دوپٹہ اس کے سر پر کافی آگے تک ڈھلک آیا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پھر میں نے الیاسے اور اس کے ہونے والے سسر سے کہا کہ وہ دونوں چند منٹ کے لیے باہر چلے جائیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ لڑکی بری طرح گھبرا رہی تھی اور میں اس کے جسم کی کپکپاہٹ صاف محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا "لڑکی کی پردہ پوشی شاید تم نے کی ہو لیکن میں تمہارا یہ قصور بھی معاف کرنے کو تیار ہوں۔ تم جو بات مجھے بتاؤ گی وہ صرف مجھ تک رہے گی۔ تمہارے ہونے والے خاوند یا تمہارے والدین کو اس کا بالکل پتہ نہیں چلے

گا- میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ چودھری برکت کے بڑے بیٹے افتخار کے ساتھ تمہارے کس قسم کے تعلقات ہیں؟"

وہ خاموش رہی' اس کے پاؤں کا انگوٹھا بڑی تیزی سے مٹی کرید رہا تھا-

"لڑکی میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں مجھے تمہارا جواب چاہیے-"

لڑکی نے اپنا سر تھوڑا سا اٹھایا- تب پہلی بار میں نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھی- وہ بلا کی خوبصورت تھی- بالکل سفید رنگ جو خوف سے کچھ مزید سفید ہو گیا تھا- سنہری آنکھیں اور شہد رنگ بال جب اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں- میرے چہرے کی سختی دیکھ کر جیسے خود بخود اس کے منہ سے نکلا-

"جی ہاں" مزید سوال و جواب کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا- میں تیزی سے اٹھا اور بغیر کسی سے ملے باہر نکل آیا... مجھے مجرم کو گرفتار کرنا تھا-

وہ فرار ہو رہا تھا

بارش پہلے سے تیز ہو گئی تھی گلی سے باہر ایک برگد تلے میں نے گھوڑا کھڑا کیا تھا- میں نے گھوڑا لیا اور تیزی سے واپس روانہ ہو گیا- ابھی میں قصبے کی آبادی سے کوئی فرلانگ بھر دور ہی تھا کہ ایک شخص ہاتھ میں سوٹ کیس پکڑے تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا- جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے دیکھا کہ اس نے ایک موٹے کھیس کی بکل ماری ہوئی تھی- اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا لیکن چال کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی- مجھے شک سا ہوا-

"کون ہے بھئی؟" میں نے کڑک کر پوچھا-

کھیس پوش ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکا اور پھر دوستانہ انداز میں میری

طرف بڑھا۔ وہ افتخار تھا۔ میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ سناؤ افتخار چودھری اتنے خراب موسم میں کہاں جانے کا ارادہ کر لیا؟" میں اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹولتے ہوئے کہا افتخار نے کھیس ہٹاتے ہوئے کہا۔

"خاں صاحب! صبح سیشن میں ایک پیشی تھی _ والد صاحب کو یاد ہی نہیں رہا۔ اب ان کو یاد آیا ہے تو مجھے بھیج دیا ہے"

میں نے صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

افتخار نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا پھر غصیلے لہجے میں بولا

"خاں صاحب آپ کے دل میں ہے کیا؟ مجھے صاف بتا دیں"

میں اس وقت صورت حال کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ساتھ کوئی سپاہی بھی نہیں تھا۔ بارش کے ڈر سے میں نے پستول بھی ساتھ نہیں رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ٹانگ میں بھی شدید ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ میں نے سوچا اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو مسئلہ بن جائے گا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"باؤ افتخار' دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ مجھے خدانخواستہ تم پر کوئی شک نہیں ہے۔ میں دراصل انوار کے کیس کے بارے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں بارش میں بات چیت ٹھیک نہیں۔ دس منٹ کی بات ہے میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ واپس میں میں تمہارے ساتھ عملے کا کوئی آدمی بھیج دوں گا۔ وہ گھوڑے پر تم کو پکی سڑک تک چھوڑ آئے گا۔

افتخار نے جانے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا "خاں صاحب مجھے چکروں میں نہ ڈالیں مجھے بہت جلدی ہے۔

میں اب تک بہت برداشت کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ گھوما اور ایک تھپڑ چٹاخ سے اس کے منہ پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی بلند آواز میں میں نے اس کو دو تین گالیاں دیں۔ اس نے اٹھ کر تیزی سے بھاگنا چاہا لیکن میرے دھکے نے اس کو پھر زمین پر گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھتا میں نے اس کو

چھاپ لیا۔ بلند آواز سے گالیاں دینے کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ تھوڑی دور کھیتوں کے درمیان ایک کوٹھا بنا ہوا تھا۔ وہاں سے دو آدمی لالٹین اور لاٹھیوں سے مسلح اس جگہ پہنچ گئے۔ میں نے افتخار کو اپنے نیچے دبایا ہوا تھا اور وہ خود کو چھڑانے کی زبردست جدوجہد کر رہا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں جب آنے والوں نے میری وردی کی جھلک دیکھی تو انہوں نے میرے ساتھ پورا تعاون کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس کو اس کے گلوبند سے اچھی طرح باندھ چکے تھے۔

وہی لڑکی کا چکر

تھانے پہنچ کر ایک گھنٹے کے اندر اندر افتخار نے سب کچھ اگل دیا۔ چودھری برکت کو جب پتہ چلا کہ افتخار ہی اصل مجرم ہے تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ رات دس بجے ہم نے افتخار کو ساتھ لیا اور بذریعہ گاڑی لاہور سے ہوتے ہوئے مانگا منڈی پہنچے۔ پکی سڑک سے دو میل ہٹ کر اینٹوں کے ایک بھٹے کے قریب جا کر ہم نے گاڑی روکی۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہم ٹارچ وغیرہ جلانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ افتخار کی نشاندہی پر ہم اینٹوں کے بنے ہوئے ایک الگ تھلگ کمرے میں پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک تنومند شخص نے دروازہ کھولا۔ اندر لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ سپاہیوں نے اس کو گرفت میں لے لیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک چارپائی کا لحاف اٹھا کر میں نے سونے والے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو ہڈیوں کا ایک اسانچہ نظر آیا۔ یہ ڈاکٹر انوار تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور چہرہ پہچاننا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ اس کیحالت بہت نازک تھی۔ ہم اس کو لاہور میو ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ مسلسل نشہ آور دوائیاں استعمال کرنے سے اس کا جسم اور ذہن بری طرح سے متاثر ہو چکا ہے۔ چند دن کے

علاج کے بعد انوار بولنے کے قابل ہو گیا لیکن افسوسناک بات یہ تھی کہ اس کا دماغ بھی ٹھکانے پر نہیں رہا تھا۔

میں نے ابتدائی تفتیشی رپورٹ میں پوری تفصیل سے افتخار کا جرم اور وجہ جرم بیان کی تھی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے "الیاسا" بانو کو چاہتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ لیکن اس سے پہلے اس کی منگنی خاندان میں ہی سرنوں نامی لڑکی سے ہو چکی تھی۔ ٹھیک ہے سرنوں بہت خوبصورت تھی لیکن دل آنے کا کیا پتہ ہوتا ہے۔ الیاسے کا دل افتخار کی بہن یعنی اپنی خالہ زاد بانو پر آگیا۔ بعد ازاں بانو کے رشتے کے سلسلے میں ڈاکٹر انوار کا نام لیا جانے لگا۔ دوسری طرف الیاسے کے والدین بھی اس کو مسلسل مجبور کر رہے تھے کہ وہ بانو کا خیال چھوڑ کر اپنی منگیتر کو بیاہنے کا خیال کرے۔ لیکن اتنی دیر میں سرنوں الیاسے یعنی اپنے منگیتر کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر افتخار کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ افتخار بھی چوری چھپے اس سے ملتا تھا۔ وہ اس پر بری طرح فریفتہ ہو چکا تھا۔ سرنوں نے جیسے اس پر جادو کر رکھا تھا۔ افتخار کو پتہ تھا کہ اگر بانو کا رشتہ انوار کے ساتھ ہو گیا تو الیاسا مایوس ہو کر ماں باپ کو اپنی خوشی پوری کرنے کی اجازت دے دے گا۔ یعنی سرنون کی شادی الیاسے سے ہو جائے گی۔ وہ سخت پریشان ہوا اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ اگر بانو کا رشتہ اس کے والد کی مرضی کے مطابق انوار سے نہ ہوا تو پھر اس کی ماں کی مرضی کے مطابق الیاسے سے ہو گا۔ اس طرح یقینی طور پر سرنوں' الیاسے کے ساتھ نہیں بیاہی جائے گی اور اس کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے اس رشتے کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اس نے اس بات پر زیادہ زور اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اس کی بات بہت کم مانتا ہے۔ وہ جتنی شد و مد سے اس رشتے کی مخالفت کرے گا اس کا باپ اتنا ہی پکا ہو جائے گا۔

اس کا باپ کئی بار کہہ چکا تھا کہ انوار جیسا صالح نیک اور فرمانبردار لڑکا' بانو کے لیے پھر نہیں ملے گا۔ افتخار نے سوچا کہ وہ کسی طرح انوار کی

نیکی اور فرمانبرداری کو ڈھونگ ثابت کر سکے تو اس رشتے کو روکا جا سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شہری لڑکے عموماً" رنگین مزاج ہوتے ہیں اس لیے انوار کی زندگی کے کچھ تاریک پہلو بھی ضرور ہوں گے۔ اس نے ایسے معاملات کی کھوج لگائی لیکن ناکام ہوا۔ اپنی مسلسل ناکامیوں پر وہ جھلا اٹھا اس کو انوار کی نیک نامی سے چڑ اور پھر عداوت سی ہو گئی۔

منگنی کے رو اس نے انوار سے ملاقات کی اور اسے صاف الفاظ میں کہا کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے۔ انوار ایک سمجھدار لڑکا تھا۔ وہ جانتا تھا افتخار کی اس کے گھر میں کیا حیثیت ہے اور پھر انتظامات کے بعد عین موقع پر وہ کسی قسم کی بدمزدگی بھی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال منگنی ہو گئی۔ رات کو جب وہ حسب معمول ٹہلنے کے لیے باہر نکلا تو گلی کے ایک تاریک گوشے میں افتخار اور اس کے تین دوست اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے اس پر قابو پا کر اسے دوائی کھلائی اور بے ہوش کر کے اپنے ساتھ قصبے میں لے آئے۔ گمشدگی کے بعد تین روز تک انوار قصبے میں ہی رہا۔ بعد ازاں انہوں نے انوار کو اسی گاڑی میں ڈالا جو اس کو تلاش کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔ اس کے ذریعے وہ اسے لاہور اور پھر مانگا منڈی لے گئے۔

یہاں افتخار کے ایک دوست نے انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے بھٹے کے ایک ویران کمرے میں انوار کو ایک بیمار رشتہ دار کی حیثیت سے رکھا۔ دوائی کی جگہ وہ اسے بے ہوشی کا سفوف پلاتے رہے۔ سفوف کے مسلسل اور ضرورت سے زیادہ استعمال کی وجہ سے انوار کی بینائی جاتی رہی اور اس کا دماغ بھی متاثر ہوا۔ اگر ایک یا دو دن پولیس اس تک نہ پہنچ سکتی تو وہ یقینی طور پر ہلاک ہو جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ افتخار اس کو خود ہی ہلاک کر دیتا۔

افتخار کے قانون سے بچے رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ سرنوں سے اس کے تعلقات ایک راز کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر کمپاؤنڈر کی گرفتاری

عمل میں نہ آتی تو اس تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ یہ کمپاؤنڈر کی گرفتاری ہی تھی جس نے اسے چوکنا کر دیا تھا اور گرفتاری سے قبل اس نے رفو چکر ہونے کی کوشش کی تھی۔

افتخار پر قتل کی نیت سے اغواء کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ چودھری برکت نے اس کی بالکل پیروی نہیں کی۔ اس کی ماں نے اپنے طور پر کچھ کوشش کی لیکن پھر بھی اس کو پانچ سال قید کی سزا ہو گئی۔ چودھری برکت کا ایثار ملاحظہ فرمائیں کہ اس نے بانو کی شادی ڈاکٹر انوار سے ہی کی۔ الیاسے نے کچھ عرصہ بعد سرنوں سے شادی کر لی۔ ڈاکٹر انوار کا ذہنی توازن آہستہ آہستہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ شاید یہ اس ماں کی دعاؤں کا اثر تھا جس نے سولہ روز تک مصلہ نہیں چھوڑا تھا.....

——— ○ ○ ○ ———

پھانسی کا پھندا

سردیوں کے دن تھے میں تھانے کے صحن میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ یہ خاص امرتسر شہر کا تھانہ تھا' پھر بھی ہر روز ایک دو فوجداری کیس یہاں پہنچ جاتے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہفتے میں ایک بھی سنگین نوعیت کا معاملہ تھانے تک نہیں آیا تھا۔ جس طرح کا آدمی کا کام ہوا اس طرح کی طبعیت ہو جاتی ہے۔ فرصت کی وجہ سے میں سخت بیزار ہو رہا تھا۔

اس وقت کوئی گیارہ بجے ہوں گے جب تھانے کے سامنے ایک کار آکر رکی میں فوراً" پہچان گیا۔ یہ ٹھاکر آنند کمار کی کار ہے۔ ٹھاکر کا امرتسری میں کپڑے کا کاروبار تھا۔ نواحی قصبے تاندیانوالہ میں بھی اس کی ایک کافی بڑی دکان تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک "کٹڑی" بھی آباد کر رکھی تھی۔ کٹڑی کے کرایہ داروں سے اسے ماہانہ دو ڈھائی ہزار روپے وصول ہو جاتے تھے۔ حال ہی میں اس نے شہر کے فیشن ایبل علاقے میں اپنے لیے ایک خوبصورت کوٹھی بنوائی تھی۔ مجموعی طور پر ٹھاکر ایک اچھا آدمی تھا۔ علاقے کے لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

گاڑی میں سے ٹھاکر کا بیٹا رشی برآمد ہوا۔ اس نے سفید دھوتی کرتے پر نہرو کیپ پہن رکھی تھی۔ نکلتے ہوئے قد کا وہ ایک قبول

صورت نوجوان تھا۔ دو تین مرتبہ پہلے بھی اس سے ملاقات ہو چکی تھی اپنے کچھ کرایہ داروں سے ان کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس سلسلے میں ٹھاکر آنند سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ پہلے تو میں سمجھا شاید لڑکا کرایہ داروں ہی کا کوئی مسئلہ لے کر آیا ہے لیکن جب میں نے اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا تو اندازہ ہوا کہ معاملہ اس سے بڑھ کر ہے خیر خیریت کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ اس نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا کہ بابا "شمو" فوت ہو گیا ہے۔ جس شخص کو وہ بابا شمو کہہ رہا تھا اس کا اصل نام شمس خاں تھا۔ وہ بڑا نیک اور پرہیز گار شخص تھا۔ عمر کوئی ساٹھ ستر کے درمیان ہوگی۔ میں اسے دو تین دفعہ ٹھاکر آنند کی کوٹھی میں دیکھ چکا تھا میری معلومات کے مطابق ٹھاکر آنند کا بڑا بھائی موہن کمار جو کچھ عرصہ پہلے خود بھی ایک لکھ پتی شخص تھا' بابا شمو کو "ڈلہوزی" سے لے کر آیا تھا۔ بابا شمو کوئی بیس سال ٹھاکر موہن کمار کے گھر مالی کے طور پر کام کرتا رہا۔ کوئی ڈیڑھ سال قبل موہن کمار مر گیا تو بابا شمو ٹھاکر آنند کے پاس آگیا وہ بڑا خوش مزاج اور خدمت گار آدمی تھا۔ میں نے کئی دفعہ ٹھاکر انند کو بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ پولیس والے کسی شخص کے بارے میں اس وقت معلومات اکٹھی کرتے ہیں جب انہیں اس پر کوئی شک ہو یا پھر وہ شخصیت بہت اہم ہو لیکن بابا شمو کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر میں اس کے بارے میں اس قدر معلوم رکھتا تھا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی بابا شمو کی دلکش شخصیت سفید داڑھی اور سفید لمبے بالوں میں گھرا ہوا اس کا سرخ و سپید چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ہر وقت خوش و خرم نظر آنے والا یہ چہرہ بے جان ہو چکا ہے۔ رشی نے واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

صبح کافی دیر جب بابا شمو نظر نہیں آیا تو خانساماں اس کی کوٹھڑی میں گیا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ کافی دیر بابا شمو کو آوازیں دیتا رہا

لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا اس نے آکر مجھے ساری بات بتائی میں اس کے ساتھ کوٹھری پر پہنچا تو دو تین ملازم دروازہ کھٹکھٹا کر بابا شمو کو جگانے کی کوشش کر رہے تھے میں سمجھ گیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے دروازے کے ساتھ والی کھڑی بھی اندر سے بند تھی میں کوٹھڑی کے عقب میں پہنچا یہاں بھی ایک کھڑکی ہے اتفاقاً" اس کھڑکی کا ایک پٹ اندر سے بند نہیں تھا میں نے زور سے دھکا دیا تو کھڑکی کھل گئی۔ اندر سے بدبو دار دھوئیں کا ایک بھبکا باہر نکلا میں نے غور سے دیکھا تو ایک دلخراش منظر میرے سامنے تھا۔ باب شمو فرش پر پشت کے بل پڑا تھا اس کی کمر اور گردن کا ایک بڑا حصہ کوئلے کی انگیٹھی پر گرنے سے جل چکا تھا۔ رشی نے بتایا کہ رات زیادہ سردی کی وجہ سے بابا شمو نے کوئلے کی انگیٹھی دہکائی اور کھڑکیاں دروازے بند کر کے سو گیا کمرے میں گیس بھر گئی اور وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہو گیا۔

میں نے اسی وقت رشی کے ساتھ ان کی کوٹھی پہنچا۔ گلی محلے کے بہت سے لوگ کوٹھی کے اندر باہر جمع ہو چکے تھے۔ کوٹھی کی بغل میں بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ ملازم کے کوارٹر تھے۔ ایک کوارٹر کے سامنے کافی رش نظر آ رہا تھا کوٹھی میں داخل ہوتے ہی مجھے جلے ہوئے گوشت اور کپڑے کے سڑاند محسوس ہوئی تھی جوں جوں میں بابا شمو کے کوارٹر کی طرف بڑھ رہا تھا سڑاند میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی تماشائیوں نے ادھر ادھر ہٹ کر رستہ دیا میں بڑی احتیاط سے کمرے میں داخل ہوا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا ٹھاکر آنند اور رشی وغیرہ بھی ہمراہ تھے کمرے کی صورت حال صاف طور پر حادثاتی موت کی طرف اشارہ کر رہی تھی کوئلے کی گیس کی وجہ سے بابا شمو کا دم گھٹا تھا لیکن بے ہوش ہونے سے چند لمحے پہلے اس نے خود کو بچانے کی جدوجہد کی تھی وہ چارپائی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تھا لیکن ہاتھ دروازے کی چٹخنی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی

اور وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلاتا انگیٹھی کے اوپر جا گرا تھا انگیٹھی پر گرنے سے اس کی کمر اور گردن کا بڑا حصہ جل گیا تھا اور پشت کے پٹھے کھنچ جانے سے لاش عجیب انداز میں اکڑی ہوئی تھی میں نے سب انسپکٹر کو کمرے کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا اور خود باہر آ کر ٹھاکر آنند کے پاس بیٹھ گیا۔ ٹھاکر نے بتایا کہ شمو کے دو رشتے دار لاہور میں کام کرتے ہیں اس نے انہیں بلانے کے لئے آدمی بھیج رکھے ہیں ہمارے وہاں بیٹھے بیٹھے وہ دونوں آدمی آ گئے ان میں سے ایک شمو کا سگا بھانجا تھا۔ وہ ماموں کی لاش دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھوڑی دیر بعد میں دونوں افراد کو ایک طرف لے گیا میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ کسی قسم کی تحقیقات کروانا چاہتے ہیں انہوں نے کہا "جناب! سب کچھ ہمارے سامنے ہے جو ہونا تھا وہ ہو گیا' تحقیقات میں کیا رکھا ہے' خواہ مخواہ میت خراب ہو گی۔" میں نے ان کی بات سے اتفاق کیا۔ ٹھاکر نے بابا شمو کی میت اس کے گاؤں بھجوانے کے لئے ایک ٹرک کا انتظام کر دیا۔ میں نے ٹھاکر سے کہہ کر ایک معقول رقم بابا شمو کے بھانجے کو دلوا دی۔

بظاہر یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن کی بات ہے میں اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اخبار ایک طرف رکھ کر میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ دھیان ایک بار پھر بابا شمو کی طرف چلا گیا تھا۔ میں ٹھاکر آنند سے ملنے گیا تھا۔ بابا گھاس پر کپڑا بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ جب میں واپس آیا تھا تو بابا اسی کپڑے پر لیٹا سو رہا تھا۔ سنہری دھوپ میں اس کا چہرہ کتنا صحت مند لگ رہا تھا۔ گلاب کے پودوں سے گزرتی ہوئی ہوا کے جھونکے اس کے سفید بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے کتنی پر سکون زندگی ہے اس شخص کی میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا تھا۔ محنت و مشقت کے بعد کتنے مزے سے پاؤں پھیلائے سو رہا ہے اور پھر میری نگاہوں میں کل کا منظر گھوم گیا۔ فرش

پڑی ہوئی بابا شمو کی اینٹھی ہوئی لاش مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں اور تکلیف سے بگڑا ہوا چہرہ' پتہ نہیں خدا اپنے نیک بندوں کو اتنی تکلیف کیوں دیتا ہے اور پھر اچانک ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا۔ میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں نے جلدی سے میز کی دراز کھینچی اور سب انسپکٹر منوہر لال کا بنایا ہوا نقشہ دیکھنے لگا۔ یہ نقشہ میرے خیال کی تصدیق کر رہا تھا۔ بابا شمو کی چارپائی اس طرح پڑی تھی کہ اس کے پاؤں کا رخ قبلے کی طرف تھا۔ بظاہر بات معمولی تھی لیکن میرے لیے اہم تھی بہت ہی اہم ایک عام مسلمان بھی اس بات کی احتیاط کرتا ہے کہ سوتے وقت اس کے پاؤں قبلے کی طرف نہ ہوں' تو کیا بابا شمو جیسا دیندار اور نمازی شخص اس قسم کی غلطی کر سکتا ہے ..... نہیں یہ نا ممکن ہے۔ تو پھر کیا اس کی موت اتفاقیہ نہیں تھی ..... وہ کسی سازش کا شکار ہوا ہے؟ کیا اسے مردہ حالت میں کمرے کے اندر لایا گیا تھا؟ ایک ساتھ بہت سے سوال میرے ذہن میں اٹھنے لگے۔

○

اگلے روز میں پھر ٹھاکر آنند کے ہاں گیا۔ کمرے کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ گھر کے افراد سے ملا لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ موت حادثاتی طور پر واقع ہوئی ہے اور اگر ایسا نہیں تھا اور بابا شمو کو قتل کیا گیا تھا تو پھر اس قتل کا منصوبہ بنانے والوں کی عقل کی داد دینا پڑتی تھی۔ انہوں نے اس قتل کو حادثہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ میں نے ٹھاکر آنند اور اس کے گھر والوں پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ میں ان پر کسی قسم کا شک کر رہا ہوں۔ قبلے کی طرف پاؤں والی بات اہم ضرور تھی لیکن جب تک اور ثبوت نہ ملتا کسی پر شک کرنا فضول تھا۔ میں نے گھر کے ملازموں اور شمو کے دوسرے ملنے جلنے والوں سے بھی سوالات کیے۔ ہر ایک نے خلوص دل سے اس کی تعریف کی۔ سب

اس کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ لڑائی جھگڑا تو دور کی بات ہے کسی سے اس کی تو تو میں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے افراد میں ٹھاکر کے علاوہ اس کی بیوی بیٹا اور دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ میں نے فردا" فردا" سب سے پوچھ گچھ کی۔ اچانک مجھے ٹھاکر کی بھتیجی کا خیال آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹھاکر موہن کمار کے مرنے کے بعد اس کی اکلوتی لڑکی اپنے چچا یعنی آنند کمار کے پاس رہنے لگی تھی۔ میں نے اس سی ملنے کی خواہش ظاہر کی تو پتہ چلا کہ وہ کالج کی سہیلیوں کے ساتھ سیر کے لیے کراچی گئی ہوئی ہے۔ ٹھاکر آنند کے گھر کا ماحول آزدانہ تھا۔ اس کی دونوں لڑکیاں نیکر اور بوشرٹ پہنے میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ ایک لڑکی تو گیارہ بارہ سال کی تھی لیکن دوسری جوان تھی۔ دیکھنے والوں کو تو ان کے مغربی لباس پر سخت شرمندگی محسوس ہوتی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے اسے اپنی برہنگی کا احساس ہی نہیں۔ وہ بیڈ منٹن کا ریکٹ اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی۔ ٹھاکر کی بھاری بھر کم بیوی بھی قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آدھی آستین کی تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔ بہر حال اپنی بیٹیوں کی نسبت وہ قدرے گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ٹھاکر نے بتایا تھا کہ شیلا یعنی اس کی بھتیجی کی چند روز میں شادی ہونے والی ہے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی جو چند روز بعد دلہن بننے والی ہے اتنی آزادی کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے۔

قریبا" پندرہ روز بعد ایک بار پھر میرا ٹھاکر آنند کے ہاں آنا ہوا۔ وہی کرایہ داروں کا پرانا جھگڑا تھا۔ آنا تو سیٹھ کو تھا نے تھا لیکن وہ کچھ لیٹ ہو گیا۔ نجانے کیوں میں خود اس کے ہاں چلا آیا۔ ایک انجانی سی جستجو مجھے وہاں کھینچ لائی تھی۔ میں نے سوچا چلو اسی بہانے ٹھاکر کی بھتیجی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ہو سکتا تھا اس سے بابا شمو کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہو جاتی۔ بابا شمو بیس سال تک ان کا ملازم رہا تھا۔ شیلا اس کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ پھر موہن کمار کی موت کے بعد شیلا جب چچا کے ہاں آئی تھی تو صرف بابا شمو ہی اس کے ساتھ تھا۔ ایک طرح وہ شیلا

کے خاص ملازم کے طور پر اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے سوچا مجھے شیلا سے ضرور ملنا چاہیے۔ پچھلے دنوں شیلا کی شادی ٹھاکر آنند کے بیٹے رشی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ میری معلومات کے مطابق وہ لوگ ہنی مون منانے کے بعد کل ہی شملہ سے واپس آئے تھے۔ میں جب موٹر سائیکل پر سوار کوٹھی پہنچا، ٹھاکر آنند اپنی گاڑی گیراج سے نکال رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ میرے ہی ہاں جا رہا تھا۔ مین نے کہا چلو یہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں" وہ کچھ متذبذب نظر آرہا تھا۔ لیکن جب میں موٹر سائیکل بند کرکے نیچے اتر آیا تو مجبوراً اسے بھی گاڑی واپس گیراج میں لے جانا پڑی۔ وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ دراصل اس کے کرایہ دار اس کے خلاف "متحدہ محاذ" بنانے میں کامیاب ہو گئی تھے۔ برنیدر سنگھ نامی ایک نوجوان جو کچھ کچھ بدمعاشی میں پاؤں رکھتا تھا چار سال کی جیل کاٹ کر حال ہی میں باہر آیا تھا۔ وہ بھی ٹھاکر کا کرایہ دار آیا تھا اس نے چند ہی دنوں میں تمام کرایہ داروں کو اپنے گھر اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ لوگ کمروں کی مرمت اور کرایہ میں کمی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پرسوں ان لوگوں نے ٹھاکر کے چند ملازمین کو بری طرح پیٹا تھا۔ میں تھا کہ برینڈر سنگھ نامی اس لڑکے کا حوصلہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ ذاتی طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ٹھاکر نے کرایہ میں جو اضافہ کیا ہے وہ مناسب ہے اور وقت کے مطابق۔ ہاں البتہ کمروں کی مرمت کا مسئلہ قابل غور تھا میں کوشش کر رہا تھا کہ ٹھاکر کٹڑی والوں کا یہ مطالبہ مان لے۔ میں برینڈر سنگھ سے ملاقات کرکے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی۔ الٹی پٹی پڑھانے والوں نے اس کا دماغ سخت خراب کر رکھا تھا۔ اچانک بالکل نیا خیال میرے دماغ میں آیا۔ بابا شمو کی موت پر ٹھاکر نے بتایا تھا بابا عموماً" کٹڑی میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں کے ایک شخص کٹڑی میں کرایہ پر مکان دلوا رکھا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کٹڑی آتی جاتے اس کا برینڈر سنگھ سے جھگڑا ہوا ہو یا بابا شمو کے سامنے یہ برینڈر نے ٹھاکر کے بارے میں کوئی غلط بات کی ہو۔ بابا شمو نے اسی برا بھلا کہا ہو جس کا برینڈر کو رنج ہو اور اس نے اسے

..... میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی میرا خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ بابا شمو کی موت اتفاقیہ نہیں تھی۔ بہرحال تفتیش کے اس مرحلے پر خیالی گھوڑے تو دوڑائے جا سکتے تھے یقین سے کچھ کہنا بہت دشوار تھا۔

ٹھاکر اس کا بیٹا اور میں کافی دیر کٹڑی والوں کے مسئلے پر غور کرتے رہے۔ رشی کافی مشتعل نظر آرہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بریندر کو گرفتار کرکے تھانے لے آؤ اور مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دوں' لیکن میں اور ٹھاکر آنند سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا درست نہیں۔ طاقت کے استعمال سے معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں بابا شمو کا ذکر آگیا۔ میں نے موقعہ غنیمت جان کر شیلا کے بارے میں پوچھا۔ رشی نے بتایا کہ وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے میکے کے ذکر پر میں نے حیرت کا اظہار کیا تو ٹھاکر ہنس کر بولا۔

"تمہاری حیرت بجا ہے انسپکٹر شیلا کا میکہ اور سسرال دونوں یہیں ہیں لیکن اس نے اپنی پھوپھی کے گھر کو میکہ بنا لیا ہے۔ لڑکیاں ایسی حرکتیں کرتی ہی رہتی ہیں"

"کب تک آجائے گی وہ؟" میں نے رشی سے پوچھا۔

"کہتی تھی جب دل اداس ہو جائے گا چندی گڑھ سے ٹیلی فون کر دوں گی' یہ فقرہ ٹھاکر کی بڑی لڑکی نندہ نے ادا کیا تھا۔ وہ تنگ پتلون قمیص میں ملبوس ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے شریر انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"میں چٹیا کاٹ دوں گا' ڈیڈی کے سامنے" رشی اس پر جھپٹا اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"بڑا پیار ہے دونوں میں" ٹھاکر آنند نے انہیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

○

میں دوپہر کے کھانے کے لیے اٹھنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ اے

ایس آئی کرامت نے آکر سلیوٹ کیا "سر! بریندر سنگھ حاضر ہے"

"اچھا ٹھیک ہے اسے اندر لاؤ۔" میں نے پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد چک میں حرکت ہوئی اور بریندر اندر داخل ہوا۔ بلا مبالغہ اس کا قد پونے سات فٹ کے قریب تھا جسم زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ اس نے لال تہمند کے اوپر پھولدار قمیص پہن رکھی تھی۔ کلف لگی پگڑی نے اس کے قد میں ایک آدھ فٹ کا اور اضافہ کر دیا تھا۔ شکل سے وہ ایک اکھڑ مزاج شخص دکھائی دیتا تھا۔ بائیں گال پر تیز دھار آلے کا پرانا نشان تھا۔ گریبان کھلا ہوا تھا اور سینے کے سیاہ بال داڑھی کے ساتھ ملے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ست سری اکال کیا۔ میں نے اس کے گریبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے بند کرو۔ اس نے دو بٹن بند کر لیے ایک بٹن اب بھی کھلا ہوا تھا میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کل اس کے بارے میں بھی جو شک پڑا تھا وہ میرے ذہن میں محفوظ تھا لیکن میں نے فی الحال بابا شمو کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اسے کرایہ داری کے سلسلے میں بلایا تھا۔ کافی دیر میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ایسا کام کرے جس سے کرایہ داروں کی حق تلفی بھی نہ ہو اور ٹھاکر کو بھی زیادہ نقصان نہ اٹھانا پڑے لیکن وہ بدستور اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا رہا۔ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"آخر بات کیا ہے؟ تم ٹھاکر کے اتنے دشمن کیوں ہو..... آخر اس نے کچھ مہربانیاں جناب؟" وہ تلخ لہجے میں بولا "میری ماں کو دھکے دیے ہیں ٹھاکر کے لڑکے نے میری بھابی کو گالیاں دی ہیں' میری بھابھی کو تھپڑ مارے ہیں' اور یہ دھکے یہ تھپڑ ہمارے حصے میں ہی نہیں آئے۔ کٹڑی کے ہر گھر پر مہربانیاں ہیں ٹھاکر اور اس کے نوکروں کی"

میں نے دیکھا اس کے گلے کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"دیکھو بریندر سنگھ" میں نے تیز لہجے میں کہا" مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تم حد سے بڑھ رہے ہو ..... مجھے پتہ چلا تھا کہ جب ٹھاکرانی کرایہ لینے کے لیے کٹڑی میں آتی تھی' تو تم نے اس سے بھی بدتمیزی کی تھی۔ کیا شریف لوگوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے؟"

"مائی باپ میری بات کا غصہ نہ کرنا" بریندر نے کہا "شریف لوگوں سے ہی شریفوں کی طرح بات کی جاتی ہے ....." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا مطلب" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر بدمعاش آدمی ہے؟"

بریندر آگے کو جھکتا ہوا بولا "جناب اگر شریف آدمی ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اس کی بھتیجی کہاں ہے اور کیا گل کھلا رہی ہے؟"

"پوری بات کھول کر بتاؤ" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا "جناب! ٹھاکر کی ایک نوکرانی سے مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ ٹھاکر کی بہو شیلا کسی پھوپھی وغیرہ کے گھر نہیں گئی' یہ سب چکر ہے۔

"تو پھر کہاں گئی ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو اسے بھی معلوم نہیں۔ لیکن اس نے بتایا ہے کہ اس کی پھوپھی تو ایک عرصہ ہوا چندی گڑھ سے کہیں اور جا چکی ہے یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں"

میں سوچ میں پڑ گیا مجھے پہلے ہی ٹھاکر اور اس کے گھر والوں کے رویے سے الجھن ہو رہی تھی۔ کئی بار میں نے لڑکی کا پوچھا تھا لیکن ایک بار بھی انہوں نے لڑکی سے ملاقات نہیں کروائی تھی۔ اگر بریندر کی اطلاع درست تھی اور شیلا کی پھوپھی چندی گڑھ میں نہیں تھی تو پھر شیلا کہاں گئی تھی۔ ٹھاکر نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ معاملہ مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ کہیں شیلا کی گمشدگی کا بابا شمو کی موت کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے تھوڑی

سوچ بچار کی اور پھر اس سلسلے میں بریندر سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے کہا

"دیکھو بریندر! میں جھوٹ بولنے والے کی زبان کھینچ لیا کرتا ہوں۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ ٹھاکر صاحب کی بھتیجی کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں؟"

بریندر سنگھ نے اطمینان سے کہا" جناب ثبوت ڈھونڈنا کونسا مشکل ہے۔ نوکرانی اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ میں کل ہی اس سے معلوم کرتا ہوں۔"

میں نے اسے سختی سے ہدایت کی کہ کوئی ٹھوس ثبوت ملنے تک یہ خبر باہر نہ نکلنے پائے۔ اس نے راز داری کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

تیسرے دن صبح سویرے وہ تھانے چلا آیا۔ اس کے چہرے پر ویسا ہی جوش نظر آ رہا تھا مخبروں کے چہرے پر اکثر نظر آتا ہے۔

"کیا خبر لائے ہو بریندر؟" میں نے اس کے ست سری اکال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ کچھ کہنے کی بجائے اس نے ایک کاغذ جیب سے نکال کر مجھے تھما دیا۔ اس پر چندی گڑھ شہر کا ایک پتہ لکھا ہوا تھا۔ کہاں سے ملا یہ پتہ؟ میں اس سے پوچھا۔

"بس جی مل گیا" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے والا" چندی گڑھ کا ایک شخص یہاں ملازمت کرتا ہے وہ ٹھاکروں کے گھر کے پاس ہی رہتا ہے اس کا کہنا ہے کوئی ایک سال پہلے شیلا کی پھوپھی اپنے خاوند کے پاس بنگال چلی گئی تھی۔ اس کا خاوند وہاں چائے کا کاروبار کرتا ہے اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ شیلا کی صرف ایک ہی پھوپھی ہے اگر آپ اپنے طور پر پتہ کرنا چاہتے ہیں تو تھانے کے کسی آدمی کو چندی گڑھ بھیج دیجئے ساری بات کھل جائے گی"

میں خواہ مخواہ کا شک کر کے ٹھاکر کے سامنے کچا پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا آدمی بھیج کر تصدیق کر لینی چاہیے۔ اسی روز میں نے ایک اے ایس آئی کو اس کام پر روانہ کیا۔ اگلے روز صبح سویرے اس نے رپورٹ

پیش کر دی ہمسایوں نے بتایا تھا کہ ٹھاکرانی کوئی ایک سال پہلے اپنے خاوند کے پاس سلہٹ چلی گئی تھی۔ مکان انہوں نے پہلے کرایہ پر چڑھایا تھا لیکن بعد میں فروخت کر دیا ..... ٹھاکر آنند کے جھوٹ کا پول کھل چکا تھا اس روز شام کے وقت میں اس کی کوٹھی میں داخل ہوا ٹھاکر اور ٹھاکرانی دونوں پوجا کے کمرے میں تھے میں ڈرائینگ روم میں بیٹھا انتظار کرتا رہا بائیں باغ سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹھاکر کے بچے بیڈ مٹن کھیل رہے تھے کوئی دس منٹ بعد ٹھاکر ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تھوڑی دیر کے رسمی گفتگو کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آگیا میں نے کہا۔

"ٹھاکر صاحب! میں جو سوال آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اس کا تعلق آپ کی گھریلو زندگی سے ہے لیکن میں یہ سوال اس لئے پوچھ رہا ہوں ....."

ٹھاکر نے میری بات کاٹی "میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں انسپکٹر! کچھ لوگ شیلا کے بارے میں باتیں بنا رہے ہیں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے" ٹھاکر کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔

"لیکن شیلا ہے کہاں" میں نے اس سے پوچھا

ٹھاکر نے رومال سے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ جھوٹ بولا تھا لیکن یہ جھوٹ صرف عزت بچانے کے لیے تھا۔ میں اپنے خاندان کی بدنامی کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ انسپکٹر! میں لوگوں کو کیسے بتاتا..... کیسے بتاتا کہ میری بہو گھر سے بھاگ گئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لی اور لا۔

"وہ شادی کے دوسرے روز ہی گھر سے چلی گئی تھی۔ ہم نے اس بات کو چھپانے کے لیے کہا کہ میاں بیوی ہنی مون منانے گئے ہوئے ہیں۔ اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے میں نے اس کی تلاش جاری رکھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی بعد میں ہمیں بہانہ گڑنا پڑا کہ وہ اپنی پھوپھی کے ہاں چلی

گئی ہے" اتنے میں ٹھاکر دونوں لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ باپ کو چند لاڈ دکھا کر لڑکیاں رخصت ہو گئیں تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور بولا" بچیوں کو اصل معاملے کی خبر نہیں وہ یہی سمجھتی ہیں پھوپھی چندی گڑھ گئی ہوئی ہے۔"

"لیکن شیلا کے گھر سے جانے کی کچھ وجہ بھی تو ہو گی"

"وہ ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ وہی اسے ورغلا کر لے گیا ہے"

"کیا نام ہے اس کا۔ اس وقت وہ کہا ہے"

"کچھ معلوم نہیں" ٹھاکر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ بولا' یہ سلسلہ کوئی ڈھائی تین سال پرانا ہے لڑکا جس کا نام یوسف ہے موٹر مکینکی کرتا ہے بڑے بھائی صاحب کی ورکشاپ سے موٹر ٹھیک کروایا کرتے تھے وہیں سے وہ شیلا کے پیچھے پڑ گیا۔ لڑکی نا سمجھ اس کے ورغلانے میں آگئی خاموشی سے معاملہ آگے بڑھتا رہا اس دوران بھائی صاحب فوت ہوگئے ہمارے ہاں آگئی۔ اس لڑکے نے یہاں بھی شیلا کا پیچھا نہیں چھوڑا میں نے ایک دو بار سختی سے شیلا کو سمجھایا تو وہ کچھ سمجھ گئی ایک رات لڑکا گھر میں گھس آیا۔ آپ اس وقت ابھی تھانے میں نہیں آئے تھے ایک بڑا سخت قسم کا سکھ انسپکٹر یہاں کا انچارج تھا اس نے لڑکے کو گرفتار کر لیا میں چاہتا تھا کہ لڑکے کی تھوڑی بہت مرمت ہو جائے اور وہ راہ راست پر آ جائے لیکن سکھ انسپکٹر صاحب نے اسے اتنی بے دردی سے پیٹا کہ اسے جان کے لالے پڑ گئے وہ کوئی ایک ہفتہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔ یہ خبر شیلا سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اس روز سے مجھے اپنا دشمن خیال کرنے لگی۔ میں جو کچھ کر رہا اس کی بہتری کے لیے کر رہا تھا لیکن نجانے اس کے ذہن میں کیا بات بیٹھ گئی تھی سارے لوگ جانتے ہیں کہ جس وقت بھائی کی وفات ہوئی ان کی مالی حالت کیا تھی۔ دو وقت کی روٹی چلانی مشکل تھی کون سی لاکھوں کی جائیداد تھی جس کے لیے میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتا تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ میں اس کا برا سوچتا ہوں۔ وہ شادی پر تو رضا مند ہو گئی

لیکن نیم دلی سے اگر مجھے معلوم ہوتا تو وہ میری عزت کو سرعام نیلام کر دے گی تو کبھی یہ قدم نہ اٹھاتا..... کبھی نہیں"

ٹھاکر پھر اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگا اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا "شیلا کے ساتھ ساتھ وہ لڑکا بھی گھر سے غائب ہے ہم نے اپنے طور پر اس کے گھر والوں سے کچھ معلوم کرنے بہت کوشش کی لیکن انہوں نے لڑکی یا لڑکے کا کوئی سراغ نہیں بتایا"

میں نے کہا " ٹھاکر صاحب آپ اچھے بھلے سمجھ دار آدمی ہیں ایسی باتیں کہیں چھپانے سے چھپتی ہیں آپ نے بہت وقت ضائع کیا ہے اگر آپ فوراً" پولیس میں رپورٹ درج کر دیتے تو لڑکی برآمد ہو چکی ہوتی۔ ٹھاکر نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا" انسپکٹر خدا کے لیے اس معاملے کو اب یہیں رہنے دو ہمیں اس لڑکی کی کوئی ضرورت نہیں وہ جو کچھ اس گھر سے لے گئی ہے ہم نے اسے بخشا وہ جہاں سے وہیں رہے ہم اس باپ کی گٹھڑی کو کیا کریں گے" ٹھاکر بہت جذباتی نظر آ رہا تھا میں نے اس وقت کوئی مزید بات کہنی مناسب نہیں سمجھی۔ بہرحال معاملے کی تحقیق ضروری تھی اور خاص طور پر بابا شمو کی موت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اس قصے کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

○

اگے روز میں ٹھاکر کے بتائے ہوئے پتے پر موٹر مکینک یوسف کے گھر پہنچا۔ قریب ہی کچی آبادی کا یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا عالیشان کوٹھیوں کے عقب میں جھونپڑا نشینوں کی یہ بستی عجیب تضاد پیش کرتی تھی دروازے پر دستک دی تو ایک بڑھیا باہر نکلی۔ میری وردی دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ میرے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں" بڑھیا ہمیں اندر لے گئی۔ گلی میں کئی راہ گیر ہمیں دیکھ کر

دروازے کے پاس کھڑے رہے ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں باہر نکل کر جھاڑا اتنے میں کمرے سے ایک جوان لڑکی اور نو دس سال کا ایک بچہ برآمد ہوا لڑکی عام شکل و صورت کی تھی۔ اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لڑکے کے ہاتھ میں تختی پکڑی ہوئی تھی۔

"گھر میں کوئی مرد نہیں ہے" میں نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا"

نہیں تھانیدار جی" عمر رسیدہ عورت نے دکھی آواز میں کہا گھر کی رونق تو پتر کے ساتھ تھی اسے ہی دشمنوں نے قتل کر دیا

"ٹھہرو مائی جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو" مجھے معلوم تھا اگر میں نے عورت کو ذرا ڈھیل دی تو وہ رو رو کر محلہ اکٹھا کر لے گی "تمہارا بیٹا کتنے عرصے سے غائب ہے"

"آج پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے میرے لال کو گم ہوئے"

"تھانے میں رپورٹ درج کرائی؟"

"کس کے خلاف کراتی" عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکروں کے خلاف کراتی تو وہ میرے ان بچوں کو بھی قتل کر دیتے" عورت اب زور زور سے رونے لگی تھی میں کوئی دس منٹ ان کے درمیان بیٹھا رہا لڑکی اور لڑکے سے بھی کچھ سوالات کیے مجھے اندازہ ہوا کہ یوسف کے قتل والی بات تو ان لوگوں نے یونہی کہی ہے۔ انہیں خود بھی شک ہے کہ لڑکا اپنی مرضی سے کہیں گیا ہے کوئی ماں ایسی نہیں ہوتی جو کسی ڈر کی وجہ سے اپنے بیٹے کے قاتلوں کے خلاف زبان نہ کھولے۔ اگر عورت کو یقین ہوتا کہ ٹھاکروں نے اسے قتل کروایا ہے تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر روتی چلاتی تھانے پہنچ جاتی میں نے عورت کو نرمی سے سمجھایا کہ اگر وہ صحیح بات پولیس کو نہیں بتائے گی تو یوسف کی تلاش بہت مشکل ہو جائے گی اور اگر وہ جلدی نہ ملا تو ہو سکتا ہے سچ مچ کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے یوسف کی بہن بڑے غور سے میرے باتیں سن رہی تھی وہ جلدی سے اٹھ کر اندر گئی اور ایک کاغذ لے کر باہر آ گئی۔ یہ ایک منی آرڈر تھا بھیجنے والے کا نام یوسف تھا اس نے جنوری کے

شروع میں ہوشیار پور کی موضع سنت وال سے ۴۰ روپے اپنی ماں کے نام بھیجے تھے اس کی ماں برابر واویلا کر رہی تھی نہیں جھوٹا منی آرڈر ٹھاکروں نے بھیجا ہے۔ انہوں نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے "یوں لگتا تھا اس کے حواس ٹھکانے نہیں لڑکی نے جھجکتے ہوئے مجھے بتایا جب سے ویر گیا ہے ماں کی یہی حالت ہی پھر وہ منی آرڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی" یہ تین چار دن پہلے ملا ہے چاچا (باپ) اسی دن سے ہوشیار پور گیا ہوا ہے میں تھوڑی دیر لڑکی سے یوسف کے بارے میں سوالات کرتا رہا اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یوسف اور شیلا ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے شیلا کئی دفعہ اپنی کار میں ان کے گھر بھی آئی تھی۔ وہ یوسف کی ماں کو ماسی کہتی تھی اور گھنٹوں اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ یوسف کی بہن سے بھی اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے وہ اسے قیمتی تحفے لا کر دیتی رہتی تھی میں بڑی دیر سے لڑکی کے کانوں میں آویزاں بندوں کی طرف دیکھ رہا تھا بندے کافی قیمتی تھے اور مجھے شک میں مبتلا کر رہے تھے لیکن اب لڑکی نے خود ہی وضاحت کر دی تھی۔ جاتے جاتے میں نے لڑکی سے کہا کہ جب اس کا والد گھر آئے تو میرے پاس تھانے پہنچے۔

تھانے واپس آکر میں یوسف کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری تحقیق و تفتیش کا اصل مقصد بابا شمو" کی موت کا پتہ چلانا تھا اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ٹھاکر اور اس کے ارد گرد گھومنے والے کرداروں میں ہی کہیں باباشمو کا قاتل چھپا ہوا یوسف کے گھر والوں کے مطابق یوسف کوئی ڈیڑھ ماہ قبل گھر غائب ہوا تھا اور اس کے چھ دن بعد شیلا کی شادی ہوئی۔ یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی شادی سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے غائب ہوا اور یہ بھی خارج از امکان نہیں تھا کہ بابا شمو کی ہلاکت سے اس کا کوئی تعلق ہو۔ دوسری طرف نریندر کا چال چلن بھی مشکوک تھا میں نے باباشمو کی قبر کھود کر اس کا پوسٹ مارٹم کرنے کی درخواست دی تھی لیکن اس سلسلے میں کچھ قانونی دشواریاں آڑے آ رہی تھیں۔ یوں بھی اس واقع کو اب ڈیڑھ

مہینہ ہونے کو آیا تھا اور پوسٹ مارٹم سے مبشت نتائج برآمد ہونے دشوار تھے ..... میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا کہ ہو نہ ہو یہ یوسف کا باپ ہے اس کا آدھے سے زیادہ سر گنجا تھا۔ ایک میلی سی دھوتی قمیص اس نے پہن رکھی تھی۔ وہ سخت خوفزدہ نظر آ رہا تھا برآمدے میں رک کر وہ اے ایس آئی سے کچھ پوچھنے لگا۔ میں کمرے سے اے ایس آئی کو آواز دی کہ بوڑھے کو اندر لے آؤ وہ اسے اندر لے آیا۔ بوڑھے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں "بیٹھ جاؤ بابا" میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جھجکتا ہوا چارپائی کے بازو پر بیٹھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا" میں نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"اللہ دتہ جناب سائیکل رکشہ چلاتا ہوں" وہ میرا اگلا سوال سمجھ کر بولا۔

"اللہ دتے! بیٹے کا کچھ پتہ چلا" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں سرکار" دو دن ہوشیار پور میں "جنجل ہوتا رہا ہوں"

"دیکھو اللہ دتے" میں نے گرج کر کہا مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو سیدھے سیدھے بتاؤ کہ لڑکی اور لڑکے کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ اسی میں تم سب کی خیریت ہے۔

اللہ دتہ چارپائی سے اٹھا اور میرے قدموں میں گر گیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا "خدا کی قسم تھانیدار جی! اس میں کوئی قصور نہیں۔ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ میں نے ٹھاکر صاحب کے سامنے اپنے چھوٹے بچے کی قسم کھائی تھی آپ کے سامنے بھی قسم کھاتا ہوں کہ ہمیں یوسف کے بارے میں کچھ پتہ نہیں"

اگر پولیس قسموں پر اعتبار کرنے لگے تو کوئی مجرم پکڑا نہ جا سکے۔ ہر مجرم خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ پولیس والی اپنے تجربے اور قابلیت کی بناء پر جھوٹ سچ کو علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ ایک کٹھن اور باریک بینی کا کام ہے۔ یہی مرحلہ ہے جہاں محنتی

اور کام چور پولیس والے کی پہچان ہوتی ہے۔ کام چور پولیس والا باریک بینی سے بچنے کے لیے ہر مشکوک شخص پر ڈنڈا برسانا شروع کر دیتا ہے جب کہ محنتی پولیس والا غور و خوض سے کام لیتا ہے اور شریف لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنانے سے گریز کرتا ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اللہ دتہ اس حد تک ٹھیک کہہ رہا ہے کہ یوسف کے بارے میں اسے کچھ پتہ نہیں میں نے اس شرط کے ساتھ اسے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ تھانے میں اطلاع دیے بغیر شہر سے باہر نہیں جائے گا اور جونہی اسے یوسف کے بارے میں کوئی اطلاع ملی فوراً" پولیس کو آگاہ کرے گا۔ وہ میری نرم دلی سے بہت متاثر نظر آرہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر کوئی اور تھانیدار ہوتا تو اس کے بیوی بچے بھی تھانے میں بیٹھے نظر آتے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک مخبر کو اس کے پیچھے لگا دیا اور ہدایت کی کہ بوڑھے کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ تھانے کے ایک آدمی کو اپنا رقعہ دے کر موضع سنت وال" کے پوسٹ ماسٹر کے پاس بھیجا۔ اس رقعے میں میں نے یوسف کا حلیہ لکھا تھا اور کہا تھا کہ اگر یہ لڑکا یا کوئی اور شخص امرتسر کے مذکورہ پتے پر منی آرڈر بک کروانے آئے تو اسے روک لیا جائے اور اس کی اطلاع مقامی پولیس اسٹیشن کو دے دی جائے اور دوسرا رقعہ میں نے پولیس اسٹیشن کے انچارج کے نام بھی لکھ دیا تھا۔

○

تھانے میں آتے جاتے لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شیلا کے گھر سے بھاگنے کی خبر تیزی سے پھیل رہی ہے۔ لوگ لڑکی کو برا بھلا کہہ رہے تھے چچا نے اسے یتیم اور بے آسرا جان کر سہارا دیا تھا۔ گھر کی بہو بنایا تھا لیکن وہ اس کے گھر کا صفایا کر کے بھاگ گئی تھی لیکن کچھ لوگ برنیدر جیسے بھی تھے وہ کہتے تھی کہ ٹھاکر اپنی یتیم بھتیجی کے ساتھ سختی سے پیش آتا

تھا۔ اس نے زبردستی اس کی شادی اپنے بیٹے سے کی۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ شادی کے روز لڑکی کو بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی اور بے ہوشی کی حالت ہی میں نکاح نامے پر اس سے دستخط کروائے گئے تھے۔ اس بارے میں یہ دلیل بھی دی جاتی تھی کہ شادی نہایت خاموشی سے ہوئی تھی۔ اور ٹھاکر کے چند عزیزوں اور خاص دوستوں ہی نے اس میں شرکت کی تھی۔

ٹھاکر سے ان افواہوں کے بارے میں پوچھنے کے لیے ایک دن میں اس کی کوٹھی گیا۔ چوکیدار نے اندر جا کر اطلاع دی۔ رشی نمودار ہوا ہوئی مجھے ڈرائینگ روم میں لے گیا۔ ٹھاکر سلیپنگ گاؤن پہنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بیزار سا نظر آرہا ہے۔ شاید اپنی کوٹھی کی طرف اٹھنے والی انگلیوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں اس نے بتایا کہ نکاح کے وقت شیلا کی بے ہوشی کی بات بالکل من گھڑت ہے اور اصل معاملے سے پولیس کی توجہ ہٹانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ درحقیقت شیلا نے ظاہر کیا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس لیے وہ نڈھال اور خاموش نظر آرہی تھی۔ دھوم دھام سے شادی نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چند روز پہلے بابا شمو کی موت ہو گئی تھی۔ رشی کی ماں شبھ گھڑی کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے سیدھے سادھے انداز میں پھیرے دے دیے گئے۔ ٹھاکر نے کہا "میرا خیال تھا کہ بعد میں ایک بڑی دعوت کر دیں گے ..... لیکن ہمارے تو سارے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔"

میں نے رشی سے بھی کچھ دیر گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ شیلا سے شادی میں اس کی پسند و ناپسند کو کوئی دخل نہیں تھا۔ پتا جی نے کہا اور اس نے منظور کر لیا۔ پتا جی چاہتے تھے کہ گھر کی لڑکی گھر میں رہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ شیلا کو وراثت میں کیا کچھ ملا تھا۔ ٹھاکر آنند نے کہا۔

"انسپکٹر! بھائی صاحب کا کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ ایک پرانی گاڑی' ایک مکان اور ایک دس مرلے کا پلاٹ۔ یہ تھا جو ان کے پاس باقی بچا تھا۔ کل کوئی ڈیڑھ لاکھ کی جائیداد تھی۔ اس تمام رقم سے بمشکل ان کے قرضے

ادا ہوئے۔ ایک ایک پائی کا حساب میرے پاس موجود ہے۔ مجھے معلوم تھا کل کچھ لوگ شک کریں گے میں نے کوڑی کوڑی لکھ رکھی ہے۔ میری منع کرنے کے باوجود وہ کاغذ لینے چلا گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور رشی سے اس کی سہاگ رات کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ شادی کی رات شیلا نے بیماری کا بہانہ کیا۔ آدھی رات تک رشی اس کی تیمارداری میں لگا رہا۔ پھر وہ سو گئی۔ رشی بھی کمرے میں ہی سویا رہا۔ صبح وہ اٹھا تو شیلا کمرے میں موجود نہیں تھی۔ دروازے کی چٹخنی گری ہوئی تھی۔ الماری کھلی ہوئی تھی اور تمام زیورات غائب تھے۔ بعد ازاں ٹھاکر کی الماری کی چابیاں بھی گم پائی گئیں۔ دن چڑھے جب الماری کو توڑا گیا تو اس میں موجود نقدی اور زیورات بھی غائب تھے۔

○

ہوشیار پور سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ یوسف کی طرف سے پہلا منی آرڈر آئے مہینہ ہو چلا تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ بریندر سنگھ اندر داخل ہوا۔ میں نے اسے گھور کر کہا۔

"بریندر تم سے کئی بار کہا ہے کہ خوامخواہ منہ اٹھا کر نہ چلے آیا کرو۔ اس طرح کرو گے تو میرے کسی کام کے نہیں رہو گے۔"

وہ ڈھٹائی سے ہنستا ہوا بولا "مائی باپ! ہم نے ساری عمر کوئی مخبری تھوڑی کرنی ہے۔ میں تو صرف ٹھاکر کا دشمن ہوں، جس دن دشمنی ختم مخبری ختم" میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بولا "اس وقت ایک کام کی بات لایا ہوں جناب"

"جلدی بکواس کرو" میں نے بیزاری سے کہا۔

"جناب یوسف کا پتہ چل گیا ہے۔ میرے ایک دوست نے اسے سرگودھے میں دیکھا ہے۔ وہ وہاں کسی سرکس میں کام کرتا ہے۔"

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا" میں نے غصے سے کہا "میرا خیال ہے کہ تم خود سرکس میں کام کرتے رہے ہو۔ بیوقوف آدمی کہاں سرکس اور کہاں یوسف اور پھر ہوشیار پور کہاں اور سرگودھا کہاں۔"

"مائی باپ! بھگو قسم کھاتا ہے کہ وہ یوسف ہی تھا۔ وہ ایک میلے میں موت کے کنوئیں پر ٹکٹیں دے رہا تھا۔ اس نے نہیں پہچانا لیکن بھگو نے پہچان لیا"

اتنے میں اے ایس آئی نے آکر سلیوٹ مارا "جناب! سائیکل رکشے والا بابا آیا ہے۔"

میں نے اسے اندر بھیجنے کو کہا۔ اللہ دتے نے سلام کیا اور ایک کاغذ سامنے میز پر رکھ دیا۔ یہ ایک منی آرڈر تھا اس میں کچھ روپے لپٹے ہوئے تھے۔ "یہ آج ہی آیا ہے سرکار" اللہ دتہ نے انکساری سے کہا۔ میں نے منی آرڈر فارم غور سے پڑھا.... بریندر سنگھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ یہ ۶۰ روپے منی آرڈر سرگودھا سے آیا تھا۔ خط والی جگہ پر صرف یہ الفاظ لکھے تھے " میں بالکل خیریت سے ہوں۔ سب گھر والوں کو سلام" وہ خود تو ان پڑھ تھا۔ ظاہر ہے کسی اور ہی سے لکھوایا ہو گا میں نے اللہ دتے کو پیسے واپس کر دیے اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ منی آرڈر فارم میں نے پاس ہی رکھ لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بریندر سے پوچھا "تمہارے دوست نے یوسف کو کب دیکھا تھا"

"جناب یہی کوئی بیس پچیس دن پہلے کی بات ہے۔"

"لیکن تم نے اطلاع آج دی ہے؟"

"جناب بھگو وہاں کسی کارخانے میں ملازم ہے۔ مہینے بعد گھر چکر لگاتا ہے"

"تم یوسف کو پہچانتے ہو؟"

"کیوں نہیں جی۔ جو اڑوس پڑوس کے لوگوں کو نہ پہچانے وہ بھی کوئی آدمی ہوتا ہی۔ وہ ٹھاکر کی کوٹھی کے پچھواڑے والی جھگیوں میں رہتا ہے۔

ان کے ساتھ ہی ہماری کٹڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انسپکٹر دلجیت کے ساتھ ایک تفتیشی پارٹی بھیج رہا ہوں تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

میں نے سب انسپکٹر کو ہدایات دینے کے لیے بلایا لیکن پھر نجانے کیوں عین وقت پر ارادہ بدل دیا۔ مجھے یہ معاملہ بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یوسف اور شیلا کی گرفتاری سے بابا شمو کی پر اسرار موت پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خود سرگودھا جاؤں گا۔

میں نے صرف بریندر سنگھ کو ساتھ لیا اور بذریعہ بس سرگودھا روانہ ہو گیا۔ امرتسر سے براستہ لاہور کوئی ۱۳۵ میل کا سفر ہے۔ ہم اگلے روز صبح سویرے سرگودھا پہنچ گئے۔ پوچھتے پوچھتے ہم کوئی دس بجے سرکس پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑا سرکس تھا۔ کھلی جگہ پر ایک وسیع و عریض شامیانہ نظر آرہا تھا۔ اس شامیانے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بے شمار خیمے لگے ہوئے تھے۔ بڑے شامیانے کے عقب میں سرکس کے جانوروں کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہاتھی کا ایک بچہ بڑے شامیانے کے سامنے باندھا گیا تھا۔ اس کے گرد تماشائی دائرے کی صورت میں کھڑے تھے۔ سرکس تو ابھی بند تھا لیکن موت کے کنویں کا ٹکٹ گھر کھلا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی قطار ٹکٹ گھر کے سامنے نظر آرہی تھی۔ اوپر پلیٹ فارم پر بھی تیس چالیس آدمی کھڑے تھے۔ بس اڈے سے یہاں تک آتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شہر میں سرکس کا کافی چرچا ہے۔ جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ایک سجے سجائے تانگے کے اوپر ڈھول والا منادی کر رہا تھا مس نیلو فر کے حیرت انگیز کمالات دیکھنے کے لیے تشریف لائیں۔ مس نیلو فر نے سارے شہر کو حیران کر دیا ..... وغیرہ وغیرہ" پتہ نہیں یہ نیلو فر کون تھی۔ سرکس کمپنی کی طرف سے لگائے گئے پوسٹروں میں بھی اسی لڑکی کی تصویر نظر آتی تھی۔ سرکس کی کامیابی اس بات سے ظاہر تھی کہ اسے لگے ہوئے قریباً

ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ کیونکہ بھگو کے کہنے کے مطابق اس نے کوئی چار ہفتے پہلے یوسف کو یہاں دیکھا تھا۔

میں اور بریندر سنگھ چلتے ہوئے ٹکٹ گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں سادہ کپڑوں میں تھے بلکہ کہنا چاہیے کہ میں سادہ کپڑوں میں تھا اس لیے اس بات کا امکان نہیں تھا کہ یوسف ہماری آمد سے مشکوک ہو جائے گا۔ میں نے کھڑکی میں سے جھک کر اندر دیکھا لیکن یوسف کی بجائے وہاں ایک ادھیڑ عمر سانولا سا شخص بیٹھا تھا۔ میں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو روکا وہ سرکس کے ایک کتے کو گود میں اٹھائے سیٹی بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے سرکس کے مالک کے بارے میں پوچھا۔ اس نے پہلے تو غور سے میرا جائزہ لیا پھر ہاتھ کی انگلی سے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ سرخ رنگ کا ایک بڑا سا خیمہ دوسرے خیموں سے کچھ ہٹ کر لگا ہوا تھا۔ خیمے سے باہر دو آدمی دھوپ میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں حساب کتاب میں مصروف ہیں۔ ہم دونوں نے دیہاتی لباس پہن رکھا تھا جب ہم خیموں کی طرف بڑھے تو ایک آدمی لپک کر ہمارے پاس آیا۔

"ائے بھیا! کدھر جاتے ہو منہ اٹھائے۔ ادھر داخلہ منع ہے۔" اس نے چھڑی ہلاتے ہوئے کہا۔

بریندر سنگھ نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ وہ پھر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ شکل و صورت سے وہ بمبئی کا کوئی فاقہ زدہ ایکٹر نظر آتا تھا۔ "ہم نے تم کو بولا ہے تم ادھر کو نہیں جا سکتا" وہ کڑک کر بولا۔ اتنے میں میز پر بیٹھے ہوئے موٹے آدمی کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ کوئی معاملہ فہم شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ملازم کو آواز دے کر کہا کہ ان لوگوں کو آنے دو۔

"کیا بات ہے بھئی! کیوں جھگڑا کر رہے ہو" موٹے آدمی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم امرتسر سے آئے ہیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ یوسف نام کا ایک لڑکا یہاں ملازم ہے۔"

"یو سپ (یوسف)" موٹے آدمی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا " ارے ہاں یاد آیا- وہ گورا چٹا موٹر مکینک .... موٹا آدمی کچھ کہتے کہتے رک گیا-

"جی ہاں وہی" میں نے جلدی سے کہا "وہ میرا بھتیجا ہے- گھر سے ناراض ہو کر آگیا ہے- بڑی مشکل سے تلاش کرتے یہاں پہنچے ہیں-"

"ہاں بھئی! مہینہ بیس روج اس نے کام کیا تھا ادھر' پھر جانے کو مانگتا تھا- ہم نے کہا جاؤ بابا- ہمارا دس پندرہ روپیہ بھی تھا اس کی طرف (طرف) میں نے کہا "بھائی صاحب! آپ کو کچھ تو معلوم ہو گا کہ کہاں گیا ہے وہ؟"

"جو کچھ پتہ تھا تمہیں بتا دیا نی' موٹا آدمی پھر حساب کتاب میں مشغول ہو چکا تھا- اسے اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کہ ہم اتنی دور سے چل کر اس کے پاس پہنچے ہیں-"

میں نے کہا "بھائی صاحب! اس کے کسی یار دوست یا ساتھی ملازم سے ہی ملا دیں-"

"ہمارا بھیجہ مت کھراب کرو" ساتھ والا شخص بھڑک کر بولا "جو مالم تھا بول دیا- کچھ اور پوچھنا ہے تو ادھر مینجر سے بات کرو" میں سمجھ گیا کہ اصلیت بتانی ہی پڑے گی- میں نے لہجہ بدل کر کہا-

"سیٹھ صاحب! ذرا اٹھ کر خیمے میں چلیں- میں پولیس انسپکٹر ہوں اور ایک اہم معاملے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں-"

سیٹھ نے چونک کر میری طرف دیکھا- میں نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا- ایک لمحے میں اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا- اس نے جیب سے رومال نکال کر جلدی سے چہرہ صاف کیا اور کھڑا ہو گیا- ذرا ہی دیر بعد ہم سیٹھ کے سجے سجائے خیمے میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے- سیٹھ نے آواز دے کر کسی کو چائے کا کہا- وہ بار بار رومال سے اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا- یا تو یہ اس کی عادت تھی یا اتنی سردی میں واقعی اسے

پسینہ آرہا تھا۔ میں نے کہا "سیٹھ صاحب! وہ لڑکا ایک اہم معاملے میں پولیس کو مطلوب ہے ہمیں اس کے بارے میں پوری معلومات چاہیں۔"

اتنے میں دروازے کا پردہ ہلا اور ایک لڑکی کا سراپا نظر آیا میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا وہ پوسٹر والی نیلو فر تھی۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ اس کے سیاہ لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ایک بوسیدہ سے سلیپنگ گون میں ملبوس تھی۔ میز پر چائے رکھ کر وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ نے اسے ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا اور پھر ہاتھوں سے ان کا جوڑا بناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سیٹھ کے ساتھ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو رہی سیٹھ کا نام ہری لال تھا۔ ساتھ والا شخص اس کا ایک حصے دار تھا۔ اس سے پہلے یہ لوگ ہوشیار پور میں تھے۔ وہاں مویشیوں کا ایک میلہ تھا۔ وہیں ہری لال نے یوسف کو دیکھا تھا۔ وہ کوئی ملازمت کرنا چاہتا تھا۔ جب ہری لال کو پتہ چلا کہ وہ موٹر مکینک بھی ہے تو اس نے اسے ملازم رکھ لیا تھا۔ اس کی تنخواہ ستر روپے مہینہ مقرر ہوئی تھی۔ سرکس کی تین چار گاڑیوں اور موت کے کنویں میں چلنے والی موٹر سائیکلوں کی مرمت اس کے ذمے تھی۔ اس کے علاوہ بھی تھوڑا بہت کام اس سے لیا جاتا تھا۔ سیٹھ نے بتایا کہ اس مہینے کے شروع میں اس کی ٹانگ پر چوٹ لگ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کنویں میں موٹر سائیکل چلانا سیکھ لے۔ کئی بار منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانا۔ ایک دن پتہ چلا کہ وہ مشق کرتے ہوئے گر گیا ہے۔ ظاہر ہے سیٹھ اسے مفت میں بٹھا کر کھلا تو نہیں سکتا تھا اس نے اسے تھوڑی بہت پیسے دے کر چھٹی کر دی۔ اب سیٹھ کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کدھر گیا ہے اور کس حال میں ہے۔ سیٹھ نے یک اہم بات بتائی کہ اس کے ساتھ کوئی لڑکی وڑکی نہیں تھی۔ وہ اکیلا ہی ن کے پاس آیا تھا۔ میں نے یوسف کے ساتھ کام کرنے والے اس کے یک دو ساتھیوں کو بھی بلایا۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ

یوسف اکیلا تھا۔ وہ رات کو ان کے ساتھ ہی سرکس میں سوتا تھا اور اس نے کبھی کسی لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اپنے گھر بار کے بارے میں اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والا استاد اس کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا سانولا سا شخص تھا اس نے بتایا کہ یوسف ہر وقت خاموش سا رہتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ اسے چھپ کر روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھر سے لڑ جھگڑ کر آیا ہے یا اس کے ہاتھوں کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے۔ لیکن وہ تھا بڑا محنتی اپنے کام کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کنویں کی تینوں موٹر سائیکلوں کو اس نے نمبرون کر دیا تھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ زندگی سے اکتا گیا ہے۔ اسی وقت وہ موٹر سائیکل لے کر کنویں کے اندر چلا جاتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ اس فن کو کچے ہاتھ مت ڈال یہ کام اتنا آسان نہیں لیکن وہ کہتا تھا "چاچا زندگی میں رکھا بھی کیا ہے۔"

ہرلال اور اس کے ملازموں کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یوسف یا تو شیلا کو امرتسر ہی سے نہیں لایا تھا یا پھر اس نے اسے کسی اور جگہ ٹھہرایا تھا' لیکن اگر اور جگہ بھی ٹھہرایا ہوتا تو اس سے ملنے تو جاتا اور پھر اس کی افسردگی اور مایوسی کیا معنی رکھتی تھی۔ کیا شیلا اس کے ساتھ نہیں تھی' تو پھر وہ کہاں تھی؟ سیٹھ سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ ملازمین سے پوچھ گچھ کرے۔ ہو سکتا ہے کسی کو اس کے بارے میں علم ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ کل پھر آؤں گا۔ سیٹھ نے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ میں جب خیمے سے باہر نکلا اچانک کوئی بھاگ کر ساتھ والے خیمے میں روپوش ہو گیا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ بھاگنے والا خیمے سے باہر کھڑا ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویسے میں اسی پہچان چکا تھا۔ یہ وہی لڑکی نیلوفر تھی۔ میں نے اس کے بالوں کے جوڑے سے اسے پہچانا تھا۔

بریندر سنگھ کی موجودگی اب فضول تھی میں نے اسے اپنے سب انسپکٹر کے نام ایک چھٹی دے کر واپس بھیج دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ سرگودھا میں مجھے ایک دو دن لگ جائیں گے۔ بریندر کی روانگی کے بعد میں نے اسٹیشن کے نزدیک ایک ہوٹل میں کمرہ لیا۔ نہادھو کر تھکن اتاری اور دوپہر کا کھانا کھا کر گھومنے پھرنے کی لیے نکل آیا۔ ایک دو مقامی دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے خاص طور پر سرکس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جس کسی نے سرکس دیکھا تھا وہ اس کی تعریف کرتا تھا۔ خاص طور پر لڑکی نیلو فر کے کام کو بہت پسند کیا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا آج سرکس دیکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ سرکس کے دو شو ہونے تھے۔ ایک تین سے چھ اور دوسرا سات سے دس بجے۔ میں گھومتا پھرتا کوئی چھ بجے سرکس پہنچا۔ چونکہ سرکس لگے کافی دن ہو چکے تھے اس لیے بہت زیادہ رش نظر نہیں آرہا تھا۔ ٹکٹ آسانی سے مل گیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ اس قسم کا تماشا بچپن میں ایک بار دیکھا تھا لیکن اب سب کچھ دماغ سے نکل چکا تھا۔ میں دلچسپی سے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیتا ہوا اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ پورا پنڈال دائرے کی شکل میں تھا اور اسے تین حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ میں جس حصے میں بیٹھا تھا یہ اسپیشل تھا۔ اس میں نیچے سے اوپر تک لکڑی کی کرسیاں چنی ہوئی تھیں دوسرے درجے میں لکڑی کی سیڑھیاں تھیں اور تیسرے درجے میں دریاں تھیں یا شاید دریاں بھی نہیں تھیں۔ شور' ٹیاں' آوازے وہ سب کچھ موجود تھا جو اس قسم کے تماشوں میں ہونا چاہیے۔ بڑے انتظار کے بعد کھیل شروع ہوا۔ مختلف آیٹم پیش کیے جاتے رہے۔ مجھے صرف نیلو فر کی آمد کا انتظار تھا۔ آخر بے پناہ تالیوں کے شور میں وہ نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک ہاتھی بھی تھا۔ پہلے تو وہ ہاتھی کی پشت پر چڑھ کر اٹھکیلیاں کرتی رہی۔ پھر وہ ہاتھی کی سونٹ میں سوار ہو گئی اور ہاتھی نے اسے پکڑ کر پنڈال کا چکر لگایا۔ تب وہ بھاگتے ہوئے ہاتھی کی

ایک ٹانگ سے چپک گئی۔ پھر وہ ہاتھی کی ٹانگوں کے درمیان لیٹ گئی۔ اس کا سب سے خطرناک کرتب یہ تھا کہ وہ ہاتھی کے آگے لیٹ گئی ہاتھی نے اپنا پاؤں اٹھایا اور اس کے سینے پر رکھ دیا۔ یہ واقعی ایک خطرناک چیز تھی اگر ہاتھی ذرا بھی آگے بڑھتا یا حرکت کرتا تو اس کا سارا بوجھ اٹھے ہوئے پاؤں پر پڑتا۔ پلک جھپکنے میں لڑکی کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ میں اندرونی گھیرے کے بالکل قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے غور سے لڑکی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ تماشائیوں کے ساتھ ساتھ خود اس کے چہرے پر بھی خوف کے آثار نظر آ رہے تھے ..... دیوہیکل ہاتھی بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ پھر تالیوں کے بے پناہ شور میں وہ کروٹ بدل کر اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل آئی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ نیم عریاں لباس میں پھر نمودار ہوئی۔ اس دفعہ اس نے بلندی پر تنے ہوئے رسّے کے اوپر نہایت خطرناک کرتب دکھائے۔ نیچے جال وغیرہ موجود نہیں تھا۔ ذرا سی لغزش اسے تیس فٹ کی بلندی سے نیچے گرا سکتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی جان پر کھیل کر لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور لوگ واقعی خوش ہو رہے تھے۔ وہ اس کے ہر انداز پر داد دے رہے تھے۔ آئٹم کے ختم ہونے کے بعد میں پندرہ بیس منٹ اور بیٹھا۔ تماشا ابھی ایک گھنٹہ اور جاری رہنا تھا لیکن میری دلچسپی اب ختم ہو چکی تھی۔ میں اٹھا اور باہر نکل آیا۔

رات ساڑھے آٹھ نو بجے کا عمل تھا۔ پنڈال سے باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سرکس کے اکا دکا آدمی آجا رہے تھے۔ موت کے کنویں کے پاس کچھ آدمی بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ تھوڑی دور ہری لال کے سرخ خیمے میں بتی جل رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو اس سے ملاقات ہو جائے۔ کل والا مچھندر پہریدار کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیمے کے پاس پہنچا لیکن پھر مجھے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔ اندر سے تیز تیز باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں محتاط قدموں سے چلتا ہوا خیمے کے قریب پہنچا۔ ایک جگہ کپڑے کے جوڑ میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اس چھوٹی سی

درز کو احتیاط سے کھولا اور آنکھ وہاں جما دی- وہ نیلو فر ہی تھی- اس نے کپڑے بدل لیے تھے اور چہرہ میک اپ سے صاف تھا- اس حالت میں وہ ایک سیدھی سادھی لڑکی نظر آرہی تھی- وہ بڑے غصے میں کہہ رہی تھی-

"سیٹھ جی! میں مزدوری کرتی ہوں- جان خطرے میں ڈالتی ہوں' خون پسینہ ایک کرتی ہوں' کوئی بھیک نہیں مانگتی مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے"

سیٹھ کرسی پر بیٹھا تھا اس نے ایک ٹانگ میز پر رکھی ہوئی تھی' کچھ پی رہا تھا- اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا "ارے بھائی! کتنی بار کہا ہے پیسے ملیں گا' ضرور ملیں گا- لیکن بہاولپور جا کر- ابھی میرے پاس ایک دمڑی نہیں"

"لیکن مجھے اب ضرورت ہے- اس وقت" نیلو فر زور دے کر بولی-

سیٹھ نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں پھر یہی بولے گا کہ تمہاری نیت کھراب ہے- تم کمپنی کے ساتھ جانے کو نہیں مانگتا-"

"ہاں ہاں میں نہیں جاؤں گی کمپنی کے ساتھ" نیلو فر واشگاف الفاظ میں بولی "میں نہیں جا سکتی بہاولپور' ہر انسان کی مجبوریاں ہوتی ہیں ..... جو میرا حساب بنتا ہے تم مجھے دے دو-"

"ہاں یہ ہوئی نا بات" سیٹھ ہری لال آنکھیں نچا کر بولا- اس نے میز پر سے ایک کتاب اٹھائی تھوڑی دیر کچھ حساب لگاتا رہا پھر بولا "پچاس روپے نکلتے ہیں نی تمہاری طرف (طرف) سے-"

"خدا کا خوف کرو سیٹھ" نیلو فر روہانسی ہو کر بولی "تم نے تو کہا تھا" گلو" کے ساتھ پورا آئٹم کرو ڈبل پے منٹ کروں گا" (گل سرکس کے ہاتھ کا نام تھا)

"کس حرامجادے نے کہا تھا" سیٹھ اس کی بات کاٹ کر بولا "اتنا جرور کہا تھا کچھ بخشس دے دوں گا لیکن تم اس قابل کہاں ہو ..... تمہارے ننگے خالی پیٹ کو کپڑا اور روٹی کیا ملی منہ میں گز بھر کی زبان آگئی- میرا حساب

چکتا کرو اور راستہ ناپو اپنا"

نیلو فر عاجزانہ لہجے میں بولی "سیٹھ اتنے برس کام کیا ہے کمپنی میں یہ صلہ دے رہے ہو۔ مجھے مدد کرنے کی بجائے میری مزدوری بھی روک رہے ہو۔ خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔"

"اسی طرح بد تمیجی سے بات کرونی" سیٹھ تمسخرانہ لہجے میں بولا "تم نے تو بولا تھا میں بھیک نہیں مانگتی۔"

"کتے کمینے" وہ بھوکی شیرنی کی طرح اسی پر جھپٹی۔ سیٹھ نے اس کی دونوں کلائیاں تھام لیں۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو آوازیں دیں۔ ذرا ہی دیر میں تین چار مسٹنڈے خیمے کے دروازے پر نظر آئے سیٹھ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "پکڑ لو اس حرامجادی کو' اور سڑک پر پھینک آؤ۔"

چاروں آدمی لڑکی کی طرف لپکے وہ اسے باہر کی طرف کھینچنے لگے کھینچا تانی میں لڑکی کی قمیص پھٹ گئی۔ "چھوڑ دو چھوڑ دو" میں خود چلی جاتی ہوں۔" اس نے خود کو سیٹھ کے آدمیوں کی گرفت سے چھڑایا پھر بازو میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔ اسی حالت میں وہ خیمے سے باہر نکل گئی۔ میں خیموں کی اوٹ لیتا ہوا بری احتیاط سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ تھوڑی دور جاکر خیمے میں گھس گئی۔ ذرا دیر بعد وہ ایک چھوٹا سا صندوق اٹھائے آنسو پونچھتی ہوئی سرکس سے باہر جا رہی تھی۔ سڑک پر پہنچ کر وہ پیدل ایک جانب چل دی۔ میں کچھ فاصلہ رکھ کر بڑی احتیاط سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اس لڑکی کے ذریعے بہت سے رازوں پر سے پردہ اٹھ سکتا ہے کوئی تین فرلانگ چلنے کے بعد دفعتاً" میں لڑکی کی نظر میں آگیا۔ ہوا یوں کہ ایک جگہ پہنچ کر اس نے سڑک پار کرنے کے لیے اچانک رخ تبدیل کیا۔ اتفاقاً" اس وقت میں ایک سٹریٹ لائٹ کے نیچے تھا۔ رات کے دس بجے تھے راستہ سنسان تھا۔ لڑکی کے اور میرے درمیان کوئی اور شخص بھی نہیں تھا۔ اس کی نگاہ سیدھی مجھ پر پڑی۔ ظاہر میں بھی تھوڑا سا ٹھٹھک گیا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور پہچان گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ اس نے

تیزی سے سڑک پار کر کے اور ایک گلی میں مڑ گئی۔ میں بھی سڑک پار کر کے گلی میں پہنچا۔ وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور تیزی سے دوسری گلی میں داخل ہو گئی۔ اور تب میں نے محسوس کیا کہ وہ بھاگ اٹھی ہے۔ رات کے سناٹے میں اس کی ایڑی کی کھٹ کھٹ مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجبوراً" میں نے بھی دوڑ لگا دی۔ میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جب گلی کے موڑ پر پہنچا وہ بھاگتی ہوئی ڈیڑھ دو سو گز آگے نکل چکی تھی۔ سامنے ہی اندھیرے میں کوئی سیاہی مائل چیز پڑی تھی۔ میں پہچان گیا یہ اس کا صندوق تھا۔ میں نے صندوق کی طرف توجہ دیے بغیر لڑکی کا تعاقب جاری رکھا۔ اب وہ کافی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اس نے رنگ دار پتلون کے اوپر سفید قمیص پہن رکھی تھی اور یہ قمیص اندھیرے میں میری رہنمائی کر رہی تھی میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔ جب میں اس گلی کے سرے پر پہنچا وہ دور دور نظر نہیں آئی۔ رات کے سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں حیران و پریشان گلی کے وسط میں کھڑا تھا۔ اچانک مجھے پھر سفید قمیص کی جھلک دکھائی دی لیکن اس دفعہ یہ جھلک بلندی سے نظر آئی تھی۔ میں نے کچھ پیچھے ہٹ کر دیکھا وہ ایک بیس فٹ اونچی منڈیر کے اوپر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چھلانگ لگائی اور ایک چھجے کا کنارہ پکڑ لیا۔ ایک ہی جھٹکے میں وہ دوسرے مکان کی چھت پر تھی۔ اگر کوئی دوسرا پولیس والا ہوتا تو اس محلے پر گھٹنے ٹیک دیتا لیکن میں نے ہمت کی اور لڑکی کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لٹک کر میں اوپر پہنچا اور پھر منڈیر پر سے ہوتا ہوا چھجے سے جھول کر دوسری چھت پر پہنچ گیا۔ لڑکی چھتوں چھتوں پر تین چار گھر آگے نکل چکی تھی۔ اس دوران ارد گرد کے مکانوں کی بتیاں جلنے لگیں اور لوگوں نے اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ لڑکی کا اور میرا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ شاید وہ کچھ تھک گئی تھی۔ ایک مکان کی چھت سے دو تین افراد بھی میرے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ جونہی لڑکی ایک

منڈھیر سے دوسری مکان کی چھت پر کودی وہاں پر موجود دو تین افراد نے اسے پکڑ لیا۔ چند لمحون میں ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ لڑکی کو دو آدمیوں نے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

او بھائی صاحب! یہ تو عورت ہے" ایک آدمی نے حیران کن لہجے میں کہا۔ وہ کچھ کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ شاید لڑکی کے جسم کو ٹٹولنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ عورت ہے۔ ایک دوسرے شخص نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا کہ لڑکی کی پی کیپ کھینچ لی۔ اس کا جوڑا کھل گیا اور لمبے بال شانوں پر بکھر گئے اب بہت سے لوگ گلی میں بھی اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک موٹا سا شخص بڑے تھانیداری لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہی اور کہا سے آئی ہے۔ لڑکی کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور ایک پڑھے لکھے شخص کو دکھاتا ہوا بولا۔

"میں پولیس انسپکٹر ہوں اور یہ لڑکی پولیس کو مطلوب ہے۔ آپ میں سے کوئی شخص میرے ساتھ چلے میں اسے نزدیکی تھانے میں لے جانا چاہتا ہوں۔"

میرے لہجے اور انداز سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں پولیس انسپکٹر ہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں محلے کے دو آدمیوں کے ساتھ لڑکی کو لے کر نزدیکی تھانے میں پہنچ گیا۔ لڑکی اب بھی مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کی مزاحمت اور اس کا بھاگنا سب کچھ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ یوسف کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں یوسف کی تلاش میں ہوں اسی لیے وہ مجھے دیکھ کر بھاگ اٹھی تھی۔ تھانے پہنچنے تک وہ راستے میں برابر چیختی رہی: میں کچھ نہیں بتاؤں گی یوسف کے بارے میں میری کھال بھی ادھیڑ دو گے تو نہیں بتاؤں گی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں" تھانے میں پہنچ کر وہ یکا یک خاموش ہو گئی۔ تھانے کے انچارج کا نام مجھے یاد نہیں وہ مسلمان تھا اور انبالے کا رہنے والا تھا۔ غائبانہ طور پر وہ مجھے جانتا

تھا۔ اس نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ لڑکی سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے اس نے مجھے ایک کمرہ اور مکمل تنہائی فراہم کی۔ لڑکی سخت خوفزدہ تھی نجانے کیا کیا خدشات اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ اس کے ذہن سے تمام خدشات نکالنے اور اسے پر سکون کرنے میں مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ یہ میری بڑی کامیابی تھی کہ ایک گھنٹے بعد نہ صرف اس کا خوف دور ہوا بلکہ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھنے لگی۔ یوسف کے بارے میں وہ بہت حساس دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی انسپکٹر صاحب! آپ اسے مجھ سے چھین لیں گے۔ میں اس کے بغیر مرجاؤں گی' اس کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں" میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ پگلی سی لڑکی چند ہفتوں میں اس لڑکے کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو گا اور اگر یوسف بے گناہ ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا نہیں دے سکتی۔ اس نے آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان کہنا شروع کیا۔

"انسپکٹر صاحب! سیٹھ ہری لال جھوٹ بولتا ہے۔ یوسف معمولی زخمی نہیں ہے۔ اس کی ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ جب یوسف زخمی ہوا تو سیٹھ نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ علاج کرانا تو دور کی بات ہے اس نے اسے نوکری سے بھی نکال دیا۔ جس وقت وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ لے کر سرکس سے نکلا اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں نے یوسف کا پیچھا کیا اور اسے ایک ٹانگے میں ڈال کر ہسپتال لے گئی۔ اب وہ ایک ماہ سے بستر پر پڑا ہوا ہے اس کے دو آپریشن ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ ابھی ایک آپریشن اور ہو گا۔ میرے پاس جو کچھ تھا میں اس کے علاج پر لگا چکی ہوں۔ کچھ روپے بچے تھے وہ میں نے اس کے گھر کے پتے پر بھیج دیئے۔ اب نئے آپریشن کے لیے خون اور دوائیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے آج سیٹھ سے پیسے مانگے تو....."

"اس سے آگے میں سب کچھ جانتا ہوں نیلوفر" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اب تم جلدی سے مجھے یوسف کے پاس لے چلو" اس نے

ابھی تک پھٹی ہوئی قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک سپاہی کی ڈھیلی ڈھالی قمیص پہن کر وہ میرے ساتھ چل دی۔

قریباً" آدھ گھنٹے کے بعد میں یوسف کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ بستر پر دراز تھا اس کی ایک ٹانگ اوپر چھت سے بندھی ہوئی تھی میرے خیال میں اس کی عمر انیس بیس سال کے قریب تھی۔ دبلے پتلے جسم اور چوڑے شانوں والا وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ طویل بیماری کے باوجود اس کا چہرہ پر کشش دکھائی دیتا تھا۔ نیلو فر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار ابھر آئے۔ نیلو فر اس کا ہاتھ تھام کر پاس بیٹھ گئی میں اس کے دوسری جانب بیٹھ گیا۔ نیلو فر نے میرے بارے میں بتایا کہ یہ امرتسر سے آئے ہیں۔ ان کا نام نواز خاں ہے۔یوسف غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کے آثار دکھائی دیئے۔ آپ انسپکٹر نواز خاں ہیں نا" اس نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس وقت میں صرف نواز خاں ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

○

رات بارہ بجے سے لے کر صبح صادق تک میں یوسف سے مصروف گفتگو رہا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اب بھی دل و جان سے ٹھاکر کی بیٹی شیلا پر فدا ہے' لیکن وہ امرتسر سے بالکل تنہا آیا ہے۔ شیلا کی شادی سے چند دن قبل ایک روز وہ ورکشاپ پہنچنے کی بجائے بس اڈے پر پہنچا اور وہاں سے ہوشیار پور جانے والی بس پر بیٹھ گیا۔ وہ سخت دل گرفتہ تھا۔ راستے میں اس نے کئی بار خودکشی کا سوچا لیکن بوڑھی ماں اور جوان بہن کے خیال نے ہر بار اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ اس شہر سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ جہاں قدم قدم پر شیلا اور اس کی محبت کی یادیں بکھری ہوئی تھیں ..... وہ چاہتا تھا کبھی وہ گلیاں وہ درو دیوار اس کی نگاہوں کے سامنے

نہ آئیں۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ کبھی واپس نہیں جائے گا۔ اگر خدا نے اس کے دن پھیرے تو وہ اپنی ماں اور بہن کو بھی اپنے پاس بلا لے گا۔ یہ تھی یوسف کی کہانی۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ ٹھاکروں نے اس پر کیا کیا الزامات لگائے ہیں۔ اور اس کے گھر والوں کو کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے..... اور میں نے یہ سب کچھ بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔

ایک نہایت کام کی بات مجھے یوسف سے معلوم ہو گئی تھی اور اس بات نے میرے لیے سوچنے کے بہت سے دروازے کھول دیے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان دیکھے ہاتھوں نے تفتیش کا رخ متعین کر دیا ہے۔ اب خود بخود آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ بنتا جا رہا تھا۔ کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی ٹھاکر آنند..... ٹھاکر آنند"

یوسف نے بتایا کہ شیلا کی شادی سے چند ہفتے پہلے بنگال سے ایک خط آیا تھا۔ یہ خط شیلا کے پھوپھا ٹھاکر ونود کمار کا تھا۔ ونود کمار نے بھلے دنوں میں شیلا کے باپ سے کاروبار کے لیے کچھ رقم لی تھی۔ بعد میں ان کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی اور ونود کمار شیلا کے باپ کا تمام پیشہ ہضم کر گیا۔ اب آخری وقت میں اسے اپنی زیادتی کا خیال آیا تھا۔ اس نے کفارے کے طور پر وہ تمام رقم جو بمعہ سود کئی لاکھ روپے بنتی تھی شیلا کے نام بھیج دی تھی۔ جس دن سے شیلا کے نام رقم آئی تھی ٹھاکر آنند اور اس کے بیٹے کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ جو پہلے ٹھاکر کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اب اس کی " پیاری بیٹی" بن گئی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً" امرتسر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ نیلو فر اور یوسف کو تسلی دے کر میں دروازے کی طرف بڑھا اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ بابا شمو کا نورانی چہرہ پھر میری نگاہوں میں گھوم گیا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا یوسف کے پاس پہنچا۔

"یوسف" میں نے اس کے اوپر جھکتے ہوئے کہا "کیا شیلا کے نام آنے

والی رقم کا تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی پتہ تھا؟"

"ہاں تھانیدار صاحب! اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ بابا شمو بھی اس بارے میں جانتا ہے۔ وہ اسے اپنے باپ کی طرح سمجھتی ہے .... بابا شمو کو جانتے ہیں آپ؟"

"ہاں جانتا ہوں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "لیکن اب بابا شمو اس دنیا میں نہیں"

"کیا ہوا اسے ..... کب ہوا یہ؟" یوسف نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔

"اسے ٹھاکروں نے قتل کر دیا ہے" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور تم خوش قسمت ہو کہ یہاں چلے آئے ہو ورنہ تم بھی زندہ نہ ہوتے" دونوں کے چہرے پر سینکڑوں سوالات چھوڑ کر میں تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

○

جس وقت میں امرتسر اڈے پر پہنچا رات کے دس بج چکے تھے۔ دکن کی طرف سے یخ بستہ ہوا چل رہی تھی کبھی کبھی آسمان پر بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ بس اڈے سے میں سیدھا ٹھاکر کی کوٹھی پہنچا۔ لوہے کے گیٹ سے باہر لکڑی کے کیبن میں چوکیدار اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس کی کرسی کو ٹھوکر مار کر جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا میں نے اسے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ ٹھاکر کو میری آمد کی اطلاع دو۔ چوکیدار مجھے پہچانتا تھا وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد میں اس کے ساتھ ٹھاکر کے ڈرائینگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے انسپکٹر! ٹھاکر نے سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے کہا۔

"ایک تفتیش پر گیا تھا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ایک دفعہ آپ نے مجھے اپنے کھاتے دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ اس وقت میں اسی غرض سے

حاضر ہوا ہوں"

ٹھاکر نے چونک کر میری طرف دیکھا دودھیا بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ ایک دم تاریک نظر آنے لگا تھا۔

"ٹھاکر صاحب! شیلا کہاں ہے؟" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ٹھاکر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک دم اجنبیت نظر آنے لگی۔ وہ بڑے عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اس کا یہ روپ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا "میں تمہیں عقل مند سمجھتا تھا انسپکٹر! وہ طویل خاموشی کے بعد بولا۔ پھر وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ سودا ہو سکتا ہے انسپکٹر؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میرا نام نواز خاں ہے میں رشوت پر تھوکتا ہوں"

اس نے ایک دم پلٹ کر آواز دی "شیرو .... شیرو" بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ بیرونی دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور تین ہٹے کٹے مسلح آدمی برآمد ہوئے۔

"اس انسپکٹر کے ٹکڑی کر دو" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا " خبردار آواز نہ نکلنے پائے"

ٹھاکر کی آنکھوں میں خوفناک چمک نظر آرہی تھی۔ دو افراد نے بھاگ کر ڈرائنگ روم کے دروازے بند کر دیئے۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بجلی کی چمک شیشے دار کھڑکیوں پر منعکس ہو رہی تھی۔ روشندانوں سے آتے ہوئے تیز ہوا کے جھونکے ریشمی پردوں کو ہلکورے دے رہے تھے عجیب ڈرمائی منظر تھا۔ دو آدمی خنجر لیے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ تیسرے شخص کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ میں نے ایک نظر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہ تمام تر تاثرات موجود تھے جو ایک قاتل کے چہرے پر ہونے چاہیں۔ مجھے اپنی جان بچتی مشکل نظر آرہی تھی۔ ایک یا دو وار تو شاید میں بچا لیتا لیکن تین مسلح آدمیوں کے حملوں سے مستقل طور بچنا

ناممکن تھا۔ میں پیچھے ہٹتا ہوا بالکل دیوار کے قریب پہنچ چکا تھا تب اچانک چھناکے کی آواز آئی۔ ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ پھر ایک بالوں بھرا ہاتھ اندر آیا۔ چٹخنی کھلی اور کھڑکی میں بریندر سنگھ کا چہرہ دکھائی دیا۔ پلک جھپکتے میں وہ چوکھٹ پر چڑھ کر اندر آچکا تھا۔ پونے سات فٹ قد کے اوپر اس کا طرے دار شملہ' اس حالت میں وہ کوئی بدو معلوم ہو رہا تھا۔ گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور ہاتھ میں لوہے کی شاموں والی چمکتی ہوئی لاٹھی تھی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اجازت طلب کی اور پھر "ٹھاکر" کے نام کا نعرہ لگاتا ہوا ٹھاکر اور کلہاڑی والے آدمی پر پل پڑا۔ دوسری طرف میں نے بھی قریب والے دونوں افراد پر چھلانگ لگا دی اور انہیں لیتا ہوا زمین پر گر گیا۔ ایک شخص کا خنجر گر گیا تھا جب کہ دوسرے کی کلائی میری گرفت میں تھی۔ دوسری طرف بریندر کی لاٹھی بجلی بن کر ٹھاکر اور دوسرے آدمی پر برس رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے دیکھا اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر لاٹھی کا ایک بھرپور وار کلہاڑی والے شخص پر کیا وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے بھی دونوں آدمیوں کو ٹھوکروں اور گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔ بریندر اب ٹھاکر سے نپٹ رہا تھا۔ ٹھاکر کی چیخیں سن کر ساری کوٹھی میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ عین اس وقت کوٹھی کی لائٹ چلی گئی۔ دو آدمی موقعے سے فائدہ اٹھا کر بھاگ گئے۔ اندھیرے میں ٹھاکر کی بیوی اور بیٹیوں کی چیخیں گونجنے لگیں۔ ٹھاکر کی بڑی بیٹی میرے بازو ہلا کر پتا جی پتا جی کہہ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم لالٹین روشن کرنے میں کامیاب ہو گئے ٹھاکر کی بیوی دونوں بیٹیوں اور رشی کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ٹھاکر کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ زمین پر پڑا زور زور سے کراہ رہا تھا۔

"شیلا کہاں ہے ٹھاکر" میں نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ تکلیف کی شدت سے وہ چیخنے لگا۔ اتنے میں اس کی بیوی کی آواز آئی۔ و

دروازے کے شیشے سے دیکھ رہی تھی۔

"مارو مت انہیں .... مت مارو بھگوان کے لیے ..... میں سب کچھ بتاتی ہوں"

تھوڑی دیر بعد اس کی نشاندہی پر ہم ایک زمین دوز کوٹھری میں اتر رہے تھے۔ لوہے کا زنگ آلود ڈھکنا اٹھاتے ہی بو کے ایک ناقابل برداشت بھبکے نے ہمرا استقبال کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ شاید گندم وغیرہ رکھنے کے لے بنایا گیا تھا۔ لیکن اب اس میں کاٹھ کباڑ پڑا تھا ..... اور یہیں ہڈیوں کا ایک ڈانچہ بھی رکھا ہوا تھا ..... یہ شیلا تھی اس کی لاش گل سڑ کر مسخ ہو چکی تھی۔ اس کے قریب رکھا ہوا ایک کاغذ اس کی حسرتناک موت کی داستان سنا رہا تھا۔ میں نے لاش پر ایک نظر ڈالی اور کاغذ لے کر باہر آگیا۔ یہ کاغذ کیا تھا پھانسی کا پھندہ تھا جو شیلا مرتے مرتے اپنے قاتلوں کے گلے میں ڈال گئی تھی ..... اس خط کی وجہ سے نہ صرف ٹھاکر اور اس کے بیٹے کو پھانسی ہوئی بلکہ یوسف کی قسمت بھی بدل گئی۔ شیلا اسے ساڑھے چار لاکھ روپے کا مالک بنا گئی تھی۔ اس روپے سے یوسف نے اپنی بہن کی شادی ایک اچھے خاندان میں کی اور خود بھی عزت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ بعد ازاں اس نے اپنے برے دنوں کی ساتھی نیلو فر سے شادی کر لی تھی۔ اب آخر میں میں وہ خط اپ کو سناتا ہوں جو شیلا کے مقتل سے برآمد ہوا تھا۔ کسی مرنے والے کی اس سے مفصل اور کارگر تحریر میں نے نہیں پڑھی۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی مجھے اس کا ایک ایک حرف یاد ہے۔ پنسل سے ایک میلے سے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔

"مجھے معلوم ہے میرے سامنے رکھے ہوئے کھانے میں زہر ہے لیکن بھوک میں سسک سسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں یہ کھانا کھالوں میرے قاتل میرے چچی چچا ہیں۔ شادی سے انکار پر انہوں نے مجھ پر سختیاں کیں اور پھر بے ہوشی کی دوائی دینی شروع کر دی۔ بابا شمو کے قاتل بھی یہی دونوں ہیں۔ بابا جی کا قصور یہ تھا کہ وہ مجھ پر ہونے والے ظلم کے خلاف

آواز اٹھاتے تھے۔ انہیں گلا دبا کر ہلاک کیا گیا اور ان کی موت کو حادثہ بنانے کے لیے رشی نے کوئلے کی انگیٹھی والی کہانی گھڑی میں اس راز سے آگاہ ہوئی تو مجھے بھی مارنے کا فیصلہ کر لیا گیا ..... ٹھیک ہے' مجھے اب جینے کی کوئی آرزو نہیں۔ جھوٹی شادی کے نام پر چچا کا لڑکا میری عزت برباد کر چکا ہے۔ اب میں جی کر کیا کروں گی۔ کس کے لیے جیوں گی؟ میرا مرنا ہی بہتر ہے" اس کے بعد کچھ اشعار لکھے تھے۔ پھر لکھا تھا اگر یہ خط میرے قاتلوں کو ملے تو وہ کان کھول کر سن لیں۔ میں یوسف سے محبت کرتی تھی اور مرتے دم تک میرے ہونٹوں پر اس کا نام تھا اور اگر یہ کسی اور کو ملے تو وہ میرے یوسف سے کہہ دے کہ تمہاری محبوبہ شیلا اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکی' اسے معاف کر دینا' وہ تمہارے آنگن میں تمہارے میلے کپڑے نہیں دھو سکی' تمہارا کھانا نہیں پکا سکی" .... تمہاری بوڑھی ماں کے پاؤں نہیں دبا سکی' اسے معاف کر دینا۔ اس کے بعد لکھا تھا اگر اس خط کو وصیت سمجھ لیا جائے تو میں اپنے ترکے کی ایک ایک کوڑی یوسف اور اس کی بہن کے نام کرنا چاہتی ہوں ..... اس کے بعد کچھ اور باتیں لکھی تھیں۔ بے ربط اور بہکی ہوئی ..... یوں لگتا تھا جیسے اس بدنصیب لڑکی پر زہر کا اثر ہو چکا ہے۔ خط کے آخر میں وہ مسلسل یوسف کا لفظ لکھتی چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ پنسل کا سکہ ختم ہو گیا تھا۔

○ ○ ○

ات خدا اویر

دعوت ٹھیک ٹھاک تھی۔ تین چار قسم کا بکرے کا گوشت، تلی ہوئی مچھلی اور بھنے ہوئے بٹیر، دلجیت سنگھ نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ رات قریباً" دس بجے میں اور اے ایس آئی گوبندر واپس روانہ ہوئے۔ دلجیت سنگھ کا تانگہ حویلی کے دروازے کے باہر تیار کھڑا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کوچوان نے چابک لگائی اور تانگہ کچے راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک فرلانگ کے بعد نہر کی پٹڑی آگئی اور ہچکولے ذرا کم ہو گئے لیکن سامنے سے لگنے والی ہوا کچھ اور ٹھنڈی ہو گئی۔ تقریباً" تین میل آگے ایک پل تھا۔ اس پل سے "جودھ پور" کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

جودھ پور تھانے کا چارج سنبھالے مجھے آج صرف تین روز ہوئے تھے۔ جس گاؤں سے ہم دعوت کھا کر آرہے تھے۔ دلجیت سنگھ وہاں کا با اثر زمیندار تھا۔ وہ مسلسل تین دن سے اصرار کر رہا تھا کہ میں ان کے گھر رات کا کھانا کھاؤں۔ آج شام اس نے تانگہ ہی بھیج دیا تھا۔ مجبوراً" جانا پڑا۔ ویسے بھی دلجیت سنگھ جودھ پور کے سب سے اہم شخص شریف نمبردار کا دوست تھا۔ شریف نمبردار کہنے کو تو شریف نمبردار تھا لیکن مجھے دو ہی دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ نہ تو وہ شریف ہے اور نہ ہی نمبردار ہے۔ اس کی حیثیت نمبردار سے کہیں زیادہ تھی۔ دراصل اس کا چھوٹا بھائی جو قسمت سے

کچھ پڑھ لکھ گیا تھا۔ سیاست میں پاؤں رکھتا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کا ملنا جلنا تھا۔ شہر میں اس نے اپنا کوئی کاروبار بھی شروع کر رکھا تھا۔ پچھلے دنوں اس کی کوششوں سے پل سے چودھ پور جانے والی سڑک کو نیم پختہ کر دیا گیا تھا۔ آج کل نہر کی پٹڑی کو مضبوط کیا جا رہا تھا۔ کوئی پانچ فرلانگ آگے جا کر تانگہ رک گیا۔ یہاں سے اے ایس آئی گوبند رکا گاؤں تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ اس نے مجھ سے اجازت لی اور پچھلی سیٹ سے اتر کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

تانگہ پھر روانہ ہو گیا۔ میں اپنے خیالوں میں مگن بیٹھا تھا تھوڑا آگے جا کر تانگے کی رفتار پھر کم ہونے لگی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا سامنے پٹڑی پر کھیتوں کے ساتھ ایک بیل گاڑی ترچھی کھڑی تھی۔ دائیں طرف مٹی کی ڈھیر لگے ہوئے تھے اس لیے راستہ تقریباً بند ہو گیا تھا۔ دو آدمی بیل گاڑی پر شلغم لاد رہے تھے۔ کوچوان نے ان کو آواز دی لیکن وہ اپنے کام میں مگن رہے۔ میں نے بھی انہیں راستہ دینے کے لیے کہا لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے سخت غصہ آیا میں تانگے سے اتر کر ان کے پاس پہنچا۔

ہیرا جی دار تھا

"کیا بات ہے جوانو! تم راستہ کیوں نہیں دیتے"

"تم کون ہو اوئے اتنی گرمی سے بولنے والے" ان میں سے ایک نے مجھے موتی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا اس نے شراب پی رکھی ہے۔

میں خود پر قابو نہ رکھ سکا میں نے کہا "باؤں پھر میں کون ہوں؟"

وہ آگے قدم اٹھاتا ہوا بولا "بتاؤ"

میں نے ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ الٹ کر کھیت میں جا گرا۔ اس کا دوسرا ساتھی تیزی سے آگے بڑھا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر لاتوں اور مکوں سے ان کی تواضع شروع کر دی۔ اتنے میں شور سن کر کھیتوں میں کام کرتے ہوئے تین چار آدمی اور آ گئے۔ دو نے کوچوان کو پیٹنا

شروع کر دیا اور باقی مجھ پر پل پڑے۔ اگر وہ دونوں ہوتے تو میں ان سے بخوبی نبٹ سکتا تھا۔ لیکن اب صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ ایک دو زور دار مکے مجھے لگے۔ میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور میں پشت کے بل کھیت میں گر گیا۔ جس شخص کو میں نے تھپڑ مارا تھا وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی نظر آ رہی تھی۔ وہ نشے میں تھا اور کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ نہر میں سے ایک آدمی نکلا اور بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ وہ آتے ہی مجھ پر حملہ کرنے والوں پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے بھی اٹھ کر ایک آدمی کی ٹھکائی شروع کر دی۔ چند ہی منٹ میں حملہ آور بھاگ گئے۔

ایک شخص کو میرے مدد گار نے قابو میں کر لیا تھا۔ وہ اسے گریبان سے کھینچتا ہوا میری طرف لا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے گالیاں دے رہا تھا۔ "حرامخور! سرکاری افسروں پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔" میرے قریب آکر بولا "یہ لیجئے سرکار"

اس کی آواز میں عجیب طرہ کی بے باکی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اس کی عمر کوئی انیس بیس سال رہی ہو گی لمبا قد چوڑے شانے اور چھریرا جسم۔ کشادہ پیشانی کے نیچے دو روشن آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے لمبے لمبے بال ماتھے سے چپکے ہوئے تھے اور کپڑے بھی گیلے ہو رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جب لڑائی شروع ہوئی وہ نہر کے دوسرے کنارے پر تھا۔ میری مدد کے لیے اس نے سخت سردی میں نہر کے اندر چھلانگ لگا دی تھی۔ واقعی اس نے جوانمردوں والا کام کیا تھا۔ میں نے اس کو شاباش دی۔ اس نے اپنا نام "ہرا" بتایا وہ مسلمان تھا اور جودھ پور میں ہی گوشت کی دوکان کرتا تھا۔ ہم نے پکڑے جانے والے شخص کو تانگے میں سوار کیا اور جودھ پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن میں نے اس کے دو دوسرے ساتھی بھی پکڑ لیے۔ دوپہر تک ان کی اچھی ٹھکائی ہوئی۔ دوپہر کو نمبردار شریف آگیا۔ اس نے ان کی سفارش کرنی شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ اس کے ایک رشتے دار کے مزارعے

ہیں غلط فہمی کی وجہ سے سب کچھ ہوا ہے۔ کچھ تو کئے کی سزا مل گئی ہے باقی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لیتے ہیں۔ اس کے کہنے پر میں نے تمام افراد کو چھوڑ دیا۔

ناچنے والے لڑکے کو چھیڑا تھا.....

کوئی دو ہفتے بعد جود ھپور میں ایک میلہ تھا۔ اس میلے میں شریف کے دو لڑکے کسی سے جھگڑ پڑے۔ دونوں جب تھانے میں آئے تو ان کے سروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور چہرے پر نیل تھے۔ شریف نے بتایا کہ میلے میں ناچنے والون کو پیسے دینے پر جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے پانچ افراد کے نام پرچہ کٹوایا۔ میں نے اے ایس آئی کو سپاہی دے کر بھیجا' وہ دوپہر کے وقت ملزموں کو تھانے میں لے ایا۔ ایک ملزم کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ وہ ہیرا تھا۔ ملزموں میں وہ سب سے نمایاں نظر آرہا تھا۔ میں نے پوچھ گچھ شروع کی تو پتہ چلا کہ جھگڑا پیسے دینے پر نہیں بلکہ ناچنے والے لڑکے کو چھیڑنے پر ہوا تھا۔

نمبردار شریف کے لڑکے اس کو تنگ کر رہے تھے۔ ہیرے نے یہ بھی بتایا کہ جھگڑے میں وہ اکیلا تھا اس کا کوئی ساتھی اس کے ساتھ شامل نہیں تھا۔ اتنے میں قصائیوں کے تین چار آدمی بھی آگئے۔ وہ جوابی پرچہ کٹوانا چاہتے تھے۔ ان کا الزام تھا کہ شریف نمبردار اور اس کے ساتھیوں نے ان کے گھر کا دروازہ توڑا ہے اور عورتوں کی بے عزتی کی ہے۔ دونون فریق اپنی اپنی بات پر زور دے رہے تھے۔ میں نے اے ایس آئی گوبندر کو اشارہ کیا اور اس نے دو سپاہیوں کو میلے کی طرف روانہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس لڑکے کو لے کر آگئے جس کی وجہ سے جھگڑا ہوا تھا میں نے انہیں الگ کمرے میں بھیج دیا۔

لڑکے کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ وہ کسی خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ لڑکا تیرہ چودہ سال کا تھا اور بہت خوبصورت تھا۔ وہ لڑکی کا سوانگ بھر کے ناچتا تھا۔ میں نے اس کے باپ سے حقیقت حال بیان کرنے کو

کہا۔ اس نے بتایا کہ نمبردار کے لڑکے ہماری روزی میں لات مار رہے تھے۔ وہ ہمیں تنگ کرتے تھے اور میرے لڑکے سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ میں نے انہیں منع کیا تو مجھے بھی گالیاں دے کر چپ کرا دیا۔ جب ان کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو اس دوسرے لڑکے نے ان کی پٹائی کر دی۔ وہ بڑا جی دار لڑکا ہے جی۔ آپ یقین نہیں کریں گے نمبردار کے دونوں لڑکوں کے ساتھ تین چار افراد اور بھی تھے۔ اس نے ان سب کا ٹکریں مار مار کر حلیہ خراب کر دیا۔ سب چیخیں مارتے ہوئے بھاگ گئے۔"

"کیا اس کے ساتھ کوئی اور لڑکے بھی تھے" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! وہ اکیلا ان سے نہیں سنبھالا جاتا تھا جس کو ٹکر پڑتی تھی بھاگ جاتا تھا۔ بڑا شیر بچہ ہے جی وہ ..... اور ویسے بھی قسمت والا ہے ورنہ نمبرداروں نے اسے چھوڑنا نہیں تھا"

میں نے اسے کہا کہ تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔ اس نے بتایا کہ جھگڑے کے بعد نمبردار کے لڑکے تیس چالیس ساتھی لے کر اس کے گھر پہنچے۔ یہ سب لوگ ہاکیوں اور ڈنڈوں سے مسلح تھے۔ چند کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ یہ پہلے تو گھر سے باہر للکارے مارتے رہے پھر دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ سنا ہے انہوں نے عورتوں کو گالیاں دیں اور گھر میں موجود ایک مرد کو تھپڑ مارے۔ خوش قسمتی سے یہ لڑکا ہیرا گھر میں نہیں تھا۔ وہ اس وقت کنویں پر نہا رہا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

معاملے کی پوری تفصیل میرے سامنے آچکی تھی۔ میں نی دونوں فریقوں کو صلح کی طرف لانے کی کوشش کی۔ ٹھیک ہے نمبردار کے لڑکوں کی پٹائی ہوئی تھی۔ چاہے وہ ایک شخص نے کی تھی یا زیادہ نے۔ انہوں نے بھی قصائیوں کے گھر کا دروازہ توڑ دیا تھا۔ جن لوگوں نے پہلا واقعہ دیکھا تھا۔ انہوں نے ہی دوسرا بھی دیکھا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی بے عزتی کر لی تھی۔ یا یہ سمجھ لیں کہ اپنی اپنی عزت بنا لی تھی۔ نمبردار کے لڑکوں کا جرم زیادہ سنگین تھا۔ بہر حال میں نے دونوں فریقوں کو سمجھوتے پر آمادہ کر لیا۔

دونون طرف سے جھگڑا نہ کرنے کی ضمانت لے کر میں نے سب کو جانے کی اجازت دے دی۔ شریف نمبردار کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا وہ اس فیصلے سے زیادہ خوش نہیں تھا۔

لکیریں نکالو ورنہ .....

صرف چوبیس گھنٹے بعد اس سلسلے کا دوسرا واقعہ رونما ہو گیا۔ ہیرا اگلے روز شام کے وقت پھر میلے میں جا پہنچا۔ نمبردار کے لڑکے بھی شاید اس کی تاک میں تھے۔ ہیرا لوگوں کے درمیان کھڑا ناچ دیکھ رہا تھا کہ ایک پہلوان نما شخص نے پیچھے سے اس کو گرفت میں لے لیا۔ دو آدمی سامنے سے اس کے منہ پر مکے مارنے لگے۔ وہ شاید اس کی ہڈی پسلی برابر کرنے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ وہ اس کو مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اپنی ناک سے لکیریں نکالو وہ کہہ رہا تھا مجھے چھوڑ دو تو سہی میں لکیریں نکالتا ہوں۔ یہ ساری باتیں مجھے میرے مخبر بلال شاہ نے بتائیں .....

ہیرے کی چھوٹی بہن نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ روتی ہوئی گھر کو بھاگی۔ گھر میں ہیرے کے دو بھائی اور رشتے دار موجود تھے۔ وہ چھریاں اور کلہاڑیاں لے کر بھاگے۔ انہوں نے نمبردار کے دو لڑکوں اور ایک مزارعے کو پکڑ لیا اور ہانکتے ہوئے اپنے ڈیرے پر لے آئے۔ یہاں ایک چوک میں انہوں نے تینوں کو لاٹھیوں سے بری طرح مارا اور ادھ موا کر کے درختوں سے باندھ دیا۔ نمبردار کے حمایتی بھاگتے ہوئے حویلی میں پہنچے۔ انہون نے بتایا کہ اگر اس نے جلدی نہ کی تو اس کے دونون بیٹے قتل ہو جائیں گے۔ نمبردار بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میں فوراً موقع پر پہنچا۔ نمبردار کے دونوں لڑکے مار کھا کھا کر نڈھال ہو چکے تھے۔ میں نے ان کو چھڑایا اتنے میں اے ایس آئی گوبند بھی سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ ہم نے ہیرے اور اس کے باپ کو گرفتار کیا اور تھانے میں آگئے۔

نمبردار کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے اب ہیرے وغیرہ کے خلاف

کاروائی ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے پرچہ کاٹ کر باپ بیٹے کو حوالات میں بند کر دیا۔ فرض کی ادئیگی میں کچھ تلخ کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے عملے کو ہیرے کی ٹھکائی کا حکم دیا۔ بعد ازاں دنگا فساد اور نقض امن کے جرائم میں ہیرا جیل چلا گیا لیکن سیشن میں اس کی ضمانت ہو گئی اور وہ رہا ہو کر گھر آگیا۔

رانو کے چکر میں.....

دن گزرتے رہے۔ شریف نمبردار کی ایک جوان لڑکی تھی اس کا نام رانو تھا۔ ایک دو دفعہ اس کے گھر دعوت میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ کافی بھولی بھالی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ حسن و عشق کے معاملے میں کچھ عجیب ہوتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے عشق کرنے والے لوگ ذہن سے نہیں دل سے سوچتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قسم کی گتھیاں سلجھانے میں ذہن ناکام رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ رانو ہیرے کو دل دے بیٹھی اور چوری چھپے اس سے ملنے لگی۔ حیران کن بات ہے کہ جن گھروں میں ہر وقت کسی مخصوص دشمن کے بارے میں بات ہوتی رہتی ہے ان گھروں میں کوئی فرد ایسا بھی پیدا ہو جاتا ہے جو دشمن کو دوست بنانے پر تل جاتا ہے۔ عجیب فطرت ہوتی ہے بعض لڑکیوں کی بھی اپنے والدین کو بھی چاہتی ہیں' بھائیوں پر بھی جان چھڑکتی ہیں لیکن پھر ان کے دشمنوں کو دل بھی دی بیٹھتی ہیں۔ میرے تجربے میں ایسے کئی واقعات ہیں جن میں کسی لڑکی نے اپنے خاندان کے سب سے بڑے دشمن کو اپنی عزیز ترین ہستی بنا لیا۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا رانو کی' ہیرے سے اس کے تعلقات قائم ہو گئے۔ ہمارے مخبر ایسی خبریں سونگھتے رہتے ہیں۔ بلال شاہ نے جس روز مجھے یہ اطلاع پہنچائی۔ میں جان گیا کہ اب ہیرے کے دن تھوڑی رہ گئے ہیں۔

چند دن کے اندر حسب دستور یہ خبر پھیلنے لگی۔ مجھ سے ملنے والا ہر تیسرا چوتھا آدمی اس بارے میں بات کرنے لگا۔ ایک روز میرے مخبر بلال

شاہ نے بتایا کہ چھوٹی عید کے روز صبح سحری کے وقت وہ رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گیا تو اس نے ایک جگہ رانو اور ہیرے کو دیکھا ہے۔ وہ کھاد کے کھیت کی اوٹ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئے اور مختلف راستوں پر چل دیے۔

پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ایک روز سام کو پتہ چلا کہ پل کی دوکانوں کے پاس زبردست جھگڑا ہوا ہے۔ شام دوسرے گاؤں سے رانو کا منگیتر چند آدمیوں کے ساتھ آیا تھا اس نے ہیرے کو بری طرح پیٹا ہے۔ وہ کھیتوں میں پڑا زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ لیکن رات گئے پتہ چلا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہیرے کو چوٹیں تو لگی ہیں لیکن بہت زیادہ نہیں وہ خود چل کر گھر واپس آیا تھا۔

دونوں میں سے کسی فریق نے بھی پولیس سے رجوع نہیں کیا۔ یہ واقعہ میری توقع کے برعکس ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب اگر ہیرا' شریف کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اس کے دس بیس ٹکڑے ضرور کریں گے۔ لیکن معاملہ وقتی طور پر بگڑنے سے بچ گیا تھا۔ پھر بھی اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ کسی بھی وقت دوبارہ تصادم ہو سکتا ہی۔ میں نے سوچا کہ کل دونوں پارٹیوں کو بلا کر اس سلسلے میں بات کروں گا اور اگر ان کے ارادے ٹھیک نظر نہ آئے تو دونوں طرف کے پانچ پانچ دس دس آدمی اندر کر دوں گا لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

اسی رات کسی نے رانو کے منگیتر "چندرو" کو گلے پر چھری پھیر کر ہلاک کر دیا۔ صرف ایک دن پہلے اس کا ہیرے سے جھگڑا ہوا تھا۔ کئی لوگوں کے سامنے ہیرے نے چندرو کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں۔ ظاہر ہے ذہن فوری طور پر ہیرے کی طرف جاتا تھا۔ قتل کی اطلاع مجھے رات پچھلے پہر اذانوں سے کچھ پہلے ملی تھی۔ میں فوراً" اسی وقت موقع واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔ میری واپسی تک اے ایس آئی گوبند رتین مختلف جگہوں پر چھاپے مار چکا تھا۔ لیکن ہیرے کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

موقع واردات پر قاتل ایک نشانی چھوڑ گیا تھا۔ یہ ایک چاندی کا بڑا سا تعویز تھا جس میں سرخ رنگ کا دھاگا پڑا تھا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ تعویز میں ہیرے کے گلے میں دیکھ چکا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس قتل میں ہیرے کا ہاتھ تھا۔ تین دن تک ہیرے کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ تفتیش کے تمام رائج طریقے میں نے آزمائے۔ مقامی کھوجیوں سے مدد لی۔ ہیرے کے گھر والون کو بند کیا۔ اس کے ملنے جلنے والون سے پوچھ تاچھ کی۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ بہر حال یہ کوئی چھوٹا موٹا جرم تو تھا نہیں کہ پولیس ہمت ہار کر بیٹھ جاتی۔ یہ قتل کا کیس تھا اور پھر شریف نمبردار کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے قاتل کو جلد از جلد ڈھونڈنا ضروری تھا۔ ہماری کوشش جاری تھی۔

کبھی کبھی میں بھی اس انداز سے سوچتا کہ ہیرے کی زندگی اب برباد ہو گئی تھی۔ آج نہیں تو کل اسے قانون کے پھندے چڑھنا تھا۔ نمبرداروں کی سرکاری دربار میں سنی جاتی تھی۔ اور وہ آسانی سے اسی پھانسی دلوا سکتے تھے۔ مجرم لوگوں سے میرا اس قدر واسطہ رہتا تھا کہ میں دفطرت لوگوں کو پہلی نظر میں پہچان لیتا تھا۔ میرے اندر سے آواز آتی تھی کہ ہیرا بد فطرت نہیں تھا۔ وہ صرف جی دار یا کہہ لیں کہ ہتھ چھٹ تھا۔ اگر اسے اچھے حالات ملے ہوتے تو وہ ایک کامیاب زندگی گزار سکتا تھا۔ بہر حال اب وقت گزر چکا تھا۔ اب وہ ایک مفرور قاتل تھا اور مجھے اس کو گرفتار کرنا تھا۔

مائی نے بتایا.....

اس روز میں تھانے میں بیٹھا ایک عدم پتہ مقدمے کی فائل دیکھ رہا تھا کہ منشی نے آکر بتایا ایک عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے اندر بھیجنے کو کہا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی اس نے میلی کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آتے ساتھ ہی وہ میری کرسی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ چوہدری صاحب کے گھر سے آئی ہے۔ اتنی دیر میں میں اسے پہچان چکا تھا

وہ شریف نمبردار کے ہاں شاید برتن وغیرہ مانجھتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ اسے نمبردار کی حویلی میں دیکھا تھا۔

"کہو مائی' کیا بات ہے" میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ خاصی ڈری ڈری دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"مجھے رانو بی بی نے آپ کے پاس بھیجا ہے ..... اس بات کا کسی کو پتہ نہ چلے۔"

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔ وقت ضائع نہ کرو۔"

وہ کچھ دیر تو "رانو" کی تعریفیں کرتی رہی پھر بولی۔ "وہ ہیرا تو خود ہی اُس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ رانو تو مان باپ کی عزت پر مرنے والی لڑکی ہے جی۔ اگر پہلے اس کے دل میں ہیرے کے لیے کوئی جگہ تھی بھی تو اب نہیں رہی۔ جس روز چندرو سے اس کا جھگڑا ہوا تھا میں نے خود اسے ہیرے کو برا بھلا کہتے سنا تھا۔" اتنا کہہ کر مائی کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی "لیکن رانو کا خیال ہے جی کہ چندرو کو ہیرے نے قتل نہیں کیا۔ وہ کہتی ہے کہ میں چپ رہ کر کسی بے گناہ کو پھانسی پر چڑھانا نہیں چاہتی۔ ٹھیک ہے ہیرا برا ہے اس کے خاندان کا دشمن ہے لیکن یہ قتل اس نے نہیں کیا۔

میں نے پوچھا "یہ بات وہ کس طرح کہہ سکتی ہے"

مائی بولی "چوہدری جی! وہ کہتی ہے کہ ہیرے کا جو تعویز آپ کو قتل کی جگہ سے ملا تھا وہ قتل کی رات ہیرے کے گلے میں نہیں تھا۔ اس شام ہیرا رانو سے ملا تھا۔ رانو نے ہیرے سے تعویز کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ لڑائی میں کہیں گر گیا ہے۔ رانو کو یہ بات یاد رہ گئی۔ وہ اب تک اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہے لیکن اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔"

مائی کی بات سے یہ اشارہ تھا کہ ہیرے کو جان بوجھ کر اس قتل میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہی۔ لڑائی کے دوران اتفاقاً" ہیرے کا تعویز گرا تھ

یا سے نوچا گیا تھا۔ بعد میں یہ تعویز موقعہ واردات پر رکھ دیا گیا تھا۔ قتل کا یہ واقعہ کسی گہری سازش کا پتہ دے رہا تھا۔ میں نے مائی کو تو رخصت کر دیا اور خود سوچ بچار میں مصروف ہو گیا۔ رانو کے بھائی ہیرے سے نہیں لڑے تھے بلکہ اس کا منگیتر لڑا تھا۔ کیا اتفاقاً" ایسا ہوا تھا کہ چندرو کی مڈ بھیڑ ہیرے سے ہو گئی تھی یا اسے لڑایا گیا تھا۔ پھر مجھے یہ بات بھی یاد آئی کہ غیر متوقع طور پر پل پر ہونے والی لڑائی میں ہیرے کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ بات صرف مار پیٹ تک محدود رہی تھی۔ کیا اس جھگڑے کو بعد میں ہونے والے قتل کی بنیاد بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں جوں جوں سوچ رہا تھا مجھے قتل کے اس سیدھے سادے واقع کے پیچھے گہری منصوبہ بندی نظر آ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ علاقے کا مہر ترین کھوجی موقع واردات سے کوئی ایسا کھرا اٹھانے میں ناکام رہا تھا جسے ہیرے کا قرار دیا جا سکے۔ ایک بہت صاف کھرا کسی ایسے شخص کا ملا تھا جو ایک پاؤں دبا کر چلتا تھا۔ جودھ پور میں صرف دو آدمی ایسے تھے جو لنگڑا کر چلتے تھے۔ ایک موچی تھا اور دوسرا ایک مزارع لیکن دونوں میں سے کسی کا بھی ہیرے سے تعلق ثابت نہیں ہوا تھا۔ تعویز کے بارے میں مائی کے انکشاف نے یہ بات کافی حد تک صاف کر دی تھی کہ ہیرے نے یہ قتل نہیں کیا بلکہ اسے اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تو پھر قتل کس نے کیا ہے؟

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ نمبرداروں کا کوئی اندرونی معاملہ ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان لوگون نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئیں۔ اگر انہوں نے ہیرے کو پھنسانی کی کوشش کی ہے تو ہر کام بڑی صفائی سے کیا ہو گا۔ ہیرے کا اس دلدل سے بچ نکلنا معجزے سے کم نہیں تھا۔

ہیرا مل گیا.....

اس رات میرے مخبر بلال شاہ نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اس

نے بتایا کہ ہیرا یہاں سے سات میل دور ایک گاؤں میں موجود ہے۔ میں نے اسی وقت گھوڑی پر زین ڈلوائی اور بلال شاہ کو ساتھ لے کر اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے کسی تیسرے شخص کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس گاؤں کے قریب پہنچ کر بلال شاہ نے اپنا گھوڑا کھیتوں کی طرف موڑ دیا۔ دور کھیتوں کے درمیان نیچی چھت والے کچھ کچے کمرے نظر آ رہے تھے۔ شاید ان کو مویشی باندھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب وہ بے آباد تھے۔ بارشوں کی وجہ سے کچھ کمروں کی چھتیں بھی گر چکی تھیں۔ بلال شاہ نے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ ہیرا یہیں ایک کمرے میں موجود ہے۔

وہ حیران ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے ساتھ چھاپہ مار ٹیم کیوں نہیں لی۔ میں نے اسے وہیں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا' پھر کھیتوں کے درمیان چلتا ہوا مکان کے قریب پہنچا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ہیری کو آواز دی۔ تیسری آواز پر اس نے مجھے جواب دیا۔ میں نے کہا۔

"ہیرے میں تم سی بات کرنا چاہتا ہوں' باہر آؤ۔"

اس نے جواب دیا "چوہدری صاحب میرے ہاتھ میں بندوق ہے آپ آگے قدم نہ بڑھائیں۔"

میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور پستول ہولسٹر میں لگا لیا۔

میں نے کہا "ہیرے میں اس وقت اکیلا ہوں اور خالی ہاتھ ہوں"

وہ بولا "آپ کھڑکی کے پاس آجائیں۔ میں آپ کی بات سن رہا ہوں"

میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ خوفزدہ ہے اور اس کے فرار ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اسے اعتماد میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ رائفل لٹکائے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے کہا۔

"دیکھو بچے! کتنا بھی بھاگو پھانسی کے پھندے سے بچ نہیں سکو گے۔

تم بری طرح پھنسے ہوئے ہو۔ میں تمہارے سامنے خالی ہاتھ کھڑا ہوں۔ اس کا مطلب ہے میں تمہارا ہمدرد ہوں مجھے بتاؤ کہ اس قتل میں تمہارا کیا ہاتھ ہے؟"

وہ گلوگیر آواز میں بولا "چوہدری صاحب میرا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے"

میں نے کہا "دیکھو ہم پولیس والے کسی پر رحم نہیں کیا کرتے اور قتل کے لزمو پر رحم کرنا تو دور کی بات ہے لیکن میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ تم یہاں سے نکل جاؤ ..... تمہاری عمر چھوٹی ہے لیکن تمہارے دشمنوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ وہ تمہیں کسی صورت جینے نہیں دیں گے"

وہ میری بات سمجھ رہا تھا اس نے کہا "چوہدری صاحب یہاں میرا سب کچھ ہے"

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "زندگی چاہتے ہو تو سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ ماں باپ' گھر بار' پیار محبت سب کچھ۔ صرف اکیلی جان لے کر جانا ہو گا اور کچھ بھی ہو جائے واپسی نہیں ہو گی۔ بولو منظور"

اس نے کہا "لیکن ..... میرے پچھلوں پر کوئی مصیبت آئی تو"

میں نے کہا "میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ لیکن جب تک یہاں ہوں ان کی حفاظت کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ کچھ دیر گم صم کھڑا رہا۔ پھر بولا "ٹھیک ہے چوہدری صاحب" میں نے بندوق اس سے لے لی۔ وہ مجھے سلام کرکے اندھیرے میں روپوش ہو گیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا پھر گھوڑوں کی طرف واپس چل دیا۔ بلال شاہ بالکل خاص آدمی تھا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے اسے ساری بات سمجھا دی۔

چندرو کا قصہ .....

دوسرے روز میں نے ہیرے کے باپ کو بلا کر اسے ساری تفصیل

سمجھائی اور خاص طور پر تاکید کی کہ کسی کو حتی کہ اپنی بیوی کو بھی اس بارے میں کچھ نہ بتانا ..... اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اصل قاتل کون ہے' نمبردار کے اپنے گھرانے پر مجھے سب سے زیادہ شک تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ چندرو کو قتل کرنے والوں نے دوہری چال چلی ہے۔ ایک طرف تو انہوں نے اپنے ایک دشمن کا قصہ تمام کر دیا تھا اور دوسری طرف ہیرے کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا تھا۔ مزید معلومات کے لیے میں نے شریف نمبردار کے گھر کام کرنے والی مائی سے رجوع کیا۔ وہ کافی بھروسے کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ ایک رات خفیہ طور پر میں نے اسے تھانے بلا بھیجا۔ میں نے اسی کہا کہ وہ نمبردر کی بیٹی سے کچھ اور باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے دن رات کے وقت بڑھیا پھر میرے پاس آئی اس نے بتایا کہ رانو کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے باپ یا بھائیوں وغیرہ میں سے کسی نے چندرو کو قتل نہیں کیا۔

چندرو' شریف نمبردار کے ایک بچپن کے یار کا بیٹا تھا۔ بہت پہلے اس کے باپ نے رانو کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔ شروع میں وہ کافی پیسے والے تھے لیکن پھر کسی مقدمے میں ان کی ساری زمینیں بک گئیں اور چندرو کا باپ جیل میں مرگیا۔ اس کی ماں اور دو بھائی بھی وبائی بیماری میں مرگئے۔ اب وہ اکیلا تھا۔ رانو کا کہنا ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ چندرو کو اس کے باپ یا بھائیوں نے مروایا ہو گا"

چند روز بعد میں نے خود بھی شریف نمبردار اور اس کے بیٹوں سے غیر محسوس طور پر پوچھ گچھ کی۔ مجھے بھی یہی اندازہ ہوا کہ کم از کم شریف نمبردار کا اس قتل میں ہاتھ نہیں۔ لیکن مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ وہ اس قتل کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ضرور ہے۔ بہر حال میں نے اس سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا جس سے اس کے ذہن میں خیال پیدا ہو کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں۔ شریف نمبردار کا گھرانہ برابر مجھ پر زور دے رہا تھا کہ میں قاتل کو جلد ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔ ان کا اشارہ ظاہر ہے ہیرے کی

طرف تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں قاتل کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔

کوئی تین ہفتے کے بعد قصائیوں اور نمبرداروں میں پھر لڑائی ہو گئی۔ اس دفعہ قصور سراسر نمبردار کے گھرانے کا تھا۔ چھوٹے بچوں کی لڑائی کو بہانہ بنا کر نمبردار اور اس کے حواریوں نے قصائیوں کے گھر پر دھاوا بول دیا تھا۔ انہوں نے ہیرے کے چھوٹے بھائی کو بڑی بے دردی سے مارا تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کھیتوں میں لے گئے اور لاٹھیاں مار مار کر اس کو بے ہوش کر کے پھینک دیا۔ یہ ایک نہایت سنگین واردات تھی۔ میں نے کسی کی طرف داری کی کوشش نہیں کی' صرف انصاف کے تقاضے پورے کیے لیکن اس پر بھی شریف نمبردار آگ بگولہ ہو گیا۔ بعد میں کچھ لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ وہ مجھ پر قصائیوں کی طرف داری کا الزام لگا رہا ہے۔ دوسرے روز ہی بڑی بڑی سفارشیں آگئیں اور میں نے نمبردار کے دونوں بیٹوں کو بادل نخواستہ چھوڑ دیا۔

نمبردار سے اب پہلے والے تعلقات نہیں رہے تھے لیکن پھر بھی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھل کر میری مخالفت کرتا وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ شاید میری جگہ کوئی دوسرا افسر ہوتا تو وہ راتوں رات اس کا تبادلہ کرا دیتا۔ چند دن اور گزر گئے۔ مجھے خطرہ تھا کہ اپنے بھائی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا سن کر ہیرا کہیں طیش میں نہ آجائے۔ اس کی واپسی بہت سے ہنگاموں کی بنیاد ثابت ہو سکتی تھی لیکن آٹھ دس دن گزرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ یا تو اسے اس واقعہ کی خبر ہی نہیں ہوئی یا اس نے وعدہ نبھانے کے لیے خود پر ضبط کر لیا ہے۔ میں مسلسل چندرد کے قاتل کی کھوج میں تھا لیکن ابھی تک کوئی واضح راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ بہر حال تفتیش جاری تھی۔

میں نمبردار کے گھر کام کرنے والی مائی سے وقتاً" فوقتاً" معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ اس کی زبانی مجھے نمبردار کے گھر کے اندرونی حالات کا

علم ہوتا رہتا تھا۔ نمبردار کی لڑکی "رانو" بہت پریشان اور اداس رہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہیرے کو دل سے بھلا نہیں سکی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوبار اس نے بڑھیا سے زہر لانے کی فرمائش بھی کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہیرے کے ساتھ محبت میں بہت دور نکل گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب نمبردار جلد ہی اس کی شادی کر دے گا۔

حسب توقع چند ہی روز بعد پتہ چلا کہ نمبردار اپنی لڑکی کی شادی دھوم دھام سی کر رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر میرا خیال ہیرے کی طرف چلا گیا۔ اگر شادی کے موقع پر اس نے گڑ بڑ کی کوشش کی تو کوئی نہایت سنگین واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔ میں نے شریف نمبردار سے ملاقات کی اور اسے اشارے کنایے میں اس خطرے سے آگاہ کیا۔ اسے اپنے چیلے چانٹوں پر بے انتہا بھروسہ تھا۔ اس نے مغروری سے کہا "چوہدری صاحب اگر اس کی ہوا بھی اس طرف آئی تو واپس نہیں جائے گی؟

شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ نمبردار نے رانو کا رشتہ چھوٹے بھائی کی طرف کیا تھا۔ اسی بھائی کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا۔ اس کا نام نزیر تھا۔ لیکن شہر میں جاکر' میاں محمد نزیر" بن گیا تھا۔ عام طور پر اسے میاں صاحب کہا جاتا تھا "میاں صاحب" سے میری ملاقات شادی کے ایک روز پہلے ہوئی۔ وہ انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے گاؤں آیا تھا۔ اس نے سر پر ٹوپی اور توند کے اوپر شیروانی کسی ہوئی تھی۔ بات چیت میں وہ بڑا نرم خو اور با اخلاق دکھائی دیتا تھا لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مکاری کی چمک نظر آتی تھی۔ میں ایسے لوگوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ اپنے فائدے کے لیے ہر کام کر گزرتے ہیں۔

دولہا مشکوک تھا.....

دوسرے دن بارات آئی تھی۔ میں نے اپنے چند آدمیوں کو سفید کپڑوں میں گاؤں کے ارد گرد متعین کر دیا تھا۔ میں ہیرے کو کسی قسم کا موقع

نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوپہر ایک بجے کے قریب بارات آئی۔ بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ باراتی قریباً" آدھ گھنٹہ تک ہوائی فائرنگ کرتے رہے۔ دولہا کے دوستوں میں مجھے چند بدقماش افراد بھی نظر آئے۔ ایک شخص کو تو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ قتل اور ڈکیتی کے کوئی مقدموں میں ملوث رہا تھا۔ میرے ذہن میں کئی خیال سر اٹھانے لگے۔ رانو کا خاوند مجھے کوئی شریف آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ چندرو کے قتل میں اس کا ہاتھ ہو۔ میں جوں جوں سوچتا گیا ذہن کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ "میاں محمد نذیر" ایک شاعر اور چالباز شخص تھا۔ وہ رانو کی بہت بڑی جائیداد کے لالچ میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتا تھا لیکن اس کے راستے میں چندرو کی رکاوٹ تھی۔ دوسری طرف ہیرا بھی اس کو پریشان کر رہا تھا.....

اس نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے۔ چندرو کو مار کر ہیرے کو قاتل بنا دیا تھا بعد میں شریف نمبردار کو اس حقیقت کا پتہ چلا ہو گا لیکن وہ خود بھی رانو کا ہاتھ چندرو کے ہاتھ دینے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ چندرو ان کے خاندان کی برابری نہیں کرتا تھا۔ اس قتل سے اس کا راستہ خود بخود صاف ہو گیا تھا۔ اس نے چندرو کے قتل کو بھول کر اپنی بیٹی کا ہاتھ بھتیجے کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر لیا تھا..... بارات حویلی کے بڑے دروازے کے سامنے پہنچی دولہا گھوڑے سمیت حویلی کے احاطے میں دخل ہو گیا۔ تمام لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ بارات میں کئی ایک سرکاری عہدیدار بھی نظر آرہے تھے۔ میں عجیب شش و پنج میں تھا کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میرے اندر سے آواز آرہی تھی کہ رانو کا ہونے والا خاوند' "چندرو" کے قتل میں ملوث ہے۔ لیکن بغیر مناسب تیاری اور شہادتوں کے ایسے نازک وقت میں کوئی قدم اٹھانا سراسر حماقت تھی۔ تھوڑی دیر بعد نکاح کی رسم ادا ہو گئی۔ تمام لوگ کھانے کے لیے حویلی کے دوسرے حصے کی طرف بڑے میں نے دولہا کی طرف دیکھا اور میرا شک پختہ یقین میں بدل گیا۔ چندرو کا قاتل دولہا ہی تھا ..... وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

بارات کو رات گاؤں میں ہی رہنا تھا۔ مجھے ہیرے کی طرف سے ابھی خطرہ تھا۔ اس رات میں نے تھانے کی تمام نفری گاؤں کو آنے والے راستوں پر لگا دی تھی۔ خود بھی رات کے گیارہ بجے تک میں صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ بہر حال رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ دوسرے روز بارات دلہن کو لے کر شہر واپس چلی گئی۔ مجھے خوشی تھی کہ چاہے وجہ کچھ بھی ہو۔ ہیرے نے مجھ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا تھا۔ اور کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی تھی۔

دن گزرتے رہے میری بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ انگریز کا زمانہ تھا اور میرے تھانے میں قتل ہوا تھا۔ ابھی تک ملزم گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات میری لیے بڑے خطرے کی باعث تھی۔۔ انگریز اس معاملے میں بہت سخت تھا اور کوئی بہانہ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں نے خفیہ طور پر ثبوت اور گواہیاں ڈھونڈنے کا کام جاری رکھا۔۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ نمبردار کی برادری میں کئی لوگ ایسے تھے جو جانتے تھے کہ چندرو کو نمبرداروں نے خود قتل کروایا ہے لیکن اس کے باوجود وہ زبان کھولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ مجھے ایک جگہ سے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا کہ "رانو" کا خاوند الطاف جسے کئی لوگ "چھوٹے میاں صاحب" بھی کہتے تھے رانو کے منگیتر چندرو سے ملا تھا۔ اس نے چندرو کو ہیرے کے خلاف بھڑکا کر ان دونوں کو لڑایا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی مر جاتا اس کا فائدہ تھا۔ لیکن شاید یہ چندرو بھی کسی حد تک اس بات کو سمجھ گیا تھا۔ حالانکہ پل پر ہونے والی لڑائی میں اس کے ساتھ الطاف کے کئی آدمی تھے۔ لیکن اس نے ہیرے کو جان سے مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ الطاف نے سارا پروگرام پہلے ہی بنا رکھا تھا۔ جب یہ داؤ بیکار ہو گیا تو اس نے چندرو کو قتل کر دیا اور اس قتل میں ہیرے کو پھنسا دیا۔

الٹا چور کوتوال کو.....

میں نے اس کیس پر کافی محنت کی تھی اور مجھے پوری امید تھی کہ مجرم

کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا اور میرے جاننے والوں کو پتہ ہے کہ میں نے فرض نبھاتے ہوئے کبھی خدشوں کو دل میں جگہ نہیں دی۔ ایک روز میں چند سپاہیوں کے ساتھ امرتسر گیا۔ مقامی تھانیدار سے مل کر ہم نے چھاپہ مارا اور الطاف کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ تفتیش میں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ آڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر میں نے چالان مکمل کر کے عدلات میں پیش کر دیا۔ میرے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ اب ذمہ داری عدالت کی تھی کہ وہ مجرم کو چھوڑتی یا سزا دیتی مجھے سخت حیرت ہوئی جب پہلی ہی پیشی میں الطاف کی ضمانت ہو گئی۔ نمبردار اور اس کے حواری اب کھل کر میری مخالف کرنے لگے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے تبادلے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے اس سے بھی لمبا ہاتھ مارا۔ انہوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے رشوت لی کر دانستہ طور پر اصل قاتل ہیرے کو بھگا دیا تھا۔ میرے تھانے میں ہی میرے خلاف پرچہ درج ہوا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد کیس عدالت میں چلا گیا۔ وہ میرے خلاف کوئی ٹھوس ثوبت یا گواہی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ میرا ریکارڈ اور میرا کام اعلی افسروں کے سامنے تھا۔ دوسری ہی پیشی میں مجھے اس الزام سے بری کر دیا تھا۔

شریف نمبردار اور س کا بھائی زخمی سانپ کی طرہ بل کھا کر رہ گئے۔ کچھ دن کے لیے معاملہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن نمبرداروں کی دشمنی چھپائے نہیں چھپتی تھی وہ ایک بار پھر قصائیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چودھ پور میں قصائیوں کے چار گھر تھے۔ دو گھر تو خوفزدہ ہو کر قصبے سے جا چکے تھے۔ اب صرف ہیرے کا باپ اور اس کا بھائی رہ گئے تھے۔ پہلے تو انہوں نے ہیرے کے چچا کو چوری کے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسایا۔ اس کے بعد ہیرے کے باپ سے اس کی دوکان چھڑا دی۔ ان کی دست درازیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز انہوں نے ہیری کی بارہ تیرہ سالہ بہن پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ کنویں پر پانی بھرنے گئی تھی وہاں.

نمبردار کے چھوٹے لڑکے نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی۔ جب لڑکی نے مزاحمت کی تو اس نے اسے طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ اس کا بھائی جو پہلے ہی زخمی تھا اسے چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو اسے دھکے دے کر جوہڑ میں گرا دیا۔ بچی پر الزام یہ لگایا گیا کہ وہ گاؤں کے لڑکوں کو خراب کرتی ہے۔ جب میرے کانوں تک یہ خبر پہنچی تو مجھے سخت طیش آیا۔ صاف ظاہر تھا کہ نمبردار کے لڑکے ہیرے کی دشمنی اس کے گھر والوں سے لے رہے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی میری چھٹی حس خبردار کرنے لگی ہ اب جودھ پور میں خون خرابہ ہو گا.....
"

میں نے شریفوں کو بدمعاش بنتے اور بدمعاشوں کو قاتل بن کر بدلے چکاتے اور خون بہاتے دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب ہیرا واپس آئے گا۔ ویسے بھی جب ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو پھر ظالمون کے دن پوری ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز جودھ پور کی پنچائت بلائی گئی۔ اس میں نمبردار اور اس کے ہمنواؤں نے اس بات پر اصرار کیا کہ قصائیوں کے چال چلن ٹھیک نہیں انہیں قصبے سے نکال دیا جائے۔ عین اس وقت جب پنچایت نمبردار کی حمائتی میں فیصلہ دینے والی تھی میں وہاں پہنچ گیا۔ میں نے کھل کر نمبرار کی مخالفت کی اور سب کے سامنے کہا کہ وہ دشمنی کے لیے معصوم لڑکیون پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ میں نے پنچایت کو فی الحال اپنا فیصلہ محفوظ رکھنے کا مشورہ دیا۔ بھری پنچایت میں نمبردار کی پر زور مخالفت فورا" رنگ لے آئی۔ مجھے امرتسر میں ایس پی کی طرف سے بلاوا آگیا۔ میں فورا" امرتسر پہنچا۔

ایس پی صاحب مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے فرض کی ادئیگی میں حد سے تجاوز کر رہا ہوں۔ شاید ان کا اشارہ پنچایت کے واقعہ کی طرف تھا۔ میں نے واضح طور پر ہیرے کے گھر والوں کی وکالت کی میں نے ایس پی کو بتایا کہ شریف نمبردار اور اس کا بھائی جس انداز سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں اس سے خون خرابے کا اندیشہ ہے۔ میں نے تمام واقعات کی تفصیل کھول کر بیان کی۔

ایس پی صاحب کافی حد تک میری بات سمجھ گئے لیکن ان پر بھی اوپر سے دباؤ تھا۔ بہر حال انہوں نے کہا کہ وہ کل جودھ پور آئیں گے اور خود حالات کا جائزہ لیں گے۔ میں شام کے بعد جود پور واپس آگیا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ میں گھوڑا لے کر باہر نکل گیا اور پورے قصبے کا ایک چکر لگایا۔ پھر میں غیر ارادی طور پر نمبردار کی حویلی کی طرف چلد دیا۔ نمبردار کے ملازموں نے مجھے اندر بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد نمبردار اور اس کا بڑا بیٹا آگئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سیدھے منہ بات نہیں کریں گے۔ وہ میرے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے ان سے کہا "دیکھیں میں سرکاری ملازم ہوں۔ مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ..... میں صرف اپنے علاقے میں امن و امان دیکھنا چاہتا ہوں آپ یہ بات دل سے نکال دیں کہ میں آپ سے کوئی ذاتی دشمنی رکھتا ہوں"

نمبردار کا بیٹا تنک کر بولا "چوہدری صاحب! آپ مطلب کی بات کریں ہمیں معلوم ہے کون ہمارا دوست ہے کون دشمن"

شاید اس کا خیال تھا کہ مجھے امرتسر سے جو بلاوا آیا تھا اس کے نتیجے میں میں معافی مانگنے یا صلح کرنے آیا ہوں۔ میں نے نمبردار سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ہوشیار رہیں۔ اگر اپ کہیں تو میں حویلی کی حفاظت کے لیے کچھ آدمی بھیج دیتا ہوں۔"

شریف نمبردار نے غصے سے کہا "چوہدری صاحب ہماری حویلی آپ کے آدمیوں کی محتاج نہیں ہے۔ ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ آپ ہمیں ہمیشہ اس قصائی کے لونڈے سے ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید ابھی تک آپ کو ہماری طاقت کا اندازہ نہیں"

وہی ہوا جس کا ڈر تھا.....

اس کے لہجے پر میرا خون کھول اٹھا لیکن میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر

بیٹھ کر میں وہاں سے واپس لوٹ آیا۔

اس رات میں تھانے ہی میں رہا۔ احتیاطاً" میں نے کچھ سپاہی سفید کپڑوں میں ادھر لگا دیے تھے۔ رات کافی دیر گئے تک آنکھ نہ لگی۔ قریباً" آدھی رات کے وقت ابھی ذرا سویا ہی تھا کہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ دو سپاہی میرے سرہانے کھڑے تھے۔ میں ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی معاملہ سمجھ گیا۔ میں نے قریب رکھی ٹارچ اٹھائی۔ فوراً" وردی پہنی اور ان کے ساتھ باہر کو لپکا۔

گاؤں سے بھاگو' دوڑو کی آوازیں ارہی تھیں۔ میں نے دیکھا نمبردار کی حویلی کی طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک ہی میرا مخبر بلال شاہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا اس نے کہا۔

"چوہدری صاحب! ہیرے نے شریف نمبردار اور اس کے دونوں لڑکوں کو قتل کر دیا ہے اور حویلی کو آگ لگا کر بھاگ گیا ہے۔

میں نے چند لمحے کے لیے سوچا۔ ذرا اسی تاخیر مجرم کو قانون کی گرفت سے بہت دور لے جا سکتی تھی۔ میں نے اسی وقت گھوڑے پر زین ڈالی۔ بلال شاہ کے علاوہ تین سپاہیوں کو ساتھ لیا اور مجرم کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ قصبے سے باہر نمبردار کے آدمی گھبراہٹ کے عالم میں گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے لیکن ہیرا ان کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا وہ کس طرف گیا ہو گا۔

میرا رخ شہر کی طرف تھا۔ امرتسر وہاں سے کوئی دس کوس کے فاصلے پر تھا۔ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے ہم ایک گھنٹے میں شہر پہنچ گئے۔ ایک بڑی کوٹھی کے سامنے ہم گھوڑوں سے اترے۔ گیٹ پر "میاں محمد نذیر" اور "میاں محمد الطاف" کے نام لکھے نظر آ رہے تھے۔ الطاف . پکڑنے کے سلسلے میں ایک دفعہ پہلے بھی میں یہاں آ چکا تھا۔ ہم نے گیٹ کھٹکھٹایا لیکن کوئی گیٹ کھولنے نہیں آیا۔ تب میں نے دیوار کے اوپر سے دیکھا بڑی بڑی مونچھوں

والا ایک موٹا سا شخص جو شاید کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کراہ رہا تھا۔ اس نے اپنا پیٹ دونوں ہتھوں سے تھاما ہوا تھا۔ میں نے اپور بالکونی میں بھی کسی شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔

میں نے ایک سپاہی کو دیوار پھاندنے کا حکم دیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ کھول دیا۔ ہم بھاگتے ہوئے عمارت کے اندر پہنچے۔ اس وقت اوپر کی منزل سے دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں جا پہنچے۔ سیڑھیوں کے پاس ہی رانو سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کا سسر نذیر ہیرے کے نیچے دبا ہوا چلا رہا تھا۔ اس کی بندوق تھوڑی ہی دور پڑی تھی۔ ہیرے کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں نے ہیرے کو للکارا۔ اس نے جھٹکے سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے پستول سے اس کے سر کا نشانہ لے رکھا تھا۔

"خنجر پھینک دو ہیرے" میں نے گرجدار آواز میں کہا۔ ہیرا رانو کے سسر کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی توند ہلاتا ہوا بھاگا اور ہماری آڑ میں ہو گیا۔ ہیرا الٹے پاؤں آہستہ آہستہ بالکونی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے پستول کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہیرے ایک قدم بھی ہلے تو گولی مار دوں گا" ہیرے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں گرفتاری نہیں دوں گا چوہدری صاحب"

"کھیل ختم ہو گیا ہے ہیرے" میں نے سرد لہجے میں کہا "میں نے تمہیں کہا تھا۔ ادھر کا رخ نہ کرنا"

ہیرے نے کہا "نہیں ..... تم نے کہا تھا چوہدری صاحب میں تمہارے گھر کی دیکھ بھال کروں گا" میں نے کہا۔

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا ہیرے ..... لیکن میں اپنی پوری کوشش کر رہا تھا"

ہیرے کو باتوں میں لگانے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ہیرے کے پیچھے

ایک دروازہ دھماکے سے کھلا۔ بلال شاہ ہیرے پر جھپٹا اور اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ لیکن ہیرے کے جسم میں تو جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے جسم کو ایک جھٹکے سے گھمایا۔ بلال شاہ کی گرفت ڈھیلی ہوئی دوسرے ہی لمحے وہ ہیرے کے سامنے تھے۔ سر کی ایک خوفناک ٹکر بلال شاہ کے منہ پر لگی وہ چاروں شانے چت فرش پر گر گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی ہیرے کو پستول کی زد سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا اس سے پہلے کہ وہ بالکونی سے چھلانگ لگا دیتا میں نے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا پھر گھسٹتا ہوا بالکونی کی طرف بڑھا لیکن میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ سپاہیوں نے اسے دبوچ کر اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑے اور ہتھکڑی لگا دی۔ رانو یہ منظر دیکھ کر سسکیاں لینی لگی۔ ابھی اسے معلوم نہیں تھا کہ جس کے لیے وہ رو رہی ہے وہ اس کے باپ اور بھائیوں کو قتل کر چکا ہے۔ رانو کا خاوند گھر میں موجود نہیں تھا۔

کیس بالکل واضح تھا۔ ہیرے کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ اس کے بوڑھے باپ نے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ دوسری طرف رانو کا سسر "میاں نذیر" مقدمے کی بھرپور پیروی کر رہا تھا اور ہیرے کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میرا تبادلہ دوسری جگہ ہو چکا تھا لیکن جودھ پور کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ رانو کا خاوند عیاش فطرت کا مالک تھا۔ وہ گھر میں کم ہی آتا تھا اس کی راتیں عموماً" بازار حسن میں گزرتی تھیں۔ رانو بڑی تنگی کے دن گزار رہی تھی اس کا سسر اس پر بے حد سختی کرتا تھا اور پھر ایک روز اخبار کی خبر سے پتہ چلا کہ ہیرا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جیل توڑ کر فرار ہو گیا ہے۔ فرار ہونے کے چند گھنٹے کے بعد اس نے رانو کے سسرا اور اس کے خاوند کو قتل کر دیا تھا اور رانو کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہیرا اور اس کے دونوں ساتھی مفرور مجرموں کے ایک دوسرے بڑے گروہ کے ساتھ مل گئے۔ ان لوگوں نے اگلے دو تین سال مشرقی پنجاب کی پولیس کو بے حد پریشان کیا۔ آخر حکومت کی طرف سے معافی کے اعلان پر ڈاکوؤں کے اس گروہ نے خود

کو قانون کے حوالے کر دیا۔ ہیرا بھی ان میں شامل تھا اس نے رانو سے شادی رچالی تھی اور دو بچوں کا باپ تھا۔ ہیرے کو شاید دس سال قید ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا ..... شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ظلم کی انتہا ظالموں کو مظلوم بنا دیتی ہے ..... اور مظلوموں کو سنگ دل۔

——— ○ ○ ○ ———

قاتل کہاں ہے؟

ان دنوں میں ایک دیہاتی تھانے میں تھا۔ اغوا کے ایک کیس کے سلسلے میں شہر آنا ہوا۔ عدالت میں پیشی تھی۔ پیش ہو کر میں باہر نکلا تو میری چھکڑا موٹر سائیکل نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ان دنوں آج کی طرح جگہ جگہ آٹوز شاپ نہیں ہوا کرتی تھیں ..... دفعتاً" میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ میلی سے کپڑے پہنے ایک نیلی کار کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ صرف اس کے پاؤں اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ کار سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک دیوار کے سائے میں کھڑی تھی۔ میں نے کار کے پاس پہنچ کر نیچے گھسے ہوئے شخص کو آواز دی۔ وہ ایک بڑی چابی تھامے جلدی سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر ایک دم اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور قمیص پر پیوند۔ خاصا مفلس دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کے اس طرح گھبرانے پر شک سا ہوا لیکن اتنی جلدی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کوئی شخص پولیس والے کو دیکھ کر گھبراتا ہے تو اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ بعض لوگ نفسیاتی طور پر پولیس کی وردی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ بعض کو کوئی سابقہ تلخ تجربہ یاد آجاتا ہے سنی سنائی باتیں اور قانون سے ناواقفیت بھی اس خوف کا سبب بنتی ہے لہٰذا ضروری نہیں کہ جو شخص پولیس والے کو دیکھ کر گھبرائے وہ مجرم ہی ہو۔ میں نے نوجوان کو سر سے پاؤں تک گھورا پھر ذرا نرمی سے کہا "میرے ساتھ

آؤ"

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ وہ شخص بد کے ہوئے گھوڑی کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ میں چند لمحے تو دنگ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر میری نظر نیلی گاڑی پر پڑی اور میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ پوری رفتار سے بھاگتا ہوا ایک گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ میں جب اس گلی میں پہنچا وہ ایک موڑ پر نظر آیا اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔میں نےموڑپہنچاکردیکھا' دور وہ تیز بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے تعاقب جاری رکھا۔ جب کوئی پولیس والا اس طرح کسی شخص کا پیچھا کرے تو لوگ بہت دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور عموماً" بھاگنے والا زیادہ دور نہیں جا پاتا۔ اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہ ہو تو راہگیر بے خوف ہو کر اسے پکڑ لیتے ہیں لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ وہ شخص انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک رہائشی گلی میں داخل ہوا تھا۔ یہاں دروازوں میں اکا دکا عورتیں تو نظر آ رہی تھیں لیکن مرد لوئی نہیں تھا۔ دور دو آدمی مجھے مخالف سمت سے آتے دکھائی دیئے۔ میں نے انہیں پکار کر کہا "اس شخص کو پکڑو" لیکن جب تک وہ میری بات سمجھتے اور "بھگوڑے" پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کرتے وہ ان کے نزدیک سے فراٹے بھرتا ہوا گزر گیا۔ بہر حال اب ہمارا درمیانی فاصلہ خاصا کم ہو گیا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا ..... لیکن اس وقت اچانک بھگوڑے نے ایک موڑ کاٹا اور دوبارہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی موڑ پر پہنچ کر میں نے اس گلی میں پہنچ کر دیکھا۔ یہ سیدھی گلی کوئی نصف فرلانگ تک چلی گئی تھی' اس شخص کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ کسی قریبی مکان میں روپوش ہو گیا ہے۔ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن میں کار والوں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اس شخص نے گاڑی میں کیا نقص ڈالا تھا۔ میں وہیں سے مڑا اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس روانہ ہو گیا۔ گلی میں اکا دکا عورتیں اور بچے حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھی۔ میں

بھاگتا ہوا واپس کچہری کے سامنے پہنچا۔ یہاں چند افراد کھڑے میرے کسی شخص کے پیچھے بھاگنے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ مجھے واپس آتا دیکھ کر وہ میری طرف لپکے۔ میں نے نیلی گاڑی کی طرف دیکھا اور میرے اوسان خطا ہو گئے ..... گاڑی وہاں سے جا چکی تھی۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا "یہاں جو نیلی گاڑی کھڑی تھی کہاں گئی؟"

ایک دوسرے شخص نے بتایا کہ ابھی گئی ہے"

"کس طرف؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ہاتھ کے ایک جانب اشارہ کیا

"کسی کی گاڑی یہاں کھڑی ہے؟" میں نے کچہری کے سامنے کھڑی چند کاروں کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا ایک کار میں ایک نوجوان لڑکا بیٹھ رہا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ایک شخص کا پیچھا کرنا ہے کیا وہ میری مدد کرے گا۔ نوجوان با اخلاق اور جرات مند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے فوراً" ساتھ والا دروازہ میرے لیے کھول دیا ..... پھر گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی سے میری بتائی ہوئی سمت پر روانہ ہو گئی۔

جلد ہی ہمیں نیلی کار نظر آگئی۔ اگلی سیٹوں پر دو افراد بیٹھے تھے۔ ایک شاید عورت تھی۔ گاڑی درمیانی رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے لڑکے کو اوورٹیک کرنے کا کہا۔ وہ بڑی مہارت سے اوورٹیک کرکے کار آگے لے گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے سیاہ بال سلیقے سے پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ ساتھ بیٹھی ہوئی عورت عام سی شکل و صورت کی تھی۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جونہی ہماری کار نیلی کار سے آگے نکلی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان لوگوں کو رکنے کی ہدایت کی۔ میری وردی کی جھلک دیکھ کر گاڑی والے نے رکنے کے لیے گاڑی کو تھوڑا سا بائیں جانب موڑا ..... اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ..... گڑبڑ ہو گئی ہے۔ گاڑی والے کے چہرے پر اچانک تحیر کے

آثار نظر آئے۔ ہماری گاڑی نیلی کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ نیلی کار کے بریک فیل ہو چکے ہیں۔ ہماری گاڑی کی رفتار چونکہ سست ہو چکی تھی اس لیے وہ پیچھے رہ گئی اور نیلی کار تیر کی طرح ہمارے پہلو سے نکل گئی۔ تقریباً" نصف میل تک سڑک ڈھلوان چلی گئی تھی۔ دور نیچی ایک تنگ سا پل دکھائی دے رہا تھا۔ یہ پل خاصا چھوٹا تھا اور دو طرفہ آمد و رفت کے قابل نہیں تھا۔ دونوں طرف کی گاڑیاں باری باری نہایت ست روی سے گزرتی تھیں۔ اب نیلی گاڑی بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ پل کی جانب آری جا رہی تھی۔ میں نے نوجوان سے رفتار تیز کرنے کو کہا۔ وہ ایک مشاق ڈرائیور تھا اور شاید میرے ساتھ کی وجہ سے کچھ اور بھی دلیر ہو گیا تھا اس نے گاڑی کو جیسے ہوا میں اڑا دیا لیکن اب نیلی کار بھی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے پہیوں کی چرچراہٹ اور کیبن سے برآمد ہونے والی نسوانی چیخیں میں صاف سن رہا تھا۔ نیلی کار بری طرح لہرا رہی تھی۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اطراف کے پتھریلے کنارون یا کسی درخت سے ٹکرا جائے گی۔ نوجوان بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کرتا ہوا کار کو نیلی کار کے بالکل عقب میں لے گیا ..... اب اس بے قابو کار کو اوور ٹیک کرنے کا مسئلہ تھا اور یہ خاصا خطرناک کام تھا۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے بڑی جانفشانی سے نیلی کار کو اوور ٹیک کیا۔ اب دونوں گاڑیوں کی رفتار کم از کم نوے میل فی گھنٹہ تھی۔ پل لحہ بہ لحہ قریب آرہا تھا۔ معلوم نہیں اس پر سے کس سمت کی گاڑیاں گزر رہی تھیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہاں سے گاڑیاں نہایت آہستہ روی سے گزرتی تھیں اور وہاں پہنچ کر نیلی کار کو تباہ کن حادثہ پیش آنا یقینی تھا بلکہ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گاڑی پل تک پہنچ بھی پائے گی؟

میں نے نوجوان سے کہا "گاڑی آہستہ کرو" وہ بھی میرا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف قدرے پریشان نظروں سے دیکھا۔ میں نے ہاتھ

بڑھا کے اس کا شانہ تھپتھپایا وہ پہلے سے پر سکون نظر آنے لگا۔ پھر اس نے گاڑی کی رفتار کم کی' میں نے کھڑکی سے منہ نکالا اور نیلی کار والے سے چلا کر کہا کہ وہ گاڑی کو سیدھا رکھنے کی کوشش کرے۔ اس نے اپنا خوفزدہ چہرہ اثبات میں ہلایا۔ میں نے عورت کی بھی ایک جھلک دیکھی۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید لٹھے جیسا ہو رہا تھا پھر ہماری گاڑی کو ایک دھچکا لگا۔ نیلی کار کا بمپر ہماری گاڑی سے آلگا تھا۔ نوجوان نے بڑی مہارت سے کار کی رفتار کم کرنی شروع کی۔ کوئی تیس سیکنڈ بعد ہم نیلی کار کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ گاڑی رکتے ہی ہم تیزی سے باہر نکلے۔ عورت نے مرد کے شانے پر سر رکھا ہوا تھا اور ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ مرد تھپک تھپک کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مرد اور عورت دونوں باہر نکل آئے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس منہ سے ہمارا شکریہ ادا کریں۔ مرد نے آگے بڑھ کر پہلے نوجوان کو اور پھر مجھے گلے لگا لیا۔

○

یہ شخص علاقے کا ایک نہایت با اثر اور دولت مند شخص تھا۔ اس کہانی میں میں اسے عبدالعزیز کے نام سے پکاروں گا۔ عبدالعزیز کی دیہی علاقے میں کئی مربعے زمین تھی۔ پڑھا لکھا کاشتکار تھا۔ شہر میں اس نے ایک فلور مل بھی لگا رکھی تھی۔ رہائش گاؤں ہی میں تھی۔ ہفتے میں ایک دھ چکر شہر کا بھی لگاتا تھا۔ فلور مل کا کام اس کے بڑے بیٹے نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ آج عبدالعزیز ایک تاریخ کے سلسلے میں کچہری آیا تھا کہ یہ واقعہ رونما ہوا۔ میں نے اس کے ہمراہ جا کر متعلقہ تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ وہیں اس کا بیٹا بھی آگیا۔ وہ باپ سے بالکل مختلف خالص شہری نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا۔ عمر میری توقع سے خاصی کم یعنی صرف انیس سال تھی لیکن بات چیت میں وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔ یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ غصیلا ہے۔

بہر حال ضروری کارروائی سے فراغت کے بعد میں نے عبدالعزیز اور اس کی بیوی سے اجازت چاہی۔ عبدالعزیز نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ میں نے اس گاؤں کا نام لیا جہاں میں تعینات تھا۔ وہ گرمجوشی سے بولا کہ یہ تھانہ تو اس کے راستے میں پڑتا ہے۔ عبدالعزیز کی بیوی بولی کہ آپ ہمارے ساتھ ہی کار میں چلے جائیں۔ میری موٹر سائیکل ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ امکان بھی نہیں تھا کہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ اس صورت میں عبدالعزیز اور اس کی بیوی کی پیش کش غنیمت تھی۔ میں ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

ہم سہ پہر کوئی تین بجے روانہ ہوئے۔ راستے بھر عبدالعزیز بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی بیوی بھی بڑی خوش اخلاق تھی۔ وہ اپنی اور شوہر کی جان بچنے پر بہت مشکور دکھائی دیتی تھی۔ عبدالعزیز کی باتوں سے پتہ چلا کہ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ اس پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ وہ کھیتوں سے گزر رہا تھا۔ کسی نے چھپ کر اس پر تھری ناٹ تھری کے دو راؤنڈ چلائے تھے۔ ایک گولی اس کے بازو میں لگی تھی جب کہ دوسری سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مقامی تھانے میں پرچہ درج ہوا تھا کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی تھیں لیکن نتیجہ کوئی نہیں نکلا تھا۔ عبدالعزیز کسی بے قصور کو سزا دلوانا نہیں چاہتا تھا ورنہ تھانیدار نے تو اسی کہہ دیا تھا کہ جس کا نام لو اسے دس سال قید کرا دوں گا۔

دو ڈھائی گھنٹے کے سفر میں مجھے چوہدری عبدالعزیز کے باری میں اور اسے میرے بارے کافی کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی باتون سے اندازہ لگایا کہ وہ موجودہ حالات سے کچھ خوفزدہ ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی محفوظ نہیں اسے تحفظ کی ضرورت تھی۔ کسی ایسے شخص کی جو اس کی حفاظت کے فرائض ہوشیاری اور جرات سے انام دے اور اس سلسلے میں اس کی نظر مجھ پر پڑی تھی۔ یہ اس نے نہیں کہا تھا بلکہ میرا اندازہ تھا۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

اس روز تو چوہدری عبدالعزیز مجھے میری منزل پر پہنچا کر چلا گیا۔ لیکن تیسرے یا شاید دوسرے ہی روز اس کی کار مجھے لینے آگئی۔ اس نے اپنے آدمی کے ہاتھ ایک رقعہ بھی بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔ چوہدری نہایت اثر و رسوخ والا شخص تھا اور پڑھا لکھا بھی۔ ایسے لوگوں سے تعلقات نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں اور اختلافات کا خمیازہ کہیں نہ کہیں بھگتنا پڑتا ہے مجھے حالانکہ ایک دو ضروری کام تھے لیکن میں اس کے بلاوے پر چلا گیا۔

چوہدری کی حویلی نہایت شاندار تھی۔ بڑے دروازے پر دو گلہ پوش دربان مؤدب کھڑے تھے۔ اندر سے بھی حویلی میں دیہی اور شہری سجاوٹ کا حسین امتزاج موجود تھا۔ چوہدری نے ایک سجے سجائے کمرے میں میرا استقبال کیا۔ وہ ایک منقش پلنگ پر نیم دراز تھا۔ قریب ہی دو عورتیں بیٹھی تھیں ایک تو چوہدری کی بیوی تھی اور دوسری ایک فیشن ایبل سی لڑکی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اس کا نام رخسانہ تھا وہ شہر میں اپنے بھائی کے پاس رہتی تھی۔ دراصل چوہدری عبدالعزیز کے دونوں بچے یعنی رخسانہ اور اس کا بھائی تنویر اپنے باپ سے زیادہ چچا کے قریب تھے۔ وہ شروع سے چچا کے پاس رہے تھے۔ وہیں پلے بڑھے تھے' وہیں تعلیم پائی تھی۔ ان کے چچا کا نام فضل کریم تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی یعنی عبدالعزیز کی نسبت ذرا ترقی پسند اور آزاد خیال تھا۔ ..... ہاں تو جب میں چوہدری عبدالعزیز سے ملا وہ کچھ بیمار سا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ سینے کا درد ہے پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے۔ اس روز اس نے صاف لفظوں میں مجھے کہا کہ میں اس شخص یا اشخاص کا سراغ لگاؤں جو اس کی جان کے درپے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں کچھ عرصے کے لیے مستقلا اس حویلی میں منتقل ہو جاؤں۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے کچھ سرکاری فرائض ہیں اور میرے لیے یہ کسی صورت ممکن نہیں۔ اس نے کہا۔

"انسپکٹر نواز! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہیں کسی نوکری کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تم مجھے اپنے بیٹوں کی طرح لگے ہو۔ میں تمہیں اتنا

کچھ دے سکتا ہوں ..... "

چوہدری پر کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جذبات کی رو میں وہ اصل موضوع سے ہٹ رہے در حقیقت اس نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ کار والے واقعے کے بعد وہ مجھ پر غیر معمولی اعتماد کرنے لگا تھا اور اب چاہتا تھا کہ میں کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہ کر اس کے دشمن کا سراغ لگاؤں۔ نجانے کیوں مجھے اس پر ترس سا آگیا۔ کئی بار آدمی کے پاس سب کچھ ہوتا ہے لیکن اس کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ چوہدری کو اپنے گھر کی طرف سے سکون نہیں تھا۔ بچے اس سے دور تھے بیوی کی پر جوش محبت کا دور ختم ہو رہا تھا۔ زمینوں کے جھگڑے دشمنیاں رقابتیں الگ تھیں۔ کسی نے درست کہا ہے کہ آدمی کتنا بھی بڑا ہو جائے کتنی بھی دولت کمائے کتنا بھی معزز بن جائے لیکن ..... اس کے اندر کہیں ایک معصوم بچہ چھپا رہتا ہے۔ انہونی ہوتی ہے سہم جاتا ہے سمٹ جاتا ہے۔

ان دنوں میں کسی خاص کیس پر مصروف بھی نہیں تھا میں نے چوہدری عبدالعزیز سے کہا کہ میں اس کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کروں گا لیکن وہ تو چاہتا تھا کہ میں اس حویلی سے جاؤں ہی نہیں۔

اس نے کہا انسپکٹر نواز! بس مجھے تمہاری رضا مندی کی ضرورت تھی۔ میرا آدمی ابھی ایس پی بھٹی کے نام میرا پیغام لے کر چلا جائے گا۔ وہ ساری کاروائی خود کر لیں گے۔ بس آپ یہی حویلی تمہارا تھانہ ہے ..... اور اگر ایس پی کے بغیر تمہارا گزارا نہیں تو مجھے ہی ایس پی سمجھ لو میری موجودگی سے اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پکارا کر بولا۔

"اوئے نورے! جا لسی میں مکھن ڈال کر لا ..... اور دو گلاس لانا میں بھی پیؤں گا" اس کے چہرے سے بیماری کا اثر زائل ہو رہا تھا۔

میں نے چوہری عبدالعزیز کے ساتھ حویلی میں رہنا شروع کر دیا۔ بلال شاہ ان دنوں میرے ساتھ تھا میں اسے بھی حویلی میں لے آیا۔ وہ چوہدری عزیز کے ذاتی ملازم نورے کے ساتھ چند ہی روز میں بہت بے تکلف ہو گیا فرصت ملتے ہی دونوں پرانے دوستوں کی طرح کسی کونے میں بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگتے۔ میں بلال شاہ کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ گاؤں کے لوگوں میں کھل مل کر یہاں کے حالات پر گہری نظر رکھے۔ اور وہ اپنی ذمے داری بڑے اچھے طریقے سے نبھا رہا تھا۔ اس نے مجھے میں دن کا بیشتر حصہ چوہدری عزیز کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس نے ایسے افراد کی فہرست فراہم کر دی تھی جن پر اسے شک تھا۔ اس فہرست میں سب سے نام ایک زمیندار شوکی خاں کا تھا۔ شوکی خاں ایک قریبی گاؤں کا چوہدری تھا۔ عبدالعزیز کی زمینوں کی حدیں اس کی زمین سے ملتی تھیں۔ ایک کھیت کا پرانا جھگڑا تھا جو کافی عرصے سے چل رہا تھا لیکن اب شوکی خاں کا ایک بیٹا بڑا "پھنے خاں" نکلا اور اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کھیت پر ہل چلانے کی کوشش کی تھی۔ عبدالعزیز کوئی ایسا جھگڑالو تو نہیں تھا لیکن اس کی پہنچ کافی تھی۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا اس نے اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے شوکی خاں کے بیٹے کو زمین پر ہل چلانے سے روک دیا تھا۔ اس لڑکے کا نام بکو تھا۔ وہ کئی بار چوہدری عزیز کو دھمکیاں دے چکا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے چوہدری کے آدمیوں کو ایک میلے میں پیٹا بھی تھا۔

اس فہرست میں ایک اور نام بھی اہم تھا اور یہ نام تھا۔ فضل کریم کا مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس سلسلے میں میں نے چوہدری سے بات کی تو اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر نواز! میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا" خدا کرے میرا شک غلط ہو لیکن چونکہ تم نے مجھ سے دل کی بات پوچھی تھی۔ اس لیے میں نے اپنے دل کا ہر شبہ تم پر ظاہر کر دیا ہے۔ ..... فضل کریم میرا چھوٹا بھائی

ہے اس پر شک کا اظہار کرتے ہوئے تکلیف ہوئی ہے لیکن میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کا رویہ کبھی مجھ سے برادرانہ نہیں رہا۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد میں نے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی کی تھی لیکن فضل نے میرے بچوں کو مجھ سے اور رابعہ سے بدظن کر دیا راجہ چوہدری کی بیوی کا نام تھا۔

انسپکٹر! میری بیوی ایک روایتی سوتیلی ماں سے بہت مختلف ہے اس نے ہمیشہ رخسانہ اور تنویر کو اپنے بچوں کی طرح سمجھا ہے اوپر سے خود اس کی اپنی اولاد نہیں۔ وہ ان پر جان چھڑکتی ہے۔ جب کبھی وہ یہاں آتے ہیں اس کی خوشی دید کے قابل ہوتی ہے۔ لیکن فضل نے میرے بچوں کو ایسا سبق دیا ہے کہ وہ رابعہ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ فضل کے بھڑکانے سے کئی بار تنویر مجھ سے بھی الجھا ہے۔ ایک بار تو میرا دماغ بھی گھوم گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا اسے عاق کر دوں گا لیکن یہی رابعہ جس کی ہوا کو وہ تلواریں مارتے ہیں میرے آڑے آئی تھی اور اس نے مجھے جذبات کی زد میں بہنے سے روک لیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ واقعہ کب اور کیسے ہوا"

چوہدری عبدالعزیز نے بتایا کہ تنویر نے فضل کی باتوں میں آکر مجھ سے کہا کہ میں اس کے حصے کی جائیداد اس کے نام کر دوں میں نے کہا بیٹے یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے میرے بند جو دل چاہے کر لینا۔ وہ کہنے لگا کہ ابا جان آپ نے ہمیں محتاج بنا کر رکھا ہوا ہے وغیرہ بس اسی بات پر تلخی بڑھ گئی۔

میں زیادہ طوالت میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ کوئی تین چار روز کی کوشش سے میں نے عبدالعزیز کی فراہم کہ وہ فہرست سے مندرجہ بالا دو نام شوکی خاں اور فضل کریم منتخب کئے اور ان کے حوالے سے تفتیش کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا لیکن اسی روز مجھے ایک اور نام تفتیش میں شامل کرنا پڑا۔ اس کے متعلق مجھے چوہدری کی بیوی رابعہ نے بتایا چوہدری کی جان کا سب سے بڑا دشمن ایک چور تھا۔ یہ علاقے میں ٹنڈے چور کے نام سے مشہور

تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ایک پولیس والے نے اس کی بازو کو مروڑ کر تین جگہ سے
توڑ دیا تھا لیکن اس نے چوری کا مال بتانے کی بجائے اپنا دوسرا بازو آگے
دیا تھا۔ ٹنڈا چور چوروں کے اس قبیل سے تھا جنہیں ننگے چور یا ننگے ڈا
بھی کہا جاتا ہے یہ لوگ جسم پر صرف ایک لنگوٹی باندھتے ہیں اور جلد پر تیل
وغیرہ کی مالش کیے رہتے تھے تاکہ اگر کوئی انہیں پکڑنے لگے تو اس کے ہا
پھسل جائیں ایسے چور ٹانگوں کے بڑے پکے ہوتے ہیں بعض تو دس دس میل
بغیر رکے تیز رفتاری سے بھاگ سکتے ہیں ٹنڈے چور کا بھی ایسا ہی ایک گر
تھا۔ ٹنڈے نے چوہدری عزیز سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس کے علاقے
کوئی واردات نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک دفعہ یہ ٹنڈا ج
میں تھا چوہدری عزیز نے اس کے گھر والوں کو سیلاب میں بہہ جانے سے
تھا۔ چوہدری کے کارندوں نے جان پر کھیل کر اس کے بیوی بچوں کو پانی
نکالا تھا۔

"لیکن اب کچھ عرصے سے ٹنڈے چور نے وعدہ خلافی کا سلسلہ شروع
رکھا تھا اور کہنے کے باوجود باز نہیں آیا تھا یہ چوریاں اس کے آدمی نہیں
رہے آخر کوئی دو ماہ پہلے چوہدری عزیز کے آدمیوں نے گاؤں والوں
ساتھ مل کر ٹنڈے کے دو ساتھیوں کو لاٹھیاں مار مار کر ہلاک کر دیا
ٹنڈے نے بعد میں چوہدری کو پیغام بھیجا تھا کہ مرنے والے اس کے گرو
آدمی نہیں لیکن چوہدری جانتا تھا وہ اسی کے آدمی تھے رابعہ کا کہنا تھا کہ
بڑا کینہ پرور شخص ہے ہو سکتا ہے وہ اپنے آدمیوں کی موت کا بدلہ لینے
لیے چوہدری صاحب کی جان لینا چاہتا ہو۔

ٹنڈے کے متعلق میں نے چوہدری عزیز سے بات کی تو وہ خامو
گیا۔ اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں ٹنڈے کو اپنے آدمیوں کی موت کا بڑا رنج ہے
مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ میری جان لینے کی کوشش کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب! جو شخص احسان فراموش ہو سک

وہ قاتل بھی ہو سکتا ہے ..... میں اپنی طرف سے اس کا نام مشکوک افراد میں شامل کر رہا ہوں" چوہدری نے میری بات کا کوئی جواب دیا۔

اگلے روز میں نے صبح سویرے چوہدری کے ذاتی محافظوں کو چوکنا کیا اور خود بلال شاہ کے ساتھ حسن آباد روانہ ہو گیا جس آباد شوکی خاں کا گاؤں تھا گھوڑوں پر سوار دوپہر کے وقت ہم شوکی خاں کی حویلی پہنچے۔ روایتی چوہدریوں کی طرح اونچی پگڑی اور بڑی بڑی مونچھوں والا وہ ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز جلد کی سرخی تھی۔ خون جیسے اس کے مساموں سے چھوٹا پڑ رہا تھا خوش شکل اور صحت مند آدمی تھا۔ وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں لے گیا ابھی جان پہچان کی باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً" حویلی کے صحن کی طرف سے دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں کوئی زور سے چلایا۔ پھر ایسے لگا جیسے کوئی بھاری بھرکم شے بلندی سے گری ہے۔ شوکی خاں کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ ہم سے معزرت کرتا ہوا تیزی سے باہر لپکا۔ صحن سے کچھ ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی زخمی ہے اور بے ہوش میں لانے کی کوشش کی جاری ہے تجسس سے مجبور ہو کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ہوا برآمدے میں چلا گیا۔ یہاں کچی اینٹوں کا جالی دار دیوار نظر آرہا تھا۔ میں نے پردے سے دیکھا۔ دو مرد کسی کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زمین پر گرا ہوا جسم کسی عورت کا تھا۔ شوکی خان بھی قریب کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ غصے میں اور بھی سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ میں باہر نکلا اور دیکھ کر شوکی خاں بری طرح چونک گیا بے ہوش ہونے والی ایک لڑکی تھی اس کے جسم پر میلا کچیلا لباس تھا۔

شوکی خاں بولا۔ "ہماری ملازمہ ہے انسپکٹر اوپر فرش کی صفائی کرتے بچاری کا پاؤں پھسل گیا ہے"

لڑکی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ کافی چوٹیں آئی تھیں یہی غنیمت تھا کہ جان بچ گئی تھی۔ ایک چیز دیکھ کر میں لڑکی کی قمیض شانے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی تازہ

خراشیں بھی میری نگاہ سے چھپی نہ رہ سکیں۔ اس وقت ایک لمبا تڑنگا جو
نوجوان تہبند کرتے میں ملبوس کاندھے سے ریوالور ٹکائے صحن میں داخل
ہوا۔ اس کا رنگ بھی کافی سرخ تھا۔ مجھے یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوئی
شوکی خاں کا بیٹا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

بکو جلدی جلدی اپنے آدمیوں کے ساتھ بے ہوش لڑکی کو لے کر با
نکل گیا۔ شوکی خاں نے بتایا کہ وہ اسے جیپ میں ڈال کر ہسپتال سے جا
گے۔ ان کے جانے کے بعد میں شوکی خاں کے ساتھ بیٹھک میں آگیا۔ ا
کے کچھ کارندے بھی اس کے ساتھ تھے میں نے اسے کہا کہ ان آدمیو
باہر بھیج دو۔ اس نے کچھ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے میری ہدایت پر
کیا۔

میں نے کہا۔ "خاں صاحب! اگر لڑکی ہسپتال پہنچ کر یا پہنچنے سے
مرگئی تو اس کا ایک ہی مطلب ہو گا۔ اسے آپ کے بیٹے نے قتل کیا ہے"

"کیا مطلب ہے تمہارا" شوکی خاں نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ چوہدری لڑکی کا پاؤں نہیں پھسلا اس نے دوسری
سے چھلانگ لگائی ہے جب لڑکی گری تم اور میں دونوں یہاں موجود
تمہیں اچھی طرح یاد ہو گا گرنے کی آواز سے پہلے چیخ سنائی دی تھی۔ چ
گرنے کی آواز میں جو وقفہ تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ لڑکی گری نہیں"

شوکی خاں نے طویل سانس لے کر مصنوعی اطمینان سے بولا۔ "
تم ہوشیار آدمی ہو اور میں ایسے لوگوں کی قدر کرتا ہوں ..... دراصل
قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو کوئی کہاں
روکے۔ تم بتاؤ تمہاری کیا خدمت کریں!"

میں نے خشک لہجے میں کہا "چوہدری! میں خدمت کرانے نہیں
کچھ پوچھنے آیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک بات بتادوا
تمہارے بیٹے کی نیت ٹھیک نہیں لگی۔ اگر لڑکی کو کچھ ہوا تو میں خاموش
رہوں گا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ تیرا بیٹا اس لڑکی کو راستے میں جان سے مارنے کی کوشش کرے گا تا کہ اس کے خلاف فریاد کرنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے۔" شوکی خاں کے چہرے پر پریشانی کی آثار نظر آئے۔ شاید اسے بھی اس بات کا خدشہ تھا وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

کہا جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "اگر بکو کے پیچھے تو میں بھی تمہارے ساتھ چلو گا۔"

چوہدری نے رضامندی سے سرہلا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں' اور بلال شاہ اور شوکی خان گھوڑوں پر سوار تیزی سے جیپ کے تعاقب میں روانہ ہو رہے تھے۔ سرپٹ گھوڑے دوڑے میں ہم نے پانچ میل کا فاصلہ طے کیا لیکن جیپ کے آثار دکھائی نہیں دیے شوکی خاں نے رخ بدلا اور ہمیں ساتھ لے کر گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دریا کی طرف لے آیا۔ دریا کے کنارے پہنچ کر اس نے کہا۔

انسپکٹر نواز تمہارا اندازہ درست ہے بکو لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تم دریا پار کرکے دوسری طرف نکل جاؤ۔ پل یہاں سے کوئی آٹھ میل دور ہے۔ اگر ہم پل کی طرف سے گئے تو کبھی جیپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

دریا کافی چڑھا ہوا تھا اور اسے تیر کر پار کرنا کوئی ایسا آسان نہیں تھا۔ میں نے بلال شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی خوف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پانی سے بلال شاہ کوسوں دور بھاگتا تھا۔ وہ اچھا بھلا تیرنا جانتا تھا لیکن ایک دفعہ اس مفرور مجرم نے اسے اتنی بری طرح غوطے دیئے تھے کہ اس نے پانی میں داخل ہونے سے توبہ کر لی تھی ظاہر تھا کہ مجھے اکیلے ہی دریا پار کرنا ہے۔ میں نے اپنی جیبوں سے نقدی سرکاری ریوالور اور کچھ کاغذات نکال کر بلا شاہ کو تھمائے اور اللہ کا نام لے کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ کوئی دس منٹ کی سخت کوشش کے بعد ہی

میں دوسرے کنارے پر پہنچ سکا۔ ابھی میں بمشکل پانی سے نکلا ہی تھا کہ دور کسی گاڑی کی اڑاتی ہوئی دھول دکھائی دی بکو کی جیپ آ رہی تھی۔ میں بھاگتا ہوا ان کے راستے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ راستہ دریا سے کوئی ایک فرلانگ ہٹ کر تھا جونہی جیپ قریب پہنچی میں نے انھیں ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ بکو کے علاوہ دو اور آدمی موجود تھے۔ ایک نوجوان اور دوسرا ادھیڑ عمر۔ لڑکی پچھلی سیٹ پر پڑی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ساری نشست کو رنگین کر چکا تھا۔

میں نے بکو سے کہا کہ وہ سیدھا سادا مختصر راستہ چھوڑ کر اتنا چکر کاٹ کر کیوں جا رہا ہے؟

وہ بولا "تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ پوچھنے والے؟"

میں اس کو اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ لڑکی دوسرے راستے سے ہسپتال جائے گی۔

وہ کہنے لگا "تھانیدار! تو اس معاملے میں خواہ مخواہ ٹانگ نہ آڑا..... وہ راستہ خراب ہے' جیپ کا ستیاناس ہو جائے گا۔ لڑکی نے نہیں بھی مرنا تو بھی دھچکوں سے مرجائے گی۔"

میں نے کہا "بکو! مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کر میں خود اس راستے سے آیا ہوں۔ صرف ایک فرلانگ کا ٹکڑا ذرا خراب ہے۔ باقی راستہ بالکل درست ہے' تجھے اسی طرف سے جانا ہو گا"

وہ اکرے لہجے میں بولا "اگر میں نہ جاؤں تو تم کیا کر لو گے؟" اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی گرمی دیکھ کر میں جان گیا کہ میرا خدشہ سو فیصد درست تھا۔ بکو لڑکی کو ہسپتال پہنچانے میں نیک نیت نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ راستے ہی میں کہیں مرکھپ جائے۔

میں نے اٹل لہجے میں کہا "میں تجھے اس راستے سے جانے نہیں دوں گا"

وہ دانت پیس کر بولا "تو اچھا روک لو"

جونہی اس نے انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا' میں نے ایک زور دار گھونسہ اس کے منہ پر مارا اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر چابی نکال لی۔ پچھلی سیٹ پر لڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے ایک بڑھک کے ساتھ مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس کی پیشگی بڑھک میرے لیے سود مند ثابت ہوئی۔ میں فوراً" اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وہ دھول سے اٹی ہوئی زمین پر گرا اور دو تین گز تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس دوران بکو نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کندھے سے لٹکتا ریوالور نکال لیا لیکن میری ٹانگ بروقت گھومی۔ قسمت اچھی تھی کہ نشانہ درست لگا۔ ریوالور بکو کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں اچھلا اور جیپ کے بونٹ سے ٹکراتا ہوا کچی زمین پر گرا۔ اس دوران تیسرے آدمی نے اپنی لاٹھی گھمائی اور میرے رکو نشانہ بنانا چاہا میں نے نیچے جھک کر وار بچایا لیکن اس سے پہلے کہ میں سیدھا ہوتا پیچھے سے پہلی شخص نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ بکو غصے میں گالیاں بکتا' جیپ سے اترا اور زور کا مکہ میرے جبڑے پر رسید کیا۔ جونہی دوسرے مکے کے لیے اس کا بازو پیچھے ہٹا میں نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھائیں اور پوری قوت سے اس کے منہ پر دے ماریں۔ ضرب توقع سے زیادہ زور دار ثابت ہوئی۔ بکو ڈکراتا ہوا جیپ کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ میں نے پچھلے شخص کے چہرے پر سر کی ٹکر ماری۔ ذرا اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور میں نے گھما کر اسے بکو پر دے مارا۔ بکو اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر زمین بوس ہو گیا۔ لاٹھی بردار شخص میرے سر کو نشانہ بنانے کے لئے دوسری بار اپنی لاٹھی اٹھا چکا تھا۔ یہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ میں پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھا اور پھرتی سے اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اس کی لاٹھی لہراتی ہوئی زمین سے ٹکرائی۔ میں نے اسے دھکا دے کر بکو پر اچھال دیا۔ بکو نے اس کی زد سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ ایک بار پھر زمین پر جا گرا۔ دو مرتبہ گرد آلود زمین پر لوٹ پوٹ ہونے سے اس کا حلیہ خراب ہو گیا تھا۔ میرے پہلے گھونسے نے اس کا بائیاں ہونٹ پھاڑ دیا تھا' اب اس کا منہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور یوں لگتا

تھا وہ تھوڑی دیر پہلے تک خون پیتا رہا ہے اس نے ایک غلیظ گالی دے کر عمر رسیدہ ساتھی کو اپنے اوپر سے دھکیلا اور تیزی سے بائیں جانب لپکا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ میں نے چند قدم بھاگ کر زور دار چھلانگ لگائی اور جیپ سے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف گرا اس سے پہلے کہ بکو پہنچتا میں ریوالور پر قبضہ کر چکا تھا۔

"خبردار" میں نے لیٹے لیٹے ریوالور بکو کی طرف سیدھا کیا' اگر ایک قدم بھی بڑھایا تو گولی چلا دوں گا۔"

بکو اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ باقی دونوں افراد بھی انہی قدموں پر رک گئے۔ میں نے سرد لہجے میں کہا "پیچھے ہٹ جاؤ جیپ سے"

وہ تینوں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے۔ میں ریوالور ان کی طرف سیدھا کئے جیپ میں آبیٹھا۔ پھر ایک ہاتھ سے میں نے سوئچ میں چابی گھمائی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

بکو غرایا' تھانیدار! تو اپنی جان پر بڑا ظلم کر رہا ہے میں نے ریوالور ہلا کر کہا" لیکن تو اپنی جان پر ظلم نہ کرنا۔ بس اسی طرح سیدھے کھڑے رہنا۔"

وہ خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میں نے اسٹیرنگ گھمایا اور جیپ اپنے پیچھے دھول کے مرغولے چھوڑتی ہوئی دریا کے مخالف سمت روانہ ہو گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ بلال شاہ اور شوکی خاں دریا کے دوسری طرف میرا انتظار کر رہے ہون گے لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ انہیں مطلع کرتا۔

لڑکی بروقت طبی امداد سے بچ گئی۔ وہ ایک غریب لوہار کی بیٹی تھی اور حسن آباد ہی میں رہتی تھی۔ بوڑھے اور معذور باپ کے سوا اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے ابتدائی بیان میں کہا کہ بھوک سے تنگ آکر اس نے چوہدریوں کے کھیت سے کچھ چاول اکھاڑے تھے۔ چوہدری کے کارندوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ اسے بکو خاں کے پاس لے گئے۔ اس نے پہلے تو اسے ڈرایا دھمکایا لیکن جب اس نے اپنی غریبی کا رونا رویا تو وہ بولا کہ وہ اسے اپنی

حویلی میں ملازم رکھ سکتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ حویلی چلی گئی لیکن وہاں بکو خاں اس سے دست درازی پر اتر آیا۔ اس نے اس کی بہت منتیں سماجتیں کیں۔ جب وہ باز نہیں آیا تو اس نے عزت بچانے کے لیے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔

یہ ایسا بیان تھا جو لڑکی کے چہرے پر لکھا تھا۔ میں اس کے ہوش میں آنے سے بہت پہلے یہ بیان سن چکا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا لباس اس کی چہرے کی خراشیں اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ' یہ سب نشانیاں چیخ چیخ کر یہی بیان دے رہی تھیں۔

بکو کا باپ شوکی خاں مجھ سے ہسپتال میں ملا۔ اس نے مجھے خریدنے کی نہایت بھونڈی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا اور بکو کے خلاف قرار واقعی گواہی دی۔ بکو گرفتار ہو گیا اور متعلقہ تھانیدار نے اس کا ریمانڈ لے کر تفتیش شروع کر دی لیکن بعد ازاں لڑکی اپنے پہلے بیان سے منحرف ہو گئی اور اس نے بکو کو بے قصور قرار دے دیا۔ میں جانتا تھا اس نے دباؤ کے تحت ایسا کیا ہے لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ اس مسئلے کی جڑیں بہت گہری اور اس کی شاخیں سالہا سال تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک انسپکٹر کے ناتواں ہاتھ ظلم کے اس درخت کو کاٹنے سے قاصر تھے۔ میرا اصل مسئلہ چوہدری عزیز کی حفاظت تھا۔ اس سلسلے میں میں مختلف بہانوں سے دو مرتبہ شوکی خاں سے ملا۔ اس دوڑ دھوپ سے پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے شوکی خاں کے دو گھبرو بیٹے خاندانی دشمنی میں قتل ہو چکے ہیں۔ اب اس کا یہی ایک بیٹا زندہ ہے۔ یہ ہے تو بہت اتھرا لیکن شوکی خاں اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا یہ اکلوتا وارث بھی اپنی زندگی ہار جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب متنازعہ کھیت کے سلسلے میں چوہدری عزیز سے جھگڑا ہوا تھا تو شوکی خاں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جھگڑا بڑھے اور اس کا غصیلا بیٹا کسی کو قتل کر دے یا خود قتل ہو جائے۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ شوکی خاں اب اس مسئلے کو جلد ہی چھیڑنا نہیں چاہتا۔

شاید وہ اگلی پشت تک انتظار کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال یہ بات بعید از امکان نہیں تھی کہ بکو نے اپنے طور پر چوہدری عزیز کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں نے شوکی خاں کے گاؤں سے پولیس کا ایک قابل اعتماد مخبر لیا اور اسے بکو کی ٹوہ پر لگا دیا۔

اب میں چوہدری کے بھائی فضل کریم کے بارے کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میں اس سے خود ملنا چاہتا تھا لیکن ایک ایسا واقعہ ہوا کہ مجھے ارادہ بدلنا پڑا۔ وہ ایک تاریک رات تھی۔ میں چوہدری عزیز کے ساتھ والے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ اچانک ایک آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ پاٹ دار آواز بلال شاہ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ "خاں صاحب .... خاں صاحب' پکڑا گیا' بھاگو" میں تکیے کے نیچے سے لوڈ ریوالور نکالتا ہوا لالٹین لے کر تیزی سے باہر آیا۔ بلال شاہ کی چارپائی برآمدے میں تھی۔ وہ چارپائی پر نظر نہیں آیا۔ تب میری نگاہ صحن میں پڑی وہ ایک بڑے ٹوکرے پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ ایسے ٹوکرے دیہات میں مرغیوں کے ڈربے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ٹوکرے کو مرغیوں پر الٹا ڈال دیا جاتا ہے ..... لیکن بلال شاہ جس طرح ٹوکرے پر لیٹا ہوا تھا یوں لگتا تھا ٹوکرے میں مرغیوں کی بجائے کوئی بھینسا گھس گیا ہے۔ ٹوکرا زور زور سے ہل رہا تھا۔ اس میں جو کوئی بھی تھا وہ باہر نکلنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا "اٹھ جاؤ اوپر سے"

لیکن وہ مسلسل ٹوکرے سے چمٹا ہوا بولا "نہیں خاں صاحب! بھاگ جائے گا"

"ہے کیا اس میں؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

چور ہے جناب' بالکل ننگا ..... اوپر سے تیل ملا ہوا ہے' بھاگ جائے گا جناب"

"ارے نہیں بھاگے گا۔ یہ پستول نہیں دیکھ رہا تو؟ اوپر سے اٹھ تو

سہی۔"

ٹوکرے کے اندر سے مسلسل جدوجہد کا تاثر مل رہا تھا۔ حویلی کے تمام مرد ملازموں کے علاوہ چوہدری عزیز بھی صحن میں پہنچ گیا تھا۔ بلال شاہ ابھی تک ٹوکرے سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر میری یقین دہانی پر اس نے اپنا بھاری بھرکم جسم ٹوکرے سے اٹھایا۔ دفعتاً" ٹوکرا اوپر اچھلا اور ایک منحنی سا ننگ دھڑنگ شخص نکل کر تیر کی طرح دروازے کی طرف بھاگا رک جاؤ" میں چیخا۔ اس وقت چوہدری کے ذاتی ملازم نورے نے لاٹھی گھما کر ماری وہ اچھل کر بھینسوں کی کھرلی میں جا گرا۔ دو آدمیوں نے اسے دبوچا لیکن وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اس کی پھرتی قابل دید تھی۔ اب وہ بھاگتا ہوا۔ بیرونی دیوار کی طرف جا رہا تھا۔

"اوہو' ای گل ہوئی نا" بلال شاہ چلایا۔

میں نے ریوالور سیدھا کیا۔ جونہی اس شخص نے اچھل کر دیوار کا کنارہ تھامنا چاہا میں نے فائر کر دیا۔ تاریکی میں شعلہ چمکا اور گولی دھماکے سے ننگے چور کی ٹانگ میں لگی۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ بلال شاہ پھر مرغیوں کا ٹوکرا اٹھائے بھاگا اور اس کے اوپر ڈال دیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کی یہ حرکت سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیتی لیکن اس وقت صورت حال سنگین تھی۔ میں نے چوہدری عزیز کو وہیں کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور بلال شاہ کو ساتھ لے کر حویلی کے کمروں کی تلاشی لینے لگا۔ زنان خانے میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔ چوہدری عزیز کی بیوی اور بیٹی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔ میں نے انہیں چوہدری عزیز کے پاس بھیجا۔ تمام کمروں کی تلاشی ضروری تھی۔ ممکن تھا کہ ابھی گروہ کا کوئی آدمی حویلی ہی میں موجود ہو۔ کمرے بالکل خالی تھی' لیکن تلاشی رائیگاں نہیں گئی۔ چوہدری کی بیٹی رخسانہ کے کمرے سے اک ایسی چیز دستیاب ہوئی جس نے مجھے چونکا دیا۔ اس کا تذکرہ میں آگے کروں گا۔ بہر حال میں نے واپس آکر بتایا کہ سب خیریت رہی ہے' چور کوئی چیز لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن چوہدری کے

چہرے پر پھیلی ہوئی تشویش کم نہیں ہوئی تھی اور میں اس کا سبب اچھی طرح جانتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ چور کوئی چیز چرانے کی نیت سے آئے ہی نہ ہوں .....

بلال شاہ نے بتایا کہ وہ کم از کم تین آدمی تھے۔ وہ جاگ رہا تھا' کھٹکے کی آواز سن کر وہ اٹھا تو دو آدمی اس کی چارپائی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یاد رہے کہ بلال شاہ کی چارپائی چوہدری عزیز کے کمرے کے عین سامنے تھی۔ بلال شاہ کو اٹھتے دیکھ کر چور ٹھٹھکے .... اور جب اس نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں میرا نام پکارنا شروع کیا تو وہ واپس بھاگے اور دیوار پھاند کر نکل گئے۔ لیکن تیسرا شخص جو ایک دوسری کمرے میں تھا بلال شاہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ میری گولی اس کی ران میں لگی تھی۔ چوہدری عزیز خود بھی بڑی اچھی مرہم پٹی کر لیتا تھا۔ اس نے نہایت مہارت سے گولی نکال کر پٹی باندھ دی۔ چور چھوٹے سے قد کا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران اس نے اعتراف کیا کہ وہ ٹنڈے کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور ٹنڈے نے ہی انہیں یہاں بھیجا تھا۔ وہ کل چار آدمی تھے۔ ایک باہر کھڑا تھا اور تین اندر آئے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس کا مقصد صرف چوری تھا اور اگر اس کے علاوہ کوئی مقصد تھا بھی تو اسے کچھ معلوم نہیں۔ اس کی اطلاع پر قریبی دیہہ سے دو اور افراد بھی گرفتار کیے گئے یہ بھی ٹنڈے کے گروہ سے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ٹنڈے کو پکڑوا نہیں سکا۔ وہ ایک آوارہ گرد شخص تھا اور ہر واردات کے بعد کچھ عرصہ کے لیے روپوش ہو جاتا تھا۔ پکڑے جانے والے تینوں آدمیوں نے بتایا کہ ٹنڈا اپنے دو قریبی ساتھیوں کی موت سے بے حد افسردہ تھا اور چوہدری سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میں نے چوہدری عزیز سے اس بارے میں بات کی تو اندازہ ہوا کہ اب ٹنڈے سے اس کا اعتماد مکمل طور پر اٹھ گیا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص حویلی میں چوری چھپے اپنے ادمی داخل کر سکتا تھا اس سے کیا ممکن نہیں تھا..... کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ٹنڈے کے پیچھے بھاگنا وقت ضائع کرنے

کے مترادف ہے۔ بہتر یہی ہے کہ حویلی میں رہ کر اس کے اگلے قدم کا انتظار کیا جائے اور اس دوران فضل کریم کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔

اگلے روز کی بات ہے میں دوپہر کے وقت چوہدری کے ملازم نورے کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ حویلی کے سامنے ایک کار آکر رکی۔ بلال شاہ نے آکر بتایا کہ چوہدری کا لڑکا اور اس کا بھائی آئے ہیں۔ میں خود فضل کریم سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ میرا شہر کا چکر بچ گیا تھا۔ بیٹھک میں فضل کریم سے ملاقات ہوئی۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک چالاک شخص دکھائی دیتا تھا۔ پتلون قمیص میں ملبوس تھا اور بال بڑے فلمی انداز میں بنا رکھے تھے۔ تنویر اور وہ چوری کا سن کر خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ تنویر سے بھی ایک دو باتیں ہوئیں۔ وہ میری یہاں موجودگی سے خاصا بیزار دکھائی دیتا تھا۔ سہ پہر کے وقت جب تنویر اور فضل کریم واپس روانہ ہونے والے تھے۔ بارش شروع ہو گئی۔ بارش میں پکی سڑک تک کا سفر بڑا دشوار تھا لہٰذا وہ دونوں رک گئے۔

اس رات میری موجودگی میں پہلی مرتبہ چوہدری عزیز پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس حملے میں اس کا وفادار ملازم نورا ہلاک ہو گیا..... ایک گولی مجھے بھی لگی۔ تفصیل اس واقع کی یوں ہے۔ رات کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہلکی ہلکی بارش جاری تھی۔ چوری کی واردات کے بعد چوہدری کی حویلی کے گرد پہرہ مزید چوکس کر دیا گیا تھا۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ کوئی ایسا واقعہ رونما ہو گا۔ میری آنکھ فائر کی آواز سے کھلی۔ میں بھاگتا ہوا چوہدری کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ وہ بھی فائر کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ اس وقت ساتھ والے کمرے کی تاریکی میں آہٹ سنائی دی۔ چوہدری دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ میں لپک کر اس کے سامنے آیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا" کون ہے؟" ابھی بمشکل میرے منہ سے نکلا ہی تھا کہ تاریکی میں شعلہ لپکا اور انگارہ سا میری کلائی میں اتر گیا۔ میں نے اندازے سے فائر جھونکا۔ کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ میں لالٹین

تھام کر اندر لپکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ اسے حویلی کا چھوٹا کمرہ کہا جاتا تھا۔ اس مختصر سے کمرے کا ایک دروازہ زنان خانے میں کھلتا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرہ خالی نہیں۔ میں نے چونک کر اپنے قدموں کی طرف دیکھا۔ فرش پر چوہدری کے پرانے ملازم نورے کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی تھی۔ گاڑھا سرخ خون قطرہ قطرہ فرش پر ٹپک رہا تھا۔ باہر سے بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں اور تمام اہل خانہ اس چھوٹے کمرے میں جمع ہو گئے۔ ان میں تنویر اور فضل کریم بھی شامل تھے۔ فضل کریم کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے گہری نظروں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ تمام چہرے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ نورے کی لاش دیکھ کر چوہدری کی بیٹی اور بیوی چیخنے چلانے لگیں۔ کسی نے کہا اسے ہسپتال لے جاؤ ..... لیکن یہ مشورہ مضحکہ خیز تھا۔ نورا دیر ہوئی ہلاک ہو چکا تھا۔ چوہدری کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ نورے کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر رونے لگا۔ بلال شاہ بھی سخت دل گیر دکھائی دے رہا تھا۔ نورے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے اس نے کوئی حیرت انگیز منظر دیکھا ہو۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ ہر وقت ہنسی مذاق کرنے والا نورا مر چکا تھا۔ تب چوہدری کی بیوی رابعہ کی نگاہ میری کلائی پر پڑی۔ وہ پریشانی سے بولی۔

"انسپکٹر صاحب! آپ تو زخمی ہیں پھر وہ جلدی سے گئی اور ساتھ والے کمرے سے کسی پرانے کپڑے کو پھاڑ کر پٹی لے آئی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے پٹی باندھی۔ وہ اچھے نقش و نگار کی ایک جاذب نظر عورت تھی۔ خاص طور پر اس کی آواز بڑی دلکش تھی۔ میں نے سوچا جتنی محبت سے اس نے مجھے پٹی باندھی ہے اتنی محبت اپنے خاوند سے کرے تو اس کے سارے دکھ ختم ہو جائیں۔ بہر حال یہ موقع ان باتوں پر غور کا نہیں تھا۔ فرش پر نورے کی لاش پڑی تھی اور قاتل ..... قاتل اسی حویلی میں موجود تھا۔ میں نے چوہدری کے ایک آدمی سے کہا کہ حویلی کے چاروں طرف گہری نظر رکھی جائے اور کسی شخص کو آمد و رفت کی اجازت نہ

دی جائے۔ نورے کی لاش پر چادر ڈال دی گئی۔ چوہدری ابھی تک آنسو بہا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ حویلی کے اندر موجود تمام افراد کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا جائے۔ اس کی ہدایت پر سب لوگ برآمدے میں جمع ہو گئے۔ ان میں چوہدری کی بیٹی رخسانہ' بیوی رابعہ' تنویر' فضل کریم' دو نوکرانیاں اور دو نوکر شامل تھے۔ سب سے پہلے میں نے رابعہ کا بیان لیا۔ اس نے بتایا کہ وہ رخسانہ کے ساتھ پہلو کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ دھماکے سے کھلی۔ اس نے رخسانہ کے بستر پر ہاتھ مارا لیکن رخسانہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی اور اس وقت رخسانہ اس سے ٹکرائی اس نے کہا کہ ابھی گولی کی آواز آئی ہے۔ ہم دونوں چوہدری صاحب کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ اس وقت تیسری گولی چلی۔ ہم نے کسی کو چھوٹے کمرے سے بھاگتی ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم جب چھوٹے کمری میں داخل ہوئیں۔ تو چوہدری صاحب اور آپ لالٹین لیے اندر داخل ہو رہے تھے۔

رخسانہ نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہی بیان دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی آنکھ پہلے فائر پر کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور دہلیز تک آئی۔ اسی معلوم ہو گیا تھا کہ آواز چھوٹے کمرے سے آئی ہے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ آگے بڑھے۔ اس وقت اس کی سوتیلی ماں یعنی رابعہ دروازے میں اس سے ٹکرائی پھر دونوں ساتھ ساتھ چھوٹے کمرے میں داخل ہوئیں۔

فضل کریم حویلی کی بالائی منزل پر سو رہا تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا وہ رابعہ اور رخسانہ کے پیچھے ہی پیچھے موقع پر پہنچا تھا۔ پہلے فائر اور اس کے چھوٹے کمرے تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ تیس سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ اتنے وقت میں جاگنا' دروازہ کھولنا اور سیڑھیاں اتر کر چھوٹے کمرے میں پہنچنا ناممکن تھا۔ یہی نقطہ ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا کہ جس وقت پہلی گولی چلی وہ کہاں تھا۔

فضل کریم نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں اور

سکون لہجے میں بولا "میں اس وقت نیچے صحن میں تھا"

"لیکن آپ تو اوپر سوئے ہوئے تھے۔" میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس پر میرے شک کا اظہار ہو۔ آخر وہ چوہدری کا بھائی تھا۔

وہ بولا "سویا تو اوپر ہی تھا لیکن میرے گردے میں درد ہو رہا تھا۔ کافی دیر سے میں جاگ رہا تھا۔ پھر پیشاب کے لیے میں نیچے صحن میں آیا۔ اس وقت میں غسل خانہ میں تھا۔ جب گولی کی آواز آئی۔ آواز کے ساتھ ہی مجھے ایک کراہ سنائی دی جو یقیناً" نورے کی تھی۔ میں لالٹین تھام کر جلدی سے چھوٹے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس دوران دوسرا اور پھر تیسرا فائر ہوا میں نے بھاگتے ہوئے اپنا ریوالور نکالا۔ جب میں چھوٹے کمرے میں آیا' تمہارے علاوہ بھائی صاحب' بہن (رابعہ) اور رخسانہ بھی کمرے میں موجود تھیں"

فضل کریم کے بعد میں تنویر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سب سے آخر میں پہنچا تھا۔ اس نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ الٹا کہنے لگا۔ "انسپکٹر! بڑے افسوس کی بات ہے تمہاری موجودگی میں ایک قیمتی جان ضائع ہو گئی ہے ..... سچی بات ہے کسی کے بازوؤں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے کہا "تنویر میاں! چوہدری صاحب پر حویلی کے اندر سے حملہ ہوا ہے باہر سے نہیں ..... اور گھر کا بھیدی تو لنکا ڈھا سکتا ہے۔"

چوہدری نے کہا "تنویر! انسپکٹر نے اپنا فرض پوری جانفشانی سے انجام دیا ہے۔ اس نے مجھ پر چلنے والی گولی اپنے جسم پر کھائی ہے ..... تمہیں انسپکٹر سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔"

تنویر اٹھا اور پاؤں پٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے اہل خانہ کے علاوہ چار نوکر بھی قتل کے وقت حویلی میں موجود تھے۔ دو ادھیڑ عمر عورتیں تھیں ایک نو عمر لڑکا اور ایک درمیانی عمر کا مرد۔ میں نے چاروں سے پوچھ گچھ کی۔ صرف درمیانی عمر کا

مرد مجھے کچھ مشکوک لگا۔ اس کا نام عیسی تھا۔ نورے کے بعد سب سے زیادہ یہی شخص چوہدری کے قریب تھا۔ یہ ہر فن مولا شخص تھا۔ زبردست شکاری تھا۔ اس کے نشانے کی کئی بار چوہدری عزیز نے بھی تعریف کی تھی کبھی کبھی یہ چوہدری عزیز کے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ چوہدری، شہری اور دیہی مزاج کے سنگم پر کھڑا تھا۔ جہاں وہ لسی ڈٹ کر پیتا تھا وہاں چائے کا بھی شوقین تھا اور عیسی خان چائے بنانے کے فن میں ماہر تھا۔ ایک دو دفعہ میں نے بھی اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی مزیدار چائے کا لفط اٹھایا تھا۔ عیسی کے متعلق مجھے جس چیز نے مشکوک کیا وہ اس کے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی تھی، زخم تازہ تھا اور میری کلائی کی طرح اس کی ہتھیلی سے بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے اس زخم کے متعلق پوچھا اس نے بتایا کہ وہ حویلی کے صحن میں چھپڑ کے نیچے چوہدری کی بھوری بھینسوں کے پاس سو رہا تھا (چوہدری کے پاس نہایت اعلی نسل کی دو بھوری بھینسیں تھیں اور وہ صرف ان ہی کا دودھ استعمال کرتا تھا) دوسرے دھماکے سے اس کی آنکھ کھلی وہ چارپائی سے اٹھ کر حویلی کے رہائشی حصے کی طرف لپکا لیکن تاریکی کی وجہ سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گرا۔ اس کا ہاتھ قریب پڑی "پنجالی" پر پڑا اور زخمی ہو گیا۔

میں نے پٹی کھلوا کر اس کا زخم دیکھا وہ کسی تیز دھار شے سے آیا تھا۔ اس کے بیان کی مزید تصدیق کے لیے میں نے بھینسوں کے چھپڑ تک جانا ضروری سمجھا۔ یہاں پہنچ کر عیسی کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ اس نے جس پنجالی کا ذکر کیا تھا وہ دور ایک کونے میں رکھی تھی۔ عیسی نے بتایا کہ شاید بعد میں کسی نے ٹھوکر لگنے کے خیال سے پنجالی کو راستے سے ہٹا دیا ہے۔ بہرحال میں نے اس شک کو بھی ذہن میں محفوظ کر لیا۔

وہ صبح کافی ہنگامہ خیز تھی۔ چوہدری پر قاتلانہ حملے اور اس کے پرانے ملازم نورے کی ہلاکت کی خبر دور دور تک پھیل گئی۔ سارا دن حویلی میں پرسا دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ پولیس کے کئی مقامی افسر بھی اس موقع پر موجود تھے۔ چوہدری نے مجھ پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا.... ایس پی

صاحب نے مجھے ہدایت کی کہ میں پوری سرگرمی سے اسے قتل کا سراغ لگاؤں اور چوہدری عزیز کو جان و مال کا تحفظ فراہم کروں۔ کوئی تین روز بعد یہ ہنگامہ ختم ہوا۔

یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ قاتل حویلی کے اندر موجود تھا باہر سے نہیں آیا تھا۔ اس طرح ٹنڈا چور کسی حد تک مشکوک افراد کی فہرست میں سے نکل جاتا تھا۔ لیکن زمیندار شوکی خاں کے بیٹے بکو پر میرا شک کم نہیں ہوا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ملازم عیسی خاں پر مجھے شک پڑا تھا اس کے بارے معلوم ہوا تھا کہ وہ چوہدری عزیز کے پاس آنے سے پہلے شوکی خاں کے پاس ملازم تھا اور اب بھی کبھی کبھار اس سے ملتا تھا۔ ایک دفعہ وہ چپکے چپکے شوکی کے بیٹے بکو کے ساتھ شکار پر بھی گیا تھا۔ بعد میں اس نے چوہدری عزیز سے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی شوکی خاں کے گاؤں نہیں جائے گا۔

موجودہ صورتحال میں عین ممکن تھا کہ بکو نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی ہو۔ گھر کے باقی افراد میں رخسانہ اور رابعہ پر شک فضول تھا۔ یہ درست ہے کہ رابعہ کے بیان کے مطابق جب وہ بیدار ہوئی تو رخسانہ بستر پر موجود نہیں تھی لیکن رخسانہ کا اپنے باپ کو قتل کرنا کسی طور سمجھ نہیں آتا تھا۔ رخسانہ پر مجھے ایک شک تو تھا لیکن اس شک سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی اس درجہ دشمن ہے۔

جہاں تک رابعہ کا تعلق تھا۔ وہ چوہدری کی دوسری بیوی تھی لیکن اس کا رویہ سوتیلی ماں سے خاصا مختلف تھا۔ یہ درست ہے کہ چوہدری سے اسے کوئی خاص انس نہیں تھا لیکن جب عمروں میں اتنا فرق ہو تو باہمی محبت کم ہو ہی جاتی ہے۔ ویسے وہ با اخلاق اور ملنسار عورت تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب چوہدری کو کار کے حادثے میں ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی وہ اس کے ساتھ تھی۔ باقی رہے فضل کریم اور تنویر۔ ان دونوں کا رویہ خاصا الجھا ہوا تھا۔ تنویر ایک نہایت غصیلا نوجوان تھا اور اس سے کسی بھی کام کی توقع کی جا سکتی تھی۔ چچا بھی اسی بھڑکاتا رہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا

باپ اپنی دولت سے اپنے سسرال کا گھر بھر رہا تھا۔ ایک دفعہ اس کے عاق ہونے تک کی نوبت آگئی تھی۔

فضل کریم اس رات بالائی کمرے میں تھا لیکن عین قتل کے وقت وہ صحن میں موجود پایا گیا۔ اس نے گردے کے درد اور پیشاب کا بہانہ بنایا تھا۔ اس وقت وہ چھوٹے کمرے میں داخل ہوا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور ایسے ہی پستول کی گولی نورے کے سر میں لگی تھی۔ حویلی میں اس طرح کا صرف ایک اور پستول تھا اور وہ چوہدری عزیز کا اپنغا لائسنس یافتہ تھا۔ قتل کے وقت وہ چوہدری کے سرہانے رکھا تھا لیکن ایک غور طلب بات یہ تھی کہ اگر یہ قاتلانہ حملہ فضل کریم یا تنویر نے کیا ہے تو انہوں نے اس کے لیے کوئی بہتر موقع تلاش کیوں نہیں کیا جس رات وہ حویلی میں تھے اسی رات چوہدری پر حملہ ہوا انہوں نے خود کو جان بوجھ کر مشکوک کیوں ٹھہرایا۔

اس موقع پر میرا دھیان ایک بار پھر عیسی خاں کی طرف چلا گیا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے تفتیش کو غلط خطوط پر ڈالنے کی غرض سے جان بوجھ کر اس رات کا انتخاب کیا ہو۔

میں جتنا بھی سوچتا تھا آگے بڑھنے کا راستہ پیچیدہ ہوتا جاتا تھا۔ پھر میرا دھیان رخسانہ کی طرف چلا گیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے' چوری کی رات مجھے رخسانہ کے کمرے سے ایک اہم سراغ ملا تھا۔ اس کی میز پر میں نے مانع حمل گولیاں پڑی دیکھی تھیں۔ شاید بوکھلاہٹ میں وہ انہیں سنبھالنا بھول گئی تھی۔ قریب ہی ایک گلاس پڑا تھا یقینی بات تھی یہ گولیاں رخسانہ نے کھائی ہیں ایک کنواری لڑکی کا اس قسم کی گولیاں کھانا کیا معنی رکھتا تھا۔

میں نے سوچا عین ممکن ہے کہ اس معاملے کا نورے کے قتل اور چوہدری پر حملے سے کوئی تعلق ہو۔ چوہدری عزیز نے مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ میں گاؤں کے کسی بھی فرد سے کسی بھی وقت تفتیش میں مدد لے سکتا ہوں اور اس میں اس کے اپنے گھر کے تمام افراد بھی شامل تھے۔ وہ مجھ پر خاصا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اپنے اس حق کا استعمال کرتے ہوئے میں نے ایک

دن رخسانہ کو اس کے کمرے میں جا گھیرا۔ اس کا کمرہ حویلی کا سب سے "ماڈرن" کمرہ تھا۔ فرش پر قالین اور الماری میں کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ بیڑی سے چلنے والا ایک گراموفون اور ٹرانسٹر بھی موجود تھا۔ وہ ان دنوں مستقل گاؤں میں رہ رہی تھی۔ میں اجازت لے کر اندر گیا۔ وہ سب خوابی کے نیلگوں لباس میں تھی۔ میری موجودگی کے پیش نظر اس نے ایک دوپٹے سے اپنا سر اور گریبان ڈھانپ لیا تھا۔ میں چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے جلد ہی اصل موضوع پر آگیا۔ پہلے تو وہ اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولتی رہی لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میری معلومات کہاں تک ہیں اور ان معلومات کی چوہدری عزیز کو منتقلی سے کیا ہو سکتا ہے۔ تو وہ رونے لگی۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا کہ میں اس کے والد کو کچھ نہ بتاؤں ورنہ وہ خود کشی کر لے گی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور اصل بات بتانے کو کہا۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ میرے ڈھب پر آگئی۔ اس نے کہا۔

"وہ یہاں کا ایک دیہاتی لڑکا ہے۔ ایک میلے پر میں چھوٹی ماں (رابعہ) کے ساتھ گئی تھی۔ اس لڑکے نے مجھ سے چھیڑ خانی کی۔ اس چھیڑ خانی پر وہاں جھگڑا بھی ہوا۔ وہ بڑا جھگڑالو لڑکا ہے۔ اس نے ہمارے تین چار کارندوں کو بری طرح مارا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ زمیندار شوکی خاں کا لڑکا بکو تھا۔"

لڑکی کی بات پر مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی چوہدری عزیز نے بتایا تھا کہ شوکی خان کے بیٹے سے ایک میلے پر جھگڑا ہوا تھا۔

رخسانہ آنسوؤں کے درمیان اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولی "چند دن بعد کی بات ہے ایک روز میں چھوٹی ماں کے ساتھ نہر کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک کھیتوں سے دو گھڑ سوار نکلے۔ ایک گھڑ سوار نے چھوٹی ماں کو پستول دکھا کر خاموش کر دیا اور دوسرا مجھے اٹھا کر کھیتوں میں لے گیا۔ یہ وہی ذلیل بکو تھا" یہاں تک کہہ کر رخسانہ رونے لگی۔ میں اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ اس کے آنسو چیخ چیخ کر اس کی بے گناہی کا اعلان کر رہے تھے۔ میں

اسے مزید آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا تسلی کے چند فقرے بول کر اس کی کمرے سے نکل آیا۔

یہ ایک سیدھا سادا عداوت اور عصمت دری کا کیس تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ بکو ہر طریقے سے چوہدری عزیز کو انتقام کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ نورے کے قتل کے وقت وہ حویلی میں موجود نہیں تھا لیکن ایک ایسا شخص موجود تھا جو اس کے گماشتے کا کردار ادا کر سکتا تھا یعنی عیسی خاں

اگلے چند روز میں نے عیسی خان سے کچھ اگلوانے کے لیے اس پر کافی سختی کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اس معاملے میں عیسی خاں کا ہاتھ نہیں۔ اگر عیسی خاں سے کچھ معلوم ہو جاتا تو میں فوراً" بکو پر ہاتھ ڈال دیتا۔ لیکن موجودہ صورت میں ایسا کرنا کوئی خاص سود مند نہیں تھا۔ رخسانہ سے ملاقات کے تین روز بعد کی بات ہے میں اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹا سوچوں میں گم تھا۔ بلال شاہ منع کرنے کے باوجود میرے پاؤں دبانے پر تلا ہوا تھا۔ پنڈلی کو ایک ہی جگہ سے وہ پچھلے دس منٹ سے دبا رہا تھا۔ میری طرح اس کا ذہن بھی کہیں کھویا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"خاں صاحب! آپ بکو کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتے۔ لڑکی کی آبرو ریزی کا جرم تو اس پر ثابت ہے ہی۔ الو کے پٹھے کو ذرا جما کر مار لگائیں سب کچھ بتا دے گا۔

میری پنڈلی پر اس کی سخت گرفت بتا رہی تھی کہ بکو پر واقعی اس کو بہت غصہ ہے ..... دراصل جب میں دریا پار کر کے بکو کو روکنے پہنچا تھا اور زخمی لڑکی کو جیپ پر ہسپتال لے کر گیا تھا' بلال شاہ کو کافی انتظار کے بعد ایک بھینس کی دم پکڑ کر دریا پار کرنا پڑا تھا۔ عین درمیان میں وہ غوطے کھانے لگا تھا۔ شوکی خاں نے بتایا تھا کہ ایک موقع پر تو یہ بھینس کو اپنے ساتھ ہی لے ڈوبنے لگا تھا۔ مجھے یہ بات یاد آئی تو میں مسکرانے لگا۔ بلال شاہ سمجھا شاید میں اس کی تجویز کا مضحکہ اڑا رہا ہوں۔ وہ میری ٹانگ جھٹک کر روٹھی ہوئی

بیوی کی طرح باہر نکل گیا۔

عین اس وقت میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واقعت کی تیز رفتاری میں میں ایک بات بالکل بھول گیا تھا۔ وہ میکنک جس نے چوہدری عزیز کی گاڑی میں نقص ڈالا تھا میرے ہاتھ سے بچ گیا تھا..... اگر وہ ہاتھ آجاتا تو □ □ یہ ایک نہایت اہم سراغ تھا۔ اس مکینک کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں فوراً" اپنے کمرے سے نکلا اور چوہدری عزیز کے پاس جا پہنچا۔ وہ تاش کی میز سجائے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"چوہدری صاحب! آج میں تاش نہیں کھیل سکونگا۔ میرا ارادہ کہیں جانے کا ہے۔"

چوہدری نے سوالی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے اپنے شہر کے پروگرام سے آگاہ کرنے لگا۔ "نہ یار آج کہیں نہ جاؤ" وہ اداسی سے بولا "پتہ نہیں کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! گھبرایئے نہیں میں انشاء اللہ کل شام سے پہلے واپس آجاؤں گا۔"

چوہدری نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ واقعی ایک دکھی شخص تھا۔ چارون رطف دشمن تھے۔ اولاد اس سے دور تھی۔ بیوی بھی غمگسار نہیں تھی۔ وفادار ملازم ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا تھا۔ ایک طویل سانس لی کر بولا۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر! اگر ضروری سمجھتے ہو تو جاؤ لیکن کل واپس آجانا"

"آپ بالکل بے فکر رہیں چوہدری صاحب! نجانے کیوں میری آواز بھر آگئی۔ میں نے آگے بڑھ کر چوہدری عزیز کا ہاتھ تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔

باہر آکر میں نے پہریداروں کو نگرانی کے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ بلال شاہ کو بھی چوکس رہنے کا کہا اور گھوڑے پر کاٹھی ڈال کر پکی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں کوئی چھ بجے گاؤں سے نکلا۔ سرکاری ریوالور میری پاس تھا۔ چوہدری نے کہا بھی تھا کہ میں اس کی کار یا جیپ لے جاؤں لیکن نجانے کیوں میں نے گھوڑے پر جانا مناسب سمجھا اور اب میں سوچتا ہوں کہ اگر اس رات میں گھوڑے پر نہ جاتا تو صورت حال کتنی مختلف ہوتی۔ جب میں گاؤں کی حدود سے نکلا رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ جلد ہی درمیانی راتوں کا چاند مشرق سے نمودار ہو گیا۔ میں گھوڑے پر سوار اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر سفر کر رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر مجھے ایک ملنگ ملا۔ اس ملنگ نے ایک ٹیلے کے دامن میں دھونی رچا رکھی تھی۔ تین چار مرید اس کے ارد گرد تھے۔ مجھے دیکھ کر ملنگ نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔ اس نے مریدوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میں سلام کا جواب دیتا ہوا اپنے راستے پر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی میرے پیچھے ہے۔ میں نے گھوڑا آہستہ کیا۔ ایک شخص سرپٹ ٹٹو بھگاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے گھوڑا روک لیا۔ ٹٹو سوار قریب پہنچ کر نیچے اترا۔ وہ عام دیہاتی لباس میں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"سرکار! ملنگ بابا نے آپ کو بلایا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا کہتا ہے تیرا ملنگ بابا"

دیہاتی نے کہا "سرکار! کوئی بہت ضروری بات لگتی ہے۔"

میں برگزیدہ ہستیوں کا زبردست عقیدت مند ہوں لیکن بہروپیئے قسم کے پیروں فقیروں کو میں نے کبھی قابل توجہ نہیں جانا۔ بہر حال میں ابھی زیادہ دور نہیں آیا تھا' سوچا بات سننے میں کیا حرج ہے۔ میں آہستہ آہستہ گھوڑا بھگاتا ٹٹو سوار کے ساتھ چل دیا۔ ملنگ نے چہرے پر راکھ مل رکھی تھی۔ گلے میں تسبیاں اور چہرے پر خود رو داڑھی تھی۔ وہ لمبے چوغے میں ملبوس التی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ بلند آواز سے بولا'

"تھانیدار! حویلی چھوڑ آیا؟ چھوڑ آیا حویلی؟"

میں اس کے فقرے پر بری طرح چونکا اور اس کے قریب جا بیٹھا۔ ملنگ کی آنکھیں بند تھیں اور وہ وجد کے عالم میں آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

"واپس چلا جا بچہ ..... آج کی رات بڑی بھاری ہے' بڑی بھاری ہے۔"

اس کی پر اسرار آواز نے مجھے ایک لمحے کی لیے لرزا دیا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "ملنگ بابا! کس کی بات کر رہے ہیں آپ"

ملنگ نے جیسے میری آواز سنی ہی نہیں۔ اپنی ترنگ میں کہنے لگا۔ "حویلی میں ..... ایک چڑیل ہے کسی کو اس کا پتہ نہیں ..... آج وہ قتل کر دے گی ..... ہاں قتل کر دے گی۔"

"کون کس کو قتل کر دے گی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

ملنگ نے قہقہہ لگایا پھر زور زور سے ہنسنے لگا "واپس چلا جا بچہ ..... واپس چلا جا ....."

میں چند لمحے گم صم بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم مجھے اندازہ ہوا کہ ملنگ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ سو فیصدی درست ہے۔ میں گھوڑی پر بیٹھ اور نہایت تیز رفتاری سے واپس روانہ ہو گیا۔

جب پہریدار اپنی اپنی لاٹھیاں سنبھال رہے تھے میں حویلی کا دروازہ کھلوا کر اندر داخل ہو گیا۔ احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف دو پہریدار بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ میں محتاط قدموں سے اندر بڑھا۔ بلال شاہ برآمدے میں چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اسے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہوا میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں سے میں نے چوہدری کے کمرے میں جھانکا لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ اپنی چارپائی پر پڑا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت وہ سو رہا تھا۔ ایک بات محسوس کر کے میں چونک گیا۔ چوہدری نہایت گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی سانسیں نہایت دھیمی اور گہری تھیں۔ میں آکر بہ آہستگی اپنی چارپائی پر لیٹ گیا لیکن میرے کان ہر

آواز سن رہے تھے۔ دور کہیں کتے بھونک رہے تھی۔ کبھی کسی پہریدار کی آواز آتی' جاگتے رہنا' کبھی حویلی کے زنان خانے میں کوئی ملازمہ نیند کی حالت میں کھانسنے لگتی۔ میں خاموش بستر پر پڑا رہا۔ اس وقت رات کے تقریباً" گیارہ بجے تھے جب چھوٹے کمرے کی جانب سے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں چارپائی سے اترا اور رینگتا ہوا دروازے میں پہنچ گیا۔ اس جگہ تاریکی تھی اگر قاتل چوہدری کے کمرے میں پہنچ رہا تھا تو مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر چھوٹے کمرے کی تاریکی سے ایک ہیولا برآمد ہوا ..... یہ ایک عورت کا ہیولا تھا۔ وہ ننگے پاؤں چلتی ہوئی چوہدری کی مسہری کی طرف بڑھی میں اپنی جگہ بے حرکت لیٹا رہا۔ عورت' چوہدری کے سرہانے بیٹھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے چوہدری کا منہ دبایا۔ تب اس کے دوسرے ہاتھ نے حرکت کی۔ اس میں ایک درانتی تھی ..... اب مزید تاخیر خطرناک تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور چھلانگ لگا کر عورت پر جا گرا۔ رات کا گمبھیر سکوت ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ میرا دھکا لگنے سے عورت دور جا گری تھی۔ میں نے اس کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا ..... وہ رابعہ تھی۔ چوہدری کی بیوی۔ اس کی شریک حیات اور محافظ۔ ایک لمحے کے لیے میں ساکت رہ گیا۔ عورت نے اس لمحے کا فائدہ اٹھایا اور نہایت پھرتی سے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اگر ایک ساعت کی چوک ہوتی تو نوکیلی درانتی میرے پیٹ کے آر پار ہو گئی ہوتی۔ میں نے تیزی سے پہلو بدلا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر عورت نے الٹے ہاتھ سے دوسری کوشش کی۔ اس دفعہ میں نے لپک کر اس کی کلائی تھام لی۔ زور سے مروڑا دیا تو اس نے چیخ کر درانتی چھوڑ دی۔ کمر پر لگنے والی ایک زوردار ٹھوکر نے اسے کمرے کی دہلیز پر بلال شاہ کے قدموں میں پھینک دیا۔ اس وقت حویلی کے صحن سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔

بلال شاہ نے جھک کر عورت کا چہرہ اٹھایا پھر تحیر خیز آواز میں بولا "وتیرا خانہ.. خراب ..... توں پسوڑیاں پیایاں ہویاں سن؟" رابعہ کے بال

شب کے وقت اس کا کام تمام کرنے آن پہنچی۔ اس سے پہلے ایک دفعہ اس کی کوشش نورے اور میری وجہ سے ناکام ہو چکی تھی۔ اس وقت جب وہ چھوٹے کمرے میں داخل ہوئی تھی' نورے نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے نورے کو قتل کر دیا تھا لیکن پھر میں چوہدری کے سامنے آگیا تھا..... لیکن اس دفعہ نہ نورا تھا اور نہ اس کے خیال میں میں۔ وہ اطمینان سے اندر داخل ہوئی اور غیر متوقع طور پر پکڑی گئی۔

رخسانہ' تنویر اور فضل کریم بالکل بے قصور چابت ہوئے ٹنڈا چور بھی بے قصور تھا لیکن اس کے دوسرے "قصور" اسے جیل کی ہوا کھلانے لے گئے۔ رابعہ پر قتل کے الزام اور بکو پر اعانت جرم میں مقدمہ چلا۔ بکو کو تین سال قید ہوئی لیکن رابعہ عمر قید سے نہ بچ سکی۔

چوہدری عبدالعزیز جو روائتی چوہدریوں سے بہت مختلف تھا' اس واقعے کے بعد کئی برس زندہ رہا اور اکثر مجھ سے ملتا رہا۔

○ ○ ○

بستی اور درندہ

یہ میری زندگی کا ایک یادگار اور حیرت انگیز کیس ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین اس کہانی کو تادیر یاد رکھیں گے لیکن کہانی شروع کرنے سے پہلے میں آپ کو ایک بات خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں۔ شاید اب قارئین بھی اس بارے میں کسی حد تک جان چکے ہوں۔ دراصل میں ہمیشہ سے ایک حقیقت پسند شخص رہا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ دیہی علاقوں میں گزارا۔ ان علاقوں میں لوگ مافوق الفطرت چیزوں پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ ایسی باتیں عام سننے میں آتی ہیں' فلاں لڑکی پر سایہ ہو گیا۔ فلاں شخص پر کسی نے تعویز کر دیئے۔ کبھی قبرستان میں کسی چڑیل کے بارے افواہ اڑتی ہے۔ کبھی پتہ چلتا ہے کہ فلاں کونے میں جنوں کا بسیرا ہے۔ بعض لوگوں کو بڑاوے (چھوٹے قد کے بھتنے) بھی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہمارے ہر دوسرے تیسرے گاؤں میں کوئی ٹیلہ' کوئی کھنڈر یا درختوں کا جھنڈ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کے بارے عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہوتی ہیں۔ یہ تو عام لوگوں کی بات ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ساتھی پولیس والے بھی ان باتوں کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں بلکہ کچھ تھانیدار تو باقاعدہ ملنگوں کے پاس جا کر مجرموں کی نشانیاں دریافت کرتے ہیں اور زمین پر لوٹے گھما گھما کر فال نکلواتے ہیں تادیر اس ماحول میں رہنے کے باوجود میں نے اس ماحول سے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور ہمیشہ

اپنی تفتیش کی بنیاد ٹھوس حقائق پر رکھی اور میرے خیال میں ایک اچھے پولیس والے کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

اب میں اس واقعے کی طرف جو پاکستان ہندوستان بننے سے کچھ عرصے پہلے پیش آیا۔ یہ واقعہ اسی علاقے اور ماحول سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق آپ ڈاکوؤں کی بستی' نامی کہانی میں پڑھ چکے ہیں' جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' ان دنوں یہ خطہ ڈاکوؤں' لٹیروں اور مفرور مجرموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور تھانوں کا بھرم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں سہارنپور میں تعینات تھا۔ یہ ایک کافی بڑا قصبہ تھا۔ چار پانچ ہزار کی آبادی تھی۔ ڈاکخانہ' ہسپتال' اور ہائی سکول ان دنوں بھی وہاں موجود تھے۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے بلال شاہ میرے ساتھ ہی تھا۔ سردیوں کے دن تھے' کوئی دس بجے کے قریب اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت واویلا کرتی تھانے میں داخل ہوئی وہ بالکل تنہا تھی اور سخت ڈری ہوئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ایک چھوٹا بچہ اس نے کولہے سے لگا رکھا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

"وہ میرے پیچھے آ رہا ہے تھانیدار صاحب! وہ مجھے مار ڈالے گا" وہ لرزاں آواز میں چیخی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید مجھ سے لپٹ ہی جاتی۔ میں نے اپنے ہاتھ اسے ذرا پیچھے دھکیلا۔ وہ بار بار مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر دروازے کے باہر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ عورت جلدی سے میرے عقب میں ہو گئی۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور ریوالور تک پہنچ گیا۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں قریب ہوئیں اور پھر ایک شخص دروازے پر نظر آیا' یہ قصبے کا کمپاؤنڈر الطاف تھا اور تھانے کے قریب ہی رہتا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین آدمی اور تھے وہ بھی اسی گلی کے رہائشی تھے۔ وہ دروازے پر ٹھٹھک کر رک گئے۔

"کیا بات ہے الطاف" میں نے کمپاؤنڈر کو مخاطب کیا

"کچھ نہیں جناب" وہ سانسیں درست کرتا ہوا بولا۔ "ہم تو چیخیں سن

کر یہاں پہنچے ہیں"

عورت اب بھی خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے بچے نے ماں کی پریشانی دیکھ کر زور سے چلانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے عورت کو کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ اطمینان سے بتائے' کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

عورت ابھی تک سخت ہراساں تھی۔ اس نے دوپٹہ منہ پر رکھا اور ایک بہت بڑی قسم کھا کر بولی۔

"تھانیدار صاحب! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک بلا دیکھی ہے ..... وہ ' وہ ہمارے گھر کے صحن میں کھڑی تھی ..... تھانیدار صاحب میں ..... "

عورت کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے۔ اس کے ہونٹ خوف سے خشک ہو رہے تھے۔ مجھے لگا کہیں وہ چکرا کر بے ہوش نہ ہو جائے میں ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ عورت خوف سے لرزتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا لرزہ ختم ہوا۔ اس نے چند گھونٹ پانی پیا اور بولی۔

"تھانیدار صاحب! میرا خاوند کھیتوں میں پانی لگانے گیا ہوا ہے۔ میں گھر میں اکیلی ہوں بچے کو پیشاب کرانے کے لیے صحن میں نکلی تو دیوار کے پاس ایک بداوا کھڑا تھا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے اس کا سر دو آدمیوں کے سر جتنا تھا اور قد آٹھ دس سال کے بچے کے برابر۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے چار بازو اور چار ٹانگیں تھیں۔ میں چیخ مار کر باہر بھاگی وہ اچھلتا ہوا میرے پیچھے آیا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میں نے بس اتنا دیکھا کہ تھانے میں بتی جل رہی ہے اور بھاگ کھڑی ہوئی۔"

عورت کی بات سن کر اس کے پیچھے آنے والے افراد کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ مجھے بھی قدرے اطمینان ہوا۔ کمپاؤنڈر الطاف جو اب تک سانس روکے کھڑا تھا بولا "بہن تو نے تو سب کو ڈرا ہی دیا تھا۔ ہم نے سمجھا پتہ نہیں کیا آفت آگئی۔"

میں نے عورت سے کہا "بی بی! تیرا خاوند کون ہے؟"

الطاف بولا "جناب! وہی بشیرا' جس نے پچھلے ہفتے بابے شرفو کے کیس میں گواہی دی تھی"

مجھے یاد آگیا میں نے کمپاؤنڈر کو ہدایت کی کہ وہ اسی وقت جائے اور اسے بتائے کہ اس کے گھر میں کیا ہوا ہے۔ کمپاؤنڈر اس قسم کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔

بولا "میں ابھی جاتا ہوں انسپکٹر صاحب! میں اچھی طرح کان کھینچوں گا اس کے۔ اکیلی عورت کو گھر میں چھوڑ کر جائے گا تو بے چاری ڈرے گی نہیں تو کیا ہو گا۔ بھلے مانس اگر جانا ہی ہے تو کسی کو چھوڑ جا اس کے پاس"

عورت بولی "ڈاکٹر! تو سمجھ رہا ہے کہ میں ڈری ہوں۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے سب کچھ"

میں نے عورت سے کہا "بی بی! مجھے اب کمرہ بند کرنا ہے۔ جا تو بھی آرام کر۔ ابھی تیرا خاوند آجائے گا تو سب ٹھیک کر لے گا"

وہ میرے کہنے پر کھڑی تو ہو گئی لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ابھی وہ گھر نہیں جائے گی۔ بہر حال محلے والے اسے تسلی و تشفی دے کر لے گئے۔ میں بھی کمرہ بند کروا کے چلا آیا۔

اگلی صبح کی ابتدا ایک تکلیف دہ خبر سے ہوئی۔ میں صبح کے وقت چہل قدمی کے لیے نکلا۔ گھر تھانے کے قریب ہی واقع تھا۔ میں مسواک منہ میں ڈالے۔ شلوار قمیص پہنے اپنی ترنگ میں چلا جا رہا تھا۔ رات کی بات ذہن سے بالکل صاف ہو چکی تھی۔ دفعتاً" ایک لرزہ خیز چیخ فضا میں ابھری اور کوئی عورت زور زور سے بین کرنے لگی۔ میں بے ساختہ آواز کی طرف بھاگا۔ صبح صبح مسجد کا رخ کرنے والے ایک دو نمازی بھی لپکتے دکھائی دیئے۔ میں سب سے پہلے دروازے تک پہنچا۔ اس وقت تک مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہی بشیرے کا گھر ہے۔ میں نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ رات والی عورت بھیڑوں کی پوری قوت سے چلا رہی تھی۔ پھر وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر واپس مڑی' میں بھاگتا ہوا اس کے

عقب میں گیا۔ صحن کے عین درمیان میں کوئی زمین پر پڑا تھا۔ قریب ہی ایک کسی رکھی تھی۔ ایک شخص کمرے سے جلی ہوئی لالٹین لے آیا۔ عورت دونوں بازو پھیلائے مرد سے لپٹی ہوئی تھی اور نہایت دلخراش آواز میں رو رہی تھی۔ پہلی بار جب کسی کی موت کا علم ہوتا ہے تو رونے والوں کی آوازیں کلیجہ دہلا دیتی ہیں۔ میں ایسے لمحوں سے ہمیشہ کنی کترایا کرتا ہوں لیکن اس وقت یہ آوازیں سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لالٹین کی روشنی میں بشیرے کا بے جان چہرہ بتا رہا تھا کہ اس مختصر سے گھرانے پر قیامت ٹوٹ چکی ہے۔

میں نے جھک کر لاش کا معائنہ کیا۔ جسم پر خم کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن گردن کی حالت بتا رہی تھی کہ مقتول کا گلا دبایا گیا ہے۔ انگلیوں کے نشانات مدھم روشنی میں بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ لاش کی حالت سے ظاہر تھا کہ واردات ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے بیت چکے ہیں جیسا کہ عموماً" دم گھٹ کر مرنے والوں کی زبان نکل آتی ہے' مقتول کی زبان بھی منہ سے باہر تھی اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح قصبے میں اور قصبے سے باہر پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق بشیرے کے گھر کے سامنے جمع ہونے لگے لیکن کسی کو اندر نہیں آنے دیا گیا۔ میری ہدایت کے مطابق قصبے کے دو معروف کھوجیوں نے کھرا اٹھایا۔ ان دونوں کی متفقہ رائے تھی کہ گھر میں کوئی اجنبی شخص داخل ہوا ہے۔ یہ شخص قصبے کا میکن نہیں تھا۔ کھوجیوں کا قیافہ تھا کہ یہ ٹھگنے قد کا ایک گٹھا ہوا شخص ہے۔ واردات کے وقت وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ اس نے مقتول پر سامنے سے حملہ کیا اور پھر اسے گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔

دن چڑھے میں نے خود بھی مواقعہ واردات کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ مقتول بشیرے اور قاتل کے درمیان کچھ زور آزمائی بھی ہوئی ہے۔ ہو سکتا تھا بشیرے نے کسی سے اپنا دفاع کرنے کی

کوشش کی ہو۔ صحن کے ایک کونے میں کچی دیواروں کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں چھت تک بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کچھ ایسی آثار ملے جن سے اندازہ ہوا کہ قاتل ارتکاب جرم سے پہلے یہاں چھپا رہا ہے۔ بھوسے کے ڈھیر میں ایک گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ اس گڑھے میں گنے کے چوسے ہوئے چھلکے بھی پڑے تھے۔ میں نے مقتول کی بیوی کو بلایا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ قتل کے بعد اس نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ اس کے شوہر کو کسی جن بھوت نے مارا ہے۔ ظاہر ہے وہ خاوند کی موت کا ذمے دار جن بھوت کو نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ میں نے اسے بھوسے کا گڑھا اور گنے کے چھلکے دکھائے۔ وہ کہنے لگی۔ یہ سب کچھ پہلے یہاں نہیں تھا۔ ضرور اس کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔

صورت حال واضح تھی۔ قاتل شروع رات سے ہی اس گھر میں موجود تھا۔ عورت تو اس کی جھلک دیکھ کر گلی میں بھاگ گئی اور وہ اندر ہی کہیں چھپ گیا۔ بعد میں بشیرا اپنی بیوی کے ساتھ کمرے میں کنڈی لگا کر سو گیا۔ وہ اس کمرے میں چھپا اس کا انتظار کرتا رہا۔ بشیرے کا کھیتوں میں جانا ضروری تھا۔ رات آخری پہر وہ بیوی کو جگائے بغیر کمرے سے نکلا اور کسی تھام کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اس موت سے بیخبر تھا جو اس کے انتظار میں تھی۔ قاتل اس پر حملہ آور ہوا۔ وہ طاقت میں مقتول سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس نے اسے نیچے گرایا اور گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے' چند روز پہلے بشیرے نے ایک کیس میں گواہی دی تھی۔ یہ کیس رسہ گیری تھا۔ اس میں قصبے کا ایک رہائشی بابا شرفو مدعی تھا۔ بابا شرفو قصبے کی ایک دلچسپ شخصیت تھا۔ اس کی عمر اسی سال سے زیادہ نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ صحت کے اعتبار سے وہ ہی طرح ستر بہتر سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ سرخ تمتمایا ہوا چہرہ۔ برف کی طرح سفید لیکن چمکدار بال۔ دانت سارے جھڑ چکے تھے لیکن سماعت اور بصارت جوانوں کا مقابلہ کرتی تھی۔ زمانہ شباب کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اس

کی دلچسپ عادتوں میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ رات کو سوتے وقت حقے کی نال اپنے باچھ (منہ) میں دبائے رکھتا تھا۔ اس طرح نیند کی حالت میں بھی اس کا حقہ گڑگڑاتا رہتا تھا اور چوری چکاری والوں کو خبردار کرتا رہتا تھا کہ بابا شرفو جاگ رہا ہے۔

لیکن اس رات بابے شرفو کی یہ آزمودہ ترکیب ناکام رہی۔ وہ قصبے سے باہر زمیندار حاکم علی کے ڈیرے پر مویشیوں کی رکھوالی میں سویا ہوا تھا۔ چور آئے اور بڑی ہوشیاری سے مویشی کھول کر لے گئے۔ چند بھوری بھینسوں اور ان کی بچھڑیوں سمیت کل پندرہ جانور تھے۔ جلد ہی بابے کی چھٹی حس نے اسے جگا دیا۔ اس نے کچھ دور سوئے ہوئے اپنے پوتوں کو آوازیں دیں۔ دو نوجوان لاٹھیاں سنبھالے لپکے لیکن مویشی کہیں نظر نہیں آئے قصبے میں خبر ہوئی حاکم علی کے آدمی گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر بھاگے لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ بابے شرفو نے بہت کہا کہ "ڈنگر" زیادہ دور نہیں گئے لیکن ڈھونڈنے والے ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔

اگلی صبح پرچہ درج ہوا۔ میں نے موقعہ ملاحظہ کیا۔ چند گھنٹے کی تفتیش کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ بابے شرفو کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ رسہ گیر واردات کے دو گھنٹے بعد تک ایک قریبی نالے میں چھپے رہے تھے۔ وہ تمام مویشی ہانک کر اس خشک نالے میں لے گئے تھے اور جب تلاش ختم ہو گئی تھی وہ نکل کر آگے روانہ ہو گئے تھے۔

جس زمیندار کے مویشی چوری ہوئے تھے وہ خاصا با اثر تھا۔ مضافات میں اس کی کافی زمین تھی۔ مسروقہ جانوروں کی مالیت اس دور میں بھی ہزاروں روپے تک پہنچتی تھی، تین چار روز ہم نے سر توڑ کوشش کی لیکن رسہ گیروں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

چوتھے روز مقتول بشریا تھانے آیا اور اس نے مجھے اطلاع دی کہ زمیندار کے مویشی "ملہار" میں ہیں۔ یہ گاؤں سہارنپور سے کوئی پندرہ میل شمال میں سچے سائیں کے مزار کے قریب واقع تھا۔ بشیرے نے بتایا کہ وہاں

ہر سال مویشیوں کی ایک منڈی لگتی ہے۔ ان دنوں بھی منڈی لگی ہوئی تھی۔ وہ بیلوں کی ایک جوڑی خریدنے گیا تھا۔ وہاں اس کی نظر زمیندار حاکم علی کے جانوروں پر پڑی۔

بشیرے کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مویشیوں کی نشانیاں دیکھنے اور انہیں پہچاننے میں خاصا مشاق ہے۔ اس کی اطلاع کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں اسی وقت چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ' "ملہار" پہنچا اور مویشی برآمد کر لیے۔ رسہ گیروں کے تین ساتھی گرفتار کر لیے گئے لیکن سرغنہ جس کا نام شاہو تھا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاہ دین عرف شاہو بڑا پرانا اور بد نام رسہ گیر تھا۔ اس کے بچ نکلنے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ دیکھا جائے تو مسروقہ مویشیوں کی برآمد کا سہرہ بشیرے کے سر بندھا تھا اس کی بروقت اطلاع سے ہی ہم رسہ گیروں پر قابو پا سکے تھے ..... اور اب صرف ایک ہفتے بعد اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

میں نے زمیندار حاکم علی کے علاوہ بابے شرفو اور دوسرے متعلقہ افراد کو تھانے بلایا اور ان سے پوچھ گچھ کی۔ اس پوچھ گچھ سے یہ بات صاف ہو گئی کہ بشیرے کا قصبے میں کسی کے ساتھ شدید نوعیت کا جھگڑا نہیں تھا۔ بابے شرفو نے گمناک لہجے میں کہا۔

"پتر! بشیرے کا دادا اللہ بخشے' میرے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بشیرے کا باپ میرے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا اور بشیرے کی پیدائش تو کل کی بات ہے۔ بڑا فرمانبردار بچہ تھا۔ باپ کی طرح اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ سمجھ نہیں آتی کون اس کی جان سے کھیل گیا؟"

زمیندار حاکم علی نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا "تھانیدار صاحب! سیدھا سادا کیس ہے۔ یہ شاہو یا اس کے کسی ساتھی کا کام ہے۔"

بابے شرفو نے اپنی سفید گھنی بھنویں اچکائیں اور بولا "مجھے نہیں لگتا کہ یہ شاہو کا کام ہے۔"

زمیندار حاکم علی نے کہا "تو تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا تم بھی اسے ہوائی

چیزوں کا کام سمجھ رہے ہو؟"

بابا خاموشی سے اپنا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ فوراً" شاہو کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ در حقیقت میں نے قتل کے فوراً" بعد ہی اپنے مخبروں کو متحرک کر دیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ پہلے بلال شاہ نے ایک اہم اطلاع دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ "شاہو" کی شکل کا ایک آدمی قریبی گاؤں کے قبرستان میں گھوٹا (بھنگ) پی رہا ہے۔

جس وقت میں بلال شاہ کے ساتھ اس گاؤں پہنچا سہ پہر ہو چکی تھی۔ سردیوں میں دوپہر کے بعد فوراً" ہی شام سر پر پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے جلدی جلدی لیکن بڑی احتیاط سے قبرستان کے گرد گھیرا ڈالا اور آہستہ آہستہ بھنگیوں کے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن جب ہم بلال شاہ کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچے وہاں اس قسم کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک مدقوق بوڑھا چھوٹے سے کچے کمرے میں آگل جلائے لیٹا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ میں اس قبرستان میں چھاپہ مارنے پہنچا تھا۔ تب ایک چوری کا کیس تھا لیکن اس وقت بھی پوری احتیاط کے باوجود ہم مجرموں کو ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس دفعہ بھی کچھ ایسے ہی صورتحال نظر آ رہی تھی۔

بلال شاہ جب مجھے اطلاع دینے کے لیے سہارنپور روانہ ہوا تھا اس نے گاؤں ہی کے چار بھروسے کے آدمی قبرستان سے باہر مقرر کر دیے تھے اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھیں۔ اب یہ چاروں افراد پورے یقین سے کہہ رہے تھے کہ قبرستان سے کوئی شخص باہر نہیں نکلا۔ اگر اس سے پہلے بھی یہی صورتحال پیش نہ آئی ہوتی تو میں یقیناً" بلال شاہ کو جھوٹا سمجھتا لیکن اب میرا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں نے مدقوق شخص کو ٹھوکا دیکر جگایا۔ اس نے سبز رنگ کا لمبا سا چوغہ پہن رکھا تھا۔ داڑھی میں مہندی لگا رکھی تھی۔ آنکھیں نشے کی وجہ سے سرخ ہو رہی

تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بھنگ پیئے ہوئے ہے۔ میں نے اس سے ساتھیوں کے بارے پوچھا تو وہ حسب سابق ہاتھ جوڑنے لگ۔ اس کے انداز سے عجب بے نیازی جھلکتی تھی' جیسے کہہ رہا ہو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو مجھے تو اپنی خبر نہیں کہ کون ہوں۔ وہ عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت کمزور بھی تھا۔ ایسے شخص کو مار پیٹ کر کچھ حاصل نہیں' ہوتا الٹا مصیبت گلے پڑ سکتی ہے۔ کہیں کوئی چوٹ زیادہ لگ گئی اور لینے کے دینے پڑ گئے میں نے اسے دھکا دے کر نیچے گرایا وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور وہیں ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔ سب انسپکٹر اور سپاہی میرا منہ تک رہے تھے۔ بلال شاہ سب سے زیادہ پریشان تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ قبرستان کا اچھی طرح جائزہ لو کہیں گڑھا وغیرہ تو نہیں اور درختوں پر بھی اچھی طرح دیکھو۔ اس کے بعد میں نے خود اس کمرے کو احتیاط سے جانچا۔ چٹائی اور دوسرا سامان اٹھایا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ایسا تو عموماً" دیکھنے میں آتا ہے کہ مجرم قبرستانوں میں مسروقہ یا ناجائز چیزیں چھپا دیتے ہیں لیکن زندہ آدمیوں کا قبروں میں گھس جانا تو بعید از قیاس تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ یہ قبرستان تقریباً" دو ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا۔ سپاہی احتیاط سے جائزہ لے رہے تھے۔ بلال شاہ کچھ پشیمان سا میرے پاس آکھڑا ہوا میں نے کہا۔

"بلال شاہ! تجھے شاہو کا پتہ کیسے چلا؟"

بلال شاہ بولا "خانصاحب! میں نے اسے ایک نائی سے ٹنڈ کراتے دیکھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا اور اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ وہ سیدھا اس قبرستان میں چلا آیا۔ میں بھی اس کے پیچھے آیا۔ یہاں محفل لگی ہوئی تھی اور چار پانچ آدمی بھنگ رگڑ رہے تھے۔ ان میں یہ بوڑھا بھی شامل تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بھنگ کا رسیا ہوں۔ انہوں نے مجھے بھی پاس بٹھا لیا۔

"تو تم نے بھی بھنگ پی؟"

"ہاں جی" بلال شاہ نے کہا۔

"اور نشہ بھی ہوا؟"

"ہاں جی ابھی تک سر گھوم رہا ہے" بلال شاہ نے کہا۔

میں نے کہا "بلال شاہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تیرا صرف سر ہی گھوم رہا ہو' تو نے شاہو وغیرہ کو دیکھا نہ ہو' بلال شاہ میری بات نہیں سمجھا۔ میں نے غصے سے کہا "بلال شاہ' تو نے خواہ مخواہ سب کا وقت ضائع کیا ہے۔ جا منہ پر پانی کے چھینٹے مار اور یاد کر شاہو تجھے بھنگ پینے سے پہلے نظر آیا تھا یا بعد میں"

بلال شاہ سچ مچ سوچنے لگ گیا۔ اندھیرا اب گہرا ہونے لگا تھا۔ میں اٹھنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ چند فٹ دور ایک قبر کی مٹی میں حرکت پیدا ہوئی۔ پہلی نظر میں یوں لگا جیسے کوئی اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے تازہ قبر تھی اور زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس وقت بلال شاہ کی نظر بھی حرکت کرتی ہوئی قبر پر پڑی۔ اس کے منہ سے ایک ناقابل فہم آواز نکلی۔ اور وہ جو پہلے ہی نشے میں تھا بھاگ کھڑا ہوا۔ قبر کی حرکت اور بلال شاہ کی آواز نے میرے جسم میں بھی سردی کی لہر دوڑا دی۔ بہر حال میں نے دل مضبوط رکھا اور غور سے قبر کی طرف دیکھتا رہا..... دفعتاً" قبر کی مٹی دو حصوں مین بٹ گئی اور اندر سے ایک آدمی کا سر نظر آیا' پھر دوسرا سر دکھائی دیا اور پھر تیسرا وہ چار آدمی تھی۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی تھیں۔ اور وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے۔ انہوں نے میری وردی اور میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریولاور دیکھا پھر بھی کسی نے بھاگنے کی ہمت نہیں کی۔ دراصل وہ پہلے ہی نیم مردہ تھے۔ وہیں قبر کی مٹی پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے بلال شاہ کی چیخیں سن کر اے ایس آئی فرزند علی سپاہیوں کے ساتھ بھاگتا ہو موقع پر پہنچا۔ انہوں نے بھی ٹوٹی ہوئی قبر اور ہانپتے ہوئے مجرم دیکھے اور حیران رہ گئے۔ ٹارچوں کی روشنی میں ان کے چہرے ہلدی کی طرح زرد دکھائی دے رہے تھے۔ بلال شاہ کی اطلاع کے عین مطابق ان مین ایک چمکتی ہوئی ٹنڈ

ولا اشخص تھا سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے قبر کا معائنہ کیا۔ وہ تقریباً 6 x 3 فٹ کی ایک عام قبر تھی لیکن اندر "میانی" نہیں تھی۔ اوپر سے نیچے تک چوکور گڑھا تھا گڑھے پر تختے رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ یقیناً" یہ سارا عمل چند منٹ میں مکمل ہو گیا ہو گا اور کرنے ولا وہی مدقوق بوڑھا تھا۔ مجرم بروقت ہماری آمد سے باخبر ہو گئے تھے۔

لیکن ایک بات سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہم اس قبرستان میں قریباً" ڈیڑھ گھنٹے سے موجود تھے اور ظاہر ہے مجرموں کو اس تنگ گڑھے میں بیٹھے ڈیڑھ گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس تنگ جگہ میں چار آدمیوں کا پندرہ بیس منٹ بھی زندہ رہنا ناممکن تھا۔ پھر یہ سب کیسے ہوا؟ اچانک سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ سب انسپکٹر نے مجرموں کا نشہ ہرن کرنے کے لیے پانی کی نصف بھری ہوئی بالٹی اٹھائی اور ان پر پھینک دی۔ یہ بالٹی کمرے میں پڑی تھی۔ اور تلاشی کے دوران میں نے اٹھا کر دہلیز پر رکھ دی تھی۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ بالٹی اس سوراخ کے عین اوپر آگئی جو قبر میں ہوا کی آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھا۔ ہوا بالکل بند ہو گئی اور مجرموں کا دم گھٹنے لگا۔ سپاہیون کے بوٹوں کی دھمک سے مجرموں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس ابھی واپس نہیں گئی۔ وہ کافی دیر خود پر جبر کرتے رہے۔ بالاخر بے ہوش ہونے کی قریب پہنچ گئے اور زور لگا کر قبر سے باہر نکل آئے۔

○

رسہ گیر ساہو درمیانے قد کا ایک مضبوط شخص تھا جس وقت وہ گرفتار ہوا ننگے پاؤں تھا۔ میرے ذہن میں کھوجیوں کے الفاظ گونجنے لگے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ بشیرے کا قاتل گھٹے ہوئے جسم کا کوتاہ قد شخص ہے۔ شاہو کی پیشانی پر ایک زخم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ عین ممکن تھا یہ زخم بشیرے کی کسی کاہو۔ بہرحال اس موقع پر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

رات کوئی دس بجے ہم ملزم کو لے کر سہارنپور پہنچے۔ تھانے پہنچ کر

میں سب سے پہلے شاہو سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا لیکن تھانے پہنچنے سے پہلے ہی یہ بات ثابت ہو گئی کہ بشیرے کا قاتل شاہو نہیں ہے۔ ابھی ہم قصبے کی بیرونی حدود ہی میں تھے کہ ایک جگہ کھیتوں میں لوگوں کا جمگھٹا نظر آیا۔ دیہی زندگی اور وہاں کی عادات و اطوار کا میں اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ جمگھٹا دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی شخص قتل ہو گیا ہے۔ گنے کے ایک کھیت کے کنارے لوگ نیم دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ کچھ دور عورتوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ اکا دکا مرد یہاں وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کھیت کے درمیان میرا ایک اے ایس آئی چند سپاہیوں کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔

میں گرفتار شدہ مجرموں کو فرزند علی کے حوالے کر کے چند سپاہیوں کے ساتھ موقعہ واردات پر پہنچا۔ ایک بوڑھی عورت مجھے دیکھ کر زور زور سے بین کرنے لگی۔ ایک بوڑھا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے زمین پر گم سم بیٹھا تھا۔ میں کھیت میں داخل ہوا لالٹینوں کی روشنی میں ایک نوجوان لڑکی زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ زندگی کا مختصر سفر ختم کر چکی ہے۔ اس کی قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی ..... اور چہرے پر خراشوں کے نشان موجود تھے۔ قریب ہی ایک درانتی پڑی تھی لیکن یہ درانتی لڑکی کی تھی اور اس کی ہلاکت میں استعمال نہیں ہوئی تھی۔ بشیرے کے انداز میں لڑکی کو بھی گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ لڑکی کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں اوان آنکھوں کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ لڑکی نے کوئی دہشت ناک منظر دیکھا ہے۔

میں نے موقع پر موجود اے ایس آئی سے کچھ سوالات کیے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ لڑکی کے بوڑھے والدین کے مطابق ..... وہ شام کو چارہ لینے کے لیے کھیتوں میں آئی تھی۔ لیکن اس کی لاش گنے کے کھیت میں پائی گئی تھی۔ اے ایس آئی نے بتایا کہ لڑکی کا کاٹا ہوا چارہ ساتھ والے کھیت میں پڑا ہے۔ ایسے بھی کوئی آثار نہیں ملے تھے۔ جن سے شک ہوتا کہ مقتولہ کو بردتی کھیت میں لایا گیا ہے۔ لاش کا ظاہر معائنہ کرنے کے بعد میں مقتولہ

کے سوگوار والدین کے پاس پہنچا۔

بوڑھی عورت نے روتے ہوئے بتایا کہ "حنیفاں میری سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ کرماں جلی کے لیکھوں میں سہاگ کی مہندی نہیں تھی۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہونے والی تھی ..... ہائے میری حنیفاں تجھے کس کی نظر کھا گئی۔" عورت نے بڑے دکھ سے کہا اور رانیں پیٹنے لگی۔

پتہ چلا کہ حنیفاں کی شادی سلطان نامی ایک نوجوان سے ہونے والی تھی۔ حنیفاں اور سلطان آپس میں چچا زاد تھے۔ والدین چاہتے تھے کہ زمین تقسیم نہ ہو لہٰذا دونوں کی شادی کے ذریعے زمین کو بٹنے سے بچایا گیا تھا۔ میں نے تھانے پہنچ کر لڑکی کے ورثا کے علاوہ سلطان اور اس کے والدین کو بھی بلا لیا۔ سلطان ایک لمبا تڑنگا نوجوان تھا اور کافی خوبصورت بھی۔ اسے دیکھتے ہی پہلی بات مجھے یہ محسوس ہوئی کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی شادی بے جوڑ تھی۔ لڑکی درمیانے قد کی تھی اور شکل و صورت بھی درمیانی تھی۔ اس کے برعکس سلطان ان نوجوانوں میں سے تھا' لڑکیاں جنہیں کھڑکیوں سے دیکھتی ہیں۔

میں نے مقتولہ کی ماں سے پوچھا کہ انہیں قتل کا علم کیسے ہوا۔ بوڑھی عورت روتے ہوئے بولی "تھانیدار صاحب! حنیفاں کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو میں اس کی تلاش میں نکلی۔ میری قسمت میں سب سے پہلے بیٹی کا منہ دیکھنا لکھا تھا۔ میں نے کماد کے کھیت میں اس کی لاش دیکھی اور چکرا کر گر گئی۔

اتفاق سے جس وقت مقتولہ کی ماں بے ہوش ہو کر کھیت کے کنارے گری۔ اسی وقت بشیرے کو دفنانے والے قبرستان سے واپس آرہے تھے۔ انہوں نے کھیت کے منڈھیر پر عورت کو بے سدھ پڑے دیکھا۔ وہ قریب پہنچے تو انہیں ایک دوسری عورت کماد کے کھیت میں نظر آئی۔ یہ مقتولہ حنیفاں تھی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہ دوسرا وحشیانہ قتل

تھا۔ دونوں واقعات میں کافی مشابہت پائی جاتی تھی۔ مرنے والوں کا گلا گھونٹا گیا تھا اور جسموں پر کسی بڑے زخم کا نشان نہیں تھا۔ دونوں لاشوں کے قریب ایک ایسا آلہ موجود تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن یہ الہ ہلاکت کا سبب نہیں بنا تھا۔ بشیرے کی لاش کی پاس کسی اور حنیفاں کے قریب درانتی موجود تھی۔ ایک اور چیز دونوں واقعات میں مشترک تھی۔ یہ مشابہت کافی دلچسپ دکھائی دیتی تھی۔ اور عین ممکن تھا محض ایک اتفاق ہو۔ بشیرے کی طرح حنیفاں کی لاش کے پاس بھی چوسے ہوئی گنے کے چھلکے موجود تھے۔ اگر یہ دونوں قتل ایک ہی شخص کے کھاتے میں جاتے تھے تو پھر رسہ گیر شاہو یقیناً" بے قصور تھا۔ کیونکہ جس وقت حنیفاں کا قتل ہوا۔ شاہو "قبر" میں تھا۔

ایک چیز ان واقعات پر مزید روشنی ڈال سکتی تھی اور وہ تھی زمین کی واہی۔ یعنی پاؤں کے نشانات سے پتہ چل سکتا تھا کہ بشیرے اور حنفیاں کا قاتل ایک ہے یا نہیں لیکن لاش دریافت ہونے کے بعد بہت سے افراد کھیت میں گھومے پھرے تھے لہٰذا یہ ثبوت یقیناً ضائع ہو چکا تھا۔ میں نے حنفیاں کی لاش شہر پوسٹ مارتم کے لیے بھجوا دی کیونکہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ قتل سے پہلے اس سے زیادتی کی گئی ہو۔ میں نے تقریباً" بیس افراد کے بیانات قلمبند کئے۔ صرف ایک بیان ایسا تھا جو اس قتل کے ایک امکانی پہلو کی طرف روشنی ڈالتا ہے۔ یہ بیان لڑکی کے والد محمد بوٹا کا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ حنفیاں کا منگیتر یعنی سلطان اس شادی پر رضا مند نہیں تھا۔ اس کے گھر والے اس پر زبردستی کر رہے تھے ایک دفعہ اسی مسئلے پر اس کا باپ سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ محمد بوٹا کو شک تھا کہ سلطان کسی اور لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا اور اس سے شادی کا خواہشمند ہے۔

لڑکی کے باپ نے واضح طور پر سلطان کو مجرم نہیں ٹھہرایا تھا لیکن اس کا بیان دلی خدشے کی نشاندہی کرتا تھا اور یہ بات کوئی ایسی ناممکن بھی نہیں تھی۔ اگر سلطان کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا تو ظاہر ہے حنیفاں

اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ تمکن تھا کہ اپنی محبوبہ کے اکسانے پر اس نے خاموشی سے اس رکاوٹ کو دور کر دیا ہو۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اسی بیان پر غور کر رہا تھا کہ بلال شاہ اندر داخل ہوا۔

"خاں صاحب ..... خاں صاحب" اس نے دروازے ہی سے ہانک لگائی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ پتہ کرے' سلطان کس لڑکی کے چکر میں گرفتار ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ اتنی جلدی واپس لوٹے گا اور وہ بھی اتنے جوش و خروش سے۔ کمرے کی دہلیز پر پہنچ کر بلال شاہ کو ٹھوکر لگی اور وہ گرتا گرتا بچا۔ یہ ٹھوکر اس بات کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ اس کی اطلاع واقعی اہم ہے' مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی بلال شاہ کو ٹھوکر لگی ہو اور اس کی دی ہوئی اطلاع معمولی ثابت ہوئی ہو۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے دو تین لمبے سانس لئے۔ اپنے بھاری بھرکم وجود کو آکسیجن بہم پہنچائی اور بولا۔

"خانصاحب مسئلہ حل ہو گیا ..... اپ کو پتہ ہے سلطان کس عورت کے چکر میں تھا؟ جناب! وہ عورت مقتول بشیرے کی بیوہ ہے۔ سوہنی نام ہے اس کا"

بلال کی اطلاع حسب توقع نہایت اہم تھی۔ میں نے اس سے تفصیل پوچھی۔ اس نے بتایا کہ سوہنی اور سلطان کافی عرصے سے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔ پھر سوہنی کی شادی بشیرے کے ساتھ ہو گئی اور سلطان بیمار پڑ گیا۔ سنا ہے وہ کوئی نشہ وغیرہ کرنے لگا تھا ہسپتال میں کوئی دو مہینے اس کا علاج بھی ہوا۔ وہ اب بھی اکثر خاموش اور چپ چاپ رہتا تھا۔

تفتیش آگے بڑھتی نظر آرہی تھی۔ یہ مفروضہ اب حقیقت کے قریب نظر آرہا تھا کہ دونوں قتل ایک ہی شخص نے کئے ہیں۔ میں نے اپنے ذہن میں واقعات کی کڑیاں جوڑنا شروع کیں۔ سلطان' سوہنی کے عشق میں گرفتار تھا شادی کے بعد بھی چوری چھپے ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہو سکتا ہے ان دونوں نے فیصلہ کیا ہو کہ وہ اپنی راستے کی رکاوٹیں دور کر دیں۔ یعنی بشیرے

اور حنفیاں کو قتل کر دیا جائے۔ سوچے بھے سمجھے بغیر سوہنی پرسوں رات تھانے پہنچی ہو اور اس نے کہا ہو کہ میں نے صحن میں کوئی عجیب الخلقت سایہ دیکھا ہے۔ اس سے وہ تفتیش کو بھٹکانا چاہتی ہو۔ اس نے قاتل کو خود گھر میں چھپایا ہو اور بعد ازاں موقع دیکھ کر شوہر کو مروا دیا ہو۔ کھوجیوں کی تفتیش کہتی تھی کہ مجرم ٹھگنے قد کا چوڑا چکلا شخص تھا۔ یہ حلیہ سلطان کی طرف اشارہ نہیں کرتا تھا لیکن یہ عین ممکن تھا کہ سلطان نے قتل کا کام اپنی کسی ملازم یا مزارع سے لیا ہو۔

میں نے سلطان اور سوہنی کو شامل تفتیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی روز میں نے پہلے سلطان اور پھر سوہنی کو تھانے میں بلایا۔ سلطان نے پوچھ گچھ کے دوران تسلیم کیا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے سوہنی سے محبت کرتا تھا لیکن والدین (سلطان کے والدین) کی وجہ سے یہ محبت شادی کی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ اس نے کہا کہ اب وہ سوہنی کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ وہ کسی کے بچے کی ماں تھی۔ اس سے خفیہ ملاقاتوں کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ سوہنی نے بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ بشیرا اس کا شوہر تھا اور وہ اس سے بے وفائی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے اسے زیادہ کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ صرف تین روز پہلے اس کا شوہر قتل ہوا تھا اور اگر وہ اس قتل میں شریک نہیں تھی تو یہ پوچھ گچھ اس کی زخموں پر نمک پاشی کر سکتی تھی۔

اسی دوران حنفیاں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آگئی۔ اس رپورٹ نے ایک بار پھر مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ متوفیہ کی موت دم گھٹنے سے ہوئی۔ اسے گردن دبا کر ہلاک کیا گیا۔ جسم پر کئی جگہ خراشیں موجود تھیں لیکن متوفیہ کی عزت نہیں لوٹی گئی۔ رپورٹ کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ متوفیہ کے لباس سے کچھ بال برآمد ہوئے تھے۔ یہ بال نہ مقتولہ کے تھے اور نہ قاتل کے۔ یہ بال کسی انسان کے لگتے ہی نہیں تھے۔ بھورے رنگ کے یہ بال قریباً" چار انچ لمبے تھے اور ساٹھ سے ستر کی تعداد

میں متوفیہ کے لباس پر موجود تھے۔ یہ نقطہ خاصا حیران کن بلکہ پر اسرار تھا۔ ایک بار پھر میری نگاہ کے سامنے اس رات کا منظر گھومنے لگا۔ جب بشیرے کی بیوی' دہشت زدہ چہرے کے ساتھ تھانے میں داخل ہوئی تھی۔ اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی میرے پیچھے بلا آرہی ہے۔

دیہات کی سردی شہر کی سردی سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ کسی گاؤں کا درجہ حرارت نزدیکی شہر کے درجہ حرارت سے کہیں کم ہوتا ہے۔ کھلی آب و ہوا کی وجہ سے درو دیوار پر کہرہ جم جاتا ہے اور جوہڑوں کی بلائی سطح پر برف کی تہہ عام دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن تر و تازہ اور صاف و شفاف ہوا میں سانس لینے کا لطف صبح کے وقت ہی آتا ہے یہی وجہ تھی کہ میں سردی کو خاطر میں لائے بغیر ہر صبح چہل قدمی کے لیے نکل جاتا تھا۔ اس روز اتفاقاً" میں جلدی بیدار ہو گیا۔ اندھیرا کافی گہرا تھا۔ میں محتاط قدموں سے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی چل دیا۔ قصبے سے کوئی نصف کوس باہر ایک کنواں تھا۔ میرا رخ اس جانب تھا۔ میں گنے کے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ صبح کے وقت ذہن بالکل صاف تھا اور دوہرے قتل کی واردات دماغ کے کسی گوشے میں دفن تھی۔

..... دفعتاً" کھیت کی دوسری جانب سرسراہٹ ہوئی یوں لگا جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہے۔ اس سرسراہٹ کو کتے کے بھاگنے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا لیکن پھر اچانک دھپ کی آواز آئی۔ صاف محسوس ہوا کہ کوئی اوندھے منہ گرا ہوا ہے۔ تب ایک لرزہ خیز چیخ رات کے سناٹے میں ابھری اور میرے اعصاب تن گئے۔ ایکا ایکی ذہن خوفناک خدشات کی آماجگاہ بن گیا ایک لمحے کے لیے میں ٹھٹکا پھر تیزی سے گنے کے کھیت میں گھس گیا۔ تب چیخ دوبارہ سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی نہایت پریشانی کے عالم میں میں نے محسوس کیا کہ عورت پنجابی کی بجائے کسی اور زبان میں مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ وہ بھاگ رہی تھی اور میری جانب اس کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ پھر وہ مجھے چند گز کے فاصلے پر نظر آئی اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے

تھے۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے دیکھ چکی ہے۔ پھر نہایت بے تکلفی سے وہ مجھ سے لپٹ گئی میں اس اچانک دھچکے سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ لڑکی کا تعاقب کرتی ہوئی سرسراہٹ تیز ہو گئی۔ میں نے لڑکی کو خود سے جدا کیا اور اس آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھر گنوں کے عقب سے ایک ہیولہ نمودار ہوا اور ٹھٹھک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بلبوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ پھر ایک عمر رسیدہ لیکن مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "نواز خاں تم ....." میرے سامنے بابا شرفو کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور وہ ہانپ رہا تھا۔ اس دوران میں نے چند اور آوازیں سنیں۔ ان میں سے ایک آواز صاف پہچان رہا تھا یہ زمیندار حاکم علی کے بڑے بیٹے کی آواز تھی۔ پھر بھاگتے ہوئے قدم قریب پہنچ گئے۔ وہ کل تین افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں اور پستول تھے۔

"کیا ہوا کیتی؟" ایک انگریز نے بے تابی سے پوچھا۔

لڑکی، جس کو اس کے ساتھی نے کیتی کہا تھا خوفزدہ انداز میں بابے شرفو کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ حاکم علی کا بیٹا خوشیا زور سے ہنس کر بولا۔

"یہ تو اپنا نوکر شرفو ہے میم صاحب! آپ خواہ مخواہ ڈر گئیں"

شرفو بولا "خوشی پتر یہ چوروں کی طرح شالے (چارے) کے کھیت میں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھ لیا اور...."

لڑکی بولی "اور اس نے ہام کو اتنا زور سے رگڑا کہ ہمارا سارا بازو چھل گیا" وہ سویٹر کے نیچے سے اپنی کہنیاں سہلا رہی تھی۔ اس کی پتلون اور سویٹر گرد سے اٹا ہوا تھا۔ لگتا ہے بابے شرفو نے بے خبری میں واقعی اسے کافی رگڑا تھا۔

میں حیران پریشان کھڑا کبھی خوشیے کی طرف اور کبھی اس کے انگریز مہمانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ لڑکی اتنی بے تکلفی سے میرے ساتھ کیوں لپٹ گئی تھی۔ دراصل وہ مجھے اپنا کوئی ساتھی سمجھی تھی۔

"معاف کرنا میں" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ بابے شرفو نے کہا اور آگے بڑھ کے بزرگانہ انداز میں لڑکی کی پتلون جھاڑنے لگا۔

خوشیا ہم سب کو لے کر کنویں پر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ تینوں انگریز تحصیل دار صاحب کے مہمان ہیں۔ یہ سب علاقے میں شکار کرنا چاہتے لہٰذا تحصیل دار صاحب نے انھیں والد صاحب کے پاس بھیج دیا۔ یہ آٹھ دس روز یہیں مقیم رہیں گے۔ خوشیے نے بتایا کہ آج انہوں نے کونج کے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔ کونج چونکہ رات کے وقت آتی ہے اس لیے وہ کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے ایک کونج پکڑنے کے لیے وہ کچھ دور نکل گئے۔ لڑکی وہیں بیٹھی رہی اس دوران بابا شرفو جو پاس ہی ڈیرے میں سو رہا تھا' جاگ گیا اور لڑکی کو آ دبوچا۔

خوشیے نے اگرچہ سارے واقعے کی وضاحت کر دی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے کچھ کھپلا نظر آ رہا تھا۔ اس شک کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی جو کسی ان دیکھی علامت کو شبہے کا جواز بنا رہی تھی۔ ویسے ایک بات ضرور غور طلب تھی۔ یہ قصبہ شکار کے علاقے سے کوئی پندرہ بیس میل دور تھا۔ میری ملازمت کے دوران بہت کم ایسا ہوا تھا کہ کوئی شکاری اس قصبے میں آ کر ٹھہرا ہو۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ واقعہ تھا جو علی الصبح پیش آیا۔ عمر رسیدہ بابے شرفو کے "چھاپے" پر مسکراتا ہوا میں گھر واپس آ گیا۔

اس دن کا آغاز ایک خوشگوار واقعے سے ہوا لیکن اختتام ایک سنگین حادثے پر میں شام کے بعد تھانے سے گھر آ گیا۔ دس پندرہ روز سے میرا ملازم چھٹی پر تھا۔ بلال شاہ چونکہ بیوی بچوں کے ساتھ یہیں مقیم تھا لہٰذا اس کے گھر سے کھانا آ جاتا تھا۔ بلال شاہ گھر کوئی چار فرلانگ کے فاصلے پر قصبے کے جنوبی حصے میں تھا۔ اس کی دس سالہ بچی سر شام مجھے کھانا پہنچا دیا کرتی تھی بعد میں نو ساڑھے نو بجے کے قریب بلال شاہ آ کر برتن لے جاتا تھا۔ میں

نے کہا بھی کہ وہ خواہ مخواہ تکلیف نہ کیا کرئے برتن صبح پہنچ جایا کریں گے لیکن وہ باقاعدگی سے آتا تھا دراصل وہ دیکھنے آتا تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو اس رات وہ معمول سے کچھ لیٹ ہو گیا۔ بادل چھائے ہوئے تھے میں نے سوچا شاید وہ آج نہ آئے۔ اسی ادھیڑبن میں میں تکیے سے ٹیک لگائے سو گیا دوبارہ میری آنکھ ایک کھٹکے سے کھلی لالٹین جل رہی تھی دروازہ ہوا کے زور سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا میں کتنی دیر سویا تھا شاید چند منٹ یا ایک آدھ گھنٹہ میں لالٹین بجھانے اور دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھا اور اس وقت ..... احساس ہوا کہ میں گھر تنہا نہیں کوئی اور بھی اس چار دیواری میں موجود ہے پھر صحن کی جانب سے ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا اور میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ دیوار پر لٹکے ریوالور کی طرف بڑھ گیا۔ ریوالور ہولسٹر سے نکال کر میں نے اس کا چیمبر دیکھا اور محتاط قدموں سے صحن کی طرف گیا ..... ایک گو بخدار کراہ سنائی دی۔ دروازے سے نکلنے والی لالٹین کی روشنی صحن میں ایک تکون سی بنا رہی تھی۔ اس تکون میں میں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ کوئی شخص بیرونی دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے رنگین ہو رہا تھا اور اس سرخی میں سے اس کی سفید سفید آنکھیں نہایت ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں بھونچکارہ گیا بادل زور سے گرجا اور اجنبی کے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز گرج میں مدغم ہو گئی۔ میں چند قدم اور آگے گیا.....اور پھر مجھے پتہ چلا کہ یہ بلال شاہ ہے۔ اس کا ڈیزائن دار سوئیٹر جو اس کی بیوی نے چند روز پہلے بنا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آرہا تھا۔ بلال شاہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں دوڑ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بلال شاہ کے سر پر ایک گہرا زخم تھا اور خون نے اس کے چہرے پر سرخ نقاب سی چڑھا رکھی تھی۔ یہی خون اس کی قمیص اور شلوار کو بھگو رہا تھا۔

کیا ہوا بلال شاہ؟ میں نے چلا کر پوچھا۔

اس کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔

میں نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے میں لے آیا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے اس کے سر کا زخم دیکھا۔ زخم کافی گہرا تھا لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ بلال شاہ کی خاموشی زخم سے زیادہ خوف کی مرہون منت ہے۔ وہ سخت ڈرا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ میں اسے کمرے میں چھوڑ کر تیزی سے گلی میں آیا۔ زمیندار حاکم علی کا گھر نزدیک ہی تھا اور آج شام میں نے اس کے گھر کے سامنے ایک کار کھڑی دیکھی تھی۔ یقیناً یہ انہی انگریزوں کی تھی۔ میں نے مکان کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ملازم باہر نکلا۔ میں نے خوشیا کو بلانے کا کہا.....

تھوڑی دیر بعد ہم بلال شاہ کو کار میں ڈالے قصبے کے ہسپتال جا رہے تھے۔

○

بلال شاہ کے زخم میں آٹھ ٹانکے لگے۔ رات گئے وہ مدھم آواز میں بولنے کے قابل ہوا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ نہایت حیران کن اور ناقابل یقین تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار کسی کا بیان سن کر میرے رونگھٹے کھڑے ہوئے۔ یہ بیان وہم تھا یا حقیقت اور اگر حقیقت تھی تو کس حد تک حقیقت تھی اس پر بعد میں بات ہو گی پہلے آپ بلال شاہ کا بیان سنئے۔

میں حسب معمول نو بجے کے قریب گھر سے نکلا۔ میرا رخ آپ کے گھر کی طرف تھا۔ میری بیوی نے دال بنائی تھی (یہ میٹھی دال ہوتی ہے اور اسے بھانڈا بھی کہا جاتا ہے ہمارے دیہاتی اور کچھ شہری بھائی بھی اس لفظ سے آگاہ ہوں گے۔ مختلف دالوں کو پیس کر انھیں گھی میں بھون لیا جاتا ہے اور اس میں چینی یا شکر ملائی جاتی ہے۔ سردیوں میں یہ نہایت مقوی غذا سمجھی جاتی ہے) میں ایک برتن میں گرم گرم ڈال کر آپ کی طرف لا رہا تھا۔ جب میں قبرستان کے قریب سے گزرا، اچانک جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی اور ایک

سایہ سا مجھ پر جھپٹا۔ میں اس کے دھکے سے دور جا گرا۔ دال کی پلیٹ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ سایہ تیزی سے آگے بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا..... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کوئی انسان نہیں تھا۔ اس کے جسم میں کسی جنگلی درندے کی طاقت تھی اور آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ خانصاحب ..... اس کے ہاتھ دو نہیں تھے بلکہ چار تھے اور ٹانگیں بھی چار تھیں اور اس کے سر پر دو بڑے بڑے سینگ تھے..... اور خانصاحب اس کا سر ایک مکے کی طرح تھا..... بلال شاہ جب یہ بیان دے رہا تھا اس کے ہونٹ سفید ہو گئے تھے اور آنکھوں میں سخت ہراس نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ چند لمحے وہ حواس درست کرتا رہا پھر بولا۔ خان صاحب! اس کے جسم سے ایک ناقابل برداشت بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیلا اور چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ سایہ میرے پیچھے دوڑا۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں اوندھے منہ گرا۔ بھینسوں کی ایک کھرلی جو قریب ہی پڑی تھی میری پیشانی پر لگی۔ ایک شخص اس وقت بھینسوں کے قریب سو رہا تھا۔ وہ میری چیخ و پکار سن کر جاگ گیا تھا لیکن سائے کو دیکھ کر وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ بھاگ نکلا۔ میری پیشانی سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ میں نے سوچا اگر میں یہیں بے ہوش ہو گیا تو کوئی اٹھانے نہیں آئے گا۔ میں نے ہمت کی اور گرتا پڑتا آپ کے دروازے تک جا پہنچا"

بلال شاہ کا بیان خاصا سنسنی خیز تھا۔ اس قسم کی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ یہ واقعہ صبح تک پورے قصبے میں مشہور ہو چکا تھا۔ ہر چہرہ خوفزدہ اور سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ بات تھی بھی خوفزدہ کرنے والی۔ چار روز میں اوپر تلے تین پراسرار حادثات رونما ہو چکے تھے۔ دو افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور ایک شدید زخمی ہوا تھا۔ بلال شاہ کے بیان نے ان واقعات کو خوفناک حد تک پراسرار بنا دیا تھا۔ اس کا بیان بشیرے کی بیوہ سوہنی کے بیان سے عین مطابقت رکھتا تھا۔ قصبے کے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا تھے اب

برملا کہہ رہے تھے کہ سہارنپور میں کوئی خون آشام بلا موجود ہے۔

مختلف لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ جو چند پڑھے لکھے افراد تھے ان کا خیال تھا کہ کسی جرائم پیشہ شخص نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے بہروپ بھر رکھا ہے۔ کچھ یہ بھی کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی عجیب الخلقت جنگلی جانور ہو۔ ایک سال پہلے نواحی گاؤں "وجے پور" میں بھی ایک ایسی ہی بلا کے چرچے ہوئے تھے۔ بعد ازاں پتہ چلا تھا کہ وہ "سہہ" کی نسل کا ایک جانور ہے جو کبھی کبھار دیکھنے میں آتا ہے۔ ان پڑھ طبقہ خاص طور پر عورتیں نہایت خوفزدہ تھیں۔ وہ پورے یقین سے کہہ رہی تھیں کہ کوئی ہوائی چیز قبرستان سے نکل کر لوگوں کو ہلاک کرتی ہے۔ بعض بڑے بوڑھے اس پراسرار شے کے ڈانڈے سچے سائیں کے مزار سے ملا رہے تھے۔ یہ مزار سہارنپور سے قریباً بارہ میل کے فاصلے پر ایک ٹیلے کے اوپر واقع تھا۔ راستہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے کم لوگ وہاں حاضری دینے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سچے سائیں کی ناراضی قصبے پر عذاب لے آئی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ جس طبقے کا خیال تھا کہ یہ کوئی عجیب ساخت کا جنگلی جانور ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر قبرستان اور نواحی کھیتوں میں ہانکا کیا۔ ڈھول اور کنستر پیٹے گئے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔

سورج ڈوبنے سے پیشتر ہی یہ حال ہو گیا کہ قصبے کی تمام گلیاں سنسان نظر آنے لگیں۔ چند سرکردہ افراد میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے طور پر ٹھیکری پہرے کا انتظام کر لیا ہے تین ٹولیاں بنائی گئی ہیں جو رات بھر قصبے میں گشت کرتی رہیں گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے عملے کے دو دو آدمی ہر ٹولی کے ساتھ موجود رہیں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے دو اے ایس آئی اور چار کانسٹیبل ان کے ساتھ کر دیے۔ ویسے میرا ذہن کسی اور لائن پر سوچ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے میں نے کبھی اپنی تفتیش کو عقلی واقعات اور ٹھوس شہادتوں کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیا۔ ہوائی چیزوں اور ان کی پراسرار کاروائیوں پر یقین کرنا نہ تو

میرے بس میں تھا اور نہ مجھے اس کی تربیت دی گئی تھی۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ دیکھا دیکھی ہراس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے بڑا آسیب خوف ہوتا ہے جو انسانی ذہن کو اس طرح جکڑتا ہے کہ ہر طرف آسیب ہی آسیب نظر آنے لگتے ہیں۔ میں نے شروع سے واقعات پر غور کیا۔ ایک اکیلی عورت کو ایک تاریک رات میں اپنے گھر کے صحن میں کوئی عجیب شے کھڑی نظر آئی۔ اس کے خوفزدہ ذہن نے اسے ایک بلا کی شکل دے دی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے جان بوجھ کر تھانے میں ایسا بیان دیا ہو بہرحال کچھ بھی تھا' عورت کے بیان کے بعد اس کا شوہر قتل ہوا۔ اس قتل کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں خوف جڑ پکڑ گیا۔ پھر دوسری واردات ہوئی اور خوف میں مزید اضافہ ہوا۔ یہی خوف بلال شاہ کے ذہن میں اس وقت موجود تھا جب وہ رات نو بجے قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس رات ہوا چل رہی تھی۔ ممکن ہے کہیں کوئی آہٹ ہوئی ہو یا درخت کا سایہ جھوما ہو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بلال شاہ ڈر گیا اور بھاگ نکلا۔ کچھ آگے جا کر اسے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گرا..... سوال یہ تھا کہ اگر پراسرار سایہ واقعی اس کا تعاقب کر رہا تھا تو پھر اسے گرا چھوڑ کر چلا کیوں گیا۔ اس پر حملہ آور کیوں نہیں ہوا۔ دفعتاً" میرے ذہن میں اس شخص کا خیال آیا جو بھینسوں کے قریب سو رہا تھا اور بلال شاہ کے بقول "سائے" کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔

میں نے اسی وقت اپنے سب انسپکٹر کو اس شخص کا پتہ کرنے بھیجا۔ قریباً" ایک گھنٹہ بعد وہ شخص حاضر ہو گیا۔ وہ ایک اٹھارہ انیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے میلے سے کھیس کی بکل مار رکھی تھی اور خاصا خوفزدہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے "رحمت تیلی" بتایا۔ وہ ایک کاشتکار کے بیلوں کے قریب سو رہا تھا۔ میں نے اسے رات والا واقعہ تفصیل سے بتانے کو کہا۔

وہ بولا۔ "تھانیدار صاحب! میں بیلوں کے قریب سو رہا تھا۔ آواز

سن کر آنکھ کھلی میں نے دیکھا شاہ صاحب (بلال شاہ) تیزی سے بھاگے آرہے ہیں ان کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر میں نے ان کے پیچھے دیکھا۔ بڑے سے سر والی ایک خوفناک شے ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کے سر پر دو لمبے لمبے سینگ تھے اور وہ چار پاؤں پر دوڑ رہی تھی۔ اس سے آگے مجھے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور میں بھاگ کھڑا ہوا۔"

میں نے کہا "بلال شاہ کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار بھی تھی۔ تم نے تلوار نہیں دیکھی۔"

لڑکا ذرا سا ہکلایا پھر بولا "جج ..... جی جناب تلوار بھی تھی لیکن مجھے صحیح طرح نظر نہیں آئی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکے دیکھو! میں جو کچھ تجھ سے پوچھ رہا ہوں بالکل ٹھیک ٹھیک بتا۔ اگر اپنی طرف سے کوئی بات جوڑی تو میں چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ بالکل صحیح صحیح بتا تو نے کیا دیکھا؟ کیا تجھے بلال شاہ کے پیچھے کوئی نظر آیا۔"

لڑکا میرے بدلے ہوئے لہجے پر سہم گیا۔ اس نے سراسیمہ نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھا اور بولا۔ "دراصل .... دراصل جناب! میں نے صرف شاہ صاحب کو دیکھا تھا .... وہ اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ میں سمجھ گیا ضرور ان کے پیچھے کوئی خطرناک شے ہے ..... میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔" میں نے لڑکے سے چند سوال اور پوچھ کر اسے جانے دیا۔

○

حاکم علی نے اس رات میری دعوت کر رکھی تھی۔ قصبے میں جیسے حالات تھے ان میں دعوتیں کھانے کو دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن ایک وجہ تھی کہ میں تیار ہو گیا۔ آپ کو یاد ہو گا' ایک دن پہلے جب بلال شاہ زخمی ہوا تھا میں گاڑی لینے کے لئے زمیندار کی حویلی پہنچا تھا۔ میری دستک پر ایک ملازم نے دروازہ کھولا تھا اور میں نے اسے خوشبے کو بلانے کو کہا تھا۔ ملازم کے

جانے کے بعد میں نے حویلی کے اندر سے کچھ چیخیں سنی تھیں۔ کوئی عورت کسی بند کمرے میں زور زور سے چیخ رہی تھی۔ اس وقت چونکہ میں پریشان تھا اور بہت جلدی میں بھی اس لیے ان چیخوں کے بارے میں مزید کچھ نہ جان سکا۔ نہ ہی مجھے خوشیے سے پوچھنے کا خیال رہا۔ عین ممکن تھا کہ میں ان آوازوں کو بھول ہی جاتا لیکن تھوڑی دیر پہلے تھانے کے سامنے سے انگریزوں کی کار دھول اڑاتی گزری تھی اور گاڑی کے ساتھ ہی مجھے وہ چیخیں بھی یاد آگئی تھیں۔

سات بجنے والے تھے۔ میں نے ٹوپی سر پر رکھی اور سب انسپکٹر کو ضروری ہدایات دے کر تھانے سے نکل آیا۔ پورے قصبے میں خوفزدہ خاموشی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تھوڑی دور حاکم علی کی حویلی کے سامنے بھی دو مسلح آدمی پہرہ دے رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے سلام کیا۔ اسی دوران حاکم علی کا بیٹا خوشیا باہر آیا اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ حویلی کی کشادہ اور سجی سجائی بیٹھک میں تینوں انگریز' حاکم علی اور ایک مقامی شکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ شکاری کا نام شنکر تھا اور اسے میں پہلے سے جانتا تھا۔ شراب وکباب کی محفل جمی ہوئی تھی اور دنیا جہان کی باتیں ہو رہی تھیں۔۔ تعارف تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سلام دعا کے بعد میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے بھی پینے کی پیشکش کی گئی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ لڑکی کیتھی' جس کا پورا نام شاید کیتھرائن تھا مسکرا کر بولی۔

"چلو کوئی تو اس محفل میں میرا ساتھی بنا" اس کا مطلب تھا کہ میں بھی نہیں پیتی۔

گفتگو کا رخ بہت جلد قصبے کے تشویشناک حالات کی طرف مڑ گیا۔ میں اس معاملے میں انگریز مہمانوں کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ بعض اوقات یہ لوگ ایسی پتے کی بات کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے (لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا) انگریز مردوں میں سے ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا نوجوان۔ ادھیڑ عمر کا نام ڈیوڈ تھا۔ وہ لندن کی کسی سرکس کمپنی کا حصے دار تھا۔ اس کی گھنی بھنویں

اور سنجیدہ چہرہ اس کے تجربے اور صبر و تحمل کو ظاہر کرتا تھا۔ اس نے پائپ کا ایک طویل کش لے کر انگریزی میں کہا۔

میں نے آج تک ایسی سراسیمگی کی حالت نہیں دیکھی۔ عینی شاہد جس طرح کے بیانات دے رہے ہیں میرے تو رونگھٹے کھڑے ہوگئے ہیں۔ پھر وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے حاکم علی صاحب کو زیادہ دیر ہماری مہمانداری نہیں کرنا پڑے گی۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر ڈیوڈ! آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں کیا واقعی ..... وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

مسٹر انسپکٹر! دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اوقات میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں یکے بعد دیگرے پراسرار قتل ہوئے ہیں اور قاتل گرفتار نہیں ہو سکا ..... ہماری سائنس قدرت کے تمام رازوں کو پانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ واقعی اس قصبے میں کوئی ایسی قوت سرگرم ہو آپ کی ہتھکڑیاں جسے پکڑنے سے قاصر ہوں ..... " انگریز کا لہجہ ڈرامائی تھا۔ کمرے میں چند لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔

دفعتاً" میری نگاہ آدھ کھلے دروازے سے گزر کر ایک چہرے پر پڑی۔ یہ بابے شرفو کا چہرہ تھا۔ پھر فوراً یہ چہرہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے غور سے دیکھا اب وہاں لہراتے ہوئے پردے کے سوا اور کچھ نہیں تھا میں جانتا تھا بابا شرفو حاکم علی کا آدمی ہے لیکن اس وقت وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ کھانا آنے والا تھا۔ میں ہاتھ دھونے کے بہانے بیٹھک سے نکل آیا پھر تیزی سے گھوم کر میں بیرونی دروازے پر پہنچا۔ بابا شرفو اس طرف گیا تھا لیکن اب اس کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ بابا شرفو تو نظر نہیں آیا لیکن ایک اہم بات کا ضرور پتہ چل گیا۔ حویلی سے باہر کھڑی گاڑی تھوڑی دیر بعد کہیں روانہ ہونے والی تھی۔ جب میں بابے شرفو کو دیکھ کر واپس حویلی میں جانے لگا اچانک میری نظر دائیں جانب اٹھ گئی۔ حاکم علی کا ایک ملازم دو رائفلیں اور ایک تھرماس کار میں رکھ رہا تھا۔ تھرماس میں ظاہر ہے چائے وغیرہ ہو

گی- پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید وہ لوگ کہیں شکار کو جارہے ہیں لیکن ایسے حالات میں شکار پر جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا بہرحال میں بیٹھک میں واپس آگیا- ملازموں نے کھانا لگا دیا تھا- بھنی ہوئی مرغیاں " بطخیں" کئی اقسام کی مچھلی کے علاوہ شکار کئے ہوئے خرگوشوں کا سالن بھی کھانے میں شامل تھا- نہایت پر تکلف دعوت تھی- کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں میں انتظار ہی کرتا رہا کہ حاکم علی یا مہمانوں میں سے کوئی بتائے گا کہ وہ کھانے کے بعد کہاں روانہ ہو رہے ہیں' لیکن وہ سب کے سب یہ بات گول کر گئے- ان کی یہ احتیاط مجھے شک میں مبتلا کر رہی تھی--

کھانے کے بعد قصبے کے ایک بانسری نواز نے مہمانوں کو خوبصورت دھنیں سنائیں لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ انگریز مرد بس مجبوری کے عالم میں سن رہے ہیں- ہاں لڑکی واقعی لطف اندوز ہو رہی تھی- ہیر کی دھن پر وہ جھوم جھوم کر سر ہلا رہی تھی- اچانک چھت پر ایک کھٹکا سنائی دیا- پھر دھم دھم کی آواز آنے لگی میں نے دیکھا حاکم علی اور اس کے بیٹے خوشیے کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا- دونوں باپ بیٹا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خوشیا تیز قدموں سے باہر نکل گیا- چند لمحے بعد آواز آنی بند ہو گئی- اس دوران میں نے اپنا چہرہ بالکل سپاٹ رکھا تھا اور کھیتی کی طرح سر ہلا ہلا کر بانسری نواز کو داد دیتا رہا-

رات قریباً" ساڑھے دس بجے یہ محفل برخاست ہوئی میں حاکم علی اور اس کے مہمانوں سے رخصت ہو کر گھر کی طرف چل دیا- گلی بالکل سنسان تھی قریب ہی کہیں ٹھیکری پہرے کی آواز سنائی دی رہی تھی- میں نے جیب تھپتھپا کر پستول کی موجودگی کا اندازہ لگایا اور تیز قدموں سے روانہ ہو گیا- گلی کا موڑ مڑ کر میں گھر جانے کی بجائے تھانے کی طرف چل دیا- تھانے میں اے ایس آئی رات کی ڈیوٹی پر موجود تھا- مجھے اس وقت تھانے میں دیکھ کر وہ گڑ بڑا گیا- میں نے اسے کہا کہ فوراً میرے گھوڑے پر کاٹھی

ڈالو اور اسے تھانے میں لے آؤ- وہ میرے حکم پر باہر نکل گیا اس نے رات گزارنے کے لئے کوئلے دہکا رکھے تھے میں ہاتھ سینکنے کے ساتھ ساتھ سوچنے لگا' حاکم علی کے انگریز مہمانوں اور ان پے در پے حادثات میں کیا تعلق ہو سکتا ہے- پھر حویلی سے بلند ہونے والی وہ چیخیں بھی پراسرار رنگ اختیار کرتی جارہی تھیں- آج کا واقعہ میرے ذہن میں تازہ تھا- یوں لگتا تھا حاکم علی نے حویلی میں کسی کو قید کر رکھا ہے-

میں نے انگریز ڈیوڈ کی باتیں بڑے غور سے سنی تھیں- وہ بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہا تھا- اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے- شاید اگر کوئی جاہل قسم کا دیہاتی تھانیدار ہوتا تو ڈر بھی جاتا لیکن مجھ پر اس کی باتوں کا الٹا اثر ہوا تھا- اس کی تمام تر گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ قصبے میں اوپر تلے ہونے والے قتل اور حادثات کے پیچھے کوئی پراسرار ہاتھ ہے اور مجھے اس سے بچنا چاہیے کہیں میرا بھی کام تمام نہ ہو جائے- اس نے اپنی بات کو واضح کرنے کے لیئے کچھ واقعات کی مثالیں بھی دی تھیں جن میں بڑے ہوشیار پولیس والے قتل کر دیئے گئے تھے- جیسا کہ میں نے کہا ہے مجھ پر ان باتوں کا الٹا اثر ہوا تھا- میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ انگریز ان واقعات میں ضرور کسی طور ملوث ہیں-

تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی گھوڑا تھانے کے احاطے میں لے آیا- میرے کان گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر لگے ہوئے تھے- اے ایس آئی میری تیاری پر حیران ہو رہا تھا آخر اس سے نہ رہا گیا- بولا

"انسپکٹر صاحب! اتنی سردی میں آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں-"

دراصل وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ انسپکٹر صاحب اتنے خوفناک واقعات کے بعد بھی آپ اکیلے باہر جارہے ہیں- میں نے اسے کہا-

رفاقت علی سردی اتنی دیر ہی لگتی جتنی دیر انگیٹھی کے سامنے بیٹھے رہو- وہ کھسیا کر چپ ہو گیا..... اور اسی وقت مجھے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی

مدھم آواز سنائی دی۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

○

کار کی عقبی سرخ بتیاں میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ میں کافی فاصلے سے تعاقب کر رہا تھا۔ کار مختلف راستوں پر مڑتی ہوئی قصبے سے باہر نکل آئی۔ غیر ہموار راستے کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ مجھے تعاقب میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی قصبے سے کوئی ایک میل باہر پرانا اسکول تھا۔ یہ اسکول اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا چند سال پہلے سیلاب کی وجہ سے اس کی عمارت زمین بوس ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ ٹوٹی ہوئی دیواروں کے درمیان ہی تدریس کا سلسلہ جاری رہا تھا لیکن اب قصبے کے اندر نئی عمارت بن چکی تھی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کار کا رخ کھنڈر کی طرف ہے کھنڈر سے کچھ دور کار رک گئی۔ میں نے بھی اپنا گھوڑا درختوں میں باندھ دیا۔ گاڑی کی روشنیاں بجھ گئیں۔ پھر دروازے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ میں ایک کھیت کی آڑ میں چلتا کھنڈر کی بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا چند ہیولے محتاط قدموں سے عمارت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے اپنے دیکھے جانے کا بالکل خطرہ نہیں تھا۔ کھیت کے درمیان کھڑا میں اطمینان سے کار والوں کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ کچھ دیر وہ آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ لمبا تڑنگا ڈیوڈ ان میں صاف پہچانا جا رہا تھا۔ لڑکی بھی ساتھ تھی لیکن مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا وہ کہاں ہے۔ بس ایک آدھ بار اسکی باریک آواز سنائی دی تھی۔

کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ دو آدمی جھک کر چلتے ہوئے مختلف اطراف سے کھنڈر کی طرف بڑھے۔ لڑکی سمیت باقی تین افراد مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید انھوں نے باہر ہی پوزیشن لے رکھی تھی۔ کھنڈر کی طرف بڑھنے والے افراد کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں ایک ڈیوڈ ہے۔ پھر ٹارچوں کی گردش کرتی ہوئی

روشنیاں کھنڈر کے قریب پہنچ کر گم ہو گئیں۔ دونوں افراد اندر داخل ہو گئے تھے۔

یہ بڑے صبر آزما لمحے تھے۔ سخت سردی میں بے حرکت کھڑا میں نتائج کا انتظار کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اس ڈرامے میں میرا کردار کیا ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات اب واضح ہو چکی تھی کہ حاکم علی کے انگریز مہمان کسی زبردست چکر میں ہیں۔ اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ چکر بشیرے اور حنیفاں کے قتل سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی انگریز حاکم علی کے بیٹے کے ساتھ مل کر اسی قسم کی مہم جوئی کر چکے ہیں۔ جب انگریز لڑکی کو بابے شرفو نے آدبوچا تھا۔ اس وقت بھی یہ لوگ پراسرار طور پر کھیتوں میں گھوم رہے تھے۔ آخر وہ کس چیز کی تلاش میں تھے۔

میں نے سوچا کہ مجھے کھنڈر کے کچھ اور قریب پہنچنا چاہیے نیچے جھک کر بے آواز چلتا ہوا میں کچھ آگے گیا اور پھر زمین پر لیٹ کر آگے کی طرف کھسکنے لگا۔ یہاں سے مجھے دو مردوں کے بولنے کی مدھم آواز آرہی تھی وہاں ایک لڑکی کی موجودگی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اس سے آگے بڑھنا خطرناک تھا۔ میں وہیں دبک کر بیٹھ رہا۔ سناٹے میں اپنی سانسوں کی آواز بھی نہایت واضح سنائی دے رہی تھی۔ چند منٹ اور گزرے اور پھر کھنڈر کی طرف سے ایک کربناک چیخ بلند ہوئی۔ چیخ کے ساتھ ہی کسی نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ لڑکی اور دونوں مرد بے تابی سے اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے تب ایک فائر اور سنائی دیا۔ لڑکی زور سے چلائی _ وہ رہا..... وہ جا رہا ہے وہ انگلی سے ایک جانب اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس جگہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ لمبا تڑنگا ڈیوڈ بھاگتا ہوا کھنڈر سے نکلا۔ کار پہلے ہی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ وہ چلتی ہوئی کار میں دوڑ کر بیٹھا اور کار روانہ ہو گئی۔ اس کی عقبی بتیاں تیزی سے ہچکولے کھا رہی تھیں۔ میں چند لمحے اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔

کار کافی دور نکل چکی تھی۔ اس کے انجن کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جب میں نے جیب سے ٹارچ نکالی دوسرے ہاتھ میں پستول تھاما اور دھیمے قدموں سے کھنڈر کی طرف بڑھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے درمیان جگہ جگہ کائی اگی ہوئی تھی۔ کچھ دیواریں کافی بلند تھیں۔ میں نے ٹارچ جلائی اور اسکی روشنی ادھر ادھر پھینکتا محتاط انداز میں دیواروں کے درمیان گھومنے لگا۔ اچانک کار کا شور سنائی دینے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ واپس آرہے ہیں۔ ایک دیوار کی اوٹ سے دیکھا تو اندازہ درست نکلا۔ کار کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کار سر پر پہنچ گئی۔ میں وہیں لمبی لمبی گھاس میں چھپ گیا۔ قریب آکر انجن کا شور تھم گیا۔ پھر دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ تین چار ٹارچوں کی روشنیاں گردش کررہی تھیں۔ وہ لوگ بھاگنے والے شخص کو کھنڈر کے ارد گرد تلاش کر رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں چکمہ دے کر واپس اس طرف آگیا ہے۔ ویسے ایک بات میں صاف محسوس کر رہا تھا وہ کھنڈر میں داخل ہونے سے کترا رہے تھے۔

کافی دیر بعد ان لوگوں کی تلاش ختم ہوئی اور وہ کار میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔ میں نے دیوار کی اوٹ سے دیکھا۔ کار کا رخ واپس سہارنپور کی طرف تھا۔ اب چاروں طرف گہری خاموشی اور تاریکی تھی۔ کھنڈر کی عین درمیان گہرے اندھیرے میں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائی اور احتیاط سے دائیں بائیں دیکھتا ہوا کھنڈر سے باہر نکلنے لگا۔ میں اسکول کے برآمدے سے گزر رہا تھا کہ دفعتاً" ایک چیز دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لمبی لمبی گھاس میں کوئی سیاہ چیز پڑی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس چیز پر مرکوز کی اور احتیاط سے آگے بڑھا ..... یہ کسی شخص کے فل بوٹ تھے۔ پھر مجھے دو انسانی ٹانگیں نظر آئیں۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا میں نے ٹارچ کا رخ تبدیل کیا اور اس کا دائرہ ایک مردہ شخص کے چہرے پر مرکوز ہو گیا۔

..... "میرے خدا" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا- میرے سامنے شکاری شنکری کی لاش پڑی تھی اسے بغیر چھوئے ہوئے میں بتا سکتا تھا کہ وہ مر چکا ہے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یہی شخص حویلی میں بانسری سن رہا تھا اور چائے کی چسکیاں لے رہا تھا ..... لیکن اب وہ زندگی کی سرحد پار کر کے ان دیکھے سفر پر روانہ ہو چکا تھا- میں چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا- پھر محتاط قدموں سے آگے بڑھا میں کوئی ثبوت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا- لاش کے قریب بیٹھ کر میں نے غور سے دیکھا حسب سابق گردن پر کسی قسم کا نشان نہیں تھا لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں میں نے لاش کے سر کو حرکت دی اور گردن عجیب انداز سے ایک طرف ڈھلک گئی- ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ مقتول کو گردن توڑ کر مارا گیا ہے- میں نے لاش کے ارد گرد کی نشانیاں ذہن میں محفوظ کر لیں- مقتول کی جیبیں ٹٹولیں- پانچ چھ سو روپے کی رقم' سگریٹ کی ایک ڈبیہ' ماچس اور چند بوسیدہ کاغذات برآمد ہوئے-

صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ شنکر کرائے پر کام کر رہا تھا- حاکم علی کے مہمان یہاں کوئی کھیل کھیل رہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے شنکر کو استعمال کیا تھا- یہ بھی ممکن تھا کہ دو گروہ ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہوں- اور یہ بھی امکان تھا کہ کسی ایک شخص کو پکڑنے کے لیے تینوں انگریز' حاکم علی کے ساتھ مل کر تگ و دو کر رہے ہوں- یہ شخص قصبے کا بھی ہو سکتا تھا اور قصبے سے باہر کا بھی- اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ بشیرے اور حنیفاں کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو-

دفعتاً" مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے عقب میں کھڑا ہے- ایک لمحے کے لیے ..... صرف ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ایک نا معلوم خوف جاگا- پھر میں نے ایک جھٹکے سے گردن گھمائی- ٹارچ کی روشنی ایک جسم پر پڑی وہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا ..... لیکن کیا واقعی وہ ایک جسم تھا ..... میرے رگ و پے میں سردی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی- چند لمحے کے لیے مجھے اپنی بصارت پر بالکل یقین نہیں آیا- مجھے لگا جیسے میں ایک درخت ہوں اور

کسی نے مجھے جڑوں سے اکھاڑ کر یخ بستہ پانی میں پھینک دیا ہے۔ میرا یقین، ایمان، جرات، روشن خیالی، سب کچھ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا ..... میں بقائمی ہوش و حواس اپنی آنکھوں سے ایک مافوق الفطرت شے کو دیکھ رہا تھا۔ شاید میرا قلم اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر رہے جو آدمی رات کو اس ویران کھنڈر میں مجھ پر طاری ہوئی۔

ٹارچ کے زرد دائرے میں نظر آنے والا جسم (میں اسے جسم ہی کہوں گا) قریباً" پانچ فٹ بلند تھا۔ سرعام انسانی سر سے تقریباً" ڈھائی گنا بڑا تھا۔ جسم پر کوئی نیکر نما چیز تھی اور چہرے کے سوا سارے بدن پر لمبے لمبے بال دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ٹانگیں صرف دو تھیں لیکن بازو چار تھے۔ آنکھیں بالکل گول تھیں اور بھدے ہونٹوں کے درمیان سے سفید دانت جھانک رہے تھے۔

چند لمحے مبہوت رہنے کے بعد میں ایک جھٹکے سے ہوش میں آیا اور ہوش میں آنے کے بعد پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ اپنے اے ایس آئی کی بات نہ مان کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے کہا تھا "انسپکٹر صاحب! اتنی سردی میں آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

○ ○ ○

بستی اور درندہ

میرے پاس یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی کہ جو چہرہ مجھے گھور رہا ہے وہ انسان کا یا کسی درندے کا' یا کسی ایسی مافوق الفطرت شے کا جس پر میں نے کبھی یقین نہیں ..... میں آہستگی سے کھڑا ہوا اور ریوالور سیدھا کر لیا' لیکن اس سے پہلے کہ میں اس انسان نما جانور کو کوئی دھمکی دیتا' وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور حیرت انگیز پھرتی سے میرے ساتھ لپٹ گیا اس کے مس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہونٹوں تک آنے والی بے ساختہ ڈکار کو میں بمشکل گلے میں روکا۔ پھر میں لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ میرا جسم اس عجیب الخلقت چیز کی بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

تب میں نے محسوس کیا کہ وہ سخت اور کھردے ہاتھ میرے گلے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اچانک میری آنکھوں میں بشیرے حنیفاں اور شنکر کی لاشیں گھوم گئیں۔ ان سب کی گردن کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ایک اضطراری عمل کے تحت میں ہاتھ بڑھائے اور وہ بالوں بھری کلائیاں تھام لیں۔ کلائیاں تھامتے ہی مجھے مد مقابل کی بے پناہ جسمانی طاقت کا اندازہ ہوا۔ اس کی گول آنکھیں اور سفید دانت میرے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھے تیز بو کے بھبکے میرے نتھنوں میں گھس رہے تھے اور دم گھٹا جا رہا تھا پورا زور لگا کر میں نے ان قاتل ہاتھوں کو اپنے گلے سے دور کر دیا۔ مد مقابل کے جسم کو چھونے سے """جہاں ذہن میں ایک کراہت آمیز خوف جنم لے رہا تھا وہاں

تھوڑا سا اطمینان بھی ہو رہا تھا۔ اطمینان اس بات کا کہ کچھ بھی ہے مد مقابل بہرحال گوشت پوست کا جسم رکھتا ہے کوئی غیر مرئی شے نہیں۔

میں نے زور لگا کر اس کی دونوں کلائیوں کو اوپر اٹھا دیا تھا اور اب اس فکر میں تھا کہ اس کا جسم اپنے اوپر سے اچھال سکوں۔ لیکن دفعتاً" خوف کی ایک شدید لہر میرے رگ وپے میں دوڑ رہی تھی ..... دو اور ہاتھ میری گردن پر رینگ رہے تھے۔ ایک لمحے میں مجھے موت آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ میں مد مقابل کے دو زائد ہاتھوں کو فراموش کر چکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا رہا ہوں۔ شدید بوکھلاہٹ کا عالم میں میں نے پہلے ہاتھ چھوڑے اور "دوسرے" پکڑے لیے' لیکن در حقیقت اب کسی ہاتھ میری پر گرفت نہیں رہی تھی۔ میرا جسم آہنی شکنجوں میں جکڑا جا رہا تھا دو ہاتھ میری کمر پر تھے اور دو گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ دو انسان نما جانور وحشیانہ انداز سے غرا رہا تھا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ بہت سے لوگوں سے سنا تھا کہ دم گھٹ کر مرنے کی اذیت بے انتہا ہوتی ہے لیکن اب اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے ابل رہی تھیں اور بھیھڑے ہوا کے لیے ترس رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں بری طرح کھانس رہا ہوں' لیکن کھانسی کا بجائے حلق سے صرف گھرر گھرر کی آواز نکل رہ تھی۔ مد مقابل مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔

دفعتاً" ذہن کی تیرگی میں ایک جگنو چمکا۔ میری پتلون کو جب میں ایک چھوٹا چاقو موجود تھا۔ اپنی ران پر اس کی سختی میں اس وقت بھی محسوس کر رہا تھا۔ اگر میرا ہاتھ اس چاقو تک پہنچ جاتا تو زندگی بچ سکتی تھی۔ میں نے جسم کی رہی سہی قوت جمع کرکے ہاتھ کو جیب کی طرف حرکت دی۔ شاید عام حالات میں مجھے یہ چاقو نکالنا پڑتا تو چند سیکنڈ لگتے' لیکن اس وقت مجھے چاقو اور ہاتھ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا.... چاقو جیب سے باہر آیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا پھل کھولا' پھر زمین پر ٹکا کر سیدھا کیا۔ اس کے بعد کا عمل جیسے بے ہوشی میں انجام پایا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

شاید میں نے اس کی پسلیوں پر وار کیا تھا۔ میرے گلے پر گرفت نرم ہوئی اور پھیپھڑوں سے بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار اندر گھسی جسم میں توانائی کی ایک لہر دوڑی اس سے پہلے کہ یہ لہر معدم ہوتی میں نے پورے زور سے سر کی ٹکر بد مقابل کے منہ پر ماری۔ اسے اس حرکت کی بالکل توقع نہ تھی' چند لمحے کے لیے وہ چکرا کر رہ گیا۔ انہی چند لمحوں میں میں نے کروٹ بدلی اور اسے اپنے نیچے کر لیا' لیکن اس سے پہلے کہ میں اس پر گرفت مضبوط کرتا اس نے کسی تنکے کی طرح مجھے ہوا میں اچھال دیا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ اٹھے وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹنے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے جھکائی دی اور اڑنگا لگا کر اسے زمین پر گرا دیا۔ یہ وار اتنا کامیاب رہا کہ خود مجھے حیرت ہوئی مد مقابل چاروں شانے چت گرا مگر میں نے پھر چھلانگ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اپنی موت کو دعوت دینے والی بات تھے مجھے اس کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا میں نے اپنے ریوالور کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ مردہ شنکر کے قریب پڑا تھا۔ ریوالور ہاتھ میں لے کر میں تیزی سے مڑا لیکن مد مقابل اپنی جگہ موجود نہیں تھا وہ مجھ سے قریباً" پندرہ گز کے فاصلے پر تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دو چھلانگیں لگائیں اور تاریکی میں روپوش ہو گیا۔ میرے ریوالور نے یکے بعد دیگرے شعلے اگلے لیکن تمام فائر بے کار گئے میں نے بھاگ کر دیوار کی دوسری طرف دیکھا اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ خونی درندہ ایک بار پھر کھنڈر میں گم ہو چکا تھا۔

وہ پراسرار سا خوف جواب تک مجھ پر طاری تھا ایک قابل فہم اطمینان میں ڈھل چکا تھا پھر بھی اس کھنڈر میں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا میں نے نیچے گری ہوئی ٹارچ اٹھائی۔ وہ ابھی تک روشن تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ریوالور لے کر میں احتیاط سے باہر نکلنے گا۔ ہر قدم پر لگ رہا تھا کہ ابھی وہ موذی کسی کونے سے حملہ اور ہو جائے گا۔ چوکنے انداز سے چلتا ہوا میں کھنڈر سے باہر نکلا تو قدرے سلامتی کا احساس ہوا۔ ٹارچ کی روشنی ارد گرد ڈالتا میں اس جگہ پہنچا جہاں انگریز لڑکی دونوں مردوں کے ساتھ بیٹھی رہی

تھی ۔ میں نے احتیاط سے موقع کا جائزہ لیا۔ پھر مجھے ایک اہم ثبوت نظر آیا۔ میں نے فوراً نیچے جھک کر وہ ثبوت محفوظ کر لیا۔

○

علی الصبح میں زمیندار حاکم علی کے دروازے پر پر دستک دے رہا تھا۔ اس کے ملازم نے مجھے احترام سے بیٹھک میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد حاکم علی کا بیٹا خوشیا آنکھیں ملتا بیٹھک میں داخل ہوا میں نے اس سے باپ کی متعلق پوچھا تو اس نے بتایا ابھی سو رہے ہیں میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اب تک کیوں سو رہا ہے ظاہر ہے وہ جواب دیتا کہ رات دعوت کے سبب دیر سے سویا تھا میں نے کہا۔

"خوشے رات تمہارے ساتھ شکاری شنکر بھی تھا نا"

"خوشے کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا"

ہاں کیا ہوا اسے؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"اسے کسی نے قتل کر دیا ہے" میں نے جواب دیا۔

خوشیا حیران رہ جانے کی زبردست اداکاری کر رہا تھا۔ "کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کا بولا"

میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا "خوشے تم کل رات کہاں تھے؟"

خوشے نے کہا! انسپکٹر دعوت کے بعد میں سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ اس وقت تک شنکر واپس جا چکا تھا۔ ابا جی نے اسے کہا بھی تھا۔ ..... کہ اکیلے نہ جاؤ لیکن اس نے کہا شکاری کو کون شکار کر سکتا ہے ..... لیکن انسپکٹر کیا واقعی....."

"ہاں خوشے میں نے اطمینان سے کہا شنکر کی لاش وہی پڑی ہے جہاں تم اپنا مفلر چھوڑ آئے تھے"

خوشے کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا وہ ہکلایا "کک ..... کیا

کہہ رہے ہو انسپکٹر۔"

میں نے قمیص کے نیچے سے اس سڑک ڈیزائن دار مفلر نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

"خوشے! یہ مفلر تمہارے کندھے سے اس وقت گر گیا تھا جب تم نے شنکر کو قتل کیا۔"

خوشے کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں یہ غلط ہے انسپکٹر مم .....میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں تو ساری رات حویلی میں رہا ہوں۔

میں نے کہا "پھر یہ مفلر ہوا میں اڑ کر پرانے اسکول کے کھنڈر میں پہنچ گیا ہو گا ..... دیکھو خوشے یہ مفلر کل رات تمہارے گلے میں تھا۔ اگر تم حویلی سے باہر نہیں گئے تو وہ دوسرا مفلر لا کر دکھا دو میں تمہیں بے گناہ مان لوں گا۔

خوشے کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ تھوک نگل کر رہ گیا اتنے میں دروازہ کھلا اور زمیندار حاکم علی اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر خوشے کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار نظر آئے حاکم علی گہری نظروں سے صورتحال کا جائزہ لے رہا ہو۔ بہت ممکن تھا وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہو۔ اس نے اطمینان سے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر یہ مفلر خوشے کا ہے لیکن شنکر کو خوشے نہیں قتل کیا۔"

میں نے کہا "زمیندار صاحب میں بھی جانتا ہوں کہ قتل خوشے نہیں..... لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان دنوں قصبے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ کیا ہے؟"

حاکم علی نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا پھر اپنے بیٹے سے بولا کہ کمرے کا دروازہ بند کر دو۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ حاکم علی بولا "نواز خاں! میں ابھی خود تمہاری طرف آدمی بھیجنے والا تھا یہ سب ابھی نا سمجھ ہیں۔ میں نے انہیں کہا بھی تھا کہ خطرناک کام ہے' خواہ مخواہ جان مصیبت میں نہ ڈالو لیکن نہیں مانے دراصل ان پر جنون سوار تھا کہ اس پر اسرار شخص کا

کھوج لگائیں جو قصبے میں قتل و غارت کر رہا ہے رات میرے منع کرنے باوجود ڈیوڈ ان سب کو لے کر کھنڈر کی طرف نکل گیا۔ ہمارے ایک مزارعے نے اطلاع دی تھی کہ اس نے کھنڈر کے اندر کوئی عجیب و غریب شے حرکت کرتی دیکھی ہے۔ ڈیوڈ کا خیال تھا کہ وہ آسانی سے اس پر قابو پا سکے گا۔ وہ تو اکیلا جا رہا تھا۔ میں نے ہی زور دے کر شکاری شنکر کو ان کے ساتھ بھیجا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تحصیلدار کے مہمان کوئی نقصان اٹھائیں وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ یہ لوگ ان کی جان گوا کر رات گئے واپس آ گئے"

میں نے کہا"حاکم علی اگر ایسی بات تھی تو تم نے مجھے کیوں بے خبر رکھا"

حاکم علی بولا "نواز خاں! میں نے تمہیں بتایا ہے کہ انگریز اس کامیابی کو سہرا اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجرم کو پکڑ کر تمہارے حوالے کیا جائے۔ ان لوگوں کی سوچ بھی عجیب ہوتی ہے۔ جان خطرے میں ڈالنے کو شغل سمجھتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "اس شغل کے نتیجے میں جو موت ہوئی ہے اس کی ذمے داری کس پر ہو گئی۔"

حاکم علی بولا۔ "نواز خاں میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب یہ معاملہ تمی کو سنبھالنا ہے ویسے شنکر ایک پیشہ ور شکاری تھا۔ میں نے اسے پوری صورت حال بتا کر معقول معاوضہ دیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اب تمہارے مہمان کیا کہتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے خود ہی کسی وجہ سے اسے ہلاک کر ڈالا ہو"

حاکم علی بولا۔ "نہیں انسپکٹر! میں ہر طرح کی ضمانت دے سکتا ہوں۔"

اس دوران ڈیوڈ اس کا ساتھی اور لڑکی کیتھی بھی آ گئے _ ڈیوڈ کے چہرے پر خراشیں تھیں جو شاید رات کے حادثے کا نتیجہ تھیں۔ تینوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ حاکم علی کے کہنے پر ڈیوڈ' رات پیش آنے والے واقعات

کی تفصیل بتانے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے کم و بیش تمام حالات درست بتائے تھے۔ ہاں قاتل کا حلیہ بیان کرنے میں وہ کچھ مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ شاید ایسا خوف کی وجہ سے تھا۔ وہ اسے کچھ زیادہ ہی بھیانک اور پر اسرار بنا کر پیش کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی لوگ اس کے مختلف حلیے بیان کرتے رہے ہیں۔ پہلے مقتول بشیرے کی بیوی سوہنی نے کہا تھا کہ اس کی چار ٹانگیں اور چار بازو ہیں۔ جبکہ بلال شاہ نے اس کے سر پر دو بڑے بڑے سینگ بھی اگا دیئے تھے۔ کچھ لوگ اس کا سر عام آدمی سے دو گنا بتاتے تھے اور پھر مٹکے کے برابر قرار دیتے تھے اس عجیب الخلقت شے کے بارے میں جو آخری اطلاع آئی تھی وہ حاکم علی کے مزارعے کی فراہم کردہ تھی۔ اس نے قاتل کی ٹانگیں تو دو ہی بتائی تھیں لیکن ایک دم کا اضافہ کر دیا تھا۔

اب تک کی سوچ بچار سے میں جس نتیجے پر پہنچا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی ہوائی چیز یا خوفناک درندہ نہیں بلکہ انسان ہی دس پندرہ یا بیس سال پہلے کسی عورت نے ایک عجیب الخلقت بچہ جنم دیا تھا۔ ایسے بچے یا تو پیدائش کے چند گھنٹے بعد جاں بحق ہو جاتے ہیں یا انہیں تلف کر دیا جاتا ہے ..... لیکن کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا۔ یہ بچے زندہ رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا بچہ تھا شاید ماں باپ کی محبت اس کی زندگی کا بہانہ بن گئی تھی۔ بہرحال ایک حقیقت واضح تھی کہ یہ کریہہ المنظر بچہ اب ایک طاقتور اور خطرناک شخص کا روپ دھار چکا تھا۔ اور اس کی ہاتھوں کئی افراد اپنی جان گنوا چکے تھے۔

میں نے ڈیوڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم تحصیل دار کے مہمان ہو اس لیے میں تمہارے احترام پر مجبور ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم یہاں اپنی من مانیاں کرو۔ میرے خیال میں تم یہ سمجھتے ہو کہ یہاں کے لوگ عقل و سمجھ سے عاری ہیں اور ان کے سروں میں بھوسہ بھرا ہوا ہے"

"میں ..... میں سمجھا نہیں" انگریز نے کہا۔ رات والے حادثے سے وہ کافی دبا دبا نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "مسٹر ڈیوڈ تم کل رات بھی مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ قتل کی وارداتوں کے پیچھے کوئی پر اسرار ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کو تلاش کرنا موت کو دعوت دینا ہے' لیکن تھوڑی سی دیر بعد تم خود بندوق تھام کر کھنڈر میں پہنچ گئے۔ اب پھر تم مجھ پر ظاہر کر رہے ہو کہ قاتل کوئی آدم خور بلا ہے اور اس کے سامنے نا خود کشی کے مترادف ہے..... مسٹر ڈیوڈ ہم بھی آخر اسی دنیا میں رہتے ہیں ٹھیک ہے آپ زیادہ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لوگ ہیں لیکن حقیقت اور وہم میں تمیز کرنے والے ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ یہاں سارے لوگ سادھوؤں اور ملنگوں کو ماننے والے نہیں کچھ کو بال کی کھال آتارنا بھی آتی ہے۔ تم بچوں کی طرح مجھے ڈرا رہے ہو کہ میں تھانے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤ ورنہ جان گنوا بیٹھوں..... تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ رات تمہاری آدم خور بلا سے میں دو دو ہاتھ کر چکا ہوں۔ جب تم کھنڈر کے چاروں طرف گھوم کر خوفزدہ انداز میں واپس جا رہے تھے میں اس قاتل سے گتھم گتھا ہو رہا تھا۔

ڈیوڈ اور حاکم علی کے ساتھ ساتھ کیتھی اور خوشے کے چہرے بھی استعجاب میں ڈوب گئے۔ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "مسٹر ڈیوڈ تمہارے لے وہ بلا ہوگی لیکن میرے لیے وہ ایک قاتل سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ تم اسے خطرناک "قاتل کہہ سکتے ہو" وہ عجیب الخلقت ہے' لیکن انسان ہے اس کے سر پر کوئی سینگ نہیں' نہ ہی اس کی کوئی دم ہے وہ خوفناک اور بدصورت ضرور ہے لیکن یہ بدصورتی سمجھ میں آنے والی ہے ..... تم نے صرف مہم جوئی کے شوق میں ایک مقامی شخص کو موت کے منہ دھکیلا اور اسے خطرے میں دیکھ کر بھاگ نکلے۔ قانون کی نظر میں تم مجرم ہو۔"

رات فر فر بولنے والا انگریز اب بالکل خاموش تھا' کچھ اوپر کمرے میں مکمل سکوت رہا پھر حاکم علی کھنکار کر بولا "نواز خاں جو کچھ بھی ہوا اب اسے دوہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت یہ

قصبہ اور ارد گرد کا پورا علاقہ اس موذی کی لپیٹ میں ہے' ہمیں کچھ خبر نہیں وہ کہاں سے آیا ہے کون ہے یا کیا چاہتا ہے۔ بہرحال وہ بے دردی سے قتل کر رہا ہے لوگ پہلے ہی کچھ کم خوفزدہ نہیں۔ آج کے قتل کی خبر جب انہیں ملے گی تو وہ مزید ہراساں ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ یہ خوف و ہراس دور دور تک پھیل جائے اور مزید انسانی جانیں ضائع ہوں' ہمیں اس درندے کو ختم کرنا ہے..... اب تمہاری کیا رائے ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "حاکم علی جب تک آپ لوگ مجھے کھل کر ساری بات نہیں بتائیں گے۔ میری مدد سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

حاکم علی نے کہا۔ "کھل کر بات کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ کیا ہم کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"بالکل"۔ میں نے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے ان مہمانوں کی آمد مقصد سے خالی نہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ پہلے سے اس شخص کے تعاقب میں ہوں۔ حنیفاں کے قتل کے اگلے روز میں نے انہیں رات کے وقت کھیتوں میں دیکھا تھا۔ تمہارا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ لوگ وہاں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس وقت بھی قاتل کے پیچھے تھے۔ اگر ایسا تھا تو انہوں نے مجھ سے یہ اہم اطلاع کیوں چھپائی میں علاقہ کا انچارج ہوں۔ مجھے بے خبر رکھنے سے ان کا کیا مطلب تھا۔"

میری اس بات کے جواب میں انگریز ڈیوڈ خود بولا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتا تھا لیکن اپنا مطلب خاصی کامیابی سے بیان کر لیتا تھا۔ لگتا تھا اسے یہاں رہتے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی گفتگو میں باربار "مائی گاڈ" (خدا کی قسم) کے الفاظ استعمال کیے اور مجھے یقین دلایا کہ اس رات وہ لوگ صرف "کنفیوژن" کا شکار کر رہے تھے اور یہ کہ کل شام سے پیشتر انہیں اس عجیب الخلقت شخص کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرا شک پوری طرح رفع نہیں ہوا تھا بہرحال میں نے اس بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس وقت فوری مسئلہ اس انسان نما درندے پر قابو پانے کا تھا۔

یہ بات تو بعید از قیاس تھی کہ وہ سوچ سمجھ کر قتل کر رہا ہے اس نے اب تین افراد کو ہلاک کیا تھا جبکہ ایک شخص یعنی بلال شاہ قاتلانہ حملے سے بال بال بچا تھا۔ پہلے دونوں مقتولین یعنی بشیرے اور حنیفاں کے درمیان تو تعلق کا کھوج ملتا تھا یعنی وہ دونوں دو پیار کرنے والوں کے درمیان رکاوٹ تھے لیکن بلال شاہ پر حملے اور اس کے بعد شکاری شنکر کے قتل سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ قاتل کی حیثیت ایک خونی درندے کے سوا کچھ نہیں۔ شاید وہ بد وضع ہونے کے ساتھ ساتھ جنونی بھی تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے خونخواری تسکین کا باعث بنتی ہے ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ بھوک سے تنگ آکر لوگوں پر حملے کرتا ہو۔ اگر وہ انسانوں سے زیادہ موں سے قریب تھا تو پھر ظاہر ہے اس کی عادتیں بھی درندوں جیسی رہی ہوں گی اور عموماً" دیکھا گیا ہے کہ جنگلی درندے پہلے پہل بھوک سے تنگ آکر انسانوں پر حملے کرتے ہیں اور پھر انہیں عادت پڑ جاتی ہے۔ جہاں تک بلال شاہ پر حملے کا سوال تھا وہ اس وقت میرے لیے "میٹھی دال" لا رہا تھا۔ جب یہ دال تازہ تازہ بنی ہوتی ہے اس کی خوشبو خاصی تیز ہوتی ہے بعض اوقات بھنے ہوئے چنوں کا شبہ ہوتا ہے میں عین ممکن تھا۔ کر قاتل جو قبرستان کی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا دال کی خوشبو سونگھ کر بلال شاہ کی طرف لپک آیا ہو۔ اس شبے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی تھی کہ جب بلال شاہ ٹھوکر لگنے سے گرا تو قاتل نے اس تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ ہو سکتا ہے دال کی پلیٹ جو موقعے سے غائب ہو گئی تھی۔ اسی نے اٹھالی ہو۔

لیکن اگر یہ مفروضہ درست تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صرف بھوک کی وجہ سے قتل کرتا تھا تو پھر لڑکی حنیفاں کا قتل کیا معنی رکھتا تھا۔ اسے کھیت میں قتل کیا گیا۔ نہ اس کی عزت لوٹی گئی' نہ اس سے کوئی چیز چھینی گئی..... میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بلال شاہ ایک ملازم کے ساتھ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی صورت یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ وہ کوئی بری خبر لایا ہے۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ اگر یہ کسی طرح مرنے کی خبر لایا ہے تو خدا

کرے وہ شنکر ہی ہو..... میرا پہلا اندازہ درست تھا۔ بلال شاہ کسی کے مرنے کی خبر لایا تھا لیکن .....وہ شنکر نہیں تھا قصبے کے سب سے ہنس مکھ اور دلعزیز نوجوان الطاف کا۔ میں نے اس کا ذکر پہلے بھی کیا ہے۔ وہ کمپاؤنڈر تھا۔ تھانے کے قریب ہی اس کا کلینک تھا۔ قصبے میں ہسپتال بھی موجود تھا۔ لیکن الطاف کے کلینک کی رونق سدا بہار تھی۔ اردگرد کے دیہات سے بھی مریض اس کے پاس آتے تھے۔..... میں بلال شاہ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ الطاف قتل ہوگیا ہے _ ابھی دو تین روز پہلے وہ مجھ سے اپنی شادی میں شرکت کی دوخواست کر رہا تھا لیکن چونکہ بارات کو ایک دور کے گاؤں جانا تھا۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا۔ یوں بھی قصبے میں حالات اچھے نہیں تھے۔ کتنی ہی دیر میں کچھ نہ بول سکا پھر ہمت کرکے میں نے بلال شاہ سے کہا۔ "..... لیکن اس کی تو شادی تھی" سوال بے معنی تھا لیکن مجھے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ بلال شاہ نے کندھے کے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں بولا۔

"ہاں خاں صاحب وہ رات ہی بیوی کو لے کر واپس پہنچا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بات تھی بھی صدمے کی۔ ایک خوشیوں بھرا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا ایک مانوس اور ہمدرد چہرہ قصبے کی گلیوں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا تھا۔

"اس کی لاش دیکھی نہیں جاتی جناب۔" بلال شاہ کے ساتھ آنے والے کہا۔ "یہ اسی درندے کا کام ہے جس نے پہلے قتل کیے ہیں۔" (اس شخص کو ابھی شنکر کی موت کا علم نہیں تھا ورنہ وہ دو کی جگہ تین کا لفظ استعمال کرتا) حاکم علی اور اس کے مہمانوں کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک عجیب طرح کا خوف کمری کی فضا میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور بلال شاہ کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔

شادی والے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر آنکھ اس ناگہانی موت پر اشکبار تھی۔ لوگ غمزدہ تو تھے ہی لیکن

ان کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں بھی لہرا رہی تھیں۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ ہجوم میں عورتیں اور بچے خال خال ہی نظر آتے تھے۔ اس کا سبب بھی وہ خوف تھا جو پورے قصبے پر آسیب کی طرح حاوی ہو چکا تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے نہایت تکلیف اور پریشان کن تھی۔ میں گھر کے صحن مین داخل ہوا تو مقتول کی والدہ دھاریں مارتی ہوئی مجھ سے لپیٹ گئی۔ وہ مجھے شانوں سے جھنجھوڑ کر نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے اس بمشکل خود سے جدا کیا اور لاش کی طرف بڑھا۔ وہ ایک چارپائی پر پڑی تھی اور اس کے اوپر سفید چادر تنی ہوئی تھی۔ میں نے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور میرے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے یہ قتل بھی یعنی کا اندازہ سے ہوا تھا۔ مقتول کو گردن دبا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کی علاوہ جسم پر کہیں زخم کا نشان نہیں تھا۔ کہنیوں اور ٹخنوں پر چند خراشیں تھیں جو مقتول کے تڑپنے مچلنے کی نشاندہی کرتی تھیں۔ مقتول کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی۔ وہ بھی سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ ہاتھوں پر مہندی کی سرخی اس موت کے منظر کو اور بھی رقت آمیز بنا رہی تھی۔

گھر والوں نے لاش کو زمین سے اٹھا کر خود چارپائی پر رکھا تھا ادھر ادھر گھوم کر انہوں نے تمام ثبوت ضائع کر دیئے تھے۔ میں نے گھر کے سربراہ سے چند سوال پوچھے اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ رات گھر میں قریباً" بیس افراد موجود تھے جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ رات کوئی نو بجے الطاف اپنی بیوی کے پاس کمرے میں چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تمام لوگ سو گئے۔ رات کو پچھلے پہر دلہن کی چیخ و پکار سن کر سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ گھرانے کا سربراہ الطاف کا باپ تھا کہنے لگا۔ "جناب! میں سب سے پہلے موقع پر پہنچا میں نے دیکھا کہ میری بہو دروازے میں کھڑی چلا رہی ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا میرے پوچھنے پر اس نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ اتنے میں میری بیوی آگئی یہ وہ اس سے لپیٹ کر رونے لگی۔ میری بیوی

نے پوچھا۔ الطاف کہاں ہے؟۔ لیکن وہ صرف روئے جا رہی تھی۔ تب ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ میں لالٹین لے کر اس طرف بھاگا میں نے دیکھا کہ میرے بچے کی لاش زمین پر پڑی ہے۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ قتل بھی اسی انسان نام درندے کی ہاتھوں ہوا ہے یوں لگتا تھا کہ رات جب وہ کھنڈر سے بھاگا تو کھیتوں میں چھپتا چھپاتا قصبے کی طرف نکل آیا۔ حالانکہ ٹھیکری پہرہ لگا ہوا تھا لیکن الطاف کا مکان عقبی جانب سے خاصا غیر محفوظ تھا۔ اس طرف زمین کا ایک خالی قطعہ تھا اور عورتیں کوڑا کرکٹ پھینک جاتی تھیں۔ صرف چند روز پہلے الطاف نے اس جانب کی دیوار اونچی کروائی تھی۔ لیکن اب بھی اس دیوار کو پھاند کر اندر آنا ایسا دشوار نہیں تھا۔ قاتل یقیناً" اسی طرف سے داخل ہوا تھا۔ میں نے موقعے کا معائنہ کیا اور اندازہ درست ثابت ہوا۔ کچی دیوار پر ایسے نشان موجود تھے جن سے دیوار پھاندنے کی نشاندہی ہوتی تھی۔

اس کیس میں سب سے اہم گواہی مقتول کی بیوہ کی تھی۔ وہ قتل سے پہلے تن تنہا مقتول کے ساتھ تھی۔ گھر کے ایک کمرے میں میں نے اس سے سوالات کیے۔ چند گھنٹے پہلے یہ کمرہ جملہ عروسی تھا۔ لیکن اب یہاں کی ہر شے سے اداسی اور سوگواری ٹپک رہی تھی۔ دیوار پر ایک کھونٹی سے الطاف کا سہرا لٹکا ہوا تھا۔ خوبصورت مسہری پر گلاب کے مرجھائے ہوئے پھول پڑے تھے ایک تپائی شیشے کے پھولدار جگ میں دودھ پڑا تھا دو گلاسوں میں بھی بچا کھچا دودھ موجود تھا ایک تفتیش کار کی حیثیت سے مجھے ہر چیز کا بغور جائزہ لینا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پوچھ گچھ کے لیے میں نے اس کمرے کو منتخب کیا تھا۔ مسہری کے قریب ہی ایک جستی ٹرنک پڑا تھا۔ اس کے ڈھکنے پر خون کے قطری نظر آ رہے تھے۔ میں نے الطاف کی دلہن سے کہا کہ وہ مجھے تفصیل سے ساری بات بتائے۔

لڑکی کم عمر تھی اور رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اس کی ہچکی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بمشکل اس نے خود پر قابو پایا اور کچھ بتانے میں کامیاب

ہوئی۔ اس نے کہا۔

"جب کسی نے دروازے کو ہلایا ہم جاگ رہے تھے۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ ہوا سے ایسا ہوا ہی۔ دوسری بار دروازہ ہلا تو کافی آواز آئی۔ وہ اٹھنے لگے تو میری دل میں آئی کہ انہیں روک لوں' لیکن میرے سوچتے سوچتے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئے اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں لگتا تھا انہوں نے دروازہ کھولا اور اچھی طرح باہر جھانک کر پھر بند کر دیا۔ پھر ان کے قدموں کی آواز سے لگا کہ وہ واپس آ رہے ہیں ..... لیکن اس وقت دروازہ پھر بجنے لگا۔ وہ واپس پلٹ گئے۔ اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک دو بار آہٹ سنائی دی۔ تب کوئی دھیمے قدموں سے کوئی چلتا کمرے میں آگیا میرے وہ وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ "ان" کی بجائے کوئی اور ہو گا لیکن جب اس نے مجھے چھوا تو مجھے فورا اندازہ ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "کون ہے" جواب میں وہ شخص لپیٹ گیا اور زبردستی کرنے لگا۔ میرے منہ کو اس نے اپنے مضبوط ہاتھ سے بند کر رکھا تھا۔ اس دوران میرے ہاتھ میں پیتل کا گلدان آگیا۔ میں نے پورے زور سے اس کے سر پر دے مارا۔ جونہی میرا منہ آزاد ہوا میں چلانے لگی۔ اس نے زور سے ایک تھپڑ میرے منہ پر مارا اور باہر کو بھاگا۔ میں گرتی پڑتی دروازے تک آئی تو وہ باہر نکل چکا تھا۔ میرے سسر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا میں نے انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کیا لیکن کچھ بول نہ سکی۔ اتنے میں میری ساس بھی چیختی چلاتی پہنچ گئی اور میں اس سے لپٹ کر رونے لگی۔"

میں نے لڑکی سے چند اور سوال پوچھے۔ اس کے جوابات سے اندازہ ہوا کہ حملہ آور اس پر مجرمانہ حملے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ لڑکی سے چند سیکنڈ گتھم گتھا ہوا۔ اس دوران لڑکی کو اس کی جسمانی ساخت میں کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ حملہ آور نے کوئی بات نہیں کی نہ ہی اس کے منہ سے کوئی غراہٹ وغیرہ بلند ہوئی۔ ہاں یہ بات لڑکی نے تسلیم کی کہ اس کے جسم سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ حالات اور واقعات واضح طور

پر اسی جنونی قاتل کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ جستی ٹرنک پر نظر آنے والا خون قاتل کا تھا۔ گلدان لگنے سے یقیناً" اس کے سر پر زخم آیا تھا۔ اور یہ کافی گہرا زخم تھا۔ کیونکہ خون کے قطرے نہ صرف کمرے سے باہر گھر سے باہر بھی پائے گئے۔ میں نے ایک بار پھر قصبے کے کھوجیوں کو بلایا۔ رات پچھلے پہر تھوڑی سی بارش ہو گئی تھی۔ اس لیے کھرا تو نہ اٹھایا جا سکا لیکن خون کے دھبوں نے کھوجیوں کی کافی رہنمائی کی۔ وہ بڑی کامیابی سے خشک خون کا سراغ لگاتے قصبے سے باہر جوہڑ کے کنارے پہنچ گئے۔ جوہڑ کی جانب کافی بڑے رقبے میں سرکنڈے کھڑے تھے۔ کچھ سال پہلے ایک ڈاکو قصبے میں واردات کرکے ان سرکنڈوں میں چھپ گیا تھا۔ جب دیہاتی اسے پکڑنے کے لیے داخل ہوئے تو اس نے کاربین سے فائر کرکے تین افراد کو ہلاک کر ڈالا اور بھاگ گیا۔ اس وقت سے قصبے کے لوگ ان سرکنڈوں میں داخل ہونے سے کتراتے تھے۔ خاص طور پر بچے اور عورتیں تو اس جانب بالکل رخ نہیں کرتے تھے۔ خون کے دھبے یہ گواہی دے رہے تھے کہ مجرم ان سرکنڈوں میں روپوش ہے۔

میں سب انسپکٹر سے مشورہ کیا پھر قصبے کے معززین کو بلایا۔ سب کی رائے تھی کہ سرکنڈوں کے گرد گھیرا ڈال کر مجرم کو گرفتار کیا جائے اور کسی صورت اسے بچ کر نکلنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس کے آخری سفاکانہ قتل نے ہر شخص کا دل ہلا دیا تھا۔ اس دوران شکاری شنکر کی موت کی خبر بھی پھیل گئی۔ اور لوگوں کے خوف و ہراس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ سب کام چھوڑ چھاڑ تھانے کے سامنے جمع ہونے لگے۔ جب کوئی تین چار سو کا مجمع ہو گیا۔ تو میں نے انہیں ضروری ہدایات دیں اور ساتھ لے کر سرکنڈوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان سرکنڈوں کو دو اطراف سے جوہڑ نے گھیر رکھا تھا۔ دو اطراف خالی تھیں۔ انگریز ڈیوڈ نے مشورہ دیا کہ ہانکا صرف ایک طرف سے کیا جائے۔ ایک جانب مسلح نوجوانوں کو قطار کی شکل میں کھڑا کر دیا جائے۔ اس کی تجویز اچھی تھی۔ میں قصبے کے پچیس تیس پر جوش نوجوانوں

کو ایک طویل قطار کی صورت میں سرکنڈوں کے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ ان سب کے پاس برچھیاں تلواریں اور لاٹھیاں تھیں۔ ڈیوڈ کا انگریز ساتھی اپنی بارہ بور کی بندق لیے ان کے ساتھ تھا۔ حاکم علی اپنے بیٹے اور اور مزارعین کے ساتھ جوہڑ کی طرف کھڑا ہو گیا۔ ان لوگوں کے پاس بھی تین چار رائفلیں تھیں۔ باقی سب لوگ ہانکا کرنے کے لیے سرکنڈوں میں داخل ہوئے۔ میں اپنے عملے کے ساتھ سب سے آگے تھا۔ میری بائیں طرف ڈیوڈ اپنی طاقتور رائفل لیے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پیشہ ور شکاری کی چمک تھی۔ ہمارے پیچھے قصبے کے لوگ ڈھول بجاتے کنستر پیٹتے چلے آ رہے تھے وہ سب کے سب برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ ہمیں قریباً" ایک فرلانگ کا فاصلہ اسی طرح طے کرنا تھا۔ ڈیوڈ کے پیچھے پیچھے اس کی دوست کیتھرائن بھی آ رہی تھی اس نے بڑی بے باکی سے رائفل تھام رکھی تھی نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں رہی ڈیوڈ سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اب پتہ نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت بہرحال ہم محتاط قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک ایک انچ زمین کو دیکھا جا رہا تھا۔ اگر وہ قاتل یہاں موجود تھا تو اس کا بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ قریباً" فرلانگ کے ہانکے میں ایک سور ایک کتا دیہاتیوں کی برچھیوں کا نشانہ بنے' لیکن وہ درندہ دکھائی نہیں دیا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف جوہڑ کے کنارے کھڑا دستہ" پوری طرح ہوشیار تھا۔ اگر قاتل ہانکے کے نتیجے میں جوہڑ میں چھلانگ لگاتا ہے تو بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت ہم جوہڑ سے قریباً" پچیس گز کے فاصلے پر تھے۔..... جب دفعتاً" سرسراہٹ کی آواز آئی اور کوئی سیاہ چیز تیزی سے ہانکا کرنے والوں پر جھپٹی ایک ساتھ کئی چیخیں گونجی۔ میری تمام ہدایات بے کار گئیں آگے چلنے والے نوجوان منہ پھیر کر بھاگے۔ اس کے بعد جو دوسرا منظر میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ایک ریچھ نما جانور کیتھی کے ہاتھ سے بندوق چھین رہا ہے پھر وہ کیتھی کے ساتھ ہی زمین

پر گرا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور اور ڈیوڈ کے ہاتھ میں رائفل تھی لیکن ہم گیتھی کے خیال سے فائر نہیں کر سکتے تھے ..... تب میں نے دیکھا کہ بھاگتے ہوئے افراد میں سے ایک برچھی بردار پلٹا اور اس نے بھاگ کر ریچھ نما شے پر حملہ کیا۔ اس نے لڑکی کو چھوڑا اور برچھی بردار پر حملہ آور ہوا۔ برچھی بردار اور گتھم گتھا ہو کر نیچے گرے اتنے میں تین نوجوان لاٹھیاں سونت کر آگے بڑھے۔ کھٹاک کھٹاک کی آواز سے لاٹھیاں ریچھ نما شخص پر برسنے لگیں۔ خدا کی پناہ ..... وہ ایک نا اہل یقین منظر چار بازوؤں اور بہت بڑے سر والا وہ عجیب الوضع شخص چند گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ ایک بار پہلے بھی میں اسے دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت رات تھی۔ اب دن کی روشنی میں وہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر گھنے بال تھے اور وہ کسی جنگلی بھینسے کی طرح زور آور تھا۔ چند لاٹھیاں کھا کر وہ مخالف سمت کی طرف بھاگا لیکن اس وقت نوجوانوں کی ایک اور ٹولی اس کے سر پر پہنچ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچھاڑ کر لیا گیا۔ اب وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور بپھرے ہوئے دیہاتیوں کی لاٹھیاں اسے روئی کی طرح دھنک رہی تھی۔ میں پستول تان کر بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اگر چند لمحے لوگوں کو اور نہ روکا جاتا تو وہ اسے جان سے مار ڈالتے "رک جاؤ۔" میں چلایا۔ لوگوں کے ہاتھ سست پڑ گئے۔ سب انسپکٹر اور اے ایس آئی فرزند علی آگے بڑھے اور انہوں نے مجرم کو گرفت میں لے لیا مجرم کا سر پھٹ چکا تھا اور جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ مزاحمت کے قابل نہیں تھا' لیکن پھر بھی اس سے خوف آ رہا تھا۔ اس خوف میں گھن اور کراہت کی جھلک نمایاں تھی' میں نے اسے غور سے دیکھا اس کا چہرہ عام انسانوں سے مشابہہ تھا' لیکن معمول سے کہیں بڑا تھا۔ "سر عام انسانی سر سے قریباً" ڈھائی گنا بڑا تھا اور خاصا بد وضع بھی۔ یوں لگتا تھا گردن پر مٹکا رکھا ہوا ہے۔ اس کی کمر پر کندھوں کے قریب ایک بڑا ابھار تھا۔ اور دو زائد بازو اسی ابھار سے پیوست تھے۔ وہ اپنی خون آلود آنکھیں جھپک جھپک کر لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی سفیدی مائل

آنکھیں دیکھیں اور ایکا ایکی میرا سارا خوف اور ساری کراہت دور ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک ڈرا ہوا معصوم جانور میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کا سارا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ لوگوں کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا گاہے گاہے کوئی شخص پیچھے آکر لاٹھی اس کے سر پر دے مارتا تھا جب لاٹھی اسے لگتی تو وہ کسی جانور ہی کی طرح بہک جاتا۔ تکلیف یا حصے کی کوئی جھلک اس کی چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔

پھر میں نے اپنے ان ہمدردانہ خیالات کو ذہن میں سے جھٹکا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بے رحم قاتل تھا۔ چند گھنٹے پہلے اس نے ایک بے گناہ نوجوان کو عین سہاگ رات میں قتل کیا تھا اور اس کی بیوی پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی۔ اس سے پہلے دو تین انسانوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ میں نے بلال شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ ایک رسی لیے آگے بڑھا اور لوگوں کے ساتھ مل کر مجرم کو مضبوطی سے جکڑ دیا۔ پھر میرا دھیان اس شخص کی طرف چلا گیا جس نے فی الواقع اس درندے کو زیر کیا تھا۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ وہ سو سالہ بابا شرفو تھا۔ جب نوجوان بھاگ رہے تھے وہ پیر کہنہ سال بڑی دلیری سے آگے بڑھا تھا اور ایک ہی وار سے مجرم کو دم ختم کر دیا تھا۔ بعد میں مجرم پر جھپٹنے والے نوجوان اس کے پوتے اور نواسے تھے۔ انہوں نے جب اپنے جد امجد' کو مصیبت میں دیکھا تھا تو واپس پلٹے تھے اور لاٹھیوں سے مجرم کا بھرکس نکال دیا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگ بابے شرف کو گھیرے میں کھڑے تھے اس کا سرخ و سپید چہرہ نوجوانوں کی طرح تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ بہر حال اس کی بوڑھی ہڈیوں نے کام دکھایا تھا اور اس کے کندھے کو موچ آ گئی تھی میں نے دیکھا کیتھرائن بڑی محبت سے بابے کا کندھا ٹٹول رہی تھی۔ میں بھی بابے کے قریب چلا گیا۔ بابے کے چہرے پر رونق ہی رونق تھی۔ پتہ نہیں یہ مجرم پکڑے جانے کی خوشی تھی یا کیتھرائن کے نازک ہاتھوں کا مس کام دکھا رہا تھا۔

○

مجرم رسیوں میں جکڑا ہوا میرے سامنے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور عجیب انداز سے روزن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے ساتھ سر کھپا رہا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور اس قتل و غارت سے اس کا مقصد ہے اس ایک گھنٹے میں اس نے صرف چند الفاظ بولے تھے عجیب گو بخار آواز میں کہے ہوئے وہ الفاظ یہ تھے ناں ناں ..... ہاں ہاں ..... جا ..... اموں یہ ناقابل فہم الفاظ میری کیا مدد کر سکتے تھے۔ گاہے گاہے وہ کڑی نظروں سے مجھے گھور کر رسی کو کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا تھا۔ مجھے اس کے گھورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک سپاہی نے آکر بتایا کہ کوئی ملنا چاہتا ہے میں کمرے سے نکل کر دفتر میں پہنچا تو بابا شرفو بیٹھا تھا۔ حال احوال پوچھ کر میں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو بابے نے ایک پرچی میرے سامنے کر دی۔

میں نے دیکھا اس پر ٹوٹی پھوٹی اردو اور شکستہ خط میں لکھا تھا۔ "انسپکٹر صاحب! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں یہ بہت ضروری ہے۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ اور وقت بتائیں کہ میں راز داری سے آپ سے بات کر سکوں۔" کیتھی کی تحریر پڑھ کر میں نے بابے شرفو کی طرف دیکھا۔ اس نے زبانی بھی یہی پیغام دیا۔ کہ میم آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا۔

"بابا شرفو یہ بات کیا ہے"

بابا شرفو۔ "نہیں پتر نہیں .... ایسی بات نہیں وہ خراب عورت نہیں ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں خراب تو واقعی نہیں حالانکہ تو نے اسے اتنی بری طرح "راگڑا" تھا پھر بھی وہ تجھے ملائم ہاتھ لگاتی ہے۔

بابا گڑ بڑا کر میری طرف دیکھنے لگا پھر زور سے قہقہہ لگا کر بولا "تو بڑا بھولی ہے پتر..... اس عمر میں کیا عشق کروں گا۔

"لو تمہاری عمر کوئی بہت زیادہ تو نہیں۔" میں نے مسکہ لگایا۔ "اور انگریز عورتیں تو ویسے بھی بڑی عمر کے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔"

بابا شرفو ہنس کر کہنے لگا۔ "بس بڑی دنیا دیکھ لی اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے ..... ویسے جب میں چھوٹا تھا میری ماں کہا کرتی تھی تیرے لیے میم بیاہ کر لاؤں گی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا.... میں سمجھ گیا کہ بابا اب نواب سراج الادلہ کے زمانے کا کوئی قصہ شروع کرنے والا ہے۔ وہ پرانے زمانے کے بڑے دلچسپ واقعات سنایا کرتا تھا لیکن اس وقت مجھے فرصت نہیں تھی۔ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

بابا شرفو! تمہارا کیا حال ہے۔ میم کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

بابے شرفو نے بتایا کہ وہ اس بارے میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے بابے شرفو سے کہا کہ وہ شام چھ بجے کے بعد اسے میرے گھر لے آئے۔ بابے نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ میم کو جا کر بتا دیتا ہے اگر اسے یہ تجویز پسند آگئی تو شام چھ بجے ملاقات ہو گی۔

بابا اس کے بعد واپس نہیں آیا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ پروگرام کے مطابق وہ چھ بجے انگریز لڑکی کو لے کر میرے گھر آئے گا۔ شام تک میں نے کئی بار سوچا' لیکن کچھ سمجھ نہیں آئی کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ شام سے کچھ دیر پہلے متعلقہ ایس پی صاحب سہارنپور پہنچے۔ ان کی موجودگی میں ملزم سے پوچھ گچھ ہوتی رہی لیکن کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ قریبا ساڑھے پانچ بجے میں گھر روانہ ہو گیا۔ سنا تھا کہ انگریز وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ پورے چھ بجے میں بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگا لیکن چھ کے بعد ساڑھے چھ بجے پھر سات' لیکن کوئی نہیں آیا۔اس وقت ساڑھے سات بجے تھے جب بابے شرفو کی صورت دروازے پر نظر آئی۔ اس نے بتایا کہ میم آج نہیں آسکے گی۔ دونوں صاحب اس کے ساتھ بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ذرا دیر کے لیے باہر آئی تھی اور اس نے مجھ

سے کہا تھا کہ انسپکٹر سے کہہ دو میں آج نہیں آسکتی۔
بابے شرفو نے یہ بھی بتایا کہ کل دوپہر تک ان لوگوں کو واپس چلے جانا ہے لیکن میم نے کہا ہے کہ جانے سے پہلے وہ ایک دفعہ انسپکٹر سے بات کرنے کا موقع ضرور نکالے گی۔ بابے شرفو کے جانے کے بعد میں تا دیر اس بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے اب کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کیتھی اس خطرناک قاتل کے سلسلے میں ہی بات کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا تھا تو وہ کیا بات ہو سکتی تھی۔ قاتل کو گرفتار ہوئے بارہ گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔ اس دوران اس سے نرمی بھی برتی گئی مارا پیٹا بھی گیا لیکن بے معنی الفاظ بولنے یا گھورنے کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ سخت ڈرا ہوا بھی دکھائی دیتا تھا۔
اسی شام جواناں مرگ الطاف کا جنازہ اٹھا تو قصبے میں کہرام مچ گیا۔ جنازے میں شرکت کے بعد میں افسردہ دل لیے گھر واپس آگیا۔ دیر تک کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آئی۔ ساری رات جیسے غنودگی میں گزر گئی۔ صبح صبح ایک چوری کی اطلاع آگئی۔ ورادات قریبی گاؤں میں چوہدری کے گھر ہوئی تھی۔ اس سے گہرے تعلقات تھے۔ جانا ضروری تھا۔ وہاں سے کوئی دس بجے واپسی ہوئی۔ میں سیدھا تھانے پہنچا۔ وہاں ایک سنگین خبر میری منتظر تھی ..... وہ انسان نما درندہ حوالات سے فرار ہو چکا تھا۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن زندگی میں کبھی کسی مجرم کے فرار کا مجھے اتنا دکھ نہیں ہوا چند لمحے کے لیے میں سن کھڑا اس پر خطر واقعے کا صدمہ برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اپنے حوالدار پر برس پڑا۔ یہ ایک سکھ حوالدار تھا۔ مجرم کی نگہداشت اس کی ذمے داری تھی۔ اور کل شام روانگی سے پہلے میں اسے خاص طور پر محتاط کرکے گیا تھا۔ حیران کن بات تھی کہ رسیوں سے جکڑا ہونے کے باوجود مجرم کے عقبی کھڑکی توڑی اور تھانے باہر نکل گیا۔ یہ کھڑکی قریباً" تین فٹ کی بلندی پر تھی۔ بالکل چھوٹی سی کھڑکی تھی اور اندر لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ کم از کم چار سلاخیں کاٹے بغیر بندہ اس کھڑکی سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ جس مجرم کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا تو سر

ہی بہت بڑا تھا۔ جب تک ساری سلاخیں نہ کاٹی جاتیں۔ وہ باہر پاؤں نہیں رکھ سکتا تھا لیکن اس نے سلاخوں کو چھیڑا ہی نہیں تھا۔ ..... پوری چوکھٹ کی اکھاڑی تھی اور اس میں ہماری کوتاہی کو دخل تھا۔ کھڑکی کی سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ لیکن خود کھڑکی مضبوط نہیں تھی ایک دفعہ پہلے میرے ذہن میں آیا تھا کہ لاک اپ کی کھڑکی دیوار میں ہلتی ہے۔ کہیں کوئی حوالاتی قسمت آزمائی کی کوشش نہ کرے۔ پھر نجانے کیسے یہ بات ذہن سے محو ہو گئی۔ بعض اوقات کوئی غلطی ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے اور پھر دم سادھ لیتی ہے۔ مہینوں اور سالوں میں اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمیں اس کی قیمت چکانا پڑتی ہے.....

جب میں نے بغور کھڑکی کا معائنہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ کھڑکی اندر سے نہیں بلکہ باہر سے اکھاڑی گئی ہے۔ یہ شک بڑ سنسنی خیز تھا۔ چوکھٹ نکلنے سے اوپر کی کچھ اینٹیں اکھڑ گئی تھیں۔ اطراف کی کچھ اینٹیں بھی کھسکی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کھسکی ہوئی اینٹوں کا رخ اندر کی طرف تھا۔ بڑا معمولی سا فرق تھا لیکن بغور دیکھنے سے پتہ چل جاتا تھا۔ اب تک میرے سب انسپکٹر نے جو تفتیش کی تھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملزم نے کسی طرح دانتوں سے کاٹ کر یا دیواروں سے رگڑ کر اپنی بندشیں کمزور کیں اور پھر توڑ دیں۔ بعد ازاں وہ بیت الخلا میں گیا (یہ مختصر سا بیت الخلا حوالات کے اندر ہی تھا) وہاں سے اس نے اینٹ اٹھائی اور اس کی متواتر ضربوں سے کھڑکی کو باہر کی طرف نکال دیا۔ حوالدار اوتار سنگھ جو کبھی کبھار شراب کا نشہ کر لیتا تھا۔ نشے کی ترنگ میں رہا اور ملزم نو دو گیارہ ہو گیا ..... لیکن کھڑکی کی اینٹوں کے معائنے کی بعد میں یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ ملزم کے اتنا قریب ہونے کے باوجود اوتار سنگھ کھڑکی ٹوٹنے کی آواز سن نہ سکا

میں نے اپنے خیالات کا اظہار سب انسپکٹر سے کیا۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ حوالدار اوتار سنگھ کو بلائے۔ چند لمحے بعد بس انسپکٹر واپس آیا تو اس کے چہرے پہ خدشات منڈلا رہے تھے۔ اس نے بتایا

کہ حوالدار کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ایس آئی فرزند علی نے آکر بتایا کہ حوالدار کہیں نہیں مل رہا۔ سب انسپکٹر نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"خان صاحب! میرا خیال ہے کہ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہماری باتیں سن لی تھی..... اگر میرا اندازہ غلط تو وہ فرار ہو گیا ہے۔"

یہ اطلاع ہم سب کے لیے ایک دھماکہ تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ حوالدار خریدا گیا ہے۔ یہ حوالدار پانچ ماہ روپوش رہنے کے بعد پکڑا گیا۔ کیسے پکڑا گیا یہ ایک طویل اور خشک کہانی ہے بہرحال اس کے غائب ہوتے ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ ملزم کے فرار ہونے میں اس کا ہاتھ ہے اب سوچنے کی بات تھی کہ وہ کون سے لوگ ہیں جنہوں نے اسے استعمال کیا ہے اور ملزم کی رہائی سے انہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ واقعہ آدھی رات کے فوراً بعد ہوا ہے۔ اور یقینی بات تھی کہ مجرم بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ ویسے بھی میں اس خبر کی تشہیر نہیں چاہتا تھا۔ قصبے کے لوگوں نے کئی دنوں کے بعد سکھ کا سانس لیا تھا۔ یہ اطلاع ان کے لیے سخت ہراس کا باعث بن سکتی تھی۔

دفعتاً" میرے ذہن میں آیا کل رات انگریز لڑکی مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں گھڑی دیکھی بارہ بجنے والے تھے میں فوراً تھانے سے نکلا اور حاکم علی کی حویلی کی طرف چل دیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک موٹا تازہ ملازم باہر نکلا میں نے حاکم علی کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کہیں کام گئے ہوئے ہیں۔ انگریز مہمان کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ خوشے کو شہر جانا تھا اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اتنے میں بابا شرفو دروازے پر نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ "آجا پتر اندر آجا" میں بھی کسی ایسی ہی پیش کش کا منتظر تھا۔ بابا کچھ اداس نظر آرہا تھا۔ میں نے پوچھا تو میرا مطلب سمجھ کر ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ "بابا! کچھ اتہ پتہ لیا میم کا۔"

بابا بھنا کر بولا۔ "وہ تو سب کو دے کے گئی ہے کچھ نہ کچھ تمہیں نہیں دے کے گئی کھتائیوں (بسکٹوں) کا ڈبہ۔"

ملازم بولا۔ "تمہیں تو عطر دے کے گئی ہے" بابا مصنوعی غصے سے ملازم کے پیچھے لپکا۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد بابا جوتی ہاتھ میں لیے بڑبڑاتا ہوا واپس آگیا۔

"کل کے لونڈے مزاق اڑاتے ہیں ..... عطر دے کے گئی ہے ۔ میری عمر ہے عطر لگانے کی۔"

اب بابا اور میں بیٹھک میں تنہا تھے۔ میں نے اچانک اپنا لہجہ بدلا اور بابے سے کہا۔ "بابا شرفو! میں تھوڑی دیر کے لیے اوپر جانا چاہتا ہوں۔"

بابے نے میرا چہرہ دیکھا اور گڑبڑا گیا۔ "لیکن پتر چوہدری صاحب نے منع کر رکھا ہے۔ کوئی نوکر سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا۔"

میں نے کہا۔ "بابا اسی لیے تو کہہ رہا ہوں ..... اس بات کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے اور ہاں اگر کوئی ملازم آجائے تو اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلے جانا۔ میں واپسی پر خاموشی سے باہر نکل جاؤں گا۔"

بابے نے اپنے پوپلے منہ میں خشک زبان گھمائی اور اثبات میں سر ہلا کر حقہ گڑگڑانے لگا۔ لگتا تھا وہ بھی بالائی منزل کا اسرار جاننے کی خواہش دل میں رکھتا ہے۔

وہ چوکنے انداز میں باہر دیکھنے لگا اور میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوا اوپر آگیا۔ قدرت نے یہ اچھا موقع دیا تھا اور میں ہر صورت اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ بالائی منزل پر ایک تنگ سی رہداری تھی۔ دونوں طرف کوئی دس بارہ کمرے تھے۔ لکڑی کے موٹے دروازوں پر سبز رنگ کی تہہ چڑھی ہوئی حاکم علی ان کمروں کو مہمان خانے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ دو دروازوں سے باہر پڑی استعمال شدہ اشیاء سے میں نے اندازہ لگایا کہ انگریز مہمان بھی ان ہی کمروں میں ٹھہرے رہے تھے۔ نیم تاریک راہداری سے گزر کر میں آخری کمروں کے سامنے پہنچا۔ بائیں جانب والا کمرہ چھت پر

جانے والی سیڑھیوں کے عین نیچے تھا اور نسبتاً چھوٹا بھی۔ سات آٹھ سیڑھیاں اوپر ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اسے آپ شہر کی زبان میں گیلری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اوپر نیچے یہ دونوں کمرے نیچی چھتوں والے تھے۔ مجھے بالائی کمرے پر شبہ تھا۔ محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا۔ میں بالائی دروازے کے سامنے پہنچا۔ دروازے پر ایک بڑا تالا لگا تھا لیکن کمرہ خالی نہیں تھا۔ کسی کے رونے کی مدھم آواز میں صاف سن رہا تھا۔ میں نے انگلی کی پشت سے ہلکی سی دستک دی۔

"کون ہے" اندر سے آواز آئی یہ لسوانی آواز تھی۔ "پولیس ..... " میں نے جواب دیا۔

"کون۔" کسی نے بے پناہ حیرت سے پوچھا۔

"پولیس ..... پولیس" میں زور دے کر کہا۔ دفعتاً" کوئی دورازے پ جھپٹا اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا ..... ساتھ ساتھ ایک فریادی آوا سنائی دے رہی تھی۔ "خدا کے لیے میری مدد ..... میں یہاں قید ہوں مجھے یہاں نکالو" عورت بری طرح چیخ رہی تھی۔ "خدا کے لیے ..... خدا کے لیے"

میں نے لمحے کے لئے سوچا۔ ان گنت اندیشوں نے ذہن پر یلغار کی لیکن فرض غالب رہا۔ میں نے ہولسٹر میں ہاتھ ڈالا اور زمیندار حاکم "علی لگایا ہوا تالہ ایک دھماکے سے ٹوٹ کر میرے قدموں میں گر پڑا۔ دروا اب بری طرح ہل رہا تھا۔ میں نے گنڈی گرائی ..... پٹ کھلے۔ ایک ادھیڑ عورت میرے سامنے تھی۔ اس کے کھچڑی بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر ا پاؤں ننگے تھے اس نے میری وردی کی جھلک دیکھی اور چیخ کر مجھ سے لپ گئی۔

"مجھے یہاں سے لے چلو صاحب جی" وہ گڑگڑائی۔ اس کی آنکھو میں خوف تھا اور رخساروں سے لگاتار آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں نے مح سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے بتایا کہ وہ ضلع سیالکوٹ کی ا

تحصیل کی رہنے والی ہے وہ ذات کی "میو" ہے (میوات کی رہنے والے یہ مسلم راجپوت پنجاب کے دیہی علاقوں میں اکثر بیشتر دیکھنے میں آتے ہیں۔ کئی جگہوں پر ان کے پورے پورے گاؤں آباد ہیں۔ ان کی شکل و صورت اور لب و لہجہ مقامی پنجابیوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ رنگ کے یہ سانولے لوگ بولی میں زیادہ تر اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) عورت نے بتایا کہو وہ اپنے بچے کو ڈھونڈتی ہوئی اس قصبے تک پہنچی تھی۔ میں نے اس کے بچے کے بارے پوچھا۔ اس کے جواب نے مجھے چونکایا اور پھر جھجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ عورت سچ کہہ رہی ہے لیکن وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس کے من سے ماں کی زبان بول رہی تھی اور ماں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اس نے کہا۔

حضور آج سے بیس سال پہلے میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ لوگوں نے کہا وہ بدصورت اور خوفناک ہے۔ کسی نے کہا یہ بد دعا کا نتیجہ ہے۔ کسی نے کہا اس میں شیطان کی روح ہے .... لیکن حضور وہ صرف ایک بچہ تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح معصوم اور بے گناہ میں ..... اس کی طرف لوگوں کی نگلیاں اٹھتی نہ دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اسے چادر میں چھپایا اور گاؤں سے لے کر دور نکل گئی۔ میرا خاوند نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اسے میرے ساتھ آنا پڑا۔ یک گاؤں کے خدا ترس چوہدری نے ہم پر مہربانی کی۔ اس نے آبادی سے ور ایک الگ تھلگ مکان ہمیں رہنے کے لیے دے دیا وہاں اس کا باغ تھا۔ م اس کے باغ کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

ایک عمر اسی طرح گزر گئی۔ کچھ عرصہ پہلے میرا خاوند بھی مر گیا۔ ہدری کا ایک لڑکا بڑا تیز طرار اور سخت گیر نکلا وہ اکثر باغ کی سیر اور شکار ے لیے وہاں آتا ..... کوئی ایک ماہ پہلے کی بات ہے وہ آیا اس کے ساتھ چند ریز بھی تھے ہم ماں بیٹا ایک چھوٹے سے کچے مکان میں رہتے تھے۔ میں پنے بیٹے کو بہت کم باہر آنے دیتی تھی لیکن اس دن وہ گھر سے باہر درختوں نیچے گرے ہوئے پھل اٹھا رہا تھا۔ انگریزوں نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی

رہ گئے۔ ان بدبختوں کے لیے وہ ایک عجیب جانور تھا۔ ان کی نظریں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں اپنے بچے کو جلدی سے گھر میں لے گئی۔ ..... لیکن پھر..... پھر وہ ظالم مجھ سے میرا بچہ چھین کر لے گئے۔ "عورت نے ایک ہچکی لی اور زارو قطار رونے لگی" حضور۔ وہ میرا بچہ ہے جیسا بھی ہے میرے جگر کا ٹکڑا میری گود میں کھیلا ہے۔ لیکن وہ ظالم ..... وہ ظالم اسے مجھ سے دور لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ اسے ولایت لے جائیں گے۔ لوگوں جو اس کا تماشہ دکھائیں گے۔ جانوروں کی طرح اس سے کرتب کرائیں گے۔ حضور! میں قسم کھاتی ہوں وہ جانور نہیں ..... انسان ہے۔ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اپنے کوکھ جنے کی قیمت میں کیسے وصول کر لوں۔ وہ مجھے روپیہ دیتے ہیں ..... حضور آپ ہی بتایئے کون اپنا خون بیچ سکتا ہے۔ کون اپنی اولاد کے پیسے لے سکتا ہے؟

عورت اشکبار سوالیہ آنکھوں سے میرا چہرہ تک رہی تھی میرے پاس اس سوال کوئی جواب نہیں تھا۔ شاید کسی مرد کے پاس اس کا سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ عورت جو اس وقت بھی بچے کو پیار کرتی ہے جب وہ اس کے پیٹ میں ہوتا ہے جو اسے اپنے لہو سینچتی ہے۔ جو اس کے ساتھ ایک عرصہ بسر کرتی ہے اور جب وہ پیدا ہوتا ہے تو دنیا کے لئے نوزائیدہ ہوتا ہے لیکن ماں کے لیے اس کی عمر نوماہ ہوتی ہے۔

عورت چلا رہی تھی۔ "حضور میرے بچے کی جان بچائیں۔ وہ لوگ اسے سمندر پار لے جائیں گے۔ میں جیتے جی مرجاؤں گی حضور۔ اس کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ..... کوئی نہیں"

میں ششدر تھا۔ ایک کریہہ المنظر انسان کے لیے ایک عورت کی پکار جہاں قابل فہم تھی وہاں انتہائی رقت آمیز بھی۔ میں عورت سے کہا کہ وہ حوصلے اور صبر سے تفصیل کے ساتھ مجھے ساری بات بتائے۔ اسی صورت میں میں اس کی مدد کے قابل ہو سکوں گا۔

عورت نے آنسوؤں اور آہوں کے درمیان ایک بار پھر اپنی بپتا

کی ۔ اس کی گفتگو سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ انگریز کسی مقصد کی تحت عورت کے عجیب الخلقت بیٹے کو اپنے ساتھ مل کر اسی زبردستی اٹھایا اور نکل گئے ہیں راستے میں کسی طرح وہ عجیب وضع نوجوان جس کا نام عورت " ہابو" بتایا ان کی حراست سے چھوٹ گیا۔ انہوں نے اس پکڑنے کی کوشش کی اور اس کو ٹوہ لگاتے سہارنپور آ پہنچے۔ اس دوران "ہابو" کی ماں بھی اس کے لیے در بدر بھکی رہی۔ وہ بھی سہارنپور پہنچی۔ انگریزوں نے اسے دیکھ لیا اور خوشے وغیرہ کے ذریعے اسے پکڑ کو حویلی میں بند کر دیا۔ شاید وہ اسے قتل ہی کر دیتے لیکن ان کا خیال تھا کہ شاید "ہابو" کو قابو کرنے کے لیے اس کی ماں کی ضرورت پڑ جائے۔

اگر یہ صورتحال درست تھی اس کا مطلب تھا کہ "ہابو" کو حوالات سے نکالنے میں حاکم علی اور اس کے معزز مہمانوں کا ہاتھ تھا۔ اور اب وہ لوگ اسے لے کر اڑن چھو ہونے والے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ وقت بہت قیمتی ہے۔ بابے شرفو کی اطلاع کے مطابق انگریزوں کو قصبے سے روانہ ہوئے قریباً" پانچ گھنٹے ہو چکے۔ ان پانچ گھنٹوں میں وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکے تھے۔ میں فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

جس وقت میں تھانے کے دروازے سے نکلا مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کہا جانا ہے۔ میرے ساتھ صرف اے ایس آئی فرزند علی تھا۔ میرے گھوڑے کا رخ جیسے خود بخود شہر کی جانے والی سڑک کی طرف ہو گیا تھا۔ آخر ملزم کو لے کر وہ لوگ اور کہاں جا سکتے ہیں۔ سوچوں میں گم گھوڑا دوڑاتا ہوا میں قصبے سے کوئی تین فرلانگ دور آیا تھا جب اچانک میرے ہاتھوں نے لگام کھینچ لی۔ گھوڑا رک گیا۔ فرزند علی نے بھی گھوڑے کو ایک طرف کھڑا کر دیا گاڑی کے ٹائروں کے نشانات جو کافی مدھم تھے۔ اس جگہ پہنچ کر بالکل معدوم ہو گئے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ دفعتاً" فرزند علی نے "خانصاحب" کہہ کر انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے انگلی کے رخ پر دیکھا مجھے وہ منظر آج تک یاد ہے جیسے آج کل ٹی وی کے اشتہاروں

میں لڑکیاں بال کھولے کھیتوں میں بھاگتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ایک لڑکی تیزی سے ہماری طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔ میں اور فرزند یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ کیتھی تھی۔ انگریزوں کی ساتھی لڑکی وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اکا دکا کسان اٹھ اٹھ کر اسے دیکھ رہے تھے۔

ہم نے گھوڑے کھیتوں کی طرف موڑے چند ہی لمحے بعد ہانپتی کانپتی کیتھی ہمارے سامنے تھی گھوڑے سے اتر کر میں اس کی سامنے پہنچا۔ وہ تھوڑی دیر ہاتھوں میں سر تھامے اپنی سانسیں درست کرتی رہی۔ پھر بال جھٹک کر بولی۔

"انسپکٹر ہمارے ساتھ آؤ حوالاتی خطرے میں ہے" وہ ہابو کا ذکر کر رہی ہے اور میں اس کی تلاش میں تھا۔ میں نے گہری نظروں سے کیتھی کا چہرہ دیکھا وہ فریب نہیں کر رہی تھی۔ میں نے اسے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھایا اور ایڑ لگا دی۔

گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اور کیتھی میرے کان میں چلا رہی تھی۔ "انسپکٹر ہابو انوسینٹ (بے گناہ) نے کوئی مرڈر (قتل) جان بوجھ کر نہیں کیا۔

وہ مسلسل بولتی رہی اور جب ہمارے گھوڑے "وجے پور" میں داخل ہوئے میں ہابو کے متعلق بہت کچھ جان چکا تھا۔ وہ وجے پور کے ہندو نمبر پردیپ کمار کی حویلی میں تھا۔ پردیپ کمار حاکم علی کا گہرا دوست تھا۔ انگریز اپنے شکار کو لے کر وہیں پہنچے تھے۔ اب وہاں اس پر جانوروں کی طرح تشدد کیا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے اتنا خوفزدہ کر دیں کہ سفر میں وہ بے چوں چراں ان کی ہدایات پر عمل کرے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں اور فرزند علی گھوڑے دوڑاتی ہوئے سیدھے حویلی کے دروازے پر پہنچے دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ پردیپ کمار گھبرایا ہوا باہر نکلا اس نے میرے ساتھ کیتھی کو دیکھا اور مزید گھبرا گیا میں سخت لہجے میں پوچھا۔ "حاکم علی اور [illegible] لوگ کہاں ہیں۔"

وہ بولا "نواز صاحب وہ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے چلے گئے ہیں"

کیتھی چلا کر بولی "جھوٹ بولتا ہے۔ ہماری کار وہ کھڑی ہے"

میں نے دیکھا کار کو ایک برآمدے میں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی' لیکن اس کا کچھ حصہ دیوار کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ میں نے ریوالور نکال لیا پردیپ کمار سخت خوفزدہ دکھائی دینے لگا لیکن اس وقت میری نگاہ چھت کی طرف اٹھ گئی۔ ایک بندوق کی نالی منڈھیر سے جھانک رہی تھی۔ پھر فائیر ہوا اور گولی کیتھی کے سر کو چھو کر گزر گئی۔ اس سے پہلے فائر دوسری گولی چلتی میں تاک کر فائر کر کیا رائفل کے پیچھے نظر آنے والا سر جھٹکے سے پیچھے گیا۔ اور سیڑھیوں سے ایک شخص لڑھکتا ہوا دھڑام سے صحن میں آگرا۔ یہ حاکم علی کا بیٹا خوشیا تھا۔

دفعتا سیڑھیوں کی بالائی منزل پر حاکم علی نظر آیا۔وہ بیٹے کے انجام پر سخت مشتعل دکھائی دیتا تھا۔ ایک بڑھک کے ساتھ اس نے رائفل سیدھی کی اور مجھ پر فائر کر دیا لیکن شعلہ نکلنے سے پہلے ہی میں چھلانگ لگا کر ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔ حاکم علی کی آواز سنائی دی' پھاٹک بند کردو" ایکا ایکی تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اور کیتھی محفوظ آڑ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اپنے سرکاری ریوالور سے چند فائر کیے پھر میں ریوالور لوڈ کرنے لگا۔ اور زخمی فرزند علی نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس وقت مجھے اندورونی کمرے سے ایک چنگھاڑ سنائی دی۔ یقینا یہ اسی ہابو کی آواز تھی۔میں فائرنگ کرتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف ہٹنے لگا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نی دیکھا۔ ہابو رسیوں سے جکڑا زمین پر پڑا تھا۔ میں نے تیزی سے ہابو کی بندشیں کاٹ دیں لیکن وہ اسی طرح زمین پر لیٹا رہا۔میں اس کی نفسیات سمجھ رہا تھا۔ وہ خوفزدہ تھا یا خوفزدہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے سہارا دے کر اسے پاؤں پر کھڑا کیا۔ اس وقت برآمدے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔یقیناً فرزند علی کی گنی چنی گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ کیتھی بھاگتی

ہوئی کمرے میں گھس آئی۔ اس کے عقب میں کم از کم آٹھ آدمی تھے۔ دو کے ہاتھ میں برچھیاں اور باقی لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ ان کے پیچھے دونوں انگریز بھی نظر آرہے تھے۔

میں کیتھی اور ہابو ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ حاکم علی کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ بندوق لہرا کر انگریز ڈیوڈ سے بولا "تو اس لڑکی کے ٹکڑے کر میں اس تھانیدار سے حساب لیتا ہوں۔" پھر اس کی بندوق میرا نشانہ لینے کے لیے بلند ہوئی۔ اب تاخیر کا مطلب موت تھا۔ میں نے دو قدم بھاگ کر چھلانگ لگائی اور حاکم علی کے اوپر جا گرا بندوق کی نالی میری بغل سے ہوتی ہوئی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ فائر ہوا اور چھروں کی بوچھاڑ چھت میں گھس گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ لاٹھی بردار مجھ پر جھپٹیں گے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا میں نے گردن گھما کر دیکھا لاٹھی بردار وہ غلطی کر چکے تھے۔ جس کی مجھے توقع تھی۔ انہوں نے ہابو پر حملہ کیا تھا۔ میں جانتا تھا ہابو اس وقت جدوجہد کرے گا جب اس کی جان خطرہ لاحق ہو میرے دیکھتے دیکھتے وہ لاٹھیاں اس کے سر پر پڑیں اور وہ ایک غراہٹ کے ساتھ لاٹھی برداروں پر پل پڑا۔ اس کا انداز انتہائی وحشیانہ تھا۔ میں نے اپنے تلے دبے حاکم علی کی کنپٹی پر اس زور سے ریوالور کا دستہ مارا کہ اس کے پاس بے ہوش ہونے کے سوا چارہ نہیں رہا۔

میں اٹھا اور پورے جوش کے ساتھ ہابو کا ہاتھ بٹانے لگا پلک جھپکتے ہی میدان صاف ہو گیا درحقیقت پردیپ کمار کے آدمی ہابو سے اس قدر خوفزدہ ہو چکے تھے کہ انہیں بھاگنے میں ہی عافیت نظر آئی۔ صرف ڈیوڈ اور اس کے ساتھی نے کچھ مزاحمت کی۔ دیوڈ کو تو ہابو کا ایسا جھانپڑا پڑا کہ وہ تین قلا بازیاں کھا کر کمرے کی دہلیز پر گرا اور اٹھ نہ سکا جب کہ اس کے ساتھ کو میں نے قابو کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد سہارنپور سے میرا سب انسپکٹر عملے کے ساتھ پہنچ گیا۔ ہابو کی ماں بھی اس کے ساتھ تھی، اور بیٹے ملاپ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ

جسے ہاتھ لگانے سے بھی کراہٹ آتی تھی ماں کے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ اور وہ بڑی محبت سے اس کا بدوضع چہرہ چوم رہی تھی۔ پھر اس نے بیٹے کے ہاتھ میں ہتھکڑی دیکھی اور چلا اٹھی "حضور! یہ بے گناہ ہے اسے چھوڑ دیں"

میں نے کہا "مائی اسے چھوڑنا میرے بس میں نہیں اس نے چار افراد کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں"

انگریز لڑکی کیتھی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "انسپکٹر! ہام تم سے کچھ کہنا مانگتا ہے۔" میں ہمہ تن گوش متوجہ ہو گیا۔ لڑکی نے جو بیان دیا اس کے لب لباب یہ تھا ڈیوڈ نے ہابو کی عجیب جسمانی ساخت دیکھ کر ایک منصوبہ سوچا تھا۔ وہ اسے اپنے سرکس میں لے جانا چاہتا تھا۔ (جن دنوں کی یہ بات ہے برطانیہ میں فریک شوز freak shows کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ فریک شوز میں عجیب جسمانی ساخت رکھنے والے افراد کی نمائش کی جاتی ہے۔ مثلاً" کوئی بے حد دبلا شخص کوئی بہت موٹا شخص کوئی ٹھگنا یا لمبا شخص جس شخص کا جسمانی عیب ہوتا تھا وہ اتنا ہی کامیاب کرکے سرکس والے خوب دولت کماتے تھے۔ یہ سلسلہ انسانیت سوز ہونے کے باوجود مغربی ممالک میں تا دیر جاری رہا) ہابو کو دیکھ کر ڈیوڈ مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس شخص کے وا سطے سے بے پناہ دولت کما سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اغوا کیا گیا تھا۔ لیکن آداب غلامی سکھانے کے لیے اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ نتیجتاً" فرار ہونے کے بعد وہ سخت خطرناک ثابت ہوا۔

مجھے یاد آیا کہ بشیرے اور حنیفاں کے قتل کے موقعے پر مقتولین کے پاس ہتھیار موجود تھے بشیرے کی لاش کے پاس درانتی پڑی تھی شکاری شنکر بھی ظاہر ہے بندوق سے مسلح تھا۔ موجودہ صورت حال میں اندازہ ہوتا تھا کہ ہابو نے یہ قتل خوفزدگی کے عالم میں جان بچنے کے لیے کیے..... لیکن ایک قتل ایسا تھا جو اس پوری کہانی میں فٹ نہیں بیٹھتا تھا اور وہ تھا کمپاؤنڈر کا الطاف کا قتل یہ قتل ہابو نے جان بچانے کے لیے نہیں بلکہ منصوبے کے تحت کیا۔

شوہر کی جان لی اور نوبیاہتا بیوی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی۔ اس قتل سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ ہابو اتنا سیدھا سادا اور کم عقل نہیں جتنا اس کی ماں بتاتی ہے اور جتنا وہ چہرے سے نظر آتا ہے۔ یہ قتل اسے پھانسی کے پھندے تک لے جانے کے لیے کافی تھا۔

میں حبیب عرف ہابو اور اس کی ماں جوہڑ کے کنارے کھڑے تھے۔ ہمارے سامنے دور دور تک سرکنڈے پھیلے تھے الطاف کو قتل کرنے کے بعد ہابو انہی سرکنڈوں میں چھپا تھا۔ میں نے ہابو کی ہتھکڑی اے ایس آئی فرزند علی کو تھمائی اور سرکنڈوں میں گھس گیا۔ مجھے ہابو کی بے گناہی کا ثبوت تلاش کرنا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہابو نے اشارے کنایوں اور بے معنی الفاظ کے ذریعے اپنی ماں کو بتایا تھا کہ اس نے پرسوں رات کسی کو قتل نہیں کیا۔ یعنی وہ بتا رہا تھا کہ الطاف کا قتل اس نے نہیں کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سرکنڈوں میں ایک لاش پڑی ہے۔

اگر ہابو کا بیان درست تھا اور سرکنڈوں میں واقعی کوئی لاش موجود تھی، تو عین ممکن تھا یہ لاش اس شخص کی ہو جس نے الطاف کو موت کے گھاٹ اتارا اور اس کی بیوی مجرمانہ حملہ کیا اور اگر واقعی الطاف ہابو کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا تو میرے نزدیک ہابو بے گناہ تھا۔ اس نے تینوں قتل جان بچانے کی فطری عمل کے تحت کیے تھے۔ ان واقعات کی زمے داری ہابو سے زیادہ حاکم علی کے لالچی مہمانوں پر عائد ہوتی ہے۔

میں دھڑکتے دل کی ساتھ ہابو کی بتائی ہو سمت میں بڑھ رہا تھا۔ ..... آخر میں پانی سے بھرے ہوئے ایک چھوٹے گڑھے کے کنارے پہنچ کیا .....پچھلے پہر کی دھوپ میں سرکنڈوں پر چند گدھ منڈلا رہے تھے اور گڑھے میں ایک لاش تیر رہی تھی۔ ہانکے کے دوران ہم اس مقام تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کے سر پر ایک گہرا زخم تھا۔

میں اسی وقت سمجھ گیا کہ یہی شخص الطاف کی موت کا ذمے دار ہے بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ پتہ چلا کہ یہ شخص الطاف کا رقیب تھا۔اس نے قصبے میں ہونے والے قتل کی وارداتوں سے فائدہ اٹھایا اور الطاف کو پر اسرار طور پر قتل کرکے اس بیوہ پر مجرمانہ طور پر حملے کی کوشش کی۔ آپ کو یاد ہو گا الطاف کی بیوی نے بیان دیا تھا کہ مجرم کے جسم سے بو کے ناگوار بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس بو سے ہمارا دھیان فوراً" ہابو کی طرف چلا گیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ درحقیقت مجرم نے اس وقت شراب پی رکھی تھی اور یہ ناگوار بو شراب کی تھی وہ نشے سے چور تھا اور یہی مدہوشی اس کی موت کا سبب بنی ۔ وہ سرکنڈوں میں پناہ لینے کے لیے داخل ہوا لیکن گڑھے میں جا گرا۔ سر کے زخم نے بھی اس کی موت میں اہم کردار ادا کیا۔

میں گڑھے کے کنارے بیٹھا' تیرتی ہوئی لاش دیکھ رہا تھا۔ ذہن خیالوں کا تانا بانا بننے میں مصروف تھا..... پھر میں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ میں نے اسے کہا میں نے اے ایس آئی فرزند علی کو اپنے پاس بلایا وہ ہابو اور اس کی ماں سمیت سرکنڈوں میں داخل ہونے لگا میں نے اسے کہا کہ ان دونوں کو باہر ہی رہنے دے۔ وہ انہیں چھوڑ کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر نامعلوم نوجوان کی لاش پانی سے باہر نکالی اور اطمینان سے معائنہ کرنے لگا۔ فرزند علی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ آخر وہ بول ہی پڑا۔

"خاں صاحب ملزم نکل جائے گا۔

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے نکل جانے دو فرزند علی ورنہ وہ ساری عمر جیل یا پاگل خانے میں سڑتا رہے گا ..... کیا تم ایسا چاہتے ہو"

فرزند علی خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ ساری بات سمجھ رہا تھا۔ طویل سانس لے کر بولا۔

"خان صاحب! اگر وہ پھر پکڑا گیا تو"

"وہ نہیں پکڑا جائے گا فرزند علی" میں نے پورے یقین سے کہا۔ "مفرور اس لیے پکڑے جاتے ہیں کہ وہ اپنے دماغ سے سوچتے ہیں اگر کوئی مفرور مال کے دماغ سے سوچے تو کبھی نہ پکڑا جائے گا ..... میں جانتا ہوں ہابو نہ کبھی جرم کرے گا ور نہ پکڑا جائے گا--"

کچھ دیر ہم یوں ہی بیٹھے رہے پھر میں نے سرکنڈوں سے سر نکال کر دیکھا .... جوہڑ کا کنارہ خالی تھا .... ہابو کی ماں اسے اپنے پروں میں چھپا کر نجانے کس گھونسلے میں جا بیٹھی حاکم علی اس کے کیے کی سزا بیٹے کی موت اور ایک سال قید کی شکل میں ملی دونوں انگریزوں کو مختلف دفعات کے تحت سزا ہوئی۔ یہ سزا ان کے جرائم کے پیش نظر کچھ بھی نہیں تھی۔ بہر حال وہ انگریز کا دور تھا۔ ہم دیسی لوگ کیا کہہ سکتے تھے۔ کیتھی کو سہارنپور بہت پسند آیا وہ کچھ دن وہاں رہی بابے شرفو کو وہ ینگ مین (جوان آدمی) کہتی تھی۔ آخر ایک دن وہ ینگ مین کو اداس کر کے واپس ولایت چلی گئی۔



ڈائمنڈاردوبکس

تمام کتب فی سبیل اللہ

ایڈمن ٹیم:

شاہ زر خان + کول فائر

جہاں ملیں آپ کو نایاب کتب نایاب ویب سائٹس سے

Rekhta	ناول + کھانیاں
Scribd	ماھانہ ڈائجسٹ
Slide Share	عمران سیریز
Kitab Ghar	بچوں کی کھانیاں
English Book,s	سکول وکالجزبکس
English Novel,s	نوٹس + مواد

اس گروپ میں ایڈمنز 24/7 دستیاب ہوتے ہیں

اورآپ کی ڈیمانڈ پر بروقت کام کیا جاتا ہے

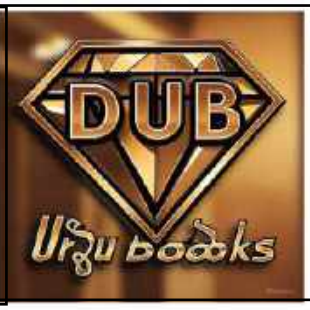
03176699066
SHAHZAR KHAN
TEAM DIAMOND URDU BOOKS

COOL FIRE/WAQAS AHMED
TEAM DIAMOND URDU BOOKS
03256699979

تمام کتب انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کرکے مہیا کی جاتی ہیں جو کتاب پیڈ ہو یا پی ڈی ایف میسر نہ ہو وہ شیئر نہیں کی جاتی

ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس گروپس لنکس

گروپ میں ایڈ ہونے کے لیئے گروپ کے نام یا تصویر پہ کلک کریں

 ڈائمنڈ اردوبکس	 ڈائمنڈ اردوبکس
 ڈی یوبی میڈیا	 کاروانِ شعروادب
 اردوتحاریر کاگلدستہ	 ڈائمنڈ لنکس ورلڈ
 کتابوں پر تبصرے	 حمدونعت آفیشل
 ڈی یوبی ٹیلی گرام 300,000+ books	 فیس بک گروپ ڈائمنڈ اردوبکس

لنک ری سیٹ ہونے یا کام نہ کرنے کی صورت میں اس نمبر پر رابطہ کریں

شاہ زر خان: 03176699066

DUB

یا اللہ عزوجل　　بسم اللہ الرحمن الرحیم　　یا رسول اللہ ﷺ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معزز اراکینِ ڈائمنڈ اردو بکس !

آپ سب کو ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس کے گروپس میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

گروپس کے قواعد و ضوابط :

گروپس میں کسی بھی قسم کی تصاویر ، ویڈیوز ، آڈیوز ، فیس بک/واٹس ایپ لنکس ، یا وائس میسجز شیئر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

کوئی بھی ممبر کسی دوسرے ممبر سے ذاتی رابطہ (بغیر اجازت) نہ کرے۔ شکایت کی صورت میں متعلقہ ممبر کو تمام گروپس سے نکال دیا جائے گا۔

تمام ممبران اور ایڈمنز کے ساتھ خوش اخلاقی، عزت و وقار اور بہترین تربیت کا مظاہرہ کریں۔

گروپس میں سیاسی ، مذہبی یا کوئی بھی ایسی بحث جس سے انتشار پیدا ہو یا جھگڑے کا خدشہ ہو ، سختی سے منع ہے۔

یہ قواعد سخت ضرور ہیں، لیکن ان کا مقصد گروپ کے نظم و ضبط اور ممبران کی سہولت کو یقینی بنانا ہے۔

انتہائی اہم اعلامیہ

گروپ میں قادیانی، مرزائی، احمدی، مرتد، گستاخِ رسول، گستاخِ صحابہ و اہلِ بیت، گستاخِ اولیاء، دہشت گرد تنظیموں، پاکستان و اسلام مخالف افراد، فوج یا سرکاری اداروں کے خلاف بولنے والوں کا داخلہ سختی سے ممنوع ہے۔ ایسے افراد کی شناخت کی صورت میں انہیں فوری طور پر تمام گروپس سے نکال دیا جائے گا۔

ہم صرف معیاری کتب فراہم کرتے ہیں، تاہم درج ذیل کتب ہماری پالیسی کا حصہ نہیں ہیں:

شیعہ مکتبہ فکر کی کتب , انتشار پھیلانے والی تحریریں , اداروں اور ریاست پاکستان کے خلاف مواد , لادین، ملحد یا فتنہ پرور مصنفین کی کتب

نوٹ :

تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش کر کے فی سبیل اللّٰہ اور بغیر کسی معاوضے کے فراہم کی جاتی ہیں (خود سکین نہیں کرتے)۔ اگر کسی کتاب سے متعلق کاپی رائٹ مسئلہ ہو تو براہِ کرم ایڈمنز سے رابطہ کریں، متعلقہ کتاب گروپ سے حذف کر دی جائے گی۔

رابطہ برائے شمولیت یا گروپ لنک ری سیٹ

سپر ایڈمن شاہ زر خان

+92 317 6699066

ایڈمن وقاص احمد/کول فائر

+44 7716 717193

+994 40 729 52 41